سب رنگ ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلس

بازیگر

پہلا حصّہ

پیش نوشت

بازی گر ایک آشفتہ مزاج اور مہم جُو نوجوان بابر زماں کی آپ بیتی ہے۔ بڑی دھوم رہی ہے اس کی۔ بہت شہرت کمائی ہے اِس نے۔ یہ سب رنگ کا ایک مقبول سلسلہ ہے۔ پڑھنے والے نہایت بے قراری سے اِس کا انتظار کرتے ہیں اور بہت ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں مگر اِس کے مصنف کا نام کبھی شائع نہیں ہوا لیکن جو قارئین شکیل عادل زادہ کے اسلوب اور طرزِ نگارش سے آشنا ہیں اُن کے لیے یہ راز کبھی راز نہیں رہا۔ بات دراصل یہ ہے کہ شکیل عادل زادہ کا طرزِ تحریر اس قدر منفرد اور یکتا ہے کہ بقول شاعر

کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے!

بازی گر کا اسلوب بیانیہ ہے مگر بیانیہ طرزِ اظہار جتنا آسان نظر آتا ہے اتنا ہی [illegible] بھی ہے۔ اس میں کبھی کبھی بڑے نازک مقامات آتے ہیں۔ ایسے ہفت خواں سر کرنے پڑتے ہیں کہ بیساکھی دے کر نکلنے اور علامتوں کی بیساکھی کے سہارے آگے بڑھنے کی گنجائش نہیں۔ اس میں رمز وکنایہ سے اِس خوبی اور مہارت سے کام لینا پڑتا ہے کہ تحریر میں جھول پیدا نہ ہو۔ سلاست وروانی اپنی پوری رعنائی کے ساتھ برقرار رہے۔ سچ پوچھیے تو یہ الفاظ کے برمحل استعمال، اُن کی نشست برخاست، اُن کی تزئین اور ترتیب کا فن ہے اور اس فن میں شکیل عادل زادہ کو مہارت حاصل ہے۔ یہ مہارت انھوں نے اپنی خداداد صلاحیت، محنت اور ریاضت سے حاصل کی ہے۔

شکیل عادل زادہ نے بہت لکھا اور خوب لکھا ہے۔ بازی گر کو اُن کے تخلیقی سفر میں ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ صرف بابر زماں کی آپ بیتی نہیں، جگ بیتی بھی ہے۔ اس کے کردار معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے انسان ہیں جو اندھیرے کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں اور اندھیرے ہی میں پروان چڑھتے ہیں۔ یہ چور، اُچکے، بدمعاش اور غنڈے ہیں۔ قتل وغارت جن کا پیشہ ہے مگر اس شر میں بھی خیر کا پہلو ہے اور یہ زندگی کی ایک بنیادی حقیقت کا اظہار ہے۔ معاشرے کا کوئی بھی فرد سراپا بُرا نہیں ہوتا۔ اس کے وجود میں ایک اچھا انسان بھی چھپا ہوتا ہے اور اسی بُرائی اور اچھائی کے امتزاج سے اس کی تشکیل اور تعمیر ہوتی ہے۔ اور اسی اچھائی اور بُرائی کے تضاد سے اُس کی شخصیت اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ یہی تضاد کہانی میں زندگی کا رنگ بھرتا ہے۔ فن کار کا کمال فن یہ ہے کہ اپنے کرداروں کے اس تضاد کی بازیافت کرے اور اِس خوبی اور چابک دستی سے کرے کہ اُن کی محبت اور نفرت، اُن کے دُکھ درد اور خوشیاں قاری کی اپنی محبت اور نفرت اور اپنی خوشی اور غم بن جائے۔ بات یہ ہے کہ قاری جب قصّے کے حصار میں داخل ہو جاتا ہے تو وہ اس کے سحر میں صرف کھو نہیں جاتا بلکہ اپنی خوشیاں، اپنی ناآسودہ خواہشات اور وہ سب کچھ تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اُسے زندگی میں نہیں ملتا۔ لکھنے والا جب اپنے قارئین کے یہ مطالبات مہیا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، تب ہی قبول عام کی سند حاصل کرتا ہے۔ بازی گر ایک ایسی ہی ادبی تخلیق ہے۔ اس میں صرف تفریح طبع کا ساماں نہیں ہے، زندگی کی ہنگامہ آرائی ہے۔ ہل چل ہے اور گہما گہمی ہے جو کبھی خون کی گردش تیز کر دیتی ہے، کبھی دل گرفتہ کر دیتی ہے اور کبھی مبہوت اور دم بخود کر دیتی ہے۔ کہتے ہیں اندھیروں میں رنگوں کا فرق مٹ جاتا ہے۔ شکیل عادل زادہ کے فن کی خوبی یہ ہے کہ اندھیرے میں جنم لینے والوں اور اندھیرے میں رہنے والوں نے اپنے کرداروں کی انفرادیت برقرار رکھی ہے۔ جس طرح اُن کی عادات واطوار اور اقدار مختلف ہیں۔ اس طرح اُن کی شناخت بھی ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ہر ایک کا اپنا علیحدہ مزاج ہے اور اپنی نرالی کج کلاہی اور سج دھج ہے۔

بازی گر کی تعمیر وتشکیل میں کلاسیکی داستان نگاری اور جدید افسانہ نگاری کا ایسا دل آویز امتزاج ہے کہ اُسے پڑھتے ہوئے الف لیلہ کا سندباد جہازی، آرائشِ محفل کا حاتم طائی، فسانۂ آزاد کا آزاد اور ایسے ہی دوسرے لازوال کردار بار بار آتے ہیں مگر جس طرح یہ تمام کردار اپنی اپنی جگہ منفرد اور یکتا نظر آتے ہیں، اسی طرح بازی گر کا بابر زماں بھی اپنی انفرادیت اور اپنا علیحدہ تشخص رکھتا ہے۔ وہ دلیر ہے، حوصلہ مند ہے، خوب صورت اور وجیہ ہے، دشت نورد ہے، محبت بھی ٹوٹ کر کرتا ہے۔ نفرت کی آگ میں بھی جلتا ہے۔ قدم قدم پر مصائب اور ابتلا سے دوچار ہوتا اور مردانہ وار اُن کا مقابلہ کرتا ہے۔ موت سے آنکھ مچولی کرنے میں تلذذ محسوس کرتا ہے۔ حسینوں اور مہ جبینوں کے حسن اور رعنائی سے متاثر بھی ہوتا ہے۔ بازی گر ایک ایسا نظامِ شمسی ہے جس میں بابر زماں کو سورج کا مقام حاصل ہے۔ دوسرے تمام کردار اور واقعات اس کے گرد گردش کرتے ہیں۔ شکیل نے اس کردار کو جس محنت سے تخلیق کیا ہے، اسی احتیاط اور مہارت سے اس میں توازن اور اعتدال بھی برقرار رکھا ہے۔ اپنے شگفتہ اور دل نواز طرزِ تحریر سے اسے سجایا ہے، نکھارا ہے اور سنوارا ہے۔

بازی گر، شکیل عادل زادہ کی ایک مقبول اور ہر دل عزیز ادبی تخلیق ہے۔ اسے کل بھی قبول عام کی سند حاصل تھی، آج بھی ہے اور مجھے اُمید ہے کہ آئندہ بھی اسے یہی مقام حاصل رہے گا۔

شوکت صدیقی

۱۲ جولائی ۱۹۸۷ء

امنگوں حسرتوں آنسوؤں اور آہوں کی داستان

شاید میری زندگی میں کوئی تبدیلی نہ آتی اگر میں اُس روز گھر جانے کے بجائے خلافِ معمول ریلوے اسٹیشن نہ چلا جاتا اور کلکتے سے آنے والی ہوڑہ ایکسپریس تین ساڑھے تین گھنٹے لیٹ نہ ہوتی۔ روزانہ صبح سویرے سیر کرنا میرا معمول تھا۔ یہ عادت میں نے اپنے والد سے سیکھی تھی۔ شروع شروع میں میں اُن کے ساتھ ہی آتا تھا مگر وہ گھٹنوں کے درد کے باعث زیادہ دُور چلنے سے معذور ہو گئے تھے اس لیے میں نے تنہا سحر خیزی شروع کر دی تھی۔ کبھی اس طرف کبھی اُس طرف۔ میں شہر کے مختلف حصّوں میں نکل جاتا اور کوئی آٹھ بجے گھر واپس پہنچتا۔ اُس روز اسٹیشن کی رونق شباب پر تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ آج ہوڑہ ایکسپریس خاصی تاخیر سے آ رہی ہے۔

ریل جب کسی بڑے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر گرجتی ہوئی داخل ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے زندگی کا سوئچ آن کر دیا ہے۔ بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ خصوصاً میری عمر کے لوگوں کے لیے یہ تماشا دیدنی ہوتا ہے۔ بھاگتے ہوئے قلی چیختے ہوئے خوانچہ فروش، گھبرائے ہوئے مسافر، آنے والے، جانے والے، بچے بوڑھے اور جوان، ننھے ننھے چہرے، گورے، کالے، چھوٹے لمبے، دُبلے پتلے۔

میں جس شہر کا ذکر کر رہا ہوں اُس کا نام گیا ہے۔ گیا، بہار کا ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ اُس کی آبادی ڈھائی لاکھ سے زیادہ نہیں ہے۔ اُس کے تین اطراف پہاڑیاں ہیں اور چوتھی طرف ندی ہے۔ اس محلِ وقوع کے اعتبار سے اُسے دلکش شہروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ کپل وستو سے شاکیہ منی یہاں آئے تو یہیں کے ہو گئے۔ اس شہر کی فضاؤں میں ایک سکون سا گھلا ہوا ہے۔ گوتم بُدھ نے یہیں نروان حاصل کیا اس لیے اسے کچھ لوگ گوتم کے شہر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ گوتم بُدھ کے اس شہر میں بُدھ مذہب کے پیرو برائے نام ہیں۔ اس کے برعکس یہاں کی آبادی ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ جن دنوں یاتریوں کی آمد شروع ہوتی ہے، شہر کی گھما گھمی میں ایک دم اضافہ ہو جاتا ہے۔ زندگی تیز ہو جاتی ہے، بازار سجنے لگتے ہیں اور بہت سے بے کار روزگار سے لگ جاتے ہیں۔ مہاتما بدھ کی سالگرہ کا یہ میلا مسلسل ایک مہینے تک جاری رہتا ہے۔ اس عرصے میں شہر کی آبادی خاصی زیادہ ہو جاتی ہے۔ شہر کی انتظامیہ کو بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ رضاکار طلبہ کے دستے بن جاتے ہیں۔ یہ دستے گیا آنے والے بُدھ مسافروں کی مدد کرتے ہیں اور انتظامیہ کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ اسٹیشن سے سات میل دُور بدھوں کا خاص علاقہ ہے اسے بُدھ گیا کہتے ہیں۔ یہ علاقہ کئی مربع میل میں پھیلا ہوا اور ایک جزیرے کی سی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ یہاں کی دُنیا قطعی مختلف ہے۔ سارے علاقے میں گوتم بدھ کے چھوٹے بڑے مندر اور پگوڈے بنے ہوئے ہیں۔ گیروے رنگ کے کپڑوں میں ملبوس بُدھ پجاری ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ تمام مندروں کی صناعی دیکھنے کے لائق ہے۔ بعض مندر تو ایسے ہیں جن میں ہیرے جواہر جڑے ہوتے ہیں۔ مندروں کے اس سلسلے کا سب سے نمایاں مندر وہ ہے جس کے احاطے میں پیپل کا ایک بہت قدیم درخت اپنی شاخیں پھیلائے کھڑا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ گوتم بُدھ نے اسی درخت

کے سائے میں ریاضت کی تھی اور نروان حاصل کیا تھا۔ یہاں ہر طرف گوتم کی مورتیاں ہیں اور اس ترتیب سے نصب کی گئی ہیں کہ ان سے گوتم بدھ کی پوری زندگی کی عکاسی ہوتی ہے۔ اس مندر کا کلس بُدھ گیا پہنچنے سے بہت پہلے دکھائی دینے لگتا ہے۔ جن دنوں یہاں میلا لگتا ہے، اسٹیشن تک سات میل کا راستہ مختلف رنگوں اور نسلوں کے یاتریوں سے آباد ہو جاتا ہے۔ بعض یاتری پیدل چل کے آتے ہیں اور اس طرح گوتم بُدھ سے اپنی والہانہ عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔

یہ اُس دن کا ذکر ہے جب شاکیہ مُنی کی ولادت کا جشن منایا جا رہا تھا اور سارا شہر بدل گیا تھا۔ مجھے بھی طلبہ کے رضا کار دستے میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی تھی مگر میری طبیعت ذرا مختلف تھی، اس لیے میں نے اپنی والدہ کی علالت کا بہانہ کر کے چھٹی لے لی تھی۔ ہوڑہ ایکسپریس آنے والی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ بہت سے طلبہ کی ڈیوٹی اسٹیشن پر بھی لگائی گئی ہے کہ وہ یاتریوں کی رہبری کریں۔ آج انھیں خُوب مزا آیا ہو گا۔ انتظار میں ساری رات گزر گئی ہو گی۔ اُن کا حال احوال پوچھنے اور ہوڑہ ایکسپریس سے اُترنے والے مسافروں کا تماشا دیکھنے کے لیے میں پلیٹ فارم پر آ گیا جیسے ایک دم کسی نے پلیٹ فارم کی زور سے چٹکی لے لی ہو قلیوں میں افراتفری مچ گئی۔ ہوڑہ ایکسپریس کا سیاہ انجن تیز سیٹیاں بجاتا ہوا پلیٹ فارم میں داخل ہو رہا تھا۔ سب طالب علم منتشر ہو گئے۔ میں ایک جگہ چائے کے اسٹال پر دیوار کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ میں نے دیکھا کہ سیکنڈ کلاس کے ایک کمپارٹمنٹ کے سامنے ایک بوڑھا اور اُس کی کم سن لڑکی بے یار و مددگار کھڑے ہیں۔ کسی قلی کی بھی نظر اُن پر نہیں گئی۔ یہ سیزن کا زمانہ تھا۔ قلی کم مسافر زیادہ تھے۔ ہر شخص اپنی دُھن میں مست تھا۔ کوئی رضا کار طالب علم بھی ان کی مدد کے لیے نہیں آیا۔ گو اُن کے پاس سامان مختصر تھا لیکن بوڑھا اُسے اپنے کاندھے پر اٹھاتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ کم سن لڑکی اضطراب میں اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ اُس کی عمر تیرہ سال سے زیادہ نہیں ہو گی۔ میری نظریں اسی پر جم گئی تھیں۔ وہ بہت نازک اور حسین تھی۔ میں اُس کی طرف کھنچتا چلا گیا اور میں نے آگے بڑھ کے اُن کا سامان اٹھا لیا۔ بوڑھے نے ٹوٹی پھوٹی ہندی اردو میں میرا شکریہ ادا کیا۔ لڑکی کی نگاہیں ممنونیت سے چمک اٹھیں۔ بوڑھا شکل سے ہمالیا کی ترائی والے علاقے کا کوئی باشندہ معلوم ہوتا تھا لیکن لڑکی کے نقش و نگار خالص ہندوستانی تھے۔ صرف اُس کے ملتھے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اُس کا تعلق بوڑھے کی نسل سے بھی ہو سکتا ہے، مجھے یقین تھا کہ سکم، نیپال، تبت اور بھوٹان کے سوا ان کا وطن کہیں اور نہیں ہو سکتا۔

اسٹیشن سے باہر آ کے میں نے کسی نہ کسی طرح جد و جہد کر کے ایک تانگا حاصل کیا۔ میں تانگے والے کے ساتھ بیٹھا اور وہ دونوں پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ میں نے غور سے اُسے دیکھا۔ اُس کے رخساروں پر سُرخی چھائی ہوئی تھی ویسے اُس کا رنگ خُون میں تھوڑے سے پانی سفیدا اور پیلا رنگ ملا کے بنایا گیا تھا۔ وہ اپنے روایتی لبادہ نما ریشمی لباس میں ایک نازک سی گڑیا معلوم ہو رہی تھی۔ اُس کے گندھے ہوئے لمبے سیاہ بال کمر تک لٹکے ہوئے تھے۔ اُس کے دانت موتیوں کے بنے ہوئے تھے۔ وہ بہت شرمیلی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ جب وہ اپنی دراز پلکوں کو جنبش دیتی تو مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے تانگا ہچکولے کھانے لگا ہے۔ میری عمر ایسی زیادہ نہیں تھی۔ یہی کوئی سولہ سترہ سال ہو گی۔ فرسٹ ایر کا طالب علم، گھر میں ضدّی، نک چڑھا اور قنوطی مشہور تھا۔ آج تک کسی لڑکی کو اس طرح نہیں دیکھا تھا۔ افسانوں اور ناولوں کے قصّے مجھے جھُوٹ معلوم ہوتے تھے۔ خاندان میں کئی حسین لڑکیاں تھیں مگر اُن پر نظر ہی نہیں گئی تھی۔ اسکول میں بھی میں اپنے ساتھیوں سے بہت کم ملتا جُلتا تھا۔ اعزا سمجھتے تھے کہ یہ لڑکا خود پسند، مغرور اور بد تہذیب ہے، چنانچہ والد صاحب کی توجہ بھی میری جانب کم سے کم تھی۔ مجھے یہ زندگی ہی کچھ بے مزہ اور بے رنگ معلوم ہوتی تھی۔ صبح اٹھیے، شام تک محنت کیجیے۔ دوسروں کی برائیاں کیجیے، رات کو سو جائیے۔ سب کا یہی معمول تھا۔ میں جب نویں میں تھا اُسی وقت سے میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ میں زندگی کے اس چکر میں نہیں پڑوں گا۔ میں نے میٹرک فرسٹ کلاس پاس کیا۔ کالج نے مجھے فرسٹ ایر میں وظیفہ آفر کیا جو میرے زمیں دار باپ کی شان کے خلاف تھا۔ انھوں نے حقارت سے اسے مسترد کر دیا حالانکہ زمیں داری کوئی ایسی بڑی نہیں تھی۔ بس کھاتے پیتے لوگ تھے، عزت تھی، لوگ احترام کرتے تھے، جھک کے سلام کر لیتے تھے۔ چار بہنیں، دو چھوٹے بھائی، ایک ماں، ایک باپ۔ اگر مجھے شامل کر لیجیے تو کل نو افراد تھے، بہتر ہے مجھے شامل نہ کیجیے کیونکہ والد صاحب مجھے کالی بھیڑ کے نام سے پکارتے تھے۔ پتہ نہیں، یہ وہ کیوں کہتے تھے؟ میرا قد نکلتا ہوا، رنگ نکھرا ہوا اور چہرہ زمیں داروں کے بیٹوں کے چہروں کی طرح دلکش اور با وقار تھا۔ ہاں میں اپنے مزاج، فکر اور اطوار میں ضرور اُن سے مختلف تھا۔ ضبط کی یہ حالت تھی کہ گرمی، سردی، برسات کچھ بھی ہو، میرے معمولات میں فرق نہیں آتا تھا۔ ایک بار طے کر لیا تھا کہ صبح سیر کے لیے جایا کریں گے چنانچہ میں جاتا رہا، والد صاحب ہار گئے۔ میں نہیں ہارا۔

بوڑھے کے ساتھ اُس لڑکی کو دیکھ کے مجھ پر عجیب سے احساسات طاری ہوئے۔ جسم میں کوئی چیز تڑپنے لگی۔ جی چاہا اُسے گھر لے جاؤں اور شیشے کی اُس الماری میں بند کر دوں جس میں چینی کے برتن رکھے ہوئے ہیں۔ صبح و شام اُسے دیکھا کروں۔ زلفوں اور رخساروں کے متعلق میں نے صرف شعر پڑھے تھے اور وہ شعر مجھے کبھی اچھے نہیں لگے تھے۔ میں شاعروں کو پاگل سمجھتا تھا مگر آج ان کی اور ان کے شعروں کی حقیقت مجھ پر واضح ہو رہی تھی۔ راستے میں بوڑھے شخص نے شفقت سے میرا نام پوچھا اور اپنا نام بتایا۔ اُس کا نام اجین تھا۔

"اور ان کا نام؟" میں نے بے اختیار پوچھا۔

"اُس کا نام کورا ہے۔ میری بچّی ہے۔" اُس نے جواب دیا۔

"کیا آپ تبت سے آ رہے ہیں؟" میں نے شائستگی سے پوچھا۔

"ہم بہت دُور سے آ رہے ہیں۔" بوڑھا کچھ سوچتے ہوئے بولا "لیکن ہمارا تعلق ہمالیائی بستیوں ہی سے ہے۔"

"وہاں کے لوگ بہت اچھے ہوتے ہیں، شریف، نیک، محنتی۔"

"گیا کے لوگ بھی کچھ کم اچھے نہیں ہوتے۔"

باتیں شروع ہوئیں تو ہم تمام راستے باتیں کرتے رہے۔ اُس نے مجھ سے میری تعلیم اور خاندان کے بارے میں پوچھا۔ میری شرافت کی بڑی تعریف کی۔ بوڑھے کی ہندوستانی صاف نہیں تھی لیکن اُس کا لہجہ بھاری بھرکم تھا۔ آنکھوں میں گہرائی اور چہرے پر تدبّر تھا۔ وہ کوئی معمولی شخص معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا "آپ وہاں کیا کام کرتے ہیں؟"

"پہاڑی کیا کر سکتے ہیں؟" اُس نے مختصر جواب دیا۔

"اور یہ؟" میں نے جھجک کر پوچھا۔ "یہ پڑھتی ہیں؟"

"ہاں کورا بہت اچھی طالبہ ہے۔"

"کورا! آپ کو یہ شہر اچھا لگ رہا ہے؟" وہ اب تک خاموش رہی تھی۔ میں نے پہلی بار ڈرتے ڈرتے اُسے مخاطب کیا۔

اُس کے چہرے کی سُرخی گہری ہو گئی۔ اُس نے آنکھیں پٹ پٹا کر شکستہ لہجے میں کہا۔ "بہت اچھا۔" اُس کی ہندوستانی بھی ٹوٹی پھوٹی تھی مگر آواز بڑی سریلی اور لچک دار تھی۔

"آپ ہمارے گھر آئیے نا، ہماری بہنیں ہیں، ماں ہیں۔ وہ سب آپ سے مل کے بہت خوش ہوں گے۔"

اُس نے شرما کے نظریں جھکا لیں۔ اُس کے بجائے بوڑھے نے جواب دیا "ضرور آئیں گے۔ ہم اپنے بیٹے کے گھر ضرور آئیں گے۔"

سات میل کا یہ سفر باتوں باتوں میں کٹ گیا۔ جب ہم بدھ گیا پہنچے تو دھوپ میں تیزی آ گئی تھی۔ مندروں کے کلس چمک رہے تھے اور ہر طرف بدھ یاتریوں کے غول کے غول رواں دواں تھے۔ میں ان دونوں کو خیموں کی طرف لے گیا جہاں منتظم نے اُن کے ناموں کا اندراج کیا اور جب انھیں قیام کا اجازت نامہ مل گیا تو انھیں اُن کے خیموں میں بسا کے میں نے اجازت چاہی۔ بوڑھا اجین مجھ سے بہت متاثر تھا۔ وہ مجھے بار بار دعائیں دے رہا تھا۔ کہتا تھا کہ اگر اُس کا بیٹا زندہ ہوتا تو وہ آج میرے برابر ہوتا۔ وہ اپنے خیمے سے ایک گہری وادی میں گر گیا تھا۔ بوڑھے کے لہجے میں سکون، وقار اور دکھ شامل تھا۔ جب میں واپس ہونے لگا تو اجین نے مجھے روک کے اپنا صندوق کھولا اور موتیوں کی ایک مالا نکال کے زبردستی میرے گلے میں ڈال دی۔ میں نے مالا لاکھ واپس کرنا چاہی مگر اُس نے میری ایک نہ سنی۔ چلتے چلتے اجین نے میرے گھر کا پتہ دریافت کیا۔ پتہ بہت آسان تھا میرا مکان محلہ کریم گنج میں تھا۔ میں نے اُسے مکان کا نقشہ بخوبی سمجھا دیا تھا تاکہ وہ بھول نہ جائے۔ اسی لمحے کورا نے اپنی شیریں آواز سے مجھے روک لیا "آپ ادھر آئیں گے؟" وہ اٹکتے اٹکتے بولی۔

"ضرور آئیں گے۔" میں نے چہک کر کہا "لیکن آپ بھی آئیں گی۔"

اُس نے اثبات میں سر ہلایا "ضرور ضرور آئیں گے۔"

واپسی میں راستے بھر میرے ذہن میں کوئی اور چیز نہیں تھی۔ میں اُن دونوں ہی کے متعلق سوچتا رہا۔ بوڑھے اجین کی دی ہوئی مالا میں نے جیب میں رکھ لی تھی اور کورا کا چہرہ میری آنکھوں میں محفوظ تھا۔ آج کا دن مجھے ایک نیا دن معلوم ہو رہا تھا اور میں خود کو اجنبی اجنبی محسوس کر رہا تھا۔ گھر آ کے میں نے والدہ کو تاخیر سے لوٹنے کی وجہ سچ سچ بتا دی۔ اس رُوداد کی تصدیق کے لیے میرے پاس اجین کی مالا موجود تھی، اُسے والد صاحب نے دیکھا تو کسی سوچ میں پڑ گئے، پھر کہنے لگے "تمھیں یہ مالا کسی صورت میں قبول نہیں کرنی چاہیے تھی۔ یہ بیش قیمت موتیوں کی مالا ہے، مجھے حیرت ہے اُس شخص نے اتنی معمولی خدمت پر یہ تمھیں کیوں بخش دی ہے؟"

"جی ہاں، اُسی نے مجھے دی ہے۔" میں نے قدرے ناراضی سے کہا "میں نے اُسے بہت منع کیا مگر وہ مانا ہی نہیں۔ وہ ایک بہت نیک، شریف اور مال دار شخص معلوم ہوتا ہے۔"

انھیں مجھ پر شبہ ہوا کہ میں جھُوٹ بول رہا ہوں، پہلے ہی میں اُن کا سب سے مشکوک بیٹا تھا۔ انھوں نے مالا کئی بار پرکھی اور کسی جوہری کی طرح اسے نگاہوں میں تولا اور والدہ کے سپرد کر دی جنھوں نے احتیاط سے اپنے زیور بکس میں اسے مقفل کر دیا۔

دن تو جیسے گزرنا تھا، گزر گیا، رات آئی تو مجھے نیند نہیں آئی۔ حالانکہ میں جلد سو جانے کا عادی تھا۔ پوری رات کروٹیں بدلتے گزر گئی۔ کورا کا چہرہ نظروں میں سمایا رہا۔ ایسی بے چینی تھی کہ کسی کروٹ قرار نہیں تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی تین بج رہے تھے۔ والد صاحب فجر کی نماز سے پہلے جاگتے تھے تو مجھے اُٹھا دیتے تھے اُن کے بیدار ہونے سے پہلے گھر سے باہر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ خدا خدا کر کے وہ گھڑی آئی، میں پہلی ہی آواز پر اٹھ بیٹھا۔ انھیں سلام کیا اور جلد سے جلد کپڑے بدل کے گھر سے نکل گیا۔ آج اِدھر اُدھر جانے کے بجائے میرا رُخ بدھ گیا کی سمت تھا۔ آدھے راستے تک میں پیدل چلتا رہا، پھر ایک تانگے میں بیٹھ گیا۔ بُدھ گیا میں میرے پہنچنے سے پہلے ہی دن نکل آیا تھا۔ ہر شخص جاگ رہا تھا اور شاکیہ منی کے قدموں میں پھول نچھاور کرنے، اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کے لیے مضطرب تھا۔ شاکیہ منی کو سکون بہت پسند تھا اور صبح سکون اور امن کی علامت ہوتی ہے۔ اس سال دُنیا کے مختلف حصّوں سے گوتم بدھ کے پیرو بڑی تعداد میں یہاں آئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اجین اس وقت اپنی بیٹی کورا کے ساتھ کسی مندر میں ہو گا۔ احتیاطاً میں نے خیمے میں جھانک لینا مناسب سمجھا۔ خوش قسمتی سے وہ دونوں وہاں موجود تھے، جب کہ باقی خیموں کے باسی مندروں میں عبادت کے لیے چلے گئے تھے۔ میں نے خیمے کے باہر سے آواز لگائی۔ بوڑھا اجین برآمد ہوا۔ وہ مجھے دیکھ کے کھِل اُٹھا اور میری کمر پہ ہاتھ رکھ کے بولا "آؤ آؤ بیٹے اندر آؤ۔"

"آپ ٹھیک تو ہیں نا؟" میں نے پُوچھا۔

"بالکل۔ دیکھو کورا! بابر آیا ہے۔" میں رات تم سے اس کا ذکر کر رہا تھا۔" اجین نے مجھے چٹائی پر بٹھا لیا جس پر ایک سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ سامنے ہی کورا کا بستر تھا۔ وہ لیٹی ہُوئی تھی، میرے پہنچتے ہی اُٹھ بیٹھی۔ اُس نے

اپنی چمکتی اور مسکراتی آنکھوں سے میرا خیر مقدم کیا۔ سلام کے لیے بے اختیار میرے ہاتھ اٹھ گئے۔ اُسے سلام کرنا نہیں آتا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اُٹھے، پھر اُس نے اپنا ایک ہاتھ ماتھے پر ٹکا کے کچھ کہا جسے میں نہیں سُن سکا۔

"آپ کہیں باہر نہیں نکلے؟"

"نہیں، مجھے بھیڑ بھاڑ پسند نہیں ہے۔" اجّین نے انکسار سے کہا۔ "جب بھیڑ چھٹ گئی تھی، اُس وقت ہم نے رات کو بدھ گیا کی سیر کی تھی۔ شاکیہ منی جانتے ہوں گے کہ میرا دل اُن میں ڈوبا ہُوا ہے۔"

"اور کورا آپ؟" میں نے ہمت کر کے پوچھا۔

کورا سے بولا نہیں گیا۔ "یہ۔ یہ تو گھبرا رہی ہو گی۔" اجّین نے جواب دیا۔ "کورا تم باہر سے بات نہیں کرتیں؟ کورا کچھ اور شرما گئی اور اُس نے مٹھائی کا ڈبّا میرے سامنے لا کر رکھ دیا۔ "کچھ کھاؤ نا بیٹے!" اجّین نے مجھ سے شفقت سے کہا۔

"آپ لوگ ہندوستانی بہت اچھی جانتے ہیں۔" میں نے مٹھائی کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" بوڑھا اجّین ہنس کر بولا۔ "میں بہت عرصے تک ہندوستان میں رہا ہوں۔ کورا کو ہندوستانی میں نے ہی سکھائی تھی۔ پھر یہاں آ کے ہم نے ـــــ گھر کے کام کاج کے لیے ایک ملازمہ رکھ لی۔ اس سے کورا نے اچھی خاصی ہندوستانی سیکھ لی ہے۔"

میں نے وہاں زیادہ دیر ٹھیرنے کے لیے شاکیہ منی کی تعلیمات کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں نے اُس کے سامنے گوتم بدھ کی زندگی سے متعلق بہت سی روایتوں پر حیرت کا اظہار کیا۔ میرا خیال تھا کہ اجّین شدّ و مد سے گوتم بدھ کے نظریات فلسفے اور زندگی کی تبلیغ کرے گا اور اس طرح مجھے یہاں کچھ اور قیام کرنے اور کورا کا چہرہ دیکھنے کا موقع مل جائے گا۔ اجّین نے میرا تجسّس غور سے دیکھا مگر کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔ اُس نے سرسری انداز میں گوتم بدھ کی تعلیمات کا ذکر کیا اور کہا جو بدھ کہتے ہیں وہ سچ ہے کیونکہ گوتم کے قریب آئے بغیر اُسے پہچانا اور سمجھا نہیں جا سکتا۔ اُس سے کم از کم مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ ایک عام بدھ شخص ہے۔ کوئی پروہت یا مبلغ نہیں یا اُس کے تجربہ کار حواس نے سراغ لگا لیا تھا کہ میں بعض اخلاقا اور رسمًا یہ گفتگو کر رہا ہوں۔ گفتگو میں شوقِ حصُول کی وہ شدّت نہیں تھی جو ہونی چاہیے۔ کچھ اور نہیں بنا تو میں نے اُس سے کہا۔ "آپ گیا شہر نہیں دیکھیں گے کیا؟"

"شہر سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ دکانیں، بازار، چھوٹی بڑی عمارتیں، غریب امیر لوگ، مجھے تو تم کوئی خاص چیز دکھاؤ۔"

"خاص جگہ تو آپ خود ہی بیٹھے ہیں۔" میں نے مہذب لہجے میں کہا۔ "یاد ہے، کل آپ نے کیا وعدہ کیا تھا؟"

"مجھے بھی یاد ہے، کورا کو بھی یاد ہے۔" اُس نے جواب دیا۔

"تو پھر آپ کب چلیں گے، کل میں نے امّی کو آپ کی دی ہوئی مالا دکھائی۔ وہ سب حیران تھے کہ آپ نے اتنی قیمتی چیز ایک اجنبی لڑکے کو کیسے دے دی۔ وہ مجھ پر شک کر رہے تھے، میں نے اُنھیں بہت سمجھایا۔ اب آپ کو میری بات کی لاج رکھنے کے لیے چلنا ہو گا۔"

"اچھا۔" وہ ہنس کر بولا۔ "میں اُن سے ضرور ملوں گا اور کہوں گا کہ تمھارا بیٹا بہت ذہین، خوش اخلاق اور مہمان نواز ہے۔ ایسے اچھے بیٹے پر تو آنکھ بند کر کے اعتبار کرنا چاہیے۔"

"اعتبار تو انھوں نے کر لیا ہے اور آپ کا بہت بہت شکریہ بھی ادا کیا ہے اور کہا ہے کہ آپ کسی دن ہمارے ہاں کھانا کھائیں۔ آپ کے لیے ہم آپ کی پسند کے کھانوں کا انتظام کر دیں گے۔"

"نہیں نہیں۔" بوڑھے اجّین نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ "میں ہر قسم کا کھانا پسند کرتا ہوں۔"

میری متجسّس نگاہیں بار بار کورا کی جانب اُٹھتی تھیں، میں نے محسوس کیا کہ اُس کا بھی کچھ یہی حال ہے، وہ بھی بار بار میری طرف دیکھتی ہے جب ہماری نگاہیں ٹکراتی تھیں تو ہم دونوں گردنیں جھکا لیتے تھے۔ کاش میں اُس میں کہیں بھی بدصورتی کا کوئی گوشہ کوئی نقطہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ وہ تو میرے دل میں اُترتی گئی اور لمحہ بہ لمحہ اور حسین اور حسین نظر آنے لگی۔ بوڑھے اجّین کی موجودگی میں اُس سے کوئی بات نہیں ہو پا رہی تھی۔ میں نے بہت سے لفظ سوچے، بہت سے طریقے اُسے مخاطب کرنے کے لیے میرے ذہن میں آئے سب ناکام ہو گئے۔ میں قطعًا واقف نہیں تھا کہ ایک لڑکی سے اور اتنی حسین لڑکی سے کیسے بات کرنی چاہیے۔ یہ سب کچھ مجھے بہت مشکل نظر آیا۔ میری طبیعت ایسی تھی کہ اپنی کوئی خواہش پوری نہ ہونے کی صورت میں میں ہمیشہ کے لیے اُس سے دست بردار ہو جاتا تھا۔ میں نے سوچا اُنھوں، یہ لوگ یاتری ہیں، آج آئے ہیں، کل چلے جائیں گے، پھر یہی اپنا شہر گیا ہو گا یہی گھر، یہی کالج۔ یہی معمولات لیکن میں خود پر جبر کرنے میں ناکام ہو گیا۔ بوڑھا اجّین کہتا تھا کہ اُسے گوشہ نشینی بہت پسند ہے۔ حالانکہ وہ بدھ گیا کے ہجوم میں چلا آیا تھا اور یہاں اپنے خیمے میں خیمے کی طرح جما ہوا تھا۔ "اگر آپ کو شہر سے کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتائیں۔" میں نے پوچھا۔

"یہاں ہمارے پاس کم سے کم چیزیں ہونی چاہئیں جن کی ضرورت ہو انھیں بھی ترک کر دینا چاہیے۔ شاکیہ منی کہتے تھے کہ اپنے آپ کو ضرورتوں سے بلند کرو۔"

"شہر کے کالجوں میں بہت سے طلبہ کی ڈیوٹی لگی ہے کہ وہ گیا میں آنے والے مہمانوں کا خیال رکھیں۔ میں بھی ان میں شامل ہوں۔" میں نے جھوٹ بولا۔ "میری خوش قسمتی ہے کہ میرے حصّے میں آپ جیسے مہمان آئے۔ آپ بہت اچھے آدمی ہیں، جی چاہتا ہے کہ آپ کے پاس بیٹھا رہوں اور آپ کی باتیں سنتا رہوں۔"

وہ اس بات سے بہت خوش ہُوا۔ "ابھی تمھاری عمر کم ہے مگر تم بڑی اچھی باتیں کرنے لگے ہو، تم ضرور ترقی کرو گے۔"

"آپ نے جواب نہیں دیا کہ آپ کب ہمارے ہاں چلیں گے؟"

وہ سوچنے لگا۔ "کسی دن بھی چلے چلیں گے، ابھی تو ہم لوگ یہاں موجود ہیں، ایسی کیا جلدی ہے؟"

"جلدی تو مجھے ہے، میں آپ کو اپنا گھر دکھانا اور اپنے بہن بھائیوں سے ملوانا چاہتا ہوں۔ وہ کورا کو اور آپ کو دیکھ کے بہت خوش ہوں گے، آپ ہماری عزت بڑھائیں گے۔ دیکھیے اب ٹال لیے مت۔"

وہ مسکرانے لگا اور اُس نے دوسرے دن رات کو ہمارے گھر کھانے کا وعدہ کر لیا۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں نے جلد ہی بہت سی جذباتی باتیں کہہ دیں۔ اُسے میری دعوت قبول فوراً کرنی پڑی۔ میں اُسے ٹالنے کا کچھ اور موقع دیتا تو کچھ دیر مزید یہاں بیٹھنے اور کورا کی سیر سے لطف اٹھانے کا بہانہ مل جاتا۔ مجھے وہاں سے اٹھنا پڑا۔ اجّین کے ساتھ کورا بھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ چلتے وقت اُس نے مجھے اور الجھن میں مبتلا کر دیا۔ اُس کی آنکھیں بول رہی تھیں۔ وہ لفظ نہ جانے کیسے میری سمجھ میں آ گئے۔

میں وہاں سے تو رخصت ہو گیا لیکن بدھ گیا کے علاقے سے باہر نہیں گیا بلکہ کچھ دُور اِدھر اُدھر گھوم گھام کے ایک ایسی جگہ کھڑا ہو گیا جہاں سے میں آسانی سے اجّین کے خیمے پر نظر رکھ سکتا تھا۔ کسی کام کے بغیر ایک جگہ ٹھیرے رہنے سے بہت سے لوگوں کی توجہ میری جانب مبذول ہو گئی۔ "تمھیں کس کی تلاش ہے؟" ایک پروہت نے نرم لہجے میں مجھ سے دریافت کیا۔

"سکون کی تلاش۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

اُس کے ماتھے کی شکنیں دُور ہو گئیں۔ "شاکیہ منی تمھیں سکون کا درس دیں گے۔" یہ کہتا ہوا وہ آگے بڑھ گیا۔ شاید میرے چہرے میں اُسے کوئی خاص بات نظر نہیں آئی تھی۔

بارہ ساڑھے بارہ بجے کے قریب بوڑھا اجّین باہر نکلا، جاتے جاتے وہ خیمے کا پردہ ڈالنا نہیں بھولا۔ اُس کے ہاتھ میں مٹی کا ایک برتن تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ دوپہر کا کھانا لانے کی غرض سے باہر آیا ہے۔ میلے کے زمانے میں یہاں لنگر کے سے انداز میں کھانا تقسیم کیا جاتا تھا جس میں خاصی دیر لگتی تھی۔ اگر وہ کھانا خریدنے بھی جاتا تو اُسے واپس آنے میں کم از کم آدھا گھنٹہ ضرور لگ جاتا۔ میں اس آدھے گھنٹے میں اس کے خیمے میں داخل ہو کے کورا سے باتیں کر سکتا تھا۔ جیسے ہی وہ کچھ دور گیا، میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور تیز رفتاری سے اجّین کے خیمے تک کا فاصلہ طے کرنے لگا۔ خیمے کے قریب میرے قدم ٹھٹکنے لگے۔ اندر جا کے میں کورا سے دوبارہ واپس آنے کا کیا جواز پیش کروں گا اور پھر کورا بوڑھے اجّین سے یہ راز کیوں چھپائے گی؟ بات خراب ہو جائے گی۔ وہ باتیں بھی ذہن سے اچانک اتر گئی تھیں جو مجھے کورا سے کہنی تھیں۔ مجھے اپنے آپ پر غصّہ آنے لگا۔ میں کوئی بہانہ بنا دوں گا۔ اتنے قریب آ کے واپس جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ میں خیمے کا پردہ ہٹا کے اندر داخل ہو گیا۔ کورا کے چہرے پر اُلجھن کے آثار نمودار ہوئے مگر دوسرے ہی لمحے وہ مسکرانے لگی اور تیزی سے کھڑی ہو گئی۔ میرا سارا جسم تمتمانے لگا۔ اُس کی نظریں سوال کر رہی تھیں کہ میں دوبارہ کیوں واپس آیا ہوں؟ ایسی گھبراہٹ سے زندگی میں کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ چند لمحوں تک میں یوں ہی گُنگ کھڑا رہا۔ کچھ کہنے کی کوشش کی مگر کچھ کہہ نہ سکا۔

"بیٹھیے۔" کورا نے پہل کی۔

"نہیں، میں بیٹھنے کے لیے نہیں آیا۔ آپ سے باتیں کرنے آیا تھا مگر سب کچھ بھول گیا اس لیے واپس جا رہا ہوں۔" میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔

"کھانا کھا کے جائیے گا، بابا کھانا لینے گئے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے، میں اُن کے سامنے آنا نہیں چاہتا، نہ ہی آپ انھیں یہ بتائیں کہ میں دوبارہ یہاں آیا تھا۔ میں آپ سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے، مجھے معاف کر دیجیے۔ بابا کو مت بتائیے گا۔" میں نے گھبراہٹ میں کہا۔

وہ میرے بے ربط جملوں اور اختلاجی کیفیت پر کچھ حیرت زدہ سی ہوئی۔ "میں نہیں بتاؤں گی۔"

"کل آپ آئیں گی نا؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"ہاں۔" اُس نے گردن ہلا کر کہا۔

"دیکھیے ضرور آئیے گا ورنہ۔" میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

"ضرور۔" اُس نے جیسے ایک ایک حرف علیحدہ علیحدہ ادا کیا اور اُس کے چہرے پر وہی مسکراہٹ چھا گئی جو میں نے کسی اور لڑکی کے چہرے پر نہیں دیکھی تھی۔

میں سمجھ رہا تھا جیسے میں امتحان ہال میں بیٹھا ہوں۔ یا میں چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہوں یا مجھے تیز بخار ہو گیا ہے۔ اس کش مکش سے نجات پانے کے لیے میں فوراً چلا آیا۔ کسی لمحے بھی اجّین آ سکتا تھا۔ تمام راستے مجھے معلوم تھے۔ اس لیے میں اجّین کی نظروں سے بچتا ہُوا بدھ گیا کے علاقے سے دُور نکل گیا اور تانگے میں بیٹھ کے گھر کی راہ لی۔ گھر والے میری وجہ سے پریشان ہو گئے ہوں گے۔ اطلاع دیے بغیر اتنی دیر تک کبھی میں گھر سے باہر نہیں رہا تھا۔ والد صاحب کی گرج دار آوازیں ابھی سے میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ گھر سے کچھ فاصلے پر تانگے سے اتر کے میں نے باقی راستہ پیدل طے کیا۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ میری تلاش میں گھر کا ملازم محلّے میں گھوم رہا تھا اور اب میرے ہم جماعت ساتھیوں کے گھر جا رہا تھا۔

گھر میں میری ناپسندیدگی کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ میں جھوٹ کم سے کم بولتا تھا۔ منہ پھٹ تھا اور کسی مصلحت کا خیال کیے بغیر ہر بات صاف صاف کہہ دیتا تھا۔ آج مجھے سو بہانے سوجھ رہے تھے۔ جھوٹ کے بغیر چارہ نہیں تھا۔ میری آہٹ پر سبھی دروازے پر آ گئے۔ "کہاں تھے جمّی؟" امّی نے تلخی سے پوچھا۔

"گیا شہر ہی میں تھا۔" میں نے ناراضی سے کہا۔ "اب میں اتنا چھوٹا بھی نہیں ہوں کہ گھر سے کچھ دیر اپنی مرضی سے باہر نہ رہ سکوں۔ میں اپنے دوستوں کے ساتھ بدھ گیا چلا گیا تھا۔"

"کوئی اطلاع بھی نہیں دی؟" امی خفگی سے بولیں۔

"خیال تھا جلدی واپس آجاؤں گا۔"

"یہ تم بدھوں وغیرہ کے جھنجھٹ میں کیوں پڑ گئے؟ ہم مسلمان ہیں بیٹا!"

"تو کیا آپ یہ سمجھتی ہیں کہ میں اپنا مذہب بدلنے گیا تھا؟"

"توبہ توبہ، نعوذ باللہ۔" امی کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔ "کیسی باتیں کررہا ہے، ذرا اپنے ابا کے سامنے آکے دیکھنا، وہ تیری کیسی خبر لیتے ہیں۔"

امی نے اس بار مجھے کچھ زیادہ ہی برا بھلا کہا۔ پتہ نہیں کیوں؟ یہ اتنی ناراض ہونے والی بات تو نہیں تھی۔ حیرت ہے کہ اُس دن والد صاحب نے کچھ نہیں پوچھا، وہ دوسرے کمرے میں امی کی ساری باتیں سن رہے تھے، میں سمجھا، یہ بھی اُن کے خفا ہونے کا ایک انداز ہے یا امی نے اُن کا کوٹا بھی پورا کردیا تھا۔ میری بہن فرخ اور فہمیدہ نے امی کی ڈور کھینچی تو کہیں وہ چپ ہوئیں۔ ایسی صورت میں یہ کس طرح ممکن تھا کہ میں اُس دعوت کا ذکر کرتا جو میں نے بوڑھے امین اور اس کی بیٹی کورا کو دی تھی۔ میں نے بڑی بے بسی محسوس کی، اپنا گھر مجھے پڑوس کے کسی گھر کی طرح لگا۔ ایک جیل خانہ جہاں میں سزا کے دن کاٹ رہا ہوں۔ مجھے بے تحاشا غصہ آرہا تھا۔ میں نے اُسے پینے کی کوشش کی تو اور بڑھ گیا۔ اس جھنجلاہٹ میں، میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے ابھی اور اسی وقت دعوت کا ذکر کردینا چاہیے۔ منع کردیں گے تو میں گھر سے نکل جاؤں گا۔ "ابا۔" میں نے آرام کرسی پر حقہ گڑگڑاتے ہوئے انھیں کسی قدر گستاخی سے مخاطب کیا لیکن میں اپنے لہجے پر قائم نہیں رہ سکا۔ "ایک بات کہوں، آپ برا تو نہیں مانیں گے؟"

"کہو۔" وہ ترشی سے بولے۔

"ابا! اگر میں یہاں کسی کی دعوت کروں تو آپ کو اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

"اعتراض کیوں ہوگا؟ یہ تمھارا گھر ہے۔"

مجھے اپنے کانوں کی صحت پر شبہ ہوا۔ "ابا!" میں نے ناز اور پیار سے انھیں مخاطب کیا۔ "میں نے کل رات دو معزز آدمیوں کی دعوت کردی ہے۔"

"کون ہیں وہ؟" ابا نے غیر متوقع نرمی سے پوچھا۔

"وہ وہی بزرگ بدھ شخص ہے جس کا نام امین ہے اور اُس کی لڑکی، وہ لوگ بے حد شریف ہیں، کل مالا انھوں نے ہی مجھے دی تھی۔" میں نے جوش میں کہا۔ جواب دینے کے بجائے والد صاحب حقہ گڑگڑانے لگے۔ "میں اُن سے کہہ چکا ہوں ابا! بس میرے منہ سے نکل گیا، آپ انکار کردیں گے تو میری بھد ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے تم نے جو بات کہہ دی ہے اُسے پورا کیا جائے گا۔" ابا نے آہستگی سے کہا۔ "مگر آئندہ اتنی جلدی اجنبیوں کو دعوت دینے میں احتیاط برتنا، پتہ نہیں کون لوگ ہیں، کہاں سے آئے ہیں۔"

"بہت اچھے لوگ ہیں، آپ اُن سے ملیے تو سہی۔ میں ایسے ویسوں کو اپنے گھر میں کیوں مدعو کرتا۔" میں نے جذباتی لہجے میں کہا اور بوڑھے امین کی تعریفیں کرنے لگا۔

والد صاحب نے میری لاج رکھ لی تھی، مجھے اُن پر بہت پیار آیا۔ تمام شکوے ایک ہی بات میں دور ہوگئے۔ میں جس کام کو بہت مشکل سمجھتا تھا وہ اتنا آسان نکلا۔ اب میری عقل میں آیا کہ وہ تو میری محبت میں مجھ سے ناراض رہتے ہیں، دل کے بہت اچھے ہیں۔ اس سے میرے سچ کی تائید بھی ہوگئی کہ میں کہیں اور نہیں اصلاً میں گیا تھا۔ امی، بہنوں اور بھائیوں نے بدھ یاتری کے متعلق بہت سے سوال کیے۔ میں بتاتا رہا کہ وہ کتنا معقول، سنجیدہ، تجربہ کار اور خوش اخلاق شخص ہے۔ میں نے اپنے گھر میں اُس کا ایسا تصور قائم کردیا کہ جب وہ آئے تو سب عزت و تکریم سے پیش آئیں۔ امی کھنچی کھنچی رہیں، شام تک میں نے انھیں بھی منا لیا لیکن میں خود سے روٹھا ہوا تھا۔

دوسری رات نیند تو آئی مگر عجب عجب طرح کے خواب آتے رہے کہ میں کورا کے ساتھ پہاڑوں، وادیوں کا سفر کررہا ہوں۔ وہ میرے گھر میں بیٹھی ہے، میرے ساتھ پڑھ رہی ہے، وہ چھوٹی مہری کا پاجامہ اور کرتا پہنے ہوئے ہے، گلے میں دوپٹا بھی ہے۔

❋

صبح ہوتے ہی میں سیر کو نکل گیا۔ سوچا بدھ گیا کی طرف ہو آؤں اور ایک بار پھر تصدیق کرآؤں، کہیں کورا نے میرے آنے کا ذکر امین سے نہ کردیا ہو۔ اگر ایسا ہوا تو وہ اپنے وعدے سے منحرف ہوسکتا ہے، ممکن ہے نہ آئے، انکار کردے اور گھر میں سب میرا خوب مذاق اڑائیں لیکن نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ کورا خاموش رہی ہوگی۔ میں جلد ہی گھر واپس آگیا اور چیزیں قرینے سے رکھنے لگا۔ قدِ آدم شیشے کی صفائی کی، دیواریں جھاڑیں، دیوارگیریاں صاف کیں، فرش دھلوایا، بیٹھک میں چاندنی بدلی، چھوٹا سا فانوس چمکایا، گاؤ تکیوں کے غلاف بدلوائے۔ بہنیں بھی میرا ساتھ دیتی اور مجھے چھیڑتی رہیں۔ امی نے مختلف قسم کی لذیذ سبزیاں اور چاول پکائے، چٹنیاں، مربہ جات، گوشت کا کوئی سالن نہیں پکایا گیا۔ کورا کو تحفے میں دینے کے لیے امی نے سلیم شاہی جوتیاں اور کانوں کے بالے علیحدہ نکال کے رکھ لیے۔ کچھ بھی ہو ایک زمیں دار کے گھر مہمان آ رہا تھا۔

سرِ شام میں کپڑے پہن کے تانگے میں سوار ہو کے بدھ گیا کی جانب روانہ ہوگیا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ بدھ گیا کا جانا پہچانا راستہ آج طویل معلوم ہوتا تھا۔ ڈر تھا کہ امین کا ارادہ نہ بدل گیا ہو۔ یہ بھی خیال آیا کہ پھر وہ واپس نہ چلا گیا ہو۔ دل میں ہزار اندیشے لیے میں اُس کے خیمے پر پہنچا تو وہ موجود تھا اور خوش خوش نظر آرہا تھا۔ میری جان میں جان آئی۔ بدھی سلام دعا کے بعد میں نے کہا۔ "آپ کو مکان ڈھونڈنے میں مشکل پیش آتی اس لیے میں خود ہی چلا آیا، چلیے تیار ہو جائیے۔"

"میں منتظر تھا بابر! میں نے تم سے وعدہ کیا تھا، تم نے بے کار تکلیف کی۔ بہرحال ابھی بیٹھو، ذرا اندھیرا ہو لے تو چلتے ہیں۔" کورا نے پہلے ہی سادہ سا لباس پہن رکھا تھا۔ اُس نے اپنا تبتی لباس اتار دیا تھا اور پاجامے ٹائپ کپڑے پر ڈھیلا ڈھالا کرتا پہن رکھا تھا۔ ہلکی سی نیلی شال شانوں پر ڈال رکھی تھی۔ اس لباس سے وہ اور دل کش ہوگئی تھی۔

"آپ کی بہنیں کتنی بڑی ہیں؟" پہلی بار اُس نے مجھ سے سوال کیا اور مجھے ایسا لگا جیسے اُس نے میری بہت سی باتوں کا جواب دے دیا ہے۔ میں نے اُسے اپنی تمام بہنوں کے نام بتائے اور عمریں بتائیں۔ بوڑھا بھی انہماک سے سنتا رہا۔ اندھیرا ہوتے ہی اُس نے مجھ سے معذرت چاہی اور کہا کہ اسے لباس تبدیل کرنا ہے اس لیے میں اور کورا کچھ دیر کے لیے باہر چلے جائیں۔ ہم نے اُس کی درخواست کی تعمیل کی، جب ہم دونوں باہر آگئے تو میں نے چپکے سے پوچھا۔ "آپ نے کچھ کہا تو نہیں؟"

"نہیں۔" وہ جھجکتی ہوئی بولی۔ "ہم نے نہیں بتلایا۔"

"میں بہت ڈر رہا تھا، پتہ نہیں وہ کیا سمجھیں۔" یہ کہتے کہتے میں جھینپ سا گیا پھر بولا۔ "آپ تو اس لباس میں بہت اچھی لگ رہی ہیں۔"

وہ لجاگئی اور کہنے لگی۔ "آپ کو اچھا لگ رہا ہے؟"

"آپ کچھ بھی پہن لیں، مجھے اچھا لگے گا۔" میں نے بے تابی سے کہا۔ "دیکھیے، گھر میں سب سے خوب گھل مل جائیے گا۔ میں نے اپنی بہنوں سے آپ کی بہت تعریف کی ہے۔"

"اور میں نے بابا سے آپ کی۔"

"آپ نے بالکل غلط تعریف کی، میں تو بہت برا ہوں۔"

"ہوں۔" اُس کے موتیوں جیسے دانت چمکنے لگے۔

"آپ سے پرسوں ہی ملاقات ہوئی ہے مگر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں، آپ کو ایسا لگتا ہے؟"

اُس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"گھر جا کے بھی آپ کا خیال رہا۔" میں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

اس اثنا میں بوڑھے امین نے آواز دی۔ "اندر آجاؤ۔" ہم دونوں اندر گئے تو وہ لباس بدل چکا تھا۔ "میں تیار ہوں۔"

اندھیرا ہو چکا تھا۔ بوڑھے کی بغل میں کسی موٹی کتاب کے سائز میں سفید کپڑے میں لپٹا ہوا بقچہ دبا ہوا تھا۔ میں نے اُس سے کہا۔ "یہ مجھے دے دیجیے۔" اُس نے انکسار سے انکار کردیا۔ میں نے زیادہ اصرار بھی نہیں کیا۔ ہم تانگے میں بیٹھ گئے۔ سڑکوں پر روشنیاں جھلملانے لگی تھیں۔ میں خوشی اور فخر کے جذبات سے سینہ پھلائے، گردن اکڑائے تانگے کی اگلی نشست پر کوچوان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ تانگا رکنے کی آواز سن کے والد صاحب دروازے پر آگئے۔ دونوں ایک دوسرے سے پرانے شناساؤں کی طرح بغل گیر ہوئے۔ ڈیوڑھی میں امی اور بہنوں نے کورا کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ امی نے تو اُسے گلے لگایا۔ کاش میں امی ہوتا۔ وہ سہمی جھجکتی ہوئی اندر زنان خانے میں چلی گئیں اور میں، والد صاحب اور امین بیٹھک میں آگئے۔ چاندنی کے اوپر درمیان میں قالین بچھا ہوا تھا۔ امین کو عزت کے ساتھ وہاں بٹھا دیا گیا۔ "آپ نے میری عزت بڑھائی۔" والد صاحب نے خالص زمیں دارانہ لہجے میں کہا۔ یہ لہجہ وہ اسی وقت اختیار کرتے تھے جب گھر میں کوئی معزز مہمان آتا تھا۔

امین میرے کردار اور اخلاق کی تعریف کرنے لگا۔ "اِس بچے نے مجھے مجبور کردیا کہ میں آپ سے ملاقات کروں۔"

"آپ کہاں سے آرہے ہیں؟" والد صاحب نے رسمی انداز میں پوچھا۔ "بابر نے تو بس آپ کی تعریفیں کیں، کچھ بتایا نہیں۔"

"جناب یوں تو کہانی بڑی لمبی ہے، کسی وقت فرصت میں سناؤں گا، تبت سے چلے ہوئے چھ مہینے سے زیادہ ہوگئے۔ چند مہینے بریلی میں رہا، پھر کلکتے چلا گیا، اب وہیں سے آرہا ہوں، تبت میں کھیتی باڑی کرتا تھا۔"

"اچھا اچھا، آپ بھی زمیں دار ہیں۔ خوب؟" والد صاحب نے ہنس کر کہا۔ "اپنا بھی ایک زمانے سے یہی پیشہ ہے۔"

دونوں بزرگوں میں جلد ہی مغائرت ختم ہوگئی اور وہ دنیا جہان کی باتیں کرنے لگے۔ والد صاحب اپنے بچوں کے متعلق باتیں کرنے لگے، پرانی یادیں، تجربے اور غیر معمولی واقعات سنانے لگے۔ امین جیسا سامع انھیں کہاں دستیاب ہوتا؟ میری بڑی بہن فہمیدہ نے آواز دے کے مجھے بلالیا۔ میں صحن میں گیا تو وہ کہنے لگی۔ "بابر! یہ تو بہت پیاری ہے، میٹھی میٹھی باتیں کررہی ہے، گڑیا سی لگتی ہے۔ اگر یہ مسلمان ہوتی تو میں اسے گھر سے نہ جانے دیتی، تمھارے لیے محفوظ رکھ لیتی۔ اب سمجھ میں آیا کہ کل تم کہاں غائب تھے۔ اچھا یہ بات ہے۔"

"کیا بات ہے؟" میں نے مصنوعی ناگواری سے پوچھا۔

"ہم سب سمجھتے ہیں جناب؟ تم اُدھر کیوں نہیں آتے۔" وہ شوخی کرنے لگی اور مجھے کھینچتی ہوئی اندر کمرے میں لے گئی جہاں کورا میری دوسری بہنوں اور بھائیوں میں گھری بیٹھی تھی۔ انھوں نے اتنی جلدی دوستی کرلی تھی کہ اُسے چوڑیاں تک پہنا دی تھیں۔ وہ ابھی تک اُس کے نازک نازک ہاتھوں، اُس کے رنگ، زلفوں، ہونٹوں اور دمکتے ہوئے رخساروں سے مبہوت تھیں۔ گو میری بہنیں بھی خوب صورتی میں کسی سے کم نہیں تھیں لیکن کورا کے آگے اُن کے چہرے گہنا گئے تھے۔

"بھائی جان! ہم انھیں اب جانے نہیں دیں گے۔ ان سے کہیے، کچھ دن ہمارے گھر رہیں۔" میری چھوٹی بہن فرخ کہنے لگی۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" میں بھی جھینپا جھینپا سا تھا۔ "تم ہی ان سے کہو یا پھر امین صاحب سے۔"

"آپ جائیں گی تو نہیں؟" میرے چھوٹے بھائی جہاں گیر نے معصومیت سے پوچھا۔

کورا کو جواب دینے میں مشکل پیش آئی۔ "نہیں۔" اُس نے جہاں گیر کے گال پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا۔

جہاں گیر اور فرخ امین کے پاس پہنچ گئے اور ضد کرنے لگے کہ وہ کورا باجی کو آج رات جانے نہیں دیں گے۔ والد صاحب نے انھیں سمجھایا کہ یہ پھر آئیں گے۔ امین نے فرخ اور جہاں گیر کو گود میں بٹھا لیا اور اُن سے وعدے کرنے لگا کہ ہم لوگ دوبارہ آئیں گے۔

میں گھر میں اِدھر اُدھر گھوم پھر رہا تھا، کبھی اس طرف کبھی اُس طرف۔ امی نے ایک پرتکلف کھانے کا اہتمام کیا تھا، رات کے دس بجے تک

وہ دونوں موجود ہے۔ کورا کو یہاں لاکے احساس ہوا کہ میں اُسے لینے لیے کہاں لایا تھا، اتنے لوگوں کی موجودگی میں اُس سے کوئی بات ہی نہیں ہو سکتی تھی پھر بھی دل مطمئن تھا۔ بوڑھے امین نے چلتے وقت امی کے لیے قدیم طرز کا ایک قیمتی گلوبند دیا۔ والد صاحب کے شدید انکار کے باوجود بھی وہ نہیں مانا۔ اپنا بقچہ جس طرح دبائے آیا تھا، اُسی طرح واپس لے گیا جب کہ میرا خیال تھا کہ اُس میں کوئی تحفہ ہوگا جو وہ گھر جا کے والد صاحب کے حوالے کر دے گا۔ اُس میں ضرور کوئی ایسی قیمتی چیز تھی جو وہ خیمے میں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ چلا گیا لیکن دوبارہ آنے کا وعدہ بھی کرتا گیا۔ اُس کے جانے کے بعد گھر میں اُس کی اور کورا ہی کی باتیں ہوتی رہیں۔ مجھے خوشی تھی کہ والد صاحب نے اُس کی ذہانت اور شرافت کا گہرا اثر قبول کیا ہے۔ وہ پہلو بدل بدل کے اُس کی اعلا نسبی اور رسائی حسنِ سلوک کا تذکرہ کرتے تھے، جب وہ ایسا کر رہے تھے تو مجھے لگتا تھا جیسے وہ میری صفات بیان کر رہے ہوں۔

★

پھر تو اپنا کچھ یہ عالم ہوا کہ نیند ہی اُچاٹ ہو گئی۔ کتابوں میں جی نہیں لگتا تھا کتابیں کیا، کسی کام میں جی نہیں لگتا تھا۔ دوسرے دن بھی میں ایک دوست کے گھر کا بہانہ کر کے بدھ گیا پہنچ گیا۔ بوڑھا امین گھر کی خیریت، بہن بھائیوں کا حال پوچھنے لگا۔ کورا نے نام لے لے کے تمام گھر والوں کا حال احوال پوچھا۔ اُس کے کان میں وہی بالیاں لٹک رہی تھیں جو امی نے کل رات اُسے دی تھیں۔ چوڑیاں بھی وہ پہنے ہوئے تھی چنری بھی اُس نے سر پہ ڈال رکھی تھی۔ اب میرا یہ معمول ہو گیا کہ کسی نہ کسی وقت موقع نکال کے بدھ گیا پہنچ جاتا۔ میلا شباب پر تھا۔ بدھ گیا کی رونق میں پہلے سے کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک ہفتے بعد وہ پھر ایک رات کورا کے ساتھ والد صاحب سے ملنے آیا اور رات گئے واپس گیا۔ گزشتہ ایک ہفتے میں کئی بار میں نے کوشش کی تھی کہ کورا سے تنہائی میں ملاقات ہو جائے مگر مجھے کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ بوڑھا بدھ گیا میں شاید خیمے میں رہنے کے لیے آیا تھا۔ وہ بہت کم باہر نکلتا، دن بھر اپنے خیمے میں پڑا رہتا اور باہر جاتا بھی تو جلد واپس آ جاتا۔ پہلے والا تکلف ختم ہو گیا تھا اور اب ہم دونوں ایک دوسرے سے تم کہہ کے مخاطب ہوتے تھے۔

نویں دن مجھے ایسا موقع مل گیا جب امین اپنی کسی ضرورت کے تحت شہر گیا تھا۔ کوئی بہت ہی اہم ضرورت ہوگی۔ خیمے کے اُوپر پردہ پڑا ہوا تھا، احتیاطاً میں نے اندر جھانک لینا مناسب سمجھا اور یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ وہاں تنہا کورا موجود تھی۔ اُس کا چہرہ کھل اُٹھا۔ "بابا کہاں ہیں؟" میں نے ناقابلِ یقین لہجے میں پوچھا جیسے امین وہیں کہیں چھپا بیٹھا ہو۔

"وہ کسی کام سے شہر گئے ہیں، دیر سے آئیں گے۔" کورا نے سادگی سے جواب دیا۔

"تم کھانا کھاؤ گے؟ باہر جانے سے پہلے بابا مجھے دے گئے تھے، میں نے ابھی تک نہیں کھایا ہے۔"

"ہاں، بشرطیکہ تم ساتھ کھاؤ۔" اُس نے چٹائی کا بنا ہوا دسترخوان بچھا لیا۔ چاول پر سبزیاں اور ہلکی چٹنیاں رکھی ہوئی تھیں ہم دونوں چھوٹے چھوٹے لقمے بنا کے کھاتے رہے "میں ایک ہفتے سے یہ کوشش کر رہا تھا کہ تم سے تنہائی میں ملاقات ہو جائے۔"

"میں بھی ـــ"

"سچ؟" میں نے کپکپاتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔"

"کورا جب تم چلی جاؤ گی تو بہت اُداسی ہو جائے گی۔"

"ہم لوگ جانے ہی والے ہیں۔"

"کب؟" میرے ہاتھ کا لقمہ ہاتھ ہی میں رہ گیا۔

"بابا کہہ رہے تھے اب تین چار دن میں ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔"

"کہاں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"پتہ نہیں۔" وہ اُداسی سے بولی۔

"تم نے اپنے بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں۔" میں نے شکایتاً کہا۔

"کیا بتاؤں۔" وہ دکھ سے بولی۔

"تمہارے بابا بھی۔۔۔" میں کہنا چاہتا تھا کہ عجب پُراسرار شخص ہے۔ دن بھر خیمے میں گھسا رہتا ہے حالانکہ اتنی دور سے یہاں آیا ہے۔

"وہ میرے بابا نہیں ہیں۔"

"کیا؟" میرا نوالہ حلق میں اٹک گیا۔ "تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔"

"لیکن تم نے تو کہا تھا کہ۔۔۔۔"

"میں نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ میرے بابا ہی ہیں لیکن میرے باپ نہیں ہیں۔" اُس کی آنکھوں میں اچانک آنسو بہنے لگے۔

"کیا بات ہے، مجھے نہیں بتاؤ گی؟"

"میرا باپ مارا گیا۔" اُس نے روتے ہوئے کہا۔ "وہ تبت کے ایک قبیلے کا سردار تھا میرے چچا نے اُسے مار دیا۔ بابا امین میرے باپ کا دوست بھی تھا اور مجھے پڑھاتا بھی تھا، جب ہمارا وہاں رہنا مشکل ہو گیا تو وہ مجھے لے کے ہندوستان چلا آیا۔"

میں حیرت میں ڈوب گیا۔ بوڑھے امین کے کسی طرزِ عمل سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ کورا کا باپ نہیں ہے۔ "تو کیا تم اب یہیں رہو گی ہندوستان میں؟"

"مجھے نہیں معلوم وہ کسی ایک جگہ نہیں ٹکتے۔ شہر شہر گھومتے رہتے ہیں۔" کورا نے معصومیت سے کہا۔

"ایسا کیوں ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

اُس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا صرف آنسو تھے۔ اُس نے خوب آنسو بہائے میں اُسے دلاسا دیتا رہا۔ سمجھاتا رہا حالانکہ میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ کسی ایک جگہ قیام کیوں نہیں کرتا؟ میرا ذہن اُلجھ گیا۔ ابھی میں اسی کشمکش میں اُلجھا ہوا تھا کہ غیر متوقع طور پر بوڑھا امین وحشت زدہ انداز سے خیمے میں داخل ہوا۔ اُس کی بغل میں وہی بقچہ دبا ہوا تھا اور اُس کی سانس قابو میں نہیں تھی۔ "کوئی مجھے پوچھتا ہوا تو نہیں آیا تھا؟" اُس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نہیں۔" کورا نے اور میں نے ایک ساتھ جواب دیا۔

"تم کب سے یہاں بیٹھے ہو؟"

"تھوڑی دیر ہوئی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تم سو کیوں رہی ہو؟" اُس نے کورا سے سوال کیا۔

"کچھ نہیں، یہ کہہ رہی تھیں ہم تین چار دن میں جا رہے ہیں۔ میں نے غصہ اور فرش وغیرہ کا ذکر کر دیا تو رونے لگیں۔"

امین مسکرانے لگا اور فرش پر بیٹھ گیا۔ "آپ شہر نہیں گئے بابا؟" کورا نے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

"میں درمیان سے لوٹ آیا، پیسے تو یہیں بھول گیا تھا۔"

"تو آپ گھر جا کے ابا سے لے لیے ہوتے۔"

"اوہ نہیں نہیں بابو! یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا۔"

"آپ تو غیریت برتتے ہیں، وہ آپ ہی کا گھر ہے۔"

"تم بہت اچھے لڑکے ہو، بہت یاد آؤ گے۔"

"آپ میلے تک تو ٹھہرتے، اتنی بھی کیا جلدی ہے؟"

بوڑھے نے ایک گہری سانس لی۔ "بابو! میں ضرور ٹھہرتا مگر مجھے جلدی یہاں سے جانا ہوگا۔ شاید ہم آج کل میں چلے جائیں۔"

"کیوں؟ کورا تو بتا رہی تھیں کہ آپ تین چار دن اور رہیں گے۔ میں آپ سے کہنے والا تھا کہ ان دنوں کے لیے آپ انھیں ہمارے ہاں رہنے دیجیے۔ بہنوں نے بہت اصرار کیا ہے۔"

"ہم پھر آئیں گے بابو! پھر آئیں گے۔" وہ سر ہلاتا ہوا بولا۔ "اب تو گیا میں بھی ہمارا ایک گھر ہے۔"

"نہیں نہیں، ہم آپ کو ابھی نہیں جانے دیں گے۔"

"اچھا دیکھو، کل بتائیں گے۔" صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے ٹال رہا ہے لیکن میں اُسے کیسے روک سکتا تھا۔ اُسے ایک نہ ایک دن تو جانا ہی تھا۔ مجھ سے وہاں بیٹھا نہیں گیا۔ بوڑھے نے صندوق سے چند کاغذات نکال کے انھیں غور سے دیکھنا شروع کر دیا تھا اور مجھ سے کچھ بے نیازی اختیار کر لی تھی۔ میں نے کورا کو اشارہ کیا اور امین کو آداب کہتا ہوا چلا آیا۔ سات میل کا یہ سفر میں نے پیدل ہی طے کیا۔ تنہا تنہا، اُداس اُداس۔ نہ جانے گھر کیسے پہنچا۔ جاتے ہی میں بستر پہ گر گیا۔ امی لاکھ چیختی چلاتی رہیں۔ پھر انھوں نے آ کے میرا ہاتھ دیکھا۔ میری آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں اور جسم گرم تھا۔ "وہیں گیا ہوگا بدھ گیا۔ نہ جانے کہاں کہاں کے لوگ روگ لگا کے وہاں آتے ہوں گے۔ باہر یہ بیماری وہیں سے لایا ہے۔"

امی سچ کہتی تھیں۔ میرا تو جسم ٹوٹ رہا تھا اور بدھ گیا ہی سے مجھے روگ لگا تھا۔ میں نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا، اُوپر کے کمرے میں پڑا ناجانے میں پڑھتا تھا۔ بہنیں آئیں، بھائی آئے، ابا آئے۔ میں اُٹھ کے نہیں گیا۔

کوئی ایک بجے رات کو زور زور سے دروازہ پیٹنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں جاگ رہا تھا، اس بے وقت دستک پر حیران رہ گیا پھر نیچے اُتر کے صحن میں پہنچا، ابا اور امی بھی جاگ گئے تھے۔ اتنی رات گئے کون ہمارے گھر آ سکتا ہے؟ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ کون ہو سکتا ہے؟ میں آنکھیں ملتا ہوا دروازے پر پہنچا۔ جیسے ہی میں نے دروازہ کھولا، سُن سے رہ گیا۔ میں سمجھا کہ کوئی خواب دیکھ رہا ہوں، اُس کا خیال تھا۔ وہی سامنے کھڑی تھی کورا، کسی ہرنی کی طرح سہمی ہوئی دروازے پہ کھڑی تھی اور اُس کی بغل میں گٹھری دبی ہوئی تھی۔ مجھے دروازے پر دیکھتے ہی وہ تیزی سے میری طرف لپکی، چونکہ والد صاحب بھی پیچھے آ گئے تھے اس لیے میں ایک طرف ہو گیا۔ "تم؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "خیریت تو ہے؟" وہ ڈیوڑھی میں بار بار مڑ کے گلی میں جھانکنے لگی۔

"اندر آ جاؤ۔" والد صاحب نے تذبذب کے لہجے میں کہا۔

"امین صاحب کہاں ہیں؟" میں نے سراسیمگی سے پوچھا۔

"بتاتی ہوں۔" اُس نے نڈھال آواز میں کہا اور گھبرائی ہوئی اندر گھر میں آ گئی۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ روشنی میں آئی تو سب اُس کی صورت تکنے لگے۔ اُس کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی، آنکھوں میں وحشت بسی ہوئی تھی اور ہونٹ لرز رہے تھے۔ لباس گرد میں اور چھوٹے چھوٹے پاؤں مٹی میں اَٹے ہوئے تھے۔ گھر میں آتے ہی وہ زار و قطار رونے لگی۔

میں نے محسوس کیا کہ امی اور ابا کے چہرے کبیدہ ہو گئے ہیں، امی کا انداز تو بڑا جارحانہ تھا۔ "کیا ہوا بیٹی؟ تم اتنی رات کو یہاں اکیلی کیسے آ گئیں؟ امین صاحب کہاں ہیں؟" ابا نے بھاری آواز میں پوچھا۔

وہ ہچکیاں لینے لگی۔ "انھیں مار دیا گیا ہوگا۔"

"مار دیا گیا ہوگا؟" ابا نے پھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں۔ خیمے میں ایک آدمی گھس آیا تھا، اُس کے ہاتھ میں چھرا تھا، وہ بابا پر چڑھ گیا اور بابا نے مجھ سے کہا کہ بیٹی بھاگ جاؤ، بھاگ جاؤ۔ میں نے جلدی سے یہ سامان سمیٹا اور وہاں سے چلی آئی۔"

"میں بہت دور تک بھاگتی رہی، پھر مجھے ایک تانگے والا مل گیا۔ میں نے اُسے بہت دور چھوڑ دیا تاکہ وہ یہ گھر نہ دیکھ سکے پھر میں چھپتی چھپاتی یہاں آ گئی۔ میرا کوئی گھر بھی نہیں ہے، دُنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

امی کو چاہیے تھا کہ وہ اُس کے سر پر ہاتھ رکھتیں اور اُسے سینے سے لگا کے کہتیں، یہ تمہارا گھر ہے مگر امی اور ابا بُت بنے کھڑے رہے۔ "تمہیں یہ کیسے یقین ہے کہ امین صاحب مارے گئے؟" ابا نے کسی پولیس والے کے لہجے میں اُس سے پوچھا۔

"اُس کے ہاتھ میں چھُرا تھا۔ بابا خالی ہاتھ تھے اور کمزور تھے۔ میں جانتی ہوں کہ وہ زہر بلا چھُرا ہوگا۔ وہ تبت ہی کا کوئی آدمی تھا۔ جب بابا نے مجھ سے یہ کہا کہ میں بھاگ جاؤں اور اپنے دوست کے پاس چلی جاؤں تو وہ

میری طرف جھپٹا لیکن بابا نے اُسے پیچھے سے پکڑ لیا۔ میں خیمے سے نکل کے اندھیرے میں کھڑی ہوگئی اور راستہ بدل کے سڑک کے کنارے بھاگتی رہی پھر مجھے تانگا مل گیا۔"

"ممکن ہے، وہ زندہ ہوں۔"

"شاید مٹی ماہیں تو ایسا ہو سکتا ہے۔" وہ روتے ہوئے بولی۔

ابا خاموش گم سم سے ہوگئے پھر چونک کے بولے "تمھیں کسی نے دیکھا تو نہیں؟"

"نہیں۔"

"مگر امین صاحب تو بہت شریف آدمی ہیں، اُن کے ایسے دشمن کیسے ہوگئے؟ وہ تو بہت...." ابا اُلجھتے ہوئے بولے۔

"ہم شہروں شہروں بھاگتے پھر رہے تھے، آخر اُس نے ہمیں پکڑ لیا۔ وہ بہت بُرے لوگ ہیں۔"

"کون بھاگتے پھر رہے تھے؟ تم کیا کہہ رہی ہو؟" والد صاحب نے تشویش سے پوچھا۔ "پھر وہ یہاں بھی تو آسکتے ہیں۔"

"آپ نہیں جانتے وہ بہت بُرے ہیں، پتہ نہیں وہ کیوں بابا کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ ویسے یہاں اُن کا آنا مشکل ہے کیونکہ بابا نے کسی سے آپ کا ذکر نہیں کیا تھا۔"

میں اندر ہی اندر کھول رہا تھا کہ ابا ایک معصوم لڑکی سے کیسے سوالات کر رہے ہیں۔ انھیں ایسے وقت تو خاموش رہنا چاہیے تھا مگر ابا بہت عجیب آدمی تھے۔ "اس میں کیا ہے؟"

"اس میں ہیرے جواہر اور کچھ کاغذات ہیں۔" کورا نے کہا۔

"ہیرے جواہر؟" والد صاحب نے اُس سے چھوٹی سی گٹھری لے کے وزن کیا۔ "یہ تو خاصی بھاری ہے۔" پھر وہ اُس کی اجازت کے بغیر گٹھری کھولنے لگے۔ کاغذات میں غالباً تبتی زبان میں آڑی ترچھی لکیریں بنی ہوئی تھیں، وہ کاغذات ایک دوسرے موٹی کاغذ میں لپٹے ہوئے تھے۔ گٹھری میں وہ بقچہ بھی رکھا ہوا تھا جو امین اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرتا تھا۔ ابا نے بقچہ کھول کے دیکھا تو سب کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ روشنی میں جواہر جگ مگ کر رہے تھے۔ میں نے ابا اور امی کی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ اُن کے چہروں کے رنگ بار بار بدل رہے تھے، کبھی سُرخی، کبھی زردی، کبھی سفیدی۔ ابا نے انھیں خاموشی سے گٹھری میں باندھ دیا۔ "یہ تو بہت قیمتی ہیرے جواہر معلوم ہوتے ہیں۔ تمھاری اور ان کی حفاظت دونوں مشکل کام ہیں، بہرحال اب تم آگئی ہو تو اللہ مالک ہے، دیکھیں گے کیا ہوتا ہے۔" وہ لمبی سانس کھینچ کے بولے اور امی سے مخاطب ہوئے۔ "انھیں حفاظت سے رکھ دو۔"

امی نے گٹھری ہاتھوں میں لینے سے انکار کیا۔ ابا نے انھیں گھور کے دیکھا۔ وہ سہم گئیں اور جھجکتے ہوئے انھوں نے اُسے اُٹھایا اور اندر کمرے میں لے گئیں۔ فہمیدہ بھی اُٹھ گئی تھی سو ابا نے اُسے حکم دیا کہ وہ اپنے کپڑے کورا کو پہنا دے اور صبح اُسے اُوپر والے کمرے تک محدود رکھے تاکہ محلے والوں کی نظریں اُس پر نہ پڑ سکیں۔ ہمارے محلے کے مکانات ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے، بعض کا تو چھتوں چھتوں راستہ تھا۔ اُوپر کے کمرے میں عموماً میں رہتا تھا۔ وہاں ایک پلنگ تھا اور میز کرسی موجود تھی۔ ایک الماری میں میری نصاب کی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ فہمیدہ بھی سہمی ہوئی تھی۔ سبھی خاموش اور گم سم سے تھے۔ کورا کو فہمیدہ نے اپنا لباس پہنا دیا۔ صرف فہمیدہ ہی ایسی تھی جس نے اُس کے آنسو پونچھے اور میں نے ابا اور امی کے سامنے تسلی اور تشفی کے بہت سے جملے ادا کیے۔

فہمیدہ اُسے لے کے اُوپر کے کمرے میں چلی گئی اور میں نیچے آگیا۔ یہیں ابا کورا کی عدم موجودگی میں آزادی سے تبصرہ کر سکتے تھے۔ "بابر!" انھوں نے مجھے مخاطب کیا۔ "اس لڑکی کا انتظام جلد سے جلد کہیں اور کرنا پڑے گا۔ مجھے یہ معاملہ اُلجھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ بہتر ہے یہ یہاں سے چلی جائے ورنہ ہم کسی بڑی مصیبت میں گھر سکتے ہیں۔ اب تک زندگی میں جو عزت اور مرتبہ حاصل کیا ہے، وہ سب خاک میں مل جائے گا۔ ہم اسے کہاں کہاں تک چھپائیں گے جب کہ ہمیں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم۔ پولیس اسے ضرور ڈھونڈ رہی ہوگی۔ وہ یہاں بھی آسکتی ہے۔"

"مگر ابا وہ ہماری پناہ میں آئی ہے۔" میں نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر پھر ہمیں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ اُس کے ساتھ قیمتی زیورات ہیں اور نہ جانے کس قسم کے کاغذات ہیں۔"

"ابا وہ سیدھی اور معصوم لڑکی ہے، ابھی اُس کی عمر ہی کیا ہے۔"

"اس کی عمر ہی کیا ہے۔" امی نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ "اُس کی ہمت تو دیکھو، سات میل کا سفر تنِ تنہا طے کرتی ہوئی آدھمکی۔"

"زندگی بچانے کے لیے آدمی سات میل تو کیا ستر ہزار میل بھی جا سکتا ہے۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"فمی کی ماں! کیا تم تھوڑی دیر کے لیے خاموش نہیں ہوسکتیں، ہمیں پہلے سے کوئی فیصلہ کرنا چاہیے اور فیصلہ کرنے کے لیے جذبات کی نہیں، سکون کی ضرورت ہے، ممکن ہے، بچی کا محض گمان ہو کہ امین کو کچھ ہوگیا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ امین زندہ ہو؟ یا اور بھی بہت کچھ ہوسکتا ہے۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ تعلقات محدود رکھنے چاہئیں ورنہ آدمی خواہ مخواہ پریشان ہو جاتا ہے۔"

"ابا! صبح تک ہم انتظار کیوں نہ کریں؟ اُس وقت تک کورا کی حالت بھی سنبھل جائے گی اور یہ بھی پتہ چل جائے گا کہ امین صاحب زندہ ہیں یا۔" میں نے اپنی زبان قابو میں کی۔

"نہیں وہ مر گئے، ٹھیک ہے صبح تک دیکھ لیتے ہیں مگر ہمیں فوراً کچھ کرنا ہوگا۔" ابا یہ کہہ کے خاموش ہوگئے۔

میں اُن کے برابر ہی لیٹا ہوا تھا۔ آج وہ کورا میرے گھر میں تھی جسے گھر میں لانے کے لیے میں نے صرف چند روز میں اتنے خواب دیکھ لیے تھے کہ انھیں شمار کرنا بھی مشکل تھا۔ وہ ایک منزل اُوپر تھی، بہت ہی قریب مگر قریب تو وہ اُس دن سے بھی تھی جب میں نے اُسے اسٹیشن پر دیکھا تھا۔ امین مجھے پہلے ہی کوئی غیر معمولی شخص معلوم ہوتا تھا، کورا کے بیان سے اس کی تصدیق بھی ہو

گئی تھی۔ وہ مارا گیا اور کورا اکیلی رہ گئی۔ اب کورا کا کیا ہوگا؟ اگر والد صاحب نے انکار کر دیا تو؟ اگر پولیس نے تفتیش کی تو؟ ابا کبھی یہ بات گوارا نہیں کریں گے۔ یہ گھر میرا ہے مگر یہ گھر تو ابا کا بھی ہے اور امی کا ہے، میرا کیا ہے۔ کورا کے آنے سے اچانک جو خوشی ہوئی تھی، وہ چند ہی لمحے باقی رہی۔ اب تفکرات نے ذہن پر قبضہ کر لیا تھا۔ اُوپر کورا بھی نہیں سوئی۔ ابا بھی ساری رات کھنکارتے رہے اور میری نیندیں تو پہلے ہی اُچاٹ ہو چکی تھیں۔

ابا صبح نماز کے لیے اُٹھے تو انھوں نے مجھے جگا کے تاکید کی کہ میں بدھ گیا کی طرف نہ جاؤں۔ میں نے حامی بھر لی اور حسبِ معمول سیر کے لیے روانہ ہوگیا۔ سیر کا تو نام ہے۔ جب سے کورا کو دیکھا تھا صبح کی خوب صورتی تر و تازگی اور شگفتگی کم نظر آنے لگی تھی۔ کورا بھی ایک صبح تھی، صبح کی طرح بیج، صبح کی طرح ملائم، شبنم کی طرح جھلملاتی ہوئی، ہرنی کی طرح خوش گوار، پھولوں کی طرح دل کش۔ والد صاحب کی تاکید کے باوجود میرے قدم خود بہ خود بدھ گیا کی طرف اُٹھ گئے۔ میرا ارادہ امین کے خیمے میں جانے کا نہیں تھا۔ صرف حقیقتِ حال جاننے کا ارادہ تھا۔ بدھ گیا کی رونق کا وہی عالم تھا، کہیں بھی کسی قسم کی تشویش کے آثار نہیں تھے۔ میں نے دُور سے دیکھا، امین کے خیمے پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ کیا امین اندر موجود ہے؟ میں وہاں جاتے جاتے رہ گیا۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو گھر ضرور آتا۔ پھر کیا قاتل اسے چھُرا گھونپ کے فرار ہوگیا اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوئی کہ وہ اندر مُردہ پڑا ہے؟ مرنے سے پہلے اس کی چیخیں گونجی ہوں گی اور قریب کے خیموں کے لوگ جاگ گئے ہوں گے۔ موت کے وقت تو آدمی کو ضرور چیخنا چاہیے۔

مجھے اپنے چند طالب علم ساتھی مل گئے، اچھا ہوا کہ میں نے کسی سے کورا کا ذکر نہیں کیا تھا ورنہ وہ مجھ سے میرے مہمانوں کے بارے میں ضرور پوچھتے۔ انھیں بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ امین کے خیمے پر سکوت چھایا ہوا تھا۔ میں بدھ گیا سے جلد ہی واپس آگیا تاکہ والد صاحب کو شبہ نہ ہو جائے۔ گھر میں ابا اور امی کے چہروں پر ابھی تک تکدر تھا اور اس میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو مجرم سا سمجھا۔ میرے پہنچتے ہی وہ مجھ سے پوچھنے لگے "کچھ پتہ چلا؟"

"کیسے پتہ چلتا؟" میں نے رُکھا سا جواب دیا۔

"تو پھر مر ہی گیا۔" ابا افسردگی سے بولے۔ "اگر وہ زندہ ہوتا تو اب تک کورا کی خبر لینے ضرور آتا۔"

"ممکن ہے کوئی اور مجبوری ہو۔"

"تم اس کا بندوبست کرو بھئی، مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔" ابا ایسی اجنبیت سے بولے جیسے میرا اور اُن کا کوئی رشتہ نہ ہو۔

"آپ ہی بتائیے کیا کیا جا سکتا ہے؟"

"میرا خیال ہے ہمیں پولیس میں بتا دینا چاہیے یا مندر کے بڑے پروہت یا بدھ گیا کے منتظم کو صورتِ حال سے آگاہ کر دینا چاہیے۔" ابا بہت پریشان نظر آرہے تھے۔

"ابھی سے کسی کو کیسے مطلع کر دیں؟ ہم کچھ انتظار بھی تو کر سکتے ہیں۔"

"معاملات بگڑ سکتے ہیں۔" ابا نے متوحش ہو کے کہا۔

"کورا پولیس وغیرہ کا سامنا کس طرح کرے گی؟ ایک ایسی لڑکی جس کا کوئی سہارا نہیں ہے، اُسے ہم پولیس کے حوالے کیسے کر سکتے ہیں؟ وہ تو ویسے ہی مر جائے گی۔" میں نے تندی سے کہا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا، کیا کیا جائے۔ ایک طرف اس لڑکی کا سوال ہے، دوسری طرف اپنی عزت کا۔ اس لڑکی نے تو اچھی خاصی زندگی حرام کر دی اور اس کے فتنے وارثم ہو صرف تم۔" وہ غصّے سے بولے۔

میں نے سوچا کہ ابا کی باتوں کا کیا جواب دوں؟ اُن کی نظر میں گھر، گھر کی عزت، خاندان، علما اور برادری ہی سب کچھ ہے۔ میں کورا کی خیر خبر پوچھنے اُوپر چلا گیا۔ فہمیدہ اور دوسری بہنوں کے چہرے بہت تاباں نظر آرہے تھے۔ وہ اُسے گڑیا کی طرح درمیان میں لیے بیٹھی تھیں۔ میرے آتے ہی کورا بے اختیار اُٹھ کھڑی ہوئی مگر بہنوں کا خیال کر کے پھر سمٹ کے بیٹھ گئی۔ "یہ تمھارا ہی گھر ہے کورا! تمھیں گھبرانے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ کسی چیز کی تکلیف تو نہیں ہے؟" میں نے جوشیلے لہجے میں کہا۔

"یہ ہم سے بول نہیں رہیں۔" فرخ نے شکایت کی۔

"ہاں ہم سے ناراض ہیں۔" جہاں گیر نے تلملا کے کہا۔

"نہیں، نہیں، ان کی طبیعت خراب ہوگی۔" میں نے اُسے ڈانٹ کر کہا۔ "تم لوگ انھیں پریشان کر رہے ہو گے؟"

کورا نے اُسے اپنی گود میں لے لیا۔ "بہت شریر ہے۔"

اِدھر اُس کی پذیرائی کا یہ حال تھا، اُدھر ابا پر خفقانی دورے پڑ رہے تھے۔ شام تک وہ متعدد مرتبہ مجھے بُرا بھلا کہتے اور ہزار اندیشے ظاہر کرتے رہے۔ انھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ ممکن ہے کورا ہی اپنے باپ کو قتل کرا آئی ہو اور امین اُس کا باپ نہ ہو۔

میں نے تائید نہیں کی کہ واقعی امین اُس کا باپ نہیں تھا مگر کیا وہ قتل کر سکتی ہے؟ ابا کو کیا ہو گیا تھا، انھوں نے میری زندگی تلخی میں مبتلا کر دی۔ شام کو میں ایک بار پھر بدھ گیا گیا۔ وہاں تو میلا لگا ہوا تھا، کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔ ابا کے تلخ اور ترش جملوں میں ایک رات اور گزر گئی۔ دوسرے دن دوپہر کو میرے ایک کلاس فیلو ہری شنکر نے مجھے بتایا کہ بدھ گیا کے ایک خیمے میں ایک شخص قتل کر دیا گیا ہے۔ ہری شنکر بدھ گیا ہی سے آرہا تھا۔ تفصیل پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ امین ہی تھا۔ ہری شنکر کے بیان کے مطابق خیمے کے اردگرد پولیس لگی ہوئی تھی۔ یاتریوں میں دہشت پھیلنے کے خیال سے یہ واقعہ چھپانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی تھی پھر بھی بہت سے لوگوں کو معلوم ہو ہی گیا۔ "لوگ کہتے ہیں، اُس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی، لڑکی غائب ہے۔" ہری شنکر نے سنسنی خیز انداز میں کہا۔

میں نے چاہا، یہ اطلاع والد صاحب کو جا کے دے دوں لیکن پھر اُن کا کیا حال ہوگا؟ وہ اور گھبرا جائیں گے۔ گھر جاتے ہی مجھے امی کی انتہائی تلخ باتیں

سننی پڑیں۔ "میں کہتی ہوں بابر! یہ لڑکی کب تک ہمارے گھر میں رہے گی؟ تمھیں کچھ پتہ نہیں تمھاری جوان بہنیں بھی ہیں، اس کا آتا پتہ پوچھ کے اسے کہیں چھوڑ آؤ۔"

"چھوڑ آؤں گا، چھوڑ آؤں گا۔" میں نے غصّے میں کہا۔

ایک دن، دو دن، تین دن، چوتھے دن تو آبا نے الٹی میٹم دے دیا۔ انھیں کہیں سے معلوم ہوگیا تھا کہ امین کو قتل کر دیا گیا ہے۔ اوپر اب صرف فہمیدہ کو بھیجا جاتا تھا۔ کورا کو ویسے بھی کمرے میں بند رکھا گیا تھا۔ پڑوس والوں کی عورتیں آتیں تو فہمیدہ کو آواز دے کے بلا لیا جاتا۔ گھر میں ایک دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ ابھی تک مجھے کورا سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میں نے ارادہ کیا کہ آج رات ضرور اُس سے ملاقات کروں گا لیکن وہاں فہمیدہ موجود ہوگی۔ کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آئی تو میں نے ابّا سے کہا: "یہ میں کورا سے یہ کیوں نہ پوچھوں کہ وہ اپنے کسی رشتے دار کا پتہ بتائے تاکہ انھیں مطلع کیا جا سکے۔"

"یہ بات تو میں خود پوچھ چکا ہوں مگر وہ تو کسی بات کا جواب ہی نہیں دیتی، بس رونے لگتی ہے۔"

"میں کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔ آپ تھوڑی دیر کے لیے فہمیدہ کو وہاں سے ہٹا دیجیے۔" میں نے جرأت کر کے کہا۔

"کوشش کر لو مگر یہ بھی یہ سمجھ لو کہ اُسے جلد از جلد یہاں سے جانا چاہیے۔ کھانا پینا بھی ختم ہوگیا ہے۔ میں گھر سے باہر بھی نکل نہیں سکتا کہ جانے میری عدم موجودگی میں کیا واقعہ پیش آجائے۔"

"ٹھیک ہے، میں اُس سے بات کر لیتا ہوں۔"

ابّا نے فہمیدہ کو آواز دے کے نیچے بُلا لیا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میری حالت دگرگوں تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اُس کا کوئی نہیں ہے، کورا سے تنہائی میں ملنے کا خیال بھی مجھے وحشت میں مبتلا کیے ہوئے تھا۔ میں اُس سے کیا کہوں گا اور وہ کیا جواب دے گی؟ تسلی و تشفی کے لیے میرے پاس چند جملے تک نہیں تھے۔ میں اوپر پہنچا تو کورا کو پھر رونا آگیا۔ میں نے دروازہ بند کر لیا اور اپنی قمیص سے اُس کے آنسو پونچھنے لگا۔ "روتی کیوں ہو کورا!" مجھے خود بھی رونا آگیا۔

"میں نے گھر والوں کو بہت پریشان کر دیا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے کورا! کاش میں بڑا ہوتا۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "لیکن اب بھی کیا ہے، میں دنیا بھر کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔ میں نے سوچا ہے میں تمھیں یہاں سے لے جاؤں گا۔"

وہ حیرت سے میرا چہرہ دیکھنے لگی۔ "نہیں نہیں، میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

"نہیں، میں جانتا ہوں کہ تم ٹھیک نہیں ہو۔ مجھے اپنے بارے میں کچھ اور بتاؤ۔ وہ کون شخص تھا جس نے بابا کو قتل کر دیا؟ ممکن ہے تم نے کچھ باتیں والد صاحب سے چھپائی ہوں اور صرف مجھے بتانا چاہتی ہو۔"

"وہ انھی لوگوں میں سے کوئی تھا جو میرے چچا کے دوست ہیں، وہ مجھے مارنا چاہتے ہیں لیکن کاغذات حاصل کرنا چاہتے ہیں جو میں نے ابّا کو لا کے دیے ہیں۔"

"وہ تمھیں کیوں مارنا چاہتے ہیں اور وہ کاغذات کیسے ہیں؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔ "اور یہ زیورات کس کے ہیں؟"

"یہ زیورات ہمارے ہیں میرے۔ بابا امین نے چلتے وقت انھیں اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ کاغذات میں بھی کوئی خاص بات ہے جو مجھے نہیں معلوم مگر امین بابا بار بار انھیں دیکھتے تھے اور کسی سوچ میں پڑ جاتے تھے۔ وہ لوگ مجھے اس لیے مارنا چاہتے ہیں کہ اپنے باپ کی موت کے بعد قبیلے کی سردار بننے کی حق دار میں ہوں۔ ہمارے ہاں یہ رواج ہے کہ اگر کسی سردار کے ہاں صرف لڑکی پیدا ہوئی ہو تو وہ ولی عہد ضرور ہوتی ہے مگر اُسے اُس وقت تک سرداری نہیں سونپی جاتی جب تک اُس کی شادی نہ ہو جائے، پھر اُس کا شوہر اُس کے نام پر سرداری کرتا ہے۔ میرے باپ بہت رحم دل اور نیک تھے۔ قبیلے میں کئی شادیاں کرنے کا رواج ہے مگر انھیں ایک ہندو عورت یعنی میری ماں سے محبت ہوگئی تھی۔ اس لیے انھوں نے اُن کے سوا کسی سے شادی نہیں کی۔ میری ماں میری پیدائش پر مر گئیں پھر میرے باپ نے شادی نہیں کی اور مجھے پرورش کرتے رہے۔ انھوں نے قبیلے کے سب سے دانا شخص امین کو میرا اُستاد مقرر کیا۔ قبیلے کے سبھی لوگ اُن کے انصاف اور رحم کے باعث اُن سے محبت کرتے تھے مگر میرے چچا نے انھیں مار دیا اور خود سردار بن بیٹھا۔ پھر اُس نے مجھے بھی مارنا چاہا کیونکہ میری شادی ہو جانے پر اُسے سرداری چھوڑنی پڑے گی۔ ہمارا قبیلہ بہت بڑا ہے۔ ہماری کئی بستیاں ہیں، پکے مکانات ہیں، سڑکیں ہیں۔ اسے جانگ قبیلہ کہتے ہیں۔" یہ سب باتیں کورا نے اٹکتے اٹکتے ٹکسالی لہجے میں بیان کیں۔ "وہ بُری طرح میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، مجھے بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں اور کاغذات پر بھی قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔"

"وہ تمھیں حاصل نہیں کر سکیں گے۔" میں نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ "تم اب قطعی محفوظ ہو، میں تمھیں یہاں سے لے جاؤں گا۔ بہت دُور لے جاؤں گا۔ میں تمھاری خاطر سب کو چھوڑ دوں گا۔"

"میں تمھارے ساتھ نہیں جاؤں گی، مر جاؤں گی۔"

"تو میں بھی مر جاؤں گا۔"

"پھر میں کیا کروں؟" وہ سادگی سے بولی۔

"تم ایسا کرو کہ آج رات جاگتی رہو۔ صبح پانچ بجے یہاں سے ایک گاڑی جاتی ہے، میں تمھیں فہمیدہ کا بُرقع دے جاؤں گا تم بُرقع پہن کے میرے ساتھ چلنا۔"

"نہیں، کوئی دیکھ لے گا، رات کے وقت نکلنا مشکل ہوتا ہے۔"

"دن کے وقت نکلنا کون سا آسان ہوتا ہے، محلے میں سبھی تمھیں دیکھیں گے مگر تم تو بُرقع پہنے ہوئے ہوگی۔ کون سمجھے گا کہ تم جا رہی ہو یا میری کوئی بہن جا رہی ہے۔ میں اپنی بہن کے ساتھ اکثر جاتا رہتا ہوں۔ ہم تانگے پر پردہ ڈال دیں گے لیکن دن میں گھر سے کیسے نکلیں گے۔ رات کو گاڑی کے وقت تو سبھی نکلتے ہیں۔ میں ایک سوٹ کیس میں کپڑے تیار رکھوں گا اور کچھ نقدی اکٹھی کرنی ہوگی، زیورات تو یہیں رہنے چاہئیں۔"

وہ منع کرتی رہی اور سوچتی رہی۔ میں نے اُسے ہدایت کی کہ رات کو وہ میری ہلکی سی دستک پر اُٹھ بیٹھے۔ نیچے آکر میں نے والد صاحب سے کہا: "اِس کا کوئی عزیز موجود نہیں ہے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟" وہ اشتعال میں بولے۔

"وہ یہی کہتی ہے۔"

"اُسے بکنے دو۔" انھوں نے ڈپٹ کر کہا۔

"مجھے تو وہ بڑی حرافہ معلوم ہوتی ہے، میں کہتی ہوں اُس سے صاف کہہ دو کہ وہ اپنا ٹھور ٹھکانا ڈھونڈے ورنہ نکال باہر کرو۔" امّی نے کہا۔

"ایسا ہی کرنا پڑے گا۔" میں نے اداسی سے کہا۔

دن کے وقت چپکے سے میں نے فہمیدہ کے کپڑے چرا لئے، کچھ اپنے کپڑے رکھے اور ایک سوٹ کیس تیار کر لیا۔ میں نے یہ کام کئی گھنٹوں میں کیا، پھر میں نے وہ مالا بھی رکھ لی جو امین نے مجھے دی تھی۔ یہ سب کام ہوگیا اب مجھے رات کا انتظار تھا۔ میری عمر خاصی کم تھی۔ رات کو ایک بُرقع پوش لڑکی کے ساتھ گھر سے نکلنا آسان کام نہیں تھا۔ کوئی بھی جاننے والا دیکھ سکتا تھا مگر ان تمام اندیشوں کے باوجود مجھے رات کا انتظار تھا۔ یہ گھر پہلے بھی میرا کب تھا؟ اسے تو مجھے کبھی نہ کبھی خیرباد کہنا ہی تھا۔ اب امّی رویا کریں، ابّا تلملایا کریں، بہنیں یاد کیا کریں۔

آدھی رات کے بعد میں گھڑی دیکھ کے اُٹھا، سب سوئے ہوئے تھے۔ میں نے ننگے پیر چل کے سوٹ کیس اُٹھایا اور دروازے کے پاس رکھ دیا۔ امانت کو کنڈی میں نے کھلی رہنے دی تھی۔ پھر میں اُوپر گیا اور ہلکی سی دستک دی۔ کورا فوراً اُٹھ کے باہر آگئی اور مجھ سے منتیں کرنے لگی کہ میں اپنے ارادے سے باز آجاؤں۔ میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا۔ فہمیدہ کے سینڈل بھی میں نے سوٹ کیس میں رکھ لیے تھے۔ وہ ننگے پیر ہی نیچے آئی۔ بُرقع اوڑھ لو، میں نے سرگوشی میں کہا۔ اسے بُرقع اوڑھنا نہیں آتا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں اس کی مدد کی۔ پھر ہم دونوں رینگتے ہوئے نیچے آئے اور کوئی آہٹ پیدا کیے بغیر ڈیوڑھی میں آگئے۔ سوٹ کیس اُٹھا کے میں نے دروازہ آہستگی سے کھولا اور کورا کا ہاتھ پکڑے ہوئے باہر نکل آیا۔ باہر نکل کے میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور سوٹ کیس کھول کے فہمیدہ کے سینڈل اُسے پہنا دیے۔ پھر دوبارہ دروازہ بند کر کے ہم احتیاط سے سڑک پر آگئے۔ میں نے شیروانی پہن لی تھی تاکہ میری عمر سولہ سترہ سال سے کچھ زیادہ معلوم ہو۔ بُرقعے میں کورا کی عمر چھپ گئی تھی۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔ ہم اندھیرے میں چلتے ہوئے خاصی دُور نکل آئے، کسی نے ہمیں نہیں دیکھا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے اندھیرے میں بھاگتے رہے۔ گلیاں جانی پہچانی تھیں۔ میں ان گلیوں سے ہزاروں بار گزرا تھا۔ مگر اس وقت بڑی عجیب اور ڈراؤنی محسوس ہو رہی تھیں۔ ذرا بھی آہٹ ہوتی تو ہم سانس روک کے اندھیرے کی آڑ میں ہو جاتے، پتا کھڑکتا تو دل لرز جاتا۔ ہم گھر سے خاصی دُور نکل آئے تھے مگر ابھی تک ہول طاری تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہر قدم پر کوئی ہمارا تعاقب کر رہا ہو۔ ہمیں خود اپنی آوازوں اور آہٹوں سے خوف آرہا تھا۔ گلیوں میں اونگھتے ہوئے کتے قدموں کی ہلکی چاپوں سے بیدار ہو جاتے اور غلط انداز نگاہ ڈال کر دوبارہ پیروں میں سر رکھ کے سو رہتے۔ جب وہ غرانے لگتے تو ہم خاموشی سے کھڑے ہو جاتے اور انھیں ہم پر ترس آجاتا۔ کورا مجھ سے زیادہ سہمی ہوئی تھی۔

"گھر واپس چلو۔" اُس نے ایک جگہ میرا ہاتھ روک کر منت کی۔

کئی بار خود میرے ذہن میں گھر واپس جانے کا خیال آیا تھا، دروازہ کُھلا ہوا تھا۔ گھر میں سب سو رہے ہوں گے، ہم بڑی آسانی سے واپس جا سکتے تھے۔ اور اس اذیت سے نجات پا سکتے تھے، کوئی بھی ہمیں دیکھ لیتا تو ہمارا کیا حشر ہوتا، ہم تو کہیں کے نہ رہتے۔ غم اور غصّے میں ابّا تو مہینوں تک کھانا بھی نہیں کھاتے، کورا پولیس کے سپرد کر دی جاتی۔ "نہیں۔" میں نے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "اب تھوڑا سا راستہ رہ گیا ہے۔" میں نے جھوٹ کہا تھا۔ گلی کے نکڑ سے اسٹیشن کا راستہ دو میل کے قریب تھا اور یہ دو میل ہمارے لیے دو سو دو ہزار میلوں سے کم نہیں تھے۔

آگے بڑھتے، رکتے، چھپتے، راستہ بدلتے ہم وہاں تک پہنچ گئے جہاں تانگا ملنے کا امکان تھا۔ کوچوان، گھوڑا اور تانگا سب غنودہ تھے۔ میں نے ہمت کر کے ایک تانگے والے کے اونگھتے ہوئے جسم پر ہاتھ رکھا۔ اُس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ "کہاں جانا ہے؟" اُس نے آنکھیں ملتے ہوئے بے دلی سے پوچھا۔

"اسٹیشن۔" میں نے اپنی آواز بھاری بنانے کی کوشش کی۔

"مجھے اُدھر نہیں جانا، دوسرے تانگے والے سے پوچھ لیجیے۔" یہ کہہ کے اُس نے ایک جماہی لی اور پھر سونے کی تیاری کرنے لگا۔

"کتنے پیسے لوگے؟" میں نے اُس کی بات نظرانداز کر کے کہا۔

"میں نے آپ سے کہہ دیا بابوجی! مجھے اُدھر نہیں جانا۔"

"دو روپے لوگے؟"

اُس کی آنکھیں کھل گئیں اور اُس نے غور سے مجھے دیکھا۔ "تین روپے دیں گے بابوجی؟ رات کا وقت ہے، گھوڑا تھکا ہوا ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" میں نے اُس سے حجت کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ حالانکہ یہاں سے اسٹیشن تک کا یہ بہت زیادہ کرایہ تھا لیکن اُس وقت وہ مجھ سے سو روپے بھی طلب کرتا تو میں اُسے دینے کے لیے تیار ہو جاتا۔ ہم تانگے میں بیٹھے تو [illegible] کچھ کم ہوئی۔ دل قابو میں آنے لگا۔ رات کے وقت سڑک پر صرف ایک شور تھا۔ تانگے اور کتّوں کا شور۔

"کہاں جا رہے ہیں بابوجی؟" تانگے والے نے گھوڑے کو چابک لگاتے ہوئے پوچھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ راستے میں تانگے والا اپنی عادت کے مطابق سوال و جواب ضرور کرے گا، گھوڑے کو بُرا بھلا کہے گا اور بڑبڑاتا رہے گا۔ اُس کے سوال پر میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا جواب دینا چاہیے۔ میں کہاں جا رہا ہوں؟

کسی اور شہر کا نام ذہن میں نہیں آیا۔ میں نے مختصراً کہا۔ "کلکتے۔"

"گاڑی پونے پانچ بجے آتی ہے مگر آج کل سالی گاڑیوں کا کیا اعتبار۔ ابھی کل ہی، اپ آدھے دن لیٹ آئی تھی۔" وہ میری ہُوں ہاں سے بے نیاز اپنی زبان ہلاتے جا رہا تھا۔ "زمانہ خراب آگیا ہے بابوجی! کسی چیز کا ٹیم نہیں رہا۔ اب دیکھیے آپ کو کب تک انتظار کرنا پڑے۔"

میں نے اس درمیان کورا سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ بُرقع میں اُس کا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ اُس کا چہرہ زرد پڑا ہوگا، ہوائیاں اُڑ رہی ہوں گی۔ وہ مُڑ مُڑ کے بُرقع کی جالی سے مجھے دیکھتی تھی اور کسمانے لگتی تھی۔ اس سیاہ مضبوط سڑک پر گھوڑے کے نعل کی آواز آج مجھے بہت بُری معلوم ہو رہی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں خود ایک سڑک ہوں اور گھوڑا مجھ پر دوڑ رہا ہے۔ گھوڑے کا ہر بڑھتا ہوا قدم فاصلہ کم کر رہا تھا لیکن راستہ ہی آج طویل ہو گیا تھا۔ "تیز چلاؤ۔" میں نے گھبرا کے کہا۔

"ہوا سے باتیں کر رہا ہے بابوجی! اور ابھی گاڑی آنے میں بھی بہت دیر ہے۔ آپ اطمینان رکھیے۔ وقت پر پہنچا دوں گا۔" کچھ دیر تک یہی کیفیت رہی۔ یہی عذاب ناک کیفیت، تانگے والے کو میری خاموشی پسند نہیں آئی چنانچہ اُس نے پیچھے ایک نظر ڈال کے پہلے برقع پوش کورا کو دیکھا پھر مجھے اور کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگا۔ "ساتھ میں آپ کے گھر سے ہیں؟"

کوئی اور موقع ہوتا تو میں کہتا، تیری بہن ساتھ ہے یہ ایک غیر متعلق اور بے ہودہ سوال تھا لیکن مجھے خوش اخلاقی کا ثبوت دینا تھا۔ میں نے بہ مشکل تمام ہنستے ہوئے کہا۔ "بھابی ہیں، میکے آئی تھیں اب واپس جا رہی ہیں، بھیا کو چھٹی نہیں مل سکی اس لیے میں لے کے جا رہا ہوں۔"

"اچھا اچھا۔" تانگے والا بولا۔ "بھائی کیا کام کرتے ہیں؟"

"انجینئر ہیں، عمارتیں ہیں نا کلکتے میں بڑی بڑی، وہ سب وہی بناتے ہیں۔ بہت بڑے انجینئر ہیں، کلکتہ کبھی دیکھا ہے؟" میں نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

"نہیں جناب بس سنا ہی سنا ہے۔" وہ آہ بھر کے بولا۔ "سنا ہے، بڑا ظالم شہر ہے، آدمیوں کا جنگل ہے، وہاں ہر وقت روشنی رہتی ہے اور لوگ جاگتے رہتے ہیں، کلکتے کے بہت سے لوگ گیا آتے ہیں تو انھی سے اُس شہر کے بارے میں سُن لیتا ہوں، بہت بار ارادہ کیا جانے کا مگر......" وہ ایک مصرع گنگنانے لگا "ہزاروں خواہشیں ایسی......"

کلکتے کا ذکر بہت سود مند ثابت ہوا۔ گو میں نے خود کلکتہ نہیں دیکھا تھا مگر میں اُسے اُس شہر کے بارے میں بہت سی دلچسپ باتیں کر کے چونکاتا رہا۔ آخر اسٹیشن تک راستہ کٹ ہی گیا۔ اُسے مجھ سے میرے سفر اور کورا کے متعلق کوئی سوال کرنے کا موقع نہیں ملا۔ یقیناً یہ بات اُس کے لیے حیرت انگیز ہوگی کہ میکے سے واپس جانے والی کسی لڑکی کو رخصت کرنے کے لیے اسٹیشن پر کوئی نہیں آیا مگر ممکن ہے، میکے میں اُس کے تمام رشتے دار ضعیف ہوں، بیمار ہوں، اس کا دیور تو بہر حال اس کے ساتھ ہے۔ اسٹیشن کے باہر عمارت میں تیز روشنی تھی۔ میں نے پہلے ہی جیب سے تین روپے نکال کے ہاتھ میں رکھ لیے تھے تاکہ تانگے والے سے کوئی اور گفتگو نہ ہو سکے۔ اُترتے ہی میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور اُس نے مجھے دعائیں دیں۔ کئی قلی ہماری طرف دوڑے مگر میرے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سوٹ کیس دیکھ کے ٹھٹک گئے۔

میرے لیے گھر سے باہر قدم نکالنے کا یہ پہلا موقع نہیں تھا، میں والد صاحب کے ساتھ قریب کے شہروں میں کئی بار جا چکا تھا۔ گھر سے اسٹیشن تک آنے کا مشکل مرحلہ گزر چکا تھا، اب مجھے کہیں لوگوں کی نظروں سے بچ کے گاڑی کا انتظار کرنا تھا۔ میری کوئی منزل نہیں تھی، کہاں جاؤں؟ کون سے شہر میں اُتروں؟ میں یہ طے کرنے میں ناکام ہو گیا تھا۔ قریب کے کسی شہر میں جانا مناسب نہیں تھا۔ ہر پھر کے ایک ہی شہر ذہن میں آیا اور وہ تھا کلکتہ۔ تانگے والے سے گفتگو کر کے مجھے کورا کے ساتھ سفر کرنے کی دشواریوں کا اندازہ ہو گیا تھا۔ ہر آدمی چہرے پر لکھی ہوئی عمر دیکھتا ہے۔ ذہن کی بھی ایک عمر ہوتی ہے مگر وہ نظر نہیں آتی، جوان، بوڑھے بچے ہوتے ہیں اور بچے بوڑھے ہوتے ہیں۔ میں زندگی کے بارے میں ہر چیز جانتا تھا۔ میں نے کتابیں پڑھی تھیں اور بہت کچھ سوچتا رہتا تھا، میرا ذہن خیالوں اور خوابوں کا کارخانہ تھا۔ روز مجھے ہزاروں خواب دکھاتا تھا، ہزاروں تصورات اس میں ڈھلتے تھے۔ کورا کا چہرہ برقع میں چھپ گیا تھا، قد اُس کا پہلے ہی نکلا ہوا تھا۔ کوئی قیاس بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اندر ایک نوخیز لڑکی ہے۔ میں نے بھی شیروانی اسی لیے پہنی تھی کہ میرا قد بھی نکلتا ہوا تھا مگر میں کورا کی طرح برقع نہیں پہن سکتا تھا۔ میں آواز چاہے کتنی ہی بھاری بنا لیتا، چہرے پر سنجیدگی کی کتنی ہی تہیں جما لیتا اور چال میں کتنا ہی وقار پیدا کر لیتا، میرے چہرے پر عمر صاف لکھی ہوئی تھی۔ میں اسٹیشن کی روشنیوں سے بچتا ہوا بکنگ آفس پہنچا اور کلکتے کے دو ٹکٹ خرید کے تیزی سے پلیٹ فارم پر آگیا۔ یہاں قلی اپنی سُرخ چادریں بچھاتے اونگتے یا لیٹے ہوتے تھے۔ ابھی چار بجے تھے اور گاڑی آنے میں پون گھنٹا باقی تھا۔ بکنگ کلرک نے بتایا تھا کہ آج گاڑی وقت پر آرہی ہے، پلیٹ فارم پر تیز روشنیاں نہیں تھیں، میں دُور ایک دھیمی روشنی کے نیچے دھری ہوئی بنچ پر بیٹھ گیا اور میں نے کورا سے کہا کہ وہ اپنے چہرے سے نقاب ہٹانے کی غلطی نہ کرے۔

بہت ممکن تھا کہ محلّے کا کوئی شخص، کوئی رشتے دار یا کوئی شناسا بھی آج کی گاڑی سے کلکتے جا رہا ہو، اس لیے میں پلیٹ فارم سے ہٹ کر ایک سنسان بنچ پر چھپا بیٹھا تھا اور میں نے اپنا چہرہ اس طرح جھکا لیا تھا جیسے مجھ پر نیند کا غلبہ ہو۔ مجھے یہ بھی خدشہ تھا کہ بدھ گیا کے یاتریوں کو لینے کے لیے آنے والے رضا کار طالب علم اس طرف نہ آجائیں۔ جب تک گاڑی گیا کے اسٹیشن سے حرکت نہ کرتی، میرے لیے سکون محال تھا۔ شیروانی کے اندر سارا جسم پسینے سے تر بتر تھا۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" کورا کی سہمی ہوئی کمزور آواز اُبھری۔

"بہت دُور۔ جہاں کوئی ہمارے پیچھے نہ آسکے۔" میں نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہم کلکتے چل رہے ہیں کورا! ابھی کچھ دیر میں ہم یہاں سے نکل جائیں گے پھر کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوگا۔"

"اب بھی ہم گھر واپس چل سکتے ہیں۔" کورا کے لہجے میں لرزہ تھا۔

"اب تو چلے آئے ہیں۔ اب گھر کا خیال چھوڑ دو کورا! ہم اپنا ایک گھر علیحدہ بنائیں گے۔ ٹھیک ہے، اب جو کچھ بھی ہو۔"

"بابر!" اُس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"ہمت رکھو کورا! دنیا بہت بڑی ہے۔" میں نے اُسے تسلی دینے کی کوشش کی حالانکہ میری حالت خود دگرگوں تھی۔ میں ہڑبڑا کر اِدھر اُدھر دیکھتا تھا۔

"گھر والے کیا سوچیں گے، وہ سب بہت روئیں گے۔"

"رونے دو، انھیں کون سی میری فکر تھی۔ رو پیٹ کر خاموش ہو جائیں گے۔ سمجھ لیں گے کہ میں مر گیا، یا میں پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔"

"سب مجھے بُرا بھلا کہیں گے۔ میں ہی تمام مصیبتوں کی جڑ ہوں۔"

"کورا ایسی باتیں مت کرو، تم نہ آتیں تب بھی شاید میں کسی دن وہ گھر چھوڑ دیتا۔ اب اُن کا ذکر مت کرو۔"

ایک قلی کے قریب آنے کی آہٹ ہوئی تو میں نے سر جھکا لیا، کورا بھی چپ ہو گئی۔ قلی نے ہماری بنچ پر آکے کہا۔ "بابوجی! جگہ چاہیے؟"

"نہیں۔" میں نے گردن جھکائے جھکائے جواب دیا۔

"اس گاڑی میں جگہ ملنی مشکل ہوتی ہے۔" قلی نے حجت کی۔

"نہیں بھائی! ہم خود جگہ تلاش کر لیں گے۔" میں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

قلی بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ یہاں کے قلیوں کا یہی حال تھا۔ وہ جگہ فراہم کرنے کے بہانے ایک دو روپے اینٹھ لیتے تھے۔ گاڑی میں اتنی ہی جگہ ہوتی تھی جتنی ہو سکتی تھی۔ قلی جگہ کھینچ کے بڑی نہیں کر سکتا تھا۔ مستورات کے لیے گاڑی میں علیحدہ ڈبے ہوتے تھے، میں نے سوچا کورا کو وہاں بٹھا دوں گا تو وہ بڑی محفوظ رہے گی، خود میں اسٹیشن پر اُتر کے اُس کی خیریت دریافت کرتا رہوں گا مگر مستورات کے ڈبے میں کورا کا نقاب اُٹھانا لازمی تھا اور عورتوں کا پوچھ گچھ کرنا بھی یقینی تھا۔ کورا کی ہندوستانی خاصی صاف تھی مگر اتنی بھی نہیں۔ بہر حال ہندوستان میں ہر جگہ مسلمان عورتیں صاف اُردو یا ہندوستانی نہیں بولتیں لیکن ڈر یہ تھا کہ اگر ڈبے میں کوئی مسلمان عورت تحرگئی اور اُس نے اِدھر اُدھر کے سوالات شروع کر دیے تو کورا کیا جواب دے گی۔ اُسے مردانے میں اپنے پاس بٹھانے میں بھی خطرہ تھا۔ ڈبے میں تمام لوگوں کی نظریں اس بُرقع پوش لڑکی پر جم جائیں گی اور خواہ مخواہ کی اُلجھنیں پیدا ہوں گی۔ ایک بُرقع پوش مسلمان لڑکی کا مردانے ڈبے میں سفر کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں اسی کشمکش و پیچ میں گرفتار رہا جیسے

گاڑی آنے کا وقت قریب آرہا تھا، پلیٹ فارم کی زندگی کھلنے لگی تھی۔ قلیوں کا شور بڑھ گیا تھا۔ کسی آوارہ انجن کی تیز سیٹیوں کی آواز آتی، یا اُس کی تیز روشنی نظر آتی تو گمان ہوتا جیسے گاڑی آگئی ہے، مسافروں میں بدھ راہب اپنے مخصوص لباس میں علیحدہ پہچانے جاتے تھے۔ گاڑی آنے کے وقت تک اسٹیشن پر خاصا ہنگامہ ہو گیا تھا۔ مجھے چند طالب علم بھی نظر آئے، میں اپنی بنچ سے اُٹھ کر جنگلے کے قریب اندھیرے میں ہو گیا کیونکہ کئی دکان دار اور شناسا چہرے اسٹیشن پر گشت کر رہے تھے۔ کورا اکیلی بنچ پر بیٹھی رہی۔ یہ بہت کربناک وقت تھا، کم بخت گاڑی نہ جانے کہاں اٹک گئی تھی۔ جب پلیٹ فارم پر ٹہلنے والوں کی بھیڑ بڑھ گئی اور بہت سے لوگ ہوس ناک نظروں سے کورا کے اردگرد منڈلانے لگے تو میں اندھیرے سے نکل کے بنچ پر آگیا۔ بھیڑ خود بخود چھٹ گئی۔ میں ایک طرف غور سے دیکھنے لگا جیسے کسی کے آنے کا انتظار ہو، جیسے ابا ٹکٹ لینے گئے ہوں اور بیٹے اور بیٹی کو یہاں بٹھا گئے ہوں۔ کورا کے چمکیلے ہاتھ برقع سے چمک رہے تھے، اُس کے خوب صورت پیر بھی سیاہ لباس میں صاف نظر آرہے تھے۔ جب بھی ہم طالب علم اسٹیشن آتے اور کسی بُرقع پوش عورت کو دیکھتے تو سب سے پہلے اُس کے پیروں پر ہماری نظریں جاتیں، پیروں اور ہاتھوں سے اندازہ ہوتا کہ وہ کتنی گوری ہوگی اور گوری ہوگی تو اُس کا چہرہ کتنا دل کش ہوگا۔ اب یہی صورت میرے ساتھ تھی، ہم پلیٹ فارم کے آخری سرے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر بھی لوگ یہاں تک آ جا رہے تھے، انھیں کون روک سکتا تھا کہ اس طرف مت آؤ، اس طرف مت دیکھو، جب وہ اس طرف سے گزرتے تو کورا کی جانب گردن موڑ کے ضرور دیکھتے۔ میں نے تصور تصور میں اُن میں سے بعضوں کی آنکھیں پھوڑ دیں۔

کسی کو کیا خبر تھی کہ بُرقع میں ایک شہزادی بیٹھی ہوئی ہے۔ اگر وہ نقاب اُٹھا دے تو اسٹیشن پر بجلی گر جائے، اور سب کچھ تلپٹ ہو جائے۔ یہ احساس کہ میرے پاس ایک خزانہ موجود ہے، حسن و جمال کا خزانہ، ایک بہت ہی خوب صورت لڑکی۔ یہی احساس مصائب و ابتلا کے وقت میرا سہارا بنا ہوا تھا۔ احتیاطاً میں نے ابا کا ایک تیز دھار والا رام پوری چاقو بھی سامان میں رکھ لیا تھا، یہ چاقو دستے کے اوپری حصے پر لگا ہوا پیتل کا ایک چھوٹا سا کھٹکا دبانے سے کھٹ سے کھل جاتا تھا۔ ابا قربانی کے موقع پر اسے عموماً استعمال کرتے تھے۔ میں نے سوچا یہ چاقو بنچ کی لکڑی میں اپنے اور کورا کے درمیان گاڑ دوں۔ میں اسی طرح کی باتیں سوچتا رہا کیونکہ آنے جانے والوں کی نظریں ناقابلِ برداشت ہوتی تھیں۔ مجھے غصّہ تھا، خوف تھا، غم تھا، مجھ پر متضاد کیفیتیں غالب تھیں۔ اسٹیشن پر سناٹا ہونے لگی، گاڑی کی آمد کا غلغلہ ہوا، مغرب کی طرف سے آنے والی گاڑی کی روشنی ایک ہلکے سے نقطے کی صورت میں اُبھری، یہ نقطہ بتدریج بڑھتا گیا۔ سب لوگ گاڑی کی طرف جھپٹ پڑے، میں بھی سوٹ کیس اُٹھا کے بنچ سے اُٹھا مگر میں نے اتنی وحشت کے بجائے

تمل سے آگے بڑھنے کا ارادہ کیا، مستورات کے ڈبے کے اوپر ایک عورت کی تصویر بنی ہوتی تھی۔ رات کے وقت وہ تصویر روشن ہو جاتی تھی۔ میں نے گاڑی پر ایک سرسری نظر ڈالی، لوگ ڈبوں پر ٹوٹے پڑ رہے تھے، جانے والوں کو بھی جلدی تھی، آنے والوں کو بھی۔ گاڑی وہاں کوئی پندرہ منٹ ٹھیرتی تھی مگر لوگ بہت دیوانگی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ میں نے ویسے بھی سوار ہونے میں تاخیر کی تاکہ بدھ یاتریوں کی رہبری کے لیے آنے والے رضا کار طالب علم اسٹیشن سے نکل جاتیں۔

ہمارے سامنے عورتوں کا کوئی ڈبا نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے کورا کو اشارہ کیا اور تیزی سے انجن کی طرف جانے لگا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے پیچھے ڈبے ڈھونڈتے ہوتے آگے بڑھ رہے تھے اور ہمیں کچھ خبر نہیں تھی کہ قدم کس بے ترتیبی سے پڑ رہے ہیں۔ اچانک کسی نے زور سے میرا بازو پکڑ لیا، میرا دل دھک سے رہ گیا۔ کورا مجھ سے پیچھے تھی۔ وہ وہیں ٹھٹک گئی جہاں کھڑی تھی۔ ایک لمحے میں جیسے ہر طرف اندھیرا چھا گیا مگر دوسرے ہی لمحے میں نے خود کو سنبھالا، وہ میرا کلاس فیلو جگ دیش تھا۔ "کہاں؟" اُس کی آواز مجھے زہر لگی۔

"کہیں نہیں ذرا بردوان تک، دو تین روز میں آجاؤں گا۔" میں نے گڑبڑا کے جواب دیا "تم نے کہیں میرے چھوٹے بھائی کو تو نہیں دیکھا؟"

"نہیں، کیا وہ نہیں مل رہا ہے؟" اُس نے ہمدردی ظاہر کی۔

"شاید ماموں کے ساتھ ہو۔ ممکن ہے ماموں کو کہیں اور جگہ مل گئی ہو۔ میں انھی کو تلاش کر رہا ہوں۔"

اُس نے میری بوکھلاہٹ محسوس کر لی تھی۔ قریب ہی سہمی ہوتی کورا کھڑی تھی۔ "سسٹر؟" اُس نے خوش اخلاقی سے پوچھا۔

"ہاں، اب تم ایسا کرو جگ دیش! ذرا گاڑی کے اُس سرے تک چلے جاؤ، ممکن ہے، چھوٹا بھائی تمھیں نظر آجاتے۔ میں اِدھر دیکھتا ہوں۔" یہ کہہ کے میں نے اُس کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور آگے بڑھ گیا۔ جگ دیش ڈبوں میں جھانکتا ہوا مجھ سے دُور ہوتا گیا۔ سب سے آگے کے ڈبوں میں عورتوں کا ڈبا بھی لگا ہوا تھا۔ میں نے رُک کر کورا سے کہا کہ وہ کسی سے بات نہ کرے۔ گونگی اور بہری بنی رہے۔ کورا میری نصیحت گرہ میں باندھ کے سر ہلاتی ہوئی ڈبے میں داخل ہوئی خوش قسمتی سے جگہ کم نہیں تھی، میرے اندازے کے مطابق اُن میں مسلمان عورتیں بھی موجود تھیں، میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ کورا کے پہنچنے پر سبھی نے منہ بنایا کیونکہ وہ اُن کی نیند میں خلل کا سبب بنی تھی۔

میں نے عورتوں کے برابر کے ڈبے میں داخل ہونے کی کوشش کی مگر مسافروں نے مجھے اندر داخل نہیں ہونے دیا۔ میں چیختا چلاتا رہا۔ انھوں نے سامان ہی دروازے کے نزدیک رکھ دیا تھا تاکہ دروازہ آسانی سے نہ کھل سکے۔ "جگہ نہیں ہے کوئی اور ڈبا دیکھو۔" ایک گرج دار آواز آئی۔

"جناب! میں کھڑا ہو کے سفر کر لوں گا۔" میں نے التجا کی۔

"دوسرا ڈبا دیکھو میاں!" ایک مولوی صاحب نے کہا۔

"جناب! مجھے بس ذرا سی جگہ چاہیے۔ میں اگلے اسٹیشن پر اُتر جاؤں گا۔ گاڑی چلنے والی ہے میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے آرام میں مخل نہیں ہوں گا۔"

"میاں! آپ سے کہہ رہا ہوں، یہاں بالکل جگہ نہیں ہے۔"

"مولوی صاحب! کچھ تو انسانی ہمدردی کیجیے۔" میں نے عاجزی سے کہا۔

"کہاں اُترنا ہے بالک؟" ایک نسبتہً نرم آواز نے پکارا۔

"جناب اجانا تو دُور ہے مگر میں اگلے اسٹیشن پر اُتر جاؤں گا۔"

ڈبے میں بھن بھناہٹ ہوئی۔ مسافر کسمسانے لگے۔ ایک صاحب نے سامان ہٹایا، دوسرے نے دروازہ کھولا، تیسرا اوپر کی برتھ پر لیٹے لیٹے حکومت کو بُرا بھلا کہنے لگا۔ مولوی صاحب بھی بڑبڑا رہے تھے۔ ذرا سا دروازہ کھلا تو میں تیر کی طرح اندر داخل ہو گیا۔ ڈبے میں اتنے زیادہ مسافر نہیں تھے مگر ایک برتھ پر دو دو آدمی سو رہے تھے، کچھ نے فرش پر چادر بچھائی ہوئی تھی، میں بیت الخلا کے نزدیک کھڑا ہو گیا۔

"صاحب زادے! کیا تنہا سفر کر رہے ہو؟" مولوی صاحب نے پوچھا۔

"نہیں، ساتھ میں بھی ہیں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"ہیں، وہ کہاں ہیں؟" انھوں نے تشویش سے کہا۔

"ساتھ والے ڈبے میں۔"

مولوی صاحب نے کچھ سوچ کر کہا، "اچھا۔ میاں! مسافروں کا حال عجیب ہے، سب ایک ہی ڈبے پر پل پڑتے ہیں، جگہ تلاش نہیں کرتے، بے آرام رہتے ہیں اور بے آرام کرتے ہیں۔"

میں سہما اور دبکا کھڑا رہا، اسی اثنا میں کسی نے مجھے آواز دی۔ میرا دل زور سے دھڑکا۔ وہ جگ دیش ہی تھا۔ کم بخت پیچھے پڑ گیا تھا۔

"بابر؟" اُس نے کھڑکی کے اندر جھانک کے آواز لگائی۔

میں نے جواب دینے سے گریز کیا مگر اُس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ "میں آگیا ہوں۔" میں نے بے بسی سے کہا۔

"چھوٹا مل گیا؟" اُس نے تیزی سے پوچھا۔

"ہاں، دونوں مل گئے۔ پچھلے ڈبوں میں ہیں۔"

"یار! کھڑے کیوں ہو؟ ٹرنک پر بیٹھ جاؤ۔" اُس نے ڈھٹائی سے کہا۔

"ٹرنک میرا نہیں ہے۔"

"تو کیا ہوا، اِس طرح کب تک کھڑے رہو گے، کن جناب کا ہے یہ صندوق؟" ڈبے کے ہر شخص نے اُس کا سوال سُنا۔

سب دم سادھے بیٹھے رہے۔ جگ دیش کی یہ مداخلت مجھے بہت بُری لگی۔ بڑی مشکل سے تو جگہ حاصل کی تھی، وہ مسافروں کو ناراض کیے دے رہا تھا۔ "بیٹھ جاؤں گا جگ دیش! سفر ہی کتنا ہے۔"

انجن کی تیز سیٹی کے ساتھ ساتھ گاڑی کے پہیے چرمرائے۔ جگ دیش ڈبے سے چپکا ہوا کچھ دُور تک دوڑا پھر دعا سلام کرتا ہوا رخصت ہو گیا۔ میں نے ٹھنڈی سانس لی یقین نہیں آیا کہ گاڑی گیا شہر سے روانہ ہو چکی ہے۔ وہ جب [illegible] شینوں سے دُور آگے بڑھی اور کہ [illegible] سے گزری تو کلیجے میں ہُوک سی اُٹھی۔ جی چاہا کہ زنجیر کھینچ کے گاڑی سے اُتر جاؤں۔ بے اختیار گھر یاد آ گیا، سب کے چہرے نظروں میں گھوم گئے، ابا جاگ گئے ہوں گے اور اُنھوں نے بستر پر مجھے نہیں دیکھا ہوگا تو اُن کا کیا حال ہوا ہوگا؟ پھر اُنھوں نے امی کو جگایا ہوگا۔ امی کا دل دھک سے رہ گیا ہوگا وہ زار و قطار رونے لگی ہوں گی۔ ابا نے دروازہ کھلا دیکھا ہوگا تو ساری بات سمجھ گئے ہوں گے پھر اُنھوں نے چھت پر جا کے کورا کی موجودگی کی تصدیق کی ہوگی، وہ کیسے پریشان ہوں گے، نیچے اُتر کے سامان دیکھیں گے، اپنی جیبیں اور نقدی دیکھیں گے اور سر پر ہاتھ رکھ کے بیٹھ جائیں گے، پھر اماں انھیں دوڑائیں گی، ابا اسٹیشن تک آئیں گے، اُس وقت تک گاڑی گیا سے بہت دُور آ چکی ہوگی۔

♥

گاڑی نے رفتار پکڑی اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اندر آتے تو سبھی دوبارہ اونگھنے لگے۔ میں کمپارٹمنٹ کی دیوار سے لگا کچھ دیر کھڑا رہا اور اپنے زاویے بدلتا رہا۔ درمیان میں مولوی صاحب کی آنکھ کھلی تو اُنھوں نے مجھے دیکھا "بیٹھ جاؤ میاں! کھڑے کیوں ہو؟ اب آ ہی گئے ہو تو آرام سے بیٹھو۔"

"شکریہ جناب! میں ٹھیک ہوں۔"

"بیٹھ جاؤ۔ وہاں تکلیف ہے تو اِدھر آ جاؤ۔" مولوی صاحب نے حکم دیا۔

میں نے ٹرنک پر بیٹھ کے دیوار سے سر ٹکا دیا۔ نیند آنے کا کوئی سوال نہیں تھا، یہ بیداری کی بھی سب سے آگے والی کیفیت تھی۔ صرف ایک دیوار کا فاصلہ تھا، اُدھر کورا موجود تھی۔ اُس کا خیال میرے ذہن سے چمٹا ہوا تھا۔ نہ جانے وہ کیا سوچ رہی ہو؟ گھبرا تو نہیں گئی ہوگی؟ اُس کی طبیعت تو ٹھیک ہوگی؟ کاش میں اُس کے پاس ہی بیٹھ سکتا تاکہ اُسے تسلی دیتا رہتا، سُنا تھا، کلکتہ دن کے ساڑھے دس گیارہ بجے آتا ہے، یہ وقت انتہائی مناسب تھا مگر میں کلکتے میں کہاں جاؤں گا؟ کہاں ٹھیروں گا اور لوگ میرے اور کورا کے بارے میں پوچھیں گے تو انھیں کیا بتاؤں گا، ہنگامی کے بجرت طرح طرح ستاتے رہے، کبھی حوصلہ، کبھی خوف، کبھی آنے والے دنوں میں کورا کے ساتھ رہنے کی سرشاری، کبھی وسوسے اندیشے لیکن میں اپنی جگہ جما بیٹھا رہا، مولوی صاحب کو جھونکنے کی عادت تھی، ہر پانچ منٹ بعد اُن کی آنکھ کھل جاتی تھی اور وہ انگڑائی لے کے میری خیریت دریافت کر لیتے تھے۔ کچھ دُور آگے اندھیرا مرنے لگا اور ہر طرف ایک مٹیالی روشنی پھیلنے لگی اور لمحہ بہ لمحہ اُجلی ہوتی گئی۔ ڈبے کے بہت سے مسافر جاگ پڑے، گھٹے ہوتے سر والا ایک ہندو سب سے پہلے جاگا۔ مجھے اندر آنے کی اجازت اُسی نے دی تھی۔ پھر مولوی صاحب آیتیں پڑھتے ہوتے اُٹھے، وضو کرنے کے بعد جیسے ہی اُنھوں نے مصلا اُٹھایا، لوگوں نے جگہ چھوڑ دی، اُنھوں نے نماز جلدی ہی ختم کر لی، پھر ڈبے کے سبھی لوگ چہچہانے لگے اور اُنھوں نے میری شکل دیکھی۔ میری شکل پر کچھ ایسی ہی علامتیں ہوں گی کہ اُن کی توجہ میری جانب مبذول ہوگئی۔ ایک صاحب نے کھسک کر مجھے باقاعدہ سیٹ پر بٹھا لیا۔ "ماشاءاللہ میاں کسی اچھے خاندان سے تعلق معلوم ہوتا ہے۔" مولوی صاحب نے میرا چہرہ اور لباس دیکھتے ہوتے رائے دی۔

"کچھ پڑھتے ہیں آپ؟"

"بی اے کے پہلے سال میں ہوں۔" میں نے جھوٹ بولا۔

"ماشاءاللہ، ماشاءاللہ۔"

"یہ بی اے کی عمر نہیں ہے۔" ایک صاحب نے کہا "بہت خوب۔ آپ کی آنکھوں پر چشمہ ہونا چاہیے تھا۔"

"کیوں؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"بھئی حد سے زیادہ پڑھنے والے تمام بچوں کی آنکھوں پہ چشمہ ہی لگا رہتا ہے۔" ڈبے میں سب ہنسنے لگے۔ میں نے بھی مسکرا کے اُن میں شامل ہونے کی کوشش کی۔ رفتہ رفتہ ماحول کی اجنبیت ختم ہو گئی۔ مولوی صاحب نے مجھے اپنے قریب بٹھا لیا تھا۔ اُنھوں نے میرا نام پوچھا تو میں نے اپنے نام کا دوسرا لفظ بتایا، زبان۔ وہ مجھ سے میرے خاندان اور والد صاحب وغیرہ کے متعلق سوالات کرتے رہے اور میں انھیں کچھ سچ کچھ جھوٹ بتاتا رہا۔ گاڑی ایک اسٹیشن پر رُکی تو میں نے اُن سب کا شکریہ ادا کیا۔

"تمھیں تو آگے جانا ہے۔" مولوی صاحب نے نکتہ چینی کی۔

"مگر میں نے آپ سے اسی اسٹیشن تک بیٹھنے کی اجازت لی تھی۔ اب میں کوئی دوسرا ڈبا ڈھونڈ لوں گا۔" مولوی صاحب کے ساتھ تمام مسافروں نے بیک زبان مجھے اپنے ساتھ بٹھانے پر اصرار کیا، مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے اُن سے وعدہ کیا کہ میں ضرور اسی ڈبے میں آؤں گا، ذرا زنانے میں خیریت دریافت کر لوں۔ وہاں سے اُتر کے میں برابر کے ڈبے کی کھڑکیوں پر جھپٹا۔ اندر جو عورتیں بیٹھی تھیں، اُن کے مردوں نے کھڑکیاں گھیر لی تھیں۔ کورا نے مجھے دیکھا تو بے تاب ہو گئی۔ اُس نے نقاب ناک تک پہن رکھی تھی، اُس کی آنکھوں اور پیشانی کے کچھ حصے کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اُس کے پاس ایک اور برقع پوش مسلمان عورت بیٹھی تھی۔ میں نے کھڑکی میں گردن ڈال دی۔ میں کچھ کہنے ہی والا تھا مگر فوراً خیال آگیا لہٰذا میں نے اشارے سے اُس کی خیریت پوچھی۔ اُس نے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے جواب دیا کہ وہ ٹھیک ہے۔ پھر میں نے ہاتھوں سے چائے کی پیالی کی شکل بناتے ہوتے پوچھا کہ وہ چائے پیے گی یا کچھ کھائے گی؟ کورا نے اثبات میں سر ہلایا، اِس موقع پر اُس کے برابر بیٹھی ہوئی عورت بول پڑی۔ "بھیّا! یہ تمھاری بہن ہیں؟" میرے اقرار پر اُس نے کہا "مجھے بہت دکھ ہوتا ہے بڑی صابر بچی ہے۔ ایک

پہلو سے بیٹھی ہوتی ہے۔ ویسے تم بے فکر رہو، میں اس کی دیکھ بھال کرتی رہوں گی۔"

میں نے اس نیک خاتون کا شکریہ ادا کیا اور اسٹال سے دو پیالیاں چائے اور بسکٹوں کی ایک پلیٹ لاکے اُن کے سپرد کر دی۔ کورا نے چائے پینے کے لیے نقاب ہٹائی تو ڈبے میں جیسے چکا چوند ہو گئی۔ جو مرد اِدھر اُدھر برتھوں پر کھڑے تھے، وہ مبہوت رہ گئے، ناچار کورا کو اپنا رُخ بدلنا پڑا۔ بُرقع والی دوسری عورت نے اُس کی دیوار بننے میں تعاون کیا۔ جب تک گاڑی نہیں چلی، میں پلیٹ فارم پر کھڑا رہا، پھر واپس اپنے ڈبے میں آ گیا۔ مولوی صاحب نے اپنا ناشتے دان کھول لیا تھا۔ جبراً انھوں نے مجھے بھی شریک کر لیا اور میں ہر اسٹیشن پر اُتر کے کورا کی خیریت دریافت کرتا رہا۔ کلکتہ آنے تک مولوی صاحب سے بہت سی باتیں ہو چکی تھیں۔ اُن کی عمر زیادہ نہیں تھی، یہی کوئی پینتالیس سال کے ہوں گے۔ اُن کے چہرے پر تراشی ہوئی داڑھی تھی، اُن کی آنکھیں چمکیلی اور تیز تھیں، پیشانی اور چہرے کا رنگ کھلتا ہوا تھا، قد بھی مناسب تھا۔ کھلے ہوئے بٹنوں کی شیروانی میں وہ خاصے سلجھے ہوئے، مستعد اور تجربے کار آدمی معلوم ہوتے تھے۔ ڈبے میں ہم دو ہی مسلمان تھے۔ مولوی صاحب کا نام محمد شفیق تھا۔ وہ مراد آباد سے آ رہے تھے اور اُنھی کے قول کے مطابق وہ ایک مدرسے میں درس و تدریس کے لیے کلکتے جا رہے تھے۔ جز وقتی طور پر وہ مراد آبادی برتنوں کی کمیشن ایجنٹی بھی کرتے تھے۔ اُن کے پاس ایک صندوق میں مختلف قسم کے برتنوں کے نمونے رکھے ہوتے تھے، یہ نمونے وہ دُکانوں پر دکھا کے آرڈر لیا کرتے تھے اور آرڈر مراد آباد بھیج دیتے تھے۔ مولوی صاحب بہت شائستہ گفتگو کرتے تھے اور تب و تاب سے رہتے تھے۔ کلکتے تک وہ مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ اُنھوں نے شادی نہیں کی تھی، سیاحت اُن کا مشغلہ تھا۔ وہ سارا ہندوستان دیکھ چکے تھے۔ میں نے اُن سے کلکتے کا پتہ لیا، اِسی بہانے میں نے بازاروں اور محلّوں کے نام بھی معلوم کر لیے۔ اُنھوں نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں کلکتے میں اُن سے ضرور ملاقات کروں گا۔

ہوڑا اسٹیشن پر ظاہر ہے مجھے میرے ماموں جان لینے نہیں آئے۔ مولوی محمد شفیق بھی سخت پریشان ہوتے۔ میں کورا کے ساتھ پلیٹ فارم پر کھڑا رہا۔ ازراہِ ہمدردی مولوی صاحب بھی رُک گئے تھے اور گھور گھور کے کورا کو دیکھ رہے تھے۔ اُس کے ہاتھ دیکھ رہے تھے، پیر دیکھ رہے تھے۔ اُن کے ٹھہر جانے سے میں بھی رُکا رہا ورنہ اب تک میں اسٹیشن سے باہر ہوتا۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن، عجب گو مگو کا عالم تھا۔ میں اپنے خود ساختہ ماموں کا انتظار کر رہا تھا اور مولوی صاحب کو مجھ سے اتنی اُنسیت ہو گئی تھی کہ انھوں نے میرے بغیر اسٹیشن سے باہر جانا ملتوی کر دیا تھا۔ ماموں جان کو بھلا کیوں آنا تھا۔ مولوی صاحب نے پوچھا۔

"میاں! تمھارے پاس اُن کا پتہ بھی ہے؟"

"جناب! اُن کا آنا بالکل یقینی تھا۔ تار تک دے دیا تھا، ایک ہفتے پہلے خط لکھ دیا تھا۔ وہ کولوٹولا اسٹریٹ میں کہیں رہتے ہیں۔ نمبر اور بلڈنگ کا نام وغیرہ تو مجھے یاد نہیں ہے۔"

"مجھے بھی قریب ہی جانا ہے، آؤ وہیں کہیں تلاش کرتے ہیں۔ اب تو اُن کے آنے کی اُمید نہیں ہے۔ آدھ گھنٹے سے زیادہ ہو چکا ہے اور گاڑی پہلے ہی آدھ گھنٹے لیٹ آئی ہے۔ آؤ میاں! اٹھو۔ اگر وہ آج نہ ملیں تو آپ دونوں میرے ساتھ رہیے گا۔ اپنا ٹھکانا بھی بُرا نہیں ہو گا۔"

"شکریہ جناب! آپ کہاں زحمت کریں گے۔ میرا خیال ہے، میں کچھ دیر اور انتظار کر لوں۔ آپ اپنا وقت ضائع نہ کیجیے، مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔"

"تکلیف کا تم نے خوب ذکر کیا۔ تم تو غیریت برتنے لگے، میاں! آدمی آدمی کے کام آتا ہے۔ میں یہاں سے اُس وقت تک نہیں ٹلوں گا جب تک تمھارے ماموں جان قبلہ آ نہیں جائیں گے۔ یہ کلکتہ ہے صاحبزادے! بہت منحوس شہر ہے، یہاں بدذات جنات رہتے ہیں۔ آدمی کھو جاتا ہے تو پتہ نہیں چلتا۔ دیکھ رہے ہو، لوگ کیسے بھاگ رہے ہیں، جدھر دیکھو آدمی ہی آدمی نظر آتا ہے۔"

مولوی صاحب سچ کہتے تھے۔ میں نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ انسان گروہ پسند ہوتا ہے۔ یہاں تو انسانوں سے مجھے وحشت ہونے لگی تھی۔ مجھے حبس سا محسوس ہوا۔ اُدھر مولوی صاحب کو ٹالنا مسئلہ ہو گیا تھا۔ وہ تو دھرنا دے کے ایک بینچ پر بیٹھ گئے تھے۔ میں نے کورا کو بھی اُن کے ساتھ بٹھا دیا۔ وہ میری مجبوری اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ پندرہ منٹ اور گزر گئے۔ میں نے پھر مولوی صاحب سے اصرار کیا کہ وہ ہم لوگوں کی خاطر اپنا وقت برباد نہ کریں مگر وہ نہ مانے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ہم اسٹیشن سے اُن کے ساتھ باہر نکلیں اور کولوٹولا اسٹریٹ میں ماموں جان کو تلاش کریں۔

"ماموں جان کا نام اکبر جہاں ہے۔ وہ اجناس کے بڑے بیوپاری ہیں اور اِسی سلسلے میں انھیں ہندوستان کے مختلف شہروں میں جانا پڑتا ہے۔" یہ باتیں میں نے پہلے ہی مولوی صاحب کو بتا دی تھیں۔ بُری قسمت میں بھی وہی ڈبا لکھا تھا جس میں مولوی صاحب موجود تھے۔ میں نے اُس بُرے وقت کو کوسا۔ ڈرتے ڈرتے دل سے مولوی صاحب کے ہمراہ اسٹیشن سے باہر آیا۔ پہلی نظر میں اس شہر کا کوئی اچھا تاثر ذہن پر مرتب نہیں ہوا۔ اب تک میں نے صرف چھوٹے چھوٹے شہر، قصبات اور دیہات دیکھے تھے، یہ تو دنیا ہی اور تھی۔ میں نے بے بسی سے کورا کی طرف دیکھا۔ مولوی صاحب نے ایک ٹیکسی روک لی تھی۔ "آؤ میاں بیٹھو!" انھوں نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ میں اور کورا ٹیکسی میں قربانی کے بکروں کی طرح پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ مولوی صاحب ڈرائیور کے قریب بیٹھے تھے۔ کچھ سامان ڈِگی میں رکھ دیا گیا تھا اور کچھ ہم نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔

میں سوچتا رہا، مولوی صاحب بے چارے ماموں جان کی تلاش میں کہاں کہاں سر ماریں گے؟ کن کن لوگوں سے پوچھیں گے؟ پھر میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی، میں نے مولوی صاحب سے کہا۔ "جناب! کیوں نہ ہم آپ کی قیام گاہ چلیں، وہاں نہا دھو کر اطمینان سے ماموں جان کی تلاش میں نکلیں گے۔"

"بخدا! میں نے تو پہلے ہی تم سے کہا تھا۔" مولوی صاحب اُچھل پڑے۔ "مکان تو نہیں، البتہ ایک کمرے کا انتظام ضرور اُن لوگوں نے کیا ہو گا، جیسے تیسے گزر کر لیں گے۔ مجھے تو تمھارے ماموں جان کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ پتہ نہیں کیا حادثہ ہوا؟ خدا خیر کرے۔ انھیں تمھارا تار اور خط مل جانا چاہیے تھا۔" میں خاموش رہا اور شیشے سے کلکتے کا نظارہ کرنے لگا۔ عمارتیں ہی عمارتیں، سواریاں، ٹرامیں، بسیں، ہاتھ گاڑیاں، ہر جگہ انسان، دُکانیں، ہوٹل، بڑے بڑے بورڈ، نیلے پیلے، کالے، ہرے، سفید، سُرخ رنگوں کا شہر۔ مولوی صاحب کے اشارے پر ٹیکسی ایک بڑی مسجد کے قریب ٹھہر گئی۔ مسجد سے ملحق عمارت میں مدرسہ تھا، مدرسہ بند تھا۔ ٹیکسی ٹھہرا کے مولوی صاحب اندر خبر کرنے چلے گئے۔ میں نے سوچا، یہیں سے فرار ہو جاؤں مگر مولوی صاحب کا سامان بھی ٹیکسی میں رکھا تھا، اُسے کہاں چھوڑتا اور ٹیکسی والے سے کیا عذر پیش کرتا۔ مولوی صاحب جلد ہی واپس آ گئے۔ اُن کے ساتھ ایک اور دراز ریش بزرگ تھے۔ اُنھوں نے سامان اُتروانے میں مدد کی۔ کرایہ بھی انھی صاحب نے ادا کیا۔ پھر ہمیں ایک ایسے کمرے میں پہنچا دیا گیا جس میں ایک موکھلا اور دروازہ تھا۔ کمرے میں صرف ایک چارپائی تھی۔ سیلن تھی اور اندھیرا تھا لیکن کمرے کے باہر چھوٹا سا صحن بھی تھا۔ ایک طرف باورچی خانہ اور غسل خانہ تھا۔ روشنی ہونے پر کمرہ کچھ ایسا بُرا معلوم نہیں ہوا۔ "میں باہر چلا جاتا ہوں۔" مولوی صاحب نے چارپائی پر بستر بچھا کے کہا۔ "عزیزہ سے کہو کہ اطمینان سے بیٹھیں، بُرقع اُتار دیں، چاہیں تو غسل کر لیں، ہم لوگ کھانے کا انتظام کرتے ہیں۔ جس چیز کی ضرورت ہو، صابن، تولیا، لوٹا، وہ سب میرے سامان میں موجود ہے۔"

اصولاً مجھے اتنے مہربان آدمی کے سامنے کورا کا پردہ اُتروا دینا چاہیے تھا مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں مولوی صاحب کے ساتھ کھانا لینے کے لیے روانہ ہو گیا، یہ جگہ محفوظ تھی۔ میں نے ارادہ کیا کہ مولوی صاحب کو صاف صاف بتا دوں مگر ہمت نہیں پڑی، اتنے افسانے تراشے تھے کہ اب حقیقت بیان کرتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ یہ مسلمانوں کا محلہ تھا۔ مولوی صاحب نے خاصا پُرتکلف کھانا خریدا۔ کورا کو ان کھانوں کی عادت نہیں تھی۔ میں نے ساتھ میں اُس کے لیے ماش کی دال بھی لے لی۔

جب ہم کھنکار کے اندر داخل ہوئے تو صحن میں ایک اور چارپائی رکھی جا چکی تھی۔ مولوی صاحب صحن میں بیٹھ گئے، میں کورا کے لیے کھانا لے کے اندر چلا گیا۔ اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ میری بہن فہمیدہ کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ میں اُسے تکتا رہ گیا۔ اِس لباس میں تو وہ کوئی حور معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے اُس کے سامنے کھانا رکھ دیا اور خود مولوی صاحب کے ہمراہ کھانے کے لیے صحن میں آ گیا۔ مولوی صاحب بہ ضد ہوتے کہ میں اپنی بہن کے ساتھ ہی کھانا کھاؤں۔ جی تو میرا بھی یہی چاہتا تھا مگر میں نے دل پہ پتھر رکھ لیا۔ کورا کو دیکھ کے سفر کی ساری تکان دور ہو گئی تھی۔ اتنے قریب تو وہ گھر میں بھی کبھی نہیں ہوئی تھی۔ صحن سے میری نظریں اندر کمرے ہی کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ کورا کو مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلانے کی آرزو تھی۔ مولوی صاحب تھوڑی دیر کے لیے مدرسے کے دفتر میں چلے گئے تو مجھے آزادی نصیب ہوئی۔ میں نے دروازے کی کُنڈی بند کی اور اندر کمرے میں گھس گیا۔ کورا چارپائی پر اُداس بیٹھی تھی۔ نہ جانے کیوں میرے قدم لرزنے لگے۔ اِس خیال سے میرا بُرا حال ہو گیا کہ وہ اور میں کمرے میں تنہا ہیں، میں دُور ہی کھڑا رہا۔ کورا بھی کھڑی ہو گئی۔ اُس نے نظریں اُٹھائیں، نظریں جھکائیں، اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے، میرے دل میں بھی درد اٹھا لیکن میں نے اپنے آنسو روک لیے۔ "غم مت کرو کورا!" یہ مشکل تمام میرے منہ سے نکلا۔ "غم مت کرو، اس اجنبی جگہ چند دن پریشانی رہے گی۔ میری جیب میں ابھی روپے ہیں۔ کچھ دن تو ویسے بھی اچھے گزر جائیں گے۔"

"مگر اب ہم جائیں گے کہاں؟" وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

"یہ تو مجھے خود نہیں معلوم۔ یہ شہر تو بہت خراب ہے، ہمارا اِس جگہ گزارا نہیں ہو گا۔" پھر مجھے خیال آیا کہ میں خود ہی حوصلہ شکنی کی باتیں کر رہا ہوں۔ مجھے تو اس کی ڈھارس بندھانی چاہیے۔ میں اُس کے اور قریب ہو کے چارپائی پہ بیٹھ گیا۔ وہ ابھی تک کھڑی ہوئی تھی۔ کمرے میں اُس کی وجہ سے ایک تازگی اور روشنی معلوم ہوتی تھی۔ ایک نامعلوم خوشبو سی ہر طرف بسی ہوئی تھی۔

"بیٹھ جاؤ کورا!" میں نے اپنی آواز پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ وہ بھی چارپائی پہ بیٹھ گئی۔ "مولوی صاحب ابھی آتے ہوں گے، تم اُن کے سامنے پردہ کرتی رہنا اور مجھ سے کم ہی بولنا۔ ابھی ہم شاید باہر جائیں اور ماموں جان کی تلاش میں ناکام ہو کے واپس آ جائیں۔ ہم مولوی صاحب سے زیادہ دیر جھوٹ نہیں بول سکتے۔ اگر انھوں نے کہیں تمھاری شکل دیکھ لی تو وہ یقیناً شک میں پڑ جائیں گے، چنانچہ ہمیں یہاں سے بھی چلنا ہو گا۔"

"مگر کہاں؟" وہ سراسیمگی سے بولی۔

"کہیں بھی۔" میں نے تذبذب سے کہا۔

"بابر! میرا زیادہ گھومنا ٹھیک نہیں ہے۔" وہ شکستہ لہجے میں بولی۔ "وہ میرے پیچھے پڑے ہوتے ہیں، اُنھوں نے میرا پتہ چلا لیا تو مصیبت آ جائے گی۔ اگر ہمیں مکان نہیں ملا اور تم کسی کام پہ نہ لگ سکے تو ہمارا کیا ہو گا؟ سب پیسے ختم ہو جائیں گے۔"

"ہو جانے دو۔ خدا سے اُمید رکھو۔ میں نہیں سمجھتا کہ ہم نے گھر سے بھاگ کر کوئی بُرا کام کیا ہے۔ میں اپنے ماں باپ کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔"

"بابر! مولوی صاحب سے سب کچھ کہہ دو۔ شاید وہ ہماری مدد کریں۔"

"اور اگر وہ خود گھبرا گئے تو کیا ہو گا؟"

کورا کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا، آنسو تھے۔ آنسو بہتے

رہے ہے۔ وہ آنسو تھے یا آگ کے قطرے جو میرے دل و دماغ پر گر رہے تھے کاش میں چند سال پہلے پیدا ہو گیا ہوتا۔ میں خود کو بہت کمزور محسوس کرنے لگا۔ کورا تو میرے پیروں میں لرزش پیدا کیے دے رہی تھی۔ اس اجنبی شہر میں کسی سے مکان اور کام کی بات کرنا بھی آسان نہیں تھا۔ کسی کی مدد کے بغیر راستے بھی تلاش نہیں کیے جا سکتے تھے۔ کورا کو کسی محفوظ جگہ ٹھیرا کے ہی میں مکان اور کام تلاش کر سکتا تھا۔ انسانوں کے ساتھ انسانوں کی اتنی شدید ضرورت ہوتی ہے، پہلے کبھی اس کا احساس نہیں ہوا تھا۔ اب تک آرام کی کھاتی تھی، نہ صبح کی فکر، نہ شام کی، کھانا خراب ہوتا تو میں پلیٹ پھینک دیا کرتا تھا۔ اپنی انھی سرکشیوں کی وجہ سے میں گھر میں جل ککڑا مشہور تھا۔ سارے کس بل ایک ہی دن میں نکلے جا رہے تھے۔ ہم نے غلط شہر کا انتخاب کیا تھا مگر ہم کسی بھی شہر میں جاتے، یہی صورت پیش آتی۔ کورا کو ساتھ لے کے سڑکوں پر گھومنے میں خدشے ہی خدشے تھے، کورا کو کسی الماری میں بھی بند نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ کوئی مکان نہیں تھی جسے مقفل کر دیا جاتا۔ وہ نقدی نہیں تھی کہ اُسے جیب میں رکھا جا سکتا۔ کورا تو ایک لڑکی تھی، ایک ہیرا۔ سو سو کے نوٹوں کے پہاڑ بنا دیے جاتے تب بھی کورا کی قدر و قیمت زیادہ ہوتی۔ بہت سی باتیں سمجھ میں آنے لگیں، ہر چیز بدلی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ جب اُس کی آنکھیں رونے سے باز نہیں آئیں تو میں تلملا کے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ "روؤ نہیں کورا! خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ۔" لیکن مجھے خود بھی رونا آ گیا۔

فی الحال بس ایک راستہ نظر آتا تھا کہ ہم کسی ہوٹل کا رُخ کریں۔ ہوٹل مسافروں کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ میں نے اسٹیشن سے آتے ہوئے راستے میں بہت سے ہوٹلوں کے بورڈ دیکھے تھے، انھی میں سے کسی معقول مسلم ہوٹل میں ٹھیر جائیں گے، وہاں کوئی بہانہ بنا دیں گے کہ ہم اپنے ایک ناراض بھائی کو منانے کے لیے آئے ہیں۔ جس کے متعلق سُنا ہے کہ وہ کلکتے آ گیا ہے۔ وہ ہوٹل اچھا ثابت نہ ہوا تو دوسرے ہوٹل میں مقیم ہو جائیں گے۔ جیب میں روپے کافی ہیں۔ شاید آئندہ دنوں میں جینے کا کوئی آسرا پیدا ہو جائے۔ میں خاکے بناتا اور بگاڑتا رہا۔ ذہن میں طغیانی آئی ہوئی تھی۔ جو ترکیب نظر آتی تھی، اُس کے ساتھ کوئی نہ کوئی اندیشہ بھی ضرور لگا ہوتا تھا۔ سارے مسئلے حل ہو جاتے اگر مولوی صاحب کی داڑھی جیسی داڑھی میرے چہرے پر بھی موجود ہوتی۔

کورا کے گلے میں چھپا ہوا دھانی دوپٹا پڑا ہوا تھا۔ یہ دوپٹا اُسے اتی نے دیا تھا۔ کورا نے فہمیدہ کی طرح اُسے سر پہ اوڑھ لیا تھا۔ میں اُس کا حسین سر اپنے سینے سے لگا کے اُسے تسلی دینے کا ارادہ کرتا تھا مگر سوچ جاتا تھا۔ میرے ہاتھ آگے نہیں بڑھ سکے۔ میں سوچتا ہی رہا، اسی اثنا میں دروازے پر کھٹکا ہوا۔ شاید مولوی صاحب آ گئے تھے۔ میں اُٹھ کے باہر گیا۔ مولوی صاحب ہی تھے۔ آتے ہی کہنے لگے۔ "میں نے دفتر والوں سے کہہ دیا ہے کہ میرے عزیز ساتھ ہیں۔ فرض کرو، اگر تمھارے ماموں جان نہ ملے تو تم کہاں جاؤ گے؟"

"ہم کہیں بھی چلے جائیں گے۔" میں نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

"نہیں بھئی۔" وہ خفا ہو کے بولے۔ "میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر دفتر والوں کو آگاہ کر دینا ضروری تھا۔ کہو، تم نے کمر لگائی یا نہیں؟ اور عزیزہ کا کیا حال ہے؟"

"ٹھیک ہے، آپ کا بہت شکریہ ادا کر رہی تھیں۔ آپ نہ ملتے تو ہمارا نہ جانے کیا حال ہوتا۔ مجھے یہ شہر کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔"

"اچھا، میاں! اتفاق نامراد شہر ہے لیکن سیر و سیاحت کے لیے بُرا نہیں ہے۔" وہ اس طرح پیش آ رہے تھے جیسے ہم اُن کے آبائی مکان میں مہمان ہوں۔ کچھ دیر وہ کلکتے کے بارے میں معلومات کے دریا بہاتے رہے۔ جو باتیں اُنھوں نے پہلے کہی تھیں، انھیں دہراتے رہے اور اپنے دور دراز کے سفر کے واقعات سُناتے رہے۔ میرا خیال ہے، اُن کی زندگی میں ایسا کوئی واقعہ اب تک پیش نہیں آیا ہوگا کہ اُن کی ملاقات ایک سولہ سترہ سال کے لڑکے سے ہوئی ہو جو ایک تیرہ سالہ غیر مسلم لڑکی کو لے کے گھر سے نکل پڑا ہو اور لڑکی بھی کون؟ تبت کے ایک سردار کی لڑکی جو جائز طور پر اپنے قبیلے کے تخت کی وارث تھی اور قبیلے کے موجودہ غاصب سردار کو بُری طرح مطلوب تھی اور اُس نے اُسے ختم کرنے کے لیے ہندوستان بھر میں اپنے آدمی پھیلا دیے تھے جو کتوں کی طرح اُس کی بو سونگھ رہے تھے اور اس لڑکی کے لیے تبت کے ایک ذہین شخص کا قتل ہو چکا تھا۔ اگر وہ موقع پر بھاگ کے ہمارے گھر میں پناہ نہ لے لیتی تو نہ جانے اُس کا کیا حشر ہوتا۔ مولوی صاحب کو کیا معلوم تھا اُن کے ساتھ کون ستم رسیدہ لوگ ہیں۔ میرے ابا تیار نہیں ہوتے، ایک گڑیا سی لڑکی کو گھر میں رکھنے کے لیے ابا تیار نہیں ہوئے تو غیروں سے کیا اُمید تھی۔ مجھے اُن کے جلے کٹے جملے یاد تھے۔ وہ لوگ ذرا سا حوصلہ رکھتے تو آج یہ نوبت نہ آتی۔ مولوی صاحب نے بہت سے پھول دیکھے ہوں گے، بڑی عالی شان عمارتیں، باغات، عجائب گھر، نوادر مگر انھوں نے کورا جیسی لڑکی نہیں دیکھی ہوگی۔

میں توقع کر رہا تھا کہ ابھی وہ مجھ سے کہیں گے کہ چلو ماموں جان کی تلاش میں نکلیں، شاید مولوی صاحب کو باتوں میں خیال نہیں رہا تھا یا میں انھیں اس قدر پسند آ گیا تھا کہ وہ مجھے کچھ دیر اور ساتھ رکھنے کے لیے دانستہ ماموں کا ذکر نہیں کر رہے تھے۔ میں اُن کی طویل گفتگو حیرت اور اشتیاق سے سنتا رہا۔ پھر انھیں اچانک خیال آیا "ارے وہ بے چاری اندر کیا سوچ رہی ہوں گی؟ تم اُن کے پاس جا کے بیٹھو۔ میں ادھر کمر سیدھی کرتا ہوں۔" پھر کہنے لگے۔ "مگر تمھارا دل اپنے ماموں سے ملنے کے لیے بے چین ہوگا۔ چلو کورٹولا اسٹریٹ چلتے ہیں۔ اپنی بہن سے کہہ دو کہ وہ اطمینان سے آرام کریں، کسی قسم کی فکر نہ کریں۔"

"آپ پہلے آرام کر لیجیے۔ بعد میں ماموں جان کی تلاش میں نکلیں گے۔" میں نے سعادت مندی سے کہا۔

وہ ایک لمحے کے لیے میرے مشورے پر چونکے ضرور مگر پھر مسکرانے لگے۔ "نہ، میاں! تم سے جدا ہونے کو جی نہیں چاہتا۔ سوچتا ہوں، ماموں

مل جائیں گے تو تم چلے جاؤ گے، تم سے بڑی انسیت ہو گئی ہے۔"

"ہم آپ کو بھی وہیں لے چلیں گے۔" میں نے تیزی سے جواب دیا۔

"اپنی زندگی تو تنہا گزری ہے۔" وہ مغموم آواز میں کہنے لگے۔ "تھوڑی سی اور رہ گئی ہے وہ بھی کٹ جائے گی۔"

"آپ کا کوئی نہیں ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

وہ گہری سانس لے کے بولے۔ "ہاں یہی سمجھو کہ کوئی نہیں ہے۔"

"گھر، والدہ، والد، بہن وغیرہ؟" میں نے پوچھا۔

"صرف ایک بہن ہے، اُس سے بھی ملے ہوئے عرصہ ہو گیا ہے۔" وہ اداسی سے بولے۔ "سب مر کھپ گئے، جو زندہ تھے، وہ بھی اپنے لیے مر گئے۔ تم سناؤ، کتنے بہن بھائی ہو؟"

"میں۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "ہم تو دو بہن بھائی ہیں۔ ایک میں، ایک یہ فہمیدہ، ماں باپ مر گئے، چچا کے ساتھ رہتے ہیں۔"

"گویا تم بھی میری طرح...." وہ کہتے کہتے سانسیں لینے لگے۔ وہ میرے بارے میں کچھ اور پوچھتے مگر میں نے کورا کا بہانہ کیا کہ شاید اُس نے مجھے آواز دی ہے۔ میں تیزی سے اندر گیا۔ کورا دروازے سے لگی ہوئی ہماری باتیں سن رہی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ "اس کمرے میں تمھارا دم گھٹ رہا ہوگا؟"

"نہیں۔" اُس نے پہلی بار مسکرانے کی کوشش کی۔

"بس تھوڑی سی تکلیف اور ہے، ابھی میں اور مولوی صاحب شاید باہر جائیں۔ تم سونے کی کوشش کرنا، رات بھر جاگتی رہی ہو۔ سمجھیں؟ سوؤ گی نہیں تو مجھے دُکھ ہوگا۔"

"اور تم....؟" وہ کہنا چاہتی تھی کہ تم بھی تو نہیں سوئے ہو، میری نیند تو اُسی دن سے اُڑ گئی تھی جس دن میں نے اُسے دیکھا تھا۔

"میں تمھاری خاطر برسوں جاگ سکتا ہوں۔"

"میری خاطر تم کیا کیا کرو گے؟" وہ تھرتھراتی ہوئی آواز میں بولی۔

"پتہ نہیں۔" میں مختصر جواب دے کے باہر آ گیا۔

کورا کو اندر سے دروازہ بند کرنے کی تاکید کر کے میں اور مولوی صاحب باہر نکلے اور ہاتھ سے چلانے والے رکشا میں بیٹھ کر کورٹولا اسٹریٹ پہنچ گئے۔ یہاں مولوی صاحب کے کئی شناسا مسلمان دکان دار تھے۔ اُن سے اجناس کی تھوک خرید و فروخت کے لوگوں کا پتہ پوچھتے ہوئے وہ ادھر اُدھر سر مارتے رہے۔ دو چار ہی مسلمان یہ کام کرتے تھے اور اُن میں سے کوئی میرے ماموں اکبر جہاں خاں کو نہیں جانتا تھا۔ جب وہ سنجیدگی سے پوچھتے اور بار بار لوگوں سے میری زبانی اُن کا حلیہ بیان کرواتے تو مجھے بڑی وحشت ہوتی۔ جیسے جیسے ہم مایوس ہوتے گئے، مولوی صاحب مجھ پر خفا ہوتے رہے کہ میں نے بلڈنگ کا نام اور پتہ یاد کیوں نہیں رکھا۔ "میں بی اے میں پڑھتا ہوں یا گھاس کھودتا ہوں کہ اتنی اہم بات کا مجھے ہوش نہیں رہا ہو۔ کیا کلکتے آ کے تم نے کوئی قصبہ سمجھ لیا تھا میاں؟"

ہم کورٹولا اسٹریٹ اور اُس سے ملحق تمام علاقے میں ماموں جان کا سُراغ لگاتے لگاتے تھک گئے۔ مولوی صاحب کی حیرت لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک جگہ سے ناکام ہو کے وہ دوسری جگہ جاتے، دوسری سے تیسری جگہ، اسی تگ و دو میں شام ہو گئی اور ہم تھک ہار کے گھر واپس آ گئے۔ "اب کیا ہوگا؟" میں نے سراسیمہ ہو کے پوچھا۔

"اب کیا ہوگا؟ تم یہیں ٹھیرو گے؟ فوراً اپنے گھر ٹیلی گرام دو کہ وہ تمھیں ماموں جان کا صحیح پتہ لکھیں۔ مجھے تو یہ اندیشہ ہے کہ تم نے کورٹولا اسٹریٹ ہی غلط یاد رکھا ہے۔ کوئی اور علاقہ ہوگا۔"

گھر تار دیں۔ گویا والد صاحب کو اطلاع دیں کہ بخیر و عافیت یہاں آ گئے ہیں۔ آپ کی خیریت نیک مطلوب ہے۔ دیگر احوال یہ ہے کہ.... میں نے فوراً حامی بھر لی اور مولوی صاحب کی تجویز کی تائید میں سر ہلانے لگا۔

"گھر کا پتہ بھی یاد ہے؟" مولوی صاحب نے ہنس کر کہا۔

"جی۔ جی ہاں، خوب یاد ہے۔" میں نے گھبرا کے جواب دیا۔

چلتے چلتے اور بولتے بولتے مولوی صاحب اتنے تھک گئے تھے کہ غنودہ ہونے لگے اور اُن کی آنکھ لگ گئی لیکن وہ پندرہ بیس منٹ بعد ہی جاگ گئے۔ انھیں فوراً چائے کی طلب ہوتی۔ مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔ رات ہوتی تو دل کچھ اور ڈوبنے لگا۔ اندر کورا بھی خاموش بیٹھی تھی۔ کھانا کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ مولوی صاحب مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ انھیں بھی کچھ چُپ لگ گئی تھی۔ اُن کی یہ خاموشی مجھے زہر لگی، کھانا کھا کے اُنھوں نے مجھے حکم دیا کہ میں اپنی بہن کو دروازے پہ کھڑا کر دوں، وہ کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں انکار کر ہی نہیں سکتا تھا۔ میں نے اندر جا کے کورا کو بتایا کہ وہ صرف 'جی' اور 'نہیں' اور 'شکریہ' کے سوا کچھ نہ بولے ورنہ مولوی صاحب اُس کے لہجے سے کھٹک جائیں گے۔ کورا دروازے پر آئی۔ مولوی صاحب نے نستعلیق انداز میں اُسے ماموں جان کے نہ ملنے کی تمام تفصیل سے آگاہ کیا، مجھے سرزنش کی۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ کورا یقیناً مجھ سے عمر میں بڑی ہوگی، چنانچہ وہ اُسے عزیزہ اور آپ کہہ کے مخاطب کر رہے تھے، اُن کی گفتگو کا مقصد صرف یہ تھا کہ یہ جگہ کورا کے رہنے کی تو نہیں ہے مگر مجبوری پر صبر و شکر کرنا چاہیے۔ اُنھوں نے کورا کو نہایت شفقت آمیز انداز میں تسلی دی۔ اُن کے ہر جملے پر کورا جی جی کرتی رہی اور میں خوف سے لرزتا رہا کہ کہیں مولوی صاحب اُس سے کچھ اور نہ پوچھ لیں۔

مجھے اگر یہ خبر ہوتی کہ مولوی صاحب مدرسے سے ملحق مسجد میں عشا کی نماز پڑھتے ہوئے دیر لگا دیں گے تو میں کب کا یہاں سے رخصت ہو گیا ہوتا۔ ہم اسی شش و پنج میں مبتلا رہے کہ وہ ابھی واپس آتے ہوں گے، فرار کا ایک اچھا موقع ہاتھ سے نکل گیا ـ ہمارے سروں پر ایک ہول ناک رات مسلط

تھی۔ بہت کم روشنی کا ایک بلب کمرے میں ٹمٹما رہا تھا اور گلی کے تمام بلب بجھے ہوئے تھے۔ اندر تاریکی ہو تو باہر کی روشنی بھی کچھ کام نہیں کرتی۔ صحن میں کورا اس طرح بیٹھی تھی جیسے اُس کے گھر میں موت ہوگئی ہو۔ میں تو بھی کو ختم کرکے آیا تھا۔ میرے گھر میں بھی شاید اپنے بیٹے کی موت پر ایسا ہی عالم ہوگا۔ سُنا ہے، موت بُری اولاد کی بھی اچھی نہیں لگتی۔ مولوی صاحب نے آنے کے بعد تار گھر چلنے کے لیے اصرار نہیں کیا، آتے ہی خاموشی سے لیٹ گئے۔ کورا نے اُن کا بستر تین حصّوں میں تقسیم کردیا تھا۔ میرے لیے زمین پہ چادر بچھا دی تھی اور تکیے کے لیے چند کپڑے دے دیے تھے۔ مولوی صاحب کو آج نیند نہیں آرہی تھی وہ مجھ سے کہتے رہے کہ مجھے اندر جاکے بہن کو تسلی دینی چاہیے۔ شاید وہ ہم دونوں کے درمیان ہونے والی بات چیت کی سُن گُن لینا چاہتے تھے۔ بُرے وقت میں آدمی ہر قسم کے شبہے کرتا ہے۔ آخر آدھی رات کے وقت نیند نے اُن پر قبضہ کرلیا۔ مجھے اُتنی رات کو یہاں سے بھاگنے کی ہمت نہیں پڑی۔ میں نے کورا کو آہستہ سے آواز دی۔ اُس نے ایک ہی سرگوشی میں دروازہ کھول دیا۔ "نیند نہیں آرہی ہے؟" میں نے چوروں کی آواز میں کہا۔ اُس نے سر ہلاکے اثبات میں جواب دیا۔ "ہم کل ضرور یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔"

"بیٹھ جاؤ۔" اُس نے کمرے میں رکھی ہوئی اکلوتی چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے بیٹھنے سے پہلے ایک بار پھر دروازہ کھول کے دیکھ لیا، مولوی صاحب سوئے ہوئے تھے۔

جب میں نے آہستہ سے کنڈی لگائی تو نہ جانے کیوں میرے ہاتھ کانپنے لگے۔ حلق خشک ہوگیا اور آنکھیں جلنے لگیں، سارے جسم میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ میرے لیے چارپائی تک جانا مشکل ہوگیا۔ میں بیٹھ گیا تو میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم کیوں کھڑی ہو؟"

وہ بھی بیٹھ گئی اور میری زبان پر فالج گر گیا۔ مُنہ سے کوئی بات ہی نہیں نکل رہی تھی۔ میں اُسے عزم و ہمت کی تلقین کرنے آیا تھا۔ خود میرے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے، ہم کچھ دیر یوں ہی چُپ چاپ بیٹھے رہے۔ بڑی اذیت ناک خاموشی تھی۔ میں اُس کے جسم اور بالوں کی خوشبو صاف محسوس کرسکتا تھا۔ پہلو بدلتے وقت اُس کے کپڑے سرسراتے تو مجھے عجیب لگتا۔ "بابر!" آخر وہ خود بولی۔ "میں نے تمھیں بہت پریشان کیا۔"

"تم دن میں بھی کئی بار یہ جملہ کہہ چکی ہو۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "تمھیں پتہ نہیں۔ بالکل احساس نہیں کہ تمھیں دیکھ کر مجھے کیا ہوجاتا ہے۔ تمھیں قریب پاکے میری ہمت بڑھ جاتی ہے۔" میں نے بے ترتیب لفظوں میں کہا۔ کوئی لفظ اِدھر تھا کوئی اُدھر۔ زبان میں لکنت آگئی تھی۔

وہ مجھ سے کچھ اور قریب آگئی تھی۔ میں سوچتا رہا کہ مجھے کیا کہنا اور کیا کرنا چاہیے؟ جی تو بہت کچھ کہنے اور کرنے کو چاہتا تھا مگر خدشہ تھا کہ وہ میرے بارے میں کیا سمجھے گی۔ مجھے بہت چھوٹا آدمی سمجھے گی۔ کہے گی کہ میں عام آدمی ہوں، بے کردار، بدنیت، مجھ پر اُس کا اعتبار ختم ہوجائے گا۔ "سو جاؤ کورا!" میں نے اُسے تاکید کی۔

"بیٹھے رہو۔" اُس نے آہستہ سے کہا۔

مجھے کسی سہارے کی ضرورت محسوس ہوئی، اُس چارپائی کا کوئی سرہانا بھی نہیں تھا۔ "میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔" میں نے بہانہ کیا۔

"میں دبا دوں؟" وہ اُٹھتے ہوئے بولی۔

"نہیں، نہیں، کچھ ایسا خاص درد نہیں ہے۔" وہ جھجکتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔ "نہیں، تم آرام کرو۔" میں نے بجھی ہوئی سرگوشی کی لیکن اُس نے میرے سر پر اپنے ہاتھ رکھ دیے تھے۔ سر میں ایک چھناکا سا ہوا۔ اُس کی لمبی اُنگلیوں میں بجلی کے ننگے تار تھے۔ میرے سر میں کرنٹ دوڑنے لگا۔ پھر وہ کرنٹ پورے جسم پر چھا گیا جب اُس کی انگلیاں میری پیشانی پر آئیں میں ڈھیتے ڈھیتے سنبھلا۔

"تمھیں بخار آرہا ہے۔" وہ میری گرم پیشانی چھوتے ہوئے بولی۔

"نہیں تو، میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔"

"مجھے سر دبانا نہیں آتا۔ مجھے تو کوئی بھی کام نہیں آتا۔"

"تم تو بہت اچھا دبا رہی ہو، درد بس بھاگنے والا ہے۔"

اتنی مدّت میں وہ پہلی بار کھل کھلائی۔ "تم بہت جھوٹ بولتے ہو۔" کمرے میں جل ترنگ بج اُٹھے۔

"آہستہ، مولوی صاحب جاگ جائیں گے۔"

اُس کے ہاتھ میری آنکھوں پر آگئے۔ اُس کی انگلیاں میری پلکوں سے مَس ہوتیں تو میری آنکھیں کپکپانے لگیں۔ زندگی میں بہت سے لذیذ کھانے کھاتے تھے، انعامات جیتے تھے، امتحان میں کامیابی حاصل کی تھی، شرطیں جیتی تھیں، بہترین لباس پہنا تھا، باغوں کی سیر کی تھی۔ ابا کے ساتھ ایک بار شکار کا لطف بھی اُٹھایا تھا مگر جو لذّت کورا کے لمس میں تھی اُس کا پہلی بار انکشاف ہوا تھا۔ اُس کی بے قرار انگلیاں میرے سر، پیشانی اور آنکھوں پر رقص کرتی رہیں اور میرے سینے میں جذبات کی فصل لہلہاتی رہی۔ "بس۔ بس۔" میں نے بے دلی سے کہا۔

اُس نے بس نہیں کیا۔ اُس کے نازک ہاتھ میرے بالوں کی گرد سے میلے ہوگئے ہوں گے۔ وہ تو ایک آئینہ تھا۔ ذرا سی ہوا چلی اور گرد جم گئی۔ میں نے بے تابی سے اُس کے ہاتھ تھام لیے اور انھیں گھور کے دیکھا۔ میرے ہاتھوں میں جیسے ریشم آگیا۔ انھیں احتیاط سے تھامنا چاہیے کہیں خراب نہ ہوجائیں۔ وہ میری فریفتگی، میرا خوف، میری لرزش، میرا اضطراب دیکھتی رہی۔ "کورا! ایک بات کہوں؟" میں نے بے تابی سے کہا۔ اُس نے گردن جھکالی جیسے میں جو بات کہنے والا ہوں، وہ اُسے پہلے سے معلوم ہو۔ میں... میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کیا تم... تم مجھے ہمیشہ یاد رکھو گی؟"

کہنا یہ تھا کہ مجھے بھول تو نہیں جاؤ گی؟ میں نے یہ سوال کرکے بُرا کیا۔ اُس کی آنکھوں میں پھر آنسو اُمڈ آئے۔ شاید یہ بات مجھے نہیں کہنی چاہیے تھی، اِس سے ایک دوری معلوم ہوتی تھی، اجنبیت سی۔ "تم پھر رونے لگیں؟ اچھا تو پھر میں باہر چلا جاتا ہوں۔" اُس نے جلدی جلدی آنسو پونچھ لیے۔

مولوی صاحب کے جاگنے کے خیال سے میں نے ایک بار دروازے سے جھانک کے دیکھ لینا مناسب سمجھا۔ وہ اپنی چارپائی پر کسمسا رہے تھے، میں نے کورا کو ہاتھ ہلاکے الوداع کہا اور اشارے سے اُسے سو جانے کی تاکید کرکے چپکے سے باہر نکل آیا۔ پھر میں زمین پر بچھی ہوئی چادر پر لیٹ گیا۔ "عزیزم! میرے پلنگ پر آجاؤ، نیچے تمھیں زحمت ہو رہی ہوگی۔"

"آپ جاگ رہے ہیں مولوی صاحب؟" میں نے تعجب سے کہا۔ "میں فہمیدہ سے سر دبوانے کے لیے اندر چلا گیا تھا۔ وہ بھی جاگ رہی ہے۔"

"ہاں بھئی، ایسے عالم میں کسے نیند آتی ہے؟" مولوی صاحب کا یہ فقرہ میرے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح لگا۔ اُنھوں نے ہماری باتیں تو نہیں سُن لیں؟ ہم تو بہت آہستگی سے باتیں کر رہے تھے، ممکن ہے اُنھوں نے دروازے کی جھری سے جھانک کر سب کچھ دیکھ لیا ہو؟ وہ تو صرف سر دبا رہی تھی۔ مولوی صاحب ٹھنڈی سانسیں بھرتے رہے۔ میں نے اُن سے اس کے بعد کوئی بات کرنا مناسب نہیں سمجھی۔ رات کے آخری حصّے میں یہ دقت تمام میری آنکھیں بند ہوئیں۔

صبح طبیعت کی خرابی کا عذر کرکے میں وہیں لیٹا رہا اور مولوی صاحب کو میں نے ایک غلط پتہ دے دیا تاکہ وہ گھر تار دے دیں۔ مولوی صاحب جیسے ہی تار دینے گئے، میں نے سامان سمیٹ کے سوٹ کیس میں بند کردیا اور چابی جیب میں رکھ لیا۔ دفتر ابھی بند تھا۔ گلی میں مولوی صاحب کی عدم موجودگی کی تصدیق کرکے میں نے ایک مختصر خط اُن کے نام لکھا۔

"ہم جا رہے ہیں، آپ کی محبت اور عنایت کا شکریہ۔
ہم آپ کو کبھی فراموش نہیں کرسکیں گے۔ یہاں رہ کے ہم
خود پر ایک بوجھ محسوس کر رہے تھے۔ اس لیے ہم جا رہے ہیں۔"

یہ خط میں نے اُن کے ٹرنک پر پتھر سے دبا کے رکھ دیا۔ تیاری میں کچھ دیر نہیں تھی۔ کورا نے بُرقع اوڑھا، میں نے عُجلت سے شیروانی پہنی اور ایک مرتبہ پھر باہر جاکے دیکھا۔ ہم کسی رکاوٹ کے بغیر گلی میں آگئے اور گلیوں گلیوں ہوتے ہوئے کسی نامعلوم بازار میں جا نکلے۔ راستے میں ہر طرف سے نگاہیں اٹھیں مگر یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ ایک بُرقع پوش لڑکی اپنے بھائی کے ساتھ گزر رہی تھی۔ کیڑے نالیوں میں رینگتے رہتے ہیں۔ اُنھی نالیوں کی طرح کلکتے میں گلیوں کا جال بچھا ہوا ہے جس میں انسان رینگتے، کلبلاتے، سڑتے اور پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ بڑی سڑک پر آکے ہم ایک رکشا میں بیٹھ گئے۔ رکشا ایک نہایت سیاہ ناتواں شخص چلا رہا تھا جس کی پسلیاں ایک ایک کرکے گنی جاسکتی تھیں، میں نے اُسے ہوڑا اسٹیشن کا پتہ دیا۔ کورا مجھ سے لگی بیٹھی تھی، یہ امر پہلی بار بے حد دلکش محسوس ہوا اور جی چاہا کہ کورا اسی طرح قریب بیٹھی رہے اور رکشا ساری عمر چلتا رہے۔ میری نظریں دائیں بائیں کی ہوٹلوں کے بورڈوں پر جمی ہوئی تھیں۔ ایک جگہ میری نظر ٹک گئی۔ میں نے رکشا رکوا کے جائزہ لیا۔ یہ جگہ معقول نظر آتی تھی۔ یہاں زیادہ شور غل بھی نہیں تھا۔ ہوٹل کا بورڈ اردو میں لکھا ہوا تھا۔ رکشے والے کو پیسے ادا کرکے میں نے شیروانی کے بٹن بند کیے اور چال میں ایک ٹھہراؤ پیدا کرلیا۔ دروازے ہی پر میرے ہاتھ سے ایک شخص نے سوٹ کیس چھین لیا۔ "کمرہ چاہیے جناب؟"

"ہاں جی۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔ "مگر..."

"مگر کیا صاحب؟ ایک نمبر ہوٹل ہے، فلش کا انتظام، مرغن کھانا، صاف ستھرا بستر۔ آپ آزمائیے تو سہی۔ اس علاقے میں دُور دُور ایسا ہوٹل نہیں ہے۔"

"ہمیں زیادہ نہیں ٹھہرنا ہے۔ دو تین دن۔"

"آپ ایک بار ٹھہر کے تو دیکھیے۔ پھر آپ بار بار اِدھر آئیں گے۔" وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا اور ایک زینہ عبور کرکے مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا۔ منیجر نے مجھے دلچسپی سے دیکھا اور جب اُس کی نظر کمرے کے باہر کھڑی ہوئی کورا پر پڑی تو اُس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی۔ پھر اگر وہ فوراً مجھے چابی نہ دے دیتا تو میں وہیں سے واپس ہوجاتا۔ "دوسری منزل کمرہ نمبر ۲۱۲۔" اُس نے ملازم سے کہا اور مجھے ہدایت کی کہ میں دوبارہ نیچے آکے نام اور پتہ لکھوا دوں۔ "ہاں۔" وہ مجھے دوبارہ متوجہ کرتے ہوئے بولا۔ "پندرہ روپے یومیہ ہوں گے جناب!"

یہ رقم بہت زیادہ تھی۔ خصوصاً اُس شخص کے لیے جس کا کُل اثاثہ پانچ چھ سو روپے ہو مگر میں نے بے فکری سے سُنا اور واپس آگیا۔ دوسری منزل پر ہمیں جو کمرہ دیا گیا تھا، وہ اتنا بڑا نہیں تھا مگر ہمارے لیے کسی محل کے برابر تھا۔ ہمیں تو سر چھپانے کی جگہ چاہیے تھی۔ یہ میری زندگی کا پہلا موقع تھا کہ میں کسی ہوٹل میں مقیم تھا۔ کمرے میں دو پلنگ موجود تھے اُن کے درمیان ایک چھوٹی سی میز تھی۔ ایک طرف سنگھار میز اور کرسی بھی رکھی ہوئی تھی۔ غسل خانہ بھی صاف ستھرا تھا۔ چٹخنی بند کرکے میں دھڑام سے بستر پر گر گیا۔ کورا نے چہرے سے نقاب ہٹا دی تھی۔ چاند بدلی سے نکل آیا تھا۔ "کیسی جگہ ہے؟" میں نے کسی قدر مطمئن لہجے میں پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔" اُس کے لہجے سے مایوسی مترشح تھی۔

"تم تو جین بابا کے ساتھ بہت سے ہوٹلوں میں ٹھہری ہوگی، اچھے ہوٹلوں میں۔"

"ہاں، ہندوستان آنے کے بعد ہم کئی جگہ ٹھہرے۔"

"میں نیچے نام پتہ لکھوا کے آتا ہوں۔ تم صرف میری آواز پر دروازہ کھولنا۔ میں تین بار دستک دوں گا۔" یہ کہہ کے میں نیچے آگیا۔ راستے میں میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے رجسٹر میں کیا اندراج کرانا ہے؟ نیچے کے کمرے میں جو لوگ بیٹھے تھے، وہ مجھے دیکھتے ہی خاموش ہوگئے، مجھے یہ گمان ہوا کہ وہ میرے ہی بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ منیجر نے ایک رجسٹر میرے سامنے

رکھ دیا۔ میں نے اپنا نام انور علی لکھا، عمر ۲۴ سال، پتہ محلہ فیض گنج مراد آباد۔ اس جگہ کا نام میں نے مولوی صاحب سے سُنا تھا۔ ساتھ میں ایک بہن بہن کا نام کیا بتاؤں اور عمر؟ عمر کا خانہ آیا تو میں جھجکنے لگا، ۲۵، ۳۰، یا ۳۵ اگر کہیں ان میں سے کسی کی نظر کورا کے چہرے پر پڑ گئی تو؟ میں نے بہن لکھ کے جگہ خالی رہنے دی۔ منیجر میرا پس و پیش تاڑ گیا۔ ”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ اُس نے مہذب لہجے میں کہا۔ ”ہم خواتین کے نام اور عمریں نہیں لکھتے۔“

”شکریہ۔“ میں نے مسکرا کے کہا اور اُس کے مطالبے پر ۳۰ روپے پیشگی دے دیے۔ اب تک ہر کام اطمینان بخش طور پر انجام پایا تھا۔ دُوسری منزل پر دونوں طرف کمروں کا ایک سلسلہ تھا۔ درمیان میں ایک تنگ راستہ گزرتا تھا۔ اُس کے آخری سرے پر ہوٹل کے بیرے بیٹھے ہوتے تھے۔ میں انہیں نظر انداز کرتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ ”اب کیا ہو گا؟“ کورا نے پوچھا۔

”اب کچھ دیر آرام کریں گے، پھر سوچیں گے کہ کیا ہو۔ کچھ شہر کی تفریح کریں گے۔“ اسی وقت دروازے پر کسی نے دستک دی۔ دل اُچھل کے حلق میں آ گیا۔ ”بیرا ہو گا۔“ کورا نے یہ کہہ کے میری دہشت دور کی۔

میں نے کورا کو آرام کرنے کا اشارہ کیا اور ذرا سا دروازہ کھول کے دیکھا۔ بیرا ہی تھا۔ ”کچھ کھانا چاہتے وغیرہ صاحب؟ میں سامنے بیٹھا ہوں، جس چیز کی ضرورت ہو، گھنٹی بجا دیجیے گا۔“

میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کے اُسے دو روپے تھما دیے۔ مولوی صاحب نے اپنے واقعات بتاتے ہوئے مجھے ایک بیرے کو زیادہ بخشش دینے کا مال سُنایا تھا۔ وہ بات میرے ذہن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ واقعی اُس کے چہرے کا موسم ہی بدل گیا۔ اُس نے ادب سے مجھے سلام کیا اور ایک بار پھر اپنی خدمات کی پیش کش کی۔ میں نے جلد سے جلد اُس بلا کو ٹالنے کے لیے دروازہ بند کر دیا۔

”کچھ کھاؤ گی؟“ میں نے کورا کے کانوں کے قریب جا کے زور سے پوچھا۔

”نہیں۔“ وہ اپنے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

”کھایا پیا کرو، نہیں تو دُبلی ہو جاؤ گی۔“

”تم ذرا غور کر کے دیکھو، چہرہ کیسا ہو رہا ہے، پیلا ہو گیا ہے۔ ایک دن میں تمہارا کیا حال ہو گیا ہے۔“

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بس ذرا رہنے کی جگہ اور کام مل جائے۔ پھر دیکھنا میں کیسا موٹا ہو جاؤں گا۔“

”باہر!“ وہ پُر خیال لہجے میں بولی۔ ”کوئی ایسی جگہ بھی ہے جہاں انسان نہیں رہتے؟ چلو کسی پہاڑ پر کسی جنگل میں چلیں، جب ذرا بڑے ہو جائیں گے چلے آئیں گے۔“

”انسان وہاں بھی ہوں گے، انسان ہر جگہ موجود ہیں۔“ میں نے بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔ وہ میرے سرہانے بیٹھ گئی تھی اور اُس نے اپنی کہنی میرے شانوں پر ٹکا دی تھی۔

”جب میں یہاں آئی تھی تو سب لوگ مجھے گھور گھور کے دیکھ رہے تھے۔ یہ ایسا کیوں کرتے ہیں بابر؟“

”پتہ نہیں، شاید ان لوگوں کے گھروں میں عورتیں نہیں ہوتیں۔“ میں نے تلخی سے کہا۔

”چلو تم تیار ہو جاؤ۔ اس شہر میں رہنا ہے تو ہمارے لیے یہاں کے گلی کوچوں سے واقف ہونا ضروری ہے۔“

پہلے میں نہایا، پھر وہ نہائی۔ جب وہ غسل خانے سے نہا کے برآمد ہوئی تو مجھے ایک بڑی سی لڑکی نظر آئی۔ وہ شرما رہی تھی، نگاہ اٹھاتے ہوئے جھجک رہی تھی۔ ہمارے پاس کپڑے کم تھے، اس لیے کہ ان ہی کپڑے پہن لیے جو وہ پہنے ہوئے تھی۔ میں نے صندوق سے مال نکال کے اپنی جیب میں رکھ لی۔ پھر ہم تالا لگا کے ہوٹل سے باہر جانا ہی چاہتے تھے کہ بیرا لپکتا ہوا آیا۔ ”سرکار کہیں جا رہے ہیں؟“ اُس کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو مجھے اچھی نہیں لگی۔ ”یہ کب واپسی ہو گی؟“

”معلوم نہیں کب آئیں۔“ میں نے جھنجلاہٹ سے کہا۔ ”کیا یہاں بتانا پڑتا ہے یا یہاں آنے جانے کے اوقات مقرر ہیں؟“

”نہیں حضور، ایسی کوئی بات نہیں، میرا مطلب یہ تھا کہ سرکار کچھ خدمت کا موقع دیں، کچھ کھانے پینے کا انتظام کر رکھوں؟“

”جب آئیں گے تو بتائیں گے۔“ میں زینے سے اُترنے لگا۔ کورا میرے پیچھے پیچھے تھی۔ نیچے اُترنے تک ہمیں دیکھ کے کسی نے گلا صاف کیا۔ کسی کے لبوں پر مسکراہٹ آئی، کسی کی نگاہ میں چمک پیدا ہوئی، ہم یہ سب کچھ برداشت کرتے ہوئے سڑک پر آ نکلے۔

چند ہی قدم چلے ہوں گے کہ ایک معقول شکل و صورت کے ٹیکسی والے نے ہمارے قریب ٹیکسی روک کے پوچھا۔ ”کہاں جائیے گا جناب؟“

”کہیں نہیں۔“ میں نے تیزی سے کہا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ کسی نہ کسی سواری میں تو بیٹھنا ہی ہو گا۔ ”ٹھیرو۔“ میں نے اُسے حکم دیا۔

”جناب! کلکتے کی سیر کیجیے۔“ ڈرائیور نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

”بہت کی ہے۔“ میں نے بے نیازی سے کہا۔ ”ہمیں بڑے بازار تک لے چلو۔“ بڑے بازار کا نام میں نے اسٹیشن پر لگے ہوئے اشتہاری بورڈوں میں کہیں دیکھ لیا تھا۔ ڈرائیور نے ایک لمحے کچھ سوچا اور دروازہ کھول دیا۔ اب وہ تھا اور کلکتے کی سڑکیں تھیں، ہم میلوں بھاگتے رہے۔ ایک سڑک سے دوسری سڑک، ایک بازار سے دوسرا بازار۔ مگر بڑا بازار آ کے نہیں دیا۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے ایسی جگہ کا نام کیوں لے دیا جو ہوٹل سے اتنی دور ہے۔ ڈرائیور سے یہ پوچھتے ہوئے بھی جھجک ہو رہی تھی کہ وہ کتنا فاصلہ طے کرے گا؟ ممکن ہے، بڑا بازار اتنی ہی دور ہو۔ آخر بہت دیر بعد میں نے اُسے ٹوکا۔ ”تم نے گاڑی غلط راستے پر ڈال دی ہے۔“

وہ کچھ چونکا، مگر دوسرے ہی لمحے اطمینان سے کہنے لگا۔ ”صاب! راستہ تو غلط نہیں ہے، البتہ میں آپ کو صاف ستھرے راستوں سے لے کے آیا ہوں، ذرا کلکتے کی بہار بھی دیکھیے۔“

ہمارا مقصد بھی یہی تھا کہ کلکتہ خوب دیکھا جائے۔ پھر ڈرائیور گاڑی ایک ایسی جگہ لے آیا جہاں بڑی بڑی عمارتیں ختم ہو گئی تھیں اور نیم شہری علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ یہ جگہ دیکھ کے مجھے کچھ پریشانی ہوئی۔ ہم بتدریج کسی ویران علاقے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ”یہ تم کہاں لے جا رہے ہو؟“ میں نے بے چینی سے پوچھا۔

”بڑے بازار۔“ ڈرائیور نے گردن موڑ کے کہا۔ ”جناب! یہ غریبوں کی بستی بھی دیکھیے۔ آئیے میں آپ کو اپنا گھر دکھاؤں۔“

”میں نے تم سے صرف بڑے بازار چلنے کے لیے کہا تھا۔ یہ تم کہاں لے آئے؟“ میں نے گھبرا کے کہا۔

”بڑے بازار ہی چل رہا ہوں صاب!“

”ہمیں نہیں جانا، واپس چلو۔“ میری آواز غصے سے کانپنے لگی۔ کورا برقع میں سانس روکے بیٹھی تھی۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ ہی دور آگے جا کے اُس نے گاڑی روک لی اور انجن بند کر دیا۔ یہ درختوں میں ڈھکا ہوا ایک سنسان علاقہ تھا۔ وہ گردن گھما کے اطمینان سے پیچھے مڑا۔ ”ذرا ان کا مکھڑا تو دکھا دیجیے۔“ اُس نے عیارانہ مسکراہٹ سے کہا اور ایک دم کورا کے نقاب پر ہاتھ ڈال دیا۔

”یہ کیا بدتمیزی ہے؟“ میں اُس کا ہاتھ روک کے چیخا۔ ”اپنا ہاتھ ہٹاؤ ورنہ۔“

”ورنہ کیا؟ صاب! ابھی تمہاری عمر ان باتوں کی نہیں ہے، انہیں تو ہم پر چھوڑ دو۔“ اُس نے خشونت سے کہا۔

”میں کہتا ہوں، گاڑی واپس لے چلو۔“ اُس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ ”ان نازک ہاتھوں کو کیوں زحمت دیتے ہو صاحب؟“ اُس نے زور سے جھٹکا دیا۔ میرا ہاتھ دروازے سے لگا۔

کورا نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹا لیا تھا اور چیخنا شروع کر دیا تھا۔ ڈرائیور اُس کا چہرہ دیکھ کے بدحواس ہو گیا۔ اس نے اُس کے رخساروں پر ہاتھ پھیرنے کی کوشش کی۔ میں نے اُس کے منہ پر ایک مکا رسید کر دیا۔ اُس پر وحشت طاری ہو گئی۔ اُس نے میرے سر پر ایک زور کا ہاتھ مارا اور دروازے کا ہینڈل گھما کے مجھے باہر پھینکنے کی کوشش کرنے لگا۔ کورا نے اُس کے ہاتھ نوچنے اور کاٹنے شروع کر دیے تھے۔ ڈرائیور بُری طرح بوکھلا گیا تھا۔ اُس نے ایک ہاتھ سے میری گردن پکڑ لی۔ کورا نے سراسیمگی میں اُسے کاٹنا اور نوچنا بند کر دیا۔ کورا اس کا بچا نہ لو۔ میں نے اُکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ میری گردن اُس کے نیچے میں تھی۔ کورا نے اس زور سے اُس کی کلائی کاٹی کہ اُس نے بلبلا کے میری گردن چھوڑ دی۔ اس عرصے میں مجھے اپنی اندرونی جیب سے چاقو نکالنے کا موقع مل گیا۔ میں نے چاقو کا کھٹکا دبایا تو اُس کا پھل بجلی کی طرح دستے سے نکل آیا۔ میرے ہاتھوں میں چاقو دیکھ کے ڈرائیور کے چہرے پر مُردنی چھا گئی۔ اگر چاقو دیکھ کے اُس کی آنکھیں بجھ نہ جاتیں تو میں چاقو دستے سمیت اُس کی گردن میں اُتار دیتا۔ وہ مبہوت رہ گیا۔ ”چل۔“ میں نے اُس کی گردن پر چاقو کی نوک رکھتے ہوئے کہا۔ ”ورنہ میں تجھے قتل کر دوں گا۔“ مجھے اس سے کسی رواداری کی توقع نہیں تھی، اس لیے میں نے مزید کہا۔ ”تو نہیں جانتا نہیں ہے کہ ہم کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں اور کس گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔“

”گاڑی چلاؤ۔“ کورا نے بھی تحکمانہ لہجے میں کہا۔

ڈرائیور سکتے میں رہ گیا تھا۔ چاقو کی نوک اُس کی گردن میں چبھ رہی تھی وہ ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ چاقو قربانی اور شکار کے موقعوں کے علاوہ گھر میں بے کار پڑا رہتا تھا۔ اس کی قدر و قیمت آج معلوم ہوئی جب میں نے دو تین بار ڈرائیور کی گردن میں نوک چبھوئی تو اُس کے جسم میں حرکت ہوئی۔ کورا کو اشارہ کر کے میں نے پھرتی سے چاقو اس کے ہاتھ میں دے دیا اور دروازہ کھول کے اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ پھر میں نے صرف ایک لمحے میں چاقو کورا کے ہاتھ سے لے کے ڈرائیور کی داہنی پسلی میں چبھو دیا۔ اُس نے ہلکی سی سسکاری بھری اور چابی گھما کے انجن اسٹارٹ کر دیا۔ جب تک وہ دوبارہ آبادی میں نہیں آ گئی، میں نے اُسی پر نظریں جمائے رکھیں۔ میرا چاقو مسلسل اُس کے جسم سے چپکا رہا۔ جب بھی گاڑی کو جھٹکا لگتا، ڈرائیور کراہ کے دروازے کی جانب سمٹتا۔ ”تھانے لے چلو۔“ میں نے کرخت آواز میں اُسے حکم دیا۔

”جی؟“ وہ بُری طرح گھبرا گیا۔

”ہاں تھانے، پھر میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم نے کس کے ساتھ گستاخی کی تھی۔ تمہیں دس سال کی سزا نہ کراؤں تو کہنا۔“ میں نے اشتعال میں کہا۔

”مجھے معاف کر دیجیے صاب! بال بچے ہیں۔ مجھ پر شیطان سوار ہو گیا تھا۔ میں نے آپ کو پہچانا نہیں تھا۔“ وہ گھگھیانے لگا تھا لیکن میں بازار میں پہنچنے تک اپنے فیصلے پر بضد رہا۔

کورا نے اُسے معاف کرنے میں عجلت کی۔ ہم نے ہوٹل جانے کے بجائے اُسے راستے میں چھوڑ دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ دوبارہ ہمیں ہوٹل کے دروازے پر چھوڑنے جائے۔ میں نے اُس کے سامنے ٹیکسی کا نمبر لکھا اور اُس کا نام نوٹ کر لیا۔ بعد میں مجھے یہ دلچسپ بات معلوم ہوئی کہ بڑا بازار ہوٹل سے زیادہ دور نہیں ہے۔ خیر جب وہ چلا گیا تو سڑک پر چلنا ہمارے لیے مشکل ہو گیا۔ اب ہمارے لرزنے اور سراسیمہ ہونے کی باری تھی۔ ہمارے دلوں پر ایک ہیبت چھائی ہوئی تھی۔ ہم دونوں فٹ پاتھ پر گم سُم کسی دُوسری ٹیکسی کی تلاش میں جا رہے تھے۔ کورا نے اچانک میرا بازو پکڑ لیا۔ میں نے اختلاجی حالت میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ کورا کی دہشت زدہ آواز سے میرے سینے پر جیسے کوئی گولا گرا۔ ”وہ۔“ وہ شارعِ عام پر میرے بازو سے چمٹ گئی۔

”کون؟“ میں نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”وہی۔ بھاگ چلو، وہی لوگ۔“ وہ پیچھے مڑتی ہوئی بولی۔ میں نے

سامنے کی طرف دیکھا۔ دوسری فٹ پاتھ پر گیروے لباس میں ملبوس دو بدھ راہب نہایت محتاط انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ آ رہے تھے، وہ ہم سے زیادہ دُور نہیں تھے۔ گو کورا بُرقع میں تھی لیکن میں انہیں دیکھ کر اُسے قریب کی ایک گلی میں لے آیا۔ "وہ وہی ہیں میں انہیں جانتی ہوں، وہ ہمارے قبیلے کے لوگ ہیں۔"

"گھبراؤ نہیں۔ اُنھوں نے ہمیں دیکھا نہیں ہے۔" میں نے اُسے تسلی دی۔ ہم ہندوؤں ایک محلے سے گزر رہے تھے، یہ بہت گنجان علاقہ تھا، گلیوں میں گندگی پھیلی ہوئی تھی ہندو بنگالنیں ہمیں اس طرح دیکھ رہی تھیں جیسے ہم انسان نہیں، کچھ اور ہوں، جدھر بھی نظر جاتی تھی، ہماری طرف اشارے ہو رہے تھے، انگلیاں اُٹھ رہی تھیں، آج شاید اس گلی میں پہلی بار کوئی بُرقع پوش عورت اور شیروانی پہنے ہوئے ایک شخص دکھائی دیا تھا۔ ہمیں گلیوں کا پتہ نہیں تھا، ہم یوں ہی اِدھر اُدھر گھومتے اور خود کو تماشا بناتے رہے۔ آخر ایک اور سڑک پر جا نکلے۔ خوش قسمتی سے وہاں ہمیں ہاتھ والا رکشا مل گیا۔ ہوٹل جاتے ہوتے بھی ڈر لگ رہا تھا۔ پیروں میں دُکھن ہونے لگی تھی۔ بھوک اور پیاس کے عالم میں ہم کہیں پانچ بجے ہوٹل پہنچے اور دروازہ بند کر کے ہانپنے لگے۔ کورا کا انگارا چہرہ سفید پڑا ہوا تھا۔ "بابو! وہ سسکتے ہوئے بولی۔ "بابو! ہم نے گھر سے آ کے غلطی کی تھی اور دوسری غلطی مولوی صاحب کے ہاں سے آ کے کی۔ واپس چلو نہیں تو میرا دم گھٹ جائیگا۔"

میں نے اُس کی ٹھوڑی اُوپر اُٹھائی۔ اُس نے اپنے آنسو چھپانے کے لیے گردن جھکالی تھی۔ "کورا!" میں نے کرب سے کہا "خدا کے لیے اپنے آپ کو سنبھالو، یقین کرو، یہ بُرا وقت ٹل جائے گا، اچھے دن آ جائیں گے۔"

اس کے سوا میرے پاس کہنے کے لیے اور کیا تھا۔ ان لفظوں میں کوئی جان نہیں تھی اُسے ان پر اعتماد کیسے آتا؟ وہ ہچکیاں لینے لگی میں نے اپنی روح جاتی ہوئی محسوس کی جیسے کوئی میری طاقت کھینچ رہا ہو۔ میں نے اُسے اُٹھا کے کھڑا کیا۔ اُس کے سرسبز چہرے پر شبنم پڑی ہوئی تھی۔ میرا جی ایسا اُمڈا، ایسی کھلبلی مچی، سینے میں ایسا درد اُٹھا، ایسا طوفان آیا کہ میں نے اُسے بے اختیار گلے سے لگا لیا۔ کورا کو تو جیسے رونے کا بہانہ مل گیا، جیسے کوئی بند ٹوٹ گیا۔ وہ ایسا روئی، اتنا روئی کہ شاید ہی کوئی رویا ہوگا۔ میں اسے سمجھاتا اور تسلیاں دیتا رہا۔ روتی ہوئی تسلیاں بے اثر ہوتی ہیں۔ وہ جس ستون کا سہارا لیے کھڑی تھی، اُس کی بنیادیں ہی کمزور تھیں۔ ستون خود اشک فشاں تھا اور اس کی مٹی اُس کے آنسوؤں سے بہی جا رہی تھی۔

مجھے اُس وقت ایسا محسوس ہوا جیسے میری تخلیق اُسی کے لیے ہوئی ہے۔ وہ رو رہی ہے تو میں رو رہا ہوں، وہ مسکرا رہی ہے تو میں مسکرا رہا ہوں، وہ دُکھ میں ہے تو میں دُکھ میں ہوں۔ وہ نہیں ہے تو میں بھی نہیں ہوں اور کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر جب وہ میرے سینے میں سمائی تو مجھے یاد آیا کہ میں تو اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ میرا اپنے گھر سے رشتہ تو ایک رسمی چیز تھا مجھے تو وہاں سے اُٹھ کے کہیں اور آنا تھا۔

کمرے میں گہرا اندھیرا ہو گیا۔ ہمیں کچھ ہوش ہی نہیں رہا۔ ہم ایک دوسرے کو شناخت کرتے رہے۔ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ ہم اس دنیا میں لوٹ آتے لیکن اب ہمارے دلوں پر اس قدر بوجھ نہیں تھا۔ میں نے سہری پر بٹھا کے روشنی کی اور اُس کے آنسو پونچھ کے دروازے پہنچا۔ بیرا خدمت کے لیے حاضر تھا۔ "حضور نے کچھ طلب نہیں کیا؟"

"ضرورت ہی نہیں پڑی۔" میں نے باہر آ کے کہا۔

"میں یہیں موجود ہوں۔ گھنٹی بجا دیجیے گا اور ہاں کچھ شوق ہیں آپ؟" اُس نے گردن گھماتے ہوئے کہا۔ "ان دنوں یہاں بڑی سخت کڑکی ہے مگر ہم اپنے معزز مہمانوں کے لیے کچھ نہ کچھ انتظام رکھتے ہیں۔ حکم ہو تو پیش کروں؟ انگریزی راج میں سبھی قسم کی چیزیں ہیں۔" میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے؟ میں ابھی اُس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کہنے لگا۔ "دوسری پری بھی موجود ہو تو سرکار! بہار ہی کچھ اور ہوتی ہے۔"

"تم کس پری کی بات کر رہے ہو؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔ اُس کے چہرے پر یکبارگی ناگواری پیدا ہوئی، پھر وہ سنبھل کر بولا۔ "یہاں تو سب اُسے پری کہتے ہیں۔ آپ کے ہاں پتہ نہیں کیا کہتے ہوں گے۔"

"لے آؤ۔" میں نے سرسری انداز میں کہہ دیا۔ کورا اندر تھی۔ مجھے اُس کی فکر ستا رہی تھی۔

"ابھی پیش کرتا ہوں۔" اُس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں نے دن بھر کھانا نہیں کھایا تھا۔ میں سمجھا کہ بیرا اس وقت کی کوئی خاص چیز لے کے آنے والا ہے۔ کورا نے بُرقع اُتار دیا تھا اور کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ کچھ دیر بعد دوبارہ دستک ہوئی۔ بیرے اخباری کاغذ میں تہہ در تہہ لپٹی ہوئی کوئی وزنی چیز مجھے تھمائی۔ "انگلش ہے جناب! قیمت بھی انتہائی مناسب ہے۔ صرف تیس روپے۔" میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو وہ کہنے لگا۔ "پھر دے دیجیے گا۔ ایسی کون سی جلدی ہے۔ ہاں، ایک بات سرکار!" اُس نے اوپر کی منزل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "حضور شوقین معلوم ہوتے ہیں، اوپر بھی جناب کی پسند کے کچھ لوگ ہوتے ہیں۔ ایک نظر دیکھ لیجیے گا۔ بخدا میرا دل کہتا ہے آپ کوئی نواب ہیں۔ ہائے لکھنؤ، جس دن سے وہ شہر چھوٹا ہے، آدمی ہی نظر نہیں آتے، سب آتے ہیں۔"

"تم کن لوگوں کا ذکر کر رہے ہو؟" میں نے تشویش سے پوچھا۔

"واہ حضور! کیسی سادگی ہے، وہی جناب، انجمن آرا، عشرت، ننھی جان۔" وہ ہاتھ نچاتے ہوئے بولا۔ "کلکتے سے تو وہ بہت نالاں تھیں، یہاں اہلِ دل کی تلاش میں آئی تھیں مگر یہاں کہاں وہ لوگ۔"

باتیں کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگیں۔ میں نے اپنے پہلو میں ہوئی چیز کے پرت کھولنے شروع کیے۔ جیسا کہ مجھے شبہ ہوا تھا، وہ کی بوتل تھی، اسکاچ وسکی مجھے شدید گھن آئی۔ میں نے زندگی میں پہلی دفعہ شراب کی بوتل چھوئی تھی۔ میں نے اُسے بیرے کے سر پر دے مارنے کا ارادہ کیا مگر میرے حیرت زدہ ہاتھ کچھ نہیں کر سکے۔ چند لمحوں تک میں ٹکٹکی باندھے بوتل دیکھتا رہا پھر کچھ سوچ کے میں نے اُسے دوبارہ کاغذ میں لپیٹ لیا۔ "تمہارا نام؟" میں نے مضبوط لہجے میں پوچھا۔

"نام کیا جناب! سب اکّن میاں کہتے ہیں۔ کہیے چیز آپ کو پسند آئی؟" اُس نے آنکھ مار کے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے تذبذب سے جواب دیا۔ "اکّن میاں! اب ہم آرام کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں کھانا بھجوا دیجیے۔"

"ظاہر ہے، ایک دو گھنٹے بعد۔" وہ شوخی سے بولا۔

"نہیں ابھی۔" میں نے ناراضی سے کہا۔

"جیسی مرضی جناب کی۔" اُس نے سر ہلا کے کہا۔ میں نے جھٹ دروازہ بند کر لیا۔ میرے ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی۔ یہ ہوٹل شرابیوں اور طوائفوں کا ہوٹل تھا۔ وہ ذلیل کورا کے متعلق بھی یہی سمجھ رہا تھا۔ کتابوں میں یہ باتیں پڑھی تھیں اور یقین نہیں آتا تھا۔ اب سب کچھ سامنے تھا۔ میں نے اکّن میاں کو جان بوجھ کر اُس کی بدزبانی کی سزا نہیں دی کیونکہ خطا میری تھی کہ میں کورا جیسی معصوم لڑکی کو ایسے گندے ہوٹل میں لے آیا تھا۔

میں نے بوتل غسل خانے میں رکھ کے ہاتھ دھوتے۔ کھانا تو ہم سے کھایا نہیں گیا، سب بچ کر گیا۔ اُس وقت باہر جانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی، دھیمی روشنی کر کے ہم دونوں اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے۔ رات دبے پاؤں گزرتی رہی۔ ہم دونوں کے سوال ایک ہی تھے اور جواب؟ کاش ہمیں اُن کے جواب معلوم ہوتے۔ آدھی رات کے وقت میں نے دیکھا کہ کورا پلنگ پر بیٹھی ہوئی ایک جانب دیکھ رہی ہے مجھ پر ہیجان طاری ہو گیا۔ میں نے اُس کا حال پوچھا تو وہ نیند نہ آنے کا شکوہ کرنے لگی۔ میں نے اِدھر اُدھر کے واقعات سنا کے اُسے بہلانے کی کوشش کی۔ اُسے ہنسانا چاہا۔ پھر میں نے اُس کے پلنگ پر پہنچ کے اُس کا سر اپنی چھاتی پر رکھ لیا۔ وہ گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ اُسے کچھ سکون آ گیا۔ میں نے اپنی نشست نہیں بدلی تاکہ وہ بے آرام نہ ہو جائے۔ میں اسی طرح ایک کروٹ سے بیٹھا رہا۔ آخر اُسے نیند آ گئی۔

صبح ہوتے ہی میں نے اکّن میاں سے آخری بار چائے منگوائی اور تیس روپے کے ساتھ بھری ہوئی بوتل اُس کے حوالے کر دی۔ اُس کے منہ پر تھوکنے کی حسرت دل ہی دل میں رہ گئی۔ نیچے دفتر میں چابی دے کے میں نے ہوٹل کا کرایہ بھی واپس نہیں مانگا۔ اکّن میاں اور منیجر میری صورت دیکھتے رہ گئے۔

دو دن میں دنیا بدل گئی۔ اپنے قد و قامت اور زمانے کی نیرنگی کا اندازہ ہوا۔ کلکتے کی ہر سڑک دن کا کانٹا تھی جو ہر لمحے آدمی کو اس کی اوقات کا احساس دلاتی رہتی تھی۔ ایک گھنٹے تک ہم یوں ہی گھومتے رہے۔ کہاں جائیں؟ کس طرف کا رُخ کریں؟ ہمارا کوئی بھی تو نہیں ہے ہمیں نیکی اور محنت سے رہنے کے لیے کوئی جگہ میسر نہیں ہے۔ میں نے سوچا کورا کا بُرقع اُتروا دوں، اس طرح لوگوں کا تجسس ختم ہو جائے گا مگر اُس کے دشمن یہاں بھی موجود تھے اور مسلسل اُس کا تعاقب کر رہے تھے۔ آدمی کو کہیں آزادی نہیں ملتی۔ اُس کا ارادہ سماج کا پابند ہے۔ میں نے حال ہی میں روسو کا ایک مقولہ پڑھا تھا کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے لیکن جدھر دیکھو پابہ زنجیر ہے۔ اُس وقت میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ روسو کا مطلب کیا ہے، حالانکہ مطلب گیا میں بھی اتنا ہی واضح تھا جتنا کلکتے میں۔ پھر مجھے ایک ہوٹل نظر آ گیا۔ کہتے ہیں کہ ایک زمانے میں آدمی چھت کے بغیر رہتا تھا مگر اب چھت کے بغیر اُس کا گزارا نہیں ہوتا۔ یہاں ہر شخص کو ایک چھت کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ مجھے کسی دوسرے ہوٹل میں جانے کے سوا کوئی راستہ نظر نہیں آیا۔ یہ ہوٹل پہلے والے ہوٹل سے خاصا مختلف تھا۔ ہم نے کمرے میں جا کے خود کو بند کر لیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کریں؟ میں کام کی تلاش میں نکلنا چاہتا تھا مگر کورا کو ہوٹل میں تنہا چھوڑ کے کیسے جا سکتا تھا۔ پیسے جیب سے بھاگ رہے تھے۔ میں نے سوچا جلد ہی کام کا کوئی بندوبست نہ ہوا تو سارے پیسے ختم ہو جائیں گے پھر یہ ہوٹل بھی نہ رہے گا۔ کسی سے دل کی بات کہتے ہوتے خوف آتا تھا اور کسی سے کچھ کہے بغیر چارہ بھی نہیں تھا مگر کس سے بات کریں؟ ہر شخص پورا سُراغ لگاتا ہے۔ اس ہوٹل میں بھی یہی ہوا۔ لوگوں نے بُرقع پوش کورا کو دیکھ کے اشارے کیے، آوازے کسے۔ شام کے وقت میں اُس کے ساتھ سیڑھیوں سے اُتر رہا تھا۔ ایک آدمی تیزی سے اُترتا ہوا کورا سے ٹکرا گیا۔ کورا سیڑھیوں پر گر پڑی اور لڑھکتی ہوئی دُور جا گری۔ اس افراتفری میں اُس کا نقاب اُٹھ گیا۔ ہوٹل کے بیروں اور دوسرے لوگوں نے اُس کا چہرہ دیکھ لیا، وہ چہرہ جو میں چھپاتے چھپاتے پھر رہا تھا۔ کورا کے گھٹنے میں چوٹ آ گئی تھی۔ ہمارے اردگرد اچھی خاصی بھیڑ جمع ہو گئی۔ وہ آدمی معذرت کرنے لگا کہ اُس سے چوک ہو گئی۔ ایک دوسرا ادھیڑ عمر شخص ہماری ہمدردی میں اُسے بُرا بھلا کہنے لگا۔ میں حیران و پریشان تھا کہ کس کا گریبان پکڑوں؟ کس کے پیٹ میں چاقو اُتاروں؟ کس کی آنکھیں نکال لوں؟ ہنگامہ بڑھ جانے کا خطرہ تھا مگر کورا نے غیر معمولی برداشت کا ثبوت دیا۔ وہ کراہتی ہوئی فوراً اُٹھ گئی اور میرے ساتھ چلنے لگی۔ سب نے دیکھ لیا تھا کہ میرے ساتھ ایک چھوٹی لڑکی ہے جس کی عمر بارہ تیرہ سال سے زیادہ نہیں ہے مگر ابھی سے اُس کے شباب کے آثار نمودار ہونے لگے ہیں۔ اُس کی ابتدا ہی سے انتہا کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ کورا لنگڑا رہی تھی۔ اس لیے میں اُسے دوبارہ کمرے میں لے آیا۔ وہ فہیدہ کا مہوٹی موری کا پاجامہ پہنے ہوئے تھی۔ میں نے اُس سے کہا کہ اپنا گھٹنا دکھاؤ تو وہ شرمانے لگی لیکن اُس کی چوٹ کچھ شدید معلوم ہوتی تھی۔ زخم دیکھے بغیر مجھے قرار نہیں آ سکتا تھا۔ میں نے اُسے باتھ روم بھیج دیا تاکہ وہ کوئی ڈھیلا لباس پہن لے۔ وہ غسل خانے سے یہ کہتی ہوئی واپس آ گئی کہ معمولی چوٹ ہے۔ میں اُس کی پنڈلیاں دبانے لگا۔ وہ مجھ سے گھر واپس چلنے کے لیے اصرار کرنے لگی۔

گھر اب کہاں تھا؟ گھر اپنا ہوتا تو ہمیں در بدر کی ٹھوکریں کھانے کی کیا ضرورت تھی؟ ابھی میں اُسے سمجھا ہی رہا تھا کہ ٹِک ٹِک کی آواز آئی۔ میں نے کورا پر چادر ڈال کے دروازہ کھول کے دیکھا۔ وہ ادھیڑ عمر شخص میرے سامنے کھڑا تھا جو ہمیں کچھ دیر پہلے سیڑھیوں پر ملا تھا اور جس نے ہم سے بڑی ہمدردی ظاہر کی تھی۔ "مجھے کریم گل کہتے ہیں۔" اُس نے نفاست سے کہا۔ "کیسے اندر خیریت تو ہے؟"

میں نے اُس کی ہمدردی کا شکریہ ادا کیا اور کہا۔ "میری بہن کو معمولی چوٹ آئی ہے۔" خیال تھا کہ وہ جلد ہی رخصت ہو جائے گا مگر وہ دروازے ہی پر اپنا تفصیلی تعارف کرانے لگا۔ اُس نے بتایا کہ کچھ عرصے سے اُس کا قیام مستقل اسی ہوٹل میں ہے اور اس اعتبار سے وہ میرا پڑوسی ہے اور پڑوسی کے بڑے حقوق ہوتے ہیں۔ "کبھی اُدھر آئیے اِن ملنوں تو گھر سے بھی کچھ لوگ آئے ہوئے ہیں۔ آپ سے مل کے ہمارے گھر والے خوش ہوں گے۔ آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا؟" مجھے خاموش دیکھ کے وہ بولا۔

ظاہر ہے میں نے اُسے اپنا غلط نام بتایا۔ کریم گل مجھ سے یہ وعدہ لیے بغیر نہیں ٹلا کہ رات کو میں ضرور اُس کے کمرے میں آؤں گا۔ میں اب ہوٹل میں رہنے والے کسی شخص سے ملنے کا قائل نہیں رہا تھا مگر کریم گل رات کو آٹھ بجے پھر آدھمکا۔ میں نے اُسے اندر نہیں بُلایا، دروازے ہی پر اُس سے کہہ دیا کہ میں کچھ دیر بعد خود آؤں گا۔ شکل و صورت سے وہ رکھ رکھاؤ کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ میں فیصلہ کرتا رہا کہ جاؤں یا نہ جاؤں؟ اُس نے کورا کو بھی بُلایا تھا لیکن کورا کو ساتھ لے جانا مناسب نہیں تھا۔ پھر کورا کمرے میں اکیلی رہے گی۔ میں جلد ہی واپس آ جاؤں گا۔ اگر میں نہ گیا تو وہ پھر آ دھمکے گا۔ ممکن ہے وہ کوئی ہمدرد آدمی ہو، شاید ہماری مصیبتیں دُور کرنے کا سبب بن جائے۔ میں نے کورا سے ذکر کیا تو وہ بھی شش و پنج میں پڑ گئی۔ کورا نے کہا وہ اندر سے چٹخنی بند کر لے گی۔ دروازے پر تالا لگا دیا جائے گا۔ جب تک اُسے یہ یقین نہیں ہو جائے گا کہ میں لوٹا ہوں، وہ دروازہ نہیں کھولے گی۔ چنانچہ دو گھنٹے بعد میں چوتھی منزل کے کمرہ نمبر ۴۴۰ کے دروازے پر کھڑا تھا۔ کریم گل کمرے میں تنہا تھا۔ اُس نے بڑھ کر میرا استقبال کیا، مجھے گلے سے لگایا اور اِدھر اُدھر کی دلچسپ باتیں کرتا اور میرے بارے میں پوچھتا رہا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں آسنسول سے اپنی بہن کو ساتھ لے کے عارضی قیام کے لیے یہاں آیا ہوں اور اپنے بڑے بھائی کی تلاش میں ہوں۔ وہ ہم سے ناراض ہو کے کلکتے آ گیا ہے۔ وہی ہمارا سرپرست تھا۔

"آپ اپنی بہن کو نہیں لائے؟" وہ شکایت کرنے لگا۔

"پھر آ جائے گی، آپ کے گھر والے کہاں ہیں؟"

"چچی جان برابر کے کمرے میں گئی ہوئی ہیں۔ ٹھہریے میں آپ کو اُن سے ملواتا ہوں۔"

"پھر مل لوں گا۔" میں نے کہا۔ "اُنھیں کیوں زحمت دیتے ہیں۔" لیکن وہ نہ مانا، باہر چلا گیا اور تین چار منٹ بعد ایک اوسط قد کی عورت کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ میں نے اُٹھ کر اُسے آداب کیا۔ عورت نے اشتیاق سے مجھے دیکھا۔ پھر پیار بھرے لہجے میں اُس نے میرے آداب کا جواب دیا۔ "جیتے رہو۔" اُس نے شگفتگی سے کہا۔

اُس کا رنگ گورا تھا اور جوانی زوال پر آ گئی تھی مگر اب بھی اُس کے نقش و نگار میں جاذبیت تھی، اُس نے ہلکا میک اپ کر رکھا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں کاجل لگا ہوا تھا۔ اُس کا بات کرنے کا انداز بڑا دل نشیں اور شاعرانہ تھا۔ وہ اپنے بھتیجے سے زیادہ خوش خلق ثابت ہوئی۔ اُس نے مجھے ڈبیا سے گلوری نکال کے کھلائی۔ وہ خاص انداز سے مسکراتی تھی۔

"کریم کے رشتے سے تم بھی میرے بھتیجے ہو۔" وہ شفقت سے بولی۔ "ارے تمھاری بہن کہاں ہے؟ کریم اُس کی بڑی تعریف کرتا ہے۔" میں نے اُس کے ساتھ نہ آنے کی معذرت کی اور وعدہ کیا کہ اگلی ملاقات میں اُسے ضرور ساتھ لے آؤں گا۔ وہ میرے بھائی کے بارے میں پوچھنے لگی کہ میں نے کہاں کہاں تلاش کیا؟ وہ آخر کیوں ناراض ہو گیا ہے؟ میں افسانے تراشتا رہا۔ اُس نے اپنے ہاتھ سے مجھے چائے بنا کے پلائی۔ وہ اتنی محبت سے پیش آئی کہ اب تک مجھ سے کوئی عورت اس طرح پیش نہیں آئی تھی۔

انھوں نے مشکل سے مجھے اجازت دی۔ کورا صحیح و سلامت تھی۔ میری پکار پر اُس نے دروازہ کھول دیا۔ میں نے اُسے ساری باتیں بتا دیں۔ پھر رات کا کھانا کھا کے ہم اپنے بستروں پر دراز ہو گئے۔ کورا کی ٹانگ میں درد ہو رہا تھا۔ یہ بات وہ مجھے پریشان نہ کرنے کے لیے چھپا رہی تھی۔ میں اُس کے پلنگ پر پہنچ گیا کیونکہ اُسے سُلانے کی ترکیب مجھے معلوم ہو گئی تھی۔

صبح ہوئی تو ابھی ہم نے ناشتہ بھی نہیں کیا تھا کہ کریم اپنی چچی کے ساتھ آ گیا۔ مفر کی کوئی صورت نہیں تھی۔ میں نے اُسے اندر بُلا لیا۔ چچی نے اندر آتے ہی کورا کی بلائیں لے لیں۔ پھر وہ دونوں رشتے داروں کی طرح گھُل مل گئیں۔ کورا کے لہجے میں ایک اٹک تھی۔ اُس باتونی عورت سے اُسے کچھ نہ کچھ بات تو کرنی ہی تھی۔ گو اُس نے بہت کم بات کی تاہم اُس کا لہجہ صاف غمازی کرتا تھا کہ اُس کا تعلق ادھر کے علاقوں سے نہیں ہے۔ ادھر کریم گل مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ وہ دونوں ہمیں دیکھ کے اور ہم سے مل کے بہت خوش ہوئے تھے۔ انھوں نے ہماری دوپہر کی دعوت کی۔ دوپہر کا کھانا ہوا پھر رات بھی ہوا۔ ایک دن میں وہ ہم سے اس قدر قریب ہو گئے کہ ہمارے درمیان بھید ہی نہیں رہا۔ میں کسی قدر مطمئن ہو گیا تھا۔ یہ لوگ بہت اچھے ثابت ہوئے تھے، غم خوار تھے، زیادہ کریدتے نہیں تھے، جو کچھ میں نے کہا، انھوں نے کسی چون و چرا کے بغیر اُس پر یقین کر لیا تھا۔ اس کے باوجود میں اُن سے تعلقات بڑھانے میں خاصا محتاط تھا۔ وہ خود اس قدر آگے بڑھ کے ہم سے پیش آئے کہ آدمی شرمندہ ہو جاتا ہے اور پھر ایسا آدمی جو محبت اور ہمدردی کی نظر کے لیے ترس رہا ہو۔ کل رات کورا کہہ رہی تھی، کیوں نہ ہم مر جائیں، تمام دُکھوں سے نجات مل جائے گی۔ میں نے اُسے جواب دیا تھا کہ محبت اور پیسے باقی ہیں اور چاقو بھی جیب میں موجود ہے۔ جب

تک ہم جائیں گے اور حوصلہ جواب دے جائے گا تو ہم اسی چاقو سے اپنا کام تمام کریں گے۔ آج رات ذرا حالت بدلی ہوئی تھی۔ سارا دن ہم نے کریم گل اور اُس کی چچی کی دل کش باتوں کے سائے میں گزارا تھا۔ چچی جان کو کورا اتنی پسند آ گئی تھی کہ وہ اُسے اپنے پاس ہی بٹھا کے رکھتی تھیں۔ انھوں نے ایک بار کورا کو پان بھی کھلا دیا۔ لالی اُس کے نازک ہونٹوں پر اتنی رچی کہ میں دیکھتا رہ گیا۔ اِس سُرخی کا عکس اُس کی صُراحی دار گردن سے بھی جھلکنے لگا تھا، جیسے اُس نے ہونٹوں پر مہندی لگائی ہو۔

دوسرے دن کریم گل کی چچی نے ہمیں مجبور کیا کہ ہم وکٹوریا میموریل، چڑیا گھر دیکھیں۔ چچی اور اُن کے بھتیجے کریم گل میں کوئی بیگانہ پن نہیں تھا۔ وہ زندگی کو زندگی کی طرح گزارتے تھے، خوب ہنستے تھے، خوب کھاتے تھے، خوب تفریحیں کرتے تھے، جب سے چچی دلّی سے آئی تھیں، کہتی تھیں: "بھتی کریم نے تو کلکتے کی ایسی سیر کرائی ہے کہ میں خواب میں بھی تصور نہیں کر سکتی تھی۔"

میں اُن کے سامنے بے بس ہو جاتا تھا۔ وہ اتنے چاؤ، حکم اور شفقت سے بات کرتے تھے کہ انکار کرنے کے لیے بہت سنگ دل اور غیر مہذب ہونا ضروری تھا۔ دوسرے دن بھی وہ ہمیں کلکتہ دکھاتے رہے۔ انھوں نے مجھے اپنی جیب سے ٹیکسی کا کرایہ بھی ادا نہیں کرنے دیا۔ چچی کورا سے ایسی پیوستہ ہو گئی تھیں کہ مجھے اُس سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔ مجھے اُن کی یہ قربت زیادہ پسند نہیں آئی۔ میں کورا کو کسی اور سے زیادہ قریب نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اُس رات کھانے کے بعد چچی کو اچانک سینما دیکھنے کی سُوجھی۔ بس اُن کے منہ سے بات نکلنے کی دیر تھی، کریم بھی سیر سپاٹے کا رسیا تھا، اُس نے چچی کی پُر زور تائید کی۔ مجھ سے کہا گیا۔ میں نے صاف انکار کر دیا کہ ہم سینما نہیں دیکھتے۔ چچی سے کون جیت سکتا تھا۔ میرے اور کورا کے شدید انکار کے باوجود انھوں نے ہمیں اُٹھا ہی لیا۔ وہی ہوا جو چچی چاہتی تھیں۔ کچھ دیر بعد ہم لائٹ ہاؤس سینما کے گیٹ پر کھڑے تھے۔ میری طبیعت مکدر تھی۔ چچی کورا کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں اور کریم مجھے کلکتے کی عمارتوں اور تفریح گاہوں کے بارے میں مسلسل کچھ نہ کچھ بتا رہا تھا۔ اتفاق سے گیٹ ہی پر اُن لوگوں کے ایک شناسا جوڑے سے ملاقات ہو گئی۔ عورت برقعے اوڑھے ہوئے تھی۔ مرد کا چہرہ درشت تھا۔ اُس کے سر کے بال گھٹے ہوئے تھے۔ اُس کے ہاتھ میں ایک کڑا بھی پڑا ہوا تھا۔ پہلی ہی نظر میں وہ شخص مجھے ناپسند ہوا۔ چچی نے بڑھ کے اُن سے میرا تعارف کرایا۔ عورت نے نقاب اُٹھا دی۔ اُس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ سُرخی پوڈر میں لپی ہوئی تھی۔ اُس کی ناک میں نتھ تھی اور لبوں پر ایک ایسی مسکراہٹ تھی جسے کوئی بھی نام دیا جا سکتا ہے۔ اُس نے کورا میں خاص طور پر دلچسپی لی اور سر سے پاؤں تک اُس کا جائزہ لیتی رہی۔

"ماشاء اللہ ہیرا ہے ہیرا۔" بے اختیار اُس کے منہ سے نکلا۔

بیگم نے ناگواری سے منہ بنایا۔ "یکی بی نظر مت لگاؤ، ہم نے اسے بیٹی بنا لیا ہے۔"

"مٹھائی کے بغیر؟" یکی بی نے ایک بے ہنگم قہقہہ لگایا، مجھے حیرت ہوئی کہ بھلا کوئی عورت بھی اس طرح قہقہہ لگا سکتی ہے؟

"مٹھائی تمھاری پکی۔" چچی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"پھر کب ارادہ ہے؟" یکی بی نے آنکھیں گھماتے ہوئے پوچھا۔

"جلد ہی۔" چچی نے شوخی سے کہا۔

اسی اثنا میں مرد کریم گل کا بازو پکڑ کے ایک طرف لے گیا۔ پھر وہ زور زور سے یہ باتیں کرتے ہوئے واپس آئے کہ ٹکٹ ہم لیں گے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کریم گل نے مجھے سُنانے کے لیے اپنی آواز بلند کی ہو۔ وہ سب ابھی تک مجھے نظر انداز کر رہے تھے اور کورا ہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ چچی نے اس ہجوم میں کورا کے شانوں پر بے تکلفی سے اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ میرے خون کی گردش تیز ہونے لگی۔ جی میں آیا کہ میں کورا کا ہاتھ تھام کے یہاں سے جتنی تیزی سے بھاگ سکتا ہوں، بھاگ جاؤں۔ سینما جانے کے لیے میں پہلے ہی کب تیار تھا۔ ان لوگوں کی باتیں سُن کے اور رویّے دیکھ کے مجھے خلجان ہونے لگا۔ درشت چہرے والا مرد ٹکٹ لے آیا تھا اور اُن سب کے قدم سینما ہال میں جانے کے لیے اُٹھ چکے تھے۔ میں اپنے ارادے کو عملی جامہ نہیں پہنا سکا۔ مجھے کورا کے پاس بیٹھنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ وہ اُن دونوں عورتوں کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی، پکچر شروع ہو چکی تھی، انٹرول ہوا تو چچی اور یکی بی کے قہقہے گونجنے لگے۔ میرا دھیان سینما کی طرف نہیں تھا۔ میں اُن دونوں کی سرگوشیاں سُن رہا تھا، وہ دونوں مرد رشتوں کی بات کر رہے تھے۔

جیسے تیسے میں نے وہ وقت گزار لیا۔ رات کو بارہ بجے پکچر ختم ہوئی۔ میں کریم گل کے بجائے کورا کے پہلو میں چلنے لگا۔ چلتے وقت یکی بی اور اُس کا شوہر رخصت ہونے لگے تو انھوں نے چچی سے کہا۔ "ہماری طرف سے بات پکّی سمجھو اور خیال رکھنا کہ فصل تیار ہونے میں دیر لگے گی۔ اس عرصے میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"اب تک یہی ہوا ہے۔" چچی نے یکی بی سے کہا۔ "بہرحال سوچ لو، تمھاری مرضی۔" پھر انھوں نے میری طرف دیکھ کے کہا۔ "میری زمین سے اچھی فصل کہیں نہیں ہوتی اور اس بار تو۔۔۔"

"ٹھیک ہے ہم سوچ کے جواب دیں گے لیکن جب تک ہم جواب نہ دے دیں تم کسی اور سے بات نہیں کرو گی۔"

"میں تمھارا انتظار کروں گی اور مجھے معلوم ہے تمھارا جواب کیا ہوگا۔"

یہ کہہ کے چچی آگے بڑھ گئیں۔ وہ دونوں دوسری سمت چلے گئے۔ میرے جسم میں آگ لگی ہوئی تھی۔ چچی میری خاموشی محسوس کر کے کہنے لگیں۔ "دلّی میں شاہدرے کے پاس ہماری بڑی زمین پڑی ہوئی ہے۔ کوئی اُس کی دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہے۔ کریم گل یہاں چلا آیا ہے۔ اِن کے ساتھ ہر سال سودا کرنا پڑتا ہے۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چچی تمام راستے فلم کی باتیں کرتی رہیں۔ انھوں نے اصرار کیا کہ آج رات کورا اُن کے پاس سوئے۔ کورا نے خود سختی سے منع کر کے میری مشکل آسان کر دی۔ رخصت ہوتے وقت انھوں نے کورا کی

پیشانی کا بوسہ لیا اور بلائیں لیں۔ کمرہ بند کرکے میں نے کورا کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر بھی اضطراب چھایا ہوا تھا۔ ہم نے جلدی جلدی تمام کپڑے سوٹ کیس میں ڈال لیے۔ اب یہاں ایک لمحے ٹھہرنا بھی مشکل ہوگیا تھا۔ احتیاطاً میں نے ایک گھنٹا گزار دیا۔ رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ میں نے دروازے سے جھانک کے دیکھا، ہوٹل پر پُراسرار خاموشی مسلط تھی۔ جیسے ہی دروازہ کھول کے نکلے، بیرے نے ہمیں حیرت سے دیکھا۔ میں نے اُس کے ہاتھ پر پانچ کا نوٹ رکھ کے اُس کا تجسس دُور کر دیا، وہ سوٹ کیس تھام کے نیچے دفتر میں آیا۔ دو روز کا باقی کرایہ ادا کرکے میں تیزی سے نیچے اُتر آیا۔ نیچے دربان کی حیرت بھی میں نے پانچ روپے ادا کرکے دُور کر دی۔ ٹیکسی ملنے میں دیر لگی تو ہم پیدل چل پڑے۔ رات کے وقت ایک بُرقع پوش عورت کے ساتھ سوٹ کیس ہاتھ میں لے کے چلنے کی دشواری کا مجھے اندازہ تھا۔ خوش قسمتی سے کچھ ہی دُور ایک ٹیکسی مل گئی۔ زائد کرائے کے لالچ میں وہ آمادہ ہوگیا۔ چاقو جیب سے نکال کے میں نے ہاتھ میں رکھ لیا تھا۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد ٹیکسی ڈرائیور نے اچانک مجھ سے کہا کہ ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ میں نے پیچھے کے شیشے سے مڑ کے دیکھا۔ ہم سے کچھ فاصلے پر تیز روشنیاں تھیں۔ جہاں جہاں گاڑی مڑتی تھی، وہ روشنیاں بھی مڑ جاتی تھیں۔ ٹیکسی ڈرائیور کی جیب میں کچھ روپے ٹھونس کے میں نے خوشامد کی کہ وہ گاڑی تیز بھگائے۔ میری نظریں عقبی شیشے کی طرف تھیں، گاڑی کی رفتار بہت تیز ہوگئی تھی۔ وہ علاقہ آگیا تھا جہاں مجھے اُترنا تھا۔ پچھلی گاڑی ایک موڑ پر نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ میں کورا کو لے کے تیزی سے اُترا اور جیب سے روپے نکال کے گنے بغیر ڈرائیور کو تھماتے ہوئے کہا کہ وہ گاڑی آگے بڑھا لے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ایک نظر ہم دونوں کو دیکھا پھر اُس نے حکم کی تعمیل کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ ہم کسی تاخیر کے بغیر ایک چھوٹی سی گلی میں رینگ گئے اور اندھیرے میں چھپ کر کھڑے ہوگئے۔ میں نے چاقو کا کھٹکا دبا کے اُسے برہنہ کر رکھا تھا۔ دو ایک منٹ بعد ہمارے پیچھے والی گاڑی کی روشنیاں سڑک پر نظر آئیں۔ گاڑی زن سے گزر گئی۔ ہم اُس تنگ گلی میں اور آگے بڑھ گئے۔

مدرسے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے زور زور سے پھاٹک پیٹا اور آوازیں لگائیں۔ ایک بوڑھے شخص نے کھانستے ہوئے اندر سے پوچھا "کون ہے؟" میں نے بلند آواز سے کہا "زماں! میں مولوی محمد شفیق کا مہمان ہوں۔ دروازہ کھولیے۔"

بوڑھے نے کھڑکی کھول کے ہمارے چہروں پر ٹارچ کی روشنی ڈالی اور اندر آنے کی اجازت دے دی۔ مولوی صاحب نے ایک ہی دستک پہ دروازہ کھول دیا اور ہمیں دیکھ کے حیرت زدہ رہ گئے "آؤ۔ اندر آجاؤ۔" انھوں نے سکون سے کہا۔

ہم دونوں سر جھکائے ہوئے اندر داخل ہوگئے "کہاں رہے؟" انھوں نے چارپائی پہ بیٹھتے ہوئے کہا۔ اُن کے ٹھنڈے لہجے میں شدید ناراضی چھپی ہوئی تھی۔

"ہمیں معاف کر دیجیے مولوی صاحب! خدا کے لیے ہمیں معاف کر دیجیے۔ ہم نے آپ کو ناراض کیا لیکن ہم نے بہت سے جھوٹ بولے تھے۔ اُن کے خوف سے ہم چلے گئے تھے۔ آپ کے سوا اس شہر میں ہمیں کوئی آدمی نہیں آیا اس لیے ہم آپ کے پاس آگئے ہیں۔ اب آپ جو بھی چاہیے سزا دیں ہمیں معاف کر دیجیے۔ اب ہم یہاں سے کہیں نہیں جائیں گے۔ آپ ہمیں ... میں لے لیجیے، آپ ہمیں اپنا غلام سمجھ لیجیے۔ ہم آپ کی خدمت کریں گے، اپنے ساتھ مرادآباد لے چلیے۔ ہم قسم کھاتے ہیں کہ آپ کو دُکھ نہیں پہنچائیں گے"

"سکون، اطمینان ... معلوم ہوتے ہو۔" مولوی صاحب ہاتھ اُٹھا کے میری تیز زبان قابو میں کی۔

"کورا! تم مولوی صاحب سے پردہ مت کرو، نقاب اُٹھا دو۔" کورا نے نقاب اُٹھا دی اور جھجکتے ہوئے اُن سے معافی مانگنے لگی۔

"ارے تم اتنی چھوٹی ہو؟" مولوی صاحب پر حیرت طاری تھی، وہ کورا کو تعجب سے دیکھنے لگے۔

"اب میری سُن لیجیے۔ میں آپ سے بالکل جھوٹ نہیں بولوں گا۔ ایک جھوٹ نہیں کہوں گا، اس کے بعد آپ جو چاہیں فیصلہ کر دیجیے گا۔ ہمیں ... دے کے گھر سے نکال دیجیے یا ہمارا گلا گھونٹ دیجیے۔" میں نے جذباتی لہجے میں کہا "یہ لڑکی جیسے آپ دیکھ رہے ہیں، یہ ایک غیر مسلم لڑکی ہے۔ اس کا نام ..."

میں نے شروع سے آخر تک تمام روداد انھیں سُنا دی۔ میں نے ... کا مندر اور جواہر کا واقعہ ذکر نہیں کیا جو ہمارے گھر میں رکھے ہوئے تھے۔ نہیں بتایا کہ وہ تبت کے قبیلے جانگ کی جائز سردار ہے۔ میں نے ذرا ... مناسب سمجھی اور یہ کہا کہ کورا ایک سردار کی لڑکی ہے۔ نیا سردار اس کی کم عمری کے باوجود اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس کا اتالیق اجین اس کے باپ کی موت کے بعد اس کی سرپرستی کرتا تھا۔ وہ اسے لے کے ہندوستان چلا آیا۔ نئے سردار نے ان دونوں کے پیچھے آدمی لگا دیے تھے۔ ان آدمیوں نے یہاں اجین کو قتل کر دیا اور کورا ہمارے گھر بھاگ آئی۔

مولوی صاحب نے ایک ایک بات توجہ سے سُنی "تمھیں یہاں ... ہوتے تو کسی نے نہیں دیکھا؟ میری مراد اُن لوگوں سے ہے جو تمھارا ... کر رہے تھے۔"

"نہیں"۔ میں نے جواب دیا پھر مدرسے کے دروازے تک پہنچنے کی تفصیل سے اُنھیں سُنایا "ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں ... اپنے شہر لے چلیے۔ وہاں کچھ بھی کہہ دیجیے گا۔ میں وہاں کام کروں گا، آپ پر بوجھ ہرگز نہیں بنوں گا۔ کورا کے لیے میں سب کچھ کروں گا، مزدوری کروں گا، ... ڈھوؤں گا۔ ہمیں صرف رہنے کے لیے جگہ چاہیے۔"

مولوی صاحب چند لمحوں تک خاموش رہے۔ اُن کی یہ خاموشی ہم پر گراں گزری۔ ہم عدالت میں کھڑے ہوئے تھے اور اُن کا فیصلہ سُننے کے منتظر تھے۔ انھوں نے اچانک اپنے دونوں بازو وا کیے اور کھڑے ہوگئے۔ انھوں نے ہم دونوں کو سینے سے لگا لیا "بابر! کورا!" انھوں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا "اچھا ہوا کہ تم دونوں واپس آگئے۔ تم نے کوئی گناہ نہیں کیا، البتہ غلطی ضرور کی ہے۔ خیر غلطی آدمی ہی سے ہوتی ہے اور تم تنہا بھی ... جو غلطی ہوگئی اُسے بھول جاؤ، وہ ماضی کا حصہ بن گئی۔ تم نے اس چھوٹی عمر میں بڑی جرأت کا ثبوت دیا۔ اب تم فکروں سے بے نیاز ہو جاؤ۔ میں تمھاری دیوار ہوں، میں تمھارا گھر ہوں۔"

"مولوی صاحب!" ہم سے کچھ نہیں کہا گیا۔ بس ہماری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ اُس رات ہم کوئی چار بجے سوئے۔ اطمینان اور سکون کی نیند۔

❤

میں اب اُس شہر میں ایک پل بھی ٹھہرنے کا حامی نہیں تھا مگر مولوی صاحب نے تین دن بعد جانے کا پروگرام بنایا۔ انھیں کچھ کام نمٹانے تھے، اور اُن کا خیال تھا کہ جب ہم کلکتے آئے ہیں تو اُن کے ساتھ کچھ سیر و تفریح بھی کرلیں۔ اب وہ لمحے لمحے ہماری خیر خبر پوچھنے لگے۔ انھوں نے ہمیں خوب سیر کرائی۔ کبھی اِدھر لے جاتے ہیں، کبھی اُدھر۔ صرف دو دنوں میں انھوں نے ہمارے تمام خوف اور دُکھ دھو دیے۔ کورا بھی اُن کی خوب خدمت کرتی رہی۔ کورا کو مولوی صاحب کی شکل میں اجین بابا مل گئے تھے۔ ان دو دنوں کا پتہ ہی نہیں چلا۔ انھوں نے میرے اور کورا کے لیے نئے نئے کپڑے خریدے، چادریں خریدیں، گھر کا کچھ سامان لیا، پھر آخری رات کو دریا کا منظر دکھانے کے لیے لے گئے۔ میں جہاں جہاں گیا، اُن سے سنسان مقامات پر بیٹھنے کے لیے زور دیتا رہا۔

دریا کے ایک خاموش کنارے پہ بیٹھے ہوئے تھے۔ رات کا کھانا ساتھ لے گئے تھے سو ہم نے وہیں کھایا۔ منظر ایسا دلکش تھا کہ اُٹھنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ رات گہری ہوگئی تھی۔ ابھی ہم کنارے کنارے چل رہے تھے۔ مولوی صاحب سب سے آگے، کورا اُن کے پیچھے، میں کورا کے پیچھے۔ یکا یک سامنے سے ہمیں چار آدمی آتے ہوئے نظر آئے۔ آناً فاناً اُن میں سے ایک نے بڑھ کے مجھے اس زور کا ہاتھ مارا کہ میں اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا اور زمین پر گر پڑا۔ پھر کورا کی ہلکی سی چیخ بلند ہوئی اور معدوم ہوگئی۔ مولوی صاحب نے شور مچا دیا۔ دو آدمی کورا کو اٹھا کے ایک طرف بھاگے۔ تیسرا مجھ پر جست لگانے کے لیے بڑھا۔ میں نے چاقو کھول لیا تھا۔ چاقو اُس کے پیٹ میں اُتر گیا۔ اُس کی ایک کرب ناک چیخ اُبھری۔ میں اُس کے جسم سے چاقو کھینچ کے دیوانوں کی طرح آگے بڑھا۔ جو شخص مولوی صاحب سے زور آزمائی کر رہا تھا میں نے پیچھے سے اُس کی پیٹھ میں چاقو اُتار دیا تھا۔ مولوی صاحب آزاد ہو کے اُن لوگوں کی طرف بے تحاشا بھاگ رہے تھے کیونکہ وہ لوگ کورا کو لیے ہوئے اندھیرے میں آگے بڑھ رہے تھے۔ مولوی صاحب بچاؤ بچاؤ کی آوازیں لگا رہے تھے۔ مجھے دوسرے شخص کی پشت سے چاقو نکالنے میں دیر ہوگئی کیونکہ چاقو اُس کی کمر میں پورا نہیں اُترا تھا۔ اُس نے دہاڑتے ہوئے مجھے دبوچ لیا۔ مجھ سے کچھ اور نہ بنا تو میں نے اُس کے ہاتھ میں کاٹ لیا۔ وہ بلبلاتا ہوا پیچھے ہٹا تو میری ایک لات نے اُسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ پشت کے بل گرا، چاقو زمین پر پڑا تھا۔ اُسے اُٹھا کے میں نے اُس کی پسلی میں اُتار دیا اور ... ہی وار پر بس نہیں کیا، کئی جگہ سے اُس کا پیٹ چاک کر ڈالا۔ پھر میں نے آگے کی طرف دیکھا۔ وہ لوگ اندھیروں میں گم ہوگئے تھے۔ مولوی صاحب بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں خون میں تر بتر تھا۔ میں اندازہ لگا کے تیزی سے اُس سمت بھاگا جہاں مولوی صاحب بھاگتے ہوئے نظر آئے تھے۔ دفعتاً ایک شخص نے میرے پیروں پر ٹانگ مار دی۔ میں اوندھے منہ گر پڑا۔ میں نے نظر اُٹھا کے دیکھا، وہ کانسٹیبل تھا۔ اُس نے تیز سیٹی بجائی پھر چاروں طرف سیٹیاں بجنے لگیں اور جب میں نے نظر اُٹھا کے دیکھا تو میں ہر طرف سے گھرا ہوا تھا۔ میں نے اطمینان کی سانس لی کہ چلو قصہ ختم ہوا، کانسٹیبل میرے پاسبان آگئے تھے۔ کورا کو لینے بڑا آگئے۔

اُن میں ایک اور کانسٹیبل کا اضافہ ہوگیا۔

پہلے کے تین کانسٹیبل میرے ہاتھ میں چاقو دیکھ کے مجھے قابو میں کرنے کی فکر میں تھے۔ آنے والے کانسٹیبل نے آتے ہی میرے شانے پر اپنے وزنی بوٹ سے ٹھوکر ماری، میں یہ ٹھوکر برداشت نہ کر پایا لیکن اُدھر بہت دُور سے کہیں کورا کی چیخ سنائی دی۔ میں نے پھر اُن کے حصار سے نکلنے کے لیے پر تولے۔ کانسٹیبل نے دوسری ٹھوکر کے لیے پیر اُٹھایا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے بے دم کر دیتا، میں نے اُس کی ٹانگ پکڑ لی۔ وہ بے توازن ہو کے زمین پر گر پڑا۔ دوسرا کانسٹیبل چیختا ہوا میری طرف جھپٹا تو میرا چاقو اُس کے پیٹ میں کمر تک اُتر گیا، پھر مجھے سنبھلنے کی مہلت نہیں ملی۔ میں چاقو نکالنے کی کوشش میں تھا کہ اُنھوں نے مجھے اپنے بازوؤں کے شکنجے میں جکڑ لیا۔ میری فریادوں اور چیخ پکار پر اُن کی گرفت اور سخت ہوگئی اور کسی نے پیچھے سے میری کمر میں اس زور کا گھٹنا مارا کہ میں بلبلاتا ہوا زمین پر اوندھے منہ گر پڑا۔ میں کچھ دیر زمین پر تڑپا لیکن پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔ میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

آنکھ کھلی تو میں ننگی اور کھردری زمین پر پڑا ہوا تھا۔ سارے جسم میں ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ کروٹ بھی نہیں بدلی جاتی تھی۔ سر کے بال کیچڑ اور خون میں سنے ہوئے تھے۔ شیروانی پر سفیدی برائے نام رہ گئی تھی۔ ہر طرف خون کے دھبے تھے، ہاتھوں پر، چہرے پر، پیروں پر خون ہی خون جما ہوا تھا۔ کمرے میں ایک مدھم سی روشنی کا بلب ٹمٹما رہا تھا اور آہنی سلاخوں کے پیچھے دو مسلح سنتری پہرا دے رہے تھے۔ میری آہٹ پر اُنھوں نے غور سے میری طرف دیکھا جیسے میں کوئی پاگل کتا ہوں، اُن کی آنکھوں میں نفرت اور حقارت تھی "جاگ گیا، جاگ گیا، حرامی بچہ۔" انھوں نے صدا لگائی۔

اُن کے صدا لگانے کی دیر تھی کہ سلاخوں پر بہت سے سپاہیوں کا اجتماع ہوگیا، وہ سب حیرت اور غصے سے مجھے گھور رہے تھے۔ کسی کی نظر میں ہمدردی نہیں تھی۔ طرح طرح کی گالیاں دی جا رہی تھیں۔ میری ماں اور بہن کے متعلق شرم ناک تبصرے ہو رہے تھے۔ "سالا شکل سے کیسا معصوم نظر آتا ہے۔"

"ایک دم دس نمبری ہے۔ ابھی اس کی عمر تو دیکھو۔"

"چڑھ جا بیٹا سولی پر، رام بھلی کریں گے۔"

یہ سب آوازیں میرے کانوں میں چبھ رہی تھیں۔ میرا رُواں رُواں لرزنے لگا۔ میں نے دل کو تسلی دی کہ یہ تو ایک ڈراؤنا خواب ہے۔ ابھی

آنکھ کھل جائے گی اور میں اپنی دنیا میں واپس آجاؤں گا۔ میں نے دہشت سے زمین پر ہاتھ پاؤں مارے مگر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ حالات کی سختی اور کھردری زمین سے میری جلد چھل گئی۔ ان کی ہنسی نکل گئی "یہ سالا بالکل جنگلی ہے۔"

میں نے اپنا سر گھٹنوں میں دے دیا اور کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

پھر اچانک ان کی زبانوں پر فالج گر گیا۔ ایک بھاری بھرکم آواز نے ڈپٹ کر انھیں سلاخوں سے دور ہونے کا حکم دیا۔ میں نے دزدیدگی سے سر اٹھا کے دیکھا۔ پولیس کی وردی میں ملبوس لمبے قد کا ایک شخص مجھے زہریلی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ کوئی انسپکٹر ہوگا۔ "اسے باہر لاؤ۔" اس نے درشتی سے سنتری کو حکم دیا۔

سنتری دروازہ کھول کے دروازے ہی پہ کھڑا رہا۔ "چل بے، صاحب بلا رہے ہیں۔" اس نے مجھے نفرت سے مخاطب کیا۔ میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ مجھ میں کھڑے ہونے کی بھی ہمت نہیں تھی "اٹھتا ہے یا نہیں، یا دماغ ٹھکانے لگا دوں؟" میں نے کسمسا کے اٹھنا چاہا مگر اٹھ نہ سکا۔ "سالا ان رہا ہے۔"

"تم اسے اٹھا کے سیدھے میرے پاس لاؤ۔" انسپکٹر نے شاید میری مخدوش حالت کا اندازہ لگا لیا تھا "خبردار اسے کوئی ضرب نہ پہنچانا۔ بہت احتیاط سے دفتر میں پہنچاؤ۔"

سنتریوں کو نرمی اور احتیاط کا مشورہ دیا گیا تھا مگر انھوں نے مجھے کسی جانور کی طرح گھسیٹا۔ مجھ سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ میں اٹھا تو میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ مجھے کھینچتے ہوئے دروازے کے پاس لاتے۔ اس وقت میرے ذہن میں اپنی ٹیسوں اور کراہوں کے احساس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں دو قدم چلا ہوں گا کہ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور میں گرتے گرتے بچا۔ میری آمد پر کوٹھری سے باہر بیٹھے ہوئے سپاہیوں میں انتشار سا پیدا ہوا۔ مجھے ایک مختصر تنگ راستے سے گزار کے انسپکٹر کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں پہلے ہی دو کالے پولیس افسر بیٹھے ہوئے تھے۔ "اسے پانی پلایا؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"ابھی نہیں جناب! یہ ابھی تو جاگا ہے۔" سپاہی نے جواب دیا۔

"کیا یہ بیان دینے کے قابل ہے؟" دوسرے پولیس افسر نے پوچھا۔

"دیکھ لیتے ہیں۔"

میں نے پوری طرح بیدار ہونے اور منتشر اعصاب یکجا کرنے کی کوشش کی۔ بیان؟ کس بات کا بیان؟ میں نے دو آدمیوں اور ایک کانسٹیبل کو ہلاک کر دیا ہے۔ اس کے بعد بھی بیان کی ضرورت ہے؟ یہ مجھ سے میرا نام، خاندان، پتہ اور پوری کہانی پوچھیں گے۔ میں انھیں کیا بتاؤں گا؟ کیا سارا واقعہ سچ سچ بتا دوں؟ انسپکٹر نے کاغذ اور قلم سنبھال لیا تھا۔ اب مجھ سے سوالات کیے جائیں گے۔ مجھے کیا جواب دینا چاہیے۔ پتہ نہیں، رات کیا ہوا؟ مولوی صاحب کا کیا حشر ہوا؟ کورا کہاں گئی؟ میں انھیں کس طرح کا بیان دوں؟ "تمہارا نام؟" انسپکٹر نے کسی قدر نرمی سے پوچھا۔

میں خاموش رہا۔ ایک سپاہی نے مجھے جھنجوڑ کر کہا "صاحب پوچھتے ہیں۔ سیدھے کھڑے ہو۔"

میں نے ویران نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا "میرا نام... ظہیر خاں ہے۔" میری لرزتی ہوئی آواز ابھری۔

"ظہیر خاں۔" اس نے دہرایا۔ "باپ کا نام؟"

"حسن خاں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"پتہ؟"

"میرا کوئی پتہ نہیں۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"تمہارا گھر کہاں ہے؟" کانسٹیبل نے مجھے ٹہوکا مار کے پوچھا۔

"گھر؟" میں نے آہستگی سے کہا "میرا کوئی گھر بھی نہیں ہے۔"

"تم کلکتے کب آئے؟" انسپکٹر کے بائیں جانب بیٹھے ہوئے افسر نے دلچسپی سے پوچھا۔ "دیکھو میاں صاحب! تم نے رات میں سب کچھ صاف صاف بتا دو۔ تمہارا یہ پہلا بیان بہت اہم ہوگا۔ نہیں، کھل کر بات کرو۔ تم کلکتے کب آئے؟"

"بہت دن ہو گئے۔" میں نے بے خیالی کے انداز میں کہا۔

"یہاں کہاں رہتے تھے؟" انسپکٹر کو میرے جوابات پر غصہ لگا تھا۔ "کہیں نہیں، نہیں ادھر ادھر۔" میں نے بے چارگی سے کہا۔

"صاحب اس طرح یہ نہیں بولے گا۔ اگر حکم ہو تو اس کی زبان کا انتظام کروں؟" کانسٹیبل نے میرے بازو پر گرفت سخت کرتے ہوئے کہا۔

"تم چپ رہو۔" انسپکٹر نے ڈانٹ کر کہا۔ "ہاں ظہیر خاں! اس سے پہلے تم کس شہر میں تھے؟"

"میں کسی ایک شہر میں نہیں رہتا، گھومتا رہتا ہوں۔" میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ مولوی صاحب کے بارے میں کچھ پوچھتے یا

"ماں باپ زندہ ہیں؟"

"مر گئے۔" میں نے کرب سے کہا۔

"کوئی عزیز رشتے دار؟"

"سب مر گئے۔ مجھے کچھ پتہ نہیں۔"

"ہونہہ۔" انسپکٹر نے اپنے ساتھی پولیس افسروں کی جانب دیکھ کر منہ بنایا۔ "شاید کانسٹیبل کے مشورے پر عمل کرنا پڑے گا۔"

"نہیں۔" افسر نے سختی سے منع کر دیا۔ "اس کی حالت پہلے ہی خراب ہے۔" اس نے انگریزی میں کہا۔ "میرا خیال ہے ہمیں زیادہ الجھن کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایک صاف مقدمہ ہے۔ مطلب کی بات پوچھو۔" وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "کچھ پڑھنا لکھنا جانتے ہو؟"

میں جواب دینے میں ہچکچایا "نہ جاننے کے برابر۔"

"یہ چاقو کس کا ہے؟" اس نے میرا چاقو لہرا کے کہا۔

"میرا ہے۔" میں نے نقاہت سے جواب دیا۔

"اور یہ موتیوں کی مالا؟" اس نے میری آنکھوں کے سامنے مالا گھماتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی میری ہے۔"

"چرائی ہے؟" وہ مسکرا کے بولا۔

"جی نہیں، یہ میری ماں کی نشانی ہے۔"

"ماں کہاں ہے؟"

"ماں بھی مر گئی۔" میں نے کانپتے ہوئے کہا۔

"کب؟ کہاں؟"

"لکھنؤ میں۔" میرے ذہن میں یہی نام آیا۔

"تو گویا تم لکھنؤ سے تعلق رکھتے ہو؟"

"جی نہیں۔ میری ماں کو مرے ہوئے بہت برس ہو گئے ہیں۔ اس وقت میں بہت چھوٹا تھا۔ مجھے کچھ کچھ یاد پڑتا ہے کہ وہ لکھنؤ شہر میں مری تھیں۔ ہم دونوں ریل میں سفر کر رہے تھے۔ کوئی چور سامان میں یہ مالا دیکھ کے ہمارے پیچھے پڑ گیا، چنانچہ ماں نے احتیاطاً اسے میرے گلے میں بنیان کے نیچے چھپا دیا۔ اس کے بعد میں ریل میں سو تا رہ گیا اور اٹھا تو ماں نہیں تھی اور وہ چور بھی نہیں تھا۔ میں نے ماں کو بہت تلاش کیا۔ اس کا کہیں پتہ نہیں چلا۔"

"ماں کو چور لے گیا؟" انسپکٹر نے ہنس کر کہا۔

"انسپکٹر صاحب!" میں اپنی پوری توانائی سے چیخ پڑا۔ "تمہاری بھی کوئی ماں ہوگی۔ مجھے چاہے جتنا برا کہو، میری ماں کے بارے میں ایک لفظ نہ کہنا ورنہ میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ کسی مجبور کی مجبوری کا مذاق مت اڑاؤ۔ میں تمہارے سامنے ایک مجرم کی طرح کھڑا ہوں لیکن میری بھی ایک ماں تھی۔"

"کیس دلچسپ ہوتا جا رہا ہے، خاصا تیز لڑکا ہے۔ اچھی داستان سناتی ہے۔" پولیس افسر نے انگریزی میں تبصرہ کیا۔ "پھر تم یہ مالا لیے شہروں شہروں گھومتے رہے ہو؟" میں نے جواب نہیں دیا، گردن جھکا لی۔

"اچھا ظہیر خاں!" انسپکٹر نے سرد لہجے میں پوچھا۔ "رات کیا واقعہ پیش آیا تھا؟"

"کچھ نہیں، بس میری قسمت خراب تھی۔"

"وہ تو ہے لیکن ہمیں اس کاغذ پر کچھ لکھنا ہے اور عدالت میں پیش کرنا ہے، تم چاہو تو سوچ سکتے ہو۔" ابھی تک انھوں نے مولوی صاحب اور کورا کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ مجھ سے ضرور سوال کرتے۔ میں نے چند لمحوں میں ہزاروں باتیں سوچیں۔ کاش مجھے جواب دینے سے پہلے یہ معلوم ہو جاتا کہ ان دونوں پر کیا گزری؟ میں دو آدمیوں کے قتل سے انکار کر سکتا تھا۔ انکار کرنے میں کیا حرج ہوتا لیکن کانسٹیبل کے قتل کے تین چشم دید گواہ موجود تھے اور مقتول کانسٹیبل کے پیٹ سے جو چاقو برآمد ہوا تھا، اس سے صاف ظاہر تھا کہ ریت پر آگے پیچھے انھیں جو دو لاشیں پڑی ہوئی ملی تھیں، وہ بھی اسی سے شکار کی گئی ہوں گی۔

وہ وجہ جاننا چاہتے تھے۔ میں انھیں کیا وجہ بتاتا۔ مجھے خاموش دیکھ کے انسپکٹر نے غضب ناک آواز میں کہا "ہمارے سوال کا جواب دو۔"

"میں" میں نے اٹک اٹک کر کہا "میں دریا کے کنارے بیٹھا ہوا تھا کہ دو آدمیوں نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے اپنے بچاؤ کے لیے ان پر جوابی حملہ کر دیا۔"

"کیا تم انھیں پہلے سے جانتے تھے؟"

"نہیں۔ میں نے ان کی شکل کبھی نہیں دیکھی تھی۔"

"وہ تم سے کیا چاہتے تھے؟"

"پتہ نہیں۔" میں نے سادگی سے جواب دیا۔

"کیا انھوں نے تمھیں چھیڑا تھا؟" انسپکٹر نے مسکرا کر کہا۔

"انھوں نے آتے ہی مجھ پر حملہ کر دیا۔ شاید وہ میری مالا مجھ سے چھین لینا چاہتے تھے۔" میرے لہجے میں تلخی آگئی۔

"انھیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ تمہارے پاس ایک قیمتی مالا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"اور انھوں نے کیا کیا؟"

"انھوں نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈالا۔ ایک نے میرے گال پر مکا مارا۔ میں نے چاقو دکھایا مگر وہ نہیں مانا۔"

"تم اعتراف کر رہے ہو!" پولیس افسر نے کہا۔

"میں سچ بیان کر رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ جھوٹ کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔" میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"اور دوسرا آدمی؟ وہ تو پہلے آدمی سے خاصی دور مرا ہوا پایا گیا تھا؟" انسپکٹر نے تجسس سے پوچھا۔

"جب میں نے بھاگنے کی کوشش کی تو دوسرے آدمی نے میرا تعاقب کیا، پھر میں نے اسے بھی مار دیا۔"

"اور کانسٹیبل؟"

"مجھے معلوم تھا کہ مجھ سے دو آدمیوں کا خون ہو چکا ہے۔ میں بھاگنا چاہتا تھا کہ کانسٹیبل نے میرا راستہ روک لیا؟" یہ کہہ کے میں خاموش ہو گیا۔

"کچھ اور پوچھنا ہے؟" انسپکٹر نے پولیس افسر سے پوچھا۔

"بظاہر کافی ہے لیکن صرف خانہ پری کے لیے۔ مجھے یہ معاملہ پیچیدہ نظر آ رہا ہے۔" پولیس افسر نے انگریزی میں کہا۔ "میں نہیں سمجھتا کہ اس تیز لڑکے نے جو بیان دیا ہے، وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ بہرحال اس نے اعتراف کر لیا ہے۔ ہمیں اپنے طور پر تفتیش جاری رکھنی چاہیے۔ کیا یہ معلوم ہوا کہ باقی دو مقتول کون تھے؟"

"نہیں۔ ابھی ان کے بارے میں کوئی پتہ نہیں چلا۔"

"اس لڑکے کی زبان اور لہجہ صاف ہے۔ تم نے اس خاص بات پر توجہ دی؟" پولیس افسر نے پوچھا۔

"ترجمہ تو ابھی بہت سی باتوں پر دینی ہے، میرا خیال ہے، ہمیں آج صبح اسے عدالت میں پیش کرنے کے لیے خاصی معلومات حاصل ہو گئی ہیں۔"

"اسے خاص سنتریوں کی حفاظت میں رکھا جائے۔ پولیس میں اشتعال پھیلا ہوا ہے۔" پولیس افسر نے کہا۔

"اس مالا کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟" انسپکٹر نے دریافت کیا۔

"میں سمجھتا ہوں، یہ ایک بیش قیمت مالا ہے۔"

"مجھے تو نقلی نظر آتی ہے، ذرا غور سے دیکھو۔" انسپکٹر نے اُسے افسر کی طرف اُچھال کے کہا۔

افسر نے گھما پھرا کے مالا کا جائزہ لیا اور انسپکٹر کی طرف دیکھا۔ انسپکٹر کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ پھر پہلے افسر نے مالا دوسرے افسر کی طرف بڑھا دی۔ "کیا خیال ہے؟"

"یہ قتل کا کیس ہے۔" اُس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "ہمیں یہ مالا فوراً سیل کر دینی چاہیے۔ اس سے پہلے کہ....."

"تمھاری رائے صحیح ہے۔" انسپکٹر نے بات اُس کی زبان سے اور مالا اُس کے ہاتھ سے تقریباً چھین لی اور لفافے میں بند کر کے اُسے سیل کر دیا۔ لفافے پر تینوں پولیس افسروں نے دستخط کیے اور اسے ایک الماری میں مقفل کر کے الماری بھی سیل کر دی گئی۔ "تم کچھ اور کہنا چاہتے ہو؟" انسپکٹر نے گرج دار آواز میں مجھے مخاطب کیا۔ "ورنہ ہم تمھیں تمھارے اس ابتدائی بیان کے بعد عدالت میں پیش کر دیں گے؟"

"مجھے کچھ اور نہیں کہنا۔" میں نے مایوسی سے جواب دیا۔

میری اُنگلیوں کے نشانات لے کے مجھے پھر حوالات کی کوٹھری میں پھینک دیا گیا۔ صبح کی روشنی پھیل چکی تھی۔ میں ایک کونے میں سر جھکا کے بیٹھ گیا۔ میں نے تھانے اور حوالات کے بہت قصے سُنے تھے اور بہت کہانیاں پڑھی تھیں۔ میں گیا میں روزانہ تھانے کی عمارت سے گزرتا تھا لیکن اندر سے تھانا کبھی نہیں دیکھا تھا اور میری کسی پولیس والے سے بھی دوستی نہیں تھی، محلّے کا ایک شخص پولیس میں ملازم تھا۔ مجھے اُس کے چہرے سے ڈر لگتا تھا۔ گیا کے ایک معزز گھرانے کا چشم و چراغ اس وقت حوالات میں بیٹھا تھا۔ ایک ہفتے میں کیا سے کیا ہو گیا۔ تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ یہ دن دیکھنا نصیب ہو گا۔ اگر کسی طرح ابّا اور امّی کو خبر ہو گئی کہ اُن کا بیٹا قاتل ہو گیا ہے تو اُن دونوں کی حرکتِ قلب بند ہو جائے گی۔ کمزور ٹانگوں سے اتنی تیز دوڑنے کا یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ اب پچھتانے کا کیا موقع ہے۔ میں نے اعتراف کر لیا ہے اور مجھے قتل کی سزا ابھی معلوم ہے۔ کاش سزا پانے سے پہلے مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ کورا محفوظ ہاتھوں میں پہنچ گئی ہے۔ کاش ایسا ہی ہو، ورنہ میری رُوح بے چین رہے گی۔ میں نے اپنی دانست میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ میں نے تو مولوی صاحب کو منع کیا تھا کہ وہ رات کے وقت دریا کے کنارے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیں، حالات ٹھیک ہو جائیں گے تو بہت سے دریاؤں کے کنارے جا کے سیر کریں گے مگر مولوی صاحب نے ضد کی اور مجھے یہاں جہنم میں پھنسا کے نہ جانے کدھر چلے گئے۔

ممکن ہے، مولوی صاحب کے ساتھ بھی کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو، وہ تنہا دو بدمعاشوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اگر وہ صحیح و سلامت ہیں تو مجھے ضرور پوچھنے آئیں گے، شاید آ جائیں یا شاید نہ آئیں جب انھیں یہ معلوم ہو گا کہ میری گردن پر تین آدمیوں کا خون ہے تو وہ وہاں میرا رشتہ پڑھ لیں گے اور کسی اُلجھن سے بچنے کے لیے میری خیر خبر لینے نہیں آئیں گے اور اگر وہ کورا کو غنڈوں کے قبضے سے آزاد کرانے میں کامیاب ہو گئے ہیں، جس کا امکان بہت کم ہے، تو بھی وہ ادھر نہیں آئیں گے۔ انھیں سارا معاملہ معلوم ہے، وہ مجھ سے کسی طرح اپنا تعلق ظاہر کرنا نہیں چاہیں گے پھر پولیس اُن کے سُراغ میں لگ جائے گی اور کورا تک پہنچ جائے گی۔ مولوی صاحب کا نہ آنا ہی بہتر ہے، وہ بے چارے میری وجہ سے کیوں اُلجھن میں پڑیں۔

علی الصباح سنتری مجھے انسپکٹر کے کمرے میں لے جا رہے تھے۔ میرا جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا لیکن اب کسی زخم کا احساس نہیں تھا۔ مردہ آدمی کو زخم کہاں ستاتے ہیں۔ میں نے شیروانی اُتار کے دُور پھینک دی۔ حوالات کی کوٹھری سے بھی اجنبیت ختم ہوتی جا رہی تھی، ایک سنتری نے سلاخوں سے پانی کا گلاس اندر کر دیا۔ "منہ دھو لے۔" اُس نے حقارت سے کہا۔

منہ کس کے لیے دھوؤں؟ سنتری اور تھانے دار کے لیے؟ میں نے گلاس لے کے وہیں دو تین چھینٹے منہ پر مارے اور کُرتے سے پانی پونچھ کے پھر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ سنتری نے پھر ایک گلاس چائے سلاخوں سے میرے ہاتھ میں تھما دی، شکر میں کالا پانی گھول دیا گیا تھا۔ کبھی گلاس میں چائے نہیں پی تھی مگر کبھی حوالات میں بھی نہیں رہا تھا۔ صبر و شکر کر کے ایک گھونٹ بھر کے حلق سے اُتار لی۔ گھر یاد آنے لگا۔ بہنیں، بھائی، ابّا، امّی اور کورا۔ نہ جانے کورا پر کیا گزری ہو گی؟ میں نے اُسے دُکھ ہی دُکھ دیے۔ مجھے بے اختیار رونا آ گیا۔ سنتریوں نے بھی میری ہچکیوں کی آواز سن لی۔ آنسو ایسے اُمڈ اُمڈ کے آتے کہ یہ خبر ہی نہیں ہوتی کہ کون دیکھ رہا ہے اور کون ہنس رہا ہے۔ مجھ پر غشی طاری ہو گئی۔ پھر میں اپنے حال سے بیگانہ ہو گیا۔

سنتریوں نے اندر آ کے مجھے جھنجوڑا تو مجھے اپنا پتہ چلا۔ "چلو عدالت میں چلنا ہے۔" سنتری کی آواز میں پہلے جیسی گرج نہیں تھی۔ "رو تا کیوں ہے؟ چل اُٹھ۔" اُس کے ہاتھ میں ہتھکڑیاں تھیں۔ میں نے ہاتھ آگے کر دیے۔ وہ خاصی وزنی ہتھکڑیاں تھیں۔ تھانے کی چار دیواری میں کھڑی ہوئی بند گاڑی کے قریب مجھے دوسرے نئے سپاہیوں کے سپرد کر دیا گیا اور اُنھوں نے مجھے گاڑی میں ٹھونس دیا۔

کوئی ایک میل راستہ طے کیا ہو گا کہ میرے پہلو میں بیٹھے ہوئے ایک بڑے سپاہی نے تاسف سے کہا۔ "کیا کر لیا بھئی؟ صورت شکل سے تو تو بُرا آدمی نہیں لگتا ہے؟"

میں نے ایک سرد آہ بھری۔ "کیا تم خاموش نہیں رہ سکتے؟"

"تیری مرضی بھئی، تجھ پر ترس آتا ہے۔" سپاہی نے ہمدردی سے کہا۔ "میں نے اپنی پوری زندگی میں اتنا کم عمر قاتل نہیں دیکھا۔"

میری خاموشی پر سپاہی بھی چپ ہو گیا۔ گاڑی معتدل رفتار سے چلتی ہوئی ایک جگہ ٹھہر گئی۔ سپاہیوں نے مجھے اشارہ کیا۔ "چلو نانا جان کے پاس چلو۔ چاہو تو بیان بدل دینا، میں پیر صاحب سے تیرے لیے ضرور دُعا کراؤں گا۔" ایک سپاہی نے چپکے سے کہا۔

وہ میرے اردگرد گھیرا ڈالے ہوئے ایک بڑی عمارت میں داخل ہو گئے۔ وہاں غیر معمولی بھیڑ تھی، مجرم، سپاہی، وکیل، محرّر، گواہ، تماش بین، اخباری نمائندے، فوٹو گرافر، ہر قسم کا آدمی نظر آ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے سارا کلکتہ مجرم ہے اور آج ہی سب کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ چار سپاہیوں اور انسپکٹر کی سرکردگی میں مجھے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ ہر شخص مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ لوگ اشارے کر رہے تھے اور جن کی نظریں مجھ پر نہیں پڑی تھیں، انھیں میرے دیدار کے لیے اُکسا رہے تھے۔ دبی دبی سرگوشیاں تھیں۔ انسپکٹر میرے آگے ہر اشارے اور سرگوشی سے بے نیاز فخر کے ساتھ ہجوم کے درمیان گزر رہا تھا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ ایک کمرے میں داخل ہو کے انسپکٹر نے مجسٹریٹ کے سامنے میری فائل پیش کر دی۔ میں قریبی دیوار سے چپکا کھڑا رہا۔ فائل کے سرسری مطالعے کے بعد مجسٹریٹ نے عینک اُتار کے میرا جائزہ لیا۔

"یہ ہے وہ؟" اُس نے متعجب ہو کے پوچھا۔ "یہ۔ یہ قاتل ہے؟"

"جی جناب عالی! اس نے اعتراف کر لیا ہے۔" انسپکٹر کے اشارے پر مجھے مجسٹریٹ کے روبرو پیش کر دیا گیا۔

اُس نے پھر عینک چڑھا لی اور فائل پڑھنے لگا۔ "یہ بیان اسی کا ہے؟" اُس نے تذبذب سے پوچھا۔

"جی جناب عالی!" انسپکٹر نے مختصر جواب دیا۔

مجسٹریٹ کچھ دیر کشمکش میں مبتلا رہا۔ "تمھیں مزید تین دن کا ریمانڈ درکار ہے؟" اس نے انسپکٹر سے کہا۔ "حالانکہ یہ کیس تو صاف ہے۔"

"ہماری تفتیش مکمل نہیں ہوئی ہے جناب عالی!" انسپکٹر نے مؤدبانہ کہا۔ مجسٹریٹ نے کاغذ پر دستخط کر کے فائل پیش کار کی طرف بڑھا دی۔ مجھے دُور بٹھا دیا گیا تھا، پھر انسپکٹر اور مجسٹریٹ کے درمیان گفتگو ہوتی رہی۔ وہ میں نہیں سُن سکا مگر دُور سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ مجسٹریٹ پر حیرت چھائی ہوئی ہے، وہ کبھی میری شکل دیکھتا تھا، کبھی انسپکٹر کی۔ فائل کی کارروائی مکمل ہو جانے کے بعد مجھے عدالت سے اُٹھا لیا گیا اور جس طرح لایا گیا تھا، اُسی طرح واپس لے جا کے کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔

سہ پہر کو ایک جلی ہوئی روٹی اور پتلی دال سلاخوں کے اندر سرکا دی گئی۔ وہ سمجھتے تھے کہ مجھے شاید بھوک لگی ہو گی، میں نے ناتواں آواز میں اُن سے کہا۔ "لے جاؤ۔"

"کھا لو میاں جی کھا لو۔" سنتری نے پچکار کے کہا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"کیا کھانا پسند نہیں آیا؟ یہاں گوشت اور چکنی روٹی نہیں ملتی، میاں جی! اس کی عادت ڈالو، آگے یہی کھانا ملے گا۔"

دال اور روٹی شام تک یوں ہی پڑی رہی اور میں ایک گوشے میں سکڑا سمٹا بیٹھا رہا۔ شام تک کمزوری میں اور اضافہ ہو گیا۔ کوئی کلیجا نوچ نوچ لیتا تھا۔ اچانک ہُوک سی اُٹھتی تھی اور آنکھوں میں ترمرے ناچنے لگتے تھے۔ کبھی ایسا خوف طاری ہوتا کہ سامنے کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ جسم میں سیٹیاں سی بج رہی تھیں۔ اپنے آپ سے باتیں کرنے کی قوت بھی نہیں رہی تھی، ہر طرف سناٹا تھا، ویرانی اور تنہائی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے دیواریں مجھ پر گر جائیں گی اور دیواروں میں اُبھرے ہوئے نوکیلے پتھر میرے سر پر پڑنے لگیں گے۔

شام کو پھر مجھے انسپکٹر کے کمرے میں طلب کر لیا گیا اور سوالات کی تکرار کی گئی، میرے جوابات سے انھیں مایوسی ہوئی کیونکہ میں نے اپنے بیان میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ مولوی صاحب کو آنا ہوتا تو اب تک آ گئے ہوتے۔ وہ کرید کرید کے مجھ سے مختلف قسم کے سوال کرتے رہے۔ پھر وہ آپس میں گفتگو کرنے لگے۔ اس بار اُن کے چہروں پر تشویش کے آثار نمایاں تھے، اُن کی آپس کی گفتگو سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ پولیس مقتولوں کے گروہ سے کچھ معلومات حاصل کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اُن کے تبصروں کے مطابق دونوں مقتول کلکتے کے اوسط درجے کے بدمعاش تھے۔ اُن کے ساتھیوں سے رابطہ قائم کیا گیا تو کوئی نتیجہ خیز بات نہیں معلوم ہو سکی۔ سب نے شاید لاعلمی ظاہر کی تھی۔ پولیس کو موقعِ واردات سے بھاگنے والے دو بدمعاشوں کا بھی کچھ علم نہیں تھا۔ اس لیے کہ اُن کا ذکر ہی نہیں کیا جا رہا تھا گویا سپاہیوں نے صرف مجھے بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ مولوی صاحب، کورا اور باقی دو بدمعاشوں پر اُن کی نظر نہیں پڑی تھی۔ میرا واقعہ ہی اتنا سنگین تھا کہ وہ کسی دوسری طرف توجہ دے بھی نہیں سکتے تھے ورنہ میں اُن کے ہاتھ سے نکل جاتا۔ مجھے آخری بار دُور سے کورا کی ایک چیخ سنائی دی تھی جو شاید اُنھوں نے نہیں سُنی۔ اگر مولوی صاحب کورا کو چھڑانے میں کامیاب بھی ہو گئے اور پولیس نے مطلوبہ بدمعاشوں سے رابطہ بھی قائم کر لیا تو اس بات کا امکان نہیں تھا کہ وہ دونوں جائے واردات پر اپنی موجودگی کا اقرار کر لیں گے، پھر مجھے بار بار بلایا جاتا رہا اور مجھے بتایا گیا کہ مقتولین کی لاشوں کے پوسٹ مارٹم سے ظاہر ہے کہ زخموں کے نشانات اُسی چاقو سے لگائے گئے ہیں جس کی ملکیت کا میں نے پہلے ہی اقرار کر لیا تھا۔

ایک دن گزر گیا، میرے معدے میں غذا کا ایک دانہ بھی نہیں گیا تھا۔ دوسرے دن دوپہر مجھے جبراً کھانا کھلایا گیا اور شام کو میرے منہ پر طمانچے مارے گئے تاکہ میں اپنے بارے میں تفصیل سے بتاؤں۔ وہ لوگ مجھے نرمی سے سمجھاتے رہے اور مجھ پر تشدد بھی کرتے رہے لیکن میں نے کچھ نہیں بتایا۔ میں اپنے پچھلے بیان پر اصرار کرتا رہا۔ میں نے چیخ چیخ کر اُن سے کہا۔ "جب میں نے

اعتراف کر لیا ہے تو تم اور کیا چاہتے ہو؟"

"ہم تمھارے بارے میں کچھ اور جاننا چاہتے ہیں۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے، تم جو سزا مناسب سمجھتے ہو مجھے دے دو، بار بار کیوں پریشان کرتے ہو؟" میں نے پہلی بار اُن سے تلخی کے ساتھ بات کی۔

"تمھیں پھانسی ہو جائے گی۔"

"پھر کیا ہوگا؟" میں نے زہر خند سے کہا۔

"تم مر جاؤ گے۔"

"مجھے اب زندگی کی تمنا بھی نہیں ہے۔"

"لڑکے!" ایک ادھیڑ عمر افسر نے شفقت سے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ "پولیس تمھاری دوست ہے، تمھیں اس کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔ ممکن ہے تم ہمیں کوئی ایسا نکتہ بتا دو جس سے تمھاری سزا کم ہو جائے، ہم عدالت میں تمھاری سفارش کر سکتے ہیں۔"

"میں نے جو کچھ کہا ہے، اس کے سوا مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

"کیا تمھیں کسی کا خوف ہے؟ کسی بدمعاش کا؟" اس نے ملائمت سے پوچھا۔ "تم یقیناً کچھ چھپا رہے ہو۔"

وہ خوف کی بات کر رہا تھا۔ اگر میں اُسے بتا دیتا کہ مجھے کررا کا خوف ہے۔ کررا جو ایک معصوم اور ستم رسیدہ لڑکی ہے، جس کے لیے میں نے گھر چھوڑ دیا اور نوبت یہاں تک پہنچی، جسے چھپانے کے لیے میں نے کیا نہیں کیا۔ کیا میں اسی کو طشت از بام کر دوں؟ میں اپنے خاندان کی رسوائی کا سبب بنوں اور اپنے باپ کو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑوں؟ میں مولوی صاحب کو پریشان کروں کہ انھوں نے میرے ساتھ سلوک کیا تھا۔ میں نے دو قتل تو کیے ہی تھے۔ کانسٹیبل کو بھی ہلاک کر دیا تھا۔ اس کے تین گواہ موجود ہیں، خود پولیس گواہ تھی۔ زیادہ باتیں کرنا فضول تھا، جو ہو گیا تھا، وہ تو ہو گیا تھا اور ممکن تھا، میں انھیں بتا دیتا، اگر مجھے کلی طور پر یقین ہو جاتا کہ کررا کو غنڈے ہی لے کے گئے ہیں، مولوی صاحب ناکام ہو گئے۔ ایک بار وہ پکڑ لیتے تو دور تک پہنچ جاتے۔ بات گیا تک جا پہنچتی۔ میں نے انھیں اپنا سراغ ہی نہیں دیا۔

تین دن بعد مجھے دوبارہ عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ میری حالت ان تین دنوں میں مسلسل جاگنے اور فاقے کرنے سے ایسی ابتر ہو گئی تھی کہ مجسٹریٹ کو مجھے پہچاننے میں دشواری ہوئی۔ "کیا یہ وہی لڑکا ہے؟" اُس نے حیرانی سے پوچھا۔ "معلوم ہوتا ہے تم نے اسے بہت مارا ہے اور کھانا بھی نہیں کھلایا۔"

"ہم نے اس کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا ہے جناب عالی! مگر یہ بہت ڈھیٹ لڑکا ہے، اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاتا۔" انسپکٹر نے اپنی تلخی چھپانے کی ناکام کوشش کی۔

وہی سوال، وہی جواب، آخر مجسٹریٹ نے قاتل کا بغور جائزہ لینے کے بعد دستخط کر دیے، پیش کار نے مہر لگا دی اور مجھے حوالات سے جیل منتقل کر دیا گیا۔

حوالات کے ماحول سے جیل کی فضا بہت بہتر تھی۔ اس چار دیواری میں آکے میں نے سکون کی سانس لی۔ میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں اور مجھے ایک تاریک کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ کوٹھری میں پہلے سے ایک شخص مقیم تھا۔ مجھے دیکھ کے اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں چمک اُبھری۔ میں چپ چاپ ایک گوشے میں سمٹ گیا۔ وہ اپنی بیڑیاں کھڑکاتا ہوا میرے پاس آیا۔ میری نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ اُس نے درشتی سے میری ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور غور سے میری آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ "لاڈلے! تو بھی یہاں آگیا۔" میری آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے۔ "کمال ہے۔ تو نے اتنی عمر میں کمال کر دیا، کسے مارا؟" وہ تجسس سے بولا۔

"خود کو مار دیا۔"

میری آواز میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ وہ میرے قریب بیٹھ گیا اور میرے کانوں کے قریب منہ لاتے ہوئے رازداری سے بولا۔ "ایک یا دو؟"

"تین۔"

"تین؟" وہ اُچھل پڑا۔ "شاباش۔ اپنی قسمت بھی کیسی نیاسی ہے میرے رب!" وہ چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ڈر رہا تھا کہ کہیں کوئی ذلیل قسم کا آدمی ادھر نہ ڈال دیا جائے۔ جی دار آدمی دیا۔ تیرے صدقے جاؤں مالک۔" اُس نے اُچک کے میرے گال کا بوسہ لے لیا۔ میں نے گھور کے اسے دیکھا، وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "کیا ہو گیا تھا لاڈلے؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے بگڑ کے کہا۔

وہ بے تحاشا ہنسنے لگا۔ "بالکل نیا نیلا ہے، زندگی میں نیا نیا ہے سب چیز تیری نئی معلوم ہوتی ہے پیارے! جیل میں بھید بھاؤ کیسا۔ بتا دے میری جان! بتا دے کہ ایمان سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ اب تو اس کوٹھری میں آگیا ہے تو اپنے کو یار سمجھ۔ رونا چاہتا ہے تو پہلے رو لے، پھر بعد میں تجھے بڑی ہنسی آئے گی۔ تو میری طرح ہنسے گا۔ تجربے کی بات ہے لالے!"

"تم کون ہو؟" میں نے سراسیمگی سے پوچھا۔

اُس کی پھر ہنسی چھوٹ گئی۔ "واہ رب واہ! پوچھتا ہے تم کون ہو؟ اپنے آپ کو نہیں پہچانتا۔ ارے جو تو ہے، وہی میں ہوں۔ ہم دونوں کی ایک ذات ہے، ایک ہی دھرم، ایک ہی مقدر۔ لو بھئی یہ لڑکا تو کمال کا ہے۔"

وہ عجیب آدمی تھا۔ میں نے ایک بار پھر کنکھیوں سے اُسے سر سے پیر تک دیکھنے کی کوشش کی، وہ میری طرح جیل کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ اُس کے پیروں میں بھی بیڑیاں تھیں، میرے پیروں میں بھی۔ شاید اُس نے داڑھی بہت دن سے نہیں بنائی تھی۔ اس کے دانت بھی زرد ہو گئے تھے۔

"تم یہاں کیسے آئے؟" میں نے اُچٹتے ہوئے اُس سے سوال کیا۔

"خوب میرے بھولے بادشاہ!" اُس نے میرے گال کی چٹکی لی۔ "اس سوال سے دودھ کی خوشبو آتی ہے اے لاڈلے!" اُس نے اپنی منہ پھاڑ کر کہا۔ "یہ جگہ اُنھی لوگوں کے لیے بنی ہے جو کچھ کر کے آتے ہیں، کچھ کھیل دکھا کے آتے ہیں، ایک دو کو مار کے آتے ہیں۔"

"تو کیا تم بھی، تم نے بھی کسی کو قتل کیا ہے؟"

"مگر تو مجھ سے بازی لے گیا۔ مجھ سے تو ایک آدمی بھی ٹھیک طرح نہ سدھ پایا۔ تو نے بھلا کیسے ان نازک ہاتھوں سے تین کو مار دیا؟"

"میں نے تینوں کے پیٹ میں چاقو مار دیا۔"

"ارے واہ!" اُس نے کھل کھلا کے کہا۔ "جواری تھے؟"

"نہیں۔" میں نے منہ بنا کے کہا۔

"پھر کوئی دھوکا کیا تھا؟" اُس نے آنکھ مار کے کہا۔ میں نے وہی بیان دُہرانا شروع کیا جو میں نے پولیس کو دیا تھا۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ جب کانسٹیبل کے پیٹ میں چاقو اتارنے کی بات آئی تو اُس نے دونوں ہاتھ بڑھا کے مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ "ایک بار پھر سے سنا میرے شیر!" اُس نے مجھے آزاد کرتے ہوئے کہا۔ "یقین نہیں آتا۔" میں نے کانسٹیبل والا واقعہ اُسے دوبارہ سنایا۔ "تو نے تو یار بڑے بڑے استادوں کی ایسی کی تیسی کر دی، مگر یہ تو بتا اُن دو شہدوں نے تجھ پر حملہ کیوں کیا تھا؟ دیکھ کچھ چھپانا نہیں۔ یہ تھانا نہیں ہے۔ یاروں کا گھر ہے۔"

"مجھے نہیں معلوم، بس اچانک انھوں نے مجھ پر وار کر دیا۔"

"ایسے کوئی وجہ تو ہوگی یا وہ سالے پاگل ہو گئے تھے؟"

"پتہ نہیں، وہ مجھے کیا سمجھے تھے۔" میں نے معصومیت سے کہا۔

"میں بتاتا ہوں، وہ تجھے لونڈا سمجھے تھے۔ تو نے ضرور جھگڑا کیا ہوگا لاڈلے، یا تو نے انھیں ٹھکرا دیا ہوگا۔"

"کیا بات کر رہے ہو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اے جانے دے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "دریا کا کنارہ ہو، تنہائی ہو، رات ہو اور نیت خراب ہو۔ تو جو بھی نہ ہو، تھوڑا ہے۔"

"تم سمجھتے ہو میں جھوٹ بول رہا ہوں۔" میں نے ناراضی سے کہا۔

"ارے نہیں۔" وہ اپنے کان پکڑتے ہوئے بولا۔ "تو ہی سچ بول رہا ہے۔ مگر اب نہیں تو پھر بتا دے گا، شرم آتی ہے۔"

"کیسی شرم؟"

"اب یہ ذکر چھوڑ، یہ بتا کیس میں جان کتنی ہے؟"

"میں اعتراف کر چکا ہوں۔"

"کیا ہے، کیا کچی بات کہہ دی تو نے۔" وہ بگڑتے ہوئے تیوروں سے بولا۔ "یعنی تو نے حامی بھر لی ہے؟"

"ہاں کانسٹیبل کے قتل کے وقت تین اور کانسٹیبل بھی موجود تھے، انکار کا کیا سوال تھا۔"

"انکار کا کیا سوال تھا۔" وہ برہم ہو کے بولا۔ "ابے ہم تو پھانسی کے پھندے پر بھی انکار کرتے رہیں گے۔"

"مجھے معلوم تھا کہ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔"

"حاصل وصل کیا، ذرا آنکھ مچولی رہتی ہے اور کبھی کبھی تکا بھی لگ جاتا ہے۔ بیان بدل دیتا۔" اس نے میرے بازو پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"تم جیل میں پہلی بار آئے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"پہلی بار!" وہ قہقہہ لگا کے بولا۔ "تو ابھی مجھے نہیں جانتا، بے عشقی کرتا ہے۔ کنڑ سے! یہ تو اپنا گھر ہے۔ اس بار ذرا اوچھا ہاتھ پڑ گیا تو اس مدبودار کوٹھری میں رہنا پڑ گیا ہے، باہر بڑی یاد اللہ ہے۔ سرکاری وکیل نے جان لڑا دی ہے لیکن اپنا ڈنڈا وکیل بھی کچھ کم نہیں ہے، شہزادے! یہ کام ہو گیا تو دلانے والے کو ترسے گا۔"

"گویا تم بچ جاؤ گے؟"

"ابے اگر بچیں گے نہیں تو بچنے کی آس کیوں توڑیں۔"

"کیا تمھارے خیال میں، میں بچ سکتا ہوں؟" میں نے تیزی سے کہا۔

"کوئی وکیل کیا ہے؟"

"میرا تو کوئی بھی نہیں ہے۔ میں اس دنیا میں تنہا ہوں۔"

"دیکھ ڈنڈے سے بات کریں گے۔ سالا کیا داؤ پیچ جانتا ہے، سرکاری وکیل کو تو ہنسی کا ناچ نچا دیتا ہے! ایسے ایسے پائنٹ ڈھونڈ کے لاتا ہے کہ بھری عدالت چکرا کے رہ جاتی ہے۔"

"مگر۔" میں نے مایوس لہجے میں کہا۔ "وہ مجھے نہیں بچا سکے گا۔"

"ایسی ناامیدی؟" وہ میری کمر پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے۔ ڈنڈے کو آنے دے، میں بات کرتا ہوں۔"

"نہیں، کسی سے بات نہ کرنا، پھر بہت سی باتیں پھیلیں گی۔"

"زندگی بڑی چیز ہے لاڈلے! اتنی جلدی گھبرا گیا؟ ابھی تیری عمر ہی کیا ہے، اپنا حال دیکھ، آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔ پھر بھی جینے کی آرزو ہے۔ کچھ نشہ وشہ کرتا ہے؟" اُس نے آہستگی سے پوچھا۔

"نہیں، میں نے آج تک سگریٹ بھی نہیں پی۔"

"بالکل کورا ہے۔" وہ ہنسنے لگا۔

"تم بار بار ہنستے کیوں ہو؟" میں نے ناگواری سے کہا۔

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا اور ایک ٹھنڈی سانس لے کے بولا۔ "لاڈلے! کیا ہنسنا بھی بند کر دیں؟ یہ ہنسی ہی تو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ اپن تو ساری باتیں ہنسی میں اڑا دیتے ہیں ورنہ اس دنیا میں کیا رکھا ہے۔ یہ دنیا؟" وہ کرب ناک لہجے میں بولا۔ "بڑا رلاتی ہے پیارے! بہت ظالم ہے یہ، میں اسے ہنسی میں ٹال دیتا ہوں۔"

اُس کا نام مشعل تھا۔ چھوٹے چھوٹے بالوں کی داڑھی اور گھنی مونچھوں والا مشعل، آواز کرخت، لہجہ تلخ، ہنسی بھی زہریلی۔ میں شروع شروع میں اس سے جھجکتا رہا، مجھے اُس سے خوف آتا تھا لیکن پہلے ہی دن شام تک اُس نے اتنی باتیں کیں کہ مجھے اس کے متعلق اپنی رائے بدلنی پڑی۔ وہ ایک قتل کر کے آیا تھا۔ کلکتے کے ایک بدمعاش کا قتل، وہ خود بھی بہت بڑا بدمعاش

تھا اور غنڈوں کے ایک بڑے گروہ کا سرغنہ۔ ٹھل پٹنے سے تعلق رکھتا تھا، پٹنے میں اُس کے ساتھ پے در پے ایسے حادثے پیش آتے کہ اُس نے اپنا آبائی شہر چھوڑ دیا اور کلکتے چلا آیا اور یہاں ترقی کرتے کرتے وہ بدمعاشوں کا بادشاہ بن گیا۔ وہ اُونچی اونچی کڑوی کسیلی باتیں کرتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ وہ بار بار جیل آتا تھا۔ یہاں کے سب لوگ اُس سے واقف تھے، ہماری کوٹھری پر تعینات سنتری بھی اُسے اچھی طرح جانتا تھا، جب رات کا کھانا آیا تو سنتری نے چپکے سے ایک تھیلا اُس کی طرف اُچھال دیا۔ اس میں سموسے رکھے تھے۔ ٹھل نے کھانے پر مجھے اپنے ساتھ بٹھالیا اور چار دن بعد نہ جانے کیوں میں نے بہت اطمینان سے جیل کا کھانا کھایا، پتلا شوربہ، ادھ پکی روٹیاں اور دال۔ پیالے مٹی کے تھے۔

رات کو ہم دونوں ساتھ ساتھ لیٹ گئے۔ میرے ساتھ ٹھل کے رویّے میں خاصی تبدیلی آگئی تھی۔ ہم اپنے بازوؤں کا تکیہ بناتے ایک دوسرے کے سامنے کروٹ لیے لیٹے تھے۔ اگر ٹھل نہ ہوتا تو مجھے جیل کے آداب سمجھنے میں بڑی دشواری ہوتی اور اس مختصر تاریک کوٹھری میں میرا دم نکل جاتا۔ میں نے دیکھا کہ وہ باتیں کرتے کرتے کہیں گم ہو جاتا ہے اور چھت گھورتے آہیں بھرنے لگتا ہے پھر اچانک ہڑبڑا کے مجھ سے باتیں شروع کر دیتا ہے۔ میں نے اپنے بارے میں اسے کچھ زیادہ نہیں بتایا تھا لیکن مجھے احساس تھا کہ اُسے میری باتوں پر یقین نہیں آیا ہے۔ وہ ہنسنے اور قہقہے لگانے لگتا تھا۔ اُس نے میرا نام بھی نہیں پوچھا تھا، مجھے مسلسل لاڈلے کہہ کر ہی مخاطب کر رہا تھا۔

مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ میں آدھی رات کے وقت اُٹھ کے کوٹھری میں ٹہلنے لگا، بیڑیوں کی آواز سے سنتری چونک گئے۔ اُنھوں نے مجھے حکم دیا کہ میں چپ چاپ لیٹ جاؤں۔ شاید ٹھل بھی جاگ رہا تھا، سنتری کی آواز سن کے اُس نے ایک طویل انگڑائی لی۔ سناٹے میں اُس کی ہڈیاں چٹخنے کی آواز دُور تک گئی ہو گی۔ اُس نے کھردرے لہجے میں آواز بلند کی۔

"کیا ہے سنتری! کیوں بگڑ رہے ہو؟ ابھی نیا نیا ہے، پہلی رات اسی طرح گزرتی ہے، رفتہ رفتہ عادی ہو جائے گا۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا "سو جا لاڈلے، سو جا۔ یہ تو باہر ہی سے حکم بلند کرتے رہتے ہیں، اندر آ کے دیکھیں تو نانی یاد آجائے۔ زمین کتنی سخت ہوتی ہے۔"

میں دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔ سیلن اور تاریکی کی وجہ سے کوٹھری میں طرح طرح کے کیڑے مکوڑے موجود تھے۔ ٹھل بھی میرے قریب آکے بیٹھ گیا۔ "لاڈلے!" اُس نے نرمی سے کہا۔ "تو تو واقعی کوئی شہزادہ معلوم ہوتا ہے۔ اس نامراد شہر میں کیسے پھنس گیا؟"

"بس جو لکھا تھا، وہ پورا ہوا۔" میری آواز بھرا گئی۔

"لے یہ چادر اوڑھ لے کیڑوں سے بچا رہے گا ورنہ تیری نازک جلد خراب ہو جائے گی۔ اب گھر کے بستر کا خیال چھوڑ دے۔"

"کیسا گھر؟" میں نے آہ بھر کے کہا۔

"اُس نے اپنی چادر میرے جسم پر ڈال دی۔ یہ سنتریوں کی مہ[ربانی] ہے، رات کو چادر مجھے دے دیتے ہیں اور صبح ہوتے ہی واپس لے لیتے [ہیں]۔"

"نہیں پھر تم کیا اوڑھو گے؟ تم سچ کہتے ہو، مجھے سب چیزوں کا [عادی] ہونا چاہیے۔" میں نے چادر اُسے واپس کرتے ہوئے کہا۔

"اب جی مت جلا لاڈلے! تکلف مت کر جو بات میں کہوں، ما[ن لیا] کر، مجھے حکم دینے کی کچھ عادت ہو گئی ہے۔"

ٹھل اور میں یوں ہی ساکت و صامت رات گئے تک بیٹھے ر[ہے]۔ دوسرے دن تعطیل تھی، اس لیے مجھے عدالت میں پیش نہیں کیا گیا۔ [ٹھل] نے بتایا کہ اب مجھے سیشن کورٹ کے سپرد کیا جائے گا، بیانات، جرح [اور] پورے واقعے کی اکھاڑ پچھاڑ ہو گی۔ وکیل عدالت میں عورتوں کی ط[رح] ایک دوسرے کو کوستے دیں گے اور پہلوانوں کی طرح عدالت کے اکھا[ڑے] میں داؤ پیچ آزمائیں گے۔ وہ مجھے کچہری کی اصطلاحیں اس طرح سمجھ[ا رہا تھا] جیسے کوئی وکیل ہو۔ دوسرے دن اس کا بڈھا وکیل اُس سے ملنے کے [لیے] جیل آیا۔ وہ واقعی بڈھا تھا، سیاہ فام اور پستہ قد، اُس کے گال ا[ندر] دھنسے ہوئے تھے اور ناک پر موٹی سی عینک رکھی ہوئی تھی۔ پہلے تو وکیل ٹھل سے اُس کے کیس کی پیچیدگی کے متعلق گفتگو کرتا رہا۔ ٹھل [کے ماتھے] پر شکن تک نہیں آئی۔ پھر ٹھل نے اُس سے میرا تعارف کرایا، وکیل میر[ی] روداد سُن کے کچھ دیر سوچتا رہا۔ ٹھل نے مجھے کہنی ماری "دیکھا، کوڑ[ی] لا رہا ہے، چت کر دے گا، سرکاری وکیل کو ناک چنے چبوا دے گا، چھو[ٹا] مگر کھوٹا نہیں ہے۔ اس چھوٹے سے جسم میں عقل ہی عقل بھری ہوئی۔"

چند لمحے غور و فکر کرنے کے بعد بڈھے وکیل نے مجھے مش[ورہ دیا کہ] میں عدالت میں اپنے بیان پر جما رہوں اور بہت کم بات کرنے کی کو[شش] کروں۔ اس پر ٹھل وکیل کو بُرا بھلا کہنے لگا کہ وہ غلط مشورہ دے رہا [ہے]۔ "دیکھو بڈھے صاحب اگر تم ایسا تیر چلاؤ کہ سیدھا جج کے دل میں [لگے] اور وہ ترس کھا کے اسے ایک دم رہا کر دے۔"

"یہ ناممکن ہے، ٹھل!" وکیل نے سکون سے کہا۔

"ناممکن؟" ٹھل ناراض ہو کے بولا۔ "مجھے اس لفظ سے نفرت [ہے]۔"

مجھے معلوم تھا کہ وکیل کا یہی جواب ہو گا۔ اُس نے میرے معا[ملے کی فیس] نہیں لی۔ ٹھل اُس پر گرم ہوتا رہا اور اُسے گالیاں دینے لگا۔ بڈھا وکیل [ٹھل کو] خوب سمجھتا تھا اس لیے اپنا بیگ دبا کے چپ چاپ چلا گیا۔

اگلے دن مجھے اور ٹھل، دونوں کو ساتھ ہی گاڑی میں [بٹھا کر] کچہری لے جایا گیا۔ ہم جدا ہو گئے۔ مجھے ایک جج کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ پھر پیشی [کا] ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ سرکار کی طرف سے مجھے اپنی صفائی کے لیے ا[یک وکیل] دیا گیا۔ وکیل نے مجھ سے بہت کچھ پوچھنا چاہا، اُس نے کچھ اُگلوانے [کی کوشش کی،] مجھ سے جھوٹ بھی بولے، مجھے ڈرایا دھمکایا بھی، عاجزی سے بھی پوچھا اور غصے سے بھی لیکن میں نے اپنے بیان میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ مجھے عدالت میں پیش کیا جاتا رہا اور اُن سوالات کی تکرار ہوتی رہی جو تھانے میں کیے گئے تھے، ایک ایک نکتے پر بحث ہوئی، تینوں کانسٹیبل گواہوں نے میرے خلاف بیانات دیے، چاقو اور رومال دونوں چیزیں عدالت میں پیش کی گئیں۔ چاقو پر میری اُنگلیوں کے نشانات تھے اور رومال جوہریوں کی رپورٹ کے مطابق سچے موتیوں کی ایک بیش قیمت مالا تھی، جج کی ہدایت پر مجھے ایک ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا، جس نے مختلف طریقوں اور آلوں سے میرے جسم کا معائنہ کیا۔ پیشی والے دن ٹھل مجھے دیر تک سمجھاتا اور میری ہمت بندھاتا رہتا۔ ٹھل کے کرخت لہجے سے مجھے اب ایک اُنسیت سی ہو گئی تھی۔ ادھر میرا وکیل مقدمے کو نئے نئے رنگ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ جب تک تم مجھے پوری تفصیل سے واقعہ نہیں بتاؤ گے، میں اندھیرے میں رہوں گا اور صحیح طرح تمھاری وکالت نہیں کر سکوں گا، پیشیاں، سوالات اور بیانات ہوتے رہے، بیس دن گزر گئے، ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق میری جسمانی اور ذہنی حالت نارمل تھی لیکن اُس نے میری رپورٹ میں کوئی ایسی بات ضرور رکھی تھی جو کئی دنوں تک بحث کا موضوع بنی رہی۔ اُس نے لکھا تھا کہ مجھے کوئی شدید صدمہ پہنچا ہے لیکن میں عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ قوتِ برداشت اور دماغی صلاحیتیں رکھتا ہوں۔ ڈاکٹر نے میری عمر سولہ سال سے زیادہ بتائی تھی۔ مقتولین کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ، اُن کے ساتھیوں کے بیانات، ان باتوں کا مقدمے سے کوئی تعلق نہیں تھا، دونوں وکیلوں کے درمیان بھی نوک جھونک ہوتی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہمارے کالج کا کوئی تقریری مقابلہ ہے جس میں سب سے اچھی تقریر کرنے والے کو انعام ملنے والا ہے اور موضوع میری ذات ہے۔

میرے وکیل نے سارا زورِ بیان اس نکتے پر صرف کیا تھا کہ میں نے مجرمانہ حملے سے مدافعت کرتے ہوئے پہلے دو آدمیوں کو قتل کیا پھر اسی دہشت کا اثر تھا کہ مجھے پولیس والوں کی نیت پر بھی شبہ ہوا۔ اگر میرے لیے یہ بہت شرم ناک بات تھی۔ میری زبان سے اپنے بارے میں ایسے لفظ ادا نہیں ہو سکتے تھے مگر ٹھل، اُس کے بڈھے وکیل اور اپنے وکیلِ صفائی کے بہم اصرار پر میں اپنے بیان میں اضافہ کرنے پر مجبور ہو گیا۔ بڑی مشکل سے عدالت میں میری زبان کھلی۔ بات بھی یہی تھی کہ میں نے اپنی مدافعت میں ان غنڈوں پر چاقو چلایا، وہ مجھ سے کورا کو یعنی مجھ سے مجھی کو چھین لینا چاہتے تھے۔ وہ تو صرف دو سامنے آئے اگر چار ہوتے، اگر دس بھی ہوتے تو میں اُن سب کے جسموں میں چاقو اُتار دیتا۔

وکیلِ صفائی عدالت میں میرے ماضی کے متعلق عدالت کی رائے مشکوک اور متزلزل کرنے کا کام انجام دیتا رہا۔ اُس نے اتنی باتیں کیں کہ ہر بات مبہم اور مشکل نظر آنے لگی۔ میں کٹہرے میں حیرت زدہ ہو کے اُس کے دلائل سنتا رہتا تھا۔ اُس نے بار بار میری عمر کی طرف توجہ دلائی، میرے چہرے کی شرافت پر اصرار کیا، جج سے اپیل کی کہ وہ میری آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرے، اُس نے مجھے زمانے کا ستایا ہوا ایک مظلوم شخص قرار دیا، جو اپنا وکیل بھی نہیں کر سکتا تھا، اُس نے ایسی جوشیلی باتیں اتنے پُر اثر انداز میں کیں کہ اگر میں جج ہوتا تو اُسے ضرور انعام دیتا۔ بڈھا وکیل بھی مشوروں میں اُس کے ساتھ شامل تھا۔ وکیلِ صفائی نے عدالت میں شبہ ظاہر کیا کہ ممکن ہے میرا مؤکل طویل عرصے پہلے کسی زبردست حادثے میں اپنی یادداشت کھو چکا ہو اور اب ماضی کے محض دھندلے دھندلے نقوش اُس کے ذہن میں رہ گئے ہوں یا اسے اپنے معزز خاندان کی نیک نامی کا اس قدر شدید احساس ہو کہ وہ اس شرم ناک واقعے میں ان اہم ناموں اور شخصیتوں کو رسوائی سے بچانے کے لیے ایثار پر آمادہ ہو گیا ہے۔ یقیناً اس نے جھگڑوں اور رسوائیوں سے بچنے کے لیے قتل کا اعتراف کر لیا ہے۔ ساتھ ہی اپنی حیثیت بھی مشکوک کر لی ہے۔

اُس نے عدالت پر زور دیا کہ اُس کے مؤکل کا کوئی خراب ریکارڈ کہیں موجود نہیں ہے جب کہ مقتولین کا ماضی اور کردار بے حد گھناؤنا تھا۔ وہ کئی بار جیل جا چکے تھے اور متعدد مقدمات میں ماخوذ تھے، بدمعاشوں کے ساتھیوں اور رشتے داروں نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ وکیلِ صفائی نے اس نکتے کی طرف جج کی توجہ خاص طور پر مبذول کرائی۔ اُس نے پُرزور آواز میں کہا۔ "اس سے ثابت ہوتا ہے کہ میرے مؤکل اور مقتولوں کے درمیان کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اُنھوں نے اسے ریل کے کنارے تنہا بیٹھے ہوئے دیکھا تو اُن کے غلیظ کردار کی رگ جاگ اُٹھی۔ وہ وحشی ہو گئے۔"

جب سرکاری وکیل نے میرے پاس چاقو کی موجودگی کا ذکر کیا تو وکیلِ صفائی نے ان گنت عذر پیش کر دیے کہ وہ چاقو میں نے اپنی حفاظت کے خیال سے رکھا تھا کیونکہ میں دُنیا میں تنہا تھا۔ میرے وکیل نے اصرار کیا کہ غنڈوں نے اپنے شرم ناک منصوبے میں ناکامی کے بعد مجھ سے مالا چھیننی چاہی جو مجھے جان سے زیادہ عزیز تھی۔

دن پر دن گزرتے گئے۔ آخر مجھ پر باقاعدہ جرح کا وقت آیا۔ سرکاری وکیل نے مجھے تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں ویسے بھی تھک گیا تھا پھر وہ مجھ سے حیاسوز سوالات کرنے لگا۔ جہاں تک بنا، میں شرماتا اور جھجکتا ہوا بہت مختصر جوابات دیتا رہا لیکن پھر حد ہو گئی، سرکاری وکیل کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کس سے مخاطب ہے؟ وہ اُس شخص سے مخاطب تھا جسے اب زندگی کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اُس کے سوال و جواب بہت جارحانہ ہو گئے تو میں نے بھری عدالت میں چیخ کر کہا۔ "ایسے سوال مت کرو، مجھے پھانسی دے دو، میں قتل کا اعتراف کر چکا ہوں۔ ایک آدمی موت قبول کرنے کے لیے تیار ہے تم اُسے سزا دینے سے کیوں کترا رہے ہو؟ موت کے لیے یہ رسمیں کیوں ادا کی جا رہی ہیں؟ اب بہت ہو چکا، بس کرو، بس کرو۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "سیدھی اور صاف بات ہے، تنگ کیوں کرتے ہو؟"

میں نے تین قتل کیے ہیں۔ مجھے اس کی سزا موت کی صورت میں دے دو۔ مجھ پر رحم مت کرو۔" میں نے چلا چلا کے عدالت سر پر اٹھا لی۔ مجھے خاموش کرنے کے لیے جج کو کئی بار میز پر ہتھوڑی مارنی پڑی۔ میرا وکیل مجھے صبر و تحمل کے اشارے کرتا رہا تھا۔ عدالت میں اس آخری دن میری حالت خاصی خراب ہو گئی۔ آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ میں نے روتے ہوئے ان سے درخواست کی کہ وہ مجھے پھانسی دے دیں اور ادھر ادھر کے فضول سوالوں میں وقت ضائع نہ کریں۔

جج نے فیصلے کے لیے چھ دن بعد کی تاریخ ڈال دی تب مجھے قرار آیا۔ میں نے جیل پہنچتے ہی یہ خوش خبری تجمل کو سنائی۔ وہ مقدمے کی ساری کارروائی کے درمیان مجھے مشورے دیتا اور تبصرے کرتا رہا تھا۔ ادھر خود تجمل کا مقدمہ طول اختیار کر گیا تھا۔ میں اس کے بعد جیل میں آیا تھا مگر میرے مقدمے کا فیصلہ اس کے فیصلے سے پہلے ہونے والا تھا۔ مجھ پر اس کی مہربانیاں بتدریج بڑھتی رہی تھیں۔ ان بیس پچیس دنوں میں ہم کیا باتیں کر سکتے تھے۔ تجمل نے اپنی کالی زندگی کے ہزاروں واقعات مجھے سنائے۔ اس دوران میں اس نے میرا ایسا خیال رکھا تھا جیسے میں اس کا مہمان ہوں۔ اس نے میرے متعلق خود ہی بہت سی رائیں قائم کر لی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ میں کسی شریف گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ سنتری بھی اس کی وجہ سے میرا خیال رکھنے لگے تھے اور خود میں نے بھی کبھی انہیں پریشان نہیں کیا تھا۔ میرا فیصلہ ہونے والا تھا۔ تجمل اور سنتریوں کو حیرت تھی کہ میرے چہرے پر فکر اور تشویش کی کوئی علامت کیوں نہیں ہے جب کہ ممکن ہے مجھے موت کی سزا دے دی جاتی۔ میں ہنس کر انہیں جواب دیتا "موت کیا چیز ہے۔ کون شخص ایسا ہے جو ہمیشہ سے زندہ ہے۔" اس پر تجمل مجھے بے اختیار گلے سے لگا لیتا اور میرے ہاتھوں اور پیشانی کو بوسے دیتا۔ "تو بڑا بے جگرا ہے لاڈلے!" وہ مجھ سے کہتا۔ "تو نے تو تجمل کو بھی مات کر دیا۔"

تجمل ایک ایک دن گن رہا تھا۔ جیسے میرے نہیں، اس کے مقدمے کا فیصلہ سنایا جانے والا ہو۔ جیسے مجھے نہیں، اسے موت آ رہی ہو۔ آخری دو دنوں میں میری حالت عجیب سی ہونے لگی۔ شاید فیصلے کے بارے میں تجمل کے بار بار ذکر کرنے سے مجھ پر اثر ہونے لگا تھا۔ میں کچھ اداس اداس اور خاموش خاموش رہنے لگا۔ فیصلے میں ایک رات کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ میں اور وہ زمین پر لیٹے ہوئے تھے کہ تجمل کہنے لگا۔ "لاڈلے! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تیری طرف سے کوئی اور موت قبول کر لے؟"

"کیا مطلب؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"مطلب یہ ہے شہزادے کہ اگر ایسا ہو جاتے کہ تیری جگہ میں پھانسی کے تختے پر چلا جاؤں اور تو آزاد ہو جاتے۔"

"اگر ایسا ممکن بھی ہوتا تو میں اسے قبول نہ کرتا۔"

"پتہ نہیں، اپنا کیا فیصلہ ہو۔" تجمل کہتا ہے کہ وہ مجھے بچانے کے لیے جان کی بازی لگا دے گا۔ تجمل کہتا ہے تو صحیح ہی کہتا ہو گا۔ سالے کی زبان میں تاثیر ہے، جو کہہ دیتا ہے وہی ہو جاتا ہے۔ امید ہے کہ وہ مجھے صاف بچا لے جائے گا لیکن اگر تو زندہ نہ رہا تو مجھے اپنے فیصلے سے کوئی خوشی نہیں ہو گی۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ تیرے بجائے وہ مجھے سزا دے دیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں موت سے زیادہ قریب ہوں۔ اسے کچھ اور قریب کر لوں گا۔"

"ہونہہ۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "کیسی خوابوں کی باتیں کرتے ہو۔"

"لاڈلے! کل تجمل کہہ رہا تھا، تیرا مقدمہ اب بھاری نہیں رہا۔"

"یہ تو کل پتہ چل جائے گا۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "مجھے تو اس کی خوشی ہے کہ آخر کوئی فیصلہ تو ہو جائے گا، ادھر یا ادھر۔"

"لاڈلے! اگر قاتلوں کے لیے یہ کوٹھڑیاں نہ ہوتیں تو میں تجھے فرار کرا دیتا اور شہر میں میرے لونڈے تجھے اس طرح انڈر گراؤنڈ کر دیتے کہ پولیس کو دنیا تک خبر نہ ملتی۔"

"جو باتیں ہو نہیں سکتیں، ان پر سوچتے کیوں ہو؟"

اس رات ہم دونوں میں سے کسی کو نیند نہیں آئی۔ رات سے دل پر ہول طاری ہو گیا تھا۔ صبح ہوئی تو میں ڈگمگانے سا لگا اور میرا دل بے تحاشا دھڑکنے لگا۔ تجمل نے گلے لگا کے مسکراتے ہوئے مجھے رخصت کیا۔ ایک ایک پل صدیوں کی طرح گزر رہا تھا۔ کوئی میرے جسم سے طاقت کھینچے لے رہا تھا۔ میں خود کو لاکھ سمجھا رہا تھا کہ جو ہو گا، اسے ہمت سے قبول کرنا چاہیے مگر اس دن عدالت لے جانے والی گاڑی کی رفتار بھی شاید بہت سست تھی۔ ہر طرف ایک شور سا مچا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ سارے جسم میں سنسناہٹ تھی۔ ایک سرد لہر آتی تھی اور گزر جاتی تھی۔ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب گاڑی عدالت کے احاطے میں ٹھہری اور کب مجھے جج کے کمرے تک پہنچایا گیا۔ میں تو گم سم، بے جان سا بیٹھا تھا۔ سپاہیوں نے مجھے سنبھالا اور زمین پر میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ پاتا۔ آخر وہ گھڑی آ گئی جب جج نے اپنا فیصلہ سنانا شروع کیا۔ عدالت میں غیر معمولی خاموشی طاری ہو گئی۔ ہر شخص دم بخود تھا لیکن میرا سارا وجود لرز رہا تھا۔ شاید میں بہرا ہو گیا تھا۔ شاید جج مقدمے کی نوعیت اور مختلف مدارج کا ذکر کر رہا تھا۔ مجھے کچھ ہوش نہیں تھا۔ مجھے ہوش اس وقت آیا جب جیل کے ایک سنتری نے میرا بازو جھنجھوڑ کے مجھے چونکایا۔ جج کہہ رہا تھا۔ "قتل کی ناکافی شہادتوں، پہلے دو مقتولین کے گندے ریکارڈ، ڈاکٹری رپورٹ اور مجرم کی کم عمری دیکھتے ہوئے عدالت اس کے لیے چودہ سال قید بامشقت کی دوہری سزا تجویز کرتی ہے۔ دونوں سزاؤں کا اطلاق ایک ساتھ ہو گا۔"

جیسے ہی جج نے فیصلہ سنایا، وکیل صفائی دوڑتا ہوا میرے پاس آیا۔ اس نے مجھے زور سے بھینچ لیا۔ "میں ان حالات میں تمہارے لیے یہی کر سکتا تھا، تمہیں زندگی مبارک ہو۔" عدالت میں بیٹھا ہوا ہر شخص میری طرف لپکنے لگا لیکن سپاہیوں نے انہیں مجھ سے ملنے کا موقع نہیں دیا۔ کمرۂ عدالت میں ایک انتشار سا پیدا ہو گیا تھا۔ "لڑکے وکیل سے سپاہیوں کی پرانی شناسائی معلوم ہوتی تھی۔ وہ مجھے جیل کی گاڑی تک پہنچانے آیا اور مبارک باد دینے لگا۔"

"میں تجمل کو جا کے بتاؤں گا تو وہ کتنا خوش ہو گا۔"

"میں خود تجمل کے پاس جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اب تمہاری جگہ بدل دی جائے گی۔ تجمل سے تمہاری ملاقات نہیں ہو سکے گی۔ شاید وہ تم سے پھر کبھی آ کے ملے۔"

۱۴ سال قید بامشقت۔ موت کے بجائے زندگی، آدھی زندگی، زنجیروں میں بند زندگی۔ ۱۴ سال کس نے دیکھے ہیں۔ ۱۴ سال کے بعد کیا ہو گا؟ وہ سب خوش تھے کہ میں موت سے بچ گیا لیکن مجھے نہ خوشی تھی، نہ غم بلکہ غم ہی کچھ زیادہ تھا۔ ۱۴ سال تک جہنم کا عذاب، زندہ درگور، اس احساس کے ساتھ زندہ رہوں گا کہ کورا ابھی اس دنیا میں کہیں ہے اور کہاں ہے؟ یہ مجھے شاید کبھی معلوم نہ ہو سکے۔ کورا کا غم سینے میں چھپائے زندہ رہوں گا۔ صرف ایک رات کے سفر کے فاصلے پر میرا گھر اور گھر والے موجود ہیں۔ مجھے ستانے کے لیے زندگی کی سزا دی گئی ہے۔ میرے ساتھ ایک بے رحم مذاق کیا گیا ہے۔

لڑکے وکیل کی بات درست نکلی۔ میری جگہ تبدیل کر کے مجھے عام قیدیوں کی بیرک میں منتقل کر دیا گیا۔ یہاں کا پہلا تجربہ ہی ناخوش گوار ثابت ہوا۔ کوٹھری میں مجھے صرف تجمل ملا تھا مگر یہاں بھانت بھانت کے لوگ موجود تھے۔ میری آمد پر سبھی نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔ ایک نوجوان قیدی میرے جسم کے چاروں طرف گھوم کے میرا جائزہ لینے لگا۔ دوسرے قیدی یہ تماشا دیکھتے رہے اور ہنستے رہے۔

"یہ کیا مذاق ہے؟" میں نے غصے سے کہا۔ جواب میں اس نے ایک بے ہودہ جملہ کہا اور ہاتھ بڑھا کے میرے بال پکڑ لیے۔ پھر غور سے میرا چہرہ دیکھنے لگا اور بال پکڑے پکڑے اس نے چہرہ تمام قیدیوں کے سامنے کیا اور میرے گال کا بوسہ لے لیا۔ میرا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔ اس کے پیٹ میں گھونسا مارنے میں مجھے کچھ دیر نہیں لگی۔ وہ چیختا اور بلبلاتا ہوا فرش پر گر گیا۔ پھر جیسے ہی اس نے اٹھنے کی کوشش کی، میں نے اس کے جبڑے پر ایک ٹکر رسید کر دیا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اس نے دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی۔ میرے گھونسوں اور لاتوں نے اسے تباہ حال کر دیا۔ ایک دوسرا قیدی اسے بچانے کے لیے آگے بڑھا مگر قیدیوں نے اسے روک لیا۔ وہ تجسس اور حیرت سے اپنے ساتھی کو پٹتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

"کیا کہنے، کیا کہنے، سبحان اللہ سبحان اللہ۔" ایک شخص نے آگے بڑھ کے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور میرا ہاتھ بلند کر کے مجھے فتح یاب قرار دے دیا۔ قیدیوں میں تالیاں بجنے لگیں۔ جس نوعمر قیدی کو میں نے گرایا تھا، اسے اٹھا کے میرے پاس لایا گیا تھا۔ اس کے منہ سے خون جاری تھا۔

"چلیے ہاتھ ملائیے صاحب زادے، ہاتھ ملائیے۔"

اس نے بہت نفرت اور غصے سے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ "جناب کا نام؟" ادھیڑ عمر کے شخص نے شائستگی کے ساتھ پوچھا۔

"ظہیر خان۔" میں نے برہمی سے جواب دیا۔

"ماشاء اللہ، کیا ہاتھ دکھاتے ہیں جناب نے۔ خادم کو عظمت خان عرف نصیب میاں کہتے ہیں۔" اس نے ہاتھ بڑھا کے کہا۔ "کب تک قیام رہے گا؟"

"۱۴ سال۔" میں نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔

یہ سن کے تمام قیدی میرے اطراف اکٹھے ہو گئے۔ "خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو چار۔" نصیب میاں نے کہا۔ "جناب کا وطن؟"

"پوری دنیا۔" میں نے جواب دیا۔

"آہا ہا، کیا شاعرانہ بات ہے۔" پھر اس نے مجھ سے مختلف قیدیوں کا تعارف کرایا۔ "یہ بندو ہے، یہ ساڑھے ہے، یہ چمن میاں ہیں، یہ جگو ہے، یہ لیلا ہے، نام اس کا لیلا ہے مگر کام مجنوں کا کرتا ہے، یہ ہر چرن ہے، ہم اسے ہر جی کہتے ہیں، یہ تیجا ہے، چاقو کے فن میں ماہر، یہ شبلی ہے، کم بخت گانا خوب گاتا ہے۔ اور اس کا کوئی نام نہیں ہے، نمبر ہے، چوبیس۔ یہ نواس ہے، جیب تراشی کے فن میں یکتا۔ یہ گھوش ہے۔ ایسے ایسے پینترے بدلتا ہے کہ گرگٹ بھی شرما جاتے۔ یہ لالہ ہے، دولتی مارتا ہے اور یہ جسے جناب نے شکست فاش دی ہے اس کا نام کالا نتے ہے۔ اس بیرک میں ایک سے ایک نامی گرامی شخصیت موجود ہے۔ اب اپنے بارے میں بتائیے۔ جناب کا آنا کیسے ہوا؟"

"قتل۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"کیا خوب، وہ تو جناب کے تیوروں سے نظر آتا ہے، کس کی بن آئی تھی؟ کچھ تفصیل سنا کے ہمیں بھی لطف اندوز ہونے کا موقع دیجیے گا۔"

"لمبی داستان ہے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔

"تو پھر سو ختے ہیں۔ سنائیے گا۔ جناب خاصے تھکے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔" نصیب میاں کا انداز مضحکہ خیز تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سب میرا مذاق اڑا رہے ہوں۔ نصیب میاں مسلسل باتیں کر رہا تھا۔ "دیکھ کیا رہے ہو۔ مہمان کی خاطر کرو۔" نصیب میاں نے ان سب کو اشارہ کیا۔

جس شخص کا نام جگو تھا، اس نے بیڑی کا بنڈل میرے آگے کر دیا۔ میں نے نفرت سے منہ سکیڑ لیا، اس نے بھی منہ بگاڑا مگر ایک دوسرے شخص نے اپنے لمبے بالوں میں انگلیاں ڈال کے سگریٹ نکالا اور مجھے پیش کیا۔ "نہیں، میں تمباکو نہیں پیتا۔"

پہلے ہی تجربے سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں اور طریقے سے زندگی بسر کرنی ہو گی۔ شکل و شباہت سے ان میں کوئی معقول آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک ایک چھٹا ہوا بدمعاش معلوم ہوتا تھا۔ میں ان سب سے کم عمر تھا۔ نصیب میاں البتہ کچھ مختلف قسم کا شخص تھا۔ اس کا رنگ گندمی تھا اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہو گی، بہت چہک چہک کے باتیں کرتا تھا۔ جس شخص کو میں نے مارا تھا، اس کی عمر بیس پچیس سال ہو گی، رنگ سانولا اور جسم فربہ تھا لیکن اس کا قد میری طرح نکلتا ہوا نہیں تھا۔ چہرے پر چاقو کے دو واضح نشانات موجود تھے۔ اس کی مونچھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ بڑھے ہوئے بالوں کی وجہ سے اس کا چہرہ ہیبت ناک ہو گیا تھا۔ بعد میں مجھے ان کی گفتگو سے پتہ چلا کہ کالا نتے کو فرش بوس کر دینا ان کے نزدیک بڑے دل گردے کی بات تھی۔ خود کالا نتے کا یہ حکم تھا کہ جب وہ کسی سے مقابلہ کر رہا ہو تو کوئی درمیان میں دخل دینے کی جرأت نہ کرے۔ سب حیرت زدہ تھے کہ میں کالا نتے پر غالب کیسے آ گیا؟ وہ نہیں جانتے تھے کہ کالا نتے میں وہ غصہ اور اشتعال نہیں تھا جو اس

نے مجھے دلا دیا تھا۔ اگر میں ٹھل کے ساتھ چند دن نہ گزار چکا ہوتا تو مجھے اس پر ہاتھ اٹھانے کی ہمت کبھی نہ ہوتی۔

ایک دن میں وہ مجھ سے خاصے مانوس ہو گئے حالانکہ میں نے اُن سے اپنے سلسلے میں بہت کم باتیں کی تھیں۔ میں رات بھر اپنی سوچوں میں گم رہا۔ دوسرے دن صبح تمام قیدی میدان میں لائے گئے اور انھیں مختلف کاموں پر لگا دیا گیا۔ میرے لیے ہر بات نئی تھی۔ میدان میں دوسرے بیرکوں کے قیدیوں سے بھی میری ملاقات ہوئی۔ دو ایک قیدیوں نے مجھ سے گندا مذاق کیا اور کھلنے کی کوشش کی تو میں نے کانتے والا تجربہ آزمایا۔ محافظوں نے سزا کے طور پر بیدوں سے میری کھال اُدھیڑ دی لیکن میں نے بھی اُف تک نہیں کی۔

صرف سو دن میں ہر طرف یہ مشہور ہو چکا تھا کہ میں ہی وہ لڑکا ہوں جس نے کانتے کو گرایا ہے اور میں اکٹھے تین قتل کر کے یہاں آیا ہوں۔ اُن میں مختلف چھوٹی بڑی سزاؤں کے قیدی تھے۔ مجھے سب سے پہلے زمین کھودنے کے کام پر لگایا گیا۔ صبح سے سہ پہر تک میں مٹی ایک جگہ سے کھود کے ڈلیا میں بھرتا اور دوسری طرف ڈال آتا۔ ذرا بھی غفلت ہوتی تو سنتری کا بید میری کمر پر پڑتا، دو دن میں میرے ہاتھ چھل گئے۔ میں یہ سمجھ کے اپنے ہاتھ دوسرے قیدیوں سے چھپاتا تھا کہ وہ میرا مذاق اُڑائیں گے۔ بوجھ اٹھانے پانی بھرنے اور مٹی کھودنے سے میرے جسم میں درد ہونے لگا اور ہر لمحے کورا کا چہرہ میری نظروں میں گھومتا رہا۔ کاش وہ مجھے ایک نظر دیکھ لیتی کہ میرا کیا حال ہو گیا ہے۔ اس سے بچھڑے ہوئے ایک مہینہ ہو گیا تھا۔

تیسرے دن صبح ہی صبح ایک سنتری نے بیرک میں مجھے ٹھل کا پیغام سنایا۔ ٹھل نے کہلوا کے بھیجا تھا کہ "لاڈلے کا خیال رکھنا۔"

"کون لاڈلا؟" نصیب میاں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ نیا لڑکا جو آیا ہے۔" سنتری نے میری طرف اشارہ کیا۔

کانتے پہلی بار جوش میں میرے پاس آیا اور تیزی سے پوچھنے لگا۔ "تم اُستاد ٹھل کو جانتے ہو؟"

"ہاں۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔

اُس نے مجھے اٹھا کے سینے سے لگا لیا۔ "پہلے کیوں نہیں بتایا تھا یار! اُستاد کا آدمی ہے میں بھی تو کہوں یہ چھت سے اچانک کون ٹپک پڑا۔ اُستاد نے اس کے لیے پیغام بھیجا ہے تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی بھیجا ہوگا۔"

"واہ لاڈلے میاں! تم نے بھی کیسا تکلف کیا۔" نصیب میاں نے بھڑک کے کہا۔ "ٹھل بھائی کا آدمی آئے اور ہمیں خبر بھی نہ ہو۔ یا ٹھل بھائی۔ جب سے وہ گئے ہیں جیل کی رونق ہی چلی گئی۔ سنتری بھی اب منہ آنے لگے ہیں۔ اُن کی کیا بات ہے، جب آتے ہیں جیل کے در و دیوار کانپ جاتے ہیں۔"

"سنا ہے اُستاد اس مرتبہ کچھ گہرے ہی پھنس گئے ہیں؟" لیلا کی آواز بھی اُس کے نام کی طرح نسوانی تھی۔

"ہاں مگر انھیں یقین ہے کہ وہ چھوٹ جائیں گے کیونکہ ٹنڈا وکیل یہی کہتا ہے۔" میں نے دبدبے سے کہا۔ "اُن کا فیصلہ بس ہونے والا ہے۔"

"پھر وہ ادھر ہی آئیں گے۔" نصیب میاں نے کہا۔

پہلے ہی دو چار واقعوں سے میں تمام قیدیوں کا مرکزِ نگاہ بن چکا تھا، اب ٹھل کے حکم نے کچھ اور اثر دکھایا۔ وہ سب میرے کام میں ہاتھ بٹانے لگے۔ میں ایک مہینے کی قلیل مدت میں اس نئے ماحول کا عادی ہو گیا۔ صبح اُٹھنا، کام پر لگ جانا، شام کو بیرک میں رہزنی، ڈکیتی، اغوا، قتل، چوری اور جیب کاٹنے کے واقعات، شولی کا گانا اور نصیب میاں کے پھڑکتے ہوئے شعر سننا۔ ہر قیدی کے ساتھ ایک عجیب داستان وابستہ تھی۔ نصیب میاں کسی زمانے میں لکھنؤ کے چھوٹے موٹے نواب تھے۔ پھر ایک حسین و جمیل طوائف پر عاشق ہو گئے اور ساری دولت لٹا بیٹھے اور باؤلے بن کے اپنی محبوبہ کے کوچے کا طواف کرنے لگے۔ وہ طوائف لکھنؤ میں اُن سے محبت کا دعوا کرتی تھی مگر ایک آشنا کے ساتھ کلکتے بھاگ آئی۔ نصیب میاں اپنا سب کچھ اُس پر لٹا چکے تھے، کلکتے میں اُسے مار کے ہی انھیں چین ملا۔ وکیل نے کوشش کر کرا کے اُن کی پھانسی کی سزا عمر قید میں تبدیل کروا دی۔ یہ واقعہ سناتے وقت نصیب میاں کی آواز جھرجھرانے لگی تھی۔ وہ تصورات میں لکھنؤ پہنچ گئے تھے۔ شولی اپنی پُرسوز آواز میں گا گا کے انھیں جیل کی دنیا میں واپس لایا۔ جب بھی نصیب میاں ماضی میں جاتے، شولی یہی کرتا تھا اور وہ واپس آ کے پھر ہنسنے بولنے لگتے تھے۔

ہل چلانا، مار کھانا، بوجھ ڈھونا، پانی بھرنا، چادریں، دریاں اور کھادی کے دوسرے کپڑے بنانا۔ جیل کے کارخانے میں مشقت کرانے کے کئی طریقے ایجاد کیے گئے تھے۔ اس چار دیواری میں صرف مرد رہتے تھے اور مرد بھی وہ تھے جو چار دیواری کے باہر علیحدہ پہچانے جاتے تھے۔ جگہ جگہ کے منتخب لوگ یہاں جمع تھے، کوئی ہمیشہ ہنستا رہتا تھا، کوئی ہمیشہ روتا رہتا تھا۔ کوئی زمانے کو ہمیشہ انگوٹھے سے ٹھکراتا تھا، کوئی باہر کی دنیا کی یاد میں گم رہتا تھا۔ سب کے چہرے ڈھلکے ہوتے تھے، آنکھیں اندر دھنسی جاتی تھیں، ہر طرف گندگی تھی، مچھر، کھٹمل، پسّو، ناکافی ہوا، گرمی، سنتریوں کی گالیاں، قیدیوں کی باہمی لڑائیاں، بات بات پر تکرار، کبھی دال روٹی کبھی چاول اور پتلی دال۔ ہفتے میں دو بار پانی کا شوربہ، بدبو، ہر سمت ایک سیلی ہوئی بو، حبس، گھٹن۔ ایک مہینے میں جیل کے ماحول سے پوری طرح واقف ہونے کے باوجود مجھے بہت وحشت ہونے لگی۔ ایسی وحشت کہ کسی سے بات کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ میں جب یہ سوچتا کہ مجھے ۳، سال تک اسی چار دیواری میں زندگی بسر کرنی ہوگی اور اس زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی تو میرے اعصاب جواب دینے لگتے تھے۔ میری یہ حالت دیکھ کے کانتے، جگو، لیلا، شولی، نصیب میاں اور دوسرے لوگ میرے گرد اکٹھے ہو جاتے اور فحش مذاق کر کر کے پوچھتے۔ "کون یاد آ رہا ہے لاڈلے کچھ ہمیں بھی تو بتا یار!"

لاڈلا کیا بتاتا؟ لاڈلے کے تو سارے لاڈ ختم ہو گئے تھے۔ ایک ایسی ہی چار دیواری میں لاڈلے کا گھر کا تھا جس میں آزاد قیدی رہتے تھے۔ فہمیدہ رہتی تھی، شبّو رہتی تھی۔ ایک امی رہتی تھی، ایک ابا رہتے تھے۔ نہ جانے لاڈلے کے جی میں کیا آئی کہ ایک رات اُس نے سب کو اُس چار دیواری میں دفن کر دیا اور خود بھاگ کے چلا آیا۔ وہ سب اپنی اپنی کہانی سناتے تھے۔ میں نے انھیں کچھ نہیں بتایا تھا۔ مجھے خوف تھا کہ پھر میرے پاس کچھ نہیں رہے گا۔ میں تو خالی ہو جاؤں گا۔ جیسے کورا کو میرے سینے سے کوئی چرا کے لے جائے گا۔ میں اُن سے کیا کہتا کہ جیل کی چار دیواری میں انھیں جو یہ میرا جسم نظر آتا ہے یہ تو ایک ڈھانچا ہے۔ اس کی جان تو باہر ہی بھٹک رہی ہے۔ اس کی روح تو کورا کو تلاش کر رہی ہے۔ کاش کورا کا کچھ نشان مل جائے، اب کچھ نہیں رہا، صرف اتنا معلوم ہو جائے کہ وہ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ ورنہ یہ سانس اٹکی رہے گی۔

ڈیڑھ مہینے بعد جیل کے پُرسکون سمندر میں جوار بھاٹا آ گیا۔ معلوم ہوا کہ ٹھل آ گیا ہے اور اس بار چار سال کے لمبے قیام کے لیے آیا ہے۔ اُس نے آتے ہی مجھے پوچھا اور مجھے دیکھ کے حیرت زدہ رہ گیا۔ "لاڈلے!" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ ڈیڑھ مہینے میں تجھے کیا ہو گیا؟ تیرا رنگ روپ کون چھین لے گیا؟" پھر وہ قیدیوں سے غصّے میں مخاطب ہوا۔ "کیا تمھیں میرا پیغام نہیں ملا تھا حرام کے جنو؟ اس کا کیا حال کر دیا ہے؟ کیا تمھیں سنتری نے نہیں بتایا تھا کہ یہ میرا لاڈلا ہے۔"

ٹھل کی گرج سے سب کانپنے لگے۔ نصیب میاں سب کے نمائندے کی حیثیت سے آگے بڑھے اور نیاز مندی سے بولے۔ "ٹھل بھائی! آپ کا حکم ملا تھا، خدا جانتا ہے، لاڈلے کا پورا خیال رکھا۔ ہم نے اسے ہر طرح خوش رکھنے کی کوشش کی، اسے کہانیاں سنائیں، اس کے کام میں ہاتھ بٹایا۔ شولی نے اسے روز گانا سنایا مگر یہ روز بروز اداس اور خاموش ہوتا چلا گیا۔ اس نے ہم سے بات کرنی تقریباً بند کر دی ہے۔ ہر وقت کچھ سوچتا رہتا ہے، کڑھتا رہتا ہے، نہ کسی سے کچھ کہتا ہے نہ کسی کی سنتا ہے۔ ٹھل بھائی! بھلا آپ کا حکم ہو اور آپ کے جاں نثار اُس کی تعمیل نہ کریں۔"

"تم نے اسے کام کیوں کرنے دیا کم بختو! تم نے اس کے ہاتھ نہیں دیکھے تھے؟ اس کا رنگ نہیں دیکھا تھا؟ تم نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا تھا جو تم سب حرام زادوں سے الگ نظر آتا تھا۔" ٹھل گرجنے لگا۔ "تم نے میرے لاڈلے کو کیا سے کیا بنا دیا۔"

کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سب نے گردنیں جھکا لیں کیونکہ ٹھل سخت طیش میں تھا۔ اُس نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا اور اپنے پہلو میں بٹھا کے کہنے لگا۔ "لاڈلے جانی! بندے نے آنے میں دیر لگا دی۔ میں تو پہلے ہی آ جاتا۔ مجھے معلوم تھا کہ تجھ پر کیا بیت رہی ہوگی۔ اب تو فکر کرنا چھوڑ دے۔ یہ جیل ضرور ہے مگر یہاں ٹھل موجود ہے۔ ٹھل کی موجودگی میں تو اداس ہوتا ہے شہزادے؟ اب ہنس دے، قسم خدا کی ہنس دے۔ ٹھل کو خوش کر دے۔" وہ مجھے جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔ "اتنا ہنس کہ آنسو نکل آئیں تیرے آنسو بھی تو ٹھیک سے نہیں نکلے ہیں پگلے ہنس ورنہ۔۔۔"

میں نے بمشکل تمام اُس کے حکم کی تعمیل کرنے کی کوشش کی۔ ہنسنے کا چہرہ بنایا تو وہاں موجود سب لوگ بے تحاشا ہنسنے لگے۔ ٹھل بھی ہنسنے لگا۔ ٹھل کے آنے کے بعد جیسے جیل کا نظم و نسق تبدیل ہو گیا۔ ہر چیز میں باقاعدگی آ گئی۔ لڑائی جھگڑے کم ہو گئے۔ ٹھل کے گروہ کے آدمی سگریٹ، پان اور کھانے کی دوسری چیزیں اُسے پہنچا دیتے تھے اور ٹھل انھیں سارے قیدیوں میں تقسیم کر کے پھر خود کھاتا تھا۔ اب میں برائے نام کام کرتا تھا۔ سنتری بھی ٹھل کی وجہ سے درگزر کرتے تھے لیکن چار مہینے کی یکسانی سے اُکتا کے میں نے کام پر جانا شروع کر دیا۔ اس عرصے میں قیدیوں کو یہ پتہ لگ گیا تھا کہ میں تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا جانتا ہوں۔ پہلے وہ اپنے خط نصیب میاں اور دوسرے معمولی پڑھے لکھے لوگوں سے لکھواتے تھے، اب اُن کا یہ کام میں کرنے لگا۔ ٹھل نے پہلوانی، چاقو زنی اور لٹھ بازی کے بہت سے داؤ مجھے سکھا دیے تھے۔ وہ کہتا تھا۔ "وہ آدمی مُردار ہے جو اپنا بچاؤ نہیں کر سکتا۔ زندہ رہنے کے لیے کچھ ثابت کرنا پڑتا ہے لاڈلے!" ٹھل کے حکم سے سرتابی ناممکن تھی۔ اُس کے گروہ کے لوگ اور وہ لوگ بھی جو اُس کے گروہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے جیل میں شاگردوں کی طرح اُس کی اطاعت کرتے تھے، اُسے اُستاد مانتے تھے۔ اُن لوگوں نے بھی مجھے فنونِ حرب سے آراستہ کرنا شروع کر دیا تھا۔

ٹھل مجھے اپنے قریب ہی رکھتا تھا۔ اُس سے میری قربت کے باعث جیل میں ہر شخص میری بڑی عزت کرتا تھا۔ عزت کرتا تھا یا خوف زدہ تھا، کچھ بھی ہو مگر ٹھل کے آنے سے پہلے اور آنے کے بعد اُن کے رویّوں میں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا تھا۔ کسی نہ کسی طرح چھ مہینے کٹ گئے۔ جب میں راتوں کو اچانک بے چین ہو جاتا اور اُٹھ اُٹھ کے بیرک میں ٹہلنے لگتا تو دوسرے قیدی ٹھل کو میرا احوال سناتے اور وہ میری گردن پکڑ کے اصرار کرتا کہ "لاڈلے! گھن لگ جائے گا، زنگ لگ جائے گا، اتنا مت گھٹا کر۔ دِق ہو جائے گی میری جان! مجھے بتا دے کہ تجھے کیا غم ہے؟ قسم ہے اپنے رب کی، ٹھل سات تہہ خانوں سے تیرے لیے خوشی لائے گا۔" ٹھل اسی قسم کے وعدے کرتا رہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ایک چھوٹی سی لڑکی کورا کی خبر نہیں لا سکتا۔ میرا دل اب بالکل نہیں لگتا تھا۔ کچھ دن اچھے گزرتے تھے پھر نہ جانے کیا ہو جاتا تھا، دیواروں سے سر پھوڑنے کو جی چاہتا تھا۔ میں کھانا جوں کا توں واپس کر دیتا تھا، پانی نہیں پیتا تھا، راتوں کو جاگتا رہتا تھا، بہت سخت محنت کرتا تھا، دھوپ میں اپنے آپ کو تپاتا رہتا تھا۔ ٹھل آ کے مجھے سمجھاتا، ڈانٹتا ڈپٹتا، جھڑکتا، گالیاں دیتا، پیار کرتا، میرے گالوں پر طمانچے مارتا، پھر سینے سے بھی لگا لیتا۔ ہر طرف ایک اندھیرا سا نظر آتا تھا۔ ایک دن ٹنڈا وکیل ٹھل سے ملنے آیا تو اُس نے مجھ سے پوچھا، "مجھے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟" میں نے اُس سے چند

کتابوں کی فرمائش کردی۔ اگلی ملاقات میں نیتا کتابیں لے آیا، قصّے کہانیوں کی کتابیں۔ کتابوں سے میرا دل خوب بہلا۔ تجمل کو یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی اور اُس نے جیل میں اُس سے ملنے کے لیے آنے والے گروہ کے ہر شخص کو نئی نئی کتابیں لانے کا حکم دیا۔ میرے لیے یہ مشغلہ خاصا سود مند ثابت ہوا۔ تجمل پڑھنا لکھنا بالکل نہیں جانتا تھا، کبھی کبھی رات کو مجھ سے فرمائش کرتا، "لاڈلے! کوئی اچھی سی کہانی ہو تو ہمیں بھی سُنا۔" میں اُسے بلند آواز میں کہانیاں سنایا کرتا۔ بیرک کے دوسرے قیدی بھی دل چسپی سے کہانیاں سُنتے۔ جیل میں قیدیوں کو ایک نیا مشغلہ ہاتھ آگیا تھا۔ پھر ایک دن نیتا نے مجھ سے کہا کہ میں جیل میں اپنا تعلیمی سلسلہ کیوں نہ شروع کروں؟

"کیا ایسا ہو سکتا ہے۔؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔ میں تمھیں اس کی اجازت دلوا دوں گا۔" نیتا نے گرم جوشی سے کہا حالانکہ میں نے میٹرک کا امتحان پاس کرلیا تھا اور فرسٹ ایئر میں پڑھتا تھا لیکن جیل میں میرے پاس کوئی سرٹیفکیٹ نہیں تھا۔ میں نے نیتا سے جب یہ کہا کہ میں میٹرک کا امتحان دینا چاہتا ہوں تو وہ ہنسنے لگا۔ "میٹرک بہت اونچی کلاس ہوتی ہے لاڈلے! ابھی مڈل کی سوچو۔"

"ٹھیک ہے مگر تم میٹرک ہی کی اجازت لو اور مجھے کتابیں لاکے دو۔"

"میٹرک مشکل ہوتا ہے لاڈلے میاں؟"

"جو میں کہہ رہا ہوں، وہی کرو۔"

نیتا نے حامی بھرلی اور جیل کے حکام سے مجھے امتحان میں بیٹھنے کی خصوصی اجازت دلوا دی۔ اُس نے مجھے میٹرک کا پورا کورس بھی لاکے دے دیا جو میرے لیے بہت آسان تھا، پھر بھی میں شب و روز، جب بھی وقت ملتا، پڑھتا رہتا اور تجمل میری ہمت بڑھاتا رہتا۔ سنتری بھی اس بات سے خوش تھے کہ میں عام قیدیوں کی صحبت میں بیٹھنے کے بجائے تعلیم کی طرف توجہ دے رہا ہوں اور میٹرک کی تیاری کر رہا ہوں۔ میں نے چار مہینے کی مسلسل محنت کے بعد امتحان دیا اور جب نتیجہ آیا تو جیل میں ایک طوفان برپا ہوگیا۔ میں فرسٹ ڈویژن پاس ہوا تھا۔ تجمل کا خوشی کے مارے بُرا حال تھا، وہ بار بار اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا تھا۔ "دیکھا میرے لاڈلے کا کمال۔" وہ قیدیوں سے مخاطب ہو کے کہتا۔ "یہ تجمل کا لاڈلا ہے، کسی اور کا نہیں۔"

جیل میں ہر طرف سے قیدی مجھے دیکھنے آنے لگے۔ جن کے گھروں سے مٹھائیاں آئی تھیں، وہ اُنھوں نے تجمل کی خدمت میں پہنچا دیں اور اُسے مبارکباد دینے لگے۔ تجمل چودھری بنا ہوا افتخار کے ساتھ مبارکبادیں قبول کرتا رہا۔ نیتا وکیل بھی حیران تھا کہ میں نے پہلی ہی سیڑھی پر میٹرک کا امتحان کیسے دے دیا۔ "لاڈلے! تُو نے تجمل کا نام روشن کردیا۔" وہ میری کمر پر ہاتھ رکھ کے کہتا۔ "تو نے تجمل کے زندہ رہنے کا سامان کردیا۔"

ادھر نصیب میاں سب سے کہتے پھرتے تھے۔ "خدا کی قسم، جیل میں پہلا جی دار آدمی آیا ہے۔" بیرک میں سنتریوں کی اجازت سے ایک جشن منایا گیا۔ کانتے اور دوسرے قیدیوں نے رقص کیا، شوکی نے گانا گایا، طبلے کے طور پر تالیاں بجائی گئیں، منھ سے آوازیں نکالی گئیں اور اُنگلیاں چٹخائی گئیں۔ میں دولھا بنا ہوا درمیان میں بیٹھا تھا۔ تجمل کو اگر بتیاں بہت پسند تھیں، اس موقع کے لیے خاص طور پر اگر بتیاں منگوائی گئی تھیں۔ تجمل بار بار افسوس کا اظہار کرتا۔ "ہائے، میں باہر نہ ہوا ورنہ ایک ہفتے کا جشن مناتا۔"

جیل میں یہ بڑی بات تھی۔ اس رات تو ایسا معلوم ہوا جیسے ہم آزاد ہونے کی خوشیاں منا رہے ہیں اور یہ جیل نہیں ہے کلکتے کا کوئی محلہ ہے۔ دوسرے دن ہی ہم واپس جیل آگئے۔ کھیتی باڑی، وہی مشقتیں، چادریں اور دریاں بنانا اور سنتریوں کی ڈانٹ اور سیکھانا، وہی چاروں طرف اونچی دیواریں۔ تقریباً ہر قیدی کو سزا کے طور پر ایک یا دو ہفتے کے لیے تنگ و تاریک کھولی میں تنہا رکھا جاتا تھا۔ اس طرح اُس کے اوسان ٹھکانے آجاتے تھے اور وہ واپس آکے پوری تن دہی سے محنت کرنے لگتا تھا۔ خوش قسمتی سے میں ابھی تک اُس کوٹھری میں نہیں گیا تھا اور میرا عمومی ریکارڈ نہایت اچھا جا رہا تھا۔ امتحان میں کامیابی کے بعد جیلر اور دوسرے حکام کی نگاہوں میں میرے لیے ایک نرمی آگئی تھی۔ جب میں نے تجمل سے یہ کہا کہ میں آگے بھی تعلیم جاری رکھنا چاہتا ہوں تو اُس نے اپنا سینہ کھول دیا۔ "لاڈلے! میں بھی تجھ سے یہی کہنے والا تھا۔ تُو نے میرے منھ کی بات چھین لی۔ اپنا نیتا بھی کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ میں تجھے وکیل بناؤں گا، جب تک نیتا مر چکا ہوگا۔ بھلا وکالت میں کتنے دن لگ جائیں گے لاڈلے؟"

"کوئی چھ سال۔" میں نے جواب دیا۔

"اُس وقت تک تو نیتا ضرور زندہ رہے گا مگر اُسے مال پانی زیادہ دینا پڑے گا۔ سالے کی ہڈیاں نکل آئی ہیں۔"

"تو تم راضی ہو؟" میں نے جوش سے کہا۔

"میں راضی، میرا خدا راضی لاڈلے!"

ایک سال بعد میں نے فرسٹ ایئر کا امتحان پاس کرلیا اور دوسرے سال ابھی میں امتحان کی تیاریوں میں مصروف تھا کہ تجمل کی سزا کے دن پورے ہوگئے۔ جیل میں اُداسی سی چھا گئی۔ اس درمیان کئی نئے قیدی آئے، کچھ چھوٹ گئے، کانتے ایک بار باہر جا کے چھ مہینے بعد پھر اندر آگیا۔ تجمل نے اُسے مار مار کے ادھ مُوا کردیا۔ اُس نے کوئی غلط داؤ لگا دیا تھا۔ رخصت کے وقت تجمل نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں اُس کی عدم موجودگی میں اُداس نہیں ہوں گا اور مسلسل پڑھتا رہوں گا۔ اُس نے تمام قیدیوں کو حکم دیا کہ وہ میرا خاص خیال رکھیں۔ اگر کسی سے ذرا بھی شکایت ہوئی تو اُس کے باہر آنے کا انتظار نہیں کیا جائے گا، جیل کے اندر ہی سزا دی جائے گی۔ تجمل کے جانے کے بعد جیل کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا مگر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی سرپرست درمیان سے اُٹھ گیا ہو۔ نصیب میاں اُس کی نمائندگی ضرور کرتا تھا مگر اُس کا لہجہ اور انداز بانکوں کے تھے۔ اُس میں وہ گھن گرج نہیں تھی جو تجمل میں تھی۔ دو سال میں میرے بازو خاصے مضبوط ہوگئے تھے اور قد پہاڑ کی طرح نکل آیا تھا، داڑھی کے بھورے بھورے بال اُبھرنے لگے تھے اور مسوں کی جگہ مونچھوں نے لے لی تھی۔ میں نے ایف اے کا امتحان دیا اور ساری جیل، جیلر اور پولیس کے دوسرے حکام کو چونکا دیا، میں پھر فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوا تھا۔ تجمل ہفتے میں ایک بار ضرور مجھ سے ملنے آتا تھا۔ یہ خبر سُن کے وہ باقاعدہ جیل میں آگیا۔ اُس نے خود کو چوری کے الزام میں گرفتار کرالیا تھا۔ اُسے تین مہینے کی سزا ہوئی۔ ڈیڑھ دو ماہ گزارنے کے بعد وہ پھر واپس چلا گیا اور میں اپنی تعلیم میں مصروف ہوگیا۔

میرا کام بہت آسان کردیا گیا تھا۔ ایف اے میں میری کامیابی کے بعد جیلر کا رویّہ بھی بدل گیا تھا۔ اُس نے مجھے کلرک کا کام سونپ دیا۔ وہ جیل میں آنے والے پولیس کے حکام کے سامنے مجھے فخر سے پیش کرتا تھا۔ دوپہر کو وہ مجھے دفتر میں بُلا کے اپنے گھر کا پکا ہوا کھانا کھلاتا تھا۔ بی اے کے پہلے سال میری مارکس شیٹ دیکھ کے وہ پہلے تو دنگ رہ گیا پھر ایسا جوش میں آیا کہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ بہت دنوں بعد میں نے ایک گھر دیکھا، وہی بستر، وہی الماریاں، وہی آنگن، وہی گلاس اور گلدان، سب کچھ وہی تھا جو میرے گھر میں تھا۔ مرچ مسالوں اور کپڑوں کی خوش بو سارے گھر میں رچی ہوئی تھی۔ جب بھی گھر کا خیال آتا، میں سر جھٹک کے اُسے کوڑے میں پھینک دیتا، یہ کوڑا خود میرے جسم کے اندر رہتا، ایک ملبا اندر جمع ہوگیا تھا۔ یہاں آکے میرا جی گھبرانے لگا۔ جیلر ساتھ نہ ہوتا تو میں بھاگ جاتا۔ اُس نے مجھے اپنی بیوی سے ملایا۔ "یہ ہے وہ قیدی، لاڈلا! اِس کا نام ظہیر خاں ہے مگر جیل میں سب اسے لاڈلا کہتے ہیں۔"

میں نے گھبرا کے اُسے سلام کیا۔ اُس کی آنکھوں میں وہی حیرت تھی جو چڑیا گھر میں ریچھ دیکھ کے بچوں کو ہوتی ہے، ریچھ نے سلام کیا لہٰذا اُس کا ڈرنا اور سہمنا لازم تھا۔ اُسے جیلر نے ضرور بتایا ہوگا کہ میری گردن پر تین آدمیوں کا خون قرض ہے جو میں یہ سخت سزا کاٹ کے اُتار رہا ہوں۔ سلام کا جواب اُس نے ہچکچاہٹ سے دیا۔ وہ سُرمئی رنگ کی ایک ۳۵، ۳۶ سال کی عورت تھی۔ "بیٹھ جاؤ۔" اُس کے حکم میں کچھ خوف شامل تھا۔ میں نے کچھ تامل کیا مگر جیلر نے مجھے کرسی پر بٹھا دیا۔ "یہ ایک نیا آدمی بن کے جیل سے جائے گا۔" وہ افتخار سے بولا۔ "لاڈلے کا ریکارڈ بھی اچھا ہے، میں اسے جلد سے جلد رہا کرانے کی کوشش کروں گا۔ بچّے کہاں ہیں؟"

عورت دزدیدہ اور مشتاق نگاہ سے مجھے دیکھ رہی تھی اور مجھے یہ سب نیا اور حیرت انگیز لگ رہا تھا۔ کسی عورت کو دیکھے یا اُس سے بات کیے ہوئے ایک مدت گزر گئی تھی۔ جیل کی کڑی سزاؤں میں سب سے سخت سزا یہی ہے کہ مرد عورتوں کو نہیں دیکھ پاتے۔ اپنی ساڑی کا پلّو سنبھالتے ہوئے وہ باہر چلی گئی اور چند لمحوں بعد واپس آئی تو اُس کے ساتھ ایک لڑکا اور دو لڑکیاں تھیں۔ اُن میں سب سے بڑی لڑکی کا رنگ سونے کا تھا۔ دوسری لڑکی عمر میں کورا کے برابر ہوگی۔ وہ استری کے بغیر کپڑے کی طرح رسی پر لٹکی ہوئی تھی۔ لیکن بڑی لڑکی ایک مکلف استری کی ہوئی لڑکی تھی، تیکھے نقش و نگار، بدن کا ہر حصہ تراشا ہوا اور سلیقے سے اپنی جگہ رکھا ہوا تھا، متناسب، بے داغ، متوازن اور ستانہ لڑکا سب سے چھوٹا تھا۔ "لاڈلے یہ ہے میری بڑی بیٹی سونیا۔" جیلر نے کہا۔ "ایف اے کے آخری سال میں ہے اور یہ ہے چھوٹی نٹ کھٹ بلّو، ببلا، پڑھنے میں اِس کا جی بالکل نہیں لگتا۔ یہ ابھی تک آٹھویں میں ہے اور یہ لڑکا دلّو، چھٹی کلاس میں پڑھتا ہے۔ چلو بھئی سب نمسکار کرو لاڈلے کو۔" سب نے ایک ساتھ ہاتھ جوڑ لیے مگر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے آج وہ کسی قاتل کو پہلی بار دیکھ رہے ہیں۔ وہ سب گنگ تھے۔ "ارے، تم سب خاموش کیوں ہو؟" جیلر نے ناراضی سے کہا۔ "لاڈلے سے باتیں کرو، یہ بہت اچھا لڑکا ہے۔"

بڑی مشکل سے سونیا کے لب کھلے اور اُس نے مجھ سے بی اے میں میرے مضامین کے بارے میں پوچھا۔ میری نظریں جھکی ہوئی تھیں اور پسینہ سا آ رہا تھا۔ اُس کی آواز سُریلی تھی۔ کورا کی آواز میرے ذہن میں گونجنے لگی۔ وہ اسی طرح ٹھیر ٹھیر کے، سنبھل سنبھل کے بولتی تھی۔ کورا اب سونیا کے مانند بڑی ہوگئی ہوگی اور بڑی ہو کے وہ کیسی عظیم الشان لڑکی بن گئی ہوگی۔ وہ تو قلوپطرہ کی طرح حسین ہو گی، میں تصور میں اُس کے خاکے بناتا تھا۔ میری کسمساہٹ، کم گوئی اور گریز سے اُن کی جھجک کچھ دُور ہوئی اور وہ سب مجھ سے طرح طرح کے سوال کرنے لگے۔ میرا گھر کہاں ہے؟ میری ماں کیسی ہیں؟ میرے کتنے بہن بھائی ہیں؟ جیلر نے انھیں مجھ سے ایسی باتیں پوچھنے سے منع کیا۔ آدمی کو گھر کی قیمت کا پتہ جیل میں چلتا ہے۔ جیلیں شاید اسی لیے بنائی گئی ہیں کہ لوگ گھروں اور گھر والوں کی قدر و منزلت سے آشنا ہو سکیں۔ نصیب میاں کہتا تھا کہ بیوی کی اہمیت کا اندازہ طوائف کے پاس جا کے ہوتا ہے۔ اُنھوں نے مجھے انناس کا شربت پلایا اور بڑی ہمدردی اور محبت سے باتیں کیں۔ منہ ایسی غذائیں کھانے اور کان ایسی باتیں سُننے سے ناآشنا ہوگئے تھے۔ میں نے اُن کا شکریہ ادا کر کے جلد سے جلد وہاں سے نکل جانا چاہا لیکن جیلر نے روک لیا۔ جب انھیں یہ یقین ہوگیا کہ میں ایک قاتل اور قیدی کے علاوہ ایک انسان بھی ہوں، تب کہیں اُن کا خوف دُور ہوا اور اُنھوں نے آہستہ آہستہ مجھ میں دل چسپی لینی شروع کی۔ سونیا نے سب سے زیادہ باتیں کیں۔ تھوڑی دیر کے لیے مجھے محسوس ہوا جیسے میں آزاد ہوگیا ہوں اور کورا کے سامنے سے باتیں کر رہا ہوں لیکن میں پھر قید ہوگیا۔ اپنی بیرک میں آکے میں خاموش لیٹا رہا، نصیب میاں مجھے چھیڑتا رہا، مجھے رات بھر نیند نہیں آئی۔ کچھ ایسا لگتا رہا کہ کسی نے جسم کو دیا سلائی لگا دی ہے اور وہ بھڑک اُٹھا ہے اور کسی نے پھونک مار کے دبی ہوئی آگ کو ہوا دے دی ہے۔

"یہ سُرخی؟" نصیب میاں نے میری آنکھیں دیکھ کر کہا۔ "میں اِسے خوب جانتا ہوں لاڈلے صاحب! یہ کب اُبھرتی ہے، خدا کی قسم آپ کو دیکھ کے بڑی تسلّی ہوتی ہے کہ جوانی کے دن ضائع نہیں گئے، جو کچھ ہوگیا، وہ تو خیر ہوگیا پر کوئی کسر بھی نہیں چھوڑی۔ یقین کرنا، اِس عمر میں نظریں ٹھیرتی ہی نہیں تھیں۔ صبح کچھ اور رنگ ہوتا تھا، شام کو کچھ اور۔ جسم میں انگارے سے بھرے رہتے تھے اور اُس آگ میں ایسا لطف آتا تھا کہ ہر وقت جلتے رہنے کو جی چاہتا تھا، لاڈلے میاں! ہم پر جوانی ٹوٹ کر آئی تھی اور ہم نے بھی ٹوٹ کر اُس سے پیار کیا تھا۔"

نصیب میاں کی باتیں آج بہت دل کو لگیں، کچھ مجھے بھی ایسی چنگاریاں اُبھرتی محسوس ہوتی تھیں لیکن میں نے کتابوں کے بوجھ سے انھیں دبا دیا تھا، جیلر نے مجھے اپنے گھر لے جا کے بہت بُرا کیا۔ میں رات کو پھر سلاخوں سے باہر سناٹا تکتا رہا اور اپنا بکھرا ہوا جسم سمیٹنے کی کوشش کرتا رہا، رات بھر میں کورا کے حصار میں رہا، وہ کبھی اِدھر سے کبھی اُدھر سے کبھی اِس طرف سے کبھی اُس طرف سے آتی رہی میں سلاخوں سے اپنا سر پھوڑنے اور چیخنے لگا۔ بیرک کے سارے قیدی جاگ گئے نصیب میاں مجھے اپنے دامن سے ہوا دینے لگا۔ پھر جیلر کے گھر میں میری آمد و رفت بڑھ گئی اور سونیا مجھ سے اپنے مضامین اور کتابوں کے بارے میں مشورے کرنے لگی یہ دیکھ کے جیلر نے مجھ سے سونیا کو پڑھانے کی باقاعدہ فرمائش کر دی، میں روزانہ دو گھنٹے اُس کے گھر میں بیٹھا سونیا کو پڑھاتا رہتا، سارے گھر والے میرا احترام کرنے لگے، یہ احترام رفتہ رفتہ ایسے تعلق میں بدل گیا جو عزیزوں کو عزیزوں سے ہوتا ہے، وہ اچھے نمبروں سے پاس ہوتی اور بی اے میں آگئی۔ میں نے بی اے میں بھی فرسٹ ڈویژن حاصل کی تھی۔

سنجیدہ، متین، اور حسین سونیا بڑے انہماک سے پڑھتی تھی۔ ہم دونوں میں تعلیمی موضوعات کے سوا، دوسری باتیں کم ہی ہوتی تھیں۔ میں جب دوپہر کو وہاں جاتا تو وہ کمرے میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی ہوتی اور جب میں واپس ہوتا تو وہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آتی۔ میں روز اُس کی سوندھی سوندھی خوشبو سونگھتا تھا۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھوں سے میری نظریں ٹکرا جاتیں تو وہ کچھ لرز کے اپنی لانبی اور گھنی پلکیں جھکا لیتی۔ اُس کی متانت میں ایک لرزش سی پیدا ہو جاتی مگر وہ فوراً اپنی کتابوں کی طرف متوجہ ہو جاتی۔ شروع شروع میں سونیا کی ماں بھی ہم دونوں سے کچھ دور بیٹھی اپنا کام کرتی رہتی تھی، پھر اُس نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی۔

میں ڈیڑھ سال تک بلا ناغہ وہاں جاتا رہا۔ اب میں ایم اے کی تیاری کر رہا تھا، بتھل کو بھی معلوم تھا کہ میں وکالت کا امتحان دے رہا ہوں۔ وہ چھوٹی موٹی چوریاں کر کے ایک ایک دو دو مہینے کے لیے میرے پاس رہنے آجایا کرتا تھا۔ میں جیل میں جس طرف سے بھی گزر جاتا، لوگ میرا حال پوچھتے، سلام کرتے، ہر طرف لاڈلے میاں، لاڈلے صاحب ہی کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ جس دن نصیب میاں کو رہائی ملی، وہ میرے گلے لگ کے بہت رویا۔ ”میں باہر آپ کا انتظار کروں گا لاڈلے صاحب“۔ وہ جو ہر وقت شوخیاں کرتا اور پھل جھڑیاں چھوڑتا رہتا تھا، مجھ سے رخصت ہوتے وقت بہت اُداس تھا۔ جیل کے بہت سے ساتھی چلے گئے لیکن یہ تو جیل تھی، قیدیوں کا بازار، جیل کی دُکان ہر وقت کھلی رہتی ہے۔ آنے والوں کو اس کے دروازے کبھی مایوس نہیں کرتے مگر واپسی کے لیے یہی دروازے بڑے تنگ ہو جاتے ہیں۔

نصیب میاں بھی چلا گیا اور اُس کے جانے سے جیل خالی خالی معلوم ہونے لگی، نئے نئے قیدی آگئے پُرانے قیدیوں میں میرے سوا چند ہی قیدی اور رہ گئے تھے۔ ساڑھے چار سال گزر گئے اور ایک دن سونیا نے مجھ سے کہا کہ جیلر کا تبادلہ ہو گیا ہے اور اب وہ لوگ جلد ہی یہاں سے کہیں اور چلے جائیں گے۔ یہ خبر سناتے ہوئے سونیا کی آواز بھرّا رہی تھی۔ میں نے کچھ نہیں کہا، کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ میری زبان کو تالا لگ گیا۔ میں نے اپنی ریگ زار آنکھوں سے اُسے دیکھا، اُس کی گھنیری پلکوں پر آنسو جھلملا رہے تھے۔ میرا دل سُن ہو گیا۔

”ہم یہاں سے شہر چلے جائیں گے، پتاجی کہہ رہے تھے کہ آپ کی سزا کے دن پورے ہونے والے ہیں۔“ اُس نے انگلیوں سے اپنے دراز گیسوؤں کے لچھے بناتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ ”آپ وہاں تو آئیں گے نا؟“

”ہاں۔“ میں نے لرزیدہ آواز میں کہا۔

”آپ سیدھے وہیں آئیے گا؟“ اس نے سرگوشی کی۔

”ہاں۔“ میں اس کے سوا کوئی جواب نہیں دے سکا۔

”یہاں سے چھوٹنے کے بعد آپ کیا کریں گے؟“

”کچھ نہیں معلوم۔“ میں نے سرد آہ بھر کے جواب دیا۔

”پتاجی کہتے تھے کہ وہ آپ کی مدد کریں گے وہ آپ کا بہت ذکر کرتے ہیں، آپ۔ آپ آئیں گے نا؟“ وہ اٹک اٹک کر بولی۔

”آپ کب جائیں گی؟“ میں نے اپنی آواز مضبوط بنانے کی کوشش کی۔

”تین چار روز میں۔“ اُس نے اُداسی سے جواب دیا۔

ہم دونوں دیر تک چُپ بیٹھے رہے، نہ کوئی سوال، نہ کوئی جواب! اُس کی ماں نے آ کے ہمیں چونکا دیا۔ سونیا نے ہڑبڑا کر آنسو خشک کیے اور کتابوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اُس کی ماں میرا حال پوچھتی رہی۔ ضیا وحید کا حال پوچھ رہا تھا۔

پُرانا جیلر چلا گیا، نیا جیلر آگیا، نیا جیلر بہت درشت آدمی تھا۔ اُس کے آنے کے بعد جیل میں سخت احکام جاری ہوئے، قیدیوں میں سراسیمگی پھیل گئی بید، ہنٹر، کوڑے برسنے لگے حالانکہ میرے متعلق پُرانا جیلر اُس سے سفارش کر گیا تھا اور میرا سابقہ ریکارڈ بھی بہت اچھا تھا مگر وہ آدمی طبیعت کا تھا، جیل کے لیے انتہائی موزوں۔ بتھل کے گروہ کے لوگوں کا بھی اُس نے ناطقہ بند کر دیا۔ قیدیوں کو بیرک کے باہر ملنے جلنے پر پابندی عائد کر دی گئی مجھ سے کلرکی کا کام چھین لیا گیا اور مجھے دوبارہ مشقت پر لگا دیا گیا۔ دن میں کئی وقت جیل کے حکام معائنے کے لیے آتے اور نئے نئے احکام صادر کرتے۔

بتھل، شرلی، کانتے، جگو، لیلا، سارنگے، نصیب میاں اور بہت دوسرے ساتھیوں کے جانے سے جیل یوں بھی اُجڑ گئی تھی۔ نیا جیلر آ گیا سارا نقشہ ہی پلٹ گیا، پھر سونیا بھی چلی گئی۔ جیل میں جو چند گھنٹے آزادی مل جاتے تھے، وہ بھی ختم ہو گئے، گھر گیا، کورا گئی، سب چلا جائے یہ جو کچھ باقی ہے یہ بھی کیوں ہے؟ مجھے بعض اوقات خود پر حیرت ہوتی کہ میں کیوں باقی ہوں، میرے باقی رہنے کی اب کون سی ضرورت ہے؟

جیل میں سختی کے اُس زمانے میں ایک نیا قیدی داخل ہوا۔ وہ مجھے بیرک کے باہر نظر آیا تھا، میں نے اُسے پہچان لیا لیکن وہ مجھے شناخت نہیں کر پایا کیونکہ میرا قد دارنٹ کی طرح لمبا اور جسم گھوڑے کی طرح پھیل گیا تھا، میرے گالوں پر بھوری سی داڑھی تھی اور مونچھوں سے چہرہ اور بھی بدل گیا تھا۔ سنتریوں کا پہرا سخت تھا مگر میں اُس کے قریب پہنچ گیا اور جاتے ہی میں نے اس کی گردن پر وار کیا۔ وہ فوراً گر پڑا۔ میں اُس پر چڑھ کے اُس کا نرخرا دبانے لگا۔ سنتریوں اور دوسرے قیدیوں نے اُسے میرے پنجے سے نجات دلائی۔ سب حیران تھے کہ آج یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ اُسے دیکھ کے میری آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا، میرے غیظ و غضب کی ایسی کیفیت قیدیوں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ کئی آدمیوں نے مجھے پکڑا لیکن میں ان سب سے آزاد ہو کے اُس پر پل پڑا، وہ میری گرفت میں آتے آتے رہ گیا اور میدان میں اِدھر اُدھر بھاگنے اور شور مچانے لگا۔ پیچھے پیچھے سنتری دوڑ رہے تھے، انھوں نے سنگینیں تان لی تھیں مگر وہ میرے پیروں پر گر گیا۔ ”میں تمھیں پہچان گیا ہوں مجھے معاف کر دو، مجھے معاف کر دو۔“ اُس نے گھگیا گھگیا کر کہا۔ ”تمھیں اپنی ماں اور بہن کی قسم، مجھے معاف کر دو۔“

میں نے اپنے مضبوط پیروں سے اس پر ٹھوکر ماری۔ ”میں تجھے نہیں چھوڑوں گا کمینے!“ میں نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ سنتریوں نے مجھے پکڑ لیا تھا اس کے باوجود وہ میرے پیروں پر سر رکھ کے گڑگڑا گڑگڑا کر معافی مانگ رہا تھا۔ وہ کریم گل تھا، وہ ظالم کریم گل جس نے اپنی چچی کے ساتھ مل کر کورا کو بیچنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ سنتری مجھے پکڑ نہ لیتے تو میں وہیں اُس کا کام تمام کر دیتا۔

”وہ کہاں ہے؟“ میری گرج سے وہ لرز لرز گیا۔

”کون؟“ اس کی کانپتی ہوئی آواز نکلی۔

”وہی، جسے تو پچی بی اور اس حرام زادے کے ہاتھوں فروخت کر دینا چاہتا تھا کمینے، مجھے بتا دے وہ کہاں ہے؟ ورنہ میں تجھے یہیں زندہ دفن کر دوں گا۔“

”خدا کی قسم، مجھے کچھ نہیں معلوم۔“ وہ عاجزی سے بولا۔

سنتری مجھے پکڑ کے ایک طرف لے گئے، کچھ میرے پُرانے ریکارڈ کا اثر تھا کہ انھوں نے صرف تنبیہ کر کے مجھے چھوڑ دیا لیکن جیسے ہی میں اُن کی گرفت سے آزاد ہوا، میں نے کریم گل کی گردن دبوچ لی۔ ”مجھے سب کچھ صاف صاف بتاؤ۔“ سنتریوں نے مجھے دوبارہ پکڑ کے جیلر کی خدمت میں پیش کر دیا اور جیلر نے کسی تاخیر کے بغیر مجھے ایک ہفتے کی قید تنہائی سے نواز دیا۔ مجھے ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ ایک ہفتہ سزا کاٹنے کے بعد جب میں اپنی بیرک میں واپس آیا تو وہاں بتھل پہلے سے موجود تھا۔ ”لاڈلے!“ اس نے مجھے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ ”جانی! یہ تجھے کیا ہو گیا ہے؟ تو تو اب پڑھ لکھ گیا ہے۔ تیرا حال سُن کے مجھے فوراً یہاں آنا پڑا۔“ میری خاموشی پر اُس نے کہا۔ ”مجھے کریم گل کی زبانی سارا حال معلوم ہو گیا ہے، کون تھی وہ لاڈلے؟

تیرے لیے تو میں آسمان سے پری اُتار لاؤں گا۔ جیلوں میں آدھے سے زیادہ قیدی عورتوں کی وجہ سے آتے ہیں، تُو نے بہت چھپایا، لاڈلے! مجھے بتا تو سہی وہ کون تھی اور کہاں ہے؟“

”مجھے کیا معلوم کہ وہ اب کہاں ہے؟“ میں نے تلخی سے کہا۔

”تو اتنی عمر میں اُسے کہاں سے لایا تھا اور تیرا ارادہ کیا تھا؟ کیا تو پاگل ہو گیا تھا؟“

”مجھ سے کچھ مت بولو۔“ میں نے اشتعال میں کہا۔

”میں جانتا ہوں، میں جانتا ہوں لاڈلے!“ وہ میری کمر پر ہاتھ رکھ کے بولا۔ ”تیرے ساتھ کیا گزری ہے؟ پر وہ کہتا ہے کہ اس نے بُری نیت ضرور کی تھی مگر اس کے بعد اُسے کچھ نہیں معلوم۔“

”جھوٹ بکتا ہے۔“

”وہ جھوٹ نہیں بول سکتا، یہاں اُس کی میرے مُریدوں نے جس طرح خاطر کی ہے اُس میں آدمی جھوٹ نہیں بول سکتا۔“

بتھل کی زبانی معلوم ہوا کہ ایک رات بیرک میں اُس کے آدمیوں نے ایک ساتھ اُسے اتنا مارا کہ وہ لہولہان ہو گیا۔ بیرک کے سارے قیدیوں کو سزائیں ملیں، اُن کی کمر ننگی کر کے کوڑے برسائے گئے مگر انھوں نے اُف تک نہیں کی، انھوں نے میرا انتقام لے لیا تھا۔ بتھل نے اُسے میرے پیروں پر لا ڈالا۔ کریم گل نے اعتراف کر لیا تھا کہ میرے ہوٹل سے فرار ہونے کے بعد اُس کے آدمیوں نے ٹیکسی میں میرا تعاقب کیا تھا چونکہ اُسے یقین تھا کہ کورا میری بہن نہیں ہے لیکن راستے میں ٹیکسی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس کے بعد اُس نے کچھ نہیں کیا۔

پھر وہ کون لوگ تھے، جو ہمارا پیچھا کرتے کرتے دریا کے کنارے تک پہنچ گئے؟ کریم گل اس سے زیادہ نہیں بتا سکا، وہ اب بھی ایک لڑکی کے اغوا کے جرم میں سزا کاٹنے آیا تھا۔ یقیناً وہ کوئی اور لوگ تھے جو ہم پر نظر رکھے ہوئے تھے، ممکن ہے وہ ٹیکسی والا ہی شکوک ہو گیا ہو، ممکن ہے وہ پچی بی اور اُس کے شوہر کے زر خرید غنڈے ہوں، کریم گل نے بتایا کہ ہوٹل والوں کو یہ خبر ہو گئی تھی کہ میں نے دو بدمعاشوں اور ایک کانسٹیبل کو قتل کر دیا ہے مگر انھوں نے میرے بارے میں پولیس کو کچھ بتانے کے بجائے خاموش رہنے میں عافیت سمجھی کیونکہ اس طرح اُن کا ہوٹل بدنام ہونے اور پولیس کی نظروں میں آنے کا خدشہ بھی تھا۔ بتھل دو مہینے کی سزا کاٹنے کے بعد مجھے سمجھا بجھا کے باہر چلا گیا۔ کریم گل اب دن رات میری خدمت میں لگا رہتا تھا، کبھی وہ میرے پاؤں دباتا اور سر کی مالش کرنے لگتا، یا کبھی میرے قریب بیٹھ کے مجھے تکتا رہتا، میں نے بڑی مشکل سے اسے جھڑک کے اپنا پیچھا چھڑایا۔

کریم گل کے واقعے سے جیل کے حکام کی نظروں میں میری جو ساکھ خراب ہو گئی تھی وہ ایم اے سال اوّل کے امتحان میں کامیابی کے بعد کچھ بحال ہو گئی۔ نیا جیلر بھی احکام دیتے دیتے تھک گیا تھا، جیل کا پہیا پھر اپنی رفتار سے چلنے

لگا۔ قیدی آتے رہے اور اپنے جرائم کا جزیہ ادا کر کے واپس جاتے رہے، چھ سال میں، جیل کے اندر میں نے رنگ رنگ کے چہرے دیکھے، جیل میں بھی درجے ہوتے ہیں، چھوٹا قیدی، بڑا قیدی، کمزور قیدی، طاقت ور قیدی، کالا قیدی، گورا قیدی۔ بجھل اور اس کے آدمیوں نے مجھے جیل میں رہنے کا سلیقہ سکھایا۔ جیل کے باہر بھی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے اور جیل کے اندر بھی، کتابوں سے زیادہ میں نے ان سے پڑھا اور ان سے زیادہ خود سے پڑھا کہ میں اتنی طویل مدت کے بعد بھی ثروت کو نہ بھلا سکا۔ میرا خود میری کوتاہی، ان چھ سال میں کوئی ایسا لمحہ نہیں گزرا جب وہ مجھ سے دور رہی ہو۔ میں جیل میں قید تھا، وہ میرے سینے میں قید تھی۔

میں ایم اے کے دوسرے سال کی تیاری کر رہا تھا کہ جیل میں ایک نیا قیدی وارد ہوا، وہ چوبیس پچیس سال کا ایک تنومند شخص تھا۔ اس کے چہرے سے شرافت ٹپکتی تھی۔ وہ نہ کسی سے بات کرتا تھا، نہ کسی کی سنتا تھا، بس خاموش اور اداس رہتا تھا، اپنے آپ میں گم، جو میرا حال تھا وہی اس کا تھا، یہی بات مجھے اس کے قریب لے گئی لیکن وہ میری طرح اپنا غم راز نہ رکھ سکا۔ اس نے اچھا ہی کیا، جیل میں ویسے بھی گٹ پٹ کے سارے غم گرد ہو جاتے ہیں، وقت کی دھول ان پر جم جاتی ہے۔ جس نے اپنے غم کا اظہار کر دیا، اس نے اسے ننگا کر دیا۔ میں نے اسے باہر ہی نہیں نکالا تھا کیونکہ وہ مجھے بہت عزیز تھا۔ نوجوان سوشیل میری باتوں میں آ گیا۔ وہ بنارس کا گریجویٹ تھا اور اپنے مختصر خاندان کا واحد کفیل، وہ روزی کی تلاش میں کلکتے آ گیا تھا کہ ایک دن اس کی بڑی بہن ہگلی میں ڈوب گئی کیونکہ اسے سوشیل کے ایک امیر دوست نے دھوکا دیا تھا۔ وہ غیرت مند لڑکی جس نے اپنا سب کچھ اپنے بھائی کے عزیز دوست کے حوالے کر دیا تھا، اس صدمے کی تاب نہ لا سکی، سوشیل نے اپنے دوست کو قتل کر دیا لیکن قتل کرتے وقت اس نے اپنی بوڑھی ماں، دو چھوٹے بھائیوں اور ایک بہن کے متعلق نہیں سوچا، اگر وہ انھیں ختم کر کے دوست کو قتل کرتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ وکیل نے اسے پھانسی سے بچا لیا مگر سزا سے نہیں بچا سکا، اب کلکتے میں اس کا خاندان فاقے کر رہا تھا اور وہ جیل میں تھا۔

میں نے بجھل سے کہہ کے اس کے خاندان کے لیے گزارے کا انتظام کرا دیا۔ سوشیل نے یہ بھی گوارا نہیں کیا۔ ایک صبح بیرک میں اس کی لاش پائی گئی۔ وہ شدتِ غم سے مر گیا تھا۔ اس اعتبار سے وہ مجھ سے زیادہ غیرت مند ثابت ہوا، اس نے مجھے شکست دے دی، مجھے مات دے کے چلا گیا۔

ساتویں سال جب میں فرسٹ ڈویژن میں ایم اے کا امتحان پاس کر چکا تھا تو ایک دن مجھے جیلر نے طلب کیا اور آزادی کا مژدہ سنایا۔ مجھے یقین نہیں آیا، یہ تو صحیح تھا کہ اس سال کے اختتام پر شب و روز ملا کے میری سزا مکمل ہونے والی تھی مگر اس قدر جلدی اور اچانک یہ پروانہ آ جائے گا، میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اسے پڑھا اور آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے، جیلر کے چہرے پر مسکراہٹ تھی، وہ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کے مجھے نصیحتیں کر رہا تھا، مجھے اس کی کوئی بات یاد نہیں۔ اس خبر سے میرے اعصاب جواب دے گئے۔ رگ و پے میں جیسے برف گھل گئی۔

میں نے بیرک میں آ کے کسی کو نہیں بتایا کہ اب میں ان سے بچھڑنے والا ہوں، یہ خبر بجھل تک ضرور پہنچ جاتی اور وہ ایک جلوس کی شکل میں گیٹ پر میرا استقبال کرتا، میں ساری رات بیرک میں ٹہلتا رہا اور صبح آٹھ بجے جیلر کے دفتر میں حاضر ہو گیا۔ اس نے میری خون آلود شیروانی، کرتا، پاجامہ اور سات سال پرانے نوٹ، جو میری جیب سے برآمد ہوتے تھے، واپس کر دیے اور میری مالا بھی میرے سپرد کر دی۔ میں نے جیلر کے سامنے بے اختیار ہو کے اسے اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ اب پرانا لباس میرے جسم پر نہیں آ سکتا تھا۔ اس سخت مزاج جیلر نے میری مجبوری محسوس کر لی اور اپنا کرتا پاجامہ مجھے دے دیا، پھر اس نے میری کمر تھپتھپائی، میری ناک پکڑی اور مجھے اپنے دفتر کے دروازے پر رخصت کرنے آیا۔ "میں نے تمہارا چاقو واپس نہیں کیا ہے اس لیے کہ اب تمہیں اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" اس نے مسکرا کے کہا۔

"جناب..." مجھ سے کچھ کہا نہ جا سکا۔

"جاؤ، میں دوبارہ تمہاری شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔"

"جناب..." میں نے بے تابی سے اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔

سنتریوں نے مجھے جیل کے خاص دروازے تک پہنچا دیا۔

کچھ دیر بعد میں جیل کے آہنی پھاٹک کے باہر کھڑا تھا۔

باہر کی دنیا ہی بدلی ہوئی تھی، یہاں نہ سنتری تھے، نہ بیرکیں تھیں، نہ یہاں پتھریلی دیواریں تھیں اور نہ لوہے کی سلاخیں، چوڑی سڑکیں، بلند و بالا عمارتیں، بھاگتے چیختے ہوئے لوگ، دکانیں، ٹھیلے گاڑیاں، تو عجیب منظر تھا، میرے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ یہ خواب تھا یا حقیقت؟ جو کچھ پیچھے رہ گیا وہ خواب تھا یا جو سامنے موجود ہے، یہ خواب ہے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ مجھے خوف سا محسوس ہوا، کوئی مجھے نیند سے بیدار نہ کر دے اور میں دوبارہ سلاخوں کے پیچھے نہ چلا جاؤں، میں نے تیز قدموں سے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ جیل میں جانے کا اتنا دکھ نہیں تھا جتنا واپس آنے کی خوشی ہو رہی تھی۔ دل کی دھڑکن قابو میں نہیں آ رہی تھی، مگر یہ کلکتہ ہی تھا اور میں جیل سے آزاد ہو گیا تھا، سات سال میں دوبارہ کھلے آسمان کے نیچے تھا، اب میں جہاں اور جدھر چاہتا، جا سکتا تھا، بھاگ سکتا تھا۔ اونچی آواز میں گانا گا سکتا تھا، میں دکانوں پر دیر تک کے نت نئی چیزوں کا نظارہ کر سکتا تھا، یہاں ٹھیلوں پر پھل بکھرے ہوئے تھے، ہوٹلوں سے کھانوں کی مست خوشبو آ رہی تھی، چائے کی پیالیاں کھڑک رہی تھیں، میں نے پورے سات برسوں میں صرف ایک بار جیلر کے گھر کی عورتیں دیکھی تھیں، سونیا، اس کی ماں اور چھوٹی بہن، مگر اب یہاں تو عورتیں ہی عورتیں نظر آ رہی تھیں، رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس۔ معلوم ہوتا تھا جیسے دنیا نئی کر گئی ہے، ہر چیز بدلی ہوئی تھی۔ میں حیران حیران نظروں سے جیل کے پھاٹک کے باہر کی دنیا کے مناظر دور تک دیکھتا رہا۔ میں نے خود کو اجنبی محسوس کیا حالانکہ کسی شخص نے مجھ پر توجہ نہیں دی تھی، سب اپنے اپنے خیالوں میں گم تھے۔ کوئی آ رہا تھا، کوئی جا رہا تھا، ہر شخص کو جلدی تھی جیسے آج کے بعد دنیا ختم ہو جائے گی، ہر کام نمٹانا ہے، آج ہی نمٹا لیا جائے۔ خاصی دور آنے کے بعد مجھے کچھ ہوش آیا اور سب سے پہلے مجھے کرار کا خیال آیا۔ جیل سے آزادی کی حیرت میں یہ خیال چند لمحوں کے لیے مجھ سے بچھڑ گیا تھا۔ شاید اسی لیے تنہائی اور اجنبیت سی محسوس ہوئی تھی، کسی چیز کی کمی تھی جیسے میں جیل میں کچھ بھول آیا ہوں۔ میں نے بجھل کو اپنی رہائی کی اطلاع جان بوجھ کر نہیں دی تھی۔ ورنہ دروازے پر میرے استقبال کے لیے ایک بھیڑ موجود ہوتی۔ بجھل خوشی سے دیوانہ ہو جاتا اور مجھے جلوس کی شکل میں اپنے اڈے تک لے جاتا۔ اب اس شہر میں میرے جاننے والوں کی کمی نہیں تھی۔ سات سال میں نہ جانے کتنے قیدی جیل آئے تھے اور واپس چلے گئے تھے۔ بدنصیب میاں کانتے، شوبی، چوبیس، بندھو، سانٹے، لیلا، ہیجا اور بہت سے دوست، یہاں سابق جیلر کا گھرانا بھی تھا اور سوشیل کا لٹا پٹا بدنصیب خاندان بھی یہیں رہتا تھا، جسے بھی معلوم ہوتا کہ آج لالا ڈولا جیل سے رہا ہو رہا ہے، وہ دوڑا ہوا آ جاتا۔

وہی شہر، گلیاں، عمارتیں اور وہی لوگ تھے لیکن میں وہی نہیں تھا۔

میرے چہرے پر اب بھوری داڑھی تھی اور میرا قد پہلے سے لمبا ہو گیا تھا، میرے شانے پھیلے ہوئے تھے، سینہ چوڑا تھا اور ٹانگیں مضبوط تھیں، مجھے بہت سے آدمیوں میں علیحدہ سے پہچانا جا سکتا تھا۔ یہ تو تھی ظاہری حالت۔ اندر سے میرا حال وہی تھا، وہی بے چینی، مایوسی، خوف اور کرار۔ ایسا لگتا تھا جیسے صرف ایک رات گزری ہے اور صرف ایک بھیانک رات میں میرے جسم کا حلیہ بدل گیا ہے اور کرار کل رات ہی مجھ سے جدا ہوئی ہے۔ یہ ایک طویل سیاہ رات تھی۔ میں نے بجھل اور اس کے ساتھیوں کو اسی لیے اطلاع نہیں دی تھی کہ وہ آ جائیں گے تو مجھے کرار کو ڈھونڈنے کا وقت نہیں مل سکے گا۔ جب تک اس کے بارے میں کوئی خبر نہ مل جاتی، اس وقت تک مجھے چین کیسے نصیب ہو سکتا تھا۔ جیل سے رخصت ہوتے وقت جیلر نے وہ روپے بھی میری جیب میں ڈال دیے تھے جو سات سال پہلے میری جیب سے برآمد کیے گئے تھے۔ میں نے انھیں گنا نہیں تھا، دو ڈھائی سو سے کم کیا ہوں گے۔ مالا میں نے گلے میں کرتے کے اندر چھپا لی تھی۔

میں نے بے تابی سے ہاتھ اٹھا کے ایک خالی رکشا کو آواز دی، تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد رکشا اس بازار سے گزرنے لگا جہاں سے میں کرار کے ساتھ کئی بار گزرا تھا۔ مجھے ان ہوٹلوں کے بورڈ بھی نظر آئے جن میں ہم دونوں نے وحشت ناک وقت بسر کیا تھا۔ میرا دل اندر سے کسی نے پکڑ لیا، اس وقت کا ایک ایک لمحہ یاد آنے لگا، رکشا مدرسے کے سامنے جا کے ٹھہر گیا، مدرسے کی عمارت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی، بس دیواروں پر نئی نئی سفیدی کی گئی تھی۔ میں دھڑکتے دل سے اندر داخل ہوا اور میری نگاہ کسی شناسا کو تلاش کرنے لگی۔ کوئی پہچانا آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے دفتر کی چق ہٹائی۔ میز پر بیٹھے ہوئے ایک ادھیڑ عمر کے شخص نے مجھے جھانکتے ہوئے دیکھ کے اندر بلا لیا: "فرمائیے؟" اس نے سپاٹ آواز میں کہا۔ مجھے کچھ کہتے ہوئے جھجک ہوئی۔ میں سوچنے لگا کس طرح پوچھوں؟ وہ شخص میرے پس و پیش پر جھنجلا گیا اور کہنے لگا: "فرمائیے، کیا کام ہے؟"

"جناب، میں ایک صاحب کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"یہ گم شدہ لوگوں کا دفتر نہیں ہے، مدرسہ ہے۔" اس نے کہا۔ "البتہ اگر مدرسے کے کسی صاحب کے بارے میں پوچھنا ہے تو فرمائیے، میں حاضر ہوں۔"

"جناب، میں مولوی محمد شفیق کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔" میں نے گھبرا کے کہا۔ "وہ مراد آباد سے تعلق رکھتے ہیں۔"

"مولوی محمد شفیق؟" اس نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "میں اس نام کے کسی صاحب سے واقف نہیں ہوں۔"

مجھ پر ہول طاری ہو گیا۔ "وہ یہیں پڑھاتے تھے۔" میں نے تشویش سے کہا۔ "وہ مراد آباد سے کبھی کبھی یہاں پڑھانے آتے تھے، آپ انھیں ضرور جانتے ہوں گے۔"

"بھائی، میں نے عرض کیا نا کہ میں اس نام کے کسی شخص سے واقف نہیں ہوں۔ مجھے یہاں ملازمت کرتے ہوئے پانچ سال گزر گئے ہیں۔" اس نے کسی قدر ناراضی سے جواب دیا۔

"پانچ سال؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔ "اور پانچ سال میں اس نام کے کوئی مولوی صاحب ادھر نہیں آئے؟"

"جی نہیں۔" وہ تلخی سے بولا۔ "جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے، قطعاً نہیں اور میری یادداشت ایسی کمزور بھی نہیں ہے۔"

"اس سے پہلے۔" میں نے شکستہ لہجے میں کہا۔ "کوئی سات سال پہلے وہ یہاں ضرور آتے تھے۔ آپ مدرسے کے کسی بزرگ سے پوچھیے۔"

"ہاں ممکن ہے۔ اب میں اپنے پیدا ہونے سے پہلے کی باتیں تو یاد نہیں رکھ سکتا۔" وہ تلخی سے بولا۔ "فرض کیجیے، میں آپ کو کسی بزرگ سے ملا بھی دوں تو آپ کو کیا حاصل ہو گا۔ جو شخص پانچ سال سے یہاں نہیں آیا، اس کے بارے میں آپ کچھ جان کر کیا کریں گے اور وہ آپ کو کیا بتا پائیں گے؟"

"مجھے ان کے بارے میں کچھ ضروری باتیں معلوم کرنی ہیں۔" میں نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔ "شاید کوئی بات معلوم ہو جائے۔ براہ مہربانی میری مدد کیجیے، میں آپ کا شکر گزار ہوں گا۔"

اس نے قلم دوات میں رکھ دیا اور اکتاہٹ سے بولا: "آئیے میرے ساتھ لیکن آپ کا نام کیا ہے؟"

میں نے اپنا نام ظہیر خان بتلایا اور اپنے آنے کی غرض و غایت بتاتے ہوئے بھی جھوٹ بولا۔ وہ جھجکتے ہوئے مجھے ایک بزرگ کے پاس لے گیا۔ بزرگ ایک جماعت کو درس دینے میں مصروف تھے۔ میں ان مولوی صاحب کو پہچان گیا۔

اب وہ خاصے ضعیف ہو چکے تھے۔ جب اُن سے مولوی محمد شفیق کے بارے میں پوچھا گیا تو وہ چونک پڑے۔ ساتھ ہی میرا دل بھی اُچھل کے حلق میں آگیا۔ "پتہ نہیں میاں!" وہ تاسف سے بولے۔ "پتہ نہیں مولوی محمد شفیق کہاں ہیں، کدھر کو جا کے بس گئے۔ یہ لگ بھگ آٹھ سال پہلے کی بات ہے۔ وہ اپنے عزیزوں کے ہاں گئے تھے پھر آج تک واپس نہیں آئے۔ کوئی خیر خبر بھی معلوم نہیں ہوئی۔ اُن کی خیریت پوچھنے کے لیے مراد آباد کئی خط ڈالے گئے مگر کسی نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ پھر مراد آباد کے ایک صاحب سے معلوم ہوا کہ وہ وہاں بھی موجود نہیں ہیں۔"

"کیا وہ اُس دن کے بعد سے واپس نہیں آئے؟" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "وہ کہاں چلے گئے؟"

"اللہ جانتا ہے۔" بزرگ مولانا ٹھنڈی سانس لے کے مختلف آواز میں بولے۔ "ایسے گئے کہ اب تک نہیں لوٹے۔ اُن کا سامان بھی بہت دنوں تک حجرے میں پڑا اُن کا انتظار کرتا رہا، پھر میں نے اُسے اپنے حجرے کی الماری میں بند کر دیا۔"

میرے اعصاب جھنجھنا گئے۔ میں سکتے کی حالت میں انھیں گھورنے لگا۔ میری یہ کیفیت دیکھ کے بزرگ مولانا نے پوچھا۔ "آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ آج اتنے برسوں بعد مولوی مراد آبادی کا جاننے والا کہاں سے آگیا؟"

"کیا آپ مجھ پر ایک احسان کر سکتے ہیں۔" میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "میں اُن کے مرحوم دوست کا لڑکا ہوں۔"

"ضرور ضرور۔" بزرگ نے شفقت سے جواب دیا۔ "کہو۔"

"کیا آپ اُن کا سامان مجھے ایک نظر دکھا سکتے ہیں؟"

بزرگ نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ "کیوں نہیں لیکن سامان تو اُنھی کا ہے، میں اُنھی کے حوالے کروں گا۔"

"میرا مطلب یہ نہیں ہے۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "میں اُسے صرف دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ کوئی چیز طلب نہیں کروں گا۔"

"بہرحال۔" بزرگ شخص جھجکتے ہوئے بولے۔ "آپ کا اصرار ہے تو یہی سہی۔ وہ معمولی سامان ہے۔ آیئے میرے ساتھ۔"

★

وہ مجھے ایک حجرے میں لے گئے۔ بڑے صاحب بھی تنہا رہتے تھے۔ یہ حجرہ اس حجرے سے مختلف نہیں تھا جس میں ہم لوگ ٹھہرے تھے۔ بزرگ نے اپنے کمزور ہاتھوں سے الماری کا تالا کھول کے میرا سوٹ کیس اور مولوی صاحب کا کچھ سامان باہر نکالا۔ سب کچھ جوں کا توں محفوظ تھا۔ میری بہن فہمیدہ کا دوپٹا اور کورا کے کپڑے، سینڈل، میرے کپڑے، میری میٹرک کی سند، مولوی صاحب کے کپڑے، جلدیں، تکیہ، لوٹا اور وہ تمام سامان جو آخری دنوں میں مولوی صاحب نے ہمارے لیے خریدا تھا۔ میں نے فہمیدہ اور کورا کا دوپٹا اُٹھا کے بے اختیار اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا مگر میرے آنسو بُری طرح نکل آئے۔ اتنے آنسو نکلے کہ ہچکیاں بندھ گئیں اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ پھر میں نے دوپٹا جھپٹ کر سینے سے لگا لیا۔ سیلاب سا گویا ایسا اُٹھا کہ بزرگ کی موجودگی کا خیال نہ رہا۔ انھوں نے میرے کندھے پر اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ رکھا اور نرمی سے بولے۔ "میاں! آپ کو کیا ہو گیا؟ کیا ان کپڑوں سے آپ کا بھی کوئی تعلق ہے؟ بیٹھیے، آرام سے بیٹھیے اور مجھے اپنے بارے میں کچھ بتایئے۔ آپ نوجوان آدمی ہیں، ضبط سے کام لیجیے۔"

میں نے اُن کے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ اُن کے ہاتھ آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ بزرگ نے اپنے بھیگے ہوئے ہاتھ ہٹا کے میرے سر پر رکھ دیئے۔ "میاں بات کیا ہے؟ آپ مجھ سے اپنے دل کا حال کہہ دیجیے اور خوب رو لیجیے۔ آپ سے پوری ہمدردی ہے۔ یقیناً آپ کے ساتھ کوئی بڑا سانحہ ہو گیا ہے۔ اگر آپ کے کسی کام آسکتا ہوں تو مجھے اپنے باپ کی جگہ سمجھیے۔" میں نے کہا۔ "بس مولوی صاحب! آپ کا بہت بہت شکریہ۔" میں نے رقت سے کہا۔ "یہ سامان واپس رکھ دیجیے۔ شکریہ، بہت بہت شکریہ۔ میں نے آپ کو زحمت دی۔" میں آنسوؤں اور ہچکیوں کے درمیان بولا اور ایک پل میں حجرے کے دروازے پر آگیا۔ بزرگ مجھے بلاتے اور چیختے رہ گئے۔ میں وہاں ایک لمحے بھی نہیں ٹھہرا۔ انھوں نے اس ضعیفی میں نہ جانے کس تیزی سے حجرے کے باہر آ کے کئی آوازیں دیں لیکن میں وہاں سے بھاگتا اور مدرسے کی عمارت عبور کرتا ہوا

◘

گلی میں آ کے میں ہانپتا ہوا فٹ پاتھ کے ساتھ ایک کھمبے سے ٹک گیا۔ مجھ سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا جا رہا تھا۔ اسی کھمبے سے سر ٹکرا کے پاش پاش کرنے کو جی کرتا تھا۔ مولوی صاحب کا کوئی پتہ نہیں۔ پھر وہ ایسے میں کہاں چلے گئے کہ انھیں مدرسے سے اپنا سامان اُٹھانے کی بھی مہلت نہیں ملی؟ دماغ میں کن سلائیاں رینگنے لگیں۔ میں خود کو اچانک ایک بوڑھا اور ناتواں شخص محسوس کرنے لگا۔ بزرگ نے میرے جسم کی ساری طاقت کھینچ لی تھی۔ خبر نہیں کہ کتنے لوگ مجھے اس عالم میں دیکھ کے گزر گئے تھے اور کتنے قریب کھڑے تھے۔ ایک کانسٹیبل نے آ کے اپنی لاٹھی میرے بازو میں چبھوئی حالانکہ میں خاموش بیٹھا تھا۔ کسی سے کچھ کہہ رہا تھا، نہ میری کوئی فریاد تھی۔ اس نے مجھے وہاں بیٹھنے تک نہیں دیا۔ "کون ہے تو!" اس نے نفرت سے پوچھا۔

میں نے سر اُٹھا کے دیکھا، کانسٹیبل کے ساتھ اور راہ گیر بھی کھڑے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ اُن کے انداز میں استہزا اور تمسخر تھا۔ میں چپ چاپ وہاں سے اُٹھ گیا اور آہستہ آہستہ ایک طرف چلنے لگا۔ "اسکرو ڈھیلا معلوم ہے۔ لگتا ہے سالا ابھی جیل سے چھوٹ کے آیا ہے۔" "بال تو دیکھو، پھگاس کی طرح اُگے ہوئے ہیں۔" لوگ میرے حال پر تبصرہ کر رہے تھے۔ میں نے بے بسی سے پیچھے مڑ کے دیکھا تو وہ سہم کر چپ ہو گئے۔

میں گلی گلی کوچے کوچے ویران نظروں سے لوگوں کو دیکھتا رہا اور نہ جانے کہاں سے کہاں نکل گیا۔ طرح طرح کے وسوسے اور

ستا رہے تھے۔ مولوی صاحب مدرسے واپس نہیں آسکے۔ اگر کورا کو وہ غنڈوں کے قبضے سے آزاد کرانے میں کامیاب نہ ہوئے ہوتے تو دوسرے دن، تیسرے دن ضرور مجھے حوالات میں دیکھنے آتے یا جیل میں ملاقات کے لیے آتے یا خط کے ذریعے اطلاع دیتے۔ اُن کی اتنی طویل گمشدگی اس بات کا ثبوت تھی کہ انھوں نے کورا کو حاصل کر لیا اور وہ مجھ سے کوئی رابطہ قائم کرنے میں خوف محسوس کر رہے ہیں۔ میں انھیں کورا کے بارے میں سب کچھ بتا چکا تھا، باقی باتیں خود کورا نے انھیں بتا دی ہوں گی کہ تبت کے ہانگ قبیلے کے لوگ اس کی بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ یقیناً یہی پیش نظر انھوں نے اپنے آپ کو چھپا لیا ہو گا۔ اگر وہ کورا کو حاصل کرنے میں ناکام ہو جاتے تو مدرسے واپس آ کے اپنا سامان ضرور حاصل کرتے۔ اُن کے واپس نہ آنے اور اپنے بارے میں کوئی خبر نہ دینے سے ظاہر تھا کہ کورا کے معاملے کی نزاکت دیکھتے ہوئے انھوں نے کلکتے سے چپ چاپ نکل جانے کو ترجیح دی ہو گی۔ شاید انھوں نے دیکھ لیا ہو کہ میں نے ایک کانسٹیبل کو ہلاک کر دیا ہے اور موقع واردات پر کچھ اور کانسٹیبل آگئے ہیں۔ اُس وقت سیٹیاں بجنے لگی تھیں۔ جب مولوی صاحب کورا کے تعاقب میں بھاگ رہے تھے تو ایک غنڈا اُن کے پیچھے لگ گیا تھا۔ اس کا راستہ روک کر میں نے مولوی صاحب کو آگے جانے میں مدد دی تھی اور چاقو اُس کے پیٹ میں گھونپ کر اُس کا کام تمام کر دیا تھا۔ اگر کانسٹیبل موقع پر نہ آجاتا تو میں مولوی صاحب کو پکڑ لیتا۔ مجھے اتنا وقت ہی نہیں ملا۔ مولوی صاحب اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ میں نے دوسرے کورا کی ایک آخری چیخ سنی تھی۔ اس کے بعد کے واقعات پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے جیل میں جب بھی اس واقعے کا تجزیہ کیا تھا، مجھے ایک اطمینان محسوس ہوا تھا اور تجزیہ میں نے ہزاروں بار کیا تھا۔ ہزاروں بار کیا، میں سوچتا ہی رہتا تھا۔ اسی لیے میں سب سے پہلے مدرسے آیا۔ خیال تھا کہ مولوی صاحب کے بارے میں یہاں سے کوئی اشارہ ضرور مل جائے گا۔

کیا میں یہی سننے کے لیے جیل سے آیا تھا؟ میلوں پیدل چلتے ہوئے مجھے شام ہو گئی۔ نہ کھانے کا ہوش تھا، نہ پینے کا۔ وہ شہر جو جیل کے پھاٹک سے باہر آنے کے بعد بہت حیران کن لگ رہا تھا، اب مجھے اُسے دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔ شہر تو کوئی صحرا نظر آ رہا تھا۔ میرا بس چلتا تو میں اس شہر کو آگ لگا دیتا۔ مغرب کے بعد جب شہر روشنیوں میں نہا گیا تو میں نے اپنے آپ کو ہاوڑا اسٹیشن پر موجود پایا۔ جی میں آیا ایک بار مجمل سے ملاقات کر لوں۔ اسے میری رہائی کی خبر ملے گی تو وہ کیا سوچے گا، کہے گا بہت کمینہ اور کم ظرف نکلا۔ ہر بار جب وہ مجھ سے ملنے کے لیے جیل آتا تھا، یہی پوچھتا تھا کہ میری قید کے دن کب ختم ہو رہے ہیں؟ وہ کہتا تھا "لاڈلے! مجمل کے لاڈلے پر کبھی اتنا بڑا جشن نہیں ہوا ہو گا جو میں تیری رہائی پر مناؤں گا۔"

مجمل کو کیا معلوم تھا کہ میرے لیے دنیا میں سب سے اہم ذات کون سی ہے۔ میں نے اس کی ناراضی نظرانداز کر دی اور کھڑکی سے ٹکٹ لے کے بینچ پر آ کے بیٹھ گیا۔ معلوم ہوا کہ مراد آباد جانے والی گاڑی میں ابھی دو گھنٹے باقی ہیں۔ میں نے ایسی بینچ منتخب کی تھی جہاں مسافروں کی بھیڑ کم تھی۔ اپنا بازو سر کے نیچے رکھ کے میں نڈھال ہو کے لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اسٹیشن پر ہونے والے شور سے مجھے وحشت ہو رہی تھی۔ مجھے اس نیم جانی کی کیفیت میں پڑے ہوئے کوئی آدھا گھنٹہ گزرا ہو گا کہ میں نے اپنے قریب کسی کی سرسراہٹ محسوس کی۔ کوئی مسافر ہو گا، یہ خیال کر کے میں کروٹ بدلے بغیر ویسے کا ویسا پڑا رہا لیکن دوسرے ہی لمحے ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ ایک شخص کا ہاتھ میرے گریبان پر تھا اور دوسرے کا جیب میں۔ میری اچانک بیداری سے وہ گھبرا کے پیچھے ہٹے۔ ایک میری مالا پر ہاتھ ڈالنے کی فکر میں تھا، دوسرا میری جیب کاٹنے کی کوشش میں۔ میری ہڑبڑاہٹ پر وہ بھاگنے کے بجائے مجھ پر چڑھ دوڑے۔ ایک نے ناک کے پاس گال پر مکا لگایا، دوسرے نے پیٹ میں گھونسا مارا۔ میں کُبڑا ہو گیا۔ جیب میں ہاتھ ڈالنے والے شخص نے مغلوب الغضب ہو کے فوراً میری جیب پر دوبارہ ہاتھ ڈالا اور دوسرے نے میرا گریبان پھاڑ دیا۔ میں نے اُسی تکلیف کے عالم میں اپنا سر اُس کے سینے پر مارا۔ وہ دھڑام سے پلیٹ فارم کی سخت زمین پر گر گیا۔ اس اثنا میں جو شخص جیب سے روپے نکالنے کی کوشش میں تھا، وہ سنبھل کر کھڑا ہوا۔ اُس کے ہاتھ میں روپے نہیں آئے تھے یا اُس نے اپنے دوسرے ساتھی کا حشر دیکھ کے ارادہ ملتوی کر دیا ہو گا۔ اُس نے جیب سے ہاتھ نکال کے مجھ پر وار کرنے کے لیے ہاتھ اُٹھایا ہی تھا کہ میں نے اُس کا ہاتھ جہاں تھا، وہیں پکڑ لیا اور اُس کے پیٹ میں اتنے زور سے گھٹنا مارا جتنے زور سے اُس کے ساتھی نے مجھے مارا تھا۔ وہ کراہتا بلبلاتا پیٹ پکڑے ہوئے بینچ کے قریب لڑکھڑا کے ڈھیر ہونے لگا۔ میں نے وہاں سے فوراً بھاگنے کا ارادہ کیا لیکن چند قدم آگے مجھے دو اور غنڈوں نے گھیر لیا۔ میں اپنی جگہ رُک کے اُن کے حملے کا جواب دینے کے لیے تیار تھا کہ میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس دوران میں دوسرے نے جوش میں آ کے مجھ پر حملہ کر دیا تھا لیکن میرے روکنے سے پہلے اُس کے ساتھی نے اُسے روک لیا اور حیرانی سے مجھے گھورنے لگا۔

"لاڈلے؟" اُس نے آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے تعجب سے کہا۔ "تو آزاد ہو گیا؟ یہ تو ہی ہے نا؟"

"ہاں میں سالے، یہ میں ہی ہوں۔" میں نے تلخی سے جواب دیا۔

"لاڈلے!" وہ چیخ کر جوش میں مجھ سے لپٹ گیا اور اپنے ساتھی کے بال پکڑ کے اُسے اُس نے میرے پیروں پر دھکا دے دیا۔ "یہ لاڈلا ہے بے۔ اپنا لاڈلا، اپنا یار۔ اُستاد جس کا ذکر صبح و شام کرتے ہیں۔ یہ استاد مجمل کا لاڈلا ہے۔"

اُس کا ساتھی آنکھیں پھاڑے ہوئے اُٹھا۔ "یہ ہے وہ؟"

"ہاں یہ۔" وہ میرے سینے سے علیحدہ ہو کے فخر سے بولا۔ "سالے اس کا کوئی جواب نہیں۔ اس نے جیل میں آتے ہی اُستاد کانٹے کو چت کر دیا تھا۔ اُستاد نے اسے خود داؤ سکھائے ہیں۔ سالے تم کیا، تمھارے جیسے دس آدمی بھی اس پر قبضہ نہیں جما سکتے۔" مجھے حیرت ہوئی کہ لاڈلے نے ہاتھ نہیں اُٹھایا مگر لاڈلے نے

وہ میری طرف متوجہ ہو کے تذبذب سے بولا: "تو یہاں کیسے نظر آ رہا ہے؟ تو کب آزاد ہوا؟ استاد کو خبر نہیں کی؟"
"میں آج ہی آزاد ہوا ہوں، استاد کے پاس نہیں گیا۔"
"کیوں؟" اس کی بھنویں سکڑ گئیں۔
"مجھے پہلے ایک اور جگہ جانا تھا۔ میں جلدی واپس آ کے استاد سے ملوں گا۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔
"نہیں لاڈلے! اگر استاد کو خبر ہو گئی کہ تو اس سے ملے بغیر چلا گیا ہے تو وہ بہت ناراض ہوگا، آ چل ایک بار اسے اپنی شکل دکھا آ، آپے میں آ جائے گا۔ اس پر تو تو نے جادو کر دیا ہے چل۔" اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔
"نہیں۔ میں ابھی نہیں جا سکتا۔" میں نے اپنا کندھا چھڑاتے ہوئے کہا۔
"یہ بہت بری بات ہے لاڈلے!" اس نے مجھے سمجھانا چاہا۔ "تو نے تو جیل میں بہت پڑھا لکھا ہے پھر بھی ایسی نادانی کی بات کر رہا ہے۔"
"مجھے بہت ضروری کام ہے سارٹے! اسی لیے میں بھٹل بھائی کے پاس نہیں گیا کہ وہ مجھے جلدی نہیں جانے دیں گے۔"
"ابے سالے سات سال تک کام پڑا رہا، جیل سے آزاد ہوتے ہی تجھے اتنی جلدی ہو گئی۔ ابے تو تو بڑا بے مروت ہے۔"
"دیکھ سارٹے!" میں نے لجاجت سے کہا۔ "مجھے معلوم ہے کہ یہ اچھی بات نہیں ہے لیکن تجھے اندازہ نہیں ہے کہ مجھے اس دن کا کتنے سال سے انتظار تھا۔ میں تجھ سے بنتی کرتا ہوں کہ تو استاد کو مجھ سے ملنے کی بات مت بتانا۔"
"لاڈلے! اگر استاد کو معلوم ہو گیا تو وہ میری کھال کھینچ لے گا۔"
"تو کہہ دینا۔" میں نے روتی آواز میں کہا۔ "کہہ دینا کہ لاڈلے بہت برا آدمی نکلا۔ ہو سکے تو اسے منانے کی کوشش کرنا ورنہ تیری مرضی۔"
اس دوران میں وہ دونوں غنڈے جنھوں نے میری مالا اور سوئیوں پہ ہاتھ صاف کرنا چاہا تھا، کراہتے ہوئے اٹھ کر آ گئے اور سارٹے کو مجھ سے باتیں کرتے دیکھ کر حیرت میں پڑ گئے۔ "سالو!" سارٹے نے کہا۔ "غلط آدمی پہ ہاتھ ڈال دیا میری نظر بھی چوک گئی۔ لاڈلے! تجھے دیکھے ہوئے اتنے دن ہو گئے کہ میں تیرا چہرہ نہ پہچان سکا۔ ابے داڑھی تو نرالی ہوتی۔ یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے معلوم ہوتا ہے ہفتوں سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں ہے۔ تجھے کیا ہو گیا ہے پیارے؟ ضرور کوئی چکر ہے کیا ہمیں بھی نہیں بتائے گا۔ آ چل چائے پی۔"
"جی نہیں چاہ رہا ہے۔" میں نے اداسی سے کہا۔
"ابے چل!" اس نے مجھے دھکا دیتے ہوئے کہا۔ "اور سنا باقی دن جیل میں کیسے گزرے؟ کوئی ہاتھا اس دوران اچھا ہی نہیں پڑا کہ تیرے پاس آ جاتا۔ تجھے دیکھے ہوئے تین سال ہو گئے مگر تو نے مجھے خوب پہچانا۔ میں بھی تو کہوں کون سالا ایسا جیالا آ گیا جس نے ایک ہاتھ میں دو آدمیوں کا دھڑن تختہ کر دیا۔ چلو بے۔" اس نے اپنے ساتھیوں کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "لاڈلے سے معافی مانگو، سالے اپنے آدمی پہ ہاتھ ڈالنے کا گناہ کر بیٹھے۔" پھر اس نے اپنے گال پر سو چار طمانچے

رسید کیے، کان پکڑے۔ "یار معاف کر دے لاڈلے!"
"جانے دے سارٹے! تیری اور ان کی کیا غلطی ہے۔ یہ مجھے جانتے تو
تھے، بس جو ہو گیا ہو گیا۔ اپنی سنا، شول کیسا ہے؟ گاتا گاتا ہے یا نہیں؟
کانتے کا کیا حال ہے؟ بندھو کیا کر رہا ہے اور وہ حاتو باز تیجا کرم،
نصیب میاں کیا کر رہے ہیں؟"
"یار سب ایک ساتھ مل لے گا، میں کہتا ہوں میرے ساتھ چل، [illegible]
کا وقت ہے سبھی ڈیرا ڈالے ہوئے ہوں گے۔ سفر پہ جانا ہے تو کچھ ڈھنگ
کے کپڑے پہن کے جا، استاد بھٹل کا آدمی اور اس حلیے میں سفر کرے، استاد
کے نام کی تو لاج رکھ لے یار۔"
"بس کر سارٹے، اصرار نہ کر کچھ ایسی ہی مجبوری ہے۔ [illegible]
استاد سے مت کہنا، بس تجھ سے یہی التجا ہے۔"
"دیکھ بھئی لاڈلے؟ کوئی ایسی ویسی بات ہو تو بتا، ہاتھ پاؤں [illegible] سے چلانا، ابھی سات سال کی کاٹی ہے، خیال رکھنا۔ ورنہ جہاں جا رہا ہے مجھے بھی ساتھ لیتا چل۔ میں اڈے پہ کہلوا دیتا ہوں۔"
"نہیں سارٹے! میں تنہا جاؤں گا۔ بے فکر رہ، میں اپنا پورا خیال رکھوں گا اور جلدی واپس آؤں گا، دعا کر کہ میرا کام ہو جائے۔"
"ابے اپنی دعا کہاں قبول ہوگی ہاں، سالی بددعا کرا تو وہ دعا میں بدل جائے گی۔ چل چائے پی۔"
چائے کے اسٹال پر آ کے سارٹے نے نہ صرف چائے سے بلکہ ان [illegible] لوازم سے بھی میری خوب تواضع کی اور مجھے ٹھونس ٹھونس کر کھلاتا رہا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر آ گئی تھی، وہ آخر وقت تک اصرار کرتا رہا کہ میں ایک بار بھٹل [illegible] ضرور مل لوں۔ اس نے مجھے اپنی قمیص اور واسکٹ اتار کے دے دی اور اس کے ایک ساتھی کا جوتا میرے پیر میں فٹ آ گیا۔ ایک کے گلے میں رومال بندھا ہوا تھا، اس نے رومال میں مکھن اور برٹینیا بسکٹوں کے بہت سے پیکٹ باندھ [illegible]۔ پھر سارٹے نے ان سب کو حکم دیا کہ وہ اپنی جیبیں خالی کر کے جو کچھ بھی ان کے پاس ہے میرے حوالے کر دیں۔ میں منع کرتا رہا مگر انھوں نے میری جیب میں روپے ٹھونس ہی دیے۔ جب تک گاڑی چلی نہیں اور انھوں نے مجھے [illegible] کی ایک برتھ پر آرام سے لٹا نہیں دیا، اس وقت تک وہ پلیٹ فارم پر ٹھیرے رہے۔ گاڑی حرکت میں آتے ہی وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

★

سارٹے یا اس کے کسی ساتھی کی زبانی بھٹل کو میری رہائی کا پتہ چلے گا تو وہ بہت برہم ہوگا مگر اسے یہ خبر دو تین روز بعد ملنی تھی۔ جب جیل [illegible] معمول اس کا آدمی یا وہ خود مجھ سے ملنے کے لیے آتا۔ تب بھی وہ یہ جان کر بہت ناراض ہوتا جس انداز سے سارٹے اور اس کے ساتھیوں نے مجھے رخصت کیا تھا۔ اس سے مجھے یہ توقع تھی کہ وہ بھٹل کو نرم کرنے کی ضرور کوشش کریں گے، وہ میری سفارش کریں گے۔ اب جو بھی ہو، ساری دنیا ناراض ہے تو بھٹل [illegible]

میں برتھ پر لیٹا یہی سوچتا رہا۔ گاڑی اسٹیشن پر اسٹیشن عبور کرتی رہی، مجھے ایک لمحے کے لیے بھی نیند نہیں آئی، حالانکہ سامنے کی برتھوں پر اور نیچے ہر شخص سو رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ جب میں جاگ ہی رہا ہوں تو اس بوڑھے شخص کو اپنی برتھ کیوں نہ دے دوں جو زمین پر سکڑا ہوا بیٹھا ہے اور بار بار کروٹیں بدل رہا ہے۔ نیچے اتر کے میں نے اسے جگایا اور اپنی جگہ کی پیشکش کی۔ وہ انگشت بدنداں رہ گیا۔
"نہیں نہیں بابو جی! میں یہیں ٹھیک ہوں۔"
"جاؤ، مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔" میں نے اکتاہٹ سے کہا۔
"میرے پاس ٹکٹ نہیں ہے بابو!" اس نے آہستگی سے جواب دیا۔
"لیٹ جاؤ۔ ٹی ٹی آئے گا تو دیکھا جائے گا۔"
وہ جھجکتا اور سمٹتا ہوا اوپر چلا گیا اور میں اس کی جگہ فرش پر بیٹھ گیا۔ باقی رات یوں ہی بیٹھے بیٹھے گزر گئی۔ مجھے کسی کل چین نہیں تھا۔ سفر خاصا طویل تھا اور ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ لکھنؤ اسٹیشن پر معلوم ہوا کہ ابھی مراد آباد دو سو میل ہے۔ ڈبے میں ہر شخص ایک دوسرے سے مانوس ہو گیا تھا، کچھ درمیان میں اتر گئے تھے، کچھ نئے مسافر آ گئے تھے۔ انھوں نے مجھ سے بات کرنا چاہا "کہاں جانا ہے؟ کیا کرتے ہو؟" میں ہوں ہاں کر کے ٹالتا رہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انھوں نے مجھ سے بات چیت ہی بند کر دی۔ میرے کپڑوں اور بالوں میں سفر کی خاک دھول اٹ گئی تھی۔ جب میں نے باتھ روم کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو پہچاننے میں نہیں آیا۔ آنکھیں سرخ تھیں اور پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔ دل آئینے میں نظر نہیں آیا ورنہ وہ بھی سوجا ہوا دکھائی دیتا۔ میں کسی اور دنیا کا آدمی تھا۔ یہاں تو ہر شخص مجھ سے مختلف دکھائی دے رہا تھا۔ گاڑی رینگتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ آج ہی اسے لیٹ بھی ہونا تھا۔ جیسے تیسے بریلی اسٹیشن آیا، لوگوں نے بتایا کہ مراد آباد اب پچاس میل کے قریب رہ گیا ہے۔ پھر رام پور اسٹیشن پر یہ فاصلہ گھٹ کے سترہ اٹھارہ میل رہ گیا، میں ڈبے کے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ ایک سفر کورا کے ساتھ کیا تھا، اپنی زندگی کا ہولناک سفر۔ گاڑی میں اس کی ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔ بار بار ہر اسٹیشن پر اتر کے میرا اسے دیکھنا، اس کا گونگی بنی رہنا، فہمیدہ کے سیاہ برقعے سے اس کے خوبصورت اجلے چہرے کا جھانکنا، وہ لرزنا، وہ سہمنا۔ یہاں بھی ہر اسٹیشن پر اتر کے میں اسے دیکھتا تھا کہ شاید وہ کہیں نظر آ جائے، شاید کوئی اتفاق رونما ہو جائے مگر اب میں اسے پہچانوں گا کیسے؟ وہ تو بوڑھی ہو گئی ہوگی۔ اور بوڑھی ہو کے کیسی ہو گئی ہوگی۔ اف اس پر تو نظر بھی نہ ٹھیرتی ہوگی۔ میں اسے ہر شکل میں، ہر روپ میں پہچان لوں گا اور وہ بھی مجھے اس حلیے میں دور سے پہچان لے گی۔ میں ہر اسٹیشن پر عورتوں کو گھورتا، داڑھی اور شیروانی والے لوگوں کو غور سے دیکھتا کہ کوئی مولوی صاحب جیسا شخص نہیں تھا، کوئی کورا جیسی شخصیت نہیں تھی۔ وہ تو سب کالے ناٹے، اُبلے ہوتے بے ہنگم لوگ تھے، مولوی صاحب جیسا فرشتوں کا اور کورا جیسا گڑیوں اور پریوں کا معصوم چہرہ

کسی کا نہیں تھا۔
تاخیر سے ہی مگر آخر گاڑی مراد آباد اسٹیشن پر پہنچ گئی۔ اسٹیشن سے باہر نکلنے والا سب سے پہلا مسافر میں تھا۔ میرے حواس بکھرے ہوئے تھے۔ میں پاگلوں کی طرح باہر آیا، سامنے تانگے کھڑے تھے۔ میں تانگے والے کو فیض گنج کا پتہ بتا کر جلد از جلد اپنی منزل پر پہنچ سکتا تھا لیکن اسٹیشن کے عین مقابل ایک وسیع اور پرشکوہ عمارت پر میری نظر گئی۔ اس عمارت پر یہ بورڈ لگا ہوا تھا: "اسلامیہ مسافر خانہ مراد آباد۔" عمارت کی اوپری منزل کی تعمیر رکی ہوئی تھی۔ مسافر خانے کے ساتھ اسلامیہ کا لفظ دیکھ کر میں نے مناسب سمجھا کہ یہاں کے منتظمین سے مولوی محمد شفیق کے بارے میں پوچھوں تاکہ ان کا مکان ڈھونڈنے کی الجھن سے بچ سکوں۔ مولوی صاحب عموماً سفر کرتے رہتے تھے۔ میں نے سوچا، ممکن ہے مسافر خانے کے منتظمین انھیں جانتے ہوں۔ یہ سوچ کے میں عمارت میں داخل ہو گیا۔ میرے پاس چونکہ کوئی سامان نہیں تھا اس لیے کسی نے مجھ پر توجہ نہیں دی۔
مسافر خانے کی دیواروں پر جگہ جگہ مسافروں کے لیے ہدایتوں کے بورڈ آویزاں تھے۔ مجھے خیال آیا کہ سارٹے صحیح کہتا تھا مجھے کم سے کم بڑھے ہوئے بال ضرور ترشوا لینا چاہیے تھے لیکن اتنا ہوش تھا کسے؟ میں نے اسی حلیے میں منتظم کے دفتر پہنچ کے اپنا مدعا ظاہر کیا۔
"فیض گنج؟" اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ "میں فیض گنج کے کسی ایسے شخص سے واقف نہیں ہوں لیکن یہ زیادہ بڑا شہر نہیں ہے۔ پتہ آسانی سے دستیاب ہو جائے گا۔ یہ فرمائیے کہ آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟"
میں نے جھنجلا کے جواب دیا۔ "کلکتے سے۔"
"آپ کا سامان کہاں ہے؟ جب تک آپ انھیں تلاش کر رہے ہیں، اس وقت تک اپنا سامان یہاں محفوظ کروا سکتے ہیں اور اگر آپ چاہیں تو رکنے کا بھی انتظام ہو سکتا ہے۔ یہ مسافر خانہ خدمت خلق کے لیے تعمیر کیا گیا ہے اسی لیے واجبی سا کرایہ رکھا گیا ہے جو ہر شخص آسانی سے ادا کر سکتا ہے۔ شمالی ہند میں مسلمانوں کے لیے اس سے بہتر مسافر خانہ کہیں نہیں ہے۔ میرا خیال ہے پہلے آپ نہا دھو کے لباس تبدیل کر لیجیے۔ عمارت کے باہر دکانوں میں حجام موجود ہیں، کھانے پینے کا بھی معقول انتظام ہے پھر اطمینان سے مولوی صاحب کی تلاش میں نکلیے گا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے، ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔"
میں اس باتونی منتظم کا شکریہ ادا کر کے اور مسافر خانے کے انتظام کی تعریف کر کے باہر نکل آیا، وہ تو حد سے زیادہ خوش اخلاق شخص

تھا وہ میرے پیچھے پیچھے آیا لیکن میں تیز رفتاری سے ایک تانگے میں بیٹھ گیا تھا۔ "کہاں صاحب؟" تانگے والے نے کبیدہ ہو کے پوچھا۔

"فیض گنج۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"کرایہ اور سواریاں بٹھالوں؟"

"نہیں۔ میں پورے تانگے کا کرایہ ادا کر دوں گا، جلد سے جلد چلو" میری عجلت پر اس نے مجھے گھور کے دیکھا اور گھوڑے کو ایک چابک رسید کیا۔ تانگا اچھلا اور مرادآباد کی سڑکوں پر سرپٹ بھاگنے لگا۔ مرادآباد گیا ہی کی طرح کا اوسط درجے کا شہر معلوم ہوتا تھا لیکن سرگرمی یہاں گیا سے زیادہ تھی۔ تانگے والے نے حسبِ عادت مجھ سے مختلف سوالات کرنے چاہے میں اُسے ٹالتا رہا۔ تانگا ایک لمبی سڑک سے گزر کے پُررونق بازار میں داخل ہوگیا۔ یہ ایک گنجان علاقہ تھا۔

"فیض گنج میں کہاں اُتریے گا؟" تانگے والے نے پوچھا۔

"جہاں فیض گنج آئے اُتار دینا۔"

تانگے والے نے منہ بنا کے گھوڑے کو ایک گالی دی، یہ گالی گھوڑے نے تو شاید نہیں سنی ہوگی، یا گھوڑا گالیوں میں تمیز کرتا ہوگا کہ کون سی اُسے دی گئی ہے اور کون سی مسافر کو۔ میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ ڈھائی تین میل کے سفر کے بعد تانگا ایک جگہ رُک گیا۔ "لیجیے سرکار! جناب کا فیض گنج آگیا۔ دیکھیے سامنے چوکی ہے فیض گنج پولیس چوکی۔" تانگے والے نے میرا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ میں نے اُس کے ہاتھ پر ایک روپیہ رکھا تو اُسے اپنے رویے پر شرمندگی ہوئی۔ "مرادآباد میلی بلاتے ہیں سرکار" اُس نے پُرتکلف انداز میں کہا۔ "میرا نام خیرالدین ہے، لوگ مجھے خیرا کہتے ہیں۔ یہیں فیض گنج کے قریب کنبل کے تعزیے پر تانگا کھڑا کرتا ہوں یا ہم ریلوے اسٹیشن پر۔ مجھے بتا دیجیے گا صاحب کہ آپ کہاں ٹھہرے ہیں؟ ابھی کچھ دن تو قیام رہے گا؟ جب ضرورت ہو بلا لیجیے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں لکڑی کی ٹال کے برابر ایک گلی میں گھس گیا۔

یہ فیض گنج ہے۔ کاش یہاں کہیں قریب ہی کورا موجود ہو۔ اُس کے تصور سے میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ ممکن ہے مولوی صاحب نے کلکتے کے مدرسے سے آنے والے خطوں کا جواب دانستہ نہ دیا ہو اور اپنے کسی عزیز سے جواب لکھوا دیا ہو کہ وہ تو جب سے کلکتے گئے ہیں، واپس ہی نہیں آئے۔ کورا کے خیال سے مولوی صاحب نے ہر ممکن احتیاط برتی ہوگی۔ کاش مجھے اُن کے گھر کا پتہ معلوم ہوتا اور میں اُن دونوں کو چونکا دیتا۔ یہ چند ہی لمحوں کی خوش خیالیاں تھیں، ہوا کی طرح گزر گئیں۔ گلی میں چند لوگ نظر آئے میں نے اُن میں سے معقول شکل صورت کے ایک شخص کو روک کے مولوی صاحب کے بارے میں پوچھا۔ وہ میری کوئی امانت کرنے کے بجائے حیرت میں پڑ گیا۔ "مولوی محمد شفیق؟" اُس نے ماتھے پہ اُنگلی مارتے ہوئے آنکھیں موند کے کہا۔ "ہاں ہاں۔ وہ۔ آپ کہیں

اُن مولانا کی تو بات نہیں کر رہے ہیں جو عرصے سے نظر نہیں آئے؟ ہم نے سُنا تو تھا کہ وہ کسی اور شہر میں جا کے بس گئے ہیں، واللہ اعلم۔ بہرحال وہ اب اس محلّے میں نہیں رہتے۔ شہر میں ہوتے تو کبھی نظر تو آتے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے میں نے انھیں برسوں سے نہیں دیکھا۔"

مرادآباد کا یہ شخص باتونی معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اُس کی زبان روکی "اب وہ یہاں نہیں رہتے؟" میں نے تشویش سے پوچھا۔

"ہاں صاحب وہ یہاں نہیں رہتے، بالکل نہیں رہتے۔ اتنی بات میں یقین سے کہہ سکتا ہوں، اب رہا یہ سوال کہ وہ کہاں رہتے ہیں تو میں نہیں جانتا۔" اُس نے فیصلہ کُن انداز میں جواب دیا۔

"اُن کا کوئی عزیز وغیرہ؟" میں نے [illegible] لہجے میں کہا۔ "وہ اس شہر میں پیدا ہوئے تھے، کوئی رشتے دار؟ کوئی تو ہوگا جسے اُن کے بارے میں کچھ علم ہو۔"

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اُن کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی اور اُن کے والدین بھی نہیں ہیں، یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ یہاں پیدا ہوئے تھے اور اگر وہ یہیں پیدا ہوئے تھے تو اُن کے والدین کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا، ہو سکتا ہے کہ وہ کہیں اور سے آئے ہوں۔ اس صورت میں عزیزوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دور کیوں جائیں مجھی کو دیکھ لیجیے میں یہاں پیدا ہوا، یہیں پلا بڑھا لیکن میرے والدین بارہ بنکی سے آئے تھے۔"

"جناب جناب! کوئی بزرگ کوئی تو ایسا ہوگا جو اُن کے بارے میں آپ سے زیادہ جانتا ہو۔ ازراہِ کرم مجھے ایسے کسی شخص سے ملا دیجیے۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"کیوں نہیں ہوگا، آئیے کوشش کر کے دیکھتے ہیں مگر آپ نے اپنے اسمِ گرامی اور دیگر حالات سے آگاہ نہیں کیا۔ خادم کو بشیر حسین کہتے ہیں یہیں چُنگی میں ملازم ہوں۔" اُس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

میں نے سرسری طور پر اپنا تعارف کرایا۔ ایک گھر، دوسرا گھر، وہ شریف آدمی اپنا کام چھوڑ کے مجھے کئی گھروں میں لے گیا۔ کسی نے کچھ بتایا، کسی نے کچھ، آخر ایک صاحب مولوی صاحب کے کچھ قریبی عزیز نکل آئے۔ اُن سے معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کے بہت سے عزیز شہر کے مختلف محلّوں میں رہتے ہیں لیکن مولوی صاحب نے شروع ہی سے اپنے آپ کو سب سے الگ تھلگ رکھا تھا، وہ لوگوں سے بہت کم ملتے جلتے تھے اور علمی مطالعے میں مصروف رہتے تھے یا سفر کرتے رہتے تھے۔ یاد آ رہا ہے کہ ایک رات انھوں نے خود مجھ سے کہا تھا کہ اُن کا کوئی نہیں ہے نہ ماں نہ باپ صرف ایک بہن ہے اور اُس سے بھی ملے ہوئے عرصہ ہوگیا ہے۔ میں رات ہوتے تک مختلف محلّوں میں اُن کے عزیزوں کے گھروں کے چکر لگاتا رہا مگر ہر جگہ سے مایوسی ہوئی، ایسا معلوم ہوتا

تھا جیسے مولوی صاحب کی کسی کو فکر ہی نہیں ہے۔ جس شخص سے بھی پوچھا، اُس نے یہی کہا۔ "ہوں گے کسی پُرفضا مقام پر درس دے رہے ہوں گے یا سیاحت کر رہے ہوں گے۔" تعجب ہے کہ اُن کے دو چار قریبی عزیزوں نے بھی اُن سے زیادہ دل چسپی کا اظہار نہیں کیا۔ حالانکہ مولوی صاحب بڑی جاذبِ نظر شخصیت کے مالک تھے۔ اُن کی گفتگو میں شائستگی تھی اور لوچ تھا۔ وہ بہت جلد لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے، لباس بہت عمدہ پہنتے تھے، بڑی نفاست سے رہتے تھے۔ احتیاط پسند ضرور تھے مگر ملاقاتی کے دل میں دوبارہ ملنے کی خواہش یقیناً پیدا کر دیتے تھے۔ ایسی باغ و بہار شخصیت سے اُن کے عزیزوں کی بے تعلقی اور لاعلمی عجیب بات تھی لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ خود میں بھی اپنے عزیزوں، محلّے کے لوگوں اور گھر والوں سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ جیل میں ہم سب قیدی ایک ہی بیرک میں رہتے تھے مگر میں حقیقت میں کبھی اُن کے ساتھ نہیں رہا۔ میں تو ہمیشہ کورا کے ساتھ رہا۔

کتنے ہی گھر دیکھ ڈالے، اُن کے کتنے ہی عزیزوں سے پوچھا۔ مولوی صاحب کے ذکر پر کچھ لوگ تو مجھ سے اُن کی شکایت کرنے لگے کہ وہ کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتے تھے۔ اُن کے ماں باپ کے انتقال پر لوگوں نے اُن کی خبرگیری کرنی چاہی تھی مگر وہ کسی دینی درس گاہ میں چلے گئے تھے۔ وہاں سے فارغ التحصیل ہو کے آئے تو عزیزوں نے اُن سے شادی کرنے اور گھر بسانے کی خواہش ظاہر کی، اُنھوں نے انکار کر دیا۔ جب وہ خود ہی اپنے رشتے داروں کی فکر سے آزاد تھے تو کسی کو کیا پڑی تھی کہ وہ اُن کی فکر کرتا۔ فکریں تو اُن لوگوں کی کی جاتی ہیں جو خود کسی کی فکر کرتے ہیں۔ محبت تو ایثار کا باہمی معاہدہ ہے مگر کچھ لوگ اس سے بلند ہوتے ہیں۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ دوسرا کس رویے کا اظہار کر رہا ہے۔ وہ سودے بازی نہیں کرتے۔

گویا مولوی صاحب کلکتے کے مدرسے میں اپنا سامان واپس لینے نہیں گئے تو مرادآباد بھی نہیں آئے۔ میں اس کے باوجود مرادآباد میں اُن کا نام جاننے والوں کے دروازوں پر دستک دیتا رہا۔ بہت سے نیک لوگوں نے مجھے اپنے گھر میں مہمان بنانے کے لیے اصرار کیا، میرا دل مطمئن نہیں ہوا تھا۔ رات خاصی گزر گئی تھی۔ اگر کچھ اور وقت ملتا تو میں مزید لوگوں سے رابطہ قائم کرتا۔ تھک ہار کے میں مسافر خانے چلا آیا اور ایک کمرے میں بند ہو گیا۔ ریل کی دو راتیں بھی جاگ کر گزری تھیں مگر نیند آج بھی آنکھوں سے غائب تھی۔ دماغ پھٹا جاتا تھا، بُری طرح دُکھ رہا تھا۔ بعض گھروں میں جو شربت چائے وغیرہ سے تواضع کی گئی تھی، وہی پیٹ میں پڑ گیا تھا۔ جیل سے باہر کی دنیا بہت وسیع تھی۔ صبح اُٹھ کے میں پھر محلّے محلّے گھومتا رہا۔ بعض لوگوں سے دوبارہ ملاقات

ہوئی، اتنا ضرور پتہ چلا کہ مولوی صاحب کی واحد بہن شاید حیدرآباد دکن میں رہتی ہے۔ کسی کو اُس کا پتہ بھی معلوم نہیں تھا۔ میں مرادآباد کی ایک مسجد میں بھی گیا جہاں ایک بڑی درس گاہ میں مولوی صاحب دینی تعلیم دیتے تھے۔ یہاں بھی مولوی صاحب کا کوئی سُراغ نہیں ملا۔ کلکتے کے مدرسوں کی طرح وہ سب بھی مولوی محمد شفیق کی روپوشی پر حیرت زدہ تھے۔ میں پوچھتا پاچھتا مرادآبادی برتنوں کی اُن دکانوں پر بھی گیا جن کے برتنوں کے نمونے دکھا دکھا کے مولوی صاحب مختلف شہروں سے آرڈر لیا کرتے تھے اور انھیں مرادآباد بھیج دیا کرتے تھے۔ یہ مولوی صاحب کا جُزوقتی کام تھا۔

جہاں بھی مولوی صاحب کی خیر خبر کا ذرا امکان ہوا، میں وہاں ایک پیشہ ور سُراغ رساں کی طرح گیا۔ دو دن میں مرادآباد کے بہت سے لوگ مجھ سے واقف ہو چکے تھے۔ مرادآباد کے آخری سرے کے محلّے کٹ گھر سے لال کرتی تک، دیوان کا بازار، محلّہ پیر غیب، کسرول، مفتی ٹولا، بھٹی محلّہ، محلّہ تمباکو والان، گل شہید، مغل پورہ، محلّہ قانون گویاں، مسلمانوں کے جتنے بھی محلّے تھے، میں مسلسل تین دن تک اُن کی خاک چھانتا رہا۔ ان تین دنوں میں میری حالت ابتر ہوگئی، کپڑے سیاہ ہوگئے، پاؤں میں گٹھے پڑ گئے۔ مجھے پاگل سمجھا جانے لگا۔ مجھ جیسے شہر میں چلتا ہوا آدمی بار بار نظروں میں آتا ہے۔ تین دن میں مرادآباد کے لوگوں کی نگاہوں میں میرے لیے اشتیاق اور تپاک کے بجائے تجسس، طنز اور مزاح پیدا ہوگیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ اس شہر میں کوئی شخص مولوی صاحب کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور جب یہ امکان ختم ہوگیا تو میری آنکھوں کی روشنی ماند پڑنے لگی اور میرا حلق خشک ہونے لگا، سانس رکنے لگی، کھانسی ہونے لگی۔ حتیٰ کہ بخار آگیا۔ میں اسی حالت میں ایک رات پھر فیض گنج گیا اور گلیوں میں گرتا پڑتا مارا مارا پھرتا رہا۔ مسافر خانے واپس جاتے ہوئے منڈی چوک کی ایک دکان کے تختے پر نڈھال ہو کے بیٹھ گیا۔

مجھ سے آگے نہیں چلا گیا۔ یہاں بھی کلکتے کے اسٹیشن والا واقعہ دُہرایا گیا، میرے ہاتھ پیروں میں جان نہیں تھی۔ وہ تین لفنگے تھے۔ پہلے تو انھوں نے مجھے فقیر سمجھ کر چھیڑا، پتھر مارا۔ میں نے اُن کی جانب سے بے نیازی برتی تو وہ شرارت پر اُتر آئے۔ وہ شاید آخری شو دیکھ کے واپس آ رہے تھے، ترنگ میں تھے۔ "کچھ جیب ویب میں ہے میاں جی؟" ایک نے یہ پوچھتے ہوئے میری جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ میں نے اُسے ڈانٹ کر بھگانا چاہا تو وہ سب ہنسنے لگے۔ اُن میں سے دو نے مجھے بازوؤں سے پکڑ لیا اور اپنے ساتھی کو اشارہ کیا کہ وہ میری تلاشی لے۔ میں بُری طرح اُن کی گرفت میں تھا۔ میں اپنے آپ کو خود اُن کے حوالے کر دیتا لیکن میری گردن میں مالا پڑی ہوئی

تھی اور جو روپے میری جیب میں تھے، وہ میرا آخری سہارا تھے۔ میں نے اُن سے منت کی کہ وہ مجھے چھوڑ دیں، ایک بے گھر غریب آدمی کو پریشان نہ کریں۔ اُس نے روپے جیب سے نکال لیے۔ اُس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ "ابے یہ دیکھ۔ یہ دیکھ۔ اس کی جیب میں تو بڑا مال ہے۔" اُس نے اپنے ساتھیوں سے چیخ کر کہا۔

"اور دیکھ اور دیکھ۔ ان فقیروں کے پاس مال نہیں ہوگا تو کیا ہم کنگالوں کے پاس ہوگا۔ چل جلدی سے اپنا کام کر۔ وہ حوالدار اِدھر ہی ٹہلتا رہتا ہے، کسی بھی سمے آسکتا ہے۔" اُس کے ساتھی نے زور سے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"میرے روپے واپس کرو۔" میں نے دہاڑ کر کہا۔

"ضرور ضرور، ہم تجھے سویرے ناشتے کے اور کل شام کی پکچر کے پیسے ضرور دیں گے۔ بتا اور مال کدھر ہے؟"

"روپے واپس کرو۔" میں نے چیخ کر کہا۔

"ابے۔" جس شخص نے میری جیب سے روپے برآمد کیے تھے، وہ میرا انیفا اور جسم ٹٹولتے ٹٹولتے جب گردن تک پہنچا اور مالا سے اس کے ہاتھ ٹکرائے تو حیرانی سے بولا۔ "ابے یہ تو ایک مالا بھی پہنے ہوئے ہے۔"

"کھینچ لے گردن سے۔" اُس کے ساتھی نے گرج کے حکم دیا۔

"ہاتھ مت لگانا۔" میری آواز غصے سے کانپنے لگی۔ اُس کا ہاتھ میرے گریبان کے اندر پہنچ چکا تھا۔ میں نے یک بارگی اُچھل کے اپنی دونوں ٹانگیں اُس خبیث کی ٹانگوں پر مار دیں۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا سامنے کی دُکان کے بند دروازے سے ٹکرایا اور چیخنے لگا۔ یہ اُس کے ساتھیوں کے لیے ایک غیر متوقع بات تھی۔ دونوں میرا بازو چھوڑ کے بجلی کی طرح سامنے آگئے اور ایک نے کمر سے چاقو نکال کے اور پینترا بدل کے تیزی سے کہا۔ "مالا نکال۔"

میں ایک لمحے تک سُن کھڑا رہا۔ اُس نے چاقو لہرا کر مجھے گردن سے مالا نکالنے کا دوبارہ حکم دیا۔

"کیا مالا تیرے باپ کی ہے۔" میں نے تحمل سے کہا۔

"یہ تو تجھے ابھی معلوم ہو جائے گا۔" میں یہی چاہتا تھا کہ وہ چاقو کا کوئی غلط ہاتھ دکھائے۔ وہ مجھ سے اور نزدیک ہو گیا۔ میں یوں ہی کھڑا اُن دونوں کو گھورتا رہا۔ "یہ چاقو ابھی تیرے پیٹ میں اُتر جائے گا۔ جان پیاری ہے تو مالا حوالے کر دے۔"

میں نے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے گردن کی طرف دونوں ہاتھ بڑھائے۔ ایک ثانیے بعد میرا پھرتیلا ہاتھ چاقو والے شخص کے پنجے پر تھا۔ دوسرے نے مجھے لاتیں ماریں اور مجھ پر گھونسے برسائے۔ لیکن میں نے اُس کے ساتھی کا پنجہ نہیں چھوڑا اور اُس کا بازو مروڑ کے چاقو اُس سے چھین لیا۔ چاقو میرے ہاتھ میں آتے ہی اُن کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ گھگھیانے لگے۔ اگر مجھے سات سال کا تلخ تجربہ نہ ہوتا تو میں اُن کے پیٹ میں چاقو اتار دیتا۔ "روپے واپس کرو۔" میں نے چیخ کر کہا۔

"ابھی میاں جی ابھی۔ جانے دیجیے روپے۔" اُس نے اپنے ساتھی کو حکم دیا۔ "جبو! ادھر جو ایک پائی کی بھی کمی ہوئی۔ میاں جی مجھے کوئی آدمی دکھتے ہیں۔" میں نے اُس کے تبصرے پر کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ دوسرا ساتھی بھاگا ہوا اپنے کراہتے ہوئے ساتھی کے پاس گیا جو اوندھا پڑا تھا۔ وہ روپے اُس کی جیب سے نکال کے تیزی سے واپس آیا۔ "گن لیجیے میاں جی!" اُس نے روپے میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ میں نے گنے بغیر انھیں جیب میں رکھ لیا۔ "پہلے تو نہیں دیکھا، نئے نئے شہر میں آئے ہو استاد؟"

سپاہی کی چاپ سے تینوں پریشان ہو گئے۔ میرا جواب سنے بغیر اُنھوں نے زمین پر ڈھیر پڑے ہوئے ساتھی کو اُٹھایا۔ پندرہ بیس قدم بعد ایک گلی میں بھاگنے ہی والے تھے کہ میری ہوئی آواز نے انھیں روک لیا۔ "ٹھہرو۔ اپنا چاقو لیتے جاؤ۔"

اُنھوں نے چاقو واپس لینا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ مجھے دھیان ہی نہیں رہا کہ میرے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو ہے، سپاہی میرے پاس آچکا تھا۔ میرا حلیہ اور چاقو دیکھ کے اُس کا پارہ چڑھ گیا۔ "کون ہو؟" اُس نے سپاہیانہ آواز میں پوچھا۔

"ایک مسافر ہوں۔" میں نے تھکی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"یہاں کون تھا ابھی؟ یہ شور کیسا ہو رہا تھا؟"

"تین لڑکے تھے، چاقو چلانا آتا نہیں اور چاقو لیے پھرتے ہیں۔ مجھے یہ دکھا کے روپے لوٹنا چاہتے تھے۔ میں نے چاقو چھینا تو بھاگ گئے۔" میں نے سادگی سے کہا۔

"چاقو دیکھ کے بھاگے یا میرے قدموں کی آواز سن کے؟"

"جو سمجھ لیجیے، قسمت نے آپ کو بھی وقت پر بھیج دیا۔"

"میں تمھارے بیان پر کیوں یقین کروں؟"

"میں جو کہہ رہا ہوں۔" میں نے ترشی سے کہا۔ "اُن کا چاقو میرے ہاتھ میں ہے۔ شاید آپ نے انھیں بھاگتے ہوئے بھی دیکھا ہو؟"

"یہ چاقو تمھارا بھی تو ہو سکتا ہے۔" وہ بگڑ کے بولا۔ "کون ہو تم؟ کیا نام ہے؟" میں نے اپنا نام بتایا اور کہا کہ میں یہاں اکیلا ہوں، کسی کی تلاش میں تھا۔ انھیں دیکھتے دیکھتے تین ہو گئے۔

"اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ مجھے تم کوئی خطرناک آدمی معلوم ہوتے ہو۔ اس شہر میں تمھیں کون جانتا ہے؟"

"کوئی نہیں۔ کیا ضروری ہے کہ ہر شہر میں آدمی کا جاننے والا ہو؟" وہ میں نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "یہ چاقو آپ لے لیجیے۔"

اُس نے ایک دم چاقو میرے ہاتھ سے لیا جیسے میں نے اُسے دیا نہیں ہے بلکہ اُس نے مجھ سے چھینا ہے۔ "معاملہ کچھ گڑبڑ معلوم ہوتا ہے۔ شاید تم لوگوں کا ڈاکا ڈالنے کا پروگرام تھا۔ تم نے اپنے ساتھیوں کو بھگا دیا؟"

"حوالدار صاحب! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔" میں نے تلملا کر کہا۔ "یہ دیکھیے میرا ہاتھ۔ بخار میں جل رہا ہے، یہ دیکھیے۔" میں نے اپنی کلائی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تمھیں میرے ساتھ تھانے چلنا ہوگا۔" وہ برہمی سے بولا۔

"کیوں؟ میں نے کیا جرم کیا ہے؟"

"جرم؟" وہ چاقو لہراتے ہوئے بولا۔ "یہ جرم نہیں ہے؟ رات کے اس وقت یہاں بیٹھنا، شور شرابا کرنا جرم نہیں ہے؟ باقی جرم تھانے دار صاحب ثابت کریں گے اور وہ صبح سے پہلے تمھیں نہیں چھوڑیں گے جب تک انھیں اس علاقے میں آج کی رات صحیح و سلامت گزرنے کا یقین نہیں ہو جائے گا۔ چلو۔"

میں نے اُس کی منت سماجت کی۔ شہر میں کوئی ایسا بھی نہیں تھا جس سے میں اپنے تعلق کا حوالہ دے دیتا۔ اُس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ آدمی دنیا میں تنہا نہیں رہ سکتا، اُس کی کوئی بنیاد ضرور ہونی چاہیے۔ کسی محلے، کسی گھر اور کسی گروہ سے اُس کی وابستگی ضروری ہے کیونکہ یہاں پولیس والے بھی رہتے ہیں۔ انھیں سب سے زیادہ ضرورت شناخت کی پڑتی ہے۔ اگر میں اُس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیتا تو وہ اپنے گلے میں لٹکی ہوئی سیٹی بجا دیتا۔ اس سیٹی سے مجھے بہت خوف آتا تھا، جب بھی سنتری جیل میں سیٹیاں بجاتے تھے میں اپنے کان بند کر لیتا تھا۔ سیٹی کی آواز سے میرا روآں روآں لرزنے لگتا تھا۔ حوالدار میری منت سماجت سے ضد پر آ گیا۔ میں نے بہت کہا مگر وہ نہیں مانا۔ میں نے اُسے دس روپے نکال کے دیے۔ وہ کچھ دیر جھجکا، ہنسا، متذبذب ہوا لیکن اپنی بات پر اڑا رہا۔ ہاتھ میں چاقو، گلے میں قیمتی مالا، جیب میں روپے، اندھیری رات، اجنبی شہر، ملنگوں کا حلیہ، ان تمام خصوصیات کی یک جائی سے کسی کو بھی مجرم ثابت کیا جا سکتا ہے۔ میرے ساتھ تو ایک خصوصیت بھی تھی۔ اگر کوئی یہ پہچان لیتا کہ کلکتے میں تین قتل کرکے سات سال کی سزا کاٹنے والا شخص اُس کے سامنے موجود ہے تو زمین ملتے تو سے پر سلا رکھ دیتا پھر بھی اُسے میری بے گناہی کا یقین نہ آتا۔ میں کچھ دور تک خاموشی سے اُس کے ساتھ چلتا رہا پھر ایک نیم تاریک گلی کے قریب پہنچ کے میں نے اُس سے ایک بار پھر درخواست کی۔ تھانا بہت قریب ہے، زیادہ دور نہیں جانا ہے۔ اُس نے طنزاً کہا۔

"سنو حوالدار جی!" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔ آپ مجھے وہاں لے جا کے وقت ضائع کر رہے ہیں۔"

"سب مجرم ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔"

"آپ مجھے مجرم کیوں کہہ رہے ہیں؟"

"چلو، ملزم سمجھ لو۔" وہ مضحکہ خیز انداز میں بولا۔

"میں نہیں جاؤں گا۔" میں نے برہم ہو کے کہا۔

"کیا؟" اُس نے میرے تیور دیکھ کے سیٹی پر ہاتھ ڈالا۔ میں نے اُس کا ہاتھ وہیں روک لیا اور سیٹی کی ڈوری کو جھٹکا دیا۔ سیٹی دُور جا گری۔ "کیا کیا؟" وہ بوکھلاہٹ میں بولا۔ "یہ ایک اور جرم ہے۔ بھگوان کی سوگند! اتنی مار لگواؤں گا کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔"

"چپ رہو۔" میں اُسے گریبان سے کھینچتا ہوا گلی میں لے آیا۔ "چپکے سے یہاں بیٹھ جاؤ اور آواز مت نکالو۔ شور کیا تو سمجھ لینا ہاں۔" میری آواز میں ایسی گرج تھی کہ اُس کی زبان کو قفل لگ گیا۔ "میں تمھیں یہیں ختم کر کے فرار ہو سکتا ہوں لیکن تمھارے بیوی بچوں کا خیال آ گیا۔ جاؤ اپنا راستہ سنبھالو۔"

وہ ٹھٹک سا گیا۔ اُس کے ہونٹ لرزنے لگے۔ اُسے میرے ہاتھ پاؤں کے زور کا اندازہ نہیں تھا۔ جب اپنے شانوں پر اُس نے وزن محسوس کیا تو غصے یا خوف سے اُس کا انگ انگ تھرکنے لگا۔ اُس نے اپنی ٹوپی سنبھالی اور بھاگتا ہوا گلی کے پار ہو گیا۔ میں اندر گلی میں رینگ گیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے اُن سیٹیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ وہی ہیبت ناک آوازیں جو برچھے کی طرح دل میں گھس جاتی تھیں۔ میں بھوک اور بخار کی ناتوانی میں اِس گلی سے اُس گلی میں بھاگتا رہا۔ سپاہی نے مجھے معاف نہیں کیا۔ ایک سیٹی بجی تو ہر طرف سیٹیاں گونجنے لگیں۔ نتیجتاً مجھے خود کو ایک نیم پختہ مکان کی شکستہ دیوار کی اوٹ میں چھپ کے بیٹھ جانا پڑا۔ وہاں مرغیوں کا ڈربا تھا۔ میری آہٹ پر مرغیوں میں افراتفری پھیل گئی، وہ پھڑپھڑانے اور شور کرنے لگیں لیکن میں چپ چاپ پڑا رہا۔ یہ کسی کمرے کا ٹوٹا ہوا حصہ تھا جو کبھی مکان کے اندر شامل ہوگا۔ آدھی چھت سلامت تھی۔ آدھی کی گری ہوئی اینٹیں اِدھر اُدھر کئی ڈھیروں میں پڑی ہوئی تھیں جو حصہ زمانے کی دست بُرد سے محفوظ رہ گیا تھا، اب اُسی میں مکان تھا۔ مکان کے ایک در کھلے میں روشنی ہوئی اور کسی عورت کی لرزیدہ آواز اُبھری۔ "کون ہے؟" میں دم سادھے پڑا رہا۔ مرغیاں کڑکڑاتی رہیں۔ عورت نے ایک ہاتھ سے لالٹین باہر نکالی۔ "کون ہے؟" وہ پھر چلائی۔ اُس نے مجھے دیکھتے ہوئے دیکھ لیا ہوگا۔ دوسرے ہی لمحے ایک اینٹ میری پیٹھ پر آ کے لگی۔ میری کراہ نکل گئی۔ اگر میں اسی طرح پڑا رہتا تو وہ اور اینٹیں پھینکتی۔ میں وہاں سے کسک کے دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ باہر سیٹیاں گونج رہی تھیں۔ میں کسی دوسری جگہ بھی پناہ نہیں لے سکتا تھا۔ یہ بھی خوف تھا کہ عورت

کے گھر والے جاگ کر شور نہ مچا دیں۔ میں نے آہستگی سے جواب دیا۔ "ایک پناہ گیر ہے۔"

"پناہ گیر؟" عورت کی خوف زدہ آواز اُبھری۔

"ہاں اماں پناہ گیر، چور نہیں ہوں۔"

کچھ دیر خاموشی رہی پھر وہ بولی۔ "یہاں کیوں چھپے بیٹھے ہو؟"

"کچھ دیر میں چلا جاؤں گا، یقین کیجیے۔ آپ کی کسی چیز پر ہاتھ نہیں ڈالوں گا۔ اطمینان سے سوئیے۔"

"مگر، مگر، تم ہو کون؟" عورت کا خوف بڑھ گیا تھا۔

"میں ایک مسافر ہوں اماں! وہ شاید قریب آ رہے ہیں لِلّٰہ کچھ دیر کے لیے لالٹین اندر کر لیجیے اور خاموش ہو جائیے۔"

اُس نے میری بات مان لی، مو کھلے سے لالٹین اور اپنا سر ہٹا لیا، مرغیاں بھی شاید اپنی مالک کی آواز پہچان کے خاموش ہو گئی تھیں۔ دیوار کے قریب تیز سیٹیوں اور تیز قدموں کی آوازیں آئیں۔ پھر وہ آگے بڑھ گئے۔ میں نے سکون کی سانس لی۔ عورت نے لالٹین پھر مو کھلے سے نکال لی تھی۔ "آپ کا شکریہ۔ خدا آپ کو اس کا اجر دے گا۔" یہ کہہ کے میں شکستہ دیوار سے باہر نکلا۔

"سُنیے۔" اس نے مجھے جاتے دیکھ کے روکا۔ میں پیچھے مُڑ کے دیکھنے لگا، لالٹین پھر مو کھلے کے اندر ہو گئی اور آہستہ سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی، چادر میں لپٹی ہوئی ایک ادھیڑ عمر عورت برآمد ہوئی۔ اُس کا چہرہ سفید تھا۔ "اگر آپ کے پاس رات بسر کرنے کی کوئی جگہ نہیں ہے تو آپ یہاں ٹھیر سکتے ہیں مگر صبح ہونے سے پہلے چلے جایئے گا۔"

"شکریہ۔" میں نے مہذب لہجے میں کہا۔ "میں مسافر خانے میں ٹھیرا ہوا ہوں اور پہلی گاڑی سے واپس جانے والا تھا۔ گاڑی صبح چھ بجے جاتی ہے۔ راستے میں یہ لوگ پیچھے پڑ گئے۔"

"اندر آ جائیے۔ میری نظریں زمانے کے سرد و گرم سے خوب واقف ہو چکی ہیں، اندر آ جائیے۔"

"نہیں نہیں۔" میں نے تکلف کیا۔ "آپ کے گھر والے....."

"انھیں میں سمجھا لوں گی۔ آئیے۔" اس نے مخلصانہ لہجے میں اصرار کیا۔ میں انکار کرتے کرتے رہ گیا اور اُس کے پیچھے جھجکتا جھجکتا مکان کے اندر داخل ہوا کسی زمانے میں یہ ایک چھوٹی سی خوب صورت حویلی ہوگی، اب کھنڈر میں بدل گئی تھی، رات کو مزید ویران اور پُراسرار ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے برآمدے کی چوکی پر بٹھا دیا اور خود اندر جا کے شاید بستر کا انتظام کرنے لگی۔ پھر وہ مجھے ایک شکستہ کمرے میں لے گئی جہاں ایک چارپائی پر صاف ستھرا بستر بچھا دیا گیا تھا۔ اس کے گھر میں کوئی مرد نہیں تھا، ایک اجنبی کے لیے یہ ایثار بڑی حیرت کی بات تھی۔ "آپ یہاں آرام کیجیے۔ میں فجر کی نماز سے پہلے آپ کو اُٹھا

دوں گی۔"

"آپ نے بہت زحمت کی اماں! آپ تو فرشتہ ہیں، ا[illegible] میرا یہ حلیہ دیکھنے کے باوجود احسان کیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ [illegible] تک میرا خیال ہے آپ یہاں تنہا رہتی ہیں؟"

"ہاں آپ نے صحیح اندازہ لگایا۔ میرے شوہر مر چکے ہیں دو بچیاں ہیں۔ ایک کو اُس کے ماموں علی گڑھ لے گئے ہیں۔ دوسری [illegible] یہاں اِرد گرد سب میرے شوہر کے عزیزوں کے مکانات ہیں [illegible] کے ملنے ہی نے مجھے متاثر کیا۔ وہ پڑھی لکھی عورت معلوم ہو[illegible] جانے کیوں مجھے یقین ہے کہ آپ ایک اچھے آدمی ہیں اس لیے یہ جرأت کی اور پھر یہاں کیا رکھا ہے ـــــ ڈرتے تو مال [illegible] والے ہیں ہم غریبوں کے پاس خلوص کی دولت کے سوا کیا ہے [illegible] کھائیے گا یا پیجیے گا؟"

"نہیں مجھے بھوک نہیں ہے، ایک گلاس پانی پلا دیجیے مجھے بخار ہے، مسافر خانے جاتے جاتے میں ایک دُکان کے تختے کے لیے رُک گیا تھا کہ..." میں نے مختصراً اپنی روداد سُنائی۔

"توبہ ہے۔" وہ اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کے بولی۔ "آج تو آپ [illegible] مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ ایک شریف اور بہادر شخص میرے گھر مہمان [illegible] آپ کو بخار ہے؟ لائیے مجھے اپنا ہاتھ دکھائیے۔" اس نے اپنا ہا[illegible] کے میری کلائی پکڑ لی۔ "ارے واقعی۔ آپ کو تو بہت تیز بخار [illegible] اللہ تیرا شکر ہے۔ مجھ سے گناہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ یقیناً گھر آپ کو اللہ نے بھیجا ہے۔ بھلا اتنے بہت سے گھروں میں آپ کیوں آتے مگر میں آپ کو پانی نہیں پلاؤں گی۔ بغیر دودھ کی [illegible] پیجیے۔ آپ بالکل لیٹ جائیے۔ کمر سیدھی کر لیجیے، دیکھیے کوئی تکلف کیجیے۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

بستر پر لیٹتے ہی جسم جیسے کسی نے بھٹی میں جھونک د[illegible] دن کی مسلسل تھکن اور بھوک سے حالت پہلے ہی ناگفتہ بہ تھ[illegible] بستر کے اور اُس نیک عورت کے گداز نے تمام طاقت چھین ل[illegible] تپ کے بخار آیا کہ ہوش و حواس جاتے رہے۔ نہ جانے وہ عورت واپس آئی اور میں بخار میں کیا کیا بکتا رہا۔ جب مجھے کچھ ہو[illegible] میں نے دیکھا، میرا سارا کُرتا پسینے میں بھیگا ہوا ہے۔ میں کت[illegible] میں دبا ہوا تھا اور عورت میرے سرہانے بیٹھی ہوئی میرے [illegible] بھیگا کپڑا رکھ رہی تھی۔ لالٹین کی روشنی تیز تھی اور قریب [illegible] کی بچی ایک تسلے میں کپڑا بھگو بھگو کے اسے دے رہی تھی۔ [illegible] بے چینی سے اُٹھنے کی کوشش کی۔ عورت نے میرے سینے رکھ کے مجھے لیٹے رہنے دیا۔ "خدا کا شکر ہے کہ آپ کو پسینہ ورنہ آپ کی حالت تو بگڑ گئی تھی۔"

"کیا وقت ہوا ہے؟" میں نے ناتواں آواز میں پوچھا۔

"فجر قریب ہے۔" وہ سرگوشی میں بولی۔

"مجھے چلنا چاہیے۔" میں نے اُٹھنے کا ارادہ کیا تو آنکھوں کے آگے [illegible]ـیرا چھا گیا، سارا کمرہ گھومنے لگا۔

"آپ اِس حالت میں کہیں نہیں جا سکتے۔"

"تو میں یہاں بھی تو نہیں رہ سکتا۔"

"مگر آپ جائیں گے کیسے؟" وہ فکرمندانہ لہجے میں بولی۔

"کسی نہ کسی طرح مسافر خانے تک پہنچ ہی جاؤں گا۔"

"آپ کو اندازہ نہیں ہے۔ آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔ دیکھیے اگر آپ کو ابھی دوا اور پرہیزی غذا نہیں ملے گی تو [طب]یعت اور خراب ہو جائے گی۔ میرے لیے ایک اجنبی مرد کو یہاں [رکھ]نا مشکل ہے۔ طرح طرح کی باتیں ہوں گی لیکن میں آپ کو اس حالت [میں] باہر بھی نہیں جانے دے سکتی، اب ایک ہی شکل ہے کہ میں آپ کو [اپنے] مکان کی اُس بوسیدہ کوٹھری میں ٹھیرا دوں جہاں کسی کی نظر [نہیں] جاتی۔ وہاں میرے مرحوم شوہر کا سامان بند ہے۔ مجبوری کی [با]ت ہے، وہ کوٹھری رہنے کے لائق تو نہیں ہے۔ مگر آپ بھی [با]ہر جانے کے لائق نہیں ہیں۔"

یہ اُس کا فیصلہ تھا، کہنے کا انداز مختلف تھا۔ اُس نے پہلے ہی فیصلہ کر لیا تھا۔ صبح ہونے سے پہلے مجھے اُس بوسیدہ کوٹھری [میں] منتقل کر دیا گیا اور دن کے وقت باہر سے تالا لگا دیا گیا۔ جب [باہ]ر میں کسی کے آنے کا اندیشہ نہ رہا تو وہ میرے لیے عجلت میں [دلیہ] بنا کے لائی اور اصرار کر کے ایک قدح مجھے پلوایا۔ باہر اُس کی بچی [پہرا دے] رہی تھی تاکہ جیسے ہی دروازے پر دستک ہو، وہ باہر [آ]ن جائے۔ یہ ترکیب سود مند ثابت ہوئی، وہ دن میں متعدد بار مجھے [د]یکھنے آئی۔ دوپہر کو اُس نے مجھے دلیا بنا کے کھلایا۔ صرف ایک دن [م]یں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اپنی بڑی بہن یا اپنی ماں، اپنی [ما]ں کے گھر میں ہوں۔ اُس نے مجھے رات کو بتایا کہ میں بخار کی حالت [میں ا]ن کو را، فہمیدہ، امی، ابا، نفل جیل، جاقر اور نہ جانے کیا کیا بڑبڑا[تا ر]ہا تھا۔ دوسرے دن رات کو وہ مسلسل کوٹھری میں رہی اور اُس کی [ب]ری بچی میرے پیر دباتی رہی۔ پہلے وہ سہمی ہوئی تھی، بعد میں اپنی [ماں] کی دیکھا دیکھی مجھ سے کھل گئی۔ وہ مجھے اپنی چھوٹی بہن معلوم [ہو]تی تھی بالکل ایسی ہی تھی، اتنی ہی پیاری، اتنی ہی معصوم۔ دوسری [را]ت اور دوسرا دن بھی میں نے اُس کوٹھری میں گزارا۔ عورت [کا] نام ارجمند تھا، وہ ریاست رام پور سے بیاہ کے مراد آباد آئی تھی۔ [ز]مانے کے گرم جالے میں اُس کا چہرہ دیکھا، بُردباری، برداشت [اور] تمکنت کے علاوہ عزم اور حرکت بھی اُس کے چہرے سے نمایاں

تھی۔ کسی زمانے میں اُس کا رنگ سُرخ ہو گا۔ اب سفید ہو گیا تھا۔ اب وہ غریبی اور محرومی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ اُس نے مجھے اپنے شوہر کے عزیزوں کے ظلم و ستم، طعنوں، تشنوں اور الزام تراشیوں کی ایک طویل اور دردناک داستان سنائی۔ اسکول میں ٹیچر تھی اور محلے کی بچیاں بھی اُس کے پاس پڑھنے آتی تھیں، وہ ایک سلیقہ مند عورت تھی مگر غربت میں سلیقے کا رنگ کہاں نکھرتا ہے۔ میری موجودگی کے دوران میں اُس نے اپنی بیماری کا بہانہ کر کے اسکول سے چھٹی لے لی تھی اور بچیوں کو منع کر دیا تھا۔ چار دن تک وہ خدا ترس عورت میری تیمارداری کرتی رہی۔ چار دن بعد میری حالت کسی قدر سنبھلی، اُس نے اپنے گھر کی کئی مُرغیاں کاٹ کے اور ان کا شوربا بنا کے مجھے پلایا۔ وہ میرے بارے میں کچھ جاننے کی مشتاق تھی۔ میں نے اُسے بتایا کہ دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ کلکتے میں ایک اُستاد تھے جو اچانک غائب ہو گئے، میں انھی کی تلاش میں آیا ہوں۔ میں نے بخار کے ہذیان میں جن جن لوگوں کے نام لیے تھے، وہ میرے عزیز تھے یا ملاقاتی۔

چوتھے دن بھی اُس نے مجھے نہیں جانے دیا۔ پانچویں روز بڑی مشکل سے اجازت ملی۔ میرے چلتے وقت وہ بہت روئی، وہ اور اس کی بچی رات بھر جاگتی رہیں۔ میں نے وعدہ کیا کہ میں اُس سے دوبارہ ملنے آؤں گا۔ صبح کاذب کے وقت میں نے اُس کے گھر سے نکلنے کا ارادہ کیا، جب میں آنسوؤں کے ساتھ اُس سے رخصت ہونے لگا تو اُس نے میرے ہاتھ میں کریچ کا ایک تھیلا تھما دیا۔ میں نے اُسے کھول کے دیکھا، اُس میں کُرتے، پاجامے کے دو جوڑے، دو چادریں اور دو بنیان رکھے ہوئے تھے۔ ایک پوٹلی میں کھانا بندھا ہوا تھا۔ "یہ کیا ہے؟" میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ کچھ نہیں بولی، سسکتی رہی۔ میں نے سوچا، اُس کی بچی فرح کو کچھ روپے پیسے دوں لیکن یہ بات مجھے کچھ اچھی نہیں لگی۔ میں نے فرح کو گلے سے لگا کے خوب پیار کیا۔

مراد آباد اسٹیشن سے دکن جانے والی گاڑی صبح سویرے روانہ ہوتی تھی۔ میں اُس میں بیٹھ گیا۔ دو راتوں اور ایک دن کی مسافت کے بعد حیدرآباد دکن کے نام پلی اسٹیشن پر اُترا۔

اسٹیشن سے باہر آتے ہی مجھ پر مایوسی کا غلبہ ہوا، میرے ذہن میں اس شہر کا تصور کچھ اور تھا۔ یہ تو ایک وسیع اور گنجان شہر تھا۔ چھوٹا موٹا کلکتہ۔ قدیم و جدید طرز کی عمارتیں، چوڑی سیاہ سڑکیں، میلوں پھیلے ہوئے بازار مگر دوسرے شہروں کے مقابلے میں یہ ایک بدلا ہوا شہر تھا۔ یہاں کے ہنگامے میں بھی سکون تھا۔ سڑک پر اِ[illegible]

دکانوں میں جتنے بھی آدمی نظر آتے سب بند گلے کی شیروانیوں میں ملبوس تھے، سر پر اُردو کے بڑے بڑے بورڈ آویزاں تھے۔ لوگوں کے انداز میں ایک تکلف تھا، نفاست اور سجاوٹ تھی۔ میں سارجے کی دی ہوئی واسکٹ پہنے ہوئے تھا۔ میں ہوٹل میں ٹھیرنے اور اپنا حلیہ درست کرنے کے بجائے ارجمند بانو کا تھیلا ہاتھ میں لیے جدھر منہ اُٹھا، اُدھر نکل پڑا اور مختلف مدرسوں اور مسجدوں میں جا کے محمد شفیق نامی ایک مولوی کا پتہ پوچھتا رہا۔ لوگ مجھ پر ہنسنے لگتے۔ میں عاجزی سے درخواست کرتا کہ وہ ذرا توجہ سے میری بات سُن لیں، مجھے مولوی محمد شفیق یا اُن کی بہن کا پتہ بتا دیں۔ اُن کا اور اُن کے شوہر کا نام مجھے معلوم نہیں تھا۔ نامپلی اسٹیشن سے کئی میل کا فاصلہ طے کرتا ہوا میں پُرانے شہر میں داخل ہو گیا اور اُس آخری سرے تک گیا جہاں چاؤش بستے تھے اور جہاں نظام نے ایک پُرشکوہ عمارت فلک نما بنائی تھی۔ اب تو منہ کھولتے ہوئے بھی ندامت ہوتی تھی۔ پہلے ہی دن کی ناکامی دیکھ کے مجھے یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیے تھا۔ یہاں تو وقت محض ضائع کرنا تھا مگر وقت کی کمی کس کے پاس تھی۔ میرے پاس زندگی باقی پڑی تھی۔ ابھی میری عمر ۲۳، ۲۴ سال سے زیادہ نہیں تھی جب کچھ نہ بنا تو میں نے حیدرآباد میں مرادآباد کے لوگوں کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ لوگ طرح طرح کے سوال کرتے کہ اُن کی شادی کب ہوئی تھی؟ وہ کب حیدرآباد منتقل ہوئیں؟ اُن کے شوہر کا نام کیا ہے؟ کہیں یہ تو نہیں ہے، کہیں وہ تو نہیں ہے؟ اس تگ و دو میں ایک اخبار نویس سے میری ملاقات ہو گئی۔ اُس نے میری درخواست پر اپنے اخبار میں اس مضمون کا اشتہار شائع کیا۔

"مرادآباد (یوپی) کے جناب مولانا محمد شفیق
بالقابہ اور اُن کی ہمشیرہ محترمہ جہاں کہیں بھی قیام
فرما ہوں، توجہ فرمائیں اور مدینہ ہوٹل میں بابر خاں
سے رابطہ قائم کریں۔ بابر خاں کے پاس ہر دو موصوف
کے لیے ایک امانت محفوظ ہے۔"

مشتہر: احقر بابر خاں

اخبار میں اشتہار چھپنے سے بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اخبار پُرانا ہو گیا۔ میں حیدرآباد میں ایک ہفتے قیام کرنے کے بعد آخر دلی آ گیا۔ دلی سے لاہور اور پشاور گیا اور وہاں سے دیوبند، بریلی پھر لکھنؤ آ گیا۔ اس سفر میں مجھے دو مہینے لگ گئے۔ میں نے مختلف دینی درس گاہوں میں مولوی صاحب کو تلاش کیا لیکن وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے؟ کہیں نہیں ملے۔ آخر میرا حوصلہ جواب دے گیا۔ لکھنؤ آخری شہر تھا جہاں مجھے اپنے آپ کو بہ جبر یہ سمجھانا پڑا کہ مولوی صاحب سے ملاقات اب ممکن نہیں ہے۔ نہ جانے اُن کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا۔ وہ کس کھوہ میں گم ہو گئے۔ اتنے بڑے ہندوستان میں کس سے اُن کا پتہ پوچھوں؟ ابھی تو صرف چند شہر دیکھے ہیں، کہاں کہاں جاؤں۔ اب مجھے کچھ سکون ہو چلا تھا۔ مُردوں جیسا سکون، مفلوج اور معذور آدمیوں جیسا سکون۔ مجھے کوئی جلدی نہیں تھی، نہ وحشت۔ جیب میں صرف چند روپے باقی تھے مجھے اور انتظام کرنے کی فکر بھی نہیں تھی۔ بس ایک کر کہ مرنے کی ہمت بھی نہیں ہے۔ سات سال کس اُمید پر کا پڑھا لکھا تھا اور قیدیوں سے زندگی سمجھنے کی کوشش کی کورا کو کبھی پریشانی نہ ہو۔ میں اُس کے لیے اپنی ذات کا ایسا بناؤں کہ کوئی اُس پر نگاہ اُٹھانے کی جرأت نہ کر سکے۔ قلعہ کو تلاش کر رہا تھا مگر ہوا کیا؟

قیاس کیا تھا کہ مولوی صاحب کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ خون کی واردات سرزد ہو گئی ہے۔ اب کورا کی موجودگی میں رابطہ قائم کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس لیے انھوں نے جیل کا وہ کبھی خط کے ذریعے تو مجھے مطلع کر سکتے تھے مگر انھیں کیا معلوم میں نے جیل میں اپنا نام کیا بتایا ہے۔ ممکن ہے انھوں نے نام پر خط لکھا ہو اور جیل کے حکام نے اُسے تلف کر دیا ہو کہ کا کوئی شخص یہاں موجود نہیں ہے۔ بہرحال اب سات سال گزر گئے تھے، درمیان میں وقت کی موٹی دیوار حائل ہو گئی تھی۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ مولوی صاحب کو کیا سانحہ پیش آیا۔ میں نے کسی کو دل میں جگہ نہیں دی تھی۔ شاید اسی مثبت خیال سے میں کاٹ سکتا تھا۔ سوچا تھا کہ مولوی صاحب نے ضرور کورا کو حا بھی تو وہ نہیں آتے۔ انھیں معلوم ہو گا کہ میں جیل سے چھوٹتے آؤں گا۔ وہ کورا کو دلاسا دے کے زندہ رکھے ہوئے ہوں گے۔ کورا لڑکی تھی جس کے لیے بڑے بڑے ایثار کیے جا سکتے ہیں۔ انھی خود میرے سامنے تھی۔ میں نے ابا کی بات نہیں مانی، امی نے کہا تھا کہ میں کورا کو بدھ گیا کے بڑے بھکشو کے پاس چھوڑ آؤں، امی اور ابا سے اتنا پُرانا تعلق ہونے کے باوجود کورا کے لیے انھیں چھوڑ دیا۔ بوڑھے متین نے اُس کی خاطر اپنا قبیلہ چھوڑ مولوی صاحب نے اُس کا چہرہ دیکھا تو اُن میں شفقتوں اُمڈ آئے اور کورا ایسی بد نصیب نکلی کہ اُسے کہیں سکون نہ ملا۔

اب بہت کچھ سوچا جا سکتا تھا۔ کہیں تو مولوی صاحب نشان ہوتا۔ یقیناً اُس رات واقعات اُس طرح پیش نہیں طرح میں نے سوچا تھا۔ غنڈے میری کورا کو حاصل کرنے ہو گئے ہوں گے اور انھوں نے مولوی صاحب کو ختم کر کے

چھپا دی ہو گی یا پھر کورا کا تعاقب کرنے والے لوگوں نے اُسے اور مولوی صاحب کو کسی جگہ دیکھ لیا ہو گا اور مولوی صاحب کا کام تمام کر کے کورا کو اپنے ساتھ واپس لے گئے ہوں گے۔ ممکن ہے مولوی صاحب سے کہیں چوک ہو گئی ہو اور وہ کورا کو چھپانے میں ناکام ہو گئے ہوں۔ مولوی صاحب بھی میری وحشت کی بھینٹ چڑھ گئے۔ پھر لاما، کورا، مولوی صاحب تین کا تسلسل، نہ جانے کتنے لوگ میری وجہ سے متاثر ہوتے۔

کورا کو کوئی بھی لے گیا ہو، اُس کے قبیلے کے لوگ یا غنڈے، ضرور زندہ ہو گی۔ میں اُسے ایک بار صرف دیکھنا چاہتا تھا، صرف ایک بار۔ اس سے زیادہ اب میرا کوئی مطالبہ نہیں تھا۔ اس ایک بار کی دید پر کوئی معاوضے میں میری جان بھی لے لے۔ مجھ سے عمر بھر خرکاری کا کام لے، مجھے ہمیشہ کے لیے جیل میں رکھوا دے، میری آنکھیں نکال لے، میرے ہاتھ کاٹ دے، مجھے بے دست و پا کر کے کوڑے پر پھینک دے۔ مجھ سے کہے تو میں اُس کے قدموں میں مال و زر کے انبار لگا دوں، میں رہزنی کروں گا، ڈاکو بن جاؤں گا، وہ جسے کہے میں اُسے قتل کر دوں گا مگر ایک بار وہ مجھے کورا کی صورت دکھا دے۔

کہیں ایسا تو نہیں، نہیں نہیں۔ میری اُنگلیاں تھرتھرانے لگیں اور سر چکرانے لگا۔ ایسا نہیں ہو سکتا، ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ کئی بار پہلے بھی یہ خیال دل میں آیا تھا۔ میں نے سر جھٹک کے خود پر لعن طعن کی تھی۔ مولوی صاحب کے کردار پر شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا، وہ ایک فرشتہ صفت آدمی تھے۔ جب انھوں نے مجھے سینے سے لگا کر پناہ دی تھی تو اُن کے دل میں کوئی کھوٹ نہیں تھی۔ پھر انھوں نے ہمارے لیے سامان خریدا، کورا کے لیے بہترین لباس خریدا، وہ ہمیں کس ذوق و شوق سے کلکتے کی سیر کراتے رہے۔ وہ ایک مذہبی شخص تھے، ایک دین دار آدمی۔ اُن کی ساری عمر شرافت کے پیشے میں گزری تھی۔ وہ اتنے پست نہیں ہو سکتے مگر وہ میرے اور کورا کے کون سے رشتے دار تھے۔ مجھے یاد آیا جب میں نے گیا اسٹیشن پر اُن کے ڈبے میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی تو انھوں نے نہایت درشت انداز میں مجھے جگہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ محبت کے آدمی نہیں تھے۔ مرادآباد میں بھی اُن کے تعلقات محدود تھے۔ رشتے داروں تک سے رسمی مراسم تھے۔ نہ انھوں نے شادی کی تھی کہ اُن کے دل میں بیوی بچوں کی محبت کا گداز ہوتا۔ اپنی بہن سے بھی وہ عرصے سے نہیں ملے۔ اب کسی کو کیا پتہ۔ میں یہاں بیٹھا ہوں، شکل و صورت سے ایک معصوم شخص نظر آتا ہوں مگر کون جانتا ہے کہ میں نے تین قتل کیے ہیں۔ کون کسی کے دل میں جھانک سکتا ہے۔ چہرے تو سب کے مختلف ہیں۔ دنیا میں ہر آدمی دوسرے سے الگ نظر آتا ہے۔ اندر سے آدمی کریم کل ہوتا ہے، اندر سے عورت اُس کی تقاضا سے بھی برآمد ہوتی ہے۔ مولوی صاحب کو اندر سے دیکھنے کا وقت مجھے کہاں ملا تھا، ریل میں ملاقات ہوئی، ایک رات ساتھ گزاری، پھر دو دن۔ مگر انھوں نے جب ریل میں مجھ سے شفقت کا اظہار کیا تھا، اُس وقت انھوں نے کورا کو کہاں دیکھا تھا۔ کورا تو دوسرے ڈبے میں بیٹھی تھی۔ مولوی صاحب اپنے رویّے پر شرمندہ تھے۔ مجھے کھانا کھلاتے تھے اور خوب محبت کی باتیں کرتے تھے۔ ہاوڑا اسٹیشن پر بھی وہ از راہِ ہمدردی ٹھیر گئے تھے کہ ماموں جان ہمیں لینے آ جائیں تو وہ جائیں۔ اُس وقت کورا برقع میں تھی اور انھوں نے اُس کے چہرے اور عمر کا اندازہ نہیں کیا تھا۔ نہیں نہیں۔ مولوی صاحب پر شبہ کرنا گناہ ہے۔ وہ بچارے تو صرف میری وجہ سے عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ نہ جانے اُن پر کیا گزری ہو گی۔ نہ جانے وہ کس عالم میں ہوں گے۔ پتہ نہیں، زندہ بھی ہوں گے یا نہیں۔

سوچتے سوچتے میرا دماغ پک گیا تھا۔ اب ایک آخری اُمید رہ گئی تھی کہ میں اُن غنڈوں کو تلاش کروں جنھوں نے دریا کے کنارے ہم پر حملہ کیا تھا۔ انھی سے کوئی صحیح بات معلوم ہو سکتی ہے بشرطیکہ وہ زندہ ہوں اور کلکتے میں موجود ہوں۔ غنڈوں کی زندگی کا کیا بھروسا۔ سات سال میں کتنے غنڈے مر گئے ہوں گے۔ میں نے لکھنؤ سے ناکام ہو کے کلکتے کا رُخ کیا۔ لکھنؤ اور کلکتے کے درمیان گیا شہر تھا۔ گیا قریب آنے پر دل میں ہوک سی اُٹھی۔ جی میں آیا بس ایک بار گھر کی طرف سے گزر کے واپس ہو جاؤں گا۔ کوئی مجھے پہچان بھی نہیں سکے گا۔ میرا حلیہ ہی ایسا ہے، سات سال میں تو لوگ شکل بھول گئے ہوں گے۔ بس دروازہ • ایک نظر دیکھوں گا اور چلا آؤں گا۔ شاید کسی کا چہرہ بھی دیکھنے کو مل جائے۔ میں ایک فقیر کی صورت میں جاؤں گا۔ ایک کشکول خرید لوں گا اور دروازے پر کھڑا ہو کے بھیک کی صدا لگاؤں گا۔ کوئی تو دروازے پر آئے گا۔ ممکن ہے امی آ جائیں لیکن اگر کسی نے پہچان لیا تو؟ یہ کیسے ممکن ہے۔ یہ داڑھی، بدلی ہوئی رنگت، میلے پھٹے ہوئے کپڑے۔ کوئی بھی شناخت نہیں کر سکے گا۔

گاڑی جب گیا اسٹیشن پر ٹھیری تو میرا دل دھڑکنے لگا۔ اسٹیشن پر اچھی خاصی تبدیلیاں ہو گئی تھیں۔ میں لرزتے ہوئے قدموں سے پلیٹ فارم پر اُترا۔ سوندھی سوندھی خوشبو آئی۔ آگے جاؤں یا نہ جاؤں؟ گاڑی ابھی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ میں ڈبے کی طرف بڑھا، پھر واپس آ گیا۔ دل و دماغ میں بھونچال آیا ہوا تھا۔ اسٹیشن پر جیسے مسافروں کی چیخ پکار نفسا نفسی تھی، کچھ یہی کیفیت میرے جسم کی تھی۔ اسٹیشن عبور کر کے میں اپنی مانوس سڑک پر آ گیا۔ گھاس کا وہ چھوٹا سا میدان خشک ہو گیا تھا جہاں میں کبھی کبھی صبح سویرے ٹہلنے آتا تھا۔ میرے جانے کے بعد شاید کسی نے اس کی خبر ہی نہیں لی تھی۔ مجھے بہت دُکھ ہوا۔ جگت رام

ہنسے کی حویلی پر بھی کائی جمی ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا عرصے سے سفیدی نہیں ہوئی ہے۔ جب میں یہاں تھا تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ ہر سال دیوالی کے موقع پر سفیدی ہوتی تھی۔ اب تو یہاں ویرانی چھائی ہوتی تھی۔ کچھ عمارتیں نئی بن گئی تھیں۔ بہتر ہوتا کہ یہ لوگ کلکتے کا نقشہ دیکھ لیتے۔ ایسی بھونڈی عمارتیں بناتی تھیں۔ میونسپلٹی کو بھی سڑکوں کا خیال اس زمانے میں کچھ کم رہا تھا۔ بڑی سڑک سے گزر کے میں تانگے والے چوک میں آگیا اور ٹھٹک کے رک گیا۔ آگے بڑھنے کی قوت جسم میں نہیں تھی۔ سانس قابو میں نہیں آرہی تھی۔ کوئی جسم کی چٹکیاں لے رہا تھا اور درد بھر رہا تھا۔ کوئی بجلی کے تار جسم سے مس کر رہا تھا۔ کنپٹیاں سرخ ہوگئی تھیں، چہرہ تمتما رہا تھا۔

میں اپنے محلے میں داخل ہوگیا۔ محلے میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آرہا تھا۔ احسان الٰہی پرچونی کی دکان بھی اسی جگہ قائم تھی جہاں میں اُسے چھوڑ گیا تھا۔ میں اُدھر سے پہلو بچاتا ہوا گزرا۔ گلی میں کھیلتے ہوئے بچوں اور راہ گیروں کی نگاہ مجھ پر پڑی، محلے میں کسی بھی اجنبی کی آمد پر یہی ہوتا ہے۔ میں نگاہ چرایا ہوا گزر گیا۔ کوئی مجھے پہچان نہیں سکا تھا۔ ایک گلی مڑنے کے بعد میرا گھر تھا۔ میں نے اپنی رفتار کسی قدر تیز کر دی۔ دکان دار احسان الٰہی بوڑھا اور موٹا ہوگیا تھا۔ میں اسے دیکھتا ہوا گلی میں مڑ گیا، سامنے میرا گھر تھا، میرا گھر۔ پہلے ہی میری حالت خراب تھی گھر کا دروازہ دیکھ کے سنسناہٹ ہونے لگی۔ یقین نہیں آیا کہ میں ایک مدت بعد اپنے گھر کے سامنے کھڑا ہوں۔ مکان کی دیواروں پر حال میں رنگ و روغن کیا گیا تھا، کھڑکیاں بھی تبدیل کی گئی تھیں۔ گلی میں دیر تک کھڑا رہنا نامناسب بات تھی وہاں سے سرسری گزر گیا۔ دوسری بار پھر گلی میں آیا اور ڈیوڑھی میں جھانکنے لگا۔ ڈیوڑھی کا آدھا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ دوسری بار بھی کوئی نظر نہیں آیا۔ میں چوروں کی طرح اپنی گلی، اپنے گھر کے چکر لگا رہا تھا۔ میں جب چوتھی بار ادھر سے گزر رہا تھا تو ایک خوش پوش لڑکا اندر سے برآمد ہوا۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ کون ہو سکتا ہے یہ؟ یہ تو کوئی اجنبی لڑکا ہے۔ مجبور ہو کے میں نے ایک راہ گیر کو روک لیا۔ وہ جلدی میں تھا لیکن میرے منکسر لہجے نے اُس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں۔ "کیا ہے بھئی؟" وہ اُکتاہٹ سے بولا۔

"بھائی۔ میں بڑی دیر سے زمین دار صفدر زماں صاحب کا گھر دیکھ رہا ہوں۔ کوئی شخص رہبری نہیں کرتا۔ آپ ہی کچھ مدد کیجیے۔"

"صفدر زماں۔ زمیں دار؟" اس کے چہرے پر حیرت چھا گئی۔ "اب وہ یہاں کہاں بھائی، عرصہ ہوا انھیں گئے ہوئے۔"

"اچھا، مگر وہ کہاں گئے؟"

"کچھ پتہ نہیں۔ کوئی کہتا ہے پٹنے میں جا کے بس گئے۔ کوئی کہتا ہے دلی میں آباد ہوگئے۔ کوئی لکھنؤ کہتا ہے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔"

"وہ کب گئے اور اب یہاں اُن کے مکان میں کون رہتا ہے؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔ "معاف کیجیے میں آپ کے کام میں خلل..."

"کوئی بات نہیں بھائی! لوگ اُن کے بارے میں عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں۔ وہ اپنا مکان کوڑیوں کے مول فروخت کر گئے۔ اُن کا ایک جوان لڑکا گم ہوگیا تھا۔ شاید اُس کا اُن پر بہت اثر ہوا۔ ذہنی حالت بھی کچھ خراب سی ہوگئی تھی۔ گھر بیٹھے کھاتے رہے۔ پہلے بچیں، پھر بیوی کا انتقال ہوگیا۔"

"نہیں نہیں۔ کیا۔ کیا امی؟" میں نے چیخ مار کر کہا۔ اگر وہ بڑھ کے سنبھال نہ لیتا تو میں زمین پر بے سدھ پڑا ہوتا۔ میری امی مر گئی تھی۔ وہ کس روانی سے یہ خبر سنا رہا تھا جیسے میں تو پتھر کا آدمی ہوں۔

"ارے ارے کیا ہوا بھائی آپ کو؟" وہ حیرانی سے بولا۔ "اس قدر پریشان کیوں ہوگئے۔ اور یہ آپ انھیں امی کیوں کہہ رہے ہیں؟ آپ کون ہیں؟" وہ سٹ پٹا کے بولا اور نہ جانے کیا کیا کہتا رہا میرے کان بند ہوگئے تھے۔

"کہیں آپ..." میری حالت دیکھ کے وہ اضطراب سے بولا۔ "آپ وہ تو نہیں ہیں؟"

"تم سچ کہہ رہے ہو یا جھوٹ؟" میں نے اس کا جسم جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ "کہہ دو کہ تم جھوٹ کہہ رہے ہو۔"

"بھائی مجھے کیا ضرورت پڑی ہے جھوٹ بولنے کی۔ مجھے [illegible] ہے کہ آپ کو میری بات سے دکھ پہنچا مگر آپ سے ان کا کیا تعلق ہے؟ آپ کون ہیں؟"

"میں ایک بدنصیب ہوں۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں [illegible] "کب۔ یہ کب ہوا؟"

"عرصہ ہوا، اُن کے صاحب زادے کے فرار ہو جانے کے [illegible]"

"اوہ۔ اوہ۔" میں نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ مجھے سننے کے لیے آنا رہ گیا تھا۔ میرے منہ میں کیڑے پڑیں۔ میں کہتا تھا کہ وہ دونوں مر گئے۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ میں اپنی کس محلے میں کھڑا ہوں اور کس شخص سے مخاطب ہوں۔ میرے [illegible] کا شیرازہ منتشر ہوگیا تھا۔

"کیا آپ۔ آپ اُن کے؟" وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔

"میں بھی اُن کا ایک بیٹا تھا۔" میں نے اُس کے سینے لگتے ہوئے کہا۔ "آپ مجھے نہیں جانتے۔"

"آپ بابر تو نہیں ہیں، بابر زماں؟" وہ حیرت سے بولا۔

"نہیں۔ میں وہ نہیں ہوں۔ میں تو کوئی اور ہوں۔ میں اصل بیٹا نہیں تھا۔ وہ مجھے بیٹا سمجھتی تھیں۔ میں تو اُن کے پاؤں کی خاک بھی نہیں تھا۔ وہ مجھ پر احسان کرتی تھیں کہ مجھے اپنا بیٹا سمجھتی تھیں۔ بابر زماں تو کم بخت اُسی دن مر گیا تھا جس دن گھر سے نکلا تھا۔ وہ سالا تو پاگل ہوگیا تھا۔ وہ بہت بُرا لڑکا تھا۔ اپنی ماں کو قتل کر کے گیا۔" میں نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"آپ میرے گھر چلیے۔ آئیے آئیے، وہاں آرام سے بیٹھیے گا۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے بے خبری میں نہ جانے کیا کیا کہہ دیا۔ آئیے میرے بھائی!"

"نہیں۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔" میں نے بپھر کے کہا۔ "ہو سکے تو یہ بتا دو کہ اس گھر کے باقی زندہ لوگ کہاں ہیں؟"

"کچھ نہیں معلوم۔" وہ افسردگی سے بولا۔ "انھوں نے چلتے وقت اپنے عزیزوں کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ شاید ہی کسی کو معلوم ہو۔ یہاں ان کے بہت سے عزیز رہتے ہیں۔ دُور سے تو ہمارا بھی کوئی رشتہ لگتا ہوگا۔ بیٹے کے جانے کے بعد لوگوں نے انھیں بہت کم گھر سے نکلتے دیکھا۔ انھوں نے ملنا جلنا ہی بند کر دیا تھا۔ بہت چڑچڑے ہوگئے تھے۔ کوئی عورت اُن کے گھر ملنے جاتی تو وہ کمرے کا دروازہ بند کر لیتے۔ لوگ کہتے تھے کہ اُن کے دماغ پر بُرا اثر پڑا ہے۔ کچھ کہتے تھے کہ وہ گھر میں بیٹھے کیمیا بنا رہے ہیں۔ بچوں پر باہر نکلنے کی پابندی تھی۔ بیوی کی موت کے کچھ دنوں بعد ایک دن صبح اچانک لوگوں نے دیکھا کہ گھر میں تالا لگا ہوا ہے۔ نئے مکینوں سے پوچھا گیا تو انھوں نے بتایا کہ وہ اُن کے ہاتھ مکان فروخت کر کے گئے ہیں۔ بہت دنوں سے بات چیت چل رہی تھی۔ ایک رات وہ چابیاں دے کے چلے گئے۔ کچھ کہہ کے نہیں گئے کہ کہاں جا رہے ہیں۔ پھر کسی کو اُن کے بارے میں خبر نہیں ہوئی۔" وہ میرے کانوں میں زہر انڈیلتا رہا۔

"کسی کو بھی معلوم نہیں؟" میں نے سسکتے ہوئے پوچھا۔

اُس نے دکھ سے انکار میں سر ہلایا اور مجھے اپنے گھر لے جانے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ اس کا شبہ یقین میں بدل گیا تھا کہ میں ہی اُن کا گم شدہ بیٹا ہوں۔ محلے کے دو ایک آدمی اور ہمارے گرد جمع ہوگئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہاں بھیڑ لگتی، مجھے ہوش آگیا اور میں اپنے مخاطب شخص کا کندھا پکڑ کے اسے ایک طرف لے گیا۔ وہ حیران و پریشان تھا۔ پہلے ہی بہت رسوائی ہو چکی تھی۔ اب وہ یہاں سے منہ کالا کر گئے تھے میں انھیں مزید رسوا کرنے چلا آیا۔ بے خیالی میں نہ جانے کیا کیا منہ سے نکل گیا۔ سامنے میرے گھر کا دروازہ تھا مگر اب اس میں میرے داخلے پر پابندی عائد ہوگئی تھی۔ یہ وہی گلیاں تھیں یہاں میرا بچپن گزرا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر اختیار نہیں رہا۔ رونے کے لیے بھی کوئی ہمدرد سینہ نہیں تھا۔ میں نے پھر اپنے آپ کو چھپانے کی ناکام کوشش کی اور اس شخص کو لے کے دُور آگیا۔ "میں واپس جا رہا ہوں۔ میری درخواست ہے جو کچھ آپ نے دیکھا اور محسوس کیا ہے، اسے بھول جائیے گا۔" میں نے عاجزی سے کہا۔

"مگر آپ نے اپنے بارے میں کچھ بتایا نہیں؟"

ایک جھوٹ چھپانے کے لیے میں نے اس سے بہت سے جھوٹ بولے، وہ مجھے کریدنے لگا۔ وہ میری شکل و صورت سے کچھ خوف زدہ بھی ہوگیا تھا۔ "کچھ مت پوچھو۔" میں نے گرج کے کہا۔ وہ سہم کے رخصت ہوگیا۔ اس کے سوا اس سے پیچھا چھڑانے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ میں جب ایک طرف نکل گیا تو اس نے میرا تعاقب نہیں کیا۔ میں نے اپنے قریب کے عزیزوں کے پاس جانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اب کچھ اور سننے کی تاب نہیں تھی۔ امی بھی چلی گئیں۔ مولوی صاحب اور کورا کی طرح ابا بھی کہیں گم ہوگئے۔ ٹھیک ہے، جائیں سب جائیں، ساری دنیا گم ہو جائے۔

مگر وہ چلے کیوں گئے؟ ایسی بھی کیا بات تھی کہ کسی کو بتایا تک نہیں؟ گھر چھوڑ دیا ہے تو ضرور کوئی اور بات ہے۔ کوئی ایسی بات جس سے وہ شخص بھی واقف نہیں تھا جس نے مجھے یہ سب کچھ بتایا ہے۔ میں تو بہت خاموشی سے چلا آیا تھا۔ ایسا میں نے ابا اور امی کے آرام کے لیے کیا تھا جب تک کورا وہاں موجود رہتی، وہ دونوں پریشان اور خوف زدہ رہتے۔ میں نے تو صرف اتنا کیا تھا کہ چند سو روپے لے کے کہے بغیر گھر سے آگیا تھا۔ اس میں امی کے اتنے ناراض ہو جانے کی کیا بات تھی۔ سنا ہے جنھیں اپنی اولاد کا انتظار ہوتا ہے موت بھی انھیں انتظار کا وقت دیتی ہے، اُن کی سانس رکی رہتی ہے۔ بڑے بڑے مشکل وقتوں میں میں نے اُن کا نام نہیں لیا تھا۔ میں نے تھانے میں اُن کا نام چھپایا، جیل میں کسی کو ہوا نہیں لگنے دی کہ میرا باپ کون ہے اور میں کس شہر سے تعلق رکھتا ہوں۔ ایک ذرا انتظار کر کے دیکھ لیا ہوتا۔ جب میں واپس اسٹیشن جا رہا تھا تو میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے خود کو سمجھایا۔ مجھے رونے کی کیا ضرورت ہے؟ اس گھر سے میرا تعلق تو فرار کے وقت ہی ختم ہوگیا تھا۔ میں تو سیدھا کلکتے واپس جا رہا تھا۔ یہاں اتفاقاً آگیا تھا۔ نہ میرا گھر جانے کا ارادہ تھا۔ نہ کسی سے بات کرنے کا۔ میں تو یوں ہی اِدھر آگیا تھا۔ بس اپنی پرانی گلیاں اور گھر دیکھنے کے لیے، اپنا کالج دیکھنے کے لیے۔

میری جیب میں صرف چند آنے رہ گئے تھے۔ جیب میں وہی ٹکٹ تھا جو میں نے لکھنؤ سے کلکتے کے لیے خریدا تھا۔ خیال تھا کہ ایک گاڑی سے گیا جاؤں گا، دوسری سے کلکتے کی گاڑی میں بیٹھ جاؤں گا لیکن اسٹیشن پر پژمردہ راہوں کو دیکھ کے میرا ارادہ ڈانواں ڈول ہوگیا اور میں ایک تانگے میں بیٹھ گیا۔ یہ میلے کا زمانہ نہیں تھا۔

اس لیے بدھ گیا میں شاکیہ منی کا سکون چھایا ہوا تھا۔ راہبوں کی ٹولیاں ایک مندر سے دوسرے مندر آجا رہی تھیں، اور اس پیڑ کے نیچے بھیڑ لگی ہوئی تھی، جہاں شاکیہ منی نے نروان حاصل کیا تھا۔ میں بھی ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔ میلا ہو رہا ہوتا تو بدھ گیا کے منتظم میرے اس طرح دھرنا دے کے بیٹھنے پر کئی مرتبہ مجھے ٹوکنے آتے۔ اب کسی نے خبر بھی نہیں لی۔ دیر تک میں یوں ہی سکڑا سمٹا بیٹھا رہا۔ شام کو ایک بھکشو ادھر سے گزرتے وقت مجھے دیکھ کے رک گیا اور ملائمت سے کہنے لگا: "شاکیہ منی تم پر سکون کی بارش کرے۔ تمھیں کیا دکھ ہے؟"

"زندگی کا دکھ ہے۔" میں نے سختی سے کہا۔

وہ میرے پاس بیٹھ گیا۔ "تم ٹھیک جگہ آگئے ہو۔ ایسے دکھیاروں کے لیے شاکیہ منی کے پاس بڑی اچھی دوا ہے۔"

"زہر سے اچھی دوا کون سی ہوگی؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"نہیں نہیں۔" وہ خوف زدہ لہجے میں بولا اور میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ "شاکیہ منی کے پاس آکر ایسی بات نہیں کرتے۔"

"میں نے پہلے بھی اس کے پاس آنا چاہا تھا، مجھے کلکتے میں جانگ قبیلے کا ایک بھکشو ملا تھا۔ وہ میرا دوست بن گیا۔ میں دنیا میں تنہا تھا اور دنیا نے مجھے بہت دکھ دیے تھے پھر اس نے مجھے شاکیہ منی کے سکون کی تعلیم دی۔ میں نے جو کچھ میرے پاس تھا، وہ لوگوں میں بانٹ دیا۔ ایک رات وہ غائب ہو گیا۔ پھر واپس نہیں آیا۔ میں اس کا انتظار کرتا رہا جب میرے پاس پیسے نہیں رہے تو سب مجھ سے روٹھ گئے پھر مجھے ایک ناکردہ گناہ کے الزام میں جیل ہو گئی۔ میں سات سال کی سزا کاٹنے کے بعد اس کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔ کیا تم اسے جانتے ہو؟ اس کا نام کیرسا تھا۔"

"کیرسا، ایک بھکشو؟" وہ اداسی سے بولا۔ "ایک بھکشو؟"

"ہاں جانگ قبیلے کا ایک بھکشو۔" میں نے سرد آہ بھر کے کہا۔ "میں شاکیہ منی سے اس کی شکایت کرنے آیا ہوں۔"

"شاکیہ منی ضرور تمھاری شکایت سن رہا ہوگا۔ میں کسی ایسے بھکشو کو نہیں جانتا لیکن یہاں تبت کے چند لوگ آئے ہوتے ہیں۔ میں تمھیں ان سے ملواتا ہوں، آؤ میرے ساتھ۔"

وہ تاسف کا اظہار کرتا ہوا مجھے ایک بھکشو کے پاس لے گیا جو اپنی کٹیا میں ریاضت کر رہا تھا۔ آواز دینے پر وہ باہر آیا اور میرے ساتھی بھکشو کی زبانی میری داستان سن کے حیرت میں پڑ گیا۔ اس نے کیرسا کے متعلق لاعلمی ظاہر کی تو میں نے اس کے متعلق کچھ اور معلومات سے اسے آگاہ کیا۔ میں نے کہا۔ "وہ کہتا تھا کہ وہ اجین نامی ایک شخص کی تلاش میں آیا ہے۔ اجین اس کے قبیلے کی ایک لڑکی کو ہندوستان لے آیا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ میں نے قبیلے کے سردار سے وعدہ کیا ہے کہ میں اس کی بھتیجی ضرور واپس لے آؤں گا۔ وہ تو بہت سی باتیں کرتا تھا۔"

"وہ بھکشو نہیں ہو گا، وہ بھکشو نہیں ہو گا۔ وہ جھوٹا ہو گا۔ کوئی بھکشو جھوٹ نہیں بولتا اور کوئی بھکشو ایسے کام نہیں کرتا۔" وہ تیزی سے بولا۔ "دوست! تمھیں دھوکا ہو گیا۔ تم سچ کہتے ہو، اجین نام ایک شخص جانگ قبیلے سے ایک لڑکی کو ہندوستان لے آیا تھا۔ اجین کو یہاں بدھ گیا میں کسی نے مار دیا، لڑکی کے بارے میں، میں کچھ نہیں جانتا۔"

"تو پھر وہ لڑکی کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہو گا۔" میں نے جوشیلے لہجے میں کہا۔ "اس نے اپنا وعدہ پورا کیا ہو گا۔"

"یہ بہت پرانی بات ہے، میں کچھ نہیں کہہ سکتا مگر مجھے یقین ہے وہ بھکشو نہیں تھا۔"

"کیا میں جانگ قبیلے جا سکتا ہوں؟ میں اسے تلاش کروں، وہ ایسا نہیں تھا، وہ میرے ساتھ کئی دن ٹھیرا تھا۔"

"تم جانگ قبیلے کسی وقت بھی جا سکتے ہو مگر تمھیں وہاں سے کیا ملے گا دوست؟ آؤ ہمارے ساتھ رہو۔ بھکشوؤں کو ان باتوں سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ آؤ، ہم تمھیں شاکیہ منی کے پاس لے جائیں۔"

میں نے تذبذب سے حامی بھر لی اور پہلے بھکشو کے ساتھ اس کی کٹیا میں چلا گیا۔ تمام رات اس نے مجھے صبر و ضبط کی تلقین کی۔ میں اس کی باتیں سنتا رہا۔ اس کے ساتھ میرے ٹھیرنے کا مقصد یہی تھا کہ میں کسی طرح اس بھکشو سے ملاقات کر لوں جو جانگ قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔ یقیناً کوئی ایسا بھکشو یہاں موجود ہو گا، نہیں تو آجائے گا۔ بدھ گیا میں ہزاروں یاتری روزانہ آتے جاتے رہتے ہیں۔

دوسرے دن میرے ساتھی بھکشو سندر نے نہلا دھلا کے مجھے کپڑے پہننے کے لیے دیے۔ میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا، اس لیے کہ میں نے پہلے ہی اس سے کہہ دیا تھا کہ میں شاکیہ منی کے پاس آنے کے لیے اپنا سب کچھ لٹا چکا ہوں۔ میں نے کپڑے پہن لیے۔ گیروے رنگ کا بھکشوؤں کا لباس لیکن اب مالا چھپانے کا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ سندر نے مالا دیکھی تو مجھ سے کہا کہ میں اسے اتار دوں لیکن میں نے بہانہ بنا کے اسے اپنے گلے میں ڈال لیا کہ یہ میری ماں کی یادگار ہے۔ سندر نے سوچا ہو گا کہ چند دنوں بعد خود اسے اتار کے کسی کو دان کر دوں گا۔

میں پانچ چھ روز بھکشوؤں کی ٹولی کے ساتھ مندر میں گھومتا اور بدھ کی تعلیمات سنتا رہا۔ وہ سب میری بہت عزت کرتے تھے۔ تمام راہبوں میں یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ ایک شخص نے شاکیہ منی کی تعلیمات سے متاثر ہو کے ادھر کا رخ کیا ہے۔ مجھے ریاضتوں کے طریقے سمجھانے اور یکسوئی حاصل کرنے کی مشقوں کی تعلیم دی جانے لگی۔ میں بار بار ان سے کیرسا کا ذکر کرتا تھا اور انھیں اپنی داستان سناتا تھا۔ بدھ گیا کا ماحول بہت پراسرار تھا۔ بھکشو کسی جگہ جم کر بیٹھ جاتے تو پتھر بن جاتے تھے۔ پھر انھیں دنیا کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ ابھی تک خاص جانگ قبیلے کا کوئی ایسا بھکشو مجھے نہیں ملا تھا جس سے کورا کے بارے میں کوئی خبر مل سکتی۔ چھٹے روز آدھی رات گزر نے کے بعد میں کٹیا میں لیٹا ہوا تھا کہ ایک شخص نے آواز دی۔ میں اٹھ کے بیٹھ گیا اور میں نے اسے اندر آنے کی اجازت دی۔ راہبوں کے مخصوص لباس میں وہ شخص تیزی سے اندر آیا۔ ادھر ادھر دیکھ کے اس نے یکایک اپنا ہاتھ بلند کیا، جس کے ہاتھ میں چھرا تھا۔ "یہ مالا تمھارے پاس کہاں سے آئی؟" اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔ میں نے پینترا بدلنا چاہا۔ اس نے چھرے کی نوک میرے سینے کے سامنے کر دی۔

اندھیرے میں اس کا چہرہ خوف ناک ہو گیا تھا۔ اس کی راہبوں جیسی معصومیت اور سادگی، سفاکی اور درندگی میں بدل گئی تھی۔ اس کے چھرے کی نوک میرے سامنے تھی۔ وہ اگر چاہتا تو ایک ہی جھٹکے میں میرا کام تمام کر سکتا تھا۔ پہلے پہل تو میں کچھ بھی نہیں سمجھا اور اس کی اچانک آمد اور حملے سے گھبرا اٹھا لیکن پھر میرے ذہن نے تیزی سے کام شروع کر دیا۔ میری مزاحمت میں نرمی آگئی۔ یہ وہی شخص تھا جس کا مجھے انتظار تھا اور جس کے لیے میں نے بدھ گیا کے اس اجنبی ماحول میں بدھ راہبوں کا بھیس اختیار کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ کسی نہ کسی دن یہ ضرور آئے گا، یہ ایک یا اس کے دوسرے ساتھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ میری گردن میں لٹکی ہوئی مالا دیکھ کے بے چین ہو جائیں گے اور تفتیش حال کے لیے ضرور میرے پاس آئیں گے۔ صرف حصول اس شخص کے لیے اتنا اہم نہیں تھا جو خنجر بدست مجھ پر حملہ آور تھا۔ وہ یہ بھی جاننا چاہتا ہو گا کہ میں نے یہ مالا کہاں سے حاصل کی ہے اور جب تک یہ معلومات اسے فراہم کر کے مطمئن نہ کر دیتا۔ اس وقت تک میری زندگی محفوظ تھی۔ میرے بدلے ہوئے رویے اور چہرے پر چھائے ہوئے سکون سے وہ حیران ہو گیا اور جھنجلا سا گیا۔ اس نے میرے گال پر ایک مکا مارا اور دوسرے ہاتھ سے چھرا تان کر میرے اور قریب ہو گیا۔ اب میں حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا۔

"میری بات کا جواب دو۔" اس نے شقاوت سے کہا۔

"چھرا سامنے سے ہٹاؤ اور جو کچھ پوچھنا ہے وہ اطمینان سے پوچھو۔" میں نے کسی قدر بے پروائی سے کہا۔

"نہیں۔" اس نے میری آنکھوں میں اپنی سرخ آنکھیں ڈال دیں اور غصے سے بولا۔ "بتاؤ، تم نے یہ مالا کہاں سے حاصل کی؟"

"اس مالا کے پیچھے ایک طویل داستان ہے لیکن اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اس چھرے کے بل پر مجھ سے کوئی راز اگلوا لو گے تو تم غلطی پر ہو۔" میں نے جرأت سے کہا۔

اس نے چھرے کی نوک میرے سینے میں چبھو دی۔ تکلیف کی شدت سے میری آنکھیں باہر نکلنے لگیں لیکن میں نے زبان سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ "میں اسے تمام کا تمام تمھارے سینے میں اتار دوں گا۔" اس نے کہا۔

اس کے لہجے میں رحم یکسر مفقود تھا۔ میرا اندازہ غلط نکلا۔ مالا دیکھ کر وہ کچھ پاگل سا ہو گیا تھا اور لمحہ بہ لمحہ متشدد ہوتا جا رہا تھا۔ "اتار دو لیکن پھر کبھی کچھ جان نہیں سکو گے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کے مر جاؤ گے، بہت سال ہو گئے۔ اب تو تمھیں کچھ ہوش آجانا چاہیے۔" میں نے اسے متزلزل کرنے کے لیے بے سر و پا باتیں شروع کیں۔ وہ کچھ سوچنے اور مجھے گھورنے لگا۔ اس نے چھرا کچھ پیچھے ہٹا لیا، اور اپنے جسم کی گرفت ڈھیلی کر دی، میرے گھٹنے اس کے دباؤ سے کچھ آزاد ہو گئے۔ میں نے ایک لمبی سانس لی اور آہستہ سے کہا۔ "یہ مالا میری ماں کی نشانی ہے۔"

وہ ایک دم برانگیختہ ہو گیا۔ "جھوٹ، میں تمھیں قتل کر دوں گا۔"

"میرے باپ کے ایک تبتی دوست نے یہ مالا تحفے میں دی تھی۔ شاید اس کا نام اجین تھا۔ اس بات کو سات آٹھ سال گزر گئے۔"

"ہاں ہاں۔" وہ بے تاب ہو گیا۔ "اجین، اجین، اس کا نام یہی تھا۔ آگے بتاؤ کیا ہوا۔" وہ وحشت سے بولا۔

"اس کے ساتھ ایک لڑکی تھی، بہت پیاری سی لڑکی۔" میری آواز پگھلنے لگی۔ "بالکل گڑیا جیسی تھی، اس کے دانت چاندی کے بنے ہوتے تھے اور چہرے پر چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ اس کا جسم قدرت نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا۔" یہ کہتے کہتے میں خاموش ہوا اور کہیں کھو گیا۔

میرے بیان پر وہ بھی مبہوت ہو گیا تھا پھر جھرجھری لے کے بولا۔ "اجین تو مر گیا؟"

"ہاں۔" میں نے دکھ بھری آواز میں جواب دیا۔ "اسے مار دیا گیا۔"

"اور لڑکی کہاں ہے؟" اس نے یہ سوال اتنی تیزی سے کیا کہ زبان ہکلانے لگی۔ میں نے اس کا سخت رویہ دیکھ کے جان بوجھ کر اجین کا نام لیا تھا اور کورا کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔ یہ وقت ادھر ادھر کی باتیں کر کے اسے ٹالنے اور کچھ چھپانے کا نہیں تھا۔ مجھے اس شخص سے کورا کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکتا تھا تاہم دونوں کی حیثیت ایک ہی تھی۔ اس کی تشویش سے ایک بات تو واضح ہو گئی کہ کورا اپنے قبیلے واپس نہیں پہنچی مگر یہ کیا راز ہے کہ لوگ ابھی تک اس کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں؟ اتنی مدت گزرنے کے بعد انھوں نے یہ کیوں نہیں سمجھ لیا کہ کورا کو کوئی غیر معمولی حادثہ پیش آگیا ہو گا۔ اس کا نگراں بوڑھا اجین مر چکا تھا۔ یقیناً کم عمر کورا نے کسی شخص کا سہارا لیا ہو گا۔ اتنے بڑے ہندوستان میں وہ نہ جانے کہاں اور کس عالم میں ہو گی۔ کیا یہ لوگ اس خوف میں مبتلا ہیں کہ کورا کسی بھی وقت قبیلے میں نمودار ہو کے اور اپنا بر منتخب کر کے سرداری کا اعلان کر سکتی ہے؟ وہ مجھ سے کچھ جاننے کے لیے بری طرح مچل

رہا تھا اور میں اُس کی زبانی کچھ سُننے کا شدت سے منتظر تھا۔

"تم چُپ کیوں ہوگئے؟ میں پوچھتا ہوں کہ لڑکی کہاں ہے؟" اُس نے چھرے کا ہاتھ بلند کر کے دوبارہ اُسے میری آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ جیسے شاید میں اپنے اور اُس کے درمیان اس تیز دھار ہتھیار کی موجودگی بھولا جا رہا ہوں۔

"وہ زندہ ہے۔" میں نے پُراُمید لہجے میں کہا۔

"وہ کہاں ہے؟" اُس نے پھر سے تکرار کی۔

"تمھارا اُس سے کیا تعلق ہے؟" میں نے نفرت سے پوچھا۔

"میرا تعلق؟" اُس کے تیور بگڑ گئے مگر وہ جلد ہی سنبھل کے بولا۔ "میں اُسی کے قبیلے کا ایک آدمی ہوں، ہم اُسے مدتوں سے تلاش کر رہے ہیں۔ وہ ہمارے سابق سردار کی بیٹی ہے اور قبیلے کی امانت ہے۔ ہم کسی بھی قیمت پر اسے دوبارہ حاصل کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

"تو تم نے اسے قبیلے سے نکال کیوں دیا تھا؟"

"اُسے بوڑھا اُجین اغوا کر کے لے آیا تھا۔" وہ مجھے جواب دینے پر مجبور تھا کیونکہ میں اُسے یہ تاثر دینے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ میں کورا کے بارے میں کچھ جانتا ہوں۔ اُس کے پاگل پن میں کسی قدر کمی آگئی تھی۔ اس دوران میں کتنی ہی بار میں نے شھل اور اُس کے ساتھیوں کے سکھائے ہوئے داؤ آزمانے کا ارادہ کیا مگر وہ پوری طرح چوکنا تھا اور ہتھیار رکھنے کے آداب جانتا تھا۔ قبیلے کے سردار نے لوگ چھانٹ چھانٹ کر کورا کی تلاش میں دوڑائے ہوں گے۔ اس نے مجھے ایک بھی داؤ آزمانے کا موقع نہیں دیا البتہ وہ اس حقیقت سے آشنا ہو چکا تھا کہ میں نے اپنے سینے اور گردن پر چھرے کا خوف کم ہی محسوس کیا ہے۔

"بوڑھا اُجین اُسے اغوا کر کے نہیں لایا تھا۔" میں نے حقارت سے کہا۔ "تم جھوٹے ہو۔ اُجین نے اپنے سردار سے دوستی کا فرض نبھایا تھا، اُس نے اُس کی بیٹی کو ظالموں کے نرغے سے بچایا، اُسے پناہ دی، ضعیفی اور ناتوانی میں دور دراز کا سفر اختیار کر کے اُسے زندہ رکھنے کے لیے یہاں تک لے آیا اور تم اُس سے زندگی چھیننے کے لیے گلی گلی کوچے کوچے اُس کا تعاقب کرتے رہے۔ تم اُجین کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے مگر کان کھول کے سُن لو کہ کورا تمھارے ہاتھ نہیں آسکتی، جاؤ، اپنے قبیلے واپس چلے جاؤ۔ اپنے سردار سے کہنا سرداری تمھی کو مبارک ہو، کورا واپس نہیں آئے گی۔"

"ارے تم اُس کا نام بھی جانتے ہو؟" وہ ہذیانی انداز میں بولا۔ "بتاؤ، وہ کہاں ہے؟" وہ میرے منہ پر اپنے سخت مکوں سے مسلسل ضربیں لگانے لگا۔ میرا ایک دانت ٹوٹ گیا اور منہ سے خون بہنے لگا۔ پھر اُس نے میرے بال پکڑ لیے اور وحشت ناک طریقے سے سر فرش کے ساتھ پٹخنے لگا۔

شھل کہتا تھا کہ جب ایسی کوئی صورت پیش آجائے اور تم خود کو بے دست و پا محسوس کرنے لگو تو اپنے مخالف کو حد سے زیادہ مشتعل کرنے کی کوشش کرو، اشتعال میں وہ ضرور کوئی غلطی کرے گا بس تم اُسی لمحے کے منتظر رہو۔

اب کورا کا ذکر ہو رہا تھا اور اُس کا دشمن میرے سامنے تھا۔ وہ کورا کو تھا اور میں اُسے تا قیامت زندہ دیکھنے کا آرزومند تھا۔ وہ کورا کا دشمن لہٰذا میرا دشمن تھا۔ یہ وہی لوگ تھے جنھوں نے کورا جیسی پھول لڑکی کا حرام کر دی تھی اور اُسے دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیا تھا دل میں اُس کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی چنانچہ میرے منہ سے خود بخود نکل گئیں جو اُستاد شھل کے فرمودے پر پوری طرح اُترتی تھیں۔ وہ غضب ناک ہو گیا تھا۔ طیش کے عالم میں اُس کا دھڑ بے اختیار میرے اُوپر اُچھلا۔ میں نے فی الفور پوری طاقت سے اپنے گھٹنے اُس کے پیٹ پر مار دیے۔ وہ گیند کی طرح اُوپر اُچھلا۔ میں چمک کر چشم زدن میں ایک ہٹ چکا تھا۔ وہ ایک ثانیے کی مدت میں تڑپ کر سیدھا ہوا کہ میں نے درمیان میں اُسے جالیا اور سینے کے بل دوبارہ زمین کا پابند کر دیا۔ میں اُس کی پُشت پر سوار تھا۔ اُس کا چھرے والا ہاتھ میں آچکا تھا۔ ویسے بھی وہ زمین پر بے بسی سے اوندھے منہ پڑا ہوا تھا اس کے ہاتھ دکھانے سے معذور ہو چکا تھا۔ میں نے اچانک اپنی گرفت اُس نے میری توقع کے مطابق نیچے کی طرف سے میرے جسم پر ایک دیا۔ میں اس جھٹکے کے لیے آمادہ تھا۔ وہ بھول گیا تھا کہ میں نے اپنا اُس کے ہاتھ پر لگا دیا ہے اُس کے جھٹکے سے میں ایک طرف تو جا ہاتھ نہ چھوڑنے سے اُس کی کلائی کھنچ گئی۔ وہ تکلیف سے تلملانے سے میرے ہاتھ میں آگیا تھا۔ میں نے اُس کے سینے پر نشست جما

"تم پوچھ رہے تھے کہ لڑکی کہاں ہے؟ اب تمھیں لڑکی کی کیا ہے؟ وہ کبھی وہاں واپس نہیں جائے گی۔" میں نے تحمل سے کہا۔

"لیکن ہمیں یہ ضرور معلوم ہونا چاہیے کہ وہ گئی کہاں؟" اُس اُس کی آواز بالکل بدل گئی تھی۔ وہ ہانپ رہا تھا، کراہ رہا تھا۔

"کیوں؟" میں نے تلملا کر کہا۔ "آخر کیوں؟ جب تمھارا اُس سے تعلق ہی نہیں رہا اور تم سے کہہ دیا گیا کہ وہ کبھی واپس نہیں آئے گی پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہو؟ تم اُسے اُس کے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟"

"کوئی ایسا نہیں کر سکتا۔" وہ کرب سے بولا۔

"ایسا کیوں نہیں کر سکتا؟ وہ تمھارے لیے مر چکی ہے۔ تم اُسے کس طرح معاف کر سکتے ہو؟" میں نے طنز سے کہا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اُسے تلاش کرنا ہی ہے۔"

"تم اُس کی گرد بھی نہیں پا سکتے، میں تمھارے سینے میں تمھارا چھرا اُتار دوں گا تاکہ تمھارے سردار کو معلوم ہو جائے کہ کورا کو بچانے والے اُس سے زیادہ طاقت ور ہیں۔"

"مجھے مت مارو۔" وہ گڑگڑا کے بولا۔ "میں اُن کا ایک میرے جیسے بہت سے لوگ ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ تم تمام آدمیوں کو ختم نہیں کر سکتے۔ پورے جانگ قبیلے کو ختم نہیں

ں گا تو میری جگہ کوئی دوسرا اُس کی تلاش میں نکل آئے گا۔"

"تم ہندوستان کے کتنے گھروں کتنے تہہ خانوں میں جھانکو گے؟"

"پروہت کہتے ہیں کہ ایک دن وہ ضرور ملے گی۔"

"پروہت جھوٹ بولتے ہیں۔" میں نے نفرت سے کہا۔

"تو کیا، تو کیا وہ مر چکی ہے؟" اُس کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔

میں نے اس بدزبان کے منہ پر طمانچہ رسید کر دیا۔ "وہ زندہ ہے اور ح تک زندہ رہے گی۔"

"تو پھر مجھے اُس کا پتہ بتا دو۔" وہ عاجزی سے بولا۔ "اور میری بات کا کرو، میں اُس سے کچھ نہیں کہوں گا۔ میں اُس سے صرف کاغذات حاصل تبت چلا جاؤں گا اور پھر کبھی واپس نہیں آؤں گا۔"

"کیسے کاغذات؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"وہ متبرک کاغذات جو اُجین کورا کے ہمراہ قبیلے سے لے آیا تھا۔ اُجین اتھ جواہر کا ایک بڑا خزانہ بھی تھا۔ ہمیں اُس خزانے اور کورا سے دلچسپی نہیں ہے۔ ہمیں کاغذات درکار ہیں۔ تم نہیں جانتے۔ وہ کاغذات کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ وہ ردی کے ٹکڑے ہیں مگر ہمارے کے لیے اُن کی حیثیت متبرک ہے۔ آج سے صدیوں پہلے ہمارے نے شاکیہ منی کے فرمودات اُن کاغذات پر لکھے تھے۔ شاکیہ منی اُس ہم لوگوں کے درمیان زمین پر موجود تھے۔ پھر وہ آسمانوں میں چلے گئے نقید ہے کہ جب قبیلے میں وہ کاغذات محفوظ رکھنے کی طاقت نہیں ں یا وہ اپنی کوتاہیوں اور بے پروائیوں کے باعث ان سے محروم ہو گا تو قبیلے پر نحوست کے بادل منڈلانے لگیں گے، قبیلے میں خوں ریزی ہے گی۔ قبیلے کے سردار کے لیے لازم ہے کہ وہ یہ انمول دستاویزات ریل میں رکھے، وہ قبیلے کی جانب سے اُن کا امین ہے، جب ایک سردار زوؤں میں طاقت نہیں رہتی تو اُسے ہونے والے سردار کو کاغذات ر کے اقتدار سے دست کش ہونا پڑتا ہے۔ قبیلے میں صرف بڑے پروہت ار کو اس کا علم ہوتا ہے کہ یہ متبرک دستاویزیں کہاں چھپا کے رکھی یں، اُجین انھیں ہم سے چھین کے لے گیا۔ اس وقت سے اب تک ہمارا نے بہت سے آدمی کھو چکا ہے۔ کئی بار آسمانی آفتیں ہماری زمینوں ل ہوئیں، ہم دانے دانے کو محتاج ہو گئے، ہر نئے سردار کے ساتھ قبیلہ وابستہ کرتا ہے کہ وہ متبرک کاغذات ضرور حاصل کرے گا۔ اُسے دس ماہ ت دی جاتی ہے، جب اس مدت میں وہ ناکام ہو جاتا ہے تو دوسرا سردار کر لیا جاتا ہے۔ اس طرح ہم متعدد سردار بدل چکے ہیں اور قبیلے میں بے یقینی بڑھتی جا رہی ہے۔ اگر ہمیں وہ کاغذات دوبارہ مل جائیں تو امر دنوں سے بلبر نہیں آئیں گے۔"

میں نے درمیان میں دخل نہیں دیا، اُسے بولنے دیا۔ اُس کی آنکھیں بے یقینی اور دکھ کی غمازی کر رہی تھیں۔ اُس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا، زبان

میں لکنت تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُسے یہ انکشاف کرتے ہوئے سخت روحانی اذیت ہو رہی ہو۔ برسوں بعد اُسے ایک شخص ملا تھا جو اُس کے سامنے کورا کا نام لے رہا تھا۔ چھرے کی نوک اور موت کے خوف سے زیادہ اُس کے دل میں یہ اضطراب آمیز تجسس موجود ہوگا کہ میں ضرور اُس کی رہبری کر سکتا ہوں۔ وہ مجھ سے مفاہمت کرنے اور اعتماد میں لینے کے لیے ہر کمزور بات ہر اہم انکشاف کرنے پر مجبور تھا۔ میرے لیے اب اس میں زیادہ کشش نہیں رہ گئی تھی۔ کورا کا نام اُسے پتہ تھا نہ مجھے۔ وہ جن کاغذات کی بات کر رہا تھا، وہ ابا جان کی تحویل میں تھے اور مجھے کوئی علم نہیں تھا کہ انھوں نے انھیں محفوظ بھی رکھا یا نہیں۔ میں ابا جان کے موجودہ پتے سے بھی ناواقف تھا۔ میں اُس سے اور کیا بات کرتا؟ کاغذات کے بدلے کورا کا سودا کرتا تو کورا کہاں تھی۔ اُسے تو میرے مقدر نے مجھ سے چھپا دیا تھا اور کاغذات حوالے کر کے جانگ قبیلے کا سکون واپس کرنے اور کورا کو ایک عذاب ناک تعاقب سے نجات دلانے کی کوشش کرتا تو ابا جان کہاں تھے۔ میری خاموشی پر وہ مجھ سے فریاد کرنے لگا۔ میں جست لگا کے اُس کے سینے سے اُٹھ گیا۔ "جاؤ، مجھے کچھ نہیں معلوم۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "خود میں بھی اُس کی تلاش میں ہوں، وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گئی ہے۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ شاکیہ منی کی قسم، تم سب کچھ جانتے ہو۔" وہ میرے پیروں پر گر گیا۔ "میں دنیا بھر کا خزانہ تمھارے قدموں پر ڈال سکتا ہوں، میرے قبیلے کا یقین مجھے واپس دلا دو۔ اُسے نحوستوں سے بچا لو۔"

میں نے ٹھوکر مار کے اُسے اپنے پیروں سے جُدا کر دیا۔ وہ مجھ سے دولت کی بات کر رہا تھا۔ میرے لیے کورا کے بغیر ہر دولت بے کار تھی۔ میرے لیے کورا ہی سب سے بڑا خزانہ، سب سے بڑی دولت تھی۔ اُس پر دوبارہ وحشت کا دورہ پڑا۔ اُس نے حیرت انگیز پھرتی سے میرے سینے پر اپنا سر مارا، چھرا میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ اُس نے جھپٹ کر اُسے اُٹھا لیا، میں نے پھر مزاحمت ترک کر دی تھی۔ اُس کے سامنے کسی حیل و حجت کے بغیر تن کر کھڑا ہو گیا تھا۔ میری بے حسی پر وہ ہراساں ہو گیا اور اُس کا بلند ہاتھ اُٹھا کا اُٹھا رہ گیا۔ "تم اپنی طاقت ضائع کر رہے ہو، یہ چھرا پھینک دو اور انسانوں کی طرح بات کرو۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"میں تمھیں قتل کر دوں گا۔" اُس نے طیش میں کہا۔

"تم کبھی یہ حماقت نہیں کر سکتے۔"

"تو مجھ پر رحم کرو۔ مجھے کچھ اور نہیں چاہیے، صرف وہ کاغذات میرے حوالے کر دو۔" وہ کبھی نرم پڑتا، کبھی گرم ہو جاتا۔ "نہیں تو۔" اُس نے پھنکار کے کہا اور دفعتاً میری گردن پر ہاتھ ڈال دیا، مالا ٹوٹ کر نیچے گر پڑی۔ اُس کے دانے فرش پر بکھر گئے۔ میرے خون میں رعشہ ہونے لگا۔ وہ میرے چہرے کی جانب متوجہ تھا کہ شاید اب میں اُس کے سامنے کوئی انکشاف کروں گا۔ اُس کی اس بے خبری کے وقت میں نے اُڑنگا مار کے اُسے

بے توازن کر دیا اور جب اُس کا چھرا میرے ہاتھ میں آیا تو نہ جانے مجھے
کیا ہو گیا۔ چھرا سیدھا اُس کے دل میں اُتر گیا۔ ابھی کٹیا میں اُس کی بھیانک
چیخ اُبھری ہی تھی کہ میں نے اُس کا منہ بند کر دیا۔ دوسرے وار میں اُسے
چیخنے کی ہمت بھی نہیں ہوئی۔ کچھ دیر وہ فرش پر تڑپا پھر ٹھنڈا ہو گیا۔ میں
نے جلدی جلدی مالا کے دانے سمیٹے۔ ایک ایک کونے میں چراغ لے
کے انھیں ڈھونڈا کہ کوئی دانہ رہ نہ جائے۔ پھر میں نے خون آلود چھرے
سے اس کے لباس کا ایک حصہ کاٹ کے اس میں دانے احتیاط سے باندھ
دیے۔ ایک کونے میں میرے پرانے کپڑے پڑے تھے۔ راہبوں کا گیروا
لباس اُتار کے میں نے وہی میلے اور شکستہ کپڑے پہن لیے۔ چھرا
وہیں رہنے دیا۔ رات کو وہاں کسی کے آنے کا امکان نہیں تھا۔ میں رات بھر
میں کہیں سے کہیں پہنچ سکتا تھا۔ چار بجے ہوڑا ایکسپریس کلکتے کے لیے
گیا اسٹیشن سے گزرتی تھی۔ میرے پاس گھڑی نہیں تھی لیکن اندازے کے
مطابق ابھی تین چار گھنٹے باقی تھے۔ میں آہستہ سے کٹیا کے باہر آ گیا۔ بدھ گیا
کے مندروں اور مورتیوں پر سکوت طاری تھا، جیسے مورتیاں بھی کھڑے
کھڑے بیٹھے بیٹھے نیند کی آغوش میں پہنچ گئی ہوں۔ ہر چیز اپنی جگہ ٹھہری
ہوئی تھی۔ چند بدھ راہب آلتی پالتی مارے مراقبے میں ڈوبے ہوئے تھے۔
پیپل کے درخت کے نیچے چراغ جل رہا تھا۔ میں نے اپنے پیر زمین سے
چپکا دیے اور بہت آہستہ آہستہ آگے قدم بڑھاتا رہا۔ اگر میں راہب
کے لباس میں ہوتا تو فکر کی کوئی بات نہیں تھی۔ باہر آنے کے بعد میں
نے اپنے حواس مجتمع کیے اور درختوں کی اوٹ میں کبھی بھاگتا، کبھی ٹھہرتا اسٹیشن
جانے والا راستہ کم کرتا رہا۔ پتا بھی کھڑکتا تھا تو دل لرز جاتا تھا۔ خود اپنے
سائے سے ڈر لگتا تھا۔ اُس سائے نے راستے بھر مجھے بہت پریشان کیا جیسے
کوئی میرے پیچھے لپک رہا ہو۔ میں بدحواسی سے پیچھے مڑ کے دیکھتا تو تاحد
نظر تاریکی اور ویرانی کے سوا کچھ نظر نہ آتا۔ ساری رات گہری نیند میں تھی۔

میں گیا اسٹیشن پر گاڑی کا انتظار کرنے کے بجائے قریب ہی
ایک سنسان جگہ بیٹھ گیا۔ ذہن کے پردے پر جیل کی بیرکوں، سنتریوں اور
سلاخوں کا منظر بار بار اُبھر آتا تھا اور میرے جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی۔
میں نے راہبوں کے لباس میں چھپے ہوئے جانگ قبیلے کے اُس بدمعاش
کو معاف کر دینے کا ارادہ کر لیا تھا حالانکہ پہلے میرا ارادہ یہی تھا کہ کورا کا
کم از کم ایک دشمن تو کم ہو جائے گا اور دوسرے لوگوں کو عبرت ہوگی۔ وہ
اگر میری مالا نہ چھیڑتا تو شاید یہ نوبت نہ پہنچتی۔ وہ تو دیوانہ ہو گیا تھا۔ میں
اسے مارتا نہیں تو وہ نہ جانے کہاں کہاں میرا پیچھا کرتا۔ اُس کے تمام ساتھیوں
کی توجہ مجھ پر مبذول ہو جاتی۔ اُسے ختم کرنے کے بعد مجھے کوئی دکھ نہیں
تھا بلکہ کچھ سکون سا محسوس ہونے لگا تھا۔ میں نے اُجین جیسے شریف
شخص کا بدلہ لے لیا تھا۔ اس سے زیادہ وہ مجھے کچھ نہیں بتا سکتا تھا اور میں
اُس کے دل میں ہمیشہ خلش کا سبب بنا رہتا۔ اُس کے لیے میری زندگی
اور میرے لیے اُس کی موت اہم تھی۔ وہ مجھے زندگی دے کے ایک
نہ ختم ہونے والے عذاب سے دوچار کر دیتا۔ اب صبح پولیس آئے
میری گم شدگی کے باعث قتل کا شبہ مجھ پر کیا جائے گا۔ مگر
میں کہاں کا کہاں پہنچ چکا ہوں گا۔

میں نے پہلے ہی ہر طرف سے ناکام ہو کے کلکتے جانے
کر لیا تھا۔ بدھ گیا آ کے یہ بات صاف ہو گئی تھی کہ کورا اپنے قبیلے
نہیں پہنچی۔ کاشی میں گیا رکنے کے بجائے سیدھا کلکتے چلا
پھر نہ اپنا گھر غیروں کے ہاتھ میں دیکھ کے سینے کی جلن میں اضا
نہ اُتی کے بارے میں کچھ معلوم ہوتا، نہ اُس بدمعاش سے واسطہ پڑ
پر چہل پہل ہونے لگی تو میں اپنی کمین گاہ سے نکل کے باہر آیا اور
کا سہارا لیتا ہوا خاص گیٹ سے اندر جانے کے بجائے ایک لمبا
کے اسٹیشن پہنچ گیا۔ گاڑی صرف چند منٹ لیٹ تھی۔ میرے پاس
چھدام بھی نہیں تھا۔ جسم پر راہبوں کا لباس ہوتا تو ٹکٹ چیکر سے
آسانی ہو جاتی۔ گاڑی کے آخری سرے پر تیسرے درجے کے ایک
مجھے بڑی مشکل سے جگہ ملی۔ میں وہیں فرش پر دھرنا دے کے
ہوتے مسافروں نے میرا حلیہ دیکھ کے پہلے منہ بنایا پھر آنکھیں موند لیں
کے دوران میں گیا اسٹیشن پر گاڑی میں جگہ ملنا ایک مسئلہ ہوتا ہے
کم تھی۔ اس لیے زیادہ جھنجھٹ نہیں کرنی پڑی۔ گاڑی نے گیا اسٹیشن
کی تو بھاری تن و توش کے ایک شخص نے جماہی لیتے ہوئے مجھے
اور بولا "ٹکٹ ہے؟" میں نے سوچا کہ میں یہی سوال اُس سے
اُس کا نشتر برداشت کر کے میں نے آہستگی سے اقرار میں گردن
گیا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں چنانچہ وہ مجھے ڈرانے اور
کہ میں اگلے اسٹیشن پر اُتر جاؤں ورنہ وہ مجھے ریلوے پولیس
کر دے گا۔ وہ ریلوے ہی کا کوئی ملازم معلوم ہوتا تھا۔ میری چپ
کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔ وہ مجھے ریلوے کے سخت قوانین سے ڈ
کی کوشش کرنے لگا۔ اُس کی معلومات سے متاثر ہو کے بعض د
اُس کی تائید کرنے لگے۔ گاڑی کی رفتار کے ساتھ بابو کی گفتار
"دیکھو تو کیسا جوان آدمی ہے، ہٹا کٹا ہے، جہاں پاؤں مارے
آئے گا۔ اے بھائی! کچھ دوسری دنیا کا بھی خیال کر۔ کچھ کام کیا کر، یہ
کی عادت پڑ گئی تو چار دن میں مانجھا ڈھیلا ہو جائے گا۔"

دوسرے مسافر اُس کے طرزِ تکلم پر ہنسنے لگے۔ اب تک
تھا اور محض ہوں ہاں کر کے اپنا سر گھٹنوں میں دے لیتا تھا لیکن
رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا اس لیے میرا سارا جسم کھولنے لگا۔
"زبان کو لگام دو۔" میں نے بگڑے ہوئے تیوروں سے کہا۔
تمھاری زبان سے نکلا تو میں تمھیں کھڑکی سے نیچے پھینک دو
ڈبے میں ہر شخص کو سانپ سونگھ گیا جس نے بھی مجھ

ہمت کی، میرے تیور دیکھ کے وہ آنکھیں چرا کے کسمسانے لگا۔ ڈبے میں
کوئی آواز، کوئی جھنکار نہیں اُبھری۔ ایک صاحب نے دبے دبے لفظوں
کی کوشش کی۔ "اگر آپ پہلے بتا دیتے تو بات آگے نہ بڑھتی۔ بہرحال
کچھ
بیٹھیے، غصہ تھوک دیجیے، کہاں جا رہے ہیں آپ؟"

میں نے کوئی جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ انھی صاحب نے مجھے
اپنی نشست پر جگہ دینے کی پیش کش کی۔ یہ پیش کش میں نے مسترد کر دی۔ پھر
ڈبے میں مجھ سے کوئی نہیں بولا۔ وہ آنکھیں بند کرتے، پھر کھولتے اور چونک کے
ایک نظر مجھے دیکھ کے دوبارہ آنکھیں بند کر لیتے۔ میری آنکھیں جاگ رہی تھیں
مل رہی تھیں۔ دنیا میں آدمی کو خاموش نہیں رہنے دیا جاتا۔ آدمی سکون سے
بیٹھا ہو تو لوگ اُسے بے سکون کر دیتے ہیں۔ اس سے ثابت یہ ہوا کہ جب
تک اونچی آواز میں نہ بولو، کسی کو آواز سنائی نہیں دیتی۔ میں اس دنیا کا آدمی ہی نہیں
تھا۔ جیل میں بے ہوشی کے سات سال گزارنے کے بعد شاید میں جیل سے باہر کی دنیا سے
تعلق بہت کچھ بھول سا گیا تھا۔ اس دنیا اور اس دنیا کی زندگی سے رفتہ رفتہ مانوس ہو
رہا تھا۔ اس چھوٹے سے واقعے نے میرے ذہن پر بڑا اثر ڈالا اور یہاں کی زندگی
کے بارے میں میری یادداشت واپس آنے لگی۔

گاڑی کسی اسٹیشن پر ٹھہری۔ میں نے کھڑکی سے جھانک لینا مناسب
سمجھا۔ ٹکٹ چیکر تیز تیز قدموں سے اسی طرف آ رہا تھا۔ میں مقابل کا دروازہ
کھول کے نیچے اُتر گیا اور اندازے کے مطابق درمیان کے ایک ڈبے
میں بیٹھ گیا۔ ٹکٹ چیکر کی نقل و حرکت پر نظر رکھتے ہوئے مختلف اسٹیشنوں
پر میں بار بار ڈبے بدلتا رہا۔ صبح آسنسول کے اسٹیشن پر میری نگاہ نے ایک
اور منظر دیکھا۔ پولیس کا ایک دستہ مختلف ڈبوں کی تلاشی لے رہا تھا۔
مجھے جاڑا سا آ گیا۔ صبح سویرے جاگ جانا بدھ راہبوں کا معمول تھا۔ میری
کٹیا میں میرے بجائے جب انھیں ایک لاش ملی ہوگی تو انھوں نے فوراً
علاقے کے منتظم کو خبر کی ہوگی پھر تار برقی کے سلسلے دوڑ گئے ہوں گے۔ کلکتے
کے راستے میں تمام بڑے اسٹیشنوں پر فون کے ذریعے اطلاع دی جا
سکتی تھی۔ پولیس نے اندازہ لگا کے جگہ جگہ میرا حلیہ نشر کر دیا ہوگا کہ چار بجے
گیا سے گزرنے والی ہوڑا ایکسپریس قاتل کے فرار کے لیے بے حد سود مند
ہوگی۔ میں گاڑی سے اُتر گیا اور انجن سے کچھ آگے آہستہ آہستہ قدم
بڑھانے لگا۔ انھیں ضرور کسی کی تلاش تھی۔ معمول کے خلاف آسنسول اسٹیشن
پر گاڑی زیادہ دیر تک ٹھہری رہی۔ پھر انجن نے سیٹی دی تو میں نے اپنی رفتار
اور سست کر لی۔

یہ جگہ پلیٹ فارم سے خاصی دور تھی۔ یہاں تک آتے آتے گاڑی نے
رفتار پکڑ لی تھی۔ میں پہلے ہی سے تیار کھڑا تھا حالانکہ یہ ایک خطرناک جست تھی
مگر جان پر بنی ہوئی تھی اس لیے میں نے طوفان کی طرح بھاگتے ہوئے ایک
ڈبے کا ڈنڈا پکڑ لیا اور اُس سے لٹک گیا۔ میرا جسم پسینے سے شرابور تھا
اس لیے ڈنڈے پر ہاتھ پھسلنے لگا۔ میں نے اُس پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ میرا
جسم دو ہاتھوں پر لٹکا ہوا تھا اور گاڑی کا تیز شور دل دہلائے دیتا تھا۔ سب سے
نچلے پائدان پر میرا ایک پیر کسی نہ کسی طرح ٹک گیا تھا۔ خوش قسمتی سے
دروازے کے برابر کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ میں نے ڈنڈے سے ایک
ہاتھ ہٹا کے اُسے پکڑ لیا۔ دفعتہً کھڑکی میں ایک نوجوان لڑکی کا چہرہ اُبھرا،
وہ دہشت سے چیخی پھر دوسرے ہی لمحے اُس نے دروازہ کھول دیا اور دروازے
پر اُس کے ساتھ ایک عورت بھی نمودار ہوئی۔ کھڑکی پر ہاتھ ٹکا کے میں خود کو
متوازن کر چکا تھا اور دوسرے پائدان پر پاؤں رکھنے میں کامیاب ہو گیا
تھا۔ اُن دونوں نے ہاتھ بڑھا کے مجھے کھینچ لیا۔ "کیا مرنے کا ارادہ تھا؟" عورت
نے منہ بگاڑ کے کہا۔

"گاڑی روانہ ہو چکی تھی۔" میں نے شرمساری سے کہا۔

"کون ہو تم؟" وہ نخوت سے بولی۔

"میں بھی آپ ہی کی طرح ایک مسافر ہوں۔ مجھے اگلے اسٹیشن تک
یہاں پناہ لینے کی اجازت دے دیجیے۔" میں نے لجاجت سے کہا۔

"یہ فرسٹ کلاس کا ڈبا ہے۔" وہ طمطراق سے بولی۔

"جی میں نے دیکھ لیا ہے۔ میں یہیں دروازے پر بیٹھا رہوں گا۔ آپ
اطمینان سے آرام کیجیے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے آرام میں مخل ہوا۔"
میں نے نظریں جھکا کے ندامت سے کہا۔ "اگلے اسٹیشن پر اُتر جانا۔" وہ تحکمانہ
لہجے میں گویا ہوئی۔

ڈبے میں اُن دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ وہ دونوں جدید فیشن
کے سیاہ برقعوں میں لپٹی ہوئی تھیں، اُن کے نقاب اُٹھے ہوئے تھے۔ کسی
مرد کے بغیر اُن کا تنہا سفر کرنا ایک حیرت انگیز بات تھی لیکن زمانہ بدل گیا تھا۔
کلکتے میں تو اور بدلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ میں دروازے کے قریب فرش پر اپنا
جسم سکیڑ کے بیٹھ گیا۔ جب ذرا سانس قابو میں آئی تو مجھے اُن کے چہرے دیکھنے
اور اُن کے بارے میں کچھ سوچنے کا شعور آیا۔ میری نظریں عورت کے چہرے
پر ٹک گئی تھیں۔ یہ شکل کچھ جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ مجھے اپنی جانب اس طرح
ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے سے عورت بے قرار ہونے لگی۔ اُس نے نفرت سے منہ پھیر کے
کھڑکی سے باہر جھانکنا شروع کر دیا۔ اسے کہاں دیکھا ہے؟ بہت قریب سے
دیکھا ہے مگر کہاں؟ کس جگہ؟ میں مسلسل ذہن پر زور دے رہا تھا لیکن
کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ ہاں اُس کے پہلو میں بیٹھی ہوئی لڑکی کا چہرہ میں پہلی بار
دیکھ رہا تھا۔ اُس کا چہرہ کھلے برقعے میں قمقمے کے مانند چمک رہا تھا۔ اُس کی
سیاہ آنکھوں میں نیلاہٹ کی آمیزش تھی، اُس کے بالوں کی کئی لٹیں پیشانی پر
بکھری ہوئی تھیں اور کھڑکی سے آنے والی تیز ہوا میں اُڑی اُڑی جاتی تھیں۔
اُس کے نقوش تیکھے، رنگ گلابی اور ہونٹ ترشے ہوئے تھے۔ جب اُس کی
نظریں مجھ سے ٹکرا جاتیں تو وہ بہت گھبراتی اور اپنی لمبی اُنگلیاں مروڑنے لگتی
اور پلکیں جھکا لیتی۔ میں بھی کچھ یہی کرتا۔ وہ بار بار کنکھیوں سے دیکھ جاتی۔ پھر چونک کے
ادھر اُدھر دیکھتی۔ اسی عالم میں اُس کی اور میری نظریں چار ہو جاتیں۔ میں نے اُس کی اُداسی

اور سوگواری صاف محسوس کر لی تھی جیسے اسے سفر کی صعوبتوں کی عادت نہ ہو، جیسے وہ تھک گئی ہو، جیسے اُس نے گھر سے پہلی بار قدم نکالا ہو۔

کھڑکیوں سے بوندیں اندر آنے لگیں۔ عورت نے اُکتا کے کھڑکی بند کر لی اور مُنہ پر ہاتھ رکھ کے جماہی لینے لگی۔ اِس بار پھر بے اختیار میری نظریں اُس کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں اور جب میں نے اُسے پہچانا تو پہچانتا چلا گیا۔ مجھے ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ سات سال میں اُس کے چہرے پر صرف معمولی ردّ و بدل ہوا تھا جسے اُس نے غازے کی تہہ میں چھپانے کی کامیاب کوشش کی تھی۔ میری آنکھوں میں سوزش سی ہونے لگی۔ میری ساری رگیں تن گئیں اور خون شریانوں میں اُبلنے لگا۔ وہ کریم گل کی چچی تھی، خود ساختہ یا پیشہ ورانہ چچی۔ کلکتے کے ہوٹل میں اُس نے مجھ پر بڑی نوازشیں کی تھیں۔ کورا پر تو وہ جی جان سے فدا تھی۔ چہرے مُہرے سے وہ اب بھی کوئی بیگم نظر آتی تھی۔ اُس نے کورا کو فروخت کر دینے کا سودا کر لیا تھا۔ میں اُسے کیسے بُھول سکتا تھا؟ اُس نے میری عزت، میری ناموس نیلام پر چڑھا دی تھی۔ میرا جی چاہا کہ اُس کی آنکھیں نکال لوں اور اُس کی زبان کاٹ لوں۔ میں نے اُسے خوب پہچان لیا تھا مگر اُس نے ابھی تک مجھے نہیں پہچانا تھا کیونکہ سات سال میں میری وضع قطع بہت تبدیل ہو گئی تھی۔ اُسے دیکھ دیکھ کے میں خون کے گھونٹ پیتا رہا۔ فرسٹ کلاس میں تنہا سفر کرنا، ساتھ میں ایک نوجوان لڑکی۔ گویا اُس کا کاروبار اچھا چل رہا تھا۔ مجھے وہ لڑکی کورا کی طرح معصوم لگی۔ بے بس، گرفتار۔ میں نے سوچا کہ یہ کسی معزز خاندان کی لڑکی ہو گی جو اِس ذلیل عورت کے پھندے میں نہ جانے کس طرح پھنس گئی۔ اُس کا چہرہ مضطرب تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اسے ڈر لگ رہا ہو گا۔ آگے نہ جانے کیا ہو؟ یہ پشیمان ہو رہی ہو گی۔ گھر واپس جانے کے لیے اس کا دل بے قرار ہو گا مگر پیچھے کا تمام راستہ مٹا ہوا نظر آ رہا ہو گا۔ چند لمحوں میں ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ اُن دونوں کے درمیان عزیزوں جیسا ربط ضبط معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ بے ساختگی کے بجائے ایک جھجک تھی۔ میری عقل خبط ہو گئی۔ گاڑی پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی۔ میں چھرا بھی کُٹیا میں چھوڑ آیا تھا ورنہ اُس کے سینے میں بھونک دیتا۔ میں شعلوں میں گھرا بیٹھا تھا۔

"بیگم صاحب! کچھ کھانے کو ہو گا؟" میں نے اپنی زبان پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے التجا آمیز انداز میں کہا۔

اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں اور ہونٹوں پر مُسکراہٹ اُبھر آئی۔ اِس بار اُس نے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا اور طنطنے سے بولی۔ "بھوکا ہے؟"

"جی۔" میں نے بے تابی سے گردن ہلا کے جواب دیا۔

"کہاں جا رہا ہے؟" اُس نے ٹھسّے سے پوچھا۔

"کلکتے۔ روزگار کی تلاش میں۔"

اُس نے کنڈیا میں سے کچھ بسکٹ اور پوریاں نکال کے میری طرف بڑھا دیں۔ مجھے بہرصورت اُنھیں زہر مار کرنا تھا۔ میں نے بسکٹ اور پوریاں اُس کے ہاتھ سے جھپٹ لیں اور بے تحاشا منہ میں ٹھونسنے لگا۔ چچی کے لبوں پر مُسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔" اطمینان سے کھا۔" اُس نے نرمی سے کہا۔ "کہاں سے آ رہا ہے؟"

"بنارس سے بیگم صاحب!" میں نے تیزی سے جواب دیا۔

"بنارس میں کیا کرتا تھا؟"

"کوئی ایک کام کیا ہو تو بتاؤں، پر قسمت خراب ہے بیگم صاحب! پہلے ایک ہندو سیٹھ کے ہاں نوکر تھا۔ وہ مر گیا تو اپنا کام بگڑ گیا۔ کیا گیا، اپنی قسمت بھی ساتھ لیتا گیا۔"

"کچھ پڑھنا لکھنا آتا ہے؟"

"بس جی اپنا نام لکھ لیتا ہوں۔" میں نے ندامت سے کہا۔

"تیرے ماں باپ کہاں ہیں؟"

"پتہ نہیں کہاں ہیں بیگم صاحب! سب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مجھے تو ہندو سیٹھ کسی میلے سے پکڑ کے لایا تھا۔ بہت خاطر کرتا تھا اپنی۔ اب وہ مزہ کبھی نہیں آئے گا۔ مسلمانوں سے نفرت کرتا تھا لیکن خیال رکھتا تھا۔ جتنے بھی اچھے اچھے پکوان پکتے تھے، وہ مجھے کھلا دیتا تھا۔" میں بولتا رہا مگر میرے ہی لفظ میرے دل پر گھونسے مارتے رہے۔ میں نے اپنے آپ کو بہت سنبھالا، بہت جبر کیا، تب کہیں اپنا لہجہ بدلنے پر قادر ہو سکا۔ اُس نے میری کہانی میں خاصی دل چسپی لی۔ لڑکی بھی گوش بر آواز تھی۔ "نام کیا ہے رے تیرا؟" چچی نے پوچھا۔

"فقیر دین۔" میں نے گھبرا کے کہا۔

"فقیرے!" وہ اونچی آواز میں بولی۔ "کلکتے میں کسی کو جانتا ہے یا یوں ہی مُنہ اُٹھائے چل پڑا ہے؟"

"بس چل پڑا ہوں بیگم صاحب! اللہ میاں کوئی سبب بنائے گا۔ اتنی بڑی جگہ ہے، کہیں نہ کہیں تو سر چھپانے کو جگہ مل جائے گی اور میاں نے منہ چیرا ہے تو کھانے کو بھی دے گا۔ اب دیکھیے نا، دانے دانے پر مہر لگی ہوتی ہے۔ آج آپ کا دانہ قسمت میں لکھا تھا، کھینچ کر یہاں لے آیا۔"

"تُو باتیں تو خوب کرتا ہے پر تُو کلکتے میں کام کیا کرے گا؟ وہ تو بڑی نامُراد جگہ ہے۔ میں کہتی ہوں واپس چلا جا، بنارس ہی میں تلاش کر۔"

"اب چل دیا تو چل دیا بیگم صاحب!" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"تیری مرضی۔ یہ بتا تجھے کون سا کام پسند ہے؟"

"مجھے کسی کام میں عار نہیں ہے۔ بھوکے کو کیا چاہیے، دو روٹی۔" میری زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ جیل سے آنے کے بعد اب تک میں نے اتنی باتیں نہیں کی تھیں اور جیل کی مہمانی میں بھی کہاں کی تھیں! وہ ایک کمین عورت تھی۔ وقت اور مقام دونوں بُرے تھے۔ پولیس چوکنّا ہو گئی تھی۔ بردوان کا اسٹیشن قریب آ رہا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ اس بار پولیس صرف پلیٹ فارم پر موجود ہو، وہ دونوں طرف کھڑی ہو کے اُترنے والے مسافروں پر نظر رکھ سکتی تھی۔ اگر میں چچی سے ایسی باتیں شروع نہ کرتا تو مجھے اگلے اسٹیشن پر اُترنا پڑتا۔ پھر پولیس کی زد سے بچ کے دوبارہ کسی ڈبّے میں چڑھنا پڑتا۔ ایک شخص جس کے پاس سفر کا ٹکٹ بھی نہ ہو، جو پولیس کو مطلوب ہو اور جس کا حلیہ بھی مشکوک ہو اور جس کے لیے فرار کے راستے محدود ہوں، وہ کیسی کیسی بدترین مفاہمت پر نہ اُتر آئے گا۔ چچی سے اسی حال میں ملاقات ہونا سہ گیا تھا۔ میں نے طے کیا تھا کہ کلکتے اُترتے ہی میرا رُخ جیل کی طرف ہو گا۔ وہاں میں کریم گل سے ملوں گا اور اُس سے اُس شیطان کا پتہ پوچھوں گا جو سات سال پہلے سینما میں کریم گل اور چچی سے کورا کا سودا کر رہا تھا۔ اُسی نے ہمارے پیچھے بدمعاش لگائے ہوں گے۔ اب دو ہی امکانات تھے۔ یا تو کورا اُن غنڈوں کے ہاتھ لگ گئی ہو گی جنھوں نے اُس رات ہم پر حملہ کیا تھا یا اُسے مولوی صاحب لے گئے ہوں گے اور آج کریم گل کے بجائے براہِ راست اُس کی چچی سے میری ملاقات ہو گئی تھی۔ اُس کے سامنے کریم گل کی حیثیت تو محض ایک کارندے کی تھی۔ چچی اُس سے کہیں زیادہ مشّاق اور مجنّہ کار عورت تھی۔ خیریت گزری کہ چچی مجھے پہچان نہیں سکی۔ اگر پہچان جاتی تو واقعات مختلف انداز سے پیش آتے۔ ممکن تھا کہ میں اُسے کھڑکی سے پھینک دیتا۔ اندھیری رات میں اونگھتے ہوئے مسافروں کو پتہ بھی نہ چلتا کہ کس گنہ گار کے بوجھ سے گاڑی کا وزن کم ہو گیا ہے۔ دوسرے میں نے چچی کے ساتھ ایک لڑکی کو دیکھ لیا تھا۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر، غصّے کے باوجود ہر طرح لڑکی کا جائزہ لے کے گفتگو کی ابتدا کی۔ میرا یہ یقین بتدریج پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ اس لڑکی کی حیثیت کورا سے مختلف نہیں ہے۔ یہ بھی کہیں سے خواب دکھا کے لائی گئی ہے، کسی بے غیرت نے اسے بیچ دیا ہے یا یہ اپنے حالات سے تنگ آ کے چچی کی خواب آور باتوں پر ایمان لے آئی ہے۔ میں نے کورا کا کرب دیکھا تھا۔ میں نے جیل میں ایک نمبری بدمعاشوں سے بے ضمیری اور انسانیت سوزی کے ہزاروں واقعات سُنے تھے۔ مجھے اُس کی منزل معلوم تھی۔ "سُن بھئی فقیرے!" چچی نے کندھے اُچکا کے کہا۔ "بنارس اور کلکتے میں بہت بڑا فرق ہے۔ بنارس کی دُنیا اور ہے، کلکتے کی اور۔ کلکتے میں تجھے نئی نئی باتیں سُننے کو ملیں گی۔ تیرا دیدہ پھٹ جائے گا۔ اب اگر تُو مجھ سے حامی بھرے کہ تُو میرے اشاروں پر چلے گا، میری مرضی کے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھائے گا تو میں تیرے لیے کچھ سوچ سکتی ہوں۔"

"بیگم صاحب! بیگم صاحب!" میں نے مچل کے کہا۔ "میں آپ کی خدمت کرتا رہوں گا۔ آپ رات کو دن کہیں گی تو میں بھی اُسے دن کہوں گا۔ آپ دن کو رات کہیں گی تو میری پھوٹی زبان پر ایک بھی لفظ شکایت کا نہیں آئے گا۔ بس آپ ہاں کہہ دیجیے۔ کہہ دیجیے نا۔"

"بھئی دیکھ فقیرے!" چچی نے گھبراتے ہوئے کہا۔ "میں تجھے نہیں جانتی۔ تیرا آگا پیچھا مجھے کچھ نہیں معلوم مگر تو انسان کا بچّہ لگتا ہے اس لیے اعتماد کرتی ہوں۔ مجھے تیری جوانی پر ترس آ رہا ہے۔ بنارس میں ہندو بنیے کے ہاں حلوے مانڈے کھانے سے تیرے چہرے پر یہ جو رنگ پھوٹا پڑتا ہے، میں اِس کا ذمہ تو نہیں لیتی، پر تجھے اپنے گھر بھی سب کچھ نصیب ہو گا۔ خدا نے ہر چیز دی ہے لیکن بس ایک بات گرہ میں دھر لے کہ میں کسی چیز پر کوئی اعتراض پسند نہیں کرتی۔ زمانہ بدل گیا ہے۔ ہم لوگ پُرانے چونچلوں اور بناوٹی رکھ رکھاؤ کے قائل نہیں ہیں۔ ہم فیشن بھی کرتے ہیں اور جی بھر کے دُنیا کا مزا بھی لیتے ہیں۔ سمجھا؟ کچھ آیا دماغ میں؟"

"سب کچھ آ گیا۔" میں نے جوش سے کہا۔ "بس جی پھر اپنے تو مزے آ گئے بیگم صاحب! آپ مجھے ہر معاملے میں دو قدم آگے پائیں گی۔ جس کھونٹ کہیں گی، بگٹٹ بھاگوں گا لیکن......" میرا چہرہ لٹک گیا۔

"لیکن کیا فقیرے! کیا تنخواہ کی بات کر رہا ہے؟"

"نہیں بیگم صاحب!" میں نے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "اب تو میں نے خود کو آپ کے قبضے میں دے دیا ہے بیگم صاحب! بس ایک غلطی ہو گئی۔" میں نے اٹک اٹک کے کہا۔

"کیسی غلطی؟" وہ چونک کے بولی۔ "کچھ منہ سے تو پھوٹ۔"

"گیا اسٹیشن پر ایک ہندو سے لڑائی ہو گئی تھی۔" میں نے منمناتے ہوئے کہا۔ "اُس نے میری ماں کو گالی دے دی تھی۔ میں برداشت کر گیا۔ پھر نہ جانے وہ کیا کیا اول فول بکتا رہا۔ میں چپ رہا۔ پھر اُس نے میرے منہ پر تھوک دیا۔ بس مجھے غصّہ آ گیا۔ میں نے اُسے لاتوں اور گھونسوں پر رکھ لیا۔ اُس کا خون بہنے لگا۔ آدمی کوئی بڑا تھا۔ پولیس میں رپورٹ کر دی گئی۔ اب پولیس مجھے اسٹیشن اسٹیشن پکڑنے کی فکر میں ہے۔"

"تو لڑتا جھگڑتا بھی ہے؟" اُس نے ناگواری سے کہا۔

"بس بیگم صاحب! غصّہ آ گیا۔ دماغ خراب ہو گیا تھا۔"

"خیر آدمی کو کبھی کبھی لڑتے جھگڑتے بھی رہنا چاہیے۔"

"اب وہ بردوان اسٹیشن پر پھر میری تلاش میں آئیں گے۔ اسی لیے میں کچھ دیر کے لیے باہر جاؤں گا اور دوبارہ آپ کی خدمت میں یہیں آ جاؤں گا۔"

"آنے دے اُنھیں، تجھے کھا تھوڑی جائیں گے۔"

"ان پولیس والوں کا دین ایمان کچھ نہیں ہوتا بیگم صاحب! میں اُن کے سامنے آنا ہی نہیں چاہتا۔" میں نے مضطرب ہو کے کہا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا رے، بردوان تک اطمینان سے بیٹھا رہ۔" یہ کہہ کے چچی نے مٹّی کے برتن سے مٹھائی کا ایک دونا نکال کے مجھے دیا۔ میں نے بے ڈھنگے پن سے اُسے سلام کیا۔ لڑکی میری داستان اور بے چین باتیں حیرت اور حسرت سے سُن رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ میرے کسی جملے پر مسکرانے کی کوشش کرتی اور پھر اداسی میں ڈوب جاتی۔ "یہ چھوٹی بیگم آپ کی بہن ہیں؟" میں نے چچی سے لڑکی کے متعلق پوچھا۔ بیٹی کا لفظ میں

نے دانستہ استعمال نہیں کیا تھا۔ چچی نے جس طرح ایک بار کورا کی بلائیں لی تھیں اسی طرح اُس کی ٹھوڑی پکڑ کے اُسے پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ چچی کی اس وارفتگی پر لڑکی کا رنگ سرخ ہو گیا اور اُس کی آنکھوں میں شرم کے ڈورے پڑ گئے۔ "یہ میری زندگی ہے، یہ میرا سہارا ہے۔" چچی نے اُسے بازو سے پکڑ کے خود سے قریب کر لیا۔ لڑکی دُہری ہو گئی۔

بردوان اسٹیشن تک میں اُس سے بنارس کی باتیں کرتا رہا پھر جب پلیٹ فارم پر گاڑی سست پڑنے لگی تو چچی نے میری طرف دیکھ کے لیٹرین کی جانب اشارہ کیا۔ اس کے سوا اُس کے ذہن میں مجھے چھپانے کے لیے کوئی ترکیب ہی نہیں آ سکی تھی۔ میں وہاں چلا گیا۔ پھر ڈبّے کے اندر کون آیا؟ کون گیا؟ میں اس تمام روداد سے بے خبر رہا۔ پلیٹ فارم سے اُٹھنے والا شور اتنا تیز تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ پولیس والوں نے کھڑکی سے جھانک کے فرسٹ کلاس میں سفر کرنے والی ان دو برقع پوش معزز خواتین سے ادب کے ساتھ پوچھا ہو گا کہ انھوں نے اپنے ڈبّے میں کوئی شخص تو نہیں دیکھا؟ چچی کے تیور بگڑ گئے ہوں گے اور پولیس والے کوئی جواب دیے بغیر آگے نکل گئے ہوں گے۔ اندر میرا دم گھٹتا رہا۔ ایک ایک لمحہ گراں گزر رہا تھا۔ میں کریم گل کی تو چچی کی مٹھی میں بند تھا۔ میں نے سوچا کہ فرض کرو اُس نے یہ بہروپ مجھے پہچان کر بھرا ہو اور پولیس کے انتظار ہی میں بیٹھی ہو؟ مجھے جھرجھری آ گئی۔

بردوان اسٹیشن سے گاڑی کی روانگی میں خاصی تاخیر ہوئی میرے لیے وقت کاٹنا دوبھر ہو گیا۔ خدا خدا کر کے جب گاڑی نے حرکت کی تو میرے اوسان بحال ہوئے۔ پھر چچی کی دستک پر میں باہر نکلا۔ "آئے تھے وہ؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"آئے تھے اور جیسے آئے تھے، ویسے ہی چلے گئے۔" چچی مسکرائی۔

"کیا کہتے تھے؟" چچی اکیلے میں یقیناً مجھ پر احسان جتانے کے لیے باتیں بنا سکتی تھی مگر لڑکی کی موجودگی میں مبالغے سے کام نہیں لے سکی۔ اُس نے صرف یہ کہا۔ "بس بیٹھ جا آرام سے، کاہے کی فکر کرتا ہے۔ تیرے لیے جھوٹ بولنا پڑا۔"

میں نے احسان مندی کے طور پر اُسے سلام کیا۔ میری سادگی پر وہ کھل کھلا کے ہنس پڑی۔ لڑکی اُس کی ہنسی میں شریک نہیں ہوئی۔ جیسے جیسے کلکتے کا فاصلہ گھٹ رہا تھا، لڑکی کے چہرے پر دھند سی چھاتی جا رہی تھی۔ کسی اسٹیشن پر ٹھیرنے کے لیے گاڑی کی رفتار مضمحل ہونے لگی۔ میں نے دوبارہ چھپنے کے لیے پر تولے۔ "بیٹھا رہ۔" چچی نے حکم دیا اور کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ "کہاں تک تلاش کریں گے۔ بس اب نچلا ہو کے بیٹھ جا۔"

چچی کا اندازہ درست تھا۔ پتہ نہیں وہ کون سا اسٹیشن تھا۔ وہاں پولیس کا کوئی ہرکارہ ڈبّے کی طرف نہیں پھٹکا۔ دو اسٹیشنوں پر مطلوبہ ملزم کی تلاش میں ناکامی کے بعد انھوں نے ہار مان لی ہو گی اور یہ قیاس کیا ہو گا کہ ملزم گیا سے رات کو جانے والی ہوڑا ایکسپریس میں سوار ہو گیا ہو گا۔

وہ آنی ہی تنگ دو کر سکتے تھے۔ ممکن ہے، انھوں نے شبہے میں ج
مسافروں کو پکڑ بھی لیا ہو۔ پولیس خانہ پری کو سب سے زیادہ ا
ہے لیکن ابھی گاڑی ٹھیرے ہوتے چند ہی منٹ گزرے ہوں
ہٹے کٹے آدمی نہایت بے تکلفی سے کھڑکی پر کھڑے ہو گئے۔ مجھے
کہ اُن کے چہروں کا رنگ بدل گیا۔ شکل و صورت سے اُن کے مش
نظر آ رہے تھے۔ میں نے زندگی کا ایک بڑا حصّہ ایسے ہی لوگوں ک
گزارا تھا۔ ایک کچھ لمبا اور دوسرا اوسط قد کا تھا۔ وہ معمولی کپڑے پ
تھے۔ "خیریت تو ہے؟" لمبے قد کے آدمی نے چچی سے پوچھا۔

"ہاں سب ٹھیک ہے۔" چچی نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

اُس آدمی نے میری جانب آنکھ کا اشارہ کیا۔ چچی نے ا
سے اُسے مطمئن کرنا چاہا لیکن وہ چچی کی خاموش زبان سمجھ نہیں سک
آنکھوں میں ایک دم شعلے لپکے اور وہ مجھے گھور کے دیکھنے لگا۔ چچی
کی طرف بازو بڑھا کے اُس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ پہلے تو اُس
لیکن پھر جیسے وہ سب کچھ سمجھ گیا۔ لڑکی نے اُن دونوں کے آنے
منہ پھیر لیا تھا اور چہرے پر نقاب ڈال لی تھی۔ وہ چچی کے یہ اشا
نہیں دیکھ سکی تھی۔ چچی کے ملازموں کے سامنے وہ بے پردہ او
ہونا نہیں چاہتی ہو گی۔ ظاہر ہے چچی نے اُسے یہ بتایا ہو گا کہ اُس
خدّام چل رہے ہیں۔ پہلے مجھے تعجب تھا کہ چچی جیسی جہاں دید
جوان لڑکی کے ساتھ تنہا کیسے سفر کر رہی ہے۔ دونوں خادموں کی آ
میرے لیے خشونت اور حقارت بھری ہوئی تھی۔ چچی نے پان دا
اُن کے لیے گلوریاں بنائیں اور مجھ سے پوچھا۔ "کھاتا ہے؟"
بڑھا دیا۔ مدتوں بعد پان کھانے کو ملا۔ آخری پان بھی سات
اسی نے کھلایا تھا۔ میرے ہونٹ لال ہو گئے۔ چچی نے دیکھ
ہوئے کہا۔ "کم بخت کے لب کیسے رچ گئے ہیں۔" اس تبصرے
پہلو بدل کے میری طرف یاس بھری نظر کی اور خود لال ہو گئی۔ جب
ہزاروں پان کھلا دیے گئے ہوں۔ کلکتے تک آنے والے ہر اسٹیشن
خدّام حاضری لگا جاتے اور مجھ پر نفرت برساتے ہوئے رخصت
میں سارے وقت فرش پر بیٹھا رہا۔ اونگھ بھی نہیں آئی۔ چچی اور ا
درمیان بہت کم باتیں ہوئیں۔ میں نے چچی کی غفلت کا بہت
کہ وہ اِدھر اُدھر ہو تو میں لڑکی سے کچھ بات کروں مگر کسی بھی
آنکھ نہیں لگی اور نہ اُس نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔

ہوڑا اسٹیشن پر گاڑی فاتحانہ انداز میں داخل ہوئی۔ آ
سنبھل کا کوئی آدمی ہوتا تو وہ مجھے پہچان سکتا تھا۔ جب میں یہا
جا رہا تھا تو مجھے سارے مل گیا تھا۔ ان دنوں پتہ نہیں اسٹیشن
میں کس کی ڈیوٹی ہو گی۔ مجھے یہ خوف بھی تھا کہ بردوان اور آسا
طرح پولیس ہوڑا اسٹیشن پر ایک آخری کوشش کر ڈالنے کا

سی خوف کے باعث میں نے سامان چچی کے محافظوں اور قلی کو نہیں
نے دیا بلکہ بڑھ کے بستر بند، سوٹ کیس، کنڈیاں اور تھیلے خود اپنے ہاتھوں
ھوں پر اٹھا لیے۔ کندھوں پر رکھے ہوئے سامان سے میرا چہرہ بڑی حد
چھپ گیا تھا۔ میں چچی کے پیچھے پیچھے اُن کے نقوشِ قدم پر چلتا ہوا
سے بہ حفاظت باہر آنے میں کامیاب ہو گیا۔ خادموں نے جلد سے
یسی کا بندوبست کر دیا۔ ٹیکسی آ گئی تو وہ مجھے ٹیکسی سے اتار کے خود
بیٹھنا چاہتے تھے لیکن چچی نے انھیں دوسری گاڑی میں بیٹھنے کا
دیا کیونکہ اُسے کلکتے میں میرے کھو جانے کا ڈر تھا۔ ٹیکسی روانہ
ور خاصا سفر طے کر کے درمیانے درجے کے ایک چھوٹے سے بنگلے کے
جا کے ٹھیری۔ اُس علاقے میں ہر طرف چھوٹے بڑے بنگلے بنے
تھے۔ ہم بنگلے میں پہنچے۔ میں چچی کی شان و شوکت دیکھ کے دنگ
میں نے سامان کمرے میں رکھ دیا۔ بنگلے میں قیمتی فرنیچر موجود تھا۔ تمام
سجے ہوئے تھے۔ ایک بڑا سا ڈرائنگ روم تھا۔ اُس کی سجاوٹ پر خاص
ی گئی تھی۔ یہاں آ کے لڑکی کچھ اور گھبرا گئی تھی۔ اُس کی نظریں کسی ایک
ٹک رہی تھیں۔ وہاں ایک ادھیڑ عمر بنگالی ملازم تھا اور ایک بوڑھی
تھی۔ چچی کی آمد پر اُن دونوں نے مسکرا کے ایک دوسرے کو دیکھا۔
اُن سے میرا تعارف کرا کے فیصلہ کن اور حکمیہ لہجے میں کہا کہ "یہ لڑکا
رے ساتھ رہے گا۔ اس کے لیے کوٹھری کا بندوبست کر دو۔ یہ ہمارے
ے کام کیا کرے گا۔"

چچی لڑکی کو اپنے ساتھ اندر کے کمروں میں لے گئی۔ میں نے پہلی بار
زبانی لڑکی کا نام سنا۔ اُس کا نام زرّیں تھا۔ دونوں خادم ڈرائنگ
ں آ کے بیٹھ گئے تھے۔ کچھ دیر بعد چچی بھی لباس تبدیل کر کے اُن
ں پہنچ گئی۔ چچی نے اب ایک کسی ہوئی ساڑی پہن لی تھی اور ہلکا
اپ بھی کر لیا تھا۔ اُس کا رنگ بہت اجلا تھا اور اس عمر میں بھی
ایک ڈھلنے والی جاذبیت تھی۔ میں نے سوچا کہ اُس لڑکی کے
اؤں اور اُسے آگاہ کروں کہ وہ کن لوگوں کے درمیان آ پھنسی ہے
بھی اس اقدام کا موقع نہیں آیا تھا۔ پورے سفر میں اُس نے مجھ سے ایک
ت نہیں کی تھی۔ دونوں ملازم چچی سے کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد چلے
پھر چچی زرّیں کو ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ برقع میں تو اُس کے
روپ کا پتہ ہی نہیں چلا تھا۔ اب غرارے جمپر اور دھانی دوپٹے
کچھ اور ہی لڑکی نکل کے آئی تھی۔ میں اُسے دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔
بدن چمپئی اور چاقو سے تراش کر بنایا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ "بھئی اب بولو،
ت چیت کرو۔ تم نے تو چپ شاہ کا روزہ رکھ لیا ہے۔ دیکھو یہ ریڈیو
گراموفون ہے۔ اللہ کا شکر ہے، اس گھر میں ہر قسم کا سامان موجود ہے۔
یا ہوا اٹھاؤ اور برتو۔" چچی نے ناز سے کہا۔ زرّیں بس مسکرا کے رہ گئی
ا۔ "نیا نیا گھر ہے، دل لگتے لگتے لگے گا۔ مجھے تمھاری چپ کھائے

ڈالتی ہے۔ کچھ ہنسو، بولو، ناچو گاؤ۔ ہر بات ذہن سے نکال دو۔" میں وہیں بیٹھا تھا۔ چچی نے مجھے ڈانٹ کے بھگا دیا۔

گھر میں کھانے کا ایک الگ کمرہ تھا۔ اُس کمرے میں ایک بڑی سی میز رکھی ہوئی تھی۔ چچی سچ کہتی تھی کہ اس گھر میں آسائش کی ہر چیز موجود ہے۔ بنگالی ملازم کا نام راجو تھا۔ اُس نے شام تک میرے کپڑے دھو دیے۔ میں جب نہا دھو کے اور لباس تبدیل کر کے چچی کے سامنے خدمت بجا لانے کے لیے پہنچا تو وہ حیران رہ گئی۔ زرّیں نے بھی بہت غور سے مجھے دیکھا۔ پھر رات تک بنگلے میں کئی موٹریں آ آ کے رکیں۔ چچی نے مہمانوں کو پورے احترام سے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور مشروبات سے اُن کی تواضع کی۔ میں ہر وقت وہاں گھسا ہوا نہیں رہ سکتا تھا مگر جیسے بھی بنا، میں ڈرائنگ روم کے اندر باہر کی سُن گُن لینے کی کوشش کرتا رہا۔ کمرے میں ہنسی کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ چچی نے زرّیں کو کسی کے سامنے نہیں بلایا۔ ابھی وہ اُسے نئے ماحول سے مانوس کرنا چاہتی ہو گی۔ پہلے ہی دن اجنبی لوگوں کے ساتھ اُسے بٹھا دینا اُس کے نزدیک مصلحت کے خلاف ہو گا مگر وہ کسی بھی وقت اُس کا سودا کر سکتی تھی۔ اُسے ہر قسم کے گاہک آسانی سے مل جاتے ہوں گے۔ کچھ ایسے ہوں گے جنھیں سدھی ہوئی لڑکیاں پسند ہوں گی اور کچھ ایسے ہوں گے جو خود سدھانے کا فن جانتے ہوں گے۔ کورا کے معاملے میں تو اُس نے عجلت دکھانے کی کوشش کی تھی لیکن زرّیں کورا سے کچھ زیادہ عمر کی تھی۔ اُس کی عمر اٹھارہ اُنیس برس ہو گی اور پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ چچی کے گھر میں تھی اس لیے چچی کو کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ اُس کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرنے کی فکر میں ہو گی۔ اس مدت میں اُس کا تجربہ خاصا وسیع ہو گیا ہو گا۔ اُس نے نہ جانے کہاں کہاں ٹھوکریں کھائی ہوں گی۔ بہرحال مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد زرّیں کی انواع و اقسام کی غذاؤں سے تواضع کی گئی۔ پھر کیرم بورڈ سجا دیا گیا۔ زرّیں کی دل جوئی اور دل بستگی کے لیے ہر طرح ریاضت کی گئی۔ میں بہت چوکنا ہوا تھا لیکن درمیان میں زرّیں کی بات آ گئی۔ ورنہ میں باورچی خانے میں رکھے ہوئے لمبے چاقو کی نوک پر چچی سے اُس بدمعاش کا پتہ کبھی کا پوچھ چکا ہوتا۔ جس سے اُس نے کورا کو فروخت کرنے کا معاملہ طے کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ زرّیں جیسی سادہ اور معصوم لڑکی چچی کی بے باکی، بے حجابی اور گھر کے آزادانہ ماحول سے جلد اکتا جائے گی، بوکھلا جائے گی۔ اگر میں ابھی سے اُس پر چچی کی بے حیائی اور درندگی کا راز فاش کر دیتا تو اُسے یقین نہ آتا بلکہ وہ الٹا میری شکایت کر کے سارا کام بگاڑ سکتی تھی۔ اس لیے پہلے چچی کے بارے میں اُس کا مشکوک ہونا ضروری تھا اور ظاہر ہے کہ میں اُسے بوری میں چھپا کے تو کہیں لے جا نہیں سکتا تھا۔ ایک دفعہ ایسی کوشش کی تھی تو اُس کا خمیازہ آج تک بھگت رہا تھا۔ اُس وقت تو کورا کی مرضی شامل تھی اور وہ ہر طرح مجھ میں شامل تھی۔ پھر بھی راستے میں ہر جگہ کانٹے بو دیے گئے تھے۔ اُس وقت تو میری جیب بھری

ہوئی تھی اور لباس بھی ڈھنگ کا تھا مگر اب تو کچھ بھی نہیں تھا۔ میں زرّیں کی مرضی کے خلاف اُسے ساتھ لے کے گھر سے باہر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتا تھا۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ جس بدمعاش کی مجھے تلاش ہے، وہ چچی کے ہاں ایک نئی لڑکی کی آمد کا ذکر سُن کر خود اس طرف آ جائے۔

سوتے وقت چچی نے مجھے اپنے پیر دبوانے کے لیے طلب کر لیا۔ یہ بات بڑی انوکھی تھی مگر چچی کے ہاں ہر چیز جائز تھی۔ مجھے بڑی جھجک ہوئی۔ پھر بھی قہرِ درویش برجانِ درویش، مجھے حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔ میرا جی چاہا کہ میں اُس کے پیروں کی انگلیوں کے بجائے ناخن کھینچ لوں مگر میں ضبط کیے ہوئے نہایت احتیاط سے اُس کے پیر دباتا رہا۔ زرّیں اُس کے ساتھ ایک پلنگ پر نیم دراز تھی۔ چچی نے مجھے ڈانٹا۔ "کم بخت ہاتھوں میں دم نہیں ہے کیا؟ ذرا زور سے داب، سارے بدن کی جان نکلی ہوئی ہے۔" یہ سُن کے زرّیں نے اِس خدمت کے لیے خود کو پیش کیا۔ "نا نا۔" چچی نے اٹھلا کے کہا۔ "یہ نازک ہاتھ پیر دبانے کے لیے نہیں، چوڑیاں پہننے، مہندی لگانے اور پیار کرنے کے لیے ہیں۔" میں نے زور زور سے اُس کے پیر دبانے شروع کر دیے۔ "ہاں، اب ٹھیک دبا رہا ہے۔" وہ کراہتے ہوئے بولی۔ "ابھی اپنی نوکری پکی مت سمجھو، جب تک میں تجھے اچھی طرح دیکھ اور پرکھ نہ لوں گی، کوئی پکی بات نہیں کروں گی۔"

دوسرے روز میں نے گھر کے کاموں میں زیادہ تن دہی سے حصّہ لینا شروع کر دیا اور ہر چیز چمکا دی۔ کرسیاں، الماریاں اور شیشے کے برتن، اِس طرح میرے کام اور میری زبان سے چچی مطمئن ہونے لگی۔ شام کو چار بجے وہ ٹیکسی منگوا کے اور زرّیں کو ساتھ لے کے گھر سے کہیں جانے لگی۔ میں اُس کے پیچھے پڑ گیا۔ "بیگم صاحب! مجھے بھی ساتھ لے چلیے۔ کلکتہ دیکھ لوں گا، موٹر میں بیٹھوں گا۔" میں نے بچوں کی طرح ضد کی۔ اُسے مجھ پر ترس آ گیا اور اُس نے اپنے ساتھ مجھے بھی گاڑی میں بٹھا لیا۔ ٹیکسی کلکتے کی سڑکوں پر گھومتی رہی۔ چچی زرّیں کو وکٹوریا گارڈن لے گئی۔ وہ پہلے مجھے اور کورا کو بھی اسی جگہ لائی تھی۔ ہم خوب گھومے اور آخر تھکے ہارے گھر واپس ہوتے۔ دوسرے دن زرّیں کچھ کچھ کھلنے لگی۔ میں بیشتر وقت اُس کے قریب گزارنے کی جستجو میں رہا۔ رات کو بھی موٹریں آئیں اور مہمان چچی کے ساتھ کچھ دیر بیٹھ کے چلے گئے۔ پھر رفتہ رفتہ اُن کی تعداد بڑھ گئی۔ تین دن بعد صرف ایک بار چچی اکیلی کہیں باہر گئی۔ میرے لیے یہی وقت مناسب تھا۔ میں زرّیں کے پاس بیٹھا اُس سے مختلف باتیں کرتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی مجھ سے کچھ بات کرے گی، اپنے بارے میں مجھے کچھ بتائے گی لیکن وہ تو صرف سرد آہیں بھرتی رہی۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ اتنا اعتماد تو مجھے ہو گیا کہ زرّیں مجھے ایک بے ضرر، خدمت گزار اور وفا شعار شخص سمجھنے لگی ہے۔ تین دن تک میں نے جی جان سے چچی کی خدمت کی تھی۔ "زرّیں بیگم! آپ سے ایک بات کہنے کو جی چاہتا ہے۔" میں نے آخر جرأت کر ہی لی۔ میرا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ اُس نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔ "آپ ہی کے فائدے کی ایک بات ہے۔" میں نے زور دے کے کہا۔

"کہو۔" وہ آہستگی اور سنجیدگی سے بولی۔

"پہلے ایک وعدہ کیجیے۔" میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کے کہا۔

"کیسا وعدہ؟"

"یہ وعدہ کہ میں جو کچھ کہوں گا اُسے آپ اپنے ہی تک محدود رکھیں گی۔ میرے خلوص پر شبہ مت کیجیے۔ میں آپ سے کچھ کارآمد باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، میں وعدہ کرتی ہوں۔" وہ تجسّس سے بولی۔

"آپ کو اپنی سب سے عزیز چیز کی قسم، میں جو کچھ کہوں اُس کا ذکر کرنے سے پہلے تصدیق کر لیجیے گا کہ میں نے سچ کہا ہے یا نہیں۔"

"تم بات تو بتاؤ۔" وہ اُکتا کے بولی۔

"آپ۔ آپ مجھے کسی معزز اور شریف خاندان کی لڑکی معلوم ہوتی ہیں۔" میں نے ہچکچاہٹ سے کہا۔ "لیکن آپ بُرے لوگوں میں پھنس گئی ہیں۔"

اُس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ "کیا؟" وہ سٹ پٹا کے بولی۔ "کن لوگوں کے بارے میں کہہ رہے ہو؟"

"اُن لوگوں کے بارے میں جو آپ کو یہاں تک لانے پر ..." میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "آپ بہت معصوم ہیں۔ مجھے نہیں معلوم وہ کون تھے کہ آپ کو یہاں تک آنا پڑا۔ آپ بیگم صاحب کو کب سے جانتی ہیں؟" اُسے جواب دینے میں گریز ہوا۔ میں نے کہا۔ "زیادہ دنوں سے نہیں۔ یقیناً یہی ہو گا۔"

"ہاں۔ زیادہ دنوں سے نہیں۔" وہ حواس باختہ ہو گئی۔

"میں جانتا ہوں۔" میں نے تحمل سے کہا۔

"تم کیسے جانتے ہو؟" اُس نے سراسیمگی سے پوچھا۔

"میرے جاننے کی بات بعد میں پوچھیے گا۔ پہلے یہ بتائیے یہاں آنے پر تیار کیسے ہوئیں؟ دیکھیے، آپ کو یہ بتانے میں ... لیکن بہرحال میرا مقصد آپ کے نجی حالات جاننا نہیں ہے ... بروقت ایک خطرے سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ باقی آپ جانیں ... کا کام۔ آپ نے بہت بُرا کیا جو گھر سے چلی آئیں۔ چند ہی دنوں ... کو پتہ چل جائے گا کہ آپ کن مصیبتوں میں گھر گئی ہیں۔ میں کہتا ہوں ... بھی واپس چلی جائیے۔"

"مگر میں کیسے جا سکتی ہوں؟ گھر کے دروازے تو مجھ پر بند ہو گئے ہیں۔" اُس نے کرب سے کہا۔ "میں تو کہیں بھی نہیں جا سکتی۔"

"آپ کے والدین آپ کو پھر گلے لگا لیں گے۔"

"میرے ماں باپ نہیں ہیں۔ میں اپنے باپ کی اکلوتی ... اُن کا انتقال ہو گیا تو خالو مجھے اپنے گھر لے گئے لیکن پھر انھوں نے ... بچوں نے میری زندگی عذاب کر دی۔ پھر ایک دن تمھاری ... صاحب سے میری ملاقات ہو گئی۔ انھوں نے ہمارے پڑوس میں گھر ... رکھا تھا اس لیے اُن کا ہمارے گھر آنا جانا شروع ہو گیا اور جب انھوں نے ... مجھ پر ٹوٹنے والے ظلم و ستم دیکھے تو پریشان ہو گئیں۔ وہ مجھ سے ... ہمدردی کرنے لگیں۔ شاید خالو مجھے اس لیے برداشت نہیں کرتے ... کہ میں اپنے باپ کی تمام جائداد کی تنہا وارث تھی۔ بہرحال میں وہاں ... تکلیف میں تھی۔ اس لیے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے بیگم صاحب کے ساتھ ... آئی۔ انھوں نے مجھے اُس جہنم سے نکالا۔ میرے ساتھ بڑی مہربانی سے ... پیش آئیں۔ اب تم اُن کے بارے میں ایسی باتیں کر رہے ہو؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں، آپ ایک جہنم سے نکل کے دوسرے جہنم میں ... ہیں۔ پہلے والے جہنم میں کم سے کم آپ کی عزت تو محفوظ تھی مگر یہاں ... کوئی چیز محفوظ نہیں ہے۔ میں آپ سے اتنی بات نہ کرتا لیکن میں چونکہ ... اس جہنم سے گزر چکا ہوں۔ اس لیے زبان بند نہ رکھ سکا۔"

"کیا تم بیگم صاحب کو پہلے سے جانتے ہو؟"

"چونکہ آپ اخفائے راز کا وعدہ کر چکی ہیں اس لیے یہ بتا دینے ... کوئی حرج نہیں ہے کہ ہاں، میں انھیں پہلے سے جانتا ہوں اور اچھی طرح ... جانتا ہوں۔"

"لیکن وہ تو تمھیں نہیں جانتیں؟"

"ہونہہ۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "انھیں اگر چہرے یاد رہتے اور انسانوں ... کوئی ہمدردی ہوتی تو وہ مجھے ضرور پہچان لیتیں۔ اب وہ مجھے بھول گئی ہیں۔"

"تم کیا کہہ رہے ہو؟" وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

"آپ نے اس ماحول پر غور نہیں کیا؟ بیگم صاحب نے آپ کی ... آنکھوں پہ غلاف ڈال رکھا ہے۔ آپ ذرا غلاف اٹھا کے دیکھنے کی ... کوشش کیجیے۔ رات کو یہاں جو لوگ آتے ہیں، ذرا اُن کی اور بیگم صاحب کی ... باتیں سننے کی کوشش کیجیے گا۔ پھر مجھ سے بات کیجیے گا۔"

اُس کی زبان گنگ ہو گئی۔ میں نے اُسے بیٹھے بٹھائے خوف زدہ ... سراسیمہ کر دیا تھا۔ "کیا تم..... وہ نہیں ہو.....؟" وہ دل گرفتہ لہجے میں بولی۔ "تم نے ... اِن کی نوکری کی ہے اور تم.....؟"

"ہاں نوکری کی ہے اور سُن لیجیے کہ صرف آپ کی وجہ سے کی ہے۔"

"میری وجہ سے؟"

"جی ہاں آپ کی وجہ سے۔ بیگم صاحب کے ساتھ آپ کو دیکھ کے ... میرے بہت سے دکھ تازہ ہو گئے۔ اب آپ کو کیا کیا بتاؤں.....؟" میں ... نے ایک لمبی سانس لے کے کہا۔

اچانک برآمدے میں کوئی گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ میں فوراً اُس کے پاس سے اُٹھ بیٹھا۔ میں نے چلتے چلتے اُسے تاکید کی کہ اگر وہ اپنے وعدے پر قائم رہی اور اُس نے میری باتوں کی تصدیق کے لیے اپنی آنکھیں کھلی رکھیں اور کان کھڑے رکھے تو امکاناً اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

اس بات پر اُس کا تاثر دیکھنے کا وقت بھی نہیں ملا۔ چچی کی آواز لمحہ بہ لمحہ قریب آ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے بھاگ کر باورچی خانے میں پناہ لی۔ زرّیں تو کورا کی طرح سفید کاغذ تھی۔ وہ میری باتیں بڑی حیرانی سے سُن رہی تھی مگر چچی کا رنگ اتنا ہلکا نہیں ہوتا تھا کہ دھوپ سے اتر جائے۔ ویسے میں اُس کے لیے ایک بالکل نیا آدمی تھا۔ اُس کے نزدیک ابھی میرے مقابلے میں چچی کی حیثیت زیادہ مستند اور محترم تھی۔ چچی بہرحال اُسے ایک خرابے سے بچا کے لائی تھی لیکن اگر میں کسی اور اچھے موقع کا انتظار کرتا تو کس امید پر کرتا۔ چچی کا کیا بھروسا تھا۔ اگر زرّیں نے اُس سے میرے بارے میں کچھ کہہ بھی دیا اور چچی نے مجھے کھڑے کھڑے گھر سے نکال دینے کا حکم دے دیا، تب بھی مجھے اسے بچانے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔

چچی کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ اُس کا چہرہ اُس کے پیشے کی چغلی کھا رہا تھا۔ وہ بھاری بھرکم جسیم اور ڈھلتے ٹھتے کی عورت تھی۔ چچی نے اُسے بڑے کمرے میں بٹھایا اور زرّیں کو ساتھ لے کے اندر آ گئی۔ میں ڈرائنگ روم کے دروازے پر منڈلانے لگا۔ آنے والی عورت کی گونج دار آواز اچانک بلند ہوئی۔ "چشم بد دور۔ یہ ہے وہ؟ ماشاءاللہ، ماشاءاللہ۔ اس بار تو نسترن خانم! تم نے ہم سب کو شکست دے دی۔ بھئی یہ لڑکی تو اب ہماری ہو گئی۔"

"تمھاری ہی ہے۔" چچی فراخ دلی سے بولی۔ اُس کا نام مجھے پہلی بار معلوم ہوا۔ "میں نے کب انکار کیا ہے۔" پھر وہ زرّیں سے مخاطب ہوئی۔ "ارے آداب کر، جب! تمھارے سامنے کون بیٹھا ہے؟ یہ کلکتے کی نامی گرامی بیگم ہیں — مہتاب بیگم۔" میں نے جھانک کر دیکھا۔ زرّیں نے اُسے آداب کہا۔ مہتاب بیگم نے جواباً اُسے سینے سے لگا لیا۔

چچی نسترن خانم نے باورچی کو آواز دی۔ باورچی اس طرف آیا تو مجھے اپنی جگہ سے ہٹنا پڑا اس لیے میں باقی حال دیکھ اور سُن نہیں سکا۔ مہتاب بیگم دیر تک بیٹھی رہی۔ پھر نسترن زرّیں کو اُس کے کمرے میں بھیج کے مہتاب بیگم کو بڑے دروازے تک رخصت کرنے گئی۔ موقع اچھا تھا مگر میں جان بوجھ کر زرّیں کے کمرے میں نہیں گیا۔ پھر نسترن خود بھی کہیں باہر چلی گئی۔ اُس کے جانے کے بعد مہمانوں کا تانتا بندھ گیا۔ ایک آتا تھا، ایک جاتا تھا۔

دوسرے دن صبح تک خیریت رہی۔ زرّیں نے نسترن سے میرے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ میرے ساتھ نسترن کا رویّہ بدستور نرمی اور اپنائیت کا تھا۔ البتہ زرّیں کچھ اداس ہو گئی تھی۔ جب کبھی میرا اور اُس کا سامنا ہوتا، میں اُسے معنی خیز نظروں سے دیکھتا۔ وہ گردن جھکا لیتی۔ اُسی دن شام کی چائے کے وقت نسترن نے ایک بار پھر زرّیں سے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔ "بی بی! یہ تجھے کیا ہوتا جا رہا ہے؟ رنگ اُڑتا جا رہا ہے۔ کیا تجھے کسی چیز کی ضرورت ہے؟ کیا تجھے کسی سے کوئی شکایت ہے؟

با کوئی ملازم تیرا کہنا نہیں مانتا؟ مجھے بتا کہ آخر کیا بات ہے؟ میں تیرے لیے دنیا بھر کی خوشیاں خرید لوں گی۔"

زریں نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ "نہیں، یہاں ہر چیز موجود ہے، مجھے تو کوئی غم نہیں ہے۔"

"اب اپنا وہ محلہ بازار بھول جا بی بی! توبہ توبہ، تیرے ساتھ کیسا بُرا سلوک کرتے تھے وہ لوگ۔ میں جب بھی خیال کرتی ہوں، میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔"

"بھول ہی گئی ہوں۔" زریں نے شکستہ آواز میں کہا۔

"اور یہ تو اندر کیا چھپی بیٹھی رہتی ہے۔ کچھ باہر بھی آیا جایا کر بیگی! اس مکان میں صرف ایک کمرہ تھوڑی ہے۔"

"جی۔" زریں اُس سے نظریں نہیں ملا رہی تھی۔

"تو یہاں کھڑا کھڑا منہ کیوں تکتا رہتا ہے؟" اچانک نسترن میری طرف متوجہ ہو گئی۔ "کچھ بی بی کا بھی خیال رکھا کر، اس کی خدمت کیا کر۔"

"میں تو بہت کہتا ہوں بیگم صاحب!" میں نے فدویانہ انداز میں کہا۔ "مگر زری بی کو تو کمرے میں بند پڑے رہنے کی عادت ہے۔"

"نہیں، نہیں بس بہت ختم ہو چکا۔" نسترن نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "آج سے کمرہ بند۔ شام کو میرے دو منہ بولے بھائی آ رہے ہیں، اُن کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں، اُن سے کوئی پردہ نہیں ہے۔ آج شام اُن کے ساتھ بائیسکوپ چلیں گے۔ زریں! تم اپنے سب سے اچھے کپڑے پہن لینا۔ سمجھیں، میں کیا کہہ رہی ہوں؟"

"جی۔" زریں نے سر کو خفیف سی جنبش دی۔ "میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ آج آپ ہو آئیے۔ مجھے مَردوں کے ساتھ جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔" زریں نے جرأت کر کے کہا۔

"کون مرد؟" نسترن کچھ تلخی سے بولی۔ "بی بی! وہ اپنے بھائی ہیں، چاہے سگے نہ ہوں مگر کیا عزیزوں سے کم ہیں۔"

"پھر بھی میرے لیے تو اجنبی ہیں۔" زریں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"اجنبیت تو ختم کرنے سے ختم ہو گی۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا میری لاڈلی کہ یہ کلکتہ ہے، فیض آباد نہیں ہے، لکھنؤ نہیں ہے۔ یہاں تم وہاں کی باتیں کرنے لگیں تو بس کام ہو گیا۔ اری ننھی بی! میری جان! جب میں تمھاری عمر کی تھی، اُس وقت میرا بھی یہی حال تھا۔ اب عمر گزرنے کے بعد پتہ چلا کہ سارا وقت کتنے ڈھکوسلوں، کتنے ڈھونگوں میں گزر گیا۔"

زریں کا یہ بدلا ہوا انداز نسترن کے لیے تازیانہ ثابت ہوا۔ اُس نے اتنی باتیں کیں، ایسی نرمی، گرمی، تلخی اور شفقت سے باتیں کیں کہ زریں کے پاس خاموش رہنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہ رہا۔ پھر اُس دن نسترن غیر متوقع طور پر کہیں باہر گئی۔ میں اسی موقع کی تاک میں تھا۔ اس لیے جھٹ زریں کے کمرے میں پہنچا۔ وہ سسک سسک کے رو رہی تھی۔ "رونے سے کچھ نہیں ہوگا زریں!" میں نے یہ پروا نہیں کی کہ میں اُسے میں مخاطب کر رہا ہوں۔ "اب تم نے زیادہ نہ سہی، کچھ نہ کچھ اندازہ لیا ہوگا۔ میں اِس وقت صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ تم اُن مَردوں کے سا جانا جنھیں بیگم صاحب نے اپنے منہ بولے بھائی بتایا ہے۔ تاکہ تمھیں میرے انکشاف پر مکمل یقین ہو جائے۔ گھبرانے کی نہیں ہے۔ میں یہیں موجود ہوں اور ہاں یقیناً تم مجھ پر بھی شبہ کیونکہ میری عمر، میرا حلیہ اور میرے کپڑے میری باتوں کی نفی کرتے یقین کرو، تم جس طرح خود پر اعتبار کر سکتی ہو، اُسی طرح مجھ اور باقی معاملہ اپنے خدا پر چھوڑ دینا۔ سمجھیں تم نے۔ بیگم صاحب کے مجھ پر اور خود پر احسان کیا ہے، میں کوشش کروں گا کہ تمھارے پورا اُتروں۔ اب تمھیں کیا بتاؤں کہ میں وہ نہیں ہوں جو نظر آتا بس اپنا خیال رکھو، میں یہی کہنے آیا تھا۔" میری آواز بھرّانے لگی تھی

زریں نے لرزتی ہوئی پلکیں اُٹھا کے مجھے دیکھا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کے رونے لگی۔ "رونا بالکل بند۔" میں نے اُس ہو کے کہا۔ "رونے سے کام اور بگڑ جائے گا۔ تمھیں تو یہ تاثر دینا چاہیے اس ماحول میں بہت تازگی محسوس کر رہی ہو۔"

"میں اُن مَردوں کے سامنے نہیں جاؤں گی۔" وہ رِقت سے

"آج کے بعد مت جانا۔" میں چاہتا ہوں کہ تم سب کچھ اپنی دیکھ لو۔ میں قریب ہی کہیں موجود رہوں گا۔ اب میں چلتا ہوں۔ بیگم نے سارے نوکروں کو چوکنا رکھا ہوگا۔ اپنے رویّے سے کسی قسم کا اظہار میں اُس کے کمرے سے نکل آیا۔

نسترن خانم کا کوئی بھی وفادار ملازم اُسے میرے بارے کر سکتا تھا۔ ویسے ابھی تک تو بات ٹھیک چل رہی تھی۔ چائے نسترن کا اچانک گھر سے باہر جانا کسی خطرے کی علامت ضرور کا زندگی میں بے شمار لڑکیوں سے واسطہ پڑ چکا تھا۔ وہ لڑکیوں مزاجوں سے خوب آشنا ہو گئی ہوگی۔ آج اُس نے زریں کے ترشی محسوس کر لی ہوگی۔ نسترن کوئی ایک گھنٹے بعد واپس آ گئی جھنجھلائی ہوئی تھی۔ آج اُس نے مجھ پر بھی ملامت کی وہ نظر اب تک ڈالتی رہی تھی۔ پھر جب اندھیرا ذرا گہرا ہوا تو گیٹ ہوئے بوڑھے جاٹ ملازم نے اُسے اُس کے دونوں بھائیوں کی اطلاع دی۔ وہ اُن کے استقبال کے لیے دوڑتی ہوئی دروازے پہنچی۔ ڈرائنگ روم کی تمام بتیاں روشن کر دی گئیں۔ باورچی حکم دے دیا گیا تھا کہ وہ کچھ شیرینی کا انتظام کر لے۔ میں بھی اُس کی خاطر باورچی خانے میں مصروف تھا مگر ڈرائنگ روم میں تڑپ رہا تھا۔ وہاں کچھ دیر بعد ہی جانا مناسب تھا۔ باورچی کر لی تو اُس کے بجائے میں خود چائے کی ٹرے لے کے ڈرائنگ

کر پہنچ گیا۔ نسترن سامنے بیٹھی تھی۔ اُس کے دونوں بھائیوں کی پشتیں میری جانب تھیں۔ نسترن کی رازدارانہ نگاہ پر اُن کی آوازیں ایک دم ماند ہو گئیں۔ دونوں نے پلٹ کے مجھے دیکھا۔ ٹرے میرے ہاتھ سے گرتے گرتے رہ گئی پیالیوں میں ایک چھینٹا کا ہوا۔ نسترن ہنس کر بولی۔ "نیا نیا ہے، ہر وقت گڑبڑ کرتا رہتا ہے۔"

میرے ہاتھ لرزنے لگے تھے۔ میں پورے سات سال کے بعد اُس شخص کو دوبارہ دیکھ رہا تھا۔ یہ وہی بدمعاش تھا جس نے ایک رات سینما میں نسترن سے کورا کی فروخت کے سلسلے میں بھاؤ تاؤ کیا تھا۔ کریم گل نے ہوٹل میں قسمیں کھا کھا کے کہا تھا کہ اُس کے غنڈوں نے ہمارے ہوٹل سے رہنے کے بعد صرف اُس وقت تک ہمارا تعاقب کیا تھا جب تک ٹیکسی نظر آتی رہی۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ اُسے کوئی خبر نہیں تھی۔ مل کے ساتھیوں نے صحیح بات اگلوانے کے لیے کریم گل کی چمڑی اُدھیڑ دی تھی مگر اس کے سوا کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ یہ کام کریم گل کا نہیں، کسی اور کا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ کام اُس شخص کے سوا کسی کا نہیں ہو سکتا، جو اس وقت یہاں موجود ہے۔ اُس رات سینما میں اس نے اور اُس کے ساتھ والی عورت سچی بی نے جن ہوس ناک نظروں سے کورا کی پذیرائی کی تھی، وہ میں زندگی بھر فراموش نہیں کر سکتا۔ اُن کے تیوروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کورا کو نسترن سے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اُسے میرے اور کورا کے ٹھکانے کا پتہ چل گیا ہو یا اُس نے اور کورا کو مولوی صاحب کے ساتھ کہیں بازار وغیرہ میں دیکھ کے تعاقب کیا ہو۔ میں اندر سے ہُمک رہا تھا۔ اس لیے مجھے میز تک پہنچنے میں بڑی دشواری ہوئی۔ میرے پیر من من بھر کے ہو گئے تھے۔ دل کی رفتار اچانک بند سی ہو کے تیز ہو گئی تھی۔ پھر بھی میں نے خود کو سرزنش کی اور قابو میں رہتے ہوئے اُن دونوں کو سلام کیا۔ وہ میری جھجک پر ہنسنے لگے۔ دونوں تنو مند تھے۔ میرے مطلوب شخص کا رنگ روپ خاصا بدل گیا تھا۔ سر کے بال اور اُڑ گئے تھے۔ ہاتھ میں کڑا ابھی نہیں تھا۔ وہ لباس معقول پہنے ہوئے تھا۔ کیوں نہ پہنتا، ایسے نامعقول لوگوں کو معقول لباسوں کی کیا کمی؟ اُس کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں اُس کے ہونٹوں پر تلوار کی مانند کھنچی ہوئی تھیں۔ اُس کی آنکھوں میں بہت تیز چمک تھی۔ دوسرا شخص سفید شیروانی میں ملبوس تھا اور ناک نقشے کے اعتبار سے چوڑے چکلے ڈیل ڈول کا تھا۔ اُس کے چہرے کا رنگ سرمئی تھا۔ انگریزی بال نفیس تراش سے آراستہ کیے گئے تھے۔ وہ اگر خود کوئی نواب نہیں تو کسی نواب کا مصاحب ضرور معلوم ہوتا تھا۔ نسترن کو اپنے گاہکوں کی قسموں کا خوب اندازہ ہوگا کہ کون سی لڑکی کے لیے کس قسم کے گاہک سے رابطہ قائم کرنا چاہیے۔

"خانم: ہماری بے چینی کب دور ہوگی؟" نواب زادے نے کہا۔

"گھبرائیے نہیں مرزا صاحب!" خانم کے بجائے وہ بدمعاش بولا۔ "پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ۔ ہمیں یقین ہے، چاند میاں کہ تم اس بار بھی ہمیں تباہ کرواؤ گے۔" نواب ہنس کر بولا۔

کم سے کم مجھے اُس بدمعاش کا نام معلوم ہو گیا تھا۔ میں وہاں زیادہ دیر ٹھہرنے کی غرض سے خود چائے بنانے لگا۔ نواب نے بے جا مداخلت کی۔ "بھئی خانم! ہم تو آپ کے ہاتھ کی چائے پئیں گے۔"

"ذرا دیکھیے تو سہی۔" خانم نے ایک ادا سے کہا۔ "فقیر اکیسی عمدہ چائے بناتا ہے۔ میں اندر جا رہی ہوں۔ ذرا سنبھل کے بیٹھیے اور سینے پر بائیں جانب ہاتھ رکھ لیجیے۔"

"سہے ہے۔" نواب اپنے زانو پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "خانم! آپ بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ آپ کا ہم سے بڑا قدر دان کون ہوگا۔"

"چلیے، جانے بھی دیجیے۔ اب بہار چلی گئی ہے تو آپ کے چونچلے شروع ہو گئے۔" خانم نے اُٹھتے ہوئے کہا مگر کچھ سوچ کے پھر بیٹھ گئی۔ اُس نے مجھے حکم دیا۔ "جا ذرا بانو سے جا کے کہہ کہ اندر کیا چھپی بیٹھی ہیں، باہر آئیں، میرے محسن بھائی آئے ہیں۔" خانم نے میرے ہاتھ سے پیالی چھین لی۔

میں دروازے سے باہر جا کے آگے بڑھنے کے بجائے وہیں ٹھہر رہا۔ اندر چاند میاں کہہ رہا تھا۔ "خانم! چھوکریوں کے انتخاب میں تو دور دور تک تمھارا کوئی ثانی نہیں، یہ چھوکری پر تمھاری نظر کب سے پڑنے لگی ہے؟ چھانٹ کے لائی ہو۔ خیال رکھنا، اس کے چہرے سے یہ جھاڑ جھنکار مت ہٹوانا ورنہ سمجھ لو، چھوکریاں باہر جانے سے انکار کر دیں گی۔"

"چلو ہٹو، کچھ مرزا صاحب کا بھی خیال کرو۔" خانم کی آواز آئی۔ "تمھاری یہ عادت کبھی نہیں جاتے گی۔ موقع بے موقع زبانی خرچ کرتے رہتے ہو۔ بس اب وہ آنے ہی والی ہے۔ ذرا احتیاط سے بیٹھو اور خبردار، اُس کے سامنے کوئی اول فول بات مت کرنا۔"

میں نے زریں کے کمرے میں جا کر اُسے خانم کا حکم سنایا۔ زریں نہایت بہترین لباس پہنے ہوئے تھی۔ شاید نسترن نے اُس کی آرائش و زیبائش میں خاص طور پر دلچسپی لی تھی۔ وہ ایک دلہن کی طرح سجی ہوئی تھی۔ وہی غرارہ تھا اور تنگ جمپر۔ سر پر دوپٹا تھا۔ دو چوٹیوں میں سے ایک آگے کی طرف پڑی ہوئی تھی۔ میں مبہوت رہ گیا۔ "میں نہیں جاؤں گی۔" اُس نے منہ پھیر کر کہا۔

"چلی جاؤ زریں، چلی جاؤ۔ میری مانو، اس وقت یہی مناسب ہے۔ میں تمھیں کوئی غلط مشورہ نہیں دوں گا۔ کبھی کبھی آدمی کو حالات سے سمجھوتا کرنا ہی پڑتا ہے۔ یہ سمجھ لینا کہ ایک بُرا خواب دیکھا تھا جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا۔" میں نے اُسے سمجھایا۔

"ایک طرف تو تم منع کرتے ہو، دوسری طرف مجھے وہاں بھیجنے کے لیے بھی مُصر ہو؟" وہ اضطراب سے بولی۔ "میرا جی وہاں جانے کو نہیں چاہتا۔"

"جی تو میرا بھی نہیں چاہتا مگر مجبوری ہے زریں!" میں نے نرمی سے کہا۔

"پہلے یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟" اُس نے ایک غیر متعلق سوال کیا۔
"میں کوئی بھی ہوں لیکن ہوں تمہارا غم خوار۔ خدارا اِس وقت میرے بارے میں مت سوچو۔ تمھیں پہنچنے میں دیر ہو گی تو بیگم صاحب خود اندر آجائیں گی۔"

وہ بہت مشکل سے آمادہ ہوتی۔ میں اُسے ساتھ لے کے چلا۔ اُس کا لباس خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔ دروازے پر آہٹ سُن کے نسترن لپکی اور اُسے شانوں سے پکڑ کے اس طرح آگے لے چلی جیسے دلھنیں لے جائی جاتی ہیں۔ نواب مرزا اور چاند میاں کے دیدے پھٹ گئے۔ وہ چند لمحوں کے لیے ساکت سے ہو گئے۔ چاند میاں کی پتلیاں اُس کی آنکھوں میں پارے کی طرح حرکت کرنے لگیں۔ اُس نے مرزا کا ہاتھ پکڑ کے کوئی سرگوشی کی۔ تب کہیں مرزا ہوش میں آیا۔

"میں نے ان دونوں سے تمہارا غائبانہ تعارف کرا دیا ہے۔" نسترن نے چہک کے زرّیں سے کہا۔ "انھیں تسلیمات کرو۔"

"آداب!" زرّیں کا سیدھا ہاتھ اُٹھتے ہوئے کپکپا گیا۔

"تسلیمات، تسلیمات۔" مرزا کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ "ہم نے جب سے آپ کا تذکرہ سنا ہے، آپ کو دیکھنے کے لیے طبیعت بے قرار تھی۔ ماشاء اللہ، ماشاء اللہ گویا خانم نے آپ کی تعریف میں بخل سے کام لیا تھا۔"

زرّیں نے کوئی تاثر ظاہر نہیں کیا۔ نسترن اشتیاق سے اُن دونوں کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھی۔ اُن کے چہروں پر تو بس حیرت چھائی ہوئی تھی۔ زرّیں کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ اُس نے شاید اُن دونوں کے چہرے تک نہیں دیکھے ہوں گے۔ "خانم باجی! آپ نے شاید انھیں بتایا نہیں کہ آپ سے ہمارا کیا رشتہ ہے؟" چاند میاں نے زبان کھولی۔ "یہ تو ہم سے اچھی خاصی اجنبیت برت رہی ہیں۔"

"میں نے بتا دیا ہے لیکن یہ تو فطری شرم ہے۔ اب تم ٹھیرے کلکتے کے آدمی۔ اس گڑیا کو تو ابھی یہاں کی آب و ہوا سے مانوس ہونے میں وقت لگے گا۔"

"ہمیں نہیں معلوم نہیں تھا کہ میاں ایسی صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ہم زرّیں بانو کے لیے تو کچھ بھی نہیں لائے۔" نواب مرزا بے قراری سے بولا۔ "خالی ہاتھ چلے آئے۔" اُس نے شیروانی کا بٹن کھول کے اندرونی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈّی نکالی۔ "خانم! آپ ہماری طرف سے یہ پانچ ہزار روپے رکھیے اور زرّیں کے لیے ان کی پسند کے مطابق ایک بہت عمدہ ساتحفہ خریدیے۔"

"ارے نہیں مرزا بھائی! زرّیں بھی یہیں ہے آپ بھی یہیں ہیں۔ دسیوں موقع آئیں گے۔" نسترن نے گڈّی واپس کرتے ہوئے کہا۔

"بھلا آپ کون ہوتی ہیں درمیان میں دخل دینے والی؟ یہ ہمارا اور زرّیں بانو کا معاملہ ہے۔" مرزا کو اپنی جگہ قرار نہیں تھا۔

"اچھا تو دیکھیے زرّیں سے پوچھ لیجیے۔ کیوں زرّیں؟" زرّیں کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں سے خوشی پھوٹی پڑ رہی زرّیں نے پہلی مرتبہ چہرہ اوپر کیا۔ میں سامنے کھڑا تھا۔ ایک لیے اُس کی نظر میری طرف اُٹھی۔ میں نے اشارے سے تحمّل کی تلق اسی وقت نسترن کو جیسے پہلی بار میری موجودگی کا احساس ہوا۔ اُس نے مجھے کمرے سے نکل جانے کا حکم دیا۔ میں باہر تو آ گیا لیکن جانے کے بجائے میٹھی اور نمکین نعمتوں کی پلیٹیں سجانے کے بہانے بار بار اندر جا رہا خاموش بیٹھی تھی۔ وہ تینوں بات بات پر کھِلے جا رہے تھے۔ نسترن کہ "آج ہمارا خیال آپ لوگوں کے ساتھ سیر کو جانے کا تھا۔"

"چشمِ ما روشن دلِ ما شاد، موٹر حاضر ہے۔" مرزا چہک کے بولا۔

"لیکن زرّیں کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"

"طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟ پھر تو انھیں ضرور جانا چاہیے۔ طبیعت گی۔ ہم انھیں دریا کے کنارے لے چلیں گے۔ رات کا کھانا لارڈز میں کیوں کیوں زرّیں! آپ کا کیا خیال ہے؟" نواب مرزا بلا واسطہ اُس سے مخاطب زرّیں کے بدن میں رعشہ سا پیدا ہو گیا۔ اُس کے بجائے نسترن "آج نہیں، پہلے آپ سے زرّیں کا حجاب تو ٹوٹ جائے۔"

"تو گویا ہمیں روز یہاں حاضری دینی ہوگی؟"

"آپ کا گھر ہے، جب چاہیں تشریف لائیے۔"

خاصی دیر یہی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ رات کو نو بجے وہاں نسترن نے زرّیں کو اُن کے جانے سے پہلے اُس کے کمرے میں بھیج دیا تھا پیچ میں مبتلا تھا کہ چاند میاں آگے چلا بھی گیا اور میں دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا! میں یا تو نسترن کی فکر کر سکتا تھا یا چاند میاں کی۔ میں نے سوچا کہ خیر جا گزر گئے ہیں، وہاں چند روز اور سہی کم سے کم یہ تو معلوم ہو گیا کہ وہ بہ مل موجود ہے اور اُس رُوسیاہ کا نام چاند میاں ہے۔ میرے دل میں خو ہوئی کہ کاش اُسے کورا کا پتہ معلوم نہ ہو۔ کاش وہ انکار کر دے کہ اُس کورا کو حاصل کرنے میں ناکام ہو گئے تھے۔ زرّیں نے رات کا کھانا کھا کر دیا تھا۔ میں ایک بار اندر گیا تو وہ تکیے میں منہ چھپائے پڑی تھی ا کی کمر سہلاتے ہوئے اُسے سمجھا بجھا رہی تھی۔ میں نے بھی اُس رات ویسے بھی میں محض زندگی برقرار رکھنے کے لیے چند لقموں سے صبح و شا جہنم بھر لیتا تھا۔

اب مجھے ایک اور فکر کھائے جا رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا اور نواب مرزا کی باتیں سننے کے بعد زرّیں کا کیا حال ہوگا۔ کوئی اُر لیتا ہوگا۔ میں اپنی کوٹھری کے فرش پر بیٹھا ہوا آنے والے لمحوں تھا۔ اب زرّیں کو یہ بتانا آسان تھا کہ نسترن اُس کے لیے کیا سوچ ر اس سے آگے خود مجھے راستے گم نظر آتے تھے۔ کوئی گھر نہیں تھا، کو وہی کلکتہ تھا، وہی سڑکیں وہی ویرانی اور دہشت تھی لیکن کوئی او تھا۔ ابھی مجھے اپنے ذہن کے جالے صاف کرنے کی کوشش کرتے

ن کہ ملازم نے اطلاع دی بیگم صاحب طلب کر رہی ہیں۔ میں اُٹھ کے بنگلے پہنچا۔ زرّیں کا کمرہ بند تھا۔ برابر کے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ اندر سے نسترن آواز آئی "اِدھر آجا۔"

میں کشمکش کے عالم میں اندر پہنچا۔ نسترن بستر پر تنہا پڑی ہوئی تھی آجے ش ہی نہیں تھا کہ ساڑی کا پلّو کدھر گرا ہوا ہے اور بدن کا کون سا حصّہ عریاں ے دروازہ بھیڑ لے۔" اُس نے مجھے دوسرا حکم دیا۔ "آج مجھے پھر وہی درد ہو رہا ہے۔" وہ کروٹ بدلتے ہوئے بولی۔ "دیکھتی ہوں تیرے ہاتھوں میں کتنا دم ہے اور لے بنارس والے سیٹھ کے ہاں کیا کھا پیا ہے۔"

میرے جسم کے ہر مسام سے پسینہ نکلا اور کانوں میں سائیں سائیں نے لگی۔ "جی۔" میں نے اٹک اٹک کر کہا۔ "آج تو خود میرے ہاتھوں میں بھی درد ہے۔"

"آج ہی تیرے ہاتھوں میں درد ہونا رہ گیا تھا کم بخت! میں انکار سننے عادی نہیں ہوں۔ چل آ، ہاتھ چلائے گا تو تیرے ہاتھ بھی دب جائیں گے۔"

"جی بہت درد ہے۔" میں نے گھبرا کے کہا۔

اُس نے مجھے گھور کے دیکھا پھر اُس کے لبوں پر ایک پُراسرار مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ "آ، تیرا درد میں دُور کرتی ہوں۔"

"آپ؟" میری آواز میں لرزش تھی۔

"وہاں کھڑا کھڑا کیا لرز رہا ہے۔ جا دفان ہو جا اور اسی وقت میرے گھر سے نکل جا۔ جا دُور ہو۔ مُردار کہیں کا۔" وہ درشتی سے بولی۔ میں نظریں جھکائے کھڑا رہا۔ اُس نے چیخ کر کہا۔ "جاتا ہے یا بُلاؤں دربان کو اور اُس سے کہوں کہ اِس موئے کو گھر سے نکال دے، یہ تو نخرے کرتا ہے۔"

"میں کہیں نہیں جاؤں گا، آپ ہی کے پاس رہوں گا۔" میں نے تلملا لہا۔ "آپ دھکّے دے کے نکال دیں گی تو دوبارہ واپس آ جاؤں گا۔"

"بکتا ہے۔" وہ ناگواری سے بولی۔

اُس سے بعید نہیں تھا کہ وہ مجھے اُسی وقت نکال باہر کرتی۔ میں آہستہ آہستہ اُس کی مسہری کی طرف بڑھنے لگا۔ پھر میں نے پائنتی بیٹھ کے اُس کے پیر لیے، اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کراہنے لگی۔ میرے ہاتھ تیز تیز حرکت رہے تھے۔ نسترن نے آنکھیں بند کیے کیے کہا۔ "روشنی آنکھوں میں کھب رہی ہے، اُٹھ کے بڑا بلب بجھا دے۔" میں نے اُس کے حکم کی تعمیل کی۔ "ایسے تیرے ہاتھ تو ڈھنگ سے پیروں میں نہیں آتے۔" وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی اور میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولی۔ "کہاں درد ہو رہا ہے تیرے؟"

"میرے ہاتھوں میں۔" یہ لفظ بمشکل تمام میرے منہ سے نکلے۔ اُس نے میرے ہاتھ دبانے شروع کر دیے اور ایک بھرپور انگڑائی لی۔ زور پڑنے کی وجہ سے اُس کے بلاؤز کے بٹن ٹوٹنے کی آواز آئی۔ "کمر دوہری ہو گئی ہے۔"

میں نے شرم سے اپنی آنکھیں نیچی کر لیں۔ ایک لمحہ ایک صدی کے مانند گزر رہا تھا۔ مجھ پر غصّے اور خوف کی ملی جلی کیفیت طاری تھی۔ میرا دل دو حصّوں میں بٹ گیا تھا۔ ایک دل یہ کہتا تھا کہ پیروں کے بجائے اُس کی گردن دبا دوں، درد ہمیشہ کے لیے نکل جائے گا۔ دوسرا دل کہتا تھا، چند دن اور گزار لے۔ میں نے اس سے پہلے کسی عورت کی آنکھ میں ایسی چمک نہیں دیکھی تھی۔ مجھ پر جہاں جہاں اُس کی نظر پڑتی تھی، وہاں وہاں آگ سی لگنے لگتی تھی۔ "تو جو کچھ کہتا تھا وہ سچ تھا۔" وہ خوابیدہ آواز میں بولی۔ "تو میری آزمائش پر پورا اُترا۔ تیری نوکری پکی۔ اب میں تیرے لیے اچھے اچھے کپڑے بنواؤں گی۔ مٹھائیاں بنواؤں گی تجھے لیکن دیکھ، آنکھیں مت پھیر لینا۔ یہ نہ ہو کہ تو مجھے عورت سمجھ کے کہیں دیوانہ ہو جائے۔" اُس نے باتیں کرنے پر کمر باندھ لی تھی اور مجھ پر اپنی نوازشیں نچھاور کر رہی تھی۔ چند لمحوں کے لیے مجھے کچھ سکون ہوا۔

"اب میں یہاں آ گیا ہوں تو کہیں اور کیوں جاؤں گا۔ ایسی اچھی جگہ کہاں ملے گی۔" میں نے اپنے حواس درست کرتے ہوئے کہا۔

"بس سمجھ لے۔ تو نے میرے تعلقات تو دیکھ ہی لیے ہیں۔ کلکتے کا بڑے سے بڑا آدمی یہاں آتا ہے۔ تو نے اگر بھاگنے کی کوشش کی تو میں تجھے سات تہہ خانوں سے بھی نکال لاؤں گی۔" یہ کہہ کر وہ پھر لیٹ گئی۔ اُس نے مجھے حکم دیا۔ "ذرا میرے بازو تو دبا۔" میں نے اس بار کسی چون و چرا کے بغیر اُس کے بے لباس بازوؤں پر ہاتھ چلانے شروع کر دیے۔ وہ کسماتی اور آہیں بھرتی رہی۔ کبھی اِس کروٹ ہوتی، کبھی اُس کروٹ۔ اُس کا لباس بستر پہ بکھر گیا تھا۔ میں نظریں چُراتا رہا۔ پھر اچانک کسی نے ہولے سے دروازے پر کھٹ کھٹ کی۔ وہ بے چینی سے اُٹھی۔ اُس نے مجھے بستر پر رُکنے کا حکم دیا اور کواڑ کا ذرا سا پٹ کھول کے باہر جھانکا۔ "کون؟ چاند میاں؟ ساتھ میں اور کون ہیں؟"

ملازم نے جواب دیا۔ "اکیلے ہیں۔" نسترن نے منہ بنایا اور ملازم کو ہدایت کی کہ وہ چاند میاں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دے۔

"جا آرام کر۔" اُس نے بے دلی کے ساتھ مجھ سے کہا۔ میری جان میں جان آئی۔ میں کمرے سے نکل کے باورچی خانے میں گھس گیا۔ وہ اپنا لباس درست کر کے ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔ مجھے اُن کی یہ گفتگو سننے کا موقع نہیں ملا۔ پھر باورچی خانے کے دروازے کی آڑ سے میں نے دیکھا کہ وہ چاند میاں کو اپنی خواب گاہ میں لے گئی ہے۔ گویا معاملہ گمبھیر تھا۔ اتنی رات گئے چاند میاں کا آنا اور آتے ہی کمرے میں بند ہو جانا بے علّت نہیں تھا۔ میرے ذہن میں ہزار اندیشے گردش کرنے لگے۔ جیسے ہی اُن کا کمرہ بند ہوا، میں نے باہر جا کے دیکھا۔ وہاں وہی موٹر کھڑی تھی جس میں شام ڈھلے نواب مرزا اور چاند میاں آئے تھے۔ ممکن ہے وہ زرّیں کو لینے آیا ہو؟ اندھیری رات ہے۔ ایسے میں اُسے ایک گھر سے دوسرے گھر منتقل کرنے میں کیا دشواری ہوگی۔ سبات لیکن ذہن پر اٹکی ہوئی ہوگی۔ زرّیں کا حال دیکھ کر خود نسترن بھی جلد از جلد اُس سے پیچھا چھڑانے کا ارادہ رکھتی ہوگی اس لیے وہ کم کے سودے پر بھی آمادہ ہو جائے گی۔ نواب مرزا کو کسی کل قرار نہیں آیا ہوگا۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور اہلِ نظر نسترن کو لالچ دیتا، اُس نے پہلی فرصت میں چاند میاں کو نسترن سے گفت و شنید کے لیے بھیج دیا ہے۔ میں نے رینگتے ہوئے زرّیں کے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ مجھے کچھ انتظار کرنا پڑا۔ پھر اندر سے زرّیں کی ناتواں آواز آئی۔ میں نے سرگوشی میں اُسے اپنا نام بتانے کی کوشش کی لیکن اُس تک میری آواز نہیں پہنچ سکی۔ چنانچہ مجھے دوبارہ باورچی خانے میں جانا پڑا۔ وہاں میں نے ایک ردّی کاغذ پر

کونلے سے اپنا نام لکھا اور وہ کاغذ جھاڑو کے تنکے کے ذریعے دروازے کے نیچے سے اُس کے کمرے کے اندر ڈال دیا۔ زرّیں نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ کمرہ روشن تھا مگر زرّیں کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں سوج کر سرخ ہو گئی تھیں
"خدا کے لیے مجھے یہاں سے لے چلو۔" اُس نے چیخنے کی کوشش کی۔
میں نے ایک دم اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "میں تو پہلے ہی تمھیں لے چلتا لیکن تم سے یہ بات کہتا کس طرح؟ اب تو تم نے خود دیکھ لیا۔ سنو، چاند میاں پھر آیا ہے۔ جاگتی رہنا اور ہوشیار بھی رہنا۔ میں یہیں کہیں رہوں گا۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو تو فوراً مجھے آواز دے لینا۔"
"میں اب ایک لمحے بھی یہاں ٹھہرنا نہیں چاہتی۔" اُس نے سسکتے ہوئے کہا۔
"میں خود ایک لمحے بھی تمھیں یہاں دیکھنا نہیں چاہتا مگر باہر سوچ سمجھ کے قدم نکالنا ہوگا۔ یہ رات خیریت سے گزر جائے تو یہی بہت ہے۔"
"مگر ہم جائیں گے کہاں؟" اُس نے پوچھا۔ میری آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ کورا بھی مجھ سے بار بار یہی سوال کرتی تھی۔
"دُنیا بہت بڑی ہے۔ یہاں سے نکلیں تو سہی پھر دیکھا جائے گا کہ کہاں جانا ہے۔ تم بس حوصلہ قائم رکھنا۔ تم تو مسلسل رو رہی ہو۔"
"اور تم جو رو رہے ہو۔" اُس نے میرے آنسو دیکھ لیے تھے۔
"مجھے ایک پُرانی بات یاد آ گئی تھی۔" میں نے آستین سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "اچھا دروازہ بند کر لو۔"
اُس نے کچھ اور کہنا چاہا مگر میں نے نہیں سُنا کیونکہ نسترن اور چاند میاں کسی وقت بھی باہر آ سکتے تھے۔ میں باورچی خانے کی روشنی گُل کر کے پھر چوکیداری کرنے لگا۔ میں نے احتیاطاً پیاز کاٹنے کا چاقو سنبھال لیا تھا اور لوہے کی سنسی ہاتھ میں پکڑ لی تھی۔ کچھ دیر تک کوئی آہٹ نہیں ہوئی۔ میں نے دبے قدموں نسترن کے کمرے کے دروازے پر جا کے کان لگا دیے۔ اندر دھیمے لہجے میں کچھ گفتگو ہو رہی تھی میری سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی۔ اب میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ میں دعا کر رہا تھا کہ بس کسی طرح یہ رات گزر جائے، صرف ایک رات کی مہلت اور مل جائے۔
میں چوکنا ہو کے بیٹھ گیا۔ جسم کی تمام طاقت کانوں میں سمٹ آئی۔ پھر چاند میاں بہت دیر بعد نسترن کے ساتھ باہر نکلا۔ وہ دونوں خاموش تھے۔ جب اُن کی چاپیں باورچی خانے کے قریب سنائی دیں تو میری رگیں جلنے لگیں۔ چاقو اور سنسی پر میرے ہاتھ تڑپنے لگے۔ وہ زرّیں کے کمرے سے آگے گزر گئے تھے۔ میں دم سادھے اندر بیٹھا رہا۔ گاڑی چلنے کی آواز آئی اور چند منٹ بعد نسترن نے زرّیں کے دروازے پر ٹھوکے مارنے شروع کر دیے۔ پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ نسترن اپنی خواب گاہ میں چلی گئی۔ وہ دوبارہ واپس نہیں آئی۔ میں ساری رات جاگتا رہا۔ گویا نسترن نے چاند میاں کو ناشاد و نامراد واپس کر دیا تھا۔ اُسے اُمید ہوگی کہ کل نواب مرزا دیوانہ ہو کے اپنی پیش کش میں اور اضافہ کرے گا۔ اُسے اس دہشت کی سیاہی میں زمانہ گزر گیا تھا۔
مگر میں زرّیں کو کہاں لے جاؤں گا؟ میری جیب میں ایک دمڑی بھی نہیں تھی۔ ایک نوجوان بُرقع پوش لڑکی کے ساتھ بڑھی ہوئی داڑھی اور اُول جلول کپڑوں والے ایک نوجوان کو دیکھ کر لوگ کیا کہیں گے؟ اس لیے میں نے سوچا، اس بار پہلے سے سوچ لیا جائے ورنہ کورا کے وقت کی طرح زرّیں کو دربدر مارے مارے پھرنا ہوگا۔ مجھے سوشیل کا گھر یاد آیا۔ بتھل کی اُس بدقسمت گھر کے گزارے کے لیے ماہانہ رقم اب بھی پہنچتی ہوگی۔ مجھے میں زرّیں کو اپنی بہن بتا کے چند دنوں کے لیے وہاں ٹھہرا مگر میں نے تو اُس کا گھر بھی نہیں دیکھا تھا۔ نہ معلوم کیسا ماحول ہو، اردگرد رہتے ہوں۔ ہندوؤں کے محلے میں ایک بُرقع پوش لڑکی کا ٹھہرنا سو والوں کے لیے مصائب میں اضافے کا سبب بن جائے گا۔ سوشیل کے گھر کے کسی فرد سے واقف نہیں تھا۔ اُن کے سامنے خود کو شناخت کرا گا کہ میں سوشیل کا وہی دوست ہوں جس کی ایما پر اُنھیں ہر ماہ ایک ہے اور اب میں اُس رقم کا محصول وصول کرنے آیا ہوں۔ پھر ایک ہی گو بتھل کا اڈا۔ زرّیں جیسی نازک اندام لڑکی کو کلکتے کے خطرناک بدمعاش پڑے جاؤں؟ میں نے جیل میں اس ماحول کے قصے سُنے تھے، خود اپنی وہ جگہ کبھی نہیں دیکھی تھی۔ سوچنے اور منصوبے بنانے کا وقت بھی نکل مرزا زرّیں کے حسن و جمال کا نظارہ کر چکا تھا۔ اُس کی بے تابیاں بتا اب مجھے بہر طور جلد از جلد اُسے یہاں سے لے جانا تھا۔ چاہے بعد میں کچھ پیش آئیں۔ میری جیب میں مالا کی چھوٹی سی پوٹلی پڑی تھی۔ میں نے دیکھا اور آنکھوں سے لگا لیا۔ اس قیمتی مالا کا صرف ایک دانہ میری بہت کر سکتا تھا مگر کورا کی ایک ہی یادگار تو رہ گئی تھی۔ اس یادگار کی میں حفاظت کی تھی۔ جسے دیکھیے، سب سے پہلے اُس کی نظر اسی پر پڑتی تھی موتیوں میں کوئی خاص بات ضرور ہوگی اسی لیے بدھ گیا میں اُس مقدس مجھے شناخت کر لیا تھا ورنہ ایسی مالائیں تو ہزاروں گلوں میں پڑی خیال آیا تو میں بہتا چلا گیا۔ میرا چہرہ بھیگ گیا۔ امّی یاد آئیں، ابّا یاد آ۔ کی شکلیں باورچی خانے کی دھندلی دیواروں پر اُبھر آئیں۔
نہ معلوم اُن کے چہرے دیکھنا کبھی نصیب بھی ہو یا نہ
کے بعد ابّا جان کے چڑچڑے پن سے وہ کتنی پریشان ہوں گی۔ مجھے بھاتی ہوں گی۔ بے چاریوں نے یہ سمجھ لیا ہوگا کہ میں مر گیا ہوں۔ ہاں اگر میں اُن کا بھائی ہوتا تو اُن کے پاس ہوتا۔ اس وقت وہ کہاں ہو رہی ہوں گی؟ کیسا مکان ہوگا؟ محلے والے کیسے ہوں گے؟ چھو ہوں گے۔ کاش ابّا جان کا سایہ اُن کے سروں پر سلامت رہے مگر نہ بھائے کیا ہو گیا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ انھیں گیا میں رہتے ہوئے لگا ہو۔ اُن کے پاس کورا کا خزانہ محفوظ تھا نا۔ جانگ قبیلے کے سر بنا کر آیا تھا، اُس کا کہنا تھا کہ وہ ایک انمول خزانہ ہے۔ ممکن ہے وہی خزانہ ٹھکانے لگانے کے لیے گیا کی سکونت ترک کر دینا مناسب کاغذات، وہ متبرک کاغذات جن کی جانگ قبیلے کے لوگوں کو ضرو نے ضرور اُن کاغذات کا مطالعہ کیا ہوگا اور اُن کی سمجھ میں کوئی با ہو سکتا ہے بدھ راہب جھوٹ بول رہا ہو اور اُن کاغذات میں کو
پوشیدہ ہو۔ جانگ قبیلے کے لیے مہاتما بدھ کی وصیت یا کوئی راستہ یا کچھ اور جبھی تو وہ اتنا پریشان تھا۔ متبرک کاغذات کی گمشدگی پر اُس کا یہ اضطراب ناقابلِ فہم تھا۔ خصوصاً ایسے کے لیے جس نے اعلا تعلیم حاصل کی تھی۔ اُس کی یہ بات میرے دل کو نہیں لگی۔ اُن کاغذات میں ضرور کوئی اہم نکتہ درج ہوگا۔ ابّا جان نے اس نکتے کی پہنچی ہوگی تو اُن کی تشویش بڑھ گئی ہوگی۔ گیا میں اپنے سابق مکان کے قریب جو ایک آدمی مجھے ملا تھا، اُس کا بیان تھا کہ ابّا جان کمرہ بند کر کے بیٹھ جاتے تھے اور کسی کا گھر میں آنا پسند نہیں کرتے تھے۔ بہت ممکن ہے وہ تخلیے میں اُنھی کاغذات کا مطالعہ کرتے ہوں اور انھیں ڈر ہو کہ یہ راز کسی پر کھل نہ جائے اور جب اُن کی تحقیق و جستجو میں رکاوٹ پڑ رہی ہو تو انھوں نے گیا سے کہیں اور منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ کون اپنا آبائی مکان، زمین اور جائداد چھوڑ کے اس طرح روپوش ہو سکتا ہے کہ کسی ہمسائے کو بھی خبر نہ ہو۔ چُپ چپاتے مکان بیچ دیا۔ نہ کسی سے کہا، نا کسی پر اعتماد کرتے۔ کسی غیر معمولی واقعے کے بغیر ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔ پس منظر میں کوئی بے حد اہم بات ہو گی۔ ذہن کو کسی کل چین نہیں تھا۔ انھی قیاس آرائیوں اور خیال آفرینیوں میں صبح ہو گئی اور مجھے اچانک احساس ہوا کہ میں کہاں اور کس گھر میں ہوں۔ میں تو زرّیں کی چوکیداری کر رہا تھا۔ اس غفلت پر مجھے جرم کا احساس ہونے لگا۔
ناشتے کی میز پر نسترن کا چہرہ فکر میں ڈوبا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اُس نے مجھ پر کوئی توجہ نہیں دی، جیسے رات اُس نے مجھے قریب بُلا کے کوئی بات ہی نہ کی ہو۔ البتہ زرّیں موقع پا کے کنکھیوں سے مجھے دیکھ لیتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ آج کم سے کم رات تک تو امان ہے کیونکہ نسترن کے گھر سے کوئی دن دہاڑے زرّیں کو لے جانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ خود نسترن سیر و تفریح کے بہانے اُسے جا کے چھوڑ آئے۔ مجھے اندازہ تھا کہ آج چاند میاں، نواب مرزا اور بہت سے دوسرے لوگوں کی بھیڑ لگ جائے گی۔ نسترن نے زرّیں کے حسن کا چرچا دور دور کر دیا ہوگا۔ گیٹ پر دربان، اندر کئی ملازم، مہمانوں کی مستقل آمد کا خطرہ اور نسترن کی گھر میں موجودگی۔ میں زرّیں کو ان سب بلاؤں کی آنکھوں میں دھول جھونک کے کیسے لے جا سکتا تھا۔
دو دن سے میں گھر کے ہر فرد کا جائزہ لے رہا تھا کہ کون کس وقت کہاں رہتا ہے۔ دربان کی کوٹھری گیٹ سے چند قدم کے فاصلے پر تھی۔ وہ عموماً صرف ضروریات کے لیے وہاں سے ہٹتا تھا ورنہ وہیں بیٹھا ہوا حقہ گڑگڑاتا رہتا تھا۔ میں نے ان چار دنوں میں اُس سے خاصی دوستی کر لی تھی۔ شروع شروع میں گھر کے تمام ملازموں نے مجھے خشونت کی نظروں سے دیکھا مگر بعد میں وہ سب مجھ سے گھُل مل گئے۔ باورچی روزانہ صبح گوشت ترکاری لینے کے لیے جاتا تھا۔ غرض میں نے فرار کے طریقوں پر بہت غور کیا لیکن عمل کے قابل کوئی ترکیب ذہن میں نہیں آئی۔ اُس روز جب باورچی ہدایت لے کے بازار روانہ ہو گیا تھا اور نسترن زرّیں کے کمرے میں چلی گئی تھی تو ایک تدبیر میرا دماغ جھنجوڑنے لگی۔ میں نے باہر جا کے دیکھا۔ دربان حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ میں بنگلے میں آ گیا۔ آیا ڈرائنگ روم کی صفائی کر رہی تھی۔ دوسرے ملازم اپنی اپنی کوٹھریوں میں تھے۔ پھر میں ایک فیصلہ کر کے زرّیں کے کمرے میں گھس گیا۔ نسترن اُس سے کہہ رہی تھی کہ "آج نواب مرزا شاید دو چار دنوں کے لیے تمھیں اپنے گھر لے جائیں۔ میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گی۔" میں جیسے ہی کمرے میں اچانک داخل ہوا، وہ بات کرتے کرتے رُک گئی۔ اُس نے مجھے اچٹتی نظر سے دیکھا۔ میرے بے اجازت اندر پہنچنے سے اُس کے چہرے پر ناگواری کی شکنیں اُبھر آئیں۔ میں ایک دم اُس کے بہت قریب پہنچ گیا۔ پھر میں نے پھرتی کے ساتھ اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ ہکا بکا رہ گئی۔ اُسے پوری طرح اپنی گرفت میں لینے کے لیے مجھے زیادہ وقت نہیں لگا۔ "زرّیں!" میری دھیمی آواز اُبھری۔ "کسی تاخیر کے بغیر دروازہ بند کر دو اور تیار ہو جاؤ۔" میرا لہجہ حکمیہ تھا۔ زرّیں سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔ "دیر مت کرو، وقت نہیں ہے۔" اُس کے تساہل پر مجھے جھنجلاہٹ ہونے لگی۔ نسترن میری گرفت سے آزاد ہونے کے لیے برابر ہاتھ پاؤں مار رہی تھی مگر اُسے کیا معلوم تھا کہ وہ کس کی گرفت میں ہے۔ زرّیں نے کمرہ بند کر دیا۔ نسترن چیخنے کی کوشش بھی کر رہی تھی لہٰذا میں نے اُس کے منہ پر ایک طمانچہ رسید کر دیا۔ اگر مجھے زرّیں کی موجودگی کا خیال نہ ہوتا تو میں اُسے اتنے طمانچے مارتا، اتنے طمانچے مارتا کہ وہ لہولہان ہو جاتی۔ پھر جب اُس نے شور مچانے کا ارادہ کیا تو میں نے باورچی خانے سے اٹھایا ہوا چاقو نکال لیا اور اپنے وجود کی تمام نفرت سمیٹ کے اُس سے کہا۔ "نسترن خانم! میں زرّیں کو لے کے جا رہا ہوں۔ پہلی بار تو میں چوٹ کھا گیا تھا مگر اب دوسری بار ایسا نہیں ہوگا۔ میں اس شریف اور معصوم لڑکی کو تم سے بہت دُور لے جاؤں گا۔ چیخنے کی کوشش نہ کرو۔ اس وقت تم مجھے صرف یہ بتاؤ کہ چاند میاں کہاں رہتا ہے؟"
"تم کون ہو؟" دہشت سے اُس کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔
"یہ میں تمھیں پھر کبھی بتاؤں گا۔ اس وقت تو مجھے چاند میاں کا پتہ چاہیے۔"
"وہ کیلا بگان میں رہتا ہے۔" نسترن لرز کے بولی۔ "کیا تم زرّیں کو اُس کے پاس لے کے جا رہے ہو؟"
"تم نے کیا سب کو اپنے جیسا سمجھ لیا ہے۔ اس دنیا میں سبھی تم جیسے کمین نہیں رہتے نسترن خانم! وقت کم ہے۔ تم ذرا اس کرسی پر سیدھی طرح بیٹھ جاؤ۔" میں نے اُسے جھٹکا دے کے اُٹھایا اور زرّیں سے چادر مانگی۔ نسترن تڑپنے لگی تھی اس لیے مجھے اُس کے منہ پر ایک اور ضرب لگانی پڑی۔ وہ ہوشیار عورت تھی۔ سمجھ گئی کہ مزاحمت کرنا بے کار ہے۔ زرّیں نے اسے کرسی سے باندھنے میں میری مدد کی۔ نسترن کو چاروں طرف سے باندھ کے میں نے زرّیں سے پوچھا۔ "تمھارے پاس کچھ نقدی ہے؟"
"نہیں، وہ تو سب میں نے انھیں دے دی تھی۔" زرّیں نے معصومیت سے کہا۔
میں نے نسترن سے کہا۔ "تمھارے روپے کہاں رکھے ہیں؟ میں صرف

وہ روپے مانگ رہا ہوں جو زریں نے مجھے دیے تھے۔ وہ پانچ ہزار روپے نہیں جو نواب مرزا نے زریں کی رونمائی کے لیے دیے تھے۔"

نسترن نے آنکھوں کی پتلیوں سے ایک طرف اشارہ کیا۔ میں نے تیزی سے سنگھار میز کی دراز کھولی۔ دراز میں اُس کا چھوٹا سا بٹوا موجود تھا۔ بٹوے میں چابی رکھی تھی۔ چابی سے میں نے الماری کھولی۔ الماری میں بہت قلیل رقم تھی۔ وہ میں نے گنے بغیر جیب میں ڈال لی اور زریں کو ہدایت کی کہ وہ دروازہ بند کرے اور میرا انتظار کرے اور جب تک اُسے یقین نہ ہو جائے کہ خود میں آیا ہوں، اُس وقت تک دروازہ نہ کھولے۔

باہر آ کے میں نے عمر رسیدہ جاٹ دربان سے کہا کہ بیگم صاحب کو ٹیکسی کی ضرورت ہے۔ وہ کندھے اچکا کر گیٹ روانہ ہو گیا۔ میں بھاگا ہوا اندر آیا۔ میری آواز سُن کے زریں نے دروازہ کھول دیا۔ کمرے سے نکلتے وقت میں نے آپا کی نقل و حرکت دیکھ لی تھی۔ اُس کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ زریں نے برقع پہن لیا تھا۔ وہ بالکل تیار تھی اور اپنا سوٹ کیس بھی ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔ میں نے اُسے منع کر دیا اور سوٹ کیس وہیں چھوڑ دیا۔ میں چلتے چلتے ایک دفعہ نسترن کا چہرہ دیکھنا چاہتا تھا مگر اُس کے منہ پر ڈھاٹا بندھا ہوا تھا، صرف آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ ہم نے اُسے ایسا کس کے باندھا تھا کہ وہ جنبش بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اُس سے میرا تعارف ہونا رہ گیا تھا۔ تعارف کے لیے اگر میں رُک جاتا تو ذرا سی دیر میں معاملہ بگڑ سکتا تھا۔ میرے سینے میں گھٹن سی ہوئی جیسے کوئی مجھ سے شکایت کر رہی ہو کہ بابر! تم نے اِسے اتنی آسانی سے معاف کر دیا؟

بہرحال میں نے نسترن سے کہا "نسترن خانم! ہم جا رہے ہیں۔ تم نے زریں کے بارے میں غلط رائے قائم کی تھی۔ اگر میں یہاں نہ بھی ہوتا اور تم نواب مرزا جیسے کسی شخص کے ہاتھ اسے فروخت کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتیں تو زریں اپنی عصمت بچانے کے لیے چوڑیاں پیس کر پھانک لیتی ۔ یہ اسی کردار کی لڑکی ہے۔ ایک بار پہلے بھی تم نے ایک اور لڑکی کے متعلق غلط اندازہ لگایا تھا۔ یاد ہے آج سے سات سال پہلے؟"

اُس کی پتلیاں حیرت سے پھیل گئیں۔ میں نے زریں کا ہاتھ تھاما۔ اُس کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ چکا تھا۔ "چلو زریں!" میں نسترن پر قہر کی ایک نظر ڈالتا ہوا دروازہ بند کر کے باہر آ گیا۔ زریں میرے پیچھے پیچھے تھی۔ ہم ڈرائنگ روم کے دروازے پر پہنچ گئے۔ زریں کو بوڑھی آپا کی نگاہ سے اوجھل کرنے کے لیے میں ٹھہر گیا اور زریں کو تنہا آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ وہ احتیاط سے نکل گئی۔ میں بھی چلا۔ اس طرح ہم گیٹ تک پہنچ گئے۔ دربان اپنی جگہ موجود نہیں تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ جب تک دربان ٹیکسی لے کے واپس آئے گا، اُس وقت تک ہم اُس کی عدم موجودگی سے فائدہ اُٹھا کے اِردگرد کی گلیوں میں گم ہو جائیں گے مگر اس اقدام میں ایک خطرہ تھا۔ وہ یہ کہ ٹیکسی آنے کے بعد دربان اندر اطلاع دینے جائے گا، ٹیکسی باہر کھڑی ہوئی ہو گی اور نسترن کو آزاد ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔ وہ فوراً منتظر ٹیکسی میں بیٹھ کے ہمارا تعاقب شروع کر دے گی۔ اگر سواری ملنے میں دیر ہو گئی تو وہ آسانی سے ہمارے سروں پہ پہنچ جائے گی۔

گیٹ سے باہر گلی میں جھانک کے دیکھا۔ دربان ٹیکسی لے کے آ رہا تھا۔ چند منٹ اور ٹھہر جاتا تو دربان اندر اطلاع دینے پہنچ جاتا یا ہمیں باہر دیکھ لیتا۔ میں نے زریں کو ایک طرف کھڑا کر دیا اور خود گیٹ سے باہر۔ گیٹ کے اندر کھڑی رہی۔ دربان مجھے منتظر دیکھ کے بولا "جاؤ نیچر صاحب کو خبر کر دو۔"

میں نے جواب دیا "وہ تیار ہیں۔" یہ سنتے ہی زریں باہر نکل آئی۔ دربان نے اُس سے پوچھا "بیگم صاحب کدھر ہیں؟"

"آ رہی ہیں۔ آتے آتے انھیں کچھ یاد آ گیا تھا۔" یہ کہتے ہوئے وہ ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ ہم نے چند لمحے انتظار کیا۔ پھر میں نے دربان سے کہا "بیگم صاحب کہاں رُک گئی ہیں؟" پھر وہ جیسے ہی اندر گیا، میں نے ڈرائیور کو چلنے کا حکم دیا۔ وہ سُنی اَن سُنی کر گیا۔ میں نے دوبارہ کہا، پھر مجھے اپنی جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کے اُس کے حوالے کیا، اُس کی باچھیں کھل گئیں۔ اُس نے ایک نعرہ لگایا اور پوچھا "کہاں جانا ہے؟"

"چلتے رہو۔" میں نے اِدھر اُدھر نظریں گھماتے ہوئے کہا۔ اُس نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ اگلا موڑ مڑتے ہی مجھے نواب کی کار نظر آئی۔ میں نے زریں کو چپکے سے اشارہ کیا۔ چاند میاں اور نواب پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے پوری طرح دن کا بھی انتظار نہیں کیا تھا۔ بہرحال وہ رُکے ہوئے تھے اور ہماری ٹیکسی سڑکوں پر دیوانوں کی طرح پھر رہی تھی۔ ڈرائیور بار بار نشست پر اُچھل رہا تھا جیسے اُسے ایڑ لگا رہا ہو۔ وہ نعرے بھی لگا رہا تھا۔ جیسے رسید کر رہا ہو یا گالی دے رہا ہو۔ کدھر جاؤں؟ کہاں ٹھہروں؟ کس دروازے پر دستک دوں؟ میرا ذہن بُری طرح اُلجھا ہوا تھا۔ بنگلے پر نواب مرزا کی گاڑی بروقت پہنچ گئی تھی۔ اس لیے اب بھی لاحق تھا کہ نواب مرزا کی گاڑی ہمارے تعاقب کے لیے میں آ جائے گی۔ اگر ایسا ہوا اور انھوں نے راستہ کاٹ کے کسی جگہ روک لیا تو کیا ہو گا؟ "ہم کہاں جا رہے ہیں؟" زریں نے اس میں مجھ سے پوچھا کہ ڈرائیور اُس کی آواز نہ سُن سکے۔

"تمھیں وہاں سے آنے پر کوئی دکھ تو نہیں ہو رہا۔" جواب دینے کے بجائے میں نے اُس سے ایک عجیب سوال کیا۔ اُس سے جواب نہ بن پڑا۔ وہ جز بز ہو کے رہ گئی۔ میں اُس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ کچھ توقف کے بعد وہ دھیرے سے بولی "میں تمھارے ساتھ آ گئی ہوں۔"

میرے جسم میں بجلی کا ایک جھٹکا سا لگا۔ کاش اس وقت مختلف انداز سے پیش آتیں۔ ٹیکسی بے منزل بھاگتی رہی۔ ڈرائیور نے کئی بار پیچھے مڑ کے دیکھا۔ وہ میری خاموشی سے تنگ آ گیا تھا اور منزل کا پتہ پوچھنا چاہتا تھا۔ میری سمجھ میں کوئی منزل نہیں آ رہی تھی۔ جدھر نظر اٹھاتا تھا، وہاں دروازوں پر بھوت کھڑے ہوتے ملتے تھے۔ آخر ڈرائیور نے ایک جگہ ٹیکسی روک دی اور تلخی سے پوچھا "کہاں جاؤ گے؟"

میں نے سراسیمہ ہو کے اُسے دیکھا اور تذبذب سے کہا "سیال دے۔"

"سیال دے؟" اُس نے دہرایا۔ "ایسا بولو نا۔"

گاڑی نے پھر اپنا سفر شروع کر دیا تھا۔ اس مرتبہ اُسے کچھ قرار آ گیا تھا۔ رفتار متوازن اور سبک تھی لیکن میری بے قراری بڑھ گئی تھی اور میرے ذہن کی گاڑی کی رفتار اتنی ہی منتشر اور تیز ہو گئی تھی۔ دماغ پھٹنے لگا تھا۔ آدھے گھنٹے کی مسافت کے بعد ڈرائیور نے گاڑی روکی۔

"سیال دے میں کدھر جانا ہے؟"

"استاد بھَل کے ہاں!"

"استاد بھَل؟" میرے لہجے کی سردی اُسے لگ گئی تھی۔ اُس نے مجھے انتہائی حیران نظروں سے دیکھا "تم بھَل کے ہاں جانا چاہتے ہو؟"

"ہاں۔" میں نے گردن ہلا کے کہا۔

وہ سٹ پٹا گیا۔ "کیا تم اُس کا اڈا جانتے ہو؟"

"نہیں ۔ تم وہاں کسی جگہ بھی پوچھ سکتے ہو۔"

"ہم اُس علاقے میں نہیں جاتا۔ وہاں کی سواری ہوتی ہے تو منع کر دیتا ہے۔" وہ کچھ تنک کے بولا۔

"ہمیں وہیں چھوڑ دو۔" میری آواز میں حکم تھا۔

وہ کچھ جھجکا، پھر ایک تنگ لمبی گلی میں مڑ گیا۔ ایک ہوٹل کے قریب گاڑی روک کے اُس نے پان والے سے کچھ پوچھا۔ میں نے دیکھا پان والا اُسے پتہ سمجھا رہا ہے۔ اُس گلی میں بہت سے ہوٹل تھے اور ہر قسم کی دُکانیں تھیں۔ گاڑی ایک بڑی سی پیلی عمارت کے سامنے جا کے ٹھہر گئی۔ ڈرائیور نے ایک بار پھر اتر کے کسی راہ گیر سے پتہ پوچھا۔ اُس نے اسی جانب اشارہ کیا۔ "سنو!" میں نے مرتعش آواز میں ڈرائیور سے کہا۔ میرے دل کی دھڑکن بہت تیز ہو گئی تھی۔ "اُدھر جا کے کہو استاد بھَل کا ایک مہمان آیا ہے۔ اُسے اِدھر بھیج دو۔"

"نا بابا!" وہ کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "آپ خود اُدھر جاؤ۔ اندر جا کے پتہ کرو۔"

"جاؤ۔" میں نے زور دے کے کہا۔ "جاؤ۔"

وہ اُلجھتا، بڑبڑاتا، کسمساتا ہوا بائیں جانب کی عمارت میں گھس گیا۔ یہ عمارت بناوٹ میں دوسری عمارتوں سے مختلف تھی۔ حویلی لگتی تھی، اُسے دیکھ کر ہیبت طاری ہوتی تھی۔ باہر لوہے کا ایک گیٹ تھا۔ ڈرائیور جھجکتا ہوا جیسے ہی گیٹ تک پہنچا، گٹھے ہوئے جسم کا ایک شخص اُس کے سامنے آ گیا۔ ڈرائیور نے ٹیکسی کی طرف اشارہ کر کے اُسے کچھ بتایا۔ اُس نے مجھے خشونت اور حقارت سے دیکھا اور سینہ پھلاتا ہوا آہستہ قدموں سے میرے پاس آیا۔ "کس سے ملنا ہے؟" سوال اُس نے مجھ سے کیا تھا مگر اُس کی نظریں زریں پر لگی ہوئی تھیں۔

"استاد بھَل سے۔" میں نے تندی سے کہا۔

"کون ہو تم؟"

"بس تم استاد کو بتا دو کہ اُس کا ایک مہمان آیا ہے۔"

"نام بتاؤ۔" اُس نے سختی سے کہا۔

"تم سے جو کہا جا رہا ہے، وہی کرو۔"

اُس کے ماتھے پر شکنوں کا جال بچھ گیا۔ "استاد مصروف ہے۔"

میں نے ارادہ کیا کہ واپس ہو جاؤں کیوں کہ ان لوگوں کے تیور ہی عجیب ہیں اور پتہ نہیں اس عرصے میں بھَل کے رویّے میں کیا تبدیلی آ گئی ہو۔ جیل سے چھوٹنے کے بعد میرے یہاں نہ آنے پر وہ سخت ناراض ہو گا۔ ٹیکسی ڈرائیور گاڑی کے اگلے حصے پر کھڑا تھا۔ میں ٹیکسی سے اتر آیا اور میں نے آہستہ سے کہا "جاؤ، اُس سے کہو لاڈلا آیا ہے۔"

"لاڈلا؟" اُس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"ہاں لاڈلا!"

اُس نے ایک آن میں کئی پہلو بدلے۔ اُس کی پلکیں پھڑپھڑانے لگیں۔ جیسے اُس کی آنکھ میں تنکا پڑ گیا ہو۔ اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ پھر وہ مجھ سے کچھ کہے بغیر سرپٹ بھاگا۔ دروازے پر ایک آدمی اُس کی ٹکر سے گرتے گرتے بچا۔

میں اپنی زندگی کا سب سے ہولناک انتظار کرتا رہا۔ میری نظریں گیٹ پر جمی ہوئی تھیں۔ چند ثانیوں کے طویل عرصے بعد بلند آواز سے دروازہ کھلا اور اندر سے بھَل برآمد ہوا۔ ایک لمحے وہیں ٹھٹک کے اُس نے متجسس نگاہ سے مجھے دیکھا اور وحشت میں لپک کے آیا۔ پھر وہ بے تحاشا میرے سینے سے لپٹ گیا۔ "لاڈلے! لاڈلے!" اُس کی آواز بھرّا رہی تھی۔ "میری جان! تو نے اپنے بھَل کو بھی خبر نہیں کی؟ کہاں چھپ گیا تھا؟"

گلی میں بھیڑ لگ گئی۔

بھَل کو یہ فکر نہیں تھی کہ گلی میں ہمارے اِردگرد بھیڑ لگ گئی ہے۔ وہ مجھے دیوانگی میں گلے سے لپٹائے ہوئے تھا اور میرے بازو، ماتھا اور گال بے تحاشا چوم رہا تھا۔ اُس نے میرا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں بھر کے والہانہ انداز سے کہا "میرا چاند آ گیا، آہ تجھے کیا معلوم ان حرام زادوں سے پوچھ، میں تیرے لیے کتنا فکرمند تھا۔ یہ نطفۂ حرام کہتے تھے، استاد سالا لاڈلا بے مروت نکل گیا، کتابوں نے اُسے بگاڑ دیا، اب وہ کاہے کو تیرے پاس آئے گا۔ میں کہتا

تھا، دیکھ لینا، وہ ایک دن ضرور آئے گا۔ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ لاڈلے جانی! تو نے میری لاج رکھ لی۔" وہ سانس لیے بغیر کہتا گیا۔

گلی کا وہ حصہ لوگوں کی بھیڑ کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔ وہ سب حیرت زدہ تھے، جو لوگ پیچھے کی جانب تھے وہ اُچک اُچک کے یہ منظر دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بجھل نے ایک ذرا سانس لی تو میں نے ترنم ساری سے اُسے مخاطب کیا۔ "بجھل بھائی! میرے ساتھ ایک لڑکی بھی ہے۔" میں نے کوشش کی تھی کہ یہ بات اُس کے سوا کوئی نہ سُن سکے۔

"کہاں ہے؟" اُس نے بے تابی سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بلند آواز سے پوچھا، پھر اُس کی نگاہ خود ہی ٹیکسی میں بیٹھی ہوئی برقع پوش زریں پہ ٹھہر گئی۔ ایک لمحے کے لیے اُس کے چہرے پر تجسس کے آثار ہویدا ہوئے لیکن اگلے لمحے اُس نے زور سے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور اپنے قریب کھڑے ہوئے لوگوں کو للکارا۔ "ابے یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے، میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو! اُٹھائی گیرو! اپنی بہن کو عزت سے گھر پہنچاؤ۔"

ٹیکسی ہر طرف سے لوگوں نے گھیر لی اور چاروں دروازے کھول دیے جیسے زریں چاروں دروازوں سے ایک ساتھ برآمد ہو گی۔ انھوں نے تماش بینوں کو دور ہٹنے کے لیے ڈانٹنا پھٹکارنا شروع کر دیا۔ سیاہ برقع میں ملبوس وہ سرو قد لڑکی ٹیکسی سے اُتری تو سب کی نگاہیں اُس پر جم گئیں۔ اُس کے سرخ و سفید مرمریں ریشمیں ہاتھ عریاں تھے اور جھل مل کر رہے تھے۔ تماش بینوں کے دیدے پھٹے ہوئے تھے۔ بجھل کی آنکھوں میں خون اُتر آیا، اُس نے قہر آلود نگاہوں سے مجمع کی طرف دیکھا۔ سب نے گھبرا کے نظریں نیچی کر لیں۔ "چلو یہاں سے۔" وہ بُری طرح دہاڑنے لگا اور مجھ سے مخاطب ہو کے بولا۔ "آ لاڈلے! چل — اپنے گھر چل۔ آ، اب میں تجھے خوب جی بھر کے دیکھوں گا، آنکھیں ترس گئی تھیں۔"

زریں بجھل کے آدمیوں کی جلو میں مکان کے اندر چلی گئی تھی۔ بجھل کو قرار نہیں تھا۔ وہ کبھی میری گردن میں ہاتھ ڈالے مجھے دبوچتا تھا، کبھی پیار کرتا تھا، جب ہم دروازے میں داخل ہوئے تو ٹیکسی ڈرائیور نے خوف زدہ لہجے میں اُسے سلام کیا۔ بجھل کو اُس کا مطلب سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو بجھل نے مجھے دھکا دے دیا اور اپنی جیبیں لوٹ کر جتنے روپے برآمد ہوئے، سب ٹیکسی ڈرائیور کے ہاتھ پر دھر دیے۔ ڈرائیور نے خوف و دہشت میں کئی سلام کیے۔ ابھی بجھل چند قدم ہی اندر گیا ہو گا کہ کسی نے باہر سے ہانک لگائی۔ "استاد! یوں اندر نہ جاؤ۔ اب مٹھائی کا انتظام بھی کر دو۔"

"ابے مٹھائی!" بجھل پلٹ کے تڑپا۔ گیٹ پر ایک بوڑھا شخص مسکرا رہا تھا۔ "مر سیلا! وا! تو نے خوب یاد دلایا۔ اُس راون کی اولاد بسنتے سے جا کے کہہ دے، دکان میں جتنی مٹھائی ہو سب جھٹ پٹ اڈے پر پہنچا دے۔"

"استاد خالی خولی مٹھائی؟" بوڑھے آدمی کے برابر کھڑے ہوئے ایک ادھیڑ عمر آدمی نے کان کھجاتے ہوئے کہا۔ "سادی مٹھائی کیا مزہ دے گی۔"

"ابے تا تا تھیا بھی کرائیں گے۔ اُس کنجری لاجو سے جا کے کہہ دے، آج اڈے پر گانا ہو گا اور سُن۔ امیرے سے جا کے کہنا، پانچ بکرے لوٹ دے۔ محلے میں کہہ دیجیو آج رات سب بجھل کے مہمان ہیں۔ امیرے سے کہہ دینا اگر کمی ہوا تو اُس کی انتڑیاں نکال لوں گا۔" وہ دروازے پہ یہ احکام صادر کرتا رہا، لوگ اُس سے طرح طرح کی فرمائشیں کرتے رہے۔ وہ سُنتا رہا اور لوٹ لوٹ دیتا رہا۔ ایک آدمی نے یہ دیکھ کے گیٹ بند کر دیا، باہر شور مچنے لگا۔ گرج کے ایک موٹی سی گالی دی۔ گالی کی آواز باہر پہنچنے کی دیر تھی، سب سونگھ گیا۔ پھر بجھل کو مجھ پر توجہ دینے کی مہلت ملی۔ "تو نے داڑھی بھی اور کپڑے کیسے گندے پہن رکھے ہیں۔" وہ ناراضی سے بولا۔ "سنگ ہم کر رہا ہے۔ یہ تو کہاں اُڑن چھو ہو گیا تھا لاڈلے میاں؟" بجھل نے میری طرف اشتیاق سے مجھے دیکھا اور بولا۔ "تو نے بجھل کا کڑا امتحان لیا ہے۔"

اس حویلی نما عمارت کے اندر کا نقشہ باہر سے مختلف تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے باقاعدہ منصوبے کے تحت تعمیر کیا گیا ہے، اندر بھول بھلیاں بنی ہوئی تھیں۔ چند کمروں سے گزرنے کے بعد ہم ایک ایسے کمرے میں پہنچے جہاں ایک دروازے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ بجھل نے دری ہٹا کر ایک پتھر اکھاڑا، اندر لوہے کا ایک پہیا تھا۔ اُسے گھماتے ہی کمرے کی مشرقی حصے کی دیوار کھسکنے لگی اور پھر ایک روشن کمرہ نظر آیا۔ بجھل مجھے لے گیا اور دیوار برابر کر دی۔ اُس کمرے میں مختلف دروازے تھے۔ سفید گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ کمرے کا ایک دروازہ کھول کے بجھل مجھے دوسرے کمرے میں چلا آیا۔ یہاں مسہری بچھی ہوئی تھی اور دیواروں پر لٹکی ہوئی تھیں۔ وہ راستے بھر کچھ نہ کچھ بولتا رہا۔ عمارت کے اس پُراسرار ماحول سے مجھ پر ہیبت سی طاری ہو گئی تھی۔ اُس نے میرے کاندھوں پر زور دے کر مجھے مسہری پر بٹھا دیا اور تالی بجائی۔ "کہاں مر گئے کم بختو؟ اسے بٹھا ہوئی۔" وہ چیخ رہا تھا۔ "لاڈلے آ گیا ہے۔"

اُس کی چیخ پکار پر کئی آدمی بھاگ کے اندر آئے۔ اُن میں وہ مجھے دیکھتے ہی پھڑکنے لگا اور مسہری سے اُٹھا کے ناچنے لگا۔ اس پڑے۔ اُن میں کئی ایسے لوگ موجود تھے جو جیل میں میرے ساتھ رہے چھوٹی موٹی سزائیں کاٹ کے رخصت ہو گئے تھے۔ تھوڑی دیر میں انواع و اقسام کے پھلوں اور کھانوں کا انبار لگا دیا گیا۔ اس عالم میں کچھ کھایا پیا نہیں گیا۔ وہ سب مجھ سے ایک سوال بار بار کرتے تھے کہ جیل سے رہا ہونے کے بعد سیدھا استاد بجھل کے پاس کیوں نہیں آیا؟ بجھل کی بے تابیوں کا ذکر کر رہے تھے۔ سارٹے نے آ کے بتا دیا، اُسے ہاوڑا اسٹیشن پر ملا تھا۔ بجھل نے اشتعال میں اُسے اتنا مارا کہ وہ دن باہر نکلنے کے قابل نہیں ہو سکا تھا۔ وہ مجھے بڑھ چڑھ کے ساری باتیں بتاتے رہے اور بجھل خاموشی سے حقہ گڑگڑاتا رہا۔ پھر اچانک غصے میں آ گیا۔ "کیا یہیں بیٹھے رہو گے؟ کچھ انتظام و انتظام نہیں کرنا؟ محلے کے لوگ کہیں گے کہ لاڈلے کے آنے کے بعد بجھل اپنے وعدوں سے پھر گیا۔"

پوتوں کے بچو! اُٹھو، اُٹھو۔" وہ تلخی سے بولا۔ "محلے والوں سے کہہ دو کہ آج کسی کے گھر چولہا نہیں جلے گا، سب بجھل کے مہمان ہیں۔" بجھل کی گرج پر وہ بوکھلا کے اُٹھے۔ لالہ چلتے چلتے ناک پر انگلی رکھ کے منکنے اور جھکنے لگا۔ بجھل نے ڈانٹ کر بھگا دیا۔ کمرے میں بجھل اور میں تنہا رہ گئے۔ چند لمحے ایک اذیت ناک خاموشی طاری رہی۔ "کیا بات ہے، تو کچھ پریشان ہے؟" بجھل نے حیرانی سے پوچھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"جھوٹ!" وہ میرے بال پکڑ کے بولا۔ "خیر تو ہے؟"

"ہاں سب خیر ہے۔" میں نے اداسی سے کہا۔

وہ حقہ گڑگڑاتے گڑگڑاتے رُک گیا۔ "خیر نہیں ہے، خیر نہیں ہے لاڈلے!" اُس نے میری آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ "بتا، کیا معاملہ ہے۔ کس نے ٹیڑھی کی، میں اُس کی آنکھیں نکال لوں گا۔"

"کسی نے نہیں۔ وقت اور زمانے کی آنکھیں نکال سکتے ہو تو نکال لو۔" میں نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔

"ہاں یہ بات میرے اختیار میں نہیں ہے لاڈلے!" وہ افسردگی سے بولا۔ "وقت اور زمانہ کچھ نہیں کہتے، انھیں لوگ کسی کے خلاف بھڑکا دیتے ہیں۔ میں انھی لوگوں کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔"

"چھوڑو۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "یہاں کی سناؤ، سب لوگ خیریت سے ہیں؟ شولی، نصیب میاں، کانتے، یہ سب کیسے ہیں؟"

"میرے تو سب حرام کی کھا رہے ہیں اور عیش کر رہے ہیں۔ تو اپنی بتا، بات کیوں ہے۔ مجھ سے چھپا رہا ہے جانِ من؟" وہ شکایتی لہجے میں بولا، پھر کچھ سوچ لینے لگا۔ "میں تو بھول ہی گیا۔ تیرے ساتھ یہ لڑکی کون ہے؟"

"ایک لڑکی ہے بس، ستم رسیدہ، آفت زدہ۔"

"صاف صاف بات کر۔" وہ اُلجھ کے بولا۔

"میں اسے اغوا کر کے لایا ہوں۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں سمجھتا تھا کہ وہ اس اطلاع پر ششدر رہ جائے گا مگر اُس کے چہرے پر تاثر نہیں ابھرا البتہ وہ کچھ سوچنے ضرور لگا۔ "تو کیا کسی نے دیکھ لیا ہے؟" اُس نے بے نیازی سے پوچھا۔

"دیکھا تو نہیں ہے لیکن ...." میں کہتے کہتے جھجکنے لگا۔

"لیکن کیا؟" وہ برہمی سے بولا۔ "لاڈلے! کھل کے بات کر۔"

"بعد میں بتاؤں گا۔ اس وقت مت پوچھو۔"

"تیری مرضی، تو تھکا ہوا معلوم ہوتا ہے، اچھا ہر اندیشہ ذہن سے نکال کے دیر آرام کر لے۔ تو اب بجھل کے ہاں ہے۔ اس سے زیادہ محفوظ جگہ جیل بھی نہیں ہے اور اپنا حلیہ تو ٹھیک کر۔ بجھل کے یار آئیں گے تو کیا کہیں گے۔ ابے او لالے! او حرام کے جنے!" وہ چیخ کر بولا۔ "بلا حجام کو اور لاڈلے کے لیے نئے کپڑے لا۔"

بجھل کے حکم کی فوراً تعمیل کی گئی۔ حجام نے آ کے میری داڑھی مونچھیں صاف کر دیں۔ غسل کے لیے گرم پانی تیار کیا گیا اور ایک سفید کڑھا ہوا کُرتا اور پاجامہ فراہم کر دیا۔ جب میں نہا دھو کے اور کپڑے تبدیل کر کے باہر نکلا تو بجھل اُچھل کر کھڑا ہو گیا اور میری صورت تکتا رہ گیا۔ اُس نے آوازیں دے کے اپنے لوگوں کو بلایا اور مستانہ انداز میں کہنے لگا۔ "لو دیکھو، لاڈلے کا حسن دیکھو۔ یہ ہے لاڈلا۔ دیکھا تم نے کیسا چمک کے آیا ہے، لبے یہ کیا گھور گھور کے دیکھتے ہو۔ نظر لگ جائے گی سالو! ہے کوئی کلکتہ شہر میں ایسا جوان؟ اگر کوئی ہو تو اُسے ڈھونڈ کے میرے سامنے لاؤ، میں اُسے گولی مار دوں گا۔"

اس اثنا میں نصیب میاں بھی آ گیا تھا۔ اُس کے بالوں میں مہندی لگی ہوئی تھی۔ وہ شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے بالکل نواب لگتا تھا، وہ آتے ہی میری بلائیں لینے لگا۔ "سبحان اللہ استاد! سبحان اللہ آہا ہا! چشم بد دور، پہچانا نہیں جاتا، ستم ڈھا رہا ہے۔ رخسار پر کالا نشان لگا دو اُستاد! ہم پر بھی جوانی آئی تھی پر ایسی ٹوٹ کے نہیں آئی تھی۔"

اپنے بارے میں اُن کے تبصرے سُن کے مجھے جھینپ آنے لگی اور میرا دل چاہا کہ میں آئینے میں اپنا چہرہ جا کے دیکھوں اور یہ بھی جی چاہا کہ زریں کے پاس جاؤں۔ اب تک مجھے اُس کی کوئی خبر نہیں تھی کہ اُسے انھوں نے کہاں ٹھہرایا ہے۔ یہاں عورت کا نام و نشان نہیں تھا۔ وہ اکیلے میں گھبرا گئی ہو گی۔ نہ جانے اس پُراسرار جگہ آ کے وہ کیا سوچ رہی ہو لیکن میں اُن سب کی موجودگی میں زریں کے پاس جانے کے ارادے کا اظہار نہیں کر سکا۔ جس جس کو خبر ملتی تھی، وہ آتا جا رہا تھا۔ بجھل دوسرے کمرے میں آ گیا تھا۔ جہاں چاندنی بچھی ہوئی تھی اور گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ پھر کانتے آیا، سارٹے آیا، شولی آیا، ہرچرن آیا، تیجا، جگن میاں، بندھو اور نواس آئے اور مجھ سے بغل گیر ہوتے رہے۔ بجھل کمرے کے درمیان دیوار سے ٹیک لگائے ایک شان سے بیٹھا ہوا حقہ پی رہا تھا، میں اُس کے برابر موجود تھا۔ جو بھی آتا، بجھل میرے بارے میں اُس سے چار پانچ جملے ضرور بولتا۔ آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ سب میرے نام سے واقف تھے اور اس طرح مل رہے تھے جیسے میری اُن کی پرانی شناسائی ہو۔ سب کو ایک ہی شکایت تھی کہ میں نے جیل سے آزاد ہو کے بجھل کے اڈے کا رُخ کیوں نہیں کیا۔ صاف ظاہر تھا کہ بجھل نے اُن سے میرا اس قدر تذکرہ کیا تھا کہ اب درمیان میں کوئی اجنبیت نہیں رہ گئی تھی۔ اتنی جلدی اتنی بڑی تبدیلی ہوئی تھی کہ مجھے اپنے حواس بجا رکھنے میں دیر لگی۔ صبح تک میں نسرین بیگم کا ملازم تھا اور اس وقت کلکتے کے نامی گرامی بدمعاشوں کے درمیان بیٹھا تھا۔ وہ سب مجھ پر فدا ہو رہے تھے۔ دوپہر کا کھانا سب نے اسی کمرے میں کھایا۔ کھانے کے بعد جیل کے واقعات دُہرائے جانے لگے۔ معلوم ہوتا تھا جیسے انھیں دُنیا کا کوئی کام نہ ہو۔ وہ مجھے کرید کرید کے جیل کے واقعات یاد دلا رہے تھے اور مجھے زریں کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ پھر میں نے ہمت کر کے بجھل کے کان میں کہا کہ میں لڑکی کے پاس جانا چاہتا ہوں۔

"بیٹھ لاڈلے!" اُس نے میرا کاندھا پکڑ کے زبردستی بٹھا لیا۔ "دیکھ یہاں تیرے لیے کون لوگ آئے ہیں، وہ خیریت سے ہے، اپنی بیٹی ہے، بہن ہے۔

تیرے ساتھ آئی ہے تو اُس کے لیے تو عزت ہی عزت ہے۔ اُس کی فکر نہ کرو وہ آرام سے ہوگی۔"

"میں چند منٹ بعد واپس آجاؤں گا۔"

میں نے اصرار کیا تو وہ مان گیا: "جا دیکھ آ، پر ابھی واپس آجائیو۔" میری بے قراری پر سب شوخ نظروں سے مجھے دیکھنے لگے اور ایک دوسرے کو آنکھ مارنے لگے۔ تجمل نے بھی یہ دیکھ لیا۔ وہ انھیں گھڑکنے لگا: "تمھاری ماں سے ملنے جا رہا ہے کتو!" کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ لالہ مجھے لیے ہوئے ایک زینے پر آگیا۔ چکر دار سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میرا دل بہلنے لگا اور جسم میں پھریریاں سی اُٹھنے لگیں۔ پہلی اور دوسری منزل پر کمرے بنے ہوئے تھے، جو سب کے سب مقفل تھے۔ تیسری منزل پر لالہ نے مجھے ایک فلیٹ میں چھوڑ دیا۔ لرزتے ہاتھوں سے میں نے دستک دی۔ ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا اور تحقیق کرکے اندر آنے کی اجازت دی۔ وہ ایک معمولی فلیٹ تھا لیکن وہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ بوڑھی عورت کے ساتھ سلونے رنگ کی ایک نوجوان لڑکی بھی تھی۔ اُس نے مسکرا کے مجھے دیکھا اور اندر کے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ میں کھنکارتا ہوا اندر داخل ہوا تو زرّیں ہڑبڑاتی ہوئی پلنگ سے اُٹھی۔ اُس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ مجھے پھٹی ہوئی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔ آیا نسترن بیگم کا ملازم فقیرا اُس کے سامنے کھڑا ہے یا کوئی اور شخص؟ اُس کی تذبذب اور مضطرب کیفیت سے مجھے کچھ لطف آیا۔ میں نے مسکرا کے اُس سے پوچھا: "پہچانا میں کون ہوں؟" اُس کے ہونٹ تھرتھرانے لگے۔ "یہ میں ہوں فقیر محمد جسے نسترن فقیرا کہتی تھی۔" اُسے شاید پھر بھی یقین نہیں آیا۔ میں نے میز پر رکھا ہوا آئینہ اُٹھا کے اپنا چہرہ دیکھا۔ زرّیں کی حیرت بجا تھی۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے بھی اپنے آپ کو پہچاننے میں تامل ہوا۔ یہ چہرہ تو کسی اور شخص کا تھا، جیسے بدل گیا ہو۔ "میں وہی ہوں۔" میں نے شوخی سے کہا۔

"تم تو بالکل بدل گئے ہو۔" وہ سراسیمہ لہجے میں بولی۔

"صرف چہرہ بدلا ہے یا یوں کہو کہ ایک مدت بعد مجھے اپنا چہرہ واپس ملا ہے۔" میری آواز اچانک بھرّانے لگی۔

اُس کی حیرت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی بلکہ اُس میں اشتیاق کا اضافہ ہوگیا تھا: "فقیرے تمھارا اصلی نام ہے؟" اُس نے معصومیت سے پوچھا۔

"نہیں۔ میرا اصل نام یہ نہیں ہے۔"

"پھر کیا ہے؟" وہ تیزی سے بولی۔

"اب میں اُسے بھول چکا ہوں یہاں سب مجھے لاڈلا کہتے ہیں کچھ دن پہلے تک میرا نام ظہیر خاں تھا اور اس سے پہلے کچھ اور۔"

"اُس سے پہلے کیا تھا؟"

"وہ مت پوچھو۔" میں نے بے چین ہو کے کہا: "تمھیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟ جی تو نہیں گھبرا رہا ہے؟"

"نہیں۔ انھوں نے میرا بڑا خیال رکھا ہے جب سے آئی ہوں یہ بڑی بی اور ان کی بچی میری خاطر مدارات میں لگی ہوئی ہیں۔ انھوں نے یہ ڈھیر سی کتابیں اور رسالے بھی میرے لیے لا کے رکھ دیے ہیں کپڑے بھی دیے ہیں

"ممکن ہے تمھارا دل گھبرانے لگے مگر یقین کرو کہ وہاں ہی اچھا ہوا۔ وہ تو بہت بُری عورت ہے۔ وہ نہ جانے تمھیں کہا

"میری قسمت کی بات تھی کہ تمھیں اللہ میاں نے بھیج د نظریں کر کے کہا: "میں تمھیں کس نام سے پکاروں؟"

"جو تمھیں اچھا لگے، چاہو تو میرا کوئی اور نام رکھ لو۔ میں ا کا عادی ہو گیا ہوں۔"

"تم نے وعدہ کیا تھا کہ مجھے اپنے بارے میں بتاؤ گے کچھ مجھے بھی بتاؤ۔" وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

"کیا بتاؤں۔" میں نے کرب سے کہا: "یقیناً تمھاری یہ جستجو تم جس شخص کے ساتھ آئی ہو اُس کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور کہا نہیں جاتا۔ بس یہ سمجھ لو کہ تمھاری طرح میں بھی ایک بدنصیب میرا مقدر بھی کھوٹا ہے۔"

اُس کے سر سے دوپٹا ڈھلک گیا تھا اور گیلے بال بکھرے تھے۔ اس حالت میں وہ اتنی اچھی لگ رہی تھی کہ اُسے جی چاہتا تھا۔ دوپٹا درست کرکے وہ اپنائیت سے بولی: "تم

"بہت زیادہ تو نہیں بھوک ہی نہیں لگی۔"

"سیب کاٹوں؟" اُس نے دھیرے سے پوچھا۔

"کاٹ دو۔" میں نے سرسری انداز میں جواب دیا۔ و بنانے لگی: "تم نے یہ نہیں پوچھا کہ تم کہاں آگئی ہو اور یہ کون لو

"میں تمھارے ساتھ آگئی ہوں اور مجھے اب کچھ پوچھ نہیں ہوتی۔" اُس نے بے باکی سے جواب دیا۔

میرے جسم پر کپکپی طاری ہو گئی: "میں وہاں سے تم اب تم جہاں جانا چاہو میں تمھیں پہنچا سکتا ہوں اور اگر تم یہا بھی تمھیں سب کے سینے کشادہ ملیں گے۔" بے خیالی میں سیب گر گیا۔ میں نے سیب اُٹھا کے اُس کے سپرد کیا تو میرے ہا گر گئے۔ "یہ کیا؟ تم تو رو رہی ہو۔" میں نے حیرت سے پوچھا: " بات گراں گزری ہے؟"

اُس نے اپنا منہ پھیر لیا اور دوپٹے کے پلو سے آ بولی: "میں اب کہاں جاؤں گی۔ میں سمجھتی ہوں تم مجھے سمند

"میں نے ناحق تمھیں پریشان کیا۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ اگر تم اپنے متعلق کوئی فیصلہ کرنا چاہو تو تمھیں پورا اختیار ہے۔ مجھے ٹھیک سے بات کرنی نہیں آتی۔"

اُس نے سیب کی قاشیں کاٹ کر پلیٹ میں نے دو ایک قاشیں اُٹھا کے منہ میں رکھ لیں اور اس سے نے کوئی حرکت نہیں کی تو میں نے بے اختیار ایک قاش اُٹھا

بڑھائی اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ ہاتھ بڑھا نے اُسے اپنے منہ میں رکھ لیا۔ دیر تک ہم دونوں کے درمیان کوئی بات ہوئی جب میں اُٹھ کے چلنے لگا تو اُس نے کہا: "ممکن ہے نسترن بیگم مجھے تمھیں تلاش کرنے کی کوشش کرے، باہر نکلتے ہوئے احتیاط برتنا۔"

نسترن کے ہاں میں اُس سے بڑی روانی کے ساتھ باتیں کرتا تھا لیکن جانے کیا ہو گیا تھا۔ کہنا کچھ چاہتا تھا، کہہ کچھ جاتا۔ زبان ٹھیک سے چل ہی نہیں تھی۔ صبح ہم ایک دوسرے سے چپکے ہوئے ٹیکسی میں بیٹھ کر گئے تھے۔ اب عجیب سا فاصلہ محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے شام کو آنے کا وعدہ کرکے اُس سے ت ہونا چاہا تو وہ بھی مجھے روکنے کی ہمت نہیں کرسکی البتہ زینے تک رخصت نے آئی اور اوپر کی سیڑھیوں پر اُس نے یہ کہہ کے میرے قدم جکڑ لیے: "شام ہیے گا نا؟" میں نے نگاہ اُٹھا کے اُوپر دیکھا۔ وہ مجھے تعظیم دے رہی تھی۔ میں ی سے سیڑھیاں طے کرتا ہوا نیچے آگیا۔

❀

زرّیں کو کیا اندازہ تھا کہ میں نے اپنا کون سا کرب فراموش کرکے اُسے جہنم سے نکالا ہے۔ میں ہی اُسے لایا تھا اور مجھی کو اُس پر رشک آرہا تھا۔ جی ہا کہ اُسے واپس کرا دوں۔ جب کورا واپس نہیں آسکی تو زرّیں کو ایک محفوظ مقام پناہ حاصل کرنے کا کیا حق ہے۔ یہ کورا کی حق تلفی تھی، جسے یہاں آنا چاہیے تھا۔ نہ جانے کہاں ماری ماری پھر رہی ہے۔ یہ کون سی لڑکی درمیان میں آگئی۔ پھر سے کسی نے میرے چٹکی لی: "کورا بہت بڑے دل کی لڑکی ہے۔ اگر اُسے پتہ چلے وہ بہت خوش ہوگی کہ میں نے اُسی جیسی ایک مظلوم لڑکی کی مدد کی ہے۔"

نسترن کے ہاں چند دن میں نے محض زرّیں کی وجہ سے گزارے تھے لپنے آپ پر بڑا جبر کیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے کورا کی یاد التوا میں الی اور اپنی زندگی کے سب سے بڑے مقصد سے غافل رہا۔ زرّیں کو یہاں مطمئن دیکھ کے پھر میرے سینے میں سوزش ہونے لگی تھی۔ نسترن سے چاند میاں کا پتہ معلوم ہو چکا تھا۔ میں پہلی فرصت میں وہاں جانا چاہتا تھا۔ یقیناً اُس کی اُن غنڈوں تک رسائی ہوگی جنھوں نے مجھ سے کورا کو چھین لیا تھا۔ تجمل کے ہاں ہتھیاروں کی کمی نہیں تھی۔ یہاں آنے کے بعد متعدد مرتبہ میرا دل چاند میاں کی طرف جانے کے لیے تڑپا لیکن تجمل نے ایک لمحے کے لیے بھی مجھے اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ میں ہر جگہ ناکام ہو چکا تھا۔ اب چاند میاں ہی میری آخری اُمید تھا۔ اُسی سے کورا کا سراغ مل سکتا تھا بشرطیکہ وہ غنڈے اُسی کے خریدے ہوئے ہوں جنھوں نے دریا کے کنارے اُس سیاہ رات میں ہم پر حملہ کیا تھا۔ اگر دوسروں کی طرح اُسے بھی کورا کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہوا تو میں کبھی اُن غنڈوں تک نہیں پہنچ سکتا۔ سات سال ہیں وقت کی موٹی دیوار درمیان میں حائل ہو گئی تھی۔ چاند میاں کے علاقے میں اس وقت جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ نسترن بیگم نے سارے اور نواب مرزا کو تمام روداد سنا دی ہوگی۔ نواب مرزا کا تو بُرا حال ہوگا۔ وہ ایک طرف نسترن پر شک کر رہا ہوگا کہ اُس نے زرّیں کے دام بڑھانے کے لیے اُسے کہیں چھپا دیا ہے۔ دوسری طرف وہ میرے تعاقب میں ہوگا۔ نسترن کو بھی اس طرح سیدھے سادے انداز میں باندھ لوندھ کر چھوڑ آنے کا مجھے غم تھا۔ دل کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ کم از کم وہ آنکھیں تو پھوڑ آتا جو حسین لڑکیوں کو تکنے اور بُری نظر سے پرکھنے کا گناہ کرتی تھیں۔ کم از کم اُس کی ناک تو کاٹ آتا تاکہ دُنیا کو معلوم ہو جاتا، اس بدبخت نے کسی سے بے وفائی اور غداری کی ہے۔

تجمل کے اڈے پر شام تک سینکڑوں غنڈوں کا اجتماع ہو گیا۔ دور دور خبر پہنچا دی گئی تھی کہ آج تجمل اپنے لاڈلے کی واپسی پر جشن منا رہا ہے۔ اُس لمبی گلی میں چھڑکاؤ کر دیا گیا تھا۔ لاؤڈ اسپیکروں پر فلمی ریکارڈ بج رہے تھے۔ گلی میں رکشا اور ٹیکسی کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔ بنّے ملائی نے کئی من مٹھائی بنا کے اڈے پر پہنچا دی تھی۔ سرِ شام تجمل مجھے ساتھ لے کے مکان سے باہر آیا اور دندناتا ہوا گلی کے اِس سرے سے اُس سرے تک گیا۔ دکان داروں اور راہگیروں نے اُسے مبارک باد پیش کی اور اُس نے اپنے ہاتھ سے سب کو مٹھائی تقسیم کی۔ گلی میں شادی جیسا منظر تھا۔ میں یہ سب کچھ دیکھ کے حیرت زدہ تھا۔ تجمل سے کچھ کہنے کا سوال نہیں تھا۔ میں خاموشی سے اپنا تماشا دیکھتا رہا۔ ایسی صورت میں کیلا بگان میں چاند میاں کی طرف جانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تجمل کو ذرا فرصت ملی تو میں نے اُس سے زرّیں کے پاس چلنے کے لیے کہا۔ وہ ٹالنے لگا لیکن میں اصرار کرکے اُسے اوپر لے گیا۔ دروازہ زرّیں ہی نے کھولا۔ وہ شاید میرا انتظار کر رہی تھی۔ اب اُس نے دوسرا لباس پہن لیا تھا۔ حسبِ وعدہ مجھے موجود پا کے اُس کے چہرے پر سُرخی چھا گئی لیکن جب اُس کی نظر میری پشت پر چھپے ہوئے دیو ہیکل تجمل پر پڑی تو وہ سہم کے پیچھے ہٹ گئی۔ خوش قسمتی سے تجمل زرّیں کی یہ کیفیت نہیں دیکھ سکا تھا۔ اُس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ "تجمل بھائی آئے ہیں۔" میں نے بے تپاک آواز میں زرّیں سے کہا، وہ سمجھ گئی کہ میرے لہجے میں کیا تاکید پوشیدہ ہے۔

"آداب!" وہ اپنا ایک ہاتھ اُٹھا کے ادب سے بولی۔

"خوش رہو۔" تجمل نے اُس کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا۔ مجھے حیرت ہوئی، تجمل کا ہاتھ کپکپا رہا تھا اور وہ کچھ گھبرایا ہوا تھا۔

"اندر آئیے۔" زرّیں نے شیریں آواز میں کہا۔

"نہیں بیٹے! اب ہم چلیں گے نیچے بہت کام ہے۔" تجمل کے منہ سے یہ لفظ بہ مشکل ادا ہوئے۔

"کچھ دیر تو بیٹھیے۔" وہ شگفتگی سے بولی۔

"ہاں آئیے اندر آئیے۔" میں نے مچل کے تجمل کا ہاتھ پکڑ لیا۔ تجمل جزبز ہوتا ہوا فلیٹ میں داخل ہوا۔ باہر کے کمرے میں ایک پلنگ اور دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک کرسی پر میں، دوسری پر تجمل بیٹھ گیا۔ زرّیں کھڑی رہی۔ "ارے تم تجمل بھائی کی کچھ خاطر نہیں کر رہی ہو۔ یہ تمھارے گھر آئے ہیں بھئی۔" میں نے اجنبیت دور کرنے کے لیے زرّیں سے کہا۔

"نہیں۔" تجمل اکھڑ کے بولا۔ "لاڈلے اُسے تکلیف کیوں دیتے ہو۔"
"تکلیف کی کیا بات ہے، ابھی آپ نے مجھے بیٹی کہا ہے۔"
تجمل کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔ "ہاں میں نے یہی کہا ہے۔ تم لاڈلے کے ساتھ آئی ہو تو میری بیٹی، میری بہن ہو۔" وہ جذبات سے بھرپور آواز میں بولا۔ "تم کسی بڑے خاندان کی لڑکی معلوم ہوتی ہو۔ یہاں یہ گھر، یہ علاقہ، یہ لوگ سب گندا اور بُرا ہے پر ہمارے پاس یہی کچھ ہے۔" وہ یہ کہتے کہتے اُداس ہو گیا۔ "کچھ دنوں تک یہاں ہر تکلیف برداشت کرو، پھر میں تمھیں کوئی صاف ستھری جگہ دے دوں گا۔"
"میرے لیے یہی بہت ہے کہ یہاں آپ لوگ موجود ہیں۔"
"میں تمھارے لیے کچھ لایا بھی نہیں، پہلی مرتبہ آیا اور خالی ہاتھ آیا، خیر مجھ پر تمھارا اُدھار رہا۔"
"اب میں بری الذمہ ہوا زریں! میں نے تمھیں تجمل بھائی کے حوالے کیا۔" میں تجمل کی طرف متوجہ ہوا۔ "اور تجمل بھائی! اب زریں کا خیال تمھی کو رکھنا ہو گا۔" میں نے جوشیلے انداز میں کہا۔
"مجھ پر اتنی بڑی ذمے داری کیوں ڈالتا ہے لاڈلے؟"
"میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ زریں بے حد اچھی لڑکی ثابت ہو گی۔ یہ تمھیں بہت لذیذ کھانے کھلائے گی اور تمھارا گھر دیکھے گی، یہ تمھیں ...."
"بس بس۔" تجمل نے ترش روئی سے میری بات کاٹ دی۔ "میں بھلا اسے کام کرنے دوں گا۔ اس کے یہ نازک ہاتھ بھلا کام کرنے کے لیے بنے ہیں۔ میں کیا اس سے خدمت لوں گا، معاوضہ لوں گا۔ مجھے لالچ دیتا ہے لاڈلے؟ یہ خوش رہے، بس یہی میری لالچ ہے۔"
"ان کا مطلب یہ نہیں تھا۔" زریں جلدی سے بولی۔ "ان کا مطلب یہ تھا کہ ایک بیٹی کو اپنے ماں باپ کی خدمت کرنی چاہیے، میں اس فرض میں کوتاہی نہیں کروں گی۔"
"ہاں ہاں، تمھی اس کی طرف داری نہیں کرو گی تو کون کرے گا۔" وہ کمرے سے باہر چلی گئی تو تجمل بولا۔ "لاڈلے! کیوں مجھے کانٹوں میں گھسیٹ رہا ہے، کیوں میرے زخم کریدنے کی شرارت کر رہا ہے، بڑی مشکل سے تو اسے پتھر بنایا ہے۔" وہ اپنے دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔
"میں اپنا بوجھ کم کر رہا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں اُسے یہ احساس دلانا چاہتا ہوں کہ اُس نے کچھ کھویا نہیں، پایا ہے۔ اُسے نرمی، مرہم اور گداز کی ضرورت ہے تجمل بھائی! آپ سمجھتے کیوں نہیں۔"
"میں سب سمجھ رہا ہوں مگر میں خود سے ڈر رہا ہوں۔"
"سچ بتاؤ، کیا وہ تمھیں اچھی نہیں لگی؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔
"اچھی۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے لاڈلے! ان آنکھوں نے زمانہ دیکھا ہے۔ اچھی بُری آنکھوں کا تجربہ کرتے ہوئے عمر گزر گئی ہے۔ تو اتنی اچھی لڑکی کو یہاں لے کیسے آیا۔ یہ جگہ تو بہت بُری ہے۔"
"اور کہاں لے جاتا، میرے پاس کوئی اور چھت تھی ہی نہیں۔"
"اس چھت سے پانی ٹپکتا ہے۔ یہاں کی سیلن، یہاں کی بُو اُسے مار دے گی۔ میں یہی سوچ کے پریشان ہو رہا ہوں، وہ تو شہزادی ہے لاڈلے! شہزادی کا دل ان کھولیوں میں کہاں لگے گا۔"
"اُسے دل لگانا پڑے گا، اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔"
زریں چائے کی ٹرے لے کے اندر آئی تو ہم نے خاموشی اختیار کی۔ دیر تک پیالیاں کھنکنے کی آواز آتی رہی۔ تجمل سر جھکائے بیٹھا تھا۔ زریں نے اُسے چائے دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ اپنے خیالوں سے چونکا۔ چائے صرف دو گھونٹوں میں اُنڈیل گیا۔ "بیٹھ جاؤ۔ کھڑی کیوں ہو۔" اُس نے کہا۔ وہ سمٹ کے پلنگ پر بیٹھ گئی اور اپنے ناخن کریدنے لگی۔ "زریں! ..." لے کے بولا۔ "ہمیں کسی بڑی آزمائش میں مت ڈالنا۔" یہ کہہ کے وہ اُٹھا، تھام کے دروازے کی طرف چلا۔ زریں اُس سے کچھ نہیں کہہ سکی۔ نہ جانے کچھ خیال آیا، وہ واپس مڑا۔ کمرے میں پہنچ کے اُس نے زریں کے سر ... پھر وہاں سے نکل کے کھٹ کھٹ سیڑھیاں اُترنے لگا۔
"کیا بات ہے؟" نیچے آ کے میں نے تجمل سے پوچھا۔ "تم ... نہیں ہو؟ میں کوئی غلط لڑکی نہیں لایا ہوں۔ کسی بھی معزز اور نیک ... بیٹی ایسی ہو سکتی ہے۔"
اُس نے پلٹ کے میرے بازو جھنجھوڑ ڈالے۔ "لاڈلے ... دُکھانے والی بات کیوں کرتا ہے۔ تو کنجری بھی لاتا تو میں اُسے سر پر ... تو تو ایک فرشتہ لڑکی لایا ہے۔ سمجھ، ان دونوں باتوں میں فرق ... کی باتیں مت کر۔"
تجمل کی برہمی دیکھ کے میں نے اُس وقت خاموشی مناسب ... اندھیرے میں ڈوب رہی تھی۔ رات ہوتے ہوتے گلی میں میلے کا سماں ... کانتے اور نصیب میاں تجمل کو اُن چوکیوں پر لے گئے جو دیگوں کے قریب ... تھیں۔ گلی کے اس حصے میں ایک پرائمری اسکول تھا۔ اسکول سے ملحق ... میدان میں تیز روشنیاں ہو رہی تھیں اور ایک شامیانہ نصب تھا۔ ... چوکیوں، اسٹولوں، بینچوں اور چارپائیوں پر سیکڑوں آدمی بیٹھے ہوئے ... ناچ رہے تھے۔ مجھے اور تجمل کو ایک اونچی کرسی پر بٹھا کے ہمیں ہاروں ... سے لاد دیا گیا۔ جو آتا، اُس کے اور میرے گلے میں ہار ڈال کے چلا ... والوں میں عورتیں بھی تھیں، بچے بھی تھے۔ جب سے تجمل زریں کے پاس ... تھا کچھ متفکر اور اُلجھا ہوا نظر آتا تھا لیکن اب اُس کی شادابی لوٹ آئی ... میں زیادہ تر ہندو رہتے تھے۔ دوسرے مذاہب کے لوگوں کی تعداد بہت ... کی رات کوئی تفریق کوئی امتیاز نظر نہیں آ رہا تھا۔ تجمل کسی زندہ پیر کی ... مسند پہ شان و شوکت سے بیٹھا تھا۔ بس اتنی ہی کسر تھی کہ لوگ مریدوں ... اُس کے ہاتھ پیر نہیں چوم رہے تھے۔ اس کے باوجود اُن کی نگاہوں میں ... کے لیے جو محبت اور عقیدت تھی، وہ الگ سے پہچانی جا سکتی تھی۔ تجمل ... گلی کے ایک ایک بچے کا نام معلوم تھا۔ وہ ہر ایک کا نام لے کے اُن ...

... بیان کرتا۔ بچوں سے اُن کے والدین اور والدین سے اُن کے بچوں کا حال ... پوچھا۔ جب دیگیں کھلیں اور تمام چینی کی پلیٹیں کھڑکھڑائیں تو ایک ہنگامہ برپا ... ہو گیا۔ ایک گھنٹے تک کھانے کا زور و شور رہا۔ بوڑھی عورتیں ہاتھ پھیلا پھیلا کے ... تجمل کو دعائیں دے رہی تھیں۔ جیل میں مجھے تجمل کے آدمی اس گھن گرج کے ... متعلق بہت کچھ بتاتے تھے۔ جیل میں جو چیزیں کسی کو نصیب نہیں ہوتیں، وہ ... اُس کی وجہ سے اندر آ جاتی تھیں لیکن یہاں تو اور ہی منظر تھا۔ جو کچھ میں نے جیل میں سُنا تھا، وہ اس کا نصف بھی نہیں تھا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میرے ساتھ مذاق ... کیا جا رہا ہو اور جن خوبیوں کا میں مستحق اور اہل نہیں ہوں، مجھے انھی کا انعام دیا جا رہا ہو۔ نہ جانے یہ سب کیا اور کیوں ہو رہا ہے۔ کھانے کے بعد عورتوں ... بچوں کو رخصت کر دیا گیا۔ پھر طبلے، ہارمونیم والے ایک گول دائرے میں بیٹھ گئے۔ ایک جانب سے رنگ برنگے کپڑوں میں سولہ سنگھار کیے ہوئے تین لڑکیاں برآمد ہوئیں۔ اُن کے ساتھ ایک بوڑھی عورت بھی تھی۔ چاروں نے تجمل کو جھک کر سلام کیا اور اپنی نشست پہ جا بیٹھیں۔ قمقموں کی روشنی میں اُن کا سنگھار چمک رہا تھا۔ ... تو بہت چھوٹی سی لڑکی تھی، کوئی بارہ تیرہ سال کی ہو گی۔ دوسری سترہ سال ... کی قریب ہو گی، تیسری بیس بائیس سال کی۔ بڑی لڑکی متانت سے بیٹھی ہوئی ... تھی۔ مجھے اس سے پہلے ناچ رنگ کی کسی محفل میں بیٹھنے کا تجربہ نہیں تھا۔ میں تصور ... نہیں کر سکتا تھا کہ اتنی خوب صورت اور سلیقے کی لڑکیاں مردوں کے سامنے ... پاؤں میں گھنگرو باندھ کے آئیں گی اور گا ناچ گائیں گی۔ ان کی آواز کیسے نکلے گی، ... ناچنے کے لیے ان کے پیر کیسے اُٹھیں گے، سب سُنا ہی سُنا تھا۔ میں نے جیل ... کی سات سالہ دور میں سُننے ہی کا کام کیا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ لوگ جھوٹ بولتے ... ہیں۔ بہرحال ہارمونیم اور طبلے کی آواز گونجی تو لڑکیاں اپنی جگہ سے اُٹھیں۔ انھوں نے ... تھوڑی ہی دیر میں محفل اپنے طلسم میں جکڑ لی۔ اُن کے گھنگرو بج رہے تھے، ... جیسے شاید رقص کر رہا تھا۔ تجمل کے سامنے نوٹوں کی گڈیاں رکھی تھیں۔ بڑی ... لڑکی ہمارے سامنے آ کے ناچنے لگی۔ اُس نے خصوصاً مجھے اپنی نگاہوں کی زد پہ ... لیا۔ اُس کی آنکھیں مٹک رہی تھیں، کولھوں میں بجلی بھری ہوئی تھی۔ لمبی، ... گلاب کے پھول کے رنگ کی۔ پیشانی پر ستارے جگمگا رہے تھے۔ ... اُس کی آنکھوں میں کالا جادو بھرا ہوا تھا۔ میں اُس کی اس خصوصی توجہ سے گھبرا گیا۔ میری ... ہٹ سے اِرد گرد قہقہے اُبلنے لگے اور لوگ میرے کانوں، ناک، سر، ہونٹوں ... ہاتھوں سے نوٹ چپکانے لگے۔ رقاصہ انھیں نوچتی رہی۔ میں شرم سے ... ہو گیا۔ میری یہ حالت دیکھ کے لڑکی کو بھی شاید مجھ پر ترس آ گیا۔ اُس نے ... ہاتھ کے اشارے سے لوگوں کو منع کیا۔ وہ گا بھی رہی تھی، ناچ بھی ... رہی تھی۔ اُس کی آواز تینوں لڑکیوں میں سب سے اچھی تھی۔ ناچ میں توازن تھا، ... پیر بہکا ہوا نہیں پڑتا تھا۔ درمیان کی لڑکی کچھ زیادہ پھرتیلی اور بے جھجک ... ہوئی تھی۔ وہ میرے سامنے آئی تو جم گئی اور آنکھوں سے اشارے کرنے لگی۔ ... روپوں کی بارش ہو رہی تھی۔ اس کُھلی فضا میں مجھے حبس محسوس ... ہونے لگا۔ لوگوں کے شوق کا یہ عالم تھا کہ وہ لڑکیوں کو اپنی طرف کھینچنے کے لیے تڑپے جا رہے تھے۔ ایک نوٹ جیب سے نکالتے تھے، ابھی وہ ہٹتی نہیں تھی کہ دوسرا نوٹ نکال کے اُس کے ہاتھ پر رکھ دیتے تھے۔ میں کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ فضا میں گھنگرو کھُلے ہوئے تھے۔ ہارمونیم کی تانیں ہوا میں رچ گئی تھیں، طبلہ گرج رہا تھا اور لڑکیوں کے بدن پھڑک رہے تھے۔
تجمل مسرور بیٹھا حقے کے کش پہ کش لگا رہا تھا۔ وہ میری کمر پہ ہاتھ رکھے ہوئے تھا۔ بڑی لڑکی نوٹ اُٹھا کے بار بار اُسے سلام کرتی تھی۔ گانے کے دوران میں ایک جگہ رُک کے اُس نے مجھ سے شائستگی کے ساتھ پوچھا۔ "آپ ہمیں داد نہیں دے رہے ہیں؟" میں بوکھلا گیا اور اِدھر اُدھر دیکھ کے پہلو بدلنے لگا۔ وہ زیرِ لب مسکرائی۔ "یہ تو عام محفل ہے، کبھی غریب خانے آئیے، پھر ہم آپ کے دل کو وصول کریں گے۔" میں نے نظریں جھکا لیں۔
کانتے سینے پر ہاتھ رکھ کے اور سرد آہ بھر کے بولا۔ "کیوں زِلّو! کبھی ہم سے تو تم نے ایسے نہیں کہا۔ ہائے، تڑپتے ہی رہ گئے۔"
"ہٹو، ہم لاڈلے صاحب سے بات کر رہے ہیں۔"
"وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ لاڈلا صاحب تو سالا آج دولھا بنا ہوا ہے۔ تازہ تازہ ہے زِلّو! اس پہ بجلی گرانے کی کوشش مت کرنا۔ ہمارے ہی سینے کافی ہیں ہائے۔" کانتے نے دل پر ہاتھ مار کے کہا۔ "زِلّو! تم میری بات مان لیتیں تو آج میری دُنیا بدلی ہوئی ہوتی۔ تم نے مجھے انگاروں پر چھوڑ دیا اور اب لاڈلے کو نشانہ بنا رہی ہو۔"
"تم بالکل نہیں بدلے کانتے! تم ہمیں بہت ستاتے ہو۔"
"ہے ہے۔" کانتے دُہرا ہو گیا۔ "زِلّو تم نے بدلنے ہی نہیں دیا۔ خیر تمھاری مرضی، اب ذرا لگے ہاتھوں وہ ظالم گانا تو سُنا دو، ہم کو تمھاری نظر لینے مار ڈالا۔" وہ ہنس کر بولا۔ "ذرا انتساں وار۔"
"ہُوں۔" اُس نے ناگواری سے منہ بنایا، پھر مہذب لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "آپ بھی سُنیں گے؟"
"سنائیے۔" میں نے دھیرے سے کہا۔
"سُنائیے۔" کانتے نے میری نقل اُتاری۔ "جیسے دولھا کہہ رہا ہو قبول ہے۔"
زِلّو کے موتی جیسے دانت چمکنے لگے۔ "کانتے! تم بہت وہ ہو۔" اس نے سازندوں کو اشارہ کیا اور درمیانی لڑکی کے کان میں کچھ کہا۔ لمحوں میں ساز بدل گیا۔ طبلہ کسی اور انداز سے صدائیں لگانے لگا۔ تینوں لڑکیاں ایک ساتھ فرش پر کھڑی ہو گئیں۔ ایک نے آغاز کیا، دوسری نے آدھا مصرع اُٹھایا اور تیسری کا نمبر آیا تو محفل میں شور مچ گیا۔ اُس کی دل کش آواز پر بعض من چلے ناچنے لگے۔ تجمل کے قریب بیٹھے ہوئے تماش بین ہنس ہنس کے دُہرے ہو گئے۔ تجمل نے انگلی سے اشارہ کر کے انھیں خاموش کیا۔ زِلّو نے رقص میں کمال کر دیا۔ وہ اِس بار کسی کے پاس نہیں آئی، بس رقص کرتی اور گاتی رہی اور لوگ نوٹ پکڑے اُس کی طرف اشارے کرتے رہے۔ پھر لوگ زِلّو کی آواز کے سحر میں ایسے ڈوبے کہ ہر قسم کی آواز، چہکار بند ہو گئی۔ صرف زِلّو کی سُریلی آواز گونجتی رہی۔ جیسے اُس نے

سب کی توانائی کھینچ لی ہو۔ ابھی یہ محفل شباب پر تھی کہ سامنے سے زرشت چہروں کے کئی قوی ہیکل اشخاص اس طرف آتے نظر آئے۔ ہر ایک کی نگاہ اُن کی طرف اٹھ گئی۔ مجمع میں بھن بھناہٹ سی ہوئی اور زلو کی نغمہ سرائی پر دبی دبی سرگوشیاں غالب آگئیں۔ تجمل کے چہرے پر بے شمار لکیریں کھنچ گئیں۔ اس نے کلنتے کو اشارہ کیا، کلنتے تیزی سے اٹھ کے آنے والے اشخاص کی طرف دوڑا اور اُس نے آگے جاکے ہاتھ پھیلا کے تجمل کی نشست کی طرف اشارہ کیا۔

سب سے آگے ایک گرانڈیل شخص تھا، وہ قد میں پستہ اور جسم میں بھاری تھا۔ اُس نے کلنتے کا ہاتھ جھٹک دیا اور سینہ پھلائے ہوئے آگے بڑھا۔ زلو نے گانا روک دیا۔ ہارمونیم کی آواز سسکنے لگی اور طبلچی کے ہاتھ طبلے پر ٹھٹھر سے گئے۔ تجمل اُٹھ کے کھڑا ہوگیا۔ وہ دو قدم آگے بڑھا اور سب سے آگے آنے والے شخص کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کے بولا۔ "آؤ آؤ موجمدار! بیٹھو بیٹھو۔" اس نے اپنی نشست پر بیٹھے لوگوں کو جگہ دینے کا اشارہ کیا۔ "تم نے آکے جی خوش کر دیا۔" تجمل نے شادمانی سے کہا۔ میں بھی تجمل کے ساتھ کھڑا ہوگیا تھا۔ اُسی لمحے میری نظر موجمدار کے ساتھ آنے والے لوگوں میں سب سے پیچھے کھڑے ہوئے چاند میاں پر پڑی۔ میرا دماغ سنسنا گیا۔ کھڑے کھڑے میرا جسم لہرا گیا۔ "ہم یہاں بیٹھنے کے لیے نہیں آئے ہیں استاد تجمل!" موجمدار نے سخت لہجے میں کہا۔ "لڑکی ہمارے حوالے کر دو۔"

"کون سی لڑکی؟" تجمل کے تیور بھی بدل گئے۔

"وہ لڑکی جو آج تمھارے اڈے پر آئی ہے۔" اُس نے تندی سے کہا۔

"موجمدار!" تجمل گرج کے بولا۔ "جو آدمی تجمل کی پناہ میں آتا ہے، اُسے واپس نہیں کیا جاتا۔ اُس کی حفاظت کی جاتی ہے۔"

"دیکھو تجمل! ہم تمھارے معاملے میں کبھی نہیں بولتے۔ وہ ہمارے آدمی چاند میاں کی امانت ہے، اُسے واپس کر دو اور بات مت بگاڑو۔ ایک لڑکی کے لیے ہمیں آپس میں بگاڑ نہیں کرنا چاہیے۔"

"بگاڑ؟۔ بگاڑ تو تم کر رہے ہو موجمدار! تم دیکھ رہے ہو کہ میں اپنے لاڈلے کی واپسی کا حسین جشن منا رہا ہوں۔ تمھیں آنے سے پہلے اس بات کی احتیاط رکھنی چاہیے تھی۔ ہم کبھی تمھاری خوشیوں میں اس طرح دخل نہیں دیتے۔ آؤ یہاں بیٹھ کے گانا سنو۔"

"میں گانا سُننے نہیں، لڑکی لینے آیا ہوں۔" موجمدار کا لہجہ اور سخت ہوگیا۔

"میں تمھیں کوئی لڑکی نہیں دے سکتا۔"

"میں تمھیں سوچنے کا وقت دیتا ہوں۔"

"میں تمھیں آخری جواب دے رہا ہوں۔"

"بہت خون خرابہ ہو سکتا ہے استاد تجمل!" موجمدار قہر آلود لہجے میں بولا۔ "میری بات مان لو تمھارا آدمی لڑکی کو بھگا کے لے آیا ہے۔ نمٹنا تو ہمیں اُس سے چاہیے تھا مگر ہم سیدھے تمھارے پاس چلے آئے کیونکہ وہ تمھارا آدمی ہے۔"

"وہ میرا لاڈلا ہے۔" تجمل میری گردن میں بانہیں ڈال کے فخر سے بولا۔

"یہ ہے وہ؟" موجمدار نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیوں بے چاند میاں!"

وہ پیچھے مُڑ کے بولا۔ "پہچانتا ہے اسے؟" چاند میاں جھجکتا ہوا آگے آیا۔ مجھے غور سے دیکھنے لگا۔ میرا حلیہ بدل چکا تھا اس لیے اُسے پہچاننے میں "ابے کیا ٹکر ٹکر دیکھ رہا ہے۔" موجمدار نے اُس کی گردن پکڑ کے کہا۔ "یہی ہے؟"

"ہاں استاد یہی تھا۔ پر یہ تو نسرین کے ہاں گھر کے کام کاج تھا، مگر وہ یہی تھا۔ تو یہ کسی چال سے وہاں نوکر بنا ہوا رہ رہا تھا۔"

"ہاں۔" میں نے آگے بڑھ کے کہا۔ "حرام کی اولاد! وہ میں ہی ابھی تو نے صرف مجھے لڑکی لے جاتے دیکھا ہے۔ جب میں تجھے اُس وقت دیکھنا، ابھی میرا قرض ادا نہیں ہوا۔ میں تیری تلاش میں تھا۔ بعد میں نمٹوں گا۔" تجمل نے میرا کاندھا دبایا۔ میری درشتی پر سب چمکنے لگی تھیں، دور کھڑی ہوئی زلو کانپنے لگی تھی۔

"اپنے آدمی کی زبان بند کرو تجمل!" موجمدار غضب ناک ہو کے

"اس سے پوچھو کہ کیا یہ لڑکی اس کے باپ کی تھی۔" میں نے میں کہا۔ "یہ کہاں کا دعوے دار بن کے آگیا۔ اس سے کہہ دو واپس چلا جائے، چلا جائے گا، چلا جائے گا لاڈلے! اٹو تو خاموش رہ۔ میں اس کے بالی موالیوں کو دیکھ لوں گا۔ تو نے میری موجودگی میں بولنا شروع تجمل نے مجھے نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "چل اُدھر بیٹھ۔ گانا شروع کرو، کیوں بند کر دیا؟ لئے وہ لاجو کنجری کدھر گئی؟ گانا شروع کرو۔"

"گانا بعد میں شروع کرنا تجمل! گانے کے لیے رات پڑی ہے بات کا جواب دو۔ لڑکی واپس کرنی ہے کہ نہیں؟"

"موجمدار تم جانتے ہو کہ تجمل کو اس انداز میں بات کرنا پسند اور جب تجمل کا لاڈلا درمیان میں ہو تو تمھیں سوچ سمجھ کے بولنا چاہیے۔ جشن لاڈلے کی خاطر منایا جا رہا ہے اور اسے کم نہ سمجھنا، سات سال میرے آدمیوں نے ہر قسم کے داؤ پیچ سکھائے ہیں۔ اسے انیلامت سمجھنا۔ کوئی ہوتا تو میں تمھاری بات پر ضرور غور کرتا مگر یہ تو لاڈلے کی بات ہے۔ کسی کنجری کو پکڑ کے نہیں لایا۔ وہ ایک بڑے خاندان کی ایک شریف لاڈلا اُسے بچا کے لایا ہے۔ سمجھے موجمدار! تم اس دتے چاند میاں میں آکر آپس میں بیکار کی تناتنی پیدا کر رہے ہو۔" تجمل نے کبھی نرم لہجے میں کہا۔ "اس سے پوچھو کیا وہ لڑکی اس کی بہن تھی؟ اس کی ماں

"تو تمھارا جواب یہی ہے؟" موجمدار نے سرد آواز میں کہا۔

"جواب صاف ہے۔ کیا تمھیں لکھ کر دیا جائے؟"

موجمدار نے زمین پر پیر پٹخا۔ "ٹھیک ہے تجمل! اب ہمارا سن لو ہم سے اب کوئی اُمید مت رکھنا۔ میں تمھیں کل شام تک اور دیتا ہوں۔ سوچ سمجھ لینا۔ لڑکی شام تک آئی تو پھر تمھارے علاقے لڑکی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ ہم آزاد ہوں گے۔"

"جاؤ۔ جاؤ۔ تم تجمل سے بات کر رہے ہو۔ قسم ہے لاڈلے کی ہر لڑکی میری بیٹی ہے۔ تم نے اگر ایسی کوئی نادانی کی تو کلنتے

جائے گی۔ بس موجمدار! تم نے بہت کہہ لیا اور ہم نے بہت سن لیا۔ گانا شروع کرو زلو! موجمدار! تمھاری دوستی کا خیال ہے ورنہ میرے علاقے میں اس طرح کی باتیں کرنے والا واپس نہیں جاتا۔"

تجمل کی آواز فضا میں گرجی تو طبلے والے نے سہم کے پے در پے اور ہارمونیم والے نے جلدی جلدی ہاتھ مارنے شروع کر دیے۔ زلو کے گھنگرو حرکت میں آگئے۔ موجمدار چند لمحے ٹھہرا۔ پھر سارے مجمع کو نفرت سے گھورتا ہوا واپس جانے لگا۔ جاتے جاتے وہ دوبارہ ٹھہرا اور بلند آواز میں بولا۔ "کل شام تک تجمل! ہم کل شام تک انتظار کریں گے۔"

کلنتے، شبو، لیلا اور سارٹے وغیرہ ہاتھوں میں کھلے چاقو لیے تجمل کے ارد گرد کھڑے تھے، اُن کے جسم اکڑے ہوئے تھے۔ کلنتے نے ہاتھ اٹھایا تو تجمل نے اُس کا بازو پکڑ کے مروڑ دیا۔ کلنتے کے ہاتھ سے چاقو چھوٹ گیا اور وہ زمین پر تین چار لڑھکنیاں کھاتا ہوا ایک طرف بلکنے لگا۔ "واپس جاتے ہوئے آدمی پر ہاتھ اٹھاتا ہے بے غیرت!" تجمل نے نفرت سے کہا اور خاموشی سے اپنی نشست پر آکے بیٹھ گیا۔ اُس کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔

محفل میں سخت کشیدگی پائی جاتی تھی۔ تجمل کو اس کا احساس شاید سب سے زیادہ تھا۔ اس نے روپے لٹانے شروع کر دیے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ محفل پر بہار آگئی۔ جیسے ابھی یہاں کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ طوائفوں نے بھی رنگیلے ناچ اور گانوں سے کبیدگی دور کرنے کا کام کیا۔ پھر ہر طرف سے روپے برسات ہونے لگی۔ یہ دھومیں آدھی رات تک مچتی رہیں۔ طوائفیں روپے لوٹتے لوٹتے تھک گئیں۔ نصیب میاں میرے پاس ہی بیٹھا تبصرے کر رہا تھا اور زلو کی گائیکی پر بار بار پھڑک اٹھتا تھا۔ "اے میاں لاڈلے! دیکھتے ہو، اور عشق کرنے کو جی چاہتا ہے آہا ہا۔ کیا ستار گلا پایا ہے، پنڈا تو دیکھو، شباب امڈا پڑ رہا ہے، شراب کا پیالہ ہے، رنگ تو دیکھو ہاتھ لگاؤ تو میلا ہو جائے۔ اے جانی! دیکھتے ہو وہ تمھاری طرف آ رہی ہے۔ ذرا اپنے آپ کو سنبھال کے رکھنا، یہ آنکھیں جلا کے رکھ دیتی ہیں۔ مجھے دیکھتے ہو سارا جسم جھلسا ہوا ہے۔" نصیب میاں کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ میدان میں کود کے طوائفوں کے ساتھ ناچنے لگے۔

جاتی رات کو روشنیاں ماند پڑنے لگیں۔ سازندوں نے ساز غلاف میں لپیٹے اور طوائفوں نے پیروں سے گھنگرو کھولے۔ پھر تجمل کو آداب کرتی ہوئی وہ ٹم ٹم میں بیٹھ کے اپنے ٹھکانے چلی گئیں۔ کسی نے اب تک موجمدار کے متعلق تجمل سے بات کرنے کی جسارت نہیں کی تھی۔ سب لوگ دوبارہ راگ رنگ میں شامل ہو گئے تھے۔ صرف میں ایک ایسا شخص تھا جو یہاں نہیں بیٹھا تھا بلکہ تصور میں چاند میاں کا تعاقب کر رہا تھا۔ بار بار میرا ہاتھ اُس کے گریبان تک جاتا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے نوکرانی بیٹھی تھی۔ میری تپتی رگوں میں خون کھول رہا تھا۔ وہ کوئی اور شخص تھا جو نصیب میاں کے تبصرے سن رہا تھا اور زلو کا ناچ دیکھ رہا تھا۔ وہ سموچا آدمی نہیں تھا، آدھا آدمی تھا۔

اڈے پر واپس آکے تجمل اپنے پلنگ پر ڈھے گیا۔ میں سامنے دھری ہوئی کرسی پر خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ "کیا تو اُدپر جاکے سوئے گا؟" تجمل نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"تم کیا سمجھ رہے ہو؟" میں نے جھنجلا کر کہا۔

"تو کاہے کو منہ لٹکائے بیٹھا ہے پیارے! اب آرام کر، دن بھر میں تھک گیا ہوگا۔" وہ انگڑائی لے کے بولا۔

"میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"کیا موجمدار کا خیال آگیا ہے؟" تجمل بے پروائی سے بولا۔

"میں نے یہاں آکے بُرا کیا۔" میں نے یاسیت سے کہا۔ "میں اگر اسے لے کے کہیں اور نکل جاتا تو یہ نوبت نہ پہنچتی۔"

وہ اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ "ادھر آ لاڈلے! یہ تو کیا بک رہا ہے اور کس زبان سے بک رہا ہے۔ تو میرے پاس نہ آتا تو اور کہاں جاتا۔ میں نے تیرا برسوں انتظار کیا ہے۔ اب آیا ہے تو ایسی باتیں کرنے لگا۔ تو میرا دل دکھا رہا ہے۔ تیرے لیے تو میں نے نہ جانے کیا کیا سوچ رکھا تھا۔ تو سب کچھ خاک میں ملائے دے رہا ہے۔"

"میرا یہ مطلب نہیں ہے، تم غلط سمجھے۔" میں نے ندامت سے کہا۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ ایک لڑکی کسی بہت بڑے ہنگامے کا سبب بن سکتی ہے اور یہ سب میری وجہ سے ہوگا۔"

"ہوگا تو کیا ہوگا۔" وہ بگڑ کے بولا۔ "ابے کیا دنیا کو سر منڈے والی کی سلائی سمجھ لیا ہے۔ یہ کتے کی دُم ہے۔ تو نے تو میرا جی خوش کیا ہے لاڈلے! اگر تیری پروا میں نہیں کروں گا تو اور کون کرے گا۔ تیری غلطی میری غلطی ہے۔ بس چپ رہ اور زیادہ بات نہ کر۔"

"تم نہیں سمجھتے، وہ لڑکی مجھے راستے میں مل گئی تھی۔"

"ہر شخص کسی نہ کسی کو کسی نہ کسی راستے ہی میں ملتا ہے۔ یہ راستے اسی لیے ہیں لاڈلے کہ لوگ ایک دوسرے سے ملا کریں۔ وہ لڑکی کہیں بھی ملی ہو، اب تو ہماری عزت ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر..." میں کہتے کہتے رہ گیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر۔" وہ چڑ کے بولا۔ "لاڈلے میاں! تو جو بات کہنا چاہتا ہے، وہ مجھے معلوم ہے، یہ جو تو گھٹا گھٹا رہتا ہے۔ اپنے آپ میں گم۔ یہ صرف اس وجہ سے ہے کہ تو دل کھول کے بات نہیں کرتا۔ میں نے یہ بات جیل ہی میں محسوس کر لی تھی۔ میں جانتا ہوں، یہی لڑکی تھی نا وہ جس کے لیے تو نے اُس اُچکے کریم گل کو مارا تھا؟ جسے تو یاد کرتا رہتا تھا؟"

"نہیں۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "یہ لڑکی وہ نہیں ہے۔ تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میں کہہ رہا ہوں کہ یہ لڑکی تو مجھے راستے میں مل گئی۔"

تجمل چونک کے مجھے گھورنے لگا۔ "ابے تو بات صاف صاف کر۔"

میں نے سوچا تجمل کو ساری بات بتا دوں کہ وہ لڑکی کون تھی لیکن

یہ مجھے اچھا نہیں لگا۔ میں نے اپنی زبان کی لگام تھامی اور کہا: "میں اُسے تلاش کر رہا ہوں۔"

"وہ کہاں ہے؟ مجھے بتا۔ وہ ہندوستان، ایران توران کے کسی کونے میں ہو، میں تیرے لیے اُسے لا دوں گا۔"

"یہی تو مجھے نہیں معلوم۔" میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

"کوئی اتا پتا؟ کوئی نشانی؟" اُس نے میرا ہاتھ کھینچ کے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا اور میرے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ "کیا وہ بہت خوب صورت تھی؟ تیری پسند ہے تو ضرور کوئی بات ہوگی۔"

"وہ بہت خوب صورت تھی۔" میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"تُو نے اُسے کب سے نہیں دیکھا؟"

"جب سے میں جیل گیا ہوں، سات سال سے زیادہ ہوگئے۔" میری آواز بھیگ گئی۔ میں نے اپنا سر جھکا لیا۔

"اے لاڈلے! ارے لاڈلے! ابے تُو تو بہت تھُڑدلا ہے، ہائیں! لگتا ہے یہ مَرد ہو کے روتا ہے! ابے یہاں نہ جانے کیا کیا گزر گیا۔ ہمیشہ آنکھوں کو مات دے دی۔ جب بھی آنکھوں نے کمزوری دکھائی، کسی دوسری طرف دیکھنے لگے۔ آنکھوں کو دھوکا دے دیا۔ میری جان مجھے بتا، وہ کون تھی؟ کہاں تھی اور کیسے تجھ سے دُور ہوگئی؟ کچھ تُو نے بتایا، کچھ کریم گل کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ تیرے ساتھ ایک بہت خوب صورت لڑکی تھی جس پر اُس نے بُری نظر ڈالی تھی۔ جیل میں آنے کا واقعہ تُو نے دوسرا سنایا، میرا خیال ہے تو مجھ سے جھوٹ بولتا رہا۔ بتا دے اُسی لڑکی کا چکر تھا نا؟ کسی کا نام بھی جانتا ہے، اُسے کون لے گیا؟"

"نہیں نہیں، کچھ نہیں، میں کچھ نہیں جانتا۔" اگر چاند میاں موجبدار کے ساتھ یہاں نہ آتا تو شاید میں ہتھّل کو چاند میاں کا نام بتا دیتا یا شاید پھر بھی نہ بتاتا۔

ہتھّل گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ "لاڈلے! مگر ایک بات تو بتا، تو چاند میاں کو دیکھ کے اتنا کیوں بھڑک گیا تھا؟ سبھی کو اس پر حیرت ہوئی تھی۔ اُس پر تیرا کون سا قرضہ ہے جو تجھے ادا کرنا ہے؟ اشارہ تو کر، اُسے ابھی اُٹھوا لوں۔"

مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ "وہ تو ... وہ تو زریں کا معاملہ تھا۔" میں نے ہچکچاہٹ سے کہا۔ "زریں کے ساتھ اُس نے زیادتی کی تھی۔"

"نہیں کچھ اور بات بھی ہے۔ تُو چھپا رہا ہے۔"

"میں کچھ نہیں چھپا رہا ہوں۔" میں نے تلخی سے کہا۔ میری تلخی دیکھ کے ہتھّل چپ ہوگیا۔ اگر میں اُس سے یہ کہہ دیتا کہ چاند میاں ہی وہ شخص ہے جس نے نسرین سے کورا کا سودا کرنا چاہا تھا اور مجھے یقین ہے کہ اُسی نے ہمارے پیچھے بدمعاش لگائے تھے تو ہتھّل اپنے قول کے مطابق صرف چند ساعتوں میں چاند میاں کو یہاں میرے قدموں میں ڈال سکتا تھا۔ چاہے بعد میں اُسے موجبدار کے آدمیوں سے کتنا ہی بڑا فساد مول لینا پڑتا مگر مجھے یہ بتاتے ہوئے کچھ کمزوری محسوس ہوتی تھی۔ جرم کا احساس ہوتا تھا۔ جیسے میں نے کورا کو رسوا کر دیا ہو۔ میں ایک کمزور آدمی ثابت ہوا، کورا کا بوجھ نہیں اُٹھا سکا۔ جیسے میں ہار گیا اور میری آگ بجھنے لگی اور مجھ سے کچھ بن نہ سکا تو میں نے اپنی مدد کے لیے لوگوں کو بُلا لیا۔ ابھی کچھ پتہ نہیں، کورا کہاں ہو؟ کس حال میں… اگر اُس کا نام طشت از بام ہو جائے گا تو وہ کیا کہے گی۔ مجھے ایک ہلکا… محسوس ہوتا تھا اور اگر خدا نہ کرے کورا کا حال کچھ انھیں معلوم ہوا تو ایک… ملے ہے۔ پھر اُس رات انھوں نے مولوی صاحب کو ختم کر دیا تھا۔ اس… ہوئے معاملے میں ہتھّل اور اُس کا گروہ پڑ گیا تو نہ جانے کیا ہو جائے۔ میں تو… دیکھتا رہ جاؤں گا اور لوگ تماشا دیکھیں گے۔ میں نے ہتھّل کو کچھ نہیں بتایا… وہ جانتا تھا کہ میں اُس سے کچھ چھپا رہا ہوں۔

"سُن میرے طوطے!" ہتھّل فیصلہ کُن انداز میں بولا۔ "اب یہ بات کُھل کے سامنے آگئی ہے کہ تُو ہتھّل کے جنگل کا جانور ہے۔ اب تُو اپنے… کوئی قدم اُٹھانے کی نادانی نہ کرنا۔ موجبدار کے لوگ تیلا نہیں موتتے۔ تو کوئی… ویسی بات کرنے سے پہلے مجھ سے مشورہ کر لینا۔ اپنے پاس بھی لوگوں کی… نہیں ہے۔"

"اور نسرین کے متعلق تم نے کیا سوچا ہے؟" میں نے اُس کا دھیان… ہٹانے کے لیے کہا۔ "فرض کرو، موجبدار کے آدمی پاگل پن کرنے لگیں؟"

"ہم وقت پر سوچتے ہیں جانو! پہلے سے سوچتے تو یہاں نہ بیٹھے ہوتے… شمار بھی آدمیوں میں ہوتا۔ وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔" وہ جماہی لے کے بولا۔ "اب سو جا۔ تُو تو آتے ہی پریشان ہونے لگا۔ ابھی کچھ دن آرام کر۔ تیرے پیروں کے گھٹے، میں نے دیکھ لیے ہیں۔ نہ جانے کہاں کہاں مارا مارا پھرتا رہا ہے۔" وہ چادر تان کے لیٹ گیا۔ میں کچھ دیر تک وہاں بیٹھا رہا، پھر… کے برابر کے کمرے میں آگیا۔ ہتھّل نے بڑی آسانی سے کہہ دیا تھا کہ… جاؤں۔ میرے لیے سونا اور کھانا اتنا آسان ہوتا تو پھر بات ہی کیا تھی… جیسے تیسے زہر مار کر لیتا تھا۔ جیل سے آنے کے بعد بھوک اور نیند… ہوگئی تھی۔ میں نے اپنی مالا کے دانے پڑھنے شروع کر دیے اور باقی رات… اُسے اپنے چہرے پر رکھ کے کھیلتا رہا۔ صبح سویرے مُرغوں کی بانگ… کسمساتا ہوا اُٹھا۔ ہتھّل سو رہا تھا۔ میری ایک ذرا سی آہٹ پر وہ بیدار ہو…

"کون ہے؟" اُس نے ہڑبڑا کے پوچھا۔

"میں ہوں اور کون؟" میں نے مختصر جواب دیا۔

اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ "نیند نہیں آ رہی ہے؟"

"صبح ہوگئی ہے۔" میں نے تندی سے کہا۔

"ابے یہ کیسی جوانی ہے۔ جا سو جا۔" وہ کروٹ لے کے بولا۔

میں دبے قدموں چلتا ہوا اُس چاقو کے نزدیک پہنچا جو ہتھّل… رکھا ہوا تھا۔ جب ہتھّل کی گہری سانسیں تواتر کے ساتھ شروع ہوگئیں… یقین ہوگیا کہ وہ سو گیا ہے۔ میں پنجوں کے بل اُس کے سرہانے کے…

…گیا۔ پھر میں نے دھیرے دھیرے پلنگ کی طرف ہاتھ بڑھانا شروع کیا۔ …اتنا چوکنا تھا کہ ہتھّل کروٹ بدلنے کی کوشش کرتا تو میں ایک لمحے میں …ہاتھ پھلانگ کے اُس سے دُور جا پہنچتا۔ اب میرا ہاتھ چاقو چھونے لگا …اور میں نے اپنی سانس روکی ہوئی تھی۔ جیسے ہی میں نے چاقو اُٹھایا …نے کروٹ بدلی، میرا دل اُچھل کے حلق میں آگیا لیکن میں ایک جست …اُس کے پلنگ سے چند قدم کے فاصلے پر آنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ …نے پھر آنکھیں کھول دیں اور خشمگیں نظروں سے مجھے گھورا۔ نیم تاریک …ے میں اُس کی سُرخ سُرخ آنکھیں دو چراغوں کے مانند جل رہی تھیں۔

"…ری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے کیا؟" وہ بے چینی سے بولا۔

"نہیں، میں ذرا سویرے اُٹھنے کا عادی ہوں۔"

"ہاں جیسے میں تو تیری عادتیں جانتا نہیں۔ ایک ایک بات کی خبر …تا تھا۔ جب تیرے ساتھ جیل میں نہ رہا تو لوگوں سے پوچھ لیا کرتا تھا۔"

"میں باہر جا رہا ہوں، کچھ دیر ٹہل کے آ جاؤں گا۔"

"اکیلے مت جانا، تھوڑی دیر میں کوئی جاگ جائے گا۔"

"تم مجھے بالکل بچہ سمجھتے ہو۔"

"تو میرے لیے ابھی تک بچہ ہے۔ مجھے یاد ہے، جب تیری مسیں بھی …ں بھیگی تھیں اور تُو ڈرا ڈرا سہما سہما سلاخوں کے اندر بیٹھا تھا۔ یاد ہے نا؟"

"ہاں یاد ہے مگر میں ڈرا ہوا تو نہیں تھا۔"

"ہاں! تُو شیر کا بچہ ہے۔ تُو نے کانتے کو پچھاڑا، کریم گل کو چت کیا، …ڑکے کو بے بس کیا اور رات بھی تیری زور دم زور دیکھ لی۔" وہ نیند سے اُٹھ …اس طرح باتیں کر رہا تھا، گویا سویا ہی نہ ہو۔ میں نے اپنی پُشت پر چاقو …پا لیا تھا۔ ہتھّل پھر اونگھنے لگا تو میں موقع دیکھ کے چپکے سے باہر نکل آیا۔ …وازہ بند تھا۔ نصیب میاں برآمدے میں سو رہا تھا اور دوسرے لوگ …ھر اُدھر پلنگ ڈالے پڑے تھے۔ میں نے کنڈی کا جائزہ لیا تو اندازہ ہوگیا …سے کھولنا آسان نہیں ہے، سب جاگ جائیں گے اور شور سن کے ہتھّل …اندر سے آ جائے گا۔ باہر دروازے پر چوکیدار بھی ہوگا۔ جلد ہی مجھے اپنی …لی کا احساس ہوگیا۔ میں دوبارہ ہتھّل کے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ جاگ گیا …میرے پہنچتے ہی مسکرا کے مجھے دیکھنے لگا اور اُٹھ کے باتھ روم کی طرف …پڑا۔ میں نے اُس کا چاقو تکیے کے نیچے رکھ دیا اور دوسرے کمرے میں …تکیے پر سر ٹکا دیا۔ جب باہر آوازیں آنے لگیں تو میں اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ ہتھّل برآمد… چائے پی رہا تھا اور ایک لڑکا اُس کے جسم کی مالش کر رہا تھا۔ نصیب میاں …کے قریب کھاتے گالیاں کھرے ہوئے بیٹھا تھا، چائے کی پیالی اُس کے …نے بھی رکھی تھی۔ مجھے دیکھ کے نصیب میاں نے آواز لگائی۔ "ابے چھوکرے! …ے لاؤ۔ اپنا خورشید نکل آیا ہے۔"

مالش سے نمٹ کے ہتھّل نہانے چلا گیا اور میں نے نصیب میاں کو …رکے کسی نہ کسی طرح ایک چاقو حاصل کر لیا۔ نصیب میاں نے مجھے پانچ روپے …ے دیے، اُس کی آنکھ اوجھل ہونے کی دیر تھی کہ میں سامنے والے دروازے سے نکل کے بھاگا۔ یہ مکان دو طرف سے کُھلتا تھا۔ کچھ اور دروازے بھی یقیناً ہوں گے جو ابھی میرے علم میں نہیں آئے تھے۔ جس دروازے سے میں باہر نکلا، وہاں ایک تنگ گلی سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی دُور تک چلی گئی تھی۔ گلی کے درمیان دوسری گلیوں میں جانے کے لیے مختصر راستے بھی بنے ہوئے تھے۔ مکان سے کچھ فاصلے تک تو میں آہستہ آہستہ چلا۔ رات کے تماش بینوں کی مجھ پر نظر پڑی تو انھوں نے جگہ جگہ مجھے سلام کیا لیکن اگلے چند منٹوں میں میں دوسری پھر تیسری اور پھر بڑی سڑک پر تھا۔ میں نے سوچا، پہلے جا کے نسرین کا حال کیوں نہ پوچھوں لیکن ٹیکسی میں بیٹھتے ہی میں نے کیلا بگان کا نام لیا۔ نصیب میاں نے الماری سے نیا اور تیز دھار والا لمبا چاقو مجھے دیا تھا۔ میں نے چاقو نیفے میں اُڑس لیا تھا۔ ہتھّل کے گھر سے کیلا بگان کا فاصلہ خاصا تھا۔ ٹیکسی آڑے ترچھے راستوں سے گزرتی ہوئی آخر کیلا بگان کے علاقے میں پہنچ گئی۔ چاند میاں جیسے لوگوں کا پتہ چائے خانوں، پان فروشوں یا حجام کی دُکانوں سے آسانی کے ساتھ مل جاتا ہے۔ تین چار دکانوں پر تگ و دو کے بعد مجھے اُس کے مکان تک پہنچنے میں دشواری نہیں ہوئی۔ یہ متوسط درجے کے فلیٹوں کا علاقہ تھا۔ کوئی عمارت بڑی تھی، کوئی چھوٹی۔ ایک ایک منزل کی عمارتیں بھی بنی ہوئی تھیں۔ چاند میاں کا گھر نسبتہً پُرسکون جگہ واقع تھا۔ اچھا خاصا صاف ستھرا علاقہ، گاڑی رکھنے کی جگہ بھی بنی ہوئی تھی۔ اِرد گِرد خاموش اور بے نیاز عمارتیں تھیں۔ مجھے احساس تھا کہ چاند میاں اپنے پیشے کے لحاظ سے عام مکانوں سے ذرا مختلف مکان میں رہتا ہوگا۔ یہ دو منزلہ عمارت تھی۔ گیٹ کے ساتھ چاروں طرف لمبی دیوار کھنچی ہوئی تھی۔ میں نے پہلے عمارت کے گرد ایک چکر لگایا۔ پیچھے کی گلی میں بھی ایک راستہ تھا۔ میری دستک پر مسخ چہرے کی ایک عورت نے دروازہ کھولا اور منہ بنا کے پوچھا: "کس کو مانگتا ہے؟"

"چاند میاں کو۔" میں نے تحمل سے جواب دیا۔

"چاند میاں کو؟" اُس نے پھر مجھے سر سے پیر تک غور سے دیکھا اور بولی: "وہ تو آج کل خالی بیٹھا ہے، اُس کے پاس کیا رکھا ہے؟"

"مجھے اُس سے ملنا ہے۔" میں نے تیزی سے کہا۔

"کیا آپ باہر سے آیا؟" میرا لباس دیکھ کے اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولی: "پٹنہ سے کہ ڈھاکا؟"

میں نے تنگ آ کے جواب دیا: "لکھنؤ سے۔"

"کب آیا؟" وہ پُرشوق لہجے میں بولی۔

"کل رات آیا۔" میں نے تلملا کے کہا۔

اُس نے آنکھ ماری۔ "اندر آؤ۔" میں نے اُس سے دوبارہ چاند میاں کی موجودگی کے بارے میں پوچھا۔ وہ مجھے اندر لے گئی اور ایک آراستہ کمرے میں بٹھا کے چند لمحوں بعد ایک گداز بدن کی ادھیڑ عمر عورت کو ساتھ لے آئی۔ عورت مجھ پر تیز نظریں ڈالتی ہوئی آہستہ قدموں سے آگے بڑھی اور معنی خیز انداز میں بولی۔

"چاند میاں بھی اپنا عزیز ہے۔ ہم بھی تمہاری خاطر تواضع میں کمی نہیں کریں گے۔ جو کام تم کو چاند میاں سے لینا ہے، وہ ہم سے کہہ کے دیکھو۔"

"مجھے چاند میاں سے ملنا ہے۔" میں نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مل لینا اُس سے بھی۔ یہاں بھی قدر دان لوگ رہتے ہیں ذرا چائے وغیرہ تو پی لو۔ دانی! دوڑ کے چائے لاؤ۔"

"کیا چاند میاں یہاں نہیں رہتا؟" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے بٹھا لیا۔ "چاند میاں کا مہمان اپنا مہمان ہے۔" وہ کھسک کے میرے قریب آگئی اور رازداری سے کہنے لگی "کچھ لینے آئے ہو؟" میں نے مضطرب ہو کر پہلو بدلا اور ابھی کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ وہ مسکرانے لگی "تو کچھ دینے آئے ہو؟"

اسی اثنا میں ایک نوجوان شوخ لڑکی اپنے حال سے بیگانہ ہانپتی ہوئی اندر آئی "کیا آپ نے مجھے بلایا ہے؟"

"ہاں میں نے چائے کے لیے تمھیں آواز دی تھی دیکھو ایک مہمان آیا ہے ناشتے وغیرہ کا انتظام کرو۔" اس نے تکلف سے کہا۔ لڑکی ناخن منہ میں لیے مجھے مڑ مڑ کے دیکھتی ہوئی چلی گئی۔ پھر عورت نے لاکھ مجھے روکنے کی کوشش کی مگر میری سمجھ میں ساری بات آگئی تھی۔ میں نہیں رُکا میرے چلتے چلتے وہ کہنے لگی "چاند میاں سے بات نہ بنے تو یہ دروازہ کھلا ہے میرا نام دینا ہے۔" میں پیر پٹختا ہوا باہر آگیا۔ وہ ساری عمارت چاند میاں کے ہم پیشہ لوگوں سے آباد تھی۔

خوش قسمتی سے تیسرا دروازہ خود چاند میاں نے کھولا اور مجھے اپنے سامنے دیکھ کے سکتے میں رہ گیا "تم؟" وہ رعشہ زدہ آواز میں بولا۔

"ہاں میں۔" میں نے پھرتی سے چاقو نکال کے کھٹ سے ننگا کر دیا۔

"تم کیوں آئے ہو؟" وہ گھگیا کے بولا۔

میں نے اُس کے منہ پہ ایک مکا مارا اُس کا سر دیوار سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

"میں ایک پرانا حساب چکانے آیا ہوں۔" میں نے تھوک کر کہا۔

"کیسا حساب؟" اُس کی نظریں چاقو پر جمی ہوئی تھی۔

"پُرانا حساب ہے۔"

"تمھیں غلطی ہوئی ہے مجھ سے نسترن بیگم بھی کہہ رہی تھی کہ تم کسی سات سال پرانی بات کا ذکر کر رہے تھے۔" وہ خوشامدانہ لہجے میں بولا۔

"وہ بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی اور تم بھی بالکل ٹھیک سمجھے ہو۔ بات تمھارے لیے پرانی ہے مگر میرے لیے بالکل نئی ہے۔ مجھے بتاؤ وہ لڑکی کہاں ہے؟"

"تم کس لڑکی کا ذکر کر رہے ہو؟ یہاں تو لڑکیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے تمھیں سات سال پہلے کبھی دیکھا ہو۔" وہ اپنے ہوش و حواس پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"میں تمھیں ساری بات یاد دلائے دیتا ہوں اگر تمھیں آسانی سے یاد نہیں آیا تو یہ چاقو تمھارا حافظہ کرید کے تمھیں یاد دلا دے گا۔ میں تمھارے چہرے کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ یاد ہے تم نے اور اُس کمین کی بچی سجی بی نے سات ساڑھے سات سال پہلے نسترن بیگم اور کریم گل سے سینما گھر میں ایک کم عمر لڑکی کا سودا کیا تھا۔ تمھارے نسترن اور کریم گل کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا کہ میرے ساتھ برقع میں ایک حسین لڑکی موجود ہے۔ جب میں ہوٹل سے فرار ہو گیا تو کریم گل نے ہمارا تعاقب کیا مگر وہ ہمیں ڈھونڈنے میں ناکام رہا۔ میں نے سجی بی کی ہوس ناک نظریں دیکھ لی تھیں۔ تم نے شکست قبول نہیں کی تلاش کرتے رہے اور آخر تم نے ہمارا سراغ لگا ہی لیا۔ اُس رات ہم تینوں دریا کے کنارے سیر کے لیے گئے تھے تو تمھارے آدمیوں نے... کچھ یاد آیا؟ یہ ایسا واقعہ نہیں ہے جو تم آسانی سے بھول سکو۔ ایک کانسٹیبل اور تمھارے دو آدمی مارے گئے تھے، باقی دو بدمعاش بھاگ گئے ہو۔ میں وہی قرضہ چکانے آیا ہوں۔ افسوس ہے چاقو وہ نہیں اور اس کی دھار بھی پہلے والے چاقو سے تیز ہے اور اب مجھے اس فن بھی آتا ہے۔"

اُس کی آنکھیں پھٹ گئیں وہ خوف سے ایک قدم پیچھے ہٹا۔ میں نے چاقو کی نوک اُس کی گردن پہ ٹکا دی "چاند میاں! میں جاننا چاہتا ہوں وہ لڑکی کہاں ہے؟"

"مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں نے تمھارے پیچھے بدمعاش نہیں..."

"تمھارے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ میں کریم گل کو بھگت چکا ہوں۔ آخری آدمی ہو جس کے پاس میں ہر طرف سے مطمئن ہو کے آیا ہوں۔ کچھ صاف صاف بتا دو شاید اس طرح تمھاری جان چھوٹ جائے۔ مجھے صحیح و سلامت واپس مل گئی۔"

"لڑکی کہاں ہے، مجھے لڑکی کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں میں بڑی سے بڑی قسم کھا سکتا ہوں۔"

"تمھاری قسمیں؟ چاند میاں!" میں نے چاقو کی نوک اُس میں چبھو دی۔ "میں قسمیں سننے نہیں آیا ہوں لڑکی کا پتہ بتاؤ باقی..."

"لڑکی۔ لڑکی نہیں ملی، لڑکی نہیں ملی تھی۔" وہ کانپتے ہوئے...

"لڑکی گئی کہاں؟" میں نے چیخ کر پوچھا۔

"لڑکی۔ مجھے یاد آیا ٹھہرو ٹھہرو، بتاتا ہوں جب دونوں کانسٹیبل کی سیٹیوں کی آواز سنی تو لڑکی کو چھوڑ کے بھاگ گئے اور میاں کے پاس رہ گئی۔"

میری سانس رک گئی "کیا تم بھی اُن کے ساتھ تھے؟ کرو چاند میاں! ذہن پر زور ڈالو۔" میں نے اُس کے پیٹ میں ایک گھونسا مارتے ہوئے کہا۔ میرا دوسرا ہاتھ چاقو سمیت اُس کی گردن پر تھا۔ وہ بلبلا اُٹھا۔

"میں اُن کے ساتھ نہیں تھا لیکن انھوں نے آکے مجھے یہ..."

"سچ سچ بتاؤ چاند میاں! جھوٹ کا نتیجہ برا ہو گا۔ ناک..."

"میں تم سے سچ کہہ رہا ہوں۔ میں اپنی ماں..." وہ ماں والا تھا لیکن میری آنکھوں کی سُرخی دیکھ کے اُس کی زبان منقلب...

"ممکن ہے انھوں نے لڑکی تم سے چھپا لی ہو؟"

"وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ میں نے بہت دنوں تک اُن کا... مگر ٹھہرو، ہو سکتا ہے ایسا ہی ہوا ہو کیونکہ ایک آدمی نے کچھ دنوں... بتایا تھا۔" وہ ہانپ ہانپ کے بولا۔

"یہ چال بازی کا وقت نہیں ہے۔" میں نے اپنے جوتے سے اُس کے پاؤں کی انگلیوں پر ضرب لگائی۔ وہ ایک زمین کھڑاؤں پہنے ہوئے تھا۔ "کون تھے وہ آدمی؟"

"وہ بہت معمولی آدمی تھے، کرائے کے آدمی۔"

"اُن کا تعلق کس گروہ سے تھا؟"

"کسی سے نہیں۔ وہ چار پانچ آدمیوں کا ایک چھوٹا سا گروہ تھا۔ مگر ہاں ایک آدمی موجمدار کے گروہ میں شامل ہے۔" اُس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

"مجھے اُس کے پاس لے چلو۔ اگر بات صاف نہ ہوئی تو میں تم دونوں کو ایک ساتھ جہنم رسید کر دوں گا۔ جھوٹ اور فریب سے کام نہیں بنے گا چاند میاں! تم مجھے نہیں جانتے۔ میں اس وقت تمھیں زندگی اُدھار دے رہا ہوں، چلو۔" میں نے اُس کی ناک پر مکا مارتے ہوئے کہا۔ ناک سے خون بہنے لگا۔ چاند میاں بُری طرح گھبرا گیا تھا۔

"میں وہاں جا کے کیا کروں گا۔" وہ تھرتھراتے ہوئے بولا۔

"تمھارے سامنے بات ہو گی چاند میاں! آج کا دن تمھاری زندگی یا موت کا دن ہے، چلو۔" میں نے دروازے کی طرف اُسے دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا زینے پر گرا۔ میں نے چاقو جیب میں رکھ لیا۔ چاند میاں کی حالت ایسی تھی کہ اُس کے لیے میرے ساتھ خاموشی سے چلے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے گھونسے نشانوں پر لگائے تھے۔ وہ اپنا پیٹ پکڑے ہوئے تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھ کے وہ میری خوشامد کرنے لگا۔ چاقو کی دھار دوبارہ دکھانے پر وہ کہیں چپ ہوا۔

چاند میاں میرے ساتھ تھا۔ کورا کو مجھ سے جدا کرنے والا شخص، چاند میاں جس نے وہ سہانی اور سنہری رات گرمی اور تیرگی میں بدل دی تھی۔ اُس وقت مجھے کچھ ہوش نہیں تھا۔ میرے جسم میں جنگل جل رہا تھا۔ میری رگیں چیخ رہی تھیں۔ ٹیکسی کی رفتار سست تھی یا مجھے سست محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ڈرائیور کو گاڑی تیز چلانے کا حکم دیا۔ چاند میاں مجھے اُس شخص کے پاس لے جا رہا تھا جس نے کورا کے نازک ہاتھوں کو اذیت دینے کا جرم کیا تھا۔ میں نے طے کیا تھا کہ میں پہلے اُس کے دونوں ہاتھ کاٹ ڈالوں گا کیونکہ وہ ہاتھ کورا پر اُٹھے تھے اور وہ آنکھیں نکال لوں گا جنھوں نے کورا پر بُری نگاہ ڈالی تھی اگر اُسے کورا کا پتہ معلوم ہوا۔ اگر اُس نے بتا دیا کہ کورا کہاں ہے۔ اگر اُس نے بتایا بھی تو وہ کوئی اچھی جگہ نہیں ہو گی۔ میں تو وہاں جاتے جاتے راستے میں دم توڑ دوں گا۔ اے کاش وہ انکار کر دے کہ دے کہ کورا اُن کے ہاتھ نہیں آئی تھی۔

گاڑی تنگ گلی کے ایک بڑے مکان کے سامنے رُک گئی۔ چاند میاں اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کے کرایہ ادا کرنا چاہتا تھا مگر میں نے ٹیکسی والے کو حکم دیا کہ وہ ہمارا انتظار کرے۔ ٹیکسی والا صورتِ حال بڑی حد تک سمجھ چکا تھا، خاموش ہو گیا۔ مکان کی ڈیوڑھی میں دو چار ایسے آدمی موجود تھے جن کے پیشے چہروں پہ لکھے ہوئے تھے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے آگے بڑھنے میں کچھ تامل ہوا کہ چاند میاں مجھے کسی اور جگہ تو نہیں لے آیا لیکن اب میں ڈیوڑھی میں داخل ہو چکا تھا۔ چاند میاں کو اندر بھیج کر اُس بدمعاش کا انتظار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ فرار کا اس سے اچھا موقع چاند میاں کو پھر کب نصیب ہوتا۔ میں نے چاقو ہاتھ میں رکھ لیا۔ مختصر ڈیوڑھی میں تین چار آدمیوں نے درشتی سے ہمیں دیکھا اور حقارت سے زمین پر تھوک کے رہ گئے۔ اگر میں تنہا ہوتا تو وہ مجھ سے ضرور باز پرس کرتے مگر میرے ساتھ چاند میاں تھا اور اُس نے یقیناً کوئی اشارہ کیا تھا اسی لیے اُن کے ہماری طرف بڑھتے ہوئے قدم رُک گئے۔ جب ہم آگے نکل گئے تو وہ کچھ فاصلے کے ہمارے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ میں نے چاقو کھول لیا اور چاند میاں کا ہاتھ پکڑ کے اُسے اس کی پشت سے لگا دیا۔ چاقو کی نوک اب چاند میاں کی ذرا سی غیر ضروری حرکت کی متحمل نہ ہوتی۔ یہ مکان مجھل کے مکان جیسا پیچیدہ تو نہیں تھا مگر عمارت اور ہیبت میں اُس سے کچھ کم بھی نہیں تھا۔ ڈیوڑھی میں پہنچتے ہی میں نے آگے پیچھے اِدھر اُدھر سونگھنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے پوچھنا چاہا کہ وہ کہاں جا رہا ہے لیکن مجھ سے اپنی یہ ہتک نہیں ہو سکی میری نہیں تو کم سے کم یہ اُس چاقو کی ضرور ہتک تھی جو میرے ہاتھ میں مچل رہا تھا۔ اب جہاں بھی آگئے تھے، ٹھیک تھا۔ ایک دروازہ عبور کر کے ہم ایک بڑے ہال میں آگئے۔ ہال کا درمیانی حصہ کھلا ہوا تھا۔ چاروں طرف ستونوں پر ایک بڑا پختہ سائبان بنا ہوا تھا اور اندر۔ ہر طرف کمرے تھے، جیسے ہندوؤں کی کوئی دھرم شالہ۔ سائبان کے اندر کمروں کے آگے اِدھر اُدھر چوکیاں پڑی تھیں اور دو تین پارٹیاں تاش کھیل رہی تھیں۔ درمیان میں ایک چوکی پر موجمدار بیٹھا ہوا تھا۔ ایک لڑکا اُس کی پنڈلیوں کی مالش کر رہا تھا، دوسرا کاندھے دبا رہا تھا۔ وہ ایک بنیان اور دھوتی میں بیٹھا اینڈ رہا تھا۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کو پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔ اس نے ایک لڑکے کو ہاتھ، دوسرے کو ٹانگ مار کے پرے دھکیل دیا اور پشت سیدھی کر کے مجھے حیرت سے دیکھنے لگا۔ "اُستاد موجی!" چاند میاں نے لرزتے ہوئے فریاد کی۔ "بینی کہاں ہے؟"

"کون بینی؟" موجمدار نے کڑک کے پوچھا۔

"بینی، بینی، اپنا بینی اُستاد!" چاند میاں نے مظلوم آواز میں کہا۔

موجمدار نے چند لمحے توقف کیا پھر اُس کے ہونٹ مسکراہٹ سے چمکنے لگے۔ "بینی۔ ہاں بینی۔ بینی کی تجھے کیا ضرورت پڑ گئی چاند میاں؟ ہم سے بات کر۔"

"لاڈلے کو بینی کی ضرورت ہے۔" چاند میاں نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"ہم جو یہاں بیٹھے ہیں آ اِدھر آکے بیٹھ۔"

"اُستاد بینی کا پتہ بتا دو وہ اس وقت کہاں ہو گا؟"

موجمدار نے اپنی دھوتی کی طرف اشارہ کر کے گالی دی اور کہنے لگا۔ "میں تو سمجھا تھا مجھل نے صبح صبح لڑکی بھیج دی ورنہ لاڈلے اور مجھل سے تو شام کو بھینٹ ہوتی۔"

"وہ شام کبھی نہیں آئے گی موجمدار!" میں نے بلند آواز میں کہا۔

"خیر وہ تو شام کو دیکھا جائے گا۔ ہم جو وقت دیتے ہیں اُس سے پہلے

ہتھیار اٹھانا پاپ سمجھتے ہیں۔ تمام تک لاڈلے سے ہماری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تو بتا کیسے آیا؟ یہ مینی کا کیا معاملہ ہے؟ ذرا سمجھ میں آنے والی بات کر۔"

"استاد موجی! لاڈلے کو مینی کی تلاش ہے۔"

"کیوں؟ لاڈلے کو ہمارے آدمی کی ایسی کیا ضرورت پڑ گئی؟"

"یہ اس کا اور لاڈلے کا پرانا معاملہ ہے۔" اس معاملے میں تم نہ بولو۔" چاند میاں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "بتاؤ استاد! مینی کہاں ہے؟"

"ارے مینی بھی آجائے گا سالا، وہ کدھر جائے گا۔ آ لاڈلے ادھر آ کے بیٹھ۔ تو پھل کا لاڈلا ہے تو اپنا بھی لاڈلا ہے۔"

"موجدار! اس بدمعاش کو میرے حوالے کر دو۔" غصے میں چاقو کی نوک چاند میاں کی کمر میں لگ گئی۔ وہ چیخ پڑا۔ پیچھے آنے والے آدمی دروازے پر کھڑے ہو گئے تھے، چوکیوں پر تاش کھیلنے والے بھی سائبان میں کھڑے ہوئے تھے اور انھوں نے اپنے اپنے چاقو کھول لیے تھے۔

"یہاں تو سب بدمعاش ہیں لاڈلے! ذرا رسان سے بات کر۔ یہ پھل کا اڈا نہیں ہے۔ چاند میاں کو چھوڑ دے۔"

"چاند میاں کو اس وقت تک نہیں چھوڑا جا سکتا جب تک مینی کو سامنے نہ لایا جائے۔" میں نے کڑوے لہجے میں کہا۔

"چھوڑ دے۔ میں بولتا ہوں اسے چھوڑ دے۔ جرات کرنی ہے مجھ سے کر۔" موجدار نے اپنی آواز پرسکون رکھنے کی ناکام کوشش کی۔

"میں اسے نہیں چھوڑوں گا، پہلے مینی کو بلاؤ۔"

موجدار چوکی سے اٹھ کھڑا ہوا اور میرے قریب آ کے بولا۔ "میں بولتا ہوں، کھیل مت خراب کر۔ تو جیسے آیا ہے اسی طرح تجھے عزت کے ساتھ واپس کر دیا جائے گا۔ ہم تجھ سے یہاں کچھ نہیں کہیں گے ورنہ پھر پھل کو کیا منہ دکھائیں گے۔"

"میں تمھارے پاس نہیں آیا، یہ جانور مجھے دھوکے سے یہاں لایا ہے۔ میں اسے لے کے جا رہا ہوں، معلوم ہوتا ہے تم بھی مینی کو نہیں جانتے ورنہ معاملہ اتنا نہ بڑھاتے۔"

"مگر چاند میاں ہمارے پاس کسی امید سے آیا ہے۔ یہ ٹھیک جگہ آیا ہے اور ہمارا آدمی ہے، ہم اسے تجھے کیسے واپس کر دیں؟"

"پھر تم کل رات لڑکی کو لینے ہمارے پاس کیوں آ گئے تھے؟ تم جانتے تھے کہ اسے پھل نے پناہ دی ہے۔"

"وہ لڑکی ہمارے علاقے سے اٹھائی گئی ہے، چاند میاں بھی ہمارا آدمی ہے۔ میں پھل کے علاقے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ جا تو ابھی بچہ ہے، پہلے پھل سے پوچھ کہ بات کس طرح کی جاتی ہے۔ پھل نے رات ضرور سوچا ہوگا اور شام تک وہ لڑکی ہمارے حوالے کر دے گا۔"

"ہونہہ۔" میں نے حقارت سے کہا۔ "پھل کبھی ایسا سنگ دل نہیں ہو سکتا۔ وہ لڑکی اپنی مرضی سے آئی ہے، اسے جبراً نہیں اٹھایا گیا۔"

"پر یہ تو شام کی بات ہے، اس سے پہلے کوئی بات کرنا ہے کا رہے۔ مجھے مجبور نہ کر، تیرے ساتھ اگر زیادتی ہوئی ہے تو میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ چاند میاں اور مینی کو ضرور سزا دی جائے گی۔ ان کا حقہ پانی بند کر دیا..."

"میں چاند میاں کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔" میں نے چاقو رکھتے ہوئے اسے دھکا دیا۔ "چل آگے بڑھ۔" چاند میاں کرب ناک انداز میں...

"تو اسے نہیں لے جا سکتا۔" موجدار نے غصے سے کہا اور... اوپر کیا۔ اچانک ایک جانب سے اس کی سمت چاقو پھینکا گیا۔ اس نے... سے اپنے ہاتھ میں اس کا قبضہ لے لیا اور اسے بار بار فضا میں اچھال... کی دھار پر انگلی پھیرتے ہوئے بولا۔ "چھوڑ دے۔"

"تم اسے زندہ حاصل نہیں کر سکتے۔" میں نے پھرتی سے چاقو... کے سینے پر تان لیا۔ "یہ تمھارا آدمی ہو یا کسی اور کا، اب یہ میرے قبضے... میں اسے مارنا نہیں چاہتا لیکن تم نے اگر ضد کی تو میں اسے وقت... ختم کر دوں گا۔"

"الو کے پٹھے!" موجدار نے بھڑک کے کہا۔ "تو یہاں سے زندہ... نہیں جانا چاہتا۔ میں تجھے سوچنے کے لیے وقت دیتا ہوں۔"

"الو کے پٹھے تم ہو موجدار! میں یہاں اپنی جان ہتھیلی پہ رکھ... ہوں، جان کی پروا تم جیسے لوگ کرتے ہیں۔ مجھے جانے دو اور دورِ... زیادہ دیر چاقو کھلا رکھو گے تو اسے زنگ لگ جائے گا۔"

"تو سیدھی طرح نہیں مانے گا۔ میں موجدار ہوں، کلکتے میں کو... موجدار کا نام نہیں جانتا۔"

"میرا اصل نام بھی تمھیں معلوم نہیں ہے اور میرے سینے میں... ہے وہ تمھاری آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں موجدار! مجھے پہچاننے کی... تم بہت بڑی غلطی کر رہے ہو۔ میں وقت سے پہلے تمھیں آگاہ کرتا... کو نہ تم لڑکی حاصل کر سکتے ہو نہ چاند میاں کو یہاں روک سکتے ہو۔ اگر... تمھاری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے تو میں اسے واضح کر سکتا ہوں۔"

موجدار کا پارۂ غضب انتہا کو پہنچ گیا۔ اس نے اپنا چاقو اٹھایا ہی تھا کہ میں نے اپنا چاقو چاند میاں کے سینے میں اتار... نے ایک فلک شگاف لرزہ خیز چیخ ماری۔ اس کا جسم تڑپا، پھڑ... اسے موجدار کی طرف پھینک دیا۔ موجدار کے اٹھے ہوئے ہاتھ پر... گئی تھی۔ وہ سکتے میں رہ گیا۔ پورے مکان میں چاند میاں کی دم تو... کراہوں کے سوا کوئی آواز، کوئی آہٹ نہیں تھی۔ پھر موجدار کے... میرے گرد اپنا گھیرا تنگ کر لیا۔ "ہٹ جاؤ استاد! ہم اس سے سمجھ..." ایک طویل قامت شخص آگے آیا۔ اس کی ناک اور نچلا ہونٹ کٹا... آنکھ کے نیچے بھی چاقو کا ایک گہرا نشان تھا جس نے اس کی... کر دی تھی۔

"اسے سنبھالو موجدار!" میں نے سرد آواز میں کہا۔

موجدار کو کچھ ہوش آیا۔ اس نے تیزی سے آنکھیں... اور اپنے آدمیوں کو دور ہٹنے کا اشارہ کیا۔ "میں خود اس سے نم...

...نے ہاتھ اٹھایا۔ "دور کھڑے رہو۔ تم اس پر کئی نشان ڈال دو گے اور ...پھل کے سامنے شرمندہ کرو گے۔ ہاں لاڈلے! ہتھیار ڈالنا ہے یا مرنے ...ار ہے؟"

"موجدار! تم نے ابھی اس کا حشر دیکھ لیا ہے اور پھر تکرار کی حماقت ...ہے ہو۔ جھکتے کیوں ہو، ہاتھ اٹھاؤ۔"

موجدار نے پھر ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ وہ اس انتظار میں رہا کہ پہلے ...وار کروں۔ ایک طرف چاند میاں کی لاش پڑی تھی۔ اس نے ٹھوکر سے ...چند قدم دور کر دیا۔ اس کے آدمی لاش کھینچ کے سائبان میں لے گئے۔ ...خون آلود ہو چکا تھا۔ میں پوری طرح چوکنا کھڑا تھا۔ جب موجدار نے ...کے میری پسلی میں چاقو اتارنا چاہا تو میں اس کا رخ بھانپ کے ...زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کا ہاتھ فضا میں لہرا گیا مگر اس نے حیرت انگیز پھرتی ...مجھے ٹھوکر ماری۔ میں بیٹھے بیٹھے فرش پر لوٹ گیا اور ابھی سنبھلنے کی ...کوشش کر رہا تھا کہ موجدار میرے سر پہ پہنچ گیا۔ جب اور کوئی صورت سمجھ میں ...نہ آئی تو میں نے اس کی ٹانگ میں چاقو مار دیا۔ وہ بس ایک ثانیے کے لیے ...ڈگمگایا۔ چاقو اس کی ٹانگ میں ٹھیک سے پیوست نہیں ہوا تھا۔ اس نے ...رفتاری سے جھک کے میری گردن پر وار کر دیا۔ چاقو میرے شانے کا ...گوشت کاٹتا ہوا گزر گیا۔ شانے میں درد کی ایک شدید لہر ابھری۔ میری ...آنکھوں کے سامنے دھندلاہٹ سی آ گئی۔ میں نے اپنی بینائی بحال رکھنے ...کے لیے سر جھٹکا۔ موجدار کا خیال ہوگا کہ ضرب شدید لگی ہے۔ اس نے پہلے ہی ...اعلان کر دیا تھا کہ وہ ایک ہی وار میں میرا کام تمام کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے ...آدمیوں کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھنے لگا لیکن میں اس مختصر ترین عرصے ...میں پیچھے ہٹ کے ایک زقند میں کھڑا ہو چکا تھا۔ موجدار نے اپنی جگہ ٹھیر ...کر ایک بار پھر مجھے چاقو پھینکنے کا حکم دیا۔ خود اس کی ٹانگ سے خون نکل رہا تھا۔ ...وار کرنے کے لیے پر تولے۔ موجدار کے کوشش کا کوئی عالم نہیں رہا تھا۔ ...کھلی جگہ حرکت کرتے ہوئے ایک دوسرے کو تول رہے تھے۔ اس ...کے زخم سے خون رس رہا تھا اور میرے شانے سے خون بہتا ہوا پیٹ تک ...پہنچ چکا تھا۔ اس نے نت نئے پینترے بدل کے مجھ پر وار کیے اور میں نے ...استاد کے تعلیم کیے ہوئے تمام نکتے آزمائے۔ دیر تک ہم دونوں کے تمام ...وار خالی جاتے رہے۔ دونوں محتاط ہو گئے تھے۔ موجدار کو بخوبی اندازہ ہو گیا تھا ...کہ اس کا مقابل کون ہے۔ کیا ہوا جو میرے جسم کی چادر پر اس کے ساتھیوں ...جیسے داغ دھبے نہیں تھے۔ موجدار کے دل میں کوراہیں میٹھی تھی جو اس ...کی آنکھیں شناسا امید بھری نظروں سے دیکھتی۔ موجدار کا سینہ خالی تھا۔ اسے کوئی یاد ...آتا ہوگا؟ میرا تو جسم سلگ رہا تھا، چنگاریاں اٹھتی رہتی تھیں اور اب ...شعلے پھوٹ رہے تھے۔ وہ کس سے جنگ کر رہا تھا؟ ایک تازہ آدمی ...میں ایک انگارا آدمی سے۔ دیر ہو گئی تو وہ جھلا گیا اور جھلاہٹ میں میری ...جانب جھپٹ کر دوبارہ پسلی پر حملہ کرنے کے لیے چیتے کی تیزی سے بڑھا۔ اس طرح اس نے میری مشکل آسان کر دی۔ میں نے خود کو ذرا سی جنبش دے کے اسے چکرا دیا اور اس کا چاقو والا ہاتھ پکڑ کے اس کا پورا جسم ایک طرف گھسیٹ لیا۔ وہ جھونک میں آتا ہوا دیوار سے ٹکرایا۔ یہی موقع تھا جب میں اس کے سینے میں پورا پھلکا اتار دیتا مگر اس نے کمال کیا۔ دیوار پر جگنو کی طرح چمکا اور زخمی شیر کی طرح بپھر کے مجھ پہ دوڑا۔ ادھر میں بڑھ چکا تھا۔ ہمارا ٹکراؤ درمیان میں ہوا۔ اس کا چاقو والا ہاتھ میں نے اپنے ہاتھ پر روک لیا مگر میرا چاقو اس کے کولھے میں پیوست ہو گیا۔ خون کا ایک فوارہ چھوٹ پڑا۔

یکایک سائبان میں کھڑے ہوئے موجدار کے لوگوں میں کھلبلی مچ گئی۔ ایک شور ہوا۔ ہم دونوں کو کسی اور طرف دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔ گمان ہوا کہ پولیس آ گئی ہے۔ میں نے اچٹتی نظر سے دیکھا، پھل، کانتے، لالہ شولی اور دوسرے لوگ چہروں پر غیظ و غضب بکھرائے کھڑے تھے۔ سب کے ہاتھوں میں کھلے ہوئے چاقو چمک رہے تھے۔ موجدار کے آدمیوں نے پھل اور اس کے آدمیوں پر حملہ کرنا چاہا تو اس نے گالی دے کے انھیں منع کیا۔

"پھل اپنے لاڈلے کی لاش لینے آیا ہے۔"

ادھر پھل کے ساتھی جامے میں نہیں تھے، وہ میری طرف بڑھنے کے لیے بے چین تھے۔ پھل نے انھیں روک دیا۔ "ٹھیرو سور کے بچو! دیکھتے نہیں میرے لکھنؤ بالک کے تیور کیا ہیں۔ دولھا بنا ہوا ہے، یہ بجلی اس میں کہاں سے آ گئی۔ صبح تک کیسا سست اور ڈوبا ہوا بیٹھا تھا۔ ہاں میرے شہزادے! دکھا دے بہتر واں ہاتھ، بس اب دیر ہی کتنی رہ گئی ہے۔"

موجدار کے جسم کا نچلا حصہ لہولہان ہو گیا تھا۔ پھل کے آنے کے بعد اس میں کچھ اور تیزی آ گئی۔ اس نے تڑپ کے ایک بار پھر میرے پہلو پہ وار کیا۔ میں پھرکی کے مانند گھوم گیا اور اپنے چاقو پر اس کا وار روکا۔ اگر ایک لمحے کی بھی غفلت ہو جاتی تو اس کا چاقو میرے دل میں ترازو ہو جاتا۔ جب اس نے یہ وار خالی جاتے دیکھا تو میرے چاقو پہ زور دیتا ہوا وہ اپنا چاقو آہستہ آہستہ میرے چاقو پر گھسنے لگا۔ میں نے ہاتھ پر اپنی پوری طاقت صرف کرتے ہوئے اسے پیچھے دھکیل دیا اور جست لگا کے دائیں جانب ہو گیا۔ "جیتے رہو میرے بادشاہ!" اسی لمحے پھل کی آواز گونجی۔ پھل کی آواز پر موجدار کے لوگوں نے موجدار کا حوصلہ بڑھانا شروع کر دیا۔ پے در پے حملوں کی ناکامی کے بعد موجدار کی پیشانی پر پسینہ بہنے لگا تھا۔ شاید کولھے کی ضرب شدید تھی۔ اس کے چہرے پہ درد و کرب کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ یہ دیکھ کے میں نے اسے میدان میں نچا نچا دیا۔ وہ ایک ماہر چاقو باز تھا۔ اس کے بھاری جثے میں ایسی پھرتی تھی جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

آخر وہ وقت آ گیا جب اس کے ہاتھ بہکنے لگے۔ وہ زمین پہ ڈھیر ہو گیا۔ چاقو کا صرف دستہ باہر رہ گیا تھا، باقی سب کا سب اس کے سینے کے اندر تھا۔ اس کے آدمی اس کی طرف دوڑے۔ اس نے ایک کراہ کے ساتھ مجھے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ میں سمجھا کہ شاید وہ کراکے بارے میں کچھ جانتا ہے

اور آخری وقت میں اُسے ایک نیکی کا خیال آگیا ہے۔ اُس کا لرزتا ہوا ہاتھ میری کمر کی جانب اُٹھا اور اُس نے میرا کُرتا پکڑنے کی کوشش کی "تو تجمل کا لاڈلا ہے" اُس نے کراہ کر کہا، کہتے ہی اُس کی گردن ڈھلک گئی۔

موجدار کے آدمی اُس کی لاش پر جھکے ایک ناقابلِ بیان کیفیت سے دوچار تھے۔

"اپنے ہتھیار ڈال دو۔" تجمل کی آواز نے انھیں چونکا یا۔

اُن سب کا رُخ ایک آن میں تجمل اور اُس کے ساتھیوں کی طرف ہوگیا۔ کانتے، شولی اور لالہ نے مجھے اپنے بازوؤں میں بھر لیا تھا۔ وہ اپنی آستینوں سے میرا پسینہ اور خون پونچھ رہے تھے۔ "ابھی ہم زندہ ہیں استاد تجمل! موجدار مر گیا مگر اُس کا نام لینے والے ابھی زندہ ہیں۔" وہ طویل قامت پُرہیبت شخص جو موجدار سے پہلے میری طرف بڑھا تھا، اپنا چاقو لہرا کے اور سینہ پھُلا کے بولا۔

"گھوشی۔" تجمل کی آنکھیں خون اُگلنے لگیں۔

"تجمل فیصلہ ہو چکا ہے اور ہم یہ فیصلہ دل سے قبول کرتے ہیں، بس اپنے لاڈلے کو یہاں سے لے جاؤ، لڑکی بھی تم اپنے پاس رکھو۔ موجدار کا اڈا اُس کے نام پر چلتا رہے گا۔"

"اور کوئی احسان کرنا ہو تو کر دے۔"

"یہ احسان نہیں، لاڈلے کا انعام ہے۔"

"انعام۔" تجمل زمین پر تھوک کر بولا۔ "راجا جی انعام دے رہے ہیں، سُنا تم نے کانتے، راجا جی نے انعام کا اعلان کر دیا ہے۔" وہ ہنسنے لگا۔

"تجمل بات نہ بڑھاؤ۔" گھوشی نے دبنگ لہجے میں کہا۔

"ہتھیار رکھ دے گھوشی!" تجمل نے نرمی سے کہا۔

"اور تم کیا چاہتے ہو؟"

"لو۔ یہ پوچھتا ہے اور میں کیا چاہتا ہوں کیا مجھے جتانا پڑے گا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔" تجمل نے تمسخر سے کہا۔

"تم ہم سب کو مجبور کر رہے ہو۔"

گھوشی کے ہاتھ میں کھلا چاقو تھا۔ تجمل کے ہاتھ خالی تھے، اس کے باوجود وہ آہستہ آہستہ گھوشی کی طرف بڑھنے لگا۔ "ہاں گھوشی! میں تم سب کو مجبور کر رہا ہوں۔" تجمل نے ایک ہی جست میں جادوئی انداز میں اُس کا چاقو چھین لیا۔

موجدار کے تمام ساتھیوں نے اُس کے قدموں پر چاقو ڈال دیے۔ صرف گھوشی کھڑا رہا۔ تجمل نے گھوشی سے چھینا ہوا چاقو بے نیازانہ پھر اُس کی طرف اُچھال دیا جسے گھوشی نے اپنے ہاتھ پر لے لیا۔ "گھوشی!" تجمل نے پیار سے اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "مجھے تیری بات پسند آئی۔ میں تیرا خیال رکھوں گا۔ اب اِس لاش کا بندوبست کر، فرش صاف کروا اور سب بھول جا۔ سُنا؟"

گھوشی نے اپنا چاقو بھی اُس کے قدموں میں ڈال دیا۔ تجمل بڑھ کے اُسے گلے لگا لیا۔ پھر تجمل میری جانب گھوم کے مجھے حیرت و اشتیاق سے دیکھنے لگا۔ اُس کی پلکیں لرز رہی تھیں۔ میرا لباس ... نے مجھے اپنے سینے میں جکڑ لیا۔ "جانی! لاڈلے جانی! گو تجمل ... چھیڑ کرتا ہے۔"

میں نے اپنی گردن اُس کے شانے پر ٹکا دی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اُس نے مجھے اپنی گود میں اُٹھا لیا۔ "کوئی ہے۔ کوئی ..." وہ بلند آواز میں بولا۔ "جو میرے لاڈلے جیسا جوش رکھتا ہو۔"

سب نے تجمل کے گرد گھیرا ڈال دیا اور مستانہ وار میرے ہاتھ ... سب کے کپڑے خون سے لال ہو گئے۔

ہر شخص باری باری مجھ سے بے تابانہ بغل گیر ہوا ... سے بھینچا، پھر دوسرا اُسے کھینچ کے اُس کی جگہ خود لے لیتا۔ سبھوں نے دستوں میں گرا لیے تھے۔ موجدار کے تمام ساتھیوں کے چاقو قدموں میں پڑے تھے۔ تجمل نے مجھے کانتے کے حوالے کر کے موجدار ... خاموشی سے چادر ڈال دی۔ چاند میاں کی لاش ننگی پڑی رہی۔ "لا... تجمل کی بھاری آواز عمارت میں گونجی۔ "چل اولو! اس بکے بچے! اور قد... سب گھوشی کا ہاتھ بٹاؤ۔ ابے گھو گھو کے کیا دیکھ رہے ہو، وہ کوئی ... اب سب اپنے ہیں۔ موجی کی لاش پوری عزت سے ٹھکانے لگا... مت کروا دینا۔" تجمل کی ...

تجمل کی آواز پر عمارت میں افراتفری سی مچ گئی۔ موجدار ... کے سائبان کے تخت پر ڈال دی گئی اور چاند میاں کی زمین پر ... بالٹیاں فرش پر بہائی جانے لگیں۔ تجمل موجدار کے ہر آدمی کے کند... اور اُسے گلے لگا تا رہا۔ اُس نے ایک ایک دو دو جملوں میں سب سے کچھ ... نے چاقو تجمل کے قدموں میں ڈال دیے تھے، اُن کے چاقو واپس ... "سب ٹھیک ہے؟" تجمل نے بلند آواز میں پوچھا۔

"سب ٹھیک ہے استاد!" لالے نے جوش میں ...

"چپ بے۔" تجمل نے اُسے جھڑک دیا۔ "ہاں گھوشی! کام ... گا یا مجھے یہاں ٹھہرنا پڑے گا؟"

"نہیں استاد! تم جاؤ، لاڈلے کے زخم لگا ہے جلد کے ... کراؤ، ہم سب نمٹا لیں گے۔" گھوشی کے لہجے میں اُداسی شامل تھ...

"میں یہی چاہتا ہوں گھوشی! بعد میں تجھے شکایت نہ ... کے ساتھ وہ نہیں کیا جو اُسے کرنا چاہیے تھا۔ تو جنیا چاہے کر ... ہو تو بات کر لے۔"

"استاد! اتنا ذلیل مت کرو۔" گھوشی نے تلخی سے کہا: "... اُستادوں کے پاؤں دباتے ایک ٹائم ہو گیا ہے۔ جو ہونا تھا، وہ ... جی دار اور بات والا آدمی تھا استاد! ہم نے چاقو تمھارے قدمو...

... اور زبان دے دی ہے۔"

تجمل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ گھوشی کی بات سُنی اَن سُنی کرتا ہوا کانتے ... پاس آیا، اُسے اشارہ کیا اور میری گردن میں ہاتھ ڈال کے دروازے میں آگیا۔ ... ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ کانتے، تجمل اور میں ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے، باقی ... دوسری ٹیکسی میں بیٹھے۔ تجمل کے آدمیوں کی بڑی تعداد موجدار کے اڈے ہی ... تھی۔ اُن میں بعد میں پہنچنے والے آدمی بھی شامل تھے۔ شاید جس کو خبر ... تجمل موجدار کی طرف گیا ہے، وہ اسی طرف آتا گیا۔

گاڑی گلیوں سے گزرتی رہی۔ تجمل گم صم سا بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اپنے ... حرکت دی تو وہ چونکا اور مجھے خود سے قریب کر کے بولا۔ "کیا حال ہے شیرا؟"

"ٹھیک ہوں۔" میں نے آہستگی سے جواب دیا۔

"وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔" وہ تیز و تند لہجے میں بولا۔ "ہم نے تو ... بہن رکھی تھیں لاڈلے! ہم تو مر گئے تھے نا۔ تو نے ہمارا بھی کچھ خیال نہیں کیا۔"

میں نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے لیکن الفاظ میرے ہونٹوں پہ لرز ... گئے۔ اُس نے خاموشی اختیار کر لی اور ڈرائیور کو گاڑی تیز چلانے کا حکم دیا۔ ... کانتے اگلی نشست پر کسی خیال سے بہک گیا۔ "اُستاد! سالے لونڈے ... جواب نہ کر دیں۔" اُس نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ "کوئی کُتے کا بچہ کم اصل ... ل جائے۔"

"ابے تو ڈھونڈتا ہے وہاں جو تیری بہن کے یار چھوڑے ہیں، وہ کس لیے ...؟" تجمل چمک کر بولا۔ "میں نے اُن سے کہہ دیا ہے کہ بات بدلی تو نقشہ بدل ... گا۔" تجمل کے تیور دیکھ کے کانتے کو کچھ اور کہنے کی ہمت نہیں پڑی۔ ٹیکسی ... پیچ گلیوں کے چکر کاٹتی ہوئی تجمل کے اڈے پہنچ گئی۔ مکان میں اچھی خاصی ... لگی ہوئی تھی۔ تجمل کے داخلے پر بھن بھناہٹ سی ہوئی۔ تجمل اُن سب کو نظر ... کرتا ہوا اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اُس کے پیچھے پیچھے کئی اور لوگ بھی اندر آ... اُن میں ایک قوی الجثہ، پستہ قد، ادھیڑ عمر، سیاہ رو شخص بھی تھا جس کے چہرے پر ... نشان تھے۔ "کیا بات ہے؟" اُس نے تجمل کی کمر پہ ہاتھ رکھ کے پوچھا۔ "... اُدھر کیسے جانا ہو گیا؟"

تجمل نے پلٹ کر دیکھا اور اُس کے چہرے پر ایک کڑوی مسکراہٹ ... "کچھ نہیں موتی! لاڈلا جوان ہو کے جیل سے باہر نکلا ہے۔ تجمل اور اُس کے ... ساتھ ہو کے یہ رنگ تو آنا ہی چاہیے۔" اس نے چاقو کے کمال ہاتھ دکھا... ایسی بجلی تو نے کہیں نہ دیکھی ہو گی موتی! مجھے تیرا بڑا خیال آیا۔"

"یہ ہوا کیا تجمل؟" موتی نے گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"ہوا کیا، لاڈلے نے اُس تیس مار خاں کو ختم کر دیا۔"

"موجدار کو؟" موتی ہڑبڑا کے بولا۔ "نہیں نہیں۔"

"اب حجت بعد میں کرنا۔" تجمل نے مجھے بستر پر لٹاتے ہوئے کہا۔ ... میرے پاؤں تک خون سے تر ہار کھڑا تھا۔ تجمل نے اُسے میرے جسم کو ہاتھ نہیں ... لگانے دیا، کُرتا پھاڑ کے اُس نے شانے کا زخم دیکھا۔ "سالے نے چاقو چلانا بھی

نہیں آتا تھا اور بنا پھرتا تھا کوتوال کا بچہ۔ دیکھ موتی! کیسا اوچھا وار کیا ہے۔ دیکھتا ہے کانتے! ایسے ہے موجی اُستاد موجدار کلکتہ شہر کے ٹھیکے دار کا ہاتھ۔" تجمل نے زمین پر تھوک دیا۔

چاقو نے میرے شانے کی کچھ کھال اُدھیڑ دی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد جرّاح آگیا۔ نصیب میاں نے گرم دودھ کا ایک گلاس مجھے اپنے ہاتھ سے پلایا۔ میرا لباس تبدیل کر دیا گیا۔ مجھے اپنے اردگرد یہ جمگھٹ دیکھ کے اُلجھن ہو رہی تھی۔ ہر شخص کی نگاہ مجھ پر مرکوز تھی۔ جب جرّاح معمول مرہم پٹی سے فارغ ہو گیا تو موتی میرے پاس آیا اور میری آنکھوں میں اپنی چھوٹی مگر چمک دار آنکھیں ڈال کے مجھے گھورنے لگا۔ میں نے نظریں نہیں ہٹائیں۔ "شاباش۔" وہ دونوں ہاتھوں سے میری پسلیوں پر گھونسے مارنے اور قہقہے لگانے لگا۔ "مجھے آنے میں دیر ہو گئی بچو! سالی گاڑی نکل گئی، ورنہ میں رات ہی تیرا دیدار کر لیتا۔" موتی نے میرے ہاتھ چوم لیے۔

"موتی! تو ذرا میرے ساتھ چل۔" تجمل نے اُسے کھینچتے ہوئے کہا اور کانتے کو ہدایت کی کہ وہ میرا خیال رکھے۔

"وہیں جانا ہے ہونا استاد؟" کانتے کی زبان سے یہ جملہ نکلا ہی تھا کہ تجمل نے اُس کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ رسید کیا۔ کانتے کا توازن بگڑ گیا، وہ پلنگ پر گرتے گرتے بچا۔ پھر اُس نے نظریں نہیں اُٹھائیں۔ تجمل کسی تاخیر کے بغیر موتی کو ساتھ لے کے کمرے سے نکل گیا۔

اُس کے جانے کے بعد میں نے کانتے سے تجمل کی پریشانی کی وجہ پوچھنی چاہی، حالانکہ وجہ مجھے معلوم تھی۔ کانتے نے کوئی تبصرہ نہیں کیا، بات گھما کے مجھی سے پوچھنے لگا۔ "بھلا تو موجدار کے اڈے پر اکیلا کیوں چلا گیا؟ کیا تو یہ سمجھتا تھا کہ اُستاد گھبرا کے لڑکی اُس کے حوالے کر دے گا؟"

"نہیں، وہ کوئی اور بات تھی۔" میں نے ناگواری سے کہا۔

"اور کیا بات تھی؟" وہ آنکھ مار کے بولا۔ "لڑکی ہی کی بات تھی۔ تو نے پہلے چاند میاں کو پچھاڑا تھا۔ اب ہم سے بات مت بنا۔ اُستاد تیرے غائب ہو جانے سے بہت پریشان تھا۔ تجھے چاقو اور پانچ روپے دیتے پر نصیب میاں کو نہ جانے کیوں اُستاد نے گالیاں دے کے چھوڑ دیا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو اُس کی لاش پڑی ہوتی۔"

میں نے معذرت خواہانہ انداز میں نصیب میاں کو دیکھا۔ نصیب میاں نے کہا۔ "لاڈلے میاں! آج تم نے ہمیں استاد کے سامنے بڑا خوار کیا۔" نصیب میاں کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ "خدانخواستہ کچھ ہو ہوا جاتا تو ہم تو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ جانے سے پہلے اشارہ ہی کر دیا ہوتا۔ ایک سے ایک شہ زور یہاں موجود ہے۔"

"نصیب میاں!" میں نے تاسف سے کہا۔ "وہ میرا ہی معاملہ تھا۔"

"اے میاں! یہ میرا تمھارا کیا، قسم اُس بے وفا کی، اُستاد کے رُوبرو یہ کبھی بات مت کہنا۔ بہرحال رات گئی بات گئی۔ چھوڑو میاں شہزادے! یہ بتاؤ آخر یہ کون سی رگ پھڑک اُٹھی تھی؟ بخدا استاد تلملاتے ہی رہ گئے۔ ہماری رگوں میں بھی کبھی خون دوڑا کرتا تھا مگر وہ آدمی ہی کا خون تھا۔ یہ تو شیروں اور چیتوں کی خصوصیات ہیں۔ میں واری جاؤں۔ مجھ سے کہا ہوتا تو میں اِس چاند سے مکھڑے پر ایک کانٹا نہ ... گ

دیتا۔ بتاؤ جانی میاں! کیا معاملہ تھا؟ یہ بیٹھے بٹھائے شاعری کی کیا سوجھ گئی تھی؟ سُنا ہے آمد ہی آمد تھی۔"

"کچھ نہیں ہوا نصیب میاں! اپنا مقدر ہی کھوٹا ہے۔" میری آواز بھرّانے لگی اور میں نے اپنا سر جھکا لیا۔ نصیب میاں بے قرار ہو گیا اور میری بلائیں لینے لگا۔

"لاڈلے میاں! ارے سبحان اللہ تمہارا جیسا مقدر ہو تو سالے بھی ناز کریں۔ جیل میں رہے تو کسی نواب زادے کی طرح۔ واپس آئے تو پذیرائی کے لیے ایک پلٹن موجود۔ وجاہت یہ کہ کسی کی طرف ایک بھرپور نظر دیکھ لیا تو خاک کر دیا۔ رنگ گلنار، چہرہ کتابی، لب گلابی، گفتار میں دم خم، چال میں دبدبہ، سینہ مردوں کا، دل شیر ببر کا۔ آتے ہی اِدھر اُدھر نظر کی تو ایک ہی وار میں اِدھر ماہ جبیں کو اسیر کیا، اُدھر ایک خلقت کو اپنے زندانِ اُلفت میں گرفتار کیا۔ ہتھیار ہاتھ میں لیا تو بجلی دوڑا دی، قدم بڑھایا تو زلزلے آ گئے۔ لاڈلے میاں! یہ موجدار کا معاملہ کلکتے میں کسی زلزلے سے کم نہیں اور پھر تم مقدر کو کہیں؟......"

کلنتے نے گرج کے نصیب میاں کی زبان روکی۔ "بدنصیب میاں! تمھیں تو کسی کوٹھے پر ہونا چاہیے تھا، کہو تو لاجو سے بات کر لوں؟"

"ہے کلنتے!" نصیب میاں سینے پر ہاتھ مار کے بلبلائے۔ "کوٹھا ہی تو آباد کیا تھا کہ یہ بربادی ملی۔ سنو کلنتے صاحب! یہ گھن گرج کسی اور کو دکھانا، کسی خیال میں مت رہنا۔ بخدا جو تمھیں اب بھی نہیں آتا، وہ ہم نے بچپن میں سیکھ لیا تھا۔ شمشیر، چاقو، لٹھ، بَلَم، تیر تفنگ، شہ زوری، منہ زوری سب ہتھیاروں سے لیس تھے لیکن ایک تیرِ نگاہ نے مار ڈالا کہ سینے میں دل بھی لیے پھرتے تھے جو بدقسمتی سے تمہارے پاس موجود نہیں ہے۔ کلنتے میاں! سوچ سمجھ کے بات کیا کرو کہ کس سے مخاطب ہو اور کون سامنے موجود ہے۔"

"چپ رہو۔" کلنتے نے ڈپٹ کر کہا۔ "کچھ خیال بھی نہیں، کہ لاڈلا تھکا ہوا ہے، خون بھی کافی نکلا ہے، اُسے آنکھیں بند کر کے ایک ذرا سستا لینا چاہیے، بس لتّے پر قینچی چل رہی ہے۔"

"پہلے سے ہمیں کیوں نہیں ٹوکا۔ آدمی تم بھی ہماری صحبت میں رہ کے ترچھے ہوتے جا رہے ہو کلنتے یار!" وہ کسی قدر خفگی سے بولا۔ "اب ہماری زبان پر قفل لگ جائے گا۔ ہم نے اپنے ہونٹ سی لیے مگر ایک بات ضرور پوچھیں گے ورنہ ہمیں بے کلی رہے گی اُدھر تو سب کام حسبِ منشا ہوا ہے؟"

"اب استاد خود گیا ہے تو سب ٹھیک ہی ہو جائے گا۔" کلنتے نے نصیب میاں کو آنکھ ماری۔ اُس کی یہ حرکت میں نے دیکھی۔ پھر نصیب میاں نے اپنی تیزی و طراری برقرار رکھنے کی بہت کوشش کی مگر وہ اپنے چہرے پر لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہوئی فکریں نہ چھپا سکا۔ باہر آدمیوں کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ کلنتے بار بار اُٹھ کے اُن سے ملنے جاتا اور تھوڑی دیر ٹھہر کے واپس آ جاتا۔ میں نے اُن دونوں سے ایک بار کہا بھی کہ وہ مجھے کمرے میں تنہا چھوڑ دیں اور میرے لیے اتنی زحمت نہ کریں مگر وہ نہیں ٹلے بلکہ کچھ اور جم کے بیٹھ گئے۔ اُن کی آنکھیں ایک دوسرے سے باتیں کر رہی تھیں اور وہ جس تشویش میں مبتلا تھے میں اُسے بخوبی سمجھ رہا تھا۔

جب مچھل نے گھوشی کے ہتھیار ڈالنے کے بعد اُسے فرش موجدار اور چاند میاں کی لاشیں ٹھکانے لگانے کا حکم دیا تھا تو میرے ذہن خدشے نے سر نہیں اُبھارا تھا جس سے اب میں دوچار تھا۔ یہ لوگ میں کیوں آ گئے۔ مجھ پر جو کچھ بھی گزرتی، وہ گزر جاتی۔ مچھل نے موقع پر لیے پریشانیاں مول لے لی تھیں۔ یقیناً کلنتے، نصیب میاں، موتی، مچھل دوسرے آدمیوں کو تشویش ہو گی کہ موجدار اور چاند میاں کی لاشیں کہاں چھ لاشیں چھپانے کا مرحلہ بخیر و خوبی نمٹ بھی گیا تو اِس کی کیا ضمانت ہے نہیں کرے گا۔ موجدار کا گروہ خاصا وسیع معلوم ہوتا تھا اور لازم نہیں ہر آدمی بے چون و چرا مچھل کے حکم کی تعمیل کرے۔ کوئی بھی شخص کسی بھ کے ساری روداد پولیس کے گوش گزار کر سکتا تھا۔ چاہے وہ آدمی مچھل آدمیوں کی نظروں میں کتنا ہی معتوب و مطعون قرار پاتا۔ یہ بعد کی با وقت تک وہ آدمی پولیس کی توجہ موجدار اور چاند میاں کی گم شدگ چکا ہوگا اگرچہ مچھل کے لہجے میں اعتماد کی مضبوطی موجود تھی مگر وہ اچانک کیوں روانہ ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں صرف سوچنے اور گھٹنے کر سکتا تھا۔ چاند میاں کی موت کا ذمے دار موجدار تھا۔ میں اُسے مارنا میرا مقصد تو کچھ اور تھا، موجدار نے خواہ مخواہ ضد کر کے اُس کے سینے پر کرا دیا اور پھر مجھے موجدار سے بھی کوئی بیر نہیں تھا۔ اُس نے خود ہ دو آدمی جب ایک دوسرے پر چاقو تول لیں تو اُن میں سے کسی ایک ہی ہے۔ وہ نہ مرتا تو میں مر جاتا۔ موجدار نے خود مجھے دعوت دی واقعے کے گواہ تھے۔ پہلا زخم کھانے کے بعد موجدار اپنی گدی پر ہتھ آتی ہتّے نہ چڑھتی۔ چاند میاں مجھے فریب دے کے اُس کے اڈّے کے پاس جانے سے پہلے میرے ذہن کے کسی گوشے میں موجدار کا خ نے اُس کا علاقہ ہی پہلی بار دیکھا تھا۔ میری غلطی صرف اتنی تھی کہ میں پر چاند میاں کو آزاد نہیں کیا اور واپس نہیں آیا لیکن اگر مجھ جاتی تو میں کبھی آئینے میں اپنا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا اور میرا سر کرا اُٹھ سکتا تھا۔ پھر مجھے کوڑا کی اُمید ترک کرنی پڑتی اور صرف اپنے رکھنا پڑتا۔

ساری باتیں صاف تھیں کسی کی لب کشائی کی گنجائش آدمیوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے یہ منظر دیکھا تھا اور مشتعل ہونے کے کر لیا تھا۔ یہ عدالت خود اُن کے اُستاد نے لگائی تھی۔ مچھل کو اُس حال تھا جو ایک شخص کو اس صورتِ حال میں ہونا چاہیے مگر بعد اس پر غالب آ گئی کہ اُس کا اطمینان منتشر ہو گیا۔ مچھل کو یہ آئ ایک زمانہ گزر گیا تھا۔ موجدار کے گروہ میں ہر قسم کے آدمی موجود تھے چھوٹے لمبے، جب کے چہرے مختلف تھے، سب کا ظرف بھی مختلف تھے اور ایک نے انھیں مارا تھا۔ مچھل کے ذہن میں گرہ لگ گئی موجدار اور چاند میاں کا نام و نشان نہ مٹ جاتا، اُس وقت تک

پا سکتا تھا، موجدار کے جو دوسرے جاں نثار موقع پر موجود نہیں تھے ضروری نہیں کہ وہ بھی فیصلہ قبول کرتے جو وہاں موجود لوگوں نے کیا تھا۔ اُن میں سے کوئی بھی اپنے استاد موجدار کی روح سے وفاداری نبھانے کے اختیار میں یہ صاف اور سادہ واقعہ پیچیدہ اور مشکل بنا سکتا تھا۔ میں جس قدر سوچ رہا تھا، مچھل کی پریشانیوں کا احساس ہوتا جا رہا تھا اور میں کوئی واضح بات سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ ایسے معاملوں میں حالات عموماً کیا رُخ اختیار کرتے ہیں۔ میں بدتر نتیجے ہی اخذ کر سکتا تھا۔ کلنتے اور نصیب میاں نے اس موضوع پر مجھ سے بات نہ کرنے کی قسم کھا لی تھی۔ میں اُن کا تذبذب اور اُن کے چہروں پر بتدریج بڑھتا ہوا اضطراب آسانی سے پڑھ سکتا تھا۔ کاش میں زریں کو لے کے کہیں اور نکل جاتا اور کاش کسی اور وقت مچھل کے پاس آ جاتا۔ مجھ ایک شخص کے اُلجھے ہوئے معاملے سے کتنے لوگ متاثر ہو رہے تھے جب کہ میں نے کبھی یہ نہیں چاہا تھا کہ کوڑا کا فسانہ عام کرتا پھروں، میں نے اپنے سینے میں چھپا رکھی تھی۔ اب بھی کوئی اُس کا نام نہیں جانتا تھا۔ نصیب میاں اور کلنتے پر فکریں چھائی ہوئی تھیں۔ چند ثانیوں کے لیے میں بھی اُن کی اس کیفیت سے متاثر ہوا لیکن پھر میرا ذہن کوڑا کے خیال سے قوی ہوتا گیا اور میں نے طے کیا اگر مچھل پر کوئی آنچ آئی یا کسی کم ظرف نے موجدار کی موت اُس طرح تسلیم نہ کی جس طرح خود اُس نے کی تھی تو میں موجود ہی رہوں گا۔ میں کہاں بھاگا جا رہا ہوں، میں مچھل کو زیادہ پریشان نہیں کروں گا۔ کہیں شام ڈھلے مچھل واپس آیا۔ سب اُس کی طرف دوڑ پڑے۔ موتی، شوکی، لالا، فدا، گھوشی اور موجدار کے کئی دوسرے آدمی بھی اُس کے ساتھ تھے۔ مچھل کے چہرے پر طمانیت کے آثار تھے۔ اُس نے آتے ہی مجھے گلے لگایا، میرا حال پوچھا اور نصیب میاں کو حکم دیا کہ وہ سب کے کھانے کا انتظام کرے اور سونا گاچھی آدمی بھیج کے کنجریوں کو بلا لے۔ مچھل کے اس اعلان پر سب چہکنے لگے۔ "استاد! آج تو وہیں چل کے سنتے ہیں۔ تمھیں اُس علاقے میں گئے ہوئے بھی بہت دن ہو گئے ہیں۔ آج تو کچھ دھوم دھڑکا ہو جانا چاہیے۔" شوکی نے ناچتے ہوئے کہا۔

"کیوں گھوشی! تیری کیا منشا ہے؟" مچھل نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اب اِن لڑکوں کا بھی کچھ خیال کر، فکر چھوڑ۔"

"نہیں استاد!" گھوشی نے نیازمندانہ کہا۔ "مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ میں ان لوگوں کی خوشی میں پوری طرح شریک ہوں۔ آپ میرے ہی ساتھی ہیں۔"

"ہائے مستانہ!" موتی نے گھوشی کی کمر پر زور کا دھپّا مارتے ہوئے کہا اور پھر مچھل سے بولا۔ "کیوں مچھل! کیا تیرا دیوالا نکل گیا ہے۔ نہ رنگ نہ ڈھنگ۔ گھوڑا لگوا دے، بس اب برداشت نہیں ہوتا۔ ناچ میں کیا خاک مزہ آئے گا۔"

"گھوڑے میں کیا مزہ رہ گیا ہے موتی! اگر دس سے ایک نمبر کی ولایتی میم آتی ہے تو آج میں کسی کو اس کی اجازت نہیں دوں گا۔"

"کیوں؟" موتی ناراضی سے بولا۔ "آج ہی تو دن آیا ہے۔ سالی کچھ عجیب ہماہمی سی تھی۔ میں نے تو آسنسول میں اکتا کے تین چار کو دیا یا ر اتار دیا تھا۔ تمھارے ترچھے لگی ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے سب مر گئے ہو یا مرگھٹ میں رہنے لگے ہو۔"

"کل تو بڑا نقشہ جما تھا استاد موتی!" نصیب میاں نے ہاتھ نچا کے کہا۔

"او نواب صاحب! کیا ایسا سوکھا ہی ٹرخاؤ گے؟ مہمان آئے ہیں تمہارے گھر۔ کیا تم بھی اُنھی جیسے ہو گئے نصیب میاں! لگا دو چٹائی!" موتی ترنگ میں بولا۔

"آج رہنے دے موتی! بات مانا کر۔" مچھل نے اُسے تھپک کے کہا۔

موتی جز بز ہوا لیکن مچھل کی بات مان گیا۔ وہ سب ایک بڑے کمرے میں آ گئے اور بات بات پر قہقہے لگانے لگے۔ مچھل نے مجھے اپنے قریب ہی بٹھا لیا تھا۔ دوپہر کو اُن لوگوں نے شاید کھانا نہیں کھایا تھا۔ نصیب میاں اور لالے نے نہ جانے کیا کرشمہ دکھایا کہ دو گھنٹے کے اندر اندر کھانا فراہم ہو گیا۔ رات تک اُس کمرے میں تل دھرنے کی جگہ نہیں رہی۔ مچھل کے سامنے رکھے ہوئے طشت میں مٹھائی کے تھیلوں اور پھولوں کے ہاروں کا انبار لگ گیا تھا۔ جو آتا سب سے پہلے مچھل کے ہاتھ چومتا، مٹھائی پیش کرتا، اُس کے گلے میں ہار ڈال کے میرے پاس آتا اور میرے گلے میں ہار ڈالتا، میری پیشانی چومتا۔ مچھل نے بہت سے ہار دوسرے لوگوں کے گلوں میں ڈال دیے تھے۔ میں نے بھی اُس کی تقلید کی۔ کھانا کھانے کے بعد کوئی رات کے دس بجے موتی نے مچھل کو اُٹھایا۔ مچھل کچھ آمادہ معلوم نہیں ہوتا تھا مگر موتی کے اصرار پر گھر سے باہر نکل آیا۔ میرا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں تھا۔ گلی ٹم ٹموں کی گھنٹیوں سے گونجنے لگی۔ مچھل نے چند آدمیوں کو اڈّے پر رہنے کی ہدایت کی اور ٹم ٹم میں سوار ہو گیا۔ اُس کے دائیں طرف میں، بائیں طرف موتی بیٹھا تھا۔ سامنے کی سیٹ پر گھوشی اور کلنتے تھے۔ ہماری ٹم ٹم کے پیچھے کئی ٹم ٹمیں چل رہی تھیں۔ وہ جس طرف سے گزرتیں، بازار میں شور مچ جاتا۔ موتی مچھل کی کمر سے اپنا ہاتھ گزار کے بار بار میری کمر میں گدگدیاں کرتا تھا۔ مجھے اُس کی اِس حرکت پر ہر بار مسکرانا پڑتا تھا۔

ایک چوراہے پر جا کے یہ قافلہ ٹھہر گیا۔ سب لوگ سواریوں سے اُتر کے ایک جگہ اکٹھے ہوئے پھر منتشر ہو گئے۔ اُن کی باتوں سے مجھے اتنا اندازہ تو ہو گیا تھا کہ وہ ناچ گانا سننے کی جگہ آئے ہیں۔ میں نے اس سے پہلے اس جگہ کے متعلق سنا ہی تھا۔ گلی میں داخل ہوتے ہی ہارمونیم، طبلوں اور گھنگھروؤں کی آوازوں نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ ہم پانچ آدمی کلنتے، گھوشی، موتی اور مچھل ایک ساتھ چل رہے تھے، دوسرے لوگ ہم سے کچھ فاصلے پر مختلف ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ یہ گلی عام گلیوں سے قطعی مختلف تھی، یہاں گھومنے والے لوگ بھی عام آدمیوں سے علیحدہ معلوم ہو رہے تھے۔ میری رگوں میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ جدھر نظر پڑتی، وہاں روشنیوں میں چمکتی دمکتی لڑکیاں دکھائی دیتیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اُن کی جبینوں اور رخساروں پر ستارے اُگ آئے ہوں۔ گلی میں مچھل داخل ہوا تو لوگ دس دس قدم پیچھے ہٹ گئے یا آگے بڑھ گئے۔ شور و غل کی جیسے کسی نے لگام کھینچ لی۔ ہر طرف دبی دبی سرگوشیاں ہونے لگیں۔ لوگ احترام آمیز نگاہوں سے مچھل کو دیکھتے، کترا کے ایک دوسرے کو اشارہ کرتے اور سمٹ جاتے۔ مچھل کا سینہ کچھ آگے نکل آیا تھا اور چلتے ہوئے اُس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان فاصلہ زیادہ ہو گیا تھا۔ یہی حال کلنتے، موتی اور گھوشی کا بھی تھا۔ گلی میں تنبولی، گل فروش اور چائے والوں کی صدائیں گونج رہی تھیں مگر اب ہر ایک نے اپنا کاروبار چند لمحوں کے لیے معطل کر دیا تھا۔ کوئی دکان سے اُٹھ کر بھاگا ہوا آتا اور مچھل کے گلے لگ جاتا، کوئی دور سے سلام کر کے رہ جاتا۔ پان والوں

نے بیڑے بنا بنا کے طشتری میں تجمل کو پیش کیے۔ ایک بیڑا میں نے بھی کھایا۔ میرے منہ میں عطر گھل گیا۔ ہر پان والے نے اصرار کیا کہ تجمل اُس کی دکان پر ایک پان چابے۔ کچھ لوگ مونڈھوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ اٹھ کے تجمل کے گرد جمع ہو گئے۔

گل فروشوں نے ہم سب کے ہاتھوں میں ہار باندھ دیے اور ایک ایک ہار ہمارے حوالے کر دیا۔ ہر شخص ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی فکر میں تھا۔ ہر شخص کی خواہش تھی کہ تجمل اُس کی دکان پر ایک لمحے کے لیے سہی مگر ٹھہرے ضرور۔ تجمل ایک خفیف تبسم سے اُن کے سلام کا جواب دیتا اور اُن کی صداؤں پر سر ہلاتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ جب ہم گلی کے نکڑ سے گزرتے ہوئے دوسری گلی میں داخل ہوئے تو بے داغ سفید کرتے اور دو پلی ٹوپی والے ایک دبلے پتلے بزاز نے ہمارا راستہ روک لیا۔ تین فرشی سلام کیے اور کہنے لگا: "ایسے نہیں جانیے گا، راستہ ہم نے بند کر دیا ہے۔ ہماری لاش سے گزر کے آگے جائیے گا۔"

تجمل نے اُسے سینے سے لگا لیا اور پہلی بار کھل کے ہنسا: "چھٹن صاحب! یہاں سلام کیے بغیر کون آگے جانے کی ہمت کر سکتا ہے۔ ہم تو تمھی کو دیکھنے کے لیے اِدھر آئے تھے، تمھارے ہاتھ کا پان کھائے ہوئے دن ہو گئے۔"

چھٹن بزاز آدھا جھک گیا: "ابھی پیش کرتا ہوں۔ سرکار نے قدم رنجہ تو فرمایا۔ گلی ویران ویران ہو گئی تھی۔ اتنے دنوں عاشقوں کو کیوں ترسایا اور وہ بڑے نواب صاحب کہاں ہیں؟ نواب نصیب میاں؟"

"نصیب میاں کو آج ہم نے سزا دے دی۔"

"کیسی سزا؟" وہ پریشان ہو گیا۔ "للہ خادم کو یقین نہیں آتا۔"

"چھٹن صاحب ہمیں آگے بھی جانا ہے۔" تجمل نے کسمسا کے کہا۔

"یہ لیجیے وہ آیا ہی چاہتا ہے۔" چھٹن نے ایک لڑکے کو اشارہ کیا۔ لڑکا سنہرا خاص دان دونوں ہاتھوں سے پکڑے ادب سے ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ چھٹن نے خاص دان اُس کے ہاتھ سے لے کے ڈھکنا کھولا۔ لڑکے نے طشتری آگے کر دی۔ چھٹن کو شاید پہلے ہی ہماری آمد کی خبر ہو گئی تھی، اس لیے خاص قسم کے بیڑے تیار تھے۔ چھٹن نے سب کو اپنے ہاتھ سے بیڑے کھلائے۔ موتی نے اُس کی انگلی کاٹ لی۔ چھٹن کھلکھلانے لگا: "واللہ کیا مذاق پایا ہے۔" اُس نے خوش دلی سے کہا۔ پان کھلانے کے بعد اُس نے عطر کی شیشی کھولی اور ہمارے لباسوں پر خوشبو مل۔ پھر ایک ایک پھلیل شیشی میں ڈبو کے ہمارے کانوں میں اٹکا دی اور کہنے لگا: "اب اگر اتنے دنوں میں آئیے گا تو ہمیں ناراض سمجھیے گا۔ وعدہ کیجیے کہ جلد آئیں گے؟"

"آئیں گے، جلد ہی آئیں گے چھٹن صاحب!" تجمل نے آگے بڑھنا چاہا۔ چھٹن نے دوزانو ہو کے اُس کا کرتا کھینچ لیا۔

"نا۔ بس ایک لمحے اور۔ بھلا لاڈلے میاں پہلی بار اِدھر آئیں اور صرف گلوری سے شوق کر کے آگے بڑھ جائیں؟" اُس نے مجھے سلام کیا۔ مجھے حیرت تھی کہ اُسے میرا نام کس طرح معلوم ہوا اور نام معلوم تھا تو اُس نے مجھے پہچان کیسے لیا! میں تو پہلی بار یہاں آیا تھا اور تجمل کے پاس آئے ہوئے مجھے ابھی ایک ہی دن ہوا

تھا۔ چھٹن نے عطر کی ایک شیشی مجھے پیش کی۔ تجمل نے مجھے اُس کا شکریہ ادا کرنے کی مہلت بھی نہیں دی۔ مجھے کھینچتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ راستے میں … لوگوں نے تجمل سے اصرار کیا تھا کہ وہ اُن کے ساتھ چلے۔ اُن میں عورتیں بھی تھیں۔ تجمل نے سب کے اصرار مسترد کر دیے۔ میری نظریں کسی ایک جگہ نہیں … تھیں۔ چبوتروں پر، چوکیوں پر، بالکونیوں پر لڑکیاں ہی لڑکیاں تھیں۔ … نے زرق برق لباس پہن رکھے تھے جیسے آج گلی میں کوئی بہت بڑا … ہو رہی ہو۔ کچھ آگے جا کے موتی نے تجمل کا ساتھ دینے سے انکار … منہ بگاڑ کے بولا: "کیا یہاں صرف بیڑے کھانے اور ہار پہننے آیا ہے؟ … کے کہیں بیٹھ۔ وقت گزرا جا رہا ہے۔"

"ذرا دیر ٹھہر۔" تجمل نے اِدھر اُدھر دیکھ کے کہا۔

"کیا بات ہے تجمل! تیرا جی آج کچھ خراب معلوم ہوتا ہے؟" … سے بولا: "تو تو آج کچھ بدلا ہوا نظر آ رہا ہے۔"

"نہیں، یہ بات نہیں۔ ایسا کر موتی! تو چل کے کہیں بیٹھ۔ میں تھوڑی … آتا ہوں۔" تجمل نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"کس دن کا بدلا لے رہا ہے یار؟" موتی نے ہونٹ سکیڑ لیے۔

"کیا بکواس کرتا ہے موتی! کہہ جو دیا، میں ابھی آیا۔ چل باتیں … بڑھا۔" تجمل نے اُسے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

"تف ہے موتی پر جو تیرے بغیر جائے۔" موتی گرج کے بولا: "تجمل! میں یہاں کے راستوں سے خوب واقف ہوں۔ اپنی بھی پرانی … تیری سفارش کی ضرورت نہیں پڑتی۔"

"میں جانتا ہوں تو پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔" تجمل نے اُس کے …

"ذرا ذرا بات پر مچل جاتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تو آسنسول میں … گھاس کھودتا ہے۔ لگتا ہے ابھی تیرے دودھ کے دانت بھی نہیں گرے۔ سمجھتا نہیں، بک بک کیے جاتا ہے۔"

"ہاں ہاں، میرے تو دودھ کے دانت بھی نہیں گرے۔ لگتا ہے تیرے تو دانت ہی نہیں ہیں۔ تو تو بوڑھا ہو گیا ہے۔" اپنا … سے صاف صاف بات کیا کر۔ ہیر پھیر نہ کر۔"

"آقا استاد! سنا ہے کریمن حیدر آباد سے بڑا مال دولت لے … اور اپنے ساتھ ایک پری بھی لائی ہے، ہر جگہ اُس کی دھوم ہے۔" کل … کی۔ دیکھو گے تو تڑپ جاؤ گے۔ جب سے آئی ہے سیٹھوں اور ساہوکا … ہی ہلا بول دیا ہے۔"

تجمل با دلِ ناخواستہ ایک تنگ سی گلی میں مڑنے کے لیے تیار … ایک خیال سے لرزنے لگا۔ چلتے چلتے مجھے جھرجھری آ گئی اور … زمین نے جکڑ لیے۔ تجمل اپنے خیال میں گم ایک قدم آگے بڑھ گیا۔ میرا ہا … ہاتھ میں تھا۔ میرے ٹھہرنے کی وجہ سے اُس کے ہاتھ کو رکاوٹ … پلٹ کے میری جانب دیکھا۔ میں گنگ کھڑا تھا۔ "لاڈلے!" اُس نے …

"… رک کیوں گیا؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے سٹ پٹا کے کہا۔

"کیا کچھ تکلیف ہو رہی ہے؟ زخم کیسا ہے؟"

"سب ٹھیک ہے۔" میں نے ہنسی دکھانے کی کوشش کی۔

"اِس علاقے میں سر جھکا کے نہیں چلتے، ذرا گردن تو ٹھیک طرح جسم پر رکھو … کہیں گے، تجمل کا لاڈلا خوش نہیں ہے۔"

"میں بہت خوش ہوں۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

"… آگے تیرے دل کی کلیاں کھل جائیں گی۔" کلنتے نے نشیلی آواز میں کہا۔ "… لاڈلے کے سامنے تو ہم سب کی ایسی کی تیسی ہو جائے گی۔"

"… جانی۔" موتی نے مجھے تجمل کے ہاتھ سے چھین لیا۔ "میں تو ابھی تجھ سے پوری … بھی نہیں۔" وہ مجھے سڑک ہی پر چمکارتے ہوئے بولا: "تیرے بارے میں سنتا رہتا … نے عمر میں ایک ہی سچ بولا ہے اور وہ تیرے بارے میں۔ میں تجھے اپنے … سنسول لے جاؤں گا۔" وہ اشتیاق سے کہتا رہا: "اور پھر تجمل کو ٹھینگا دکھا دوں … میرے پاس ایسے ہیں کہ تجمل کو بھی نہیں معلوم۔ ایمان سے شہر تو وہ چھوٹا … دل کے بڑے لوگ رہتے ہیں۔"

تجمل نے کچھ نہیں کہا۔ کلنتے اور گھوشی موتی کی باتوں پر بُری طرح ہنستے … ایک دروازے کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ دروازہ بند تھا۔ جھریوں سے روشنی … تھی، درزوں سے موسیقی ٹپک رہی تھی۔ ایک دل کش آواز روشنی کے ساتھ … رہی تھی۔ گھوشی نے آگے بڑھ کے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے ایک ادھیڑ … کا چہرہ برآمد ہوا۔ گھوشی نے کہا: "دروازہ کھولو۔"

ہم سب اندھیرے میں کھڑے تھے۔ عورت نے گھوشی سے چمکار کر کہا: "معزز مہمان بیٹھے ہیں، ذرا کچھ دیر بعد زحمت کرنا۔"

گھوشی نے ایک ہاتھ سے دروازہ کھول دیا۔ عورت احتجاج کرتی رہی۔ "آؤ" اندر سے گھوشی کی آواز آئی۔ دروازہ کھلا تو روشنی ہمارے چہروں پر پڑی۔ عورت … کے لیے ٹھٹکی، پھر وارفتہ ہو کے چبوترے پر آ گئی اور اُس نے تجمل کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اب تم اِس طرح آیا کرو گے؟ نہ خیر نہ خبر۔ جب سے آئی ہوں، خبر بھی نہیں لی … کر کیا ہوا، پردیس میں لُٹ گئی یا برباد ہو گئی۔ کہلوایا بھی کہ آ کے شکل دکھا جاؤ … تجمل نے پرانا مکان واپس نہیں کیا۔ اس ٹوٹے ہوئے مکان میں رہ رہی ہوں … رسید تک نہیں دی۔"

"یہیں کھڑے کھڑے باتیں کرتی رہو گی یا اندر آنے کو بھی کہو گی۔ ساتھ میں … ہیں۔" تجمل نے ناراضی سے کہا۔ "حیدر آباد میں رہ کے کریمن تم نے کمائی بہت … ہو گی، اخلاق بھی کھوٹا ہو گیا۔"

"وہی، بالکل وہی، تم نہیں بدلے۔" کریمن نے شیفتگی سے کہا۔

"اور تم بھی نہیں بدلیں۔ وہی کھنک، وہی تڑپ ہے۔"

"جاؤ جی، اجڑا ہوا دیار ہوں۔" وہ تجمل کا ہاتھ تھامے ہوئے اندر لے گئی۔ … چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ تجمل کا چہرہ جیسے ہی نمودار ہوا، رقص تھم گیا۔ پہلے سے بیٹھے ہوئے لوگوں میں بے چینی سی پیدا ہوئی۔ انھوں نے ناگوار نظروں سے پہلے ہمیں پھر کریمن کو دیکھا۔ جیسے انھیں ہماری آمد نہایت شاق گزری ہو۔ تجمل نے اُن کی جانب کوئی توجہ نہیں کی۔ وہ ایک کونے میں لگے ہوئے گاؤ تکیے پر پھیل کے بیٹھ گیا۔ "میں تمھارا تعارف کراؤں؟" کریمن نے تجمل کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ "یہ کلکتے کے مشہور سیٹھ لکشمی داس ہیں، اور یہ اُن کے مدراس سے آئے ہوئے مہمان۔ سیٹھ صاحب حُسن اور آواز پرکھنے کی جو نگاہ رکھتے ہیں، یقین کرو وہ میں نے اپنی ساری زندگی میں کسی اور شخص میں نہیں دیکھی۔" کریمن نے اپنے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ سیٹھ لکشمی داس گھٹنوں سے اوپر کی سفید شیروانی پہنے ہوئے تھا، نیچے دھوتی تھی۔ رنگ کھلتا ہوا، پیشانی تنگ، قد موزوں، عمر پچاس سے اوپر، جسم فربہ، شیروانی میں سونے کے بٹن اور انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی تھی۔ کریمن نے اُس کے اتنے ہی تعارف پر بس نہیں کیا۔ کہنے لگی: "وضع دار آدمی ہیں، غریبوں کے دوست، فن جاننے والے، دان پُن میں کلکتے کے چند ہی سیٹھ، سیٹھ لکشمی داس جی سے آنکھ ملا سکتے ہیں۔" سیٹھ کے لبوں پر اپنی تعریف سے کسی قسم کا تاثر نہیں اُبھرا البتہ پیشانی پر کچھ شکنیں اُبھریں اور آنکھیں چڑھ گئیں۔ "اور یہ ہیں تجمل، استاد تجمل۔ ان کا نام تو آپ نے سنا ہو گا۔" کریمن نے سیٹھ کو مخاطب کیا۔

سیٹھ نے جواب دینے کے بجائے سر کی ایک خفیف جنبش سے انکار کیا اور کہنے لگا: "کریمن بانو! معاف کرنا۔ ہمیں بھیڑ میں گانا سننے میں مزہ نہیں آتا۔ جب ہم آئیں تو دروازے پر تالا لگا دیا کریں۔"

"کلکتے میں نئے نئے آئے ہو سیٹھ؟" کریمن کے جواب دینے سے پہلے تجمل کی کرخت آواز اُبھری۔ "کریمن تم نے پورا تعارف نہیں کرایا۔" تجمل کی آواز پر سیٹھ نے اپنی آنکھیں پوری طرح کھولیں اور سر اُٹھا کے اُسے گھورنے لگا۔ اُس کے ساتھ بیٹھے ہوئے مہمان مضطرب ہونے لگے۔

"ہاں استاد! سیٹھ کا بڑا کاروبار احمد آباد میں ہے۔ حال ہی میں انھوں نے یہاں جوٹ کا نیا کارخانہ لگایا ہے۔ یہ یہاں رہتے تو ضرور تمھیں جانتے۔ یہ صرف نہ جاننے کا اجنبی پن ہے۔ تم بھی انھیں نہیں جانتے، یہ بھی تمھیں نہیں جانتے۔ بہرحال جان پہچان کا اس سے اچھا موقع اور کب آتا۔ سیٹھ صاحب! یہ تجمل ہیں، شہر میں کون ہے جو استاد تجمل سے واقف نہ ہو۔ ہر جگہ ان کے نام کا ڈنکا بجتا ہے۔ یہ ان کے ساتھی ہیں، ایک تو یہ کلنتے ہے اور اسے بھی میں چہرے سے پہچانتی ہوں حالانکہ میں کئی سال بعد کلکتے واپس آئی ہوں۔" اُس نے گھوشی کی طرف اشارہ کیا۔ "اور یہ جو پیچھے کونے میں دبکے میری سرکار بیٹھے ہیں، یہ سمجھتے ہیں، میں انھیں بھول گئی۔ یہ موتی ہیں۔"

موتی کی آنکھیں چمکنے لگیں: "ہائیں، کریمن بانو! خوب پہچانا، میں تو سمجھا تھا سب کی طرح تم نے مجھے بھی بھلا دیا ہو گا۔"

"موتی میاں! یہ تو نظر نظر کی بات ہے۔" وہ مسکرا کے میری طرف متوجہ ہو گئی۔ "ماشاءاللہ، چشمِ بد دور، چشمِ بد دور۔ البتہ انھیں میں نے نہیں پہچانا۔"

"یہ لاڈلا ہے۔" کلنتے جوش میں بولا: "استاد کا لاڈلا!"

کریمن آنکھیں پٹ پٹانے لگی، جیسے میری صورت دیکھ کے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ "تو آپ نے سنا سیٹھ، یہ سب نامور لوگ ہیں۔ جو انھیں نہیں جانتا،

اُسے ضرور جانا چاہیے، یہ کام کے لوگ ہیں اب میں آپ دونوں کو ملانے کی رسم سے بھر پائی۔ میں نے اپنی طرف سے سارا حجاب دُور کر دیا ہے سیٹھ صاحب! استاد! ہاتھ ملائیے گلے لگیے۔ ہم سے کھل جاؤ یہ وقت اور مے پرستی ایک دن"۔

دونوں اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہے کرمن کی بات ختم ہونے کے بعد کچھ دیر تک کمرے میں سکوت چھایا رہا۔ کرمن بیٹھے بیٹھے کروٹیں بدلنے لگی کبھی وہ سیٹھ کی طرف دیکھتی کبھی تجمل کی طرف۔ "گانا شروع کرو کرمن!" تجمل نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ "وہ کہاں ہے جسے تم نے ہماری نظروں سے چھپا رکھا ہے؟"

"وہ گاتے گاتے تھک گئی تھی، میں نے اُسے آرام کے لیے اندر بھیج دیا تھا پھر جیسے ہی سیٹھ صاحب آئے، میں نے اُسے بیدار کر دیا۔ لباس تبدیل کر کے ابھی آتی ہو گی۔ تم اس عرصے میں پری بانو کا گانا سنو۔ پری کی آواز میں بنگال کا جادو بھرا ہے"۔ ایک دُبلی پتلی تیکھے نقش و نگار کی سنجیدہ لڑکی درمیان میں نیچے کی طرف منہ کیے بیٹھی تھی۔ اپنے نام پر اُس نے اپنی بوجھل پلکیں اُوپر اُٹھائیں، وہ پہلے ہی تجمل کو سلام کر چکی تھی، اب دوبارہ سلام کیا۔ اُس کے ہاتھوں میں مہندی لگی تھی۔ عمر خاصی کم معلوم ہوتی تھی۔

"کچھ شروع کرو کرمن!" موتی نے بپھر کے کہا۔

"اجازت ہے؟" کرمن نے سیٹھ سے پوچھا۔

"ہم چلتے ہیں کرمن بانو! پھر آئیں گے، ہماری طرف سے شہ پارہ کو یہ دے دیجیے گا۔ اُس نے کل ہم سے فرمائش کی تھی"۔ سیٹھ نے ایک پیکٹ کرمن کی طرف بے نیازی سے کھسکا دیا، کرمن نے پیکٹ کو ہاتھ نہیں لگایا۔

"آپ نہیں جائیں گے جناب! شہ پارے کو خود دیجیے گا یہ۔ میں اسے ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گی، وہ آئے گی تو خود آپ سے نمٹ لے گی۔ شام سے وقت پوچھ رہی تھی، میں بھی تو کہوں آج اسے کیا ہو گیا ہے کچھ بتاتی نہیں تھی۔ اب پتہ چلا کیا بھید تھا۔ تشریف رکھیے سیٹھ صاحب!"

"ارے شہ پارے؟" اُس نے اچک کر آواز لگائی۔ "ارے کہاں گم ہو گئیں، سنتی ہو سیٹھ صاحب واپس جا رہے ہیں۔ پھر مجھ سے کچھ مت کہنا"۔

اندر سے ایک باریک آواز آئی۔ "آئی، بس ابھی آئی"۔

"اب آؤ بھی نا۔" کرمن سر پر ہاتھ رکھ کے بولی۔

"نہیں کرمن بانو! انھیں آج آرام کرنے دو، ہم کل آئیں گے۔ جب بھی زحمت ملا نہ دیا آئیں گے، اپنے مہمانوں کا خیال کرو"۔

"سیٹھ صاحب! یہ کوئی غیر نہیں ہیں کہ ان کا خیال کیا جائے۔ آپ بھی تشریف رکھیے، یہ بھی بیٹھے رہیں۔ دونوں مجھے عزیز ہیں۔ آج یہی سہی، دیکھیے تو سہی کیسے ہنر شناس ہیں، شہ پارے ان کے سامنے گائے گی تو قیامت برپا کرے گی۔ فن اور حسن تو نگاہوں کی تلاش میں رہتا ہے، میرے نصیب جاگے کہ آج ایسے ایسے سننے والے موجود ہیں۔ میں آپ کو نہیں جانے دوں گی"۔ وہ روٹھنے کے انداز میں بولی۔

"کرمن بانو! آج ہمیں معاف کر دیجیے"۔ سیٹھ نے اُٹھنے کی کوشش کی۔

کرمن نے اضطراب سے تجمل کو دیکھا۔ "بیٹھیے سیٹھ! کرمن کو رات بھر نیند نہیں آئے گی۔ بیٹھ جائیے"۔ تجمل کی آواز میں مختلف عناصر صاف جھلک رہے تھے۔

"بیٹھو سیٹھ بیٹھو!" موتی اُلجھتے ہوئے بولا۔ "ہم روز کے آنے والے ہیں، وجہ سے اُٹھنا چاہتے ہو تو مت جاؤ۔ کرمن نے تمھیں یہ نہیں بتایا کہ ہم جانے میں روک ٹوک نہیں ہوتی، ہم کسی بھی وقت کہیں بھی جا سکتے ہیں۔ تم پہلے آئے ہو اس لیے اتنی بات بھی کہی جا رہی ہے، بعد میں آتے تو بات دوسری ہوتی۔ تجمل بدل گیا ہے، میں تھوڑی دیر پہلے اس سے یہی کہہ رہا تھا۔ کلکتہ ہے سیٹھ! آسنسول ہوتا تو بات اتنی لمبی نہ ہوتی"۔

"کیا مطلب؟" سیٹھ نے تنک کے پوچھا۔

"مطلب صاف ہے سیٹھ!" موتی نے تلخی سے کہا۔ "بیٹھ جاؤ"۔

"ہم نہیں بیٹھتے"۔ سیٹھ نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"تو جاؤ"۔ موتی نے پھنکار کر کہا۔

"کرمن بانو! آیندہ دو کمرے بنایا کرو، ایک ہمارے لیے ایک سالے کے لیے"۔ وہ یہ کہتا ہوا اپنے ساتھیوں سمیت واپس جانے لگا۔ کرمن نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ اسی لمحے اندر سے ایک زرق برق لڑکی بھاگتی ہوئی دروازے پر سیٹھ کی انگلی پکڑ لی اور کچھ کہا نہیں بس ایک نظر دیکھا۔ بے چینی مترشح ہوئی، وہ مسکراتا ہوا دلیرانہ ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔ پھر ہماری جانب نظر کی اور ہم نے پہلی بار اُسے غور سے دیکھا۔ وہ شہ پارہ نہیں ہو سکتی تھی۔ اُس کے متعلق کانتے نے جو کچھ کہا تھا، وہ اُس سے کہیں لمبی سی شوخ، چنچل، گھنی پلکیں، لمبی سیاہ چوٹی، سیٹھ نے اُس کے سامنے سے اپنا دیا ہوا پیکٹ واپس لے لیا اور اُس کے حوالے کر دیا۔ اُس کی نتھنے پھڑکنے لگے اور چہرہ خوشی سے تمتما گیا۔ اُس نے جلدی جلدی خوب صورت ڈبے سے ایک چمکتا ہوا ہار نکالا۔ لڑکی کی بڑی بڑی آنکھیں بڑی ہو گئیں۔

"سیٹھ صاحب! اپنے ہاتھ سے پہنائیے"۔ کرمن نے درخواست کی۔ شہ پارہ نے اپنا چہرہ اُوپر کر کے آنکھیں موند لیں۔ اُس کے ہونٹ کانپ رہے تھے، رخساروں پر شفق چھائی ہوئی تھی۔ سیٹھ نے صراحی دار گردن میں ہار ڈال دیا۔ شہ پارہ نے آنکھیں کھول دیں۔ سیٹھ نے ہاتھ تھام رکھا تھا۔ وہ لہراتی ہوئی اُٹھی اور اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی، جھٹکے سے اُس نے ہاتھ چھڑا لیا اور خراماں خراماں چلتی ہوئی دالان میں گئی۔ پہلی لڑکی کرمن کے پاس آ گئی تھی اور کرمن دوبارہ ہمارے قریب۔ شہ پارہ نے پیروں میں گھنگرو باندھے، سازندوں نے ساز۔ شوخی اور ناز سے سازندوں سے کچھ کہا اور بیٹھے بیٹھے انگلیاں۔ کے لبوں پر ایک دل آویز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اُس نے پہلے تجمل کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا اور تان اُٹھائی:

یہ جو گردن جھکائے بیٹھے ہیں لاکھ فتنے اُٹھائے

اُس نے اسی پر بس نہیں کیا، اُٹھ کے ناچنے لگی اور ایسا ناچ کہ کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ کل رات زرّو بھی اسی طرح ناچی تھی مگر یہ تو زرّو سے بڑھ گئی تھی۔ اس کے تڑپتے بدن میں جیسے سنگیت بھرا ہوا تھا، جیسے آگ بھری ہوئی تھی۔ جب حرکت کرتی تھی تو چنگاریاں لپکتی تھیں۔ سب دم بخود ہو گئے۔ موتی اپنی جگہ پھڑکنے لگا۔ پہلا شعر تو شہ پارہ نے اپنی جگہ بیٹھ کے گایا، پھر سیٹھ نے اُسے نوٹ دکھا کے اپنے پاس بلایا۔ وہ اُٹھتی تھی تو سیٹھ ایک اور نوٹ جیب سے نکال کے اُس کے حوالے کر دیتا تھا۔ سیٹھ کی جیب میں جیسے خزانہ بھرا تھا۔ ایک نوٹ اُسے دیتا تھا، دوسرا جھٹ جیب سے نکال لیتا تھا، چنانچہ وہ وہیں جمی بیٹھی تھی، اُٹھنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ سیٹھ کے ساتھی بھی نوٹ لُٹا رہے تھے۔ یہ ماحول، یہ کمرہ، یہ حسین لڑکی، یہ ناز، یہ رقص۔ کل مجھے زرّو کو دیکھ کر بھی تعجب ہوا تھا، اتنی حسین لڑکیاں کس بے پروائی سے مردوں کے سامنے ناچ لیتی ہیں۔ میری نظریں حیرت سے یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ میری سمجھ میں یہاں کے آداب آ رہے تھے۔ جب بہت دیر ہو گئی اور شہ پارہ سیٹھ کے سامنے سے اُٹھ اُٹھ کے بیٹھتی رہی تو کرمن نے تجمل کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ "بتاؤ! تو دولتیا معلوم ہوتا ہے، باپ کما کے دیا ہے، تھوڑی دیر اور برداشت کر لو کرمن، تمھیں شہ پارہ سے کانٹے کی چیزیں سنواؤں گی"۔ وہ اتنی آہستہ آواز میں بولی کہ میرے سوا کوئی نہ سن سکا۔

"ٹھیک ہے کرمن! اسے جیبیں خالی کر لینے دو"۔

"اور اپنی دولت پر بلو کرتے رہو"۔ موتی طیش میں بولا۔ "تجمل! میں چاقو نکالتا ہوں، دیکھتا ہوں، روپے میں زیادہ زور ہے یا چاقو میں"۔

کرمن نے اُس کے پیر پکڑ لیے۔ "میری عزت تمھارے ہاتھ میں ہے موتی! یہ تمھارے آنے کی برکت ہے کہ بارش ہو رہی ہے۔ بس میری خاطر اسی طرح خوش بیٹھے رہو، گھر تمھارا ہے، میں تمھاری ہوں، لڑکی تمھاری ہے"۔

شہ پارہ کے ماتھے پر پسینہ بہنے لگا تھا۔ وہ تھک گئی تھی۔ یہ خوب تماشا تھا۔ مجھے اُس لڑکی پر ترس آنے لگا۔ اُس نے اتنی نازک گڑیا سی لڑکی کو کھلونا سمجھ رکھا تھا اور تجمل خاموش تھا۔ موتی پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ کرمن خوشامد کر رہی تھی۔ کانتے اور گھوشی کے چہرے سرخ ہو گئے تھے۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ یہاں کوئی بہت بڑا فساد ہو سکتا ہے۔ تجمل کا پُرسکون چہرہ دیکھ کے سبھی رُکے ہوئے تھے۔ سیٹھ روپے لٹا رہا تھا۔ موتی کی آنکھوں سے اب شعلے اُگلنے لگے تھے، اُسے روکنا مشکل ہو گیا تھا۔ سیٹھ نے شاید یہ نہیں کیا کہ یہاں کوئی اور بھی بیٹھا ہے اور کوئی اور کون بیٹھا ہے۔ وہ کلکتے میں یہ بالکل نیا نیا آیا تھا یا اُس کے پاس بہت دولت تھی یا وہ بہت اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ کبھی اُس نے ہماری جانب توجہ ہی نہیں کی۔ وہ کوئی بڑا ہی آدمی ہو گا۔ لٹاتا رہا تھا۔ ایک ہی غزل میں دیر ہو گئی۔ سیٹھ نے اپنے دونوں ہاتھ گاؤ تکیے پر پھیلا رکھے تھے اور گاؤ تکیہ اُس کے زانوؤں پر رکھا تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے مخمور نظروں سے شہ پارہ کو دیکھے جا رہا تھا۔ پھر شاید اُس کے پاس نوٹ ختم ہو گئے۔ اُس نے اپنی گھڑی اُتار کر نچھاور کر دی، اپنا قلم نثار کر دیا، اپنے ہاتھوں کی انگوٹھیاں نچھاور کر دیں اور جب کچھ نہ رہا تو گلے کے اندر لٹکی ہوئی سونے کی زنجیر بھی اُتار دی۔ اُس نے زنجیر اُتاری تو مجھے مالا کا خیال آیا۔ مالا میری بنیان کے نیچے تھی، موجدار سے لڑائی کے وقت مجھے اگر کسی بات کا خیال تھا تو مالا کا تھا کہ کہیں اس کی ڈوری پر موجدار کا چاقو نہ چل جائے، وہاں اس کے بکھرے ہوئے دانے سمیٹنا مشکل ہو جاتا۔ میرا لباس تبدیل کرتے وقت تجمل اور اُس کے آدمیوں نے یہ مالا دیکھ لی تھی مگر اُس وقت اُن کی نگاہیں اس کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں کر سکیں۔ سیٹھ لکشمی داس نے آج جتنا روپیہ خرچ کیا تھا، زیور، انگوٹھی، قلم، کرتے کے طلائی بٹن، شیروانی کے طلائی بٹن، اُن سب کی قیمت اِس مالا سے کم ہی تھی۔ میرے جی میں آیا کہ میں شہ پارہ کو یہ مالا پیش کر دوں اور سیٹھ سے کہوں، تمھارے پاس اس سے زیادہ قیمتی کوئی شے ہو تو پیش کرو۔ میں نے اپنے گلے پر ہاتھ رکھ لیا کہ کہیں کرمن، شہ پارہ یا ہمارے پاس بیٹھی ہوئی لڑکی کی نظر میری مالا پر نہ پڑ جائے۔ سیٹھ خالی ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنی جیبیں اُلٹ دیں لیکن شہ پارہ اُس کے سامنے بیٹھی گاتی رہی۔ موتی کا قہقہہ اُبل پڑا۔ سیٹھ نے نخوت و نفرت سے منہ پھیر لیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اب بھی شہ پارہ اُس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ جیسے اُسے بھی ضد ہو گئی ہو۔ سیٹھ نے اپنے شانے اُچکائے اور شیروانی کی اندرونی جیب سے تمنچہ نکالا۔ شہ پارہ اُسے دیکھ کے کچھ پیچھے ہٹی۔ سیٹھ نے اپنا تمنچہ چلانے کے لیے تیار کر لیا۔ بس لبلبی دبانے کی دیر تھی۔ کرمن ہکا بکا رہ گئی، سازندوں کے ساز گڑبڑا گئے، طبلہ لرزنے لگا۔

کانتے نے جھٹ اپنی جیب سے چاقو نکالا اور کھٹ کر کے کھول لیا۔ موتی اور گھوشی نے بھی یہی کیا۔ تجمل نے اُن کی یہ وحشت دیکھی تو دونوں ہاتھ پھیلا کے انھیں صبر و ضبط کی تلقین کی۔ اِس اثنا میں سیٹھ تمنچہ شہ پارہ کے حوالے کر چکا تھا۔ ساتھ ہی اُس نے اپنا گریبان چاک کر دیا اور سینہ آگے کر کے شہ پارہ کو اشارہ کیا کہ وہ اس پر گولی چلا دے۔ اُس کے ساتھی اُسے روک رہے تھے۔ شہ پارہ کے ہاتھ میں کانپتا ہوا تمنچہ دیکھ کے کرمن کے چہرے پر طمانیت کی لہر دوڑی۔ وہ اُٹھنا چاہتی تھی کہ تجمل نے اُسے روک لیا۔ پہلے تو شہ پارہ کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا، وہ گانا وانا بھول گئی تھی۔ سازندوں کے ہاتھوں پر برف جم گئی تھی۔ شہ پارہ نے کرمن کی طرف دیکھا۔ کرمن چیخ کر شاید یہ کہنا چاہتی تھی کہ وہ تمنچہ ایک طرف پھینک دے۔

"تمنچہ سیٹھ کو واپس کر دینا چاہیے"۔ تجمل نے کرمن سے کہا۔

"وہ اس وقت ہوش میں نہیں ہے استاد! میں نے اتنا ضدی آدمی اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ اس سے کچھ بعید نہیں ہے، تمنچہ اُسے واپس نہیں کرنا چاہیے"۔ کرمن سرگوشی میں بولی۔

"تمنچہ اُسے واپس کرا دو"۔ تجمل نے سختی سے کہا۔

"استاد! اب تک تم نے جس ظرف کا ثبوت دیا ہے، خدا کے لیے اُس پر قائم رہو، یہ جگر رسوا مت کرو"۔ کرمن لجاجت سے بولی۔

"اور ہمیں بھی تماشا نہ بناؤ کرمن بانو!"

"کرمن یہ جرأت کیسے کر سکتی ہے تجمل! کرمن یہاں کس کے آسرے پر سر اونچا کیے بیٹھی ہے۔ تجمل کے، تم کہتے ہو تو میں اُس سے کہے دیتی ہوں"۔ کرمن نے شہ پارہ کو اشارہ کیا۔ شہ پارہ نے تمنچہ سیٹھ کو واپس کر دیا۔

سیٹھ نے فرطِ جذبات میں اُس کی انگلیاں چوم لیں۔ شہ پارہ اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے اُٹھی تو سیٹھ بھی بے تابی سے اُٹھ گیا۔ "اب کہیں نہ جاؤ"۔ اُس نے لڑکھڑاتی

ہوئی آواز میں کہا: "اب تم صرف ہمارے لیے گانا گاؤ گی، صرف ہمارے لیے ناچو گی، صرف ہمارے دل پر راج کرو گی۔ ہم تمھیں اپنی رانی بنائیں گے اور تمھارے قدموں میں دُنیا بھر کی خوشیاں بکھیر دیں گے۔ جو کچھ ہمارے پاس ہے، وہ تمھارا ہے۔ کرمن بانو!" وہ بلند آواز سے بولا: "ہم شہ پارہ کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ اب وہ کسی اور کے سامنے نہیں ناچے گی۔ جو تم کہو گی، وہ ہم پیش کر دیں گے۔ بتاؤ ہمیں کیا کرنا ہوگا؟"

"سیٹھ! آپ کی باتیں سن کے میں اپنی قسمت پر جتنا بھی ناز کروں، کم ہے۔ میری محنت کا صلہ مل گیا مگر سیٹھ، شہ پارہ ہی میری پونجی، میری کل جائداد ہے۔"

"ہم تمھیں کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دیں گے۔"

"میں جانتی ہوں، اللہ نے آپ کو ہر نعمت سے نوازا ہے۔ آپ کے بہت سے کارخانے ہیں، میرا کارخانہ تو ایک یہی ہے۔"

"ہم شہ پارہ کے لیے تمھاری ہر خواہش پوری کریں گے۔"

"مجھے سوچنے کا موقع دیجیے۔ یہ باتیں ایسی تو نہیں ہیں کہ ابھی اور اسی وقت طے ہو جائیں۔ میں نے تو ایسا کبھی خیال بھی نہیں کیا تھا، آپ مجھے کچھ وقت دیجیے۔"

"نہیں۔ ہم تمھارا جواب اِسی وقت سُننا چاہتے ہیں۔"

"اس وقت آپ دیکھ رہے ہیں کہ میرے غریب خانے پر مہمان موجود ہیں۔ ابھی تک انھوں نے شہ پارہ کو ٹھیک سے سُنا بھی نہیں ہے۔"

"ہم اسی لیے جلد از جلد جواب چاہتے ہیں۔ تم اگر چاہو تو شہ پارہ سے پوچھ لو، وہ انکار نہیں کرے گی۔ ہم نے کچھ اور ہی فیصلہ کر لیا ہے۔ اب شہ پارہ صرف ہمارے دل کی دھڑکن بنی رہے گی۔ ہم اس کا کسی اور کے سامنے ناچنا گانا پسند نہیں کریں گے۔"

"سیٹھ صاحب! سیٹھ صاحب! یہ فیصلے اتنی جلدی نہیں ہوتے۔" کرمن نے خوشامدانہ انداز میں کہا: "آپ کو بھی میرا تجربہ کارانہ مشورہ ہے کہ ذرا رات کو بستر پر ٹھنڈے دل سے سوچیے گا۔" کرمن دبے دبے لفظوں میں سیٹھ کو سمجھاتی بجھاتی رہی مگر اُس کی ضد بڑھتی جا رہی تھی۔ ہم میں سے کسی شخص نے ابھی تک اس معاملے میں دخل نہیں دیا تھا۔ کرمن کی زبان تھک گئی مگر سیٹھ کی ضد میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ اُس کی جیب میں بھرا ہوا تمنچہ تھا۔ کرمن کو خوف ہوگا کہ بات قابو ہی میں رہے، اسی لیے وہ نرمی، خوش اخلاقی، معذرت اور خوشامد کے لہجے میں سیٹھ لکشمی داس سے مخاطب تھی۔ سیٹھ نے کلکتے میں قائم کیا ہوا اپنا کارخانہ کرمن کے نام کرنے کی پیش کش کی۔ ایک ہزار روپے ماہانہ مشاہرہ، پچیس ہزار روپے نقد جسے بڑھا کے اُس نے ایک لاکھ روپے کر دیا۔ کرمن مبہوت ہوگئی تھی۔ اُس کی خاموشی پر سیٹھ اپنی پیش کشوں میں اضافے پر اضافے کیے جا رہا تھا۔

"ہم شہ پارہ کو اس تنگ و تاریک جگہ سے نکال کے تخت پر بٹھانا چاہتے ہیں۔ اس کی صحیح جگہ وہی ہے۔" وہ جوش میں بولا: "ہم اسے ہر صورت میں یہاں سے لے جائیں گے۔"

کرمن جز بز بیٹھی تھی۔ سیٹھ نے شہ پارہ سے کہا: "چلو، ہمارے ساتھ چلو شہ پارے! ہم تمھاری قدر کریں گے۔"

"مگر۔۔۔ مگر اس وقت؟" شہ پارہ جھجک کے بولی۔

"ہاں اِسی وقت، ابھی۔ ہم کرمن کے نام کاغذ لکھے دیتے ہیں۔ ہم اپنے وعدے پورے نہیں کر دیں گے، اُس وقت تک تمھارے قریب ہ[illegible]

"یہ وقت مناسب نہیں سیٹھ صاحب!" شہ پارہ نے حوصلے ک[illegible]

"ہم نے انکار سُننا نہیں سیکھا ہے شہ پارے!"

"کنیز انکار نہیں کر رہی ہے۔ کنیز کی درخواست ہے کہ اُس کی ماں کو کچھ تو مہلت دی جائے۔ ہمیں آخر اتنا اختیار تو حاصل ہے۔"

"گانا شروع کرو۔" اچانک ببّھل نے گرج دار آواز میں حکم د[یا] "گانا شروع کرو۔"

"شہ پارہ نہیں گائے گی۔" سیٹھ نے درشتی سے کہا۔

"کیوں نہیں گائے گی؟" ببّھل نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے تحمّل [سے کہا]

"تم سُن نہیں رہے ہو؟ ہم شہ پارہ کا سودا کر رہے ہیں۔"

"اور اُس کی ماں تیار نہیں ہے۔ جاؤ سیٹھ، جاؤ۔ کرمن کے [...] ممکن ہے کرمن یہ لڑکی تمھارے سپرد کر دے، پھر جو جی چاہے کرنا۔ تمھارے [...] ختم ہو چکے ہیں اور اس جگہ اُسی آدمی کی قدر ہوتی ہے جس کی جیب [...] ہے۔ تمھاری جیب میں کچھ نہیں ہے۔ جیب میں جب کچھ ڈال کے آ[نا] بات کرنا۔ گانا شروع کراؤ کرمن! دیر کس بات کی ہے۔"

"شہ پارہ اب نہیں گائے گی۔ ہم یہیں بیٹھے بیٹھے شہ پارہ کو [...] سکتے ہیں۔ ہماری بات روپیہ ہے، ہماری بات سونا ہے۔"

"تم سے کہہ دیا گیا ہے کہ کرمن کو سوچنے کا وقت دو۔"

"تم درمیان میں مت بولو۔ یہ ہمارا اور کرمن کا معاملہ ہے۔"

"تم ہمیں جانتے نہیں ہو، اسی لیے ہم اب تک فائرنگ [...] کی کوشش بھی نہیں کی۔ یہ علاقہ ہمارا ہے اور یہاں ہمارا حکم چل[تا ہے]"

"یہ علاقہ انھی کا ہے سیٹھ!" کرمن گھبرا کے بولی۔

"اور ہماری بات فولاد ہے۔" ببّھل بولا۔ "اور ہمارا وقت [...] یہ سودے بازی بعد میں کرنا۔ ہمیں گانا سُننا ہے۔"

"تم شوق سے گانا سنو مگر وہ گانا شہ پارہ کا نہیں ہوگا۔"

"وہ گانا شہ پارہ ہی کا گانا ہوگا۔" ببّھل نے اطمینان سے [کہا]

"ہم گانا نہیں ہونے دیں گے۔" وہ غصے میں بولا: "ہم شہ[ر] کر دیں گے۔ بہتر ہے تم اپنی زبان بند رکھو۔ ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا؟۔۔۔ موتی! دیکھتا ہے یہ سیٹھ کا بچہ کیا بک رہا [ہے]" سے کہا: "ہمیں زبان بند کرنے کا حکم دے رہا ہے۔"

"استاد! اس کی زبان چاقو سے کاٹ لوں؟" گھوشی [نے] ہنستے ہوئے کہا: "بہت ہوگیا استاد! تم نے تو حد کر دی۔"

"ببّھل! کیا ذلیل کرانے لایا تھا؟ یہ کنجڑا اتنی دیر سے ٹر ٹر [کیے جا رہا ہے اور تو] بیٹھا سُن رہا ہے؟" موتی انگڑائی لے کے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"میں نے اتنی باتیں کبھی نہیں سُنیں۔" سیٹھ جھنجلا کے بولا: "تمنچہ ہے، احمد آباد میں کئی غنڈے اس کا مزہ چکھ چکے ہیں۔ آگے بڑھنے کی کوشش مت کرنا۔"

موتی نے ایک مصنوعی قہقہہ لگایا: "ببّھل ذرا احمد آباد بھی جانا پڑے گا۔ یہ شہر بھلا کلکتے سے کتنی دُور ہے؟" وہ آہستہ آہستہ سیٹھ کی طرف بڑھنے لگا۔

"ہزار ڈیڑھ ہزار میل پر ہوگا۔" ببّھل نے سرسری جواب دیا۔

"آگے مت بڑھو، میں کہتا ہوں آگے مت بڑھو۔" سیٹھ نے تمنچہ تان کر کہا۔

"کرمن! کرمن بانو! تم اسے روکو۔ اِس جانور کو روکو۔ اگر ایک خون ہوگیا تو پھر یہاں سے کوئی زندہ واپس نہیں جائے گا۔ ہم اب جائیں گے اور شہ پارہ ہمارے ساتھ جائے گی۔"

کرمن کانپ رہی تھی۔ موتی قہقہے لگاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ شہ پارہ چیختی ہوئی موتی کے پاس آئی اور اُس کا بازو جھنجوڑ کے بولی: "رُک جاؤ، رُک جاؤ، میں سیٹھ سے بات کرتی ہوں۔ میں نہیں گاؤں گی، نہیں ناچوں گی، میں سیٹھ کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ یہاں خون مت بہاؤ۔"

موتی رُک کے شہ پارہ کو غور سے دیکھنے لگا: "تم اتنی پیاری لڑکی ہو۔ میں تمھیں اس پاگل کے ساتھ نہیں جانے دوں گا۔"

"شہ پارہ! سامنے سے ہٹ جاؤ۔" سیٹھ نے مرتعش آواز میں کہا: "شاید اس کی موت آگئی ہے۔"

"نہیں نہیں۔" شہ پارہ ہذیانی انداز میں بولی: "میں تم سے منت کرتی ہوں۔ تمنچہ اندر رکھو، تمنچہ اندر رکھ لو۔" وہ ایک لمحے میں جست لگا کے سیٹھ کے پاس پہنچ گئی۔

موتی اُس کے مقابل کھڑا تھا۔ اُن دونوں کے درمیان چند فٹ کا فاصلہ تھا۔ تمنچے پر سیٹھ کی گرفت سخت معلوم ہوتی تھی۔ ببّھل کھڑا ہوگیا۔ شولی، کانتے چند قدم آگے بڑھ گئے۔ اُن کے چاقو روشنی میں چمک رہے تھے۔ کرمن سیٹھ کے قدموں پر سر رکھ کے فریاد کر رہی تھی۔ سیٹھ کے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگ بھی اُسے روکنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ ادھر ببّھل، کانتے اور شولی کھلے چاقو ہاتھوں میں لیے قہر آلود نظروں سے سیٹھ کو گھور رہے تھے۔ میرے ہاتھ میں چاقو نہیں تھا۔ میں نے کانتے سے کہا کہ اگر اُس کے پاس کوئی فاضل چاقو موجود ہو تو وہ میرے حوالے کر دے۔ ببّھل نے سُن لیا اور اپنا چاقو مجھے دے دیا۔ سیٹھ تمنچہ تانے بار بار موتی کو سامنے سے ہٹنے کا حکم دے رہا تھا اور موتی کسی بُت کی طرح اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے چاقو کھولے اُس کے رُو بہ رُو کھڑا تھا۔ پھر نہ جانے اچانک کیا ہوا، میں صرف اتنا دیکھ سکا کہ موتی کا جسم بائیں طرف پھرتی سے جھکا اور اُس کا چاقو والا ہاتھ بجلی جیسی تیزی سے سیٹھ کے ہاتھ پر جھپٹا۔ سیٹھ نے ایک چیخ ماری۔ تمنچے سے گولی کی آواز آئی اور تمنچہ لڑھکتا ہوا دُور جا گرا۔ سیٹھ کے ہاتھ سے خون بہنے لگا تھا اور وہ درد کی شدت سے اپنا ہاتھ دوسرے ہاتھ سے بُری طرح پکڑے ہوئے تھا۔ موتی نے جس تیزی اور پھرتی اور چابک دستی سے یہ کام کیا تھا، وہ چاقو زنی کا کمال تھا۔ اُس نے ٹھیک اُسی ہاتھ پر چاقو کا وار کیا تھا جس میں تمنچہ موجود تھا۔ پہلے موتی نے بائیں طرف جسم جھکا کے سیٹھ کو ورغلایا اور پھر دائیں ہاتھ سے اُس کے ہاتھ پر حملہ کر دیا۔

چاقو اس انداز سے لگایا گیا تھا کہ تمنچے کی گولی ضائع چلی جائے ورنہ دوسری صورت میں وہ کسی کو بھی لگ سکتی تھی۔ اپنا جسم ہٹانا اور تمنچے کا نشانہ قائم رکھتے ہوئے حملہ کرنا اس بات کا ثبوت تھا کہ موتی کو اپنی چاقو زنی پر مکمل اعتماد ہے۔ ببّھل نے اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ گھوشی نے تمنچے پر قبضہ کر لیا تھا۔ خون روکنے کے لیے کرمن نے اپنا دوپٹا سیٹھ کے ہاتھ پر باندھ دیا۔ وہ بلبلانے لگا تھا۔ اُس کی تین انگلیوں کے درمیانی پوروں پر چاقو کی ایک گہری لکیر کھنچ گئی تھی۔ ذرا ہاتھ اور گہرا پڑ جاتا تو تینوں پورے زمین پر گر جاتے مگر موتی کا مقصد یہ نہیں ہوگا۔ جو مقصد تھا، وہ اُس نے حاصل کر لیا تھا۔ سیٹھ لکشمی داس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ اُس نے درد و کرب دبانے کی بہت کوشش کی مگر اُس کی کراہیں نکل ہی گئیں۔ اُس کے ساتھیوں، دوستوں اور کرمن نے اُسے فرش پر بٹھا کے گھر طو دواؤں سے اُس کی پٹی کر دی۔ ببّھل نے دوبارہ شہ پارہ کو حکم دیا کہ وہ گانا شروع کرے۔ شہ پارہ نے گھنگرو اُتار دیے تھے۔ ببّھل کے حکم پر اُس نے کسی توقف کے بغیر عمل کیا۔ جیسے ہی گھنگرو چھنکے اور طبلے پر پہلی تھاپ پڑی، سیٹھ وحشت زدہ انداز میں اُٹھ گیا: "نہیں شہ پارے، تم نہیں گاؤ گی۔ انکار کر دو شہ پارے!" وہ چیخنے لگا۔

شہ پارہ نے مصرع اُٹھا دیا ع۔ روٹھی پھرتی ہے پھولوں کی سواری آپ کی۔

سیٹھ نے تیز نظروں سے اُسے دیکھا اور اپنے ساتھیوں سمیت دروازے کی طرف بڑھنے لگا: "سنو سیٹھ!" کانتے کی آواز نے اُس کے قدم روک لیے۔ کانتے نہ جانے اُس سے کیا کہنا چاہتا تھا مگر پھر رُک کے کہنے لگا: "جاؤ سیٹھ! آیندہ احتیاط رکھنا۔"

"یہ احمد آباد نہیں ہے سیٹھ!" موتی نے ہنس کے کہا: "وہاں نخرے رہتے ہوں گے۔ اب جاتے کہاں ہو، بیٹھ جاؤ، ہماری طرف سے گانا سنو۔ تم چلے جاؤ گے تو مزہ نہیں آئے گا۔ تمھیں سامنے دیکھ کے شہ پارے کی آواز میں کچھ اور ہی سوز پیدا ہوگا۔"

سیٹھ نے شعلہ بار نظروں کے سوا کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس نے آخری بار شہ پارہ پر ایک نظر ڈالی اور گردن جھٹکتا ہوا دروازے سے نکل گیا۔ کرمن کی پکار، موتی، کانتے اور گھوشی کے قہقہوں نے دُور تک اُس کا تعاقب کیا ہوگا۔ کرمن نے لپک کے دروازہ بند کر دیا اور سیدھی ببّھل کے پہلو میں آ بیٹھی: "آج تو خیر ہوگئی استاد!" وہ خفقانی لہجے میں بولی: "اگر تمنچہ چل جاتا تو؟"

"تو کیا ہوتا، تمھاری چاندنی خراب ہو جاتی۔" موتی نے کہا۔

"میرا تو دل ابھی تک ہول رہا ہے۔"

"تم گھاٹے میں نہیں رہیں کرمن بانو!" کانتے نے آنکھ مار کے کہا۔

"آگ لگے ایسی دولت کو، سر پہ تلوار لٹک رہی تھی۔" کرمن بولی: "وہ تو آج متھے سے اُکھڑ گیا تھا۔ دیکھو میرا دل۔" اُس نے ببّھل کا ہاتھ پکڑ کے اپنے سینے سے لگا لیا: "کیسا دھڑک رہا ہے۔"

"ہم بھی تمھارے پرانے آشناؤں میں سے ہیں۔" موتی نے شکایت کی۔

"یہ تو پیسے کی دھڑکن ہے کرمن بانو!" گھوشی نے کانتے کو کہنی ماری: "سودا بُرا نہیں تھا، بات اب بھی بن سکتی ہے۔"

"اے جاؤ بھی۔" وہ گھوشی کو ٹھوکا مار کے بولی: "اِس جنونی کو کون اپنی بیٹی

دے گا۔" پھر اُسے اچانک کچھ خیال آیا یا شاید وہ موضوع بدلنا چاہتی تھی اُس نے شہ پارہ کو اشارہ کر کے ہمارے پاس بُلایا۔ "میں تو بھول ہی گئی۔" وہ ماتھے پہ ہاتھ رکھ کے بولی۔ "آداب نہ تسلیم، سلام نہ دعا۔ اُس نامنجار نے موقع ہی نہیں دیا۔ بچھل تو شاید پہلی بار شہ پارے کو دیکھ رہے ہیں۔"

سیٹھ کے جاتے ہی ہم لوگوں کو باتوں میں مصروف دیکھ کے شہ پارہ نے نغمہ سرائی بند کر دی تھی۔ کریمن کی طلبی پہ وہ فوراً ہمارے پاس آئی سب کو گردن خم کر کے ایک ہاتھ سے تسلیم کی۔ مجھے وہ اُس وقت بہت اچھی لگی میرا جی چاہا کہ وہ ایک بار اور تسلیم کرے۔ پہلی لڑکی ٹرے میں چائے سجا کے لے آئی تھی، خشک میوے اور مونگ پھلیاں وغیرہ۔ شہ پارہ کو اتنے قریب سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ تو بہت معصوم ہے۔ یقیناً اُسے بھی کسی نسترن نے کریمن کے حوالے کیا ہو گا۔ میرا دل اُس سے یہ پوچھنے کے لیے مچلا کہ وہ کہاں سے آئی ہے۔ رقص کی یہ تعلیم، یہ گائکی تو اُس نے اسی جگہ سیکھی ہو گی۔ سیٹھ کے واقعے سے اُس کی شوخی رخصت ہو گئی تھی۔ وہ دھیمے دھیمے مسکرا رہی تھی۔ یہ بہت اجنبی مسکراہٹ تھی۔ موتی اُس کے حسن کی برملا تعریف کر رہا تھا، وہ شرما شرما جاتی تھی، میری نظریں اُس کے چہرے پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ جب موتی نے اصرار کیا کہ اب رات جا رہی ہے کچھ ناچ گانا ہو ہی جائے تو وہ ایک گہری سانس لے کے اٹھی۔ میں نے چاہا اُسے گانے سے منع کر دوں اور کہوں کہ وہ صرف باتیں کرتی رہے لیکن موتی، گھوشی اور کانتے کا اشتیاق دیکھ کے خاموش رہا۔ شہ پارہ نے پھر گانا شروع کر دیا ۔

رونق بھرتی ہے پھولوں کو سواری آپ کی
کس قدر ممنون ہے بادِ بہاری آپ کی

وہ اتنی دل سوز، دل نشیں اور دل کش آواز میں گا رہی تھی کہ سب پر محویت طاری ہو گئی۔ موتی کی جیب میں جو کچھ بھی تھا، وہ اُس نے لُٹا دیا۔ شہ پارہ اُس کے سامنے آ کے گانے لگی۔ میری جیب میں پیسے ہی نہیں تھے لیکن کانتے اور گھوشی نے کل والی حرکت کی میرے کان، گال اور ہونٹوں سے نوٹ لگا دیے۔ شہ پارہ انھیں میرے چہرے سے مسکرا مسکرا کے نوچتی رہی۔ میں اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بھی مجھے دیکھ رہی ہے اور اُس کی نگاہ میرے جسم میں پیوست ہوتی جا رہی ہے۔ "دیکھا استاد! میں نے پہلے ہی کہا تھا" لاڈلے کے سامنے سالا اپنے کو کون پوچھے گا۔" کانتے نے بچھل سے کہا۔ "اب ہماری کیا ضرورت ہے چلو اٹھو استاد!"

"حرام کے جنے، تیری زبان میں کیڑا لگ گیا ہے۔" بچھل نے غصے سے کہا۔ "کسی دن اسے کاٹ کے کتوں کے آگے ڈال دوں گا۔"

کانتے بھن بھنانے لگا۔ موتی نے اُس کے سر پہ دھپ مار کے اُسے خاموش کیا۔ شہ پارہ کو گاتے گاتے ہنسی آ گئی۔ اُس کے موتیوں جیسے دانت بکھر سے گئے۔

ابھی اُسے گانا گاتے ہوئے دیر نہیں گزری تھی کہ دروازے پر زور زور سے دھڑ دھڑ ہونے لگی۔ شہ پارہ کی آواز میں لرزہ آ گیا۔ ہم سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ گھوشی نے سیٹھ کا تمنچہ بچھل کے حوالے کر دیا تھا۔ کریمن تھوڑی دیر لا دروازے کی طرف نہ جاتی تو شاید دروازہ ٹوٹ جاتا۔ وہ اُدھر گئی اور اِدھر ہم اُٹھنا چاہتے تھے، بچھل نے انھیں بیٹھے رہنے دیا۔ البتہ ہمارے چاقو سے غافل نہیں تھے۔ سازندوں کے ہاتھ بہکنے لگے اور شہ پارہ اپنی آواز قائم رکھنے میں ناکام ہو گئی۔ کریمن نے لرزتے لرزتے کنڈی کھولی۔ دروا کریمن کے منہ پر لگا۔ چونکہ باہر سے اُس پر زور پڑ رہا تھا اور حضرت جا پہلے ایک انسپکٹر دندناتا ہوا اندر گھسا، اُس کے پیچھے دو پولیس والے تھے۔ سیٹھ کشمی داس اور اُس کے دوست تھے۔ انسپکٹر دو چار ہی قدم آگے سٹ پٹا کے ٹھہر گیا۔ اُس کے چہرے پر چھائی ہوئی درشتی تیزی سے ہو گئی۔ "سلامے۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "استاد بچھل موجود ہیں۔ کہو استاد! کیا معاملہ ہے؟"

بچھل کھڑا ہو گیا۔ "مکرجی! کیسے ہو؟"

"ٹھیک ہوں استاد! یہ کیا؟..." اُس نے سیٹھ کی طرف دیکھ کے کہا۔ "میں سمجھا تھا کوئی اور ہو گا۔"

"سیٹھ نے تمھیں میرا نام نہیں بتایا ہو گا مگر چلو اچھا ہوا تم آ سیٹھ کے چاقو مار دیا ہے۔" بچھل نے مسکرا کے کہا۔

"ہاں جی انسپکٹر صاحب اور بچھل کے پاس سیٹھ کا تمنچہ ہے"

"زیادہ کیوں بولتا ہے لے۔" بچھل نے موتی کو جھڑک دیا۔

"میں پوری بات بتا رہا ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ مکرجی جانتے ہیں مکرجی! ا ہتھکڑی لگا دیجیے۔ موتی نے سیٹھ کے ہاتھ پہ چاقو مارا تھا۔ قتل عمد سے۔ دفعہ لگ سکتی ہے، سیٹھ کا خون بھی بہنگا ہے۔"

انسپکٹر مکرجی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ کبھی بچھل کی جانب کی جانب۔ "ان غنڈوں نے ہماری بے عزتی کی ہے انسپکٹر!" سیٹھ کشمی میں کہا اور موتی کی طرف دیکھا۔ "اسے سزا دلواؤ۔"

"بھیڑیے، بھیڑیے سیٹھ صاحب!" انسپکٹر نے ہاتھ اُٹھاتے "استاد بچھل کو نہیں جانتے؟ یہ سب اِن کے ساتھی ہیں۔ مجھے یقین تک کوئی خود ان سے چھیڑ نہ کرے یہ آگے نہیں بڑھتے۔"

سیٹھ کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ "انسپکٹر! ہم کیا جھوٹ بولا تم یہ ہمارا ہاتھ نہیں دیکھ رہے ہو؟"

"دیکھ رہا ہوں سیٹھ صاحب! دیکھ رہا ہوں۔ ایسے موقعوں باتیں ہو ہی جاتی ہیں، جانے دیجیے۔" انسپکٹر نے اُس کا تکدر دور کر

"انسپکٹر!" اُس نے کپکپا کے انگریزی میں کہا۔ "تم ہمارے کتوں کو عزت دے رہے ہو؟ ہم کیا تمھیں اسی لیے یہاں لا کوئی کارروائی نہیں کرو گے تو ہم تمھارے افسروں کے پاس جا روپے ہم نے تمھیں دیے ہیں اس سے کہیں زیادہ ہم اُن پر خرچ بدمعاشوں نے ہمیں شہ پارے کے سامنے شرمندہ کیا ہے۔ یہ قصائی

ہرا ہاتھ اپنے چاقو پہ مچلنے لگا۔ میں نے بچھل کی طرف دیکھا اُس کے ں پہ ایک پُرسکون مسکراہٹ رقصاں تھی۔ "نادو سیٹھ صاحب!" انسپکٹر نے نرمی انگریزی ہی میں کہا۔ "آپ نیچ لوگوں کے منہ کہاں آ رہے ہیں۔ یہ بڑے شیطان یرے کے بچے ہیں یہاں ایک سے ایک چھٹا ہوا بدمعاش بیٹھا ہے اپنی عزت ہاتھ ہوتی ہے سیٹھ صاحب! انھیں جتنا چھیڑیں گے یہ اتنا ہی منہ آئیں گے۔ ہے کہ معاملہ رفع دفع کر لیجیے۔ یہ جیل، تھانے اور کچہری وغیرہ سے نہیں ڈرتے۔ پھر آپ کا تمنچہ بھی ان کے پاس ہے۔ یہ رنڈی کا کوٹھا ہے سیٹھ صاحب! ان کے خلاف آپ کو کوئی گواہ بھی نہیں ملے گا۔ آپ کیوں ان جھگڑوں میں س گئے؟ آپ ان..."

"زبان سنبھالو انسپکٹر!" میں نے آگے بڑھتے ہوئے اُردو میں کہا۔ "اتنی گالیاں دو، ہم بھی کچھ عزت رکھتے ہیں۔"

انسپکٹر کی آنکھیں پھیل گئیں، رنگ زرد پڑ گیا۔ وہ سٹ پٹا گیا۔ اُس نے بولنا چاہا مگر منہ کی بات منہ ہی میں رہ گئی۔ بچھل نے قہر آلود لہجے میں مجھ سے چھا۔ "کیا کہہ رہے ہیں مکرجی؟ ہمیں گالیاں دے رہے ہیں؟"

میں نے بچھل کو نہیں بتایا کہ انسپکٹر نے ہمیں کن القاب سے نوازا ہے۔ "اپنا لا بھی گٹ پٹ جانتا ہے انسپکٹر صاحب!" موتی نے آتشیں انداز میں کہا۔ "ے اور تمھارے سیٹھ سے کچھ زیادہ ہی جانتا ہو گا۔ ہاں، لاڈلے بول! فر گٹ پٹ ائے۔"

"یہ لاڈلا ہے؟ وہی لاڈلا جس نے جیل میں تعلیم حاصل کی تھی؟" انسپکٹر ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ "مجھے افسوس ہے اُستاد!"

"ہاں یہ وہی لاڈلا ہے مکرجی! اچھا ہوا تم نے بھی اسے دیکھ لیا۔"

"مجھے افسوس ہے، میرا مطلب سیٹھ کو کسی صورت سے مطمئن کرنا تھا استاد ل! بات اُلجھانے کی کوشش مت کرو۔ میرا مطلب کچھ اور نہیں تھا۔"

"میں تمھارا مطلب سمجھتا ہوں مکرجی!" بچھل نے زہر خند سے کہا۔ "اطمینان سیٹھ کا تھا، ہماری تمھاری دوستی تو اپنی جگہ ہے۔"

"استاد بچھل!" انسپکٹر ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ "میں...."

"جانے دو انسپکٹر! گالیاں ہم پر اثر نہیں کرتیں۔ کچھ کارروائی کرنی ہے تو ورنہ یہاں سے چلے جاؤ۔ ہم یہاں مخل کرنے نہیں آئے۔"

"تم گانا سنو بچھل! کارروائی ہو چکی۔" اُس نے سیٹھ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "آؤ سیٹھ چلو۔"

"کیا کارروائی ہو چکی؟" سیٹھ مچل کے بولا۔

"چلو سیٹھ! باہر چلو۔" انسپکٹر نے اُسے آسان کرنے کی کوشش کی۔

"نہیں سیٹھ! بیٹھو۔ شہ پارے نے آج گانے میں تڑپا تڑپا دیا۔ تم بڑے لی ہو، مول تول خوب کیا۔ اب بھی قیمت کم ہی رہی۔" موتی نے کہا۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا انسپکٹر کہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"آئیے میں آپ کو سمجھاتا ہوں۔" وہ سیٹھ کو کھینچتے ہوئے بولا۔ سیٹھ نے اس دفعہ زیادہ مزاحمت نہیں کی، اُس کے دوستوں نے بھی اُس کی پیٹھ تھپکی حالانکہ وہ سیٹھ کی حمایت میں اس بار پہلے سے زیادہ سرگرم اور پُرجوش نظر آ رہے تھے۔ چلتے چلتے انسپکٹر نے میری طرف حیرت سے دیکھا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ کریمن پھر سر پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھ گئی تھی۔ بچھل کا چہرہ چمکنے لگا تھا۔ "سالا ڈلے! لاڈلے! گلے لگ جا۔" وہ بے تابی سے بولا۔ "دیکھا موتی! میرے شیر کی گرج سُنی، میری بجلی چمکتی دیکھی؟"

"استاد! لاڈلے کو گٹ پٹ کرتے دیکھنے کی حسرت رہ گئی، سالے انسپکٹر کا چہرہ دیکھا تھا۔ اُس سے بات نہیں ہو رہی تھی۔ کیا گالیاں دے رہا تھا لاڈلے؟" کانتے نے میری پسلیوں میں ہاتھ ڈال کے پوچھا۔

وہ سب میرے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ موتی نے دہاڑ کے کہا۔ "بس کریمن! اب ایک آخری آئٹم سنوا دے۔ شہ پارے سے کہہ دے کہ وہ آج سارا ریکارڈ توڑ دے۔"

"اب مجھ سے نہیں گایا جائے گا۔" شہ پارہ نے آہستگی سے کہا۔

"تو مت گاؤ، بس ہمارے سامنے بیٹھی رہو۔ تمھارا تو سامنے رہنا بھی گانا ہے، طبلہ ہے، ہارمونیم ہے۔" موتی نے دونوں ہاتھ پھیلا کے کہا۔

"مجھے ڈر ہے کہ وہ جنونی پھر کسی افسر کو لے آئے گا۔ اُس کے پاس بہت پیسے ہیں۔" کریمن نے خوف زدگی سے کہا۔

"حرام کے ہیں۔" بچھل نفرت سے بولا۔ "اچھا ہے کچھ پولیس افسروں کا بھلا ہو جائے سب اپنے ہی آدمی ہیں۔ پر اب وہ اِدھر نہیں آئے گا۔"

"تمھیں معلوم ہے؟" کریمن نے حواس باختگی سے کہا۔ "تمھیں یقین ہے؟"

"ہاں۔" بچھل نے بے پروائی سے کہا۔ "اب وہ نہیں آئے گا، اب رات کو تم دروازہ کھلا رکھ کے سونا کریمن!"

"رات کو میں چوکیداری کرنے کو تیار ہوں۔ کیوں کریمن؟" موتی نے شوخی سے پوچھا۔ "تمھارا کیا خیال ہے؟"

"تمھارا گھر ہے موتی! یہاں آج تم لوگ نہ ہوتے تو مجھ پر کیا کیا نہ بیت جاتی۔ وہ تو پھن پھیلائے بیٹھا تھا۔ شہ پارہ کا چہرہ دیکھو، تھکا دیا غریب کو۔ لمحے لمحے پہ دل دھڑک رہا تھا۔"

گانے کی محفل تو پہلے ہی اُجڑ گئی تھی، سازندے بھی اپنا تان تنبورا سنبھال کے اندر چلے گئے۔ کریمن حیدرآباد کے واقعات سنانے لگی اور شہ پارہ سب کے سامنے میرے قریب آ کے بیٹھ گئی۔ میں گھبرا گیا۔ اُس کے سراپا سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی، پہلے تو وہ مجھے دیکھ کے آنکھیں پٹ پٹاتی رہی۔ پھر اُس کے لبوں پر تھرتھراہٹ سی ہوئی۔ یہی کیفیت میری تھی۔ "آپ ۔ آپ۔" وہ جھجک کے بولی۔ "میں تو سمجھ رہی تھی کہ آپ بولنا نہیں جانتے۔" میرا دماغ سن سنا گیا۔ کوئی معقول بات عقل میں نہیں آئی۔ وہ خود ہی مسکرا کے کہنے لگی۔ "میرا نام شہ پارہ ہے۔"

"میں نے سُن لیا ہے۔" میں بدحواسی سے بولا۔

وہ کچھ جھجکی۔ "آپ اِن سے بالکل جُدا معلوم ہوتے ہیں۔"

"آپ کا خیال ہے ورنہ مجھے تو اپنے آپ میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں

آتی۔" میں نے سنبھل کے کہا۔" آپ ہی بتائیے آپ کو مجھ میں کیا چیز جُدا نظر آتی ہے؟"

"ہر چیز۔ جب سے آپ آئے ہیں، خاموش بیٹھے ہیں۔ نہ داد نہ بیداد۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کو رقص و موسیقی سے دلچسپی نہیں ہے اور جیسے آپ کو جبراً یہاں کھینچ کے لایا گیا ہے۔ کہیے، میرا خیال درست ہے نا؟"

"مجھے یہ سب بہت عجیب سا لگ رہا ہے۔" میں نے اُلجھتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ آپ تو ان محفلوں کے عادی ہوں گے؟"

"نہیں، میں پہلی بار کسی ایسی جگہ آیا ہوں۔" میں نے صاف گوئی سے کہا۔

"سچ؟" وہ تعجب سے بولی۔ "آپ بنا رہے ہیں۔"

"آپ جو سمجھیے۔" میں نے کسی قدر خفت سے کہا۔

"واقعی؟ مجھے یقین نہیں آتا، بھلا آپ..." اُس کی پُتلیاں تھرکنے لگیں۔ "پھر تو آپ کو یہ سب کچھ اجنبی اجنبی لگ رہا ہوگا۔ سچ بتائیے۔ یہ ماحول آپ کو پسند آیا؟"

"سچ پوچھیے تو نہیں آیا۔ ممکن ہے بعد میں آ جائے۔"

"خدا نہ کرے۔" وہ تیزی سے بولی۔

"کیوں! آپ تو خود یہاں..." میں نے پہلو بدل کے کہا۔ "میرا خیال ہے، آپ تو بہت خوش نظر آ رہی ہیں۔"

"ہاں بہت خوش ہوں۔" وہ نظریں نیچی کر کے بولی۔

"آپ خوب گاتی ہیں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"اور خوب ناچتی ہیں۔" وہ سرگوشی میں بولی۔ "یہ بھی تو کہیے۔"

میں نے چونک کے دیکھا۔ اُس کی گردن جھکی ہوئی تھی، صرف پلکیں نظر آ رہی تھیں جو تھرتھرا رہی تھیں۔ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ اُن سب کی توجہ ہماری طرف مرکوز ہو گئی ہے۔ ہم دونوں چُپ تھے اور وہ گہری نظروں سے ہمارا جائزہ لے رہے تھے۔ موتی کا قہقہہ اُٹھا تو مجھے بڑی ندامت ہوئی۔ شہ پارہ کے جسم کا تمام خون چہرے پر سمٹ آیا، ہماری گھبراہٹ سے سب کی کلکاریاں چھوٹ پڑیں، میری ناراض نگاہی نے اور جھینپ لگائی۔

"ہم کو تمھاری نجریا نے مارا، نجریلے نے مارا، نجریا نے مارا، مارا، مارا۔" کانتے نے کولھے پر ہاتھ رکھ کے مٹکتے ہوئے گایا۔ "دیکھا نا اُستاد!"

تجمل نے اُچک کر اُس کی گردن پکڑ لی۔ "میں تیری کھال اُدھیڑ دوں گا۔" وہ غرا کے بولا۔ "بھڑوے، مجھے اپنا شاہجہاں پوری سب سے پہلے تیری ہی گردن پر آزمانا پڑے گا۔"

"وہ دن کب آئے گا؟" کانتے نے چاقو کھول کے کہا۔ "اس کی دھار بھی بہت بانکی ہے اُستاد! کاٹ دو۔"

شہ پارہ اُداس بیٹھی تھی، کانتے کی باتوں پر اُسے ہنسی آ گئی، کانتے نے ایک سرد آہ بھری۔ "اُستاد! کبھی کبھی مجھے ایسا خیال آتا ہے کہ ساری بات گردن کے اُوپر کے حصے کی ہے۔ اگر گردنیں بدل جایا کریں تو کتنا مزہ آتا۔ پھر کبھی کبھی لاڈلے کی گردن اُدھار مانگ کے اِدھر آیا کرتا۔ اپنی قسمت بھی چند گھنٹوں کے لیے بدل جایا کرتی۔"

"کوئی فرق نہ پڑتا۔" موتی نے کہا۔ "گردن سے نیچے بھی ایک چیز ہوتی ہے، کہاں سے لاتا؟"

"استاد! میری مانو تو آج لاڈلے کو یہیں چھوڑ جاؤ، کچھ شرم و دم آ ...

کریمن! تم لاڈلے کے بارے میں کیا کہتی ہو؟" کانتے نے پوچھا۔

"میرا بس چلے تو انھیں یہیں رکھ لوں۔" کریمن نے وارفتگی ...

"ہے ہے ظالم!" موتی پر جیسے گریہ طاری ہو گیا۔

دیر ہو گئی تھی۔ تجمل جھنجلا کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ کریمن نے اُس سے بیٹھنے کے لیے اصرار کیا مگر تجمل اُٹھ چکا تھا، وہ دوبارہ فرش پر نہیں بیٹھا۔ اُٹھتے ہی سب ٹھنڈی سانسیں بھرتے، ہائے ویلا مچلاتے، انگڑائیاں ... اُٹھ گئے۔ "اب کب آؤ گے؟" کریمن نے تجمل کے پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے ... دو سال بعد پھیرا لگا جاتا۔"

"جلد ہی آؤں گا کریمن!" تجمل نے جواب دیا۔ "کوئی پریشانی ہو تو ... کوئی ایسی ویسی بات ہو تو گلی سے کسی آدمی کو بُلا لینا۔ اپنے آدمی یہاں گھر رہتے ہیں۔"

"اور میرے لیے کیا حکم ہے؟" موتی نے کریمن کے گلے میں بانہیں ... "آسنسول آؤ گی یا بس یہیں یہیں تک بات ہے؟"

"تم دل سے بلاؤ گے تو سر کے بل آؤں گی۔" کریمن کِھل کِھلا ...

"اور ابھی تو تم شہر میں ٹھہرو گے، جب تک یہاں ہو میرے حجرے پر روز ... یہ میرا حکم ہے۔"

شہ پارہ سب سے پیچھے تھی۔ مجھے یقین تھا کہ چلتے وقت وہ مجھ سے ... کرے گی۔ اس لیے میں دانستہ اُن لوگوں سے پیچھے رہ گیا تھا۔ دروازے پر ... جھک کے تسلیم کی۔ میں نے آنکھوں کے اشارے سے جواب دیا۔ اُس نے ... کے ایک جھماکے کی طرح مجھ سے قریب ہو کے چپکے سے کہا۔ "دیکھیے ... کبھی اِدھر نہ آئیے گا۔" اس سے قبل کہ کانتے ہمیں مُڑ کے دیکھتا، وہ اپنا ... کے مکان کے اندر واپس ہو گئی۔

جس وقت ہم یہاں داخل ہوئے تھے، یہ پورا علاقہ جگمگا رہا تھا ... ہوتا تھا، برات چلی گئی ہے۔ روشنیاں گل ہو چکی تھیں۔ جھنجھن صاحب ... بھی بند ہو گئی تھی لیکن ابھی کچھ راہ گیر موجود تھے۔ کہیں کہیں کوئی دروازہ کھلا ... گلیوں میں جگہ جگہ پھولوں کی پتیاں بکھری ہوئی تھیں۔ تجمل کی رفتار تیز ... لگانے والے سپاہیوں کی نظر جب تجمل پر پڑی تو انھوں نے تجمل کی خیر ... دریافت کی۔ واپسی میں ہمیں بہت سے آدمی ٹکرائے، اُن میں بیشتر تعداد ... آدمیوں کی تھی۔ وہ بات تجمل سے کرتے تھے اور گھور کے مجھے دیکھتے تھے ... میں اشتیاق تھا، کسی کی نظر میں تجسس، کہیں خشونت تھی کہیں عقیدت ... دو دنوں ہی میں بہت سے لوگوں کے چہروں سے آشنا ہو چکا تھا کہ ... ٹیڑھے میڑھے یہ چہرے کل اور آج شہ پارہ کے اڈے پر آئے، میری واہ ...

... ہر کوئی کی مبارک باد دینے آئے تھے۔ کریمن کے اڈے میں بیٹھے ہوئے تجمل اور ... چلتے ہوئے تجمل میں نمایاں فرق تھا۔ اب وہ اتنا خاموش نہیں تھا۔ اُس کی ... وں میں سُرخی بڑھ گئی تھی۔ سینہ پھولا ہوا تھا، آواز میں غضب اور غصہ تھا جیسے ... سب ناراض ہو اور جیسے کسی نے خلافِ طبع کوئی بات کہہ دی تو اُس کا خون ... جائے گا۔ وہ گالیاں دے رہا تھا اور یہ کہتا جا رہا تھا کہ تجمل اور اُس کے آدمیوں ... طرف آنکھ اُٹھانے والے کی آنکھ نکال لی جائے گی، وہ کہتا تھا جس میں حوصلہ ... وہ حسرت نکال لے، کسی میں دم خم ہو تو سینہ ٹھونک کے سامنے آئے اور تجمل کے ... اِن پر ہاتھ ڈالنے والے ہاتھ کاٹ دیے جائیں گے۔ اُس کی بے اندازہ لاف و گزاف ... مجھے خدشہ ہوا شاید تجمل ابھی تک موجدار کی موت کے سلسلے میں اُن اندیشوں ... پاک نہیں ہوا ہے جن کا اشارہ کانتے نے کیا تھا، اُس کا ذہن ابھی تک آگندہ ... بہرحال تجمل کی شتاسنوالیسی لوگوں کی آمد و رفت، مبارک بادیں، گھوشی اور ... اُس کے ساتھیوں کی ہم رکابی اور سوناگاچھی میں دِرانہ آمد، کریمن سے باتوں اور ... کے واقعے میں انہماک دیکھ کے میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ وہ اب پوری ... مطمئن ہے۔ موتی، کانتے اور گھوشی نے اس دوران میں کوئی ایسی بات نہیں کہی ... ہیں یہ اندیشے میرے ذہن میں دوبارہ اُبھرتے۔ تجمل کی دیکھا دیکھی موتی، کانتے ... وہاں ملنے والے تجمل کے دوسرے آدمی بھی بڑھ چڑھ کے باتیں کر رہے تھے۔ ہر ... کسی نے وہاں تجمل یا اُس کے کسی آدمی کے بارے میں اپنے بغض کا معمولی سا ... بھی نہیں کیا۔ وہ سب بڑے تپاک سے ملے تھے۔

ہمیں گھر واپس پہنچنے میں دو بج گئے۔ موتی کو ایک علیحدہ کمرے میں سُلا دیا ... میں بڑے کمرے کی چاندنی پر لیٹ گیا۔ جسم سخت اور کھُردری زمین پر سونے ... کا عادی ہو گیا تھا۔ تکیے کی عادت بھی جیل میں چھوٹ گئی تھی۔ نیند نہیں آئی۔ نیند ... آتی، نیند اس طرح آنے لگتی تو یہ دن کیوں آتے۔ نیند تو اُسی دن سے اُچٹ گئی ... جس دن کورا کو دیکھا تھا۔ وہ نیند کے ساتھ سب کچھ لے گئی، خود بھی کانٹوں ... شاید ہو گی، مجھے بھی کانٹے چبھو گئی۔ برابر کے کمرے سے تجمل کی کھانسی ... آ رہی تھی۔ وہ بھی جاگ رہا تھا۔ میری وجہ سے کتنے لوگ جاگ رہے تھے۔ میں ... نے آ کے تجمل کا سکون درہم برہم کر دیا۔ پتہ نہیں موجدار کی لاش کے ساتھ ... کیا پیش آیا۔ تجمل نے اُسے کہاں چھپایا اور شور و پشتوں کی زبانیں بند کرنے ... کیا ترکیب ایجاد کی۔ میرے دل کا دھڑکا بے وجہ نہیں تھا کہ کسی وقت بھی ... سکتی ہے۔ میرے پیروں میں تو بیڑیاں پڑیں گی ہی، تجمل اور اُس کے کئی آدمی ... ہو جائیں گے۔ تجمل کو جیل میں ڈالنے کے لیے پولیس کو ایک بہانہ درکار ... کیونکہ تجمل سارا الزام اپنے سر لے گا۔ تجمل کے جو آدمی باہر رہ جائیں گے، وہ ... کا خون کرتے پھریں گے اور اُس شخص کا گھر ہی نہیں محلّہ تک اُجاڑ دیں ... جس کے متعلق ذرا سا شبہ ہو گا کہ اُس نے موجدار کی موت کی مخبری کی ہے۔ ... ایک ہی بات میرے ذہن میں گردش کر رہی تھی۔ درمیان میں تجمل کے چہرے ... ن دیکھ کے اس گردش میں کچھ کمی ضرور آ گئی تھی مگر وہ سکون میری خوش فہمی ... کریمن کے ہاں سے آنے کے بعد تجمل کے چہرے پر تشکنوں کا جال اور گہرا ہو گیا تھا۔ مجھے اب کوئی فیصلہ کرنا چاہیے تھا۔ دو ہی صورتیں میری عقل میں آتی تھیں۔ یا تو میں خود کو پولیس کے حوالے کر کے اقبالِ جرم کر لوں کہ موجدار کے ساتھ اصل میں کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ میرا مقصد اُسے مارنا نہیں تھا، پھر عدالت جو چاہے فیصلہ کرے۔ قریب ترین سزا موت تھی۔ زندگی اور موت ویسے بھی میرے لیے یکساں تھیں مگر اس طرح میں تجمل اور اُس کے ساتھیوں کو عذاب سے نجات دلا سکتا تھا جو ایک صرف میری وجہ سے کسی بھی بڑی مصیبت میں گرفتار ہو سکتے تھے یا پھر میرے فرار میں اُن کی نجات تھی۔ فرار ہو کے میں پولیس کی ساری توجہ اپنی جانب مبذول کرا لیتا۔ فرار ہو کے میں کورا کی تلاش بھی جاری رکھ سکتا تھا۔ وہ کہیں تو ہوگی، کسی نہ کسی جگہ، کسی نہ کسی وقت وہ اور مولوی صاحب مجھے نظر آ ہی جائیں گے حالانکہ دھندا ور دیر ہو گئی لیکن اُمید ٹوٹے نہیں ٹوٹتی تھی۔ اِسی اُمید میں میں نے چاند میاں کے گھر کا رُخ کیا تھا، چاند میاں کی باتوں سے یہ اُمید پھر ٹوٹ سی گئی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُس رات کے واقعے کے بعد جس رات کورا مجھ سے جُدا ہوئی تھی، وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ وہ بدمعاش مجھے پھسلانے کے لیے موجدار کے ہاں لے گیا اور ایک فرضی غنڈے مینی کا نام بھی لے دیا۔ مینی کا شاید کوئی وجود نہیں تھا مگر یہ اُمید ہی مجھ سے حجت کراتی رہی، وہ دونوں غنڈے یا اُن میں سے ایک اب تک ضرور موجود ہوگا، جس نے دریا کے کنارے اُس منحوس رات میں ہم پر حملہ کیا تھا۔ مجھے اپنی زندگی کی آخری سانس تک کورا کی تلاش جاری رکھنی تھی اور یہ تبھی ممکن تھا جب میں یہاں سے فرار ہو جاتا۔

اور فرار کیسے ہو جاتا، باہر صحن میں تجمل کے کئی آدمی پہرا دے رہے تھے، دن میں اس کا امکان نہیں تھا کہ تجمل مجھے تنہا چھوڑ دے گا۔ ایک ہی واقعہ اُسے میری طرف سے محتاط رکھنے کے لیے بہت تھا۔ تجمل کے آدمی شہر بھر میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس بڑے شہر میں چھپنا آسان، فرار ہونا مشکل تھا، جب تک تجمل کو مجھ پر مکمل اعتماد نہ ہو جائے کہ میں ایک بار تنہا جا کے صحیح و سلامت واپس آ جاؤں گا، وہ مجھے ایک قدم بھی اڈے سے باہر جانے کی اجازت نہیں دے گا۔ تجمل میری طرف سے بُری طرح کھٹک گیا تھا۔ میں نے ہی اُسے کل رات اشارۃً بتایا تھا کہ وہ لڑکی زریں نہیں ہے جس کے لیے میں بھرے مجمع میں چاند میاں پر جھپٹ پڑا تھا۔ اسی لیے آج صبح میرے غائب ہو جانے کے بعد وہ سیدھا چاند میاں کے گھر پہنچ گیا اور جب میں اُسے وہاں نظر نہیں آیا تو اُس نے موجدار کے اڈے کا رُخ کیا۔ تجمل اس حقیقت سے بھی واقف ہوگا کہ چاند میاں کے مرنے کے بعد میری بے قراری میں کمی نہیں آئی ہے بلکہ اس میں اُسے مزید شدت کا یقین ہوگا۔

میرے پیر بندھے ہوئے تھے۔ کلکتے میں ہر جگہ تجمل کی زنجیریں پڑی تھیں اور ایک زنجیر اس عمارت کے اُوپر موجود تھی، اُس کا نام زریں تھا۔ یہ زنجیر میں نے خود اپنے پیروں میں ڈال لی تھی۔ کل شام سے میں اُس کے پاس نہیں جا سکا تھا۔ تجمل کے پیروں میں زریں کی زنجیر ڈال کے خود کہیں بھاگ جانا بھی مناسب بات نہیں تھی اگر مجھے معلوم ہوتا کہ نسترن کے ہاں سے زریں کو لانے کے بعد یہ مسائل کھڑے ہو جائیں گے، تب بھی اُسے نسترن کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ میرے فرار کے بعد تجمل ہر طرح

اُس کی دل جوئی کی کوشش کرتا مگر بجھل کی زندگی ہر لمحے خطروں کی زد پر رہتی تھی۔ ایک مہینے آزادی، دوسرے مہینے جیل اور یہ تو صرف میرا فیصلہ تھا۔ زریں کو بھی اپنے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار ہونا چاہیے تھا۔ اُس کی اپنی بھی تو ایک شخصیت تھی۔ وہ بھی تو کچھ سوچتی ہوگی۔ کچھ خواب اُس نے بھی تو دیکھ رکھے ہوں گے۔ زریں کے خیال نے مجھے اور پریشان کر دیا۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ میں نے سوچا ابھی اُوپر جا کے اُس کے فلیٹ کی کنڈی کھٹکھٹاؤں اور کہوں اب تم آزاد ہو، جہاں چاہو جا سکتی ہو۔ میں تمہارا اتنا خیال نہیں رکھ سکتا کیونکہ مجھے ایک شخص کی تلاش ہے، وہ نہ جانے دُنیا کے کس کونے میں گم ہو گیا ہے۔

میری آہوں اور کروٹوں کی آہٹیں بجھل کے کانوں میں بھی پہنچ گئیں۔ اُس کے کان، اُس کی آنکھیں میری ہی جانب لگی ہوئی تھیں۔ وہ کھانستا ہوا میرے کمرے میں داخل ہوا، بتی جلائی تو میری آنکھیں چندھیا گئیں اور میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ میرے پاس آ کے رُک گیا۔ "جاگ رہا ہے لاڈلے!" اُس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "زخم میں تکلیف تو نہیں ہو رہی ہے؟"

"نہیں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"تو پھر سوتا کیوں نہیں ہے؟"

"نیند نہیں آ رہی ہے۔" میں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نیند تو کل رات بھی تیری آنکھوں میں نہیں تھی، اب سو جا لاڈلے، سو جا۔" وہ میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"تمھیں بھی تو نیند نہیں آ رہی۔" میں نے تیکھے انداز سے کہا۔

"ہاں! وہ گردن ہلا کے بولا۔ "میری نیند بھی اُڑ گئی ہے۔"

"کیوں تمھیں کیا ہو گیا؟" میں نے تنک کے پوچھا۔

"پتہ نہیں لاڈلے۔" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولا۔ "کیا ہو گیا ہے۔"

"میں جانتا ہوں کیا بات ہے، میں آ گیا ہوں۔"

اُس نے اضطراب سے پہلو بدلا، گھور کے مجھے دیکھا، پھر تلخی سے کہنے لگا "ہاں شاید یہی بات ہے۔ "تو آ گیا ہے۔" اُس کی تلخی کچھ اور گہری ہو گئی۔ "تو جو آ گیا ہے لاڈلے۔"

اُس کا لہجہ ہی ایسا تھا کہ مجھ سے کچھ اور نہیں کہا گیا۔ کچھ دیر بعد میں نے آہستگی سے کہا۔ "میں نے یہاں آ کے تمھیں سکون دینے کے بجائے اور پریشان کر دیا۔ تم مجھ سے بہت ناراض ہو گے!"

"ہاں! میں تجھ سے بہت ناراض ہوں لاڈلے۔" وہ مضطرب ہو کے بولا۔

"تو ایسی باتیں کرتا رہے گا تو میں تجھ سے بالکل روٹھ جاؤں گا۔"

"تم بھی روٹھ جاؤ، مجھ سے سب روٹھ گئے ہیں۔"

اُس نے میرا سر اپنے بازو کے حلقے میں لے لیا۔ "یہی تو آفت ہے کہ تجھ سے روٹھا نہیں جاتا۔ میں تجھ سے روٹھ نہیں سکتا۔"

"میں، میں۔" میری آواز گلوگیر ہو گئی۔ "میں چلا جاؤں گا۔"

"چلا جائے گا؟" وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "مجھے چھوڑ کے چلا جائے گا؟ مجھے معلوم ہے تو اتنا بزدل نہیں ہے۔"

"جب تک میں رہوں گا روز کوئی مصیبت آتی رہے گی۔"

"مصیبت یہ نہیں لاڈلے جو تو سمجھتا ہے۔ مصیبت تو یہ ہے" وہ بھپرتے ہوئے بولا۔ "تجھے کچھ نظر نہیں آ رہا۔"

"مجھے سب کچھ نظر آ رہا ہے اور اس لیے میں کہتا ہوں کہ مجھے جانا چاہیے۔ میرے جانے سے حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"کون سے حالات! یہ تو کیا بک رہا ہے؟" وہ کڑوے لہجے

"حالات تمھارے سامنے ہیں، جو کچھ ہوا، وہ اچانک ہو گیا۔"

"کیا تو میرے سامنے صفائی پیش کر رہا ہے۔" وہ بگڑ کے

"میں تمھیں حقیقت بتا رہا ہوں۔"

"لاڈلے جھوٹ مت بول، تو نے حقیقت ہی تو نہیں بتائی۔ نہیں کوڑے! دُکھ تو یہ ہے کہ تو نے حقیقت نہیں بتائی، یہ حالات بچھونا ہیں، کبھی دھوپ، کبھی چھاؤں، کبھی ہاتھ اوچھا پڑ جاتا ہے، کبھی ہے۔ تو مجھے حالات سمجھانے چلا ہے۔"

"لیکن اس بار تم جھوٹ بول رہے ہو، تم مجھ سے نہیں، خود ہو۔ تم جانتے ہو اتنے لوگوں کا منہ بند کرنا کتنا مشکل کام ہے اور ایسے ہوں، تمھیں حالات کی سنگینی کا پورا احساس ہے جس کا اظہار تم نہیں چاہتے، تمھارا چہرہ بتا رہا ہے، تمھاری آواز بتا رہی ہے۔"

"میری آواز، میرا چہرہ۔" وہ منہ چڑا کے بولا۔ "تو نے ان میں نہیں دیکھا لاڈلے۔ یہ حالات تو میں کسی طرح سنبھال ہی لوں گا، نمٹنے کا کام مجھے آتا ہے، میں تجھے آج اُس بدنام جگہ جان کے لے چلوں تاکہ پتہ چل جائے کہ بجھل کے سینے میں کتنی طاقت ہے۔ اس کی ٹکر کے کتے ہیں جو تیرے بجائے خود جیل جانے کو تیار ہو جائیں گے۔ تو انھیں دیکھنے کو جی مچلنے لگتا ہے، جیل تو ہماری ڈیوٹی ہے لاڈلے گھر آتے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے میاں مٹھو، سارا شہر سنبھالا جا سنبھالا اور تجھ سے نمٹنا مشکل نظر آتا ہے تو سمجھ میں نہیں آتا۔ نگاہ کا پتہ نہیں چلتا۔ لاڈلے، لاڈلے۔" وہ بے چینی سے بولا۔ "یہ نہیں بتائے تھے کہ تو آزاد ہو کے انھیں زچنا کھسوٹنا شروع کر آدمی کو دوسروں کی دُکھتی رگیں نہ معلوم ہوں تو اُس کا جینا حرام کچھار سے نکل پڑا، آتے ہی ہاتھ دکھانے شروع کر دیے۔ کچھ تو تسلی میری بات سن، تیرے سر کی قسم، چاقو تیرے ہاتھ میں اچھا نہیں لگ وہ بے قرار ہو گیا۔ "مجھے تیری چاقو بازی دیکھنے کا شوق نہیں ہے، کتابیں پڑھتا تھا اور قلم سے لکھتا تھا تو بہت اچھا لگتا تھا۔"

"تجھے کیا یہ خود پسند ہے۔" میں نے اُس کی بات کاٹ کے

"میں چاند میاں اور موحد اسے کے پاس اپنی چاقو زنی کے جوہر دکھا تو وہاں کسی اور کام سے گیا تھا۔"

"اور اکیلا چلا گیا تھا، میری آنکھیں جیسے بند ہو گئی تھیں۔"

"میں اُسے اتنا مشکل کام نہیں سمجھتا تھا۔ اس لیے تمھیں نہیں بتایا ورنہ بات دہ جاتی اور پھر مجھ سے اپنے سوا کسی کو بتایا بھی نہیں جاتا۔"

"کسی کو تو بتا دے لاڈلے! اتنا مت خوف کر۔"

"کیا بتاؤں!" میں نے جھنجلا کے کہا۔

"کون ہے وہ، کہاں ہے، کدھر ہے؟"

"کون؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

"وہی جو تجھے جیل لے گئی تھی، کون ہے وہ، کدھر رہتی ہے؟"

"کاش میں اُس کا پتہ جانتا؟ میں نے تمھیں کل ہی یہ بتا دیا تھا۔"

"چاند میاں کو اُس کا پتہ معلوم تھا؟"

"میں اسی خیال سے اُس کے پاس گیا تھا۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"لیکن اُس کا پتہ نہیں چلا۔" وہ تیزی سے بولا۔ "جہاں تک اپنا دماغ کام کرتا ہے لاڈلے! تو بچپنا کر رہا ہے، سات سال کا پھیر پڑ گیا ہے۔ سات سال میں کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ نہ جانے اب وہ کہاں ہو، ہو بھی یا نہ ہو۔"

"ایسا مت کہو۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "وہ مجھے ڈھونڈ رہی ہوگی۔"

"مجھے بتا وہ تجھے کہاں اور کب ملی تھی؟"

میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ اُس نے میرے ہاتھ چہرے سے ہٹائے تو ناراض ہونے لگا۔ "یہ لو پھر وہی ٹسوے، سالا بجھل کا لاڈلا بجھل کے ہوتے ہوئے آنکھوں میں پانی لاتا ہے۔"

"مجھے جانے دو، میں اُسے تمام دُنیا میں ڈھونڈوں گا۔"

"کوئی کسی کو اس طرح سے ڈھونڈتا ہے دیوانے۔ سات سال تو نے جیل میں بتائے۔ ذرا سا وقت ملا تو اتنا تیز بھاگنے لگا۔ آنکھ میں پانی آ جائے تو چیزیں صاف نظر نہیں آتیں، تیز بھاگنے میں سانس پھول جاتا ہے۔ تو نے کتابوں میں کیا پڑھا ہے رے، تو اپنے آپ کو اور اُلجھا رہا ہے وحشی۔ کام خراب کر رہا ہے۔ اس طرح وہ تجھے تھوڑی مل جائے گی۔ دیکھا، بدحواسی میں بات اور خراب ہو گئی۔ یہ کام طریقے سے بھی ہو سکتا تھا، میری مان جاتی۔ ذرا ٹھنڈے دل سے غور کر۔ میں اسی لیے تجھ پر زور دیتا ہوں کہ غور میں نے نہیں کیا تھا۔ لاڈلے تیرے پاس وقت ہے۔ میں جب سوچنے کی قوت آئی تو وقت نکل چکا تھا۔ تو بھی وہی کر رہا ہے۔ بتا جیل چلا جائے گا تو اُسے کیسے تلاش کرے گا۔ ایک جگہ سے بچ گیا ہے، دوسری جگہ پھنس جائے گا۔ اوسان ٹھیک رکھ، پہلے اپنے آپ کو تلاش کر۔"

"جو تم کہہ رہے ہو، وہ میں بھی سوچتا ہوں مگر وہ مجھے بہت یاد آتی ہے۔ تمھیں کیا پتہ ہے میں نے اُس کے لیے کن کن لوگوں کو چھوڑ دیا ہے۔"

"اور کیا حال ہوا؟"

میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں بجھل کو بتانا بھی نہیں چاہتا تھا کہ میں نے اس لڑکی کے لیے اپنے ابا، امی اور بہن بھائیوں کو چھوڑ دیا۔ میرے آبائی گھر میں اب دوسرے لوگ رہتے ہیں، میری امی مر گئی ہیں، میری کورا کو لوگوں نے بیچ کی وحشت کی تھی اور دماغی لوگوں نے اُسے میرے ساتھ رہنے نہیں دیا۔ بجھل کو کیا اندازہ

تھا کہ میرا سینہ کیسا ہے، میرے اندر بار بار آگ لگتی ہے، میرا جی دیواروں سے سر پھوڑنے کو چاہتا ہے، میرا جی کرتا ہے کہ اپنے جسم پر چاقو کے اتنے گھاؤ لگاؤں کہ کوئی جگہ باقی نہ رہے۔ بجھل مجھے سمجھاتا بجھاتا رہا اور اُس کی باتیں سمجھنے کے سوا میرے پاس راستہ بھی کیا تھا۔ ہر راستے پر بجھل بیٹھا تھا، ہر چوراہے پر پولیس موجود تھی، ایسی حالت میں کورا کو کہاں ڈھونڈا جا سکتا تھا۔ میں نے چپ سادھ لی۔ "تو آج زریں کے پاس بھی نہیں گیا۔" بجھل ناراضی سے بولا۔

"وقت ہی نہیں ملا۔" میں نے اُداسی سے جواب دیا۔

"وہ کیا سوچتی ہوگی، اُسے لا کے قید کر دیا۔ صبح اُٹھ کے فوراً وہاں جانا اور دیکھ، میں صبح تیری یہ حالت نہ دیکھوں، سمجھ لاڈلے ایسے وقت میں تو اُداس رہ کے مجھے پریشان کرے گا۔ اس وقت تیرا سنبھلے رہنا ضروری ہے۔ میری خاطر کچھ وقت اور گزار لے۔ اب تو سو جا، چل لیٹ جا۔" اُس نے میرے کندھے پر ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔ میں خاموشی سے لیٹ گیا۔ اُس نے ایک تکیہ میرے سر کے نیچے رکھ دیا۔ وہ کچھ دیر کمرے میں ٹھہرا رہا، پھر ہلکے ہلکے قدم اُٹھاتا اور گہری گہری سانسیں لیتا ہوا میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اُس کے جانے کے بعد بھی مجھے نیند نہیں آئی۔ یہاں تک کہ کمرے کی سیاہی اُجلی ہونے لگی۔ منہ ہاتھ دھو کے میں باہر گیا تو نصیب میاں اور دوسرے لوگ ورزش کر رہے تھے۔ کوئی دیوار پر لگے تکیے کو بے تحاشا مکے مار رہا تھا، کسی کا سر نیچے اور پیر اُوپر تھے۔ نصیب میاں بنیان پہنے اپنے ہاتھ اور ٹانگیں کھولنے کی مشق کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے ورزش ختم کر دی اور بلند آواز میں بولا۔ "آہا آفتابِ عالم تاب طلوع ہو گیا۔" پھر اُس نے خاص انداز میں آنکھیں میچیں اور کہنے لگا۔ "ازراہِ خدا اس نابکار کو پھر آزمائش میں نہ ڈالیے گا، جو کچھ دن رہ گئے ہیں، وہ رُسوائی میں گزریں گے۔ غلاموں کی ہم رکابی کے بغیر باہر جانے کا قصد نہ کیجیے، سرکار کی سواری دھوم دھام سے نکلنا چاہیے۔"

میں نے توجہ نہیں دی، وہ اپنے ساتھ چائے کی ایک پیالی پینے کی آوازیں لگاتا رہ گیا۔ چند لمحوں بعد میں زریں کے فلیٹ کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ تیزی کی وجہ سے میری سانس اُکھڑ گئی تھی۔ کسی نے نہایت عجلت میں دروازہ کھولا۔ وہ زریں ہی تھی۔ اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے، دوپٹا شانے پر ڈھلکا ہوا تھا۔ آنکھیں ویران تھیں۔ شاید اُسے یہ یقین کرنے میں مشکل پیش آئی کہ میں ہی اُس کے سامنے موجود ہوں۔ پھر اُس کی آنکھیں ٹمٹمانے لگیں اور وہ مجھے راستہ دینے کے لیے ایک طرف ہٹ گئی۔ "تم نے کل میرا انتظار کیا ہوگا۔" اُس کی شکایت سننے سے پہلے خود میں نے ہی پہل کر دی۔ "کل دن بھر مصروفیت رہی۔" وہ کچھ نہیں بولی، ہونٹ پھڑپھڑا کے رہ گئے۔ "کیا حال ہے؟ جی تو نہیں لگ رہا ہوگا؟" اُسے چپ دیکھ کے میں نے گھبرا کے پوچھا۔ "کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟"

"نہیں۔" اُس نے ہلکی آواز میں جواب دیا۔ "کوئی پریشانی نہیں۔"

"ناشتہ کر لیا؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی نہیں اور تم نے؟" اُس نے نظریں اُٹھا کے پوچھا۔

"میں نے کبھی نہیں کیا، ایسا تمھارے ساتھ کروں گا۔" میں نے محسوس کیا کہ اُس کے چہرے پر سُرخ لہریں آ کے گزر گئی ہیں۔

"میں ابھی لاتی ہوں۔" اُس نے تیزی سے کہا۔

"ماما سے کہہ دو۔"

"میں خود لاتی ہوں، وہ اور اُس کی بیٹی مجھے کام ہی نہیں کرنے دیتیں۔" وہ فوراً باورچی خانے میں چلی گئی، میں اندر کمرے میں آ کے اُس کی مسہری پر بیٹھ گیا۔ چادر پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ رسالے اور کتابوں کا ایک ڈھیر میز پر رکھا تھا۔ اُس وقت بھی بجلی جل رہی تھی۔ مجھے اُس کے بستر سے اُس کی خوشبو آتی محسوس ہوئی ایسی ہی خوشبو کراس کے جسم سے آتی تھی۔ جب میں نے اُس کا سَر دبایا تھا تو اُس کے بالوں میں بھی خوشبو تھی۔ میں نے بے اختیار تکیہ منہ سے لگا لیا۔ زریں کے قدموں کی چاپ سے مجھے ہوش آیا۔ اُس نے ٹرے میز پر لا کے رکھ دی اور میرے سامنے کرسی کھینچ کے بیٹھ گئی۔ اس دوران اُس نے منہ بھی دھو لیا تھا، بالوں میں کنگھی بھی کر لی تھی، دوپٹے سے سَر ڈھک لیا تھا۔ اتنی جلدی وہ ناشتے کا سامان لے آئی تھی۔ "شروع کرو۔" اُس نے مجھے گُم سُم دیکھ کے کہا۔

"ہاں تم بھی تو شروع کرو۔" میں نے جھجک کے کہا۔

اُس نے پوری کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈال لیا اور سَر جھکائے کھاتی رہی۔

"میں نے کل دن بھر تمھارا انتظار کیا۔" وہ دبے دبے لہجے میں بولی۔

"بس کل دن بھر اُلجھنیں ہی رہیں۔"

"مجھے تمھاری مصروفیت کا تھوڑا بہت علم ہو گیا ہے۔" میرے ہاتھ کا لقمہ ہاتھ ہی میں رہ گیا۔ "گھبراؤ نہیں، اب مجھے کچھ کچھ سمجھ آنے لگی ہے۔"

"تمھیں کیا معلوم ہوا؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"وہی جو کل ہوا۔" اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کل کیا ہوا؟" میں نے جھینپ کے پوچھا۔

"معلوم ہوا کہ تم نے چاند میاں اور موجدار سے بدلہ لے لیا اور بھی بہت سی باتیں مجھے تمھارے بارے میں معلوم ہوئیں۔"

"تمھیں کیسے معلوم ہوا؟"

"بس معلوم ہو گیا۔ تم نے ناشتے سے ہاتھ کیوں اُٹھا لیا؟"

"پہلے بتاؤ، یہاں کون آیا تھا؟"

"کوئی بھی نہیں۔" اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ "مجھے تو تم نے کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔" اُس کا انداز شکایت کا ہو گیا۔

"ضرور یہاں کوئی آیا تھا اور تمھیں کیا کیا باتیں معلوم ہوئیں؟"

"مجھے معلوم ہوا کہ تم نے ایک لمبی مدت جیل میں گزاری ہے۔" وہ سکون سے بولی۔ "تم پر قتل کا الزام تھا، جیل میں تم نے اعلا تعلیم حاصل کی۔"

"اور کیا کیا؟" میں نے ناگواری سے پوچھا۔

"بس ابھی اتنا ہی کچھ معلوم ہوا ہے۔"

"اور تمھیں ڈر نہیں لگا، تمھیں مجھ سے نفرت نہیں ہوئی؟"

"بالکل نہیں۔" وہ شرما گئی۔

"تو مجھ پر ترس آیا ہو گا؟"

"ہاں یہ کہہ سکتے ہو۔" وہ خوش دلی سے بولی۔

"گویا تمھیں اس ماحول کا خوب اندازہ ہو گیا ہے۔"

"ہاں، میرے لیے یہ سب باتیں نئی ہیں جو میں نے کتابوں میں ... اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا مگر تم اتنے پریشان کیوں ہو گئے؟" وہ رسانی ...

"کچھ نہیں، میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا تھا۔"

"کیا بات؟" وہ چونک کے بولی۔

"زریں، اچھا ہوا تمھیں کسی ذریعے سے سہی اس ماحول کا اند... تم سے اسی سلسلے میں بات کرنے والا تھا، نسترن کے گھر سے نکلنے ... میں راستے بھر یہ سوچتا رہا کہ تمھیں ساتھ لے کے کہاں جاؤں، ہر جگہ نظر ... سوا کوئی جگہ نظر نہیں آئی مگر ظاہر ہے یہ تمھارے لیے مستقل جگہ نہیں ... عارضی پناہ گاہ ہے، یہاں عجیب عجیب لوگ رہتے ہیں، تم ایک بڑے خا... لڑکی ہو۔ کچھ دنوں بعد تمھیں اس ماحول سے خوف آنے لگے گا، یہاں ... بھروسا نہیں کہ وہ کب جیل میں چلا جائے یا قتل ہو جائے، یہاں ایک ... چاقو تانے کھڑے ہیں، میں جب اُدھر دیکھتا ہوں اور جب تمھیں دیکھ... سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی۔"

"اتنے پریشان نہ ہو، میری کوشش ہو گی کہ میں اپنے آپ کو ... دوں۔" وہ سنجیدہ ہو گئی۔ "اب یہی میرا خاندان، یہی میری تہذیب ..."

"پھر بھی زریں، تمھیں اپنے متعلق کچھ نہ کچھ سوچنا ضرور ہو گا ... شوخی سے گفتگو کر رہی تھی، اتنی سی دیر میں بدل گئی۔ مجھے ... لگی اور بے چینی سے اپنے دوپٹے کا گوٹا اُدھیڑنے لگی۔ "زریں۔ تم ... ہو، بہت خوب صورت ہو، ایک اچھی لڑکی میں جو خوبیاں ہونی چاہئیں ... میں موجود ہیں، یہ جگہ تمھارے رہنے کی نہیں کیونکہ یہاں کے مکین خو... پسِ لیے پھرتے ہیں۔"

"مجھے اِن مکینوں سے کوئی غرض نہیں۔" وہ اضطراب سے بولی۔ "... اچھے ہیں، انھوں نے مجھے پناہ دی ہے اور پھر تم جو موجود ہو۔"

"میں۔ میں۔ میں کہاں ہوں، تم مجھے شمار مت کر..."

"کیوں! کیا تم مجھے راستے میں چھوڑ جاؤ گے۔ اب میرا کو... میں وہاں واپس جا سکتی ہوں، وہ لوگ مجھے پہلے ہی کون سا گھر..."

"میں تمھیں کیسے بتاؤں۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "مجھے خو... مجھے بہت دُور جانا ہے۔"

"میں بھی ساتھ چلوں گی۔" وہ اشتیاق سے بولی۔

"نہیں، میں تمھیں ساتھ نہیں لے جا سکتا، نہ جانے مجھے ... میرا کوئی یقین نہیں ہے، میں اگر یہاں بھی رہوں تب بھی اپنے آ..."

"آخر وہ کون سی بات ہے جو تمھیں اس قدر اُلجھائے ہوئ..."

"میں تمھیں کیا بتاؤں۔" میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔

"تمھارا غبار ہلکا ہو جائے گا، میں کسی سے نہیں کہوں گی، اپنے سینے میں ... محفوظ کر لوں گی، مجھ پر اعتبار کرو۔"

"زریں، وہ کوئی راز نہیں جو تم سمجھ رہی ہو۔"

"پھر کیا ہے، تمھیں آخر کیا پریشانی ہے۔"

"کوئی پریشانی نہیں۔" میں نے تلملا کے کہا۔ "اپنے آپ پر سے اعتبار اُٹھ ... گیا ہے۔ میں اپنی ضمانت نہیں دے سکتا، میرا دل دنیا میں نہیں لگتا۔" میں نے ... اُن کا چہرہ دیکھنے کے لیے سَر اُٹھایا۔ "تم کہتی تھیں تمھاری ایک بڑی جاگیر ہے جس ... تمھارے بددیانت خالو نے قبضہ کر لیا ہے، زریں تم اپنے گھر چلو، ایک نئی زندگی ... شروع کر سکتی ہو، میں تمھیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا، میں تمھارے خالو کو تمھارے ... ان میں ہموار کرنے کی کوشش کروں گا، اپنا گھر پھر اپنا گھر ہوتا ہے، تم کہیں بھی ... اُن سے نہ رہ سکو گی، تم میرے ساتھ چلو، اگر وہ نہ مانے تو میں تمھیں واپس لے آؤں گا۔ ... ہم کوئی اور راستہ ڈھونڈ لیں گے۔"

"میں وہاں کیسے جا سکتی ہوں، کون مجھے اتنے دنوں کی گُم شدگی کے بعد ... قبول کرے گا، میں کس مُنہ سے وہاں جاؤں گی۔"

"وقت اور تمھارا رویّہ ہر تلخی دُور کر دے گا۔"

"نہیں، یہ ممکن نہیں ہے۔" وہ تیز آواز میں بولی۔ "میں اب وہاں نہیں ... جا سکتی، اس سے تو بہتر ہے تم میرا گلا گھونٹ دو۔"

"زریں۔ ایک بار انھیں اور آزمانے میں کیا حرج ہے، میں تو تمھارے ... ساتھ رہوں گا۔ اُن سے بات کریں گے، وہ کیسے نہیں مانیں گے، وہ تو تمھیں ... دیکھتے ہی خوف زدہ ہو جائیں گے اور ہر حالت میں مفاہمت پر آمادہ ہوں گے، اب ... تک تم وہاں دب کے اور گھٹ کے رہ رہی تھیں، اب تم ذرا ہمت اور حوصلے سے ... بات کرنا، میں تمھاری خیریت پوچھتا رہوں گا، تم اپنی جاگیر کسی اور کے نام کر کے ... خالو کی دست بُرد سے محفوظ رہ سکتی ہو، ہزار طریقے نکل آئیں گے۔ ہمت پیدا کرو ... زریں، میں تمھارے بھلے ہی کے لیے اصرار کر رہا ہوں۔ میں تمھارا دشمن نہیں ہوں ورنہ ... تمھیں یہاں کیوں لاتا۔ وہاں اگر تمھیں کوئی پریشانی ہو تو مجھے خط لکھ دینا، ... تار کر دینا۔ ایک نہیں، کئی کئی آدمی تمھاری مدد کو آ جائیں گے۔ مگر ... یہاں تم خود بے دست و پا ہو گی، کوئی بھی تمھاری مدد کو نہیں آئے گا۔"

اُس نے منہ پھیر لیا اور ہچکیوں سے رونے لگی، میں اُسے جتنا سمجھانے کی کوشش کرتا اتنا ہی وہ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی، میں بدحواس ہو گیا، سمجھ میں ... نہ آیا کس طرح اُسے خاموش کروں۔ اس کے قریب جانے کی ہمت بھی نہیں ... ہو رہی تھی، جھجکتے جھجکتے اس کی کرسی کے پاس پہنچا۔ مجھے معلوم تھا، آدمی کب رونا ... ہے، ... جب روتا ہے آنکھیں جلنے لگتی ہیں جب ہنستا ہے۔ ... اُس وقت مجھے خود پر بہت غصہ آیا، میں نے اُسے بیٹھے بٹھائے رُلا دیا۔ وہ ابھی ... شوخی سے باتیں کر رہی تھی، میں نے پہلی بار اُسے اس انداز میں دیکھا تھا۔ مجھ سے ... اُس کی شوخی دیکھی نہیں گئی، میں خوش نہیں ہوں تو شاید میرا جی چاہتا ہے دنیا کا ...

ہر آدمی ناخوش رہے۔ جی میں آیا کہہ دوں، تم یہیں رہو مگر وہ نہیں۔ میں تمھاری نگہبانی کرتا رہوں گا کیونکہ میں تمھیں نسترن کے ہاں سے لایا ہوں۔ زبان سے یہ لفظ ادا نہیں ہو سکے، میں نے اپنے آپ پر قابو پا کے اُس کا سَر اُٹھانے کی کوشش کی، میرے ہاتھ اُس کے بالوں سے مَس ہوئے تو لرزنے لگے۔ "زریں۔ زریں۔" میری ڈگمگاتی ہوئی آواز اُبھری۔ "زریں۔ میں نے تمھارے سامنے ایک تجویز رکھی ہے، تم اس پر سکون سے سوچ سکتی ہو، ہم کسی دوسری ترکیب پر بھی غور کر سکتے ہیں، تم تو ایک بہت اچھی بات پر رونے لگیں۔ مت رو، مت رو، ورنہ میں تمھیں چھوڑ کے کہیں چلا جاؤں گا۔ میں تم سے ناراض ہو جاؤں گا۔"

میری بات بے اثر نہیں ہوئی، اُس نے سَر اُٹھا کے مجھے دیکھا تو مجھ سے دیکھا نہیں گیا۔ "میں دوپہر کو آؤں گا۔" میں نے گھبراہٹ میں کہا۔ "نیچے میرا انتظار ہو رہا ہو گا۔ جب میں دوپہر کو آؤں تو تم میرے لیے میٹھے چاول پکا کے رکھنا، مجھے میٹھے چاول کھائے ہوئے عرصہ ہو گیا اور میری بات پر سکون سے سوچنا۔" یہ کہتا ہوا میں وحشت میں وہاں سے بھاگ آیا، اتنی تیزی سے کہ سیڑھیوں سے پھسل گیا۔ گھٹنے اور کولہے میں چوٹ آ گئی مگر کپڑے جھاڑ کے اُٹھ کھڑا ہوا، نیچے جھبل میرا انتظار کر رہا تھا۔

*

اندر کمرے میں، جہاں میں رات سویا تھا، محفل جمی ہوئی تھی۔ موجدار کے آدمی بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے، موتی جھبل کے بائیں طرف اور نصیب میاں دائیں طرف تھے، درمیان میں گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے جھبل حقہ پی رہا تھا، میرے داخل ہوتے ہی شور مچ گیا، موتی نے مجھے اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ جھبل کے سامنے شہر کے مختلف حصوں کی سرگرمیوں کی رُوداد پیش کی جا رہی تھی۔ فلاں علاقے میں مندی ہے، فلاں میں تیزی ہے، اُدھر پولیس کا دباؤ بڑھ گیا ہے، اِدھر سیالدے کا ڈی ایس پی تبدیل ہو کے بھاگلپور چلا گیا ہے، تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ کسی نے آ کے اطلاع دی کہ لکشمی داس اُستاد سے ملنے کے لیے آیا ہے۔

موتی چونک پڑا، کانتے بجلی کی سی تیزی سے اُٹھ کھڑا ہوا، لکشمی داس کے نام پر سارے کمرے میں بھن بھناہٹ ہونے لگی۔ جھبل نے اُسے دوسرے کمرے میں بٹھانے کا حکم دیا۔ "کچھ پہلے ہی آ گیا۔" وہ مسکرا کے بولا۔ "آ موتی، گھوشی، نصیب میاں، کانتے آ۔" جھبل اپنی نشست سے اُٹھتے ہوئے بولا اور میرا ہاتھ پکڑ کے باہر صحن سے ملحق کمرے میں آ گیا۔ یہاں ایک چوکی بچھی ہوئی تھی۔ اِدھر اُدھر مونڈھے پڑے تھے۔ کانتے جھبل کا حقہ اُس کے سامنے رکھ کے چلا گیا۔ جھبل نے مجھے اپنے ساتھ چوکی پر بٹھا لیا۔ چند ہی منٹ بعد سیٹھ لکشمی داس دو آدمیوں کے ساتھ کمرے میں نمودار ہوا۔ دونوں آدمیوں نے بڑے بڑے خوان سَر پر اُٹھا رکھے تھے۔ سیٹھ نے آ کے سب سے پہلے سب کو پرنام کیا۔ اُس کا انداز بالکل بدلا ہوا تھا۔ جھبل نے اُسے مونڈھے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر نرمی سے پوچھا۔ "کیا حال ہے سیٹھ جی؟"

"اُستاد، رات میں نشے میں تھا، کچھ خیال نہیں رہا۔"

"کوئی بات نہیں سیٹھ۔ رات تم اگر نشے میں نہ ہوتے اور صبح یہاں آ جاتے تو بھی ہمارے دل کے دروازے اسی طرح کھلے ہوئے ملتے۔"

"مجھے بہت دکھ ہے اُستاد پر وہ مجھے پسند بہت ہے۔" وہ دُبلے لہجے میں بولا۔ "کریمن سے بات کرو ممکن ہے وہ مان جائے مگر وہ تمنچے سے نہیں مانے گی، تمنچہ اُٹھانے سے پہلے یہ خیال کر لینا کہ اُس کی پہنچ وُور وُور ہے۔"

"رات کی بات جانے دو" میں نے کہہ دیا "مجھے دُکھ ہے، میں نشے میں تھا۔"

سیٹھ نے تنک کے کہا "اب اُس کا ذکر مت کرو۔"

"جانے دو" تجمّل بے پروائی سے بولا "سیٹھ ایک بات سن لو زیادہ نشہ ہر چیز کا بُرا ہوتا ہے طاقت کا، دولت کا، حُسن کا، شراب کا۔"

"میں سمجھتا ہوں اُستاد" سیٹھ نے نظریں جُھکا کے کہا "یہ خوان نذر کے لیے لایا ہوں اسے قبول کر لو۔"

"اس کی ضرورت نہیں سیٹھ، اسے واپس لے جاؤ، تمھارا آنا ہی بہت ہے۔"

"نہیں اُستاد یہ تو تمھیں قبول کرنا ہی پڑے گا۔" تجمّل کے انکار پر اُس کا اصرار بڑھ گیا اور اُس نے خوان قبول کیے بغیر رخصت ہونے سے انکار کر دیا۔ تجمّل نے اُسے قبول کر لیا۔ نصیب میاں نے فوراً چائے کا اہتمام کیا۔ جب خوانوں سے سرپوش اُٹھائے گئے تو سب کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ وہ چاندی کے روپوں سے بھرے ہوئے تھے۔ تجمّل نے خوان پوش ڈھک دیا اور سیٹھ سے اس کے کارخانے کی جگہ اور کام کے متعلق پوچھنے لگا۔ سیٹھ زیادہ دیر نہیں بیٹھا۔ سب سے ہاتھ ملایا۔ جب وہ میری طرف آیا تو اُس نے گہری نظروں سے میرا جائزہ لیا۔ "لاڈلا" وہ زیرِ لب مسکرا کے بولا۔ "میری خواہش ہے تم میرے ساتھ کام کرو اور اگر کبھی تمھیں میری ضرورت پڑے تو بے جھجک چلے آنا۔"

"شکریہ" میں نے اُس سے ہاتھ ملاتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔

"اُستاد کبھی آپ لوگ اُس طرف آئیں کیوں نہ ایک مجرے کا انتظام کرایا جائے۔"

وہ مہذّب انداز میں بولا۔ موتی ابھی تو آپ یہاں ہیں۔"

"ہاں۔ مگر دیکھو سیٹھ شہ پارہ نہیں گائے گی۔"

موتی کی بات پر کانتے کی ہنسی چھوٹ گئی۔ سیٹھ اور تجمّل نے بھی اُس کا ساتھ دیا۔ سیٹھ کے جانے کے بعد تجمّل نے دونوں خوان نصیب میاں کے حوالے کیے کہ وہ اُنھیں اپنے اور موجدار کے آدمیوں میں تقسیم کر دے۔ پچھلی رات کا واقعہ تھا۔ سیٹھ کی اچانک آمد میرے لیے حیرت کی بات تھی مگر تجمّل کے بُشرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُسے سیٹھ کی آمد کا پہلے سے یقین تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے سیٹھ کی آمد سے زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔ اس کا مطلب تھا کہ سیٹھ آج رات پھر شہ پارہ کے پاس جائے گا اور شہ پارہ اُس کے سامنے ناچے گی اور سیٹھ للچائی نظروں سے اسے دیکھتا رہے گا، اُس کا ہاتھ پکڑے گا۔ وہ تھک جائے گی اور کریمن روپوں کے لالچ میں اُسے سیٹھ کے حوالے کر دے گی۔ مگر مجھے یہ سوچنے کی کیا ضرورت تھی۔

مجھے حسبِ وعدہ زرّیں کے پاس میٹھے چاول کھانے کے لیے جاتے ہوئے جھجک ہو رہی تھی۔ میں سہ پہر تک نہیں گیا۔ پھر زرّیں نے مجھے ماما کے ہاتھ خود ہی بلوا لیا۔ اُس نے مجھ سے اور میں نے اُس سے کوئی اور بات نہیں کی۔ چاول کیسے ہیں، اچھے ہیں۔ بس رسمی بات ہوئی۔ اُس نے بہت لذیذ چاول پکائے تھے، مجھے اپنا گھر یاد آ گیا۔ اسکول سے واپسی پر امّی بطورِ خاص میرے لیے میٹھے چاول چھپا کے رکھتیں کہ انھیں کوئی اور نہ کھا جائے۔ رات کو تجمّل پھر مجھے اپنے ساتھ لے کے گھومنے نکل گیا۔ نئے پرانے لوگوں سے بھینٹ ہوئی۔ تجمّل کی ٹیکسی کے ٹیکسیاں تھیں، وہ کئی ہوٹلوں، جوئے خانوں اور شراب کے اڈّوں پر گیا۔ ہر جگہ گزشتہ رات والی تناتنی کا مظاہرہ کیا۔ ایک بڑے علاقے کا چکّر کاٹ کے آدھی رات کو اڈّے پر واپس آیا۔ میں موقع کا منتظر تھا۔ رات گزر گئی تو میں نے اُس کے کمرے میں جا کے زرّیں کا ذکر کیا کہ وہ مجھے کہاں اور کہاں سے آئی ہے، میں نے اسے زرّیں کے متعلق ساری بات بتا دی اور اصرار کیا کہ زرّیں کی بہتری اسی میں ہے کہ اُسے اُس کے گھر فیض آباد پہنچا دیا جائے۔ اُس نے میری باتیں درمیان میں کوئی دخل دیے بغیر اطمینان سے سنیں۔

"تمھاری کی منشا کیا ہے؟" اُس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"اُس کی منشا نہیں ہے۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"پھر تو اُسے اس جہنّم میں دوبارہ کیوں رسید کرنا چاہتا ہے، یہ اچھی بات نہیں ہوئی۔ میں نے اُس لڑکی کو بیٹی کہا ہے۔ وہ کیا کہے بیٹی بنالیا۔ بنا کے چھوڑ دیا۔ جا سوچا تو تُو کبھی کبھی بالکل بچّہ بن جاتا ہے۔"

میں نے اپنی ضد نہیں چھوڑی اور جن باتوں سے زرّیں کو... تھا وہ اُس کے سامنے دُہرا دیں۔

"میں نے تو کچھ اور سوچا تھا لاڈلے زرّیں بہت ہی خوب ہے، بہت بھولی بھالی۔ تُو کیا کٹھور بن گیا ہے۔"

"تم میری باتوں پر دھیان ہی نہیں دیتے اُس کی ایک بڑی... میں ہے، وہاں سے مل جائے تو وہ اطمینان سے رہ سکتی ہے۔"

"وہ لڑکی ہے اور جوان ہے لاڈلے، لڑکی کے لیے جاگیر بے کار ہوتی ہے جب تک کوئی اُسے سنبھالنے والا نہ ہو۔ نہیں نہیں ——— ہے وہ جھنجلا گیا اور ناراض ہو کے کہنے لگا "لاڈلے چار دیواری سے تبھی باہر نکل سکتی ہے جب خود اُس کی منشا ہو... اجازت نہیں دوں گا۔"

اس کے بعد تجمّل سے کچھ کہنا بیکار تھا۔ میں خفا ہو کے اپنے... آیا۔ میں نے دوسرے دن اُس سے بات بھی کم کی۔ دوسرے دن رات گھمانے لے گیا۔ میں بے دلی سے اُس کے ساتھ چلتا رہا۔ دوسرے دن... پاس بھی گیا اور چند لمحے ٹھہر کے واپس آ گیا۔ ہر راستہ بند تھا۔ دو... گزر گئے۔ اس دوران میں تجمّل نے شاید موجدار کے اڈّے کا کچھ نہ کچھ بند... کیونکہ تجمّل کے انداز میں اب اُتنا اکھڑا پن نہیں رہا تھا۔ شاید موجدار کی مرضی کے مطابق دب گیا تھا۔ گھوشی کو مستقل طور پر موجدار کے اڈّے... گیا تھا۔ ساتھ میں تجمّل کے آدمی بھی تھے۔ جیل میں میں نے اُن لوگوں... سُنا تھا وہ اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں تھا۔ دن بھر یہاں لوگوں کی بھیڑ... جو تجمّل کے ساتھ رہتے تھے، اڈّے سے نکل جاتے۔ پھر وہ لوگ آتے...

بجتے تھے، کوئی سلام کرنے آتا، کوئی ٹکے جیب لوٹ دیتا، کوئی صرف کانتے سے بات کرتا۔ کسی کا تعلق صرف شوبی سے تھا، کوئی فدے کے پاس آ کے روپے جمع کرا دیتا تھا۔ یہ سب مال اکٹھا کر کے نصیب میاں کے حوالے کر دیا جاتا جو ایک بڑے سے رجسٹر میں اس کا اندراج کرتا۔ زیادہ بات زبانی ہوتی تھی۔ تجمّل بیٹھا بیچوان پیتا رہتا یا غصّہ ہوتا یا خوش ہوتا یا گالیاں دیتا یا آنے والے لوگوں سے اُن کی خیریت دریافت کرتا۔ میں نے محسوس کیا جب میں سامنے آتا ہوں تو موضوع کچھ بدل سا جاتا ہے، روپے پیسے رہ جاتے ہیں، پھر تجمّل مجھے ساتھ لے کے دوسرے کمرے میں چلا آتا ہے۔ مجھے یہاں آئے ہوئے دس دن سے زیادہ گزر چکے تھے۔ میرے پاس کوئی کام نہیں تھا یا تو کمرے میں تنہا خاموش بیٹھا رہوں یا اُن لوگوں کی باتیں سُنتا رہوں۔ موتی اسٹیشن واپس چلا گیا تھا۔ جب طبیعت بہت گھبراتی تو میں زرّیں کے پاس چلا جاتا۔ لیکن وہاں کوئی بات ہی نہ ہوتی۔ اُسے دیکھ کے مجھے کرارا سا آنے لگتی اور میں گھبرا کے پھر نیچے آ جاتا اور پھر اُس کے پاس چلا جاتا۔ زرّیں کے لمبے بال اور بڑی بڑی آنکھیں مجھے بہت بھلی لگتی تھیں۔ اب وہ عموماً سوچی ہوئی رہتی تھیں۔ جب میں واپس نیچے آتا تو خود کو ملامت کرتا کہ اُس کے سامنے مجھ سے بات کیوں نہیں کی جاتی۔ جو سوچ کے جاتا ہوں وہ بھول کیوں جاتا ہوں اور یاد آتا ہے تو دُہرانے کی ہمّت کیوں نہیں پڑتی۔ سو ایک دن میں ارادہ کر کے گیا کہ آج اُس سے ضرور بات کروں گا۔ اُس نے حسبِ معمول مجھے چائے پیش کی اور میرے سامنے خاموش بیٹھ گئی۔ میں نے لب کھولنے کی جرأت کی جیسے آج میں پہلی بار اُس سے مخاطب ہو رہا ہوں۔ میں نے آہستہ سے کہا "زرّیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔"

"کیا۔ کیا بات ہے؟" وہ سٹپٹا گئی "طبیعت تو خراب نہیں ہے؟"

"زرّیں" میں نے اضطراب سے کہا "میں مر جاؤں گا۔"

"نہیں" وہ سراسیمگی سے مجھے دیکھنے لگی "آخر تمھیں کیا غم ہے۔"

"میرا غم یہ ہے کہ دُنیا بہت بڑی ہے۔ کاش یہ ایک گاؤں یا ایک شہر کے برابر ہوتی۔"

"تو پھر کیا ہوتا؟" وہ معصومیت سے بولی۔

"پھر شاید مجھے قرار آ جاتا۔"

"مجھے بتاؤ تمھیں کس طرح قرار آ سکتا ہے؟" وہ بے چینی سے بولی "میں تمھارے کسی کام آ سکتی ہوں۔ میں تمھارے لیے کچھ کر سکتی ہوں؟"

"کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔" میں نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

"اور اس پریشانی میں تمھیں میری پریشانی بھی لاحق ہو گئی۔"

"ہاں۔ تم میری بات مان لیتیں تو اچھا ہوتا۔ اس سے یہ مطلب نہیں تھا کہ میں تمھیں بالکل سمجھتا ہوں، میں تم سے پیچھا چھڑا رہا ہوں۔ میں نے اپنی، تمھاری اور اس جگہ کی تمام باتیں ذہن میں رکھ کے یہ تجویز پیش کی تھی۔ میں تم سے رشتہ نہیں توڑ رہا تھا۔"

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

"کیا۔ کیا فیصلہ کر لیا ہے؟"

"یہی کہ تم جہاں کہتے ہو میں وہاں چلی جاؤں گی، چاہے بعد کو کچھ ہو، میں تمھیں اور پریشان نہیں کروں گی۔ تم مجھے جہاں چاہے پہنچا سکتے ہو۔ میں تمھارے اختیار میں ہوں۔"

"زرّیں زرّیں" میں نے حیرانی سے اُسے دیکھا "میں تمھیں تمھارے گھر پہنچانا چاہتا ہوں، تمھارا گھر۔ تمھاری ماں اور باپ کا گھر۔"

"تم چاہے جہاں پہنچا دو، میں تیار ہوں۔"

"زرّیں! میں تمھیں وہاں مرنے کے لیے چھوڑ کے نہیں آؤں گا، میں تمھارے لیے لڑوں گا۔ تمھیں اپنے گھر میں عزت سے بٹھا کے آؤں گا اور ہو سکا تو تمھارے پاس کوئی آدمی چھوڑ کے آؤں گا۔ میں تجمّل سے کہہ کے ماما اور اُس کی لڑکی بھی تمھارے ہمراہ کر سکتا ہوں۔ تجمّل کے دوست دُور دُور شہروں میں موجود ہیں لیکن جو فیض آباد میں بھی کوئی نہ ہو، نہیں ہُوا، تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایک بار وہاں جا کے صورتِ حال تو دیکھنی چاہیے۔"

"ٹھیک ہے تم جو چاہو، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" اُس نے بمشکل اتنا کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں نے کچھ دیر اُس کی واپسی کا انتظار کیا، پھر کچھ سوچ کے نیچے اُتر آیا۔

مجھے تجمّل کو آمادہ کرنے میں تین چار دن لگ گئے۔ اس کے باوجود اس نے خود میرے ساتھ اوپر جا کے زرّیں سے بات کی۔ زرّیں نے اپنی آمادگی ظاہر کر دی۔ تجمّل نے اُس سے کہا کہ فیض آباد میں اگر وہ کسی قسم کی پریشانی سے دوچار ہو تو اُسے فوراً مطلع کر دے۔ تجمّل نے اُس سے یہاں تک پوچھا کہ کہیں اُس نے میرے دباؤ میں آ کے تو یہ فیصلہ نہیں کیا ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ یہ فیصلہ اُس نے اپنی مرضی سے کیا ہے۔ تجمّل اسے سمجھاتا رہا۔ زرّیں نے اپنے فیصلے میں تبدیلی نہیں کی۔ "تم جب چاہو یہاں آ سکتی ہو، اس کے لیے لاڈلے کی سفارش کی ضرورت نہیں۔ تم میری بیٹی ہو۔" یہ کہتے ہوئے تجمّل کی آواز بھرّانے لگی اور اُسے نہ جانے کیا ہُوا۔ وہ مجھے زرّیں کے پاس چھوڑ کے تیزی سے نیچے اُتر گیا۔

فیض آباد میں تجمّل کا کوئی دوست نہیں تھا لیکن لکھنؤ میں موتی جیسا ایک دوست کلن خاں موجود تھا۔ لکھنؤ اور فیض آباد کا فاصلہ بہت کم ہے۔ تجمّل نے نصیب میاں سے کلن خاں کے نام ایک مختصر خط لکھوایا کہ وہ فیض آباد جا کے اُس کی بھیجی ہوئی لڑکی کی جاگیر واپس دلانے کے لیے ضروری قدم اُٹھائے۔ ایسا ہی ایک خط اُس نے میرے حوالے کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ تجمّل مجھے تنہا روانہ نہیں کرے گا۔ اُس نے فدے، شوبی اور سارنگے کو میری ہمراہی کے لیے منتخب کیا۔ فدے کو حکم دیا گیا کہ اگر زرّیں ضروری سمجھے تو وہ وہاں کچھ دنوں تک قیام کر سکتا ہے۔ تین دن کے اندر اندر زرّیں کے بیس جوڑے بنوائے گئے اور کئی زیور۔ تجمّل نے اُسے کچھ نقدی بھی دی۔ رات کے وقت گہرے اندھیرے میں جب سارا محلہ سویا ہوا تھا۔ تجمّل نے زرّیں کے سر پر ہاتھ رکھ کے اُسے رخصت کیا۔ ماما پچھلے دروازے سے زرّیں کو لے کے نیچے اُتری اور ٹیکسی میں

بیٹھ گئی۔ احتیاطاً یہ رازداری کی گئی تھی۔ اسٹیشن پر ہمیں دیر تک گاڑی کا انتظار کرنا پڑا۔ زرّیں کو فرسٹ کلاس کے ایک ڈبے میں بٹھا دیا گیا تھا۔ وہ فرسٹ کلاس میں آئی تھی، فرسٹ کلاس میں واپس جا رہی تھی۔ ہم سب اُس کے برابر کے ڈبے میں بیٹھ گئے۔ دوسرے دن شام کو گاڑی لکھنؤ اسٹیشن پہنچی۔ طویل قامت، گرانڈیل، سرخ و سپید کبّن خاں اپنے ساتھیوں سمیت اسٹیشن پر موجود تھا۔ اُس نے ہم سب کو گلے لگایا جیسے ہماری پرانی جان پہچان ہو۔ کبّن خاں کا اصرار تھا کہ ہم ایک رات لکھنؤ ہی میں گزاریں مگر ہم اُسی رات فیض آباد روانہ ہو گئے۔ فیض آباد کے اسٹیشن پر جامو ہمارا منتظر تھا۔ ہمیں ایک بڑے مکان میں ٹھیرا دیا گیا۔ میں نے سفر میں دانستہ زرّیں کے پاس بار بار جانے سے گریز کیا تھا۔ اب بھی میں اُس سے دُور دُور رہا۔ صبح تک ہم ایک دوسرے سے مشورے کرتے رہے۔ میں نے کبّن خاں اور جامو کو زرّیں کی ساری کہانی سُنائی۔ انھوں نے اُس کے خالو کو کسی قسم کی رعایت دینے سے انکار کر دیا۔ یہ صلاح ٹھیری کہ اُس سے کوئی مفاہمت نہ کی جائے۔

دوسرے دن صبح ہی صبح ہم پندرہ آدمی، کبّن خاں، جامو، اُن کے ساتھی اور ہم چار زرّیں کی وسیع و عریض حویلی میں پہنچے تو اُس کا خالو ہمیں دیکھ کے بوکھلا گیا۔ اُس سے کوئی بات ہی نہیں کی گئی۔ اُسے یہ یقین دلانے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ ہم کس مقصد سے آئے ہیں۔ جامو نے اُسے حکم دیا کہ وہ شام تک حویلی خالی کر دے اور حویلی کے علاوہ دوسری تمام جائداد اور زمینوں کی دستاویزیں بھی زرّیں کے حوالے کر دے۔ اس سلسلے میں کوئی چھل، فریب یا کوئی قانونی اُلجھن ڈالی گئی تو انجام تباہ کن ہوگا۔ جیسا کہ میرا خیال تھا، اُس سے کہیں زیادہ آسانی سے بات نمٹ گئی۔ وہ ہم سے اتنا خوف زدہ ہو گیا تھا کہ اُس نے زرّیں کے قدموں پر سر رکھ کے معافی مانگنے کی خواہش ظاہر کی۔ اُس کی ساری منّتیں، خوشامدیں ضائع ہو گئیں، چار آدمی وہاں تعینات کر کے باقی واپس آ گئے۔ حویلی میں سامان کا بیشتر حصّہ زرّیں کی ملکیت تھا۔ جامو نے ایک وکیل بھی ساتھ لے لیا تھا۔ اُس نے ضروری کاغذات تیار کیے۔ شام کو میں زرّیں کو ساتھ لے کے اُس کی حویلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ لرز رہی تھی اور مجھے اُسے سنبھالنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ اپنے آدمی پھیلا کے جامو نے اس بات کا بھی انتظام کر دیا کہ محلّے والے کوئی رخنہ پیدا کرنے کی کوشش نہ کر سکیں۔ جامو کے وکیل نے کاغذات کا معائنہ کرنے کے بعد زرّیں کے خالو اور اُس کے خاندان کو حویلی سے نکل جانے کی اجازت دے دی۔ زرّیں کو اپنی خالہ اور بہن بھائیوں سے نہیں ملنے دیا گیا۔ اُن کا سامان جامو کے آدمیوں کی نگرانی میں دن بھر ڈھلتا رہا۔

شام تک حویلی پر زرّیں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اپنے مکان میں دوبارہ آ کے اُس کی عجیب حالت ہو گئی تھی۔ جیسے وہ خواب دیکھ رہی ہو۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے چیزیں دیکھتی تھی، پوری حویلی میں دوڑتی پھرتی تھی۔ حویلی کے آبائی ملازم وہیں رہ گئے تھے۔ وہ زرّیں کی واپسی پر پھولے نہیں سماتے تھے۔ زرّیں ملازماؤں سے گلے مل کے روتی تھی اور ایک ایک چیز آنکھوں سے لگاتی تھی۔ اُس نے مجھے پوری حویلی کی سیر کرائی۔ اپنی امّی اور ابّا کی قدِآدم تصویریں دکھائیں۔ بیٹھک کھول دی گئی۔ کبّن خاں، جامو اور اُن کے ساتھی وہاں بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ سارے کھانے کا انتظام جامو نے کیا تھا۔ حویلی ہی میں کھانا آ گیا تھا۔ حویلی میں کھانے کا فوری انتظام ممکن نہیں تھا۔ یہ سب کچھ ایک دن میں ہو گیا۔ مجھے خود یقین نہیں آ رہا تھا۔ لکھنؤ سے آتے ہوئے میرا دل بہت پریشان رہا تھا۔ نہ معلوم فیض آباد میں کیا پیش آئیں۔

کھانے کے بعد جامو نے ہم سب کو گانا سُننے کی دعوت دی۔ میں نے تھکن کی وجہ سے انکار کیا مگر وہ نہیں مانا۔ حویلی کے اندر اور باہر جامو کے آدمی موجود تھے، اس لیے کسی خطرے کا امکان نہیں تھا۔ میں نے زرّیں سے اجازت لی کہ میں جامو کے ساتھ کچھ دیر کے لیے باہر جا رہا ہوں، شاید رات کو دیر ہو جائے۔

فیض آباد کا بازار مختصر تھا مگر یہاں لکھنؤ سے زیادہ نفاست نظر آتی تھی۔ سنبھل کی طرح تو نہیں مگر جامو کی عزت بھی فیض آباد میں کچھ کم نہیں تھی۔ اُس کا ڈیل ڈول موتی جیسا تھا۔ بہت منہ پھٹ تھا، بات بات پر گالی بکتا تھا۔ میں ایک خاص جگہ لے جا رہا ہوں۔ میں نے پہلے ہی وہاں کہلوا بھیجا تھا کہ آج کے بعد کسی وقت میں اپنے مہمانوں کے ساتھ آؤں گا۔ وہاں ایک چیز دیکھنے کی ہے۔ زیادہ بات نہیں کرتی، کھوئی کھوئی رہتی ہے۔ اُس کی یہی ادا اپنا خانہ خراب کرتی ہے۔ گاتی کیا ہے، دل پر چھریاں چلاتی ہے۔“ سارے راستے جامو اُس کی تعریف کرتا رہا۔

ہم سیڑھیاں چڑھ کے اُوپر پہنچے۔ دروازہ بند تھا اور اندر سے کسی کے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ میرا دل بے تاب ہو گیا۔ جامو سچ کہتا تھا، اُس کی آواز میں جادو تھا۔ جامو کی ایک ہی دستک پر دروازہ کھول دیا گیا۔ ایک پختہ عمر عورت نے پُرتپاک انداز سے ہمارا استقبال کیا۔ اُس لڑکی نے ہماری آمد کی وجہ سے گانا بند کر دیا تھا۔ وہ سر جھکائے اپنے ناخن کرید رہی تھی۔ جب ہم سب بیٹھ گئے تو جامو نے کہا۔ ”نیلم جان! بس آج جادو جگا دو۔ مہمان دل پھینک کے جائیں تو بات ہے۔“ آواز پر اُس نے سر اُٹھایا اور زیرِ لب مسکرا کے دیکھا۔ جیسے ہی اُس نے سر اُٹھایا، میری آنکھیں دُھندلا گئیں، دل کی دھڑکن مفقود ہو گئی۔ سینہ کسی نے چاقو سے چیر دیا۔ کمرے میں سنّاٹا چھا گیا۔ میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے سے یہ دھند ہٹانے کی۔ نیلم جان نے مجھے دیکھ لیا تھا اور اُس کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔ بجلی کی سی تیزی سے اُٹھی۔ اُس نے جھروکے سے چھلانگ لگا دی۔

میں چیختا اور چلّاتا ہوا ایک ہی جست میں سیڑھیاں عبور کر گیا۔ میری بہن فہیمہ سڑک پر بے حال پڑی تھی۔ خون سے اُس کا چہرہ لال ہو گیا تھا۔ میں نے اُسے اپنے سینے میں دبوچ لیا۔

گلی میں بھگدڑ مچ گئی۔

پہلے تو مجھے خیال ہی نہیں آیا کہ یہ کون سی جگہ ہے اور میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔ دل کسی نے مٹھی میں بند کر لیا تھا۔ پھر جب خون میں نہائی ہوئی فہیمہ میرے سینے سے لگی تو میرا رہا سہا ہوش بھی رخصت ہو گیا۔ فہیمہ کی سانس اکھڑ گئی تھی اور اُس کی ہر کراہ میرا کلیجا کاٹ رہی تھی۔ جب گلی میں چیخ پکار شروع ہوئی اور کسی نے میرے بال پکڑ کے زور زور سے میرا سر جھٹکا تب کہیں مجھے اردگرد کا ہوش آیا۔ میں نے دہشت سے اپنے بازوؤں میں جکڑی ہوئی فہیمہ کا چہرہ آنکھوں کے سامنے کیا۔ اُس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور خون ہونٹوں سے نکل کے گردن پر اُتر رہا تھا۔ میں نے اُس کا لہولہان چہرہ آستین سے صاف کیا۔ اُس کی پلکوں میں جنبش ہوئی۔ ”ہٹ جاؤ، ہٹ جاؤ، دُور رہو۔“ جب اُس نے نظریں پھرا کے بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھا تو میں نے چیخ کر کہا۔ لوگ ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ میری چیخوں کا کسی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ شرلی اور فدے نے چاقو نکال لیے اور تماش بینوں کی طرف دوڑ پڑے۔ چند لمحوں میں جامو، کبّن اور سارٹے کے سوا سب مجھ سے دُور ہو گئے۔ میں نے انھیں گھور کے دیکھا تو وہ بھی پیچھے ہٹ گئے۔ میں نے فہیمہ کا چہرہ اپنے دامن سے چھپا لیا تھا لیکن اس طرح وہ میری نظروں سے چھپ گیا۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہ فہیمہ نہیں کوئی اور لڑکی ہے۔ اپنے شبہے کی تصدیق کے لیے میں نے پھر دامن کھینچ لیا۔ وہ فہیمہ ہی تھی۔ میری بہن فہیمہ ہی تھی۔ میری بہن، میری فمّی، میری بھتو۔ وہی اُس کی کمان کی طرح کھنچی ہوئی آنکھیں تھیں، وہی اُس کے منہ میں دائیں جانب اُبھرا ہوا دانت۔ وہ فہیمہ ہی تھی۔ ”تم کہاں ہو فمّی؟“ میری آواز پر لرزہ طاری تھا اور میں اپنا سر اُس کے سینے پر پٹخ رہا تھا۔ ”مجھے بتاؤ فمّی! تمھیں کون یہاں لایا؟“ میری بلکتی ہوئی آواز سے اُس کے ہونٹوں میں ارتعاش پیدا ہوا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر مسکرا کے رہ گئی اور اُس کی گردن میرے شانے پر ڈھلکنے لگی۔ ”نہیں فمّی! ۔ نہیں۔ تم مجھے بتاؤ۔ بتاؤ تم کیسے آئیں اور وہ سب کہاں ہیں؟“ میں نے اُس کا چہرہ تھام کے کہا۔

”بابر! ۔ بابر!“ بہ مشکل تمام اُس کے منہ سے میرا نام نکلا۔

”بولو فمّی! ۔ بولو۔ میں بابر ہوں، تمھارا کمینہ بھائی، تمھارا ذلیل بھائی۔ میرے منہ پر تھوک دو۔“ میں نے اُس کے ماتھے کے خون سے اپنی تھوتھنی رگڑتے ہوئے کہا۔

اُس کی مردہ آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے روشنی اُبھری اور معدوم ہو گئی۔ ”بابر!“ اُس نے سسکتے ہوئے پھر میرا نام لینے کی کوشش کی۔ ”تم ۔ تم ۔“

”ہاں میں ۔ میں۔“ میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔

”تم ۔ تم۔“ اُس نے ایک گہری سانس لی اور اُس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ میں نے چیخ چیخ کر اُسے آوازیں دیں، اُسے جھنجوڑا۔ صرف ایک بار اُس نے آنکھیں کھولیں، میرا ہاتھ مضبوطی سے تھاما اور میری گود میں لڑھک گئی۔ اس کے بعد وہ نہیں بولی اور نہ اُس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں۔ وہ مر گئی اور میں اُس کا لاشہ لیے اُسے دوبارہ زندہ کرنے کے لیے شعبدے بازی کرتا رہا، اُسے گلی میں نچاتا رہا۔ پھر سارٹے نے آ کے مجھے پکڑا۔ کبّن خاں نے میری بہن کو مجھ سے جُدا کرنے کے لیے اُس کے جسم پر ہاتھ لگایا تو میں نے اُس کے پیٹ میں لات مار دی۔ پھر جامو اور بہت سے لوگوں نے مجھے پکڑ لیا۔ پولیس آ گئی اور اُن سب نے فہیمہ کو مجھ سے چھیننے کی خاطر مجھ پر حملہ کر کے مجھے بے قابو کر دیا۔ فہیمہ کے جسم پر چادر ڈال دی گئی۔ میں اُس کے پاس جانے کے لیے پچھاڑیں کھا رہا تھا مگر وہ لوگ مجھے کھینچتے ہوئے ہجوم سے باہر لے آئے۔ سارٹے نے بے تحاشا میرے گالوں پر طمانچے مارنے شروع کر دیے۔ ”لاڈلے! ہوش میں آ لاڈلے! ہوش میں آ لاڈلے! کیوں اپنا تماشا بنا رہا ہے۔ بتا وہ تیری کون تھی؟“

”وہ فمّی تھی۔“ میں اپنے بال نوچتا ہوا اُس کے جسم پر گر گیا اور میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ سارٹے نے مجھے گلے سے لگا لیا اور میں نے اُس کے کپڑے بھگو دیے۔ میرا ایک بازو کبّن خاں نے اپنے کندھے پر ڈالا، دوسرا سارٹے نے اپنے کندھے پر۔ وہ مجھے ایک چبوترے پر لے آئے۔ ”کبّن! ۔ تم اسے سنبھالو۔ میں پولیس سے نمٹ کے آتا ہوں۔“ جامو نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”وہ اُسے لے جا رہے ہیں۔“

”کہاں لے جا رہے ہیں؟“ میں نے بڑبڑا کے کہا۔

”بیٹھو لاڈلے! ہمّت رکھو۔“ کبّن خاں مجھے چمٹاتے ہوئے بولا۔

”لاڈلے! تجھے اپنی ماں کی قسم، خاموش ہو جا، لوگ کیا کہیں گے، اتنا بڑا آدمی رو رہا ہے۔“ سارٹے نے میری کمر سہلاتے ہوئے کہا۔

”سارٹے! مجھے اُس کے پاس جانے دو۔“ میں نے اُس کے پیر پکڑ لیے۔

”وہ کہیں نہیں جائے گی، ہمارے ہوتے ہوئے وہ کہیں جا سکتی ہے؟“

کبّن خاں نے بلند آواز میں کہا۔ ”پولیس کو اپنی کارروائی کر لینے دے۔“

”پولیس۔“ میں نے اپنا چہرہ چھپا کے کہا۔ ”پولیس کیا کرے گی؟“

”پولیس خانہ پُری تو ضرور کرے گی لاڈلے! ذرا سی دیر صبر کر لے۔“ سارٹے آہستگی سے بولا۔ ”دیکھ کتنے لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ ذرا خیال کر، یہ کون سی جگہ ہے۔“

گلی میں ہر طرف سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ پولیس والے چیخ چیخ کر مجمع منتشر کر رہے تھے۔ سیٹیاں بج رہی تھیں اور ہر طرف شور ہو رہا تھا۔ جس چبوترے پر میں بیٹھا ہوا تھا، وہاں بھی لوگ آ گئے اور انگلیوں سے میری جانب اشارہ کرنے لگے۔ کبّن خاں اور سارٹے نے انھیں ڈانٹ کر بھگانا چاہا۔ وہ میرے کانوں میں سیسہ اُنڈیل رہے تھے۔ ہر طرف نیلم جان نیلم جان کی آوازیں تھیں۔ نیلم جان اس جگہ بہت مقبول معلوم ہوتی تھی۔ نیلم جان اپنے گھر میں بھی اتنی ہی مقبول تھی۔ محلّے کی لڑکیاں ہر وقت اُسے گھیرے رکھتی تھیں۔ وہ ہر وقت مسکراتی اور شرماتی رہتی تھی۔ تیز تیز باتیں کرتی تھی۔ اُس کی میٹھی آواز سے سبھی متاثر تھے۔ یہاں بھی اُس کی آواز کا چرچا تھا جس کے جو منہ میں آ رہا تھا کہہ رہا تھا۔ یہ دیکھ کے سارٹے نے مجھے کبّن خاں کے حوالے کر کے اپنا چاقو لہراتا ہوا اُن کی جانب جھپٹا اور غرّانے لگا۔

”کبّن خاں! سارٹے کو روکو۔ ان سب کو میرا چہرہ دیکھنے دو۔“ میں نے

دھاڑیں مارتے ہوئے کہا: "کبن خاں ان کے ہاتھوں میں پتھر دے، وہ اپنی نیلم جان کا بدلہ مجھ سے لیں گے۔ میں نے نیلم جان کو مار دیا ہے۔ میں نے نیلم جان کو مار دیا ہے۔" میں نے چلا چلا کے کہا: "میں نیلم جان کا قاتل ہوں۔"

میں نے کبن خاں کی گرفت سے آزاد ہوتے ہوئے صدا لگائی اور مجمع کی جانب بھاگنے لگا۔ سارنگے نے درمیان میں مجھے دھکا دے دیا اور میرا ماتھا فرش کی اینٹوں سے ٹکرا گیا۔ کبن خاں نے دوڑ کے پھر مجھے پکڑ لیا۔ اچانک ایک طرف سے ہجوم کا ریلا امڈتا ہوا آیا۔ کبن خاں مجھے لیے ہوئے زمین پر لیٹ گیا۔ جس جھروکے سے فہمیدہ نے چھلانگ لگائی تھی، اُس میں آگ لگ گئی تھی اور لوگ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے بھاگ رہے تھے۔ کبن خاں مجھے سمیٹے ہوئے زمین پر پڑا رہا۔ اس تنگ جگہ پہ ان گنت آدمی اُس کا جسم روندتے ہوئے گزر گئے۔ اکیلا سارنگے چیخ چیخ کر انھیں میری طرف بڑھنے سے روکتا رہا لیکن کبن خاں اندھا دھند بھاگتے ہوئے لوگوں کی ٹانگوں اور ضربوں سے خود تو اوسان کھو بیٹھا اور مجھے اُس کی گرفت سے نکلنے کا موقع مل گیا۔ فہمیدہ کی لاش ہٹائی جا چکی تھی اور جہاں وہ گری تھی، وہاں سپاہی دائرہ بنائے ہوئے کھڑے تھے۔ فہمیدہ کا خون فرش پر جم گیا تھا۔ میں اتنی تیزی سے آیا تھا کہ سپاہی دیکھتے رہ گئے۔ میں نے اُن کے دائرے میں داخل ہو کے فہمیدہ کا خون فرش سے کھسوٹ کے اپنے چہرے پر مل لیا۔ سپاہیوں نے میرے جسم پر لاٹھیاں برسانی شروع کر دیں۔ مجھے خبر نہیں پھر کیا ہوا۔ میں وہاں اس جلتے ہوئے مکان میں داخل ہونا چاہتا تھا کہ میرے سر پہ کسی سپاہی نے لاٹھی مار دی۔ میری آنکھوں میں اندھیرا گھس آیا اور کانوں پہ سناٹا چھا گیا۔ میں وہیں لڑکھڑا کے گر گیا۔

✱

جب میری آنکھ کھلی تو سارا منظر بدل گیا تھا۔ میں ایک پلنگ پہ دراز تھا اور میرے اطراف سفید دیواریں کھڑی تھیں۔ میں نے ہڑبڑا کے اُٹھنا چاہا تو دماغ میں دھماکا سا ہوا اور میری یہ خوش فہمی کہ میں ایک بھیانک خواب سے دوچار تھا، ایک ثانیے میں چکنا چور ہو گئی۔ میرے سر پہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور جسم اتنا بوجھل تھا کہ مجھ سے اُٹھایا نہ جا سکا۔ زریں میرے پاس بیٹھی تھی اور سامنے کی دیوار سے کمر ٹکائے سارنگے کھڑا تھا۔ میں نے وحشت سے اُن دونوں کو دیکھا۔ وہ دونوں آنسو بہا رہے تھے۔ "سب ٹھیک ہے لاڈلے!" مجھے اُٹھتا دیکھ کے سارنگے میرے قریب آ کے بولا۔

"وہ کہاں ہے؟ فتی کہاں ہے؟" میں اپنی تمام طاقت سمیٹ کے بستر پر بیٹھ گیا اور میں نے سارنگے کا گریبان پکڑ کے پوچھا: "اُسے کہاں چھوڑ آئے؟"

"وہ یہیں ہے۔ پولیس نے اُسے ہمارے حوالے کر دیا ہے۔" سارنگے نے روہانسے لہجے میں کہا: "تیرا انتظار تھا، پر تو اب کیسے اُٹھے گا، تیرے تو بہت چوٹیں آئی ہیں۔"

"مجھے کیا ہوا ہے؟ میں ہر حال میں زندہ رہوں گا سارنگے! مجھے موت نہیں آئے گی۔"

میں نے پلنگ سے جست لگانے کی کوشش کی تو زریں نے میرا شانہ

پکڑ لیا: "تم نہیں جاؤ گے، میں تمھیں اُس کی صورت دکھا دیتی ہوں۔" ہوئے بولی: "تمھاری حالت ٹھیک نہیں ہے۔"

"اپنے آپ کو قابو میں رکھ لاڈلے! جو قسمت کو منظور تو... اس قابل نہیں ہے کہ باہر جا سکے۔ ہم نے تمام انتظام کر دیا ہے۔ دیکھ کے اُسے ہمارے سپرد کر دے۔" سارنگے نے فیصلہ کن لہجے میں... خیال نہیں ہے تو اُسی کا خیال کر۔"

"مجھے بھی مار ڈالو سارنگے! میں اب اُس کے ساتھ ہی ر... اُس کی گود میں گرتے ہوئے کہا: "مجھے بھی اُس کے ساتھ ہی د...

"لاڈلے!" سارنگے نے تلخی سے کہا: "تجھے کیا ہو گیا ہے... جی کا آدمی ہے۔ اُستاد تو تیرے جی پہ ہی مرتا ہے۔ کیا تو اسی ط... وہ حرام زادی موقع پا کے فرار ہو گئی ہے۔ قدیرے نے اُسے بہت تلا... کہیں نہ ملی تو مکان میں آگ لگا دی۔ چل اُٹھ، برابر کے کمرے میں... بدکر نکلے! ایک دن تو اُسے گھر سے جانا ہی تھا۔" میرا سینہ پھٹنے لگا... نکلے میرے بائیں جانب کھڑی تھی۔ وہ اپنا چہرہ چھپا کے پھوٹ پھ...

"جی! بہن جی!" سارنگے نے اضطراب سے کہا: "تم بھی اسے رُلانے لگیں... کمرے میں لے چلو۔ اپنا لاڈلا شیر کا بچہ ہے۔ شیر کی طرح آنکھوں میں... کے دُنیا کا مقابلہ کرے گا۔"

زریں کو اپنے دوپٹے کا بھی خیال نہیں رہا۔ اُس نے لپک کے بانہ... دے کے اُٹھایا۔ میں نے اُس پہ اپنا بوجھ نہیں لدنے دیا، پھر بھی زرا... ہاتھ تھامے رکھا۔ میں اپنے پیروں سے چلا۔ زریں میرے پہلو سے لگ... اور اپنی لبالب آنکھیں اُٹھا کے بار بار میرا چہرہ دیکھتی تھی۔ دوسرے... مسہری پر کفن میں لپٹی ہوئی فہمیدہ کا جنازہ رکھا تھا۔ اُس کے اردگرد جو... قرآن شریف پڑھ رہی تھیں۔ ایک بوڑھی ملازمہ نے سارنگے کے اشا... کے چہرے سے کفن ہٹایا۔ اُس کے چہرے پر نور چھلک رہا تھا۔ ایسا... تھا جیسے وہ گہری نیند سو رہی ہو، جیسے اُس کے ذہن پر کوئی بوجھ... ابھی گھر کی طرح چہچہاتی ہوئی اُٹھے گی اور باورچی خانے میں جل... پہلے ناشتہ تیار کرے گی، پھر ابا کے کمرے میں بھاگی بھاگی جا کے... پیالی چائے دے گی اور پوچھے گی کہ ابا آج کیا پکایا جائے، یا پھر... باہیں ڈال کے کہے گی: "ابا! آج میں آپ کے لیے فرنی پکاؤ... مجھے جیوتی بیٹے سے چاندی کے ورق منگوا دیجیے۔" میری بھتیجی کو س... پسند تھا۔ کفن میں وہ کیسی مقدس لگ رہی تھی جیسے آسمان سے اتر... پری ہو۔ اُس کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے محسو... اُس کی آنکھیں کھلی ہوئی ہوں اور اُس کی نظریں میرے جسم میں پو... رہی ہوں۔ میں نے اپنا منہ پھیر لیا۔ سارنگے نے آ کے میرے کا... کی: "لاڈلے! اب چل۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں فہمیدہ کے پائنتی اسی...

...نا۔ بوڑھی عورت نے اُس کا چہرہ کفن سے ڈھانپنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میں نے اُس کے ہاتھ پکڑ لیے۔ میں نے فہمیدہ کے بال چومے، اُس کی پیشانی ...ہوئی اور اُس کی آنکھیں چومیں۔ میرا دل کھنچا جا رہا تھا۔ میں اُس کے سرہانے بیٹھا ہوا ...نے آنسوؤں سے اُس کا چہرہ میلا کرتا رہا۔ پھر زریں نے مجھے اُس کے پاس سے ...ٹھایا اور سارنگے مجھے میرے کمرے میں لے جانے لگا۔ میں نے انکار کر دیا اور اُس کمرے میں چلا آیا جہاں دبی دبی سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔ میرے پہنچتے ہی وہاں خاموشی چھا گئی۔ قدیرے، شولی اور کبن خاں نے مجھے درمیان میں بٹھا دیا جہاں ایک مولوی صاحب بیٹھے ہوئے تسبیح پڑھ رہے تھے۔ کمرہ لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ میری آنکھوں میں اب آنسو بھی نہیں رہے تھے کہ میں اُن کا ساتھ دے ...تا۔ میں گردن جھکا کے بیٹھ گیا۔ مولوی صاحب نے جھکتے جھکتے مجھ سے فہمیدہ کا جنازہ اُٹھانے کی اجازت چاہی۔ جامو اور سارنگے نے اصرار کیا کہ میں حویلی ہی میں ٹھیر جاؤں، وہ فہمیدہ کو دفنا کے آ جائیں گے لیکن میں نے اُن کی بات نہیں مانی۔ میں سارے راستے فہمیدہ کی ڈولی کو کندھا دیتا ہوا قبرستان تک لے گیا۔ کسی نے کندھا دینے کی کوشش کی تو میں نے اُسے اپنی جگہ نہیں لینے دی۔ قبرستان حویلی سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ میں نے اپنی بہن کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اُتارا۔ اُس کی قبر پھولوں سے ڈھانپ دی گئی۔ میں نہ رویا، نہ میں نے کوئی آہ بلند کی۔ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ کب وہ مجھے اُس کی قبر سے اُٹھا کے حویلی میں لے آئے اور کب اُنھوں نے مجھے بستر پہ لٹا دیا۔ مجھے جب ہوش آیا، جب زریں اپنے سامنے نظر آئی تو پتہ چلا میں کہاں آ گیا ہوں۔ میرا جسم ٹھنڈا پڑا تھا۔ زریں نے اسے حرارت پہنچانے کے لیے چادر ڈال دی۔

★

پھر ایسی حرارت چڑھی کہ سارا جسم بھٹی کے مانند دہکنے لگا۔ زریں کبھی میرے ماتھے پر برف کے ٹکڑے رکھتی اور کبھی آیتیں پڑھ کے پھونکتی۔ جب بھی میری آنکھ کھلتی، میں اُسے اپنے پاس بیٹھی ہوئی دیکھتا اور گرد و پیش میں مجھے کوئی تبدیلی نظر نہ آتی۔ وہی ایک جیسی روشنی، ایک جیسا اندھیرا۔ گھٹن اور حبس جب تک آنکھیں اور کان بند رہتے، مجھے کچھ خبر ہی نہ ہوتی لیکن جیسے ہی انھیں دیکھنے اور سننے کی تمیز آتی، ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی میری بوٹیاں نوچ رہا ہے اور چاقو سے گوشت کاٹ رہا ہو اور کوڑے مار رہا ہو۔ میں چیختا چلاتا رہتا، پھر میرے اوسان معطل ہو جاتے اور میں نڈھال ہو کے جیسے اپنے آپ میں گر پڑتا۔

اسی عالم میں جب مجھے اپنی سدھ بدھ نہیں تھی، ایسا محسوس ہوا کہ کوئی بہت دُور سے مجھے آواز دے رہا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ آواز اتنی قریب ہوئی کہ میرے کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔ میں نے گھبرا کے آنکھیں کھول دیں۔ کوئی میرے کانوں میں گھسا بیٹھا تھا۔ میں نے لیٹے لیٹے کروٹ بدلی۔ دیکھا کہ سرہانے بجھل بیٹھا ہے۔ اُس کی آنکھیں سرخ تھیں اور چہرہ تمتما رہا تھا۔ میں نے حیرانی سے اُس پہ نگاہیں مرکوز کر دیں۔ "میں آ گیا ہوں لاڈلے!" اُس کی بھاری بھرکم آواز کمرے میں گونجنے لگی۔

یکایک میرے ہونٹوں اور میری پلکوں پر رعشہ طاری ہو گیا۔ اُس نے میرا سر اپنے زانوؤں پر رکھ لیا اور میرے گالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا: "اچھا بھلا لاڈلے! بس اب اچھا ہو جا۔" اُس نے میرے کانوں کی لویں کھینچنا شروع کر دیں: "اُٹھ کے بیٹھ۔" اُس نے مجھے دونوں بازوؤں سے پکڑ کے اپنے سینے پر لٹکا لیا: "کیا پاگل ہو گیا ہے۔" وہ ناراضی سے بولا: "دُنیا میں صرف تو ہی تو نہیں رہتا، اور لوگ بھی رہتے ہیں۔ سلاؤ زریں! مجھے دوا دو۔" زریں دوا کا پیالہ لیے کھڑی تھی۔ میں نے تذبذب سے اُسے دیکھا۔ بجھل نے زریں کے کانپتے ہوئے ہاتھ سے دوا کا پیالہ چھین کے میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ میں نے منہ پھیرا تو بجھل نے ایک ہاتھ سے میری گردن پکڑ لی اور میرا سر ہلاتے ہوئے پیالہ میرے حلق میں لوٹ دیا۔ دوا میرے سینے پر گر گئی تھی۔ بجھل نے اپنے کرتے سے میرا چہرہ اور کپڑے صاف کیے: "اب بس ٹھیک ہو جا پہلوان!" وہ زور زور سے میری کمر پر دھپ مارتے ہوئے بولا۔

"ان کا جسم دُکھ رہا ہے۔" زریں نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں جانتا ہوں، جانتا ہوں، میں اسے دوا پلانے نہیں، غیرت دلانے آیا ہوں۔ سات سال جیل میں گزارنے والا، موجدا جیسے موذی کو مارا، چاند میاں جیسے سور کے بچے کو شکار کیا، اب ہاتھ پیر پھیلا بیٹھا مرنا چاہتا ہے۔" بجھل نے تلخی سے کہا: "بہن کے پاس کس منہ سے جائے گا۔ چل مر جا۔" بجھل مجھے بستر پہ دھکا دیتا ہوا بولا۔

"آپ ان سے، ان سے ایسی......" زریں بجھل کی آنکھیں دیکھ کے چپ ہو گئی۔

"تم اب جاؤ زریں! جا کے سو جاؤ۔" بجھل نے کسی قدر نرمی سے کہا۔ "اب میں آ گیا ہوں لاڈلا میرے سامنے بیمار نہیں رہ سکتا۔" زریں وہاں سے نہیں ہٹی۔ بجھل نے اُسے دوبارہ آرام کرنے کا حکم دیا۔ وہ سر جھکائے خاموشی سے اپنی جگہ کھڑی رہی۔ "اچھا اچھا۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا: "تم لاڈلے کی اجازت مانگتی ہو؟ لاڈلے!" اُس نے میری ٹھوڑی اُوپر اُٹھا کے کہا: "اپنا نہیں تو اس کا حال دیکھ۔ زریں نے دو دن سے آنکھ بند نہیں کی ہے۔ میرا حکم اس پر نہیں چلتا، اب تو اپنی زبان سے اسے کمر ٹکانے کا حکم دے۔ بتا دے کہ اب تو اچھا ہو گیا ہے، بتا دے کہ اب بجھل آ گیا ہے۔"

بجھل کی باتوں سے میری رگوں میں کھولن ہونے لگی تھی۔ میں نے پہلی بار زریں کی طرف غور سے دیکھا۔ اُس کا رنگ پیلا پڑ چکا تھا، سر پہ میلا دوپٹا تھا۔ اُس نے کپڑے بھی یوں ہی سے پہن رکھے تھے۔ میں اُس کی پیاس بھری نظروں کی تاب نہ لا سکا۔ بجھل نے ٹہوکا مار کے پھر مجھے اُکسایا کہ میں اپنی زبان سے زریں کو آرام کرنے کی اجازت دوں۔ میں نے نقاہت سے اُسے مخاطب کیا۔ ابھی میری زبان سے اُس کا نام ہی ادا ہوا تھا کہ اُس کے کمھلائے ہوئے چہرے پر مسرت کی ایک لہر اُبھری اور وہ بے قرار ہو کے میرے قریب آ گئی: "اب تم کیسے ہو؟" اُس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"مجھے موت نہیں آئے گی زریں!" میں نے نحیف آواز میں کہا۔

"یہ مر ہی نہیں سکتا، جاؤ زریں! میں یہاں موجود ہوں۔" تجمل نے سختی سے کہا۔ "اور دیکھو، سورج نکلنے سے پہلے تم یہاں نہیں آؤ گی۔"

"مگر ــ مگر ــ"

"اگر مگر کچھ نہیں۔" تجمل تیز آواز میں بولا۔

"دوائیں۔" زریں نے جھجک کر کہا۔ "دوائیں میز پہ رکھی ہیں۔"

"ہاں ہاں، میں اسے ایک ساتھ ساری دوائیں پلا دوں گا۔ اب اسے دوا کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ دواؤں سے ٹھیک ہو گا تو مجھے اس کے بارے میں فیصلہ بدلنا پڑے گا۔ دیکھ لینا بٹیا جب تم صبح آؤ گی تو لاڈلا ایک دم فِٹ فاٹ ہو گا۔"

زریں نے بدبدا کر کچھ کہا جسے میں سُن نہیں سکا۔ چند لمحے وہ مذبذب اور متردد وہیں کھڑی رہی۔ تجمل کے اشارے پہ ماما اُسے اپنے ساتھ لے گئی لیکن وہ ایک ہی لحظے بعد پلٹ آئی۔ "آپ کا بستر میں ... میں یہیں بھجوا دیتی ہوں۔"

"میرا بستر۔" تجمل نے ہنس کر کہا۔ "میں تو خود بستر ہوں، دیکھا، لاڈلا میرے بستر پہ لیٹا ہوا ہے۔" وہ مجھے اُٹھا کے سینے سے لگاتے ہوئے بولا۔

زریں کے جانے کے بعد میں اور تجمل کمرے میں تنہا رہ گئے، میں یوں ہی تجمل کے سینے سے چپکا بیٹھا رہا۔ کمرے میں بھیانک خاموشی طاری تھی۔ مجھے یہ خاموشی زہر لگنے لگی۔ "تم کب آئے؟" بہت دیر بعد میں نے ہمت کر کے سرگوشی میں پوچھا۔

"میں شام ہی یہاں پہنچا ہوں۔ ان حرام کے جنوں نے مجھے دیر سے خبر کی۔" وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ "بہر حال پھر بھی میں وقت پہ آ گیا ہوں۔ لاڈلے! تو نے مجھے بہت نیچا کیا۔"

میں نے اُس کا گریبان پکڑ لیا۔ "تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔" وہ اطمینان سے بولا۔ "میں تجھ سے خفا ہوں۔"

"پھر تم یہاں کیوں آ گئے۔ تمھیں کس نے بلایا تھا؟"

"تو نے ہی بلایا لاڈلے! تو نے ہی بلایا۔" اُس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"چلے جاؤ، واپس چلے جاؤ، مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

"چلا بھی جاؤں گا، پر تجھ سے نمٹ کے جاؤں گا۔"

"چلے جاؤ۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "نہیں جاؤ گے تو میں دیوار سے اپنا سر پھوڑ لوں گا۔ تم کیوں آئے ہو، جاؤ۔" میں نے وحشیانہ انداز میں اسے پلنگ سے دھکیل دیا۔

"پلک مُتنے، کھٹولے، تجھ سے اور کیا ہو گا۔" وہ فرش سے اُٹھتا ہوا بولا۔ "پھوڑ لے دیوار سے سر، پھوڑ لے، میں تیرا تماشا دیکھ کے جاؤں گا۔"

"لو دیکھو۔" میں نے اپنا گریبان چاک کر لیا اور اپنے منہ پر طمانچے مارنے لگا۔ تجمل پُرسکون انداز میں کھڑا مجھے دیکھتا رہا، میں نے اپنا سر مسہری کے تکیے سے پھوڑنا شروع کر دیا۔

"بس تجھ سے یہی ہو گا۔" وہ میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے بستر پہ پٹختے ہوئے [illegible] "زریں کے کپڑے تیرے جسم پر فِٹ تو نہیں آئیں گے پھر بھی وہ کپڑے [illegible] ہی ہیں لاڈلے! اپنے ہاتھوں میں چوڑیاں پہن لے، جھومر سجا لے [illegible] نے اپنا سر تکیے میں چھپا لیا اور سسکیاں لینے لگا۔ تجمل میرے کان کے [illegible] بولا۔ "کس پہ ٹائم نہیں گزرا لاڈلے! پر سب تیری طرح لونڈیا بن کے [illegible] بیٹھ گئے۔ تُو نے تو بستر پکڑ لیا۔" تجمل کا سر جھکا دیا۔ باہر وہ سب سالے [illegible] شہر کے مجھوڑے میرا منہ تک رہے تھے۔ جب انھوں نے مجھے بتایا کہ لاڈلا [illegible] دن سے چیخ چلا رہا ہے تو جی چاہا گدی سے اُن سب کی زبانیں کھینچ لا[ؤں]۔"

"ہونہہ۔" میں نے نفرت سے ہونٹ سکیڑ کے کہا۔ "تمھیں صرف [illegible] کی پروا ہے، تم کچھ نہیں جانتے، تمھیں چاقو چلانا، حکم دینا اور باتیں کرنا آتا [ہے]، تم کچھ نہیں سمجھتے۔"

"ہاں ہاں، تو سمجھتا ہے۔" وہ زہرخند سے بولا۔ "تُو سب سے زیادہ [سمجھتا] ہے۔ تیری سمجھ اور جان پہچان دیکھ لی لاڈلے! وہ کنجر کی اولاد کنجری نکل[ی] تو ٹرک پر ٹسوے بہاتا رہا۔ تجھے کچھ خیال بھی نہیں آیا کہ تو کیا کر رہا ہے۔"

"چپ رہو، چپ رہو، میں کچھ سُننا نہیں چاہتا۔" میں نے کان بند کرتے ہوئے کہا۔ "میں بہت کمینہ، بہت ذلیل اور نیچ آدمی ہو[ں]، کُتا ہوں۔"

تجمل کچھ کہنے کے بجائے کرسی پہ اپنا سر لٹکا کے بیٹھ گیا۔ میری [سسکیوں] کے سوا وہاں کوئی آواز نہیں تھی۔ جب دیر گزر گئی تو مجھے تجمل کی یہ [خاموشی] بھی گراں گزرنے لگی اور احساس ہوا کہ میں نے اُس سے کچھ زیادہ باتیں کہ[ہ دی] ہیں۔ وہ میرا حال سُن کے اتنی دُور سے یہاں آیا ہے اور میں نے اسے کیا کیا کہہ دیا ہے۔ شاید وہ ناراض ہو گیا ہے۔ میں نے اُس کی طرف نگاہ کی۔ اپنے آپ میں گُم تھا۔ کرسی کی پُشت پر باہر کی طرف اُس کا سر ڈھلکا ہ[وا تھا]۔ میں نے اُسے آواز دینے کا ارادہ کیا لیکن ہمت نہیں پڑی، میرے جسم [کے] چھوٹ رہے تھے اور رگ و پے میں سَن سَن ہو رہی تھی۔

"مجھے معاف کر دو۔" میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔ "مجھے کچھ خبر [نہیں] کیا کرنا چاہیے تھا، میں کیا کہہ رہا ہوں اور مجھے کیا کہنا ہے اور کیا کرنا چا[ہیے]۔"

تجمل چونک کے کرسی پر مچل پڑا۔ "لاڈلے! میں تیری بات کا [برا نہیں] مانتا، ان کانوں میں ایک چھلنی لگی ہوئی ہے، صرف باریک باریک باتیں [سنتا ہوں] ہیں اور ان دیدوں کو رگڑ گھس کے اس کام کا بنایا ہے کہ پرکھ سکیں کون ہے، سمجھا جانی؟"

"میں بہت ـ بہت، مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔" میں نے ا[س] سے کہا۔ "میرا دل قابو میں نہیں ہے۔ یہ ڈوب رہا ہے اور ڈوبتا بھی نہیں [illegible] کوئی نئی بات کر، یہ بتا کہ بہن سے کوئی بات بھی ہوئی؟" [illegible] لہجے میں بولا۔ "اب مجھ سے کچھ نہ چھپا۔"

میں نے مایوسی سے سر ہلا دیا۔ "کیا سب کو معلوم ہو گیا کہ وہ [illegible]

[ج]ب میں نے اُسے مرنے کے بعد بھی بے چین کیا، میں نے اُس کا پردہ چاک کر دیا۔"

"[illegible] کیسی بات کرتا ہے، تو نے گلا پھاڑ کے سب کو بتایا ہے کہ تیرا اُس [illegible] کیا رشتہ ہے، بہت مضبوط سینہ چاہیے لاڈلے! لوہے کا بنا ہوا سینہ، تو [illegible] ہی وار برداشت نہیں کر پایا۔ اب زندگی میں صرف وہی چاقو نہیں ملتے [جو] جیبوں میں رکھا جاتا ہے، ہر طرف سے چاقو چلتے ہیں میری جان! [illegible] کے ہلکے نظر نہیں آتے، یہ داؤ پیچ جو تُو نے جیل میں سیکھے ہیں یہ تو معمولی [illegible] [ل]وگوں کے داؤ ہیں، وار کرنے اور وار بچانے کے ہُنر کا پتہ تو زندگی میں ملتا [ہے] شہزادے! اتنا اکیلا مت رہ۔ زندگی کاٹ کھائے گی، زندگی کے وار سے [illegible] کے لیے کبھی تنہا کبھی مل کے، کبھی سامنے سے کبھی پیچھے سے داؤ پیچ دکھانے [پڑ]تے ہیں۔ تُو نے کچھ بتایا ہی نہیں کیونکہ تجھے لوگوں نے اتنا خوف زدہ کر دیا [illegible] کہ تُو نے سب پر بھروسا کرنا چھوڑ دیا ہے۔ یہ خوف دور کر، بہت اکیلا [ہو] جائے گا لاڈلے! میں سمجھتا تھا تُو کتابوں اور قلم کے داؤ پیچ سیکھ کے اور مضبوط [illegible] ان نکلے گا۔ تُو کاہے سے ڈرتا ہے رے؟"

میں گم سم اُس کی باتیں سُنتا اور صورت دیکھتا رہا۔ "جانے دے۔" وہ ہاتھ [جھ]ٹک کے بے پروائی سے بولا۔ "اس بات پر غور کر کہ وہ یہاں آ کیسے گئی؟"

"مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ وہ میری بہن فہمیدہ تھی مگر وہ تھی وہی۔ [م]جھ نہیں معلوم کہ وہ کہاں سے آ گئی۔ وہ تو بہت شرمیلی، چار دیواری میں رہنے [وا]لی لڑکی تھی۔ کسی اجنبی آدمی نے کبھی اُس کا سایہ تک نہیں دیکھا تھا۔ اُسے [دیکھ] کے مجھے ہوش ہی نہیں رہا، پتہ نہیں میں نے کیا کیا اور کیا کہا ہو گا۔ آدمی کے [illegible] ہتھیار ہو تو اُسے یہ خیال رہتا ہے کہ وہ قتل بھی کر سکتا ہے یا قتل بھی ہو [سک]تا ہے۔ آدمی جانتا ہے کہ ان جانے راستوں پر سفر کرنے سے بھٹک جانے [کا] اندیشہ ہے۔ آدمی رہی باتیں تو سوچ سکتا ہے جو اُس کے دماغ اور دل میں آتی [ہیں]، آدمی رات کو دن کیسے کہہ سکتا ہے۔" میری آواز پر کپکپی طاری ہو گئی۔ "تجمل بھائی [ہما]ری کوئی بہن ہوتی اور بہن بھی فہمیدہ جیسی ہوتی پھر میں تم سے پوچھتا۔"

تجمل سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔ اُس کے چہرے پر خون اُبھر آیا۔ پلکیں [ت]یزی سے جھپکنے لگیں اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے کوئی بُری بات کہہ [دی] ہے یا تجمل کہیں کھویا ہوا ہے، اُس نے میری بات سُنی ہی نہیں۔ وہ کرسی [سے] اُٹھ کے کمرے میں ٹہلنے لگا اور دھیمی آواز میں بولا۔ "رات کو دن بھی کہنا [پڑتا] ہے لاڈلے! چلتے چلتے زمین پھٹ جاتی ہے، آنکھ کھلی ہے تو سب کچھ [illegible] ہے، آنکھ بھی ایک چاقو ہے۔ بدن پر موجود ہے تو کچھ بھی دکھا سکتی ہے۔" [وہ] لمبی سانسیں کھینچتا ہوا سرگوشی میں بولا۔ "باقی لوگ کدھر ہیں؟"

"کیا پتہ، میں کچھ نہیں جانتا۔"

"تُو نے انھیں کہاں چھوڑا تھا؟"

"میں نے انھیں جہاں چھوڑا تھا، اب وہ وہاں نہیں ہیں۔ وہ نہ جانے [کہا]ں کھو میں گُم ہو گئے۔ میں نے انھیں تلاش بھی نہیں کیا، میں تو اُن کے لیے [اُس]ی دن مر گیا تھا جس دن گھر سے رخصت ہوا تھا۔ اب سات سال بعد میں

اُنھیں اپنا کالا چہرہ دکھا کے پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا اور پھر مجھے تو کسی اور شخص کی تلاش تھی۔"

"دیوانے! یہ آدمی کا بچہ بھوبھل کے موافق ہوتا ہے، تنکے سے کریدو تو نہ جانے کتنی چنگاریاں پک پڑیں۔ میں جانتا ہوں ایسی چھیڑ چھاڑ اچھی نہیں ہوتی۔ مجھے یقین تھا، ایک دن تو خود ہی تنگ ہو جائے گا۔ سات سال تو بڑی بات ہے، ایک لمحے میں کایا پلٹ جاتی ہے مگر تو نے سات سال اپنے آپ کو برف خانے میں رکھا۔ لاڈلے! اس کی ضرورت نہیں تھی۔ بس دل پہ برف رکھنی پڑتی ہے جبھی آدمی ٹھیک طرح سوچ سکتا ہے، تُو نے سوچنے کا کام نہیں کیا اور کیا کیا؟ تجھے کیا ملا، تو اپنے آپ کا اتنا دشمن کیوں ہے۔ میری بات سُن، غور سے سُن، آدمی کی جون میں آ، یہ آدمیوں کی دُنیا ہے کھال سے نکال اور سینکے سے ڈھول بجا۔ ڈُنڈے، نندے، شولی، سارٹے، جامو اور کبن خاں حرامی بھی تیری طرح نشے میں آ گئے تھے مگر میں اُسے تیرے لیے ضرور تلاش کروں گا۔ اطمینان رکھ، تجمل اُس چنڈال کو تیرے قدموں میں ضرور ڈال دے گا جو تیری بہن کو لائی تھی۔ یہ تجمل کا وعدہ ہے، لاڈلے میری خاطر اب اکیلا کہیں جانے کی کوشش مت کرنا۔ اکیلا آدمی پاگل ہوتا ہے، تجھے پتہ نہیں، کون کون تیرا طلب گار ہے جانی! اور سُن تجھے جس لڑکی کی تلاش ہے، وہ ایسی آپادھاپی میں کبھی نہیں مل سکتی، تو اُس طرح اُسے کبھی حاصل نہیں کر سکتا۔"

تجمل رات بھر میرے جسم میں سوئیاں چبھوتا رہا۔ وہ سچ کہتا تھا۔ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ حواس باختہ زریں جب کمرے میں داخل ہوئی تو مجھے دیکھ کے دنگ رہ گئی۔ اُس کی آمد پہ مجھے خیال آیا کہ رات گزر گئی ہے اور تجمل رات بھر جاگتا رہا ہے۔ زریں نے مجھے دوا کا پیالہ دیا تو تجمل نے اُسے سلیپچی میں اُلٹ دیا اور ہنس کے کہنے لگا۔ "زریں! لاڈلے کو بھوک لگ رہی ہے۔"

*

جب تجمل مجھے باہر لایا تو بیٹھک بھری ہوئی تھی۔ مجھے اور تجمل کو دیکھتے ہی وہ سب کھڑے ہو گئے۔ ان میں جامو بھی تھا، کبن خاں بھی، نندے، شولی سارٹے بھی، نواس بھی موجود تھا۔ وہ شاید تجمل کے ساتھ آیا تھا۔ میرے سر پہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں لیکن میری آنکھیں خشک تھیں اور میں اپنے قدموں پہ کھڑا تھا، میرے چہرے پر بھی اُنھیں نمایاں تبدیلی نظر آئی ہو گی۔ وہ سب مجھ سے لپٹ گئے اور کبن خاں تجمل کا بازو پکڑ کے جوش میں بولا۔ "اُستاد! کیا جادو کر دیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"میں تو پہلے ہی کہتا تھا۔" سارٹے ٹنک کے بولا۔ "اگر استاد کو پہلے سے خبر کر دیتے تو لاڈلا ہمیں اتنا پریشان نہ کرتا۔ استاد لاڈلے کی رگ رگ سے واقف ہے۔"

"تیری زبان بھی کاٹتے کی طرح چلنے لگی؟ کُتر دوں گا۔" تجمل نے گھُرک کے کہا، پھر کبن خاں کو مخاطب کر کے بولا۔ "کبن خاں! کیا پتہ چلا؟"

"اُستاد تجمل، وہ سالی لکھنؤ میں بھی نہیں ہے۔" کبن خاں سر کھجاتے

بجے بولا۔ بہرحال استاد! جائے گی کہاں، میں اُسے پاتال سے بھی زندہ پکڑ کے لے آؤں گا۔ ذرا لگے سانس تو لینے دو، کہیں نہ کہیں جا کے تو ٹکے گی۔ لوٹ پھر کے آجائے گی اپنی اوقات پہ۔ لاڈلے! غیرت کر، قسم سے کچھ خیال ہی نہیں رہا۔ سالا سب کچھ ایسا تابڑ توڑ ہوا کہ اُس کی طرف نظر ہی نہیں گئی۔ استاد! بڑی شرمندگی ہے۔"

"نہیں کبن متو! تو نے تو بڑا کام کیا۔" مجھل اُسے سینے سے لگاتے ہوئے بولا۔ "اور یہ جامو، تو نے اسے مجھ سے پہلے نہیں ملایا، کہاں چھپا کے رکھا تھا؟ رستم کو شہر میں کیا رنگ جمایا ہے میرے شیر نے۔"

"استاد بس تمھاری دعا ہے۔" جامو نے انکسار سے کہا۔ "میں تو لاڈلے کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتا، نہ جانے اُس دن میرے منہ سے کیا کیا نکل گیا۔"

"ملا ڈلا جانتا ہے کہ تیری اس میں کوئی خطا نہیں تھی جامو!"

"استاد، وہ لڑکی بہت اچھی تھی، بہت ہی اچھی۔ ان بدمعاشوں سے پوچھ لو۔" وہ اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ندامت سے بولا۔ "میں ہمیشہ اُس کا ذکر کرتا تھا، نگاہ نہیں اُٹھاتی تھی مگر استاد! تم جانتے ہو، اپنے کام سے اور اپنے آپ سے بھی کبھی تو بڑی گھن آتی ہے۔ یہ آنکھیں سب کچھ دیکھتی ہیں اور یہ ہاتھ سالے کچھ کر نہیں پاتے۔"

"رہنے دے جامو! کوئی اور بات کر۔" مجھل میری آنکھوں میں لرزتے ہوئے آنسو دیکھ کے بولا۔ "جامو! تو نے تو کمال کر دیا، ایک ہی دن میں بٹیا کے لیے حویلی خالی کرا دی۔"

"استاد! کیوں شرمندہ کرتے ہو، سب کھاد ہو گیا۔ میں نے کیا کیا، بٹیا کی حویلی تھی، اُسے مل گئی۔ کبن خاں کا حکم تھا، میں بٹیا کے لیے شہر فیض آباد کی تمام حویلیاں خالی کرا سکتا تھا۔ کبن خاں نے زندگی میں پہلی تو فرمائش کی تھی۔ وہ خالو کا بچہ یہاں سے تو دُم دبا کے نکل گیا مگر بعد میں اُس نے شہر میں بڑا ہنگامہ مچایا۔ کئی رئیسوں اور محلے کے چودھریوں کے پاس گیا۔ اپنی بھی نوابوں رئیسوں سے صاحب سلامت ہے۔ پہلے تو سب بگڑے مگر جب میں نے انھیں ساری بات بتائی تو گھڑوں میں وبک گئے۔ اب بٹیا آرام سے رہ سکتی ہے اور میں تو یہاں موجود ہوں۔ میں نے کہہ دیا ہے کسی نے حویلی پر نگاہ اُٹھا کے دیکھا تو آنکھیں نکال لوں گا۔" جامو نے طیش میں کہا۔

ماما نے آکے اطلاع دی کہ ناشتہ تیار ہے۔ دوسرے کمرے میں فرش پر ناشتہ سجا ہوا تھا۔ زریں نے خاصا اہتمام کیا تھا۔ فہمیدہ کے واقعے کو تین دن گزر گئے تھے، تین دن سے ایک کھیل بھی اُڑ کے منہ میں نہیں پہنچی تھی۔ اب بھی بھوک نہیں تھی، میری نظر ان سب کے سامنے اُٹھتی ہی نہیں تھی حالانکہ وہ بار بار میرے قریب آکے، مجھے گلے لگا کے مجھ سے اپنے لگاؤ کا اظہار کر رہے تھے۔ مجھ سے کچھ کھایا نہیں گیا لیکن پھر سب نے ہاتھ اٹھا لیا اور کہا کہ جب تک میں نہیں کھاؤں گا وہ بھی کچھ نہیں کھائیں گے۔ مجبوراً مجھے اُن کا ساتھ دینا پڑا۔ ان لوگوں سے مل کے میرا ذہن پھر بوجھل ہونے لگا۔ انھوں نے سکون سے ناشتہ کیا لیکن

ناشتے کے بعد کسی نے اُس رات کا ذکر پھر چھیڑ دیا۔ اُن کی باتوں سے معلوم ہوا تھا کہ انھوں نے فیض آباد شہر کا ہر محلہ چھان مارا ہے مگر چمپا نائکہ کا کہیں نہیں ملی۔ پولیس سے انھوں نے یہ بات چھپانے کی کوشش کی تھی کہ فہمیدہ میری بہن تھی لیکن پولیس کو پتہ چل ہی گیا۔ اُن کے بیان کے مطابق پولیس والے حویلی میں مجھ سے سوالات کرنے آئے تھے۔ جامو نے انھیں میری بیماری کا عذر کر کے ٹال دیا۔ چمپا نائکہ کے غائب ہو جانے سے پولیس کی توجہ اُس کی طرف مبذول ہو گئی تھی، پھر بھی جامو کے خیال میں انھیں ایک بار ضرور میرے پاس آنا تھا۔ جس وقت ہم چمپا کے کوٹھے پر پہنچے تھے تو وہاں اور بھی لوگ تھے اور نیلم جان گا رہی تھی۔ ہماری آمد سے نیلم جان کے گانے میں مداخلت ہوئی، اُس نے گانا بند کر دیا اور پھر اُسے اچانک نہ معلوم کیا ہوا کہ وہ جھجک کے کود پڑی۔ سب سے پہلا آدمی میں تھا جو چیختا ہوا نیچے اترا، سب نے فہمیدہ کو میری گود میں تڑپتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں تو اب سڑک پر بھی نہیں نکل سکتا تھا۔

جامو نے نیلم جان کو تین سال قبل شہر کے بازار میں پہلی بار دیکھا تھا اور وہ اکثر اُسی کے کوٹھے پر گانا سننے جاتا تھا۔ نیلم جان کبھی بازار میں نہیں نکلتی تھی، بس اپنے بالاخانے پر شام کو محفل سجاتی تھی اور درد بھرے نغمے گاتی تھی، ناچتی بھی ہو گی، فہمیدہ ناچتی ہو گی۔ زنّو، پری بیگم اور شہ پارہ کی طرح ناچتی ہو گی۔ جامو کہتا تھا، وہ بہت دُکھی نظر آتی تھی اور اپنی بستی کی دوسری طوائفوں سے کم ہی ملتی جلتی تھی، وہ سب اُس سے جلتی تھیں اور اُس کے متعلق عجیب عجیب کہانیاں بیان کرتی تھیں۔ جامو نے بتایا کہ اُس نے ایک ایک طوائف سے نیلم جان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی، کوئی کچھ کہتا تھا، کوئی کچھ۔ خود نیلم جان نے اپنے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا، ہاں سب کو یہ بات معلوم تھی کہ نیلم جان کسی شریف خاندان کی لڑکی ہے اور مجبوراً طوائف بنا دی گئی ہے۔ اس بازار میں آنے کے بعد اُس کے سامنے کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا، اس لیے وہ ناچتی اور گاتی رہی۔ چمپا کے سازندے کہتے تھے کہ انھوں نے پہلی بار نیلم جان کو اُس وقت دیکھا تھا جب چمپا فیض آباد میں اُسے ساتھ لائی تھی۔ اُس کے ساتھ جو مرد تھا، وہ واپس چلا گیا تھا۔ چمپا اپنے ساتھ دو لڑکیوں کو لے کے پانچ سال پہلے فیض آباد سے گئی تھی۔ واپس آئی تو اُس کے ساتھ نیلم جان تھی اور یہاں سے جانے والی دونوں لڑکیوں کو وہ کہیں اور چھوڑ آئی تھی۔ چمپا کا کوٹھا اُس کی عدم موجودگی میں ایک دوسری طوائف رانی چلاتی تھی۔ چمپا کے آنے کے بعد رانی شاید بریلی چلی گئی اور چمپا نے نیلم جان کی محفل سجانی شروع کر دی۔ ہم نہایت احتیاط سے مجھل کو نیلم کے بارے میں بتا رہے تھے۔ میں نے اپنے آپ پر بڑا ضبط کیا۔ اگر میں نہ کرتا تو مجھے کبھی اِن واقعات کا علم نہ ہوتا۔ میں بھی نیلم جان کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ شاید اُن کی گفتگو میں کوئی ایسی بات آ جائے جس سے نیلم کے گھر والوں کا حال معلوم ہو سکے مگر کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ بس اتنا معلوم ہوا کہ نیلم جان کو چمپا نے خریدا تھا۔ کس سے اور کہاں سے خریدا تھا؟ یہ کوئی

نہیں بتا سکتی تھی یا چمپا کی کوئی رازدار۔ نیلم جان کا یہ حال ہوا تو یہ تو چمپا ہی بتا سکتی تھی کہ باقی گھر والوں کا کیا ہوا ہو گا۔ وہ بدنصیب کہاں ہوں گے۔ میں سب سوچتا تھا۔ میں نے نسترن کو دیکھا تھا، زریں کو دیکھا تھا اور میں نے چاند میاں کو دیکھا تھا، جن کے گھر سے بھائی بھاگ جاتے ہیں اور جن کے باپ مر جاتے ہیں، اُن کی بہنوں کا یہی ہوتا ہے۔ وہ سب نیلم جان کا تذکرہ کر رہے تھے، اس کی عادات و اطوار، شائستگی اور شرافت بیان کر کے مجھے خوش کر رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ انھوں نے چمپا کو تلاش کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ مجھل کس کس کی زبان بند کرتا؟ میری صورت دیکھ کے ہر ایک کو نیلم جان یاد آ جاتا تھا، ایک کی زبان رکتی تو دوسرے کی چلنے لگتی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ نیلم جان گانے کے درمیان اچانک پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی پھر اُس دن تک چمپا کا بالاخانہ ویران رہا اور لوگ گلی میں بھٹکتے رہے۔

مجھل نے مجھے واپس اندر بھیجنا چاہا لیکن میں نے اُس کا حکم نہیں مانا۔ اُن کی ہمدردیاں سہتا اور اُن کی دل جوئیاں برداشت کرتا رہا اور فرش کو گھورتا رہا۔ مجھل نے مجھ سے چاقو بھی چھین لیا تھا۔ آخر مجھل کبن خاں اور جامو سے یہ مطالبہ کرتا ہوا اُٹھ گیا کہ وہ ایک ہفتے کے اندر اندر چمپا کو کہیں نہ کہیں سے لا کے میرے پیروں پہ ڈال دیں۔ مجھل کے اُٹھتے ہی وہ سب منتشر ہو گئے۔ جامو کے دو تین ساتھیوں، فدے، شولی اور سارٹے کے سوا سب وہاں سے چلے گئے۔ مجھل مجھے اندر لے آیا جہاں سُرخ آنکھوں اور زرد چہرے کے ساتھ زریں بے تابی سے ہمارا انتظار کر رہی تھی، وہ ہمیں حویلی کے دالان میں لے گئی جس کے آگے ایک بڑا صحن موجود تھا، صحن میں خشک پتے کھڑکھڑا رہے تھے اور دھوپ منڈیروں پر پھیل گئی تھی۔ مجھل دالان میں رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ کے پیچوان کے کش لینے لگا، پھر حقے کی نال اُس کے منہ سے لگی رہ گئی۔ وہ بھی کچھ سوچ رہا تھا، میں بھی اور زریں ہم دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ "بٹیا!" ایک ساعت بعد کہیں مجھل کی گمبھیر آواز نے ماحول کا سکوت توڑا۔ "اس بڑی حویلی میں تیرا جی کیسے لگے گا؟"

زریں ڈری سہمی بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھل کی آواز پر وہ چونک پڑی اور دبے دبے قدموں سے اُس کے پاس گئی۔ تھم سے سر ٹکا کے اُس نے جھجکتے جھجکتے جواب دیا۔ "بابا! میں اس گھر میں پیدا ہوئی تھی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" مجھل نے اُلجھتے ہوئے کہا۔ "پر میں سوچتا ہوں تو اکیلی یہاں کیسے رہے گی، گاؤں اور شہر کی جائداد کی آمدنی کی دیکھ بھال، کسان، اناج، نوکر چاکر، ان سب کو تو اکیلی کیسے دیکھے گی اور پھر یہ سب جنجال نہ بھی ہو تب بھی اس محل میں تو تیرا جی بہت گھبرائے گا۔"

"بابا! اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔" زریں آہستگی سے بولی۔ "یہاں کی دیکھ بھال میں نہیں کروں گی تو اور کون کرے گا۔"

"تو کیسے کر سکتی ہے پگلی! یہ تو بڑا کام ہے۔"

"جہاں تک بن سکا کروں گی۔" وہ اداسی سے بولی پھر کچھ تذبذب کے بعد کہنے لگی۔ "بابا! ایک بات کہوں؟"

"کہہ بٹیا کہہ۔" مجھل نے تجسس سے کہا۔

"بابا! میرا جی یہ چاہتا ہے کہ یہ سب آپ سنبھال لیں اور میں بس آپ کی خدمت کرتی رہوں۔ اب آپ یہیں رہیے۔ میں آپ کے لیے اچھے اچھے کھانے پکاؤں گی، آپ کا حقہ تازہ کروں گی۔ دیکھیے میری بات منع مت کیجیے گا۔ مجھے کچھ اور نہیں چاہیے، یہ سب چیزیں میرے لیے بیکار ہیں، آپ یہاں رہیں گے تو اس سے بڑھ کے میرے لیے کوئی اور خوشی نہیں ہو گی۔"

مجھل اُچھل کے کھڑا ہو گیا۔ اُس نے اپنے قریب کھڑی ہوئی زریں کا دوپٹا سرکایا اور اُس کا چہرہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھورتا رہا۔ مجھل کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اُس نے زریں کی پیشانی چوم لی اور اُسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ زریں پر لرزہ سا طاری ہو گیا مگر مجھل فوراً پیچھے ہٹ گیا اور تیزی سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "نا نا۔ نا بٹیا نا۔ یہ تو کیا کہہ رہی ہے۔ کوئی بیٹیوں کے دھن پر بھی بیٹھتا ہے۔ ایسی بات پھر مت کرنا، اتنا بُرا مت سمجھ بٹیا!"

زریں سہم گئی۔ "بابا! آپ میری بات نہیں سمجھے یا میں آپ کو سمجھا نہیں سکی۔ میں آپ کو خواب میں بھی بُرا تصور نہیں کر سکتی۔"

"نا نا، ایسی باتیں مت کر۔" مجھل نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تو نہیں جانتی کہ ہم کون لوگ ہیں۔ ہم بہت فتور رکھتے ہیں۔"

"میں سب جانتی ہوں، پھر آپ نے پوچھا ہی کیوں تھا۔"

"پوچھا تھا پر بٹیا ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا۔" زریں مضبوط آواز میں بولی۔

"تو ابھی بچی ہے، کچھ نہیں سمجھتی۔" مجھل جھنجلا کے بولا۔

"تو پھر آپ کیوں پوچھتے ہیں کہ میں یہاں کیسے رہوں گی، میں جیسے تیسے رہ لوں گی۔ زندگی تو گزارنی ہی پڑے گی۔"

"او نہیں نہیں۔" مجھل نے ہذیانی انداز میں کہا۔ "بس اب خاموش رہ، بس اب کچھ نہ کہنا، میرے کانوں میں اتنا دم نہیں ہے۔" زریں کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی مگر مجھل کی اضطراری حالت دیکھ کے چپ ہو گئی۔ مجھل کو کسی پہلو قرار نہیں تھا۔ میں نے اُسے اتنا مضطرب پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ بار بار اپنے بال کھینچ رہا تھا۔ زریں وہاں سے چلی گئی تو مجھل کو کچھ قرار آیا اور وہ مجھ سے کہنے لگا۔ "لاڈلے! لاڈلے! یہ کیسی لڑکی ہے، تو نے مجھے اس سے کیوں ملایا تھا۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ سامنے ہوتی تھی تو میں یہی سوال خود سے کیا کرتا تھا اور سوچتا تھا کہ کاش بدھ گیا سے واپسی کے وقت میرے پاس کلکتے جانے کے لیے ٹکٹ کے پیسے ہوتے اور زریں کے ڈبے میں داخل ہونے اور اُسے دیکھنے کی نوبت نہ آتی، میں نسترن اور چاند میاں کو کسی نہ کسی طرح یقیناً ڈھونڈ لیتا اور کورا کی تلاش میں یہ رخنہ پیدا نہ ہوتا لیکن جب ایسا خیال آتا تو مجھے گھبراہٹ ہونے لگتی اور میں اپنے آپ کو سرزنش کرتا۔ زریں بھی کورا ہی کی طرح ایک لڑکی تھی، مجھ سے کم ایک لڑکی تو اپنے گھر واپس آ گئی۔ اچھا ہوا، بدھ گیا سے

واپسی پر میری جیب میں پیسے نہیں تھے اور میں زریں تک پہنچ گیا تھا۔ اگر میں اُس کے ڈبے میں داخل نہ ہوتا تو زریں کا نہ جانے کیا حال ہوتا۔ کبھی کورا کو میرے ڈیرے پہنچنے کا یہ حال معلوم ہوگا تو وہ بہت خوش ہوگی۔

میری خاموشی سے بجھل کی اُلجھن میں اور اضافہ ہوگیا۔ دھوپ صحن میں پھیل چکی تھی مگر بجھل کو کچھ ہوش نہیں تھا۔ بچپن کی نال زمین پر پڑی تھی اور بجھل دہشت سے اپنا چہرہ نوچنے لگتا تھا۔ مجھے اُس کی اس کیفیت سے خوشی سی ہوئی۔ ماما نے آکے اُسے چونکایا کہ باہر بیٹھک میں جامو اُس کا منتظر ہے۔ بجھل کی چال میں پہلے جیسی تیزی نہیں تھی، میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ بیٹھک کے دروازے پر بجھل نے مجھے روک دیا۔ میں نے درشتی اور ناراضی سے اُسے دیکھا مگر اُس نے مجھے جامو کی بات سننے کا موقع نہیں دیا۔ شہر سے جامو فہمیدہ اور چمپا بائی کے متعلق کوئی خبر لایا ہوگا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ مجھ سے یہ باتیں کیوں چھپانا چاہتے تھے، اب پردہ ہی کیا رہ گیا تھا۔ وہ نہ جانے اندر بیٹھے کیا کھسر پھسر کر رہے تھے، میں دروازے کے قریب منڈلاتا رہا۔ بجھل نے صبح ناشتے کے دوران میں کبن خاں اور جامو کو حکم دیا تھا کہ وہ چمپا بائی کو ایک ہفتے کے اندر میرے قدموں میں ڈال دیں مگر اس طرح بھلا فہمیدہ واپس آسکتی تھی، فہمیدہ تو منوں مٹی تلے دبی ہوئی تھی۔ اُن کا خیال ہوگا کہ چمپا سے اپنی بہن کا بدلہ لے کے مجھے کوئی تسکین حاصل ہو جائے گی۔ چمپا کے نام سے میرے خون کی گردش ضرور تیز ہو جاتی تھی لیکن چمپا کا کیا قصور تھا، یہ تو چمپا کا کاروبار تھا۔ سزا تو مجھے خود کو دینی چاہیے تھی۔ ابا کہتے تھے، جس گھر کی دیواریں نیچی ہوں وہاں چور گھس آتا ہے۔

ایک چمپا بائی ہی کیا، ہزاروں چمپا بائیوں کے جسموں میں چھرا گھونپنے کے بعد بھی مجھے قرار نہ آتا۔ میں نے اپنی بہن کے پیروں میں گھنگرو بندھے دیکھے تھے۔ اُن گھنگروؤں کی بازگشت اب تک میرے دماغ میں گونج رہی تھی۔ بجھل نے آکے مجھے درہم برہم کر دیا۔ میں بستر پر پڑا تھا تو اُن لوگوں کی آنکھوں سے دور تھا جو یہ جان گئے تھے کہ فہمیدہ سے میرا کیا رشتہ تھا۔ کلکتے میں بجھل نے میرے اردگرد جو پہرا لگایا تھا، وہ یہاں بھی موجود تھا۔ شہر کے کتنے ہی لوگوں نے میرا چہرہ دیکھا تھا اور جامو کے کتنے ہی ساتھی اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے۔ میں شہر میں جامو کے اثر و رسوخ کا مشاہدہ کر چکا تھا۔ مجھے بھی چمپا بائی کی تلاش تھی لیکن میں اُس سے صرف اتنا پوچھنا چاہتا تھا کہ اُس نے فہمیدہ کو کہاں سے حاصل کیا تھا؟ ابا اُسے کہاں ملے تھے؟ بجھل سمجھتا تھا کہ فہمیدہ کی موت کے بعد میری بدحواسی، بے ہوشی اور گم شدگی بے حسی کی بات ہے۔ بجھل کو تمام حالات معلوم کب تھے۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ فہمیدہ کا چہرہ دیکھ کے میرے ذہن نے کیسے کیسے بھیانک خواب دیکھے تھے۔ میں بخار میں تپ رہا تھا اور امّی میرے پاس بیٹھی تھیں، ابا میرے سرہانے کھڑے تھے۔ مجھے اُن سے نظر ملانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی اور میں غش کھا کے گر پڑتا تھا۔

بجھل نے ایک کشمکش سے نجات دلا کے دوسری سے دوچار کر دیا تھا۔ ایک کوٹھری سے دوسری کوٹھری میں منتقل کر دیا تھا۔ اُس نے مجھے زندگی کے میرے ہاتھ باندھ دیے تھے۔ باہر جانے کا راستہ بند تھا۔ ممکن ہے وہ چمپا بائی کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں، میں نہیں چاہتا تھا کہ ایسا ہو ورنہ وہ تمام ماجرا سنائے گی کہ فہمیدہ کس گھرانے کی لڑکی تھی، اُس کے باپ اُس کے خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ کیا گزری۔ مجھے چمپا اپنے طور پر ملنا چاہیے تھا۔ یا اُس تک اُن کے پہنچنے سے پہلے اُس کی لینی چاہیے تھی۔ اگر بجھل نہ آتا تو شاید میں حویلی کی بڑی دیواریں پھاند ہو جاتا بشرطیکہ مجھے اپنا ہوش بھی رہتا۔

بجھل جلد ہی واپس آگیا اور اُس نے مجھے بتایا کہ نیلم جان ایک نواب خاص لگاؤ رکھتا تھا۔ نیلم جان اُس نواب سراج علی کی طور پر بلائی جاتی تھی اور بند کمرے میں نواب کے سامنے ناچتی گاتی سازندوں نے اب تک جامو کو یہ بات اس لیے نہیں بتائی تھی کہ خوف زدہ تھے۔ جب جامو نے انھیں مجبور کیا تو انھیں نواب کا نام بتا کوئی خاص بات نہیں بتا سکے۔ صرف اس قدر بتا سکے کہ نواب نے چمپا نیلم جان کا سودا کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور چمپا نے خوش اُسے ٹال دیا تھا۔ اُس نے نواب سے وعدہ کیا تھا کہ وہ جب بھی نیلم جان اُس کا گانا سننے کی فرمائش کرے گا، وہ اُسے اُس کی حویلی لے آ بہت دنوں تک چلتا رہا۔ سازندوں کا خیال تھا کہ خود نیلم جان بھی سے متاثر تھی۔ نواب چمپا اور اُس کے سازندوں کو ہمیشہ انعام و اکرام جب جامو اور کبن خاں نواب سے ملنے کے لیے اُس کی حویلی پہنچے تو کہ نواب ان دنوں سخت بیمار ہے اور ایسی حالت میں ملاقات کر معذور ہے۔

بجھل کی زبانی یہ باتیں سن کے میرا جسم سُن ہوگیا۔ کانوں میں بجنے لگیں۔ وہ یہ واقعات سپاٹ انداز میں سُنا رہا تھا اور اُس دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی تھی کہ اُس کا ایک ایک لفظ میرے رہا ہے۔ وہ نیلم جان کی زندگی کُرید رہے تھے حالانکہ وہ اُسے اپنے چکے تھے۔ میں بجھل کی چال سمجھ گیا تھا۔ وہ یہ سب سُنا کے مجھے یہ تھا کہ کبن خاں اور جامو میرے بارے میں کتنے فکرمند ہیں اور مجھ یہ کہنے کی جرأت نہیں تھی کہ بس کرو، اپنا کام کرو۔ مجھے میرے حال پر مجھ سے اتنی ہمدردی کا اظہار مت کرو۔ دوپہر کے کھانے سے پہلے آہستگی سے میرے پاس آئی کہ مجھے اُس کی آہٹ کا احساس بھی انھیں تبدیل کرلو۔" اُس نے دھیمی آواز میں کہا۔ وہ اپنے ہاتھوں میں کپڑے لیے کھڑی تھی۔

مجھے گھر یاد آگیا۔ جمعے کی نماز سے پہلے امّی یا فہمیدہ اسی طرح نکال کے دیتی تھیں۔ میں کتاب پڑھنے یا کچھ لکھنے کے دوران میں تھا کہ امّی یا فہمیدہ کے آنے کی خبر ہی نہیں ہوتی تھی۔ میں نے بڑ سے اُسے دیکھا اور بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا: "آج جمعہ"

"نہیں۔" وہ اُداسی سے بولی۔ "آج پیر ہے۔" میں نے

نوں سے کپڑے چھین لیے۔ "پانی گرم ہوگیا ہے مگر نہانے میں کوئی حرج نہ ہوگا۔" وہ ہچکچاہٹ سے بولی۔ "اگر طبیعت خراب ہو تو مت نہانا۔"

"مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ میرا جی کچھ کرنے کو نہیں چاہتا۔"

"کیوں؟" وہ میرے پاس بیٹھ گئی۔ "میں جانتی ہوں تم کتنے اُداس ہو مگر مرنے والے تو مر ہی جاتے ہیں، البتہ اُن کی روحیں زندہ رہتی ہیں اور سب کچھ دیکھتی رہتی ہیں۔" وہ رُندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "مجھے کیا خبر تھی کہ یہاں آنے کے بعد تم اس حادثے سے دوچار ہوگے۔ میں یہاں آنے کے لیے تیار نہیں ہوتی تو آج یہ بات نہ ہوتی۔"

"اُس کی موت اسی طرح لکھی تھی، تم کیا کر سکتی تھیں، مجھے یاد ہے تم یہاں کتنی خوش ہوئی تھیں، سوچا تھا کہ تم اپنے تمام دُکھ بھول جاؤ گی اور نئے سرے زندگی بسر کرو گی لیکن تمھیں ایک دن بھی سکون نہ ملا۔"

"میری ایک بات مانو گے؟" وہ افسردگی اور عاجزی سے بولی۔ "کہتے ہوئے جھجک ہوتی ہے لیکن تمھارا حال دیکھا نہیں جاتا۔ تم ٹھیک کہتے ہونے والی بات کو کون روک سکتا ہے، نہ تم، نہ میں، نہ کوئی اور۔ تمھیں آگے سے کام کرنے ہیں۔ یہ گھر تمھارا ہے۔ تم...... تم...... نہیں......"

وہ کپکپانے لگی اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر سر جھٹک کے بولی: "جاؤ، کپڑے پہن لو۔ پانی ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

میں نے بھی کچھ نہیں کہا۔ اُس کے لہجے میں ایسا سوز تھا کہ میں نے ایک بچوں کی طرح اُس کی ہدایت پر عمل کیا۔ وہ غسل خانے تک رہنمائی کرتی ہوئی میری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ ابھی میں نے کُرتا اتارا ہی تھا کہ مجھے پہلی بار اپنے گلے میں کسی چیز کی کمی کا احساس ہوا اور میرے دل کی حرکت جیسے بند ہونے لگی۔ میں نے دیوانگی سے اپنا سینہ ٹٹولا۔ مالا میرے گلے سے غائب تھی۔ میں اسی حالت میں چیختا ہوا غسل خانے سے باہر نکلا۔ میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ کورا کی ایک ہی چیز میرے پاس رہ گئی تھی، اُس کی بھی میں حفاظت نہیں کر سکا۔ میری چیخ پکار سے حویلی کے ملازمین اِدھر اُدھر دوڑنے لگے اور انھوں نے بجھل کو خبر کی۔ بجھل کے باہر آنے سے پہلے میں خود بیٹھک میں پہنچ گیا۔ "میری مالا کہاں ہے؟" میں نے دہشت زدہ انداز میں اُسے مخاطب کیا۔ "میری مالا واپس کر دو۔"

"کون سی مالا؟" بجھل نے تعجب سے پوچھا۔

"وہ مالا جو تم نے میرے پاس دیکھی ہوگی، وہ کسی کی امانت تھی۔ وہ اب میرے گلے میں نہیں ہے۔" میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔

"اُلٹے رے، ایک مالا کے لیے اتنی دیوانگی؟ میں کھیلنے کے لیے تجھے ایسا اور مالا لا دوں گا۔" بجھل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں، نہیں، مجھے وہی مالا چاہیے۔ آہ کسی نے میری مالا چھین لی۔" میں نے زاری کرتے ہوئے کہا۔ "مجھ سے جو چاہو لے لو مگر میری مالا مجھے واپس کر دو۔"

"لاڈلے! میں تجھے ویسی بہت سی مالائیں لا دوں گا۔" بجھل نے چمکار کر کہا۔ "اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے؟"

"تم نہیں جانتے، تم اُس کی قیمت کا اندازہ نہیں کر سکتے بجھل بھائی! خدا کے لیے جامو، کبن خاں اور دوسرے لوگوں سے پوچھو کہ انھوں نے میری مالا تو نہیں دیکھی؟" میں نے اُس کی منت کی۔

"تو دیکھ رہا ہے لاڈلے! سب باہر گئے ہوئے ہیں، میں اکیلا یہاں بیٹھا ہوں۔ آئیں گے تو پوچھ لوں گا۔ مالا انھوں نے دیکھی ہوگی تو جائے گی کہاں۔ تجھے واپس مل جائے گی۔" بجھل ناگواری سے بولا۔

"مجھے اُن کے پاس لے چلو۔ آؤ باہر چلو، ہم انھیں کہیں نہ کہیں تلاش کر لیں گے۔" میں نے بجھل کا دامن کھینچتے ہوئے کہا۔

"لاڈلے! اپنے اوسان ٹھیک کر، بالکل پاگل ہوگیا ہے۔ وہ آتے ہی ہوں گے۔ کچھ تو خیال کر، ہم اُن کے مہمان ہیں۔ ذرا تسلی رکھ، انھیں واپس آنے دے۔" بجھل کے لہجے میں ناراضی اور تلخی شامل تھی۔ "چپ چاپ ایک طرف بیٹھ جا اور اُن کا انتظار کر۔" اُس نے مجھے ڈانٹ کر کہا۔

"آہ، آہ۔" میں اپنا ماتھا پکڑ کے بیٹھ گیا۔ "میں کتنا کم بخت ہوں، کتنا کم ظرف ہوں، آہ بجھل بھائی! تم ٹھیک کہتے تھے، مجھے ہوش میں رہنا چاہیے تھا۔ میں نے فہمیدہ سے بات بھی نہیں کی، کسی حکیم ڈاکٹر کے پاس لے جانے کے بجائے میں اُس کے پاس بیٹھا اُسے موت کے منہ میں دھکیلتا رہا اور میں نے اپنی مالا بھی کھو دی۔" میں گریہ کرنے لگا کیونکہ مجھے اپنی حالت پر کوئی اختیار نہیں تھا۔

بجھل حیرت زدہ تھا اور مجھے خاموش کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے پھر کوئی میرا عزیز مر گیا ہو۔ آہ، وہ مالا جو کبھی نہ کبھی کورا تک پہنچنے کا ذریعہ بن سکتی تھی، جس کے لیے میں نے بدھ گیا میں ایک شخص کا خون کر دیا تھا، جو کورا کی غیر حاضری میں اُس کی حاضری کی حیثیت رکھتی تھی، جو میرے دُکھ سکھ میں شریک تھی، جس سے میں راتوں کو کھیلا کرتا تھا اور جس کے دانوں پر میں کورا کے نام کا ورد کیا کرتا تھا۔ جیل سے واپسی کے بعد وہ میرے جسم کا حصہ بن گئی تھی۔ کورا کی تلاش میں ناکامی کا احساس جتنا شدید ہوتا جاتا تھا، اتنی ہی وہ مجھے عزیز ہوگئی تھی۔ فہمیدہ خود تو گئی، مجھ سے میری مالا بھی چھین لے گئی۔ مجھے اپنا وجود حقیر محسوس ہونے لگا، جیسے میں غریب ہوگیا ہوں، جیسے میں مفلوج ہو گیا ہوں، جیسے ہجوم میں کورا کا ہاتھ مجھ سے چھوٹ گیا ہے۔

نہ جانے کیا ہوتا اگر اُس لمحے ماما اندر آکے بجھل کو یہ اطلاع نہ دیتی کہ بی بی جی اُسے اندر بلا رہی ہیں۔ بیٹھک میں کوئی اور مرد نہیں تھا۔ اس لیے بجھل نے خود جانے کے بجائے زریں کو وہیں بلا لیا۔ وہ گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ میں نے اُسے حسرت و یاس کی نگاہ سے دیکھا اور بے تابی سے کہا: "زریں! میری مالا کھو گئی۔"

"کیسی مالا؟" وہ آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے بولی۔

"تم نے اُسے میری گردن میں دیکھا ہوگا، میں اُسے کُرتے کے نیچے چھپا کے رکھتا تھا۔" میں نے رقت بھری آواز میں کہا۔

"اُس مالا میں ایسی کیا خصوصیت تھی جو تم اتنے پریشان ہو؟"
"تم نہیں جانتیں۔" میں نے سر جھٹک کے کہا۔ "وہ امانت تھی، وہ ایک تحفہ بھی، وہ میرے لیے سب کچھ تھی۔"
"کیا بہت قیمتی تھی؟ بھلا کتنی قیمت ہو گی اُس کی؟"
"اُس کی قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔"
"تمھیں کس نے دی تھی وہ؟" زرّیں نے سادگی سے پوچھا۔
"وہ۔ وہ بس دی تھی ایک شخص نے۔ اُس سے تم واقف نہیں ہو۔" میں نے جھنجلا کے کہا، پھر اُس کی صورت دیکھنے لگا۔ مجھے زرّیں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ محسوس ہوئی۔ "کیا؟ کیا؟" میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانک کے پوچھا۔ "کیا تم نے وہ دیکھی ہے؟"
"ہاں دیکھی تو ہے۔" زرّیں سرگوشی میں بولی۔
"کہاں؟ مجھے جلدی بتاؤ۔" میں نے تیزی سے پوچھا۔
"پہلے انعام کا وعدہ کرو۔" زرّیں مسکرا کے بولی۔
"انعام؟" میں نے اضطراب میں کہا۔ "جو تم کہو گی۔ جو تم کہو گی زرّیں! کیا واقعی وہ تمھارے پاس محفوظ ہے؟"
"بابا! آپ گواہ رہیے۔ یہ انعام کا وعدہ کر رہے ہیں، منہ مانگا انعام۔" زرّیں بجھل کے قریب جا کے بولی۔
"میں نے سُن لیا ہے بٹیا! لاڈلے! زبان سے مت پھرنا۔"
"میں وعدہ کرتا ہوں، میرے امکان میں جو کچھ بھی ہو گا، میں زرّیں کو دے دوں گا۔" میں نے جھجک کے کہا۔
"بابا! دیکھیے، انھوں نے وعدے میں یہ شرط بھی رکھ دی۔"
"شرط نہیں زرّیں!" میں نے اُداسی سے کہا۔ "میرے پاس رکھا ہی کیا ہے مگر میں تمھیں مالا نہیں لوٹا سکتا۔"
"میں اُسے نہیں مانگوں گی۔" وہ شوخی سے بولی۔
"تو پھر جو جی چاہے، مانگ لینا۔"
"وعدہ ہے؟" زرّیں نے تکرار کی۔
"ہاں اب مجھے مالا دکھا دو، تمھارے پاس محفوظ ہے نا؟"
زرّیں نے اپنی اوڑھنی ذرا سی سرکائی، مالا اُس کے گلے میں چمک رہی تھی۔ میرا جی چاہا، میں اُسے اُس کی گردن سے کھینچ لوں لیکن چند قدم چل کے رُک گیا۔ زرّیں نے مالا اتار کے ایک بار غور سے دیکھی، پھر میری طرف بڑھا دی۔ مالا جب میرے ہاتھ میں آئی تو میں نے اُسے دیوانہ وار آنکھوں سے لگانا اور چومنا شروع کر دیا۔ زرّیں اور بجھل حیرت سے میری بے قراری دیکھتے رہے۔ پھر مجھے خیال آیا۔ میں نے تمتماتی ہوئی آواز میں زرّیں کو انعام طلب کرنے کی پیش کش کی۔ زرّیں کچھ تذبذب میں پڑ گئی اور شرمیلے لہجے میں بولی۔ "میں سوچ کے بتاؤں گی۔" یہ کہتے ہوئے اُس کے چہرے پر کئی دن کی سُرخی ایک ساتھ ابھری۔ بجھل کا قہقہہ بلند ہوا ہی تھا کہ وہ تیز قدموں کے ساتھ بیٹھک سے چلی گئی۔ میں اپنی مالا کے دانے گننے میں مصروف تھا اس لیے میں نے کچھ خیال نہیں کیا۔
مالا کی گم شدگی اور بازیابی سے مجھے اپنی حالت میں خاصی [تبدیلی] محسوس ہو رہی تھی۔ کورا کی یاد سے دل و دماغ میں ایک تازگی اور توانا[ئی محسوس] ہوئی۔ میں اپنے آپ سے پشیمان ہونے لگا کہ میں تین چار دن کورا کے [دربار میں] حاضری نہیں دے سکا جیسی حاضری کا سلسلہ اُس سے پہلی ملاقات [کے بعد] سے جاری تھا مگر یہ کیفیت بڑی لمحاتی ثابت ہوئی۔ جامو اور کتبہ [کے] آنے کے بعد میرے خواب پھر بکھر گئے۔ وہ آتے ہی فہمیدہ کا تذکرہ کر[تے۔] کئی دن بھر کی تگ و دو کا حال ان کے سیر ایم ندامت سے بوجھل ہونے [تک] انھیں چمپا بائی کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ جامو نے اپنے آشنا[ؤں] میں یہ شوشہ چھوڑ دیا تھا کہ نیلم جان اصل میں چمپا بائی کے کسی جگہ [سے] کے دل برداشتہ ہو گئی تھی اور نتیجے میں اُس نے چھلانگ لگا کے خود[کشی کی۔] جامو نے آج بھی پولیس والوں کو مجھ سے باز پرس کرنے سے روکے رکھا[۔ وہ] میرے سامنے فہمیدہ کے بارے میں عجیب عجیب باتیں کرتے تھے۔ رات [گئے تک] گفتگو ہوتی رہی، لوگ آتے جاتے رہے اور جامو ہر ایک سے اُس کی ر[وداد] اور تبصرہ کرنے کی تکرار کرتا رہا۔ میں اُٹھ کے وہاں سے چلا آیا۔ بجھل [...]
رات کو میں نے موقع پا کے حویلی کے گرد ایک چکر لگایا۔ ادھ[ر] مکانات تھے تو اُدھر درمیانی باغ کے بعد حویلی کی عمارت تھی۔ حو[یلی] خاصی اونچی تھی۔ پہلی ہی نظر میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہاں سے فرار ناممکن ہے۔ ابھی میں نے پورا راستہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ مجھے لہ[راتے] سائے رینگتے ہوئے نظر آئے۔ میں ٹھٹک کے ایک جگہ رُک گیا۔ وہ [...] ساتھی تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بجھل میرے ارادوں سے پوری [طرح واقف تھا۔] اُدھر حویلی کے ملازم ہیں تو اِدھر جامو کے ساتھی، بجھل کی نگاہ ہر جگہ [...]
دوسرے دن بھی یہی ہوا۔ تیسرے دن بھی یہی۔ میرا خیال تھا کہ [...] کب تک فیض آباد میں مقیم رہے گا۔ کلکتے میں فوجدار کے قتل کا وا[قعہ] تھا اور بجھل کی طویل غیر حاضری کو فوجدار کے ساتھی کتنے ہی رنگ د[یں گے۔] بجھل کو جلد سے جلد یہاں سے جانا چاہیے تھا مگر وہ حیرت انگیز [طور پر] ٹھیرا رہا۔ اُسے آئے ہوئے پانچ دن گزر گئے تھے۔ جامو پہ بتدریج بیزاری چھاتی گئی۔ میں نے اس دوران میں راتوں کے وقت کئی [بار] میں اُٹھ کے حویلی سے باہر نکلنے کی تدبیر کی لیکن مجھے ہر بار ناکامی کا[سامنا کرنا پڑا۔] جتنا وقت گزر رہا تھا، مجھ پر مایوسی کا غلبہ شدید ہوتا جا رہا تھا۔ میں[نے] وقت حویلی کے اندر ہی گزارنا شروع کر دیا تھا اور لوگوں سے با[ت چیت] کم کر دی تھی۔ زرّیں سے اب رسمی گفت و شنید رہ گئی تھی۔ وہ کھا[نا لاتی،] کھانا کھانے چلا جاتا، وہ سونے کو کہتی، میں بستر پہ دراز ہو جاتا۔ وہ [...] کرنے کو کہتی، میں کسی چون و چرا کے بغیر اُس کے حکم کی تعمیل کرتا۔ مجھ[سے] ترتیب مجھ سے اِدھر اُدھر کی بات کرنی چاہی۔ میری طرف سے کوئی [...] ملا تو وہ بھی خاموش رہنے لگا۔ زرّیں کی آنکھوں میں اب جھنجلاہٹ نہ[...]

[لہٰذا] اس لیے میں نے اُس کی جانب نظر اٹھانے کی بھی احتیاط شروع کر دی تھی۔
پانچویں دن شام کے وقت میں باغ کے سبزے پر لیٹا ہوا تھا کہ ایک [بو]ڑھے ملازم کے ذریعے بجھل نے مجھے بُلایا۔ زرّیں نے بجھل کے رہنے کا انتظام [حو]یلی کے اُس خاص حصّے میں کیا تھا جو ایک زمانے میں اُس کے باپ کے استعمال [میں] رہتا تھا۔ میں آہستہ قدموں سے جب اُس کمرے میں داخل ہوا تو بجھل وہاں تنہا [تھ]ا اور ایک پلنگ پر فکرمند سا بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے سرہانے ایک کاغذ رکھا تھا۔ "[لا]ڈلے!" اُس نے گمبھیر آواز میں مجھے مخاطب کیا۔ "اب تو تو سب سے خفا معلوم [ہو]تا ہے۔"
"میں بات کیا کروں؟" میں نے چڑچڑے پن سے کہا۔
"تجھے مرچیں کھلانی پڑیں گی شہزادے! بات کرتا رہا کر۔ آدمی یہ چنگالی [نہ کرے] تو سارا معاملہ خراب ہو جاتا ہے۔ لے ذرا یہ کاغذ پڑھ۔" اُس نے کاغذ [مجھ]ے تھما دیا۔
"کیسا کاغذ؟" میں نے کسمساتے ہوئے اُسے ہاتھ میں لیا۔
"دیکھ اس میں کیا لکھا ہے؟" بجھل سنجیدہ لہجے میں بولا۔
میں نے اُسے کھول کے دیکھا۔ وہ کوئی قانونی دستاویز تھی، تازہ تازہ۔ [می]ری نبضیں تیز ہو گئیں۔ میں نے اُسے پڑھنا شروع کیا تو میرے ہاتھ کانپنے لگے۔ زرّیں نے اپنی تمام جائداد، حویلی، زمینیں، سب کچھ میرے نام کر دیا تھا۔ جیسے جیسے میں کاغذ پڑھتا جا رہا تھا، میری حالت غیر ہو رہی تھی۔ زرّیں نے [غ]یر مشروط طور پر اپنی تمام جائداد سے دست برداری کا اعلان کیا تھا۔ میری [ع]قل خبط ہو گئی اور میرے ہاتھوں میں کاغذ تھرتھرانے لگا۔
"کیا ہو گیا لاڈلے؟" بجھل نے میرا شانہ پکڑتے ہوئے کہا۔
"یہ کیا ہے؟" میرا منہ کھلا ہوا تھا۔ "یہ کیا ہے؟"
"یہ مذاق نہیں ہے لاڈلے!" بجھل نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"مگر۔ مجھے مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہے۔"
"کیوں نہیں جانی! ان چیزوں کی ضرورت سب کو ہوتی ہے۔"
"میں یہ کاغذ پھاڑ دیتا ہوں، میں اسے جلا دوں گا۔"
"وہ کہتی ہے کہ اس کی نقلیں اُس کے پاس موجود ہیں۔" بجھل نے ہنستے ہوئے کہا۔ "آج اُس نے شہر کا بڑا وکیل بلایا تھا۔ اُس نے مجھے بھی خبر نہیں ہونے دی۔ بس ابھی میرے پاس یہ کاغذ پھینک کے چلی گئی۔ میں کچھ کچھ سمجھ گیا تھا کہ اس میں کیا ہو سکتا ہے مگر لاڈلے! اُس نے اپنے لیے تو کچھ بھی نہیں رکھا۔"
"سب اُس کا ہے۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" میں نے کاغذ مروڑ کے اُس کی طرف اُچھال دیا۔ "وہ کیا چاہتی ہے؟"
"لاڈلے! بٹیا نے تماشا کیا ہے۔ بٹیا نے ہم دونوں کا امتحان لیا ہے۔ کتنی جلدی فیصلہ مت کر، سوچ سمجھ لے۔"
"کیسا تماشا؟ کیا زرّیں ہمیں لالچی سمجھتی ہے؟"
"لالچی نہیں گنوارے! سمجھا کر اُس نے کچھ اور کہنا چاہا ہے۔ میں تو بٹیا کا منہ چوم لوں گا۔"
"میری سمجھ میں نہیں آتا اُس نے یہ کیوں کیا ہے؟"
"بٹیا کی نیت پر شبہ مت کر۔ نہ وہ ہمیں لالچی سمجھتی ہے نہ تم کو۔ یہ کاغذ بٹیا کے آنسو ہیں لاڈلے! یہ بٹیا کی زبان ہیں۔ تو نے پڑھا نہیں، اُس نے کوئی شرط نہیں رکھی ہے۔ آج سے یہ سب تیرا ہے۔ تو بڑا مال دار ہو گیا ہے، جاگیردار۔ لاڈلے! یہ مت سمجھنا کہ بٹیا نے تجھے تیری خدمت کا معاوضہ دیا ہے۔ اُس کے دل میں کھوٹ نہیں ہے۔ اُس نے خود کو ہماری عدالت میں پیش کر دیا ہے۔"
"میں اُس سے بات کروں گا۔" میں نے بے چینی سے کہا۔ "لاؤ یہ کاغذ مجھے واپس کر دو۔ میں خود اُس سے بات کروں گا۔"
"لے۔" بجھل شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ "ذرا احتیاط سے بات کرنا، غصے مت ہونا۔ اُسے بھی غصہ آ سکتا ہے۔"
"کیا مطلب؟" میرے قدم رُک گئے۔
"بٹیا کا تو نے اندازہ کر لیا۔ وہ کم عمر ہے مگر بڑی سوچ والی ہے۔ اُسے غصہ آ جائے گا تو وہ عمر بھر ہمیں رلاتی رہے گی۔ پھر فہمیدہ کی طرح تو اُس کا بھی سوگ کرتا رہے گا اور اُس لڑکی کی طرح بھی، جس نے تجھے غصّے میں مبتلا کر رکھا ہے، جس کی مالا تیری گردن میں پڑی ہوئی ہے۔" میں نے خشمگیں نظروں سے اُسے گھورا۔ وہ مسکراتے ہوئے سر ہلانے لگا۔ "اب ٹائم خراب نہ کر لاڈلے! جا بھاگ جا۔"
زرّیں کے پاس جاتے وقت میری چال میں پھرتی نہیں تھی۔ میں نے طے کیا، میں آج اُسے سب بتا دوں گا۔ اُس سے صاف صاف کہہ دوں گا کہ میں یہاں کیوں نہیں ٹھیر سکتا۔ میں نے بارہا اشارۃً اُسے یہ بتانے کی کوشش کی تھی مگر وہ کیوں نہیں سمجھتی تھی۔ زرّیں شاید میری آمد کی منتظر تھی۔ میں جو سوچ کے گیا تھا، وہ دروازے پر قدم رکھتے ہی بھول گیا۔ اُس نے غرارہ پہن رکھا تھا اور اُس کے چہرے پر اطمینان اور سکون چھایا ہوا تھا۔ ہونٹوں اور رخساروں سے گلابی رنگ چھلکا پڑتا تھا۔ آج اُس کے بال بھی سلیقے سے بندھے ہوئے تھے، میری آمد پر جب وہ کھڑی ہوئی تو مجھے خوف آنے لگا۔ وہ ایک مکمل لڑکی، ایک آدمی تھی۔ اُس کا قد نکلا ہوا تھا جیسے ابھی اور بڑی ہو گی، آنکھیں غزالیں، چہرہ کتابی، رنگ گلابی تھا۔ وہ سانچے میں ترشی ہوئی تھی اور اُس میں کوئی خامی نظر نہیں آتی تھی۔ صرف یہ کہ اُس کے قد اور جسم کے مطابق اُس کی آنکھوں میں پختگی نہیں تھی، وہ کچی کچی تھیں اور یہ کچا پن اُس کے چہرے پر بھی نمایاں تھا، جیسے اُس کے چہرے پر ابھی ابھی تازہ گلابی رنگ چڑھایا گیا ہو۔ اُسے دیکھ کے مجھے اکثر کورا کا دھوکا ہو جاتا تھا۔ وہ بھی اتنی ہی نئی نئی، کچی، تازہ اور معصوم نظر آتی تھی۔ "زرّیں!" میں نے اُسے مخاطب کرنے کی ہمت کی۔ "تم نے یہ کیا کیا ہے؟"
اُس نے آنکھیں جھکا لیں۔ "زرّیں! میرے لیے یہ سب بے کار ہے، میں ان کا کیا کروں گا؟" میں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں نے تمھیں بتایا تھا زرّیں! مجھے دُور جانا ہے۔ نہ معلوم کتنی دُور جانا پڑے۔ میں نے تمھیں بتا دیا تھا کہ میں کہیں نہیں رُک سکتا اور اسی لیے میں نے تم سے فیض آباد آنے کے لیے اصرار کیا تھا اور تم نے

میری بات قبول کر لی تھی اب تم نے یہ کیا کر دیا؟"

"میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔" وہ سادگی سے بولی۔

"کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ اس بہلانے سے میں یہاں رُک جاؤں گا؟ زرّیں! میں نہیں رُک سکتا میں نہیں رُک سکتا، چاہے تجّل بھائی کتنے ہی پہرے لگا لیں مجھے ایک دن یہاں سے جانا ہے زرّیں! میں نے تم سے کہا تھا کہ فیض آباد سے جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں تمھیں بھول جاؤں گا، اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تو میں ضرور واپس آؤں گا، کوئی میری بات نہیں سمجھتا، تجّل بھائی، جامو، کبن خاں کوئی نہیں جانتا، تم ان سب سے علیحدہ ہو کم از کم تمھیں تو میری بات سمجھنی چاہیے۔"

"تم نے یہ کیسے جانا کہ میں کچھ نہیں سمجھتی؟" اُس نے اپنی زبان کھولی۔

"پھر تم نے یہ حویلی میرے سر پہ کیوں لاد دی۔"

"اس لیے کہ میں اس کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتی تھی، خدا کے لیے تم اس سے کچھ اور مطلب نہ لینا۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"مگر میں..... مجھے آگے جانا ہے۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔

"تمھیں کوئی نہیں روک سکتا۔" اُس نے یاسیت سے کہا۔ "تم جانا چاہو گے تو ضرور جاؤ گے میں تمھیں روک نہیں رہی ہوں تم جاؤ۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"زرّیں؟ زرّیں؟ میری اچھی زرّیں! مجھے اتنا بُرا مت سمجھو میں مجبور ہوں ورنہ رُک جاتا۔ تم یہ کاغذ واپس لے لو۔"

"دی ہوئی چیزیں واپس نہیں لی جاتیں۔"

"میں اس کا کیا کروں گا؟" میں نے پیچ و تاب کھا کے کہا۔

"تم یہ سب جلا دو، گرا دو، جو چاہے کرو، اسے بیچ دو اور فقیروں میں خیرات کر دو۔ مجھے کوئی سروکار نہیں ہے۔"

"تو تمھیں ــ تمھیں میرا کوئی خیال نہیں ہے؟"

"میں تم سے منّت کرتی ہوں۔" اُس نے عاجزی سے کہا۔ "تم جہاں بھی جاؤ، مجھے اپنے ساتھ لیتے چلو، میں تم سے کچھ نہیں کہوں گی، بس تمھارے ساتھ سفر کرتی رہوں گی، میں تم سے کوئی شکایت نہیں کروں گی۔"

"لیکن ــ لیکن میں تمھیں ساتھ نہیں لے جا سکتا۔"

"کیوں نہیں لے جا سکتے؟" وہ ناراضی سے بولی۔

"اس لیے کہ مجھے خود پتہ نہیں، مجھے کہاں جانا ہے۔"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے۔" وہ تیزی سے بولی۔

"زرّیں! تم نے ایک بار پہلے بھی میری بات مان لی تھی۔ یہ حویلی تم اپنے نام پر رکھو جب میں واپس آؤں گا تو چاہے تم مجھے دے دینا، میں نے ترتی سے کہا۔ میں تو تم سے یہ کہنے والا تھا کہ تم مجھے کسی راستے سے یہاں سے باہر نکلنے میں مدد دو، جتنی دیر ہو رہی ہے میرا دل ڈوبتا جا رہا ہے، میرے ساتھ ایک احسان کرو، میں تمھیں ضرور ساتھ لے جاتا زرّیں لیکن میں تمھیں اُن مشکلوں سے دوچار کرنا نہیں چاہتا جو مجھے پیش آ سکتی ہیں، تم میرے لیے اس جائداد سے دست بردار ہو سکتی ہو مگر میری خوشی کے لیے کچھ نہیں کر سکتیں۔"

اُس نے نظر اُٹھا کے دیکھا، اُس کے نتھنے اُبھر گئے تھے اور ہونٹ پھڑکنے لگے تھے۔ "جو تم چاہو گے وہی ہو گا۔" اُس کی آواز پھٹ گئی۔ "آج رات کو حویلی سے نکال دوں گی۔"

"زرّیں!" میں نے اُس کی جانب لپک کے کہا۔ "اس طرح مت مخاطب کرو، مدد ہی کرنی ہے تو پھر خوشی خوشی مجھے رخصت کرو، اُس کی خوشامد کی۔" کیا تم ــ تم واقعی مجھے باہر نکال سکتی ہو؟ میں تمھارا زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ کسی کو پتہ نہیں چلے گا کہ خود تم نے مجھے فرار کیا ہے۔ زرّیں پھر تم میرے لیے دعا کرتی رہنا، تمھاری دعائیں ہوں گی۔ امّی کہتی تھیں کہ لڑکیوں کی دعائیں جلدی قبول ہوتی ہیں۔"

"میری دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔" وہ ٹھیک طرح کہہ نہیں سکی۔

"زرّیں! میں ضرور رُک جاتا مگر کیا کروں؟ اگر رُک گیا تو میرا یہ جو تم دیکھ رہی ہو میرے بس میں کچھ نہیں ہے۔"

"تم ضرور جاؤ۔" اُس کی آواز جیسے کہیں دُور سے آئی، مجھے گیا کہ اگر میں زیادہ دیر وہاں ٹھیرا تو زرّیں کی کیا حالت ہو سکتی ہے، چاپ وہاں سے چلا آیا۔

شام کو حسبِ معمول فیض آباد کے تمام چاقو باز، لٹھ باز، داداگیر اور پہلوان، استاد، شاگرد قسم کے لوگ بیٹھک میں جمع ہو گئے۔ اُن کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ لکھنؤ سے کبن خاں کے کئی ساتھی آ گئے تھے۔ جس جس کو معلوم ہوتا کہ اُستاد تجّل کلکتے سے فیض آباد آیا ہے اُسے ایک طوائف چمپا بائی کی تلاش ہے، وہ اُسے دیکھنے اور سلام کرنے آتا۔ پانچ روز گزر گئے تھے اور ابھی تک جامو نہ تو چمپا بائی کو تلاش کر سکا تھا، نہ نواب سراج علی سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ تجّل کے ہر وقت جامو کے ساتھی موجود رہتے تھے۔ کوئی اُس کے جسم کی مالش کرتا، پیر دباتا تھا اور کوئی اصرار کرتا تھا کہ وہ اُسے اپنے ساتھ کلکتے لے چلے، ہاں کرتا رہتا تھا۔ وہ شام میں نے بڑی بے چینی سے کاٹی۔ رات کا کھانا بیسے کھایا گیا۔ رات گئے تک بیٹھک میں لوگ موجود رہے۔ میں زرّیں کو ٹٹولنے کے لیے کئی بار اندر گیا تھا اور مجھے ہر بار مایوسی ہوئی تھی۔ وہ اور کھوئی ہوئی تھی کہ کوئی بھی رائے قائم نہیں کی جا سکتی تھی۔ رات بعض ساتھی بیٹھک کی فرشی نشست پر لیٹ گئے اور باقی رخصت ہو گئے۔ تجّل اپنے کمرے میں آ گیا۔ میرے کمرے کا دروازہ تجّل کے کمرے میں تھا۔ تجّل کے حقّے کی آواز جاری تھی۔ رات کو زرّیں ماما کے ساتھ دودھ لیے ہوئے پہلے تجّل کے کمرے میں گئی پھر میرے پاس آئی۔ ماما دروازے پر رُک گئی تھی جیسے ہی اُس نے دودھ کا گلاس میری مسہری کے قریب تپائی پر رکھا، میں نے سرگوشی کی۔ "یاد ہے زرّیں؟"

اُس نے اپنی بوجھل پلکیں اٹھائیں اور آہستگی سے کہا۔ "میں جاگ رہی ہوں۔ میں تمھارے ساتھ ہی چلتا ہوں، بعد میں میرا آنا مشکل ہو گا۔"

میں دودھ کا گلاس ہاتھ میں لیے کمرے کی روشنی دھیمی کر کے اُس کے ساتھ باہر چلا گیا۔ تجّل نے بھی مجھے اُس کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا اور حقہ گڑگڑانے لگا۔ میں نے گھڑی دیکھی، بارہ بج چکے تھے۔ زرّیں کے کمرے میں ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ ملاتے ہی میں دوسری طرف چلی گئی تھی، میرا دل قابو میں نہیں تھا۔ زرّیں نے زبان سے ایک لفظ ادا نہیں کیا تھا، میں شش و پنج میں مبتلا تھا کہ کہیں اس نے فیصلہ بدل تو نہیں دیا ہے۔ وہ اتنی آسانی سے مجھے کس طرح حویلی سے باہر نکال سکتی ہے، کہیں وہ تجّل سے خوف زدہ تو نہیں ہو گئی، کہیں اُس نے شام کو ہی تو نہیں کہہ دیا تھا۔ وہ الماری سے کپڑے نکال رہی تھی، یہ کپڑے اس نے ایک چرمی تھیلے میں رکھے، میری آنکھیں حیرانی سے پھٹنے لگیں۔ صابن کی ٹکیا، ایک چھوٹا آئینہ، منجن کی شیشی، مسواک، کسی دوا کی گولیاں، یہ سب رکھ کے اس نے تھیلا بند کر دیا۔ پھر وہ ایک نفیس کمبل اُٹھا لائی۔ جب وہ یہ سب کام کر چکی تو اُس نے ایک اچٹتی ہوئی نظر گھڑی پر ڈالی اور کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ میں نے کچھ کہنے کا ارادہ کیا لیکن اُس کے سامنے زبان کھولتے ہوئے ڈر آتا تھا، کسی دلیل اور حجت سے بچنے کے لیے میں خاموش ہی رہا۔ جو کچھ مجھے کہنا تھا، میں نے کہہ دیا تھا، اب اُسے بھی کچھ سُننے کی خواہش نہیں ہو گی۔ گھڑی دیکھ کے وہ اپنی جگہ سے اُٹھی۔ دروازے سے باہر جھانک کے دیکھا اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اُس کی چال میں توازن نہیں ہے، وہ لڑکھڑا سی رہی ہے۔ "زرّیں!" میں نے اندر کمرے ہی میں اُسے آہستہ سے مخاطب کیا۔ "زرّیں! چند لمحے رُک جاؤ۔"

وہ سکتے کی سی کیفیت سے دوچار دیوار سے جسم ٹکا کے ٹھیر گئی اور میری جانب ٹھیری ہوئی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ "زرّیں! تم نے میرا بہت خیال رکھا ہے، میں تمھیں کبھی نہیں بھول سکتا، نہ معلوم کیا حالات پیش آئیں، میری واپسی ہو یا نہیں لیکن اگر زندہ رہا تو بہر حال ادھر آؤں گا۔ تم مجھے غلط مت سمجھنا، میں نے سب کچھ سچ کہا ہے، میں تم سے جھوٹ بھی بول سکتا تھا۔ زرّیں! بس خیال رکھنا، میں جب آؤں تو تمھارے چہرے پر فکر کی کوئی لکیر نہ دیکھوں، مجھے بہت یاد آؤ گی، اپنی صحت کا خیال رکھنا اور یہیں اس حویلی میں رہنے کی کوشش کرنا، کہیں اور مت جانا، تجّل بھائی یقیناً کوئی اچھا انتظام کر دیں گے، سُن رہی ہو زرّیں میں کیا کہہ رہا ہوں۔" میں نے اُس کے بہت قریب جا کے کہا۔ وہ نظریں جھکائے کھڑی رہی، کسی بات کا جواب نہیں دیا، نہ ہاں نہ ناں۔ "بولو زرّیں! کچھ تو کہو۔" میں نے اٹک اٹک کر لفظوں سے کہا۔ "تم میری غیر حاضری میں خوش رہو گی۔ حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرو گی۔ تم ــ تم مجھے یاد رکھو گی۔ بولو نا۔" میں نے اُس کے بازو جھنجھوڑنے کے لیے ہاتھ اُٹھائے لیکن میرے ہاتھ اُٹھ کے اُٹھے رہ گئے۔ اُس نے تھیلا اُٹھایا، کمبل اپنے شانوں پر ڈالا اور آگے بڑھ گئی۔ میرے دل میں آیا۔ اُسے انکار کر دوں لیکن یہ موقع نکل جاتا تو نہ جانے کب ہاتھ آتا، میں خاموشی سے اُس کے پیچھے چلنے لگا۔ اُس نے دالان میں آ کے ایک نظر اِدھر اُدھر کا جائزہ لیا، حویلی میں سناٹا طاری تھا۔ زرّیں چند قدم آگے چل کے بائیں جانب مُڑ گئی۔ ایک تنگ جگہ سے گزر کے اُس نے ایک دروازے کو دھکا دیا۔ میں نے اُس کی پیروی کی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا، زرّیں نے دیاسلائی جلا کے ایک موم بتی روشن کی تو کمرے کا منظر آنکھوں پر کھلا، وہ قالین پر دبے دبے قدموں سے چلتی ہوئی ایک دوسرے دروازے سے کمرے سے باہر نکل گئی، دوسرے کمرے میں قدیم کتابیں الماریوں میں رکھی ہوئی تھیں اور فضا میں ایک عجیب بُو پھیلی ہوئی تھی، کتب خانے کا دوسرا دروازہ باغ میں کھلتا تھا، باغ میں جھینگروں کا شور غالب تھا اور جگنو چمک رہے تھے، ایک مختصر راستہ طے کر کے زرّیں باغ کے شمالی حصّے میں آ گئی اور اُس نے پیچھے مُڑ کے دیکھا، میں نے بھی تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ کوئی ہمارا تعاقب نہیں کر رہا تھا۔

زرّیں نے ایک بار پھر گرد و پیش کا جائزہ لینا مناسب سمجھا۔ پھر وہ گرد ندوں کی باڑھ میں گھس گئی، یہ جگہ سبزے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ باڑھ کے اندر ایک چھوٹا سا صحن تھا، صحن کے آگے ایک کوٹھری تھی۔ زرّیں نے نہایت احتیاط سے کنڈی کھولی۔ باغ کے سکوت میں کنڈی گرنے کی ہلکی سی آواز سے ایک لمحے کے لیے خلل پیدا ہوا اور دروازہ ہلکی سرسراہٹ کے ساتھ کھل گیا۔ اندر گہرا اندھیرا تھا، زرّیں نے دروازہ بھیڑ دیا اور دیاسلائی روشن کر کے موم بتی جلا دی۔ اُس کوٹھری کے اندر ایک اور مختصر کوٹھری تھی۔ جہاں کاٹھ کباڑ پڑا ہوا تھا، مکڑی کے جالے دروازے اور دیواروں پر پھیلے ہوئے تھے۔ زرّیں نے اس تنگ جگہ آ کے ایک چھوٹے سے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ دروازے کی لکڑی موٹی اور مضبوط تھی اور درمیان میں ایک بڑی بلّی کے ذریعے اُسے بند کیا گیا تھا، اندر سے ایک موٹی کنڈی بھی لگی ہوئی تھی۔ یہ چھوٹا دروازہ پتھر کی طرح مضبوط معلوم ہوتا تھا۔ زرّیں یہ دروازہ بھی خود ہی کھولنا چاہتی تھی، میں نے اُسے ایک طرف ہٹایا اور بلّی اٹھانے کے لیے زور کرنے لگا۔ بلّی قبضے میں پھنسی ہوئی تھی تاہم میری ذرا سی جد و جہد سے ہٹ گئی۔ میں نے کنڈی کھولی اور آہستہ آہستہ دروازہ اندر کی طرف کھینچا۔ دروازے کی چولیں چٹخنے کی آواز کوٹھری میں اُبھری تو کوئی پرندہ پھڑپھڑاتا ہوا دیوار سے ٹکرایا۔ زرّیں کی چیخ نکل گئی۔ دروازے کا پٹ کھلنے کی اُمید پیدا ہوئی تو میں نے اطمینان کی گہری سانس لی اور زرّیں کی طرف دیکھنے لگا۔ زرّیں نے تھیلا آگے بڑھا دیا اور کمبل اپنے شانے سے اُتارا۔ میں تذبذب میں پڑ گیا۔ سوچا کہ واپس ہو جاؤں۔ اس اندھیری رات میں زرّیں اکیلی کیسے اپنے کمرے میں واپس جائے گی، اُسے نیند بھی نہیں آئے گی اور پھر نہ جانے بعد میں اس کا کیا حال ہو۔ میں نے تھیلا اور کمبل زمین پر رکھ دیا۔ موم بتی کی مدھم روشنی میں اُس کا چہرہ کبھی سُرخ ہوتا تھا کبھی زرد۔ اُس کی آنکھیں کبھی روشن ہوتی تھیں کبھی بجھ جاتی تھیں۔ میں نے تھیلا اُٹھایا۔ "میں جا رہا ہوں زرّیں!" میں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

"خدا حافظ۔" وہ اٹکتے اٹکتے بولی۔

"میں واپس آؤں گا زریں!" میرا دل چاہا بڑھ کے اُسے دیوانہ وار گلے لگا لوں۔ میرا سینہ جلنے لگا اور پیروں میں لرزش ہونے لگی۔ "تم کچھ اور نہیں کہو گی؟" میں نے بدبُدلتے ہوئے کہا۔

"خدا حافظ۔ ہو سکے تو خط لکھ دینا۔" وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولی۔ "یہ رکھ لو۔" اُس نے ایک بندھا ہوا رومال میرے آگے کر دیا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے اُسے جلدی جلدی کھولنا چاہا۔ اُس کے اندر نوٹوں کی کئی گڈیاں تھیں اور ایک چاقو تھا۔ بڑا رام پوری چاقو۔

"زریں! اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہی بہت ہے کہ تم نے مجھے باہر آنے دیا۔ مجھے تو کپڑوں کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ میں انھیں کہاں رکھوں گا کیونکہ میری کوئی منزل نہیں ہے۔"

"اسے رکھ لو۔ مدد کرتے رہنا۔" اُس نے رقت سے کہا۔

"زریں!" میں آنکھیں مسلتے ہوئے بولا۔ "زریں! حوصلہ مت کھو دینا۔ بس میری تم سے یہی التجا ہے۔ میں ضرور واپس آؤں گا زریں!" میں نے سامان اُٹھا لیا اور زریں کی طرف دیکھے بغیر تیزی سے دروازہ کھول کے باہر نکل آیا۔ پھر میں نے پیچھے مُڑ کے نہیں دیکھا۔

❦

حویلی کے باہر ایک چوڑی گلی تھی۔ میں احتیاط سے گلی عبور کر کے دوسری جانب رینگ گیا۔ ہر سُو اندھیرا تھا اور میرے دماغ میں بھی اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ زریں کی حویلی سے نکل تو آیا مگر ابھی چند ہی قدم چلا ہوں گا کہ دل پریشان ہونے لگا۔ زریں کا چہرہ اس اندھیرے میں بھی اوجھل نہیں ہوتا تھا۔ باہر کی کھلی فضا بڑی حبس زدہ تھی۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ کدھر جاؤں؟ کون سا راستہ اختیار کروں؟ کون سا راستہ کدھر کی طرف جاتا ہے اور کس جانب بابا جان نے ڈیرا جمایا ہوا ہے؟ میں ایک تنگ گلی میں داخل ہو گیا اور وہاں سے مختلف گلیوں سے گزرتا ہوا کھلی سڑک پر آ گیا۔ بجلی کے کھمبوں کی روشنیاں اونگھ رہی تھیں۔ سڑک کے کنارے چلتے چلتے مجھے ایک چوراہا نظر آیا۔ دُور چھوٹے سے جھونپڑی نما ہوٹل کے پھونس میں سے روشنی کی کرنیں نکل رہی تھیں اور زندگی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ وہاں دو تین تانگے بھی کھڑے ہوئے تھے۔ ہوٹل میں جانے کے بجائے میں ایک تانگے کے قریب کھڑا ہو گیا۔ کچھ ہی دیر میں تانگے والا آ گیا اور دزدیدگی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "کدھر جانا ہے بابو جی؟"

"کیا تم شہر کے تمام گلی کوچوں سے واقف ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں جی! ان سڑکوں پر تانگا چلاتے ہوئے عمر بیت گئی ہے۔ کہو کہاں جانا ہے بابو؟" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

"مجھے نواب سراج علی کی حویلی جانا ہے۔" میں نے لمبی سانس کھینچ کر کہا۔

وہ نواب کے نام پر جز بز ہونے لگا اور مجھ سے محلّے کا نام پوچھنے لگا۔ محلّے کا نام مجھے معلوم نہیں تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ ہوٹل میں پتہ پوچھنے کے لیے گیا۔ "چلو جناب تشریف رکھو۔ پردیسی معلوم ہوتے ہو؟" اُس نے چابک اٹھاتے ہوئے کہا۔ میں نے جواب نہیں دیا تو وہ بولا۔ "کون سی گاڑی سے آئے ہو جناب؟"

"کسی گاڑی سے نہیں۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "باتیں کم کرو، زیادہ چلاؤ۔ مجھے جلدی پہنچنا ہے۔"

اُس نے پلٹ کے ترشی سے دیکھا اور کہا۔ "اُتر جائیے جناب! ہم کی سواری بٹھاتے ہیں، میٹھے بول کے عاشق ہیں۔"

"میں نے کون سی کڑوی بات کہی ہے۔" میں نے سختی سے کہا۔ "بیمار آدمی میٹھے بول نہیں بول سکتا۔ میری طبیعت خراب ہے۔"

"تو یہ کہیے نا، کہیے تو پہلے کسی حکیم کا دروازہ کھٹکھٹاؤں۔"

"نہیں شکریہ! مجھے پہلے وہیں جانا ہے۔" میں نے اکتا کے کہا۔

"دولت خانہ کہاں ہے جناب کا؟" وہ گھوڑے پر چابک لہراتے ہوئے بولا۔

"رنگ پور۔"

"یہ کہاں ہے جناب؟"

"بنگال میں، راستہ کتنی دُور ہے؟"

"اطمینان سے بیٹھیے، پہنچا دوں گا بابو جی! تین دن سے جاڑے بخار کا شکار ہے، یہ لفظ بھی بڑی بُری چیز ہوتی ہے۔"

اُس نے راستے بھر ایک لمحے کے لیے زبان بند نہیں کی۔ میں تندی کا نتیجہ دیکھ چکا تھا اس لیے ہوں ہاں کر کے اُس کی باتوں کے جواب دیتا رہا۔ شاید ہر تانگے والا اتنا ہی بولتا ہے۔ گیا اور مراد آباد میں بھی یہی ہوا۔ گھنٹے بعد تانگا ایک عمارت کے سامنے رُک گیا۔ یہ عمارت زریں کی حویلی نہیں تھی۔ دروازہ بند تھا اور پہرے دار موجود نہیں تھا۔ میں نے جیب سے نکال کے تانگے والے کو دیے، وہ مجھے دعائیں دینے لگا اور کھڑا رہا۔

"تم اب جاؤ۔" میں نے اپنا لہجہ نرم رکھنے کی کوشش کی۔

"نہیں جناب، پہلے دروازہ تو کھل جائے، تسلی کر کے جاؤں گا۔ دروازہ نہیں کھلا تو آپ رات کو کہاں ٹھہریں گے۔"

"دروازہ کھل جائے گا۔" میں نے بیزاری سے کہا۔ میں اُس کی میں حویلی کی چار دیواری کا چکر نہیں لگا سکتا تھا اور وہ جاتا ہوا نظر نہیں آ رہا تھا۔ ناچار میں نے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ تانگے والا بھی میری مدد کو آ گیا۔ سونے والے پہرے دار کو گالیاں دینے لگا۔ خاصی دیر کی تگ و دو کے بعد کسی نے آواز لگائی۔ جواب میں میں نے اپنا نام فتح علی بتایا اور خود کو سراج کا عزیز ظاہر کیا۔ تانگے والے نے میری جانب سے جواب دیا۔ "بابو جی کلکتے سے آئے ہیں، بے خبر میاں! دروازہ کھولو، ورنہ نواب صاحب کی ڈانٹ پڑے گی۔" دروازے کے بجائے کھڑکی کھولی گئی۔ اندر سے ایک معمر شخص، جس کے چہرے پر بڑی بڑی مونچھوں کے سوا کچھ نہیں تھا، برآمد ہوا اور میرا سر سے پیر تک جائزہ لینے لگا۔ "رنگ پور سے؟" اُس نے منہ بنا کے پوچھا۔ "بھلا آپ ہیں نواب صاحب کے؟"

"میں اُن کے لیے اپنے چچا کا خصوصی پیغام لے کے کلکتے سے آیا ہوں۔" میں نے بھاری آواز میں کہا۔ "نواب صاحب کو جگا دیجیے، پیغام نہایت ضروری ہے۔"

"نواب بہادر بیمار ہیں۔" وہ تلخی سے بولا۔ "صبح آئیے۔"

"ارے گھر آئے مہمانوں سے ایسی باتیں کرتے ہو۔" تانگے والا ناراض ہو گیا۔ "نواب صاحب کو پتہ چلے گا تو کھڑے کھڑے حساب کر دیں گے۔"

"میں آپ کو مہمان خانے میں ٹھہرا سکتا ہوں مگر نواب بہادر سے ملاقات صبح ہی ہو سکتی ہے، اگر اُن کی طبیعت ٹھیک ہوئی۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، جائیے جناب آرام کیجیے، سمجھ لیجیے گاڑی لیٹ ہو گئی۔ صبح ان دربان میاں کی تو خبر نہیں۔ بھلا فیض آباد میں نواب سراج علی کی حویلی کے پہرے دار ان کے مہمانوں کے ساتھ ایسا سلوک کریں۔ واہ میاں واہ! بابو جی کا چہرہ نہیں دیکھ رہے ہو۔ یہ بھی کسی شہزادے سے کم نہیں۔ ان کی طبیعت بھی خراب ہے چاچا!" تانگے والے اور پہرے دار میں تُو تُو میں میں ہونے لگی تو میں نے دخل دے کے معاملہ رفع کر دیا۔ تانگے والا مجھ سے سلام دُعا کر کے بڑی مشکل سے رخصت ہوا۔ پہرے دار دروازہ بند کر کے بڑبڑاتا ہوا مجھے عمارت میں لے گیا۔ عمارت سے نحوست سی ٹپکتی تھی۔ نچلی ہی منزل پر ایک علیحدہ حصّے میں اُس نے مجھے ایک آراستہ کمرے میں پہنچا دیا۔ میں نے اُس کی خوشامد کی کہ وہ نواب صاحب کے کمرے تک چلے اور اُن سے درخواست کر کے دیکھے، وہ میرا نام سُن کے ضرور دروازہ کھول دیں گے۔ وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کے توبہ کرنے لگا۔ میں نے اُسے لالچ دیا تو وہ کچھ مشکوک ہو گیا۔ زریں نے مجھے جو چاقو دیا تھا، میں نے سوچا، وہی چاقو دکھا کے اُس سے نواب کے کمرے میں چلنے کے لیے اصرار کروں۔ ظاہر ہے، میں صبح کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے منہ اندھیرے ہی فیض آباد سے دُور نکل جانا چاہیے تھا۔ ممکن ہے بختل جاگ رہا ہو اور وہ تھوڑی دیر بعد میرے کمرے میں گیا ہو تو اُسے پتہ چلے کہ میں ابھی تک غائب ہوں۔ پہرے دار کے انکار پر مجھے غصّہ آنے لگا۔ اتنی بڑی حویلی میں کسی کی مدد کے بغیر میں نواب کا کمرہ تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے سوا کوئی صورت نہیں تھی کہ وہی میری مدد کرے۔ میں نے اُسے مختلف انداز میں نواب سے فوراً ملاقات کی اہمیت بتائی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ مجبوراً مجھے اس سے سخت لہجے میں بات کرنی پڑی۔ اس کا اُلٹا اثر ہوا۔ اُس نے مجھے حویلی سے باہر نکلنے کا حکم دے دیا۔ میں نے اُس کا کاندھا پکڑ لیا۔ "چلو۔" میں نے اپنی جیب سے چاقو نکال کے کہا۔ "مجھے نواب کے کمرے میں لے چلو۔" اُسے مجھ سے ایسی سختی کی توقع نہیں تھی۔ پہلے تو وہ اپنی بات پر جما رہا لیکن جب میں نے اُس کے گال پر ایک ہاتھ رسید کیا تو گھگھیا کے آمادہ ہو گیا۔ "خاموشی سے چلے چلو۔" میں نے اُسے دھکا دیتے ہوئے حکم دیا۔

"جناب ہماری عمر بھر کی بنی بنائی خاک ہو جائے گی۔" وہ گڑگڑایا۔ پھر اوپری منزل کی سیڑھیوں پر ٹھہر کے بولا۔ "مجھے جان سے مار دیجیے مگر مجھ سے یہ نہیں ہو سکے گا۔"

"تم کسی بات کی فکر مت کرو۔ میں نواب صاحب سے تمہاری سفارش کروں گا، میں کسی بُرے ارادے سے نہیں آیا بڑے صاحب! مجھے یہاں ڈاکا نہیں ڈالنا، ڈاکا ڈالنا ہوتا تو میں تمھیں پہلے ہی ختم کر چکا۔ مجھے نواب سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ سمجھے، نواب صاحب مجھے دیکھیں گے تو تم سے خوش ہوں گے کہ تم نے فوراً مجھے اُن کے پاس پہنچا دیا۔"

"جناب ایسی کیا بات ہے جو آپ صبح تک نہیں رُک سکتے۔"

"مجھے جواب لے کے فوراً واپس جانا ہے۔"

وہ ٹھٹکتا اور جھجکتا رہا اور زینے پر چڑھ کے ہانپنے لگا۔ حویلی اندر سے سجی ہوئی تھی، جھاڑ فانوس سے آراستہ، دیواریں صاف و شفاف تھیں۔ ان تمام چیزوں سے نواب کے حُسنِ ذوق کا اندازہ ہوتا تھا۔ اُوپری حصّے کے ایک کونے میں دوسرا پہرے دار لٹھ اور ٹمٹماتی ہوئی لالٹین سرہانے رکھے چارپائی پر سو رہا تھا۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ اُوپر کے حصّے میں بھی کوئی پہرے دار موجود ہو گا۔ ہماری آہٹ سے اُس کی آنکھ کھل گئی اور اُس نے پھرتی سے لٹھ اُٹھا لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا سُنتا، میں نے اُس کا لٹھ والا ہاتھ پکڑ کے دوسرے ہاتھ سے گردن کی پُشت پر اتنی تیزی سے سیدھا وار کیا کہ وہ فرش پر بے سُدھ گر گیا۔ اپنے ساتھی پہرے دار کا یہ انجام دیکھ کے نچلے حصّے کا پہرے دار کانپنے لگا۔ میں نے اُسے دروازہ کھولنے کا حکم دیا۔ اُوپر کے حصّے کے تمام کمروں کا راستہ غالباً اسی دروازے سے گزرتا تھا۔ بوڑھے پہرے دار نے چابیوں کا گچھا اُٹھا کے تالا کھولا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ نواب سراج علی باہر سے تالا لگوا کے سوتا ہے۔ یقیناً اُوپر کی عمارت سے باہر جانے کا کوئی اور راستہ بھی ہو گا مگر مجھے ان باتوں پر توجہ دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ چالیس پچاس قدم تک رہنمائی کرتا ہوا بوڑھا پہرے دار ایک محراب دار دروازے کے سامنے رُک گیا اور لرزتی ہوئی اُنگلی سے اشارہ کرنے لگا۔ میں نے دستک سے پہلے چند لمحوں تک غور کیا۔ کمرے کے دروازے کی شان و شوکت سے پتہ چلتا تھا کہ پہرے دار دھوکا نہیں دے رہا ہے۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اُسے بھی فرش پر گرا دیا۔ بختل نے یہ بے ضرر داؤ مجھے خاص طور پر سکھایا تھا۔

میری معمولی دستک پر آنکھیں ملتے ہوئے، سفید پاجامے اور کُرتے میں ملبوس گندمی رنگ کے ایک پُروقار، بُردبار ادھیڑ عمر شخص نے دروازہ کھولا، میرے ہاتھ میں بند چاقو چُھپا ہوا تھا۔ میرا چہرہ دیکھ کے وہ ٹھٹک گیا۔ "نواب سراج علی!" میری آواز بھرّانے لگی۔

اُس نے تذبذب سے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ "آ آپ! دہشت پاتے ہوئے بولا۔ "آپ کون ہیں؟"

"مجھے آپ سے ایک کام ہے۔" میں نے اپنی آواز پر قابو پا لیا تھا۔

"مگر، مگر اس وقت؟" اُس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔

"ہاں نواب صاحب! کام کی نوعیت ہی ایسی ہے۔"

"مگر میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" وہ ناگواری سے بولا۔

"مجھے معلوم ہے لیکن میرے پاس یہی وقت تھا۔" میں نے انتظار کیا کہ وہ اندر آنے کو کہے گا جب اُس نے دروازے پر کھڑے کھڑے ہی گفتگو کرنا

چاہی تو میں اُسے ہٹا کے خود اندر چلا گیا۔ نواب سراج علی کو دیکھ کے چاقو پر میری انگلیوں کی گرفت سخت ہو گئی تھی، میں نے اپنے آپ کو بہت سنبھالے رکھا جامو اور کپتن خاں نے فہمیدہ کے نام کے ساتھ اُس کا نام لیا تھا تو مجھ سے اُن کے سامنے سر نہیں اٹھایا گیا تھا۔ اب نواب سراج علی میرے سامنے کھڑا تھا۔ کاش میں اُس کی آنکھیں نکال سکتا۔ ان آنکھوں نے فہمیدہ کو کن نظروں سے دیکھا ہوگا۔ وہ بظاہر ایک معقول اور سنجیدہ آدمی نظر آتا تھا۔ میری جسارت پر وہ حیرت اور برہمی سے میرا جائزہ لینے لگا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا اور ایک ہاتھ سے چاقو اچھال کے دوسرے ہاتھ میں لے لیا۔ یہ بے ساختہ عمل یقیناً نواب کی آنکھوں سے اوجھل نہیں رہا ہوگا۔ نواب بوکھلا گیا تھا۔ پھر اُس نے اندر چلنے کے لیے ہاتھ پھیلا کے اشارہ کیا۔ "نواب صاحب! مجھے آپ سے زیادہ بات نہیں کرنی، پہلے میں یہ واضح کر دوں کہ میں آپ کا مال و اسباب لوٹنے نہیں آیا ہوں، میں ڈاکو نہیں ہوں۔"

"بیٹھیے بیٹھیے۔" اُس نے اضطراب سے کہا۔

"نواب صاحب! میں نیلم جان کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

"نیلم جان؟" اُس نے چونک کر کہا اور ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"ہاں نیلم جان! مجھے معلوم ہے کہ آپ کے اُس سے خصوصی مراسم تھے۔" میں نے بمشکل تمام یہ لفظ ادا کیے۔ "میں اُسی کے بارے میں بات کر رہا ہوں۔"

"نیلم جان؟" اُس نے ایک سرد آہ بھری۔ "وہ تو روٹھ گئی۔"

"ہاں وہ وداع ہو گئی۔" میں نے شکستہ لہجے میں کہا اور کہتے کہتے کہیں کھو گیا۔ نواب کی کسمساہٹ پر مجھے ہوش آیا اور میں نے سنبھل کے کہا۔ "وہ مر گئی۔"

"آپ اُس کے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہیں؟"

"نواب صاحب! مجھ سے کچھ مت چھپائیے جو کچھ آپ نیلم جان کے بارے میں جانتے ہوں سچ سچ کہہ دیجیے۔" میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔

"آپ کون ہیں؟ کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"میرا نام پوچھ کے کیا کیجیے گا۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "مجھے جلد ہی واپس جانا ہے۔ مجھے نیلم جان کے بارے میں بتائیے۔ آپ اُسے کب سے جانتے تھے۔ آپ اُس کے بارے میں کیا کیا جانتے ہیں؟"

"یقیناً آپ کا تعلق محکمہ پولیس سے نہیں۔" نواب قابو یافتہ لہجے میں بولا۔ "ازراہِ نوازش سکون سے بیٹھیے اور مجھے یہ بتائیے کہ آپ اُس کے بارے میں اتنے متجسس کیوں ہیں؟"

"نواب صاحب! وقت ضائع مت کیجیے۔ میں جس طرح آپ کی حویلی میں داخل ہوا ہوں کچھ اس کا خیال کیجیے، بہتر ہے آپ ہر بات بتا دیں، میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہ سب میرے اور آپ کے درمیان رہے گا۔ میں آپ کی رسوائی کے لیے یہاں نہیں آیا، میرا کچھ اور مقصد نہیں ہے۔ بتائیے آپ اُس سے کب ملے؟" میں نے بے قراری سے کہا۔

"میری اُس سے کچھ زیادہ شناسائی نہیں تھی۔" وہ بے نیازی سے بولا۔

"آپ جھوٹ کہتے ہیں۔ آپ نے چمپا بائی سے متعدد بار اُس کا سودا کرنے کی پیش کش کی تھی۔"

"سودا مت کہیے۔" نواب نے بے چینی سے کہا۔ "یہ صحیح ہے کہ اس قسم کی پیش کش کی تھی مگر میں اُسے عزت کی زندگی دینا چاہتا"

"نواب صاحب! للہ کچھ مت چھپائیے، آپ کی غلط بیانی سے کام بگڑ سکتا ہے۔ میں آپ کو پھر یقین دلاتا ہوں کہ جو کچھ آپ بتائیں گے سینے میں محفوظ رہے گا۔ آپ نیلم جان کے بارے میں اور کیا جانتے ہیں؟"

"برادرم!" نواب گہری سانسیں لینے لگا۔ اُس نے سر سے پیر تک غور سے دیکھا اور دل شکستہ لہجے میں بولا۔ "میں آپ کو کیا بتاؤں، مجھے کچھ بتاؤں۔ نیلم جان ایک سربستہ راز تھی، جب سے اُسے دیکھا تھا کسی اور طوائف سے رابطہ قائم کرنے کو جی نہیں چاہا۔ وہ سب سے جدا تھی۔ خوب گاتی تھی اور بڑی باتیں کرتی تھی۔"

"کیا آپ کیا آپ اُس کے بارے میں اور کچھ نہیں جانتے کہ وہ کہاں سے آئی تھی۔ آپ نے اُس سے کبھی پوچھا تو ہوگا؟"

"پوچھا تھا، ان گنت بار پوچھا تھا لیکن وہ سرد آہیں بھر کے رہ جاتی تھی مگر جناب!" وہ جھجک کے بولا۔ "سوال یہ ہے کہ آپ کیوں اُس کے پیچھے پڑ گئے ہیں؟ آپ کون ہیں، صاف صاف کیوں نہیں بتاتے۔ وہ ایک تھی، نہایت حسین، نہایت نفیس عورت، اُس کی روح مجھ سے ناراض ہو... آپ اپنے بارے میں بتائیے۔"

"جناب! آپ فضول کی حجت کر رہے ہیں۔" میں نے تلملا کے کہا۔ "آپ سے درخواست کر رہا ہوں۔ میں آپ کو اپنے متعلق کچھ نہیں بتا سکتا۔ مجھے آپ سے نیلم جان کے سلسلے میں سب کچھ پوچھنا ہے کسی طرح بھی۔" میں نے اچھلتے ہوئے بپھر کے کہا۔ "میں نیلم جان کا ایک ہمدرد ہوں۔"

نواب کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "میں سمجھ رہا ہوں آپ ضرور اُس کے ہمدرد ہیں، مرنے کے بعد لوگوں کو کون پوچھتا ہے، کہیں آپ وہ شخص تو نہیں جس کی آغوش میں نیلم جان نے دم توڑا تھا۔ آپ کا چہرہ۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو آپ کا چہرہ۔" وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "آپ کا چہرہ نیلم جان سے ملتا ہے، آپ کی آنکھیں، آپ کی پیشانی۔ میں دعوٰی تو نہیں کر سکتا مگر کتنی شباہت... مجھے معاف کیجیے، مجھے معاف کر دیجیے، شاید میں نے دورانِ گفتگو نیلم جان کے متعلق کوئی ناروا بات نہیں کی ہے، پھر بھی آپ کے جذبات کو ٹھیس پہنچی ہو تو مجھے معاف کر دیجیے۔"

"نواب سراج علی!" میں نے بلند آواز سے کہا۔ "میری بات کا جواب دیجیے۔ نیلم جان ایک طوائف تھی، وہ کوٹھے پر بیٹھ کے اپنے طلب گاروں کا دل بہلاتی تھی۔ وہ آپ کے عشرت کدے میں آتی تھی اُس کے متعلق بُرا مانا گیا۔ طوائف ہی تھی۔"

"وہ طوائف نہیں تھی، وہ طوائف نہیں تھی، یہ اُس پر ایک تہمت ہے، ایک گالی ہے، میں نے زندگی کے چالیس سال گزارے ہیں۔ میں نے اُس جیسی نہیں دیکھی، اتنی اُداس، اتنی نیک نفس، اُس کی انھی خوبیوں کی وجہ سے میں اُسے اس حویلی کی زینت بنانا چاہتا تھا۔ میری ایک بیوی تھی، وہ عرصہ ہوا اولاد کے بغیر مر گئی۔ اُس کے بعد میں نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا کہ نیلم جان سے ملاقات ہو گئی، میں نے اُس کے لیے بڑی سے بڑی قیمت لگا دی تھی۔ وہ یہاں آ کے بھی طربیہ گاتی تھی، چمپا بائی کی وجہ سے وہ تو سارے وقت میری باتیں سنتی اور مجھ سے باتیں کرتی رہتی تھی، وہ میری صحت کے بارے میں فکرمند رہتی تھی، اُس نے مجھ سے کبھی کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ میں نے اُس سے بے شمار مرتبہ کسی فرمائش کے لیے کہا مگر اُس نے جواب میں ایک لفظ ادا نہیں کیا بلکہ وہ اس بات پر ناراض ہو جاتی تھی، چنانچہ میں نے اُس سے اس قسم کی باتیں کرنی ہی ترک کر دی تھیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ وہ مجھ سے متاثر تھی اور اُس کی موت کا واقعہ سُن کے مجھ سے چلا نہیں جاتا، مجھ سے بات نہیں کی جاتی، اُس کا چہرہ ہر وقت نظروں کے سامنے رہتا ہے۔" نواب کی آنکھیں نم ہو گئیں، گلے میں جیسے کوئی چیز پھنس گئی۔ "اب میرا دل باہر نکلنے کو نہیں چاہتا۔ وہ کیا گئی ہے کہ سب چین قرار لے گئی۔ مجھ میں اُس کے کفن دفن میں شریک ہونے کی ہمت نہیں تھی، میں اُس کی قبر پر مٹی بھی نہیں ڈال سکا۔ وہ میرے لیے کھانا پکاتی تھی، میرا لباس منتخب کرتی تھی، وہ اس حویلی کی آرائش میں دلچسپی لیتی تھی۔" نواب کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

مجھ پر سناٹا چھا گیا، چاقو میرے ہاتھ سے زمین پر گر گیا اور مجھے اُسے اٹھانے کا خیال بھی نہیں آیا۔ میری آنکھیں بہہ رہی تھیں، دیر تک ہم دونوں میں کوئی بات نہ ہو سکی، پھر نواب نے اپنی کرسی میرے قریب کھینچ لی۔ "آپ اور کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟" وہ کرب سے بولا۔

"آپ کو اُس نے کبھی یہ نہیں بتایا کہ وہ کس گھر سے تعلق رکھتی ہے، اُس کا گھر کہاں تھا، اُس نے کچھ تو بتایا ہوگا؟"

"نہیں، کچھ نہیں بتایا، میں نے اُس کا ماضی کریدنے کی بہت کوشش کی، اس ذکر سے وہ اُداس ہو جاتی تھی اور مجھے اُس کی اُداسی گوارا نہیں تھی، اتنا تب مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ قسمت نے اُس کے ساتھ کوئی بہت بڑا مذاق کیا ہے۔ اُس کا لہجہ وہ نہیں تھا جو بالاخانوں میں ہوتا ہے، وہ تو بڑی سادہ اور معصوم تھی، لیکن بارے... بس صرف ایک بار کسی تقریب پر، شاید عید کے موقع پر، نہ جانے کیسے اُس کی زبان سے نکل گیا تھا کہ اُس کا بھی ایک گھر تھا جو اُجڑ گیا۔ البتہ وہ اپنے ایک بھائی کو بہت یاد کرتی تھی جو گھر سے ناراض ہو کے چلا گیا تھا۔"

"اور کیا کہتی تھی وہ؟" میں نے کپکپاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

نواب نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "کچھ نہیں عزیزم!" وہ افسردگی سے بولا۔ "مجھے کچھ اور نہیں معلوم۔ کچھ بھی نہیں معلوم۔"

میرا جی چاہا کہ اپنے گالوں پر طمانچے لگاؤں، نواب کو شاید میری کیفیت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ "آپ۔ آپ کچھ کھائیں پئیں گے، میں تو بھول ہی گیا۔ اصل میں آپ...."

"شکریہ نواب صاحب! مجھے جانا ہے۔ آپ کو بڑی زحمت ہوئی، ایک بات اور بتا دیجیے۔ کیا چمپا بائی نے آپ کو کبھی اشارۃً یہ بتایا تھا کہ اُس نے نیلم جان کو کہاں سے حاصل کیا؟"

"نہیں، نائکائیں ایسی باتیں نہیں بتایا کرتیں۔"

"آپ کے خیال میں چمپا اُسے کہاں سے لائی ہوگی؟"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا، چمپا ایک مشاق نائکہ ہے، ممکن ہے نیلم جان براہِ راست اُس کے ہاتھ آ گئی ہو یا اُسے اُس نے کسی اور ذریعے سے حاصل کیا ہو، بات یہ ہے کہ شہر میں طوائفوں اور اُن کے طلب گاروں کے درمیان ایک غیر رسمی معاہدہ ہوتا ہے کہ فریقین ایک دوسرے کے ذاتی معاملات سے دلچسپی نہیں لیں گے۔ فیض آباد میں اپنی تھوڑی بہت عزت ہے، چمپا بائی نیلم جان کو چھپا کے یہاں بھیجتی تھی ورنہ شہر میں بڑی رسوائی ہوتی۔ بالاخانے پر بھی رفت و رفت جانے سے شرفا گریز کرتے ہیں۔ میں اگر زیادہ تفتیش میں پڑتا تو چمپا بائی مجھ سے محتاط ہو جاتی اور اس طرح نیلم جان مجھ سے دور ہو سکتی تھی۔"

"چمپا بائی شہر سے فرار ہو گئی ہے اور مجھے اُس کی تلاش ہے۔ نواب صاحب! کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ وہ مجھے کہاں دستیاب ہو سکتی ہے؟"

"آپ اُس سے مل کے کیا کریں گے؟"

"کچھ نہیں، میں اُس سے عاجزی سے درخواست کروں گا کہ مجھے وہ جگہ بتا دے جہاں سے اُس نے نیلم جان کو حاصل کیا تھا۔"

"مگر کیوں، اُس کی موت کے بعد اب آپ کو کیا حاصل ہوگا؟"

"آپ نہیں سمجھ سکیں گے اور آپ پوچھیے بھی نہیں۔"

"میں نے آپ کو اپنی ہر بات بتا دی ہے، کیا آپ مجھ پر اعتماد نہیں کریں گے؟ جہاں تک میں سمجھتا ہوں، ہم دونوں کا غم مشترک ہے، مجھے بتائیے اور میری طرح یقین کیجیے کہ میں نیلم جان کو اُس کی موت کے بعد رسوا کرنے کی رذالت نہیں کروں گا۔"

"نہ پوچھیے، آپ کچھ مت پوچھیے۔" میں نے جھلا کے کہا۔

"عزیزم! خیر آپ نہ بتائیے لیکن ایک بات تو طے ہے کہ اُس دن بالاخانے پر آپ نیلم جان کے سامنے موجود تھے۔ آپ کو دیکھ کے اُس کی غیرت کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور جب آپ پاگلوں کے مانند بھیجے گئے تو اُس کی سانس اکھڑ گئی، سازندوں نے مجھے ساری بات بتا دی ہے۔ مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ اُس کا جنازہ کس گھر سے اٹھا اور آپ کن لوگوں کے ساتھ بالاخانے تشریف لائے تھے۔ میں نیلم جان کا چہرہ نہیں بھول سکتا۔ آپ کی آنکھیں، آپ کا چہرہ ساری کہانی خود بیان کر رہے ہیں، خیر جانے دیجیے۔" وہ پہلو بدل کے بولا۔ "میری نظر میں نیلم جان کوئی طوائف نہیں تھی۔ اُس سے میرے بہت سے جذبات وابستہ تھے۔ اُس کا کوئی عزیز میرے گھر آئے تو مجھ پر اُس کی پذیرائی لازم ہے، وہ میرا مہمانِ عزیز ہے۔ آپ یہاں قیام فرمائیے۔ میرے پاس رہیے، ہم دونوں مل کے چمپا بائی کو تلاش کریں گے۔"

"مہربانی، نواب صاحب! خدا کے لیے اب کچھ اور مت کہیے، مجھے صرف اتنا بتا دیجیے کہ چمپا بائی کہاں جا سکتی ہے؟"

"وہ کہاں نہیں جاسکتی۔" نواب نے بڑی مسکراہٹ سے بولا۔ "ہندوستان میں کسی جگہ بھی جاسکتی ہے۔ ہر جگہ اُس کا گھر موجود ہے۔"

"پھر بھی وہ اپنے شناساؤں کے سوا اور کہاں جائے گی۔"

"میں سمجھتا ہوں۔" وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "آگرے میں اُس کی ایک بہن موتیا رہتی ہے، وہاں جاسکتی ہے، زیادہ دُور جانے کا تو امکان نہیں ہے، وہ قریب کے شہروں میں کسی جگہ گئی ہوگی۔ ہاں وہ رام پور بھی جاسکتی ہے، وہاں کے نوابوں سے اُس کا تعلق ہوسکتا ہے، لکھنؤ تو وہ نہیں گئی ہوگی۔ ریاستوں میں اُس کے چھپنے کا زیادہ امکان ہے، کچھ کہا نہیں جاسکتا۔"

"مجھے اجازت دیجیے۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "آپ کو بڑی زحمت ہوئی۔"

"جناب! میں آپ کو اس طرح نہیں جانے دوں گا، آپ یہاں قیام کریں گے، آپ میرے مہمان رہیں گے اور میں آپ کے ساتھ شہر شہر خود چلوں گا۔"

"میں معذرت خواہ ہوں، میرے لیے ایک لمحہ گزارنا مشکل ہے، میں غم کی دیواروں کو عبور کرکے آپ کے پاس آیا ہوں، صبح ہونے سے پہلے مجھے شہر سے نکل جانا ہے ورنہ میں پھر کبھی نہ جاسکوں گا۔ ازراہِ عنایت میرا راستہ نہ روکیے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے۔" نواب ناراضی سے بولا۔ "آپ کے آنے سے تو میری طبیعت سنبھل گئی ہے، ہم رات کے وقت کسی دن یہاں سے روانہ ہوجائیں گے۔ ایک آدھ دن تو سفر کی تیاری ہی میں لگ جائے گا، نہ جانے کہاں کہاں جانا پڑے۔"

"نواب صاحب! ابھی آپ مجھے جانے دیجیے، میں پھر فیض آباد آؤں گا اور آپ کے ہاں کئی دن قیام کروں گا۔ مجھے جانے دیجیے۔"

"دیکھیے جناب! چمپا بائی جن علاقوں میں ہوگی، وہاں کچھ اچھے لوگ نہیں رہتے، آپ کا تنہا جانا مناسب نہیں ہے اور پھر ایسے عالم میں جب آپ کے ذہن پر غم کا بوجھ بھی ہو۔"

"نواب صاحب! میں جانتا ہوں مجھے اپنے آپ پر کتنا جبر کرنا ہوگا۔"

"تو آپ میرے ساتھ جانا نہیں چاہتے۔" نواب شکایتی انداز میں بولا۔

"اصرار مت کیجیے۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" نواب نرم ہوکے بولا۔ "اچھا ایک بات ہماری ضرور مانیے، میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کس افراتفری میں سفر کررہے ہیں، میں آپ کو اپنا بھائی، اپنا عزیز سمجھ کر کچھ خدمت کرنا چاہوں گا، آپ انکار کیوں نہیں کریں گے کہ میں اُسے تسلیم نہیں کروں گا۔"

"دیکھیے میرے پاس کافی روپے ہیں۔" میں نے جیب سے نوٹوں کا رومال نکال کے اُسے دکھایا۔ "اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔"

"پھر بھی آپ کو میری بات ماننی پڑے گی۔" اُس نے اصرار کیا۔

میں نے مزید انکار یوں نہیں کیا کہ وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور نواب آسانی سے ہار مانتا نظر نہیں آتا تھا۔ اُس نے دیوار میں نصب ایک تجوری کھول کے رومال میں نوٹ رکھے اور میری جیب میں ٹھونس دیے اور میرا ہاتھ تھامے ہوئے کمرے سے باہر آیا۔ میں نے معذرت کے ساتھ اُس کے دونوں پہرے داروں کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ بتایا۔ دونوں پہرے دار ابھی تک زمین پر پڑے تھے۔ نواب نے انھیں ہلایا۔ بوڑھا پہرے دار کچھ ہوشیار ہوا اور نواب کو میرے ساتھ دیکھ کے پہلے تو اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا، پھر وہ لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا اور میرے قدموں میں گر گیا۔ نواب نے فی الفور بگھی تیار کرنے کا حکم دیا۔ میں نے انکار کردیا کہ رات گئے نواب سراج علی کی بگھی سڑکوں سے گزرتی تو کئی نگاہیں اُٹھتیں۔ پھاٹک تک نواب خود مجھے رخصت کرنے آیا، پہرے دار مہمان خانے سے میرا سامان لے آیا تھا۔ نواب نے رخصت ہوتے وقت میری آنکھوں میں جھانک کے دیکھا، اُس کے چہرے پر بے شمار لکیریں کھنچ گئیں اور وہ فوراً پلٹ گیا۔ گلی میں آنے کے بعد کھڑکی بند کرنے کی آواز نے دُور تک میرا تعاقب کیا۔

❋

میں اندازے سے اسٹیشن کی طرف بڑھ رہا تھا، رفتار تیز تھی، ایک تانگا مل گیا، جیسا کہ میرا خیال تھا، گاڑی چھوٹ چکی تھی اور میں صبح تک دوسری گاڑی کا انتظار نہیں کرسکتا تھا۔ تانگے والے نے مجھے لاری کے اڈے پر پہنچا دیا۔ صبح چھ بجے تک میں لاری کے اڈے سے قریب سنسان جگہ پر بیٹھا رہا، ٹھیک چھ بجے لاری روانہ ہوئی تب مجھے سکون ہوا۔ لاری رکتی رُکاتی نو بجے لکھنؤ پہنچی۔ اس وقت لکھنؤ سے کوئی گاڑی آگرے کی طرف روانہ نہیں ہو رہی تھی۔ میں پھر آگرے کی سمت جانے والی لاریوں میں بیٹھتا اُترتا رہا اور اس طرح فیض آباد اور لکھنؤ سے دُور ہوتا گیا۔ بریلی اسٹیشن پر گاڑی میں بیٹھنے کے بجائے میں شہر میں اُتر گیا۔ رات کے آٹھ بجے تھے۔ ایک ہوٹل میں سامان رکھ کے میں نے لباس تبدیل کیا اور تانگے کے ذریعے طوائفوں کے بازار پہنچ گیا جس کا نام اعظم نگر تھا۔ رات کا وقت تھا، اعظم نگر میں سوناگاچھی اور فیض آباد کے بازار کی طرح رونق تھی، پہلے تو میں چوڑی سڑک اور اُس سے ملحق گلیوں میں بنے ہوئے مکانات میں جھانکتا رہا۔ پھر مجھے جلد ہی احساس ہوگیا کہ اس طرح تو چمپا بائی کو تلاش کرنا ناممکن ہے۔ کچھ دروازے بند تھے اور گانے کی آواز آرہی تھی۔ کچھ کھلے ہوئے تھے اور وہاں خوب صورت لڑکیاں انتظار کررہی تھیں۔ نچلی منزلوں پر میں کھلے ہوئے دروازوں میں جھانک سکتا تھا۔ میں وہاں بھٹکتا رہا، چمپا بائی کے بارے میں کسی سے براہِ راست پوچھنے میں اندیشہ تھا۔ جب میں دو تین بار ادھر سے اُدھر منڈلاتا رہا تو میں نے محسوس کیا، کچھ آنکھیں میرا تعاقب کررہی ہیں۔ گردن میں شوخ رنگ کا رومال ڈالے ہوئے ایک آدمی نے میرے قریب آکے چپکے سے کہا۔ "میرے ساتھ آیئے۔"

"کہاں؟" میں نے چونک کر معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"نزدیک ہی۔" وہ آنکھیں جھپکاتا ہوا بولا۔

میں نے چند لمحے سوچا، پھر اُس کے ساتھ چل دیا۔ وہ مجھے ایک مکان میں لے گیا اور ہم کشادہ سیڑھیاں طے کرتے ہوئے ایک بڑے کمرے میں داخل ہوگئے۔ کمرہ روشن تھا اور ایک خوب صورت، نوخیز لڑکی ساز ملانے میں مصروف تھی۔ مجھے آتا دیکھ کے اُس نے سلام کے لیے ہاتھ اُٹھایا۔ میں نے جھک کے اُس کے سلام کا جواب دیا۔ اُس کے پاس ہی ایک ادھیڑ عمر عورت بیٹھی تھی۔ اُس نے اُٹھ کے مجھے قالین پر بٹھایا۔ میرا جی متلانے لگا، میں یہاں گانا سننے نہیں آیا تھا لیکن اب یوں ہی واپس جاتے ہوئے جھجک سی محسوس ہوتی تھی۔ عورت نے مجھے پان کی گلوری پیش کی، لڑکی نے گانا شروع کیا۔ وہ گاتی رہی اور میں اپنے میں گم بیٹھا رہا۔ نہ میں نے اُسے داد دی، نہ اپنے پاس بلایا، نہ روپے دیے، اُس نے بے دلی سے جلد ہی غزل ختم کردی اور حیرانی سے مجھے گھورنے لگی۔ مجھے یہ خیال ہی نہیں رہا کہ وہ اب گا نہیں رہی ہے۔ ادھیڑ عمر عورت نے نزدیک آکے پوچھا۔ "کیا سرکار کو غزل پسند نہیں آئی، نصیبِ دشمناں مزاج کیسے ہیں؟"

"ٹھیک ہیں۔" میں نے کسمساہٹ سے کہا اور اُٹھ گیا۔ جیب میں ہاتھ ڈال کے میں نے دس روپے کا نوٹ لڑکی کی طرف اُچھال دیا۔ وہ شخص اب بھی میرے ساتھ تھا اور میری ناپسندیدگی کی وجہ پوچھ رہا تھا۔ "مجھے کہیں اور لے چلو لیکن ضروری نہیں کہ میں گانا بھی سنوں، میں تو چہرے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"چہرے؟" وہ تعجب سے بولا اور مسکرانے لگا۔ "اچھا میں سمجھ گیا۔"

"کیا سمجھے؟"

"اے صاحب! آیئے میں آپ کو چہرے دکھاتا ہوں، یہ ایک دشوار کام ہے مگر مجھے آپ کی خاطر کوئی نہ کوئی حیلہ بہانہ کرنا ہی ہوگا۔" وہ مجھے مختلف گھرانوں پر لے گیا، کہیں محفل جمی ہوئی تھی، کہیں ہار سنگھار کیے لڑکیاں گنگنا رہی تھیں، مجھے چمپا بائی کہیں بھی نظر نہیں آئی۔ میرا رہبر زینوں پر چڑھتے اُترتے، چبوترے پھلانگتے پھلانگتے تھک چکا تھا۔ میں کہیں ٹکتا ہی نہ تھا۔ "کیا آپ کو کسی خاص لڑکی کی تلاش ہے؟"

"ہاں، پر یہاں وہ لڑکی نظر نہیں آئی۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"اُس کا نام کیا ہے؟"

"اُس کا نام۔" میں نے سوچ کے جواب دیا۔ "اُس کا نام چمپا ہے۔"

"چمپا! اس نام کی تو کوئی لڑکی اس بازار میں ہے نہیں۔"

"سوچ کے بتاؤ۔"

"نہیں جناب! اس بازار میں کون آتا ہے، کون جاتا ہے، مجھے سب علم رہتا ہے۔ آپ نے خود دیکھ لیا کہ اپنی یاد اللہ سب سے ہے۔"

"یعنی تم نے چمپا نام کی کسی طوائف کا نام نہیں سُنا؟"

اُس نے چند لمحے سوچ کے جواب دیا۔ "نام تو سنا ہے مگر مجھے یقین ہے یہاں بہت دنوں سے اس نام کی کوئی لڑکی نہیں آئی۔"

"جو نام تم نے سُنا ہے، اُس کا چہرہ یاد ہے؟"

"مجھے چہرہ یاد نہیں آتا۔"

میں نے نوٹوں کی گڈی میں سے بیس روپے نکال کے دیے۔ اتنی بڑی رقم دیکھ کے اُس کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ کہنے لگا۔ "ٹھیریے، میں اور دوسروں سے معلوم کیے لیتا ہوں۔"

"اس طرح مت پوچھنا، یوں کرو کہ پچھلے پندرہ دنوں کے اندر جتنی نئی طوائفیں اور اُن کی نائکائیں یہاں آئی ہیں، اُن کے نام پوچھ لو، چمپا آئی ہوگی تو خود پتہ چل جائے گا۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے، ٹھیریے، میں ابھی پوچھ کے آتا ہوں مگر یہ آپ کی تسلی کے لیے ہے۔" وہ مجھے ایک جگہ ٹھیرا کے بھاگا بھاگا گیا اور پندرہ بیس منٹ بعد منہ لٹکائے واپس آگیا۔ "چمپا بائی نامی ایک طوائف فیض آباد میں رہتی ہے مگر وہ تو نائکہ ہے اور صرف ایک ہی دفعہ بریلی آئی ہے۔"

وہ شخص اسٹیشن تک میرے ساتھ رہا، اتنی مختصر سی ملاقات میں وہ مجھے بے حد پسند کرنے لگا تھا اور اصرار کررہا تھا کہ میں ایک دو روز اور بریلی ٹھیروں، پھر وہ مجھے نینی تال لے جائے گا اور رام نگر کے جنگلات کے مناظر دکھائے گا۔ اسٹیشن سے کچھ فاصلے پر وہ مجھے چائے پلانے ایک ہوٹل میں لے گیا۔ ہوٹل معمولی سا تھا، گیس کی لالٹین بھڑک رہی تھی، سیاہ دیگچیاں چولھوں پر بے ترتیبی سے رکھی ہوئی تھیں اور تین چار تپائیاں ادھر اُدھر بکھری پڑی تھیں، ہوٹل خالی تھا، صرف ایک مزدور بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ چائے ہمارے سامنے آئی تو دو اور آدمی دندناتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ ڈیل ڈول میں بس غنیمت تھے لیکن چہرے مُہرے سے چنبل کے گروہ کے آدمی لگتے تھے۔ آتے ہی انھوں نے ایک تپائی کو ٹھوکر سے لوٹ دیا اور ہوٹل والے کو گالی دیتے ہوئے ہمارے برابر تپائی پر بیٹھ گئے۔

میں نے چائے کی پیالی اُٹھائی ہی تھی کہ ایک نے گالی کے ساتھ میری جیب پر ہاتھ ڈال دیا۔ میں اس ناگہانی حملے کی تاب نہ لاسکا، تپائی سے زمین پر جا پڑا۔ دوسرے نے میرا تھیلا اپنے قبضے میں کرلیا اور کمبل دُور پھینک دیا۔ گرتے ہی میں نے ایک قلابازی لی۔ اس طرح میری جیب اُن کی دست برد سے محفوظ ہوگئی۔ میرا رہبر جس کا نام مُرلی تھا، تیزی سے مجھے سہارا دینے آیا لیکن اُٹھانے کے بجائے اُس نے میرے بازو اس انداز سے جکڑ لیے کہ مجھے ہاتھ ہلانے میں دشواری ہوئی۔ اسی اثنا میں اُن بدمعاشوں میں سے ایک نے میرے گال پر زور سے مکا مارا، میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ میں نے مُرلی سے اپنے بازو چھڑانے کے لیے جدوجہد کی مگر مُرلی نے انھیں اور زور سے جکڑ لیا۔ مارنے والے نے ایک اور ہاتھ میرے منہ پر رسید کیا اور چاقو کھول کے مجھ پر تان لیا۔ مُرلی اُن کی خوشامد کرنے لگا کہ وہ ایک مسافر پر کیوں ظلم کررہے ہیں لیکن اب مُرلی کی چال بازی میری سمجھ میں آچکی تھی۔ میں نے ایک نگاہ میں چاقو کی پوزیشن اور چاقو بردار شخص کے تیور دیکھے۔ دوسرے کو میرے تھیلے سے رقم نہ ملنے پر بڑی مایوسی ہوئی تھی اور اُس نے غلیظ گالیاں دے کے تھیلا ایک طرف پھینک دیا تھا۔ وہ بھی اپنے ساتھی کی طرح چاقو تان کے کھڑا ہوگیا۔ اس سے پہلے کہ میں پینترا بدل کے مُرلی کو اپنے آگے کرتا، مُرلی نے میرے بازو چھوڑ دیے۔ "رقم نکالو۔" انھوں نے چاقو کچھ آگے کرکے مجھے حکم دیا۔

"میرے پاس کچھ نہیں، صرف سفر کا خرچ ہے۔" میں نے غصے سے کہا۔

"خبردار جو ایسی ویسی حرکت کی، میں تم سب کو پکڑوا دوں گا۔" میں نے سوچ سمجھ کے

یہ جملہ ادا کیا تھا۔ وہ تعداد میں دو تھے اور دونوں کے ہاتھوں میں کھلے چاقو تھے۔ تیسرا بھی اُن کا ساتھی تھا، اُن پر یہ ثابت کرنا ضروری تھا کہ میں نے سادگی میں اُن کے چاقوؤں کا زیادہ اثر قبول نہیں کیا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ چاقو مجھ سے دُور رکھیں گے، اُن کا مقصد مجھے خوف زدہ کر کے رقم حاصل کرنا ہے۔ وہ رقم حاصل کیے بغیر نہیں ٹلیں گے۔ رقم میں اُنھیں دے دیتا اگر مجھے ایک نامعلوم سفر درپیش نہ ہوتا اور چونکہ مجھے آگے جانا تھا اس لیے میں اُن سے کوئی بڑا جھگڑا مول لینا بھی نہیں چاہتا تھا۔ ہوٹل کی جگہ تنگ تھی۔ یہ موجملر کی عمارت نہیں تھی۔ اِدھر اُدھر تپائیاں بھی راستہ روکے ہوئے تھیں، میری نظر بظاہر اُن پر مرکوز تھی لیکن تمام اطراف کا جائزہ لے رہی تھی، خون خرابے کا موقع نہیں تھا، مجھے جلدی سے آگے بڑھنا تھا۔

”نکالو رقم میرے تساہل پر“ ایک بار پھر انھوں نے گرج کر دھمکی دی۔

”جیب لوٹ دو ورنہ یہ چاقو تمھارے پیٹ میں اُتر جائے گا۔“

میں نے اپنا جسم سکیڑ لیا۔ ”میں نہیں نکالوں گا۔“ میں نے ضد کی اور کسی قدر خوف زدہ نظروں سے انھیں دیکھنے لگا۔ میرے سارے حواس جاگے ہوئے تھے۔ ایک لمحے کے لیے میں نے اپنی گردن پیچھے کی طرف کر لی جیسے میں گھبرا کے پیچھے ہٹنا چاہتا ہوں۔ میں انھیں یہی تاثر دینا چاہتا تھا کہ وہ مزید خوف زدہ کرنے کے لیے چاقو والا ہاتھ کچھ اور آگے بڑھائیں، جیسے ہی انھوں نے میرے اندازے کے مطابق میرے پیٹ میں چاقو گھونپنے کا خوف پیدا کرنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا میں نے دائیں ہاتھ والے چاقو بردار کا پہنچا پکڑ کے برق رفتاری سے بائیں طرف کھینچ لیا۔ میری تدبیر یہی تھی کہ اُس کا ہاتھ میری پہنچ، میری دسترس میں آجائے۔ جیسے ہی دائیں ہاتھ والے شخص کا پہنچا میری گرفت میں آیا، میں نے اُسے بائیں جانب کھینچا تو گھبراہٹ میں بائیں جانب والے شخص کا چاقو اپنے ساتھی کے کولھے میں پیوست ہو گیا کیونکہ وہ پہلے ہی چاقو بڑھا چکا تھا۔ میری تیزی نشانے پر خود اُس کا ساتھی آیا۔ پہلا ساتھی چیخ مار کے زمین پر لڑھک گیا پھر دوسرے کے ہاتھ پر قبضہ جمانے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ میں نے اُس کے پیٹ میں لات ماری اور چاقو اپنے قبضے میں کر لیا۔ دونوں زمین پر بلبلا رہے تھے۔ مُرلی بھاگ جانا چاہتا تھا مگر میں نے اُس کی گردن پکڑ لی اور اُسے اُس کے ساتھیوں کی طرف دھکیل دیا۔ وہ تینوں اُٹھ کے بیٹھ گئے تھے حالانکہ پہلے والا شخص تکلیف سے بلبلا رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں کھلا چاقو تھا۔ ”استاد! استاد!“ وہ تینوں بیک وقت خوشامد کرنے لگے۔ ”ہمیں دھوکا ہو گیا استاد!“

میں نے اپنا کمبل اور تھیلا اُٹھا لیا۔ بے ترتیب سامان درست کیا۔ مزدور یہ صورت دیکھ کے پہلے ہی بھاگ گیا تھا، ہوٹل والا کھڑا لرز رہا تھا۔ زخمی بدمعاش کو اُٹھا کے تپائی پر بٹھا دیا گیا تھا۔ اُس کے کولھے سے خون بہہ رہا تھا۔ زخم گہرا نہیں تھا۔ میں نے اس کا خاص خیال رکھا تھا، اگر میں بائیں طرف دُور تک کھینچنے کے بجائے اسے اُس کے ساتھی کے سامنے کر دیتا تو چاقو یہ چھیلتا ہوا نہ لگتا بلکہ کمر میں اندر تک گھس جاتا۔ اپنے زخمی ساتھی کو چھوڑ کے وہ دونوں اُس کے اشارے پر میری طرف لپکے۔ ”استاد! معاف کر دو“ وہ میرا دامن پکڑ کے بولے۔

میں نے کچھ نہیں کہا۔ انھیں حقارت سے دیکھتا ہوا ہوٹل سے باہر آ گیا۔ مُرلی دُور تک میرے پیچھے آیا۔ میں اسٹیشن کی بنچ پر بیٹھ کے گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ بریلی میں چمپا نہیں ملی اور میری بے خبری کا نتیجہ اس واقعے کی صورت میں نکلا۔ دلّی جاتے ہوئے درمیان میں مُراد آباد کا اسٹیشن پڑا۔ دل نہیں مانا، ممکن ہے مولوی صاحب اِس عرصے میں واپس آ گئے ہوں۔ ایک گھڑی کے لیے ٹھہر کر دیکھ آؤں سارجمند بیگم اور اس کی بچّی کو بھی دیکھ آؤں گا۔ کوئی فیصلہ کرنے میں دیر ہو گئی۔ گاڑی مُراد آباد اسٹیشن پر صرف بیس منٹ ٹھہری اور دلّی کے لیے روانہ ہو گئی۔ دلّی اُتر کے میں نے وہاں کے بازار میں چمپا کو تلاش کرنا شروع کیا۔ چمپا وہاں بھی نہیں ملی۔ چمپا کا ملنا آسان نہیں تھا، مجھے جن لوگوں کی تلاش ہوتی ہے وہ نظروں کو فریب دے جاتے ہیں۔ مجھے کچھ خبر نہیں، میں نے یہ سفر کس طرح گزارا۔ مسافروں کی بھیڑ میں الگ تھلگ بیٹھنے کی کوشش کرتا تھا تاکہ وہ مجھے تنگ نہ کر سکیں۔ مجھے کسی کی بات اچھی نہیں لگتی تھی، سب جھوٹ معلوم ہوتا تھا۔ اگر آدمی خاموش رہتا ہے تو دوسرا اُسے بولنے پر کیوں مجبور کرتا ہے۔ مسافر اِس کا اتنا خیال کیوں نہیں رکھتے۔ میں گھٹنوں میں سر دیے اپنے آپ میں گم ہو جاتا تھا مگر وہ مجھے سکون سے نہیں بیٹھنے دیتے تھے۔ کہاں سے آئے ہو، کیا کرتے ہو، کیا حال ہے؟ میں اُن سے کیا کہتا کہ تم میں حال سننے کا حوصلہ نہیں ہے، تم کیا سُننا چاہتے ہو۔ جب کوئی اسٹیشن آتا تھا، میں اُتر کے مسافروں کے چہرے دیکھا کرتا تھا اور دیوانہ وار اسٹیشن کے چکّر لگایا کرتا تھا کہ شاید کورا یا مولوی صاحب آجائیں۔ مسافر مجھ پر ہنسا کرتے تھے۔

دن کے گیارہ بجے گاڑی آگرہ اسٹیشن پر ٹھہری۔ پلیٹ فارم پر قدم رکھتے ہوئے میرے قدم ڈگمگانے لگے۔ چمپا اگر اپنی بہن موتیا کے ہاں بھی نہ ملی تو پھر میں اُسے کہاں کہاں ڈھونڈوں گا؟ میں کس کس کو ڈھونڈھتا پھروں گا! مجھے موتیا کے بالاخانے پر جا چاتک پہنچنا چاہیے تھا اور اس کے لیے موزوں وقت رات تھا۔ دن میں وہ کسی اور جگہ، کسی اور کمرے میں چھپی ہوئی ہو سکتی تھی لیکن رات کے درمیان اُس کی موجودگی کا امکان زیادہ تھا۔ اُس وقت دوسرے بالاخانے بھی اپنے کاروبار میں مصروف ہوں گے۔ دن کے وقت سب کی توجہ میری طرف مبذول ہو سکتی تھی مگر مجھے ایک لمحے کے لیے قرار نہیں تھا لیکن میں نے رات تک خود کو کسی طرح یہ وقت گزارنے پر آمادہ کر لیا۔ بریلی میں بدمعاشوں نے جس انداز سے مجھ پر حملہ کیا تھا، وہ یہاں بھی دُہرایا جا سکتا تھا، مجھے اپنے گرد و پیش سے بہت محتاط رہنا چاہیے تھا۔ مجھے اپنی ضرورت اب فہمیدہ کی موت کے بعد زیادہ محسوس ہوتی تھی، اس ضرورت کا احساس مجھے نجل نے دلایا تھا۔ دل میں آتا تھا، کوئی جرأت کروں۔ بس کھلا چاقو لے کے پہنچوں اور جو سامنے آئے اُسے کاٹتا ہوا بڑھتا رہوں، فہمیدہ میرا دل مسوستی رہتی تھی۔ کورا نے مجھے حوصلہ دیا تھا اور فہمیدہ نے وہ حوصلہ چھین لیا تھا۔

میں اوسط درجے کے ایک ہوٹل میں ٹھہر گیا اور سہ پہر تک کمرے کا دروازہ بند کیے بستر پر لوٹتا رہا۔ سہ پہر کو طبیعت بہت گھبرانے لگی۔ ایک پل کاٹنا دوبھر ہو گیا۔ میں ہوٹل سے باہر نکل آیا اور آگرے کی سڑکوں پر دلّی کا سا گھومتا رہا۔ جامع مسجد، تاج محل، فتح پور سیکری، اکبر کا قلعہ، آگرے میں بہت سی دیکھنے کی چیزیں تھیں، ہوٹل کا بیرا بہت اشتیاق سے اُن کا تذکرہ کرتا تھا۔ ہوٹل میں داخل ہوتے ہی گائیڈوں نے مجھے گھیر لیا تھا مگر اُن میں کوئی گائیڈ ایسا نہیں تھا جو مجھے کورا تک پہنچا سکے جو میرے ابا جان کا پتہ بتا سکے۔

رات آگے نہیں دیتی تھی۔ ریلوے لائن عبور کر کے میں سیدھی سڑک پر ہو لیا۔ چلتے چلتے شہری حدود سے لمحہ بہ لمحہ دُور ہو رہا تھا۔ باغات شروع ہو گئے تھے۔ ایک درخت کے نیچے بیٹھ کے میں نے گہری گہری سانسیں لیں مگر اس طرح میری حالت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ آدھے گھنٹے تک میں اسی جگہ بیٹھا رہا، پھر جب سورج غروب ہونے کی تیاری کر رہا تھا، اُس وقت میں نے چلنے کا ارادہ کیا اور شہر کی طرف واپس ہو گیا۔ کچھ ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد میں ایک جگہ ٹھٹھک کے رُک گیا۔ سامنے سے اپنے مخصوص لباس میں بدھ راہبوں کا ایک گروہ آہستہ روی سے میری طرف آ رہا تھا۔ انھیں دیکھ کے میرا دل مچلنے لگا اور میری عقل میں نہیں آیا کہ میں انھیں کس طرح مخاطب کروں۔ میں لوکھلائے ہوئے انداز میں وہیں کھڑا رہا یہاں تک کہ وہ میرے قریب آ گئے۔ انھوں نے شاید میری بے چینی محسوس کر لی تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے رُکے، مسکرائے اور ہاتھ ہلا کے مجھے سکون کی تلقین کی اور آگے بڑھ گئے۔ بدھ گیا میں جانگ قبیلے کا ایک شخص میرے ہاتھوں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ مجھے انھیں دیکھتے ہوئے بہت سے خوف محسوس ہوئے۔ جب وہ دُور چلے گئے تب مجھے ایک خیال آیا اور میں نے اُن کا تعاقب شروع کر دیا، وہ آگے آگے تھے، میں خاصے فاصلے سے اُن کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ وہ تین راہب تھے اور ایک دوسرے سے بے نیاز اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ ایک موڑ پر جا کے وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے رفتار تیز کر دی لیکن میں انھیں دوبارہ نہیں دیکھ سکا۔ اس جگہ جمنا ندی قریب تھی اور علاقہ پُرسکون تھا۔ فاصلے پر سبزے سے ڈھکے ہوئے چھوٹے چھوٹے مکانات بنے ہوئے تھے، وہ موڑ کے قریب ہی کسی مکان میں چلے گئے ہوں گے کیونکہ مجھے نظر نہیں آئے۔ جمنا ندی پر غروب ہوتے ہوئے سورج کی شفق پھیلی ہوئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سارا پانی سُرخ ہو گیا ہو اور خون کا دریا بہہ رہا ہو۔ میں راہبوں کا ٹھکانا ڈھونڈ کے جانگ قبیلے کی گم شدہ کورا کے متعلق کچھ معلومات حاصل کر سکتا تھا، شاید وہ مجھے کوئی ایسی بات بتا سکیں جس کا تعلق کورا سے ہو اور مجھے اُمید کا کوئی سِرا مل جائے؟ اُن سے مل کے میرے دل کو تسلی ہو جاتی مگر نہ معلوم وہاں کورا تک بات آنے میں کتنی دیر لگ جاتی، اس لیے وہ جگہ ذہن میں رکھ کے واپس آ گیا۔

ہوٹل پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی۔ میں ضروری تیاری کر کے جلد از جلد وہاں سے نکلا اور میں نے اپنے آپ کو پُرسکون رکھنے کی ہر ممکن تلقین کی۔ ہوٹل سے میں جھم جھم گلی کی جانب روانہ ہوا۔ آگرے کی اس گلی میں بریلی کے بازار سے زیادہ رونق تھی۔ یہاں عمارتیں قدیم طرز کی اور صاف تھیں، بھیڑ بھی بریلی سے زیادہ تھی۔ بہت سے بالاخانوں کے دروازے کھلے ہوئے تھے اور زیوروں سے لدی پھندی رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس دلھنیں بنی ہوئی نوجوان لڑکیاں اور عورتیں سڑک ہی سے نظر آجاتی تھیں، اُوپر کے بالاخانوں کی طوائفیں جھروکوں میں بیٹھی یا کھڑی ہوئی تھیں، میلے کا سا منظر تھا، پان چائے اور گل فروشوں کی دُکانوں پر لوگوں کے گروہ موجود تھے۔ جہاں گانا ہو رہا تھا، وہاں کے دروازے بند تھے۔ میں نے پان کا بیڑا خرید کے منہ میں چبایا۔ کلائی میں ہار لپیٹا تاکہ میری بدحواسی اور اجنبیت کا کسی کو احساس نہ ہو سکے۔ چمپا بائی اگر یہاں موجود ہو گی تو اُس نے اپنی آمد کی خبر مشہور نہیں کی ہو گی پھر بھی ممکن ہے، موتیا بائی نے احتیاطاً یہاں اپنے شناساؤں کو باخبر کر دیا ہو کہ کوئی اجنبی شخص اُسے پوچھتا ہوا آئے تو اُسے فوراً اطلاع دی جائے۔ میں چاروں طرف نظریں ڈالتا ہوا گلی میں اس انداز سے گھومتا رہا جیسے یہاں کے تمام گھروں سے واقف ہوں۔ چمپا بائی کی آنکھوں میں میری شکل محفوظ ہو گی، میری آنکھوں میں بھی اُس کی شبیہہ نقش ہو گئی تھی۔ چمپا کی بہن موتیا بائی کا بالاخانہ بھی یہیں کہیں ہو گا۔ کسی سے پوچھنے کے بجائے میں خود ہی اُسے تلاش کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ اس مشکل کام کا تجربہ مجھے بریلی اور دلّی میں ہو چکا تھا۔ گلی میں بار بار پھیرے لگانا بھی مشکوک تھا۔ اس تمام احتیاط کے باوجود مُرلی کی طرح ایک شخص میرے پاس آیا اور رازدارانہ انداز میں بولا۔ ”کوئی خدمت ہو تو بتایئے؟“

یہاں آ کے میرے پیروں میں لرزش ہونے لگی۔ مجھے بُرے بُرے وسوسوں نے گھیر رکھا تھا۔ چمپا بائی سے ملاقات ہوئی اور اُس نے ابا جان اور گھر والوں کے متعلق کوئی اچھی خبر نہ سنائی تو مجھ سے اُٹھا کیسے جا سکے گا؟ بہتر ہے کچھ نہ سنوں اور یہیں سے واپس کہیں اور بھاگ جاؤں۔ مجھے تذبذب میں دیکھ کے اُس شخص نے دوبارہ مجھے پیش کش کی، میں نے خود کو اُس کے سپرد کر دیا۔ وہ مجھے مختلف بالاخانوں پر لے گیا مگر چمپا بائی کہیں نظر نہیں آئی۔ جب ہم چوتھے بالاخانے سے اُتر رہے تھے تو میں نے تنگ آ کے اُس سے صاف صاف موتیا بائی کے بالاخانے پر چلنے کی فرمائش کر دی۔ ”شوخی جان!“ اُس کی مسکراہٹ مجھے زہر لگی۔ ”میں حضور کو وہیں لے جانے والا تھا، شوخی جان پر تو ابھی پوری طرح جوانی بھی نہیں آئی کہ دُور دُور تک اُس کی خوشبو پھیل گئی مگر صاحب! ہر وقت محفل سجی رہتی ہے اس لیے میں کترا رہا تھا۔ آپ پہلے ہی کہہ دیتے۔“ اُس نے آنکھ مار کے کہا۔ ”آگرے کا ہیرا ہے، ایک تاج محل یہاں پہلے سے موجود ہے، دوسرا شوخی جان کا بدن ہے۔“

وہ مجھے ایک صاف ستھری کشادہ عمارت میں لے گیا۔ رنگ و روغن تازہ تازہ تھا۔ ”یہ موتیا بائی کا ڈیرا ہے۔“ جب اُس نے یہ بتایا تو میرے دل کی حرکت معدوم ہونے لگی۔ میں اُس سے کہنا چاہتا تھا۔ ”ذرا ٹھیرو۔ مجھے سانس لینے دو۔ میں اپنے حواس درست کر لوں۔“ وہ تیزی سے زینے پھلانگنے لگا۔ زینے پر ہمارا کئی آدمیوں سے ٹکراؤ ہوا۔ شوخی جان گا رہی تھی اور دروازہ بند تھا، لوگ مایوس واپس آ رہے تھے۔ میرے ساتھ موجود شخص نے بے بسی سے شانے اُچکا کے منہ بنایا۔ میں نے اُس کا بازو پکڑ کے اُسے اُوپر چلنے کا اشارہ کیا۔ اب انتظار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اُس نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ کنڈی لگی ہوئی تھی۔

جلد ہی اندر سے بھرے بھرے جسم اور گندمی رنگت کی ایک عورت برآمد ہوئی، اُس کی عمر یہی کوئی چالیس سال ہوگی۔ "موتیا بائی! نواب صاحب بہت دُور سے شوخی جان کا چرچا سُن کے آئے ہیں۔" میرے رہبر نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

میں نے اپنی جیب ٹٹولی، چاقو موجود تھا۔ عورت نے انکار میں گردن ہلائی ہی تھی کہ میں آگے بڑھ گیا اور اُسے دروازے سے ہٹا کے اندر داخل ہوگیا۔ درمیان میں چھریرے بدن کی ایک خوب صورت لڑکی دل کش آواز میں گا رہی تھی۔

اور ایک کونے میں پان دان کھولے چمپا بائی بیٹھی تھی۔

فرش پر نوٹ اور پھول بکھرے ہوئے تھے۔

محفل شباب پر تھی۔ چھریرے بدن اور گندمی رنگ کی ایک خوب صورت لڑکی تماش بینوں کے درمیان بیٹھی ہوئی گانا گا رہی تھی۔ اُس کی عمر بہت کم معلوم ہوتی تھی۔ میں دروازے پر کھڑی ہوئی عورت کو ایک طرف ہٹا کے اندر داخل ہوا تو لڑکی نے اپنی پلکیں اُٹھا کے ایک نظر مجھے دیکھا اور شرما کے اُس پستہ قد اور تومند شخص کی جانب متوجہ ہوگئی جو وہاں سب لوگوں سے نمایاں تھا۔ اُس نے میری آمد پر بُرا سا منہ بنایا اور کسمسا کے اپنے ساتھیوں سے ناگواری کا اظہار کیا۔ دروازہ کھولنے والی عورت نے ناچار مجھے ایک طرف بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ میں اُس کی بات پر عمل کرنے کے بجائے چند لمحوں تک وہیں کھڑا رہا۔ میں نے پہلے سرسری نظر سے محفل کا رنگ دیکھا، پھر میری نگاہ چمپا بائی پر جم گئی۔ چمپا بائی پان دان کھولے گلوریاں بنانے میں مصروف تھی۔ اُس نے شاید مجھے دیکھا نہیں یا دیکھا ہوگا تو پہچانا نہیں تھا لیکن میں نے اُسے خوب پہچان لیا تھا۔ اُسے دیکھ کے میرے تن بدن میں چنگاریاں اُٹھنے لگی تھیں۔ جی میں آیا، بڑھ کے اُس کا گلا گھونٹ دوں اور جب تک اُس کی آنکھیں حلقوں سے باہر نہ اُبل پڑیں اُسے نہ چھوڑوں لیکن اس طرح آپا جان تک پہنچنے کی یہ آخری اُمید بھی ختم ہو جاتی۔ مجھے یہاں تک لانے والا شخص میری پُشت پر موجود تھا۔ اُس نے ٹہوکا مار کے مجھ سے آگے بڑھنے اور بیٹھ جانے کی درخواست کی اور سرگوشی میں کہا: "یہی تھی شوخی جان ہے، ذرا قریب جا کے دیکھیے، پنڈا کیسا دمک رہا ہے۔"

چمپا بائی کے ساتھ ایک اور عورت بھی بیٹھی تھی۔ وہ شاید اُس کی چھوٹی بہن موتیا بائی تھی۔ دونوں کی شکلیں ملتی جلتی تھیں۔ موتیا نے مجھے دیکھ لیا تھا لیکن جب اُس نے یہ محسوس کیا کہ شوخی جان کے بجائے میری نگاہیں مسلسل اُس کی بہن چمپا بائی پر مرکوز ہیں تو اُس نے سہمے ہوئے انداز میں چمپا کے کان میں کچھ کہا۔ چمپا نے ہڑبڑا کے دروازے کی جانب دیکھا، گلوری اُس کے ہاتھ میں جیسے جم گئی۔ اُس نے بدحواسی میں موتیا سے کچھ کہا۔ دونوں بے چین ہو گئیں۔ موتیا نے پان دان جلدی سے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ چمپا اُچھل کے اُٹھ کھڑی ہوئی اور تیزی سے دائیں جانب کے کمرے کی طرف بڑھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ دروازہ بند کرتی، میں محفل عبور کرتا ہوا سیدھا اُس کمرے میں داخل ہوگیا۔

کمرے میں ایک دوسرا دروازہ بھی تھا، چمپا بائی بھاگ کے باہر جانا چاہتی لیکن مجھے سر پر دیکھ کے ایک کونے میں دبک گئی۔ وہ بُری طرح لرز رہی اُس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لیے تھے۔ "تم کون ہو؟" اُس نے گھگھیائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"تم اتنی پریشان کیوں ہو گئی ہو؟" میری آواز بھی کانپ رہی تھی۔ "تمھاری تلاش میں بہت دُور سے آرہا ہوں۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟" وہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔

"گھبراؤ نہیں، میں تمھیں مارنے نہیں آیا ہوں۔" میں نے نفرت سے کہا۔ "مجھے صرف ایک بات بتا دو کہ تم نے فہمیدہ کو کہاں سے حاصل کیا تھا؟"

"کون فہمیدہ؟ میں کسی فہمیدہ کو نہیں جانتی۔"

"تم فہمیدہ کو نہیں جانتیں؟" میں نے چیخ کے کہا۔ "تم نیلم جان کو نہیں جانتیں چمپا بائی؟ میں تمھارا خون پی لوں گا۔"

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔" میں نے مڑ کے دیکھا، موتیا دروازے میں کھڑی ہوئی شائستگی سے کہہ رہی تھی۔ "بیٹھیے، تشریف رکھیے۔ آپ کسی غلط جگہ آ گئے ہیں! یہ تو بالاخانہ ہے جناب اور یہ میری بڑی بہن ہے۔ بے شک ان کا نام چمپا ضرور ہے مگر کسی نیلم جان سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔ آپ کس نیلم جان کی بات کر رہے ہیں؟"

"موتیا بائی۔ چبلا پن مت کرو اور درمیان میں مت دخل دو۔" میں نے مشتعل ہو کے کہا۔ "مجھے چمپا سے بات کرنے دو۔"

"اے میاں واہ۔" موتیا بائی ہاتھ نچا کے بولی۔ "منہ اُٹھائے گھر میں آئے، پھر اس پہ دیدے دکھاتے ہو، ہم بھی شرفا میں اُٹھتے بیٹھتے ہیں۔ یہ کیسا دستور ہے نہ محفل کا خیال، نہ کچھ عورت ذات کا پاس۔ چہرے مہرے سے تو خاندانی آدمی معلوم ہوتے ہو۔ کہہ جو دیا تم سے کہ ہم نیلم جان کو نہیں جانتیں۔" وہ بگڑ کے بولی۔

"نہیں جانتیں!"

"ہاں نہیں جانتے۔" موتیا نے غصّے سے کہا۔

"موتیا بائی! تم بات بڑھا رہی ہو۔" میں نے ضبط سے کام لیا۔ "میں جھگڑا ٹنٹا کرنے نہیں آیا ہوں۔ مجھے تمھاری بہن چمپا بائی سے صرف یہ پوچھنا ہے کہ اُس نے نیلم جان کو کہاں سے اور کن حالات میں اُٹھایا تھا۔ بس مجھے صحیح صحیح بتا دو۔ میں چلا جاؤں گا۔"

"یہاں کوئی نیلم جان ویلم جان کو نہیں جانتا۔" اپنا راستہ لو۔" موتیا کا لہجہ گرم ہوتا گیا۔ "باہر محفل جمی ہوئی ہے، عزّت دار لوگ بیٹھے ہیں۔"

"چمپا بائی! میں کیا پوچھ رہا ہوں؟" میں نے گرج کے کہا۔

"چمپا سے کیا بات کرتے ہو۔" موتیا نے پھر دخل دیا۔ "چمپا بائی اندر بیٹھیں اور اے میاں! جاؤ کسی اور بالاخانے پہ جا کے دستک دو، نیلم جان کا کہیں نہ کہیں ضرور پتہ مل جائے گا۔"

"چپ رہو۔" میں نے اُلٹے ہاتھ سے موتیا کے رخسار پہ ایک طمانچہ رسید کیا۔ وہ پلنگ پہ جا کے گری۔ سازندوں کے سازوں، شوخی جان کے گھنگروؤں اور محفل کی ہما ہمی میں موتیا کی آواز باہر نہ جا سکی۔ اُس نے آتے ہی احتیاطاً دروازہ بھی بند کر دیا تھا۔ "کھلتے ہیں مجھے شہ پاشہ کے بالاخانے پر اس کا اندازہ ہو چکا تھا کہ محفل کے وقت کوئی بھی یہ دنگا فساد پسند نہیں کرتا لیکن موتیا بائی نے خود ہی پہل کر دی تھی۔ "چمپا بائی!" میں نے چند قدم آگے بڑھ کے کہا۔ "تم فیض آباد سے بھاگ کے یہاں پہنچیں۔ تم کہیں بھی جاؤ، تمھیں اس سے سروکار نہیں ہے۔ فہمیدہ کی قسمت ہی خراب تھی۔ میں تم سے کچھ نہیں کہوں گا۔ مجھے صرف یہ بتا دو کہ وہ بدقسمت لڑکی تمھیں کہاں ملی تھی؟"

چمپا بائی کی آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ موتیا بھی طمانچہ کھا کے خاموش ہو گئی تھی۔ میں جب چمپا کے قریب پہنچا تو موتیا تیزی سے اُٹھ کے باہر نکل گئی۔ میں نے پلٹ کے دیکھا تو چمپا نے دوسرے دروازے سے بھاگنا چاہا لیکن میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "بتاتی ہوں۔ بتاتی ہوں۔" وہ درد سے بلبلا کے چیختی ہوئی بولی۔ "میں نے نیلم جان کو میسور سے خریدا تھا۔"

"میسور سے؟"

"ہاں میسور سے۔ میں نے اُسے پانچ ہزار روپے میں خریدا تھا۔ میں اُس کا گھر نہیں جانتی۔ میں اُس کے بارے میں اور کچھ نہیں جانتی۔ میں تم سے سچ کہہ رہی ہوں۔" وہ عاجزی سے بولی۔

میں نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ "میسور میں تم نے کس سے اُسے خریدا تھا اور کب خریدا تھا؟ وہ تمھیں کس حالت میں ملی تھی؟"

"میں ایک ہوٹل میں ٹھیری ہوئی تھی کہ چند اجنبی لوگوں نے سودا کر کے اُسے میرے حوالے کر دیا۔" وہ رونے لگی۔ "لڑکی اچھی تھی۔ میں نے مول تول نہیں کیا اور زیادہ [illegible] پھر میں نے اُسی وقت میسور چھوڑ [illegible] تھا۔"

"یعنی تمھیں یہ نہیں معلوم کہ تم نے پانچ ہزار روپے کن لوگوں کو دیے اور اُن کے نام کیا تھے؟ تمھیں کچھ نہیں معلوم تھا؟ - چمپا بائی! سچ سچ بتاؤ۔" میں نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔ نام تو اُن کے ضرور کچھ تھے۔ مجھے یاد نہیں رہے۔ انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ میرے ساتھ کوئی دھوکا نہیں ہوگا۔ اُن کا ایک آدمی میرے ساتھ آگرے تک آیا تھا۔ آدھی رقم میں نے اُسے یہیں دی تھی۔"

"جو شخص تمھارے ساتھ آیا تھا کیا تم اُسے بھی نہیں پہچانتیں؟" میں نے ہاتھ اُٹھا کے چمپا کے گال پہ تھپڑ مارنا چاہا۔

"اُس کا نام بکرم تھا۔" چمپا جلدی سے بولی۔

"تم اُن کا ٹھکانا جانتی ہو؟"

"نہیں، میں کچھ نہیں جانتی۔" وہ پیچھے ہٹ کے بولی۔ "پانچ سال گزر گئے۔ اس کے بعد میں میسور نہیں گئی۔" صاف ظاہر تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔

"ٹھیک ہے چمپا بائی! تمھیں میرے ساتھ میسور چلنا ہوگا۔"

"میں۔ میں۔ نہیں۔" وہ ہکلانے لگی۔

"ہاں تم۔ تم۔ اور ابھی۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "تیاری کرو۔"

"کیسی تیاری؟" پیچھے سے اچانک کسی مرد کی آواز آئی۔ میرے پیچھے دو آدمی کھڑے تھے، اُن کے ساتھ موتیا بائی بھی تھی۔ یہ چہرے میرے جانے پہچانے ہوئے تھے۔ ان چہروں پہ چنچل اور موجمدار کے آدمیوں کی چھاپ تھی۔ پچھلے سات ساڑھے سات برسوں سے میں انھی چہروں کے درمیان رہ رہا تھا۔ میرے تمام حواس انھیں پہچان چکے تھے۔ "کہاں جانے کا ارادہ ہے؟" اُن میں سے ایک نے میرے سینے پہ ہاتھ رکھ کے مجھے دھکیلتے ہوئے کہا۔

میں نے اُس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "دُور رہو، یہ میرا اور چمپا بائی کا معاملہ ہے۔ بہتر ہے تم لوگ درمیان میں نہ پڑو۔"

"موتیا بائی!" دوسرا شخص اب تک خاموش کھڑا تھا، اُس نے زبان کھولی۔ "اسے بتا دو کہ اس علاقے میں نوشے کے بغیر پتّا تک نہیں ہلتا۔"

موتیا بائی نے اشتعال میں کہا۔ "سُن لیا تم نے میاں! اب سیدھے سیدھے یہاں سے بھاگ جاؤ اور آیندہ اس طرف کا رُخ مت کرنا۔ اکیلی عورتیں سمجھ کے ہاتھ اُٹھایا تھا، ابھی نوشہ زندہ ہے۔"

"موتیا بائی! میں نے تم سے کہا تھا کہ بات مت خراب کرو۔ یہ نوشہ اور شہ بالا الگ ہی رکھو۔ چمپا بائی میرے ساتھ جا رہی ہے۔"

"چمپا بائی کہیں نہیں جائے گی۔" نوشہ کی بھاری آواز گونجی۔ "نوشہ کے بغیر یہاں سے کوئی سواری نہیں جاتی۔ ہر معاملہ پہلے نوشہ سے نمٹانا پڑتا ہے۔ ان گلیوں میں جو کچھ ہوتا ہے، وہ نوشہ کے حکم کے بغیر نہیں ہوتا۔ نوشہ کو مت جگاؤ بیٹا! جیب میں پیسے ہوں تو ٹھنڈے ٹھنڈے تماشا دیکھو۔" نوشے کے ساتھی نے استہزا سے کہا۔

"دفع ہوتے ہو یا نہیں؟" نوشہ گرج کے بولا۔

"چمپا بائی! چلو۔" میں نے نوشہ کی بات سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے کہا۔

"چمپا بائی نہیں جائے گی۔"

"چمپا بائی کو کوئی روک نہیں سکتا۔"

"تھو۔" نوشہ کے ساتھی نے منہ آگے کر کے فرش پر تھوک دیا۔ "کیا بکواس کیے جا رہا ہے سالے! اتنی دیر سے ٹرٹر کیے جا رہا ہے، یہاں سے نکلتا ہے یا اُٹھا کے پھینکنا پڑے گا؟" وہ گالیاں دیتا ہوا طیش میں میرے پاس آیا اور میرے جبڑے پر اُس نے مکا مارنا چاہا۔ میں اُن کے ساتھ کوئی جھگڑا مول لینے سے گھبرا رہا تھا اس لیے جیسے ہی اُس نے ہاتھ اُٹھایا، میں نے پھرتی سے اپنا منہ ایک طرف کر لیا۔ نوشہ کے ساتھی کا پھسلتا ہوا ہاتھ میرے بازو پر پڑا۔ وہ جھونک میں کچھ جھکا اور سٹ پٹا گیا۔ میں نے اس لمحے سے فائدہ اُٹھا کے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کسی تاخیر کے بغیر اُس کے پیٹ میں پوری قوت سے گھٹنا مارا۔ گھٹنا معدے کے منہ پہ لگا تھا۔ نوشہ کا ساتھی بلبلا گیا اور پیٹ پکڑے ہوئے فرش پر لوٹنے لگا۔ میں نے اُس کے ساتھ احتیاط اس لیے نہیں برتی تھی کہ

نوشہ کے تیور اچھے معلوم نہیں ہوتے تھے۔ بہتر یہی تھا کہ ایک کو ناکارہ کر دیا جائے۔ اپنے ساتھی کا حشر دیکھ کے نوشہ کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ میں نے ایک بار پھر اُسے درمیان میں دخل نہ دینے اور اس معاملے سے علیحدہ رہنے کا مشورہ دیا لیکن نوشہ نے اپنے نیفے سے اُسترا نکال کے کھول لیا تھا۔ میرا ہاتھ خالی تھا اور چاقو نکالنے کا وقت نکل گیا تھا۔ کمرہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ فرنیچر کی وجہ سے جگہ بھی تنگ تھی۔ نوشے نے اتنا تو جان لیا تھا کہ میں کوئی اناڑی آدمی نہیں ہوں۔ غنڈے ہتھیار اسی وقت نکالتے ہیں جب زبانی تنبیہ اور دوسرے حربے ناکام ہونے کا اندیشہ ہو۔ دونوں عورتیں باہر جانے والے دروازے کے پاس ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی کھڑی تھیں۔ موتیا کچھ دیر پہلے شستہ لہجے میں بات کر رہی تھی مگر اب گالیاں بکنے لگی تھی۔ چمپا بائی کو سکتہ سا ہو گیا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں چمپا بائی فرار ہونے میں کامیاب نہ ہو جائے۔ دوسری طرف نوشہ اُسترا لیے پر تول رہا تھا۔ اُسترے کی تیز دھار روشنی سے چمک رہی تھی۔ یکایک اُس نے حملہ کرنے کے لیے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔ میں تیزی سے بائیں جانب ہٹ گیا لیکن اُس نے مجھے دھوکا دیا تھا۔ اُس نے چشم زدن میں اُسترا دائیں ہاتھ سے اُچھال کے بائیں ہاتھ میں پکڑا اور مجھ پر حملہ کر دیا۔ بچتے بچتے بھی میرے ہاتھ پر اُسترے نے ایک لکیر کھینچ دی۔ اگر میں چند قدم پیچھے ہٹ کے اُس کے اچانک حملے سے نہ بچتا تو اُسترا میری بائیں پسلی کاٹتا ہوا گزر جاتا۔ پیچھے ایک بڑا صندوق رکھا تھا۔ میں اُس سے ٹکرا گیا۔ نوشہ نے ایک غلیظ گالی دی اور اُسترا تانے ہوئے دھمکیاں دیتا ہوا مجھ پر دوبارہ جھپٹنے کے لیے پر تولے۔ نوشہ کو توقع نہیں ہوگی کہ میں اتنی جلدی زمین پر بیٹھ جاؤں گا۔ اُدھر وہ بڑھا، اِدھر میں بیٹھا۔ نتیجے میں نوشہ خود صندوق پر گرتے گرتے رہ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس طرح اُس کا دوسرا حملہ میرے سر پر ہوگا لیکن اُسے معلوم نہیں تھا کہ میرے پاس صندوق سے ٹکرانے کے بعد اپنے بچاؤ کی ایک ہی صورت رہ گئی تھی۔ میں اُس کی دونوں ٹانگیں پکڑ کے اتنی تیزی سے آگے کی طرف اُچھلا کہ اُس کا منہ صندوق پر جا پڑا۔ اس طرح اُس کی ٹھوڑی شکستہ ہو گئی ہوگی اور نیچے کے کئی دانت ٹوٹ گئے ہوں گے۔ نوشہ اپنی چیخ نہیں روک سکا اور بوکھلاہٹ میں اُسترے پر قابو نہیں رکھ سکا۔ اُس نے خود اپنی اُنگلیاں کاٹ لیں۔ میں نے اُس کی ٹانگیں نہیں چھوڑیں۔ وہ صندوق سے اُچھلتا ہوا فرش پر آ گیا اور زمین سے اُس کا منہ ٹکرایا تو رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی۔ نوشہ کا پورا منہ چکنا چور ہو گیا۔ اُس نے اپنی ٹانگیں آزاد کرانے کی تھوڑی سی جدوجہد کی۔ میں نے اُس کی ایک ٹانگ مروڑ دی۔ وہ بھیانک کراہیں بلند کرنے لگا۔ میں اُس سے نمٹنے میں اتنا منہمک تھا کہ مجھے موتیا اور چمپا بائی کے بھاگنے کی خبر بھی نہیں ہوئی۔ وہ دونوں کمرے میں نہیں تھیں۔ نوشہ کا دوسرا ساتھی پیٹ پکڑے ہوئے فرش پر ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اُس کی آوازوں میں نوشہ کی آوازیں بھی شامل ہو کے اور دہشت پھیلا دی تھی۔ میرا خیال تھا کہ نوشہ کچھ دیر ضرور مزاحمت کرے گا مگر وہ تو بہت جلد اوسان کھو بیٹھا۔

صرف چند منٹوں میں کمرے کی یہ حالت ہو گئی تھی۔ مجھے یقین تھا موتیا اور چمپا ابھی دُور نہیں پہنچی ہوں گی۔ میں نوشہ اور اُس کے ساتھی کو چھوڑ کر باہر کی طرف لپکا۔ اندر ٹین کا سائبان پڑا ہوا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا مکان ایک اور سجا ہوا کمرہ کھلا تھا۔ عموماً زینے والے مکانوں میں ایک ہی راستہ ہوتا ہے۔ مجھے کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ چمپا اور موتیا اگر دیوار پھلانگ کے دوسرے مکان میں نہیں گئی ہیں تو اسی مکان میں ہوں گی۔ باورچی خانے کے قریب مجھے کوٹھری جیسا ایک کمرہ بند نظر آیا۔ میں نے دروازے سے کان لگا کے کچھ سننے اور جھریوں سے جھانکنے کی کوشش کی۔ اندر گہرا اندھیرا تھا۔ کچھ بھی نظر نہیں آیا، نہ کوئی آہٹ محسوس ہوئی۔ ممکن ہے یہ بعید نہیں تھا کہ وہ دوسرے مکان میں اُتر کے پولیس کو بُلا لیں۔ اندر دو آدمی کراہ رہے تھے۔ ایک کا چہرہ لہولہان تھا۔ میرا کوئی گواہ نہیں تھا۔ یا تو مجھے فوراً یہاں سے بھاگ جانا چاہیے تھا یا پھر پولیس کے خطرے سے بے پروا ہو کے موتیا اور چمپا بائی کی واپسی کا انتظار کرنا چاہیے تھا مگر ابھی دیر کتنی ہوئی تھی۔ میں انھیں نیچے راستے میں پکڑ سکتا تھا لیکن راستے میں پکڑنے سے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ پوری سڑک پر ہنگامہ ہو جاتا۔ میں سارے مکان میں کسی دیوانے کی طرح اِدھر سے اُدھر چکر لگاتا رہا۔ میرے قدم بار بار باورچی خانے سے ملحق کوٹھری کی طرف اُٹھتے تھے۔ اگر وہ دیوار پھلانگ گئی ہیں تو اس کے لیے انھوں نے کسی چیز کی مدد ضرور لی ہوگی۔ میں نے غور سے دیکھا۔ دیوار کے ساتھ کوئی کرسی یا میز لگی ہوئی نہیں تھی۔ میں نے بے تحاشا کوٹھری کا دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ لکڑی کا دروازہ ہلنے لگا۔ "باہر آ جاؤ چمپا بائی، آ جاؤ۔" میں نے چیخ چیخ کر کہا۔

کوٹھری کے اندر ضرور کوئی موجود تھا۔ کوئی چیز گرنے کی آواز سے میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے اور زور زور سے دروازہ دھڑ دھڑایا۔ "چمپا بائی! اگر تم باہر نہ نکلیں تو میں اس کوٹھری کو آگ لگا دوں گا۔ باہر آ جاؤ۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمھیں کچھ نہیں کہوں گا۔ میں اگر تمھیں مار بھی دوں تو نیلم جان واپس نہیں آ جائے گی۔ میں تم سے صرف اُس کے گھر کا پتہ جاننا چاہتا ہوں۔" میں چیختا چلاتا رہا مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے چمپا بائی، تم ہمیشہ کے لیے اندر رہو، میں باہر سے کنڈی لگا کے آگ لگا رہا ہوں۔"

"نہیں، نہیں، ٹھیرو۔" چمپا بائی نے پھٹی پھٹی آواز میں کہا۔ "میں باہر آ رہی ہوں۔" ساتھ ہی کوٹھری کا دروازہ کھل گیا اور اندر سے برانداز چمپا اور موتیا برآمد ہوئیں۔ اُن کے چہرے سفید ہو رہے تھے۔

"موتیا بائی! تم نے خواہ مخواہ زحمت کی۔ وہ دونوں اندر تڑپ رہے ہیں۔ چمپا کو معلوم تھا کہ میں فیض آباد میں اس کے بالاخانے پر کن لوگوں کے ساتھ پہنچا تھا۔ پھر بھی اس نے خیال نہیں کیا۔"

"نیلم جان تمھاری کون تھی؟" موتیا نے سہم کے پوچھا۔

"کیا کرو گی پوچھ کے۔" میری آواز بھر آئی۔ "میں اُس کا کچھ بھی نہیں تھا۔ چلو چمپا بائی! دیر نہ کرو۔ میرا سینہ جل رہا ہے۔"

"ابھی؟ اسی وقت؟" چمپا بائی کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

"ہاں ابھی اور اسی وقت۔"

"مگر آپ سوچیے تو میاں! اس بات کو برسوں گزر چکے ہیں۔ نہ معلوم اب وہ لوگ وہاں موجود ہوں یا نہ ہوں۔" موتیا نے نرمی سے کہا۔

"تم پھر فضول باتیں کرنے لگیں موتیا بائی! مجھے چمپا بائی کے ساتھ چاہے دُنیا کے آخری سرے تک جانا پڑے مگر میں نیلم جان کے گھر کا پتہ ضرور چلاؤں گا۔"

"مگر چمپا باجی کو نیلم جان کے گھر کا پتہ معلوم نہیں ہے۔" موتیا بولی۔ "میاں! جذبات میں نہ آئیے، ہم تو بہ کرتے ہیں۔ ہم نے آپ کو بوجھنے میں غلطی کی۔ ذرا ایک دو دن ٹھیر لیے، ہم یہ اطمینان کر کے کیوں نہ چلیں کہ وہاں تک جائیں اور کچھ بات بھی بنے، خواہ مخواہ طُول طویل سفر کرنا پڑے اور حاصل وصول کچھ نہ ہو تو فائدہ؟ آپ چاہیں تو یہاں ٹھیریں مگر یہ جگہ آپ کے لیے مناسب نہیں ہے۔ آپ یقیناً ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے ہوں گے۔ میں باجی کی طرف سے وعدہ کرتی ہوں کہ ہم کسی اور طرف نہیں نکلیں گے۔ آپ کے ساتھ ہی چلیں گے، جہاں تک بھی آپ لے جائیں۔ البتہ بالاخانے کا کچھ نہ کچھ انتظام کرنے میں ایک دو دن کی دیر لگے گی۔"

"موتیا بائی! تم نے پھر حیل و حجت شروع کر دی۔" میں نے غصے سے کہا۔ "تمھارے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں صرف چمپا بائی کو ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔"

"اچھا میں باجی کو تنہا آپ کے ساتھ بھیج دوں گی میاں! آپ تنگ نہ کیجیے۔ ایک بار رنڈی کی بات کا بھی اعتبار کر کے دیکھیے۔"

"بس کرو۔" میں نے چمپا بائی کی کلائی تھام لی۔ "چلو۔"

موتیا بائی رونے لگی۔ چمپا کی حالت تو پہلے ہی ابتر تھی۔ "ہم نے نیلم جان کو اپنی بیٹی بنا کے رکھا تھا۔" موتیا سسکیاں بھرتی ہوئی بولی۔ "اس کی موت کا جتنا دُکھ تمھیں ہے، اتنا ہی ہمیں بھی ہے۔"

"چمپا بائی تو اپنی بیٹی کے کفن دفن میں بھی شریک نہیں ہوئی۔ یہ کیسی ماں تھی جو اپنی بیٹی کی لاش سڑک پر چھوڑ کے چلی آئی۔ موتیا بائی! اپنی زبان بند رکھو۔ اگر اب تم نے ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو..." میں نے دوسرے ہاتھ سے چاقو نکال لیا۔

چاقو دیکھ کے موتیا کی زبان پر جیسے فالج گر گیا، وہ اپنے بال کھسوٹنے لگی۔ چمپا نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ "مجھے جانے دو موتیا!" چمپا نے اُداسی سے کہا۔ "چلو میرا سامان نکالو۔"

موتیا دھاڑتی ہوئی اپنی بہن سے لپٹ گئی۔ "میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گی۔" وہ بلکتی ہوئی بولی۔ "میں تمھیں اکیلی نہیں جانے دوں گی۔"

"میں چمپا بائی کے سوا کسی کو نہیں لے جاؤں گا۔" میں نے اپنا فیصلہ سنایا۔ "اور کان کھول کے سُن لو موتیا! اگر تم نے میرے جانے کے بعد کوئی بے وقوفی کی تو تمھاری بہن کبھی واپس نہیں آسکے گی۔ سمجھیں؟ تم اپنے حمایتیوں کو بُلانے کا حشر دیکھ ہی چکی ہو۔ جلدی کرو، چمپا بائی کا سامان نکالو۔ اندر اُن دونوں کو تمھاری ضرورت ہے۔ اگر تم نے اُن کی جلد ہی خبر نہ لی تو بالاخانے پر پولیس آ جائے گی اور تمھارا کاروبار ٹھپ ہو جائے گا۔"

موتیا نے ٹین کے ایک چھوٹے صندوق میں چمپا کا سامان بھر دیا۔ ایک مختصر بستر بھی جلد از جلد تیار کر دیا گیا۔ بستر میں چادر، تکیے اور کمبل کے سوا کچھ نہیں تھا۔ موتیا، چمپا کے کپڑوں کے لیے اندر گئی تھی تو لگے ہاتھوں نوشہ اور اُس کے ساتھی کی درگت بھی دیکھ آئی ہوگی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ بہت بوکھلائی ہوئی تھی۔ قدم رکھتی کہیں تھی، پڑتا کہیں تھا۔

باہر نکلتے وقت جب ہم اُس کمرے سے گزرے تو نوشہ کا چہرہ خون میں نہایا ہوا تھا اور اُس کا ساتھی ایک طرف بے ہوش پڑا تھا یا مر گیا تھا۔ نوشہ ابھی تک کلبلا رہا تھا۔ چمپا بائی کی سسکی نکل گئی۔ میں نے چمپا اور موتیا کو آگے کیا اور خود اُن کے پیچھے پیچھے چلا۔ دروازہ کھلا تو شوخی جان کی آواز آئی۔ سازندے سُروں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ شوخی جان ابھی تک اسی شخص کے پاس بیٹھی ہوئی سر مار رہی تھی، گا رہی تھی۔ ہم دائیں جانب کے کمرے سے نکلے۔ موتیا نے صندوق اور چمپا نے بستر سنبھال رکھا تھا۔ محفل طے کر کے سامنے کے دروازے سے جانے کے بجائے سازندوں کی نشست عبور کر کے ہم دبے قدموں سے بائیں جانب کے کمرے میں آ گئے۔ یہاں آ کے چمپا نے بُرقع اوڑھا۔ اس کمرے سے بھی ایک دروازہ زینے میں کھلتا تھا۔ اس طرح ہم تماش بینوں کی نظروں میں آنے سے بچ گئے۔ رخصت ہوتے وقت میں نے موتیا کو یہ مہلت نہیں دی کہ وہ چمپا سے کوئی بات کر سکے۔ موتیا نے اُسے ایک ٹہوکا دیا اور دونوں ایک بار پھر گلے مل کے رونے لگیں۔ "موتیا بائی! اپنی بہن کی زندگی پیاری ہے تو اس کی واپسی کا انتظار خاموشی سے کرنا۔" میں نے زینے سے اُترتے ہوئے موتیا کے کان میں دوبارہ یہ بات ڈالنی مناسب سمجھی۔

گلی میں کچھ دُور تک ہمیں پیدل چلنا پڑا، سڑک کے نکڑ پہ ہمیں ایک تانگا مل گیا۔ وہ شخص جو مجھے موتیا کے بالاخانے پر لے گیا تھا، پھر کہیں نظر نہیں آیا۔ میں نے تانگے والے کو اپنے ہوٹل کا پتہ بتایا۔ چمپا کو تنہا تانگے میں چھوڑ کے ہوٹل جانا مناسب نہیں تھا۔ میں نے اُسے بھی ساتھ لے لیا۔ ہوٹل کے لوگوں نے جب میرے ساتھ ایک بُرقع پوش عورت دیکھی تو اُن کی آنکھیں تلملانے لگیں لیکن میں نے اپنے کمرے میں آ کے بیرے کو فوراً بل لانے کی ہدایت کی۔ چمپا اس دوران میں خاموش بیٹھی رہی۔ بل ادا کرنے کے بعد اپنا مختصر سامان اُٹھا کے میں نے اسٹیشن کا رُخ کیا۔ آگرہ سٹی اسٹیشن پر جب میں چمپا کو ساتھ لیے ہوئے ٹکٹ گھر کی طرف جا رہا تھا تو چمپا نے مجھے مخاطب کیا۔ "میسور کا ٹکٹ مت لینا، ممبئی تک کا ٹکٹ لینا۔" میں ٹھٹک کے رُک گیا۔

"چمپا بائی! صحیح صحیح بتاؤ، کہاں جانا ہے؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"اور یہ بات جان لو کہ فرار کی کسی کوشش کا نتیجہ بہت ہولناک ہوگا۔ فیض آباد

میں سب کو معلوم ہے کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ جا مو کو تم اچھی طرح جانتی ہو۔ جوبات میں موتیا سے کہہ کے آیا ہوں وہی تم سے کہتا ہوں۔ موتیا بھی جان سے جائے گی۔"

"میں نے تمھیں غلط بتایا تھا، فہمیدہ مجھے بمبئی میں ملی تھی۔" چمپا کے لہجے میں اب پہلے جیسی لرزش نہیں تھی۔

"اچھا تو بمبئی چلتے ہیں، تم جہاں جہاں کہو گی میں وہاں وہاں جاؤں گا۔" میں اُس پہ نظر رکھے ہوئے ٹکٹ گھر کی طرف بڑھ گیا۔ اُس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے۔ کھڑکی سے معلوم ہوا کہ دلی سے بمبئی جانے والی گاڑی ڈیڑھ بجے آئے گی۔ آگرہ سٹی اسٹیشن پر انتظار کا یہ ڈیڑھ گھنٹہ بہت مشکل سے کٹا مگر گاڑیاں میری خواہش کے بموجب کب آتی جاتی تھیں۔ ڈیڑھ گھنٹہ بہت ہوتا ہے ڈیڑھ گھنٹے میں موتیا اپنی رائے بدل سکتی تھی۔ وہ کچھ اور غنڈے اپنی مدد کے لیے طلب کر سکتی تھی یا پولیس بلا سکتی تھی۔ چمپا کی وجہ سے میں نے فرسٹ کلاس کے دو ٹکٹ خریدے تاکہ وہ میری نظر میں زیادہ سے زیادہ رہے۔ ہم دونوں فرسٹ کلاس ویٹنگ روم میں بیٹھ گئے۔ میں نے چاقو اپنے ہاتھ میں رکھا۔ ویٹنگ روم میں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ کوئی درمیان میں آیا تو اُسے کم سے کم چمپا بائی زندہ نہیں ملے گی۔ میری بہن فہمیدہ کی رُسوائی اور موت کا یہ بہت کم خراج تھا مگر اُس کا بے غیرت مجبور بھائی یہی کچھ کر سکتا تھا۔ چمپا بائی نے نقاب چہرے سے ہٹالی تھی اور سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ میں نے فہمیدہ کے بارے میں اُس سے بہت سی باتیں معلوم کرنے اور اُسے مارنے کی حسرت جبراً دبا رکھی تھی۔ گاڑی آنے میں پندرہ منٹ کی اور تاخیر ہو گئی۔ یہ پندرہ منٹ بھی کسی نہ کسی طرح گزر گئے۔ کاش میرے پاس پٹا ہوتا جو میں چمپا کی گردن میں ڈال کے اُس کی زنجیر ہاتھ میں پکڑے رہتا۔ گاڑی آتے ہی اسٹیشن پر بڑی افراتفری مچ گئی۔ میں نے چمپا بائی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ قلی اُس کا صندوق اور بستر اُٹھائے ہوئے تھا۔ کمپارٹمنٹ میں صرف ایک مدراسی مسافر موجود تھا۔ پڑھا لکھا شخص معلوم ہوتا تھا۔ اُردو بہت کم جانتا تھا۔ اُس نے خندہ پیشانی سے ہمیں آمنے سامنے والی سیٹ دے دی اور خود اُوپر کی برتھ پر سونے کے لیے چلا گیا۔ میں نے چمپا بائی کو اشارہ کیا کہ وہ بستر بچھا کے آرام کرے۔ چمپا بائی دیر تک سیٹ پر بیٹھی رہی، میں بھی بیٹھا رہا۔ "تم بھی سو جاؤ۔ میری طرف سے اطمینان رکھو۔" اُس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"مجھے نیند نہیں آ رہی ہے، سفر لمبا ہے چمپا بائی! سو جاؤ۔"

وہ ایک دو گھنٹے تک کھڑکی کی طرف منہ کیے ایک پہلو سے بیٹھی رہی پھر تھک کے برتھ پر لیٹ گئی۔ گاڑی مختصر وقفوں کے لیے مختلف اسٹیشنوں پر رُکتی رہی۔ میں تمام رات جاگتا رہا، چمپا بائی مل گئی تھی۔ وہ میرے اُجڑے ہوئے گھر کی طرف جانے والا راستہ تھی۔ میری آنکھوں میں ابا امی کے چہرے گھبے ہوئے تھے۔ کفن میں رکھا ہوا فہمیدہ کا چہرہ بار بار سامنے آجاتا تھا۔ چمپا بائی کی آنکھیں بند تھیں۔ میرے ہاتھ بار بار اُس کی گردن کی طرف اُٹھتے تھے اور رہ جاتے تھے۔ نہ معلوم ابا جان کیسے ہوں، امی کی موت اور فہمیدہ کی جدائی نے اُن کی کمر توڑ دی ہوگی۔ بس میں ایک بار وہاں پہنچ جاؤں، اُن کے پیروں پہ گر جاؤں گا اور بہن بھائیوں سے کہوں گا کہ وہ جب تک میرے منہ پہ نہیں تھوکیں گے، سکون نہیں آئے گا۔

گاڑی آگرے سے بہت دُور آ چکی تھی۔ کھڑکیوں کے شیشے دُھندلے ہو گئے تھے۔ میں نے انھیں صاف کر کے باہر دیکھا۔ سورج نکل چکا تھا۔ چمپا بائی بھی اُٹھ کے بیٹھ گئی تھی۔ نیند اُسے بھی نہیں آئی تھی۔ اُوپر مدراسی گہری نیند سو رہا تھا۔ صبح بھوپال کے اسٹیشن پر پوری ترکاری لے کے چمپا کے آگے رکھ دی۔ وہ ناشتہ کرتے ہوئے جھجکی۔ "تم نہیں کرو گے؟" آہستہ سے پوچھا۔

"نہیں مجھے کوئی خواہش نہیں ہے۔"

"مجھے بھی نہیں ہے۔"

"تھوڑا سا کھا لو، چائے پیو گی؟"

"ہاں ضرور چائے پلوا دو۔" اُس نے بوجھل آواز میں کہا۔

میں نے چائے والے کو آواز دی۔ گاڑی کے ساتھ چلنے والا بھی سامنے آ گیا۔ میں نے اُس سے ایک ٹرے لے کے چمپا کو دے دی۔ "تم چائے پیو گے؟" اُس نے کیتلی میں چینی کا ایک چمچہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔ میں فوراً کوئی جواب نہیں دے سکا۔ جی میں آیا کہہ دوں ہاں لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے خود کو سرزنش کی۔ "میں ابھی چائے نہیں پیوں گا۔" میں نے مختصر جواب دیا اور کھڑکی میں گردن ڈال کے پلیٹ فارم پر نظر ڈالنے لگا۔ اچانک میں اپنی سیٹ پر اچھل گیا۔ کچھ دُور ایک فرلانگ سے بھی کم فاصلے پر مولوی صاحب جیسی صورت کا ایک شخص ٹی اسٹال پر کھڑا تھا۔ وہی قد، وہی شیروانی۔ میں بے چین ہو گیا۔ چمپا بائی کی طرف دیکھا، وہ چائے پی رہی تھی۔ دروازہ کھول کے میں نے پلیٹ فارم پر بھاگنا شروع کر دیا۔ کئی مسافروں سے میں گرتے گرتے بچے لیکن میرے قدم کچھ فاصلے پر جا کے منجمد ہو گئے۔ وہ مولوی صاحب کی شکل و صورت کا کوئی شخص نظر آتا تھا مگر قریب سے اتنا مختلف تھا کہ مجھے اپنے آپ سے ندامت ہوئی۔ بھلا مجھے مولوی کورا کی صورت کیوں نظر آتی۔ میں تھکے ہوئے قدموں سے واپس آنے لگا۔ تک پہنچنے کی کچھ نہ کچھ سبیل پیدا ہو گئی تھی مگر کورا نہ جانے کہاں کس سمت رہتی تھی۔ مجھے ہر سمت اُس کی آہٹ، اُس کی خوشبو محسوس ہوتی تھی۔ آگے بدھ بھکشوؤں کو دیکھ کے ایک موہوم سی اُمید پیدا ہوئی تھی۔ شاید انھیں ہی غائب ہونے والی لڑکی کورا کا علم ہو مگر موتیا کے بالا خانے پر پیش حالات کا کچھ اندازہ نہیں تھا۔ کورا کی فکر کرتا تو چمپا بائی پھر ہاتھ نہ آتی۔ کہتی تھی کہ اُس نے فہمیدہ کو میسور سے حاصل کیا ہے، اب بمبئی کی طرف تھی۔ چمپا کی بات اور ارادے کا کیا بھروسا تھا۔ یک بارگی مجھے گمان ہوا کہ میری غیر حاضری سے فائدہ نہ اُٹھا لیا ہو۔ میں دوڑ کے ڈبے میں داخل ہو گیا۔ میری سانس قابو میں آئی۔ چمپا بائی اپنی جگہ بیٹھی ہوئی تھی۔ گاڑی بھوپال اسٹیشن سے روانہ ہوئی تو چمپا بائی اپنی سیٹ سے اُٹھ کے میرے برابر آ گئی۔ پہلے یوں ہی کبھی کھڑکی میں جھانکتی، کبھی میری صورت تکتی رہی، پھر آہستگی سے اُس نے مجھے مخاطب کیا۔ "اگر تمھیں یہ ڈر ہے کہ میں کہیں بھاگ جاؤں گی تو یہ بات دل سے نکال دو۔ میں تمھارے ساتھ ہی چل رہی ہوں۔"

"تم اپنے حق میں بہتری کر رہی ہو۔" میں نے ترشی سے کہا۔ "تمھیں یا تمھاری بد زبان بہن کو ڈھونڈنا میرے لیے اتنا مشکل نہیں ہوگا۔"

وہ چپ ہو گئی۔ گاڑی چلتی رہی، پھر وہ کچھ دیر بعد مجھے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "فہمیدہ تمھاری کون ہوتی تھی؟ وہ تمھیں دیکھ کے کیوں کود گئی تھی؟"

"میری شکل ہی ایسی ہے۔" میں نے آہ بھر کے کہا۔

"نہیں یہ بات تو نہیں ہے، ماشاءاللہ تم لاکھوں میں ایک ہو، نوجوان ہو، وجیہہ ہو۔ اگر تم مناسب سمجھتے ہو تو مجھے بتا دو، کم از کم یہ خیال کر کے کہ فہمیدہ سے میرا بھی کچھ تعلق رہا ہے۔"

"یہی تو دکھ ہے کہ فہمیدہ سے تمھارا تعلق کیوں رہا ہے چمپا بائی! تمھاری زبان پر اُس کا نام کیوں آتا ہے۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"میاں، ہم بھی تو آخر انسان ہیں، قسمت قسمت کی بات ہے، کون چاہتا ہے کہ وہ محفل سجائے، لوگوں کی نگاہوں میں تماشا بنے، ہم سے اتنی نفرت مت کرو، ہمارے سینے میں بھی دل ہوتا ہے۔"

"مجھے شبہ ہے، مجھے شبہ ہے چمپا بائی کہ تمھارے سینے میں بھی دل ہوتا ہے۔ تم فہمیدہ جیسی لڑکی کو لے آئیں، فہمیدہ جس نے اپنے گھر کے مردوں کے سوا کسی کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔"

"تم سچ کہتے ہو۔" وہ یاسیت سے بولی۔ "وہ اتنی ہی اچھی لڑکی تھی۔ مجھے بھی یہ دُنیا دیکھتے اور یہ کاروبار کرتے ہوئے ایک عمر گزر گئی ہے، میں نے اُس جیسی لڑکی نہیں دیکھی۔ میں تم سے قسم کھا کے کہتی ہوں کہ فہمیدہ کوٹھے پر آ کے بھی اتنی ہی پاک باز تھی جتنی اپنے گھر میں ہو گی، بڑے بڑے نوابوں رئیسوں نے پیش کش کی لیکن اُس نے سب کو ٹھکرا دیا۔ وہ بس ناچتی گاتی تھی، میں نے بھی اُسے نہیں چھیڑا۔ بہت دنوں بعد تو وہ ناچنے گانے پر آمادہ ہوئی تھی۔ میاں! میں تمھیں خوش رکھنے یا تمھاری خوشامد کے لیے فہمیدہ کی اچھائیاں نہیں کر رہی ہوں۔"

"تم مجھے کیا یقین دلانا چاہتی ہو؟" میں نے اُداسی سے کہا۔ "یہ کیا کم ہے کہ وہ کوٹھے پر بیٹھتی تھی، یہ کیا کم ہے چمپا بائی!"

"میاں! میں اگر اُسے نہ لے آتی تو مجھ جیسی کوئی اور لے جاتی۔ وہ ایک لڑکا کے قبضے میں پہنچ گئی تھی، وہاں سے واپسی نہیں ہوتی، وہاں سے لڑکیاں اپنے گھر واپس جانے کا راستہ بھول جاتی ہیں۔ انھیں یاد بھی رہتا ہے تو غیرت اُن کے پیروں میں زنجیر ڈال دیتی ہے۔ فہمیدہ واپس نہیں جا سکتی تھی، میں نے تو اُسے بالکل اپنی بیٹیوں کی طرح رکھا۔"

"بس چمپا بائی! بس کرو، مجھ پہ یہ احسان اور کرو کہ مجھے فہمیدہ کے گھر کا پتہ بتا دو۔ تم نہیں جانتیں تو مجھے اُن لوگوں سے ملا دو جن سے تم نے فہمیدہ کو حاصل کیا تھا۔ مجھے کچھ اور غرض نہیں، میں کچھ اور سُننا نہیں چاہتا۔"

"میاں! میں تمھارا دُکھ محسوس کر رہی ہوں مگر مجھے تم نے بتایا نہیں کہ تم فہمیدہ کے کون ہوتے ہو؟" وہ بے تابی سے بولی۔

"یہ ذکر چھوڑو چمپا بائی۔" میں نے اپنا منہ چھپا لیا کہ کہیں چمپا مجھے نہ بچوں کی طرح بلک بلک نہ دیکھ لے۔ اُوپر سے مدراسی بابو اُٹھ کے آ گیا تھا۔ انگریزی میں پوچھنے لگا، بھوپال گزر گیا یا نہیں؟ میں نے چمپا کے سامنے انگریزی بولنے سے گریز کیا، آگے نہ معلوم کیسے واقعات پیش آئیں۔ میں نے مدراسی کو اُردو میں جواب دیا کہ بھوپال گزرے دیر ہو گئی ہے، اب گاڑی وندھیاچل کے طویل پہاڑی سلسلے سے گزر رہی ہے۔ اُس کی آنکھوں سے حیرانی جھلکنے لگی، وہ سوچ رہا ہو گا یہ کیسے لوگ ہیں جن کا سامان تھرڈ کلاس کے مسافروں کا سا ہے، انگریزی میں بات کرنا بھی نہیں جانتے۔ منہ ہاتھ دھو کے وہ فارغ ہوا تو سامنے کی نشست پر آ کر بیٹھ گیا اور ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں ہماری منزل کا پتہ پوچھنے لگا، وہ بھی بمبئی جا رہا تھا۔ کہنے لگا یہ عورت تمھاری سسٹر ہے کہ مدر؟ چمپا بھی سمجھ گئی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ مجھے جواب دینے میں ہچکچاہٹ ہوئی۔ وہ بہت جھکی آدمی تھا، سمجھا کہ میں اُس کا سوال نہیں سمجھا ہوں۔ میں نے کہا یہ میری عزیزہ ہے۔ میں نے غلط بھی نہیں کہا تھا، وہ فہمیدہ کے رشتے سے میری بھی عزیز ہوتی تھی، فہمیدہ کو اُس نے اپنی بیٹی بنایا تھا اور میں کبھی فہمیدہ کا بھائی کہلاتا تھا۔

ناگپور کے اسٹیشن پر قریب ہی کسی جگہ اُترنے والا ایک اور مسافر ڈبے میں سوار ہو گیا اور تھوڑی دیر میں مدراسی شخص سے گھل مل گیا۔ وہ دونوں انگریزی میں بات کر رہے تھے۔ میرا خیال درست نکلا۔ مدراسی شخص نووارد مسافر سے اپنے شک کا اظہار کر رہا تھا کہ ہمارے پاس فرسٹ کلاس کا ٹکٹ بھی ہے یا نہیں۔ اُن کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ مدراسی شخص مدراس میں پولیس کا کوئی بہت بڑا افسر ہے۔ آنے والا شخص بھی حکومت کے محکمۂ جنگلات کا بڑا افسر تھا۔ وہ دونوں چونکہ ہمارے بارے میں تخمینے لگا رہے تھے اس لیے بار بار ہماری جانب اُن کی نگاہیں اُٹھ جاتی تھیں۔ چمپا بائی اُداس بیٹھی تھی۔ شاید مدراسی افسر نے میرے اور چمپا کے درمیان ہونے والی گفتگو کی سُن گُن لے لی تھی۔ وہ پولیس افسر تھا۔ کان کھڑے رکھتا ہو گا۔ گاڑی کے شور میں اُوپر آواز پہنچنا حیرت کی بات تھی۔ مجھے بہت غصہ آیا کہ نئے مسافر کے آنے سے پہلے مدراسی مجھ سے کیسی قربت کی باتیں کر رہا تھا۔ جیل میں ایک ہی جیسے لوگ رہتے ہیں مگر جیل کے باہر کی دُنیا کے لوگ ایک دوسرے سے کتنے مختلف ہوتے ہیں، خواہ مخواہ دوسروں کے معاملے میں ٹانگ اڑاتے ہیں، نووارد

شخص نے اُس سے وعدہ کیا کہ وہ اگلے اسٹیشن پہ اُتر کے متعلقہ ٹکٹ چیکر کو ڈبّے میں بھیج دے گا۔ پھر اصل بات خود بخود سامنے آ جائے گی میرے کان کھڑے ہوئے اگر چمپا کو کہیں یہ معلوم ہو جائے کہ پولیس کا ایک افسر اُس کے ساتھ سفر کر رہا ہے تو وہ کسی بھی لمحے بدل سکتی ہے، مدراسی افسر عورت کی بات سُنے گا، چمپا اُسے بہت بہکا سکتی ہے اور میرے بارے میں مبالغوں کا پٹارا کھول سکتی ہے اور کچھ نہیں ہو گا تو میرے قدم اور اُلجھ جائیں گے اور اگر کسی کو یہ معلوم ہو گیا کہ میں ہی وہ شخص ہوں جس نے کلکتے کی جیل میں سات سال گزارے ہیں تو کسی کو بھی میری بات کی صداقت پر یقین نہیں آئے گا اور میں بات بھی کہاں کر سکوں گا۔ کیا میں پولیس کو یہ بیان دوں گا کہ میں چمپا کو اس لیے ساتھ لیے جا رہا تھا کہ وہ میرے گھر کا پتہ جانتی ہے جو میں خود نہیں جانتا۔ بہتر یہی تھا کہ کسی نہ کسی طرح جلد سے جلد یہ ڈبّا چھوڑ دیا جائے مگر اس طرح مدراسی شخص کو مجھ پہ اور شبہ ہو جاتا۔ اب تک وہ مسافرت کی مروّت کر رہا تھا۔

نووارد شخص اگلے اسٹیشن پہ اُتر کے ٹکٹ چیکر کو بھیجنا نہیں بھولا۔ میں نے بھی یہی سوچا تھا کہ ٹکٹ چیکر کے آنے کے بعد مدراسی افسر مجھ سے کسی قدر مطمئن ہو جائے گا۔ پھر میں کوئی بہانہ کر کے دوسرے ڈبّے میں چلا جاؤں گا یا پھر کوئی بھی بات نہ بنی تو زریں کا دیا ہوا چاقو تو میرے پاس موجود ہی ہے۔ بات ختم کر کے چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دوں گا اور وندھیاچل کی پہاڑیوں میں گم ہو جاؤں گا۔ میں نے بہت سے منصوبے ذہن میں باندھ لیے۔

ٹکٹ چیکر نے استہزائی انداز میں ہم سے ٹکٹ دکھانے کا مطالبہ کیا۔ میں نے جان بوجھ کے بے نیازی اختیار کی، ٹکٹ جیب سے نکالنے میں دیر کی۔ مدراسی افسر مسکرانے لگا۔ جی میں آیا چاقو سے اُس کے موٹے سیاہ ہونٹ تراش لوں۔ ٹکٹ دیکھنے کے بعد ٹکٹ چیکر اور مدراسی دونوں کو مایوسی ہوئی۔ "کیا آپ ہی کے پاس سے نکالے گئے ہیں؟" ٹکٹ چیکر نے انگریزی میں پوچھا۔

"وہ جنگلات کے افسر ہیں۔" مدراسی نے کہا۔

"ہاں جی! آپ کو ان مسافروں سے کچھ پریشانی ہوئی جناب؟"

"نہیں۔" مدراسی نے تیزی سے کہا۔ "اصل میں ہم دونوں کو غلط فہمی ہو گئی تھی کہ یہ لوگ ٹکٹ کے بغیر سفر کر رہے ہیں۔"

"یقیناً جناب۔" ٹکٹ چیکر نے ہمیں سر تا پا گھورتے ہوئے خوشامدانہ انداز میں کہا۔ "آپ کا شبہ درست تھا مگر صاحب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب تو دُھنے، چمار، تیلی، کمہار جس کے پاس چار پیسے ہیں، اُس کا بول بالا ہے۔ سب بھگوان کی لیلا ہے۔ جناب کدھر جا رہے ہیں؟" مدراسی نے اُسے بتایا کہ وہ بمبئی جا رہا ہے لیکن میں نے محسوس کیا کہ ٹکٹ چیکر سے باتیں کرتے کرتے وہ ہماری طرف دیکھ کے کچھ متجسس سا ہو جاتا ہے۔ غالباً اُس نے میری اور چمپا کی باتیں سُن لی تھیں۔ اُس نے اچانک اپنی اندرونی جیب سے ایک کارڈ نکالا اور اُسے چپکے سے ٹکٹ چیکر کو دکھایا۔ ٹکٹ چیکر کے چہرے پہ عاجزی اور گہری ہو گئی۔

"جناب! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" اُس نے گردن جھکا کے کہا۔

"کیا تم ان کے سامان کی تلاشی لے سکتے ہو؟" مدراسی نے کہا۔

ٹکٹ چیکر ہچر مچر کرنے لگا کہ یہ اُس کا کام نہیں ہے، یہ تو ریلوے پولیس ہی کر سکتی ہے۔

"آپ کو ان پر کس قسم کا شبہ ہے صاحب؟" اُس نے تشویش سے پوچھا۔

"میری پوری زندگی پولیس میں گزری ہے۔" مدراسی نے غرور سے کہا۔

"ضرور جناب! آپ تو اُڑتی چڑیا پہچان لیتے ہوں گے۔" ٹکٹ چیکر رشتہ خلقی ہو کے بولا۔ "اب تو مجھے بھی یہ معاملہ خاصا دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔"

"بہرحال ابھی سفر طویل ہے، دیکھو کیا ہوتا ہے۔"

"کاش میں آپ کے ساتھ بمبئی تک سفر کر رہا ہوتا۔" ٹکٹ چیکر سے بولا۔ "میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے ان کے متعلق کیا رائے قائم کی۔"

"میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ایک پولیس افسر کو پہلے پوری تفتیش کرنی چاہیے، اس کے بعد ہی اپنی رائے کا اظہار کرنا چاہیے۔"

"بے شک جناب! کیا اچھی بات کہی ہے لیکن آپ نے کسی بنا پر ہی تفتیش شروع کی ہو گی۔" ٹکٹ چیکر دبے لہجے میں بولا۔

"تمھیں پولیس میں ہونا چاہیے تھا۔" مدراسی ادھیڑ عمر ٹکٹ چیکر کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ "شک کی بہت سی وجوہ ہیں۔ لڑکا صورت شکل سے خاندانی معلوم ہوتا ہے لیکن بے حد اکھڑ ہے۔ عورت کی آنکھ عام عورتوں کی سی ہے۔ دونوں میں کوئی تعلق بھی معلوم نہیں ہوتا۔ دونوں ایک دوسرے سے کھنچے ہیں۔ عورت کا لباس بھڑکیلا ہے، لڑکے کا بے حد سادہ۔ لڑکا بہت پریشان ہے، بیٹھے بیٹھے چونک پڑتا ہے، حیران نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہے جیسے کوئی چیز کھو گئی ہے۔ عورت بھی کھوئی ہوئی ہے مگر کچھ خوف زدہ ہے، لڑکے کے پاس صرف ایک تھیلا ہے۔ عورت کے پاس ٹین کا ایک بکس ہے اور چھوٹا سا بستر ہے، اتنے طویل سفر میں یہ مختصر سامان۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انھوں نے بہت عجلت میں سفر کا ارادہ کیا ہو۔ فرسٹ کلاس کے مسافروں میں جو شائستگی، متانت اور رکھ رکھاؤ آپس میں عموماً ہوتا ہے، وہ ان میں نہیں ہے۔ جب لڑکا اس عورت کے ساتھ ڈبّے میں داخل ہوا تھا تو میں نے اُس کے ہاتھ میں دبی ہوئی ایک چیز دیکھی تھی۔ وہ چیز چاقو کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتی۔ سفر میں چاقو رکھنا ایسی معیوب بات نہیں مگر جس چابک دستی سے لڑکا اُسے اپنے ہاتھ میں چھپائے ہوئے تھا، وہ کوئی ایسا شخص ہی پہچان سکتا ہے جس کی عمر میری طرح پولیس میں گزری ہو۔"

"غلط جناب غلط۔" ٹکٹ چیکر کا سر تیزی سے ہلنے لگا۔ "پولیس میں ہزاروں آدمی ہوتے ہیں، پر کیسے کہ اُس کی نظر بھی آپ جیسی ہو۔ میں حیرت زدہ ہوں صاحب!"

"اور بہت سی باتیں ہیں، اگر ان کا تجزیہ کیا جائے۔"

"اب آپ کا اگلا قدم کیا ہو گا جناب؟" ٹکٹ چیکر اشتیاق سے بولا۔

"میں ابھی کچھ اور تجزیہ کرنا چاہتا ہوں۔ لڑکا ایک لمحے کے لیے بھی عورت کے پاس سے نہیں ٹلتا۔ میں کوشش کروں گا کہ عورت کو گفتگو پر آمادہ کر سکوں۔"

"سفر میں بھی آپ گویا ڈیوٹی پر ہیں، خوب صاحب خوب! اسٹیشن آ رہا ہے، جی تو نہیں چاہتا مگر مجھے بھی ڈیوٹی کے لیے اُترنا ہو گا۔ جب تک ساتھ ہوں یہاں آتا رہوں گا، آپ کو کسی قسم کی تکلیف ہو تو بے تکلف کہیے گا۔" ٹکٹ چیکر نیازمندی سے بولا۔ مدراسی افسر نے اُسے اپنا کارڈ دیا اور کہا کہ ایک اہم مشن پر اُس کا تقرر کچھ دنوں کے لیے بمبئی ہو گیا ہے، اگر اُس کا کبھی مدراس سے ہو تو وہ ضرور ملے۔ دونوں میں بڑی محبت کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں گونگے اور بہرے کی طرح سُنتا رہا۔ مدراسی افسر نے ٹکٹ چیکر سے میرے اور چمپا کے بارے میں جو باتیں کی تھیں، اُن کا مجھے خود اندازہ نہیں تھا۔ آنے والے لمحوں میں وہ کوئی بھی ارادہ کر سکتا تھا۔ مجھے اسی ڈبّے میں سوار ہونا رہ گیا تھا۔ بظاہر تمام باتوں سے بے خبر کبھی گردن جھکائے، کبھی کھڑکی سے باہر بھاگتی ریل دیکھتے ہوئے اُن کی باتیں سُنتا رہا۔ ٹکٹ چیکر جانے والا تھا۔ مدراسی افسر کی توجہ پھر ہماری طرف مبذول ہو جائے گی اور اگر مجھ سے یا چمپا سے کوئی غلطی ہو گئی تو اُس کا شبہ اور توانا ہو جائے گا۔ اب اپنی اس کوتاہی پر پشیمان ہونے سے کیا ہو سکتا تھا کہ میں نے مدراسی افسر سے انگریزی کیوں نہیں بولی۔ میرا دماغ خراب ہو گیا تھا، چمپا بھی یہی کہتا تھا مگر میں کیا کروں، جب مجھے اُس کی یاد آتی ہے اور گھر یاد آتا ہے تو کچھ خیال ہی نہیں رہتا۔

اس موقع پہ ڈبّا بدلنا مناسب نہیں تھا۔ ٹکٹ چیکر چلا گیا تو میں نے اُس سے کچھ پھل خریدے اور چمپا کو تھما دیے کہ وہ انھیں کاٹ دے۔ ساتھ ہی میں نے چائے منگوائی۔ چمپا نفاست سے امرود اور سیب کی قاشیں بنانے لگی۔ مجھے لیں اُسے دیر ہو رہی تھی۔ میں نے جیب سے اپنا چاقو نکال لیا اور چمپا کو تھمانے لگا اور دانستہ مدراسی افسر کا چہرہ نہیں دیکھا۔ جانے والے بیرے کو بیسٹ کر کے میں نے چمپا کے لیے پان بھی منگو لیے۔ پھر میں نے مدراسی مسافر سے اصرار کیا کہ وہ ہمارے ساتھ چائے پیے۔ اُس کی آنکھوں کی چمک کچھ اور بڑھ گئی۔ میری دعوت پر وہ بہت جز بز ہوا۔ پہلے اُس نے انکار کیا مگر میرے اصرار پر بلند ہو گیا۔ میں اُس کی برتھ پہ پڑے لے کے چلا گیا۔ چمپا نے اُسے چائے دی۔ اُس کے چہرے پہ کچھ ہی دیر بعد شگفتگی کے آثار نمایاں ہوئے۔ "تمھارا ذوق بہت اچھا ہے۔" اُس نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"میرے استاد نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ سفر میں ہمیشہ چاقو اپنے ساتھ رکھنا، بڑا ضرور ہو کہ آدمی مر سکے۔" میں نے مضبوط آواز میں جواب دیا۔

وہ مسکرانے لگا اور نرمی سے پوچھا۔ "تم کیا کام کرتے ہو؟"

"فی الحال تو آوارہ گردی کرتا ہوں۔"

وہ ہنسنے لگا۔ "آوارہ گردی کی بھی کئی قسمیں ہیں۔"

"چاقو بازی، مکّا بازی، لٹھ بازی، ہر قسم کے داؤ پیچ اور سارے زمانے کا گشت، کبھی اِدھر جاتا ہوں کبھی اُدھر جاتا ہوں۔"

"اور کہیں سکون نہیں ملتا۔ دلچسپ نوجوان ہو۔"

"آپ سچ کہتے ہیں۔" میں نے اداسی سے کہا۔

"بہت دکھی معلوم ہوتے ہو، اصل وطن کہاں ہے؟"

"اب تو کہیں بھی نہیں، کبھی ہوا کرتا تھا۔"

"کچھ پڑھا لکھا نہیں؟" اُس کے لہجے میں طنز تھا۔

"تھوڑا بہت پڑھا لکھا تھا۔" میں نے مایوسی سے جواب دیا۔

"پھر کیا ہوا—؟"

"سب بھول گیا۔"

"مناسب سمجھو تو اپنے بارے میں بتاؤ، سفر بھی خاصا طویل ہے، شاید میں تمھارے کسی کام آ سکوں۔ مجھے نوجوانوں کی مدد کر کے خوشی ہوتی ہے۔"

"کیا سُنیں گے آپ۔" میرے منہ سے آہ نکل گئی۔ "لمبی کہانی ہے، سفر ختم ہو جائے گا، کہانی ادھوری رہ جائے گی۔" میں نے بات پلٹ کے کہا۔ "آپ بتائیے، مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی اوٹ پٹانگ باتیں لے کے بیٹھ گیا، آپ اپنے بارے میں کچھ بتائیے۔"

"میری باتیں اتنی دلچسپ نہیں ہیں، اپنی سناؤ، تم مجھے کسی زمیں دار کے بیٹے معلوم ہوتے ہو۔" وہ امرود کی قاش منہ میں رکھتے ہوئے بولا۔

"اب تو میں خود اپنا بیٹا، اپنا باپ ہوں، زمین پر بوجھ ہوں۔"

"کچھ بتانا نہیں چاہتے۔" وہ مہذب انداز میں بولا۔

"کیا بتاؤں — دہراتے ہوئے اُلجھن ہوتی ہے۔"

"بمبئی کسی کام سے جا رہے ہو؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ایک شخص کی تلاش ہے، سُنا ہے بمبئی میں رہتا ہے، کچھ خاندانی معاملہ ہے۔ جب معلوم ہوا تو جیسے کھڑے تھے، تیار ہو گئے۔ سفر کی تیاری بھی نہ کر سکے۔" میں نے نجی اور خاندانی معاملہ بتا کے بات ختم کرنے کی کوشش کی۔ مجھے یقین تھا کہ مدراسی افسر کے ذہن کا غبار کچھ دُور ہوا ہو گا۔ یقیناً تجسس بھی سوا ہوا ہو گا مگر تجسس کا رُخ بدل جانا چاہیے تھا۔

میں اُسے یہ بتانا چاہتا تھا کہ مجھے بھی باتیں کرنا آتی ہیں لیکن کوئی شخص جب بات نہیں کرنا چاہتا تو اُسے بات کرنے پر کیوں آمادہ کیا جاتا ہے، کوئی چپ ہے تو اُس پہ شک نہ کیا جائے، کوئی چپ ہے تو اُس کے بہت سے سبب ہو سکتے ہیں، کوئی چپ ہے تو وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہے، اُسے تنگ کیوں کرتے ہو۔ ٹکٹ چیکر دو تین اسٹیشن بعد خیر خبر لینے آیا اور مجھے اُس کے ساتھ گفتگو میں مصروف دیکھ کے سر ہلاتا ہوا چلا گیا، تاہم تب تک مدراسی کے لب و لہجہ میں خاصی تبدیلی آ گئی تھی۔ گو مجھ میں اُس کی دلچسپی ختم نہیں ہوئی تھی۔ میں نے پھر بھی اُس سے انگریزی میں بات نہیں کی۔ وہ اٹک اٹک کر اردو میں نہایت سنبھل سنبھل

کے بات کر رہا تھا، شام کے وقت میں نے اپنا تھیلا اُس کے سامنے کھول کے ٹٹولنا شروع کیا، مقصد صرف یہ تھا کہ وہ یہ دیکھ لے، کوئی مشکوک چیز تھیلے میں نہیں ہے۔ زرّیں نے اس میں سامان رکھا تھا۔ میں نے کسی جگہ پڑھا تھا کہ سفر کی رفاقت کا ایک دن عام دنوں کی رفاقت کے سو دن کے برابر ہوتا ہے۔ میرے رسوخ سے چمپا کے چہرے پہ شادابی آگئی تھی، اس کے باوجود مجھے اطمینان نہیں تھا۔ ایسے عالم میں جب اعصاب میں کیڑے رینگ رہے ہوں اور دماغ پھٹا جا رہا ہو، فہمیدہ کے مجرموں اور آبا جان سے ملنے کے تصور سے دل ہول رہا ہو، ایسی باتیں کرنی پڑیں، فہمیدہ کے پیروں میں گھنگرو باندھنے والی عورت چمپا کی خاطر داری کرنا پڑے، ایک اجنبی مسافر سے غیر ضروری راہ و رسم رکھنا پڑے، مگر ٹھیک ہے، سات سال جیل خانے میں بھی تو گزرے ہیں، جب سے گھر سے قدم نکالا ہے یہی ہو رہا ہے۔ ساری دنیا یہی چاہتی ہے کہ آدمی چپ رہے، چاہے جھوٹ بولتا رہے، کیا معلوم اور کہاں کہاں جانا پڑے اور کیا کیا کرنا پڑے۔

چمپا نے پورے دن ضبط و تحمل کا ثبوت دیا تھا جب کہ وہ کسی وقت بھی ہنٹا کھڑا کر سکتی تھی، میری باتوں سے وہ بھی متاثر معلوم ہوتی تھی۔ مدراسی بہت تیز آدمی تھا۔ سامنے جو کچھ ظاہر کر رہا تھا، کیا خبر اندر بھی وہی سمجھ رہا ہو۔ رات تک کوئی مسافر ڈبے میں نہیں آیا۔ رات کا کھانا مدراسی نے ہمیں اپنی طرف سے کھلایا تب مجھے کچھ سکون آیا۔

کھانے کے بعد وہ مدراس اور دلی کے کھانوں کے بارے میں اپنے ساتھ پیش آنے والے دلچسپ واقعات سنانے لگا اور اُس نے مجھے دعوت دی کہ میں بمبئی میں اُس سے ضرور ملاقات کروں۔ اُس کا نام راج کرشنا تھا۔ آخر وقت تک اُس نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ وہ پولیس کا افسر ہے اور اسی بات سے مجھے تشویش ہوتی تھی۔ شاید اُس نے اس کا اظہار ناموزوں سمجھا ہو کیونکہ بات چیت بے تکلفی کی حد میں داخل ہو گئی تھی، جہاں افسری برتری کا ذکر مناسب نہیں ہوتا۔

صرف ایک رات درمیان میں باقی رہ گئی تھی۔ علی الصباح گاڑی شہر بمبئی کی سرحدوں میں داخل ہو جائے گی۔ بمبئی شہر قریب آ رہا تھا اور میرے خون کی گردش تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ممکن ہے آبا جان بھی بمبئی میں رہتے ہوں۔ جب وہ مجھے دیکھیں گے تو اُن کا کیا حال ہوگا۔ دھتکار دیں گے یا گلے لگا لیں گے، پہچانیں گے بھی یا نہیں؟ فہمیدہ نے تو انھیں وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا ہوگا۔ کیا آفت آئی تھی کہ اچھا خاصا گھر چھوڑ دیا۔ میں چلا گیا تھا تو کون سی قیامت آگئی تھی، لوگ اچانک مر بھی تو جاتے ہیں۔ سمجھ لیتے کہ میں مر گیا ہوں، آخر میں نے بھی تو اُن کے لیے یہی سوچا تھا۔

برا برتن سمیٹ کے جا چکا تھا۔ مدراسی مسافر راج کرشنا پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔ گاڑی کسی اسٹیشن پر ٹھہری اور چھوٹنے ہی والی تھی کہ ایک مسافر بھاگتا ہوا آیا۔ اُس نے ایک نظر ہم لوگوں پر ڈالی اور اجازت طلب انداز میں جھجکتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ "معاف کیجیے، مجھے قریب ہی اُتر جانا ہے" اُس نے لجاجت سے کہا۔

"ضرور ضرور، آئیے بیٹھیے۔" راج کرشنا فراخ دلی سے بولا۔ مسافر کے ایک جانب بیٹھ گیا۔ اُس کے ہاتھ میں صرف ایک چرمی تھیلا تھا۔ عمر کوئی ۳۵، ۳۶ سال، مانگ سلیقے سے نکلی ہوئی، انگریزی لباس پہنے ہوئے، رنگ سرمئی۔

راج کرشنا معذرت کر کے سونے کے لیے اُوپر کی برتھ پر چلا گیا۔ نووارد مسافر نے اصرار کر کے مجھے بھی لٹا دیا۔ میں نے پیر سکیڑ لیے، وہ کھسک کر بیٹھا تھا۔ اُوپر کی ایک اور برتھ خالی تھی مگر وہ سونے پہ آمادہ نہیں ہوا۔ سامنے کی سیٹ پر چمپا اپنے جسم پر چادر ڈال کے لیٹ گئی تھی۔

رات گہری ہوتی جا رہی تھی، نووارد شخص نے کمپارٹمنٹ کا دروازہ کیا اور ہم لوگوں سے روشنی بند کرنے کی اجازت چاہی۔ مدراسی ابھی جاگ رہا تھا۔ اُس نے اس زحمت پر اُس کا شکریہ ادا کیا۔ نئے مسافر نے بتی گل کر دی۔ کمپارٹمنٹ میں اب ایک ہلکا بلب روشن تھا اور گاڑی تیزی سے بھاگ رہی تھی، ہچکولے لے رہی تھی۔ راج کرشنا کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے بعد ایک کروٹ ساکت ہو گیا۔ چمپا بائی نے ساڑھی کے پلّو سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا تھا، اس لیے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ سو رہی ہے یا جاگ رہی ہے۔ نووارد کسی گہری سوچ میں گم تھا، پھر وہ پشت سے سر ٹکا کے اونگھنے لگا۔ میری آنکھوں سے نیند کوسوں دُور تھی، کل بھی ایک پل کے لیے آنکھ نہیں لگی تھی۔ کچھ دیر کے لیے میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

بمبئی قریب آ رہا تھا، میرے پائنتی بیٹھے ہوئے مسافر کو آئے ہوئے بہت دیر ہو گئی تھی۔ دفعتہً مجھے کچھ کھٹکا ہوا۔ میں نے لیٹے لیٹے نیم باز آنکھ سے دیکھا، مسافر نے دروازے کے قریب جا کے آہستہ سے کھڑکی کا شیشہ اٹھایا، باہر جھانکا، پھر گھڑی دیکھی اور ایک گہری سانس لے کے اپنی جگہ آ کے بیٹھ گیا۔ میں سمجھا شاید اُس کی منزل آنے والی ہے۔ مسافر چند لمحے ساکت و صامت رہا۔ دوبارہ آہٹ ہوئی، مجھے بار بار شبہ ہوتا تھا کہ کہیں چمپا کے اڈے میں سے تو نہیں آگیا ہے۔ مسافر پھر اُٹھا۔ اُس نے چمپا کی طرف دیکھا۔ چمپا کے منہ پر ساڑھی کا پلّو پڑا ہوا تھا۔ مسافر نے اپنا منہ قریب لے جا کے جیسے اُسے سونگھا۔ میں اسی طرح چوکنا ہو گیا۔ چمپا کے بعد مسافر میری طرف آیا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ جیسے ہی اُس کے مڑنے کی آہٹ ہوئی، میں نے اپنی آنکھوں کے پردے کسی قدر اُوپر کیے۔ مسافر راج کرشنا کی برتھ کے قریب تھا۔ اُس نے جیب سے ہاتھ نکالا تو ایک تمنچہ اُس کے ہاتھ میں تھا لیکن میرے مارنے سے پہلے اُس نے تمنچہ راج کرشنا کے سر پر تان لیا تھا۔ میرا رواں رواں ہو گیا۔ جسم پر کپکپی طاری ہو گئی۔ اس موقع پر مسافر کو چھیڑنے کے خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے تھے۔ میری ایک آہٹ بھی صورتِ حال سنگین بنا سکتی تھی۔ بہ مشکل دم سادھے پڑا رہا۔ نہ ہلنے کا یارا، نہ آنکھ کھولنے کی مجال۔ مسافر نے راج کرشنا

کے پٹھے پر ٹھوکا مارا۔ راج کرشنا کا جسم اچانک مضطرب ہوا۔ ایک ہلکی سی سسکاری کی آواز آئی۔ اُس نے تمنچہ دیکھ لیا ہوگا۔ مسافر نے سرگوشی میں کچھ کہا۔ کوشش کے باوجود میں نہ سن سکا۔ راج کرشنا کا چہرہ میرے سامنے نہیں تھا لیکن اُس کے جسم پر دوبارہ خفیف سا لرزہ طاری ہوا۔ اس نے کچھ کہا مگر مسافر نے اُسے شاید دوبارہ دھمکی دی اور تمنچہ کسی قدر دُور کیا کیونکہ راج کرشنا برتھ پر بیٹھ رہا تھا۔ مسافر نے ایک بار پھر مجھ پہ نگاہ کی۔ میری آنکھیں اس طرح بند ہوئی تھیں کہ وہ انھیں جھانک کے دیکھتا، تبھی اُسے اُن کے کھلنے کا احساس ہوتا۔ راج کرشنا کی آنکھیں چوڑی ہو گئی تھیں۔ وہ بہت احتیاط سے چلا۔ مسافر نے تمنچے کی نال اُس کی گردن سے ٹکا دی تھی۔ راج کرشنا آگیا تھا۔ مسافر نے اُسے دروازے کے قریب چلنے کا اشارہ کیا۔ میرے جسم میں سرد و گرم لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ راج کرشنا نے جوتے پہننا چاہے مگر مسافر نے اُسے اجازت نہیں دی۔ میں لیٹا ہوا تھا لیکن میرا ذہن کام کر رہا تھا۔ مسافر کے جسم کی ہر جنبش، ہر حرکت میری نگاہ کی زد میں تھی۔ راج کرشنا ایک سعادت مند شاگرد یا کسی معصوم بچے کی طرح مسافر کی ہدایت پر دروازے کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا تھا۔ چمپا نے کروٹ بدلی تو مسافر نے ایک لمحے کے لیے چونک کے اُس کی طرف دیکھا مگر وہ ایک لمحہ ہی تھا۔ جگنو کی چمک بجھ گیا اور میں اپنی طاقت جسم میں گھونٹ کے رہ گیا۔ مسافر کا ارادہ ظاہر تھا۔ میں بہت پہلے ہی دھیرے دھیرے اپنی جیب تک ہاتھ لے گیا تھا۔ چاقو میرے ہاتھ میں تھا۔ اُسے کھینچ کے کھٹکا دبانے کی دیر تھی مگر مسافر لمحے کی مہلت بھی نہیں دے رہا تھا۔ راج کرشنا کے بارے میں بہت جلد کوئی فیصلہ ہونے والا تھا۔ مسافر نے ہاتھ بڑھا کے دروازے کی چٹخنی نیچے گرا دی۔ اب اُس کا ہاتھ زنجیر کی طرف اُٹھ رہا تھا۔ میں نے ایک بار پوری صورتِ حال ذہن میں تولی، کچھ اور سمجھ میں نہیں آیا تو میں نے بند چاقو چمپا کے جسم پر پھینک دیا۔ تھوڑی میں گیند کی طرح برتھ کے نیچے گر کے اُوپر کی طرف اُٹھا۔ چمپا ہڑبڑا اُٹھی۔ بلا اختیار مسافر نے تمنچہ چمپا کی سمت کر دیا مگر جب اُس نے دوسرے لمحے میری طرف دیکھا ــ مگر اُسے دیکھنے کی مہلت نہیں ملی۔ میں نیچے سے اُس کے پہنچے پکڑتا ہوا اُوپر کی طرف اُٹھ گیا تھا۔ میرے اندازے میں کوئی خامی نہیں تھی۔ اُدھر چمپا کی سسکی بلند ہوئی، اِدھر میں جھپٹا۔ مسافر نے پہلے چمپا کی جانب تمنچہ تانا، پھر گھبراہٹ سے بوکھلا کے تمنچے کا رُخ بدلنا چاہا مگر میں نے اُسے درمیان ہی میں ایک کے اُوپر اٹھا لیا۔ تمنچے سے شعلہ نکلا اور ڈبے کی چھت میں سوراخ ہو گیا۔ میں نے اُس کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے اُس کی گردن پر وار کیا۔ راج کرشنا منہ موڑے مبہوت کھڑا تھا۔ وہ ایک دم مسافر کے جسم سے لپٹ گیا۔ چمپا بھی جاگ گئی مگر تب تک میں مسافر کے تمنچے والے ہاتھ کی ہڈی توڑ چکا تھا، جوڑ کھل گیا تھا۔ تمنچہ نیچے گر گیا اور مسافر درد سے پیر پٹخنے لگا۔ تمنچہ راج کرشنا نے اٹھا لیا اور مسافر کی جیبوں کی تلاشی لے کے ایک لمبا چاقو برآمد کر لیا۔ میری ضرب سے مسافر کی گردن ڈھلک گئی تھی۔ وہ فرش پر لوٹنے لگا۔ میں نے اُسے ایک ٹھوکر لگانی چاہی لیکن راج کرشنا نے مجھے روک لیا۔ چمپا نے سوئچ دبا کے کمرہ روشن کر دیا۔ گاڑی تیز رفتاری سے بھاگ رہی تھی۔ راج کرشنا نے گھڑی دیکھی۔ ۲، ۲½ بج رہے ہوں گے۔ بمبئی آنے میں ۳ گھنٹے باقی تھے۔ میں نے دوبارہ دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔ راج کرشنا نے اپنا ہاتھ بڑھا کے میری طرف اشارہ کیا۔ میں کچھ نہیں سمجھا، وہ مجھے اپنے پاس بلا رہا تھا۔ میں اُس کے قریب پہنچا تو اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے بوسہ دینے لگا، اُسے آنکھوں سے لگا لیا۔

"یہ کون ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا آپ اسے جانتے ہیں؟"

"میں اسے نہیں جانتا مگر یہ مجھے بہت اچھی طرح جانتا ہے۔" راج کرشنا کا چہرہ وفورِ مسرت سے تمتما رہا تھا۔ "یقیناً یہ اُس گروہ کا کوئی آدمی ہے جس کی تفتیش کے لیے مجھے بمبئی میں تعینات کیا گیا ہے۔ یہ لوگ مجھے بمبئی نہیں جانے دینا چاہتے۔ بہت پیچیدہ معاملہ ہے، پھر کسی وقت سناؤں گا مگر یہ اکیلا نہیں ہوگا۔" راج کرشنا تذبذب سے بولا۔ "اس کے دوسرے ساتھی بھی کسی دوسرے کمپارٹمنٹ میں سفر کر رہے ہوں گے۔" راج کرشنا کا زرخیز دماغ کام کرنے لگا۔ اُس نے مجھے ہدایت کی کہ میں کھڑکی سے جھانک کے دیکھوں۔ میں نے شیشہ اُوپر کیا تو دُور سے روشنیاں جگمگاتی ہوئی نظر آئیں۔ گاڑی کی رفتار بھی سست پڑ گئی۔ کوئی اسٹیشن آ رہا تھا۔ "تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کر لو۔" اُس نے مجھے متوجہ کیا۔

"تمہارے کتنے ساتھی تمہارے ساتھ ہیں؟" راج کرشنا نے تحکمانہ لہجے میں مسافر سے پوچھا۔ مسافر کی حالت نہایت خستہ تھی، بازو جھٹکتا تھا، گردن پکڑتا تھا، فرش سے سر مارتا تھا۔ گردن پر میری ضرب سے اُسے بے ہوش ہو جانا چاہیے تھا مگر کاٹھی کا مضبوط تھا، گردن پر گوشت بھی زیادہ تھا اس لیے کچھ جھیل گیا۔ اُس نے راج کرشنا کی بات کا جواب نہیں دیا، کراہنے لگا۔ "یہ نہیں بتائے گا۔" میں نے رائے ظاہر کی۔

"یہ لوگ خاصی دُور سے ہمارا تعاقب کر رہے ہوں گے، جیسے ہی زنجیر کھنچتی اور گاڑی اسٹیشن سے پہلے کسی سنسان مقام پر رُکتی، اِس کے دوسرے ساتھی بھی اُتر جاتے۔ جو مقام طے ہو گیا تھا، وہاں چونکہ پروگرام کے مطابق گاڑی نہیں رُک پائی ہے اس لیے دوسرے ساتھی سبب جاننے کے لیے ہمارے ڈبے کا رُخ ضرور کریں گے۔ ابھی سفر میں تقریباً ۲ گھنٹے باقی ہیں۔ ہم کچھ اور نہیں کر سکتے تو کھڑکیاں، دروازے بند کر کے ڈبے میں بند ہو کر تو بیٹھ سکتے ہیں۔ وہ آنے والے اسٹیشن پر دروازہ کھلوانے کے لیے زیادہ ہنگامہ نہیں کریں گے اور انھیں اپنے ساتھی کا حشر دیکھنے کے لیے کسی ویران جگہ گاڑی رُکوانے کی حماقت بھی نہیں کرنی چاہیے۔ ممکن ہے وہ بمبئی تک خود ہی اس انتظار میں رہیں کہ اچانک گاڑی رُک جائے۔" راج کرشنا اس انداز سے باتیں کر رہا تھا جیسے اُسے پہلے سے سارا پروگرام معلوم ہو۔

اسٹیشن آ گیا تھا۔ ڈبے میں باہر دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا، شیشے پر ہاتھ مارا مگر ہم نے کوئی جواب نہیں دیا۔

شاید کوئی مسافر ہوگا۔ گاڑی کوئی سات منٹ ٹھیری ہوگی' پھر اپنی منزل کی جانب رینگنے لگی اور کچھ دور جا کے ہولے سے باتیں کرنے لگی: "آپ کب تک تمنچہ تانے اس طرح کھڑے رہیں گے' بیٹھ جائیے' میں اس کا انتظام کر دیتا ہوں' بمبئی تک یہ سوتا رہے گا۔"

"یہ میرے لیے بہت قیمتی ہے عزیز دوست!" راج کرشنا کی آواز مسرت سے معمور تھی۔ "میں اپنے ساتھ ایک تحفہ لے کے اُن کی خدمت میں پہنچوں گا جس اہم کام کی ذمے داری سونپنے کے لیے انھوں نے پہلے مجھے دلّی بلایا' پھر بمبئی تعینات کیا' اس کا آغاز ہی اتنا خوش گوار ہوا ہے' میں اسے سنبھال کے رکھنا چاہتا ہوں اور بمبئی تک چھیڑنا نہیں چاہتا یہ سب تمھاری بدولت ہوا ہے' میں نے تمھیں بتایا نہیں کہ میں مدراس کا ایک بڑا پولیس افسر ہوں۔"

میں نے رسمی تعجب کا اظہار کیا۔ "کرشنا جی! آپ ہٹ جائیے' میں اسے تین چار گھنٹے تک بے سُدھ کر سکتا ہوں' آپ اطمینان رکھیے' یہ مرے گا نہیں۔" یہ کہتے ہی میں نے کرشنا کے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ تاک کے ایک دو سرا ہاتھ مسافر کی گردن پر مارا' وہ بے ہوش ہو گیا۔ "اب آرام کیجیے۔" میں نے برتھ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

راج کرشنا گھبرا سا گیا۔ اُس نے بے ہوش مسافر کو ٹٹول کے دیکھا اور آنکھوں میں ممنونیت بھر کے بولا۔ "ہاں اب میں سکون سے بیٹھ سکتا ہوں۔" وہ میرے قریب بیٹھ کے پھر شکریہ ادا کرنے لگا۔ "کیا تم جاگ رہے تھے؟" وہ حیرت سے بولا۔

میں نے اُسے تفصیل سنائی۔ راج کرشنا میری پیٹھ تھپ تھپانے لگا۔ گاڑی چھک چھک چھُو چھُو کرتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ راج کرشنا نے چمپا سے پان مانگ کر کھایا۔ اُس نے چمپا سے درخواست کی کہ وہ تھوڑا پانی اور اُس کے سوٹ کیس سے نیلی گولیاں نکال کے اُسے دے دے۔ راج کرشنا نے گولیاں حلق سے اتار کے ایک گھونٹ پانی پیا۔ اب تو چمپا نے بھی سُن لیا تھا کہ وہ ایک بڑا پولیس افسر ہے اور اُس کے ہاتھ میں تمنچہ بھی تھا' چمپا کے ایک اشارے پر وہ مجھے بے بس کر سکتا تھا لیکن چمپا ایک جہاں دیدہ عورت تھی۔ میں اُسے جبراً بمبئی لیے جا رہا تھا اور میں نے موتیا بائی کے ہاں دو آدمی زخمی کر دیے تھے۔ یہ بات اتنی اہم نہیں تھی کہ ہمیشہ کے لیے میری زبان بند ہو جاتی۔ میں کبھی واپس آتا تو پھر گلی گلی چمپا بائی موتیا بائی کو تلاش کرتا' میں فیض آباد کے جامو اور اُس کے ساتھیوں کو بھی اشارہ کر سکتا تھا۔ بات بڑھتی تو چمپا کا دامن بھی جل جاتا' اُس نے میری بہن فہمیدہ اور نہ جانے اور کتنی لڑکیاں خریدی ہوں گی۔ پھر چمپا' نوشہ اُس کے ساتھی اور ریل میں تمنچے والے مسافر کا انجام دیکھ چکی تھی۔

راج کرشنا نے گھڑی دیکھ کے مجھے بتایا کہ بس اب بمبئی آنے میں پندرہ منٹ باقی رہ گئے ہیں۔ ہم نے مسافر پر چادر ڈال دی تھی۔ اُسے ہوش آ گیا تھا مگر وہ لیٹے لیٹے کراہ رہا تھا۔ بمبئی آ رہا تھا اور میری آنکھوں کے سامنے بار بار ابر سا چھا جاتا تھا' راج کرشنا بڑی شدت سے دادر اسٹیشن کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس نے مجھے حکم دیا کہ میں چمپا کے ساتھ اُس کی قیام گاہ پر ٹھیروں۔ وہ میرا کوئی عذر تسلیم نہیں کر رہا تھا۔ "تم میرے ساتھ ٹھیرو گے' اب میں تمھیں کہیں اور نہیں جانے دوں گا۔"

میں نے اُس سے وعدہ کیا کہ دو چار روز میں اُس کے مکان پر آ جاؤں گا۔ ایک خیال یہ بھی آیا کہ راج کرشنا کے توسط سے اُن غنڈوں تک رسائی ہو جائے جن کا چمپا' فہمیدہ کے سلسلے میں حوالہ دیتی تھی لیکن یہ بات نامناسب تھی۔ راج کرشنا کو پھر ساری باتیں معلوم ہو جاتیں۔ وہ ہمیں چھوڑنے پر بہ مشکل اس سے آمادہ ہوا۔

چمپا نے اُس کا اور اپنا سامان تہہ کر لیا تھا۔ مجھے چمپا سے یہ پوچھنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا کہ اُسے بمبئی کے کون سے اسٹیشن پر اترنا ہے۔ بمبئی سینٹرل اسٹیشن تک جاتی تھی۔ دادر اسٹیشن پر پولیس افسران کی تعداد نے ہمارا ڈبا گھیر لیا۔ چمپا بھی حواس باختہ ہو گئی۔ راج کرشنا سب سے پہلے ڈبے سے اُترا۔ تمام افسر آگے بڑھے' سلوٹ کیا اور مصافحہ کیا۔ یہ تمام لوگ راج کرشنا کے استقبال کے لیے آئے تھے۔ راج کرشنا نے ان میں سے ایک افسر سے کہا کہ وہ ڈبے میں پڑے ہوئے شخص کو پولیس کی حراست میں باہر نکالنے کا اہتمام کرے۔ اُس نے مجھے نہیں چھوڑا' آخر تک اصرار کیا کہ میں اُس کے ساتھ چلوں اور وہ اُس شخص کی تلاش میں اپنے اثر و رسوخ سے میری مدد کرے گا جس کے لیے مجھے بمبئی کا سفر کرنا پڑا ہے۔ اُس نے پاس کھڑی ہوئی چمپا بائی سے بھی گزارش کی۔ چمپا نے بہت عاجزی سے کہا کہ جاتے ہوئے ہم دونوں ضرور اُس کے پاس ٹھیریں گے۔ وہ اُس کے چند رسمی جملے ادا کر کے ہماری ہی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ میں نے اُسے بتایا تھا کہ میری قیام گاہ دادر میں ہے۔ ہم نے اُس کی سواری کی پیشکش بھی قبول نہیں کی۔ اس اجتناب سے وہ کچھ اداس ہو گیا۔

پولیس افسر اُس کی توجہ کے منتظر تھے۔ بمبئی کے متعدد پولیس والے مخصوص لباس میں اُس کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ یہ انتظام شاید اُس کی ہدایت کے تحت کیا گیا تھا' وہ جیسے ہی اُس غول میں چھپا' ہم دادر ریلوے اسٹیشن سے باہر آ کے میں چمپا کے ساتھ ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ دو راتوں سے ایک پل کے لیے آنکھ نہیں لگی تھی۔ سامنے بمبئی شہر پھیلا ہوا تھا۔ خیال آتا تھا کہ اب ابا جان سے کسی بھی وقت ملاقات ہو سکتی ہے۔ میں خوف دوڑنے لگتا تھا۔ ڈبے سے اُتر کے مجھے یہ محسوس ہوا تھا کہ دوبارہ جیل خانے سے آزاد ہوا ہوں مگر اب یہاں پہنچ کے جب بمبئی کی سڑکوں پر نظر پڑتی اور یہ خیال آتا کہ ان میں سے کوئی نہ کوئی سڑک ابا جان تک جاتی ہوگی تو اعصاب تڑخنے لگتے۔ چمپا نے پریشان ہو کر حال دریافت کیا مگر میں خاموش رہا۔ چند لمحے بنچ سے کمر ٹکانے کے بعد اُس سے پوچھا۔ "کہاں چلنا ہے؟"

"پہلے کسی ہوٹل میں چل کے آرام کرو۔" اُس نے ملائم لہجے میں کہا۔ "اس کی تلاش میں نکلیں گے' میری طرف سے دل صاف رکھو۔"

"کس کے پاس چلنا ہے؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"اس کا نام گلابا ہے' یہیں دادر کے علاقے میں رہتا تھا' پانچ سال گزر گیا ہے' تلاش کرنے میں دیر لگ سکتی ہے' کسی ہوٹل میں سامان رکھ کے نہا دھو کے ڈھونڈنے نکلیں گے۔"

میں نے اُس کی بات مان لی۔ چمپا کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی فریب نہیں کرے گی' وہ اس علاقے کے ہوٹلوں کو جانتی تھی۔ خود کو اُس کے سپرد کر دیا۔ ٹیکسی نے ہمیں ایک کئی منزلہ ہوٹل کے سامنے اُتار دیا۔ میرے پاس ابھی رقم کافی تھی۔ اتفاق سے ہوٹل میں ایک ہوادار اور روشن کمرہ خالی تھا۔ کمرے میں آ کے چمپا نے مجھے مشورہ دیا کہ تھوڑا آرام کر لوں' اُسے میری طبیعت اچھی معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ اُس کے جانے پر میں نے اپنے آپ کو جھنجھوڑا۔ بال سفر کی گرد سے اٹے ہوئے تھے۔ جسم ٹوٹ رہا تھا۔ چمپا نہا کے بال بکھرائے ہوئے واپس آئی' پھر میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ میں نے جلدی جلدی جسم پر پانی ڈالا اور کپڑے تبدیل کر کے باہر آیا۔ چمپا نے چائے منگوالی تھی۔ ہوٹل کا بیرا اُس کے پیروں کے نزدیک فرش پر بیٹھا تھا۔ چمپا نے اتنی سی دیر میں اسے نہ جانے کس طرح اپنا رام کر لیا تھا کہ صاحب جی' بیگم صاحب' کہتے ہوئے اُس کا منہ سوکھ رہا تھا۔ چمپا اُسے ہدایات کی ہدایت دے رہی تھی' مثلاً ٹیکسی دروازے پر کھڑی رہے' کوئی آئے تو پہلے اطلاع دی جائے' وغیرہ۔

بیرا چلا گیا تو چمپا نے مجھے چائے بنا کے دی اور کچھ ٹوسٹ مکھن لینے کو کہا۔ "اب چلو' اُسے تلاش کرنے نکلتے ہیں۔" میں نے اضطراب سے کہا۔

"جلدی مت کرو۔" اُس نے تنبیہی لہجے میں کہا۔ "جلدی میں کام بگڑ سکتا ہے' اتنا لمبا سفر اُسے تلاش کرنے ہی کے لیے کیا ہے۔ ہم نے جلدی کی تو چُوک سکتے ہیں۔"

"مگر مجھے تو ایک پل گزارنا بھی مشکل ہو رہا ہے۔"

"تم بس صبر کرو' باقی باتیں مجھ پر چھوڑ دو۔ یہ سمجھ لو کہ تم ابھی بمبئی نہیں پہنچے ہو بلکہ ابھی مجھے تلاش کر رہے ہو۔" وہ نرمی سے بولی۔

"مگر کب تک؟ کب تک؟" میں نے وحشت سے پوچھا۔

"تم تو اس طرح باتیں کر رہے ہو جیسے بالکل کچھ نہیں جانتے۔ تم فیض آباد میں اُن لوگوں کے ساتھ بالاخانے پر آئے تھے' اُن لوگوں کے مزاج سے تو واقف ہو گے؟" وہ شکایتی لہجے میں بولی۔

"یہ کون لوگ ہیں؟"

"وہی لوگ ہیں' انھی جیسے' کوئی بڑا کوئی چھوٹا' کوئی کمزور کوئی طاقت ور' بمبئی میں بس جگہ بدلی ہوئی ہے۔"

"صرف جگہ نہیں بدلتی' لوگ بھی بدلے ہوئے ہوتے ہیں' سب کو ایک ترازو میں مت رکھو۔" میں نے ناراضی سے کہا۔ "جن لوگوں سے تمھارا واسطہ پڑتا ہے' لوگ صرف وہی نہیں ہوتے۔"

"میرا مطلب یہ نہیں ہے۔" وہ وضاحت کرنے لگی۔

"مطلب کچھ بھی ہو۔" میں نے اُس کی بات کاٹ کے تلخی سے کہا۔ "ایک شخص محلے کی آبروؤں کا امین ہے' دوسرا انھیں نیلام پر چڑھا دیتا ہے' تم دونوں کو ایک ہی خانے میں رکھ رہی ہو چمپا بائی! زبان سنبھال کے بات کیا کرو۔ تم نے صرف نوشے اور گلابے کو دیکھا ہے۔"

"تم تو بگڑ گئے' میری عقل ماری گئی ہے۔" وہ خفت سے بولی۔ "بات کچھ کہنا چاہتی ہوں' کہہ کچھ جاتی ہوں' میری بات سے تمھیں تکلیف ہوئی؟"

"تکلیف وکلیف کیا چمپا بائی! بس جانے دو۔" میں نے ناگواری سے کہا۔

"دیکھو' میں تم سے یہ کہنا چاہتی تھی۔" وہ اپنائیت سے بولی۔ "کہ ہمیں ذرا تحمل سے کام کرنا ہوگا۔ تمھارا مزاج دوسرا ہے' مجھے ایک دو دن میں تھوڑی بہت واقفیت ہو گئی ہے۔ اوّل تو انھیں ڈھونڈنا' پھر اُن کے مل جانے پر اُن سے فہمیدہ کا پتہ پوچھنا کہ انھوں نے اُسے کہاں سے حاصل کیا تھا' یہ ایک مشکل کام ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ تم انھیں اپنے سامنے دیکھ کے اُکھڑ جاؤ گے' اس لیے میں چاہتی ہوں کہ خود اُن کا سراغ لگاؤں اور تم یہیں ہوٹل میں رہو۔ میں اُن کے سامنے تمھیں لے جانا نہیں چاہتی۔ وہ فہمیدہ کا ذکر کرتے وقت تمھارا لحاظ نہیں کریں گے۔ نہ جانے کس کس طرح اُس کا ذکر کریں' تم سے برداشت نہیں ہوگا۔"

"میں فہمیدہ کو نیلم جان کے روپ میں دیکھ کے زندہ رہ گیا۔ مجھ سے زیادہ برداشت کس میں ہوگی' جو گالی تم نے دی ہے' جو طمانچہ تم نے لگایا ہے چمپا بائی! اُس سے زیادہ کا امکان نہیں ہے۔"

"میاں! خدا گواہ ہے کہ میں آج تک کسی لڑکی کو اُس کے گھر سے گھسیٹ کے بالاخانے نہیں لے گئی۔ میں اُنھی لڑکیوں کو اِدھر اُدھر سے لے گئی ہوں جن کے پاس اپنے گھر واپس جانے کا راستہ نہیں رہ گیا تھا۔ فہمیدہ نہ جانے کس طرح گلابے اور اُس کے ساتھیوں کے قبضے میں آ گئی تھی۔ میں نے جب اچھی طرح پرکھ لیا کہ میں نہیں تو کوئی اور اُسے خرید لے گا' تب میں نے گلابے کے ہاتھ میں تھیلی تھمائی۔"

"ہونہہ۔" میں نے نفرت سے کہا۔ "تمھاری کوئی غلطی نہیں' بازار میں اچھے طلب گار موجود ہوں تو سودا گر اپنا ایمان بھی بیچ دیتے ہیں۔" چمپا بائی چپ ہو گئی۔ چائے کی پیالی اُس کے ہاتھ میں کھڑکنے لگی' آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے گالوں پر ٹمٹمانے لگے۔ "میں تمھارے ساتھ ہی چلوں گا' کچھ بولوں گا نہیں' وہ سمجھیں گے کہ میں تمھارے کاروبار سے متعلق کوئی آدمی ہوں اور یہ وہ سچ ہی سمجھیں گے۔" میری آواز پھولنے لگی۔ "تمھاری بھی کوئی

غلطی نہیں، گلابے کی بھی کوئی غلطی نہیں، غلطی تو اُن بدنصیبوں کی....."
مجھ سے آگے کچھ کہا نہیں گیا۔
"اب تم سے میں کیا کہہ سکتی ہوں، تمہارے سامنے موجود ہوں۔" اس کا سر جھکا ہوا تھا۔
"چلو اٹھو۔" میں نے چاقو کی دھار پر گردش کے کرنے سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ "صبح صبح کا وقت ہے، دیر ہو جائے گی تو لوگوں کا ملنا مشکل ہو گا، اب اٹھو۔"
"یہ بیرا کچھ کام کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔" وہ رازدارانہ بولی۔ "میں نے اُس سے ابھی بات تو نہیں کی ہے مگر میرا خیال ہے کہ گلابے کو جگہ جگہ ڈھونڈنے کے بجائے یہیں بلائے لیتی ہوں، میرا نام سن کے وہ ہوٹل میں آ جائے گا، بات آسانی سے حل ہو جائے گی۔"
"مگر۔ مگر یہ ایک لمبا طریقہ ہے۔" میں نے اُس کی رائے مسترد کر دی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پہلے ہوٹل والوں کو علم ہو کہ ہم لوگوں کو کس بدنام شخص کی تلاش ہے، پھر وہ یہاں آئے تو بات اور بڑھے۔ چار و ناچار چمپا بائی آمادہ ہو گئی۔ اُس نے بُرقع پہن رکھا تھا۔ ایک بُرقع پوش عورت کے ساتھ گلابے جیسے آدمی کا پتہ پوچھنا معیوب سی بات تھی۔ چمپا کے بیان کے مطابق ہوٹل کا ایک بوڑھا بیرا گلابے سے اُس کے رابطے کا ذریعہ بنا تھا۔ اب وہ بیرا ہوٹل چھوڑ کے اپنے شہر جا چکا تھا اسی لیے چمپا دوسرے بیرے سے رابطہ قائم کرنا چاہتی تھی۔ وہ تمام راستے مجھے سمجھاتی رہی کہ اگر گلابے کا سامنا ہو جائے تو میں اپنے آپ کو قابو میں رکھوں۔ پورا پتہ تو معلوم نہیں تھا۔ اتنا معلوم تھا کہ ہمیں شمبھو ناتھ بلڈنگ پہنچنا ہے۔ ٹیکسی والا شاید جان بوجھ کے ٹیکسی مختلف علاقوں میں گھماتا رہا۔ آخر وہ ہمیں ایک ایسی جگہ لے گیا، جہاں چھوٹی بڑی بلڈنگیں ایک دوسرے پہ جیسے گری پڑ رہی تھیں۔ بلڈنگوں کے درمیان گزرنے والی سڑکیں تنگ تھیں، میں نے ٹیکسی رکوا لی۔ قریبی پان فروش کی دکان پر ایک شخص خاص تیوروں سے کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اُس کے پاس پہنچ کے جب اُس کے سامنے گلابے کا نام لیا تو وہ اس طرح ہنسنے لگا جیسے میں نے کوئی بہت حماقت کی بات کہہ دی ہو۔ مجھے جواب دینے کے بجائے اُس نے پنواڑی کو مخاطب کیا۔ "سنتا ہے چمپا سیٹھ! چھوکرا کس کا نام لیتا ہے، گلابے کا۔" اُس کچھ مرکا۔ پنواڑی بھی اُس کی ہنسی میں شامل ہو گیا، دونوں بار بار مجھے سر سے پیر تک دیکھتے تھے اور ہنستے تھے۔
"ابے! ہنستے کیوں ہو، کیا تمہارا دماغ خراب ہے؟ میں جو پوچھتا ہوں اُس کا جواب دو۔" مجھے اُن کے برتاؤ پہ غصہ آ گیا۔
"ابے جا۔" اچانک اُس کی ہنسی رُک گئی اور آنکھیں لال ہو گئیں۔
"جا بابو! جا، اپنا راستہ سنبھال۔" پنواڑی نے کسی قدر مفاہمت سے کہا۔ "دادر میں اب گلابے کا نام نہ لے، وہ ادھر سے دکان بڑھا گیا، اب اُس کا اڈی ادھر نہیں چلتا۔ ادھر تو بسا ہے بسوا شیر کا بچہ۔ اُس کا ایڈریس پوچھے تو بتائیں۔ وہ سامنے شمبھو ناتھ بلڈنگ ہے۔" اُس نے دونوں ہاتھوں سے شیر کا پنجہ بناتے ہوئے کہا۔ "گرجتا ہے۔"
"گلابے اب کہاں رہتا ہے؟"
"وہ سالا کہیں نالے میں پڑا ہو، میں گا اپن کو کیا۔" پنواڑی کے [illegible] دینے سے پہلے دکان پر کھڑے ہوئے شخص نے حقارت سے کہا۔
"ہم اُس کی تلاش میں بہت دور سے آئے ہیں، اُس کا پتہ [illegible]"
"اُس بھڑوے کا پتہ؟۔ لے چمپا سیٹھ!" وہ پنواڑی کو مخاطب [illegible] پھر ہنسنے لگا۔ "چھوکرے کو گلابے کا ایڈریس بتاؤ۔" وہ آنکھ مار کے [illegible] "سنا ہے سالا اب اُودر اندھیری میں مسخری کرتا پھرتا ہے۔"
میں اُن کے پاس سے چلا آیا۔ ٹیکسی اندھیری کے علاقے کی [illegible] بھاگنے لگی۔ پنواڑی اور اُس کی دکان پہ کھڑے ہوئے شہدے کی باتیں [illegible] کرتی تھیں کہ گلابے نے کوئی خاص نام پیدا نہیں کیا ہے، کبھی اُس کا نام [illegible] مگر اب وہ ایک چھوٹے سے علاقے میں محدود ہو کے رہ گیا ہے۔ کلکتہ بڑا [illegible] بڑا شہر ہے پھر بھی یہاں کا حال وہاں کے حال سے مختلف نہیں ہو گا۔ [illegible] اندھیری میں داخل ہو گئی۔ پان کی دکانوں، چائے کے اسٹالوں پر میری نگاہیں [illegible] چہرے ڈھونڈتی رہیں، جو مجھے دور سے نظر آ جاتے تھے۔ ہم نے اندھیری [illegible] سڑکوں پہ پہلے ایک چکر لگایا۔ شاید چمپا کو گلابے یا اُس کا کوئی ساتھی نظر [illegible] ٹیکسی کی رفتار کم تھی۔ کئی جگہ میں نے ٹیکسی رکوانے کا ارادہ کیا مگر چمپا [illegible] کر دیا۔ آخر ایک تنگ چوراہے پہ مجھے گلابے کا پتہ نشان پوچھنے کے [illegible] پڑا۔ یہ جگہ گنجان اور گندی تھی۔ گٹر کی بو سے دماغ پھٹا جاتا تھا، وہاں [illegible] لوگوں کی آنکھوں نے حیرت اور تجسس سے میرا معائنہ کیا۔ میں ابھی [illegible] ہی رہا تھا کہ کون سا آدمی بات کرنے کے لیے منتخب کروں کہ ایک شخص [illegible] پیچھے سے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ میں نے پلٹ کے دیکھا، جھول دار [illegible] اور اونچے پائنچوں کی پتلون پہنے ہوئے ایک چھریرے جسم اور کالے رنگ [illegible] تیکھی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ "کیا ہے؟" اُس نے منہ بنا کے پوچھا [illegible] ایک جھٹکے سے اُس کا ہاتھ اپنے کندھے سے علیحدہ کیا۔ میری اس حرکت [illegible] کے ہونٹ باہر نکل آئے۔ "کس کو مانگتا ہے؟" وہ خشونت سے بولا۔
"گلابے کو۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔
"گلابے کو۔" وہ ہاتھ نچا کے بولا۔ "کدھر سے آیا؟"
"کلکتے سے۔" میں نے سرسری جواب دیا۔ "گلابا کدھر ہے؟"
"وہ سالا ادھر اب کدھر ہے، سالا جیل میں پڑا سڑتا ہے، اُس کا [illegible] کلٹی کھا گیا۔ ابھی تم اپن سے بات کرو، اکھا چالی اپن دیکھتا ہے۔ بولو کیا [illegible]"
"وہ جیل کب گیا؟"
"ابھی بہت دن ہوا۔" وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔ "لمبا مال ڈے [illegible] میرے تذبذب سے وہ آنکھ مار کے بولا۔ "مال ہے؟"
"تم گلابے کے کسی ساتھی کو جانتے ہو؟" میں نے نرمی سے پوچھا۔
"ابھی گلابے کی بات چھوڑ دو! گلابے کا دھندا ایک دم فلاپ [illegible]

[illegible] ساتھی ایک دم فنش، ادھر اُودر ون ٹو تھری ہو گیا۔ گلابا سالا چرس [illegible] لگا تھا۔ اُودر اپنی ماں کے گھر میں کیا تگڑم لگاتا ہو گا۔ اپن سالا یہی [illegible] تا رہتا ہے۔"
میں اُس سے باتیں کر رہا تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور نے آ کے بتایا کہ بیگم صاب [illegible] بیگم صاب کے ذکر پہ میرے مخاطب نوجوان نے اُچک کے دیکھا، [illegible] سیٹی بجائی لیکن چمپا نے نقاب اٹھا رکھی تھی۔ نوجوان نے ہونٹ [illegible] لیے۔ میں لے چمپا کے پاس آ کے گلابے کے بارے میں بتایا تو اُس نے کچھ [illegible] کے ایک اور شخص کا نام لیا۔ بوبے کا۔ میں نے نوجوان سے بوبے کا ذکر [illegible] نہیں جانتا تھا۔ ممبئی بہت بڑا شہر تھا، ضروری نہیں کہ ناقابلِ ذکر [illegible] نام دوسرے علاقے کے لوگوں کو ازبر ہوں مگر ممبئی میں بہت سے لوگ [illegible] جو گلابے کے ساتھیوں کو جانتے ہوں گے۔ میں نے پہلے ہی اُس [illegible] کی ایک جھلک دیکھ کے اُسے نظر انداز کرنے کی کوشش کی تھی، وہ خود [illegible] آ گیا۔
ٹیکسی اندھیری کے علاقے میں کچھ اور آگے بڑھ گئی۔ نوجوان نے سیٹیاں [illegible] میں روکنا چاہا مگر ڈرائیور نے ٹیکسی نہیں روکی۔ سہ پہر تک ہم ٹھوکریں [illegible] طرح طرح کی باتیں سنتے بھانت بھانت کے لوگوں سے ملتے ایک ایسے شخص سے [illegible] میں کامیاب ہو گئے جو اپنی زندگی کا بڑا حصہ گزار چکا تھا۔ وہ مضبوط کاٹھی [illegible] کا ایک شخص تھا۔ آواز میں گونج تھی، رنگ کبھی گورا ہو گا، سر کے بال [illegible] زیادہ اُڑ چکے تھے۔ اب تک کئی جگہ جھگڑا ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ [illegible] کے لفنگے نہ جانے اپنے آپ کو کیا سمجھتے تھے۔ کوئی سیدھے منہ بات [illegible] کرتا تھا۔ جسے دیکھو طرم باز خاں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سارے لوگ [illegible] سے بات کر رہے ہوں، ایک لہجہ، ایک انداز۔ اعظم خاں ان میں ایک [illegible] شخص نظر آیا۔ میں نے اسے سلام کیا تو اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا [illegible] دودھ کی دکان کے اسٹول پر بیٹھا تھا۔ میں نے اُس کے چہرے کے [illegible] دیکھ کے ٹیکسی رکوائی تھی۔ چاقو کا بہت اچھا ماہر نہیں معلوم ہوتا تھا کہ [illegible] بہت سے نشان چہرے پر ڈلوا لیے تھے۔ اعظم نے مجھے اپنے برابر کے اسٹول [illegible] بٹھا لیا۔ میں نے اُس کے سامنے گلابے اور بوبے کا نام لیا تو وہ سنجیدہ ہو گیا [illegible] اس طرح بند کر لیں جیسے وظیفہ پڑھ رہا ہو۔ پھر کاندھوں کو تیزی سے [illegible] سکیڑتے ہوئے بولا۔ "کیوں بادشاہ، تمہیں ان مستوں سے کیا کام پڑ گیا؟"
"مجھے اُن سے ایک صاحب کا پتہ پوچھنا ہے۔"
"کیسا پتہ!" وہ دیدے نچاتے ہوئے بولا۔ "جاؤ خلیفہ گھر جاؤ۔ ابھی [illegible] کے آثار نظر آ رہے ہیں۔" پھر وہ چہکارنے لگا۔ "گلابے اور بوبے یہ [illegible] لگ چرس لیں گے۔"
"آپ بھی میری مدد نہیں کریں گے۔" میں نے شکایت کی۔ "یہ ممبئی کے [illegible] کے میں آپ تو یہاں کے نہیں معلوم ہوتے۔ مذاق مت سمجھیے مجھے [illegible] کا پتہ درکار ہے۔ گلابے یا بوبے یا اُن کا کوئی ساتھی اگر مل جائے تو میری مصیبت دور ہو سکتی ہے۔"
وہ ایک آنکھ بند کر کے مجھے سر سے پیر تک گھورنے لگا۔ "گلابے اور بوبے جن لوگوں کا پتہ جانتے ہیں اُن سے مصیبت اور بڑھ جاتی ہے۔ تمہیں کسی نے دھوکا دیا ہے۔ میاں جی! گلابے بہت دنوں سے جیل میں ہے، بوبا سنا ہے ڈر کے پونا بھاگ گیا تھا، اب پتہ نہیں کہاں ہے۔ بہت حرامیوں نے فیل بھی مچایا تھا، دادر کو گندا کیا تھا، اس طرف اندھیری میں بھی اندھیر کر دیا تھا۔ سالے کام ہی نہیں جانتے تھے۔ بہک گئے تھے۔ بہت سور کے بچوں کو سمجھایا کہ کچھ خیال کرو، باز آ جاؤ، غنڈا گردی کو بدنام مت کرو مگر کم ذاتوں نے اپنی ماں بہنیں بیچنا شروع کر دی تھیں۔ یہ ممبئی شہر ہی بدذات ہے۔ ہے ہے کیا بات تھی شاہ جہاں آباد کی قسم اللہ کی خلیفہ، اُجڑ کے بھی اپنا دیار سوا لاکھ کا۔"
میں نے ناگواری سے کہا۔ "آپ بھی کچھ نہیں جانتے۔ میری بات کا جواب دیجیے۔ آپ مجھے گلابے کے کسی ساتھی کا پتہ بتا سکتے ہیں یا نہیں؟"
وہ برہم ہو گیا۔ "خلیفہ! اعظم سے بات کرنی ہے تو نگاہ نیچی کرو۔ اعظم کو کسی چھوکرے کی یہ اکڑفوں بالکل پسند نہیں ہے۔"
"آپ تو ناراض ہو گئے، دیکھ رہے ہیں کہ ٹیکسی کھڑی ہے اور ایک زنانی اندر بیٹھی ہے۔ میں نے کون سی ایسی بُری بات کہہ دی ہے جو آپ کو ناگوار گزر گئی۔"
"کہاں سے آئے ہو؟" وہ سخت لہجے میں بولا۔
"میرے سوال کا جواب دینا ہے تو دیجیے۔ میں جہنم سے آ رہا ہوں۔" پھر مجھے خیال آیا، میرا لہجہ سخت ہو گیا ہے۔ "آگرے سے آ رہا ہوں۔" میں نے سنبھل کے کہا۔ "کچھ اور پوچھنا ہو تو ایک ساتھ پوچھ لیجیے، شجرہ وغیرہ۔"
"میاں خلیفہ!" اعظم نے دکان پر بیٹھے ہوئے دودھ والے کو آواز دی۔ "ذرا لونڈے کو بتا نا کہ وہ کس سے بات کر رہا ہے۔"
"ارے بھیا یہ اعظم دادا ہے۔" دودھ والے نے مجھ سے خوشامد کی۔
"ہم بھی کسی وجہ سے یہاں رُکے ہیں، ورنہ آگے بڑھ جاتے۔" میں نے ترش روئی سے کہا۔ "اعظم دادا راستہ کھوٹا مت کیجیے، مجھے یقین ہے آپ گلابے کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں، میں صبح سے تھک چکا ہوں، میری باتوں کا بُرا مت مانیے۔ مجھے جلد رخصت کر دیجیے۔"
"خلیفہ! تیری زبان میں بڑا اثر ہے۔" اعظم نے پھر دودھ والے کو مخاطب کیا۔ "لونڈے کی سمجھ میں بات آ گئی ہے۔" میں نے برداشت کر لیا۔
اعظم دادا نے بیڑی کا بنڈل نکال کے ایک دو کش لیے۔ اور باقی بیڑی توڑ کے جوتے کے نیچے مسل دی۔ "ہاں کیا پوچھنا ہے؟" میں نے پھر ساری بات دہرائی تو اعظم دادا نے ایک اور شخص نور جانی کا نام لیا۔ "نور جانی سنبھل گیا ہے مگر بہت دنوں تک گلابے کے ساتھ نشے میں رہا۔ یہ اعظم دادا ہی تھا۔" اُس نے اپنی مونچھوں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "جس نے اُس کا نشہ ہرن کیا۔"
"نور جانی! کہاں رہتا ہے؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"سنا ہے آج کل محمد علی روڈ پر دھندا کر رہا ہے۔"

"کوئی خاص پتہ۔۔؟"

"اب اتنا بھی گیا گزرا نہیں اپنا نور جانی کہ اُس کا پتہ بتانا پڑے۔" اعظم دادا کا لہجہ پھر تلخ ہو گیا۔ "مگر ملیفہ جانے سے پہلے ایک بات مغز میں ڈال لو۔ چھوکرا بازی مت کرنا۔ ہاتھ کا پکا ہے اِن نے اپنی ٹھوڑی کے نشان پہ انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک چھوٹا سا نشان اُسی کی برکت ہے۔"

"ایسے تو بہت سے نشان ہیں، کس کس کو گنو گے دادا۔" میرے منہ سے نکل گیا۔ "معلوم ہوتا ہے ساری عمر نشان ہی لگوائے ہیں۔"

اعظم دادا کا چہرہ لال ہو گیا۔ اُس نے اشتعال میں مجھ پر ہاتھ چھوڑ دیا۔ میں نے اُسے اپنے منہ کے قریب روک لیا۔ اعظم دادا اُٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ میرا مقصد اُس سے کسی قسم کی تلخی کا نہیں تھا لیکن اُس کی باتیں سُن کے میری زبان سے یہ غلطی ہو گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے پہلو میں چھل بیٹھا ہوا مجھے سرزنش کر رہا ہو۔ اگر میں اُس کا ہاتھ نہ روکتا تو وہ میرا جبڑا ضرور توڑ دیتا۔ میں نے اُس کے ہاتھ سمیت جسم پیچھے کی طرف دھکیل دیا۔ اعظم دادا دودھ والے کے اسٹولوں سے اُلجھ کے گرتے گرتے بچا۔ اُس نے پھنکارتے ہوئے مجھ پر دوبارہ حملہ آور ہونے کی کوشش کی۔ چمپا نے ٹیکسی سے یہ منظر دیکھ لیا تھا۔ اعظم دادا اپنا بھاری سر میرے سینے پہ مارنا چاہتا تھا۔ مجھے جیسے ہی یہ اندازہ ہوا میں نے ذرا بائیں جانب پینترا بدل کے اُس کا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے نیچے جھکا دیا سو وہ دُہرا ہو گیا کیونکہ اب اُس کے ہاتھ بھی کام نہیں کر سکتے تھے پھر مجھے چمپا بائی نے آ کے کھینچا تو اعظم کو سنبھلنے کا موقع مل گیا۔ چمپا کو اس مرحلے پہ دخل نہیں دینا چاہیے تھا۔ اعظم تند تیز غضب میں آگے بڑھا مگر چمپا درمیان میں آ گئی۔ اعظم نے اندھے پن میں یہ بھی نہیں دیکھا کہ اُس کے ہاتھ چمپا کے بدن کو نشانہ بنائے ہوئے ہیں۔ وہ چمپا کی چیخوں سے ہوش میں آیا۔ اس عرصے میں بہت سے راہ گیر اکٹھے ہو گئے تھے۔ دودھ والا بھی اُٹھ کے آ گیا تھا اور اعظم دادا کو روک رہا تھا۔ اعظم مغلظات بک رہا تھا۔ راہ گیروں نے درمیان میں پڑ کے مجھے اور چمپا کو ٹیکسی میں بٹھا دیا۔

چمپا منع کرتی رہی مگر میں نے ڈرائیور کو حکم دیا کہ وہ ٹیکسی کا رُخ محمد علی روڈ کی جانب موڑ لے۔ چمپا صبح سے ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھی۔ محمد علی روڈ کے علاقے میں سڑک کے دونوں جانب فلیٹوں پر مشتمل کئی کئی منزلہ عمارتیں کھڑی تھیں۔ سورج ڈوبنے کو تھا۔ سڑک پر اچھا خاصا ہجوم تھا۔ چمپا نے مشورہ دیا کہ ٹیکسی چھوڑ کے پیدل نور جانی کو تلاش کیا جائے۔ اُس کا کہنا تھا کہ شاید یہ نام اُس نے پہلے بھی سنا ہے لیکن نور جانی کا چہرہ اُسے یاد نہیں تھا۔ پانچ سال قبل جب وہ فہمیدہ کو بمبئی سے لے گئی تھی تو گلابے اپنے دو ساتھیوں سمیت ہوٹل میں آیا تھا۔ ایک کا نام لولا تھا۔ ممکن ہے تیسرا شخص نور جانی ہو۔ ہمیں دو تین جگہ ٹیکسی رکوانی پڑی۔ معلوم ہوا کہ نور جانی شام کو پارک میں بیٹھتا ہے۔ اس مرتبہ چمپا بھی میرے ساتھ ٹیکسی سے اُتر گئی تاکہ وہ میری لگام تھامے رکھے۔ اگر نور جانی وہی شخص تھا جو گلابے کے ساتھ چمپا سے ملا تھا تو بھی اُسے پہچاننے کے لیے

چمپا کا میرے ساتھ ہونا ضروری تھا۔ چند قدم چل کے چمپا ٹھٹک کے رُک گئی۔ نقاب سرکا کے مجھ سے سرگوشی میں بولی۔ "سنو، مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں اِس شخص سے پہلے مل چکی ہوں۔"

میں نے نظر اُٹھا کے دیکھا۔ ایک بینچ پر مختصر جسم اور دبلے پتلے ایک آدمی اکیلا بیٹھا تھا۔ نیچے سبزے پر دو لڑکے بیٹھے ہوئے اُس کے پیر دبا رہے تھے۔ میں چمپا کو کچھ فاصلے پہ ٹھہرا کے آگے بڑھا۔ "کیا نور جانی تم ہو؟" میں نے دبلے دبلے لہجے میں اُسے مخاطب کیا۔

وہ چونک گیا۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں اضطراب پیدا ہوا۔ اُس نے دونوں لڑکوں کو ٹانگیں مار کے دھکیلا اور سینہ آگے کر کے بولا۔ "تم کون ہو؟" میری آواز میرے اختیار میں نہیں رہی۔

"کیا کام ہے؟" اُس نے مجھے حقارت سے گھورتے ہوئے کہا۔

"ضروری کام ہے۔"

"بولو۔" وہ چہرہ جھٹک کے بولا۔

"یہاں نہیں۔" میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"اِدھر ہی بات کرو۔" اُس نے لڑکوں کو ڈانٹ کر بھگا دیا۔

میری عقل خبط ہو گئی کہ میں اس کی آنکھیں نکالنے سے پہلے اُس کے بارے میں کیا بات کروں۔ میری اُلجھن دیکھ کے چمپا لپکتی ہوئی آئی اور اُس نے نقاب اُٹھا دیا۔ "مجھے پہچانتے ہو نور جانی؟" نور جانی نے آنکھیں پھاڑ کے چمپا کی طرف دیکھا اور کچھ بوکھلا سا گیا۔ وہ بینچ سے اُٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ خود ہی نور جانی کی کشمکش دُور کر دی۔ "میں چمپا ہوں۔ گھور کیا رہے ہو؟"

"چمپا!" اُس نے حیرانی سے چمپا کا نام دہرایا۔

"ہاں میں! ارے نور جانی! کیا گھاس کھانے لگے ہو؟ چمپا بائی کو نہیں پہچانتے؟ تو پھر تم گلابے کو اور لولے کو بھی کہاں پہچانتے ہو گے؟"

"چمپا بائی آ۔" نور جانی ابھی تک اُسے پہچاننے کی کیفیت سے دوچار تھا۔

"ارے سب کچھ بھول گئے؟ وہ لڑکی یاد نہیں ہے؟ وہ فہمیدہ۔"

نور جانی کو پھر بھی چمپا کو پہچاننے میں تامل ہوا مگر جب چمپا نے ہوٹل، گلابے، لولے اور فہمیدہ کے متعلق کچھ اور اشارے دیے تو اُس کا منہ کھل گیا۔ "چمپا۔ چمپا بائی۔ تم بنارس والی چمپا بائی ہو۔ ارے تم تو بالکل بدل گئی ہو۔ معاف کرنا، میں تو بالکل بھول گیا۔ کب آئی ہو؟ کہاں ٹھہری ہو؟" نور جانی کے چہرے پہ ندامت اور مسرت چھائی ہوئی تھی۔

"اب کیا یہیں کھڑے کھڑے باتیں کرتے رہو گے؟ کہیں بیٹھنے کو بھی جا نہیں؟ اب کے بمبئی بہت بدلی ہوئی ہے نور جانی! اور بات..."

"نہیں نہیں چمپا بائی! بتاؤ کہاں ٹھہری ہو؟"

"وہیں، جہاں تم گلابے کے ساتھ آئے تھے۔"

"اسی وادر کے ایرانی جوکر کے ہوٹل میں؟"

"ہاں ہاں وہیں۔ اور کہاں ٹھہرتی۔"

"گلابے تو سالا بہت بگڑ گیا تھا۔ ایک ہاتھ بڑا اُلٹا پڑ گیا تھا۔ سال زیادہ ہو گیا اُدھر ہی ہوا کھا رہا ہے۔"

"چھوڑو، مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔" چمپا رازداری سے بولی۔

"مگر۔ مگر چمپا بائی! اپن نے وہ دھندا چھوڑ دیا۔ وہ بھی سالا گلابے نے میں کچھ وقت کے لیے مغز پھر گیا تھا۔ یہ دھندا اپن کو سجا نہیں چمپا بائی۔"

"وہ بات نہیں ہے۔" چمپا سرگوشی میں بولی۔

"پھر تو کوئی بھی کام ہو، تمھارے لیے سر حاضر ہے۔"

"تو آج رات کو آ جاؤ۔"

"ٹھیک ہے چمپا بائی!" نور جانی نے نیاز مندی سے کہا۔ "اپن ضرور آئیں گا۔ بھر کے بل آئیں گا۔ ذرا پان وان تیار رکھنا۔ تمھارے ہاتھ کا بیڑا اب یاد آتا ہے۔"

"انتظار کروں گی۔" چمپا نے میرا ہاتھ پکڑا۔ میں وہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا مگر چمپا مجھے کھینچتی ہوئی ٹیکسی تک لے آئی۔

"تم نے اُسے ابھی ساتھ کیوں نہیں لے لیا؟" میں نے تنک کے کہا۔

"رات ہونے میں دیر ہی کتنی باقی ہے۔"

"ابھی کیوں نہیں؟" میں نے غصے سے کہا۔

"ابھی نہیں۔" چمپا نے پہلی بار مجھے رُکھائی سے جواب دیا۔ میں خون کا گھونٹ پی کے رہ گیا۔ ہوٹل واپس آ کے چمپا بستر پر لیٹ گئی اور مجھے سمجھانے لگی۔ اُس کی بات بھی مناسب ہی تھی۔ پھر اُس نے کھانا منگوا لیا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ مجھے بھوک لگی ہو گی۔ میں نے اُس کے اصرار پر ایک دو لقمے زہر مار کر لیے۔ میری نظریں دروازے پہ لگی ہوئی تھیں۔

رات کے نو بجے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا تو مجھ سے اپنی بے چینی برداشت نہیں ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو نور جانی مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔ میں نے اُس کی کمر پہ ہاتھ رکھ کے اُسے دروازے سے کرسی تک لائی۔ میرا جسم اکڑنے لگا۔ میں نے اپنی گردن جبڑا سینے سے چپکا لی۔

اِدھر اُدھر کی رسمی باتیں کر کے چمپا نے نور جانی کے آگے پھلوں، مٹھائی اور چائے کا خوان سجا دیا۔ وہ بمبئی کے حالات پوچھتی رہی، پھر خاصی دیر بعد اپنے مطلب پر آئی۔ "نور جانی! یاد ہے تمھیں وہ لڑکی فہمیدہ، پانچ سال پہلے گلابے نے جس کا سودا کیا تھا۔"

"کیوں یاد نہیں۔" نور جانی ہنستے ہوئے بولا۔ "مگر چمپا بائی! تم نے کوڑیوں کے مول خریدا تھا۔ گلابے بعد کو بہت پچھتایا تھا۔ کہتا تھا کہ چمپا بائی دن دہاڑے ڈاکہ ڈال کے لے گئی۔ اگر کچھ دیر اور رُک جاتا تو پانچ کے بجائے دس پندرہ ضرور بنتے۔ بڑے ایمان کی بات ہے چمپا بائی! چھوکری ایک دم نئی تھی۔ بالکل ڈبے میں بند تھی۔ ایک دم فسٹ کلاس۔"

چمپا نے اپنا ہاتھ رکھ کے میرا بازو دبایا۔ "اُس لڑکی نے نور جانی ہمیں بہت پریشان کیا۔ بہت ضدی نکلی۔"

"جانور کو بھی سدھانا پڑتا ہے تب کھونٹے پہ آتا ہے چمپا بائی، جتنا نگ اچھا ہو گا اتنی ہی قیمت زیادہ ہو گی۔ اتنے ہی اُس کے نخرے اُٹھانے پڑتے ہیں۔ آزاد پنچھی پنجرے میں بند ہو کے پھڑپھڑائے گا تو ضرور۔ بعد کو تو وہ خوب چہکی ہو گی۔ سونا اُگلا ہو گا سونا۔ اُس نے تمھارے لیے سیپی میں بند سچا موتی لے گئی تھیں۔"

"جانے دو مت پوچھو کیسا کیسا ستایا اُس نے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر سچ کہے ہی تم نے دس ہزار سے کم کیا لیے ہوں گے۔ چھوکری اِدھر آئی، اُدھر تمھارے ہاتھ میں چلی گئی۔ گلابے کا دل رِیجھ گیا تھا۔ کہتا تھا بس یار سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اُسے گھر میں بٹھا لوں اور پوجا کرتا رہوں۔ وہ تو درمیان میں تم ٹپک پڑیں اور گلابے کے کانوں میں سکے کھنکھنانے لگے۔" مجھے چکر آنے لگے۔ چمپا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"وہ لڑکی مر گئی نور جانی۔" چمپا بائی نے آہستگی سے کہا۔

"مر گئی!" نور جانی کی آواز بیٹھ گئی۔ "نہیں، چمپا بائی! مذاق مت کرو!"

"ہاں نورے!" چمپا اُداسی سے بولی۔ "وہ اللہ کو پیاری ہو گئی۔"

"ہائے۔" نور جانی کرب سے بولا۔ "اسی لیے سالا اپن نے یہ دھندا چھوڑ دیا۔ اپنے آپ سے گھن آنے لگی تھی چمپا بائی! گلابے بھی نہیں پنپا۔ سالے کو آہ لگ گئی۔ وہ لڑکی بہت معصوم تھی چمپا بائی۔ اپن کو پتہ نہیں سالوں نے کہاں سے اُٹھایا تھا، ورنہ جی میں آئی تھی کہ چپکے سے اُس کے گھر چھوڑ آؤں۔" نور جانی کی آواز ڈوبنے لگی۔

"کیا مطلب! یعنی نور جانی تمھیں معلوم نہیں تھا کہ گلابے نے اُسے کہاں سے اُٹھایا تھا، تم تو بات کرنے یہاں اُن کے ساتھ آئے تھے؟"

"وہ چھوکری لولے نے اُٹھائی تھی چمپا بائی! جب چھوکری اُٹھ کے آ گئی تب انھوں نے اپن کو بُلا کے دکھایا تھا۔ پانچ سو روپلے اپن نے بھی حرام کیے تھے، اپن نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ یہ چھوکری اُٹھانے وُٹھانے کا کام اپن سے نہیں ہو گا۔ پر بات ایک ہی تھی۔ چھوکری اُٹھ جانے کے بعد اُن لوگوں کا ساتھ دینا بھی منہ کالا کرنا تھا۔ اپن نے اُن کا ساتھ چھوڑ دیا چمپا بائی۔ تم نے اپن کو بہت بُری خبر سنائی۔"

"کیا بتاؤں نور جانی، اپنے دل میں بھی پھانس لگ گئی۔ بڑے بڑے لوگ دھن کی پوٹلیاں لے کے آئے وہ تیار نہیں ہوئی، آخر چلی گئی۔ نور جانی!" چمپا نے میرا ہاتھ چھوڑ کے اُس کے قریب بیٹھتے ہوئے اپنائیت سے کہا۔ "کسی صورت سے تم اُس کے گھر کا پتہ چلا سکتے ہو؟"

"اپن کو کیا معلوم۔" نور جانی نے یاسیت سے کہا پھر چونک کے بولا۔ "مگر چمپا بائی! تم کو اُس کے گھر سے کیا غرض ہے۔ کیا اس گھر کی اور چھوکری کو نشانہ لگائے بیٹھی ہو۔ اپن تمھارا ساتھ نہیں دے گا، صاف صاف کہے

دیتا ہوں۔"

"نہیں نورجانی' ایسی بات نہیں' کچھ اور بات ہے۔ شک مت کرو۔ بات یہ ہے کہ مرتے وقت فہمیدہ نے ایک وصیت کی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ مجھے اس کے گھر کا پتہ معلوم ہوگا' میری عقل پہ بھی پتھر پڑ گئے تھے' ہڑبڑاہٹ میں تمام پتہ نہیں پوچھ سکی۔ کسی طرح اس کے گھر کا پتہ چلا سکتے ہو تو ایک بھلائی کر دو۔ میرے دل کا بوجھ کم ہو جائے گا' میں اس کے باپ سے ملنا چاہتی ہوں۔"

نورجانی کچھ دیر سوچتا رہا' چمپا نے پھر اُسے یقین دلایا کہ اُس کی نیت صاف ہے۔ "اب تو ایک ہی طریقہ ہے کہ میں لولے یا گلابے سے ملنے جیل جاؤں۔ سالے بتانے میں ہیچر میچر تو بہت کریں گے مگر کسی نہ کسی طرح پوچھنے کی کوشش کروں گا۔ دو تین دن انتظار کرو چمپا بائی!"

"میں انتظار کر لوں گی' میں خود جیل چلی جاتی مگر وہ مجھے آسانی سے نہیں بتائیں گے' تم اُن کے ساتھ رہ چکے ہو' شاید لحاظ مروت کر لیں۔"

رات کے گیارہ بجے تک نورجانی بیٹھا رہا' میں نے تکیے میں منہ چھپا لیا تھا۔ چمپا بار بار میری پشت پہ ہاتھ رکھ کے تسلی دیتی اور ہمت کی تلقین کرتی تھی۔ چلتے وقت نورجانی کو خیال آیا تو اُس نے میرے بارے میں پوچھا۔ چمپا نے ضرور کوئی اشارہ کیا ہوگا کہ نورجانی نے پھر کچھ نہیں پوچھا' چمپا اُسے دروازے تک رخصت کرنے گئی۔ دروازے کے باہر اُس نے میرے بارے میں کچھ نہ کچھ بتایا ہوگا۔ ممکن ہے کچھ خیال کر لیا ہو' نہیں بتایا ہو کہ میں ایک بے حیا آدمی ہوں۔

نورجانی کو رخصت کرنے کے بعد چمپا آکے میرے سرہانے بیٹھ گئی' میں نے اپنا سر نہیں اُٹھایا تو اُس نے کچھ دیر بعد میرے بالوں پہ ہاتھ پھیرا۔ اُس کے ہاتھوں کے لمس سے میرے جسم میں اُبال آنے لگا۔ میں نے خود کو بہت روکا۔ چمپا نے میرا سر گود میں لے لیا تو میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا' میں اُس کی گود میں ہچکیاں لینے لگا۔ "نہیں بیٹے' روتے نہیں۔" وہ پھنسی ہوئی آواز میں بولی۔ اور خود پھوٹ پڑی۔ اُس نے میرے پیروں پہ سر رکھ دیا اور میرے ہاتھوں سے اپنے گالوں پہ طمانچے لگانے لگی۔

❁

صبح ہوتے ہی میں چمپا سے کچھ کہے بغیر ہوٹل سے نکل گیا۔ جیل کے دروازے پر سنتری نے مجھے روک لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ جیل میں قیدیوں سے کس طرح ملاقات کی جاتی ہے۔ جب میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں پہنچا اور لولے یا گلابے سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو اُس نے حیل و حجت سے کام لیا۔ "دو تین دن بعد آنا۔" اُس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "تمھاری درخواست پر غور کر لیا جائے گا۔"

"مگر مجھے اُس سے ابھی ملنا ہے۔" میں نے التجا کی۔

"تمھیں اجازت کا انتظار کرنا ہوگا۔" وہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

"سپرنٹنڈنٹ صاحب' آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ بڑا احسان ہوگا۔" میں نے اُس کی منت کی۔ "مجھے واپس مت کیجیے' مجھے گلابے سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔"

"تم سے جو کہہ دیا وہ تم نے نہیں سُنا۔" وہ سختی سے بولا۔

"سُن لیا جناب! مگر مجھے بہت ضروری کام ہے' میں آپ سے درخواست کر رہا ہوں۔"

"چلو کل دس بجے آ جانا۔ جیل میں سختی ہو گئی ہے' قیدیوں کی درخواستوں پر جیلر صاحب خود غور کرتے ہیں' سمجھے۔"

"پھر مجھے جیلر صاحب سے ملا دیجیے۔" میں نے تیزی سے...

"اور ہم جو تم سے کہہ رہے ہیں' جاؤ کل آنا۔" اُس نے ...
میں وہیں کھڑا رہا تو اُس نے مجھے باہر نکل جانے کا حکم دیا۔ میں ... رہا۔ سپرنٹنڈنٹ نے توجہ نہیں دی۔ میں مایوس ہو کے واپس ... اچانک میرے ذہن میں راج کرشنا کا نام کوندا۔ میں پلٹ کے ... کی میز پہ لپکا۔ میں نے اُس سے ایک فون کرنے کی اجازت طلب ...

"کسے فون کرو گے؟" وہ بگڑے تیوروں سے بولا۔

"میں راج کرشنا صاحب کو فون کرنا چاہتا ہوں' وہ پرسوں ہی دلی سے بمبئی آئے ہیں' ویسے وہ مدراس کے بہت ... افسر ہیں۔"

"راج کرشنا!" وہ حیرت سے بولا۔ "تم اُنھیں کیسے جانتے ..."

"آپ اُن سے فون ملا دیجیے' وہ میری سفارش کر دیں گے۔" میں نے جوش میں کہا۔ "وہ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔"

وہ ماتھے پہ ہاتھ رکھ کے سوچنے لگا' پھر اُس نے ... بڑھا دیا۔ میں نے اُس سے فون نمبر پوچھا تو اُس نے فون اپنی ... اور گھنٹی بجا کے سپاہی کو طلب کیا۔ سپاہی آیا تو اُس نے لولے ... کسی کو بلانے کا حکم دیا اور مجھے سپاہی کے ساتھ کر دیا۔ میں ... کہا کہ وہ صرف لولا کو بلا لائے۔

سلاخوں کے پیچھے جب بڑھی ہوئی داڑھی اور ... تباہ حال شخص برآمد ہوا تو وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگا۔ "تم لولا ہو؟" ... سلاخیں پکڑ کے بے قراری سے پوچھا۔

"ہاں!" اُس نے زمین پر تھوک کے جواب دیا۔

"لولا دادا! میں تمھارے پاس ایک ضروری کام ... میری بات سُن لینا' پھر جواب دینا۔"

"بات کرو۔" وہ برگشتگی سے بولا۔

"لولا دادا! دور سے آ رہا ہوں' مایوس مت لوٹانا۔"

"کیا بوم مارتا ہے۔" وہ بیزاری سے بولا۔ "کون ہے ..."

"لولا دادا! ذرا غور سے سنو۔" میں نے ٹھہر ٹھہر کے ... "پانچ سال پہلے تم نے ایک لڑکی کو' جس کا نام فہمیدہ تھا' ... پانچ ہزار روپے میں چمپا بائی کے ہاتھ بیچ دیا تھا' یہ سودا دادر کے ... چوک کے ہوٹل میں ہوا تھا۔"

اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا' وہ ہکلانے لگا' میں نے اُس کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال دیں۔ "اپن نے کسی چھوکری کو اغوا نہیں ... کسی نے جھوٹ بکا ہے' اپن کا چھوکری کے دھندے سے کوئی ناتا نہیں۔"

"لولا دادا! تمھارا انکار بے کار ہے' وہ لڑکی مر چکی ہے' تم جیل میں ... پانچ سال درمیان میں گزر گئے ہیں' میں تمھیں یہ نہیں بتاؤں گا کہ وہ ... کون تھی لیکن وہ مجھ سے اتنی قریب ضرور تھی کہ میں تمھارا خون کر سکتا ... میں اب بھی تمھارے جیل سے نکلنے کا انتظار کر سکتا ہوں۔ جو ہو گیا سو ہو ... اُس کی قسمت میں یہی لکھا تھا' میں یہاں تم سے صرف اتنا معلوم کرنے ... ہوں کہ مجھے اُس لڑکی کے گھر کا پتہ بتا کے اپنی زندگی کی ایک نیکی ضرور ... میں فہمیدہ کا خون معاف کر دوں گا۔"

"اپن کچھ نہیں جانتا' کچھ نہیں جانتا۔" وہ ہذیان بکنے لگا۔

"تم سب کچھ جانتے ہو لولا! میں تم سے کوئی بڑا مطالبہ نہیں کر رہا ہوں ... میری جیب میں چاقو ہے اور میں اتنا حوصلہ بھی رکھتا ہوں کہ فہمیدہ کے نام پہ ... تمھارے جسم میں بھونک دوں' تم کسی طرف بھی بھاگ گئے' میرا نشانہ خطا نہیں ... تمھارا انکار بے سود ہے' میں سب کچھ جان کے ہی یہاں آیا ہوں ... اگر بتانے میں تمھارا کچھ نہیں جاتا۔ لولا بتا دو۔ کسی پہ ایک احسان بھی ... کوئی ضرورت مند تمھارے پاس آیا ہے۔" اُس نے اپنا چہرہ دونوں ... ہاتھوں سے چھپا لیا۔ "وقت نکلا جا رہا ہے۔ لولا دادا بتا دو' اپنی ماں اور ... کے واسطے بتا دو۔ تمھارا کوئی خدا ہے تو اُس کے نام پہ بتا دو۔"

"اپن نے اُسے دادر سے اُٹھایا تھا۔" خاصی دیر بعد اس کی رُندھی ... آواز اُبھری۔ "وہ گوکل بلڈنگ میں رہتی تھی اور اس بلڈنگ کے ایک ... دارے سے ملنے کبھی کبھی دادر کے پارک میں جاتی تھی۔ اپن بہت دنوں ... اُس کا پیچھا کر رہے تھے' پھر ایک رات ......"

"میں صرف پتہ پوچھ رہا ہوں لولا۔" میں نے وحشت سے کہا۔

"وہ گوکل بلڈنگ کے تیسرے مالے پر رہتی تھی۔ بھاٹیا ریسٹورنٹ ... پچھلی والی گلی میں یہ بلڈنگ ہے۔"

"اور وہ لڑکا جس کا تم ابھی ذکر کر رہے تھے؟"

"وہ اسی بلڈنگ کی کھولی میں اکیلا رہتا تھا' پڑھتا تھا اور کہیں کام ... کرتا تھا مگر اُس کے بعد اپن نے اُسے دادر میں نہیں دیکھا۔"

"لڑکے کا نام؟"

"اپن کو نہیں معلوم' پھر اپن نے دادر ہی چھوڑ دیا۔"

میں نے سلاخیں چھوڑ دیں' لولا کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں' میرے ... میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ میں تیزی سے اُٹھ کے چلا آیا۔ لولا مجھے ... دیکھتا رہ گیا۔ چند لمحوں بعد میں ٹیکسی میں بیٹھا ہوا تھا' ٹیکسی ڈرائیور نے بھاٹیا ریسٹورنٹ پہ جب گاڑی روکی تو مجھے اپنی خبر ہوئی۔ ہاتھ میں جتنے پیسے آئے' میں اُسے دے کے سڑک پہ بے تحاشا بھاگنے لگا۔ بھاٹیا ریسٹورنٹ کے پیچھے والی گلی میں آکے میرا دل دھک دھک کرنے لگا' چکر آنے لگا' پیر جواب دے گئے۔ سامنے گوکل بلڈنگ تھی۔ سانس قابو میں نہیں تھی' آنکھوں میں جلن ہو رہی تھی۔ اور ایسا لگتا تھا۔ جیسے ابھی دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔ گوکل بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں نے جنگلا مضبوطی سے پکڑ لیا۔ سامنے سیڑھیاں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ میں سیڑھیوں پہ بیٹھ گیا کہ اوپر جاؤں یا واپس ہو جاؤں۔ ابا جان دیکھیں گے تو کیا کہیں گے' اُن کا سامنا کس طرح کروں گا' کیا کہوں گا۔ گرتا پڑتا تیسرے مالے پہ پہنچا تو آمنے سامنے دو دروازے تھے' یہ سوچتے ہوئے دیر لگ گئی کہ ادھر دستک دوں یا اُدھر دستک دوں۔ ہمت کر کے ایک دروازے پہ آہستہ آہستہ ٹھوکے مارے' ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا۔ میرا حلق خشک ہو گیا' لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "صفدر زماں خاں یہیں رہتے ہیں؟"

"کون! کس کو مانگتا ہے؟" بوڑھی عورت نے شفقت سے کہا۔

"صفدر خاں' وہ ایک عمر رسیدہ آدمی ہیں۔ مجھے بتایا ہے' وہ گوکل بلڈنگ کے تیسرے مالے پر رہتے ہیں۔ کیا برابر والے فلیٹ میں تو نہیں رہتے؟"

"گوکل بلڈنگ' تیسرا مالا' ہاں ہاں یہ ادھر ہی ہے' پر یہاں کوئی صفدر خاں نہیں' برابر فلیٹ میں لطیف بھائی رہتا ہے' یہ فلیٹ میں داؤد بھائی عینک والا رہتا ہے' تم کیدھر آ گیا بیٹا؟"

"اوپر نیچے کی کسی منزل پر صفدر خاں نہیں رہتے؟" میری زبان میں لکنت آ گئی۔

"ادھر بلڈنگ میں آٹھ فلیٹ ہے۔ ہم کسی صفدر خاں کو نہیں جانتا۔"

"آپ لوگ کب سے رہتے ہیں؟"

"ہم کو چار سال کے لگ بھگ ہو گیا۔"

"چار سال پہلے اس فلیٹ میں کون صاحب رہتے تھے؟" میری آواز ڈوبنے لگی۔ "آپ نے یہ فلیٹ کس سے لیا تھا؟"

"ہو سکتا ہے وہ صفدر خاں ہی ہو جسے تم مانگتا ہے۔" بوڑھی عورت سر ہلا کے بولی۔ "تم ایسا کرو' نچلے مالے پہ مولوی اکرم رہتا ہے' وہ ادھر کا پرانا آدمی ہے' تم اُن سے بات کر کے دیکھو۔"

میں ڈگمگاتے قدموں سے نیچے اُتر آیا۔ مولوی اکرم نماز پڑھنے کے لیے گئے ہوئے تھے' اُن کی نوجوان لڑکی نے مجھے باہر کے برآمدے کمرے میں بٹھانا چاہا۔ میں زینے پہ ہی بیٹھ گیا۔ یہ لڑکی ضرور فہمیدہ' فرخ' فریال اور فارہ کو جانتی ہوگی مگر پانچ سال گزر گئے' جب تو یہ بہت چھوٹی ہوگی۔ چشمہ لگائے ہوئے زیادہ عمر اور نورانی چہرے کے مولوی اکرم جلد ہی واپس آ گئے۔ سلام کے بعد جب میں نے اُنھیں اپنی آمد کا مقصد بتایا تو وہ ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں لینے لگے۔ "پہلے تو مجھے یہ بتاؤ' تم اُن کے کون ہوتے ہو؟"

"میں اُن کا عزیز ہوتا ہوں۔" میں نے نگاہیں نیچی کر کے کہا۔

"وہ تو چلے گئے میاں! اُن کو گئے ہوئے زمانہ ہو گیا۔ چپ چاپ فلیٹ کی چابیاں گھر میں دے گئے۔ میں ہر جمعرات کو شاہ صاحب کے مزار پہ جاتا ہوں، رات گزار کے واپس آیا تو چابیاں موجود تھیں اور گھر میں کوئی نہیں تھا، رات ہی رات تمام بچّوں کو لے گئے، ضروری سامان کے سوا باقی تمام سامان بھی چھوڑ گئے۔ فلیٹ کو پگڑی پر بھی نہیں دیا۔ گھر آیا تو ایک پرچی اور مختار نامہ۔ مختار نامہ ہی اسے کہہ لو۔ رکھا تھا۔ میں نے ایک سال انتظار کیا، سامان ایک کمرے میں بند کر کے فلیٹ کو پگڑی پہ اُٹھا دیا۔ اُوپر داؤد بھائی رہتے ہیں، شریف آدمی ہیں۔ اُنھوں نے وعدہ کیا ہے۔ جب صفدر خاں واپس آئیں گے تو یہ اپنی دی ہوئی پگڑی واپس لے کے فلیٹ خالی کر دیں گے۔ پگڑی کی رقم میرے پاس امانت رکھی ہے۔"

"وہ اچانک کیوں چلے گئے؟"

"بس چلے گئے، غیرت مند آدمی تھے، چلے گئے۔" مولوی اکرم اُداسی سے بولے۔ "آئے ہوئے دیر نہیں ہوئی تھی کہ چلے گئے اور ظالم بتا کے بھی نہیں گئے۔ مجھ سے بھی نہیں کہا جس سے روز بات کرتے تھے۔ بلڈنگ میں ایک صرف میں تھا جس سے ملنا پسند کرتے تھے۔"

"وہ یہاں کیا کرتے تھے، آپ نے اُن سے نہیں پوچھا کہ وہ اپنا وطن چھوڑ کے بمبئی کیوں آ گئے تھے؟" میں نے تلخی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں کرتے تھے، دن بھر گھر میں رہتے تھے، کبھی باہر نکلتے تو لائبریری جا کے بیٹھ جاتے تھے، موٹی موٹی کتابیں تھیں اور وہ تھے۔"

"موٹی موٹی کتابیں، لائبریری۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ انھیں مطالعے کا ایسا شوق تو نہیں تھا۔"

"کیا بتائیں میاں! بس کچھ مت پوچھو۔" مولوی اکرم روہانسے ہو گئے۔

"بتائیے۔ میں بہت دُور سے انھی کی تلاش میں آیا ہوں، آپ ان کے بارے میں جو کچھ جانتے ہوں، خدا کے لیے ہر بات بتائیے۔" میں نے عاجزی سے کہا۔

"مگر آپ کون ہوتے ہیں اُن کے؟" مولوی اکرم نے تشویش سے پوچھا "آپ اُن کے بارے میں کچھ جاننے کے لیے اتنے مضطرب کیوں ہیں؟"

"میں نے آپ کو بتایا ناکہ وہ میرے عزیز ہوتے ہیں۔ رشتے داروں نے بغیر چلے آتے تھے۔ بڑی مشکل سے مجھے اُن کا پتہ چلا تو میں یہاں ہوں۔"

"آپ ان کے کیا لگتے ہیں بھلا؟" مولوی اکرم نے کُرید کی تو میں نے اِدھر اُدھر کی رشتے داری بتا کے اُنھیں ٹالنا چاہا۔ وہ مطمئن نہیں ہوتے۔ اُن کے اطمینان کے بعد ہی ممکن تھا کہ وہ مجھے اپنے دوست کے نجی حالات بتائیں۔ باتیں کرتے کرتے اچانک اُنھیں نہ جانے اس رازداری کا خیال کیوں آ گیا تھا۔

"اُن کے بچے تو سب ٹھیک تھے؟"

"ہاں سبھی ٹھیک تھے۔" مولوی اکرم آزردگی سے بولے۔ میں نے ایک ایک کا نام لے کے پوچھا تو وہ مجھے نظروں میں تولنے لگے۔ "کہیں" وہ بوکھلا کے بولے "تمھاری ناک اور آنکھیں اُن سے مشابہ ہیں۔ کہیں تم اُن کے بچھڑے ہوئے بیٹے بابر زماں تو نہیں؟ مجھے سچ سچ بتاؤ۔"

"میں وہ نہیں ہوں۔" میں نے سر جھٹک کے کہا۔

مولوی صاحب اداس ہو گئے۔ "تم چھپا رہے ہو۔ خیر مجھ سے چھپانے سے کیا حاصل ہوگا۔ وہ اپنے بیٹے بابر زماں کو بہت یاد کرتے تھے۔ میرا خیال ہے مجھے اب تمھیں سب کچھ بتا دینا چاہیے۔ تم آرام سے بیٹھو۔ میں تمھارے لیے کچھ ناشتہ پانی منگاتا ہوں۔" انھوں نے اپنی لڑکی ریحانہ کو آواز دے کے چائے وغیرہ منگا لی۔ مولوی اکرم کے لہجے میں سرگرمی آ گئی تھی۔

"آپ کچھ بتا رہے تھے؟" میں نے انھیں ٹوکا۔

"ہاں! بتا رہا تھا میاں، کیا بتاؤں، کیا نہ بتاؤں، وہ چلے گئے۔ اتنے دنوں بعد انھیں کوئی پوچھنے آیا ہے۔ صفدر اپنے ساتھ بہت دکھ لائے تھے۔ اُن کا بیٹا گھر سے جا چکا تھا۔ اُن کی بیوی مر چکی تھی۔ انھیں کچھ فکر نہیں تھی۔ دن بھر کمرے میں بند ہو کے کاغذات پڑھتے رہتے تھے، نہ گھر کا ہوش تھا نہ دنیا کی خبر۔ جو جمع پونجی لے کر آئے تھے، اسی پہ گزارا کر رہے تھے۔ بچے نیک تھے۔ یوں کہو انھیں"

"مگر اُن کے پاس کیسے کاغذات تھے، جن کا آپ ذکر کر رہے ہیں ــــ؟"

"نہ جانے کہاں سے ردّی کی دکان سے کچھ کرم خوردہ کاغذات لے آئے تھے، نامعلوم زبان میں ان پر آڑے ترچھے نشان بنے ہوئے تھے۔ جنھیں سمجھنے کے لیے وہ موٹی موٹی لغات استعمال کرتے تھے۔ صبح و شام بس ایک ہی کام رہ گیا تھا کہ کاغذات سیاہ کرتے رہیں، ان پہ جھکے رہیں جیسے ان میں کوئی خزانہ چھپا ہو۔ پہلے تو میں سمجھا کہ کیمیا کا کوئی نسخہ اُن کے ہاتھ آ گیا ہے۔ بار بار پوچھتا تھا۔ "برادرِ عزیز! کچھ ہمیں بھی نکل کے دکھا دو۔ یہ کیا ہر وقت ان بوسیدہ کاغذوں میں گم رہتے ہو؟" سنتے تھے اور مسکرا کے خاموش ہو جاتے تھے۔ ایک دن میں نے ان کے آگے سے کاغذات اُٹھا لیے۔ خاصے ناراض ہو گئے۔ میں نے انھیں جلد ہی واپس کر دیا۔ بعد کو میں نے احتیاط رکھی۔ ایک دن مزاج خوش گوار تھا۔ شاید کوئی نکتہ ہاتھ آ گیا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تو جوش میں کہنے لگے۔ میاں مولوی اکرم! یہ خزانہ ہے، یہ کاغذات، ان کی قدر میں ہی جانتا ہوں۔ ان میں دنیا بھر کی دولت چھپی ہوئی ہے۔ میں نے کہا۔ ہٹایئے بھی صفدر میاں، آپ نے اپنی زندگی کیوں ان کاغذوں کے پیچھے ہلکان کی ہوئی ہے۔ بچوں کو دیکھیے۔ فہمیدہ ہے اور فرخ بھی اب بہت سیانی ہو گئی ہے۔ ان کی شادیاں کیجیے، کچھ کام دھام کیجیے۔ باہر نکلیے، رشتے ایسے تھوڑی آ جائیں گے۔ کہتے تھے بس میں فارغ ہونے ہی والا ہوں۔ پھر رشتے گھر آیا کریں گے۔ تم دیکھنا میاں مولوی اکرم، میں تمھیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ ہم بمبئی چھوڑ دیں گے۔ ایک محل بنائیں گے۔ بہت بڑی جاگیر ہوگی، ہر طرف کھیت ہی کھیت اور باغات ہی باغات ہوں گے۔ گھوڑے، ہاتھی اور خدام کی فوج، جب سواری نکلا کرے گی، لوگ سر جھکا لیا کریں گے۔ میں اُن کا دل رکھنے کے لیے ہاں میں ہاں ملا دیتا تھا۔ مجھے اُن پر بڑا ترس آتا تھا۔ دن بھر یہی خواب دیکھتے رہتے تھے۔"

"کیسے کاغذات تھے وہ؟" میں نے تشویش سے پوچھا۔

"کسی کباڑیے نے دیے ہوں گے۔ مومی کاغذ میں لپٹے ہوئے تھے۔ میں نے انھیں بار بار دیکھا تھا۔ ایک ہی چیز مجھے ان میں صاف نظر آتی تھی اور وہ تھی مہاتما بدھ کی تصویر۔"

"مہاتما بدھ کی تصویر!" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، وہی بدھ کا خاص بیٹھنے کا انداز، دونوں ہاتھ زانوؤں پر رکھے ہوئے، آنکھیں بند، چہرہ پُرسکون، دنیا کے ہر غم سے بے نیاز۔"

"کیا ان کاغذات کی رنگت زرد تھی اور وہ سنہرے کتھئی حرفوں سے بھرے ہوئے تھے؟" میں نے مضطرب ہو کے پوچھا۔

"ہاں! کچھ ایسا ہی تھا۔ صفدر خاں نے سیاہ روشنائی میں ان پر نشان لگا رکھے تھے۔ بس انھیں دنیا کی کوئی فکر نہیں رہ گئی تھی۔ کاغذات ہی میں گم رہتے تھے۔ پیسے ویسے کی طرف سے بے نیاز تھے۔ اچھا خاصا فلیٹ اس وقت انھوں نے پچیس ہزار روپے میں لیا تھا، اب تو قیمت بڑھ گئی ہے۔ کیا تم ان کاغذات کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟" انھوں نے اچانک مجھ سے سوال کیا۔

میں دم بخود تھا، ان کے سوال پر چونک گیا۔ "ہاں مجھے کچھ ایسا لگتا ہے کہ میں نے یہ کاغذات ان کے گھر میں دیکھے تھے۔" میں نے سنبھل کر کہا۔

"ہوں نہ ہوں، یہ وہی کاغذات تھے جو کورا بدھ گیا سے فرار ہوتے وقت اپنے ساتھ لائی تھی۔ ان کے ساتھ ہیرے جواہرات کی ایک پوٹلی بھی تھی۔"

"اُس کے بعد ایک حادثہ پیش آ گیا۔" مولوی اکرم کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ "بس اُس کے بعد وہ اُکھڑ گئے، بات ہی نہیں کر پاتے تھے۔ گم سم پڑے رہتے تھے۔"

مجھے اندازہ تھا کہ مولوی اکرم اب کیا کہنا چاہتے ہیں، میں نے ان کی الجھن بھانپ لی۔ "اُن کی بڑی لڑکی فہمیدہ ایک رات گھر سے غائب ہو گئی۔" مولوی اکرم کے گلے میں آواز پھنس گئی۔ "اور وہ ہم سب سے منہ چھپا کے چلے گئے۔" انھوں نے اپنے آنسو پونچھ کے کہا "فہمیدہ بڑی سعید بچی تھی، نہ جانے اسے کیا ہو گیا۔ نیچے کھولی میں رہنے والا ایک نوجوان، صورت شکل سے تو شریف ہی معلوم ہوتا تھا۔ اوپر صفدر میاں کے پاس آتا تھا۔ فہمیدہ کے غائب ہونے کے بعد وہ بھی نہیں دیکھا گیا۔ اللہ جانے کیا بیتی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"آپ کے خیال میں صفدر صاحب اب کہاں ہوں گے؟" میں نے حماقت کی بات پوچھی، مولوی اکرم نے اس سوال کا وہی جواب دیا جو انھیں دینا چاہیے تھا۔ مولوی اکرم، ابا جان اور گھر کے حالات بتاتے رہے اور میں گُنگ بیٹھا سنتا رہا۔ وہ اپنی آواز کا درد میرے کانوں میں منتقل کرتے رہے اور میں نے ایک آہ بھی نہیں بھری۔ رکھے رکھے چائے ٹھنڈی ہو گئی۔ پھر اُن کی بچی نے آواز دے کے بتایا۔ نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ میں اٹھ کے چلنے لگا تو انھوں نے میرا دامن پکڑ لیا۔ بہت روکا، گلے لگایا، کہا، کہاں جاؤ گے۔ مگر میں انھیں سلام کر کے چلا آیا۔

✿

واپس آتے ہوئے مجھے کوئی جلدی نہیں تھی۔ نہ ذہن پر کوئی بوجھ تھا، نہ سینے میں آگ لگ رہی تھی، نہ ٹانگوں میں تھکن کا احساس تھا۔ جدھر منہ اُٹھا اُدھر چلتا رہا، چلتا رہا۔ اسی طرح رات ہو گئی مگر میرے قدم نہیں رُکے۔ کسی جگہ ایک سپاہی نے مجھے پکڑ لیا۔ وہ نہ جانے کیا کیا اول فول بکتا رہا۔ گالیاں دیں، جھڑکیاں دیں، میں نے کچھ نہیں کہا تو اُس نے ملائمت سے پوچھا۔ "کدھر رہتا ہے؟" میں نے پتہ نہیں کیا جواب دیا کہ وہ میری جیبیں ٹٹولنے لگا۔ "بائیں چاقو! نقدی! تجھے تھانے چلنا ہوگا۔" میں نے کچھ نہیں کہا مگر جب اُس نے میرا جسم ٹٹولا اور اُس کے ہاتھ مالا کے دانوں سے ٹکرائے تب مجھے ہوش آیا۔ وہ میری مالا اُتارنے ہی والا تھا کہ میں نے چیخ کے اُسے دور دھکیل دیا۔ اُس نے سیٹی بجائی۔ چاقو اور نقدی اُس کے پاس رہ گئی۔ میں بھاگتا ہوا ایک گلی میں گھس گیا اور راستوں راستوں ہوتا ہوا ایرانی جوکر کے ہوٹل پہنچ گیا۔

چمپا کی آنکھیں سُوجی ہوئی تھیں۔ میں کمرے میں پہنچ کے اُس کے بازوؤں میں گر گیا پھر مجھے کچھ خبر نہ رہی۔ صبح ہوئی اور آنکھ کھلی تو چمپا میرا سر اپنی آغوش میں چھپائے ہوئے تھی اور نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھی، جھنجھو رہی تھی، پوچھ رہی تھی کہ میں کہاں غائب تھا۔ میری خاموشی سے گھبرا کے اُس نے ڈاکٹر کو بُلا لیا۔ ڈاکٹر نے میرے سوئیاں بھونک دیں اور سُلا کے چلا گیا۔ میں شام تک بے سُدھ رہا۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو میں نے گھبرا کے چمپا کو دیکھا۔ وہ ایک پہلو سے لگی میرے پاس بیٹھی تھی۔ میں نے اطراف میں نظریں گھمائیں "تم ابھی تک یہیں ہو؟" میں نے نحیف آواز میں پوچھا۔

"میں کہاں جاؤں گی؟" وہ بلکتی ہوئی بولی۔

"تم واپس چلی جاؤ۔"
"کیسے چلی جاؤں۔"
"نہیں، اب تم جاؤ۔ میں نے تمھیں بہت تکلیف دی، مجھے معاف کردو۔ اب تمھاری ضرورت نہیں ہے۔" میں نے سرد آواز میں کہا۔
"تم کہاں گئے تھے اور کیا پوچھ کے آئے ہو؟ مجھے نہیں بتاؤ گے؟ یقیناً تم جیل گئے ہو گے۔ کیا پتہ چلا؟" اُس نے میرا بازو زور سے تھام لیا۔
"کچھ نہیں، وہ لوگ اب وہاں نہیں ہیں۔"
"کیا معلوم ہوا۔ کچھ کہہ کے تو گئے ہوں گے؟" میں نے مایوسی سے سر ہلایا۔ چمپا پر سکتہ طاری ہو گیا۔
"اب تم چلی جاؤ۔ میں تمھیں اسٹیشن چھوڑ آتا ہوں۔"
"اور تم.....؟" وہ متوحش لہجے میں بولی۔
"میرا کیا ہے، میں بھی کہیں جا مروں گا۔"
"میں تمھیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔" اُس نے میرے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا۔ "میں تمام گناہوں سے توبہ کرتی ہوں۔ میں آگرے واپس نہیں جانا چاہتی۔ اب میں تمھارے ساتھ رہوں گی۔ تم مجھے اپنے گھر کے کسی کونے میں ڈال دینا۔"
"نہیں ــــ نہیں، تم جاؤ۔" میں نے چیخ کے کہا۔
"میں نہیں جاؤں گی، میں تمھاری ماں تو نہیں بن سکتی، ہاں اپنی خادمہ سمجھ لینا، باندی سمجھ لینا۔ میرے آخری دن تو بہ میں گزر جائیں گے۔"
"چمپا بائی! توبہ کی زندگی تم میرے بغیر بھی بسر کر سکتی ہو۔ مجھے چھوڑ دو، تنگ مت کرو۔ میں کسی کے ساتھ رہنا نہیں چاہتا۔"
"پھر بھی میں اس حال میں تمھیں چھوڑ کے نہیں جا سکتی۔ میری خطائیں معاف کر دو۔ میں تمھیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔ میرا کوئی بیٹا نہیں ہے، میرے پاس گزر بسر کے لیے خاصی رقم جمع ہے، میں تم پہ بار نہیں بنوں گی اور اگر تم کہو گے تو اپنی ساری دولت کو تمھارے سامنے آگ لگا دوں گی لیکن مجھے جانے مت دو۔ اُس جہنم میں مجھے مت لوٹاؤ۔"
"چمپا بائی! چلی جاؤ۔ تم تنہا بھی اپنی زندگی بدل سکتی ہو، میرا کوئی بھروسا نہیں ہے، میں اگر زندہ رہا تو کبھی موتیا بائی سے تمھارا پتہ پوچھ کے ضرور تمھارے پاس آؤں گا۔"
چمپا بائی زار و قطار روتی رہی۔ میری جیب کے تمام پیسے سپاہی نے چھین لیے تھے۔ تھیلے میں تھوڑے سے پیسے تھے۔ میں نے ہوٹل کا بل ادا کرنا چاہا مگر چمپا بائی نے پہلے ہی ہوٹل والوں کو منع کر دیا تھا۔ ہم دونوں نے ہوٹل چھوڑ دیا اور میں چمپا کو آگرے جانے والی گاڑی میں سوار کرا آیا۔ وہ واپس جانے کے لیے قطعی آمادہ نہیں تھی لیکن جب میں نے یہ کہا کہ میں کسی وقت بھی اُسے چھوڑ کے کہیں نکل جاؤں گا تو بڑی مشکل سے تیار ہوئی۔ چلتے وقت اُس نے میری پیشانی کو بوسہ دیا، میری جیب میں کچھ روپے ٹھونسے اور آنسوؤں سے میرا چہرہ بھگو دیا۔

اسٹیشن پر بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ کوئی دلی جانے والی، کوئی کلکتے جانے والی۔ میں ایک گاڑی میں بیٹھ گیا۔ پھر خیال آیا کہ کہاں جاؤں گا لہٰذا اتر کے پھر اسٹیشن پر آ گیا اور شہر میں آ کے سڑکوں پر بے وجہ گھومتا رہا۔ اب کسی کو تلاش کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ ایک رات زرّیں کا دیا ہوا تھیلا کوئی لے گیا۔ جو کپڑے تن پہ تھے وہ ایک ہفتے میں خاک اور دھول سے میلے ہو گئے۔ پھر ان میں چیتھڑے لگ گئے۔ نہ جانے کتنے دن گزر گئے۔ سڑک پر گزرنے والے آدمیوں کو تکتا رہتا تھا۔ ہزاروں لڑکیاں اِدھر سے اُدھر جاتیں مگر اُن میں کوئی گورا نہیں تھی۔ مجھے نہ اُس کا چہرہ نظر آیا، نہ مولوی صاحب، نہ ابّا جان ملے اور نہ گھر کا کوئی اور فرد۔ میں رات کو کہیں بھی پڑ رہتا۔ دن نہ کسی طرح گزر جاتا۔ کئی بار دل میں آیا کہ زرّیں انتظار کر رہی ہو گی۔ اُس کے پاس چلا جاؤں یا پھل کے پاس چلا جاؤں لیکن کسی کو بے آرام کرنے سے کیا حاصل تھا۔ لوٹ پیٹ کے بھلا ہی دیں گے۔ زرّیں کے پاس جا سکتا تھا، پھل کے پاس جا تو تھا مگر وہ دونوں میرے لیے گورا اور ابّا جان کو واپس نہیں لا سکتے تھے۔ اپنے لیے ہر جگہ یکساں ہے۔ ہر جگہ ایک جیسی زمین ہے۔ کبھی بھوک بہت ستاتی تو چھابڑی اٹھا کے اِدھر کا وزن اُدھر پہنچا دیا اور پیٹ کی آگ بجھا لیتا۔ بدن پر لتّے چیتھڑے ضرور محفوظ تھے کہ میں لوگوں کی نظروں سے چھپی رہے۔ دن گزر گئے۔
پھر ایک شام جب میں جوہو کے ساحل پر پڑا ہوا سمندر میں اٹھنے والی لہریں دیکھ رہا تھا کہ مجھے کسی شخص کی آہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے سوچا کوئی پولیس والا ہو گا۔ یہ لوگ مجھے ایک جگہ سکون سے نہیں بیٹھنے دیتے، اسی طرح تنگ کرتے رہتے تھے۔ وہ پولیس والا ہی تھا مگر سادہ لباس میں۔ اُس کا نام راج کرشنا تھا۔
میں نے اُسے پہچاننے سے انکار کر دیا۔
"جاؤ بھائی! اپنا کام کرو۔"
راج کرشنا اکڑوں بیٹھ کے بغور میرا چہرہ دیکھنے لگا۔ اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ "ظہیر خاں! یہ میں ہوں راج کرشنا، میں تمھارا چہرہ نہیں بھول سکتا۔ میں اپنے محسن کا چہرہ کیسے بھول سکتا ہوں۔" اُس نے ٹوٹی پھوٹی اُردو میں کہا اور میرے دونوں بازو زور سے پکڑ لیے۔
"کون ظہیر خاں؟ کیوں تنگ کرتے ہو بھائی! جاؤ ظہیر خاں کو جا کے ڈھونڈو۔" میں نے نقاہت سے کہا۔ "میرا نام ظہیر خاں نہیں ہے۔"
"نہیں نہیں، نہیں ظہیر خاں!" راج کرشنا بے تاب ہو گیا۔ "تم یقیناً تم وہی ہو مگر تم نے اپنا یہ کیا حال بنا لیا ہے میرے دوست! میں تمام دلور میں تلاش کرتا رہا، میرے مخبروں نے پتہ چلا لیا تھا کہ تم کس ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے ہو لیکن تم ہوٹل چھوڑ چکے تھے۔ میں تمھاری طرف سے ... ہو چکا تھا۔ اُٹھو اُٹھو۔" اُس نے مجھے اُٹھانے کی کوشش کی۔
"میں وہ نہیں ہوں۔" میں نے کراہ کے کہا۔ "تمھیں دھوکا ہوا ہے صاب! مجھے کہیں مت لے جاؤ، میں یہیں ٹھیک ہوں۔"
"اوہ نہیں۔" وہ کرب سے بولا۔ "تمھارے ساتھ ضرور کسی نے کوئی بہت بڑا دھوکا کیا ہے۔ تم تو بہت بہادر ہو میرے دوست! بہادر بھی بھلا اس طرح زندگی سے گھبراتے ہیں؟ اٹھو اٹھو، گھر چلو۔"
"میں کہیں نہیں جاؤں گا۔" میں نے تلخی سے کہا۔
"اور میں تمھیں ساتھ لیے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا، سمجھے۔"
"نہیں۔" میں نے جھٹکے سے اپنا بازو چھڑاتے اور چیختے ہوئے کہا۔ "مجھے چھوڑ دو، مجھے تنہا چھوڑ دو۔ مجھے کہیں نہیں جانا۔"
"تم بہت ناراض معلوم ہوتے ہو۔" وہ میری کمر تھپکنے لگا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ "آؤ ڈارلنگ! تم چاہے ناراض ہی رہنا اور کوئی بات مت کرنا لیکن یہاں سے تو اٹھو۔ دیکھو، کتنے لوگ میرے ساتھ ہیں، یہ سب کیا کہیں گے۔ راج کرشنا کا دوست اس حال میں ہو اور وہ اُسے چھوڑ جائے؟"
"میں تمھارا دوست نہیں ہوں۔" میں نے جھنجھلا کے کہا۔ "میں ظہیر خاں نہیں، میرا کوئی نام نہیں ہے، میرا کوئی دوست نہیں ہے۔"
"آؤ اٹھو ورنہ۔" وہ نرمی سے بولا۔ "دیکھو، میں تمھیں زبردستی بھی لے جا سکتا ہوں۔" اُس نے میری کمر کے گرد حلقہ تنگ کر لیا۔ اُس کے ساتھی حیرت اور تجسس سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ وہ سب سادہ لباس میں تھے۔
"آئیے، اُٹھیے، کرشنا صاحب کی بات مان لیجیے۔" اُن میں سے کوئی بولا۔ کرشنا نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے خاموش رہنے کی تاکید کی۔
"گاڑی قریب لاؤ۔" کرشنا نے حکم دیا۔ ایک شخص فوراً سڑک کی جانب بھاگنے لگا۔ کرشنا اعلا درجے کا لباس پہنے ہوئے تھا، میرے جسم پر چیتھڑے لگے ہوئے تھے اور وہ بھی سیاہ ہو چکے تھے۔ کرشنا کسی جھجک کے بغیر اپنے بازو میرے گرد، میری کمر میں حمائل کیے ہوئے تھا اور نرمی سے مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آمادہ کر رہا تھا۔ جتنا میرا انکار بڑھ رہا تھا، اتنا ہی اُس کا اصرار۔ وہ میرے برابر ریتیلی زمین پر بیٹھ گیا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "ٹھیک ہے، تم نہیں جاتے تو ہم بھی یہیں بیٹھیں گے۔"
"مجھے چھوڑ دو۔" میں نے عاجزی سے کہا۔ "میری خطا معاف کر دو۔" میں نے اُس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ راج کرشنا نہیں مانا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا، وہ اُس کے منتظر تھے۔ سب نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا اور میرے دونوں بازو پکڑ کے مجھے زمین سے اُٹھا دیا۔ میں نے اُن سے اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے بہت ہاتھ پیر مارے، بہت چیخ پکار کی مگر ناچار خاموشی اختیار کرنی پڑی۔ راج کرشنا نے طے کر لیا تھا کہ اب وہ میری کوئی بات نہیں سُنے گا۔ اِدھر میں نے مزاحمت ترک کی، اُدھر راج کرشنا کے ساتھیوں نے میرا جسم اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ راج کرشنا تیز قدموں سے مجھے گاڑی کی طرف لے جانے لگا۔ گاڑی فٹ پاتھ کے ساتھ ہی کھڑی تھی۔
کار کا دروازہ پہلے ہی سے کُھلا ہوا تھا۔ جوہو پر بہت سے تماش بین ہماری جانب متوجہ ہو گئے تھے۔ راج کرشنا نے مجھے پچھلی نشست پر اپنے ساتھ بٹھا لیا اور راستے بھر میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں زور سے دبائے رہا۔
گاڑی ایک چھوٹے سے خوب صورت بنگلے میں داخل ہوئی۔ راج کرشنا نے تمام ملازموں کو اکٹھا کر لیا اور کسی کو چائے، کسی کو کھانا بنانے، کسی کو کپڑے لانے اور کسی کو گرم پانی تیار کرنے کا حکم دیا۔ اُس کے باقی تمام ساتھی راستے ہی میں رخصت ہو گئے تھے۔ وہ شاید دوسری گاڑیوں میں ہوں گے۔ میں مجرموں کی طرح گردن جھکائے بیٹھا تھا۔ راج کرشنا میرے پاس ہی بیٹھ گیا۔ "یہ تمھارا ہی گھر ہے۔ یہاں اگر تم نے کسی قسم کا تکلف کیا تو اب میں تم سے ناراض ہو جاؤں گا اور سنو، میں ایک پولیس افسر ضرور ہوں مگر اسے جیل مت سمجھنا، یہاں تم ہر طرح آزاد ہو۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو ملازم کو آواز دے لینا۔" وہ میری گردن سہلانے لگا۔
میرے ہونٹوں کو چپ لگ گئی تھی۔ نہ جانے راج کرشنا کیا کیا کہتا رہا۔ پھر ایک ملازم نے آ کے اطلاع دی کہ گرم پانی تیار ہے۔ راج کرشنا نے مجھے غسل خانے میں دھکیل دیا۔ وہاں لباس پہلے ہی تیار رکھا تھا۔ میں نے اپنے پھٹے ہوئے کپڑے اُتارے تو میرے جسم پر صرف مالا رہ گئی۔ مالا دیکھ کے بے اختیار میری آنکھیں بہنے لگیں۔ میں غسل خانے کے فرش پہ دیر تک بیٹھا مالا آنکھوں سے لگائے روتا رہا۔ پھر جب بہت دیر ہو گئی تو راج کرشنا نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے ہوں کہہ کے اسے اپنے زندہ ہونے کی تسلی دلائی اور کئی ہفتوں کی سیاہی جسم سے کھرچنے لگا اور خوب نہا دھو کے اُجلے کپڑے پہن کے باہر نکلا۔ راج کرشنا بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میرے گلے سے لپٹ گیا۔ "اب بتاؤ، تم کون ہو؟ دیکھا ہم نے کیسا پہچانا۔" اُس کی آواز سے مسرت جھلک رہی تھی۔ میں نے ندامت سے نگاہیں اُوپر نہیں اُٹھائیں۔ ڈائننگ روم سے پیوستہ کمرے کی میز پر کھانوں کی سرپوش ڈشیں اور پھل رکھے ہوئے تھے مگر میں کیا کرتا، بھوک ہی اُڑی ہوئی تھی۔ صبح چنے کھا کے میں جوہو کی ریت پہ پڑ گیا تھا۔ کل رات بھی کھایا تھا یا نہیں، یاد نہیں تھا۔ راج کرشنا نے سرپوش ہٹائے تو گرم کھانوں کی خوشبوئیں نتھنے چیرنے لگیں۔ "کھاؤ۔" اُس نے میری پلیٹ میں اُبلے ہوئے چاول اور شوربا ڈال کے ہاتھ پھیلا کے کہا۔ "خوب کھاؤ۔" مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ راج کرشنا کتنا ہٹ دھرم آدمی ہے اس لیے میں نے کوئی حجت نہیں کی، چپ چاپ کھانا زہر مار کرتا رہا۔ یہ لذیذ غذائیں بہت دنوں بعد پیٹ میں گئی تھیں۔ اس لیے ایک لمحے کو تو مجھے چکر سا آ گیا، معدہ جلنے لگا۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ میں بہت بھوکا تھا۔ میرے ساتھ راج کرشنا بھی کھاتا رہا اور بار بار کھانا میری پلیٹ میں ڈالتا رہا۔
چائے کے بعد راج کرشنا مجھے ڈرائنگ روم میں واپس لے آیا۔ کھانے کے دوران میں اُس نے میرے متعلق کوئی گفتگو نہیں کی تھی، صرف اپنے بارے میں بتاتا رہا تھا کہ میں نے ریل میں اُسے جس آدمی کے چنگل سے نجات دلائی تھی، وہ اُس کے لیے بمبئی میں کامیابی کی کلید ثابت ہوا۔ اُس شخص نے ...

میں آکے اپنے تمام گروہ کا راز فاش کر دیا اور اس طرح بمبئی پولیس ایک ایسے گروہ پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئی جو ایک عرصے سے اُس کے لیے پریشانی کا سبب بنا ہوا تھا۔ راج کرشنا کو اُسی گروہ کے لیے بمبئی بلایا گیا تھا۔ وہ گروہ بیرونی مال کی ناجائز تجارت میں ملوث تھا۔" اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ میری موجودہ زندگی صرف تمھارے سبب سے ہے۔" وہ جوشیلے لہجے میں بولا۔" بعد میں اس کیس میں کامیابی کی بنیاد پر مجھے یہیں روک لیا گیا۔ اس شہر میں اس قدر جرائم ہوتے ہیں کہ ایک لمحے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ یہ بمبئی کے پولیس والے نہ جانے کیا کرتے رہتے ہیں۔ دماغ تو کام ہی میں نہیں لاتے۔ آج بھی جوہو پہ میں ایک کیس کے سلسلے میں گیا تھا کہ تم سے ملاقات ہو گئی۔ اُف! میں نے تمھیں کس قدر تلاش کیا، نہ جانے تم کہاں چھپ گئے تھے اور ملے بھی تو کس حلیے میں ملے۔ وہ عورت کہاں ہے جو تمھارے ساتھ سفر میں تھی؟"

"وہ چلی گئی۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"کہاں؟" وہ حیرت سے بولا۔

"وہ اپنے گھر واپس چلی گئی۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

میری اکتاہٹ اُس نے نظر انداز کر دی۔ "اور اُس شخص کا کیا بنا جس کی تلاش میں تم یہاں آئے تھے؟" اُس نے کُرید کی۔

"وہ بھی نہیں...... نہیں ملا۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"خیر سفر کے دوران میں میں نے قیافتاً اتنا تو جان لیا تھا کہ تم وہ نہیں ہو جو اس عمر میں ایک نوجوان کو ہونا چاہیے۔ میں کہہ نہیں سکتا مگر مجھے شبہ ہے کہ جوانی نے تمھارے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ تم مناسب سمجھو تو مجھے کچھ بتاؤ۔ اس طرح تمھارا جی بھی ہلکا ہو جائے گا اور اگر میں تمھارے کسی کام آ سکتا ہوں تو میری طرف سے ہر خدمت حاضر ہے۔ تم میرے بارے میں جانتے ہو، میں پولیس کا ایک خاصا اور بڑا افسر ہوں۔ بمبئی میں میری حیثیت ایک ایڈوائزر کی ہے لیکن میں ان لوگوں پر بھروسا نہیں کرتا، اپنی اسکیموں پر خود عمل کرتا ہوں۔ جوہو پر جو لوگ میرے ساتھ تھے، سب کے سب بمبئی پولیس کے بڑے بڑے عہدے دار تھے۔ تمھارے ساتھ اگر کسی نے زیادتی کی ہو تو مجھے بتاؤ۔ وہ شخص کہیں بھی ہو، میں اُسے ہندوستان بھر میں تلاش کراؤں گا۔"

وہ خود ہی سب کچھ کہتا گیا پھر اُسے خیال آیا تو وہ جھینپ کے بولا۔" میں نہ جانے کیا کیا کہہ گیا ہوں۔ ہاں تو تمھارے ساتھ کیا پیش آیا میرے دوست! کچھ بتاؤ؟" اُس نے اشتیاق سے کہا۔

"کچھ بھی نہیں، بس وہ مجھے نہیں ملا۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔" اُس کے چہرے پر اُلجھن عیاں ہوئی۔ "بہرحال تم کچھ بتانا نہیں چاہتے۔ خیر کبھی کبھی آدمی اس منزل پہ پہنچ جاتا ہے جہاں ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے اور کسی سے کچھ کہنا سُننا نہیں چاہتا۔ اب یہ بتاؤ، تمھیں آرام کرنے کی خواہش ہے یا میں تمھیں بمبئی گھماؤں؟"

"میں واپس جانا چاہتا ہوں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

وہ ہنسنے لگا۔" اب تو تم گرفتار ہو گئے۔ تم میری مرضی سے جاؤ گے اور سنو، میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمھارے کسی معاملے میں حائل نہیں ہوں گا لیکن تم ٹھہرو گے یہیں۔ میں ایک بالکل تنہا آدمی ہوں۔ میری ماں مدراس میں رہتی ہیں۔ اگر یہاں بمبئی میں دیر ہو گئی تو میں اُنھیں بلا لوں گا، وہ تم سے مل کے بہت خوش ہوں گی کیونکہ تم وہ شخص ہو جس نے اُن کے بیٹے کی جان بچائی ہے۔ وہ دل کی بہت اچھی ہیں۔ میں اس وقت یہاں اکیلا ہوں، تمھیں کوئی ڈسٹربنس نہیں ہو گا۔ میں تمھیں بالکل نہیں چھیڑوں گا، پھر تو یہاں رہنے میں کیا عذر ہے۔ میری مانو، جانے کا ارادہ ملتوی کر دو۔" وہ ملتجی لہجے میں بولا۔

میں نے سپر ڈال دی۔ میری آمادگی دیکھ کے راج کرشنا نے گلے سے لگا لیا۔ میری داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ اُس نے میرے سامنے شیونگ کا سامان رکھ دیا۔ وہ مجھ سے ایسا برتاؤ کر رہا تھا جیسے میری اور اُس کی برسوں سے شناسائی ہو۔ مجھے اُس کے اس رویے سے شرم آنے لگی۔

میں نے شیو بنا لیا تو اُس نے آئینہ میرے چہرے کے مقابل کر دیا۔

"اب ذرا اپنا چہرہ خوب غور سے دیکھ لو۔ پہچاننے کی کوشش کرو اور بتاؤ کہ کیا اتنے دل کش چہرے والے نوجوان کو زندگی سے اس قدر مایوس ہونا چاہیے؟ صبح میرے ساتھی تمھیں دیکھیں گے تو پہچاننے سے انکار کر دیں گے، کہیں گے کہ میں نے رات بھر میں کوئی جادو کر دیا ہے، وہ مجھے کوئی دیوتا سمجھیں گے۔" وہ شگفتگی سے بولا۔" وہ حلیہ ٹھیک لگ رہا تھا یا یہ؟"

"کرشنا بابو!" میں نے اپنی آواز سنبھالنے کی کوشش کی۔" میرے اندر کا حلیہ ہے، اندر کا حلیہ نہیں سنبھلتا۔" میری آواز حلق میں چرمرا کے رہ گئی۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ اندر نہ تو شیو ہوتا ہے نہ غسل، نہ لباس تبدیل کیا جاتا ہے، نہ اس پہ صابن لگتا ہے نہ پاؤڈر۔

"وہ بھی ضرور سنبھلے گا۔" کرشنا پُر اُمید لہجے میں بولا۔" وہ بھی سنبھلے گا لیکن دونوں حلیے ایک ساتھ خراب ہو جائیں تو یہ بڑی تشویش ناک بات ہے بلکہ بُری بات ہے۔"

رات کو سونے کے لیے راج کرشنا نے اپنا شب خوابی کا لباس [illegible] اُس کمرے میں ریڈیو بھی تھا اور گراموفون ریکارڈ بھی، کتابیں بھی تھیں اور [illegible] بھی تھے، میں نے کوئی چیز نہیں چھوئی۔ پھر راج کرشنا اپنے کمرے میں گیا تو میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ چمپا کے جانے کے بعد اب جا کے کہیں بستر نصیب ہوا تھا لیکن مجھے نیند نہیں آئی۔ میں نے سوچنا ہی بند کر دیا [illegible] راج کرشنا نے مقوی غذائیں کھلا کے اور نرم بستر دے کے مجھے پھر سوچ کی اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ یہ چیزیں مجھے راس نہیں [illegible] آئیں۔ صبح اُٹھ کے راج کرشنا پھر میرے جسم میں تنکے چبھوئے گا۔ [illegible] آدمی کسی آدمی کو اُس طرح قبول نہیں کرتا جیسا وہ نظر آتا ہے۔ اُس کی نسل کا شجرہ، اُس کا نام، عہدہ اور پتہ جاننے کی خواہ مخواہ فکر لگی رہتی ہے گویا [illegible] کچھ نہیں ہوتا، اُس کا نام اور پتہ سب کچھ ہوتا ہے۔ اب اگر کوئی اُسے چھپانا [illegible] کہ اُس کے لیے یہ کوئی اچھا ذکر نہیں ہے تو لوگ کیوں نہیں سمجھتے؟

مگر صبح اُٹھ کے راج کرشنا نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ ناشتے کے بعد وہ مجھے گاڑی میں بٹھا کے بازار لے گیا۔ بازار سے اُس نے میرے ناپ کے جتنے بلا کپڑے مل سکے، خرید لیے۔ باقی تیار کرنے کا آرڈر دے دیا۔ پھر اُس نے میرے لیے دو جوڑی جوتے، چپل اور دوسرا سامان خریدا۔" آپ پیسے ضائع کر رہے ہیں۔" اُس نے میرے لیے تیل کی بوتل اور شیونگ کا سامان خریدا تو میں نے احتجاج کیا۔

"یہ تمھارے لیے نہیں ہے۔ یہ سب کچھ ایک بالکل نئے آدمی کے لیے ہے جس کی صرف شکل و صورت اور قد وغیرہ تم سے ملتا جلتا ہے۔" وہ ہنس کے بولا۔" تم نے سُنا ہو گا کہ ہندوؤں میں آدمی مر کے دوسرا جنم لے لیتا ہے، بس یہ سمجھ لو کہ آج سے تم نے بھی دوسرا جنم لیا ہے اور پچھلی کوئی بات تمھیں یاد ہی نہیں ہے۔"

"کرشنا بابو! آپ......" مگر اُس نے مجھے کچھ نہیں کہنے دیا۔ گھر پہنچ کے اُس نے مجھے اپنے سامنے نیا لباس پہنوایا اور دُور کھڑا کر کے دیر تک مختلف زاویوں سے مجھے ناپتا تولتا رہا۔

"بالکل بمبئی کا بابو۔ اب تم دیکھنا، اندر کا حلیہ خود بخود تمھیں بدلا بدلا نظر آنے لگے گا۔ وہ لوگ بس اب آتے ہی ہوں گے۔ آج یہاں ایک بہت خاص میٹنگ ہونا ہے، میں تمھیں اُن سے اپنے دوست کے بیٹے یا بھائی کی حیثیت سے ملواؤں گا۔ ویسے تم قطعاً آزاد ہو۔ اگر کہیں جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔ میں دوپہر کے کھانے پر تمھارا انتظار کروں گا۔ مکان کا نمبر، فون کا نمبر اور پتہ نوٹ کر لو۔ یہ باندرہ ہے۔ اگر راستہ نہ ملے تو کسی بھی قریبی پولیس اسٹیشن سے راستہ پوچھ لینا۔"

میں کہاں جاتا؟ تمام راستے ایک جیسے تھے، تمام شہر ایک جیسے تھے۔ راج کرشنا سمجھ رہا تھا کہ اب میری طبیعت کچھ ٹھیک ہو چلی ہے لیکن طبیعت تو پھر خراب ہونی شروع ہو گئی تھی۔ کل شام تک مجھے کسی بات کی خبر نہیں تھی اور اب پھر جی اُڑنے لگا۔ وہی آہٹوں پر چونک پڑنا، وہی اپنے آپ کو لاپنے لگنے کی خواہش۔ جسم پر کپڑے بھاری لگتے تھے اور انگلیوں میں انھیں کُریدنے کے لیے کھولن ہوتی تھی۔ اسی اثنا میں راج کرشنا کے ساتھی آ گئے۔ پولیس کی وردیوں میں ملبوس، چھوٹے بڑے قد کے افسران۔ ان میں کچھ لوگ وہ بھی تھے جنھوں نے کل رات مجھے جوہو سے اُٹھایا تھا۔ اُن کی آنکھوں کو مجھے پہچاننے میں دیر لگی، پھر وہ حیرت سے کبھی راج کرشنا کو کبھی مجھے دیکھنے لگے۔ راج کرشنا اطمینان سے مسکرا رہا تھا۔ اُس نے مجھے اُن سے اپنے ایک مرحوم دوست کے چھوٹے بھائی کی حیثیت سے ملوایا۔ سب نے گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کیا۔ کسی نے انگریزی میں اور کسی نے اُردو میں میری خیریت پوچھی۔ میں سفر میں راج کرشنا سے انگریزی میں اپنی ناواقفیت کا اظہار کر چکا تھا۔ پھر جب وہ لوگ ایک دوسرے کمرے میں بند ہو کے بیٹھ گئے اور راج کرشنا مجھ سے دو ایک گھنٹے کی معذرت کر کے اندر چلا گیا تو میں کچھ دیر تک ڈرائنگ روم میں تنہا بیٹھا رہا، پھر اُٹھ کے بنگلے سے باہر آ گیا۔ نئے جوتوں نے پیر کاٹنے شروع کر دیے۔ میں گلیوں گلیوں، سڑکوں سڑکوں گزرتا ہوا بہت دُور نکل گیا۔ چھوٹے چھوٹے بچے نیلی نیکر اور سفید قمیص پہنے بستے بغل میں دبائے ہوئے اسکول جا رہے تھے۔ میرے اندر نہ جانے کیا خاص بات تھی کہ کئی راہ گیروں نے مُڑ مُڑ کے اور گھور گھور کے مجھے دیکھا جیسے میرے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔ شاید میں انھیں کوئی نیا یا عجیب آدمی معلوم ہو رہا تھا یا یہ میری آنکھوں کی غلط بینی تھی مگر آگے جا کے کالج کی لڑکیوں کے ایک گروپ میں لڑکیوں نے ایک دوسرے کو کہنیاں مار مار کے میری طرف متوجہ کیا، پھر کھِل کھلا کے ہنس پڑیں۔ مجھے اُن پہ سخت غصہ آیا۔ میں نے انھیں گھور کے دیکھا، وہ سہم گئیں۔ لوگ ہر جگہ یہی چاہتے ہیں کہ آدمی کے ہاتھ میں چاقو ہو اور اُس کی آنکھیں شعلے اُگل رہی ہوں۔ میں نے واپسی کا ارادہ کیا اور گردن جھکائے ہوئے راج کرشنا کے بنگلے کی طرف بڑھنے لگا۔

درمیان میں میرے جی میں آئی کہ یہیں سے بھاگ نکلوں کیونکہ میں اس لائق ہی نہیں ہوں کہ انسانوں کے درمیان رہوں۔ میری وجہ سے راج کرشنا کو فضول تکلیف ہو گی۔ ان پڑھے لکھے لوگوں میں میری باتیں بدتمیزی سمجھی جائیں گی اور آدمی اپنی سکت سے زیادہ بدتمیزی برداشت نہیں کر سکتا۔ میرا جی تو بات کرنے کو چاہتا ہی نہیں تھا۔ اچھا ہے کہ راج کرشنا کے اُکتانے اور گھر سے دھکے دے کے نکالنے سے پہلے میں خود ہی اُس کا گھر اپنی خاک اور دھول کی لوری سے پاک کر دوں۔ ابھی موقع ہے، راج کرشنا کا گھر دُور ہے اور بمبئی بہت بڑا شہر ہے۔ راج کرشنا مجھے تلاش کر کر کے خود ہی تھک جائے گا اور پھر میں اسی شہر میں کیوں رہوں، میرے لیے ہر جگہ ایک جیسی ہے۔ میں بمبئی ہی چھوڑ دوں گا۔ میں نے راستہ بدل دیا لیکن کچھ دُور پہنچ کے مجھ سے آگے نہیں چلا گیا۔ میرے جسم پہ راج کرشنا کے خریدے ہوئے کپڑے تھے، وہ صبح کس ذوق و شوق سے میرا لباس خریدنے کے لیے بازار گیا تھا۔ میں چلا جاؤں گا تو وہ بہت پریشان ہو گا اور اگر اُس نے کہیں مجھے پھر ڈھونڈ نکالا تو میں اُس کے سامنے آنکھ بھی نہیں اُٹھا سکوں گا۔ میں اپنے آپ کو سرزنش کرتا ہوا واپسی کے راستے پر چل پڑا اور آخر وہی ہوا، راج کرشنا میری تلاش میں گھر سے نکل پڑا تھا۔ وہ مجھے راستے میں ملا۔" مجھے ڈر ہوا کہ تم کہیں واپسی کا راستہ نہ بھول گئے ہو۔" اُس نے میرے لیے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔" آؤ لنچ پر تمھارا انتظار ہو رہا ہے۔ میٹنگ لمبی ہو گئی تھی اس لیے میں نے اُن سب کو روک لیا ہے۔ تم گھبرا تو نہیں گئے؟" وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔" میرا مطلب یہ ہے کہ تم ہجوم کے درمیان حبس تو محسوس نہیں کرو گے؟"

"نہیں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔" سڑکوں پر بھی ہجوم ہی ہے۔"

"آدمی کو ہجوم میں رہنے کا عادی بننا چاہیے۔ انسان انسان سے بھاگ کر کہاں جائے گا۔"

گھر قریب ہی تھا۔ پانچ چھ منٹ بعد ہم دونوں ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔ مجھے چھری اور کانٹے سے کھانے کی تمیز نہیں تھی۔ پہلے میں نے اُن لوگوں کو دیکھا اور صرف روٹیاں کھانے پر اکتفا کی۔ مجھے اپنی تو فکر نہیں تھی البتہ راج کرشنا کی عزت کا خیال ضرور تھا کہ لوگ یہ نہ کہیں اتنے بڑے افسر کا مہمان اس

بدسلیقگی سے کھانا کھاتا ہے مگر راج کرشنا کو جیسے کوئی فکر ہی نہیں تھی، فکر ہوتی تو وہ اپنے ساتھیوں کے سامنے مجھے پہچانتا ہی نہیں اور اس حیثیت کذائی میں مجھے اپنے گھر لاتا ہی نہیں چنانچہ میں نے آزادی سے کھانا شروع کر دیا۔ شاید راج کرشنا نے میری عدم موجودگی میں اُن سب سے کہہ دیا تھا کہ وہ مجھ سے کوئی پرانی بات پوچھنے کی غلطی نہ کریں اس لیے اُن سب کا برتاؤ بہت لحاظ مروت کا تھا پھر بھی مجھے اپنی جانب اُٹھی ہوئی اُن کی دلچسپ اور سراغ رس نظریں زہر لگ رہی تھیں۔ راج کرشنا غالباً یہ کہنا بھول گیا تھا کہ وہ مجھے ان آنکھوں سے بھی نہ دیکھیں۔

سہ پہر کو راج کرشنا اپنے کسی کام کے سلسلے میں گھر سے چلا گیا تو بنگلے کے ملازم میرے اطراف اِس طرح منڈلانے لگے جیسے میں ہی اُن کا مالک ہوں۔ وہ میری زبان سے کوئی حکم سننے کے منتظر تھے۔ نوعمر بکھو مجھ پر بطورِ خاص مہربان تھا اور راج کرشنا کی تعریف میں منہ سکھا رہا تھا کہ ایسا صاحب اُسے پہلے کبھی نہیں ملا، وہ پہلے ملازموں کو کھلاتا ہے، پھر خود کھاتا ہے۔ بھگوان کرے وہ مستقل طور پر بمبئی ہی میں رہے۔ بکھو ذرا کھلا تو مجھ سے لجاتا ہوا انداز میں پوچھنے لگا: "صاب! ایک بات بتاؤ۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اُس نے اِدھر اُدھر تاک کے پوچھا: "یہ اپنے صاب نے شادی کیوں نہیں بنائی؟"

"مجھے کیا معلوم۔" میں نے ترشی سے جواب دیا۔ وہ ڈر کے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ مجھے اپنے لہجے کی سختی کا فوراً احساس ہوا۔ میں نے نرمی سے کہا: "یہ بات صاحب ہی سے پوچھنا۔"

اُس کے چہرے کی بشاشت لوٹ آئی اور وہ پوچھنے لگا: "اور صاب آپ نے...؟ آپ کی شادی ہو گئی؟ بیگم صاب کو ساتھ کیوں نہیں لائے؟"

بیگم صاحب! شادی! مجھے ہنسی آ گئی، وہ یہ کیسی باتیں کر رہا تھا۔ میری ہنسی پہ وہ بڑا حیران ہوا۔ "جا! اپنا کام کر۔" میری تلخ آواز سے وہ گھبرا کے بھاگ گیا۔ میں نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا اور بند کمرے میں کورا نہ جانے کس طرف سے آ گئی۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا، وہ شکایتی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اپنا چہرہ بستر میں چھپا لیا پھر بہت دیر تک کوئی آہٹ نہیں ہوئی۔ اس کے بعد پتہ نہیں کس وقت دبے قدموں سے راج کرشنا اندر آیا۔ وہ میری کمر پہ آہستہ آہستہ ٹھونکیں مار رہا تھا۔ میں نے ہڑبڑا کے سر اُٹھایا تو اُس نے اپنا رومال آگے کر دیا۔ میں اسی لیے یہاں سے واپس جانا چاہتا تھا۔ کلکتے میں میں نے جھل کو تنگ کیا تھا۔ فیض آباد میں زرین جامو اور کلتن خاں کو اور یہاں کرشنا میرا نشانہ بن رہا تھا۔ آخر کرشنا کے اُٹھانے سے پہلے میں خود ہی اُس کے ساتھ باہر آ گیا۔ کرشنا نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا لیکن اُس کے اَن کہے سوال میرے کانوں کے پردے پھاڑے دے رہے تھے، میرے دماغ میں چبھ رہے تھے۔ کرشنا نے جب یہ کہا کہ وہ مجھے سیر کے لیے لے جانا چاہتا ہے تو میں نے انکار نہیں کیا۔ ہم دونوں کپڑے بدل کے گاڑی میں بیٹھ گئے۔ وہ مجھے بمبئی کی سڑکوں پر گھماتا رہا، اُن میں سے بہت سی سڑکیں بہت سے فٹ پاتھ میرے جانے پہچانے تھے۔ کرشنا ایک طویل سفر کر کے دادر کے علاقے میں آ گیا۔ اُسی ریستوراں کے قریب جس کی پچھلی گلی میں ابا جان رہتے تھے اور جہاں اب صرف اُن کا سامان ایک کوٹھری میں بند پڑا تھا۔ میں نے سوچا، راج کرشنا سے چند لمحوں کی اجازت لے کے مولوی اکرم کے پاس جاؤں اور اُن سے کوٹھری کی چابی لے کے ابا جان کا سامان ٹٹولوں، شاید کسی کی تصویر مل جائے، نہ بھی ملی تو وہ چیزیں تو ہوں گی جنھیں گھر کے لوگوں نے بارہا استعمال کیا، ممکن ہے کوئی کام کی چیز مل جائے۔ پرانی کاپیاں کتابیں تو ہوں گی جن پر سب لکھتے ہوں گے مگر انھوں نے اس افراتفری میں بھلا کیا پڑھا کے آج یہاں کل وہاں ابا جان پر بھی کورا کا اثر پڑا۔ نہ وہ اپنے سامان میں لاتی، نہ ابا جان یوں در بدر مارے مارے پھرتے۔

کرشنا مجھے ایک بہت اچھے ریستوراں میں لے گیا۔ وہاں دھیمی روشنی میں ہلکی انگریزی موسیقی تیر رہی تھی۔ سب مال دار لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ عورتیں بھی تھیں اور مردوں کے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھیں، ایک طرف غیر ملکی موجود تھے، ریستوراں میں خاصی بھیڑ تھی۔ ہمارے داخل ہوتے ہی ایک باادب بیرے نے ہمیں ایک میز پہ بٹھا دیا۔ یہاں سکون تھا، کسی کو کسی کی بات سنائی نہیں دیتی تھی، راج کرشنا نے مجھ سے سرگوشی میں پوچھا: "جی لگ رہا ہو تو بیٹھیں ورنہ کہیں اور چلیں؟"

میں نے کہا: "ٹھیک ہے، یہ جگہ بہت پُر سکون ہے۔"

"کیا کھاؤ گے؟" اُس نے مسکرا کے پوچھا۔

"کچھ کھانا کیا ضروری ہے؟" میں نے تذبذب سے جواب دیا۔ یہ میرے لیے بالکل نیا تھا، مجھے یہاں کے طور طریقے معلوم نہیں تھے۔ ممکن یہاں آنے کے بعد کھانا ضروری ہوتا ہو۔

"نہیں، ہم یہاں کچھ پی بھی سکتے ہیں، بھوک لگ رہی ہو تو کچھ منگا لو۔" وہ غیر رسمی انداز میں بولا۔ میں اُس کے خیال سے خاموش ہی رہا۔ کرشنا نے انگلی کے اشارے سے منتظر بیرے کو قریب بلایا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہماری میز سجی ہوئی تھی لیکن میری نظریں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں، ہر جگہ یہی ہوتا تھا، مجھے یہ گمان ہوتا جیسے وہاں مجھے مولوی صاحب یا کورا یا ابا جان یا گھر کا کوئی اور آدمی نظر آ جائے گا۔ "کیا دیکھ رہے ہو؟" کرشنا نے اپنے لبوں پر تبسم بکھیرتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے مسکرا کے جواب دیا۔ "لوگوں کو دیکھ رہا ہوں۔"

"یہ اس شہر کا بہت مشہور ریسٹورنٹ ہے۔ یہاں تمام بڑے لوگ آتے ہیں۔ اصل میں اس کی حیثیت ایک کلب جیسی ہے۔ دولت حسن میں اور اضافہ کر دیتی ہے، یوں کہنا چاہیے کہ دولت حسن کا سنگھار کا سامان ہے، دولت کے بغیر حسن آدھا رہ جاتا ہے۔ تم نے دیکھا؟ اُس کے بدن پہ قیمتی ساڑھی ہے اور زیور بھی کچھ کم قیمت کا نہیں ہے۔"

زیور کے ذکر پہ مجھے فوراً اپنی مالا کا خیال آیا اور میرا ہاتھ خود بخود گریبان پہ چلا گیا۔ مالا میری گردن میں موجود تھی، میں نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ راج کرشنا کی باریک بین آنکھوں سے میرا یہ لمحاتی اضطراب چھپا نہ رہ سکا۔ میں کسی چور کی طرح اُس سے نظریں چرانے لگا۔ "ان لوگوں کی دنیا مختلف ہے۔" کرشنا نے اپنی بات جاری رکھی۔ "یہ غم کو پاس نہیں پھٹکنے دیتے۔ دکھ دور کرنے کے انھوں نے بہت سے علاج دریافت کر لیے ہیں۔ سب سے بڑا علاج خود دولت ہے چنانچہ یہ دن بھر دولت کمانے میں مصروف رہتے ہیں اور شام ہوتی ہے تو اُسی دولت سے دکھوں کی دوا خرید لیتے ہیں۔ یہ ریستوراں بھی ایک شفاخانہ ہے۔ یہ میزیں اسپتال کے بیڈ سمجھو، یہ بیرے ڈاکٹر اور یہ غذائیں، دوائیں ہیں، موسیقی غذا ہے۔ اچھا لباس پہننا، گانا، ناچنا، سیر سپاٹا، یہ سب دکھ کی دوائیں ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آدمی کو پہلے دولت کا دامن پکڑنا چاہیے لیکن یہاں بہت سے ایسے بھی ہیں جنھیں صرف دولت کمانا آتا ہے، اُسے خرچ کرنا نہیں آتا۔ جس طرح بیمار کو اچھے ڈاکٹر کی ضرورت پڑتی ہے اسی طرح دولت کو اچھے مشاغل کی ورنہ دولت بہت بڑا دکھ بن جاتی ہے، ناسور۔ میری باتوں سے بور تو نہیں ہو رہے ہو؟" اُس نے رُک کے میری آنکھوں کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں،" میں نے چونک کر کہا۔ "آپ بہت اچھی باتیں کر رہے ہیں۔"

"اگر تم نے سننے کا یہی اشتیاق ظاہر کیا تو میں آیندہ اور اچھی باتیں بتاؤں گا۔" وہ ہنس کے بولا۔ "اچھی باتیں ایک اسکول، ایک کتاب کا درجہ رکھتی ہیں۔"

"جی ہاں....." میں نے مستعدی سے کہا لیکن ابھی میں نے اپنا جملہ مکمل بھی نہیں کیا تھا کہ گندمی رنگت کا ایک موٹا تازہ شخص اسی رنگ کی ایک دبلی پتلی چشمے والی عورت اور اوسط بدن کی ایک نوجوان سرخ و سفید لڑکی کے ساتھ ہماری میز پر آ گیا۔ کرشنا نے اپنی نشست سے اُٹھ کے اُس سے گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کیا۔ "رستم جی، بمبئی کے ایک معزز شخص۔ مسز رستم اور ان کی بیٹی نورین رستم۔" کرشنا نے مجھ سے اُن کا تعارف کرایا پھر مجھے اُن سے متعارف کرایا۔

رستم جی نے ملائم لہجے میں کرشنا سے پہلے مجھ سے میری خیر خبر پوچھنے میں وقت صرف کیا۔ مجھے اپنے بارے میں کچھ بتاتے ہوئے جھجک ہوئی۔ کرشنا نے درمیان میں دخل دے کے تمام باتیں اپنے ہاتھ میں لے لیں اور میری طرف سے بتانے لگا کہ میں ایک زمیں دار کا بیٹا ہوں، میرا مرحوم بڑا بھائی اُن کا ہم جماعت تھا، اُس نے میرے سلسلے میں اِدھر اُدھر کی دو چار باتیں کر کے موضوع ہی بدل دیا اور وہ سب کسی کلب کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ روزانہ ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہیں اور کسی مشکل کی وجہ سے کلب بند ہے اس لیے اس ریستوراں میں آ گئے ہیں۔ راج کرشنا ٹھیک کہتا تھا، وہ دنیا کے کسی دکھ میں گرفتار نہیں تھے۔ بات بات پہ ہنسنے لگتے تھے جیسے ہنسی کے لیے تیار ہی بیٹھے ہوں۔ رستم جی کی بیوی مجھے چپ دیکھ کے حیران ہوئیں اور مہذب لہجے میں پوچھنے لگیں: "آپ کچھ بول نہیں رہے؟"

"جی،" میں نے ہچکچاہٹ سے کہا۔ "میں کیا بولوں۔"

"بمبئی میں نئے نئے ہیں۔" راج کرشنا نے پھرتی سے کہا۔ "ویسے یہ مت سمجھیے کہ انھیں بولنا نہیں آتا، جب باتوں پر آئیں گے تو سب کو ہرا دیں گے۔"

"آپ انھیں ہمارے ہاں لائیے۔" نورین رستم نے کہا، اُس کی آواز زرین کی آواز کی طرح بہت بھلی تھی۔ "میرا خیال ہے آپ کل رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیے۔" اُس نے اپنے باپ کی طرف تائیدی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ رستم جی اور اُن کی بیوی نے بھی اصرار کیا مگر کرشنا نے اپنی مصروفیت کا عذر کر کے معذرت کر لی۔

"آپ ٹال رہے ہیں کرشنا جی!" نورین نے شوخی سے کہا۔

"کرشنا جی بہت مصروف آدمی ہیں نورین! تمھیں دنیا کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ اِن کی آمد سے شہر میں ہلچل مچی ہوئی ہے، کرشنا جی کا نام ہر شخص کی زبان پر ہے، ہم اِن کا وقت ضائع نہیں کریں گے، انھیں ملنے ملانے سے کہیں زیادہ ضروری کام ہیں۔"

"مگر کرشنا جی تو روز کلب آتے ہیں پاپا! کیوں نہ ہم کل کلب ہی میں اپنی طرف سے کرشنا جی کی دعوت کریں؟" نورین مچل کے بولی۔

"کرشنا جی! یہ ابھی تک بچی ہے، اسے کچھ نہیں معلوم۔" رستم جی معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔ "اِس کی باتیں محسوس مت کیجیے اور سنو نورین!" وہ تنبیہی نگاہ سے نورین سے مخاطب ہوا۔ "تمھیں روزانہ اخبار پڑھنا چاہیے تاکہ تم جان سکو کرشنا جی اس شہر کے لیے کتنی بڑی خدمات انجام دے رہے ہیں۔"

"اوہ نہیں۔" راج کرشنا نے لجاجت سے کہا۔ "میں اپنا فرض انجام دے رہا ہوں اور رستم جی! مجھے صاف باتیں بہت پسند ہیں۔ نورین کی دعوت مجھے قبول ہے لیکن وقت کا میں ابھی تعین نہیں کر سکتا۔ نورین! میں ضرور تمھارے گھر آؤں گا۔"

"اور اکیلے نہیں، انھیں بھی ساتھ لائیے گا۔" نورین کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "کیوں جناب! آپ آئیں گے؟ آئیں گے نا؟" وہ براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"جی ہاں۔" میں نے اُداسی سے کہا۔ "ضرور آؤں گا۔" اُس نے اپنی دونوں کہنیاں میز پہ ٹکا دیں اور مجھ سے اس قدر قریب ہو گئی کہ مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔ "میں نے کبھی کھیت نہیں دیکھے۔ میں آپ سے کھیتوں اور کھلیانوں کے قصے سنوں گی۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں بہت دنوں تک کسی گاؤں میں رہوں، شہر کا رُخ نہ کروں۔" وہ خواب آفریں لہجے میں بولی۔ "آپ زمیں دار ہیں نا؟"

"جی۔" میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اُسے کیا جواب دوں۔

اُس کے بال سنہرے، دانت سفید چھوٹے چھوٹے اور نقش و نگار تیکھے تھے۔ باتوں میں شوخی تھی۔ وہ بات کرتی تھی تو دانتوں کے ساتھ مسوڑھوں کا سُرخ گوشت بھی ذرا سا نظر آجاتا تھا لیکن مجھے اُس کی بے تکان باتوں اور اس قدر قُربت سے اُلجھن ہونے لگی۔ رستم جی سے گفتگو کے دوران میں راج کرشنا بار بار میری طرف دیکھ لیتا تھا پھر اچانک اُس نے گھڑی دیکھی۔ اُسی لمحے رستم جی میز سے اُٹھنے لگے۔ کرشنا نے انھیں مزید روکنا چاہا مگر رستم جی نہیں رُکے۔ وہ تینوں دُور کی ایک میز پر جا کے بیٹھ گئے۔ تزرین چلتے چلتے مجھے اور کرشنا کو ہمارا وعدہ یاد دلانا نہیں بھولی۔

ریستوراں سے باہر آکے کرشنا نے کسی بچّے کی طرح میرا ہاتھ پکڑ لیا جیسے میں بھیڑ میں کہیں کھو جاؤں گا۔ بمبئی شہر روشنیوں سے جگ مگا رہا تھا، موٹریں، وکٹوریا، ہر طرف شور، ہنگامہ دوڑ۔ ہماری گاڑی پھر سڑکوں پر چکر کاٹنے لگی۔ مجھے یہ شہر نیا نیا سا لگ رہا تھا۔ رات کے وقت کرشنا مجھے ساحل پر لے گیا۔ وہاں کی سیر سے ہم رات گئے گھر واپس پہنچے تو کرشنا کے چہرے سے تھکن صاف نظر آرہی تھی۔ اُس نے دو ایک فون کرکے بمبئی کے پولیس افسروں سے رابطہ قائم کیا۔ دوسری طرف سے کی جانے والی باتیں تو میں سُن نہیں سکا لیکن کرشنا کی ناراضی سے اندازہ ہوا کہ آج اُس کے ماتحتوں نے اُسے کوئی تسلّی بخش رُوداد نہیں سُنائی ہے۔ اُس کے ماتھے پر بتدریج شکنیں پڑتی گئیں اور وہ فون ہی پر چیخنے چلّانے لگا۔ "ایڈیٹ، یو آر آل فول۔" اُس کے لہجے میں کسی قسم کی لچک نہیں تھی اور وہ اپنے مخاطب کو بہت تیز انگریزی میں بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ فون پٹخ کے وہ تقریباً ہانپنے لگا۔ میں نے اُس کے سامنے سے ہٹ جانے کا ارادہ کیا کیونکہ میری موجودگی اُس کے غصّے کے بہاؤ میں رکاوٹ بن سکتی تھی اور مجھے یہ خوف بھی محسوس ہوا کہ اب یہ مجھ پر غصّے ہوگا۔ ممکن ہے یہ مجھے اسی وقت گھر سے نکل جانے کا حکم دے دے لیکن میں نے جیسے ہی اُٹھ کے کمرے سے جانا چاہا، اُس کی بدلی ہوئی آواز میرے کانوں میں گونجی میرے جھجکتے ہوئے قدم رُک گئے۔ "کہاں چلے؟" میں نے اندر کمرے کی جانب نگاہ کی۔ وہ تأسف سے بولا "معاف کرنا، مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ یہاں تم بھی بیٹھے ہو۔ بات یہ ہے ڈارلنگ کہ اس شہر میں سب گدھے رہتے ہیں۔ پولیس کا آدھا کام ان نااہلوں کی وجہ سے اُلٹا ہو جاتا ہے۔ پولیس میں ایک دم پرفیکٹ آدمی بھرتی کرنے چاہئیں۔ بہرحال چھوڑو۔ یہ بتاؤ کچھ حال وغیرہ ٹھیک ہے؟ کیسا محسوس کر رہے ہو؟"

"بہت اچھا۔" میں نے زیرِ لب کہا۔

"اچھا ہوا تم آگئے، میں بہت تنہائی محسوس کر رہا تھا۔" وہ غنودہ لہجے میں بولا۔ "میں تمھیں صاف صاف بتاؤں۔ ریل میں تم مجھے بہت پسند آئے تھے حالانکہ تمھارے بارے میں میری پہلی نظر کی رائے یکسر مختلف تھی۔ بعد میں وہ رائے بدلتی گئی اور اسٹیشن پر تم سے جُدا ہونے کے بعد مجھے یہ ملال رہا کہ میں نے تمھیں جانے ہی کیوں دیا تھا۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تم بہت پریشان تھے

مجھے ایسی حالت میں تمھیں روکنا چاہیے تھا۔ وہ عورت بھی تمھاری کر...
نہیں تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ تمھارے ساتھ کوئی حادثہ نہ پیش آجائے...
برہم تھا اور بمبئی میں قدم قدم پر ٹیڑھے ترچھے آدمی بستے ہیں...
نہیں چاہتے تو میں تم سے کچھ پوچھنے پر اصرار نہیں کروں گا لیکن ایک...
ہے کہ تم یہاں سے کہے بغیر کہیں نہ جانا اور اگر گئے تو سمجھ لو مجھے...
گا۔ دوسری درخواست ہے کہ تم مجھ سے کسی قسم کی اجنبیت نہیں برتو...
میں اس بات کی تکرار اس لیے کر رہا ہوں کہ یہاں تمھیں کوئی گھٹن...
اگر تم مجھ سے کسی فرمائش کا اظہار کروگے اور مجھے اپنے دُکھ درد میں...
تو مجھے خوشی ہوگی۔ میری طرف سے تم پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ میرا...
کہ تم جب تک خود نہیں کہوگے، میں تمھارے کسی معاملے میں دخل نہیں...

"کرشنا جی! میری آنکھوں سے برداشت نہیں ہوا۔ میں...
سے ڈرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں یہاں رہا تو آپ مجھ سے...
گے۔ آپ نے آج دیکھ ہی لیا کہ میں نے ریستوراں میں آپ کے...
کے سامنے چپ رہ کے آپ کو کتنا شرمندہ کیا ہے۔ میرے کانوں اور...
ہی نہیں ہے۔ میں نہ کچھ سننا چاہتا ہوں نہ بولنا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تمھیں سُننے اور بولنے پر مجبور نہیں کروں...
کے لیے یہ جگہ بہت مناسب ہے لیکن دوست! تم نے اس دُنیا کا...
حواس سے کیا ہے۔ میں نے ایسے بہت سے ستائے ہوئے لوگ دیکھے...
ڈھے جاتے ہیں مگر پھر ہمّت کرتے ہیں۔ میں تم پر ترس نہیں کھا رہا...
مت سمجھنا کہ میں تمھیں بھیک دے رہا ہوں۔ میری تو یہ زندگی ہی تو...
سبب قائم رہی ہے سو میرے پاس جو کچھ بھی ہے، اُس پر تمھارا حق...
گھر کی ہر چیز تمھاری ہے۔"

"وہ محض ایک اتفاق تھا کرشنا جی! اس ذکر سے مجھے...
ہے۔ میں نے خاص آپ کے لیے بھلا کیا کیا ہے۔ آپ کی جگہ کوئی...
ہوتا تو میں یہی کرتا۔"

"مگر اُس جگہ کوئی اور نہیں، تم تھا، تم مجبور نہیں تھے...
دہشت خیز وقت میں آنکھیں میچے ہوئے لیٹے بھی رہ سکتے تھے لیکن...
اپنی جان داؤ پر لگا دی۔ اُس کے ہاتھ میں ریوالور تھا، اُف وہ...
تکلیف دہ منظر ہے لیکن اس واقعے سے پہلے ہی میری خواہش...
تمھاری کوئی مدد کروں۔ تمھارا یہاں آنا، یہاں رہنا اُس احسان کا...
نہیں ہے۔ اُس عظیم احسان کا معاوضہ تو میں ساری عمر ادا نہیں کر...
اور بات ہے۔ ہاں کہو کہ تم نے میری باتیں توجہ سے سُن لی ہیں...
مایوس نہیں کروگے؟"

"کرشنا جی! میں آپ کو کیا بتاؤں۔" میں نے زور سے...
بھینچ لیں اور اضطراب سے کہا۔ "منہ نہیں کھلتا، موت بھی نہیں آتی...
ہمدردی مت کیجیے، میں بہت احسان فراموش، بہت بے غیرت...

میں بہت بُرا ہوں، بہت ذلیل ہوں۔" میری آواز بھرّانے لگی۔

"اوہ آئی ایم ساری۔" وہ بے چینی سے میرے قریب آگیا۔ "مائی ڈیئر... مطلب یہ نہیں تھا کہ تم....." وہ شرم ساری سے بولا۔ "اچھا ٹھیک ہے... میرے ساتھ بھی وہی کرنا جو اب تک کرتے آئے ہو مگر یہ کیا ہے؟ ایں!"

"یہ ہی تو ہے کرشنا جی!" میری گھٹی ہوئی آواز نکلی۔

"جانتے ہو تمھاری عمر کیا ہوگی؟ تم چوبیس سال سے کم کے نہیں ہوگے۔ چوبیس سال کے آدمی کی آنکھ میں ایک قطرے کی بھی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ اُسے تو دُنیا کو رُلانا چاہیے، اُسے تو حالات سے پنجہ آزمائی کرنی چاہیے۔ ...کیا ہونا چاہیے کیا نہیں۔ اگر دُنیا کا رشتہ ہر آدمی سے یکساں ہو تو آدمی کے ...زالف کا سوال بھی اُٹھے۔" وہ جھنجلا سا گیا۔ "میں تم سے کیا کہوں۔ بس اتنا کہتا ...ن کہ یہ جگہ جوہو کے ساحل اور فٹ پاتھوں سے بہتر ہے۔ تم یہاں جس طرح ...باہر رہو۔ مجھے اس مکان سے گھٹ کے رہو۔ مجھے محض فٹ پاتھ سے گزرنے ...والا کوئی شخص سمجھ لو۔" وہ اُٹھ گیا۔ اُس نے مجھ سے کھانے کو پوچھا، میں نے ...انکار کر دیا۔ وہ مجھے میرے کمرے میں پہنچا کے چند لمحے ٹھہرا، پھر شب بخیر ...کہتا ہوا مجھ سے رُخصت ہوگیا۔

راج کرشنا نے اپنی بات کا عملی ثبوت دیا۔ مجھے یہاں آئے ہوئے ...روز گزر گئے تھے۔ ان تین دنوں میں وہ بہت مصروف رہا۔ گھر آتا تو مجھ ...سے میرا حال دریافت کرتا پھر کتابوں میں مصروف ہو جاتا یا فون کرتا یا ...آئے ہوئے افسروں سے رازدارانہ باتیں کرتا یا خفیہ میٹنگیں ہوتیں۔ میں اُس کی ...عدم موجودگی میں باندرے سے دُور نکل جاتا۔ راج کرشنا نے میرے کوٹ ...میں چند روپے ڈال دیے تھے۔ میں دن بھر یوں ہی گھومتا رہتا۔ مولوی اکرم کے ...گھر کے نیچے سے میں کئی بار گزرا اور سیڑھیوں تک گیا مگر وہاں سے لوٹ آیا۔ ...تازہ چیزیں لوگوں کا بدل تو نہیں ہو سکتیں۔ چوتھے دن دوپہر کو میں جلد ...گھر واپس آگیا۔ ڈرائنگ روم میں ایک اہم میٹنگ جاری تھی۔ میں داخل ...ہوا تو ایک لمحے کے لیے خاموشی طاری ہوگئی۔ راج کرشنا اپنی نشست چھوڑ ...کے بھاگا ہوا میرے پاس آیا۔ "آج جلدی آگئے؟ کیا حال ہے؟"

"آپ اپنا کام جاری رکھیے، میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے اپنے ...کمرے میں جاتے ہوئے کہا اور سب کو باری باری سلام کیا۔ صرف دو ایک روز ...میں ان میں سے بہت سے افسروں سے میری صاحب سلامت ہوگئی تھی۔

"ہاں ہم ایک بہت سنگین مسئلے پر بات کر رہے ہیں۔ اگر تم نے کھانا ...نہیں کھایا ہو تو کھا لو، ہمیں کچھ دیر لگے گی۔" وہ شائستگی سے بولا۔

"آپ کا انتظار کر لوں گا۔" میں نے نیچی نظروں سے جواب دیا اور اپنے ...کمرے میں چلا گیا۔ ڈرائنگ روم کی آوازیں اندر آرہی تھیں۔ وہ اچانک تیز ہوتی ...تھیں۔ کرشنا کی آواز سب سے اونچی تھی، وہ شدّت سے کسی نکتے پر اصرار ...کر رہا تھا۔ میں نے ان کی آوازیں نظر انداز کرنے کی کوشش کی لیکن یہ ممکن ...نہ تھا کیونکہ ایسی بات نہیں تھی کہ آدمی اُسے سُن کے کسی اور طرف متوجہ ہو جائے۔

وہ راج کرشنا سے متعلق بات تھی، اُس کے ماتحت افسر اپنے اندیشوں کا اظہار کر رہے تھے اور مشورہ دے رہے تھے کہ اُسے براہِ راست ملوّث نہیں ہونا چاہیے۔ شاید راج کرشنا نے اُن کی بات مان لی، میٹنگ ختم ہونے میں دیر لگ گئی۔ وہ لوگ چلے گئے تو راج کرشنا میرے پاس آگیا۔ اُس کے ماتھے پر سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے گزشتہ تین روز میں اُسے اس کیفیت میں نہیں دیکھا تھا۔ اُس سے کچھ پوچھنے کی ہمّت نہیں ہوتی تھی کیونکہ میں اپنی باتیں اُسے کب بتاتا تھا، پھر بھی میں نے دبی زبان میں اُس سے اُس کی پریشانی کی وجہ پوچھی۔

"کچھ نہیں۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ "کہتے ہیں کہ یہ بمبئی ہے۔"

"لیکن بمبئی ہے تو کیا ہوا؟" میں نے تجسّس سے پوچھا۔

"کہتے ہیں کہ بہت جمے ہوئے لوگ ہیں۔ اونہہ۔" پھر اُسے کچھ خیال آیا۔ "کوئی خاص بات نہیں ہے۔ وہی پُرانے قصّے ہیں۔ انھیں چھوڑو، تم اپنی سناؤ۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمھارے چہرے پر پہلے سے زیادہ رونق ہے، خوشی ہوئی۔"

"یہ آپ ہی کی دی ہوئی رونق ہے۔" میں نے کن انکھیوں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں دن بھر خالی پڑا رہتا ہوں، مجھے بھی تو کوئی کام بتائیے۔"

وہ اُچھل پڑا۔ اُس کے گال تمتمانے لگے۔ "کام! اِس دُنیا میں کام کی کیا کمی ہے لیکن تمھیں پیسہ کمانے کے لیے کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کام مصروف رہنے کے لیے کرنا چاہیے۔ پیسے تو میں خوب کما رہا ہوں، ٹھیک ٹھاک حالات ہیں۔ پھر بھی اگر تم واقعی سنجیدہ ہو تو میں تمھیں بہت سے کام بتا سکتا ہوں۔"

"بہت سے کام نہیں، مجھے تو آپ اپنا کوئی کام بتائیے۔" میں نے اشتیاق سے کہا۔

"اگر تم نے فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا ہے تو میں آج سے سوچنا شروع کروں گا۔ آج اس خوشی میں ہم شام کو پھر سیر کریں گے۔ اس شہر میں ایک سے ایک قابلِ دید جگہ ہے۔ دُنیا ہر طرح دیکھنی چاہیے۔"

شام ہونے میں کچھ دیر نہیں تھی مگر راج کرشنا ایک فون آنے سے اچانک مکدّر ہوگیا۔ اُس نے مجھ سے معذرت کی اور فوراً گاڑی میں بیٹھ کے کہیں روانہ ہوگیا۔ میں نے بھی ساتھ چلنے کی خواہش ظاہر کی تھی مگر اُس نے یہ عذر کر دیا تھا کہ وہ ایک بہت اہم میٹنگ میں جا رہا ہے۔ فون کی تمام گفتگو میں نے سُنی تھی۔ اُس کے جانے کے بعد میں کچھ دیر یوں ہی خاموش بیٹھا رہا، پھر میں نے کوٹ اُتارا، پتلون کی جگہ رات کے سونے کا پاجامہ پہنا اور اُس کے ساتھ قمیص پہن کے بنگلے سے باہر آگیا، دروازے پر کھڑا ہوا ایک سپاہی مجھے اِس حلیے میں دیکھ کے چیں بجبیں ہوا۔ میں ایک بس میں بیٹھ کے بائی کلا کے علاقے میں پہنچ گیا اور سڑکوں پر اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ وہاں مجھے کوئی خاص بات نظر نہیں آئی اس لیے میں نسبتاً ایک گنجان علاقے میں آگیا۔ ایک چھوٹے سے چائے کے اسٹال پر میں نے چائے پی اور سفید بنارسی پان کا ایک بیڑا منہ میں رکھا اور کمر پر ایک ہاتھ ٹکا کے کھڑا ہوگیا۔ ابھی مجھے

اس طرح کھڑے ہوئے دیر نہیں گزری تھی کہ ایک دم بہت سی نظریں مجھے اپنے اطراف منڈلاتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ سر پر بہت کم بالوں والا ایک نوجوان میرے قریب آیا اور اوپر سے نیچے تک میرے جسم کا جائزہ لینے لگا۔ میں نے بھی اُس کے ساتھ یہی عمل کیا اور اُس کے سینے پر کرختگی سے ہاتھ مار کے اُسے خود سے دُور کیا۔ وہ گرنے لگا مگر گرتے گرتے سنبھل گیا اور فوراً مجھ پر جھپٹا۔ میں پہلے سے تیار تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ منہ کے بل زمین پر پڑا ہوا تھا۔ بمبئی میں راہ گیر اکٹھے ہونے میں وقت نہیں لگتا اور پھر ایسے شخص کے لیے جس کا چہرہ اس علاقے میں شناسا ہو۔ چائے کے اسٹال اور پان والا دونوں اپنے ٹھیے سے اُٹھ کے اُس کی مدد کو دوڑے، اُدھر سے ایک تومند ادھیڑ عمر شخص تیزی سے نوجوان کی طرف بڑھا اور اُسے بازو سے پکڑ کے اُٹھاتے ہوئے بولا۔
"کیا ہوا ماسٹر تارا! یہ سالا تم فٹ پاتھ پر کیا ڈانس کر رہا ہے۔"
"ابھی ہم بتاتا ہے۔" ماسٹر تارا نے آستین سے منہ صاف کرتے ہوئے غصے سے کہا اور کسی تاخیر کے بغیر دوبارہ مجھ پر لپکا۔ میں نہ صرف اُس کا بلکہ اُس کے ساتھیوں کا بھی منتظر تھا مگر وہ نہ جانے کیوں دیر کر رہے تھے۔ ماسٹر تارا نے تیسری بار پینترا بدل کے میری ٹانگ میں اپنی ٹانگ مار کے مجھے گرا دینے کی کوشش کی مگر وہ غصے میں اتنا اندھا ہو گیا تھا کہ موقع و محل بھول گیا۔ موقع اس داؤ کا نہیں تھا۔ اس کے لیے دونوں فریقوں کے درمیان فاصلہ کم ہونا چاہیے۔ میں نے کچھ پیچھے ہٹ کے اپنے دونوں ہاتھ تیار رکھے تھے۔ وہ میرے ہاتھوں پر آیا اور اب کے میں نے اُسے سر کے بل زمین پر لوٹ دیا۔ ماسٹر تارا کے سر میں گہری چوٹ آئی ہوگی۔ اس بار اُس نے اُٹھنے کی کوشش نہیں کی یا اُس سے اُٹھا نہیں جا سکا۔ مجمع خاصا بڑھ گیا تھا اور ماسٹر تارا کے گرتے ہی لوگ دو حصّوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ کچھ لوگوں نے مجھے پکڑنا چاہا، کچھ ماسٹر تارا کا حال دیکھنے کے لیے اُس پر جھک گئے۔ میں نے اپنی طرف بڑھتے ہوئے لوگوں کو دُور رہنے کی تنبیہ کی۔
"اوئے ہٹو۔" ایک دوسرا شخص مجمع چیرتا ہوا دیوانہ وار میری طرف آیا۔ وہ چہرے مہرے سے ماسٹر تارا کا بڑا بھائی معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے آناً فاناً میرے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ "اوئے چل۔" اُس نے ایک ہاتھ سے میرا گریبان پکڑ کے دوسرے ہاتھ سے مکا تان لیا اور مجھے گھسیٹتا ہوا گرجنے لگا۔ "اوئے چل۔" میرے دونوں ہاتھ آزاد تھے۔ میں نے اُس کا پہلا مکا اپنے گال پر برداشت کر لیا لیکن دوسرے مکے سے پہلے میں دونوں اطراف سے اُس کی کمر مضبوطی کے ساتھ پکڑ چکا تھا اور میری انگلیاں اُس کی کھال میں پیوست ہو چکی تھیں۔ یہ صورت دیکھ کے وہ گڑبڑا گیا اور اُس کا دوسرا مکا فضا ہی میں معلق رہ گیا کیونکہ اب وہ اپنی کمر کی رہائی کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ میں نے اُسے مہلت نہیں دی۔ سانس اندر دبا کے ایک جھٹکے کے ساتھ اُسے زمین سے چند انچ اُوپر اُٹھایا مگر اُس نے میرے بال پکڑ لیے۔ ذرا سی اندازے کی غلطی ہو گئی تھی۔ اُس کا وزن میری توقع سے زیادہ نکلا۔ میں نے اُس کی کمر فوراً چھوڑ دی اور صرف ایک ثانیے کی سرعت میں اُس کے دونوں کانوں پر ہتھیلیاں ماریں۔ وہ بلبلا اُٹھا۔ پھر جیسے ہی اُس نے میرے بال چھوڑے میں نے اُس کی گردن پر ٹیڑھے ہاتھ سے ضرب لگائی۔ یہ ضرب ایسی ثابت ہوئی کہ وہ ایک چیخ مار کے پیچھے ہٹا اور کسی شخص سے جا ٹکرایا۔ پھر کسی اور آدمی کو میرے نزدیک آنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ ایک سپاہی بھی سیٹی بجاتا ہوا اِدھر آنکلا تھا اس لیے مجمع منتشر ہونے لگا۔ پان والا کے دوبارہ دکان پر چلا گیا اور چائے کے اسٹال والا اپنے اسٹال کی طرف بھاگا۔ میں وہیں کھڑا رہا۔
کانسٹیبل نے ماسٹر تارا کی گردن پکڑ لی۔ "لوئے دادا! خیر مناؤ تم ایدر مسخری کرتا پھرتا ہے؟ بہت سختی ہو گئی ہے چھوکرا! ابھی ٹائم بہت خراب ہے بابا! بھاگ جاؤ۔ وہ سالا ایدر ہی راؤنڈ پہ ہے۔" کانسٹیبل سے بولا۔
ماسٹر تارا ابھی مجھے گھور رہا تھا اور وہ شخص بھی جس کی گردن پر میں نے ضرب لگائی تھی لیکن انھوں نے کانسٹیبل کے لیے میری جانب کچھ نہیں کیا۔ البتہ کانسٹیبل نے خود اُن کی نگاہیں تاڑ لیں۔ وہ میری طرف بڑھا اور مجھے دھکا دے کے چند قدم پیچھے ہٹا دیا۔ میں نے اُس سے تلخی مول لینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ وہ گیا تو میں دوبارہ اپنی جگہ پہنچ گیا۔ چائے کے اسٹال پر جا کے میں نے چائے کا آرڈر دیا۔ ایک منٹ زیادہ نہیں گزرا تھا کہ میرے سامنے پیالی رکھ دی گئی۔ پورا اسٹال خالی ہو چکا تھا۔ اس گلی نما لمبی دکان میں ایک لمبی بینچ اور اُس کے سامنے لمبی میز رکھی ہوئی تھی۔ ابھی میں نے پہلا ہی گھونٹ حلق سے اُتارا تھا کہ دونوں اور اُن کے مزید دو ساتھی میرے سر پر آ گئے۔ "ابھی اپن تم کو ایدر نہیں دیکھے، ہم بولے دیتا ہے، ہاں۔" ایک شخص نے مجھے تحکم میں مخاطب کیا۔ اُس کے گلے میں میلا مفلر لٹکا ہوا تھا۔
"کیا تم مجھ سے بول رہے ہو؟" میں نے سختی سے پوچھا۔
"اور کس سے بولتا ہے۔ ابھی تم ایدر سے جاؤ۔ علاقے کا یہ حق مستانہ نے ماسٹر تارا کو دیا ہے۔ تم سالا کس نشے میں ہے۔ یہ بائی کلا یہاں آدمی ترڑی دکھاتا ہے تو اس کا کھوپڑی پھیر دیا جاتا ہے۔"
"یہ علاقہ اب میرا ہے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔
"اوئے!" وہ اچھل کے بولا۔ "سالا تم کیا پاگل ہے ایک دم؟" نے مصنوعی قہقہہ لگا کے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "تم نے سنا یہ بودم کرتا ہے۔"
"میں اِدھر سے نہیں جاؤں گا۔ میں دلی سے آ کے کیا یہاں پھروں گا؟ ماسٹر تارا! تمھارے اندر دم ہو تو نکال کے دکھاؤ مجھے ورنہ ہاتھ بڑھاؤ۔ اب میں اِدھر ہی بیٹھوں گا۔ میں نے لیا ہے۔" میں نے ترشی سے کہا۔

"تم ایدر کیسے بیٹھیں گا؟" ماسٹر تارا کا ترجمان مجھے شعلہ بار آنکھوں سے گھورتے ہوئے بولا۔ "میں کہتا ہوں تم سالا بہت چریا پن کر رہا ہے۔ ابھی اپن نرمی گرمی سے سمجھاتا ہے۔ بعد کو ٹیم نکل جائیں گا۔ تم سالا بہت پچھتائیں گا۔"
"دیکھ لیں گے۔ میں بھی کچھ سمجھ کے ہی اِدھر بیٹھا ہوں۔ تم کیسے آدمی ہو۔ آدمی نہیں پہچانتے۔" اُسے نظر انداز کر کے میں نے چائے والے کو پکارا۔ "اے چائے والا سیٹھ! کل اِدھر کے تمام لوگوں سے کہہ دو کہ اب ہم کو بھتا پہنچائیں۔ استاد مستانہ آئے گا تو میں خود بات کر لوں گا۔ کیا تمھیں کچھ اور سننا ہے؟"
اُن چاروں نے یکے بعد دیگرے مجھے دھمکیاں دیں، استاد مستانے کی شخصیت سے خوف زدہ کرنا چاہا مگر میں اپنی جگہ جما بیٹھا رہا۔ میں پوری طرح چوکنا تھا۔ چائے کی پیالی میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ بات بڑھی تو یہی کسی کے منہ پہ لوٹ دوں گا مگر اس کا موقع نہیں آیا۔ مجھے اس وقت چاقو کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی لیکن مجبوری تھی۔ سب کچھ چھن گیا تھا، صرف میں باقی رہ گیا تھا۔ ماسٹر تارا اور اُس کے ساتھی ڈھیٹ پنے سے میرے سر پر کھڑے رہے۔ وہ معمولی درجے کے لوگ تھے اس لیے مجھے اُن کی طرف سے خطرہ تھا۔ وہ کوئی بھی اوچھا ہاتھ ڈال سکتے تھے۔ اوچھے ہاتھ سے اور کچھ تو نہیں ہوتا مگر مثل کہتا تھا کہ اوچھا ہاتھ ڈالنے والے کو اس کا خمیازہ بُری طرح بھگتنا پڑتا ہے اور اُسے اپنے جسم کے کسی نہ کسی حصّے سے محروم ہونا پڑتا ہے یا ہمیشہ کے لیے جسم پر داغ پڑ جاتا ہے اور جواب دینے والے کو ہمیشہ ملال رہتا ہے کہ اُسے ایک نااہل آدمی کو ایسا جواب دینا پڑا۔ میں نے پہلے ہی مرحلے پر انھیں اپنے بارے میں بتانے کی کوشش کی تھی کہ وہ سوچ سمجھ کے بات آگے بڑھائیں۔ مثل نے ایک بات اور کہی تھی کہ ہاتھ پاؤں کی پھرتی سے زیادہ آدمی کو آنکھ کا پھرتیلا ہونا چاہیے۔ آنکھ ایک کسوٹی، ایک خوردبین کی حیثیت رکھتی ہے، اگر اس میں مقابل کو پرکھنے کی صلاحیت نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔
اُن میں سے ایک نے بھنا کے مجھ پر ہاتھ اٹھانے کا ارادہ کیا مگر اُس کے ساتھی نے اُسے جھڑک کے باز رہنے دیا۔ اسٹال کی لمبی میز کو کئی چھوٹی چھوٹی میزوں سے ملا کے ایک بڑی میز کی شکل دی گئی تھی۔ میں نے ایک ہاتھ سے اس کی نچلی سطح پکڑ رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ میں چائے کی پیالی تھی۔ چائے والا سہمی ہوئی نظروں سے بار بار چھت دیکھتا تھا۔ "بابا! اے بھائی! ایدر کا بھی کچھ خیال کرو۔" اُس نے عاجزی سے کہا۔ "ابھی سالا ادھر صبح صبح نہ جانے کس کا منہ دیکھا تھا۔" وہ ہذیانی انداز میں سر جھٹکنے لگا۔
"تم لوگ اِدھر وقت خراب کر رہے ہو۔" میں نے سرد مہری سے کہا۔ "مجھے یہاں سے کوئی نہیں اُٹھا سکتا اور سُن لو! اگر اب تم نے کوئی حماقت کی تو بہت بُرا ہو گا۔"
"اپن تم سے سمجھ لیں گا، سالا ایدر کش کا ٹیم ہے ورنہ اپن تم کو بتا دیتا کہ اپن کون ہے۔ تمھارا سارا ہیکڑی دیکھ لیتا اور تم کو بائی کلا میں پاؤں رکھنے کے قابل نہیں رکھتا۔" میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا بلکہ پان والے کو آواز دے کے ایک اور بنارسی پان بنانے کے لیے کہا۔ "ابھی تم اصل سے پیدا ہوا ہے تو ایدر ہی بیٹھا رہنا۔ اپن واپس آتا ہے۔"
"تم جاتے ہی کیوں ہو۔" میں نے زہر خند سے جواب دیا۔
"اپن بتائیں گا کہ اپن کیوں جاتا ہے، ایدر ٹھنا ہوئیں گا تو دیکھی منہ بنائیں گا۔ استاد مستانہ نے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے ہیں چھوکرا! ٹیم دوسرا ہے۔"
"جاؤ، جاؤ۔" میں نے دھتکار کے کہا۔
وہ چند لمحے ٹھیرے پھر گرجتے برستے گالیاں دیتے چلے گئے۔ اُن کے جانے کے بعد اسٹال والا میرے سامنے ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو گیا اور مجھے یہاں سے فوراً بھاگ جانے کے مشورے دینے لگا۔ وہ استاد مستانہ کے قہر و غضب کا ذکر بہت خوف زدہ انداز میں کر رہا تھا۔ پان والے نے اُس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ وہ دونوں اصرار کرنے لگے کہ اگر مجھے اپنی جان عزیز ہے تو ایک لمحے کی بھی دیر نہ کروں، بس میں بیٹھوں اور بائی کلا کا علاقہ فوراً چھوڑ دوں۔ میں نے اُن کی مخلصانہ تجویز سنی اَن سنی کر دی۔ آخر پان والے نے میرے پیر پکڑ لیے مگر میں وہاں سے نہیں ٹلا۔ "استاد مستانہ بہت بڑا چاقو باز ہے، تمنچہ بھی ساتھ رکھتا ہے، ادھر اُس کے سب لڑکے گھومتے رہتے ہیں اور وہ خود اُن کی نگرانی کرتا ہے۔" ہر بات ٹھیک تھی مگر مجھے زندگی کی ایسی کون سی فکر تھی، اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔
مجھے وہاں بیٹھے ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا۔ اس درمیان چائے کے اسٹال پر بہت سے لوگ چائے پینے کے لیے آئے اور اپنے راستے پر لگ گئے۔ ماسٹر تارا کسی کو ہدایت دے گیا ہوگا کہ وہ مجھ پر نظر رکھے۔ ایک شخص کو میں نے کئی بار چائے کے اسٹال کے نزدیک پھیرے کرتے ہوئے دیکھا۔ پھر تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ گزرا ہوگا کہ ماسٹر تارا کے ساتھ سات آٹھ آدمیوں کا ایک گروہ اسٹال پر آیا۔ وہ سب خاص قسم کے لوگ تھے۔ اُن کے چہروں پر درشت لکیریں، کٹے پھٹے نشانات نمایاں تھے۔ آنکھوں میں چنگاریاں لپک رہی تھیں۔ اُن کے درمیان سانولے رنگ، گٹھے ہوئے جسم اور اوسط قد کا ایک شخص کھڑا تھا، وہ ہاتھ پاؤں کا مضبوط معلوم ہوتا تھا۔ صرف وہی شخص تھا جس کی آنکھوں میں شعلوں کے بجائے شعلوں کی چمک تھی، ہونٹوں کا ایک کنارہ مسکراہٹ میں دُور تک کھنچ جاتا تھا، بال لمبے اور بکھرے ہوئے تھے، ٹھوڑی پر چاقو کا ایک ترچھا نشان تھا۔ ایسا ہی ایک نشان پیشانی پر بھی تھا، کان کی ایک لو کٹی ہوئی تھی۔ گلے میں زنجیر کے ساتھ گیندے اور گلاب کے پھولوں کا ہار پڑا ہوا تھا۔ گلا ایک بری چنریا سے لپٹا ہوا تھا۔ چنریا کے پلو سینے پر بالوں کی دو چوٹیوں کی طرح لہرا رہے تھے۔ وہ استاد مستانے کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ اُس نے مجھ پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ اُس کے ابروؤں میں

جنبش ہوئی، بھویں تھرتھرائیں سلب ایک آن کے لیے کپکپائے، پھر اُس کی نشیلی آنکھوں کا نشہ بڑھ گیا۔ وہ دھوپ کے رُخ پر رکھے ہوئے شیشے کی طرح چمکنے لگیں۔ اُس نے اُن پر پلکوں کا آدھا غلاف چڑھا لیا، نیم باز آنکھیں کچھ اور اثر انگیز ہوئیں، وہ مجھے کسی استاد سے زیادہ جادوگر معلوم ہوا۔ اُس کے ساتھی پَر تولے کھڑے تھے۔ اُس کے ایک اشارے کی دیر تھی۔ میں نے میز مضبوطی سے پکڑ رکھی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ ضرورت کے وقت پیچ آدھی کر کے اس سے چاقو کا کام لوں گا۔ چائے والا سیٹھ اسٹال سے باہر آ گیا تھا۔

مستانے نے اپنے بائیں جانب کھڑے ہوئے ایک شخص کو ابرو کا اشارہ کیا، وہ قد و قامت میں میرے برابر ہو گا، عمر میں مجھ سے زیادہ تھا، اُس کے اعضا میں لچک نہیں تھی، چہرہ بھی بے رحمی کا غماز تھا۔ صرف ایک لمحے میں وہ میرے روبرو موجود تھا۔ میں نے میز ایک طرف دھکیل دی۔ اُس نے اپنے ہاتھ میں دبا ہوا چاقو اپنے ساتھیوں کی طرف اُچھال دیا کیونکہ میرے ہاتھ میں چاقو نہیں تھا۔ میں نے بھی پیچ چھوڑ دی اور کھڑا ہو گیا۔ اُس کا اور میرا فاصلہ بہت کم تھا۔ اُس نے اپنا اُلٹا ہاتھ تیزی سے اٹھایا تاکہ میرے کاندھے پر ضرب لگا کے پہلے ہی وار میں مجھے زمین پر بٹھا دے۔ میں اُس کی ضرب کمزور کرنے کے لیے خود ہی نیچے جھک گیا چنانچہ جب اُس کا ہاتھ میرے کندھے پر پڑا تو اُس میں اتنا زور نہیں تھا، جتنے زور کی توقع میں اُس نے اُسے اُٹھایا تھا۔ اُس کا خیال ہو گا کہ میں نے نیچے جھک کے گویا ایک طرح کا دفاعی انداز اختیار کر لیا ہے لیکن میرا مقصد یہ تھا کہ وہ اُوپر سے میرے کندھے پر ضرب لگائے اور میں نیچے جھک کے اُس کی بغل پر ضرب لگاؤں۔ بغل کی ضرب سے بہت سے لوگ اپنا توازن کھو دیتے ہیں۔ یہی ہوا جب بالکل غیر متوقع طور پر میں نے زمین سے اچک کر اُس کی بغل نشانہ بنائی تو وہ گھبرا اُٹھا اور اُچھل کے ایک قدم پیچھے ہو گیا۔ قدم پیچھے کرنے کی مہلت میں اگر حملہ نہ کیا جائے تو فریق کو سنبھلنے کا زیادہ بہتر موقع مل جاتا ہے۔ وہ پیچھے ہٹا تو میں اُس کے ساتھ ہی آگے بڑھا اور میں نے اُس کا وار اُسی پر آزمایا البتہ فرق یہ تھا کہ وہ صرف کندھے پر ضرب لگا کے مجھے جھکانا چاہتا تھا، میں نے اُس کی گردن کے جوڑ پر ضرب لگائی۔ وہ بوکھلاہٹ میں اوندھے سیدھے ہاتھ چلانے لگا جو پھسلتے ہوئے میرے سر اور پسلیوں میں لگے۔ بچل نے نصیحت کی تھی کہ زیادہ ہاتھ پاؤں چلانے سے بہتر ہے کہ زیادہ ہاتھ پاؤں کھائے جائیں اور ایسے نشانے کی تاک میں رہا جائے کہ جہاں ضرب لگانی مقصود ہو، وہاں سے مقابل کا ہاتھ فاصلے پر ہو۔ وہ کہتا تھا کہ زیادہ ہاتھ پاؤں چلانے والا دیر تک محتاط نہیں رہ سکتا بشرطیکہ مقابل کا آدمی جان بوجھ کے اُس کے حملے برداشت کر رہا ہو اور مناسب موقع کی تاک میں ہو ورنہ معاملہ اُلٹا ہو جاتا ہے۔ آدھی لڑائی تو محض احتیاط اور کوشش سے جیتی جاتی ہے۔ لڑائی کے دوران میں مکمل طور پر اپنی ذات کے احاطے میں رہنا چاہیے اور مقابل کو اپنی آنکھ کے حصار میں رکھنا چاہیے۔ میں اِدھر اُدھر پینترے بدل بدل کے اُس کی ضربیں نامکمل کرتا رہا

پھر ابھی اُس کی ضربیں پانچ چھ سے زیادہ نہیں ہوئی تھیں کہ آخر مجھے ایک [illegible] ہاتھ آ گیا۔ میرا جما ہوا پنجہ اُس کی ناک پہ پڑا۔ اُس نے تلملا کے برق رفتاری کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے میری گردن پکڑنے کا ارادہ کیا۔ اب اُسے یہی خواہش ہونی چاہیے تھی کہ وہ جواباً میرے چہرے کے کسی حصے پر خون کی [illegible] اُبھار دے جیسی اُس کے چہرے پر اُبھر آئی تھی۔ اپنا خون دیکھ کے آدمی پر [illegible] طاری ہو جاتی ہے بس اُس کے گردن پکڑنے کی دیر تھی، میں نے اپنا دایاں ہاتھ بھرپور [illegible] اُس کی ٹھوڑی کے نچلے حصے پر مارا۔ اُس کے کئی دانت آپس میں [illegible] ہو گئے ہوں گے۔ ایک بلند کراہ کے ساتھ ہی اُس کی گرفت کمزور پڑ گئی۔ میں [illegible] کسی توقف کے بغیر اُس کے پیٹ میں مکا مار کے پہلے تو اپنی گردن آزاد کرائی [illegible] اُسے پھر سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔

آگرے میں نوشہ کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا مگر اُس کی ٹھوڑی [illegible] سر کے بجائے موتیا بائی کے صندوق سے چکنا چور ہوئی تھی۔ وہ ضرب اس [illegible] سے زیادہ شدید تھی۔ نوشہ فرش پر بلبلانے لگا تھا۔ یہاں مستانہ کے آدمی کا [illegible] مخدوش ہو جانے کے باوجود مجھے پے در پے ضربیں لگانی پڑیں تب کہیں اُس کے حواس بجا طور پر باختہ ہوئے۔ وہ گرنے لگا۔ نوشہ کے مقابلے میں یہ شخص [illegible] سے دگنا تھا، داؤ پیچ بھی اچھے خاصے جانتا تھا۔ مستانے کی وجہ سے یہاں بھی زیادہ اکٹھی نہیں ہوئی تھی۔ اُس کے آدمیوں نے بھیڑ اکٹھی نہیں ہونے [illegible] اسٹال کی کئی میزیں ٹوٹ گئیں۔ پانی کا فلٹر بھی ٹوٹ گیا۔ تقریباً سارا اسٹال چند منٹوں میں اُلٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ وہ شخص ابھی تک اُلٹے سیدھے ہاتھ [illegible] رہا تھا اس لیے اچانک مستانہ کے اشارے پر اُس کے دو آدمی اُسے بازو [illegible] پکڑ کے اپنی جانب کھینچنے لگے۔ میری لاج رہ گئی۔ نصیب میاں ہوتے تو [illegible] کیا برجستہ اور بے ساختہ وار تھے۔ جب میں نے جیل میں کانتے کو گرایا [illegible] وہاں میرا ایک وار فی البدیہہ وار سے موسوم کیا گیا تھا۔ یہاں مستانہ کے [illegible] بھی اتنی ہی جلدی اور تیزی سے فیصلہ ہونا چاہیے تھا۔ اُس کا آدمی [illegible] جا رہا تھا اور اپنے ساتھیوں کے قبضے سے آزاد ہو کے دوبارہ مجھ پر حملہ کرنے کی فکر میں تھا مگر انھوں نے اُسے بہ مشکل تمام روکے رکھا اور اسٹال والے [illegible] میلی تولیا سے اُس کا خون آلود چہرہ صاف کرنا شروع کر دیا مگر خون نہیں رکا۔ اُس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے گئے اور اُسے کلیاں کرائی جانے لگیں۔ پانی اُس کے منہ سے سرخ ہو کے واپس آ تا رہا۔

مستانہ کی آنکھوں کی نشیلی چمک گہری ہو گئی تھی اور اب اُس کی [illegible] پوری طرح اُوپر اُٹھی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے ساتھی کی طرف متوجہ نہیں تھا [illegible] مسلسل مجھے گھورے جا رہا تھا، پھر وہ آہستہ قدموں سے میرے پاس آیا [illegible] اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور ایک نعرہ لگا کے بے تابانہ میرا دائیں بازو کو بوسہ دیا اور اپنے گلے سے جنریا اُتار کے میرے گلے میں ڈال دی۔

☆ وہ جگہ گراؤنڈ فلور کے تین چار فلیٹوں پر مشتمل تھی جہاں مستانہ اپنے [illegible]

[illegible] دبیوں کی معیت میں مجھے لے گیا، مجھے اُس نے چوکی پر اپنے برابر کی [illegible] دی پھر لڈوؤں کا ایک طشت آ گیا۔ لڈوؤں پر پھولوں کی پتیاں بکھری [illegible] ہوئی تھیں اور درمیان میں ایک بڑی موم بتی جل رہی تھی۔ ایک بڑا گلاس [illegible] اور دودھ کی بالٹی بھی پاس ہی رکھی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر شخص نے دودھ کا بھرا ہوا گلاس مجھے پینے کے لیے دیا۔ ابھی میں نے صرف ایک گھونٹ لیا تھا کہ [illegible] اُس نے گلاس مجھ سے واپس لے لیا۔ پھر وہ گلاس باری باری تمام لوگوں میں [illegible] گھومتا رہا اور سب اُس سے ایک ایک گھونٹ پیتے رہے۔ ساتھ ہی دو دو [illegible] لڈو تقسیم کیے جانے لگے۔ مستانہ سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگا رہا تھا۔ وہ [illegible] بات کم کرتا تھا، اشارے زیادہ کرتا تھا۔ "تارے!" دفعتاً اُس کی آواز گونجی۔ سب اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"تارے! کاشی! بابل! دودھ پی لیا؟"

"پی لیا۔" وہ تینوں مرجھائی ہوئی آوازوں میں بولے۔

"پی لیا؟" مستانہ نے اپنی کھنک دار آواز میں دوبارہ پوچھا۔

"پی لیا استاد!" اس بار تینوں بیک وقت بولے۔

"پی لیا؟" مستانہ نے نسبتاً اونچی آواز میں پھر تکرار کی۔

"جی استاد!" اُن تینوں نے پھر سر جھکا لیے۔

مستانہ نے ایک لمبی ہوں کی اور مجھ سے مخاطب ہو کے بولا "بول [illegible] کون سا ٹھکانا چاہیے؟" اُس کی آواز میں لچک اور کھنک تھی جیسے پیتل کا [illegible] برتن بول رہا ہو۔

"یہ تمھاری مرضی پر ہے استاد! میں نے خود کو تمھارے ساتھ باندھ [illegible] لیا ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "میں اس شہر میں نیا ہوں، بمبئی میں تمھارا [illegible] نام سُنا تھا سوچا ٹرائی کروں، سو ادھر چلا آیا۔"

"اپن کا ذکر بمبئی میں کیدر نئیں ہے۔ تو نے اچھا کیا، ایدر آ گیا پر تجھے [illegible] سب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ سیدھا اپن کے پاس آتا۔" مستانہ شرابی [illegible] لہجے میں بولا۔

"میں نے سوچا، جان پہچان میں ٹائم لگے گا۔ پہلے ہی استاد کو کانٹے [illegible] ہلکے بتا دوں تو اچھا ہے۔ یہ شہر بہت ظالم ہے کئی دن سے میں اِدھر [illegible] پھر رہا ہوں پر شرافت یہاں چھو کے نہیں گئی۔ کوئی ہمارے شہر میں آ کے دیکھے [illegible] سر آنکھوں پہ بٹھاتے ہیں، یہاں تو تارا جیسا کھوسٹ نظریں ٹیڑھی کرنے لگا تھا۔"

"تارا حرامی ہے۔" مستانہ برہمی سے بولا۔ "تو نے ایدر آ کے دیکھا ہوتا [illegible] مستانے کی آنکھ اُڑتی چڑیا کا تول کر لیتی ہے۔ اپن تو ویسے تجھے پہلی نظر دیکھ [illegible] کے ہی ہاتھ اُٹھا دیتے پر اپن نے بھی سوچا، ان سالوں کی تسلی ہو جائے۔ خیر [illegible] بھول جا سب کچھ، اب یہ سب تیرے بھائی ہیں۔"

"میں نے اسے کچھ نہیں بولا تھا استاد!" ماسٹر تارا نے احتجاج کیا۔

"چپ رہ۔" مستانہ نے اپنی سرخ آنکھیں ماسٹر تارا پر جما کے للکارا۔

"دلی سے شہزادہ آیا ہے۔ اب اگر زبان کھولی تو قینچی سے کتر لوں گا۔"

نوجوان ماسٹر تارا نے بڑھ کے اُستاد کے پاؤں پکڑ لیے اور مجھ سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا، میں نے اُسے پاس ہی بٹھا لیا، پھر سب نے ماسٹر تارا کی تقلید کی۔ ہر شخص پہلے اُستاد کے پاؤں چھوتا پھر مجھ سے مصافحہ کرتا۔ میں نے مستانہ کو اپنا نام سکندر بتایا تھا۔ ماحول میں اجنبیت کا جو غبار چھایا ہوا تھا، وہ رفتہ رفتہ چھٹ رہا تھا۔ بہت دیر ہو گئی تھی، مجھے ڈر تھا کہ کہیں راج کرشنا گھر واپس نہ آ گیا ہو۔ جب اُسے پتہ چلے گا کہ میں صرف قمیص پاجامے میں گھر سے نکل گیا ہوں تو وہ میری تلاش میں نکل کھڑا ہو گا۔ میں مستانہ سے کہہ چکا تھا کہ بمبئی میں میرا کوئی تنا سا کوئی گھر نہیں ہے۔ اب اگر میں جانے کی جلدی کرتا تو سب بنی بنائی خاک ہو جاتی لیکن ظاہر تھا کہ وہ کب تک اس طرح بیٹھے رہتے۔ مستانہ نے مجھ سے بائی کلا کا کوئی بھی علاقہ مانگ لینے کی پیش کش کی تھی، مجھے اس سلسلے میں کوئی واقفیت ہی نہیں تھی اور نہ میرا مقصد کوئی علاقہ حاصل کرنا تھا اس لیے میں نے انکار کر دیا کہ پہلے میں سارے علاقے کا جائزہ لوں گا، پھر اُسے بتاؤں گا۔ مستانے کی بھی شاید یہی خواہش تھی کہ میں اُس کے ساتھ رہوں اور علاقے میں اُس کا نمائندہ بن کے آدمیوں کی نگرانی کرتا رہوں۔ وہ ابھی روپے پیسے کا کوئی اعتبار مجھ پر نہیں کرنا چاہتا ہو گا۔ وہ ابھی مجھے اور پرکھنا چاہتا ہو گا۔ میری بات سے وہ خوش ہوا، پھر اُس نے سب کو اپنے اپنے کام پر جانے کا حکم دیا اور مجھ سے دلی کے بارے میں پوچھنے لگا۔ مجھے کلکتے کی جو معلومات تھیں، وہ میں نے دلی پر منطبق کر دیں۔ میں سات سال جیل میں رہ کے ہر طرح کی بات سے واقف ہو ہی چکا تھا اس لیے مستانہ نے مجھ پر کوئی شک نہیں کیا۔ جس شخص کے میں نے دانت توڑے تھے اور ناک پھوڑی تھی، وہ مرہم پٹی کرا کے آ گیا تھا۔ مستانہ نے باقی دودھ اُسے پلا دیا۔ اُس کا نام دلیرا تھا۔ دلیرا کا چہرہ بجھا ہوا تھا مگر وہ مستانہ کے اشارے پر مجھ سے گلے مل لیا۔

رات کا کھانا میں نے مستانہ اور اُس کے قریبی ساتھیوں کے ساتھ ہی کھایا۔ کھانے کے بعد ایک آدمی نے اُسے دوسرے کمرے میں چلنے کا اشارہ کیا، مستانہ فوراً اُٹھ گیا۔ میں نے کچھ دیر اُس کا انتظار کیا پھر باہر چلا آیا اور جو پہلی بس نظر آئی، اُس میں سوار ہو گیا۔ میں نے یہ احتیاط کر لی تھی کہ کوئی میرا تعاقب تو نہیں کر رہا ہے۔ جب بس خاصی دُور آ گئی اور میرے خیال کے مطابق بائی کلا کا علاقہ دُور رہ گیا تو میں نے اُتر کے نپے تلے قدموں سے فٹ پاتھ پر چلنا شروع کر دیا۔ یہ جگہ بہت گنجان تھی۔ ایک بڑا میڈیکل اسٹور ابھی تک کھلا ہوا تھا، میں نے اُس میں داخل ہونے سے پہلے اپنے اِردگرد کا اچھی طرح جائزہ لے کے فون کرنے کے لیے اسٹور کا رُخ کیا۔ اسٹور کے مالک نے مجھے آسانی سے فون نہیں کرنے دیا لیکن جب میں نے ایک روپیہ اُس کے سامنے رکھا تو ۲ آنے کاٹ کے باقی ۱۴ آنے اُس نے میرے سامنے رکھ دیے۔ یہ میری زندگی کا پہلا ٹیلی فون تھا۔ راج کرشنا نے میری [illegible] سنتے

ہی ڈھیروں سوال شروع کر دیے۔ میں نے سرگوشی میں کہا کہ میں آج رات شاید گھر نہ آ سکوں، پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر اس سے پہلے کہ راج کرشنا تفصیل پوچھتا، میں نے فون بند کر دیا۔

میں دوسرے دن بھی راج کرشنا کے پاس نہیں جا سکا اور فون بھی نہیں کر سکا۔ مستانہ کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے میرا اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ رہنا ضروری تھا۔ اس طرح ایک تو میں زیادہ محفوظ تھا کیونکہ ممکن تھا، مستانہ کے آدمیوں کے دلوں میں اب بھی کوئی پھانس رہ گئی ہو۔ دوسرے میں اپنے آپ پر جبر کر کے جس کام کے لیے یہاں آیا تھا اس کی تکمیل جتنی جلدی ہو جاتی اچھا تھا۔ نجل اور موجدار کی طرح مستانہ کے پاس داؤ پیچ سکھانے کے لیے بڑی جگہ نہیں تھی۔ ویسے بھی مستانہ ممبئی کے ایک چھوٹے سے علاقے کا مختار تھا، نجل اور موجدار کے پاس جتنا بڑا علاقہ تھا، یہ اس کا عشرِ عشیر نہیں تھا۔ ویسے مستانہ چاقو چلانے میں بہت پھرتیلا تھا۔ یہ مقام اس نے چاقو بازی ہی کا جوہر دکھا کے حاصل کیا ہو گا۔ دوسرے یہ اس کا وہ بہروپ تھا جو خواہ مخواہ اس کے آدمیوں پر دہشت طاری کیے ہوئے تھا۔ بہرحال مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ مستانہ کی آنکھ میں رحم بالکل مفقود تھا۔ وہ کوئی پچاس سال کی عمر کا آدمی ہو گا۔ تیسرے دن صبح جب اس نے اپنے کئی آدمیوں کے سامنے داؤ پیچ کی مشق کی اور ان کے چاقو گرا دیے تو میرا جی چاہا کہ میں بھی اس سے دو دو ہاتھ کروں مگر میں دور ہی کھڑا رہا البتہ میں نے اس کے آدمیوں سے پنجہ آزمائی اور چاقو بازی ضرور کی اور ہاتھ ذرا دبے دبے رکھے۔ اس کے باوجود مستانہ عش عش کر اٹھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کی موجودی میں مجھے اپنے ساتھ چاقو آزمائی کے لیے للکارا۔ اس کی للکار میں تمسخر تھا، غصہ نہیں تھا۔ میں نے سر جھکا لیا اور پہلی بار مستانہ کا قہقہہ سُنا۔ وہ اُکھڑا اُکھڑا سا قہقہہ جس کا کوئی سر تھا نہ پیر۔ "دلی کا شہزادہ سکندر رہا تا ہے۔" اس نے سینہ پھلا کے کہا۔ "کہ اس کے سامنے ایک مستانہ کھڑا ہے۔" یہ کہتے ہوئے مستانہ نے ایک جُھرجُھری لی، آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اور نعرہ نما آواز میں بولا۔ "مالک! راجا ہی رکھیو۔" پھر وہ اچانک دیوار سے سر پھوڑنے لگا اور اس نے اپنا گریبان چاک کر کے "تار تار" کر دیا۔ اس کے آدمیوں نے اسے پکڑنا چاہا تو اس نے ان دونوں کو جھکائی دے کے فرش بوس کر دیا اور کچھ دیر تک آنکھیں بند کیے گم سم کھڑا رہا۔ پھر اس نے جیب سے چاقو نکالا اور سامنے کی دیوار پر ایک نظر کی۔ چاقو ٹھیک چھپکلی کے سر پر لگا۔ چھپکلی دو ٹکڑے ہو کے زمین پر گر گئی۔ اس کے آدمیوں نے چاروں طرف سے اسے گھیر لیا۔ میری زبان سے نکلتے نکلتے رہ گیا کہ نشانہ لگانے کا موقع آئے تبھی تو کوئی نشانہ لگا سکتا ہے۔

*

تیسرے دن دوپہر کو مجھے گھر جانے کا موقع مل گیا۔ میں وہاں دیر تک بیٹھا رہا۔ راج کرشنا موجود نہیں تھا۔ مجھے جلد واپس پہنچنا تھا اس لیے میں بکھو کو اپنی حاضری نوٹ کرا کے چلا آیا۔ مستانہ نے مجھے کچھ پیسے دے دیے تھے تاکہ میں نئے کپڑے خرید لوں۔ میں نے انھی لوگوں کے رنگ ڈھنگ کے مطابق کپڑے بنوا لیے اور دن دن بھر بائی کلا کی سڑکوں پر گھومنے لگا۔ دو دن اور گزر گئے۔ ان دو دنوں میں مجھے مستانہ سے کچھ اور قریب ہونے کا وقت مل گیا۔ خوشامد مستانہ کو بہت پسند تھی مگر میری زبان سے خوشامد کا ایک لفظ بھی نہیں پھوٹتا تھا اس لیے میں زیادہ تر خاموش ہی رہتا تھا۔ اس خاموشی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے آدمی میری عزت کرنے لگے۔ خود مستانہ نے اسے میرے عجز پر محمول کیا۔ مستانہ کی زبان کچھ صاف تھی وہ یو پی کے کسی گاؤں سے ممبئی آیا تھا۔ رات گئے اس کے پاس بھانت بھانت کی عورتیں آ جاتی تھیں جنھیں لے کے وہ اپنے کمرے میں بند ہو جاتا تھا۔ کمرے سے رات بھر ناچ گانے، راگ رنگ کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔ اس کمرے میں اس کے دو چار ہی آدمیوں کو اندر آنے کی اجازت تھی اور وہ دروازے کے ارد گرد ہی منڈلاتے رہتے تھے۔ کوئی عورت باہر نکلتی تو وہ اسے بُری طرح دبوچ لیتے۔ وہ بھی اتنی بے غیرت ہوتیں کہ کوئی مزاحمت نہ کرتیں بلکہ اپنی طرف سے کچھ اور چپٹ جاتی۔ میں آنکھیں پھیر لیتا۔ شام اور صبح دونوں وقت بھنگ گھوٹی جاتی تھی۔ ایک بار انھوں نے میری طرف بھی پیالہ بڑھایا۔ میں نے کہا، ماں نے قسم دلا دی ہے۔ رات گئے مستانہ نشے میں لڑکھڑاتا کمرے سے باہر نکلتا تو اس کے آدمی اندر گھس کے عورتوں پر جھپٹ پڑتے اور انھیں اپنے ساتھ کمروں میں لے جاتے۔ اگر کسی کی آج باری نہ آتی وہ دوسرے دن بازی لے جانے کی کوشش کرتا۔

دن بھر تاش کھیلے جاتے اور علاقے کے مختلف حصّوں سے آئے ہوئے لوگ مستانہ کے سامنے جیبیں خالی کر دیتے اور پولیس والوں کی سختی کی شکایت کرتے، کبھی کسی دکان دار کا رونا روتے۔ مستانہ کے خاص خاص آدمی آتے تو مستانہ اُٹھ کے دوسرے کمرے میں چلا جاتا۔ وہاں ابھی تک میری پہنچ نہیں ہوئی تھی۔ مستانہ کے اڈے پر باہر کے لوگ بھی ملنے کے لیے آتے۔ میرے آنے سے قبل دو کانسٹیبلوں کا قتل ہو چکا تھا اور مستانہ کے کئی آدمی جیل میں بند ہو گئے تھے مگر کسی نے قبول کر کے نہیں دیا تھا اس لیے بائی کلا میں پولیس کی نفری بڑھا دی گئی تھی اور مستانہ انھیں کچھ دنوں سنبھلے رہنے کی ہدایت دیتا رہتا۔ پولیس کی سختی کی زیادہ شکایتیں سن کے اس کی آنکھیں شراب کے بجائے خون اُگلنے لگتیں اور وہ پھنکارتا ہوا کہتا۔ "ابھی دو چار اور جائیں گے۔ مالک ان کو دو چار اور اپنے پاس بلانے کی فکر میں ہے۔ بھیجوں گا مالک! تیرا حکم ہے، بھیجنا ہی پڑے گا۔"

مستانہ کو کسی کام سے عار نہیں تھا، کام کی کوئی حد مقرر نہیں تھی۔ کسی دوسرے علاقے کے لوگ جب اس سے ملنے آتے تو وہ ان کی بڑی خاطر تواضع کرتا اور جب اپنے کسی آدمی کو سزا دینے پہ آتا تو اس کی انگلی کا کوئی پور کاٹ لیتا یا کان کی لو کتر لیتا یا کہیں سے ذرا سی کھال اتار لیتا، پھر سلگتی ہوئی [illegible] شکل کی دھات سے اس کی کمر میں داغ ڈلے جاتے مگر ایسا کم ہوتا تھا۔

[مستانہ کے] آدمی غلطیاں کم ہی کرتے تھے اور کرتے تھے تو سزا میں رتی بھر رعایت نہیں کی جاتی تھی۔

چونکہ بائی کلا میں پولیس کی تعداد میں اضافہ کر دیا گیا تھا اور افسروں کی گشت جاری تھا اس لیے میں نے باہر نکلنا اور کم کر دیا تھا۔ راج کرشنا کے ماتحت افسران مجھے اس کے ساتھ دیکھ چکے تھے۔ مجھے مستانہ کے ہاں اپنے دن گھسیٹتے ہوئے دو ہفتے گزر گئے۔ یہ دو ہفتے میں نے کسی جیل میں گزارے تھے۔ کبھی میرے خون کی گردش اتنی تیز ہو جاتی اور کبھی دماغ اتنا بھک جاتا کہ میرے ہاتھ خود اپنا گلا گھونٹنے لگتے۔ ایک ایک دن گنتا تھا، ایک ایک گھڑی بتانا مشکل تھا۔ سولھویں دن ہی میں وہاں سے چلا آتا کیونکہ وہاں مزید ٹھہرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہ گئی تھی اور میرا سینہ پک رہا تھا اور ویسے بھی مجھے جلد سے جلد ان لوگوں سے دور ہو جانا چاہیے تھا کیونکہ اب مستانہ مجھے اپنے خاص آدمی کا سا رتبہ دینے لگا تھا اور کوئی اہم کام سونپنے ہی والا تھا۔ وہ کام کسی کا خون کرنے کا بھی ہو سکتا تھا۔ سولھویں دن دوپہر کے وقت مستانہ نے مجھے اپنے خفیہ کمرے میں بلایا۔ وہاں دیواروں پر عریاں اور نیم عریاں عورتوں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں اور چھوٹے چھوٹے پایوں کی ایک بڑی چوکی بچھی ہوئی تھی۔ مستانہ کے کچھ خاص آدمی بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ مستانہ نے دروازہ بند کروا دیا اور ہمیں سرگوشیوں میں ہدایت دینے لگا۔ اس کی ہدایت سُن کے میرے ہوش اُڑنے لگے، رگیں پھٹنے لگیں۔ مستانہ نے میری طرف شوخ نظروں سے دیکھا اور درشتی سے بولا۔ "کیوں سکندر! تو نے اپن کی بات دھیان سے نہیں سُنی؟"

میں نے بوکھلا کے کہا۔ "سن لی ہے استاد!"

"تو پھر تیرے منہ کو سیل کیوں لگ گئی۔ تیرے لیے یہ کام نیا ہو گا۔" وہ بگڑے ہوئے تیوروں سے بولا۔ "پر تجھے کسی بڑے کام سے تو لگانا ہو گا۔ تو نے اچھا کیا، جلدی نہیں کی، علاقہ نہیں لیا، نہیں تو ٹھوکریں کھاتا رہتا سالا! اب خوش ہو جا، آگے مال ہی مال ہے۔" میری زبان کو سکتہ ہو گیا تھا۔ "سن لیا؟" وہ چیخ کے بولا۔

"سن لیا۔" میں نے ہڑبڑا کے کہا۔

میں وہاں سے جلد چلا آیا۔ میرے ہاتھ پاؤں بار بار برف ہو جاتے تھے اور بار بار ان میں آگ سی لگ جاتی تھی۔ شام تک مستانہ نے اس بات کا التزام رکھا کہ کوئی آدمی اس سے دور نہ رہے حالانکہ بظاہر وہ ہمیں حکم دے کے جیسے بھول گیا تھا۔ جیسے یہ اس کا معمول ہو۔ میرے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ مجھے اپنی فہمیدہ یاد آ گئی، میری جان، میری بہنو۔ میرا کلیجا پھٹنے لگا۔ چراغ جلنے کے خاصی دیر بعد مجھے بھاگ جانے کا ایک موقع ملا لیکن میرے قدم مستانہ کے فلیٹوں کے تنگ راستے میں زمین نے جکڑ لیے۔ اگر مستانہ کو فوراً خبر ہو گئی کہ میں اڈے پر موجود نہیں ہوں تو وہ میری تلاش میں اپنے آدمی دوڑا دے گا اور اگر مجھے وقت پر کوئی سواری نہ ملی تو میں بائی کلا کے علاقے میں کسی بھی جگہ پکڑا جاؤں گا۔ میں چند لمحے راستے ہی میں ٹھہرا ہوا سوچتا رہا اور سوچنے کے نتیجے میں واپس آ گیا۔ میرا اندیشہ درست تھا۔ مستانہ کے آدمی دروازے سے باہر آ گئے تھے مگر مجھے واپس آتا دیکھ کے لوٹ گئے۔ انھوں نے مجھ سے کچھ پوچھا گچھا نہیں کیونکہ میں چند ہی لمحوں میں واپس آ گیا تھا۔ مستانہ نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔

رات کے بارہ بجے ہم لوگ، ہم آٹھ آدمی دو گاڑیوں میں اڈے سے روانہ ہوئے۔ ایک گاڑی لمبی تھی، دوسری چھوٹی۔ میں چھوٹی میں تھا۔ پون گھنٹے بعد ہم اپنے مقررہ مقام پر پہنچے، دونوں گاڑیاں کچھ کچھ فاصلے پر ٹھہرائی گئی تھیں۔ میرا کام باہر ہی کھڑے رہنا تھا۔ مستانہ کے تین آدمی وہاں پہلے سے موجود تھے۔ انھوں نے آپس میں کچھ اشارے کیے۔ اس وقت رات کا ایک بجا ہو گا۔ موہوم سی روشنی تھی۔ یہ بنگلوں کا علاقہ تھا۔ چار آدمی اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ طے یہ ہوا تھا کہ اگر اتفاق سے کوئی کانسٹیبل اِدھر نکل آیا تو آپس میں دنگا کر کے اسے اُلجھا لیا جائے گا۔ میں گاڑی چلانا نہیں جانتا تھا۔ اگر جانتا ہوتا تو چپکے سے گاڑی میں بیٹھ کے فرار ہو جاتا۔ کُل گیارہ آدمی تھے۔ گیارہ میں سے دو ایک کو مار کے یا شور مچا کے بھی مقصد حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ میرے ساتھ ہی ایک آدمی اور کھڑا تھا، چار آدمی کچھ فاصلے پر ٹہل رہے تھے، چار آدمی بنگلے کی دیوار کود گئے تھے۔ ان کے جانے کے چند منٹ بعد بنگلا اندھیرے میں ڈوب گیا۔

کوئی دس منٹ بعد اِدھر اُدھر خشی شی، شوں شوں کی آوازیں آنے لگیں۔ تین آدمی بھاگتے ہوئے فٹ پاتھ پر آئے۔ ایک کے کندھے پر چادر میں لپٹی ہوئی بے ہوش لڑکی تھی۔ گاڑیوں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ لڑکی بجلی کی تیزی سے بڑی گاڑی میں ڈال دی گئی اور دو آدمی پچھلی سیٹ پر کونوں میں اِدھر اُدھر بیٹھ گئے۔ اگلی نشست پر تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ باقی آدمی چھوٹی گاڑی میں ٹھنس گئے۔ اس بار چھوٹی گاڑی آگے تھی۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے کچھ فاصلے سے چل رہی تھیں۔ بائی کلا کے علاقے میں چھوٹی گاڑی اڈے کے قریب روک دی گئی اور تمام لوگ باہر اُتر پڑے۔ دو آدمی ایک دوسرے سے اُلجھ گئے اور نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ شور مچنے لگا۔ دو کانسٹیبل سیٹیاں بجاتے بھاگتے ہوئے آئے اور لڑنے والوں کو ڈانٹنے پھٹکارنے لگے۔ دونوں فسادی ننگی ننگی گالیوں کا آزادانہ تبادلہ کر رہے تھے۔ باقی آدمیوں نے کانسٹیبلوں کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ اس اثنا میں بڑی گاڑی یہ احوال دیکھے بغیر آگے نکل گئی اور جب تک وہ اڈے کی گلی سے واپس نہیں چلی گئی، لڑائی جاری رہی اور پھر کچھ تُو تُو میں میں کے بعد بات صلح صفائی پر آ گئی۔ کانسٹیبل دونوں جھگڑالو آدمیوں کو تھانے لے جانے پر مصر تھے مگر ان کے باقی ساتھیوں نے معافی تلافی کرا لی۔ دو آدمیوں کے سوا باقی گاڑی میں سوار ہوئے بغیر آہستہ آہستہ پیدل ہی اڈے کی طرف

چل پڑے۔

جب ہم اندر داخل ہوئے تو اڈے پر بھیڑ نہیں تھی ہم لوگوں کو علیحدہ کر کے مستانہ کے ساتھ تین آدمی تھے۔ مستانہ نے سب کے بازوؤں کا بوسہ لیا اور میرا کندھا خاص طور پر تھپ تھپایا۔ وہ بہت خوش نظر آرہا تھا۔ مجھے چھوڑ کے سبھی کو پہلے سے تیار کیے ہوئے بھنگ کے پیالے پیش کیے گئے۔ بھنی ہوئی مرغیاں، تکے اور کباب تیار تھے۔ مستانہ کی یہ مستانہ روی دیکھ کے کسی نے خوشامدانہ آواز میں کہا "استاد! ذرا دیدار تو کرا دو۔" اُس کی تائید اور لوگوں نے بھی کی۔

"یہ اپن لوگوں کے لیے نہیں ہے اس سے سو بنائی جائیں گی قلو۔ یہ تو کیتس ہے۔" مستانہ معمول سے زیادہ چہک رہا تھا۔ اُس کی زبان بھی لڑکھڑا رہی تھی۔

"استاد! بس ذرا ایک سیکنڈ درشن۔"

"آؤ" مستانہ نے ہاتھ پھیلا کے تلخی سے کہا۔ "آؤ آؤ سالا! تم بھی کیا یاد کرو گے، مر جائیں گا تو سالا یاد کرو گے، روٹھ گئے۔" وہ چیخ کے بولا۔

ہم سب اندر کمرے میں پہنچ گئے۔ لڑکی چوکی پر بے سُدھ پڑی تھی۔ اُس کے بدن پر ایک چادر ڈھکی ہوئی تھی۔ مستانہ ڈگمگاتا ہوا اُس کے پاس گیا۔ "بتی جلاؤ۔" اُس نے منہ پر انگلی رکھ کے ہولے سے کہا۔ روشن کمرہ مزید روشن ہو گیا۔ مستانہ نے لڑکی کے پہلو میں بیٹھ کے دھیرے دھیرے چادر ہٹانی شروع کی۔ پھر دفعتہً ایک جھٹکے سے اسے کھینچ لیا۔ میری آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اور حلق میں سوئیاں چبھنے لگیں۔ وہ گندمی رنگ کی ایک پری رُو لڑکی تھی۔ اُس کی عمر ۱۶، ۱۷ سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اُس کا چہرہ شائستگی کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا اور پورا بدن کسی مجسمے کی طرح ترشا ہوا تھا۔ پلکیں لمبی لمبی، آنکھیں تلوار کی طرح کھنچی ہوئی، بال سیاہ اور اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے۔ وہ شب خوابی کا جدید لباس پہنے ہوئے تھی۔ سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں۔ اُس کی طرف سب ایک ٹک دیکھتے رہے۔ سب کی آنکھیں گنگ اور زبانیں دنگ تھیں۔ مستانہ نے انگلیوں سے اُس کے رخسار سہلائے اور پھونکوں سے اُس کے گیسو اڑائے۔ پھر پورے بدن پر سر سے پیر تک احتیاط سے ہاتھ پھیرا۔ اسی اثنا میں کسی نے منہ سے سیٹی بجا دی۔ مستانہ نے پلٹ کے ہم سب کی طرف غصے سے دیکھا اور جھٹ چادر سے لڑکی کا بدن ڈھانپ دیا۔ "ہٹو۔" وہ ناگواری سے بولا۔

"ماسٹر! قسم سے گرینڈ ماسٹر نے چھوکری اپنے ہاتھ سے بنایلا ہے۔ ماسٹر" تمی لجلجاتی اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ "ماسٹر! دل گھبرا رہا ہے اِسے اُوپر پہنچا دو ورنہ....."

"چپ رہ" مستانہ نے ڈانٹ کر کہا۔ "بس اسے اُوپر پہنچا دو، چھوکری تمھاری ماں کی طرح اُس وقت تک یہاں رہے گی جب تک....." مستانہ بولتے بولتے کہیں گم ہو گیا۔

"استاد چھوکری اپن اُوپر پہنچاؤں گا۔"

"نئی استاد! یہ لومڑی کا بچہ دس سیر کا بورا بھی نہیں اٹھا سکتا، چھوکری کو اپن پریم سے اوپر پہنچاؤں گا۔ استاد! ایک چانس دو۔"

"استاد! اپن پہنچاؤں گا، ایک دم فس کلاس....."

"آئیں آئیں۔" مستانہ کی گرج دار آواز سے وہ سب خاموش ہو گئے۔ "لفنگے! تم سالا روز چھوکریاں دیکھتا ہے۔ ایک چھوکری بچا نہیں سکتا، دھندا کریں گا۔ تم سالا سب کتے ماس کا بنا ہے۔" مستانہ باری باری سب پر غصے کی نگاہیں پھینکنے لگا۔ پھر اُس کی نظر مجھ پر ٹک گئی۔ میں الگ تھلگ خاموش کھڑا تھا۔ "ادھر آ سکندر!" اُس کی آواز میرے جسم میں سن سنا گئی۔ میری ہچکچاہٹ پر اُس نے کرخت لہجے میں مجھے اپنے پاس بلایا۔ "اِسے تو اوپر لے جائے گا اور تو..... تو" اُس نے ایک آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کے ساتھ جائے گا۔ سلما پہرے پر رہے گا۔ روم نمبر ۶ میں۔ سمجھا اب تم سب میرے ساتھ آؤ۔ ڈھائی بج رہا ہے اور وہ چھوکریاں تھک کے مر گئی ہوں گی۔ آج اپن نے تم لوگ کے لیے خاص انتظام کیا ہے۔"

اُس کے اشارے پر میں نے لڑکی کو کندھے پر ڈال لیا۔ سبھوں کی ہنسی چھوٹ گئی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں ایک لاش اٹھائے ہوئے ہوں، فہمیدہ کی لاش۔ میں جلدی سے باہر نکل آیا۔ میرے پیر لرز رہے تھے۔ میں نے اپنا چہرہ اُس کے کپڑوں سے خشک کیا۔ اُوپر کا راستہ ایک الماری سے گزر کے جاتا تھا۔ وہ صرف بظاہر الماری تھی اور کمرہ کیا تھا، ایک بڑا مچان تھا۔ چھت نیچی ہونے کے لیے فرش پر بنا ہوا چھوٹا سا سلاخوں والا روشن دان۔ لڑکی اگر چیختی تو اُس کی آواز نچلے کمرے تک نہ جاتی۔ لڑکی سے رابطے کا واحد ذریعہ یہ روشن دان تھا۔ وہاں ایک بستر کے سوا کوئی چیز نہیں تھی۔ ایک طرف غسل خانے کا تنگ حصہ تھا۔ سلما باہر کھڑا رہا۔ میں نے لڑکی کو بستر پر لٹا دیا اور اُس کے بازو کی چٹکی لے کے اُسے ہوش میں لانے کی ناکام کوشش کی۔ میں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ میں نے اُس کے بال درست کیے، سر کے نیچے تکیہ رکھا اور گردن تک چادر ڈال دی۔ وہ ہوش ہی میں نہیں آئی کہ میں اُس سے کچھ کہہ سکتا۔ میرا ہاتھ خود بخود چاقو پر پہنچ گیا۔ میں اُس کے سینے میں چاقو گھونپ سکتا تھا لیکن یہ بھی نہ کر سکا۔ میرے ساتھ آنے والے آدمی نے دروازہ بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا۔ ہم نیچے آ گئے۔ سلما نیچے کمرے ہی میں رہ گیا۔ یہ کمرہ چھوٹے سے صحن میں کھلتا تھا اور صحن باہر جانے والے راستے سے دُور تھا۔ ایک عقبی راستہ بھی تھا مگر وہ عموماً بند رہتا تھا۔ جس کمرے میں سلما رہ گیا تھا، اُس کے بعد بھی کئی کمرے تھے۔

صحن میں شور مچا ہوا تھا، رنڈیوں کی کلکاریاں، مستانہ کے آدمیوں کے قہقہے۔ ہم دونوں جا کے اُن کے درمیان بیٹھ گئے۔ سب کے سامنے پیالے رکھے ہوئے تھے۔ مستانہ کے پہلو میں ایک نوجوان لڑکی بیٹھی تھی۔ جتنے آدمی تھے اتنی عورتیں نہیں تھیں۔ کوئی تین تین آدمیوں کے درمیان ایک عورت

تھی۔ مستانہ نے مجھے دیکھ کے ایک مستانہ نعرہ لگایا۔ پھر اُس کے حکم پر میں اُس کے پاس پہنچا تو اُس نے میری گردن میں ہاتھ ڈال دیا اور اُس کے پہلو میں بیٹھی ہوئی لڑکی نے اُچک کے میرے گال کا پیار لے لیا۔ مجھ سے ضبط نہیں ہوا۔ میں نے اُسے پرے دھکیل دیا مگر میری اس بات پر سب بے تحاشا ہنسنے لگے۔ "استاد! اسے تو شانتی کے پاس پہنچا دو۔ وہ اسے ٹھیک کر لے گی۔" اُس نے زنخوں کی طرح نقل اتارتے ہوئے کہا۔ میں یہ سب سنتا اور دیکھتا رہا، وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔

چار بجے کے قریب وہ نڈھال ہونے لگے اور عورتوں کو نوچتے کھسوٹنے لگے۔ ایک ایک عورت کے پیچھے تین تین چار چار مرد دوڑے اور واپس نہیں آئے۔ پھر سب چلے گئے۔ مستانہ بھی چلا گیا۔ میں کمرے میں اکیلا رہ گیا۔ میرے پاس گھڑی نہیں تھی، اندازاً ساڑھے چار بجے ہوں گے۔ کمرے میں بچی پڑی ہوئی ہڈیاں، آدھ کھائی بوٹیاں، چادر پر سالن کے دھبے اور پیالے تتر بتر پڑے ہوئے تھے۔ پھولوں کی کچلی ہوئی پتیاں جگہ جگہ بکھری پڑی تھیں۔ میرا جسم ایک پہاڑ بنا ہوا تھا۔ اپنے ہاتھ پاؤں کسی دوسرے کے اعضا معلوم ہوتے تھے۔ میں اٹھ کے باہر آیا۔ صحن خالی پڑا تھا۔ سبھی اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔ میں بے آواز چاپوں سے جنھیں صرف میں سن سکتا تھا، سلما کے کمرے میں گیا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے گردن ڈالے پڑا تھا۔ میں نے صحن کے ایک اندھیرے گوشے میں چھپ کے ایک بار پھر تمام کمروں کا جائزہ لیا اور وہیں سانس روکے کھڑا رہا۔ پھر جب ہر طرف سے اطمینان ہو گیا تو میں باہر جانے والے تنگ راستے میں آیا۔ مجھے معلوم تھا کہ دروازے کے قریب کٹھریا میں چوکیدار رہتا ہے۔ راستہ روشن تھا۔ چوکیدار کے کمرے میں ایک رسّی تھی۔ وہ رسّی کھینچنے سے اندر چند کمروں میں ٹن ٹن گھنٹیاں بجنے لگتی تھیں۔ یہ گھنٹیاں میری موجودگی میں کبھی نہیں بجی تھیں۔ دروازہ ایک زنجیر سے بند کیا گیا تھا۔ کنڈے میں لوہے کی بڑی میخ ڈال دی گئی تھی۔ میخ نکالنے اور وزنی کنڈا کھولنے کی آواز سے پہرے دار جاگ سکتا تھا۔ وہ اگر اندر جاگ رہا تھا اور میں گردن لٹکا کے جھانک کے دیکھتا تو کام بگڑ جاتا۔ چنانچہ میں نے اسے آواز دی۔ وہ شاید اونگھ رہا تھا۔ سٹ پٹا کے بولا "کون ہے؟"

پھر اُس نے دروازے سے سر نکالا ہی تھا کہ میں نے اُسے چیخنے کی مہلت نہیں دی۔ میری پہلی ہی ضرب سے وہ اپنے پیروں پر قائم نہیں رہ سکا اور سسکاری بھر کے اندر کمرے میں لڑھک پڑا۔ اس کے باوجود میں نے دو تین ضربیں اور لگانا مناسب سمجھا۔ پھر میں دروازہ بھیڑ کے سن سن کرتے ہوئے پیروں سے واپس آ گیا۔ خاص دروازے کے کنڈے کی میخ نکالنے میں مجھے چند منٹ اور لگ گئے حالانکہ یہ کام سیکنڈوں کا بھی نہیں تھا۔ گلی میں سکوت چھایا ہوا تھا۔ میں پاگلوں کی طرح بھاگتا ہوا سڑک پر آ گیا۔ ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ بس کوئی اکا دکا گاڑی گزر جاتی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرنا چاہیے۔ وہاں کھڑے رہنے سے بہتر تھا کہ آگے بڑھ جاؤں۔ آگے ایک چوراہے پر وکٹوریا اور ٹیکسیاں کھڑی ہوتی تھیں۔ میں نے سوچا کہ یہ سب ٹیکسی والے مستانہ کو جانتے ہوں گے مگر میرے پاس چاقو تھا۔ میں نے ایک ٹیکسی والے کو جگایا۔ "نہیں جائیں گا۔" وہ حقارت سے بولا۔

"جتنا روپیہ کہو گے دوں گا۔" میں نے اُسی کے لہجے میں تیزی سے کہا۔ "باندرے تک جانا ہے۔ ایک ضروری کام ہے۔ ایک شخص بیمار ہے۔ ڈاکٹر کو لانا ہے۔"

اُس نے منہ بنایا۔ "کتنا روپیہ دے گا؟"

"بیس روپیہ۔" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"بیٹھ بابو!" میں اُس کے برابر کی نشست پر بیٹھ گیا۔ چاقو میں نے ہاتھ ہی میں دبائے رکھا۔ ٹیکسی والے نے راستے میں کوئی گڑبڑ نہیں کی۔ وہ تیز رفتاری سے مجھے باندرے لے گیا۔ میری جیب میں بیس روپے نہیں تھے اس لیے مجبوراً ٹیکسی راج کرشنا کے بنگلے پر ٹھہرانی پڑی۔ بنگلے کے دو محافظ سپاہی پوری طرح چوکنا تھے۔ انھوں نے بندوقیں کندھوں سے اتار لیں لیکن جب مجھ پر نظر پڑی تو تذبذب میں مبتلا ہو گئے۔ میں نے اُن کے قریب جا کے سرگوشی کی۔ "ٹیکسی والا جانے نہ پائے۔" ایک سپاہی احتیاطاً میرے ساتھ آیا۔ اُسے میری نیت پر بھی شبہ ہو گیا۔ بجلی کی گھنٹی کی ٹرٹر پر راج کرشنا گاؤن پہنے ہوئے اندر سے برآمد ہوا۔ اُس کے ہاتھ میں تمنچہ تھا لیکن مجھے دیکھتے ہی اُس نے تمنچہ دُور پھینک دیا اور بے قرار ہو کے میرے سینے سے لپٹ گیا۔

سڑکوں پر گاڑیوں کی آمد و رفت میں ابھی تیزی نہیں آئی تھی کہ مستانہ کے اڈے پر جتنے لوگ موجود تھے سب منتقل کر دیے گئے۔ اِدھر سے فون کر کے راج کرشنا روانہ ہوا، اُدھر سے پولیس کی بھاری جمعیت پہنچی۔ پہرے دار ابھی تک بے ہوش پڑا تھا اور دروازہ کسی نے نہیں چھیڑا تھا۔ راج کرشنا نے مجھے اپنے ساتھ ہی لے لیا تھا۔ جب میں دو سپاہیوں کی مدد سے لڑکی کو اپنے کندھے پر ڈال کے لا رہا تھا تو میرے پیر بار بار زمین سے اکھڑ جاتے تھے۔ میں نے کسی کو اُس کا چہرہ نہیں دیکھنے دیا۔ اب وہ ہوش میں آ گئی تھی اور اُس کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ میں نے اُسے تسلی دی کہ "روؤ نہیں، تم اپنے گھر واپس جا رہی ہو۔" پولیس افسران تفتیش کے لیے اُسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے مگر میں نے ضد کی کہ "وہ سیدھی گھر جائے گی، اس سے پہلے کہ پاس پڑوس والوں کو خبر ہو۔" میں نے کسی کو اُسے ہاتھ بھی نہیں لگانے دیا۔ میں نے اسے پولیس کی گاڑی میں بٹھایا۔ اُسے گھر پہنچاتے وقت، میں اُس کے گھر کے اندر بھی نہیں گیا۔ مجھ سے اُس کے گھر والوں کے چہرے نہ دیکھے جاتے۔

راج کرشنا کی گاڑی ڈرائیور چلا رہا تھا۔ خود راج کرشنا بائی کلا ہی میں رہ گیا کیونکہ ابھی اُسے وہاں موقع پر مزید گرفتاریاں کرنے اور کئی عمارتیں سیل کرنے کا حکم دینا تھا اور یہ کام خاص طور پر اپنی نگرانی میں انجام دلوانا تھا۔

راج کرشنا جلد سے جلد میرے پاس آنے کے لیے بے تاب ہوگا مگر بائی کلا میں مستانہ کے اڈے کے بعد جو کام اُسے کرنا تھا، وہ اس سے زیادہ اضطراب کا تھا اسی لیے وہ وہاں ٹھہر گیا اور مجھے اُس نے گھر روانہ کردیا۔ گھر آکے میرا جوڑ جوڑ دکھنے لگا۔ سب سے پہلے میں نے راج کرشنا کے دلوائے ہوئے کپڑے پہنے، کپڑے بدل کے کچھ سکون ہوا، جیسے کپڑے پہنے نہ ہوں بلکہ پی لیے ہوں۔ پھر میں نے کرسی کی پشت سے سر ذرا ٹکائی تھی کہ مجھ پر غشی طاری ہوگئی۔ مجھے کچھ ہوش ہی نہ رہا۔

راج کرشنا شام سے پہلے گھر نہیں آسکا اور جب آیا تو اُس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔ میں نے سر جھکا لیا۔ وہ میرے پاس آکے خاموشی سے بیٹھ گیا۔ میں اندر ہی اندر دعا کرتا رہا، کاش کرشنا وہ لفظ خود تک محدود رکھے جن کی ادائی کے لیے اُس کے سینے پر بوجھ ہوگا۔ کئی لمحے گزر گئے۔ نہ اُس نے کچھ بات کی، نہ میں نے۔ ہم دونوں بس ایک دوسرے کی سانسیں سنتے رہے اور میں اپنی انگلیوں سے مختلف چیزوں، مختلف جانوروں کی شکلیں بناتا رہا۔ پھر میں نے ہی ابتدا کی کیونکہ سکوت ناقابلِ برداشت ہوگیا تھا۔ میں نے بہت ہلکی آواز میں اُس سے پوچھا "سب کام ٹھیک تو ہوا؟"

"ہاں۔" وہ ایک لمبی آہ بھر کے بولا "سب ٹھیک ہوگیا۔"

"اب۔۔ اب تو کہیں نہیں جانا؟" میں نے شائستگی سے پوچھا۔

"نہیں، اب شاید نہ جانا پڑے یا شاید جانا پڑ جائے۔" اُس نے کھوئے کھوئے لہجے میں جواب دیا پھر چُپ ہوگیا۔

"کپڑے بدل لیجیے۔" میں نے ڈرڈر کے زیرِ لب کہا۔

"ہونہہ۔" وہ اپنے گال رگڑتے ہوئے بولا "تمھیں تو اب کہیں نہیں جانا؟" اُس کے لہجے میں نہ تلخی تھی، نہ طنز تھا۔ البتہ شکایت تھی۔

"نہیں اب مجھے کہیں نہیں جانا۔" میں نے دبے دبے لفظوں میں کہا۔

مجھ پر صبح سے گھبراہٹ طاری تھی کہ وہ گھر آنے کے بعد بہت سی باتیں کہے گا، بہت سی باتیں پوچھے گا اور میں اسے ساری باتیں کس منہ سے بتاؤں گا۔ میں نے تو خود ہی ان باتوں کا دروازہ کھولا ہے، اب اسے بند کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔ صبح ساڑھے چار بجے جب میں اچانک وارد ہوا تھا تو میں نے اُسے یہ سب کچھ سرسری انداز میں بتایا تھا۔ اُس وقت، وقت بھی کم تھا، ہمیں روانہ ہونے کی جلدی تھی کیونکہ لمحوں میں اندھیرے کا پردہ چاک ہوجاتا۔ ڈرائیور کی وجہ سے ہم دونوں کے درمیان صرف رسمی گفتگو ہوتی رہی تھی۔ مجھے شبہ تھا کہ اس واقعے کے بعد وہ میرے بارے میں اپنی رائے بدل دے گا۔ وہ ایک بااصول شخص تھا۔ پورے سولہ دن اچانک غائب رہنا اور آنا تو اس انداز سے آنا، یہ سب کچھ اُس جیسے ذہین شخص کے سوچنے کے لیے بہت کافی تھا مگر اب کچھ بھی ہو، مستانہ کے ہاں خلافِ توقع دیر ہوگئی تھی، مجھے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ واقعات اس طرح پیش آئیں گے،

میں سمجھتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ دو چار روز میں واپس آجاؤں گا اور اُسے بھی نہیں چلے گا۔ معاملات کسی اور طرح اُس کے گوش گزار کردوں گا۔

"آپ نے میری بات کا خیال رکھا۔" میں نے اُس سے نگاہیں... کی ناکام کوشش کی۔ صبح میں نے اُس سے درخواست کی تھی کہ وہ میرا... کہیں استعمال نہ کرے۔

اُس نے بے چینی سے اثبات میں سر ہلایا۔ "مگر یہ سب کیا ہے..." آخر اُس سے برداشت نہیں ہوا۔ وہ وحشت سے بولا۔

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"میں بہت ڈسٹرب ہوں ڈارلنگ! میں پاگل ہوسکتا ہوں..." چیختا ہوا بولا "میری مدد کرو، میرے دماغ پر پانی ڈالو۔"

"دیکھیے۔" میں نے جھجکتے جھجکتے استدعا کی "اب آپ کچھ نہ پوچھ... اور کسی قسم کا تردد نہ کریں تو اچھا ہے۔ میں آپ سے کیا کہہ سکوں گا۔" میں نے اُداسی سے کہا۔

"ڈارلنگ! تم کیسی باتیں کررہے ہو۔" وہ ہذیانی انداز میں بولا۔ "جانتے ہو اب تک کیا کچھ ہوچکا ہے؟ آج کے دن پر مجھے... نہیں آتا۔ کسی کو بھی یقین نہیں آتا، وہ حیران ہو ہو کے مجھ سے پوچھتے... کرشنا جی! یہ کیا ہوا؟ میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ مجھے ابھی و... اور ٹھہرنا چاہیے تھا مگر میں اُن کی نگاہوں سے بچ کے یہاں بھاگ آ... بھر میں ہنگامہ مچا ہوا ہے۔ وہ سب اندر چلے گئے ہیں اور اُن میں... بہت سے ایسے ہیں جو کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ ہم نے تمھارے بتائے... تمام ٹھکانے آزمائے۔ ہم نے کسی کو بھی سنبھلنے اور بھاگنے کی فرصت نہیں... شہر کے معزز ترین لوگ اس میں شامل ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ تم یہاں... سے کیسے بیٹھے ہوئے ہو۔ میرا دماغ معطل ہوچکا ہے۔ تمھیں اندازہ نہیں... یہ کتنا سنگین معاملہ تھا اور اب کس قدر اہم ہوگیا ہے۔ کتنے ہی لوگوں کا... ہوچکا تھا۔ یقیناً پولیس کا ایک گروہ بھی اُن کی پشت پناہی کرتا ہوگا۔ دولت سازی، زیرِ زمین منشیات کا بہت بڑا ذخیرہ، اُف۔" اُس نے... پکڑ لیا۔ "نہ جانے ابھی اور کیا کیا انکشافات ہوں۔ دوپہر گورنر نے ذاتی... مجھے مبارک باد دی ہے۔ مجھ سے شکریے کے سوا کوئی دوسرا لفظ نہیں کہا... رات ہی پولیس افسروں سے اس معاملے میں میری بات ہورہی تھی... شبہ تھا کہ جعلی کرنسی بائی کلا کے علاقے سے آرہی ہے مگر کہاں سے... اُس علاقے کی چند ممتاز ہستیوں کے ناموں پر سرخ دائرہ بنادیا تھا مگر... ناکافی تھے اس لیے اُن پر ہاتھ ڈالنا مناسب نہیں تھا۔ میں اپنے... افسروں سے بار بار جھگڑتا تھا کہ ہمیں کسی کا لحاظ کیے بغیر اچانک چھاپا... چاہیے مگر وہ ڈرتے تھے۔ مجھے فون پر دھمکیاں دی جارہی تھیں اور کہا... جاتا تھا کہ فوراً بمبئی سے نکل جاؤ۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اُوپر سے سخت... پڑ رہا تھا۔ یہی معاملہ نمٹانے کے لیے بمبئی میں میرے قیام کی مدت بڑھ...

گئی تھی حالانکہ شہر کے کئی پولیس افسر ایک باہر کے آدمی کی مداخلت پسند نہیں کرتے تھے مگر اچانک ۔۔۔ اچانک صبح تم آگئے۔ اس سے پہلے شہر کا ایک اور گروہ ختم کرنے میں بھی تم شامل تھے، اب بھی تمھی تھے۔ میری رہبری کرو۔" وہ ہانپتا ہوا بولا "ورنہ میرا ذہن بھٹکتا رہے گا۔ پولیس والے کا ذہن بہت پیچیدہ ہوتا ہے۔ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ تمھارے بارے میں کوئی سوال نہیں کروں گا مگر ڈارلنگ! میں عہد شکنی کرتا ہوں، مجھے معاف کردو۔" اُس نے شدت سے کہا اور میرے ہاتھ تھام لیے۔

"کچھ بھی نہیں، ذرا سی بات ہے۔" میں نے سادگی سے کہا۔ "مجھے دو چار داؤ پیچ آتے تھے، آپ نے ریل میں خود اس کا مظاہرہ دیکھا ہے۔ انھیں ایسے آدمی کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔ میں سولہ دن وہیں اُن کے ساتھ رہا اور واپس آگیا۔ ممکن ہے، میں اُن کے ساتھ دو چار روز اور گزارتا، اگر وہ لڑکی لے کے نہ آجاتے۔ اس طرح میرا فوراً نکلنا ضروری ہوگیا۔ اُس وقت تک میں آپ کو بتانے کے لیے اُن کے بارے میں خاصی معلومات حاصل کرچکا تھا۔"

"مگر کیوں؟ تم وہاں گئے کیوں؟" وہ جزبز ہوکے بولا۔

"آپ پریشان جو تھے، میں نے فون پر آپ کی گفتگو سن لی تھی۔ اُس دن میٹنگ میں آپ لوگ اس معاملے پر بلند آواز میں باتیں کررہے تھے۔ میں نے سوچا، ایک کوشش کر دیکھوں مگر وہاں دن زیادہ لگ گئے۔ ویسے بھی میں ایک بے کار آدمی تھا۔ خالی بیٹھے رہنے سے کوئی کام کرلینا ہی ٹھیک تھا۔"

"مگر یہ کام!" وہ دہشت سے بولا۔ "تم نے مجھ سے کیوں نہیں پوچھا۔ میں سولہ دن پریشان ہوتا رہا۔ ایک آدھ بار کے بعد تمھاری کوئی اطلاع ہی نہیں ملی۔"

"مجبوری تھی۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"مگر تم۔۔۔ تم اتنی جلدی وہاں قبول کیسے کرلیے گئے؟"

"شاید میری صورت ہی ایسی ہے۔" میں نے جھنجلا کے جواب دیا۔ "میں انھیں اپنی ہی برادری کا کوئی آدمی نظر آیا ہوں گا۔ خود میں نے بھی انھیں یہی جتانے کی کوشش کی تھی۔ جب میں نے اُن کے دو چار آدمیوں کو زمین پر بٹھا دیا تو انھیں میری ضرورت کا احساس ہوا لیکن اب میں یہاں آگیا ہوں۔" راج کرشنا کے لب کچھ کہنے کے لیے پھڑکتے رہ گئے۔ مجھے اپنے لہجے پر شرمندگی ہونے لگی۔ میں نے جلدی سے کہا "میں اب کہیں نہیں جاؤں گا، یہیں رہوں گا۔" میرے اصرار پر وہ تھکے ہوئے انداز میں اُٹھ گیا اور نہا دھو کے کسی قدر ترو تازہ نظر آنے لگا، پھر بھی اُس کی بھوؤں کے درمیان کی جگہ سکڑی ہوئی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد پولیس افسران آگئے۔ اُن سب کے چہرے تمتما رہے تھے۔ انھوں نے صبح مجھے راج کرشنا کے ساتھ مستانہ کے اڈے پر سرگرم دیکھا تھا۔ میں لڑکی کو اُن کے سامنے اُٹھا کے نیچے لایا تھا۔ بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی، ممکن ہے مستانہ اور اُس کے ساتھیوں نے بازپرس کے دوران میں مجھے بُرا بھلا کہا ہو، ہرچند راج کرشنا نے مستانہ اور اُس کے ساتھیوں کو یہ تاثر دینے کی احتیاط کی تھی جیسے میں بھی اُن کے ساتھ پھنس گیا ہوں۔ حوالات میں بھی انھیں ایک دوسرے سے علیحدہ رکھا گیا تھا۔ میری خواہش پر سب سے پہلے لڑکی بازیاب کی گئی تھی تاکہ اُسے کسی قسم کی زک پہنچنے کا احتمال نہ رہے مگر راج کرشنا کی یہ احتیاط بے معنی تھی۔ مستانہ اور اُس کے آدمیوں کو جلد یا بدیر اس نتیجے پر پہنچنا ہی تھا کہ وہ بے وفا کون شخص ہوسکتا ہے اور پولیس افسران کو بھی معلوم ہونا تھا کہ راج کرشنا کی معلومات کا ذریعہ کون سا تھا۔ وہ سب میرے اردگرد بیٹھ گئے۔ اُن کی خواہش راج کرشنا کی توقع سے مختلف نہیں تھی کہ میں انھیں بہت دلچسپ باتیں سناؤں گا۔ مگر میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ فون کی گھنٹی بار بار بجتی رہی اور راج کرشنا کے بنگلے پر رات کو تل دھرنے کی جگہ نہیں رہی۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ گھر نہیں ہے کوتوالی ہے۔

ناشتے کی میز پر صبح کے اخبارات رکھے ہوئے تھے۔ تمام کے تمام انگریزی کے تھے۔ میں نے جان بوجھ کے ہاتھ نہیں لگایا۔ راج کرشنا سر جھکائے انھیں پڑھتا رہا، ناشتے کے فوراً بعد وہ جلد آنے کا وعدہ کرکے چلا گیا۔ میں نے اخبارات دیکھنے شروع کیے، اخباروں نے جو کہانیاں لکھی تھیں، اُن میں سے بہت سی میرے لیے بھی نئی تھیں۔ اخبارات نے شہر کی اُن شخصیتوں کے نام چھاپنے سے گریز کیا تھا جنھیں آگے پیچھے گرفتار کیا گیا تھا لیکن روداد پوری چھاپی تھی۔ کہاں کہاں کیا کیا ملا۔ سکوں کی ڈھلائی، نوٹوں کی چھپائی، شراب اور دیگر منشیات کا ذخیرہ۔ جہاں جہاں یہ ذکر تھا، وہاں ہر جگہ راج کرشنا کا نام موجود تھا۔ اُس کی تعریف میں بڑی بڑی باتیں لکھی گئی تھیں، اُس نے اب تک کتنے گروہوں کو عُریاں کیا اور پولیس میں اُس کی خدمات کا کتنا بڑا ریکارڈ ہے۔ ایک اخبار نے "ایک سچا پولیس مین" کے عنوان سے راج کرشنا پر مختصر مضمون بھی چھاپا تھا۔

اُس کے بارے میں اگلے پچھلے اتنے بہت سے واقعات پڑھ کے مجھے کمرے میں حبس سا محسوس ہوا، یہ تو وہ واقعات تھے جو میرے سامنے پیش آئے۔ اس سے پہلے راج کرشنا کی پوری زندگی جرم کُشی میں گزری تھی۔ مجرموں کے لیے اُس کا نام تازیانہ تھا۔ اگر کسی موقع پر راج کرشنا کو یہ معلوم ہوگیا کہ اُس کے ساتھ رہنے والا آدمی بھی تین قتل کرنے کے الزام میں سات سال جیل میں گزار کے آیا ہے اور یہ سزا کاٹنے کے بعد بھی اُس نے بس نہیں کیا بلکہ بدھ گیا میں ایک شخص کو چھرا مار کے ختم کردیا، کلکتے میں چاندمیاں اور موجدار جیسے بدمعاشوں کو چاقو مار کے ہلاک کردیا اور اُس کا تعلق کلکتے کے مشہور آدمی بتھل سے رہا ہے، اُس کی بہن کوٹھے پر ناچتی تھی اور اُس کے گھر کے باقی آدمیوں کا کچھ اتا پتا نہیں ہے، وہ سولہ سترہ

سال کی عمر میں ایک کم سن لڑکی کو گھر سے لے کے فرار ہوگیا تھا۔ اگر راج کرشنا کو یہ ساری باتیں یا ان میں سے کوئی ایک بات معلوم ہو جائے تو اُس کے ذہن پر کیا اثر ہوگا؟ اگر وہ میرا خیال کرے گا تو اُس کے اُصول مجروح ہوں گے۔ اتنی عمر سچائی کی گزارنے کے بعد اُسے جھوٹ بولنا، جھوٹ سہنا پڑے گا۔ میں نے پہلے ٹھیک فیصلہ کیا تھا، مجھے یہاں سے چلا جانا چاہیے۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے، میں خود وضاحت بھی نہیں کرسکوں گا کہ یہ سب مجھ سے کیوں ہوگیا۔ مجھ سے صرف ایک غلطی ہوئی تھی کہ میں نے آبا جان اور اتی پر شبہ کیا کہ وہ کورا کو کہیں باہر نہ نکال دیں اس لیے میں کورا کو وہاں سے لے کے چلا آیا تھا۔ اگر میں وہیں بیٹھا اُن سے لڑتا رہتا تو شاید وہ میری بات مان لیتے اور کورا کو گھر میں رکھنے کے لیے آمادہ ہو جاتے مگر وہ کیسے رکھتے اور میں نے کیا غلطی کی۔ جب تک کورا رہی اُسے اُوپر چھت پر بنے ہوئے ایک کمرے میں بند رکھا گیا تھا تاکہ محلّے والے اُسے نہ دیکھ سکیں، اُسے رشتے داروں اور محلّے والوں سے کب تک چھپا کے رکھا جا سکتا تھا۔ ایک نہ ایک دن تو اُس کا راز فاش ہوتا ہی۔ میں اسے غلطی نہیں کہتا کہ مجھے کورا کا خیال ترک کر دینا چاہیے تھا۔ میں اُسے بھگا کے لے گیا چھوڑ آتا یا ابا جان کی خواہش پر تھانے میں رپورٹ درج کرا دی جاتی، میں مرجاتا مگر مجھ سے یہ کبھی نہ ہوتا۔ سو جو کچھ ہوا، اُس میں میری مرضی کہاں شامل تھی۔

میں نے قلم اُٹھایا اور کاغذ پر راج کرشنا کے نام خط لکھنا شروع کیا۔ کوئی لقب سمجھ میں نہیں آیا۔ میں قلم ہاتھ میں رکھے رکھے سوچتا رہا۔ میرے جی میں آیا کہ آڑی ترچھی لکیریں کھینچ کے نیچے اپنا نام لکھ دوں مگر کون سا نام؟ بابر لکھوں، ظہیر خاں لکھوں، لاڈلا لکھوں، فقیرا لکھوں، سکندرا لکھوں، شہزادہ لکھوں، کیا لکھوں اور جاؤں گا کہاں؟ زرّیں کے پاس کہ وہ میرے بارے میں تقریباً سب کچھ جانتی ہے اور میرے لیے دعائیں کر رہی ہوگی۔ میری زرّیں پتہ نہیں وہ اکیلی رہ گئی ہے یا تجمل ابھی تک اُس کے پاس موجود ہے۔ میں زرّیں کے پاس جاکے ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو جاؤں گا مگر وہ جب سامنے آتی ہے تو کورا کی یاد آتی ہے اور دل ہولنے لگتا ہے۔ تو جب تک بن رہی ہے راج کرشنا کے پاس ہی کیوں نہ ٹھہرا رہوں۔ فہمیدہ کے پیر میں گھنگرو دیکھ لیے، اُس کے حسن کے بارے میں تماش بینوں کے تبصرے سن لیے تو اب راج کرشنا کی آنکھیں دیکھنے اور باتیں سننے سے کیا اثر پڑتا ہے۔

شام کو گھر واپس آکے راج کرشنا اِس کی معذرت کرنے لگا کہ مجھے دن بھر تنہا گھر میں رہنا پڑا اور وہ مجھے خیریت کا فون بھی نہ کرسکا۔ وہ کچھ مطمئن مطمئن خوش خوش لگ رہا تھا۔ میں نے اُس کے خیال سے اپنے چہرے پر جبری خوش حالی طاری کی۔ اُس نے مجھے فی الفور لباس تبدیل کرنے کی ہدایت کی، وہ میرے لیے نئے سوٹ لے کے آیا تھا جس کے ناپ پہلے دن درزی نے لیے تھے۔ میری ٹائی کی گرہ اُس نے خود اپنے ہاتھ سے درست کی۔ جدید وضع کے اس لباس میں میں اپنے آپ کو اجنبی محسوس ہو رہا تھا۔ "ایک دم فرسٹ کلاس۔"

وہ مجھے سرتاپا گھورتے ہوئے بے ساختہ بولا "لے جنٹلمین پرفارمنس..." میں بار بار انگریزی بولنے لگتا تھا۔ پھر اُسے میرا خیال آ جاتا تو فوراً زبان...
ہماری گاڑی جب دروازے سے اندر داخل ہوئی، اُس کے...
سبزہ ہی سبزہ تھا، خاصی دُور جاکے شاہی محلات کے طرز کی ایک شا...
عمارت بنی ہوئی تھی۔ مجھے راج کرشنا کے ساتھ قدم ملانے میں دشوار...
وہ ایک ایک قدم ناپ تول کے اُٹھا رہا تھا۔ میں نے بھی اُس کی نقل...
کی کوشش کی۔ پگڑی والے ایک دربان نے جھک کے راج کرشنا کو...
مجھے بھی کیا۔ میرے ہاتھ خود بخود مصافحے کے لیے اُٹھ گئے پھر ٹھٹک...
گئے۔ راج کرشنا بے نیازی سے آگے بڑھ گیا تھا۔ میں بھی تیز قدموں...
کے برابر ہوگیا۔ ہم ایک ہال میں داخل ہوئے۔ وہاں دھیما دھیما سا شور تھا...
مردوں کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ راج کرشنا کی آمد پر ہال میں ایک سنا...
پھر کئی لوگ اُس کی طرف دوڑ پڑے اور زور زور سے مصافحے کرنے لگ...
اُس کا بازو پکڑا اور کسی نے اُسے گلے لگا لیا۔ راج کرشنا مہذب انا...
سب کا شکریہ ادا کرتا رہا، میں بھی اس ہجوم میں اُس کے ساتھ تھا۔ "میرا...
ظہیر خاں۔" اُس نے لوگوں کی توجہ میری طرف مبذول کرائی۔ لوگوں کی آ...
حیرت اُبل پڑی "آپ کا بھائی؟" کسی نے تعجب سے پوچھا۔ راج کرشنا...
سر اُٹھا کے کہا "ہاں میرا بھائی، میرا دوست، میرا بیٹا۔" لوگ مسکرا مسکرا...
ہوگئے۔ پھر اچانک کسی نے زور سے میرا بازو پکڑ لیا۔ میرے جسم میں ایک...
گئی۔ میں نے پیچھے مُڑ کے دیکھا۔ وہ کوئی اور نہیں تھا، رستم جی تھے...
جو پہلے دن ریستوراں میں ملے تھے۔ اُن کے ساتھ اُن کی بیٹی بھی تھی۔
"نورین ہوں۔" اُس نے شوخی سے کہا۔
"مجھے..... مجھے آپ کا نام معلوم ہے۔" میں نے سٹ پٹا کے...
"ہائیں۔" وہ جھلملاتی ہوئی نظروں سے بولی "میں سمجھی کہ آپ بھول گئے ہوں گے۔ آپ دونوں کو اُس دن کے بعد سے آج دیکھا..."
"فرصت ہی نہیں ملی۔" میں نے لفظ چبا چبا کے کہا۔
"پاپا بتا رہے تھے کہ کل آپ لوگوں نے بہت بڑے بڑے مچھ... ہیں، دیو جیسے۔ مجھے تو کپکپی آگئی۔ پاپا نے مجھے اخبار بھی دیا تھا مگر پڑھا نہیں گیا۔"
"میں نے نہیں، کرشنا جی نے پکڑے ہیں۔"
"ایک ہی بات ہے۔" وہ بے پروائی سے بولی۔
"دو باتیں ہیں۔" میں نے تلملا کے کہا۔
"چلیے، دو سہی۔" اُس کے چھوٹے چھوٹے دانت کھل کھلا...
راج کرشنا لوگوں کے درمیان اس قدر گھر چکا تھا کہ میری...
نہیں دے سکا۔ وہاں زیادہ تر انگریزی بولی جا رہی تھی۔ میں وہاں...
طرز سے بالکل ناآشنا تھا۔ جب نورین نے مجھے اپنی میز پر...
کے لیے میرا ہاتھ تھاما تو میں نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ اتنے بہت سے لوگ...

درمیان کسی اجنبی لڑکی کا ہاتھ تھام کے گھومنا پھرنا میرے لیے عجیب سی بات تھی مگر وہاں مردوں اور عورتوں میں ایسا کوئی تکلف نظر نہیں آ رہا تھا، مجھے اپنی بدتہذیبی کا احساس ہوا۔ میں نے جھٹ اُس کا ہاتھ تھام لیا اور اُس کے ساتھ جاکے ایک خالی میز پر بیٹھ گیا۔ "کچھ کھیلیں گے؟" اُس نے مجھے متجسس نگاہ سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"نہیں۔ مجھے کھیلوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"
"تو پھر کن چیزوں سے دلچسپی ہے آپ کو؟"
میں اُس کے سوال کا جواب فوراً نہیں دے سکا "کسی چیز سے نہیں۔"
"کسی نہ کسی چیز سے تو ہوگی؟"
"نہیں۔"
"یعنی دنیا میں کوئی چیز نہیں ہے جس سے آپ کو دلچسپی ہو؟"
"ہاں۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا "کسی چیز سے نہیں۔"
"حیرت ہے۔" وہ مجھے غور سے دیکھنے لگی۔
"آپ کو کھانے کون کون سے پسند ہیں؟"
"جو مل جائیں، ویسے مجھے میٹھے چاول بہت پسند ہیں۔"
"میٹھے چاول۔" وہ ہنس پڑی "اور لباس کون سا؟"
"سبھی۔" میں نے اُکتا کے کہا "آپ ایسے سوال کیوں کر رہی ہیں؟"
"پھر ہم کیا باتیں کریں؟" وہ چونک کے بولی۔
"میں نہیں جانتا۔" میں نے بے دلی سے کہا۔
اُس نے اپنے شانے اُچکائے "کیا میں اچھی باتیں نہیں کرتی؟"
"نہیں۔" میں نے تیزی سے کہا "آپ کی آواز بہت اچھی ہے اور آپ باتیں بھی اچھی کرتی ہیں مگر... مگر میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"
"کیا بات ہے؟" اُس نے اپنے ہاتھ سے میری کلائی چھوتے ہوئے کہا "ٹمپریچر تو نارمل ہے۔" اور تب اُس کے چہرے سے گھبراہٹ دُور ہوئی۔ "آپ کو اپنی زمینیں یاد آرہی ہوں گی؟ سب کھلا کھلا، ہرا بھرا۔ ایسا ہی ہے نا؟"
"ہاں۔" میں نے سر ہلا کے کہا۔
"اور آپ کو کرشنا جی روکے ہوئے ہوں گے۔ اچھا ہے، مجھ سے ملیں گے تو میں کہوں گی، آپ کو ابھی اور روکیں۔"
"کیوں؟ آپ کو کیا مزہ آئے گا؟"
"پھر آپ بہت دنوں بعد جب اپنے گھر جائیں گے تو آپ کو اپنی پرانی چیزیں نئی معلوم ہوں گی اور آپ پہلے سے زیادہ سکون محسوس کریں گے۔"
"ہاں!" میں نے مایوسی سے کہا۔
"آپ کچھ اُداس اُداس رہتے ہیں۔"
"نہیں تو۔" میں نے سیدھے ہو کے کہا۔
"باتیں بھی کم کرتے ہیں حالانکہ اُس دن کرشنا جی کہہ رہے تھے کہ آپ جب باتوں پر آتے ہیں تو سب کو خاموش کر دیتے ہیں۔ آپ کا موڈ بھلا کب ایسا ہوتا ہے؟"
"موڈ کا پتہ کیسے ہوتا ہے۔"
"اگر آپ کا جی گھبرایا کرے تو آپ ہماری طرف آجایا کیجیے۔ پاپا کی کشتیاں سمندر میں چلتی ہیں، اُن کے دو جہاز بھی ہیں۔ جب اِدھر ساحل پر ہوتے ہیں تو ہم چند روز وہیں رہتے ہیں۔ اب جہاز آنے ہی والا ہے، اس بار آپ بھی ساتھ چلیے گا۔ ہم ساحل سے بہت دُور رہیں گے۔ ہے نا اچھا پروگرام رہے گا۔"
"بہت اچھا رہے گا۔" میں نے ابھی یہ کہا ہی تھا کہ راج کرشنا ہماری طرف آگیا۔ اُس نے مجھے نورین کے ساتھ اس طرح بیٹھے دیکھ کے میرے متعلق کیا خیال کیا ہوگا، یہ سوچ کے مجھے جھینپ آنے لگی۔
"شکریہ نورین کہ تم نے اِن کا خیال رکھا۔" کرشنا نے کہا۔ اُس کی آواز موسیقی کے شور میں دب گئی۔ ہال کے ایک کونے میں بینڈ باجے والوں نے ساز بجانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ بہت سی عورتیں اور مرد ہال کی خالی جگہ اکٹھے ہوگئے ہیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈال کے ناچنا شروع کر دیا۔ میری آنکھیں پھیل گئیں، میں نے کتابوں میں پڑھا تو تھا کہ لوگ اس انداز سے رقص کرتے ہیں۔ "آئیے، میرے ساتھ رقص کیجیے۔" نورین نے اشتیاق سے کہا۔
"تم آج کیوں رقص کر رہی ہو؟ رقص تو روز ہوتا ہے اور تم گُم سُم بیٹھی دیکھتی رہتی ہو۔ آج کیا بات ہے؟" کرشنا نے شگفتگی سے پوچھا۔
"آج۔" وہ سوچتے ہوئے بولی "بس آج جی چاہ رہا ہے، آؤ۔"
اُس نے میری جانب ہاتھ پھیلایا۔ میں نے بے چارگی سے راج کرشنا کو دیکھا۔ "میرے ساتھ آؤ۔" کرشنا نے اُس کی کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے اِدھر سے اُدھر تھرکنے لگے۔ میری آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔ وہ یقیناً میرے بارے میں باتیں کر رہے ہوں گے۔ سازندے دھن بدلتے تو کبھی رقص میں تیزی آجاتی کبھی مندی۔ مرد عورتیں بدل دیتے اور عورتیں مرد بدل دیتیں لیکن وہ سب سنجیدہ تھے، بہت شائستہ۔ کسی نے کسی کے ساتھ کوئی اوچھی بات نہیں کی، نہ کوئی فقرہ کسا، نہ سیٹی بجائی۔ شوخی جان اور شہ پارہ وغیرہ کے رقص کے دوران میں جو باتیں ہوا کرتی تھیں، وہ بھی میں نے سُنی تھیں۔ رقص کے بعد کھانے کی میزوں پر کھانا چُن دیا گیا۔ مجھے بہت حیرت ہوئی، ایک خوش پوش ادھیڑ عمر شخص نے کھانے سے پہلے انگریزی میں اعلان کیا کہ کلب کے معزز ارکان کی خواہش کے مطابق آج کی رات کلب کے ریکارڈ میں مسٹر راج کرشنا کی رات کے طور پر درج کی جائے گی۔ کلب کے معزز ارکان کی درخواست ہے کہ مسٹر راج کرشنا شہ کرسی پر تشریف لائیں۔ اعلان کرنے والے نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ مسٹر راج کرشنا نے اس شہر کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں، یہ کلب کی طرف سے

اُن کے اعتراف کا ایک حقیر اظہار ہے۔ اِس سلسلے میں کلب مسٹر راج کرشنا کے اعزاز میں ایک رسمی تقریب منعقد کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تقریب کا اعلان جلد ہی کر دیا جائے گا۔ تمام بہترین خواہشات راج کرشنا صاحب کے لیے ممبئی کے معززین انھیں خلوصِ دل سے مبارک باد پیش کرتے ہیں۔" ایک بار پھر ہر طرف تالیاں بجنے لگیں۔

نورین میرے پاس ہی بیٹھی تھی۔ وہ جوشیلے لہجے میں بولی "کلب میں یہ اعزاز بہت دنوں بعد کسی کو ملا ہے۔" راج کرشنا آنکھیں بند کیے، سر جھکائے ہمارے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ نورین نے اُسے ٹوکا کہ اُس کے لیے شہ کرسی خالی پڑی ہے اور سب لوگ منتظر ہیں۔ واقعی سب لوگ منتظر تھے۔ راج کرشنا سے دوبارہ بہ آوازِ بلند درخواست کی گئی۔ راج کرشنا جھجکتا ہوا اُٹھا اور آہستہ قدموں سے شہ کرسی پر جا کے بیٹھ گیا۔ میرا جی چاہا کہ کھڑے ہو کے تالیاں بجاؤں میں کھڑا ہو گیا اور زور زور سے تالیاں بجانے لگا۔ میں اکیلا کھڑا تھا اور پشیمانی سے بیٹھنے ہی والا تھا کہ ہال میں بیٹھے ہوئے لوگ کھڑے ہو گئے اور دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ راج کرشنا کرسی پر بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ تالیاں ختم ہوئیں تو وہ کسمساتا ہوا اپنی نشست سے اُٹھا اور چند لمحے ساکت کھڑا رہا۔ اُس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ اُس نے چاروں طرف سر گھمایا، پھر اُس کی نگاہیں مجھ پر ٹک گئیں۔ اُس نے انگریزی میں کہنا شروع کیا "خواتین و حضرات! اس اعزاز کا شکریہ بہت بہت شکریہ۔" اُس کی آواز بہک رہی تھی "یہی باتیں یہی احساسات کام کرنے کا حوصلہ بڑھاتے ہیں مگر میں آپ کو بتاؤں کہ میں نے کبھی ستائش کے خیال سے اپنا فرض ادا نہیں کیا ہے بلکہ میں نے اپنی زندگی کا جو مقصد بنایا تھا، مجھے خوشی ہے کہ اُسی پہ کار بند ہوں۔ ایک یہی مقصد یہی جذبہ میری رہبری کرتا رہا ہے۔ آج کے واقعات کے بارے میں آپ میری زبانی کچھ جاننے کے لیے بے چین ہوں گے مگر یہ ایک مناسب موقع نہیں ہے۔ میں ۔ میں۔" اُس کا گلا رُندھنے لگا اور آواز لڑکھڑا گئی۔ "آج کے واقعات کے لیے آپ نے مجھے جس اعزاز سے نوازا ہے میں اصل میں اُس کا مستحق نہیں ہوں۔" یہ کہہ کے وہ رُک گیا ہال میں بھن بھناہٹ ہوئی۔ سب ٹکٹکی باندھے راج کرشنا کو دیکھ رہے تھے۔ میرے جسم میں خون جم گیا تھا۔ "کل کے واقعے کے تمام اعزاز کا مستحق میرا عزیز ظہیر خاں ہے۔ وہ دجیہہ اور دل کش نوجوان جو پہلی قطار میں منہ چھپائے بیٹھا ہے، یہ سب اُسی کا کرشمہ ہے۔ میں آپ کو تفصیل نہیں بتاؤں گا اور نہ آپ براہِ مہربانی تفصیل پوچھنے کے لیے اصرار کریں بس شہ کرسی پر بیٹھنے کا سزاوار ظہیر خاں ہی ہے، میں اُس کے لیے اپنی نشست خالی کرتا ہوں۔"

پہلے تو ہال میں جیسے سارے لوگ آوازوں سے محروم ہو گئے پھر دفعتاً ایک شور گونجا۔ نورین بے طرح مجھے جھنجوڑنے لگی مجھے پسینہ آنے لگا۔ سب سے بڑی مشکل مجھے اپنا رویہ متعین کرنے میں پیش آئی عقل جواب دینے لگی کہ اس موقع پر کس تاثر کا اظہار کرنا چاہیئے۔ اصولاً راج کرشنا کو یہ تاثر دینا چاہیئے تھا کہ اُس نے میرے بارے میں جو کہا ہے وہ میں نے انگریزی میں ناواقفیت کے سبب سے نہیں سنا ہے اور اگر میں یہی بُت بنا بیٹھا رہتا تو اِن پڑھے لکھے معزز لوگوں کے سامنے راج کرشنا کی توہین ہوتی کہ وہ اپنے جس عزیز کو اتنی عزت دے رہا ہے وہ ایک جاہل شخص ہے۔ میرا دل جھٹکے کھانے لگا اور جسم کی تمام طاقت خاک ہو گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں مٹی کا پُتلا ہوں اور ابھی ریزہ ریزہ ہو جاؤں گا۔ خوش قسمتی سے میری یہ گنگ کیفیت انکسار پر محمول کی گئی ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں پھر راج کرشنا ہی نے میرے اوسان بحال کیے۔ اُس نے اردو میں مجھے آواز دی "ظہیر خاں! اِدھر آؤ اور یہ کرسی سنبھالو۔"

سب لوگوں کی نگاہیں مجھی پر جمی ہوئی تھیں، میری ایک ایک حرکت ایک ایک جنبش پر۔ نورین نے مجھے زبردستی اٹھا دیا اور میں اٹھنے کو تو اُٹھ گیا مگر راج کرشنا تک پہنچنے کا گزوں کا فاصلہ میلوں برابر ہو گیا۔ ہر قدم پر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا لپکتا رہا، بجلی کی روشنی تھی، ہال سے نکلنے کے کئی دروازے تھے، یک بارگی میرے جی میں آیا کہ بس یہاں سے فوراً بھاگ نکلوں، راج کرشنا کا یہ مذاق بہت ستم ناک ہے مگر اس کے قریب راج کرشنا مجھے لینے آ گیا۔ اُس نے جب میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تو مجھے کسی قدر توانائی محسوس ہوئی لیکن شہ کرسی پر بیٹھنے سے پہلے جب میں اُن سب کے سامنے کھڑا ہوا تو مجھے کسی کی شکل صاف نظر نہیں آئی۔ وہاں ہیولے بیٹھے ہوئے تھے اور سارا ہال لرز رہا تھا۔ دیواریں مجھ پر گری پڑ رہی تھیں اور میں فرش میں دھنسا جا رہا تھا۔ میرے سارے حواس منتشر منتشر ہو گئے تھے۔ راج کرشنا نے مجھے کرسی پر بٹھا دیا اور خود میرے برابر بیٹھ گیا۔

یقیناً لوگ اس بات کے منتظر ہوں گے کہ اب میں اپنی زبان سے کچھ کہوں گا مگر کسی کے منہ میں زبان ہوتی تو وہ کچھ کہتا بھی۔ میری زبان پر تو فالج گر گیا تھا۔ راج کرشنا خود اُٹھ کھڑا ہوا "خواتین و حضرات مجھے اندازہ ہے کہ آپ ظہیر خاں کی زبانی کچھ سننے کے مشتاق ہوں گے۔ میری بھی یہی خواہش ہے مگر میں آپ سے درخواست کروں گا۔" اُس نے شستہ انگریزی میں کہا۔ "کہ یہ ایک موزوں وقت نہیں ہے یہ گفتنی ناگفتنی کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھیے۔" اُس نے میرا بازو کھینچ کے مجھے جلدی سے اٹھا لیا "میں اپنی اور ظہیر خاں کی جانب سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں، آیئے کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" راج کرشنا نے سب کے سامنے سر جھکایا۔ میں نے بھی اُس کی تقلید کی اور جب اُس نے آخری مرتبہ شکریہ ادا کیا تو میں نے اُس کے ساتھ آواز ملانے کی کوشش بھی کی۔ میری آواز تالیوں میں ڈوب گئی۔ میرے حواس کچھ کچھ درست ہونے لگے تھے اور سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہرے مجھے صاف نظر آنے لگے تھے۔ میرے دل میں کچھ بولنے کی خواہش

ہوئی لیکن ہمت نہیں پڑی۔ لوگ چہ میگوئیاں کرتے ہوئے اپنی نشستوں سے اُٹھ گئے تھے اور میرے اردگرد اژدہام ہو گیا تھا۔ راج کرشنا پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ آج کے واقعے کے بارے میں اُس سے کسی قسم کی تفصیل طلب نہ کی جائے چنانچہ لوگ پُر اسرار انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ نورین کے رخساروں پر سُرخی دیکھ کے میں نے اطمینان کی سانس لی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھ سے کوئی ایسی نمایاں بدتہذیبی سرزد نہیں ہوئی ہے۔ میں شہ کرسی پر بیٹھنے سے پہلے جو کچھ اپنے اندر، اپنے اوپر محسوس کر رہا تھا شکر ہے کہ اُس کی خبر لوگوں کو نہیں ہوئی تھی۔ راج کرشنا نے بہت خوش اسلوبی سے بات سنبھالی تھی اور وہی تھا جس نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ ایک بُرا وقت ٹل گیا۔

سب لوگ کھانے کی میزوں پر آ گئے۔ لوگوں کی ہمت افزا باتیں سُن کے اور تحسین شناس نگاہیں دیکھ کے میری حالت کہیں معمول پر آئی۔ نورین اب بھی میرے ساتھ بیٹھی تھی اُس بڑی میز کے اطراف بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ کھانے کے بعد اُس ماحول سے میری اجنبیت کسی حد تک ضرور دور ہو گئی۔ لوگ مشروبات پی رہے تھے اور پورے ہال میں بے ترتیبی ہو گئی تھی۔

سازندوں نے پھر ساز بجانے شروع کر دیے تھے۔ کئی عورتیں اور کئی مرد پھر ناچنے لگے تھے۔ بہت آہستہ آہستہ جیسے فرش پر رینگ رہے ہوں یا کھڑے کھڑے سو گئے ہوں۔ راج کرشنا نے مجھ سے چپکے سے پوچھا "کہو تو چلتے ہیں؟"

"ہاں" میں نے تیزی سے کہا "چلیے، وقت بھی بہت ہو گیا ہے۔"

اپنے پاس بیٹھے ہوئے مردوں اور عورتوں سے راج کرشنا نے مصروفیت کا عذر کر کے جانے کی اجازت چاہی۔ نورین کہنے لگی کہ مجھے وہ یہیں چھوڑ جائے پھر رات کو کسی وقت وہ مجھے گھر پہنچا دے گی۔ راج کرشنا نے اُس کی فرمائش مسترد کر دی۔ نورین کا چہرہ بجھ گیا اور وہ ہمیں دروازے تک رخصت کرنے کے لیے ہمارے ساتھ آئی۔ جن جن میزوں کے درمیان سے ہم گزرے وہاں بیٹھے ہوئے لوگ کھڑے ہو گئے مگر آخری میز سے پہلے والی میز سے گزرتے وقت مجھ سے آگے نہیں بڑھا گیا۔ وہ ۳۰، ۳۵ سال کی ایک صحت مند، خوب صورت اور خوش لباس عورت تھی جو اپنی کرسی سے اُٹھ کے ہمیں وداع کرنے کے لیے کھڑی ہو گئی تھی۔ پہلے اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ کے راج کرشنا کو پرنام کیا پھر مجھے، میں اُسے دیکھتا رہ گیا۔ اپنی جانب میری نگاہ کے ارتکاز سے اُس کی پلکیں مرتعش ہو گئیں۔ اُس نے جلدی سے اپنی ساڑی درست کی، اُس کا بدن سمٹنے لگا مگر میری نگاہ متزلزل نہیں ہوئی۔ راج کرشنا نے بھی میرا یہ انہماک دیکھ لیا تھا۔ اُس نے آگے بڑھنے کے بجائے عورت سے باتیں کرنی شروع کر دیں۔ اس طرح عورت راج کرشنا کی جانب متوجہ ہو گئی اور مجھے اُس کی طرف غور سے دیکھنے کا موقع مل گیا۔ جب نورین نے مجھے آگے کی طرف کھینچا تو مجھے اپنی بے خیالی کا احساس ہوا اور میں ندامت سے آگے بڑھ گیا۔ میرے چلتے ہی راج کرشنا نے بھی اُس عورت سے باتیں بند کر دیں اور ہمارے پاس آ گیا۔ دروازے پر ایک بار پھر میں نے گھوم کے اُسے دیکھا، وہ بھی میری طرف دیکھ رہی تھی اُس نے نگاہیں جھکا لیں، میں بھی سٹ پٹا گیا۔ نورین سے ہمیں رخصت کرتے وقت بہت سے وعدے لیے، نہ جانے میں نے کیا کیا کہا۔ وہ واپس اندر چلی گئی اور ہم دونوں تنہا رہ گئے تو میں نے سوچا میں راج کرشنا سے اُس عورت کے بارے میں پوچھوں جو آخری میز سے پہلے والی میز پر ملی تھی راج کرشنا جیسے میرے دل میں گھسا بیٹھا تھا، گاڑی کا دروازہ کھولنے سے پہلے اُس نے مجھ سے پوچھا "کیا تم اُس عورت کو جانتے ہو؟"

"نہیں" میں نے بے قرار لہجے میں جواب دیا "وہ کون ہیں؟"

"وہ ایک ستم رسیدہ عورت ہے، بہت مال دار۔ ابھی ایک سال ہوا اُس کا شوہر ایک حادثے میں مارا گیا مگر تم اُسے اس طرح کیوں گھور رہے تھے؟" اُس نے بے چینی سے پوچھا "کیا تمھیں وہ عورت اچھی لگی؟"

"نہیں" میں نے جھینپ کر کہا "ایسی بات نہیں ہے، بات کچھ اور تھی" میں نے ایک بار پھر اپنے گلے میں پڑی ہوئی مالا ٹٹول کے دیکھی۔ "مجھے بتانا ناپسند کرو گے؟"

"میں . . . . . میں" میری زبان ہکلانے لگی "کیا آپ اُس عورت سے کوئی بات پوچھ سکتے ہیں؟ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کے لیے کہیں یہ بڑی بات تو نہیں ہو گی؟"

"نہیں" اس نے مسکرا کے کہا۔ "پولیس والے ہر قسم کا سوال کر لیتے ہیں۔"

میں فوری طور پر فیصلہ نہیں کر سکا کہ اُسے بتاؤں یا خاموش رہوں۔ میں نے سوچا یہ ایک باریک بیں آدمی ہے، بات سے بات نکال لے گا لیکن تسلی کیے بغیر میرے اندر کھلبلی مچی ہوئی تھی اس لیے میں نے مدھم آواز میں کہا۔ "اُس عورت کے گلے میں جو ہار ہے، میں اُس کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔"

"ہار!" وہ حیرت سے بولا "مگر . . . مگر وہ کیسا ہار ہے؟"

"کیا آپ اُس سے پوچھ سکتے ہیں کہ وہ اُس نے کہاں سے خریدا ہے؟ بس آپ اتنی بات پوچھ لیجیے۔" میں نے اُس کے سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ سوچ میں پڑ گیا "یہ تو بہت معمولی بات ہے میں اُس سے ابھی پوچھے لیتا ہوں لیکن اگر اُس نے کوئی اور سوال کیا؟"

"کیا آپ اُسے علیحدہ کسی کمرے میں نہیں بلا سکتے؟"

"میں اُسے کہیں بھی بلا سکتا ہوں۔"

"تو بلا لیجیے۔"

"اچھا۔" وہ کچھ دیر ٹھیرا رہا، پھر واپس عمارت کی طرف چل پڑا میں بھی اُس کے ساتھ ساتھ تھا۔ دروازے پر پہنچ کے وہ کچھ جھجکا اور اُس نے دربان کو

حکم دیا کہ وہ مسز روپ پٹیل کو باہر بھیج دے۔ ہم دروازے سے ہٹ کے کھڑے ہو گئے۔" دربان فوراً واپس آگیا۔ اُس کے ساتھ روپ بھی تھی۔ اُس کا چہرہ فق تھا۔ راج کرشنا نے اُس سے اس زحمت کے لیے معافی چاہی تو اُس کا رنگ واپس آگیا۔ "مسز روپ! کیا آپ مجھ سے کچھ سلوک کریں گی؟" راج کرشنا نے شرمسار لہجے میں پوچھا۔

"ضرور، آپ کہیے، میں کیا کر سکتی ہوں؟"

"میرا دوست ظہیر خاں یہ جاننا چاہتا ہے کہ آپ نے یہ ہار، جو آپ کے گلے کی زینت بنا ہوا ہے کس طرح حاصل کیا ہے؟ کس طرح سے مراد یہ ہے" راج کرشنا نے وضاحت کی "کہ کب اور کہاں سے حاصل کیا تھا؟ بے شک آپ جواب دینے سے انکار کر سکتی ہیں۔ یہ ایک بے حد نجی بات ہے۔"

"نہیں نہیں۔ ہم نے اسے کوئی تین سال ہوئے خریدا تھا۔ یہ چار موتی اور یہ ہیرا، مجھے ان کی قیمت کا تو پتہ نہیں ہے مگر یہ ایک بہت قیمتی ہار ہے اور پٹیل صاحب نے ہماری شادی کی تیسری سال گرہ پر مجھے پہنایا تھا۔ یہ ہار میں نے ہی پسند کیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ انھوں نے اسے خرید بھی لیا ہے، سال گرہ آئی تو میں اسے دیکھ کے دنگ رہ گئی۔"

"بہت شکریہ۔ آپ کو یاد ہے کہ آپ نے اسے کہاں پسند کیا تھا؟"

"ہاں یاد ہے۔ میں نے بیشتر جواہر نانا بھائی کے ہاں سے خریدے ہیں، یہ ہار اُنھی کے ہاں سے خریدا تھا۔ وہ اسے عام نمائش کے لیے نہیں رکھتے تھے۔"

"کیا انھوں نے اس ہار کے بارے میں آپ کو کچھ بتایا تھا؟"

"کچھ ایسا یاد پڑتا ہے۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی "انھوں نے کہا تھا کہ اس ہیرے کا شمار دُنیا کے چند نادر ہیروں میں ہوتا ہے اور ایک ضرورت مند اسے اُن کے ہاتھ بیچ گیا ہے مگر ایسی باتیں تو تمام جوہری کرتے ہیں۔ مجھے بتائیے کہ کیا اس ہار سے کوئی انوکھی بات وابستہ ہے؟"

"ہو سکتی ہے۔" راج کرشنا نے کہا "مگر نانا بھائی سے تصدیق کے بعد ہی کچھ کہا جا سکتا ہے۔ ایسی کوئی انوکھی بات ہوئی تو میں آپ کو ضرور بتاؤں گا۔"

"آپ چاہیں تو یہ ہار لے جائیں، اس طرح آپ کا کام اور آسان ہو جائے گا۔ پھر میں آپ سے واپس لے لوں گی۔" روپ نے ہار اُتارتے ہوئے کہا۔

"نہیں شکریہ۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اسے آنکھوں میں محفوظ کرلیا ہے۔ آپ کو بڑی زحمت ہوئی۔" راج کرشنا نے کہا۔

"کیا آپ ہار مجھے دکھائیں گی؟" میں نے درمیان میں دخل دیا۔

مسز روپ نے ہار میرے سپرد کر دیا۔ میں نے غور سے وہ ہیرا اور موتی دیکھے اور ہار میری انگلیوں میں کانپنے لگا۔ بالکل وہی، یہ وہی موتی تھے جو میری مالا میں پروئے گئے تھے اور یہ ہیرا، میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ وہی جسامت، وہی نیلا رنگ، وہی چمک دمک، اسے میں نے سب سے پہلے بدھ گیا میں اچھین کے ہاتھوں میں دیکھا تھا۔ جب میں جھونپڑی میں داخل ہوا تھا تو اُس نے اسے مجھ سے چھپا لیا تھا، پھر یہ ہیرا کوراکی اُس پوٹلی میں بھی موجود تھا جسے وہ اچھین کی موت کے بعد بدھ گیا سے ہمارے گھر لائی تھی۔ جب ابّا جان نے وہ پوٹلی کھول کے دیکھی تھی تو اُس میں دوسرے ہیروں کے ساتھ یہ ہیرا بھی دمک رہا تھا۔ یہ سب سے چھوٹا تھا۔ ان جواہر میں میری مالا کے چند موتی بھی تھے۔ ابّا جان نے پوٹلی فوراً بند کرلی تھی۔ گھر سے نکلنے کے بعد کچھ دنوں تک تو مکان کی رقم سے اُن کا گزارا ہوا ہوگا پھر زمینوں کی آمدنی سے، پھر ابّا جان کو یہ جواہر بیچنے کی ضرورت پڑ گئی ہوگی۔ انھوں نے یہ ہیرا سب سے آخر میں مجبوراً اُٹھایا ہوگا۔ شبہے کی بس یہی گنجائش تھی کہ ممکن ہے مسز روپ کے ہار میں، یہ ہیرا اُس سے ملتا جلتا کوئی دوسرا ہیرا ہو اور موتی بھی میرے موتیوں سے اس حد تک محض مشابہ ہوں۔ ضروری نہیں کہ دُنیا میں صرف یہی ہیرا اور موتی ہوں۔ اس شکل و صورت کے اور بھی ہو سکتے ہیں مگر یہ شہر، اُسی شہر میں ابّا جان کا قیام۔ مولوی اکرم کی زبانی سنے ہوئے اُن کے حالات، اسی شہر میں ہیرے کی فروخت، نانا بھائی کا یہ کہنا کہ اسے ایک ضرورت مند بیچ گیا ہے۔ یہ ایسی باتیں تھیں جنھوں نے میرے سینے میں جلن پیدا کر دی تھی۔ میں نے ہار واپس کر دیا۔ مجھ سے اُس کا شکریہ بھی ادا نہ کیا جا سکا۔

"کیا آپ کی اس ہار سے کوئی وابستگی ہے؟" مسز روپ نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "آپ نے مجھے اُلجھن میں مبتلا کر دیا ہے۔"

"کچھ نہیں۔" میں نے دہشت سے کہا "آپ کا شکریہ۔"

"کوئی بات نہیں، جب بھی آپ کو اس ہار کی ضرورت ہو بے تکلف مجھ سے مانگ لیجیے گا۔" اُس نے خندہ پیشانی سے کہا "اور کرشنا جی! آپ نے ظہیر خاں صاحب کی اتنی تعریفیں کی ہیں، کبھی انھیں ہمارے گھر لائیے۔"

"ضرور مسز روپ!" راج کرشنا نے یہ کہتے ہوئے میری کمر تھپکی "آؤ ظہیر!"

ہم گاڑی میں بیٹھ گئے۔ راج کرشنا تمام راستے خاموش رہا۔ چوکیدار نے ہمیں بتایا کہ ایک عورت ڈرائنگ روم میں شام سے راج کرشنا کی منتظر ہے۔ ہم دونوں دوڑتے ہوئے اندر گئے۔

وہاں چمپا بائی بیٹھی ہوئی تھی۔

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔

مگر وہاں سفید ساڑی میں ملبوس چمپا بائی ہی بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کے اُس کا بھی وہی حال ہوا، جو میرا تھا۔ وہ بوکھلا کے اُٹھ کھڑی ہوئی، اُس کے ہونٹ کانپنے لگے اور اُس نے میری طرف بڑھنا چاہا۔ میں گھبرا کے پیچھے ہٹ گیا اور راج کرشنا کی اوٹ میں ہو کر پھرتی سے چاقو جیب سے نکال لیا لیکن مجھے پھلکا دکھانے کی مہلت نہیں ملی۔ چمپا جلد ہی سنبھل گئی، اُس نے سٹ پٹاتے ہوئے انداز میں راج کرشنا کو سلام کیا۔ "آپ کب آئیں؟" راج کرشنا نے چند لمحوں کے تذبذب کے بعد پُرتپاک لہجے میں اُس سے پوچھا۔

"مجھے آئے ہوئے دیر ہو گئی۔" چمپا نے خفت سے جواب دیا۔

"بیٹھیے، بیٹھیے اور تو سب خیریت ہے؟"

"جی ہاں" اُس نے نظریں جھکا کے کہا "میں دوبارہ بمبئی آئی ہوں، آپ سے آنے کا وعدہ کیا تھا، سوچا آج اُسے نبھا دوں۔"

"بہت اچھا کیا!" وہ بولا "مگر آپ ٹھیری کہاں ہیں؟"

"ایک ہوٹل میں!" اُس نے مجھے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہوٹل میں کیوں؟" راج کرشنا شکایتی لہجے میں بولا "یہ گھر خالی پڑا ہے، آپ سیدھی اِدھر آجاتیں، ظہیر بھی میرے ساتھ ہی ہے، کیوں ظہیر؟"

"جی، جی ہاں۔" میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"بس۔" وہ جھینپ کے بولی "ناحق آپ کو زحمت ہوتی، آپ مل گئے اور دو باتیں رواداری کی کرلیں، یہی بہت ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ظہیر بھی یہیں ہوں گے۔"

"تو پھر کیا آپ نہیں آتیں؟" راج کرشنا نے مسکرا کے پوچھا۔

"تو۔ تو میں شاید اور پہلے آجاتی۔"

راج کرشنا ہنسنے لگا "آپ نے کھانا بھی نہیں کھایا ہوگا۔" وہ ترقّد سے بولا "ہم لوگ تو کلب میں کھا کے آئے ہیں۔" اُس نے بکھو کو آواز دی۔

"نہیں نہیں، اس تکلف کی ضرورت نہیں، میں کھانا کھا کے آئی ہوں۔" چمپا لجاجت سے بولی "بس چائے پی لوں گی۔"

"غلط، آپ کھانا کھائیں گی، پھر چائے پیئیں گی اور ہاں اس کے بعد پان بھی کھائیں گی۔ پھر آرام سے بیٹھ کے باتیں ہوں گی۔ مجھے آپ کے پان اب تک یاد ہیں اور اگر آپ مناسب سمجھیں تو رات کو یہاں قیام بھی کریں۔ مجھے اتنی اجازت دیجیے کہ میں لباس تبدیل کرلوں، میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ چمپا کا جواب سُنے بغیر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ میں اور چمپا اکیلے رہ گئے۔ میں نے چاقو جیب میں رکھ لیا اور تیز نظروں سے اُسے گھورنے لگا۔ میرے حواس خبط ہو گئے تھے۔ عقل کام نہیں کرتی تھی کہ اُسے کس لہجے میں مخاطب کروں، وہ یہاں کیوں آئی ہے، جب وہ راج کرشنا سے بات کر رہی تھی۔ تو اس کے ایک ایک لفظ پر میرا دل ہول جاتا تھا۔ نہ جانے اُس کی زبان سے اب کیا نکل جائے۔ یہ میرا گھر بھی نہیں تھا کہ میں اُسے دھکے دے کے نکال دیتا۔ "تم کیسے ہو؟" اچانک اُس کی کانپتی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"میں تو ٹھیک ہوں مگر تم یہاں کیوں آئی ہو؟" میں نے چیخ کر کہنا چاہا لیکن میری بلند آواز راج کرشنا کے خوف سے گھٹ کے رہ گئی۔ "بتاؤ تم واپس کیوں آئی ہو؟"

"میں اب وہاں نہیں رہ سکتی۔"

"کیوں نہیں رہ سکتیں؟" میں نے جھنجلا کے پوچھا۔

"مجھ سے اب وہاں نہیں رہا جاتا۔ تمھاری بات مان کے میں وہاں چلی گئی تھی لیکن میں نے یہ دن کانٹوں پر کاٹے ہیں۔"

"کیوں، آخر کیوں؟" "تم آخر چاہتی کیا ہو؟"

"میں کچھ نہیں چاہتی۔" وہ پھٹی ہوئی آواز میں بولی "میں جس حالت میں تمھیں چھوڑ کے گئی تھی، اُس نے مجھے چین لینے نہیں دیا۔ ان دو ہفتوں میں، میں نے کہاں کہاں کی خاک نہیں چھانی، ہر گلی کوچے میں تمھیں ڈھونڈتی رہی۔ دیکھو میرے پاؤں، جب ہر طرف سے مایوس ہو گئی تو کرشنا جی سے مدد لینے کے لیے یہاں آگئی۔"

"مگر کیوں؟" میں نے ہذیانی انداز میں پوچھا۔

"تم نے مجھے معاف نہیں کیا؟"

"کیسی معافی!" میں نے تلملا کے کہا "کیا وہ واپس آجائے گی۔"

"وہ تو واپس نہیں آسکتی۔ کاش یہ میرے بس میں ہوتا لیکن جب تک تم سچے دل سے معاف نہیں کرو گے، مجھے سکون سے موت تک نہیں آئے گی، خدا بھی معاف کر دیتا ہے۔" وہ رونے لگی۔

"میں نے تمھیں معاف کیا۔" میں نے تیزی سے کہا "یہ اُس کی قسمت تھی۔ اب تم اپنے گھر جاؤ اور دیکھو یہاں اپنی زبان مت کھولنا، کرشنا جی اگر تم سے میری قرابت کے بارے میں کُرید کریں تو کچھ بھی بات بنا دینا مگر کوئی اور بات زبان پر مت لانا، سمجھ گئیں؟"

"سمجھ گئی۔ تم مجھے اتنا بُرا کیوں سمجھتے ہو، مجھے تمھاری عزت اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ تم اگر یہاں نہ ملتے تب بھی میں اُن سے کچھ نہیں کہتی۔ بہرحال اچھا ہوا تم ان کے پاس چلے آئے، خدا تمھیں اپنی امان میں رکھے۔ مجھے کچھ سکون ہوا۔ مگر تم،...... تم نے کیا سوچا ہے؟"

"میں کیا سوچوں گی۔" وہ سانس بھر کے بولی "میری تو بس ایک ہی آرزو ہے کہ زندگی کے باقی دن تمھاری خدمت کرتے ہوئے گزار دوں یہی سوچ کے بمبئی آئی تھی کہ تمھیں ڈھونڈ کے، جہاں تم رہو گے، وہاں میں بھی کسی کونے میں پڑی رہوں گی۔ تم مجھے اپنے گھر میں اتنی جگہ تو دے دو گے کہ میں اپنا یہ سیاہ چہرہ چھپا سکوں اور خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتی رہوں۔ تم مجھے ایک ملازمہ سمجھ کے قبول کرلو گے...... اب اُن لوگوں میں واپس جانا نہیں چاہتی اور نہ تمھیں پریشان کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے بتاؤ، میں کیا کروں؟"

"تم یہ باتیں پہلے بھی کر چکی ہو اور میں ان کا جواب دے چکا ہوں۔ میں، میں کیا بتا سکتا ہوں، میرا تو کوئی گھر ہی نہیں ہے چمپا بائی۔ تمھیں میری حالت معلوم ہے۔ میں یہاں خود کرشنا جی کے ہاں ٹھیرا ہوا ہوں۔ میری مانو تم کہیں اور کہیں اور چلی جاؤ۔ دُنیا بہت بڑی ہے۔ اگر تم نے اچھی زندگی گزارنے کا عہد کرلیا ہے تو تمھیں کوئی نہیں روکے گا۔"

"مگر مجھے ہر جگہ تمھارا خیال ستائے گا۔"

"میری بات چھوڑو۔" میری آواز بھرا گئی "میرا کوئی یقین نہیں ہے جب تک بات چل رہی ہے، چل رہی ہے پتہ نہیں کل میں کہاں ہوں، ہوں بھی یا نہیں۔"

"نہیں، تم ہو گے۔" وہ وحشت سے بولی "اور تمھارے سب بچھڑے ہوئے مل جائیں گے، تم تو اتنی جلدی مایوس ہو گئے۔"

"اتنی جلدی" میں نے تلخی سے کہا: "تمھیں کیا معلوم"۔

"ہاں مجھے کچھ نہیں معلوم لیکن اتنا تو میں دیکھ رہی ہوں کہ تمھاری عمر کیا ہے، خدا نے تمھیں دماغ بھی دیا ہے، حوصلہ بھی تم ایک مرد ہو۔"

"بس چمپا بائی" میرے منہ سے اتنا ہی نکلا تھا کہ راج کرشنا لباس تبدیل کرکے واپس آگیا۔ میں نے چپ سادھ لی۔ چمپا بھی سیدھی ہوکے بیٹھ گئی۔ وہ ہم دونوں کو مسکرا کے دیکھنے لگا لیکن ابھی ٹھیک طرح بیٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ اسے خیال آیا، بھکو نے اس کی آواز پر کان نہیں دھرے تھے۔ اس نے چمپا سے معذرت کی اور بھکو کو دیکھنے کے لیے خود ہی اٹھ کے اندر جانے لگا۔ ہماری بات ادھوری رہ گئی تھی جیسے ہی وہ اوجھل ہوا، میں نے چپکے سے کہا: "میں کل صبح تمھارے پاس آؤں گا۔ تم اسی ہوٹل میں ٹھیری ہوئی ہونا؟"

"ہاں!" اس نے مدھم آواز میں جواب دیا۔

راج کرشنا بھکو پر ناراض ہوتا ہوا فوراً ہی واپس آگیا اور کچھ دیر کرسی پر بیٹھ کے یوں ہی کسمساتا رہا۔ وہ صرف ایک بار ریل میں سفر کے دوران چمپا سے ملا تھا لیکن ایک دن کی اس ملاقات کا نقش اتنا گہرا تھا کہ راج کرشنا اسے زندگی بھر فراموش نہیں کرسکتا تھا۔ وہ بہت سمجھ بوجھ کا آدمی تھا اور سمجھ بوجھ کے آدمی کو بات کرتے ہوئے دیر لگتی ہے۔ چمپا نے مجھے محتاط رہنے کا یقین دلا دیا تھا مگر میرا دل مطمئن نہیں تھا، نجانے راج کرشنا کیا سوال کر بیٹھے اور چمپا سے بات بنائے نہ بنے۔ چمپا کی آمد کے بعد خود میری خاموشی اور سکوں آمیز اضطراب سے راج کرشنا کا ذہن کسی طرف بھی جا سکتا تھا۔ ایک بات سے پردہ اٹھتا تو بہت سے پردے اٹھنے کا اندیشہ تھا، راج کرشنا پولیس افسر تھا اور افسر بھی ایسا جس کے حواس عام آدمیوں سے کئی گنا تیز تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس کی آنکھیں بظاہر دیوار کی سمت دیکھ رہی ہیں مگر وہ ہم دونوں کو ٹٹول رہی ہوں گی، چند لمحے سکوت رہا پھر وہ ہچکچا کے بولا "اور سنائیے کیسے مزاج ہیں آپ کی صحت تو ٹھیک ہے؟"

"جی" چمپا سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔

"ظہیر کو یہاں دیکھ کے آپ کو خاصا اچنبھا ہوا ہوگا۔ یہ مجھے ملے تو میں انھیں اپنے ساتھ ہی لے آیا۔ ایک آپ کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ اب آپ یہیں رہیے۔ بمبئی میں میرا گھر ہو اور آپ ہوٹل میں ٹھیریں۔ یہ ایک نہایت نامناسب بات ہے، ویسے بھی یہاں کئی کمرے خالی پڑے ہیں۔ آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ میری ماں یہاں ہوتی تو مجھے بہت برا بھلا کہتی کہ میں آپ جیسے محسنوں کو اسٹیشن ہی سے اپنے ساتھ کیوں نہیں لایا۔ بعد میں میں آپ دونوں کو کئی دنوں تک ڈھونڈتا رہا۔

"شرمندہ مت کیجیے، میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا" چمپا اٹک اٹک کے بولی: "ہاں ظہیر نے بے شک اس وقت اپنے حواس بجا رکھے تھے، اگر آپ اسے احسان سمجھتے ہیں تو وہ ظہیر خاں نے کیا ہے۔ میں تو ایک تماشبین کی طرح سب کچھ دیکھتی رہی تھی۔"

"نہیں آپ بھی میری وجہ سے ایک نازک وقت سے دوچار ہو گئی تھیں۔ آپ نے میرے ساتھ بہت سلوک کیا۔ مجھے سب باتیں ... میں نے ظہیر خاں کو یہاں لا کے کہا تھا کہ یہ احسان کا معاوضہ نہیں ... معاوضہ ادا کیا جائے، وہ احسان نہیں ہوتا۔ آپ یہاں ٹھیر کے مجھے ... کریں گی۔ ظہیر بھی اکیلا رہتا ہے۔ جب تک آپ کا جی چاہے آپ رہیے۔ کسی بات کا تکلف مت کیجیے۔"

"شکریہ" چمپا کی آنکھیں نم ہوگئیں: "میں آپ کو زیادہ زحمت دوں گی، ہوٹل میں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کل صبح میں ڈرائیور سے کہہ دوں گا وہ ... کا سامان لے آئے گا۔" راج کرشنا نے افسرانہ انداز میں فیصلہ سنا دیا ... سنتا اور دیکھتا رہ گیا۔ چمپا بہت جز بز ہوئی۔ دونوں نے میری طرف ... درمیان میں دخل دینے والا کون تھا۔ یہ راج کرشنا کا گھر تھا، وہ اپنے کسی کو بھی مہمان رکھے۔ میں نے نگاہیں چرالیں۔ میں اسے کیا بتاتا کہ یہ ... کون ہے۔ تم ایک پولیس افسر ہو۔ پہلے ہی تمھارے گھر میں ایک مشتبہ آ... ہے۔ اب دوسرے کو دعوت دے رہے ہو۔ اپنے عہدے کا خیال ... بات کھلی تو لوگ کیا کہیں گے۔ ویسے ہی لوگ تمھارے دشمن ہیں۔ ہر جگہ ... پھریں گے کہ راج کرشنا جیسے مشہور پولیس افسر کے ہاں فیض آباد کی طوائف چمپا بائی ٹھیری ہوئی ہے اور ایک نوجوان جس نے قتل کے الزام میں سات سال جیل میں گزارے ہیں، مجھے حیرت تھی کہ راج کرشنا کی ... بیں نگاہیں چمپا کے چہرے، اس کی باتوں اور انداز و اطوار کا جائزہ نہیں لے رہی ہیں۔ گو چمپا کے چہرے اور لہجے میں بہت سادگی تھی بھی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ ایک طوائف ہوگی مگر وہ تو راج کرشنا ... سڑک پر چلتا ہوا کوئی آدمی نہیں تھا۔ اسے جاننا چاہیے تھا کہ ایک عورت یکہ و تنہا ہوٹل میں ٹھیری ہوئی ہے۔ وہ رات کو اس وقت یہاں موجود ... کوئی عورت کس وجہ سے بار بار اس شہر کا رخ کرتی ہے اور ہوٹل میں ... ہے۔ راج کرشنا کو یہ بھی محسوس کرنا چاہیے تھا کہ میں نے اس کے ... چمپا سے کوئی بات نہیں کی ہے اور نہ اس کی طرح میرے چہرے پر ... چھایا ہے۔ جب میں یہاں آیا تھا تو اس نے چمپا کے بارے میں پوچھا تھا کہاں چلی گئی، میں نے سرسری طور پر اس کا ذکر کیا تھا کہ بس وہ چلی گئی ... کرشنا کو اگر میرا خیال تھا تو یہ باتیں محسوس کرنی چاہیے تھیں۔ شاید وہ ... دوران ہمارے بارے میں اپنے لگائے ہوئے اندازوں پر پشیماں تھا اور ... ہمارے متعلق کوئی غلط بات سوچنے کے لیے اس کا ذہن آمادہ نہیں ... ہوگا، چمپا کی آمد پر میری خاموشی اور گھبراہٹ" اس نے میری کسر نفسی ... محمول کی ہوگی مگر میرے پاس خاموش رہنے کے سوا چارہ بھی کیا تھا ... اچانک یہاں دیکھ کے جھوٹ موٹ کی خوشی کا اظہار مجھ سے کبھی نہ ... جاتا اور نہ میں ناراضی کا اظہار ہی کرسکتا تھا کہ چمپا کی برہمی کا اندیشہ بھی ...

بھکو نے کھانا میز پر لگا دیا تھا۔ چمپا کی وجہ سے ہم دونوں بھی اس ... ساتھ بیٹھ گئے۔ چمپا چند ہی لقمے منہ میں ڈال سکی۔ اس اثنا میں راج کرشنا ... میں کام کرنے والے آدمی اور اس کے گروہ کے متعلق دلچسپ باتیں سناتا ... چمپا گردن جھکائے سنتی رہی۔ کھانے کے بعد راج کرشنا نے اسے آرام ... مشورہ دیا۔ وقت بھی کافی ہو چکا تھا، وہ واپس جانے کی درخواست کرتی رہی ... راج کرشنا نے اس کی ایک نہ سنی، کمرہ کھلوا کے صاف کرایا اور جب ... چمپا اپنے کمرے میں داخل نہیں ہوگئی، وہ اپنے کمرے میں نہیں گیا۔

میں خاموشی سے اپنے بستر پر چلا آیا۔ اس وقت تو اور باتوں میں وقت ... گیا مگر کل صبح کل دوپہر کل شام، چمپا نہ جانے کب تک ٹھیری رہے۔ اس ... اور کون سا گوشہ اسے میسر آئے گا۔ میں اپنے بستر پر لوٹتا رہا۔ ٹھیک ... چمپا یہاں رہے اور راج کرشنا اپنی محسنہ کی خاطر داری کرتا رہے۔ میں ... پہلے ہی کہاں رک رہا تھا، میں کہیں اور نکل جاؤں گا۔ جب تک چمپا راتنے ... رہے گی مجھے تمی کی یاد آتی رہے گی، اور میں خود یہاں کب تک رہوں گا۔ کلب ... مسز روپ کے گلے میں پڑا ہوا ہار دیکھ کے میرے دل کو قرار نہیں تھا ... بہت ہوگئی تھی: نانا بھائی جوہری کی دکان بند ہوگئی ہوگی اور اس کے ... پتہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ ورنہ میں کلب سے سیدھا اس کی طرف جاتا اور ... سے التجا کرتا، تجھے تیری اولاد، اپنے خدا کی قسم، مجھے صحیح صحیح بتا دے کہ یہ ... تو نے کہاں سے حاصل کیا تھا۔ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہی تھیں۔ یہ ... ہیرا تھا جو کود اپنے ساتھ ہمارے گھر لائی تھی۔ اور موتی، میں نے خود انھیں ... کے دیکھا تھا۔ وہی موتی تھے جو میری مالا میں پروئے ہوئے تھے۔ انھیں ... موتیوں سے ایک مالا بنا کے مجھے دی تھی یا تے میں، مجھے خیال بھی ... تھا کہ راج کرشنا سے اسی وقت نانا بھائی کے ہاں چلنے کی استدعا ... مجھے شاید وہ آسانی سے اس شخص کا نام نہ بتاتا جس سے اس نے یہ ہیرا خریدا ... قیمتی چیزوں کی خرید و فروخت میں تو بڑی رازداری برتی جاتی ... حالات کا ٹنی لیں بھی مشکل تھی کہ چمپا بائی آگئی۔

میں صبح جلد ہی اٹھ کے باہر آگیا مگر چمپا بائی اور راج کرشنا مجھ ... پہلے بیدار ہو چکے تھے۔ ناشتے کے دوران کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ ... زیادہ تر اخبار بینی میں ڈوبا رہا اور چمپا گھر میں ادھر ادھر گھومتی رہی۔ ... لباس تبدیل کرکے ڈرائنگ روم میں آیا تو راج کرشنا بھی باہر جانے ... لیے تیار کھڑا تھا: "میں تھوڑی دیر کے لیے جا رہا ہوں"۔ میں نے اسے ... دینی مناسب سمجھی۔

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا: "میں بھی تمھارے ساتھ ... رہا ہوں۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ جیسے اسے شبہ ہوگیا ہو کہ اب میں ... نہیں آؤں گا۔ میں نے نہ انکار کیا، نہ اقرار۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور ... باہر کرنے لگا، چمپا کیاری سے پھول توڑ رہی تھی۔ اس نے گلاب کا ... ایک پھول مجھے اور راج کرشنا کو پیش کیا۔ راج کرشنا نے اسے کوٹ میں لگا کے چمپا کا شکریہ ادا کیا: "آج دوپہر تو آپ اپنے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھلائیں گی۔ یہاں گوشت وغیرہ سے پرہیز نہیں کیا جاتا۔ آپ جو بھی تیار کریں گی، بڑے شوق سے کھائیں گا۔ میں نے ڈرائیور کو ہدایت کر دی ہے کہ وہ ہوٹل سے آپ کا سامان لے آئے۔"

چمپا نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے مگر راج کرشنا گاڑی میں بیٹھ چکا تھا، آدھ گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم ایک معروف بازار سے گزر رہے تھے۔ راج کرشنا ادھر ادھر نظریں دوڑا رہا تھا۔ ایک جگہ اس نے ڈرائیور کو گاڑی روکنے کا حکم دیا۔ سامنے نانا بھائی جوہری کی شاندار دکان تھی، میرا سر چکرا گیا۔ نہ معلوم نانا بھائی ابا جان کے بارے میں کیا بتائے؟ شاید اسے ان کا پتہ بھی معلوم ہو۔ اگر یہ سب باتیں راج کرشنا کے سامنے ہوئیں تو میں اس سے کیا کہوں گا۔ گاڑی سے اتر کے میرے لیے اپنے پیروں پر چلنا دوبھر ہو رہا تھا مگر راج کرشنا مجھے گھسیٹتا ہوا دکان کے اندر داخل ہوگیا۔

دکان کے ایک باادب ملازم نے ہمیں ایک کمرے میں پہنچا دیا۔ کمرے میں دو اطراف شیشے لگے ہوئے تھے اور ایک تن درست گول مٹول زرد رنگت کا شخص اونچی چوکی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی عمر ساٹھ سال سے کم نہیں ہوگی۔ میرے جسم میں خون تھم گیا تھا۔ نانا بھائی نے متانت سے ہمارا استقبال کیا اور مسکراتے ہوئے پوچھا کہ وہ ہماری کیا خدمت انجام دے سکتا ہے۔

"آپ کو ایک تکلیف دینی ہے۔" راج کرشنا نے جھجک کے کہا۔

"ضرور، حکم؟" وہ آنکھیں جھپکا کے بولا۔

"آپ کا وقت تو ضائع ہوگا لیکن کچھ ایسا ہی ضروری کام ہے۔" راج کرشنا نے آدھی انگریزی اور آدھی شکستہ اردو میں شائستگی سے کہا: "آپ مسٹر پٹیل سے تو خوب واقف ہوں گے۔ وہی پٹیل صاحب جن کا ایک حادثے میں گزشتہ سال انتقال ہوگیا تھا۔"

"ہاں ہاں" وہ گمبھیر آواز میں بولا: "وہ بہت مہربان آدمی تھے۔ میرے اچھے دوستوں میں تھے، بہت خوش ذوق لیکن آپ.... آپ...."

راج کرشنا نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی: "ان کی بیوہ مسز روپ پٹیل کے پاس ایک نادر ہار ہے۔ وہ ہار آں جہانی پٹیل صاحب نے آپ کے ہاں سے خریدا تھا۔ شاید آپ کو یاد ہو، ضرور یاد ہوگا کیونکہ اس میں ایک منفرد قسم کا ہیرا اور چار بیش قیمت موتی جڑے ہوئے تھے۔ ہیرا جسامت میں چھوٹا اور نیلے رنگ کا تھا۔" نانا بھائی نے اپنی آنکھیں بند کرلیں: "مسز روپ پٹیل نے ہمیں بتایا ہے کہ آپ نے وہ ہار سپرد کرتے وقت ان سے اس کے ہیرے کی بڑی تعریف کی تھی اور کہا تھا کہ اس ہیرے کا شمار دنیا کے چند نادر ہیروں میں ہوتا ہے اور ایک ضرورت مند نے آپ کے ہاتھ بیچ گیا تھا۔ کہیے آپ کو کچھ یاد آیا؟" نانا بھائی نے متجسس انداز میں گردن ہلائی۔ راج کرشنا نے تیزی سے کہا: "وہ ایسا ہیرا نہیں تھا جسے آپ کی جوہر شناس نگاہ بھول سکے۔ ہم صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آپ نے وہ ہیرا کس ضرورت مند

سے خریدا تھا؟ وہ کون صاحب تھے اور اُن کا پتہ کیا ہے؟"

نانا بھائی نے ہم دونوں کو غور سے دیکھا، اُس کے ماتھے پر سلوٹیں پڑ گئیں۔ وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا، میرا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ "جناب!" اُس نے کسی قدر ناگواری سے کہا۔ "مسٹر روپ پٹیل نے آپ کو جو کچھ بتایا ہے وہ سب سچ ہے۔ بلاشبہ وہ ایک نادر ہیرا ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو فروخت کرنے والے کا نام نہیں بتا سکتا۔"

"دو باتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو آپ بتانا نہیں چاہتے، یا آپ بھول گئے ہیں۔ ہماری یہ درخواست بے جا ضرور ہے مگر معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔ براہِ کرم ہماری مدد کیجیے۔ ہم بڑی اُمید سے آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں اور یقین دلاتے ہیں کہ آپ کی نیک نامی اور ساکھ پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔"

"مگر جناب! یہ بات میرے کاروباری اصول کے خلاف ہے۔ دونوں میں سے کوئی بھی ایک بات سمجھ لیجیے۔ معاف کیجیے، کوئی اور خدمت ہو تو بتائیے۔" وہ رُکھائی سے بولا۔

"نانا بھائی! ہم مسٹر روپ پٹیل کی سفارش بھی لا سکتے ہیں، آپ چاہیں تو انھیں فون کر لیجیے۔" راج کرشنا نے نرمی سے کہا۔ "میری مُراد ہے کہ آپ ہم پر ہر طرح کا اعتماد کر سکتے ہیں۔"

"سفارش اور اعتماد کی بات نہیں ہے جناب! اصول اپنی جگہ ہے، میں آپ سے معافی چاہتا ہوں، مجھے وہ ہیرا اور موتی خریدے ہوئے کئی برس گزر گئے ہیں۔ آپ نے خود فرمایا ہے کہ اسے مسٹر پٹیل نے تین سال پہلے مجھ سے خریدا تھا۔ یہاں نہ جانے کتنے ہیرے روز آتے ہیں۔ آپ ذرا سوچیے، کون یاد رکھ سکتا ہے۔"

"وہ ہیرا ایسا نہیں تھا جس کے فروخت کرنے والے کا چہرہ آپ کے ذہن میں محفوظ نہ ہو۔ ایسے سودوں میں ہر طرح کی احتیاط کرنی پڑتی ہے، آپ نے اپنی تسلی کے لیے ہر احتیاط کی ہوگی۔ رسید دی ہوگی، اسٹامپ لکھا ہوگا۔ اُس شخص کا نام پتہ آپ کے ریکارڈ میں ضرور موجود ہوگا۔"

"فرض کیجیے، یہ سب محفوظ ہے بھی تو میں بتانے پر آمادہ نہیں ہوں۔" وہ کبیدہ ہو کے بولا۔ "آپ مجھے مجبور مت کیجیے۔"

"دیکھیے آخر آپ نے قبول کر لیا کہ اُس شخص کا نام آپ کے ریکارڈ میں موجود ہے۔" راج کرشنا نے اُسے چمکیلی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "اگر ہم آپ سے یہ کہیں کہ وہ ہیرا چوری کیا گیا تھا تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟" اُس کے لہجے میں نمایاں طور پر سختی آگئی۔

"میرا جواب آپ کو معلوم ہے لیکن میں ہر شخص کے سامنے جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔" نانا بھائی بیزاری سے بولا۔ "میرا وقت خاصا قیمتی ہے۔ ابھی صبح ہوئی ہے۔"

راج کرشنا نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کارڈ اُس کے سامنے پیش کر دیا۔ "یقیناً آپ کو اب کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟ آپ نے اعتراف کر لیا ہے کہ اس ہیرے کی خرید کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا گیا تھا۔"

نانا بھائی نے کارڈ اُٹھا کے اُس پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور چند ثانیوں میں اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ اچانک جھک کر کھڑا ہو گیا اور اُس نے تیزی سے فرش پر اُتر کے راج کرشنا کے ہاتھ لیے۔ "آپ نے کمال کر دیا۔ آپ پہلے ہی بتا دیتے۔ مجھے بہت افسوس ..." اُس کا لہجہ اور طور طریق یکسر بدل گیا۔ اُس نے ملازم کو آواز دے کے کافی کے لیے کہا۔ "حد ہو گئی جناب! اب بتائیے۔ بھلا مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے سامنے آپ بیٹھے ہیں۔ دیکھیے نا۔ یہ سودے بڑی رازداری کے ہوتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے۔" وہ بار بار معذرت کرنے لگا۔ "کل اور آج کے اخبار آپ کے ذکر سے بھرے پڑے ہیں۔ میں تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ صبح صبح آپ کے دیدار ہو جائیں گے۔ میں نے توجہ ہی نہیں دی حالانکہ کل آج دونوں دنوں کے اخبارات میں آپ کے فوٹو چھپے ہیں۔ کاش آپ پہلے بتا دیتے۔"

"ہر جگہ یہ حوالہ دیتے ہوئے اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ میرا خیال تھا، ہمارے چہرے بھروسے کے قابل ضرور ہیں۔ یہ کارڈ میں مجبوراً استعمال کرتا ہوں۔"

"پتھروں کو دیکھتے دیکھتے آنکھیں بھی پتھر ہو گئی ہیں۔"

"پھر تو اور قیمتی ہو گئی ہوں گی۔" راج کرشنا مسکرانے لگا۔

"آپ اشارہ کر دیتے۔" وہ پشیمانی سے بولا۔ "مجھ سے غلطی ہو گئی۔ اس کی تلافی کس صورت میں ہو سکتی ہے؟ مجھے آپ کا وقت ضائع کرنے کا افسوس ہے۔"

"تلافی کیا۔" راج کرشنا نے بے پروائی سے کہا۔ "اب آپ اپنی یادداشت پر زور دے کے ہمیں اُس شخص کے بارے میں بتا دیجیے جس کے لیے ہم نے آپ کو زحمت دی ہے۔"

"زحمت کیسی جناب! میں بتاتا ہوں۔" نانا بھائی نے ندامت سے اپنی پیشانی پکڑ لی۔ "میں نے وہ ہیرا اور موتی ایک نہایت معزز شخص سے خریدے تھے۔" میرے کانوں میں جلن ہونے لگی، میں نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ "وہ ایک مسلمان تھے۔ مجھے تو کوئی جاگیردار اور نواب معلوم ہوتے تھے۔ اُن پر بُرا وقت آگیا تھا۔ ایسے لوگوں کو ہماری ضرورت پڑتی ہی ہے۔ انھوں نے اس سے پہلے بھی چند موتی اور ایک ہیرا میرے پاس فروخت کیا تھا، وہ ہیرا اتنا زیادہ قیمتی نہیں تھا۔ انھوں نے مجھ سے رازداری کا عہد لیا تھا۔ اگر آپ کے بجائے کوئی اور یہ سوال کرتا تو میں جواب دیتا، زندگی بھر اپنا عہد نبھاتا۔ وہ اِدھر کئی برسوں سے مجھے نظر نہیں آئے۔ بمبئی میں ہوتے تو ضرور آتے۔ میں انھیں اپنے پاس دیر تک بٹھاتا تھا کیونکہ وہ مجھے اچھے آدمی نظر آتے تھے۔ انھوں نے کہا تھا کہ میں یہ ہیرا کسی صاحبِ ذوق ہی کو فروخت کروں۔ میں نے مسٹر پٹیل کو منتخب کیا تھا۔ مجھے یاد ہے اس سودے میں کوئی بہت بڑا منافع نہیں ہوا تھا۔"

"اُن کا نام؟" نانا بھائی سوچتے ہوئے بولا۔ "دلاور خان تھا شاید۔"

"شاید نہیں سوچ کے بتائیے۔"

"جی ہاں کچھ یہی نام تھا۔" وہ جھجک کے بولا۔

راج کرشنا نے میری طرف دیکھا۔ میں نے پہلی بار درمیان میں [illegible] "اُن کی عمر کیا ہوگی؟ وہ کس حُلیے کے آدمی تھے؟" میں نے مضطرب پوچھا۔ میری آواز کپکپا رہی تھی۔

نانا بھائی کے چہرے پر کشمکش کے آثار ہویدا ہوئے۔ "اُن کی [illegible] پاس کے لگ بھگ ہوگی۔ قد اوسط درجے کا تھا، رنگ کھلتا ہوا تھا، [illegible] نمایاں تھیں۔ بہت چھوٹی سی داڑھی تھی۔ بہت باوقار چہرہ تھا۔ [illegible] شیروانی میں آتے تھے، صاف ستھرے لباس میں، لیکن وہ کچھ اُلجھے [illegible] رہتے تھے۔"

وہ ابا جان ہی کا حلیہ بیان کر رہا تھا۔ ابا جان نے اپنا صحیح نام [illegible] بتایا ہوگا اور پھر پتہ بھی غلط لکھوایا ہوگا۔

راج کرشنا مجھے تک رہا تھا۔ میں نے دوسرا سوال نہیں کیا۔ وہ [illegible] لہجے میں نانا بھائی سے مخاطب ہوا۔ "کیا آپ مجھے ریکارڈ دکھا [illegible] ہیں؟"

نانا بھائی نے خندہ پیشانی سے اثبات میں سر ہلایا اور اپنی پشت [illegible] دیوار میں نصب الماری کھول کے فائلیں ٹٹولنے لگا۔ اُس نے چند [illegible] کی چھان بین کے بعد کاغذ ہمارے سامنے رکھ دیا۔ راج کرشنا نے [illegible] نوٹ کر لیا۔ دستخط دلاور خاں کے تھے مگر تحریر ابا جان کی تھی، وہی شکستہ تحریر۔

"شکریہ۔" راج کرشنا نے اُسے کاغذ واپس کرتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ [illegible] اِس پتے کی تصدیق کی تھی؟"

"میں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی، مجھے اُن کی بات پر اعتماد تھا۔ [illegible] اُن کی توہین ہوتی کہ میں اُن کے پتے کی تصدیق کرتا۔"

نانا بھائی نے کافی پلائے بغیر ہمیں اپنی دُکان سے نہیں جانے دیا۔ [illegible] نے چند گھونٹ لے کے کافی یوں ہی چھوڑ دی۔ نانا بھائی ہمیں گاڑی [illegible] رخصت کرنے آیا اور چلتے چلتے اُس نے اپنے رویّے کی کئی بار معافی [illegible] راج کرشنا نے ڈرائیور کو نانا بھائی سے حاصل کیے ہوئے پتے [illegible] کی ہدایت کی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنا وقت خراب کر رہا ہے۔ نام [illegible] ابا جان نے پتہ بھی غلط لکھوایا ہوگا مگر میں نے اُسے منع نہیں کیا۔ [illegible] دیر بعد ہم اُس چار منزلہ عمارت میں داخل ہو رہے تھے جس کا نام [illegible] نے اپنے پتے میں لکھوایا تھا۔ وہاں بھی وہی نتیجہ نکلا، اس نام کے [illegible] سے کوئی واقف ہی نہیں تھا، راج کرشنا نے حلیہ بیان کیا مگر [illegible] کے پتے والے فلیٹ نمبر میں دس سال سے ایک ہی خاندان رہ [illegible] راج کرشنا مایوس قدموں سے لوٹ آیا۔ مجھے کوئی خاص دُکھ نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ کھوئے ہوئے لوگ اتنی آسانی سے نہیں ملتے۔ ابا جان نے فہمیدہ کے غائب ہو جانے کے کچھ دنوں بعد ہی بمبئی شہر چھوڑ دیا تھا۔ نانا بھائی کی باتوں سے بھی اس کی تصدیق ہو گئی تھی وہ عرصے سے اُس کے پاس نہیں آئے تھے۔ اگر بمبئی میں ہوتے تو ضرورت کے وقت کسی اور جوہری کے پاس نہ جاتے۔ اب کسی اور شہر میں کسی نئے جوہری سے دوستی کر لی ہوگی مگر پوٹلی کب تک چلا ئیں گے۔ پوٹلی خالی ہو جائے گی تو کیا کریں گے، شاید پھر بھیک مانگیں گے۔ ایک لڑکی کو بالاخانے پر بھیج دیا تھا مگر ابھی چار اور باقی ہیں۔ دو بیٹے بھی ہیں۔ جیب تراشی اور نقب زنی کے فن میں ماہر ہو گئے ہوں گے۔ نہ باپ کو اُس کا خزانہ ملے گا، نہ بیٹے کو اس کا۔ دونوں خزانے کی تلاش میں تھے۔ ایک زر و جواہر کے خزانے کی، دوسرا ایک لڑکی کے خزانے کی۔ وہ کاغذات کی سیاہ لکیروں اور لفظوں میں اپنی قسمت ڈھونڈ رہے تھے اِدھر بیٹا اندھی گلیوں اور بازاروں کے چکر کاٹ رہا تھا۔

سب بے کار ہے، وہ خزانہ ہی کیا، جو آسانی سے مل جائے۔ موٹر سڑکوں پر بھاگ رہی تھی۔ میں شیشے کے پار لوگوں کے چہرے دیکھ رہا تھا۔ راج کرشنا کسی سوچ میں گم تھا، ابا جان اگر صحیح نام اور پتہ لکھوا دیتے تب بھی ملتے نہیں مگر وہی بات ہوتی جس کا چمپا کے آنے کے بعد مجھے خوف لاحق ہو گیا تھا۔ راج کرشنا مولوی اکرم کے پاس جاتا اور مولوی اکرم ساری کہانی بتا دیتے۔ موٹر دادر کے اُس ہوٹل کے سامنے ٹھہر گئی۔ جہاں میں اور چمپا ٹھہرے تھے۔ پھر ڈرائیور گیا اور ناکام واپس آگیا، ہوٹل والوں نے اُسے چمپا کا سامان نہیں دیا۔ مجھے گھبراہٹ ہوئی کہ کہیں راج کرشنا خود نہ اندر چلا جائے۔ ہوٹل والوں کو معلوم ہوگا کہ چمپا کس قماش کی عورت ہے۔ ہوٹل کے کئی بیرے بھی اُسے جانتے تھے۔ راج کرشنا کی زبانی چمپا بائی کا نام سُن کے وہ مسکرائیں گے اور لوگوں کو بتائیں گے کہ راج کرشنا صاحب اُس کا سامان ہوٹل سے لے گئے تھے۔ میں نے سوچا، میں اُتر کے جاؤں کیونکہ ہوٹل والے مجھے جانتے ہیں لیکن اگر انھوں نے منع کر دیا تو؟ کسی کو کسی کا سامان سپرد کر دینا ہوٹل کے اصول کے خلاف تھا۔ میں اسی کشمکش میں مبتلا تھا کہ راج کرشنا ایک دم موٹر سے اُتر کے ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ اُسے واپس ہونے میں چند ہی منٹ لگے۔ معلوم نہیں ہوٹل والوں نے اُس سے کیا کیا کہا سُنا اور کن نظروں سے دیکھا۔ میں نے اُس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی مگر مجھے ناکامی ہوئی۔ گھر کے قریب وہ اپنی نشست سے کھسک کے میرے نزدیک آگیا اور میرا ہاتھ دباتے ہوئے نرم لہجے میں بولا۔ "مجھے افسوس ہے۔" میں نے حیرت سے اُس کی جانب دیکھا کہ وہ کس بات کا افسوس کر رہا ہے۔ "گھبرانے کی بات نہیں۔" اُس نے مضبوط آواز میں کہا۔ "ہم اپنی کوشش جاری رکھیں گے لیکن شرط یہ ہے کہ تم اِسی ہمت کا ثبوت دیتے رہو۔"

میں اُس کا منہ تکنے لگا۔ اُس نے میری گردن ہلانی شروع کر دی۔ گھر آگیا تھا۔ ڈرائنگ روم میں چمپا موجود تھی۔ راج کرشنا چند قدم چلا اور ٹھٹک

کے رُک گیا۔"ظہیر! ہم کسی دوسرے گھر میں تو نہیں آ گئے؟" وہ ہنس کے بولا۔ چمپا نے اتنی سی دیر میں گھر کا نقشہ بدل دیا تھا۔ ہر چیز ترتیب اور سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ کرسیوں، صوفوں کے غلاف اور کھڑکیوں کے پردے بدلے ہوئے تھے۔ راج کرشنا نے ممنونیت کا اظہار کیا تو چمپا دوہری ہو گئی اور نظریں نیچی کر کے بدحواسی سے کہنے لگی "ٹیلی فون کی گھنٹی بار بار بجتی رہی کئی لوگ آپ کو پوچھ رہے تھے۔ میں نے بتا دیا تھا کہ آپ گھر پر نہیں ہیں۔"

راج کرشنا کا منہ بن گیا۔ جھنجلاہٹ سے اُس نے فون اُٹھایا اور نمبر ملانے لگا۔ فون پہ وہ انگریزی میں کسی سے مخاطب تھا "مجھے آج دفتر جانا چاہیے تھا۔" یہ منتانہ، اُس کے ساتھیوں اور اُس کے سرپرستوں، بائی کلّا کی کئی معزز شخصیتوں کی گرفتاری کا تیسرا دن تھا اور وہ چمپا کا شکریہ ادا کرنے اور میرا حال درست کرنے کی اُلجھن میں پڑا ہوا تھا۔ فون پہ اُس کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ کچھ اور گرفتاریاں عمل میں آئی ہیں اور شہر کے دوسرے علاقوں میں حفاظتی انتظامات سخت کر دیے گئے ہیں۔ راج کرشنا کے چہرے پر تشویش کی لکیریں بڑھتی گئیں اور اچانک اُس کی آواز بلند ہو گئی۔ وہ ہاتھ ملنے اور زانو پر گھونسے مارنے لگا "میں اس کی اجازت نہیں دوں گا" اُس نے طیش میں کہا "اس کے بجائے میں استعفا دینا زیادہ پسند کروں گا۔ تو پھر مجھے یہاں بلایا کیوں گیا ہے؟ نہیں۔ ایک بھی آدمی نہیں چھوڑا جائے گا منتانہ کے آدمیوں کو روم نمبر ۲ میں لے جاؤ اور جلد از جلد کارروائی مکمل کر کے انھیں عدالت میں پیش کر دو" کسی نے کچھ کہا ہو گا۔ راج کرشنا کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا اور اس نے چیخ کر انکار کیا پھر فون بند کر کے اُس نے فوراً دوسرا نمبر ملایا اور مخاطب کو ہدایت کی کہ وہ ملزموں کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے اُس سے ضرور رابطہ قائم کرے ورنہ وہ سیٹھ سے رابطہ قائم کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ اُس نے مختلف جگہوں پر یکے بعد دیگرے کئی فون کیے اور وہ بہت تھکا تھکا نظر آنے لگا۔ فون رکھنے کے بعد وہ کئی لمحوں تک سر جھکائے گم سُم بیٹھا رہا "مجھے جانا ہو گا" اُس نے بے قرار ہو کے خود سے سرگوشی کی۔ پھر شاید اُسے احساس ہوا کہ کمرے میں وہ تنہا نہیں ہے، ہم دونوں بھی موجود ہیں، اُس نے اضطراری حالت میں ہمیں دیکھا اور اپنے چہرے کا کھنچاؤ دُور کرنے کی کوشش کی "تم نے سُنا ظہیر!" وہ میرے پاس آ کر مسکرا کے بولا "کیا دلچسپ بات ہے پولیس پر زور ڈالا جا رہا ہے کہ وہ اُن معززین کو آزاد کر دے جنھیں برسوں ناجائز کرنسی اور منشیات کے ذخیرے وغیرہ کے سنگین جرم میں گرفتار کیا گیا تھا۔ کبھی کبھی تو بادشاہ بننے کو جی چاہتا ہے، اگر دباؤ کا یہی سلسلہ جاری رہا تو پولیس کا محکمہ کسی دن عملاً ختم ہو جائے گا یا کوئی دوسری حیثیت اختیار کر لے گا، بالکل اُلٹ کام کرے گا۔ اسے جرائم کی ڈھال اور پردے کے طور پہ استعمال کیا جائے گا۔"

میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

وہ کپڑے بدل کے باہر جانے کے لیے تیار تھا کہ چمپا نے دھیمے لہجے میں اُس سے پوچھا "کیا کھانا یہاں نہ کھائیے گا؟" راج کرشنا نے ارادہ ملتوی کر دیا اور مجھے ہدایت کی کہ کوئی فون آئے تو اب کے میں ریسیور اُٹھاؤں اور صاف منع کر دوں کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔ کھانے کے دوران میں اُس کی طبیعت کچھ خوش گوار ہو گئی۔ کھانا بھی بہت خوش ذائقہ تھا۔ چمپا نے اُس کی فرمائش کے مطابق نہایت لذیذ پکوان بنائے تھے "بس مرچیں کسی قدر تیز ہیں" وہ سُوں سُوں کرتے ہوئے بولا۔

"آیندہ خیال رکھوں گی" چمپا نے محتاط لہجے میں کہا۔

"نہیں اب کھانا پکانے کی تکلیف آپ نہیں کریں گی۔ باورچی کس لیے ہے، آپ تو آرام کیجیے اور شہر کی سیر کیجیے۔ جس چیز کی ضرورت ہو نوکر سے کہہ دیجیے۔"

"عورت گھر میں موجود ہو اور کھانا باورچی پکائے۔ یہ اچھا نہیں لگتا میں اس طرح مصروف بھی رہوں گی۔ کیا آپ کو پسند نہیں آیا؟"

"ارے نہیں" جلدی کی بنا پر نوالہ راج کرشنا کے منہ میں اٹک گیا "بہت زیادہ آیا۔ میں گزشتہ برسوں میں زیادہ تر سفر میں رہا ہوں۔ گھر کا کھانا کھائے ہوئے منہ ترس جاتا ہے۔ کھانا باورچی کے ہاتھ کا پکا ہوا ہو یا ہوٹل کا، برابر ہوتا ہے۔ عورت کے ہاتھ کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ ذرا سوچیے اگر آپ نے اس لذیذ کھانے کا، جو آج آپ نے تیار کیا ہے، ذکر بتا دیا تو پھر کہیں مزہ نہیں آئے گا۔"

چمپا کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہاں سے جلدی لوٹنے والی نہیں ہے اور اب تو اُس کا سامان بھی آ گیا تھا۔ اُس نے پورے گھر کا جائزہ لے کے انتظامات درست کرنے شروع کر دیے تھے۔ نوکروں کو حکم دے رہی تھی۔ نوکر اُس کے آگے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ راج کرشنا کھانے کے بعد دفتر چلا گیا تھا اور چمپا گھریلو کاموں میں اس طرح مصروف ہو گئی تھی جیسے یہ اُس کا گھر ہو۔ میں اپنے کمرے میں جا کے چھپ گیا۔ وہ شام کے وقت چائے کی کشتی لے کے کمرے میں آ گئی۔ اُس کے ساتھ زیادہ ضد بحث مناسب نہیں تھی۔ میں نے چپ چاپ چائے پی لی اور منہ پھیر کے لیٹ گیا "کیا طبیعت خراب ہے؟" اُس کا ہاتھ میری کلائی ٹٹولنے لگا۔ میں نے اُس کا ہاتھ لوٹ کے اُس کے منہ پر مارنے کا ارادہ کیا مگر میرا ہاتھ من بھر کا ہو گیا۔

"بس میں ٹھیک ہوں" میں نے کسمسا کے کہا۔

وہ چپ ہو گئی، پھر کچھ وقفے کے بعد بولی "رات تم کہہ رہے تھے کہ میں کل ہوٹل آؤں گا۔ کیا بات کرنا چاہتے تھے؟"

"اب اس کی ضرورت نہیں رہی" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"مجھے احساس تھا کہ تم بہت خفا ہو گے مگر مجھے بتاؤ، میں کیا کروں؟ میں تم سے کچھ کہہ رہا ہوں کیا؟"

"ہاں زبان سے کچھ نہیں کہہ رہے ہو لیکن میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں میرے کان سن رہے ہیں۔ یقین کرو میں چلی جاؤں گی مگر چند دن مجھے اپنے پاس رہنے دو۔"

"میں نے کب منع کیا ہے۔ میں منع کرنے والا ہوتا کون ہوں۔"

"میرے لیے تم سب کچھ ہو چاہے میں تمھارے لیے کچھ بھی نہ ہوں۔ میں تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں، تمھیں اپنی مری ہوئی بہن کی قسم۔ تم...."

"چپ رہو" میں اُٹھ کے بیٹھ گیا "خدارا، اب تو اُسے بھول جاؤ، بار بار اُس کا ذکر کر کے کیوں مجھے تنگ کرتی ہو۔ میں تمھارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔"

"میں ہر بات سُننے کے لیے تیار ہوں جو دل چاہے کہو، مجھے گالیاں دو، پیٹو، میری آنکھیں پھوڑ دو، مجھ پہ چھرے چلاؤ مگر میری ایک بات ضرور سُن لو۔ دیکھو یہاں سے میری وجہ سے مت جانا اور ہو سکے تو کبھی مت جانا۔ کرشنا جی تمھارا بہت خیال رکھتے ہیں۔"

"لحاظ و مروّت کا پتہ اُس وقت چلے گا جب انھیں معلوم ہو گا کہ میں کس بہن کا بھائی ہوں۔ بی بی جی! مجھے مشورے مت دو۔"

"یہ مشورہ نہیں ہے، التجا ہے" وہ آزردگی سے بولی "اور کرشنا جی پھوٹی آنکھوں اور کچے کانوں کے نہیں ہیں ورنہ پھر خیال رکھنا کیسے کہتے ہیں۔"

"ہاں ٹھیک ہے" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"تم سے بہت سی باتیں کرنی تھیں لیکن تمھیں اچانک یہاں دیکھ کے سب کچھ بھول گئی، جیسے جیسے یاد آتی رہیں گی کہتی رہوں گی اگر تم نے کچھ کہنے کا موقع دیا۔" اُس کی آواز بہت کمزور تھی، اندھی اور لولی آواز۔ میں مضطرب ہو گیا۔ وہ مجھ سے اور کیا بات کرنے والی تھی؟ وہ کیا باتیں ہو سکتی ہیں؟ میں نے سر اُٹھا کے دیکھا تو اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ مجھے اختلاج سا ہونے لگا، جی چاہا کہ اُس کے ساتھ مل کے میں بھی رونے لگوں۔ نمی کے مرنے سے نقصان تو اُس کا بھی ہوا تھا۔ اُس نے تو فہمیدہ کو زر کثیر دے کے خریدا تھا، میں نے تو اُس کا کوئی بھی حق ادا نہیں کیا تھا۔ میں اُس سے خدمت لیتا تھا، اُس پر غصّے ہوتا تھا۔ مجھے اپنے رویّے پہ ندامت ہونے لگی۔

"تم کیا باتیں کرنا چاہتی تھیں؟" میں نے خفیف لہجے میں پوچھا۔ اُس نے ممنونیت سے میری طرف دیکھا اور اُس کی بجھی ہوئی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی "پیارے میاں! یقین کرو میرا وہاں دل نہیں لگا۔ تمھارا چہرہ ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہتا تھا اور نمی یاد آیا" وہ ماتھے پر ہاتھ رکھ کے بولی "تمھارے جانے کے تیسرے دن موتیا کے پاس فیض آباد کا استاد جامو آیا تھا۔"

"جامو؟" میں اچھل کے بیٹھ گیا۔

"اُس کے ساتھ اور لوگ بھی تھے۔ انھوں نے بالاخانے پر بڑا ہنگامہ کیا، موتیا کو بہت مارا۔ موتیا کو بھی یہی معلوم تھا کہ میں تمھارے ساتھ میسور گئی ہوں۔ اُس نے صحیح صحیح بتا دیا تھا کہ تم بالاخانے آئے تھے اور مجھے ساتھ لے کے میسور گئے ہو لیکن اُسے یہی معلوم تھا۔ جامو نے موتیا سے میسور کا پتہ پوچھا مگر اُسے کچھ معلوم ہوتا تب بھی۔ وہ اُسے مارتے رہے۔ آگرے کے آدمیوں نے بھی اُن کا ساتھ دیا اور اس طرح بالاخانہ بند ہو گیا پھر میں پہنچی تو وہ آگرے ہی میں تھے اور شاید علاقے کے آدمیوں سے موتیا کی باتوں کی تصدیق کرتے پھر رہے تھے۔ اُنھوں نے مجھے بھی بہت مارا۔ میں نے سچ بتا دیا کہ میں تمھارے ساتھ میسور کے بجائے بمبئی گئی تھی۔ بمبئی میں تمھارے گھر والے اپنی لڑکی غائب ہو جانے کے بعد بدنامی کے ڈر سے چپ چاپ نے کہیں نکل گئے۔ تم نے مجھے آگرے واپس کر دیا اور خود نہ جانے کس طرف چلے گئے۔"

"کیا.... کیا تم نے سب کچھ بتا دیا؟ یہ بھی کہ اب میں بمبئی میں ہوں گا۔ تم نے کرشنا جی کے بارے میں بھی بتا دیا ہو گا؟" میں نے وحشت سے پوچھا۔

"نہیں، میں نے انھیں کرشنا جی کے متعلق کچھ نہیں بتایا، اُن کا ذکر میں کس طرح کر سکتی تھی۔ میں جو سچ بتا سکتی تھی، وہ بتا دیا۔ میں نے ابا، میں نے بچی کو گلا بے اور برا لاسے حال کیا تھا۔ وہ دونوں جیل میں تھے۔ ابھی تم نے اُن کے ایک ساتھی نور جانی کی منت کی کہ گا۔ بے اور لولا ت جیل میں ملنے کے لیے وہ کیا تھا کہ شاید تم خود جیل پہنچ گئے اور وہاں سے لے کر ... کر لیا جب تم واپس آئے تو تم نے مجھے آگرے لوٹنے کا حکم دیا۔ بس اتنی سی بات میں نے بتائی تھی۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ اب تم کہاں ہو گے۔ میں نے تمھاری حالت بتائی اور کہا کہ میں نے تمھیں اسٹیشن پر چھوڑا تھا، شاید تم کسی اور شہر کی طرف نکل گئے۔ میں انھیں بتانا نہیں چاہتی تھی کہ تم بمبئی میں ہو کیونکہ میں نے تمھیں اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ تم اُن کے ساتھ آئے ضرور تھے مگر تم اُن میں سے تھے نہیں۔ اور میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ تم اُن لوگوں میں واپس جاؤ اسی لیے میں خود تمھارے پاس آ گئی۔"

"مگر.... مگر انھیں یہ کیسے پتہ چلا کہ میں تمھارے پاس آ گیا ہوں گا یا تم بھاگ کے آگرے گئی ہو؟" میں نے حیرت سے پوچھا "میں نے تو کسی کو نہیں بتایا تھا۔"

"انھیں کسی نہ کسی طرح ضرور پتہ چل گیا ہو گا اسی لیے وہ سیدھے آگرے آ گئے۔ شاید تم بھول رہے ہو، تم نے کسی کو بتایا ہی ہو گا" وہ آہستگی سے بولی۔ "لیکن میرا خیال ہے وہ یہاں نہیں آئیں گے۔ یہ شہر بڑا ہے اور دُور بھی بہت ہے اور انھیں میری بات کا یقین بھی آ گیا تھا، جبھی تو وہ واپس چلے گئے۔"

میں دم بخود رہ گیا۔ مجھے سردی سی لگنے لگی۔ ایک ایک چہرہ نگاہوں میں گھوم گیا۔ میرے آنے کے بعد تجمل کی کیا حالت ہوئی ہو گی۔ اُس نے تو طوفان مچا دیا ہو گا۔ ایک ایک کو حاضر ہونے کا حکم دیا ہو گا کہ لاڈلا جہاں ملے اُسے پکڑ کے میرے پاس لاؤ ورنہ۔ جامو اور کپتن کے سر تجمل کے سامنے شرمندگی سے اُٹھتے نہ ہوں گے۔ زرّیں نے تو ضبط کر لیا ہو گا، میری واپسی اور عافیت کے لیے دعائیں کر رہی ہو گی اور تجمل اُسے تسلیاں دے رہا ہو گا کہ مجھے جلد ہی تلاش کر لیا جائے گا۔ اُدھر کلکتے میں تجمل کے اڈّے کا کاروبار اُس کی عدم موجودی میں چوپٹ پڑا ہو گا۔ موجد اس کے مرنے کے بعد وہاں اُس کے ہونے کی زیادہ سے زیادہ ضرورت تھی۔ وہ اِدھر اُدھر جہاں جہاں تک اُن کی پہنچ

ہو گی۔ مجھے ڈھونڈتے رہیں گے ممکن ہے نہ بھی ڈھونڈیں، تھک جائیں۔ مجھے یاد آیا میرے غائب ہو جانے کے بعد انھوں نے سیدھے نواب سراج علی کی حویلی کا رُخ کیا ہو گا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ چمپا باڑی کے پاس پہنچ گئے۔ نہ معلوم اُنھوں نے آگرے میں میرے بارے میں کیا کیا باتیں کی ہوں۔ چمپا کو پھر میرا نام لاڈلا بھی معلوم ہو گا۔ اُنھوں نے لاڈلے کے نام ہی سے مجھے پوچھا ہو گا۔ اگر چمپا کی زبان سے راج کرشنا کے سامنے کسی وقت لاڈلا نکل گیا تو اچھا نہیں ہو گا۔ میرا خُون رُک رُک کے گردش کرنے لگا اور رگوں میں مروڑ سی ہونے لگی۔

"میاں!" مجھے مبہوت دیکھ کے اُس نے سہمی ہوئی آواز میں مجھے پکارا۔ میں چونک پڑا۔ وہ کہہ رہی تھی: "میں اسی لیے تو تم سے بات کرتے ہوئے ڈرتی تھی کہ تمھیں پُرانی باتیں یاد آ جائیں گی مگر تمھیں یہ بتانا بھی ضروری تھا تاکہ تم بے خبر رہو۔ چھاؤں مل گئی ہے تو کہیں پھر دھوپ میں نہ نکل جاؤ۔"

میں نے اُسے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ پیالیاں اُٹھا کے کمرے سے نکل گئی۔ میرا سر بھیٹ رہا تھا۔ میں نے سوچا، میں چلا جاؤں۔ بہت دُور چلا جاؤں، جہاں کوئی نہ مجھے جانتا ہو، نہ لاڈلا سے واقف ہو، نہ قمی سے۔ نہ اسے یہ معلوم ہو کہ میں نے جیل کاٹی ہے اور نہ کوئی میرے ساتھ وہاں ہمدردی کرے۔ اب کبھی میں گونگا اور بہرا بن جاؤں گا اور جنگل میں نکل جاؤں گا، جہاں کوئی آدمی نہیں ہو گا اور ہو گا تو میں اُس سے بات ہی نہیں کروں گا۔ اب کوئی مجھے نہیں ملے گا۔ کوراکو ملنا ہو گا تو خود مجھے ڈھونڈتی ہوئی آ جائے گی۔ میں نے بہت ڈھونڈ لیا۔ اب میں کسی سنسان جگہ جا کے بس اُس کے خیال میں گُم رہوں گا اور دنیا کا کوئی شخص میری محویت میں رخنہ نہیں ڈالے گا۔ میں اپنی یادداشت سے اُس کا ایک مجسمہ بناؤں گا اور بس اُسے دیکھتا رہوں گا۔ کہیں کوئی آدمی نظر آیا تو میں وہ جگہ چھوڑ کے دوسری جگہ نکل جاؤں گا۔ میں اپنے سامنے کی دیوار پر اُس کی تصویر بناتا رہا۔

کسی نے کمرے کی بتی جلا کے میری آنکھیں چکا چوند کر دیں۔ راج کرشنا مجھے اُٹھا کے باہر لے آیا۔ اُس نے میرے شانے زور زور سے ہلا کے میری سُستی دُور کرنے کی کوشش کی۔ "جب میں تمھاری عمر میں تھا تو خبر ہے کیا کرتا تھا؟" وہ مستعد لہجے میں بولا۔ میں نے پٹ پٹاتی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔ "میں جاگتا، کھیلتا، گاتا، کھاتا اور دیواروں پر گھونسے مارتا رہتا تھا۔" وہ میری پیٹھ اور سینے پر گھونسے مارتے ہوئے بولا: "بالکل سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔ اٹین شن! بالکل پولیس والوں کی طرح، سینہ باہر نکالو، ہاں یہ بات، اب ٹھیک ہے۔ ایک جوان اور وجیہہ آدمی۔ پولیس کی وردی تم پر کتنی سجے گی۔" چمپا کھڑی مسکرا رہی تھی: "مجھے بہت بھوک لگی ہے چمپا دیوی!" وہ چمپا سے مخاطب ہو کے عاجزی سے بولا۔ چمپا جیسے منتظر کھڑی تھی، اِدھر اُس کے منہ سے بات نکلی، اُدھر وہ باورچی خانے کی طرف لپکی۔ "آج بہت کام کرنا پڑا۔ آخر جیت میری ہی ہوئی۔ میں نے کسی کی ضمانت نہیں ہونے دی۔" وہ انگڑائی لیتا ہوا

کرسی پر بیٹھ گیا۔ "اور ہاں — آج دفتر میں رستم جی کا فون آیا تھا۔ بلانا چاہتے تھے، کہہ رہے تھے، نورین بہت ضد کر رہی ہے۔ میں نے کہا ان دنوں مصروفیت ہے آپ کو پھر کسی دن بلاؤں گا۔ کہہ رہے تھے کہ کلب میں ہمارے آنے کے بعد لوگ ہمارا تذکرہ کرتے رہے۔ تمھارے بارے میں سب متجسس تھے۔"

اُس نے اتنی باتیں کہہ ڈالی تھیں مگر میری زبان سے ایک لفظ نہیں چھوٹا تھا۔ مجھے پھر شدت سے وہی احساس ہوا، اپنی بدتمیزی کا۔ اس احساس کی وجہ سے میرا جسم کسی مجرم کی طرح اپنے آپ کو چھپانے لگا۔ میں سوچتا رہا کہ مجھے کیا کہنا چاہیے۔ پھر میں نے سٹ پٹا کے پوچھا: "ٹریلر کا کیا ہوا؟"

"مستانہ!" اُس نے اچانک جیسے ایک نعرہ بلند کیا۔ "مستانہ حوالات میں مستی کر رہا ہے، ڈنڈے پر ناچ رہا ہے۔ لمبی سزا ہو گی یا شاید گلے میں ہار پڑ جائے۔ اُس کے گلے میں پڑا ہوا گیندے کا ہار بھی سُوکھ گیا ہے۔ بڑے عجیب انکشاف ہو رہے ہیں۔ آج اُسے میرے سامنے لایا گیا تھا۔ جناب دلچسپ آدمی ہے۔ بمبئی کی پولیس کا اُسے پہلی بار ذرا اجنبی انداز میں تجربہ ہوا، اس لیے بہت ناراض نظر آتا تھا۔ دیکھو گے اُسے؟"

"نہیں۔ میں نے اُسے بہت دیکھ لیا ہے۔"

"پولیس کے کئی نوجوان افسر جو میری عزت کرتے ہیں تم سے ملنے کے لیے بے چین تھے۔ میں نے انھیں ٹال دیا ہے۔ سب کو حیرانی ہے کہ ایک دم اچانک کرشنا جی نے یہ کیا جادو کر دیا۔"

کھانے کے بعد وہ مجھے اور چمپا کو موٹر میں بٹھا کے چوپاٹی لے گیا۔ میں اُس کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھا تھا، چمپا پچھلی نشست پر۔ ہم سمندر کے کنارے جا کے ریت پر بیٹھ گئے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ لہریں چنگھاڑتی ہوئی ہمارے پاؤں چھوتیں اور سمندر کی پہنائیوں میں گُم ہو جاتیں۔ راج کرشنا کہنے لگا: "آدمی بھی سمندر کی ایک لہر کے مانند ہے۔ اُٹھتا ہے، گرجتا ہے، کنارے پر آ کے ہانپنے لگتا ہے، زمین کو بوسہ دیتا ہے اور لوٹ جاتا ہے۔ پھر پرانی لہروں کے خمیر سے نئی لہریں اُٹھتی ہیں، مگر انجام لہر کا یہی ہوتا ہے۔" وہ میرے ساتھ کنارے کنارے دُور تک چلا گیا۔ چمپا بیٹھی رہی۔ راستے میں اُس نے پوچھا: "ظہیر خاں! تمھاری رائے میں میں کیسا آدمی ہوں؟"

میں اُس کے سوال پر حیران رہ گیا۔ "جی، آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" میں نے سراسیمگی سے پوچھا۔ مجھے ڈر لگا کہ چمپا نے ضرور اسے کچھ بتا دیا ہے۔

"نہیں، میں تمھاری رائے جاننا چاہتا ہوں، اچھی بُری جو کچھ بھی ہو، میں خفا نہ ہونے کا وعدہ کرتا ہوں۔"

"آ..... آپ کا کیا مطلب ہے؟" میں نے بدحواسی سے کہا۔

"میرا مطلب صاف ہے؟"

"مگر کیوں؟ آپ کو اس کی کیوں ضرورت پڑ گئی؟"

"مجھے اپنے آپ پر شبہ ہونے لگا ہے۔"

"نہیں،" میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔ "شبہ نکال دیجیے۔"

وہ چلتے چلتے ٹھہر گیا۔ "ظہیر! مجھے تمھارا جواب معلوم ہے۔ تم مجھے بھروسے کے قابل آدمی سمجھتے ہو تو پھر مجھ پر بھروسا کرو۔ ممکن ہے تمھاری سمجھ میں کوئی بات نہ آ رہی ہو۔ ایسا ہے تو میری عقل پر انحصار کرو۔ اپنا ہر کام آدمی خود نہیں کر سکتا، اُسے دوسروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ میں تمھارے لیے اچھا ہی سوچ سکتا ہوں اور مجھے ایسا کرنے کا موقع دو۔"

"مگر میں..... میں تو آپ کے پاس ہی موجود ہوں۔"

"لیکن کہاں؟" وہ مایوسی سے بولا۔ "تم تو علیحدہ رہتے ہو۔"

"میں ایسا نہیں چاہتا لیکن نہ جانے مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو جائے تو مجھے معاف کر دیا کیجیے۔ مجھے اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا۔"

"میں جانتا ہوں لیکن جب ایسا ہو تو خود کو دوسروں کے قابو میں دے دینا چاہیے، تجربہ کر کے دیکھ لو، اگر کوئی فرق نہ پڑا تو دوسرے خود ندامت سے پیچھے ہٹ جائیں گے۔ پھر وہ تمھیں کچھ نہیں کہیں گے۔"

"جی۔" میں نے ہلکی آواز میں کہا۔

ہم آہستہ آہستہ چلتے ہوئے چمپا تک پہنچ گئے۔ اُس نے بال کھول رکھے تھے۔ سمندر کی ہوا سے اُس کے بال اُڑ رہے تھے، جب ہم گھر واپس آئے تو رات ہو چکی تھی۔ میں منع کرتا رہا مگر چمپا میرا سر دباتی رہی تو میری آنکھ لگ گئی۔

☎

دوسرے دن سہ پہر راج کرشنا دفتر سے واپس آیا تو اُس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی بھی تھی۔ اُس کا رنگ صندلیں تھا، نقش و نگار سجل اور ایسے تھے جیسے اُنھیں ڈھالا گیا ہو۔ شکل و صورت سے وہ بہت سنجیدہ اور باوقار نظر آتی تھی حالانکہ اُس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ آنکھیں سیاہ اور روشن، بال بھورے اور بہت لمبے تھے۔ ایک سادہ سی ساڑھی پہنے ہوئی تھی۔ مجموعی طور پر وہ ایک بہت اچھی لڑکی تھی۔ "یہ مس جولین ہیں۔" اُس نے شائستہ لہجے میں کہا۔ "اِنھوں نے کم عمری ہی میں اچھا خاصا پڑھ لکھ لیا ہے اور اب میں نے اِنھیں زحمت دی ہے کہ یہ اپنے علم سے کچھ تمھیں بھی فائدہ پہنچائیں۔ اس لیے یہ تمھیں انگریزی پڑھائیں گی۔ مس جولین! یہ ظہیر ہے، مجھے یقین ہے یہ آپ کے لیے ایک اچھا شاگرد ثابت ہو گا۔ بزرگوں کا قول ہے کہ زبان سیکھنی ہو تو عورت سے سیکھی جاتی ہے۔"

"مگر میں..... میں" میرے حلق میں لفظ پھنس گئے۔

"مگر کیا؟ یعنی کیا تم پڑھنا نہیں چاہتے؟ علم کے سامنے آدمی کی حیثیت ایک بچے جیسی ہوتی ہے اور ایک سعادت مند بچے ہی کی طرح اس سے پیش آنا چاہیے۔"

"علم کے لیے عمر مقرر نہیں ہوتی۔" پہلی بار جولین اپنی کھنکتی ہوئی آواز میں بولی۔ "تاکہ اگر آپ نے محنت کی تو صرف چند مہینوں میں آپ بہت سے سال کراس کر لیں گے۔"

"بس اب اِدھر اُدھر کی کوئی بات نہیں۔" راج کرشنا نے فیصلہ کُن انداز میں کہا۔ "مس جولین! آپ اپنے شاگرد کو لے کے دائیں جانب کے کمرے میں چلی جائیے۔"

"آئیے۔" جولین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آئیے۔"

"جاؤ۔" راج کرشنا نے میرا تذبذب دیکھ کے مجھے ڈانٹا۔

میں بھاری قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ کئی بار ارادہ کیا کہ کہوں اس کی ضرورت نہیں ہے مگر بات زبان تک آ آ کے رہ گئی۔ مس جولین راج کرشنا کے کمرے میں آ گئی اور ہم دونوں میز کے گرد آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ "یہ بتائیے کہ آپ نے پہلے کتنا پڑھا ہے اور کیا پڑھا ہے؟"

"کچھ نہیں، میں نے کچھ نہیں پڑھا۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"کچھ نہیں؟" اُس کی آنکھوں میں حیرت بھر گئی۔ "یعنی آپ نے بالکل نہیں پڑھا؟ کچھ بھی نہیں؟ آپ حروف نہیں پہچانتے؟"

"تھوڑے بہت۔" میں نے تلخی سے کہا۔

اُس نے سکون سے سادہ کاغذ کا ایک پیڈ اُٹھایا اور پنسل آگے کر دی۔ "ذرا اپنا نام لکھیے۔" میں جھجکنے لگا۔ وہ پلکیں جھپکاتی ہوئی بولی: "گھبرائیے نہیں، جیسا کچھ بھی آپ جانتے ہیں، لکھ دیجیے۔ بہت خراب لکھ دیجیے۔" میں نے اُلٹے سیدھے لفظوں میں 'ظہیر خاں' لکھ دیا۔ اُس نے بڑے غور سے میری تحریر کا معائنہ کیا۔ "ہوں نہہ۔" وہ فکرمندی سے بولی: "ابتدا سے کام کرنا پڑے گا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میں کل آپ کے لیے کاپیوں اور کتابوں کا سیٹ لے آؤں گی۔ دیکھیے، ساری بات شوق کی ہے۔ شوق نہیں ہو گا تو میں کیا، کوئی بھی آپ کو کچھ نہیں سکھا سکے گا۔ بس اپنے اندر شوق پیدا کیجیے اور یہ خیال دل سے نکال دیجیے کہ آپ اب تک کچھ نہیں پڑھ سکے۔ لوگ پڑھ کے بھی تو بھول جاتے ہیں۔ آپ کو جو بھی پریشانی ہو، مجھ سے فوراً پوچھ لیجیے۔" وہ مجھے سمجھاتی رہی۔ میں منہ لٹکائے سُنتا رہا اور سوچتا رہا کہ کیا کروں؟ راج کرشنا کو کس طرح سمجھاؤں؟ اتنی اچھی لڑکی کو پڑھانے کے لیے مامور کرنے پر اُس نے کتنا روپیہ خرچ کیا ہو گا؟ بالکل فضول۔ مس جولین نہ جانے کہاں رہتی ہو گی، روز تھک جایا کرے گی۔ میں نے طے کیا، میں راج کرشنا کو منع کر دوں گا کہ میں پڑھنا ہی نہیں چاہتا۔ میں کچھ نہیں چاہتا مگر پھر وہ بہت ناراض ہو گا۔ میں اسی کشمکش میں تھا کہ جولین نے اپنی شستہ اور مہذب آواز میں مجھے پکارا۔ "مسٹر ظہیر! کیا آپ میری باتیں توجہ سے سُن رہے ہیں؟"

"جی۔" میں نے بڑبڑا کے کہا۔ "جی سُن رہا ہوں۔"

"صرف سُننا نہیں، سُن کے دماغ میں کھپانا بھی ہے۔"

"جی" میں نے چُستی سے کہا۔

"آپ صحت مند آدمی ہیں، نوجوان ہیں۔ بس صرف ایک چیز کی کمی ہے آپ میں۔ جب یہ کمی دُور ہو جائے گی تو دیکھیے کیسی تبدیلی آئے گی۔ لوگ ہر جانب سے آپ کے قریب ہونے کی کوشش کیا کریں گے۔ آپ کی بات میں وزن پیدا ہو جائے گا۔ لوگ آپ سے مشورے لیا کریں گے۔ آپ کی عزت میں کئی گنا اضافہ ہو جائے گا۔ بڑے بڑے لوگوں سے آپ کے تعلقات ہوں گے۔ بس یہ سب آپ پر منحصر ہے کہ آپ اپنی یہ کمی کتنی تیزی سے دُور کرتے ہیں۔ میں آپ کے شوق میں ہر لمحے، ہر قدم پر آپ کا ساتھ دیتی رہوں گی۔"

مس جولین اُس دن جلد واپس چلی گئی۔ میں دن بھر راج کرشنا سے بات کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ حالانکہ رات کو وہ مجھے گھمانے بھی لے گیا، ممپا بھی ساتھ نہیں تھی مگر راج کرشنا نے اپنی طرف سے جولین کا کوئی تذکرہ ہی نہیں کیا۔ وہ مجھے دن بھر کی روداد سناتا رہا کہ متانہ کو جیل میں منتقل کر دیا گیا ہے اور دو ایک روز میں اُن شہریوں کو بھی منتقل کر دیا جائے گا جو متانہ کے ساتھ گرفتار کیے گئے تھے، راج کرشنا اس بات پر بہت خوش تھا کہ گزشتہ دو دنوں کے اندر شہر کے جرائم میں حیرت انگیز کمی واقع ہو گئی ہے۔

دوسرے دن جولین کتابوں سے لدی پھندی آئی۔ سب ابتدائی کتابیں تھیں۔ وہ اُس نے میرے سامنے رکھ دیں پھر ایک ایک حرف بہت انہماک سے مجھے شناخت کراتی رہی۔ حرفوں سے لفظ بنانا، لفظوں کے معنی۔ سی اے ٹی کیٹ کیٹ معنی بلی، آر اے ٹی ریٹ ریٹ معنی چوہا۔ مجھے اُلجھن ہونے لگی۔ ایک مرتبہ جی میں آئی کہ اُسے پوری کتاب سُنا کے مطمئن کر دوں تاکہ وہ آرام سے اپنے گھر چلی جائے اور روز روز آنے کی تکلیف سے بچ جائے مگر میں یہ نہ کر سکا۔ سبق پڑھانے کے بعد وہ باتیں کرنے لگی۔ اُس کی باتوں کا انداز بہت دل کش تھا۔ باتیں کرتے ہوئے اُس کی پلکیں تھرکتی رہتی تھیں اور پتلیاں تیزی سے حرکت کرتی تھیں۔ باتیں کرتے کرتے دفعتہً وہ پوچھنے لگی "آپ کو موسیقی سے دلچسپی ہے؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ خوابیدہ لہجے میں کہنے لگی "اچھا ہوا کہ آپ نے ہاں کہہ دیا ورنہ میں بہت اداس ہوتی۔ جسے موسیقی کی تمیز نہ ہو، وہ مجھے ادھورا آدمی لگتا ہے۔ میں سوچتی ہوں سنگیت نہ ہوتا تو دنیا کیسی ہوتی۔"

"آپ گانا جانتی ہیں؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ہاں تھوڑا بہت آتا ہے، اور آپ کو؟"

"مجھے بالکل نہیں آتا لیکن مجھے بہت اچھا لگتا ہے، میرا ایک دوست تھا شمولی۔ وہ ستار خوب بجاتا تھا۔ اور بھی لوگ تھے۔ میں تو سنتا رہتا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ خود گانے کی بہ نسبت گانا سننا اور لطف اٹھانا زیادہ سچی بات ہے۔"

"وہ کیسے؟" وہ تجسس سے بولی۔

"وہ ایسے کہ بنیادی طور پر گانا گانے اور سننے والے دونوں میں موسیقی کا جذبہ ہوتا ہے مگر گانا گانے والا آدمی کسی نہ کسی قدر پابند ہو جاتا ہے جب کہ سننے والا اس پابندی سے آزاد ہوتا ہے۔ گانے والے کو ریاضت کرنی پڑتی ہے اور گانے کے آداب کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اب آپ خود ہی بتائیے کہ کون زیادہ سچا ہو سکتا ہے؟ کان گانے کے آداب سے نا آشنا ہوتے ہیں اور وہی سننا چاہتے ہیں جس میں رس ہو۔ گانے والا کچھ پیدا کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے اور جہاں کوشش اور ارادہ شامل ہو وہاں۔۔۔" میں فوراً سنبھل کے چپ ہو گیا۔ جولین مجھے تک رہی تھی۔

"کہیے نا۔ بات پوری کیجیے۔" وہ بے چینی سے بولی۔

"بات ختم ہو گئی۔ مجھے خیال آ گیا، میں اوٹ پٹانگ باتیں کر رہا ہوں۔"

"آپ نے بڑی عجیب بات کہی۔" وہ جوشیلے لہجے میں بولی "ڈیڈی جی آپ کے بارے میں سچ کہتے تھے۔"

"وہ کیا کہتے تھے؟" میں نے گھبرا کے پوچھا۔

"وہ کہتے تھے کہ ظہیر تمہارے لیے ایک دل چسپ شاگرد ثابت ہوگا۔ تم ایک تجربہ کرو گی۔ وہ اپنے دل میں آپ کے لیے بہت ارمان رکھتے ہیں۔ آپ کو ہر لحاظ سے ایک مکمل نوجوان دیکھنا چاہتے ہیں۔"

جولین اُس دن زیادہ دیر تک ٹھہری رہی۔ ممپا نے اُس کی بڑی خاطر کی۔ وہ دونوں بنگلے کے مختصر لان میں بیٹھی ہوئی باتیں کرتی رہیں۔ وہ ابھی گئی نہیں تھی کہ راج کرشنا آ گیا۔ اُس نے ڈرائیور کو ہدایت کی کہ وہ جولین کو اُس کے گھر پہنچا آئے۔ جب وہ کپڑے بدل کے اور چائے پی کے اطمینان سے بیٹھا تو میں نے ہمت کر کے کہا "میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔" وہ اُچھل سا پڑا اور ایک دم سنجیدہ ہو کے بولا "کہو"

"میں مس جولین کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے جھجکتے جھجکتے کہا۔ اُس نے سر ہلایا تو مجھے کچھ اور کہنے کا حوصلہ ہوا "آپ پیسے کیوں ضائع کر رہے ہیں؟"

"کیا مطلب؟" وہ ترشی سے بولا۔

"مطلب یہ کہ" میں نے تیزی سے کہا "میرا دل پڑھنے میں نہیں لگتا۔ اُن کا وقت خراب ہوگا اور آپ کا پیسہ۔ آپ انھیں منع کر دیجیے۔ جب میرا جی چاہے گا، میں آپ سے خود کہہ دوں گا۔"

وہ ہنسنے لگا "پڑھنے میں کس کا جی لگتا ہے۔ جی لگانے کی کوشش کرنی پڑتی ہے۔ کوشش کرو۔ مس جولین کی باتیں بھی بہت مفید ہوتی ہیں۔ تم کم کرو، سنا زیادہ کرو اور پیسے ویسے کا خوف چھوڑ دو۔ آئندہ ایسی بات منہ سے مت نکالنا۔"

"مگر سب بے سود ہے۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔

"تعلیم کبھی بے سود نہیں ہوتی۔" وہ سخت لہجے میں بولا "میری بات سہی مگر تم تھوڑی دیر کے لیے یہ صبر ضرور کر لیا کرو۔ مس جولین بہت اچھی لڑکی ہے۔"

"میں کب کہہ رہا ہوں کہ وہ بُری ہیں۔"

"دیکھو ظہیر! تمہیں اُن سے پڑھنا ہے۔ یہ میرا حکم ہے۔ بس میں اور کچھ سننا نہیں چاہتا۔" اُس نے تند و تیز لہجے میں کہا۔

مس جولین تیسرے دن بھی آئی، چوتھے دن بھی، پانچویں دن بھی اور کتابوں میں کم باتوں میں زیادہ وقت صرف کرتی رہی۔ اُس نے طرح طرح کی باتیں کیں۔ اُس کا لہجہ شیریں اور انداز نفیس تھا۔ روز نیا لباس بدل کے آتی تھی، صاف ستھرا، گو وہ بہت بھڑکیلا اور شوخ نہیں ہوتا تھا۔ اُس کی باتوں کی طرح نکھرا ہوا، صاف اور اُجلا ہوتا تھا۔ میں نے راج کرشنا کی ہدایت پر حرف بہ حرف عمل کیا۔ جس وقت وہ آتی، میں کمرے میں چلا جاتا اور کتابیں کھول کے بیٹھ جاتا، اُسے کل کا سبق سناتا، کاپی دکھاتا۔ وہ اُس پر گڈ لکھتی، شاباش دیتی اور نیا سبق پڑھاتی۔ یہ تماشا کرتے ہوئے مجھ پر جب اُداسی غالب آ جاتی تو وہ باتیں کرنے لگتی۔ میرے کان اُس کی باتوں کے عادی ہوتے جا رہے تھے۔ میری زبان سے کوئی جملہ نکل جاتا تو وہ اسی جملے کے موضوع پر گفتگو کرنے لگتی۔ چھٹے دن وہ کچھ گھبرائی گھبرائی سی تھی۔ میں نے پوچھا "مس! کیا بات ہے؟ آج آپ کچھ فکر مند نظر آتی ہیں؟"

کچھ تذبذب کے بعد وہ بولی "ہاں ظہیر! میرے باپ بہت بیمار ہیں۔"

"کیا ہو گیا انھیں؟" میں نے افسردگی سے پوچھا۔

"انھیں دق ہے۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"دق ہے؟ سنا ہے یہ تو بہت بُرا مرض ہوتا ہے؟"

"ہاں! بہت بُرا ہوتا ہے اور وہ اپنی بیماری کے آخری درجے میں ہیں۔ اُن کا سینہ کھوکھلا ہو چکا ہے۔ اب وہ زندہ نہیں رہیں گے۔"

"کیوں نہیں رہیں گے۔ آپ کو ایسی بات نہیں کرنی چاہیے۔ اُن کا علاج نہیں ہو رہا ہے کیا؟ اور آپ انھیں بیماری میں چھوڑ کے یہاں کیوں آ گئیں؟ آپ کو اُن کی تیمارداری کرنی چاہیے تھی۔"

"میں اُن کی تیمارداری اور علاج کرتے کرتے تھک گئی ہوں۔ شاید ایسی کوئی دوا ہی نہیں بنی جو میرے ڈیڈی کو شفا دے سکے۔" اُس کی آواز پھٹنے لگی۔

"یہ تو آپ نے بہت بری خبر سنائی۔ آپ کہتی تھیں کہ آپ اپنے ماں باپ کی اکلوتی لڑکی ہیں۔ آپ کو تو اُن کے پاس رہنا چاہیے۔ کل سے آپ نہ آئیے گا اور میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیے۔ میں کرشنا جی سے کہوں گا، وہ کسی بہت بڑے ڈاکٹر کو جانتے ہوں گے۔"

اُس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو لرزنے لگے "کرشنا جی سے کچھ مت کہیے گا۔ میں ہر بڑے ڈاکٹر کو دکھا چکی ہوں اور یہاں آنے میں کل دو ڈھائی گھنٹے ہی تو لگتے ہیں، اس طرح کچھ دیر کے لیے مجھے اُس ماحول سے دور رہنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اچھا اب آپ اپنا کام کیجیے۔" اُس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "آپ نے کتنا یاد کیا؟" اُس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

میں نے کتاب بند کر دی "نہیں مس! اب پڑھائی نہیں ہوگی۔ اب آپ جا کے اپنے باپ کو دیکھیے۔ ممکن ہے، وہ آپ کو پکار رہے ہوں۔"

"میں اسی لیے آپ سے نہیں کہہ رہی تھی۔ نہیں، میں اپنا وقت پورا کر کے جاؤں گی۔ وہ ٹھیک ہی ہوں گے۔ چلیے آپ شروع کیجیے۔"

وہ نہیں مانی۔ میں نے اس دن جلدی جلدی سبق پڑھ لیا اور اُس کی کسی بات پر بحث نہیں کی لیکن اُس نے اُسی وقت اُٹھنے کا ارادہ کیا جب شام ہونے لگی۔ میں نے کہا "مس! آپ کے ساتھ میں بھی آپ کے ڈیڈی کو دیکھنے چلتا ہوں۔"

"نہیں، وہاں آپ کا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ ہم بھی بہت احتیاط کرتے ہیں، وہ دق کے مریض ہیں۔" میں نے بہت اصرار کیا تو وہ کسی اور دن ساتھ لے چلنے کا کہہ کے چلی گئی۔

رات کو راج کرشنا مجھے کلب لے گیا۔ وہاں بہت سے لوگ ہمارے اِردگرد اکٹھے ہو گئے۔ اُن دنوں اخبارات میں روزانہ کلب کے علاقے میں پڑنے والے چھاپوں کے متعلق کچھ نہ کچھ چھپتا رہتا تھا اور ہر خبر کے ساتھ راج کرشنا کا نام بھی آتا تھا۔ میں بھی روز بہت توجہ سے اخبار دیکھتا تھا کیونکہ گھر آنے والے فونوں پر راج کرشنا کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ بمبئی پولیس کے پرانے افسر اُس سے خوش نہیں ہیں۔ وہ تو اخبارات نے حکومت پر زور ڈالا کہ مجرموں کے ساتھ کوئی رعایت کی گئی تو لوگ پولیس کو کبھی معاف نہیں کریں گے۔ معلوم نہیں اخبار والوں کو کیسے پتہ چل گیا تھا کہ چند با اثر لوگ راج کرشنا کو نرمی اختیار کرنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ بمبئی کے ایک رئیس گوپال داس نے حوالات میں خودکشی کر لی تھی اور باقی معزز لوگ جیل بھیج دیے گئے تھے۔

اُس رات کلب میں ہر شخص راج کرشنا کے قریب رہنے اور اُس کی زبانی کوئی نہ کوئی بات سننے کی فکر میں تھا۔ نورین بھی اپنے ماں باپ کے ساتھ تھوڑی دیر بعد آ گئی اور مجھے دیکھ کے تقریباً بھاگتی ہوئی سیدھی میرے پاس آئی۔ اُس نے نیلی اسکرٹ پہن رکھی تھی "ارے آپ؟ آج آپ کیسے آ گئے؟" وہ حیرت سے بولی۔

"جیسے آپ آ گئیں۔" میرے منہ سے نکل گیا۔

"ہم تو روز آتے ہیں۔ میں روزانہ سوچتی تھی کہ شاید آپ آج آ جائیں، آج آ جائیں۔ مجھے آپ سے شکایت ہے۔" وہ ناراضی سے بولی "آپ نے ہم لوگوں کو اپنے گھر نہیں آنے دیا۔"

"کرشنا جی کہہ رہے تھے کہ وہ کسی دن آپ کو بلائیں گے۔"

"دیکھیے، وہ دن کب آتا ہے، اچھا یہ بتائیے۔ ابھی آپ نے اپنے گھر جانے کا پروگرام تو نہیں بنایا؟" وہ میز پر جھکتی ہوئی بولی۔

"ابھی تو ایسا کوئی پروگرام نہیں ہے۔"

"پھر ٹھیک ہے، ہمارا جہاز آنے ہی والا ہے، اب کے ہم نے سوچا ہے کہ بہت سے لوگوں کے ساتھ بہت دُور سمندر میں نکل جائیں گے اور کئی دن بعد واپس آئیں گے۔ آپ ہوں گے تو اور مزہ رہے گا۔ جہاز بھی ایک طرح کا کلب بن جائے گا۔ ہم عرشے پر بیٹھ کے خوب باتیں کریں گے۔ اتنا

بڑا وقت پڑا ہوگا۔ چلیں گے نا؟"

"جی، مگر کرشنا جی...."

"کرشنا جی کیسے نہیں جائیں گے، اُن کے ہاتھوں میں ہم ہتھکڑی ڈال کے لے جائیں گے۔ وہ دوسروں کو بہت ہتھکڑیاں لگاتے ہیں۔ وہ بھلا اتنی اچھی سیر نہیں کریں گے؟ اتنا کام کرنے کے بعد انھیں کچھ آرام ملنا چاہیے۔"

ہم جب تک کلب میں موجود رہے، وہ میرے ہی پاس بیٹھی رہی اور مجھے مس جولین کا خیال آتا رہا۔ کاش اُس کا باپ ٹھیک ہو۔ راج کرشنا لوگوں کے درمیان گھرا رہا۔ پھر جب ناچ شروع ہوا تو وہ مسز روپ پٹیل کے ساتھ ناچنے لگا اور نورین ناچ کی دھن پر اپنے پاؤں تھرکاتی رہی اور مجھے مجبور کرتی رہی کہ میں بھی اُس کے ساتھ راج کرشنا اور دوسرے لوگوں کی طرح ناچوں۔ میں نے صاف کہہ دیا: "مجھے ناچ نہیں آتا۔"

"میں آپ کو ناچ سکھاؤں گی۔" وہ مچلتی ہوئی بولی: "دیکھ لیجیے، پھر آپ کو ایک عجیب لطف آئے گا، آپ بے خود ہو جائیں گے، جیسے آپ نے کوئی نشیلی چیز پی لی ہو۔"

نورین اور میں تنہا ایک بڑی میز کے گرد بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر میں کئی لڑکیاں اور عورتیں بھی آ کے وہاں بیٹھ گئیں۔ مجھے حبس محسوس ہونے لگا۔ میں نے اُٹھنے کا ارادہ کیا مگر نورین نے میز کے نیچے میرے گھٹنے پر ٹھوکا مارا اور اپنا پیر میرے پیر پر رکھ دیا۔ میں سمجھ گیا کہ اُن کے آنے کے بعد اس طرح اچانک اُٹھنا بدتہذیبی ہے۔ اُن سب کی نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں اور وہ سب مسکرا رہی تھیں۔ تب مجھے ان کی مسکراہٹ زہر لگی۔ اسی اثنا میں ناچ ختم ہو گیا اور راج کرشنا مسز روپ پٹیل کے ساتھ ہماری میز پر آ گیا۔ سب کھڑے ہو گئے اور اس افراتفری میں مجھے راج کرشنا کے قریب پہنچنے کا موقع مل گیا۔ پھر میں، نورین، راج کرشنا اور مسز روپ چاروں ایک دوسری میز پر بیٹھ گئے۔ مسز روپ کے گلے میں وہی ہار لٹک رہا تھا۔ کورا کی امانت، جس کا ابا جان نے خیال نہیں کیا۔ میری نظریں اُس کے گلے سے نہیں ہٹ رہی تھیں اور میرا دل بیٹھنے لگا تھا۔ اِس دوران میں نورین نے جو باتیں کیں، وہ میں نے نہیں سنیں۔ میں اس فکر میں تھا کہ مسز روپ پٹیل کے گلے سے یہ ہار کس طرح چھینوں۔ کہ اسی وقت راج کرشنا میرے کان میں چپکے سے بولا: "چلیں؟"

"ہاں چلیں۔" میں نے دفعتہً اُٹھتے ہوئے کہا۔

سب ہمیں رشک سے دیکھتے رہے۔ نورین پہلے کی طرح کلب کی عمارت کے خاص دروازے تک ہمیں پہنچانے آئی۔ اس بار اُس کے ساتھ کلب کے بہت سے مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ راج کرشنا نے باری باری سب سے مصافحہ کیا اور سب کا شکریہ ادا کیا۔ سب واپس ہو گئے مگر نورین واپس نہیں گئی۔ وہ ہمارے ساتھ دروازے سے باہر آ گئی اور اُس نے اُس وقت تک راج کرشنا کو آگے نہیں بڑھنے دیا جب تک اپنے گھر آنے کا وعدہ نہ لے لیا۔

عمارت سے باہر نکل کے ہم کلب کے وسیع سبزہ زار میں آ گئے۔ وہ دور لان اور درختوں کے پرلی طرف پختہ فرش پر گاڑیاں کھڑی تھیں۔ جسے کلب سے جانا ہوتا، وہ دربان کے ذریعے موٹر پورٹیکو میں طلب کر لیتا۔ ہم نے دربان کو یہ زحمت نہیں دی کیونکہ ہمارے ساتھ ڈرائیور ہی نہیں تھا۔ باہر آ کے میں نے گہری گہری سانسیں لیں۔ سبزے پر چاندنی سو رہی تھی اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اونچے اور گھنے درختوں کے نیچے کہیں کہیں گہرا اندھیرا تھا۔ ہوا نرم اور ٹھنڈی تھی۔ سوئمنگ پول کا پانی دور سے چمک رہا تھا۔ اتنا اچھا موسم اور منظر چھوڑ کے یہ لوگ عمارت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میرا جی چاہا میں یہیں سبزے پر لیٹ جاؤں۔ ہم آہستہ قدموں سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ابھی ہم درمیان ہی میں تھے اور ایک درخت کے سائے میں گزر رہے تھے کہ مجھے کچھ آہٹ ہوئی۔ میں نے چونک کے اِدھر اُدھر نظر ڈالی مگر چونکنے کی مہلت بھی نہ ملی۔ ایک سایہ بجلی کی طرح درخت کی اوٹ سے نکلا اور راج کرشنا پر جھپٹا۔ میں نے اچانک راج کرشنا کو زور سے دھکا دے دیا۔ وہ شخص جھونک میں کچھ آگے بڑھا مگر ایک لمحے میں پلٹ کے مجھ پر لپکا۔ میں اچھل کے کچھ پیچھے ہٹ گیا اور میں نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا لیے اور کسی تو مشق کی طرح اِدھر اُدھر تھرکنا شروع کر دیا۔ اُس نے کچھ سوچے سمجھے بغیر مجھ پر حملہ کر دیا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو چاقو اُس کے شانے اور سینے پر کئی انچ کی لکیر کھینچتا ہوا گزر جاتا مگر اُس کا ہاتھ جیسے ہی اُٹھا، میں نے پھرتی سے بائیں جانب سمٹ کے اُسے اپنے پنجے کے قبضے میں لے لیا۔ یہ لمحہ ایسا ہی تھا کہ وہ مجھے چاقو بازی سے نابلد کوئی شخص سمجھے اور سیدھا براہِ راست وار کرے۔ میرا تاثر کامیاب رہا۔ اُس نے کسی تردد کے بغیر پوری توقع سے حملہ کیا، اُدھر اُسے راج کرشنا کے اُٹھ جانے اور شور مچانے کا خطرہ ہوگا، اِدھر وہ میری غیر متوقع مزاحمت سے بوکھلا گیا ہوگا۔ جو کچھ اُسے کرنا تھا، جلدی کرنا تھا۔ اس کے نتیجے میں اُس کی کلائی میرے پنجے کی گرفت میں تھی اور وہ اسے آزاد کرانے کے لیے پوری جدوجہد کر رہا تھا۔ اُس نے کئی پینترے بدلے۔ میں نے اپنا دوسرا ہاتھ آزاد کر رکھا تھا اور اُس کے پیٹ پر مسلسل ضربیں لگا رہا تھا۔ وہ اپنے دوسرے ہاتھ سے میرے چہرے پر مکے مار کے میرا ارتکاز ختم کرنے اور مجھے بدحواس کرنے کی فکر میں تھا تاکہ چاقو چھڑا سکے۔ اُس نے میرے چہرے پر لگاتار مکے مارے۔ شاید میری بھنویں پھٹ گئی، مگر میں نے اُس کا پیٹ اُدھیڑ ڈالنے کی کوشش جاری رکھی۔ اُس نے اپنا جسم کسی قدر پیچھے کر لیا تھا چنانچہ میری ضربیں پھسلتی ہوئی پڑ رہی تھیں۔ اِدھر میں نے راج کرشنا کو اُٹھ کے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ میں نے چیخ کر اُسے دور رہنے کی ہدایت کی۔ اب میری توجہ چاقو والے ہاتھ پر زیادہ نہیں تھی کیونکہ وہ پوری طرح میرے پنجے کے شکنجے میں کسا ہوا تھا۔ حملہ آور خاصا پھرتیلا شخص تھا اور مجھے معلوم تھا کہ ایک بار ہاتھ میں آئی ہوئی کلائی چھوٹ جائے تو حملہ آور کا غضب سوا ہو جاتا ہے۔ پھر وہ نئے عزم سے حملہ کرتا ہے۔ راج کرشنا نے میری ہدایت پر عمل کیا تو مجھے کچھ اطمینان ہوا اور میں نے اُس کے پیٹ پر ضربیں لگانے کے بجائے اُس کا دوسرا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ اُسے چھڑانے کے لیے کچھ آگے بڑھا، میرا گھٹنا پہلے ہی اُٹھا ہوا تھا لیکن اُسے بلبلانے کا موقع نہیں ملا۔ اُس نے اچانک اپنے چاقو والے ہاتھ کو جھٹکا دیا اور چاقو اس طرح چھوڑا کہ وہ دور جا کے گرے۔ میں نے اپنا ارادہ ترک کر کے اُس کے دونوں ہاتھ آزاد کر دیے۔ اُس نے چاقو کی طرف جست لگانے کا ارادہ کیا مگر وہ مجھے دھوکا دے رہا تھا، وہ پینترا بدل کے ایک طرف بھاگ پڑا۔ میں نے اُس کے پیچھے دوڑنے کی کوشش کی۔ وہ آناً فاناً کلب کی باؤنڈری پھلانگ گیا۔ میں بھی باؤنڈری پکڑ کے اُسے عبور کرنے کے لیے جست لگانے والا ہی تھا کہ راج کرشنا کی چیختی ہوئی آواز نے میری ہمت پست کر دی۔

اُس نے اندھا دھند بھاگتے ہوئے مجھے پکڑ لیا اور میرے گلے میں جھول گیا۔ اُس کی چیخ پکار پہ دربان اور گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے ڈرائیور متوجہ ہو گئے تھے۔ وہ لان میں اِدھر اُدھر منتشر ہوئے اور ہم تک پہنچ گئے۔ راج کرشنا اپنے رومال سے میری بھنوں صاف کر رہا تھا۔ خون نے پورا چہرہ بھگو دیا تھا۔ "ڈاکٹر ملہوترا اندر ہیں صاحب!" ایک دربان نے مشورہ دیا۔

"نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے دہاڑ کے کہا: "چلیے، ایک ذرا بھوں پھٹ گئی ہے۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ انھیں یہاں سے دور کیجیے۔"

راج کرشنا نے ڈرائیوروں اور دربانوں کو اپنی اپنی جگہ واپس ہونے کا حکم دیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوا گاڑی تک لانے لگا۔ میں راستے میں حملہ آور کا چاقو اٹھانا نہیں بھولا۔ میں نے کرشنا کا رومال بھوں پر رکھ کے خون روک لیا تھا۔ راج کرشنا کی بھی خواہش نہیں تھی کہ کلب کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں تک بات پہنچے۔ اُس نے مجھے گاڑی میں بٹھایا اور گاڑی تیز رفتاری سے بھگاتا ہوا گھر لے آیا۔ چمپا نے میرے چہرے پر جما ہوا خون صاف کیا۔ زیادہ تشویش کی بات نہیں تھی۔ ایسے نشانات تو عام ہوتے ہیں مگر چمپا اور راج کرشنا اس طرح برتاؤ کر رہے تھے جیسے میری جان نکل گئی ہو — میں نے کوئی دوا نہیں لگائی۔ خون راستے ہی میں رک گیا تھا۔

وہ میرے پہلو میں بیٹھا مجھے حیرت سے گھور رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ مجھے خوشی تھی کہ اُسے کوئی گزند نہیں پہنچی۔ اگر ذرا سی تاخیر ہو جاتی تو اس وقت نہ جانے کیا ہوتا۔ "وہ بھاگ گیا۔ اگر راج کرشنا مجھ پر نہ بگڑتا تو میں اُسے ضرور ڈھونڈ لیتا۔" اُس نے بروقت فیصلہ کر لیا تاکہ کہیں بھاگنے کا وقت بھی نہ نکل جائے۔ اس پورے معاملے میں صرف چند منٹ صرف ہوئے ہوں گے، شاید تین چار منٹ۔ "وہ ذرا سی ہٹ کر لیتا تو جن لوگوں نے اُسے بھیجا تھا، انھیں نصیحت ہو جاتی۔ تب مجھے اس کا پہلے سے خطرہ تھا۔" راج کرشنا نے مجھ سے کہا: "لیکن یہ تو گمان بھی نہیں تھا کہ وہ کلب میں آدمی بھیج دیں گے۔ کیا یہاں کسی نے فون کر کے پوچھا تھا کہ میں کہاں گیا ہوں؟" اُس نے چمپا سے پوچھا۔

"ہاں، آپ کے جانے کے بعد کئی فون آئے تھے۔ میں نے کہہ دیا کہ آپ کلب گئے ہیں، دیر سے واپس آئیں گے۔" چمپا نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اب آیندہ آپ کو محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے راج کرشنا کو مشورہ دیا۔ "وہ آپ کو اس شہر میں دیکھنا نہیں چاہتے۔"

"لیکن ظہیر! میں خود نہیں جاؤں گا۔ مجھے موت کا خوف نہیں ہے۔" اُس نے پُرعزم لہجے میں کہا: "میں نے پستول نکال لیا تھا ظہیر! لیکن اندیشہ تھا کہ نشانہ چوک نہ جائے۔ بہرحال تم نے حیرت انگیز پھرتی کا ثبوت دیا — یہ دوسری بار ہے جب تم نے ایک ماں کو اُس کا بیٹا واپس کر کے اُس کی زندگی کا عرصہ بڑھا دیا ہے۔ تم نے دو جانیں بچائی ہیں۔"

"آپ اس بارے میں کچھ نہ کہیے۔" میں نے شکایت کی۔

"کیسے نہ کہوں کہ میں جو اس وقت تم سے بات کر رہا ہوں، یہ ایک عجوبہ ہے۔" وہ منتشر لہجے میں بولا: "تم کلب میں کتنے بور تھے مگر جیسے ہی وقت آیا، تمھارے اندر گویا بجلی بھر گئی۔ تم نے ایک لمحے کی بھی چوک نہیں کی۔" اُس نے زور سے مجھے بھینچ لیا۔

"بس یہی تو سیکھا ہے۔" میں نے شکستہ آواز میں کہا۔

چمپا اور وہ آدھی رات تک میرے پاس بیٹھے رہے۔ چمپا بار بار چائے بنا بنا کے لاتی رہی اور بار بار میری بھوں ٹٹولتی رہی۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ فون آنے لگے۔ کلب کے دربانوں اور ڈرائیوروں نے لوگوں کو بتا دیا ہوگا کہ راج کرشنا صاحب لان میں بھاگ رہے تھے اور اُن کا ساتھی خون آلود چہرے کے ساتھ باؤنڈری کے پاس کھڑا تھا۔ نورین کا فون بھی آیا۔ راج کرشنا نے ریسیو کیا۔ نورین نے تشویش سے میری خیریت دریافت کی۔ راج کرشنا نے اُسے اطمینان دلایا مگر نورین نے راج کرشنا کی بات پر یقین نہیں کیا۔ مجھے خود فون پر بلایا۔ میں نے اُسے تسلی دی کہ میں بالکل ٹھیک ہوں اور اُس کا یہ ثبوت کافی ہے کہ میں اُس سے بات کر رہا ہوں۔ راج کرشنا فون کا تار بھی نہیں نکال سکتا تھا کیونکہ وہ ایک پولیس افسر کے گھر کا فون تھا۔ کسی وقت بھی کوئی اہم فون آ سکتا تھا۔

یہ سلسلہ صبح ہونے کے بعد بھی جاری رہا۔ جواب دیتے دیتے، وضاحت کرتے کرتے اوسان بولا گئے تھے۔ پھر صبح ہی صبح نورین اپنے باپ کے ساتھ بنگلے پر موجود تھی۔ "کیا ہوا تھا؟" اُس نے آتے ہی اضطراب سے پوچھا۔ میں نے اُسے سرسری طور پر پورا واقعہ سنایا۔ "تو گویا یہ کلب بھی اب محفوظ جگہ نہیں رہی۔" وہ تشویش سے بولی: "کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟" اُس نے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا۔

نورین دیر تک ٹھیری رہنا چاہتی تھی مگر پولیس افسروں اور کلب کے لوگوں کا تانتا بندھ گیا تھا، اس لیے وہ جلد ہی واپس چلی گئی۔ اُس دن کرشنا دفتر نہیں جا سکا۔ میں نورین کے جانے کے بعد اپنے کمرے میں بند ہو گیا تھا۔ یہ راج کرشنا ہی کی ہمت تھی کہ وہ اتنے لوگوں کو جواب دے رہا تھا، کبھی

فون پر کبھی بالمشافہ۔ اُسے دوپہر کا کھانا کھانے کی فرصت بھی نہیں ملی۔ ڈرائنگ روم سہ پہر تک پولیس کے اور دوسرے محکموں کے افسروں اور بمبئی کے شہریوں سے بھرا رہا۔ بنگلے کے باہر موٹریں ہی موٹریں کھڑی تھیں۔ پولیس کے اعلا حکام کے حکم سے بنگلے پر پہرے داروں کی تعداد میں فوراً اضافہ کردیا گیا تھا۔ کل رات اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ راج کرشنا درمیان میں کود پڑے گا تو مجھے چیخنا نہ پڑتا اور یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ راج کرشنا کو باؤنڈری عبور کرنے سے روکنے کے لیے مجھے آوازیں لگانی پڑی تھیں۔ ایسا نہ ہوتا تو چند منٹ کی بات تھی کسی کو پتہ بھی نہ چلتا۔

سہ پہر کو مجھے جولین کا انتظار ہی رہا۔ وہ وقت کی بڑی پابند تھی مگر وقت گزر رہا تھا اور جولین نہیں آئی تھی۔ یقیناً اُس کے باپ کی حالت زیادہ خراب ہوگئی ہوگی میرے دل میں ہزار وسوسے اُٹھنے لگے۔ میں نے بنگلے کے باہر گلی میں جاکے بھی دیکھا۔ اُس کا دُور دُور پتہ نہیں تھا۔ یہاں تک کہ شام ہوگئی اور وہ نہیں آئی۔ مجھ سے ایک جگہ نہیں بیٹھا جا رہا تھا۔ جب اُس کے آنے کی اُمید بالکل ختم ہوگئی تو میں نے راج کرشنا سے پوچھا کہ اُسے کہیں جانا تو نہیں ہے؟ اُس نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے کہا، میں کچھ دیر کے لیے موٹر لیے جا رہا ہوں، وہ بگڑنے لگا کہ تم پوچھ کیوں رہے ہو؟

ڈرائیور کو جولین کے گھر کا پتہ معلوم تھا۔ میں نے اُسے ساتھ لیا۔ موٹر شہر کی وسیع سڑکوں سے گزرتی ہوئی ایک گنجان اور تنگ و تاریک علاقے میں داخل ہوگئی۔ یعنی جولین اس قدر دُور سے روز مجھے پڑھانے آتی تھی۔ ڈرائیور نے کار ایک نسبتہً کشادہ جگہ کھڑی کردی اور مجھے ساتھ لیے ہوئے تنگ گلی میں داخل ہوگیا۔ دونوں اطراف چھوٹی بڑی بلڈنگیں کھڑی ہوئی تھیں کائی لگی اور سر پر گرتی ہوئی عمارتیں، یہ آبادی اینگلو انڈین لوگوں پر مشتمل تھی۔ نچلی منزلوں کے کمروں میں سامان کم تھا، صفائی زیادہ نظر آتی تھی اسکرٹ پہنے ہوئے بوڑھی رنگ برنگی عورتیں ہاتھوں میں کنڈیاں لٹکائے گلی میں متحرک تھیں۔ فلیٹوں کے باہر بوڑھے کرسی بچھائے اخبار بینی میں مصروف تھے۔ گلی میں زرد روشنیاں جلنے لگی تھیں۔ میں نے حیرانی کے ساتھ ڈرائیور سے پوچھا کہ کہیں وہ پتہ تو نہیں بھول گیا؟ اُس نے انکار میں سر ہلایا اور بڑی گلی سے دائیں جانب کی ایک اور تنگ گلی میں مڑ گیا۔ ہمارے سامنے لکڑی کی بالکونیوں سے بنی ہوئی ایک تین منزلہ عمارت کھڑی تھی۔ ڈرائیور نے وہیں رُک کے ایک فلیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ”کیا مس جولین یہیں رہتی ہیں؟“ میں نے مشتبہ انداز میں پوچھا۔

”جی ہاں! وہ تیسرے ملے کے کونے والے فلیٹ میں رہتی ہیں۔“

مجھے عمارت میں قدم رکھتے ہوئے جھجک ہوئی۔ میں کئی لمحوں تک کش مکش میں گھرا رہا پھر ایک ارادے سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ڈرائیور گلی میں رہ گیا۔ سب سے اُوپر والی منزل پر پہنچ کے میں نے اندازے کے مطابق دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ دروازہ جولین ہی نے کھولا۔ ”آپ!“

اُس کی پتلیاں لرز کے ساکت ہوگئیں اور وہ پتھر کی سی بن گئی۔

”آپ کے ڈیڈی کیسے ہیں؟“ میں نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں [illegible]

اُس نے ایک گہری سانس لی۔ اُس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ ہونٹ بدبدانے لگے ”وہ پہلے سے بہتر ہیں لیکن انھیں اپنی سدھ بدھ نہیں“ اُس نے نقاہت سے کہا۔

”میں انھیں دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”مگر... مگر آپ کے لیے یہ مناسب نہیں ہے۔“

”میں پروا نہیں کرتا۔“ میں نے سر جھٹک کے کہا۔

اُس نے سراسیمہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”ٹھہریے۔“ یہ کہہ کے اُس نے دروازہ بند کرلیا۔ چند منٹ بعد وہ پھر نمودار ہوئی۔ ”آئیے۔“ اُس نے [illegible] میں کہا۔ وہ مجھے ایک مختصر کمرے میں لے گئی۔ وہاں چارپائی پر ایک بوڑھا منہ کھولے پڑا تھا۔ اُس کے جسم کا گوشت سوکھ گیا تھا، بس ہڈیوں کا [illegible] جس میں سانس باقی تھی۔ کمرے میں دواؤں کی بُو بسی ہوئی تھی اور میز پر شیشیاں بکھری ہوئی تھیں۔ کمرہ صاف ستھرا اور روشن تھا مگر جا بجا [illegible] چیزوں سے پٹا ہوا تھا۔ پرانی میزیں کرسیاں الماریاں در و دیوار پر عجیب اُداسی طاری تھی۔ میں فوراً کھڑا ہوگیا۔ جولین مجھے دوسرے کمرے میں [illegible] اس بڑے کمرے میں بستر بھی تھا، کرسیاں بھی تھیں۔ ایک کونے میں [illegible] سی گول ڈائننگ ٹیبل تھی۔ ایک کونے میں موٹی موٹی کتابوں کا انبار لگا [illegible] ایک طرف صندوق کے اوپر صندوق رکھے ہوئے تھے۔ فرش صاف تھا [illegible] پر شیشے کے فریموں میں مختلف مناظر کی رنگین تصویریں لگی ہوئی تھیں [illegible] جانب ستار رکھا ہوا تھا، درمیان میں دیوار پر لکڑی کی ایک بڑی صلیب نصب تھی۔ میں سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ جولین بھی میرے پاس [illegible] گئی۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے یہاں آکے غلطی کی ہے لیکن اب [illegible] کا کوئی سوال نہیں تھا۔ ”کرشنا جی اور چمپا دیدی کے کیا حال ہیں؟“ اُس نے [illegible]

”سب ٹھیک ہیں اور آپ کی ممی کدھر ہیں؟“

”وہ ابھی آتی ہیں۔“ جولین نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”یہ گھر بہت [illegible] ہے۔ جب ڈیڈی بیمار ہوئے تو ہم یہاں آگئے۔ پہلے ہم باندرے میں [illegible] تھے۔ یہاں ڈیڈی کے کئی پرانے دوست ہیں، آتے رہتے ہیں، اس [illegible] اُن کی طبیعت بہلی رہتی ہے۔“

”گھر مختصر ہے مگر آپ نے اسے بڑے سلیقے سے سجا رکھا ہے [illegible] آپ ہی آپ نظر آتی ہیں۔ آج آپ نہیں آسکی تھیں اس لیے مجھے الجھن لگی اور میں یہاں چلا آیا۔“

”مجھے فون کرنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ اس گھر میں کسی کو بلانا [illegible] اچھا نہیں معلوم ہوتا۔“ وہ کمزور آواز میں بولی۔ ”ڈیڈی کی بیماری سے کچھ تلپٹ ہوگیا ہے۔“

”میں تو آپ کے ڈیڈی کو دیکھنے اور آپ سے ملنے آیا ہوں [illegible]

[illegible] نہیں آیا، گھر تو مکینوں سے ہوتے ہیں۔“

اُس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اُس کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ وہ ایک اُجلی زرد [illegible] ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ اُس کے بال کھلے ہوئے تھے اور آنکھیں بوجھل تھیں۔ [illegible] صرف ایک دن میں وہ کچھ اور لمبی ہوگئی تھی۔ میں نے پہلی بار اُسے اس [illegible] شکل میں دیکھا تھا۔ وہ مجھے پہلے سے بہت اچھی معلوم ہوئی۔ میری نظریں بار بار [illegible] اُس کی جانب اُٹھتی تھیں اور گھبرا کے جھک جاتی تھیں۔ ”آپ گھبرائیے نہیں۔“ [illegible] میں نے بہ مشکل تمام کہا۔

”حوصلہ رکھیے۔“ مجھے اپنی آواز اجنبی محسوس ہوئی۔ ”میں... میرے [illegible] لائق کوئی کام ہو تو بتائیے۔ دوائی وغیرہ لانی ہو یا ڈاکٹر کے پاس جانا ہو تو بتائیے [illegible] میرے جسم میں بہت خون ہے اگر خون کی ضرورت پڑے تو میں... میں۔“ [illegible] وہ سسک پڑی۔ میں نے ایسی تو کوئی بات نہیں کی تھی اب میں اس سے [illegible] کہوں؟ اسے کس طرح چپ کراؤں؟ ”میں آپ کے بہت کام آسکتا ہوں [illegible] اب مجھے دُنیا میں کوئی کام نہیں ہے۔“ میں نے تیزی سے کہا۔ ”میرے پاس [illegible] بہت ہی وقت ہے۔ اگر آپ نے مجھے کوئی کام سونپا تو میرا جی خوش ہوگا۔“

وہ اور سسکنے لگی۔ ”نہیں۔“ اُس نے وحشت سے کہا۔ ”آپ کا یہی احسان [illegible] بہت ہے کہ آپ میرے ڈیڈی کو دیکھنے آگئے۔ بس اُن کے لیے دعا کیجیے۔“

”میری دعائیں قبول نہیں ہوتیں مس!“ میں نے مایوسی سے کہا۔ ”میں [illegible] آپ کے ڈیڈی کے لیے کوئی دعا نہیں کروں گا۔“

وہ سر اُٹھا کے مجھے لرزتی ہوئی پلکوں سے دیکھنے لگی۔ ”آپ چلے جائیے [illegible] آپ چلے جائیے۔ یہ گھر آفت زدہ ہے، یہاں کی ہوا خراب ہے، یہ گھر بہت خراب ہے اور آپ کے لیے نہیں ہے۔ آپ چلے جائیے۔“

”میرے لیے۔“ میری آواز بھاری ہوگئی۔ ”یہاں آپ اور آپ کی ممی [illegible] تو رہتی ہیں۔ پڑوس کے فلیٹ میں بھی لوگ رہتے ہیں اور آپ کو کیا [illegible] معلوم کہ میں کس گھر میں رہتا تھا۔“ میں نے سوچا، میں اُسے جیل کا حال بتاؤں۔ [illegible] مجھے تو کرشنا جی اپنے پاس لے آئے تھے ورنہ میرے پاس تو سر سے [illegible] چھت نہیں ہے۔ آپ یہ خراب اور اچھے کی بات کیا لے بیٹھیں۔“

اُس کی آنکھیں بجھنے اور چمکنے لگیں، شاید اُسے میری بات کا یقین نہیں [illegible] آیا تھا۔ ”آپ..... آپ۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔ اندر دروازے سے ایک لمبی [illegible] پتلی ادھیڑ عمر عورت برآمد ہوئی۔ اُس نے آہستگی سے چائے کا سامان میز پر [illegible] رکھا۔ میں نے اُٹھ کے اُسے سلام کیا۔ اُس نے مجھے انگریزی میں دعائیں دیں [illegible] پھر جلد ہی اُردو میں بات کرنے لگی۔ چائے کے دوران میں وہ اپنے شوہر کا [illegible] حال بیان کرتی رہی۔ وہ ایک خوش گفتار اور سنجیدہ عورت تھی۔ میں وہاں [illegible] زیادہ دیر نہیں رُکا۔ میں نے جولین سے اصرار کیا کہ وہ کچھ دنوں تک مجھے [illegible] پڑھانے نہ آئے۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چلتے وقت اُس نے مسکرا [illegible] کے مجھ سے کہا۔ ”آپ کا بہت بہت شکریہ۔ کرشنا جی اور چمپا دیدی کو میرا سلام [illegible] کہیے گا۔“ میں زینے پر اُترتے اُترتے رُک گیا۔ وہ بھی لکڑی کے جنگلے پر ٹھیر [illegible] گئی۔ ”کیا... کیا آپ کچھ بھول گئے ہیں؟“

”جی نہیں۔“ میں نے سر ہلا کے کہا۔ ”مس جولین! آپ کو کوئی بھی پریشانی ہو تو جھجکیے گا نہیں، مجھ سے ضرور کہیے گا۔ آپ نہیں کہیں گی تو میرے دل پر بوجھ رہے گا۔“ میں نے اُسے مُڑ کے نہیں دیکھا اور ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے سیڑھیاں اترنے لگا۔

رات کو میری آنکھیں کھلی رہیں۔ راج کرشنا نے سیر کے لیے پوچھا مگر میں نے منع کردیا۔ مس جولین کے فلیٹ میں بسی ہوئی دواؤں کی بُو رات بھر میرے دماغ پر چھائی رہی۔ اسی طرح صبح ہوگئی۔ راج کرشنا دفتر چلا گیا اور چمپا گھر کے کاموں میں مصروف ہوگئی۔ اب وہ اپنے کام میں گم رہتی تھی۔ تمام ملازم اُس کے اشاروں پر ناچتے تھے۔ اُس نے وعدے کے مطابق اپنی زبان پر تالا ڈال لیا تھا۔ راج کرشنا نے اُس سے یا مجھ سے اُس کے ماضی کے متعلق کبھی کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ اُس کے ساتھ اس طرح پیش آتا تھا جیسے دونوں برسوں کے شناسا ہوں اور جیسے چمپا اُس کی بہن ہو یا ماں ہو۔ وہ ہر وقت اُس کا مزاج پوچھتا رہتا تھا اور چمپا نیچی نظروں سے جی اور اچھا کہتی رہتی تھی۔ وہ میرے کپڑے نکال کے دیتی، دن میں کئی بار مجھے کبھی لیموں کا شربت، کبھی بادام کا اور کبھی گرم دودھ پلاتی تھی۔ چمپا نے مجھ سے جانماز منگوا کے نماز بھی شروع کردی تھی۔ وہ سب سے پہلے جاگ جاتی اور جب ہم لوگ اُٹھتے تو ہمیں مصلے پر بیٹھی ہوئی ملتی۔ صرف چند دنوں میں چمپا کا چہرہ بدل گیا تھا۔ وہ باہر بہت کم نکلتی تھی۔ بس ایک یا دو بار ڈرائیور کے ہمراہ گھر کی چند چیزیں خریدنے گئی تھی۔

صبح ہوئی، دوپہر ہوئی۔ میں بنگلے کے مختلف کمروں میں گھومتا رہا، اخبار پڑھتا رہا یا راج کرشنا کی کتابیں اُلٹ پلٹ کرتا رہا۔ جولین کے آنے کا وقت ہوگیا تھا۔ میں بار بار گھڑی دیکھنے لگا حالانکہ آج مجھے اُس کے آنے کی اُمید نہیں تھی کیونکہ میں خود اُسے منع کر آیا تھا مگر جولین عین وقت پر مسکراتی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ وہ بہت تازہ نظر آرہی تھی۔ اپنے اُسی نکھرے ہوئے لباس میں۔ ”آپ پھر آگئیں؟“ میں نے کسی قدر ناگواری سے کہا۔

”ڈیڈی کی طبیعت رات سے کچھ بہتر ہوگئی ہے۔“ وہ شگفتگی سے بولی۔ ”اُنھوں نے آنکھیں کھولیں اور بات بھی کی۔ میں اطمینان کرکے آئی ہوں۔ آئیے، اپنا کام شروع کریں۔ مجھے ڈر تھا کہ آپ کا حرج ہوگا۔“

چمپا سے چند باتیں کرکے وہ کمرے میں آگئی اور کتابیں کھول کے بیٹھ گئی۔ پھر رُک کے کہنے لگی۔ ”کل آپ کے جانے کے بعد ممی کڑھتی رہیں کہ وہ آپ کی کچھ خاطر نہیں کرسکیں۔ آپ ممی کو بہت پسند آئے۔“

”مجھے بھی وہ بہت اچھی لگیں۔“

”اور میں آپ کو دیکھ کے بہت حیران ہوئی تھی۔ دیر تک تو مجھے یقین ہی نہیں آیا تھا کہ آپ آئے ہیں یا آپ آسکتے ہیں۔ پھر بعد میں مجھے یہ

احساس ہوا کہ آپ کو میری کوئی بات گراں نہ گزری ہو؟"

"یہ احساس مجھے بھی رہا۔ ویسے بھی میں اطلاع کے بغیر پہنچ گیا تھا۔ ایسے موقعوں پہ بات کس طرح کی جاتی ہے؟ یہ بھی مجھے نہیں معلوم تھا۔"

"آپ نے بہت عجیب باتیں کیں۔" وہ خوابیدہ لہجے میں بولی۔ "میں تمام وقت یہی سوچتی رہی کہ آپ کی باتوں میں کوئی ایسی بات کیوں ہے جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ میں نے شاید آپ کو بتایا ہو کہ کرشنا جی نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں آپ سے آپ کے بارے میں کوئی سوال نہ کروں اور میں اس ہدایت پر پوری طرح کاربند ہوں مگر کیا آپ خود کچھ نہیں بتائیں گے؟"

"کیا بتاؤں؟" میں نے اضطراری آواز میں کہا۔

"اگر آپ مناسب سمجھیں تو کچھ بھی۔"

"کوئی ایسی بات ہی نہیں ہے۔"

"تو پھر رہنے دیجیے کسی اور وقت سہی، یہ بتائیے کہ آپ نے کام کتنا کیا؟ کل کی غیر حاضری کا مجھے افسوس ہے، بہرحال ہم کل کی کسر آج پوری کر لیں گے۔"

"آج پڑھنے کو جی نہیں چاہ رہا ہے۔"

"اچھا!" اس نے تعجب سے کہا۔ "مگر کیوں؟"

"بس آپ باتیں کیجیے۔"

اُس کی پتلیاں پارہ بن گئیں۔ "کیا باتیں کریں؟" وہ کچھ بکھرے ہوئے لہجے میں بولی مگر فوراً اُس کی آواز پُرسکون ہو گئی۔ "آئیے، میں آپ کو بڑے لوگوں کے اقوال سناؤں، یہ اقوال زندگی میں بہت کام آتے ہیں۔"

"خاک کام آتے ہیں۔" میں نے ترشی سے کہا۔ "اگر ایسا ہوتا تو بات ہی کیا تھی۔ آپ ہی بتائیے، کیا آپ کے ڈیڈی کسی قول سے ٹھیک ہو جائیں گے؟"

"ہاں۔" وہ آہ بھر کے بولی۔

وہ اچھی خاصی آئی تھی مگر میری باتوں سے اُداس ہو گئی اور پڑھانا لکھانا بھول گئی، کہیں کھو سی گئی، ساڑی کا پلّو اُس کے کندھے سے ڈھلک گیا لیکن اُسے خیال ہی نہیں رہا۔ مجھے بہت پشیمانی ہوئی۔ میں نے اُسے خوش کرنے کے لیے کہا۔ "مس! آپ نے کرشنا جی کے ریکارڈ سُنے ہیں؟ آئیے، میں آپ کو سُنواؤں۔"

وہ ہچکچائی مگر میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کے اُٹھا لیا۔ "آئیے مس!"

"سنیے۔ آپ مجھے مس نہ کہا کیجیے۔" اُس نے کرب سے کہا۔

"کیوں مس؟" میری زبان سے نکل گیا۔ "پھر کیا کہوں؟"

"جولین کہا کیجیے۔ گھر میں سب مجھے جولین کہتے ہیں۔"

میں نے کچھ نہیں کہا۔ راج کرشنا نے میرے کمرے میں گراموفون اور ریکارڈ رکھ دیے تھے مگر میں نے گراموفون کبھی نہیں بجایا تھا جب وہ آتا تھا تو خود کوئی نہ کوئی ریکارڈ لگا دیتا تھا۔ اُسے صرف دھنوں کا شوق تھا۔ ہلکی مدھم دھنیں جیسے چشمہ بہتا ہو۔ میں نے گراموفون پر اُس کا پسندیدہ ریکارڈ رکھ دیا۔ کمرے میں موسیقی گھُس گئی۔ پھر جولین خود ریکارڈ منتخب کر کے سننے لگی، اس طرح اُس کی طبیعت کچھ بہل گئی۔ جب وہ جانے لگی تو میں نے چاہا اُسے اور روکوں مگر شام ہو رہی تھی، راج کرشنا ابھی واپس نہیں آیا تھا۔ اُس کی موٹر ہوتی تو میں ڈرائیور سے کہہ کے جولین کو اُس کے گھر پہنچوا دیتا۔ گیٹ سے باہر میں نے دبے لہجے میں کہا۔ "میں چلوں آپ کے ساتھ؟"

"نہیں۔ میں چلی جاؤں گی۔ روز ہی جاتی ہوں؟"

"میں چلتا ہوں۔" میں نے ضد کی۔

"واپسی میں رات ہو جائے گی۔"

"تو کیا ہوا، میں آ جاؤں گا۔"

وہ منع کرتی رہی مگر میں اُس کے ساتھ ساتھ بس اسٹینڈ تک گیا۔ ہم دونوں ایک نشست پر بیٹھ گئے۔ بس نے ہمیں اُس کے گھر سے دور اُتار دیا۔ آگے جانے سے پہلے میں نے اُسے ایک جگہ روک لیا۔ سامنے پھل والے کی دُکان تھی، میری جیب میں راج کرشنا روز کچھ روپے ڈال دیتا تھا۔ میں نے بہت سے پھل خریدے۔ "یہ کیا ہے؟"

"یہ آپ کے ڈیڈی کے لیے ہیں، میری طرف سے۔"

"اوہ نہیں، یہ بہت زیادتی ہے۔" وہ ناراضی سے بولی۔

"کیوں؟ کیا میں انھیں کوئی چیز پیش نہیں کر سکتا؟"

وہ کسمسا کے چپ ہو گئی۔ میں اُس کے ساتھ اُس کے گھر پہنچا۔ اُس کے باپ کی طبیعت میں کوئی فرق نظر نہیں آیا، مس جولین سے جھوٹ بولا تھا۔ میں چند منٹ بیٹھ کے واپس آ گیا۔

جولین کے باپ کی حالت میں کوئی افاقہ نہیں ہوا مگر وہ پڑھانے آتی رہی اور میں روز اُس کے ساتھ اُس کے گھر جاتا رہا اور ایک ڈاکٹر کو بھی لے گیا۔ ڈاکٹر نے کوئی خاص اُمید ظاہر نہیں کی، چند نسخے لکھ کے دیے، میں نے نسخہ جولین کو نہیں دیا بلکہ خود دوائیں خریدیں مگر بوڑھے نے انھیں قبول نہیں کیا۔ اُس کی حالت روز بروز بگڑتی گئی۔ میں چونکہ جولین کے ساتھ روز شام کو وہاں جانے لگا تھا اس لیے گلی کے آدمی ہماری جانب نگاہیں اُٹھانے لگے تھے، ہمارے گزرتے وقت اُن کے ہونٹوں پہ ایک طنزیہ مسکراہٹ اُبھر آتی تھی۔ میں نے اُن کی پروا نہیں کی۔ ہوٹل پر لڑکے ہمیشہ آگے کی طرف بیٹھے رہتے تھے، انھوں نے سیٹیاں بجانا شروع کر دی تھیں۔ پھر کھانس کھنکار ہونے لگی، ایک دوسرے سے اشارے ہونے لگے، جولین بھی یہ سب کچھ دیکھتی تھی اور سہم سہم جاتی تھی۔ آخر ایک روز اُس نے مجھ سے کہہ ہی دیا کہ "یہ بہت بُرے لوگ ہیں، بہتر ہے کہ آپ نہ آیا کریں۔ ان کی یہی عادت ہے۔"

"ہونے دیجیے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"مگر مجھے بہت بُرا لگتا ہے۔"

"اُن کی طرف توجہ ہی مت دیا کیجیے۔"

"مگر آپ کو پتہ نہیں ہے، اُن سے پورا محلہ نالاں ہے۔ اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے، ہمیں احتیاط رکھنی چاہیے۔ میں جب بھی یہاں سے گزرتی ہوں یہ طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں، بسا اوقات ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔"

"ایسے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں، ان کا بس ایک ہی علاج ہے کہ ان کی طرف دیکھا ہی نہ جائے۔ نظر چُرا نا بھی توجہ دینا ہے یا پھر ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی جائیں۔"

"یہ ہمیشہ جاتو رکھتے ہیں اور محلّے میں آئے دن لڑتے رہتے ہیں۔"

جولین روز صبح ایک اسکول میں پڑھانے جاتی تھی اور سہ پہر کو مجھے پڑھانے آتی تھی پھر شام کو تھکی ہاری گھر پہنچتی تھی۔ میں نے راج کرشنا کی نظر میں اُس کی وقعت بڑھانے کے لیے انگریزی کی پہلی کتاب صرف پندرہ دنوں میں ختم کر لی۔ راج کرشنا نے خوش ہو کے اُسے کافی کا ایک سیٹ پیش کیا۔ یہ گیارھویں یا بارھویں روز کی بات تھی۔ مجھے اُس کے ساتھ جاتے ہوئے گیارہ بارہ ہی دن ہوئے ہوں گے۔ گیارھویں بارھویں دن حسبِ معمول شام کو میں اُس کے ہمراہ جانے کے لیے بس اسٹینڈ پر گیا تو اُس نے مجھے بس میں نہیں بیٹھنے دیا۔ میں نے وجہ پوچھی تو اُس نے خوف زدہ لہجے میں بتایا کہ صبح اسکول جاتے ہوئے لڑکوں نے مجھ پہ جملے کسے تھے کہ شام کو آپ میرے ساتھ اُس علاقے میں نظر آئیں ورنہ بُرا ہو گا۔ انھوں نے اور بھی بہت گندی گندی باتیں کی تھیں۔ بس آئی تو وہ مجھے چھوڑ کے جلدی سے چڑھنے لگی مگر میں نے اُس کی بات نہیں مانی۔ میں بھی بس میں سوار ہو گیا۔ وہ راستے بھر واپس ہونے کے لیے میری منت کرتی رہی اور سہمی رہی۔ میں نے اُسے ہمت دلائی کہ کچھ بھی نہیں ہو گا۔ اگر آج نہ گیا تو پھر کبھی اُس کے گھر نہیں آ سکوں گا۔

بس سے اُترنے کے بعد میں نے پھل خریدے۔ پھلوں کا ایک تھیلا اُس نے سنبھال لیا، ایک میں نے، پھر ہم گلی میں داخل ہو گئے۔

نکڑ کے ہوٹل پر لڑکے شاید ہمارے انتظار میں تھے۔ ایک دم سیٹیاں بجنے لگیں۔ "اوئے ندّے!" ایک لڑکے نے آواز بلند کی۔ "چھوکری بڑے چھوکرے کے ساتھ آ رہی ہے۔"

"سالا صبح اپن نے کیا بوم مارا تھا کہ اب ادر یار نہیں آئیں گا۔" ہوٹل سے ایک صحت مند لڑکا تیزی سے باہر نکلا۔ "ماسٹر! سالا ادر اپن کی پٹری میں کیا سب لوگ مر گیا ہے؟ سب نامرد ہو گیا ہے؟" ایک اور لڑکا اینٹھ میں بولا۔

جولین نے میرا بازو پکڑ لیا۔ "چلو چلو، ان کی بات مت سنو، سیدھے چلو۔" میں نے جھٹکا دے کے اُس سے اپنا بازو چھڑایا اور وہیں جم کے کھڑا ہو گیا۔ میں نے پھلوں کا تھیلا جولین کے سپرد کیا اور اُن پانچوں لڑکوں کو گھورنے لگا۔

"ماسٹر! دیکھتا ہے؟" ایک لڑکے نے ہنس کے کہا۔ "سالا آنکھیں دکھاتا ہے، ابھی بہت ہو گیا ماسٹر! اسٹارٹ ایک دم اوپننگ۔"

ماسٹر ہوٹل سے اُتر کے گلی میں آ گیا۔ اُس کے پیچھے پیچھے باقی لڑکے بھی کسل مندی سے اُتر آئے۔ راہ گیر یہ منظر دیکھتے ہوئے چپ چاپ گزر گئے۔ جولین نے پھر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "میں کہتی ہوں یہاں سے چلو۔" اُس کی آواز تھرتھرا رہی تھی۔

"ابھی یہ ادر سے نئیں جائیں گا۔ اپن نے تم کو پہلے ایڈوائز کر دیا تھا کہ ہم ادر اس کو گلی میں دُور دُور تک دیکھنا نہیں مانگتا۔ سالا تمھارے لیے ادر چھوکرا لوگ کی کمی ہے؟ اپن کے جونی میں کیا ڈیفیکٹ ہے؟ ایک دم پرفیکٹ ہے۔ کوٹن! اپن ایک چانس اور دے گا۔ اس کو بولو ابھی فنش ہو جائے۔" وہ براہِ راست جولین سے مخاطب ہوا۔ جولین اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میرا شانہ کھینچنے لگی۔

"تم چپ ہونے کا کیا لے گا؟" میں نے تحمل سے کہا۔

"تم سالا کیا دیں گا بیٹی! یہ کیا بوم مارتا ہے؟"

"ماسٹر چھوکری کے سامنے تگڑم کرتا ہے۔ سالا کو پانی کر دو۔"

"ماسٹر! ابھی سچ بتا دو کہ ادر کا لوگ بھی سالا دل رکھتا ہے۔ کوٹن کو کنٹری کا گنگ ہی لے جائیں گا۔"

"کوٹن! تم نے بولا نہیں، اپن کون ہے؟"

"بولا۔" میں نے جواب دیا۔ "اس نے ہمیں بولا کہ تم کون ہے۔ تم بالکل جانور ہے اور جب تک تمھاری زبان نہیں کاٹی جائے گی، تمھیں آدمیوں میں رہنے کی تمیز نہیں آئے گی۔ میں ادھر روز آؤں گا، تم سب سن لو۔ تم نے اگر آیندہ مس جولین کو کچھ کہا یا ادھر گلی سے گزرتے ہوئے ہمارے کان میں تمھاری کوئی آواز پڑی تو تم سب یہاں نظر نہیں آؤ گے، سمجھا؟ جا کے سیدھی طرح ہوٹل میں بیٹھ جاؤ۔" میں نے اپنی آواز پُرسکون ہی رکھی۔

اُن سب نے خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھا، پھر اچانک اُن کے منہ سے ایسی ہنسی پھٹ پڑی جیسے ٹائر پھٹ جائے۔ "یہ ماسٹر! چھوکرا تھوڑا بہت جان رکھتا ہے۔ اپن کی کوٹن نے ایلیشن کے گلے میں پٹا باندھا ہے۔ بھونکتا ٹیون میں ہے۔"

"اور سالا اپن سالا جو ادر بُلڈاگ پڑا ہے۔" ماسٹر تیور سے بولا۔ "اے چھوکرا! ادر تم نیا نیا ہے، ادر تم جانتا نہیں کیا ہوتا ہے۔ اپن بولتا ہے فنش ہو جاؤ۔ کوٹن۔" وہ دونوں ہاتھ جھٹک کے گرجا۔ "اپن کا کوٹن باہر نئیں جائیں گا۔"

جولین نے مجھے دھکا دے کے بھاگ جانے کی تلقین کی مگر میں نے گلی میں جولین کے مکان کی جانب عمداً قدم بڑھائے۔ میری توقع کے مطابق ماسٹر نے میرے گریبان پر جھپٹا مارنے کے انداز میں ہاتھ ڈال دیا۔ "ادر کا راستہ بند ہے۔" وہ میرا راستہ روک کے کھڑا ہو گیا۔ "ادر جاؤ، ادر نہ سب جونی جا سکتا ہے۔ کوٹن! اُنڈ چینج کرو۔ اپن ادر تمھارے لیے بیچ چلا ہے۔"

بٹ جو نی اِز نمبر ون۔ اِف یو۔۔۔"

میں نے اُس کی بات پوری نہیں ہونے دی، جس ہاتھ سے اُس نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈالا تھا، میں نے اُس پر ترچھے ہاتھ سے ضرب لگائی۔ ماسٹر کا ہاتھ نیچے جھول گیا۔ میں کئی دن سے انھیں دیکھ رہا تھا اور اس لیے اُلجھنے سے گریزاں تھا کیونکہ وہ مجھے زیادہ ضرر رساں نظر نہیں آتے تھے، وہ شہدے تھے، اُچکے۔ ماسٹر کی گردن پر جب دوسرا ہاتھ پڑا تو وہ نیچے بیٹھ گیا۔

"کیوں ماسٹر!" میں نے ہاتھ روک لیا۔ "یہ ٹھیک ہے؟"

اس سے پہلے کہ ماسٹر جواب دیتا، اُن میں سے ایک نے دائیں جانب سے میرے شانے کو دھکا دیا، اُس کا نام پتی تھا۔ مجھے احساس تھا کہ ماسٹر کے زیرِ نرغہ ہونے کے بعد ایسا بھی ہو سکتا ہے اس لیے اس سے پیشتر کہ پتی کے ساتھ کوئی دوسرا مجھ پر لپکے اور خواہ مخواہ معاملہ مزید اُلجھے، میں نے مشتعل انداز میں اُلٹے ہاتھ سے ایک سوچی سمجھی ضرب لگائی۔ پتی ہوٹل کے چبوترے سے جا ٹکرایا، اُس کا ماتھا کھل گیا۔ یہ سب چشم زدن میں ہو گیا۔ اس طرح باقی تین سورماؤں کو سوچنے کا موقع مل گیا، میں نے دانستہ اُن کی طرف دعوتی نگاہ سے دیکھا۔ اُدھر ماسٹر نے چاقو نکال لیا تھا۔ جولین بے تحاشا چیخنے لگی۔ "نو، نو۔" اُس نے ماسٹر کا ہاتھ پکڑ لیا، ماسٹر نے اُسے دُور دھکیل دیا اور چاقو ہاتھ میں لیے ہوئے میرے سامنے ناچنے لگا جب کہ میں ایک جگہ جما کھڑا تھا لیکن میری آنکھیں جمی ہوئی نہیں تھیں، ماسٹر کے ہاتھ میں چاقو کی گرفت اور اُس کا انداز دیکھ کے مجھے اطمینان ہو گیا تھا۔ میں نے آواز لگائی۔ "جولی! پیچھے ہٹو۔" ماسٹر نے غیر اختیاری طور پر پیچھے کی طرف دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے اُس کا چاقو والا ہاتھ میرے قبضے میں تھا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اُس کی ٹھوڑی پر ضرب لگائی۔ ماسٹر کی آنکھیں پھٹ گئیں، دوسری ضرب پر چاقو پر اُس کی گرفت کمزور پڑ گئی اور تیسری ضرب پر وہ نیچے گر گیا، فرش پر گرتے ہی میں نے اُلٹے ہاتھ سے اُسے اُٹھا لیا۔ چاقو میرے ہاتھ میں آتے ہی اُس کے ساتھی دُور ہو گئے۔ وہ ماسٹر کا اشارہ پانے کے لیے پہلے ہی تُلے کھڑے تھے اور پتی کے انجام سے محتاط ہو گئے تھے۔ میں نے پھل کا لہراتے ہوئے اُن سب پر نظر ڈالی اور آہستہ سے اُسے بند کر کے ماسٹر کی طرف اُچھال دیا۔ ماسٹر سکتے میں پڑ گیا۔ میں نے جولین کے ہاتھ سے تھیلا لیا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کے آگے بڑھ گیا۔ ابھی میں چند ہی قدم چلا ہوں گا کہ میں جولین کا بازو زور سے پکڑے ہوئے اچانک پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ اُچکے ماسٹر سے ایسا اوچھا پن بعید نہیں ہے، میرے کان اور آنکھیں پیچھے کی طرف لگی ہوئی تھیں، جیسے ہی ماسٹر کے چاقو کھولنے کی آہٹ اور اُس کے اُٹھنے کی سرسراہٹ ہوئی، میں اُس کے نشانے سے ہٹ گیا۔ ماسٹر غضب میں آگے نکل گیا۔ میں نے جولین کو چھوڑ کے اُس کی پشت پر جست لگائی۔ ماسٹر چند ثانیے بھی اپنے پیروں پر کھڑا نہیں رہ سکا۔ اُس کا چاقو والا ہاتھ میں نے اتنی شدت سے مروڑا کہ اُس کی دردناک کراہیں گلی میں ہر سمت گونجنے لگیں۔ چاقو گرنے کے بعد بھی میں نے اُسے چھوڑا نہیں۔ مجھ سے جتنی ضربیں لگ سکتی تھیں، میں نے اُس پر لگائیں اور جتنی وہ برداشت کر سکتا تھا، اُس نے برداشت کیں۔ میں اُسے بالوں، بازوؤں اور گدی سے پکڑ پکڑ کے اُٹھاتا اور فرش پر پھینکتا رہا۔ اُس کا جسم جگہ جگہ سے کھل گیا۔ درمیان میں اُس کے ایک ساتھی نے پیچھے سے اچک کے میری گردن میں ہاتھ ڈالا اور مجھے گرانے کی کوشش کی۔ میں نے اُسے اُٹھا کر پلٹ دیا۔ پھر اُس کا کوئی ساتھی نہیں پلٹا۔ یا تو وہ کہیں چھپ گئے ہوں گے یا دوسروں کو خبر کرنے کے لیے دوڑ پڑے ہوں گے۔ جولین نے میرے بازو سے لپٹ کے مجھے روک لیا۔ ماسٹر زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔ میں نے جولین کی منت پر اُسے دوبارہ نہیں اُٹھایا۔ ماسٹر کا چاقو اُس کے پاس ہی زمین پر پڑا تھا مگر اُس میں اُسے اُٹھانے کی سکت نہیں تھی۔ آگے بڑھنے سے پہلے میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ گلی میں سناٹا طاری تھا، کھڑکیوں اور بالکونیوں میں کھڑے ہوئے لوگ، عورتیں اور مرد اب گلی میں نکل آئے تھے۔ میں جولین کو لے کے اُس کے گھر کی جانب چلنے لگا۔ فلیٹ پر پہنچ کے میں نے چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔

♥

یہ معاملہ شروع ہونے سے پہلے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ بات اتنی آگے بڑھ جائے گی۔ وہ ایک تنگ گلی تھی، اُس کے نکڑ سے ذرا آگے ہوٹل تھا، گلی ہوٹل کاٹ کے دوسری گلی سے مل جاتی تھی، میں محلِ وقوع کا جائزہ لے کے ہوٹل سے چند قدم اِدھر اندر کو گلی میں کھسک آیا تھا اور میری خواہش تھی کہ سب سے پہلے ماسٹر آگے بڑھے تاکہ فیصلہ فوراً ہو جائے اسی لیے میں نے ماسٹر کو اُکسایا تھا۔ میری خواہش کے مطابق ماسٹر ہی نے پہل کی مگر اُسے پہلے ہی مرحلے پر خاموش ہو جانا چاہیے تھا۔ شہدے عام طور پر اُسی وقت علاقے کے مکینوں کے سامنے اپنی طاقت کا اظہار کرتے ہیں جب انھیں اپنی طاقت پر اعتماد ہو، بصورتِ دیگر معاملہ ٹال جاتے ہیں۔ میں نے ماسٹر کو یہ موقع دیا تھا مگر اُس نے توجہ نہیں دی۔ یہ اُس کی گلی تھی اور یہاں کے مکین اس منظر کے گواہ تھے، اُسے کچھ خیال تو کرنا چاہیے تھا مگر خیال تو اُسے ہوتا جسے کسی نے یہ باتیں ذہن میں رکھنے کی تربیت دی ہوتی۔ اُسے تو چاقو پکڑنا تک نہیں آتا تھا۔ نتیجتاً جس بات سے میں بچنا چاہتا تھا، وہی ہوئی۔ مجھے خدشہ تھا کہ یہ لوگ فضول بحث کریں گے۔ ماسٹر کے بعد پتی کا آنا اور پتی کے بعد ایک دوسرے شخص کا میری گردن میں ہاتھ ڈالنا بہت چھوٹے پن کی بات تھی۔ بتھل ہوتا تو مجھ پر بہت ناراض ہوتا کہ اس موقع پر تیرا ہاتھ اُٹھا ہی کیوں؟ تیری بات ہی نے انھیں کیوں نہ روکے رکھا مگر میں نے انھیں باز رکھنے کی پوری کوشش کی تھی۔ اُن کو کچھ نہیں پڑی تو میں کیا کرتا۔

جولین بہت حواس باختہ تھی، اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور وہ مجھے اجنبی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ اب وہ بالکل مطمئن رہے، اطمینان سے گلی میں نکلا کرے، اب کسی جانب سے کوئی

[...] آوازہ اُس کے کان زخمی نہیں کرے گا مگر جولین کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی [...]یں۔ وہ مجھے کمرے میں بٹھا کے دوسرے کمرے میں چلی گئی، شاید اُسے [...]ون کی ضرورت تھی۔ اُس کی ماں نے مجھے سنگترے کا عرق پلایا اور آگے دن [...]ے غنڈوں کے کرتوت سنانے لگی۔ جولین جب کمرے میں آئی تو اُس کے [...]ے پر پہلے جیسا اضطراب نہیں تھا۔ میں نے اُس کی طرف سے مطمئن ہو کے [...]یں ہونا چاہا لیکن جولین نے مجھے روک لیا۔ اُس کی آنکھیں ہانپ رہی تھیں، [...]نے پھڑک رہے تھے اور نچلا ہونٹ کبھی اُبھر آتا تھا، کبھی چھپ جاتا تھا، گال [...]پ چھاؤں سے تھے۔ سُرخ اور سفید رنگ جیسے آنکھ مچولی کھیل رہے ہوں۔ "آپ ابھی [...]چ رہی ہیں؟" میں نے مسکرا کے کہا۔

"میں سوچ رہی ہوں یہ میں نے کیا دیکھا تھا؟" وہ سراسیمگی سے بولی۔

"بھول جائیے جیسے۔۔۔۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔"

"اور اگر۔۔۔۔ اگر آپ کو کچھ ہو جاتا؟"

"تو کیا ہوتا! میرا رونے والا کون ہے۔"

اُسی لمحے جولین کی ممی دہشت زدہ انداز سے کمرے میں داخل ہوئی [...]اُس نے گلی میں پولیس کی آمد کی خبر سنائی۔ یہ بالکل غیر متوقع خبر تھی۔ میرا ماتھا [...]ٹکا اور میں نے کرسی چھوڑ دی۔ جولین نے مجھے روکا اور خود بالکونی سے [...] جھانک کے دیکھا۔ وہ بدحواسی سے واپس آئی۔ "نیچے پولیس موجود ہے۔"

"مجھے نیچے جا کے دیکھنا چاہیے۔"

"نہیں نہیں، ابھی ٹھیریے، کرشنا جی آتے ہی ہوں گے۔"

"کرشنا جی؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں۔" اُس نے کہا۔ "مجھے اندیشہ تھا کہ بات اور نہ بگڑ جائے۔ آپ کو [...]یں اُسی راستے سے گزرنا ہے، آپ نے دیکھ ہی لیا، پولیس آگئی۔ ابھی کچھ دیر [...]ئی، میں نے نچلے والے کی ایک لڑکی مارتھا سے کہا تھا کہ وہ کہیں سے فون پر [...]رشنا جی کو مطلع کر دے۔ بس وہ آ ہی رہے ہوں گے۔"

"اوہ! آپ نے یہ کیا کیا؟" میں نے اپنا ماتھا پکڑ لیا۔

دروازہ زور سے دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔ جولین نے مجھے منع کیا۔ [...]نے آگے بڑھ کے کُنڈی کھول دی۔ ایک انسپکٹر دو سپاہیوں کے ساتھ [...]اں موجود تھا۔ "مس جولین کا فلیٹ یہی ہے؟" اُس نے نیم گرم نیم نرم لہجے [...]یں پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور درشتی سے کہا۔ "کیا بات ہے؟"

انسپکٹر نے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا۔ اُسے شاید میرا لہجہ ناگوار گزرا [...]تھا پھر یکایک زینے میں کھلبلی سی مچی، انسپکٹر نے پیچھے مڑ کے دیکھا اور اکڑ [...]کے کھڑا ہو گیا۔ راج کرشنا کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اُس نے آتے ہی میرا [...]زو پکڑ لیا۔ "یہ کیا ہوا؟" وہ بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے کچھ نہیں کہا، بس جولین کی طرف ناراضی سے دیکھا۔ وہ راج [...]رشنا کو اندر لے گئی۔ انسپکٹر باہر ہی کھڑا رہا۔ جولین جب تک راج کرشنا کو روداد سناتی رہی، میں سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اُٹھ کے اُس کے ڈیڈی کو دیکھنے گیا۔ اُس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ میں بالکونی میں کھڑا ہو گیا۔ گلی میں سپاہی منتشر تھے اور دروازوں، چھتوں، بالکونیوں پر ہر طرف لوگ موجود تھے۔ پولیس سے کچھ دُور ایک بڑا ہجوم دائرہ بنائے کھڑا تھا، سب کی نظریں جولین کی بلڈنگ پر مرکوز تھیں۔ میں بالکونی میں نمودار ہوا تو سب میری طرف دیکھنے لگے۔ میں وہاں سے ہٹ آیا۔ راج کرشنا جولین کو تسلی دے رہا تھا۔ نیچے اُترنے سے پہلے میں اُسے جولین کے بیمار باپ کے کمرے میں لے گیا۔ وہ اُس کی حالت دیکھ کے گُنگ رہ گیا۔

ہمارے ساتھ جولین بھی نیچے اُتری۔ سپاہیوں نے بوٹوں کی گرج کے ساتھ راج کرشنا کو سیلوٹ کیا۔ گلی میں چند لمحوں کے لیے ایسا سکوت چھا گیا تھا جیسے وہاں کوئی رہتا ہی نہ ہو۔ ہر طرف پتھر کے آدمی نظر آ رہے تھے۔ انسپکٹر اور سپاہی مؤدبانہ راج کرشنا کے نزدیک کھڑے تھے۔ راج کرشنا نے جولین کی کمر تھپتھپائی اور انسپکٹر سے آہستہ لہجے میں کچھ کہا اور میرا ہاتھ تھام کے واپس ہونے لگا۔ گلی کے موڑ پر میں نے پلٹ کے دیکھا، جولین کا اُٹھا ہوا ہاتھ کپکپا رہا تھا۔ راج کرشنا نے مسکرا کے جواباً ہاتھ ہلایا۔ ہم اُس گلی میں آگئے اور اُس ہوٹل کے پاس پہنچ گئے جہاں ماسٹر نے میرا گریبان پکڑا تھا۔ نہ جانے وہاں کے لوگوں کو کیا ہوا؟ ہمارے گزرتے وقت تالیاں بجانے لگے۔ ایک ستر اسّی سالہ خمیدہ کمر شونڈ بُونڈ بوڑھا اچانک ہمارے راستے میں مزاحم ہو گیا۔ "ٹھیرو ٹھیرو۔" وہ انگریزی میں بولا۔ اُس نے میری کلائی پکڑ کے کھینچا، میں آگے جھک گیا تو اُس نے میرے بال پکڑ لیے، میں نے سر جھکا دیا۔ اُس نے میری پیشانی کو بوسہ دیا۔ جہاں جہاں لوگ کھڑے تھے، دوبارہ تالیاں بجانے لگے۔ پولیس کا دستہ موٹر میں بیٹھنے تک ہمارے ساتھ رہا۔

راج کرشنا کے آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ماسٹر اور اُس کے ساتھیوں کا دوبارہ ہوٹل میں بیٹھنا اور گلی میں دندنانا ممکن ہی نہیں تھا۔ جولین نے خواہ مخواہ ایک تماشا بنا دیا۔ بہرحال اُس کی تشفی ہو گئی اور محلے کے لوگوں کی ہمت بھی بندھی کیونکہ پولیس کا محکمہ ایسے ہی موقعوں اور ایسے ہی لوگوں کے لیے بنایا گیا ہے اور کچھ نہ سہی، راج کرشنا کے سامنے جولین کا وقار ہی بڑھ گیا۔

راج کرشنا نے دوسرے دن جولین کے باپ کو سینٹی نوریم میں داخل کرا دیا۔ جب وہ مقررہ وقت پر مجھے پڑھانے آئی تو ایک بدلی ہوئی لڑکی نظر آ رہی تھی۔ وہ ہماری واپسی کے بعد گلی میں ہونے والے چرچے سنانے لگی۔ محلے کی عورتوں اور مردوں کا ایک ہجوم اُس کے گھر اُمڈ پڑا تھا جیسے ماسٹر کے ہاتھ سے چاقو اُسی نے چھینا ہو۔ باتیں کرتے وقت جولین کو خیال ہی نہیں رہا کہ وہ اپنے شاگرد کے سامنے گفتگو کر رہی ہے۔ وہ سارا وقار بھول گئی تھی اور کسی الھڑ لڑکی کی طرح آنکھیں پٹ پٹا کے تیز تیز باتیں کر رہی تھی، میں نے اُسے ٹوکا۔ "آج آپ پڑھائیں گی نہیں؟"

وہ شرما کے دہری ہو گئی۔ "اوہ ہاں، میں ڈیوٹی پر ہوں۔"

"یہ کیسی بات کی آپ نے؟" میں نے تشکایتاً کہا۔

"اچھا جی! معاف کر دیجیے، غلطی ہو گئی۔"

"کوئی استاد اپنے شاگرد سے معافی مانگتا ہے؟"

"اچھا استاد وہی ہے جو اپنی غلطی کا اقرار کرلے۔ لوگ لوگوں کو چھپا رستم کہتے ہیں، میں آپ کو کہوں گی کہ آپ چھُپے استاد ہیں اور آپ سے درخواست کروں گی کہ مجھے شاگردی میں لے لیجیے۔"

"مجھے آتا ہی کیا ہے۔"

"آپ کو،" وہ جھرجھری لے کے بولی۔ "آپ کو وہ آتا ہے جو کسی کو نہیں آتا۔ بتائیے، آپ مجھے شاگرد بنائیں گے؟"

"کس بات کی شاگرد؟"

"کتابوں نے مجھے ڈرپوک بنا دیا ہے، آپ مجھے حوصلے کی تعلیم دیجیے۔"

"حوصلہ۔" مجھے ہنسی آگئی۔ "لوگ تو خود مجھے بار بار حوصلے کی تلقین کرتے ہیں، احساس دلاتے ہیں کہ تم ایک مرد ہو۔"

"کون لوگ ہیں وہ؟"

"بہت سے لوگ ہیں۔"

"تعجب ہے۔"

"ہاں، مجھے خود تعجب ہے۔" میں نے اُداسی سے کہا۔ "میرا خیال ہے، زندہ رہنا ہی ایک حوصلہ ہے۔ حوصلہ کہیں بے غیرتی کو تو نہیں کہتے؟"

"ہاں۔" وہ بھی افسردہ ہو گئی۔ اُس کی پلکیں سمٹ گئیں۔ کورا کی بھی یہی کیفیت ہوتی تھی، کورا۔ جولین کی پلکیں کورا کی پلکوں سے بہت مشابہ تھیں، اُنھی کی طرح گھنی اور کھنچی ہوئی۔ اب تو اور گھنی ہو گئی ہوں گی۔ میری آنکھوں میں جلن ہونے لگی۔ پھر جولین نے بے وقت موسیقی سننے کا اشتیاق ظاہر کر دیا۔ گو اُس نے کتاب کھول کے مجھے پڑھانا شروع کر دیا تھا لیکن آج اُس کے پڑھانے میں ہمیشہ والی روانی اور سنجیدگی نہیں تھی۔ میں نے اُس کی فرمائش پوری کر دی۔ وہ ریکارڈ سنتی رہی اور مجھے دیکھتی رہی۔ پھر معمول کے مطابق میں اُسے پہنچانے کے لیے اُس کے گھر گیا حالانکہ اُس کے ڈیڈی سینی ٹوریم میں داخل ہو گئے تھے۔ ہوٹل سنسان پڑا تھا۔ گلی میں مسکراتی ہوئی آنکھوں سے میرا استقبال کیا گیا۔ لوگ مجھے اور جولین کو ساتھ دیکھ کے اشارے کرنے لگے لیکن یہ اشارے ویسے نہیں تھے جیسے ماسٹر اور اُس کے ساتھی کرتے تھے۔

راج کرشنا نے ایک ہفتے کے اندر جولین کے لیے اپنے علاقے ہی میں ایک مختصر اور ستھرا مکان کرائے پر لے کے اُسے منتقل کر دیا۔ جولین اس پر تیار نہیں ہوتی تھی۔ اِس کی صورت راج کرشنا نے یہ نکالی کہ اپنے اثر سے جولین کی موجودہ ملازمت چھڑوا کے اُسے انگریزوں کے اسکول میں ملازمت دلوا دی، جہاں سینئر کیمبرج تک تعلیم دی جاتی تھی۔ یہاں پہلے سے دُگنی تنخواہ تھی۔ جولین قریب آگئی تو اُس نے میری پڑھائی کے لیے زیادہ وقت دینا شروع کر دیا۔ ہم جب سیر کے لیے جاتے تو جولین کو ساتھ لے لیتے۔ چمپا کی اُس سے بہت گھٹتی تھی۔ سینی ٹوریم میں اُس کے باپ کی حالت نسبتاً بہتر ہو گئی تھی۔

لیکن وہ نہیں ملی جس کی مجھے تلاش تھی۔ جب میری طبیعت بہت گھبراتی تو میں سڑکوں پر نکل جاتا اور ایک ایک چہرہ گھور کے دیکھتا رہتا اور ایک ایک آدمی کا جائزہ لیتا رہتا۔ میں گھنٹوں کسی چوراہے پر کھڑا رہتا اور راہ گیروں کی شکلیں تکتا رہتا۔ کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ ہر آدمی کا چہرہ مختلف تھا۔ نہ مولوی صاحب جیسی شکل کا کوئی آدمی ملا، نہ کورا جیسی شکل کی کوئی لڑکی دکھائی دی۔ نہ ابا جان نظر آئے، نہ گھر کا کوئی دوسرا فرد۔ رات کو کمرے میں بند ہو کے میں اپنی مالا کے دانے چہرے پر پھیر لیتا تھا۔ اس سے بہت بے قراری ہوتی تھی مگر یہ بے قراری ہی تو میرا سکون تھی۔ مجھے ایسا لگتا جیسے میں نے کورا کو ایک خط لکھ دیا ہے اور بس اب اُس کا جواب آتا ہی ہو گا۔ مالا کے دانے میری آنکھوں سے مَس ہوتے تو مجھ پر غنودگی طاری ہو جاتی۔

راج کرشنا کی مصروفیت بڑھتی رہی۔ کبھی کبھی وہ رات گئے گھر واپس آتا، چمپا اُس کا انتظار کرتی رہتی۔ جب تک وہ نہ آ جاتا ہم دونوں میں سے کوئی کھانا نہیں کھاتا تھا۔ وہ آکے ہمیں ڈانٹتا تھا۔ راج کرشنا کے تبادلے کی بہت سی کوششیں ہوئیں مگر کوئی کوشش بارآور نہیں ہوئی کیونکہ مرکزی حکومت نے اُسے بمبئی شہر کی ناگفتہ بہ صورتِ حال کے سدِباب کے لیے خاص طور پر یہاں بھیجا تھا۔ مستانہ کے کئی آدمی ایک ڈیڑھ مہینے کی جیل کے بعد چھوٹ گئے تھے۔ اُن کا تعلق اندرونی گروہ سے نہیں تھا۔ مستانہ کا مقدمہ چل رہا تھا اور شہر کے رئیسوں کے مقدمات بند کمروں میں جاری تھے۔ اخبارات راج کرشنا کے ساتھ تھے۔ وہ جہاں جاتا اُسے عزت دی جاتی، لوگ اُس کے لیے راستہ چھوڑ دیتے۔ پولیس کے پرانے اعلا حکام اُس کے اچانک فیصلوں سے خاصے ناراض ہوتے تھے مگر جب اُن پر عمل درآمد کے بعد کامیابی ہو جاتی تو راج کرشنا کو مبارک باد دینے کے لیے گھر آتے تھے۔ بعض اہم چھاپوں اور کارروائیوں میں راج کرشنا بذاتِ خود شریک ہوتا تھا۔ وہ ایک بے باک اور صاف گو شخص تھا۔ چمپا کی وجہ سے گھر پر ہونے والی میٹنگوں میں کمی ہو گئی تھی لیکن پولیس افسر اُس سے مشورے کرنے کے لیے روز آتے تھے۔

مجھے اُس کے ساتھ رہتے ہوئے چار مہینے ہو گئے تھے۔ اِن چار مہینوں میں کئی بار میں نے بھاگ جانے کا فیصلہ کیا مگر راج کرشنا کے خیال سے میرے قدم خود بخود مجھے اُس کے گھر واپس لے گئے۔ میں نے اُسے زیادہ پریشان نہیں کیا۔ یا ایسا تھا کہ وہ میری پریشانی کا عادی ہو گیا تھا۔ کئی مرتبہ میرے جی میں آئی کہ میں زرّیں کو اپنی خیریت کا خط لکھ دوں، وہ مطمئن ہو جائے گی کہ میں زندہ ہوں، بٹھل کو بھی قرار آجائے گا۔ میں نے سوچا تھا کہ ایک بے پتہ خط لکھوں گا مگر میں نے کوئی خط نہیں لکھا کیونکہ اس طرح وہ اور پریشان ہو سکتی تھی۔ راج کرشنا کہتا تھا کہ زندگی میں مایوسی زندگی کی عملی موت ہے۔ میں نے سمجھ لیا تھا کہ یہ تو میں ہوں ہی نہیں، یہ تو کوئی اور شخص ہے جو راج کرشنا کے پاس رہتا ہے، اِسے دُنیا کا کوئی کام نہیں ہے۔ اگر راج کرشنا اس شخص سے خوش رہتا ہے تو میرا کیا حرج ہے۔ مجھے اور کہاں جانا ہے؟ کس کے پاس جاؤں گا؟ ہر جگہ یکساں ہے۔ کسی بھی جگہ چلا جاؤں، وہاں کورا تو نہیں ہو گی۔

زرّیں کئی بار گھر آئی اور دیر تک بیٹھی رہی۔ اُس نے مجھے رقص سکھانے کی کوشش بھی کی مگر میں نے انکار کر دیا۔ پھر ایک دن ہم اُس کے گھر گئے۔ چمپا بھی ہمارے ساتھ تھی۔ رستم جی نے انواع و اقسام کے تکلفات میز پر چُن دیے تھے۔ ایک دن مسز روپ پٹیل نے بھی ہمیں مدعو کیا۔ اُس کا گھر کیا تھا، ایک محل تھا۔ مسز روپ نے پھر وہی ہار پہنا۔ شاید وہ مجھے چڑانا چاہتی تھی۔ مجھ سے وہاں کھایا نہیں گیا۔ میں گھر آکے دوسرے دن تک کمرے میں بند رہا۔ جولین نے مجھے بستر سے اُٹھایا۔ جولین کی آنکھوں میں ایک عجیب بات آگئی تھی۔ پہلے ایسی بات نہیں تھی۔ اب وہ مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھتی تو مجھ پر لرزہ سا طاری ہو جاتا۔ اُس کی آنکھوں پر مجھے اپنی کورا کی آنکھوں کا گمان ہوتا جیسے جولین کی آنکھیں بدل رہی ہوں۔ گھبرا کے میں نے اُس کی طرف دیکھنا ہی کم کر دیا۔

ایک دن شام کی بات ہے۔ جولین مجھے پڑھا کے واپس جا چکی تھی۔ دو باوردی پولیس افسر راج کرشنا سے ملنے کے لیے بنگلے آئے۔ میں اُن میں سے ایک کو خوب جانتا تھا۔ وہ بھی مجھے جانتا تھا۔ اُس کا نام جسونت راؤ تھا۔ میں نے انھیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کے اُن کے لیے ناشتہ پانی منگوایا اور خود ذرا دُور اُن کے سامنے کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ انگریزی میں ایک دوسرے سے گفتگو کر رہے تھے۔ گفتگو کا موضوع وہی تھا، شہر کے جرائم۔ نئے پولیس افسر نے جسونت راؤ سے سرگوشی میں میرے متعلق پوچھا۔ جسونت راؤ نے انگریزی میں اُسے طنزیہ یہ جواب دیا کہ "یہ راج کرشنا صاحب کی پخ ہے، پتہ نہیں کون شخص ہے۔ راج کرشنا اس کا بڑا خیال رکھتا ہے۔ مشہور ہے کہ مستانہ کیس میں اِسی نے اُس کے اڈّے میں گھُس کے راج کرشنا کے لیے مخبری کی تھی۔ اس نے ایک موقع پر اُس کی جان بھی بچائی تھی۔ اس کے بارے میں عجیب عجیب باتیں مشہور ہیں۔" سب کی طرح جسونت راؤ بھی یہ سمجھتا تھا کہ میں انگریزی سے نابلد ہوں اس لیے وہ اطمینان سے بات کرتا رہا۔ وہ راج کرشنا سے ملنے آیا تھا اور اُس کے انتظار میں بیٹھا تھا پھر بھی راج کرشنا کے متعلق اُس کا لہجہ بہت گستاخانہ اور طنز آمیز تھا۔ میں ضبط کرتا رہا کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ دونوں راج کرشنا کو ایک پاگل پولیس افسر کا خطاب دے رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ کسی دن اُس کے متعلق کوئی بہت بُری خبر آسکتی ہے کیونکہ مقامی پولیس کے تمام بڑے افسر اُس کی یہاں موجودی اپنی توہین سمجھتے ہیں اور راج کرشنا نے بارہا اُن کی توہین کی بھی ہے۔ میں بُت بنا بیٹھا رہا۔ میں نے کسی طور یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ اُن کی گفتگو مجھ تک منتقل ہو رہی ہے۔ انھیں یقین تھا کہ اگر راج کرشنا کا فوراً ہی تبادلہ نہ کیا گیا تو ہمیں جلد ہی اُس کا سوگ منانا پڑے گا۔ "شمبھو گروپ بہت ناراض ہے۔" وہ رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "اور شمبھو گروپ کے وسائل بہت زیادہ ہیں۔ ایک حملہ اس سے پہلے بھی ہو چکا ہے! مجھے شبہ ہے کہ وہ راج کرشنا کو زندہ مدراس واپس جانے دیں گے۔ بمبئی کی پولیس کا ایک بڑا سرکٹ بھی سکون کی سانس لے گا۔ یہ نہ تو مدراس ہے، نہ ہندوستان کا کوئی اور شہر ہے، یہ بمبئی ہے، راج کرشنا اسے ایک معمولی شہر کی طرح برتتا ہے۔"

جسونت کا لہجہ مخاصمانہ تھا۔ اُس کے دل میں راج کرشنا کے متعلق بڑا کینہ بھرا ہوا تھا۔ بدخواہ ہی اس انداز میں باتیں کرتے ہیں۔ راج کرشنا کے سامنے وہ بھیگی بلّی بنا رہتا تھا۔ اُن کی باتیں سُن کے میرے جسم میں انگارے سے بھر گئے۔ اتنی وحشت ہوئی کہ مجھ سے وہاں بیٹھا نہیں گیا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اس کمینے کو راج کرشنا سے برطرف ضرور کراؤں گا۔ مجھے اُس کے آنے کا انتظار تھا۔ وہ خاصی دیر سے آیا مگر جسونت اُس کے انتظار میں بیٹھا رہا تھا۔ راج کرشنا کے سامنے وہ گرگٹ کی طرح بدل گیا۔ مجھ سے ضبط نہیں ہوا۔ میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ کھانا بھی میں نے یونہی سرسری کھایا۔ جیسے ہی چمپا مجھے دودھ کا گلاس پلا کے اپنے کمرے میں گئی، میں نے راج کرشنا کے دروازے پر دستک دی۔ وہ طمنچہ تانے برآمد ہوا۔ مجھے دیکھ کے اُس نے طمنچہ جیب میں رکھ لیا۔ "کیا بات ہے ظہیر؟" وہ بے تابی سے بولا۔

"آپ سے ایک بات کرنی ہے۔"

"آؤ، آؤ، اندر آؤ، مگر دیکھو اچھی بات کرنا۔"

"آپ بمبئی چھوڑ دیں، اپنا تبادلہ کرا لیں۔"

"کیوں؟" وہ چونک کے بولا۔ "کیا تمھیں یہ شہر پسند نہیں آیا؟"

"میرے لیے ہر شہر یکساں ہے۔ میں آپ کے لیے کہہ رہا ہوں، آپ مدراس چلے جائیے یا کسی اور شہر میں تبادلہ کرا لیجیے، یہاں مت رہیے۔"

"مگر کیوں، ایسی بھی کیا بات ہے؟" وہ میرا کندھا تھپکتے ہوئے بولا۔ "میں اپنا تبادلہ کبھی خود نہیں کراتا، اُوپر سے حکم آتا ہے تو میں اُسے بدلوانے کی کوشش بھی نہیں کرتا مگر تم بتاؤ تم آخر کس سبب سے یہ مشورہ دے رہے ہو۔"

"بس میری بات مان لیجیے۔"

"ضرور مانوں گا، یقیناً کوئی خطرناک قسم کا فون آگیا ہو گا۔" وہ میری بات سنجیدگی سے نہیں سُن رہا تھا۔ ہنس کے کہنے لگا۔ "پولیس کی ملازمت میں ایسی دھمکیاں اور کوششیں عام ہوتی ہیں۔"

"لیکن آپ انھیں محض دھمکیاں کہہ کے نہیں ٹال سکتے، ابھی کچھ دن ہوئے اُس دھمکی کو حقیقت میں بدلنے کے لیے پورا زور لگایا گیا تھا، آپ کو کلب کا واقعہ یاد نہیں رہا۔"

"میں اُسے کبھی نہیں بھول سکتا اور تم جانتے ہو میں پہلے سے خاصا محتاط ہو گیا ہوں۔ ضروری کاموں کے سوا باقی تمام مصروفیات میں نے تقریباً ختم کر دی ہیں۔ ظہیر! بگڑی ہوئی چیزیں درست کرنا، اتنا آسان نہیں ہوتا۔ پولیس والے اگر ان دھمکیوں سے متاثر ہونے لگے تو پولیس نے کاروبار کر لیا۔ میری زندگی کئی مرتبہ بال بال بچی ہے، تو کیا مجھے پولیس کی ملازمت ترک کر دینی چاہیے؟"

"مگر میں ملازمت چھوڑنے کو نہیں کہہ رہا ہوں، میں تبادلے کے لیے

کہہ رہا ہوں اور شہروں میں بھی بہت سے بگڑے ہوئے معاملے ہیں آپ وہاں جا کے کام کیجیے جہاں کام کی قدر ہو جہاں آستین میں سانپ نہ پلتے ہوں جہاں اپنے ہی لوگ جڑ کاٹنے کی فکر میں لگے ہوں، وہاں سے دست برداری ہی مناسب معلوم ہوتی ہے۔"

"اپنے ہی لوگ!" وہ تعجب سے بولا۔

"ہاں وہی یہی آپ کے ساتھی۔"

"اوہ" وہ جیسے میری ساری بات سمجھ گیا ہنس کے بولا "ظہیر ہر جگہ ایسا ہوتا ہے کوئی ادارہ اس برائی سے بچا ہوا نہیں ہے۔ انھی لوگوں میں کام کرنا پڑتا ہے تم نے ضرور کہیں میری برائی سن لی ہے۔"

"برائی ہوتی تو ٹھیک تھا مگر آپ سمجھ نہیں رہے ہیں کہ لوگ آپ کو یہاں دیکھنا نہیں چاہتے، وہ آپ سے نفرت کرتے ہیں" میں نے جھلا کے کہا۔

"بے تک" وہ سنجیدگی سے بولا "مجھے اس کا احساس ہے لیکن مجھے انھی لوگوں سے کام لینا ہے انھیں نظر انداز کر کے کام کرتے رہنا چاہیے۔"

"بہر حال میں نے بات آپ کے گوش گزار کر دی ہے۔"

"اوہ نہیں" اس نے اپنا بازو میری گردن میں ڈال دیا "میں احتیاط برتوں گا۔ کچھ ایسے ضروری کام نمٹانے ہیں کہ میری موجودی لازم ہے۔ تم آخر اتنے پریشان کیوں ہو گئے ہو آخر تم نے کیا دیکھ لیا؟"

"ابھی ابھی جو لوگ آئے تھے آپ سے ملنے" میں نے جھجک کے کہا۔ "وہ آپ کے سامنے تو بہت ٹرووڈ کر رہے تھے لیکن وہ آپ سے خوش نہیں ہیں۔"

"خوش کیا" وہ بہت بڑے لوگ ہیں ان میں ایک، جسونت تو بہت کمینہ ہے۔"

"کیا انھوں نے تم سے کچھ کہا؟" وہ برہمی سے بولا۔

"کاش وہ مجھ سے کچھ کہہ دیتے۔"

"پھر ___؟"

"وہ آپ ہی کے متعلق باتیں کرتے رہے" میں نے اسے وہ تمام باتیں بتا دیں جو جسونت اور اس کے ساتھ آنے والے افسر کے درمیان ہوئی تھیں۔

راج کرشنا کا چہرہ بجھ گیا۔ "مگر، مگر کیا وہ یہیں یہ سب کہہ رہے تھے؟" وہ تمتماتی ہوئی آواز میں بولا۔

"ہاں!"

"تمھارے سامنے؟"

"ہاں میرے سامنے" میں نے تندی سے کہا۔ میں نے کہنے کو تو کہہ دیا لیکن اپنی ہی بات سے میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔

"مگر، مگر یہ کیسے ممکن ہے؟" وہ ہذیانی انداز میں بولا۔

ایک لمحے کے لیے میرا سارا وجود سرد پڑ گیا۔ اسے کیا بتاؤں کہوں کہ وہ بہت زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ اتنے بیوقوف تھے کہ ہمارے گھر اور ہم لوگوں کی موجودی میں تند و مد سے ہماری برائیاں کر رہے تھے، وہ گویا پاگل ہو گئے تھے۔ ہر چند میں نے اسے چمپا والی بات بتانے سے گریز کی تھی جسونت کو معلوم تھا کہ چمپا ایک طوائف ہے جسے راج کرشنا نے گھر میں ڈال رکھا ہے۔ راج کرشنا کی بے احتیاطی کا یہی انجام ہونا تھا۔ میں پہلے ہی ڈر رہا تھا کہ بلاواسطہ اس کا ایرانی جو کر کے ہوٹل میں چمپا کا سامان لینے کے لیے جانا مناسب نہیں ہے، مگر میں نے جسونت سے سنی ہوئی باقی تمام باتیں اسے بتا دی تھیں اور اس کا یہ سوال کرنا بالکل جائز تھا کہ جسونت کو میری موجودی میں اس ہرزہ سرائی کی جرأت کیوں کر ہوئی۔ میری زبان پتھر ہو گئی کہ میں اسے کیا بتاؤں۔ کوئی معمولی بات ہوتی تو میں کچھ بھی بہانہ کر دیتا لیکن اس کا تعلق راج کرشنا کی زندگی سے تھا، اسے یقین آنا چاہیے تھا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے، وہ میرے کانوں کا بھیانک خواب نہیں ہے۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں اور یہ مجھے جسونت سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ میں نے دل کڑا کیا "وہ انگریزی میں بات کر رہے تھے۔"

"انگریزی میں!" وہ سٹ پٹا کے بولا۔

"میں نے آپ سے چھپایا تھا، میں انگریزی جانتا ہوں۔"

"کیا۔ ؟ تم کیا کہہ رہے ہو؟" وہ اچھل کے بولا۔

"میں اسی لیے آپ سے کہتا تھا کہ آپ مس جولین پر پیسہ ضائع کر رہے ہیں۔ بس وہ باتیں کر رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ میں کچھ نہیں سمجھ رہا ہوں۔"

اس نے مجھے دبوچ لیا "ظہیر! کیا یہ سچ ہے؟"

"ہاں" میں نے گردن جھکا کے کہا۔

"اوہ! تم نے دو متضاد خبریں سنائی ہیں" اس نے دونوں ہاتھوں سے میرا چہرہ تھام لیا اور میری آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ "میں بتا نہیں سکتا" وہ بہکتی ہوئی آواز میں بولا "تم نے مجھے کتنا چونکایا ہے۔"

"میں معافی چاہتا ہوں میں نے آپ سے بہت چھپایا۔"

"مجھے حیرت تھی کہ تم کتابوں کے بغیر اتنی عجیب باتیں کیسے کر لیتے ہو۔ تم نے کہاں تک پڑھا ہے؟"

"یہی ایم اے کیا ہے۔"

"اور یقیناً فرسٹ کلاس لی ہو گی؟" میں نے نظریں نیچی کر لیں۔ "اوہ میری جان" اس نے کھڑے ہو کے مجھے گلے لگا لیا "تم نے مجھ پہ اعتبار کیا۔ مجھے بتا دیا۔"

"اب آپ کچھ اور مت پوچھیے۔"

"بالکل نہیں، بالکل نہیں میں کچھ نہیں پوچھوں گا، میں تمھیں تکلیف نہیں پہنچاؤں گا، مجھے یقین ہے ایک دن تم سب کچھ مجھے بتا دو گے اور سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"مگر آپ تبادلہ کرا لیجیے، میں نے اچھی باتیں نہیں سنی ہیں۔"

"میں اپنا کام جلد سے جلد نمٹانے کی کوشش کروں گا، بے فکر رہو۔

ابھی میں کچھ اور زندہ رہوں گا، ابھی مجھے تمھارے ساتھ بہت سی سیر کرنی ہے۔"

میں اس کی اور بہت سی باتوں سے بچنے کے لیے کمرے سے نکل آیا۔ وہ مجھے روکتا رہ گیا۔ میں نے غلطی کی تھی، اس کا احساس مجھے فوراً ہی ہو گیا۔ میں نے ظہیر خاں کے نام سے کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے کیا تھا۔ ڈگری بھی ابھی جیل میں پڑی تھی، راج کرشنا کے لیے ہندوستان کی گنتی کی چند یونیورسٹیوں سے یہ پتہ چلا لینا کون سا مشکل تھا کہ ظہیر خاں نامی طالب علم نے کب ایم اے کیا ہے اور جب اسے پتہ چلتا کہ میں نے جیل سے امتحان دیا تھا اور میں قتل کے الزام میں سات سال کی سزا کاٹ رہا تھا اور نجھل نامی شخص میرا کفیل تھا مگر اب پچھتانے سے کیا ہوتا تھا۔ راج کرشنا کے سامنے جھوٹ بولتے ہوئے گناہ کا احساس ہوتا تھا۔ میں نے اپنی مالا گلے سے اتار کے جیب میں ڈال لی، تب کہیں مجھے کچھ سکون ہوا۔

صبح میں اس سے آنکھیں ملانے سے گریز کرتا رہا۔ ناشتے کی میز پر وہ بہت خوش تھا جیسے میرے امتحان کا نتیجہ آج ہی نکلا ہے، وہ انگریزی میں مجھے یقین دلا رہا تھا کہ وہ آج سے اپنی رپورٹ تیار کرنے میں زیادہ وقت صرف کرے گا۔ "میں ایک لمبی چھٹی کی درخواست دوں گا اور ہم گھومتے رہیں گے۔" چمپا بھی حیران تھی کہ آج وہ مجھ سے دوسری زبان میں کیوں مخاطب ہے، میں کوئی جواب دیے بغیر ناشتے کی میز سے جلد ہی اٹھ آیا، اس کی ہنسی نے کمرے تک میرا تعاقب کیا۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے چمپا سے بات کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ باورچی خانے میں موجود تھی۔ میں نے سوچا وہ باہر آجائے تو اس سے کہوں کہ وہ کہیں اور چلی جائے کیونکہ اس کی موجودی راج کرشنا کی رسوائی کا سبب بن رہی ہے۔ وہ باہر آ کے کمرے کی صفائی کرنے لگی۔ اس نے پہلے غلاف بدلے، چادریں تبدیل کیں، ڈرائنگ روم کی میز پر تازہ پھول سجائے، راج کرشنا کے کمرے میں جا کر اس کا بستر درست کیا، میں سوچتا ہی رہا اور بنگلے سے باہر چلا آیا۔ شہر کی سڑکوں کے چکر کاٹتا رہا۔ آج بھی کوئی نظر نہیں آیا۔ جب میں گھر آیا تو خلافِ معمول جولین موجود تھی۔ ہری ساڑی میں اس کا رنگ کچھ اور نکھر آیا تھا۔ مجھ سے کہنے لگی کہ میرے ساتھ سینی ٹوریم چلو۔ میں نے کہا، چلو مجھے کیا کام ہے۔ واپس آ کے بھی وہ دیر تک رکی رہی اور کہیں رات کو واپس گئی۔

رات بہت ہو گئی، راج کرشنا گھر نہیں آیا۔ ہم لوگوں نے اس کے انتظار میں کھانا نہیں کھایا تھا۔ رات کو کوئی ایک بجے کے قریب موٹر رکنے کی آواز آئی، میں بھاگا ہوا گیا مگر وہ راج کرشنا کی موٹر نہیں تھی۔ ایک پولیس افسر تیزی سے اترا، میں اسے جانتا تھا، وہ ایس پی شکلا تھا۔ "میرے ساتھ آؤ۔" اس نے میرا بازو پکڑ کے کھینچا۔

"کہاں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"آؤ، کرشنا جی کے پاس۔"

"وہ کہاں ہیں؟"

"ڈاکٹر چین اسپتال میں ہیں، زیادہ بات کرنے کا وقت نہیں ہے، جلدی سے گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔" وہ مجھے موٹر میں دھکیلتے ہوئے بولا۔

"کیا بات ہے، آپ مجھے صاف صاف کیوں نہیں بتاتے؟" میں نے چیخ کر کہا۔

"کرشنا جی زخمی ہو گئے ہیں۔"

"زخمی! کہاں، کیسے؟" میری آواز دہل گئی۔

"ان پہ حملہ کیا گیا ہے۔" شکلا نے مختصر جواب دیا۔

میرا سینہ بند ہونے لگا۔ اسپتال میں پولیس افسروں کا ہجوم تھا۔ مجھے فوراً ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ سامنے راج کرشنا پڑا تھا، اس کے جسم پہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ مجھے چکر آنے لگا۔ ڈاکٹر نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور راج کرشنا کی آنکھیں کھول کے دیکھنے لگا۔ پھر مجھے اپنے پاس بلایا، میں بے جان قدموں سے اس کے پاس گیا اور راج کرشنا کے جسم سے لپٹ گیا۔ میری آہ و بکا سے اس کے جسم میں جنبش ہوئی۔ اس نے کراہ کے میرا نام لیا، اپنی لرزتی ہوئی آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا اور اکھڑی ہوئی ڈوبی ہوئی آواز میں بولا "وقت کم ہے لاڈلے۔ تم، تم سچ کہتے تھے، مجھے افسوس ہے میں تمھارے کام نہ آسکا۔ میں نے اپنا بیان لکھوا دیا ہے، میں میں نے تمھارے بابا صفدر زماں خاں کو تلاش کرنے کے لیے ہر جگہ سرکلر بھیج دیا ہے۔ میں خود تمھیں ان کے پاس کبھی لے چلتا مگر ___ سب ٹھیک ہو جائے گا ہمت رکھنا لاڈلے!" اس کی آواز بیٹھنے لگی۔

وہ مجھے لاڈلے کے نام سے پکار رہا تھا لیکن مجھے ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی۔ راج کرشنا کی سانس تیزی سے چل رہی تھی۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ میں اس کے سینے سے لپٹ کے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ میں نے چیخ کر کہا "مجھے بتائیے وہ کون تھے؟ کون لوگ تھے وہ؟" لیکن اس نے مجھ سے پھر بات نہیں کی۔ اس پر غفلت طاری ہو گئی تھی۔ ڈاکٹروں نے بہ جبر مجھے اس کے پاس سے ہٹا دیا۔ میں بکتا رہا مگر انھوں نے میری ایک نہیں سنی۔ کمرے سے باہر پولیس افسران نے مجھے گھیر لیا۔ وہ مجھ سے راج کرشنا کا حال دریافت کر رہے تھے مگر مجھ میں انھیں کچھ بتانے کی طاقت نہیں تھی۔ آخر میری حالت دیکھ کے وہ خود خاموش ہو گئے۔ ایس پی شکلا میری کمر تھپکنے لگا۔ اس نے مجھے دوبارہ ایک گوشے میں لے جا کے کھڑا کر دیا اور تسلی تشفی دینے لگا۔ میں نے راج کرشنا کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ میری نظریں اس کے کمرے کے دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر تیزی سے اندر جا رہے تھے اور باہر آ رہے تھے۔ ان میں سے کسی کے چہرے پہ اطمینان کی کوئی علامت نہیں تھی۔ اسپتال کی راہ داری پولیس افسروں کی سرگوشیوں سے بھن بھنا رہی تھی سب کی نگاہیں بار بار میری جانب اٹھ رہی تھیں۔ وہ مجھے گھور گھور کے مزید خوف زدہ کر رہے تھے۔

"امید نہیں توڑنی چاہیے ظہیر خاں!" ایس پی شکلا نے رندھے ہوئے لہجے میں پھر مجھے صبر کی تلقین کی۔

"یہ سب کیسے ہوا شکلا جی؟" میری سسکیاں نکل گئیں۔

"ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن وہ بچ کے کہاں جائیں گے۔"

"مجھے بتائیے؟ وہ کون کمینے تھے؟ مجھ سے مت چھپائیے۔" میں نے روتے ہوئے کہا۔ "شکلا جی! مجھے بتائیے یہ سب کیسے ہوا؟" میں نے اُس کا شانہ جھنجھوڑ ڈالا۔

"اطمینان رکھو ظہیر خاں! سب کھل کے سامنے آجائے گا۔ اس وقت تو تمھیں دعا کرنی چاہیے کہ کرشنا جی ٹھیک ہو جائیں۔" وہ تنبیہی انداز میں آہستگی سے بولا۔

مجھے احساس ہوا کہ راہ داری میں میری آواز دُور دُور تک پہنچ رہی ہوگی سب لوگ میری طرف متوجہ تھے۔ شکلا سچ کہتا تھا، مجھے کرشنا جی کے لیے دعا کرنی چاہیے تھی۔ وہ وقت دعا ہی کا تھا مگر میری دعاؤں میں اثر کہاں تھا۔ میں نے بہت سی دعائیں کرکے دیکھ لی تھیں۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا تاہم میں نے اپنے دل میں دعا کی "اے خدا؟ کرشنا جی کو بچالے چاہے اُن کے بدلے میری جان لے لے ویسے بھی میں فالتو ہوں۔" شکلا میرے پاس خاموش کھڑا رہا کچھ پولیس افسر اسپتال سے چلے گئے، کچھ اور آگئے۔ پھر شہر کے معزّزین آنے لگے۔ راج کرشنا کے کمرے سے کوئی خبر نہیں آئی میں رات بھر ڈاکٹروں سے پوچھتا رہا مگر انھوں نے مایوسی سے سر ہلانے کے سوا کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔

صبح ہونے والی تھی۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا کہ بچھو کے ہمراہ چمپا بوکھلائی ہوئی راہ داری میں آتی دکھائی دی۔ جیسے ہی اُس کی نظر مجھ پر پڑی، وہ میری طرف لپکی اُس کا چہرہ آنسوؤں سے تر بتر تھا۔ بچھو کی آنکھیں بھی سُرخ تھیں۔ وہ دونوں میرے پاس آکے چپ چاپ کھڑے ہو گئے اور میرا چہرہ دیکھنے لگے۔ انھوں نے مجھ سے کچھ پوچھا نہیں مگر مجھ سے ضبط نہیں ہوا۔ چمپا نے مجھے گلے لگا لیا اور خود بھی رونے لگی۔ پوری رات گزر گئی تھی، راہ داری میں لوگ بے چینی سے ٹہلتے رہے تھے۔ نرسیں دوڑتی بھاگتی رہی تھیں۔ راہ داری کے آس پاس سنگین بردار سپاہیوں کا پہرا تھا۔ صبح ہوتے ہی راج کرشنا کا پٹیوں میں لپٹا ہوا جسم اسٹریچر پر اُس کے کمرے سے باہر نکالا گیا اور فوراً آپریشن تھیٹر میں منتقل کر دیا گیا۔ آدھا گھنٹا گزرا، ایک گھنٹا گزرا، پھر کچھ اور وقت گزر گیا لیکن آپریشن ختم نہیں ہوا، کوئی دو گھنٹے بعد راج کرشنا کو دوبارہ اُس کے کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ ڈاکٹر اب بھی کچھ نہیں بتا رہے تھے۔ کسی کو اُس کے کمرے میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میں نے بہت منتیں کیں مگر ڈاکٹروں نے مجھے اُسے دوبارہ دیکھنے کی اجازت نہیں دی۔ معلوم ہوا کہ اُسے نلکیوں سے آکسیجن دی جا رہی ہے۔ چمپا ساڑی کے پلّو سے سر ڈھانپ کے ایک کونے میں سمٹی ہوئی دعائیں کر رہی تھی۔ ایس پی شکلا نے مجھے گھر جانے، ناشتہ کرنے اور لباس تبدیل کرکے اسپتال واپس آنے کا مشورہ دیا۔ میں نے اُس کی بات نہیں مانی۔ ایک ایک پل بتانا دوبھر ہو رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ ڈاکٹر کیا کانا پھوسیاں کر رہے ہیں، نہ کسی سے کچھ بولتے ہیں، نہ کسی کی سنتے ہیں، بس اِدھر اُدھر بھاگتے پھر رہے ہیں۔ راج کرشنا کے کمرے سے کوئی باہر نکلتا تو میرا دل ہَولنے لگتا۔

راج کرشنا! میری نحوست اُسے بھی لگ گئی۔ مجھے اُس کی ایک ایک بات یاد آرہی تھی۔ سانحہ وہی ہوا جس کے خوف سے کلیجا کٹنے لگتا تھا صبح کوئی گیارہ بجے اسپتال کا بڑا انگریز ڈاکٹر راج کرشنا کے کمرے سے برآمد ہوا تو اُس کی آنکھیں نم تھیں میں اُس کی طرف دوڑ پڑا۔ اُس نے میرا ہاتھ دبا کے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا "مجھے افسوس ہے۔"

"نہیں نہیں۔" میں نے اُس کا گریبان پکڑ لیا اور اُسے ایک طرف دھکیل کے راج کرشنا کے کمرے میں گھس گیا۔ اُس کے منہ پر چادر پڑی ہوئی تھی اور اُس کے جسم میں کوئی حرکت نہیں تھی۔ میں ٹھٹک کے رُک گیا۔ اُس کے سرہانے کھڑی ہوئی نرس نے چادر اُٹھا کے مجھے اُس کا چہرہ دکھایا، اُس کی آنکھیں بند تھیں جیسے وہ گہری نیند سو رہا ہو۔ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا اور میرا دل ڈوبنے لگا۔ میں اپنی جگہ منجمد کھڑا رہ گیا۔ ڈاکٹروں نے مجھے تھام کے باہر پہنچایا۔ دروازے کے پاس چمپا موجود تھی وہ میرا بازو اپنے کندھے پر رکھ کے اور میری کمر پکڑ کے مجھے ہجوم سے دُور لے گئی۔

راج کرشنا کی ارتھی اُٹھنے سے پہلے اُس کی ماں کا انتظار ہوتا رہا۔ بنگلے پر آنے جانے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ میرا جی کرتا تھا کہ میں کسی کمرے میں بند ہو جاؤں کیونکہ جو شخص بھی آتا تھا، مجھے رُلاتا تھا۔ دوپہر کو جولین بھی آگئی تھی۔ اُس کی بھی ہچکیاں بندھ گئیں۔ چمپا نے اُسے سنبھالا اور وہ دونوں تعزیت کرنے والوں کی پذیرائی میں مصروف ہوگئیں۔ میں کرشنا جی کی پائنتی پکڑ کے بیٹھ گیا تھا۔ دوسرے دن سویرے سویرے راج کرشنا کی دھان پان بوڑھی ماں گھر میں داخل ہوئی تو اُسے اپنے بیٹے کی لاش کے پاس پہنچا دیا گیا۔ تھوڑی دیر وہ یوں ہی گُنگ کھڑی رہی، نہ روئی، نہ چلّائی پھر اُس کے منہ سے ایک گھُٹی ہوئی آہ نکلی، وہ دھڑام سے راج کرشنا کے مُردہ جسم پر گر گئی اور دیر ہوگئی مگر وہ نہیں اُٹھی۔ لوگوں نے اُسے اٹھانے کی کوشش کی تو انھیں پتہ چلا کہ وہ کب کی اپنے بیٹے کے پاس پہنچ چکی ہے۔

میں نہیں مرا، اُس کی ماں مجھ سے زیادہ اُس سے محبت کرتی تھی۔

میں بے غیرت تو فہمیدہ کی موت پر بھی زندہ رہا تھا، میں نے تو اماں کی موت کی خبر ہضم کر لی تھی، میں کوراکے بغیر اب تک زندہ تھا۔ دونوں ارتھیاں ایک ساتھ اٹھیں۔ بمبئی میں کرشنا جی کا کوئی عزیز نہیں تھا مگر گھر میں کہرام مچ گیا۔ ایس پی شکلا اور دوسرے پولیس افسر لواروں سے لگے ہوئے سسکتے رہے۔ جولین میرے سینے سے لپٹی ہوئی رو رہی تھی۔ رستم جی بھی نورین کے ساتھ آگئے تھے مسز روپ بھی موجود تھیں۔ میں تو کچھ بھی نہیں کہہ رہا تھا، میں تو اب رو بھی نہیں رہا تھا اور وہ سب میرے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ نورین بار بار میرا بازو پکڑ لیتی تھی۔ جولین آنسو بھری آنکھوں سے مجھے دیکھتی اور منہ بسورتی رہی۔ سڑک پر تِل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ شمشان گھاٹ میں بھی بہت بڑا ہجوم تھا۔ اُن میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جنھیں میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ عام لوگ، سڑک پر چلتے ہوئے لوگ غریب غربا، وہ جنھیں راج کرشنا نے بدمعاشوں کے مظالم سے بچایا تھا۔ دونوں ارتھیاں پورے اعزاز کے ساتھ خشک لکڑیوں کے سپرد کر دی گئیں اور آگ لگا دی گئی۔ کرشنا جی اور اُن کی ماں جلنے لگے اور دیکھتے دیکھتے دھواں بن گئے۔ سہ پہر کے قریب ہم واپس ہوئے تو گھر پر ویرانی مسلط تھی۔ جولین اور چمپا سرخ آنکھوں کے ساتھ واپس آنے والوں کی منتظر تھیں۔ میں نے کمرے میں بند ہو کے اندر سے کنڈی لگا لی۔ میرا سارا جسم دُکھ رہا تھا۔ جولین اور چمپا دروازہ کھٹکھٹاتی رہیں مگر میں نے نہیں کھولا اور نہ مجھ میں دروازے تک جانے کی ہمت تھی۔ میری آنکھوں میں کمرہ گردش کر رہا تھا۔

راج کرشنا کا قاتل گرفتار نہیں ہوا، نہ اُس کے گرفتار ہونے کی کوئی اُمید تھی۔ وہ بمبئی پولیس کے ایک بہت بڑے افسر لکشمی کمار کے گھر سے ایک اہم میٹنگ میں شرکت کرکے واپس آرہا تھا کہ باندرے کے قریب ایک سنسان مقام پر اُس کی گاڑی روک لی گئی۔ اُس رات ڈرائیور بھی اُس کے ساتھ نہیں تھا۔ انھوں نے چاقوؤں سے اُس کا جسم چھلنی کر دیا اور ہجوم جمع ہونے سے پہلے بھاگ گئے۔ راج کرشنا سڑک پر تڑپتا رہا۔ جب راہ گیر اُدھر سے گزرے تو انھوں نے گشتی پولیس والوں کو ڈھونڈ کے اس حادثے کی خبر دی۔ ایک دن پہلے ہی میں نے اُسے پولیس افسر جسونت کی باتیں بتا کے متنبہ کیا تھا اور اُس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے کام جلد نمٹانے کی کوشش کرے گا، کام نمٹ گیا۔ جسونت کے بقول شمبھو گروپ نے اُسے زندہ مدراس واپس نہیں جانے دیا۔ اخبارات راج کرشنا کی موت کی خبروں سے بھرے ہوئے تھے اور مطالبہ کر رہے تھے کہ قاتلوں کو جلد از جلد گرفتار کیا جائے۔ بڑے لوگوں کے تعزیتی بیانات چھپ رہے تھے، بمبئی پولیس کو کھلی اجازت دے دی گئی تھی کہ وہ کسی بھی مشکوک شخص کو پکڑ سکتی ہے۔ بائی کلّا کے لوگوں کا ایک گروہ تھانے کے آگے دھرنا دے کے بیٹھ گیا تھا کہ جب تک قاتل نہیں پکڑے جائیں گے، وہ وہاں سے ہٹیں گے نہیں۔ پولیس نے چند آدمی گرفتار بھی کیے تھے مگر ظاہر ہے، اُن میں سے کوئی بھی قاتل نہیں ہوگا۔

جولین اپنے گھر واپس نہیں گئی۔ اُسے بھی چپ لگ گئی تھی۔ ذرا ذرا سی دیر میں آنکھیں بھگو لیتی تھی۔ تین دن تک گھر میں صرف رات کو ہم تنہا رہے۔ ورنہ روزانہ دن بھر لوگ آتے رہے اور خواہ مخواہ کی باتیں کر کے ہمیں تنگ کرتے رہے۔ نورین بھی روز گھنٹوں میرے پاس خاموش بیٹھ کے چلی جاتی تھی۔ ایس پی شکلا اور دوسرے افسر زیادہ تر گھر ہی میں رہے جب بھی کوئی آتا تھا، راج کرشنا کی تعریف کرتا تھا مگر مرے ہوئے آدمی کی تعریف کرنے سے کیا حاصل۔ اس طرح لوگ مرنے والے کے عزیزوں کو ڈنک لگانے کا کام کرتے ہیں اور انھیں اُن کے بچھڑنے والے آدمی کے نقصان کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ وہ شاید چھیڑنے یا طنز کرنے آتے ہیں، میرا بس چلتا تو میں گھر کے دروازے بند کر لیتا۔ کیسا تماشا ہو رہا تھا۔ انھی میں مجھے جسونت بھی نظر آیا اور وہ شخص بھی جو اُس کے ساتھ راج کرشنا سے ملنے گھر آیا تھا۔ دونوں کے سر جھکے ہوئے تھے۔ انھیں دیکھ کے میرے لیے خود پر قابو رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔

قاتلوں کو معلوم تھا کہ اُس رات راج کرشنا کہاں گیا ہے اور کس وقت لکشمی کمار کے گھر سے واپس ہوگا اور کس راستے سے آسکتا ہے۔ انھیں سب باتیں معلوم تھیں مگر کون پوچھ سکتا تھا کہ انھیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہو گیا۔ شمبھو گروپ کے نام سے مجھے وحشت ہونے لگتی تھی۔ میں نے کئی بار گھر سے نکلنے کا خیال کیا مگر میں کس کا گریبان پکڑتا اور کہاں جاتا۔ ملنے بہت سے لوگ میرے صورت آشنا ہو چکے تھے۔ مستانہ کے اڈّے کی بات اور تھی، اُس وقت مجھے کوئی نہیں جانتا تھا۔ تین دن گزرنے کے بعد گھر میں لوگوں کی آمد و رفت بڑی حد تک کم ہو گئی۔ جولین روز صبح میرے بستر پر اخبار ڈال دیتی تھی۔ راج کرشنا کی خبروں کا زور اب کم ہو گیا تھا۔ اخبارات نے مجرموں کی گرفتاری میں پولیس کی ناکامی پر مایوسی ظاہر کی تھی اور لکھا تھا کہ راج کرشنا کی موت کسی بڑی سازش کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے، اگر اس سانحے پر توجہ نہ دی گئی تو پھر کسی پولیس افسر کی زندگی محفوظ نہیں رہے گی اور یہاں غنڈوں بدمعاشوں کا راج ہوگا۔ اخبارات سے معلوم ہوتا تھا کہ راج کرشنا کی موت کا چرچا پورے شہر میں ہو رہا ہے اور پولیس اپنی ناکامی پر پشیمان ہے۔ لکشمی کمار کا بیان بھی چھپا تھا کہ پولیس اپنے تمام وسائل بروئے کار لا رہی ہے لیکن پانچ دن گزر گئے تھے اور قاتلوں کی کوئی سن گن نہیں ملی تھی، بائی کلّا کے تھانے پر بیٹھا ہوا گروہ بھی پولیس افسروں کے وعدوں پر منتشر ہو گیا تھا۔

پانچویں دن ایس پی شکلا نے تین چار پولیس افسروں کے ہمراہ آکے مجھے حکومت کے احکام سُنائے۔ ہمیں مزید تین مہینے تک اس مکان میں رہنے کی اجازت دی گئی تھی۔ یہ مدت ہماری درخواست پر بڑھائی بھی جاسکتی تھی۔ محکمہ پولیس نے راج کرشنا کی خدمات کے عوض پچیس ہزار روپے کی رقم کا اعلان کیا تھا اور مجھے پیش کش کی تھی کہ میں جب چاہوں، مجھے پولیس کی ملازمت میں لیا جا سکتا ہے۔ گورنر کی طرف سے دس ہزار روپے کی ایک خصوصی رقم بھی راج کرشنا کے پس ماندگان کے لیے مختص کی گئی تھی۔ راج کرشنا کے پس ماندگان میں صرف میں رہ گیا تھا۔ ایس پی شکلا نے ایک دستاویز میرے سپرد کی تھی۔ اُس کی رُو سے میں مدراس میں راج کرشنا کی تمام جائداد اور نقدی کا تنہا وارث قرار دیا گیا تھا۔ میں یہ سُن کر دنگ رہ

گیا کہ راج کرشنا نے اسپتال میں میرے پہنچنے سے پہلے مجسٹریٹ کو بلا کے وصیت کردی تھی۔ اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں نے اپنا بیان لکھوا دیا ہے مگر میں نے دھیان نہیں دیا تھا۔ میں سمجھا تھا کہ اُس نے حادثے کے متعلق کوئی بیان لکھوایا ہوگا۔ میں تو تصور تک نہیں کرسکتا تھا کہ وہ اس آخری وقت میں مجھے اس قدر یاد رکھے گا جب کہ اُس کی سانس اُکھڑ رہی تھی۔ شکلا یہ نوشتہ سنا رہا تھا اور میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ ایک جائداد کا وارث مجھے زرّیں نے بنایا تھا، ایک جائداد کا وارث مجھے راج کرشنا نے بنا دیا تھا، وہ شاید فہمیدہ کی موت کا معاوضہ تھا، یہ راج کرشنا کی موت کا۔ میں نے تمام دستاویزات شکلا کو واپس کردیں۔ "شکلا جی! مذاق مت کیجیے۔" میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا "مجھے کسی جائداد کی ضرورت نہیں ہے، یہ روپے پیسے میرے لیے بے کار ہیں۔ آپ حکومت کی عطا کی ہوئی رقم بھی لوٹا دیجیے اور کرشنا جی کی جائداد کا کوئی اور مناسب انتظام کردیجیے۔"

"کرشنا جی کی آتما تمھارے فیصلے سے ناخوش ہوگی۔" شکلا گلوگیر آواز میں بولا۔ "اور میں تمھیں مشورہ نہیں دوں گا کہ تم حکومت کی طرف سے دی ہوئی رقمیں واپس کرو، تم اس کا جو چاہے استعمال کرنا مگر انھیں واپس مت کرو، یہ تمھیں نہیں، کرشنا جی کو اُن کی شان دار خدمات کے عوض دی گئی ہیں، یہ بہت کم ہے۔ سُنا ہے حکومت کرشنا جی جیسے دیانت دار اور فرض شناس پولیس افسر کی یادگار قائم کرنے کے لیے اور اُن کی زندگی پولیس افسروں کے لیے ایک مثال بنانے کے بارے میں بہت کچھ سوچ رہی ہے۔ تم نے اخبار میں پڑھا ہوگا کہ گورنر نے انھیں کتنا زبردست خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔"

"مگر لوگوں نے انھیں مار دیا، اب خراجِ تحسین پیش کرنے سے کیا ہوتا ہے؟ اِن انعامات کا اعلان سُن کے کیا وہ واپس آجائیں گے۔ یہ رقم واپس کردیجیے، میں اِس کا مستحق نہیں ہوں۔"

"تمھی اِس کے مستحق ہو کیونکہ تمھی کو کرشنا جی نے اپنا وارث مقرر کیا ہے۔ سب کو موت آنی ہے ظہیر خاں! سب مرجائیں گے، آدمی کے پاس دوسرے آدمی کو یاد کرنے کے سوا اور کیا چارہ ہے۔ جو قاتل ہیں کیا وہ زندہ رہیں گے، وہ بھی مرجائیں گے مگر اُن کے مرنے پر کوئی انھیں یاد نہیں کرے گا۔ کرشنا جی مجھ سے تمھاری بہت سی باتیں کرتے تھے، وہ تمھاری بڑی عزت کرتے تھے۔ آخری دن وہ بہت دیر تک تمھارے بارے میں باتیں کرتے رہے۔"

"وہ کیا کہہ رہے تھے؟" میں نے بوکھلا کے کہا۔

"وہ تم سے بہت متاثر تھے۔ کہتے تھے کہ میری یہ زندگی ظہیر خاں کے سبب سے ہے۔ اُس نے دو بار مجھے بچایا ہے، وہ ایک ہمت والا اور ذہین نوجوان ہے۔"

"لیکن وہ چلے گئے اور میں دیکھتا رہ گیا۔"

"اب تمھارا فرض ہے کہ تم اُن کی کمائی ہوئی رقم صحیح طریقے سے استعمال کرو، اگر تم نے اس کے ساتھ غیروں کا سلوک کیا تو یہ اچھی بات نہیں ہوگی۔ دیکھو ظہیر! تم نے غور نہیں کیا، جسے کوئی اپنا سمجھتا ہے، اُسی کے لیے ایسا کرسکتا ہے، ورنہ کون کسی کا اتنا خیال رکھتا ہے۔ کیا تم اُن کی خواہش کی بجا آوری سے انکار کردو گے؟" شکلا نے نرمی سے کہا۔

"شکلا جی! یوں تو بہت کچھ کہا جاسکتا ہے مگر یہ اچھا نہیں لگتا۔ کرشنا جی کی خواہش سر آنکھوں پر، وہ مجھ سے جان بھی طلب کرتے تو میں انکار نہ کرتا مگر یہ سب کچھ ....." میں نے دوبارہ ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

"شکلا جی! کرشنا جی کی روح کا اگر آپ کو اتنا ہی لحاظ ہے تو اُن کے قاتلوں کو بھی پکڑنے کی کوشش کیجیے یا مجھے صرف ایک بار بتا دیجیے وہ کون لوگ ہیں؟ آپ کو کرشنا جی کی قسم!"

"پوری کوشش کی جارہی ہے۔" شکلا افسردگی سے بولا۔ "انھوں نے بہت منظم منصوبہ بنایا تھا، بہرحال ہم اُن تک پہنچ ہی جائیں گے اور یقین کرو کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔"

"رعایت کرنے کا معاملہ تو بعد میں آتا ہے، پہلے آپ وہاں تک پہنچ تو جائیں۔ آپ کبھی اُن کا سراغ نہیں لگا سکتے اس لیے کہ آپ ......"

شکلا نے میری بات کاٹ دی اور اپنے ساتھی پولیس افسروں کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا۔ "میں تمھارے احساسات کا اندازہ کرسکتا ہوں ظہیر خاں! مگر صبر رکھو، کچھ نہ کچھ تو ضرور ہو کے رہے گا۔" وہ ترشی سے بولا۔ غالباً اسے اپنے ساتھیوں کی موجودی میں میرے منہ سے کوئی ناروا بات نکل جانے کا اندیشہ ہوگیا تھا۔ اُس نے کاغذات وہیں چھوڑ دیے اور جلد واپس آنے کا وعدہ کرکے رخصت ہوگیا۔

میں نے سوچا، چلتے چلتے ایس پی شکلا کے کانوں میں ایک بات ڈال دوں، اُس سے کہہ دوں کہ تم بھی کسی دن کرشنا جی کی طرح کسی سڑک پر تڑپتے ہوئے نظر آؤ گے کیونکہ تم میں بھی وہی خامیاں ہیں جو کرشنا جی میں تھیں۔ کرشنا جی کی موت کے بعد کسی پولیس افسر نے ہمارا اتنا خیال نہیں رکھا جتنا شکلا نے کیا۔ اُس نے اپنا بیشتر وقت ہمارے ساتھ گھر پر ہی گزارا۔ وہ موجود ہوتا تو وہی آنے جانے والوں سے ڈھنگ کی بات کرتا، میرا تو کسی سے ملنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا، وہ اب بھی کرشنا جی کا نام احترام سے لیتا تھا جیسے کرشنا جی اُس کے قریب بیٹھے ہوں، اُس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ مجھے، جولین اور چمپا کو مار مار کے کھانا کھلائے، جب بھی آتا تھا، صبر و ضبط کی تلقین کرتا رہتا تھا۔

راج کرشنا کی وصیت کی خبر اخبارات کو بھی ہوگئی۔ کئی فوٹوگرافر اور نمایندے میرا فوٹو لینے اور مجھ سے بات کرنے کے لیے گھر آئے، میں اُن سے نہیں ملا۔ یقیناً شہر میں اس خبر پر حیرت کا اظہار کیا جارہا ہوگا کہ آخر راج کرشنا نے ظہیر خاں نامی ایک اجنبی نوجوان کو اپنی کل جائداد کا وارث کیوں بنایا۔ میں نے کاغذات میز کی دراز میں ڈال دیے تھے، مجھ سے اُن کی تفصیلات بھی نہیں دیکھی گئیں۔ کچھ دن تک برابر شہر کے مختلف علاقوں اور تھانوں میں راج کرشنا کی موت پر تعزیتی جلسے ہوتے رہے۔ اُن میں مجھے بھی

بلایا جاتا تھا۔ میں کسی جلسے میں شریک نہیں ہوا۔ ایک دن نوین نے مجھے فون کرکے اصرار کیا کہ کلب کی جانب سے کرشنا جی کی موت پر ایک ماتمی شام منائی جارہی ہے جس میں میری شرکت ضروری ہے۔ میں وہاں بھی نہیں گیا۔ آخر لوگ خود ہی تھک گئے۔ دس دن بعد لوگوں کی آمد و رفت میں بے حد کمی ہوگئی۔ ایس پی شکلا اور دو ایک افسروں کے سوا تقریباً سبھی نے آنا بند کردیا۔

❁

دس روز سے اُوپر ہوگئے تھے لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ابھی ابھی گھر آجائیں گے، وہ دوسرے کمرے میں موجود ہیں اور ابھی مجھ کو برا بھلا کہتے ہوئے باہر نکلیں گے، سڑک پر کسی گاڑی کا ہارن بجتا تو میں اپنی جگہ سے اچھل پڑتا تھا کہ کرشنا جی آرہے ہیں اور کھانے کی میز خالی پڑی ہے، چمپا نے ابھی تک کھانے کا انتظام نہیں کیا ہے، ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی ہے، شاید کوئی کرشنا جی کو پوچھے کہ وہ گھر میں موجود ہیں یا کہیں گئے ہوئے ہیں۔ ڈرائنگ روم میں اُن کی تصویر لگی ہوئی تھی، ہر وقت ایسا لگتا تھا جیسے کرشنا جی کہہ رہے ہوں، ظہیر تم مجھے بھول تو نہیں گئے، میں انھیں کیسے بھول سکتا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں، انھیں کہاں سے ڈھونڈ کے لاؤں؟ جولین نے ابھی تک اپنے گھر کا رُخ نہیں کیا تھا، دس دنوں تک نہ مجھے کوئی احساس ہی نہیں ہوا کہ اُسے اپنے گھر بھی جانا چاہیے۔ اس عرصے میں ایک بار بھی سینٹ مریم میں وہ اپنے باپ کو دیکھنے نہیں گئی تھی، خود میں نے گھر سے باہر قدم نہیں نکالا تھا۔ گھر کی تمام دیکھ بھال جولین اور چمپا ہی کرتی رہی تھیں، میں تو زیادہ تر اپنے کمرے میں بند رہتا تھا۔ جولین کی ماں پورے گھر میں تنہا تھی اور اپنی بیٹی کو دیکھنے کے لیے خود ہی وہاں آجاتی تھی۔ کرشنا جی کو گئے ہوئے شاید بارھواں روز تھا کہ میں نے جولین سے کہا کہ وہ اب اپنے اسکول جائے اور اپنے گھر میں جاکے رہے، وہ کب تک یہاں رہے گی۔ میرا کیا ہے، میں تو ان باتوں کا عادی ہوچکا ہوں۔ ایک بات اور سنو، حکومت نے تین مہینے تک اس مکان میں رہنے کی اجازت دی ہے مگر کرشنا جی کے بغیر یہاں ایک ایک لمحہ گزارنا مشکل ہورہا ہے، در و دیوار پر اُن کی پرچھائیاں لرزتی رہتی ہیں، ہر گوشے میں اُن کی آواز گونجتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، جب سے وہ گئے ہیں، اُن کا کمرہ بند پڑا ہے، وہاں جاتے ہوئے اور اُن کی چیزیں چھوتے ہوئے ہول آتا ہے، اب کسی نہ کسی دن یہاں سے جانا ہی ہے۔ حکومت قیام کی مدت میں کچھ اور توسیع کردے تو بھی کیا فرق پڑتا ہے، بہتر ہے کہ ہم اس سے پہلے ہی چلے جائیں۔ میری بات سُن کے جولین کی آنکھیں پھر برسنے لگیں۔ چمپا جس نے اب تک بہت ضبط و تحمل کا ثبوت دیا تھا، اُس کا بند بھی ٹوٹ گیا۔

"مگر تم نے کیا سوچا ہے؟" جولین نے اضطراب سے پوچھا۔

"میں کسی بھی جگہ چلا جاؤں گا۔"

"تم کہاں جاؤ گے؟" وہ سراسیمگی سے بولی۔

"میرا کیا ..... میں تو پہلے ہی کہیں چلا جاتا، کرشنا جی نے پیروں میں بیڑی ڈال رکھی تھی۔" پھر میں نے چمپا سے مخاطب ہوکے کہا "اب تمھیں بھی اپنا کوئی ٹھکانا ڈھونڈ لینا چاہیے۔" مجھے بعد میں خیال آیا کہ جولین کے سامنے مجھے چمپا سے ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی لیکن بات منہ سے نکل گئی، چمپا کوئی جواب دینے کے بجائے سر جھکائے روتی رہی۔

جولین نے ہم دونوں کو حیرت سے دیکھا اور تذبذب سے بولی "میرے ذہن میں ایک تدبیر آرہی ہے، کیوں نہ ہم سب ایک ساتھ رہیں۔ کرشنا جی نے مجھے جو مکان دلایا تھا، اُس میں خاصی گنجائش ہے۔ وہ ہمیں پہلے ہی ضرورت سے بڑا معلوم ہوتا تھا، ہم سب وہاں رہ سکتے ہیں، اگر تنگی محسوس ہوئی تو ہم کوئی دوسرا مکان لے لیں گے۔"

"نہیں جولین۔" ان دنوں ساتھ رہنے کے بعد وہ مجھے آپ کہنا بھول گئی تھی اور میں، ہمارے درمیان شاگرد اور اُستاد کے رشتے کا حجاب ختم ہوچکا تھا۔ پہلے بھی وہ کتنا رہ گیا تھا، وہ اس گھر میں گھر کے ایک فرد کی طرح رہ رہی تھی۔ میں نے انکار کیا تو اُس کی آنکھوں میں اداسی اور حیرانی سمٹ آئی۔ "مجھے جانا ہے، مجھے بہت دُور جانا ہے۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ میں نے جولین کو اپنے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں بتایا تھا۔ ممکن ہے اُس نے کبھی چمپا سے کرید کی ہو اور چمپا نے راج کرشنا کی طرح اُسے بھی کچھ بتا دیا ہو، خیر چمپا سے مجھے بعد میں پوچھنا تھا کہ اُس نے وعدہ خلافی کیوں کی۔

"میں تم سے کچھ کہہ تو نہیں سکتی۔" جولین نے مایوسی سے کہا "لیکن اگر تم مجھے اجازت دو تو میں ابھی کچھ دن یہاں ٹھیرنے کی درخواست کروں گی، مجھے اُمید ہے تم میری بات ضرور مان لو گے۔"

"لیکن اس سے کیا حاصل ہوگا؟" میں نے جھنجلاہٹ سے کہا۔

"تو پھر تم میرے گھر چلو، تمھارا دل بھی بہل جائے گا، ہم دونوں ماں بیٹی اکیلے ہیں، تم تو سب کچھ جانتے ہو، ہمارے پاس دھن دولت بھی نہیں اور پھر تم بھول گئے۔ یاد کرو، کرشنا جی کی کیا خواہش تھی، وہ چاہتے تھے کہ تم بہت پڑھ لکھ جاؤ، وہ تمھارے لیے اپنے دل میں بڑی آرزوئیں رکھتے تھے، تم میرے ساتھ رہو گے تو میں تمھیں اُن کی خواہش کے مطابق خوب پڑھاؤں گی، تمھیں ہمارے گھر میں کوئی تکلیف نہیں ہوگی، وہ گھر بھی تمھارا ہوگا۔"

"مجھ سے اصرار مت کرو جولین۔" میں نے عاجزی سے کہا "میں اب اِس شہر میں رہنا نہیں چاہتا، میں کسی گھر میں رہنا نہیں چاہتا، تم بھی ایک دن مجھ سے تنگ آجاؤ گی۔ تم ..... تم نہیں جانتیں کہ میں کہیں ٹک کے نہیں رہ سکتا۔" میں وہاں سے اُٹھ گیا۔ بہتر یہی تھا کہ میں یہ گفتگو ہی نہ کروں۔ مجھے اندازہ تھا، جولین اسی طرح ضد کرتی رہے گی۔ وہ ایک بہت نفیس لڑکی تھی، کرشنا جی بھی اُس سے بہت محبت کرتے تھے۔ مجھے بھی

وہ بہت اچھی لگتی تھی لیکن کرشنا جی کی بات اور تھی، وہ تو اِس طرح بات کرتے تھے کہ کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں پڑتی تھی۔ میں نے کئی مرتبہ یہاں سے بھاگنے کا ارادہ کیا مگر ہر مرتبہ جیسے اُنھیں پتہ چل جاتا تھا اور وہ ایسی بات کرتے تھے کہ ندامت کے سوا کچھ بن نہیں پڑتا تھا۔

جولین نہیں گئی۔ اُس کی ماں روز آتی رہی اور میرے سر پہ کرشنا جی کا غذات کا جو بوجھ ڈال گئے تھے، وہ بتدریج بڑھتا گیا۔ ایس پی شکلا مشورہ دیتا تھا کہ مجھے مدراس جاکے کرشنا جی کی جائداد کا کوئی مناسب انتظام کرنا چاہیے، اُسے اس طرح نہیں چھوڑنا چاہیے، اس گھر میں بھی اُن کا خاصا سامان تھا۔ میں یہ سب کہاں رکھتا اور کس کے سپرد کرتا؟ حکومت کی طرف سے دونوں چیک بھی آگئے تھے۔ مجھے کرشنا جی نے عجب اُلجھن میں مبتلا کردیا تھا۔ مدراس جاکے اُن کی جائداد کی دیکھ بھال کروں، مجھے یہ سب کچھ ایک ناٹک نظر آتا تھا اور یوں ہی سب کچھ چھوڑ کے چلاؤں جیسے کرشنا جی چلے گئے تھے، اس کا حوصلہ بھی نہیں ہوتا تھا، اُن کے خفا ہونے کا اندیشہ رہتا تھا، اُنھیں معلوم تھا کہ مجھے ان چیزوں سے کوئی واسطہ نہیں ہوسکتا، وہ سب جان گئے تھے پھر بھی انھوں نے احتیاط نہیں کی۔ وہ چپکے چپکے ابا جان اور گھر والوں کا پتہ چلا رہے تھے۔ اتنی راز داری سے کہ مجھے ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ نہ جانے انھیں کب میرے بارے میں اتنی باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ اُن کے طرزِ عمل میں ایک بال کا بھی فرق نہیں آیا تھا، وہ جانتے تھے کہ میں یہ سب کچھ نہیں کرسکوں گا۔ میں تو اُن کے سامنے بھی کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ دن بھر گھر میٹھا رہتا تھا یا بازاروں میں سرگشت کرتا رہتا تھا۔ شاید انھوں نے مجھے ایک کھونٹے سے باندھنے کے لیے یہ فتنے داری سونپ دی ہو، انھوں نے بُرا کیا، کاش وہ یہ وصیت میرے سامنے کرتے تو میں اُن کے پیر پکڑ کے معذرت کرلیتا مگر اُنھوں نے اس کا موقع نہیں دیا۔ چمپا نے انھیں اتنا ہی بتایا ہوگا کہ مجھ سے ابا جان اور گھر والے بچھڑ گئے ہیں ممکن ہے اُس نے فہمیدہ والی بات بھی بتادی ہو اور انھیں میرے حال پر ترس آگیا ہو۔ اُنھیں کیا معلوم تھا کہ گھر والوں کو تو میں نے خود چھوڑا تھا، سات سال جیل میں رہنے کے بعد میں نے پلٹ کے گھر کی خبر نہیں لی تھی۔ میں جیل سے چھوٹ کے سیدھا اُس کی تلاش میں نکلا تھا جو نہ جانے کس تہ خانے میں روپوش ہوگئی تھی۔ کرشنا جی ایک صرف گھر والوں کی گم شدگی سے واقف تھے۔

میں نے اپنے آپ کو ملامت کی کہ میں نے اُن کے متعلق بدگمانی کیوں کی، اُن کا جذبہ ترس پر محمول کیا۔ ترس کیسا، چمپا کے آنے سے پہلے جب وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے تب بھی وہ مجھ سے اتنی ہی محبت کرتے تھے۔ چمپا تو بہت بعد میں آئی تھی اور آنے کے بعد اُس نے فوراً تمام باتیں نہیں بتادی ہوں گی۔ میں نے تو اُن کے ساتھ بڑی زیادتی کی تھی، وہ بات کرنا چاہتے تھے تو میں اُن سے چھپا چھپا رہتا تھا۔ اب وہ مجھ سے چھپ گئے میرے دماغ میں کوئی معقول بات نہیں آرہی تھی اگر میں مدراس جاکے اُن کی جائداد بیچ کے نقدی وصول کرلیتا ہوں تو میں اُس کا کیا کروں گا، میں گھر بناؤں گا؟ سامان اکٹھا کروں گا اور پھر لوگ میرے گھر آیا کریں گے؟ وہاں کھانے پکا کریں گے؟ اگر یہی کرنا تھا تو پھر زرّیں اور بھل کے پاس رہنے میں کیا حرج تھا۔ زرّیں نے بھی اپنی تمام جائداد میرے نام کردی تھی۔ نیا گھر بساؤں گا۔ بیں! مجھے اپنے آپ پر ہنسی آنے لگی۔ کرلا کو بھلادوں گا اور اپنے آپ کو گھر کی چار دیواری میں مقید کرلوں گا کیونکہ روپیہ پیسہ اکٹھا کرنا مشکل ہوتا ہے، اتفاق سے ہاتھ لگ گیا ہے تو مجھے کوڑی کوڑی قیمت سمجھ کے اُسے استعمال کرنا چاہیے۔

میں کوئی فیصلہ نہ کرسکا تو چمپا اور جولین نے بھی کچھ نہیں کیا جب کہ میں نے صاف طور پر اُن سے کہہ دیا تھا کہ چمپا اپنا کوئی اور ٹھکانا ڈھونڈ لے اور جولین اپنے گھر چلی جائے۔ وہ دونوں سائے کی طرح میرے پیچھے لگی رہتی تھیں۔ میں سامنے نہیں ہوتا تھا تو مجھے اُن کی نگاہیں تعاقب کرتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں، کبھی جولین میرے سامنے کھانا لاکر رکھ دیتی، کبھی چمپا اور وہ دونوں عموماً چپ ہی رہتیں، جب سے میں نے جولین سے انکار کیا تھا وہ ہر وقت نڈھال نڈھال سی رہتی تھی۔ وہ اپنے کپڑوں کی طرف سے بھی بے فکر ہوگئی تھی، میں جانتا تھا کہ وہ میرے انکار سے ناخوش ہے مگر کیا میں اُس سے اقرار کرلیتا؟ اُن دونوں کی نگاہوں سے بچنے کے لیے میں نے گھر سے باہر رہنا شروع کردیا تھا۔ میں روز صبح ہوتے ہی گھر سے نکل جاتا اور رات کو گھوم پھر کے واپس آتا تو وہ دونوں ڈبڈبائی آنکھوں اور لرزتے ہونٹوں سے مجھے دروازے کے قریب لان میں ٹہلتی ہوئی ملتیں۔ میں کہہ دیتا کہ بھوک نہیں ہے تو پھر وہ بھی کچھ نہیں کھاتیں، پھر میں نے اُن کی وجہ سے یہ کہنا ہی بند کردیا۔ کھانے کی میز پر بھی خاموشی طاری رہتی تھی، بھل کی تیزی و طرّاری بھی کرشنا جی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

پولیس نے بہت سے لوگوں کو پکڑا اور چھوڑ دیا۔ راج کرشنا کے مجرم محفوظ رہے۔ اخبارات بھی چُپ ہوگئے تھے اور وہ لوگ بھی جنھوں نے اُن کے قاتلوں کو عبرت ناک سزائیں دلوانے کے لیے جلسے اور مظاہرے کیے تھے لیکن میرے ذہن میں ابھی تک پولیس افسر جسونت کی باتیں محفوظ تھیں۔ شمبھو گروپ! جب بھی کوئی کرشنا جی کا ذکر کرتا یا میں اُن کی تصویر دیکھتا، شمبھو گروپ کا نام میرے دماغ میں چبھنے لگتا۔ میں نے ایک دن اشارتاً ایس پی شکلا کے سامنے یہ نام لیا تھا تو وہ چونک پڑا تھا اور اُس نے بتایا تھا کہ شمبھو تو اِس بمبئی کا ایک بہت بڑا آدمی ہے، اُس کے کئی کارخانے ہیں۔ اور بھی کئی قسم کے کاروبار ہیں۔ اس کی جائداد کا کوئی شمار ہی نہیں، وہ مجھ سے پوچھنے لگا کہ میں شمبھو سیٹھ کے بارے میں اتنا متجسس کیوں ہوں۔ میں نے اُسے جسونت کی زبانی سُنی ہوئی باتیں نہیں بتائیں اور کہا یونہی، میں نے اُس کا ذکر بہت سنا ہے۔ ایس پی شکلا میرے جواب سے

مطمئن نہیں ہوا اور اُس نے چلتے چلتے شمبھو سیٹھ، اُس کی امارت اور اثر و رسوخ کا تذکرہ قدرے تفصیل سے کیا۔ میں سُنتا رہا۔ ایس پی شکلا کے جانے کے بعد میں نے بہت غور کیا مگر کوئی مناسب صورت ذہن میں نہیں آئی۔ شمبھو گروپ کے لوگ مجھ سے ضرور واقف ہوں گے کہ میں کرشنا جی کے ساتھ رہتا تھا۔ مستانہ کا بھی اُن سے تعلق ہوسکتا ہے۔ کرشنا جی پر وار کرنے سے پہلے انھوں نے اُن کے متعلق ہر بات جان لی ہوگی کہ وہ کہاں رہتے ہیں، اُن کی مصروفیات کیا ہیں اور اُن کے ساتھ کون کون رہتا ہے اور یہ بات بھی اُن سے چھپی نہ رہی ہوگی کہ کرشنا جی مجھی کو کلب لے گئے تھے۔ کلب میں اُن پر ہونے والا حملہ ناکام بنانے والا بھی میں تھا۔ کاش وہ کرشنا جی کے بجائے مجھے نشانہ بنا دیتے کیونکہ میری اس دنیا میں کوئی ضرورت نہیں تھی، اور میری موت کے بعد ممکن تھا، کرشنا جی سنبھل سنبھل کے قدم اُٹھاتے یا میرے کہنے کے مطابق یہ شہر ہی چھوڑ دیتے۔ کرشنا جی کی ابھی دُنیا کو بہت ضرورت تھی۔ اُن کی پوری زندگی ہی لوگوں کی خدمت کرتے ہوئے گزری تھی، زندہ رہتے تو لوگوں کے کام ہی آتے۔ کرشنا جی میرے ذمّے صرف جائداد ہی نہیں چھوڑ گئے تھے، ایک اور بار بھی ڈال گئے تھے۔ میں سوچتا تھا اگر اُن کے قاتلوں کو درگزر کرکے بمبئی سے چلا گیا تو مجھے کہیں چین نہیں ملے گا اور کرشنا جی کی رُوح بھی مجھ سے شاکی رہے گی۔ بھل سُنے گا تو طمانچے مارے گا لیکن اگر مجھے کوئی بتادیتا کہ وہ فلاں شخص ہے تو میں کبھی کا اُس کے سینے میں چاقو اُتار چکا ہوتا۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ سیٹھ شمبھو کے وہ کون سے آدمی تھے جو اس حملے میں شامل تھے، مستانہ کے بھی کئی آدمی آزاد ہوگئے تھے۔ وہ بھی میری طرف سے اپنے دل میں خار لیے پھر رہے ہوں گے۔ کرشنا جی کی وجہ سے پولیس کے کئی افسر میری صورت آشنا ہوچکے تھے۔ ایسی صورت میں اچھی طرح پہلے اِدھر اُدھر کا جائزہ لے لینا چاہیے تھا۔ جس طرح اُنھوں نے موقع محل کا خیال رکھا، مجھے بھی کرشنا جی کی طرف سے اُسی نظم و ضبط کا ثبوت دینا چاہیے تھا۔ مستانہ کے اڈے کی طرح یوں ہی گھستا چلا جاتا تو بعد میں میرے حوالے سے کرشنا جی ہی کی رُسوائی ہوتی۔

مجھے اِس تاخیر سے بہت گھٹن ہو رہی تھی لیکن ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے سے تھے میں نے انتظار کیا، شاید پولیس ہی کوئی کارنامہ انجام دے ڈالے۔ اب اتنی دیر گزر جانے کے بعد پولیس سے توقع رکھنا بے کار تھا۔ میں نے بہت سوچ اور سوچتے سوچتے میرا ذہن شمبھو سیٹھ کے نام پہ جاکے ٹھہر گیا۔ اُسی شخص کی ایما پر سب کچھ ہوا ہوگا۔ اُس کی اجازت کے بغیر اُس کے آدمی کرشنا جی جیسے بڑے پولیس افسر کو ختم کرنے کی جرات نہیں کرسکتے تھے۔ مجھے کسی طرح اُسے تلاش کرنا چاہیے تھا لیکن شمبھو سیٹھ تک رسائی آسان بات نہیں ہوگی۔ اُس تک پہنچنے میں قدم قدم پر رکاوٹیں پیش آسکتی ہیں اور درمیان میں بات خراب ہوسکتی ہے۔ بہتر یہی نظر آتا تھا کہ مناسب وقت کا انتظار کیا جائے جب تک لوگ کرشنا جی کا واقعہ بھول نہ جائیں اور میری صورت لوگوں کی نظروں سے معدوم نہ ہوجائے۔

دیر ہو رہی تھی کرشنا جی کی موت کو ایک مہینے سے زیادہ گزر چکا تھا اور میں کچھ بھی نہیں کرسکا تھا، تمام کاغذات جوں کے توں پڑے ہوئے تھے۔ جولین نے اسکول جانا شروع کردیا تھا مگر وہ رہتی ہمارے ساتھ ہی تھی۔ وہ کچھ دُبلی اور زرد ہوگئی تھی۔ ایک دن اُس نے بہت دنوں بعد اپنا خوب صورت لباس پہنا اور مجھے اصرار کرکے اپنے ہمراہ سینی ٹوریم لے گئی۔ اُس کے باپ کی حالت پھر خراب ہوچلی تھی۔ واپسی کے راستے میں جب ہم ایک دوسرے کے ساتھ بس میں برابر بیٹھے ہوئے تھے، اُس نے خواہش ظاہر کی کہ کسی ریستوراں میں چل کے چائے پینی چاہیے۔ ہم درمیان میں اُتر گئے اور ایک بہت اونچے قسم کے ریستوراں کے ایک گوشے میں بیٹھ گئے۔ ریستوراں کا ماحول پُرسکون تھا۔ کرشنا جی بھی ایک بار مجھے ایسے ہی ایک ریستوراں میں لے گئے تھے۔ میں گم سم بیٹھا تھا، جولین نے میرا ہاتھ دبا کے سرگوشی کی: "تمیں بھی کچھ بولنا چاہیے۔"

"ہاں۔" میں نے گھبرا کے کہا "مگر تمھی باتیں کرو، میں سُنتا رہوں گا۔"

"ظہیر!" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولی "تم سے باتیں کرنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ بے شک تمھیں کرشنا جی کی موت کا بہت صدمہ ہوگا مگر اِس سے کچھ کم مجھے بھی ہوگا، میں نے اُن کی موت قبول کرلی ہے کیونکہ موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ اسے قبول ہی کرنا پڑتا ہے۔ تمھیں بھی ایسا کرنا چاہیے۔ میں تم سے پوچھتی ہوں کہ تم زندگی سے کب تک اتنے بے گانہ رہو گے۔ اگر تم مجھے اپنا ایک ہم درد سمجھتے ہو اور سمجھتے ہو کہ میں تمھارے متعلق اچھی باتیں سوچ سکتی ہوں تو مجھے کچھ بتاؤ، آخر تم اتنے روٹھے ہوئے کیوں ہو؟"

میں فوراً کوئی جواب نہیں دے سکا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد میں نے دھیمے لہجے میں کہا "یہ سوال مجھ سے بہت لوگ کرتے ہیں اور مجھ سے اس کا کوئی جواب نہیں دیا جاتا۔ ایک کرشنا جی جُدا نہیں ہوئے جولین!" میری آواز بھر بھرا گئی "مت پوچھو۔"

"مجھے کچھ کچھ معلوم ہوا ہے اور اتنا تو میں خود اندازہ کرسکتی ہوں کہ کوئی ایسی بات ضرور ہے جس نے تم جیسے آدمی کو گھن لگا دیا ہے۔ اب تو خیر اسے کرشنا جی کی موت کا سبب کہا جاسکتا ہے مگر میں نے دیکھا ہے کہ تم اُن کی موجودگی میں کس طرح رہتے تھے۔ تم سے پوچھنے کی ہمت نہیں پڑی اور کرشنا جی نے بھی تاکید کردی تھی، مجھے یقین ہے کہ مجھے بتانے سے کچھ نہیں ہوگا ورنہ تم بتا دیتے اور ظاہر ہے، میری حیثیت ہی کیا ہے، میں تمھارے کسی کام نہیں آسکتی لیکن میں تمھارا دُکھ ضرور بانٹ سکتی ہوں، مجھ پہ اتنے اعتماد کا اظہار ضرور کرو۔"

"اعتماد کی بات نہیں ہے جولین!" میں نے بیزاری سے کہا "مجھے تم پر پورا اعتماد ہے لیکن میں تمھیں کیا بتاؤں۔ شاید تم سے چمپا نے کچھ کہا ہو۔"

"چمپا دیدی نے صرف اتنی بات بتائی ہے کہ تم سے تمھارے کچھ عزیز

بچھڑ گئے ہیں مگر اتنی بات تو تم سے قریب رہنے والا کوئی بھی شخص جان سکتا ہے تم نے خود بھی کئی بار اِس قسم کی باتیں کی ہیں کہ تمہارا کوئی گھر نہیں ہے، تمہارے پاس وقت کی کمی نہیں ہے، تم پڑھنا نہیں چاہتے، دوسرے نوجوانوں کی طرح تمہاری کوئی دلچسپی بھی نہیں ہے، بمبئی جیسے شہر میں رہتے ہوئے تم گھر میں گھسے رہتے ہو، تم اپنی اس عمر میں کسی سے بات کرنا نہیں چاہتے۔ کرشنا جی کے اور تمہارے ناموں کا فرق اتنا واضح ہے کہ کوئی بھی تمہارے بارے میں آسانی سے چند رائیں قائم کر سکتا ہے۔ تمھیں اس حالت میں دیکھ کے جی بہت کڑھتا ہے۔ بہت رونا آتا ہے۔" اس نے اپنی آنکھوں پر رومال رکھ لیا اور خاموش ہو گئی۔

"میرے متعلق اتنا مت سوچو جولین! تمھاری اپنی پریشانیاں کچھ کم نہیں ہیں، تمہارے باپ بیمار ہیں، ماں اکیلی رہتی ہیں، اب تمھیں اُن کے پاس چلی جانا چاہیے۔"

"تمھیں اس طرح چھوڑ کے جانے کو جی نہیں چاہتا۔"

"مجھے کچھ نہیں ہوا ہے اور نہ مجھے کچھ ہو گا۔ میری فکر مت کرو، مجھے آسانی سے موت نہیں آئے گی۔ یہ تو میری زندگی کا معمول ہے۔ میں اسی طرح لوگوں کو ستاتا رہوں گا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"تم ٹھیک نہیں ہو۔" اُس نے اتنی زور سے کہا کہ قریب بیٹھے ہوئے لوگ بھی ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔ اُسے احساس ہوا تو وہ سٹ پٹا سی گئی اور سر جھکا کے ندامت سے بولی۔ "مجھے افسوس ہے لیکن ظہیر! تمھیں اپنے متعلق سوچنا چاہیے۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو، مان جاؤ ظہیر! میرے ساتھ گھر چلو۔ میں تمھارے کسی معاملے میں حائل نہیں ہوں گی۔ مجھے تم سے کچھ درکار نہیں ہے، میری صرف اتنی آرزو ہے کہ تمھارے کچھ دُکھ کم ہو جائیں، شاید تم تسلیم کرتے ہو کہ میں ایک بُری لڑکی نہیں ہوں۔ میرے ساتھ رہ کے تمھیں کچھ بُرا محسوس نہیں ہو گا۔"

میرا سر سن سن جھنانے لگا اور میں نے اپنی آنکھیں زور سے بند کر لیں۔ میں نے اُس سے کچھ نہیں کہا۔ بیرے نے میز پر چائے لا کے رکھ دی تھی، جولین چائے بنانے لگی پھر جب اُس نے چائے کی پیالی آگے کر کے مجھے ہولے سے آواز دی تو میں نے سر اُٹھایا۔ اُس کا تمتماتا ہوا چہرہ میرے سامنے تھا اور اُس کی بڑی بڑی اور گہری آنکھیں بھی پُر نم ہو رہی تھیں۔ اُس کی ان آنکھوں سے میرا جسم لرزنے لگتا تھا۔ وہ کورا کی آنکھوں سے کسی قدر متشابہ ضرور تھیں، پہلے البتہ ایسی نہیں لگتی تھیں۔ میں نے بوکھلا کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ریستوراں میں بیٹھے ہوئے بیشتر لوگوں کی نظریں جولین پر مرکوز تھیں۔ اُس وقت مجھے شدت سے احساس ہوا کہ میرے ساتھ ایک لڑکی بیٹھی ہے جو حسن و جمال میں ہزاروں میں ایک ہے اور آج اُس نے جو لباس پہنا ہے حالانکہ سادہ ہے مگر وہ اس میں اور بھی اچھی لگنے لگی ہے۔ میں نے جلدی جلدی چائے حلق میں انڈیلی اور اُس سے کہا "اب چلو۔" وہ کچھ دیر مذبذب رہی مگر دوسرے لمحے اُس نے ایک گہری سانس لے کے بیرے کو بل لانے کا اشارہ کر دیا۔ بل ادا کرتے ہی ہم اُٹھ گئے۔ میں نے غیر ارادی طور پر پلٹ کے دیکھا، سب ہماری طرف متوجہ تھے۔ ریستوراں سے باہر نکل کے ہم کچھ دُور تک پیدل چلتے رہے۔ سڑکوں پر اچھی خاصی بھیڑ تھی۔ اُس نے ایک دُکان کے قریب رُک کے اچانک مجھ سے پوچھا۔ "تمھیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟"

"نہیں۔" میں نے حیرانی سے کہا۔ "مجھے کس چیز کی ضرورت ہو گی۔"

"کسی بھی چیز کی۔ آدمی کی سینکڑوں ضروریات ہوتی ہیں۔"

"ہاں ہوتی تو ہیں مگر..... مگر مجھے کوئی چیز یاد نہیں آ رہی ہے۔" میں نے جھجک کے کہا۔ "تمھیں تو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے؟ مجھے معاف کرنا، میں نے تم سے پوچھا ہی نہیں۔"

وہ مسکرانے لگی۔ "چلو تمھیں کچھ خیال تو آیا۔"

"بتاؤ، تم کیا خریدنا چاہتی ہو؟" میں نے تیزی سے کہا۔

"ابھی کچھ نہیں۔" وہ سوچتے ہوئے بولی۔ "پھر کبھی آئیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے اُس سے ضد نہیں کی۔ ہم دونوں بس میں سوار ہونے کے بجائے پیدل ہی راستہ طے کرتے رہے، بازاروں میں گھومتے ہوئے میری نظریں ہمیشہ بھٹکتی رہتی تھیں۔ میں آنے جانے والوں کے چہرے دیکھتا رہتا تھا، شاید کسی دن تقدیر پھر جائے اور وہ کہیں مل جائے۔ سُنا تھا آدمی کی قسمت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ ہماری رفتار تیز نہیں تھی۔ ایک جگہ کچھ آگے، فٹ پاتھ پر زیادہ بھیڑ تھی۔ ہم آگے بڑھے تو ہمیں چیخ پکار سنائی دی۔ غالباً کوئی جھگڑا وغیرہ ہو گیا تھا۔ ہم نے راستہ بدلنے کا ارادہ کیا مگر دفعتہً سامنے سے آدمیوں کا ایک ریلا ہماری جانب بھاگتا ہوا آیا۔ میں نے جولین کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُسے تیزی سے کھینچ کے اپنے پیچھے کر لیا۔ وہ سہم کے میری کمر سے چپک گئی پھر بھاگتے ہوئے لوگ ہمارے پاس سے گزر گئے تو جولین نے مجھے ٹہوکا مارا۔ میں نے مُڑ کے دیکھا۔ ایک نوجوان کچھ دُور جا کے رُک گیا تھا اور ہمیں حیرت بھری نظروں سے گھور رہا تھا، مجھے اُسے پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔ یہ وہی نوجوان تھا جس نے جولین کی گلی میں میرا داخلہ بند کرنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے اُس کا نام یاد نہیں تھا۔ اُس کے ساتھی اُسے ماسٹر کہہ کے پکارتے تھے۔ میں نے اُس کی نیت بھانپنے کا تحمل کیا، اُس کے ارادے بُرے معلوم نہیں ہوتے تھے۔ میں نے اُسے نظر انداز کر کے آگے بڑھنا چاہا۔ اُدھر مجمع بھی چھٹ گیا تھا۔ پولیس آ گئی تھی۔ ہمارے چلنے سے پہلے ماسٹر نے جھجکتے ہوئے مجھے سلام کیا۔ میں نے منہ پھیر لیا لیکن ماسٹر تیزی سے میرے پاس آ گیا اور میرے آگے گردن جھکا کے خاموش کھڑا ہو گیا۔ "کیا مرضی ہے ماسٹر؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"ماسٹر اپن نہیں ہے ماسٹر تم ہے اپن تو ڈکی ہے۔" اُس نے میری

پنڈلیاں پکڑ لیں اور عاجزی سے بولا۔ "اپن کو ایکس کیوز کر دو ماسٹر! سالا اُس دن اپن کا مغز پھر گیا تھا۔"

"میرا تم سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"اپن کو معلوم ہے یو آر گریٹ مین۔ اپن نے اس سالا فنٹاسٹک سٹی میں بہت سے فنٹوشوں کو بوم مارتے دیکھا پر اپن نے تمھارا جیسا ہاتھ نہیں دیکھا۔ اب بھی اپن کی کمر میں کبھی کبھی پین اُٹھتا ہے۔" پھر وہ جولین سے مخاطب ہو کے تیزی سے بولا۔ "اپن کوئن سے بھی ایکس کیوز کرتا ہے۔ کوئن اپن کا سسٹر ہے۔ اپن کو معلوم ہوا تھا کوئن اُودر سے چلا گیا ہے، ماں قسم اپن پھر اُودر نہیں گیا۔"

"ٹھیک ہے، ہمیں اب تم سے کوئی شکایت نہیں ہے، ہم نے اُس دن حساب صاف کر دیا تھا۔ حساب صاف کرنے کے بعد ہم کچھ یاد نہیں رکھتے۔" میں نے سرسری انداز سے کہا۔ "آگے سنبھل کے رہنا۔"

اُس نے سر ہلا کے اقرار کیا۔ "اپن پرامس کرتا ہے ماسٹر! اُس دن کے بعد سے اپن نے تم کو بہت کھوج کیا، آج اتنے دن بعد تم دکھائی دیا ہے۔ اپن کا لک ہے کہ کوئن بھی تمھارے ساتھ ہے۔ اپن پہلے ہار جیت کا نگری چولیشن۔ وہ جونی سالا ایک دم ڈفر ہے، اپن پہلے ہی ڈیکلیر کر دیا تھا کہ کوئن کو کوئی گنگ ہی لے جا سکتا ہے۔ کوئن از سپرب۔ بہت سا چھوکری لوگ اُودر رہتا ہے پر کوئن جیسا چھوکری بائی چانس پیدا ہوتا ہے۔ کوئن سب سے ڈفرینٹ تھا اور سب سے ڈفرینٹ آدمی کے پاس گیا۔"

"زیادہ بات مت کرو۔" میں نے غصے سے کہا۔

"آئی ایم ساری ماسٹر!" وہ آنکھیں پٹ پٹانے لگا۔

"ابھی تم کو اپنی زبان ٹھیک کرنی چاہیے۔"

"ویری ٹرو ماسٹر! یہ سالا زبان بہت چلتا ہے ماسٹر! لو اسے اپنے ہاتھ سے کاٹ دو، نہ سالا یہ ہو گا، نہ چلے گا۔ اپن کا تو ہاتھ سے زیادہ زبان چلتا ہے۔"

"ٹھکانے پر بیٹھنا ہے تو پہلے ہاتھ چلانا سیکھو، پھر زبان چلتی ہوئی بھی اچھی معلوم ہوتی ہے ورنہ چھری لگاؤ۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"ماسٹر! اس لیے تو سارے سٹی میں تمھارا کھوج لگاتا پھرتا تھا۔ آج تم مل گیا ہے تو اپن تم سے ایک ریکوئسٹ کرے گا۔ ماسٹر! انکار مت کرنا۔"

"کیا بات ہے؟"

"بات کچھ نہیں ماسٹر!" وہ لجاجت سے بولا۔ "پر اپن کا لائف بن جائے گا۔ اپن کو اپنی سروس میں لے لو ماسٹر! اپن بالکل چینج ہو جائے گا، جیسا تم بولے گا، ویسا کرے گا۔ اپن ڈے اینڈ نائٹ تمھارا چمچی کرے گا۔ ہاتھ چلانا سکھا دو ماسٹر!" اُس نے میرے ہاتھ پکڑ لیے۔ "آدمی بنا دو ماسٹر!" جولین نے میرا بازو نوچ کے چلنے کے لیے کہا لیکن ماسٹر بُری طرح مچل رہا تھا۔ "تم پھر پہچاننے میں غلطی کر رہے ہو ماسٹر! میرا کوئی اڈا نہیں ہے اور نہ میں اُستادی شاگردی کا کام کرتا ہوں لیکن میں تمھیں رائے دوں گا کہ تم کوئی اور دھندا کرو تو بہتر ہے۔ ان کاموں میں کچھ نہیں رکھا اور یہ تمھارے بس کا روگ بھی نہیں معلوم ہوتا۔"

"ماسٹر! اپن کو ماسٹر مت بولو، اپن کو جنگلی بولو، اُلّو کا پٹھا بولو، اپن کا نام مارٹن ہے۔ ادھر سب لوگ ہاگ مارٹی بولتا ہے، مارٹی اس ٹائم پہچاننے کا مسٹیک نہیں کر رہا۔ مارٹی نے تمھارے پیچھے بہت دھکا کھایا۔ اپن جانتا ہے ادھر تمھارا کوئی اڈا نہیں، ادھر سٹی میں اپن سارا لوگوں کو جانتا ہے، پر تم اُستاد ہے، ایک دم ٹرو اُستاد۔ اپن اڈا نہیں، اُستاد مانگتا ہے۔ تم نے اڈا کھول لیا تو ادھر سالا بمبئی میں سب کا اڈا فنش ہو جائے گا، سب کا بزنس ٹھپ ہو جائے گا۔ اپن بولتا ہے ماسٹر! ادھر بمبئی میں بہت سالا گڑبڑ ہے اپن کا۔"

وہ اپنے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "بہت جلتا ہے، پر یہ بودم کیا کر سکتا ہے۔ ایک بار ٹرائی کرنے دو ماسٹر! نہیں چلا تو مارٹی یہ دھندا چھوڑ دے گا، سالا پان بیڑی سگریٹ بیچا کرے گا یا اس سٹی سے خلاص ہو جائے گا۔ ماسٹر! مارٹی کا ریکوئسٹ ایکسیپٹ کرو، مارٹی کے گلے میں اپنا پٹا ڈال دو ماسٹر!"

میں سوچنے لگا کہ اس سے کس طرح جان چھڑائی جائے۔ انکار کی صورت میں یہ اور راستہ کھوٹا کرتا رہے گا۔ جولین بار بار مجھے اشارے کر رہی تھی اور ماسٹر کبھی میری پنڈلیاں پکڑتا تھا، کبھی میرے ہاتھوں کو پیار کرتا تھا، اُسے اتنا بھی خیال نہیں تھا کہ یہ ایک سڑک ہے اور میرے ساتھ ایک نوجوان لڑکی ہے۔ اتنا مجھے ضرور یقین ہو گیا تھا کہ اب اُس کے دل میں کوئی کینہ نہیں ہے۔ میں نے اُسے نرمی گرمی سے ٹالنے کی کوشش کی مگر وہ اپنی بات پر اصرار کر رہا۔ "تم کہاں رہتے ہو؟" کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے اُس سے پوچھا۔ اُس نے مجھے اپنا پتہ بتایا اور میرا پتہ پوچھنے لگا۔ میں نے نہیں بتایا۔ اُس نے بھی ضد نہیں کی۔ "میں کسی وقت خود تمھارے پاس آؤں گا۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

"آنے کی بات مت کرو ماسٹر! اپن کو ابھی ساتھ لے چلو، اپنے ڈور پر باندھ دینا۔" وہ بے تابی سے بولا۔ "اپن بہت خوار ہو گیا ہے، ٹرسٹ کرو ماسٹر! مارٹی ایک دم ڈاگ کے مالک پر ڈو کرے گا۔"

میں نے اُسے ترشی سے سمجھایا تو وہ کسمسا کے مان گیا۔ اُس نے جولین سے ایک بار پھر معافی مانگی اور مجھ سے کہنے لگا کہ وہ میرا انتظار کرتا رہے گا اور میں نے آنے میں دیر کی یا نہ آیا تو وہ میری تلاش میں سڑکوں پر نکل آئے گا اور جب تک میں اُسے ساتھ لے نہیں جاؤں گا، وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ چاہے میری ناراضی کی صورت میں اُسے جان کا خطرہ مول لینا پڑے۔ مجھے اُس کے دیوانے پن پر بہت تعجب ہوا مگر وہ بے حد سنجیدہ تھا، اس کا مطلب یہ تھا کہ اُس کے رگ پٹھوں میں ابھی تک میری کوئی ضرب اٹکی ہوئی تھی۔ وہ پریشان

پریشان بھی نظر آرہا تھا۔ آخر جب تک اُس نے مجھ سے وعدہ نہیں لے لیا، میرے سامنے سے نہیں ٹلا پھر ہم آگے بڑھ گئے۔ جولین نے پیچھے مُڑ کے یہ اطمینان کیا کہ وہ ہمارا پیچھا نہیں کر رہا ہے۔ اُس کے چہرے کی شگفتگی بحال ہوئی، وہ کچھ دیر تک چپ چاپ چلتی رہی پھر اُس نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا: "یہ کیا کہہ رہا تھا؟"

"تم اُس سے اتنی کیوں ڈر رہی تھیں؟" میں نے ناگواری سے کہا۔

"مجھے ڈر تھا کہ وہ کہیں پھر چاقو نہ نکال لے، اُس کا کیا بھروسا، میں اُس دن کا منظر کبھی نہیں بھول سکتی۔" وہ جھرجھری لے کے بولی۔

"چاقو نکالنا ایسا آسان نہیں ہے۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اب اُس کی طرف سے کوئی اندیشہ دل میں مت لانا۔"

"یہ بات تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو۔ وہ ایک نمبر لفنگا ہے۔ اُس سے کچھ بعید نہیں ہے۔ اُس کا دل کالا ہے۔" پھر وہ خود اپنی بات کی تردید کرنے لگی: "مگر...... مگر وہ کیا کہہ رہا تھا؟ یہ میں کیا سُن رہی تھی؟ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ آج مارتی مجھے بالکل بدلا ہوا نظر آیا۔"

"ہاں، وہ خاصا بدل گیا ہے۔"

"مگر تم نے اُس سے وعدہ کیوں کیا کہ تم دوبارہ اُس کے پاس جاؤ گے؟ ایسے لوگوں سے دُور ہی رہنا ٹھیک ہے۔ تم اُس کے پاس مت جانا۔"

"دیکھا جائے گا، فی الحال تو اُس سے نجات مل گئی۔"

"اُس کا ذکر ہی چھوڑ دو۔ مجھے اُس کے تصور سے متلی ہونے لگتی ہے۔ ہم نہ جانے کیا باتیں کر رہے تھے۔" وہ اُلجھتی ہوئی بولی: "تمھیں کچھ یاد آرہا ہے؟"

"نہیں، مجھے تو کچھ یاد نہیں آرہا۔"

"کچھ بھی نہیں؟" وہ شکایتی انداز میں بولی۔

"نہیں۔" میں نے تذبذب سے کہا۔

اِس کے بعد اُس نے کوئی بات نہیں کی، ہم ایک مختصر فاصلہ طے کر کے گھر جانے والی بس میں سوار ہو گئے۔ وہ میرے برابر بیٹھی ہوئی تھی۔ بس ہچکولے کھاتی ہوئی منزل کی طرف بڑھتی رہی۔ جولین تمام راستے نظریں نیچی کیے خاموش بیٹھی رہی۔ بہت دیر ہو گئی، نہ اُس نے میری طرف دیکھا، نہ بات کی۔ آخر میں نے ہلکی آواز میں پوچھا: "کیا تم میری کسی بات سے ناراض ہو گئیں؟"

اُس نے چونک کے پہلو بدلا اور بجھی ہوئی آنکھوں سے میرا چہرہ تکنے لگی: "کیا مجھے تم سے ناراض ہونے کا حق حاصل ہے؟" اُس نے لرزیدہ لہجے میں کہا۔

"کیوں نہیں، میری کوئی بات تمھیں بُری لگ سکتی ہے لیکن تم مجھے معاف کر دیا کرو، میرے ساتھ کچھ ایسا ہی ہے اسی لیے میں لوگوں کے ساتھ رہنے اور اُن سے بات کرتے ہوئے ڈرتا ہوں۔"

"اوہ نہیں۔" اُس نے بے قرار ہو کے کہا: "تم ایسی باتیں مت کرو، میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ کوئی تم سے ناراض نہیں ہوتا بلکہ بات اس کے برعکس ہے۔ میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ شاید تم مجھ سے خفا ہو، شاید میرے ساتھ رہنے پر، شاید میرے زیادہ عمل دخل دینے پر یا کسی اور بات پر۔ تمھیں اس طرح گم سُم دیکھ کے عجیب عجیب خیال آتے ہیں۔"

"اور میں یہ سوچتا ہوں کہ میری وجہ سے تمھیں دُکھ ہو رہا ہے، تم نہ جانے کیا سمجھ رہی ہو گی۔ تم میرے ساتھ رہتی ہو، میرا خیال کرتی ہو اور میں کچھ بھی نہیں کر پاتا۔ مجھے یہ احساس اور پریشان کر دیتا ہے۔"

"تم اپنے دل میں ایسا گمان کبھی مت کرنا، ضروری نہیں ہے کہ آدمی تبادلے میں ایک دوسرے کا خیال رکھے۔ کچھ چیزوں میں یہ سماجی تبادلہ نہیں ہوتا۔ ہر گھر دکان نہیں ہوتا اور اُس کے مکین سودے باز نہیں ہوتے، بتاؤ کیا ماں کا حق ادا ہوتا ہے؟ ماں اپنے بیٹے کی پرورش میں بہت دُکھ جھیلتی ہے مگر کیا ماں کو اس انداز سے سوچنا چاہیے کہ اُس کا بیٹا اُس کی مشقت کا معاوضہ ادا نہیں کر رہا ہے؟ کچھ لوگ اب بھی اس بری دُنیا میں ایسے ہیں جو ان باتوں سے بلند ہو کے سوچتے ہیں۔"

"تم بہت اچھی ہو۔ بہت اچھی باتیں کرتی ہو۔"

"تم بھی کچھ کم اچھے نہیں ہو۔ بعض اوقات تو مجھے تم پر رشک آتا ہے کہ میں تمھاری طرح کیوں نہیں ہوں۔" وہ مسکرا پڑی اور ہونٹ بھینچ کے بولی: "ظہیر! خوش رہنے کی کوشش کیا کرو۔ دُکھوں کا علاج یہ نہیں ہے کہ آدمی خوشیوں سے کنارہ کر کے اپنے دُکھ اور بڑھا لے۔ ہمت سے کام لینا چاہیے۔ پتہ نہیں۔" وہ اٹک اٹک کے بولی: "میں تم سے یہ باتیں کرتے ہوئے کیسی لگ رہی ہوں۔"

"تم اچھی لگ رہی ہو۔"

ایک اسٹاپ پر کچھ اور مسافر بس میں سوار ہو گئے۔ بس کھچا کھچ بھر گئی۔ ہم نے باتیں بند کر دیں اس لیے کہ ہمارے نزدیک بہت سے لوگ کھڑے ہو گئے تھے اور ہم پر گرے جا رہے تھے۔ جب بھی میں بس میں بیٹھتا تھا میرا ذہن بھی بس کے ساتھ ساتھ سفر کرتا تھا۔ صرف اتنا فرق تھا کہ بس متعینہ راستے پر چلتی تھی اور میرے خیالوں کا کوئی راستہ طے نہیں تھا۔ بس سڑک پر چلتی تھی اور میرا ذہن ہوائی جہازوں کی طرح آسمانوں میں اُڑتا تھا۔ میں خواب دیکھتا رہتا تھا کہ اگلے اسٹاپ پر اُتروں گا تو مجھے کرا نظر آجائے گی، میں اُسے دیکھوں گا تو میرا کیا حال ہو گا؟ اُس کا کیا حال ہو گا؟ وہ مجھے پہچانے گی بھی یا نہیں؟ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد اُس میں اور مجھ میں بہت فرق آگیا ہو گا۔ شاید مجھ سے زمین پر کھڑا نہ رہا جائے۔ میں تو بے ہوش ہو جاؤں گا۔ بس میں سفر کرتے ہوئے مجھے بہت سکون ملتا تھا کیونکہ میں اُسی کے بارے میں سوچتا رہتا تھا اور جب کنڈکٹر سفر ختم ہونے کا اعلان کرتا تو میرے خوابوں کا شیرازہ بکھر جاتا تھا۔

اسٹاپ آنے سے پہلے جولین نے مجھے بیدار کیا، میں اُس کے لیے بھیڑ میں راستہ بناتا ہوا نیچے اُترا۔ چمپا گھر میں اکیلی نہیں تھی، ایس پی شکلا بھی موجود تھا۔ اُس نے ہم دونوں کو ایک ساتھ گھر میں داخل ہوتے دیکھا تو مسکرا کے بولا: "کہاں سیر ہو رہی ہے ظہیر خاں!"

مجھے نہ جانے کیوں جھینپ آگئی: "کہیں نہیں۔" میں نے جھجک کے کہا۔

"آج تو کچھ مزاج ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔" وہ ہنس کر بولا۔

"آپ نے کیا کیا؟" میں نے بات بدلنے کی کوشش کی: "کوئی سراغ ملا یا ابھی تک آپ آنکھ مچولی ہی کھیل رہے ہیں۔"

"دھما چوکڑی مچی ہوئی ہے ظہیر خاں!" وہ شکستگی سے بولا: "اب شاید کبھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو۔ جو لوگ کرشنا جی سے لگاؤ رکھتے تھے اور جنھیں کرشنا جی اپنے بیٹوں اور بھائیوں کی طرح مشورے دیتے تھے، وہ شاید ہمیشہ شرمندہ رہیں گے۔ فیڈرل گورنمنٹ کی طرف سے سختی کے ساتھ احکام آرہے ہیں کہ مجرم جلد از جلد گرفتار کیے جائیں مگر ایک دن فیڈرل گورنمنٹ بھی تھک کے خاموش ہو جائے گی۔"

"ایسا نہیں ہونا چاہیے شکلا جی! ایسا نہیں ہو گا۔" میری آواز کانپنے لگی۔

شکلا میرے پاس آکے میری کمر تھپ تھپانے لگا: "تم نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا، تم مدراس بھی نہیں گئے۔ وہاں سے کرشنا جی کے منیم کا خط آیا تھا، تمھیں اس طرف توجہ دینی چاہیے۔"

"مگر میں کیا کر سکتا ہوں، مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"ہائیں۔" وہ حیرت سے بولا: "تمھیں کرشنا جی کے معاملوں سے دلچسپی نہیں ہے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا شکلا جی کہ میں کیا کروں۔"

"تمھیں وہاں جانا چاہیے۔ اگر تم کہو تو تمھارے ساتھ میں بھی چلتا ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ کرشنا جی نے ایک بڑی جائداد چھوڑی ہے، ہمارے اندازے سے زیادہ۔ وہ مدراس کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ پولیس کی ملازمت تو انھوں نے شوق اور لوگوں کی خدمت کے لیے اختیار کی تھی، تم چاہو تو چمپا دیدی اور مس جولین کو بھی ساتھ لے لو۔"

"یہاں کون رہے گا؟" چمپا نے جلدی سے کہا: "جولین کو لے جاؤ۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن میرا خیال ہے ظہیر کے لیے شکلا جی کا ساتھ کافی ہے، میں گئی تو یہاں چمپا دیدی اکیلی رہ جائیں گی۔ کام نمٹا کے آپ لوگ جلدی آجائیے گا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میرا جانا مناسب ہوتا مگر اس موقع پر جانا...... " جولین چُپ ہو گئی۔

میں سُنتا رہا۔ شکلا نے دوسرے دن مجھے مدراس چلنے کا حکم سُنا دیا۔ میں نے اپنی رائے ظاہر نہیں کی۔ ظاہر ہے کرشنا جی مجھے جس اُلجھن میں ڈال گئے تھے، اُس سے کسی نہ کسی صورت تو نکلنا تھا۔

دوسرے دن شکلا مقررہ وقت پر آگیا۔ چمپا اور جولین نے میرا سامان تیار کر دیا تھا۔ چمپا نے میرے بازو میں امام ضامن باندھا اور جولین نے اپنے ہاتھ سے سینڈوچ بنا کے دیے، وہ بہت لذیذ سینڈوچ بناتی تھی۔ میں نے تمام کاغذات شکلا جی کو دے دیے تھے میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ ہر سفر سے پہلے ایسا ہی ہوتا تھا دل میں۔ بیٹھ کے میں راستے بھر کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا جاگتا رہا۔ ہر اسٹیشن پر اُتر کے میں پلیٹ فارم کا ایک چکر لگا کے واپس آجاتا۔ اسٹیشن پہ اسٹیشن گزرتے رہے اور مدراس آگیا۔ کرشنا جی کا منیم اور دوسرے کارندے ہمیں اسٹیشن پر لینے کے لیے آئے۔ جب شکلا نے اُن سے میرا تعارف کرایا تو اُن کی آنکھوں میں بے چینی ہویدا ہوئی۔ منیم نے فوراً میرے ہاتھ چومے اور گلے لگ کے میری ٹھوڑی کو بوسہ دیا اور باقی کارندوں نے پیر چھوئے۔ وہ ہمیں کرشنا جی کے گھر لے گئے۔ کرشنا جی کا سامان، اُن کی تصویریں اور عمارت کے آگے پیچھے چمن دیکھ کے میری طبیعت بوجھل ہو گئی۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد منیم نے جائداد کی تمام تفصیلات ہمیں بتانی شروع کیں۔ شہر میں کرشنا جی کے کئی اور مکانات بھی تھے اور نواح میں چند زمینیں تھیں جن کی دیکھ بھال اُن کی ماں کرتی تھیں۔ منیم نے کرشنا جی کے متعلق ہمیں بہت سی باتیں بتائیں کہ وہ اپنے باپ کے اکلوتے لڑکے تھے۔ اُن کی ایک بہن نوجوانی میں مر گئی تھی۔ یہ ساری جائداد اُن کے باپ کی تھی جو کرشنا جی کی شادی کی آرزو میں مر گئے۔ منیم کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے خاندان والوں سے بالکل مختلف تھے۔ باہر رہتے تو کبھی گھر سے ایک پیسہ نہیں منگاتے تھے۔ گھر آتے تو ایک ایک آدمی سے اُس کا حال پوچھتے، بچوں کی خیریت دریافت کرتے اور ہر بار اُس کی کوئی نہ کوئی مدد کرتے۔

بوڑھا منیم کرشنا جی کے واقعات بتاتے ہوئے زار و قطار رو رہا تھا۔ وہ اُن کی عادات، پسند، مشاغل اور اُن کی ایک ایک بات بتاتا تھا اور آہیں بھرتا تھا۔ کہتا تھا کہ کرشنا جی نے ولایت جا کے تعلیم حاصل کی تھی اور ہمیشہ کتابوں میں گم رہتے تھے۔ موٹا جھوٹا لیکن صاف ستھرا پہنتے تھے۔ اپنی ذات پر بہت کم خرچ کرتے تھے۔ سادہ اور اچھا کھانا کھاتے تھے۔ تمام ملازم اُن کے مدراس واپس آنے کا انتظار کرتے رہتے تھے۔ انھیں سب سے زیادہ اپنی ماں سے محبت تھی اور ماں کو اُن سے۔ ابھی تک گھر پر سوگ طاری تھا۔ جو ملازمہ کرشنا جی کی ماں کے ساتھ بمبئی گئی تھی وہ تیجے کے فوراً بعد واپس آگئی تھی۔ اُس نے دونوں ماں بیٹوں کی موت کی تفصیلات سنائیں تو کئی روز تک کارندوں کے گھروں میں چولھا نہیں جلا، ہم دونوں سر جھکائے اُن کی باتیں سنتے رہے پھر شکلا اور میں منیم کے ساتھ جائداد کا جائزہ لینے کے لیے شہر کے مختلف علاقوں اور نواح میں پھرتے رہے۔ دوسرے دن کہیں شام کو ہم اس کام سے فارغ ہوئے۔ میری حیثیت تو ایک تماشبین کی سی تھی۔ شکلا ہر جگہ رُک کے منیم سے سوالات کرتا اور کاغذ پر کچھ لکھتا جاتا، پھر میرا چہرہ دیکھتا اور میری رائے پوچھتا۔ میں اُسے کیا رائے دیتا، کرشنا جی نے نہ جانے کیا سمجھ کے یہ سب کچھ میرے نام کیا تھا۔ رات کو منیم وغیرہ ہمیں کمرے میں چھوڑ کے چلے گئے تو شکلا میرے سرہانے آگیا۔ اُس نے متوحش لہجے میں مجھ سے پوچھا: "تمھارا کیا ارادہ ہے؟"

"کس بات کا ارادہ؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"تم نے کل اور آج تمام جائداد دیکھ لی ہے۔ یہ ایک خاصا بڑا کام ہے۔ یقیناً تمھارے ذہن میں کوئی تدبیر ہو گی۔" وہ فکر مندی سے بولا۔

"میرے ذہن میں کچھ نہیں ہے شکلا جی! میں تو حیران ہوں کہ کرشنا

تم نے یہ کیا کیا۔ میں تو اُنھیں پریشان کرتا رہتا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ نہ مجھے ان کاموں کا تجربہ ہے نہ ان سے دلچسپی ہے۔ آپ ہی بتائیے کیا کیا جائے؟"

"ظہیر خاں! یہ معاملہ ایسا نہیں ہے کہ تم سرسری گزر جاؤ۔ اب تمھیں بہرحال اِس سے نمٹنا ہے۔ کرشنا جی نے کچھ سوچ سمجھ کے ہی تمھیں اس کا وارث مقرر کیا ہے، وہ بہت سمجھ بوجھ کے آدمی تھے۔"

"لیکن انھوں نے کوئی اچھا فیصلہ نہیں کیا، انھوں نے ایک غلط آدمی کا انتخاب کیا۔ اب میں کیا کروں گا؟ کیا میں حساب کتاب رکھتا پھروں گا؟" میں نے تلملا کے کہا۔

"حساب کتاب تمھارا اپنا ہوگا ظہیر خاں کسی اور کا نہیں، اس طرح مت سوچو۔ یہ دیکھو کہ ایک شخص نے تمھیں کس قدر عزیز سمجھا، آہ وہ جب بھی تمھارا تذکرہ کرتے تھے۔ مجھے حیرت ہوتی تھی، میں سمجھتا تھا کہ کرشنا جی مبالغے سے کام لے رہے ہیں لیکن انھوں نے اپنی زندگی کے آخری کرب ناک لمحوں میں بھی ایک برمحل اور موزوں فیصلہ کیا ہے۔"

"آپ بھی یہی کہہ رہے ہیں۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"ہاں ظہیر خاں! میں سچ کہہ رہا ہوں میں اس کی وضاحت نہیں کر سکتا بہرحال انھوں نے غلط کیا یا اچھا کیا، مسئلہ یہ نہیں ہے، مسئلہ یہ ہے کہ اب اُن کی خواہش کی تکمیل کس طرح کی جائے؟"

"میرا خیال ہے یہ سب جائداد غریبوں میں تقسیم کر دی جائے۔"

"یہ کام تو خود کرشنا جی بھی کر سکتے تھے۔ بے شک اب تم اس کے مالک ہو مگر جب انھوں نے اپنے دل میں یہ ارادہ کیا ہوگا تو تمھاری خوش حالی اور تمھاری ایک اچھی زندگی اُن کے مدِ نظر ہوگی۔ موت کے روز وہ تم سے بہت خوش تھے، کہہ رہے تھے، میں ظہیر کو مدراس لے جاؤں گا، یہاں ماں جی بھی اکیلی رہتی ہیں اور بہت بوڑھی ہو گئی ہیں۔ کرشنا جی جب موڈ میں ہوتے تھے تو مجھ سے بہت سی باتیں کرتے تھے، میں تمھارے انکار اور دکھ کی کچھ کچھ وجہ جانتا ہوں۔ فکر مت کرو ظہیر! سب چیزیں درست ہو جائیں گی۔ کرشنا جی نے جو سرکلر روانہ کیے ہیں، ممکن ہے اُن کا جواب آ جائے اور تمھاری پریشانیاں ختم ہو جائیں۔"

"سرکلر؟ کیا آپ جانتے ہیں کہ انھوں نے ایسا کوئی سرکلر روانہ کیا تھا؟" میں نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

"ہاں۔ انھوں نے مجھے بتایا تھا۔ ابھی تک کسی جگہ سے کوئی جواب نہیں آیا ہے۔ آئے گا تو سب سے پہلے مجھے معلوم ہوگا۔" شکلا نے تاسف سے کہا۔

"اور انھوں نے آپ کو میرے بارے میں کیا کیا بتایا تھا؟" میں نے مضطرب ہو کے پوچھا۔ "مجھے ایک ایک بات بتائیے۔"

"اور کچھ نہیں۔" وہ مایوسی سے بولا۔ "سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے مجھے یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ یہ خط وہ کس سلسلے میں لکھ رہے ہیں۔ کرشنا جی کی موت کے بعد جب تم سے قریب ہونے کا موقع ملا تو مجھے یہ قیاس کرنے میں دشواری نہیں ہوئی کہ اتنی شدید اور ذاتی دلچسپی وہ صرف ایک شخص میں لے سکتے ہیں، گو وہ ہر کیس میں پورے انہماک سے کام کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ پولیس کے ریکارڈ میں کوئی ایسا کیس بھی نہیں تھا۔"

میں نے اطمینان کی سانس لی۔ "آپ کا اندازہ درست ہے، وہ خط کرشنا جی نے میرے کھوئے ہوئے عزیزوں کے سلسلے میں لکھا تھا اور انھوں نے مجھے بھی آخری لمحوں میں بتایا تھا مگر شکلا جی!" میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "یہ بات آپ ہی تک محدود رہے تو مجھ پر آپ کا احسان ہوگا۔"

"نہیں ظہیر خاں! یہ راز میرے سینے میں امانت کے طور پر محفوظ رہے گا اور میں کوشش کروں گا کہ محکمے میں کسی اور کو اس کی ہوا بھی نہ لگے، یہ ڈاک کرشنا جی کے نام پر آئے گی، اُن کے تمام امور اُن سے قریب ہونے کے باعث میرے سپرد تھے، اب بھی مجھی کو اُن کا نگراں بنایا گیا ہے لیکن ظہیر خاں! کیا اس سلسلے میں تم مجھے کچھ بتانا پسند کرو گے؟"

"پھر سہی۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"خیر پھر سہی میری دلی تمنا ہے کہ تمھاری تمام الجھنیں دور ہو جائیں۔"

"ہاں شکلا جی! تمنا تو سبھی کی ہوتی ہے لیکن بر نہیں آتی۔"

"امید رکھو۔" اس کے سوا وہ اور کیا کہہ سکتا تھا۔ ہر شخص یہی کہتا تھا، شکلا بھی یہی کہہ رہا تھا۔ کرشنا جی، ببھل، زرین، چمپا اور جولین سب یہی کہتے تھے مگر امید بر آنے کا وقت کوئی نہیں بتاتا تھا۔ سب جھوٹ بولتے تھے، مجھے بچہ سمجھ کے بہلاتے تھے۔ جب کوئی امید کی بات کرتا تھا تو مجھے اور گھٹن ہوتی تھی۔ کچھ دیر بعد شکلا پھر جائداد کے موضوع پر بات کرنے لگا۔

"کیا تم مدراس میں رہ سکتے ہو؟" اُس نے پوچھا۔

"نہیں شکلا جی! میرے لیے یہ بہت مشکل ہے، آپ جائداد کا کوئی اور انتظام کر دیجیے۔ آپ ہی کوئی بہتر تدبیر سوچیے، میرا دماغ کام نہیں کرتا۔"

"ایک صورت میرے ذہن میں آ رہی ہے بشرطیکہ تم اس پر آمادہ ہو جاؤ۔" شکلا نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ "میں بھی اس نتیجے تک پہنچا ہوں کہ اِن حالات میں تم مناسب طور پر فرائض انجام نہیں دے سکو گے۔"

"مجھے آپ کی ہر بات منظور ہے۔" میں نے تیزی سے کہا۔

"ایسے نہیں، سوچ سمجھ کر جواب دینا۔ ممکن ہے میں اپنی جگہ ٹھیک نہ ہوں۔ میری رائے ہے کہ تم یہ جائداد بیچ دو اور ساری رقم بینک میں محفوظ کرا دو، جب حالات کسی قدر درست ہو جائیں تو اس رقم سے تم کسی وقت بھی نئی جائداد خرید سکتے ہو اور کوئی بھی کام شروع کر سکتے ہو، میرے اندازے کے مطابق لاکھوں روپے سے کم یہ اثاثہ کیا ہوگا۔"

"لاکھوں روپے؟"

"ہاں لاکھوں روپے۔" وہ تشویش سے بولا۔ "کئی لاکھ روپے تم نے آج اور کل پھر کیا دیکھا؟ اِن کی فروخت میں بھی دیر لگ سکتی ہے مگر اچھا ہے کہ ہم یہ کام نمٹا کے ہی واپس چلیں۔"

مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ کسی مکان کی کیا قیمت ہو سکتی ہے۔ شکلا اپنی نوٹ بک نکال کے مجھے تفصیل بتانے لگا۔ وہ بہت سنجیدہ تھا اور گھبرا گھبرا کے سرگوشیوں میں باتیں کر رہا تھا جیسے کوئی سن نہ رہا ہو۔ اُس کی آواز میں حیرت کا عنصر تدریج بڑھتا جا رہا تھا۔ مجھے زرین یاد آنے لگی۔ اُس کی جائداد کی مالیت بھی کم و بیش اتنی ہی ہوگی۔ اُدھر فیض آباد میں بھی میرے نام ایک بڑی حویلی، دوسرے مکانات، باغات اور زمینیں تھیں۔ اِدھر کرشنا جی مدراس میں یہ انتظامات کر گئے تھے۔ شکلا کہہ رہا تھا۔ "تم اس دولت سے ایک بہترین زندگی شروع کر سکتے ہو، دُنیا کی ہر چیز خرید سکتے ہو۔" میں نے سوچا کہوں وہ دولت کس کام کی جس سے میں ایک شخص کو واپس نہیں لا سکتا، اُسے خرید نہیں سکتا۔ میں نے شکلا سے کچھ نہیں کہا۔ اس کی رائے ٹھیک ہی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے حامی بھر دی لیکن شکلا اُس کے مختلف پہلوؤں پر تبصرے کرتا رہا۔ کرشنا جی کی آبائی جائداد بیچنے کے فیصلے سے وہ بھی نامطمئن نظر آ رہا تھا اور مجھے بھی اس فیصلے سے خوشی نہیں تھی، ہم دونوں دیر تک متذبذب رہے۔ پھر اس نتیجے پر پہنچے کہ اس سے بہتر کوئی اور صورت نہیں ہے۔ مبہم ہمارا یہ فیصلہ سن کے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا مگر یہ میرے بس کی بات نہیں تھی کہ میں کرشنا جی کی ماں کی طرح وہاں بیٹھ کے آمدنی کا حساب کتاب رکھوں ورنہ پھر میں نے زرین کو کیوں رُلایا تھا۔ وہ تو اب تک مایوس نہیں ہوئی ہوگی۔

باقی دنوں میں شکلا بے حد مصروف رہا۔ کچہری، وکیل، گاہک، اس مکان کے کاغذات، اُس زمین کی دستاویزات۔ ہمیں مدراس آئے ہوئے پندرہ دن سے زیادہ گزر گئے تھے۔ شکلا پیش کشیں قبول کرتا اور رد کرتا رہا۔ ہر وقت بنگلے میں لوگوں کی بھیڑ رہنے لگی۔ اس درمیان ایک دن جولین کا خط آیا۔ اُس نے لکھا تھا کہ تم نے اتنی دیر کیوں لگا دی، خیریت کی کوئی اطلاع بھی نہیں دی۔ بہت تشویش ہے، اور لکھا تھا کہ یہاں ہر وقت تمھارا تذکرہ رہتا ہے، تمھاری بڑی فکر رہتی ہے، اپنی صحت کا خیال رکھنا، مدراسی کھانے زیادہ مت کھانا۔ کپڑے روز بدلتے رہنا، چمپا دیدی تمھیں بہت دعائیں دے رہی ہیں۔ مدراس سے ہمارے لیے کیا لاؤ گے، دوسا تو لا نہیں سکتے، آتے آتے خراب ہو جائے گا، پھر اُس نے اپنے باپ کے بارے میں لکھا تھا کہ اُس کی حالت روز بہ روز گرتی جا رہی ہے، اُس نے یہ مختصر خط انگریزی میں لکھا تھا۔ میں نے اُسے کئی بار پڑھا اور جواب دینے کا ارادہ کیا لیکن سوچتا ہی رہ گیا کہ کیا لکھوں۔ کیا یہ لکھوں کہ کرشنا جی کا چھوڑا ہوا خزانہ سمیٹ رہا ہوں۔ اسی کام سے فرصت نہیں ہے، کسی اور طرف کیا دھیان دوں؟ یہاں ایک دکان پر بیٹھا ہوں، ہر طرف سے گاہک آ رہے ہیں اور مول تول ہو رہا ہے، پھر جلد ہی جولین کا دوسرا خط آ گیا۔ اُس نے میرے جواب نہ دینے کی شکایت کی تھی اور لکھا تھا۔ "مجھے جلد سے جلد آنے کا پروگرام بنانا چاہیے، ماسٹر مارٹی نے گھر دیکھ لیا ہے۔ وہ تمھارا پتہ جاننے کے لیے مضطرب ہے، میں نے اُسے بتایا کہ تم مدراس میں ہو تو اُسے یقین نہیں آیا۔ وہ صبح و شام کئی بار گھر آتا ہے اور میری خوشامد کرتا رہتا ہے۔ ایک دن اسکول سے واپسی پر راستے میں اُس نے مجھے دیکھ لیا تھا، مجھے خبر بھی نہیں ہوئی اور وہ میرا پیچھا کرتا ہوا گھر تک پہنچ گیا۔ اُس نے مجھے تنگ بالکل نہیں کیا ہے لیکن تم نہیں ہوتے ہو تو مجھے اُس سے بہت ڈر لگتا ہے، بتاؤ میں اُس سے کیا کہوں؟"

خط کے آخر میں اُس نے پچھلے خط کے مانند باتیں لکھی تھیں اور درخواست کی تھی کہ میں اس بار اُس کے خط کا جواب ضرور دوں۔ میرا جی اچاٹ ہو گیا۔ میں نے شکلا سے اصرار کیا کہ وہ مجھے بمبئی جانے کی اجازت دے دے یا یہ معاملات جلدی جلدی ختم کرے۔ شکلا مجھ پر ناراض ہونے لگا کہ وہ تو صبح و شام اسی کام میں مصروف ہے۔ "میری موجودی ضروری ہے کیونکہ تمام کاغذات پر دستخط مجھی کو کرنے ہیں۔" میں نے کہا۔ "میں مختار نامہ لکھے دیتا ہوں، آپ جو مناسب سمجھیں کرتے رہیے گا۔" شکلا نے انکار کر دیا، پھر مجھے اپنی بات سے خود شرمندگی ہوئی۔ شکلا بیچارہ اپنے گھر اور دفتر سے چھٹی لے کے محض کرشنا جی کی محبت میں یہ تمام کام کر رہا تھا۔ اُسے کوئی غرض نہیں تھی۔ میں نے اُس سے اپنے رویے کی فوراً معافی مانگ لی اور گزارش کی کہ وہ جولین کو تسلی کے دو لفظ لکھ دے۔ شکلا نے اس پر تعجب ظاہر کیا کہ میں وہ دو لفظ خود کیوں نہیں لکھتا۔ میں نے کہا، مجھے خط لکھنے کی عادت نہیں ہے، میں نے آج تک کسی کو خط نہیں لکھا۔ اس جواز پر شکلا نے میری طرف سے جولین کو جواب دے دیا۔ جولین سمجھی ہوگی کہ ابھی میں نے اتنا کہاں پڑھا ہے کہ کسی کو خط لکھ سکوں۔ مجھے یقین تھا کہ ماسٹر مارٹی جولین کو زیادہ پریشان نہیں کرے گا اور یہاں کام سمٹ ہی رہا ہے۔ میں جلد وہاں پہنچ جاؤں گا اور مارٹی کو سمجھا بجھا دوں گا کہ بمبئی میں ایک سے ایک استاد پڑا ہے، وہ کوئی اور در دیکھے۔

ڈیڑھ مہینے کی مدت میں شکلا، کرشنا جی کی تمام جائداد اُس کے بقول مناسب قیمت پر فروخت کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ تمام روپیہ میرے دستخطوں سے بینک میں جمع ہوتا رہا۔ کرشنا جی کی تصویریں، اسناد، خطوط، کتابیں اور ذاتی سامان وغیرہ اپنے ساتھ لے جانے کے لیے ہم نے صندوقوں میں بند کر دیا اور باقی سارا سامان بیچ دیا۔ بینک میں کرشنا جی کی ایک بڑی رقم جمع تھی اور گھر کی تجوری میں بھی۔ جس بنگلے میں ہم مقیم تھے، اُس کا بھی سودا ہو گیا۔ ہم آخری کارروائیوں کی تکمیل کے لیے ہوٹل میں منتقل ہو گئے۔ اس عرصے میں جب بھی موقع ملا، میں مدراس کی گلی گلی چھانتا رہا۔ مسلمانوں کی ہر سرائے اور ہر ہوٹل کے باہر دیر تک کھڑا ہو کے میں مسافروں کو دیکھتا رہتا کہ شاید بھولے بھٹکے کوئی نظر آ جائے۔ یہ بے کار کی محنت تھی، میرے کانوں کے پردے وہ آوازیں سننے کی صلاحیت کھو چکے تھے یا میری پتلیاں وہ چہرے دیکھنے کی صلاحیت کھو چکی تھیں۔ ہر آدمی نظر آتا تھا، بس وہی لوگ نظر نہیں آتے تھے۔

آخر مدراس سے کوچ کا دن آ پہنچا۔ آخری رات تھکا ماندہ شکلا رات گئے تک حساب کتاب کرتا رہا۔ میں بستر پر آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ کچھ دیر بعد شکلا میری مسہری پر آ گیا۔ گمبھیر آواز میں اُس نے مجھے پکارا۔ "ظہیر خاں!" میں تو جاگ ہی رہا تھا۔ اُس کی پکار پر اُٹھ بیٹھا۔ "میں نے تمام فائلیں مکمل کر دی ہیں۔ اُس

کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ "اب تم انھیں سمجھ لو اور سنبھال لو۔"

"شکلا جی! ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ اب ہم مل ہی رہے ہیں۔ میں یہاں ان فائلوں کا کیا کروں گا؟" میں نے کسی قدر ترشی سے کہا۔

"تم انھیں جتنی جلدی اپنی تحویل میں لے لوگے، میرا بوجھ کم ہو جائے گا۔ وہاں شاید فرصت نہ ہو اور موقع نہ ملے۔ یہاں صرف ہم موجود ہیں۔ بہتر ہے کہ تم تمام فائلیں خوب سمجھ لو اور جو بات بھی مجھ سے پوچھنا چاہتے ہو، پوچھ لو۔ اس وقت میرے ذہن میں سب کچھ تازہ ہے۔"

"میں کیا پوچھوں گا؟ آپ نے سب کچھ دیکھ لیا ہے تو ٹھیک ہے۔" میں نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"آپ مجھ سے یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ آپ نادم کر رہے ہیں۔"

"بات بہت بڑی رقم کی ہے ظہیر خاں! ایسے معاملات یوں بے پروائی سے نہیں برتے جاتے۔ تمام جزئیات سے تمھارا واقف ہونا ضروری ہے۔ تمھیں کچھ پتہ بھی ہے کہ کتنی رقم بینک میں جمع کرائی گئی ہے؟" اس نے رازدارانہ انداز سے پوچھا۔

"کتنی ہی بڑی رقم ہو، میں نے اس کی خواہش تو کی نہیں تھی۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "اور نہ مجھے کچھ جاننے کی جستجو ہے۔ یہ فائلیں آپ اپنے ہی پاس رکھیے۔ میں گھر چل کے انھیں آپ سے لے لوں گا۔"

"ظہیر خاں!" شکلا نے ایک لمبی سانس لی اور تھکاوٹ کے انداز میں مسہری کے سرہانے سے اپنا سر ٹکا لیا۔ "خاصی معقول رقم کی بات ہے۔ تمھارے نام سے بینک میں ساڑھے آٹھ لاکھ روپے جمع کرائے گئے ہیں۔ سمجھے؟ ساڑھے آٹھ لاکھ روپے۔"

"جی!" میرے ہونٹ لرزنے لگے۔ کمرے میں گہری خاموشی طاری ہو گئی۔ میں شکلا جی کی تیز سانسیں صاف سن سکتا تھا۔ "مگر میں اس کا کیا کروں گا؟" میں نے منتشر آواز میں کہا۔

"اب سب کچھ تمھاری لیاقت اور ظرف پر منحصر ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم اس کے استعمال میں محتاط رہو گے اور کرشنا جی کی توقعات پر پورے اترو گے۔" شکلا اور نہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔ میرے کانوں میں جلن ہونے لگی۔ میں رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ شکلا مجھے چپ دیکھ کے اپنے بستر پہ چلا گیا۔ یک بارگی میرے جی میں آئی کہ میں تمام فائلیں اس کے سر پہ دے ماروں یا اس کے سامنے جلا دوں۔ وہ میرے ظرف کی بات کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ میں اس کی نظر میں ایک عمدہ محاسب ثابت ہو سکوں اور کورا کی نظر میں خود کو گراؤں۔ کرشنا جی نے مجھے سونے کی زنجیر میں جکڑنے کی کوشش کی تھی۔ انھیں اپنی باریک بین نگاہ سے یہ نظر نہیں آیا تھا کہ میرا تو وہاں دل بندھا ہوا ہے۔ وہ یہ جتانا چاہتے تھے کہ اگر وہ کسی کو عزیز سمجھتے ہیں تو اس کے لیے کیا کچھ کر سکتے ہیں مگر وہ یہ حقیقت نظر انداز کر گئے کہ ان کی طرح دوسرا بھی کسی کو [illegible] سکتا ہے اور اس کے لیے ان سے بھی زیادہ سوچ سکتا ہے۔

انھوں نے اپنی محبت میں مجھ پر سکے نچھاور کیے تھے تاکہ میں دنیا کی بلاؤں سے محفوظ رہوں حالانکہ وہ خود کہتے تھے کہ سکے دکھوں کی تلافی نہیں کرتے۔ وہ خود بھی سکوں سے دور رہتے تھے، پھر کرشنا جی نے ایسا کیوں کیا؟ مجھ بے ہنر آدمی پہ سونے کے پتھر کیوں پھینکے؟ کیا اس لیے کہ میں خود تو کچھ کروں گا نہیں، میرے تو ہاتھ پاؤں ٹوٹ چکے ہیں؟ ان کا یہ سوچنا بھی ٹھیک ہی تھا۔ میرے ہاتھ پیروں پر واقعی فالج گر گیا تھا۔ جب سے کورا جدا ہوئی تھی، میں نے اپنے ہاتھ پیروں کا کتنے دن کھایا تھا؟ پہلے جیل میں کھاتا رہا، پھر ادھر ادھر لوگ مجھے بھیک دیتے رہے۔ سوچتے سوچتے میرا دماغ پکنے لگا۔

صبح ہوتے ہی شکلا نے تیاری شروع کر دی۔ کرشنا جی کے تمام کارندے ہمیں رخصت کرنے کے لیے ہوٹل میں جمع ہو گئے تھے۔ ہوٹل چھوڑنے سے پہلے شکلا نے مجھے ایک گوشے میں علیحدہ لے جا کے کہا کہ کرشنا جی کے ملازموں کے لیے مجھے کچھ رقم کا اعلان کرنا چاہیے۔ میں نے کہا، جو آپ مناسب سمجھیں، کر دیں۔ شکلا کے ذہن میں اس بات کا خیال شاید پہلے سے تھا۔ اس نے مجموعی طور پر ۳۰ ہزار روپے کارندوں میں چیکوں کے ذریعے تقسیم کیے۔ کارندے ہاتھ پھیلا پھیلا کے دعائیں دینے لگے اور ہچکیوں سے رونے لگے۔ مجھے بھی رونا آ گیا۔ میں نے شکلا جی سے کہا کہ انھیں اور رقم دے دی جائے مگر انھوں نے میری بات سنی ان سنی کر دی۔

ہماری گاڑی گھر کے دروازے پر رکی۔ جولین اور چمپا بھاگی ہوئی آئیں۔ دونوں ہمیں دیکھ کے دنگ رہ گئیں اور میرے بازوؤں سے لپٹ گئیں۔ چمپا نے میری پیشانی کو بوسہ دیا اور بڑے کمرے میں داخل ہوتے سے پہلے کوئی آیت پڑھ کے میرے سر اور سینے پہ پھونکی۔ کرشنا جی کا سامان ان کے کمرے میں بند کر دیا گیا۔ شکلا نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ اس نے چمپا اور جولین کے لیے مدراس سے کپڑے خریدے ہیں۔ بچھو ملازم بھی ڈرائنگ روم میں ناچتا پھر رہا تھا۔ چمپا اور جولین صوفے پر میرے آزو بازو بیٹھی ہوئی تھیں اور شکلا سامنے کے صوفے پہ بیٹھا تھا۔ جولین شکایت کرنے لگی کہ ہم نے اپنے پہنچنے کی پیشگی اطلاع کیوں نہیں دی۔ انھوں نے ہمیں لینے کے لیے اسٹیشن آنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ گھر آ کے چمپا اور جولین کو دیکھ کے مجھے کچھ سکون ہوا۔ کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد شکلا نے ہم سے رخصت ہونے کی اجازت چاہی۔ مجھے شکلا کے ساتھ رہنے کی بہت عادت ہو گئی تھی اس لیے میں سمجھ رہا تھا کہ اب وہ بھی ہمارے ساتھ ہی رہے گا۔ میں نے اس سے چند منٹ اور ٹھہرنے کی درخواست کی۔ کرشنا جی کے کسی ملازم کو ابھی تک علیحدہ نہیں کیا گیا تھا۔ گھر میں ہمارے آنے سے ایک ہنگامہ سا برپا تھا۔ سب ادھر ادھر دوڑے دوڑے پھر رہے تھے، کوئی میز صاف کرتا تھا، کوئی مجھے سلام کرنے کا منتظر تھا۔ شکلا چمپا اور جولین سے معذرت کر کے مجھے میرے کمرے میں لے آیا اور تمام فائلیں میرے

لے کرتے ہوئے ان کی تفصیل سمجھانے لگا۔ یہ بینک کے کاغذات ہیں، یہ ولات کی رسیدیں ہیں، یہ مکانوں اور زمینوں کے بیع ناموں کی نقلیں ہیں، یہ متفرق پرزے ہیں، وصیت کا فائل یہ رہا۔ میں نے سب کچھ دراز ڈال دیا اور شکلا سے معافی مانگی کہ سفر کے دوران میں میرے منہ سے ر باتیں نکل گئی ہوں گی۔ شکلا نے مجھے خوب زور سے بھینچ لیا اور سسک اس کا سارا چہرہ بھیگ گیا۔ "تمھیں جب بھی میری ضرورت پڑے، مجھے شنا جی کا خادم سمجھ کے بلا لینا۔" اس نے کھوئی کھوئی آواز میں کہا اور چند ں بعد رخصت ہو گیا۔ جب وہ ٹیکسی میں بیٹھ رہا تھا تو میرے دل میں آیا ں اسے روک کے کہوں، کرشنا جی کی رقم میں سے آپ بھی کچھ لے یے۔ مگر اچھا ہوا کہ یہ بات میری زبان سے ادا نہیں ہوئی ورنہ وہ بہت سبکی ں کرتا۔ اس کی نظروں میں میری کیا وقعت رہ جاتی کہ میں اسے گھر سے ں کر کے رخصت کر رہا ہوں جب کہ میری دلی خواہش تھی کہ وہ اس رقم سے جس قدر چاہے کسی گریز کے بغیر لے۔ میرے لیے اس کے بغیر اس جانا اور یہ کام بھگتانا ناممکن تھا۔ شکلا چلا گیا اور جولین چمپا میرا مان کھولنے لگیں۔ انھوں نے میری عدم موجودگی میں میرے بہت سے ے بنوا لیے تھے۔ میرا کمرہ بھی آئینہ بنا ہوا تھا۔ نہا دھو کے اور کپڑے بدل میں ڈرائنگ روم میں آیا تو وہ دونوں مجھ سے باتیں کرنے کے لیے منتظر تھیں۔ نے جولین سے اس کے باپ کی خیریت دریافت کی۔ اس کی حالت ں بہت گر جاتی تھی، کبھی سنبھل جاتی تھی۔ جولین اداس ہو گئی۔ چمپا نے فوراً ع بدل دیا اور مجھ سے مدراس میں کرشنا جی کے خاندان والوں اور ملازموں ال پوچھنے لگی۔ اس نے یہ نہیں پوچھا کہ ہم نے ان کی جائداد کا معاملہ کس رح طے کیا، نہ میں نے اسے بتایا کہ میرے پاس ساڑھے آٹھ لاکھ روپے پرداز موجود ہے اور اب میں ایک لکھ پتی آدمی ہوں۔ لکھ پتی تو خیر میں لے بھی تھا مگر اب میرے پاس نقد رقم موجود تھی اور کوئی پوچھنے والا ں تھا کہ یہ رقم کس طرح صرف کر رہا ہوں، وہاں شرمندہ کرنے کے لیے ں موجود تھی۔ مجھے ہر وقت احساس رہتا کہ یہ دولت اس کی عطا کی ئی ہے۔ کرشنا جی ایسے گئے تھے کہ اب ان کی واپسی کا قطعی امکان یں تھا۔ میں نے سرسری طور پر چمپا اور جولین کو کرشنا جی کے گھر کا حال یا۔ انھوں نے پھر بھی نہیں پوچھا کہ مجھے جائداد سے کتنی رقم حاصل ہوئی۔ لنے بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ جولین کو دیکھ کے سب سے پہلے میرے ذہن ں ماسٹر مارٹی کا خیال آیا تھا لیکن ابھی تک جولین نے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ فاسو بتا رہی تھی کہ نورین اور رستم جی میری عدم موجودگی میں دو تین بار گھر ئے تھے اور نورین فون کر کے بار بار یہ پوچھتی تھی کہ میں کب واپس آ رہا ں اور جیسے ہی میں آؤں، اسے مطلع کر دیا جائے۔ وہ نورین اور رستم جی کی ریف کر رہی تھی۔ انھوں نے کئی بار پوچھا کہ ہمیں کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔

"اور وہ ماسٹر مارٹی؟ تم نے اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔ "اس نے تمھیں پریشان تو نہیں کیا؟"

"نہیں، ادھر تین چار دن سے تو وہ بالکل نہیں آ رہا ہے۔ اسے شاید کسی طرح پتہ چل گیا ہے کہ تم شہر میں نہیں ہو حالانکہ میں نے ہر ملازم کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ تمھارے بارے میں ان سے کچھ پوچھے تو لاعلمی ظاہر کریں۔ مجھے بعد میں خیال آیا کہ مجھے خط میں اس کے بارے میں تمھیں کچھ نہیں لکھنا چاہیے تھا، تم وہاں پریشان ہو جاؤ گے۔ اب جیسے ہی اسے معلوم ہو گا کہ تم آ گئے ہو، وہ پھر آ جائے گا۔ وہ عجیب آدمی ہے، کچھ کہتا نہیں، بس دروازے پر بیٹھا رہتا ہے۔ مجھے بلواتا ہے اور منتیں کرتا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے اس پر بڑا ترس آیا۔ میں اسے برا بھلا کہتی ہوں، کبھی منع کرا دیتی ہوں کہ گھر میں موجود نہیں ہوں مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ عجب قسم کا آدمی ہے۔ میں تو اسے پہلے سے دیکھ رہی ہوں، پہلے تو وہ ایسا نہیں تھا۔ اب اس کا حال بہت خستہ ہے۔"

"میں اس کے پاس ہو آؤں گا۔"

"تم وہاں مت جانا۔" وہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ کچھ وقت گھر میں جولین اور چمپا کی باتیں سنتے ہوئے گزر گیا لیکن جیسے ہی رات آئی، مجھے بے چینی ہونے لگی۔ چمپا اور جولین اس گھر میں موجود تھیں اور وہ مجھے اس طرح برت رہی تھیں جیسے میں اسی گھر کا ایک فرد ہوں اور میں بھی یہاں آنے کے بعد دو پہر سے اس طرح کی باتیں کر رہا تھا جیسے اپنے گھر میں آ گیا ہوں۔ مجھے ایسا لگا جیسے تجمل اور زرین کمرے میں آ گئے ہوں اور کہہ رہے ہوں کہ میں نے انھیں کس یادداشت میں بھلا دیا، انھوں نے کیا برائی کی تھی۔ وہ بھی اسی طرح کی باتیں کرتے تھے۔ تجمل تو یہاں تک کہتا تھا کہ مجھے مستقل طور پر فیض آباد میں زرین کے پاس رہنا چاہیے کیونکہ وہ اکیلی ہے اور اس کا خالو اس کا دشمن ہے مگر میں وہاں سے چلا آیا کیونکہ زرین اور تجمل بھی کورا کی طرح میرا خیال رکھتے تھے اور مجھے گویا بالواسطہ طور پر مجبور کرتے تھے کہ میرا رویہ بھی ان سے کورا کی طرح ہونا چاہیے مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ وہ کورا تو نہیں تھے۔ اگر میرے نصیب سے کورا ملتی تو کیا کہتی کہ میں تو اس کے بغیر بڑا مگن ہوں۔ مجھے اس کی غیر موجودگی میں اتنے دوست بنانے کی فرصت کیسے مل گئی؟ مگر کورا ایسی نہیں ہے۔ اس کے احساسات بہت صاف و شفاف ہیں۔ جیسا اس کا چہرہ ہے، اس کا دل بھی ویسا ہے۔ وہ میرے متعلق کسی بدگمانی کے ایک ذرے سے بھی اپنا دل میلا نہیں کرے گی۔ اسے احساس ہو گا کہ میں صرف اسی کے لیے زندہ رہا اور زندہ رہنے کے لیے آدمیوں کے درمیان رہنا پڑتا ہے۔ آدمیوں کے درمیان ہی رہ کے میں اسے ڈھونڈ سکتا تھا۔ اب اگر راستے میں کوئی تجمل، کوئی زرین، کوئی راج کرشنا، کوئی جولین اور کوئی چمپا مل جائے اور مجھے روٹی کھلا دے، پانی پلا دے اور میرے کپڑے بدلوا دے تو کورا کو اس کا شکر گزار ہونا چاہیے کیونکہ انھوں نے اس کی عدم موجودگی میں میرا خیال رکھا۔ میں نے اس کی مالا گردن سے اتار لی اور اس کا ایک ایک دانہ چومتا رہا۔

ناشتے کے بعد چمپا گھر میں اکیلی تھی، جولین اسکول چلی گئی تھی، میں

اخبار میں کرشنا جی کی کوئی خبر تلاش کر رہا تھا کہ چمپا نے آہستگی سے مجھے مخاطب کیا۔ "پیارے میاں! تین مہینے سے زیادہ وقت گزر چکا ہے۔ اب ہمیں یہ گھر چھوڑنا پڑے گا۔"

"ہاں!" میں نے نرمی سے کہا۔ "چھوڑنا تو پڑے گا، تم نے کیا انتظام کیا ہے؟" اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے سر اٹھا کے اسے دیکھا، وہ بت بنی بیٹھی تھی۔ "تمھیں کچھ نہ کچھ تو سوچنا ہوگا۔ اب کرشنا جی نہیں ہیں۔" میں نے ہچکچا کے کہا۔

"یہی تو میں تم سے کہہ رہی ہوں۔" وہ گلوگیر آواز میں بولی۔

"لیکن مجھے کسی گھر کی ضرورت نہیں ہے، بات وہی ہے جو پہلے تھی۔ تم اپنا کوئی انتظام کر لو۔ میں اس شہر میں شاید زیادہ دنوں تک نہ رہوں۔"

"تم کہاں جاؤ گے؟" اس نے وحشت سے پوچھا۔

"کہیں بھی۔"

"میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گی۔"

"پھر وہی ضد۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "میرے ساتھ کہاں ماری ماری پھرو گی۔ اپنی ضد چھوڑ دو۔" میں نے التجا کی۔ "مجھے معلوم ہے کہ اب تمھارے لیے آگرے یا فیض آباد جانا ممکن نہیں ہے۔ تم نے وہ زندگی ترک کر دی ہے لیکن تم کہیں بھی جا سکتی ہو، تمھیں روپوں کی ضرورت ہو تو میں فراہم کر سکتا ہوں۔"

"روپے پیسے کا میں کیا کروں گی، تمھارے سوا میرا اور کون ہے۔"

مجھے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ چمپا سے التجا کرنا، اس کے ساتھ مغز مارنا فضول ہے۔ وہ ماننے کی نہیں۔ مجھے خود اس کا کوئی نہ کوئی انتظام کرنا پڑے گا۔ اس نے پہلے کی طرح آنسو بہانا شروع کر دیا تھا۔ "میں تمھارے لیے کیا کروں؟ کون سی ایسی دعا ہے جو میں نے نہیں کی۔ خدا نے بھی مجھ گنہ گار کو معاف نہیں کیا ہے مگر وہ میری سننے گا ضرور۔" وہ بین کرنے لگی۔ "آہ ایک کرشنا جی کا آسرا ہو گیا تھا، وہ بھی چلے گئے۔ وہ رہتے تو شاید تم اتنے مایوس نہ ہوتے۔"

"اور ہاں! تم نے تمام باتیں کرشنا جی کو بتا دیں۔" میں نے تنک کے کہا۔ مجھے اس کی بات سے خیال آیا کہ یہ وہی تھی جس نے کرشنا جی کو میرے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ "تمھیں کچھ احساس نہیں ہوا کہ وہ مجھے کتنا عزیز سمجھتے تھے اور میں نے ان سے ہر بات چھپائی تھی؟ میں نے تمھیں تاکید کر دی تھی کہ اپنی زبان مت کھولنا اور تم نے وعدہ بھی کیا تھا مگر تم اپنی بات پر قائم نہیں رہ سکیں۔ نہ جانے تم نے ان سے کیا کیا کہا ہوگا۔"

"میں نے کرشنا جی کو فہمیدہ کی بات نہیں بتائی تھی۔" وہ بے قراری سے بولی۔ "حاشا میں نے انھیں اس بابت کچھ نہیں بتایا تھا۔ اگر کرشنا جی مجھے قسمیں نہ دلاتے اور تمھارا واسطہ نہ دیتے تو میں اپنی زبان ہرگز نہ کھولتی۔ انھوں نے خدا کا واسطہ دیا تھا۔ تب میری زبان سے اتنا نکلا کہ تمھارے گھر والے تم سے بچھڑ گئے ہیں۔ انھوں نے ضد کیا کہ میں تمھارے ابا جان کا نام بتاؤں، وہ انھیں اپنے ذرائع سے تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔ بات

میری سمجھ میں آگئی، وہ تمھارے لیے بے حد فکرمند رہتے تھے اس لیے مجھے بتانا پڑا کہ تمھارے ابا جان پہلے بمبئی کے کسی محلے میں رہتے تھے۔ جب میں دوبارہ بمبئی آئی تھی تو نور جہاں کو بلا کے میں نے تمھارے ابا جان کا پتہ پوچھ لیا تھا، وہ جیل میں بولا کی منت سماجت کرکے پتہ پوچھ آیا تھا۔ میں وہاں گئی کہ شاید آس پڑوسیوں سے کوئی کارآمد بات معلوم ہو جائے۔ میں مولوی اکرم سے بھی ملی تھی۔ میں نے کرشنا جی کو بتا دیا۔ وہ وہاں گئے اور انھوں نے مولوی اکرم کو کچھ ایسا متاثر کیا کہ وہ تمھارے ابا جان کا سامان دکھانے پر تیار ہو گئے۔ ممکن ہے کرشنا جی کو سامان میں کوئی ایسی کام کی چیز نظر آگئی ہو کہ جب وہ گھر واپس آئے تو مطمئن تھے۔ کہتے تھے کہ میں انھیں ضرور ڈھونڈ نکالوں گا۔ انھوں نے کبھی میرے بارے میں نہیں پوچھا۔ پوچھتے تو مجھے جھوٹ بولنا پڑتا۔ انھوں نے مجھے جھوٹ بولنے سے بچا لیا۔ پیارے میاں! اب وہ موجود نہیں ہیں لیکن یقین کرو، میں نے ان سے فہمیدہ کے سلسلے میں ایک لفظ نہیں کہا اور ایک بات بتا دوں، مجھے بہت سے مردوں سے واسطہ پڑا ہے، طرح طرح کے مردوں سے، جتنا میں انھیں سمجھ سکتی ہوں، تم نہیں سمجھ سکتے۔ کرشنا جی ایسے آدمی نہیں تھے کہ انھیں فہمیدہ والا حادثہ معلوم ہوتا تو وہ تم سے نفرت کرنے لگتے۔ ان کی طبیعت تو سب سے جدا تھی۔ آہ۔" وہ پھوٹ پڑی۔ "وہ کہیں چلے گئے۔ خدا نے مجھے کیوں نہیں اٹھا لیا۔"

چمپا نے کچھ اس انداز میں کرشنا جی کا ذکر کیا کہ میرا سینہ بھی اُمڈنے لگا۔ آنکھوں کا بند ٹوٹ پڑا اور میں چمپا سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ دوپہر کو شکلا کا فون آیا۔ میرا دل ہولنے لگا۔ شکلا بہت دنوں بعد دفتر گیا تھا۔ ممکن ہے کہیں سے کرشنا جی کے بھیجے ہوئے خطوط کا جواب آگیا ہو اور ابا جان کا پتہ چل گیا ہو لیکن شکلا میرا حال پوچھتا رہا۔ اس قسم کا اس نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ پتہ نہیں مجھے کیوں تسلی سی ہوئی۔ شاید مجھے شکلا کی زبانی ابا جان کا پتہ جاننا پسند نہیں تھا۔ میری سانسیں قابو میں آئیں تو میں نے اس سے کرشنا جی کے معاملے کی تفتیش کے متعلق معلوم کیا۔ شکلا کے جواب کا مجھے پہلے سے علم تھا۔ تفتیش کرنے والی ٹیم نے اپنی ناکامی کا اعتراف کرکے فائل حکومت کو بھیج دی تھی۔ صبح کے اخبار میں بھی کرشنا جی کی کوئی خبر نہیں تھی جیسے وہ اس شہر میں لوگوں کے درمیان کبھی موجود نہ رہے ہوں۔ مجھے غصہ آنے لگا۔ اچانک فون کا سلسلہ منقطع ہو گیا لیکن مجھے اس انقطاع کی اس وقت خبر ہوئی جب شکلا کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ میں اس سے کہہ رہا تھا کہ کسی طرح مجھے کوئی اتا پتہ بتا دو، کوئی اشارہ دے دو، میں خود انھیں تلاش کرکے حکومت کے حوالے کر دوں گا یا اپنے آپ ان سے نمٹ لوں گا۔

میں نے طے کیا کہ گھر میں بیٹھے رہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ وقت کافی گزر گیا ہے اس لیے اب مجھے باہر نکلنا چاہیے اور خود کوئی صورت نکالنی چاہیے ورنہ اپنے آپ سے ہمیشہ شکوہ رہے گا۔ دل میں ایک چور رہے گا اور کرشنا جی کے نام پر ندامت سی محسوس ہوگی۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے

کرشنا جی کا پوچھنے والا بھی کوئی موجود ہے۔ میں اس ادھیڑ بن میں گم تھا جولین اسکول سے واپس آگئی اور آتے ہی چہکنے لگی کہ آج اسے پرنسپل نے ...کے اس کی کارکردگی پر شاباشی دی ہے۔ چمپا نے اسے اپنے سینے سے ...لیا۔ شام ہونے سے پہلے میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ پہلے کسی طور مکان کا مسئلہ حل ...نا چاہیے۔ حکومت کی طرف سے کسی وقت بھی نوٹس آسکتا ہے۔ مرے ہوئے ...لوں کو کون اتنا یاد رکھتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ ایسا کوئی حکم آنے سے پہلے اپنا انتظام کر لیا جائے۔ جولین تو اپنے گھر جا سکتی تھی مگر چمپا؟ چمپا کسی صورت باز ...ہیں آرہی تھی۔ میرے ذہن میں آیا کہ میں کرشنا جی کی رقم میں سے کچھ ...م نکال کے ایک مناسب مکان خرید کے جولین اور چمپا کو اس میں بسا دوں۔ ...ی مجھے اس شہر میں کچھ عرصے اور رہنا پڑے گا۔ پھر شاید نئے مکان اور نئے ...حول میں چمپا اپنا ارادہ بدل دے۔ میں یہ رقم کرشنا جی کی رقم میں سے ...رض کے طور پر نکالوں گا اور جب کبھی توفیق ہوئی، واپس رکھ دوں گا حالانکہ ...ریہ بھی میرے ذہن کا ایک دلاسا ہے۔ میں یہ رقم خرچ نہ کروں تب بھی ...ں کا بوجھ میرے سینے پر رہے گا اور میرے سوا اسے کون ہاتھ لگائے گا۔ ...ہم جی آمادہ نہیں ہوا۔ میں نے سوچا کہ فی الحال جولین کے مکان میں منتقل ہو ...انا چاہیے۔ اس کی اور چمپا کی چھنتی بھی بہت ہے، جولین کی موجودی میں ...پا کا اور چمپا کی موجودی میں جولین کا دل بہلا رہے گا۔ میں نے جولین سے ...ی وقت کہہ دیا کہ وہ سامان منتقل کرانے کے لیے بچھو سے کہہ دے کچھ ملازموں ...بک دوش کر دے کیونکہ ہم زیادہ اخراجات کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ جولین ...یری بات پر یقین نہیں آیا۔ وہ آنکھیں پٹ پٹانے لگی اور پھر نہ جانے اسے ...یا ہوا، میری طرف لپکی اور میرے دونوں بازو پکڑ کے کپکپانے لگی۔ مجھے عجیب ...لا۔ ایک لمحے کے لیے تو میں سُن ہو گیا۔ جولین کی جھلملاتی ہوئی آنکھیں میری ...نکھوں سے بہت قریب تھیں۔ "کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟" وہ متجسس آواز میں بولی۔

میں نے تیزی سے اثبات میں گردن ہلائی اور لڑکھڑاتی ہوئی ...ان میں کہا۔ "ہاں۔" وہ میرے بازو چھوڑ کے فوراً چمپا کی طرف بھاگی اور اس ...لپٹ گئی۔ اس کے چہرے پر اچانک خون ہی خون سمٹ آیا تھا، وہ ...بار بے یقینی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے فوراً بچھو کو بلایا اور کرشنا جی ...کمرے کا سامان بہت حفاظت سے پیک کرنے کا حکم دیا۔ شاید اسے ڈر تھا ...میرا ارادہ نہ بدل جائے۔ اسے خوش دیکھ کے مجھے اطمینان ہوا اور میرا دل باہر ...لنے کو چاہا۔ میں ان دونوں سے کہے بغیر سڑک پر آگیا اور سوچنے لگا کہ کس طرف ...اؤں؟ میرے ذہن میں دیر سے ماسٹر مارٹی کا نام گونج رہا تھا۔ مجھے اس ...پتہ یاد تھا۔ میں بس میں بیٹھ گیا اور پوچھتا پاچھتا اس کے فلیٹ تک پہنچنے ...میں کامیاب ہو گیا۔ میری دستک پر ایک ننھا سا پستہ قد نوجوان برآمد ہوا۔ ...اس کا نام غالباً ٹمٹا تھا۔ ٹمٹا میری شکل دیکھتے ہی اچھل پڑا اور دروازے ہی ...سے چلّایا۔ "ماسٹر! ماسٹر اکرم ہیرو کم ہیرو کے اندر کون آیلا ہے۔"

اندر سے ایک کراہتی ہوئی آواز آئی۔ "کون ہے؟"

"ادے ادھر اپنا کون والا استاد آیا ہے۔" ٹمٹے نے زور سے صدا لگائی اور مجھ سے خفیف لہجے میں کہنے لگا۔ "ماسٹر اِن جرڈ ہے۔"

"اِن جرڈ ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "اسے کیا ہوا؟"

"ابھی اپن کیا بولیں۔" وہ اپنا ماتھا پکڑ کے بولا۔ "ماسٹر ایک دم فل اسٹاپ ہو گیا ہے۔ اُدھر اس دن تم نے ہاتھ کیا دکھایا، ماسٹر کا مائنڈ آؤٹ ہو گیا ہے۔"

میں نے اس کی گردن پکڑ کے اسے دروازے سے ہٹایا اور اندر داخل ہو گیا۔ یہ ایک تنگ و تاریک فلیٹ تھا۔ درمیان میں ایک مختصر روشنی کا بلب ٹمٹما رہا تھا۔ ماسٹر مارٹی ڈگمگاتا ہوا کمرے سے باہر آیا۔ اس کا ہاتھ گردن میں لٹکی ہوئی پٹی میں ڈلا ہوا تھا اور سر پر بھی پٹی بندھی تھی۔ اس کا رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ آنکھیں اندر چلی گئی تھیں۔ "اوہ یو! دی کنگ!" اس نے پھٹی ہوئی آواز میں نعرہ لگایا۔ "اپن کوئی ڈریم دیکھ رہا ہے۔"

میں نے اس کا شانہ پکڑ لیا۔ "مارٹی! یہ کیا ہو گیا؟"

مارٹی کی گردن جھک گئی۔ میں نے اسے جھنجھوڑا تو وہ شکستہ لہجے میں بولا۔ "بس گریٹ ماسٹر! اپن کا اسٹار بیڈ لک ہو گیا ہے۔" وہ اپنے ایک ہاتھ سے میری پنڈلی چھونے لگا۔ "پر تم کہاں تھا؟ اپن ڈیلی وائیڈ لگاتا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے، میں شہر میں نہیں تھا۔"

"اپن کو ڈاؤٹ تھا کہ تم ایدرسٹی میں نئیں ہو۔"

"پر یہ کیا ہوا؟" میں نے سختی سے پوچھا۔

"ایکس کیوز می استاد! ماسٹر اونلی آف ہو۔ اپن اُدھر اسٹریٹ میں بوم مارتا پھرتا تھا، پر ٹھیک تھا۔ جب سے اپن کنٹری سے آؤٹ آف باؤنڈ ہوا، اپن کا ہاتھ ایک دم ڈل ہو گیا۔ اپن نے تم کو ساری بات پہلے بول دیا تھا۔ بس ایدر اپن تمھارا ویٹ کرتا تھا یا اُدھر کون کے پاس راؤنڈ لگاتا تھا۔ اپن نے ٹوسی جن لے لیا تھا کہ جب تک..."

"بات کم کرو۔" میں نے ناراضی سے کہا۔

"اوہ ماسٹر! آئی ایم ساری۔" وہ جھینپ کے بولا۔ "اپن جریا ہے ایک دم..." اس نے اپنے آپ کو گالی دی اور دفعتہً میری چھاتی سے اپنا سر رگڑنا شروع کر دیا۔ "ماسٹر! ماسٹر!" وہ ہذیانی انداز میں بولا۔ "تم سامنے آیا تو اپن بیاڈ کنٹرول ہو گیا۔ اپن کا بہت انسلٹ ہو گیا ہے ماسٹر! ان ہاتھوں کو کاٹ دو یا ان میں جان ڈال دو۔ ریکوئسٹ ایکسیپٹ کرو ماسٹر! اپن تمھارا سلیو ہے اوپر سے نیچے تک نوکر۔ کانفی ڈینس کرو ماسٹر! یہ ٹمٹا بھی اور اُدھر کنٹری کا سارا چھوکرا تمھارا نوکر ہے۔"

"تم کیا باتیں کر رہے ہو۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "ہاتھ دکھانے کا اتنا ہی شوق ہے تو کیا بمبئی بھر میں تمھیں کوئی دوسرا نہیں ملتا؟"

"ملتا ہے بہت ملتا ہے۔" وہ تیزی سے بولا۔ "پر اپن کا ہرٹ نہیں مانتا۔ اپن اُدھر کنٹری میں آزاد رہتا تھا اور کسی چکرم کو اندر گھسنے نہیں دیتا تھا۔ سالا استاد لوگ بھی کچھ سوچ کے دُور دُور رہتا تھا۔ اُدھر اُوپر علاقے میں

کسی کا مغز پھرا تھا کہ ٹائم کل کرتا۔ سٹی میں ایک سے ایک فنٹوش علاقہ پڑا ہے۔ اپن اُودر کا کنگ تھا ماسٹر! ابھی اپن اُودر کیسے جائے۔ اپن باہر آگیا۔ اپن نے اُسی مومینٹ ڈیسائڈ کر لیا تھا کہ یا تو تمھارا سیلیوری کرے گا یا پھر سر نہیں اٹھائے گا اور اپن کو بائی چانس اُس دن تم مل گیا۔ تم مل گیا تو اپن کا ڈیڈ باڈی میں پھر سے جان آیا....." وہ بولتا رہا اور میں نے اسے بولنے دیا۔ مارٹی پہلے سے زیادہ عاجزی کے ساتھ بات کر رہا تھا۔ اس عرصے میں وہ اپنے عہد پر مکمل طور پر قائم رہا تھا اور اُس کی جو حالت رہی ہوگی وہ اس جگہ سے ظاہر تھی۔ اس کا حال پہلے سے بہت ابتر تھا۔ فلیٹ میں بڑی بے ترتیبی تھی۔ سیاہ برتن ایک طرف منتشر پڑے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک زمانے سے فلیٹ میں صفائی نہیں ہوئی ہے۔ پلاسٹر اُدھڑا ہوا تھا اور جگہ جگہ جالے تنے ہوئے تھے جس کمرے سے مارٹی کراہتا ہوا نکلا تھا، وہ بھی کسی حبس سے کم نہیں تھا۔

"مگر یہ کیا کر لیا؟" میں نے اُس کے زخموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے ضرور پھر زبان چلائی ہوگی۔ یہ کیا حال کر لیا؟"

"بس اَڑی ہو گیا۔ ایدر علاقے کا چند لوگ اپن کو جانتا تھا اور ایدر اپن کا گھومنا پھرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ سالا گھورتا رہتا تھا۔ اپن نے اُن سے کوئی چھیڑ نہیں کیا تھا، پر ایک دن جیب بالکل سوکھ گیا۔ سالا سارا چھوکرا لوگ پہلے ہی ایک ایک کر کے بھاگ گیا تھا۔ اُودر تم بھی نہیں ملا تو اپن نیچے اُترا۔ اپن نئیں، اپن کا پیٹ نیچے اُترا اور اپن نے ایک شاپ کیپر سے بھتا مانگا۔ شاپ کیپر نے اپن کی بات مان لی پر بعد میں علاقے کے آدمی لوگ سے کمپلینٹ کر دی۔ وہ سالا گالیاں بکتا ہوا ایدر آگیا اور اپن سے سارا پیسہ مانگا۔ اپن سب پیسہ خلاص کر چکا تھا۔ اُنھوں نے اپن کو باہر نکال لیا اور . . . . . باقی اپن کیا بولیں، اپن کا یہ بینڈیج بول رہا ہے۔ پھر علاقے کا آدمی ایدر آیا اور ترڑی مارا کہ اپن کو علاقے کے اُستاد چھنگا اُستاد کے پاس جا کے معافی مانگنی چاہیے۔ اپن نے رجیکٹ کر دیا۔ سالا سب اینگری ینگ مین ہو گیا اور علاقے سے دفع ہونے کا آرڈر دیا۔ اپن نے ریکوئسٹ کی کہ اپن دو دیک کے اندر اندر چلا جائے گا پھر ایدر نہیں آئے گا۔ سالا تھوڑا آدمی کا بچہ تھا، مان گیا۔"

"مارٹی کو بہت مارا استاد!" منڈا پہلی بار درمیان میں بولا۔ "ابھی تو کچھ ٹھیک ہے سالا دو دن تک تو فلیٹ پڑا رہا۔ اپن تو سمجھا مارٹی کلٹی ہو گیا۔ تم کو یہ بہت یاد کرتا تھا۔"

منڈے نے مجھے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر بٹھا دیا تھا۔ میرے جواب دینے پر وہ دونوں بھی چپ ہو گئے۔ "یہ اُستاد چھنگا کون ہے؟" کچھ توقف کے بعد میں نے پوچھا۔

"یہاں کا دادا ہے سالا اولڈ مین!" منڈے نے نفرت سے کہا۔

"سب سے اس طرف ہے؟"

"بہت دنوں سے اپن نے جب سے آنکھ کان کھولا ہے اسے ایدر دیکھا سنا ہے۔ سالا بوڑھا ہو گیا ہے پر ابھی بہت جان ہے۔ ایک دم بجار کے مالک ہے۔"

"یہاں ممبئی میں تم ایدر کتنے اُستادوں کو جانتے ہو؟"

"اپن کو زیادہ میل جول رکھنے کا ٹائم نہیں ملتا تھا۔ سٹی بہت بڑا ہے اُستاد! کچھ کو پرسنلی جانتا ہے، کچھ کا نام سنا ہے۔ اپن جو بھی تھا، چھوٹا بڑا، یہ اپنے کنٹری کا کنگ تھا۔ اپن کو وہیں سے ٹائم نہیں ملتا تھا۔" مارٹی نے تکرار کی۔

"تمھارے باقی چھوکرا لوگ کدھر ہیں؟"

"تمھی بولو، وہ کب تک مارٹی کا ساتھ دیتا۔ بھوکا مارٹی۔" مارٹی زمین پر تھوکتے ہوئے بولا۔ "سب ایدر اُودر خوار ہو رہا ہے۔ مارٹی کیا کر سکتا تھا۔ آئی سیڈ دیم، گو آن، یس فنش۔ ابھی ایدر اولی منڈا رہ گیا ہے۔"

"کیا تم میں اتنی طاقت ہے کہ میرے ساتھ چل سکو؟" میں نے ایک طویل خاموشی کے بعد کہا۔

"تم اپن کو جیل میں لے چلو۔" وہ مچل کے بولا۔

"میرے ساتھ نیچے آؤ۔"

مارٹی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ منڈا میرے بازو سے چپک گیا۔ وہ دونوں میرے پیچھے لڑھکتے پھڑکتے سیڑھیوں سے اُترے اور بازار میں آگئے۔ یہ کوئی فیشن ایبل علاقہ نہیں تھا۔ تاہم آبادی گنجان تھی۔ سڑک زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ اور اُس کے دونوں طرف کئی منزلہ سکونتی عمارتیں کھڑی تھیں۔ مارٹی زخمی ہونے کے باوجود سینہ پھلا کے میرے دائیں طرف اور منڈا بائیں طرف چل رہا تھا۔ کچھ آگے چل کے منڈے نے مجھے کہنی ماری۔ میں نے بائیں سمت دیکھا۔ دو آدمی فٹ پاتھ پر ایک کھمبے سے ٹکے ہوئے ہمیں گھور رہے تھے۔ میں نے منڈے سے پوچھا نہیں کہ یہ کون ہیں؟ ان کے چہروں بشروں سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ کس قماش کے لوگ ہو سکتے ہیں۔ میں اُجلے اور معقول کپڑوں میں تھا۔ ہم اُن دونوں آدمیوں کے قریب سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ سڑک آگے جا کے مڑ جاتی تھی۔ اِدھر اُدھر تنگ گلیاں تھیں۔ گلیوں میں بڑی بھیڑ تھی۔ ہم دوسری سڑک پر آئے تو منڈے نے پھر کہنی ماری۔ میں نے نگاہ اُٹھا کے دیکھا۔ تین آدمی ایک جنرل اسٹور کے پاس کھڑے ہماری جانب اشارہ کر رہے تھے۔ میرے دیکھتے ہی وہ ایک دوسرے سے اس طرح باتیں کرنے لگے جیسے ہم سے غافل ہوں۔ ہم مختلف سڑکوں سے گزرتے رہے اور کبھی منڈا کبھی مارٹی مجھے کہنیاں مارتا۔ کھنکارتا اور آنکھیں چلاتا رہا۔ ہم کہیں ٹھیرے نہیں۔ جب سڑکیں پوری طرح روشنیوں سے جگمگا گئی تھیں تو ہم علاقے کے بڑے حصے سے گزر چکے تھے اور راستے میں ہمیں مختلف لوگ مل چکے تھے۔ اکا دکا پولیس والے بھی گشت کرتے ہوئے نظر آئے تھے۔ مجھے مارٹی کے زخموں کا خیال تھا۔ اِس حالت میں اسے زیادہ نہیں چلنا چاہیے تھا لیکن میں نے پورا علاقہ گھوم لینا مناسب سمجھا۔ شاید ۹ بجے ہوں گے۔ بڑی سڑکیں ہم نے تقریباً تمام طے کر لی تھیں۔ ہم چوک میں واپس آگئے۔ اُس وقت منڈے نے اُچک کے میرے کان میں سرگوشی کی کہ ہمارے آگے پیچھے کئی آدمی

چل رہے ہیں۔ منڈے کو یہ بات بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میری نظریں خود ہر طرف دیکھ رہی تھیں۔ "وہ اُودر گلی میں چھنگا اُستاد کا اڈا ہے۔" مارٹی نے ہلکی اور کسی قدر لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

ہم چوک میں واپس آ کے ایک گلی میں داخل ہو گئے۔ گلی میں نکڑ پر گل فروشوں کی دُکانیں تھیں، اُن سے تین چار دُکانوں کے بعد پان والے کی سجی ہوئی دکان تھی اور اُس سے ایک چھوٹا سا ہوٹل ملحق تھا۔ میں وہیں ٹھیر گیا۔ میں نے منڈے کو پیسے دے کے پان لانے کے لیے کہا۔ مارٹی اپنا اضطراب چھپائے ہوئے تھا۔ "اُستاد! دیکھ رہے ہو؟" اُس نے میری طرف منہ کیے بغیر چپکے سے کہا۔ میں خاموش رہا۔ سات آٹھ آدمی چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ ہم اُن کی نگاہوں کے احاطے میں تھے۔ منڈا اُچھلتا کودتا ہوا پان لے آیا۔ ایک میں نے کھایا، ایک مارٹی کو دیا۔ پان چباتا ہوا میں کئی منٹ تک کھڑے کھڑے سوچتا رہا۔ وہ لوگ میرے نزدیک نہیں آئے لیکن وہ سب مستعد کھڑے تھے۔ میں ٹہلتا ہوا پھر چوک میں آگیا۔ وہ لوگ بھی آگے پیچھے چوک میں اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ جس گلی کی طرف مارٹی نے اشارہ کیا تھا کہ وہاں چھنگا استاد کا اڈا ہے، وہ چوک سے قریب ہی تھی۔ ہم آہستہ قدموں سے اُسی گلی کے دہانے پر پہنچ گئے لیکن اندر جانے کے بجائے نکڑ پر کھڑے رہے۔ میں نے دیکھا کہ ہمارا تعاقب کرنے والے آدمی بھی اِرد گرد پھیل گئے ہیں۔ چھنگا کے اڈے والی گلی زیادہ روشن نہیں تھی اور گنجان بھی کم تھی۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کے چاقو ٹٹولا۔ پھر میں نے مارٹی کو دیکھا۔ وہ اُن آدمیوں کی طرف نظریں جمائے ہوئے تھا۔ میں نے منڈے کو دیکھا۔ اُس کی پھرتی ختم ہو گئی تھی۔ وہ بالکل ساکت میرے پہلو میں دُبکا کھڑا تھا۔ میں نے اچانک ہاتھ اُٹھا کے اپنے نزدیک ترین کھڑے ہوئے آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ کچھ نہیں سمجھا۔ میں نے پھر اشارہ کیا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کی طرف بے تابی سے نظر کی اور سینے پر ہاتھ رکھ کے اشارے سے تائید چاہی کہ میں اُسی کو بلا رہا ہوں یا کسی اور کو۔ وہ آتے ہوئے جھجکا، مگر اُس کے ساتھیوں نے گردن ہلا کے اُسے حرکت کرنے کی اجازت دے دی۔ وہ میرے پاس آیا تو اکیلا نہیں تھا۔ دائیں اور بائیں سے دو آدمی پھرتی کے ساتھ آ کے اُس کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ میں نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ "مجھے چھنگا استاد کے پاس لے چلو۔"

"چھنگا اُستاد!" انھوں نے تذبذب سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ "تم کون ہے؟"

"میں اُس سے ملنا چاہتا ہوں۔" میں نے نرم آواز میں کہا۔

"تم کون ہے؟" ایک نے سختی سے پوچھا۔

"میں۔ میں تمھیں کیا بتاؤں کہ میں کون ہوں۔ میں ایک پردیسی ہوں۔ میں نے چھنگا استاد کی بہت شہرت سنی ہے۔ وہ مجھے نہیں جانتا۔ میں اُس سے ملنے آیا ہوں۔"

وہ میری بات سے مطمئن نہیں ہوئے اور اُن میں سے ایک نے بگڑتے ہوئے تیور سے کہا۔ "مگر تم کیوں اُس سے ملنا چاہتا ہے؟"

"میں اُسے دیکھنا اور اُس سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ میرے بجائے مارٹی سے مخاطب ہوا۔ "کیا لفڑا ہے؟ تم سالا باز نہیں آیا۔" پھر مجھ سے بولا۔ "اے بابو! جاؤ ابھی بات اپن نے خلاص کر دی ہے۔ مارٹی سے کہہ دیا ہے کہ وہ لونڈا پن نہ کرے۔"

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا، میں تم سے کیا کہہ رہا ہوں؟ مجھے چھنگا اُستاد کے پاس لے چلو۔" میں نے تند لہجے میں کہا۔

"چھنگا اُستاد اس ٹیم پر کسی سے نہیں ملتا۔ سویرے ایدر آؤ۔ اپن تم کو چھنگا کے پاس لے چلے گا۔ پر بات مارٹی کی ہے تو تمھارا اُودر جانا بیکار ہو گا۔ بات نہ بڑھاؤ، مارٹی سے کہو کہ وہ آگے یہ حرامی پن نہ کرے۔"

"زبان سنبھال کے بات کرو۔" میں نے تحمل سے کہا۔ "مجھے چھنگا اُستاد سے مارٹی کی بات بھی کرنی ہے اور اپنی بھی۔ سویرا کس نے دیکھا ہے، تم ضمانت دے سکتے ہو کہ سویرے تک چھنگا استاد زندہ رہے گا یا میں زندہ رہوں گا۔ تم اُسے جا کے بتاؤ، ایک پردیسی اُس سے ملنا چاہتا ہے۔"

"مارٹی کی بات کرنا ہے بابو! تو اپن سے کرو۔ چھنگا اُستاد سے ملنا ہے تو سویرے آؤ۔ اُستاد سالا کوئی زنانہ نہیں ہے کہ پردے میں چھپا بیٹھا ہے۔ تم اُس سے ضرور ملنا اور وہ بھی تم سے ضرور ملے گا۔"

میں سمجھ گیا تھا کہ اُن کی یہ تھوڑی بہت گریز میری سفید پوشی کے سبب سے ہے۔ وہ مجھے دیکھ کے سادہ لباس والے کے شک میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ اس کے باوجود میں پوری طرح ہوش میں تھا۔ چاقو میرے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ اِس اثنا میں اُن کے دوسرے ساتھی تماش بینوں کی طرح ہمارے پاس آگئے تھے۔ "میں اُستاد سے صرف چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ سویرے کی بات مت کرو۔ اُستاد سے جا کے کہو کہ ایک پردیسی آیا ہے۔ وہ منع کر دے گا تو میں واپس چلا جاؤں گا لیکن اُس سے یہ بھی کہہ دینا کہ میرے ساتھ ایک زخمی آدمی ہے، ایک آدھا آدمی ہے اور ایک میں ہوں اور میں اُس سے تنہائی میں بات کرنا نہیں چاہتا۔"

میری بات سن کے اُن سب نے تلملا کے ایک دوسرے پر دوبارہ نظر کی۔ میں نے اُن کے اشاروں کنایوں کی طرف سے عمداً منہ موڑ لیا۔ "کیوں مارٹی!" جو آدمی سب سے آگے تھا، اُس نے مارٹی سے بدلے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "کیا چکر ہے؟"

"مارٹی سے کچھ مت پوچھو، کوئی چکر نہیں ہے۔ دو اور دو چار کی بات ہے۔ تم دیر لگا رہے ہو اور میری بات سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے ہو۔" میں نے سرد آواز میں کہا۔

"دیکھو بابو! ابھی چھنگا اُستاد نے مارٹی کو بخش دیا ہے۔ اُستاد اس علاقے کا راجا ہے۔ وہ برداشت نہیں کرتا کہ کوئی اُس کے علاقے کے باسیوں کو تنگ کرے۔ مارٹی نے جو کچھ کیا، اُس کی سزا اُسے مل گئی۔"

"میں اس کا جواب تمھیں چھنگا اُستاد کے سامنے دوں گا۔ تم خیال نہیں کر رہے ہو کہ میں چھنگا اُستاد سے ملنے کی اجازت چاہ رہا ہوں۔ تم خود باتیں نہ بناؤ، اپنا آدمی اُس کے پاس بھیجو۔ اگر وہ اجازت نہیں دے گا تو میں زبردستی اُس کے پاس نہیں چلا جاؤں گا۔ مجھے یقین ہے کہ چھنگا استاد منع نہیں کرے گا۔" میں نے جان بوجھ کے اپنا مطالبہ دُہرایا۔

"تم کوئی لاٹ صاحب ہو کہ چھنگا اِسی وقت تم سے ملے۔"

"اس کا فیصلہ بھی چھنگا ہی کرے گا۔"

"فیصلہ اُس کے ساتھی بھی کر سکتے ہیں۔" پیچھے کھڑے ہوئے کسی آدمی نے درشتی سے کہا "جاؤ، جاؤ بابو! سویرے آنا۔ اِن کا بھیجا مت چلپلی کرو اِپن۔۔۔"

ابھی اُس نے اپنا جملہ مکمل نہیں کیا تھا کہ ایک آدمی گلی سے لپکتا ہوا ہمارے پاس آیا اور ہانپتے ہوئے بولا "استاد بُلا رہا ہے۔"

"بلا رہا ہے!" کئی حیرت بھری آوازیں ایک ساتھ اُبھریں۔

میں نے مارٹی اور ٹِڈے کے بال پکڑ کے انھیں آگے کی طرف دھکیلا۔ چھنگا کے آدمی ہمارے آگے پیچھے چلنے لگے۔ ہمیں زیادہ دُور نہیں جانا پڑا۔ چھنگا کا باڑا کوئی سو قدم پر تھا۔ باڑے کے پاس پختہ اور نیم پختہ عمارتیں تھیں۔ جس عمارت میں ہم داخل ہوئے وہ اوسط درجے کی دو منزلہ پختہ عمارت تھی۔ باہر کی روشنیاں مدھم تھیں لیکن اندر خاصی روشنی تھی۔ دروازہ مضبوط تھا۔ ایک ڈیوڑھی جیسی جگہ سے گزر کے ہم ایک کمرے میں پہنچ گئے۔ یہ ایک ویران سا بڑا کمرہ تھا، صرف دو چارپائیاں دیوار سے لگی ہوئی تھیں اور کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ عمارت کا کوئی دوسرا راستہ بھی ضرور ہوگا۔ ہماری رفتار تیز نہیں تھی۔ ٹِڈے کا چہرہ فق پڑا تھا، مارٹی بالکل خاموش تھا۔ ہمیں ایک بڑے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا ہال تھا۔ بڑے بڑے قمقمے جل رہے تھے۔ آدھے کمرے میں دری بچھی ہوئی تھی اور سامنے فرش سے کچھ اُونچی پختہ جگہ پر چوکی جیسا ایک بڑا چبوترا تھا۔ چبوترے پر بیک وقت کئی آدمی بیٹھ سکتے تھے اور بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ دری پر تھے۔ کمرہ چاروں طرف سے بند تھا۔ دیوار پر چھت کے قریب چند روشن دان تھے اور اطراف میں کئی دروازے تھے مگر وہ کھلے ہوئے نہیں تھے۔ چبوترے پر فربہ جسم کا ایک سانولا سا شخص مختلف عمروں کے آدمیوں کے درمیان سب سے نمایاں تھا۔ اُس کی داڑھی صاف تھی اور باریک نوک دار مونچھیں اُوپر کی طرف چلی گئی تھیں، بال کڑھے ہوئے، پیشانی چوڑی، ناک بیٹھی ہوئی اور چہرے پر چاقو کے کئی نشان اور ناک پر ایک کالا مسا تھا۔ عمر چالیس سے کچھ اُوپر ہوگی لیکن جسم اور چہرے سے وہ زیادہ عمر کا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اُس کا قد درمیانہ لگتا تھا، آنکھوں میں تیز چمک اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ہمیں آتے دیکھ کر اُس کے سوا سب چونکے، وہ ساکت بیٹھا رہا۔ میں مارٹی اور ٹِڈا آدھے کمرے تک چل کے رُک گئے۔ ہمارے اِردگرد اُس کے آدمی کھڑے ہوئے تھے۔ چھنگا نے اپنا ہاتھ اُٹھایا اور انگلی کی خفیف سی جنبش سے انھیں ہمارے پاس سے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ اُس کے ہاتھ میں چھ اُنگلیاں تھیں اور ہاتھ پر بھی دو ایک گہرے نشانات تھے۔ میں نے اُس کے بولنے کا انتظار کیا مگر وہ اپنی زبان بند کیے ہوئے مجھے گھورتا رہا۔

"چھنگا اُستاد!" میں نے معتدل لہجے میں اُسے مخاطب کیا۔ اُس نے منہ کھولے بغیر اقرار میں گردن ہلائی۔ میں چاہتا تھا کہ زبان وہ کھولے۔ تجمل نے ایک مرتبہ مجھے بتایا تھا کہ زبان بھی سن لی جائے تو بہتر ہے کیونکہ کبھی کبھی زبان آدمی کا جسم ہوتی ہے۔ "میں اس شہر کا آدمی نہیں ہوں چھنگا اُستاد!" میں نے اپنی آواز اُونچی کر کے کہا "سُنا تھا بمبئی میں ایک چھنگا اُستاد ہے، ایک علاقے پر بہت دنوں سے راج کرتا ہے، پرانا آدمی ہے، بات سمجھتا ہے، یہ مقام اُس نے اپنے بل پر حاصل کیا ہے۔ چاقو چلانا اُسے خوب آتا ہے اور وہ اپنے علاقے تک محدود رہنا زیادہ پسند کرتا ہے۔"

اُس کی باچھیں سکڑیں، پھر پھیل گئیں اور پتلیاں متحرک ہو گئیں۔

"کیا بات ہے۔" اُس نے تجسس سے پوچھا۔ اُس کی آواز بھاری تھی، کسی قدر غیر متوازن مگر اُس میں ایک گرج ضرور تھی۔

"میں تمھارے پاس تمھاری شہرت سُن کے آیا ہوں اور تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔" میری آواز میرے قابو میں تھی۔

"بولو، بولو۔" وہ پہلو بدل کے بولا۔ "کیا کام ہے؟"

"چھنگا اُستاد! ابھی تمھارے ایک آدمی نے مجھ سے ایک سوال کیا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ میں اس سوال کا جواب چھنگا استاد کے سامنے دوں گا۔ میں اُسے ضرور جواب دوں گا لیکن اُستاد! میں تم سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں کہ تم ان لوگوں کے درمیان اس اُونچی جگہ کیوں بیٹھے ہو؟"

"کام کیا ہے۔" وہ بگڑ کے بولا "مخول مت کرو۔"

"مخول نہیں چھنگا استاد! میری بات کا جواب دو۔" میں نے بلند آواز میں کہا "چلو، تمھاری طرف سے میں جواب دے دیتا ہوں۔ تم ان سب کے بیچ اپنی قوت سے اور اپنے بل پر بیٹھے ہو۔ تم نے کئی بار ان پر ثابت کیا ہے کہ تم ان سب سے برتر ہو۔ جسم کے طور پر بھی، دماغ کے طور پر بھی۔ کیا یہی بات نہیں ہے؟"

اُس کی گردن آگے نکل آئی تھی۔ "کام کی بات کرو۔" اُس نے گرج کے کہا۔ "صاف صاف بولو، لوم مت مارو۔"

"میں کام ہی کی بات کر رہا ہوں۔" میں نے اپنے لہجے کی شُستگی قائم برقرار رکھی اور اُس پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔ "آج میں بہت کام کی بات کرنے آیا ہوں۔"

"آگے بولو۔"

"تمھاری پشت پر، تمھارے سامنے اور تمھارے آزو بازو جو آدمی بیٹھے ہیں، یہ سب جانتے ہیں کہ تم ان کا جوڑ نہیں ہو۔ اگر تمھارے کسی آدمی کو کبھی یہ احساس ہو جائے کہ اُستاد کی انگلیوں میں دم نہیں رہا، اُس کا ہاتھ کپکپانے لگا ہے، اُس کے جسم میں پہلے جیسی پھرتی اور اُس کے دماغ میں پہلے جیسی

[۔۔۔]ی نہیں رہی تو یہ تمھیں چبوترے سے نیچے اُتار دیں گے اور جب تم خود یہ [محس]وس کرنے لگو گے تو تمھارے لیے عزت اسی میں ہوگی کہ تم ان کے درمیان [سے] اُٹھ جاؤ۔"

چھنگا کے تمام آدمی بے کلی سے کبھی مجھے کبھی اُسے دیکھنے لگے۔ چھنگا کی [بھو]یں چوڑی ہو گئی تھیں۔ ٹِڈے نے میری پتلون پکڑ لی تھی۔ مارٹی کھسک کے [مجھ] سے کچھ اور قریب ہو گیا۔ چند لمحوں تک سکوت طاری رہا، پھر چھنگا کی کڑکتی [ہوئ]ی آواز گونجی۔ "تمھارا کوئی چول ضرور ہلا ہوا ہے۔ ابھی پہلے اِپن تم کو دھکے دے [کے] باہر نکالنے کو بولے، تم ایدر سے ایک دم کلٹی ہو جاؤ۔ اے! یہ تم کس کو پکڑ لایا۔" [وہ ا]پنے ساتھیوں پر ناراض ہونے لگا۔

تمام آدمیوں میں بھن بھناہٹ ہوئی لیکن میری اُونچی آواز سب پر [غال]ب آ گئی۔ "چھنگا استاد! مارٹی میرا آدمی ہے۔ تمھارے آدمیوں نے میرے [آدم]ی کو اکیلا سمجھ کے مارا۔"

"مارٹی نے چالاکی کی تھی۔" وہ طیش میں بولا۔

"اور تمھارے آدمیوں نے اتنا بھی خیال نہیں کیا کہ مارٹی انھی جیسا ایک [آدم]ی ہے۔ اسے بھی بھوک لگ سکتی ہے۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"مارٹی نے بے اصولی کیا۔"

"میں اسی بے اصولی کی بات تم سے کرنے آیا ہوں۔ سب سے بڑے [بے اص]ول تم ہو کہ تم اب علاقہ سنبھالنے کی صلاحیت نہیں رکھتے پھر بھی یہاں [جم]ا دیے بیٹھے ہو۔" چھنگا یک لخت چبوترے سے اُٹھ گیا۔ اُس کے تمام [آدمی] بھی کھڑے ہو گئے۔ "چھنگا! تمھارے آدمیوں کی طرح مارٹی کا بھی ایک اُستاد [ہے] اور اب وہ اس علاقے میں آ گیا ہے۔ اصولی اور بے اصولی کا پتہ تمھیں [چ]ل جائے گا۔ تم چبوترے سے نیچے اُتر آؤ۔ میں تم پر یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ [تمھا]رے دن چلے گئے۔ اگر تم عزت کے ساتھ اُترنا نہیں چاہتے تو تمھاری مرضی۔" [میں] نے چاقو اُچھالتے ہوئے کہا۔ "میں آ گیا ہوں اور مجھے تم سے یہ علاقہ حاصل [کرن]ا آتا ہے۔"

ایک ساتھ کئی چاقو ہوا میں لہرا گئے۔ کچھ لوگ میری طرف جھپٹے۔ میں [اپن]ی جگہ کھڑا رہا۔ "چھنگا! منظور ہے؟" میں نے چاقو کی دھار پر انگلی پھیری۔ ایک سیاہ شکل کے چوڑے چکلے آدمی نے میرے گریبان پر ہاتھ [ڈا]لا۔ دوسروں نے فوراً اُس کی تقلید کی۔ میں اپنے قدم مضبوطی سے زمین [پر جم]ا چکا تھا۔ میں نے اپنا گریبان اور بازو آزاد کرانے کی بھی کوشش نہیں [کی۔ م]یری توقع کے مطابق اُسی لمحے چھنگا کی آواز تڑخی۔ "ہٹ جاؤ۔" اُس کے [آدمیوں نے اِ]س کا حکم ماننے میں تامل ہوا۔ چھنگا نے دوبارہ دہاڑ کے کہا "ہٹ جاؤ۔"

تمام آدمی کسمساتے ہوئے مجھ سے الگ ہو گئے لیکن وہ میرے گرد [گھیر]ا ڈالے کھڑے رہے تھے۔ چھنگا نے پھنکار کے پھر انھیں دھتکارا۔ انھوں [نے گھ]یرا توڑ دیا اور کمرے کی دیواروں تک ہٹ گئے۔ یہ حکم دینے کے بعد چھنگا [میرے مقاب]لے کھڑا ہو گیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے مجھے گھورنے لگا۔

اُس کے نتھنے پھڑک رہے تھے اور ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ "چھوکرا! ابھی چانس ہے، تم ایدر سے چلے جاؤ۔" اُس نے اپنی آواز پر ضبط کیا۔ "جوانی سنبھالو۔ یہ لال سندر مکھڑا سفید ہو جائے گا اور یہ سفید کپڑا لال ہو جائے گا۔"

"ابھی جاؤ، چھوکری لوگ کو بازو دکھانا۔ ٹیم پہچانو چھوکرا! تمھارا ٹیم اِسک آسکی (عشق و عاشقی) کا ہے۔ ابھی تم ایدر کہاں سے آ گیا۔ چھنگا نہیں چاہتا کہ وہ تم پر ہاتھ اُٹھائے۔"

"چھنگا!" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "ابھی تمھاری کوئی آخری خواہش ہو تو بولو۔ چھوکرا اپنے بڑے کو ضرور عزت دے گا۔"

چھنگا گہری سانسیں بھرنے لگا۔ "تم نہیں مانیں گا۔" اُس نے ایک سمت منہ اُٹھایا۔ دوسرے ہی لمحے ایک چاقو اُچھلتا ہوا چھنگا کے ہاتھ میں آ گیا۔ اُس نے اُسے بڑی چابک دستی سے پکڑا تھا۔ چاقو ہاتھ میں آنے کے بعد چھنگا نے اُس کی دھار کا جائزہ لیا اور تمسخرانہ انداز میں بولا۔ "چھوکرا! اپنے اوپر ترس کھاؤ۔"

"تم بہت حکم چلا چکے چھنگا! اب تم بوڑھے ہو چکے ہو۔ مجھے تمھاری عمر کا خیال آتا ہے۔ تمھیں ایک سمجھدار اور تجربہ کار آدمی کی طرح میرے حق میں دست بردار ہو جانا چاہیے۔ یہ جتنے آدمی کھڑے ہیں، میں انھیں جتنی اچھی طرح استعمال کر سکتا ہوں، جتنا زیادہ میں ان کا خیال کر سکتا ہوں، تم نہیں کر سکتے۔ اچھا ہے کہ یہ سب لوگ سامنے موجود ہیں۔ میرا دل بھی تم پر ہاتھ اُٹھانے کو نہیں چاہتا لیکن تم خود اپنی عزت کے پیچھے پڑے ہوئے ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ سوچ لو۔"

"ہوّا او۔۔۔" چھنگا نے غضب میں پھنکار ماری۔ اُس کا [سینہ تیز]ی سے گردش کرنے لگا تھا اور جسم میں جیسے بجلی کا جھٹکا لگ گیا تھا۔ اُس نے اپنے ہاتھ اور پیر پھیلا لیے اور شاید اس بات کا منتظر رہا کہ پہلے میں کوئی جنبش کروں۔ میں نے مہلت نہیں دی اور اُس نے توقف نہیں کیا۔ وہ مجھ پر ناراض بلی کی طرح جھپٹا۔ میں نے اُسے اپنی طرف بڑھنے دیا اور پلک جھپکنے کی مہلت میں دائیں طرف ہٹ گیا۔ چھنگا فوراً پلٹ پڑا اور اپنی جگہ ایک لمحے ٹھہر کے اور تاک کے دوبارہ حملہ آور ہوا مگر اس بار بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ میں نے اُچھل کے پھر جگہ بدل لی اور جب تک چھنگا دوبارہ مجھ تک پہنچتا، میں پھرتی سے گھومتا ہوا کمرے کے درمیان آ گیا۔ چھنگا مجھ پر نگاہ رکھتا ہوا ایک فاصلے پر ٹھہر گیا اور چند لمحے کچھ سوچنے کے بعد سنبھلے سنبھلے قدموں سے آگے بڑھا۔ پھر ایک دم اُس کا جسم تڑپا۔ اس بار اُس نے سامنے سے آنے کے بجائے اچانک بائیں سمت گھوم کے وار کرنے کے لیے پَر تولے۔ مجھے اُس کی زد سے بچنے کے لیے زیادہ مشکل پیش نہیں آئی کیونکہ اُس نے حرکت کرنے کے لیے مجھے معقول وقت دے دیا تھا۔ چھنگا نے پے در پے مختلف زاویے بدلے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اُس کے چاقو اور میرے جسم میں ایک پور کا فاصلہ رہ گیا۔

کمرے میں مکمل سکوت چھایا ہوا تھا۔ میں نے اب تک چھنگا پر

کوئی وار نہیں کیا تھا۔ درمیان میں کئی موقعے ایسے آئے کہ میں اُس کی کلائی پہ ہاتھ ڈال سکتا تھا مگر نہ میں نے اپنے چاقو سے تاک لگائی۔ نہ اُس کے حملے کا جواب حملے سے دیا۔ میں اِدھر اُدھر اُس کے واروں جستوں اور جھپٹوں سے بچتا ہی رہا حالانکہ کئی موقعوں پر یہ ممکن تھا کہ جب وہ پلٹ کے وار کرنے کے مرحلے میں ہوتو میں درمیان میں حملہ کر کے اُسے گرد بٹھا دوں۔ میں نے یہ گریز اس لیے کی کہ چھنگا کے آدمی پیش آنے والا کوئی سانحہ اتفاق نہ سمجھیں اور ہر بات کے شاہد ہیں اُنھیں یہ یقین بتدریج ہی آ سکتا تھا۔ کوئی اچانک سانحہ اُن کے لیے ناقابلِ قبول ہوتا۔ میں نے یہ گریز اس لیے بھی کی کہ جلدی میں خواہ مخواہ کام نہ بگڑ جائے۔ مناسب ہوگا کہ چھنگا کو میرے بارے میں رائے بنانے اور محتاط ہونے کا موقع مل جائے۔ اُس کی یہ احتیاط اُس کے پائے ثبات میں لرزش اور غضب میں تنزلزل کا سبب بن سکتی تھی۔ ہر لمحہ پیشِ نظر رکھنا ضروری تھا۔ بہرحال یہ موجمدار جیسا معاملہ نہیں تھا۔ موجمدار کے وقت مجھے اپنا ہوش نہیں تھا۔ اس وقت میں اپنے حواس میں تھا اور چھنگا کی ایک ایک جنبش میری نگاہ کے دائرے میں تھی۔

شروع شروع میں چھنگا استاد نے جس چستی کا مظاہرہ کیا تھا وہ اب بھی موجود تھی مگر اب اُس میں ایک ہوشمندی شامل ہو گئی تھی اور وہ غالباً اس نتیجے تک پہنچ چکا تھا کہ قوت ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ اُسے محفوظ رکھا جائے۔ مجھے اندازہ تھا کہ چھنگا چند واروں میں فیصلے کا خواہشمند ہوگا کیونکہ وہ اسی طرح اپنے ساتھیوں کے سامنے اپنی مشاقی اور برتری ثابت کر سکتا تھا۔ اس کے برعکس میرے لیے طوالت مناسب تھی۔ میں طوالت ہی سے اُس کے ساتھیوں کے سامنے اپنی اہلیت ثابت کر سکتا تھا اور وہ میرے بارے میں کوئی مستقل رائے قائم کر سکتے تھے۔ یہ میرے لیے میرے ہاتھ کی آزمائش کا وقت تھا اور اُس کے لیے اُس کی بقا کا۔ اس لیے میں نے معاملے کو طول دیا۔ میں سارے کمرے میں تھرکتا رہا اور چھنگا چاقو لیے میرے پیچھے پیچھے دوڑتا رہا۔ کئی منٹ اسی آنکھ مچولی میں گزر گئے۔ ننگے چاقوؤں کی موجودگی میں یہ آنکھ مچولی کچھ کم خطرناک نہیں ہوتی اور ایسی صورت میں چند منٹ گزارنا ایک طویل مدت کے برابر ہوتا ہے۔ تب مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں دوبارہ جیل میں آ گیا ہوں اور قریب ہی تجمل کھڑا ہوا مجھ پہ نگاہ رکھے ہوئے ہے اور میرے مقابل کو اُکسا رہا ہے کہ وہ اس طرح وار کرے اور پھر مجھ سے کہہ رہا ہے ”لاڈلے! اس داؤ سے بچ کے دکھا“ چھنگا نے داؤ پہ داؤ آزمانے میں طرح دیتا اور درگزر کرتا رہا۔ وہ پینترے بدلتا رہا۔ اُس میں موجمدار جیسی ہنرمندی نہیں تھی تاہم وہ اپنی صلاحیتیں خوب آزما رہا تھا کیونکہ وہاں جتنے لوگ موجود تھے، وہ اُن سب میں ممتاز تھا۔ فربہی کے باوجود اُس کے جسم میں بلا کی تیزی اور چمک تھی مگر شاید اُس کی نگاہ پہ چربی چڑھ گئی تھی۔ جو بات میں نے اس کے اندر دیکھی تھی اور اپنے رویے میں ترمیم کر لی تھی وہ میرے اندر اُس نے دیکھنا گوارا نہیں کی۔ یہ غرور بہت دنوں بعد پیدا ہوتا ہے۔

تجمل کا کہنا تھا کہ ہمیشہ یہ غرور، یہ نشہ جھنک کے میدان میں اُترنا چاہیے اگر نگاہ پہلے بہک گئی یا دھوکا کھا گئی یا اُس نے وہ توجہ نہیں دی جو اُسے دینی چاہیے تو بعد میں نگاہ کا فیصلہ بدلنے کا وقت نہیں ملتا۔ تجمل کا کہنا تھا کہ نگاہ کا فیصلہ بدلنے کے لیے ذہن کھلا رکھنا چاہیے۔ جب خاصی دیر ہو گئی تو میں نے چیخ کر کہا۔ ”چھنگا! اب بھی موقع ہے، تم کہو تو میں چاقو پھینک دیتا ہوں۔ مناسب ہے کہ اب کسی کوٹھری میں بند ہو کے پرانے دن یاد کیا کرو۔ ہم بھی تمھاری خدمت کریں گے۔“

جیسا کہ مجھے یقین تھا، چھنگا کے غیظ و غضب کا پارہ انتہا کو پہنچ گیا۔ وہ کسی پاگل کی طرح مجنونانہ میری طرف بڑھا، میں اس بار بھاگا نہیں بلکہ میں نے پہلی مرتبہ ہاتھ بڑھا کے اچانک اپنا چاقو اُس پہ تان لیا۔ اس طرح کہ اگر وہ اپنی جھونک میں آگے آتا تو چاقو آر پار ہوتا مگر اُس نے یہ ماجرا دیکھ کے عین وقت پہ پینترا بدل دیا اور چونکہ بہت قریب آ کے اُس نے رکنے اور مڑنے کی کوشش کی تھی اس لیے وہ کچھ سٹ پٹا سا گیا۔ اگر وہ اُسی لمحے زمین پر جھک جاتا تو میرا وار بے اثر جاتا۔ اُس نے میرے چاقو والے ہاتھ کے نشانے سے بچنے کی کوشش میں رُخ بدلا تو میری اُٹھی ہوئی ٹانگ ٹھیک اُس کی پسلی میں لگی۔ وہ ڈگمگا گیا اور کہیں ایک ثانیے کے بعد اُسے ہوش آیا کہ اُسے فرش پر لڑھکتے ہوئے دُور ہو جانا چاہیے۔ چاقو کے سامنے ایسے مرحلے بار بار آتے ہیں گردن جھکنے، زمیں بوس ہونے اور دستے دست بردار ہونے سے عزت نہیں گھٹتی۔ بعد میں اُس نے ایسا ہی کیا۔ وہ دو تین لڑھکنیاں کھاتا ہوا میری توقع کے خلاف فرش سے حیرت انگیز طور پہ اُٹھ گیا، اُس لمحے مجھ سے اندازے کی ایک معمولی چوک ہو گئی۔ جب وہ فرش سے اُٹھ کے کھڑا ہوا تھا تب مجھے اُس کی طرف جھپٹنا نہیں چاہیے تھا۔ مجھے اپنی جگہ رک کے اُس کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ وہ نسبتاً گنجائش کی جگہ پہ تھا۔ میں بڑھا تو وہ بجلی کی طرح اپنی جگہ سے حرکت کر گیا اور جو داؤ میں نے اُس پہ صرف کیا تھا، اُس نے اسی کا ہدف مجھے بنایا، البتہ میں اُس کی ٹھوکر کی ضرب کھانے سے پہلے فرش پر جھکتا ہوا آگے نکل گیا تھا۔ میرے ساتھ مشکل یہ تھی کہ مجھے اُس کے جسم کو اسی حد تک نشانہ بنانا تھا جس حد تک وہ برداشت کر سکے، اُس کے ساتھ ایسی کوئی مجبوری نہیں تھی۔ یہ اُس کا پاٹا تھا اور اُس کے آدمی منٹوں میں میری لاش ٹھکانے لگا سکتے تھے۔

تجمل نے مجھے ایک اور بات بتائی تھی کہ بالکل اچانک بہت قریب جا کے ہی ارادہ بدلنا چاہیے۔ ظاہر کچھ کرتے اور عمل کچھ کرنے کا مظاہرہ سبھی کرتے ہیں۔ بات اتنی ہی ہوتی ہے کہ ارادہ کس لمحے بدلا جائے۔ اگر پہلے بدل دیا تو عموماً بے اثر ہو جاتا ہے۔ اگر سر پہ پہنچ کے بدلا تو مقابل کے پاس گڑگڑانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا مگر میں تجمل کے اس مشورے پہ اُسی وقت عمل کرتا جب مجھے فیصلہ کرنے کی جلدی ہوتی۔ جب ہم دونوں پھر سامنے آئے تو میں نے ہاتھ اُٹھا کے اُسے موقع دیا کہ وہ میرا ہاتھ آسانی سے پکڑ لے۔ اُس نے یہ موقع جانے نہیں دیا۔ جب اُس نے میرا چاقو والا پنجہ پکڑا تو تماشائیوں میں کھلبلی مچی۔ میں نے مجمعے کی ایک چیخ سنی۔ کسی نے اُس کے سر پہ زور سے دھپ لگا کے اُسے زمین پر بٹھانے کی کوشش کی تھی۔ چھنگا دوسرے ہاتھ سے میرے جسم پر چاقو مارنا چاہتا تھا۔ میں گتھم گتھا ہونے کے بجائے جھٹکے سے اُس کی مخالف سمت کھنچ گیا اور ایک پل میں یہ صورت ہو گئی کہ وہ اُس طرف، میں اس طرف اور ہم دونوں کے کھنچے ہوئے، بندھے ہوئے ہاتھ درمیان کے فاصلے پہ حادی آ گئے۔ میں نے اُس کے پنجے سے ہاتھ چھڑانے کی ضد نہیں کی بلکہ گھومنے لگا۔ نتیجے میں اُسے بھی میرے ساتھ گھومنے پر مجبور ہونا پڑا اور اُس کی میرے قریب آنے کی ہر کوشش ناکام ہو گئی۔ میں نے اُسے پانچ چھ تیز چکر دلائے۔ ہم دونوں جیسے اسکول کے بچوں کی طرح ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے اور اپنے جسم ہاتھوں کی درازی کے برابر دوری پر رکھے ہوئے فرش پر اُچھل کود رہے تھے اور بھاگتے ہوئے چکر کاٹ رہے تھے، چھٹا چکر تھا کہ بالکل اچانک ایک جھٹکا دے کے میں اُس کے قریب ہو گیا۔ اُس کا چاقو والا ہاتھ اُٹھا مگر میں اپنا سر اُس کے سینے پر مار چکا تھا۔ اس کے پنجے سے میرا ہاتھ تو چھوٹا ہی تھا، اُس کے قدم اس ضرب سے لڑکھڑا گئے لیکن میں نے اُس کے بہکے ہوئے قدموں سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا بلکہ اُسے سنبھلنے کی مہلت دی۔ وہ تیزی سے اوسان بحال کر کے میری طرف بڑھا اور اُس نے میرے شانے، گال اور شانے پر وار کرنے کے لیے کئی داؤ آزمائے۔ میں سمٹتا اور پہلو بچاتا رہا۔ وہ مجھ سے بہت قریب تھا اور جھنجلایا ہوا تھا۔ اسی عالم میں میں نے اُس کی چھاتی پر ایک بھرپور ہاتھ مار کے اُسے دُور دھکیل دیا۔

جب ہم دونوں پھر آمنے سامنے ہوئے تو میں نے اُس کی پیشانی بھیگی ہوئی دیکھی، تیز روشنی میں اُس کا پسینہ چمک رہا تھا۔ میرے خون کی گردش تیز ہو گئی، اب خاصی دیر ہو گئی تھی۔ میں نے بے تحاشا ہاتھ چلانا شروع کر دیا۔ وہ اِدھر اُدھر مٹکتا تھرکتا رہا۔ میں نے اُسے ایک پل چین نہیں لینے دیا۔ کئی بار ایسے اسباب ہوئے کہ میں اُس کا جسم لہولہان کر سکتا تھا لیکن میں نے مجبوراً اپنے ہاتھ کھینچے رکھے جب کہ وہ میرا جسم اُدھیڑ ڈالنے کی فکر میں تھا۔ ممکن ہے اُس کے ساتھیوں نے میری گریز میرے کسی اندرونی خوف پر محمول کی ہو یا وہ میری حماقت پر حیران ہوں مگر میرا مقصد کچھ اور تھا۔ وہ سب جان کار لوگ تھے۔ اپنے نشانے اپنے وار سے بچانا ایک اذیت ناک کام تھا۔ جب میں نے اچھی طرح اُس کی حالت کا جائزہ لے لیا تو پہلی مرتبہ میں نے اُس کا بایاں بازو تاک کے وار کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ وہ سمجھ گیا۔ اُس نے جھٹ اپنا زاویہ بدل لیا لیکن چشم زدن میں چاقو میرے دوسرے ہاتھ میں تھا اور میں نے اُس کے دائیں بازو پہ ایک لکیر کھینچ دی جو اُس کا کرتا پھاڑتی ہوئی کہنی تک چلی گئی۔ کرتے پہ خون کی کونپلیں پھوٹ پڑیں۔ وہ اُچھلا اور گھبرا کے پیچھے ہٹا۔ میں نے کسی قدر بے خیالی ظاہر کی، جیسے میں اُس کی حالت پر متعجب ہوں۔ میرا چاقو والا ہاتھ گرا ہوا تھا اور میں مجہول انداز میں کھڑا تھا۔ چھنگا میرے لٹکے ہوئے چاقو والے ہاتھ ہی پہ جھپٹا۔ میں نے اُسے فوراً بلند کر لیا۔ چھنگا کا ہاتھ میری بغل سے گزر گیا لیکن واپس نہیں آیا۔ میں نے اپنا بازو تیزی سے نیچے کر کے اُسے دبا لیا تھا۔ اُسی لمحے میں نے اپنا چاقو اُچھالا اور اُسے مارٹی کی طرف پھینک دیا اور دوسرے ہی لمحے میں نے چھنگا کا ہاتھ دبائے دبائے اُس کی گردن پر ضرب لگائی، اُس نے دوسرے ہاتھ سے میری گردن پکڑ رکھی تھی۔ ضرب معمولی نہیں تھی۔ چھنگا کی سسکی نکل گئی۔ اُس نے بوکھلاہٹ میں میری گردن چھوڑ دی۔ میں اسی امر کا منتظر تھا۔ میں نے پیچھے ہو کے دفعتاً اپنی پوری طاقت سے اُس کے جسم پر ٹکر ماری۔ میری بغل میں دبا ہوا اس کا پنجہ چٹخ گیا تھا، اُس کی ایک کرب ناک چیخ بلند ہوئی۔ فرش پر چاقو گرنے کی آواز آئی، میں نے اُس کا پنجہ آزاد کر دیا اور اُس سے علیحدہ ہو کے اُس کی پسلیوں پر تین چار شدید ضربیں لگائیں۔ چھنگا فرش پر ڈھے گیا اور ہاتھ پاؤں مارنے لگا، پھر میں نے اُس کا چاقو فرش سے اُٹھا لیا اور اُس کے آدمیوں کی طرف دیکھا، اُنھوں نے نظریں جھکا لیں۔ ٹنڈا مارٹی کی ٹانگوں سے لپٹ گیا تھا اور مارٹی نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا تھا۔ تیز سانسوں اور چھنگا کی کراہوں کے سوا کوئی اور آواز کمرے میں نہیں تھی۔ میں چاقو تانے ہوئے چھنگا کے پاس آیا۔ وہ فرش سے اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اُس کا بازو پکڑ کے اُسے کھڑا کیا اور اُس کا چاقو اُس کے آگے کر دیا۔ چھنگا نے مجھے حیرت زدہ نظروں سے دیکھا، اُس کے ہونٹ پھڑپھڑانے لگے اور اُس نے وحشیانہ طور پر میرے گلے میں اپنے بازو ڈال دیے۔ کمرے میں جیسے کسی نے شور کا بٹن دبا دیا۔ مارٹی اور ٹنڈا میری کمر سے چمٹ گئے، چھنگا کے آدمیوں نے مجھے ہر طرف سے گھیر لیا۔

m

مجھے وحشت ہو رہی تھی۔ میں جلد سے جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ جولین اور چمپا دروازے پر کھڑی ہوئی میرا انتظار کر رہی ہوں گی اور اُنھوں نے بچھو کو میری تلاش میں روانہ کر دیا ہوگا لیکن یہاں سے جلدی نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ میرے اشارے پر چھنگا کے خون آلود کپڑے فوراً بدلوا دیے گئے۔ اُس کے زخمی بازو پر پٹی باندھ دی گئی تھی اور اُس کے پنجے پہ مالش کی جا رہی تھی، میں خود چھنگا کو چبوترے پہ لے آیا تھا اور وہ میری گردن میں ہاتھ ڈالے بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر میں چھنگا کے آدمی قریبی چوک کے گل فروشوں کے ہاں سے ہاروں اور پھولوں کے ٹوکرے لے کے آ گئے اور چھنگا نے اپنے ہاتھ سے میری گردن ہاروں سے بھر دی۔ میں نے آدھے ہار اُتار کے چھنگا کے گلے میں ڈال دیے۔ اُس نے اُنھیں فوراً اُتار دیا۔ پھر وہاں جتنے آدمی موجود تھے، وہ ایک ایک کر کے آتے اور میرے گلے میں ہار ڈالتے رہے۔ میں قریب رکھی ہوئی سینی سے ایک ایک رس گلا اُن کے منہ میں ڈالتا رہا، مارٹی میرے دائیں طرف اور چھنگا بائیں طرف بیٹھا تھا اور ٹنڈا میری کمر سے چپکا ہوا تھا۔ کوئی دو بجے تک یہ ہنگامہ ہوتا رہا۔ پھر میں نے اُٹھنے کا ارادہ کیا۔ چھنگا نے مجھے روک لیا اور گمبھیر آواز میں بولا ”کہاں جاتا ہے، اب اس جگہ تھی بیٹھے گا۔ اپن سویرے چلا جائے گا۔“

”نہیں چھنگا! تم وہیں رہو گے، اسی چبوترے پر بیٹھے رہو گے،

میں اب چلتا ہوں۔ تم بے شک اس علاقے کے راجا ہو۔ تمھارے ہاتھ میں بجلی بھری ہوئی ہے۔ تم جوان ہو اور کئی جوانوں پر بھاری ہو۔ تم حوصلے کے آدمی ہو۔"

"نئیں راجا! راجا تو تم ہو۔ اپن کو اتنا مت گراؤ، اپن اب یہاں نئیں رہے گا۔ یہ جگہ تمھارا ہے، تمھی اِس کا مالک ہے اور یہ سب تمھاری پرجا ہے۔ اپن دو ایک دن میں اپنے گاؤں چلا جائے گا؟"

میں نے اُس سے بہت اصرار کیا، چھنگا نہیں مانا۔ میں نے اُس سے یہ بھی کہا کہ وہ میرا نائب بن کے علاقے میں موجود رہے مگر وہ کسی بات پر آمادہ نہیں ہوا۔ وہ ایک دو دن ٹھہرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوا، مجھے فوراً دوسرا انتظام کرنا تھا۔ مارٹی میرے پاس ہی بیٹھا تھا لیکن یہ موقع اُس کا نام لینے کا نہیں تھا۔ میں نے چاروں طرف نظر گھمائی اور ایک دراز قد، دُبلا اور توانا آدمی کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا، یہ وہی آدمی تھا جس نے پاڑے کی گلی کے نکڑ پر مجھ سے کہا تھا کہ فیصلہ چھنگا کے ساتھی بھی کر سکتے ہیں۔ وہ میرے پاس آگیا۔ میں نے بلند آواز میں کہا: "یہ علاقہ تم دیکھو گے جب تک میں مستقل طور پر یہیں نہ آجاؤں۔" پھر میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کے پوچھا: "کیا کسی کو اعتراض ہے؟"

❤

مارٹی اور منڈا مجھے گھر تک پہنچانے آئے۔ رات بہت گزر چکی تھی۔ جولین اور چمپا ... کے قریب ہی گیلے لان پر بے چینی سے ٹہل رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کے دونوں دیوانہ وار میری طرف دوڑیں۔ میں نے اُن کے کچھ کہنے سے پہلے ہی معذرت کر لی۔ میرے کپڑے بدلے ہوئے تھے۔ چھنگا کے خون سے میری قمیص سُرخ ہو گئی تھی۔ اس لیے میں نے وہیں ایک آدمی سے اُسے بدل لیا تھا۔ میرے بال بھی بکھرے ہوئے تھے۔ جب تک جولین اور چمپا نے میرے ہاتھ پاؤں ٹٹول کے نہ دیکھ لیے، اُن کی وحشت کم نہیں ہوئی۔ میں نے مارٹی اور منڈے کو بھی اندر بُلا لیا۔ اُن کا اتنی رات گئے واپس جانا ٹھیک نہیں تھا، وہ لوگ جھجکتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے اور دونوں نے چمپا کے پیر چھوئے، جولین کو سلام کیا۔ جولین اور چمپا نے میرے انتظار میں کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس وقت بھوک نہیں لگ رہی تھی مگر اُن کے خیال سے میں میز پر بیٹھ گیا۔ سارا گھر اُجڑا ہوا تھا۔ اتنے مختصر وقت میں تقریباً تمام کا تمام سامان باندھ دیا گیا تھا۔ مارٹی اور منڈا سر جھکائے کھانا کھاتے رہے۔ میں نے جولین سے اپنے کپڑے منگوا کے مارٹی کو پہننے کے لیے دے دیے۔ پھر میں نے اُس کے زخم کھول کے دیکھے۔ زخم معمولی تھے۔ چمپا نے اُس کی پٹی بدل دی۔ مارٹی کی آنکھیں برسنے لگیں اور وہ بیٹھے بیٹھے سسکیاں بھرنے لگا۔ میں نے اُن دونوں کو اپنے کمرے میں سُلا دیا اور خود ڈرائنگ روم میں آ کے لیٹ گیا۔ چمپا میرے سرہانے آ کے بیٹھ گئی اور مجھ سے پوچھے بغیر میرا سر دبانے لگی۔

صبح دس بجے تک ہم نے مکان بدل لیا۔ حکومت کی طرف سے جو ملازم وہاں تعینات تھے، وہ وہیں رہ گئے۔ بجّو کو ہم نے اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ جولین نے فون پر تسکلا کو مکان چھوڑنے کی اطلاع دے دی تھی۔ منڈا اور مارٹی سامان اُٹھانے رہے۔ جولین کا گھر کرشنا جی کے سرکاری مکان سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ جیسے ہی ہم اس کام سے فارغ ہوئے، میں منڈا اور مارٹی کو لے کے وہاں سے روانہ ہو گیا اور چھنگا کے علاقے میں پہنچ گیا۔ علاقے میں گشت کرنے والے آدمی سڑک ہی پر مل گئے اور ہمیں اپنی معیت میں پاڑے لے گئے۔ چھنگا وہاں سے جا چکا تھا اور چبوترے پر وہ آدمی موجود تھا جسے میں نے گزشتہ رات چھنگا کی جگہ مقرر کیا تھا۔ اُس کا نام زورا تھا۔ میرے پہنچتے ہی زورا چبوترے سے اُتر گیا۔ میں نے اُسے حکم دیا کہ علاقے کے تمام آدمیوں کو پاڑے میں بُلایا جائے۔ پھر میں اِس وقفے میں زورا سے علاقے کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا۔ دوپہر تک پاڑے کے بڑے کمرے میں علاقے کے تمام آدمی جمع ہو گئے۔ اُن میں سے بیشتر نے رات کا واقعہ نہیں دیکھا تھا مگر اپنے ساتھیوں سے تمام روداد سُن لی ہو گی۔ میں نے کوئی زیادہ لمبی چوڑی بات نہیں کی۔ میں نے کہا کہ مجھے دو باتیں بالکل پسند نہیں ہیں۔ ایک تو لڑکیوں کا اغوا، دوسرے طوائف بازی۔ جتنی در پردہ نوچیاں ہیں، اُن سے کہہ دیا جائے کہ وہ کسی دوسرے علاقے میں چلی جائیں یا اُنھیں گزر بسر کے لیے اُس وقت تک بھتّے سے پیسے پہنچائے جائیں جب تک وہ کسی کام دام پر نہ لگ جائیں۔ علاقے سے کوئی لڑکی اغوا نہیں ہونی چاہیے۔ میں نے اعلان کیا کہ آیندہ سے وصول ہونے والا بھتّا مراتب کے اعتبار سے تمام آدمیوں میں تقسیم کیا جائے گا، اُستاد کا کوئی بھتّا نہیں ہو گا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ مجھے علاقے میں زیادہ دنوں تک نہیں رہنا ہے۔ جب ہم ان میں سے کوئی آدمی میری یا چھنگا اُستاد کی جگہ لینے کے قابل ہو گا، علاقہ اُسے سونپ دیا جائے گا۔ جب بھی کوئی آدمی یہ سمجھے کہ وہ موجودہ اُستاد سے زیادہ اہلیت رکھتا ہے، اُسے کسی تامل کے بغیر اُستاد کو چیلنج کر دینا چاہیے۔ پاڑے میں باقاعدہ ورزشیں ہوا کریں گی اور ہر قسم کے ہُنر کی مشق کی جائے گی۔ آپس میں کوئی اختلاف ہو تو اُسے اُستاد کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

میں دن بھر وہیں رہا تھا۔ پھر میں نے مارٹی اور منڈے کو پاڑے میں چھوڑ دیا تھا۔ اُس رات بھی مجھے گھر لوٹنے میں دیر ہو گئی تھی، چمپا اور جولین نے کہا کچھ نہیں مگر اُن کا نہ کہنا بھی سب کچھ کہنا تھا۔ اسی طرح کوئی بیس پچیس دن گزر گئے۔ مارٹی کے زخم مندمل ہو گئے تھے۔ میں نے پاڑے ہی میں اُسے چاقو بازی، لاٹھی بازی، پٹے بازی، بانے بازی اور مختلف قسم کے داؤ پیچ بتانے شروع کر دیے تھے اور یہ سلسلہ صرف مارٹی تک محدود نہیں تھا، دوسرے بھی اس میں شامل ہو گئے تھے۔ پاڑے کی عمارت میں رنگ و روغن کرا دیا گیا تھا۔ صرف ایک مہینے میں علاقے کے سارے آدمی چھنگا کا نام بھول چکے تھے۔ وہ میرے اِرد گرد بیٹھے رہتے تھے۔ میں ہر دوسرے تیسرے دن علاقے کا گشت کرتا تھا اور واپس آ کے اپنے آدمیوں کو مختلف ہدایتیں دیتا تھا۔ شہر کے دوسرے اڈّوں کی سرگرمیاں مجھے معلوم ہوتی رہتی تھیں۔ جولین اور چمپا نے اپنا رویہ نہیں بدلا۔ رات گئے جب میں گھر واپس لوٹتا تو وہ مجھے جاگتی اور تلملاتی ہوئی ملتیں حالانکہ میں اُن سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ میرا انتظار نہ کیا کریں۔ ویسے اب اُنھیں مجھ سے بات چیت کا وقت ہی نصیب نہیں ہوتا تھا، آتے ہی میں لیٹ جاتا اور بستر میں بند ہو جاتا اور اپنی مالا کے دانے منہ پر پھیر لیتا۔ کو اچکے سے میری آنکھوں میں آ کے بیٹھ جاتی۔ میں اُسے اپنی آنکھوں میں بند کیے سو جاتا اور صبح ہوتے ہی ناشتے کے بغیر گھر سے نکل جاتا۔ پھر ایک رات ایسا ہوا کہ مجھے پاڑے میں رہنا پڑا۔ اُس رات علاقے کے ایک آدمی بسنتا کا پڑوسی علاقے کے ایک آدمی سے جھگڑا ہو گیا تھا، چنانچہ مجھے پہلی بار اُستاد بالم خاں کے پاڑے میں داخل ہونا پڑا۔ بالم خاں نے میرا ذکر خاصا سُنا ہو گا۔ مارٹی نے مجھے بتایا تھا کہ علاقے کے آدمی میرے بارے میں عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں، کبھی کہتے ہیں کہ میں پولیس کا آدمی ہوں، کبھی کہتے ہیں کہ میں اُن میں سے نہیں ہوں، مجھ پر کسی بھوت یا جن کا سایہ ہے، کبھی کہتے ہیں کہ میں نے اُستاد مستانہ کے اڈّے میں گھس کے پولیس کو رپورٹ کر دی تھی اور سارے اڈّے کو پکڑوا دیا تھا اور میری ایک بڑے پولیس افسر سے دوستی تھی۔ مارٹی اپنے طور پر اُن کی تردید کرتا رہتا تھا۔ میں نے اُسے ہدایت کی کہ وہ کسی تردید یا تائید میں اپنا وقت ضائع نہ کرے، لوگ جو کہتے ہیں، اُنھیں کہنے دے۔ اگر لوگ زیادہ تنگ کریں تو اُن سے کہہ دے کہ مستانہ نے ایک نوجوان لڑکی اغوا کی تھی، وہ غنڈا نہیں تھا اس لیے پولیس کو رپورٹ کر دی گئی۔ ان طرح طرح کی افواہوں اور کہانیوں کے باوجود میرے علاقے کے لوگ چھنگا کے مقابلے میں میری کہیں زیادہ عزت کرتے تھے، میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ مجھ سے قریب رہنا چاہتے تھے۔

اُس رات جب زخمی بسنتا پاڑے میں واپس آیا تو مجھے بالم خاں کے پاس جانا پڑا۔ بالم خاں میری شکل دیکھتے ہی میرا مذاق اُڑانے لگا اور مجھ پر ناقابلِ برداشت فقرے کسنے لگا حالانکہ اُس کے آدمیوں نے اُس کی زبان روکنے کی بھی کوشش کی مگر بالم خاں۔ جو گندمی رنگ کا ایک لمبا چوڑا آدمی تھا اور جس کی آواز میں کھنک تھی، اُس نے میری بات پر کان نہیں دھرے، نتیجتہً بات بڑھ گئی اور اتنی بڑھی کہ بالم خاں چاقو تان کے کمربستہ ہو گیا، میں نے درگزر کرنے کی کوشش کی مگر وہ اپنے دل میں میرے لیے کوئی بڑی نفرت لیے بیٹھا تھا۔ مختصر یہ کہ مجھے اُس سے مقابلہ کرنا پڑا اور اُس رات بالم خاں کا علاقہ بھی میرے علاقے میں شامل ہو گیا۔ بالم خاں زخمی ہونے کے بعد علاقہ چھوڑ کے بھاگ گیا۔

بالم خاں کا علاقہ بہت چھوٹا تھا۔ وہ صرف چند گلیوں اور ایک لمبی سڑک پر مشتمل تھا، آمدنی بھی معمولی تھی، شاید وہ چھنگا کے علاقے پر مدت سے تاک لگائے بیٹھا تھا۔ اُس نے مجھے اپنے سامنے دیکھا تو اُسے اپنا پرانا خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر آیا مگر بالم خاں صرف دیکھنے کا آدمی تھا۔ محض تین چار داؤں میں گہرے زخم لگوا لیے اور چلتا بنا۔ میں اُس رات گھر نہیں جا سکا۔

دوسرے دن کوئی بارہ بجے مارٹی ہانپتا کانپتا ہوا پاڑے میں آیا اور اُس نے خوف زدہ آواز سے میرے کانوں میں سرگوشی کی کہ کوئن علاقے میں آئی ہوئی ہے۔

"کوئن!" میں اُچھل پڑا۔ "جولین؟"

"ہاں راجا ڈارلنگ!" اُس نے گھبرا کے کہا۔ "ہاں میرا نام خود بخود راجا پڑ گیا تھا۔

"کہاں ہے وہ؟"

"اپن نے اُسے پاڑے سے دُور ہی رکھا ہے۔ وہ اپن کا ایڈریس پوچھتی ہوئی پُرانے فلیٹ گئی تھی جدھر تم فرسٹ ٹائم آیا تھا۔ اُودر لوگوں نے ایڈریس بھیج دیا، اب اپن کو علاقے کا سارا لوگ جانتا ہے۔ اپن لے نون پر بن چلا جا!"

"اُسے تمھارا پتہ کیسے معلوم ہوا؟" مگر فوراً مجھے یاد آیا کہ جب مارٹی مجھے اپنا پتہ بتا رہا تھا، وہ میرے ساتھ تھی۔ میں مارٹی کے ساتھ بھاگا بھاگا علاقے کے چوک میں پہنچا۔ اُسے منڈے نے ایک جگہ روک رکھا تھا۔ میں اُسے اُسی وقت علاقے سے باہر لے گیا۔ گھر آ کے میں نے اُسے تنبیہ کی کہ وہ وہاں کیوں گئی۔ وہ کچھ نہیں بولی، بس منہ چھپا کے رونے لگی۔ رات کو چونکہ میں گھر نہیں آیا تھا اس لیے وہ میری تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ میں اُس دن گھر ہی رہا کیونکہ جولین کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی لیکن دوسرے دن وہاں نہیں رُک سکتا تھا۔ اب وہ لمحہ قریب آ رہا تھا جس کا مجھے انتظار تھا۔ میں نے جولین کو سمجھانے کی کوشش کی کہ میں ایک ضروری کام کے سلسلے میں مصروف ہوں۔ آیندہ بھی کسی رات گھر سے غائب رہ سکتا ہوں۔ وہ کام کی نوعیت پوچھنے لگی، میں اُسے کام کی نوعیت کیسے بتا سکتا تھا۔ خود میرا دل علاقے میں کہاں لگتا تھا، میں تو وہاں مجبوراً ٹھیرا ہوا تھا۔ وہاں مجھے ایک تو دن بھر ہر لمحے چوکنا رہنا پڑتا تھا، دوسرے گھر آتے ہی چمپا اور جولین کی آنکھیں سہنی پڑتی تھیں۔ چمپا ابھی تک چپ تھی مگر ایک رات جب میں دوسرے ناغے کے بعد واپس آیا تو وہ بھی تنبیہ کرنے لگی کہ میں بُرے لوگوں کی صحبت میں پڑ گیا ہوں اور کرشنا جی کو بھول چکا ہوں۔ "بُرے کام کا بُرا انجام ہوتا ہے پیارے میاں!" وہ ہاتھ جوڑ کے مجھ سے التجا کرنے لگی کہ میں منڈے اور مارٹی کا ساتھ چھوڑ دوں۔ مجھے اپنے عزیزوں کو تلاش کرنا چاہیے۔ میں نے اُس سے وعدہ کیا کہ میں جلد ہی باقاعدگی سے گھر آنا شروع کر دوں گا لیکن ایسا ہوا نہیں۔

بعد کے دنوں میں میری مصروفیت اور بڑھ گئی۔ اب میں تین تین چار چار دن بعد گھر واپس آتا۔ میرے کپڑے میلے ہوتے اور میں اپنی صورت دکھا کے یا ایک رات سو کے صبح صبح واپس چلا جاتا۔ جولین کے گھر فون نہیں تھا مگر چمپا مجھے بتاتی رہتی تھی کہ تسکلا جی آئے تھے، مجھے پوچھ رہے تھے۔ میں نے تسکلا کو کہیں سے فون نہیں کیا کہ کرشنا جی کے لکھے ہوئے خطوط کا کہیں سے کوئی جواب آیا یا نہیں۔ مجھے اُمید نہیں تھی کہ کسی جانب سے کوئی جواب آسکتا ہے۔ اگر آتا تو تسکلا مجھ سے ملنے کے لیے ضرور بے چین ہوتا۔ میں مسلسل دو مہینے چھنگا کے پاڑے میں خود کو تماشا بنا تا رہا۔ پھر بمبئی کے کئی اُستاد مجھ سے ملنے کے لیے آئے لیکن میں زیادہ تر اپنے ہی علاقے میں محدود رہتا، بہت کم کسی سے ملتا جلتا تھا۔ زورا، چھیدا، مارٹی اور منڈا ہر وقت مجھے خبریں پہنچاتے رہتے تھے۔ بالم خاں کا علاقہ شامل ہونے کے بعد یہ علاقہ خاصا بڑا ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود زورا اور مارٹی کی خواہش تھی کہ اسے اور وسیع کیا جائے کیونکہ یہ بمبئی کے اور بہت سے علاقوں کے مقابلے میں کچھ نہیں ہے۔ میں نے اُن کی بات پر توجہ

نہیں دی۔ وہ چاروں مجھ سے قریب رہنے کے لیے ہمہ وقت کوشاں رہتے تھے۔

تین مہینے گزر گئے۔ بمبئی کا شاید ہی کوئی اڈا ایسا ہو جس کے بارے میں مجھے تمام تفصیلات معلوم نہ ہوں۔ آخر وہ لمحہ آگیا جب میں نے زورا اور مارٹی کو بلا کے اپنی ایک خواہش ظاہر کی۔ میں نے انھی کے ذریعے تمام معلومات اکٹھی کی تھیں اور یہ کام اُس وقت تک ناممکن نظر آتا تھا جب تک میرے ساتھ کچھ اور لوگ شریک نہ ہوں۔ میں پوری طرح اصل چہروں سے واقف نہ ہو جاؤں۔ غیر متعلق لوگوں پر ہاتھ ڈالنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا اور متعلق لوگوں کی نشان دہی کے لیے خاص قسم کے لوگوں کا ساتھ ضروری تھا۔ میرا بھتا علاقے کے لوگوں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ انھیں پاڑے میں ہر قسم کی آزادی حاصل تھی۔ وہاں بسنری بھی گھوٹی جاتی تھی اور روز طرح طرح کے کھانوں کی محفل جمتی تھی۔ جھنگا کے دَور میں ہر دوسرے تیسرے روز مجرا ہوتا تھا، چنانچہ مجھے بھی مجبوراً پاڑے میں گانا سننے کے لیے طوائفیں لانے کی اجازت دینی پڑی۔ جس رات رقص و سرود کا یہ ہنگامہ گرم ہوتا، میں وہاں نہیں رہتا تھا۔ مارٹی اور منڈے کے سوا کسی کو پتہ نہیں تھا کہ میں کہاں جاتا ہوں اور کسی میں جرأت بھی نہیں تھی کہ وہ میرا تعاقب کر سکے۔ میں نے زورا، مارٹی، چھیدا اور دوسرے قریبی آدمیوں کو اشارہ کر دیا کہ وہ زیادہ آمدنی والے علاقوں پر نظر رکھیں اور معلوم کریں کہ کون سا علاقہ کن لوگوں سے متعلق ہے۔ یہ کام اُن کے لیے مشکل نہیں تھا۔ بمبئی کے دوسرے علاقوں میں ہر ایک کے اپنے شناسا اور ہم پیشہ آدمی موجود تھے اور ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے۔ مارٹی، زورا اور منڈے کی زبانی ہر چھوٹی موٹی بات میرے کانوں میں پڑتی رہتی تھی۔ وہ مجھے بتاتے تھے کہ کس علاقے میں میرے متعلق کیا باتیں مشہور ہو گئی ہیں۔ پھر میں نے انھیں تیواڑی دادا کے علاقے کے آدمیوں سے رابطہ بڑھانے کی ہدایت کی۔ وہ تیواڑی کے چند آدمیوں کو اپنے ہاں لے بھی آئے تھے اور انھیں رات بھر حیدرآباد سے آئی ہوئی طوائف گل فام کا گانا سنواتے اور انگریزی شراب پلاتے رہے۔ میں اُس محفل میں موجود نہیں تھا لیکن تھا پاڑے ہی میں۔

میں نے زورا اور مارٹی سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو صرف چند لمحوں کے لیے اُن پر سکتہ طاری ہوا پھر انھوں نے میرے ہاتھ چوم کے کہا۔ "راجا جی! تم بولو تو اپن سر کاٹ دے۔"

تیسرے دن شام کو سات بجے وہ علیحدہ علیحدہ پاڑے سے روانہ ہوئے۔ اس سے پہلے وہ کئی بار محلِ وقوع کا جائزہ لے آئے تھے۔ زورا اور مارٹی کے ہاتھوں میں اب خاصی پھرتی آگئی تھی۔ منڈا اور چھیدا بھی اُن کے ساتھ تھے۔ رات ہوتے ہوتے وہ امیروں کی اُس سبزہ زار آبادی میں مختلف مقامات پر چھپ گئے تھے۔ منڈا کوڑے کے ڈرم میں گھس گیا تھا۔ ٹھیک ڈیڑھ بجے وہ یکے بعد دیگرے اپنی اپنی جگہوں سے نکلے اور ایک متعینہ مقام پہ ایک دوسرے سے مل گئے۔ چھیدا اور زورا کے کندھوں پر چڑھ کے سب سے پہلے مارٹی نے باؤنڈری عبور کی۔ وہ اپنے ساتھ ضروری سامان بھی لے گئے تھے۔ منڈا باہر ہی رہ گیا۔ زورا، چھیدا اور مارٹی نے باؤنڈری اُتر کے سب سے پہلے دروازے کا رُخ کیا اور لپٹ سے چوکی دار کے سر پہ پہنچ کے اُسے کچھ دیر کے لیے حرکت اور آواز سے معذور کر دیا۔ پھر وہ کوٹھی کی طرف بڑھے۔

صبح کے اخباروں میں خبر آنا ممکن نہیں تھا لیکن دوپہر تک سیٹھ شمبھو ناس اور اُس کے داماد گردھاری لال کے قتل کی خبر شہر میں پھیل چکی تھی۔ میں گھر سے چار دنوں سے غائب تھا، اُس دن سرِ شام ہی گھر پہنچ گیا۔ جولین بیمار تھی۔ میں چمپا کے ساتھ اُس کے کمرے میں گیا تو اُس نے نقاہت سے آنکھیں کھولیں۔ میں نے بے اختیار اُس کی پیشانی چوم لی۔ وہ اُٹھ کے بیٹھ گئی اور میرے ہاتھوں پر اپنا سر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ میں حیران رہ گیا۔ چمپا نے مجھے بتایا کہ تین دن پہلے اُس کا باپ مر چکا ہے۔ میرا سر چکرانے لگا۔ جولین نے میرے ہاتھ بھگو دیے تھے۔ پتہ نہیں کس وقت چمپا مجھے اُٹھا کے میرے کمرے میں لے گئی۔ مجھے رات بھر کوئی سدھ بدھ نہ رہی۔ صبح ہوئی تو چمپا نے مجھے جگایا۔ دھوپ چڑھ آئی تھی۔ مجھے فوراً پاڑے جانے کا خیال آیا۔ ابھی شمبھو گروپ کا پروردہ تیواڑی دادا موجود تھا۔ میرا پاڑے جانا ضروری تھا۔ چمپا نے میرا تذبذب دیکھ کے جھجکتے ہوئے کہا۔ "ایک آدمی باہر بیٹھا ہوا تمھارا انتظار کر رہا ہے۔"

"میرا انتظار! کون ہے؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"باہر آکے دیکھ لو۔" چمپا ڈوبی ہوئی آواز میں بولی۔

میں نے چادر ایک طرف پھینک دی اور بستر سے اُچھل کے نیچے آیا۔ جب میں ڈرائنگ روم کے دروازے پہ پہنچا تو میری آنکھیں پھٹ گئیں۔ بجھل میری طرف دیکھ رہا تھا۔

میں ... یہ فریبِ نظر ہے، میں ابھی تک سو رہا ہوں مگر اُس کا دیو قامت سراپا میری آنکھوں سے دُور نہیں ہوا۔ وہ دیمیا کمرے کے وسط میں صلیب کے نیچے کرسی پر جما ہوا بیٹھا تھا اور سُرخ نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ چوکھٹ پر میرے ہاتھوں کی گرفت سخت ہو گئی۔ اُس کی پیشانی پر بے شمار لکیریں کھنچی ہوئی تھیں۔ مجھ سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا جا سکا۔ میں دروازے ہی پر ٹھٹکا ہوا آنکھیں پٹ پٹاتا رہا۔ پھر مجھے اُس وقت خبر ہوئی جب میں اُس کے سینے سے چمٹا ہوا تھا۔ اُس نے مجھے زور سے جکڑ رکھا تھا۔ ہم دیر تک ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہوئے۔ میں نے اپنی آنکھیں بھینچ لی تھیں مگر آنسو پھوٹ پڑے اور میرا سر اُس کے کندھے پہ تڑپنے لگا۔ بجھل نے یک لخت مجھے اپنی چھاتی سے ہٹا دیا اور میرے بازو پکڑ کے مجھے غور سے دیکھنے لگا۔ اُس کی نظروں سے بچنے کے لیے میں نے دوبارہ اُس کے سینے میں سر چھپانا چاہا مگر اچانک ایک دھماکا سا ہوا، قدم زمین سے اُکھڑ گئے اور میں ایک طرف جُھک گیا۔ بجھل نے اُلٹے ہاتھ سے میرے گال پہ طمانچہ رسید کیا تھا۔ میں ابھی سنبھلا بھی نہیں تھا کہ اُس نے دوسرا طمانچہ لگا دیا۔ میں نے مضبوطی سے اپنے پیر زمین پر جمانے کی کوشش کی تاکہ اُسے نشانہ لگانے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ میں نے اُس کا ہاتھ نہیں روکا۔ وہ خود ہی تھم کے ہانپنے لگا اور اُس نے ایک جھٹکے سے مجھے اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔

"لاڈلے جانی!" اُس کی کراہتی ہوئی آواز اُبھری۔ "رونا بھی ہے، رُلاتا بھی ہے۔"

"ہاتھ کیوں روک لیے بجھل بھائی!" میں نے سسکتے ہوئے کہا۔

"تُو نے ہاتھ پیر پھیلا دیے۔" وہ منہ پھیر کے بولا۔

میں نے اُس کا گریبان پکڑ لیا۔ "ہاتھ مت روکو۔ مارو، خوب مارو۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "میری سانس نکال دو۔"

"ہاتھوں میں جان ہوتی تو اتنی دیر نہ لگتی لاڈلے!" وہ میرے شانے جھنجوڑتے ہوئے مضطرب لہجے میں بولا۔ "تیرا دل پتھر کا ہو گیا ہے۔ جی چاہتا ہے اُسے نوچ کے پھینک دوں۔"

"تو نوچ لو نا۔" میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔ "دیر کیوں کرتے ہو، ایک ذرا سی ہمت کر لو، پھر یہ آزار ہی ختم ہو جائے گا۔ مجھ سے بھی اب یہ برداشت نہیں ہوتا۔ میں اپنا یہی گزنکا سینہ چھپانے کے لیے لوگوں سے دُور رہتا ہوں۔"

"چپ ... آواز میں چلایا۔ "دُنیا میں آدمی اکیلا نہیں ہوتا لاڈلے!" اُس کی آواز ڈوبنے لگی۔ "سب کچھ تجھی پر نہیں ہے کہ تُو کیا چاہتا ہے، دوسروں پر بھی ہے کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ معلوم نہیں، تُو نے کیا پڑھا لکھا ہے۔ کتابوں میں تو یہ سب کچھ نہیں ہوتا ہوگا۔"

"میں نے کچھ نہیں پڑھا لکھا، میں بالکل جاہل ہوں، جنگلی ہوں، کتا ہوں۔ ہاں! مجھے اس دُنیا میں نہیں رہنا چاہیے۔"

بجھل کے طمانچوں اور آواز کی گرج سُن کے بیمار جولین بھی چادر اوڑھے ہوئے بستر سے اُٹھ آئی تھی اور چمپا کے پہلو میں سکڑی سمٹی کھڑی تھی۔ اُس کی آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ "اگر آپ لوگ بیٹھ جائیں۔" اُس نے لرزیدہ آواز میں ہمیں ٹوکا۔

بجھل چونک کے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس نے میرے بازو چھوڑ دیے اور میری گردن میں بانہیں ڈال کے گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔ "تو نے پلٹ کے خبر بھی نہیں لی بادشاہ!" وہ تھکے تھکے لہجے میں بولا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ منٹ گزر گئے۔ میری آنکھوں سے آنسو اُبل رہے تھے۔ کمرے میں خاموشی طاری ہو گئی۔ "تم یہاں کیسے آگئے؟" میں نے رُندھی ہوئی آواز میں نرمی سے پوچھا۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا کہ بجھل اُس گھر میں آیا ہے جہاں میں رہتا ہوں۔ یہ میرا گھر تو نہیں مگر بجھل نہ جانے کتنی دُور سے چل کے میرے پاس آیا ہے۔ اُسے دیکھ کے میری زبان گنگ ہو گئی تھی اور اس کے بعد اُس نے مجھے کچھ پوچھنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔

"آگیا۔" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولا۔ "آخر پہنچ ہی گیا۔"

"لیکن تم ... تم کیوں آگئے؟"

"چلا جاؤں گا لاڈلے!"

"نہیں، نہیں۔" میں نے گھبرا کے کہا۔ "میرا مطلب ..."

"تیرا مطلب کچھ بھی ہو۔" وہ میری بات کاٹ کے پژمردگی سے بولا۔ "میں تجھے دیکھنے آیا ہوں، خود کو تجھے دکھانے نہیں آیا۔ تو کہے تو چلا جاؤں گا۔"

"نہیں بجھل بھائی!" میں نے اضطراب سے کہا۔ "نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ تم غلط سمجھے۔ میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا، میرا مطلب یہ تھا کہ تم اپنی پیشانیاں بڑھانے یہاں کیوں آگئے؟ میں نے پہلے ہی تمھیں کون سا خوش رکھا تھا۔"

"جانے دے۔" وہ ہاتھ جھٹک کے بولا۔ "طعنہ مت دے۔ تُو تو بالکل نہیں بدلا۔" اُس نے دونوں ہاتھوں سے میرا چہرہ تھام لیا۔ "تُو تو وہی ہے، وہی لاڈلا راجا۔ کیا تُو یہ سمجھتا تھا کہ تُو اپنے آنے کے بعد وہاں موجود نہیں ہوگا۔ تُو تو ہر وقت وہیں تھا۔ تیری پرچھائیں تو وہیں رہ گئی تھی کوڑے! اُسے بھی ساتھ لیتا آتا۔" وہ میرے بال کھینچنے لگا۔ "تو مجھ سے کہہ کے بھی آ سکتا تھا، میں نے تیری کون سی بات ٹالی تھی۔ برس ہونے کو آ رہا ہے۔"

"مجھے جانا تھا۔" میں نے روتے ہوئے کہا۔

"جانا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ تجھے جانا ہے۔ تیرے پیروں میں زنجیر پڑی ہے۔ پر تُو کچھ دیر بعد جا سکتا تھا اور جا کے واپس آ سکتا تھا۔ تجھے صرف اپنے پیروں کی زنجیر کیوں دکھائی دیتی ہے۔ تُو نے تو ..." چمپا کو سامنے کھڑا دیکھ کے اُس کی زبان لڑکھڑاتے ہوئے سرد پڑ گئی۔ چمپا کے پیچھے جولین دبکی کھڑی تھی۔ اُس کا چہرہ سفید پڑا ہوا تھا۔

"آئیے، ناشتہ کر لیجیے۔" چمپا نے جھجکتے ہوئے مداخلت کی۔

"ناشتہ۔" بجھل سٹ پٹا کے بولا۔ "نہیں، نہیں۔ ہم ہوٹل سے نمٹ کے آئے ہیں، ناشتہ نہیں۔ پر ہاں، لاڈلا تو ناشتہ کرے گا۔ چل اُٹھ۔" وہ مجھے دھکیلتے ہوئے بولا۔ "کچھ کھا لے۔"

"مگر آپ ... آپ تو کہہ رہے تھے کہ آپ سیدھے اسٹیشن سے یہاں آرہے ہیں۔" چمپا نے ہلکی آواز میں کہا۔ "آئیے۔"

"کھانے پینے کا کسے ہوش ہے مائی! اپنا ناشتہ تو اسے دیکھ کے ہی ہو گیا۔" وہ میری کمر پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "اس سے پوچھو، معلوم ہوتا ہے کہ یہ کچھ کھاتا پیتا ہی نہیں ہے۔ کیسا دُبلا ہو گیا ہے۔"

"باہر جو لوگ کھڑے ہیں، اُنھیں بھی اندر بلا لیجیے۔" جولین نے جھکتی ہوئی آنکھوں سے کہا۔ "یہ گھر ظہیر ہی کا ہے۔" جولین کی سانس ٹھہری ہوئی تھی۔

"باہر کون ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ۔ وہ تیرے دو ایک جاننے والے ہیں۔" بجھل بے پروائی سے بولا۔ "انھیں باہر ہی رہنے دے۔ یہ گھر ہے، پاڑا نہیں ہے۔"

"کون کون ہے؟" میں نے تیزی سے اُٹھتے ہوئے کہا اور بجھل کے جواب دینے سے پہلے دروازے کی جانب بھاگا۔ مکان کے باہر کرسیاں ڈالے

گردن جھکائے فیض آباد کے اُستاد جامو اور کانتے بیٹھے ہوئے تھے۔ جیسے ہی انھوں نے مجھے دیکھا دونوں مجھ پہ جھپٹ پڑے۔ جامو نے مجھے اُوپر اُٹھا لیا۔ کانتے اپنا سر میرے سینے پر مارنے لگا۔ انھوں نے راہ گیروں کی پروا بھی نہیں کی۔ "چلو، چلو اندر چلو۔" میں نے انھیں کھینچتے ہوئے کہا۔

وہ جھجکے مگر میں انھیں اندر جولین کے گھر کے مختصر سے ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ وہ دونوں بجھل کے پاس مبارک باد کا شور مچاتے ہوئے آئے۔ انھوں نے مجھے پاس ہی بٹھا لیا۔ وہ کبھی مجھے گھونسے مارتے، کبھی سر ٹکراتے۔ یہ دیکھ کے جولین کا چہرہ تمتمانے لگا تھا۔ وہ ہم سب کو جھل ملاتی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اب کوئی پردہ ہی نہیں رہ گیا تھا۔ جولین نے بہت کچھ سن لیا تھا۔ بجھل، جامو اور کانتے کے چہرے ایسے نہیں تھے جنھیں اتنی عمر کی لڑکی نہ پہچانتی ہو۔ اُسے میرا نام بھی معلوم ہو گیا تھا۔ تاہم وہ بہت خوش خوش نظر آ رہی تھی جیسے اُس کے عزیز رشتے دار آ گئے ہوں اور وہ اپنے باپ کے مرنے کا غم بھول گئی ہو۔ وہ بار بار اندر جاتی تھی اور چند لمحے بھی نہیں گزرتے تھے کہ واپس آ جاتی تھی۔ اندر اُس کی ماں ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ اُس کے اصرار پر ہم سب گول میز کے گرد بیٹھ گئے۔ یہ میز وہ اپنے پُرانے گھر سے ساتھ لائی تھی اور چار ہی آدمی اس کے اطراف بیٹھ سکتے تھے۔ میز پر بہت اہتمام تھا۔ اتنی سی دیر میں یہ سب چیزیں تیار ہو گئی تھیں۔ بھاجی بھی تھی، پوریاں بھی تھیں، مٹھائی بھی تھی، بسکٹ، ٹوسٹ اور مکھن بھی کچھ موجود تھا۔ جب جمپا چائے دانی لے کے آئی تو جامو نے آہستگی سے پوچھا "کیسی ہو جمپا بائی؟"

"ٹھیک ہوں۔" اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"تم تو بالکل بدل گئی ہو۔" وہ اُسے گھورتے ہوئے بولا۔

"چپ رہ جامو!" بجھل نے تلخی سے کہا۔ "فضول باتیں مت کر۔"

جامو نے تلملا کے گردن جھکا لی۔ ناشتے کے دوران میں خاموشی رہی۔ کسی نے کچھ کھایا نہیں۔ انھوں نے جلدی جلدی چائے کے گھونٹ اُنڈیلے اور ڈرائنگ روم میں میرے گرد گھیرا ڈال کے بیٹھ گئے۔ بجھل نے مجھے اپنے قریب بٹھا لیا تھا۔ میرے آنسو تھم گئے تھے لیکن حیرانی بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر بجھل کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں بمبئی میں ہوں اور اس جگہ رہ رہا ہوں؟ اسے میرا پتہ کس نے بتایا؟ مجھے اندازہ تھا کہ اب کیا ہوگا۔ بجھل میری انگلیاں ٹٹول رہا تھا اور بار بار مجھے دبوچ لیتا تھا۔ جامو اور کانتے نے کچھ بولنا چاہا تو بجھل نے پھر اُنھیں جھڑک دیا۔ "استاد نے تو زبان پہ تالا لگا لیا ہے۔ تو ہی کچھ بول لاڈلے! تجھ پہ کیا بیتی؟ تو اتنے دنوں کہاں رہا؟"

"کانتے!" بجھل نے مشتعل ہو کے کہا۔ "لاڈلے کو پریشان نہ کر۔ میں جانتا ہوں، یہ تجھے کچھ نہیں بتائے گا۔ یہ بڑا کنجوس ہے، سب کچھ اپنے پاس ہی رکھتا ہے۔ اسے مت چھیڑ۔"

لیکن یہ زبان بندی کتنی دیر کی تھی۔ مجھے دیکھ کے اُن کے ذہنوں میں بے شمار سوال اُٹھ رہے ہوں گے۔ یہ فیض آباد کی جمپا بائی ہے جس کے کوٹھے پر میری بہن ناچتی تھی اور جو میرے خوف سے فیض آباد سے بھاگ کے اپنی بہن موتیا بائی کے پاس آگرے چلی گئی تھی۔ میں اسی کے ساتھ رہ رہا ہوں۔ اور یہ خوب صورت لڑکی کون ہے جو اتنی بے تابی سے ان لوگوں کو دیکھ رہی ہے۔ یہ گھر کیسا ہے جہاں میں بیٹھا ہوں اور اگر مجھے گھر ہی بنانا تھا تو بجھل اور زریں نے کیا بگاڑا تھا۔ جلد یا بدیر مجھے بہت سے سوالوں کے جواب دینے تھے۔ مجھے بتانا تھا کہ میں نے زریں کے ہاں سے آنے کے بعد کیا حاصل کیا اور جب میں نے کچھ حاصل نہیں کیا تو واپس کیوں نہیں آیا؟ وہی سوال و جواب، وہی کیوں اور کیسے۔ میرے پاس اُن کے کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔ اُنھیں کیا معلوم تھا کہ مجھ سے تو آئینے کے سامنے بھی نہیں جایا جاتا۔ میں اُن کے سامنے اپنے زندہ رہنے کی کیا وضاحتیں پیش کر سکوں گا، میں اُنھیں کیا بتاؤں گا کہ جو کچھ ہوتا رہا، وہ میرے ارادے کے بغیر ہوتا رہا۔ گاڑی میں کرشنا جی مل گئے حالانکہ ساری گاڑی آدمیوں سے بھری ہوئی تھی اور اب جب اس شہر سے نکلنے میں چند ہی روز یا چند ہی ہفتے کا کام باقی رہ گیا تھا تو وہ آ گئے۔ مجھے یہاں کون سا ہمیشہ رہنا تھا۔ مجھے تو آگے جانا تھا کیونکہ جب بھی میں کہیں کچھ دیر کے لیے ٹھیرتا، جی گھبرانے لگتا تھا۔ اسی لیے میں نے عہد کر لیا تھا کہ اب کوئی کرشنا جی ملے یا کوئی زریں یا کوئی جولین نظر آئی تو میں فوراً راستہ بدل دوں گا لیکن اب وہ آ چکے تھے۔ بجھل آ گیا تھا۔ وہ میرے ہاتھوں میں زنجیریں پہنانے آ گیا تھا۔

"آپ لوگ بتائیں تو... آپ کا سامان کدھر ہے؟" جولین نے تذبذب آمیز شائستگی سے پوچھا۔

بجھل نے سر اُٹھا کے شاید پہلی بار جولین کو غور سے دیکھا۔ وہ دُہری ہو گئی۔ "یہ کون ہے رے؟" وہ سرگوشی میں بولا۔

"یہ جولین ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"جولین!" اُس نے تجسس سے دُہرایا۔

"ہنہ"۔ وہ مسکرا کے رہ گیا اور جولین سے مخاطب ہو کے نرمی سے بولا۔ "ہمارے پاس کوئی سامان وامان نہیں ہے۔ تم ہماری فکر مت کرو، اپنے گھر کا کام کرو۔"

"مگر آپ یہیں رہیں گے۔" وہ نیچی نظروں سے بولی۔

بجھل چپ رہا۔ جولین اُس کے جواب کی منتظر تھی کہ معاً دروازے پر زور زور سے دھڑ دھڑ ہونے لگی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ وہ مارٹی اور ٹنڈا کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ اس وقت اُن کا آنا بے سبب نہیں تھا۔ سیٹھ شمبھو ناس اور اُس کے داماد گردھاری کے قتل کی خبر صبح کے اخباروں میں شائع ہو چکی ہوگی۔ ایک ساتھ بہت سے وسوسوں نے میرے دماغ پہ یورش کی۔ میں نے بجھل کے ہاتھوں سے اپنی گردن چھڑائی اور اچھل کے دروازے پہ جا پہنچا۔ وہ مارٹی اور ٹنڈا ہی تھے۔ دونوں حواس باختہ تھے۔ انھیں اندر آنے سے روکنے کے لیے میں خود باہر چلا گیا۔ "راجا ڈارلنگ! علاقے میں پولیس لیفٹ رائٹ کر رہا ہے۔ وہ اپن کے اڈے کا کئی مینٹلمین پکڑ کے لے گیا ہے۔" ٹنڈا خوف زدہ آواز میں بولا۔

"زورا اور چھیدا کہاں ہیں؟"

"وہ دونوں ابھی باہر ہے۔" مارٹی نے آنکھ دباتے ہوئے جواب دیا۔ "پر اُدھر دوسرے اڈے کا بھی کئی لوگ پکڑا گیا ہے۔ راجا جی۔ ابی جی ایٹلی پاڑے پر چلو۔ زورا اور چھیدا بولتا ہے کہ اس ٹائم استاد کو پاڑے پر ہی ہونا مانگتا۔"

"مگر میں"۔ میں نے پریشانی سے کہا۔ "میں ابھی نہیں جا سکتا مارٹی! میرے ہاں کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں۔ چھیدا اور زورا سے بولو کہ وہ اڈے ہی پر رہیں، باہر نہ نکلیں۔ جیسے ہی موقع ملا، میں اُدھر آتا ہوں۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے مارٹی!"

"گیسٹ سے کام کا کہہ کے تھوڑا ٹائم کے لیے اُدھر چلو راجا! پکڑے کا آدمی چھڑانے کا انتظام بھی کرنا ہے۔"

"مجبوری ہے مارٹی! وہ ایسے مہمان نہیں ہیں۔"

"کون لوگ آ گیا؟" وہ حیرت سے بولا۔

"کچھ پُرانے لوگ آ گئے ہیں، میں نے اسی لیے آج تمھیں اندر نہیں بلایا۔" میں نے دروازے کی جانب دیکھ کے کہا۔ "مارٹی! تم اس وقت چلے جاؤ۔ میں زیادہ دیر تمھارے پاس ٹھیر گیا تو اُن میں سے کوئی بھی باہر آ سکتا ہے۔"

"تم آج کیسا بات بولتا ہے راجا ڈارلنگ!" مارٹی نے تجسس سے پوچھا۔ "ایسا کون لوگ ہے؟ ابھی تم سمجھا کرو راجا! وہ سالا تیواڑی لوگ کا اکھا دھندا چوپٹ ہو گیا ہے۔ شک پڑا تو وہ ادھر آ کے گڑبڑ کر سکتا ہے۔ وہ سالا ہر علاقے میں جا کے ٹٹولے گا کہ کون مائی کا لال نے اُن کا گرینڈ فادر کو فنش کر دیا۔ ابھی تمھارا ہونا اُدھر کمپل سری ہے۔ تم شام سے چلا گیا تھا راجا اور پول نائٹ غائب رہا۔ اب تم اُدھر نئیں جائیں گا تو زورا اور چھیدا بھی....."

مارٹی نے اپنی بات پوری نہیں کی تھی کہ دفعتہً کسی نے میرے کندھے پر زور سے ہاتھ مارا۔ میں کھڑے کھڑے ڈگمگا گیا، ٹنڈا اچھل پڑا، مارٹی کی آواز گلے میں پھنس گئی۔ بجھل باہر آ گیا تھا۔ "کیا بات ہے لاڈلے!" وہ اونچی آواز سے بولا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے جھینپ کے کہا۔

"یہ کون لوگ ہیں؟"

"یہ ماسٹر مارٹی اور ٹنڈا ہیں۔"

"کیا چکر ہے؟" وہ ترشی سے بولا۔

"کوئی چکر نہیں ہے۔" میں نے ناگواری سے جواب دیا۔

اُس نے مارٹی کی گردن دبوچ لی۔ "کیا ڈراما ہے ماسٹر؟"

مارٹی کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ "راجا استاد!" اُس کی گھٹی ہوئی آواز نکلی۔ اُس کا سارا جسم پھڑکنے لگا تھا۔

"راجا استاد!" بجھل نے برگشتگی سے دُہرایا اور مجھ سے پوچھا۔ "لاڈلے! یہ کون لوگ ہیں؟"

"یہ اڈے کے لوگ ہیں۔"

"کون سے اڈے کے؟ تیرا ان سے کیا ناتا ہے؟ یہ تجھے کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟" بجھل کے لہجے سے ظاہر تھا کہ اُس نے ہماری کچھ باتیں ضرور سن لی ہیں۔

"اڈے پر۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ "کچھ ایسی ہی بات ہے، تم اندر چل کے بیٹھو، اس بیچ میں دبڑو۔"

"لاڈلے!" وہ یکایک گرج کے بولا۔ "زبان سنبھال کے بات کر۔"

"کوئی بات نہیں ہے، تم تو خواہ مخواہ....." میں نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ "یہ میرے ساتھی ہیں۔ انھوں نے میرا ساتھ دیا ہے۔ تمھیں کچھ معلوم نہیں ہے تو تم کیوں..."

"میں کیا پوچھ رہا ہوں؟" وہ بلند آواز سے بولا۔

"کوئی ایسی بات ہی نہیں ہے۔ تم پریشان مت ہو۔ معمولی بات ہے۔ میں ابھی تمھیں سب کچھ بتا دوں گا۔ تم اندر جاؤ۔"

"کدھر ہے تیرا یارا؟" بجھل نے مارٹی کے گلے پر گرفت سخت کرتے ہوئے پوچھا۔ مارٹی چیخنے چلانے لگا۔ "راجا جی! راجا استاد! ابھی اپن کیا بولے۔"

ٹنڈا میری ٹانگوں سے لپٹ گیا تھا۔ "اسے چھوڑ دو بجھل بھائی!" میں نے اپنا لہجہ نرم رکھنے کی پوری کوشش کی۔ "اسے چھوڑ دو۔ اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔"

"قصور کس کا ہے، یہ تو میں تجھے بعد میں بتاؤں گا جب تیری انگلیاں بھونک دوں گا۔" وہ طیش میں بولا۔ "میں نے سنا تھا تو مجھے یقین نہیں آیا تھا، بتا یہ سب کیا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں ہے۔" میں نے ناراضی سے کہا۔ "تم نے کیا سُنا تھا؟"

"میں اگر کچھ اور سُنتا تو تیرے پاس کبھی نہ آتا مگر میں... میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں؟"

"تمھیں پوری بات معلوم نہیں ہے۔"

"وہی تو میں تجھ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"میں نے تم سے کہہ دیا ہے کہ تمھیں ہر بات بتا دوں گا۔" میں نے تلملا کے کہا۔ "انھیں جانے دو، انھیں کیوں روکتے ہو۔"

"تجھے ان کے سامنے منہ کھولتے ہوئے کیوں شرم آتی ہے؟"

"کچھ نہیں دادا! اپن کا راجا بہت اچھا ہے۔ راجا ایک قبر ہے دادا!" ماسٹی تڑپتے ہوئے بولا۔ "تم اس کے بارے میں بری بات مت سوچو۔"

تجمل نے غضب ناک انداز میں ماسٹی کے منہ پر پنجہ مارا۔ وہ بلبلا گیا۔ میں سمجھ گیا کہ تجمل کا مقصد کیا ہے۔ وہ مارٹی اور ٹنڈے کو اس لیے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا کہ انھی کی موجودگی میں اسے اصل بات کا پتہ چل سکتا تھا۔ اسے شبہ تھا کہ ان کے جانے کے بعد میں اسے ٹالنے کی کوشش کروں گا۔ تجمل کی تشویش ظاہر کرتی تھی کہ اس نے میرے بارے میں پہلے سے بہت کچھ سن رکھا ہے۔ مارٹی اور ٹنڈے سے بات چیت کے دوران میں اس کا اچانک آجانا اور یوں مشتعل ہو جانا کسی سبب ہی سے ممکن تھا۔ میرے خلاف کسی نے اس کے کان ضرور بھرے تھے۔ اگر اس نے دروازے کی آڑ میں میری اور مارٹی کی باتیں سن لی تھیں تو وہ ایسی نہیں تھیں کہ تجمل انھیں درگزر کر دیتا۔ میں اسے نہیں بتانا چاہتا تھا کہ میرے نام سے ایک اڈا شہر میں موجود ہے۔ مارٹی اور ٹنڈا اس وقت نہ آتے تو شاید بات اتنی نہ بڑھتی مگر انھیں بھی اسی وقت آنا رہ گیا تھا۔ اب اسے کھل کے سب کچھ بتائے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ "میرا پاڑے میں جانا ضروری ہے۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"کس کا پاڑا؟" وہ بے چینی سے بولا۔

"ہم لوگوں کا۔" میں نے سر جھکا کے کہا۔ "یہ لوگ مجھے بلانے آئے ہیں۔ پاڑے کے کئی آدمی گرفتار ہو گئے ہیں۔ علاقے میں پولیس گشت کر رہی ہے۔ میری وہاں موجودگی ضروری ہے۔ علاقے میں کشیدگی کا اندیشہ ہے۔"

"تو ایک پاڑا بھی چلاتا ہے؟" اس نے وحشت سے پوچھا۔

"ہاں!" میں نے سانس کھینچتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس کی ضرورت تھی۔"

"مگر کس لیے؟" وہ بے قراری سے بولا۔

"یہ میں تمھیں بعد میں بتاؤں گا۔" میں نے اداسی سے کہا۔ "تم یہاں ٹھیرو۔ میں کچھ دیر بعد واپس آجاؤں گا۔ جلد ہی واپس آنے کی کوشش کروں گا۔"

"میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا۔"

"نہیں! وہاں تمھارا جانا ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیوں ٹھیک نہیں ہے؟" اس کی آواز ڈھلک گئی۔

"بس تم وہاں مت جاؤ، اچھا نہیں لگتا۔"

"بھلا کیوں لاڈلے!" اس کا ماتھا سکڑ گیا۔ "میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تو نے اتنی چھوٹی عمر میں کتنی ترقی کی ہے۔ میں یہاں آنے کے بعد سب سے پہلے وہاں نہیں جاؤں گا تو اور کہاں جاؤں گا؟" مجھے ایسا لگا جیسے اس نے چاقو سے میرے کان چیر دیے ہوں۔ پھر میں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ اس نے جامو اور کانتے کو آواز دے کے باہر بلا لیا۔ جامو اور کانتے کے پیچھے پیچھے جولین اور چمپا بھی گھر سے باہر نکل آئی تھیں۔

جولین کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ تجمل نے ان سے کیا کہا۔ میں ایک طرف چل پڑا۔ وہ بھی میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ہمیں بس کا انتظار نہیں کرنا پڑا۔ بس میں بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی۔۔ ہم سب ڈنڈا پکڑ کے کھڑے ہو گئے۔ بس تیز رفتاری سے سڑک پر بھاگ رہی تھی۔ تجمل آگے چلا گیا تھا۔ جامو اور کانتے میرے پاس ہی تھے۔ میرے حواس کام نہیں کر رہے تھے۔ مجھے اپنے آپ سے چڑ ہو رہی تھی۔ کانتے جیسے میرے کانوں میں گھسا بیٹھا تھا۔ وہ چپکے چپکے مجھے بتا رہا تھا کہ استاد میری وجہ سے کتنا پریشان تھا۔ کلکتے میں اڈے کا بھی وہ حال نہیں رہا۔ شولی نے غداری کی اور موجمدار کے اڈے کا مالک بن بیٹھا۔ تجمل چپ چاپ دیکھتا رہا۔ اس نے شولی کو نہیں چھیڑا بلکہ کسی نے شولی کے منہ لگنے کی کوشش بھی کی تو تجمل نے اس کی ہمت نہیں بڑھائی۔ میرے جانے کے بعد اڈے کے کاموں سے تجمل کی دلچسپی برائے نام رہ گئی تھی۔ "استاد کی وہ بات ہی نہیں رہی لاڈلے!" کانتے کہہ رہا تھا۔ "استاد بہت چڑچڑا اور مرکھنا ہو گیا ہے۔ کبھی ذرا ذرا سی بات پر بگڑ جاتا ہے اور کبھی بہت بڑی بات بھی ہو جائے تو خاموش رہتا ہے۔ اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کس بات پر خفا ہو گا، کس بات پر خوش۔ کئی سوٹے کے نیچے شولی سے مل گئے۔ بولتے ہیں استاد تجمل بوڑھا ہو گیا ہے۔ قسم سے لاڈلے! یہ سن کے خون کھول جاتا ہے۔ استاد کے خیال سے ہاتھ نہیں اٹھاتا ورنہ۔۔۔" کانتے کا منہ لال ہو گیا تھا۔ کہہ رہا تھا۔ "میں اپنا زیادہ ٹیم استاد کے ساتھ ہی بتاتا ہوں۔ اپنا دھندا بھی سالا آدھا رہ گیا ہے۔ ہر جتن کر کے دیکھ لیا۔ استاد واپس نہیں آیا۔ جب استاد کا جی بہت گھبراتا تھا تو فیض آباد میں زرین بی بی کے پاس چلا جاتا تھا۔ ادھر اڈے کی آمدنی بھی گھٹ گئی ہے۔"

کانتے میرے کان ڈس رہا تھا۔ میرے جی میں آیا کہ میں بھاگتی ہوئی بس سے چھلانگ لگا دوں۔ سب کی پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔ جی کو بھی قرار آجائے گا کہ میں مر گیا ہوں۔ کبھی کبھی زندہ آدمی مرے ہوئے آدمی سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ کبھی کسی کی موت بھی دوسروں کے سکھ کا باعث ہوتی ہے۔ میری زندگی خود مجھے بھی کون سا سکھ پہنچاتی تھی۔ کانتے اور جامو نہ جانے کیا کیا کہتے رہے۔ میں نے کچھ سنا، کچھ نہیں سنا۔ ادھر تجمل کو بھنک پڑ گئی۔ اس نے بھری بس میں انھیں لتاڑ دیا۔ پھر وہ دونوں نہیں بولے۔

بس چلتی رہی۔ مسافر کن انکھیوں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ شاید ہمارے چہرے ان سب کے چہروں سے مختلف تھے۔ وہی کٹے پھٹے، تنے کھنچے ہوئے چہرے۔ الجھا ہوا لباس اور گٹھے ہوئے جسم۔ ٹنڈا اور ماسٹی پیچھے دبکے کھڑے تھے۔ کوئی مسافر راستے میں اترا تو ٹنڈا اچھلتا ہوا تجمل کے پاس پہنچا اور گھگھیائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "دادا۔ دادا! ادھر کا سیٹ خالی پڑا ہے۔"

تجمل بپھر گیا جیسے ٹنڈے نے اسے چٹکی بھر لی ہو۔ ٹنڈے کی

بات اتنی بری لگی کہ اس کے منہ سے مغلظات کا طوفان امڈ پڑا۔ نشستوں پر بیٹھے ہوئے لوگ اچک اچک کے اسے دیکھنے لگے۔ تجمل کی آواز کے سوا بس میں کوئی آواز نہیں تھی۔ ہر شخص دم بخود تھا۔ جامو نے جب آگے بڑھ کے زور سے تجمل کا کندھا پکڑا تب کہیں اس کی زبان بند ہوئی۔ نشستیں خالی اور پر ہوتی رہیں، پھر کسی نے تجمل کو بیٹھ جانے کی پیشکش نہیں کی نہ ہی ہم میں سے کوئی کسی خالی سیٹ پر بیٹھا۔

ابھی پاڑا آنے میں کچھ دیر تھی کہ ایک خوش پوش مسافر بس میں داخل ہوا اور میرے قریب کی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس نے اخبار کھولا تو غیر اختیاری طور پر میری نظر سرخیوں میں بھٹکنے لگی اور اخبار کی شہ سرخی پر جم کے رہ گئی۔ شمبھو نواس اور اس کے داماد کے قتل کی خبر سب سے نمایاں تھی۔ اخبار نے لکھا تھا کہ راج کرشنا کی موت کے بعد یہ ممبئی کا دوسرا سنگین حادثہ ہے۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ پتہ نہیں اخبار نے سیٹھ شمبھو کی خبر چھاپتے وقت کرشنا جی کی موت کا ذکر کیوں ضروری سمجھا تھا۔ یہ محض اتفاق تھا یا اخبار والے کو بھی شبہ تھا کہ شمبھو گروپ ہی راج کرشنا کی ہلاکت کا سبب ہے۔ اخبار والوں سے زیادہ باخبر کون ہو گا۔ بقیہ خبر پڑھنے کے لیے میں نشست پر جھک گیا۔ مجھے یہ خیال بھی نہ رہا کہ یہ بدتہذیبی ہے۔ کوئی اس طرح دوسروں کی چیزیں نہیں دیکھتا۔ میرا جی چاہا کہ میں اس شخص سے اخبار چھین لوں۔ میرے دماغ میں بھن بھناہٹ سی ہونے لگی اور کچھ دیر کے لیے میں تجمل کی آمد سے بے خبر ہو گیا مگر مجھے مزید خبر پڑھنے کی فرصت نہیں ملی۔ ہماری منزل آ چکی تھی۔ مارٹی نے دبے دبے لہجے میں صدا لگائی۔ ہم پاڑے سے کچھ دور مین روڈ پر اتر گئے۔ مارٹی کی اطلاع درست تھی۔ علاقے میں پولیس والوں کی تعداد عام دنوں سے زیادہ تھی۔ اس کی یہی وجہ ہو سکتی تھی کہ پولیس کو شمبھو گروپ کے مشتعل لوگوں سے کسی گڑبڑ کا اندیشہ تھا۔ پولیس شمبھو گروپ کے اثر و رسوخ اور طاقت سے خوب واقف تھی اور آسانی سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ کسی مخالف گروہ ہی نے سیٹھ شمبھو نواس کو ختم کیا ہے اور اس مخالف گروہ کے سراغ کے لیے شمبھو گروپ کے لوگ مختلف علاقوں کی گلی گلی چھان ماریں گے۔ وہ پولیس پر اعتبار نہیں کریں گے اور خود فیصلہ کرنے کی کوشش کریں گے۔

علاقے میں زندگی معمول پر تھی۔ اب بہت سے لوگ مجھے جان گئے تھے چنانچہ میں جس طرف سے گزرا اور مجھ پر جس کی نظر پڑی، اس نے مجھے سلام کیا۔ کسی نے راستہ روک کے مجھ سے پاڑے کے کسی آدمی کی شکایت کی تو کسی نے آواز دے کے میری خاطر کرنی چاہی۔ پاڑے کے بہت سے لوگ بھی علاقے میں بکھرے ہوئے تھے۔ انھوں نے مجھے اور میرے ساتھ تین اجنبیوں کو دیکھا تو متجسس نگاہوں سے میرے اطراف چلنے لگے۔ میں نے انھیں دور رہنے کا اشارہ کر دیا پھر بھی ان کی بے چینی کم نہیں ہوئی۔ میری رفتار تیز تھی۔ میرا بس چلتا تو میں بس پاڑے کے قریب ہی رکواتا۔ اگر ہم

ٹیکسی میں آتے تو بہتر تھا۔ راستے میں ملنے والے لوگوں سے نجات مل جاتی۔ میں نظریں نیچی کیے آگے بڑھ رہا تھا تاکہ کم سے کم لوگوں سے سامنا ہو مگر لوگ خود مجھے اپنی جانب متوجہ کر لیتے تھے۔ کانتے نے میرا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ تجمل خاموشی سے میرے برابر چل رہا تھا۔ جامو ہمارے پیچھے تھا۔ ٹنڈا اور مارٹی نہ جانے کون سی گلیوں سے نکلتے ہوئے ہم سے پہلے پاڑے پہنچ گئے تھے۔ زورا، چھیدا اور پاڑے کے بہت سے لوگ عمارت سے باہر گلی میں ہمارے منتظر تھے۔ جیسے ہی ہم گلی میں داخل ہوئے، ان سب نے ہمارے لیے راستہ چھوڑ دیا اور جھکتے ہوئے ہمیں سلام کیا۔ میں نے نگاہوں نگاہوں میں انھیں پرسکون رہنے کی تلقین کی اور پاڑے کی عمارت میں داخل ہو گیا۔ چھنگا کے جانے کے بعد عمارت پر رنگ و روغن کر دیا گیا تھا اور اس کی شکل نکل آئی تھی۔ سب حیرت زدہ اور سراسیمہ تھے۔ ہم اندر جا کے بیٹھک کی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر سکوت طاری رہا۔ پھر میں نے ہی زبان کھولی۔ "یہی پاڑا ہے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ تجمل نے اپنا بھاری چہرہ ہلایا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے منہ پر ورم چڑھ گیا ہو۔ "اور یہ زورا ہے، یہ چھیدا ہے، یہ کاسو ہے۔۔۔" میں نے اسے وہاں بیٹھے ہوئے تمام لوگوں کے نام بتلانے شروع کیے۔ تجمل بت بنا بیٹھا رہا۔

"تم نے اپن کے نام تو بول دیے راجا جی! پر دادا کون ہے؟" زورا نے اٹک اٹک کے پوچھا۔

"اپن کو بھی تو دادا کے بارے میں کچھ بولو۔"

"یہ استاد تجمل ہیں۔" میں نے مدھم آواز میں کہا۔

"استاد تجمل!" ان سب نے حیرت اور تذبذب سے دہرایا۔

"یہ میرے... میرے سب کچھ ہیں۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "اور یہ استاد جامو ہیں اور یہ کانتے ہے۔"

پھر خاموشی چھا گئی۔ "یہ ادھر ممبئی کب آئے؟" کسی نے پوچھا۔

"آج سویرے۔" میرے بجائے جامو نے جواب دیا۔

"تم لوگوں کے بارے میں راجا جی کبھی کچھ بولا نہیں۔ اپن کو خبر ہوتی تو سب اسٹیشن چلتے۔" زورا اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کے بولا۔

"ہمارا آنا اچانک ہوا۔" جامو نے نرمی سے کہا۔

"سب بھل تو ہے؟" کاسو نے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

"ہاں سب خیر ہے۔" جامو نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"اپن کے لیے کوئی کام ہو تو بولو۔ تم راجا جی کا مہمان ہو تو اکھا پاڑے کا مہمان ہوا، اکھا علاقے کا مہمان ہوا، اکھا بستی کا مہمان ہو۔ راجا جی کے لیے اپن کا جان حاضر ہے۔" چھیدا جوشیلے لہجے میں بولا۔

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔" جامو نے کسی قدر تندی سے کہا۔ "ہم اپنے راجا بہادر کو دیکھنے آئے ہیں۔"

"راجا جی کا کیا بولو! استاد چھنگا کو اس نے ایسا ناچ کرایا کہ اپن دیکھتا

رہ گیا۔ اپن نے اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں دیکھا۔ لو دردہ سالا بالم خاں بھی بہت ترڑی مارتا تھا اپن کا راجا کے دو چار ہاتھوں میں کلٹی ہو گیا۔ راجا تو راجا ہے جامو کستاد! جب سے ایدر پاڑے میں بیٹھا ہے علاقے کا سبھی لوگ چین کا مُرلی بجاتا ہے اور آج ادھر کوئی نہیں جو راجا کی آنکھ سے آنکھ لڑا سکے۔ راجا تو۔۔۔" چھیدا روانی میں بکے جا رہا تھا۔

"بس۔" میں نے ترشی سے کہا "بس۔"

"ابھی اپن نے کچھ بھی نہیں بولا راجا۔۔۔"

"بولتے رہو۔" یکبارگی تجمل کی گونجتی ہوئی آواز ابھری۔ ڈما اچھل کے زورا کی کرسی کے پیچھے چلا گیا۔ چھیدا پلکیں جھپکانے لگا۔ "بولتے رہو۔" تجمل نے دوبارہ تیز آواز میں کہا۔

"دادا!۔ دادا!" چھیدا نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا "اپن کو نہیں مالوم کہ تمھارے حکم کا کیا مطلب ہے۔ اپن نے جو بولا ہے سچ بولا ہے۔ ماں قسم ایدر ممبئی میں اکڑی کرتے ہوئے بال پر چاندی بننے لگا پر اپن نے راجا جیسا کوئی استاد نہیں دیکھا۔ اپن سو بار بولا کہ راجا آگے بڑھو، تم تو اکھا سٹی کا راجا بنیں گا۔ پر راجا اپنے پاڑے سے باہر نہیں نکلا۔ اُس سالا بالم کا بُرا ٹیم آ گیا تھا تبھی راجا کا آدمی چھیڑ دیا۔ دادا! راجا وہ پہلا پاڑا ماسٹر ہے جس نے پاڑے کا ایک پیسہ کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ایک بات ہو تو بولوں۔ باتوں کا ڈھیر ہے۔"

چھیدا باتیں کر رہا تھا تو سبھی کی نگاہیں تجمل کی جانب مرکوز تھیں مگر تجمل کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ آنکھیں میچے چھیدا کی باتیں سُنتا رہا۔ چھیدا خاموش ہوا تو تجمل نے اپنی غنودہ آنکھیں کھولیں، اُن میں سُرخی دوڑ رہی تھی۔ اُس نے چھیدے سے پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ اسی اثنا میں پاڑے کے کئی آدمی تھیلوں اور ٹوکروں سے لدے پھندے اندر داخل ہوئے۔ درمیان کے چبوترے پر پہلے جہاں کبھی جھنگا بیٹھتا تھا اور اب میں بیٹھنے لگا تھا اور میری عدم موجودگی میں زورا یا چھیدا بیٹھتے تھے۔ اُسی چبوترے پر دیکھتے دیکھتے تمام چیزیں بکھیر دی گئیں۔ ڈما چبوترے پر پھدکتا پھر رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ پاڑے کے لوگ کھانے پینے کی ہر دکان سے کوئی نہ کوئی چیز اُٹھا لائے ہیں۔ چبوترے پر بیٹھنے کی جگہ بھی مشکل سے رہی تھی۔ زورا نے تجمل کو چبوترے پر چلنے کے لیے کہا۔ اُس نے انکار نہیں کیا۔ یہ سامان پوری ایک بارات کے لیے کافی تھا۔ کھانے کے دوران میں بھی چھیدا کی زبان قینچی کی طرح چلتی رہی۔ میں اور تجمل بس اُن کا ساتھ دینے کے لیے ٹونگتے رہے۔ جامو اور کانتے نے خوب سیر ہو کے کھایا۔ اُن کے چہروں پر بشاشت نمایاں تھی۔

میرا دماغ خالی خالی تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے، ٹھیک ہو رہا ہے یا غلط؟ تجمل کی غیر متوقع آمد پر اور کیا ہونا چاہیے تھا۔ یہ دوپہر کا کھانا تو نہیں تھا مگر اس کے بعد کھانے کی گنجائش نہیں رہ جاتی تھی۔ عمارت میں باقاعدہ سکونتی کمرے موجود تھے۔ اُن میں پاڑے کے بعض آدمی مستقل قیام کرتے تھے۔ کھانے کے بعد سفر کی تھکن دور کرنے کے لیے تجمل سے کمرے میں چلنے کو کہا گیا مگر وہ وہیں بیٹھا رہا۔ البتہ جامو اور کانتے اُس کی اجازت سے مارٹی اور ڈنڈے کے ساتھ باہر چلے گئے۔ پاڑے کے باقی لوگ بھی رخصت ہو گئے۔ صرف زورا اور چھیدا رہ گئے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ بھی چلے جائیں تاکہ میں تجمل سے کوئی بات کر سکوں اور اُسے بتا سکوں کہ جو کچھ اُس کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں، یہ محض اس کے وقت سے پہلے یا بعد میں آنے کا اتفاق ہے۔ میں نے ابھی زورا اور چھیدا کو وہاں سے چلے جانے کا اشارہ نہیں کیا تھا کہ پاڑے کا نوجوان لڑکا قسمتے بوکھلایا ہوا اندر آیا۔ اُس نے تجمل کو دیکھا تو ٹھٹک کے زورا کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ زورا اُس کے پاس پہنچا۔ قسمتے نے اُس کے کان میں کوئی اہم بات کہی۔ زورا کا چہرہ اچانک تمتمانے لگا۔ قسمتے کا انداز بتا رہا تھا کہ بات کی نوعیت معمولی نہیں ہے۔ زورا فوراً چھیدا کے پاس گیا اور چھیدا میرے پاس آیا۔ تجمل کے سامنے یہ کانا پھوسی مجھے معیوب لگی لیکن نہ جانے وہ کیا بات تھی جس سے زورا اور چھیدا مضطرب ہو گئے تھے۔

میں نے چھیدا کی سرگوشی بظاہر بڑے تحمل سے سُنی تھی مگر اب مجھ سے ایک پہلو نہیں بیٹھا جا رہا تھا۔ زورا اور چھیدا فوراً باہر جانا چاہتے تھے۔ میں نے انھیں روک لیا اور قسمتے کو ہدایت کی کہ وہ پاڑے کے تمام آدمیوں سے فرداً فرداً کہہ دے کہ کسی غیر ضروری جھگڑے سے پرہیز کیا جائے۔ قسمتے چلا گیا۔ ہم تینوں ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے۔ "کیا نقشہ ہے لاڈلے؟" تجمل کی تیکھی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔

"کوئی خاص بات نہیں ہے دادا!" چھیدا نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"کیا ہے لاڈلے! تو ہی بتا۔"

"پرسوں یہاں ایک سیٹھ شمبھو ناس اور اُس کے داماد گردھاری کا قتل ہو گیا ہے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "شمبھو سیٹھ بہت مال دار تھا۔ ممبئی میں ہر جگہ اُس کا کاروبار پھیلا ہوا ہے۔ شمبھو کا کام تیواڑی دادا کرتا تھا۔ تیواڑی دادا نے دھمکی بھیجی ہے کہ سیٹھ شمبھو کے خون کے بدلے کے لیے تیار رہو۔ ہو سکتا ہے کہ یہ دھمکی اُس نے دوسرے اڈوں کو بھی بھیجی ہو۔ سُنا ہے کہ تیواڑی کا اچھا خاصا بڑا اڈا ہے اور وہاں کسی بات میں کوئی مار نہیں ہے۔ تیواڑی دادا شاید یہ جاننا چاہتا ہے کہ تنکا کس کی داڑھی میں نکلتا ہے۔"

"اور سیٹھ شمبھو کو اپنے راستے سے ہٹایا کس نے ہے؟" تجمل نے ہم تینوں پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

"ہم نے۔" میں نے سکون سے کہا۔

"راجا!" زورا اور چھیدا نے ایک ساتھ احتجاج کیا۔

"ہاں تنکا تو تم سب کی داڑھیوں میں نظر آ رہا ہے۔"

"راجا نے نہیں دادا! شمبھو کو اپن نے ختم کیا ہے۔"

"پر راجا کے بولنے پر۔" تجمل آہستگی سے بولا۔

"ہاں! میری ہدایت پر۔" زورا اور چھیدا کے کچھ کہنے سے پہلے میں نے ل کے کہا "میں نے ہی ان سے کہا تھا۔"

"مگر دادا! کام بہت صاف ہوا ہے گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ پولیس کا باپ بھی اپن تک نہیں پہنچ سکتا۔"

"مگر تیواڑی پہنچ چکا ہے۔" تجمل نے زہرخند سے کہا۔

چھیدا اور زورا جز بز ہونے لگے۔ اُن کے پاس اس کا کوئی جواب ں تھا، جواب صرف میرے پاس تھا۔ تیواڑی کی دھمکی خاص طور پر اس تے کے استاد کو دی گئی تھی۔ اس کا مطلب صاف تھا کہ تیواڑی اپنے ھ کے قتل کے متعلق کوئی رائے قائم کر چکا ہے تو اسے یہ بھی معلوم ہو میں ہی وہ شخص ہوں جو کرشنا جی کے ساتھ رہتا تھا اور جس نے ایک زین میں، دوسری بار کلب میں اُن کی جان بچائی تھی۔ چونکہ میں نے ڑی سے اُلجھنے کی کوشش نہیں کی تھی اس لیے اُس نے بھی مجھ پر دینا مناسب نہیں سمجھا ہوگا مگر اب۔۔۔۔ اب کوئی خفیف سا شبہ ہی کے قدم روک رہا ہوگا۔ وہ کسی وقت بھی اس طرف آ سکتے تھے۔ جب کا شبہ یقین میں بدل جائے گا یا علاقے پر پولیس کا دباؤ کم پڑ جائے گا۔ ر وہ کوئی اور صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ "تم پہلے جا کے سیٹھ نور بھائی لو کہ وہ علاقے کے گرفتار شدہ آدمیوں کو اپنی ضمانت پر رہا کرانے کا انتظام ے۔" میں نے چھیدا کو ہدایت دی "اور زورا تم تھانے جا کے اپنے آدمیوں ر خبر کرو۔ انھیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو پہنچاؤ۔"

زورا اور چھیدا کے لیے یہی بہتر تھا کہ وہ اس وقت یہاں سے ہو جائیں۔ تجمل کے سامنے اُن سے کوئی ایسی ویسی بات نکل جاتی تو خواہ مخواہ ن پیدا ہوتی۔ مجھے زورا اور چھیدا پر اعتماد تھا اور یہ اندیشہ نہیں تھا کہ ماری کے بعد پولیس کی مار انھیں کمزور کر دے گی اسی لیے پاڑے کے تنے آدمیوں میں سے میں نے انھیں منتخب کیا تھا لیکن اُن کے وں پر زیادہ زور نہیں پڑنا چاہیے تھا۔ یہ تاکید مجھے تجمل ہی نے کی تھی۔ ب میں اور تجمل تنہا رہ گئے تو میں نے اُس سے بات کرنے میں خود ل کرنی چاہی مگر لفظ میرے حلق میں پھنس کے رہ گئے۔ وہ لگاتار میرا تک رہا تھا۔ مجھ سے کوئی بات نہیں ہو سکی۔ مجبوراً میں نے اُسے کرنے کا مشورہ دیا۔ تجمل کا چہرہ کھنچ گیا اور وہ انگلیاں مروڑنے لگا۔ "لاڈلے! ب کیا ہے؟" وہ اُبلتی ہوئی آواز میں بولا۔

"جو تم دیکھ رہے ہو۔" میری زبان بہکنے لگی۔

"مگر میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں۔" وہ ہیجانی لہجے میں بولا "لاڈلے! اجان! میں یہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔"

"میں خود بھی نہیں چاہتا تھا۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"پھر یہ کیوں ہے؟" اُس کی آواز پھٹنے لگی "تیرے پاس تو بڑی دولت تھی۔ تُو نے آزاد پنچھیوں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ تُو ہر امتحان میں اوّل نمبر آتا رہا مگر تجھے کیا ہو گیا لاڈلے! تجھے کیا ہو گیا شہزادے! اگر یہی بات تھی تو کلکتے کا اڈا کیا کم تھا۔ تُو مجھ سے کہتا تو میں وہاں سے ہٹ جاتا۔"

"مجھے معلوم تھا کہ تم یہی باتیں کرو گے۔ تمھیں یہی باتیں کرنی بھی چاہئیں لیکن تمھیں نہیں معلوم کہ یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے۔ ممکن ہے تم مجھ سے اتفاق نہ کرو مگر مجھے اس کی فکر نہیں ہے کیونکہ میں نے وہی کیا ہے جو میرے دل اور دماغ نے کہا تھا۔ میں تمھارے پاس سے چلا آیا تھا اور اس لیے چلا آیا تھا کہ مجھے چمپا بائی سے اپنے گھر والوں کا پتہ پوچھنا تھا۔ ویسے تم اور جامو بھی کچھ تاخیر سے سہی، چمپا بائی کو ڈھونڈ کے اُن کا پتہ چلا سکتے تھے لیکن میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ نمّی اور میرے گھر والوں کی نشان دہی کسی اور کو ہو۔ مجھے اندیشہ تھا کہ چمپا بائی ملے گی تو نہ جانے کیا کیا باتیں کھلیں گی۔ جامو اور کبن خاں اور دوسرے لوگ اُس سے نہ جانے کس کس طرح اور کیا کیا اگلواتے۔ نمّی کے پیروں میں گھنگرو دیکھنے سے پہلے گھر والوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں تھا اور نہ میں اُن سے دوبارہ کوئی رابطہ پیدا کرنا چاہتا تھا۔" میری آواز بھرّا گئی۔ تجمل کی آنکھیں چوڑی ہو گئی تھیں۔ اُس نے میرا ہاتھ زور سے دبا رکھا تھا۔ "مختصر یہ کہ میں چمپا بائی کو ڈھونڈتا ہوا آگرے پہنچ گیا۔ چمپا بائی نے بتایا کہ اُس نے نمّی کو ممبئی سے حاصل کیا تھا۔ میں اُسے جبراً اپنے ساتھ ممبئی لے آیا اور۔۔۔" میں نے ٹرین میں کرشنا جی کے ملنے، ممبئی میں ابا جان کی تلاش میں ناکامی، چمپا کی واپسی کی ساری روداد تفصیل سے اُسے سُنا دی۔

"پھر تو واپس کیوں نہیں آ گیا؟" وہ بے چینی سے بڑبڑایا۔

"پھر میں نے سوچا کہ اب کہاں جاؤں، کسے لگتی ہے۔ کو پریشان کروں گا۔ ابھی تو وہ نہیں ملی تھی کہ ابا جان ممبئی میں ہیں بلکہ اُس کا کیا۔ میرا جی کسی جگہ نہیں لگتا تھا۔ میں اسی شہر میں پڑا رہا۔ ایک دن اتفاقاً جوہو کے ساحل پر کرشنا جی نے مجھے پہچان لیا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے گئے اور مجھے مسلسل نادم کرتے رہے۔ انھوں نے میرے کپڑے بنوائے، مجھے بڑے لوگوں کے کلب میں لے گئے۔ وہ میرا بہت خیال رکھتے تھے، بالکل اپنا بھائی، اپنی اولاد سمجھتے تھے۔ میں نے کئی بار ارادہ کیا کہ وہاں سے بھاگ جاؤں لیکن ہر بار کرشنا جی کے خیال نے قدم روک لیے۔ میں نے انھیں اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ انھوں نے پوچھنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی تو انھوں نے یہ ذکر ہی چھوڑ دیا۔ ابھی مجھے وہاں رہتے ہوئے چند ہی دن ہوئے تھے کہ کرشنا جی کچھ پریشان پریشان نظر آنے لگے۔ میں ایک دن اُن سے کہے بغیر گھر سے نکل گیا اور دبائی کلا کے علاقے میں پہنچ گیا۔" میں نے مستانہ کا سارا واقعہ، چھاپے، گرفتاریاں، لڑکی کی واپسی، اخبارات کے تذکرے، کرشنا جی کی شہرت اور شہر میں اُن کے چرچوں کا حال اُسے سنایا۔ "اس واقعے کے بعد کرشنا جی مجھے اور عزیز رکھنے

لگے۔ پھر ایک مرتبہ اُن پر کلب میں حملہ ہوا۔ اتفاق سے میری نظر پڑ گئی ورنہ ملنے والوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اُن کی جان ہر وقت خطرے میں رہتی تھی۔ میں نے کئی بار انھیں محتاط رہنے کا مشورہ دیا مگر انھیں اپنا کام اپنی جان سے زیادہ عزیز تھا۔ وہ ہر وقت فائلوں میں گھرے رہتے تھے۔ کلب کے حملے کے بعد ہم گھر لوٹے تو چمپا بائی ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ میں اُسے دیکھ کے حیران رہ گیا۔ میں نے اُس پر بہت زور دیا کہ وہ واپس چلی جائے۔ چمپا بائی تو تیار ہو گئی تھی مگر کرشنا جی نے اُسے روک لیا۔ چمپا نے اپنی روِش بدل لی تھی۔ اُس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ میرے بارے میں کرشنا جی کو کچھ نہیں بتائے گی۔ جب کرشنا جی ہی اُسے گھر رکھنے پر آمادہ تھے تو میں کیا کر سکتا تھا۔ ویسے بھی کسی نہ کسی دن مجھے وہاں سے جانا ہی تھا۔ بس میں تمھیں کیا بتاؤں کہ کیا کیا ہوتا رہا۔ میں روز نکلنے کی تدبیر کرتا تھا اور روز ارادہ بدل دیتا تھا۔ میں ہر وقت یہی سوچتا تھا کہ اب کس طرف جاؤں۔ پھر ایک دن کرشنا جی میرے لیے جولین کو لے آئے۔ میں انھیں کیسے بتا سکتا تھا کہ مجھے پڑھنے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر میں انھیں سچی بات بتا دیتا تو وہ سوالات کرتے کرتے جیل تک پہنچ جاتے مگر میں کرشنا جی کو غلط سمجھا تھا۔ وہ بہت بڑے آدمی تھے۔ جولین نے مجھے پڑھانا شروع کر دیا۔ وہ ایک غریب اور بے سہارا لڑکی ہے۔ اُس کا باپ بیمار تھا۔ میں روز اُسے گھر چھوڑنے جانے لگا۔ گلی کے لڑکے ہم پر آوازے کسنے لگے چنانچہ ایک روز مجھے اُن سے بات کرنے کے لیے رکنا پڑا..."

جھل سے ... سُنتا رہا۔ پھیدا خاموش بیٹھا میرے اور قریب کھسک آیا تھا۔ میں نے اُس سے کچھ چھپانے ... سُرخی دوڑ رہی تھی۔ اُس نے درمیان میں ایک لفظ بھی نہیں کہا، نہ جُھل ... میں پڑے ... نے اُس کی طرف دیکھا۔ میں تو جیسے اپنے آپ سے باتیں ... ہوئے ... تھا۔ بس مجھے اُس کی گہری سانسیں سنائی دیتی رہیں۔ "میں نے کرشنا جی کو بتا دیا تھا کہ پولیس افسر جسونت اپنے ایک ساتھی سے اُن کے متعلق کیا باتیں کر رہا تھا۔ وہ بولے تم نے یہ سب کیسے سن لیا؟ میں نے انھیں یقین دلانے کے لیے بتا دیا کہ میں انگریزی سمجھتا ہوں۔ اس پر وہ اتنے خوش ہوئے کہ مجھے لے کے کمرے میں ناچنے لگے اور وہ بات بھول گئے جو میں نے اُن سے کہی تھی۔ میں نے دوبارہ اُن کی توجہ جسونت کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کی۔ انھوں نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ اپنا کام جلد سے جلد نمٹا کے یہاں سے اپنے گھر مدراس چلے جائیں گے مگر دوسرے ہی دن وہ سڑک پر تڑپتے ہوئے پائے گئے۔ اس کے بعد وہ گھر واپس نہیں آئے۔"

"میں نے اپنے کانوں سے سُنا تھا کہ وہ کون لوگ ہیں جو کرشنا جی کو اس لیے پسند نہیں کرتے کہ کرشنا جی ایک فرض شناس اور دیانت دار پولیس افسر ہیں۔ انھیں بچانے کی ہر کوشش ناکام ہو گئی۔ میں نے بہت دعا کی، اے خدا! اُن کے بجائے میری جان لے لے۔ میں نے اپنے آپ سے عہد کیا تھا کہ جن لوگوں نے کرشنا جی کو مارا ہے، اُن کو میں ضرور سمجھوں گا۔ میں نے کرشنا جی کا پٹیوں میں لپٹا ہوا جسم دیکھا ہے، اُن کی آواز... مرتے وقت اُن کی آواز میں نے سُنی تھی۔" میرا سینہ پھٹنے لگا۔ میں بلک بلک کے رونے لگا۔ جُھل نے مجھے گلے لگا لیا۔ مجھ اور رونا آ گیا۔

"لاڈلے! لاڈلے! ارے لاڈلے!" وہ مجھے تسلی دے رہا تھا مگر خود اُس کی آواز بھر بھرانے لگی تھی۔

"کرشنا جی چلے گئے۔" میں نے اپنا منہ چھپا لیا۔

"لاڈلے! لاڈلے جانی!" اُس نے میرے ہاتھ پکڑ لیے اور اپنے دامن سے میرا چہرہ خشک کرنے لگا۔ "لاڈلے! جانا سبھی کو ہے۔ اِلز سکندر بھی چلا گیا، رستم پہلوان بھی مر گیا، اُس کا بیٹا سہراب بھی خاک ہو گیا۔ بڑا بڑا بادشاہ مر گیا۔ بڑا بڑا پھنّے باز خاں مر گیا۔ تو بھی ایک دن مر جائے گا، میں تجھ سے پہلے چلا جاؤں گا۔ کچھ آنسو اور لوگوں کے لیے بھی روک رکھ۔ آدمی کو تمام آنسو ایک ہی ٹائم برباد نہیں کرنے چاہییں۔ ان کی بار بار ضرورت پڑتی ہے۔"

"مگر کرشنا جی بہت اچھے آدمی تھے جُھل بھائی!"

"پیر پیمبر اُٹھ گئے لاڈلے! یہ تو دنیا ہے پیارے جانی!"

"وہ بہت اچھے تھے، تم نے انھیں نہیں دیکھا۔" میں نے چیخ کر کہا۔

"میں نے تیری آنکھوں میں اُسے دیکھ لیا ہے۔ مجھے یقین ہے لاڈلے! وہ بہت اچھا آدمی ہو گا، تیری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔"

"میری آنکھیں دھوکا کھا گئیں۔ میں نے انھیں نہیں پہچانا۔" میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔ "میں اُن سے اپنے آپ کو چھپا رہا۔ وہ سب کچھ جانتے تھے۔ چمپا نے وعدہ خلافی کی تھی اور انھیں سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ چپکے چپکے ابا جان کو تلاش کرتے رہے۔ مجھے ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ چلتے وقت انھوں نے مجھے بتایا.... انھوں نے مجھے لاڈلے کے نام سے پکارا تھا، کہا تھا۔ لاڈلے! مجھے افسوس ہے...."

"آگے بات کر لاڈلے!" جُھل اضطراری لہجے میں بولا۔

"آگے پھر کیا تھا۔" جسے جانا تھا، وہ چلا گیا۔ سارا گھر اُجڑ گیا۔ اُن کی ایک ماں تھی۔ اُس نے ارتھی سے سر ٹکایا تو پھر اُٹھایا نہیں۔ دونوں کو ایک ساتھ جلا دیا گیا۔ شروع شروع میں بڑا چرچا رہا۔ اخبار بھی لکھتے رہے، جلسے ہوتے رہے، مظاہرے ہوتے مگر اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ ایس پی شکلا کرشنا جی کی بہت عزت کرتا تھا۔ وہ روز گھر آتا تھا۔ اُس نے بتایا کہ کرشنا جی اپنی تمام جائداد میرے نام کر گئے ہیں۔ وہ مجھے مدراس لے گیا۔ ابا جان اُدھر خزانے کی تلاش میں نہ جانے کہاں مارے مارے پھر رہے ہیں اور بیٹے پر دولت کی بارش ہو رہی ہے۔ کرشنا جی کی تمام جائداد بیچ کے ساڑھے آٹھ لاکھ روپے میرے

نام بینک میں جمع کر دیے گئے۔"

"لاڈلے!" جُھل نے حیرت سے کہا۔

"میں نے یہ دن ضائع نہیں کیے جُھل بھائی!" میں نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں نے دولت بنائی ہے۔ میں لکھ پتی آدمی ہوں۔ ہزاروں کی حویلی اور جاگیروں کا بھی میں ہی مالک ہوں۔ تم بھی اپنا تمام سب میرے نام کر دو۔"

"لاڈلے! تُو نے ایسی باتیں کہاں سے سیکھ لیں۔ کلیجا چھلنی کیے جاتا ہے، بس کر۔ میں نے تو تجھے نہیں سکھائی تھیں یہ باتیں۔ تُو تو مجھ سے بڑا چاقو باز نکلا، تیرا چاقو تو نظر بھی نہیں آتا۔"

"تم جو چاہے کہہ لو۔ میں نے تم سے تقریباً ہر بات کہہ دی ہے۔ یقین کرو میں نے کرشنا جی کی ارتھی پر عہد کیا تھا کہ میں اُن کے گنہ گاروں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ وصیت کا تو مجھے بعد میں پتہ چلا۔"

"میں سمجھتا ہوں۔ مجھ سے صفائی مت کر۔"

"میں اکیلا یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ شہر میں میرا ایسا کوئی جاننے والا بھی نہیں تھا۔ شمبھو بہت اثر و رسوخ کا آدمی تھا اور مجھے بہت سے لوگوں نے کرشنا جی کے ساتھ رہتے ہوئے اور اُن کے ساتھ گھومتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے خاصا وقت گزارا تاکہ انھیں کرشنا جی سے میرا تعلق بھولنے کا وقت مل جائے۔ پھر مجھے اُنھیں تلاش بھی کرنا تھا کہ وہ کون ہیں جو شمبھو کے آلۂ کار تھے۔ میں کس سے پوچھتا۔ بتاؤ، میں کس سے پوچھتا کہ کرشنا جی کا قاتل کون ہے۔ اس کے لیے مجھے کسی باڑے میں آنے کی ضرورت تھی، آدمیوں کی ضرورت تھی۔ سو مجھے یہ سب کچھ کرنا پڑا۔ میں نے شمبھو کو مار دیا ہے جُھل بھائی! تواڑی ابھی باقی رہ گیا ہے۔ جب تک میں اُس کا خون نہیں دیکھ لوں گا، کرشنا جی کی روح مجھ سے شکایت کرتی رہے گی۔ میں نے شمبھو کو پہلے اس لیے مارا کہ وہی بنیاد تھا۔ میں نے سوچا، پہلے اُن کی بنیاد اُکھاڑ دوں۔ سمجھے تم؟ مجھے ان کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مجھے تو دُنیا ہی سے دلچسپی نہیں ہے۔"

"لاڈلے!" اُس نے میری گردن اپنے بازو میں جکڑ لی۔ "میرے لاڈلے! تو مجھے بھی تو بلا سکتا تھا۔ تُو اکیلا کیوں رہا؟ کیا میں مر گیا تھا؟ کیا ہم سب مر گئے تھے؟"

"مگر تمھارے ساتھ بھی وہی مسئلہ رہتا۔ پہلے تو یہ بات طے کرنی تھی کہ وہ کون لوگ ہیں۔ اور یہ پہچان کسی اڈّے کے بغیر ممکن نہیں تھی اور تم تو یہاں موجود ہی تھے۔"

"میں...!" وہ چیخ کر بولا۔

"ہاں تم... یہ سب کچھ تمھی نے تو مجھے دیا تھا۔"

"گالی دے رہا ہے لاڈلے!"

"تم مجھ سے ایسی اُمید رکھتے ہو۔" میں نے درشتی سے کہا۔

"نہیں لاڈلے! نہیں، میرا دماغ جل جائے اگر میں ایسا سوچوں پر لاڈلے! میں نے تجھے اور بہت سی باتیں بھی تو بتائی تھیں۔ میں نے کہا تھا، چاقو ہر جگہ نہیں چلتا اور دوسرے کی کمنگی ہمیشہ سامنے رکھنا۔"

"میں کوئی بات نہیں بھولا، مجھے سب یاد ہے۔ تم نے یہ بھی تو بتایا تھا کہ کبھی کبھی چاقو سے اپنی انگلی بھی کاٹ لینی چاہیے اور تم نے یہ بھی بتایا تھا کہ چاقو اُن لوگوں کو نہیں اُٹھانا چاہیے جو زمین کے اوپری حصّے سے محبت کرتے ہوں۔"

"ہاں! میں نے کہا تھا۔" وہ کرب سے بولا۔ "پر لاڈلے! تُو مجھے ایک اشارہ کر دیتا، تجھے میرا خیال کیوں نہیں آیا۔ اگر چمپا جامو کو خط نہ لکھتی تو میں تیری صورت دیکھنے ہی کی آرزو میں مر جاتا۔"

"چمپا نے جامو کو خط لکھا تھا؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"وہ تیری طرف سے نااُمید ہو گئی تھی۔ تُو روز روز گھر سے غائب رہنے لگا تھا اور کچھ بتاتا بھی نہیں تھا اور وہ دونوں لونڈے تیرے پاس گھر آیا کرتے تھے۔ وہ کبھی خط نہ لکھتی مگر جب مجبور ہو گئی تو اُسے جامو کو لکھنا پڑا۔"

"چمپا نے تمھیں بھی تنگ کیا۔ وہ ایسی ہی ہے، پہلے ممی کو کرتے پر بٹھایا۔ پھر میرے پیچھے پڑ گئی اور کرشنا جی کو سب کچھ بتا دیا اور اب تمھیں......"

"غصّہ مت کر۔ جو معافی مانگ لے اُس کے لیے دل بڑا کر لینا چاہیے۔ وہ عورت کیا کر سکتی تھی۔ اُس نے تیرے بھلے ہی کے لیے جامو کو لکھا تھا۔ چمپا کو معاف کر دے لاڈلے! یہ سارا گورکھ دھندا ہے۔ تو کس کس کا گریبان پکڑے گا اور کہاں کہاں چاقو نچائے گا۔ ہو سکے تو اس دُنیا کو آگ لگا دے۔"

"وہ سامنے رہتی ہے تو مجھے ممی یاد آنے لگتی ہے۔"

"اتنی بڑی معافی کوئی نہیں مانگتا۔ ذرا یہ تو سوچ لے کہ اُس کا کیا قصور تھا۔ جانے دے لاڈلے! میری خاطر، ممی کی خاطر اور اُس کی خاطر جس کے لیے تُو نے اپنا یہ حال کر رکھا ہے۔ جانے دے۔ کوئی اور بات کر۔ یہ بتا کہ تُو نے تواڑی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

"ابھی میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"اب تُو بے فکر ہو جا، میں آ گیا ہوں، تیرا عہد پورا ہونا چاہیے، وہ ضرور پورا ہو گا چاہے مجھے باقی عمر جیل ہی میں گزارنی پڑے۔"

"تو پھر بات ہی کیا ہوئی، یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں۔"

"تُو تو بڑا شیر ہے، شیرِ ببر۔ مگر تجھے کیا ضرورت پڑی ہے، میں جو موجود ہوں۔ تُو کہے تو میں ابھی اُس کا سر کاٹ کے لے آؤں۔"

"تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟"

"دیکھ لاڈلے! شمبھو کو مارنے کے بعد تُو نے تواڑی کو ویسے بھی آدھا کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لونڈا گیری پہ اُتر آیا ہے۔ ذرا صبر کر لے پھر سب کچھ تیرے سامنے آ جائے گا۔ ویسے جو تُو چاہے، وہی ہو سکتا ہے۔"

"میں کرشنا جی کے قاتل کو زندہ دیکھنا نہیں چاہتا۔"
"ٹھیک ہے لاڈلے! ٹھیک ہے۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔
"اب کئی مہینے گزر چکے ہیں۔ مجھے جانا ہے۔"
اُس نے شاید میری بات نہیں سُنی۔ وہ بیٹھے بیٹھے اچانک کھلی آنکھوں سے جیسے سو گیا۔ پھر ایک دم چونک کے اُٹھ بیٹھا اور میری گردن میں ہاتھ ڈالے ہوئے پاڑے میں گھومتا رہا۔ اُس نے پاڑے کا وہ حصہ بھی دیکھا جہاں زور ہوتا تھا۔ اُس وقت بھی وہاں چند آدمی زور آزمائی میں مصروف تھے۔ بجھل وہاں چند ہی لمحے ٹھیرا اور پاڑے سے باہر آ کے گلی کے نکڑ تک چلا آیا۔ حسبِ معمول نکڑ پر پاڑے کے تین چار آدمی موجود تھے۔ اُدھر سے جامو اور کانتے واپس آ رہے تھے۔ انھوں نے ہمیں دُور سے دیکھ لیا اور لپکتے ہوئے ہمارے پاس آ گئے۔ کانتے نے آنکھیں مسلنی شروع کر دی تھیں۔ جامو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ مٹّا کانتے کی ٹانگوں کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔ مارتی جامو اور کانتے پیچھے کھڑے تھے۔ بجھل نے مارتی کو ہاتھ کے اشارے سے قریب بلایا۔ مارتی نظریں جھکائے جھکتا ہوا اُس کے رُوبرو پہنچا تو بجھل نے نرم آواز میں اُسے مخاطب کیا۔ "مارتڑا! میرے لیے حقّے کا انتظام کر۔"
"دادا!" مارتی نے سسکی سے اُسے پکارا اور اُس کی پنڈلیاں پکڑ لیں۔ بجھل نے مارتی کے بال پکڑ کے سر جھنجوڑ دیا۔ یہ دیکھ کے مٹّا بھی اُچھلتا ہوا بجھل کی ایک ٹانگ سے لپٹ کے رونے لگا۔ بجھل نے اُس کی گردن میں پنجہ ڈال کے اُسے اُٹھایا اور زمین پر چھوڑ دیا۔ مٹّا قلابازیاں کھاتا، اچھلتا کودتا ہوا مارتی کے ساتھ چوک کی طرف بھاگنے لگا۔

✿ شام کو بجھل درمیان میں گاؤ تکیے کے سہارے چوکے پر بیٹھا ہوا حقہ پی رہا تھا۔ اُس کے دائیں بائیں جامو اور کانتے تھے۔ پاڑے کے پرانے لوگ بھی چوکے پر اُس کے ساتھ بیٹھے تھے۔ بجھل کے آگے ہاروں اور پھولوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ چوکے کے نیچے بھی پاڑے کے بہت سے آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ علاقے سے اچھی خبریں نہیں آئی تھیں۔ سہ پہر کو بجھل میرے ساتھ بالم خاں سے حاصل کیا ہوا اڈّا بھی دیکھ آیا تھا۔ علاقے میں پولیس موجود تھی۔ معلوم ہوا کہ تیواڑی کے کئی آدمیوں نے علاقے میں گڑبڑ کرنے اور خوف و ہراس پھیلانے کی کوشش کی مگر پولیس موجود تھی اس لیے بات آگے نہیں بڑھ سکی۔ میں نے اپنے آدمیوں کو پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ وہ جہاں تک ہو سکے، برداشت کریں۔ پاڑے کے گرفتار لوگوں کی ضمانت کل تک کے لیے ملتوی ہو گئی تھی۔ بجھل کو دیکھ کے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس پاڑے میں اور اس کے آدمیوں کے درمیان عرصے سے رہ رہا ہو۔ رات ہوئی تو اُس نے مجھے حکم دیا کہ میں کانتے کو اپنے ساتھ لے کے گھر چلا

[1] چوکی نما پختہ چبوترے کو یہاں چوکے کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

جاؤں۔ میں نے اصرار کیا کہ وہ بھی ساتھ چلے مگر وہ وہیں ٹک گیا۔ میں آج رات وہاں سے ہٹنا نہیں چاہتا تھا۔ دن بھر تیواڑی کے آدمیوں کی جا بے جا دھمکیاں کانوں میں پڑتی رہی تھیں۔ بجھل نے سختی کے ساتھ مجھے گھر واپس جانے کا حکم دے دیا۔ پاڑے کے لوگ بھی میری طرف سے کچھ بے نیاز سے ہو گئے تھے اور بجھل کے گرد مجمع لگائے بیٹھے تھے۔ مجبوراً مجھے کانتے کو لے کے گھر آنا پڑا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں بجھل زیادہ مشتعل نہ ہو جائے۔ وہ یہاں بمبئی میں اجنبی ہے۔ میں نے تیواڑی کی بابت اُسے ہر بات بتا دی تھی۔ پھر بھی بجھل سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ کیا کر بیٹھے۔ پاڑے کے لوگ بھی اُسے برانگیختہ کر سکتے تھے۔ میں وہاں سے چلا تو آیا لیکن میرا دل وہیں اٹکا رہا۔
انھوں نے ہماری آہٹ ہی سُن کے دروازہ کھول دیا۔ جولین نے اپنے سینے پر فوراً صلیب کا نشان بنایا۔ چمپا کے ہونٹ بُدبُدانے لگے۔ دونوں بہت بے چین تھیں۔ "وہ کہاں ہیں؟" جولین نے سراسیمگی سے پوچھا۔
"وہ کہیں اور ٹھیر گئے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔
"سب خیریت تو ہے۔"
"ہاں مگر تم اتنی پریشان کیوں ہو؟"
"بس کیا بتاؤں۔" وہ بے تابی سے بولی۔
"تمھارے لیے فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔"
"کیسے نہیں ہے۔" وہ ترشی سے بولی۔
کانتے میرے ساتھ تھا، چمپا بھی موجود تھی۔ میں نے اُس سے زیادہ ضد بحث نہیں کی۔ جولین کے چہرے پر سفیدی چھائی ہوئی تھی۔ وہ اتنی دبلی اور کمزور ہو گئی تھی جیسے برسوں کی بیمار ہو۔ میں کانتے کے ساتھ اپنے کمرے میں چلا آیا۔ ہمارا کھانا بھی وہیں آ گیا۔ کانتے میرے برابر کے بستر پر لیٹ گیا اور فیض آباد سے میرے جانے کے بعد کا تمام حال سُنانے لگا۔
"زرّیں کیسی ہے؟" میں نے چپکے سے پوچھا۔
"بی بی تو تاج بی بی ہے لاڈلے! میں نے ایسی اچھی لڑکی نہیں دیکھی۔ اُستاد کے ساتھ میں اُسی کی حویلی میں ٹھیرتا تھا۔ کیا مجال جو آنکھ اُٹھا کے دیکھ لے۔ ہمیشہ نظریں نیچی رہتی ہیں اور دوپٹا سر پر۔ مجھے بھائی کہتی ہے کانتے بھائی۔ جب وہ مجھے بھائی کہتی ہے لاڈلے تو میرا جی چاہتا ہے اپنی چھاتی میں چاقو مار لوں۔ اُس پر ساری دُنیا کی دولت لٹا دینے کو جی چاہتا ہے۔ پر میں اپنی جان ہی اُس پر نچھاور کر سکتا ہوں۔ جب سے تو نکلا ہے، بی بی نے کبھی تیرا نام نہیں لیا۔ کبھی اُستاد سے تیرا نہیں پوچھا۔ وہ اُستاد کے آنے سے اتنی خوش ہوتی ہے کہ بس بتایا نہیں جا سکتا۔ اُستاد نے جب بھی تیرا ذکر اُس کے سامنے کیا، وہ اُٹھ کے چلی گئی۔ نوکرانی بتاتی تھی کہ وہ چپکے چپکے روتی رہتی ہے۔ لاڈلے! کیا تجھے بھی وہ یاد آتی ہے؟"

"آتی ہے۔" میں نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔
"آتی ہوگی، ضرور آتی ہوگی۔" وہ مچل کے بولا۔ "وہ یاد آنے کی چیز ہے۔ پر لاڈلے تُو نے اُسے ایک خط ہی لکھ دیا ہوتا۔"
"کانتے! ایسی باتیں مت کر۔" میں نے بیزاری سے کہا۔
"کیوں لاڈلے! کیا تیری اُس سے لڑائی ہو گئی تھی؟"
"نہیں۔"
"تو پھر کیا بات ہے؟"
"پتہ نہیں۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "کچھ اور بات کر۔ آ پاڑے واپس چلتے ہیں، ابھی رات زیادہ نہیں ہوئی ہے۔"
"اُستاد نے حکم دیا ہے کہ رات گھر ہی گزاری جائے۔"
مجھ سے ایک پل بھی نہیں کاٹا جا رہا تھا۔ کانتے باتیں کرتے کرتے سو گیا۔ اُس پر طویل سفر کی تھکن سوار تھی۔ مجھے نیند نہیں آئی۔ کچھ دیر تک میں یوں ہی بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر باہر آ گیا۔ ڈرائنگ روم میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے اندر جھانک کے دیکھا تو جولین ٹیبل لیمپ کی مدھم روشنی میں خاموش بیٹھی تھی۔ لیمپ کی روشنی میں اُس کا آدھا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ کرسی پر گردن ڈھلکی ہوئی تھی۔ میں دیر تک وہیں کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کی زرد ساڑی کا پلو کرسی کے بازو پر گرا ہوا تھا۔ روشنی میں اُس کی ٹھوڑی اور ہونٹ چمک رہے تھے۔ میں دبے قدموں سے اُس کے پاس پہنچا۔ اُس کی طبیعت زیادہ خراب معلوم ہوتی تھی۔ چار ہی دن پہلے اس گھر میں موت ہوئی تھی اور مجھے اُس کے باپ کے جنازے میں شریک ہونے کی فرصت بھی نہیں ملی تھی۔ میری آہٹ سے اُس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ گھبرا گئی۔ "کیسی طبیعت ہے تمھاری؟" میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں پوچھا۔
"ٹھیک ہوں۔" وہ جلدی سے انگریزی میں بولی اور اپنی ساڑی کا پلو درست کرنے لگی۔ "تم سوئے نہیں؟"
"نیند نہیں آ رہی ہے۔" میں نے اپنی پیشانی رگڑتے ہوئے کہا۔
"کیا سر میں درد ہو رہا ہے؟ دبا دوں؟"
"نہیں۔ درد نہیں ہے۔"
"بیٹھ جاؤ۔"
میں اُس کے برابر کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ "تم کیوں نہیں سوئیں؟"
"میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔"
"تو میں دبا دوں؟" میرے منہ سے نکل گیا۔
"تم!" اُس کی آواز کانپ گئی۔ "نہیں، نہیں۔"
"کیوں؟"
"بس نہیں۔" وہ کسمساتی ہوئی بولی۔
میں نے تکرار نہیں کی۔ چند لمحے توقف کے بعد میں نے ہچکچاہٹ سے کہا۔ "تم کسی ڈاکٹر کو دکھاؤ نا۔ صبح میرے ساتھ چلنا۔"
"ہاں۔" وہ بھنچی ہوئی آواز میں بولی۔
"اور تم کسی بات کی فکر مت کرو۔"
"ہوں۔" اُس نے ساڑھی کا پلو دانتوں میں دبا لیا۔
"سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے زور دیتے ہوئے کہا۔ مجھے احساس ہوا کہ لوگ مجھ سے بھی اسی طرح کہتے ہوں گے۔ کسی کو یہ خیال نہیں ہوتا ہوگا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے مگر ایک آدمی دوسرے سے اس کے سوا اور کہہ بھی کیا سکتا ہے۔ وہ اگر اتنا بھی نہ کہے تو کیا کہے۔ میں جولین کے باپ کو مرنے سے نہیں روک سکتا تھا۔ میں نے فوراً بات بدل دی۔ جولین کے لیے اُس کے باپ کا ذکر تکلیف دہ ہوگا۔ میں نے کہا۔ "تم کہتی تھیں کہ تم مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہو۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ اسکول چھوڑ دو اور باقاعدہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لو۔ اب تمھیں کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے تمھارا دل بھی بہل جائے گا اور تم بہت عالم فاضل بھی ہو جاؤ گی۔"
"کیا تمھاری یہی خواہش ہے؟" اُس نے جھنجھناتی ہوئی آواز میں پوچھا۔
"میں تو یہی سمجھتا ہوں۔"
"اور تم۔" وہ شکایتی لہجے میں بولی۔ "تم نے مجھ سے یہ کیوں چھپایا تھا کہ تم پڑھے لکھے ہو۔ مجھے تو پہلے ہی شبہ ہو گیا تھا۔ اب سوچتی ہوں تو..."
میں نے حیرانی سے اُسے دیکھا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے یاد آ گیا کہ صبح بجھل کی تمام باتیں اُس نے سُن لی ہوں گی۔ "میں کرشنا جی کو بتانا نہیں چاہتا تھا۔"
"تم نے کہاں تک پڑھا ہے؟" اُس نے اشتیاق سے پوچھا۔
"اب تو سب کچھ بھول گیا ہوں۔"
"اب بھی چھپاؤ گے؟"
"ہاں، اب چھپانے کے لیے کیا رہ گیا ہے۔"
"بتاؤ نا۔ اچھا ابھی نہیں، ٹھیرو۔ میں تمھارے لیے چائے بنا کے لاتی ہوں۔" وہ کرسی سے اُٹھ گئی۔ میں اُسے روکتا رہا مگر وہ رُکی نہیں۔ اُس نے منٹوں میں چائے بنا لی اور آ کے اپنی جگہ بیٹھ گئی۔ اُسے خوش دیکھ کے مجھے بہت خوشی ہوئی۔ کسی کو خوش دیکھ کے مجھے رشک آتا تھا کہ آدمی کتنی جلدی خوش ہو جاتے ہیں۔ اُس کا خیال تھا کہ میں اُسے سب کچھ بتا دوں گا اور کوا کو رُسوا کر دوں گا تاکہ وہ ملے تو اُس کے سامنے میرا سر نہ اُٹھ سکے کہ میں نکما، میں نکھٹو، میں چھچھورا ساری دنیا سے ذلیل کرتا رہتا تھا، سب سے اُس کی شکایت کرتا پھرتا تھا۔ جولین کی ضد پر اپنی تعلیم کے سوا میں نے اُسے کچھ نہیں بتایا۔ ظاہر ہے، چمپا کا پیٹ بہت ہلکا تھا۔ رہی سہی کسر بجھل نے آ کے پوری کر دی۔ اچھا ہوا کہ کرشنا جی کا ذکر چل نکلا۔ اُن کا ذکر ہمیشہ نیا معلوم ہوتا تھا۔ وہ مجھے

اُن کی ایسی دلچسپ باتیں بتلانے لگی جن کا خود میں نے بھی مشاہدہ نہیں کیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ جولین کی نظر کتنی گہری ہے اور کیسی کیسی جزئیات پر جاتی ہے۔

جب رات بہت ہوگئی تو میں نے اُسے ہدایت کی وہ اپنے کمرے میں جاکے سو جائے۔ گلی میں کتّے بھونک رہے تھے۔ چوکی دار کی آواز ایک دم گونجتی تھی اور دیر تک اُس کی چاپ سُنائی دیتی تھی۔ جولین ہچر مچر کرتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں ڈرائنگ روم کی روشنی گل کرکے واپس اپنے کمرے چلا آیا۔ کانتے گہری نیند سو رہا تھا۔ اُس کی موجودگی میں مجھے اپنی مالا گلے سے اُتارتے ہوئے اچھا نہیں لگا۔ گریبان میں ہاتھ ڈال کے میں اُس کے دانوں پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ کہیں صبح کے آخری وقت میری آنکھ لگی ہوگی۔

میرا ارادہ تھا کہ ہم صبح سویرے پاڑے کی طرف روانہ ہوجائیں گے لیکن کانتے کے اُٹھنے، نہانے اور لباس تبدیل کرنے میں دیر ہوگئی۔ میں نے اُسے اپنے کپڑے پہننے کو دے دیے تھے۔ سفید کُرتے اور پاجامے میں اُس کا رنگ روپ نکل آیا تھا۔

جولین کو دیکھ کے مجھے یاد آیا کہ میں نے رات اُس سے کیا کہا تھا۔ وہ بہت ہشّاش بشّاش تھی۔ کہنے لگی، اب طبیعت ٹھیک ہے، ڈاکٹر کے پاس پھر کسی وقت چلیں گے۔ مجھے بھی پاڑے پہنچنے کی جلدی تھی۔ ابھی ہم دروازے سے نکلے ہی تھے کہ ایک پولیس گاڑی آکے رُکی۔ کانتے نے میرا بازو پکڑ لیا مگر وہ ایس پی شکلا تھا۔ شکلا گاڑی سے اُترتے ہی میرے گلے سے لگ گیا۔ "کہاں ہو تم؟ —" وہ کبیدہ لہجے میں بولا۔ "میں نے اتنے پھیرے کیے مگر تم آج ملے۔"

"میں تو یہیں تھا شکلا جی!" میں نے بشاشت سے کہا۔

"کہاں تھے —— ممیا پیدی اور جولین سے پوچھو۔ میں کتنی بار آیا ہوں، انھوں نے تمھیں کچھ نہیں بتایا؟"

"بس اتفاق ہے کہ میں آپ کو نہیں مل سکا۔"

"اور تم نے بھی میری طرف آنے کی کوشش نہیں کی۔ خیر، یہ بتاؤ، اب تم کیسے ہو۔ کیا ارادہ ہے؟"

"ارادہ کیا۔" میں نے شکستہ لہجے میں کہا۔ "آئیے اندر بیٹھیے۔"

"نہیں، میں پھر آؤں گا۔ وہی قتل و غارت گری کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے ظہیر خاں! تم کسی وقت ملو تو میں تمھیں بڑی دلچسپ باتیں بتاؤں۔" اُس نے کانتے کی طرف دیکھ کے پوچھا۔ "یہ کون ہیں؟"

"یہ میرے دوست ہیں کانتے۔"

"کانتے۔" اُس نے کانتے کو نمسکار کیا۔ کانتے شرمانے لگا۔

"اندر بیٹھیے نا۔"

"مگر چند منٹ۔ اور کوئی تکلف نہیں ہوگا۔"

"بالکل نہیں۔ جیسا آپ حکم کریں گے۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

ہم ڈرائنگ روم میں آکے بیٹھ گئے۔ شکلا نے منع کیا مگر چپا چائے لے آئی۔

"تم نے سُنا،" شکلا میرے کان میں رازدارانہ انداز سے بولا۔ "سیٹھ شمبھو قتل ہوگیا ہے۔"

"ہاں سُنا تو ہے۔"

"بس اب کچھ دنوں میں، میں تمھیں ایک خوش خبری ضرور سناؤں گا۔"

"وہ کیا —؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"کچھ دن اور انتظار کرو۔"

"کچھ بتائیے نا۔" میں نے اصرار کیا۔

"مگر اپنے تک رکھنا۔" وہ اِدھر اُدھر نظریں گھما کے بولا۔ کانتے فاصلے پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے وعدہ کیا تو شکلا نے سرگوشی کی۔ "کرشنا جی کے قاتلوں کا اب جلد ہی پتہ چل جائے گا۔"

"وہ کیسے؟"

"بس کیسے ویسے مت پوچھو۔"

"کون لوگ تھے؟" میں نے اضطراب سے پوچھا۔

"سامنے آجائیں گے، سامنے آجائیں گے ظہیر خاں!" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ "شمبھو کے مرنے کے بعد صورتِ حال خاصی بدل گئی ہے۔"

"وہ شمبھو ہی تھا نا؟"

"ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن . . ." وہ فکرمندی سے بولا۔ "مگر پولیس کے جو افسران کرشنا جی کی بہت عزت کرتے تھے، وہ اب خاصے مطمئن نظر آتے ہیں۔"

"صرف مطمئن؟" میں نے زہرخند سے کہا

"کسی حد تک شیور۔" وہ جوش میں بولا۔

"تو وہ کون تھے؟ مجھے ذرا اشارہ کر دیجیے۔"

"یہ میں ابھی نہیں بتا سکتا۔ چند دن اور انتظار کرو۔ بڑے بڑے انکشافات کی توقع ہے۔ مرکزی حکومت کے دل میں بھی تمھاری طرح کرشنا جی کی موت کی پھانس پھنسی ہوئی ہے۔"

"پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔

"میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر کرشنا جی کی موت اتنی آسانی سے ہضم کرلی گئی تو پولیس کی ملازمت چھوڑ دوں گا لیکن اب شاید مجھے اپنا ارادہ بدلنا پڑے۔ میں اپنے طور پر کام کر رہا تھا ظہیر خاں! میں نے مرکزی حکومت کو چوری چھپے بہت سے خط لکھے ہیں۔"

"تو کیا شمبھو کا قتل مرکزی حکومت نے کرا دیا؟"

"نہیں۔ بالکل نہیں، میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کیسے ہوا۔ میں سمجھتا ہوں"

شمبھو کے لوگ ہی اُس سے ناراض ہوگئے ہوں گے یا شمبھو کے مخالف گروپ نے ایسا کرایا ہوگا لیکن اس سے وہ رکاوٹ ضرور دُور ہوگئی جو اُس کی زندگی میں ہر قدم پر آڑے آتی تھی۔"

"آپ تو تمام راز فاش کیے دے رہے ہیں۔"

"اوہ۔" وہ گھبرا کے بولا۔ "مگر یہ صرف ایک قیاس ہے۔"

"ٹھیک ہے شکلا جی! آپ اپنا کام کیے جائیے میں . . . ." میں نے اپنی زبان دانتوں میں دبالی۔ "میں آپ کا منتظر رہوں گا۔"

"اب میں آتا رہوں گا بشرطیکہ تم ملے اور ہاں ایک خاص بات۔" وہ جھک کے بولا۔

"دو جگہ سے میرے ریمائنڈر کے جواب آئے ہیں۔"

"کیا —؟" میں کھڑا ہوگیا۔

"یہ جواب آیا ہے کہ تمھارے ابّا جان جیسی شکل و صورت کے ایک آدمی دیکھے گئے تھے لیکن اب وہ وہاں نہیں ہیں۔ ایک خط سورت سے آیا ہے ایک بھوپال سے۔ گویا وہ بھوپال اور سورت میں بھی رہے۔" وہ تاسف سے بولا۔

"اور کیا لکھا تھا؟" میں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"اور کوئی خاص بات نہیں ہے۔ یہ بھی اس لیے ہوا کہ میں نے ایک دن اُن تمام پتوں پر پھر ریمائنڈر ڈالے جن پر کرشنا جی نے سرکلر بھیجے تھے۔ دو جگہ سے جواب آگیا۔ مجھے اُمید ہے کہ جلد ہی تم کوئی اچھی خبر سُن لوگے۔"

"آپ نے بھوپال اور سورت بتایا نا؟"

"سورت کے خط میں تو کوئی خاص بات نہیں ہے۔ صرف اتنا لکھا ہے کہ کبھی ایک صاحب اس شکل و صورت کے سورت کے ایک محلّے میں رہتے تھے مگر برسوں گزر گئے، اب وہ وہاں نہیں ہیں۔"

"اور بھوپال میں؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"بھوپال کے خط میں ذرا وضاحت ہے۔ لکھا ہے کہ یہ صاحب اپنے خاندان کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ محلّے والوں سے بہت کم ملتے جلتے تھے۔ شاذ و نادر ہی باہر نکلتے تھے۔ پھر ایک دن اپنے خاندان سمیت اچانک کہیں چلے گئے۔ کسی کو اُن کا پتہ معلوم نہیں ہے کیونکہ وہ کسی کو بتا کے نہیں گئے تھے۔ جواب آئے ہوئے تو تین چار روز ہوگئے۔ میں مصروفیت کی وجہ سے نہیں آسکا اور سوچتا تھا کہ یہ جواب بتا کے میں تمھیں اور پریشان کروں گا۔ اِس وقت بات منہ سے نکل گئی۔ مجھے معاف کرنا، تمھیں دُکھ ہوا ہوگا۔"

"نہیں شکلا جی! کس کس بات کا دُکھ کیا جائے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ مارے مارے پھر رہے ہوں گے۔ وہ یہاں نہیں ہیں مگر کسی نہ کسی شہر میں تو ضرور ہوں گے۔"

"مگر ایسا کیوں ہے؟" وہ اُداسی سے بولا۔

"ایسا یوں ہے کہ اُس خاندان میں ایک میں پیدا ہوگیا تھا۔" جلد ہی مجھے احساس ہوگیا کہ میں شکلا کے سامنے یہ کیا کہہ رہا ہوں۔ "شکلا جی! کہیں سے کوئی اور خط آئے تو مجھے ضرور بتائیے گا۔"

ہماری گفتگو ہمی تک محدود تھی۔ کسی اور نے اُسے نہیں سُنا۔ البتہ کانتے بے چین ہو رہا تھا۔ شکلا کو ہم سے زیادہ عجلت تھی۔ اُس کے جاتے ہی ہم گھر سے نکل گئے۔ کانتے مجھ سے پوچھتا رہا کہ ایس پی شکلا مجھ سے کیا باتیں کر رہا تھا۔ میں نے اُسے ٹال دیا لیکن میں خود کو نہیں ٹال سکا۔ شکلا نے ابّا جان کا ذکر کرکے میرے اوسان چھین لیے تھے۔ اتفاق سے ہمیں ٹیکسی مل گئی۔ علاقے میں آج پولیس کل سے زیادہ تھی۔ بڑے چوراہے پر بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ میں نے ٹیکسی رکوا کے اُترنا چاہا مگر کانتے نے مجھے روک لیا اور سیدھے پاڑے چلنے پر زور دیا۔ پاڑے کی گلی کے نکڑ پر بھی پولیس موجود تھی۔ عمارت کے باہر بھی معمول سے زیادہ سرگرمی دکھائی دے رہی تھی۔ کانتے نے ٹیکسی عمارت کے سامنے ہی رکوائی۔ ابھی میں اندر داخل نہیں ہوا تھا کہ معلوم ہوا، رات کسی وقت تیواڑی کے آدمیوں نے علاقے میں گھس کے بلوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ لڑائی میں شندھا مارا گیا اور رتن زخمی ہوگیا۔ صبح سے پولیس کے کئی افسر پاڑے آچکے تھے۔ استاد تھل نے سب کو منع کر دیا تھا کہ وہ تیواڑی کے آدمیوں کا نام نہ لیں۔ کہہ دیں کہ حملہ آور پہچانے نہیں گئے۔ پولیس میں یہی بیان لکھوا دیا گیا تھا۔ رتن اسپتال میں پڑا تھا اور شندو کی لاش آنے والی تھی۔

میں اندر داخل ہوا تو تھل حقہ پی رہا تھا۔ زورا اُس کے بائیں بازو بیٹھا ہوا تھا۔ منّا اُس کے پیر دبا رہا تھا اور جامو ایک طرف گاؤ تکیے سے لگا سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

"لو لاڈلا آگیا۔" تھل نے مجھے دیکھتے ہی صدا لگائی۔ "جامو ذرا دیکھنا۔ یہ اس کے ساتھ کون نواب کا بچہ حرام زادہ آ رہا ہے۔"

جامو کی نظر جیسے ہی کانتے پر پڑی، وہ اپنی نشست سے اُچھل پڑا۔ "یہ تو کچھ کانتے دکھائی پڑتا ہے۔" اُس نے دھیمے لہجے کہا۔

میں تیزی سے چوکے پر چڑھ گیا۔ "یہ دروازے میں لوگ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟" میں نے پریشان لہجے میں پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"سانس سنبھال۔" تھل نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ "آنے میں دیر کر دی شہزادے؟" وہ تیکھی آواز میں بولا۔

"نکلتے نکلتے دیر ہوگئی مگر . . . مگر . . ."

"جو تو نے سُنا ہے ٹھیک ہے۔" وہ سکون سے بولا۔ "پر تو نے کوئی غلط بات تو نہیں سنی ہے اور نہ یہ کوئی نئی بات ہے۔ سپاہی میدان میں مارا گیا۔ تیراک پانی ہی میں ڈوبتا ہے۔"

"مگر یہ ہوا کیا؟" میں نے غصّے سے کہا۔

"ہوتا کیا۔ شندو کا وقت آگیا تھا۔"

"اوہ نہیں۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "آج یہ ہوا ہے کل کچھ اور ہو سکتا ہے۔ انھوں نے ہمارے علاقے میں گھس کے ہمارے آدمی کو مار دیا۔ وہ کیسے لوگ ہیں۔"

"اور کیا وہ اپنے علاقے میں لے جا کے مارتے۔" وہ مسکرا کے بولا۔ "ہاتھ کھلے تھے، پولیس اونگھ رہی تھی۔ وہ آ گئے۔ کیا تیرا پاڑا کوئی قلعہ ہے رے؟"

"مگر یہ ناقابلِ برداشت ہے۔" غصے سے میری آواز لرزنے لگی۔

"ہے تو۔ پر تو اطمینان سے تو بیٹھ۔"

"تم... تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"کچھ نہیں۔" وہ سادگی سے بولا۔ "تندو کی موت کا مجھے بھی دکھ ہے۔"

"پھر؟" میں نے وحشت سے کہا۔

اُس نے میرا زانو دبایا اور آنکھیں بند کر کے مجھے تحمل کی تلقین کی۔ میں اُس کی صورت دیکھتا رہ گیا۔ تجھل نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ یہ تو بہت بڑی بات تھی۔ میں نے کچھ کہنا چاہا تو اُس نے دوبارہ مجھے تھپکی دے کے خاموش کر دیا۔ "وہ آیا نہیں؟" اُس نے الجھے ہوئے لہجے میں زورا سے پوچھا۔

"بس آتا ہی ہوگا دادا!" زورا نے تردد سے جواب دیا۔

"کون؟" میں نے درمیان میں دخل دیا۔

"چھیدا۔" تجھل نے آہستگی سے کہا۔ "اُسے ذرا کام سے بھیجا ہے۔"

میں نے کام کی نوعیت نہیں پوچھی اس لیے کہ مجھے تجھل سے کسی اطمینان بخش جواب کی توقع نہیں تھی۔ "مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" موقع دیکھ کے میں نے چپکے سے کہا۔

"کیا بات ہے؟" اُس نے پہلی بار توجہ دی۔

"یہاں مناسب نہیں ہے۔" لیکن وہاں سے اُٹھنا بھی مناسب نہیں تھا۔ میں نے اُس کے کان میں بات ڈال دی۔ "صبح ایس پی آنکلا آیا تھا۔"

"اچھا۔" وہ میرے نزدیک کھسک آیا۔ "کیا کہتا تھا۔"

"کہتا تھا کہ اب کرشنا جی کے قاتلوں کو پکڑنے میں کچھ ہی دیر جاتی ہے۔ اُس نے نام تو نہیں لیا لیکن اُس کا اشارہ اسی طرف تھا۔"

"پھر؟" وہ کسمسا کے بولا۔

"اس سے پہلے کہ وہ اُس کا انجام طے کرنے کے لیے طویل وقت گزاریں اور ہزار باتیں سامنے آئیں، ہمیں کچھ سوچ لینا چاہیے۔ اُس کے اندر جانے کے بعد دونوں باتیں ممکن ہیں۔ وہ واپس بھی آ سکتا ہے اور ہم ایک لمبے وقت کا انتظار نہیں کر سکتے۔"

"میں تیری بات سمجھ گیا۔" وہ ہاتھ اُٹھا کے بولا اور چند لمحے سوچنے کے بعد گمبھیر لہجے میں بولا۔ "کچھ دیر صبر کر۔"

معلوم ہوا کہ تندو کی لاش لینے کے لیے پاڑے کے کئی آدمی اسپتال گئے ہوئے ہیں۔ تندو اسی علاقے میں رہتا تھا۔ اُس کی بوڑھی ماں اُس کے ساتھ تھی۔ تندو کی شادی ہو گئی تھی لیکن اُس کی بیوی پہلے بچے کی پیدائش پر ہی مر گئی تھی پھر تندو نے شادی نہیں کی۔ وہ بہت جی دار شخص تھا۔ اُس کا چہرہ بار بار میری آنکھوں کے سامنے آ رہا تھا۔

جب چھیدا پاڑے میں داخل ہوا تو تجھل چوکے سے اُٹھ گیا اور اُس نے چھیدا کو درمیان ہی میں روک لیا۔ چھیدا نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے اُسے کچھ بتایا۔ تجھل کا نچلا ہونٹ باہر نکل آیا۔ وہ چھیدا کے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے چند قدم خاموشی سے ٹہلتا رہا۔ پھر اُس نے مجھے اور جامو کو اُٹھنے کا اشارہ کیا۔ کانتے بھی ہمارے ساتھ اُٹھنے لگا۔ تجھل نے اُسے وہیں بیٹھے رہنے کا حکم دیا اور زورا سے آنکھوں آنکھوں میں کچھ کہا۔ ہم چاروں پاڑے سے نکل کے گلی میں آ گئے۔ تجھل کی رفتار کسی قدر تیز تھی۔ چوراہے پر چھیدا نے ایک ٹیکسی روک لی۔ ٹیکسی والا اُسے جانتا تھا۔ تجھل، جامو اور میں پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ چھیدا ٹیکسی والے کو ہدایت دیتا رہا اور ٹیکسی مختلف راستوں سے گزرتی رہی۔ مجھ سے خاموشی برداشت نہیں ہوئی۔ آخر میں نے جامو سے پوچھ ہی لیا۔ "ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"ہم استاد پیرو کے پاس جا رہے ہیں۔" جامو کے بجائے تجھل نے جواب دیا۔

اُستاد پیرو کا نام سن کے میرے کانوں میں پٹاخا سا چھوٹا۔ میں حیرت سے تجھل کا منہ تکنے لگا۔ اُس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ پیرو بمبئی کا ایک مشہور اُستاد تھا۔ تیواڑی کے بعد اگر بمبئی میں کسی کا نمبر آتا تھا تو پیرو کا۔ تجھل سے پیرو کا کیا تعلق ہو سکتا تھا، ممکن ہے وہ اُس کا واقف کار ہو۔ ایک ساتھ بے شمار سوال میرے ذہن میں سرسرانے لگے مگر بمبئی میں تجھل کا کوئی شناسا موجود ہوتا تو وہ سب سے پہلے اُسے میرے متعلق لکھتا۔ میں نے ذہن پر بہت زور دیا مگر تجھل اور پیرو کا کوئی تعلق میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں ٹیکسی والے کی موجودگی میں نہ حیرت کا اظہار کر سکتا تھا، نہ وہاں جانے کا مقصد پوچھ سکتا تھا۔ میں گھٹ کے رہ گیا۔ چھیدا کا انتظار کرنا اور اُس کے آنے پر تجھل کا چبوترے سے اُٹھ جانا، پھر اچانک پیرو کی طرف جانے کا ارادہ کر لینا، یہ سب بڑی انوکھی باتیں تھیں لیکن میں تجھل کی عادت سے واقف تھا۔ وہ اپنے فیصلوں پر رائے زنی پسند نہیں کرتا تھا۔ میں چپ بیٹھا رہا۔ ٹیکسی ماہم کے علاقے میں داخل ہو گئی اور گلیوں سے گزرتی ہوئی گیروے رنگ کی ایک دو منزلہ مضبوط عمارت کے سامنے ٹھہر گئی۔ تیسری منزل آدھی بنی ہوئی تھی۔ گلی چوڑی تھی اور زیادہ گنجان نہیں تھی۔ یہ عمارت گلی کے آخری سرے پر واقع تھی۔ اس طرح اُس کے دروازے تین اطراف کھلتے تھے۔ اونچی دیوار عمارت کا احاطہ کرتی تھی۔ چھیدا سب سے پہلے اُترا اور اُس نے دیوار کے سائے میں اسٹولوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں سے کچھ کہا۔ وہ پیرو ہی کے اڈے کے آدمی تھے۔ اندر سے جب تک آدمی واپس نہیں آیا، ہم ٹیکسی ہی میں بیٹھے رہے۔ آدمی اکیلا واپس نہیں آیا تھا، اُس کے ساتھ گٹھے ہوئے جسم کے تین ادھیڑ عمر آدمی بھی تھے۔ وہ ٹیکسی کی جانب لپکے۔ ہم تینوں ٹیکسی سے اُتر آئے۔

اُن کی معیت میں ہمیں اندر لے جایا گیا۔ ایک بڑے کمرے کے دروازے پر درمیانہ قد، جھکے ہوئے اور متناسب اعضا کا ایک شخص کھڑا تھا۔ اُس کی عمر پچاس اور پینتالیس کے درمیان ہوگی۔ رنگ صاف تھا۔ "پیرو دادا! کلکتے والا استاد تجھل۔" چھیدا کی آواز میں لکنت آ گئی۔

"آؤ، آؤ استاد! اندر آؤ۔" اُس نے تجھل کا بازو پکڑتے ہوئے پرجوش انداز میں کہا۔ "آؤ آؤ راجو! مہاراجو! ادھر بیٹھو۔" وہ ہمیں ایک چوکی پر لے گیا۔ اُس پر سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ چوکی پر بیٹھنے سے پہلے اُس نے ہمیں گلے لگایا۔ وہ ایک سلجھا ہوا، صاف اور تیز آدمی معلوم ہوتا تھا۔ "کلکتے سے کب آنا ہوا؟"

"کل سویرے۔" تجھل نے سکون سے جواب دیا۔ "پیرو دادا! مجھے تم سے کچھ خاص بات کرنی ہے۔ چھیدا نے میرے بارے میں تمھیں بتایا ہوگا۔"

"باتیں بعد میں ہوں گی، پہلے یہ بتاؤ استاد کہ پیو گے کیا؟ ولایتی، دیسی، سبزی یا کوئی اور چیز؟" اُس کے بڑے بڑے دانت چمکنے لگے۔

"کچھ نہیں کھائیں گے پئیں گے بعد میں، اس وقت تمھارے پاس ایک کام سے آیا ہوں۔ کھانے پینے کے لیے تو بہت وقت پڑا ہے۔"

"ہاں ہاں۔ تم ادھر بمبئی میں اپن کا مہمان ہے۔" وہ ہنس کر بولا۔ "جو اپن کے بس میں ہوگا، اپن اپنے مہمان کے لیے کریں گا۔"

"بات بڑی ہے پیرو دادا!" تجھل نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "لیکن تمھارے سامنے کلکتے کا استاد تجھل بیٹھا ہے۔ یہ فیض آباد کا استاد جامو ہے اور یہ تمھارا راجا ہے جس نے چھنگا سے پاڑا لیا ہے۔"

"یہ راجا ہے۔" وہ تعجب سے بولا۔ "اپن نے اس کی بڑی تعریف سُنی ہے۔ اپن راجا کو دیکھنے کا تڑپ رکھتا تھا۔"

"پیرو دادا! مجھے یقین ہے کہ تم نے ادھر بمبئی میں جو نام بنایا ہے، وہ اپنی بہادری اور سوجھ بوجھ سے بنایا ہے۔"

"استاد! بولو، بولو۔ کام بولو۔"

"دادا! ہم بہت صاف بات کرنے آئے ہیں۔ بات عجیب ہے لیکن کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے تم ٹھنڈے دل سے سوچ لینا۔"

"بولو دادا! بولو۔ اپن وعدہ کرتا ہے کہ اپن سوچ سمجھ کے جواب دے گا۔ اپن کو کام بولو۔ ادھر اُدھر کی بات مت کرو۔"

"پیرو دادا! ہم تم سے کچھ دنوں کے لیے تمھارا اڈا چاہتے ہیں۔"

"کیا۔۔۔؟ تم کیا بولتا ہے استاد تجھل!" وہ کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھ جاؤ دادا! بیٹھ جاؤ۔ میری بات غور سے سنو، ہم کچھ دنوں کے لیے تمھارا اڈا چاہتے ہیں۔ اس کے بدلے میں تم چاہو تو ہم تمھیں راجا کا پاڑا، کلکتے کا اڈا اور فیض آباد کا اڈا، تینوں کی ایک ساتھ پرچی لکھ کے دے سکتے ہیں۔"

"پر یہ تم کیا بولتا ہے استاد تجھل!" وہ ہذیانی انداز میں بولا۔ "اس کمرے کی دیواروں سے لگے ہوئے اُس کے تینوں آدمی چوکنے ہو گئے۔ "ایسے کیسے ہوتا ہے استاد تجھل!"

"ایسا ہو سکتا ہے پیرو دادا! تم چاہو تو ایسا ہو سکتا ہے۔" تجھل آہستگی سے بولا۔ "یہ اڈا تمھارا ہے اور ہم تم سے اسے سدا کے لیے نہیں مانگ رہے ہیں۔ ہم کو اس اڈے کی آمدنی سے بھی کوئی غرض نہیں ہے۔ وہ سب تمھاری اور تمھارے آدمیوں کی۔ ہم تو صرف تھوڑے دنوں کے لیے یہ اڈا لینا چاہتے ہیں۔ تم سوچ لو۔"

"سوچنا کیسا استاد!" وہ ترشی سے بولا۔ "کیا تم یہی بولنے آیا ہے؟"

"ہاں!" تجھل نے شائستگی سے کہا۔ "ہم اسی لیے تمھارے پاس آئے ہیں۔"

"تم کلکتے کا استاد تجھل ہے۔" وہ بلند آواز سے بولا۔ "اپن نہیں سمجھتا کہ استاد ہو کے ایسا بات بولتا ہے۔"

"اگر اسے سودے کے طور پہ دیکھا جائے، تب بھی یہ سودا بُرا نہیں ہے۔" تجھل کے لہجے میں کسی قدر تندی آ گئی۔ "لیکن ہم سودے بازی کرنے کے لیے نہیں آئے۔ ہم تو تم سے اور ہی بات کہہ رہے ہیں۔ پیرو دادا! ہم یہ اڈا تمھارا حق سمجھتے ہیں۔ یہ تمھارا ہے اور تمھارا رہے گا۔ ہم کو معلوم ہے کہ تم نے اسے کیسے حاصل کیا ہوگا اور تمھیں اسے اپنے پاس رکھنے کے لیے کتنے جتن کرنے پڑتے ہوں گے، ہر استاد کو یہی کرنا پڑتا ہے۔" مجھے حیرت ہوئی، اسی قسم کی باتیں میں نے چھنگا سے کی تھیں لیکن تجھل کا انداز بالکل مختلف تھا۔

"اپن کا مگج پھر جاتے گا۔" وہ سر پکڑتے ہوئے بولا۔

"میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ بات بڑی ہے اور نئی بھی ہے۔ پر تم اپنا دل اور سر کھول دو تو ایسا کر سکتے ہو۔ ہماری بات کا اعتبار کرو دادا! اڈے پر تمھارے ہی آدمی رہیں گے، بس حکم ہمارا ہوگا۔ ہم اپنے آدمی یہاں نہیں لائیں گے۔ ہماری بات مان لو، ایسا کر کے دیکھو۔"

"تم... تم استاد تجھل ہو۔" وہ قہقہے لگانے لگا۔

اُس کے قہقہے رُکے تو تجھل نے سنجیدگی سے کہا۔ "پیرو دادا! ہم تم سے یہ نہیں کہہ رہے ہیں کہ اب تم یہ اڈا چلانے کے لائق نہیں ہو، نہ ہم تم سے یہ کہہ رہے ہیں کہ استادوں کی طرح پنجہ آزما کے یہ اڈا چھوڑ دو۔ ویسے اگر تم چاہو تو ہم اس کے لیے بھی تیار ہیں۔ استاد جامو، راجا اور مجھ میں سے تم جسے چاہو، اپنے لیے چن سکتے ہو۔"

"ہو۔۔۔ ہو۔" وہ پھنکارنے لگا۔ اُس نے چوکی پر زور سے گھونسا مارا مگر تجھل کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ پیرو چند لمحوں تک تلملاتا رہا۔ اُس کے آدمی چوکی کے نزدیک آ گئے تھے۔ اچانک وہ بے حس و حرکت ہو کے ہمیں گھورنے لگا۔

"کوئی استاد دو ہی باتوں سے اڈا چھوڑتا ہے، یا تو وہ مر جائے یا کوئی دوسرا اُس سے اڈا چھین لے مگر ایک تیسری بات بھی ہو سکتی ہے

پیرو دادا!" تجھل نے نرمی سے کہا۔ "وہ یہ کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں تم اُس پر عمل کرو۔ یہ کوئی حکم نہیں ہے، ہم تم سے منت کر رہے ہیں۔"

اُس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "اپن کو شک ہے کہ تمھی استاد تجھل ہو، تم کلکتے کا راجا ہو۔ نہیں... نہیں... ابھی تمھارا بھیجہ فریلا ہو گیا ہے۔"

"اتنی بے عزتی مت کرو پیرو دادا!" تجھل نے آنکھیں چڑھا کے کہا۔ "کوئی اور تمھارے پاس اس طرح نہیں آ سکتا تھا۔"

"پر... پر تم اڈا کیوں لینا چاہتے ہو؟"

"یہ بعد کی بات ہے۔ پہلے تم اڈا میرے حوالے کرنے کی بات کرو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ جس حالت میں تم اسے دو گے، میں اسی حالت میں اسے واپس کر دوں گا۔ ہمارے تمھارے درمیان صرف بات کی بات ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہوں گا۔"

"استاد تجھل! اڈا اپن نے بازو سے حاصل کیا ہے۔" اُس نے سر اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "اور کوئی اسے بازو ہی سے لے سکتا ہے لیکن تم... تم بڑی مسخری کی بات بولتے ہو۔ اپن کو یہ کیسے پتہ چلے کہ تمھی استاد تجھل ہو۔ اگر تم تجھل ہو تو اپن نے نام ضرور سنا ہے، پر اپن اس طرح کیسے تم سے آگے بات کرے۔"

"میں نہیں چاہتا کہ میں اور تم آمنے سامنے آئیں لیکن تمھاری تسلی کے لیے ضروری ہے کہ تم اپنے کسی آدمی کو اشارہ کرو۔ تم کو ابھی پتہ چل جائے گا۔" تجھل نے ناگواری سے کہا۔

پیرو دادا کچھ سوچنے لگا۔ چند لمحوں کے تذبذب کے بعد اُس نے اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ آدمی بار بار چاقو اُچھال رہا تھا اور ہمیں سُرخ سُرخ نظروں سے مسلسل گھور رہا تھا۔ وہ بہت پھرتیلا معلوم ہوتا تھا۔ اُس کی عمر بہت زیادہ نہیں تھی۔ وہ قد کا لمبا اور جسم کا مضبوط تھا۔ تجھل نے اُسے نہیں دیکھا۔ "معاف کرنا استاد تجھل!" تجھل نے چونک کے دیکھا۔ "یہ ماچھی ہے، اسے اپنے چاقو پر بڑا مان ہے۔ اس سے چاقو چھین لو۔"

تجھل کی آنکھوں میں خون اُبلنے لگا۔ "پیرو دادا! ماچھی کا مان مت توڑو۔ ابھی اسے بہت کچھ کرنا ہے۔ تم بات کرو۔"

"ماچھی کے بعد میں تم سے ضرور بات کروں گا۔"

"استاد تجھل نہیں اُٹھے گا۔ ماچھی کو میں دیکھوں گا۔" جامو نے پہلی بار زبان کھولی۔ "استاد تجھل کی بے عزتی مت کرو پیرو دادا!"

"تم میں سے کوئی بھی ہو۔ اپن کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"اسے میں دیکھتا ہوں۔" میں نے اُٹھتے ہوئے نرمی سے کہا۔

جامو نے مجھے دھکا دے کے بٹھا دیا اور پھرتی کے ساتھ چوکی سے اُتر گیا۔ اُس نے نہ جانے کس لمحے اپنا چاقو کھول لیا تھا۔ "استاد تجھل! اجازت ہے؟" وہ چاقو لہراتے ہوئے بولا۔

تجھل نے گردن ہلائی۔ جامو بجلی کی طرح تڑپ کے پلٹ پڑا۔ اُس کے ہاتھ میں بڑی لپک تھی۔ جامو نے انتظار کیا۔ ماچھی اُس پر حملہ کرنے کے لیے فرش پر تھرکنے لگا۔ اُس کے برعکس جامو ایک جگہ جما کھڑا تھا۔ جامو نے دو تین مرتبہ اُسے متزلزل کرنے کے لیے مختلف زاویوں سے اپنے جسم سے جھکیاں دیں۔ وہ ایک قدم آگے بڑھتا اور اپنا قدم پھر پیچھے ہٹا لیتا۔ اُس کی گردن آگے نکلی ہوئی تھی اور آنکھیں ماچھی کے چاقو کی نوک پر جمی ہوئی تھیں۔ جھکیوں سے ماچھی کو غصہ آ گیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ جامو صرف چند لمحوں میں فیصلہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ شاید اس بات کے انتظار میں تھا کہ ماچھی حملے میں پہل کرے۔ ماچھی بھی پوری طرح مستعد تھا۔ اُس کا جسم رواں تھا اور اُسے چاقو پکڑنا آتا تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ جامو مجھ سے پہلے چلا گیا۔ پیرو نے غور نہیں کیا حالانکہ تجھل نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ فیض آباد کا استاد جامو ہے مگر پیرو کا مطلب بھی کچھ اور تھا۔ جامو اور ماچھی ایک دوسرے کو تولتے رہے۔ ماچھی نے حملہ کرنے میں پہل نہیں کی۔ جامو اپنا چاقو پھینکتا ہوا چیتے کی طرح اُچھل کے چشم زدن میں اُس کے سر پر پہنچا۔ چاقو گرنے کی آواز ماچھی نے بھی سُنی ہو گی۔ اُس نے اس طرف دیکھا ہی تھا کہ دوسرے لمحے اُس کا چاقو والا ہاتھ جامو کے پنجے میں تھا۔ جامو نے اِدھر ماچھی کا ہاتھ پکڑا اور دیکھتے دیکھتے اُسے اپنے کندھے پر رکھ کے اس کا بھاری جُثہ ایک جھٹکے سے فرش پر پٹخ دیا۔ ماچھی نے پھر بھی چاقو سنبھالے رکھا لیکن جامو نے اُس کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔ جامو اُس پر پوری طرح حاوی آ چکا تھا۔ اُس نے اُس کے گلے پر جوتا رکھ کے ہاتھ مروڑا۔ ماچھی کی انگلیوں سے چاقو دبایا نہیں جا سکا۔ چاقو گرتے ہی جامو نے ماچھی کو چھوڑ دیا اور اپنے بال درست کرتا ہوا چوکی پر آ کے بیٹھ گیا۔ جامو نے کوئی نیا داؤ نہیں آزمایا تھا۔ اُس نے ساری توجہ تیزی اور پھرتی کی طرف دی تھی کیونکہ فیصلہ چند ہی لمحوں میں ہونا چاہیے تھا۔ پیرو نے چوکی پر کھڑے ہو کے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ جامو دوبارہ اُٹھ کے اُس کے گلے سے لگ گیا۔ "سنا تھا، پر صرف سُنا تھا۔" وہ اُسے زور سے لپٹاتے ہوئے بولا۔ "کہ اُودھ دلّی پار بڑا بڑا بانکا پڑا ہے استاد تجھل! معاف کرنا۔ اپن کو معاف کرنا۔"

"تمھاری تسلی ہو گئی پیرو دادا! اب کام کی بات کرو۔"

"کام کی بات کیا کرے، تم نے اپن کا سر جھکا دیا ہے۔"

"نہیں پیرو دادا! یہ اڈا تمھارا ہے۔ اس کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔ تمھارا مال تمھارے پاس رہے۔ ہمیں واپس اپنے شہر جانا ہے۔ ہم اِدھر ممبئی میں نہیں رہنا چاہتے۔"

"اپن کو اب تمھاری ہر بات کا اعتبار ہے۔" وہ جوش میں بولا۔ "آج سے یہ اڈا تمھارا ہے۔ اور بولو اپن کے پاس کیا ہے۔"

تجھل نے آگے بڑھ کے اُسے بھینچ لیا۔ "پیرو دادا! بس یہی بہت ہے۔ تم یہاں کے بادشاہ ہو، تم یہیں رہو گے۔ آؤ اندر آؤ۔ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔"

"چلو، چلو۔" وہ بے قابو آواز میں بولا۔ تجھل اُس کے ساتھ اندر کسی کمرے میں جانے لگا۔ پیرو جاتے جاتے پلٹ پڑا اور اپنے آدمیوں پر برسا۔ "ہائیں! ابھی چوکی خالی پڑا ہے۔ استاد تجھل آیا ہے۔ سالا تم لوگ کھڑا کھڑا کیا دیکھتا ہے۔" وہ دہاڑتا ہوا بولا۔ "مہمان کے لیے کچھ لاؤ۔ کمرہ بھر دو۔"

تجھل اُسے کھینچتا ہوا اندر لے گیا۔ اُن کے جاتے ہی چھیدا جامو کے گال چومنے لگا۔ پیرو کے آدمی بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔ ماچھی بھی فرش سے اُٹھ کے جامو سے لپٹ گیا تھا۔ وہ سب آپس میں باتیں کر رہے تھے لیکن میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ تجھل کی بات اب کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ چوکی پر کھانے پینے کے سامان کا انبار لگا دیا گیا۔ سب نے تجھل اور پیرو کی واپسی کا انتظار کیا۔ وہ دونوں بہت دیر میں باہر نکلے لیکن دونوں ایک دوسرے کی گردن میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھے۔ پیرو بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ بس اندازے ہی لگا سکتا تھا کہ انھوں نے اندر کیا بات کی ہو گی۔ پیرو نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ فلاں فلاں آدمی کو فوراً پاڑے پر بلا لائیں۔

جتنی دیر میں لوگوں نے آنا شروع کیا، اتنی دیر میں ہم سب کھانا کھاتے رہے۔ پیرو تجھل کے قریب بیٹھا اُس کی خاطریں کر رہا تھا۔ کمرے میں کسی دعوت کا منظر نظر آتا تھا۔ کھانے پینے سے فارغ ہونے کے بعد پیرو تجھل کی کمر پہ ہاتھ رکھ کے کھڑا ہو گیا اور بلند آواز سے بولا۔ "سالا لوگ! ذرا اپن کی بات سنو۔ یہ اپن کا دوست استاد تجھل ہے اور یہ استاد جامو ہے اور یہ راجا ہے۔ اپن آج سے پاڑے کا سارا انتظام تجھل استاد کو دیتا ہے۔ تم سالا کسی کو کوئی ٹوک ہو تو اپن کو ابھی بولو۔"

سب حیرانی سے پیرو کو دیکھنے لگے۔ مجمع پر خاموشی چھا گئی۔ لوگ کسمسانے اور ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے۔ "آج سے تم لوگ استاد تجھل اور استاد جامو اور استاد راجا کی بات سُنے گا۔ جو یہ بولیں گا کرے گا۔ یہ پاڑا اب پیرو دادا کی جگہ استاد راجا کا پاڑا سمجھے گا۔ اپن کا یہ فیصلہ دُور دُور جا کے بول دو۔ راجا کا پرانا پاڑا، بالم خاں کا پاڑا بھی اسی پاڑے میں مل گیا ہے۔ سمجھا۔" وہ چیخ کر بولا۔ "جس سالا کو پیرو کی مرضی پسند نہیں ہے، وہ علاقے سے کلٹی ہو جائے۔ اپن بھی اِدھر ہی رہے گا۔ پر استاد تجھل کے دوست کا مانک۔ اپن کچھ نہیں بولیں گا اور اپن آگے کچھ بولے تو اپن کی بات سننے سے انکاری کر دو، سمجھا۔" وہ دوبارہ چلایا۔ وہ سب گنگ ہو گئے تھے۔ کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ہر شخص کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئی تھیں مگر پیرو کی باتوں میں کوئی پیچیدگی نہیں تھی۔ پیرو چپ ہوا تو تجھل نے اونچی آواز سے کہا۔ "سب کچھ اسی طرح رہے گا، کسی کام میں فرق نہیں آئے گا لیکن بات ہماری چلے گی۔"

تجھل نے جامو اور چھیدا کو وہیں چھوڑا۔ پھر مجھے اور پیرو دادا کو اپنے ساتھ لے کے چل پڑا۔ باہر کئی ٹیکسیاں تیار کھڑی تھیں۔ ایک ٹیکسی میں ہم تینوں بیٹھے، دوسری اور تیسری میں پیرو دادا کے اڈے کے آدمی بیٹھ گئے۔ جب ہم اپنے پاڑے پہنچے تو ہمارے ساتھ پیرو اور اُس کے ساتھیوں کو دیکھ کے لوگوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پاڑے میں کچھ دیر کے لیے سناٹا سا چھا گیا۔ تجھل نے پیرو کو عزت کے ساتھ چوکی پر اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ تندو کی لاش آ گئی تھی لیکن بیماری وجہ سے اُسے روک لیا گیا تھا۔ پیرو کا خیال تھا کہ تندو کے جنازے میں تینوں پاڑوں کے لوگ شریک ہوں اور اُسے دھوم دھام سے اُٹھایا جائے مگر تجھل نے اُس کی رائے مسترد کر دی۔ تندو کے مُردہ جسم پر پھول ہی پھول بکھرے ہوئے تھے۔ پیرو نے اُس کی ماں کے لیے فوراً تین ہزار روپے نقد اور پچاس روپے ماہانہ وظیفے کا اعلان کیا۔ میں نے اپنا اعلان منہ ہی میں دبائے رکھا۔

تندو کا چہرہ خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ اُس کی بائیں آنکھ کٹ گئی تھی۔ آخری رسوم کے لیے اُس کی لاش اُٹھائی گئی تو پاڑے کے بہت سے لوگ بری طرح رونے لگے۔ زورا نے بتایا کہ رتن کی حالت اب کسی قدر بہتر ہے اور اُسے ہوش آ گیا ہے، اُسے ہدایت کر دی گئی ہے کہ وہ اپنے بیان میں تیواڑی کے آدمیوں کا نام نہ لے۔ مجھے ابھی تک اسپتال جانے کا وقت نہیں ملا تھا۔ کچھ دیر پاڑے میں ٹھہر کے تجھل، پیرو، کالتے اور میں علاقے میں گشت کے لیے نکلے۔ تندو کی موت کی وجہ سے علاقے بھر میں بے چینی پائی جاتی تھی۔ ہمیں موجود پا کے لوگوں کے چہروں پر اطمینان نمایاں ہوا۔ ہمارے پیچھے پیچھے بہت سے آدمی چل رہے تھے۔ مارتی اور ٹنڈا بھی اُن میں موجود تھے۔ مارتی مجھ سے بات کرنے کے لیے بہت بے تاب تھا۔ پیرو نے یہاں بھی اپنا اعلان دہرایا تھا۔ سب متحیر تھے کہ اُس نے اپنا پاڑا میری نگرانی میں دے دیا ہے۔ اس کے باوجود ہمارے ساتھ موجود رہے۔

تندو شام کو سادگی سے دفن کر دیا گیا۔ پاڑے کے چند ہی لوگ جنازے میں شریک ہوئے۔ اُس کے محلے کے لوگوں کی تعداد بھی کم نہیں تھی۔ اندھیرا پھیلنے سے پہلے پیرو واپس چلا گیا مگر اُس کے کئی آدمی ہمارے پاڑے میں رہ گئے۔ رات ہوئی تو میں نے تجھل کے کہنے سے پہلے پیش بندی کر دی کہ میں آج رات گھر نہیں جاؤں گا۔ اُس نے میری بات سُنی ان سُنی کر دی۔ اُس رات وہ خود مجھے اپنے ساتھ گھر لے آیا۔ مارتی اور ٹنڈا بھی ہمارے ہمراہ تھے۔ میرا خیال تھا کہ تجھل رات بھر آرام کرے گا لیکن ٹیکسی باہر کھڑی رہی اور وہ جولین اور چمپا سے چند باتیں کر کے واپس چلا گیا۔ ٹنڈے کو میرے پاس ہی چھوڑ دیا گیا۔ کیسی عجیب بات تھی، ان حالات میں وہ مجھے گھر میں آرام کرنے کے لیے کہتا تھا۔ میں نے رات گئے گھر سے نکلنے کی ٹھانی مگر گلی میں چند قدم چل کے واپس آ گیا۔

شہر کے دور دراز علاقوں تک پیرو کی ہیک وشی اور اُس کے اڈّے پر پیرو اور بجھل کے قبضے کی خبر پہنچ گئی تھی۔ تین دن گزر گئے۔ دوسرے لوگوں کی طرح میں یہ سب کچھ ایک تماشے کی طرح دیکھتا رہا۔ علاقے میں پھر کوئی واردات نہیں ہوئی۔ دوسرے ہی دن تیواڑی کے چند آدمی ٹوٹ کے پیرو کے پاڑے میں شامل ہو گئے یعنی اُس پاڑے میں جو اب تیرے نام سے موسوم تھا۔ اُن کا بہت احتیاط سے خیر مقدم کیا گیا۔ تیسرے دن علاقے سے پولیس بھی ہٹ گئی۔ اب بجھل کا زیادہ وقت پیرو کے اڈّے پر گزرتا تھا۔ کانتے اور جامو کبھی اِدھر کبھی اُدھر دونوں جگہ آتے جاتے رہے۔ میں نے کئی بار اُن سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی مگر انھوں نے کوئی خاص بات نہیں بتائی۔ بجھل جب کوئی بات بتانا پسند نہیں کرتا تھا تو پھر کوئی بھی اُس سے کچھ پوچھ نہیں سکتا تھا۔ وہ پیرو کے اڈّے میں بیٹھا ہوا ایسا لگتا تھا جیسے وہاں کا پرانا آدمی ہو اور کلکتے کا اڈّا بمبئی میں منتقل ہو گیا ہو۔ پیرو نے اُس کے لیے یہاں بھی حقّے کا انتظام کر دیا تھا۔ وہ عموماً اُس کے ساتھ ہی رہتا تھا مگر بجھل کی کسی بات پر زبان نہیں کھولتا تھا۔ بس مسکراتا رہتا تھا اور بجھل کو احکام دیتے ہوئے دیکھتا رہتا تھا۔ وہ تیسرا دن ہی تھا کہ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ کچھ تنہائی ملی تو میں نے تلخی کے ساتھ بجھل سے پوچھا۔ "آخر تم کیا چاہتے ہو؟"

"جو تُو چاہتا ہے۔" وہ ہنس کے بولا۔

"لیکن تم یہ کیا کر رہے ہو؟" میں نے ناراضی سے کہا۔

"کیا تیری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے؟" وہ نرمی سے بولا۔

"تم نے قلعہ ضرور بنا لیا ہے مگر۔ ۔ ۔"

"پہلے قلعہ بنا لینا اچھا ہوتا ہے لاڈلے! تُو ہی تو کہتا تھا کہ تیواڑی بہت بڑا استاد ہے۔ آدھی بمبئی اُس کے پاس ہے۔ ہر طرف اُس کے آدمی پھیلے ہوئے ہیں اور اُسے کسی بات میں کوئی لاج نہیں ہے۔ تُو نے اُس کے متعلق بہت سی باتیں بتائی تھیں۔ بڑے استاد کے لیے انتظام بھی بڑا کرنا پڑتا ہے۔ کام مناسب طریقے سے ہونا چاہیے نا۔ اپنی بھی عزت کی بات ہے لاڈلے! اور پھر مجھے جلدی بھی ہے۔ میرا بھی اس شہر میں دم گھٹ رہا ہے۔"

"میں تم سے کیا پوچھ رہا ہوں؟" میں نے ناگواری سے کہا۔

"ابھی میں تجھے کیا جواب دوں رے!"

"کچھ مجھے بھی بتاؤ۔"

"سب کچھ تیرے سامنے ہے۔"

وہ اسی طرح کی باتیں کرتا رہا۔ آخر میں نے تنگ آکے اُس سے بات کرنا ہی بند کر دیا۔ جامو اور پیرو بھی وہاں آگئے تھے۔ ہوتے ہوتے ایک ہفتہ گزر گیا۔ بجھل اور جامو پیرو کے علاقے میں صبح و شام گشت کرتے تھے۔ علاقہ بڑا تھا لیکن وہ میلوں پیدل نکل جاتے۔ کبھی پیرو اُن کے ساتھ ہوتا، کبھی وہ تنہا ہوتے۔ سرات گئے بجھل مجھے گھر واپس بھیج دیتا۔ تینوں پاڑوں میں غیر معمولی سرگرمی پائی جاتی تھی۔ عجب عجب کہانیاں مشہور ہو گئی تھیں۔ کوئی کچھ کہتا تھا، کوئی کچھ کہتا تھا۔ بجھل شاید ہی کسی وقت آرام کرتا ہو۔ میں صبح آتا تو اُس کی آنکھیں سرخ دیکھتا۔ وہ یقیناً رات بھر جاگتا رہتا تھا۔ کئی بار میرے جی میں آئی کہ اُس سے کہوں تم اپنی صحت کا خیال رکھو اور پھر تم ایک اجنبی جگہ بیٹھے ہوئے ہو۔ کسی وقت بھی کوئی سرپھرا ناراض ہو سکتا ہے مگر مجھے اُس سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ تینوں پاڑوں کے آدمی اُس کے اشارہ کے منتظر رہتے تھے۔ ہر وقت پھلتو بازی اور زور آزمائی کی مشقیں جاری رہتی تھیں۔ چاقو میں کانتے کا ہاتھ بہت رواں تھا۔ وہ پیرو کے اڈّے کے زور آوروں سے زور آزمائی کرتا رہتا تھا اور سب کو دنگ کر دیتا تھا۔ بجھل موجود ہوتا تو وہ کانتے کے سامنے تنہا کھڑا ہو جاتا۔ کانتے اُس پر چاقو لے کے جھپٹتا اور مختلف داؤ آزماتا، بجھل خود کو بچاتا رہتا اور آخر کانتے کے ہاتھوں سے چاقو چھین لیتا۔ پیرو کا خاص آدمی ماچھی اب بجھل کے گرد بیٹھا رہتا اور جب بھی موقع ملتا اُس کے پاؤں دبانے لگتا۔ پاڑے کے دوسرے لوگوں کا حال بھی یہی تھا۔

دسویں دن رات کو خلافِ توقع بجھل نے مجھ سے گھر جانے کے لیے اصرار نہیں کیا۔ جامو اور کانتے دیر سے غائب تھے۔ اڈّے پر سکون چھایا ہوا تھا۔ پیرو کچھ بے چین نظر آرہا تھا لیکن بجھل کے چہرے پر تشویش کی کوئی علامت نہیں تھی۔ "اب تم کلکتے کا ارادہ کب کرو گے پیرو دادا؟" بجھل کی آواز گونجی۔

"بجھل بھائی! جیسے ہی ٹیم ملا، اپن اُدھر بھاگیں گا۔" پیرو مچل کے بولا۔ "پر اپن ابھی تم کو جانے نہیں دیں گا۔"

"مجھے بہت دیر ہو گئی ہے پیرو دادا! تم نے ہماری بات رکھ لی۔ میں سدا اسے یاد رکھوں گا۔" بجھل نے ملائمت سے کہا۔

"شرمندہ مت کرو بجھل بھائی!" پیرو نے بجھل کے ہاتھ پکڑ لیے۔ "کبھی کسی بات کی ضرورت ہو تو ہم کو لکھنا۔"

"اپن کا جی کرتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ کے تمھارے ساتھ چلے۔"

"نہیں پیرو داد! ابھی تم کو بمبئی میں بہت کام کرنا ہے۔"

میں حیرانی سے اُن کی باتیں سن رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے بجھل کچھ ہی دیر بعد روانہ ہونے والا ہے۔ اُس کی آواز تھکی ہوئی تھی اور آنکھیں بھاری تھیں۔ وہ باتیں پیرو سے کر رہا تھا اور زور زور سے بال میرے نوچ رہا تھا۔ گھنٹوں گزر گئے۔ وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ کچھ کچھ مجھے بھی اندازہ ہو چلا تھا۔ میری رگوں میں خون کا دوران تیز ہو گیا تھا۔

"دیر ہو گئی۔" اچانک پیرو نے اضطراب سے کہا۔

بجھل نے منہ بنایا۔ "راستے میں ہوں گے۔"

ابھی اُس نے ایک گہری سانس ہی لی تھی کہ باہر گاڑیوں کا شور ابھرا۔ پیرو نے بے قراری سے بجھل کو دیکھا۔ بجھل نے گردن ہلائی اور چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ باہر سے کھٹ پٹ کی آوازیں آنے لگی تھیں، تیز تیز پا ہیں۔ سامنے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میری نگاہیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ دفعتہً کئی چہرے دروازے پر نمودار ہوئے، میری آنکھیں دھندلا گئیں۔ میں جھٹ اُچھل کے دروازے کی جانب بھاگا۔ کانتے اور جامو خون میں لت پت تھے۔ اُن کے کپڑے لال ہو گئے تھے لیکن وہ دونوں اپنے قدموں سے فرش پر کھڑے تھے۔ کانتے کی پیشانی اور کنپٹی سے خون بہہ رہا تھا۔ جامو کا سارا بازو سُرخ ہو گیا تھا۔ اُن دونوں کے درمیان اونچے قد اور کسے ہوئے جسم کا ایک زخمی شخص موجود تھا۔ وہ نہایت بپھرا ہوا اور سخت مشتعل نظر آرہا تھا۔ میں اُسے نہیں پہچانا۔ جامو اور کانتے اسے لیے لیے آگے آگئے۔ اُن تینوں کے پیچھے ایک ہجوم تھا۔ کئی آدمی زخمی تھے۔ زورا بھی تھا، چھیدا بھی تھا، مارتی بھی تھا۔ بالم خاں کے پاڑے کے بھی کچھ لوگ تھے۔ ماچھی بھی تھا اور پیرو کے پاڑے کے کئی آدمی بھی تھے۔

"بجھل بھائی! اُوپر والے نے لاج رکھ لی۔" جامو نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں اسے زندہ لے آیا ہوں۔"

"جامو! مجھے یقین تھا کہ تو خالی ہاتھ واپس نہیں آئے گا۔" بجھل نے آگے بڑھ کے اُسے گلے سے لگا لیا۔

میں نے کانتے کو زور سے پکڑ لیا۔ "کانتے! یہ کیا ہے؟" میں نے دہشت سے کہا۔ "تم لوگ کہاں سے آرہے ہو؟"

"ہم تیواڑی کو لینے گئے تھے لاڈلے راجا!" اُس نے مسکرا کے میری ٹھوڑی پکڑ لی۔ "سالے کا پاڑہ چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ ایک آدمی کو بھی اُس کی گلی سے ہلنے نہیں دیا۔ سڑک پر لاشیں بکھری پڑی ہیں۔ پر ہم اسے لے آئے ہیں۔ بڑا زور کیا حرام کے جنے نے۔" کانتے نے زمین پر تھوک دیا۔ اُس کے تھوک میں خون ملا ہوا تھا۔

بجھل غور سے تیواڑی کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ تیواڑی بھی اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا تھا۔ بجھل پیرو کا بازو پکڑ کے اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ "لاڈلے!" اُس نے بلند آواز میں مجھے پکارا۔ "اسے سنبھال۔" اُس نے تیواڑی کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے چاقو نکال لیا۔ میری نظروں میں کرشنا جی کا پٹیوں میں لپٹا ہوا جسم گھوم گیا۔ میں اُس کی بوٹی بوٹی کر دینے کے لیے آگے بڑھا۔ بجھل نے ہاتھ بلند کر کے مجھے روک لیا۔ "تیواڑی! کوئی آخری خواہش ہو تو بیان کر دے۔" بجھل نے سرد لہجے میں کہا۔

"ایک ہی آخری خواہش ہے دادا! اپن کو ایک چاقو دے دو، اپن ایسے نہیں مرنا چاہتا۔ تم اپن کو چاقو کے بغیر مار دو گے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں ہو گی۔" تیواڑی نے بھاری لہجے میں کہا۔

"چاقو کی موت تو عزت کی موت ہوتی ہے تیواڑی! میں تجھے لڑتے ہوئے مرنے کی عزت نہیں دینا چاہتا۔ یہاں تیرا آنا ہی تیری موت کے برابر ہے۔ استاد جامو سے کہا گیا تھا کہ وہ تجھے زندہ پکڑ کے لائے۔ تو تو دیر ہوئی مر چکا ہے۔" بجھل کی آواز بھی جیسے اُس کی آنکھوں کی طرح سُرخ تھی۔

"اپن نے تم سے اپنی آخری خواہش بول دی ہے اور اپن تم سے رحم کی بھیک نہیں مانگ رہا ہے۔" تیواڑی نے گرج کے کہا۔

جامو نے اُس کی طرف چاقو اُچھال دیا۔ "بجھل بھائی! اسے اپنی حسرت نکال لینے دو۔ اسے چاقو سے مارا نہیں جائے گا۔"

"تیری مرضی جامو!" بجھل نے اپنا چاقو لہراتے ہوئے کہا۔

"نہیں بجھل بھائی! تم نہیں۔" جامو بجھل کے سامنے مزاحم ہو گیا۔ اُدھر کانتے تیواڑی کی طرف چاقو لے کے بڑھنے لگا۔

"تم میں سے کوئی نہیں جائے گا۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "تیواڑی کو میں دیکھوں گا۔ تم ہٹ جاؤ۔"

"لاڈلے!" بجھل دہاڑنے لگا۔

"مجھے منع مت کرو بجھل بھائی!" میں نے تلملا کے کہا۔

"تیرا کام چاقو چلانا نہیں ہے۔" بجھل غضب ناک آواز میں بولا۔

"مجھے مت روکو۔" میں ایک جست لگا کے تیواڑی کے سامنے پہنچ گیا۔ کانتے نے پھر آڑے آنے کی کوشش کی، میں نے اُسے دھکا دے دیا۔

اِرد گِرد کھڑے ہوئے لوگ پیچھے ہٹ گئے اور کمرے میں ہمارے لیے ایک دائرہ بن گیا۔ چاقو میرے ہاتھ سے نکلا نکلا جا رہا تھا۔ میرے رگ و پے میں سنسنی دوڑی ہوئی تھی۔ مجھے تیواڑی کے مقابل دیکھ کے بجھل چپ ہو گیا۔ کمرے میں ہر آواز معدوم ہو گئی تھی۔ میں اُس کے حملے کا انتظار کرنا نہیں چاہتا تھا اور نہ کوئی داؤ آزمانے کی خواہش رکھتا تھا لیکن اُسی لمحے مجھے بجھل کی بات یاد آگئی۔ اُس نے جیل میں مجھے نصیحت کی تھی کہ لڑتے وقت دماغ ٹھنڈا اور جسم گرم رکھو۔ میں نے اپنے بڑھتے ہوئے قدم بہ جبر روک لیے ورنہ میں نے تو اپنا چاقو بھی پھینک دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ جامو کا جو چاقو تیواڑی کے ہاتھ میں تھا، اُسے اُسی سے لہولہان ہونا چاہیے تھا۔ تیواڑی اپنی زندگی کی آخری لڑائی لڑ رہا تھا۔ زخمی ہو جانے کے باوجود اُس کے جسم میں طوفان کی لپک تھی۔ اگر وہ زیادہ زخمی ہوتا تو ہم میں سے کوئی بھی اُس کے خلاف چاقو اُٹھانے پر آمادہ نہ ہوتا مگر معلوم ہوتا تھا کہ جامو نے اُس کے گال اور سینے پر خون کی لکیریں بہت احتیاط سے کھینچی ہیں۔ یہ لکیریں کھینچنا بہت مشکل کام ہے۔ یہ اُسی وقت کھینچی جاتی ہیں جب رعایت کا کوئی گوشہ ذہن میں موجود ہو ورنہ ہاتھ ذرا سا بہک جائے تو گوشت نکل آتا ہے۔ بجھل کہتا تھا کہ لکیر کھینچو تو ایسی کہ ناخن کا گمان ہو اور خون کی بوندیں

پسینے کی طرح پھوٹ رہیں۔

تیواڑی نے بندر کی طرح آگے پیچھے اُچھلتے کودتے ہوئے سب سے پہلے میرے کولھے کو نشانہ بنانا چاہا۔ مجھے اب مجمع کا کوئی ہوش نہیں تھا اور نہ دنیا کی خبر تھی میرے سامنے تو بس تیواڑی تھا۔ میں اُس کی پھرتی تولتا رہا۔ اس پھرتی میں ایک تحمل بھی تھا حالانکہ یہ تحمل کا موقع نہیں تھا۔ وہ نپے تُلے انداز میں وار کر رہا تھا اور میں نپے تُلے انداز میں بچ رہا تھا۔ دو ایک بار میں بھی اُسے اپنے چاقو کی زد پر لایا مگر وہ اپنا جسم صاف بچا گیا۔ اگر نگاہ مخالف کے چاقو کی پابند کر دی جائے کہ جدھر چاقو جائے اُدھر نگاہ بھی اُس کے ہمراہ جائے تو مخالف کا وار عموماً ناکام ہو جاتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ جسم بھی نگاہ کا پابند ہو۔

تیواڑی نے دوسرا شدید وار میرے سینے پر کیا۔ وار اتنا غیر متوقع اور بے ساختہ تھا کہ میرے پاس اپنی جگہ سے ہلنے کا وقت بھی نہیں رہا تھا۔ اگر میں برق رفتاری سے اُس کا بڑھا ہوا چاقو اپنے چاقو پہ نہ روکتا تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ جیسے ہی میں نے اُسے روکا، میرے ذہن میں فوراً ایک خیال شعلے کے مانند لپکا۔ میں نے چاقو پر زور برقرار رکھتے ہوئے اپنا جسم کسی قدر پیچھے کر کے ایک جھٹکے سے ہاتھ نیچے گرا دیا۔ اُس جھٹکے سے میرا چاقو نیچے گر گیا تھا۔ میں نے اُسے دانستہ گرایا تھا۔ تیواڑی سمجھا کہ میں حواس باختہ ہو گیا ہوں مگر اب تیواڑی کی کلائی میرے پنجے کی گرفت میں تھی۔ یہ ایک خطرناک قدم تھا۔ میرے ہاتھ سے چاقو گرنے کی وجہ سے تیواڑی سخت برہم ہو گیا تھا۔ اُس نے میری گرفت سے کلائی چھڑانے کے لیے پے در پے کئی جھٹکے دیے۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ یہی کرے گا لیکن میں اپنا جسم ڈھیلا کر کے اُس کا ہاتھ پکڑے ہوئے نیچے جھول گیا تھا۔ کچھ اس طرح کہ میرے جسم کا سارا وزن تیواڑی کے ہاتھ پر آ گیا تھا۔ یہ دباؤ برداشت کرنا اُس کے لیے سخت اذیت ناک ہو گا۔ میں نے اُس کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ ظاہر ہے، اُس کے توازن کے ساتھ اُس کی سوچ بھی بگڑ گئی۔ وہ مجھ سے اس داؤ کی توقع نہیں کرتا ہو گا۔ ببھل سچ کہتا تھا کہ بہت سے داؤ موقع پر خود بخود تخلیق ہو جاتے ہیں۔ تیواڑی اب میری گردن اور منہ پر بھی ضربیں لگا سکتا تھا۔ میں اپنے گھٹنوں کے بل فرش پہ تقریباً بیٹھ گیا تھا۔ میں نیچے جھکا تو اُسے بھی جھکنے پر مجبور ہونا پڑا اور برنائے احتیاط اُسے کوئی مناسب ضرب لگانے کے لیے کچھ سوچنا پڑتا۔ اُس نے اچھا کیا۔ میں نے کچھ اور سوچ رکھا تھا۔ اُس کا جھکاؤ لازماً اُسی ہاتھ کی سمت ہو سکتا تھا جس ہاتھ سے میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ وہ میرے بائیں شانے تک جھک آیا۔ اُن چند لمحوں میں، میں نے اپنا جسم اور اپنے پیر پوری طرح قابو میں کر لیے تھے۔ جیسے ہی اُس کا جسم میرے شانے سے ٹکرایا۔ میں نے پھرتی سے اپنے جسم کو جنبش دی اور تمام تر طاقت سے شانہ کسی قدر اوپر کر کے اُس کا ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ میرے شانے سے گزرتا ہوا فرش پر چت گر گیا۔

اس جھونک میں چاقو اُس کے ہاتھ میں قائم رہتا تو مجھے اُس کی تمام خطائیں معاف کر دینی چاہیے تھیں۔ میری توقع کے مطابق چاقو اچھل کے نیچے گرا۔ ہڈی چٹخنے کی آواز آئی۔ وہ درد سے کراہا۔ میں نے اُسے چھوڑ کے اُس کا چاقو اُٹھا لیا۔ ابھی میرا ہاتھ اُٹھا ہی تھا کہ ببھل چیخنے لگا: ”نہیں لاڈلے! نہیں۔ ذرا ٹھہر۔“ میرا ہاتھ اُٹھا کا اُٹھا رہ گیا۔ ”اِسے اتنی آسان موت دیتا ہے رے، پگلے۔“ اُس نے چاقو میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ ”چل ہٹ۔“ اُس نے مجھے دُور دھکیل دیا اور اپنے دونوں ہاتھ اُٹھائے ہوئے تیواڑی پر جھپٹا۔ تیواڑی کی کرب ناک چیخ سے کمرہ لرز گیا۔ صرف ایک لمحے میں ببھل اُس کے جسم سے ہٹ گیا۔ اُس نے اپنی بند مٹھی میرے آگے کر دی۔ میں نے ہاتھ پھیلا دیا۔ میرے ہاتھ میں تیواڑی کی کٹی ہوئی ناک تھی۔

میں نے پلٹ کے حیران آنکھوں سے تیواڑی کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے ہوئے فرش پر تڑپ رہا تھا۔ اُس کی کٹی ہوئی ناک میری ہتھیلی پر رکھی تھی اور ببھل میرے سامنے کھڑا تھا۔ مجھے چکر سا آنے لگا اور میں بے اختیار اُس کے گلے سے لپٹ گیا۔ کمرے میں تیواڑی کی کراہوں کے سوا کوئی آواز نہیں تھی مگر پھر اچانک کھلبلی مچ گئی۔ لوگوں نے دوڑ کے ہمیں ہر طرف سے گھیر لیا۔ سب سے آگے پیرو تھا۔ اُس نے ہم دونوں کو ایک ساتھ اپنے بازوؤں میں جکڑنے کی کوشش کی۔ ببھل نے مجھے چھوڑ کے اُسے گلے لگا لیا۔ جامو اور کانتے نے مجھے زور سے اپنی طرف کھینچ لیا اور میرے گال چومنے لگے۔ ہر شخص ایک دوسرے کو دھکیلتا اور کھینچتا ہوا آگے آتا اور ہم سے لپٹ جاتا۔ کسی نے ببھل کا شانہ، کسی نے اُس کا کُرتا، کسی نے اُس کی پنڈلیاں پکڑ رکھی تھیں۔ پیرو دادا ببھل کی گردن میں بانہیں ڈالے کھڑا تھا اور بُری طرح دہاڑ رہا تھا لیکن لوگ ہمارے اطراف سے نہیں ہٹے، پیرو چیختا، گرجتا رہا۔

جامو، کانتے، زورا، چھیدا، مارٹی، ماچھی اور دوسرے لوگوں میں سے بیشتر کے کپڑے خون اور پسینے سے تر بتر تھے جیسے وہ کہیں سے ہولی کھیل کے آ رہے ہوں۔ چند لمحوں تک لوگ اسی طرح شور کرتے، ایک دوسرے پر ٹوٹتے اور آپس میں گتھم گتھا ہوتے رہے پھر جب ببھل نے اپنا ہاتھ بلند کر کے انھیں خاموش ہو جانے اور دور ہٹنے کی تلقین کی تو کمرے کا شور کسی قدر کم ہوا۔ ببھل اونچی آواز میں ماچھی کو پکار رہا تھا۔ ماچھی بھیڑ کاٹتا ہوا اُس کے پاس پہنچا۔ ببھل نے مضطرب لہجے میں اُس سے پوچھا: ”گنتی کر لی ہے رے؟“

ماچھی کو جواب دینے میں تامل ہوا۔ شاید ببھل کی بات اُس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ ”سب ٹھیک ہے ببھل بھائی!“ ماچھی کے بجائے جامو نے آہستگی سے جواب دیا۔

”کسی کو بھول تو نہیں آئے؟“

”اپن کا اکھا آدمی موجود ہے۔“ ماچھی ہانپتے ہوئے بولا۔

”سویرا ہونے کو ہے۔“ ببھل نے ناگواری سے کہا۔ ”کیا اُن کے سامنے اس طرح آؤ گے؟“ ببھل کا اشارہ واضح طور پر پولیس کی جانب تھا۔ کمرے میں بھن بھناہٹ سی ہونے لگی۔ ”وہ ماسٹر مارٹی کا بچہ کدھر ہے؟“ ببھل نے بھڑے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ مارٹی میری پیٹھ سے چمٹا ہوا تھا۔ ببھل کی آواز پر وہ اُچھل کے سامنے آیا اور سر جھکا کے اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اُس کا بایاں بازو خون میں نہایا ہوا تھا۔ ببھل نے آگے بڑھ کے اُس کا ہاتھ اوپر اُٹھا کے چھوڑ دیا۔ مارٹی کی سسکی نکل گئی۔ جیسے ہی ببھل نے اُس کی کمر پہ تھپکی دی۔ مارٹی اپنا سر اُس کی چھاتی سے رگڑنے لگا۔ ”جا پیچھے جا کے مرہم پٹی کرا۔“ ببھل نے اُس کا سر پکڑ کے گال پہ ایک چپت رسید کیا۔ مارٹی پہ دیوانگی طاری ہو گئی۔ وہ ببھل کے پیروں پر گر گیا۔ ببھل کے اشارے پر زورا نے اُسے اُٹھایا اور مارٹی کا نڈھال جسم کندھے پر لاد کے باہر نکل گیا۔ دوسرے ہی لمحے ببھل نے سب کو منتشر ہونے، مرہم پٹی کرانے اور کپڑے بدلنے کا حکم دیا۔ جن لوگوں کے زخم گہرے تھے، انھیں پہلے ہی تہ خانے میں بھیج دیا گیا تھا۔ پیرو کے اڈے کی یہ عمارت خاصی بڑی تھی۔ یہاں بہت سے آدمی مستقل رہتے تھے اور ہر قسم کا انتظام موجود تھا۔ پیرو کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ زخمیوں سے نمٹنے کے لیے پہلے ہی تمام تیاری کر لی گئی تھی۔ یہاں تک کہ پچاس ساٹھ آدمیوں کے کپڑے بدلنے کا خیال بھی رکھا گیا تھا۔ جن آدمیوں کے زخم بھرنے میں دیر لگتی انھیں منتقل کرنے کے لیے ملاتے کی خفیہ جگہوں کا تعین بھی کر لیا گیا تھا۔ پیرو روانی سے ماچھی اور اپنے دوسرے ساتھیوں کو حکم پہ حکم دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں پیرو، ببھل، جامو، کانتے اور چھیدا کے علاوہ اور میرے سوا تمام کمرہ خالی ہو گیا لیکن ہمارے علاوہ وہاں ایک اور آدمی بھی موجود تھا، تیواڑی۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ چہرے سے ہٹا لیے تھے۔ اُس کا چہرہ لہولہان تھا۔ ”اس کا کیا کرنا ہے استاد؟“ پیرو نے تیواڑی کو گھورتے ہوئے وحشت سے پوچھا۔

”اس کا کیا کرنا ہوتا۔ اس کا فیصلہ تو ہو چکا ہے۔“

”پر... پر استاد! ببھل بھائی!“ پیرو تذبذب سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اچانک تیواڑی کی ٹوٹی ہوئی آواز کمرے میں اُبھری۔ ”اپن کو ایک چاقو دے دو۔“ وہ ہذیانی انداز میں بولا۔

”تجھے چاقو تو دے دیا گیا تھا، پر تو نے اُسے کھو دیا۔ اب پھر تجھے چاقو دیا جائے تو تُو پھر اُس کا غلط استعمال کرے گا۔ چاقو تو دوسروں پر اُٹھتے ہوئے اچھا لگتا ہے تیواڑی! اپنے آپ پہ اُٹھاتے ہوئے اچھا نہیں لگتا۔ شیشے میں ایک بار اپنی شکل تو دیکھ لے۔“

”نہیں نہیں۔“ تیواڑی درد و کرب سے چیخنے لگا۔

”کیوں لاڈلے! ٹھیک ہے نا؟“ وہ مجھ سے مخاطب ہو کے بولا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے ڈوبی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”اب اِسے جانے دیا جائے، کیوں پیرو دادا؟“

”مگر...... مگر ببھل! ببھل بھائی!“ پیرو نے اٹک اٹک کے کہا۔

”تم اِسے کچھ دن اپنے پاس رکھنا چاہو تو رکھ لو۔ اس کا زخم بھر جائے تو اِسے چھوڑ دینا۔ اب پٹے کا خرچہ بھی بچ جائے گا۔ جامو! اِسے سامنے سے اُٹھا لے اور تُو بھی اپنا حلیہ ذرا ٹھیک کر کے آ۔ جلدی کر۔“ ببھل جھنجلا کے بولا۔

جامو نے بڑھ کے تیواڑی کو ایک جھٹکے سے کھڑا کیا مگر وہ اُس پر اپنی گرفت قائم نہ رکھ سکا۔ تیواڑی نے زمین پر پڑا ہوا میرا چاقو تاک لیا تھا۔ اُس نے اُسے اُٹھا تو لیا مگر وہ اپنے سینے میں پیوست نہیں کر پایا کیونکہ کانتے نے بجلی کی طرح لپک کے اُس کا اُٹھا ہوا ہاتھ درمیان ہی میں پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے اُس کے جبڑے پر مکا مارا۔ تیواڑی اپنے اوسان کھو چکا تھا اور اب وہ کسی ایک آدمی کے بس کا نہیں رہا تھا اس لیے جامو کو پھر اُس کے نزدیک جانا پڑا۔ اُس نے اُس کی گردن میں اپنے بازو ڈال کے اُسے دوبارہ قابو میں کیا۔ اس اثنا میں کانتے اُس سے چاقو چھین کے میری طرف اُچھال چکا تھا۔ جامو اور کانتے تیواڑی کو گھسیٹتے ہوئے باہر لے جانے لگے مگر ببھل کی آواز نے اُن کے قدم روک لیے۔ ”جامو استاد!“ ببھل نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ”اس حرام کی اولاد کو ہوش آئے تو بول دینا کہ چاقو کے ساتھ ساتھ آنکھ کی دھار بھی تیز رکھنا پڑتی ہے اور بول دینا کہ غنڈے کی آنکھ کھل ہو جائے تو چاقو بھی نہیں چلتا اور اس.... اس سوئے کے بچے کو یہ بھی بول دینا کہ اچھا آدمی کبھی اکیلا نہیں ہوتا۔ بس اب اِسے لے جا۔ لے جا۔“ پیرو نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اُس کی زبان بند کی۔

اُن کے جانے کے بعد کچھ دیر کے لیے کمرے پر سکوت چھا گیا۔ فرش پر خون کے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ میری مٹھی میں ابھی تک تیواڑی کی ناک دبی ہوئی تھی۔ پیرو دادا، ہم دونوں کے ہاتھ تھامے بدبداتا ہوا ہمیں دوسرے کمرے میں لے گیا۔

ہم کوئی آدھے گھنٹے بعد منہ ہاتھ دھو کے اور کپڑے بدل کے اڈے کے سب سے بڑے ہال جیسے کمرے میں آئے۔ یہاں پہلے سے کئی آدمی موجود تھے۔ درمیان میں سماوار رکھا ہوا تھا اور چائے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ہم تینوں کو گلاسوں میں بغیر دودھ کی چائے پیش کی گئی۔ اس دوران میں وہاں کچھ اور لوگ بھی آ گئے۔ ہماری طرح سب نے اپنے حلیے درست کر لیے تھے۔ کوئی دس منٹ بعد جامو اور کانتے ایک ساتھ نمودار ہوئے۔ ببھل نے انھیں اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔ جامو نے ایک ڈھیلا ڈھالا کُرتا پہن رکھا تھا۔ کُرتے کی ایک آستین پھولی ہوئی تھی۔ صاف نظر آتا تھا کہ آستین کے نیچے کلائی پٹیوں سے لپٹی ہوئی ہے۔ کانتے کی پیشانی اور کانوں پر روئی چپکی ہوئی تھی۔ روئی کا رنگ پیلا ہو گیا تھا۔ اُس کے سر کے درمیانی

حصے سے ٹھوڑی تک بھی ایک پٹی بندھی ہوئی تھی۔ دونوں کے چہروں پر بشاشت نمایاں تھی۔ پٹی کے باہر کانتے کے بال سلیقے سے کڑھے ہوئے تھے۔ تنگ لباس میں اُس کا چوڑا سینہ کچھ اور چوڑا ہوگیا تھا۔ پیرو دادا بھجل کے کان میں کچھ کہہ کے کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔ جامو اور کانتے نے چائے ختم ہی کی تھی کہ بھجل نے مجھے ٹہوکا مارا اور نرم آواز میں ہدایت کی کہ میں جامو اور کانتے کو ساتھ لے کے جلد از جلد گھر روانہ ہو جاؤں۔ وہ دونوں جز بز ہونے لگے۔ میں سمجھتا تھا، وہ انکار کردیں گے کیونکہ یہ موقع گھر جانے کا نہیں تھا لیکن وہ دونوں کسمسا کے رہ گئے۔ میں نے ماشٹی اور دوسرے لوگوں کو دیکھنے کا بہانہ کرنا چاہا مگر بھجل نے میرا منہ بند کردیا۔ اُس نے مجھے تاکید کی کہ میں جامو اور کانتے کو گھر ہی روکے رکھوں۔ اس تاکید کے بعد حیل وحجت کی گنجائش نہیں تھی۔ مجھے بھجل کا مطلب سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ ابھی اندھیرا تھا اور ہم روشنی پھیلنے سے پہلے گھر پہنچ سکتے تھے۔

"اور تم ــ ؟" میں نے منتشر لہجے میں بھجل سے پوچھا۔

"میں پیرو دادا کے ساتھ رہوں گا۔" وہ درشتی سے بولا۔

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی جامو اور کانتے اُٹھ گئے۔ نتیجتہً مجھے بھی اُن کے ساتھ اُٹھنا پڑا۔ باہر موٹر تیار کھڑی تھی۔ ہم تینوں پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ کانتے نے اپنا سر میرے کندھے پر ڈھلکا دیا تھا۔ میرا دماغ جل رہا تھا۔ ڈرائیور کی موجودگی میں اُن سے کچھ پوچھنا نازیبا تھا۔ سارے راستے خاموشی رہی پھر گھر سے فاصلے فاصلے پر میں نے گاڑی رکوا دی۔ مجھے اس احتیاط کا اچانک خیال آگیا تھا۔ ہم دبے دبے قدموں سے اندھیرے میں گزرتے ہوئے چند منٹ میں گھر پہنچ گئے۔ دروازہ پہلی ہی دستک پر کھول دیا گیا۔ جولین سامنے کھڑی تھی۔ ہم تینوں تیزی سے اندر داخل ہوگئے۔ میں نے دروازہ بند کرکے چٹخنی چڑھا دی۔ ڈرائنگ روم میں ٹیبل لیمپ روشن تھا۔ ایک کتاب فرش پر گری ہوئی تھی، باقی کتابیں صوفے پر بکھری ہوئی تھیں۔ جولین نے جلدی جلدی اپنا لباس درست کیا۔ وہ سراسیمگی سے ایک کونے میں سمٹ گئی تھی۔ "تم اب تک جاگ رہی ہو؟" میں نے اُس کی حیرت اور پریشانی کم کرنے کے لیے نرمی سے پوچھا۔

اُس کی پلکیں پٹ پٹانے لگیں اور اُس نے تیزی سے گردن ہلائی۔

"جامو اور کانتے بھائی آرام کریں گے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"ہمارے لیے کوئی تکلیف مت کرنا۔" کانتے درمیان میں بولا۔

"یہ کیا ہوگیا؟" وہ کانتے کی پٹیوں کی طرف انگلی اُٹھا کے دہشت سے بولی۔ "بھجل بھائی کہاں ہیں؟"

"وہ بھی جلدی آجائیں گے، ذرا معمولی سا جھگڑا ہوگیا تھا۔ کانتے اور جامو بھائی کو کچھ چوٹیں آئی ہیں۔ انھیں آرام کی ضرورت ہے۔ دودھ ہو تو گرم کرکے انھیں پلا دو۔"

"دودھ والا بس آتا ہی ہوگا۔" اُس کی آواز لرز رہی تھی۔

"میں بازار سے دودھ لے آتا ہوں، تم ان کے لیے بستروں کا انتظام کردو۔" جامو اور کانتے نے منع کیا لیکن جولین بھاگی ہوئی باورچی خانے سے دودھ کا برتن لے آئی۔ میں اُن دونوں کو دہیں چھوڑ کے گلی میں آگیا۔ دودھ کی دُکان پر جانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ دودھ والا راستے ہی میں مل گیا۔ جب میں واپس آیا تو جامو اور کانتے میرے کمرے میں جا چکے تھے۔ جولین نے اتنی دیر میں دونوں کے لیے بستروں کا انتظام کردیا تھا۔ نیپا بھی جاگ گئی تھی۔ میں نے کانتے کا لباس بدلوا دیا اور اُس کے پاس بیٹھ کے اُس کا سر دباتا رہا۔ صبح کی روشنی اُجاگر ہو رہی تھی۔ جامو نے آنکھیں میچ لی تھیں۔ جولین کی آہٹ پر وہ دونوں پھر اُٹھ کے بیٹھ گئے۔ جولین دودھ کے ساتھ مکھن اور بسکٹوں سے بھری ہوئی کشتی ساتھ لائی تھی۔ دودھ پیتے ہی جامو نے مجھے بھی اپنے ساتھ سو جانے کا مشورہ دیا۔ میں تھوڑی دیر بعد آنے کا بہانہ کرکے باہر آگیا۔ میرے جسم پر کوئی زخم نہیں تھا اور نہ میری آنکھیں اُن کی طرح بوجھل تھیں۔ ڈرائنگ روم میں جولین مجھ سے طرح طرح کے سوال کرنے لگی۔ میں نے تیواڑی کی ناک کاغذ میں لپیٹ کے جیب میں رکھ لی تھی۔ سوچا تھا، اُسے دکھاؤں گا تو وہ ڈر جائے گی اور جب اُسے معلوم ہوگا کہ یہ کس کی ناک ہے تو اُس کی حالت قابلِ دید ہوگی۔ وہ کرشنا جی کو اپنے باپ سے زیادہ یاد کرتی تھی۔ یہ مکان بھی اُسے کرشنا جی ہی نے دلایا تھا۔ اُس نے ہر کمرے میں اُن کی تصویر سجا رکھی تھی۔ تیواڑی کی ناک میری جیب میں پڑی رہی اور میں اُسے اِدھر اُدھر کی باتوں میں بہلاتا رہا لیکن خود میری زبان بہک رہی تھی اور میرے منہ سے اوندھے سیدھے لفظ نکل رہے تھے۔ میں نے اُسے جامو اور کانتے کا خیال رکھنے کی ہدایت کی اور کہا کہ اُن کا کمرہ بند رہے اور پڑوسیوں کی نظریں اُن پر نہ پڑیں تو بہتر ہے۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ میں ایسی باتیں کرکے خود اپنی کہی ہوئی تسلی آمیز باتوں کی نفی کر رہا ہوں۔ اُس کی آنکھوں کی بے چینی اور بڑھ گئی۔ میں نے اپنے ہونٹ بند کرنے کی کوشش کی تو میری خاموشی سے وہ اور پریشان ہو گئی حالانکہ اندیشے کی کوئی بات نہیں تھی۔ بھجل نے انھیں محض احتیاطاً گھر بھیج دیا تھا کہ وہ آرام بھی کرلیں گے اور اڈے پر پولیس کے آنے کے بعد کوئی اُلجھن بھی پیدا نہیں ہوگی۔ دوسرے زخمی لوگوں کی طرح بھجل انھیں کسی اور جگہ بھی بھیج سکتا تھا اور اگر زیادہ تشویش کی بات ہوتی تو وہ انھیں کسی بھی گاڑی سے روانہ کرسکتا تھا۔ جتنی دیر میں پولیس تفتیش شروع کرتی، وہ کسی اور شہر میں گھوم رہے ہوتے۔

کانتے کا سر دباتے ہوئے مجھے اُس سے چند ہی باتیں کرنے کا موقع ملا تھا۔ اُن کے ساتھ ستّر کے قریب منتخب آدمی تھے۔ وہ آدھی رات گزرنے کے بعد تیواڑی کے اڈے کے اطراف پھیل گئے تھے۔ انھوں نے اپنے راستے میں مزاحم ہونے والے ہر آدمی کو خاموش کردیا

تھا۔ موٹروں نے انھیں مختلف مقامات پر اُتارا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ مختلف گلیوں سے گزرتے ہوئے اور تیواڑی کے آدمیوں کو پہلے ہی ہلّے میں ختم کرتے ہوئے اُس گلی میں داخل ہوگئے جہاں تیواڑی کا اڈا تھا۔ چند روز ہوئے تیواڑی اپنا پرانا اڈا بدل کے یہاں آگیا تھا۔ کچھ لوگ باہر پہرا دیتے رہے اور ان کی ایک بڑی تعداد عمارت میں داخل ہوگئی۔ جو باتیں جولین کی آمد کے باعث کانتے مجھے نہیں بتا سکا تھا، اُن کا میں خود اندازہ کرسکتا تھا۔ عمارت میں داخلے کے وقت اُنھیں کسی قدر دشواری پیش آئی ہوگی لیکن وہ سب کے سب واپس آگئے۔ کانتے کہتا تھا کہ تیواڑی کے پاڑے میں اور اُس کے اردگرد لاشیں بکھری پڑی ہیں، کاش وہ مجھے بھی ساتھ لے جاتے۔ میری آنکھوں پر تو انھوں نے پردہ ڈال دیا تھا۔ رات پیرو دادا اور بھجل کی باتوں ہی سے میں کھٹک گیا تھا کہ آج ضرور کچھ ہونے والا ہے۔ پیرو کے اڈے کی خاموشی گراں گزر رہی تھی۔ تیواڑی نے اپنی حفاظت کے تمام انتظامات کر رکھے ہوں گے اسی لیے اُس نے اڈا بھی بدل دیا تھا مگر اُس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ وہ اتنی تعداد میں اور اس طرح پاڑے میں اچانک آجائیں گے۔ رات کو کچھ اتنا محسوس نہیں ہوا لیکن جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، میری حیرانی بڑھتی جا رہی تھی۔

اب صبح ہو چکی تھی۔ پولیس نے تمام علاقہ گھیرے میں لے لیا ہوگا، اُنھیں صرف تیواڑی کے آدمیوں کی لاشیں نظر آئیں گی۔ ممکن ہے، تیواڑی کے چند آدمی بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئے ہوں اور بھاگتے بھاگتے اُنھوں نے کسی آدمی کو پہچان لیا ہو مگر ایسی مخبری کا امکان نہیں تھا۔ تیواڑی کا پورا اڈا تاراج ہو چکا تھا۔ مخبری کرنے والے اس حقیقت سے پوری طرح باخبر ہوں گے کہ تیواڑی کے بعد اُس کے دشمن ہی اُس کا اڈا سنبھالیں گے اور ان کے کان میں بھنک بھی پڑ گئی کہ فلاں آدمی نے پولیس میں مخبری کی ہے تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ پولیس کو کچھ بتانے سے پہلے وہ بدلے ہوئے حالات کا جائزہ لیں گے۔ اگر تیواڑی کے کسی وفادار ساتھی نے اپنی جان پر کھیل کے پولیس کی توجہ پیرو دادا و بھجل کی جانب مبذول کرانی چاہی تو اُس کی شہادت کی تصدیق کے لیے پولیس کو بہت سر کھپانا پڑے گا۔ اوّل تو کسی آدمی کے بچ نکلنے کا امکان نہیں تھا۔ اُنھوں نے پوری طرح احتیاط برتی ہوگی اور تمام شہادتیں مٹا کے آئے ہوں گے۔ کانتے کو افسوس تھا کہ اُسے تیواڑی کے پاڑے کو آگ دکھانے کا وقت نہیں ملا۔ اِدھر تیواڑی اور اُس کے قریبی ساتھیوں کی گمشدگی پولیس کے لیے ایک معمّا ہوگی۔ تیواڑی ایسے موقع پر غائب تھا جب ایس پی تسکلا کے بقول اُس کے خلاف کرشنا جی کے معاملے میں از سرِ نو تفتیش ہو رہی تھی۔ اس سے بھی پولیس بہت سے نتیجے اخذ کرسکتی تھی۔ کچھ بھی ہو، شہر کے مختلف پاڑوں کی جانب پولیس کا رجوع ہونا

لازم تھا۔ وہ گرفتاریاں بھی کریں گے۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ میں تو اپنے طور پر ہی سوچ سکتا تھا۔ پیش آنے والے واقعات کے بارے میں صرف اندازے لگائے جاسکتے تھے۔ یہ امکان بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ واقعات بالکل مختلف نوعیت سے پیش آئیں اور ہم دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں۔ میں جلد سے جلد بھجل کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ چاہے مجھے دیکھ کے وہ کتنا ہی ناراض ہو۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اگر بھجل پر کوئی حرف آیا تو میں ساری ذمّے داری اپنے سر لے لوں گا۔ میرے آگے پیچھے دُنیا میں ہے بھی کون۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ جامو اور کانتے گہری نیند سو چکے ہوں گے تو میں نے وہاں سے بھاگنے کا ارادہ کیا۔ میں آہستہ آہستہ کمرے میں گیا اور کوئی آہٹ پیدا کیے بغیر میں نے الماری سے اپنے کپڑے نکال لیے۔ وہ دونوں بے خبر سو رہے تھے۔ غسل خانے میں آکے میں نے جیسے تیسے لباس تبدیل کیا۔ جو کپڑے رات پیرو کے اڈے پر پہنائے گئے تھے، وہ موزوں نہیں تھے۔ جیبیں ٹٹولتے وقت میرے ہاتھ میں پھر تیواڑی کی ناک آگئی۔ میں اُسے نالی میں پھینکتے پھینکتے رہ گیا۔ نالی میں پھر بھی کسی قدر صاف پانی تھا۔

جولین اور چپا کو ایک بار پھر جامو اور کانتے کے بارے میں خیال رکھنے کا کہہ کے میں گھر سے نکل آیا لیکن کچھ دُور پہنچ کے مجھے اپنی خالی جیبوں کا احساس ہوا۔ میری جیب میں چند ہی سکّے تھے۔ دوبارہ گھر واپس آکے میں نے جولین سے چند روپے لیے اور ایک لمحہ بھی گھر میں ضائع نہیں کیا۔ آدھے گھنٹے بعد میں پیرو کے علاقے میں تھا۔ ٹیکسی راستے میں چھوڑ کے تیز قدموں سے میں پاڑے کی طرف بڑھنے لگا۔ علاقے میں کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آتی تھی۔ تقریباً ساری دُکانیں کھل گئی تھیں۔ آگے مجھے پیرو کے پاڑے کے دو ایک آدمی گشت کرتے ہوئے دکھائی دیے۔ میں نے اُن سے نگاہ چرانے کی کوشش کی مگر مجھے دیکھ کے وہ خود ہی بھاگتے ہوئے میری جانب لپکے۔ "کیا حال ہے؟" میں نے پُرسکون لہجے میں اُن سے پوچھا۔

"اچھا خیر ہے راجا جی!" وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

"اور اُس طرف؟" میں نے نگاہوں نگاہوں میں پوچھا۔

اُن میں سے ایک نے آنکھ ماری، دوسرے نے منہ پر ہاتھ رکھ کے بانسری بنائی اور سیٹی بجانے لگا۔ میں اُن کے شانے دباتا ہوا آگے نکل گیا۔ علاقے میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پیرو کے آدمی موجود تھے۔ یہ احتیاط بے سبب نہیں ہوگی۔ آگے میں کہیں نہیں ٹھیرا۔ دُور ہی دُور سے انھیں اشارے کرتا ہوا پاڑے پہنچ گیا۔ عمارت میں قدم رکھ کے مجھے اپنا وزن کچھ ہلکا محسوس ہوا۔ وہاں معمول کے مطابق چہل پہل تھی۔ وہ سب مجھے روک کے بات کرنا چاہتے تھے مگر میں سیدھا بڑے کمرے میں آگیا۔ پیرو سامنے کی چوکی پر بیٹھا ہوا پیر دبوا رہا تھا۔ وہ صرف ایک

جانگیا پہنے ہوئے تھا۔ ایک آدمی اُس کے کھنچے ہوئے سڈول جسم کی مالش کر رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی پیرو نے اُن دونوں کو ہاتھ مار کے بھگا دیا اور ریچھ کی سے اُٹھ گیا۔ "کیا ہے لاڈلے؟" وہ تشویش سے بولا۔ "تم اتنی جلدی کیسے واپس آگیا؟"

"بتھل بھائی کہاں ہیں؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"اپن نے بڑی مشکل سے اُسے کمرے میں بند کیا ہے۔ بتھل بھائی کئی دن سے جگائی کر رہا ہے لاڈلا! ابھی اپن نے بولا کہ تم اندر نہیں جائیں گا تو اپن تم سے کبھی بات نئیں بولیں گا۔" پیرو ہنسنے لگا۔ "استاد مان گیا۔"

"مارتی اور دوسرے لوگ کدھر ہیں؟"

"سب سالا اپنے اپنے ٹھکانوں پر پارسل کر دیا گیا ہے کوئی بات نئیں لاڈلا جانی! سب فٹ فاٹ ہے۔ تم ایدر بیٹھو، بولو کیا پیئں گا؟ کیا کھائیں گا؟" وہ میری کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا۔ "ایسا جلدی کیسے آگیا؟"

"بس آگیا۔" میں نے افسردگی سے کہا۔

"تو ایدر بیٹھو۔ میٹھو راجا! ابھی تم سے بات کرنے کا ٹائم ہی نئیں ملا۔ سالا رات بھر کائیں کائیں ہوتا رہا۔ رات اپن نے پہلی بار تیرا کھیل دیکھا راجا! وہ سالا تیواڑی کا پلا، اکھا شہر میں کاٹتا بھونکتا پھرتا تھا۔ جب تو نے چاقو پھینکا تھا تو اپن کا مغز بھی فرائی ہو گیا تھا۔ اپن نے بتھل بھائی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی حیران تھا کہ سالا کیا داؤ تیرے بھیجے میں آیلا ہے کہ تو نے یوں کھٹاک چاقو پھینک دیا۔ پھر اُودر بتھل بھائی نے تو سالا سب کی آنکھ فیر دیا۔ اپن نے ایسا جادو کبھی نئیں دیکھا۔ ایک پل میں بھاگ کے اُس کے پاس پہنچا اور دیکھتے دیکھتے ناک کاٹ لایا۔ نہ اُس کا لابیل تیواڑی کو ملنے کا ٹائم دیا نہ جھکنے کا۔ ایسا جان پڑتا ہے جیسے تیواڑی ناک آگے کیے سالا تیار بیٹھا تھا کہ آؤ استاد بتھل! اپن کا ناک کاٹ لو۔ پتہ نہیں بتھل بھائی کب گیا، کب واپس آیا، سالا لوگ باگ سویرے سے ہمارا مغز کھاتا ہے کہ دادا! رات کو اپن لوگوں نے کیا دیکھا تھا، ہم بولا۔ جلوو دیکھا تھا، سپنا دیکھا تھا سالا!"

میں چپ بیٹھا سُنتا رہا، وہ میرے جانو کالنتے اور بتھل کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرتا رہا۔ پھر وہ میرے کچھ اور قریب کھسک آیا اور سرگوشی میں اصرار کرنے لگا کہ میں بتھل سے کہہ کے بمبئی میں اُس کا قیام چند دن کے لیے اور بڑھوا دوں۔ میں نے کہا، یہ سب بتھل کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ کب یہاں سے جانے کا ارادہ کرتا ہے۔ وہ میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوا اور کہنے لگا کہ کم از کم پھر میں ہی اس شہر میں رُک جاؤں کیونکہ تیواڑی کا پاڑا آجانے کے بعد اتنا بڑا علاقہ سنبھالنا اُس کے لیے دشوار ہوگا۔ میں نے کہا کہ مجھے پاڑوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے تو ایک مجبوری کے سبب چھنگا استاد سے پاڑا لیا تھا ورنہ مجھے تو کب کا بمبئی سے چلا جانا چاہیے تھا۔

"اپن کا سب کچھ تیرا ہے لاڈلا! اپن ایک بار ہاں کہہ دے۔" وہ بے تابی سے بولا۔

"تو اگر پاڑا چلانے کا کام کرنا نئیں چاہتا تو مت چلانا۔ تو راجا بن کے رہنا اور کبھی پاڑے میں مت آنا۔ اپن تجھ کو بتھل کی طرح سمجھ گا راجا!"

"پیرو دادا!" میں نے سر جھکا کے کہا۔ "مجھے جانا ہے۔"

"اپن کو پتہ ہے تجھے جانا ہے۔ بتھل نے اپن کو کچھ کچھ تیرے بارے میں بولا ہے۔ پر بہت زیادہ نہیں۔ اپن پوچھتا رہ گیا، بولا پیرو دادا! لاڈلا اپنے آپ کو بند کرتا ہے تو مجھ سے اُس کو مت کھلواؤ۔ بول لاڈلے! اپن تیرے لیے کیا کر سکتا ہے؟"

"تمھارا بہت بہت شکریہ پیرو دادا! تم نے تیواڑی کے معاملے میں ہماری مدد کی۔ یہی بہت ہے۔ تمھارا دل بہت بڑا ہے۔"

"اپن نے کچھ بھی نئیں کیا لاڈلا! اپن تو بیٹھا سالا دیکھتا رہا۔" وہ اضطراب سے بولا۔ "لاڈلا! اپن نے تیرے لیے ایک بات سوچا ہے۔ ذرا تسلی سے سننا۔" میرے کان کھڑے ہو گئے۔ "لاڈلا! اپن چاہتا ہے کہ ابھی بتھل بھائی سے ایسا رشتہ بنا لے کہ کبھی نہ ٹوٹے۔ اپن نے بتھل بھائی سے کوئی بات نئیں بولا ہے۔ اپن نے سوچا، پہلے تجھ سے بات کرے گا۔" وہ میرا ہاتھ دباتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "کچھ اور مت سمجھنا۔ خیال کر لینا کہ تیرے سامنے پیرو دادا بول رہا ہے جس کا کوئی عزت ہے۔ اپن تجھے ایک راز کی بات کھول رہا ہے۔ بتھل بھائی کی طرح اپن کا بھی ایک اولاد ہے۔ وہ اپن کا بیٹا بھی ہے، بیٹی بھی۔ اپن نے اُسے پاڑے کی زندگی سے جدا رکھا ہے۔ اس کی ماں بڑے گھرانے کی عورت ہے۔ اپن اُٹھا لے آیا تھا۔ یہ ایک لمبا کہانی ہے۔ بس اتنا جان لے کہ اس کے بعد وہ گھر واپس نئیں گیا اور اپن بھی اُسے ایدر نئیں لایا۔ اپن نے اکھا زندگی اُسے بند کھیلتا دیکھنے کے لیے بتا دیا ہے۔ جو باقی رہ گیا ہے وہ بھی اُسی کے لیے ہے۔ اپن اُس کے ماتھے پر ایک لکیر دیکھنا نئیں مانگتا تھا۔ جو کچھ اپن سے ہو سکا، اُس کے لیے کیا۔ یہ پاڑا، یہ سالا اکھا دھندا اُسی کے لیے ہے سن جانی! اپن کی رانی کا ایک بیٹی ہے، ابھی اپن اپنے منہ سے اپنی بیٹی کے بارے میں کیا بولے۔ وہ چاند کا ٹکڑا ہے۔ پڑھا لکھا ہے۔ اپن تجھے اُس کو دینا چاہتا ہے۔ اپن پیرو دادا ہے لاڈلا! کوئی باپ اپنی بیٹی کے بارے میں ایسا نئیں بولتا۔ پر اپن نے تجھ سے کوئی شرم نئیں کیا ہے کیونکہ اپن کا من صاف ہے اور اپن صاف بات مانگتا ہے۔ تو اُسے لے لے۔"

میرے کان سن سن کرنے لگے۔ "پیرو دادا!" میں نے دہشت سے کہا۔ [...]ں کرو، ایسی باتیں مت کرو جن کا جواب سنتے ہوئے تمھیں دُکھ ہو۔ تم [...]ے اس لائق سمجھتے ہو، یہ تمھارا بہت احسان ہے، بہت شکریہ۔" میری [...]از گھٹ گئی۔ "مگر میں۔۔۔ میں کسی لائق نہیں ہوں۔ مجھے نہ تو بتھل [...]ائی کے پاس رہنا ہے، نہ کہیں اور۔ زبان بند کر لو پیرو دادا! بھول جاؤ [...]م نے۔۔۔ تم نے ابھی مجھ سے یہ باتیں کی ہیں۔ مجھے اپنی نظروں [...]بہت گراؤ۔ مجھے اتنا نادم مت کرو۔"

"اپن کا کوئی زور نہیں ہے، اپن جانتا ہے۔"

"اس سے آگے کوئی بات مت کرنا، پیرو دادا!"

"لاڈلا! اپن تجھ سے منت نئیں کرتا، سوچنے کو بولتا ہے۔ اپن [...]نتا ہے۔ یہ باتیں زور دینے کی نئیں ہوتیں۔ یہ سب تیرے جی پر ہے۔ [...]اپن نے تیرے سامنے ایک بات رکھی ہے۔ تو چاہے تو اُسے ایک بار [...]کھ لے۔ تیرے لیے اپن یہ بھی کر سکتا ہے۔ وہ بہت اچھا بیٹی ہے۔ [...]ایک دم ایک نمبر ہے۔"

"وہ ضرور اچھی ہوگی لیکن میں بہت بُرا ہوں پیرو دادا! کچھ اور [...]ت کہو۔ میرے لیے سر اُٹھانے کی گنجائش باقی رکھو۔"

"تو سوچ لے۔" وہ افسردگی سے بولا۔ "اچھی طرح سوچ لے۔ اپن [...]بتھل بھائی کے مافک نئیں چاہتا کہ تو چاقو اُٹھائے۔ اپن تجھ کو وہی [...] دیکھنا مانگتا ہے جو بتھل دیکھنا مانگتا ہے اور جیسا تو خود ہے۔"

میں نے اُس کے پیر پکڑ لیے۔ "سوچنے کے لیے کچھ نہیں ہے [...]دادا!" میری آواز بھر بھرانے لگی۔ "اپنے لفظ واپس لے لو پیرو دادا!"

وہ کسی بُت کی طرح ساکت ہو گیا۔ مجھے اپنے سارے جسم پر اُس [...]نظریں چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ میرا جی گھبرانے لگا۔ جی میں آیا، اُٹھ [...] بھاگ جاؤں لیکن پیرو جھرجھری لیتا ہوا خود سنبھل کے بیٹھ گیا۔ اُس [...] میرے ہاتھ اپنے پیروں سے ہٹائے اور انھیں اپنے سینے پر رکھ لیا۔ [...]سر ہلانے لگا۔ پھر اُس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ میں لفظ ہی ڈھونڈتا [...]ا اُسے کس طرح بتاؤں۔ کیا کہوں۔ وہ اب کچھ کہہ نہیں رہا تھا لیکن [...]ں کی خاموشی بھی مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ پیرو میرا ہاتھ [...]ے جھٹکے سے اُٹھ گیا۔ اُسی وقت ایک آدمی بھاگتا ہوا اندر داخل [...]اور پیرو کے کان میں کچھ کہنے لگا۔ پیرو کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔

[...]نے دو۔" وہ گرج کے بولا۔ "آنے دو۔"

"کون ہے؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"پولیس کا آدمی۔" وہ تملا کے بولا۔ "لاڈلا! تم اندر جاؤ۔ میں اس [...] بات کرتا ہوں۔ جاؤ، تم اندر جاؤ۔" وہ مجھے دھکا دینے لگا۔

"میرے یہاں رہنے میں کیا حرج ہے؟" میں نے ترشی سے کہا۔

"نئیں لاڈلا! تم بات سمجھا کرو۔ وہ علاقے کی پولیس کا آدمی ہے [...]ئی خاص بات بولنا چاہتا ہوگا، ابھی اپن نے بھی اپنا کئی آدمی اُدھر بھرتی کرایا ہے۔ تم ایدر سویرے سویرے کیسے واپس آگیا؟ تم کو بتھل بھائی نے گھر بھیجا تھا۔ تم اُن دونوں کو چھوڑ کے ایدر کیوں آگیا؟ ابھی تم اندر بھی مت جاؤ بلکہ پاڑے سے باہر جا کے ٹیکسی پکڑو اور سیدھا گھر جاؤ۔ کوئی بات ہوگا تو اپن آدمی بھیج دیں گا۔"

"میں تو گھر سے یہاں آیا ہوں اور تم واپس جانے کو کہتے ہو؟ جامو اور کالنتے گھر میں سو رہے ہیں، جس طرح تم اور بتھل بھائی یہاں ہو، میں بھی ہو سکتا ہوں۔"

"تم بھی ہو سکتا ہے، پر تم کو بتھل بھائی نے کیا بولا تھا، تم سامنے مت آؤ تو اچھا ہے۔ ابھی ہم سالا ایدر کیا مکھی مار رہا ہے۔"

"مجھے یہیں رہنے دو۔ آخر تم مجھے کیوں واپس کرنا چاہتے ہو؟"

"لاڈلا! بچہ مت بنو۔" وہ جھنجلا کے بولا۔ "اپن بولتا ہے تم جاؤ۔ وہ علاقے کا آدمی ہے۔ تم کو ایدر نئیں دیکھے تو ٹھیک ہے۔ اُس کے ساتھ کوئی اور بھی نیا آدمی ہو سکتا ہے۔ اپن ایدر موجود ہے، تم کیوں فکر کرتا ہے۔"

"اگر انھوں نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو کیا ہوگا؟"

"کچھ نئیں ہوئیں گا، پر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ابھی اپن نے اپنا جیسا سوچا ہے، سالا دن کا رات ہوتے ہوتے کیا دیر لگتا ہے۔"

"تم کیسی باتیں کرتے ہو، یہ اڈا اب میرے نام سے چلتا ہے۔ کیا علاقے کی پولیس اس بات سے بے خبر ہوگی؟ میں یہاں نہیں ہوں گا تو وہ اور مشکوک ہو سکتے ہیں۔ کیا وہ پوچھیں گے نہیں کہ راجا کون ہے اور کدھر ہے، پھر تم کیا جواب دو گے؟ ہم سب کو اُن کا سامنا کرنا چاہیے۔ جو زخمی ہیں، اُن کی حد تک تو بات ٹھیک ہے لیکن میرے جسم پر کوئی نشان نہیں ہے۔ میں بھی تمھاری طرح اُن کے سامنے آ سکتا ہوں اور اُن سے بات کر سکتا ہوں۔"

"لاڈلا! یہ اڈا تیرے نام سے ضرور ہے اور تیرا ہی ہے۔ پر تو نے آج تک علاقے کا پولیس کا آدمی سے بات نہیں کیا۔ اب بھی کرنے کی ضرورت نئیں ہے۔ اپن زیادہ بات نئیں بولتا۔ وہ اب آتا ہی ہوگا۔ جا پچھلے دروازے سے نکل جا۔ وہ کوئی بھی ارادہ دل میں لے کے آ سکتا ہے۔ وہ اپن سب کو چوڑیاں بھی پہنا سکتا ہے۔ لاڈلا! سالا واردات بھی تو دیکھ۔ پولیس سالا پبلک کو اور بڑا افسر کو کیا منہ دکھائیں گا۔ کچھ نہ کچھ اُسے کرنا ہوئیں گا۔ پولیس والا یہ نئیں سمجھیں گا کہ تیواڑی کے اڈے پہ جگہ جگہ یہ پان کا پیک کس نے تھوکا ہے۔ کس پلڑے والا آدمی نے ایسا کیا ہوگا۔ وہ ہر طرف آئے گا۔ ایدر بھی آئے گا اور ایدر پہلے آئے گا کہ اپن کا اور تیواڑی کا بہت پہلے سے لگتا تھا۔ اپن سالا تیواڑی سے سدا ہار گیا کہ اپن وہ دھندا نئیں کر سکتا تھا جو تیواڑی کرتا تھا۔ وہ سالا تو آدمی نئیں کُتا تھا۔"

"اگر تم پکڑے گئے تو میں بھی تمھارے ساتھ جاؤں گا۔"

"لاڈلا! دھتا مت لگاؤ۔" وہ ناراضی سے بولا۔ "تم کو یہ سب نئیں کرنا تو تم ایسا کیوں سوچتا ہے۔ جو اپن بولتا ہے وہ کرو۔ تم کیوں جائیں گا جب اپن ایدھر بیٹھا ہے۔ زیادہ آدمی جانا ٹھیک ہے یا کم آدمی؟"

"تمھارے اور تجمل بھائی کے بدلے میں چلا جاؤں گا۔"

"اور اپن تجھے جانے دیں گا؟" وہ طیش میں بولا۔ دروازے سے ایک اور آدمی بھاگ کے آیا۔ پیرو نے مجھے سخت لفظوں میں خفیہ دروازے سے باہر نکلنے کی تلقین کی۔ میں سمجھ چکا تھا کہ میری کوئی بات اس پر اثر انداز نہیں ہوگی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ میں نے جیل میں سات سال گزارے ہیں اور ان پولیس والوں سے میرا واسطہ کچھ کم نہیں رہا ہے۔ وہاں سے ایک لمحے کے لیے ہٹنے کو میرا بالکل جی نہیں چاہتا تھا۔ مجھے حالات کی نزاکت کا پوری طرح احساس تھا۔ تجمل اندر موجود تھا۔ جو اس کا حشر ہوتا، وہی میرا بھی ہوتا مگر پیرو کا اصرار اتنا شدید تھا کہ مجھے اس کی بات ماننی پڑی۔ پولیس اندر آئی تو ایک آدمی نے مجھے اشارہ کیا اور پاڑے کے خفیہ دروازے سے باہر نکال دیا۔ یہ دروازہ سڑک پر کھلنے کے بجائے برابر کی عمارت کے ایک فلیٹ میں نکلتا تھا۔ فلیٹ میں پیرو کے ایک آدمی کا کنبہ رہتا تھا۔ اس آدمی نے مجھے فلیٹ میں روکنا چاہا مگر میں سیڑھیاں اترتا ہوا گلی میں آگیا۔ علاقے میں ہر طرف پولیس پھیلی ہوئی تھی۔ میں پاڑے سے کچھ دور ہوٹل میں جا کے بیٹھ گیا۔ یہاں سے میں پاڑے کا پھاٹک بہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔ چائے کے دوران میں میری نظریں اسی دروازے پر مرکوز تھیں۔ ہوٹل میں پاڑے کے کچھ اور آدمی بھی تھے لیکن وہ مجھ سے بے نیاز بیٹھے رہے۔

مجھے متلی سی ہو رہی تھی۔ میں نے دو تین گھونٹوں میں چائے ختم کرلی۔ ہوٹل میں بہت شور تھا۔ زور زور سے گراموفون بج رہا تھا۔ میں نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے اور میز پر کہنیاں ٹیک کے بیٹھ گیا۔ معلوم ہوتا تھا، ہوٹل میں آنے والے کے لیے گانا سننا شرط ہے۔ پیرو کے جو آدمی ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تھے، ان سب کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ انھیں بھی معلوم ہوگا کہ پاڑے میں پولیس موجود ہے اور وہ سمجھ رہے ہوں گے کہ میں اسی کے خوف سے یہاں آ کے بیٹھ گیا ہوں۔ جب خود میرا یہ حال ہے تو ان پر اس کا کیا اثر ہوگا۔ میں نے سوچا۔ واپس پاڑے چلا جاؤں۔ اس سے بہتر تھا کہ میں اس ہوٹل ہی میں نہ آتا بلکہ کہیں اور نکل جاتا لیکن یہاں آنے کے بعد اچانک اٹھ جانا ان کے لیے اور تشویش کا سبب ہوتا۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ یہ ایک موزوں ترین جگہ تھی۔ یہاں سے میں پاڑے کی عمارت میں آنے جانے والے ہر شخص کو دیکھ سکتا تھا۔ خاصی دیر ہوگئی۔ اندر سے کوئی نہیں نکلا۔ مجھے اپنے آپ سے چڑ ہونے لگی کہ میں نے پیرو کی بات رد کیوں نہیں کر دی۔ یہاں تماشائی کی طرح آ کے کیوں بیٹھ گیا۔ پھر سویرے سویرے میرے گھر سے واپس آنے کا کیا مقصد تھا۔

میرے ذہن میں کوئی بات واضح نہیں تھی۔ سر میں بھڑکی سی چل رہی تھی۔ پولیس والے ابھی واپس نہیں ہوئے تھے۔ بہت ممکن کہ جب وہ باہر نکلیں تو تجمل، پیرو اور پاڑے کے بہت سے آدمی ان کے ہمراہ ہوں۔ اگر نتیجہ یہی نکلنا تھا کہ رات کو تیواڑی کے پاڑے میں گھس کے چاقوؤں کی دھار آزمائی جائے اور اسے کسی نہ کسی طرح کھلی آنکھوں اور جلتے ہوئے جسم کے ساتھ پکڑ کے میرے سپرد کر دیا جا[ئے] اور صبح اس واردات کے الزام میں خود کو پولیس کے حوالے کر دیا جا[ئے] تو یہ خوب لطیفہ تھا۔ یہ نتیجہ بھگتتے ہوئے پیرو اور تجمل مجھے شریک نہیں کرنا چاہتے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ نتائج کی ساری ذمے داری انھی پر آنی چاہیے۔ جیسے تیواڑی سے تو انھی کا معاملہ تھا نا، میں تو ایک بیمار کا آدمی تھا اور میں نے تو انھیں اس کام کا ٹھیکا دیا تھا۔ نہ میں ان کی سوچ میں شریک تھا۔ نہ میں نے عملی طور پر ان کا ساتھ دیا تھا۔ وہ چلے جائیں اور میں دیکھتا رہوں خوب۔ نہ جانے وہ کیا سمجھتے تھے۔

اگر تجمل کو یہ اندیشہ تھا کہ کرشنا جی کی وجہ سے بہت سے پولیس افسر میری صورت آشنا ہیں، میں یہاں موجود ہوں گا تو ان میں سے کوئی بھی مجھے پہچان سکتا ہے۔ مجھے خود بھی یہ اچھا نہیں لگتا تھا کہ مرنے کے بعد کرشنا جی کے نام پر کسی قسم کا داغ آئے۔ مجھے پہچان لیا جاتا تو اخبارات اور شہر بھر میں قسم قسم کی افواہیں بھنبھنانے لگتیں۔ متناز[عہ] واقعہ دہرایا جاتا اور کہا جاتا کہ راج کرشنا ایک ایسے شخص کو اپنے سا[تھ] رکھتا تھا جس کا تعلق شہر کے مشہور داداؤں سے ہے مگر وہ تو میں کسی وقت بھی پہچانا جا سکتا تھا۔ کرشنا جی کے ہاں بڑے افسر آتے تھے۔ ان کا تعلق پولیس ہیڈ کوارٹر سے تھا یا ہیڈ آفس سے۔ علاقوں کے چھوٹے افسروں سے ان کا رابطہ کم رہتا تھا۔ اس لیے علاقوں کے پولیس والے [مجھ] سے واقف نہیں تھے۔ ادھر میں نے اپنے آپ کو محدود رکھنے کی پوری کوشش کی تھی۔ مجھے اس بات کا بہت پہلے سے خیال تھا۔ پاڑے کے تمام معاملات زیادہ اور چھیدا ہی پولیس سے طے کرتے تھے۔ رات کو میں عموماً پاڑے میں نہیں رہتا تھا۔ پھر کرشنا جی کی موت کو کئی مہینے گزر گئے تھے۔ جب میں نے جھنگا استاد کے پاڑے میں قدم رکھا تھا [اور] پاڑا لینے کے بعد کرشنا جی کے اصل مجرموں کی نشان دہی میں بھی خاصا وقت لگ گیا۔ یوں سڑک پر کوئی جاننے والا افسر کبھی دیکھ لیتا تو اسے کیسے پتہ چلتا کہ جھنگا سے پاڑا چھیننے والا شخص میں ہی ہوں۔ جھنگا کے پاڑے میں خود بخود میرا نام راجا پڑ گیا تھا لیکن کسی اچھے اور [...] کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کبھی نہ کبھی تو میں کسی جاننے والے کی نظر [میں] آ سکتا تھا۔ میری شناخت کرشنا جی کی رسوائی تھی مگر ان کے قاتل آزادانہ گھومتے رہیں، یہ بے شرمی اس رسوائی سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔ کرشنا کے سامنے میری تسلی نہیں ہوئی۔ جب بھی ان کی تصویر پر نظ[ر]

پڑتی تھی، مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ان کی آنکھیں مجھ سے کچھ کہہ رہی ہیں۔ تاہم مجھے اس بات کا قلق تھا کہ یہ سب کچھ ان کے مرنے کے بعد ہوا۔ مرنے سے پہلے ہوتا تو وہ مجھے لپٹا کے خوب پیار کرتے، ان کا بہت نام ہوتا اور وہ زندہ رہ جاتے۔

میری شناخت اب بھی ان کے لیے ایک نازیبا بات تھی حالانکہ اب صورت بالکل بدلی ہوئی تھی لیکن اب تجمل موجود تھا۔ تیواڑی کے عوض اگر تجمل کے اندر جانے کا امکان تھا تو بات ایک ہی تھی۔ مجھے کیا، کسی کو بھی یہ سودا منظور نہیں ہو سکتا تھا۔ تجمل نے کرشنا جی کی روح کے سامنے مجھے نہال کرنے کے لیے اپنے ذہن میں یہ مفاہمت کرلی تھی تو اس نے یہ کیوں سمجھ لیا تھا کہ میں بھی اسے قبول کرلوں گا۔ کرشنا جی کی رسوائی کی قیمت تجمل کو نہیں چکانی چاہیے تھی۔ کرشنا جی موجود ہوتے تو وہ ہرگز اپنی یہ قیمت مقرر نہ کرتے۔ میرا سینہ اندر سے دھنس رہا تھا اور سر بیٹھا جا رہا تھا۔ پتہ نہیں کیا ہو رہا تھا، کیا ہونے والا تھا۔ کیا سوچ کے تجمل نے اتنے لوگ اکٹھے کیے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی کچا نکل سکتا تھا۔ اس نے اتنا شور کیوں مچایا۔ ہر جگہ یہ منادی کیوں کرائی کہ اب پیرو کا اڈا راجا کے نام سے چلے گا اور تینوں پاڑے ایک ہو گئے ہیں۔ مشکوک ہونے کی تو یہی بات تھی کہ پیرو نے کسی تامل کے بغیر اپنا اڈا اجنبی لوگوں کے حوالے کر دیا ہے۔ شک کی دعوت تو خود تجمل نے دی تھی۔ روزانہ اکھاڑا جمانا، نعرے لگانا، چوکی پر بیٹھ کے حکم چلانا اور پیرو کا خاموشی سے بیٹھے رہنا۔ یہ ایسی باتیں نہیں تھیں جو دوسرے پاڑوں میں نہ پہنچی ہوں۔ اگرچہ یہ سب تیواڑی کے لیے تھا کہ وہ ایک بہت بڑے اڈے کا مالک ہے، چھوٹے موٹے پاڑے شامل کر کے تقریباً آدھا شہر اس کے زیر اثر آجاتا تھا اور اس کے پاس آدمیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ بہت بڑا کنبہ تھا اور تجمل نے یہ سب کچھ دیکھ کے اپنے دماغ میں اس کے لیے موت سے بدتر سزا تجویز کر رکھی تھی تو اسے اور باتوں پر بھی توجہ دینی چاہیے تھی۔ ممکن ہے اسے میں یہ سزا نہ دے پاتا لیکن میں رفتہ رفتہ اس کے قریب پہنچ رہا تھا۔ شمبھو ناس کی موت کے بعد وہ آدھا رہ گیا تھا۔ باقی آدھا بھی کسی نہ کسی صورت سے مجھے ہی ختم کرنا تھا مگر اس طرح نہیں ہوتا۔ شمبھو ناس کی طرح پولیس کھوج لگاتی رہتی۔ پیرو نے ابھی ابھی جس لہجے میں بات کی تھی، اس میں خوف کا نمک شامل تھا۔ گویا اس کا یقین بھی متزلزل ہو گیا تھا کہ جو کچھ ہو رہا تھا اور ہو چکا ہے، اس میں اس کا دامن صاف رہے گا۔ اس نے مجھے پاڑے سے نکال دیا تھا کیونکہ اسے حالات بگڑ جانے کا اتنا ہی خدشہ تھا جتنا مجھے۔ شاید یہی کوئی چھپا ہوا خوف تھا کہ اس نے اپنی بیٹی کا ذکر مجھ سے کر دیا۔ وہ کہتا تھا کہ اس نے اپنی بیٹی اور بیوی کے لیے جو کچھ ہو سکا ہے، فراہم کیا ہے۔ تیواڑی کے بعد شہر میں دوسرا بڑا پاڑا پیرو کا تھا۔ شہر میں دوسری بڑی آمدنی کا پاڑا۔

اسے آنے والے دنوں پر اعتبار نہیں ہوگا جبھی وہ مجھ سے کہتا تھا کہ اب یہ سب کچھ میں سنبھال لوں۔ یعنی وہ بھی اب اس کشمکش میں مبتلا تھا کہ تجمل کے اندازے غلط بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ تجمل کے خیال سے وہ کھل کے اپنے تذبذب کا اظہار نہیں کر رہا تھا مگر وہ متردد ضرور تھا۔

تجمل اندر سو رہا تھا۔ جامو اور کانتے ادھر گہری نیند میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پیرو جاگ رہا تھا اور میں جاگ رہا تھا۔ کسی آدمی نے اشارہ کیا ہوگا، بیرے نے میرے سامنے ایک اور چائے لا کے رکھ دی۔ میں ہڑبڑا گیا اور میں نے اپنے دماغ کی دھول جھاڑنے کے لیے بے اختیار کئی بار سر جھٹکا۔ اسی لمحے پاڑے کے پھاٹک کی کھڑکی کھلی۔ میں نے اپنی کرسی سیدھی کرلی۔ میری نگاہ وہیں ٹکی ہوئی تھی۔ پاڑے کے دو تین آدمی کھڑکی سے باہر نکلے۔ پھر ایک باوردی شخص برآمد ہوا۔ اس کے ساتھ تین سپاہی تھے۔ میں انتظار کرتا رہا مگر اندر سے کوئی اور نہیں نکلا۔ پاڑے کے آدمیوں نے چند قدم تک پولیس والوں کا ساتھ دیا پھر واپس ہو گئے۔ میں نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ پولیس والے ہوٹل کے قریب آگئے۔ وہ علاقے کے تھانے کا کوئی چھوٹا افسر تھا۔ میں نے اس کا چہرہ غور سے دیکھا۔ وہ فکر زدہ تھا۔ جب وہ ہوٹل سے گزر گئے تو میں نے اٹھنے میں دو تین منٹ کا توقف کیا۔ ہوٹل والے نے مجھ سے چائے کے پیسے نہیں لیے۔ پیرو کے آدمیوں نے منع کر دیا ہوگا۔ میں نے بھی اصرار نہیں کیا۔ پاڑے کی عمارت کے باہر اسٹول پر بیٹھے ہوئے لوگ میرے وہاں پہنچنے پر کھڑے ہو گئے۔ "کیا بات ہے؟" میں نے اپنا تجسس چھپاتے ہوئے پوچھا۔

"ییلا رام آیا تھا۔" ایک نے لاپروائی سے کہا۔ "اپن کا ہی کبوتر ہے۔ دادا کو بولنے آیا تھا کہ ذرا نرم گرم ہو سکتا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے گھبرا کے کہا۔

"ابھی سنا ہے کہ سالا کچھ فنکشنوں کا آرڈر خاطری کرے گا بھلے کرلے۔" وہ ناک چڑھا کے بولا۔ "استاد کو بولتا تھا کہ ایک ڈزن آدمی اندر لے جائے گا۔ ابھی اپن نے استاد کو بولا کہ اپن کو بھیج دو۔ چھٹی کیے ہوئے بہت دن ہو گیا۔ کچھ کر دم نکالے گا۔"

اس کی باتوں پر اس کے ساتھی ہنسنے لگے۔ میں نے ان کا ساتھ دینے کی کوشش کی مگر مسکراہٹ میرے لبوں پہ ٹھٹھرا کے رہ گئی۔ عمارت میں جانے کے بجائے میں وہاں سے آگے چل دیا۔ کچھ آگے جا کے میں نے ایک ٹیکسی پکڑ لی۔ میرے پرانے علاقے میں بھی پولیس گشت کر رہی تھی بلکہ ٹیکسی جہاں جہاں سے گزری، چوراہوں پر ٹولیوں میں پولیس موجود تھی۔ ٹیکسی والا راستے بھر مجھ سے رات کے واقعے پر باتیں کرتا رہا کہ ادھر آنے جانے پر سخت پابندی ہے۔ پولیس نے تیواڑی دادا کا پاڑا صبح سے اپنے قبضے میں لے رکھا ہے۔ گاڑی بھر بھر کے پولیس آتی ہے اور علاقے میں بکھر جاتی ہے۔ تیواڑی کے پاڑے کے قریب کا سارا بازار بند پڑا ہے اور

لوگ ملبیٹوں میں گھسے بیٹھے ہیں۔ اِرد گرد کی سڑکیں سنسان پڑی ہیں۔

میرے علاقے میں کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں اندر پہنچا تو زورا بے تابانہ اُٹھ کے میرے پاس آیا۔ اُس نے مجھے زور سے بھینچ لیا۔ یہاں آ کے مجھے کچھ سکون ملا۔ یہاں ممّا بھی موجود تھا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کے اُچھلنے لگا۔ زورا نے مجھے بتایا کہ مارتی کو سیٹھ دینا کے گودام میں رکھا گیا ہے۔ اُس کے ساتھ دو تین آدمی اور ہیں، مارتی کی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے۔ خون بہت نکل گیا ہے، پیرو کے خاص ڈاکٹر نے بازو میں کئی ٹانکے لگائے ہیں سیٹھ دینا کا گودام پیرو کے علاقے میں تھا۔ زورا نے مجھے اطمینان دلایا کہ وہ جگہ نہایت محفوظ ہے میرے علاقے سے چند لوگ پکڑ لیے گئے تھے۔ زورا اس پر فکرمند نہیں تھا۔ اُسے توقع تھی کہ جلد یا بدیر پولیس افسران اُسے بھی تھانے بلائیں گے یا خود یہاں آئیں گے۔ واپس آتے ہوئے میں نے بالم خان کے اڈے کا بھی ایک چکر لگایا۔ پولیس نے وہاں سے بھی چند آدمی گرفتار کر لیے تھے۔

پیرو کے علاقے میں واپس پہنچتے پہنچتے دوپہر ہو گئی۔ میں باڑے نہیں گیا۔ علاقے میں اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ وہیں مجھے باڑے کے کئی آدمی مل گئے۔ اُن کی زبانی معلوم ہوا کہ تجمل اور پیرو عمارت میں موجود ہیں، کچھ دیر ہوئی تجمل سو کے اُٹھا ہے اور اُس نے جوکی سنبھال کے پیرو کو آرام کے لیے اندر بھیج دیا ہے، صبح سے دو مرتبہ پولیس آ چکی ہے اور کوئی پندرہ بیس آدمی حوالات میں بند کر دیے گئے ہیں، پیرو تھوڑی دیر کے لیے باہر نکلا تھا اور علاقے کے ایک مختصر گشت کے بعد واپس چلا آیا۔ پھر جب انھوں نے تیواڑی کے باڑے میں پولیس کو ملنے والی لاشوں کے بارے میں بتایا تو مجھے یقین نہیں آیا۔ میں گنگ رہ گیا۔ وہ اُن کی تعداد ۲۷ بتا رہے تھے۔ میں نے اُن سے دوبارہ تصدیق کی اور مجھے ایسا گمان ہوا جیسے اونچا سننے لگا ہوں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ پولیس کو کوئی بھی زخمی نہیں ملا، خود تیواڑی کے بہت سے آدمیوں کو پولیس نے پکڑ لیا ہے، اُس کے ماتحت دوسرے باڑوں کے کئی داداؤں کو بھی حوالات میں داخل کر دیا گیا ہے، اُن میں شعلہ استاد بھی شامل ہے۔ میں نے اُن کے سامنے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ چپ چاپ ایک طرف بڑھ گیا۔ میرے قدم بوجھل ہو گئے تھے اور جسم اچانک ٹوٹنے لگا تھا۔ شاید یہ پہلا دن تھا کہ میں نے راہ گیروں کو غور سے نہیں دیکھا۔ شام ہو گئی اور روشنیاں آنکھوں میں کھبنے لگیں تو مجھے گرد و پیش کی خبر ہوئی۔ میں نہ جانے کہاں نکل آیا تھا۔ یہ شہر کا کوئی ایسا علاقہ تھا جہاں میں اس سے پہلے نہیں آیا تھا۔ پیرو کے علاقے سے یہاں تک ہزاروں لوگ سڑکوں پر گزرے ہوں گے۔ ممکن ہے اُن میں کورا بھی گزری ہو۔ مجھے اپنی اس بے خبری سے وحشت ہونے لگی اور کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اِدھر سے ضرور گزری ہے، میں نے اُسے پھر کھو دیا ہے، اُس نے مجھے گم دیکھا ہوگا تو منہ پھیر لیا ہوگا کہ جب مجھے اس کا کچھ ہوش ہی نہیں ہے تو وہ مجھے کیوں آواز دے۔ میں نے اپنا ہاتھ دانتوں سے کاٹ لیا اور میرے دل میں آیا کہ میں ابھی اسی لمحے شہر سے نکل جاؤں، جو تجمل کا حشر ہوگا، اُسے میں نہیں روک سکتا۔ میں نے اُسے نہیں بلایا تھا اور میں نے اُس سے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ کرے۔ مجھے تو کورا کی تلاش میں آگے جانا ہے۔ میں یہاں رہوں گا تو پھر کوئی نہ کوئی بات ہو جائے گی، پھر کوئی زنجیر میرے پیروں میں پڑ جائے گی، کورا تک پہنچنے میں اور دیر ہو جائے گی، میں دیر سے اُس کے پاس پہنچوں گا تو وہ کہے گی، اب بھی کیا ضرورت تھی آنے کی، ابھی اور دو چار کام نمٹا کے آتے۔ میں قریب کے اسٹیشن جانے والی ایک بس میں بیٹھ گیا۔ راستے میں میں نے اپنے ذہن میں کوئی اور خیال نہیں آنے دیا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ جو بھی گاڑی نظر آئی، اُسی میں بیٹھ جاؤں گا لیکن اسٹیشن پر قدم رکھتے ہی میرا ارادہ منتشر ہو گیا۔ میرے گلے میں پڑی ہوئی مالا تنگ ہونے لگی اور اُس کے دانے چبھنے سے لگے۔ ایسا لگا جیسے کورا شکایت کر رہی ہو کہ میں اُس سے ملوں گا تو وہ مجھ سے نہیں بولے گی۔ کہے گی کہ میں تجمل کو چھوڑ کے کیوں چلا آیا۔

وہ اتنی ہی اچھی تھی۔ اُس کا دل اتنا ہی نرم و نازک اور صاف و شفاف تھا۔ وہ ایسا ہی کہتی۔ وہ مجھے کسی کی نظروں میں کم نہیں دیکھنا چاہے گی۔ چاہے وہ خود تکلیف برداشت کر لے۔ اسٹیشن سے پیرو کا علاقہ کچھ نزدیک ہو گیا تھا۔ میں ایک عزم کے ساتھ بس میں بیٹھ گیا۔ میں نے سوچا تھا، تجمل کے سامنے جاتے ہی اعتراف کر لوں گا کہ اس موقع پر اُسے چھوڑنے کا خیال میرے دل میں آیا تھا۔ جب میں رات کو اپنی مالا دیکھوں گا اور کورا میری بند آنکھوں میں کہیں سے اُتر آئے گی تب مجھے اُس کے سامنے ندامت نہیں ہوگی۔

علاقے میں صبح جیسی بات نہیں تھی۔ پولیس کی تعداد پہلے سے زیادہ تھی۔ میں نے اپنے دل کی دھڑکن سنبھالے رکھی۔ تجمل سے اگر کوئی لغزش ہو گئی تھی تو ایسا ہونا ممکن تھا۔ کسی سے بھی ایسا ہو سکتا تھا۔ بڑے بڑے اندازے غلط ثابت ہو جاتے ہیں۔ تجمل پہلے بھی کئی بار جیل جا چکا تھا۔ ایسی واردات کے بعد علاقے میں پولیس کا آنا، تفتیش کرنا اور گرفتاریاں کرنا کوئی توقع کے خلاف بات نہیں تھی۔ توقع کے خلاف بات یہ تھی کہ وہ اتنی آسانی سے تجمل اور اُس کے ساتھیوں تک پہنچ جائیں اور کسی اور طرف سوچنے اور منتشر ہونے کے بجائے اسی جانب اپنی ساری توجہ مرکوز کر دیں۔ توقع کے خلاف بات یہ تھی کہ خود تجمل نے پیچیدہ طریقۂ کار اختیار کر کے اُن کے لیے راستہ آسان کر دیا تھا مگر تجمل نے ایسا کیوں کیا؟ باڑے جانے سے پہلے مجھے معلوم ہو گیا کہ ابھی تک پیرو اور تجمل باڑے ہی میں ہیں، دن بھر پولیس کے کارندے آتے جاتے رہے ہیں لیکن انھیں اہتمام کے ساتھ رسمی تفتیش کے لیے تھانے نہیں بلایا گیا ہے۔ تجمل نے ضرور تمام پہلوؤں پر غور کیا ہوگا۔ میری بے یقینی کی وجہ

شاید کورا ہی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو مجھے پھر دیر ہو جائے گی۔ وہ تجمل کو تھانے بلا لیں، جیل میں بند کر دیں مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انھوں نے تجمل پر فردِ جرم عائد کر دی۔ تجمل نے اپنے دفاع کی ہر تدبیر ذہن میں محفوظ اور ملحوظ رکھی ہوگی۔ اس کے باوجود کوئی حادثہ رونما ہو جائے کوئی روزن کھل جائے تو تجمل کیا کر سکتا ہے۔ پھر تو آدمی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہے اور کرشناجی کو ختم کرنے کے بعد تیواڑی سر اُٹھا کے چلتا ہے اور سمجھو تو اس اُسے سونے کی دیوار میں چھپاتا ہے۔ تجمل نے یقیناً ہر امکان نظر میں رکھا ہوگا۔

پیرو کے آدمیوں نے مجھے باڑے میں داخل ہونے سے روک دیا۔ پھاٹک کے سامنے پولیس کی دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ پتہ چلا کہ اندر علاقے کے تھانے کے بڑے افسر کے ساتھ وہ افسران بھی موجود ہیں جنھیں تیواڑی کے باڑے کی واردات کے سلسلے میں متعین کیا گیا ہے اور انھیں آئے ہوئے خاصا وقت گزر گیا ہے۔ میں دروازے پر کھڑے ہوئے لوگوں کو راستے سے ہٹاتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ تجمل کے ہونٹوں میں حقے کی نے دبی ہوئی تھی۔ پیرو اُس کے بازو میں بیٹھا تھا۔ چوکی پر پولیس کے چار افسر موجود تھے۔ تین سپاہی دُور دیوار سے لگے ہوئے کھڑے تھے۔ افسروں کے سامنے لیمن کی بوتلیں کھلی ہوئی تھیں۔ سب سے پہلے تجمل نے مجھے دیکھا۔ اُس کی بھویں سکڑ گئیں۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور چند لمحوں بعد دوبارہ کھولیں تو اُن میں تاسف اور پریشانی کے اثرات تھے جیسے وہ مجھے دروازے سے لوٹ جانے کی تلقین کر رہا ہو۔ میں کشمکش میں دروازے پر ٹھٹکا کھڑا رہا لیکن واپس جانا مناسب معلوم نہیں ہوا۔ میں تیزی سے چوکی کے پاس پہنچ گیا۔ دروازے کی طرف جن افسروں کی پشت تھی وہ اب میرے سامنے تھے۔ میری آنکھیں سُن ہو گئیں۔ اُن میں میرا ایک شناسا تھا۔ مجھے اپنے حواس بحال رکھنے میں مشکل پیش آئی۔ اُس کا بھی یہی حال ہوا۔ میرے ہاتھ سلام کے لیے اُٹھتے کے اُٹھے رہ گئے۔ اُس کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔ وہ مجھے حیران نظروں سے گھور رہا تھا۔ میں نے بھی اپنی آنکھیں نہیں جھکائیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ تجمل کی آواز پر وہ چونک پڑا۔ "شکلاجی!" تجمل نے بیزار لہجے میں کہا۔ "کوئی اور بات پوچھنی ہو تو جھجک نہ کریں جو کچھ ہم جانتے اور سمجھتے تھے، ہم نے آپ کو بتا دیا ہے۔ آگے بھی جب آپ کا جی چاہے، اِدھر آئیں۔ جو خاطر ہم سے ہو سکی، کریں گے۔ اگر ہمارے اندر جانے سے آپ کا بھلا ہو سکتا ہے تو ہم آپ کے لوگوں کے ساتھ چلتے ہیں۔"

شکلا خاموش رہا۔ اُس کی نظریں مجھی پر مرکوز تھیں۔ اُس کے بجائے ایک دوسرے افسر نے تلخ لہجے میں کہا۔ "تجمل دادا! واردات بہت سنگین ہے۔"

"ہے تو۔" تجمل سر ہلا کے بولا اور حقہ گڑگڑانے لگا۔

"اور اپن کیا بول سکتا ہے۔" پیرو نے تیزی سے کہا۔

"اور ہم کسی کوشش سے گریز نہیں کریں گے۔"

"ایسا ہونا بھی چاہیے۔" تجمل نے نرم آواز میں کہا۔ "یہ کام کسی باڑے کے آدمیوں ہی نے کیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے، انھوں نے کسی کے بولنے پر ایسا کیا ہو، کوئی اور بات بھی ہو سکتی ہے۔ آپ لوگ پولیس والے ہیں یہ باتیں اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ باڑے کے آدمیوں کو باڑے کے آدمیوں سے بیر ہوگا۔ بستی والوں کا اس میں کوئی نقصان نہیں ہوا ہے۔ آپ بولتے ہیں کہ گلی کا چوکی والا بھی محفوظ رہا۔ یہ تو کوئی دشمنی کی بات لگتی ہے صاب لوگو!"

"اور تیواڑی کا دشمن کون ہو سکتا ہے؟"

"وہ اپنا دشمن خود ہو سکتا ہے اور لوگ باگ بھی ہو سکتے ہیں۔ سچ پوچھو تو ہم بھی اُس کے دشمن ہیں۔" تجمل نے کہا۔ "ہمیں تو یہ جان کے خوشی ہوئی ہے۔ تیواڑی کا ریکارڈ تو آپ کے پاس ہوگا۔ ممکن ہے، کسی نے اُسے چھپا دیا ہو۔ نہ ملے تو ہم سے پوچھ لیں۔ ویسے علاقے کی پولیس علاقے کے باسیوں، لوچیوں اور بھٹی والوں کو اب اُس کا اتنا خیال نہیں ہوگا۔ ابھی اُس کے اڈے کے بہت سے آدمی زندہ ہیں، آپ زور دیں تو شاید بے وفائی کر لیں۔ پولیس چپ ہے تو ہم بھی چپ ہیں۔ آپ پوچھتے ہو تو زبان کھولیں۔ پر آپ بابو لوگ سب جانتے ہوں گے۔"

"تم تو کلکتے سے آئے ہو، تمھیں تیواڑی کے بارے میں اتنی باتیں کیسے معلوم ہیں؟" ایک افسر نے تندی سے کہا۔ وہ سب سے زیادہ معمر تھا۔

"بڑے صاب!" تجمل عنودہ لہجے میں بولا۔ "پیرو تو اِدھر رہتا ہے اور بھی اپنی جان یہاں رہتا ہے۔ اسے اڈا بولتے ہیں اور اڈے پر رہ کے ہاتھ پاؤں کے ساتھ دیکھنے اور سننے کے سارے کل پرزے چوکس رکھنے پڑتے ہیں۔ ناک الف رکھنی پڑتی ہے۔"

"اور ہم لوگ اسی لیے تمھارے پاس آئے ہیں۔"

"آپ بھی کمال کرتے ہو جناب!" پیرو نے کسی قدر ترشی سے کہا۔ "ذرا دم تو لینے دو۔ ابھی سالا اپن کو خود اُس مائی کا لال کا کھوج ہے جو اودر اُس شان سے پہنچا۔ کل وہ اودر جا سکتا ہے تو آج ایدر بھی آ سکتا ہے۔ ابھی اپن بھی آپ کا مافک....."

تجمل نے اُس کی بات پوری نہیں ہونے دی۔ اپنا ہاتھ بڑھا کے وہ مجھ سے بولا۔ "بیٹھ جا راجا! کھڑا کیوں ہے۔ آ اِدھر آ۔" ایس پی شکلا نے ہم دونوں کو دیکھ کے سر جھکا لیا۔

"دیکھو پیرو دادا! کسی کو معاف نہیں کیا جائے گا۔" شکلا کے برابر بیٹھے ہوئے افسر کے لہجے میں غصہ شامل تھا۔ "ہم انھیں نہیں چھوڑیں گے۔ چاہے وہ ہمارا باپ بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ یہ لاقانونیت برداشت نہیں کی جائے گی۔ اگر تمھیں کچھ پتہ ہے تو ہمارا ساتھ دو۔ تعاون کی صورت میں رعایت ضرور ہو سکتی ہے ورنہ....." "ورنہ" وہ جھجک کے بولا۔ "بات

بہت خراب ہو سکتی ہے۔ ہم بولے دیتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم اُن کی گردنوں تک پہنچیں اور رعایت کی کوئی گنجائش نہ رہے، وہ خود کو ہمارے حوالے کر دیں تو اچھا ہے۔ اس مرتبہ پولیس کے وہ لوگ سامنے نہیں ہیں جو پہلے تھے۔"

"اب وہ لوگ کیوں سامنے ہوں گے۔ تیواڑی کا معاملہ ہے۔ وہ بڑا آدمی ہے۔ ممبئی کے جنگل کا شیر ہے۔ اب تو سب کچھ بدل جائے گا۔" تجھل نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بڑے آدمی کے لیے قانون بھی بڑا ہونا چاہیے۔ زیادہ سخت لوگوں کی ضرورت پڑے گی۔ زیادہ بڑے قانون داں، عقل داں افسر لوگوں کی جناب! صاف صاف بات کرو۔ ہم آپ کے ساتھ چلتے ہیں۔ چلو پیرو دادا! اب تمھارے ہاں سے اپنا دانہ پانی شاید اُٹھ ہی گیا ہے۔"

"اور اُن پولیس والوں کو بھی ہمارے ساتھ لیتے چلیے جن کی جگہ آپ آئے ہیں اور جنھیں بدلنے کی آپ نے اب ضرورت سمجھی۔" میں نے شکلا کو گھورتے ہوئے کہا۔

"تو چپ رہ، بڑے آدمیوں کے بیچ میں بولتا ہے۔"

"یہ کون ہے؟" معمر افسر نے پوچھا۔

"یہ اپن کا لاڈلا ہے۔" پیرو میری کمر پر دھپ مارتے ہوئے بولا۔ "تجھل نے میرے بال کھینچ لیے۔ اسے معاف کر دینا صاب! یہ نہیں اِس کی عمر بول رہی ہے۔ ابھی افسروں میں اُٹھا بیٹھا نہیں ہے۔"

"کیا میں نے کوئی غلط بات کہی ہے؟" میں نے ناگواری سے کہا۔

"نہیں، غلط نہیں، بے موقع بات کہی ہے اور بے موقع بات بھی غلط بات کے برابر ہے۔" تجھل آہستگی سے بولا۔ پھر اُس کی آواز بتدریج اونچی ہوتی گئی۔ "ہر بات کہنے کے لیے ایک وقت اور موقع ہوتا ہے۔ قانون کی کتاب اندھا بھی پڑھ سکتا ہے پگلے! یہ عدالت، وکیل منصف، ایک حاکم کے اُوپر دوسرا حاکم۔ یہ سب گورکھ دھندا کس لیے ہے۔ موقع آئے گا تو منہ سے نکلی ہوئی بات اچھی بھی لگے گی۔"

"تجھل دادا! تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں صاب!" میں راجا کو سمجھا رہا تھا۔ اِس کی زبان اِس کے ہاتھ اور سر کی طرح اِس کے بس میں نہیں ہے۔ آپ بولیں، آپ نے پورے باڑے کی تلاشی لے لی ہے۔ سب کچھ جان بوجھ لیا ہے۔ اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ہم اس سے زیادہ کیا بولیں۔ کچھ اور لیمن ویمن منگوائیں؟ رات کے کھانے کا ٹائم بھی ہو گیا ہے۔ یہ جگہ آپ لوگوں کی شان کے مطابق نہیں اور ٹائم بھی ایسا نہیں کہ آپ سے کھانے کے لیے بولا جائے۔" تجھل حقہ گڑگڑانے لگا۔

ایس پی شکلا کے سوا اُن سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اُن کے چہروں سے عیاں تھا کہ وہ کوئی فیصلہ کرتے ہوئے جھجک رہے ہیں۔

"ہم تمھیں ایک موقع اور دیتے ہیں، ہم پھر آئیں گے۔"

"ضرور آئیں۔ آپ کو دروازہ ہر وقت کھلا ملے گا۔ مجھے جانا تھا۔ پیرو کی وجہ سے رک گیا تھا۔ اب آپ لوگوں کی وجہ سے رکنا پڑے گا۔"

ایس پی شکلا اچانک کھڑا ہو گیا۔ اُس کی دیکھا دیکھی دوسرے افسروں نے بھی چوکی چھوڑ دی۔ تجھل اور پیرو بھی فرش پر آ گئے۔ "ابھی اپن ایک بات بولیں۔" پیرو نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"بولو۔" معمر افسر نے پلٹ کے پوچھا۔

"اپن سمجھتا ہے کہ پہلے آپ ایدر ٹائم خراب کرنے کے بجائے کسی اور طرف جاؤ۔ اُودر شاید تم کو کچھ مل جائے۔ ایدر تو اپن ہر ٹائم پر موجود ہے۔ جب بولے گا، چلا جائے گا۔ اپن کا تجھل بھائی بولتا ہے کہ ہر دادا کا دو گھر ہوتا ہے۔ کبھی اِس گھر میں، کبھی اُس گھر میں۔ اور بولتا ہے کہ مرنے سے پہلے بیس بار موت کا مزہ چکھنا چاہیے۔ انیس بار ہوا تو دادا سالا انیس نمبر ہے۔" اُس کی بھڑکتی ہوئی آواز جلد ہی ماند پڑ گئی۔ "ابھی اپن کے منہ سے کوئی جاستی بات نکل گیا ہو تو معاف کرنا۔ اپن سے بولنا نئیں آتا۔ سالا سارا ٹائم چاقو میں لگ گیا۔ کوئی اور کام ہو تو بولو۔"

معمر افسر کے ہونٹوں پر سوکھی مسکراہٹ بکھر گئی۔ اُس کی گردن معنی خیز انداز میں ہلتی رہی۔ باری باری اُس نے ہم تینوں پر نظر ڈالی۔ پھر دروازے پر اور قدم بڑھا دیے۔ ہم تینوں انھیں پھاٹک تک پہنچانے گئے۔ ایس پی شکلا اُن سب سے آگے تھا۔ موٹر میں بیٹھنے کے بعد اُس نے سر اُٹھایا۔ میں سامنے کھڑا تھا۔ اُس کی آنکھیں کچھ چھوٹی ہو گئی تھیں اور مجھی پر مرکوز تھیں مگر موٹر فوراً چل پڑی۔ ہم چند منٹ تک جاتی ہوئی موٹریں دیکھتے رہے۔ جیسے ہی وہ نظروں سے اوجھل ہوئیں، اِدھر اُدھر بیٹھے ہوئے آدمی لپک کے ہمارے پاس آ گئے۔ "کیا ہو رہا ہے دادا؟" ماچھی کی آواز چہکی۔

"واپس چلا گیا ہے۔" پیرو نے بوجھل لہجے میں جواب دیا۔

"کیا بولتا تھا؟"

"پریشان تھا۔"

"ٹھیک تو رہا؟" ماچھی نے آنکھ دبا کے پوچھا۔

"ہاں۔" تجھل اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔ اور میری کمر پکڑتا ہوا اندر چلا آیا۔ "تو پھر آ گیا رے؟" وہ جماہی لیتا ہوا مجھ سے مخاطب ہوا۔

"تجھل بھائی! میرا جی بہت گھبرا رہا ہے۔ یہ کیا... یہ سب کیا ہے؟" میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "کیا مجھے کچھ پوچھنے کی اجازت نہیں ہے؟"

وہ چلتے چلتے رک گیا۔ "لاڈلے! کیا یہ تیری آواز ہے؟"

"یہ کیسی باتیں ہو رہی تھیں؟"

"تو تو بہت دیر سے آیا۔ اس سے پہلے بہت سی باتیں ہو چکی تھیں، ابھی اور ہو سکتی ہیں۔ یہ آنا جانا، سننا سنانا تو لگا رہتا ہے۔"

وہ سستائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"مگر یہ کس طرح کی باتیں تھیں؟"

"یہ تیری سمجھ میں ابھی نہیں آئیں گی۔ بالوں کا رنگ بدلتا ہے، تب یہ نرم گرم سمجھ میں آتی ہے۔" وہ چوکی پر بیٹھ کے چلم کی آگ کریدنے لگا۔

"یہ تو بہت بے معنی، کچی، مشکوک اور فرسودہ باتیں تھیں۔"

"اسی طرح ہوتا ہے لاڈلے! کبھی اونچی، کبھی نیچی، کبھی سرد، کبھی گرم، جان بوجھ کے کچی پکی باتیں کرنی پڑتی ہیں۔ وہ چلے گئے نا؟"

"ہاں چلے تو گئے لیکن پھر واپس آ سکتے ہیں۔"

"پھر چلے جائیں گے، پر اب انھیں آنے میں دیر لگ سکتی ہے۔"

"مجھے کہنے دو کہ تم نے یہ قدم اُٹھاتے ہوئے کچھ جلدی کی، زیادہ نہیں سوچا۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "مجھے آثار اچھے نظر نہیں آ رہے ہیں۔"

"لاڈلے! میں نے تجھے اسی لیے گھر بھیج دیا تھا تاکہ تو اپنے دماغ پر بوجھ نہ ڈالے مگر تو کانتے اور جامو کو چھوڑ کے یہاں آ گیا۔"

"میں اس لیے آ گیا کہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔"

"تو کیوں گھبراتا ہے رے! کچھ اور بات کر۔ لل جامو اور کانتے کا کیا حال ہے اور وہ گڑیا کیسی ہے؟ کیا نام ہے اُس کا؟..."

"میں صبح سے گھر نہیں گیا۔" میں نے تنک کے کہا۔

"پھر تو دن بھر کہاں رہا؟"

"یوں ہی گھومتا رہا۔"

"اب تو گھر جا کے سوجا، جب تک میں نہ آؤں اِدھر مت آنا۔ اب چلنے کی تیاری کرنا ہے۔ میرا خیال ہے، میں جلد ہی تیرے پاس آ جاؤں گا۔"

"ہونہہ۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے تھیں بس ایک دو دن ہی میں چل دینا ہے۔ مجھے تو اب یہاں سے نکلنا ہی مشکل معلوم ہو رہا ہے۔"

"لاڈلے! ضرور ملیں گے۔ دل چھوٹا مت کر۔"

"اور ہاں!" میں نے بوکھلا کے کہا۔ "یہی ایس پی شکلا تھا۔ تجھل پپ رہا۔ اُس نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ نہ جانے وہ کیا سوچ رہا ہوگا۔"

"جو تو سوچ رہا ہے، یہی وہ بھی سوچ رہا ہوگا۔ تو نے بات اگلی دل ہے، اُس نے تجھے نہیں دیکھا۔ تو نے اُسے اپنے آپ کو دکھا دیا۔"

"مگر وہ اس سے پہلے بھی تو مجھے دیکھ سکتا تھا اور میں بھلا اس موقع پر گھر کیسے رہ سکتا تھا۔ میری جگہ تم ہوتے تو تم بھی یہی کرتے۔"

"میں تیرے کہنے پر گھر میں بیٹھا رہتا۔"

"بالکل نہیں، تم تو گھر جاتے ہی نہیں۔"

"اب جانے دے کون کیا کرتا، کیا نہ کرتا۔" وہ اُلجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ہر آدمی اپنی جگہ ہوتا ہے لاڈلے! آدمی ایک دوسرے کی جگہ بدل لیا کرے تو پھر یہ دنیا بڑی ہلکی ہو جائے۔"

"تم خفا ہو گئے۔ یقین کرو، میری عقل کام نہیں کر رہی ہے۔"

"لاڈلے! میری جان!" اُس نے مجھے دبوچ لیا۔ "مجھے معلوم ہے کہ تو کیا سوچ رہا ہے، پر تو اتنا مت سوچ میرے بلبل! یہ وقت تو گزرنا ہی تھا۔ تو دیکھنا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھ پر اتنا شک کر، میری بات مان لے گھر چلا جا۔ وہاں جامو اور کانتے بھی اکیلے ہوں گے۔ یہاں میرے ساتھ بہت سے لوگ ہیں۔ شکلا تجھے نہ دیکھتا تو اچھا تھا۔ پر اس نے تجھے اب دیکھ لیا ہے تو دیکھنے دے۔ سالا، اِس سے زیادہ یہی سمجھے گا کہ تو پاگل ہو گیا ہے۔"

"کچھ اور بھی سمجھ سکتا ہے۔ مجھے اب خیال آ رہا ہے کہ یہ اچھا نہیں ہوا۔" میں نے اُداسی سے کہا۔

"اب خیال آنے سے کیا ہوتا ہے۔ میں اُسے دیکھ رہا تھا۔ تیرے آتے ہی اُس کی زبان پر تالا لگ گیا تھا۔ اس سے پہلے اُس نے ہم لوگوں کو بہت تنگ کیا تھا۔ تو سچ کہتا تھا، وہ اچھا اور سچا آدمی ہے۔"

"تمھیں یاد ہے، میں نے تم سے کہا تھا کہ شکلا نے مجھ سے اشارتہً تیواڑی کا ذکر کیا تھا۔ اُس نے نام تو نہیں لیا تھا لیکن وہ سلسلہ ملا سکتا ہے۔"

"ملا لے، کچھ اور وقت لگ جائے گا۔ میرے سر میں پہلے ہی یہ بات تھی لیکن اس سے کوئی بڑا فرق نہیں پڑے گا۔"

"تم اتنے مطمئن کیوں ہو؟" میں نے جھلا کے کہا۔

"کیا تجھے میرا اطمینان برا لگتا ہے؟" وہ مسکرانے لگا۔

"نہیں، کچھ عجیب لگتا ہے۔"

وہ ہنسنے لگا، مجھے اُس کی ہنسی بہت بری لگی۔ اتنے میں پیرو آ گیا اور تجھل سے کچھ پوچھے بغیر اُس کی ہنسی میں شامل ہو گیا۔ "کیا ہے تجھل بھائی! ابھی سالا کھانے وانے کا بھی کچھ ہونا چاہیے۔" وہ تجھل کے ہاتھ سے حقے کی نے لے کر کش لینے لگا۔ پھر بے تحاشا کھانسنے اور ہنسنے لگا۔

"تمھارے بس کا نہیں ہے پیرو۔" تجھل نے اُس کے منہ سے نے ہٹالی۔ "تمھارے لیے وہ سالی پری چھم چھاپ ہی ٹھیک ہے۔"

وہ دونوں آپس میں فضول باتیں کرتے رہے۔ جب کھانا آیا تو بہت سے لوگ آ گئے۔ سب کھانے پر ایسے پلے جیسے کئی دنوں کے فاقے سے ہوں۔ میں بھی ٹونگتا رہا۔ صبح سے اب تک کچھ نہیں کھایا تھا۔ کھانے کے دوران میں پیرو کے آدمی تجھل سے اصرار کرنے لگے کہ گرا بائی سے چندنیا بائی آئی ہوئی ہے۔ آج رات اُسے بلایا جائے۔ تجھل نے جز بز ہو کے اجازت دے دی۔ باڑے میں شور مچنے لگا۔ چمپی اور ماچھی فوراً چندنیا کو لینے چلے گئے۔ فرش پر سفید چاندنی بچھا دی گئی۔ میں نے تجھل سے ماٹی کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اُس نے منع کر دیا اور مجھے تسلی دی کہ ماٹی کی پوری دیکھ بھال کی جا رہی ہے، اُس کی حالت صبح سے اچھی ہے۔

چندنیا جیسے تیار ہی بیٹھی تھی۔ وہ اُسے ایک گھنٹے کے اندر لے آئے۔ وہ بُوٹے قد اور گندمی رنگ کی ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ جُوڑا بندھا ہوا تھا اور کانوں میں پھولوں کی بالیاں لٹک رہی تھیں۔ ماجھی اور اڈے کے دوسرے آدمیوں نے مجھے روکنے کی کوشش کی مگر بٹھل نے مجھے ٹھیرنے نہیں دیا۔ میں خود بھی اب وہاں رکنا نہیں چاہتا تھا۔ گانا شروع ہونے سے پہلے میں وہاں سے چلا آیا۔ علاقے میں پولیس کا زور تھا۔ میں کچھ دُور تو گلیوں گلیوں راستہ طے کرتا رہا۔ پھر مین روڈ پہ آ کے بس میں بیٹھ گیا۔

گیارہ بجے سے پہلے میں گھر پہنچ گیا۔ جامو اور کانتے ڈرائنگ روم میں تپّسی کھیل رہے تھے۔ جولین، چمپا اور جولین کی ماں آمنے سامنے بیٹھی ہوئی تھیں میرے انتظار میں کسی نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی جامو اور کانتے نے کھیل بند کر دیا اور چمکتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگے۔ میں نے اشاروں میں انھیں بتایا کہ ابھی سنانے کے لیے کوئی خاص بات نہیں ہے لیکن میرے اشاروں سے اُن کا اضطراب بڑھ گیا۔ جولین، چمپا اور جولین کی ماں نے بھی محسوس کر لیا کہ ہم لوگ کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں چنانچہ وہ یکے بعد دیگرے کھسک گئیں۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ انھیں ایک ایک بات تفصیل سے بتاؤں گا۔ پھر ارادہ بدل دیا اور دن بھر کی روداد جستہ جستہ سنائی۔ اُن پر کچھ اثر ہی نہیں ہوا۔ میرا جی چاہا کہ میں اُن کے منہ نوچ لوں۔ میں نے برگشتہ ہو کے تمام خطرے اُن کے کان میں ڈالے۔ جامو سر جھکائے بے حس و حرکت بیٹھا سنتا رہا۔ مجھے کچھ قرار آیا لیکن اُس کی سنجیدگی چند لمحے برقرار رہی۔ اُس نے منہ بنا کے زور سے سر جھٹکا اور جیسے میری تمام باتیں دوسرے کان سے اُڑا دیں۔ میں نے اُسے پھر متنبہ کرنا چاہا تو وہ بھڑک گیا، بھڑک کے کہنے لگا: "لاڈلے! ابے تُو نے بٹھل بھائی کو کیا اُلّو کا پٹھا سمجھ لیا ہے۔ اپنی یاری اُس سے ایک سال سے اُدپر کی نہیں ہے۔ تُو نے تو اُس کے ساتھ ایک وقت گزارا ہے۔ پھر ایسی بے ازار بند باتیں کیوں کرتا ہے کیس دیکھ لاڈلے!"

وہ تلملا کے بولا: "پولیس گھن چکر بنی ہوئی ہے۔ سالا ہم ایک ایک آدمی چن چن کے اُٹھام کر آئے ہیں اور تیواڑی کی لاش بھی وہاں موجود نہیں ہے۔ اُس کے دو تین آدمی بھی غائب ہیں۔ تین چار روز میں اپنے کچھ زخمی اچھے ہو جائیں گے اور اپنے اپنے اڈّوں پر واپس آ جائیں گے۔ باقی لوگ تو موجود ہی ہیں۔ پولیس کی ابھی نگاہ بھی نہیں جا سکتی کہ کون موجود نہیں ہے۔"

"اور اُن میں سے اگر کوئی اوچھا نکل گیا؟"

"ابے اُن میں ایک ساتھ دس اوچھے نکلیں تب بات بنے گی۔ ایک دو تو سالے مکوٹ کرتے رہ جائیں گے۔ اُن کو یقین ہے کہ ہم کو جانا ہے۔ پھر سارا ستن اُنھی پر برسے گا۔ وجہ بھی لاڈلے! ہم نے اتنے لوگوں کو اس لیے اکٹھا کیا کہ ایک تو تیواڑی کے اڈّے پر زیادہ لوگوں کی وجہ سے کوئی حرامی بچ کے نہیں جائے گا اور تیواڑی کو زندہ پکڑنے میں بھی آسانی ہوگی۔ دوسرے اتنے بہت سے لوگ شامل ہوں گے تو کیمنہ پن کرتے ہوئے سالوں کی میا مرے گی۔ واردات بھی اپنی جگہ انیا ٹاک ہو گی اور پولیس بھی منہ دیکھتی رہ جائے گی۔ اس کیس میں ہر بات کا خیال رکھنا تھا۔ اب دیکھ پولیس ناچ رہی ہے۔ وہ بٹھل بھائی اور پیرو پہ ہاتھ ڈال کے دیکھیں خیا بائیں گے۔ بس یارا اپنا مغز مت پلپلا کر۔ اس کے سوا کچھ ہوا تو سالی ہونی کو کون روک سکتا ہے، ہو جائے۔ اب تو جو کچھ ہونا تھا وہ ہو گیا پیارے! وہ لوٹ نہیں سکتا۔ اب ٹسوے بہائیں کیا۔ جولی بہن!" اُس نے آواز لگائی "یہ کھانا نکالو۔"

جامو نے کچھ کہنے کے لیے چھوڑا ہی نہیں تھا۔ میں نے بھی چپ سادھ لی۔ اُس کی ایک یہی بات دل کو لگی کہ گزرے ہوئے وقت پر سر کھپانا فضول ہے۔ اُس نے یہ بات بڑی آسانی سے کہہ دی تھی مگر وہ اور کہتا کیا۔ وہ یہ بات پریشانی سے بھی کہتا تو ایک ہی مطلب تھا۔ جامو کو بہت سی باتیں معلوم نہیں تھیں۔ وہ ایس پی شکلا کو نہیں جانتا تھا لیکن اگر اُسے تمام واقعات اور تمام سلسلے معلوم بھی ہوتے تو یہی کہتا۔ ہم پیرو کو تنہا چھوڑ کے فرار نہیں ہو سکتے تھے۔ ہمیں یہیں رہنا تھا اور جو ہونا تھا، اُسے قبول کرنا تھا۔ اب کچھ بھی ہو جائے۔

میز پر کھانا لگاتے ہی جولین نے ہم سب کو بلا لیا۔ میں نے انھیں یہ نہیں بتایا کہ میں تھوڑا بہت کھا کے آیا ہوں۔ میں بھی اُن کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میز پر بہت اہتمام تھا۔ جولین نے بہت اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ وہ بہت خوش خوش تھی۔ صرف ایک دن میں وہ سب اتنے گھُل مِل گئے تھے جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ چمپا کو جولین نے ہمارے ساتھ ہی بٹھا دیا تھا۔ مجھے چمپا پر غصہ آ رہا تھا۔ یہ سب اُسی کا کیا دھرا تھا۔ نہ وہ بٹھل کو خط لکھتی، نہ یہ سب کچھ ہوتا۔ کچھ دنوں بعد خط لکھ دیتی۔ بارہ بج چکے تھے لیکن وہ سب دیر تک ڈرائنگ روم میں بیٹھے رہے۔ جولین کانتے کے برابر بیٹھی ہوئی تھی اور کانتے اُس سے کہہ رہا تھا کہ وہ اُسے گٹ پٹ سکھا دے۔ جولین میری طرف دیکھ کے کہنے لگی کہ ایک کو سکھایا تھا، بعد میں بہت شرمندگی ہوئی۔ کانتے مچلنے اور ضد کرنے لگا۔ آخر جولین کو وعدہ کرنا پڑا کہ وہ اُسے ضرور انگریزی سکھائے گی۔

"اور میں اپنی پیاری بہن کو سونے میں لاد دوں گا۔" کانتے جوش میں بولا۔ "پھر میں بنگلا اور ہندی میں بات نہیں کروں گا۔ میں تو جولین کی طرح ایک میم لاؤں گا اور اُس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے گردن اُٹھا کے لیفٹ رائٹ لیفٹ رائٹ چلوں گا۔ وھاٹ یو ویل ترام پی تنا..."

جولین کی ہنسی کمرے میں کھنکنے لگی۔ وہ اتنے زور سے ہنسی جیسے اوپر سے کسی نے ڈھیر سی چوڑیاں زمین پر گرا دی ہوں۔ جامو نے اُلٹے ہاتھ سے کانتے کو طمانچہ رسید کیا۔ وہ سب بہت خوش تھے۔ آنے والا کل جیسے انھوں نے خرید لیا ہو۔ وہ ٹھاٹ سے پاؤں پسارے چائے پی رہے تھے۔

جولین نے بہ اصرار انھیں اُن کے کمرے میں بھیجا۔ وہ اپنے ساتھ مجھے بھی سلانا چاہتے تھے مگر میں ڈرائنگ روم کے صوفے پر لیٹ گیا۔ جولین کچھ دیر تک تو بیٹھی رہی۔ پھر جب میں نے اُس سے کوئی بات نہیں کی تو اُٹھ کے اندر چلی گئی۔ اُس کے جاتے ہی میں نے دروازہ بند کر لیا اور اپنی مالا گردن سے اُتار لی۔ میں نے اُس کے ایک ایک دانے کو خوب پیار کیا۔ میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔

***

سویرے سویرے میری آنکھ کھُل گئی۔ میں نے جلدی سے مالا گردن میں ڈالی اور ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول دیا۔ پھر مجھے نیند نہیں آئی۔ میں صوفے پر کروٹیں بدلتا رہا اور مجھے ایس پی شکلا کا خیال ستانے لگا۔ وہ نہ جانے کیا سوچتا ہوگا۔ ممکن ہے وہ یہ سوچ رہا ہو کہ میں نے کرشنا جی کی دولت اِدھر اُدھر لٹانی شروع کر دی ہے۔ اُس کے ذہن میں یہ بات بھی آ سکتی ہے کہ تیواڑی کو ختم کرانے کے لیے میں نے کرشنا جی کی دولت سے آدمی خریدے ہوں گے۔ سب سے پہلا خیال اُس کے دل میں یہی آئے گا کہ پیرو کے باپ سے میرے رابطے کا سبب یہی ہو سکتا ہے اور جب یہ بات اُس کے دل میں گھر کرے گی تو وہ کھوج لگاتا ہوا کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔ اُسے سِرا مل جائے گا تو کھوج لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ میں نے طے کیا کہ وہ آئے گا تو میں اُسے بینک کے سارے کاغذات دکھا دوں گا کہ میں نے ایک پیسہ بھی بینک سے نہیں نکالا ہے۔ ابھی ہم نے ناشتہ بھی نہیں کیا تھا کہ دروازے پر آہستہ آہستہ دستک ہوئی۔ جولین نے آدھا کواڑ کھولا اور اپنے دوسرے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ جامو اور کانتے فوراً اُٹھ کے میرے کمرے میں چلے گئے۔ دروازہ کھلنے میں ذرا سی دیر ہوئی۔ ایس پی شکلا عام لباس میں اندر داخل ہوا۔ میں اپنی نشست سے اُچھل کے کھڑا ہو گیا۔ شکلا کی آنکھیں سُرخ تھیں اور چہرہ بجھا ہوا تھا۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ جولین اور چمپا اُس سے اُس کے گھر والوں کی خیریت پوچھ رہی تھیں۔ وہ انھیں سرسری جواب دے رہا تھا اور کن انکھیوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اُن دونوں نے بھی اندازہ کر لیا کہ شکلا آج پریشان پریشان ہے اور شاید اسی خیال سے وہ ہٹ گئیں کہ صبح صبح اُس کے آنے کا کوئی خاص ہی مقصد ہو سکتا ہے۔ میری خواہش تھی کہ وہ بیٹھی رہیں۔ پھر مجھے جامو کی بات یاد آ گئی کہ ایک آدمی، دوسرے آدمی کو زیادہ سے زیادہ کیا سزا سُنا سکتا ہے۔ میں سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔ "کیا تم وہی ہو جسے میں نے کل رات دیکھا تھا؟" اُس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

کچھ اور کہنے سے پہلے وہ میری صورت دیکھنے لگا۔ اُس کی پلکیں لرز رہی تھیں "پھر کیا... کیا میں تم سے کچھ پوچھ سکتا ہوں؟"

"آپ کو پورا اختیار ہے شکلا جی!" میں نے مایوسی سے کہا۔

"عہدے کا اختیار یا اپنا؟"

"دونوں لیکن اس وقت آپ گھر آئے ہیں۔"

"میں تمھیں کس نام سے پکاروں؟"

"کسی بھی نام سے جو آپ کو اچھا لگے۔"

"یہ میں نے کیا دیکھا تھا؟" وہ کرب سے بولا۔

"آپ نے راجا کو دیکھا تھا۔ ظہیر خاں عرف راجا عرف......"

میں نے اپنی زبان منہ میں دبا لی۔ "شکلا جی! آپ نے راجا کو دیکھا تھا۔"

"مجھے یقین نہیں آتا۔" اُس کی آواز کہیں دُور سے آئی۔

"میں آپ کے سامنے موجود ہوں۔"

"ظہیر خاں!" اُس کی آنکھیں کسمسانے لگیں "تم وہاں کب پہنچ گئے؟"

"بہت دن ہوئے۔"

"مگر کیوں؟" اُس کی گھُٹی ہوئی چیخ نکلی۔

"بس یوں ہی۔ مجھے تھوڑا بہت چاقو چلانا آتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اسے دھندے کے طور پر کیوں نہ اختیار کیا جائے۔"

"غلط! تم ایسا نہیں کر سکتے۔ میں تمھیں جانتا ہوں، اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں نے مدراس میں تمھیں بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میں تو اپنے گھر اور ملاقاتیوں میں تمھارا حوالہ دیتا تھا۔"

"اب مت دیجیے گا۔ تردید کر دیجیے گا کہ جو کچھ آپ نے میرے بارے میں کہا تھا، سب غلط تھا۔"

"نہیں، نہیں۔ وہ غلط نہیں ہو سکتا لیکن میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ تم سے کسی ایسی جگہ ملاقات ہو جائے گی۔"

"شکلا جی! مجھے اندازہ تھا کہ آپ پہلی فرصت میں میرے پاس آئیں گے اور مجھ سے ایسی باتیں کریں گے لیکن میرے پاس آپ کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہے یا یوں سمجھیے کہ میں آپ کو کچھ بتانا نہیں چاہتا۔"

"مجھے احساس ہے کہ میں کرشنا جی نہیں ہوں لیکن میں اُن کا ایک خادم تھا۔ میں تمھارے بارے میں اُن کی طرح نہیں سوچ سکتا لیکن یقین کرو کہ میں رات بھر نہیں سویا۔ مجھے بار بار اپنی آنکھوں پر دھوکا ہوتا رہا۔"

"کیوں شکلا جی! کیا وہ لوگ آدمی نہیں ہیں؟"

"وہ لوگ آدمی ضرور ہیں مگر کرشنا جی ہوتے تو اُن کے درمیان تمھیں دیکھ کے اُن کا سینہ بھی جلنے لگتا۔ تم تو بہت اچھے لڑکے ہو ظہیر خاں! کرشنا جی اپنے دل میں تمھارے لیے کیا کیا اُمیدیں رکھتے تھے۔ میں پوچھتا ہوں، تمھیں ہو کیا گیا ہے؟ تمھارے پاس کمی کس چیز کی تھی؟ تمھیں ایسی کون سی ضرورت وہاں کھینچ لے گئی؟ اگر مجھے یہ سوال کرنے کا حق پہنچتا ہے تو تم جواب دو۔ میں وجہ جاننا چاہتا ہوں؟" میں اُسے کیا وجہ بتا سکتا تھا، وجہ شاید وہ خود بھی جانتا ہوگا پھر میرے ہی منہ سے سننے کی اذیت کا خواہش مند کیوں تھا۔ "بولو ظہیر خاں! بولو۔ تم چپ کیوں ہو۔ مجھے جواب دو۔" میں سوچتا ہی رہا کہ اُسے کیا جواب دوں۔

"سنو ظہیر!" چند ثانیوں کے سکوت کے بعد وہ لرزیدہ آواز میں بولا۔ "میں آج سے طویل رخصت پر جا رہا ہوں۔ یہ کاغذ ہے۔ چاہو تو اسے پڑھ لو۔"

"یہ کیا ہے؟" میں نے گھبراہٹ سے کہا۔

"یہ چھٹی کی درخواست ہے۔ اس کے بعد شاید میں پولیس میں واپس بھی نہ آؤں۔ مجھے اپنے بارے میں اب کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔"

"مگر آپ یہ کیوں کر رہے ہیں؟" میں نے سراسیمگی سے پوچھا۔

"ممکن ہے کہ تم غور کرو تو اس کی وجہ تمھاری سمجھ میں آ جائے۔ اب میری تم سے ایک درخواست ہے۔ تم اسے حکم بھی سمجھ سکتے ہو اور بنتی بھی۔ تم یہاں سے فوراً چلے جاؤ۔ بہت دُور چلے جاؤ۔"

"کیوں شکلا جی؟" میں نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"بس ظہیر خاں!" وہ شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ "میری بات مان لو۔ میں کرشنا جی کی آتما سے معذرت کر لوں گا کہ جو کچھ انھوں نے مجھے سکھایا تھا، میں اُس کا اہل ثابت نہیں ہوا۔ شاید اس سبب سے کہ مجھے اُن کے ساتھ رہنے کا کم ہی وقت ملا۔ ظہیر خاں! یہاں سے چلے جاؤ۔"

"مگر شکلا جی! کیوں؟"

"اس لیے ظہیر کہ کرشنا جی نے تمھارے بارے میں جو خواب دیکھا تھا، میں اُس کی تعبیر اُلٹی دیکھنا نہیں چاہتا۔ میں تمھیں کرشنا جی کا واسطہ دیتا ہوں۔ میں تو جا ہی رہا ہوں لیکن تم بھی ان لوگوں کو چھوڑ کے کہیں نکل جاؤ اور سب کچھ بھلا دینے کی کوشش کرو۔ پھر کبھی اُس طرف کا رُخ مت کرنا۔ جب اُنگلیاں ٹھیک کام کرتی ہوں تو چاقو اُٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔ اُنگلیوں سے قلم بھی چلایا جا سکتا ہے۔ اُنگلیوں سے بہت سے کام کیے جا سکتے ہیں۔ ظہیر خاں! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم سے کس طرح بات کروں۔ تم نے رات کی گفتگو سن لی ہوگی۔ اس کے بعد کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اندازہ نہیں ہے کہ حالات کیا رُخ اختیار کریں لیکن میں تمھارے حوالے سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ حالات بہت بگڑ بھی سکتے ہیں۔ راستے مسدود بھی ہو سکتے ہیں۔ سمجھ رہے ہو؟"

"شکلا جی!" میں نے بھاری آواز میں کہا۔ "آپ نہ چھٹی کی درخواست دیجیے، نہ ملازمت ترک کرنے کا خیال کیجیے۔ اپنا کام کرتے رہیے۔ رہا میرا سوال تو میں یہاں سے بہت جلد چلا جاؤں گا بشرطیکہ حالات نے اجازت دی مگر ابھی نہیں جا سکتا۔"

"کیوں نہیں جا سکتے؟"

"میرے ساتھ کچھ مجبوریاں ہیں۔ انھیں مجبوریاں میں آپ کے خیال سے کہہ رہا ہوں حالانکہ مجھے ذمے داریاں کہنا چاہیے۔"

"کیسی ذمے داریاں؟" وہ ہذیانی انداز میں بولا۔

"کچھ ایسی ہی باتیں ہیں۔"

"ظہیر خاں! تم آگ میں بیٹھے ہوئے ہو۔"

"میں جانتا ہوں۔" میں نے سانس کھینچ کے کہا۔ "مشکل یہ ہے کہ شکلا جی کے علاوہ آپ کی ایک اور حیثیت بھی ہے اور بدقسمتی سے میری بھی۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کسی سخت مرحلے سے دوچار ہوں۔ ہم اپنی دوسری حیثیتیں یکسر نظرانداز نہیں کر سکتے۔ مجھے آپ کی مجبوری کا اندازہ ہے۔ آپ بھی میری مجبوری سمجھیں۔ آپ بھی صاف بات کرتے ہوئے جھجک رہے ہیں اور میں بھی کوئی ایسی بات کرنا نہیں چاہتا جس میں آپ سے اپنے تعلق کی بنا پر کسی رعایت طلبی کا پہلو نکلتا ہو۔"

"تم کیسی سمجھ بوجھ کی باتیں کر رہے ہو۔" وہ گلوگیر آواز میں بولا۔ "تم ایسے نہیں ہو سکتے۔ میں رات کو بھی تمھارے پاس آ سکتا تھا لیکن جب میں یہ کاغذ لکھنے میں کامیاب ہو گیا تب میں نے تمھارے پاس آنے کا فیصلہ کیا۔"

"آپ اپنے کام پر جائیے شکلا جی! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ سے کبھی کوئی سوال نہیں کروں گا۔ میں کنٹرول توڑ کے آپ کے سامنے آؤں گا۔"

"نہیں ظہیر! نہیں۔ میں اب وہاں نہیں جاؤں گا۔ تم میرے لیے کرشنا جی کا ورثہ ہو۔ کرشنا جی میرے بہت محترم تھے، وہ مجھے بہت عزیز تھے۔ چلتے وقت انھوں نے مجھ سے تمھارے بارے میں بہت کچھ کہا تھا۔" شکلا نے آنکھوں پر رومال رکھ لیا۔ "ظہیر! میں اپنے آپ کو کمزور محسوس کر رہا ہوں۔ میں کام نہیں کر سکتا۔"

"پھر آپ مجھے کمزور کر دیں گے۔"

"تب مجھے یہ فیصلہ کرنے میں دیر لگی ہے اور تمھاری باتیں سن کے اب اس فیصلے کی توثیق بھی ہو گئی ہے۔"

"میں نے کوئی ایسی بات نہیں کی ہے جس میں آپ کے فیصلے کی توثیق کا کوئی مفہوم پوشیدہ ہو۔" میں نے تندی سے کہا۔ "میں تو آپ سے کہہ رہا ہوں کہ اپنا فیصلہ بدل دیجیے۔ بھول جائیے کہ آپ نے مجھے وہاں دیکھا تھا۔ آپ کی دست برداری اور خاموشی غلط ہے۔"

"لیکن بڑی بُرائی سے چھوٹی بُرائی بہتر ہوتی ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے اپنے ذہن میں کوئی حتمی رائے قائم کر لی ہے اور وہی آپ کی اُلجھن کا سبب ہے مگر یہ بھی تو ممکن ہے کہ آپ کی رائے درست نہ ہو۔"

"میں نے کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی ہے۔ میں وردی پہن کے نہیں آیا ہوں، نہ میں نے تم سے یہ پوچھا ہے کہ کیا درست ہے اور کیا نادرست لیکن اگر یہ صحیح ہوا تو... تو؟"

"تو آپ اسے غلط ثابت کرنے کی مشکل میں نہ پڑیے گا۔ آپ کوئی ملازمت کیجیے گا۔" میں نے شکستگی سے کہا۔

"شاید یہ میں نہ کر سکوں۔" وہ آہ بھرتے ہوئے بولا۔ "اسی لیے میں اپنی بات دہرا رہا ہوں۔ میں یہ پرزہ لے کے ہیڈ آفس جا رہا ہوں۔ تم.... تم

بھی ہو سکے تو اُدھر مت جانا۔ میں تم سے یہی کہہ سکتا ہوں۔ سوچ لینا ظہیر اور ہو سکے تو مان لینا۔"

یہ کہتے ہی وہ اُٹھ گیا۔ مجھ میں اُسے روکنے کی ہمت نہیں تھی۔ اُس نے چمپا اور جولین کا انتظار بھی نہیں کیا۔ تیزی سے دروازہ کھول کے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ موٹر چلنے کی آواز آئی تو میں بھاگ کے گلی میں پہنچا۔ اُس کی موٹر نکل چکی تھی۔

میرے خون کی گردش رُک گئی تھی۔

اُدھر وہ گیا اِدھر جامو اور کانتے نے مجھے آ کے گھیر لیا اور کریدنے لگے کہ ایس پی شکلا کیا کہنے آیا تھا۔ میں اُن سے کیا کہتا کہ وہ کچھ کہنے نہیں، کچھ سنانے آیا تھا۔ بیان لینے نہیں، بیان دینے آیا تھا۔ میری خاموشی پر وہ ناراض سے ہونے لگے تو میں نے انھیں ساری بات بتا دی کیونکہ ان باتوں کا تعلق اُن سے بھی تھا۔ وہ کچھ سوچنے لگے۔ مجھے معلوم تھا کہ میری طرح اُن کے پاس بھی کوئی جواب نہیں ہے۔ میں نے سر اُٹھا کے اُن کی طرف دیکھا۔ جامو کا سر جھک گیا تھا۔ کانتے بھی اپنی آنکھیں مسل رہا تھا۔ جولین نے اُن کے سامنے چائے لا کے رکھ دی۔ چائے رکھے رکھے ٹھنڈی ہو گئی۔ وہ خاصی دیر اسی طرح گُنگ بیٹھے رہے۔ پھر جامو نے سر اُٹھایا اور بوجھل آواز میں بولا۔ "لاڈلے! مجھے بتا تو کس نتیجے پر پہنچا ہے؟"

"یہ تم نے عجیب بات کہی جامو بھائی!" میں نے زہرخند سے کہا۔

"دیکھ لاڈلے! اور باتوں کے سوا ہم کو اس وقت پہلے نتیجہ دیکھنا ہے۔ تیری باتوں سے دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ پہلے سن لینا۔ چرا چری بعد میں کرنا۔ پہلی بات تو یہ ہے شکلا کو پتہ چل گیا ہے کہ پرسوں رات واردات سالی کس نے کی تھی۔ اب وہ تجھ کو جتانے اور مشورہ دینے آیا تھا کہ ابھی وقت ہے تو اُڑن چھو ہو سکتا ہے۔ یہ تو ایک بات ہوئی۔ اب ذرا تصویر اُلٹ کے دیکھ۔ اُدھر کورا کاغذ ہے۔ بالکل چٹیل میدان، کوئی گھاس پھوس نہیں، کچھ نہیں لکھا، کوئی لکیر نہیں پڑی۔ ایس پی نے کل رات تجھے ہیرے کے اڈے پہ دیکھا تو تصویر کے کوری طرف اُسے کچھ دکھائی دینے لگا۔ اپنا آدمی بیچ میں نظر پڑ جائے تو سالا ایسا اپنے آپ ہونے لگتا ہے۔ شکلا کے سر میں شک بھر گیا۔ شک کیا، خوف بھر گیا کہ کہیں تُو تو ان لوگوں میں شریک نہیں ہے۔ اس کو پتہ ہے کہ تیواڑی اور اس کے آدمیوں نے کرشنا جی کو ختم کیا ہے اس لیے اُس کے شک کو اور ہوا لگی اور وہ شک کی حالت میں تیرے پاس آیا کہ تجھے ہوشیار کر دے۔ مطلب یہ کہ وہ دو حالتوں میں سے ایک میں تیرے پاس آیا۔ شک کی یا یقین کی۔ دونوں میں اُس کے لیے مرن ہی مرن تھا۔ سو اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔ اب ہم کو یہ جانچنا ہے کہ وہ کس حالت میں تیرے پاس آیا۔ لاڈلے! یقین کی بات ہوتی تو ایک تو اُس کی باتوں کا رنگ دوسرا ہوتا، دوسرے واردات کے بارے میں جو میں نے تجھ سے مغز ماری کی تھی، اب بھی وہی کہتا ہوں۔ تو کہتا ہے کہ تو نے مچھل بھائی کو شکلا کے بارے میں بول دیا تھا۔ مچھل بھائی کے سر میں ایس پی شکلا کا دھیان ضرور ہوگا۔"

وہ خاموش ہو گیا اور اُس نے ایک ہی گھونٹ میں چائے انڈیل لی۔ میں حیرانی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں خود سے باتیں کر رہا ہوں۔ "تم نے تمام....."

"ابھی نہیں۔" اُس نے مجھے بات نہیں کرنے دی۔ "ابھی میری بات ادھوری ہے۔" وہ ہاتھ اُٹھا کے بولا۔ "تو نے شکلا سے ہٹ کی کہ وہ عرضی واپس لے لے۔ اُس نے منع کر دیا۔ ہم شکلا سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ ہمی تھے اور ہمیں یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ یہ جاننے کے بعد بھی اپنی جگہ کام کرنا نہیں چاہتا۔ سمجھا لاڈلے! اب اپنی طرف آ جا۔ ہم تو جیل جانے کے بعد جیل سے نکلنے کا ہر جتن کرتے رہیں گے اور شکلا بھی سامنے آیا تو گردن ہلاتے رہیں گے۔" جامو زور زور سے نفی میں گردن ہلانے لگا۔ "ہمارے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔ تو تو پڑھا لکھا ہے۔ اگر تجھے کچھ دکھائی دے رہا ہے تو مجھے بتا دے۔ شکلا کو اتنا خیال تو ہوگا اور ہونا چاہیے کہ ہم نے یہ سب کیوں کیا ہے۔ اب تو کچھ بولنا چاہے تو بے دھڑک بول۔ میں نے اپنی بات ختم کر دی ہے۔"

میں نے جامو کے کندھے سے سر ٹکا دیا۔

اُس دن میں دن بھر گھر ہی رہا۔ رات کو تھوڑی دیر کے لیے مچھل کے پاس گیا تو وہاں محفل جمی ہوئی تھی۔ وہ کل والی طوائف نہیں تھی، کوئی دوسری لڑکی تھی، دُبلی پتلی۔ اُس کی آواز سُریلی تھی۔ سب گُم تھے اور وہ چوکی کے سامنے بیٹھی ہوئی گا رہی تھی ؎

یہ کیا کہا کہ میری بلا بھی نہ آئے گی

کیا تم نہ آؤ گے تو قضا بھی نہ آئے گی

میرا جی چاہا کہ میں وہیں بیٹھ کے سنتا رہوں مگر جب اُس کے گھنگرو بجے تو مجھے فتی یاد آنے لگی۔ میں مچھل کو ایس پی شکلا کی بابت کچھ نہ بتا سکا۔ صرف چند باتیں ہو سکیں۔ جب میں چلنے لگا تو دروازے کے پاس ہیرو نے میرے سر پہ نوٹوں کی گڈی رکھ کے مجھے روک لیا۔ مچھل نے اُسے آواز دی مگر ہیرو مگن تھا۔ لڑکی ناچتی گاتی ہوئی میرے پاس آ گئی۔ اُس کی پیشانی اور گالوں پر ستارے چمک رہے تھے۔ میں نے آنکھیں میچ لیں اور کھڑے کھڑے ہانپنے لگا۔ میرا سارا جسم پسینے میں نہا گیا۔ لڑکی گاتی رہی۔ جیسے ہی اُس نے میرے بال پکڑ کے سر سے نوٹوں کی گڈی اُٹھائی، میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ مسکرا رہی تھی اور ہیرو قہقہے لگا رہا تھا۔ میں وہاں سے بھاگ آیا۔ دُور تک اُن کے قہقہے سنائی دیتے رہے۔

پاڑے میں داخل ہونے سے پہلے میں نے باہر کھڑے ہوئے لوگوں سے احتیاطاً پوچھ لیا تھا کہ اندر پولیس تو موجود نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ

پولیس آج سارا دن نہیں آئی البتہ علاقے میں اُس کی تعداد بڑھ گئی ہے۔ جب میں گھر پہنچا تو رات زیادہ ہو گئی تھی۔ جولین ڈرائنگ روم میں بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔ میں دن میں دیکھ چکا تھا کہ پرسوں رات کی واردات کے بارے میں کیا کیا خبریں چھپی ہیں۔ جولین کے خیال سے میں نے اخبار صوفے کے نیچے پھینک دیا تھا لیکن وہ اُس کے ہاتھ لگ گیا۔ آج کی خبروں میں سب سے نمایاں خبر اسی واردات کی تھی۔ اخبار نے مرنے والوں کے نام اور اُن کی روداد شائع کی تھی کہ اُن میں کون کتنی بار کس کس جرم میں جیل گیا۔ اُس نے اسے اپنی نوعیت کی سب سے منفرد اور سنگین واردات قرار دیا تھا اور طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی تھیں۔ ایک جگہ سرسری طور پر کرشنا جی کا ذکر بھی تھا۔ لکھا تھا کہ اس موقع پر وہ بہت یاد آرہے ہیں۔ اخبار میں چھپنے کے بعد ہر بات الوکھی اور حیرت انگیز معلوم ہونے لگتی ہے۔ یہ واقعہ بھی اخبار نے اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا تھا اور توقع ظاہر کی تھی کہ جلد ہی اہم انکشافات ہونے والے ہیں۔ اخبار میں ایک اور تازیانہ کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں پولیس کی ناکامیوں پر افسوس ظاہر کیا گیا تھا۔ جولین کا چہرہ زرد پڑا ہوا تھا۔ میں نے سمجھ لیا کہ اُس نے خبر ضرور پڑھ لی ہے۔ جامو اور کانتے زخمی حالت میں اُس کے گھر میں چھپے ہوئے تھے۔ صبح ایس پی شکلا آیا تھا پھر جامو اور کانتے دن بھر آپس میں سرگوشیاں کرتے رہے تھے۔ بجھل غائب تھا۔ جب میں واردات والی صبح منہ اندھیرے واپس آیا تھا تو میرے کپڑے بدلے ہوئے تھے۔ سوچنے کے لیے جولین کے پاس بہت کچھ تھا۔ میں نے اُس سے رسمی بات کی اور جلد ہی سے اپنے کمرے میں آگیا۔ وہ دونوں ابھی جاگ رہے تھے۔ میں کانتے کے پاس ہی لیٹ گیا۔ میں نے سوچا کہ جب دروازہ بند ہونے کی آواز آئے گی تو ڈرائنگ روم میں جا کے سو جاؤں گا۔ میں نے دیکھا تھا، اُس کی آنکھیں آئی ہوئی تھیں۔ میرے بس میں ہوتا تو میں اُس کے سارے آنسو نچوڑ لیتا۔ وہ ہنستی ہوئی بالکل پھول کے مانند کھل جاتی تھی۔ اُس کی ہنسی چھلکتی تھی۔ جی چاہتا تھا وہ ہمیشہ ہنستی رہے۔ ہنستے ہوئے اُس کے دانت اس طرح جگمگاتے تھے جیسے اُس کے منہ میں دودھیا روشنی بھر گئی ہو۔ میں نے کئی بار ارادہ کیا کہ اُس کے پاس جاؤں اور کہوں کہ تم کیوں روتی ہو۔ دو ہمت مگر میں سوچتا ہی رہ گیا۔ بہت دیر بعد آہٹ ہوئی۔ میں دبے قدموں وہاں پہنچا۔ پہلے میں نے جھانک کے اطمینان کر لینا چاہا۔ وہ ابھی تک موجود تھی۔ اُس کا آدھا بدن چادر سے ڈھکا ہوا تھا اور بند آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، چہرہ اُوپر اٹھا ہوا تھا۔ میں دیکھتا رہا اور رینگتا ہوا واپس اپنے کمرے میں آگیا۔ پھر دوبارہ آہٹ ہوئی لیکن میں پلنگ پر پڑے پڑے اندھیرا گھورتا رہا۔

⊛

پانچویں دن وہ زخمی اپنے اپنے پاڑے واپس آگئے جن کے زخم معمولی تھے اور جن کی حالت ابھی ٹھیک نہیں تھی، وہ ابھی تک چھپے ہوئے تھے۔ مارٹی کا حال پہلے سے اچھا تھا۔ اُس کا زخم خشک ہو رہا تھا۔ میں اُسے دیکھنے گیا تو وہ اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ میں نے اُسے گلے سے لگا لیا۔ مارٹی کے ساتھ دو ایک زخمی اور تھے۔ اُن کے قریب پھلوں کا انبار تھا۔ ایک آدمی اُن کی دیکھ بھال پر مامور تھا۔ پیرو کے علاقے کا خاص ڈاکٹر روز رات کو انھیں دیکھنے آتا تھا۔ اس اثنا میں پولیس افسروں کا زور کچھ بڑھ گیا۔ میں نے اپنا زیادہ وقت گھر پر ہی گزارا۔ جولین جامو اور کانتے کی نرسنگ کرتی تھی۔ کانتے کی پیشانی اور کان کا زخم بھر گیا تھا۔ البتہ تھوڑی خشک ہونے میں ابھی وقت درکار تھا۔ جامو کے بازو میں چاقو لگا تھا۔ وہ دیسی دواؤں سے اپنا علاج خود کر رہا تھا۔ جولین کی ماں بازار سے سودا لینے جاتی تھی تو اُن کی دوائیں بھی لے آتی تھی۔ اخباروں میں روز خبریں چھپ رہی تھیں۔ ہر طرف تیواڑی کی تلاش جاری تھی۔ اب خبروں کا رجحان تیواڑی کی گم شدگی یا فرار کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اُس کے باقی آدمی بھی بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ بہت سوں نے پیرو کے پاڑے میں پناہ لینے کی کوشش کی۔ پیرو نے کہہ دیا کہ وہ کچھ عرصے بعد ادھر کا رُخ کریں۔ تیواڑی کا علاقہ دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ پولیس کی موجودگی کے باوجود علاقے میں لوٹ مار کے واقعات ہونے لگے تھے۔ پولیس نے ہر طرف گرفتاریاں کی تھیں، چند ہی آدمیوں کو چھوڑا تھا۔ وہ پیرو کے پاڑے کے کچھ اور آدمی پکڑ کے لے گئے تھے۔ شعلا استاد ابھی جیل میں تھا۔

ایس پی شکلا اس کے بعد گھر نہیں آیا، نہ ہی وہ اُن افسروں میں شامل تھا جو بار بار پیرو کے پاڑے آتے تھے اور ہر بار نئے نئے سوال اُٹھاتے تھے۔ میں نے جولین کو اسکول جانے سے روک لیا تھا۔ جس دن سے اُس نے خبر پڑھی تھی، اُس دن سے وہ گم سُم ہو گئی تھی۔ کانتے اُسے ہنسانے کی کوشش کرتا تو وہ دبی دبی کھنچی کھنچی ہنسی ہنستی تھی۔ جمپا بھی چپ چپ رہتی تھی۔ یا تو نماز پڑھتی رہتی یا مصلے پر بیٹھی تسبیح گھماتی رہتی۔ کئی دن گزر گئے تھے۔ اب تنہائی کے چند لمحے بھی مشکل سے نصیب ہوتے تھے۔ رات کو وہ لوگ دیر تک جاگتے رہتے تھے۔ آدمی مر جائے تو اُس کے پاس جانا آسان ہوتا ہے۔ زندہ لوگوں کے پاس جانا بہت دشوار ہوتا ہے۔ وہ نہیں ملتی تھی لیکن میں اپنے کمرے میں بند ہو کے کسی نہ کسی طرح اُسے بلا لیتا تھا۔ اُس کی پرچھائیاں وہاں آجاتی تھیں۔ میں اُس کی مالا کے دانوں میں اُس کی خوشبو سونگھ لیتا تھا۔ اب تو گردن سے مالا نکالنے کی مہلت بھی نہیں ملتی تھی۔ لوگ ہر وقت سامنے رہتے تھے۔ دل ہر وقت اُڑا اُڑا رہتا تھا۔ کسی سے بات کرنے کو طبیعت نہیں کرتی تھی اور سب سے بات کرنی پڑتی تھی۔ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ دن کب ختم ہوں گے اور وہ کون سا دن ہوگا جب کوئی دیوار سامنے نہیں رہے گی۔

رات کے وقت میں روز پاڑے جاتا تھا اور جلد ہی واپس آجاتا تھا۔ چھٹے دن رات کو میں بجھل کے پاس خاموش بیٹھا تھا کہ ٹنڈا اور لکھے بھاگے آئے اور ہانپتے ہوئے اندر داخل ہوئے "دادا! — دادا!" ٹنڈے نے آتے ہی شور مچانا شروع کر دیا۔ اُس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی "دادا! — وہ ..... وہ اپن کا زورا کو اریسٹ کر کے لے گیا۔" ٹنڈے نے بدحواسی سے کہا "پولیس کا لوگ راجا جی کو بولتا تھا، زورا بولا، راجا نے پاڑا اپن کو دے دیا ہے۔ راجا اس ٹائم نئیں ہے۔ جب بولو اُدر چلا چلے گا۔ ابھی کوئی اس پاڑے کا بات کرنا ہو تو اپن سے کرو۔ وہ سالا زورا کو لے گیا دادا!"

بجھل کے ہاتھ میں بھری ہوئی چلم تھی۔ دفعتاً ٹنڈے کی ہول ناک چیخ کمرے میں گونجی۔ بجھل نے چلم اُس کے منہ پر کھینچ ماری تھی۔ فرش پر چنگاریاں بکھر گئیں۔ ٹنڈا اپنا منہ کھسوٹنے اور بری طرح چلانے لگا "ماچھی! بجھل کی گرج دار آواز پر ماچھی تیزی سے اُٹھ کھڑا ہوا "ماچھی! اس کتے کے بچے کو اُلٹا لٹکا دے۔ سویرے تک اس کو بات کرنا آجائے گا۔" ٹنڈا چیختا چلاتا رہا لیکن ماچھی اُسے کھینچتا ہوا دوسرے کمرے میں لے گیا۔ ہر سُو سکوت مسلط ہو گیا تھا۔ چند لمحوں بعد بجھل کی بپھری ہوئی آواز نے یہ خاموشی توڑی۔ وہ لکھے سے مخاطب تھا "لکھے! اچھا ہوا کہ تُو نے زبان نہیں کھولی۔ سالو! تم اپنی سسرال والوں سے گھبراتے ہو۔ پیرو! یہ گدھے کے بچے بدمعاش بنتے ہیں۔ ان لفنگوں کو اتنا نہیں معلوم کہ ہتھکڑی چاقو والے کا زیور ہے اور جیل خانہ" وہ بلند آواز سے بولا "جیل خانہ سسرال ہے۔ جن کو یہ رشتے بھی نہیں معلوم، وہ حرام کے تخم زنشہ بن جاتے ہیں۔"

"بجھل بھائی! غصہ تھوک دو۔" پیرو دھیمے لہجے میں بولا "یہ سب سالا ایک دم ٹٹو کا دم ہے۔ یہ بمبئی ہے۔ سالا ہر اونگا بونگا دادا بننے کے شوق میں ادھر آجاتا ہے۔ جیسے سالا دادا نئیں ہوا، چڑی مار ہو گیا۔ سرکس کا جوکر ہو گیا۔" وہ تھوک کے بولا۔

بجھل نے اُسی وقت پیرو کے خاص آدمی گلیا کو ہدایت کی کہ وہ لکھے کے ساتھ زورا کے پاڑے میں جا کے کہہ دے کہ زورا گیا، سارا پاڑا چلا جائے۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی ہم لوگ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ جاتے جاتے اُس نے لکھے کو آواز دی "لکھے! چھیدا سے بول دینا کہ حوالات میں زورا سے جا کے مل لے اور بتا دے کہ خبر ہو گئی ہے۔"

لکھے سر تا پا لرز رہا تھا۔ اُس نے سر جھکایا اور گلیا کے ساتھ فوراً باہر نکل گیا۔ بجھل کے کہنے سے پہلے ہی میں بھی وہاں سے چل دیا۔ دوسرے دن دوپہر کو پولیس نے پیرو کو گرفتار کر لیا۔ رات کو جب میں حسبِ معمول علاقے پہنچا تو پاڑے سے کچھ دُور ہی مجھے یہ اطلاع مل گئی۔ میرے پیر زمین سے اکھڑنے لگے۔ سنبھل سنبھل کے میں نے عمارت میں قدم رکھا۔ بجھل کو جلد سے جلد دیکھنے کی خواہش میرے سینے میں آندھی کی طرح اٹھی تھی مگر

میں سب سے پہلے میری نظر اُسی پر پڑی۔ وہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے چوکی کے درمیان میں بیٹھا تھا۔ اِردگرد لوگ جمع تھے۔ خلافِ توقع وہ بہت خوش خوش نظر آرہا تھا اور کسی بات پر مسکرا رہا تھا۔ جیسے ہی میں اُسے دکھائی دیا، اُس نے اپنا ہاتھ اُٹھایا۔ اُس کے قریب بیٹھے ہوئے لوگ پرے ہٹ گئے۔ میں نے اُس کے بڑھے ہوئے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا۔ اُس نے کھینچ کے مجھے اپنے پہلو میں بٹھا لیا "سب خیریت ہے؟" میں نے مضطربانہ پوچھا۔

"ہاں" وہ سرسری انداز میں بولا۔

"کوئی نئی بات؟"

"وہ تُو نے باہر سُن ہی لی ہوگی۔"

"کیا؟" میں نے جان بوجھ کر تعجب کا اظہار کیا۔ میں پیرو کی خبر اُسی کی زبانی سننا چاہتا تھا۔ میری صورت دیکھ کے وہ انگڑائی لینے لگا۔

"تیری یہی مرضی ہے کہ میرے منہ سے سُنے تو سُن۔ پیرو چلا گیا ہے۔" وہ تیزی سے اُنگلیاں کھولنے اور بند کرنے کی مشق کرتے ہوئے بولا۔

"پھر—؟" میں نے تجسس سے کہا۔

"پھر کیا، پھر" وہ ہنستے ہوئے بولا "اب چلنے کی تیاری کر۔ اندا ذرا سا ٹیڑھا ہو گیا۔ دیر زیادہ ہو گئی۔ اب کوئی کام رہ گیا ہو تو جلدی سے نمٹا لے۔"

"تم..... تم ہوش میں ہو؟" میں نے بوکھلا کے کہا۔

"کون کہہ سکتا ہے کہ وہ ہوش میں ہے۔" وہ آہستہ آہستہ بولا "ابے کیا یہیں بیٹھا رہے گا رے! چلنا نہیں ہے کیا؟"

"مگر ہم کیسے جا سکتے ہیں۔"

"اب دیر کیا رہ گئی ہے۔ تھوڑا سا کام اور ہے۔"

"ابھی پیرو بند ہے۔" میں نے تلملا کے کہا۔

"وہ بھی آجائے گا۔ منہ کا مزہ بدلنے گیا ہے۔ کبھی کبھی یہ کسرت ہوتی رہنی چاہیے۔ مجھے بھی دن بہت ہو گئے۔" وہ کسمساتے ہوئے بولا۔

میں نے نہیں پوچھا کہ پیرو کب اور کیسے آجائے گا۔ وہ کسی بنیاد ہی پر یہ بات کہہ رہا ہوگا۔ میں نے اُس سے ضد بحث بند کر دی تھی جو وہ کہتا تھا، میں سُن لیتا تھا کیونکہ اُس سے کچھ کہنا سننا بے کار تھا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا کہ کوئی اور بات نہ ہو جائے۔ جو وہ کہہ رہا ہے، سچ ثابت ہو جائے۔ مجھے اپنی دعاؤں سے ڈر لگتا تھا اس لیے میں نے دعا نہیں مانگی۔ میری زبان ہی کالی تھی۔ بمبئی چھوڑنے کے خیال سے میری رگوں میں خون اچھلنے لگا۔ رُواں رُواں کھڑا ہو گیا۔

"ہم کب تک چل سکیں گے؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"اب دن اور وقت کی بابت تو میں تجھے نہیں بول سکتا۔ پر جلد ہی لاڈلے! مجھے پتہ ہے کہ تُو یہاں سے نکلنے کے لیے کتنا بے چین

ہوگا۔بس کچھ دن اور ٹھہر جاؤ۔"

"تمھیں اندازہ ہے کہ میں کس طرح . . . . ."

"ہاں ہاں' اُس نے تجھے ٹوک دیا۔" انتظار کرلاڈلے!"

"اور کیا ہو رہا ہے؟" میں نے جھنجلا کے کہا۔

"زندگانی انتظار ہی انتظار ہے۔ اچھے دن' اچھی رُت کا انتظار' بچھڑے ہوؤں کا انتظار' بچپن سے جوانی کا' جوانی سے بڑھاپے کا انتظار اور موت کا انتظار۔" وہ اسی طرح کی باتیں کرتا رہا۔

جامو اس قابل تھا کہ پاڑے جا سکے۔ دوسرے دن میں پہلی بار اُس کے ساتھ وہاں پہنچا تو میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ پیرو وہاں بیٹھا تھا۔ کمرے میں پیرو کے تمام خاص خاص آدمی موجود تھے۔ زورا اور چھیدا بھی تھے۔ جامو کو دیکھ کے سب اُس کی طرف دوڑ پڑے اور اُس سے گلے ملنے لگے۔ مجھل بھی اپنی نشست سے اُٹھ کے آگیا اور جامو کو لے کے درمیان میں بیٹھ گیا۔ پیرو جامو کو لپٹے ہوئے تھا اور اُس سے وہی بات کہہ رہا تھا جو ایک بار اُس نے مجھ سے کہی تھی۔ جامو مجھل کی طرف دیکھ کے مسکرانے لگا۔ مجھل نے پھر معذرت چاہی۔ "آئیں گے پیرو دادا! پھر آئیں گے۔ اب جانے دو۔ اب ہم لوگ کے اِدھر رُکنے سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ اگر ایسا سمجھتے ہو تو کہہ دو۔"

"نیئں مجھل بھائی؟" پیرو اضطراب سے بولا۔ "ابھی اپن سالا سب سنبھال لے گا۔ اس بار تمھارے رُکنے کو نیئں بولتا۔ اپن کا مطلب کچھ اور ہے۔ اُکھا دن تو سالا اُٹھک بیٹھک میں خلاص ہو گیا۔ اپن نہ تم سے ٹھیک بول سکا، نہ تمھارے پاس بیٹھ سکا۔ ابھی کچھ ٹائم دو تاکہ پیرو اپنے مجھل بھائی کو ستی کا جلوہ شلوہ دکھاتے۔"

"وہ بعد میں ہو جائے گا پیرو دادا! تم کو بہت کام پڑا ہے۔"

"کام سالا ہوتا رہے گا۔" پیرو مچل کے بولا۔ "تم کوئی روز روز ادھر آتا ہے۔ اپن کی بات پہ ناں مت بولو' بولو ہاں' ہاں' ہاں۔" اُس کی آواز اونچی ہوتی گئی۔

"ہاں کیسے بول دے پیرو!" مجھل نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا اور پیرو کو سمجھانے لگا مگر سامنے بیٹھے ہوئے آدمی بھی پیرو کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ اُن کی باتیں میرے پلے بالکل نہیں پڑ رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ یہ سب کچھ مجھے سنانے کے لیے کہہ رہے ہوں اور مجھے چھیڑ رہے ہوں یا بہلا رہے ہوں۔ ممکن ہے مجھل نے پہلے سے کہہ رکھا ہو کہ جب میں آؤں تو وہ میرے سامنے اس قسم کی باتیں کرنے لگیں۔ اس طرح کچھ وقت اور نکل جائے گا۔ پرسوں رات زورا' کل دوپہر پیرو پکڑا گیا۔ اُن کی واپسی اس بات کی ضمانت نہیں تھی کہ اب کچھ باقی نہیں رہا۔ پیرو کے اصرار اور مجھل کے انکار کا سلسلہ دیر تک جاری رہا تا اِیں کہ درمیان میں جامو کو دخل دینا پڑا۔ اُس نے وعدہ کیا کہ ہم چند دن اور ٹھہر جائیں گے۔ جامو کی یقین دہانی پر وہ سب نعرے لگانے لگے اور پیرو نے جامو کے گالوں کی مٹھی لے لی۔

کمرے میں شور مچا ہوا تھا۔ ہر شخص زور زور سے بول رہا تھا' گالیاں دے رہا تھا اور ایک دوسرے کو گھونسے مار رہا تھا اور گلے مل رہا تھا۔ مجھے اپنی رائے بدلنی پڑی۔ وہ سب دل سے یہ چاہتے تھے کہ ہم لوگ جانے کا ارادہ ملتوی کر دیں۔ میری حیرت اُس وقت کچھ اور سوا ہو گئی جب کمرے میں مجھل کی آواز پر سکوت طاری ہو گیا۔ اُس کے مخاطب سبھی لوگ تھے اور وہ پاڑوں کے انتظام اور تقسیم پر کچھ کہہ رہا تھا۔ اُس کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ ہمارے آنے سے پہلے اُن کے درمیان کچھ اسی قسم کی گفتگو ہو رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ابھی تیواڑی کے پاڑوں پر ہاتھ ڈالنے کا وقت نہیں آیا ہے لیکن کچھ عرصے بعد یہ سب پیرو کے پاس آ جائیں گے۔ راجا کے دونوں پاڑے بھی اب پیرو کے پاڑے میں شمار ہوں گے۔ مجھل' جامو کانے اور راجا تیواڑی سے ملنے والے پاڑوں میں سے کسی کے دعوے دار نہیں ہیں۔ یہ سب پیرو کے ہیں اور پیرو کو اختیار ہے کہ وہ کسے کون سا پاڑا دے۔

اس موقع پر پیرو اُٹھ کھڑا ہوا۔ "تیواڑی کا پاڑا تمھارا ہے۔" وہ چیخ کر بولا۔ "یہ بھی تمھارا ہے۔ سب تمھارا ہے مجھل بھائی! تم اِدھر رُک کے بولو۔"

مجھل نے پیرو کی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ اُس کا بازو پکڑ کے بولا۔ "تم میں سے بہت سے آدمی پاڑا سنبھالنے کی جان کاری رکھتے ہیں لیکن اصل جان کاری کیا ہے۔ یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ جس کا ہاتھ صاف ہے اور جس کا سر صاف ہے، وہی جان کار ہے۔ ہم کو خوشی ہوگی، اگر تم یہ سب اپنے پاس ہی رکھو۔ ہم کو دیکھنا ہے کہ تم میں یہ کتنا سماتا ہے۔ تم سالا اُتھلے برتن نکلتے ہو یا کنواں بن جاتے ہو۔ بس ہم کو اتنا کہنا تھا۔"

یہ کہہ کے مجھل چپ ہو گیا۔ پھر ایک دم پیرو اُٹھ کھڑا ہوا۔ "ابھی اپن کو بھی بولنے دو۔ سالا مجھل بھائی کے آنے کے بعد اپن کا کھوپڑی جھلی ہو گیا ہے۔ اپن بولتا ہے کہ یہ جو کچھ ہے ہم سب لوگوں کا ہے۔ پیرو سالا تمھارے بغیر کچھ نہیں اور تم سالا ایک دوسرے کے بغیر کچھ نہیں۔ ابھی اپن کے دل میں بلبلہ سا اُٹھتا ہے۔ پیرو اپنا پاڑا چھوڑتا ہے۔ اپن یہ تم کو دینے کو بولتا ہے' بولو منظور ہے؟"

سب حیرت سے اُسے گھورنے لگے۔ کمرے میں سناٹا طاری ہو گیا۔ پھر یہ سناٹا بھن بھناہٹ میں بدل گیا اور شور ہونے لگا۔ "نامنظور ہے۔" ماچھی نے پہل کی۔ سب نے چلا کے اُس کی تائید کی۔

"پیرو یہیں رہے گا۔" جامو نے ترشی سے کہا۔ "پیرو کو تمھاری ضرورت ہے اور تمھیں پیرو کی۔ تم نے پیرو کو کھو دیا تو تم نے سالا سب کھو دیا۔ اس کو پکڑے رکھنا۔ اپنی بات یاد رکھو۔"

"ابھی جامو بھائی مسخری کرتا ہے۔" پیرو ہنسنے لگا۔

پھر اُن میں سے ہر آدمی بڑھ چڑھ کے مشورے دینے لگا کہ پاڑوں کا انتظام کس طرح کیا جائے کہ آپس میں جھگڑے فساد کا امکان کم سے کم ہو جائے۔ ہر آدمی اپنی اپنی بولی بولنے لگا۔ ہم تینوں چپ چاپ سنتے رہے۔ انھوں نے طے کیا کہ پیرو جسے چاہے گا، اپنی مرضی سے پاڑے پر بٹھائے گا۔ اب چونکہ شہر کا بڑا حصہ ان پاڑوں پر مشتمل ہو گا اس لیے مختلف آدمیوں کو پاڑے تفویض کیے جائیں گے اور اُن کی مدت مقرر نہیں ہوگی۔ ہر پاڑا اپنے دادا کے نام سے پکارا جائے گا لیکن ان کا نگران پیرو ہوگا اور یہ بات پولیس سے پوشیدہ رکھی جائے گی۔ ہر پاڑے سے آمدنی کا دسواں حصہ پیرو کے پاس آئے گا۔ پیرو اپنے پاس صرف ایک پاڑا رکھے گا۔ ہر مہینے کی کسی ایک تاریخ کو تمام پاڑوں کے دادا پیرو کے پاڑے میں جمع ہوں گے اور کوئی پریشانی یا شکایت ہوگی تو پیرو کے سامنے رکھ دیں گے۔ پیرو کے پاس تمام پاڑوں سے لیے ہوئے آدمیوں کا ایک خاص گروہ ہوگا جو کسی پاڑے کے دادا کی مخالفت پر اُس کے سر پہ پہنچ جائے گا۔ اُن میں سے ہر آدمی کی حیثیت دادا کے برابر ہوگی۔ کسی پاڑے کی آمدنی کم ہے تو دسواں حصہ اُسے معاف بھی کیا جا سکتا ہے بلکہ اپنی طرف سے اُس کی مدد کی جا سکتی ہے۔ ضرورت پڑنے پر پیرو کی منشا کے مطابق داداؤں کا تبادلہ بھی ہوتا رہے گا۔ ہر پاڑے میں چاقو زنی' اکھاڑے وغیرہ کا باقاعدہ انتظام ہوگا۔ آپس میں مقابلے ہوتے رہیں گے۔ اگر کوئی آدمی یہ سمجھتا ہے کہ وہ دادا بننے کا اہل ہے تو اُسے سیدھے پیرو کے پاس آنا پڑے گا۔ پیرو اُس کے مقابلے کا انتظام کرے گا۔ جیتنے کی صورت میں آزمائشی طور پر پہلے اُسے کوئی چھوٹا پاڑا دے دیا جائے گا، اگر اُس نے ٹھیک طرح پاڑا چلایا تو اُسے کسی بڑے پاڑے پر منتقل کر دیا جائے گا۔ ہر پاڑا اپنے اپنے علاقے میں آزاد ہوگا۔ پیرو کی طرف سے محض مجبوری کے عالم میں دخل اندازی کی جائے گی۔ کوئی ایسی بات نہیں کی جائے گی جو داداؤں کی آزادی میں حائل ہو، جس سے اُن میں بددلی پیدا ہو، اُن کی ہمت شکنی ہو۔ وہ خود کو پیرو کا غلام سمجھیں۔ پیرو کے خاص آدمیوں کے گروہ کا کوئی آدمی پیرو کی اجازت کے بغیر کسی پاڑے کے معاملات میں دخل نہیں دے گا۔ اس انتظام کی بنیاد یہ تھی کہ پاڑوں کے درمیان میل جول قائم رہے اور جو حاصل کیا گیا ہے، وہ آپس کے انتشار میں کھو نہ دیا جائے۔ چھیدا نے تجویز پیش کی کہ علاقے میں پھیلے ہوئے آدمیوں کے کام بھی طے کر دیے جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ لوگ طاقت کے زعم میں بے لگام ہو جائیں اور جو کچھ اب تک نہیں ہوا ہے، وہ ہونے لگے اور تیواڑی کی طرح انھیں کسی بات کا خیال نہ رہے۔

وہ بار بار ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ مجھل گردن جھکائے حقہ پینے میں مصروف تھا۔ جامو کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ دلچسپی سے اُن کی باتیں سن رہا تھا اور میرے سینے میں بلبلے اُٹھ رہے تھے۔

جب وہ ایسی باتیں کر رہے ہیں تو یقیناً انھیں تیواڑی کے معاملے میں اب کسی بڑی الجھن کا اندیشہ نہیں ہے اور مجھل کی بات سچ ہے کہ اب جانے کا وقت آگیا ہے۔ اب میری آنکھیں میرے پاس ہوں گی اور میں انھیں اُسی کے لیے وقف کر دوں گا۔ میں نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ اب اگر راستے میں کوئی کرشنا جی نظر آئے تو میں نظریں چرا لوں گا، راستہ ہی بدل دوں گا۔

جب بہت دیر ہو گئی تو پیرو بھڑک اُٹھا اور چیخ کر بولا۔ "بس' سب ٹھیک ہے۔ جیسا تم بولتے ہو' وہی ہوئے گا۔ اگر اس مافک کام ٹھیک نیئں چلا تو تین مہینے بعد اپن سب لوٹ دے گا۔ سمجھا۔ اب اپنے منہ پہ تالا لگاؤ اور سالا یہ سوچو کہ مجھل بھائی جانے والا ہے۔ وہ جا کے اُودر کیا بولے گا کہ تم لوگوں نے اُس کے ساتھ کیا کیا۔ بوم مارا۔ ناٹک کرتا رہا۔"

پیرو انھیں برا بھلا کہنے اور گالیاں دینے لگا۔ اُس نے حکم دیا کہ فوراً ایک بڑے جشن کا انتظام کیا جائے۔ سارے شہر سے طوائفیں لائی جائیں اور تین دن تک ناچ رنگ کیا جائے۔ دوسرے علاقوں کے استادوں کو بھی مدعو کیا جائے اور دیگیں چڑھا دی جائیں۔

مگر مجھل اس جشن کے لیے آمادہ نہیں ہوا۔ اُس نے سختی کے ساتھ منع کر دیا کہ یہ موقع جشن منانے کا نہیں ہے۔ وہ سب بہت خوش تھے۔ مجھل کے انکار سے اُن کے چہرے لٹک گئے۔ پیرو ناراض ہو کے بیٹھ گیا۔ مجھل نے اُسے سمجھایا کہ جشن کے اور بہت سے موقعے آئیں گے۔ مجھل نے جیسے میرے منہ کی بات چھین لی۔ میری خواہش بھی یہی تھی کہ وہ انکار کرے۔ وہ نہ بولتا تو میں منع کر دیتا لیکن میرے کچھ کہنے کی نوبت نہیں آئی۔

جب میں اور جامو پاڑے سے باہر نکلے تو رات بہت گزر گئی تھی۔ میرے پیر زمین پر ٹپک رہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ سڑک سنسان تھی اور ہلکی ہلکی پھوار نے اُسے گیلا کر دیا تھا۔ پولیس موجود تھی۔ ابھی ہم کچھ دور گئے ہوں گے کہ ایک آدمی بھاگتا ہوا ہمارے پاس آیا۔ وہ چھیدا تھا۔ اُس نے بتایا کہ پیرو نے مجھے کل دوپہر پاڑے آنے کی ہدایت کی ہے۔ میں اُس سے وجہ پوچھنا چاہتا تھا مگر جامو میرا ہاتھ کھینچ کے آگے بڑھ گیا۔ میں ہر روز رات کو پاڑے جاتا ہی تھا، پھر دوپہر کو خاص طور پر بلانے کی ضرورت کیوں پڑ گئی۔ میں راستے بھر اُلجھا رہا۔ خاصی تگ و دو کے بعد ہمیں ٹیکسی ملی۔ برسات کی وجہ سے ٹیکسی والے بھی سڑکوں سے بھاگ گئے تھے۔ جامو کا زخم ابھی ہرا تھا۔ پانی پڑنے سے بگڑ سکتا تھا۔ تاہم گھر سے کچھ فاصلے پر ہمیں ٹیکسی چھوڑنی پڑی۔ بارش تیز ہو گئی تھی۔ میں نے جامو کا بازو اپنی اوٹ میں لے لیا لیکن چلنے کے دوران میں یہ ایک مشکل کام تھا۔ جیسے تیسے بھاگتے ہوئے ہم گھر پہنچ گئے۔ جولین نے فوراً دروازہ کھول

دیا۔ ڈرائنگ روم روشن تھا لیکن جولین کا چہرہ بجھا ہوا تھا۔ ہمیں بھیگا ہوا دیکھ کے وہ جلدی سے تولیا لے آئی اور مجھے اس نے ایک چادر دے دی۔

"ارے جولی بہن! تم اب تک جاگ رہی ہو؟" جامو نے حیرت سے کہا۔ ڈرائنگ روم بے ترتیب پڑا تھا۔ جولین بھی کچھ بے ترتیب سی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور اسے ساڑی کا ہوش نہیں تھا۔ جامو کے ٹوکنے پر اسے خیال آیا۔ اس نے حواس باختگی سے اپنی ساڑی درست کی اور نظریں نیچی کر لیں۔ "ہم نے تو کہہ دیا تھا کہ ہمیں دیر ہو سکتی ہے۔" جامو نے ندامت سے کہا۔ "بس اب تمھیں کچھ دنوں کی تکلیف اور ہے۔ ہم جلد ہی چلے جائیں گے۔"

"نہیں نہیں مجھے تو نیند نہیں آ رہی تھی۔" وہ منتشر لہجے میں بولی۔ "آپ کپڑے بدل لیجیے جامو بھائی! بہت بھیگ گئے ہیں۔ میں آپ کے لیے چائے بنا کے لاتی ہوں۔"

"اب تم سو جاؤ۔ میں اس وقت چائے نہیں پیوں گا۔" جامو اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں چند لمحوں تک وہیں ٹھہرا ہوا جولین کو دیکھتا رہا پھر میں بھی چلا آیا۔ کپڑے بدل کے میں کانپنے کے ساتھ بستر پر لیٹنے کے بجائے کرسی پر بیٹھ گیا۔ گھر میں قدم رکھتے ہی میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ اتنی دیر میں جولین کی آواز آئی۔ وہ مجھے باہر بلا رہی تھی۔ جامو نے فوراً چادر اوڑھ لی کیونکہ اس نے قمیص اتار دی تھی۔ میں باہر گیا تو جولین چائے لیے کھڑی تھی۔ میں نے اسے گھور کے دیکھا۔ ٹرے اس کے ہاتھ میں لرز رہی تھی اور پیالیاں بج رہی تھیں۔ ٹرے لے کے میں اندر آ گیا۔ جب بھی یہاں سے جانے کی کوئی امید پیدا ہوتی تھی، مجھے جولین کا خیال آنے لگتا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ میرے جانے کا سنے گی تو کتنی اداس ہو جائے گی۔ اب تو اس کا باپ بھی نہیں تھا اور نہ ہی کرشنا جی۔ ایک بوڑھی ماں تھی۔ دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔ دور کے چند رشتے دار ہوں گے تو وہ اس ماحول میں واپس جانا نہیں چاہتی تھی، نہ ہی اس کا وہاں جانا مناسب تھا کیونکہ وہ ایک علیحدہ لڑکی تھی۔ جولین اس اکیلی زندگی سے بہت گھبرائے گی، ویسے بھی ذرا ذرا سی بات پر گھبرا جاتی ہے۔ اس کا دل بہت کمزور ہے۔ وہ مارٹی سے کتنا ڈرتی تھی۔ میں نے اس کے لیے مارٹی سے لڑائی مول لی، کرشنا جی نے اسے نئے مکان میں منتقل کر دیا اور اچھی ملازمت دلوا دی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ وہ خوش رہے، ہنستی رہے لیکن وہ روز بہ روز اداس ہوتی جاتی تھی۔ اس کا خیال میرے دماغ سے چمٹا ہوا تھا۔ کرشنا جی نے میرے لیے بڑی دولت چھوڑی تھی مگر جولین اس سے بھی بڑی دولت تھی۔ اس کی خوب صورتی صرف چہرے تک محدود نہیں تھی۔ رات دن، صبح و شام، وہ ہر وقت کرشنا جی کی طرح مجھے آرام پہنچانے کی جستجو میں لگی رہتی تھی۔ اب جانے کی کوئی صورت بندھی تو اسے اطلاع دینے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی حالانکہ میں اس سے بارہا کہہ چکا تھا کہ مجھے یہاں ٹھہرنا نہیں ہے۔ اسی لیے میں اس کے ساتھ گھر میں بھی نہیں رہنا چاہتا تھا۔ مجھے بہت پہلے سے احساس تھا کہ اس کے ساتھ رہوں گا تو اسے اور پریشان کروں گا۔ میں نے اس کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔ ایک مارٹی کے آزار سے نجات دلانا کون سی بڑی بات تھی اور مارٹی بھی اس کے ساتھ مجھے دیکھ کے زیادہ تنگ کرنے لگا تھا ورنہ وہ اس سے پہلے بھی وہیں رہتی تھی۔ میں نے اس کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔ میں کسی کے لیے کر بھی کیا سکتا تھا۔ میرے ہاتھ پیر تو ٹوٹے ہوئے تھے۔ میرا کام ان لوگوں کو دکھ پہنچانا رہ گیا تھا جو میرا خیال کرتے تھے۔

چائے پی کے جامو جلد ہی سو گیا۔ میں کرسی پر بیٹھا جاگتا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بھی ابھی تک جاگ رہی ہوگی۔ جامو نے میرے سامنے اس سے کہا تھا کہ وہ چند دن کا مہمان ہے۔ اس نے میری اور پنجل کی تمام گفتگو سنی تھی۔ وہ مجھ سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ سوچتی ہوگی کہ مجھے روکنے کا اسے کیا حق پہنچتا ہے۔ وہ بہت سی باتیں سوچ رہی ہوگی مگر میں کیا کر سکتا ہوں۔ جو میرے بس میں نہیں ہے، وہ میں کیسے کر سکتا ہوں۔ کیا میں جولین جیسی بے سہارا لڑکی کو سہارا دینے کے لیے بمبئی میں ٹھہر جاؤں؟ میرے پاس بہت پیسے ہیں۔ ہم دونوں بہت سکھ سے رہیں گے۔ بمبئی میں جی نہ لگا تو کہیں اور چلے جائیں گے مگر پھر جولین تو میرے ساتھ رہے گی مگر میں خود کس کے ساتھ رہوں گا؟ میں اس کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ نہیں ہوں گا ورنہ پھر میں زریں کے پاس سے کیوں چلا آیا تھا؟ میں نے پنجل سے کیوں فرار اختیار کیا اور جیل سے نکلنے کے بعد اس کی تلاش میں کیوں نکل کھڑا ہوا؟

بہتر ہے کہ میں اسے جا کے بتا دوں "جولی! اچھی جولی! مجھے بہت کام ہے۔ تم خود اپنے بارے میں کچھ سوچو۔" کسی نہ کسی دن تو مجھے اس سے یہ بات کرنی ہی ہے۔ فرض کرو، میں نہ ہوتا اور اس کا باپ بھی مر گیا ہوتا اور کرشنا جی بھی نہ ہوتے تو وہ کیا کرتی۔ دنیا میں نہ جانے کتنے لوگ بے سہارا ہیں اور میں کس شمار و قطار میں ہوں۔ میں کرسی سے اٹھ گیا اور ہلکی چاپوں سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ جولین صوفے پر نیم دراز ہو گئی تھی۔ میرا اندازہ درست تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ میری آہٹ پر وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔ اس نے ساڑی کے پلو سے اپنا بھیگا ہوا چہرہ خشک کیا اور پٹ پٹاتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس کی نگاہیں فرش پر جمی ہوئی تھیں۔ "تم رو رہی ہو؟" میں نے بہ مشکل تمام کہا۔ اس کے بدن میں ارتعاش سا ہوا مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی گردن کچھ اور جھک گئی۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ "جولین!" چند لمحوں کے توقف کے بعد میں نے اسے پکارا۔ اس نے کسمسا کے ایک ثانیے کے لیے نگاہیں اٹھائیں اور اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ میں نے اس سے بات کرنے کا ارادہ ہی ملتوی کر دیا۔ اس وقت

نہ تو مجھ سے کوئی بات ہو رہی تھی اور نہ شاید وہ کچھ سننا چاہتی تھی چنانچہ میں نے سکوت اختیار کر لیا مگر یہ خاموشی نہ بولنے سے زیادہ بری تھی۔ "جولین!" میں نے ہانپتی ہوئی آواز میں اسے پھر مخاطب کرنے کی کوشش کی۔ "مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔" میں نے تیزی سے کہا تاکہ کہیں میری زبان نہ اٹک جائے۔ "مجھے اب چند دنوں میں یہاں سے جانا ہے۔" اس کی آنکھیں پھر چھلک پڑیں اور ہونٹ کانپنے لگے۔ "مجھے معلوم ہے کہ تمھیں اس اطلاع سے دکھ ہوگا۔" میری آواز بھرانے لگی۔

"میں نے تمھارے بارے میں بہت سوچا ہے مگر میری عقل کام نہیں کرتی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ جولین! میں رک نہیں سکتا اور نہ تمھیں اس طرح تنہا چھوڑ کے جانے کو جی چاہتا ہے۔ تمھی بتاؤ۔ میں کیا کروں؟"

وہ سسکیاں بھرنے لگی۔ "مت رو، مت رو۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "تم بہت اچھی ہو جولین! یقین کرو، میں تمھاری وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ اس وقت میری سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ تمھیں خوش دیکھ سکوں اور تمھارے لیے خوشی مہیا کر سکوں مگر جو چیز خود میرے پاس نہیں ہے، وہ میں کسی کو کیا دے سکتا ہوں۔ شاید تمھیں میرے متعلق پہلے سے کچھ معلوم ہو گیا ہو یا جامو اور کانتے نے تمھیں باتوں باتوں میں کچھ بتا دیا ہو لیکن جو کچھ انھوں نے تمھیں بتایا ہوگا یا تم نے خود اندازہ کیا ہوگا، وہ بہت کم ہے۔ مجھ سے کچھ پوچھنا مت۔ بس میں تم سے اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے جانا ہے اور مجھے نہ جانے کہاں کہاں جانا پڑے۔ تم ایک ذہین اور پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ اپنے بارے میں بہتر فیصلہ کر سکتی ہو۔ میرا کوئی گھر نہیں ہے کہ میں تمھیں وہاں لے جاؤں اور پھر تمھارے سامنے ایک بڑی زندگی پڑی ہے۔ فیض آباد میں ایک لڑکی زریں رہتی ہے۔ مجھے خیال آیا تھا کہ میں تمھیں وہیں پہنچا دوں۔ وہ بھی تمھاری طرح بہت اچھی اور تنہا ہے۔ تمھاری تو ماں بھی ہے، اس کا کوئی نہیں ہے۔ ایک بڑی حویلی میں رہتی ہے۔ تم دونوں ایک دوسرے سے ملتیں تو بہت خوش ہوتیں۔ تم وہاں ملازمت بھی کر سکتی ہو اور تعلیم بھی جاری رکھ سکتی ہو مگر جب میں نے سوچا تو یہ مجھے کچھ اچھا نہیں معلوم ہوا۔ اس طرح کوئی کسی کے گھر میں نہیں رہ سکتا۔ شاید تم بھی اسے پسند نہ کرو۔ جولین! کرشنا جی نے میرے نام بہت بڑی رقم چھوڑی ہے۔ وہ رقم میرے کسی کام کی نہیں ہے۔ تم اس رقم میں سے جو چاہو لے لو یا سب اپنے پاس رکھو۔ پھر تم ایک بہت اچھا گھر بنا سکتی ہو، ملازم رکھ سکتی ہو اور ملازمت چھوڑ کے اعلا تعلیم حاصل کر سکتی ہو۔ تم چاہو تو اپنی ماں کا کہیں انتظام کر کے ہوسٹل میں بھی رہ سکتی ہو، ولایت بھی جا سکتی ہو۔ اس رقم سے تم بہت کچھ کر سکتی ہو۔ خبر ہے، کتنی رقم ہے؟" میں نے اس کی طرف دیکھ کے پوچھا۔ اس کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو جاری تھے۔

میں گھبرا گیا۔ "ساڑھے آٹھ لاکھ کے قریب۔"

اس نے اپنی بھیگی لرزتی ہوئی پلکیں اٹھائیں اور اپنا منہ چھپا لیا۔

"تم نے سنا، کرشنا جی مجھے کیا سمجھتے تھے۔" میری آواز پھٹنے لگی۔ "میں نے تمھیں نہیں بتایا تھا اس لیے کہ مجھے بتاتے ہوئے شرم آتی تھی۔ وہ روپیہ بینک میں محفوظ ہے۔ میں نے اس میں سے ایک پائی کو بھی ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ کرشنا جی نے نہ جانے کیوں اسے میرے نام کر دیا تھا۔" "تم اس قدر رو کیوں رہی ہو؟ جولین! میری باتوں کا جواب دو۔" میں نے وحشت سے کہا۔ "رونا بند کرو۔ مجھے بھی رونا آ رہا ہے۔" میں نے اس کے دونوں ہاتھ چہرے سے ہٹا دیے۔ وہ نڈھال ہو کے میرے سینے پر گر پڑی۔ میری سانس بند ہونے لگی اور جسم سن ہو گیا۔ میرے ہاتھ پتھر کے ہو گئے۔ جولین میرے سینے پر سسک رہی تھی۔ میں دیر تک گنگ بیٹھا رہا۔ پھر میری سانس پھولنے لگی۔ میرا جی چاہا کہ اسے خوب زور سے گلے لگا لوں، خوب پیار کروں اور کہہ دوں کہ میں نہیں جاتا، میں یہیں رہوں گا لیکن میری زبان اور ہاتھوں پر رعشہ طاری ہو گیا تھا۔ میں بے اختیار پیچھے ہٹ گیا۔ مجھے نہیں معلوم کس طرح، دوسرے لمحے جولین کے بازو میرے ہاتھوں کی گرفت میں تھے۔ میں نے اسے جھنجھوڑ دیا۔ "مت رو۔" میں نے چیخ کر کہا۔ مجھے یہ خیال ہی نہیں رہا کہ میری بلند آواز سے گھر میں کوئی بھی جاگ سکتا ہے۔ جولین خود ہی سنبھل گئی۔ "میری بات سنو جولین! میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ یہ مت سمجھنا کہ مجھے تمھاری فکر نہیں ہے لیکن تم... سمجھنے کی کوشش کرو۔" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"تمھیں کون روک سکتا ہے۔" وہ بلکتی ہوئی بولی۔

"اس طرح مت کہو۔ میں رک جاؤں گا تو تمھیں پریشان ہی کرتا رہوں گا۔" میں نے روتے ہوئے کہا۔ "نہ خود چین سے بیٹھوں گا، نہ تمھیں چین لینے دوں گا۔ میں ہر روز تمھیں رلاتا رہوں گا۔ اب تک تو میں نے یہی کیا ہے۔ تم نے دیکھ ہی لیا ہے کہ یہاں رہ کے میں نے تمھیں کیا دیا۔ آنسو دیے۔ میرے پاس اور ہے بھی کیا۔ میں تو کب کا چلا جاتا۔ ایک کام نے روک کے رکھا لیکن اب میں ایک طرف سے مطمئن ہو گیا ہوں۔ سمجھ لو، کرشنا جی نے مجھے کچھ کام سونپا تھا۔ وہ اب نمٹ چکا ہے۔" وہ چونک کے سرخ آنکھوں سے مجھے گھورنے لگی۔

"لیکن میں تمھاری جانب سے فکر مند ہوں جولین! میں نے تمھارے سامنے کئی باتیں رکھی ہیں۔ تم اپنے لیے جو بات مناسب سمجھو، مجھے بتا دو۔ میرا خیال ہے تم ایک نیا مکان لے لو، یہ پیسے آخر کس کام آئیں گے۔"

"مجھے پیسے نہیں چاہییں۔" وہ لرزیدہ لہجے میں بولی۔

"کیوں نہیں چاہییں؟ کرشنا جی تمھیں بھی اتنا ہی عزیز رکھتے تھے جتنا مجھے۔ ان کے پیسوں پر تمھارا بھی حق ہے اور اب تو یہ میرے پیسے ہیں۔ میں تمھیں دے رہا ہوں۔ تمھارے دل میں کچھ اور خیال آ رہا ہے

کیا؟ نہیں..... نہیں! اسے دل سے نکال دو۔ میں یہ بات تم پر ترس کھا کے یا تمہیں ضرورت مند سمجھ کے نہیں کہہ رہا ہوں۔ میرا مقصد تو یہ ہے کہ تم خوش رہو۔ سمجھیں؟"

"تم چلے جاؤ۔" وہ سسکتی ہوئی بولی۔

"مگر تمہارا کیا ہوگا؟"

"کچھ بھی نہیں، میں زندہ رہ لوں گی۔" اُس کی زبان ڈگمگا رہی تھی۔

"تم نے کیا سوچا ہے؟"

"کچھ نہ کچھ تو سوچنا پڑے گا۔" اُس کی ٹھٹھری ہوئی آواز اُبھری۔ "زندہ رہنا ہے۔"

"ہاں جولین! میری اچھی جولین! کچھ نہ کچھ ضرور سوچو۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لے چلتا مگر میری کوئی منزل، کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ اگر خدا نے میری بات سن لی تو میں کبھی ضرور واپس آؤں گا۔ یہاں میں مارٹی سے کہہ دوں گا۔ وہ میری عدم موجودی میں تمہارا خیال رکھے گا اور میں تمہیں چند ایسے نام بتا کے جاؤں گا کہ جب بھی میرا نام لے کے تم اُن سے ملو گی اور تمہیں کوئی پریشانی ہوگی تو وہ فوراً حاضر ہو جائیں گے۔ وہ میرے نام کا اتنا پاس ضرور رکھیں گے۔ وقت پڑا تو وہ تمہارے لیے جان بھی لڑا سکتے ہیں۔ جولین! تم یہ بھی تو سمجھ سکتی ہو کہ میں مر گیا ہوں۔ کوئی بھی آدمی کسی بھی وقت مر سکتا ہے۔ تم یہ سمجھ لو کہ تم نے مجھے دیکھا ہی نہیں تھا۔ کرشنا جی کو جو چاقو لگے، اگر وہ مجھے لگ جاتے؟"

جولین بُت بنی بیٹھی تھی۔ وہ نہ میری طرف دیکھ رہی تھی نہ رو رہی تھی۔ اُس کی نظریں سامنے دیوار پر جمی ہوئی تھیں۔ گیلے رخساروں پر لیمپ کی پیلی روشنی دمک رہی تھی۔ اُس کے ہونٹ بار بار تھرتھرانے لگتے تھے۔

"تم بولتیں کیوں نہیں؟" میں نے سراسیمگی سے پوچھا۔ "کیا سوچ رہی ہو؟"

"کچھ نہیں۔" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔

"کچھ تو ضرور سوچ رہی ہوگی؟"

وہ گم صم بیٹھی رہی۔ میں بھی سر جھکا کے خاموش ہو گیا۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ پرنالے گرنے کا شور اندر تک گونج رہا تھا۔ لیمپ کی روشنی کبھی مدھم پڑ جاتی تھی، کبھی تیز ہو جاتی تھی۔ شاید بجلی جانے والی تھی۔ جب دیر ہو گئی اور اُس کے بدن کی کوئی آہٹ نہیں اُبھری تو میں نے بے چینی سے اُس کی طرف دیکھا۔ جولین کا بدن ساکت تھا۔ صرف سینہ متحرک تھا۔ صبح تک میں یوں ہی بیٹھا رہا۔ وہ بھی بیٹھی رہی۔ صبح ہونے میں دیر ہی کتنی رہ گئی تھی۔ دودھ والے نے آواز لگائی تو وہ چونک پڑی۔ گھبرا کے اُٹھی اور لڑکھڑاتی ہوئی باورچی خانے کی طرف لپکی۔

نماز کے لیے چمپا کے اُٹھنے سے پہلے میں اندر چلا آیا۔

صبح بارش ہلکی ہو گئی تھی۔ میں اپنے کمرے ہی میں پڑا رہا۔ چمپا آئی تو میں نے منع کر دیا کہ میرا جی ناشتے کو نہیں کر رہا ہے۔ پھر کانتے اصرار کر کے مجھے ناشتے کی میز پر لے آیا۔ میری نظریں جولین کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ وہاں موجود نہیں تھی۔ ناشتہ کر کے میں کسی سے کچھ کہے بغیر گھر سے نکل گیا اور سڑکوں پر گھومتا رہا۔ ایک سڑک سے دوسری سڑک۔ ایک چوک سے دوسرا چوک۔ بار بار مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے جولین میرے پہلو میں چل رہی ہو اور مجھے پیچھے سے آوازیں دے رہی ہو۔ راستے میں کئی بار میں نے گھر واپس جانے کا ارادہ کیا کہ نہ جانے جولین کی طبیعت کیسی ہو لیکن میں آگے ہی بڑھتا رہا۔

جولین کو کیا اندازہ تھا کہ کوئی اُس سے بھی زیادہ تنہا ہو سکتا ہے۔ اُس کا تو کوئی بھی نہیں تھا۔ اُس سے تو سب کچھ چھین لیا گیا تھا۔ دشمن جگہ جگہ اُس کی بُو سونگھتے پھر رہے تھے۔ مولوی محمد شفیق نے نہ جانے کب تک ساتھ دیا ہوگا۔ کوئی جولین سے اس طرح نہیں بچھڑ گیا تھا جس طرح اُس سے بچھڑا۔ کسی نے اُس کے لیے اپنا گھر چھوڑ دیا تھا۔ وہ ایسی نہیں تھی کہ اُس پہ وقت کی گرد پڑ جائے۔ وہ تو میرے دل میں روز بہ روز روشن ہو رہی تھی۔ جولین کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ میرے سینے میں کیسی جلن ہوتی ہے۔ کبھی کبھی میرا جی چاہتا تھا کہ سر سے پاؤں تک اپنے جسم میں چاقو کھینچ دوں۔

فٹ پاتھوں پر بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ جیسے ہی بارش بند ہوئی لوگ چیونٹیوں کی طرح سڑکوں پر اُبل پڑے ــــــ بھیڑ زیادہ ہوتی تھی تو میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگتا تھا کہ کہیں نگاہ چوک نہ جائے۔ راہ گیر تیز تیز قدموں سے چل رہے تھے کیونکہ ابھی تک آسمان پر گھرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ میں وہاں تک جانا چاہتا تھا جہاں تک آدمی نظر آتے ہوں۔ کسی دن انہی آدمیوں کے درمیان وہ مجھے مل جائے گی۔ میں نے ایک طویل فاصلہ طے کر لیا۔ دھوپ نکل تب مجھے یاد آیا کہ پیرو نے آج دوپہر مجھے آنے کی ہدایت کی تھی۔ جب میں پاڑے پہنچا تو مجھے کچھ سکون تھا کہ میں نے صبح سے اب تک کا وقت ضائع نہیں کیا ہے۔ پیرو میرا انتظار کر رہا تھا۔ اُس نے اور تجمل نے اُجلے کپڑے پہن رکھے تھے۔ "لاڈلے جانی! اتنی دیر کر دی؟" وہ مجھے دیکھتے ہی چلایا۔ "اب چل، جلدی چل۔"

"کہاں چلنا ہے؟" میں نے اُداسی سے پوچھا۔

"یہ مت پوچھ، اپن نے تجمل بھائی کو بھی نہیں بولا ہے۔"

"چلو۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ وہ دونوں تیار ہی بیٹھے تھے۔ فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم دونوں کے سوا کوئی اور آدمی اُس کے ساتھ نہیں تھا۔ علاقے میں کچھ دُور پیدل چل کے پیرو نے ایک ٹیکسی رُکوا لی۔ چند منٹ کے سفر کے بعد وہ ایک بڑے جنرل اسٹور کے سامنے رُک گیا اور اِدھر اُدھر دیکھ کے باہر ہی کھڑے کھڑے اُس نے کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص کو اشارہ کیا۔ اُس کے اشارے کی دیر تھی۔ ایک آدمی لپکتا ہوا اسٹور سے باہر آیا اور اُس نے پیرو کے ہاتھ میں چابیوں کا گچھا تھما دیا۔ اسٹور کے برابر ہی گیراج

تھا۔ پیرو نے وہاں سے ایک موٹر نکال لی۔ وہ خود اسے چلا رہا تھا۔ آگے کی نشست پر تجمل اور پچھلی پر میں بیٹھ گیا۔ موٹر کی رفتار تیز تھی۔ پیرو ایک لمبا راستہ عبور کرتا ہوا ایسے علاقے میں داخل ہو گیا جہاں اونچے اونچے مکانات تھے اور کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔ اب میری کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا تھا کہ پیرو ہمیں کہاں لے جا رہا ہے۔ کچھ دیر بعد موٹر ایک سبز پوش آہنی پھاٹک کے پاس رُک گئی۔ ہارن کی آواز پر کسی تاخیر کے بغیر دروازہ کھلا اور موٹر اندر داخل ہو گئی۔ چوکی دار نے پیرو کو جھک کے سلام کیا۔ وہ ایک بہت بڑی کوٹھی تھی۔ عمارت کے سامنے میدان میں سبزہ پھیلا ہوا تھا۔ پیرو نے پورٹیکو میں موٹر کا انجن بند کر دیا۔ تجمل اُسے متجسس نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ "آؤ تجمل بھائی!" وہ تجمل کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بے تابی سے بولا۔ "اندر آؤ۔"

"یہ تم کہاں لے آئے پیرو دادا؟" تجمل نے مسکرا کے پوچھا۔

"تجمل بھائی! اپن کسی کو آج تک یہاں نہیں لایا۔ پاڑے کے صرف دو ایک آدمیوں کو پتہ ہے کہ اپن ہفتے میں ایک بار کہاں جاتا ہے۔" ابھی وہ بتا ہی رہا تھا کہ اندر سے ایک خوش لباس جوان عورت برآمد ہوئی۔ اُسے ادھیڑ کہنا غلط ہوگا۔ اُس کا قد جولین کی طرح لانبا، رنگ سرخ و سفید، جسم متوازن اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ ہم دونوں کو دیکھ کے وہ کچھ گھبرا سی گئی۔ "تجمل بھائی! پہچانو، کون ہے؟" پیرو نے ہنستے ہوئے کہا۔

تجمل چند لمحے سوچتا رہا پھر پُرسکون آواز میں بولا۔ "بھابی۔"

"واہ تجمل بھائی!" وہ اُچھل پڑا۔ "تم نے کیسے جانا؟"

"تم دونوں کی آنکھوں سے۔"

عورت نے دونوں ہاتھ جوڑ کے پہلے تجمل کو نمسکار کیا پھر مجھے۔

"رانی!" پیرو ہنستی ہوئی آواز میں بولا۔ "اپن کا تجمل بھائی اور سالا لاڈلا ربیا۔" پیرو نے ایک ہی سانس میں ہمارے متعلق نہ جانے کیا کیا کہہ دیا۔ رانی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اُس نے ہمیں اندر چلنے کے لیے کہا اور ایک سجے ہوئے کمرے میں لے آئی۔ فرش پہ قالین بچھا ہوا تھا اور ارد گرد اونچی اونچی کرسیاں اور صوفے رکھے ہوئے تھے۔ رانی شائستگی سے ہمارے سامنے بیٹھ گئی۔ اُس کے کانوں میں چھوٹے بُندے لٹکے ہوئے تھے اور ماتھے پہ بندیا دمک رہی تھی۔ گلے میں میری مالا کی طرح موتیوں کی مالا پڑی تھی۔ جُوڑا بندھا ہوا تھا اور چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔

"یہ کیا ہے پیرو دادا؟" تجمل نے مضطرب ہو کے سرگوشی کی۔

"بس تجمل بھائی!" پیرو کھلکھلانے لگا۔ "اپن نے تم کو نہیں بولا تھا۔ یہ بھی اپن کا پاڑا ہے۔ ابھی تجمل بھائی! اپن نے سوچا تم سے کوئی پردہ رہ گیا تو اپن کو بعد میں بہت خواری ہوگا۔ سالا ٹائم ہی نہیں ملا۔ اپن تم کو بہت پہلے ایدر لے آتا اور یہیں ٹھہرنے کو بولتا۔ پر وہ سالا چھیڑا جھاڑی جو اُودر چلا آرہا تھا، یہ اپن کا رانی ہے تجمل بھائی!" وہ بہکی ہوئی آواز میں بولا۔ "ابھی تجمل بھائی کی خاطری کرو رانی! اپن کو آنے میں دیر ہو گئی۔ جو بھی گھر میں ہے، لے آؤ اور وہ..... وہ پیرو کا بچی مہارانی گیتا کیدر ہے؟ اُسے بولو چاچا تجمل آیا ہے۔ جلدی آؤ۔ بولو دیکھو کون آیا ہے۔"

پیرو کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی رانی اُٹھ کے اندر چلی گئی۔ پیرو بہت خوش تھا۔ اُس نے وہی داستان تجمل کو سنانی شروع کر دی جو چند دن پہلے سرسری انداز میں مجھ سے بیان کر چکا تھا۔ تجمل اشتیاق اور تعجب سے سنتا رہا۔ "اپن اس کو بالکل دُور رکھا ہے تجمل بھائی! رانی کو پتہ ہے کہ اپن کہاں رہتا ہے پر چھوکری کچھ نہیں جانتا۔ رانی بہت اچھا عورت ہے تجمل بھائی! ایک دم سو نمبر ہے۔ وہ اُس کو سمجھا لیتا ہے۔ کبھی اپن کا بہت جی کرتا ہے کہ بس ایدر ہی رہے، اُودر واپس نہ جائے۔ پر اپن کیا کرے، تم جانتا ہے تجمل بھائی! چاقو سالا ایک بار ہاتھ کو چمٹ جاتا ہے تو پیچھا نہیں چھوڑتا۔" پیرو اُداسی سے بولا۔ وہ بتانے لگا کہ اُسے یہ گھر لوگوں کی نظروں سے دُور رکھنے میں کتنی مشکل پیش آتی ہے اور اُس کی بیوی نے کسی موقع پہ اُس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اُس نے کبھی اپنے ماں باپ کا نام نہیں لیا۔ اُسی وقت دروازے سے چوڑیاں بجیں۔ پیرو ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھا اور اُس نے درمیان ہی میں آنے والی لڑکی کو جھپٹ کے اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ اُس کی پیشانی، سر اور ہاتھ چومنے لگا۔ "مہارانی جی!" وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ "کیسا ہو تم؟"

جب پیرو سامنے سے ہٹا اور اُس کا ہاتھ تھامے ہوئے اسے ہمارے پاس لایا تو میں نے اُسے غور سے دیکھا۔ پیرو نے اُس کے بارے میں جو کچھ مجھ سے کہا تھا، وہ بہت کم تھا۔ اُس کی عمر سولہ سترہ سال سے زیادہ نہیں ہو گی۔ اُس کے گالوں سے خون چھلک رہا تھا۔ وہ اپنی ماں کے رنگ روپ پر گئی تھی۔ وہی قد، وہی نقشہ، وہی سیاہ بال اور بڑی آنکھیں۔ وہ دونوں چھوٹی بڑی بہنیں معلوم ہوتی تھیں۔ "چاچا کو پرنام بولو۔" پیرو نے اُسے حکم دیا۔ لڑکی نے آگے آ کے تجمل کے پیر چھو لیے۔ تجمل نے کھڑے ہو کے اُس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ تجمل کا ہاتھ کپکپا رہا تھا۔ "جیتی رہو۔" وہ بھاری آواز میں بولا۔ "پیرو! تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ میں خالی ہاتھ گھر آ گیا۔" تجمل نے اپنی جیب ٹٹولتے ہوئے ناراضی سے کہا اور جتنے نوٹ اُس کی جیب میں تھے، اُس نے نکال کے لڑکی کے ہاتھ میں تھما دیے۔ لڑکی کو تامل ہوا مگر پیرو نے اُسے ڈپٹ دیا۔ اُس نے دوبارہ تجمل کو پرنام کیا۔ "اور یہ لاڈلا راجا۔" پیرو نے اُسے میری طرف متوجہ کیا۔ "لاڈلا! یہ اپن کی گیتا ہے۔" اُس کے لہجے میں لرزش تھی۔ "یہ اپن کا مہارانی ہے۔ اپن اس کا غلام ہے۔"

"پتا جی!" گیتا ناگواری سے بولی۔ "پھر آپ نے!"

"اوہ۔" پیرو ہنس کے بولا۔ "اپن بھول گیا۔ یہ گیتا اپن کا بیٹی ہے لاڈلا! اپن اس کا باپ ہے، غلام نہیں۔ اپن کا بہت پیارا بیٹی ہے۔"

پیرو نے اُسے اپنے اور تجھل کے درمیان بٹھا لیا۔ "تجھل بھائی! ابھی تمھارا بھتیجی نے گیارہ نمبر درجہ پاس کیا ہے۔ فٹ فٹ ولایتی بولتا ہے۔ اپن کا جان ہے۔" وہ گیتا کو اپنے بازو میں سمیٹتے ہوئے بولا۔

گیتا کا چہرہ لال ہو گیا تھا۔ وہ ڈھیلی موری کا پاجامہ اور کُرتا پہنے ہوئے تھی۔ چُنا ہوا دوپٹا گلے میں پڑا تھا۔ وہ شرمائی شرمائی سی تھی۔

"چاچا تجھل کہاں سے آئے ہیں؟" اُس نے جھجکتے ہوئے ہلکی آواز میں پوچھا۔

"چاچا کلکتے سے آیا ہے بیٹا!" پیرو نے ایسے لہجے میں اُسے جواب دیا جیسے گیتا چھوٹی سی بچی ہو۔ وہ کن انکھیوں سے ہم دونوں کو دیکھنے لگی۔

"تو یہ یہاں کیوں نہیں ٹھہرے؟" وہ شکایتی لہجے میں بولی۔

"کیا بولے بیٹا! چاچا کو جانے کا جلدی ہے۔ اپن نے بہت مغز مارا۔ اب تم بول کے دیکھو۔ چاچا اپنی بھتیجی کی بات نئیں ٹالیں گا۔"

"پھر آئیں گے بیٹا!" تجھل نے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"چاچا کلکتے میں کیا کرتے ہیں؟"

"چاچا" پیرو مسکرانے لگا۔ "چاچا کا اودر بڑا کاروبار ہے۔"

"کیا کاروبار ہے؟" وہ تجسس سے بولی۔

پیرو نے تذبذب سے تجھل کو دیکھا۔ "ابھی تم چاچا سے ملنے کلکتے جائیں گا نا۔ تو دیکھنا۔" پیرو اٹک اٹک کے بولا۔ "یہ بہت سوال کرتا ہے تجھل بھائی!"

"ہاں تم اُدھر آنا تو خود دیکھ لینا۔" تجھل نے سانس بھر کے کہا۔

"تم اُودر جا کے ماں سے بولو کہ جلدی کھانا دیو۔ ایک دم جلدی سمجھا۔" وہ گیتا کے کان مروڑتے ہوئے بولا اور ابھی وہ اٹھی بھی نہیں تھی کہ اُس سے پوچھنے لگا۔ "واپس آ گیا؟"

"آ گئی۔" وہ پیرو کے سامنے سیدھی کھڑی ہو گئی اور چھن چھن ہنسنے لگی۔

"دیکھا تم نے تجھل بھائی! کتنا شریر ہے یہ۔" پیرو نے اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا کے اُس کے چہرے کی طرف کیے اور بھوں کہہ کے اُسے ڈرانے لگا۔ وہ اُچھلتی بھاگتی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔ پیرو تجھل سے اُسی کی باتیں کرنے لگا کہ وہ کتنی ذہین، کتنی شوخ اور کتنی سعادت مند لڑکی ہے۔ تجھل اپنا بھاری سر ہلاتا رہا۔

چند ہی لمحوں میں وہ واپس آ گئی۔ "رانی جی کہتی ہیں ابھی دیر ہے صبر کرو۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔" وہ سامنے کرسی پر جم کے بیٹھ گئی۔

"دیکھا دیکھا تجھل بھائی! کیا کیا بات اس کو پتہ ہے۔" پیرو مچلتے ہوئے بولا۔ "ابھی اتنا چھوٹا عمر میں یہ ایسا بڑی بڑی باتیں بولتا ہے۔"

ایک بوڑھی ملازمہ نے میز پر پھلوں کا شربت اور مٹھائیاں لا کے رکھ دیں۔ گیتا نے گلاس بھرے۔ تجھل کو گلاس دینے کے بعد وہ میرے پاس آئی۔ میں نے نگاہ اُٹھائی تو اُس نے نظریں نیچی کر لیں۔ کو جب مجھ سے جُدا ہوئی تھی، اُس سے خاصی چھوٹی تھی لیکن وہ بہت بڑی معلوم ہوتی تھی اور جب میں اُسے گھر سے لے کے آیا تو ایسا محسوس ہوا تھا جیسے اچانک میری عمر بڑھ گئی ہے۔ پیرو کو گلاس دینے کے بعد وہ اپنی جگہ جا کے بیٹھ گئی مگر اب وہ بار بار میری طرف اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ اُس نے میرے بارے میں پیرو سے کچھ نہیں پوچھا تھا اور نہ پیرو نے میرے نام کے سوا اُسے کچھ بتایا تھا۔ اُس کے پیر تیزی سے حرکت کر رہے تھے اور وہ اپنے دوپٹے کی چُنٹیں کھول رہی تھی۔ پھر پیرو کو خود ہی خیال آ گیا شاید اُس نے محسوس کر لیا کہ گیتا میرے متعلق کچھ جاننا چاہتی ہے۔ وہ دونوں سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ ہم دونوں چُپ بیٹھے تھے۔ "تم راجا سے نئیں ملا۔ یہ راجا ہے۔ راجا تجھل بھائی کا... " وہ جھجکتے ہوئے بولا۔ "تجھل بھائی کا بیٹا ہے۔" "راجا اپن کا تجھل بھائی کے ماتک ایک فس کلاس ہے۔ تم اس سے بات بولو۔ ارے تم دونوں چپ کیوں بیٹھا ہے" وہ ہم دونوں کو ڈانٹنے لگا۔ "بولو۔ بولو راجا! یہ تمھارا گھر ہے۔ ابھی تم گھوم پھر لیتے! راجا کو باغ کا سیر کراؤ۔ راجا! گیتا پھولوں کا عاشق ہے۔ سالا پچھواڑے ایک سے ایک پھول مار رکھا ہے۔ کالا، پیلا، نیلا۔"

"آپ پڑھتے ہیں؟" گیتا نے ہچکچاہٹ سے پوچھا۔ میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"پڑھ چکے ہیں؟" وہ سمٹی ہوئی آواز میں بولی۔

"ہاں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"کہاں تک؟" اُس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"تھوڑا بہت۔"

گیتا میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوئی۔ وہ کچھ اور پوچھنا چاہتی تھی لیکن بات اُس کے ہونٹوں پہ آتے آتے رہ گئی۔ پیرو نے اُسے دوبارہ ٹوکا۔ وہ کسمساتی ہوئی اُٹھی اور اضطراری نظروں سے میری جانب دیکھ کے بولی۔ "آئیے۔" اُس کا لہجہ شرمیلا تھا۔

مجھے اُس کا ساتھ عجیب سا معلوم ہوا۔ میں منع کر دینا چاہتا تھا مگر گیتا کھڑی ہو چکی تھی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ کوٹھی کے پچھلے حصے میں لے آئی۔ یہ چمن تھا۔ پیرو اسے باغ کہہ رہا تھا۔ یہاں ہر طرف ہریالی تھی اور قسم قسم کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ چمن کے ایک کونے میں چھوٹا سا تالاب تھا۔ اُس میں سفید بطیں تیر رہی تھیں۔ گو چمن کا رقبہ زیادہ نہیں تھا مگر پودے بہت سلیقے سے لگائے گئے تھے۔ سارا منظر بہت پیارا تھا۔ فرصت ہو تو آدمی کرسی وہاں کے بیٹھ جائے اور سوچتا رہے۔ گیتا کی پھولوں سے دلچسپی کے بارے میں پیرو نے بالکل سچ کہا تھا۔ مجھے اس کی تعریف میں کچھ کہنا چاہیے تھا لیکن میرے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلا۔ میں چپ چاپ اُس کے ساتھ گھومتا رہا۔ "آئیے یہاں بیٹھ جائیے۔" اُس نے پتھر کی ایک بینچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے اُس کی ہدایت پر عمل کیا۔ وہ بھی میرے قریب بیٹھ گئی۔ "آپ کلکتے میں رہتے ہیں؟" اچانک اُس نے پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے بے سوچے سمجھے جواب دیا۔

"پھر... پھر آپ کہاں رہتے ہیں؟"

"میں بس ایسے ہی شہروں شہروں گھومتا رہتا ہوں۔"

"اچھا۔" وہ تذبذب سے بولی۔ "آپ کا کام ہی ایسا ہو گا؟"

"ہاں، کچھ ایسا ہی ہے۔"

"آپ کو پھولوں سے شوق نہیں ہے؟" کچھ توقف کے بعد اُس نے پوچھا۔

"ہے۔" میں نے اداسی سے کہا۔

"مجھے تو بہت ہی شوق ہے۔" وہ شوخی سے بولی۔ "آپ کو چمن پسند آیا؟"

"بہت اچھا ہے۔"

"آپ ایک مہینے پہلے آتے تو دیکھتے، پتے نظر نہیں آتے تھے؟"

"جی۔" میں نے ہنکاری بھری۔

اُس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ "آپ... آپ کی طبیعت کیا خراب ہے؟"

"کیوں؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"کیا آپ ہمیشہ اتنا ہی بولتے ہیں؟"

"جی۔ !" میں نے گھبرا کے کہا۔ "کیا میں نے آپ کی کسی بات کا جواب نہیں دیا؟"

"دیا تو مگر... مگر آپ نے اپنی طرف سے کوئی بھی بات نہیں کی۔" وہ تیزی سے بولی۔ "کیا آپ پتاجی اور تجھل چاچا سے بھی بس اتنی ہی باتیں کرتے ہیں؟"

"مجھے زیادہ بولنا نہیں آتا۔" میں نے یوں ہی کہہ دیا۔

"پھر آپ کو کیا آتا ہے؟" وہ چمک کے بولی۔

"زیادہ سننا۔"

"میں بھی یہی کوشش کرتی ہوں مگر میری زبان نہیں رکتی۔ ہماری مس دُرگا کہتی ہیں کہ کم بولنا، کم کھانا دونوں تن درستی کے لیے ضروری ہیں۔ آپ کی مس سچ کہتی ہیں لیکن وہ ایک بات کہنا شاید بھول گئیں۔ کم سوچنا بھی تن درستی کے لیے مفید ہوتا ہے۔"

"اچھا!" وہ تعجب سے بولی۔ "میں اُن سے پوچھوں گی کہ ہمیں یہ کیوں نہیں بتایا۔ کیا آپ سوچتے بھی کم ہیں؟"

"نہیں۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"پھر بھی آپ کی... آپ کی صحت بہت اچھی ہے۔"

"اور آپ کی بھی بہت اچھی ہے۔"

اُس کے لبوں پر مسکراہٹ چھلک پڑی۔ "تب مجھے اپنے بارے میں کچھ بتائیے۔"

"کیا بتاؤں؟"

"کچھ بھی، یہی کہ آپ کے بہن بھائی کتنے ہیں؟"

"اب تو کوئی بھی نہیں ہے۔" میری آواز گلے میں پھنس گئی۔

"اب تو سے کیا مطلب؟ یعنی..." وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"ہاں، اب کوئی بھی نہیں ہے۔"

"تو آپ چاچا کے اکیلے بیٹے ہیں؟"

"ہوں۔" میں نے سر ہلایا۔

"اور کوئی بھی نہیں ہے؟"

"نہیں، کوئی بھی نہیں ہے۔"

"آپ کی ماتا جی!"

"وہ بھی نہیں ہیں۔"

اُس کی پلکیں پھڑکنے لگیں۔ "پھر تو آپ بہت تنہائی محسوس کرتے ہوں گے؟"

"ہاں۔" میں نے تندی سے کہا۔ "چلیے اندر چلیں۔"

"چلیے۔" وہ افسردگی سے بولی۔ ہم اُٹھ ہی رہے تھے کہ ملازم نے کھانا تیار ہونے کی اطلاع دی۔ کھانے کا کمرہ دوسرا تھا۔ ایک بڑی میز کے اطراف کرسیاں رکھی ہوئی تھیں مگر تجھل اور پیرو تخت پہ بیٹھے ہوئے تھے۔ دو ملازم موجود تھے اور اندر سے سامان لا کے تخت پر رکھ رہے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی پیرو چلانے لگا۔ اُس نے اپنے ایک طرف گیتا کو اور دوسری طرف مجھے بٹھایا اور مجھ سے چمن کا حال پوچھنے لگا۔ مجھے ایسا لگا جیسے پیرو چمن کے بارے میں کم اور گیتا کے بارے میں زیادہ پوچھ رہا ہے اور مجھے جتا رہا ہے کہ اُس نے کوئی غلط بات تو نہیں کہی تھی۔ گیتا بھی چمن کی طرح خوب صورت تھی۔ میرے دل میں آیا، سچی بات بتا دوں کہ چمن اور گیتا دونوں مجھے اچھے لگے۔ تاہم میں نے لفظ سنبھل سنبھل کے ادا کیے۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اب لوگوں سے کم بات کیا کروں گا اور دوسروں کے معاملات میں بالکل دخل نہیں دوں گا۔ میرے اختصار کے باوجود پیرو بہت خوش ہوا۔

گیتا کی ماں رانی کے آنے کے بعد ہم نے کھانا شروع کر دیا۔ اقسام زیادہ نہیں تھیں لیکن کھانا لذیذ بے حد تھا۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ یہ سب کچھ اتنے کم وقت میں تیار ہو گیا تھا۔ "یہ تو کچھ کھا ہی نہیں رہے ہیں۔" گیتا کی ماں نے پیرو سے میری شکایت کی۔

"ہا، راجا مہمان بنا ہے تجھل بھائی!" پیرو میرے کولہے پر زور سے کہنی مارتے ہوئے بولا۔ "کھا راجا! خوب کھا۔" رانی نے بھنے ہوئے مرغ کا ڈونگا میرے آگے کر دیا۔ پیرو نے میری پلیٹ میں مسلم مرغ لوٹ دیا اور

گیتا نے چٹنی بکھیر دی۔ کھانے کے دوران میں پیرو ہی زیادہ باتیں کرتا رہا۔ گیتا نے ایک بار پھر جگل سے کہا کہ وہ چند دن کے لیے یہاں ٹھہر جائے۔ مجھے ڈر لگا کہ کہیں جگل آمادہ نہ ہو جائے لیکن اُس نے گیتا سے معذرت کر لی۔ رانی اپنی تھمی ہوئی، جمی ہوئی آواز میں بار بار مجھے ٹوکتی تھی۔ جب بھی میں نے سر اٹھایا، اُسے اپنی جانب دیکھتے ہوئے پایا۔ وہ بھی پیرو کے مانند بہت خوش تھی جیسے ہم اُس کے رشتے دار ہوں اور بہت دن بعد اُس کے ہاں آئے ہوں۔ جو تھوڑی بہت اجنبیت باقی تھی، وہ کھانے کے دوران میں ختم ہو گئی۔ چلتے وقت رانی نے مجھے ایک سو ایک روپے دیے۔ ہم پانچ بجے کے قریب وہاں سے رخصت ہوئے۔ وہ دونوں دروازے تک ہمیں پہنچانے آئیں اور اصرار کرنے لگیں کہ جانے سے پہلے ہم ایک بار اُن کے گھر آئیں۔ گیتا نے مجھ سے کہا کہ اگر میں کسی دن شام کو آ جاؤں تو وہ مجھے اپنی موٹر میں بمبئی کی سیر کرائے گی۔ میں نے ڈھل مل یقین وعدہ کر لیا۔ پیرو نے جنرل اسٹور کے گیراج میں گاڑی کھڑی کی اور اُسی طرح باڑے واپس آ گیا جس طرح گیا تھا۔ وہاں پہنچ کے پتہ چلا کہ پولیس افسران کی ایک جماعت پیرو سے بات کرنے کے لیے آئی تھی، اُس کے آدمیوں نے کہہ دیا کہ پیرو شام کو مل سکتا ہے۔ پولیس کے ذکر سے میرے کان کھڑے ہوئے۔ علاقے میں بھی ابھی تک پولیس کا زور کم نہیں ہوا تھا۔ پیرو ایک دن گزار کے واپس آ چکا تھا لیکن اُس کی واپسی اُس کے بری الذمہ ہونے کی دلیل نہیں تھی۔ پولیس کا پھر اس طرف آنا بے مقصد نہیں ہو گا۔ انھوں نے متعدد مرتبہ باڑے کی تلاشی لی تھی اور مختلف لوگوں کو گرفتار کیا تھا لیکن نہ باڑے سے انھیں کچھ حاصل ہوا، نہ گرفتار ہونے والوں نے کچھ بتایا۔ شاید تیواڑی کے کسی خاص آدمی نے انھیں پھر پیرو کو ٹٹولنے پر اکسایا ہو گا یا کوئی اور بات ہو گی۔ ادھر جگل اور جامو واپسی کے ارادے باندھ رہے تھے۔

وہ واپسی کا ارادہ اُسی وقت کر سکتے تھے جب پیرو کو مکمل طور پر محفوظ سمجھتے ہوں۔ جانا اتنا آسان نہیں تھا۔ اتنی بڑی واردات کے بعد پولیس یوں چُپ نہیں بیٹھ جائے گی۔ اُوپر سے دباؤ پڑ رہا ہو گا۔ اطلاع سن کے پیرو کے چہرے پر برہمی چھا گئی لیکن وہ محض کچھ دیر قائم رہی۔ پھر پیرو باڑے کے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ شام کا وقت تھا۔ ہر طرف سے آدمی آ رہے تھے۔ باڑے میں اچھا خاصا ہجوم تھا۔ رات کو باڑے کے آدمیوں نے باورچی بلا کے باڑے ہی میں کھانے کا انتظام کیا تھا۔ کھانے کے بعد ناچ گانے کے لیے ایک طوائف بھی بلائی گئی تھی اور نقلیں اُتارنے والا ایک مسخرا بھی۔ اُس نے نقلیں اُتارنی شروع ہی کی تھیں کہ پولیس کے آنے کی اطلاع ملی۔ جگل نے مجھے اشارہ کیا۔ پولیس ابھی باڑے سے دُور تھی۔ میں وہاں سے پہلے ہی نکل آیا اور پیدل چل دیا۔ سڑکوں پر آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ میں چلتا رہا۔ پھر اچانک ایک جگہ اندھیرے میں ایک سپاہی نے میرا راستہ روک لیا۔

"کہاں جا رہا ہے؟" اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کے تلخی سے پوچھا۔

"گھر۔" میں نے بیزاری سے جواب دیا۔ وہ پوچھنے لگا کہ گھر کدھر ہے؟ میں نے اُسے پتہ بتا دیا لیکن دوسرے ہی لمحے اُس نے میری جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ جیب میں چاقو موجود تھا۔ میں نے اُس کا پنجہ پکڑ لیا۔ "جیب سے ہاتھ نکالو۔" میں نے غصے سے کہا۔

"چاقو۔" وہ طنز سے بولا۔ "اور نوٹ بھی؟ کدھر سے آ رہا ہے؟"

وہ اپنا پنجہ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے حقارت سے بولا۔

"میں نے چوری نہیں کی ہے۔ یہ روپے میرے ہیں۔" میں نے ترشی سے کہا۔

"تیرے ہیں، تیرے باپ کے ہیں۔ تھانے چل۔" وہ تحکمانہ لہجے میں بولا۔ "چل۔" وہ مجھے دھکا دینے لگا۔ ایک دفعہ مراد آباد میں بھی اسی طرح ایک سپاہی نے مجھے پکڑ لیا تھا اور ایک بیوہ عورت ارجمند بیگم نے مجھے اپنے گھر میں پناہ دی تھی۔ سپاہی سمجھ گیا کہ میرا ارادہ آسانی سے اُس کے ساتھ جانے کا نہیں ہے۔ اُس نے فوراً سیٹی بجا دی۔ اُس کے جواب میں دُور سے سیٹیاں گونجیں اور گرد و پیش میں سیٹیاں ہی سیٹیاں بجنے لگیں۔ ساتھ ہی کتے بھونکنے لگے۔ اُس وقت مجھے احساس ہوا کہ مجھے سپاہی سے نرم لہجے میں بات کرنی چاہیے تھی۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اُس کے منہ سے سیٹی چھین لی۔ "تم شور کیوں مچا رہے ہو؟"

"سیٹی واپس کر۔" وہ چیختے ہوئے بولا اور میرے ہاتھ سے سیٹی چھیننے کے لیے اُچھلنے کودنے لگا۔ "تُو اکیلے میرے ساتھ نہیں جائے گا۔"

"میں نے تمھارا بگاڑا کیا ہے بھائی! میں اپنے گھر واپس جا رہا ہوں۔ کیا تم نے مجھے کوئی جرم کرتے ہوئے پکڑا ہے؟ مجھے جانے دو۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"ابھی تم نے ایک پولیس مین کی ڈیوٹی میں دخل دیا۔ اُس سے سیٹی چھینا اور اُس کے ساتھ اکڑ کے بات کیا۔ زیر دفعہ ۳۳۲ دست اندازی پولیس میں چھ مہینے کاٹے گا تو پتہ چل جائے گا کہ تُو نے کیا جرم کیا ہے۔"

سیٹیاں قریب ہو رہی تھیں۔ یہ سیٹیاں سن کے میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا تھا۔ ایسی ہی سیٹیاں اُس وقت بجی تھیں جب کرا کو بدمعاش لیے جا رہے تھے۔ ان سیٹیوں سے میرا دل ہولنے لگا تھا۔ دوسرے سپاہی اپنے ساتھی کو ڈھونڈ رہے تھے۔ میں چند لمحے سوچتا رہا۔ مجھے دوسروں کے آنے سے پہلے بھاگ جانا چاہیے تھا ورنہ وہ جلد ہی مجھ تک پہنچ جاتے اور مجھے دھکے دیتے ہوئے تھانے لے جاتے۔ تھانے جانے میں کوئی بات نہیں تھی۔ میں انھیں بتا سکتا تھا کہ میرا نام راجا ہے۔ تھوڑی سی تصدیق کر کے وہ مجھے چھوڑ دیتے۔ یہ بات میں سپاہی کو بھی بتا سکتا تھا مگر ان حالات میں سپاہی کو یا تھانے جا کے اپنا نام پتہ بتانے سے اور الجھنیں پیدا ہو سکتی تھیں اور اگر میں اپنا نام صحیح نہ بتاتا تو وہ چاقو کی موجودگی سے شک میں پڑ جاتے اور صبح ہونے سے پہلے مجھے ہرگز نہ چھوڑتے۔ جیب میں جتنی بھی رقم تھی، وہ میں نے سپاہی کو دینے کا خیال کیا لیکن اگر سپاہی رقم لینے سے انکار کر دیتا تو بات اور بگڑ سکتی تھی۔ دوسرے سپاہی کسی لمحے بھی یہاں پہنچنے والے تھے۔ میں نے اپنے سامنے، دائیں بائیں دیکھا۔ سیٹیاں تیز ہو گئی تھیں۔ میں نے اپنے ہاتھ میں دبی ہوئی سیٹی زمین پر دُور پھینک دی۔ سپاہی بوکھلا کے اُسے حاصل کرنے کے لیے دوڑا۔ اُس نے میری جیب چھوڑ دی۔ میرے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے تھے۔ جیسے ہی وہ جھکا، میں نے جھپٹ کے ایک ہاتھ سے اُس کا منہ بند کیا اور کسی تاخیر کے بغیر دوسرے ہاتھ سے اُس کی گردن پر ضرب لگائی۔

سپاہی کی ایک ہلکی کراہ بلند ہوئی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ میں اُسے دکان کے تختے پر ڈال کے آہستگی سے رینگتا ہوا ایک تنگ گلی میں داخل ہو گیا۔ گلی میں تعفن پھیلا ہوا تھا۔ شاید یہاں لوگ کوڑا کرکٹ ڈالتے تھے۔ بارش کا پانی گڑھوں میں جمع تھا۔ میرے پاؤں کوڑے کیچڑ میں دھنستے رہے لیکن میں مین روڈ پر آنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہاں مجھے ایک ٹیکسی مل گئی۔ ٹیکسی ڈرائیور سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لے کے مجھے بٹھانے پر تیار ہو گیا۔ میں نے اُسے دوگنے پیسوں کی پیش کش کی تھی۔ میں نے غور نہیں کیا کہ وہ کس طرف جا رہا ہے کیونکہ جس جگہ سے ٹیکسی چلی تھی، وہ میری دیکھی ہوئی نہیں تھی۔ ڈرائیور کی نیت خراب ہو گئی۔ اُس نے ایک سنسان جگہ گاڑی روک لی۔ میں سمجھا، گاڑی خراب ہو گئی ہے لیکن اُس کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا اور وہ مجھ سے جیب کی ساری رقم نکالنے کا مطالبہ کر رہا تھا۔ میں نے اُس سے وعدہ کیا کہ میں اُسے سارے پیسے دے دوں گا، پہلے وہ مجھے میری منزل پر تو پہنچا دے۔ اُس نے چاقو میرے سینے پر رکھ دیا۔ میں نے اُس سے دوبارہ کہا کہ وہ میری بات کا یقین کر لے۔ اُسے کچھ خیال آ گیا مگر اُس نے یہ شرط رکھی کہ میں پہلے سارے پیسے اُس کے حوالے کر دوں۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کے تمام روپے اُسے تھما دیے۔ روپے ہاتھ میں آ جانے کے بعد وہ مجھے ٹیکسی سے فوراً اُترنے کا حکم دینے لگا۔ مجھے غصہ بھی آیا اور حیرت بھی ہوئی۔ "چلو، اُترو اور بھاگ جاؤ۔" اُس نے چاقو میری گردن کے گرد لہراتے ہوئے سختی سے کہا۔ میں نے اُس کے چاقو والے ہاتھ پر سکون سے ہاتھ رکھ دیا۔ وہ ایک دم اُچھل گیا۔ اُسے میری جانب سے اس برتاؤ کی توقع نہیں تھی۔ اُس کے ہاتھ بہکنے کے وقفے میں، میں نے دوسرے ہاتھ سے اُس کی کلائی پکڑ لی۔ اُس نے زور کیا۔ میں اُس کا ہاتھ اُس کے سینے تک لے گیا۔ میرے انگوٹھے کے ناخن سے اُس کی نس دبی ہوئی تھی جس سے اُس کے ہاتھ کی طاقت آدھی رہ گئی تھی۔ وہ چاقو سنبھالنا نہیں جانتا تھا۔ اُس نے گھبرا کے چاقو چھوڑ دیا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے چاقو اٹھا کے اُسے بند کر دیا۔

"چلو۔" اپنی نشست سے کمر ٹکاتے ہوئے میں نے کہا۔

"دادا! اپن کو معاف کر دو۔" وہ التجا کرنے لگا۔

"سیدھی طرح چلو۔" میں نے اُسے چاقو واپس کر دیا۔

ڈرائیور نے راستے میں کئی دفعہ مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی مگر میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس نے اپنا منہ بند کر لیا۔

گھر سے خاصے فاصلے پر میں ٹیکسی سے اُتر گیا۔ ڈرائیور نے باہر آ کے میری پنڈلیاں چھوئیں اور تمام روپے واپس کر دیے۔ میں نے اُسے مقررہ کرایہ دینا چاہا۔ اُس نے وہ بھی لینے سے انکار کر دیا۔ "نئیں دادا! اپن کے لیے ایک ڈبل حرام ہے۔"

میں نے اُس سے زیادہ ضد نہیں کی۔ گلیوں میں چوکی داروں کی آوازیں اور لاٹھیوں کی بازگشت گونج رہی تھی۔ ابھی گھر دُور تھا اور پھر کوئی بھی درمیان میں آ سکتا تھا۔ کیا پتہ کون کس وقت کس ارادے سے سامنے آ جائے۔ میں چاروں طرف دیکھ دیکھ کے محتاط انداز میں قدم بڑھاتا ہوا گھر سے قریب ہوتا رہا۔ یہ احتیاط بے کار تھی، جب تک دوسرے بھی احتیاط نہ برتیں۔ دوسرے خود رخنہ ڈال دیتے ہیں۔ اپنے طور پر طے کی ہوئی ہر بات ادھوری ہے جب تک دوسرے اُس کا ساتھ نہ دیں۔ رہنے کے لیے کوئی اور دنیا تو ہے نہیں۔ اگر میں خاموش رہتا تو گھر پہنچنے کے بجائے اس وقت کہیں اور ہوتا۔ اپنے گھر واپس آنے والے اشخاص کو نہ جانے کتنی مشکلوں سے گزرنا پڑتا ہو گا، راستے میں طرح طرح کے لوگ ملتے ہوں گے، اُن لوگوں سے بچ کے گھر پہنچنا بہت مشکل کام ہے۔ ہر شخص اپنے پاس چاقو تو نہیں رکھ سکتا۔ میرا جی متلا رہا تھا۔ ہر آدمی کو اُس سے خار ہے۔ کوئی نہیں چاہتا کہ میں اُس کے پاس پہنچ سکوں۔ جگلین نے دروازہ کھولا۔ میں سیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا اور فرش پر چادر بچھا کے لیٹ گیا۔ میرے کانوں میں سیٹیاں بجتی رہیں اور آنکھوں سے پانی بہتا رہا۔

دوسرے دن اسپیشل پولیس نے شہر کے مختلف باڑوں پر اچانک چھاپے مارے، تلاشی لی اور بہت سے آدمی پکڑ لیے۔ انھوں نے باڑوں کے کئی داداؤں کو بھی گرفتار کر لیا۔ پیرو کے باڑے سے انھیں کچھ دستیاب نہیں ہوا۔ البتہ دوسری جگہوں سے انھیں منشیات، مسروقہ مال اور ہتھیاروں کا انبار ملا۔ ہر جگہ سے کئی سو آدمیوں کو بیک وقت پکڑا گیا تھا۔ ان میں سے بعض آدمی ایسے بھی تھے جنھیں پہلے گرفتار کر کے چھوڑ دیا گیا تھا۔ جھنگا اور بالم خاں کے باڑے بھی خالی گئے۔ اس مرتبہ پولیس نے نام بنام بہت سے لوگوں کو طلب کیا تھا۔ زیادہ تر زخمی واپس آ چکے تھے۔ ماروتی بھی دو ایک دن میں آنے والا تھا۔ فہرست میں اُس کا نام نہیں تھا لیکن وہ ایسے نام فہرست میں شامل تھے جو ابھی تک خفیہ جگہوں پر اپنے زخم سکھا رہے تھے، اُن کی واپسی میں ابھی دیر تھی۔ پیرو نے اُن کے بارے میں لاعلمی ظاہر کی

کہ وہ گزشتہ دو روز سے غائب ہیں، شاید اپنے گاؤں چلے گئے ہوں، آئیں گے تو انھیں تھانے بھیج دیا جائے گا۔ اتنے آدمیوں میں سے دو کا موقع پر نہ ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ کئی اور زخمی بھی تھے جن کا نام اُن کی فہرست میں شامل نہیں تھا۔ یہ ضروری بھی نہیں تھا کہ ہر آدمی روزانہ باڑے میں آ کے حاضری دے ویسے تجمل نے ایسے لوگ منتخب کیے تھے جن کے گھر دور نہیں تھے اور جو باڑوں میں مستقل طور پر یا اِدھر اُدھر پڑے رہتے تھے۔ جن لوگوں کے گھر بار تھے، انھیں واردات کی رات تیواڑی کے اڈے کے آس پاس متعین کیا گیا تھا تاکہ وہ کاری زخم لگنے سے محفوظ رہ سکیں۔ باڑے سے متعلق لوگوں کا زخمی ہونا عام بات تھی۔ پولیس انھیں پکڑ بھی لیتی تو یہ پتہ چلانا مشکل تھا کہ وہ کہاں زخمی ہوئے ہیں اور انھیں کس نے زخمی کیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ اپنے ہی باڑوں کے کسی آدمی کا نام لے سکتے تھے۔ جامو اور کانتے بھی اب باہر نکل سکتے تھے۔ اُن کی روپوشی محض احتیاطاً تھی۔

اخبارات پولیس کی ناکامی پر بہت جز بز تھے۔ ان تازہ گرفتاریوں کے بعد خبروں میں پھر سے سرگرمی نظر آنے لگی۔ اب کے پیرو نے اپنے باڑوں سے گرفتار ہونے والوں کی ضمانت کا انتظام کرنے میں عجلت نہیں کی۔ دو دن سخت پوچھ گچھ کر کے پولیس نے بیشتر آدمیوں کو خود چھوڑ دیا۔ اُن پر خاصا تشدد کیا گیا تھا مگر کسی نے اقرار نہیں کیا۔ پولیس کی بے یقینی اور تذبذب کی کیفیت اس بات سے عیاں تھی کہ اُس نے باڑوں پر چھاپے مارنے میں کوئی تخصیص نہیں برتی تھی۔ تیواڑی کے ماتحت باڑوں پر بھی اسی طرح اچانک چھاپے مارے گئے تھے۔ ماچی نے مجھے بہت سی باتیں بتائیں لیکن تیواڑی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا کہ اُسے تجمل اور پیرو نے کہاں چھپایا ہوا ہے، وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ ظاہر ہے، ایسے حالات میں انھوں نے اُسے اور اُس کے ساتھیوں کو زندہ نہیں رکھا ہوگا۔ اُن کی لاشیں کہیں کسی پختہ فرش کے نیچے دبا دی گئی ہوں گی یا انھوں نے تیواڑی کو چھوڑ دیا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تیواڑی میں کچھ غیرت باقی تھی، وہ اپنی کٹی ہوئی ناک لے کے اپنے لوگوں یا پولیس کے پاس نہیں جا سکا۔ میں نے بہت کرید کی مگر کسی نے مجھے اُس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

اخبارات تیواڑی کی بازیابی پر مسلسل زور دے رہے تھے۔ تجمل نے مجھے تاکید کر دی تھی کہ میں اب رات کو بھی باڑے نہ آؤں۔ گھر میں روز جا رہا۔ گھر میں ہر وقت جولین تھی۔ اُس کا چہرہ اب دیکھا نہیں جاتا تھا۔ برسوں کی بیمار معلوم ہوتی تھی۔ دن بھر میں بھی اپنے کمرے میں بند رہتا تھا۔ اُس دن کے بعد سے نہ اُس نے مجھ سے کوئی بات کی تھی نہ میں نے اُس سے بات چیت بند بھی نہیں تھی۔ وہ مجھے کھانے کے لیے بلاتی، میں چلا جاتا۔ وہ مجھے چائے دے جاتی، میں لے لیتا۔ جامو اور کانتے دن میں کئی بار ڈرائنگ روم میں جا کے بیٹھتے تھے۔ وہ مجھے بھی بلاتے تھے مگر میں کوئی نہ کوئی عذر کر کے انھیں ٹال دیتا تھا۔ جولین نے اُن کی خاطر داری میں کوئی کمی نہیں کی تھی۔ کانتے اُسے ہنسانے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ مسکراتی تھی لیکن کانتے اُس کی مسکراہٹ دیکھ کے خود اداس ہو جاتا تھا۔

گرفتاریوں کا چوتھا دن تھا۔ میں باڑے پہنچا تو اُس دن سرگرمی کچھ زیادہ نظر آئی۔ معلوم ہوا کہ پیرو نے آج تمام باڑوں کا انتظام اُسی انداز میں کر دیا ہے جو کچھ دن پہلے ایک رات اُن سب کے درمیان طے پایا تھا۔ چھنگا والا باڑا مستقل طور پر زورا کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ چھیدا کو پیرو نے اپنے پاس رکھنے کا اعلان کیا تھا اور بالم خاں کا باڑا ماسٹر مارتی کو دے دیا گیا تھا۔ پیرو نے اپنے باڑوں پر بھی مختلف آدمی بٹھا دیے تھے اور اگرچہ ابھی تیواڑی کے باڑے اُس کے قبضے میں نہیں آئے تھے لیکن انھیں سنبھالنے والے آدمیوں کی نامزدگی کی جا چکی تھی۔

اُس رات تجمل میرے ساتھ گھر واپس آ گیا۔ جولین اُسے دیکھ کے بوکھلا سی گئی۔ تجمل نے آتے ہی اُس کی خیریت دریافت کی اور پوچھا کہ اُس کا رنگ اُڑا اُڑا کیوں ہے؟ جولین کچھ جواب نہیں دے سکی۔ واردات کے بعد تجمل پہلی بار گھر آیا تھا۔ سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ تجمل کو جانے کی جلدی بھی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ چائے کے بعد اُس نے بتایا کہ پرسوں اُس کی روانگی ہے۔ میرے کانوں میں سن سناہٹ ہونے لگی۔ میں نے بے یقینی سے اُس کی طرف دیکھا۔ تجمل کی نظریں جولین پر ٹکی ہوئی تھیں۔ جولین سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ چمپا اور جولین کی ماں ایک دوسرے کے چہرے دیکھ رہی تھیں۔ تجمل نے جولین کو آواز دی۔ وہ چونک پڑی۔ تجمل نے اُسے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ جامو اور کانتے پرے ہٹ گئے۔ جولین ڈگمگاتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھی اور تجمل کے پاس جا کے چپ بیٹھ گئی۔ "جولی بیٹا! ہم جا رہے ہیں۔" تجمل نے آہستگی سے کہا۔ جولین کے بدن میں جنبش نہیں ہوئی۔ "میں لاڈلے کو بھی اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں۔ لاڈلے کو آگے بہت سے کام ہیں۔ شاید تم کچھ جانتی بھی ہو۔ مجھے پتہ ہے کہ تم اکیلی ہو جاؤ گی لیکن اگر میں لاڈلے کو چھوڑ کے بھی چلا گیا تو یہ یہاں نہیں رہے گا۔ ہم تم کو اپنے ساتھ لے چلتے پر وہ جگہ تمھارے رہنے کی نہیں ہے اور ہمارا بھی کوئی بھروسا نہیں ہے کہ ہم آج کہاں ہوں، کل کہاں۔ ہمت کر کے تم کو ادھر ہی رہنا ہے۔"

"نہیں استاد!" کانتے نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ "جولی بہن ہمارے ساتھ جائے گی۔ تمھاری ذمے داری پر نہیں، میری ذمے داری پر۔ میں اسے کلکتے لے جاؤں گا اور جو کچھ مجھ سے ہو سکا، وہ اس کے لیے کروں گا۔"

"چپ رہ۔" تجمل نے تلخی سے کہا۔ "اپنا آپ سنبھالا نہیں جاتا، جوان بہن کو سنبھالے گا۔ کتنے دن سنبھالے گا نقشین! پہلے یہ بیل بوٹے مٹا لے جو تو نے کھال پر جگہ جگہ لگائے ہیں۔ بہن کو رسوا کرے گا؟"

"استاد!" کانتے بگڑ کے بولا۔ "اس بیچ تم چپ رہو تو بہتر ہے۔"

"منہ نہ کھلوا کانتے!" تجمل نے گرج کے کہا۔ "بہن کے سامنے گالی..."

"میں یہیں رہوں گی بابا!" جولین اکھڑی ہوئی آواز میں بولی۔

"یہیں رہنے میں تیرا سکھ ہے جولی بٹیا!" تجمل نے اپنا لہجہ نرم کرنے کی کوشش کی۔ "جو تیرے لیے بہتر ہے، وہی میں بول رہا ہوں۔"

"جولی بہن اگر ہمارے ساتھ جانا چاہے تو ہمیں منع نہیں کرنا چاہیے تجمل بھائی!" جامو ترشی سے بولا۔ "ہم اسے کوئی تکلیف نہیں ہونے دیں گے۔ کیا ہم ایک عورت اور ایک لڑکی کا بار نہیں اٹھا سکتے؟"

"جامو!" تجمل نے ناگواری سے کہا۔ "تو بھی ایسی لونڈوں کی سی باتیں کر رہا ہے۔ کیا جولی کوئی لاچار لڑکی ہے۔ اس نے موٹی موٹی کتابیں پڑھی ہیں رے! یہ کتابیں اسی لیے لکھی جاتی ہیں کہ آدمی اکیلا نہ رہے۔ کتابوں کی دھار چاقو کی دھار سے تیز ہوتی ہے۔ سالا روز یہ منوں ٹنوں کاغذ کیا یوں ہی ردی کیا جاتا ہے۔ جولی اپنا اچھا بُرا تجھ سے بہتر جانتی ہے۔ چلو! ابھی جولی کی ماں موجود ہے۔ سب کے باپ زندہ نہیں ہوتے، اور تو... تو اور کانتے کیا اپنی بابت کچھ بول سکتے ہیں۔ رہنے دے جامو! بس کر، زرّیں بٹیا کا حال نہیں دیکھا۔ جولی تُو نے دلا دی اور چیزیں بھی تو دلا دے۔ جامو استاد! اَن کہی اَن کہی رہنے دے۔"

"آپ لوگ کیوں ایک دوسرے سے ناراض ہو رہے ہیں۔ میں نے کہہ دیا ہے، میں یہیں رہوں گی۔ میں اور میری ماں۔ اگر ظہیر نہ ملتا تو کیا ہم لوگ نہ رہتے۔" جولین نے سسکتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہم جولی کو زرّیں بہن کے پاس ٹھیرا سکتے ہیں۔ وہ بھی اکیلی ہے اور وہ بھی بہت اچھی ہے۔ جولی کو دیکھ کے خوش ہوگی۔" کانتے بولا۔

"ہاں ضرور خوش ہوگی۔ تم لوگ اگر جولی کے بجائے زہر لے جاؤ گے تو بھی وہ خوش ہوگی۔ پر کانتے! کیا ہم زرّیں بٹیا کو خوش کر سکے؟" تجمل کا لہجہ بوجھل تھا۔ "بس زیادہ مت بول۔"

"پر استاد! جولی بہن..."

"جولی یہیں رہے گی کانتے!" تجمل نے بلند آواز میں کہا۔ کانتے اپنے کان نوچنے لگا۔ "جولی یہیں رہے گی کانتے! اور عزت سے رہے گی۔ جولی! اگر تم کو کسی بات کی ضرورت ہو تو ہم کو بولو۔ پر جو اپنے ہاتھ میں نہیں ہے، وہ ہم تم کو نہیں دے سکتے۔ تم سمجھتی ہوگی کہ میں کیا کہہ رہا ہوں جولی! جب بھی تم جامو کو کانتے کو یا مجھ کو کسی کام کے لیے بولو گی، ہم تیسرے دن ادھر آ جائیں گے۔ بس ہم اتنا ہی بول سکتے ہیں۔"

"بابا! آپ کا بہت شکریہ۔" جولین رُندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"نہیں جولی! ایسی بول کے ہم کو چھوٹا مت کرو۔ ہم ویسے ہی بہت چھوٹے ہیں۔ تم اپنے بھروسے پر کلکتے آنا چاہتی ہو تو آ جاؤ یا جہاں تم بولو، پر جولی! جگہ بدلنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ آدمی کوشش کرے تو جدھر چاہے اُدھر اپنی جگہ بنا لیتا ہے۔ دُنیا میں آدمیوں کی کمائی نہیں۔ نظر سنبھال کے ڈالی جائے تو مرضی کے آدمی مل جاتے ہیں۔"

"میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا۔" جولین سراسیمگی سے بولی۔

"جولی ہیرا ہے استاد!" کانتے نے بپھر کے کہا۔

"پر تو جوہری نہیں ہے، تیرے ہاتھ میلے ہیں۔ باتیں مت بنا۔"

"میں اس کے لیے اپنے ہاتھ صاف کر لوں گا۔" کانتے غصے سے بولا۔

"ساری دُنیا کا صابن خرچ ہو جائے گا کانتے! کر لے۔ اگر تو یہ کر سکتا ہے تو کر لے۔ تو اس ہیرے کو ساری عمر ڈبیا میں بند کر کے رکھنا۔"

"کانتے بھائی! آپ بابا کے ساتھ جائیں۔" جولین نے اپنی آنکھیں چھپا لیں۔ "میں یہاں بالکل خوش رہوں گی۔ بہت آرام سے رہوں گی۔"

کانتے نے کچھ اور کہنا چاہا مگر جامو نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اُسے تحمل کی تلقین کی۔ "چمپا بائی!" تجمل نے چمپا کو مخاطب کیا۔ اُس کی آواز بگڑی ہوئی تھی۔ چمپا سیدھی ہو کے بیٹھ گئی۔ "تم نے کیا سوچا ہے؟"

"میں... میں کیا سوچوں۔" وہ ہکلاتی ہوئی بولی۔

"چمپا بائی!" تجمل نے مدھم لہجے میں کہا۔ "تمھیں بھی کچھ سوچنا تو ہوگا۔ تم چاہو تو یہیں جولی کے پاس رہ سکتی ہو یا چاہو تو ہمارے ساتھ چل سکتی ہو۔"

"میں تو ظہیر میاں کی وجہ سے بمبئی آئی تھی اور اسی کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔" چمپا جھجکتی ہوئی بولی۔

"مگر تم میرے پاس کیسے رہو گی؟ میں تمھیں کہاں رکھوں گا؟" میں نے وحشت سے کہا۔ "مجھے تو خود بہت دور..."

تجمل نے میری بات کاٹ دی۔ "چمپا بائی! لاڈلے ابھی کسی ایک جگہ نہیں رہے گا۔ جب کبھی اس کا گھر ہو جائے، تم اس کے پاس چلی آنا۔ میں لاڈلے کو تمھاری طرف سے بول لوں گا۔ ابھی تم اپنے آپ کے بارے میں فکر مت کرو۔ جیسا تم بولو گی، وہی ہو سکتا ہے۔ جولین بھی اپنی بٹیا ہے۔ تم اِدھر بھی رہ سکتی ہو اور چلنا چاہو تو چل بھی سکتی ہو۔"

چمپا بائی میری طرف دیکھنے لگی۔ جولین کی ماں نے پہلی بار زبان کھولی۔ "ابھی چمپا کو ادھر چھوڑ جاؤ۔ ہم بالکل اکیلا ہو جائیں گے۔"

"اس کا فیصلہ خود چمپا بائی کرے گی۔" تجمل نے نرمی سے کہا۔

"کیوں چمپا بائی! ابھی تم ہمارے ساتھ نہیں رہو گی؟" جولین کی ماں نے بے چینی سے پوچھا۔

"نہیں ممی! چمپا دیدی کو مجبور مت کرو۔" جولین کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔

"میں وہاں سے آنے کے بعد کئی جگہ جا سکتی تھی لیکن مجھے ظہیر کے پاس آنا تھا، اِس کے پاس رہنا تھا۔ میری کوئی خواہش نہیں تھی۔ اب بھی یہی ہے لیکن اب مجھے ظہیر کی طرف سے کچھ سکون ہے کیونکہ یہ تمھارے ساتھ جا رہا ہے تجمل بھائی! میں ابھی جولین کے ساتھ رہوں گی

لیکن مجھے رہنا تو ظہیر ہی کی چوکھٹ پر ہے۔ میں اس کے لیے دعا کرتی رہوں گی۔" جولین کی ماں نے چمپا کو زور سے چمٹا لیا۔

کچھ دیر بعد نچھل کل آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے اٹھ گیا۔ میں، جامو اور کانتے اسے ٹیکسی تک پہنچانے گئے۔ کانتے بہت چپ چپ تھا۔ واپس آ کے بھی وہ کسی سے بات کیے بغیر پلنگ پر لیٹ گیا۔ میں رات بھر جولین کے پاس جانے کے لیے سوچتا ہی رہا، پھر صبح ہو گئی۔

صبح اٹھ کے سب سے پہلے میں نے کرشنا جی کی جائداد اور بینک سے متعلق تمام کاغذات نکالے۔ مدراس سے آنے کے بعد انھیں میں نے اب تک نہیں چھوا تھا۔ ایس پی شکلا کے گھر میں کبھی نہیں گیا تھا۔ جولین اور چمپا غالباً ایک دو بار وہاں جا چکی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ پتہ پوچھتے پوچھتے آخر میں اس کے دروازے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ میرا نام سن کے شکلا بے تابی سے باہر آیا اور مجھے اپنے سامنے دیکھ کے متجسس نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر وہ مجھے فوراً اندر لے گیا اور میری اس غیر متوقع آمد کا مقصد پوچھنے لگا۔ "شکلا جی!" میں نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ "میں آپ کو یہ اطلاع دینے آیا ہوں کہ میں جا رہا ہوں۔ آپ اپنی ڈیوٹی پر واپس جائیں۔ میں یہ کاغذات اپنے ساتھ لایا ہوں، انھیں دیکھ لیجیے۔ میں نے ان میں سے ایک پیسہ استعمال نہیں کیا ہے۔"

"مگر تم یہ مجھے کیوں دکھانا چاہتے ہو؟" وہ مضطرب لہجے میں بولا۔ "یہ پیسہ تمھارا ہے۔ تم اسے جہاں چاہو خرچ کرو۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے لیکن تم اسے اچھی جگہ خرچ کرو گے تو مجھے خوشی ہو گی۔"

"میں نے اسے خرچ ہی نہیں کیا ہے اور اب میں جا رہا ہوں، چلتے وقت مجھے آپ سے ملنا بھی تھا اور آپ سے ایک کام میں مدد بھی لینی تھی۔"

"کہو کہو، کیا کام ہے؟" میں نے اسے بتایا کہ میں اپنا سارا روپیہ جولین کے نام منتقل کرنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں جو ضروری قانونی کارروائیاں ہیں، ان کی تکمیل میں وہ میری مدد کرے۔ چونکہ میرے پاس وقت کم ہے اور میں ان باتوں سے ناواقف بھی ہوں۔ "ظہیر خاں!" وہ حیرت زدہ آواز میں بولا۔ "کیا تمھارا دماغ ٹھیک ہے؟"

"کیوں شکلا جی! کیا میں یہ پیسہ کسی کے نام نہیں کر سکتا؟"

"ضرور، ضرور، تم اسے آگ بھی لگا سکتے ہو، کنویں میں بھی پھینک سکتے ہو۔ تم مالک ہو۔ تم کچھ بھی کر سکتے ہو۔"

"شکلا جی! مجھے احساس ہے کہ یہ رقم کرشنا جی کی ہے، میں اسے کہیں اور ضائع نہیں کر رہا ہوں، جولین کو دے رہا ہوں۔ کرشنا جی اسے بھی خود سے بہت قریب سمجھتے تھے۔"

"مجھے شک ہے کہ اس وقت تمھاری طبیعت ٹھیک ہے۔ آؤ

میرے ساتھ کسی ڈاکٹر کے پاس چلو۔ تم یہ سارا روپیہ جولین کے نام کر دینا چاہتے ہو۔ وہ لڑکی اسے سنبھال سکے گی؟" وہ ہذیانی انداز میں بولا۔ "اگر تمھیں جولین کی کچھ مدد ہی کرنی ہے تو اسے چند ہزار دے سکتے ہو، ایک لاکھ دے سکتے ہو، اس سے کچھ اور زیادہ دے سکتے ہو مگر یہ.... اوہ۔ کرشنا جی ہوتے تو! مگر کرشنا جی کیوں ہوتے۔"

"کیا وہ ناراض ہوتے؟"

"وہ اپنا سر پیٹتے ظہیر خاں!"

"وہ کچھ بھی نہیں کہتے۔ وہ اگر یہ سب کچھ اپنی زندگی میں میرے نام کر دیتے اور میں اسے جولین کو دے دیتا تو وہ زبان پر ایک حرف بھی نہ لاتے۔"

"تم جولین کو یہ کیوں دینا چاہتے ہو؟"

"میں سمجھتا ہوں، اسے مجھ سے زیادہ ضرورت ہے۔ اس کا باپ مر گیا ہے۔ ایک بوڑھی ماں ہے۔ وہ اکیلی ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ اسے کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔"

"روپیہ تو اس کی پریشانی اور بڑھا دے گا ظہیر خاں! روپے سے اگر پریشانیاں دور ہو جاتیں تو تم اس قدر پریشان نہ ہوتے۔"

"وہ اور بات ہے۔"

"وہ اور بات نہیں ہے ظہیر خاں! میرے دوست! ذرا غور کرو۔" شکلا میرا ہاتھ دباتے ہوئے تلملاتی آواز میں بولا۔ "میں تمھیں اس کا مشورہ نہیں دوں گا اور نہ اس سلسلے میں تمھاری کوئی مدد کروں گا۔"

"شکلا جی! میں آپ سے مشورہ لینے نہیں آیا ہوں۔ آپ مناسب نہیں سمجھتے تو یہ رقم آدھی کر دیجیے۔ جولین کو واقعی روپے کی ضرورت ہے۔ وہ اعلا تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ممکن ہے، وہ ولایت چلی جائے۔ وہ بہت ذہین لڑکی ہے۔ اس کی ترقی میں جو رکاوٹ ہے، وہ روپے سے بڑی حد تک دور ہو سکتی ہے۔"

"تم نے جولین سے اس کا تذکرہ کیا تھا؟"

"ہاں، پہلے اس نے منع کر دیا۔"

"منع کر دیا! تو جان لو کہ وہ اب بھی اسے قبول نہیں کرے گی۔"

"میں اسے بتاؤں گا ہی نہیں۔ رخصت ہوتے وقت کاغذ دے جاؤں گا۔ میرے جانے کے بعد وہ دیکھے گی تو خود بخود اسے قبول کرنا ہو گا۔"

"نہیں نہیں۔" اس کی پیشانی شکنوں سے بھر گئی۔ وہ مجھے سمجھاتا رہا مگر میں اپنی بات پر قائم رہا۔ وہ کہنے لگا کہ یہ رقم اس کی جیب سے نہیں جا رہی ہے اور جولین کو وہ خود بھی پسند کرتا ہے۔ مجھے سوچنا چاہیے کہ پھر اس کی نا آمادگی کی کیا وجہ ہے۔ "تم کب جا رہے ہو؟" اس نے افسردگی سے پوچھا۔

"کل رات۔"

"اور کہاں جا رہے ہو؟"

"کسی طرف بھی نکل جاؤں گا۔"

"کوئی تو منزل ہو گی؟" وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ابھی شاید کلکتہ سمجھیے۔" میں نے تذبذب سے کہا۔

"وہاں تمھارا پتہ کیا ہو گا؟"

"میرا پتہ!" میں سوچنے لگا کہ اسے کیا پتہ بتاؤں۔ مجھے کلکتے میں بھی کب رہنا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر میں کلکتے گیا تو وہاں شاید چند ہی دن ٹھہروں گا پھر کہیں اور چلا جاؤں گا۔ "مگر آپ پتہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"تمھارے بارے میں کوئی خط آیا تو کہاں مطلع کروں؟"

"چھوڑیے شکلا جی! خط آنا ہوتا تو اب تک آ جاتا۔"

"مجھے اب بھی امید ہے۔ فرض کرو، تمھاری عدم موجودگی میں کوئی خط کہیں سے آ جائے تو میں تمھیں کہاں ڈھونڈوں؟"

چند لمحے سوچنے کے بعد میں نے اسے فیض آباد میں زرین کا پتہ بتا دیا۔ مجھے یقین تھا کہ اسے خط لکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی اور اس نے لکھا بھی تو زرین کے پاس وہ خط محفوظ رہے گا۔ وہ نچھل کو مطلع کر دے گی۔ یہ پتہ کسی اڈے کا نہیں تھا، زرین کا تھا۔ شکلا نے اسے ڈائری میں نوٹ کر لیا۔ میں نے دوبارہ اس کی توجہ رقم کی طرف دلائی۔ اس نے پھر مشورہ دیا کہ مجھے اور سوچ لینا چاہیے۔ یہ رقم بعد میں بھی کسی وقت منتقل ہو سکتی ہے۔ اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ شاید بعد میں میرا ارادہ بدل جاتے۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ کاغذات کی تکمیل کے لیے اس وقت میرے ساتھ نہیں جائے گا۔ میں اٹھ گیا۔ میں نے اس سے وعدہ لیا کہ وہ اپنی ملازمت پر واپس چلا جائے گا۔ اس نے مجھے کئی بار گلے لگایا، میرے گال چومے اور کہا کہ کل کسی وقت مجھ سے ملنے کے لیے وہ گھر آئے گا۔

باہر آنے کے بعد ہی میں نے کسی وکیل کی تلاش شروع کر دی۔ راستے میں ایک جگہ ایک بورڈ پر میری نظر پڑی۔ میں جھجکتے جھجکتے وکیل کے دفتر میں پہنچا۔ وہ ایک بوڑھا آدمی تھا۔ اس نے میری بات پوری توجہ سے سنی اور سر جھکائے ہوئے کچھ سوچتا رہا۔ اس نے کئی بار میری شکل دیکھی۔ جیسے میں کوئی مجرم ہوں۔ میں نے اسے اپنی پوری فائل دکھائی پھر وہ مجھ سے طرح طرح کے سوال کرنے لگا کہ جولین میری کون ہوتی ہے اور میں یہ سب اسے کیوں دے رہا ہوں۔ میں نے کہا، تمھیں اس سے کیا، تم تو کاغذ تیار کر کے مجھے دے دو اور اپنی فیس بتا دو۔ وہ بڑی مشکل سے آمادہ ہوا۔ اس نے بتایا کہ زیادہ لمبے چوڑے طریقۂ کار میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں جولین کے نام جس رقم کا چاہوں، ایک چیک کاٹ سکتا ہوں اور چیک کے ساتھ احتیاط کے طور پر بینک کو خط بھی لکھ سکتا ہوں۔ خط کا مضمون بھی اس نے مجھے بتا دیا۔ میں نے فیس کے لیے کہا تو اس نے انکار کر دیا کہ وہ مشورے کی فیس نہیں لیتا۔ میری جیب میں پیسے بھی کم تھے اور میں ڈر رہا تھا کہ کہیں وہ زیادہ پیسے نہ مانگ لے۔ اب تمام کام مجھے کرنا تھا۔ وکیل سے بات کر کے مجھے اپنا وزن کچھ کم محسوس ہوا۔

باڑے میں نچھل کی وہ آخری رات تھی۔ جامو اور کانتے میرے ساتھ تھے۔ آج معمول سے زیادہ چہل پہل تھی۔ ہر طرف بریانی اور بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ آج وہاں مارتی بھی نظر آ رہا تھا۔ زورا اور چھیدا بھی تھے۔ پیرو گرو نچھل کے پاس بیٹھا ہوا تھا مگر کسی سے بہت کم بات کر رہا تھا۔ میں نے مارتی کو جولین کا خیال رکھنے کی تاکید کی۔ وہ رونے لگا اور بولا کہ راجا! مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ میں نے اسے سمجھایا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ ہاں پھر کبھی ضرور ملاقات ہو گی۔ جامو اور کانتے بھی لوگوں کے درمیان گھرے رہے۔ سب نے ساتھ کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد سامنے کی جگہ پر سازندوں اور طوائفوں نے قبضہ کر لیا۔ آج ایک نہیں، چار چار طوائفیں موجود تھیں۔ سب زرق برق لباس پہنے اور سنگھار کیے ہوئے تھیں۔ گانے میں ہم بس تھوڑی دیر بیٹھے۔ جامو اور کانتے کی وجہ سے مجھے بھی رکنا پڑا۔ جب ہم چلنے لگے تو محفل درہم برہم ہو گئی۔ نچھل اور پیرو کے سوا تقریباً سبھی ہمارے ساتھ گلی میں آ گئے اور بار بار ہمیں اپنے سینوں میں بھینچتے رہے۔

جولین نے میرے لیے ایک سوٹ کیس خرید لیا تھا۔ میرے تمام کپڑے اسی سوٹ کیس میں بھر دیے گئے تھے۔ یہ کپڑے کرشنا جی نے بنوائے تھے اور بعد میں جولین نے سلوائے تھے۔ ہم گھر پہنچے تو یہی تیاری ہو رہی تھی۔ جولین نے نچھل، کانتے اور جامو کے کپڑے بھی بنوائے تھے۔ جولین کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ میں تو اپنے کمرے میں آ گیا۔ وہ دونوں رات گئے تک باہر ہی بیٹھے رہے۔ صبح ہوئی تو میں آخری بار اسے تلاش کرنے کے لیے گھر سے نکل پڑا۔ ممکن ہے وہ اسی شہر میں ہو اور اب تک میری نظروں سے اوجھل رہی ہو۔ میں گھنٹوں مصروف چوراہوں پر کھڑا ہوا لوگوں کو تکتا رہا۔ شام کو واپس آیا تو میرے پیروں میں دکھن ہو رہی تھی۔ گھر کے باہر ایک نئی لمبی سیاہ موٹر کھڑی تھی اور باوردی ڈرائیور موٹر میں اونگھ رہا تھا۔ یہ موٹر میں نے پہلی بار دیکھی تھی۔ گھر میں داخل ہونے سے پہلے میں نے ڈرائیور سے پوچھ لینا مناسب سمجھا کہ اندر کون آیا ہے۔ اس نے نورین کا نام لیا۔ مجھے تسلی ہوئی۔ اندر نورین ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ وہاں اکثر آتی رہتی تھی۔ معلوم ہوا کہ کل بھی آئی تھی اور چمپا نے اسے میری روانگی کے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ میرے لیے ایک گل دستہ لائی تھی اور گیارہ بجے دن سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے اسے بہت دنوں بعد دیکھا تھا۔ وہ نیلی قمیص اور اسکرٹ پہنے ہوئے تھی۔ اس کے گلے میں ایک سفید رومال بندھا تھا۔ بالکل کسی اسکول کی طالبہ معلوم ہو رہی تھی۔ "اگر میں کل نہ آتی تو مجھے پتہ بھی نہ چلتا۔" وہ شکایت کرنے لگی۔ میں نے اس سے معذرت کی کہ میں زیادہ مصروفیت کی وجہ سے اس دوران میں اس سے نہیں مل سکا اور نہ اس

کے گھر آسکا۔ نورین نے میری معذرت قبول کر لی اور کرشنا جی کا ذکر کرنے لگی کہ کلب میں لوگ انھیں بہت یاد کرتے ہیں اور کبھی کبھی میرا تذکرہ بھی ہو جاتا ہے۔ اُس نے بتایا کہ وہاں لوگ میرے بارے میں مختلف قسم کی باتیں کرتے ہیں اور ڈیڈی بھی تمھیں پوچھتے رہتے ہیں۔ وہ یہ باتیں چمکتی آنکھوں سے کر رہی تھی۔ جولین بھی موجود تھی۔ نورین نے اُس سے پانی طلب کیا اور جولین جیسے ہی اندر گئی، نورین کھسک کے میرے قریب آگئی۔ اُس نے سرگوشی میں مجھ سے پوچھا کہ میرے پاس کچھ وقت ہے؟ میں نے جواب دیا کہ گاڑی رات کو جاتی ہے، ابھی خاصا وقت پڑا ہے۔ "مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں مگر یہاں نہیں۔ کچھ دیر کے لیے میرے ساتھ چلو۔ میں تمھیں یہیں پہنچا دوں گی۔" وہ رازدارانہ لہجے میں بولی۔

"کیسی باتیں؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"کچھ اہم باتیں۔" میں نے تجسس سے اُسے دیکھا۔ وہ تیزی سے بولی "ایسی کوئی گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ بس تم سے کچھ کہنا ہے۔"

میں نے بے تابی سے اقرار میں گردن ہلا دی۔ جولین کے آنے پر وہ چپ ہو گئی۔ میرے دل کو بے کلی ہو گئی کہ وہ مجھ سے ایسی کیا باتیں کرنا چاہتی ہے۔ چند منٹ بعد وہ واپس جانے لگی۔ میں بھی اُس کے ساتھ موٹر میں بیٹھ گیا۔ جولین اور چمپا بھی دروازے سے باہر آگئی تھیں۔ نورین نے اُن سے کہا کہ وہ مجھے ابھی کچھ دیر بعد واپس لے آئے گی۔ وہ دونوں دیکھتی رہ گئیں۔ موٹر فر سے روانہ ہو گئی۔ آدھے گھنٹے بعد ہم اعلا درجے کے ایک پُرسکون اور ٹھنڈے ریستوران کے ایک کونے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ "تمھارے پاس وقت کم ہے اس لیے میں کسی تمہید کے بغیر بات کروں گی۔" وہ بیرے کو کافی کا آرڈر دیتے ہوئے کچی پکی اردو میں بولی۔ "تم جانتے ہو کہ مجھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنا نہیں آتا۔ میں تمھارے گھر کوئی دس بار آئی ہوں گی، تم کسی بار نہیں ملے۔ مجھے شبہ ہوا کہ شاید جولین اور چمپا تمھیں میرے بارے میں کچھ بتاتی نہیں ہیں۔"

"نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ انھوں نے ہر بار مجھے بتایا ہے۔"

"تو ٹھیک ہے۔" وہ عجلت میں بولی۔ "پہلے مجھے تم سے چند سوال کرنے ہیں، جواب دیتے رہنا۔ پھر میں اپنی بات بتاؤں گی۔" اُس کی آواز میں لرزہ تھا۔

"پوچھیے۔"

"یہ بتاؤ کہ میں تمھیں کیسی لگتی ہوں؟"

"جی!" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں مجھے بتاؤ کہ میں کیسی لگتی ہوں؟"

"تم..... تم بہت اچھی ہو۔"

"نہیں۔" وہ مچل کے بولی۔ "مجھے بتاؤ کہ میں تمھیں لگتی کیسی ہوں؟ صرف چہرے مہرے اور رنگ روپ سے نہیں، دونوں طرح تمھیں پوری آزادی ہے کہ تم جس طرح سمجھتے ہو کسی جھجک کے بغیر کہہ دو۔ مجھے کوشش کرنے کے لیے جواب نہ دینا۔ اب تم جا رہے ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم پھر کبھو نہ ملیں اور ایک دوسرے سے شرمندہ نہ ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر مجھے تم سے صاف جواب کی اُمید نہ ہوتی تو میں یہ سوال کرتی ہی نہیں۔"

"یہ تم مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"بس میری بات کا جواب دو۔"

"تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔" میں نے جھجک کے کہا۔

"تم بھی مجھے اچھے لگتے ہو۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو اچھے لگتے ہیں۔ میں نے طے کیا ہے کہ تم مجھ سے اور میں تم سے شادی کر لوں۔"

"کیا۔ ؟" میں اچھل گیا۔

"ہاں۔" وہ پُرسکون لہجے میں بولی۔ "یہ بات تمھیں عجیب محسوس ہو گی لیکن ہم ایک دوسرے سے کیوں جھجکیں اور غیر ضروری باتوں میں وقت کیوں ضائع کریں۔"

"مگر..... مگر۔" میری آواز دھڑکنے لگی۔

"ہاں تمھارے ذہن میں چند سوال آسکتے ہیں۔ پہلا سوال یہ آسکتا ہے کہ میں ایک پارسی لڑکی ہوں اور تم مسلمان ہو۔ میرے لیے یہ کوئی اختلاف کی بات نہیں ہے۔ تمھارے لیے میں مسلمان ہو سکتی ہوں۔ دوسرا سوال شاید تمھارے ذہن میں یہ ہو کہ میں ایک کروڑ پتی باپ کی بیٹی ہوں اور تم اتنی بڑی حیثیت کے آدمی نہیں ہو۔ میں اسے بھی مسترد کرتی ہوں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں تو جو کچھ تمھارا ہے، وہ میرا ہے اور جو میرا ہے، وہ تمھارا ہے۔ تیسرا یہ سوال تمھیں پریشان کر سکتا ہے کہ میرے ڈیڈی رستم جی کیسے اور کیوں تیار ہو جائیں گے تو اس کی فکر بھی چھوڑ دو۔ میرے ڈیڈی مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ میں اُن کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ انھوں نے بہت پہلے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ میں جسے پسند کروں گی، انھیں اُس کے ساتھ میری شادی کر دینے پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ میں نے ایک بار اُن سے تمھارا ذکر کیا تھا، انھوں نے تمھارے بارے میں اچھی رائے ظاہر کی تھی۔ میں تمھارے لیے ایک اچھی بیوی ثابت ہوں گی اور مجھے یقین ہے کہ تم بھی میرے لیے ایک عمدہ شوہر......."

"نورین، میں..... میں۔" میں نے سراسیمگی سے کچھ کہنا چاہا۔ "ممکن ہے تمھیں کوئی اور لڑکی مجھ سے زیادہ پسند ہو۔ یہ بات میرے لیے دُکھ کی ہے لیکن میں تمھارے راستے میں رکاوٹ نہیں بنوں گی۔ تم اپنے لیے مجھ سے بہتر فیصلہ کر سکتے ہو۔ میں چھ مہینے تک تمھارا انتظار کروں گی۔ یہ عرصہ سوچنے کے لیے بھی کافی ہو گا اور تمھیں کام نمٹانے کے لیے بھی۔"

"لیکن..... لیکن سوچنا کیا ہے۔" میں نے شکستہ آواز میں کہا۔

"سوچنا ہے ظہیر! سوچنا چاہیے۔ میں نے اپنے طور پر تمھارے بارے میں خوب سوچ لیا ہے لیکن تم نے میرے متعلق اس انداز سے ممکن ہے نہ سوچا ہو۔ یہ شادی ہے۔ ہم دونوں زندگی بھر ساتھ رہیں گے۔ ایک دوسرے کے وفادار۔ ہم دو ہیں، ایک ہو جائیں گے۔ ہماری روحیں، ایک دوسرے سے بندھ جائیں گی۔ سوچے بغیر یہ سب کچھ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں تمھیں سوچنے کا پورا موقع دینا چاہتی ہوں۔"

نورین کے گال تمتما رہے تھے۔ میرا سارا جسم گنگ ہو گیا تھا۔ اُس نے جلدی جلدی کافی بنائی۔ ایک پیالی میرے آگے رکھ دی۔ میں نے اپنے حواس مجتمع کرنے کی بہت کوشش کی۔ اُس سے کچھ کہنے کے لیے میرے ہونٹ کپکپانے لگے۔ "چلو اٹھو، تمھیں دیر ہو رہی ہے۔" اُس نے بیرے کو بلا کے ایک نوٹ دے دیا اور ریستوران سے نکل آئی۔ واپسی پر اُس نے مختلف دکانوں سے میرے لیے سوٹ کا کپڑا، شیونگ کا سامان، جوتے، بسکٹوں کے ڈبے اور بہت سی چیزیں خریدیں اور تمام سامان کے ساتھ مجھے چھوڑ گئی۔ وہ اندر نہیں آئی۔ موٹر روانہ ہونے سے پہلے اُس نے یاسیت سے کہا کہ وہ میرے مثبت جواب کی توقع رکھے گی۔ اُس نے کچھ اور بھی کہا جو میں نے سنا نہیں۔ موٹر چل پڑی۔

گھر میں سبھی میرے منتظر تھے۔ تجمل آچکا تھا۔ سوٹ کیس اور بستر بند ڈرائنگ روم میں رکھے تھے۔ جولین، کلانتے اور جامو کے درمیان نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔ میری سانس قابو میں نہیں تھی اور مجھے سفر کے خیال سے ہول آرہا تھا، دل ڈوبا جا رہا تھا۔ تجمل نے میرا بازو پکڑ کے مجھے جھنجوڑ دیا۔

"کیا بات ہے لاڈلے؟" وہ بے قراری سے بولا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے سنبھل کے کہا۔ "کچھ بھی نہیں۔"

"چلنا ہے۔" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

"ہاں چلو۔" میں نے بہکے بہکے انداز میں کہا۔ میں اُن سے اپنی اِس خواہش کا اظہار نہیں کر سکا کہ بس آج کے لیے سفر کا ارادہ ملتوی کر دیا جائے۔ کلانتے ٹیکسی لینے چلا گیا تھا۔ دو ٹیکسیاں آئیں۔ جولین کی ماں گھر ہی پر رہی۔ اُس نے میری پیشانی کو بوسہ دیا اور دعائیں دے کے مجھے رخصت کیا۔ جولین، چمپا اور میں ایک ٹیکسی میں اور دوسری میں وہ تینوں بیٹھ گئے۔

ٹیکسی میں خاموشی طاری تھی۔ پھر چمپا کی روتی ہوئی آواز ابھری۔ "پیارے میاں! خط لکھنا۔" میں نے گردن ہلائی۔ وہ آیتیں پڑھ پڑھ کے مجھ پر پھونک رہی تھی۔ اسٹیشن پر پیرو پہلے سے موجود تھا۔ اُس کے ساتھ صرف زورا، چھیدا، ماچھی، منڈا اور مارتی تھے۔ گاڑی روانہ ہونے میں زیادہ وقت نہیں تھا۔ میں نے چمپا کو علیحدہ لے جا کے ایک لفافہ دیا اور اُسے تاکید کر دی کہ وہ گھر پہنچ کے کسی مناسب وقت لفافہ جولین کو دے دے۔

منڈے نے میری ٹانگیں پکڑ رکھی تھیں اور اپنا سر پٹخ رہا تھا۔ مارتی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ وہ سب ہم سے بار بار لپٹ جاتے تھے۔ گارڈ نے سیٹی بجائی تو پیرو نے دونوں ہاتھوں سے میرے بال کھینچ لیے اور پیشانی سے سر مارتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"لاڈلے! اپن کو تیرا انتظار رہے گا۔"

وہ دونوں ہم سے علیحدہ کھڑی ہو گئی تھیں۔ کلانتے انھی کے پاس تھا۔ گاڑی بس حرکت میں آیا ہی چاہتی تھی۔ میں دوڑ کے اُن کے پاس پہنچا۔ چمپا نے اپنی بانہیں پھیلا رکھی تھیں۔ میں بے اختیار اُس کے سینے سے چمٹ گیا۔ "پیارے میاں! اللہ تمھارے ساتھ ہے۔ اللہ تمھیں خوش رکھے، شاد آباد رکھے۔" وہ سسکتی ہوئی بولی۔ "تمھاری مرادیں پوری کرے اور میرے لیے چین سے مرنے کا انتظام کر دے۔"

میں چمپا سے الگ ہوا تو اُس کے پہلو میں کھمبے سے ٹکی ہوئی جولین کھڑی تھی۔ اُس کی آنکھیں ویران تھیں۔ سُونی سُونی خالی خالی سی۔ میں نے اُسے دیکھا تو اُس پہ کپکپی طاری ہو گئی۔ اگر میں اُس کا شانہ نہ تھام لیتا تو شاید وہ گر جاتی۔ مجھے نہ جانے کیا ہوا۔ میں نے اُسے زور سے کھینچ کے اپنے بازوؤں میں بند کر لیا۔ جولین کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ آسے تجمل نے مجھ سے جُدا کیا۔ گاڑی حرکت میں آگئی تھی۔ چمپا نے ایک طرف، دوسری طرف سے مارتی نے بھاگ کر جولین کو سنبھالا دیا۔

منڈا دور تک گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگتا رہا۔

ڈبے میں ہم چاروں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ یہ فرسٹ کلاس کا ڈبا تھا۔ اسٹیشن سے چلتے ہی گاڑی اندھیرے میں ڈوب گئی اور بتدریج تیز ہوتی گئی۔ ڈبے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سب ایک دوسرے سے دُور نشستوں کے کونوں میں بیٹھے ہوئے کچھ سوچ رہے تھے۔ دیر تک سامان فرش ہی پر پڑا رہا۔ گھر سے جولین اور چمپا نے جو سامان ساتھ کیا تھا، اُس میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ پیرو اور اُس کے آدمی کھانے پینے کی اتنی چیزیں ساتھ لائے تھے کہ ایک ہفتے کے سفر میں بھی بچ جائیں۔ جامو، کلانتے اور تجمل نے اپنے گلوں سے ہار آتاس کے برتھ پر ڈال دیے تھے۔ کچھ دیر بعد تجمل قریب آگیا اور میرے گلے میں ہاتھ ڈال کے آہستگی سے بولا۔ "ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں سب ٹھیک ہے۔" میں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"تیواڑی کی ناک کا تو نے کیا کیا رے؟" وہ مسکرا کے بولا۔

"وہ میں نے گٹر میں پھینک دی تھی۔"

"بڑی ٹھیک جگہ چُنی تو نے۔"

"اور تیواڑی کا کیا ہوا؟" میں نے اضطراب سے پوچھا۔

"وہ بھی کسی ایسی ہی جگہ پڑا ہو گا۔" تجمل اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "جانے دے اب تو سو جا۔ باتیں صبح ہوں گی۔ کچھ کھا کے سونا۔"

"نہیں بھوک نہیں ہے۔"

"کھا لے! مجھے تو بہت لگ رہی ہے۔"

"تم کھا لو میرا جی نہیں چاہ رہا ہے۔"

"اب جی سنبھال کے رکھ، کب تک بچہ گردی کرے گا۔"

"میں نے گھور کے اُسے دیکھا۔ "کیسی بچہ گردی؟"

"خفا ہو گیا؟" وہ ہنسنے لگا۔ "ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جاتا ہے۔ یہی تو بچہ گردی ہے اور کیا ہے۔ خبر ہے تیری عمر کیا ہے؟ پچیس سے

کیا کم ہوگی۔"

"میں ناراض تو نہیں ہوا۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔

"لاڈلے!" وہ گمبھیر آواز میں بولا۔ "اب کہیں اور مت نکل جانا۔"

"کیا مطلب؟" میں نے گھبرا کے کہا۔

"میرے ساتھ ہی رہنا۔"

"تمھارے ساتھ! مگر مجھے تو۔۔!"

"ہُش، ہُش۔ بے صبری مت کر۔ بے صبری میں سارا کام خراب ہو جاتا ہے۔ تُو اگر مجھے پہلے بتا دیتا تو شاید یہ بات نہ ہوتی۔"

"تم اسے بے صبری کہتے ہو؟ سات سال وہاں گزر گئے، ایک سال سے اوپر ہو گیا اور تم۔۔۔۔ تم کیا کر سکتے ہو؟ تم بھی میری طرح مجبور ہو۔ تم کیا کوئی جادوگر ہو؟"

"ہاں۔" وہ اداسی سے بولا۔ "میں بھی مجبور ہوں پر لاڈلے! اکہری سوچ سے دُہری سوچ اچھی ہوتی ہے۔ میں تجھ سے کچھ سوچ سمجھ کے ہی بولتا ہوں۔"

"اب تو تمھیں تقریباً ساری باتیں معلوم ہیں۔ مجھے سوچ کے جواب دو کہ میں کیا کروں؟" میں نے زہرخند سے کہا۔ "تم تو مجھے کلکتے لیے جا رہے ہو لیکن میں تمھیں پہلے سے بتائے دیتا ہوں کہ مجھے کلکتے میں نہیں رہنا ہے۔ تم وہاں جا کے اڈّے پر بیٹھو۔ جب تم اس معاملے میں کچھ کر ہی نہیں سکتے تو خواہ مخواہ کیوں پریشان ہوتے ہو۔ میں چلا جاؤں گا کسی طرف بھی نکل جاؤں گا۔"

"میں نے تجھ سے کب بولا ہے کہ تُو کلکتے میں رہنا۔ کون جانتا ہے کہ تُو اڈّے پہ بیٹھے۔ پگلا لاڈلے! اب تُو جائے گا نہیں، میں تجھے اکیلا نہیں جانے دوں گا۔" وہ حکمیہ لہجے میں بولا۔ "اور اگر تُو چلا گیا تو سمجھ لینا کہ میں تجھ سے کبھی بات تک نہیں کروں گا اور تُو بھی کبھی میرا نام مت لینا۔"

"تو تم میرے ساتھ چلو گے؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"ہاں ایسا بنا تو میں تیرے ساتھ چلوں گا۔"

"کہاں تک؟" میں نے بپھر کے کہا۔ "تلووں میں چھالے پڑ جائیں گے۔"

"میرے دل میں چھالے پڑے ہوئے ہیں، تُو تلووں کی بات کرتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے سر جھٹک کے کہا۔ "تم نے طے کر ہی لیا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم نے تو کہنے کے لیے کوئی بات نہیں رکھی۔"

"لاڈلے! مجھے ایک بار تفصیل سے تمام باتیں بتا۔ دیکھ، اب کچھ چھپانا نہیں۔ ہر بات بول دے۔" وہ اپنا بازو تنگ کرتے ہوئے بولا۔ "اگر کوئی بات رہ گئی تو شاید میں کچھ فیصلہ نہ کر سکوں۔"

جامو اور کانتے اونگھنے لگے تھے۔ میں نے اُسے ساری باتیں ترتیب سے بتا دیں۔ گھر سے نکلنے کا سارا واقعہ، اپنا اصل نام مولوی محمد تنغیق کے ساتھ اور کلکتے کے مختلف ہوٹلوں میں قیام۔ بدھ گیا میں کورا کی تلاش میں بھٹکنے والے بھکشو کی بے تابی، اُس کا قتل۔ میں نے اُس سے کوئی بات نہیں چھپائی۔ وہ یہ سب کچھ سُن کے گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ میں کھڑکی سے باہر اندھیرے میں گھورتا رہا۔ "کیوں؟ کیا سوچنے لگے؟" میں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"ابے! جو بات تُو آٹھ سال سے سوچ رہا ہے۔ کیا مجھے اس کے لیے چند گھنٹوں کا وقت بھی نہیں دے گا؟" وہ بگڑ کے بولا۔

"گھنٹے کیا، دن لے لو، سال لے لو۔" میں نے تنک کے کہا۔ "میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ سوچنے میں اپنا وقت کیوں ضائع کرتے ہو، کچھ نہیں ملے گا۔"

"کیسی باتیں کر رہا ہے رے!" وہ ناگواری سے بولا۔ "جب تُو اتنا ہی مایوس ہے تو پھر خود کیوں کسی ایک جگہ نہیں ٹِک جاتا۔"

"میرا کیا ہے۔ اگر میں کہیں دیر تک ٹھہر جاتا ہوں تو میرا جسم ٹوٹنے لگتا ہے میرے سینے میں جلن ہونے لگتی ہے۔ جب میں چلنے لگتا ہوں تو میری طبیعت ٹھہری رہتی ہے میرے نصیب ہی میں یہ لکھا ہے۔ تجھل بھائی! مجھے معلوم ہے، دُنیا بہت بڑی ہے۔ اس بڑی دُنیا میں اُسے تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔ جدھر دیکھو اُدھر ہی ایک راستہ جاتا ہے مگر وہ آخر کسی جگہ تو رہتی ہوگی۔ رہتی ہوگی نا؟"

"کیوں نہیں بابرے! شیر ببر! اُسے ڈھونڈیں گے۔ کلکتے جانا ضروری ہے۔ تھوڑے دن ٹھہر کے پھر نکل پڑیں گے۔"

"مگر کس طرف؟" میں نے مایوسی سے کہا۔

"سوچنے دے۔" وہ اُلجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "تُو نے بتایا کہ وہ مولوی کلکتے کے ایک مدرسے میں پڑھاتا تھا اور مراد آباد شہر میں رہتا تھا۔"

"ہاں۔" میں نے بے چینی سے کہا۔ "مگر میں مدرسے بھی گیا اور مراد آباد بھی۔ اُس کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ جیسا کہ میں نے تمھیں ابھی بتایا ہے۔"

تجھل پھر چپ ہو گیا۔ گاڑی تیز رفتاری سے سفر طے کرتی رہی۔ وہ بیٹھے بیٹھے چونک کے مجھ سے کوئی بات پوچھتا۔ پھر کھو جاتا۔ سارے سفر میں اُس کا یہی حال رہا۔ جامو اور کانتے بیشتر وقت سوتے رہے اور میں کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا بھاگتی ہوئی بستیاں دیکھتا رہا۔ جو بھی اسٹیشن آتا، میں اُتر جاتا۔ اُن میں سے کوئی نہ کوئی میرے ساتھ ہوتا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے
بقیہ واقعات دوسرے حصے
میں مُلاحظہ فرمائیں

سب رنگ ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ

بازیگر

دوسرا حصّہ
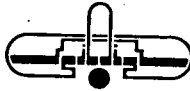
ہماری آمد کی کسی کو خبر نہیں تھی۔ ہم وہاں اچانک پہنچے تو اڈے میں کھلبلی مچ گئی۔ شولی نے مجھے کندھوں پر اٹھا لیا۔ نصیب میاں نے میری بلائیں لے لیں۔ "اے واہ میاں! سبحان اللہ! ایسی بھی کیا ستم گری، نہ نامہ نہ پیام، نہ سلام نہ کلام۔ قسم جیتی بیگم کی، استاد نواب کو کسی پہلو چین نہیں تھا۔ آہیں بھرتے تھے۔" نصیب میاں نے میرے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

اڈا اجڑا اجڑا معلوم ہوا لیکن تھوڑی ہی دیر میں آدمیوں سے بھر گیا۔ ہر شخص مجھ سے گلے مل رہا تھا اور میری عدم موجودی میں جھجل کی کیفیت بیان کر رہا تھا۔ کانتے نے بمبئی میں مجھے سچ بتایا تھا۔ جلد ہی مجھے خود بھی اندازہ ہو گیا کہ اڈے کا وہ حال نہیں ہے جو پہلے تھا۔ کئی آدمی پیسہ دینا بند کر چکے تھے۔ سونا گاچھی کے علاقے پر استاد نبو خاں نے پوری طرح قبضہ جما لیا تھا۔ اُدھر گھوشی پہلے ہی مو جمدار کے اڈے پر قابض تھا۔ دور دراز کے چھوٹے موٹے اڈے بھی پیسہ دیتے ہوئے آنا کانی کرنے لگے تھے اور کہتے تھے کہ جب استاد جھجل اس طرف کی خبر ہی نہیں لیتا تو وہ کیوں اُسے علاقے کی آمدنی میں شریک کریں۔ جھجل کے سامنے شکایتوں کا دفتر کھل گیا۔ اُسے بتایا گیا کہ علاقوں میں گشت کرنے والے آدمی بھی حساب میں صاف نہیں رہے۔ پیسہ درمیان ہی میں اُڑا جاتے ہیں۔ جھجل کے بمبئی جانے کے بعد حالات اور خراب ہو گئے تھے۔ گھوشی کی غداری کا ذکر سب کے ہونٹوں پر تھا۔ جھجل کے اڈے کے کئی پرانے آدمی گھوشی سے مل گئے تھے۔

دوسرے دن شہر میں دور دور تک یہ خبر پھیل گئی کہ جھجل لاڈلے کے ساتھ واپس آ چکا ہے۔ شام کو استاد نبو خاں تمام رقم لے کے خود حاضر ہو گیا۔ اُس نے جھجل سے معذرت طلب کی اور رقم کی ادائی میں تاخیر کے مختلف عذر تراشے۔ جھجل نے کچھ نہیں کہا۔ رقم نصیب میاں کو دے دی گئی۔ رات تک لوگوں کا تانتا بندھا رہا۔ دو ہی دنوں میں رُکی ہوئی اچھی خاصی بڑی رقم جمع ہو گئی۔ اور اڈے کی پرانی رونق رفتہ رفتہ بحال ہونے لگی۔ کانتے بمبئی سے آنے کے بعد اب تک الگ تھلگ رہا تھا۔ وہ بھی کچھ سرگرم ہو گیا۔ اُس نے جھجل سے ایک ہزار روپے کے جولین کے نام بمبئی روانہ کر دیے اور منی آرڈر میں سختی کے ساتھ یہ تاکید کر دی کہ یہ روپے صرف جولین خرچ کرے گی۔ وہ جولین کے سلوائے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ کپڑے میلے ہو گئے تھے لیکن کانتے انھیں اتارتا نہیں تھا۔ جامو فیض آباد جانے پر مصر تھا۔ جھجل نے اُسے نہیں جانے دیا۔ اڈے کے دوسرے لوگ اُس کی خاطر تواضع میں مصروف تھے۔ نبو خاں اُسے اپنے ساتھ سونا گاچھی لے گیا تھا۔ شولی، سالٹے، لیلا، لالہ وغیرہ سب میرے گرد جمع رہتے تھے۔ نصیب میاں اِدھر سے اُدھر تھرکتے رہتے تھے۔ جب بھی کوئی شخص پیسے لے کے آتا وہ چلاتے۔ "استاد برکت ہی برکت ہے۔ ساری برکت چشم بد دور لاڈلے میاں کی ہے۔ استاد نواب! ذرا ایک بکرا تو منگوا لو۔"

دو دن تک یہی ہنگامہ رہا۔ جھجل زیادہ تر لوگوں کی باتیں سنتا اور اُن سے ملتا رہا۔ وہ خود عموماً خاموش ہی رہتا۔ تیسرے دن صبح ہی صبح جھجل

میرے ساتھ اُس مدرسے میں گیا جہاں مولوی محمد شفیق مجھے اور کورا کو لے گئے تھے۔ صدر مدرس تجھل سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آئے اور مولوی محمد شفیق کا سامان دکھانے پر آمادہ ہو گئے۔ وہ سامان ایک الماری میں ابھی تک بند تھا۔ وہاں کوئی نئی بات معلوم نہیں ہوئی۔ مولوی شفیق کے سامان سے ایک کاپی نکلی۔ کاپی میں تعویذ لکھے ہوئے تھے اور کلکتے کی مختلف دکانوں کے پتے بھی درج تھے۔ تجھل نے صدر مدرس سے وہ کاپی عاریۃً طلب کی۔ انھوں نے بڑی حیل و حجت کے بعد اُسے کاپی دے دی۔ میں کورا کے سارے کپڑے لے جانا چاہتا تھا مگر مدرس نے کاپی ہی بڑی مشکل سے دی تھی۔ وہ کپڑے اصل میں فہیدہ کے تھے مگر کورا نے بھی انھیں پہنا تھا۔ اُن میں کورا کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ میں نے سوچ لیا کہ کسی دن رات کو یہاں آ کے انھیں چوری کر لوں گا۔ تالا بہت معمولی تھا۔ ایک جھٹکے میں کھُل سکتا تھا اور مدرسے میں کوئی خاص پہرا بھی نہیں رہتا تھا۔ دوپہر تک تجھل مولوی صاحب کی کاپی کے پتوں پہ جا جا کے اُن کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر کسی کو بھی مولوی صاحب کا پتہ معلوم نہیں تھا۔ سب یہی کہتے تھے کہ انھوں نے ایک عرصے سے اُن کی شکل نہیں دیکھی ہے، نہ اُن کے متعلق کچھ معلومات رکھتے ہیں۔

اُس دن رات کو تجھل نے خلافِ توقع اپنے تمام اڈّوں کا نگراں استاد جامو کو بنا دیا۔ تجھل کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ اُس کی عدم موجودگی میں جامو اور جامو کی عدم موجودگی میں کانتے اور لالہ اڈّے کا کام سنبھالیں گے۔ کانتے کی طرح لالہ کا ہاتھ بھی چاقو میں بہت رواں تھا۔ سب نے یہ اعلان حیرت سے سُنا کیونکہ بہت سے لوگوں کو امید تھی کہ تجھل جامو کے بجائے لاڈلے کو متعین کرے گا۔ کانتے نے مجھے بتایا کہ جامو بے حد اصرار کے بعد کلکتے میں رُکنے پر تیار ہوا ہے اور اُس نے لکھنؤ کے کلن خاں کو اطلاع دے دی ہے کہ وہ فیض آباد میں اُس کے چھوٹے بھائی جمرو کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ فیض آباد کا اڈّا یوں بھی محفوظ تھا۔ وہاں کلکتے اور بمبئی کی طرح آپس میں اختلافات پیدا ہونے کا زیادہ امکان نہیں تھا۔ شہر بھی چھوٹا تھا اور جامو کی گرفت سخت تھی۔

صرف چار دن میں اڈّے کے معمولات مکمل طور پر اپنی ڈگر پہ آ گئے۔ نصیب میاں کو روزنامچے میں اندراج کرنے کے کام سے سر اُٹھانے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ تقریباً اڈّے سے کترانے والے سبھی لوگ واپس آ چکے تھے مگر گھوشی نہیں آیا تھا اور آنے والے لوگ گھوشی کے بارے میں عجیب عجیب باتیں بیان کرتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ تجھل یا جامو اُسے خود بلائیں گے اور کہیں گے کہ یا تو وہ اڈّا چھوڑ دے ورنہ نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو جائے۔ موجدار کا اڈّا یا تو تجھل کے اڈّوں میں شامل نہ ہوتا اور شامل ہو گیا تھا تو اُسے واپس نہیں جانا چاہیے تھا۔ اِدھر تجھل تیزی سے اپنے کام نمٹا رہا تھا اور اپنے معتبر آدمیوں کو بُلا کے مختلف ہدایتیں دے رہا تھا۔ تجھل نے خاص خاص لوگوں کے سوا شاید کسی کو نہیں بتایا تھا کہ وہ میرے ساتھ واپس جا رہا ہے۔ میں شولی یا سارٹے کو ساتھ لے کے روز سویرے سویرے اڈّے سے نکل جاتا تھا اور دوپہر کو واپس آ جاتا تھا۔ شولی رات کو مجھے ساز پہ گانا سناتا تھا۔ اُس کی آواز پہلے سے کہیں زیادہ نکھر گئی تھی۔ یہاں بھی میرا کوئی اور کام نہیں تھا۔ دن بھر گلی گلی پھرتا اور شام کو اڈّے واپس آ کے اِدھر اُدھر کی باتیں سنتا رہتا۔ ایک دن مجھے جیلر صاحب نظر آ گئے۔ وہی جیلر صاحب جو مجھ پر بہت مہربان تھے اور جن کی لڑکی سُونیا کو میں نے جیل میں پڑھایا تھا۔ اتفاق سے جیلر صاحب کی نظر مجھ پر نہیں پڑی۔ میں نے راستہ بدل لیا۔ اُس دن رات کو کئی آدمیوں نے دبے دبے لہجے میں تجھل کو آمادہ کرنا چاہا کہ وہ گھوشی کے سلسلے میں کوئی قدم اُٹھائے، اس سے اڈّے کی بدنامی ہو رہی ہے۔ تجھل نے ہُوں ہاں کر کے ٹال دیا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ تا تھا کہ تجھل کے لیت و لعل کی وجہ کیا ہے۔ اگر وہ خود گھوشی کا سامنا کرتے ہوئے کتراتا تھا کہ گھوشی پہ چاقو اُٹھانا اُس کے لیے سُبکی کی بات ہے تو وہ کسی کو بھی بھیج سکتا تھا۔

پانچویں دن صبح صبح سب جاگ گئے تھے۔ تجھل نہا رہا تھا اور نصیب میاں روزنامچے پر پنسل سے لکیریں کھینچ رہا تھا — باقی لوگ بھی اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ میں چپکے سے دروازے سے نکل گیا۔ گلی میں آتے ہی مجھے ایک ٹیکسی مل گئی۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر میں موجدار کے علاقے میں تھا۔ میں نے ٹیکسی اڈّے کی عمارت کے دروازے پر رکوائی۔ دروازے پہ جو لوگ موجود تھے، انھوں نے مجھے دیکھا تو کچھ اندر کی طرف دوڑے اور دوسرے میری جانب لپکے۔ وہ سب مجھے جانتے تھے۔ "گھوشی کہاں ہے؟" میں نے اُن میں سے ایک سے دریافت کیا۔

"اندر ہے۔" سندر نے آگے آ کے سینہ پھُلاتے ہوئے کہا۔

"اُس سے کہو کہ لاڈلا ملنے آیا ہے۔"

سندر نے اپنے شانے سکوڑ لیے اور میری آنکھوں میں جھانکنے لگا پھر اُس نے اپنے قریب کھڑے ہوئے آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ فوراً اندر کی طرف بھاگا مگر وہ ابھی ڈیوڑھی میں تھا کہ گھوشی کو آتا ہوا دیکھ کے پلٹ پڑا۔ گھوشی کے پیچھے کئی آدمی تھے۔ میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ "لاڈلے!" گھوشی نے دُور ہی سے مجھے پکارا اور میرے سامنے آ کے کھڑا ہو گیا۔ "کیا ہے لاڈلے؟" وہ نخوت سے بولا۔

"گھوشی! میں تجھ سے ملنے آیا ہوں۔ شاید تُو نے سُنا نہیں کہ ہم لوگ واپس آ گئے ہیں؟" میں نے بلند آواز میں کہا۔

"میں نے سُن لیا تھا۔" وہ منہ بنا کے بولا۔

"اس وقت میں تجھ سے یہ کہنے آیا ہوں کہ سیدھے سبھاؤ اڈّا واپس کر دے۔ میں زیادہ بات نہیں کروں گا۔ تُو نے اڈّا زور سے نہیں لیا ہے، تُو نے تجھل بھائی کے ساتھ نیچ پنا کیا ہے۔ تُو نے استاد تجھل کی خاموشی غلط سمجھی اور یہ بھی غلط سمجھا کہ میں مر گیا ہوں۔ میں تیرے سامنے زندہ موجود ہوں۔ اچھی طرح اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔"

"استاد تجھل اڈّا سنبھالنے کے کام کا نہیں رہا۔ وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔" گھوشی نے تلملا کے کہا۔ "اور یہ اڈّا موجدار سے استاد تجھل نے نہیں لیا تھا، تُو نے لیا تھا۔ تُو چلا گیا تو اڈّے پر تجھل کا کوئی حق نہیں تھا۔ موجدار کے ٹیم بھی یہ اڈّا میں چلاتا تھا۔ میں اپنے گرو کا اڈّا اس طرح برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ اُدھر تجھل میٹھا حقہ گُڑ گُڑ کرتا رہے اور اِدھر آدمی ہاتھ سے نکلتا رہے۔ اُدھر تجھل منہ پھُلائے گردن ڈالے بیٹھا رہے اور اِدھر سالا مکڑی جالا بُنتا رہے۔ اڈّے کو زنگ لگ گیا تھا لاڈلے! میں نے استاد سے بار بار بولا پر استاد نے دھیان نہیں دیا۔ میں نے اڈّا لے لیا تب بھی استاد منہ پہ تالا مارے رہا۔"

"زبان سنبھال کے بات کر گھوشی! اب استاد تجھل کے لیے تُو نے ایک لفظ بھی انھیں منہ سے نکالا تو تیری زبان کاٹ لوں گا۔ بے کار کے بہانے مت کر۔ یہ اڈّا میں نے استاد تجھل کو دیا تھا تو اُس سے چاقو کے بل پر ہی واپس لے سکتا تھا۔ تُو نے شہد پن کیا۔ تو اُچکا ہے گھوشی! تجھل نے تیرے ساتھ کیا زیادتی کی تھی؟ وہ تجھے اپنا سب سے قریب کا آدمی سمجھتا تھا۔ تیری آنکھ میں سُور کا بال ہے۔ تُو بیمار ہو جائے یا بوڑھا ہو جائے تو کیا تیرے ساتھی تیری زندہ لاش نوچنے لگیں۔ تُو استاد تجھل کو بوڑھا کہتا ہے۔ چل میرے ساتھ چل۔ میں تجھے اُس کا بڑھاپا دکھاؤں گا۔ تجھل کے اور تمام اڈّے بھی تیرے ہو جائیں گے لیکن تجھے تیری ماں کی قسم ہے، تو بھاگنا مت۔ تجھل پہ چاقو اُٹھانا، ہم میں سے کوئی نہیں بولے گا۔ چل۔" میں نے اُسے دھکیلتے ہوئے کہا۔

"تو بِن بات کی اڑی کر رہا ہے۔" وہ سیدھا کھڑے ہوتے ہوتے بولا۔ "میں کیوں جاؤں؟ تجھل کو آنا ہوتا تو خود آتا۔ تو اُس کے حق میں نہیں بولے گا تو اور کون بولے گا۔ پر میری بات سُن لاڈلے! جھگڑا مت کر۔ میری جگہ تُو ہوتا تو تُو بھی یہی کرتا۔ تجھل کا ٹیم جا چکا ہے۔"

"تجھل کا ٹیم جا چکا ہے اور تُو نے یہ بھی جاننے کی کوشش نہیں کی کہ تیرے ساتھ احسان کرنے والے کا ٹیم کیوں جا رہا ہے۔ تو گدھ کی طرح اُس کے قریب منڈلاتا رہا کہ کب استاد گردن ڈالتا ہے۔ گھوشی! جو کبھی نہیں ہوتا، تُو نے وہ کیا ہے۔ اب تیرا کیا خیال ہے؟ اڈّا واپس کرتا ہے تجھل کو یا مجھے؟ اور سُن لے، اب وہ جامو بھی آ گیا ہے جو اڈّے کی مکھی پہچانتا ہے تو اُسے دو کر دے۔ میں کوئی اور بات سننا نہیں چاہتا۔ تُو نے بُرا کیا ہے۔ جو اپنی غلطی مان لے، وہ بڑا آدمی ہوتا ہے۔ اب بھی کچھ نہیں گیا۔ اڈّا واپس کر دے۔ تجھل کو یہاں آنے کی تکلیف نہ دے۔ تُو خوار ہو گا۔ پانی بھی نہیں ملے گا گھوشی! اب ہم میں سے کوئی تجھ پر چاقو نہیں اُٹھائے گا۔ استاد تجھل ہی تجھ سے نمٹے گا۔"

"تُو کہنا کیا چاہتا ہے؟" وہ تندی سے بولا۔

"تُو سمجھنا نہیں چاہتا ورنہ میری بات بالکل صاف ہے۔ میں تیرے پاس آیا ہوں۔ تجھے سمجھ جانا چاہیے۔ چل میرے ساتھ چل اور استاد سے معافی مانگ لے۔ وہ تجھے معاف نہیں کرے گا لیکن میں اُس سے کہوں گا تو وہ میری بات ٹالے گا بھی نہیں۔ جلدی سے فیصلہ کر لے۔"

کچھ دیر بعد ہم اڈّے پہنچ گئے۔ میری تلاش میں کئی آدمی دوڑ چکے تھے۔ میں نے گھوشی کو تجھل کے سامنے کھڑا کر دیا۔ تجھل نے منہ پھیر لیا۔ "اِسے معاف کر دو تجھل بھائی!" میں نے عاجزی سے کہا۔ "میں اِسے اسی لیے لایا ہوں۔ میری خاطر معاف کر دو۔"

"لاڈلے!" تجھل دہاڑنے لگا۔ "تُو اِس کمینے کے پاس کیوں گیا تھا؟"

"گھوشی سے غلطی ہو گئی تجھل بھائی! غلطی کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ ہم سب اپنی زندگی میں انھی غلطیوں سے دوچار رہتے ہیں۔ تم تو کہتے تھے کہ جو واپس آئے، اُس کے لیے دل کھُلا رکھنا چاہیے۔ گھوشی نے میری بات کا لحاظ کیا کہ میرے ساتھ چلا آیا۔"

"اگر تُو نے اِسے بخش دیا ہے تو پھر مجھ سے کیوں پوچھتا ہے۔" وہ کرب سے بولا۔ "پر تُو ایسی باتیں مت کیا کر۔"

گھوشی نے تیزی سے بڑھ کے تجھل کے پیر پکڑ لیے۔ تجھل بگڑا رہا۔ گھوشی بلبلانے لگا۔ تجھل نے اُس کے گال پہ ایک طمانچہ رسید کیا۔ گھوشی اُس کی چھاتی سے لپٹ گیا۔ "قسمت کا اچھا ہے گھوشی کہ لاڈلے تیرے پاس پہنچ گیا۔ میں جامو کو تیرے پاس بھیجنے ہی والا تھا۔ ذرا شہر والوں کو بھی پتہ چل جاتا کہ استاد جامو کون ہے۔ جامو! اب اِسے تُو ہی سنبھال۔" تجھل نے اُسے ایک ہاتھ سے دھکا دیا۔ دوسری طرف سے جامو نے گھوشی کو بڑھ کے گلے سے لگا لیا۔

دوپہر کو ڈاکیے نے ایک خط تجھل کے سپرد کیا۔ تجھل نے اُسے میرے حوالے کر دیا۔ وہ زرّیں کا خط تھا۔ زرّیں نے تجھل کو آداب و تسلیمات کے بعد اُس کی خیریت پوچھی تھی اور لکھا تھا کہ "میری معرفت ظہیر کے نام بمبئی سے ایک خط آیا ہے۔ میں نے خط کھول کے نہیں دیکھا ہے۔ اسے کسی تاخیر کے بغیر آپ کے پاس بھیج رہی ہوں۔ یہ خط کسی مس جولی نے لکھا ہے۔ یقیناً ظہیر بمبئی میں رہے ہوں گے۔ آپ چاہیں تو اسے کھول لیں۔ شاید ظہیر اس طرف آنے ہی والے ہیں، انھوں نے اسی لیے میرا پتہ دیا ہو گا۔ ممکن ہے وہ کلکتے میں آپ کے پاس پہنچ گئے

…اایسا ہے تو مجھے فوراً مطلع کیجیے اور اُن سے میرا آداب کہیے۔
…بیٹی۔ زریں"

خط کے ساتھ میرے نام ایک لفافہ بھی تھا۔ میں نے جلدی
…پھاڑ کے دیکھا۔ وہ انگریزی میں ایک دو سطری خط تھا، جولین
…سلام کے بعد اُس نے لکھا تھا: "میں یہ تمھیں واپس کر رہی ہوں۔
…کے ساتھ۔ جولین"

جولین نے چیک واپس کر دیا تھا۔ وہ خط بھی اُس کے ہمراہ تھا
…نے وکیل کی ہدایت پر بینک کو لکھا تھا تاکہ جولین کو اپنے اکاؤنٹ
…میں منتقل کرتے ہوئے کوئی پریشانی نہ ہو۔ میں نے دونوں خط
…ریزہ کر دیے اور میرا جی چاہا کہ میں خود کو بھی ریزہ ریزہ کر لوں کاش
…اپنے ہاتھ سے یہ چیک دے کے آتا یا کوئی ایسی ترکیب کرتا
…یہ اُس کے نام منتقل ہو جاتا اور اُسے اطلاع بینک کے ذریعے
…اگر کوئی کسی کی چیز لینے پر تیار نہ ہو تو کون اُسے چپیٹ سکتا ہے۔
…نے نہ جانے کیا سمجھ کے چیک واپس کر دیا۔ اب میں اُسے کس طرح
…سکتا تھا۔ وہ تو اتنی دُور ہو گئی تھی۔

بتھّل وہاں ایک دن اور ٹھہرا۔ اسٹیشن پر نصیب میاں، کانتے
…علی گھوشی اور رجا موجود تھے۔ ہمارے ساتھ بہت مختصر سامان تھا۔
…بستر بند اور ایک سوٹ کیس۔ بتھّل سفید کُرتے پاجامے اور واسکٹ
…میں تھا۔ اُس نے مراد آباد تک کا ٹکٹ خریدا۔ میں نے منع کیا کہ
…آباد جانا بے سود ہے کیونکہ وہاں میں ایک ایک آدمی سے مولوی
…کے بارے میں معلوم کر چکا ہوں مگر بتھّل نے میری بات نہیں سنی۔
…نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا۔ کچھ عجب نہیں تھا کہ اس عرصے میں مولوی
…واپس آ گئے ہوں یا اُن کے کسی عزیز کو اُن کا اتا پتا معلوم ہو گیا
…جیسے جیسے مراد آباد قریب آتا گیا، میرے خون کی گردش تیز ہوتی گئی۔
…دن تین بجے سہ پہر کو ہم مراد آباد اسٹیشن پر اُترے۔ میرے پاؤں اکٹ
…تھے۔ اسٹیشن کے سامنے ہی مسافر خانہ تھا۔ بتھّل ساتھ نہ ہوتا تو میں
…سے سیدھا مولوی صاحب کے محلّے کی طرف نکل پڑتا۔ بتھّل کو شیو
…اور کپڑے تبدیل کرنے میں دیر لگ گئی۔ میں نے یہ کام منٹوں
…کر لیا۔ چائے میں اور وقت لگ گیا۔ مسافر خانے کے باہر ہی تانگوں
…ایک قطار کھڑی تھی۔ ہم دونوں پہلے تانگے میں بیٹھ گئے۔ اسٹیشن سے
…گنج کا راستہ دو ڈھائی میل کے قریب ہو گا۔ دوپہر کے سینما چھوٹے
…اس لیے اسٹیشن روڈ کی سڑک پر خاصی بھیڑ تھی۔ مغرب کی اذان
…وقت ہم نیض گنج میں داخل ہوئے۔ مجھے وہ گلی اچھی طرح یاد تھی
…مولوی شفیق رہتے تھے۔ گلی میں اندھیرا ہو گیا تھا۔ میونسپلٹی کا بتی والا آدمی
…پر چڑھ کے بتی جلا رہا تھا۔ مولوی شفیق کے مکان میں دھیمی روشنی ہو
…بتھّل نے میرا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ میرے اشارے پر اُس نے دروازے

پہ دستک دی۔ میں نے زور سے آنکھیں بند کر لیں۔ اندر سے ایک ادھیڑ عمر آدمی برآمد ہوا۔ مولوی صاحب وہاں نہیں تھے۔ وہ بھلا کیوں ہوتے۔ اُس مکان کے بعد ہم نے کئی مکانوں پر دستکیں دیں۔ ہر جگہ سے ایک ہی جواب ملا۔ اُن کے اعزا مولوی صاحب کو تقریباً فراموش کر چکے تھے۔ رات کو دس بجے ہم مسافر خانے واپس آ گئے اور صبح ہوتے ہی پھر نکل کھڑے ہوئے۔ ہم نے شاہی بازار میں برتنوں کی مختلف دُکانوں پر بھی مولوی صاحب کے متعلق معلوم کیا۔ مدرسۂ امدادیہ جامعۂ قاسمیہ اور مراد آباد کے تمام بڑے مدرسوں میں جا جا کے پوچھا۔ تین دن تک ہم اسی طرح کوچے کوچے پھرتے رہے۔ مولوی صاحب کی عادتیں، اُن کے مشاغل اور اُن کے مزاج وغیرہ کے بارے میں تو بہت کچھ معلوم ہو گیا لیکن کسی شخص نے پلٹ کے اُن کی خبر نہیں لی کہ وہ اچانک کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ برتنوں کی کچھ دُکانوں سے کئی شہروں کے دُکان داروں کے پتے ضرور معلوم ہو گئے جہاں سے مولوی صاحب برتنوں کے آرڈر بک کرتے تھے۔ بتھّل نے ایک سادہ کاپی اور قلم خرید کے مجھے دے دیا تھا۔ کوئی خاص بات ہوتی تو وہ مجھے نوٹ کرنے کا اشارہ کر دیتا۔

مراد آباد سے چلتے ہوئے میں نے بتھّل سے کچھ روپے لے کے ارجمند بیگم کی بیٹی فرخ کے لیے مٹھائی اور دیگر چیزیں خریدیں لیکن میں راستے ہی سے لوٹ آیا کہ پتہ نہیں ارجمند بیگم کس حال میں ہو۔ اب تو وہ مجھے بھول بھی گئی ہو گی اور بھول گئی ہو گی تو بھولے ہی رہنے دیا جائے۔ جتنے کم آدمیوں سے ملا جائے، اتنا ہی اچھا ہے۔ میں نے مٹھائی مسافر خانے کے باہر کھڑے ہوئے فقیروں کو دے دی اور فرخ کے کھلونے بھی انھی میں تقسیم کر دیے۔ سلامت کو ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔ بتھّل کا خیال تھا کہ اب مولوی صاحب کو اُن علاقوں میں تلاش کیا جائے جو بستی سے دُور ہیں۔ مولوی صاحب کو کورا نے تمام باتیں بتا دی ہوں گی اس لیے وہ اُسے لے کے کسی ایسی جگہ منتقل ہوئے ہوں گے جہاں اُن کے کسی جاننے والے کے پہنچنے کا امکان نہ ہو اور جہاں کورا اپنی تلاش میں پھرنے والے تبت کے لوگوں سے بھی دُور رہے۔ ہم دلّی آ گئے اور دلّی سے مدراس جانے والی ریل میں بیٹھ گئے۔ بتھّل سے جرح کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ مولوی صاحب کہیں بھی ہو سکتے تھے۔ مدراس شہر میں میں نے بھی مولوی صاحب کو تلاش کیا تھا مگر بتھّل نے چند مفروضے بنا لیے تھے۔ اُس کا خیال یہ بھی تھا کہ مولوی صاحب نہ کسی گاؤں میں ہوں گے نہ کسی بڑے شہر میں۔ وہ ایک اوسط درجے کے شہر میں ہو سکتے ہیں۔ اگر وہ کسی بڑے شہر میں ہوتے تو مراد آباد کے کسی شخص کو اس مدت میں ضرور دکھائی دیتے کیونکہ برتنوں کی تجارت کے سلسلے میں مراد آباد کے لوگ ہندوستان کے تقریباً تمام شہروں میں جاتے ہیں۔ مولوی صاحب کے پاس کوئی خزانہ نہیں تھا اس لیے انھوں نے اپنی گزر بسر کے لیے کوئی نہ کوئی صورت ضرور اختیار کی ہو گی اور کورا کی حفاظت کی وجہ سے

وہ کوئی بڑا کاروبار بھی نہیں کر سکے ہوں گے نیز انھوں نے محنت مزدوری کا پیشہ بھی نہیں اپنایا ہو گا کیونکہ یہ اُن کی عمر اور مزاج کے خلاف ہے وہ کوئی بُردبارانہ اور سنجیدہ کام کرتے ہوں گے مثلاً کسی مدرسے میں پڑھاتے ہوں گے، کسی مسجد میں امام ہوں گے اور اُن کی کوئی چھوٹی موٹی دُکان بھی ہو سکتی ہے یا وہ کمیشن ایجنٹی کا کام کر رہے ہوں گے۔ بتھّل پہلے انھیں جنوبی ہند کے تمام چھوٹے شہروں میں تلاش کرنا چاہتا تھا۔ مدراس اُس کی منزل نہیں تھی۔

ہم دو مہینے تک مدراس، ٹراونکور، کوچین، میسور، بنگلور اور آس پاس کے تمام شہروں میں گھومتے رہے۔ چند شہر چھوڑ کے باقی میں مسلمانوں کی آبادی نہ ہونے کی برابر تھی۔ یہاں جتنے مدرسے تھے، مسجدیں تھیں اور مسلمانوں کے دوسرے ادارے تھے۔ وہ سب ہم نے دیکھ لیے تھے۔ ہر قسم کے تاجر سے بھی بات کر لی تھی۔ میسور سے ہم اوراوپہ آ گئے۔ کرنول، رائے چور، ادونی، گلبرگہ، بیدر، نظام آباد، اورنگ آباد، سکندر آباد وغیرہ سے گزرتے ہوئے ہم تیسرے مہینے حیدر آباد دکن پہنچ گئے۔ جنوبی ہند کی شاید ہی کوئی چھوٹی بڑی بستی رہ گئی ہو جہاں ہم نہ گئے ہوں۔ ان شہروں میں ابا جان کا بھی کوئی پتہ نہ چلا۔ اتنے طویل سفر کے بعد بھی بتھّل کے چہرے پر تھکن نہیں تھی۔ میں نے اُس سے کئی بار کہا بھی کہ وہ کہاں تک اُن کھوئے ہوئے لوگوں کی تلاش میں دوڑ دھوپ کرے گا۔ وہ واپس چلا جائے مگر بتھّل نے ہر بار سبھی مجھے جھڑک دیا۔ پھر میں نے کہنا ہی بند کر دیا۔

راستے میں ہمیں طرح طرح کے واقعات پیش آئے۔ بنگلور میں ہمارا بستر بند چوری ہو گیا، کئی جگہ لوگوں نے ہماری جیب کاٹنے کی کوشش کی، ہمیں غلط راستوں پر ڈال دیا گیا، کالج کے طلبہ کے ایک گروہ نے جو پکنک منانے حیدر آباد جا رہا تھا، ریل میں بتھّل کا مذاق اُڑایا اور اُسے سیٹ سے اُٹھا دیا غرض چاقو نکالنے کی ضرورت کئی جگہ پیش آئی مگر بتھّل تو جیسے چاقو اپنے ساتھ لایا ہی نہیں تھا۔ وہ اڈّوں اور پاڑوں سے دُور دُور رہا۔

میں حیدر آباد پہلے بھی آ چکا تھا لیکن جب ہم اس طرف آ ہی نکلے تھے تو ایک بار پھر قسمت آزما لینے میں کیا حرج تھا۔ حیدر آباد خاصا بڑا شہر اور مسلمانوں کا مرکز تھا۔ بتھّل کسی شہر میں داخل ہوتے ہی جس انداز سے انھیں ڈھونڈتا تھا۔ اُس سے ہر جگہ اُمید کی ایک کرن نظر آتی تھی۔ یہ بات تو اب بالکل طے ہو گئی تھی کہ حیدر آباد سے نیچے جنوبی ہند کے تمام علاقے میں مولوی صاحب اور ابا جان ابھی نہیں گئے۔ ہم نے جگہ جگہ لوگوں کو زریں کا پتہ بھی دے دیا تھا کہ اگر انھیں کوئی ایسا شخص نظر آئے تو وہ فوراً مطلع کریں۔ پتے کے ساتھ ہم نے ٹکٹ لگے ہوئے لفافے بھی کثیر تعداد میں تقسیم کیے تھے۔ حیدر آباد میں ہمیں قیام کیے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ پہلے مرحلے میں ہم نے تمام مدرسے، لائبریریاں اور خانقاہیں دیکھ لی تھیں۔ حیدر آباد

کے نواح میں گولکنڈا کا علاقہ، حسین ساگر اور قطب شاہی مزارات کے قریب کی تمام مسجدوں میں بھی جا کے پوچھ لیا تھا۔ فلک نما کی جاڈشوں کی بستی میں بھی احتیاطاً ہو آئے تھے۔ اب صرف دُکانیں اور بازار دیکھنے تھے۔ اُس دن شام کو ہم چار مینار سے شاہ گنج کی طرف جا رہے تھے۔ یہاں عموماً چھوٹی دُکانیں تھیں۔ ہر دس بارہ دُکانوں میں سے کسی دُکان پر رُک کے ہم انھیں پوچھ لیتے۔ بتھّل ایک بازار کی مختلف قسم کی دُکانیں منتخب کرتا تھا۔ مثلاً چمڑے کی کوئی دُکان، برتنوں کی، جنرل مرچنٹ کی کوئی دُکان مولوی صاحب کسی بھی قسم کا کاروبار کرتے ہوں، اُس سے متعلقہ دُکان داروں سے اُن کا رابطہ ضرور ہونا چاہیے تھا۔ ہم دُور کھڑے انتظار کرتے رہتے کہ گاہک ہٹیں تو ہم دُکان پر پہنچیں۔ بعض اوقات بہت دیر ہو جاتی تھی۔ پھر ہمیں کوئی معمولی چیز خریدنے کے بہانے دُکان دار سے بات کرنے کا طریقہ اختیار کرنا پڑتا تھا۔ بعض دُکان دار ہماری پوری بات ہی نہیں سنتے تھے جیسے ہم اُن کے پاس بھیک مانگنے آئے ہوں۔ وہ بیزاری سے کہتے تھے کہ بابا! گراہکی کا ٹائم ہے، سوختے کے وقت آؤ۔ البتہ بعض دُکان دار بہت شرافت سے پیش آتے تھے۔ بتھّل ایک بازار میں ایک قسم کی کم از کم دو دُکانوں پر ضرور جاتا تھا۔

ہم نے شاہ گنج کا بازار تقریباً سارے کا سارا دیکھ لیا تھا۔ وہاں سے ہم طوائفوں کے بازار محبوب کی مہندی آ گئے۔ جب ہم ایک بالا خانے کے نیچے سے گزر رہے تھے تو آگے ہمیں شور سنائی دیا۔ گل فروشوں کی ایک دُکان کے سامنے بھیڑ لگی ہوئی تھی اور چیخ پکار مچی ہوئی تھی۔ لوگ اُچک اُچک کر ہجوم کے درمیان دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہم ایسے ہجوموں پر ہمیشہ ایک سرسری نظر ڈال لیتے تھے۔ چاہے وہ مداری کا تماشا ہو رہا ہو یا لڑائی جھگڑا۔ ہم وہاں پہنچے تو مار پٹائی ہو رہی تھی۔ وہ دو نوجوان لڑکے تھے۔ ایک کی عمر تو بہت کم تھی، یہی کوئی پندرہ سولہ کا ہو گا۔ دوسرا اکیس کا ہو گا۔ دونوں ایک دوسرے سے گتھے ہوئے تھے۔ اُن کی زبانوں سے گالیاں بھی جاری تھیں۔ لوگوں نے جھجکتے جھجکتے بیچ بچاؤ کی کوشش کی مگر جب انھیں ناکامی ہوئی تو وہ تماشا دیکھنے لگے۔ چھوٹے لڑکے کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اُس نے بڑے لڑکے کے بال پکڑ رکھے تھے اور بڑا لڑکا اُس کے پیٹ میں لات مار رہا تھا۔ ہجوم کو ایک نظر دیکھنے کے بعد بتھّل نے مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا لیکن میرے قدم وہیں جم گئے تھے، پتھر کے ہو گئے تھے، میری آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔

چھوٹا لڑکا جہاں گیر تھا۔ میں اُس کا چہرہ کیسے بھول سکتا تھا، وہ میرا چھوٹا بھائی تھا۔

میں نے بتھّل کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور جھپٹ کے درمیان میں کود پڑا۔

تہانگیر کی پیشانی سے خون چھوٹ رہا تھا اور اُس کی آنکھیں
بند ہوئی جا رہی تھیں۔ مجھے اپنی طرف بڑھتا
دیکھ کے لڑکا چیخا۔ وہ درمیان میں دخل نہ دینے کی تلقین کر رہا تھا
ن اُس کی بات پوری ہونے سے پیشتر ہی میں نے اُس کے کولھے
ھوکر مار دی تھی۔ میں جہاں گیر کو اگر کھینچ کر اُس سے علیحدہ کرتا تو لڑکا
ں دوران میں اُسے دو چار ضربیں اور لگا دیتا۔ جہاں گیر مزید ضربوں کا
مل معلوم نہیں ہوتا تھا اس لیے میں نے جاتے ہی اُسے جہاں گیر
ے دُور کرنے کی کوشش کی۔ وہ دونوں ایک ساتھ زمین پر گر گئے۔
اں گیر بھی اُس کی جھونک میں زمین پر آ گیا تھا کیونکہ اُس نے ابھی تک
ے کے بال نہیں چھوڑے تھے۔ میں نے اُس کی گردن پکڑ کے
ھینچا تو اُسے بال چھوڑنے پڑے۔ میں اُسے لے کے جلد سے
لد بھیڑ سے دُور ہو جانا چاہتا تھا مگر لڑکے نے ایک لمحے میں پھرتی
ے اُٹھ کے میری کمر پہ پوری طاقت سے سر مار دیا۔ اگر سامنے ہجوم نہ ہوتا
یں اوندھے منہ سڑک پر جا گرتا۔ لوگوں نے مجھے سنبھال لیا۔ ہر شخص اپنی
ولی بول رہا تھا۔ "بس کر، بس کر، جانے دے مولے!" ایک طرف سے کسی
وڑھے کی پھٹی ہوئی آواز گونجی۔

لڑکے کا نام مولا تھا۔ ہجوم میں بہت سے لوگ اُسے جانتے تھے۔
وہ بار بار اُس کا نام لے کے اُسے سمجھانے بجھانے کے لیے آوازیں لگا
ہے تھے مگر کسی نے اُس کا ہاتھ نہیں پکڑا۔ مولا نہیں مانا۔ مجھے ڈر تھا
کہ جہاں گیر نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے یا معاملہ بڑھتا ہوا دیکھ کے فرار
ہونے کی کوشش نہ کرے۔ میں نے بہت احتیاط کی تھی۔ یہ شارعِ عام
ں اور علاقہ بھی بالاخانوں کا تھا۔ مولا کے کچھ اور ساتھی بھی وہاں موجود
ہو سکتے تھے لیکن مولا کے لیے میری ضرب ناکافی ثابت ہوئی۔ جہاں گیر
ں پیشانی سے خون ابل رہا تھا۔ میری آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں۔ مجھے سامنے
ں چیزیں صاف نظر نہیں آ رہی تھیں۔ مولا دہاڑتا ہوا دوبارہ میرے پیچھے
پکا اور اُس نے پشت سے میری واسکٹ پکڑ لی۔ میں نے جہاں گیر پر
پنی گرفت قائم رکھی تھی۔ وہ مسلسل مجھ سے خود کو چھڑانے کی تگ و دو کر رہا
تھا۔ اُس کا ہاتھ تھامے تھامے میں نے مولا سے نمٹنے کا فیصلہ کیا۔ اس
اثنا میں تجمل بھی، ہجوم چیر کے آگے آ چکا تھا اور خاموش کھڑا تھا۔ میں
نے جہاں گیر کو اُس کی طرف دھکیل دیا پھر پلٹ کے قدم بڑھاتے کہ مولا
کو کمر سے پکڑ کے زمین پہ پٹخ دوں مگر تجمل میرے اور اُس کے درمیان
لیا۔ اُس نے دوسرے ہاتھ سے میرا بازو جکڑ لیا۔ مولا نے دیوانہ وار تجمل
کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا اور کچھ دیکھے بغیر وحشت زدہ انداز میں اُس
کی ٹھوڑی پر مکا مارا۔ وہ بُری طرح گالیاں بک رہا تھا۔ تجمل نے حرکت
نہیں کی۔ وہ مجھے اور جہاں گیر کو اپنی آڑ میں لیے ہوئے جما کھڑا رہا۔ مولا
نے تجمل کے سینے پر پے در پے گھونسے مارے۔ "اِسے چھوڑ دے

چاچا!" اُس نے چلا کے کہا۔ "اس رنڈی کے جنے کو چھوڑ دے۔" میرے
کانوں میں آگ بھڑک اُٹھی۔ میں تجمل کے ہاتھ سے اپنا بازو چھڑا کے
اُس کی طرف جھپٹا مگر تجمل نے ٹانگ مار کے مجھے زمین پر گرا دیا اور
دوبارہ پکڑ کے جھڑکنے لگا۔ مولا خود ہی اچانک رُک گیا۔ وہ تجمل کو چند
ہی گھونسے مار سکا۔ اُسے شاید تجمل کا چہرہ دیکھنے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ
پیچھے ہٹ گیا۔ اُس کے پیچھے ہٹتے ہی، ہجوم میں سے بہت سے لوگ
ہماری جانب بڑھے۔ بعض نے جہاں گیر کی پیشانی صاف کرنی چاہی مگر
تجمل نے انھیں روک دیا اور جہاں گیر کا ماتھا اپنے دامن سے خشک کیا۔
تجمل جہاں گیر کی طرف متوجہ تھا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد ہی میں نے
مولا کی تلاش شروع کر دی۔ مجھے ذرا سی دیر ہو گئی۔ مولا فرار ہو چکا تھا۔

اُوپر بالاخانوں پر کھڑی ہوئی عورتوں میں سے کسی نے کپڑا
پھینک دیا تھا۔ تجمل نے اپنے ہاتھ سے جہاں گیر کے پٹی باندھی۔ آگے
کچھ دُور نکڑ پہ ایک انگریزی شفاخانہ تھا۔ ہمارے ساتھ کئی آدمی چلے۔
پھر ابھی کمپونڈر جہاں گیر کی مرہم پٹی کر رہا تھا کہ ایک بُرقع پوش عورت
بے تابی سے مطب میں داخل ہوئی اور نقاب اُلٹ کے جہاں گیر سے
لپٹ گئی۔ "یہ کیا ہو گیا رجو!" وہ ہذیانی انداز میں بولی۔

وہ اکیلی نہیں تھی۔ ڈاکٹر کے اشارے پر اُس کے ساتھ آنے
والے دونوں آدمیوں نے اُسے جہاں گیر سے جُدا کیا۔ دونوں آدمیوں
کی وضع قطع سے اُن کے پیشے کا صاف پتہ چلتا تھا۔ میرا دل ڈوبنے
لگا۔ میں نے غور سے عورت کو دیکھا مگر وہ فرخ، فریال یا فارہ میں
سے کوئی نہیں تھی۔ وہ ادھیڑ عمر کی ایک گوری چٹی عورت تھی۔ اُس کا
ناک نقشہ ترشا ہوا تھا۔ میں نے ذہن پر بہت زور دیا مگر خاندان کی کوئی
ایسی عورت میرے ذہن میں محفوظ نہیں تھی۔ وہ جہاں گیر کو رجو کے
نام سے مخاطب کر رہی تھی۔ یک بارگی خیال آیا کہ کہیں مجھے دھوکا تو
نہیں ہوا ہے مگر اتنا بڑا دھوکا میری آنکھیں نہیں کھا سکتی تھیں۔ وہ
یقیناً جہاں گیر تھا۔ میرا چھوٹا بھائی، جب میں گھر سے نکلا تھا تو اُس کی
عمر آٹھ نو سال سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ اُسی کا چہرہ تھا۔ اب وہ بڑا ہو گیا
تھا۔ سولہ سترہ سال کا دُبلا پتلا لمبا سا لڑکا۔ اُس کا قد میری طرح اُٹھ رہا
تھا لیکن اُس کی آنکھیں ابھی تک کچی کچی تھیں۔ وہ پٹ پٹاتی نظروں سے
ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ عورت اُس کے برابر تپائی پر بیٹھی ہوئی اُس کے
کپڑوں سے گرد جھاڑ رہی تھی اور شکایت کر رہی تھی کہ وہ اُسے اطلاع
دیے بغیر گھر سے کیوں نکلا۔ "میں مولا اور اُس کے حمایتیوں کو دیکھ لوں گی۔
دیکھ لینا، وہ پھر کبھی اس گلی میں نظر نہیں آئیں گے۔" وہ بلند آواز سے
کہہ رہی تھی۔ "وہ مجھے نہیں جانتا ہے رجو! میں نواب بہادر سے کہہ دوں تو
عمر بھر جیل میں سڑتا رہے۔ تم... تم نے اُس بدمعاش کی بات پر کان
ہی کیوں دھرے تھے۔ تم راستہ بدل دیتے یا سر جھکائے چلے آتے۔"

"وہ خود ہی میرے سامنے آ گیا۔" جہاں گیر نے شکستہ آواز میں کہا۔
"خیر، اب کے وہ بچ کے نہیں جائے گا۔" عورت غصّے سے بولی۔
میرا سر گھوم رہا تھا۔ جہاں گیر کے ماتھے پر پتھر کا کوئی کونا لگ
گیا تھا اور زخم کی گچی بن گئی تھی۔ کمپونڈر مرہم پٹی سے فارغ ہو گیا تو
عورت نے ریشمی رومال میں بندھے ہوئے پیسے نکالے مگر تجمل ڈاکٹر
کو پہلے ہی فیس ادا کر چکا تھا۔ عورت کی آنکھیں ممنونیت سے چمکنے لگیں۔
جہاں گیر نے سرگوشی میں اُسے بتا دیا تھا کہ ہمی دونوں نے درمیان میں
پڑ کے معاملہ رفع دفع کرایا ہے۔ عورت نے دبے دبے لفظوں میں ہمارا
شکریہ ادا کیا۔ جب وہ جہاں گیر کو اپنے ساتھ لے جانے لگی تو میں نے
تجمل کی طرف نظر کی۔ تجمل نے آنکھیں میچ لیں۔ چلتے وقت جہاں گیر
نے ہم دونوں کو سلام کرنے کے لیے ہاتھ اُٹھایا۔ میں اُسے گھورتا رہا۔
مطب کے اندر کئی مریض موجود تھے اور باہر ابھی تک گلی کے چند
لڑکے کھڑے تھے۔ گلی میں آتے ہی عورت نے نقاب ڈال لیا اور
اپنے دونوں آدمیوں کے ساتھ ایک طرف چل دی۔ جب وہ کچھ آگے
بڑھ گئی تو ہم بھی کچھ فاصلے سے اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ میرے
قدم ڈگمگا رہے تھے۔ گلی میں خاصی چہل پہل تھی۔ تجمل ساتھ نہ ہوتا تو
میں جہاں گیر کو عورت کے ہاتھ سے ضرور چھین لیتا۔ کچھ دُور جا کے
جہاں گیر نے پیچھے مڑ کے دیکھا اور عورت کو کوئی اشارہ کیا۔ عورت نے
تیزی سے گردن گھمائی۔ پیچھے ہم آ رہے تھے۔ اُس کی چال میں ذرا سی
لرزش پیدا ہوئی مگر وہ جلد ہی سنبھل کے نپے تلے قدموں سے آگے
بڑھتی رہی۔ اس کے بعد اُن میں سے کسی نے منہ پھیر کے ہمیں دیکھنے
کی ضرورت نہیں سمجھی۔ "کیا یہ وہی ہے؟" تجمل نے آہستگی سے پوچھا۔
"ہاں وہی۔" میں نے بے چینی سے کہا۔ "وہ جہاں گیر ہے مگر
اُس کے ساتھ جو عورت ہے اُسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

وہ چپ ہو گیا۔ عورت دوسری گلی میں مڑ گئی، ہم نے اپنی رفتار
تیز کر دی۔ اس علاقے میں چھوٹے بڑے، نئے پُرانے دو دو تین تین
منزلہ مکانات تھے۔ جس گلی میں عورت داخل ہوئی تھی، وہ زیادہ بڑی
نہیں تھی۔ ہمارا اور اُس کا فاصلہ بھی کم ہو گیا تھا۔ کوئی دو سو قدم چلنے
کے بعد وہ ایک حویلی نما مکان کے پاس جا کے ٹھیر گئی۔ مکان کا رنگ و
روغن تازہ تھا۔ اُوپر کی دونوں منزلوں پر شہ نشینیں بنی ہوئی تھیں۔ مکان
کے آس پاس بھی کئی مکانات تھے جو تقریباً ایک ہی طرز کے تھے مگر
گلی میں اُس سے نمایاں کوئی اور مکان نہیں تھا۔ ہم دُور ہی سے دروازہ
دیکھ کے دوسری طرف نکل گئے۔ تجمل نے میری انگلیوں میں اپنی انگلیاں
پھنسا رکھی تھیں۔ میرے ہاتھ سرد پڑے ہوئے تھے۔ تجمل مڑ کے پھر
چوڑی گلی میں آ گیا اور جدھر جہاں گیر کو ہم نے پہلی بار مولا سے دست
بہ گریباں دیکھا تھا، اُس جگہ سے نزدیک ایک تنگ ہوٹل میں آ بیٹھا۔

ہوٹل ایک دکان میں واقع تھا۔ بیٹھنے کے لیے اِدھر اُدھر تپائیاں
پڑی ہوئی تھیں۔ دیواریں کالی تھیں۔ دیگوں کے پاس بیٹھے ہوئے
ہوٹل کے آدمی نے ہمیں پہچان لیا اور مسکراہٹ کے ساتھ ہمارا
استقبال کرتے ہوئے بیرے کو میز صاف کرنے کا حکم دیا۔ ہماری آمد پر
ہوٹل میں بیٹھے ہوئے کئی لوگوں کی نگاہیں ہماری جانب اُٹھنے لگیں۔
ممکن ہے اُن میں سے بعض نے ہمیں کچھ دیر پہلے دیکھا ہو۔ "تم یہاں
کیوں آ گئے؟" میں نے دہشت سے پوچھا۔

"ذرا دیر ٹھیرو۔" وہ درشتی سے بولا۔

"کہیں وہ پھر نہ نکل جائے۔"

"نہیں۔" تجمل اپنی انگلیاں چٹخاتے ہوئے بولا۔ "اتنی جلدی نہیں۔"

"تم نے اُس عورت سے بات کیوں نہیں کی؟" میں نے
مضطرب لہجے میں کہا۔

"لاڈلے! وہ تنک کے بولا۔ "چین سے بیٹھا رہ۔"

شاید تجمل کو میرے یقین پر شبہ تھا۔ آٹھ سال سے زیادہ
ہو گئے تھے لیکن گھر کے ایک ایک آدمی کا چہرہ میری آنکھوں میں
نقش تھا۔ میرے توجہرے ہی میں بہت بڑی تبدیلی ہو گئی ہو گی اسی لیے
جہاں گیر مجھے نہیں پہچانا۔ ہر شخص کا جتنا زمانہ میں نے اُسے دیکھتے ہوئے گزارا
تھا، اتنا وقت اُسے نہیں ملا تھا۔ وہ مجھے بھول سکتا تھا مگر میں اُسے کیسے
بھول جاتا۔ یہ وہی جہاں گیر تھا جس کے کپڑے گندے ہو جاتے تھے تو میں
انھیں بدل دیتا تھا۔ میں اکثر اُسے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتا تھا۔ وہ
روز مجھے اپنا سبق سُناتا تھا۔ جب بھی گلی میں نکل جاتا تو میں اُس کے کان
پکڑ کے اُسے گھر واپس لاتا۔ وہ مجھ سے روٹھ جاتا تھا۔ امّی سے روز روز کے
میری سختیوں کی شکایت کرتا تھا۔ جب کورا گھر میں آئی تھی تو وہ بہت خوش
خوش تھا۔ ہر وقت اُسی کے گرد منڈلاتا رہتا تھا۔ مجھے یاد آیا، اُس نے امّی
سے کہا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے کورا کو اپنے گھر میں روک لے۔ اُس نے
کورا کو گڑیا باجی کا لقب دیا تھا۔ کبھی کبھی وہ اتنی ذہانت کی باتیں کرتا تھا
کہ امّی اور ابّا جان دنگ رہ جاتے تھے۔ اُسے یہاں اِس بازار میں دیکھ کے
میرے ذہن میں ہر لمحے ایک نیا وسوسہ اُٹھ رہا تھا۔ تجمل کو علم نہیں تھا کہ مجھے
ایک ایک پل کاٹنا دوبھر ہو رہا ہے۔ بیرا بالائی سے بھری ہوئی چائے کی
پیالیاں میز پر رکھ گیا۔ میرا جی چاہا کہ میں پیالی تجمل کے منہ پر مار دوں۔ اُسے
اس وقت چائے کی طلب ہو رہی تھی۔

تجمل نے مجھ سے چائے پینے کے لیے اصرار نہیں کیا۔ میری چائے
رکھے رکھے ٹھنڈی ہو گئی۔ تجمل نے دو تین گھونٹوں میں پیالی حلق میں انڈیل
لی تھی۔ ابھی ہمیں بیٹھے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ سامنے کی تپائی سے
ایک شخص سر کھجاتا، جھجکتا ہوا ہمارے پاس آیا۔ "کیا پردیسی ہو حضت؟" اُس
نے لفظ چباتے ہوئے کہا۔ تجمل نے اثبات میں سر ہلایا

"اپن نے پہلے ہی جان لیا تھا کہ پردیسی سیّاں ہو۔" وہ تیزی سے بولا: "لڑکا بالو کو بچا لیا حضت! مولا بے ہوش کر کے دم لیتا۔ اِدھر کسی میں اتنا زور نہیں تھا کہ کبیرے شاہ کے مرغے پر ہاتھ ڈالتا۔ رجّو کی قسمت اچھی تھی کہ آپ لوگ وقت پر پہنچ گئے۔ ایک بات بولیں؟" وہ اپنا چہرہ ہمارے قریب کرتے ہوئے سرگوشی میں بولا: "آزو بازو سے ہوشیار رہنا، مولا نے کبیرے شاہ سے جا کے بولا ہوگا۔ بھروسا نہیں کہ کبیرا کلدار سمجھ کے جیب میں بٹھا لے ہے۔"

"تمھارا کیا مطلب ہے؟" تجمل نے بھاری آواز میں کہا۔

"کام کی بات بولتا ہوں سرکار! چکر میں اِدھر آ کے پھنس گیا ہوں۔ بیس سال اِدھر مغز مارتے ہوئے ہو گیا۔ یہ زمین سُسرا پاؤں سے چپک گیا ہے۔ مطلب صاف ہے۔ اس طرف ناگ پوری سانپ کبیرے شاہ کا سکہ چلتا ہے۔ حالی بھی نہیں چلتا، کلدار بھی نہیں چلتا۔" وہ اِدھر اُدھر دیکھ کے ہنس کر بولا۔ حیدرآباد میں ریاستی سکّوں کو حالی اور انگریزی چھاپ کے سکّوں کو کلدار کہتے تھے۔ دونوں سکّے ایک ساتھ رائج تھے۔ ہمیں کلدار کہنے سے اُس کی مراد تھی کہ ہم ریاست سے باہر کے لوگ ہیں۔

"اور یہ لڑکا کون تھا؟" تجمل نے تلخی سے پوچھا۔

"یہ رجّو تھا۔ رجّو نواب زادہ، سُریلی خانم کا بیٹا۔"

"سُریلی خانم! نواب زادہ!" تجمل الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ہاں سُریلی خانم!" وہ اشتیاق سے بولا: "خانم کا نام اب سُریلی خانم ہی پڑ گیا ہے۔ وہ کوئل کی طرح کوکتی ہے۔ نواب عالم نواب بہادر نے اُسے سُریلی خانم کا خطاب دیا تو یہی نام پڑ گیا۔ اب بس قسمت والوں ہی کو سُریلی کے گلے کا جادو دیکھنے کو ملتا ہے۔"

"کیوں؟ کیا وہ محفل نہیں سجاتی؟"

"ہے ہے۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کے سرد آہ بھرتے ہوئے بولا۔ "جب سے اُس نے گانا بند کیا ہے، اِدھر بازار آدھا رہ گیا ہے۔ اب وہ صرف دربار سرکار میں جا کے گاتی ہے۔ میں کیا بولوں، ایک زمانہ تھا کہ دُور دُور سے لوگ اُس کا جلوہ دیکھنے اور اُس کی آواز کی شراب پینے آتے تھے۔ خانم نے کئی سال ہوئے اپنی دکان بند کر لی ہے۔ ایسی چلمن ڈالی ہے کہ لوگ دیدار تک کو ترس جاتے ہیں۔ اب تو صرف ٹھمرا تاڑی ہی رہ گیا ہے۔ خیر اب بھی لوگ ہیں۔" وہ کسمسا کے بولا: "بازار کبھی بند نہیں ہوتا۔ اس پنجرے میں روز نیا نیا پنچھی آتا ہے۔ ابھی بولو حضت! کہیں چلنا ہے؟" وہ زیرِ لب مسکراہٹ سے بولا: "آج کل تو بازار میں رونق آئی ہوئی ہے۔ کل ہی بنارس سے ایک نئی مینا آئی ہے۔"

"کیا یہ لڑکا رجّو، خانم کا بیٹا ہے؟"

تجمل کے استفسار پر اُس نے منہ بنایا: "لوگ ایسا ہی بولتے ہیں سُریلی خانم بھی اُسے بیٹا ہی کہتی ہے۔ ابھی کوئی ڈیڑھ سال ہوتے، بازار کے لوگوں نے اس لڑکے کو خانم کے ساتھ دیکھا تھا۔ ہوگا کسی نواب ہی کے نطفے سے۔ سُریلی نواب سے کم کسی آدمی کو گھاس نہیں ڈالتی... صورت شکل سے بھی رجّو نواب زادہ لگتا ہے۔ بچّو کی ناک ٹیڑھی ہی رہتی ہے۔ کسی سے ملتا جلتا نہیں۔ زیادہ تر گھر میں پڑا رہتا ہے۔ خانم نے اُسے پڑھانے لکھانے کا بھی گھر ہی پہ انتظام کیا ہے۔ صبح ایک مولوی اور شام کو پتلون کوٹ پہنے ہوئے ایک عیسائی ماسٹر آتا ہے۔ عرصے سے خانم مہینوں مہینوں کے لیے بڑے بڑے راجوں مہاراجوں نوابوں کے بلاوے پر گانے کے لیے جاتی رہی ہے۔ وہیں کسی نواب سے آشنائی ہو گئی ہوگی۔ لوگ بولتے ہیں کہ سُریلی نے اُسے اپنی ماں کے پاس بھوپال میں رکھا ہوا تھا۔ ماں مر گئی تو لڑکے کو پھر اِدھر اپنے پاس لے آئی۔ پہلے چھپاتی تھی۔ اب اُسے چھپانے کی ضرورت نہیں، نواب بہادر کے ہاں سے اُسے اتنا مل جاتا ہے کہ کئی پشتیں چلا سکتی ہے۔ کچھ چڑی مار یہ بھی بولتے ہیں کہ خانم کی جاتی جوانی نے انگڑائی لی ہے۔ لڑکے کو تیار کر رہی ہے۔ اندر کا حال نیلی چھتری والا جانتا ہے۔ لڑکے کی اٹھان..."

"بس کرو۔" تجمل نے ترشی سے اُس کی بات کاٹ دی۔

"کیا حضت!" وہ ناگواری سے بولا: "آپ ہی کی بات کا جواب بول رہا تھا۔"

"کیا خانم اکیلی رہتی ہے؟" میں نے اضطراب سے پوچھا۔

لیکن تجمل اُس کا جواب سننے سے پہلے ہی اُٹھ گیا تھا۔ اُس نے کرتے کے اندر بنڈی کی جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کے اُس شخص کی ہتھیلی پر رکھ دیا اور مٹھی بند کر دی۔ وہ آدمی تیزی سے پلکیں جھپکانے لگا۔ اُس نے جھک کے دو مرتبہ ہمیں سلام کیا۔ ہم ہوٹل سے باہر آ گئے تو وہ بھی تیزی کے ساتھ چبوترے سے کود گیا: "کہیں چلیے گا نہیں؟" وہ تذبذب سے بولا۔

"نہیں۔" تجمل نے سر جھٹک کے انکار کر دیا۔

"پھر رات کو آئیے گا؟" وہ جھجکتے ہوئے بولا۔

"ہاں، شاید آ جائیں۔"

"میں اسی ہوٹل کے آس پاس ملوں گا۔" اُس نے گردن خم کرتے ہوئے مدھم آواز میں کہا: "نہیں نظر آؤں تو خلیفہ جا کر پوچھ لیجیے گا۔ ...سب لوگ بندے کو اسی نام سے پکارتے ہیں۔ فٹاں میں حاضر آ جاؤں گا۔ لطف نہ آ جائے تو گردن کٹا دیجیے گا۔ دیر تک یاد رکھیے گا کہ کسی خادم خلیفہ جمّا سے ملاقات ہوئی تھی۔" وہ اسی طرح کی باتیں کرتا ہوا ہمارے ساتھ چلتا رہا اور ہم سے ہوٹل کا پتہ پوچھنے لگا۔ تجمل نے کچھ نہیں بتایا اور جب برہمی کا اظہار کیا تو وہ واپس ہو گیا۔

ہم محبوب کی مہندی کے ملاقے سے نکل آئے۔ اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ بس اسٹینڈ پر آتے آتے کھمبوں کی روشنیاں جل گئیں۔ تجمل کے کرتے کے دامن پر جہاں گیر کے خون کے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ اُس نے

کپڑے بدل لیے اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ میں اُس کی صورت دیکھتا اور اپنی بوٹیاں نوچتا رہا۔ راستے بھر اُس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ مجھے اب اپنے آپ سے ڈر لگ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میرا سارا جسم کیچڑ میں سَنا ہوا ہے اور مکھیاں بھنک رہی ہیں۔ خانم کے ہاں جانے میں تجمل کے پس و پیش کی وجہ اب کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ شاید تجمل میرا لحاظ کر رہا تھا کہ وہاں جانے کے بعد مجھے اور نہ جانے کیا کیا دیکھنا اور سُننا پڑے۔ کچھ وقت گزر جائے گا تو سب کچھ دیکھنے اور سننے کے لیے میری آمادگی بڑھ جائے گی لیکن تجمل کو یہ خیال نہیں رہا تھا کہ میرا سینہ بہت کشادہ ہے، وہ پھٹے گا نہیں۔ فتی کو بھری محفل میں سولہ سنگھار کیے ہوئے بیٹھے دیکھ کے بھی میری آنکھوں نے بینائی نہیں کھوئی تھی۔

کمرے میں تجمل کی گہری سانسوں کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ ہمیں آئے ہوئے خاصی دیر ہو گئی تھی۔ جہاں گیر کا چہرہ بار بار میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا تھا، وہ مجھ سے چند ہی میل دُور تھا۔ اتنے لمبے سفر کے بعد کہیں اُس کی صورت نظر آئی تھی جب پیروں میں گٹّے پڑ گئے تھے اور اُمید کے چراغ کی لَو روز بہ روز کم ہوتی جا رہی تھی، اب بھی مجھے اُس کی صرف ایک جھلک نصیب ہوئی تھی۔ میں اُسے اچھی طرح دیکھ بھی نہیں سکا تھا۔ تجمل وہاں سے واپس چلا آیا تھا اور اب دوبارہ جانا ہوا بھی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ وہ پاؤں پھیلائے پلنگ پر لیٹا ہوا تھا لیکن سو نہیں رہا تھا۔ بہت دیر بعد اُس نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور مجھے کرسی پر بے حس و حرکت بیٹھا ہوا دیکھ کے کروٹ بدلنے لگا: "تو بھی کچھ کمر سیدھی کر لے۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ میں نے ہنکاری بھری۔ وہ تھکے ہوئے لہجے میں کہنے لگا: "کیا سوچ رہا ہے رے!"

"کیا سوچ سکتا ہوں۔" میں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا: "کیا تمھیں اب بھی شبہ ہے کہ وہ جہاں گیر نہیں ہے؟"

"مجھے پہلے بھی شبہ نہیں تھا۔"

"تو پھر کیا ہے۔ تم وہاں سے واپس کیوں چلے آئے؟"

"اندھیرا ہو گیا تھا۔ اندھیرے میں وہاں جانا ٹھیک نہیں تھا۔"

"کیوں؟ کیا کوئی ہمیں روک لیتا؟"

"تیری تو مت ماری گئی ہے لاڈلے!" وہ اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ "جہاں گیر ایک گھر میں رہتا ہے، سڑک پہ نہیں۔ ہو سکتا ہے اس وقت خانم ملنے سے انکار کر دیتی اور اُسے معلوم ہوتا کہ ہم وہی لوگ ہیں جنھیں اُس نے تھوڑی دیر پہلے دیکھا تھا تو وہ شبہ کرتی۔"

"تو کیا ہوتا؟"

"کچھ نہ ہوتا، پر بہت کچھ ہو بھی سکتا تھا۔"

"کیا ہو سکتا تھا، ہم بتا سکتے تھے کہ ہم جہاں گیر سے ملنے آئے ہیں۔"

"لاڈلے! تو اب بڑا ہو گیا ہے، کیسی ننھی ننھی باتیں کرتا ہے۔" وہ جھنجلا کے بولا: "ابھی ہمیں صرف اتنا پتہ چلا ہے کہ جہاں گیر، خانم کے ہاں رہتا ہے اور تو نے خلیفے کی زبان سے سُن ہی لیا ہے کہ خانم اُس کا کتنا خیال رکھتی ہے۔ ہر آدمی زمین پر اپنی جگہ گھیرتا ہے لاڈلے! کوئی بڑی کوئی چھوٹی۔ آدمی پیڑوں کی طرح ہوتے ہیں، بہتروں کی جڑیں بہت پھیلی ہوتی ہیں، کسی کی اُوپر ہی اُوپر ہوتی ہیں۔ پیڑ اکھاڑنے سے پہلے اُس کی جڑوں کا دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ ہمیں وہاں طریقے سے جانا چاہیے۔ لپڑ دھپڑ میں نہیں، سوچ سمجھ کے۔ کیا یہ ٹھیک ہوتا کہ ہم ایک دو گھنٹے بعد ہی وہاں چلے جاتے۔ خانم بازار میں بیٹھتی ہے۔ بازار کی عورت کی آنکھیں چار ہوتی ہیں۔ فرض کر، خانم اُس وقت ملنے سے انکار کر دیتی تو کیا ہم چاقو نکال لیتے؟ فیل مچاتے؟ ننٹا کرتے؟ کیا اس طرح جہاں گیر پر اچھا اثر پڑتا؟ جو باتیں سامنے کی ہیں، انھیں کیوں پوچھتا ہے۔ خانم کو شبہے میں ڈالنے سے بات خراب ہو سکتی تھی۔ زبردستی ایک ایسی عورت کی دہاڑی نہیں ہونی چاہیے جس نے جہاں گیر کو پناہ دی ہے اور اُسے اپنے بیٹے کی طرح رکھتی ہے۔"

"کیا معلوم، وہ کس طرح اُس کے پاس ہے۔"

"یہی بات تو میں تجھ سے بولنا چاہتا ہوں۔ ہمیں کچھ پتہ نہیں۔ پہلے ہمیں کچھ پتہ ہونا چاہیے۔ میں پہلے جہاں گیر سے ملنا چاہتا ہوں لیکن ہم وہاں جہاں گیر کے باہر نکلنے کی آس میں کھڑے نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ جگہ دوسری ہے اور ہمارا مطلب کچھ اور ہے۔ اندھیرے میں اندھا ہی جا سکتا ہے۔ ابھی ہمیں نہ جانے اور کہاں کہاں جانا پڑے۔ وقت جیب میں رکھا ہوا نہیں ہوتا پر اسے جیب میں رکھے ہوئے پیسے سے زیادہ سنبھال سنبھال کے خرچ کرنا پڑتا ہے۔ مجھے پتہ ہے لاڈلے! تیرے دل پہ آری چل رہی ہے، پر بھائی! یہ آری تو چلتی رہے گی۔ ساری زندگی ایسا ہی ہوتا ہے۔ سکھ پل بھر سے زیادہ نہیں ہوتا اور زندگی بس پل پل بھر ہوتی ہے۔ کچھ سمجھ آئی تیرے دماغ کی انگیٹھی میں؟"

میں چپ رہا۔ کچھ ایسی ہی باتیں میرے ذہن میں بھی آئی تھیں لیکن میرا دل نہیں مانتا تھا۔ ہو سکتا ہے، خانم نے جہاں گیر کو بہت کچھ سمجھ لیا ہو۔ مجھے امّی یاد آ رہی تھیں۔ امّی کی روح بہت بے کل ہوگی۔

"لیکن خانم کے دروازے پہ جانے کے بعد کل بھی یہی صورت پیش آئی تو؟..." میں نے منتشر لہجے میں کہا۔

"شاید ایسا نہ ہو۔"

"فرض کرو، ایسا ہی ہوا؟"

"تو پھر کچھ اور سوچیں گے۔"

"جو کل سوچنا ہے، وہ ابھی کیوں نہیں سوچ لیتے؟"

"لاڈلے! کیا یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے جہاں گیر کو کھوج لیا ہے۔

اور بھی سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اب میرا مغز مت کھا۔ جا کچھ آرام کر لے۔ کھانا نہیں کھائے گا؟ مجھے تو بہت بھوک لگ رہی ہے۔"

"تم کھا لو۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"چھوڑ، پھر میں بھی نہیں کھاتا۔"

"میرا جی بالکل نہیں چاہ رہا۔"

اُس نے چادر تان لی۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔ بہت دیر ہو گئی۔ اُس نے کروٹ نہیں بدلی۔ میں نے دروازہ کھول کے بیرے کو آواز دی اور اُس سے کھانا لانے کے لیے کہا۔ کھانا آ گیا۔ میں نے اُسے اُٹھایا۔ وہ جاگ ہی رہا تھا۔ میں اُس کے ساتھ بیٹھ کے روٹی اپنے منہ میں ٹھونستا رہا۔ اُس نے فیرنی کی پلیٹ میرے آگے کر دی۔ میں نے بہ مشکل تمام اُسے بھی حلق سے اتار لیا۔ میری طرح وہ بھی ساری رات بستر پہ کسمساتا رہا لیکن صبح کے قریب اُس کی آنکھ لگ گئی۔ تجمل نے میرے سوال کا صحیح جواب نہیں دیا تھا۔ یقیناً اُس کے ذہن میں کچھ اور اندیشے بھی پل رہے تھے۔ صبح ہوئی تو اس نے اُٹھنے میں دیر لگا دی حالانکہ وہ روزہ سویرے سویرے اُٹھ جاتا تھا۔ ہوٹل سے نکلتے نکلتے دھوپ چڑھ گئی۔ بس میں جانے کے بجائے اُس نے نام پلی سے محبوب کی مہندی کا پیدل راستہ پیدل ہی طے کیا۔ ہم بازار میں داخل ہوئے تو دوپہر ہو چکی تھی۔ تجمل کا رُخ خانم کے مکان کی جانب تھا۔ اُس کی گلی میں پہنچتے ہی میرے پیروں میں لرزش ہونے لگی۔ سارا جسم پسینے میں نہا گیا۔ رگوں میں ٹھنڈی بجلی سی دوڑنے لگی۔ تجمل کے اشارے پر میں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے دروازے پر دستک دی اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ممکن ہے اندر سے جہاں گیر برآمد ہو جائے لیکن وہ نہیں آیا۔ جس شخص نے دروازہ کھولا تھا، وہ انھی میں سے ایک تھا جو کل خانم کے ساتھ دواخانے آئے تھے۔ ہمیں دیکھ کے اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں پھیل گئیں۔ اُس نے متجسس انداز میں ہمیں سلام کیا۔ "خانم ہیں؟" تجمل نے بھاری آواز میں پوچھا۔

"خانم اپنے کمرے میں آرام کر رہی ہیں۔"

"اُن سے بولو کہ دو پردیسی ملنے آئے ہیں، کچھ کام ہے۔"

"لیکن خانم نے ملنا جلنا بند کر دیا ہے۔" اُس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"تم خانم کو جا کے بولو۔ ہم کو یہیں سے جواب مت دو۔"

"آپ وہی لوگ ہیں نا جنھوں نے کل رجو میاں کی مدد کی تھی؟"

اُس نے کسی قدر گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ کو خانم سے کیا کام ہے؟"

"اُن سے بولو کہ ایک ضروری کام ہے۔ یہ اتفاق ہے کہ رجو میاں خانم کے بیٹے نکلے۔ اب وہ کیسے ہیں؟"

"اچھے ہیں۔ ہلکا سا بخار ہے۔"

"پھر ہم انھیں بھی دیکھ لیں گے۔ جاؤ، تم کھڑے کیوں ہو۔" تجمل نے

ترشی سے کہا۔ "ہمیں اُمید ہے کہ تم جا کے بولو گے تو خانم ہم سے ضرور ملیں گی۔"

"مگر... مگر میں اُوپر جا کے کیا بتاؤں۔ خانم ناراض ہوتی ہیں۔ آپ کام بتائیں، میں اُن سے جا کے بول دوں گا۔"

"کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔ ہم نے خانم کا بہت ذکر سُنا ہے۔ کیا وہ پردیسیوں سے ملنے سے انکار کر دیں گی؟ ہم خانم کا زیادہ وقت نہیں لیں گے اور نہ ہم خانم سے کل رجو میاں کی مدد کرنے کی اُجرت لینے آئے ہیں۔ اس بات سے بے فکر رہو۔"

"اب خانم کہیں آتی جاتی نہیں ہیں۔ اگر ایسا کوئی کام ہے تو میں یہیں سے جواب دے دیتا ہوں۔ خانم صرف چند خاص جگہوں پر جاتی ہیں۔"

"ہم کو یہ جان کاری ہو گئی ہے۔ ہم خانم کو کہیں چلنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ تم بحث مت کرو۔ اُن سے جا کے بولو کہ ہم حیدر آباد آئے ہیں تو اُن سے ملے بغیر نہیں جائیں گے۔"

اُس کے ہونٹ پچک گئے۔ اُس نے کھڑے کھڑے کئی پہلو بدلے اور دروازہ بند کر کے اندر چلا گیا۔ ہم باہر انتظار کرتے رہے۔ بے اختیار میں نے تجمل کا بازو پکڑ لیا۔ مجھے چکر سا آ رہا تھا۔ تجمل میری کمر تھپکنے لگا۔ واپس آنے میں اُسے کئی منٹ لگ گئے۔ اُس نے اندر آنے کے لیے راستہ چھوڑ دیا اور ہمیں ڈیوڑھی سے ملحق ایک بڑے کمرے میں بٹھا دیا۔ مونڈھے پر بیٹھ کے میری سانس پھولنے لگی۔ یہ ایک بڑا کمرہ تھا۔ خانم کے آدمی نے روشن دان کھول دیے۔ کمرہ روشن ہو گیا۔ چھت اور دیواروں پر پچی کاری کی گئی تھی اور ان میں لگے ہوئے چھوٹے چھوٹے شیشے کے ٹکڑے روشنی میں چمکنے لگے تھے۔ سامنے ایک تخت پر قالین بچھا ہوا تھا اور گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ باقی تین اطراف مونڈھے اور آرام کرسیاں تھیں۔ تخت کے اُوپر دیوار میں گھڑی نصب تھی۔ وہ ٹک ٹک کر رہی تھی۔ تجمل میرے برابر ہی بیٹھا تھا۔ "لاڈلے! چاقو باز!" وہ سرگوشی میں بولا۔ "زبان اپنے منہ ہی میں رکھنا۔"

کوئی پندرہ منٹ بعد قریب ہی کہیں سے چوڑیاں بجنے کی آواز آئی۔ میں سنبھل کے بیٹھ گیا۔ چند لمحوں بعد تخت کے قریب کے دروازے سے خانم نمودار ہوئی۔ اُس کے پیچھے وہ آدمی بھی تھا۔ خانم نے گردن خم کر کے اور ہاتھ اُٹھا کے آداب کیا۔ آج وہ کل سے بالکل بدلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ سفید غرارہ اور نیلا جمپر پہنے ہوئے وہ کوئی ملکہ معلوم ہو رہی تھی۔ اُس کا سر ہرے دوپٹے سے ڈھکا ہوا تھا۔ کلائی چوڑیوں سے بھری ہوئی تھی۔ کانوں میں آویزے لٹک رہے تھے۔ وہ پاؤں لٹکا کے تخت پر بیٹھ گئی۔ اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اُس نے کئی بار ہم دونوں کو غور سے دیکھا اور اُس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم پھیل گیا۔ "معاف کیجیے، آپ کو زحمت ہوئی۔ کل میں رجو میاں کو دیکھ کے بہت پریشان ہو گئی تھی، آپ کا شکریہ بھی ٹھیک طرح ادا نہیں کر سکی۔ اگر آپ وقت پر نہ پہنچ جاتے تو اُس کم بخت نے کسر کون سی چھوڑ دی تھی۔" وہ متانت سے بولی۔ اُس کی آواز بہت اچھی تھی۔

"ہم رجو میاں کا شکریہ وصول کرنے نہیں آئے۔" تجمل نے ٹھیری ہوئی آواز میں کہا۔ "اُس وقت رجو میاں کی جگہ کوئی اور ہوتا تب بھی شاید ہم یہی کرتے۔"

"اس محلے میں کوئی اور ایسا نہیں کرتا۔" خانم افسردگی سے بولی۔ "مولا رجو سے خار کھاتا ہے۔ پہلے وہ یہیں میرے پاس ملازم تھا۔ بچپن ہی سے اُس نے عادتیں بگاڑ لیں۔ روز تنگ کرتا تھا۔ رجو میاں ہر وقت اُس کی شکایت لے کے میرے پاس آتے تھے۔ میں نے اُسے نکال دیا۔ اُس وقت سے وہ اور شیر ہو گیا۔ میں کبھی رجو میاں کو تنہا باہر نہیں بھیجتی تھی حالانکہ وہ اس بات سے بہت گھٹتا ہے۔ کہتا ہے آپی! میں بچہ تو نہیں ہوں، مجھے اکیلا جانے دیجیے مگر یہ ماحول تو آپ جانتے ہی ہیں۔ میں بھی نہ جانے کس مجبوری میں یہاں ٹکی ہوئی ہوں۔ جلد ہی یہاں سے نکل جاؤں گی۔ لوگ چین نہیں لینے دیتے۔ مولا کو اس علاقے کے ایک بدمعاش شاہ کبیر نے اپنے پاس رکھ لیا ہے۔ شاہ کبیر بہت سنگ دل آدمی ہے۔ پہلے بھی وہ ایک بار مولا رجو کو پریشان کر چکا ہے۔ اس بار تو حد ہو گئی۔ اب میں آپ کو کیا بتاؤں۔ میں نے اپنے آپ کو اِس چار دیواری میں بند کر لیا ہے۔ دو ایک ہی جگہ آنا جانا ہوتا ہے۔ شاہ کبیر مجھ سے اس بات پر بدظن ہے کہ میں اُس کے بلاوے پر اُس کے گھر کیوں نہیں جاتی۔ میں نے کئی بار عاجزی سے کہا کہ مجھے اب معاف کر دو لیکن یہاں اس علاقے میں شاہ کبیر کا حکم چلتا ہے۔ وہ تو کچھ نواب بہادر کی بات ہے اور کچھ میں بھی ان لوگوں کا خیال رکھتی ہوں۔ بہت مشکل سے زندگی بسر ہو رہی ہے۔" وہ جھرجھری لے کے بولی۔ "معاف کیجیے میں نے ایک ساتھ اتنی باتیں کر لیں اور آپ سے کچھ پوچھا بھی نہیں۔ بس دل بھرا ہوا تھا۔ زبان نہیں رکی۔ ارے شجاعت میاں!" اُس نے اپنے ساتھ آنے والے آدمی کو مخاطب کیا۔ "کھڑے کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو، مہمانوں کے لیے کچھ چائے وغیرہ کا انتظام کرو۔ یہ تو کھانے کا وقت ہے۔ آپ لوگوں نے ابھی کھانا تو نہیں کھایا ہوگا؟"

"نہیں، نہیں۔ کھانے وانے کا تکلف مت کرو سُریلی خانم! ہاں، چائے میں کوئی حرج نہیں ہے۔" تجمل نے نرمی سے کہا۔

شجاعت اُٹھنے لگا تو خانم کی آواز نے اُسے پھر روک لیا۔ "خاص دان بھی لیتے آئیو اور ذرا اِدھر شبنم سے کہہ دو کہ وہ رجو میاں کو دوا دے دے۔ وقت ہو گیا ہے۔"

شجاعت کو حکم دینے کے بعد وہ ہماری طرف متوجہ ہوئی لیکن اُس کے کچھ کہنے سے پہلے تجمل نے کہا۔ "کیا رجو میاں کی طبیعت زیادہ خراب ہے؟"

"نہیں، خدانخواستہ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے مگر احتیاط بہتر ہے۔ اچھا ہے، دو تین خوراکیں پی لیں۔ یہ انگریزی دوا اثر بھی تیز کرتی ہے۔ کل تک اللہ نے چاہا تو بھلا چنگا ہو جائے گا۔"

"تم رجو میاں سے بہت پیار کرتی ہو۔"

"رجو میاں میری زندگی ہے۔" وہ خوابیدہ لہجے میں بولی۔ "اُس کے لیے میں نے اپنے آپ کو محدود کر لیا ہے۔ نواب بہادر کے بڑے احسانات ہیں اس لیے میں اُن کا کہنا نہیں ٹال سکتی۔ رجو میاں کے بعد مجھے کوئی شے عزیز ہے تو صرف موسیقی۔ میں اب بھی ریاض کرتی رہتی ہوں لیکن میں نے نواب بہادر سے کہہ دیا ہے کہ میری جائداد کا انتظام کر دیجیے اب میں رجو میاں کو لے کے زیادہ دنوں تک اس ماحول میں نہیں رہ سکتی۔ وہ ٹال رہے ہیں۔ ایک دن ضرور آمادہ ہو جائیں گے۔ پھر مجھے کچھ سکون مل جائے گا۔"

"رجو میاں! تمھارے .... تمھارے ...." تجمل نے جھجک کے کہا۔

"وہ میرا بیٹا ہے۔" خانم نے تیزی سے اُس کی بات مکمل کر دی۔ "مجھے آپی کہتا ہے۔ بہت اچھا لڑکا ہے۔ یوں تو اپنے بچوں کی سبھی تعریف کرتے ہیں۔"

"وہ بہت اچھا ہے اور جی دار بھی ہے۔ مولا اُس سے ڈیڑھ گنا ہے پر رجو خوب زور کر رہا تھا۔"

"جی کی کیا پوچھیے، بس جی ہی جی ہے۔ دھان پان ہے اور روز بہ روز ہانس ہوتا جا رہا ہے۔ میں کہتی ہوں، تم ذرا اپنی جان بناؤ۔ تب یہ جی داری بھی اچھی لگے گی، مسکرا کے خاموش ہو جاتا ہے۔ کھانا تو بہت ہی کم کھاتا ہے۔ ہر وقت کچھ سوچتا رہتا ہے۔"

"کیا سوچتا رہتا ہے؟" تجمل نے تجسس سے پوچھا۔

"معلوم نہیں کن خیالوں میں گم رہتا ہے۔ میں ایک بار شملے گئی ہوں۔ سوچتی ہوں کچھ دنوں کے لیے اُسے وہیں لے جاؤں گی لیکن یہاں سے تو جان چھوٹے۔" وہ کچھ کھو سی گئی پھر چونک کر بولی۔ "ارے۔ میرا دماغ بھی ٹھکانے نہیں ہے۔ میں نے آپ سے پوچھا ہی نہیں کہ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

"ہم کلکتے سے آئے ہیں۔" تجمل نے آہستگی سے جواب دیا۔

"کلکتے سے۔" اُس نے دہرایا۔ "کہیے، کیسے زحمت کی؟"

"بس خانم، تم سے ملنے چلے آئے۔" تجمل نے لمبی سانس کھینچتے ہوئے کہا۔ "تمھارا بہت چرچا سُنا تھا۔"

"میرا کیا چرچا۔ رسوائی کا ذکر سُنا ہوگا۔"

"رسوائی کیسی، ہم ان باتوں کو نہیں مانتے۔ جو جہاں ہے، پتہ نہیں وہ وہاں کیوں ہے۔ خانم! تم بہت سمجھ دار عورت ہو۔ تمھارے رنگ روپ کی طرح تمھارا دل بھی صاف ہے۔ تمھیں دیکھ کے اور مل کے اچھا لگا۔"

"آپ کا حسنِ نظر ہے۔" خانم کی نظریں جھک گئیں۔ سر سے اُس کا

دوپٹا ڈھلک گیا تھا، وہ اُس نے فوراً درست کرلیا۔ "آپ لوگوں کا شغل؟ یہاں کہاں قیام ہے؟ حیدرآباد کب آنا ہوا؟ مجھے بھی اتنی دیر بعد یہ باتیں سوجھ رہی ہیں۔"

"یہاں آئے ہوئے کئی دن ہوگئے۔ ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے ہیں اور رہا کام۔ ! تو خانم کام نہ پوچھو تو بہتر ہے۔"

"کیوں؟ بھلا آپ ایسا کون سا کام کرتے ہیں؟"

"ابھی تو گلی گلی گھومنا ہی کام ہے۔"

"دُنیا کی سیر کررہے ہیں۔ سب سے خوب صورت کام ہے۔"

"ہاں دُنیا دیکھ رہے ہیں۔"

"یوں آپ کا مستقل مشغلہ؟ اگر بتانا مناسب سمجھیں؟"

"کیا بولیں۔ نہ پوچھو تو اچھا ہے۔ کبوتر اُڑاتے ہیں۔ بازیاں کھیلتے ہیں زورازوری اپنا کام ہے۔ جہاں زبان کام نہیں کرتی، وہاں ہتھیار چلاتے ہیں۔ بس یہی اُچھل کود آنکھ مچولی کرتے رہتے ہیں۔"

"خوب! ضرور کوئی جاگیردار ہوں گے۔ آپ بہت بذلہ سنج ہیں۔ سب کچھ بتا کے بھی کچھ نہیں بتایا اور یہ آپ کے ساتھ کون صاحب ہیں؟"

"یہ میرا رجّو ہے۔" تجّل نے میری کمر پہ دھپ مارتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔" وہ کسی قدر تعجب سے بولی۔ "یعنی یہ آپ... یہ آپ کے...."

"تم اسے یہاں میرے ساتھ دیکھ کے حیران ہوگی پر جو لوگ آگے پیچھے اور ایک دوسرے سے چھپ کے کہیں آتے ہیں، وہ ساتھ آئیں تو کیا بُرا ہے میرا اس کا معاملہ کچھ دوہرا ہے خانم!"

"جی۔!" خانم کی آنکھیں جلنے بجھنے لگیں۔

"اسے اچھی طرح دیکھو خانم! میں اسے تمھارے سپرد کرنے آیا ہوں۔"

"میرے سپرد کرنے؟"

"ہاں خانم! اسے بھی رجّو میاں کی طرح سمجھ لو۔ ساری بات سمجھنے ہی کی ہوتی ہے۔ اس کی بہت سی عادتیں رجّو میاں سے ملتی جلتی ہیں۔ یہ بھی اُلجھا اُلجھا رہتا ہے۔ ہر وقت سوچتا رہتا ہے۔ تم نے غور نہیں کیا کہ اس کی پیشانی اور آنکھیں رجّو میاں سے کتنی ملتی ہیں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" خانم نے مضطرب لہجے میں کہا۔

"میں کوئی بہت عجیب بات نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں تمھارے رجّو کے لیے ایک تحفہ لایا ہوں۔ وہ اسے دیکھ کر خوش ہوگا۔ یہ بھی رجّو کے لیے کل سے مچل رہا تھا۔ یہ بھی اچھا لڑکا ہے۔ ذرا ضدّی اور نٹ کھٹ ہے۔ غصہ جلدی آجاتا ہے۔ یہ دونوں مل جائیں گے تو شاید ان کی تنہائی دُور ہوجائے گی۔"

"بخدا! میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"ان حالات میں، میں یہی بول سکتا ہوں خانم! میں نے اس پہ بہت سوچا اور یہی فیصلہ ہوا کہ میں اپنے لاڈلے کو تمھارے سپرد کردوں۔ یہ ایک سے دو ہوجائیں گے۔ تمھارے دو جوان بیٹے۔ کیا یہ بات اچھی نہیں ہوگی؟ خانم! مجھے پتہ ہے کہ تم رجّو کے لیے کیا کیا سوچتی ہوگی۔ اُس کی خوشی کے لیے تم بڑے سے بڑا کام کرسکتی ہو۔ رجّو میاں کو بھی بلالو اور پوچھو کہ کیا اُسے یہ دوسرا بھائی پسند ہے؟ میرا خیال ہے، وہ انکار نہیں کرے گا۔"

خانم کا چہرہ لال ہوگیا۔ "خدا کے لیے آپ صاف صاف بات کیجیے۔" وہ لرزیدہ آواز میں بولی۔ وہ کبھی مجھے دیکھتی تھی، کبھی تجّل کو۔

"میں بہت صاف بات کررہا ہوں خانم! اس میں کوئی لاگ لپیٹ، چھل فریب نہیں ہے۔ میری بات پر یقین کرو۔ میں مذاق نہیں کررہا ہوں، میں اپنے اوسان میں ہوں۔ میں تم سے یہ نہیں بول رہا ہوں کہ تم رجّو میاں کو میرے حوالے کردو۔"

اُسی لمحے شجاعت رنگین خوان پوش سے ڈھکی ہوئی تھالی ہاتھوں میں اُٹھائے ہوئے اندر آیا۔ اُس نے تھالی خانم کے آگے رکھ دی۔ وہ ابھی کرسی پر بیٹھ بھی نہیں پایا تھا کہ خانم نے اُسے کمرے سے باہر جانے کا حکم دے دیا۔ شجاعت چلا گیا تو وہ سراسیمہ آواز میں بولی۔ "بے شک آپ یہ نہیں کہہ رہے ہیں مگر کوئی اس طرح کیسے کہہ سکتا اور کرسکتا ہے۔"

"جس طرح میں کہہ رہا ہوں اور کررہا ہوں۔"

"معاف کیجیے۔" وہ ترشی سے بولی۔ "یہ دل آزاری ہے۔"

"نہیں خانم! ایسا مت بولو، ایسا نہیں ہے۔ ہم کل رات بھی تمھارے پاس آسکتے تھے پر نہیں آئے۔ مجھ کو شبہ تھا کہ اس وقت تم شاید نہ ملو اور گھبرا کے کوئی ایسا قدم نہ اُٹھالو جو رجّو میاں کے لیے، ادھر اپنے لاڈلے کے لیے اور خود تمھارے لیے اور پریشانیاں کھڑی کردے۔ ان معاملوں میں ایسی گھبراہٹیں ہوجاتی ہیں۔ پھر بولو۔ میری کیا کوشش ہونی چاہیے تھی کہ مجھے تم سے بات کرنے اور تم کو سمجھانے کا موقع مل جائے۔ خانم! تم رجّو میاں کو ہمیشہ دیواروں، پردوں اور پنجرے میں بند نہیں رکھ سکتیں۔ تمھیں اپنے اُوپر بھروسا ہونا چاہیے کہ تم نے رجّو میاں سے جھوٹ نہیں بولا ہے۔ اُس کو سچ ہی سچ دیا ہے۔ اب ایک اچھی صورت سامنے آئی ہے۔ ذرا سوچو، رجّو میاں کتنے خوش ہوں گے اور اسے دیکھو یہ مائی کا لال کتنا بے تاب ہے، رجّو میاں شریف زادے ہیں۔ وہ اُس عورت کو کیسے بھول سکتے ہیں جس نے اُن کے سکھ کے لیے اپنے سکھ جلا دیے —— خانم! بھلا اس میں جھجکنے اور گھبرانے کی کیا بات ہے۔"

خانم کی آنکھیں ساکت ہوگئیں۔ اُس کے ہاتھ کانپنے لگے۔

"رجّو میاں کو بلاؤ خانم! بلاؤ خانم! اُسے آواز دو۔" خانم نے اپنا چہرہ چھپا لیا اور سسکنے لگی۔

"میں تم سے رجّو میاں کو لینے نہیں آیا ہوں۔" تجّل نے کہا۔ "میں نے پہلے بول دیا ہے۔ تمھیں پتہ نہیں، ہم کہاں کہاں سے گھومتے ہوئے آئے ہیں، کچھ میرے لاڈلے کا بھی خیال کرو، رجّو میاں کی خاطر۔ اُس کی خاطر تمھارے لیے ہر بات سے بڑی ہے۔"

"کیا... کیا یہ رجّو میاں کے؟..." خانم پھٹی ہوئی آواز میں بولی۔

"ہاں خانم!"

"مگر... مگر رجّو میاں نے مجھے کبھی نہیں بتایا؟"

"یہ بھی کسی کو کچھ نہیں بتاتا تھا۔"

خانم کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ چند لمحوں تک خاموشی طاری رہی۔ خانم پتھر کی طرح گنگ ہوگئی تھی۔ تجّل کی آواز پر وہ جیسے سوتے سوتے چونک پڑی۔ "کیا سوچنے لگیں خانم؟"

"کچھ نہیں۔" وہ ہذیانی انداز میں بولی۔

"کیا مجھے کچھ اور بولنے کی ضرورت ہے؟"

"نہیں نہیں۔" خانم نے روتے ہوئے کہا اور ایک دم تخت سے اُٹھ گئی۔ اُس نے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھے اور بوجھل قدموں سے اندر چلی گئی۔ میری سانس سینے میں اٹکنے لگی اور آنکھوں کے سامنے دُھند سی چھانے لگی۔ تجّل نے میرا سر پکڑ کے جھنجوڑ دیا۔ خانم فوراً ہی واپس آگئی۔ اُس کا سر جھکا ہوا تھا۔ جہاں گیر اُس کے ساتھ نہیں تھا۔

"چائے بناؤ خانم!" تجّل نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

خانم نے ہڑبڑا کے کسی معمول کی طرح تھالی سے سرپوش ہٹایا۔ اُس کی اُنگلیاں لرز رہی تھیں۔ اُس نے پھلوں، خشک میووں اور نمکین چیزوں کی پلیٹیں ہمارے سامنے رکھ دیں اور چائے بنانے لگی۔ خانم شکر گھول رہی تھی۔ اندر سے دفعتہً کھٹ پٹ کی آواز آئی۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ جہاں گیر ہی تھا۔ وہ تیزی سے آرہا تھا مگر ہمیں دیکھ کے ٹھٹک گیا۔ پھر اُس نے ہم دونوں کو سلام کیا اور خانم کے برابر تخت پر بیٹھ گیا۔ "کیوں آپی!" اُس نے تیز لہجے میں پوچھا۔ "آپ نے مجھے بلایا تھا؟"

"ہاں!" خانم نے ٹوٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہ صاحب تم سے بات کرنا چاہتے تھے۔" خانم نے نگاہیں اُٹھا کے ہماری جانب اشارہ کیا۔

"اچھا۔" وہ کچھ مضطرب سا ہوگیا۔ "مگر آپ کو کیا ہوگیا ہے۔ آپ کچھ پریشان پریشان ہیں۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" خانم نے مرتعش ہونٹوں سے مسکرانے کی کوشش کی۔ "تم مہمانوں سے بات کرو۔ دیکھو یہ کہتے ہیں، یہ تمھارے لیے ایک اچھی خبر لائے ہیں۔"

"کیسی خبر؟" وہ مچل کے بولا۔ "ضرور مولا کی بات ہوگی مگر آپی! میں اُس سے خود نمٹوں گا ورنہ... ورنہ مجھے۔" وہ ہمیں دیکھ کے کچھ کہتے کہتے چُپ ہوگیا اور چند ثانیے ٹھیر کے بولا۔ "مگر آپ کیا خبر لائے تھے؟"

"خبر کیا، ہم تو تمھیں دیکھنے آئے تھے رجّو میاں!" تجّل نے کہا۔ "اس سے ملو، یہ لاڈلا ہے۔ میں تمھیں اِس سے ملانے لایا تھا۔ کل سے، جب سے اس نے تمھیں دیکھا ہے، یہ تمھارا حال پوچھنے اور تمھیں دیکھنے کو کہہ رہا تھا۔"

"اچھا۔" وہ پٹ پٹاتی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ "میرا جی خود بھی ان سے ملنے کو چاہ رہا تھا۔ میری وجہ سے انھیں بہت تکلیف ہوئی۔ مولا نے ان کی کمر میں کئی بار زور سے سر مارا تھا اور اُس نے آپ پر بھی ہاتھ اُٹھایا تھا۔ میں نے آپی سے رات بھی کہا تھا، آپی افسوس کررہی تھیں۔ آپ کو کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

"نہیں رجّو! ویسے اپنے سارے گریبان رفو کیے ہوئے ہیں۔"

"ہاں۔" وہ حیرت سے بولا۔ "پھر آپ ہر جگہ اسی طرح درمیان میں آجاتے ہوں گے۔ کیا پہلے بھی آپ کو مولا جیسے لوگوں سے واسطہ پڑا ہے؟" تجّل آہستہ آہستہ سر ہلانے لگا۔ جہاں گیر جوشیلے لہجے میں بولا۔ "مگر مولا ذلیل ہے، وہ بدمعاش ہوگیا ہے۔ کسی دن میں اُسے... میں اُسے...."

"جانے دو اس ذکر کو رجّو میاں! اتنا غصہ نہیں ہوتے۔ اُسے معاف کردو۔" تجّل کی آواز اُس پہ غالب آگئی۔ "یہ بتاؤ کہ تمھارا پورا نام کیا ہے؟"

"پورا نام؟" وہ سٹ پٹا کے بولا۔ "ظفر علی۔"

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا مگر جہاں گیر نے اپنا نام ظفر علی ہی بتایا تھا۔ میں نے بے چینی سے تجّل کو دیکھا۔ وہ پُرسکون تھا۔

"اور ابّا کا نام؟" تجّل نے مسکرا کے پوچھا۔

"کیوں۔؟" وہ تندی سے بولا۔ "یہ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"یوں ہی، ممکن ہے وہ ہمارے کوئی جاننے والے ہوں۔"

"یہ آپ کیسے کہہ رہے ہیں؟"

"کیا تمھارے ابّا سے ہماری جان پہچان نہیں ہوسکتی، ذرا بتاؤ تو...."

"منوّر علی۔" اُس نے تیزی سے کہا۔ میرا سر پھٹنے لگا۔

"کیا کہا؟ صفدر علی؟" تجّل نے پوچھا۔

"جی.... جی نہیں۔" وہ حواس باختہ سا ہوگیا اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے بولا۔ "منوّر علی۔ میں نے منوّر علی کہا ہے۔"

"میں نے سُن لیا ہے۔ کوئی بات نہیں۔" تجّل نے ہنس کے کہا اور میرا شانہ پکڑ کے بولا۔ "چلو بابر زماں خاں! یہ جہاں گیر نہیں ہیں، یہ تو رجّو میاں ہیں۔"

جہاں گیر اُچھل کے تخت سے کھڑا ہوگیا۔ "کیا یہ.... یہ بابر زماں خاں ہیں؟" اُس کی آواز جھرجھرا رہی تھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ آندھی کی طرح مجھ پہ جھپٹا اور میرے قریب آکے مجھے گھورنے لگا۔ اُس کی

آنکھیں اُلٹ گئی تھیں۔ وہ چکرا کے گرا ہی چاہتا تھا کہ میں نے بڑھ کے اُسے سنبھال لیا اور اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ میرا سینہ گرجنے لگا۔ میں نے اپنے ہونٹ کاٹ لیے لیکن مجھے خود پہ اختیار نہیں رہا۔

پتہ نہیں کتنی دیر بعد خانم نے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کیا۔ جہاں گیر کی آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں۔ اُس کا چہرہ شرابور تھا۔ وہ بڑبڑ رہا تھا۔ کبھی میرے ہاتھ چومتا تھا، کبھی انھیں آنکھوں سے لگاتا تھا۔ میں اُسے نوچ کھسوٹ رہا تھا۔ خانم ہماری کمر پہ ہاتھ رکھے ہوئے ہمیں تخت پر لے آئی۔ اُس نے اپنے دوپٹے سے میرا اور جہاں گیر کا چہرہ خشک کیا۔ جہاں گیر نے اُس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور زار و قطار رونے لگا۔ خانم اُسے سمجھانے لگی۔ اُس نے ہم دونوں کو پانی پلایا اور ہمارے سر اپنے سینے پر رکھ کے خود بھی سسکنے لگی۔

تجمّل اور خانم کی موجودگی میں جہاں گیر نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا اور نہ خود کچھ بتایا۔ وہ تو بار بار میری صورت دیکھتا اور سکتے میں رہ جاتا تھا۔ اُسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ میں ہوں۔ اس کی تصدیق کے لیے اچانک وہ میرے ہاتھ زور سے پکڑ لیتا اور میرے سینے سے چمٹ جاتا۔ جو اُس کا حال آج تھا، وہ میرا کل سے تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں میں آنسو کب سے بند کر رکھے تھے، تمام رات بستر پہ لوٹتا رہا تھا، تمام رات میں نے اُس کی آہٹیں محسوس کی تھیں۔ خانم ہمیں اوپری منزل کے ایک آراستہ کمرے میں لے آئی۔ اُس نے شجاعت کو حکم دیا کہ وہ ہمارا سامان ہوٹل سے لے آئے۔ تجمّل نے منع نہیں کیا۔ نہ جانے کس وقت خانم نے ڈھیر ساری مٹھائی منگوالی تھی۔ نیاز کے بعد اُس نے ہم سب کا منہ میٹھا کرایا۔

خانم اور تجمّل کمرے سے چلے گئے تو جہاں گیر میری صورت دیکھ کے پھر بلکنے لگا۔ میں نے اُس کا سر اپنی گود میں چھپا لیا۔ اُسے چپ کرانے کی میں نے بہت کوشش کی مگر اُس کے آنسو تھمتے ہی نہ تھے۔ "چپ ہو جا منے! میں اب آ گیا ہوں۔" میں اُسے جتنا سمجھانے کی کوشش کرتا، اُس کی آنکھیں اتنی ہی اُمڈ آتی تھیں۔ اتنا تو مجھے پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ خانم کے ساتھ گھر میں اکیلا ہے۔ میرے ذہن میں اور بے شمار باتیں بھی منڈلا رہی تھیں مگر میں نے جہاں گیر سے کچھ پوچھنے کی جلدی نہیں کی۔ اُس کے جوابات سے مجھے ڈر لگتا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر میں نے اُسے کریدا تو سب سے پہلے وہ مجھ سے پوچھے گا کہ میں ان سب کو چھوڑ کے گھر سے کیوں چلا گیا تھا۔ میں اُسے کیا بتاتا کہ وہ جو ایک خوف زدہ سی گڑیا اُس رات گھر میں اُتری تھی، وہ مجھے لے گئی تھی۔ وہ روٹھ کے کہیں چلی گئی، مجھے اکیلا چھوڑ گئی۔ میں منے کو کیا بتاتا کہ میں کہاں رہا۔ میں نے اتنے بہت سے دن کہاں گزارے۔ منا کسی کوڑا کولے کے گھر سے نکلتا تو میری بات اُس کی سمجھ میں آتی۔

میرے کان سُن ہو گئے جب جہاں گیر نے ہچکیوں کے دوران میں خود ہی مجھے بتانا شروع کیا کہ اُس کے ساتھ کیا کچھ پیش آیا۔ وہ کوئی تین سال پہلے گھر والوں سے بچھڑ گیا تھا۔ ایک سال وہ شہروں شہروں گلی گلی انھیں ڈھونڈتا رہا۔ پھر اُس کے پیروں نے جواب دے دیا اور وہ بھوپال کے ایک نواب کے ہاں ملازم ہو گیا۔ نواب اُس کا خیال رکھتا تھا۔ وہیں خانم سے اس کی ملاقات ہوئی اور خانم نے اُسے نواب سے مانگ لیا۔ اس کے بعد وہ خانم کے ساتھ یہاں آ گیا۔ اس دوران میں بھی وہ مسلسل ابا جان کی تلاش میں لگا رہا مگر وہ اُسے کہیں نظر نہیں آئے۔ ابا جان نے اُس کے گھر واپس آنے کا انتظار بھی نہیں کیا۔ وہ میرٹھ میں تھے کہ ایک دن جب وہ گھر کے کسی کام سے باہر نکلا تو شہر میں ہلڑ مچ گیا۔ ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ جہاں گیر کو گھر جانے کا راستہ نہیں ملا۔ پولیس نے تمام راستے بند کر دیے تھے۔ شہر میں گولیاں چل رہی تھیں اور چاقو گھونپے جا رہے تھے۔ جہاں گیر پولیس اور بلوائیوں کے ڈر سے شہری حدود سے باہر آ گیا۔ وہاں سے اُسے ایک متعصّب بلوائی بہ جبر اپنے گھر لے گیا۔ اُس نے جہاں گیر کو سخت اذیتیں پہنچائیں۔ اُسے تین دن تک بھوکا رکھا اور ننگا کر کے بید سے مارا۔ وہ اُسے مذہب بدلنے پر مجبور کرتا تھا مگر ایک دن جب اُس بلوائی کو پولیس پکڑ کے لے گئی تو جہاں گیر کو وہاں سے بھاگنے کا موقع مل گیا۔ اس اثنا میں ابا جان گھر چھوڑ کے جا چکے تھے۔ وہ محلّے میں ہر ایک سے اُن کا پتہ پوچھتا پھرا لیکن ابا جان محلّے میں کسی سے ملتے ہی نہیں تھے۔ وہ اپنا پتہ بتا کے بھی نہیں گئے۔ انھوں نے سمجھ لیا ہو گا کہ جہاں گیر فسادات میں مارا گیا۔ ممکن ہے انھوں نے اُسے تلاش کیا ہو مگر جب اُس کا کوئی پتہ نہ چلا ہو تو مایوس ہو گئے ہوں۔ وہ کسی ایک جگہ نہیں ٹھہرتے تھے۔ تین مہینے اس شہر میں، چار مہینے اُس شہر میں۔ میرٹھ میں آئے ہوئے انھیں دو مہینے سے زیادہ نہیں ہوئے تھے۔ بمبئی میں مولوی اکرم نے جو باتیں ابا جان کے متعلق بتائی تھیں، جہاں گیر بھی وہی دہرا رہا تھا۔ ابا جان ایک کمرے میں بند ہو جاتے تھے اور دن بھر کاغذات پر جھکے انھیں پڑھتے یا کچھ لکھتے رہتے تھے۔ اُن کے اِرد گرد موٹی موٹی کتابیں پھیلی ہوئی تھیں۔ کھانے پینے کا انھیں کوئی ہوش نہیں تھا۔ گھر کا کوئی فرد اُن سے شکایت کرتا تو وہ ہمیشہ یہی کہتے کہ بس چند دنوں کی بات اور ہے پھر سارے دُکھ دُور ہو جائیں گے، ہم ایک محل بنائیں گے، آگے پیچھے ملازموں کی فوج ہو گی۔ ایک دن آئے گا کہ ہمیں دنیا میں کسی چیز کی کمی نہیں ہو گی۔ ابا جان رات کو دیر سے کمرے سے نکلتے اور پلنگ پر آ کے بھی یا تو گم سم رہتے یا بڑبڑاتے رہتے۔

جہاں گیر نے نیچی نظروں اور دبے دبے لہجے میں مجھے فمّی کے گھر سے غائب ہو جانے کا واقعہ بھی بتایا۔ ابا جان اُس کے بعد بہت چڑچڑے ہو گئے تھے۔ ہمیشہ فرخ، فریال اور فارعہ کو جھڑکتے رہتے تھے۔ اکبر اُن کے سامنے جاتے ہوئے ڈرتا تھا۔ انھوں نے اسکول کی کتابیں گھر میں لا کے رکھ دی تھیں اور کہا تھا کہ وہ خود پڑھایا کریں گے مگر انھیں کبھی فرصت نہیں ملی۔

پہلے فمّی سب بہن بھائیوں کو پڑھاتی تھی۔ وہ چلی گئی تو یہ سلسلہ بھی بند ہو گیا۔ ابا جان کبھی کبھی گھر سے نکلتے تھے۔ واپس آتے تو اُن کے ساتھ کتابوں کا ڈھیر ہوتا۔ وہ کتابیں گھر میں اُن کے سوا کوئی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ کبھی واپس آتے تو اُن کی جیب میں ایک بڑی رقم ہوتی۔ فرخ اور فریال دس بار اُن سے کہتیں کہ پیسے ختم ہو گئے ہیں تو وہ کان دھرتے اور ایک پہر کے لیے گھر سے نکل جاتے۔ اُن کا خط بڑھ جاتا تھا، کپڑے گندے ہو جاتے تھے انھیں خبر ہی نہیں ہوتی تھی۔ گھر میں سب کو ہدایت تھی کہ پڑوسیوں سے زیادہ میل جول نہ رکھا جائے۔ کوئی ملنے آئے تو اُسے دروازے ہی سے ٹال دیا جائے۔ انھوں نے فرخ، فریال اور فارعہ پر کڑی پابندیاں عاید کر دی تھیں۔ جس محلّے میں وہ رہتے، لوگ انھیں شک کی نظروں سے دیکھتے۔ کئی مرتبہ سب نے طے کیا کہ اب کے ابا جان باہر جائیں گے تو وہ یہ کاغذات جلا دیں گے پھر نہ کاغذات ہوں گے، نہ ابا جان ان میں سر کھپائیں گے مگر ابا جان کے خوف کی وجہ سے کوئی ایسا نہیں کر سکا۔ انھوں نے بہت دعائیں مانگیں۔ فرخ ہر نماز کے بعد دعا مانگتی تھی، اُس نے بہت سی منتیں بھی مان رکھی تھیں۔ ابا جان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی بلکہ وہ روز بہ روز اور زیادہ مستغرق رہنے لگے۔ بار بار گھر اور شہر بدلنے کے سبب اُن کے پاس سامان بھی بہت کم رہ گیا تھا۔ ابا جان کی رازداری کے خیال سے جہاں گیر نے خانم کو اپنا صحیح نام نہیں بتایا تھا۔ ابا جان کا نام بھی غلط بتایا تھا اور اپنے گھر سے بچھڑنے کی ایک فرضی داستان سُنا دی تھی۔

جہاں گیر کہہ رہا تھا کہ وہ ان تین برسوں میں کبھی پوری نیند نہیں سویا۔ اُسے بُرے بُرے خواب آتے ہیں، راتوں کو وہ ہڑبڑا کے اُٹھ جاتا ہے اور چیخنے لگتا ہے۔ اُسے معلوم تھا کہ سُریلی خانم ایک طوائف ہے اور گانا سنانے کے لیے نواب صاحب کے ہاں مہمان ہے لیکن ایک خانم ہی تھی جس نے اُس پر سب سے زیادہ توجہ دی۔ اُس نے اُس کے کپڑے بنوائے، ڈاکٹر سے علاج کرایا۔ وہ ہر وقت اُس کا خیال رکھتی تھی اسی لیے وہ خانم کے ساتھ چلا آیا۔ اُس کے کپڑے پھٹ گئے تھے اور جیب میں ایک دمڑی نہیں تھی۔ نواب صاحب کے ہاں سے اُسے کھانا مل جاتا تھا اور چار آنے روز۔ ان چار آنوں میں نہ تو وہ کہیں جا سکتا تھا، نہ آ سکتا تھا اور نہ پڑھ سکتا تھا۔ اُس نے پیسے جوڑ جوڑ کے رکھے۔ نواب صاحب کے بچے اُسے مارتے تھے۔ یہ سب خانم نے دیکھا تھا۔ جب خانم نے اُسے بلا کے اُس کے بارے میں پوچھا تو وہ رونے لگا۔ خانم نے اُسے بہت پیار کیا اور اُسی وقت کہا، "اب تم میرے ساتھ چلو گے۔" جہاں گیر خانم کی باتیں کرتے نہیں تھکتا تھا، جیسے میں اُسے ڈانٹوں گا کہ وہ ایک طوائف کے ساتھ کیوں چلا آیا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ فمّی اُس کی بہن بھی ایک ناچنے گانے والی تھی اور اُس کا بڑا بھائی سات سال جیل میں گزار کے آیا تھا۔ اُس نے کئی قتل کیے تھے۔ اُس نے کلکتے کے ایک بہت بڑے بدمعاش موجدار کو ٹھکانے لگا دیا تھا اور وہ بمبئی شہر کے کئی پارٹیوں کا استاد رہ چکا ہے۔ اُس کی جیب میں ہمیشہ ایک چاقو ہوتا ہے۔ جہاں گیر والہانہ انداز میں خانم کا ذکر کر رہا تھا۔ شاید وہ غیر شعوری طور پر مجھے یہ جتانا چاہتا تھا کہ میری زبان سے خانم کے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات نہ نکل جائے جس سے اُس کی سُبکی ہو۔ کوئی بات ایسی نہ ہو کہ خانم کے سامنے اُسے سر اُٹھانے میں جھجک ہو۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اُس نے کئی دفعہ یہاں سے بھاگنے کا ارادہ کیا مگر خانم کے خیال سے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ نہ جانے آپی کیا سمجھیں۔ وہ بہت روئیں گی، کھانا پینا بند کر دیں گی۔ وہ آپی کی نظروں سے ذرا بھی دُور ہو جائے تو وہ پریشان ہو جاتی ہیں، اگر وہ کہیں چلا گیا تو آپی زندہ نہیں رہیں گی۔ اُس نے آپی سے بہت سے وعدے کیے تھے اور آپی نے اُس سے۔

جہاں گیر کہتا تھا کہ گھر میں بس کوئی دن ہی ایسا جاتا تھا جب میرا تذکرہ نہ ہوتا ہو۔ ابا جان نے تو میرے جانے کے چند دن بعد ہی مایوسی کا اظہار کر دیا تھا۔ کچھ دن اور گزر گئے اور میں گھر واپس نہیں پہنچا تو انھوں نے اعلان کر دیا کہ میں مر چکا ہوں، زندہ ہوتا تو ضرور واپس آ جاتا۔ ابا جان کا خیال تھا کہ میں جس لڑکی کے ساتھ گھر سے نکلا ہوں، لوگ اُسے تلاش کر رہے ہوں گے اور اُس کے ڈھونڈنے والوں نے مجھے مار ڈالا ہو گا۔ وہ بتا رہا تھا کہ میرے جانے سے امّی کا بُرا حال تھا۔ وہ ابا سے ہمیشہ لڑتی جھگڑتی رہتی تھیں۔ پھر ابا کاغذات میں گم ہو گئے اور انھوں نے بتدریج گھر میں دلچسپی لینا کم کر دیا۔ امّی ہر وقت اُن سے کہتی تھیں کہ وہ گھر کی طرف دھیان دیں اور میری تلاش کے لیے دوڑ دھوپ کریں مگر ابا جان کچھ دن تک تو مجھے اِدھر اُدھر ڈھونڈتے رہے، پھر گھر میں بند ہو گئے۔ انھوں نے رشتے داروں سے ملنا بھی منقطع کر دیا۔ امّی کی صحت گرتی گئی۔ وہ بہت دُبلی ہو گئی تھیں۔ ہر وقت مجھے یاد کرتی رہتی تھیں اور آسمان کی طرف دیکھتی رہتی تھیں۔ ساری ساری رات وظیفے پڑھتی تھیں۔ انھیں یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن میں ضرور واپس آ جاؤں گا۔ پھر وہ ایسی بیمار پڑیں کہ پلنگ سے نہیں اُٹھیں۔ آخری وقت بھی اُن کی زبان پر میرا ہی نام تھا۔ کہتی تھیں کہ باہر آئے تو کہنا تیری ماں نے بہت انتظار کیا۔ امّی کی موت کے بعد چند روز کے اندر اندر ابا جان نے زمینیں بیچ دیں۔ چپ چپاتے گھر کا سودا کر لیا۔ میں نے جہاں گیر کو روکا نہیں تاکہ جتنے طعنے دینے ہوں، وہ ایک ہی بار دے لے۔ میں نے درمیان میں ایک بات بھی نہیں پوچھی۔ وہ خود ہی سب کچھ کہتا اور سینہ خالی کرتا رہا۔ امّی کے ذکر پہ اُس کی آواز حلق میں پھنس گئی، کہنے لگا۔ "مجھے خوب یاد ہے، امّی نے آخری وقت میرا ہاتھ تھام کے کہا تھا کہ جب تک تیرا بڑا بھائی واپس نہیں آتا، تو اپنے آپ کو اس گھر کا رکھوالا سمجھنا، میں یہ سارا گھر تجھ پہ چھوڑے جا رہی ہوں۔ امّی نے سبھی کو تاکید کی تھی کہ اپنے باپ کا خیال رکھیں اور بھائی کو تلاش کرتے رہیں، ایک نہ ایک دن وہ ضرور مل جائے گا۔ وہ نہ آئے تو اُسے اپنی امّی کا واسطہ دینا۔ وہ کتنا

ہی روٹھا ہوا ہو واپس آجائے گا اور اُس کے ساتھ وہ لڑکی ہو تو اُسے عزت سے گھر لانا۔ امّی نے فتی سے بھی کہا تھا کہ وہ اب اس گھر کی ماں بہن سب کچھ ہے۔ نہ تو فتی، امّی کی بات پوری کرسکی نہ میں۔" جہاں گیر کہہ رہا تھا۔ "پتہ نہیں اب وہ سب کہاں اور کس حال میں ہوں۔ اکبر بہت چھوٹا ہے، گھر کا سودا کون لاتا ہوگا؟"

معلوم نہیں جہاں گیر نے اور کیا کیا کہا' اور کتنے طمانچے مارے۔ میرے اعصاب شل ہو گئے تھے۔ شاید اُس کی آواز میں بھی دم نہیں رہا تھا۔ وہ چپ ہوگیا اور میری صورت دیکھنے لگا۔ میری آنکھیں پگھل رہی تھیں اور جسم پتھر سا ہوگیا تھا۔ "بھائی جان! آپ کہاں چلے گئے تھے؟" وہ سسکتے ہوئے بولا۔ میں نے اُسے جواب نہیں دیا۔ وہ مجھے جھنجوڑنے لگا۔ "آپ کیوں روٹھ گئے تھے؟"

"مت پوچھ منّے!" میں نے اُس سے فریاد کی۔ "کچھ نہ پوچھ' سمجھ لے کہ اس عرصے میں میں مرگیا تھا' میں دوبارہ زندہ ہوا ہوں۔"

جہاں گیر خاموش ہوگیا لیکن چند ہی لمحوں بعد سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ایک بات بتا دیجیے' وہ کہاں ہیں؟"

"وہ نہیں ہے۔" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "وہ کھو گئی۔"

"کھو گئیں!۔ کہاں؟"

"مجھے کچھ نہیں معلوم منّے! چپ ہو جا۔"

اُس نے پھر مجھے تنگ نہیں کیا' اپنی زبان سی لی۔ کمرے میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ ہم دونوں دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ جہاں گیر نے اپنا سر میرے شانے پر ٹکا دیا تھا۔ خانم نے کمرے میں آ کے روشنی کی اور ہمیں اُٹھا کے کمرے سے باہر لے گئی۔

باہر کے کسی مکان سے گانے کی آواز آرہی تھی۔ وقفے وقفے سے گھنگرو بجنے لگتے تھے اور طبلے کی تھاپ تیز ہو جاتی تھی۔ خانم کو اِس کا احساس ہوا تو اُس نے کھڑکی بند کردی۔ ہم سب اوپری منزل کے صحن میں بیٹھے تھے۔ وہاں کئی گملے رکھے ہوئے تھے۔ ایک چھوٹا باغیچہ سا تھا۔ سائبان کے تھموں پر بیلیں چڑھی ہوئی تھیں اور رات کی رانی کی خوشبو سے فضا مہکی ہوئی تھی۔ ایک بوڑھی اور ایک نوجوان خادمہ سامنے چوکی پر بچھے ہوئے دستر خوان پر کھانا لگا رہی تھیں' طرح طرح کے کھانے۔ جہاں گیر کا چہرہ آنسوؤں سے دُھل سا گیا تھا جیسے کئی دنوں کی بارش کے بعد دھوپ نکلے۔ خانم نے لباس تبدیل کرلیا تھا۔ وہ نارنجی ساڑی میں ملبوس تھی اور خوش خوش نظر آرہی تھی۔ خادماؤں کو ہدایت دینے کے کام سے فارغ ہو کے وہ میرے پاس آ بیٹھی اور چپکے چپکے جہاں گیر کی باتیں کرنے لگی۔ وہ مجھے بتا رہی تھی کہ اب جہاں گیر کی صحت بہت ٹھیک ہے۔ پہلے تو اُس کی ہڈیاں ہی ہڈیاں نظر آتی تھیں۔ اُس نے اُسے شہر کے سب سے بڑے ڈاکٹر' ڈاکٹر بُرہان کو دکھایا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ اگر وہ کچھ اور دیر سے آتی تو جہاں گیر کو دق ہونے کا اندیشہ تھا۔

مجھ سے اُس کا شکریہ ادا نہیں کیا جا سکا۔ میری زبان سے ایک لفظ بھی نہیں پھوٹتا تھا۔ جب ہم کھانا کھانے کے لیے چوکی پر آئے تو وہ سمجھی کہ میں تکلف کر رہا ہوں۔ اُس نے تجمل سے میری شکایت کی۔ "ہاتھ پیر کھول لاڈلے!" وہ برہمی سے بولا۔

"ہاں! بھائی جان!" جہاں گیر چہک کے بولا۔ "میٹھے چاول کھائیے۔ آپ کو میٹھے چاول بہت پسند ہیں نا؟"

اُسے اب تک یاد تھا۔ امّی میرے لیے بطورِ خاص خشکے میں میٹھا ڈال دیا کرتی تھیں۔ ممکن ہے' فرخ نے اُسے بتایا ہو۔ خانم نے چاولوں کی تھالی میرے آگے کردی۔ میرے حلق میں لقمے اٹک رہے تھے اور مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے امّی آج ہی مری ہیں اور یہ اُن کی موت کا کھانا ہے۔

کھانے کے بعد خانم نے ہمیں قہوہ پلایا اور رات کو دیر تک وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ شہر میں اچھے گھریلو ملازموں کا قحط' ملازموں کے سلسلے میں اپنے تجربے۔ اُسے شکایت تھی کہ رواداری اُٹھ گئی ہے اور لوگ بہت سفلے ہو گئے ہیں۔ اُس نے میرا پلنگ بھی جہاں گیر کے کمرے میں بچھوا دیا تھا لیکن جہاں گیر میرے پلنگ پر آ کے اور مجھ سے چمٹ کے لیٹ گیا۔ خانم شاید روزانہ اُس کی پیشانی پر بوسہ دے کے رخصت ہوتی تھی۔ شب بخیر کہتے وقت اُس نے جہاں گیر کے ساتھ میری پیشانی پر بھی اپنے ہونٹ ثبت کیے اور مسکراتی ہوئی اوجھل ہوگئی۔ آدھی رات تک جہاں گیر خوابیدہ لہجے میں مجھے گھر کی باتیں سناتا رہا۔ پھر میرے بازو پر سر رکھ کے سو گیا۔ میں اُس کے بال سنوارتا اور اُس کا چہرہ تکتا رہا۔ وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ بالکل آٹھ سال پہلے کے منّے کی طرح' میں نے اُس کے بہت سے پیار لیے۔ مجھے یاد تھا کہ وہ سوتے میں ٹانگیں بہت مارتا تھا۔ جب وہ ایسا کرتا تو میں غصے سے اُسے اُٹھا کے امّی کی چارپائی پر ڈال دیا کرتا۔ اب بھی وہ ٹانگیں چلا رہا تھا۔ میں نے اپنا رُخ بدل لیا' اُس کی ٹھوکریں میرے منہ پر ہی لگنی چاہییں تھیں۔

ابھی ہر سو گہرا اندھیرا ہی طاری تھا کہ مجھے دروازے پر دستک کا احساس ہوا۔ میں یوں ہی آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ پہلے تو میں سوچتا رہا کہ اِس وقت کون ہوسکتا ہے۔ چوتھی پانچویں دستک پر میں نے اُٹھ کے دروازہ کھول دیا۔ وہاں خانم موجود تھی۔ "کیا وہ جاگ گیا ہے؟" اُس نے آہستگی سے پوچھا۔

"نہیں' وہ سو رہا ہے۔" میں نے تذبذب سے جواب دیا۔

وہ سیدھی کمرے میں چلی آئی اور جہاں گیر کے سرہانے بیٹھ کے اُس کے گال تھپ تھپانے لگی۔ جہاں گیر فوراً ہی اُٹھ گیا۔ "آپی! آج تو نیند آرہی ہے۔" اُس نے خانم کے گلے میں بانہیں ڈال کے کسمساتے ہوئے کہا۔

"نہیں' بالکل نہیں' شجاعت اُٹھ چکا ہے۔ بستر چھوڑو گے تو نیند بھاگ جائے گی۔ بس جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" خانم نے اُس کے بازو ہلاتے ہوئے

اُسے بستر سے اُٹھنے پر مجبور کردیا۔ وہ پوری طرح بیدار ہوگیا تو خانم چلی گئی۔ جہاں گیر نے مجھے جاگتا دیکھ کے سو جانے کا مشورہ دیا اور کہا کہ وہ ایک دو گھنٹے بعد واپس آجائے گا۔ اُس نے بتایا کہ وہ روز صبح کسی ملازم کے ساتھ چہل قدمی کے لیے جاتا ہے۔ جب وہ نہا دھو کے باہر آیا تو میں بھی تیار ہوگیا تھا۔ میں نے شجاعت کو منع کردیا اور اُسے اپنے ساتھ لے کے گھر سے نکل گیا۔ ہم چار مینار تک آ گئے۔ اُس کے پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے مجھے اپنا قد بڑا اور وزن زیادہ محسوس ہو رہا تھا' جیسے میں ایک دن میں بہت بڑا ہوگیا ہوں۔ راستے میں جہاں گیر مجھے عمارتوں اور راستوں کے بارے میں بتاتا جا رہا تھا۔ "یہ خلوتِ مبارکہ ہے' یہ مکہ مسجد ہے' وہ سامنے چار کمان ہے اور یہ شفاخانۂ عثمانیہ ہے۔" میں ان راستوں سے پہلے بھی گزر چکا تھا لیکن میں نے اُس کے سامنے اپنی معلومات کا اظہار نہیں کیا۔ جیل سے چھوٹنے کے کچھ دنوں بعد ہی میں مولوی محمد شفیق کی تلاش میں یہاں آیا تھا اور میں نے کوئی گلی نہیں چھوڑی تھی۔ اخبار میں اشتہار بھی چھپوایا تھا۔ اُس وقت بھی جہاں گیر یہیں ہوگا۔ کاش وہ مجھے اُسی وقت نظر آ جاتا مگر میں ہر گھر میں گھس کے تو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایسے ہی کسی گھر میں کورا بھی چھپی ہوتی ہوگی۔ باہر سے کسی کو کیا خبر ہوسکتی ہے کہ اندر کون ہوسکتا ہے۔ ہم نے جنوبی ہند کی تمام بستیوں میں اُنھیں پوچھ لیا تھا۔ ممکن ہے' ابّا جان کی طرح کورا اور مولوی صاحب نے بھی اپنا نام تبدیل کرلیا ہو اور وہ خود بھی نہ چاہتے ہوں کہ کوئی تلاش کرتا ہوا اُن تک پہنچ جائے۔ ممکن ہے' ابّا جان کی طرح مولوی صاحب نے بھی مجھے مرا ہوا سمجھ لیا ہو اور کورا کو بھی یہ باور کرا دیا ہو مگر پھر کورا کیسے زندہ رہی ہوگی۔ جس طرح امّی جان مرگئیں' وہ بھی... وہ بھی، "نہیں نہیں۔" میں نے اپنا منہ کھسوٹ لیا۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ جہاں گیر بھی میرے ساتھ ہے اور ہم سڑک پر چل رہے ہیں' وہ پریشان ہوگیا اور حیرانی سے پوچھنے لگا کہ مجھے کیا ہوگیا ہے۔

میری خجالت اُسے مطمئن نہیں کرسکی۔ وہ اور مضطرب ہوگیا اور گھر واپس چلنے پہ اصرار کرنے لگا۔ اُس نے خانم کا عذر کیا کہ اب وہ اپنی صبح کی ریاضت سے فارغ ہوگئی ہوگی اور ہماری راہ تک رہی ہوگی۔ یوں بھی اندھیرا چھٹ گیا تھا اور ہمیں واپس ہو جانا چاہیے تھا۔ محبوب کی مہندی کے علاقے میں پہنچتے پہنچتے اکّا دکّا دکانیں کھل گئی تھیں' خانم ناشتے پر ہمارا انتظار کر رہی تھی اور بیٹھک میں تجمل گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے اس طرح تخت پر بیٹھا تھا جیسے اُسے یہاں آئے ہوئے بہت دن گزر گئے ہیں' مجھے حیرت ہوئی۔ خانم نے تجمل کے لیے حقّے کا انتظام بھی کر دیا تھا۔ یقیناً حقہ وہاں پہلے سے موجود ہوگا یا گھر کا کوئی ملازم شوق کرتا ہوگا۔ معلوم ہوا کہ خانم نے ہماری عدم موجودی میں دو بکرے ذبح کرائے ہیں۔ دھوپ چڑھی اور اُتر گئی۔ تجمل دن بھر گھر ہی میں پڑا رہا۔ شام کو کہیں وہ باہر نکلا' اُس نے جہاں گیر کو بھی ساتھ لے لیا۔ میرا خیال تھا کہ گھر سے باہر آنے میں اُس کا کوئی مقصد ہوگا مگر وہ جہاں گیر کا ہاتھ تھامے شہر کے خوب صورت علاقے عابد شاپ روڈ' باغِ عامّہ کا ایک لمبا چکر کاٹ کے اور نام پلّی کے ایک مدراسی ہندو کی دکان سے چاٹ مسالہ کھا کے گھر چلا آیا۔

خانم کے ہاں ٹھیرے ہوئے ہمیں کئی دن گزر گئے۔ اس دوران میں ایک رات نواب عالم تاب نے اُسے اپنے محل طلب کیا۔ خانم نے معذرت کرلی کہ اُس کے ہاں مہمان آئے ہوئے ہیں۔ شجاعت کا کہنا تھا کہ خانم نے نواب بہادر کے ہاں جانے سے پہلی بار انکار کیا ہے۔ صبح و شام جب ہم گلیوں سے گزرتے تھے تو چھجوں' کھڑکیوں اور شہ نشینوں پر بیٹھی ہوئی عورتیں ایک دوسرے کو اشارے کرتی تھیں' اُن میں سے کئی عورتوں کی خانم کے ہاں آمد و رفت تھی اور جہاں گیر بھی اُن سے خوب واقف تھا۔ وہ آتے جاتے ہوئے اُنھیں سلام کرتا تو وہ مسکرا کے جواب دیتیں۔ کچھ دعائیں دیتیں اور کچھ اُس سے اپنے گھر میں آنے کے لیے اصرار کرتیں۔ بازار کے بہت سے لوگ بھی جہاں گیر کو بخوبی جانتے تھے اور اُس کے سلام کا جواب نہایت سرگرمی سے دیتے تھے' رات کو گلیوں میں دن کا سماں ہو جاتا تھا۔ گلیاں پھولوں سے مہک جاتی تھیں۔ عورتیں رنگ برنگے کپڑے بدل لیتی تھیں۔ اُن کے کپڑوں میں ٹنکے ہوئے سلما ستارے روشنی میں دمکتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے روشنی اُن کے چہروں سے پھوٹ رہی ہو۔ اُن کے لبوں پر اور آنکھوں میں مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ رات کو ہم باہر نکلنے سے پرہیز کرنے لگے۔ میں نے تجمل سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ اب اُس کا ارادہ کیا ہے۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ اس سلسلے میں خود سوچ رہا ہوگا مگر اُس کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ میں جہاں گیر کو جلد سے جلد یہاں سے لے جانا چاہتا تھا مگر خانم کے خیال سے میری زبان نہیں کھلتی تھی اور یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اُسے لے کہاں جاؤں گا۔

ایک دن شام کو گھر واپسی کے وقت خلیفہ جمّا نے ہمارا راستہ روک لیا۔ اُس نے جہاں گیر کے سامنے اوٹ پٹانگ باتیں شروع کردیں۔ "کب حضرت! آپ نے تو بالا ہی بالا کام کرلیا؟" اُس نے چھوٹتے ہی کہا اور آنکھ مار کے بولا۔ "کون سا منتر پھینکا تھا جادوگر بالمانے! ادھر چرچا ہے کہ سُر کی ملکہ راگ بھول گئی ہے۔" تجمل نے جب تک اُس کی مٹھی میں دو روپے نہیں رکھے اُس کی زبان کو تالا نہیں لگا پھر بھی اُس کے دانت کھل کھلاتے رہے اور اُس کی معنی خیز نظریں دور تک ہمارا تعاقب کرتی رہیں۔ اُسے زیادہ باتیں کرنے کا موقع نہیں ملا تھا مگر اُس کی ان اچٹتی ہوئی باتوں سے ظاہر تھا کہ بازار میں خانم کے اجنبی مہمانوں کے متعلق حیرانی ہے۔ میں نے طے کرلیا تھا کہ اب میں صبح کے سوا باہر نہیں نکلا کروں گا۔ صبح بازار میں بہت سکون ہوتا تھا۔ گلیاں تقریباً سنسان پڑی رہتی تھیں مگر تجمل نے آنا جانا بند نہیں کیا۔ وہ جہاں گیر کو لے کے کسی وقت بھی گھر سے چل پڑتا تھا۔ نتیجتہً مجھے بھی اُس کے ساتھ جانا پڑتا۔ گھر سے باہر جانے

کے لیے ان گلیوں کے سوا کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا۔
دن میں خانم کے ہاں کئی لڑکیاں آتی تھیں۔ جہاں گیر نے مجھے بتایا تھا کہ خانم ان لڑکیوں کو گانے کا ریاض کراتی ہے۔ جب سے ہم آئے تھے، خانم نے یہ سلسلہ بھی بند کر دیا تھا۔ لڑکیاں اب بھی آتی تھیں مگر وہ دن بھر گھر کے کاموں میں لگی رہتیں یا ایک کمرے میں بند ہو کے خود ہی مشق کر لیا کرتیں۔ ایک لڑکی کا نام نیساں تھا۔ وہ دن بھر ہماری خاطروں میں لگی رہتی۔ اُس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ رنگ چمپئی تھا۔ چھوٹے چھوٹے دانت تھے۔ وہ ہر لمحے اس طرح شرماتے اور بدن چراتے ہوئے نظر آتی تھی جیسے اُس کی کوئی چوری پکڑ لی گئی ہو یا جیسے کسی نے اُسے گدگدی کر دی ہو یا کسی نے اُس کے کان میں کوئی بے حجاب بات کہہ دی ہو۔ بھورے بالوں کی چوٹیاں اُس کے شانوں پہ لہراتی رہتی تھیں۔ اُس کا قد نہ بڑا تھا نہ چھوٹا۔ وہ بہت شائستہ تھی۔ جب وہ گھر آتی تو سب سے پہلے تجمل کو تسلیمات کرتی، پھر خانم کو، پھر مجھے، پھر جہاں گیر کو۔ شام کو وہ اپنے گھر چلی جاتی۔ اُس کے جانے کے بعد گھر میں ایک کمی سی محسوس ہوتی تھی۔ کئی بار میرے جی میں آئی کہ نیساں سے بات کروں۔ کیا وہ بھی کچھ اور بڑی ہو کے اپنے پیروں میں گھنگرو باندھے گی؟ ابھی تو وہ اس قدر شرماتی ہے، پھر اتنے مردوں میں کیسے بیٹھے گی۔ اُس کے حلق سے تو آواز بھی نہیں نکلے گی لیکن امی بھی تو نیساں کی طرح تھی۔

ہمیں یہاں آئے ہوئے دس دن سے اوپر ہو چکے تھے۔ راستے میں کئی بار مولا سے آمنا سامنا ہوا تھا۔ ہم دونوں کو ساتھ دیکھ کے اُس کی نگاہوں میں چمک آ جاتی تھی لیکن وہ چپ رہا اس لیے میں نے بھی ہاتھ اُٹھانا مناسب نہیں سمجھا حالانکہ میرے ذہن سے وہ گالی نہیں نکلی تھی جو اُس نے جہاں گیر سے لڑائی کے دوران میں امی کو دی تھی۔ تجمل بھی کئی مرتبہ اُسے اِدھر اُدھر بازار میں بیٹھا ہوا دیکھ چکا تھا اور اُس نے مجھے سختی سے منع کر دیا تھا کہ میں ان گلیوں سے کان بند کیے اور نظریں جھکائے ہوئے گزرا کروں۔ میں نے یہی کوشش کی تھی اور تجمل نہ کہتا تب بھی جہاں گیر کے ساتھ بازار میں گزرتے ہوئے مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا لیکن میں نے سوچ لیا تھا کہ چلتے وقت اگر موقع ملا اور بعد میں خانم پہ کوئی آنچ آنے کا اندیشہ نہ ہوا تو میں مولا سے ضرور ملوں گا۔ اِن دنوں مولا کے متعلق جہاں گیر اور خانم نے اتنی باتیں بتا دی تھیں کہ مجھے خود ہی اُسے راستے میں روک لینا چاہیے تھا۔

میں نے بہت ضبط کیا مگر مولا سے ضبط نہیں ہوا۔ صبح صبح میں جہاں گیر کے ساتھ سیر سے واپس آتا تھا۔ وہ تین روز سے مسلسل مجھے ایک جگہ بیٹھا ہوا نظر آتا۔ اُس دن سویرے مولا نے پہلی بار اپنی زبان کھولی۔ ہم اُس کے قریب سے گزرے تو اُس نے بیڑی پھینک کر ایک گالی دی اور زمین پہ تھوک دیا۔ گالی ذومعنی تھی۔ یہاں تک بات ٹھیک تھی۔ میں نے جان بوجھ کے اسے کانوں کا دھوکا سمجھا لیکن پھر اُس نے اونچی آواز میں خانم کے متعلق ایک پھبتا ہوا گندہ فقرہ چست کیا۔ میرے قدم رکنے لگے۔ جہاں گیر کے کان بھی تیز تھے۔ اُس نے بھی فقرہ سن لیا ہوگا۔ میں نے درگزر کیا لیکن دوسری صبح مولا حسبِ معمول پھر اپنی جگہ بیٹھا تھا۔ اگرچہ جہاں گیر نے اُس رذیل کے دوسری طرف سے گھر واپس آنے کو کہا تھا لیکن میں نے راستہ نہیں بدلا۔ میں اُسی گلی سے گھر کی طرف آیا جدھر مولا روزانہ ہمارا انتظار کرتا تھا۔ اُس نے ہمیں دُور سے دیکھتے ہی منہ سے سیٹی بجائی اور جب ہم اُس کے سامنے پہنچے تو اُس نے پھر اپنی زبان گندی کی۔ مجھ سے آگے بڑھنا دوبھر ہو گیا۔ مولا چاہتا بھی یہی تھا کہ میرا خون آزمائے۔ تاہم خانم کی رسوائی سے میرے ہاتھ اینٹھنے لگے۔ اِدھر جہاں گیر نے بھی میرا ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ ہم کوئی چھ سات قدم آگے چلے ہوں گے کہ ایک دم جہاں گیر بلبلانے لگا۔ مولا نے پیچھے سے پتھر مارا تھا۔ پتھر جہاں گیر کی گردن پر لگا اور خون پھوٹ پڑا۔ میں نے جہاں گیر کو ایک طرف کیا۔ وہ مجھے روکنے لگا۔ مولا اکیلا نہیں تھا۔ جب اُس نے سیٹی بجائی تھی تبھی مجھے شبہ ہو گیا تھا کہ وہ اکیلا نہیں ہے۔ اُس کے دو ساتھی اور بھی تھے جو اُس سے کچھ دُور اِدھر اُدھر بیٹھے ہوئے تھے اور مجھے پلٹتا دیکھ کے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے اُن کے آنے کا انتظار کیا۔ "تجو! آنکھیں دکھا رہا ہے؟" مولا نے اپنا سر جسم سے آگے کر کے ہنستے ہوئے کہا۔

میرا اُن کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ اُس کے دونوں ساتھی بھی اُس کے آزو بازو کھڑے ہو گئے۔ میں نے جواب دینے کے بجائے باری باری اُن کی طرف دیکھا۔ تجمل نے جیل میں مجھے بتایا تھا کہ مقابل کی جگہ تبدیل کرنا ضروری ہو تو نگاہوں سے کام لینا چاہیے۔ وہ اپنی جگہ سے ضرور حرکت کرے گا اور جب وہ نسبتاً موافق موقع پہ آ جائے تو اپنی نگاہ ٹھہرا لینی چاہیے۔ میں نے یہی کیا۔ وہ مجھے گھور رہے تھے۔ دونوں ساتھی مولا کے کچھ اور قریب ہو گئے۔

"کیا چاہتا ہے مولا!" میں نے اپنی آواز پہ قابو پاتے ہوئے کہا۔

"یہ معشوق اپن کا ہے۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کے بولا۔ اُس کا اشارہ جہاں گیر کی طرف تھا۔ میرا خون رگوں میں اُبلنے لگا۔ مجھے اُس سے کوئی بات ہی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ میں نے سوچا جیب سے چاقو نکال کے اُس کی زبان کاٹ لوں۔ "اُس دن کے دھوکے میں نہ رہنا بچو! وہ تیرا باپ بھڑوا بیچ میں آ گیا۔" وہ بپھرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "مار بھول گیا گیدڑ! رجو کو چھوڑ دے میرا ہے تو تجھ کو ابھی خود بھی ......"

جہاں گیر نے میرا کرتا پکڑ لیا تھا۔ میں نے چیخ کر اُسے ایک جگہ کھڑے رہنے کا حکم دیا۔ مولا کی آواز حلق میں رہ گئی۔ میں دونوں ہاتھ سیدھے کیے ہوئے اُس کی گردن کی طرف جھپٹا۔ مجھے یقین تھا کہ اُس کے دونوں ساتھی کچھ آگے بڑھ کے میرے ہاتھ پکڑنے کی کوشش کریں گے لیکن میرا ارادہ مولا کی گردن پکڑنے کا نہیں تھا۔ میں نے مولا کے قریب پہنچ کے اپنے دونوں ہاتھ پھیلانے کے لیے جھٹکا دیا۔ دونوں ہاتھ اُس کے ساتھیوں کی گردنوں پر ایک ساتھ پڑے۔ دونوں زمین پر گر گئے۔ اُن کی طرف دیکھے بغیر میں نے تیزی سے مولا کے پیٹ میں گھٹنا مارا۔ وہ دائیں بائیں اپنے ساتھیوں کو دیکھنے کی چوک کر بیٹھا تھا اور غضب میں آ کے مجھ سے لپٹ گیا تھا۔ گھٹنا لگتے ہی وہ پیٹ پکڑ کے زمین پر بیٹھ گیا۔ وہ اکہری ہڈی کا تھا۔ میں اُسے کمر سے پکڑنے کے لیے دوبارہ آگے بڑھا مگر اُس کا ایک ساتھی زمین سے اُٹھ گیا۔ اُس کی گردن پہ ضرب شاید ٹھیک طرح نہیں لگی تھی۔ اُس نے بائیں جانب سے میرے جبڑے پر گھونسا مارا۔ یہ دیکھ کے مولا کی ہمت بھی بڑھی۔ اُس کے اُٹھنے سے پیشتر ہی جہاں گیر اُس کا گریبان پکڑ کے اُس سے اُلجھ گیا تھا۔ جہاں گیر کو اُس سے علیحدہ کرنے میں چند لمحوں کے لیے میری توجہ ہٹ گئی اور مولا کا ساتھی مجھے دو تین ضربیں لگانے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ مجھ سے لپٹ گیا تھا اور مجھے گرانے کے لیے زور کر رہا تھا۔ میں نے اُس کی خواہش پوری کی اور اُسے ساتھ لے کے زمین پر آ پڑا۔ ایسے موقع پر سب سے پہلے نیچے پڑے ہوئے آدمی کے لوٹھے اور سر پہ زور دے کے اُسے قابو میں رکھنا ہوتا ہے۔ اُس نے ایک ہاتھ سے میری ٹھوڑی پر ہتھیلی سے دباؤ ڈالا اور دوسرا ہاتھ مکے لگانے کے لیے آزاد رکھا۔ اُس نے اپنا جسم زیادہ اوپر نہیں اُٹھایا تھا۔ اُٹھاتا تو میرے دونوں کھلے ہوئے ہاتھ زیادہ آسانی سے کام کرتے۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اُسے خود سے اور نزدیک کر لیا اور اُس کی کمر بازوؤں سے جکڑ لی۔ اب بس کی میری حالت ایک جیسی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ میں نیچے تھا اور وہ اوپر۔ مجھے جلدی تھی۔ جہاں گیر اور مولا میری نظروں سے اوجھل تھے۔ مولا کے ساتھی کے لیے زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میری ٹھوڑی پر رکھا ہوا اُس کا ہاتھ ہم دونوں کے سینے کے درمیان پھنس گیا تھا۔ اُس نے ٹھوڑی چھوڑ دی تھی اور اپنے کھلے ہوئے ہاتھ سے میرے کان پر گھونسے مار رہا تھا۔ میں نے پوری طاقت سے اپنے دائیں شانے پر زور دیا۔ وہ سمجھا کہ میں اس جانب سے پلٹنا چاہتا ہوں چنانچہ اُس نے بھی اپنا سارا زور اسی طرف صرف کر دیا لیکن مجھے بائیں شانے سے پلٹنا تھا۔ ہم دونوں جھونک میں ایک دوسرے سے گتھے ہوئے تین چار لڑھکنیاں کھا گئے۔ اُس کا وزن کم تھا۔ جہاں جھونک کمزور پڑی میں نے وہیں اپنے آپ کو لیا۔ نیچے آنے سے وہ اپنے حواس برقرار نہیں رکھ سکا۔ اُس نے اُچھل کود شروع کر دی۔ اُس سے یہی توقع تھی۔ میں نے دوبارہ اُسے اپنے جسم سے چمٹا لیا بلکہ اُس کے نتھنوں میں پنجہ ڈال کے اُس کے پیٹ پر جم کے بیٹھ گیا۔ میں کچھ اوپر اُٹھا تو اُس نے یہ جانا کہ میں کھڑا ہو رہا ہوں لیکن جسم ڈھیلا چھوڑ کے میں دوبارہ کہیں اوپر سے گرنے کے انداز میں اُس پر بیٹھ گیا تھا۔ پھر سہ بارہ یہی ہوا۔ میں نے یہ عمل کئی بار دہرایا۔ وہ چیخنے چلانے لگا۔ اُس کی انتڑیاں پچک گئی ہوں گی۔ اُس کی آنکھیں اُبلنے لگیں تو میں نے اُسے چھوڑ دیا۔

چند ثانیوں کی تاخیر ہو گئی۔ اُدھر مولا نے جہاں گیر کا دانت توڑ دیا تھا۔ جہاں گیر کی توجہ میری ہی طرف ہو گی ورنہ وہ اتنی جلدی مار کھانے والا نہیں تھا۔ کاش میں اُسے اپنے بارے میں پہلے بتا دیتا۔ میں نے مولا کو پیچھے سے پکڑ کے پہلے جہاں گیر کو اُس سے دُور ہونے کی ہدایت کی۔ جہاں گیر دُور ہو گیا تو میں نے مولا کی کمر سے ہاتھ ہٹا لیے۔ وہ جیسے ہی میری طرف پلٹا، میں بیٹھ گیا اور اُسے لیے ہوئے اوپر اُٹھا۔ پھر میں نے اُسے زمین پر لوٹنے میں دیر نہیں کی۔ اُس نے کھڑے ہونے کی ہمت کی۔ میری ٹھوکروں نے اُس کا توازن بگاڑ دیا۔ میں نے اُس کے منہ پر اتنے طمانچے مارے کہ خون کی دھار بہہ نکلی۔ میں اُسے وہیں ختم کر دیتا اگر جہاں گیر درمیان میں نہ آ جاتا۔ مولا کے ساتھی بھاگ گئے تھے۔ اِرد گرد تماشا دیکھتے ہوئے راہ گیروں نے ہمیں گھیرے میں لے لیا تھا حالانکہ مولا تڑپ رہا تھا مگر اُس کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔

جہاں گیر نے راہ گیروں میں سے کوئی آدمی تجمل کو بلانے کے لیے گھر کی طرف دوڑا دیا تھا۔ تجمل نہیں آیا مگر جب ہم گھر والی گلی میں داخل ہوئے تو خانم شجاعت کے ساتھ تیزی سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ زمین پر پڑے رہنے کی وجہ سے میرے تمام کپڑے گندے ہو گئے تھے۔ جہاں گیر کے منہ سے خون جاری تھا لیکن اُس کے پیر ٹیک رہے تھے۔ وہ میرے بازو سے چمٹا جا رہا تھا۔ خانم نے گلی ہی میں واویلا شروع کر دیا۔ جہاں گیر اُسے گھر میں لے گیا۔ بیٹھک میں تجمل حقہ پی رہا تھا۔ "میں نے بولا تھا خانم! مت جاؤ۔" وہ بلند آواز سے بولا۔ "وہ آتے ہی ہوں گے۔ سب ٹھیک ہے نا؟" اُس نے مجھ سے مخاطب ہو کے پوچھا۔ "نہیں مانے حرام کے جنے۔"

"نہیں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"چل کپڑے بدل لے، ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

"وہ تین تھے آپی!" جہاں گیر حیرت بھری آواز میں بولا اور خانم کو ساری داستان سنانے لگا۔ خانم نے آنکھیں بند کر کے اُس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ اُس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔

"اب میں ایک دن بھی یہاں نہیں ٹھیروں گی۔" وہ وحشت سے بولی۔

"چاہے اس گھر کا انتظام ہو یا نہ ہو۔ میں اسے ارجی بائی ہی کو دے دوں گی۔ مجھے پہلے ہی اس کا اندیشہ تھا۔"

"خانم!" تجمل کی آواز گونجی۔ "جلدی مت کرو۔ اطمینان سے چلیں گے۔"

"کیسا اطمینان!" وہ ہذیانی انداز میں بولی۔ "آپ نے دیکھا نہیں کہ یہ کس طرح واپس آئے ہیں۔ میں اب یہاں نہیں رہ سکتی۔"

"انھیں کیا ہوا ہے۔" تجمل نے غنودہ آواز میں کہا۔

"اور کیا کسر رہ گئی تھی۔ معاف کیجیے آپ تو یہیں بیٹھے رہے۔ اگر انھیں کچھ ہو جاتا! آپ اُن لوگوں کو نہیں جانتے۔ میں ایک عرصے سے

یہیں رہتی ہوں۔"

"خانم! اتنا نہیں گھبراتے۔" تجمل دھیمے لہجے میں بولا۔

"کیسے نہ گھبراؤں۔ آج وہ تین تھے، کل چھ ہو سکتے ہیں، پرسوں دس۔ بازار میں کوئی اُن کے منہ نہیں لگتا۔ سب کو معلوم ہے کہ اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔"

"جیسے تمھاری مرضی خانم! ہم تو کب سے جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔" تجمل نے تندی سے کہا۔ "تم جیسا چاہو کرو، پر جلدی میں نقصان ہو سکتا ہے۔ میں تم سے اتنا ہی بول سکتا ہوں۔"

"آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔" خانم نے لجاجت سے کہا۔

"جو میں بولتا ہوں وہ تم بھی سمجھا کرو۔"

خانم نے تجمل کی طرف سراسیمگی سے نگاہ اُٹھائی، اُس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے کھلے مگر لرز کے رہ گئے۔ وہ تجمل کی بات سے مطمئن نہیں تھی۔ اُن کے درمیان ہونے والی باتیں میرے لیے نئی تھیں، انھیں سن کے مجھے بے کلی ہونے لگی۔ صاف ظاہر تھا کہ تجمل کے اتنے دنوں کہاں ٹھیرے رہنے کا کوئی سبب ہوگا اسی لیے میں نے اسے پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ جب بھی میں اس سلسلے میں سوچتا تھا، میرا دماغ بند ہونے لگتا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ تجمل کا بھی یہی حال ہوگا۔ میرا کوئی ٹھکانا ہوتا اور جہاں گیر سے ملنے کے بعد گھر تک پہنچنے کی کوئی صورت نکلتی تو میں یقیناً خانم سے درخواست کرتا کہ وہ ہمارے ساتھ ہی رہے چونکہ وہ پہلی ملاقات میں بازار کی زندگی ترک کرنے کا اظہار کر چکی تھی اور اُس نے اپنے گھر کے دروازے تماشائیوں کے لیے بند کر دیے تھے۔ خانم کہیں جانے کی بات کر رہی تھی لیکن کہاں؟ ناشتے کے بعد کچھ دیر کے لیے مجھے اور تجمل کو تنہائی کا موقع ملا۔ میں اُس سے پوچھ سکتا تھا مگر اب تک میں نے اس بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا تو اب بھی کیا ضرورت تھی۔ تجمل نے جو کچھ طے کیا ہوگا، سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا۔

دوسرے دن صبح نیساں بیٹھک میں آئی تو اُس کا چہرہ بیماروں جیسا لگ رہا تھا۔ وہ ایک کونے میں کھڑی ہوگئی۔ تجمل نے چونک کے اُس کی طرف دیکھا اور مضطرب آواز میں پوچھا۔ "کیا بات ہے نیساں بیٹا! یہ تو نے ہلدی اپنے گالوں پر کیوں مل لی ہے؟"

نیساں سسکنے لگی۔ تجمل فوراً تخت سے اُتر کے اُس کے پاس گیا اور اُس کے سر پہ ہاتھ رکھ کے پوچھنے لگا۔ "کیا کسی نے تجھے کچھ کہہ دیا ہے؟ رجّو میاں سے لڑائی تو نہیں ہوگئی؟"

وہ سر جھکائے اور تندت سے رونے لگی۔ "کیا بات ہے؟ بھلا مجھے نہیں بتائے گی؟ تو تو مجھے بابا کہتی ہے۔" وہ اُسے اپنے بازو میں سمیٹتا ہوا تخت پر لے آیا۔ "بتا شہزادی!"

نیساں نے بہ مشکل تمام سر اُٹھا کے میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں سُرخ آنسو بھرے ہوئے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ میرے سامنے بات کرنا نہیں چاہتی۔ مجھے خدشہ ہوا کہ وہ جہاں گیر کی کوئی بات نہ کرے۔ میں اُٹھنے لگا تو تجمل نے مجھے بٹھا لیا اور نیساں سے بولا۔ "لاڈلے سامنے ہی بول دے، مت گھبرا، میرا اس سے کوئی پردہ نہیں ہے۔ ہاں تو تو جب بولنے پر آتی ہے تو مینا کی طرح بولتی ہے۔"

"آپی نے ارجی بائی سے بیعانہ لے لیا ہے۔" وہ اٹک اٹک کے بولی۔

"اچھا! پھر کیا ہوا؟" تجمل نے تجسس سے پوچھا۔

"ابھی ابھی ارجی بائی واپس گئی ہے۔" وہ روتے ہوئے بولی۔ "تمام سامان سمیت مکان کا سودا کر لیا ہے۔ میں نے اُن کی باتیں سنی ہیں۔ تین چار دن میں وہ باقی پیسے دے دے گی۔ پھر آپی چلی جائیں گی۔ میں نے آپی سے کہا کہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیے۔ انھوں نے مجھے ٹال دیا۔ آپی کے بغیر میرا جی نہیں لگے گا۔ آپ ہی اُن سے کچھ کہیے بابا! آپ کی بات وہ بہت مانتی ہیں۔ میں انھیں کبھی تنگ نہیں کروں گی۔ جو وہ کہیں گی کروں گی۔ میں نے اُن سے بہت کہا لیکن وہ کہتی ہیں کہ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے۔"

تجمل چپ ہوگیا پھر افسردگی سے بولا۔ "آپی ٹھیک بولتی ہیں نیساں۔"

"آپ بھی یہی کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں نیساں! تیری ماں ابھی زندہ ہے۔ وہ کس طرح تجھے اُن کے ساتھ بھیج دے گی۔ لیں بھی تو کب تک اپنی آپی کے ساتھ رہے گی۔ لڑکیاں پرائے گھر کی ہوتی ہیں۔"

"مگر مجھے معلوم ہے کہ مجھے کسی گھر میں نہیں جانا۔"

تجمل نے جواب نہیں دیا۔ "یہ ممکن نہیں ہے نیساں!" وہ تلخی سے۔

"کیوں ممکن نہیں ہے بابا!"

"نیساں! تو اب اتنی بچی نہیں ہے۔"

"بابا! میں آپ لوگوں کے ساتھ بالکل ایک لونڈی کی طرح رہوں گی اور کبھی کسی سے کوئی شکایت نہیں کروں گی۔ آپ مجھے ساتھ لے چلیے۔ دیکھیے منع مت کیجیے گا۔ میں آپ کے ہاتھ جوڑتی ہوں، مجھے یہ سب نہیں لگتا۔"

"میں تجھ سے کیا بولوں، میرے بس میں کچھ نہیں ہے۔"

"آپی بھی یہی کہتی ہیں مگر آپ چاہیں تو مجھے لے جا سکتے ہیں۔"

"کیسے؟ کیسے نیساں!" تجمل نے شکستہ لہجے میں کہا۔

"آپ مجھے خرید لیجیے بابا! میں عمر بھر آپ لوگوں کی خدمت کروں گی۔"

تجمل گم سم ہوگیا۔ "کیا کہہ رہی ہے ری!"

"ہاں بابا! آپ مجھے خرید سکتے ہیں۔"

"نہیں نہیں۔" تجمل تیزی سے سر ہلانے لگا۔ "ایسے خواب نہ دیکھ۔ جو تو سوچ رہی ہے دوسرے بھی اسی طرح سوچیں، تبھی یہ ممکن ہے۔"

"تو آپ کیوں نہیں سوچتے، آپ تو میری اتنی تعریفیں کرتے ہیں۔"

"تو بہت اچھی ہے نیساں!" تجمل اُلجھ کے بولا۔ "پر میں کیا سوچوں۔ میں خانم سے بات کروں گا۔ میں تجھ سے کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔ اب مجھ سے کچھ مت پوچھنا، تجھے خود پتہ چل جائے گا۔"

وہ منتیں کرنے لگی اور اُس کے آنسو بہتے رہے۔ تجمل نے ہامی نہیں بھری۔ مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔ "نیساں مت روؤ۔" میں نہ جانے کیوں بیچ میں بول پڑا۔ میری آواز بھرا گئی تھی۔ تجمل نے تیز نظروں سے مجھے دیکھا اور سر جھکا لیا۔ دروازے پر کسی کی آہٹ ہوئی تو نیساں گھبرا کے اُٹھ کھڑی ہوئی اور چُنری سے منہ چھپائے بیٹھک سے بھاگ گئی۔ جہاں گیر اندر آیا تھا۔ اُسے تجمل کے پاس چھوڑ کے میں اوپری منزل پر اپنے کمرے میں چلا آیا اور بستر پہ گر پڑا۔ میرا جسم اچانک ٹوٹنے لگا تھا اور سینے میں جلن سی ہو رہی تھی۔ بہت دیر ہوگئی تو خانم مجھے پوچھنے کے لیے کمرے میں آئی۔ مجھے اُس کی آمد کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ اُس نے میری کلائی پر ہاتھ رکھا تو میں ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا۔ وہ میرا حال پوچھنے لگی اور سمجھی کہ مولا سے جھگڑے کے دوران میں مجھے کوئی اندرونی چوٹ آگئی ہے۔ میں نے اُس سے نیساں کے متعلق بات کرنا چاہا مگر لفظ میری سمجھ میں نہیں آئے۔ مجھے خود نہیں معلوم تھا کہ مجھے اُس سے کیا کہنا چاہیے اور آخر کس بنیاد پہ میں اُس سے نیساں کا ذکر چھیڑوں۔ تجمل نے نیساں کو منع کر دیا تھا۔ خانم پہلے ہی جواب دے چکی تھی میرے درمیان میں دخل دینے کا کیا محل تھا۔ ٹھیک ہے، نیساں کی قسمت میں جو لکھا ہے، اُسے کون روک سکتا ہے۔ فہمی کی قسمت میں جو لکھا تھا، وہ پورا ہوا۔ میں نے قسمت کی بات کبھی نہیں مانی تھی لیکن اب اسے ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ خانم میری طبیعت کی طرف سے مطمئن ہو کے چلی گئی۔ میں وہیں کمرے میں لیٹا رہا۔ میرا دم گھٹ رہا تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے میرے جسم پر بہت سی مکڑیوں نے جالے بُن لیے ہوں۔ جہاں گیر کے ملنے کے بعد مجھے اور ناتوانی محسوس ہونے لگی تھی۔ اُس کی صورت دیکھتے وقت میرا دل بیٹھنے لگتا تھا اور سر میں دھواں سا بھر جاتا تھا۔ نیساں نے کمرے میں آکے دوپہر کے کھانے کی اطلاع دی۔ میں نہ جاتا تو خواہ مخواہ کا تماشا بنتا۔ کھانے کی چوکی پر نیساں بھی ہمارے ساتھ بیٹھی تھی۔ بار بار میری نگاہیں اُس کی طرف اُٹھ جاتی تھیں، وہ کوئی دلھن معلوم ہو رہی تھی۔ اُس نے اپنی چنری سر سے آگے کر لی تھی تاکہ کوئی اُس کا چہرہ نہ دیکھ سکے مگر وہ اپنے ہاتھ نہیں چھپا سکی۔ اُس کی لانبی لانبی اُنگلیاں بے قرار تھیں۔ سہ پہر کو تجمل قیلولے کے لیے لیٹ گیا اور جہاں گیر دوسرے کمرے میں ماسٹر سے پڑھنے چلا گیا۔ میں مونڈھے پر بیٹھا ہوا اپنے ناخن کُریدتا رہا۔

پھر مجھ سے بیٹھا نہیں گیا۔ میں نے ایک ارادہ کر لیا تھا۔ جتنا میں سوچتا تھا، اتنا ہی وہ میرے ذہن پر اور اُبھرتا جاتا تھا۔ میں نے اُوپر جا کے اپنا سامان ٹٹولا۔ کپڑے پہنے اور کسی کو بتائے بغیر باہر آگیا۔ مجھے زیادہ دُور نہیں جانا پڑا۔ جب میں زینہ طے کر کے دوسری منزل پہ پہنچا تو ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں شوکت آرا سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھے دروازے سے ملحق ایک کمرے میں لے گئی۔ فرش پر چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ دیواروں کا رنگ گلابی تھا۔ چند منٹ بعد ہی صاف ستھرے لباس میں گندمی رنگ کی ایک اوھیڑ عمر عورت نمودار ہوئی۔ اُس نے مجھے تسلیمات کی اور ساڑی کا پلّو شانے پہ درست کر کے بولی۔ "فرمائیے کنیز کو کیوں یاد فرمایا ہے؟"

میں نے کہا۔ "میں نیساں کے سلسلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"خدا کرے آپ نیساں کی شکایت لے کے نہ آئے ہوں۔"

"نہیں ایسی بات نہیں۔ میں کچھ اور بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں تو ڈر گئی تھی۔" وہ جُھرجُھری لے کے بولی اور تعجب آمیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ "فرمائیے! پھر بھلا نیساں کی کیا بات ہو سکتی ہے؟"

"آپ نیساں خانم کو دے دیجیے۔" میں نے جھجک کے کہا۔

"وہ خانم ہی کی ہے۔" اُس نے بے ساختہ جواب دیا۔

"آپ کو معلوم ہے کہ خانم جلد ہی یہاں سے جانے والی ہیں۔ نیساں کی خواہش ہے کہ وہ خانم کے ساتھ ہی چلی جائے۔"

اُس نے ایک گہری سانس لی اور پہلو بدلنے لگی۔ "میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکی؟" اُس کی آواز بجھی ہوئی تھی۔

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ نیساں کو خانم کے حوالے کر دیں اور اُس کی جو قیمت آپ کے ذہن میں ہو، مجھے بتا دیں، میں ادا کر دوں گا۔"

اُس کے لبوں پر ایک لمحے کے لیے مسکراہٹ اُبھری۔ "اچھا! یہ بات ہے۔ کیا سُرملی خانم نے آپ کو بھیجا ہے؟" وہ مجھے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"نہیں، خانم کو نہیں معلوم کہ میں یہاں آیا ہوں اور نہ شاید خانم آپ سے اس سلسلے میں بات کرنا مناسب سمجھیں۔ میں اپنی مرضی سے آیا ہوں۔"

وہ کچھ سوچنے لگی اور بوجھل آواز میں بولی۔ "میں نے نیساں کے لیے کبھی ایسا نہیں سوچا، میں معذرت کرتی ہوں۔"

"لیکن نیساں کے لیے آپ نے ایک بات تو ضرور سوچ رکھی ہے کہ آپ دو ایک سال بعد اُسے محفل میں بٹھائیں گی۔"

"ہاں! نیساں خانم سے اسی کی تربیت لے رہی ہے۔ اُس کی اُٹھان اچھی ہے اور اللہ نے اُسے آواز کے حُسن سے بھی خوب نوازا ہے۔ خانم نے اُس پہ بہت محنت کی ہے مگر میں اُسے خانم کو کیسے دے سکتی ہوں۔ خانم تو ایسی دس لڑکیاں حاصل کر سکتی ہے۔"

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں، آپ کو پتہ ہوگا کہ خانم نے اپنے آپ کو محدود کر لیا ہے اور اب وہ مکمل طور پہ یہ زندگی ترک کر رہی ہیں۔ نیساں کو یہاں سے لے جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اُسے آپ سے چھین کے خود فائدہ اُٹھایا جائے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ نیساں کے ساتھ ایسا نہیں ہوگا، نیساں خود بھی یہ نہیں چاہتی۔ نیساں سے آپ کی جو توقعات وابستہ ہیں، وہ میں پیشگی پوری کیے دیتا ہوں۔ کیا آپ یہ پسند نہیں کریں گی کہ نیساں کسی گھر میں رہے؟"

"کہاں! کہاں میاں!" وہ اُداسی سے بولی۔ "اب یہ باتیں پُرانی ہو گئی ہیں، بظاہر اب بھی اچھی لگتی ہیں۔"

"آپ جس طرح چاہیں یقین کر لیں۔ سب سے بڑا یقین وہ قیمت ہے جو میں آپ کو ادا کر سکتا ہوں، کچھ اور مت سمجھیے۔ مجھ پہ اعتبار کیجیے۔"

"میاں! آپ کی عمر ابھی کم ہے۔ آپ نے زمانہ نہیں دیکھا، آپ پہلے کچھ اور سوچ لیجیے، پھر میرے پاس آئیے گا اور ویسے بھی میں نیساں کو اس طرح کیسے کسی کو دے سکتی ہوں، میری تمام آرزوئیں اُس سے بندھی ہوئی ہیں۔ ابھی مجھے اپنے لگائے ہوئے پودے کی بہار تو دیکھ لینے دیجیے۔ مجھے ایسی بات پر مجبور مت کیجیے جو میرے اختیار میں نہ ہو اور جس کا تصور بھی میرے خواب و خیال میں نہ ہو۔ نیساں کو ابھی اپنی تربیت پوری کر لینے دیجیے، پھر دیکھیے گا۔ نیساں چار صاحبانِ ذوق کے درمیان بیٹھے گی تو مجھے بھی اُس کی قیمت کا اندازہ ہوگا۔ ابھی نہ میں آپ سے کچھ کہہ سکتی ہوں اور نہ آپ اُس کی قدر و قیمت صحیح طور پہ پرکھ سکتے ہیں۔ یہ بات یہیں رہنے دیجیے۔ ویسے خانم کے لیے میری جان حاضر ہے، آپ اُس کے مہمان ہیں تو میرے بھی سر آنکھوں پہ۔"

"میں فیصلہ کر کے آیا ہوں اور مایوس واپس جانے نہیں آیا۔ ممکن ہے آپ کے ذہن میں کوئی اور بات ہو، وہ نکال دیجیے۔ بہتر ہے آپ نیساں کو نیلام پہ نہ چڑھائیں۔ نیلام کی آخری بولی آپ اپنے تصور میں طے کر لیجیے۔ میں مول تول نہیں کروں گا اور دوبارہ آپ سے التجا کروں گا کہ نیساں اگر یہ زندگی پسند نہیں کرتی تو آپ بھی اُس پہ رحم کیجیے۔"

"میاں! میرے لیے یہ بات بڑی اچانک ہے، مجھے سوچنے کے لیے وقت دیجیے، میں اس طرح کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی، بھلا اپنے جگر کے ٹکڑوں کو کوئی اس طرح کیسے جُدا کر سکتا ہے۔"

"اور جگر کے ٹکڑوں کو اس طرح دکان پہ بھی نہیں سجایا جاتا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن ہم یہاں بیٹھ کے اور کیا سوچ سکتے ہیں۔ میں آپ کو نہیں جانتی، آپ کون ہیں، کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، کیا کرتے ہیں، آپ نے اپنے بارے میں کچھ بتائے بغیر اتنی ڈھیر ساری باتیں کر دیں۔"

"خانم، آپ ٹالنے والی باتیں نہ کریں۔ آپ یہاں تجربے نہیں دکھتیں، عجیب دکھتی ہیں۔ پھر یہ تمام باتیں پوچھنا بے کار ہے۔ نیساں بازار میں بیٹھے گی، بازار میں رکھی جانے والی ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے، وہ مجھے بتا دیجیے اور اِدھر اُدھر کی بات مت کیجیے۔ آپ کا ارادہ نیساں کو بازار میں لانے کا نہیں ہوتا تو میں آپ کے پاس نہ آتا۔"

"آپ بہت، بہت عجیب نوجوان ہیں۔" وہ ترشی سے بولی۔ "فرض کیجیے، میں انکار کر دیتی ہوں کہ میں نیساں کے بارے میں ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتی"

"میں جانتا ہوں، آپ کا انکار محض حجت ہے۔ جو قیمت آپ کو رفتہ رفتہ ملے، وہ ایک ساتھ مل جائے تو یہ سودا بُرا نہیں ہے۔ فرض کیجیے نیساں ہی انکار کر دے۔"

"اُس کی یہ جرأت نہیں۔" وہ خفا ہو کے بولی۔

"لیکن کسی دوسرے میں یہ جرأت ہو سکتی ہے۔"

"آپ دھمکی دے رہے ہیں؟" اُس کا چہرہ تمتمانے لگا۔

"دھمکی کیسی! میں آپ کو منہ مانگی رقم ادا کرنے کو کہہ رہا ہوں۔"

"آپ نے بھلا اُس کے لیے کیا سوچا ہے؟" وہ برہمی سے بولی۔

"یہ بتانا آپ کا کام ہے۔"

"میں نے آپ سے کہہ دیا، میں نے کچھ نہیں سوچا۔"

"تو سوچ لیجیے، میں یہیں بیٹھا ہوں۔"

"نہیں، آپ پھر کسی وقت آئیے۔"

"آپ بتا دیجیے، کسی جھجک کے بغیر بتا دیجیے۔"

"میں کیا بتاؤں۔" وہ سر جھٹک کے بولی۔

"کچھ بھی، جو آپ مناسب سمجھیں، میں آپ سے کسی رعایت کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں۔ آپ خانم کا خیال بھی مت کیجیے۔"

"مجھے تنگ نہ کیجیے۔" وہ بیزاری سے بولی۔

"بتائیے، بتائیے؟"

"یہ کیسی زبردستی ہے۔"

"کوئی زبردستی نہیں، آپ کچھ کہہ کے تو دیکھیے۔"

"آپ...... آپ پچاس ہزار دے سکتے ہیں؟"

"میں آپ کو ساٹھ ہزار دوں گا۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "سودا پکا، نیساں اب میری ہے۔ میرے پاس نقد رقم نہیں ہے لیکن میں چیک دے رہا ہوں، آپ کل صبح کسی بھی بینک میں یہ چیک داخل کر دیجیے اور بینک والے سے کہہ دیجیے کہ وہ جلد از جلد یہ چیک بمبئی بھیج دے۔ اُسے بمبئی سے تار سے جواب آ سکتا ہے کہ میرا چیک ٹھیک ہے یا نہیں۔ ہم چار پانچ روز تک یہیں ہیں، اُس وقت تک آپ کو رقم مل جائے گی۔ نیساں اب یہاں واپس نہیں آئے گی اور جب تک آپ کو رقم نہیں مل جاتی ہم یہاں سے نہیں جائیں گے۔ آپ نیساں سے خانم کے ہاں آ کے مل سکتی ہیں۔" میں نے چیک بُک جیب سے نکالی اور چیک بھر کے اُس کے

ہاتھ میں تھما دیا۔ شوکت آرا کے ہاتھوں پہ کپکپی طاری تھی۔ اُس کی آنکھیں چیک پر ساکت ہو گئی تھیں۔ میں چلنے لگا تو وہ حواس باختہ انداز میں اُٹھی اور لڑکھڑاتی زبان میں مجھے روکنے لگی۔ میں زینے سے نیچے اُتر آیا۔

میں واپس پہنچا تو بیٹھک میں سبھی میرا انتظار کر رہے تھے حالانکہ مجھے جانے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ جیسے ہی موقع ملا، میں نے نیساں سے کہہ دیا کہ وہ آج سے اپنے گھر نہیں جائے۔ اُس کی پتلیاں جگمگانے لگیں، مجھے شبہ تھا کہ شوکت آرا، خانم سے ملنے نہ آ جائے مگر وہ نہیں آئی۔ اندھیرا ہونے تک نیساں موجود رہی تو خانم نے اُسے ٹوکا۔ نیساں کو جواب دینا مشکل ہو گیا۔ خانم نے اُسے بُرا بھلا کہا لیکن وہ خاموش بیٹھی رہی۔ "چلی جائے گی آپی!" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "ابھی یہ تین چار روز یہیں رہے تو کیا حرج ہے۔"

"کوئی حرج نہیں لیکن شوکتی نہ جانے کیا سوچے گی۔"

"نیساں نہیں پہنچے گی تو وہاں سے خود کوئی لینے آ جائے گا۔"

"پر تو کہاں گیا تھا رے؟" تجمل نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"میں یہیں قریب ہی گیا تھا۔" میں نے سرسری انداز میں جواب دیا۔

ابھی تجمل کچھ اور کہنے والا تھا کہ شجاعت ہانپتا ہوا اندر آیا اور خانم کے پاس جا کے کہنے لگا۔ "شاہ کبیرا آیا ہے۔"

"کبیرا!" خانم نے خوف زدہ آواز میں کہا۔ "وہ کیوں آیا ہے؟" وہ ہماری طرف سراسیمگی سے دیکھنے لگی۔

"پتہ نہیں۔ بولتا ہے، خانم سے ملنا ہے۔"

"اکیلا ہے؟"

"نہیں، وہ تینوں بھی ساتھ ہیں۔"

"کہنا اس وقت خانم باہر گئی ہوئی ہیں، تم نے کہہ تو نہیں دیا کہ میں اندر گھر میں موجود ہوں۔"

"نہیں، میں نے کہا، میں دیکھ کے بتاتا ہوں۔"

"تم اُن سے جا کے یہی کہہ دو کہ میں کہیں گئی ہوئی ہوں۔"

"مل آؤ خانم! پوچھ لو کہ وہ کیا بولنا چاہتا ہے۔" تجمل نے بلند آواز میں کہا۔ "نہیں جاؤ گی تو وہ دوبارہ آئے گا۔"

"میں پہلے ہی ڈر رہی تھی۔" وہ میری طرف دیکھ کے بولی۔ "سرلا نے نہ جانے کیا کیا کان بھرے ہوں گے۔ میں اُس کے دوبارہ آنے سے پہلے کچھ رقم بھجوا دوں گی، پھر شاید وہ نہیں آئے۔"

"رقم دینے کی کیا ضرورت ہے، پہلے اُس سے جا کے بات کرو، بولو تو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" تجمل نے نرمی سے اُسے سمجھایا۔

"میں آپ سے بار بار کیا کہہ رہی ہوں۔ یہ لوگ بہت تخریبی ہیں، اِن میں فتنہ بھرا ہوا ہے۔ بات بات پہ چاقو نکال لیتے ہیں اور زبان پہ تو انھیں قابو ہی نہیں۔ اب نواب بہادر سے کچھ کہنے کے لیے بھی میرا منہ نہیں پڑے گا۔ میں نے دو مرتبہ اُن کا ہرکارہ واپس کر دیا ہے۔ آپ کا اُن کے سامنے جانا مناسب نہیں، اپنی عزت اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے، اس وقت کسی طور سے یہ بلا ٹل جائے تو بہت ہے۔"

"خانم، جتنا ڈرو گی، اتنی ہی بات خراب ہوگی، مجھے ساتھ نہیں لے جاتیں، مت لے جاؤ۔ تم خود جا کے بات کرو۔"

"اُف خدا۔" خانم اپنا ماتھا پکڑے بیٹھی رہی۔ پھر لرزیدہ آواز میں بولی۔ "اگر اُس نے بابر میاں کو پوچھا یا رجو میاں کو بُلایا تو آپ مت بھیجیے گا، میں کہہ دوں گی، دونوں گھر پہ نہیں ہیں، جب تک میں نہ آ جاؤں، آپ سب یہیں رہیے۔"

"نہیں، وہ بُلائے تو انھیں بُلا لینا، جو بات ہو وہ ایک ہی بار ختم ہو جائے تو اچھا ہے۔ وہ انھیں کھا نہیں جائے گا۔"

"وہ بہت بُرا ہے۔"

"تو یہ بھی آدمی کے بچے ہیں۔"

"چند روز تک، اب چند روز ہی کی تو بات ہے۔"

"نہیں خانم۔" تجمل نے پہلی بار سختی سے کہا۔

"اچھا آپ یہیں بیٹھے رہیے، جیسا کچھ ہوگا، میں کسی عذر سے درمیان میں آ کے آپ کو بتا دوں گی۔" خانم سٹ پٹا کے بولی اور شجاعت کے ساتھ بیٹھک سے باہر چلی گئی۔ اُس کے جاتے ہی تجمل نے نیساں سے کہا، وہ یہ دیکھ کے آئے کہ خانم نے شاہ کبیرا کو کس جگہ بٹھایا ہے۔

"برابر والی چھوٹی بیٹھک میں ہی وہ اسے بٹھا سکتی ہیں۔" نیساں کی آواز بھی لرز رہی تھی۔ جہاں گیر گنگ ہو گیا تھا۔ میں نے تجمل سے پوچھا کہ کیا میں خانم کے پاس چلا جاؤں؟ اُس نے انکار کر دیا۔

"بیچارہ لاڈلے۔" وہ تلخی سے بولا۔

نیساں بیٹھک سے چلی گئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ حواس باختہ بھاگتی ہوئی آئی۔ "وہ کہتے ہیں کہ بابر بھائی کو ہمارے سامنے لاؤ۔ آپی منتیں کر رہی ہیں۔ شاہ کبیرا بہت غصے میں معلوم ہوتا ہے۔ میں نے دروازے کے پاس کھڑے ہو کے اُن کی کچھ باتیں سُنی ہیں۔ وہ اُونچی آواز میں بول رہا ہے اور خانم کی کوئی بات نہیں سُن رہا ہے۔"

تجمل کھڑا ہو گیا۔ اُس نے مجھے اشارہ کیا۔ جہاں گیر بھی ساتھ چلنے لگا۔ تجمل نے اُسے منع کیا لیکن وہ نہیں مانا۔ ہم تینوں ایک ساتھ چھوٹی بیٹھک میں داخل ہوئے۔ خانم تخت پہ بیٹھی ہوئی تھی۔ مونڈھوں پر چار آدمی موجود تھے۔ اُن کے درمیان جو شخص سب سے نمایاں تھا، وہی شاہ کبیرا ہوگا۔ اُس کی بڑی بڑی مونچھیں اوپر اُٹھی ہوئی اور آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ لمبے بال پیچھے کی طرف لوٹے ہوئے تھے اور کنگھی ہوئی مونچھیں ... پہ جھول رہی تھیں۔ گلے میں سونے کی زنجیر، کان میں کالا ڈورا، ٹھوڑی ...

ؤ کا نشان' قد زیادہ بڑا نہیں تھا مگر جسم ٹھکا ہوا تھا، اُس نے ململ کا پیلا
ا اور لٹھے کا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ رنگ سُرخی مائل سیاہ لمبی ناک اور بڑا سَر'
پہ نظر پڑتے ہی خانم بوکھلا کے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ شاہ اور اُس کے
تھیوں نے گردن موڑ کے ہمیں دیکھا اور اُن کی پیشانیوں پر بل پڑ گئے۔

"کیا بات ہے خانم؟" جُھل نے ہلکی آواز میں پوچھا۔

"کچھ نہیں' یہ شاہ کبیرا ہیں۔" وہ کانپتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "اِس
قے کے خاص آدمی ملنے کے لیے آئے ہیں اور یہ ... یہ میرے مہمان ہیں۔"

"ان میں وہ لڑکا تو نہیں جس نے مَولا اور اُس کے ساتھیوں پر
ا اُٹھایا تھا۔" شاہ کبیرا کی بھاری آواز کمرے میں گونجی۔

خانم نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"کیا تم اُس سے ملنا چاہتے تھے شاہ؟" جُھل نے پوچھا۔

"ہاں اس لونڈے کی صورت دیکھنا ہے۔"

"دیکھ لو شاہ! خوب اچھی طرح دیکھ لو' یہی ہے وہ۔"

"آپ لوگ اندر بیٹھیے' میں ابھی آتی ہوں۔" خانم نے التجا کی۔

"خانم بات بولو' شاہ کبیرا کیا چاہتا ہے۔" جُھل نے بگڑتے ہوئے
میں کہا۔ "شاہ کبیرے! خانم نہیں بتائے گی' تم بولو۔"

"سُریلی خانم!" شاہ کبیرا نے منہ بنا کے پوچھا۔ "یہ کون لوگ ہیں؟"

"یہ میرے مہمان ہیں' یہ آپ لوگوں کو نہیں جانتے۔" وہ گھگھیا
ولی۔ "اسی لیے ...."

"خانم! ہم اپنے آپ کو جنوانے آئے ہیں۔"

"آپ اندر چلیے' میں خود ان سے بات کرتی ہوں۔"

"ایسی کیا بات کر رہی ہو؟"

"خدا کے لیے آپ چلے جائیں۔" خانم عاجزی سے بولی۔

"تم ہی بولو شاہ کبیرے! عورت سے کیا بات کرتے ہو۔"

"بول دے بھئی۔" شاہ کبیرا نے بے پروائی سے اپنے ایک ساتھی
دیا۔ "اُنھیں بھی بول دے۔ خانم کے مہمانوں کا کچھ تو خیال رکھنا پڑے
تسم کر۔"

شاہ کبیرا نے جس آدمی کو اشارہ کیا تھا' وہ بھن بھنانے لگا۔ "شاہ کبیرے
سی آدمی پہ پہلی بار اس بازار میں ہاتھ اُٹھایا گیا ہے۔" وہ میری طرف دیکھ
تے سے بولا۔ "اسے بازار میں سب کے سامنے' شاہ' مَولا اور اُس کے
یوں سے معافی مانگنی پڑے گی۔"

"ورنہ کیا ہوگا؟"

"ورنہ اسے اُٹھا لیا جائے گا۔"

"اور کوئی بات؟"

"اور خانم مکان کے سودے کا پندرھواں حصہ شاہ کبیرے
ے گی' یہاں بکنے والے تمام مکانوں کا یہی ہوتا ہے اور جانے سے
پہلے خانم شاہ کبیرے کے ہاں مجرا کرے گی۔"

"اور کچھ؟"

"بس یہی۔"

"نہیں' کوئی اور بات ہو تو بولو۔"

"بس یہی۔"

"اور اگر خانم ان سب سے انکار کر دے۔"

شاہ کبیرا ہنسنے لگا۔

"نہیں نہیں' بولو' پھر کیا ہوگا؟"

"پھر بُرا ہوگا۔"

"کیا بُرا ہوگا؟"

"پھر خانم کا یہاں سے نکلنا مشکل ہو سکتا ہے۔ اس چھوکرے کا
یہ مکھڑا ابھی داغ دار ہو جائے گا اور بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔"

"تم لوگ کس برتے پہ یہ بات کر رہے ہو؟"

شاہ کبیرا دوبارہ ہنسنے لگا' اُس کا ساتھی جلدی سے بولا۔ "شاہ کبیرا
یہاں کا بادشاہ ہے' بادشاہ کس برتے پہ بات کرتا ہے۔" اُس نے چاقو
نکال کے اُچھالا اور اُس کی دھار پہ اُنگلی پھیرنے لگا۔

"میں خانم کی طرف سے تمھاری تمام باتوں سے انکار کرتا ہوں۔"

"نہیں نہیں۔" خانم ہذیانی انداز میں بولی۔

"تم کون ہوتے ہو خانم کے معاملے میں بولنے والے۔"

"ہم اس علاقے کے لوگ ہیں۔"

"زیادہ بک بک مت کرو۔" شاہ کبیرے نے اپنے ساتھی کو جھڑک
دیا۔ "میں نے بول دیا ہے کہ ہم کو خانم کے مہمانوں کا خیال کرنا چاہیے۔"

"جاؤ شاہ کبیرے! جو دل چاہے کرو' خانم کی طرف سے میں نے
جواب دے دیا ہے۔"

خانم نے اپنا چہرہ سینے میں چھپا لیا۔

"کیوں خانم! کیا یہی تمھارا جواب ہے؟"

"نہیں۔" خانم پھٹی ہوئی آواز میں بولی۔ "مجھے تمھاری سب باتیں
منظور ہیں' میں پندرھواں حصہ بھی تمھیں دے دوں گی اور میں۔ میں جانے
سے پہلے تمھارے ہاں ایک دن ضرور آؤں گی لیکن .... میں تم بابر میاں
کو مت بلاؤ۔"

"نہیں خانم! پھر ان سے ایک یہ رعایت بھی کیوں لے رہی ہو۔"
جُھل نے تنک کے کہا۔ "شاہ کبیرے' ہم کو تمھاری تیسری بات بھی منظور
ہے۔ اب ہم کیا بولیں' ہم بھی خانم کے مہمان ہیں' کچھ اس کا حق بھی ہم پر
ہے۔ بولو' تم کہاں لے جانا چاہتے ہو؟ کس چوراہے پر؟"

شاہ کبیرے کو جواب دینے میں تامل ہوا۔ وہ تیکھی نظروں سے جُھل
کو گھورنے لگا۔ اُس کے کچھ کہنے سے پہلے اس کا ساتھی نخوت سے بولا۔ "میرا
کے ہوٹل پر چلو۔"

"چلو! چل بھئی لاڈلے! شاہ کبیرا کی بات مان لے۔ مان لے مِلنی'
نرم گرم چلتا ہے' ہم کو کون سا ادھر رہنا ہے۔ خانم! تم بے فکر رہو' ہم لوگ
شاہ کے ساتھ جاتے ہیں اور ابھی واپس آ جاتے ہیں۔ شاہ کا تاج سَر پہ
رہنے دو' چلو شاہ!"

"نہیں شاہ۔" خانم رو پڑی۔

شاہ کبیرا کچھ متذبذب ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کی طرف
دیکھا اور ایک جھٹکے سے اُٹھ گیا۔ "جُھلے! مَولا کو میرا کے ہوٹل پہ لے کے آ'
اُن دونوں اُٹھائی گیروں کو بھی ساتھ پکڑ لانا۔"

خانم نے شاہ کبیرے کا دامن پکڑ لیا۔ "خانم! بھیک مت مانگو۔"
جُھل نے چیخ کر کہا۔ "ہم مرنے نہیں جا رہے ہیں۔ شاہ کبیرا زبان کا اتنا
ڈھیلا نہیں ہوگا۔ لاڈلا دو ہاتھ اُٹھا کے اور دو لفظ منہ سے بول کے صحیح
سلامت واپس آ جائے گا۔ شاہ کبیرا کی بات میری سمجھ میں آتی ہے۔ یہ اِس
کی ناک کا سوال ہے۔ شاہوں کی ناک سدا اونچی ہوتی ہے۔ کیوں شاہ!
یہی تمھاری خواہش ہے؟"

شاہ نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔

جُھل دروازے پہ آ گیا تھا۔ شاہ کے تینوں ساتھی بھی کھڑے
ہو گئے تھے۔ میں نے جہاں گیر کو سختی کے ساتھ وہیں ٹھیرنے کی تاکید
کی۔ ہم سب گھر سے باہر آ گئے۔ ہوٹل سے کچھ آگے ایک تنگ چور رستہ
تھا۔ کبیرے کا ایک آدمی پچھلی گلی سے مُڑ گیا تھا۔ آگے آگے شاہ' اُس کے
پیچھے اُس کے ساتھی اور اُن کے پیچھے ہم چل رہے تھے۔ جہاں جہاں سے
شاہ گزرا' لوگوں نے راستہ چھوڑ دیا اور نظریں چُرانے لگے۔ بہت سوں
نے اُسے سلام کیا۔ جواب میں شاہ نفی کے انداز میں گردن ہلا دیتا تھا۔
بالاخانوں پہ کھڑی ہوئی عورتیں اندر چلی گئیں۔ جو باہر رہیں' وہ ایک دوسرے
سے کانا پھوسی کرنے لگیں۔ کسی نے شاہ کو اُوپر آنے کا اشارہ کیا۔ کسی نے
نشانہ لگا کے ایک پھول اُس کے چہرے پہ مارا۔ گلی کے تقریباً تمام لوگ ہم
سے واقف ہو گئے تھے۔ صبح مَولا سے جھگڑے کی خبر بھی شاید سارے ہی
بازار میں پھیل گئی ہوگی۔ لوگ پہلے شاہ کو دیکھتے تھے پھر ہمیں۔

میرا کے ہوٹل پہ آ کے شاہ کبیرا رُک گیا۔ ہوٹل کے مارواڑی مالک نے
فوراً ایک کُرسی گلی میں ڈال دی۔ اُس کے باقی دو ساتھی تپائی پر بیٹھ گئے۔ ہم نہیں
بیٹھے اور نہ شاہ کبیرا نے ہمیں اس کا حکم دیا۔ ہم ہوٹل کے آگے ٹاٹ کے سائبان
کے نیچے کھڑے رہے۔ ہوٹل کا ایک بیرا شاہ کے پیر دابنے لگا۔ گلی کے
دونوں اطراف بالاخانے تھے اور یہ جگہ نسبتاً زیادہ آباد تھی۔ نچلی منزلوں
کے دروازوں' کھڑکیوں اور کوٹھوں پہ لوگ تاکا جھانکی کرنے لگے تھے۔ ہوٹل
میں موجود گاہک بھی اپنی اپنی نشستوں سے اُٹھ کے چبوترے پر کھڑے
ہو گئے تھے۔ ہوٹل کے مالک نے آنکھوں آنکھوں میں شاہ کے ساتھی سے
پوچھنے کی کوشش کی کہ شاہ کی برہمی کا کیا سبب ہے۔ اس پہ وہ گرجنے
برسنے لگا۔ "شاہ کبیرے کا ہر آدمی شاہ کبیرے کی جگہ ہوتا ہے۔ کسی
کوئی شکایت ہو تو اپنے باپ شاہ کبیرے سے بولو' اس سے بولے۔
اپنے آپ فیصلہ کرنا شاہ کبیرے کی بے عزتی ہے' یہ چھوکرا حرام زادہ شاہ
کے آدمی مَولا کے آگے آیا ہے۔"

"ٹھیک بولتے ہو کالے دادا' پر ادھر سالا گلی کا سارا لوگ اس بات
خیال رکھتا ہے۔ ابھی اپن نے خود کتنا بار شاہ کو بولا ہے۔ شاہ نے ایک
دم ہر ٹیم اپن کی بات سُنا۔" ہوٹل کا مالک خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ "زرا زرا
ابھی شاہ' چھوڑ دو' اس کو معاف کر دو۔"

"جان بچ گیا مارو سیٹھ ورنہ سالے کا ہڈی بھی دکھائی نہیں دیتا۔"
شخص جس کا نام ہوٹل والے نے کالا لیا تھا' تھوک کے بولا۔

ہم نے کچھ نہیں کہا۔ شاہ کے آدمی گندی گندی گالیاں بکتے
مچاتے رہے۔ وہ چاروں طرف دیکھتے تھے جیسے سب سے مخاطب ہو
اُن کی منشا بھیڑ لگانا تھا۔ پہلے تو لوگ سہمے سہمے دُور دُور رہے لیکن جب
کی جانب سے اُن کے کھڑے رہنے پہ کسی ناراضی کا اظہار نہیں کیا گیا
رفتہ رفتہ اُن کی تعداد بڑھتی گئی۔ بازار کا وقت شروع ہو رہا تھا۔ بازار میں
والے تماش بین بھی اس بھیڑ میں شامل ہو گئے۔ گلی میں شاہ کے آدم
کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ ہوٹل کا گراموفون بند کیا جا چکا تھا۔ یکایک
پولیس والے بھی آ گئے۔ شاہ نے صرف اپنی پتلیوں کو جنبش دی تھی کہ وہ
گئے۔ اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا اور کسی کسی جگہ روشنیاں جل گئی تھیں۔ بھگت
واپس آ گیا۔ اُس کے ساتھ مَولا اور کئی آدمی بھی تھے۔ ان میں وہ لڑکے
موجود تھے جو صبح مَولا کے ساتھ نظر آئے تھے۔ مَولا سے اپنے پیروں
کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ گردن سے لٹکے ہوئے کپڑے میں اُس کا ہا
جھول رہا تھا۔ دوسرے ساتھی کا بھی یہی حال تھا۔ انھیں شاہ کے رو
کر دیا گیا۔ شاہ کی پُشت پر بھی بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ ایک
نے مَولا کی کمر پر دھپ مار کے اُسے سیدھا کھڑے ہونے پہ مجبور کیا
گرتے گرتے بچا۔

"یہی تھا وہ؟" کبیرے کے ایک دوسرے آدمی نے میری طر
اُنگلی اُٹھا کے پوچھا۔ "اسے پہچان لے۔" مَولا نے مُردنی سے ہاں
کبیرے کا آدمی مُڑ کے مجھ سے مخاطب ہوا۔ "چھوکرے! آگے بڑ
بازار کا ٹیم ہو گیا ہے۔"

"شاہ کبیرے! اپنا لاڈلا نہیں مانتا۔" جُھل نے اُونچی آواز
"بولتا ہے اِس بے عزتی سے بہتر ہے کہ شاہ سے لڑتے لڑتے
دے دوں۔"

شاہ کی آنکھیں چڑھ گئیں۔ اُس نے اُچھل کے کرسی چھو
جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اُس کا سر تھرتھرانے لگا۔ اُس کے ساتھ

اُس کے ساتھ چند قدم آگے بڑھے۔ "ٹھیرو شاہ!" مجھل نے چیخ کر کہا "یہ بولتا ہے شاہ جھوٹا شاہ ہے۔ اس میں دم خم نہیں ہے۔ خالی پیلی ٹنگ جماتا ہے۔ نہ اُس سے چاقو چلانا آتا ہے اور نہ علاقہ سنبھالنا۔ اُس نے علاقے کے سارے لوگوں کو پریشان کر رکھا ہے۔ بولتا ہے کہ شاہ کو اس جگہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔" ابھی مجھل نے اپنی بات ختم نہیں کی تھی میں نے چاقو نکال لیا۔ "اس کا کہا مان لو شاہ! یہ تمھیں بھرے بازار میں یکی دے رہا ہے۔ اس کی زبان اور ہاتھ پیر کاٹ لو۔ اور یہ کوئی غلط بات ین کر رہا تم نے بھی کبھی اسی طرح یہاں کھیل تماشا کیا ہوگا۔ یہ بولتا ہے کہ اہ کو مجھ سے معافی منگوانی ہے تو چاقو کے زور پہ منگوائے سبات ٹھیک ں ہوتا ہے۔ ابھی تم اس کو سمجھو یہ میرے قابو میں نہیں ہے لیکن ایک ت سن لو۔ تمھارے جواب دینے سے پہلے تمھارے کسی آدمی نے کوئی بول کی تو یہاں خون ہی خون ہوگا۔ تم میں سے ایک بھی واپس نہیں جاسکے گا۔" ل کا لہجہ اکھڑ گیا تھا۔ "شاہ بولو! کیا بولتے ہو؟"

شاہ کا چہرہ بگڑ گیا۔ اُس کے دو تین آدمی چاقو کھولے ہوئے مجھ پہ پٹنا چاہتے تھے وہ مجھل کی آواز سن کے ٹھیر گئے۔ "کیوں شاہ؟ اپنے ام آدمیوں کو حکم دو کہ وہ اِس کی بوٹی بوٹی کر دیں تاکہ سب کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ شاہ کبیرا کس برتے پہ بادشاہت کرتا ہے۔ بے عزتی ں ہونا ہے تو شاہ پھر اس مافق کیوں نہ ہو بازار کے لوگ بھی دیکھ لیں گے ، شاہ نے ایک چھوکرے کو کس طرح مارا۔"

"چپ ہو! اس پہ چاقو اُٹھانا بے عزتی ہے۔" شاہ کبیرا گرج کے بولا۔

"تو مجھ پہ اُٹھاؤ، پر اس کی حسرت دل میں باقی رہے گی، بہتر ہے، اہ پہلے اسے ختم کر دو، پھر مجھ کو دیکھنا۔"

"چھوکرے سے بولو، مان جائے۔"

میں نے جیسے ہی شاہ کی طرف چاقو لہرایا، جہاں گیر بھیڑ کاٹتا آکے میرے بازو سے لپٹ گیا۔ میں نے اُسے دھکیل دیا۔ "میں ان طرف سے تم سے معافی مانگتا ہوں۔" وہ شاہ کے سامنے ہاتھ جوڑ کے ڑا ہوگیا۔

مجھل نے جہاں گیر کو کھینچ لیا اور اُس کے گال پہ ایک طمانچہ رسید ۔ "کیوں شاہ! قبول ہے؟ جلدی بولو یا پھر اسی طرح واپس چلے جاؤ۔ ار کے لوگ اسے بھی تمھاری بڑائی سمجھیں گے۔"

"میں اس کی حسرت ضرور پوری کروں گا۔" شاہ غرانے لگا۔

"لیکن پہلے اپنے آدمیوں سے وصیت کر جاؤ۔"

"تو اس چھوکرے سے پوچھ لے کہ اس کی کوئی آخری خواہش ہے؟" اہ کبیرا نے بپھر کے کہا۔ "اسے پانی پلا دو۔"

"یہ لال پانی پینے کا عادی ہے۔"

"نہیں شاہ!" مجمع میں سے ایک لرزتی ہوئی نسوانی آواز آئی۔ وہ خانم تھی۔ خانم برقع کے بغیر چلی آئی تھی۔ وہ شاہ کے پیروں پر گر گئی۔ شاہ نے اُسے ٹھوکر ماردی اور ایک جھرجھری لی جیسے جانور جسم کی دھول جھاڑ رہا ہو میری طرف سینگ مارنے کے انداز میں آیا۔ وہ مجھ سے اتنا قریب ہو گیا کہ میرے اور اس کے درمیان فاصلہ چند ہی انچ رہ گیا ہوگا۔ اُس نے بائیں ہاتھ سے میرا سینہ ٹھونکا۔ میں نے بھی یہی عمل کیا۔ شاہ کبیرا پلک جھپکتے میں مجھ سے دُور ہو گیا۔ اُس نے ایک طرف ہاتھ پھیلایا کسی نے چاقو اُچھالا جو شاہ نے اِس طرح اُچک لیا جیسے شِکرا اپنا شکار جھپٹ لیتا ہے۔ وہ چاقو تانے میرا انتظار کرنے لگا۔

اسی لمحے مجھل نے چاروں طرف نظر گھما کے بالا خانوں پر اور گلی میں کھڑے ہوئے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا "تم سب آنکھیں کھلی رکھنا اور شاہ کو جتنا دیکھنا ہے، دیکھ لو اِس کے بعد یہ مورت تمھیں نظر نہیں آئے گی۔ مجھ کو پتہ ہے تم سب اِسے دوبارہ دیکھنا چاہتے ہو یا نہیں۔"

شاہ نے مجھل کی بات پر یکسر توجہ نہیں دی۔ وہ میری طرف متوجہ تھا۔ شاہ نے اپنا چاقو ہتھیلی اور کلائی سے اس طرح چپکا لیا تھا کہ نظر نہیں آتا تھا۔ مجمع میں سوئی بھی گرتی تو آواز آتی۔ میں نے پہل کی اور شاہ کی طرف بڑھا۔ وہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ میں پلٹ کے دوبارہ یہی عمل دہرایا شاہ پھر ٹھپک گیا۔ میرا مقصد وار کرنا نہیں تھا۔ صرف شاہ کی پھرتی کا اندازہ لگانا تھا۔ اس میں اچھی خاصی پھرتی تھی۔ اس نے بھی بھِڑنے کی جلدی نہیں کی۔ میں نے زیادہ چستی اس لیے نہیں دکھائی تھی کہ شاہ فوراً میرے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کر سکے۔ اُس کی خواہش یقیناً یہ ہوگی کہ وہ پہلے ہی ہلّے میں میرے ہاتھ سے چاقو چھین لے مگر جہاں اتنے لوگ موجود ہوں، وہاں یہ بے احتیاطی نہیں کی جاسکتی۔ شاہ اپنی خواہش کے باوجود ہر احتیاط کا خیال رکھے گا۔ میری نظریں پوری طرح شاہ اور اُس کی ایک ایک حرکت پہ مرکوز تھیں۔

شاہ کے آدمیوں کے لیے شاہ کے خلاف فوراً کوئی فیصلہ ہونا اُن کی برہمی کا سبب بن سکتا تھا۔ مجھے کسی ایسے داؤ کا موقع ملنا چاہیے تھا کہ شاہ کے ساتھی بعد میں کسی قسم کا شکوہ نہ کریں۔ شاہ نے دو تین بار اُچھل کے میرے وار بہ آسانی خالی دے لیے تو میں اُس سے کچھ دُوری پر کھڑا ہو کے اُسے گھورنے لگا۔ پھر میں نے دونوں ہاتھ پھیلا لیے اور شاہ پہ یہ ظاہر کیا کہ میں چاقو مارنے کا دائرہ وسیع کر رہا ہوں اور میری مراد اُس کے بچنے کی جگہ تنگ کرنا ہے۔ یہ کوئی چوڑی گلی نہیں تھی۔ لوگوں کے گھیرے کے درمیان جو جگہ چھوٹی تھی، وہ کم تھی۔ اس طرح آگے بڑھنے میں شاہ کا ردِّ عمل یہی ہو سکتا تھا کہ وہ میرے بازوؤں کے دائرے میں چلا آئے اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کر سکوں، وہ خود ہی بڑھ کے

میرے سینے پر چاقو رکھ دے میں نے دو قدم ہٹ کے خود کو اس کے مقابل کیا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ شاہ آگے آنے کا خطرہ مول نہ لے اور کسی دوسری طرف نکلنے میں کامیاب ہو جائے۔ شاہ کو لمحوں میں اپنے آئندہ اقدام کے بارے میں جو بات مجھے سمجھانی تھی، اُس نے اُسے اسی طرح سمجھا، جس طرح میں چاہتا تھا۔ اس میں اُس کے لیے خطرہ کم، میرے لیے زیادہ تھا۔ کوئی بھی یوں ایسی تنگ جگہ پہ ہاتھ کھول کے مقابل کو براہِ راست سینے تک آنے کا موقع نہیں دے گا۔ میں نے اُسے اس کا موقع دیا تھا تاکہ وہ مجھ سے تیز آگے بڑھ سکے اور یقین کرے کہ جب وہ میرے سینے میں چاقو کی نوک پیوست کرے گا۔ میں اپنے پھیلے ہوئے ہاتھ سمیٹ کے اُس کے کُولھے پر چاقو نہیں مار سکوں گا۔ اس وقت میری گرفت کمزور پڑ جائے گی یا میں بوکھلا جاؤں گا۔

وہ میرے اس بچکانہ داؤ کا یقین کر چکا تھا کیونکہ ابھی تک میرے بارے میں اس کی رائے جمی نہیں تھی۔ اُسے میری خوش فہمی سے فائدہ اُٹھانا چاہیے تھا۔ اُس نے چاقو بائیں ہاتھ میں لے لیا اور اپنا ایک ہاتھ ۴۵ ڈگری کے زاویے سے اُٹھائے ہوئے مجھ پہ لپکا۔ اُس کا رُخ سیدھا میری چھاتی کی طرف تھا لیکن اگر میں اسی داؤ پہ قائم رہتا جس کا تاثر میں نے شاہ کو دیا تھا تو اُسے نشانہ لگانے میں دیر نہ ہوتی۔ اِس صورت وہ کسی قدر ترچھا ہو کے اور جسم کو خم دے کے چاقو مارتا تاکہ میں جوابی وار کروں تو میرے چاقو بردار بائیں ہاتھ کی رسائی اُس کے جسم تک نہ ہو سکے اور میں کوئی پینترا بدل لوں تو وہ آسانی سے دائیں جانب نکل جائے۔ وہ ہر طرح مطمئن ہو کے جست لگا کے آگے آیا۔ اِدھر وہ بڑھا، اُدھر میں لیکن وہ جھک کے میرے سینے پہ چاقو گھونپنے ہی کو تھا کہ میں بھی اچانک جھک گیا اور میں نے نیچے سے اُس کا چاقو والا پہنچا پکڑ لیا۔ شاہ ایک لمحے کے لیے سکتے میں پڑ گیا پھر چنگھاڑنے لگا۔ اُس نے اپنا پہنچا چھڑانے کی بہت تگ و دو کی۔ میرا چاقو والا ہاتھ آزاد تھا۔ شاہ نے اُسے معذور کرنے کے لیے میری کلائی پکڑ لی اور میری نس پہ ناخن کا دباؤ ڈال دیا۔ میں نے بھی اُس کا پہنچا مروڑنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ نے اپنا ناخن نس سے ہٹا لیا۔ میں پکڑی ہوئی کلائی کے باوجود اُس کے شانے پر نوک ضرور چبھو سکتا تھا مگر میں نے یہ نہیں کیا۔ میرے جی میں آئی کہ اپنا چاقو پھینک دوں لیکن اِس طرح اُس کی ساری توجہ میری پکڑ سے اپنا پہنچا چھڑانے پر مبذول ہو جاتی اور فیصلہ جلد ہی ہو جاتا۔ شاہ کو مجھ سے اتنی تیزی کی توقع نہیں ہوگی۔ فاصلہ بہت کم تھا۔ اُس کے سان و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ میں اتنے کم فاصلے پہ زاویہ بدل لوں گا۔ وہ اپنے جسم کی پوری طاقت صرف کر رہا تھا اور گالیاں بھی بک رہا تھا۔ میری ماں اور بہنیں اتنی ہی بار زناں ہو گئی تھیں کہ کوئی بھی اُنھیں گالی دے دیتا تھا۔ شاہ اپنا

پہنچا نہیں چھڑا سکتا تھا۔ چاقو پہ اُس کی گرفت مضبوط تھی مگر نہ وہ موجدار تھا نہ تیوا ڑی میں نے اُسے دھکا دے کے اُس کا پہنچا چھوڑ دیا۔

مجھے یقین تھا کہ شاہ کے حملوں میں شدت آجائے گی اور وہ شور بھی زیادہ مچائے گا۔ لوگوں کو اس بات پر حیرت ہوئی ہوگی کہ میں شاہ کے پہنچے سے اتنی آسانی سے کیوں دست بردار ہو گیا۔ میں نے مجھل کی طرف نظر کی تھی۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند نہیں کی تھیں۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ شاہ مجھ پہ پے درپے وار کرنے لگا۔ میں کبھی اِدھر کبھی اُدھر، کبھی نیچے بیٹھ کے، کبھی اُٹھ کے بمبئی کے جھنگا استاد کی طرح اُسے دائرے میں گھماتا رہا۔ وہ ہواؤں میں ہاتھ مارتا رہا۔ اُس کی سانس پھول گئی تھی اور ماتھے سے پسینہ بہنے لگا تھا۔ وہ بار بار چاقو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتا اور مجھے فریب دینے کی کوشش کرتا۔ کبھی وہ چیتے کی طرح دہاڑ کے جھپٹتا لیکن اُس کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو رہی تھی۔ بے شک اُس نے میری آستین پھاڑ دی تھی لیکن وہ چاقو میری جلد تک نہ پہنچا سکا۔ "بس لاڈلے! آنکھیں تھک گئی ہیں۔" مجھے مجھل کی آواز سنائی دی "جلدی کر، لوگوں کو کام پر بھی جانا ہے۔"

"کیا کروں؟" میں نے اُس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا کیونکہ اُس دوران میں صرف ایک شخص دیکھا جا سکتا تھا اور وہ تھا شاہ کبیرا۔ مجھے اتنا بھی ہوش نہیں تھا کہ کون کہاں کھڑا ہے؟ جہاں گیر اور خانم کا کیا حال ہے؟ شاہ کا پہنچا پکڑنے کے بعد میں نے ایک ہی لمحے کے لیے مجھل کو دیکھا تھا۔ جہاں گیر اور خانم میں سے کوئی نظر نہیں آیا تھا۔

"کاٹ دے۔" مجھل نے پُرسکون آواز میں جواب دیا۔

یہ سن کے میں نے مدافعت ختم کر دی۔ اور اُس کے وار سے پہلو بچا کے ایک کونے میں چلا گیا۔ مجھل نے جس بات کی طرف اشارہ کیا تھا، وہ آسان نہیں تھی میرے سامنے کوئی اور شخص نہیں، شاہ کبیرا تھا اِس علاقے کا سب سے چابک دست آدمی۔ مجھل کی ہدایت پر مجھے بہت احتیاط سے عمل کرنا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں چمکتی ہوئی دھار کا چاقو تھا اور وہ اچھے خاصے داؤ پیچ بھی جانتا تھا۔ درمیان میں خود ہی داؤ پہ داؤ نکل آتے ہیں لیکن تمام امکانی داؤ نظر انداز کر کے کسی ایک داؤ کا موقع تلاش کرنا مشکل کام ہے۔ اس اثنا میں ذرا بھی اُنیس بیس ہو جائے تو سارا معاملہ اُلٹا ہو سکتا ہے۔ مجھے سب سے پہلے اُس کا چاقو چھیننا تھا۔ اِس کی تدبیر ایک تو وہ تھی جو میں نے تیواڑی کے ساتھ کی تھی کہ اپنا چاقو پھینک کے اُس کا دھیان بٹا دوں مگر چاقو ایک بار ہاتھ سے نکلنے کے بعد دوبارہ حاصل کرنے میں دُشواری پیش آسکتی تھی اور مجھے چاقو کی ضرورت تھی۔

شاہ کبیرا کچھ سوچ کے سنبھل گیا تھا۔ اب کے میں اُس کی طرف گیا۔ کبیرا نے مجھے بڑھنے دیا مگر میں درمیان ہی میں رُک کے اُلٹے قدموں

اپنی جگہ لوٹ آیا۔ کبیرے نے اپنا ہاتھ سیدھا کر کے چاقو آگے کر لیا تھا۔ میں جتنی تیزی سے آیا تھا۔ اتنی تیزی سے ترچھا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس وقفے میں کبیرا وار کرنے میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ اُس نے مدافعت کا انتہائی آخری حربہ اختیار کیا تھا۔ اُس نے پیچھے اور دائیں بائیں کچھ جگہ اپنے لیے محفوظ رکھی تھی۔ تاکہ اُسے حرکت کرنے میں آسانی ہو۔ اُس کا دوسرا ہاتھ لٹکا ہوا تھا۔ مجھے بہر طور اُس کا دراز ہاتھ پکڑنا تھا اور یہ تبھی ممکن تھا جب میری جانب سے اُس کے دماغ میں کسی اور داؤ کا شبہ نہ پیدا ہو جائے۔ میں نے چند فٹ آگے بڑھ کے فاصلہ کم کیا اور چاقو اس انداز میں تان لیا جیسے اُس پر صحیح نشانہ لگانے کے لیے پر تول رہا ہوں اور قریب جانے کے بجائے اپنی جگہ ہی سے اُس پر چاقو اچھال دوں گا۔ اُسے مجھ سے اس گھٹیا حرکت کی توقع نہیں کرنی چاہیے تھی لیکن وہ خود اوچھا آدمی تھا۔ اُس نے یہی جانا کہ میرا ارادہ اب دُور ہی سے تاک کے چاقو پھینکنے کا ہے۔ جواب میں وہ خود ایسا نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اُس کا ہاتھ پہلے ہی دراز تھا۔ ایسا کرنے کے لیے اُسے اپنا ہاتھ پیچھے کر کے نشانہ بھی قائم کرنا تھا۔ اُس نے اُسی پر عمل کیا۔ جیسے ہی اُس کا ہاتھ پیچھے کی طرف گیا میں نے جست لگائی اور آناً فاناً چاقو دوسرے ہاتھ میں لے لیا۔ شاہ کبیرا گڑبڑا گیا۔ یہ دیکھ کے اُس نے اپنا ہاتھ پھر آگے کرنا چاہا لیکن میں نے اُس کے سینے کی طرف چاقو سیدھا کر کے دوسرے ہاتھ سے اُس کا پہنچا پکڑ لیا تھا۔ اُس نے بھی میرا چاقو والا ہاتھ گرفت میں لے لیا تھا اور اُسے اپنے سینے سے دُور کرنے کی فکر میں تھا مگر نوک اُس کے سینے میں پیوست تھی۔ اُس کے لیے اُسے اپنے جسم کو کوئی بڑی جنبش دینے میں اندیشہ تھا۔ میں نے دباؤ بڑھایا تو اُس نے اپنا چاقو چھوڑ دیا اور غیر متوقع طور پر میری ناک پر مکا مارا۔ میں لڑکھڑا گیا۔ میری ناک سے خون نکل آیا تھا۔ میں نے اُسے دوبارہ چاقو نہیں اُٹھانے دیا۔

ہتھیار سے محروم ہو جانے کے بعد بھی شاہ کبیرا ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ میں نے اپنا چاقو پھینکنے سے احتراز کیا۔ اصولاً یہ لازم بھی نہیں تھا حالانکہ جی یہی چاہتا تھا۔ شاہ کبیرا کے دونوں ہاتھ اب آزاد تھے۔ وہ دوبارہ میرا ہاتھ پکڑنے میں کامیاب ہو جاتا تو اپنے دونوں ہاتھوں کا زور ڈال سکتا تھا۔ میں اُس کے قریب ہوتا رہا اور اُس کے اُچھلنے کودنے کی جگہ محدود کرتا رہا تا آں کہ ایک جگہ میں نے دانستہ اپنا ہاتھ پکڑ[illegible] دیا۔ اُس نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے جکڑ لیا۔ میں نے چاقو چھوڑ دیا لیکن چاقو زمین پر نہیں گرا۔ وہ میرے دوسرے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ میں نے اُسے اُس کے پیٹ میں چبھو کے جھٹکے سے کھینچا۔ اُس کا ازار بند کٹ چکا تھا۔ ببّھل نے یہی کہا تھا۔

شاہ کبیرا یک لخت زمین پر بیٹھ گیا۔

زمین پر جیسے ایک گٹھری پڑی ہوئی تھی۔ اُس نے بُری طرح اپنا جسم سکوڑ لیا تھا۔ میں اُس کے پاس چاقو لیے کھڑا رہا۔ ہر طرف سکوت طاری تھا۔ چند لمحوں تک وہ اسی طرح سمٹا اور بندھا ہوا منہ چھپائے گلی کے فرش سے چمٹا رہا پھر اچانک کسی دیوانے کے مانند اُٹھا اور ایک طرف مجمع میں جا گھسا۔ لوگ اُس کے لیے جگہ چھوڑتے ہوئے ایک دوسرے پر گر گئے۔ اس کے بعد مجھے اس کی صورت نہیں دکھائی دی۔

کسی نے میرا شانہ ہلایا تو میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ ببّھل میرے پیچھے کھڑا تھا اور اُس کے ہاتھ میں شاہ کبیرا کا چاقو تھا۔ اُس نے چاروں طرف گھوم کے چاقو دکھایا۔ کوئی شخص آگے نہیں آیا پھر اِدھر ببّھل نے چاقو بند کیا، اُدھر ایک ساتھ کئی چاقو ببّھل کے پیروں پہ گرے اور ہجوم میں ایک شور اُٹھا۔ ہوٹل کے مارواڑی مالک نے دوڑ کے میری ٹانگیں پکڑ لیں۔ "واہ مائی باپ!" وہ اپنا سر مارتے ہوئے بولا۔ "اپن کو جوتا مارو۔"

وہ اپنے گالوں پر طمانچے مارنے لگا۔ "اپن کو بخش دو دادا!"

اُس نے نہ جانے اور کیا کہا۔ جہاں گیر آ کے مجھ سے لپٹ گیا تھا۔ پاس ہی خانم بھری ہوئی آنکھوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ میں نے بے اختیار اپنا بازو پھیلا دیا۔ وہ میرے پہلو سے لگ گئی اور میرے شانے پہ سر رکھ کے ہچکیاں لینے لگی۔ میں صرف اتنا دیکھ سکا کہ کالے دادا ببّھل سے گلے مل رہا ہے اور مولا ہوٹل کے چبوترے کے نزدیک بے سُدھ پڑا ہے پھر کسی ایک کا چہرہ دکھائی دینا مشکل ہو گیا۔ بالاخانوں کی عورتیں چیخ پکار مچا رہی تھیں اور اِدھر اُدھر کھڑے ہوئے لوگ مجھ پہ ٹوٹ پڑنے کے لیے بے تاب تھے۔ خانم کی موجودی کی وجہ سے وہ میرے نزدیک آ کے ٹھیر گئے۔ کوٹھوں پر کھڑی ہوئی کئی عورتوں نے اپنے کانوں اور بالوں سے ہار پھول نوچ کے میری طرف پھینک دیے تھے اور ایک ساتھ کئی عورتوں کا غول بھیڑ کاٹتا ہوا اندر آ گیا تھا۔ انھوں نے خانم کو گھیر لیا۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ خانم چیختی چلاتی اور مجھے کھینچتی ہوئی باہر لے آئی لیکن ہمارے پیچھے لوگوں کا ہجوم کم نہیں ہوا۔ اچانک مجھے ببّھل کا خیال آیا۔ وہ ہمارے ساتھ نہیں تھا۔ میرے قدم منجمد ہو گئے۔ میں نے بے چینی سے مڑ کے دیکھا۔ وہ آ رہا تھا اور شاہ کبیرا کے آدمیوں کی جلو میں آ رہا تھا۔

لوگ ہمارے ساتھ خانم کی گلی تک چلے آئے۔ بڑی بیٹھک کھول دی گئی۔ ببّھل کئی آدمیوں کے ہمراہ وہاں جا کے بیٹھ گیا۔ خانم مجھے اوپر لے گئی۔ میری آستین کبیرا نے چیر دی تھی۔ مجھے کچھ احساس ہی نہیں رہا۔ میں نے خانم کے سامنے کُرتا اتار دیا۔ خانم میرے بازو ٹٹولنے لگی لیکن جسم پر زخم کا کوئی نشان نہیں تھا۔ اُس کی کپکپاتی ہوئی اُنگلیاں میری گردن اور بالوں میں مچل رہی تھیں۔ جہاں گیر میرے گھٹنوں پر سر رکھے مجھے گھور رہا تھا جیسے میری شکل بدل گئی ہو۔ اُس کی آنکھوں کی چمک کبھی تیز ہو جاتی، کبھی مدھم پڑ جاتی۔ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ وہ تو بس ٹکر ٹکر مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ میں نے سوچا، اُس سے کہوں، منّے! آنکھیں بند کر لے۔ اس طرح مت دیکھ، جہاں گیر کو بھی گھر سے نکلے ہوئے کئی سال ہو گئے تھے۔ جو باتیں آدمی گھر میں دیر سے سمجھتا ہے وہ باہر جلدی سمجھ لیتا ہے۔ جہاں گیر میں بھی بہت سمجھ آ گئی تھی۔ اب اُس کی مونچھیں پھوٹ رہی تھیں اور گالوں پر رُوئیدگی اُبھر رہی تھی۔ اُس نے اپنے طور پر بہت کچھ قیاس کر لیا ہو گا کہ اُس کا بھائی اتنے دنوں تک کہاں رہا۔ اُس نے مجھ سے اس بابت پوچھا بھی تھا مگر میں نے ٹال دیا تھا۔ اب وہ ضرور کڑیاں ملا رہا ہو گا۔ میں نے سوچا، اُسے بتا دوں کہ میں نے جیل میں تعلیم بھی حاصل کی ہے، میری فرسٹ کلاس آئی تھی۔ مجھے فکر ہو رہی تھی کہ جہاں گیر مجھ سے خوف زدہ تو نہیں ہو گیا ہے۔

نیساں گرم گرم چائے لے آئی تھی۔ میں نے جہاں گیر کی نگاہیں منتشر کرنے کے لیے نیساں سے پوچھا کہ اُسے لینے کے لیے اُس کے گھر سے کوئی آیا تو نہیں تھا۔ نیساں نے نفی میں جواب دیا۔ اُس کے جواب سے مجھے کچھ سکون ہوا۔ خانم مجھے کچھ دیر آرام کرنے کا مشورہ دے رہی تھی لیکن میں نیچے چلا آیا اور جہاں گیر کو بھی اپنے ساتھ لیتا آیا۔ بیٹھک میں ببّھل اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو سب کھڑے ہو گئے اور مجھ سے بغل گیر ہونے کے لیے لپکے۔ اِن میں کالے دادا بھی تھا۔ اُس نے مجھے زور زور سے بھینچ لیا، میرے گالوں کو بوسہ دیا اور میری انگلیاں چومیں۔ اُس نے جہاں گیر کو بھی اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ رات کا کھانا بھی ان سبھوں نے خانم کے ہاں کھایا اور ببّھل سے صبح اڈّے پر آنے کا وعدہ لے کے رخصت ہو گئے۔ وہ اڈّے اور شاہ کبیرا کے متعلق بہت سی باتیں کرنا چاہتے تھے لیکن ببّھل نے غالباً جہاں گیر کی وجہ سے ہر بات آنے والی صبح پر ملتوی کر دی۔

دوسرے دن صبح خلافِ توقع خانم سحر خیزی کے لیے ہمیں اُٹھانے نہیں آئی۔ وقت پر میری آنکھ خود ہی کھل گئی اور میں حسبِ معمول جہاں گیر کو لے کے نکل گیا۔ رات کو بھی سوتے وقت وہ گُم سُم رہا تھا۔ خانم نے بھی کوئی خاص بات نہیں کی تھی۔ کھانے کے دوران بھی خاموشی طاری رہی تھی۔ خانم بہت گھبرائی گھبرائی نظر آتی تھی۔ شاید اُسے خدشہ لاحق ہو گا کہ شاہ کبیرا مشتعل ہو کے واپس نہ آ جائے اور کوئی دوسری رُکاوٹ درمیان میں پیش نہ آ جائے۔ میں اُس سے یہ کیسے کہہ سکتا تھا کہ کبیرا کی واپسی کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ وہ اب نہیں آئے گا۔ وہ ضرور پوچھتی کہ میں یہ بات اتنے وثوق سے کیوں کہہ رہا ہوں۔ میرے پاس کوئی جواب نہ ہوتا۔

راستے میں کئی بار میں نے جہاں گیر سے بات کرنے کا ارادہ کیا لیکن سارا راستہ یوں ہی گزر گیا۔ آج مولا اپنی جگہ موجود نہیں تھا۔ گلیوں میں ایسے کئی آدمی ملے جنھوں نے بڑھ کے ہم دونوں کا حال پوچھا۔ اُس دن ہم زیادہ دُور نہیں گئے تھے۔ جلد ہی گھر واپس پہنچ گئے۔ خانم پریشان تھی۔ سویرے سویرے شاہ کبیرے کے چند آدمی ببّھل کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ خانم نے مجھ سے کہا بھی کہ میں ذرا جا کے دیکھوں۔ میں نے اُسے تسلی دی کہ وہ جلد ہی واپس آ جائے گا۔ ناشتے کے بعد نیساں نے چپکے سے میرے کان میں آ کے بتایا کہ اُس کی ماں آئی ہوئی ہے۔ میں نے اُسے ہدایت کی کہ اگر وہ واقعی ہمارے ساتھ جانا چاہتی ہے تو اپنی ماں سے صاف صاف کہہ دے۔ وہ سہمنے لگی اور بولی کہ میں اپنی ماں کے سامنے اتنی بڑی بات نہیں کہہ سکتی، میں نے کہا کہ پھر وہ خاموش رہے۔ نیساں کی سمجھ میں میری بات کچھ آئی، کچھ نہیں آئی۔

میں نے نیساں کو سمجھا بجھا کے بھیج دیا تھا لیکن شوکت آرا کے آنے کی اطلاع سے مجھے خود بے چینی ہونے لگی تھی۔ سارے بازار میں خبر ہو گئی تھی کہ خانم کے ہاں ٹھیرے ہوئے مہمانوں میں سے ایک نے شاہ کبیرا پر چاقو اُٹھایا ہے۔ جب شوکت آرا کو یہ پتہ چلا ہو گا کہ یہ وہی شخص تھا جو ایک دن پہلے اُسے چیک دے کے گیا ہے تو اس نے میرے بارے میں رائے بدل دی ہو گی۔ رات بھر اُس نے سوچا ہو گا۔ یوں بھی وہ کہاں آمادہ تھی۔ آخر وہ نیساں کی ماں ہے۔ نیساں کے سلسلے میں کوئی فیصلہ کرنے کا حق اُسے یا خود نیساں ہی کو ہے۔ نیساں میں ہمت نہیں ہے۔ یتیمی میں بھی گھر واپس جانے کی ہمت نہیں تھی ورنہ وہ گھنگروؤں کی زنجیر توڑ کے چلی جاتی مگر جاتی کہاں! ایسی لڑکیاں پھر کہاں جا سکتی ہیں۔ میں نے اس پہلو پر غور نہیں کیا تھا کہ شاہ کبیرا کے واقعے کے بعد نیساں کی ماں اپنی رائے بدل سکتی ہے لیکن کبیرا سے معافی مانگنے کے بجائے مر جانا زیادہ بہتر تھا۔

معلوم نہیں کہ وہ کیوں آئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ نیساں کو دیکھنے آئی ہو یا یہ بھی ممکن تھا کہ رات بھر شوکت آرا نے حساب کتاب لگایا ہو کہ وہ جلدی میں کہیں گھاٹے کا سودا تو نہیں کر گئی ہے۔ اگر ایسا ہے تو میں رقم میں اضافہ کر دوں گا۔ اس بات کا بھی امکان تھا کہ وہ خانم سے محض تصدیق کے لیے آئی ہو۔ خانم اَن جانے میں کچھ بھی کہہ سکتی ہے۔ کاش میں اُسے پہلے ہی بتا دیتا۔ میں نے طے کیا کہ اگر بات نہیں بنی تو میں کرشنا جی کی ساری دولت شوکت آرا کو دے دوں گا۔ میری جگہ کرشنا جی ہوتے تو وہ بھی یہی کرتے۔ یہ سب کچھ وہ میری خوشی کے لیے کر کے گئے تھے۔

ابھی نیساں کو گئے دیر نہیں ہوئی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ خود درمیان میں جا کے دو ٹوک بات کر لوں کہ خانم مجھے آواز دیتی

ہوئی وحشت زدہ سی کمرے میں داخل ہوئی۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ جہاں گیر نچلی منزل پر مولوی صاحب سے پڑھنے گیا تھا۔ میں کمرے میں اکیلا ہی تھا۔ خانم آتے ہی خفگی سے کہنے لگی: "یہ تم نے کیا کیا؟ مجھے بھی نہیں بتایا!" میں نے لاعلمی ظاہر کی تو اُس کی آواز تیز ہوگئی: "آخر تم نے اتنی بڑی رقم اُسے کیوں دے دی؟"

میں نے آہستگی سے کہا: "آپی! اُس نے یہی طلب کیا تھا۔ میں نے اپنی طرف سے کچھ روپے بڑھا دیے۔"

"ایسا ہی تھا تو تم مجھ سے کہتے اور دیکھتے کہ میں اُسے کتنے میں تیار کرلیتی۔ تم وہاں اکیلے کیوں چلے گئے؟"

"اب چھوڑیے آپی! آدمی کی قیمت روپوں میں نہیں لگائی جا سکتی۔ نیساں بہت پیاری لڑکی ہے، وہ بہت معصوم ہے اور یہاں رہنا نہیں چاہتی۔ جو شوکت آرا کی قسمت میں لکھا تھا، وہ اُسے مل گیا۔ وہ اُس کی ماں بھی تو ہے۔ یہ بھی تو دیکھیے کہ وہ اپنی بیٹی کی جدائی کے لیے تیار ہوگئی ہے۔" میں نے دبے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ماں!" وہ چیخ کے بولی: "کس کی ماں۔ وہ ماں ہوتی تو اپنی بیٹی کے لیے اتنی جلدی فیصلہ نہ کرتی۔ کوئی ماں اپنی بیٹی کو اس طرح جدا نہیں کرتی۔ نیساں کی ماں نہ جانے کہاں ہوگی۔" میں حیرت سے اُس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ "میں اُس سے چیک واپس لے رہی ہوں۔" خانم نے برہمی سے کہا۔

"نہیں آپی! میں اُس سے وعدہ کرچکا ہوں۔"

"مگر تم نے مجھ سے ذکر کیوں نہیں کیا؟"

"مجھ سے غلطی ہوگئی۔ مجھے اچھا بھی نہیں لگتا تھا۔" میں نے ہچکچاہٹ سے کہا۔

"میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر آپ نیساں کو ساتھ رکھنے پہ تیار نہیں ہوں گی تو میں اُسے کہیں اور چھوڑ آؤں گا۔ آپ جہاں گیر، تجمّل بھائی اور نیساں کو کچھ مت بتائیے گا۔ نیساں ہمیشہ اپنے آپ کو بوجھ سمجھے گی۔ روپے کا کیا ہے۔ روپے اور آجائیں گے۔ اگر شوکت آرا اپنی مرضی کے مطابق نیساں کو محفل میں بٹھاتی تو کیا وہ اس سے زیادہ حاصل نہیں کرسکتی تھی؟"

"کرسکتی تھی۔" خانم تیزی سے بولی: "مگر بعد میں نیساں کے تمام دکھ بھی تو اُسے اٹھانے پڑتے۔ وہ سُولی پہ بھی تو ٹنگی رہتی۔ وہ نیساں پہ خرچ بھی تو کرتی اور کچھ دنوں بعد نیساں ہی اُس کے دھن دولت کی مختار ہوتی۔ نیساں کی زبان اور دیدے کھلتے تو شوکتی کے دل پہ آرے بھی تو چلتے۔ محفل میں بیٹھی ہوئی لڑکی پہ ہزار نظریں پڑتی ہیں اور کسی وقت بھی کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ وہاں کوئی ایک آدمی نہیں آتا۔ تم نے نہ جانے اُس سے کس طرح بات کی۔ تم اُن لوگوں کو نہیں جانتے۔ تم نے یہ کیا کردیا؟"

"جانے دیجیے آپی! دیکھیے نیساں آپ سے کتنی محبت کرتی ہے۔ وہ ہمارا کتنا خیال رکھتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے، جہاں گیر کے کپڑے بھی وہ دھوتی ہے۔ اس دن مُولا سے جھگڑے کے درمیان جہاں گیر کی قمیص پھٹ گئی تھی تو وہی اُسے سی رہی تھی۔"

"لڑکیاں گھر کا کام کرتی ہی ہیں۔"

"اور لڑکیاں گھر ہی کا کام کرتے ہوئے اچھی بھی لگتی ہیں۔"

خانم نے مجھ پہ بہت زور دیا کہ میں چیک منسوخ کردوں، وہ شوکت آرا سے نئے سرے سے بات کرے گی۔ میں نے خانم سے التجا کی کہ اب وہ اس سلسلے میں شوکت آرا سے کوئی بات نہ کرے۔ خانم بہت جز بز ہوئی اور مجھے شکایتی نظروں سے دیکھتی ہوئی چلی گئی۔ میں اوپر بیٹھا نیساں کا انتظار کرنے لگا۔ بہت دیر ہوگئی۔ نیساں نہیں آئی۔

تجمّل سہ پہر کو تھکا ہوا سا گھر واپس آیا۔ شاہ کبیر کے واقعے کو ایک دن گزر چکا تھا۔ خانم اور جہاں گیر کے ابھی تک رخسار مرجھائے ہوئے تھے۔ شام کو کالے دادا مٹھائی کے ٹوکروں سے لدا پھندا گھر میں داخل ہوا۔ خانم بھی وہیں بیٹھی تھی۔ کالے دادا اُس سے معافی مانگنے لگا۔ خانم کے ہونٹوں پہ لرزہ طاری ہوگیا۔ کالے دادا نے فوراً اپنا چاقو نکال کے خانم کے پیروں میں رکھ دیا اور بولا کہ خانم اُس کے لیے جو سزا تجویز کرے وہ اُس کے لیے تیار ہے۔ خانم نے اپنے پیر سمیٹ لیے اور سر جھکائے چپ بیٹھی رہی۔ کالے دادا نے اُس سے درخواست کی کہ وہ کچھ دن اور ٹھہر جائے۔ خانم نے لب نہیں کھولے۔ وہ خود ہی کہنے لگا کہ بیعانہ واپس کیا جا سکتا ہے۔ ہم چوگنا ارجی بائی کو لوٹا دیں گے لیکن خانم نے ہامی نہیں بھری۔ اُس نے کالے دادا کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ کالے دادا مایوس ہو کے تجمّل کے پیر دابنے لگا۔

اُسی رات خانم نے اپنا ہلکا پھلکا سامان سمیٹنا شروع کردیا۔ اُس نے اپنے بہت سے کپڑے لوگوں میں بانٹنے کے لیے علیحدہ کردیے۔ نیساں اُس کی مدد کررہی تھی۔ اُسے یقین آگیا تھا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ چل رہی ہے۔ اُس کے قدم زمین پر نہیں پڑتے تھے۔ وہ پورے گھر میں اس طرح بھاگی بھاگی پھر رہی تھی جیسے بہت دنوں بعد اپنے میکے جا رہی ہو۔ وہ میری طرف دیکھ کے شرمانے لگتی تھی۔ پانی لاؤں، چائے لاؤں، پان لاؤں۔ جب بھی اُسے میرے سامنے آنے کا موقع ملتا، وہ یہی تکرار کرتی رہتی۔ میں ہر بار اُس سے کچھ نہ کچھ منگوا لیتا تھا۔ کام کرکے اُس کا شہابی رنگ دمکنے لگتا تھا۔ اُس کی سانس ہمیشہ پھولی پھولی رہتی تھی۔ چُنری اِدھر جاتی

تھی، بال اُدھر بکھرے ہوئے ہوتے تھے۔ امّی نتّی کو ایسی حالت میں دیکھ کے ہمیشہ ٹوکتی تھیں، کہتی تھیں: "ساری دیوانی! ذرا دوپٹّا تو سر سے ٹکا کے رکھا کر، اور یہ کیسی اُلٹی سیدھی چلتی ہے۔ اوسان میں رہا کر۔" نتّی بھی ہرنی کی طرح گھر میں چوکڑیاں بھرتی پھرتی تھی۔

دوسرے ہی دن ارجی بائی نے خانم کو مکان کے باقی روپے یک مشت ادا کردیے۔ اُسے ضرور شبہ ہوگیا تھا کہ دیر ہوجانے سے خانم کا ارادہ بدل سکتا ہے۔ اُس دن نواب بہادر کا ہرکارہ اُن کا ایک پیغام لے کے خانم کے پاس آیا۔ اُس نے نواب بہادر کی طرف سے پہلے خانم کو ایک طشت پیش کیا۔ طشت میں سلما ستاروں سے ٹکا ہوا ریشمی جوڑا، سونے کی چوڑیاں، گلوبند، سرخ نگینے کی انگوٹھی، گلاب کے تازہ پھول رکھے ہوئے تھے۔ نواب بہادر نے خانم کو بلایا تھا اور یہ وضاحت کردی تھی کہ وہ گانے کے لیے نہیں بلا رہا ہے بلکہ خانم سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہے۔ خانم نے نواب کے تحائف کا شکریہ ادا کرتے ہوئے طشت ہرکارے کو واپس کردیا اور بولی: "کنیز پر پہلے ہی نواب بہادر کے بہت احسانات ہیں۔ اب کنیز کو ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔ نواب بہادر کو میری تسلیم کہنا اور کہنا کہ میں انھیں کبھی نہیں بھولوں گی لیکن کنیز نے اپنے بارے میں ایک فیصلہ کرلیا ہے۔ خدا نواب بہادر کا اقبال قائم رکھے۔ کہنا کہ اُن کی تمام باتیں میرے دل پر نقش ہیں مگر کنیز اپنی حیثیت سے خوب واقف ہے۔"

مجھے پتہ بھی نہیں چلتا کہ کوئی آیا تھا اور خانم نے اُسے واپس کردیا۔ میں اُس وقت کمرے میں تجمّل کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ نیساں چپکے سے کمرے میں آگئی اور جیسے ہی موقع ملا، مجھے باہر آنے کا اشارہ کرنے لگی۔ میں اُوپر چلا آیا۔ نیساں زینے سے ملحق کوٹھری میں میرا انتظار کررہی تھی۔ اُس نے ہانپتے کانپتے یہ تمام باتیں مجھے بتائیں اور پریشانی سے کہنے لگی: "اگر نواب بہادر نے آپی کو روک لیا تو.....! وہ بہت بڑے آدمی ہیں۔"

"ہوا کریں۔" میں نے ترشی سے کہا۔

اندھیرے کی وجہ سے میں نیساں کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ زینے میں کوئی بھی آسکتا تھا۔ میں اُس کا شانہ تھپ تھپا کے نیچے اُتر آیا۔ بیٹھک میں خانم تجمّل سے اصرار کررہی تھی کہ اب جتنی جلدی ممکن ہو یہاں سے چلنا چاہیے۔ تجمّل نے اُسے تحمل کی تلقین کی اور کہا کہ ایک دو دن تک اُس کا یہاں رہنا کچھ ضروری ہے مگر خانم کا اصرار بڑھتا گیا۔ ابھی ہمیں کم سے کم ایک دن اور رکنا چاہیے تھا۔ میں نے شوکت آرا سے وعدہ کیا تھا کہ جب تک اُسے بینک سے رقم مل جانے کا یقین نہیں ہو جائے گا، میں نیساں کو ساتھ نہیں لے جاؤں گا لیکن یہ تو میری اور شوکت آرا کی بات تھی۔ تجمّل یہاں اور ٹھہرنے کو کیوں کہہ رہا تھا؟ یقیناً اڈّے پہ کسی گڑبڑ کا اندیشہ تھا۔ خانم کے اچانک اصرار پہ تجمّل کچھ گھٹا گھٹا سا نظر آتا تھا اور خانم پہ جیسے ایک ایک لمحہ گراں گزر رہا تھا۔ اُس کے لہجے میں لرزش تھی۔ تجمّل کچھ دیر سوچتا رہا، پھر اُس نے شجاعت کے ذریعے کالے دادا کو اڈّے سے بلوا لیا اور اُسے بتایا کہ ہم سب ابھی پہلی گاڑی سے جانا چاہتے ہیں۔ کالے کو یقین نہیں آیا۔ وہ ابھی کچھ دن اور ٹھہرنے کے لیے تجمّل سے ضد کرنے لگا۔ میں نے بیچ میں بولنا چاہا کہ کل تک کے لیے جانا ملتوی کردیا جائے، کل تک شوکت آرا کے چیک کا جواب بمبئی سے ضرور آجائے گا۔ ہمارے جانے کی خبر روپوش نہیں رہ سکتی تھی۔ شوکت آرا کے کانوں میں بھنک پڑ گئی تو وہ نیساں کے آڑے آسکتی ہے مگر خانم بھی کسی سبب ہی سے گھر سے جلد از جلد نکل جانے پہ زور دے رہی تھی۔ شاید نواب کے ہرکارے سے کوئی ایسی بات ہوئی تھی جسے نیساں بھی نہیں سن سکی۔ گاڑیوں کا وقت مقرر ہوتا ہے۔ خانم کو اِس کا بھی احساس نہیں تھا۔ میں نے پھر اپنی بات اپنے آپ تک محدود رکھی۔ اب یہی ہوسکتا تھا کہ شوکت آرا نہ مانے تو میں ایک دن کے لیے رُک جاؤں، تجمّل چاہے کچھ کہے، میں نیساں کے ساتھ اُس کے گھر ٹھہر جاؤں گا۔ خانم اور جہاں گیر تجمّل کے ہمراہ چلے جائیں۔ ممکن ہے، مجھے ایک دن کے بجائے دو دن لگ جائیں۔ ایک دو دن بعد جہاں وہ بتائیں گے، میں اُن کے پاس آجاؤں گا۔ میرا چیک بالکل درست تھا۔ دستخط بھی میں نے دو بار کردیے تھے اور رقم کے اندراج میں پوری احتیاط برتی تھی۔ شوکت آرا نے زیادہ فیل مچایا تو مجھے بھی اب نرمی سے پیش آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ شاہ کبیر کے واقعے کا حال سن چکی ہوگی اور مجھ سے زیادہ لے دے نہیں کرے گی۔ پھر خود نیساں اُس کے ہاں رہنے پر کہاں آمادہ تھی۔

خانم نے ارجی بائی کو بلوا کے گھر کی چابیاں اُس کے حوالے کردیں۔

کالے دادا اور اُس کے ساتھیوں نے ہمارا مختصر سامان اپنے ہاتھوں میں اُٹھا لیا۔ نیساں اور خانم دونوں نے سیاہ برقعے پہن رکھے تھے۔ کالے برقعے میں نیساں کا چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ گلیوں میں اس وقت بہت بھیڑ تھی۔ ہر طرف سے گانے بجانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ خانم کا سامان آگے چلا گیا تھا، پیچھے پیچھے ہم روانہ ہوئے اور بازار کے باہر مین روڈ پہ کھڑی ہوئی دو موٹروں میں بیٹھ گئے۔ ان موٹروں کا انتظام کالے دادا ہی نے کیا تھا۔ چلتے وقت خانم کی بوڑھی ملازمہ خانم کے گلے لگ گئی تھی۔ اُس کی بیٹی اُلفت بھی پھوٹ پھوٹ کے [illegible] تھی۔ خانم کے دونوں ملازم شجاعت اور امنی موٹر تک ہمیں پہنچانے آئے۔ خانم نے انھیں وہیں سے واپس کردیا حالانکہ وہ اسٹیشن چلنا چاہتے تھے۔ خانم نے اُن سب کو معقول رقم دے دی تھی۔ جب موٹریں روانہ ہوئیں تو میرے اوسان بحال ہوئے۔ اب یہ خطرہ نہیں رہا تھا کہ شوکت آرا درمیان

بس آجائے گی۔ بس اتنی سی بات تھی کہ گاڑی کے انتظار میں ہمیں اسٹیشن پہ نہ ٹھیرنا پڑے۔ اس کا بھی امکان کم تھا۔ جھل نے کالے دادا کو حکم دیا تھا کہ اس وقت جو بھی گاڑی حیدرآباد سے باہر جاتی ہو، ہم اسی سے روانہ ہوجائیں گے۔ بیٹھک میں کالے دادا اور جھل کے درمیان ہونے والی گفتگو سے پہلی بار مجھے یہ پتہ چلا تھا کہ جھل دلّی کی طرف جانا چاہتا ہے۔ دلّی کی گاڑی کا وقت نہیں تھا۔ کاچی گوڑا اسٹیشن سے ہمیں اورنگ آباد کے لیے گاڑی مل سکتی تھی۔ وہاں بمبئی سے آنے والی گاڑی ہمیں دلّی کی طرف لے جاتی۔ ہم کاچی گوڑا اسٹیشن پر اُتر گئے لیکن ابھی ہم پلیٹ فارم پر پہنچے بھی نہیں تھے کہ پولیس کی ایک گاڑی تیزی سے آکے رُکی۔ اُس کے پیچھے ایک بڑی سیاہ موٹر کار تھی۔ لمحوں میں پولیس والے گاڑی سے اُتر گئے اور سیدھے ہماری طرف بڑھنے لگے۔ دفعتہً خانم کی چیخ نکل گئی۔ "نواب بہادر!" اُس نے وحشت زدہ لہجے میں کہا۔ "آخر اُنھیں خبر ہوگئی۔"

"کیسے خبر ہوگئی؟" جھل نے چونک کے پوچھا۔

"وہ۔ وہ یہاں آگئے ہیں۔" خانم نے حواس باختگی سے گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ پولیس ہمارے اطراف آکے ٹھیر گئی تھی۔ چند ثانیوں بعد موٹر سے سفید شیروانی میں ملبوس ایک دراز شخص برآمد ہوا۔ اُس کا جسم بھاری نہیں تھا۔ رنگ کھلتا ہوا گندمی، آنکھیں بڑی بڑی۔ سر پہ ترکی ٹوپی، چال میں وقار۔ عمر پینتالیس سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اُس کے ساتھ دو اشخاص اور تھے جو اُس کے خاص ملازم معلوم ہوتے تھے۔ نواب بہادر آہستہ آہستہ چلتا ہوا ہمارے پاس آگیا۔ خانم نے اپنی نقاب اُٹھا دی تھی۔ "آپ!" وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے بولی۔ "آپ یہاں کیسے آگئے؟"

"ہم تمھیں لینے آئے ہیں خانم!" نواب نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"کہاں؟" خانم سٹ پٹا کے بولی۔

"محل میں۔" نواب نے ٹھیرے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

"کیا ہرکارہ آپ کے پاس نہیں پہنچا؟ میں نے آپ کو پیغام بھجوا دیا تھا۔ اور اپنی معذوری ظاہر کردی تھی۔"

"ہمیں معلوم ہوگیا ہے لیکن ہم تم سے اس سلسلے میں کچھ بات کرنے کے خواہش مند تھے اس لیے خود یہاں چلے آئے۔"

"میں نے پیغام رساں پر ہر بات واضح کردی تھی۔" خانم تپ مُردگی سے بولی۔ "آپ نے کیوں زحمت کی؟"

"ہم تمھارے لیے بہت سی زحمتیں اُٹھا سکتے ہیں۔"

"آپ کی نوازشیں مجھ پہ بے پناہ ہیں لیکن کنیز نے جو عرض کیا ہے اُسی پہ قائم رہنا چاہتی ہے۔ کنیز اس شہر سے رخصت ہو رہی ہے۔"

"ہم دیکھ رہے ہیں۔" نواب نے ہماری طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "سمجھنے کی کوشش بھی کر رہے ہیں۔ بخدا ہمیں یقین نہیں آتا کہ تم اس طرح اچانک ہم سے دُور ہوسکتی ہو۔"

"مجبوری کچھ ایسی ہی ہے۔" خانم نے مدھم آواز میں کہا۔

"ہم وہی تو جاننا چاہتے ہیں۔ کیا تم ہمیں نہیں بتاؤ گی؟"

"آپ نہ پوچھیے اور ایسی کوئی خاص بات بھی نہیں ہے۔"

"پھر بھی ہم یہ جاننے کے لیے بے تاب ہیں کہ تم نے ہمیں اطلاع دیے بغیر اتنی عجلت میں یہ فیصلہ کیوں کرلیا۔ جہاں تک بازار ترک کرنے کا تعلق ہے ہم کون سا اسے پسند کرتے تھے۔ ہم نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم جب چاہو چلی آنا، ہمارے دروازے کھُلے ملیں گے۔ تم اُدھر کیوں نہیں آئیں؟ آخر ہم سے کون سی لغزش ہوگئی ہے؟"

"ہے ہے۔ آپ سے کوئی لغزش کیوں ہوتی۔ لِللہ ایسی باتیں مت کیجیے۔ خدا گواہ ہے کہ کنیز کے دل میں آپ کا کیا مرتبہ ہے۔" خانم بے بسی سے بولی۔

"تو پھر تم نے ہم سے یہ بے اعتنائی کیوں برتی خانم! اس کا کوئی سبب تو ضرور ہوگا۔ ہم فردِ جرم سننے آئے ہیں۔ اگر تم ہمیں کچھ بتائے بغیر چلی گئیں تو ہمیں چین نصیب نہیں ہوگا اور تم ہمیں کس کے آسرے پہ چھوڑ کے جا رہی ہو؟ کیا تمھیں یاد نہیں رہا، ہم نے اپنے بارے میں تم سے کیا کچھ نہیں کہا تھا۔ ہم تمھاری ہر مجبوری ختم کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہمیں بتاؤ۔ ہم تمھارے لیے نہ جانے کیا کیا کرسکنے پر قادر ہیں۔"

"اس قدر نادم نہ کیجیے کنیز کے شانوں پر پہلے ہی بہت بوجھ ہے۔"

"ہمیں بتاؤ خانم! ہم سے کچھ مت چھپاؤ۔"

"میں آپ کو کیا بتاؤں۔" خانم بے بسی سے بولی۔

"کوئی خوف مت کرو، ہم تمھارا خوف ہی تو دُور کرنے کے لیے آئے ہیں۔ ہمیں پہچانو، ہم ہر دیوار ڈھا دیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ فیصلہ تمھارا نہیں ہوگا۔"

"میرا ہی ہے۔" خانم تیزی سے بولی۔ "کوئی اور اس میں شریک نہیں ہے۔ کوئی دیوار نہیں، کچھ بھی نہیں۔"

"نہیں۔" نواب نے افسردگی سے کہا۔ "ہم کس طرح یقین کرلیں؟"

"میں آپ سے کہہ رہی ہوں۔"

"ہمیں شبہ ہے کہ یہ تم کہہ رہی ہو خانم! ہم بھی کچھ ارادہ ہی کرکے آئے ہیں۔ ہم تمھیں یوں کیسے جانے دیں ورنہ جو چند لوگ اس شہر میں ہمارا نام لیتے ہیں، انھیں ہم کیا منہ دکھائیں گے۔ تمھاری چارہ گری اگر ہمارے بس میں نہیں تو ہمیں اپنا نام بدل لینا چاہیے خانم! گھبراؤ مت، احتیاطاً ہم اسی لیے پورے انتظام سے آئے ہیں۔ یہ لوگ۔" نواب بہادر نے ہمارے اطراف کھڑے ہوئے پولیس کے لوگوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "یہ لوگ ہمارے اشارے کے منتظر ہیں اور ہم تمھارے اشارے کے۔ تم ہی کرسکتے تھے۔ کہو تو اس سے زیادہ بھی کر گزرنے کے لیے آمادہ ہیں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" خانم خوف زدہ لہجے میں بولی۔

"ہم کچھ بھی نہیں کہہ رہے ہیں۔" نواب نے کہا۔ "صرف اتنی بات کہہ رہے ہیں کہ ابھی ہم اس شہر میں موجود ہیں اور ہم نے زندگی صرف اپنے محل میں مقید ہوکے نہیں گزاری ہے۔ خانم! تم زبان نہیں کھولو گی تو ہمیں مجبوراً بعض ناروا باتوں کے لیے قدم اُٹھانا پڑے گا۔ تمھاری زباں بندی کی صورت میں ہم یہی کرسکتے ہیں۔ ہمیں اتنا اختیار حاصل ہے اور ہم زندہ ہیں۔ جن لوگوں نے تمھیں اس اقدام پر مجبور کیا ہے، انھیں تم سے ہمارے تعلق کا پاس رکھنا چاہیے اور اگر انھوں نے نہ رکھا تو ہم بھی نہیں رکھیں گے۔"

"اگر آپ کچھ اور سمجھ رہے ہیں تو غلط ہے۔ میں آپ سے کہہ چکی ہوں کہ یہ سب کچھ میرے ایما پر ہے۔ میں نے اپنے لیے یہی بہتر سمجھا ہے۔"

"لیکن.... لیکن ہم اسے تمھارے لیے بہتر نہیں سمجھتے۔ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص اپنے متعلق بہتر ہی سوچا کرے۔ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ ہم تم سے بے خبر رہے ہیں۔ تم سامنے نہیں ہوتیں تو کیا ہم سے دُور ہو جاتی ہو۔ ہمیں اندازہ ہوگیا ہے کہ تم کن اندیشوں میں اُلجھ گئی ہو۔ ہمارا بھی کچھ فرض ہے۔ اپنے عزیز لوگوں کے لیے بسا اوقات ناپسندیدہ رویّے بھی اختیار کرنے پڑتے ہیں۔"

"جو آپ سوچ رہے ہیں، ایسا نہیں ہے۔ میں کہہ رہی ہوں، ایسا نہیں ہے۔"

"گاڑی پلیٹ فارم پر لگ چکی ہے۔" دفعتہً جھل نے ایک قدم آگے بڑھ کے نرم آواز میں خانم کو ٹوکا۔

"گاڑیاں روز جاتی ہیں۔" نواب نے درشتی سے کہا۔ "ہمارے حکم کے بغیر گاڑی حرکت میں نہیں آسکتی اور ہم اپنے معاملات میں کسی کی دخل اندازی پسند نہیں کرتے۔"

"خانم بھی اپنے معاملات میں کسی کی دخل اندازی پسند نہیں کرتی۔"

"آپ خدا کے لیے خاموش رہیے۔" خانم جھل سے عاجزی کے ساتھ بولی۔

"خانم! ان لوگوں کو بتا دو کہ ہم کیسی باتیں سننے کے عادی ہیں اور ہمیں کون سا لہجہ پسند ہے۔" نواب نے برافروختگی سے کہا۔ "ہمیں افسوس ہے کہ جو ہم نہیں چاہتے تھے، وہ ہم سے سرزد ہو رہے گا۔ ہمیں معاف کردینا۔ اگر ہمیں یہ یقین نہ ہوتا کہ تم بعد میں ہمیں معاف کردو گی تو ہم اُلٹے قدموں واپس چلے جاتے۔" نواب نے یہ کہتے ہی گردن خم کرکے پولیس کو اشارہ کیا۔ خانم بلک پڑی۔ ایک ساتھ کئی پولیس والے ہماری جانب لپکے۔ انھوں نے دیکھتے دیکھتے دونوں اطراف سے کالے دادا اور اُس کے تین ساتھیوں کے شانوں کے علاوہ میرے شانے بھی زور سے پکڑ لیے مگر جھل نے اچانک اپنے کندھے زور سے جھٹکے اور اس سے پہلے کہ پولیس والے اُسے دوبارہ قابو میں کرتے، نواب کی چھاتی میں جھل کا چاقو چبھا ہوا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اُس نے نواب کا بازو پکڑ رکھا تھا۔ نواب کی آنکھیں پھٹ گئیں اور اُن میں انگارے سے دہکنے لگے۔ اُس نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی لیکن جھل کی گرفت سے اپنا بازو نہیں چھڑا سکا۔ اِدھر کئی پولیس والوں نے پیچھے سے جھل کو کھینچنا چاہا، جھل کھنچا مگر نواب بہادر بھی ساتھ کھنچا چلا آیا۔ "ہٹ جاؤ۔" جھل نے گرج کے کہا۔ "نواب صاحب! انھیں روک لو ورنہ...." پولیس خود پیچھے ہٹ گئی۔ "نواب بہادر! ہم بھی یہ نہیں چاہتے تھے۔" جھل نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "اگر ہمیں بھی بعد میں خانم کے معاف کردینے کا یقین نہ ہوتا تو ہم لَوٹ جاتے۔ آپ نے خانم کی بات سمجھنے اور سننے پر دھیان نہیں دیا۔ آپ عزّت دار آدمی ہو۔ عزّت والے اس طرح سے نہیں آتے اور اپنی بات یوں نہیں منواتے۔ پہلے ان لوگوں سے بولو کہ یہاں سے چلے جائیں پھر ہم سے بات کرو۔ اگر آپ اپنی عزّت شان لٹانے اِدھر آسکتے ہو تو نواب! اپنے پلّے بھی کچھ ہے اور جن کے پاس کم ہوتا ہے، اُنھیں اُس کے جانے کی اتنی فکر بھی نہیں ہوتی۔ ہتھیلی پر رکھی ہوئی چیز کسی وقت بھی گر سکتی ہے۔ ان کو حکم دو کہ یہاں سے دُور ہوجائیں۔ اِن کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے دل میں آپ کے لیے بہت درجہ ہے۔ خانم نے ہم کو ایسا ہی بولا تھا۔ خانم کوٹھے سے چلی آئی ہے نواب! یہ دکان بند کرآئی ہے۔ اب اس سے کوئی بات بولنی ہے تو اِس کا خیال کرکے بولو۔"

"ہم خانم ہی کے خیال سے اِدھر آئے ہیں۔ ہمارا خانم کا رشتہ دُکان کا رشتہ نہیں ہے۔" نواب نے مشتعل لہجے میں کہا۔ "ہمارے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ تم اِس گستاخی کی سزا کا تصوّر نہیں کرسکتے، جو تم کر رہے ہو۔"

"ہم کو اس کا دُکھ ہے پر ہم کو ایسی گستاخیاں کرنے کی عادت ہے۔ ہم نے آپ کی شان کا پورا لحاظ کیا ہے۔ آپ بھی ہم بے شان، بے عزّت لوگوں کا کچھ لحاظ کرو۔ ابھی ہماری ایک بات سنو، آخری بات۔ گاڑی جانے والی ہے۔ اگر آپ کے دل میں کوئی کھٹکا ہے تو ہم خانم کو آپ کے ساتھ کرتے ہیں۔ آپ اس سے علیحدہ میں بات کرلو لیکن اس سے پہلے ان لوگوں کو یہاں سے ہٹا دو اور سُن لو کہ اس کے بعد تم نے خانم پہ کوئی جبر کیا تو ہم وہ کریں گے جس کا تم بھی تصوّر نہیں کرسکتے۔ خانم اگر ہاں کہہ دیتی ہے تو ہم تمھارے پیروں پر سر رکھ دیں گے۔ پھر تم جو چاہے ہمارا کرنا، ہم کچھ نہیں بولیں گے۔ ہماری طرف سے خانم پوری طرح آزاد ہے۔"

نواب گنگ ہوگیا۔ چند لمحوں تک وہ سکتے کے عالم میں خانم کو گھورتا رہا پھر کہیں دُور سے آتی ہوئی آواز میں بولا۔ "کیوں خانم! یہ ہم کیا

تن رہے ہیں؟"

خانم پر غشی طاری تھی۔ جہاں گیر نے اُسے سنبھالے رکھا تھا۔ اسٹیشن پر چاروں طرف بہت سے لوگ کھڑے ہوئے ہم لوگوں کو اچک اچک کے حیرت سے دیکھ رہے تھے اور پولیس کی وجہ سے اِدھر آنے سے ہچکچائے ہوئے تھے۔ نواب نے مضمحل انداز میں پولیس والوں کو اسٹیشن سے جانے کا اشارہ کیا۔ تجمل نے اُس کی چھاتی سے چاقو ہٹالیا۔ "جاؤ خانم! نواب صاحب سے بات کرو۔"

خانم کو بات کرنے کا یارا نہیں تھا۔ وہ سسک رہی تھی۔ نواب بہادر کی نظریں اُسی پہ جمی ہوئی تھیں۔ خانم کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ تجمل نے ہم سب کو پلیٹ فارم سے جانے کا حکم دیا اور خود بھی کچھ فاصلے پر چلا گیا۔ جہاں گیر نے اُس کا حکم نہیں مانا۔ تجمل نے اُسے اپنے پاس کھینچ لیا۔ میں بھی گیٹ کے پاس ٹھہر کے دُور سے انھیں دیکھتا رہا۔ نواب بہادر خانم کے روبہ رو ساکت و جامد کھڑا تھا۔ اُن کے درمیان شاید کوئی بات نہیں ہوئی۔ کچھ دیر بعد نواب نے شیروانی کے بٹن کھولے اور موتیوں کی مالا گلے سے اتار کے خانم کے ہاتھوں پر ڈال دی اور تیزی سے پلٹ کے واپس جانے لگا۔

زرّیں کی حویلی کے بڑے دروازے پہ آکے تانگا ٹھہر گیا۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔ ہمیں شام ہی کو یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا مگر گاڑیاں ہر جگہ تاخیر سے روانہ ہوئی تھیں۔ حویلی کی سڑک پر اور گرد و پیش سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گھنے درختوں کی وجہ سے اندھیرا اور بڑھ گیا تھا۔ حویلی کے دروازے پر بوڑھا پہرے دار اونگھ رہا تھا۔ تانگے کی آواز سے وہ ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا۔ اُس نے لاٹھی سنبھال لی۔ میں نے اُسے پہچان لیا۔ وہ دلّو تھا۔ استاد جامو نے اپنے ایک پرانے ساتھی کو حویلی کی پہرے داری پہ تعینات کر دیا تھا۔ عن میں وہ جامو کے اڈّے پہ لڑکوں کو مشق کراتا تھا۔ سب سے پہلے تجمل تانگے سے اُترا۔ دلّو نے جیسے ہی اُسے دیکھا، لاٹھی چھوڑ کے تجمل کی طرف دوڑا اور اُس کے گلے سے لپٹ گیا۔

ہم تین دن سے مسلسل سفر کر رہے تھے۔ حیدر آباد میں تجمل کی زبانی دلّی جانے کے ذکر ہی سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کہاں جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ میں نے کوئی اعتراض اس لیے نہیں کیا تھا کہ ہمیں کہیں نہ کہیں تو جانا ہی تھا۔ جیسے جیسے منزلیں کم ہوتی جا رہی تھیں، میرے اعصاب سُن ہوتے جا رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے میں اپنے گھر شہر گیا جا رہا ہوں۔ کوئی ڈیڑھ سال بعد آج میں پھر اُس کی حویلی کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ بڑی حویلی جو اُس نے میرے نام کر دی تھی۔ زرّیں اب نہ جانے کیسی ہو گئی ہو گی۔ ممکن ہے وہ بدل گئی ہو۔ تین چار مہینے پہلے جب میں کلکتے میں تھا تو اُس نے جولین کا خط روانہ کیا تھا۔ خط سے تو ایسا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ بمبئی میں کانتے بھی ہر وقت اُس کا ذکر کرتا رہتا تھا۔ وہ مجھ سے بہت ناراض ہو گی۔ میں نے اُسے اپنی خیریت کا ایک خط بھی نہیں لکھا تھا۔ دلّو نے بڑا دروازہ پورا کھول دیا اور عمارت کے اندر کی طرف چیخ پکار کرتا ہوا بھاگا۔ حویلی کے احاطے میں قدم رکھتے ہی میرے دل پہ ہول سا طاری ہونے لگا۔

عمارت کا دروازہ کھلنے سے پہلے آواز آئی "کون ہے؟"

وہ اُسی کی آواز تھی۔ اضطراب آمیز مرتعش سی۔ "کون ہے؟" اُس نے دوبارہ پوچھا۔

"دروازہ کھولو رانی بیٹیا! دیکھو کون آیا ہے۔" دلّو نے اونچی آواز میں کہا۔ "تمھارے بابا آئے ہیں، تجمل بھائی۔"

"میں ہوں زری بٹیا!" تجمل تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔

دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا اور ہلکی روشنی میں زرّیں کا کانپتا ہوا سراپا نمودار ہوا۔ وہ ایک لمحے تک وہیں مبہوت کھڑی رہی۔ پھر وحشت سے چبوترے کی سیڑھیاں پھلانگ کے تجمل کے سینے سے لگ گئی۔ "بابا آپ!" وہ سراسیمگی سے بولی۔

"ہاں ری۔" تجمل نے اُس کی پیشانی کا بوسہ لیتے ہوئے کہا۔ "میں تو سمجھا تھا، تُو مجھے پہچانی نہیں۔"

"آپ نے آنے کی اطلاع کیوں نہیں دی؟"

"تُو خواہ مخواہ پریشان ہوتی، ہمارا کچھ ٹھیک نہیں تھا۔" تجمل اُس کے بازو دباتے ہوئے بولا۔ "اور یہ تُو کیسی ہو گئی ہے؟ گوشت اور کم کر لیا ری! کتنی دُبلی ہو گئی ہے۔ سب خیریت تو ہے؟ تُو نے میری بات نہیں مانی۔"

"بابا! آپ اتنے دنوں تک کہاں تھے؟" وہ اُس کے سینے پہ مچلنے لگی۔

"شکایتیں بعد میں کرنا، دیکھ میں تیرے لیے کس کس کو لایا ہوں۔"

"ظہیر کہاں ہیں؟" وہ بے تابی سے بولی۔

"لاڈلا!" تجمل نے ہنستے ہوئے کہا۔ "وہ بھی آیا ہے۔"

"سچ!" وہ تقریباً چیختے ہوئے بولی اور تجمل سے جدا ہو کے ہم لوگوں کی طرف جھپٹی۔

"ارے پیچھے کیوں منہ چھپائے کھڑا ہے، سامنے آ لاڈلے کہیں کے!" تجمل نے زور زور سے کہا۔ زرّیں نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ میرے سامنے آکے چونک کے رُک گئی۔ اُس کی پلکیں تھرا رہی تھیں۔ "اس سے تو بعد میں ملنا۔ اِدھر دیکھ، یہ خانم ہے۔" تجمل کی آواز پہ وہ لوکھلائے ہوئے انداز میں خانم کی طرف مڑ گئی اور اُس نے خانم کو جھجکتے، اٹکتے ہوئے آداب کیا۔ "اور یہ نٹ کھٹ چھوکری نیساں ہے۔" نیساں شرم سے دُہری ہو گئی۔

"اور اسے پہچان۔" تجمل جہاں گیر کو اپنے پہلو میں بھینچتے ہوئے بولا۔

"یہ.... یہ بھلا کون ہو سکتا ہے؟" جہاں گیر نے سلام کے لیے ہاتھ اُٹھایا۔

زرّیں اُسے حیرت بھری نظروں سے تکنے لگی۔ "چل، اندر چل۔" تجمل ایک جانب سے اُسے دوسری جانب سے جہاں گیر کو سمیٹتا ہوا اُوپر چڑھ گیا۔

حویلی کی ساری روشنیاں جلا دی گئی تھیں۔ زرّیں کی خادمائیں اور ملازم بھی شور سُن کے جاگ گئے تھے۔ وہ بوڑھی ملازمہ میری بلائیں لے رہی تھی جو کلکتے میں زرّیں کے ساتھ فلیٹ میں رہتی تھی۔ ہم سب ایک بڑے کمرے میں آ گئے تھے۔ زرّیں نے حویلی خوب سجا کے رکھی تھی، خود بکھری ہوئی تھی۔ دیواروں کا رنگ نیا نیا تھا۔ کارنس پہ تمام چیزیں سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ چھت میں ایک بڑا فانوس لٹک رہا تھا اور فرش پر سُرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ تجمل دیوان پر نیم دراز ہو گیا تھا۔ خانم اور نیساں سامنے ایک ساتھ، ایک دوسرے سے چپکی ہوئی بیٹھ گئی تھیں۔ زرّیں نے اندر جاتے ہی حکم دینے شروع کر دیے تھے۔ "بابا! آپ نے کھانا تو نہیں کھایا ہو گا؟" وہ کئی بار یہ پوچھ چکی تھی۔ عجب اوٹ پٹانگ سی باتیں کر رہی تھی۔ کہنا کچھ چاہتی تھی، منہ سے کچھ اور نکل جاتا تھا۔

"بیٹھ جا، تسلّی سے بیٹھ جا۔" تجمل نے جب اُسے ڈانٹا تو کہیں اُس کی زبان تھمی لیکن پھر اُس نے چائے بنانے کا حکم دیا۔ "بابا کا حقہ بھی تیار کر لینا، تمباکو رکھے رکھے سوکھ گیا تھا۔ میں نے تین دن پہلے ہی منگوایا ہے۔ بابا! آج صبح ہی سے مجھے لگ رہا تھا کہ آپ آنے والے ہیں۔"

"روز تجھے ایسا لگتا ہو گا۔"

"بابا! میں ہر دوسرے تیسرے روز کلکتے خط لکھتی تھی۔ جامو بھائی اور کانتے ہر بار یہی جواب دیتے تھے کہ بس وہ آنے ہی والے ہیں۔ پھر ایک مہینہ ہوا کہ اُن کا خط بھی کم کم آنے لگا۔" میں نے زرّیں کو اتنا بولتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُس کی پتلیاں متحرک تھیں، نظروں کو قرار نہیں تھا۔ کبھی مجھے دیکھتی تھی، کبھی جہاں گیر کو، کبھی خانم کو اور کبھی نیساں کو۔ صبح تک کوئی نہیں سویا۔ زرّیں نے نہیں پوچھا کہ ہمارے ساتھ کون کون ہے۔ تجمل نے اُن کے بارے میں صرف اتنا بتایا تھا کہ میں تیرے لیے ایک بڑی اور ایک چھوٹی بہن لایا ہوں۔

نیند کا پتہ ہی نہیں چلا۔ فیض آباد اسٹیشن پر اُتر کے سب کے چہروں پہ تھکن سوار تھی۔ بیٹھے بیٹھے نیساں اور خانم کی پنڈلیاں دُکھنے لگی ہوں گی۔ میں تو ہر اسٹیشن پہ اُتر کے مسافروں کو دیکھ آتا تھا۔ میرے ساتھ جہاں گیر بھی ہوتا، کبھی کبھی تجمل بھی۔ شاید ہی کوئی ایسا مسافر ہو جس پہ میری نظر نہ گئی ہو۔ میں ہر ڈبے میں جھانک کے بھی دیکھ لیتا تھا۔ ہر دفعہ میں یہ طے کرتا کہ اب کے نہیں جاؤں گا لیکن جیسے ہی کوئی اسٹیشن آتا، میں پھر نیچے اُتر جاتا۔ ہر جگہ یہ گمان ہوتا تھا کہ شاید اُن میں سے کسی کی صورت دکھائی دے جائے لیکن تمام آدمی کبھی ایک جگہ اکٹھے نہیں ہوتے۔ ایسا ہوتا تو پھر کسی کو کسی کا ڈھونڈنا اتنا عذاب نہ ہوتا۔

نیساں کی چمکیلی آنکھیں زرّیں پر ٹکی ہوئی تھیں۔ وہ زرّیں کو اس طرح ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھ رہی تھی جیسے کوئی نئی دُلھن کو دیکھتا ہے۔ خانم دیر تک برقع پہنے بیٹھی رہی۔ زرّیں کو اچانک اُس کا خیال آیا تو وہ اُن دونوں کو دوسرے کمرے میں لے گئی۔ جب وہ واپس آئیں تو اُن کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ خانم نے لباس تبدیل کر لیا تھا اور زرّیں کے پاس بیٹھی چپکے چپکے نہ جانے کیا کیا باتیں کرنے لگی تھی۔ نیساں کان لگائے سُن رہی تھی۔ کبھی میری جانب اُس کی نگاہ آتی تو آنکھوں میں ستارے سے چمکنے لگتے۔ جب زرّیں کو یہ معلوم ہوا کہ جہاں گیر میرا چھوٹا بھائی ہے تو پہلی مرتبہ اُسے اعتبار ہی نہیں آیا مگر جب اُس نے جہاں گیر کو غور سے دیکھا تو اُس کے چہرے کے رنگ تیزی سے بدلنے لگے۔ جہاں گیر میں نمّی کی بڑی مشابہت تھی اور مری ہوئی نمّی کو زرّیں نے بے شمار مرتبہ دیکھا تھا۔ اُس کی لاش اسی کمرے سے پیوستہ کمرے میں رکھی گئی تھی۔ جہاں گیر زرّیں کی نگاہوں کا ہدف بنا کسمساتا اور جھینپتا رہا۔ خانم نے اشارے سے اُسے اپنے پاس بلا لیا۔ وہ زرّیں اور خانم کے درمیان سکڑ کے بیٹھ گیا۔ میں وہاں سے اُٹھ کے باہر آ گیا۔

دن نکل رہا تھا۔ صبح کی خنک اور مدھم روشنی حویلی کے در و بام پر چھائی ہوئی تھی۔ مجھے یہاں کی ایک ایک جگہ معلوم تھی۔ آگے باغ تھا۔ میں نے باغ میں جانے کا ارادہ کیا لیکن میرے قدم خود بہ خود اُس کمرے کی طرف اُٹھ گئے جہاں کبھی میں رہتا تھا۔ کمرے کی ترتیب وہی تھی۔ سامنے وہی پلنگ تھا جس پر میں سویا کرتا تھا۔ بستر پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں اور آس پاس میزوں پر کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ دیوار پر وہی بڑی گھڑی آویزاں تھی جس کا گھنٹا سن کے مجھے یہاں حبس محسوس ہونے لگتا تھا اور میں ہر لمحے حویلی سے باہر نکلنے کی تدبیریں سوچتا رہتا تھا۔ تجمل نے باہر جانے کے تمام راستے بند کر دیے تھے۔ میں نے کمر پلنگ سے ٹکائی ہی تھی کہ مجھے فوراً احساس ہو گیا، یہاں اب زرّیں سوتی ہے۔ اُس کی خوشبو بستر میں بسی ہوئی تھی۔ میں نے بے اختیار تکیے میں منہ چھپا لیا لیکن اسی لمحے مجھے ایسا لگا جیسے کوئی اندر آ رہا ہے۔ میں بھاگ کے باہر دالان میں چلا آیا اور آرام کرسی پر ہانپنے لگا۔

تھوڑی ہی دیر میں زرّیں کی خادمہ مجھے ڈھونڈتی ہوئی اِدھر آ نکلی۔ اُس نے ناشتہ تیار ہونے کی اطلاع دی۔ میں وہاں پہنچا تو تجمل زرّیں سے کہہ رہا تھا۔ "بٹیا! اتنے دنوں میں تُو کتنی باؤلی ہو گئی ہے۔ تجھے ناشتے اور کھانے کی پہچان بھی نہیں رہی۔" ہمارے درمیان ایک لمبا دستر خوان بچھا ہوا تھا۔ زرّیں نے نہ جانے کیا کیا بنوا لیا تھا۔ تاہم سب نے کھُل کے کھایا۔ ہم نے ابھی چائے نہیں پی تھی کہ ایک ملازمہ نے جمرو کے آنے کی خبر دی۔ زرّیں نے بتایا کہ وہ روز صبح آکے مجھے پوچھتے ہیں۔

مہینے ڈیڑھ مہینے بعد لکھنؤ سے کبّن خاں بھی آجاتے ہیں اور حویلی ہی میں ٹھیرتے ہیں۔ کلکتے میں جب تجّمل نے جامو اُستاد کو اپنے اڈّے کا نگراں بنایا تھا تو یہاں فیض آباد میں جمرو نے اپنے بڑے بھائی کا اڈّا سنبھال لیا تھا۔ جامو نے اپنے دوست کبّن خاں کو خط لکھ دیا تھا کہ وہ جمرو کا خیال رکھے اور گاہے گاہے فیض آباد جاتا رہے۔ تجّمل زرّیں کو بیٹھک میں چائے بھجوانے کا کہہ کے باہر چلا گیا۔ میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے بیٹھک میں پہنچ گیا۔ جمرو ہمیں دیکھ کے اُچھل پڑا۔ اُس کی عمر میرے برابر ہی ہوگی۔ تجّمل نے اُس کی اُنگلیاں مروڑیں، کولھے پہ ہاتھ مارے اور سر کے بال کھینچ لیے۔ "کیسا ہے بالم تو۔! وہ سجنی سدا سہاگن تیری کھوپڑی سے نکلی یا ابھی تک چمٹی ہوئی ہے؟"

جمرو نے نظریں نیچی کرلیں۔ تجّمل نے اُسے بیٹھنے کو کہا۔ زرّیں چائے لے کے اندر آئی تو جمرو دوبارہ اپنی نشست سے اُٹھ گیا اور بھرّاتی آواز میں بولا۔ "بہن جی! مبارک ہو، اُستاد آگئے۔"

زرّیں زیرِ لب مسکرانے لگی اور جمرو سے بولی۔ "جمرو بھائی! اب آپ جامو اور کانتے بھائی کو بُلا لیجیے اور ہاں کبّن بھائی کو بھی۔ میں بھی آج انھیں خط لکھتی ہوں۔"

"بس بس۔" تجّمل نے ڈپٹ کے کہا۔ "مجھ سے پوچھے بنا انھیں خط پتر مت لکھنا اور جمرو! تو اس کی باتوں میں نہ آنا۔"

"نہیں بابا! بلا لیجیے، جامو بھائی کو گئے ہوئے کتنے دن ہوگئے۔" زرّیں نے شکایتی لہجے میں کہا۔ "سب آجائیں گے تو بہت اچھا لگے گا۔"

"ہاں ہاں دیکھیں گے بٹیا! ابھی ذرا ٹھیر۔" تجّمل نے نرمی سے کہا اور جمرو سے اڈّے کے متعلق پوچھنے لگا۔ دوپہر کے کھانے تک وہ وہیں ٹھیرا رہا۔ اُس کے واپس نہ پہنچنے کے سبب اڈّے کے کئی آدمی بھی اِدھر آگئے تھے۔ اُدھر دلّو نے شہر بھر میں خبر کردی ہوگی۔ دوپہر تک بیٹھک میں بڑی تعداد میں لوگ جمع ہوگئے۔ جمرو تجّمل کے منع کرنے کے باوجود اُس کا جسم دباتا رہا۔ کسی اور نے اُس کی جگہ لینے کی کوشش کی تو جمرو تیار نہیں ہوا۔ سب نے ساتھ ہی کھانا کھایا۔ اندر سے چائے، گلوریاں آتی رہیں اور حقّہ چاروں طرف گھومتا رہا۔ اُن میں بہت سے لوگ مجھے جانتے تھے، میں ان سے واقف نہیں تھا۔ فِتّی کے کفن دفن کے دن مجھے اتنا ہوش ہی نہیں تھا کہ اُن کی صورتیں یاد رکھتا۔ تجّمل حالانکہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا مگر وہ اُن کے درمیان بیٹھا انہماک سے اُن کی باتیں سن رہا تھا۔ امین آباد میں چکوری بالو کا ہنگامہ، نواب اچھے اور چودھری رام پرشاد کا قتل، کبّن خاں اور کان پور کے اُستاد دھیرا کی لڑائی، کان پور میں پولیس کی دہشت، وحیدا کا جیل سے فرار، کتنے لوگ جیل میں ہیں، کتنوں کا وارنٹ جاری ہے۔ وہ جگہ جگہ کے واقعات اُسے سُنا رہے تھے اور اُن وارداتوں میں آزمائے جانے والے داؤ انھیں ازبر تھے۔ اُن کی باتیں اتنی دلچسپ اور حیران کُن تھیں کہ میں بھی وہیں بیٹھا سُنتا رہا۔ میں نے اندر جا کے جہاں گیر، خانم یا نیساں میں سے کسی کا حال نہیں پوچھا کہ انھیں اس نئی جگہ آنے کے بعد کیا محسوس ہو رہا ہے۔ نیساں کا جی تو نہیں گھبرا رہا ہے۔ مجھے سب سے زیادہ اُسی کی فکر تھی۔

سہ پہر ہو رہی تھی مگر کوئی اُٹھنے کا نام نہیں لیتا تھا بلکہ اُن کی تعداد بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر نئے آنے والے کے لیے تجّمل کو اُٹھنا اور گلے ملنا پڑتا تھا۔ گفتگو کے دوران میں اتفاق سے تجّمل کو کہیں جماہی آگئی۔ جمرو چابُک بھڑک اُٹھا۔ "اب تم لوگوں کو کچھ خیال بھی ہے۔ یہاں بیٹھے بیٹھے اُستاد کا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔" وہ ناراضی سے بولا۔ "منہ اُٹھائے چلے آتے ہو ٹُک ٹُک ٹُک۔ اُستاد کو کیا اس بوچڑ خانے میں بٹھاؤ گے؟ جاؤ، جا کے اڈّے کی کچھ صفائی دھلائی کرو۔ رات کا کھانا اُستاد اڈّے ہی پہ کھائیں گے۔ ہر قسم کا انتظام ہونا چاہیے۔"

تجّمل نے جمرو کی گردن دبوچ لی اور اُسے اپنے زانوؤں پہ جھکا کے اُس کی پیٹھ پر زور زور سے ہاتھ مارنے لگا۔ جمرو نے حرکت نہیں کی۔ وہ دم سادھے پڑا رہا۔ تمام لوگ کھڑے ہوگئے تھے اور جمرو کے اعلان کے بعد بہت عجلت میں نظر آنے لگے تھے۔ جمرو بھی اُنھی کے ساتھ چلا گیا۔

میں اندر گیا تو مجھے اپنی بینائی پر شُبہ ہوا۔ خانم سادہ کپڑوں میں پلنگ پر بیٹھی زرّیں کی چوٹی گوندھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کے وہ چپ ہوگئیں۔ زرّیں نے جھٹ دوپٹا اپنے سر پہ رکھ لیا اور بدن سمیٹ کے بیٹھ گئی۔ جیسے مائیوں میں بیٹھی ہو۔ "بابر میاں! تم بھی کچھ آرام کرلو۔ طبیعت خراب ہوجائے گی۔" خانم آہستگی سے بولی۔

"جی آپی!"

"اُسی کمرے میں۔" زرّیں مجھے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"وہاں تو اب تم قابض ہو۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

وہ شرما گئی، اُس کی آواز جھن جھنانے لگی۔ "میں اپنے پُرانے کمرے میں چلی گئی ہوں۔"

"نیساں کہاں ہے؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"وہ نہیں مانی۔ باورچی خانے میں گھُسی بیٹھی ہے۔ کہتی تھی کہ بابر بھائی کے لیے اپنے ہاتھوں سے میٹھا بناؤں گی۔"

زرّیں تیکھے لہجے میں بولی جیسے اُسے میرا اصل نام معلوم نہیں ہوا بلکہ اُس نے میری کوئی چوری پکڑلی ہے۔ معلوم نہیں صبح سے اُن کے درمیان کیا کیا باتیں ہوئی ہوں۔ خانم نے کیا کہا ہو اور زرّیں نے اسے کیا کچھ بتایا ہو۔ ظاہر ہے وہ ایک دوسرے کا چہرہ تو نہیں دیکھتی رہی ہوں گی۔

ممکن ہے خانم نے اپنے بارے میں اُسے تمام باتیں بتا دی ہوں کہ وہ بالاخانے سے اُتر کے آئی ہے اور نیساں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ پچھلے سے کیا حال تھا۔ بعد میں زرّیں کو یہ بات معلوم ہوتی تو اُسے بہت اچنبھا اور دُکھ ہوتا۔ خانم نے اپنے بارے میں کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں رکھی ہوگی اور زرّیں نے ایک لفظ نہیں کہا ہوگا۔ اُن دونوں کے تیوروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو خوب اچھی طرح سمجھتی ہیں۔ زرّیں بھی ایک مرتبہ اس منزل سے گزر چکی تھی۔

دُور سے کوئی دیکھے تو ایسا لگتا تھا کہ خانم زرّیں کی بڑی بہن ہو۔ حویلی کا موسم بدل گیا تھا۔ نیساں چہچہاتی ہوئی ہر گوشے میں پھرتی تھی۔ جہاں گیر پر بھی اب کہیں آنے جانے کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ فیض آباد کی سڑکوں پہ کبھی میرے ساتھ اور کبھی تجّمل کے ساتھ گھومتا رہتا تھا۔ ویسے حویلی ہی اتنی بڑی تھی کہ کہیں باہر جانے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ اچھا خاصا بڑا باغ تھا۔ کمروں کا ایک سلسلہ تھا۔ ایک کونے سے آواز لگاؤ تو دوسرے کونے میں نہیں پہنچتی تھی۔ لائبریری میں زرّیں کے ابّا جان کی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا۔ اِس دوران میں زرّیں نے بھی اُس میں خاصا اضافہ کرلیا تھا۔ تیسرے ہی دن جہاں گیر کا تعلیمی سلسلہ دوبارہ شروع کردیا گیا۔ زرّیں نے اُسے الٰہ آباد سے انٹرینس کرانے کے لیے جمرو سے کہہ کے ایک ساتھ دو دو ماسٹروں کا انتظام کرادیا تھا۔ نیساں کے لیے علیحدہ ماسٹر رکھا گیا۔ بعض اوقات زرّیں خود اُسے پڑھانے لگتی تھی۔ خانم نے اپنے زیورات اور نقدی زرّیں کے حوالے کرنا چاہا لیکن زرّیں نے حویلی کی تمام چابیاں اُس کے آگے ڈال دیں۔ صبح جب خادمہ کھانا پکانے کے لیے سبزی گوشت پوچھنے آتی تو زرّیں خاموش بیٹھی رہتی۔ پھر مجبوراً خانم ہی کو بتانا پڑتا۔ ہمارے آنے کے تیسرے ہی دن کبّن خاں لکھنؤ سے آگیا تھا اور حویلی ہی میں ٹھیرا ہوا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد تجّمل عموماً جامو کے اڈّے چلا جاتا۔ کسی کسی دن وہ مجھے بھی ساتھ لے جاتا۔ جہاں گیر نے کئی بار اُس کے ساتھ جانے کی ضد کی مگر تجّمل کبھی اُسے اپنے ساتھ اڈّے نہیں لے گیا۔ جہاں گیر اتنا بچہ نہیں تھا، کچھ کچھ اُسے بھی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ تجّمل بابا کا کیا کاروبار ہوسکتا ہے۔ صبح سویرے ہی سے بیٹھک میں لوگ آنے شروع ہوجاتے۔ تجّمل نے جہاں گیر کو اس وقت بیٹھک تک آنے سے روک دیا تھا لیکن جہاں گیر کئی لوگوں کو جان گیا تھا۔ کبّن خاں تو اُسے ہر وقت اپنے پہلو سے لپٹائے رکھتا۔ زرّیں بھی اڈّے کے کئی آدمیوں کے سامنے آتی تھی۔

جب میں نیساں اور خانم کو ایک ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھتا تو مجھے جولین بہت یاد آتی۔ ہمیں آئے ہوئے پندرھواں دن تھا کہ بمبئی سے چمپا کا خط آیا۔ اُس نے ہماری خیریت دریافت کی تھی اور لکھا تھا کہ اگر ظہیر تک میرا پیغام پہنچ سکے تو اُسے بتا دینا کہ تمھارا خط نہ آنے سے بہت تشویش ہے۔ اُس نے زرّیں سے درخواست کی تھی کہ اگر اُسے میرے بارے میں کچھ معلوم ہو تو وہ اُسے ایک دو سطری خط لکھ دے۔ جولین کی طرف سے کوئی پیغام نہیں تھا۔ حالانکہ خط انگریزی میں تھا اور جولین ہی نے اُسے لکھا ہوگا۔ یہ خط تجّمل نے بھی سُنا اور چپ بیٹھا رہا۔ زرّیں نے اُس سے اجازت چاہی کہ کیا وہ اُسے جواب لکھ دے؟ تجّمل نے انکار نہیں کیا۔

سترھویں دن رات کو وہ اڈّے سے جلد واپس آگیا۔ میں نے اُس سے بات کرنے کا ارادہ کیا۔ جہاں گیر اپنی نئی زندگی سے بہت خوش معلوم ہوتا تھا اور تن دہی سے تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ خانم اُس کے ساتھ ہی تھی اور ہر وقت اُس کی دیکھ بھال میں لگی رہتی تھی۔ جہاں گیر کے سلسلے میں زرّیں نے خانم کی بہت سی ذمّے داریاں کم کردی تھیں اور میں نے بہت غور سے دیکھا تھا کہ نیساں کی پیشانی پر کوئی لکیر تو نہیں کھنچی ہے لیکن وہ ہمیشہ چہکتی رہتی تھی۔ تجّمل نے خانم کے لیے ایک ستار منگوا دیا تھا۔ خانم نے اُسے قبول نہیں کیا، بولی کہ وہ اب اسے چھونا نہیں چاہتی لیکن تجّمل نے یہ کہہ کے اُس کی بات مسترد کردی کہ اب وہ اپنی خوشی کے لیے گایا کرے، اپنے لیے گایا کرے۔ تجّمل نے اُس پر زور دیا کہ اُسے اپنا ریاض جاری رکھنا چاہیے۔ اُس نے خانم کو بتایا کہ حیدرآباد میں ایک دن صبح اُسے خانم کا گانا سننے کا موقع ملا تھا۔ اُس وقت خانم ریاضت کر رہی تھی۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ ہوسکتا ہے خانم نے صبح سویرے بند کمرے میں ریاضت شروع کردی ہو۔ میں تجّمل سے کہنا چاہتا تھا کہ میں اب جا رہا ہوں اور میرے ساتھ اُسے چلنے کی ضرورت نہیں ہے، کھوئے ہوؤں کو میں خود ہی ڈھونڈتا رہوں گا، وہ اپنے اڈّے واپس چلا جائے اور جامو کو فیض آباد بھیج دے۔ یہاں اُس کے اڈّے کے لوگ اُس کی کمی بُری طرح محسوس کرتے ہیں۔ میں نے سوچا تھا، اُس سے کہوں گا کہ تین چار مہینے بعد میں فیض آباد آتا رہوں گا اور ان لوگوں کے ساتھ کچھ دن رہ کے پھر چلا جایا کروں گا۔ مجھ سے کوئی کام نہیں ہوگا کیونکہ میرا جی کسی کام کو نہیں چاہتا۔ میں پہلے ابّا جان کے ٹکڑوں پر پلتا رہا، پھر جیل میں مجھے مفت کا کھانا ملتا رہا۔ بمبئی میں کرشنا جی جب تک دوبارہ نہیں ملے تھے، مجھے چند روز مزدوری کرنی پڑی تھی۔ پھر کرشنا جی مجھے گھر لے گئے۔ میں زرّیں سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ خانم، نیساں اور جہاں گیر کے لیے جتنی رقم چاہے، مجھ سے لے لے۔ میری بات سن کے وہ زہر کھالیتی یا کبھی میرے سامنے نہ آتی۔ سو اُس سے اس قسم کی بات کرنا ہی بے کار تھا۔

ممکن ہے تجّمل یہ سمجھتا ہو کہ جہاں گیر کے ملنے کے بعد میں اُس

کی خاطر اب کہیں آنے جانے کی بات نہیں کروں گا۔ اُس نے یہاں آ
کے اب تک جانے کا نام نہیں لیا تھا۔ شاید مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔
کھوئے ہوئے لوگ اتفاق سے مل جاتے ہیں۔ کرشنا جی نے تمام دُنیا میں
خط لکھے تھے۔ کیا نتیجہ نکلا؟ تجمل نے اتنی دوڑ دھوپ کی کیا حاصل ہوا؟
رف جہاں گیر ملا، وہ نہیں ملی۔ جہاں گیر کو تو میں پہلے بھی چھوڑ کے چلا آیا تھا۔
ر آدمی کا سینہ، اُس کی آنکھیں اُس کے پاس ہوتی ہیں اور اُس آدمی کی
نکھوں اور سینے میں کیا کچھ ہوتا ہے یہ وہی جان سکتا ہے۔ میں یہاں
بیٹھا لوگوں کی صورتیں دیکھتا رہتا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میرا
سینہ بجھ گیا ہے۔ تجمل مجھے صبر و ضبط کی تلقین کرتا تھا کہ کرشنا جی بھی یہی
کہتے تھے۔ انھیں کیا اندازہ تھا کہ اُن کی باتیں سُننا بھی میرے لیے سب سے
بڑا ضبط ہے۔ اگر یہ لوگ میری جگہ ہوتے تو اُن کے کس بھٹ جاتے مگر یہ
میری جگہ [illegible] کیوں؟ — فتی پانچ ہزار میں بک گئی تھی۔ نیساں کی
قیمت ساٹھ ہزار تھی۔ کاش اُس کی بھی کوئی قیمت ہوتی۔ پھر میں کہیں
ڈاکا ڈال لیتا۔ میں کچھ بھی کر لیتا۔ ایسا ہوتا تو کتنا آسان ہو جاتا۔
اب اُس کے لیے صَرف کرنے کو میرے پاس ایک ہی چیز رہ
جاتی تھی اور وہ بھی بار بار ہاتھ سے نکل جاتی تھی۔ شاید کبھی وقت مہربان
ہو جائے اور اُس کا سایہ کہیں نظر آجائے۔ یہاں اس طرح گھر میں بیٹھا
میں اپنے بالوں کی جوئیں ہی نوچ سکتا تھا۔ جو لمحے اِدھر اُدھر ضائع ہو
گئے۔ اس میں میری کوئی خطا نہیں تھی۔ وہ سُنے گی تو مجھے معاف کر دے گی۔
اپنی طرف سے میں نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا تھا۔ اب جتنی دیر ہو
رہی تھی، ہر وقت یہ خدشہ رہتا تھا کہ اور دیر نہ ہو جائے۔ تجمل بھی کچھ سوچ
رہا تھا۔ اچھی طرح یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ اس وقت اُس سے کی
جانے والی بات بے سود نہیں جائے گی، میں نے دبے دبے لہجے میں کہا۔
”میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”مجھے معلوم ہے تو کیا بولے گا، کل پرسوں چل دیں گے۔“ وہ
پُرسکون آواز میں بولا۔ ”یہی بولنا چاہتا تھا؟“

”ہاں! مگر تم میرے ساتھ کیوں جاتے ہو؟“

”کیا تو مجھے اپنے ساتھ لے جانا نہیں چاہتا؟“

”نہیں! یہ بات نہیں ہے۔“ میں نے جھنجلا کے کہا۔ ”مجھے تمھارا
ہی خیال ہے۔ تمھیں اڈّے سے دُور ہوئے بہت دن ہو گئے۔ تمھیں اب
وہاں جانا چاہیے۔“

”اڈّے کی بات مت کر، یہ کہہ کہ تو اکیلا ہی جانا چاہتا ہے۔“

”نہیں نہیں۔“ میں نے گھبرا کے کہا۔ ”غلط مت سمجھو۔“

”پھر ساتھ چلیں گے۔“ وہ فیصلہ کُن انداز میں بولا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے سانس لے کے کہا۔ ”تمھاری مرضی مگر
کب چلو گے؟“

”میں نے بول دیا نا، کل پرسوں۔“ وہ ناگواری سے بولا۔ میں چپ
ہو گیا۔ کچھ دیر حقہ گڑگڑانے کے بعد وہ کہنے لگا کہ اب دکن کی طرف
جانا بے کار ہے۔ اُس کی رائے تھی کہ اب بھی ہمیں پروگرام بنا کے چلنا
چاہیے۔ ہم جنوبی ہند سارے کا سارا دیکھ چکے تھے۔ اگر حیدرآباد میں
جہاں گیر نہ ملتا تو ہم حیدرآباد سے اُدھر کی طرف ہی جا سکتے تھے۔ تجمل کا خیال
تھا کہ مولوی محمد شفیق شمالی ہند میں مُرادآباد سے قریب کہیں ہوتے تو
کسی نہ کسی کو ضرور نظر آتے۔ اسی کے پیشِ نظر اُس نے جنوبی ہند کے
انتہائی دور دراز حصّوں میں سفر کیا تھا۔ تجمل نے وسطی ہند جانے کا
ارادہ ظاہر کیا۔ میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ میرے لیے ہر جگہ یکساں تھی
وہ کہیں بھی ہو سکتی تھی۔ دوسرے دن صبح تجمل نے جمرو کو بتا دیا کہ وہ کل
یہاں سے روانہ ہو جائے گا۔ گھر میں بھی خبر ہو گئی اور زرّیں نے بھی سُن
لیا۔ سب کے چہروں پہ بادل سے چھا گئے۔ جہاں گیر تجمل کے پاس آ کے
رونے لگا۔ دوپہر کے کھانے پہ خانم نے تجمل سے درخواست کی کہ وہ
ابھی جانے کا ارادہ ملتوی کر دے۔

”تم بولتی ہو تو میں رُکا جاتا ہوں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں
پڑے گا۔“ تجمل نے ملائمت سے کہا۔ ”جتنی جلدی ہم جائیں گے، اتنی
جلدی واپس آجائیں گے۔“ خانم نے اس کے بعد اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

شام کو میں باغ میں بیٹھا ہوا تھا۔ نیساں میرے پاس آ گئی اور
جھکی جھکی پلکوں سے وہی بات دُہرانے لگی جو خانم نے تجمل سے کہی
تھی۔ میں نے اُسے پاس بٹھا کے سمجھایا کہ مجھے بہت ضروری کام ہے۔
میں نے اُسے تاکید کی کہ زرّیں اور خانم کی کوئی بات اُسے بُری لگے تو
وہ دل پہ میل نہ لائے۔ گھر میں کسی نہ کسی سے کوئی بُری بات ہو ہی جاتی
ہے۔ وہ کبھی خانم کی شکایت زرّیں سے یا زرّیں کی شکایت خانم سے
نہ کرے۔ نیساں بولی کہ مجھے تو خود ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ میری کوئی
بات آپی یا خانم کو بُری نہ لگ جائے۔ میں نے کہا۔ ”پگلی! آپی اور خانم
بہت سمجھ دار ہیں۔ بڑوں کا کام نظر انداز کرنا اور معاف کرنا ہوتا ہے
اور ان سے بھی غلطیاں ہو سکتی ہیں۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے
اُداس مت ہو جانا۔ چھوٹی بن کے رہنا اور انھیں بڑی سمجھ کے چپ
ہو جانا۔ اب یہی تمھارا گھر ہے۔“ نیساں شکایت کرنے لگی کہ زرّیں باجی
مجھے کام نہیں کرنے دیتیں۔ میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہی کرتی ہیں۔ گھر میں نوکر
اور نوکرانیاں موجود ہیں تو تمھیں کام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تمھارے
لیے پڑھنے کا کام کیا کم ہے۔ اس سے نمٹ جاؤ تو خوب کام کرنا۔ پھر
زرّیں بھی منع نہیں کرے گی۔“ بولی ”میرا جی یہ چاہتا ہے کہ میں ہر وقت
زرّیں باجی کے پاس بیٹھی رہا کروں۔ وہ بہت اچھی ہیں۔“ پھر ایک دم

و چھنے لگی کہ کیا آپ اُن سے ناراض ہیں؟ میں نے کہا نہیں، ناراض
وتا تو میں تمھیں یہاں کیوں لاتا۔ کہنے لگی، مجھے ایسا ہی لگتا ہے، تو پھر
پ ان سے بات کیوں نہیں کرتے؟ میں نے کہا، کرتا کیوں نہیں ہوں۔
دلی، ایسے بات تھوڑی کرتے ہیں، وہ تو ہر وقت آپ کا خیال رکھتی
ہیں۔ بتانے لگی کہ زرّیں نے میرے لیے بہت سے کپڑے بنوائے ہیں۔
ترین کپڑے کی شیروانیاں، چکن کے کُرتے وہ خود اپنے ہاتھ سے سی
ہی ہے۔ نیساں مجھے بتانے لگی کہ جب بھی میرا ذکر آتا ہے، زرّیں
اموش ہو جاتی ہے یا بات بدل دیتی ہے یا وہاں سے اُٹھ کے ہی
لی جاتی ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ میں اُس کے لیے کیا لاؤں؟
ں نے جواب دیا کہ بس آپ آجائیں۔ اللہ کرے آپ جس کام کے لیے
ارہے ہیں، اُس میں پوری کامیابی ہو۔ میں نے اُس کے ہاتھ چوم لیے۔
یاں کی آنکھیں بھر آئیں۔ کہنے لگی، بابر بھائی! میں آپ کے لیے روز
ا کروں گی۔ میں نے کہا، بہت سے لوگ دعائیں کرتے ہیں مگر کچھ بھی
یں ہوتا۔ کہنے لگی، دیکھیے گا، میری دُعائیں بہت قبول ہوتی ہیں۔ میں نے
ن کے گھر دعا مانگی تھی، دیکھیے قبول ہو گئی۔

میں اسی لیے دن بھر یا تو بیٹھک میں بیٹھا رہا تھا یا پھر اِدھر باغ
ں آ گیا تھا کہ ایک ہی دن کی بات ہے۔ گھر کے لوگوں کے سامنے
سے کم آیا جائے مگر مجھے نیساں نہ جانے کہاں کہاں تلاش کرتی ہوئی یہاں
ے آ گئی۔ تجمل اُس دن اڈّے نہیں گیا۔ لوگ اُس سے ملنے یہیں آتے رہے۔
ت کا کھانا بھی تجمل نے بیٹھک میں نہیں کھایا۔ اُن لوگوں کو وہیں بھجوا دیا
ا۔ اِدھر ہم سب ساتھ بیٹھے تھے۔ جہاں گیر، تجمل اور میں ایک طرف
ر وہ تینوں دوسری طرف۔ کسی سے کھایا نہیں جا رہا تھا، بس سب ٹونگ
ہے تھے۔ مجھے کچھ ایسا لگا جیسے ان کی خاموشی کی وجہ میں ہوں۔ میں وہاں سے
ٹھ آیا۔ ایک رات اور باقی تھی کل کسی وقت جانا ہی تھا۔ کیا پتہ پہلی ہی
ل پہ وہ مل جائے۔ سوچتے سوچتے میرا ذہن نہ جانے کہاں کہاں جا پہنچا۔
نے دیکھا کہ وہ ایک بہت بڑے، عالی شان محل میں بیٹھی ہے، کنیزیں
یاں اُس کی خدمت میں حاضر ہیں مگر فوراً مجھے احساس ہوا، اگر وہ کسی
ل میں ہوتی تو میری رسائی اُس تک کس طرح ہو سکے گی۔ پر وہ محل میں
یا جھونپڑی میں، جب اُسے یہ معلوم ہو گا کہ اُس کے دروازے پہ کون
آیا ہے تو وہ ہزار بندھن توڑ کے لڑکھڑاتی ڈگمگاتی میرے پاس آ
ئے گی اور میں جب اُسے دیکھوں گا! میں نے کتنی بار سوچا تھا کہ جب
میرے سامنے آئے گی تو میرا کیا حال ہو گا۔ مجھ سے اپنے پیروں پر کھڑا
جائے گا، میری آنکھیں جل جائیں گی۔

کمرے میں کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی۔ میں جیسے سوتے سے
ک پڑا۔ زرّیں اندر آئی تھی۔ اُس کے ہاتھوں میں بہت سی چیزیں
تھیں۔ وہ اُس نے میز پہ ایک طرف رکھ دیں اور میرے نزدیک آ کے
آہستگی سے بولی۔ ”یہ سامان ساتھ لیتے جانا۔“

وہ اِدھر آئی اور اُدھر جانے لگی۔ ”بیٹھو۔“ میں نے بہ مشکل تمام کہا۔

”رات خاصی ہو گئی ہے۔“ وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔

”اچھا۔“ میں نے حواس باختہ لہجے میں کہا۔ ”کیا بہت وقت ہو گیا؟
کیا تم سو گئے تھے؟“

”نہیں،“ میں نے سیدھے ہو کے کہا۔ ”میں جاگ رہا تھا۔“

”میں چلتی ہوں۔“ وہ سرگوشی میں بولی۔

”کیوں؟“ میں نے تذبذب سے کہا۔ ”بیٹھو۔“

اُس نے پلکیں اُٹھا کے مجھے دیکھا۔ میں اسی لیے یہاں آنا نہیں
چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ زرّیں کی آنکھیں خشک نہیں ہوئی ہوں گی،
میرے جانے سے اور بھر آئیں گی۔ وہ اپنے مخصوص لباس میں میرے
سامنے کھڑی تھی۔ یہ کپڑے اُس کے بدن پہ بہت سجتے تھے۔ تنگ موری
کا پاجامہ، پشواز اور سبز دوپٹا۔ اُس کے کانوں میں آویزے لٹک رہے
تھے۔ یہ آویزے اُسے خانم نے دیے تھے۔ خانم نے منیہارن کو بلوا کے
اُس کی کلائیاں چوڑیوں سے بھروا دی تھیں اور نیساں نے اُس کے ہاتھوں
پہ مہندی سے نقش و نگار بنائے تھے۔ ٹھوڑی پہ کالا تل بھی نیساں ہی نے
بنایا ہو گا کہ کہیں اُسے نظر نہ لگ جائے۔ وہ اس طرح بے حس و حرکت کھڑی
تھی جیسے ایک رنگین مجسمہ ہو، جیسے ابھی اس میں جان ڈالنے کی کسر رہ گئی
ہو، سرو قد۔ کورا کا قد بھی اتنا ہی بڑا ہو گیا ہو گا۔ میرے جی میں آئی کہ میں
اُسے شانوں سے پکڑ کے پلنگ پہ بٹھا دوں اور اُس سے کہوں کہ میرے سر
میں درد ہو رہا ہے۔ ضرور وہ کہے گی، لاؤ۔ میں دبا دیتی ہوں، پھر میں اُس کے
ہاتھ تھام لوں گا اور اُن سے اپنا چہرہ چھپا لوں گا۔ اس طرح وہ رات بھر
میرے پاس بیٹھی رہے گی۔ میرا جی چاہا کہ وہ میرا سر اپنے زانوؤں پہ رکھ لے یا
اپنے سینے میں چھپا لے تاکہ میں خوب رو سکوں لیکن میں اس کی صورت
دیکھتا رہا۔ میرا گلا بند ہو گیا تھا۔ وہ کچھ دیر کھڑی رہی۔ پھر جب جانے
لگی تو میں اُسے روک بھی نہیں سکا۔ تمام لفظ، جو معلوم ہوتے تھے میرے
ذہن میں بے شمار باتیں منڈلا رہی تھیں پر میری زبان پہ جیسے فالج گر گیا
تھا۔ وہ چلی گئی۔ میں نے کچھ دیر اور ٹھہرنے کے لیے اُسے آواز دینا چاہا۔
دروازے پہ جا کے اُس نے ایک بار مُڑ کے دیکھا۔ میری آنکھیں پھٹی ہوئی
تھیں۔ وہ چشم زدن میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ ابھی دالان ہی میں
ہو گی۔ میں نے اُس کے پیچھے بھاگنے اور اُس کا راستہ روکنے کا ارادہ کیا
مگر اُسے روک کے مجھے کیا کہنا چاہیے کہ میں نہیں جاتا، میں رُکا جاتا
ہوں یا میں اُسے یہ اطمینان دلانے کی کوشش کروں کہ جلد واپس آ
جاؤں گا اور اس بار خیریت کے خط بھی لکھتا رہوں گا۔ بس وہ میرا انتظار

کرتی رہے اور آسے میری قسم کہ ایک آنسو بھی نہ بہائے۔
میں دروازے کی جانب تیزی سے بڑھا۔ اس کی چوڑیوں کی بازگشت دالان میں گونج رہی تھی۔ وہ دالان سے گزر کے آہستہ آہستہ اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی لیکن باہر آ کے میرا جسم پتھر ہو کے رہ گیا۔

دوسرے دن گیارہ بجے ہم فیض آباد سے چل کے لکھنؤ اور کان پور کے راستے سے جھانسی آگئے۔ جھانسی سے للت پور، گوالیار، بھوپال، دھول پور، اُجّین، اجمیر، اندور، امراوتی، رائے گڑھ۔ نام بھی یاد نہیں رہے تھے۔ چار مہینے تک ہم وسطی ہند کے کونے کونے میں پھرتے رہے۔ ابّا جان بھوپال کے علاوہ اجمیر اور گوالیار میں بھی ٹھیرے تھے۔ اس کے بعد اُن کا کوئی نشان نہیں ملا۔ جنوبی ہند کی طرح ہم نے اپنی دانست میں کوئی بستی نہیں چھوڑی۔ جہاں ریلوں کے راستے نہیں تھے، وہاں ہم نے لاری سے سفر کیا۔ جہاں لاری بھی نہیں جاتی تھی، وہاں ہم گھوڑوں اور خچروں پر چلتے رہے۔ جہاں مسجدیں اور مدرسے تھے، جہاں بھی کوئی چھوٹی سی بستی تھی، دکانوں، لائبریریوں، محلوں کے چودھریوں اور مدرسوں سے پوچھ گچھ کی۔ جہاں جہاں بھی اُن کے ملنے کا امکان ہو سکتا تھا، ہم وہاں وہاں گئے۔ پھر ایک دن تجمل نے اچانک وسطی ہند میں اور آگے جانے کے بجائے شمال مشرق کی طرف بڑھنے کا ارادہ کیا مگر سی پی سے راج پوتانہ قریب تھا۔ ہم دوسرے راستوں سے ہوتے ہوئے پھر اجمیر واپس آگئے۔ تجمل نے اس بار بھی وہاں حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے ہاں حاضری دی اور ایک دن تک مزار کے احاطے میں پڑا رہا۔ اجمیر سے ہم جودھ پور آگئے۔ جودھ پور سے بیکانیر اور بیکانیر سے جیسلمیر۔ جیسلمیر راج پوتانے کی ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ جب ہم وہاں پہنچے تو عصر کا وقت تھا۔ سامنے جو مسجد نظر آئی، ہم اُس کے دروازے پہ کھڑے ہو گئے۔ نمازی باہر آ رہے تھے۔ ہم نے انھیں روک کے پہلے ابّا جان کا حلیہ بتایا۔ ابّا جان اپنا صحیح نام کہیں نہیں لیتے تھے۔ نمازیوں نے ایسے حلیے کے کسی شخص کو جاننے سے لاعلمی ظاہر کی۔ میں نے پھر اکبر کا حلیہ بیان کیا اور بتایا کہ اُن کے ساتھ تین لڑکیاں بھی ہوں گی مگر وہ ابّا جان یا گھر کے کسی اور آدمی سے واقف نہیں تھے۔ پھر میں نے اُن کے سامنے مولوی محمد شفیق کا نام لیا۔ اُن کا رنگ، قد اور ناک نقشہ بتایا۔ مولوی شفیق کا حلیہ سن کے وہ ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے اور ایک بزرگ شخص نے آگے آ کے بھاری آواز میں کہا: ”میاں! تم انھیں کیسے جانتے ہو؟“

میرا سر گھومنے لگا۔ یکایک تجمل نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے کھینچ لیا اور خود اُن کے سامنے ہو کے بولا: ”بڑے صاحب! کیا وہ یہیں ہیں؟“

”آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟“ بزرگ آدمی نے ... سے کہا: ”میں نے پوچھا تھا کہ آپ انھیں کیسے جانتے ہیں؟“
”ہم اُن کے کچھ لگتے ہیں۔“ تجمل نے تنک کے کہا۔
”میں یہی تو پوچھ رہا ہوں بھائی کہ آپ اُن کے کیا لگتے ہیں!“
”ہم اُن کے رشتے دار ہیں۔“
”رشتے دار ہیں۔“ بزرگ نے اپنے ساتھی نمازیوں کی طرف دیکھ کے دُہرایا۔ اُس کے لہجے میں حیرت تھی: ”کیا رشتے داری ہے آپ کی ...“
”بڑے صاحب! آپ ہمیں یہ بتاؤ کہ وہ کہاں ہیں؟ یہیں ہیں یا کہیں اور؟“ تجمل نے برہمی سے کہا۔
”آپ اُن سے کب سے نہیں ملے؟“ ایک دوسرے شخص نے ...
”بہت دن ہو گئے، برس بیت گئے، آٹھ برس سے بھی زیادہ ...“ کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں: ”لیکن آپ لوگ یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہو ... بات کا جواب دو؟“
”آپ کی بات کا کیا جواب دیں۔“ بوڑھے آدمی نے ڈوبتی آواز میں کہا: ”آپ لوگ کہاں سے آ رہے ہیں؟“
”مراد آباد سے۔“
”جیسلمیر کب آئے؟“
”کچھ ہی دیر ہوئی ہے۔“
”آپ کو اُن کا پتہ کس نے دیا تھا؟“
”ہم انھیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک آگئے ہیں۔“
مجھے اپنے سامنے کھڑے ہوئے لوگ دُھندلے دُھندلے نظر آ رہے تھے۔ تجمل نے میرے پنجے میں سختی سے اپنی انگلیاں پھنسا رکھی تھیں۔ پولیس والوں کی طرح نہ جانے کیسے کیسے سوال کر رہے تھے۔ جیسے ہم ... صاحب کے بارے میں نہیں، کسی مجرم کے بارے میں پوچھ رہے ہوں۔ جسم پسینے میں شرابور ہو گیا تھا، مجھے چکر سا آ رہا تھا۔ ”آپ بولتے کیوں نہیں؟“ میں نے ہذیانی انداز میں کہا: ”مولوی صاحب کہاں ہیں؟“
”تو چپ رہ۔“ تجمل نے زور سے میرا پنجہ مروڑ دیا اور تھکے ہوئے لہجے میں بولا: ”کیا اب وہ یہاں نہیں رہتے؟“
”نہیں بھائی!“ بزرگ آدمی نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا: ”آئیے، آئیے۔ آپ لوگ کہاں ٹھیرے ہوئے ہیں؟“
”ابھی کہیں نہیں اور نہ کہیں ٹھیرنے کا ارادہ ہے۔ ہم صرف مولوی صاحب سے ملنے آئے تھے۔ آپ اُن کا پتہ جانتے ہو تو ہمیں بتا دو۔“
”خدا بہتر جانتا ہے، بڑی لمبی کہانی ہے۔ آئیے میرے ساتھ۔ آپ مولوی صاحب کے عزیز ہیں تو میرے بھی عزیز ہیں۔ میں تو کیا ہوا، اُن کے دوست اور بہی خواہ یہاں کم نہیں ہیں۔ میرا ...

... یا ... چلیے گھر چلیے۔ زیادہ دُور نہیں ہے۔“
تجمل نے گردن جھکا لی: ”آ لا ڈلے!“ اُس نے میری کمر پہ ہاتھ رکھ کے ... کی: ”سنبھل کے رہ، یہ نہ جانے کیا سمجھیں گے۔“
بزرگ آدمی کا گھر مسجد سے کوئی پچاس قدم دُور ہو گا۔ کئی نمازی بھی ہمارے ساتھ ... گئے۔ میری ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ وہ چھوٹی اینٹوں سے بنا ہوا قدیم ... ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ بزرگ نے اندر جا کے چند لمحوں بعد بیٹھک کا ... کھول دیا۔ وہاں زیادہ سامان نہیں تھا۔ اونچے پایوں کا ایک پلنگ ... میں چند کتابیں، تین چار شکستہ کرسیاں، مونڈھے اور جانماز۔ اس کے سوا کچھ نہیں ... دل جیسے کسی نے جکڑ لیا۔ بوڑھا آدمی چارپائی پہ بیٹھ کے گہری گہری ... لینے لگا۔ اُس نے آنکھیں موند لیں اور زیرِ لب کوئی آیت تلاوت کی ... ٹھیرے لہجے میں بولا: ”آپ حضرات کا نام؟“
”اِس کا نام ظہیر اور میرا اکبر خاں ہے۔“ تجمل نے تیزی سے کہا۔
”میرا نام منیر علی ہے، مولوی صاحب مجھ پہ بہت کرم کرتے تھے۔ وہ میرے ... بھی تھے، مربّی بھی۔ وہ برابر والے مکان میں رہتے تھے، آپ ہماری باتوں ... رہے ہوں گے لیکن کچھ ایسی ہی بات تھی جو آپ سے اتنا کچھ پوچھنا پڑا۔ کسی ... مجھ پہ کچھ نہیں کھلا ہوتا۔ کوئی بات ناگوار گزری ہو تو مجھے معاف کر دیجیے۔“
”کچھ نہیں بڑے صاحب!“ تجمل نے دھیمی آواز سے کہا: ”یہ نرم گرم چلتا ... آپ مولوی صاحب کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے؟“
”کیا بتاؤں، کیا نہ بتاؤں۔“ منیر علی ہاتھ ملتے ہوئے بولے: ”آپ نے آنے ... میں دیر کر دی۔“ میری سانس اکھڑنے لگی۔ ”گزشتہ رمضان کی بات ہے ... پہلا روزہ تھا، سحری کے بعد مولوی صاحب معمول کے خلاف نماز ... کو نہیں آئے۔ نماز کے بعد ہم چند لوگ اُن کی خیریت دریافت کرنے ... گھر پہنچے کہ خدانخواستہ اُن کی طبیعت تو ناساز نہیں ہے۔ پہلی دفعہ ... تھا کہ مولوی صاحب نے ناغہ کیا ہو۔ جب سے یہاں آئے تھے، پابندی ... سے وقت پر پہنچ جاتے تھے۔ ہم نے آوازیں لگائیں، اندر سے کسی نے جواب ... نہیں دیا۔ ہمیں فکر لاحق ہوئی۔ کنڈی کھٹکھٹانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو ... کھلا ہوا تھا۔ ہم نے پھر بھی آوازیں دیں مگر اُدھر کوئی ہوتا تو جواب دیتا۔ ... چھوٹی بچی کو ہم نے حقیقتِ حال جاننے کے لیے ڈرتے ڈرتے مکان ... بھیجا، وہ سہمی ہوئی واپس آئی اور پھر جب ہم نے خود اندر جا کے دیکھا تو ... اُجڑا ہوا تھا۔ سامان تتر بتر تھا اور کوئی ذی نفس وہاں موجود نہیں تھا۔ ... کیا حال ہوا۔ رات کو تراویح کے بعد وہ ہمارے ساتھ ہی گھر واپس گئے ... تراویح سے سحری کے دوران یہ سب کچھ گزر گیا۔ مولوی صاحب بہت ... کا گلا بیٹھ گیا۔
”اور پھر اُن کا کوئی پتہ نہیں چلا؟“
منیر علی نے مایوسی سے سر ہلایا: ”نہیں بھائی! اِدھر اُدھر کئی جگہ آدمی ... کچھ معلوم نہیں ہوا۔“

”اُن کے ساتھ اور کوئی بھی رہتا ہو گا؟“ میں نے پھٹی ہوئی آواز میں پوچھا۔
”ہاں میاں! اُن کی ایک بیٹی بھی اُن کے ساتھ رہتی تھی۔ آپ تو اُسے جانتے ہوں گے۔ کیسی نیک سیرت بچی تھی۔ کبھی اونچی آواز سے بولتے نہیں سُنا۔ پلکیں ہمیشہ جھکی ہی دیکھیں۔“
”کیسی تھی وہ؟“ میرا سارا جسم کپکپانے لگا تھا۔ میں اُٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ پھر میں نے ہانپتے ہوئے پوچھا: ”وہ..... اُس کا نام؟......“
تجمل نے اُٹھ کے میرے شانے پر زور دے کے مجھے دوبارہ مونڈھے پر بٹھا دیا: ”اِس کا مطلب ہے۔“ وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا: ”اب تو وہ اچھی بڑی ہو گئی ہو گی۔“
”ماشاء اللہ۔ خدا اُس کا نگہبان ہو۔“ منیر علی نے جھجکتے ہوئے کہا اور مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگے۔
”وہ دونوں ہی چلے گئے؟“ تجمل نے اُلجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
”چلے گیا گئے، کیا کہا جا سکتا ہے۔ جانا اِسے کہتے ہیں بھلا؟ خدا انھیں اپنی امان میں رکھے۔ جہاں رہیں، خوش رہیں۔ ہم تو یہی کہہ سکتے ہیں۔ طرح طرح کے خیال آتے ہیں، کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ رات کو ہم سے خوب اچھی طرح باتیں کرتے رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ مسجد کی چٹائیاں بوسیدہ ہو چکی ہیں، انھیں بدلوا دیا جائے تو بہتر ہے۔ ہم سے ناراض ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا اور کوئی بھلا اس طرح اچانک ناراض ہوتا ہے۔ جب سے گئے ہیں، مدرسہ بھی ویران ہو گیا ہے۔ بچے مارے مارے پھر رہے ہیں۔ اُن کی پڑھائی کے ایسے عادی ہو گئے تھے کہ اب کسی دوسرے کا پڑھایا ہوا اُن کے پلّے ہی نہیں پڑتا۔ وہ مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتے تھے، جانا ہوتا تو مجھ سے ذکر ضرور کرتے۔ اور بھائی! صاف بات تو یہ ہے کہ کوئی یوں گھر سے نہیں نکلتا، وہ بھی جوان بچی کے ساتھ۔“
”وہ اپنے بارے میں کیا بتاتے تھے؟“ تجمل نے آہستگی سے پوچھا۔
”کچھ نہیں۔ یہاں آئے تھے تو بچی ساتھ تھی۔ تھوڑا سا سامان تھا۔ سب سے پہلے مجھ سے اُن کی ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میں یہاں اس شہر میں رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے وہ پہلی ہی نظر میں بھا گئے تھے۔ میں نے کہا: بسر و چشم، برابر کا مکان خالی کیے دیتا ہوں، آپ یہیں رہیے۔ بس رہنے لگے۔ مجھ سے کہا کہ مجھے کوئی روزگار بھی فراہم کر دو۔ میں نے اپنے ایک شناسا عبداللہ بھائی کے ہاں بات کرا دی۔ عصر کے بعد وہاں چلے جاتے تھے۔ مغرب کی نماز وہیں پڑھتے تھے اور عشا سے پہلے واپس آ جاتے تھے۔ حساب کتاب کا کام تھا۔ عبداللہ بھائی نے چند ہی مہینوں میں تنخواہ بڑھا دی۔ ادھر ہم لوگوں نے اُن کا کچھ انتظام مدرسے سے کروا دیا تھا۔ امامت کا وہ ایک پیسہ نہیں لیتے تھے۔ کبھی زبان سے کچھ نہیں کہا۔ قسم ہے جو کبھی ایک حرف بھی شکایت کا ادا کیا ہو۔ عبداللہ تو اُن کے جیسے مرید ہو گئے تھے۔ وہ انھیں اپنے ساتھ ہی رکھنا چاہتے تھے لیکن مولوی صاحب آمادہ نہیں ہوئے۔ میری منجھلی لڑکی زہرہ اور نرجس دونوں ہم جولیاں تھیں۔

اب بھی ہر وقت اُس کی یاد میں روتی رہتی ہے۔ میں اُسے کیا سمجھاؤں کہ وہ کہاں گئی ہے اور کب واپس آئے گی۔"

"نرجس! کیا اُس کا۔۔۔ اُس کا یہی نام تھا؟" میں نے سراسیمگی سے پوچھا۔

"ہاں۔ مولوی صاحب اُسے نرجس ہی کے نام سے پکارتے تھے۔" منیر علی نے جواب دیا۔ "نرجس کو خدا نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا اور تمام صفاتِ حسنہ بھی اُسے ودیعت کر دی تھیں۔ وہ مولوی صاحب کی آنکھوں کا سکھ تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے مولوی صاحب زندہ ہی اُس کے لیے ہوں۔ مسجد، مدرسے اور ملازمت سے جو وقت بھی ملتا مولوی صاحب بچّی کے ساتھ گھر ہی میں گزارتے۔ اُن کا بس نہیں چلتا تھا کہ مزید وقت کہاں سے نکال کے گھر میں گزاریں۔ ملنے جُلنے میں وہ بہت محتاط تھے۔ تقریبات میں شرکت سے پرہیز کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بہت سے لوگوں کو شکایت بھی ہوتی لیکن مولوی صاحب ایسے لہجے میں اُن سے معذرت کرتے کہ پھر کچھ کہا نہیں جاتا تھا بلکہ خود شرمندہ ہونا پڑتا تھا۔ بچّی کا بھی یہی عالم تھا۔ دو تین گھروں میں جانے کے سوا وہ گھر سے قدم نہیں نکالتی تھی، وہ بھی کبھی کبھار۔ محلّے کی بچیاں خود ہی اُس سے ملنے، اُسے دیکھنے آجاتی تھیں۔ ہم لوگوں نے کئی بار اشارۃً مولوی صاحب کی توجہ اس طرف دلائی کہ آپ نرجس کو ہمارے گھر کیوں نہیں بھیجتے، وہ مسکرا کے رہ جاتے تھے۔ کہتے تھے، بھیا! تم کچھ اور مت سمجھنا لیکن اُسے ایک لمحے کے لیے اپنے سے جدا کرنا مجھے گوارا نہیں ہے۔ رفتہ رفتہ ہم اُن کے مزاج کے عادی ہو گئے تھے۔ ہم نے اُن سے شکوہ کرنا ہی ترک کر دیا تھا۔ ہم نے محسوس کر لیا تھا کہ ہماری ایسی باتوں سے وہ اُداس ہو جاتے ہیں۔ ہمیں اور تو سب کچھ برداشت تھا مگر اُن کی پیشانی پر بل نہیں دیکھے جاتے تھے۔"

منیر علی بولتے بولتے رُک گئے اور معذرت کر کے اندر چلے گئے۔ اندر سے کسی نے دروازے پر دستک دی تھی۔ دستک کے ساتھ چوڑیوں کی آواز بھی آئی تھی۔ اُن کے جاتے ہی بیٹھک میں بیٹھے ہوئے دوسرے لوگوں نے مولوی صاحب کی باتیں شروع کر دیں۔ تجمّل خاموشی سے سنتا رہا۔ منیر علی جس لڑکی کا ذکر کر رہے تھے، میرا دل کہتا تھا، وہ کورا کے سوا کوئی نہیں ہوگی۔ مولوی صاحب نے یہاں آکے اُس کا نام بدل دیا ہوگا۔ میرے کان کورا کا ذکر سن رہے تھے۔ وہ اِس بیٹھک میں آتی ہوگی۔ مجھے یہ سب ایک خواب معلوم ہو رہا تھا۔ میری آنکھوں میں جلن ہو رہی تھی اور میری رگیں جیسے کوئی کھینچے لے رہا تھا۔ منیر علی واپس آئے تو اُن کے ہاتھوں میں میٹھی اور نمکین چیزوں سے بھری ہوئی تام چینی کی دو پلیٹیں تھیں۔ اُنھوں نے پلیٹیں سامنے رکھ دیں اور اصرار کرنے لگے کہ ہم کچھ کھائیں۔ تجمّل نے دال سیو لو بنگ لیے لیکن مجھ سے ہاتھ نہیں بڑھایا گیا۔ منیر علی نے زیادہ اصرار کیا تو تجمّل نے آہستگی سے کہا: "بڑے صاحب! اِس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"نصیبِ دشمناں کیا بات ہے؟" منیر علی شائستگی سے بولے۔ "آب و ہوا بدلنے سے بھی ہوتا ہے۔ یہ علاقہ بھی کم لوگوں کو راس آتا ہے مگر یہ تیل میں تلی ہوئی چیزیں نہیں ہیں، گھر کی ہیں کچھ کھا لو میاں! اللہ نے چاہا تو کچھ نہیں ہ[وگا]۔"

"نہیں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ "میرا جی نہیں چاہ رہا ہے۔"

"تو یہ لڈو کھا لو۔ تل کے ہیں۔ میری بیٹی زہرہ نے بنائے ہیں۔ [مولوی] صاحب بھی بڑے شوق سے کھاتے تھے۔" منیر علی نے پلیٹ میرے آگ[ے]...

"نہیں نہیں۔" میری آواز رُندھنے لگی۔ "آپ۔۔۔ آپ کیا بات..."

"مولوی صاحب جیسلمیر کب آئے تھے؟" تجمّل نے نرمی سے پو[چھا]۔

"تین سال سے کچھ زیادہ ہوئے ہوں گے۔" منیر علی نے تذبذب[سے] جواب دیا اور اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کے کہا: "مجھے خوب یاد ہے ... رمضان تو اُنھوں نے یہیں گزارے۔ یہ تیسرا ہی تھا نا؟" دوسرے لوگوں [نے سر] ہلا کے تائید کی۔

"آپ لوگوں نے اُنھیں کہاں کہاں ڈھونڈا؟" تجمّل نے پوچھا۔

"اِدھر اجمیر، بیکانیر، جے پور اور اُدھر میرپور، خیرپور، سکھر، نواب شا[ہ]... نزدیک و دُور جتنے شہر تھے، جہاں جہاں لوگ جاتے رہے، اُنھیں تلاش کرتا[رہا]۔"

"آپ نے پولیس کو بھی بتایا؟"

"ہاں بھائی! یہ بھی کیا۔ کئی بار تھانے کوتوالی کے چکّر لگائے ... کے بااثر لوگوں کو درمیان میں ڈالنے کی کوشش کی مگر کوئی نتیجہ نہیں[نکلا]۔ اُن کا سامان ایک کوٹھری میں بند کر کے تالا ڈال دیا گیا۔ میں نے ابھی ... کے لیے مکان خالی رکھا ہے۔ وہاں جاتے ہوئے بھی ہول آتا ہے۔ میری ... وہاں روز جھاڑو دیتی ہے۔ پگلی کہتی ہے کہ وہ لوگ اچانک آگئے تو ... کہ گھر کتنا گندا رکھا تھا۔"

"جس دن سویرے مولوی صاحب دکھائی نہیں دیے، اُس سے ... لوگوں نے اُن کے پاس کسی کو آتے جاتے تو نہیں دیکھا تھا؟"

"پولیس نے بھی ہم سے یہ سوال کیا تھا مگر ہم نے کسی ایسے شخص کو[نہیں] دیکھا۔ تین سال کی مدت میں اُن سے کوئی ملنے نہیں آیا۔ دونوں مکا[نوں کے] بیچ ایک دیوار ہی تو حائل ہے۔ اِس طرف کی اونچی آواز اُس طرف ... بیچ میں خواتین کے لیے آنے جانے کے لیے کھڑکی بنی ہوئی ہے۔ ... ہمیں ضرور خبر ہوتی۔"

"اور یہاں مولوی صاحب سے کن کن لوگوں کا ملنا جلنا تھا؟"

"جہاں تک میرے علم میں ہے، مسجد کے نمازیوں، محلّے کے لو[گوں اور] عبداللہ بھائی کے ہاں آنے جانے والوں کے سوا اُن کا کوئی جانن[ے والا نہیں تھا]۔ میں نے آپ سے کہا نا کہ وہ خود ملنا جلنا پسند نہیں کرتے تھے بلکہ ... کہوں گا کہ وہ کترانے کی حد تک لوگوں سے الگ تھلگ رہتے ... میں اُنھیں مدعو بھی کیا گیا۔ شاید وہ ایک ہی بار گئے ہوں۔ بس ... ہوتے تھے۔ تین سال میں صرف ایک بار، وہ بھی ڈھائی دن کے۔ یہ اُن کے جانے سے کوئی ڈیڑھ دو مہینے پہلے کی بات ہے۔ یہ ... ایک دفعہ اجمیر شریف چلنے کے لیے آمادہ ہو گئے تھے۔ میرا خیال [تھا] [کہ وہ بچّی کو یہیں] چھوڑ دیں گے مگر اُنھوں نے نرجس کو بھی ساتھ لے چلنے کی خواہش ظاہر [کی]۔ لہٰذا میں نے گھر سے اپنی دونوں بچیوں کو بھی اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ ہم [حاض]ری دے کے چوتھے ہی دن واپس آگئے تھے۔"

"[ان کے] جانے سے ڈیڑھ مہینے پہلے؟" تجمّل نے تکرار کی۔

"جی ہاں۔" منیر علی نے آنکھیں میچ کے جواب دیا۔

"اور اجمیر شریف کے سوا آپ کہیں نہیں گئے؟"

"نہیں، کچھ وقت تو آنے جانے میں گزرا، باقی اجمیر شریف میں۔" منیر علی [نے] جھجک کے کہا۔ "سفر سے واپسی پر وہ بہت خوش تھے۔ میں نے کہا کہ اب [گھ]ر سے باہر نکلا کیجیے، طبیعت بہلی رہے گی۔ اُنھوں نے وعدہ کیا تھا کہ عید بعد میرے [سا]تھ دلی چلیں گے اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی درگاہ پر حاضری دیں گے۔"

تجمّل خاموش بیٹھا کچھ دیر تک سوچتا رہا اور اندر سے آیا ہوا دودھ [کا] شربت پیتا رہا۔ پھر میرا بازو تھام کے اُٹھنے لگا۔ "بڑے صاحب! اب ہم پھر [کسی] وقت آئیں گے۔ آپ کا ہم نے بہت وقت لیا، اب ہمیں اجازت دو۔"

"وا صاحب! دوبارہ آنے کا کیا سوال۔ آپ یہیں میرے ساتھ رہیں گے۔ [یہ گ]ھر چھوٹا ہے مگر میں آپ کو کہیں اور نہیں ٹھہرنے دوں گا۔ آپ کا سامان [کہ]اں رکھا ہے؟"

"تھوڑا سا سامان تھا، وہ ہم نے ایک دکان پہ رکھوا دیا تھا۔ آپ کی مہربانی۔ [ہمیں] جانے دو، ہم پھر آئیں گے۔"

"نا صاحب! یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ جیسلمیر میں ٹھہرے تو میرے غریب [خا]نے پر ٹھہریں گے۔ میرے آپ سے کئی رشتے نکلتے ہیں۔ ایک تو آپ مولوی [صا]حب کے عزیز ہیں۔ اس شہر میں مجھ سے زیادہ کوئی اُن سے قریب نہیں تھا۔ [دوس]رے آپ میرے ہم ملت ہیں۔ تیسرے سب سے پہلے آپ کی مجھی سے بات [ہو]ئی ہے۔ انکار کیا تو میں سمجھوں گا کہ آپ نے مجھے کسی لائق نہیں سمجھا۔"

تجمّل نے بہت منع کیا مگر منیر علی ضد کی حد تک اپنی بات پر اڑے [رہ]ے۔ تجمّل بجز ہو کے آخر آمادہ ہو گیا۔ منیر علی نے اُسی وقت ہم سے دکان کا [پتہ] پوچھ کے ایک آدمی روانہ کر دیا کہ وہ اُن کا نام لے کے ہمارا سامان اُٹھا لائے۔ [دوسرے] لوگ رات کو آنے کا کہہ کے رخصت ہو گئے۔ اندھیرا ہونے لگا تھا۔ جب [منی]ر علی اندر چلے گئے تو تجمّل میرے قریب آگیا اور مجھے جھنجوڑتے ہوئے بولا: "لاڈلے! [جا]نتا ہوں تجھے کیا لگ رہا ہوگا پر ذرا اپنے آپ کو تھام کے رکھ۔ جانو! سب [تیر]ی طرف دیکھ رہے تھے۔ کوئی بات اُوپر تلے ہو گئی تو اُسی کی بدنامی ہوگی۔ [وہ ب]ھی اچھا بُرا سوچنے میں دیر نہیں لگاتے رے!"

"میرا جی بہت گھبرا رہا ہے۔" میں نے سسکتے ہوئے کہا۔

"مجھے پتہ ہے، پر یہ پانی آنکھوں ہی میں بند رکھ۔"

"یہ لوگ کیسی باتیں کر رہے تھے؟ کیا کہہ رہے تھے؟"

"میں نے تجھ سے کچھ الگ نہیں سنا ہے رے!"

"یہاں سے چلے چلو۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ تم یہاں ٹھہر کیوں گئے؟"

"کیا اُس کے گھر آکے اتنی جلدی چلا جائے گا؟"

"پردہ ہے کہاں۔ اُس کا ملنا میرے نصیب میں نہیں ہے۔" میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ "وہ نہیں ملیں گے، کبھی نہیں ملیں گے۔" میں نے بلکتے ہوئے انداز میں کہا۔

"کچھ سوچ سمجھ کر لاڈلے! تجھے تو یہ سن کے خوش ہونا چاہیے کہ وہ خیریت سے ہے، عزت سے رہ رہی تھی۔ یہاں آکے بھی اُس کا کچھ پتہ نہ چلتا تو ہم کیا کر لیتے۔" دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ تجمّل نے جلدی سے میرے آنسو پونچھے اور میرا زانو تھپ تھپاتے ہوئے بولا: "اپنا نہیں تو کچھ اُسی کا خیال کر لے۔"

"چائے پی لیجیے۔" منیر علی چائے کی پیالیاں لیے ہوئے بیٹھک میں آگئے۔

"آپ بہت تکلیف کر رہے ہو بڑے صاحب! ایسا مت کرو۔" تجمّل نے اُٹھ کے اُن کے ہاتھ سے چائے لے لی۔

"تکلیف کیسی جناب! یہ تو عین راحت ہے۔ آپ نے سنا نہیں کہ مہمان خیر و برکت لاتے ہیں۔ باتوں باتوں میں مجھے احساس ہی نہیں رہا کہ سفر کی تھکن سوار ہوگی، آپ کو چائے کی طلب ہوگی۔ آپ مولوی صاحب کے وطن کے ہیں۔ آپ حضرات چائے شوق سے پیتے ہوں گے۔ مولوی صاحب بتاتے تھے کہ اُن کی طرف ناشتے میں چائے کا رواج عام ہو گیا ہے۔ یہاں بھی اب بہت سے گھروں میں یہ رسم چل پڑی ہے۔ مولوی صاحب باقاعدگی سے صبح و شام چائے پیتے تھے۔ اُنھی کی دیکھا دیکھی ہمارے گھر کے بچّے بھی عادی ہو گئے۔" منیر علی کندھے پر پڑے ہوئے لمبے رومال سے اپنی آنکھوں کے گوشے صاف کرنے لگے اور عاجزی سے بولے: "دیکھیے صاحب! کوئی تکلف کریں گے تو شکایت ہوگی۔ گھر میں بچیاں بھی پوچھ رہی تھیں۔ آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو دستک دے دیجیے گا۔" منیر علی ہمیں گھر کا نقشہ سمجھانے لگے۔ اُنھوں نے بتایا کہ اُن کی بیوی پانچ سال ہوئے مر چکی ہیں۔ سب سے بڑا لڑکا بھی فوت ہو گیا ہے۔ دوسرا لڑکا علی گڑھ میں تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ ایک لڑکی کی شادی ہو گئی ہے، وہ جے پور میں اپنے شوہر کے ساتھ مقیم ہے۔ دو لڑکیاں اور ایک بارہ سالہ لڑکا اُنھی کے ساتھ ہیں۔ منیر علی کی ایک چکّی ٹھیکے پر چل رہی تھی۔ تھوڑی بہت زمینیں بھی تھیں، اُن سے ہر سال کچھ نہ کچھ آمدنی ہو جاتی تھی۔ وہ مولوی صاحب سے صرف دس روپے مکان کا کرایہ لیتے تھے۔ یہ بھی اُن کی ضد پر۔ مولوی صاحب نے کرائے کے بغیر رہنے سے انکار کر دیا تھا۔ منیر علی دیر تک اپنے بارے میں بتاتے رہے۔ اس اثنا میں اُن کا آدمی ہمارا سامان لے کے آگیا تھا۔ منیر علی مغرب کی نماز کو چلے گئے۔ اُنھوں نے ہم سے نماز کے لیے نہیں پوچھا۔ گھر کی بوڑھی ملازمہ نے آکے لالٹین جلا دی اور بیٹھک کا دروازہ کھول دیا۔ یہ دروازہ دوسری جانب سے گھر میں کھلتا تھا اور شاید اسی خیال سے بنایا گیا تھا کہ مہمانوں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔

منیر علی نماز پڑھ کے واپس آئے تو تجمّل منہ ہاتھ دھو کے اور کپڑے بدل کے بیڑی کے کش لگا رہا تھا۔ منیر علی نے اپنے چھوٹے لڑکے کی مدد سے دوسری چارپائی بھی بیٹھک میں ڈال دی اور بوڑھی ملازمہ نے چارپائیوں

پرسفید بستر لگا دیے۔ میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ اس درمیان میں تجمل نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی جیسے میں وہاں موجود ہی نہ ہوں۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ منیر علی واپس آئیں گے تو کسی طرح خود ہی ان سے کورا کا ذکر چھیڑوں گا لیکن انھیں آئے ہوئے دیر ہوگئی، ان کے سامنے اس کا نام میری زبان پر نہیں آسکا۔ مجھے ڈر لگنے لگا تھا کہ نہ جانے وہ اس کے بارے میں کیا بتائیں۔ میں گنگ بیٹھا اپنی انگلیوں کی کھال چھیلتا رہا۔ میرا جسم خود مجھے بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ کئی بار دل میں آئی کہ تجمل کو وہیں چھوڑ کے باہر بھاگ جاؤں۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" دفعتہً منیر علی نے میرے پاس آکے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "اب طبیعت کیسی ہے؟ کچھ دیر آرام کر لو اور کوئی بات چیت کرو۔ بات چیت کرو گے تو جی بہلے گا۔ تمھاری عمر میں تو ہماری زبان کو قرار نہیں ہوتا تھا۔ کہیں پڑھتے ہو؟"

"جی نہیں۔" میں نے زیرِ لب جواب دیا۔

"پھر کیا مشغلہ ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"کچھ تو ضرور کرتے ہوگے؟"

میں نے تجمل کی طرف دیکھا۔ "اس نے ابھی پڑھائی ختم کی ہے۔" میرے بجائے تجمل نے جواب دیا۔

"صاحب زادے ہیں ماشاءاللہ؟"

"ہاں، نہ جانے کیا کیا کچھ ہے۔" تجمل بدبداتے ہوئے بولا۔

"اچھا۔" منیر علی ہنسنے لگے۔ "اولاد تو واقعی سبھی کچھ ہوتی ہے۔ ماشاءاللہ تعلیم کہاں تک حاصل کی ہے؟"

"سولہ درجے پورے پاس کیا ہے لاڈلے نے۔"

"اچھا اچھا۔" منیر علی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "اتنی کم عمری میں! پھر تو یہ عالم و فاضل ہوئے۔ بھئی ہمارے منہ سے کوئی ایسی ویسی بات نکل جائے تو نظر انداز کر دینا ظہیر میاں!" میں نے سر جھکا لیا۔

"اور ہر امتحان میں پہلے نمبر پہ آیا ہے۔" تجمل نے بتایا۔

"خوب، خدا ہر جگہ، ہر قدم پہ کامیاب کرے۔" منیر علی مجھے دعائیں دینے لگے پھر کچھ توقف کے بعد بولے۔ "مولوی صاحب قبلہ سے آپ کا کیا رشتہ نکلتا ہے؟"

تجمل کو جواب دینے میں ہچکچاہٹ ہوئی۔ "قریب کا ہی سمجھ لو ویسے رشتے ناتوں سے کیا ہوتا ہے۔ رشتہ تو سمجھنے کا ہوتا ہے، اب آپ کا ان سے کون سا رشتہ تھا۔"

"بے شک۔ سب سے بڑا رشتہ تو آدمیت کا ہے۔ پھر بھی وہ آپ کے کیا لگتے تھے؟ معاف کیجیے، مولوی صاحب سے تعلقِ خاطر کی وجہ سے جاننے کا اشتیاق ہے۔"

"بھائی کہہ لو۔"

"بھائی!" منیر علی نے تعجب سے کہا۔ "مگر... مگر..."

"مگر کیا؟" تجمل نے چونک کے پوچھا۔

"مولوی صاحب فرماتے تھے کہ ان کا کوئی بھائی نہیں ہے۔"

"بھائی صرف سگے ہی ہوتے ہیں؟"

"نہیں نہیں۔" منیر علی ندامت سے بولے۔ "میرا مقصد یہ نہیں ہے۔ ایک دن میں مولوی صاحب سے ان کی پچھلی زندگی کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ ساقبل تو اپنے بارے میں کچھ بتاتے نہیں تھے مگر اس دن نہ جانے کس عالم میں تھے، بہت سی باتیں کہہ گئے۔ کہتے تھے کہ قریبی عزیزوں میں صرف ایک بہن تھی۔"

"انھیں ایسا ہی کہنا چاہیے تھا۔"

"کیا مطلب! میں سمجھا نہیں۔"

"نہ پوچھو تو بہتر ہے بڑے صاحب!"

"کوئی مضائقہ نہیں۔" منیر علی تیزی سے بولے۔

"آپ نے غور نہیں کیا۔ ان کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ ان کے نہیں تو اس کے تو کچھ عزیز ہو سکتے ہیں۔ وہ بھول گئے کہ دوسروں کے لیے تو انھیں بھولنے کی پابندی نہیں تھی۔"

"نہیں جناب! بالکل نہیں۔" منیر علی نے تردد سے کہا۔ "میں آپ سے متفق ہوں اور کچھ سمجھنے کی کوشش بھی کر رہا ہوں مگر آپ کو اتنی مدت بعد اچانک ان کی یاد کیسے آگئی؟"

"ہم انھیں مدت سے کھوج رہے ہیں۔"

منیر علی پہلو بدلنے اور سر ہلانے لگے۔ "آپ کی باتوں نے عجب الجھن میں ڈال دیا ہے۔ شروع شروع میں مولوی صاحب کی موجودگی میں بھی کچھ یہ الجھن ہوتی تھی۔ انسان کا ذہن ہے۔ آدمی جو نہیں سوچنا چاہتا وہ سوچتا ہے۔ مولوی صاحب جب یہاں تشریف لائے تھے تو لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے تھے۔ بعد میں ان کے حسنِ اخلاق اور شرافتِ نفس نے سب کو چپ کر دیا۔ مولوی صاحب کی گوشہ نشینی اور خاموشی ہی لوگوں کے لیے الجھن کا باعث ہوتی تھی۔ میں آپ سے نہیں پوچھوں گا کہ وہ آخر کیا بات تھی حالانکہ ایک آدمی ہونے کی حیثیت سے مجھے جستجو ہے مگر یہ معاملہ آپ کا ہے۔ جب تک آپ خود نہیں بتائیں گے، میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا۔" منیر علی تاسف سے بولے۔ "نرجس بھی انھی کی طرح خاموش اور الگ تھلگ رہتی تھی۔ آہ نرجس۔ کیا بتاؤں، وہ کیسی لڑکی تھی۔ خدا گواہ کہ میں نے اسے اپنی زہرہ سے کم کبھی نہیں سمجھا۔ وہ بھی انھی کی طرح میرا لحاظ کرتی تھی۔ مجھے ابا جان کہتی تھی۔ گھر میں زہرہ اور سلمہ کے لیے کوئی نئی چیز اسے شامل کیے بغیر نہیں آتی تھی۔ کبھی کوئی ایسی چوک ہو جاتی تو زہرہ مجھ سے لڑتی۔"

میرے کان پھٹے جا رہے تھے۔ منیر علی اچانک کھڑے ہو گئے۔ ایک شخص دبے پاؤں بیٹھک میں داخل ہوا تھا، اس کے کپڑے گندے اور بال بڑھے ہوئے تھے، داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ وہ آتے ہی پھٹی پھٹی نگاہوں سے تکنے لگا۔ منیر علی نے تیزی سے بڑھ کے اس کا شانہ تھام لیا اور کمزور کانپتی ہوئی آواز میں بولے۔ "ارشد میاں! کہاں چلے گئے تھے؟"

"یہیں تھا۔" آنے والا بھی ہوئی آواز میں بولا۔

"کہاں چھپے بیٹھے تھے؟ پتہ ہے تین دن ہو گئے۔ سارا شہر چھان مارا۔ خدا کے لیے مجھ بوڑھے پر تو رحم کرو۔ بتا کے جایا کرو، چاہے کتنے ہی دن کے لیے جاؤ۔ میرے اعصاب میں اب اتنا دم نہیں ہے۔ آئینے میں صورت بھی ہے اپنی۔ ذرا کپڑے تو دیکھو۔"

ارشد نگاہیں نیچی کیے سنتا رہا۔ میں نے اسے پہلی بار غور سے دیکھا۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ سرخ آنکھیں باہر نکلی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ قد بھی خاصا بڑا تھا مگر وہ بیمار بیمار نظر آتا تھا۔ "میرا بھانجا ہے۔ بی اے کر چکا ہے۔" منیر علی نے تجمل سے کہا، پھر ارشد سے بولے۔ "یہ ہمارے مہمان ہیں۔ اکبر خاں صاحب اور ان کے بیٹے ظہیر میاں۔ یہ مولوی صاحب کے عزیز ہیں۔"

"مولوی صاحب کے عزیز!" نوجوان کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

"بہت مہربان لوگ ہیں، میری درخواست قبول کر لی اور یہاں قیام پر آمادہ ہو گئے۔"

"مولوی صاحب!" ارشد نے سٹ پٹاتے ہوئے پوچھا۔ "ان کا کوئی ہے...؟"

"نہیں بیٹے! یہ خود انھیں تلاش کرتے ہوئے آئے ہیں۔" منیر علی مایوسی سے بولے۔ "جاؤ تم اندر سب کے بہن بھائیوں کو صورت دکھا دو، وہ سب بہت پریشان ہیں، کپڑے بھی بدل لینا۔"

ارشد دزدیدہ نظروں سے ہمیں گھورتا رہا۔ منیر علی نے دوبارہ اسے ٹوکا۔ وہ اندر چلا گیا۔ "بہت سعادت مند لڑکا ہے۔" اس کے جانے کے بعد منیر علی پژمردگی سے بولے۔ "کچھ عرصے سے اس کی طبیعت میں عجیب انقلاب آیا ہے۔ نہ کھانے کا ہوش، نہ پہننے کا۔ نہ کسی سے بات کرتا ہے، نہ کسی کی سنتا ہے۔ آپ نے حالت دیکھی؟ رات رات بھر، دن دن بھر گھر سے غائب رہتا ہے۔ لوگ ڈھونڈ کے تلاش کر کے لاتے ہیں۔"

"کیا پھیر ہے؟" تجمل نے تجسس سے پوچھا۔

"پھیر کچھ نہیں، بس قسمت کا پھیر ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا، کیا ہو گیا ہے۔" منیر علی اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ کے اداسی سے بولے۔ "اچھا خاصا تھا۔ میں پہلے نظر کا قائل نہیں تھا لیکن اب میرا بھی یہ خیال ہے کہ اسے نظر لگ گئی ہے۔ بہت سہارا لیکن روز بہ روز حالت بگڑتی ہی گئی۔ باپ کا انتقال پہلے ہی ہو چکا تھا، ماں بھی مر گئی تو میں اسے یہاں لے آیا۔"

"کب سے ایسا ہے؟" تجمل نے بیڑی جلاتے ہوئے پوچھا۔

"کئی مہینے سے۔" منیر علی بے چینی سے بولے۔ "کئی مہینے سے۔"

تجمل نے اس کے بعد کچھ نہیں پوچھا اور نہ منیر علی نے کچھ بتایا۔ نوجوان ارشد بیٹھک میں واپس نہیں آیا تھا تاآنکہ عشا کی اذان ہو گئی۔ منیر علی نماز کو چلے گئے۔ بیٹھک میں خاموشی چھا گئی اور تجمل ننگے پاؤں ٹہلنے لگا، پھر اچانک میرے پاس رک کے اس نے مجھے مونڈھے سے اٹھایا اور میرا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ "لاڈلے!" اس کی آواز بھنچی ہوئی تھی۔ وہ میرے گال زور زور سے تھپتھپانے لگا۔ "پردہ کھینچ لے لاڈلے! پردہ کھینچ لے۔ کانچ پہ اتنا زور مت ڈال۔ اپنا نہیں تو اس کا خیال کر لے۔"

وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر بوڑھی ملازمہ اور منیر علی کے چھوٹے لڑکے نے آکے دسترخوان لگانا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر میں منیر علی بھی دو آدمیوں کے ساتھ واپس آگئے۔ ان میں سے ایک شخص شام کو ہمارے ساتھ آیا تھا۔ تجمل نے مجھے دسترخوان پہ بلایا۔ میں چپ چاپ سب کے ساتھ بیٹھ گیا۔ کھانے میں قسم قسم کی چیزیں تھیں۔ بیٹھک میں روشنی مدھم تھی۔ میں ہاتھ چلاتا رہا تاکہ منیر علی کو کچھ کہنے کا موقع نہ ملے، مجھے معلوم تھا، میں جتنا انکار کروں گا کہ بھوک نہیں ہے، جی متلا رہا ہے، منیر علی کا اصرار اتنا ہی بڑھتا رہے گا۔ کیا پتہ، ان پلیٹوں میں کبھی کورا نے بھی کھانا کھایا ہو۔ اس کا ہاتھ تو ضرور لگا ہوگا۔ وہ یہاں بیٹھک میں بھی آتی ہوگی۔

کھانے کے دوران میں وہ سب باتیں کرتے رہے۔ مولوی صاحب کی عادات و صفات کے متعلق باتیں۔ تجمل زیادہ تر سنتا رہا۔ وہ لوگ رات گئے واپس ہوئے۔ منیر علی نے رخصت چاہی لیکن تجمل نے اسے روک لیا۔

"اگر آپ کو نیند نہ آ رہی ہو تو کچھ دیر اور بیٹھو۔"

"بسر و چشم۔" منیر علی شگفتگی سے بولے۔ "مجھے تو آپ ہی کا خیال تھا ورنہ جی تو یہ چاہتا ہے کہ رات بھر آپ سے باتیں کرتا رہوں۔"

"بڑے صاحب! آپ بول رہے تھے کہ مولوی صاحب یہاں بہت خوش تھے اور ان کا یہاں سے جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ پھر ایکا ایکی یہ کیا ہو گیا؟ میرا مطلب ہے، آپ نے ان کا سامان بھی دیکھا؟"

"دیکھا جناب! جس رات یہ حادثہ پیش آیا، تمام سامان بکھرا ہوا تھا۔ میں نے اور زہرہ نے سامان دوبارہ ترتیب سے رکھا پھر شاید میں نے آپ کو بتایا تھا، سب سامان ایک کوٹھری میں بند کر دیا۔"

"کیا آپ مجھے وہ سامان ایک نظر دکھا سکتے ہو؟"

منیر علی کسمسانے لگے پھر بولے۔ "میں اسے ان کی امانت سمجھتا ہوں۔"

"میں صرف دیکھنے کی بات کر رہا ہوں بڑے صاحب! شاید کوئی کام کی بات کا پتہ چل سکے، شاید کوئی کاغذ پتر نکل آئے۔"

"آپ چاہیں تو دیکھ لیں۔" منیر علی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "ہو سکتا ہے آپ کی نگاہ کسی ایسی چیز پہ پڑ جائے جو میری نظر سے روپوش رہی ہو ویسے پولیس دو بار سامان کھکوڑ چکی ہے لیکن دیکھیے... آپ نے فرمایا ہے کہ آپ مولوی صاحب کے عزیز ہیں۔ ان کے سامان میں بظاہر ایسی کوئی خاص چیز نہیں تھی، پھر بھی... معاف کیجیے۔ آدمی کو..."

"ہاں ہاں! آپ کا خیال ہے کہ کچھ کاغذ وغیرہ ہو سکتے ہیں۔"

"بدگمانی نہ سمجھیے۔" منیر علی نے کسی قدر تندی سے کہا۔

"آپ ٹھیک سمجھتے ہو بڑے صاحب!" بجھل نرم لہجے میں بولا۔

"آپ میرے لیے بہت محترم ہیں۔ مہمانوں کی دل شکنی کسی صورت میں روا نہیں ہے۔ آپ کچھ اور تصور مت کیجیے۔"

بجھل ہنسنے لگا۔ "بڑے صاحب! چھوڑو۔ میں نے یوں ہی بول دیا تھا، پولیس والوں نے اور آپ نے سب دیکھ لیا ہے تو ٹھیک ہے۔"

منیر علی زیادہ دیر نہیں ٹھہرے۔ رات بھی بہت ہو گئی تھی۔ بجھل پلنگ پر لیٹ کے کراہنے لگا۔ محلہ سرِ شب ہی سناٹے میں ڈوب گیا تھا۔ گلیوں میں جب کتے بھونکتے، سکوت درہم برہم ہو جاتا۔ بجھل رات بھر کھانستا اور بیڑیاں پیتا رہا۔ منیر علی جاتے جاتے لالٹین کی بتی کم کر گئے تھے، بیٹھک میں دھواں پھیلا ہوا تھا۔ "لاڈلے!" رات کے کسی حصے میں بجھل نے مجھے پکارا۔

"ہُوں۔" میں نے ہنکاری بھری۔ "کیا ہے؟"

"سوتا کیوں نہیں ہے!"

"تم بھی تو نہیں سو رہے ہو؟"

"سر کچھ دُکھ رہا ہے۔"

میں اُٹھ کے اُس کے سرھانے چلا گیا۔ "لاؤ دبا دوں۔"

"نا۔ نا۔" اُس نے کراہتے ہوئے میرے ہاتھ پکڑ لیے۔ میں نے زور کر کے اپنے ہاتھ اُس سے چھڑائے اور اُس کا سر دبانے لگا۔ بجھل کے ماتھے کی نسیں اُبھری ہوئی تھیں۔

"اتنی بیڑیاں کیوں پیتے ہو؟"

"کوئی بیڑی مزا ہی نہیں دے رہی لگتا ہے سالا نیم کا پتا ہے۔"

"میں تم سے ایک بات کہوں؟"

"بول۔" اُس نے آنکھیں بند کر کے کہا۔

"مگر تم مانو گے نہیں، تم سے کچھ کہنا بے کار ہے۔"

"مجھے پتہ ہے لاڈلے کہ تُو کیا رٹ لگائے گا۔ یہی بولے گا کہ تھیں اوّا چھوڑے ہوئے دن ہو گئے، جامو پریشان ہو گا، تمھارے پیچھے وہاں نہ جانے کیا ہو رہا ہے، اُدھر زرّیں تمھاری راہ تک رہی ہو گی، مجھ سے زیادہ تمھاری اُنھیں ضرورت ہے۔ یہی بولنا چاہتا ہے نا؟"

"ہاں یہی کچھ۔ اور میں کوئی بے جا بات نہیں کر رہا ہوں۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ جس طرح بھی ہوا، واپس آ جاؤں گا۔ بمبئی کی طرح نہیں کروں گا۔ اگر کہیں تمھاری ضرورت پڑی تو خط لکھ دوں گا۔ میں اپنے آپ کو سنبھال کے رکھوں گا۔ آخر جب تم نہیں تھے تو بھی میں انھیں تلاش کر رہا تھا۔ پھر کیا میں واپس نہیں آ گیا تھا۔ مجھے اتنی جلدی موت نہیں آئے گی۔ آتی تو بہت پہلے آ جاتی۔"

"لاڈلے جانی! کیا تیرے پاس بولنے کے لیے کچھ اور نہیں ہے۔ مجھے تیری یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں۔"

"اور مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ تم گلی گلی گھر گھر آوازیں لگاتے پھرو۔"

"کبھی کبھی دل کرتا ہے تجھے خوب ماروں۔"

"تو مارتے کیوں نہیں، پہلے بھی تم کئی مرتبہ کہہ چکے ہو۔ تمھیں دو گا کس نے، تمھیں تو دیر بھی نہیں لگے گی۔ کاش میں خود یہ کر سکتا۔"

"لاڈلے!" وہ اپنا سر جھٹکنے لگا۔ "بس کر، اتنا زیادہ مت بول۔ تیری زبان بھی چاقو ہے پر اسے چاقو کی طرح دیکھ بھال کے چلایا کر۔"

میں نے چپ سادھ لی اور آہستہ آہستہ اُس کا سر دباتا رہا۔ مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ یہ گفتگو بے نتیجہ ہے پھر بھی میں منہ بند نہیں رکھ سکا حالانکہ میں نے طے کر لیا تھا کہ اُس سے ایسی کوئی بات نہیں کروں گا۔ رات کے آخری حصے میں بجھل کی آنکھیں بھاری ہونے لگیں۔ میں اپنے بستر پر چلا آیا۔ میں نے اپنی مالا گردن سے اُتار کے اپنے چہرے پر ڈال لی۔

منیر علی نے ہمیں علی الصباح جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ نماز سے فارغ ہو کے بیٹھک میں آئے اور سلام کے بعد رات کی بات پر معذرت چاہنے لگے۔ "مجھے ساری رات بے کلی رہی کہ کہیں آپ کی دل آزاری تو نہیں ہوئی۔" ندامت زدہ لہجے میں بولے۔ "آپ جب چاہیں، مولوی صاحب کا سامان دیکھ سکتے ہیں۔"

"بڑے صاحب! رات گئی، بات گئی۔" بجھل نے اُونچی آواز میں کہا۔

"نہیں صاحب! بات ایسے نہیں جاتی۔"

بجھل نے زیادہ اشتیاق ظاہر نہیں کیا مگر منیر علی نے ناشتے کے بعد ہم سے اُٹھنے کی التجا کی اور ہمیں اپنے مکان سے ملحق ایک دوسرے مکان کے دروازے پر لے آئے۔ یہ مکان کسی مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا اور ساخت تھی جیسے کسی قلعے کا دروازہ ہو۔ میرا خون رگوں میں جمنے لگا۔ کبھی اس مکان کی دیواری میں کوار رہتی تھی۔ یہ دروازہ اُس نے بارہا مولوی صاحب کے لیے اپنے ہاتھوں سے کھولا ہو گا۔ دروازے پر اُس کی انگلیوں کے نشانات اب بھی کہیں موجود ہوں گے۔ دروازہ کھلنے میں دیر ہو گئی۔ منیر علی نے پہلے ہی اپنے لڑکے کو اندر سے کنڈی کھولنے کے لیے بھیج دیا تھا۔ دروازے کے ساتھ دو طرف اینٹوں سے چُنی ہوئی اُونچی دیوار تھی اور اُوپر کئی روشن دان بنے ہوئے تھے۔ ان دیواروں سے اندر داخل ہونا آسان نہیں تھا۔ کوئی سیڑھی لگا کے، کمند پھینک کے اُوپر جا سکتا تھا یا دوسرے مکان سے چھت چھت ہوتا پہنچ سکتا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی ہم ایک کوٹھری جیسی ڈیوڑھی سے گزرے۔ بہت کم تھی لیکن ڈیوڑھی سے آگے ایک کشادہ اور روشن صحن تھا۔ صحن کے تھموں پر ٹکا ہوا دالان تھا اور اندر کمرے تھے۔ فرش پکا تھا۔ کسی جگہ کا بھی پڑا ہوا نظر نہیں آ رہا تھا۔ صحن میں ایک جانب بیری کا درخت پھیلا تھا، چنبیلی، موتیا اور گلاب کے پودوں میں پھول کھلے ہوئے تھے۔ سفید گلاب کی ایک کونے میں چھت تک چلی گئی تھی اور پھولوں کے گچھے شاخوں پر جھول رہے تھے۔ کیاریوں کی مٹی گیلی گیلی تھی۔ صبح وہاں ضرور پانی ڈالا گیا تھا۔ مکان نیا نہیں تھا۔ رنگ بھی کچھ میلا میلا ہو گیا تھا لیکن کہیں گرد اور دھول جمی ہوئی نہیں تھی۔ کمروں کے ساتھ بنے ہوئے طاق بھی صاف تھے۔ دالان میں آ کے میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ مجھے ایسا لگا جیسے کوار کسی تھم یا دیوار کی اوٹ میں چھپی ہوئی ہے یا کسی روزن سے جھانک رہی ہے۔ سامنے کے کمرے کا دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ "یہ کیوں کھلا ہوا ہے؟" منیر علی نے متوحش لہجے میں اپنے چھوٹے لڑکے سے پوچھا اور اُس کا جواب سُننے سے پہلے ہی کمرے میں داخل ہو گئے۔ ہم بھی اُن کے پیچھے پیچھے چلے آئے۔ منیر علی چند قدم چل کے ٹھٹک گئے۔ اندر چارپائی پر ارشد سکڑا ہوا پڑا تھا۔ ہماری آہٹ پر وہ چونک پڑا اور اپنا جسم چرانے کے انداز میں اُٹھ گیا۔ اُس کے گلے میں ایک چُنا ہوا دوپٹا پڑا تھا۔ "ارشد میاں! تم یہاں کب سے ہو؟" منیر علی نے کسی قدر تلخی سے کہا۔

"جی۔ بہت دیر سے، بہت دیر سے۔" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

"اور میں اُدھر تمھیں پوچھ رہا تھا۔" منیر علی ترشی سے بولے۔ "یہ گلے میں تم نے کیا ڈال رکھا ہے؟ رنگ دار لباس کا شوق تمھیں کب سے ہو گیا؟"

"جی۔" وہ گھبرا سا گیا۔ اُس نے جلدی سے دوپٹا اُتار کے پلنگ پر ڈال دیا اور نظریں نیچی کیے ایک جانب سمٹ کے کھڑا ہو گیا۔ اُس نے شیو بنا لیا تھا اور اُس کا لباس بھی تبدیل ہو گیا تھا۔ آج وہ کل رات سے بہت بدلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اُس کا رنگ گندمی لیکن زردی مائل تھا۔ چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ وہ کھڑے کھڑے لرز رہا تھا۔

منیر علی اُسے گھر واپس جانے کا حکم دے کے باہر آ گئے۔ اُن کے لہجے پر چند لمحوں تک کبیدگی طاری رہی۔ "یہاں مولوی صاحب رہتے تھے۔ یہ اُن کا خاص کمرہ تھا۔ اس مکان میں ایک چھوٹی کوٹھری اور تین کمرے ہیں۔ ایک کمرہ باہر صحن کے ساتھ ہے۔ وہ مردانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا اگرچہ اُس کے استعمال کی نوبت کم ہی آتی تھی۔ تیسرا کمرہ یہ ہے۔ یہاں نرجس بیٹی رہتی تھی۔"

وہ ہمیں مولوی صاحب کے کمرے سے ملے ہوئے ایک دوسرے کمرے کے دروازے پر لے آئے۔ میری آنکھیں پھیل گئیں۔ وہاں ایک بڑا تالا لٹکا ہوا تھا۔ منیر علی نے جیب سے چابیاں نکال کے اُسے کھولا۔ میرے پاؤں چوکھٹ پہ قدم رکھتے ہی ڈگمگانے لگے۔ کمرے میں کئی ٹرنک اُوپر تلے رکھے ہوئے تھے اور ہر طرف مختلف قسم کا سامان کسی دُکان کی طرح یا جہیز میں دیے جانے والے اسباب کے انداز ترتیب سے سجا ہوا تھا۔ ایک چھوٹی میز پر قلم دوات، کاپیاں اور چند کتابیں موجود تھیں۔ میز پر ایک گل دان بھی رکھا تھا، اُس کے پھول اور پتے خشک ہو گئے تھے۔ کھلی ہوئی الماری کے خانوں میں آئینہ، سُرمے دانی، تیل کی شیشیاں، صابن، نیچے کے خانوں میں چائے کے برتن، چینی کی پلیٹیں اور سب سے اُوپر کے خانے میں کتابوں کا ڈھیر تھا۔ کمرے میں کھڑکی سے قریب نواڑ کی ایک مسہری پڑی ہوئی تھی۔ "یہ اُن کا کل سامان ہے۔" منیر علی بجھل کو ایک ایک چیز کی تفصیل بتا رہے تھے۔ بجھل الماری کے اُوپر کے خانے سے کتابیں نکال کے اُن کے صفحے اُلٹنے پلٹنے لگا۔ میرے ہاتھ پاؤں اکڑنے لگے تھے۔ منیر علی نے ایک ایک ٹرنک کھول کے دکھایا۔ کپڑوں میں زیادہ تر کوار ہی کے کپڑے تھے۔ ریشمی، رنگین، پھول دار اور سادہ کپڑے۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے انھیں چھوا۔ میرا سارا جسم منجمد ہونے لگا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے میں کوار کو چھو رہا ہوں۔ اُس کے دوپٹے، شلواریں، جمپر کُرتے، پشواز، غرارے، چھوٹے کپڑے، دو سیاہ برقعے، جُتیاں۔

"وہ ہمیشہ سادہ لباس پہنتی تھی مگر مولوی صاحب اُس کے لیے طرح طرح کے کپڑے سلواتے رہتے تھے۔ دیکھیے، بہت سے کپڑے تو اِن میں ایسے ہیں جنھیں اُس نے پہنا ہی نہیں یا صرف ایک ہی بار کبھی مولوی صاحب کے اصرار پر کوئی جوڑا پہن لیا ہو۔" منیر علی نے کہا۔ "یہ اُس کے زیور ہیں، مصنوعی زیور۔ اصلی میں نے محفوظ کر لیے ہیں، دو ہار مولوی صاحب اپنے ساتھ لائے تھے، چوڑیاں اُنھوں نے یہیں بنوائی تھیں۔" منیر علی کی انگلیوں میں اُس کے آویزے جھل ملا رہے تھے۔ "اُسے زیور پہننے کا بھی کچھ ایسا شوق نہیں تھا، بس کبھی کبھی بالوں میں تازہ پھول لگا لیتی تھی۔"

میں نے میز پر رکھی ہوئی کاپیاں کھول کے دیکھیں، وہ کوار ہی کی تحریر تھی۔ مولوی صاحب کی تحریر ایسی نہیں ہو سکتی، کئی کاپیاں بھری ہوئی تھیں۔ میں نے ایک ایک صفحہ لوٹ کے دیکھا۔ اُس کے لکھے ہوئے لفظ میری آنکھوں کے سامنے گردش کر رہے تھے۔ میری نظریں کسی ایک جگہ ٹھہر ہی نہیں رہی تھیں۔ تمام لفظوں کی نشست و برخاست یکساں تھی جیسے انھیں ناپ تول کے لکھا گیا ہو، چُن چُن کے لکھا گیا ہو۔ اُس کی تحریر بہت صاف اور شگفتہ تھی۔ چیکتی ہوئی، چمکتی ہوئی، دُھلی ہوئی سی تحریر۔ ایک لفظ کے بعد دوسرے لفظ کے درمیان خاصا فاصلہ تھا۔ جہاں جہاں "کش" آتا تھا، اُس کے ہاتھ کی لرزش صاف پتہ چلتی تھی۔ نہ جانے کیوں وہ "کش" اور لفظوں کی طرح صاف نہیں لکھ پاتی تھی۔ مجھے خیال آیا، شاید اُس نے میرے لیے کچھ لکھا ہو۔ کہیں کسی صفحے پر میرا نام بھی ہو مگر وہ تمام صفحات نصابی موضوعات پر مشتمل تھے۔ الفاظ معانی، تاریخ، جغرافیہ، چھوٹے چھوٹے معلوماتی مضمون۔ اُس نے اُردو لکھنا خوب اچھی طرح سیکھ لیا تھا۔ بولنے میں تو وہ اور بھی طاق ہو گئی ہو گی۔ لوگ کسی شخص کی دل نشیں گفتگو کی مثال پھولوں سے دیتے ہیں کہ وہ شخص جب باتیں کرتا ہے تو اُس کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ کوار پر یہ مثال بالکل صادق آتی تھی۔ اُس کے منہ سے اُس وقت بھی پھول جھڑتے تھے جب وہ اٹک اٹک کے اُردو بولنے کی کوشش کرتی تھی۔ اُس کے ننھے ننھے چھوٹے دانت چمکنے لگتے تھے اور رخساروں میں گڑھا پڑ جاتا تھا۔ اب تو وہ اور روانی اور شستگی سے بولتی ہو گی۔ مولوی اسماعیل میرٹھی کی پانچویں کتاب بھی میز پر موجود تھی۔ اساتذہ کے مجموعے بھی اُس کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔

ایک ٹرنک میں مولوی صاحب سے متعلق سامان بھرا ہوا تھا۔ اُن کے کپڑے اور دوسری چیزیں۔ منیر علی کے بیان کے مطابق یہ سامان اُن کی بیٹی نرجس نے صندوقوں میں بند کیا تھا۔ جو سامان صندوقوں میں آنے سے رہ گیا تھا، وہ اِدھر اُدھر پڑا ہوا تھا۔ منیر علی نے اپنے دو ٹرنک بھی اس مقصد کے لیے خالی کر دیے تھے۔ مولوی صاحب کا اپنا سامان بہت مختصر تھا۔ بجھل نے مجھے بلا کے اُن کی کاپیاں اور کاغذات دکھائے۔ اُن میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ مولوی صاحب

نے کوئی یادداشت نہیں لکھی تھی۔ ڈائری نما ایک کاپی پر چیدہ چیدہ اشعار رقم تھے۔ فارسی اور عربی شعروں کی کثرت تھی۔ میں نے جستہ جستہ انھیں پڑھا۔ کوئی پُرزہ ایسا نہیں تھا جو میں نے غور سے نہ دیکھا ہو کہ شاید کہیں کوئی نشان مل جائے یا کہیں میرا ذکر ہو لیکن مولوی صاحب کے کاغذات میں منتخب احادیث، اشعار اقوال، علمی نوٹ، تفسیر، بعض مسائل کی شرح، بعض منطقی موضوعات کے خلاصے اور حکایتوں کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ کتابوں میں انگریزی کی کتابیں بھی شامل ہیں۔ دس بارہ انگریزی ناول، انگریزی اردو ڈکشنری، انگریزی الفاظ و معانی کی کاپی، شیکسپیئر کی چند کتابیں اس بات کی غمازی کرتی تھیں کہ مولوی صاحب نے فرصت کے اوقات میں انگریزی سیکھنے کی کوشش کی ہے اور اُن کی انگریزی تحریر سے پتہ چلتا تھا کہ انھوں نے اچھی خاصی مہارت بھی حاصل کرلی ہے۔ ابتدائی کتابوں کے علاوہ اگلے درجوں کی کئی کتابیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔

اُس کی مسہری کی نواڑ پہ دھول کی ہلکی سی تہہ جمی ہوئی تھی۔ میں نے الماری کے خانے سے بے خیالی میں آئینہ اُٹھایا کہ شاید اُس میں کورا کا کوئی عکس محفوظ رہ گیا ہو۔ آئینے کے پیچھے مجھے ایک کنگھی دکھائی دی۔ میں نے اُسے آنکھوں سے لگا لیا۔ اُس میں کورا کی خوشبو بسی ہوئی تھی اور دندانوں میں اُس کے چند بال اٹکے ہوئے تھے۔ وہی سُرخی مائل سیاہ بال۔ کلکتے میں جب ہم دونوں ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے اور ہمیں کچھ پتہ نہیں تھا کہ ہم کہاں جائیں گے کیا کریں گے، کورا نے اپنے بال میرے چہرے پہ بکھیر دیے تھے۔ مجھے وہ خوشبو اب تک یاد تھی۔ ہم کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک سامان دیکھتے رہے۔ میرا جی وہاں سے ایک لمحے کے لیے بھی ہٹنے کو نہیں چاہتا تھا لیکن منیر علی ایک ایک کرکے صندوق میں تالے ڈالتے گئے اور پھر ہمارے دیکھنے کو کچھ نہیں رہا۔ بجّل واپس ہونے لگا تو مجھے بھی کمرے سے نکلنا پڑا۔ منیر علی نے دروازے پہ تالا لگا دیا اور چلتے چلتے دوسرے کمرے میں جھانک کے دیکھا، وہاں ارشد موجود نہیں تھا۔ ہمارے باہر آتے ہی منیر علی کے گھر کے صحن میں کھلنے والی کھڑکی کے پٹ زور سے بند ہونے کی آواز آئی۔ منیر علی کا چھوٹا بیٹا اندر سے دروازے کی کنڈی لگانے کے لیے مکان ہی میں رہ گیا۔ ہم تینوں باہر چلے آئے۔ بجّل کے چہرے پہ دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ بیٹھک میں آکے بھی وہ چپ چپ رہا۔ "آپ نے کیا اندازہ لگایا جناب؟" منیر علی نے سانس قابو میں آتے ہی مضطرب لہجے میں پوچھا۔

بجّل نے جواب نہیں دیا۔ منیر علی دیر تک اُس کی صورت دیکھتے رہے اور تپائی پہ رکھی ہوئی خشک میوے کی پلیٹ سے کشمش ٹونگتے رہے۔ اُسی لمحے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اور بھی کمرے میں موجود ہے۔ میں نے بے چینی سے چاروں طرف نگاہ گھمائی تو سامنے کے روشن دان کی جالیوں سے دو بڑی بڑی آنکھیں جھانکتی ہوئی نظر آئیں۔ میں اُس کا پورا چہرہ تو نہیں دیکھ سکا لیکن اُس کا رنگ میں نے بھانپ لیا تھا۔ وہ جالیوں کے پاس سے فوراً ہٹ گئی۔ منیر علی نے بھی مڑ کے دیکھا مگر روشن دان خالی ہو چکا تھا۔ وہ منیر علی کی لڑکی زہرہ ہی ہوسکتی تھی، کورا کی ہم جولی

نہ جانے اتنے عرصے کے ساتھ میں کورا نے اُس سے کیا کیا باتیں کی ہوں گی۔ سہیلیوں میں کوئی پردہ نہیں ہوتا۔ کورا کے بارے میں جتنا وہ جانتی ہوگی، اور نہیں جانتا ہوگا۔ اسے بھی تلاملی ہوگی کہ ہم کیوں آئے ہیں، کورا کے عزیز ہیں۔ وہ بھی بہت کچھ جاننے کے لیے بے تاب ہوگی۔ ہوسکتا ہے کورا نے میرے بارے میں بھی کچھ بتایا ہو۔ صبح ناشتے کے دوران میں بھی روشن دان میں کسی سائے کا گمان ہوا تھا مگر اُس وقت اتنی روشنی نہیں تھی۔ منیر علی کچھ دیر تک بجّل کے ردِّ عمل کا انتظار کرتے رہے مگر بجّل نے کچھ نہیں کہا تو انھوں نے ہم سے معذرت چاہی کہ انھیں چھوٹے لڑکے کو مدرسے چھوڑنے اور اپنے کام نمٹانے کے لیے باہر جانا ہے۔ دوپہر کے کھانے سے پہلے واپسی ہو جائے گی۔ دوران کوئی بھی ضرورت ہو تو بے تکلف دستک دے لیجیے گا۔ ملازمہ بھی موجود ہے اور اگر آپ میرے ساتھ چلنا چاہیں تو بصد شوق۔"

"نہیں بڑے صاحب! ہم یہیں رہیں گے۔" بجّل سپاٹ لہجے میں بولا۔ منیر علی شاید خود بھی ہمیں ساتھ لے جانا نہیں چاہتے تھے، بس رسماً انھوں نے کہا تھا۔ اُن کے جانے بعد بجّل اور میں بیٹھک میں پھر تنہا رہ گئے۔ منیر علی کو گئے ہوئے خاصی دیر ہوگئی تھی۔ وہ آنکھیں دوبارہ مجھے روشن دان میں ہوئی نظر آئیں۔ جیسے ہی میں نے نگاہ اُٹھائی، اُس کے چہرے کے سنہرے رنگ کا ایک جھماکا سا ہوا اور معدوم ہوگیا۔ پھر بار بار میری نگاہ خود ہی روشن دان کی طرف اُٹھنے لگی مگر وہاں کوئی نہیں آیا۔ بجّل گاؤ تکیے سے سر ٹکائے آنکھیں نیم وا کیے لیٹا تھا۔ میں اُسے چھوڑ کے باہر آگیا۔ بیٹھک میں ہوا بند بند سی تھی۔ گلیوں میں دُور دُور تک لوگ نہیں تھے لیکن اِرد گرد سے پھیری لگانے والوں کی صدائیں آرہی تھیں۔ میں محلّے کی مسجد سے بھی آگے نکل گیا۔ کچھ فاصلے پر سبزی منڈی اور اُس کے پاس ہی آڑھت۔ میں یوں ہی بے سر و پا گلیوں میں گھومتا رہا۔ اب مولوی صاحب اَلبجان یا جہان گیر کی طرح گھر کا کوئی آدمی ملنے کا امکان تھا۔ مبیلمیر زیادہ بڑا شہر نہیں تھا۔ منیر علی نے پہلے ہی انکار کر دیا تھا کہ وہ کے حلیے اور نام کے کسی آدمی سے واقف نہیں ہیں۔ میرا دماغ دماغ خالی تھا اور مجھے اپنا جسم کھوکھلا لگ رہا تھا۔ میں جلد ہی گھر کی طرف واپس ہوا مگر راستے میں ایک جگہ میرے پیر رُکنے لگے۔ سامنے سے کندھے لٹکائے منہ اُٹھائے ہوئے آہستہ آہستہ ارشد آرہا تھا۔ میں نے سوچا اُسے روک کر پوچھوں۔ تھوڑی دُور تک میں نے اُس کا پیچھا بھی کیا۔ اُسے خبر ہی نہیں تھی کہ اُس کے پیچھے کوئی آرہا ہے۔ اُسے گھر سے باہر دیکھ کے میرے ذہن میں خیال آیا اور میرے قدموں میں تیزی آگئی۔ ارشد آگے نکل گیا تھا۔ میں گھر چلا آیا۔ بیٹھک میں بجّل اسی طرح نیم دراز غنودہ پڑا ہوا تھا۔ میں دروازے پر دستک دینے کے لیے بڑھا لیکن میرے ہاتھ کواڑوں کو بس چھو کے رہ گئے۔ میں کرسی پہ بیٹھ کے ہانپنے لگا۔ "بنڈل لائے ہو؟" میرے بجّل کی آواز گونجی۔ میں کرسی سے اُچھل پڑا۔ وہ کروٹ بدلے مجھی کو دیکھ رہا تھا۔

"بھول گیا، لے آتا ہوں۔"

"جب جائے تو لے آنا، ابھی کچھ ہیں۔"

"تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں معلوم ہوتی؟"

"ٹھیک ہے یرے۔" اُس نے اونچی آواز میں کہا۔ "بس ذرا بدن زور کر رہا ہے۔ سالا اِدھر کا موسم بدن کو نہیں لگ رہا۔"

"تو چلے چلو۔ اب یہاں کیا رکھا ہے۔"

"کچھ دیر اور ٹھیر لینے میں حرج نہیں ہے۔"

"ٹھیرو۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "کیا فائدہ طبیعت اور خراب نہ ہو جائے۔"

"لگتا ہے لاڈلے! اجوانہ پانی ادھر کا ہے، وہی رُکے ہوئے ہے۔ ہوا کے اُوپر تلے ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ اپیس میں ہر وقت ہی جلتی رہتی ہے۔"

"میں تمھارا حال کہہ کے حوالے آتا ہوں۔ سبزی منڈی میں ایک دکان پر میں نے حقّے بھی دیکھے تھے، کہو تو وہ بھی لے آؤں؟"

وہ ہنسنے لگا۔ "تیرا تو بہت دن ٹکنے کا ارادہ معلوم ہوتا ہے۔"

"میں تو تمھاری وجہ سے کہہ رہا ہوں۔"

بجّل کچھ کہہ ہی رہا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میں اُس کی بات سُنے بغیر لپک کر وہاں پہنچا۔ دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ وہ غیر ارادی طور پر میرے ہاتھ سے کھل گیا۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نے سسکاری بھری، اُس کے ہاتھ میں رکھی ہوئی پیتل کی ٹرے میں پلیٹیں کھڑکھڑانے لگیں۔ شرم سے اُس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اُس کا رنگ گندمی تھا۔ لباس سادہ تھا۔ تنگ موری کا پاجامہ اور جمپر، دوپٹا سر سے ڈھلکا ہوا، کانوں میں بالیاں اور ہاتھوں میں رنگ برنگی چوڑیاں تھیں، ناک لمبی، چہرہ ستواں، نقش و نگار سجل، قد نکلتا ہوا۔ میں اُسے ایک ہی نظر دیکھ سکا۔ ایک لمحے کے لیے جیسے اُسے سکتہ سا ہوگیا پھر اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ نتیجتہً ٹرے گر گئی اور نسعل کا چھناکا ہوا۔ وہ بدحواسی میں بلٹ طرف بھاگی اور میری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ میں پیچھے ہٹنا چاہتا تھا مگر ایک لمحے میں یہ سب کچھ ہوگیا۔ مجھ سے دروازہ بھی بند نہیں کیا جاسکا۔ سامنے منیر علی کے گھر کا صحن اور دالان کا کچھ حصہ نظر آرہا تھا۔ میں نے دزدیدگی سے بجّل کی طرف دیکھا، وہ گاؤ تکیے میں منہ چھپائے پٹ لیٹا ہوا تھا۔ آخر ہمت کرکے میں نے دروازہ بند کر دیا۔

مجھے یقین تھا کہ وہ پھر واپس آئے گی لیکن بہت دیر ہوگئی، دروازے پر دوبارہ دستک نہیں ہوئی، نہ اُس نے ملازمہ کو بھیجا حالانکہ وہ اُسے اندر بھیج سکتی تھی۔ میں نے ارادہ کیا کہ خود دستک دے کے معذرت کرلوں، منیر علی کی واپسی میں ابھی وقت ہے۔ ملازمہ کہیں باہر گئی ہے تو وہ بھی واپس آسکتی ہے۔ میں وہاں تک گیا بھی لیکن پھر لوٹ آیا۔ اِس اثنا میں دروازہ کھٹ کھٹانے کی آواز آئی۔ میں نے جو طے کیا تھا، سب ذہن سے نکل گیا اور میں دروازے کے پاس گم سم کھڑا رہا۔ دوسری دستک پر میں نے کھکار کے اپنی موجودگی کی تصدیق کی۔ "یہ...... یہ لے لیجیے۔" اندر سے سمٹی ہوئی آواز میں کسی نے کہا۔

میں نے آہستگی سے ایک جانب کا پٹ کھول کے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ ٹرے میرے ہاتھ سے مَس ہوئی تو میں نے اُسے تھام لیا۔ "معاف کیجیے۔" میں نے تیزی سے کہا۔

اُس طرف خاموشی طاری رہی مگر چوڑیاں بجنے سے مجھے اندازہ ہوا کہ ابھی دروازے کے پار کوئی موجود ہے۔ "میں...... میں! آپ زہرہ ہی ہیں؟" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "آپ ہی ہیں نا؟" اُس نے جواب نہیں دیا۔ میں نے اُس کی خاموشی ہی جواب سمجھی۔ "سنیے، مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔" میں نے دبی زبان میں کہا۔ "نرجس کے بارے میں، صرف اُس کے بارے میں، آپ خدا کے لیے مجھے کچھ بتا دیجیے۔ بڑے صاحب سے میں بہت سی باتیں نہیں پوچھ سکتا اور نہ وہ اتنا جانتے ہوں گے جتنا آپ۔ مجھے معلوم ہے یہ آپ کے لیے بہت مشکل ہے، آپ ایک پردے دار لڑکی ہیں اور میں آپ کے لیے اجنبی ہوں لیکن نرجس کے رشتے سے آپ مجھے اتنا قریب مت سمجھیے۔ مجھ پہ بھروسا کیجیے، جتنا آپ خود پر کرسکتی ہیں۔ آپ نرجس کی سہیلی ہیں، سو میرے لیے اتنی ہی محترم ہیں جتنی نرجس کی کوئی سہیلی ہوسکتی ہے۔" میں نے سانس لینے کے لیے ایک لمحے توقف کیا۔ "بتلائیے۔ اب نہیں تو پھر کسی وقت موقع نکال کے۔ آپ سوچ لیجیے مگر ہمدردی سے سوچیے گا۔ میں آپ کو مجبور تو نہیں کرسکتا، صرف منت کرسکتا ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ بڑے صاحب کو ہماری باتوں کا علم نہیں ہوگا۔ آپ ایک پڑھی لکھی لڑکی ہیں، آپ غور کریں تو اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ نرجس کے لیے، اُس کے لیے جسے آپ بہت عزیز سمجھتی تھیں، مجھے صرف نرجس ہی کی بات کرنی ہے، کچھ اور، اور۔" میں نے اپنی زبان روک لی۔ اُدھر سے کچھ آہٹ نہیں ہوئی تھی جیسے وہاں کوئی موجود ہی نہ ہو اور میں اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہوں۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ وہ شاید میری بات سُنے بغیر چلی گئی تھی۔ خاصی دیر انتظار کرنے کے بعد میں نے دروازہ بھیڑ دیا اور ٹرے بجّل کے آگے رکھ دی۔

کوئی پانچ دس منٹ کے اندر اندر منیر علی واپس آگئے۔ بجّل پلنگ سے اُٹھ گیا۔ ظہر کی نماز پڑھنے اور کھانا کھانے کے بعد جب منیر علی فراغت سے بیٹھے تو شہر کے حالات بتانے لگے۔ اسی دوران بجّل نے اچانک اُن سے پوچھا۔ "بڑے صاحب! آپ نے مولوی صاحب کو ارشد میاں کے بارے میں کچھ بولا تھا؟"

"جی!" منیر علی نے حیرانی سے کہا۔ "آپ...... آپ کی کیا مُراد ہے؟"

"میں آپ سے جو بول رہا ہوں، وہی میری مراد ہے۔"

"آپ کو کیسے معلوم؟" منیر علی نے تیز و تند لہجے میں کہا۔

"ارشد میاں کو دیکھ کے! میرا خیال ہے آپ نے اُن سے ضرور بات کی ہوگی، پھر وہ کیا بولے؟ ہوسکے تو مجھے بتاؤ۔"

"مگر...... مگر آپ اتنے وثوق سے یہ کیسے کہہ رہے ہیں؟"

"میں اندازے کی بات بول رہا ہوں۔"

"مگر یہ بہت نجی بات تھی جو صرف میرے اور مولوی صاحب کے

درمیان ہوئی تھی۔ آپ کا اندازہ۔ نہیں نہیں" مولوی صاحب کے لہجے میں لرزش آگئی "بہرحال، آپ کا اندازہ بہت خوب ہے۔"

"اور یہ کوئی بُری بات نہیں تھی بڑے صاحب! لڑکی والے کا گھر دُکان ہوتا ہے۔ جہاں بیٹی ہوتی ہے، وہاں گراہک آتے ہی ہیں۔ جس چیز کو لوگ اچھا سمجھتے ہیں، اسی کو اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں۔ آپ ارشد میاں کے لیے کسی بھی لڑکی کے لیے بول سکتے ہیں، ہر جگہ لڑکیوں کی بیریاں لگی ہوئی ہیں، ہر جگہ یہ دکانیں ہیں۔ میں تو صرف اتنا پوچھ رہا ہوں کہ مولوی صاحب نے آپ کو جواب میں کیا بولا؟"

"آپ اُن کے جواب کا اندازہ بھی کیوں نہیں لگا لیتے؟"

"وہ مجھ کو معلوم ہے پر مولوی صاحب بولتے کیا تھے؟"

"کیا بولتے؟" منیر علی کی آواز ماند پڑ گئی "انھوں نے ارشد میاں کو اس لائق نہیں سمجھا۔"

"انھوں نے کیا بولا بڑے صاحب؟" منیر علی میری طرف دیکھ کے رُکے۔

"اس کے سامنے ہی بولیے، میں اس سے بہت کم باتیں چھپاتا ہوں" تجمل نے کہا۔

"رات کو کسی وقت گفتگو کریں گے" منیر علی نے تذبذب سے کہا۔

"یہ تب بھی موجود رہے گا۔ آپ اس کی فکر نہ کرو" تجمل مسکراتے ہوئے بولا۔

"میری اس کی چھوٹائی بڑائی عمر کی ہے۔"

"نہیں صاحب! درجے کی بھی ہے، ہمیں ابتدا سے مراتب کی تربیت دی گئی ہے۔"

"یہ بات یہ خوب جانتا ہے۔"

"آپ کی مرضی" منیر علی نے پلکیں سکوڑتے ہوئے کہا "میں نے مولوی صاحب قبلہ سے بات کی تھی حالانکہ مجھے ایسا کرنا نہیں چاہیے تھا۔ شروع سے میرا اور ہمشیرہ مرحومہ کا خیال تھا کہ ارشد میاں کی نسبت زہرہ سے کر دی جائے گی۔ اس خواہش کی رسمی تکمیل لیں ضروری نہیں سمجھی گئی کہ گھر کا معاملہ تھا۔ ارشد میاں کی تعلیم کے دوران ہی میری بہن اپنے بیٹے کو دولھا اور میری بیٹی کو دُلھن دیکھنے کی حسرت دل میں لیے دُنیا سے چلی گئی۔ ارشد میاں کو میں نے یہاں بُلوا لیا۔ جب میں نے اُن کی رغبت مولوی صاحب کے گھر میں دیکھی تو زہرہ کے معاملے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ ارشد اور زہرہ کی بات ہمشیرہ اور مجھ تک محدود تھی۔ نرجس بھی اپنی بچی تھی۔ خدا جانتا ہے کہ میں نے کبھی دو گھر نہیں سمجھے۔ زہرہ کے بجائے نرجس، مجھے یہ فیصلہ کرنے میں ذرا بھی گرانی محسوس نہیں ہوئی بلکہ خوشی ہی ہوئی چنانچہ ایک روز میں نے مولوی صاحب کا مزاج خوش گوار دیکھ کے اس کا ذکر کر دیا۔ میرا خیال تھا انھیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ ارشد میاں کو وہ بھی اپنا بچہ سمجھتے تھے لیکن خلافِ توقع مولوی صاحب نے اُس دن پہلی بار مجھ سے عجیب رویّہ اختیار کیا۔ انھوں نے صاف منع کر دیا۔ ایسے معاملے میں فوراً جواب نہیں دیا جاتا۔ انکار ہو تو مناسب عذر پیش کر دیا جاتا ہے، میں اُن کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ انھوں نے آیندہ کے لیے بھی یہ کہہ کے بات کا دروازہ بند کر دیا کہ نرجس کے سلسلے میں ایسی کوئی بات نہ کی جائے تو بہتر ہے۔"

"پر انھوں نے ایسا کیوں کہا بڑے صاحب؟" تجمل نے درمیان میں

"واللہ اعلم۔ اُن سے کچھ پوچھنے کی پھر میری ہمت نہیں پڑی

نے اس کے بعد مولوی صاحب سے اپنے مراسم میں کوئی شکن نہیں آ

نرجس بیٹی مجھے اُسی طرح عزیز رہی اور مولوی صاحب اسی طرح میرے لیے

"آپ نے بولا نہیں کہ مولوی صاحب تم کو کہیں تو نرجس بی بی

تھانا ہے، پھر آخر منع کیوں کرتے ہو؟"

"میں نے آپ سے کہا نا، اصل میں انکار سننے کے بعد مجھے

نہیں رہا۔ یوں بھی میں لاکھ نرجس کو اپنی بیٹی سمجھتا، اُس کے بارے میں

کرنے کا اختیار اُنھی کو تھا۔"

"پر بڑے صاحب! مولوی صاحب اِدھر کئی سال سے بسے

آپ کے علاوہ بھی اور لوگوں نے اُن سے ایسی بات بولی ہوگی، کیا انھو

سب کو یہی جواب دیا؟"

"ہاں بھائی! سبھی کو" منیر علی مایوسی سے بولے۔

"ایسا کیوں بڑے صاحب؟"

"ارشد کی بات کے بہت دنوں بعد میں نے ایک دفعہ اشارۃً

کہا تھا کہ آپ نے ارشد میاں کو اپنی فرزندی میں قبول نہیں کیا، مجھے کو

نہیں ہے لیکن دوسروں کے سلسلے میں آپ اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کر

کے کئی اچھے گھروں نے اُن سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔

اُن کی خاص رفاقت کی وجہ سے چند صاحبان نے تو میرے ذریعے ہی

تک بات پہنچوائی تھی۔ مولوی صاحب نے کسی میں کوئی تخصیص نہیں

کو کسی پر ترجیح نہیں دی۔ اُن میں ایسے خاندان بھی تھے، دولت کے

جن کے گھر کی لونڈی ہے۔ کہیں سے کوئی سلسلہ جنبانی ہوتی تھی

کے سامنے بہت احتیاط سے اس کا تذکرہ کرتا تھا۔ ایک موقع پر انھو

قدرے ناراض ہو کے کہہ دیا کہ جب وہ مناسب سمجھیں گے، خود مجھے بتا

اُس وقت تک انھیں شرمندہ نہ کیا جائے۔ پھر میرے زبان کھولنے

ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مگر میرے چُپ ہو جانے سے کچھ نہیں ہوتا

مولوی صاحب کے مزاج سے واقف نہیں تھے، وہ بار بار اپنے نام

کرتے تھے اور انکار کو اپنی سُبکی سمجھتے تھے۔ میں انھیں سمجھاتا تھا کہ

ایسی ہی مجبوری ہوگی جو مولوی صاحب نے معذوری ظاہر کی ہے۔ یہ

خواہش بھی تھی کہ نرجس اُن کے گھر آیا کرے۔ ماشاءاللہ چندے آفتاب

ماہتاب۔ چاند کو شرماتی تھی، بالکل پھولوں جیسی تھی۔ کسی ملک کی شہزادی

کی کوئی ملکہ۔ لڑکیاں بالیاں دُور دُور سے اُسے دیکھنے آتی تھیں۔ وہ تو

نے ملنے جلنے میں بہت احتیاط رکھی تھی اس لیے لوگ آنے سے

لگے تھے۔ میں ہمیشہ خوف زدہ سا رہتا تھا کہ کبھی کچھ ہو نہ جائے، دل

ہوتا رہتا تھا۔ زہرہ اُس کی نظر اُتارتی رہتی تھی۔ سچی بات تو یہ ہے

بھی پسند نہیں تھا کہ نرجس سب کے سامنے آیا کرے۔ اکثر ایسا ہوا

کی نظروں سے زہرہ نے اُسے چھپائے رکھا۔ گھر میں اچانک کوئی آ جاتا

تو زہرہ اُسے کمرے میں بند کر دیتی تھی اور چپکے سے کھڑکی کے راستے اُسے

کے گھر بھیج دیتی تھی۔ اب میں آپ کو کیا کیا بتاؤں" منیر علی کی آنکھوں میں

بھر آئے۔

"بولو بڑے صاحب! بولتے رہو" تجمل نے اُن کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

"بس بھائی! یہی کچھ داستان ہے" منیر علی گلوگیر آواز میں بولے۔

"آپ نے ارشد میاں کو دیکھا ہے، بڑا گبرو جوان، بہت ہونہار اور سعادت مند

تھا۔ مولوی صاحب ایسے ناسمجھ نہیں تھے کہ اُس کا حال دیکھ کے کچھ اندازہ نہ

تے ہوں مگر انھوں نے توجہ نہیں دی تو میں نے بھی اس سلسلے میں ایک لفظ

کہا۔ پھر وہ چلے ہی گئے۔ اب ارشد اطلاع دیے بغیر دُور دُور نکل جاتا ہے۔

یہاں کبھی وہاں۔ آس پاس کے لوگ، محلے والے، ہر وقت میرا سینہ جلاتے

ہیں۔ میں تو اُس سے مایوس ہو چکا ہوں، اب خدا ہی اُس کی کچھ سُن لے

ٹھیک ہے ورنہ۔۔۔۔"

"بڑے صاحب! آپ نے خود بھی تو کچھ جانا بوجھا ہوگا کہ۔۔۔ کہ۔۔۔"

"میں جانتا ہوں آپ کا مدّعا کیا ہے" منیر علی نے تجمل کو بات پوری نہیں

دی، وہ سر ہلا کے بولے "مجھے یہ جاننے کی سدا جستجو رہی اور میں کچھ جان

ضرور اس کے تدارک کی بھی کوشش کرتا۔ اگر میرے بس میں واقعی کچھ ہوتا۔

ساتھ ساتھ ہمیشہ یہ احساس بھی رہا کہ میں کیا جاننا چاہتا ہوں اور میں نہ جانوں

ہے۔ مولوی صاحب سراپا، سربہ سر میرے سامنے تھے۔ وہ نرجس کی شادی

کرنا ہی نہیں چاہتے تھے تو کوئی انھیں مجبور کیسے کر سکتا تھا اور وہ اپنے دُکھ کسی

سنا نہیں چاہتے تھے تو کوئی کیسے اُنھیں پابند کر سکتا تھا۔ میں آپ کو ایک

سناؤں، ایک دفعہ کا ذکر ہے، لوگوں نے مولوی صاحب کے پیچھے نماز پڑھنے

اجتناب کرنا چاہا۔ اُن کا کہنا تھا کہ جب تک مولوی صاحب کی ذات کے

میں تمام باتیں واضح نہ ہو جائیں، اُن کے پیچھے نماز پڑھنا مناسب نہیں ہے۔

نے اُن سے کہا۔ صاحبو! خدا کے خوف سے ڈرو۔ مولوی صاحب ایک عالم

ہیں، میں اُن کے ساتھ رہتا ہوں، اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو سب سے پہلے

میں کہتا۔ اُن کا الگ تھلگ رہنا کسی طور بھی اُن پہ حرف زنی کا جواز

بنتا، بدگمانی اللہ کو پسند نہیں ہے۔ تمھارے پاس آنکھیں ہیں اور اللہ نے

سننے کی خوبی عطا کی ہے۔ مولوی صاحب چار مرتبہ تمھارے سامنے

ہیں، تم انھیں اچھی طرح دیکھتے اور سنتے ہو۔ وہ تمھارے بچوں کو درس دیتے

اور گھر جا کے زمانے کی ساری آلائشوں سے دُور ہو جاتے ہیں۔ میں نے

سے کوئی غلط بات نہیں کی تھی یا مولوی صاحب کی بے جا طرف داری کا

نہیں کیا تھا، جو میں سمجھتا تھا، جیسا میں نے انھیں پایا تھا، وہی میں نے

کہا۔ لوگ اس فقیر کی عزت کرتے ہیں۔ میرا بھرم قائم رہا لیکن انسان انسان

اور پھر وہ صاحبان جو مولوی صاحب سے ایک مستقل رشتہ استوار کرنے

کے آرزو مند تھے، ظاہر ہے اُن کے دلوں پہ غبار چھایا رہتا ہوگا جس کا وہ

بے شک مولوی صاحب کے سامنے اظہار نہیں کرتے تھے۔ مولوی صاحب کی خوش خلقی اور کم سخنی اُنھیں اُن کے سامنے کچھ کہنے سے روکے رکھتی تھی۔ تاہم پھانس تو چبھتی رہتی ہوگی۔ اچھے بُرے سبھی طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ کوئی زیادہ اثر لیتا ہے، کوئی کم۔ یہ غبار چھٹ جاتا، اگر مولوی صاحب کوئی ایک خاندان منتخب فرما لیتے۔"

"آپ سب ٹھیک بولتے ہو بڑے صاحب!" تجمل نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا "پر ہم کو یہ بتاؤ کہ مولوی صاحب کدھر چلے گئے؟"

"جناب!" منیر علی کے چہرے کا رنگ بدل گیا "آپ کیا فرما رہے ہیں؟"

"میں بولتا ہوں بڑے صاحب! مولوی صاحب خود سے نہیں گئے، خود سے جاتے تو اس طرح سے نہ جاتے۔ کوئی اُنھیں لے گیا ہے، پر کون لے جا سکتا ہے۔ آپ جانتے ہوں گے کہ کون اُنھیں لے جا سکتا ہے۔"

"جناب! جناب!" منیر علی لرزیدہ لہجے میں بولے "میں کیا۔۔۔ کیا جان سکتا ہوں یعنی یعنی کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں جانتا ہوں؟"

"دیکھو بڑے صاحب! بات بہت سیدھی ہے۔ آپ بولتے ہو کہ مولوی صاحب نے ہر ایک کو منع کر دیا تھا اور لوگ اُن کی اس بات پر خفا ہونے لگے تھے اور آپ بولتے ہو کہ مولوی صاحب ایک دم، اچانک چلے گئے۔ ایسی صورت میں اُن کو کون لے جا سکتا ہے، وہی لے جا سکتا ہے جو سب سے زیادہ خفا ہوگا اور وہ کون تھا، یہ آپ کو پتہ ہوگا۔ معاف کرنا، ہم کو کھل کے بتاؤ۔"

"صاحب! میرے بڑھاپے کا کچھ خیال کیجیے" منیر علی برگشتگی سے بولے۔

"بڑے صاحب! میں جو بولتا ہوں وہ آپ خوب سمجھتے ہو، میں کسی دوسری زبان میں نہیں بول رہا ہوں، مجھ کو زیادہ بات مت کرنے دو۔"

"بھائی! آپ غلط سمجھ رہے ہیں" منیر علی کی آواز بھرا گئی۔

"میں یہ نہیں بول رہا کہ وہ آپ ہی ہو یا آپ سب جانتے ہوئے بھی اَن جان ہو، پر آپ جو کچھ جانتے ہو، اُسے جاننا نہیں چاہتے۔ مجھ کو پتہ نہیں کہ ایسا کیوں ہے۔ ہو سکتا ہے، ایسا اس لیے کہ آپ گھبراتے ہو۔ آپ کسی بات سے گھبرا سکتے ہو۔"

منیر علی نے اپنی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لیا۔ اُن کے ہونٹ کانپنے لگے تھے۔ تجمل نے اُن کی طرف دیکھے بغیر بھاری آواز میں کہا "ہو سکتا ہے کہ آپ کو اپنے جاننے پر شبہ ہو اور آپ نے اپنی چُپ کے لیے اس شبہے کو سہارا بنا لیا ہو۔ آپ نے اپنے آپ کو اسی طرح تسلی دی ہوگی۔ اس کے سوا تیسری بات نہیں ہے۔ آپ کہتے ہو کہ جانے سے پہلے کوئی ایسا ویسا آدمی آپ نے مولوی صاحب کے پاس نہیں دیکھا۔ مولوی صاحب سب سے الگ تھلگ رہتے تھے اور آپ سے زیادہ اور کوئی اُن کے نزدیک نہیں تھا، اِدھر بات کرو تو اُدھر آ جاتی تھی۔ جن خاندان والوں کے پیام آئے، وہ سب آپ کو پتہ ہیں۔ مولوی صاحب نے اُن کا ذکر آپ سے بھی کیا ہوگا اور اپنے آپ جواب دینے کے بجائے آپ ہی سے کہلوایا ہوگا۔" منیر علی کچھ کہنے کے لیے مضطرب ہوئے مگر تجمل نے

اپنی بات جاری رکھی۔ "آپ بول لو گے کہ اگر مجھ کو پتہ ہوتا تو میں ان کی کھوج میں آدمی کیوں دوڑاتا۔ میں اُن کا مکان خالی کیوں رکھتا اور پولیس کو کیوں بلاتا۔ آپ نے اُن کی کھوج میں سب کچھ کیا، پَر ایک بات نہیں کی۔ آپ کو شاید چنگاری ڈالتے ہوئے ڈر لگتا تھا، آپ کو پتھر اپنے اُوپر واپس آنے کا خوف ہوگا اور جب بہت دن بیت گئے تب آپ کا شبہ پیلا پڑ گیا۔ بڑے صاحب! کانٹا دن بیتنے سے گھل نہیں جاتا، یہ تو آپ کے سینے میں اٹکا رہے گا۔ آپ سب سے چھپا سکتے ہو، پر اپنے آپ سے نہیں۔"

تجّل تھم کے بڑی جلانے لگا۔ منیر علی بُت کی طرح ساکت ہو گئے تھے اور ٹھٹھری ہوئی نظروں سے تجّل کو دیکھ رہے تھے۔ اُن کے جسم کا سارا خون جیسے چہرے پر سمٹ آیا تھا۔ "بڑے صاحب!" تجّل نے نیچے لہجے میں کہا۔ "آپ کے لیے ہمارے دل میں بہت عزت ہے۔ ہم آپ کے مہمان ہیں، آپ نے ہم کو مولوی صاحب کے نام پر اپنے گھر میں رکھا، ہم آپ کو مولوی صاحب ہی کا نام دیتے ہیں اور یہ بول دیں کہ ہمارا سینہ قبر کی طرح ہے۔ آپ کو ہم سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ بس ہم اتنا ہی بول سکتے ہیں جتنا، بڑے صاحب!"

"آپ سے میں کیا کہوں۔" منیر علی کی کپکپاتی آواز گونجی۔ "آپ ہی سوال کر رہے ہیں، آپ ہی جواب دے رہے ہیں، میرے کہنے کے لیے کیا اب بھی کچھ باقی رہ جاتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ مجھے کیا کہنا چاہیے۔ میں کسی پر الزام نہیں رکھ سکتا کیونکہ میں کچھ نہیں جانتا۔ بخدا میں نے اپنا وہم دُور کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا کوئی حاصل نہیں نکلا۔ آپ درست کہتے ہیں کہ میں اس نتیجے سے خود مطمئن نہیں ہوا مگر میں اپنی بساط کے مطابق یہی کر سکتا تھا۔ میں ہر وقت اللہ سے دعا کرتا رہتا تھا۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ دو بے ماں کی جوان بچیوں اور دو بچوں کا باپ ہوں۔ مجھے ارشد نے اور نازاں کر دیا ہے۔ زندگی بہت سنبھل سنبھل کے ٹک ٹک کے گزاری ہے۔ میں جانتا تھا کہ کوئی بات منہ سے نکالوں گا تو کوئی ہم نوائی نہیں کرے گا۔ سب کو اپنی عزت آبرو عزیز ہے۔ پھر میں کس بنیاد پر سر اُٹھا کے بات کرتا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے کچھ نہیں دیکھا تھا اور مجھے کسی جانب سے کوئی شہادت بھی نہیں ملی تھی۔ اس لیے میرا قیاس مجھی تک محدود رہا لیکن آپ یقین کریں اور یقین کرنے کی کیا بات ہے، آپ نے خود ہی کہہ دیا ہے، مجھے سکون نصیب نہیں ہوا۔ ایک اپنی بے سرو سامانی کا احساس، تھوڑی بہت بنی بنائی کا خیال اور پھر یقین کی فروتنی۔ یہی باتیں تھیں جنھوں نے مجھے باندھے رکھا ورنہ شاید ایسا نہ ہوتا اور مجھے آپ کے سامنے یوں شرمندہ نہ ہونا پڑتا۔"

"نہیں بڑے صاحب! ایسا مت بولو۔ ہم کو اندازہ ہے کہ ایسی بات ضرور ہوگی۔ ہر آدمی بندھا ہوا ہے۔ وہ اپنی رسیاں اتنی ہی کاٹ سکتا ہے جتنا یہ یقین ہوتا ہے کہ جسم چاقو سے بچا رہے گا۔ جہاں رسی تنگ ہونی شروع ہو، وہیں کاٹ دو تو آدمی کھلا رہتا ہے پر مکڑی رسی بُنتی رہتی ہے اور پتہ نہیں چلتا۔ پھر آدمی جالوں میں لپٹا ہوا ہی چلتا ہے۔ ہم آپ سے صفائی نہیں مانگ رہے ہیں۔

ہم جو جاننا چاہتے ہیں، وہ ہم کو بتاؤ۔"

"ہاں بھائی! ایک ذرا ٹھیریے۔ سمجھ میں نہیں آتا، کہاں سے ... تاہم میں آپ سے کچھ چھپاؤں گا نہیں۔ جس کانٹے کا آپ ذکر کر رہے ... سلسلے میں جو کچھ میرے علم میں ہے، آپ کے سامنے بیان کیے ... اللہ مجھے معاف کرے۔" منیر علی نے بیٹھک میں چاروں طرف دیکھتے ... لہجے میں کہا۔ "جیسا کہ میں آپ کو بتا چکا ہوں، نرجس بی بی کی خوشبو ... سکی۔ وہ ایک پھول ہی تھی، پھول کی خوشبو دیواروں کی پابند نہیں ... دُور تک گئی اور ایسی ایسی جگہوں سے بات آنے لگی جہاں کے لوگ ... سے واقف نہیں تھے اور مولوی صاحب بھی جن کے ہاں کبھی نہیں ... میں نہیں کہہ سکتا کہ نرجس کا ذکر ایک گھر سے دوسرے گھر میں، دوسرے ... تیسرے گھر میں کس طرح پہنچا۔ محلّے کی دو ایک تقریبات میں ... بہ مجبوری اُس کی شرکت پر آمادہ ہو گئے تھے، آمادہ نہ ہوتے تو لوگ ... کیا سمجھتے۔ اُن میں سے ایک تقریب تو انھی صاحب کے ہاں تھی ... مولوی صاحب شام کو کھاتا نویسی کا کام کرتے تھے۔"

کچھ لوگ تو مولوی صاحب کے انکار پر چُپ ہو گئے۔ کچھ ... کہا، سہ بارہ کہا۔ بعض نے انھیں دولت سے متاثر کرنا چاہا، بعض ... خاندانی امارت سے، القصہ یہاں تک پیش کش کی گئی کہ نرجس بی ... ایک محل بنوا دیا جائے گا اور حقِ مہر وہی ہوگا جو مولوی صاحب ... میں سوچتا تھا کہ مولوی صاحب کا پائے ثبات کبھی نہ کبھی ضرور ڈگ ... لیکن اُن کے ارادے میں جنبش نہیں ہوئی۔ میں نہیں کہہ سکتا، آپ ... سمجھیں۔" منیر علی کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ "آخری دنوں میں رانا صا ... خاں کا اصرار بڑھ گیا تھا۔ وہ ہر دوسرے تیسرے روز پیغام بھیج ... کہیں دُور جا کے میری بھی اُن سے کوئی قرابت نکلتی ہوگی لیکن ... آنا جانا بس شادی و غمی تک محدود ہے۔ وہ بہت بڑے آدمی ... میں رسوخ ہے۔ بہت بڑی حویلی میں رہتے ہیں۔ با اثر، صا ... لوگوں میں اُٹھتے بیٹھتے ہیں۔ نوکر، چاکر، زمینیں، گاؤں، جاگیر ... کارخانوں میں کچھ حصے، سب کچھ اُن کے پاس ہے اور بڑے ... آفتاب خاں کے انتقال کے بعد سارا کچھ انھی کے ہاتھ میں ... خون ہے، عمر ایسی بھی نہیں، دو بیویاں ہیں اور دونوں صاحب ... کی طرف سے جب نرجس کے لیے رشتہ آیا تو مجھے بھی حیرت ... معلوم تھا لیکن میں نے مولوی صاحب سے ذکر کر دیا اور بہت ... پیغام بر کو جواب دے دیا۔ رانا صاحب نے دوبارہ قاصد بھیجا ... کا ایک انبار، کئی طشت جوڑوں، زیوروں اور نقدی پر مشتمل ... دوبارہ جواب دے دیا۔ انھوں نے ان قیمتی تحائف کی طرف ... نے پھر معذرت چاہ لی لیکن یہ سلسلہ چلتا رہا۔ رانا صاحب قاص ... پہ ہرکارے بھیجتے رہے اور میں انھیں واپس کرتا رہا۔ کئی بار ...

... سے ذکر بھی نہیں کیا کہ اُدھر سے اتنے شدید تقاضے ہو رہے ہیں۔ ... تا تو وہ خواہ مخواہ پریشان ہوتے۔ ممکن ہے رانا صاحب نے براہِ راست ... کسی ذریعے سے بھی اُن تک بات پہنچائی ہو مگر مولوی صاحب نے وہی ... دیا ہوگا جو اُن کی طرف سے میں دیتا رہا تھا۔ رانا صاحب کی تربیت ... ماحول میں ہوئی ہے، اُس کا مجھے بخوبی علم ہے۔ انھوں نے آنکھیں کھولیں ... خدمت گاروں کو اپنے اِرد گرد دیکھا۔ رانا صاحب شاہد باز آدمی ہیں۔ ... آبا کے جو مشاغل تھے، وہ انھیں ورثے میں ملے ہیں چنانچہ انھوں نے ... ش کش بھی کی کہ وہ اپنی دونوں بیویوں کو طلاق دے دیں گے، میں نے ... کیا کہ وہ ہمیں زیادہ شرمندہ نہ کریں، اگر ایسا کوئی ارادہ ہوتا تو پس و پیش ... جاتا، پھر میں نے مولوی صاحب کی اجازت کے بغیر یہاں تک کہہ دیا ... کی منسوب ہو چکی ہے۔ رانا صاحب چند دنوں تک خاموش رہے مگر ... ن کا اصرار بڑھ گیا اور اُس میں کچھ تلخی کی بھی آمیزش ہو گئی۔ مجھے احساس ... رانا صاحب کو یہ انکار شاق گزرتا ہوگا چنانچہ میں ہر بار نہایت عاجزی ... ساتھ قاصد سے معذرت کرتا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ کچھ مجبوریاں مانع ہیں، ... پیام لے کے آیا کہ مجبوریاں کیا ہیں، بتائی جائیں، رانا صاحب ہر مجبوری ... کرنے کی کوشش کریں گے۔ میں نے عذر کیا کہ بعض ناگفتنی باتیں ہیں ورنہ ... رانا صاحب جیسے ذی حیثیت اور رتبہ دار شخص سے رشتہ قائم کرنا پسند ... کرے گا، کسی بھی خاندان کے لیے یہ تعلق باعثِ عزت ہے۔ یہ میں ... اس لیے کہا کہ رانا صاحب اپنی ذات اور شخصیت کی ہتک نہ سمجھیں۔ میں ... قاصد سے یہاں تک کہا کہ میں اپنی بچی زہرہ کا رشتہ کرنے کو تیار ہوں، ... حسنِ صورت اور حسنِ سیرت میں یکتا ہے۔ کہنے کے لیے میرے پاس ... سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ پھر اتنا ضرور ہوا کہ رانا صاحب کے پیاموں کی ... ت میں کمی آ گئی لیکن محض ایک مختصر مدت کے لیے۔ اس کے بعد قاصد ... بارہ پھیرے شروع کر دیے اور وہی اصرار و انکار کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مولوی ... کے جانے سے کوئی دو ماہ پہلے کی بات ہے، پیام بر نے میرا حتمی ... ن کے میرے پاس آنا بند کر دیا تھا۔ ہاں مولوی صاحب کے پاس کوئی ... آیا ہو، بس یہیں تک کی بات ہے بھائی! رانا صاحب کی پہنچ دُور ... اور اُن سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔ مقدر آ جائیں تو کچھ بھی کر سکتے ہیں، ... اروں مصاحبوں اور شورہ پُشتوں کا اُن کے ہاں سے وظیفہ جاری ہے۔ ... سے بہت سے اُن کے اثر و رسوخ کا تجربہ کر چکے ہیں، چنانچہ لوگ ... بھی رانا صاحب سے متعلق کسی معاملے میں رائے زنی سے احتیاط ... ہیں۔ ظاہر ہے، اچھے تجربے نہیں ہوئے ہوں گے۔ بس جناب!" منیر علی ... سانس لے کے بولے۔ "یہی حالات تھے جو میں نے آپ کے سامنے ... دیے۔ اب غیب کا حال اللہ کو معلوم۔"

تجّل گردن جھکائے گُنگ بیٹھا تھا۔ منیر علی نے بات ختم کی تو اُس ... بھاری سر اُٹھایا۔ اُس کی آنکھوں میں سُرخ ڈورے پڑے ہوئے تھے۔

دیر تک سکوت چھایا رہا۔ منیر علی کبھی مجھے دیکھتے، کبھی تجّل کو۔ وہ تجّل کے منہ سے کچھ سُننے کے لیے مضطرب نظر آ رہے تھے مگر تجّل خاموش رہا۔ وہ شکستہ لہجے میں بولے۔ "آپ نے توجہ دی؟"

تجّل نے آہستگی سے ہنکاری بھری۔ منیر علی زیرِ لب مولوی صاحب اور کورا کے لیے دعائیں مانگنے لگے کہ خدا انھیں اپنی امان میں رکھے۔ عصر کی اذان ہو رہی تھی، وہ اُٹھنا نہیں چاہتے تھے لیکن مسجد سے انھیں آدمی پوچھنے آ گیا۔ وہ ہم سے اجازت لے کے چلے گئے۔ اندھیرا دھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا۔ ملازم نے آ کے لالٹین جلا دی۔ تجّل پلنگ سے نہیں اُٹھا۔ میں نے باہر جانا چاہا تو اُس نے مجھے بھی سختی سے روک دیا۔

منیر علی رات کے کھانے ہی پر بیٹھک میں آئے۔ مختلف کھانے تھے لیکن کسی سے کھایا نہیں گیا۔ منیر علی نے دوپہر کی طرح ہم سے بے تکلفی کے ساتھ کھانے کے لیے اصرار بھی نہیں کیا۔ ہم گُم سُم سے نوالے منہ میں رکھتے رہے۔ کھانے کے دوران محلّے کے چند لوگ آ گئے تھے۔ تجّل نے کھانے کے بعد عذر کر دیا کہ اُس کی طبیعت سُست ہے۔ آنے والے لوگ اُسے آرام کا مشورہ دے کے جلد ہی رخصت ہو گئے۔ منیر علی نے بھی تجّل کا عذر سُن لیا تھا۔ وہ فوراً اندر جا کے ایک پلیٹ میں آملے کا مُربّا لے آئے۔ "سونے سے کچھ دیر پہلے اسے کھا لیجیے گا۔ انشاءاللہ افاقہ ہوگا۔" انھوں نے دبی زبان میں تجّل کو تاکید کی۔ تجّل نے تھوڑا مُربّا مجھے دیا، باقی اُسی وقت خود کھا لیا۔ منیر علی نے اندر سے بیٹھک کی کنڈی لگا دی اور لالٹین کی لَو دھیمی کر دی۔

تجّل اُن کی موجودگی ہی میں چادر تان کے منہ ڈھانپ کے لیٹ گیا تھا۔ میں نے بھی آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی لیکن ایسا لگا جیسے میری سانس بند ہو جائے گی۔ میری رگوں میں مروڑ ہو رہی تھی۔ کوئی زور زور سے سینہ دبا رہا تھا۔ میں نے شام سے اب تک کا وقت نہ جانے کس طرح کاٹا تھا۔ ایک بار میرے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ شاید تجّل ہی نے منیر علی سے کہا ہے کہ مجھے یہ سب کچھ سُنایا جائے اور شاید اسی لیے تجّل نے یہاں ٹھیرنے کا ارادہ کیا تھا۔ ممکن ہے اُس کے اور منیر علی کے درمیان ساز باز ہو چکی ہو اور وہ مجھے یہ باور کرانے کی فکر میں ہو کہ اب اُس کی تلاش بے سود ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میری نظروں میں اُس کی تصویر دُھندلی پڑ جائے گی، اُس کا رُتبہ کم ہو جائے گا۔

ایسی بے سروپا باتیں ہر وقت میرے ذہن میں کلبلاتی رہتی تھیں۔ مجھے ہر آدمی پر شک ہو جاتا تھا کہ وہ کورا کے بارے میں ضرور کچھ جانتا ہے اور مجھ سے جھوٹ بول رہا ہے۔ میں منیر علی اور تجّل کے درمیان ہر لمحے موجود رہا تھا۔ اُس کے بال اب بھی میری جیب میں تھے۔ میں نے اُس کے کپڑوں میں اُس کی خوشبو سونگھی تھی۔ کئی بار مجھے یہ گمان بھی ہوا تھا کہ کورا گھر کے اندر ہی موجود ہے اور منیر علی نے مولوی صاحب کے جانے کی ایک فرضی داستان ہمیں سُنا دی ہے یا تجّل نے فیض آباد سے روانہ ہونے سے پہلے ہی کسی آدمی کو چپکے سے یہاں بھیج کے ایک شخص منیر علی کو ہموار کیا ہے کہ ہم دُور دراز کے سفر کے بعد مسلسل پہنچیں

تو اتفاقاً اُس سے ملاقات ہو اور وہ میرے سامنے ایسا واقعہ بیان کر دے۔ کچھ ہی دیر بعد میرا ذہن اپنے آپ ان خیالوں کی نفی کر دیتا تھا اور میرا دل کرتا تھا کہ میں اپنے منہ پر زور زور سے طمانچے ماروں۔

بار بار میرے سینے میں ہوک اُٹھتی تھی۔ میں یہاں بیٹھا ہوا کیا کر رہا ہوں ممکن ہے، وہ جیسلمیر ہی میں ہو اور رانا نے اُسے سب کی نظروں سے چھپا رکھا ہو کسی محل میں بند کر رکھا ہو۔ وہ جیسلمیر یا قریب ہی کے کسی علاقے میں ہو سکتی ہے۔ یہ خیال آتے ہی میرے جسم میں آگ بھڑکنے لگتی تھی، نہ جانے اُس پر کیا گزر رہی ہو۔ مجھے یقین تھا کہ رات کو جب خاموشی چھا جائے گی اور منیر علی سونے کے لیے چلے جائیں گے تو تجھل مجھ سے چلنے کو کہے گا، اسی لیے اُس نے بیٹھک میں آنے والوں سے طبیعت کی ناسازی کا کہہ کے انھیں جلد ہی جانے پہ مجبور کر دیا ہے۔ وہ آج کہیں سے کسی ذریعے سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے گا کہ اب وہ کہاں ہے؟ اُسے رانا کے آدمی لے گئے ہیں یا کوئی اور؟ لیکن تجھل تو آرام سے بستر پہ لیٹا ہوا تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ اُسے احساس ہی نہیں تھا کہ مجھے ایک ایک لمحہ گزارنا دوبھر ہو رہا ہے۔ اُسے تو اُسی وقت اُٹھ جانا چاہیے تھا جب منیر علی نے اپنی بات ختم کی تھی۔ جب بہت رات بیت گئی اور تجھل کے جسم میں جنبش نہیں ہوئی تو میں بستر سے اُٹھ گیا۔ پہلے میں نے ایڑیوں کے بل بیٹھک میں چل کے دیکھا، پھر دروازے کے پاس جا کے کنڈی کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ابھی میرا ہاتھ کنڈی تک پہنچا بھی نہیں تھا کہ تجھل کی آواز گونجی۔ "اتنی رات گئے کہاں جائے گا رے! سویرا ہونے دے۔"

وہ جاگ رہا تھا۔

"اٹھو، چلو۔" میں نے غصے سے کہا۔

"پر کدھر لاڈلے؟"

"کدھر جا سکتے ہیں، یہاں سے تو اُٹھو۔ کہیں بھی چلیں گے۔"

"نئی جگہ ہے بابرے! گلی کے کتے نہیں پہچانتے۔"

"تمھیں اب کتوں کی فکر ہونے لگی۔ تم یہیں بیٹھے رہو، مجھے جانے دو۔"

"راستہ پوچھے بنا جائے گا؟"

"ہاں تمھارے خیال میں ابھی راستے کا پتہ کرنا بھی باقی ہے۔" میں نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ بڑے صاحب کی باتیں میں نے بھی سُنی تھیں۔ میں اب یہاں ایک پل بھی نہیں رہ سکتا۔"

"بیٹھ جا۔ تُو تو سویرے ہی یہاں سے جانے کو کہتا تھا۔ ہم نکل لیے ہوتے تو کیا ہوتا؟ بیٹھ جا لاڈلے! سر گردن ہی پہ رہنے دے۔" وہ درشتی سے بولا۔ "ایک رات گزرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔"

"ایک لمحہ گزرنے سے بہت کچھ ہو جاتا ہے۔ میں جیل سے نکلنے کے بعد تمھارے پاس نہ آتا اور بمبئی میں کرشنا جی نہ ملتے تو شاید میں کب کا یہاں پہنچ گیا ہوتا۔ پھر یہ وقت آسکتا تھا؟"

"پر جو بیت گیا وہ تیری اگر مگر سے واپس نہیں آجائے گا۔"

"تمھیں ہو کیا گیا ہے؟" میں نے وحشت سے کہا۔ "تم تو باتیں بنا ہو، تمھیں تو آرام سوجھ رہا ہے۔"

"طعنے مت دے۔ آرام کون کر رہا ہے۔"

"اور کیا کر رہے ہو۔ پتہ نہیں تم کیا کیا سوچ رہے ہو۔ تمھارا چاقو ہے؟ لگتا ہے اُسے بھی زنگ لگ گیا ہے لیکن میرے چاقو کی دھا کھٹل نہیں ہوئی ہے۔"

"ہاں، چاقو کی بات تو تُو مجھی سے کرے گا رے! صاف صاف کیوں نہیں دیتا گھما پھرا کے بات کیا کرتا ہے۔"

"مجھ سے اس وقت سوال جواب مت کرو۔ نہ جانے میرے اور کیا نکل جائے، میں تم سے یہ کہنا نہیں چاہتا تھا۔"

"تیرا خُوب ہے سیاں! چٹ پٹ سب تیری ہے ساتھ کیا کر کہ آدمی سہار لے۔"

"غنیمت ہو تم تو بات پکڑ لیتے ہو۔"

"لاڈلے! میں نے تجھ سے یہ بھی تو بولا تھا کہ ہر چیز چاقو سے جا سکتی۔ تیرے دماغ میں ہر گھڑی ہتھیار کیوں رہتا ہے۔ کبھی اس سے کے بھی سوچ لیا کر شیرِ ببر! بیٹھ جا، کھڑا کیوں ہے۔"

میں نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا اور بستر پہ اوندھا میرے بستر ہی پہ چلا آیا اور میرے بالوں میں اُنگلیاں پھیرنے لگا۔ میں پھوٹ کے رونے لگا۔ "تُو نے کوئی نئی بات نہیں سُنی ہے رے! تو تیرے کان ہر بات سُننے کے عادی ہو جانے چاہئیں۔ تجھ سے کے بعد اُن پر کچھ بھی بیت سکتا تھا اور اگر تجھے کوئی اور خبر سُننے یہ سمجھ لے دادا کہ تو ابھی جیل ہی میں ہے۔ جیل میں بھی تو تُو نے بتائے تھے۔"

"مگر وہ جیل تھی۔"

"ابے! صرف ایک دیوار کا فرق ہے۔ پہرے دار اب ہیں، جیل کا قانون جیل کے باہر بھی لاگو ہے۔ اُدھر لوہے کی بیڑ ہیں، اِدھر کانچ کی۔ بس سمجھ کا پھیر ہے رے! ذرا اُس بوڑھے آدمی کو دھیان دے جس کے گھر میں تُو ٹھیرا ہوا ہے۔ تُو نے دیکھا نہیں کہ زبان اٹک رہی ہے، ہاتھ پیر اٹک رہے ہیں لاڈلے! میں انھیں کیا تو یہ سب کچھ جان لیتا؟ اوپر اوپر دیکھ کے چلے گا تو پیر ٹوٹ ٹوٹے ہوئے پیر سے کتنی دُور جائے گا پگلے! کیا ہم یہاں سے سید چلے جاتے جہاں تیرا جانے کا ارادہ ہے۔ اس بوڑھے آدمی کو مارنا پہلے چاقو سے اُس سمیت سارا گھر کاٹ کے جا۔ میرے چاقو کی د ہو گئی ہے پر اب بھی ہڈی تک اُتر سکتی ہے، میں بھی تیرا ساتھ دو اتنا بڑا سر ہے تیرا۔ یہ اتنی ننھی سی بات تیری سمجھ میں نہیں آتی۔"

"میری سمجھ میں سب باتیں آتی ہیں مگر میں کیا کروں....!"

میں نے چیخ کر کہا۔ میری آواز سناٹے میں دُور دُور گئی ہوگی، اندر منیر علی نے بھی سُنی ہوگی۔ "ٹھیک ہے۔ میں کہیں نہیں جا رہا، تم جا کے سو جاؤ۔ اب میں کچھ نہیں بولوں گا، کچھ نہیں کہوں گا۔" لیکن ساری رات وہ میرے بستر ہی پر بیٹھا رہا۔ مجھے جب بھی اُس کا خیال آتا، میری سسکیاں نکل جاتیں۔ رات کے آخری حصّے میں مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔

صبح ناشتے کے بعد وہ مجھے ساتھ لے کے باہر نکل آیا۔ منیر علی سے اُس نے کہہ دیا تھا کہ وہ دوپہر کے کھانے پہ ہمارا انتظار نہ کریں۔ منیر علی نے پیش دستی کیا اور ہمارے ساتھ چلنے کی خواہش ظاہر کی مگر تجھل کو نا آمادہ دیکھ کے وہ چپ ہو گئے۔ ہم محلّے کی گلیوں سے گزرے تو منیر علی کے دو ایک شناسا مل گئے اور کچھ دُور تک ہمارے ساتھ چلتے رہے۔ وہ ہماری رہبری کے خواہش مند تھے۔ تجھل نے بڑی مشکل سے اُن سے چھٹکارا حاصل کیا۔ سبزی منڈی سے نکل کے ہم شہر کے خاص بازار میں آ گئے۔ دکانیں کُھل رہی تھیں اور سڑکوں پر لوگوں کی تعداد میں رفتہ رفتہ اضافہ ہو رہا تھا۔ جیسلمیر کوئی بڑا شہر نہیں تھا۔ دو تین گھنٹے میں ہم نے شہر کا خاصا فاصلہ طے کر لیا اور گنجان آبادیوں سے گزرتے ہوئے ایک نسبتہً کم آباد علاقے میں آ گئے۔ تجھل پرچون کی ایک دکان پر ٹھیر گیا۔ وہاں دھوتی باندھے ہوئے ایک دُبلا پتلا شخص پٹھلے پر پلتھا مارے بیٹھا تھا اور پلی سے ڈبّے میں سرسوں کا تیل ڈال رہا تھا۔ جیسے ہی گاہک دکان سے ہٹا، تجھل نے اُس کے پاس جا کے پوچھا کہ کیا وہ ریاست ٹونک سے آئے ہوئے ایک شخص عالم خاں کو جانتا ہے۔ دکان دار نے لاعلمی ظاہر کی اور بولا۔ "کدھر کا پتہ بتایا ہے؟"

"پتہ ہم کو معلوم نہیں ہے، پر ادھر ہی کہیں بولا تھا۔" تجھل نے کہا۔ "وہ یہاں کسی بڑے رئیس یا نواب کے ہاں کام کرتا ہے۔ اُسے یہاں آئے ہوئے دن ہو گئے ہیں۔"

"کون سا رئیس؟" دکان دار بے دلی سے بولا۔ "ادھر کوئی ایک دو رئیس لوگ تو نہیں رہتے، جب تک پورا نام پتہ نہ ہو، ہم کیا بولیں۔"

"اُس کا نام کچھ رانا وانا سے شروع ہوتا ہے۔"

یہ سُن کے دکان والا کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی لیکن وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ "ادھر رانا، راؤ بھی بہت ہیں۔ پورا نام بولو۔"

"ہم کو بتایا تھا کہ اُس کی بہت بڑی حویلی ہے۔"

"رانا شمشیر علی خاں، رانا مہتاب خاں، رانا....."

تجھل نے ہاتھ اُٹھا کے اُسے روک دیا اور اُن دونوں کے پتے پوچھ لیے۔ چلتے چلتے دکان دار نے ہمیں مشورہ دیا کہ پہلے ہم رانا مہتاب خاں کی طرف جائیں کیونکہ وہاں نوکر چاکر بہت ہیں اور اُس کی حویلی بھی دُور نہیں ہے، شاید وہیں سے ہمیں ہمارے مطلوبہ آدمی کا پتہ چل جائے۔

پتہ مشکل نہیں تھا۔ ہم نے دکان دار کے بتائے ہوئے راستے پر کوس بھر کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ سامنے پتھروں سے کھنچی ہوئی ایک چار دیواری نظر آئی۔ وہ کسی قلعے کی فصیل سے مشابہ تھی۔ اندر درمیان میں واقع عمارت کی بالائی منزل کی محرابیں، بارہ دری اور شہ نشین دُور سے صاف دکھائی دیتی تھیں۔ چار دیواری کے سامنے کا اور بائیں طرف کا بڑا حصہ خالی پڑا تھا۔ دائیں طرف کچے پکے مکانوں، جھونپڑیوں اور مویشیوں کے باڑے پر مشتمل ایک چھوٹا سا محلّہ تھا۔ وسط میں لکڑی کا بنا ہوا ایک قدِ آدم دروازہ تھا، اُس پر پیتل کے نوکیلے، سینگ نما مُٹھا اور کڑے نصب تھے اور اُس میں سے ہاتھی بہ آسانی گزر سکتا تھا۔ وہاں سروں پہ پیلی پگڑیاں اور کمر سے سفید پٹکے باندھے، تلوار لٹکائے کئی آدمی موجود تھے۔ وہ یقیناً پہرے دار ہوں گے۔ دروازے کے دونوں پٹ کُھلے ہوئے تھے اور اُس کے دونوں جانب کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ کُھلے ہوئے پٹوں سے اندر باغ اور عمارت کے ایک حصّے کی صرف جھلک نظر آسکتی تھی۔ لوگ کسی روک ٹوک کے بغیر اندر باہر آ جا رہے تھے۔ باہر کی طرح اندر بھی چہل پہل تھی۔ باہر دروازے سے ملی ہوئی سبیل کے گرد فقیروں اور معذوروں کی ایک ٹولی قطار سے بیٹھی ہوئی تھی۔ ہم نے دُور دُور رہ کے چار دیواری کا چکر لگایا۔ چار دیواری زیادہ بڑے علاقے کا احاطہ نہیں کرتی تھی لیکن اُس کی دیواریں خاصی اونچی تھیں۔ کہیں کہیں درمیان میں چھوٹے بڑے دروازے تھے، اُن میں سے بیشتر بند تھے۔ بڑے دروازے کے بالمقابل پشت پہ اُس جیسا ایک اور دروازہ تھا جو شاید مہینوں سے کھولا نہیں گیا تھا۔ تجھل نہ فصیل کے قریب گیا، نہ وہاں کسی آدمی سے اُس نے کوئی بات کی بلکہ تھوڑی ہی دیر بعد وہ عمارت سے دُور ہوتا گیا۔ ہم واپس بڑے بازار میں آ گئے۔ میں نے تہیّہ کر لیا تھا کہ اب اُس سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔ وہ بھی تمام راستے مجھ سے نہیں بولا۔ بازار کے قریب کا تمام علاقہ گنجان تھا۔ ہم ملحقہ گلیوں اور سڑکوں سے گزرتے ہوئے بازار کے اختتام پر ایک ہوٹل میں داخل ہو گئے۔ ہوٹل میں کم ہی لوگ تھے۔ اگلے حصّے میں ایک بڑے سے چبوترے پہ پراٹھے پکائے جا رہے تھے اور چولھوں پہ بہت سی دیگچیاں چڑھی ہوئی تھیں۔ ہوٹل کی دیواریں پیلی تھیں اور اُس پہ بیل بوٹے، شیر اور ہرنوں کی تصویریں بنائی گئی تھیں۔ لمبی لمبی بینچوں کے ساتھ اِس سرے سے اُس سرے تک اسکول کی ڈیسکوں کی طرح میزیں لگی ہوئی تھیں۔ تیز ریکارڈوں کا شور اندر گونج رہا تھا۔ تجھل ایک کونے میں جا کے بیٹھ گیا۔ چند لمحوں بعد بیرے نے کھانے کی فہرست بتا کے ہم سے کھانے کے لیے پوچھا۔ تجھل نے ہاتھ جھٹک کے کہا۔ "کچھ بھی لے آ۔"

بیرا کھڑا رہا اور آنکھیں چڑھا کے بولا۔ "بولو کیا کھاؤ گے؟"

"دو آدمیوں کا کھانا لے آ۔" تجھل نے اونچی آواز میں کہا۔

تجھل کی آواز پہ ہوٹل میں بیٹھے ہوئے دوسرے لوگ بھی متوجہ ہو گئے تھے۔ بیرا بڑبڑانے لگا اور وہیں سے چیخ کے بولا۔ "خُدّن! ادھر دنیا نچھی بیٹھا ہے، نچھی کو نچھی کھلا، دو پلیٹ اسپیشل اسپیل کو آگ دکھا دے۔" تمام لوگ ہنسنے لگے۔ تجھل نے اُن کی طرف دھیان نہیں دیا۔ وہ دوسرے کونے میں بیٹھے ہوئے ایک ادھیڑ عمر شخص کو گھور رہا تھا۔ اُس شخص کی مونچھیں اُوپر اُٹھی ہوئی تھیں۔

نچلا ہونٹ کسی قدر باہر نکلا ہوا تھا، قد درمیانہ، سینہ چوڑا اور رنگ مٹیالا تھا۔ گالوں کی ہڈیاں اُبھری ہوئی تھیں۔ کان بڑے تھے اور سر پہ چھوٹے چھوٹے بال تھے۔ وہ سب سے الگ تھلگ بیٹھا تھا، چائے کا ایک خالی گلاس اُس کے آگے رکھا تھا۔ تجمل نے اُس کی طرف دیکھا تو اُس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔ دفعتہً تجمل نے اُسے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ پہلے وہ جھجکا لیکن تجمل کا اشارہ واضح تھا۔ اُس کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ وہ تیزی سے اُٹھا اور اپنے دونوں ہاتھ کولھے پر رکھے، سینہ آگے کرتا، کش لگاتا ہوا ہمارے پاس آ کے کھڑا ہو گیا۔ "کیا ہے جی!" اُس نے منہ بنا کے پوچھا۔

"منہ کو ٹھیک کر۔" تجمل نے ترشی سے کہا۔ "بیٹھ جا۔"

"کیا بات ہے۔" وہ نخوت سے بولا اور بینچ پہ تجمل کے بیٹھ گیا۔ اُس کا ایک ہاتھ جیب میں چلا گیا تھا۔ وہ پوری طرح چوکنا تھا۔

"ہاتھ باہر نکال لے، اِدھر دھندا کیسا ہے؟" تجمل نے پوچھا۔

"دھندا؟ کیسا دھندا؟" وہ چونک کے بولا

"اپنے دھندا کیسا ہوتا ہے جڑی مار!"

"کون ہو تم؟" اُس کا چہرہ بگڑ گیا۔

"تجھ کو کیا دکھائی پڑتا ہے۔"

"مجھ کو مجھ کو اٹھائی گیرے لگتے ہو۔"

"تو نے ٹھیک جانا، مُردار نہیں ہے۔"

"کام بولو۔"

"اِدھر اجنبی ہیں، دُور سے آئے ہیں۔"

"تو ایسا بولو۔" وہ اپنے پیلے دانت نکال کے بولا۔ "کدھر سے آ رہے ہو؟"

"دلّی سے!"

"دلّی سے۔" وہ اُچھل کے بولا۔ "اُدھر سے اِدھر! یہ تو مرگھٹ ہے۔" اُس نے گالی دے کے کہا۔ "اِدھر دھندا کدھر ہے، یہ تو ریاست ہے بابا! دھندے کا مزا تو اُدھر اجمیر یا دہی ہے۔ اجمیر میں بہت سکھ سے تھا پر مجبوری سالی اس نامراد جگہ لے آئی، اِدھر ریت ہی ریت ہے۔"

"اپنی بھی مجبوری ہے۔"

"ٹھیک ہے پھر اِدھر ہی رہو، پچھتاؤ گے۔"

"اِدھر اور کون کون ہے؟"

اس طرف تو ہم ہی ہے، اُس طرف آٹھ دس پکھیرو خاک چھانتے پھرتے ہیں۔ ہم نے تم سے بولا نہیں، اِدھر اُس طرف جیسا نقشہ نہیں ہے، سب سُسرے آپس میں کٹتے مرتے پھرتے ہیں، ایک دُوسرے کا حق مارتے ہیں۔"

"کہاں بیٹھتے ہو؟"

"بیٹھنے سے تمہارا مطلب ہے مل بیٹھنے کا؟"

"ہاں! تم نے کوئی پاڑا نہیں بنایا؟"

"پاڑا!" وہ ہنسنے لگا۔ "اِدھر تو صرف جانور کا پاڑا بن سکتا ہے۔ اِدھر مال ہی نہیں ہے لوگوں کے پلّے! بس ایک پرتھو ہے، اُس کے پانچ چھ چھوکرے ہیں۔ سالے بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔ ہاتھ ایک اچکّے۔ دیواریں پھاندنے کے سوا ڈھنگ کا کوئی کام نہیں آتا۔ پاڑا اِدھر کیسے چلے گا، جو بھی ذرا اونچا اُٹھتا ہے، راجا لوگ اپنے تھان سے باندھ لیتے ہیں اور وہ اُوپر جا کے اپنے ہی آدمی کا گلا کاٹتا ہے۔ راجا لوگوں کے یہاں جو گیا، وہ سدا کے لیے دھندے سے گیا، بیٹھ سے گیا۔ اُسے پھر دھندے کی ضرورت بھی کیا پڑی ہے۔ مفت میں عیش ملتا ہے۔ اپنے کو بھی اِدھر راجا داس دیو نے بولا تھا کہ تم ہمارے اصطبل میں جگالی کرو، ہم نے صاف ناں کر دی اور اُس کے سامنے تو نہیں، پیچھے میں کہا، پتا ڈال کے کھانے سے کھلا بھوکا رہنا ٹھیک ہے۔"

"یہ راجا لوگ ان سے کیا کام لیتے ہیں؟"

"راجا لوگوں کی چاکری!" وہ کان پہ ہاتھ رکھ کے بولا۔ "مرغا بنانے ہیں، مُرغا لڑاتے ہیں۔ راجا لوگوں میں بھی ایکا نہیں۔ ایک دوسرے سے خار کھاتے ہیں اور ان پالتوؤں کو بھونکنے کاٹنے کے لیے بھیج دیتے ہیں اور بھاڑ ہولی کھیل کے آ جاتے ہیں، کبھی جو جیت گئے، کبھی ہار گئے۔ اِدھر اُدھر دونوں طرف سے یہی لوگ مرتے ہیں۔ جہاں راجا لوگوں کو ٹیڑھ نظر آتی ہے، وہیں ان کو چابک مار کے دوڑا دیا جاتا ہے۔ سالے بھڑوے ہیں، چھوکری اُٹھا کے مالک کے لیے لاتے ہیں اور جس کو مالک بولتا ہے، قتل کر دیتے ہیں۔ مت پوچھو بابا! اِدھر کیسا کیسا کھیل ہوتا ہے۔ راجا جیل میں جانے والے کے گھر میں کچھ دانہ ڈال دیتا ہے اور کام کی جورو بہنیں گھر میں رکھ لیتا ہے۔ ہم کیا کیا کہانی بتائیں۔ اِدھر ایک سے ایک راجا نواب، مائی کا لال پڑا ہے۔ ہم اِدھر کے دیکھے بھالے نہ ہوتے تو اِدھر ان کے جال میں ضرور آ جاتے، پر سُر لگا کے آئے تھے۔" بیرے نے پلیٹوں میں بھنی ہوئی مرغیاں لا کے رکھ دی تھیں۔ تجمل نے اُسے بھی کھانے میں شریک کر لیا، اُس نے تکلف نہیں کیا۔ کھانے کے دوران بھی وہ باتیں اور تجمل ہوں ہاں کرتا رہا۔

"اب ہم اِدھر آ گئے ہیں۔" تجمل نے سَر اُٹھا کے کہا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے بابا! تم آ گئے ہو، یہ تو ہم بھی دیکھ رہے ہیں کہ تم آ گئے ہو، ہم اپنی بات نہیں بولتے۔ دو ایک آدمی کم زیادہ ہونے سے اِن کا کچھ نہیں جاتا لیکن وہ اُدھر جو اپنی ماں کے دشمن کھونٹے کھونٹے پھن پھیلائے بیٹھے ہیں! وہ رہتے اندر ہیں، پر ایک آنکھ اندر، ایک باہر رکھتے ہیں اور جو باہر کھلے ہوئے ہیں، وہ بھی اُن کی ہنڈیا چاٹنے کے لیے زبان نکالے پیچھے پیچھے لگے رہتے ہیں، ہڈی مل ہی جاتی ہے۔ یہ دم چھلّے شہر کی منڈی تیزی کی پل پل کی بات اُن کے کانوں میں ٹانکتے ہیں۔ ابھی اپنے کو ہی لے لو، چھ برس بعد اِدھر لوٹے تو سب نے طوطے کا جھوٹا کھایا ہوا تھا، سب کی آنکھوں میں طوطا مُوت گیا تھا۔ حرامیوں نے بہت آنکھ مٹکّا کرائی لیکن جوالا! بازار والوں سے جا کے پوچھو، جوالا ایک چھدام پیچھے نہیں کھسکا، سالے سمجھتے تھے، ہم اُدھر خالی بیٹھے ہوں گے۔" وہ منہ میں کلی کر کے اُسے پی گیا۔ ہمیں پہلی بار معلوم ہوا کہ اُس کا نام جوالا ہے۔ وہ بہت تیز تیز بول رہا تھا جیسے ہم بہت دنوں بعد اُسے دوبارہ ملے ہوں۔ تجمل نے اُسے اپنا نام دلن اور میرا بھورا بتایا۔ ہوٹل کے تقریباً تمام آدمی کن انکھیوں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ ریکارڈوں کے شور سے ہماری آواز اُن تک نہیں پہنچ رہی ہو گی لیکن وہ سب کان لگائے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ بیرا پلیٹیں اُٹھانے آ گیا تھا اور میں نے دیکھ لیا تھا، اُس نے ہم سے نظریں بچا کے جوالا کو آنکھ ماری ہے۔ جوالا نے اُسے جھڑک دیا۔ "آنکھ پھوٹ گئی تیری۔ گھاس چرتے چرتے آدمی کی پہچان بھول گیا۔ سمجھا ہم دب گئے، ہمارا باپ بنے گا۔" بیرے نے ہونٹ سکوڑے ہی تھے کہ جوالا نے اُس کے ہاتھوں میں رکھی ہوئی پلیٹوں پہ ہاتھ مار دیا۔ زور کا چھناکا ہوا۔ ہوٹل کا مالک دروازے کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اپنی چوکی سے اُٹھ کے بھاگا ہوا ہمارے پاس آیا اور جوالا کے شانے تھپ تھپانے لگا لیکن جوالا نے شانے جھٹک کے اُسے دُور کر دیا۔ "ایک دن ہم دونوں کو فرائی کر دیں گے۔" وہ گرجتا ہوا بولا۔ "سالے آدمی نہیں دیکھتے، تمہارے شہر میں تمہاری ماں کے یار آئے ہیں۔"

ہوٹل کا مالک ٹوٹی ہوئی پلیٹیں خود اُٹھانے لگا۔ باورچی بھی اُس کی مدد کے لیے آ گیا۔ اُس نے بیرے کو دھکا دے کے ایک طرف کر دیا۔ گانا ختم ہو گیا تھا اور سوئی خالی ریکارڈ پہ گھوم رہی تھی۔ ہر شخص دم بخود بیٹھا تھا۔ جب تک ہوٹل کے مالک نے اپنی جگہ واپس جا کے ریکارڈ نہیں بدلا، خاموشی نہیں ٹوٹی۔ پھر بیرے نے دبے پاؤں آ کے پانی سے بھرے ہوئے گلاس ہمارے سامنے رکھ دیے۔ جوالا نے اُسے اُبلتی ہوئی آنکھوں سے گھور کے دیکھا لیکن بیرا گردن جھکائے جلد ہی واپس ہو گیا تھا۔ "ہم کیا بول رہے تھے؟" جوالا نے اپنا ماتھا ٹھونکتے ہوئے دھیمی آواز میں تجمل سے پوچھا۔

"ہمیں یاد نہیں۔" تجمل نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

جوالا کے چہرے کی لکیریں بڑھ گئیں۔ اُس نے اپنے سر کو تیزی سے جھٹکا دیا اور گلاس منہ سے لگا کے ایک ہی سانس میں ختم کر دیا۔ "ہاں! ہم کو یاد آیا۔" وہ چمک کے بولا۔ "ہم کہہ رہے تھے کہ تمہارے دماغ میں اُدھر کی بات ہے تو اُدھر کا گھوڑا اِدھر ریت میں ٹھیک سے نہیں چلتا، سمجھے۔"

"کوئی اور بات کرو جوالا!"

"جو تم پوچھو۔" وہ سرد لہجے میں بولا۔

"ہم نے تم سے کہا ہے کہ ہم اِدھر آ گئے ہیں۔"

"اور ہم نے کیا بولا! ارے بابا! ہم نے بولا، ٹھیک ہے، تم آئے ہو تو اِدھر ہی رہو، اِدھر زمین کی کمائی نہیں ہے پر آگا پیچھا بتائے دیتے ہیں۔ بعد کو مت کہنا کہ ہم کو خبر نہیں ہوئی تھی۔ یاد رکھو گے کہ پہلے جوالا ملا تھا، ہم بولتے ہیں لوٹ جاؤ، اِدھر بہت خواری ہوتی ہے اور اگر تمہارے دھیان میں یہ ہے کہ تم کسی راجا نواب کے وہاں گھس بیٹھ جاؤ گے تو ایسا کر لو، پر یہ بھی دھیان میں رکھنا کہ راجا لوگ جب تک سر نیچے، پیر اُوپر کر کے نہیں دیکھ لیتے، اُس وقت تک ہاتھ نہیں رکھتے۔ اُدھر جا کے پہلے اپنی تول کرانی ہو گی۔ ایک ماشے کا فرق ہو گا تو منہ پھیر لیں گے۔ اور وہ لوگ جو اُن کے آئیں بائیں بیٹھے ہیں، سالے پہلے ہی ترازو میں پاسن کا فرق کر دیں گے۔ وہ تمہارے جاتے ہی کھڑے نہیں ہو جائیں گے کہ اُستاد آؤ، بس تمہارا انتظار کر رہے تھے۔ راجا کو تو بعد میں پتہ چلے گا، وہ تم کو دروازے ہی سے رستہ دکھا دیں گے۔ راجا لوگوں کو اپنا پتہ کرانے کے لیے پہلے اِدھر بازار میں بہت دنوں تک جھٹکا کرنا پڑے گا اور وہ تمہیں کھلا چھوڑ دیں گے! سالے وقت آنے پر سب مل بیٹھ کے ایک ہو جائیں گے، اُدھر پگڑی والوں کو مال چڑھا کے اشارہ کریں گے کہ شکار کدھر ہے۔"

"اسامی بولو جوالا!" تجمل نے بوجھل آواز میں کہا۔

"اسامی!" جوالا سٹ پٹاتے ہوئے بولا۔

"ہاں اسامی!" تجمل نے زور دے کے کہا۔ "آنے کے بعد لوٹنا ہم کو نہیں سکھایا گیا۔ نئی جگہ، سب جگہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہم کو جگہ بولو، باقی ہم پہ چھوڑ دو۔"

"ہم تم کو دس جگہ بول سکتے ہیں۔" وہ تیزی سے بولا۔ "پر بابا! ہماری بات سمجھو، ہم اِدھر رزق کی جگہ بیٹھے ہیں اور تم پہلے ہمارے پاس آئے ہو، جوالا کے پاس جوالا کالی جعلی باتیں نہیں کرتا۔ اِدھر ایک سے ایک نڈی کا..."

"اسامی بولو۔" تجمل نے تندی سے کہا۔

جوالا کے جسم میں ایک لمحے کے لیے بجلی سی چمکی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل گیا۔ اُس نے بیرے کو آواز دے کے چائے لانے کے لیے کہا۔ بیرا گلاس رکھ کے واپس چلا گیا تو وہ ہمیں اکتائے ہوئے لہجے میں شہر کے رئیسوں کے نام اور اُن سے متعلق آدمیوں کی تفصیل بتانے لگا۔ کون پہلے کہاں تھا، کس نے کیا کیا اور کون کس چیز کا ماہر ہے، کس کی خُو کیسی ہے، کس نے کتنے آدمیوں سے جا تو چھینا اور چھنوایا ہے وغیرہ۔ تجمل خاموشی سے سنتا رہا۔ انھی ناموں میں دو تین ناموں کے بعد رانا مہتاب کا نام آیا تو میں نے بے اختیار تجمل کی طرف دیکھا مگر وہ آنکھیں موندے چائے پی رہا تھا۔ جوالا بتا رہا تھا کہ رانا کے پاس میلسیر کے علاوہ بیکانیر، احمد آباد اور اجمیر کے آدمی بھی ملازم ہیں۔

"رانا اتنے بہت سے آدمیوں کا کیا کرتا ہے رے؟" تجمل نے پوچھا۔

"کیا کرتا ہے۔" وہ بھڑک کے بولا۔ "اچار نہیں ڈالتا بابا! راجا لوگوں کی شان ہی ان لوگوں سے ہے۔ یہ نہ ہوں تو راجا لوگ آدھے بھی نہیں۔ روپیہ پیسہ بھی ہاتھ پاؤں مانگتا ہے۔ جو کام راجا لوگ اپنے ہاتھ پیر سے نہیں کر پاتے، وہ ان سے کراتے ہیں۔ یہ ان کے دوسرے ہاتھ پیر ہیں۔ ایک کو دُوسرا اُلّو سمجھتا ہے اور اُلّو کون ہے، یہ ہمارے بولنے کی بات نہیں۔ تم نے ہم سے زیادہ دُنیا دیکھی ہے۔ رانا کی بہت لمبی چوڑی زمینیں ہیں، گاؤں کے گاؤں ہیں۔ یہ لوگ اُس کی زمینوں پہ جا کے کسانوں سے اپنا بھی بھتا وصول لیتے

ہیں، رانا کا بھی۔ وہ اپنے مالک کے لیے گھر گھر نئی نئی چھوکریاں تاکتے رہتے ہیں۔ اِدھر چھوکری کا بدن پکنا شروع ہوا، اُدھر اُن کے پھیرے شروع ہوگئے، چھوکری ابھی دو ہاتھ اُونچی نہیں ہوئی کہ یہ اُس کی بولی بول دیتے ہیں۔ چھوکریاں تو گیاں ہوتی ہیں، چھوٹی سی گٹھری میں آجاتی ہیں، یہ حرام کے جنے تو ہاتھی جیسا آدمی اٹھوا لیتے ہیں اور پتہ نہیں چلتا کہ کدھر چھو ہوگیا۔"

"رانا کی کتنی بیویاں ہیں؟"

"بیویاں؟" جوالا کے منہ سے ہنسی چھوٹ پڑی۔ "کیسا بولتے ہو بابا! وہ روز ایک عورت کو سہاگن بناتا ہے، ویسے دو بیویاں ہیں۔ بچے رانا کے نام سے پولے جاتے ہیں۔ بولتے ہیں کہ رانا چھوکری کو ایک بار چھو کے دوبارہ ہاتھ نہیں لگاتا۔ کبھی کچھ اور نہیں ملتا تو اُس کے آدمی ڈھونڈ ڈھونڈ کے اُس کے لیے نچنیاں اور کنجریاں لے آتے ہیں۔ کنجریاں چاؤ سے رانا کو نوابی پکارتی ہیں۔ رانا کو بس یہی ایک شوق ہے۔ اِدھر جیسلمیر میں اُس جیسا رنگ دار آدمی کوئی نہیں۔ حویلی میں روز رات کو ناچ گانا، دھوم دھڑکا ہوتا ہے۔ ہم تو اُدھر کبھی نہیں گئے لیکن یہی جھینگر لوگ بولتے ہیں کہ رات کو نیلے پیلے شیشے جڑے کمرے میں اِدھر شہر کے اور آس پاس کے بہت سے راجا نواب لوگ اکٹھے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے پہ ولایتی شراب کا چھڑکاؤ کرتے ہیں۔ حویلی سے ہر مہینے بگڑی والوں کو پیسہ جاتا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں رانا کی بہن کی سگائی ہوئی تھی۔ برات نظام حیدرآباد شہر سے آئی۔ پندرہ دن تک میلا ٹھیلا لگا رہا۔ منوں ٹنوں گولا بارود پھونک دیا گیا۔ ہر طرف سے گانے بجانے اور کوٹھے مٹکانے والیاں آئیں، ایک اِندر سبھا اندر جمتی تھی تو ایک باہر مستانوں کے لیے۔ رانا نے کئی ہاتھی اجمیر سے منگوائے تھے۔ بینڈ باجے والے تو تمہارے دلّی شہر سے آئے تھے۔"

"رانا کے ہاں تم نے کون کون سے خاص خاص آدمیوں کے نام بولے تھے؟" بچّل نے تھمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ہم نے بولا، اُدھر ایک آدمی نہیں ہے۔" جوالا نے برہمی سے کہا۔ "ایک سے ایک نگینہ ہے۔ اُدھر اٹھو ہے، جانو ہے، فرید خاں ہے جس کا نام رانا نے سہراب خاں رکھ دیا ہے، اچھو ہے، کالے میاں ہے، دل بر ہے، چینا سنگھ ہے، اجیت سنگھ ہے۔ کس کس کا نام بولیں اور ان سب سے بڑھ کے رستم خاں ہے۔ رستم کا نام پہلے بشیرا تھا، رانا نے اُس کا نام بھی بدل کے رستم رکھ دیا۔ بشیرا رانا کے پاس حویلی میں ہی رہتا ہے۔ اُس سے زیادہ کوئی اور رانا کا من چڑھا نہیں ہے۔ رانا اُدھر بھوپال میں اپنے کسی رشتے دار کے ہاں مہمان تھا، شکار کھیلتے ہوئے کسی جھگڑے میں اُس نے بشیرے کے ہاتھ کی بجلی دیکھ لی۔ پھر وہ بشیرے کو ساتھ ہی لے آیا۔ چاقو بشیرے کے ہاتھ میں آکے سالا گوندے جیسے چپک جاتا ہے۔ وہ چیتے کی طرح اپنے شکار پہ جھپٹتا ہے۔ رانا پہ ایسا جادو کیا ہے کہ بشیرے کو روز دیکھے بنا اُس کو چین نہیں ملتا۔ باقی لوگ بھی بشیرے کا بہت خیال کرتے ہیں۔ جب کوئی کام خاص ہوتا ہے تو رانا بشیرا ہی سے بولتا ہے ورنہ وہ سالا حویلی میں اینڈتا رہتا ہے اور رگ پٹھوں کو تیل پلواتا رہتا ہے۔ رانا نے بشیرے کو گھوڑے کی سواری بھی سکھا دی ہے، رانا کا حکم ہے کہ بشیرا جو چیز بھی مانگے، اُسے ترت دی جائے۔ بولتے ہیں کہ بشیرا روز صبح اپنے لیے بادام پستے، دودھ اور میوے کا جو کشتہ بنواتا ہے، اُس کا ایک گلاس رانا کو بھجواتا ہے، ایک خود پیتا ہے۔ رانا نے اُس کی شادی بھی اپنے ایک پرانے آدمی کی بیٹی سے کرادی ہے اور بشیرا کی ماں کو بھی بھوپال سے بلا لیا ہے۔ جیسلمیر میں اور دُور دُور بشیرا کا چاقو گرانے والا ہماری جان پہچان میں نہیں ہے۔ ایک بار ہم نے بھی اُسے فرید خاں سے لڑتے دیکھا تھا۔ فرید خاں ڈیل ڈول میں اُس سے بیشی ہے، اُس نے بہت زور کیا لیکن بشیرے نے چاقو اُس کے ہاتھ میں رکھے ہوئے اُسے جیسے باندھ دیا تھا، ایک دم جام کر دیا تھا۔ فرید خاں اُس کے پھندے کو نہیں توڑ سکا، پھر اُس نے چاقو بشیرے کے پیروں پہ پھینک دیا اور بشیرے نے اُس کو گلے لگا لیا۔ اُسی دن رانا نے فرید خاں کا نام بدل کے سہراب رکھ دیا تھا۔ بشیرا اب بہت کم باہر نکلتا ہے۔ اُس کا کام زیادہ تر یہی ہے کہ وہ رانا کے دوسرے آدمیوں کو ہاتھ چلانا سکھلائے۔"

"بس جوالا! ہم کو جانا ہے۔" جوالا بشیرے کے بارے میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر بچّل نے اُسے روک دیا۔

"کیوں؟" جوالا حیران نظروں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا اپنے سے کوئی بات زیادہ ہوگئی؟ ہم نے تم سے کچھ غلط نہیں بولا ہے۔"

"تم نے سب ٹھیک بولا ہے۔"

"پھر کیا ہے، تم ایسے کیوں اُٹھنے لگے؟"

"ہم کو اب جانا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے بابا! پر تھوڑی دیر ابھی اور بیٹھو، ابھی اور بہت سی باتیں باقی ہیں۔" جوالا تیکھے لہجے میں بولا۔

"کل ہو سکا تو اِدھر آئیں گے۔"

"کل کس نے دیکھی ہے یارا!"

"کل ہوگی تو آنے کی کوشش کریں گے۔"

بیرا قریب ہی موجود تھا۔ بچّل نے اُسے اشارہ کر کے اپنے پاس بلایا اور دس روپے کا نوٹ اُس کے ہاتھ میں تھما کے اُٹھنے لگا۔ بیرے نے نوٹ لے لیا تھا لیکن جوالا نے جھپٹ کے اُس کا گریبان پکڑ لیا۔ بیرے کو نوٹ وہیں میز پہ پھینکنا پڑا۔ بچّل نے اُسے نہیں اُٹھایا، جوالا بیرے سے اُلجھا ہوا تھا کہ وہ آگے بڑھ گیا اور ہوٹل کے چبوترے سے نیچے گلی میں اُتر آیا۔

ہم ابھی گلی میں کچھ ہی دُور آئے ہوں گے کہ جوالا نے ہمیں آلیا اور قریب آکے بولا۔ "کیوں سیٹھا! کچھ خفا ہوگئے؟ ہم اپنی ماں کی قسم کھا کے بولتے ہیں کہ اپنا مطلب کچھ اور نہیں تھا۔" بچّل نے اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے تھپکی دی۔ "ابھی اپنا خیال تھا کہ تم کو پرتھو کے پاس لے چلیں گے۔ اُس کُتّے کی ذات سے بھی مل کے دیکھو۔"

"ملیں گے جوالا، پھر کبھی ملیں گے۔"

جوالا ہم سے ہمارا پتہ پوچھنے لگا کہ ہم کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں، اور بولا کہ اگر ہمیں رہنے کی کوئی تکلیف ہو تو اُس کا گھر موجود ہے جہاں اُس کی ایک بیوہ بہن اور اُس کے بچے رہتے ہیں۔ بہن کا شوہر لڑائی میں مارا گیا تھا۔ اُس کی اور بچوں کی دیکھ بھال ہی کے لیے اُسے واپس جیسلمیر آنا پڑا ہے۔ وہ ہم سے اور بہت سی باتیں پوچھ رہا تھا لیکن بچّل نے اُسے ٹال دیا اور وعدہ کیا کہ ہمیں رہنے کی یا کوئی اور ایسی ویسی مشکل پیش آئی تو ہم اُسی کے پاس آئیں گے۔ جوالا بچّل کی باتوں سے مطمئن نہیں ہوا۔ "ہاتھ کے نیچے لگتے ہو، پیارا، اِدھر ہاتھ کو زنگ لگ جاتا ہے۔ اِدھر کی بات نرالی ہے، اس لیے ہم نے یہ سب تم کو بولا تھا۔" راستے بھر وہ مسلسل تکرار کرتا رہا۔ بازار بھی گزر گیا لیکن وہ ہمارے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ پھر بچّل نے سبزی منڈی کے نزدیک ایک جگہ ٹھہر کے تیز لہجے میں اُسے واپس جانے کے لیے کہا تب کہیں وہ ہم سے جُدا ہوا۔ ہم سیدھے منیر علی کے گھر نہیں گئے بلکہ ایک لمبا چکر کاٹ کے دوبارہ بازار میں آگئے۔ بچّل نے اچانک ایک راہ گیر کو روک کے تار گھر کا پتہ پوچھا۔ مجھے بہت حیرت ہوئی مگر میں نے کچھ بولنا مناسب نہیں سمجھا۔

تار گھر اور ڈاک خانہ ایک ہی عمارت میں تھا۔ بچّل نے تار کا فارم اور کھڑکی کے اندر بیٹھے ہوئے ایک بابو سے قلم مانگ کے مجھے تھما دیا اور کہنے لگا، "پیرو کو تار دو کہ وہ پہلی گاڑی سے بیکانیر پہنچے۔"

"کیوں؟" میں نے بوکھلا کے کہا۔ یہ لفظ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا تھا۔ میں نے فوراً اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور بچّل سے کوئی دوسرا سوال نہیں کیا۔

"لکھ! پتہ تو تجھے یاد ہوگا۔"

میں نے سر ہلایا اور تار کے فارم پہ پیرو کا پتہ لکھنے لگا۔

"کیا لکھا ہے؟"

"جو تم نے کہا ہے۔"

"پڑھ کے سُنائیے۔"

"لکھا ہے فوراً بیکانیر پہنچو۔ مگر وہاں کہاں؟" میں نے مضطرب لہجے میں پوچھا۔

"اتنا ٹھیک ہے لیے! یہ تار کب تک پہنچ جائے گا؟"

"ممکن ہے رات تک۔ دیر بھی ہو سکتی ہے۔"

"بابو سے کہو کہ زیادہ پیسے لے کے اسے جلدی بھیج دے۔"

میں نے فارم پہ ارجنٹ لکھ دیا۔ بابو کو فارم دے کے اور پیسے ادا کر کے ہم باہر چلے آئے۔ بچّل نے گھر جانے کے بجائے بازار سے کئی چیزیں خریدیں۔ شیرینی، دو ریشمی گلابی دوپٹے، چوڑیاں، چاندی کے کڑے، شیروانی کا کپڑا اور ایک شال۔ دھوپ اوپر چلنے لگی تھی۔ ہم سامان سے لدے پھندے گھر کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں منیر علی مل گئے۔ وہ ہمی کو ڈھونڈنے کے لیے گھر سے نکلے تھے۔ بچّل نے گھر آکے سارا سامان اُن کے حوالے کر دیا۔ منیر علی نے بہت اِنکار کیا مگر بچّل نے ملازمہ کے ہاتھوں سامان اندر بھجوا دیا۔ منیر علی غالباً یہ جاننے کے لیے بے تاب نظر آتے تھے کہ ہم کہاں کہاں گئے تھے۔ نہانے کے بعد جیسے ہی بچّل بیٹھک میں واپس آیا اور چارپائی پر پاؤں پسار کے بیٹھا، منیر علی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "کہاں کہاں کی سیر کی جناب نے؟"

"یوں ہی گلی گلی گھوم رہے تھے بڑے صاحب!" بچّل نے نرمی سے جواب دیا۔

"کیسے، شہر آپ کو کیسا معلوم ہوا؟" منیر علی نے تجسس سے پوچھا۔

"صرف ناموں کی بات ہوتی ہے۔"

"ہاں! آپ سچ کہتے ہیں۔" منیر علی ہنس کے بولے۔ "یعنی آپ کے خیال میں بستیاں بھی آدمیوں کی طرح ہوتی ہیں مگر صاحب! آدمی آدمی میں تو بہت فرق ہوتا ہے۔"

"ہاں بڑے صاحب! بستی بستی میں اتنا فرق نہیں ہوتا۔"

منیر علی نے گھر پہنچتے ہی ہم سے کھانے کو پوچھا تھا۔ ہم نے منع کر دیا تھا لیکن چائے کے ساتھ کھانے ہی کے برابر سامان آگیا۔ دہی بڑے، امرود، کیلے، سنگترے، ناشپاتی کی چاٹ، نمک پارے وغیرہ۔ منیر علی سمجھے تھے کہ شاید ہم تکلف کر رہے ہیں، دوپہر کا کھانا کھا کے نہیں آئے ہیں۔ میری حد تک تو اُن کا یہ قیاس درست تھا کیونکہ میں نے ہوٹل میں چند ہی لقمے لیے تھے۔

چائے پینے کے کچھ ہی دیر بعد بچّل نے اُن سے کہہ دیا کہ ہم آج رات کسی وقت یہاں سے چلے جائیں گے۔ "کیوں بھلا؟" منیر علی نے حیرانی سے پوچھا جیسے بچّل نے کوئی انوکھی بات کہہ دی ہو۔

"آپ نے اچانک جانے کا ارادہ کیوں کر لیا؟"

"کیا کریں بڑے صاحب! جانا تو کسی وقت ہے، ہی، دن بھی کئی، ہو گئے ہیں۔"

"کہاں! تیسرا ہی دن تو ہے بلکہ تیسرا دن تو اب شروع ہوا ہے۔ نہیں جناب! ابھی آپ اور ٹھہریں گے۔" انھوں نے حتمی لہجے میں کہا۔

"نہیں بڑے صاحب! موقع ملا تو پھر کبھی آئیں گے۔"

"ابھی تو آپ کا آنا ہی معلوم نہیں ہوا۔" وہ ناراضی سے بولے۔ "آدمی آتا اپنے بس سے ہے، جاتا پرائے بس سے ہے۔ میں آپ کو اتنے جلدی نہیں جانے دوں گا۔ اتنے دور دراز کے سفر کے بعد آپ آئیں اور فوراً چل دیں، یہ کیسے ممکن ہے۔ مجھے تو آپ کی خاطر تواضع کا موقع ہی نہیں ملا۔ ابھی تو میں کہوں گا کہ ہم نے ایک دوسرے کو اچھی طرح دیکھا بھی نہیں۔ میرے اوسان تو ارشد میاں نے بے حال کر رکھے ہیں۔ آپ کو کسی قسم کی تکلیف ہوئی ہو تو مجھے معذور سمجھ کے معاف کر دیجیے۔ آپ کو کیا بتاؤں آج دوپہر ارشد میاں کو پھر وہی دورہ پڑا تھا۔ جسم پتھر ہو گیا تھا۔ اُس کے ہاتھ پاؤں اکڑے ہوئے تھے جیسے

بند تھی۔ یہ دورہ کئی بار پہلے بھی پڑ چکا ہے جسم پہ کپکپی طاری ہو جاتی ہے اور دیکھتے دیکھتے وہ دنیا و مافیہا سے بے سدھ ہو جاتا ہے۔ خود بھی روتا ہے دوسروں کو بھی رُلاتا ہے۔ اتفاق سے میں گھر نہیں تھا۔ جیسے ہی خبر ملی بھاگا بھاگا آیا۔ بچے پریشان ہو گئے تھے۔ آپ کے آنے سے کچھ دیر پہلے اُسے ہوش آیا ہے۔ ساری رات چھت پر پڑا اوس میں بھیگتا رہا تھا۔ جیسے جیسے دن گزر رہے ہیں اُس کی حالت سنبھلنے کے بجائے اور گرتی جا رہی ہے۔ نہ جانے اُس کا کیا ہوگا۔ یقین جانیے آپ کے آنے سے کچھ تسلی ہو گئی تھی کہ اب میں تنہا نہیں رہا۔ حالانکہ یہ احساس اپنی جگہ تھا کہ آپ مہمان ہیں اور آپ کو واپس بھی جانا ہے۔ میری درخواست مان لیجیے کچھ اور ٹھہر جائیے۔" منیر علی شدت سے اصرار کرنے لگے۔ نتیجتہً بجّل مزید ایک رات ٹھہرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

منیر علی رات تک سرگرم رہے۔ کبھی اندر جاتے کبھی بیٹھک میں آ کے ہمارے پاس بیٹھ جاتے۔ وہ رات کے کھانے پر محلّے کے چند لوگوں کو بھی بُلانا چاہتے تھے۔ بجّل کے سامنے انھوں نے اس کا ذکر کیا تو اُس نے نہ تائید کی نہ تردید لہٰذا منیر علی نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ وہ بتا رہے تھے کہ محلّے کے کئی آدمی ہمیں اپنے گھر مدعو کرنا چاہتے تھے مگر جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ ہم واپس جا رہے ہیں تو وہ بہت مایوس ہوئے۔ منیر علی محلّے کے ایک اعلا تعلیم یافتہ بزرگ شاہد صاحب کا ذکر بھی کر رہے تھے۔ شاہد صاحب ناگ پور کے کسی کالج میں پرنسپل تھے اور ان دنوں اپنے وطن آئے ہوئے تھے۔ "میں نے اُن سے تمھارا ذکر کیا تھا۔" منیر علی نے مجھ سے مخاطب ہو کے کہا۔ "میں نے کہا تھا کہ میں اُسے لے کے آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ آپ مل کے بہت خوش ہوں گے۔ بہت سعید بچہ ہے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ سولہ درجے پاس کیے ہوئے ہے۔ شاہد صاحب نے بہت اشتیاق ظاہر کیا، وہ جب بھی کہیں یہ سنتے ہیں کہ مسلمان بچے نئی روشنی کی تعلیم سے آراستہ ہو رہے ہیں، بہت مسرور ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہمیں نئے زمانے کی تعلیم میں پیچھے نہیں رہنا چاہیے۔ عجیب عجیب طرح قائل کرتے ہیں۔ آدمی سن کے ششدر رہ جاتا ہے کہ افسوس، وہ کتنی غفلت میں تھا۔ میں نے انھی کے ایما پر بڑے لڑکے کو علی گڑھ بھیجا ہے۔ چھوٹا ابھی اسکول میں پڑھ رہا ہے اور ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی حاصل کر رہا ہے۔ بچیوں کو ایک اُستانی پڑھانے آتی ہے۔ مولوی صاحب بھی انھی کے ہم نوا تھے۔ پچھلی مرتبہ جب شاہد صاحب ناگ پور سے آئے تھے تو مولوی صاحب سے اُن کی ملاقات ہوئی تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں دونوں ایک دوسرے کے ایسے شیدائی ہوئے کہ جب تک شاہد صاحب یہاں رہے، روز مولوی صاحب سے ملنے آتے رہے۔ دینی معاملات میں مولوی صاحب طاق تھے تو شاہد صاحب نئی تعلیم کے رموز و نکات کے ماہر۔ دونوں میں خوب دلچسپ تبادلۂ خیال ہوتا تھا۔ ممکن ہوا تو کل صبح اوّل وقت اُن کے ہاں چلیں گے۔ دین دار آدمی ہیں۔ پانچوں وقت پابندی سے مسجد آتے ہیں۔ محلّے میں سبھی اُن کی عزت کرتے ہیں، آتے ہیں تو جمگھٹا لگ جاتا ہے۔ ماشاء اللہ گھر میں سب کچھ ہے لیکن اپنا آبائی علاقہ نہیں چھوڑتے۔ کہتے ہیں کہ مجھے یہاں آ کے تم لوگوں کے ساتھ رہ کے ایک فرحت محسوس ہوتی ہے۔" میں نے سر جھکا لیا۔ میں اُن سے کیا کہتا کہ میرا دل کسی سے ملنے کو نہیں چاہتا۔ ارشد کے تو ہاتھ پاؤں اکڑ بھی جاتے ہیں، وہ تو بے خبر بھی ہو جاتا ہے۔ مجھ سے تو یہ بھی نہیں ہوتا۔

رات کے کھانے پر منیر علی نے گزشتہ دونوں دنوں سے زیادہ اہتمام کیا۔ وہ پہلی بار ہمیں اندر گھر میں لے گئے اور دالان میں رکھے ہوئے ایک تخت پہ بٹھا دیا۔ تخت پہ سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ درمیان میں دستر خوان بچھا ہوا تھا۔ منیر علی کا گھر خاصا بڑا تھا۔ وسیع صحن، لمبا چوڑا دالان، فرش دُھلا ہوا اور دیواروں کا رنگ اُجلا۔ دالان میں دوسری جانب ایک اُونچی جگہ دری بچھی تھی، گاؤ تکیے تھے اور کئی لالٹینیں جل رہی تھیں۔ پورا مکان روشن تھا۔ ہر چیز سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ صحن میں رات کی رانی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ دالان سے اندر کی طرف کئی کمرے بنے ہوئے تھے۔ کورا یہاں دن میں نہ جانے کتنی بار آتی ہوگی۔ صحن میں مولوی صاحب کے گھر میں کھلنے والی کھڑکی بھی نظر آ رہی تھی۔ وہ بدن کو خم دے کے، سر جھکا کے ہی کھڑکی سے گزرتی ہوگی۔ کبھی اُس طرف وہ، اِس طرف زہرہ بیٹھی رہتی ہوگی۔ میرے گھر میں بھی ایسا ہی ہوتا تھا۔ اماں پڑوس والی چچی جان سے بات کرتی تھیں تو پیڑھی پہ کھڑکی کے پاس بیٹھ جاتی تھیں اور گھنٹوں بیٹھی رہتی تھیں۔ کھڑکی اُس وقت بند ہوتی تھی جب ابا جان آتے تھے یا گھر میں مہمان ہوتے تھے۔ میری نظریں ہر سمت گھوم رہی تھیں۔ سامنے باورچی خانہ تھا۔ دفعتہً میری نگاہ ایک جگہ ٹھہر گئی۔ باورچی خانے کے کواڑوں کی اوٹ سے زہرہ جھانک رہی تھی۔ میں اُسے ایک ہی نظر دیکھ سکا۔ اُس کے کانوں میں آویزے جھول رہے تھے۔ غرارہ، جمپر اور سبز دوپٹا۔ اُس کا رنگ آگ کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا منہ کھل گیا۔ اُس نے جھٹ کواڑ بند کر دیا اور شاید اتنی بدحواسی سے پلٹی کہ چھوٹی بہن سے ٹکرا گئی۔ دونوں کی چیخیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔ منیر علی دوڑے دوڑے باورچی خانے گئے اور فوراً واپس آ گئے۔ دونوں بہنوں نے یہ بہانہ کر دیا تھا کہ شامی کباب تلے جا رہے ہیں، گھی میں پانی کا چھینٹا پڑ گیا تھا۔

اس کے بعد زہرہ دروازے پر نمودار نہیں ہوئی۔ گو میری نظریں بار بار اس طرف اُٹھتی رہیں۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو مگر سب بے کار تھا۔ یہ محض میری خوش گمانی تھی۔ مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ میری التجا بے سود ہے۔ زہرہ مجھ اجنبی سے کیسے بات کرے گی۔ میں تو اُسے کورا کی سہیلی سمجھ رہا ہوں مگر وہ مجھے اُس کا کچھ کیوں سمجھے۔ اب ہمیں یہاں سے جانا ہی تھا۔ میرے ذہن میں پھر وہی ترکیب آئی کہ میں اُسے ایک خط کیوں نہ لکھوں۔ میں اُس سے صرف کورا کے بارے میں معلوم کروں گا۔ کسی کے متعلق کسی سے کچھ پوچھنا کوئی غلط بات نہیں ہے۔ اس میں زہرہ کا کوئی ضرر نہیں ہے۔ میں اپنے خط میں پہلے ہی اُس سے یہ وعدہ کر لوں گا کہ تمھارا جوابی خط تمھیں واپس مل جائے گا۔ وہ جواب میں مجھے صرف

اتنا بتا دے یا لکھ دے کہ کورا کسی کے بارے میں اُس سے کچھ کہتی تھی یا نہیں۔ اُس نے زہرہ سے کچھ تو ضرور کہا ہوگا۔ کاش زہرہ جواب میں صرف چند سطریں لکھ دے۔ میں نے سوچا کہ ایک سوال نامے کی صورت میں اُسے خط کیوں نہ لکھوں۔ میں اُس سے صرف اتنی درخواست کروں گا کہ وہ ان سوالات پر ہاں یا نہیں کے نشانات لگا دے مگر علیحدہ بیٹھ کے خط لکھنے اور پھر اُسے زہرہ کے حوالے کرنے یا کسی ذریعے سے اُس تک پہنچانے کی صورت میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ میں خط لکھ بھی لیتا تو اُسے دیتا کس طرح؟ رات کا وقت تھا۔ منیر علی عشا کی نماز سے فارغ ہو کے آ گئے تھے اور اب اُن کے کہیں جانے کا امکان نہیں تھا اور اُن کی موجودگی میں دستک دے کے کسی کو بیٹھک میں نہیں بُلایا جا سکتا تھا۔ بالفرض اگر بُلا بھی لیا جاتا تو میں خط اُس کے حوالے نہیں کر سکتا تھا تا این کہ دستک کے جواب میں خود زہرہ ہی دروازے پر نہ آئے۔ منیر علی کے سامنے اُن کے چھوٹے لڑکے مجّو سے بھی التجا نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنی بہن کو میرا خط پہنچا دے۔ بیٹھک سے ملحق غسل خانے وغیرہ کے لیے جو ایک مختصر سی جگہ تھی، وہاں ایک نیچی دیوار گھر کے صحن میں حائل تھی۔ کبھی وہ جگہ صحن ہی کا حصہ ہوگی۔ منیر علی نے بیٹھک میں ٹھہرنے والے مہمانوں کی سہولت کے لیے صحن کے کونے میں دو طرف دیوار کھینچ کے اُسے علیحدہ کر دیا تھا۔ دیوار میں ایک دروازہ بھی تھا۔ بس یہی ہو سکتا تھا کہ زہرہ اس طرف کھڑی ہو اور اُسے پتہ ہو کہ میں رقعہ پھینک رہا ہوں اور وہ اُسے اُٹھا لے یا پھر رات کو کسی وقت جب سب سو گئے ہوں، میں اِس طرف سے دیوار پھاند کے گھر میں داخل ہو جاؤں اور خط کسی ایسی جگہ رکھ آؤں جہاں صبح سب سے پہلے زہرہ کی نظر پڑے۔ باورچی خانے میں یا کسی اور جگہ۔ یا اگر گھر میں کہیں زہرہ ہی دکھائی دے جائے، اُس کے سونے کا کمرہ کھلا ہوا ہو یا وہ دالان ہی میں سو رہی ہو تو خط اُس کے سرہانے رکھ آؤں یا اُس کے دوپٹے میں باندھ آؤں۔ صبح اُٹھنے کے بعد اُس کی نظر دوپٹے کی گانٹھ پر ضرور جائے گی مگر اس طرح دوپٹے میں رقعہ بندھا دیکھ کے وہ میرے بارے میں کیا سمجھے گی اور زہرہ تک خط پہنچ بھی گیا تو کیا ضروری ہے کہ وہ جواب بھی دے دے۔ وہ اپنی سہیلی کی بات کسی کو کیوں بتلائے گی، وہ سوچے گی نہیں کہ میں کون ہوتا ہوں اور اگر کورا نے اُسے میرے متعلق کچھ بتایا ہے تو وہ میرے بارے میں تصدیق کرنے سے پہلے جواب کیوں دے گی۔ بجّل نے یہاں میرا نام دوسرا بتایا تھا، بابر نہیں۔ ایک دوسری صورت بھی تھی کہ میں رات کو گھر میں کود کے زہرہ کو چھت پر لے جاؤں۔ منیر علی بیدار ہو گئے تو میں اُنھیں ایک لمحے میں بے سدھ کر دوں گا۔ میں اپنے آپ کو چھپا کے جاؤں گا۔ زہرہ کو بھی کچھ دیر کے لیے جب تک میں اُسے چھت پر لے جاؤں، بے حس و حرکت رکھا جا سکتا ہے۔ میں چاقو دکھا کے بھی اُس سے پوچھ سکتا ہوں۔ وہ دہشت زدہ ضرور ہو جائے گی لیکن بعد میں جب اُسے یہ اطمینان ہو جائے گا کہ میرا مقصد کورا کے بارے میں جاننے کے سوا کچھ نہیں ہے تو وہ کسی قدر سنبھل جائے گی۔

ممکن ہے زہرہ اعصاب کی مضبوط ثابت ہو۔ میں ہاتھ جوڑ کے اُس کے سامنے کھڑا ہو جاؤں گا۔ ارشد اور دوسرے گھر والوں کا اتنا مسئلہ نہیں ہے۔ میں آسانی سے مکان میں جا سکتا ہوں۔

کھانا دستر خوان پر سجا دیا گیا تھا۔ منیر علی نے ارشد کو بھی ساتھ بٹھا لیا۔ وہ اندر کسی کمرے میں گھسا ہوا تھا۔ ہمیں سلام کر کے وہ چپ چاپ بیٹھ گیا۔ ایک طرف میں، بجّل اور منیر علی کا چھوٹا لڑکا مجّو تھا، سامنے ارشد اور منیر علی۔ ارشد نے صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے تھے۔ صاف لگتا تھا کہ منیر علی اُسے جبراً یہاں لائے ہیں۔ وہ نظریں جھکائے ہوئے اپنے پیروں کی کھال چھیل رہا تھا۔ اُسے دیکھ کے مجھے خفقان ہونے لگا۔ ارشد نے زبان نہیں کھولی۔ منیر علی نے کئی بار اُسے ٹوکا بھی کہ وہ ہماری طرف دھیان رکھے کہ کہیں ہم تکلف تو نہیں کر رہے ہیں۔ انھوں نے اُسے باورچی خانے سے گرم بریانی لانے کو بھی کہا۔ ارشد نے اُن کے حکم کی تعمیل کی۔ وہ چھوٹے چھوٹے لقمے منہ میں ڈال رہا تھا۔ منیر علی زیادہ تر اُس کی تعریف کرتے رہے کہ اسے تعلیم کا بہت شوق ہے۔ وہ اُس کے ماں باپ کے واقعات بھی سناتے رہے۔ ارشد ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرتا رہا، آخر کھانا ختم ہوتے ہی وہ ہمارے درمیان سے اُٹھ گیا اور دوبارہ نہیں آیا۔

منیر علی مراد آباد میں ہمارا پتہ پوچھ رہے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ مولوی صاحب سے قرابت کے باعث ہم مراد آباد ہی میں رہتے ہوں گے۔ اس ذکر پر بجّل کو انھیں مدعو کرنا چاہیے تھا لیکن بجّل نے نہ تو واضح طور پر مراد آباد میں اپنا پتہ بتایا، نہ اُن سے وہاں آنے کو کہا۔ اُس نے کہہ دیا کہ ابھی اُس کا وہاں جانے کا ارادہ نہیں ہے اور مراد آباد جانے سے پہلے جلد ہی وہ دوبارہ جیسلمیر آئے گا۔ منیر علی کو کوئی شک نہیں ہوا کیونکہ بجّل نے صاف لہجے میں بات کی تھی۔

ہم ساڑھے بارہ بجے کے قریب واپس ہوئے۔ بجّل آتے ہی پلنگ پر دراز ہو گیا۔ جیسے جیسے رات بڑھتی گئی گلیوں میں ہُو کا عالم طاری ہوتا گیا۔ میں نے خود کو چادر میں لپیٹا، منہ میز پوش سے ڈھانپا اور آہستہ سے دروازہ کھول کے بیٹھک سے ملحق غسل خانے کے حصے میں آ گیا۔ دیوار پہ ہاتھ رکھ کے میں نے اُس کی مضبوطی کا بھی اندازہ کر لیا اور اندر جھانک کے دیکھا۔ مکان میں دھیمی روشنی ہو رہی تھی۔ دالان میں چارپائی پر کوئی سو رہا تھا۔ وہ یقیناً منیر علی ہوں گے۔ وہاں اور کوئی چارپائی نہیں تھی۔ زہرہ اندر کسی کمرے میں ہو سکتی تھی۔ اگر میں کودتا تو دھمک ہوتی اور جتنی دیر میں منیر علی جاگتے، اتنی دیر میں لپک کے میں اُن کے پاس پہنچ سکتا تھا اور انھیں بہت دیر کے لیے ہوش و حواس سے معطل کر سکتا تھا۔ اُن کے لیے گردن پر ایک معمولی ضرب کافی ہوتی۔ میں دیوار پر چڑھ گیا مگر اُوپر چڑھ کے میرے پیروں میں جان نہیں رہی۔ پیر جیسے کسی نے جکڑ لیے۔ کئی لمحوں تک میں گٹھری بنا ہوا وہیں بیٹھا رہا پھر اسی طرف کود پڑا۔ بجّل سویا ہوا تھا۔ میں اپنے بستر پہ آ کے ہانپنے لگا۔ میں نے رات بھر میں کئی بار ارادہ کیا مگر صبح قریب آتی گئی۔ یہاں تک کہ اندر

گھر سے منیر علی کے جاگنے کی آواز آئی اور کچھ ہی دیر بعد مسجد میں اذان ہونے لگی۔

صبح کے نو بجے ہوں گے سواری باہر کھڑی تھی ہم نے بہت روکنا چاہا مگر منیر علی ہمارے ساتھ بیٹھ گئے اور جب تک گاڑی روانہ نہیں ہوئی، وہ اسٹیشن پر موجود رہے۔ انھوں نے کھانے پینے کا بہت سا سامان ہمارے ساتھ کر دیا تھا میرے اور جھل کے لیے ایک ایک جوڑے کا کپڑا علیحدہ تھا۔ چلتے وقت انھوں نے ہم دونوں کو کئی بار گلے لگایا میرے سر پر ہاتھ پھیر، مجھے دعائیں دیں اور ڈبڈبائی ہوئی آواز میں کہا کہ وہ ہمارا انتظار کرتے رہیں گے۔

گاڑی لیٹ تھی حالانکہ سفر طویل نہیں تھا ہم مغرب سے کچھ پہلے بیکانیر کے اسٹیشن پر اُترے اور منہ ہاتھ دھو کے اندر شہر میں چلے گئے۔ ہم نے اپنا مختصر اسباب اسٹیشن کے باہر ایک ہوٹل میں رکھ دیا تھا ہم زیادہ دُور نہیں گئے شہر کا ایک ہی حصہ دیکھا ہو گا کہ واپس آ گئے۔ تھوڑی سی تگ و دو کے بعد رات گزارنے کے لیے اسٹیشن کے قریب ہمیں ایک سرائے میں جگہ مل گئی۔ جھل نے گاڑی سے اُترتے ہی بمبئی سے آنے والی گاڑیوں کے بارے میں معلومات حاصل کر لی تھیں۔ رات کو کوئی گاڑی نہیں آتی تھی۔ ہیرو کے آنے کا امکان صبح ہی تھا بشرطیکہ اُسے تار جلد مل گیا ہو۔ سرائے میں برابر برابر چار پائیاں لگی ہوئی تھیں۔ ہمارے علاوہ وہاں اور بھی مسافر تھے۔ یہاں جھل کو حقہ پینے کو مل گیا۔ رات کا کھانا ہم نے ہوٹل میں کھا لیا تھا منیر علی کے دیے ہوئے کھانے میں سے بہت کچھ بچ گیا تھا انھوں نے توشہ دان بھی دے دیا تھا۔ جیسلمیر کے مقابلے میں یہاں کی رات اتنی خنک نہیں تھی۔ سرائے کے بستر کے ساتھ رکھی ہوئی ولائی ہمارے پیروں میں پڑی رہی۔ ولائی کے بجائے ہم نے اپنی چادریں اوڑھ رکھی تھیں۔

رات کو سرائے میں بھیڑ سے ہوئے لوگوں کی نیندیں اچانک اُڑ گئیں کسی نے سوتے میں جھل کی جیب سے روپے چرانا چاہا تھا۔ اُس کی آنکھ لگ گئی۔ میں بھی اُس کے بازو کی چارپائی پہ آنکھیں موندے پڑا تھا۔ تمام لوگ سوئے ہوئے تھے اور ساری سرائے اندھیرے اور خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس آدمی کی چارپائی ہم سے تین چار پائیاں دُور تھی۔ اُس نے دُور سے دیکھ لیا تھا کہ جھل نے اپنی واسکٹ اُتار کے سرہانے رکھ دی ہے اور اُس کی صدری چادر سے باہر جھانک رہی ہے۔ وہ شاید زمین پر رینگتا ہوا آیا تھا۔ مجھے بھی خبر نہیں ہوئی مگر جیسے ہی اُس نے جھل کی چارپائی پر آ کے اُس کی واسکٹ پر ہاتھ ڈالا، مجھے آہٹ کا احساس ہو گیا۔ میں نے جھل کی چارپائی پھلانگ کے اُس کی گردن دبوچ لی۔ وہ اس طرح چیخنے پکارنے لگا جیسے اُسے کسی سانپ نے کاٹ کھایا ہو۔ سرائے میں شور مچ گیا۔ وہ اُلٹا مجھ پر الزام رکھنے لگا کہ میں جھل کی واسکٹ سے روپے چرانے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ یہ دیکھ کے اپنی چارپائی سے بھاگا ہوا آیا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ میں اور جھل ساتھ ساتھ سرائے میں آئے ہیں۔ میری جست ہی پر جھل کی آنکھ کھل گئی تھی۔ شور سن کے سرائے کا مالک بھی آ گیا اور مسافر اپنی چارپائیاں چھوڑ کے ہمارے گرد جمع ہو گئے۔ جھل نے چور سے کچھ نہیں کہا مگر سرائے کا مالک اور دوسرے لوگ اُسے مارنے لگے۔ آخر جھل نے اُٹھ کے اُسے چھڑایا۔ سب لوگ اُسے اُسی وقت سرائے سے نکال دینا چاہتے تھے۔ جھل نے صبح تک کے لیے اجازت دلوا دی لیکن صبح اُس کی چارپائی خالی پڑی تھی۔

ناشتے کے بعد ہم اسٹیشن آ گئے اور ایک بینچ پر بیٹھے رہے۔ گاڑیاں آتی جاتی رہیں۔ معلوم ہوا تھا کہ بمبئی سے آنے والی گاڑی بارہ بجے سے پہلے نہیں آئے گی۔ بارہ بھی بج گئے مگر گاڑی نہیں آئی۔ پھر کوئی ڈیڑھ بجے اسٹیشن پر ہماری منتظر گاڑی کی آمد کی گھنٹیاں بجیں۔ جھل پلیٹ فارم کے وسط میں ایک جگہ آ کے ٹھہر گیا۔ گاڑی تیزی سے اسٹیشن میں داخل ہوئی اور میں نے شروع کے ڈبوں میں زورا کو ایک دروازے پر کھڑا ہوا دیکھ لیا۔ وہ وہی تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا، زورا کے پیچھے ماچھی کھڑا تھا۔ ہیرو مجھے نظر نہیں آیا۔ ہم لپکتے ہوئے اُن کے ڈبے تک پہنچے۔ گاڑی ابھی ٹھیری بھی نہیں تھی کہ ماچھی اور زورا نے ڈبے سے کود کے مجھے اُوپر اٹھا لیا۔ اُس طرف ہیرو جھل سے چمٹا ہوا تھا۔ پھر زورا اور ماچھی مجھے چھوڑ کے جھل سے لپٹ گئے اور ہیرو نے میرے سر پہ زور سے اپنا سر مار کے مجھے جکڑ لیا۔ وہ تینوں ایک لمحے میرے پاس ٹھیرتے دوسرے لمحے جھل کے پاس۔ "دادا! دادا! اپن کے سامنے یہ تم ہو نا؟" ہیرو جھرجھراتی ہوئی آواز میں بولا۔ "بولو اُستاد! بولو۔ اپن کی آنکھ کو تسلی دو۔"

"ہاں ہیرو!" جھل نے ہیرو کے بازو جھنجوڑ دیے۔

"اوئے۔" ہیرو کی بلند آواز سے اطراف کے مسافر بھی چونک گئے لیکن ہیرو سب سے بے خبر جھل کو دبوچے ہوئے تھا۔ "تیلے گرام آیا تو اپن سمجھا سالا کسی نے مسخری مارا ہے پر اپن بولا، دیکھا جائیں گا۔ جو ہوئیں گا، دیکھا جائیں گا۔ کیوں ماچھی!" وہ پلٹ کے بولا۔ "اپن کیا بولتا تھا۔"

"دادا بولتا تھا کہ تار پہ اُستاد جھل کا نام لکھا ہے۔ بس اتنا بہت ہے۔" ماچھی نے تیزی سے کہا۔ "دادا تم کو بہت یاد کرتا تھا استاد! روز تمھارا بولتا تھا۔"

"تم ٹھیک ہو ہیرو؟" جھل نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں جھل بھائی! ایک دم ٹھیک۔" ہیرو جھل کے ہاتھ اپنے سینے سے لگاتے ہوئے بولا۔ "تم اپنا بولو تم کیدر ہے؟ کتنے دن تم کو اودر بمبئی سے جاتے ہوئے ہو گئے۔ تم نے اپنا ہیرو کو بھلا دیا، چھ مہینے سے اُوپر ہو گیا۔ اپن اودر کلکتے میں کوئی بیس خط ڈالا ہو گا۔ ہر ٹیم ایک ہی جواب ملتا تھا کہ اُستاد نئیں ہے استاد نئیں ہے۔ اُستاد ابھی نئیں آیا ہے۔ اُس کا لاڈلا بھی نئیں ہے۔ تم کیدر چھپ گیا تھا جھل بھائی؟"

"بتاؤں گا ہیرو دادا، سب بتاؤں گا۔" جھل نے رُکی رُکی آواز میں کہا۔ "تم بولو بمبئی میں سب خیریت ہے۔ پھر کوئی آیا تو نہیں تھا؟"

"آیا تھا۔" ہیرو سر جھٹک کے بولا۔ "پر اب سب فِٹ فاٹ ہے۔ تمھارے جانے کے بعد سالا اپن کو پھر لے گیا تھا۔ دس دن اندر رکھا پھر چھوڑ دیا۔"

"وہ دوبارہ بھی تم کو لے گئے تھے؟" جھل نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں استاد! لے گیا تھا سالا، پر وہ ایک لمبی بات ہے تم اپنا بولو۔ تم ایدر کیدر ہو، ایدر چھوندر جگہ پر۔"

"ہم کل ہی ادھر آئے تھے۔"

"پر پر ایدر تم کیا کرتا ہے جھل بھائی؟" ہیرو پٹ پٹاتی آنکھوں سے بولا۔

"اُسے ہی بولنے کے لیے تم کو بلایا ہے۔"

"بولو جھل بھائی! جلدی بولو۔" ہیرو نے بے چینی سے کہا۔

"آؤ اب ادھر سے چلتے ہیں۔" جھل ہیرو کا بازو تھام کے قدم بڑھاتا ہوا بولا۔ اسٹیشن پر مسافروں کی نقل و حرکت میں بھیڑ اُور آ گیا تھا۔ زورا اور ماچھی نے دونوں جانب سے میرے گلے میں بانہیں ڈال رکھی تھیں۔ ماچھی مجھے گدگدا رہا تھا اور زورا میرا ہاتھ آنکھوں سے لگائے ہوئے تھا۔ وہ بار بار اُسے چومتا تھا۔ پلیٹ فارم کے لوگ متجسس نظروں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ زورا بتا رہا تھا کہ اڈے کے تمام آدمی روز میرا انتظار کرتے ہیں کہ شاید میں واپس آ جاؤں۔ وہ روز ایک دوسرے سے شرط لگاتے ہیں۔ ماسٹر ماسٹی تو میرا نام آتے ہی رونے لگتا ہے۔ منڈے نے اپنا نام بھی بمبئی میں میرے مشہور نام راجا پر رکھ لیا ہے۔ اب وہ خود کو راجا جونیئر کہتا ہے اور ہر وقت میری طرح چاقو اچھالتا اور لڑتا رہتا ہے۔ سب کہتے ہیں کہ راجا استاد سپنا دکھا کے چلا گیا سپنے میں آنے والے بے مروت ہوتے ہیں۔ زورا بمبئی میں میرے پیچھے ہونے والے واقعات ایک ہی سانس میں سنا دینے کے لیے بے چین تھا۔ وہ میرے پوچھے بنا ایک ایک آدمی کا حال بتا رہا تھا۔ کہتا تھا کہ چھینگا استاد کے پاٹے کے تمام آدمی مجھے دیکھنے اور مجھ سے ملنے کے لیے کلکتے جانا چاہتے تھے مگر میرا کوئی پتہ ہی نہیں تھا۔

اسٹیشن سے باہر ہیرو نے مجھے ان سے چھین لیا۔ "راجا! وہ میری کمر میں ہاتھ ڈال کے کھینچتے ہوئے بولا۔ "خیر تو ہے؟"

"ہاں ہیرو دادا! سب خیر ہے۔" میں نے نظریں جھکا کے کہا۔ اُس نے میری ٹھوڑی اُوپر اُٹھائی۔ "تم ایک دم نہیں بدلا۔" میرے ہونٹ کپکپانے لگے۔ "بتی اور دھیمی کر لی لاڈلا راجا!" وہ میرے چہرے پہ نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "کیا بات ہے؟"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

اچانک ماچھی چیخنے لگا۔ جھل نے اُس کا پنجہ پکڑ رکھا تھا۔ "اُستاد! بس کرو، معاف کرو۔" ماچھی کا جسم پھڑک رہا تھا۔

"ہیرو!" جھل نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اس مستانے کو کیا کھلایا ہے؟"

"سالا چربی جاستی کھا لیا ہے۔"

"چاقو کھولو۔ میں اس کے ہاتھ کا ورم اُتارتا ہوں۔"

"جانے دو جھل بھائی! سالا خود کسی سے اُتروا لے گا، اپن راستے میں بولا تھا ماچھی! سالا ہاتھ سمجا لیا ہے، استاد جھل دیکھیں گا تو کیا بولیں گا۔"

جھل نے تڑپتے ہوئے ماچھی کا ہاتھ جھٹک کے چھوڑ دیا۔ "اس کی منجھائی کرو ہیرو دادا! اور یہ زورا! زورا بھی مجھے کچھ چڑھا ہوا دکھائی دیتا ہے۔"

زورا میری آڑ میں ہو گیا۔ "سالا سب مستی کرتا ہے جھل دادا! اپن نے اسی لیے خط ڈالا تھا کہ ابھی ان کو آ کے سنبھالو۔"

زورا اور ماچھی دونوں کی صحت پہلے سے بہت اچھی تھی۔ ماچھی کے چہرے سے تو خون پھوٹا پڑتا تھا۔ سینہ کچھ اور چوڑا ہو گیا تھا۔ گال بھر گئے تھے۔ مونچھیں اور ڈاڑھی ہو گئی تھیں۔ ہیرو کے اڈے میں ماچھی ہی کا ہاتھ سب سے تیز تھا۔ پہلی بار جب جھل ہیرو کے اڈے گیا تھا اور اُس نے کچھ دنوں کے لیے اُس سے اڈا مانگا تھا تو ہیرو نے ماچھی ہی کو آگے کیا تھا کہ وہ ہم لوگوں کی تصدیق کرے۔ جھل کے بجائے جامو ماچھی سے لڑا تھا مگر وہ جامو تھا۔ کوئی اور ہوتا تو شاید ماچھی اتنے جلدی بے قابو نہ ہوتا۔ اُس کے ہاتھ میں بہت چمک تھی۔ چاقو کی نوک سے اُس کی نگاہ بندھی رہتی تھی۔ زورا کا ہاتھ بھی میں نے اور جھل نے رواں کرنے کی بہت کوشش کی تھی۔ پہلے سے خاصا فرق بھی آ گیا تھا اسی لیے جھل نے اُسے جامو کے ساتھ تیواڑی کے اڈے جانے والے آدمیوں میں شامل کیا تھا۔ ممکن ہے اُس نے مشق جاری رکھی ہو۔ ہیرو کے ساتھ اُس کی موجودگی ہی اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ اُس کے ہاتھ پہ اعتبار کرنے لگا ہے۔

ابھی ہم اسٹیشن سے باہر آئے ہی تھے کہ کسی ہوٹل کا ایجنٹ ہمارے پیچھے لگ گیا اور اصرار کر کے ہمیں شہر کے صاف ستھرے علاقے کے ایک بڑے ہوٹل میں لے آیا۔ رجسٹر پہ نام لکھاتے ہوئے جھل نے اپنا نام پھر بدل دیا تھا۔ اُس نے ہم سب کے نام بھی مختلف لکھوائے۔ وہ ایک بڑا ہال جیسا کمرہ تھا۔ روشن اور ہوادار۔ فرنیچر بھی خاصا تھا۔ ایک گوشے میں کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ زورا، ماچھی اور ہیرو کے چہروں پر سفر کی دھول جمی ہوئی تھی۔ بال بھی گرد و غبار میں اَٹے ہوئے تھے لیکن وہ کمرے میں قدم رکھتے ہی نہائے دھوئے بغیر کرسیوں پر پھیل گئے اور ہیرو شور مچانے لگا کہ اُسے سخت بھوک لگی ہے۔ جھل نے ہوٹل میں کھانے کی جتنی قسمیں تھیں، سب کی سب منگوا لیں۔ اتنی چیزیں آ گئیں کہ کرسیوں کے درمیان میں رکھی ہوئی چھوٹی میز پر پلیٹیں رکھنے کی جگہ نہیں رہی تھی۔ بھنے ہوئے مرغ، بریانی اور گوشت۔ وہ کھانے پہ اس طرح ٹوٹ پڑے جیسے برسوں کے بھوکے ہوں۔ ہیرو کہہ رہا تھا کہ جب اُسے تار ملا تو گاڑی کا وقت نہیں تھا۔ راستے میں انھوں نے صرف چائے اور بسکٹ پہ گزارا کیا۔ گاڑی جگہ جگہ لیٹ ہونے پر ہیرو کا ٹی ٹی سے جھگڑا بھی ہو گیا۔

وہ بتا رہے تھے کہ ہمارے بمبئی سے آنے کے بعد پولیس انھیں مہینے ڈیڑھ مہینے تک تنگ کرتی رہی۔ ہیرو کے علاوہ اور آدمی بھی انھوں نے دوبارہ پکڑ لیے تھے۔ ہر جگہ سے پولیس کا عملہ تبدیل کر دیا گیا تھا۔ انھوں نے از سرِ نو تفتیش شروع کرنی چاہی تھی۔ سوالات میں ہیرو کے سوا تقریباً ہر آدمی کو بھوکا پیاسا رکھا گیا اور انھیں شدید اذیتیں پہنچائی گئیں لیکن کسی نے زبان نہیں کھولی۔ تیواڑی کے اڈے

پر پیرو نے یکے بعد دیگرے اپنے آدمی بھیجے تھے۔ اس کی وجہ ایک تو یہی تھی کہ پولیس مسلسل نظر رکھے ہوئے تھی۔ دوسرے تیواڑی کے بچے کھچے چند آدمی گڑبڑ کرنے کی کوشش کر رہے تھے، بعد میں اُن میں سے کئی بمبئی سے بھاگ گئے، کئی نے پیرو کے پاس آ کے چاقو پھینک دیے۔ پیرو کے آدمیوں نے اُن میں سے ایک ایک کو ڈھونڈ نکالا تھا۔ تیواڑی کے خاص اڈّے پر پیرو نے اپنے ایک پرانے دوست پیرو کو بھیجا تھا جس نے شادی کرنے کے بعد چاقو نہ اُٹھانے کی قسم کھائی تھی اور بمبئی کی ایک بستی میں خاموشی کے دن گزار رہا تھا۔ پیرو نے چند دنوں کے لیے اُس سے مدد کی درخواست کی تو وہ واپس آ گیا لیکن اُس نے چاقو کو پھر بھی ہاتھ نہیں لگایا۔ اُس کا کام تیواڑی کے وسیع علاقے پر کام کے آدمی متعین کرنا تھا۔ کبھی اس میں مزاحمت کا اندیشہ ہوا تو اُس نے خود جانے کے بجائے اپنے آدمیوں کو بھیج دیا۔ وہ صرف ایک مہینے تک وہاں رہا، پھر واپس اپنے گھر چلا گیا اور دوبارہ کارخانے میں فورمین کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ اُس نے پیرو کی دی ہوئی ایک بڑی رقم بھی لینے سے انکار کر دیا تھا۔ تین مہینے پہلے تیواڑی کے تمام اڈّے پیرو کے پاس آ گئے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ اڈّوں سے متعلق علاقوں کے تمام لوگ بہت خوش ہیں جیسا کہ ہمارے سامنے اُن کے درمیان طے ہوا تھا، سارا انتظام اُسی طرح چل رہا ہے۔ پہلے جو اڈّے تیواڑی اور سبریو میں سے کسی کے پاس نہیں تھے، وہ جوں کے توں تھے۔ نہ انھوں نے درمیان میں آنے کی کوشش کی نہ پیرو اور اُس کے آدمیوں نے اُن سے حجت کی۔ میرے دل میں آیا، پوچھوں کرستانہ کے اڈّے کا کیا ہوا لیکن میں خاموش رہا۔ پیرو کہہ رہا تھا کہ اُس نے اپنا اڈّا ماچھی کے سپرد کر دیا ہے اور خود اِدھر اُدھر علاقوں میں گھومتا رہتا ہے مگر اُس کی اصل بیٹھک اب بھی اپنے پرانے علاقے میں ہے۔ شام تک وہ بمبئی کی باتیں کرتے رہے۔ اُن میں سے کسی کو بھی اپنے گرد و پیش کی خبر نہیں تھی۔ ایک خاموش ہوتا تھا تو دوسرا بولنے لگتا تھا۔ دوسرا کچھ بولتا تھا تو تیسرا اُسے ٹوک دیتا تھا۔ تجمل توجہ سے اُن کی باتیں سنتا اور درمیان میں دخل دیتا رہا۔ کمرے میں اندھیرا ہونے لگا تھا۔ تجمل نے اُٹھ کے بتی جلائی تو وقت گزرنے کا احساس ہوا اور پیرو نے زدرا کو ڈانٹ کے چپ کر دیا۔ "سالا زبان کو بریک مار۔ ابھی تم نے پوچھا بھی ہے کہ تجمل بھائی نے اپن کو کیوں یاد کیا ہے۔ سچ دادا! راستے بھر دل دھکڑ پھکڑ کرتا رہا کہ تجمل بھائی نے اتنے دن بعد اچانک اپن کو کیوں پکارا ہے۔ تار میں جیسلمیر لکھا تھا اور بلایا تم نے ادھر بیکانیر میں تھا۔ اپن اسی بارے سوچتا رہا۔ ادھر آ کے اور تم کو دیکھ کے اپن کا جی اجلا ہوا، ایسی کیا بات ہے تجمل بھائی! راستے میں یہ جانگلو لوگ بولتے تھے کہ ضرور تجمل دادا پہ کوئی مصیبت آ پڑی ہے۔ اپن بولتا تھا کہ تجمل بھائی سالا تمھارے مافق جنگلی نہیں ہے، تم سالا ہاتھ چلاتے ہو، پورا جسم نچاتے ہو، وہ اور ہاتھ کم چلاتا اور بھیجا زیادہ گھماتا ہے۔ بولو دادا! ایسا کیا ہے؟"

"پیرو!" تجمل نے سکون سے کہا۔ "مجھے تمھاری ضرورت پڑ گئی ہے۔"

"ایسا ہے؟" پیرو اُچھل کے بولا۔ "بولو دادا!"

"تم کو جیسلمیر جانا ہے۔"

"تم جہنم میں بولو۔"

"میں نے تم کو جان کے بلایا ہے، تم اِدھر کبھی نہیں تھے، پھر تم..."

"کام بولو تجمل بھائی!" اُس نے تیزی سے کہا۔ "پر اپن حیران ہے، سالا ایسا کیا کام ہے جو تم نہیں کر سکتا۔"

"ایسا ہی ہے پیرو دادا!"

"اپن کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

"میں تم کو نہیں بلاتا، پر میرا اُس طرف جانا ٹھیک نہیں تھا، جدھر تم کو جانا ہے۔ اگر میں جیسلمیر پہنچتے ہی اُدھر چلا جاتا، تب دوسری بات تھی پر..."

"صاف بات بولو تجمل بھائی!"

تجمل نے پیرو کو وہاں کچھ نہیں بتایا۔ وہ اُسے لے کے کمرے سے باہر چلا گیا۔ اُس کے جاتے ہی زدرا اور ماچھی مجھ سے پوچھنے لگے کہ تجمل کو کیا پریشانی ہے۔ میں اُن سے کیا کہتا۔ میں نے کہا تم خود اُس سے پوچھ لینا۔ وہ اضطراب سے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے اور پھر مجھے لے کے باہر آ گئے۔ ہوٹل پُرسکون علاقے میں واقع تھا۔ بازار میں دکانیں جگمگا رہی تھیں۔ زدرا اور ماچھی چپ چپ سے ہو گئے تھے۔ میں نے اُن کی خاموشی توڑنے کے لیے مارٹی کے بارے میں پوچھا اور مجھے حیرت ہوئی کہ زدرا جولین کے متعلق سب کچھ جانتا ہے۔ وہ بتا رہا تھا کہ مارٹی روز صبح پہلے وہاں جاتا ہے پھر اڈّے پر آتا ہے یا علاقے میں گھومتا ہے۔ پیرو بھی اُن کی خیر خبر لینے کے لیے آدمی بھیجتا رہتا ہے۔ دو ایک بار وہ خود بھی گیا تھا۔ پاڑے کے بہت سے آدمیوں کو معلوم ہے کہ میرا اُس گھر سے کیا تعلق رہا ہے۔ لوگ نئی نئی باتیں کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ راجا کی ماں بمبئی میں ہے، وہ اُس سے ملنے ضرور آئے گا۔ میری ماں سے اُن کی مُراد جمیلا تھی۔ میں نے تردید نہیں کی۔ وہ گھر جا کے میرے بارے میں پوچھتے ہوں گے تو جمیلا مجھے اپنا بیٹا ہی کہتی ہوگی۔ زدرا کہتا تھا کہ مارٹی بہت بدل گیا ہے۔ وہ باتیں بھی کم بناتا ہے، ہر وقت کچھ سوچتا رہتا ہے، پاڑے میں آ کے روز پابندی سے دو تین گھنٹے ورزش کرتا ہے اور لاٹھی، چاقو، پٹے وغیرہ کی مشق کرتا رہتا ہے۔ مارٹی کے ہاتھ میں بہت پھرتی آ گئی ہے۔ ماچھی پان کھانے اور سگریٹ لینے کے لیے ایک دکان پہ ٹھیرا تو زدرا نے مجھے اُس سے کچھ دُور لے جا کے سرگوشی کی کہ اگر میں اپنے تک محدود رکھنے کا وعدہ کروں تو وہ مجھ سے ایک بات کہنا چاہتا ہے۔ میں نے جلدی سے وعدہ کر لیا۔ اُس نے بتایا کہ کانتے ایک مہینے پہلے بمبئی آیا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر کسی اڈّے پر نہیں گیا۔ جولین کے گھر میں ٹھیرا رہا۔ اُس نے مارٹی کے ذریعے صرف زدرا کو بلایا تھا اور مارٹی اور زدرا دونوں کو قسم دلائی تھی کہ وہ اُس کی آمد کا ذکر کسی سے نہیں کریں گے۔ کلکتے میں بھی وہ کسی سے کہہ کے نہیں آیا تھا۔ زدرا کہتا تھا کہ کانتے کی آمد سے جولین بہت خوش نظر آتی تھی۔ وہ صرف تین دن وہاں ٹھیرا۔ اُس کی زبانی زدرا کو معلوم ہوا تھا کہ میں تجمل کے ساتھ سفر پر گیا ہوں اور ہماری واپسی کا وقت طے نہیں ہے۔ زدرا نے کانتے سے کیے ہوئے عہد کا پورا پاس کیا۔ کسی کو نہیں بتایا، نہ مارٹی نے کسی سے کچھ کہا۔ زدرا نہ جانے کیا کیا بتا رہا تھا۔ میرا ذہن تجمل اور پیرو میں اُلجھا ہوا تھا۔ وہ راستے میں ہمیں کہیں دکھائی نہیں دیے تھے۔ میں نے ہوٹل واپس چلنے کو کہا۔ وہ دونوں بھی یہی چاہتے تھے مگر ہوٹل میں تجمل اور پیرو موجود نہیں تھے۔ رات کو خاصی دیر بعد وہ واپس آئے۔ میں نے دزدیدہ نظروں سے پیرو کا چہرہ دیکھا، وہ تمتما رہا تھا۔ آنکھوں میں تیز چمک تھی۔ اُس نے جھپٹ کے مجھے گلے سے لگا لیا اور دیر تک چمٹائے رہا۔ میں نے خود کو بہت روکا لیکن پھر میری سانسیں اکھڑنے اور آنکھیں پگھلنے لگیں۔ پیرو نے مجھے اور زور سے جکڑ لیا اور میرے ساتھ خود بھی رونے لگا۔

وہ تینوں صبح کی گاڑی سے جیسلمیر روانہ ہو گئے۔ ہم انھیں اسٹیشن چھوڑنے بھی نہیں گئے۔ تجمل جس وجہ سے وہاں جانا نہیں چاہتا تھا، وہی وجہ میرے ساتھ تھی۔ یہ جاننے کے باوجود میں نے اُن سے بہت منت کی کہ وہ مجھے بھی ساتھ لے چلیں لیکن نہ تجمل تیار ہوا، نہ اُن میں سے کوئی۔ تجمل نے مجھے کچھ بولنے کی اجازت نہیں دی، پیرو نے بھی مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو اُس نے درشت لہجے میں مجھے خاموش رہنے کی تاکید کی اور بولا کہ مجھے پیرو کی واپسی کا انتظار کرنا چاہیے۔ وہ چلے گئے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ تجمل جیسلمیر سے قریب ہی کسی گاؤں یا قصبے میں ٹھیرے گا لیکن وہ اسی ہوٹل میں پڑا رہا۔ پیرو نے چلتے ہوئے امید ظاہر کی تھی کہ وہ ایک ہفتے کے بعد یا تو خود آ جائیں گے یا پیرو، ماچھی اور زدرا میں سے کسی کو ایک وقت کے لیے یہاں بھیج دے گا۔ گویا ایک ہفتے سے زیادہ بھی لگ سکتا تھا۔ ایک مہینہ، ایک سال۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کبھی واپس نہ آئیں۔ پتہ نہیں، وہاں جا کے وہ کیا کریں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے رانا کی حویلی دیکھی تھی اور اپنے کانوں سے منیر علی اور جوالا کی باتیں سنی تھیں۔ حویلی میں داخل ہونا اور رانا تک پہنچنا اُن کے لیے آسان نہیں تھا۔ سات مہینے گزر چکے تھے۔ اس عرصے میں نہ جانے کیا ہو گیا ہو۔ ہم نے جس قدر احتیاط کی تھی، اگر انھوں نے نہ کی، اُن سے ذرا سی بھی چوک ہو گئی۔ رانا یا اُس کے آدمیوں کو ذرا سا بھی شبہ ہو گیا تو وہ زندگی بھر اُس کا پتہ نہیں چلا سکیں گے۔ پیرو کو بتاتے ہوئے تجمل کے ذہن سے کوئی بات رہ گئی ہو، انھوں نے عجلت کر دی یا تیزی دکھا دی تو جیسلمیر سے اُن کا واپس آنا مشکل ہو جائے گا۔

ضروری نہیں کہ وہ جیسلمیر میں نہ ہو، رانا نے اُسے کہیں دُور رکھا ہو، وہ اب اُس کی حویلی ہی میں نہ ہو۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ حویلی کے تمام آدمیوں کو یہ بات معلوم ہو مگر چند خاص آدمیوں کو ضرور معلوم ہوگی۔ جوالا نے رانا کے جن جن خاص آدمیوں کے نام لیے تھے، اُن میں سے چند کو یقیناً اُس کے بارے میں علم ہوگا کہ وہ اب کہاں ہے۔ وہ حویلی میں کس عذر سے داخل ہوں گے اور جا کے کیا کہیں گے۔ رانا کے کسی خاص آدمی کو اعتماد میں لیں گے مگر پھر وہ رانا تک کس طرح پہنچیں گے اور رانا تک پہنچ بھی گئے تو اُس سے کس طرح معلوم کریں گے اور حویلی کا خاص آدمی آسانی سے اُن کے اعتماد میں کیوں آ جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اُسے صرف اس قدر معلوم ہو کہ وہ اُس رات اُسے وہاں سے لے جانے میں شریک تھا، بعد کے حال سے وہ ناواقف ہے۔

اور ابھی اس بات کی تصدیق کہاں ہوئی تھی کہ اُسے رانا ہی کے آدمی لے گئے ہیں، کوئی اور بھی ہو سکتا ہے، رانا کی طرح جیسلمیر کا کوئی اور رئیس یا کوئی اور ۔۔۔ اگر وہ رانا ہی تھا تو اُس کے آدمی مولوی صاحب کو کیوں اپنے ساتھ لے گئے۔ ضرور مولوی صاحب نے مزاحمت کی ہوگی اور اُن میں سے کسی کو دیکھ لیا ہوگا اور وہ اس خدشے کے پیشِ نظر مولوی صاحب کو بھی لے گئے کہ اگر انھیں چھوڑ دیا گیا تو وہ اُن کے جاتے ہی یا ہوش میں آتے ہی شور مچا دیں گے اور رانا کے لیے اور مشکل پیدا کر دیں گے۔ یا رانا نے انھیں مولوی صاحب کو ساتھ لانے کی ہدایت کی ہو۔ رانا کا خیال، جیسا کہ اُس نے مولوی صاحب کو بار بار پیغام بھجوا کے ظاہر کیا تھا، وہی ہو اور وہ مولوی صاحب کی موجودی لیں ضروری سمجھتا ہو کہ وہ سامنے ہوں گے تو انھیں ہموار کرنا اتنا دشوار نہیں ہوگا۔ مولوی صاحب کو ختم کرنے کی صورت میں صبح محلّے بھر میں دہشت پھیل جاتی اور منیر علی شاید احتیاط کا دامن چھوڑ دیتے، وہ برسرِعام پولیس اور شہر کے لوگوں کی توجہ رانا کی طرف مبذول کر دیتے۔ ظاہر ہے، مولوی صاحب آمادہ نہیں ہوئے ہوں گے تو قرب و جوار میں کسی کو نظر آتے۔ وہ اُس کے ساتھ پھر کہاں گم ہو گئے۔ رانا نے اتنی مدت تک انھیں کوٹھری میں بند نہیں رکھا ہوگا۔ وہ نہیں مانے ہوں گے تو رانا کے آدمیوں نے انھیں راستے سے ہٹا دیا ہوگا اور وہ اکیلی رہ گئی ہوگی مگر وہ اتنی نازک ہے، اتنی باتیں اُس کی آنکھوں نے کیسے برداشت کی ہوں گی۔

تجمل کو پیرو کو بلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اُس سے کہا تھا کہ وہ واپس چلا جائے، مجھے تنہا چھوڑ دے، میں خود اُسے ڈھونڈ لوں گا، مجھے کہیں واپس نہیں جانا ہے جو مجھے وقت کی تنگی کا احساس ہو۔ میں اکیلا ہوتا تو رانا کی حویلی میں ضرور داخل ہو جاتا۔ میں رانا کے ہاں ملازم ہو جاتا۔ میں سیدھا اُس کے پاس جا کے کہتا کہ وہ رستم یا سہراب میں سے کسی کی جگہ مجھے دے دے۔ وہ میرے اس مطالبے پر ہنستا، مذاق اُڑاتا اور رستم و سہراب کو بلا کے مجھے اُن کے سامنے کر دیتا۔ مجھے یقین تھا کہ اُن میں سے کوئی بھی چند منٹوں سے زیادہ کا نہ ہوتا۔ پھر مجھے رانا کے ہاں ملازمت کرنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آتی۔ وہاں رہ کے اُن لوگوں سے قریب رہ کے کسی نہ کسی دن مجھے پتہ چل ہی جاتا کہ وہ کہاں ہے۔ ہم منیر علی کے ہاں تین دن ٹھیرے تھے۔ اگر کوئی شخص مجھے وہاں دیکھ کے کسی کو یہ بتا دیتا کہ ہم مولوی صاحب کے رشتے دار کی حیثیت سے منیر علی کے مہمان رہے تھے تو پھر شاید ایک لمحے بھی میرا وہاں رہنا ممکن نہ ہوتا۔

اور کیا عجب، پیرو جب واپس آئے تو اُس کے ساتھ وہ بھی موجود ہو۔ وہ یوں خالی ہاتھ تو نہیں آئے گا۔ بجّل نے کچھ سوچ سمجھ کے ہی پیرو کو بمبئی سے بلایا ہے۔ وہ تیوارٹی کے بعد بمبئی کا سب سے بڑا استاد تھا۔ اُس کی عمر بھی زیادہ ہے، نگاہ کا بہت تیز ہے۔ ماچھی بھی دیکھ بھال کے قدم اٹھائے گا۔ اگر اُس میں یہ خوبی نہیں ہوتی تو وہ پیرو کے اس قدر قریب نہ ہوتا، نہ پیرو اپنا اڈا اُس کے حوالے کرتا۔ زورا کو بھی ہر لمحے یہ خیال ہوگا کہ بعد میں میرے سامنے منہ دکھانے کی شرمندگی نہ اٹھانا پڑے۔ وہ ضرورت سمجھیں گے تو بمبئی سے اور آدمی بلا سکتے ہیں۔ اُن کے پاس آدمیوں کی کمی نہیں، سارے جیسلمیر میں اتنے آدمی نہیں ہوں گے، جتنے پیرو کے ایک پاڑے میں ہوں گے۔ اگر وہ واقعی اُس کے ساتھ آگئی! ابھی انھیں گئے ہوئے دیر نہیں ہوئی تھی مگر مجھ سے ایک پل نہیں کاٹا جا رہا تھا۔ مجھے اپنے آپ سے ہر چیز سے ڈر لگ رہا تھا، سینہ بار بار کوئی نوچے لیتا تھا۔ رگوں میں جیسے برف سی جم گئی تھی۔ میں کبھی باہر جاتا، کبھی ہوٹل میں واپس آجاتا۔ اس طرح شام ہوگئی۔ وہ جیسلمیر پہنچ گئے ہوں گے اور ہماری طرح حویلی کے گرد و پیش کا جائزہ لے رہے ہوں گے۔ رات کو بھی میں کھڑکی میں کھڑا یہی اندازے لگاتا رہا۔ ایک دن گزر گیا پھر دوسرا دن بھی گزر گیا۔ مجھے ہر لمحے یہ احساس ہوتا تھا کہ ہوٹل کی سیڑھیوں پر کوئی چڑھ رہا ہے حالانکہ انھوں نے ایک ہفتے بعد آنے کو کہا تھا مگر وقت کی اتنی پابندی تو تھی نہیں، وہ پہلے بھی آسکتے تھے۔ دروازے پر کوئی آہٹ ہوتی تو میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگتا۔ اے خدا، کاش وہ مل جائے، میں کرشنا جی کی دی ہوئی ساری دولت اُسی وقت لٹا دوں گا۔

ابھی ایک ہفتہ نہیں گزرا تھا، پانچواں دن تھا اور سہ پہر کا وقت۔ یکایک دروازے پر زور زور سے دستک ہوئی۔ یہ ہوٹل کے کسی ملازم کی دستک نہیں تھی۔ میں بستر سے اچھل پڑا۔ فرش پر قدم رکھتے ہی مجھے چکر سا آنے لگا مگر بجّل کے پہنچنے سے پہلے ہی میں نے ڈگمگاتے قدموں سے بھاگ کے دروازہ کھول دیا۔ سامنے پیرو کھڑا تھا۔ پیرو، ماچھی اور زورا۔ اُن کے پیچھے کوئی اور نہیں تھا اور اُن کے چہروں ہی پر سب کچھ لکھا ہوا تھا۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔

"بجّل بھائی!" پیرو کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ "وہ اُودر نئیں ہے۔"

بجّل اُسے تھامنے سے تھام کے اندر لے آیا۔ "اُودر اُس رات ہی رستم خاں نے اُس کو اور مولوی کو فرار کرا دیا تھا۔ اپن کچھ ساتھ لے کے نئیں آسکا دادا! یہ......"

اُس نے جیب میں ہاتھ ڈال کے ایک ریشمی رومال بجّل کے آگے ڈال دیا۔ اُس میں دو آنکھیں لپٹی ہوئی تھیں۔ خون میں چپچپی تھڑی ہوئی دو بڑی بڑی آنکھیں۔!

اُن کے کپڑے سیاہ ہوگئے تھے اور چہروں پر دھول جمی ہوئی تھی اور وہ مختصر سامان اُن کے ساتھ نہیں تھا جو وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ بجّل نے دونوں آنکھیں جلدی سے رومال سے ڈھک دیں اور پیرو کو کھینچ کے پلنگ پر بٹھا لیا۔ "وہ کہاں ہے؟" اُس نے چیخ کر پوچھا۔

"وہ اُودر نئیں ہے بجّل بھائی!" پیرو نے آہستگی سے جواب دیا۔

"پر یہ...... تم کیا لے آئے؟"

"اپن کو خالی ہاتھ آتے اچھا نہیں لگا۔" پیرو گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

"پر تم...... تم اتنی جلدی کیسے آگئے؟" بجّل کا لہجہ اکھڑا ہوا تھا۔

"وہاں جاستی ٹھیرنے کی ضرورت نئیں پڑی بجّل بھائی!"

"زبان کھولو پیرو دادا۔" بجّل اُس کا بازو جھنجوڑنے لگا۔

"کیا زبان کھولے۔" پیرو نے خود کچھ کہنے کے بجائے تھکے ہوئے لہجے میں ماچھی سے کہا۔ "بول دے ماچھی! بجّل بھائی کو سب بول دے۔"

بجّل نے اپنی سرخ آنکھیں ماچھی کی طرف مرکوز کردیں۔ ماچھی دروازے کے پاس سر جھکائے کھڑا تھا۔ "ابھی اپن کیا بولے۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

"بول دے، سب بول دے۔" پیرو نے دہشت زدہ لہجے میں اُسے حکم دیا۔

"اپن اُودر گیا تھا۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد ماچھی نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "پہلی رات تو دیوار کے ادھر چکر کھاتا مگج مارتا رہا کہ اندر سامنے کے راستے سے جائے یا کسی اور جگہ سے۔ اُودر پہرے دار لوگ بہت تھا۔ پھر پیرو دادا بولا کہ اِس طرح ادھر اُودر ٹکر مارنے سے اچھا ہے کہ اپن کو سیدھا رستم خاں کے پاس چل کے دیکھنا چاہیے۔ اندر جانے پر کوئی روک ٹوک نئیں تھا۔ پر سالا پوچھتا تو فورڈ ایسا کیسے اندر گھس سکتا تھا۔ ساری رات اپن دیوار کے نزدیک باغ میں پڑا رہا۔ دادا نے پھر زورا کو باہر ٹھیرنے کو بولا اور دوسرا دن سویرے سویرے اُودر گیٹ پہ جا کے کھڑا ہوگیا۔ نوارد آدمی دیکھ کے پہرے دار نے پوچھا۔ اپن نے رستم کا نام بولا اور اُس کو سب جانتا ہے۔ رستم اپنے کوارٹر پر ہی تھا۔ اپن نے کنڈی ماری تو باہر آیا اور اپن دونوں کو دیکھ کے آنکھیں پھاڑنے لگا۔"

"بوم مت مار۔ کام کی بات بول۔" پیرو نے دہاڑ کے درمیان میں دخل دیا۔ ماچھی کی زبان پھر رکنے لگی تھی۔

"چھلنی نہ کر، بولتا رہ۔" بجّل نے بے چینی سے کہا۔

ماچھی چند قدم آگے بڑھ کے بجّل کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ "اپن رستم بولا کہ دُور سے آیا ہے اور تم سے کچھ خاص بات کرنا مانگتا ہے۔" اُس کی آواز رفتہ رفتہ ٹھیرتی گئی۔ وہ بتا رہا تھا کہ یہ سُن کے رستم خاں نے اُن سے پوچھا کہ وہ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔ انھوں نے دوبارہ وہی جواب دیا کہ وہ اُس سے ملنے کے لیے دُور دراز سے آئے ہیں۔ رستم خاں اُن کی بات سے مطمئن نہیں ہوا۔ دروازے پر جما ہوا سوچتا رہا۔ پھر وہ انھیں اندر گھر میں لے گیا۔ اُس نے اُن کے کہنے پر کسی قدر جھجک کے بعد دروازہ بند کرلیا۔ ماچھی اور پیرو آتی صبح جان بوجھ کے اُس کے پاس گئے تھے تاکہ گھر میں کسی اور کی موجودگی ممکن نہ ہو۔ رستم خاں کے گھر میں اُس کی بیوی کے سوا کوئی نہیں تھا۔ وہ لنگوٹ کسے ہوئے ورزش کرنے کی حالت میں تھا۔

دروازہ بند ہوتے ہی پیرو نے چاقو نکال کے اپنے اور اُس کے درمیان فرش پر ڈال دیا۔ رستم خاں چونکا اور خشمگیں نظروں سے انھیں گھورنے لگا۔ پھر اُس نے بھی طاق سے اپنا چاقو اٹھا کے پیرو کے چاقو پر پھینک دیا۔ کوئی اور ہوتا تو شاید اتا پتہ پوچھے بغیر انھیں گھر میں نہ لے جاتا مگر وہ رستم خاں تھا، رانا مہتاب خاں کا سب سے قابلِ اعتماد آدمی۔ یہ اعتماد اُس نے اپنی بے باکی اور جرأت ہی سے حاصل کیا تھا۔ ماچھی کے کہنے کے مطابق اُس نے گفتگو میں پہل نہیں کی بلکہ اُن سے رسماً پوچھا کہ پہلے وہ ناشتہ کرلیں۔ پیرو کے انکار پر اُس نے زیادہ اصرار بھی نہیں کیا۔ تاہم وہ پوری طرح چوکنا بیٹھا تھا۔ پیرو نے اُس سے مولوی صاحب اور کورا کے بارے میں سوال کیا۔ وہ اپنی جگہ اچھل کے کھڑا ہوگیا لیکن دوسرے ہی لمحے اُس نے سنبھل کے صاف منع کردیا کہ وہ کسی ایسی لڑکی یا آدمی کو نہیں جانتا، وہ غلط جگہ آگئے ہیں۔ پیرو نے فوراً دونوں چاقو زمین سے اٹھا لیے اور رستم کا چاقو اُس کی طرف اچھال کے دوبارہ یہی سوال کیا۔ رستم خاں انکار کرتا رہا۔ پہلے ماچھی اور پیرو کا ارادہ تھا کہ کورا اور مولوی صاحب کی بات کرنے سے پہلے رستم کو بھروسے میں لیں اور اُسے اپنے ٹھکانے پر مدعو کرنے کے بہانے کسی تنہا جگہ لے جائیں گے مگر انھیں کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ کمرہ بند تھا اور پھر اُن دونوں کے لیے اس اجنبی شہر میں اس سے مناسب جگہ کی تلاش آسان نہیں تھی۔ دوسرے یہ کہ وہ رستم سے مولوی صاحب اور کورا کا ذکر کرچکے تھے۔ اب رستم خاں کا اُن کے ساتھ باہر جانا ممکن نہیں تھا۔ انھیں جو بات کرنی تھی، وہیں کرنی تھی۔

پیرو نے حتمی لہجے میں اُس سے کہا کہ وہ کورا کا پتہ پوچھے بغیر یہاں سے نہیں جائے گا۔ رستم خاں درشتی پر اُتر آیا۔ اُس نے اُن دونوں کو حکم دیا کہ وہ اُس کے گھر سے فوراً نکل جائیں ورنہ نتیجہ بُرا ہوگا۔ اُس نے اپنے چاقو کو بوسہ دے کے کہا کہ وہ دونوں حویلی سے زندہ واپس نہیں جائیں گے لیکن رستم خاں کی ہذیانی حالت دیکھ کے پیرو کو یقین آگیا تھا کہ مولوی صاحب اور کورا کے بارے میں وہ بہت کچھ جانتا ہے۔ وہ وہاں سے نہیں اٹھے۔ پیرو نے رستم خاں کو للکار کے اُس پر وار کردیا۔ ماچھی کہہ رہا تھا کہ وہ خود رستم خاں سے نمٹنا چاہتا تھا، اُس کا خیال تھا کہ پیرو نے بہت دنوں سے چاقو نہیں اٹھایا ہے، ہاتھ کھلنے میں شاید دیر لگے۔ کوئی بھی الٹی سیدھی بات ہوسکتی تھی مگر پیرو نے اُسے ایک طرف خاموش بیٹھے رہنے کی ہدایت کردی تھی۔ رستم خاں نے کئی پینترے بدلے مگر اُسے معلوم نہیں تھا کہ اُس کے سامنے بمبئی کا سب سے بڑا استاد پیرو ہے۔ دو تین ہی بار لوٹ پلٹ کے پیرو نے اُس سے چاقو گروا لیا۔ جیسے ہی رستم خاں بے بس ہوا، پیرو نے اپنا چاقو بند کرلیا اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔ رستم خاں جھپٹ کے اُس کے گلے لگ گیا اور اُس کی انگلیاں چومنے لگا اور کچھ کہے سُنے بنا دروازہ کھول کے باہر نکل گیا۔ وہ دونوں وہیں بیٹھے رہے۔ رستم چند ہی منٹ بعد واپس آگیا۔ اُس کے ہاتھوں میں پیتل کی ایک لٹیا اور کٹورے تھے۔ لٹیا سے مغزیات پڑا ہوا دودھ لوٹ کے اُس نے ایک کٹورا پیرو کے آگے کردیا۔ پیرو نے اُس میں سے چند گھونٹ پیے ہوں گے۔ باقی دودھ رستم نے ایک ہی سانس میں حلق سے اُتار لیا اور پیرو کا ہاتھ سینے سے لگا کے پوچھنے لگا کہ وہ کون ہیں اور اُس کا پتہ انھیں کس نے دیا ہے۔ پیرو نے پھر اپنی بات دُہرائی کہ جب تک رستم اُس کے سوال کا جواب نہیں دے گا، وہ اپنے بارے میں کچھ نہیں بتائے گا۔

رستم نے پھر ضد نہیں کی اور اقرار کیا کہ اُس رات وہ مولوی صاحب اور کورا کو لے کے آیا تھا۔ وہ چھ آدمی تھے۔ اِس کا منصوبہ انھوں نے کئی دن پہلے بنا لیا تھا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ محلّے کے لوگ تراویح پڑھ کے جلد ہی سو جاتے تھے۔ آدھی رات کے وقت وہ مولوی صاحب کے گھر میں اُترے۔ مولوی صاحب نے بساط بھر مزاحمت کی۔ کورا اُن لوگوں کو دیکھ کے بے ہوش ہوگئی تھی۔ رانا نے انھیں حکم دیا تھا کہ مولوی صاحب کو نہ تو ختم کریں، نہ چھوڑ کے آئیں۔ وہ رانا کی ہدایت کے مطابق شہر سے دُور اُس کی جاگیر پر واقع ایک حویلی میں انھیں لے آئے۔ یہاں رانا کبھی کبھار سیر و تفریح اور شکار کے لیے ٹھیرتا تھا۔ خاص خاص موقعوں کے لیے رانا کی نگاہ اسی حویلی پر جاتی تھی۔ حویلی کے آس پاس باغات اور کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ یہ سب کے سب رانا کی ملکیت تھے۔ حویلی میں آکے رستم نے پہلی بار کورا کو غور سے دیکھا۔ کورا کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور وہ ایک کونے میں سکڑی ہوئی بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ مولوی صاحب بُری طرح رو رہے تھے۔ وہ رستم کے پیروں پر گر گئے اور گڑگڑانے لگے کہ یہ لڑکی کسی کی امانت ہے۔ مولوی صاحب نے رستم کو خدا رسول کا، اُس کی ماں بہن کا واسطہ دیا۔ ماچھی کہہ رہا تھا، رستم خاں نے انھیں بتایا کہ کورا کو دیکھ کے اُس کا جی گھبرانے لگا۔ کورا پھولوں کی طرح نازک تھی۔ وہ اُسے دیر تک ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ جب وہ مولوی صاحب اور کورا کے کمرے کی کنڈی لگا کے باہر کی طرف آیا تو اُسے اپنے قدم بوجھل محسوس ہوئے۔ اُس کا ارادہ متزلزل ہوچکا تھا۔ اُس نے اشارتاً اپنی اس خواہش کا اظہار اپنے شاگرد سہراب سے کیا تو اُس نے توقع کے خلاف اُس کی حمایت کی۔ وہاں کئی آدمی تھے۔ ایک قاصد رانا کے پاس اطلاع دینے کے لیے روانہ کردیا گیا تھا اور اب رانا کسی بھی وقت وہاں پہنچ سکتا تھا مگر اُس کی آمد صبح کے بعد ہی متوقع تھی۔

چلتے وقت رانا پہلی بار عمارت میں دُور تک رستم کو رخصت کرنے آیا تھا۔ اس اہتمام سے اُسے یہ جتانا مقصود تھا کہ وہ ایک اہم کام کے لیے جا رہا ہے۔ رانا نے رستم اور اُس کے ساتھیوں سے وعدہ کیا تھا کہ واپسی پر وہ اُن کا منہ موتیوں سے بھر دے گا۔ رستم کو اس حقیقت کا پوری طرح احساس تھا کہ رانا اُسے بہت نازک اور پیچیدہ وقت ہی طلب کرتا ہے۔ اُس نے رستم کو بطورِ خاص یہ ہدایت کی تھی کہ مولوی صاحب اور کورا کو اُس کے خاص کمرے میں رکھا جائے اور رستم کے سوا کوئی کورا کے بدن کو ہاتھ

نگاٹے دوسروں سے جس حد تک ہو سکے، اُس کی پردہ پوشی کی جائے چنانچہ م ہی اُسے اپنے کندھے پر ڈال کے مکان سے باہر لایا تھا، اُس نے س کا بدن چادر سے ڈھک دیا تھا۔ اِس طرح کہ اُس کا چہرہ دوسروں سے چھپا رہے۔ حویلی کے اُس کمرے میں بھی جہاں مولوی صاحب اور کورا بند تھے، سہراب کے سوا اُس نے کسی کو آنے کی اجازت نہیں دی تھی۔

وہ دونوں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ حویلی کے صحن میں بیٹھے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے رہے۔ وقت گزرا جا رہا تھا۔ اندھیرا چھٹنے میں ابھی دیر تھی مگر اُنھیں جلد ہی کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ رستم سوچتا رہا پھر وہ اچانک اپنے ساتھیوں کے درمیان سے اُٹھ گیا۔ اُس نے اُنھیں یہ تاثر دیا کہ وہ حفظِ ماتقدم کے طور پر ایک بار پھر بند کمرے کا جائزہ لینا چاہتا ہے۔ رستم نے اندر جا کے جتنے بھی روپے اُس کے پاس تھے اور اپنے گلے میں پڑی ہوئی سونے کی زنجیر وغیرہ، سب کچھ مولوی صاحب کے حوالے کر دیا اور اُن سے کہا کہ جس وقت وہ اشارہ کرے اُسی لمحے وہ فرار ہو جائیں اور واپس اپنے گھر جانے کی کوشش نہ کریں بلکہ دوبارہ کبھی جیسلمیر شہر کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔ اُس نے اُنھیں یہ مشورہ بھی دیا کہ اگر آج رات وہ اشارہ دینے میں کامیاب نہ ہو سکے تو مولوی صاحب رانا سے خوش اطواری سے پیش آئیں اور بہ جبر و اکراہ اس سے کورا کی شادی پر رضامند ہو جائیں۔ رانا نے رستم سے دوبارہ وضاحت کی تھی کہ اُس کا ارادہ کورا کو مستقل طور پر اپنے حرم میں لینے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ رستم متعجب تھا کہ رانا کو اس تاکید کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ اُسے شاید خدشہ ہو گیا تھا کہ کورا کو دیکھ کے رستم کی نظر نہ بہک جائے یا وہ اُس کی آہ و بکا سے متاثر ہو کے کوئی اور قدم نہ اُٹھا لے یا ممکن ہے رانا کے ذہن میں کوئی اور بات ہو۔ رستم کو یہ بھی معلوم تھا کہ مولوی صاحب نے کورا کو رانا کے عقد میں دینے سے انکار کر دیا ہے، اگر مولوی صاحب اب بھی تیار نہ ہوئے تو کورا کا نصیب رانا کے ہاں آنے والی دوسری لڑکیوں سے مختلف نہیں ہوگا اور مولوی صاحب اب بھی آمادہ نظر نہیں آتے تھے۔

رستم کی واپسی کے کوئی آدھے گھنٹے بعد اصطبل میں دفعتہً گھوڑے ہنہنانے لگے۔ وہ سب دوڑتے ہوئے باہر پہنچے۔ کئی گھوڑے زخمی تھے اور ہنہنا رہے تھے۔ اس موقع پر رستم کے ذہن میں یہی ایک تدبیر آئی۔ اُس کی ایما پر سہراب گھوڑوں پر چاقو چلاتا ہوا ایک پل میں اندھیرے میں اوجھل ہو گیا تھا۔ باہر افراتفری مچ گئی۔ اسی ہڑبونگ میں سہراب نے اندر جا کے کنڈی کھول دی۔ جیسے ہی رستم کو سہراب دوبارہ اصطبل میں دکھائی دیا، وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ شور مچاتا ہوا اندر صحن میں واپس آیا۔ مولوی صاحب کے کمرے کا دروازہ کھلا پڑا تھا۔ ۔۔۔ کے آگے پیچھے کھیت اور باغات تھے، اُن پر گہرا اندھیرا مسلط تھا۔ رستم نے مولوی صاحب اور کورا کو جس سمت بھاگنے کو کہا تھا وہ اور سہراب اُسی سمت گئے تھے۔ باقی لوگوں کو اُس نے دوسری سمتوں میں دوڑا دیا تھا۔ مولوی صاحب اور کورا رستم کو پھر کبھی نظر نہیں آئے۔

رانا کے پاس جس وقت دوسرا قاصد پہنچا، وہ حویلی سے چل پڑا تھا۔ حالانکہ ابھی صبح پورے طور پر بیدار نہیں ہوئی تھی۔ قاصد نے اُسے راستے ہی میں جا لیا اور مولوی صاحب اور کورا کے غائب ہو جانے کی خبر سنائی۔ رانا کو سکتہ سا ہو گیا۔ اُسے گمان ہوا کہ قاصد جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ آناً فاناً جاگیر پہ پہنچا تو حویلی کے پہرے داروں اور ملازموں کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔ اُنھوں نے اُسے بتایا کہ مختلف آدمی مختلف سمتوں میں روانہ ہو گئے ہیں۔ رانا کی دل گرفتگی کم ہونے میں کئی دن لگ گئے۔ اس دوران ہر طرح اُس کی دل جوئی کی کوشش کی گئی۔ وہ اُن تمام آدمیوں کو ملازمت سے برخاست کر سکتا تھا مگر ایسا کر کے اور پریشانیاں مول لینے کا اندیشہ تھا۔ اُس نے کسی پر شبہے کا اظہار بھی نہیں کیا۔ شبہ کرتا بھی تو مولوی صاحب اور کورا واپس نہیں آ سکتے تھے۔ اُس نے قرب و جوار کے تمام علاقوں میں اپنے دوسرے آدمی بھیج کر دیکھے۔ کئی روز تک اُس کے آدمی مولوی صاحب کے محلّے میں گھومتے اور سن گن لیتے رہے۔ مولوی صاحب کے قریب کے لوگوں کی بھی نگرانی کی گئی۔ جن جن جگہوں پر رانا کا اثر و رسوخ تھا، وہاں وہاں مولوی صاحب کا حلیہ نقش کر دیا گیا اور بعض جگہ پولیس میں بھی۔ پولیس میں اس لیے کہ یہ مولوی صاحب کی تلاش کا ایک تو موثر ترین ذریعہ تھا، دوسرے اس طرح رانا پر کسی جانب سے کیے جانے والے شبہے کی بھی تلافی اور پیش بندی ہو سکتی تھی۔ رانا کی دلچسپی کی وجہ سے پولیس کے زیادہ فعال ہونے کا بھی امکان تھا جو محلّے والوں کے گم کا مے پر پہلے ہی سرگرم ہو چکی تھی۔ وہ پولیس کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھا۔ اِدھر یہ اطمینان حاصل تھا کہ مولوی صاحب کسی جگہ بھی پولیس سے رابطہ قائم کرنے اور رانا کو ملوث کرنے کی جسارت نہیں کریں گے۔ دو ایک مہینے تک رانا کی محفلیں سونی رہیں۔ اُس نے ناسازیٔ طبع کا بہانہ کر کے خود کو گوشہ نشین سا کر لیا تھا۔

رانا مہتاب خاں اور اُس کی نوجوان بہن نے کسی تقریب میں کورا کی صرف ایک جھلک دیکھی تھی۔ وہاں سے واپس آتے ہی اُس نے رستم کو طلب کر کے کورا کی فرمائش کر دی۔ رستم نے ہامی بھری تھی کہ وہ اپنے آقا کی خواہش کی تعمیل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا لیکن جب رستم نے مولوی صاحب کے گرد و پیش کے ماحول اور تمام حالات کا جائزہ لیا تو اُسے بہت سی اُلجھنوں کا اندازہ ہوا۔ مولوی صاحب متوسط درجے کے مسلمانوں کے علاقے میں رہتے تھے۔ رانا سے قریب و دور کا تعلق رکھنے والے اور حویلی میں آنے والے کئی خاندان وہاں آباد تھے۔ رانا کے بہت سے ملازموں سے بھی اُن کا رابطہ تھا۔ اُن لوگوں میں رانا کا بھرم قائم رہنا چاہیے تھا۔ وہ ہزار احتیاط کرتا لیکن اگر کہیں ذرا سی بھی بات کھل جاتی تو رانا کی بہت رسوائی ہوتی۔ رستم خاں کو علم تھا کہ رانا کے بارے میں شہر کے بہت سے مسلم گھرانے اچھی رائے نہیں رکھتے مگر کسی نے آج تک کھلے عام اُس پر حرف زنی نہیں کی تھی۔ وہ رانا کے واقعات سن کے ملال کرتے اور اُس سے کھنچے کھنچے سے رہتے تھے۔ بہ صورتِ دیگر اُن کا

رویّہ نفرت میں بدل جاتا۔ پھر محلّے کے لوگ اپنی لڑکیوں کو سایوں سے چھپا کے رکھتے تھے۔ رستم کو اس جمے جمائے ماحول کے کسی گھر میں ہاتھ ڈالنا اچھا معلوم نہیں ہوا اور اُس نے رانا کو مشورہ دیا کہ اگر اُسے لڑکی اتنی ہی مطلوب ہے تو بہتر ہے وہ باقاعدہ پیام بھیجے۔ رانا جیسے صاحبِ حیثیت شخص کو کون رشتہ دینا پسند نہیں کرے گا۔ رانا ہر صورت میں کورا کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ رانا نے رستم کی رائے سے اتفاق کیا اور براہِ راست سلسلہ جنبانی کی۔ رستم کا گمان تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شاید رانا کے دل میں کورا کا خیال خود ٹھٹھرنے لگے لیکن اِدھر سے جیسے جیسے انکار ہوتا گیا، رانا کی چنگاریاں تیز ہوتی گئیں۔

تجمل یا پیرو نے ماچھی کو بیچ میں کہیں نہیں ٹوکا۔ ماچھی اپنی زبان میں بڑبڑاتا رہا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ رستم کی زبانی یہ سب جان کے اُنھوں نے اُس کی تصدیق کی ضرورت نہیں سمجھی۔ رستم نے اپنے بیان کی شہادت کے لیے اُنھیں سہراب کے پاس لے جانا یا اُسے وہیں بُلانا چاہا مگر پیرو نے اُسے منع کر دیا۔ مولوی صاحب رستم کو اپنی منزل کا پتہ بتا کے نہیں گئے تھے۔ نہ ہی رستم نے اُن سے کچھ پوچھا تھا کیونکہ مولوی صاحب اُسے اپنا صحیح پتہ کبھی نہ بتاتے۔ ماچھی اور پیرو اُسی وقت جیسلمیر سے واپس ہو سکتے تھے۔ اب مزید کہیں جانے اور کرید کرنے سے کوئی اور نتیجہ نکلنے کی اُمید نہیں تھی لیکن رستم نے چند روز ٹھیرنے کے لیے اُن پہ زور دیا تو اُنھوں نے اُس کی بات نہیں ٹالی کیونکہ وہ خود ایسا چاہتے تھے۔ اتنی دُور آ کے اُنھیں یوں واپس جانا مناسب نہیں لگا۔ اُنھوں نے اپنے بارے میں رستم کا تجسس یہ بتا کے دُور کیا کہ وہ مدراس سے آئے ہیں اور اُنھیں مولوی صاحب کے ایک عزیز نے اُن کی کھوج کے لیے بھیجا ہے۔ رستم کو اس بات پر حیرت تھی کہ وہ اتنے تیقن کے ساتھ سیدھے اُس کے پاس کیسے آ گئے اور اُنھیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ رستم مولوی صاحب کے سلسلے میں کچھ جانتا ہے۔ سہراب کے سوا کسی کو یہ بات معلوم نہیں تھی۔ اُس رات اُن کے ساتھیوں نے بھی کسی موقع پر اُن سے اشارۃً اور کنایۃً اپنے شک کا اظہار نہیں کیا تھا۔ پیرو کو بتانا پڑا کہ مولوی صاحب اپنے آبائی گھر سے روٹھ کے اپنی لڑکی کے ساتھ جیسلمیر آ گئے تھے۔ بہت دنوں سے اُن کے رشتے دار اُن کی تلاش میں تھے۔ پھر کسی نے بتایا کہ وہ اس طرف جیسلمیر میں ہیں۔ جب یہاں آدمی بھیجا گیا تو لوگوں سے پتہ چلا کہ مولوی صاحب اور کورا ایک عرصہ ہوا، ایک رات اِن حالات میں گھر سے غائب ہو گئے تھے اور اپنے ہمراہ سامان بھی نہیں لے گئے تھے۔ اُن کے متعلق اُن کے شناساؤں سے تمام حالات معلوم ہونے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اُنھیں کون لے جا سکتا ہے۔ پیرو نے رستم کو بتایا کہ حویلی میں داخل ہونے سے پہلے اُس نے تمام معلومات حاصل کر لی تھیں اور سُنا تھا کہ رانا کی حویلی میں رستم نامی ایک آدمی کا بڑا شہرہ ہے اس لیے کہیں اور بھٹکنے کے بجائے وہ اُس کے پاس چلے آئے۔ اُن کا اندازہ غلط بھی ہو سکتا تھا۔ رستم اُس کی تاویل سے بڑی حد تک مطمئن ہو گیا اور اُس نے اُن دونوں کی خاطر تواضع میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔

وہ اپنا سامان لینے کی غرض سے باہر آئے تو زورا بے تابی سے اُن کا منتظر تھا اور دیر ہو جانے کے سبب خود اندر جانے کے ارادے باندھ رہا تھا۔ اُنھوں نے زورا کو شہر کے ایک سرائے نما ہوٹل میں ٹھیرایا اور حویلی میں رستم کے گھر واپس پہنچنے میں دیر نہیں لگائی۔ رستم گھر میں اکیلا نہیں تھا، اُس نے پُرانے واقف کار کی حیثیت سے اُن کا تعارف اپنے چند خاص آدمیوں سے کرایا۔ وہ سہراب سے ملے۔ دوپہر کے کھانے سے پہلے رستم نے اچانک اپنے ساتھیوں کو باری باری ماچھی اور پیرو سے زور آزمائی کی دعوت دے دی۔ پیرو اور ماچھی اس کے لیے تیار نہیں تھے لیکن ابھی اُنھیں یہیں رہنا تھا۔ اُنھوں نے یہ صراحت کر دی تھی کہ اُن کا تعلق کسی اڈّے سے نہیں ہے بلکہ اُن کا مشغلہ اجناس کی تجارت ہے اور وہ زیادہ تر دیہات میں رہتے ہیں اور یہ جو کچھ ہاتھ پیروں میں تھوڑی بہت پھُرتی ہے، وہ اسی فراغت کی وجہ سے ہے۔ رستم کی خواہش پر اُنھیں اُس کے ساتھیوں کے سامنے آنا پڑا۔ ہر چند کہ اُنھوں نے بہت پہلو تہی کی اور ہاتھ چلانے میں بھی احتیاط برتی لیکن کوئی بھی اُن کے آگے چند لمحوں سے زیادہ نہیں ٹھیر سکا۔ اُن کی چُستی اور تیزی دیکھ کے رستم کے ساتھی اُن کے گرد جم کے بیٹھ گئے۔ اِس موقع پر ماچھی اور پیرو نے رستم سے دانستہ پنجہ آزمائی نہیں کی تھی۔ شام کو رستم اُنھیں حویلی کی سیر کرانے لے گیا۔ اُنھوں نے پورا نقشہ ذہن میں محفوظ کرنے کی کوشش کی۔ وہ ایک ایک جگہ حیرت اور اشتیاق سے دیکھتے جیسے یہ سارا منظر پہلی بار دیکھ رہے ہوں اور جیسے عمارت کا سارا نقشہ رستم نے بنایا ہو اور وہ سب اُسی کی ملکیت ہو۔ رستم اُن کا شوق دیکھ کے اُنھیں حویلی کے ہر گوشے میں لے گیا۔ وہ کہیں بھی آ جا سکتا تھا۔ جہاں کوئی ملازم یا حویلی کا باسی اُن کی راہ میں پڑتا، رستم کو سلام کرنا ضروری سمجھتا۔ حویلی تین حصّوں میں منقسم تھی۔ ایک زنان خانہ، ایک مردان خانہ جس کے ساتھ مہمانوں کے ٹھیرنے کی بھی ایک بڑی عمارت تھی۔ تیسرا حصہ ملازموں کے کوارٹر جیسے مکانات پر مشتمل تھا۔ پچھواڑے ایک باغ تھا اور ایک چمن، جہاں بارہ دری اور حوض بنا ہوا تھا۔ رستم کے کہنے کے مطابق شام کو اور صبح عموماً رانا مہتاب خاں چمن میں کچھ وقت گزارتا تھا۔ دوپہر کو جب زنان خانے سے عورتیں اس طرف آتی تھیں تو کسی مرد کو آنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ وہ شام ہی کا وقت تھا لیکن اتفاق سے رانا مہتاب خاں چمن میں موجود نہیں تھا۔ ماچھی اور پیرو اُسی کو دیکھنے کے لیے مضطرب تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ حویلی میں گھومتے ہوئے کسی جگہ اُس سے ملاقات ضرور ہو جائے گی۔ زنان خانے اور مردان خانے کے اُس حصّے کے سوا جہاں رانا مہتاب خاں کی موجودگی کا امکان تھا، رستم نے اُنھیں حویلی کا کونا کونا تفصیل سے دکھایا۔

رات کو کھانا کھانے کے بعد رستم اُنھیں اپنے گھر سے کچھ دُور احاطہ کھنچی ہوئی ایک کھلی جگہ لے گیا۔ یہاں وہ شام کو بھی آیا تھا۔ درمیان

میں ایک اونچا چبوترا تھا جو اکھاڑے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ یہاں رانا کے آدمی ورزش کرتے اور داؤ پیچ سیکھتے تھے۔ اب وہاں فرش پر دری بچھی تھی اور اطراف میں گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ سامنے سازندے بیٹھے تھے۔ اُن کے بیچ میں ایک ناچنے گانے والی لڑکی تھی۔ رُستم نے اُن سے کچھ کہے بغیر یہ اہتمام کیا تھا۔ محفل چند ہی لوگوں تک محدود تھی اس لیے کہ پیرو اور ماچھی نے پہلے ہی رُستم سے کہہ دیا تھا کہ انھیں بھیڑ بھاڑ کا پسند نہیں ہے۔ وہ جلد از جلد یہ محفل ختم کرنے کی جستجو میں تھے لیکن رُستم غزلوں کی فرمائش پہ فرمائش کر رہا تھا۔ بہت رات گئے یہ سلسلہ بند ہوا۔ انھیں ایک اور رات ضائع جانے کا افسوس تھا۔ گھر آنے کے بعد مدہوش رُستم دیر تک انھیں اپنے واقعات، حویلی کے تذکرے اور رانا کی باتیں سُناتا رہا اور وہ اُس سے کُرید کُرید کے پوچھتے رہے۔ اُن کی دلچسپی کا محور صرف رانا کا تذکرہ تھا اور جیسا کہ جوالا نے ہمیں بتایا تھا، رُستم نے بھی رانا کے متعلق انھیں وہی باتیں بتائیں۔ دوسرے دن صبح گیارہ بجے کے قریب وہ رانا کو دیکھ سکے۔ رُستم انھیں سہراب کے ہاں دوپہر کے کھانے کی دعوت پہ لے جا رہا تھا کہ رانا سے اُن کا آمنا سامنا ہو گیا۔ رانا کو دیکھ کے رُستم ٹھہر گیا اور اُس نے اُن دونوں کو اُس کی خدمت میں اپنے مہمان کے طور پر پیش کیا۔ رانا کو شاید اُن کی آمد کے بارے میں کچھ معلوم ہو گیا تھا۔ اُس نے خندہ پیشانی سے اُن کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ اگر رُستم کے گھر میں تنگی ہو تو انھیں مہمان خانے میں ٹھہرا دیا جائے۔ ماچھی بتا رہا تھا کہ رانا کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ کے اُس کی آنکھوں میں خون اُترنے لگا۔ وہ سُرخ و سپید رنگ کا ایک دراز قد شخص تھا، اُس کا جسم فربہی کی طرف مائل تھا۔ عمر زیادہ نہیں معلوم ہوتی تھی۔ باریک مونچھیں، سیاہ بال پیچھے کی طرف لوٹے ہوئے، سفید کُرتے اور پاجامے میں وہ ایک نواب لگ رہا تھا۔ رانا اُن کے لیے کوئی نیا آدمی نہیں تھا۔ اب تک وہ اُس کے بارے میں بہت سی باتیں سُن چکے تھے اور اُن باتوں سے اُنھوں نے اُس کے متعلق جو تصور قائم کیا تھا، وہ ہو بہو اُس کے مطابق تھا۔ رانا کے چہرے پر سب سے نمایاں اُس کی آنکھیں تھیں۔ بڑی بڑی سُرخ آنکھیں۔ اُن میں خون کے سُرخ ڈورے پڑے ہوئے تھے۔

شام کو وہ زورا سے ملنے کے لیے تنہا شہر جانا چاہتے تھے مگر رُستم اُن کے ساتھ ہو گیا۔ وہ بازاروں اور گلیوں سے گزرتے ہوئے اُس سرائے کی طرف جا نکلے جہاں زورا ٹھہرا ہوا تھا۔ زورا نے انھیں دُور سے دیکھ لیا لیکن ماچھی کا اشارہ پا کے دُور دُور ہی رہا۔ اُن کا مقصد بھی زورا کو اپنے چہرے دکھانا تھے لیکن جب وہ سرائے سے قریب پان کی ایک دکان پہ پہنچے تو زورا اُن کے قریب آ گیا۔ وہ رُستم کے سامنے ایک دوسرے کے لیے اجنبی بنے رہے۔ پھر پیرو نے رُستم کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور ماچھی کو زورا سے چند باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔ اُس نے زورا سے کہا کہ کل دوپہر تک اگر وہ اُس کے پاس نہ آ سکیں تو وہ بمبئی تار دے کے اور لوگوں کو بُلا لے اور اگر وہ اُن لوگوں کے بمبئی سے آنے کے بعد بھی اُس کے پاس نہ پہنچ سکیں تو وہ سب جس طرح مناسب سمجھیں، حویلی میں داخل ہونے کی کوشش کریں اور فرض کر لیں کہ ماچھی اور پیرو کسی مصیبت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ اُدھر بیکانیر میں اُستاد ببھّل اور لاڈلے کو فوراً مطلع کر دیا جائے۔ اُن کے ذہن میں بہت سی باتیں تھیں لیکن جو اُنھوں نے سوچ رکھا تھا، وہ آسان نہیں تھا۔ وہ تعداد میں صرف دو تھے اور رانا کی حویلی ایک چھوٹے سے قلعے کی حیثیت رکھتی تھی، گو وہ اُس قلعے کے اندر بیٹھے تھے۔ دوسری رات رُستم خاں پھر مجرے کا اہتمام کر رہا تھا۔ انھوں نے اصرار کر کے مُجرا دوسرے دن کے لیے ملتوی کرا دیا۔ رُستم خاں نے اس محفل کے لیے خاص طور پر سبزی کے پیالے بنوائے تھے۔ پیرو اور ماچھی نے اسی قدر پی کہ ہوش میں رہ سکیں البتہ رُستم خاں نے خوب پی، کھانا بھی بے تحاشا کھایا اور جلد ہی اپنے آپ سے دُور ہونے لگا پھر بھی رات کے ڈیڑھ دو بجے سے پہلے ماچھی کو رُستم کے گھر سے باہر نکلنے کا موقع نہیں مل سکا۔ حویلی میں ہر سُو خاموشی تھی۔ پیرو رُستم کے پاس ہی ٹھہرا رہا اور ماچھی رات کے اندھیرے میں کوارٹر سے باہر نکلا۔

انھوں نے رُستم کی زبانی رانا کی ایک چھوٹی بہن کے متعلق سُنا تھا۔ اُنھوں نے طے کر لیا تھا کہ راستے میں جتنے آدمی آئیں گے، اُن کے ساتھ وہ کوئی رعایت نہیں کریں گے اور کسی نہ کسی طرح اندر زنان خانے میں داخل ہونا ایسا مشکل مرحلہ نہیں تھا۔ وہاں دو ایک ہی چوکی دار ہو سکتے تھے۔ رانا بہرحال ایک جاگیردار تھا، کوئی دربار ی عہدے دار یا راجا نہیں۔ حویلی کے چاروں طرف پھیلی ہوئی دیوار اور اِدھر اُدھر دروازوں ہی پر بہت پہرے دار تھے تو اندر رکھوالی کی اتنی ضرورت کہاں تھی مگر جب اُنھوں نے آپس میں بعد کے مراحل پہ غور کیا تو رانا کی بہن کو لانے کا خیال مسترد کر دیا۔ اُسے بے شک اندر سے لایا جا سکتا تھا لیکن حویلی کی دیوار کے پار لے جانا تبھی ممکن تھا جب اُن کے پاس زیادہ آدمی ہوتے۔ اپنے دوسرے آدمیوں کی آمد کا انتظار کرنے میں دن بہت لگ جاتے۔ انھیں واپس ببھّل کے پاس پہنچنا تھا۔

ماچھی نے خود کو ایک چادر میں لپیٹ لیا تھا، اندھیرے میں خود کو چھپاتا ہوا وہ حویلی کے پچھواڑے چمن میں آ گیا اور بارہ دری کی محرابوں اور جالیوں کا سہارا لے کے زنان خانے کی چھت پہ پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس جگہ کی اُس نے پہلے ہی نشان دہی کر لی تھی۔ چمن زنان خانے اور مردان خانے کے سامنے درمیانی حصّے میں تھا اور حوض کے پاس بارہ دری شاید اس خیال سے بنائی گئی تھی کہ حویلی کے دونوں حصّوں کے مکینوں کو وہاں آنے جانے میں دشواری نہ ہو۔ ماچھی چھت چھت اور منڈیر منڈیر گزرتا ہوا مردان خانے تک آسانی سے پہنچ سکتا تھا۔ چھت پر اُسے اِدھر سے اُدھر جانے میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ اُسے کسی زینے کی تلاش تھی اور اُس کا خیال تھا کہ اس طرز کی عمارتوں کے زینے عموماً کُھلے ہوتے ہیں، وہ کسی جگہ سے دوبارہ نیچے پہنچنے میں کامیاب ہو جائے گا مگر اس طرف جو زینہ نظر آیا

دروازہ بند تھا۔ ماچھی نے اُسے کھولنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام ... نیچے اُترنے کے لیے کوئی اور مناسب جگہ ڈھونڈنے لگا۔ چھت سے ... پائپ کی شکل میں کئی پرنالے باہر اُٹھے ہوئے تھے۔ اگر اُس کے پاس ... رسّی تو وہ اُسے اُن سے باندھ کے نیچے اُتر سکتا تھا۔ پرنالا دونوں ... سے پکڑ کے اور جسم نیچے گرا کے زمین پر کودنے سے ہاتھ پیر ٹوٹ ... کا اندیشہ تھا۔ چھت بہت اُونچی تھی۔ اسی لحاظ سے پرنالے بھی اُونچے ... چھت پر یہاں سے وہاں دبے قدموں کھسکتا، رینگتا رہا اور آخر اُس ... یہی بات آئی کہ وہ جس راستے سے اُوپر آیا ہے اُسی سے واپس ہو اور نیچے ہی کہیں سے مردان خانے میں جانے کا راستہ تلاش کرنے ... دو کرے۔ مجبوراً وہ بارہ دری کے ذریعے واپس چمن میں آ گیا اور رکتا ... درختوں کی آڑ لیتا مردان خانے کی طرف بڑھنے لگا۔ اُسے ایک لمبا چکر ... کے عمارت کے سامنے آنا تھا لیکن یک بارگی اُس کے ذہن میں آیا کہ ... وہ عمارت کے پچھلے ہی حصّے میں کسی طرف راستے کا سراغ لگائے۔ ... جگہ کمروں میں ہلکی روشنی تھی۔ مردان خانے کی عمارت میں پیچھے کی ... اُسے ایک تنگ گلی سی نظر آئی۔ ماچھی اُسے گلی کہہ رہا تھا مگر وہ راہ داری ... ماچھی بے آواز چاپوں سے اُس کے قریب گیا۔ راہ داری دُور تک ... تی تھی اور اندر دائیں بائیں دوسری راہ داریوں سے مل جاتی تھی۔ چند ... کے اُسے اندازہ ہوا کہ آگے کچھ فاصلے پہ راہ داری کا دروازہ بند ہے، ... ئی آواز چبکار نہیں ہے۔ ماچھی نے لوہے کے جالی دار دروازے ... جھانک کے دیکھا۔ مدھم روشنی میں چارپائی پر اُسے ایک شخص سویا ہوا ... چارپائی کے سرھانے فرش پر دھیمی جلتی ہوئی لالٹین رکھی ہوئی ... پاس ہی ایک لاٹھی بھی دیوار سے ٹکی ہوئی تھی۔ ماچھی دیر تک سوچتا ... کیا کرے۔ اگر وہ اُس شخص کو پکارتا ہے تو ضروری نہیں کہ سویا ہوا شخص ... کھول کے باہر نکل آئے اور آہٹ کی تصدیق کرے اور اسی اثنا ... ماچھی اُس پہ کود پڑے۔ وہ اندر ہی رہ کے آوازیں لگا سکتا تھا کہ ... ہے۔ اُسے خواہ مخواہ شک میں ڈال کے مزید کوئی اُلجھن پیدا نہیں ... چاہیے تھی۔ ماچھی نے اُسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا اور آگے ... کا فیصلہ کر لیا۔ عمارت کی دیوار سے چپکتا ہوا وہ کونے تک پہنچ گیا۔ ... ئیں جانب مُڑ کے عمارت کے ساتھ ساتھ ہی چلتا تھا۔ اُس نے ... سر نکال کے دیکھا۔ اُدھر کوئی نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ چلنے کے بجائے ... پنجوں کے بل بھاگنا شروع کر دیا اور چند ثانیوں میں دوسرے کونے ... مگر جب اُس نے وہاں سے جھانک کے دیکھا تو عمارت کے سامنے ... میں خاصی روشنی تھی۔ اُسے چبوترے جیسے طویل و عریض صحن کے ... پر دو تین آدمی بھی بیٹھے ہوئے نظر آئے، دو موٹریں بھی کھڑی تھیں۔ ... ٹھہر گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ رانا کی محفل ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ ... رات کا بڑا حصّہ گزر چکا تھا۔ اُس نے رُستم سے سُنا تھا کہ کبھی

کبھی تو رات رات بھر ناچ گانا ہوتا رہتا ہے۔ باہر آدمیوں کی موجودی سے ظاہر تھا کہ اندر بھی بہت سے لوگ ہوں گے۔ پتہ نہیں کب یہ محفل ختم ہو۔ ممکن ہے صبح ہو جائے۔ وہ یہیں کھڑا سوچ رہا تھا کہ کب تک انتظار کر سکتا ہے، اس درمیان میں کسی پہرے دار یا کسی اور شخص کی نظر پڑ گئی تو وہ اُس سے کیسے نمٹے گا۔ اس قسم کے کئی اندیشوں نے ماچھی کو اُلجھن میں مبتلا کر دیا۔ صحن سے دُور، درمیان کے درختوں کی آڑ میں اُسے بڑے دروازے پر چہل پہل کے آثار نظر آ رہے تھے۔ دروازہ بند معلوم ہوتا تھا۔ ماچھی نے واپس جانے کا ارادہ کیا مگر واپس مڑتے ہوئے اُس کے پیر اٹکنے لگے۔ وہ پیرو کو کیا جواب دے گا اور کل کا سورج نہ معلوم کس انداز سے نمودار ہو، یہ سوچ کر وہ رُک گیا اور اُس نے انتظار کرنے کا عزم کر لیا لیکن کسی ایسی جگہ چھپنا بہتر تھا جہاں سے وہ آنے جانے والوں کو دیکھ سکے اور عمارت کا وہ حصّہ بھی قریب رہے جس طرف اُسے جانا تھا۔ ماچھی کو ان حالات میں ایک ہی راستہ دکھائی دیا کہ وہ عمارت اور چار دیواری کے بیچ کی کشادہ جگہ عبور کر کے چار دیواری کے ساتھ لگی ہوئی کیاریوں کی باڑھ میں خود کو چھپا لے۔ اُس نے یہی کیا اور ایک ایسے مقام پر آ کے بیٹھ گیا جہاں اُس کی نظروں کے سامنے سب کچھ عیاں تھا۔ آہٹ کے بغیر کوئی اُسے دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اُس نے چادر سے اپنا جسم ڈھانپ لیا تھا۔ اس طرح وہ زمین پر اُٹھا ہوا مٹی کا ایک تودا معلوم ہوتا تھا۔ وہ وہیں موجود رہا۔ کچھ دیر بعد ہی شور اُٹھا۔ صحن میں ایک ساتھ کئی افراد آتے ہوئے دکھائی دیے۔ اُن میں رانا نہیں تھا۔ شیروانی پہنے ہوئے ایک دبلے پتلے شخص نے اُن چند لوگوں کو موٹر تک رخصت کیا۔ سب کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ پھر شیروانی والا شخص لوٹ آیا۔ اُس کے جاتے ہی سازندوں کی ایک ٹولی اندر سے آ کے صدر دروازے کی طرف چلی گئی۔ ماچھی نے اپنی نگاہیں جمائے رکھیں۔ لوگ آئے اور چلے گئے۔ سازندوں کے ساتھ گانے والی نہیں تھی۔ اُسے شاید اندر روک لیا گیا تھا۔

تھوڑی دیر میں لمبے چوڑے پختہ صحن میں خاموشی غالب آ گئی۔ وہ شخص بھی اُٹھ کے کہیں چلا گیا تھا جو آخری سرے پر پہرے داری کر رہا تھا۔ باہر کی روشنیاں مدھم پڑ گئیں۔

ماچھی نے وہیں بیٹھے بیٹھے وہ جگہ آنکھوں میں محفوظ کر لی تھی جدھر سے لوگ باہر آئے تھے۔ صحن میں ہر آہٹ معدوم ہو گئی تو ماچھی اپنی جگہ سے اُٹھا۔ صحن میں اب بھی اتنی روشنی ضرور تھی کہ دُور سے کوئی بھی اُس کی نقل و حرکت دیکھ سکتا تھا۔ ماچھی صحن میں آ کے لوٹتا پوٹتا عمارت سے قریب ہو جاتا مگر یہ ایک طویل اور تھکا دینے والا عمل تھا۔ صحن ہر طرف سے کُھلا ہوا تھا۔ بڑے دروازے پر پہرے دار اب بھی جاگ رہے تھے، گو وہ بہت دُور تھے۔ خاصی دیر سوچنے کے بعد اُس نے خطرہ مول لینے کی ٹھان لی۔ اُس نے طے کیا کہ وہ کُھلے طور پر صحن میں چلتا ہوا عمارت میں داخل ہو گا۔ دُور سے کسی نے اُسے دیکھا تو پہرے دار کا گمان کرے گا۔ عمارت

کے کونے تک وہ دیوار سے چپکتا ہوا آیا اور صحن میں قدم رکھتے ہی اُس نے اپنا جسم سیدھا کر لیا۔ اُس نے چادر اس طرح لپیٹ لی تھی کہ اُس کا جسم کم سے کم چھپ سکے۔ اُس کی چال بھی معتدل تھی۔ اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتا ہوا وہ سارا صحن عبور کر گیا اور اَن گنت تھموں پر ٹکے ہوئے والان میں آ گیا۔ یہاں اُسے معلوم نہیں تھا کہ کس طرف جانا ہے۔ اُس نے ایک اندازہ لگایا اور ایک کھلے ہوئے محراب نما دروازے میں اوجھل ہو گیا۔ اُس کا خیال درست تھا۔ دروازے کے دونوں اطراف دائیں بائیں راستے جاتے تھے۔ راستوں پہ قالین بچھا ہوا تھا۔ اِرد گرد کمرے بنے ہوئے تھے۔ ماچھی کو کسی روشن کمرے کی تلاش تھی مگر وہاں کئی کمروں کے اُوپر روشن دانوں سے ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ ماچھی نے پہلے پڑنے والا دروازہ آہستہ سے ہلا کے دیکھا، وہ بند تھا۔ ماچھی نے چہرے پر چادر لپیٹ لی اور ہلکی سی دستک دی۔ دستک کا کوئی جواب نہیں ملا تو اُس نے دروازہ دھڑ دھڑایا۔ اندر سے ایک گھبرائی ہوئی آواز اُبھری کہ کون ہے؟ ماچھی نے دستک جاری رکھی۔ اندر اُسے محسوس ہوا کہ کوئی دروازے کی طرف آ رہا ہے۔ "کون ہے؟" کسی نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"رانا جی۔۔۔ رانا جی۔۔۔۔ وہ"۔ ماچھی نے دہشت زدہ لہجے میں کہا۔ اُسے احساس تھا کہ زیادہ نہیں بولنا چاہیے۔ اُس کا لہجہ بہت نمایاں تھا۔ دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا۔ ماچھی تیار کھڑا تھا۔ اُس نے ایک لمحے میں باہر سر نکالنے والے شخص کا سر دبوچ لیا اور اُس کا منہ بند کر دیا۔ دوسرے لمحے ماچھی کا چاقو اُس کی گردن پہ تھا۔ وہ وہی شخص تھا جو رانا کے مہمانوں کو رخصت کرنے موٹروں تک آیا تھا۔ اُس نے شیروانی اُتار دی تھی اور صرف کرتا پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ وہ گھگھیانے لگا۔ "رانا کے پاس چلو"۔ ماچھی نے اُسے حکم دیا اور کہا کہ اگر اُس نے آواز نکالنے کی کوشش کی تو چاقو اُس کے سینے کے پار ہو گا۔ وہ نڈھال ہونے لگا۔ ماچھی نے اُس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا۔ رانا کا کمرہ اُس شخص کے کمرے کے برابر ہی تھا۔ ماچھی نے پھر اُسے حکم دیا کہ وہ دروازے پر دستک دے اور اپنا نام بتائے۔ وہ شخص جھجکا لیکن چاقو کی نوک اُس کی گردن میں چبھی تو فوراً آمادہ ہو گیا۔ اندر سے رانا کی لڑکھڑاتی ہوئی گرج دار آواز گونجی۔ ماچھی کے دبوچے ہوئے شخص نے اپنا نام مکی میاں بتایا۔ رانا نے ناراضی سے پوچھا "کیا ہے؟" مکی میاں نے ماچھی کے ایما پر آواز لگائی "کوئی آیا ہے، دروازہ کھولیے"۔

"نہیں کھولتے"۔ رانا نے اکھڑی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

مکی میاں نے پھر التجا کی "کھولیے سرکار! کام ہے ضروری کام ہے"۔

رانا کے ڈگمگاتے ہوئے قدموں کی گونج ماچھی کے کانوں میں پڑی تو اُس نے مکی میاں کے کندھے پہ گردن کے قریب ضرب لگائی۔ مکی میاں وہیں بیٹھ گیا۔ ماچھی پوری طرح مستعد تھا۔ دروازہ کھلا تو رانا تمنچا لیے اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ اُس کا سراپا کسی شاخ کی طرح لہرایا۔ ماچھی نے ایک ہاتھ سے

اُس پہ جھپٹا مارا، دوسرے ہاتھ سے اُس کے منہ پہ وار کیا۔ تمنچا ز
رانا اتنا مدہوش نہیں تھا جتنا آواز سے معلوم ہوتا تھا۔ ماچھی کی
کے وہ فوراً اُٹھ گیا لیکن جب اُس نے اپنا تمنچا ماچھی کے ہاتھ
اُس کے بڑھتے ہوئے قدم ٹھٹھر گئے۔ "کون ہو؟ کیا چاہتے ہو؟" را
آواز ٹھہرانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ ماچھی اُسے جواب دیے
جست لگا کے اُس لڑکی کے پاس جا پہنچا تھا جس نے اُس کے ا
چیخ بلند کی تھی کیونکہ وہ پلنگ پر برہنہ پڑی تھی۔ رانا جیسے ہی زمین
اپنا بدن چھپاتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ ماچھی نے اُسے زیادہ چیخنے کا
نہیں دی۔ ماچھی کا ایک ہی ہاتھ اُس کی خاموشی کے لیے
دوسری جانب ماچھی نیم برہنہ رانا کو نشانے پر لیے ہوئے تھا۔
بڑی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ ماچھی نے تمنچا جیب میں رکھ لیا ا
اُس کے پیٹ میں اپنا گھٹنا گھسیڑ دیا۔ رانا دوہرا ہو گیا۔ ماچھی
کے لیے اُٹھنے اور سنبھلنے کی گنجائش نہیں رکھی تھی۔ اُس نے دروازہ ب

جب وہ وہاں سے لوٹا تو اُس کے ہاتھ خون میں لت

رُستم گہری نیند سو رہا تھا اور پیرو ماچھی کے اشارے کا منتظر تھا۔
پیرو کوارٹر سے باہر نکل آیا۔ دونوں شمال کی سمت چار دیواری
ٹٹولتے ہوئے چلتے رہے۔ دوپہر ہی اُنھوں نے کسی جگہ اینٹیں
نکھیں۔ دوسری طرف سے بے نیاز ہو کے وہ اُوپر چڑھ گئے اور
چار دیواری کی منڈیر سے چپکے ہوئے خود کو گھسیٹتے رہے۔ اُن کے
ہو گئے۔ وہ دوسری جانب ایسی جگہ کُودنا چاہتے تھے جہاں
اُوپر ہو یا کوئی درخت قریب ہو جس کی شاخ کا سہارا لے سکے
پھر ایک جگہ اُنھیں کوڑے کا ڈھیر نظر آیا۔ اُنھوں نے خود کو
کے کپڑے اس قابل نہیں تھے کہ وہ شہر جا سکیں۔ وہ اند
بھاگتے رہے۔ پیرو کے کپڑے ماچھی کے کپڑوں سے بہتر تھے
ماچھی کو دُور ٹھہرا کے خود سرائے پہنچا۔ زورا جاگ رہا تھا۔ پیرو
کے وہ کسی مسافر کی پوٹلی اُٹھا لایا۔ اُن تینوں نے ریلوے لائن
جیسلمیر کی مخالف سمت سفر شروع کیا۔ وہ چلتے رہے تا آ
آیا۔ پھر اُنھیں ایک چھکڑا مل گیا۔ جیسلمیر سے تیس میل دُور لا
پر آ کے اُنھوں نے سانس لی اور گاڑی کا انتظار کرنے لگے

ماچھی چُپ ہو گیا تھا۔ بجھل نے سر نہیں اُٹھایا۔ ا
اُس نے کچھ سُنا ہی نہ ہو اور ماچھی اپنے آپ سے باتیں کر
ایک دوسرے کو سٹپٹاتی نظروں سے دیکھنے لگے۔ پیرو نے
کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ بجھل چونک پڑا۔ "بجھل بھائی! کیدھر
"کدھر بھی نہیں"۔ بجھل نے سرد لہجے میں کہا۔
"کیا سوچنے لگا ہے؟"
"کچھ نہیں پیرو!" بجھل نے آہستگی سے کہا "تم بمبئی وا

کیا۔۔۔ کیا بول رہا ہے؟ اور تم؟"
ہم کو یہیں چھوڑ دو"۔
تم ادھر کیا کریں گا بجھل بھائی؟"
پیرو! تم واپس چلے جاؤ"۔
وہ تو اپن چلا جائیں گا پَر۔۔۔ پر تم کیا سوچ رہا ہے! اپن سے کوئی
یا ہے؟"
ور بجھل بھائی! ایسے چُپ کیوں ہو گیا؟"
تم سے کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ غلطی ہم سے ہوئی جو تم کو اتنی دُور سے
یا"۔
بجھل اپنے گال تھپتھپانے لگا۔
پیرو نے اُس کے ہاتھ پکڑ لیے اور بھنچی ہوئی آواز میں بولا "بجھل بھائی!
ات ہے تو اپن کو بولو، اپن سزا سُننے کے لیے تیار ہے"۔
نہیں نہیں پیرو! نہیں، تم جاؤ۔ اُدھر بمبئی جا کے اپنا دھندا چلاؤ۔
نے جانے ہوئے راستوں پر ٹھیک چلتا ہے"۔ بجھل نے ہدایتی انداز میں
پولیس یہاں تک بھی آ سکتی ہے"۔
پیرو نے اپنا جوتا اُتار کے اُس کے سامنے کر دیا "سالا جوتا مار دو پر ایسا
یہ اپن گھوڑا کیدھر ہے، ٹوٹ ہے بجھل بھائی! ہم اپنا گیتا کا قسم کھا کے
اپن نے جان بوجھ کے کوئی غلطی نہیں کیا۔ اَور ایسا ہوا تو اپن ناک
تمھارے پیروں پہ رکھ دے گا"۔
بنا کی قسم مت کھاؤ"۔ بجھل نے درشتی سے کہا "وہ اُدھر نہیں تھا،
کو اتنا ہی بولا کہ اُدھر سے صرف اتنا جان کے آؤ۔ اس کے لیے تم
بلایا تھا۔ ہم خود بھی اُدھر جا سکتے تھے پیرو! پر ہم نے تم سے کہا تھا
جانا ٹھیک نہیں ہے۔ ماچھی کو اتنی دیر لگی۔ لاڈلے کو اتنی دیر
تی۔ وہ بھری محفل میں جا کے اِنھیں نکال کے لے آتا۔ ہم نے
پہن رکھی تھیں، کلائی میں موچ نہیں آ گئی تھی۔ سالی آنکھ میں
تی پیرو! میں نے تم کو سب بول دیا تھا"۔
بن بار بار چیختا تھا کہ سالا چلو، اس ماچھی آر کا پٹھا نے بولا ایسا کیسے
کے پاس جائیں گا۔ اپن کا مگج بھی کام نہیں کرتا تھا بجھل بھائی!
مانی کرو، جب یقین ہو گیا تب اپن نے ایسا کیا"۔
نے ٹھیک کیا پیرو! ٹھیک کیا"۔ بجھل نے گھٹے ہوئے لہجے
پولیس تمھارا پیچھا کرتی ہوئی یہاں تک آ سکتی ہے۔ تم پہلی گاڑی
چلے جاؤ"۔
اپن کو پولیس کی فکر نہیں ہے۔ تم اب کیدھر جاؤ گے؟"
تم تو ہم بھی جائیں گے۔"
کیدھر؟" پیرو برہمی سے بولا "اپن کو کیوں نہیں بولتا؟"
ہمیں پتہ نہیں ہے کہ ہم کدھر جائیں گے۔"

"ہم بھی تمھارے ساتھ چلیں گا"۔ پیرو نے فیصلہ کن انداز میں کہا "تھوڑے دن کے لیے اُودھر بمبئی چلو۔ نہیں جائیں گا تو اپن بھی تمھارے پاس یہیں رہے گا۔ ایک ساتھ جیل چلیں گا تو مزہ آئیں گا، سمجھا"۔

"پیرو! ضد مت کرو"۔ بجھل تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔

"بجھل بھائی! اپن کچھ کچھ جان رہا ہے۔ پر اُودھر رُستم سالا نے ایسا ایسا بات بولا کہ اپن سے یوں ہاتھ نچاتے ہوئے آنا ٹھیک نہیں معلوم ہوا۔ غلطی آدمی سے ہوتا ہے بجھل بھائی! اپن تو تمھارا پیرو ہے"۔

"اسی لیے تو تم کو بلایا تھا پیرو!"

"اپن جانتا ہے تم کلکتے سے بھی بہت لوگوں کو بلا سکتا تھا۔ تمھارے پاس آدمی کی کمتائی نہیں ہے۔ پر اپن کو بولو کہ ابھی کیا کرے؟"

"کچھ نہیں پیرو! اب تمھارا کام ختم ہو چکا ہے"۔ بجھل نے بھنچی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ اپنی آواز پر مشکل سے قابو پا رہا تھا "کیا ٹائم ہو رہا ہے؟"

"ابھی تین بجے ہیں"۔ زورا پہلی بار کسمساتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے۔ گاڑی پانچ بجے کے قریب جاتی ہے۔ تم آج کی گاڑی پکڑ لو"۔

پیرو بجھل کی چھاتی پر سر پٹخنے لگا "ایسا کیسے جائیں گا؟"

"تم جاؤ گے پیرو! مجھے فرصت ملی تو جلد ہی تمھارے پاس آ جاؤں گا۔ بس اس کے بعد کچھ مت بولنا"۔

"بجھل بھائی!" پیرو اُس کا چہرہ دیکھتا رہ گیا۔ بجھل نے کہنے کے لیے کوئی گنجائش نہیں رکھی تھی۔ زورا اور ماچھی نے اپنی زبان سے ایک لفظ نہیں کہا۔ اُسی لمحے بجھل نے بیرے کو بلا کے حجام کے لیے کہا۔ حجام آیا تو پیرو اور ماچھی خاموشی سے اپنے بال ترشواتے رہے۔ بجھل نے اپنے اور اُن کے کپڑوں کا ایک ایک جوڑا بھی انھیں بدلوا دیا تھا۔ اسٹیشن پر بھی اُن کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ بمبئی کی طرف جانے والی گاڑی ٹھیک وقت پر روانہ ہونے والی تھی۔ ڈبے میں چڑھتے ہوئے بجھل نے پیرو کو کھینچ کے گلے سے لگا لیا، اُس کے گال تھپتھپائے لیکن پیرو کچھ نہیں بولا، سر جھکائے کھڑا رہا۔ اُس کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ بجھل نے بازار میں رُک کے خریدی ہوئی چیزوں کا تھیلا پیرو کے سپرد کر دیا کہ وہ یہ گیتا کو دے دے۔ پیرو نے اُس سے اپنا منہ چھپا لیا۔

❊

گاڑی گئے ہوئے دیر ہو گئی لیکن بجھل وہیں پلیٹ فارم پہ ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پھیرے لگاتا رہا۔ ہم ہوٹل کا حساب چکا کے آئے تھے اور ہمارے ساتھ ہمارا مختصر سامان بھی تھا اس لیے ہوٹل واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مجھے اُس سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں خاموشی سے اُس کے ساتھ چلتا رہا۔ وہ تھک کے ایک بنچ پر لیٹ گیا۔ اُس کے سر کے نیچے میلے کپڑوں کا تھیلا رکھ کے میں بھی کونے میں اُس کے پیروں کی طرف بیٹھ گیا۔ وہاں اب کوئی سواری اور گاڑی نہیں تھی۔ نہ ہی کوئی گاڑی جلد آنے کا امکان نظر آتا تھا۔ اسٹیشن پہ بتدریج سکوت طاری ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی

مال گاڑیوں کے ڈبّوں کی کھڑکھڑاہٹ یا انجن کی تیز سیٹیوں کا شور گونج اُٹھتا۔ گشت کرنے والے سپاہی کئی بار ہماری طرف سے گزرے۔ بجّھل نے انھیں رُک کے دو روپے دے دیے تھے چنانچہ اُنھوں نے ہم سے کوئی باز پرس نہیں کی بلکہ ویٹنگ روم میں ہمیں آرام کرنے کا مشورہ دیا مگر بجّھل وہیں پڑا رہا۔ ہوا بہت سرد تھی اور اوس اِس طرح گر رہی تھی جیسے ہلکی پھوار پڑ رہی ہو۔ ہمیں وہاں بیٹھے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ سامنے کے پلیٹ فارم پر ایک مال گاڑی آ کے ٹھیری۔ بجّھل ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا اور مجھے وہیں رہنے کی تاکید کرکے وہ لائنوں لائنوں چلتا ہوا میری نگاہوں سے دُور ہو گیا۔ بہت دیر بعد وہ مجھے دوبارہ نظر آیا۔ وہ تیز تیز قدموں سے میری جانب واپس آ رہا تھا۔ اُس نے جلدی سے سامان سمیٹا اور مجھے اُٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم پلیٹ فارم پر کھڑی ہوئی مال گاڑی کے اُس سرے تک پہنچ گئے جہاں گارڈ کا ڈبا تھا۔ سفید وردی میں ملبوس ادھیڑ عمر کا گارڈ ڈبے کے باہر ہی کھڑا تھا۔ میرے سلام کا جواب دینے سے پہلے اُس نے سر تا پا مجھے گھور کے دیکھا پھر مسکراتے ہوئے ہمیں اندر فرش پر چادر بچھا کے بیٹھنے کی ہدایت کی۔ تھوڑی دیر میں کندھے پر بندوقیں لٹکائے دو سپاہی بھی ڈبے میں آ گئے اور بجّھل سے باتیں کرنے لگے۔ گارڈ کی سیٹی بجی اور سگنل پر گاڑی رینگنے لگی۔ آہستہ آہستہ اُس کی رفتار تیز ہو گئی۔

اُن کے درمیان ہونے والی گفت گو کے دوران میں نے سُن لیا تھا کہ بجّھل کا ارادہ کہاں جانے کا ہے۔ مجھے حیرت نہیں ہوئی۔ وہ کہیں بھی جائے۔ اب مجھے نہ کوئی جلدی تھی، نہ کوئی فکر۔ شمال، جنوب، مشرق، مغرب میرے لیے ہر سمت ایک سی تھی۔ سمتوں سے تو اُنھیں واسطہ ہوتا ہے جن سے لوگ روٹھے ہوئے نہیں رہتے۔ اب تو کوئی آہٹ بھی نہیں تھی کہ آدمی سمت کا اندازہ کرے۔ گاڑی کے پہیے شور مچاتے ہوئے لائنوں پر دوڑ رہے تھے۔ بار بار اسٹیشن آ جاتے تھے اور گاڑی کہیں بھی ویرانے، اندھیرے میں رُک جاتی تھی۔ سبھی لوگ نیچے اُترے، میں اپنا جسم سمٹائے بیٹھا رہا۔ میری بابت بجّھل نے اُن سے وہی عذر کر دیا تھا جو عام طور پہ وہ لوگوں سے کرتا رہتا تھا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ یوں بھی میرا سارا جسم سُن سا ہو گیا تھا۔ مجھے پہلے ہی اس میں شُبہ تھا کہ وہ لوگ کامیاب واپس آئیں گے، بس ایک اُمید تھی کہ شاید وہ کوئی خبر ہی لے کے آ جائیں، شاید زمین کی گردش بدل جائے مگر اُسے یوں ملنا ہوتا تو یہ سب کچھ کیوں ہوتا، وہ مجھ سے دُور ہی کیوں ہوتی۔ نہ میرے بس میں کچھ تھا، نہ اُس کے بس میں کچھ۔ پتہ نہیں کس کے بس میں تھا۔ سبھی کہتے تھے کہ وہ میرے لیے بہت دُعائیں مانگتے ہیں۔ چمپا، جولین، زرّیں۔ دعائیں اس طرح باریاب ہوا کرتیں تو پھر بات ہی کیا تھی۔ آدمی سچے دل سے دُعا کیا کرتا اور اُس کی اُمید بر آتی۔ چمپا کہتی تھی کہ خدا اپنے بندوں کو آزمائش میں ڈالتا ہے مگر یہ خوب آزمائش تھی۔ کئی بار میرے دل میں آیا کہ اُن سے کہوں، تم میرے لیے بددعائیں کیا کرو۔ فیض آباد سے چلتے وقت وہ چھوٹی نیساں بی نے بہت یقین سے کہا تھا کہ اُس کی دُعا ہمیشہ قبول ہوتی ہے۔ وہ بھی میرے لیے دُعا کر رہی ہو گی۔ میں نے اُس کے خیال سے اُس وقت کچھ نہیں کہا تھا کہ تھیں مایوسی ہو گی، مجھ سے اللہ میاں بہت ناراض ہیں۔ میں نے تنگ کیا، انھیں زندہ در گور کر دیا۔ میں نے اپنا گھر جلا دیا۔ میں بہن نمّی کے سامنے پہنچ گیا کہ اُسے زندہ نہ رکھوں۔ میں نے ابّا جان کے کھلونے دے کے دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ دیا مال گاڑی کے فرش پہ بیٹھا اونگھ رہا تھا، اُدھر مولوی صاحب چھپائے پھر رہے تھے۔ اُن سے بھی اُن کا گھر چھن گیا تھا۔ جیدوں سے اُدھر دُنیا میں ڈھونڈتے رہے ہوں گے۔ کہاں تک اُسے گے اور لوگوں کو کیا بتاتے پھریں گے۔ اُسے پھر کسی رانا نے دیکھا صاحب کو کوئی ہتھیار چلانا بھی نہیں آتا تھا۔ محض زبان سے کب نبھائی ہو گی۔ کہیں تھک کے گر پڑے ہوں گے۔ چلتے وقت جب کہہ رہی تھی کہ بابر بھائی! دیکھنا، میری دُعا ضرور قبول ہو گی تو میرے آیا تھا، اُس سے کہوں، ساتھ میں یہ بھی کہہ دے کہ اگر میں کامیاب خدا کم از کم مجھے موت دے دے۔ دو میں سے کوئی ایک دُعا تو لیکن نیساں کی آنکھیں دیکھ کے میں اُس سے یہ کہہ نہ سکا۔ آدمی کا نہیں ہے۔ یہ آنکھیں طرح طرح کی آنکھیں اُسے ڈراتی رہتی ہیں کی، کبھی جولین کی، کبھی چمپا کی، کبھی بجّھل کی، کبھی نیساں کی، کبھی جہا مجھے یقین ہوتا کہ میرے نہ ہونے سے ان آنکھوں کو قرار آ جا آنکھیں بھی ٹھیر جائیں گی جو ہر لمحے میرے پیچھے سائے کی طرح میرے سینے میں چبھتی رہتی ہیں تو میں ان سب سے اتنی دُور سے کوئی واپس نہیں آتا۔ میرے نہ ہونے سے تلافی نہیں ہوتی اور کورا اسی طرح دربدر بھٹکتے رہتے۔ اُن کے لیے میں اب بھی تھا۔ میرا مرنا جینا سب کے لیے یکساں تھا، البتہ جسم سامنے پڑا رہے لوتھڑا ہی ہو پھر بھی ایک اُمید رہتی ہے کہ شاید کبھی ہوش میری حالت اُن کے لیے ایسی ہی تھی اور خود میرے لیے بھی ایک آس ہو گی کہ میں پلٹ کے کبھی تو اُس کی خبر لوں گا۔ اسی آ میرے حلق میں بھی اٹکی ہوئی تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی کے ختم ہو جاتا ہے، زندگی ہے تو احساس بھی ہے۔ اِس احساس سے تھا کہ میں اپنی سزا کاٹ رہا ہوں ورنہ وہاں امّی کے سامنے کس منہ پھیر لیتیں کہتیں، چوروں کی طرح چلا آیا، زندگی کے قید خانے بھاگ کے چلا آیا، اپنی سزا پوری کر کے نہیں آیا۔ وہ وہاں بھی نہیں کرتیں۔ نہ امّی، نہ فہمیدہ۔ بجّھل نے ایک بار کہا تھا کہ خود خود غرضی ہے۔ امّی بھی مجھے اپنے پاس دیکھ کے یہی کہتیں، مُنّے تو پھر اُنھیں چھوڑ آیا، جہاں گیر کو خواب دکھا کے چلا آیا۔

ماچھی کے بقول مولوی صاحب نے رستم کو بتایا تھا کہ ہے۔ امانت سے اُن کی کیا مراد تھی، نہ جانے وہ کیا کہنا چاہتے۔

جملہ میرے ذہن میں پیوست ہو کے رہ گیا تھا۔ امانت سے اُن کا مطلب اور کیا ہو گا۔ انھیں اُمید ہو گی کہ میں کسی دن ضرور واپس آؤں گا اور کورا کو لے جاؤں گا مگر انھیں یہ کیسے یقین ہو گا کہ ایک دن میں واپس آ ہی جاؤں گا۔ میری فکر ہوتی تو کبھی نہ کبھی وہ میری خبر لیتے۔ ضرور پوچھتے کہ مجھ پر کیا گزری۔ میں زندہ ہوں یا مر گیا۔ کلکتے میں وہ جس مسجد میں ٹھیرتے تھے، وہاں کے مولانا نے بتایا تھا کہ اُس رات کے بعد وہ واپس نہیں آئے۔ اِس کا ثبوت اُن کا وہ سامان تھا جو ایک الماری میں محفوظ کر دیا گیا تھا۔ اُنھوں نے گھبرا کے فوراً کلکتہ چھوڑ دیا ہو گا۔ انھیں خدشہ ہو گا کہ کسی طرح میری زبان سے کلکتے میں اُن کی موجودگی کے دوران کورا کا ذکر آ گیا تو پولیس اُنھیں آسانی سے تلاش کر لے گی۔ وہ بھی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے اور کورا بھی۔ اُنھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ میں نے کانسٹبل کے پیٹ میں چھُرا گھونپ دیا ہے اور کانسٹبلوں نے مجھے اپنے نرغے میں لے لیا تھا۔ میرے بچنے کی اُنھیں کوئی اُمید نہیں ہو گی۔ سو اُنھوں نے کورا کو اور اپنے آپ کو محفوظ کرنے کی کوشش کی۔ اُنھیں میں نے بتا دیا تھا کہ کورا کون ہے، کہاں سے آئی ہے اور اُس کے ساتھ کیا واقعات پیش آئے ہیں چنانچہ اُنھوں نے اُسے لوگوں کی نظروں سے ہر ممکن دور دُور رکھنا چاہا۔ وہ اپنے شہر مُراد آباد بھی واپس نہیں گئے ورنہ اُن کے رشتے دار پوچھتے کہ یہ کون لڑکی اُن کے ساتھ ہے۔ کورا کا چہرہ ہی ایسا تھا کہ ہر آدمی سے اُس کا گھر چھڑوا دے۔ مولوی صاحب بھی اُس کی آہ و بکا سے، اُس کے آنسوؤں سے متاثر ہو گئے ہوں گے۔ وہ ویسے بھی تنہا آدمی تھے۔ اُنھوں نے کورا ہی کو اپنا سب کچھ سمجھ لیا ہو گا۔ سوچا ہو گا کہ وہ ایک گھر بنا کے رہیں گے اور کورا کو عمدہ تعلیم دیں گے، اُسے خوش رکھیں گے۔ بعد میں اُنھیں احساس ہوا ہو گا کہ یہ کتنا مشکل ہے لیکن پھر وہ کورا کو تنہا چھوڑ کے کہیں جا نہیں سکتے تھے۔ اتنے دن ساتھ رہتے رہتے اُنھیں اُس سے خاصا اُنس ہو گیا ہو گا۔ وہ ایک وضع دار، خوش خُلق آدمی تھے۔ خود اُنھیں کوئی بہت دُکھ تھا۔ ہم دونوں کلکتے میں ہر طرف سے ٹھوکریں کھا کے اُن کے پاس پہنچے تھے تو اُنھوں نے خندہ پیشانی سے ہمیں معاف کر دیا تھا۔ اُنھوں نے میرے اور کورا کے لیے کپڑے بنائے، گھر کا سامان فراہم کیا، وہ اس بات سے بہت خوش تھے کہ مُراد آباد جا کے اپنے گھر میں ہم دونوں کے ساتھ رہیں گے۔ وہ پہلی نظر میں سمجھ گئے تھے کہ میں اپنے گھر واپس نہیں جاؤں گا کیونکہ میرے گھر والے کورا کو اپنے ساتھ رکھنا پسند نہیں کرتے ہیں ورنہ میں گھر سے آتا ہی کیوں۔ کاش اُس دن وہ ہمیں دریا کی سیر کو نہ لے جاتے، اُسی وقت کلکتے سے روانہ ہو جاتے تو نہ وہ خانہ برباد ہوتے، نہ مجھے جیل جانا پڑتا۔

مولوی صاحب نے منیر علی سے ارشد کے لیے انکار کر دیا تھا اور بھی بہت سے گھروں کو منع کر دیا تھا۔ ارشد تو اُن کا دیکھا بھالا تھا۔ پڑھا لکھا خوش شکل و صورت کا لڑکا۔ اُنھوں نے اپنے بہی خواہ منیر علی کی بات ٹھکرا دی۔ اُن جیسے صاحبِ حیثیت شخص کا پیام منظور نہیں کیا۔ جیسلمیر آنے سے پہلے بھی جہاں وہ رہتے ہوں گے، وہاں کے لوگوں نے بھی اُن پہ زور ڈالا ہو گا، کورا کی صورت دیکھ کے بہت سے خاندانوں کی تمنا ہو گی کہ وہ اُن کے گھر میں آ جائے۔ مولوی صاحب نے کسی تخصیص کے بغیر سب کو کیوں مایوس کر دیا۔ انھیں کس کا انتظار تھا۔ کون آنے والا تھا جس کے لیے وہ کورا کو روکے بیٹھے تھے۔ اُن کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا تھا جو جوان لڑکیوں کو دیر تک گھر میں بٹھا کے رکھنا پسند نہیں کرتے۔ انھیں بہت زیادہ اپنی لڑکی سے محبت ہوتی ہے تو بھی ایک نہ ایک دن اُس کی جُدائی کا فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ نمّی بہت چھوٹی تھی، تبھی سے امّی نے اُس کے لیے جہیز تیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اکثر انھیں یہ دُعا مانگتے دیکھا تھا کہ اللہ کرے! اُن کی لڑکیوں کے نصیب اچھے ہوں۔ مولوی صاحب نے پھر کیا سوچ کے ہر شخص کو منع کر دیا تھا۔ اگر اُنھیں میرا انتظار تھا تو اس کی کوئی مدت بھی اُن کے ذہن میں متعین ہو گی۔ سات سال کی جیل کے دوران کسی ذریعے سے مجھے اطلاع پہنچا سکتے تھے کہ وہ محفوظ ہیں اور کورا اُن کے پاس ہے تاکہ میں جیل سے رہا ہو کے سیدھا اُن کے پاس آؤں۔ میں سات سال تک روز اُن کے خط کا انتظار کرتا رہا۔ سبھی قیدیوں کے خط آتے تھے، میرے پاس کبھی کوئی خط نہیں آیا۔ میں نے اپنے ذہن میں اس کی بہت سی تاویلیں ڈھونڈ رکھی تھیں کہ مولوی صاحب رابطے کی کوشش کرتے تو اُن کا یہ اقدام جیل کے حکام سے روپوش نہ رہتا۔ انھیں شاید معلوم ہو گیا ہے کہ میں نے مقدمے میں کسی کے متعلق کچھ نہیں بتایا، اپنے اور اپنے خاندان کے بارے میں کوئی بھی بات چھُپی رہی ہے تو چھُپی ہی رہنی چاہیے۔ خط لکھنے یا جیل میں مجھے دیکھنے آنے میں پولیس کو کوئی اشارہ نہ مل جائے اور از سرِ نو تفتیش شروع نہ ہو جائے، اسی اندیشے کی وجہ سے اُنھوں نے احتیاط برتی ہو گی یا مولوی صاحب کو کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے۔ کورا اُن کے پاس نہیں رہی یا وہ بھی نہیں رہے۔

لیکن وہ جیسلمیر میں تھے۔ اُدھر جیل سے نکلنے کے بعد میں نے خواہ مخواہ چاند میاں اور نسترن کا پیچھا کیا۔ موجمدار کے اڈّے پر میں نے بے کار واویلا کیا۔ مولوی صاحب تو کورا کو اپنے پروں میں چھپائے بیٹھے تھے اور اُنھیں کسی کا انتظار تھا۔ وہ کہتے تھے کہ کورا کسی کی امانت ہے۔ وہ مجھے دو سطری گم نام خط لکھ سکتے تھے، کسی ایسے اسٹیشن سے خط ڈال سکتے تھے جہاں سے وہ گزر رہے ہوں۔ کسی اور سے لکھوا سکتے تھے۔ کورا کو اُردو لکھنی آ گئی تھی۔ اُسی سے چند لفظ لکھوا دیتے۔ ایسا لگتا ہے کہ کلکتے سے جانے کے بعد اُنھیں میرے بارے میں کوئی خبر ہی نہیں تھی اور نہ اُنھوں نے کچھ جاننے کی جستجو کی تھی۔ جیسے اُنھوں نے یقین کر لیا تھا کہ اب پھانسی میرا نصیب ہے یا مجھے تا زندگی جیل میں رہنا پڑے گا۔ پھر اُنھوں نے یہ بھی سوچا ہو گا کہ جیل میں اتنی مدت تک رہنے کے بعد میں بالکل بدل جاؤں گا اس لیے مجھ سے کوئی رابطہ رکھنا بے سود ہے۔ میری واپسی کے بعد کورا بھی مجھے دیکھ کے ڈر جائے گی۔ اُنھیں کیا معلوم تھا کہ جیل میں ہر لمحے، ہر آن میں اُسی کے ساتھ رہا ہوں اور میں نے وہاں وقت نہیں گنوایا ہے۔ میں نے وہاں رہتے ہوئے سولھواں درجہ پاس کیا ہے اور

وہ بھی فرسٹ۔ جیل میں رہ کے میں یہی کر سکتا تھا۔ اخباروں میں یہ خبر چھپی تھی مگر مولوی صاحب کو کچھ پتہ ہی نہیں تھا۔ اُن کی نظر سے یہ خبر بھی نہیں گزری، گزرتی تو وہ مجھے مبارک باد کے دو لفظ ہی لکھ دیتے اور میرے بارے میں اتنا کچھ اُن کے علم میں ہوتا تو یہ بھی معلوم ہوتا کہ میری سزا کتنی مدت کی ہے اور جب میں نے اپنی سزا پوری کر لی ہے تو دوبارہ تفتیش کا سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ دو سال، تین سال، پانچ سال۔ اس دوران میں جیل کے بہت سے حکام بدل گئے تھے اور لوگ بھول گئے تھے کہ میں کس معاملے میں جیل آیا ہوں۔ بات پُرانی ہو گئی تھی۔ ایک عرصہ گزرنے کے بعد مولوی صاحب کا یہ اندیشہ دُور ہو جانا چاہیے تھا۔

مولوی صاحب جیسے شخص کے لیے جیل کا تصور ہی بہت بھیانک ہو گا۔ انھوں نے یہی سمجھا ہو گا کہ اب میری طرف توجہ دینا خود کو اور اُلجھن میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ میں جیل سے رہا بھی ہو گیا تو کورا کے لائق نہیں رہوں گا۔ میرا تو سایہ بھی کورا پہ نہیں پڑنا چاہیے۔ وہ یہ فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتے تھے اس لیے کہ اب وہی کورا کے سب کچھ تھے۔ اُس کے لیے انھوں نے اپنے ماضی سے یکسر ناتا توڑ لیا تھا۔ نہ جانے انھوں نے کورا کو کیا بتایا ہو گا۔ میرا دل کہتا ہے کہ انھوں نے اُسے میرے واپس آنے کی تسلّی دی ہو گی۔ کہا ہو گا کہ میں کھو گیا ہوں اور وہ مجھے تلاش کر رہے ہیں۔ اگر وہ کورا کو یہ نہ بتاتے تو وہ اپنا گلا گھونٹ لیتی۔ چوڑیاں پیس کے کھا لیتی۔ انھوں نے اسی طرح کچھ کہا ہو گا اور یہی اس سے کہنا بھی چاہیے تھا مگر ساتھ میں انھیں یہ بھی احساس ہو گا کہ وہ کورا کو کب تک یہ دلاسا دے سکتے ہیں۔ کورا نے انھیں ہزاروں بار ٹوکا ہو گا کہ وہ میرے ابّا جان یا امّی کو خط لکھیں۔ مولوی صاحب نے ہمیشہ یہی جواب دیا ہو گا کہ وہاں سے کوئی جواب نہیں ملا ہے۔ ممکن ہے سال دو سال بعد کورا کے بتائے ہوئے پتے پر مولوی صاحب نے گھر کوئی خط لکھا ہو اور وہاں کوئی موجود ہی نہ ہو کیونکہ امّی کے انتقال کے کچھ دنوں بعد ابّا جان نے گھر چھوڑ دیا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ابتدا ہی میں کہیں مولوی صاحب کا تعاقب جانگ قبیلے کے لوگوں نے کیا ہو جو کورا کی تلاش میں سرگرداں تھے اور مولوی صاحب محتاط ہو گئے ہوں کہ اگر کہیں کسی ذریعے سے اُن لوگوں کو پتہ چل گیا تو وہ پھر اُن کے سامنے آ جائیں گے۔ اُن کی گوشہ نشینی کا سب سے بڑا سبب یہی ہو گا۔ انھیں ایسے چند لوگ ضرور راستے میں ٹکرائے ہوں گے اور اُن کی شدّت کا بھی انھیں اندازہ ہوا ہو گا کہ وہ ہر حال میں کورا کو حاصل کرنا چاہتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اتنی طویل مدت کے دوران انھیں کوئی ایسا شخص نظر آ گیا ہو جسے وہ کورا کے لیے سب سے موزوں سمجھتے ہوں۔ اسی لیے انھوں نے باقی تمام لوگوں کو منع کر دیا ہو۔ جب انھوں نے امانت کا لفظ کہا تھا تو اُن کے ذہن میں کوئی اور شخص بھی ہو سکتا ہے۔ جیسلمیر آنے سے پہلے وہ متعدد جگہوں پر رہے ہوں گے اور اَن گنت خاندانوں سے اُن کا واسطہ پڑا ہو گا۔ ہو سکتا ہے اُن کی نظرِ انتخاب کسی شخص پر گئی ہو اور وہ اُسی کے انتظار میں ہوں یا پھر یہ ہو کہ کورا کو جُدا کرنے کا تصور ہی اُن کے لیے سوہانِ روح ہو۔ ایک طرف انھوں نے کورا سے کہا ہو گا کہ وہ میری کھوج میں ہیں، اس صورت میں دوسری طرف اُسے مستقل طور پر کسی اور سے وابستہ کرنے کا ذکر وہ اُس کے سامنے کیسے کر سکتے ہیں۔ کورا نے انھیں یقیناً کوئی ایسا تاثر دیا ہو گا کہ وہ صرف میرے لیے زندہ ہے جیسے میں اُس کے لیے زندہ تھا۔ اُس نے ایسا کچھ ضرور کہا ہو گا اور مولوی صاحب کو یہ بھی یقین ہو گا کہ وہ کورا کی رائے نہیں بدل سکتے، چاہے صدیاں بیت جائیں اور جب انھیں یقین ہو گیا تھا تو سات سال درمیان تھے۔ اس عرصے میں کورا انھی کے ساتھ تھی۔ لازماً انھیں میری زندگی اور کی سُن گُن ضرور ملنی چاہیے تھی میرے دماغ میں بہت سی مکڑیوں نے جالا بُن لیا تھا۔

مال گاڑی بھاگ رہی تھی۔ وہ سبھی باتیں کرتے کرتے اونگھنے لگے۔ صرف گارڈ جاگ رہا تھا۔ کہیں گاڑی رُکتی تو سبا ہی چونک کے آنکھیں ملنے لگتے اور گاڑی ٹھہر جاتی تو گارڈ کے ساتھ نیچے اُتر جاتے۔ گاڑی چلنے لگتی تو پھر اندھیرے لپکنے لگتے۔ رات کو کسی وقت اُس نے ہمیں جودھپور پہنچا دیا۔ وہاں سے ہم مختلف لاریوں میں سفر کرتے ہوئے گیارہ بجے کے قریب اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ ایک ہفتے بعد جیسلمیر شہر کا اُونچا قلعہ پھر ہمارے سامنے تھا۔

محلّے کی گلیوں میں زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ اسٹیشن سے یہاں تک کا فاصلہ تیز رفتاری سے طے کیا تھا۔ شاید سارے مرد گھروں سے باہر نکل چکے تھے۔ راستے میں جاننے والا کوئی شخص نظر نہیں آیا۔ ہماری دستک پر دروازہ منیر علی ہی نے کھولا اور ہمیں اپنے سامنے دیکھ کے ٹھٹک کے رہ گئے۔ اُن کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے اور لباس پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے رات بھر نہیں سوئے ہیں اور جیسے ایک ہفتے کے دوران وہ کچھ اور بوڑھے ہو گئے ہوں۔ "آپ ....!" بہ مشکل تمام اُن کے حلق سے کانپتی ہوئی آواز نکلی۔

"ہاں بڑے صاحب!" بجّھل نے نرمی سے کہا۔

"آپ ... آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟" انھوں نے سٹ پٹائے لہجے میں پُوچھا۔

"زیادہ دُور سے نہیں۔"

"مگر آپ تو، آپ تو ...."

"ہاں!" بجّھل بڑھ کے اُن کے گلے سے لگ گیا۔ "جلد ہی واپس ہو گیا۔ اِدھر جیسلمیر سے گزر رہے تھے، سوچا اپنا وعدہ بھی پورا کر لیں۔ آپ کو سلام کرتے چلیں۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ لگتا ہے کچھ ...." وہ کہتے کہتے رُک گیا۔

"آپ اتنے دنوں کہاں کہاں رہے؟" منیر علی نے اضطراری انداز میں پوچھا۔

"یہیں حیدرآباد تک، زیادہ دُور نہیں جا سکے۔"

"حیدرآباد ....!" منیر علی کی آواز لرز رہی تھی۔ انھوں نے ہم سے اندر آنے کے لیے نہیں کہا۔ وہ ایسی نظروں سے ہمیں گھور رہے تھے جیسے ہماری شکلیں بدل گئی ہوں یا ہم اُن کے لیے بالکل اجنبی ہوں۔

"بیٹھک کھولیے بڑے صاحب!" بجّھل نے انھیں ٹوکا۔

"جی .... جی۔" وہ حواس باختہ انداز سے سر ہلانے لگے۔ "ایسا ہے ..." اُن کی زبان تھرّا کے رہ گئی۔ "آپ، آپ لوگ اندر ہی سے آ جائیے۔" وہ اندر کی طرف تیزی سے جاتے ہوئے بولے۔ بجّھل نے مجھے سپاٹ نظروں سے دیکھا۔ میں نے پلکیں جھکا لیں۔ منیر علی اندر پہنچے کا کہہ کے فوراً دروازے پر آ گئے اور ہمیں گھر کے راستے سے بیٹھک میں لے گئے۔ انھوں نے بیٹھک کا گلی میں کھلنے والا دروازہ بھی نہیں کھولا۔ اندر چیزیں اُسی طرح رکھی ہوئی تھیں جس طرح ہم چھوڑ گئے تھے البتہ وہ چارپائی نہیں تھی جو میرے لیے منیر علی نے اندر گھر سے یہاں ڈلوا دی تھی۔

"بات یہ ہے۔" منیر علی نے سنبھل سنبھل کے کہنے کی کوشش کی۔ "کچھ مہمانوں کی آمد متوقع ہے۔" اُن کے لہجے سے عیاں تھا کہ وہ ہم سے جھوٹ بول رہے ہیں اور اُن کا مقصد یہ کہنا ہے کہ اب وہ اپنے گھر میں ہمیں ٹھہرانے سے معذور ہیں۔

"ہمارا ارادہ اتنی جلدی اس طرف واپس آنے کا نہیں تھا۔" بجّھل نے اُن کی بات سُنی اَن سُنی کر دی۔ "بچّوں کے لیے بھی کچھ نہ لا سکے۔ گھر میں سب ٹھیک ٹھاک ہے؟"

"جی ہاں! اللہ کا فضل ہے۔" منیر علی نے شکستہ لہجے میں جواب دیا۔

"آپ کچھ پریشان سے لگ رہے ہو۔ کیا بات ہے؟"

"نہیں نہیں۔ کچھ نہیں۔" منیر علی ہاتھ ملتے ہوئے بولے۔

"کچھ تو بات ہے۔ ارشد میاں کا کیا حال ہے؟"

"وہ ٹھیک ہیں لیکن ...."

"لیکن کیا بڑے صاحب! کھُل کے بولو۔"

"کچھ نہیں جناب!" منیر علی کے لہجے میں اضطراب تھا۔ وہ ہمیں دزدیدہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

"کچھ ضرور ہے۔ ہم آپ کا بھلا چاہنے والوں میں ہیں بڑے صاحب!"

"بے شک، بے شک لیکن کچھ صورت بدل گئی ہے۔" اُن کی آواز اٹک رہی تھی۔ "میں آپ سے منّت کروں گا کہ اس مرتبہ کہیں اور ٹھہر جائیے۔ شاید میں پہلے کی طرح آپ کی خدمت نہ کر سکوں۔"

"کیا صورت بدل گئی ہے؟" بجّھل نے حیرانی سے پوچھا۔

"مجھ سے کچھ نہ پوچھیے۔ بہتر ہے، مجھ سے کچھ نہ پوچھیے۔"

"پھر کس سے پوچھیں؟ ہم سے کوئی غلطی ہو گئی ہے بڑے صاحب؟"

"نہیں جناب! خطا کار میں ہوں۔"

"آپ نے بھلا کیا خطا کی ہے؟ آپ کیا بول رہے ہو؟"

"آپ کو کچھ پتہ نہیں!" منیر علی نے ہذیانی انداز میں کہا۔ "کس کا پتہ؟"

"آپ کچھ نہیں جانتے؟ حلفیہ آپ کچھ نہیں جانتے؟"

"کس بارے میں؟"

"وہی رانا کے بارے میں؟" منیر علی نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

"رانا! کیا اُس نے پھر کوئی بات چھیڑی ہے؟"

"نہیں صاحب! کیا آپ کو واقعی کچھ نہیں معلوم؟"

"آپ کچھ بولو گے تو پتہ ہو گا۔" بجّھل نے ملائمت سے کہا۔

"رانا کو اندھا کر دیا گیا ہے۔ اُسے دو دن پہلے کسی نے اندھا کر دیا۔" منیر علی لرزیدگی سے بولے۔ "سارے شہر میں چرچا ہے۔ بڑے بڑے ڈاکٹر بلائے گئے ہیں، وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آیا ہے۔"

"رانا کے اندھے ہونے سے آپ کا کیا تعلق؟" بجّھل نے بے چینی سے پوچھا۔

"خدا بہتر جانتا ہے کہ میرا کیا تعلق ہے۔ معلوم نہیں اُسے کیا منظور ہے۔" منیر علی ہانپتے ہوئے بولے۔ "کل رات دو آدمی دیوار پھاند کے اندر گھر میں گھُس آئے۔ میری آنکھ لگ گئی تھی۔ انھوں نے مجھے پلنگ سے اُٹھا لیا۔ اُن میں سے ایک کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ کہنے لگے، شور مچانے کی کوشش مت کرنا۔ کسی تنہا جگہ چلو۔ میرے ہوش و حواس گم ہو گئے تھے۔ میں نے بیٹھک کی طرف اشارہ کیا۔ وہ گھسیٹتے ہوئے مجھے یہاں تک لے آئے اور پوچھنے لگے کہ کچھ دن پہلے تمھارے ہاں جو دو مہمان ٹھہرے ہوئے تھے، وہ کون تھے، کہاں سے آئے تھے اور اُن کا پتہ کیا ہے۔ مجھے آپ لوگوں نے صرف اپنے نام ہی بتائے تھے۔ میں نے وہی بتا دیے اور کہا، پتہ مجھے نہیں معلوم۔ پوچھنے لگے، کیا مولوی صاحب سے اُن کا کوئی رشتہ نکلتا تھا۔ میں نے جواب دیا، ہاں انھوں نے خود کو اُن کا رشتے دار بتایا تھا۔ پھر پوچھا، تم نے رانا مہتاب کے بارے میں اُن سے کچھ کہا تھا کہ رانا نے مولوی صاحب کی لڑکی کو مانگا تھا۔ مجھے بہ صد اکراہ اقرار کرنا پڑا لیکن وہ اور مشکوک ہو گئے کہ میں جان بوجھ کے آپ کا پتہ چھپا رہا ہوں۔ وہ کرید کرید کے گھر میں آپ کے قیام کی مدت اور دیگر باتیں پوچھنے لگے۔ میں نے اُن سے کہا کہ سات روز ہوئے، وہ دونوں مہمان یہاں سے چلے گئے۔ انھوں نے میری داڑھی پکڑ لی، مجھے طمانچے مارے اور گردن دبا کے بولے، تم اُن لوگوں کا پتہ بتا دو، اسی میں تمھاری بھلائی ہے۔ میں نے اُن کے آگے ہاتھ جوڑے اور کہا کہ اس کے سوا مجھے کچھ نہیں معلوم۔ دو صاحبان یہاں ٹھہرے ضرور تھے۔ مولوی صاحب سے تعلق کی بنا پر میں نے انھیں اپنے ہاں مہمان رکھا تھا۔ مولوی صاحب اور لڑکی کی باتیں چھڑیں تو رانا مہتاب کے پیام کا ذکر بھی آ گیا۔ وہ صرف تین دن ٹھہرے۔ انھوں نے بتایا تھا کہ وہ مُرادآباد سے آ رہے ہیں، مولوی صاحب کا تعلق بھی شاید وہیں سے تھا لیکن وہ بتا کے گئے ہیں کہ مُرادآباد کی طرف نہیں جا رہے ہیں اور واپسی میں پہلے یہاں جیسلمیر آئیں گے۔ میں نے جو سچ تھا، اُسے کہنے میں ہچکچاہٹ نہیں کی مگر وہ بہ ضد رہے، مجھ سے سختی کے

ساتھ پیش آتے رہے دھمکیاں دیتے رہے کہ میں اپنے حق میں بُرا کر رہا ہوں۔ میں نے کہا میرے علم میں جو کچھ تھا، میں نے کہہ دیا۔ اب میرے پاس انھیں بتانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ میں نے اُن سے کہا کہ وہ مجھے بُرے لوگ نہیں معلوم ہوتے تھے بھلے آدمیوں کی طرح یہاں رہے۔ آخر اُن لوگوں سے ایسا کون سا گناہ سرزد ہو گیا ہے۔ وہ رعونت سے بولے، ہمیں اُن کی تلاش ہے ہم انھیں دیکھنا چاہتے ہیں اُن کے قصور کا تمھیں اُس وقت پتہ چلے گا جب ہم اُن کی پیڑھیوں تک کو اندھا کر دیں گے۔ میں انھیں اپنی لاعلمی کا یقین دلاتا رہا۔ میری عاجزی سے وہ کسی قدر نرم ہوئے، ایک دوسرے سے اشاروں اشاروں میں کچھ کہا اور چلے گئے لیکن چلتے چلتے کہہ گئے ہیں کہ اُن کے آنے کی اطلاع پولیس یا محلے والوں کے کانوں میں نہیں پڑنی چاہیے ورنہ اپنی ذلت کا میں خود ذمے دار ہوں گا اور وہ یہ بھی کہہ گئے ہیں کہ اگر انھیں بعد میں پتہ چلا کہ میں نے اُن سے کچھ پردہ پوشی کی ہے یا جھوٹ بولا ہے تو وہ دوبارہ آئیں گے اور دوبارہ اس طرح واپس نہیں جائیں گے اور اگر اس دوران میں نے کہیں روپوش ہونے کی کوشش کی تو میں جہاں کہیں بھی ہوں گا دُنیا کے آخری کونے تک وہ مجھے ڈھونڈ لیں گے۔" منیر علی کی آنکھوں سے بھر بھر آنسو بہنے لگے۔

"جی کو نرم رکھو بڑے صاحب!" بجّھل اُٹھ کے اُن کے پہلو میں بیٹھ گیا اور کھوئے ہوئے لہجے میں بولا۔ "آپ نے یہ سب بتا کے ٹھیک کیا۔ ہم وقت پر آ گئے۔ اُن کو کوئی دھوکا ہو گیا ہے۔"

"دھوکا!" منیر علی کی آواز بھرا گئی۔ "یہ کیسا دھوکا ہے۔"

"ہو جاتا ہے۔ وہ ہمارا پتہ مانگتے تھے۔ اب ہم خود اِدھر آ گئے ہیں آپ ایسا کرو کہ ہم کو اُن کے سامنے کر دو۔ اُن کا شبہ دُور ہو جائے گا۔"

"بات اتنی آسان نہیں ہے جتنی آسانی سے آپ کہہ رہے ہیں۔" منیر علی ناتوانی سے بولے۔ "انھیں آپ کے پتے کی ضرورت کیوں پڑ گئی۔ کسی غلط فہمی کی وجہ سے؟ مگر کیا اس طرح اُن کی غلط فہمی دُور ہو جائے گی؟ کیا انھوں نے آپ کو پہلے کہیں دیکھا ہے جو سامنا ہوتے ہی آپ کو پہچان لیں گے کہ آپ وہ نہیں ہیں جو انھیں مطلوب ہیں، آپ کیسے ثابت کریں گے؟"

"ثابت ہو جائے گا، اس لیے کہ ہم وہ نہیں ہیں۔"

"یہ تو آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں، جب تک آپ ثابت کریں گے وہ کچھ بھی کر بیٹھیں گے۔ انھوں نے اپنے چہرے مجھ سے چھپا رکھے تھے لیکن ان کی آنکھوں، آواز اور اطوار و انداز سے میں اُن کی اُفتادِ طبع کا اندازہ اچھی طرح کر سکتا تھا، وہ شدید قسم کے لوگ ہیں اور میں ایک خانہ دار آدمی ہیں حیل و حجت اور بات بڑھنے کی کسی اُلجھن میں پڑنا نہیں چاہتا۔ میری جگہ کوئی بھی ہوگا تو یہ نہیں چاہے گا، میں آپ کو مشورہ دوں گا بلکہ درخواست کروں گا کہ آپ فوراً یہاں سے چلے جائیے۔ میری سمجھ میں یہی آتا ہے۔"

"ہم آپ کو اس حالت میں چھوڑ کے کیسے چلے جائیں۔"

"چلے جائیے میرے ساتھ خدا ہے۔ وہ سب دیکھ رہا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے بڑے صاحب! سمجھو خدا نے ہی ہم کو بھیجا۔ آپ گھبراؤ نہیں، وہ لوگ اِدھر آئیں گے تو ایک دفعہ اُن کا شک نکل جا[ئے گا] سب بات ٹھیک ہو جائے گی۔"

"لیکن یہاں میری عزت کا کیا ہوگا؟ نہیں نہیں۔" منیر علی نے کا[نوں پر] ہاتھ رکھ لیے۔ "یہاں سے چلے جائیے اور ایسا ہی ہے تو مجھے اپنا پتہ [بتا] جائیے، میں انھیں بتا دوں گا۔ وہ آپ کو ڈھونڈ لیں گے اور اپنی تسلی کر[لیں گے۔"]

"آپ اپنے گھر میں نہیں رہنے دو گے تو ہم نہیں رہیں گے لیکن [آپ] بولتے ہیں ابھی ہمارا اِدھر رہنا ٹھیک ہے۔ پہلے آپ ہمارے بار[ے میں] اپنا شک دُور کرو، پھر ٹھنڈے دل سے سوچ کے بولو کہ ہمارا آپ کو [چھوڑ] کے جانا ٹھیک ہے یا آپ کے ساتھ اِدھر رہنا؟"

"میں آپ پر کوئی شک نہیں کر رہا ہوں نہ کرنا چاہتا ہوں لیکن [جو] بات میں نے کہہ دی ہے۔ آپ خود سوچیے وہ میرے پاس کیوں آ[ئے]۔ آپ گئے اور آپ سے رانا کے متعلق بات ہوئی اُدھر یہ واقعہ پیش [آیا]۔ اُن کی نظر سیدھی میرے گھر کی طرف کیوں آئی؟"

مجھے توقع تھی کہ منیر علی جلد یا بدیر یہ سوال کریں گے۔ انھوں[نے کہا:] "کئی دسیوں مہمان کسی گھر میں آتے جاتے ہیں، میں اُن کے جانے [کے بعد] کوئی انھیں اس طرح پوچھتا ہوا نہیں آ جاتا۔" مجھے بجّھل کا جواب جا[ننے کی] جستجو تھی۔ منیر علی مجھ سے یہ سوال کرتے تو میرے پاس اس کا کوئی ج[واب] نہیں تھا۔ بجّھل کا چہرہ دُھندلانے لگا مگر وہ دھیمی آواز میں بولا۔ "آپ [ٹھیک] نہیں بول رہے بڑے صاحب! پر میں جانتا ہوں آپ کا مطلب [کیا ہے]۔ میں آپ کی بات کا جواب ابھی نہیں دے سکتا۔ آپ کے پاس بول[نے کو] آئی تھی، دو ہی آدمی آئے تھے اور جس طرح آئے تھے، وہ آپ کو [بتاتا ہے] ابھی اُن کو شبہ ہے، شبہ نہیں ہوتا تو وہ چوری چھپے نہ آتے۔ ہو سکتا [ہے] اُنھی آدمیوں میں سے ہوں جو مولوی صاحب اور لڑکی کو لے گئے۔ بہت سی ایسی جگہوں پر بھی گئے ہوں گے جہاں جہاں رانا نے اُ[ن کی] لڑکیاں اُٹھوائی ہوں گی، اِدھر بھی آ گئے اور یہاں محلے میں آ کے اُن [کو پتہ چلا] کہ کچھ دن پہلے دو اجنبی لوگ مولوی صاحب کو پوچھتے ہوئے آئے آپ کے گھر ٹھہرے تھے۔"

"مگر آپ..... آپ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں کہ [یہ انھی نے] ہی کیا تھا؟" منیر علی کپکپاتی ہوئی آواز میں بولے۔

"یہ تو آپ بھی خوب سمجھتے ہو۔ پھر وہ آپ کے پاس نہیں آ[تے]۔ آپ کہتے ہو کہ انھوں نے آ کے آپ سے رانا کا نام لیا تھا۔"

"پھر آپ خود ہی اپنی تمام بات کی تردید کر رہے ہیں۔"

"لیکن میں یہ بھی بول رہا ہوں کہ وہ کسی ایک جگہ نہیں گئے، انھوں نے اور بھی بہت سے گھر کھوجے ہوں گے، یہاں بھی آ[ئے]

کا آنا اپنے ننک پہ پانی ڈالنے کے لیے ہے، اُسے آپ اپنے سمجھنے کے لیے اتفاق بھی کہہ سکتے ہو۔"

"میرا دماغ پھٹ جائے گا، چند دن پہلے رانا کے سلسلے میں مجھ بدزبان کا آپ کے سامنے زبان کھولنا، رانا کا اپنی آنکھیں کھو دینا، اُن کا یہاں آنا اور آپ کو پوچھنا، یہ سب کتنے عجیب اتفاقات ہیں۔"

"بہت عجیب ہیں بڑے صاحب! زیادہ حسرت کھاؤ۔" بجّھل افسردگی سے بولا۔ "اسی لیے میں بولتا ہوں کہ ہم کو اِدھر ہی رہنے دو، وہ پھر آئیں تو ہماری طرف اُنگلی اُٹھا دینا۔ میں اور کیا کہوں۔"

بجّھل نے منیر علی کو سمجھانے کی ہر طرح کوشش کی، کسی حد تک کامیاب بھی ہو گیا۔ منیر علی چپ ہو گئے مگر اُن کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ میں جانتا تھا، اُن کی خاموشی چند ثانیوں کی ہے۔ اس جہاں دیدہ کے دماغ میں کسی بھی لمحے یہ بات آ سکتی ہے کہ وہ ہم نہیں ہوں گے تو ہمارے ساتھی ہوں گے۔ بات تو ایک ہی تھی کوئی سلسلہ ضرور ملتا ہوگا۔ ابھی انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ جس رات رانا کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا، اُس کی حویلی میں رستم خاں کے ہاں دو آدمی ٹھہرے ہوئے تھے جو اُس رات کے بعد حویلی میں نظر نہیں آئے۔ وہ اپنا تھوڑا بہت سامان بھی چھوڑ گئے۔ اگر منیر علی کے پاس آنے والے آدمی انھیں یہ بھی بتا دیتے کہ رستم کے وہ دونوں مہمان حویلی سے غائب ہیں تو پھر منیر علی کو یہ یقین دلانا ہمارے لیے مشکل ہو جاتا کہ وہ کوئی اور لوگ تھے، ہم نہیں تھے لیکن جلد ہی کسی نہ کسی وقت یہ بات منیر علی کو معلوم ہونی تھی۔ ابھی صرف دو دن گزرے تھے، شہر چھوٹا تھا اور واقعہ رانا جیسے آدمی کا تھا۔ اب بھی طرح طرح کی افواہیں پھیلی ہوئی ہوں گی۔ حویلی میں بہت سے لوگوں کو پیرو اور ماچھی کی آمد کا پتہ تھا۔ پولیس کو بھی اُنھی دو آدمیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہوگا مگر حویلی کے رہنے والوں کو یہ علم نہیں تھا کہ رستم خاں کے وہ دو مفرور مہمان مولوی صاحب اور کورا سے کوئی وابستگی رکھتے تھے اور اسی بنیاد پر انھوں نے رانا کو آنکھوں سے محروم کر دیا۔ رستم نے یہ بات عام نہیں کی ہوگی کہ اُس کے ہاں ٹھہرنے والے کیا بات جاننے کے لیے آئے تھے۔ وہ یہ بات بتا دیتا تو مولوی صاحب اور کورا کی گم شدگی کے احوال سے سارا شہر باخبر ہو جاتا اور رانا کی رُسوائی کو سند مل جاتی۔ ساتھ ہی رستم اور اُس کے ساتھیوں کا پردہ چاک ہو جاتا۔ ویسے بھی اُسے یہ کسی کو نہیں بتانا تھا کہ اُسی نے اُس رات مولوی صاحب اور کورا کو جانے دیا تھا۔ اِس راز سے صرف اُس کا شاگرد سہراب واقف تھا۔ رستم خاں کو اشارۃً بھی یہ نہیں کہنا چاہیے تھا کہ اُس کے ہاں ٹھہرنے والے لوگوں نے مولوی صاحب اور کورا کا کوئی ذکر اُس سے کیا تھا۔ وہ حویلی کے عام لوگوں کی طرح حیرت کا اظہار کر رہا ہوگا لیکن یہ حقیقت خود اُس کے سینے پر بوجھ بنی ہوگی کہ اُن دو آدمیوں کے سوا یہ کام کسی کا نہیں ہے۔ رستم پر چاروں طرف سے زور پڑ رہا ہوگا کہ جن مہمانوں کو اُس نے اپنے بلانے ساتھی کہہ کے حویلی کے لوگوں سے ملوایا تھا، وہ کون تھے اور اچانک کہیں چلے گئے، اُن سے اُس کی کب سے آشنائی تھی۔ رستم اپنی لاجوابی پر سب سے زیادہ شک کا ہدف بنا ہوگا حالانکہ حویلی میں اُس کی ذات شک اور شبہے سے بالاتھی۔ رانا سے اُس کے خاص مراسم ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ اُس نے پولیس اور حویلی کے عام لوگوں سے اپنے مہمانوں کے متعلق اُلٹ سلٹ باتیں کہی ہوں گی کہا ہوگا، اُسے یقین نہیں آتا کہ ایسا انھوں نے کیا ہے اور اگر واقعی انھوں نے کیا ہے تو اُسے بہت بڑا دھوکا ہو گیا۔ وہ اسے فریب دے گئے۔ اُس رات انھوں نے اُسے غافل کر دیا تھا۔ ممکن ہے اُس نے پولیس کو ماچھی اور پیرو کا کوئی فرضی پتہ بھی دے دیا ہو، کسی دُور دراز مقام کا پتہ تاکہ پولیس انھیں ڈھونڈتی رہے۔

بمبئی شہر دُور نہیں تھا لیکن رستم خاں کی نگاہ ماچھی اور پیرو تک زندگی بھر نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ایک ہی تدبیر اُن تک پہنچنے کی رستم کے ذہن میں آئی ہوگی کہ منیر علی کو کُریدا جائے۔ وہ محلے میں مولوی صاحب کے سب سے گہرے رفیق تھے اور اُنھی کے ذریعے رانا نے مولوی صاحب کو کورا کا پیام بھجوایا تھا۔ رستم خاں کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ حویلی میں آنے سے پہلے پیرو اور ماچھی کا منیر علی اور دوسرے محلے والوں سے لازماً کوئی ربط ضبط رہا ہوگا اور منیر علی نے اُن سے رانا کے سلسلے میں اپنے شبہے کا اظہار کیا ہوگا۔ منیر علی ہی اُسے سامنے کے آدمی نظر آئے ہوں گے، اُنھی سے کچھ معلوم ہو سکتا تھا کہ وہ لوگ کہاں سے آئے تھے، انھیں کسی نے کرائے پر حاصل کیا تھا یا وہ مولوی صاحب کے بچھڑے ہوئے عزیز تھے۔ رستم کو احساس ہوگا کہ وہ اکیلا یہ سب کچھ نہیں کر سکتا۔ اُس نے دیکھ لیا تھا کہ پیرو اور ماچھی کے ہاتھ میں کیسی پھُرتی ہے۔ بجّھل کے بقول چاقو اُن کی اُنگلیوں کے اشارے پہ ناچتا تھا۔ اُن کی اُنگلیوں میں مقناطیس لگا ہوا تھا، جو چاقو جیب کا ہے رکھا تھا اور دوسرے کا چاقو کھینچ لیتا تھا۔ اپنا اکیلا پن دُور کرنے کے لیے رستم کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا ہوگا کہ وہ اپنے شاگرد سہراب کو ہر بات بتا دے۔ ہو سکتا ہے رستم کو پولیس نے اپنی تحویل میں لے لیا ہو یا حویلی ہی میں اُس کی کڑی نگرانی کی جا رہی ہو۔ اِس موقع پر اُس کا حویلی سے باہر نکلنا ویسے بھی مناسب نہیں تھا۔ وہ سہراب اور اُس کا کوئی قابلِ اعتبار ساتھی ہوگا جو منیر علی کے گھر میں چوروں کی طرح داخل ہوئے تھے۔ یہ رستم اور سہراب جیسے رانا کے تمام ملازمین کے لیے اپنے مالک سے وفاداری اور جاں نثاری دکھانے کا وقت تھا اور نہ وہ وہاں کس لیے تھے۔ اُس کی آنکھیں نکل جانے کا انھیں اتنا ہی صدمہ ہوگا جتنا کسی کے خیراندیشوں کو ہو سکتا ہے۔ رانا کی بہت سی باتیں، بہت سے حکم انھیں ناپسند ہوں گے مگر کوئی بھی یہ نہیں چاہتا ہوگا کہ رانا کو ایسی سزا ملے۔ اُن کے دل میں آگ لگ رہی ہوگی۔ بیشتر اس وجہ سے کہ یہ سب کچھ اُن کے ہوتے ہوئے ہو گیا۔ وہ اُن دونوں آدمیوں کو ڈھونڈنے کے لیے بے چین ہوں گے۔ اُن کا چین اُسی وقت بحال ہو سکتا ہے جب وہ کہیں سے رانا کے پیروں میں پیرو

اور ماچھی کے سر پا اُن کی آنکھیں لاکے ڈال دیں۔ سہراب اور رُستم نے اپنے ساتھیوں کو اشتعال دلانے کی ہر کوشش آزمائی ہوگی۔ انھیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ کورا اور مولوی صاحب کو ہم نے فرار کرایا تھا۔ واقعے کا یہ حصّہ غیر متعلق تھا چنانچہ انھوں نے اسے خود تک محدود رکھا ہوگا۔ اگر وہ سہراب ہی تھا تو اُس نے منیر علی کو سوچنے کے لیے کچھ مہلت دی تھی۔ منیر علی نے مسلسل اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ سہراب متذبذب ہو کے چلا گیا لیکن رُستم کو منیر علی کی لاعلمی کا یقین نہیں آیا ہوگا۔ وہ اپنے ساتھیوں پہ دوبارہ اُن کے گھر جانے کے لیے زور دے رہا ہوگا کہ بس وہی ایک ذریعہ ہے جہاں سے انھیں کچھ مل سکتا ہے، پانی وہیں مرتا ہے۔

بیکانیر واپس آ کے ماچھی یہ سب بتا رہا تھا تو میرا ذہن اتنی باتوں کی طرف نہیں گیا تھا۔ بظاہر میرے کان ماچھی کی آواز پہ لگے ہوئے تھے مگر میں تو کہیں اور بھٹک رہا تھا۔ بجّھل نے جب اچانک ڈیرے سے بمبئی واپس جانے کو کہا تو مجھے اُس کی بات عجیب لگی تھی۔ بجّھل نے بیرو کو جیسلمیر بھیجتے ہوئے یہ ضرور بتایا ہوگا کہ وہ خود وہاں کیوں نہیں جا رہا ہے اور کون سی ایسی رکاوٹ اُسے درپیش ہے۔ بیرو نے خیال نہیں کیا۔ اُسے اُسی دن حویلی سے واپس آ جانا چاہیے تھا جب اُس نے مولوی صاحب کے متعلق رُستم کی باتوں پہ اعتبار کر لیا تھا۔ بہرحال گزرا ہوا اب لوٹایا نہیں جا سکتا تھا۔ راستے میں پہلی بار جب میں نے بجّھل کی زبان سے یہ سنا تھا کہ اُس کا ارادہ جیسلمیر جانے کا ہے تو میں سمجھا تھا، وہ محض اپنی تسلّی کے لیے صورتِ حال کا اندازہ لگانے جا رہا ہے۔ اُس وقت پیش آنے والے حالات کا صرف دھندلا دھندلا ایک خواب مجھے نظر آیا تھا، ایک بُرا سا خواب۔ ہمیں کسی طور کل ہی رات یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ منیر علی کی آنکھیں لال ہو گئی تھیں۔ بجّھل اُن سے جو سب سے بڑی بات کہہ سکتا تھا، وہ یہی تھی کہ وہ اُن کے گھر پہ موجود رہے گا تاکہ وہ رُستم کی طرف سے دوبارہ آنے والے آدمیوں کا سامنا ہم سے کرا دیں مگر خود کو آنے والے آدمیوں کے سامنے کر دینے کی پیش کش اور رانا کے واقعے سے اپنی بے تعلقی اور بے خبری کے اصرار کے باوجود واقعات کی ترتیب اور تسلسل کی بات منیر علی کے دماغ میں جونک کی طرح چمٹ گئی تھی۔ رہ رہ کے انھیں شاید یہی خدشہ ڈس رہا تھا کہ اگر ہمارا کوئی تعلق نکلا تو ہماری یہاں موجودگی اُن کے لیے اور ضرر رساں ہو سکتی ہے۔ کسی اور کا معاملہ ہوتا تو بات دیگر تھی مگر یہ معاملہ رانا کا تھا اور وہاں بھانت بھانت کے ملازم موجود تھے۔ انھوں نے رانا اور اُس کے آدمیوں کے بارے میں بے شمار باتیں سنی تھیں اور بجّھل نے اِس کا کوئی معقول جواز پیش نہیں کیا تھا کہ رانا کے ہاں چلنے والی گولی کا دھماکا اُن کے گھر میں کیوں ہوا۔ انھوں نے دبے دبے لفظوں میں پھر ہمیں اپنے گھر سے چلے جانے کا مشورہ دیا لیکن بجّھل کو معلوم تھا کہ وہ لوگ دوبارہ آئیں گے، پولیس نہیں آئے گی کیونکہ وہ پولیس کی توجہ ہرگز منیر علی کے گھر کی جانب مبذول نہیں کریں گے۔ وہ خود آئیں گے اور منیر علی یہ نہیں جان رہے ہیں کہ وہ پہلے کی طرح اِس بار نالہ و شیون سے انھیں متاثر نہیں کر سکیں گے۔ "ہماری بات آپ کے دل [illegible] نہیں لگتی تب بھی ہم یہاں سے نہیں جائیں گے۔ اِدھر آپ کے ساتھ [illegible] گے۔ ہاں آپ چاہو تو کہیں اور جا سکتے ہو۔" بجّھل نے اُونچی آواز میں [illegible]

"کیا مطلب؟" منیر علی بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولے۔

"مطلب یہ کہ آپ کچھ دنوں کے لیے کسی اور شہر چلے [illegible] آپ کوئی ایسا اندیشہ محسوس کرتے ہو۔ ہم کو یہیں رہنے دو۔ جب اِدھر [illegible] ہو جائے گا، ہم آپ کو واپس بلا لیں گے۔"

"مگر میں کہاں جاؤں گا؟ جہاں بھی جاؤں گا، وہ میرے پیچھے [illegible] گے، لوگ میرے تمام ٹھکانوں سے واقف ہیں۔ اس سے تو وہ اور [illegible] ہو جائیں گے اور پھر میں.... اپنا گھر بار چھوڑ کے کہاں جا سکتا ہوں، ساتھ بچے بچیاں ہیں۔ ایک دیوانہ سا لڑکا بھی ہے۔"

"آپ ان سب کو لے کے ہمارے گھر چلے جاؤ، وہاں آپ [illegible] طرح محفوظ رہو گے۔ وہاں تک کوئی آپ کا پیچھا کرتا ہوا بھی نہیں [illegible] اور آپ کو اُدھر کوئی تکلیف بھی نہیں ہوگی۔ بڑے صاحب! آپ [illegible] یہی بہتر ہے کہ آپ نکل جاؤ۔ عزّت کے لیے لوگ سب کچھ کر لیتے [illegible] مولوی صاحب کو دیکھو، انھوں نے کیا نہیں کیا۔"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں، آپ کو گھر بار کی فکر ہے۔ آپ ہم [illegible] سب کا آپ نے ہم سے سودا کر لیا۔ پن چکی، زمینیں، گھر، سامان [illegible] آپ کی نظر میں ان کا جو بنتا ہو، ہم کو بول دو، ہم آپ کو ادا کر دیں [illegible] ہی نہیں کہ ادا کر کے آپ کا ہم سے واسطہ نہیں ہوگا۔ ہمارے پاس زمین ہے جس کی دیکھ بھال کے لیے اُدھر کوئی نہیں ہے۔ ہمارے بچے بچیاں ہیں، آپ کو اُدھر جا کے کوئی دُکھ نہیں ہوگا۔ ہوگا تو ہم آ[illegible] قریب ہی ہوں گے۔ آپ ہماری گردن پکڑ لینا، پر یہاں سے چلے [illegible]

"آپ.... آپ یہ کیسا مذاق کر رہے ہیں؟"

"نہیں بڑے صاحب! میں آپ سے مذاق نہیں کر سکتا [illegible] بھی مسخری کا نہیں ہے۔ میں صحیح بات بول رہا ہوں، آپ نے بٹھایا ہے۔ ہم کو کچھ کرنے دو۔"

"گویا آپ کا خیال ہے کہ میں یہ جگہ، یہ محلّہ، رشتے دار، سب کو چھوڑ دوں، یہاں سے وہاں چلا جاؤں جہاں مجھے کوئی نہیں [illegible] آپ کہنا چاہتے ہیں کہ جو اندیشہ مجھے لاحق ہے، اُس کا اب [illegible] کو بھی احساس ہو رہا ہے۔"

"ہاں بڑے صاحب!" بجّھل نے سر جھٹک کے کہا۔ "کچھ ایسا [illegible]

"اور خود آپ یہاں ٹھہرے رہنے پر کیوں بضد ہیں؟"

"پھر ہم بھی اِدھر نہیں رہیں گے۔"

"اور جو سودا آپ مجھ سے کر رہے ہیں، اُس کا کیا ہوگا؟"

"وہ ہم اِدھر ہی چھوڑ دیں گے۔"

"یہیں چھوڑ جائیں گے!" منیر علی پھٹی ہوئی آنکھوں سے بجّھل کو گھورنے لگے۔ "فرض کیجیے، میں آپ کی ہدایت پہ عمل کر لیتا ہوں تو کیا آپ میرے ہمراہ ہی چلیں گے؟"

"ہم بھی آپ کے ساتھ چل سکتے ہیں، پر آگے پیچھے۔ آپ اِدھر سے [illegible] جائیں گے، اُدھر ہم آپ کے پیچھے چل پڑیں گے۔ ہم دونوں کا ساتھ نکلنا ضروری نہیں ہے۔ آپ کسی سامان کے بغیر جاؤ اور ہو سکے تو رات کی ہی گاڑی سے ہی۔"

"بس کیجیے۔ خدا کے لیے چپ ہو جائیے۔"

"بڑے صاحب! ہم پہ اعتبار کرو۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے جناب!" منیر علی ترشی سے بولے۔

"کیوں نہیں ہو سکتا۔ آدمی جس زمین میں رہتا ہے، جڑ پکڑ لیتا ہے۔"

"مجھے یہاں رہتے ہوئے عمر گزر گئی۔ اب اس آخری وقت میں، میں کہاں جاؤں گا۔ آپ کی منشا میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ کچھ دیر پہلے آپ کچھ اور کہتے تھے، اب کچھ اور کہنے لگے ہیں۔ میری آنکھوں سے اندھیرا ہٹائیے، مجھ پر رحم کیجیے۔"

"میں نے کچھ دیر پہلے ایک اور بات بھی بولی تھی بڑے صاحب کہ سر پہ اتنا ہی بوجھ رکھو جتنا وہ سہار سکے، باقی بوجھ دوسروں کو دے دو۔ آپ یہاں رہو گے تو یہ بوجھ کم نہیں ہوگا۔ اس لیے اچھا ہے کہ آپ جگہ بدل دو۔ پھر جیسا آپ چاہتے ہو، ویسا نہ ہوا اور بات بگڑ گئی تو پچھتاوے کا وقت نکل جائے گا، پر ابھی وقت آپ کی مٹھی میں ہے۔"

"وقت نکل جائے گا، یعنی آپ...." منیر علی سرتاپا لرزنے لگے۔

"بڑے صاحب! آپ کو دیکھ کے اور آپ کی باتیں سن کے مجھے [illegible] اب یہ دِکھ رہا ہے کہ آپ کا یہاں سے ٹل جانا بہتر ہے۔ آپ کا سوچنا غلط نہیں، وہ بہت بُرے لوگ ہیں۔ فرض کرو، اُن کا شک آپ پر ہی جم جائے؟"

"مجھ پر! مجھ کمزور اور بوڑھے آدمی پر!"

"اندھے کو کچھ دکھائی نہیں دیتا، انھوں نے کئی رات کہاں دیکھا کہ آپ جھوٹ نہیں بول رہے ہو۔ کیا آپ سمجھتے ہو کہ اُن کو یقین آ گیا؟"

"نہیں آیا، بالکل نہیں آیا۔"

"پھر میں بھی یہی کہہ رہا ہوں۔"

"مگر میں اس طرح کہاں جا سکتا ہوں، میں نہیں جا سکتا۔"

"آپ سوچ لو، فیصلہ آپ کو ہی کرنا ہے، میں آپ کو زبردستی نہیں بھیج سکتا، ایسا ہوتا تو ضرور کر لیتا۔"

"آپ نے اُلجھن اور سوا کر دی ہے۔"

"یہاں مولوی صاحب سے سب سے زیادہ آپ کا رشتہ تھا، اُن کی بات بیچ میں آ گئی ہے تو سب سے پہلے آپ کا خیال جائے گا۔"

"مگر میں نے.... میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔" وہ کانپنے لگے۔

"پر جب تک آپ لوگوں کو سمجھاؤ گے، بل پڑ چکا ہوگا۔"

منیر علی پہ جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔

انھیں گُنگ بیٹھے بیٹھے دیر ہو گئی تو بجّھل نے اُن کا بازو تھپتھپایا۔ "چھوڑو بڑے صاحب! آپ گھر میں جاؤ، کچھ دیر آرام کرو۔ کہیں اور جاتے ہوئے آپ کا دل نہیں ٹھکتا تو پھر اِدھر ہی رہو۔ پر جی کڑا رکھو۔ زندگی کپڑوں کی طرح ہوتی ہے، پہنو گے تو داغ دھبے بھی پڑیں گے۔ یہ زمین ہے، آسمان نہیں ہے، جدھر مٹّی نہیں ہوتی۔ ہم بھی یہیں بیٹھے ہیں۔ جو ہوگا، دیکھیں گے۔ بیٹھک کی کُنڈی کھول دو۔ کچھ ہوا آئے گی۔ ہم لوگ بہت تھکے ہوئے ہیں، ذرا کمر ٹکا لیں۔"

"دروازہ بند ہی رہنے دیجیے۔" وہ سراسیمگی سے بولے۔

"اُسے کھلا رہنے دو بڑے صاحب! اُن کو پتہ ہو جائے گا کہ ہم آ گئے ہیں۔"

بجّھل خود اُٹھ کے دروازے تک گیا۔ منیر علی اُچھل پڑے۔ وہ بجّھل کو روکنا چاہتے تھے مگر اُن کے ہونٹ پھڑک کے رہ گئے۔ بجّھل نے پلٹ کے اُن کی طرف دیکھا اور دروازہ کھولے بغیر واپس آ کے پلنگ پر لیٹ گیا۔

دروازہ دن بھر بند رہا۔ اندر اتنا اندھیرا نہیں تھا۔ بیٹھک سے ملحق چھت پہ جانے والے زینے کے روشن دان سے روشنی خوب آ رہی تھی۔ اُدھر غسل خانے کے حصّے کی طرف کھلنے والا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ ہمیں تاریکی کا احساس نہیں ہوا۔ گلی میں چلنے والے لوگوں کی آوازیں کبھی کبھی صاف سنائی دیتی تھیں۔ اندر گھر میں کوئی آواز، چہکار نہیں تھی۔ منیر علی صبح شربت کی ٹرے رکھ کے گئے تو پھر انھوں نے سہ پہر ہی کو بیٹھک میں قدم رکھا۔ انھوں نے کھانا لا کے ہمارے سامنے رکھ دیا لیکن خود شامل نہیں ہوئے۔ بجّھل نے اُن سے طبیعت کی ناسازی کا عذر سن کے تکرار بھی نہیں کی۔ جب تک ہم کھاتے رہے، وہ خاموش بیٹھے رہے اور پلیٹیں اُٹھا کے چل دیے۔ وہ اپنے چھوٹے لڑکے کو مدرسے چھوڑنے اور بازار میں پن چکی کا حساب کتاب کرنے بھی نہیں گئے تھے البتہ نماز پڑھنے کے لیے وہ مسجد ضرور جاتے رہے۔ انھیں خیال ہوگا کہ جماعت میں خلافِ معمول اُن کی غیر حاضری کے سبب نمازی کہیں انھیں پوچھنے کے لیے گھر تک نہ آ جائیں اور کسی کو ہماری موجودگی کا پتہ نہ چل جائے۔ گھر کے خاص دروازے پر کئی مرتبہ کنڈی کھٹ کھٹانے کی آواز آئی مگر بیٹھک میں کوئی نہیں آیا، بوڑھی ملازمہ اور منیر علی کا چھوٹا لڑکا بھی نہیں۔ بیٹھک بند تھی۔ لیٹے لیٹے میری کمر دُکھنے لگی تھی۔ میں نے طاقوں میں رکھی ہوئی منیر علی کی کتابیں بھی اُلٹ پلٹ کے دیکھیں مگر اُن میں میرا جی نہیں لگا۔ اُن میں زیادہ تر مذہبی یا طب سے متعلق کتابیں تھیں۔

سہ پہر کو پہلی بار روشن دان کی جالیوں پر زہرہ کا چہرہ نظر آیا۔ میں اُسی سمت کروٹ لیے ماتھے پر ہاتھ رکھے لیٹا تھا۔ آنکھیں بھی انگلیوں میں چھپ گئی تھیں کہ یکایک روشن دان پر مجھے اُس کی آہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ہاتھ نہیں ہٹایا۔ مجھے اُس کے آنے کی توقع تھی۔ کئی دفعہ روشن دان کی جانب بے اختیار میری نگاہیں اُٹھی تھیں نہ جانے کیوں مجھے دوبارہ اُسے دیکھنے کی جستجو تھی میرے جانے کے بعد ممکن ہے اُسے افسوس ہوا ہو کہ میری بات کا اُس نے جواب کیوں نہیں دیا۔ ہو سکتا ہے اُسے یہ احساس بھی ہو گیا ہو کہ میرے سامنے زبان کھولنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ میری التجا بہت معمولی تھی۔ میں تو ایک مسافر تھا، ہمیشہ کے لیے اس کے گھر میں رہنے کے لیے نہیں آیا تھا اور میں نے اُسے یقین دلانے کی پوری کوشش کی تھی کہ مجھے صرف کورا کے بارے میں پوچھنا ہے کیونکہ وہ اُس کی ہم جولی رہی ہے۔ میری آنکھوں پر انگلیوں کا پردہ دیکھ کے وہ ایک بار تو سہم کے پیچھے ہو گئی۔ میں نے اپنا جسم باندھے رکھا اور انگلیوں کی درزوں سے روشن دان کی طرف نظریں جمائے رہا۔ چند ہی لمحوں بعد اُس کا چہرہ پھر جالیوں پر اُبھرا۔ اُدھر روشنی خاصی تھی۔ اس لیے میں اُس کے خدوخال واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور چہرہ دھوپ کی تمازت سے آگ کی طرح جل رہا تھا مگر اُس کا رنگ ہی ایسا تھا۔ وہ پلکیں جھپکاتی، زاویے بدل بدل کے اندر بیٹھک میں جھانکتی رہی۔ نہ جانے وہ یہاں کیا دیکھنا چاہتی تھی۔ اندر بیٹھک میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ دونوں پلنگوں پر ہم اوندھے سیدھے پڑے ہوئے تھے۔ اُس کا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا ہوا تھا اور ہوا سے بالوں کی لٹیں اُڑ رہی تھیں۔ دوپٹا سر سے ڈھلکا ہوا تھا اور گلے پر آ کے ٹھہر گیا تھا۔ پھر اُس کی نگاہیں مجھ پر آ کے ٹک گئیں۔ مجھے جھرجھری سی آنے لگی اور ایسا لگا جیسے کورا نے اُس سے کہا ہو کہ مجھے خوب غور سے دیکھ کے آئے۔ ہم جولیاں ایک دوسرے سے ایسی باتیں کرتی رہتی ہیں۔ وہ تھوڑی ہی دیر وہاں ٹھہر سکی۔ منیر علی ظہر کی نماز پڑھ کے گھر واپس آ گئے تھے اور دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ دوسری بار عصر کی نماز کے وقت مجھے پھر اُس کا دوپٹا روشن دان کی جالیوں پر سرسراتا ہوا نظر آیا۔ مجھ سے غلطی ہو گئی کہ میں نے نظریں اُٹھا کے اُس جانب دیکھ لیا۔ اُس کا منہ کھل گیا اور وہ چشم زدن میں اوجھل ہو گئی لیکن ابھی منیر علی نماز سے لوٹے نہیں تھے کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹا کے چائے لینے کو کہا۔ وہ اُسی کی آواز تھی۔ میں بھاگ کے دروازے پر پہنچا اور میں نے پٹ کھولنے میں احتیاط رکھی مگر وہ سامنے ہی کھڑی تھی۔ اُس کا وہی عالم ہوا۔ اب کے وہ بھاگی تو نہیں، نہ اُس کے ہاتھ سے ٹرے گری مگر اُس کا سارا بدن کسی شاخ کی طرح تھرتھرا کے رہ گیا۔ اُس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ ایک لمحے میں وہ آڑ میں ہو گئی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کے ٹرے اُس کے کپکپاتے ہاتھوں سے تھام لی۔ بجھل جاگ رہا تھا۔ اِس کے باوجود میں وہیں کھڑا رہا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو۔ شاید شرمندگی کا اظہار کرتی۔ میں نے بہت ارادہ کیا کہ اُس کوئی بات کروں لیکن لفظ میرے حلق میں اٹک گئے تھے۔ میں زیادہ وہاں کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں بولی۔ میں نے کواڑ بھیڑ دیے۔

کوئی اُمید رکھنا بیکار تھا۔ میں نے عہد کیا کہ اب روشن دان نگاہ نہیں اُٹھاؤں گا یا وہ کوئی چیز لے کے آئے گی تو دروازے پر جاؤں گا۔ سب لاحاصل ہے۔ زہرہ اگر کچھ بتا بھی دیتی تو میں کیا کر لیتا کا پتہ تو اُسے بھی نہیں معلوم تھا۔ ماچھی نے رُستم کی زبانی سُنی ہوئی اُ سی باتیں اُس کے متعلق بتائیں تو مجھے کیا حاصل ہوا۔ رات کے کھانے منیر علی ہمارے ساتھ رسمی طور پر شریک ہوئے۔ اُن کی زبان کو چُپ لگ تھی۔ ہم دونوں بھی سر نیچے کیے لقمے نگلتے رہے۔ دن بھر ہم ایک پل بھی باہر نہیں نکلے تھے۔ بجھل کے پاس بیڑی کا بنڈل بھی ختم ہو گیا کھانے سے نمٹ کے منیر علی فوراً اندر چلے گئے۔ بجھل کچھ دیر تک بیٹھک میں چہل قدمی کرتا رہا پھر میری چارپائی پر آ کے بیٹھ گیا۔ اُس گردن اپنے بازو میں جکڑ لی۔ "کدھر کی سیر کر رہا ہے؟" میں نے کوئی نہیں دیا۔ وہ بوجھل آواز میں بولا۔ "کچھ بول رے۔"

"کیا بولوں۔" میں نے تیزی سے کہا۔

"جی کیسا ہے؟"

"سب ٹھیک ہے۔"

"تو نے کچھ پوچھا نہیں؟" اُس نے سرگوشی کی۔

"کا ہے کے بارے میں؟"

"کسی کے بارے میں بھی۔"

"تمھی کچھ بتا دو۔"

"میں کیا بولوں۔ تُو تو سب دیکھ رہا ہے۔"

"پھر میں کیا پوچھوں۔"

"بولتا رہا کر۔" وہ لمبی سانس کھینچ کے بولا۔

"فضول زبان چلانے سے کیا فائدہ۔"

"ساری زندگی گھاٹا ہے لاڈلے! ہر وقت فائدے کی منہ کو کبھی کبھی یوں بھی کھول لیا کر۔ جیسا کو ہوا اور دھوپ لگتی رہتی جی ہلکا رہتا ہے۔"

"تم اس وقت اسے ہوا ہی لگا رہے ہو، دھوپ تو ہے نہ"

"ٹھیک بول رہا ہے۔ ابھی بھاری نہیں ہوئی، دھار رکھی ہو"

"کیا بھاری نہیں ہوئی؟"

"تیری زبان! میں سمجھا تھا، ایک کروٹ لیٹے لیٹے بھ ہو گی پر دھار نہیں اتری ہے۔ اپنے آپ سے بولتا رہا ہے۔"

"اپنے آپ سے کیا بولوں گا، میرے پاس سوال ہی سوا دینے کے لیے بھی تو کچھ ہونا چاہیے۔"

"تو اکیلا ہی ایسا نہیں ہے۔ ہر آدمی سدا سوال جواب کی یہ لاٹری ڈالتا ہے۔ نتیجہ نہیں نکلتا ہے۔ پر کبھی کبھی ٹھیک بھی جواب آ جاتا ہے سمجھ لے ں کی چاندی ہو گئی۔ یہ جوا کھیلتے رہنا چاہیے۔ آدمی ٹھیک طرح اپنے ی کو جواب دیتا ہے۔ پانسا پھینکے جا، پر جواریوں کی طرح نہیں، بھیجا جائے گا۔" میں چُپ رہا۔ اُس کی گرفت سے میری گردن میں درد رہا تھا۔ میں نے گردن چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ میرا دل چاہ رہا یری گردن توڑ ہی دے۔ لیکن اُس نے دو تین جھٹکے دے کے خود اپنا ڈھیلا کر دیا اور ٹک ٹک کے بولا۔ "لاڈلے! رات کو آنکھ جگی رکھنا۔"

"کیوں؟" میں نے تندی سے پوچھا حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ اُس قصد ہے۔ اُس کے کچھ کہنے سے پہلے میں نے کہا۔ "ضروری نہیں وہ آج ہی آ جائیں۔"

"ہاں!" وہ سر ہلا کے بولا۔ "تو بھی یہی سوچ رہا ہے پر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ نہ آئیں۔ انھیں آ جانا چاہیے۔"

"اور اگر وہ کل پرسوں اترسوں ایک ہفتے تک نہ آئیں؟"

"ایسا مشکل دیکھتا ہے پر یہ اُس کے بعد سوچیں گے۔"

"اس کے بعد کیا سوچو گے؟"

"پھر چل پڑیں گے۔"

"کہاں؟"

"تجھ کو پتہ نہیں رے۔"

"اب کدھر جاؤ گے؟"

"تیرا ارادہ کدھر کو ہے؟"

"گھر چلیں گے۔" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"گھر! کون سے گھر؟"

"زرّیں کے ہاں!"

اُس کی آنکھیں میرے چہرے پر منڈلانے لگیں۔ "تجھے اُس کا کیسے آ گیا؟"

"بس یوں ہی۔ دن بہت ہو گئے۔ وہ لوگ انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"چھوٹا پاپا آ رہا ہے۔ رجّو!"

"اُس کا نام جہاں گیر ہے۔"

"ہاں ہاں، اُسی کو بولتا ہوں، وہ اُدھر سُکھ سے ہو گا۔"

"اُسی طرف چلو۔"

"پہیلی بوجھ رہا ہے۔"

"تم نہیں سمجھ رہے۔" میں نے وحشت سے کہا۔

"کیا ہے رے! یہ اچانک کمان کیوں چڑھا لی؟"

"سب بے کار ہے۔"

"جانتا ہوں تو اُدھر چلنے کو کیوں بول رہا ہے۔"

"کیوں بول رہا ہوں۔"

"رسّی کاٹنے کی سوچ رہا ہے پر لاڈلے! یہ تیری بھول ہے۔"

"میرے دماغ میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"سمجھ لے، تُو نے اب کے ایسا کیا تو میں تجھ سے کبھی نہیں بولوں گا۔"

"میں تم سے کیا کہہ رہا ہوں۔"

"میں سُن رہا ہوں، پر تو وہاں رہے گا نہیں۔"

"میرے پیر میں زنجیر ڈال دینا۔"

"وہ تو کب سے پڑی ہوئی ہے۔"

"تم میری بات نہیں سُن رہے ہو۔"

"تو بھی میری بات نہیں سُن رہا ہے۔"

"میں تم سے سچ کہہ رہا ہوں۔"

"اِس ٹائم تو ضرور سچ کہہ رہا ہے، پر......" وہ میری کمر پر زور سے ٹھونگا مارتے ہوئے بولا۔ "کمر تو ابھی تیری تن بول رہی ہے۔ رہنے دے، پھر بات ہو گی اور ہاں، ایک بات کان میں ٹانک لے، اپنی مٹی میں چکنی مٹی زیادہ پڑی ہوئی ہے صرف اپنے آپ کی بابت سوچا کر۔ یہ بار بار آنکھ مچولی کیوں کرتا ہے۔" وہ مجھے بستر پر دھکا دے کے اپنے پلنگ پر چلا گیا۔ کمرے میں سکوت چھا گیا۔ گلی میں ہر آواز اندھیرے میں ڈوب گئی تھی۔ کچھ توقف کے بعد وہ نسبتہً اونچی آواز سے بولا۔ "لاڈلے! کان کھلے رکھنا۔"

"تم سو جاؤ۔" میں نے تیز لہجے میں کہا۔

بیٹھک میں کوئی گھڑی نہیں تھی مگر اندازاً اس وقت گیارہ بجے ہوں گے۔ پلنگ پر لیٹنے سے پہلے بجھل نے پھونک مار کے لالٹین بجھا دی تھی۔ میں نے اُٹھ کے صراحی ٹٹولی اور ایک کٹورا پانی لے کے پھر اپنے بستر پر آ گیا۔ ہوا بالکل بند تھی۔ بستر جسم سے چپکا جا رہا تھا۔ میں نے اُسے لپیٹ کے پیروں کی طرف کر دیا اور کھرّی چارپائی پر پاؤں پھیلا کے لیٹ گیا۔ ادوائن کسی ہوئی نہیں تھی میرے بوجھ سے چارپائی میں گڑھا سا پڑ گیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے چارپائی اندر زمین میں دھنسی جا رہی ہے۔ اس حبس میں نہ جانے کیسے بجھل کی آنکھ لگ گئی تھی۔ اُس کی سانسوں کے تواتر سے پتہ چلتا تھا کہ وہ گہری نیند سو رہا ہے۔ میں دیر تک درمیان میں رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھا رہا، پھر دبے قدموں چلتا ہوا غسل خانے کی طرف آ نکلا۔ یہ جگہ کھلی ہوئی تھی اور آسمان صاف نظر آتا تھا۔ اُوپر ستاروں کا جال بچھا ہوا تھا لیکن چاند کا دُور دُور پتہ نہیں تھا۔ دیوار کے کونے میں اُگی ہوئی چنبیلی کی بیل کا پتا پتا ساکت تھا۔ آدھی بیل دوسری طرف منیر علی کے صحن میں اُتر گئی تھی۔ اُسے دیکھ کے مجھے خیال آیا کہ دیوار پر چڑھ کے منیر علی کے گھر میں ایک نظر کیوں نہ جھانک لوں۔

دیوار پر چڑھنے میں مجھے کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ اس کا تجربہ میں پہلے ہی کر چکا تھا۔ میں نے سر اُٹھایا ہی تھا کہ فوراً نیچے کر لیا۔ منیر علی جاگ رہے تھے اور دالان کے تخت پر قبلہ رُخ بیٹھے ہوئے تھے۔ میری سانس پھولنے

گی، اگر وہ مجھے یوں جھانکتے ہوئے دیکھ لیتے! میں دیوار سے ہٹ گیا۔ منیر علی ترچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ چند لمحوں بعد میرے اوسان بحال ہوئے تو اندر دیکھنے کی کھدبد پھر ہوئی۔ میں نے آہستگی سے دوبارہ سر اُٹھایا۔ دالان میں منیر علی کے سوا کوئی نہیں تھا۔ جن کمروں کے دروازے مجھے نظر آئے، وہ سب کے سب بند تھے۔ بائیں طرف مولوی صاحب کے گھر کی کھڑکی نظر آ رہی تھی۔ منیر علی جا نماز پر تسبیح کا ورد کر رہے تھے۔ میں انھیں دیکھتا رہا مگر پھر میری آنکھیں دُھندلانے لگیں۔ میں بیٹھک میں واپس چلا آیا۔

رات خاصی گزر چکی تھی۔ مجھے اب کسی کے آنے کی توقع نہیں رہی تھی۔ رات کے آخری حصّے میں کسی لمحے نیند مجھ پر غالب آ گئی مگر بہت زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ میں ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا۔ یہ خواب نہیں تھا۔ میں نے ایک گھٹی ہوئی چیخ سُنی تھی۔ بجّل نے بھی سُنی تھی۔ وہ اُچھل کے پلنگ سے اُتر گیا۔ "لاڈلے!" اُس نے سرگوشی میں مجھے پکارا۔ "اندر کھڑکھڑ ہے۔"

میں نے بھاگ کے گھر میں کھلنے والے دروازے سے کان لگا دیے اور جھنجوڑ کے اُسے کھولنا چاہا مگر دروازہ اندر سے بند تھا۔ منیر علی نے اُسے بند کر دیا تھا۔ "اِدھر سے آؤ۔" میں نے بجّل کا ہاتھ پکڑ کے اُسے کھینچ لیا۔ "غسل خانے کی طرف، اُدھر دیوار سے بھی ایک راستہ ہے۔"

ہمیں گھر کے صحن میں کودنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی۔ میرا چاقو دانتوں میں دبا ہوا تھا مگر بجّل نے دیوار پر چڑھتے ہی مجھے چاقو جیب میں رکھنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ اندر کا سارا منظر بدلا ہوا تھا۔ صحن میں روشنی کم تھی مگر سب کچھ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ تعداد میں چار تھے۔ دو آدمیوں نے منیر علی کو بے بس کر رکھا تھا، دو کے قبضے میں زہرہ تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ جیسے ہی ہمارے اندر کودنے کی آواز ہوئی۔ دونوں آدمی منیر علی کو دھکا دے کے ہماری طرف بڑھے۔ باقی دو زہرہ کو کھینچتے ہوئے دروازے کی طرف لے جانے لگے۔ بجّل نے مجھے اُسی طرف جانے کو کہا۔ زہرہ بے سُدھ تھی۔ سر پہ دوپٹا بھی نہیں تھا۔ پھر میں نے بجّل کو دیکھا اور جھپٹ کے اُن دونوں کے کرتوں کے گلے پیچھے سے پکڑ لیے۔ انھوں نے پروا نہیں کی بلکہ اور تیز بھاگنے لگے۔ ڈیوڑھی کے قریب ایک آدمی نے زہرہ کو اپنے کندھے پر ڈال لیا۔ دوسرے نے دفعتاً مُڑ کے میرے سینے پر چاقو مارنے کے انداز میں جھپکی دی۔ میں اور آگے بڑھ گیا۔ وہ مجھے چاقو مارنا نہیں چاہتا تھا اس لیے کچھ پیچھے ہٹ گیا۔ مجھے دوسرے آدمی کی فکر تھی، جو زہرہ کو لے کے آگے بڑھ گیا تھا۔ بجّل نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ چاقو میرے ہاتھ میں نہ ہونے کی وجہ سے میرے مقابل شخص نے مجھے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ وہ اپنے بچاؤ کے بجائے مجھ پر حملہ کرنے میں پہل کر سکتا تھا اور یہی صورت میرے لیے بہتر تھی۔ ماچی کی زبانی مجھے رُستم کے ساتھیوں کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا پھر بھی اُس کے ہاتھ میں چاقو تھا اور روشنی زیادہ نہیں تھی۔ پھر مجھے فوراً اُسے راستے سے ہٹا کے جلد از جلد دوسرے آدمی تک پہنچنا تھا۔ اس بات کا بھی امکان تھا کہ گلی میں اُن کے کچھ اور آدمی نگرانی کے لیے موجود ہوں۔ دُور کار بھی کھڑی ہوگی۔ یقیناً اندر گھر میں پہلے ایک آدمی کودا ہوگا اور اُس نے دوسرے ساتھیوں کے لیے اندر سے ڈیوڑھی کا دروازہ کھول دیا ہوگا۔ دروازہ کھلا ہونا چاہیے تھا، چاہے اس میں تالا پڑا ہوا، انھوں نے تالا بھی توڑ دیا ہوگا یا منیر علی سے چابی حاصل کر لی ہوگی ورنہ باہر نکلنے میں انھیں دشواری ہوتی خصوصاً اس صورت میں کہ واپسی میں اُن کے ساتھ گھر کا ایک فرد بھی موجود ہو۔ ڈیوڑھی میں اور آدمی بھی چھپے ہو سکتے تھے۔

میرے سامنے والا شخص اپنی جھپکی کے جواب میں میرے پیچھے ہٹنے کی وجہ سے جیسے ہی پیچھے ہوا تو غیر اختیاری طور پر اُس کا چاقو اُس کے جسم سے کچھ پیچھے چلا گیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ دوبارہ حملہ بھی یہی کرے گا۔ میں نے تیزی سے کسی قدر بائیں طرف جھک کے چاقو والا ہاتھ اپنے پنجے میں کس لیا۔ اُس کی ساری توجہ اُس ہاتھ پر مرکوز ہو گئی۔ اسی دوران میں نے مجبوراً سامنے سے ایسی نازک جگہ پر ضرب لگائی کہ وہ درد سے اُٹھ نہیں سکتا تھا۔ عام حالات میں میں کبھی ایسا نہ کرتا مگر ایک ایک لمحہ بھاری تھا۔ بجّل نے چاقو کو منع کر دیا تھا۔ یہ منیر علی کا گھر تھا۔ یہاں خون کا چھینٹا نہیں پڑنا چاہیے تھا۔ وہ لوگ بھی شور کرنا نہیں چاہتے تھے۔ منیر علی کے لیے بھی یہ مناسب نہیں تھا۔ اُدھر مشرق کی سمت مولوی صاحب کا گھر تھا، مغرب میں ایک دوسرا مکان تھا۔ وہاں لوگ بھی جاگ سکتے تھے۔ مکان کے پچھلے اور اگلے حصّے میں تنگ گلیاں تھیں۔ اُس نے درد سے بے چین ہو کے سسکی بھری اور زمین پر لوٹ گیا۔ درد اتنا شدید تھا کہ اُس کی آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ میں نے اُسے کوئی موقع نہیں دیا، گردن پر میرے ہاتھ کی ضرب نے اُسے ذرد ... دلا دی۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ اپنے ساتھی کی سسکاریاں سن کے دوسرا آدمی اپنا سر آگے کیے کسی دیوانے کی طرح ڈیوڑھی سے برآمد ہوا۔ اُس کے کندھے پر زہرہ نہیں تھی۔ اُس نے ایک نظر اپنے ساتھی کو دیکھا، ابھی سنبھلا بھی نہیں تھا کہ اُس نے اُچھل کے مجھے اپنے بازوؤں میں لینا چاہا۔ میں اُلٹے قدموں دالان کی جانب ہو گیا اور اچانک ڈیوڑھی کی طرف بھاگا۔ راستے میں ڈیوڑھی کے ایک کونے میں پڑی ہوئی زہرہ کی چوٹی سے میرے پیر اُلجھ گئے۔ اُس کے بدن کو ... میں وہاں رُکا نہیں، اُسے وہیں چھوڑ کے میں نے کُنڈی لگائی ... میں وہ میرے سر پہ پہنچ گیا تھا۔ نکلنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ ... کے ہاتھ میں چاقو بھی ہو سکتا تھا۔ اپنے بچاؤ میں میرے ... کے لیے جگہ تنگ تھی۔ ڈیوڑھی میں گہرا اندھیرا تھا۔ نہ وہ ... نہ میں اُسے نیچے ہو کے میں اُس کی ٹانگیں بھی نہیں اکٹ ... کے ہاتھ کھلے رہتے اور اگر چاقو اُس کے پاس تھا تو اُسے ... ہوتی۔ وہ دروازے کے قریب آ کے ٹھہر گیا تھا۔ میں نے

... فاصلے کا تعین کیا۔ چاقو مارنے میں اُس کا ہچکچانا بھی لازم تھا کیونکہ ... بلا میرے لیے دیوار بنا ہوا تھا، اُس کے لیے بھی مشکل پیدا کر دیتا۔ ... کا بڑھایا ہوا ایک ہاتھ خالی چلا جاتا تو شاید اُسے دوسری بار ہاتھ ... نے کا وقت نہ ملتا۔ باہر صحن میں اپنے ساتھی کا حشر وہ دیکھ چکا ... اور اُس کے وہ دونوں ساتھی بھی اندر سے نہیں آئے تھے جو منیر علی کو ... ہوئے تھے اور بجّل کو سامنے دیکھ کے اُس سے بھڑ گئے تھے۔ میرے ... میں ایک اور بات آئی کہ اپنا منہ ایک طرف کر کے آواز نکال کے ... یہ تاثر دوں کہ میں کس جانب کھڑا ہوں اور جھٹ دوسری طرف ... بازو منہ کے بجائے میں ہاتھ بڑھا کے بھی آہٹ پیدا کر سکتا تھا۔ ... نے یہی کیا اور اُس نے بھی وہی کیا جس کی مجھے اُمید تھی۔ میں عقب ... اُس کی گردن ٹیڑھی کر کے جھٹکا دینا چاہتا تھا لیکن مجھے اس کی مہلت ... ملی۔ بہرحال میں نے اُس کے مُڑنے سے پہلے بازوؤں میں بازو ڈال ... اُسے ہاتھ چلانے سے معذور کر دیا لیکن وہ پشت سے میرے جسم پر ... اور ٹخنے مار سکتا تھا اور کمر ترچھی کر کے مجھے دوسری سمت لوٹ ... تھا۔ آگے اس کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ دروازے میں اڑا ہوا تھا۔ میں نے اُس کے امکانی واروں کا خیال رکھا تھا۔ میں نے اپنا جسم اُس ... دُور نہیں کیا۔ ٹانگیں اُس کی ٹانگوں سے چپکا لیں۔ اُس نے اپنا بازو چھڑانے ... سارا زور میرے بازوؤں پر ڈال دیا اور جلد ہی اُسے احساس ہو گیا کہ ... کامیاب نہیں ہو سکتا۔ میرے پاس اب ایک ہی صورت تھی کہ سینے ... تمام طاقت لگا کے اُس کا جسم لکڑی کے دروازے سے ٹکرا دوں۔ دروازے ... اور لکڑی کی اُبھری ہوئی بلیاں اُس کے جسم میں پیوست ہوں گی تو ... لیے حواس بجا رکھنا آسان نہیں رہے گا مگر یہ تبھی ممکن تھا جب میں اپنے ... بازوؤں اور اتنی تیزی سے ہٹاؤں کہ اُسے میرے ارادے کا گمان نہ ہو ... ورنہ اُس کے ساتھ خود میرے بازو زخمی ہو جاتے۔ وہ میری گرفت سے ... تمام تر کوشش کر رہا تھا اور اتنی دیر میں اُسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ میرے ... میں چاقو نہیں ہے۔ اس بات نے اُس کا حوصلہ اور بڑھایا مگر میں نے ... بازوؤں سے پیچھے نہیں آنے دیا۔ پہلے احتیاطاً اُس کے ہاتھ میں دبا ... چاقو گرا لینا ضروری تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ چاقو اُس کے کون ... ہاتھ میں ہے۔ وہ کسرتی جسم کا آدمی تھا۔ اُس کا قد زیادہ نہیں تھا لیکن جسم ... خاصی پھرتی تھی۔

پھر میں نے سب کچھ ملتوی کر دیا اور اُسے بازوؤں میں جکڑے ... کھسکتا ہوا دروازے سے کچھ دُور ڈیوڑھی کے اندر لے آیا۔ یہاں میں ... نے بایاں بازو کسی قدر ڈھیلا کیا۔ اُس کا ردِ عمل میری توقع کے مطابق ... اُس نے اپنا ہاتھ آزاد کرا لیا۔ چاقو اُس کے دوسرے ہاتھ میں تھا۔ یہ ... نے فوراً اپنے کھلے ہوئے ہاتھ میں لے لیا۔ میرا قیافہ درست تھا کہ چاقو ... اگر دائیں ہاتھ میں ہوگا تو وہ اُسے فوراً بائیں ہاتھ میں لے لے گا اور اگر بائیں ہاتھ ہی میں ہوا تو اُسے اس زحمت کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ دونوں صورتوں میں وہ میرے کولھے یا پسلی کا نشانہ لے گا۔ مجھے یقین تھا کہ اُسے ایسا ہی کرنا چاہیے۔ مجھے وہ بات یاد تھی جو کبھی جیل میں بجّل نے کانتے سے کہی تھی۔ اُس نے کہا تھا، ایسا داؤ پھینکو کہ مقابل کا نشانہ یقینی ہو جائے۔ اُس کے پاس کوئی اور چارہ نہ رہ جائے۔ اس طرح بہت آسانی ہو جاتی ہے۔ میں نے اُس کا دوسرا بازو دانستہ نہیں چھوڑا۔ نتیجتاً وہ مجھ پر حملہ آور ہونے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ اِدھر میں نے اُس کا دایاں بازو کھینچ کے اُسے رُخ بدلنے میں مدد دی مگر وہ اتنا ہی مڑ سکا جتنی مجھے ضرورت تھی۔ دوسرے لمحے اُس کا چاقو والا ہاتھ اُسی کے جسم کے نیچے دب گیا۔ میں نے جھٹکا دے کے اُسے پھر دروازے سے دُور کیا اور صرف ایک پل میں دوبارہ اُسے دروازے سے ٹکرا دیا۔ چاقو کی نوک ضرور اُس کے ہاتھ میں یا جسم کے کسی اور حصّے میں چبھی ہوگی۔ اُس کی چیخیں ڈیوڑھی میں گونجنے لگیں۔ باہر اُس کے ساتھی موجود ہوں گے تو انھوں نے بھی یہ چیخیں سنی ہوں گی۔ میں اپنا عمل دُہرانا چاہتا تھا مگر ڈیوڑھی میں یکایک روشنی ہو گئی۔ وہ بجّل تھا۔ اُس نے آتے ہی اُس کے چہرے پہ پنجہ مارا اور مجھے اُس سے جُدا کر کے اُس کا منہ بند کر دیا۔ "تو اُدھر جا۔" اُس نے سرگوشی میں مجھے زہرہ کی طرف جانے کی ہدایت کی۔

اُس کا بدن بہت ہلکا تھا۔ میں نے اُسے اُٹھایا تو وہ میرے کندھے پر جھول گئی۔ منیر علی ڈیوڑھی کی چوکھٹ کا سہارا لیے نیم جاں کھڑے تھے۔ اُن کے ہاتھ میں لالٹین لرز رہی تھی۔ میں نے زہرہ کو پلنگ پر لِٹا کے اُس کا بدن سیدھا کیا اور اُسے چادر سے ڈھک دیا۔ منیر علی لالٹین لیے لڑکھڑاتے قدموں سے پلنگ کی طرف جلد از جلد پہنچنے کی کوشش میں دالان کی دہلیز سے ٹھوکر کھا کے گرتے گرتے بچے۔ لالٹین بھڑکنے لگی۔ میں نے بڑھ کے اُنھیں سہارا دیا۔ منیر علی دونوں ہاتھوں سے زہرہ کا چہرہ ٹٹولنے لگے۔ زہرہ کے لال چہرے پر سفیدی چھائی ہوئی تھی۔ بتیسی بند تھی۔ منیر علی کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں، ہاتھوں پر لرزہ طاری تھا۔ اُنھیں زہرہ کے پاس چھوڑ کے میں اُن دونوں آدمیوں کو دیکھنے کے لیے صحن میں لوٹ آیا جن سے بجّل اُلجھا ہوا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پہ اوندھے پڑے تھے۔ اُن میں سے ایک اُٹھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا اور جلدی اُٹھنے والا نہیں تھا۔ مجھے پانی کی تلاش تھی۔ سکھڑونچی اُلٹنے کی وجہ سے سارے گھڑے ٹوٹ گئے تھے اور فرش پر پانی ہی پانی پھیلا ہوا تھا لیکن سامنے باورچی خانے کے پاس رکھی ہوئی ایک ٹنکی مجھے نظر آ گئی۔ کٹورے میں پانی لے کے میں نے زہرہ کے منہ پر چھینٹے مارے۔ منیر علی اُسے بے تحاشا جھنجوڑنے لگے۔

اُسی لمحے بجّل ڈیوڑھی والے آدمی کی گُدّی پکڑے اُسے دھکیلتا ہوا ڈیوڑھی سے باہر نکلا۔ اُس کے بائیں کان اور سر سے خون بہہ رہا تھا۔ ناک سے بھی خون کی تُلّی جاری تھی۔ چاقو اُس کی ران میں کہیں لگا تھا، بائیں جانب کی ٹانگ لہولہان ہو گئی تھی۔ بجّل نے دھکا دے کے اُسے اُس کے

اُس ساتھی پر لوٹ دیا جو زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔ اُس نے دوبارہ اُسے گدّی پکڑ کے اُٹھا لیا اور بھینچتی ہوئی آواز میں بولا۔ "دیکھ لے۔ ان حرام کے جنوں میں ابھی شاید کچھ جان باقی ہو۔ بڑے صاحب کی وجہ سے ہم نے ان کو چھوڑ دیا ہے۔ انھیں اُٹھا کے لے جا۔" ججّھل نے اُس کی گدّی سے ہاتھ اُٹھا لیا اور وہ مرہٹ کے کھڑا ہو گیا۔ "جلدی کر۔" ججّھل نے پھنکارتے ہوئے کہا۔

وہ اُبلی ہوئی آنکھوں سے ججّھل کو دیکھنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُس نے ججّھل کی بات نہیں سُنی ہے یا اُسے اپنے کانوں پر دھوکے کا شبہ ہے۔ اُس سے کوئی جواب نہیں دیا جا سکا۔

"ابھی تیرے کتنے اور آدمی ہیں اُدھر؟"

"تین ا" وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

"سب کو اِدھر بُلا لے، جلدی۔" ججّھل نے اُس کے گال پر طمانچہ مارتے ہوئے کہا۔ ججّھل کا ہاتھ اُس کے چہرے پر پھیلے ہوئے خون سے گیلا ہو گیا تھا۔ "دروازہ کھلا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ تم سب کو سدا کے لیے اِدھر چھوڑ کے بھاگ جائیں اور محلّے کے لوگ باگ تمھاری ہڈی ماس الگ کر دیں، تم سب اِدھر سے دفع ہو جاؤ ورنہ اِدھر تم چاروں کے لیے تمھاری ماں کے یاروں کو بُلایا جا سکتا ہے۔ ہم مُنڈا نہیں چاہتے، ہم کو پتہ ہے تم کدھر سے آئے ہو۔ پر اُدھر تم سب حرام کی کھاتے ہو، اُتنا سیدھا کالا پیلا تم کو دکھائی نہیں دیتا۔ ہم کو تم سے بہت سی باتیں بولنا تھیں پر وقت سالا کم ہے اور اِدھر بڑے صاحب بھی بیٹھے ہیں۔ تم چڑی ماروں نے آنے میں دیر کر دی۔ ہم کو بھی ایک رات کی دیر ہو گئی۔ کل ہی ہم تم اندھوں کو اپنا مکھڑا دکھا دیتے۔ جلدی فیصلہ کر۔ ابھی اِدھر اپنے پاس تم سب کو زندہ دابنے کے لیے جگہ بہت ہے۔"

اُس آدمی کی عمر ۳۰ سال کے قریب تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی، رنگ صاف ستھرا۔ میرے خیال میں وہ سہراب ہی ہو سکتا تھا۔ اُسے کھڑے ہونے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ خون مسلسل اُس کے کپڑے رنگ رہا تھا۔ ججّھل کی بات سُن کے وہ چند لمحوں تک تذبذب سے اُسے دیکھتا رہا۔ ججّھل طمانچہ مارنے کے لیے دوبارہ اُس کی طرف بڑھا۔ وہ تیزی سے پلٹ کے ڈیوڑھی کی جانب بھاگا لیکن ابھی وہ ڈیوڑھی میں داخل نہیں ہوا تھا کہ ججّھل کی آواز نے اُس کے قدم جام کر دیے۔ "کدھر جاتا ہے۔ پہلے ان کو ڈیوڑھی کے اندر ڈال دے اور سمجھ لے، آخری آدمی جب تک اِدھر سے نہیں ہٹے گا تم سب کی گردن کو رسّی کھینچتی رہے گی۔ اُن شکروں کو بھی بول دینا کہ اب اور زیادہ کنویں میں پتھر نہ پھینکو، ہم نے ابھی ہتھیار نہیں تولا ہے۔ سالا سودا سستا ہو گیا۔ بڑے صاحب کو دعا دو، لڑکی کو تم کتّوں نے جن ہاتھوں سے چھُوا تھا اِدھر ہمارے ہوتے ہوئے اُن کو ثابت لیے جا رہے ہو۔ اپنے ہاتھ میں زندگی بھر کھجلی ہوتی رہے گی۔"

وہ اپنے ایک ہی ساتھی کو اُٹھا کے ڈیوڑھی میں لے جا سکا۔ دوسری بار وہ صحن میں آیا تو بُری طرح ہانپ رہا تھا اور کسی بھی لمحے چکرا کے گرنے والا تھا۔ ججّھل نے اس دوران اُس کے باقی دو ساتھیوں [illegible] دیا تھا۔ ہم دونوں نے انھیں خود اُٹھا کے ڈیوڑھی میں پھینکنے کا ارا[illegible] زہرہ اچانک چیخنے لگی۔ ججّھل نے بھاگ کے لالٹین کی لَو دھیمی کر[illegible] اُس آدمی کو دالان میں کھینچ لیا جو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی [illegible] رہا تھا اور ایک اور ساتھی کو اُٹھانے میں مصروف تھا۔ ججّھل نے [illegible] دبی رکھنے اور جلدی کرنے کی پوری احتیاط کی تھی۔ ہم نے کوئی لڑ[illegible] نہیں کیا تھا۔ ججّھل کو دونوں آدمیوں سے نمٹ کے میرے پاس [illegible] تک پہنچنے میں کچھ ہی منٹ لگے ہوں گے پھر بھی دیر ہو گئی۔ صحن [illegible] دو زگھڑونچی گرنے، گھڑے ٹوٹنے، باورچی خانے کے پاس رکھے جھوٹے برتن کھڑکنے کی آوازوں اور زہرہ کی چیخوں سے برابر کے [illegible] لوگ جاگ گئے۔ ابتدا میں انھوں نے یہ ہلکی بھاری آوازیں نظرا[نداز کی] ہوں گی یا اُن تک پہنچی ہی نہیں ہوں گی مگر زہرہ کی چیخیں خاصی [illegible] تھیں۔ اب اُن کا بیدار ہو جانا لازم تھا۔ وہ کھڑکی کو دھڑ دھڑا رہے [تھے۔] اندر ہونے والے شور کے بارے میں مضطرب لہجے میں سوالات [illegible] تھے۔ برابر کے مکان میں آمد و رفت کے لیے ایسی ہی ایک کھڑکی میں موجود تھی جیسی مولوی صاحب کے مکان میں آنے جانے کے لیے [illegible] چھت پر بھی آ سکتے تھے اور دیوار پر بھی چڑھ سکتے تھے۔ ججّھل نے [illegible] دری کھینچ کے صحن میں پڑے ہوئے ایک آدمی پر ڈال دی اور [illegible] زہرہ کے پاس سے اُٹھا کے آگے کر دیا کہ پڑوسیوں کو مطمئن کریں۔ [illegible] آدمی کو میں کندھے پر لاد کے ڈیوڑھی میں بھاگ آیا اور یہیں [illegible] اندر دالان کی طرف تھا۔ زہرہ کی چیخیں بتدریج ہلکی ہو گئی تھیں۔ [illegible] اُسے کمرے میں منتقل کر دیا تھا۔ منیر علی کی جھرجھراتی آواز مجھے ڈیوڑھ[ی میں] سُنائی دی: "کوئی بات نہیں ہے، آپ لوگ آرام کریں۔" وہ پڑوسیوں [سے کہہ] رہے تھے۔ "زہرہ کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی ہے۔ اس نے گھ[ر میں] کسی آدمی کو دیکھ لیا تھا۔ ممکن ہے کوئی چور ہو۔ کھٹکا میں نے بھی سُنا [تھا۔] اب سب ٹھیک ہے۔" منیر علی اپنے لہجے کی لرزش محسوس نہ کر[سکے۔ پڑوسیوں] نے رسماً اندر آنے کو کہا مگر منیر علی تکرار کرتے رہے کہ وہ اپنی نیند خرا[ب نہ کریں۔] "زہرہ کی طبیعت زیادہ بگڑی تو آواز دے لوں گا۔"

کھڑکی پر خاموشی چھا گئی۔ زہرہ کی چیخیں بھی بند ہو گئی تھ[یں] تک اندر کوئی آہٹ نہیں ہوئی۔ میں اپنی جگہ کھڑا رہا، پھر کچھ [illegible]

میں نے سر نکال کے باہر دیکھا۔ ججّھل دری ہٹا رہا تھا۔ میں نے دالا[ن میں] چھپے ہوئے اُس آدمی کو بھی کندھے پر ڈال لیا جسے ججّھل نے پڑ[وسیوں کی] آواز سُن کے احتیاطاً اندر کھینچ لیا تھا۔ اُس میں اب اپنا بوجھ بھی [اُٹھانے] کی طاقت معلوم نہیں ہوتی تھی۔ ہم نے یہ انتظار کرنے کے بجا[ئے کہ] نگرانی کے لیے کھڑے ہوئے اُن کے ساتھی ڈیوڑھی میں آ کے انھیں لے جائیں، خود ہی اُن چاروں کو گھر سے باہر چھوڑ آنے کا فیصلہ ک[یا۔]

اُن کا ایک آدمی دروازے کے قریب منڈلا رہا تھا۔ جیسے ہی دروازہ کھُلا، وہ اندھیرے میں لپکتا ہوا دروازے کی طرف آیا۔ ججّھل نے اُسے اپنی شکل دکھانے اور صورتِ حال سمجھنے کا موقع نہیں دیا۔ جھپٹ کے اُس کا گریبان پکڑ لیا۔ اُس نے جلد از جلد گلی سے اپنے ساتھیوں کو اُٹھانے کا حکم دیا اور ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر لیا۔

جب تک میں نے چھت پر جا کے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ لیا، مجھے اطمینان نہیں ہوا۔ باہر رہ جانے والے تینوں آدمی گلی کے نکڑ پر مجھے اپنے ساتھیوں کی طرف بھاگتے ہوئے دکھائی دیے۔ زینے سے اُتر کے مجھے خود کو دیکھنے کا ہوش آیا۔ میرے سارے کپڑوں پر خون کے دھبّے پڑے تھے۔ ہاتھ بھی خون میں چپڑے ہوئے تھے۔ دالان میں سنّاٹا تھا لیکن سامنے کے ایک کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے وہاں جھانک کے دیکھا۔ منیر علی زہرہ پر جھکے ہوئے تھے۔ کمرے میں کوئی اور نہیں تھا۔ میں اندر نہیں گیا۔ میری آہٹ سُن کے منیر علی نے مجھے دروازے پر کھڑا ہوا دیکھا تو ہاتھ کھینچ کے اندر لے گئے۔ "ہوش ہی نہیں آ رہی ہے۔" وہ ہذیانی انداز میں بولے۔

زہرہ کی گردن ایک طرف ڈھلکی ہوئی تھی۔ ہاتھ سرد پڑے تھے۔ میں نے اُس کے سرہانے بیٹھ کے اُس کی چوٹی کھول دی۔ پھر میں نے اُسے اُٹھا کے دیوار کے سہارے دونوں جانب تکیے رکھ کے بٹھا دیا اور اُس کی ہتھیلیاں سہلانے لگا۔ ہتھیلیاں روئی کے گالوں کی طرح سفید ہو گئی تھیں۔ زہرہ کی انگلیاں میرے ہاتھوں میں تھیں۔ لمبی لمبی تیلی تیلی انگلیاں، ان انگلیوں نے ہزاروں بار کورا کو چھُوا ہو گا۔ اُس کی چوٹی گوندھی ہو گی، اُس کا سر دبایا ہو گا۔ ایک پل کے لیے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہی کورا ہے اور اُس کے بدن میں کورا کی خوشبو رچی ہوئی ہے۔ وہ ایک حسین لڑکی تھی۔ کورا کی سہیلی اتنی ہی خوب صورت اور چھوئی موئی ہونی چاہیے تھی۔ میرے ہاتھ رُک گئے اور میرا جی چاہا کہ میں ان انگلیوں کو خوب پیار کروں اور زہرہ کو گلے سے لگا لوں اور اُس کی گود میں سر رکھ کے خوب روؤں۔ اُسے دیکھتے دیکھتے میری آنکھوں میں گھُٹن سی ہونے لگی تھی۔ منیر علی کی آواز پر میں چونک پڑا۔ "تم نے دیکھا؟" وہ بے چینی سے بولے۔ "اس کے ہونٹوں پر جنبش ہوئی ہے۔ یہ ہوش میں آ رہی ہے۔ یا اللہ! تو اسے اپنی امان میں رکھنا۔"

زہرہ کی پلکیں تھرتھرا رہی تھیں۔ "آپ اِدھر آ جائیے۔" میں نے مسہری سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "ان کی طبیعت اب جلد ٹھیک ہو جائے گی۔" میرا وہاں سے ہٹ جانا ہی بہتر تھا۔ ہوش میں آ کے زہرہ میرا چہرہ دیکھتی تو شاید پھر بے ہوش ہو جاتی۔

"تم کہاں چلے؟" منیر علی نے اضطراب سے پوچھا۔

"ججّھل بھائی کہاں ہیں؟"

"کون! کون ججّھل بھائی؟" وہ حیرانی سے بولے۔

میرے منہ سے اُن کے سامنے ججّھل کا نام نکل گیا تھا۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ ججّھل نے اُنھیں اپنا نام اکبر خاں بتایا تھا۔ "گھر میں سب انھیں ججّھل ہی پکارتے ہیں۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "ججّھل اُن کا گھریلو نام ہے۔ وہ کس طرف ہیں؟" میں نے اُن کی توجہ ہٹانے کے لیے جلدی سے پوچھا۔

"وہ۔ وہ ارشد میاں کے کمرے میں ہیں۔" منیر علی تذبذب سے بولے۔

میں نے پھر مُڑ کے اُن کا چہرہ نہیں دیکھا۔ ججّھل کونے کے ایک کمرے میں موجود تھا اور ارشد کے سر پر پٹّی باندھ رہا تھا۔ ارشد کا تمام چہرہ سوجا ہوا تھا۔ ہاتھ میں ایک پٹّی بندھی ہوئی تھی۔ اُسے بھی اپنی خبر نہیں تھی۔ اُسے اس حالت میں دیکھ کے مجھے منیر علی کے دوسرے بچّوں کا دھیان آیا۔ وہ ابھی تک مجھے کہیں نظر نہیں آئے تھے۔

"اور دوسرے کہاں ہیں؟" میں نے اٹک اٹک کے پوچھا۔

"سب ٹھیک ہیں رے!" ججّھل تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔

"تم نے اُنھیں دیکھا بھی؟"

"ہاں ہاں دیکھ لیا، دیکھ دیا جانی! اُن دونوں بھیجیڑیوں سے نمٹ کے میں اُنھی کی طرف گیا تھا۔ ڈیوڑھی میں تیرے پاس آنے میں اُسی وجہ سے دیر ہو گئی تھی۔"

"لیکن وہ تھے کہاں؟"

"وہ بڑی کے ساتھ تھے اور کہاں ہوتے رے!" ججّھل نے تندی سے کہا۔

مجھے بھی یہی اندیشہ تھا کہ منیر علی کی چھوٹی لڑکی اور لڑکا دونوں اپنی بڑی بہن ہی کے کمرے میں ہوں گے۔ رستم خاں کے ساتھیوں نے زہرہ کو لے جاتے وقت اُنھیں نظر انداز نہیں کیا ہو گا۔ ججّھل نے مجھے بتایا کہ چھوٹی لڑکی نے اپنے حواس نہیں کھوئے۔ زہرہ کی چیخ سُن کے دونوں بچّوں کی آنکھ کھُل گئی تھی۔ رستم کے آدمیوں کو خوف تھا کہ دونوں بچّے شور مچائیں گے اس لیے انھوں نے بچّوں کو بھی بے بس کر دینا ضروری سمجھا جب کہ اُن کی دہشت ہی اُنھیں چُپ رکھنے کے لیے کافی تھی۔ باہر منیر علی کو جکڑنے والے دونوں آدمی ججّھل کے لیے چند لمحوں کے تھے۔ اُس نے اِس سے زیادہ وقت نہیں لیا۔ منیر علی کے اشارے پر اُس نے پھر سیدھے زہرہ کے کمرے کا رُخ کیا۔ لڑکی اپنے چھوٹے بھائی کو اشاروں میں حوصلے کی تلقین کے ساتھ ساتھ اُس کے ہاتھ کھولنے کی بھی تگ و دو کر رہی تھی کہ ججّھل وہاں پہنچ گیا۔ اُس نے اُن دونوں کے ہاتھ کھولے، منہ کھولا اور اُنھیں وہیں خاموش پڑے رہنے کی تاکید کر کے چلا آیا۔ اس نے اُنھیں باہر آنے کے لیے منع کر دیا تھا۔ چھوٹی نے اُس کی ہدایت پر پوری طرح عمل کیا اور اپنے بھائی کو تسلّی دیتی رہی۔

"لاج رہ گئی لاڈلے!" ججّھل کی آواز ڈولنے لگی۔ "کسی کو بھی کچھ ہو جاتا تو سالی آنکھ میں سدا کے لیے جالا پڑ جاتا۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ساری غلطی میری ہی تھی۔ میں اگر تھوڑی دیر اور جاگتا رہتا تو یہ سب کچھ اِس طرح نہ ہوتا۔ وہ شاید ہواؤں پر چل کے

آئے تھے، مجھے خبر ہی نہیں ہوئی۔

"تو یہاں بیٹھا کیا کر رہا ہے؟" بجّل راشد کے گالوں پر تھپکیاں دیتے ہوئے بولا۔ "ذرا باورچی خانے میں جا کے دیکھ، دودھ ہو تو گرم کر کے لے آ اور یہ اپنے کپڑے بھی بدل لے۔ وقت کیا ہوا ہوگا؟"

"صبح ہونے والی ہوگی۔"

"نہیں بے۔"

"ہاں لیکن ابھی اندھیرا گہرا ہے۔"

"وقت نکل جائے گا۔" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولا۔ "یہ بھی اینٹھا پڑا ہے۔ اُدھر اس کا کیا حال ہے؟" اس کی مراد زہرہ سے تھی۔

"وہ ہوش میں آ رہی ہے۔"

"ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کے باہر گلی میں پانی لوٹ دے۔ ادھر لوندیں پڑی ہوں گی۔"

"بوندیں تو گھر میں کئی جگہ ہوں گی۔"

"میں باہر کی بولتا ہوں۔" وہ تنک کے بولا۔ "دیر نہ کر، اُٹھ جا۔"

میں نے تینوں کام تیزی سے کیے۔ باورچی خانے میں دودھ موجود تھا۔ لالٹین سے مٹی کا تیل لوٹ کے میں نے کوئلوں میں آگ لگا دی اور دودھ گرم کر کے راشد کے کمرے میں لے گیا۔ بجّل مجھے زہرہ کے کمرے میں ملا۔ مجھے اندر جاتے ہوئے جھجک ہوئی۔ زہرہ پلنگ پر آنکھیں کھولے گم سم بیٹھی تھی۔ سر پہ دوپٹا بھی نہیں تھا۔ اُس کے دونوں بہن بھائی، دائیں بائیں اُس کے پہلو سے چمٹے ہوئے تھے۔ "آؤ، آؤ۔" مجھ پہ نظر پڑتے ہی پہلے کی طرح منیر علی مجھے اندر لے گئے۔ "اب کیسا پردہ ظہیر میاں!" زہرہ نے صرف ایک نظر مجھے دیکھا اور اپنا چہرہ گھٹنوں میں چھپا لیا۔ اُس کے گالوں کی سُرخی کچھ لوٹ آئی تھی۔ "یہ ظہیر میاں ہیں، اب اِن سے پردہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تجھے تو کچھ معلوم نہیں۔ میں تجھے کیا بتاؤں، انھوں نے....."

"جانے دو بڑے صاحب! بٹیا کو اُس کے کمرے میں پہنچا دو اور ذرا میرے پاس بیٹھک میں آؤ۔" پھر بجّل زہرہ سے مخاطب ہو کے بولا۔ "گھبرانے کی اب کوئی بات نہیں۔ آرام سے سو جاؤ۔"

زہرہ نے اپنا بدن اور سمیٹ لیا۔

منیر علی فوراً بیٹھک میں آ گئے۔ "بڑے صاحب!" بجّل نے کسی تمہید کے بغیر بھاری آواز میں اُن سے کہا۔ "وقت بہت کم ہے۔"

"میں نہیں سمجھا۔" منیر علی گھبرا کے بولے۔

"سمجھنے کی کوشش کرو بڑے صاحب!"

"شاید میں ابھی تک اپنے اوسان میں نہیں ہوں۔" وہ عاجزی سے بولے۔

"جو بیت گیا ہے اُسے بھول جاؤ۔"

"اُسے کیسے بھلایا جا سکتا ہے۔"

"اُسے بھول جانا ہی ٹھیک ہے۔ جو کل ہونے والا ہے اُس کی فکر کرو۔ مجھے بتاؤ آپ نے کل کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"کیا فیصلہ کروں۔" منیر علی کی آواز بھرانے لگی۔ "آپ ہی کچھ بتائیے۔ میری عقل تو کچھ کام نہیں کر رہی ہے۔ نہ جانے کون سے اعمالِ بد کی سزا خدا مجھے دے رہا ہے۔ آپ پر ہمارا سایہ پڑ گیا بڑے صاحب! بعض لوگوں کا سایہ ہی اتنا منحوس ہوتا ہے۔ نہ ہم لوگ اِدھر آتے، نہ یہ سب....."

"ایسا نہ کہیے۔" منیر علی تیزی سے بولے۔ "آج آپ نہ ہوتے تو نہ جانے میرے لیے صبح بھی ہوتی یا نہیں اور ہوتی تو کس طرح ہوتی۔ میں اپنا چہرہ خود کو بھی نہیں دکھا سکتا تھا۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں، اللہ کے واسطے مجھے معاف کر دیجیے۔ میں نے آپ کے متعلق بہت بدگمانی کی، شاید یہ اُسی کی سزا ہے۔ مجھے اپنے رویّے پر بہت ندامت ہے۔" منیر علی پھوٹ پھوٹ کے رونے لگے۔

"بڑے صاحب! میں نے آپ کو اِس وقت اس لیے ادھر نہیں بلایا ہے کہ آپ ہم سے ایسی باتیں کرو۔ ہم کو یہ باتیں سُننے کی عادت نہیں ہے۔ مجھے آپ سے یہ بولنا تھا کہ آپ چلنے کی تیاری کرو۔ جتنی جلدی ہو سکے، اِس جگہ سے نکل جاؤ۔ میں اِسی وقت اُٹھنے کو کہتا، پر زہرہ بٹیا اور راشد میاں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ مجبوری ہے، جیسے ہی اُن کا جی ٹھیک ہو جائے، آپ کو ادھر سے چل دینا ہے۔"

منیر علی گنگ نظروں سے بجّل کا چہرہ دیکھنے لگے۔

"ہاں بڑے صاحب! میں نے آپ کو پہلے بھی ایسا ہی بولا تھا۔ آپ نے خیال نہیں کیا، پر آپ اِدھر نہیں رہو گے۔"

"مگر میں....." منیر علی سٹ پٹاتے ہوئے بولے۔ "یہ کس طرح ممکن ہے؟"

"ہم بھی یہ نہیں چاہتے کہ آپ ایسا کرو، پر کچھ اور نظر نہیں آتا بڑے صاحب!" بجّل نے مایوسی سے کہا۔

"یعنی آپ کے خیال میں، وہ وہ مجھ گنہ گار کو معاف نہیں کریں گے، خدا میری کبھی نہیں سُنے گا۔ انھوں نے آپ کو دیکھ لیا ہے۔ اب تو وہی ہو گیا جو آپ چاہتے تھے، اب بھی وہ....."

"انھوں نے ہم کو دیکھ لیا ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں، جب وہ آئے تھے تو آپ نے ہماری طرف اشارہ کیوں نہیں کر دیا کہ وہ جن لوگوں کا پتہ مانگتے تھے، وہ خود آ گئے ہیں اور بیٹھک میں موجود ہیں۔"

"مجھے انھوں نے اس کی مہلت ہی کہاں دی۔ میں مشیز وقت جاگتا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے پلنگ پر کمر ٹکائی تھی کہ غنودگی طاری ہو گئی۔ نہ جانے کس وقت وہ گھر میں کود پڑے۔ میں نے نظر اُٹھا کے دیکھا تو زہرہ اُن کے قبضے میں میرے سامنے کھڑی تھی۔ اتنے میں آپ صاحبان آ گئے۔ انھوں نے مجھے زبان کھولنے یا بیٹھک کی جانب اشارہ کرنے کا موقع ہی کہاں دیا۔"

"میں جانتا ہوں آپ ہمیں ضرور بلاتے۔" بجّل نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"لیکن میں نے سوچا تھا... آپ سے سچ کہوں، میں نے اپنے طور پر سوچا تھا کہ میں کل کی طرح، جہاں تک ہو سکا، اُن سے آپ کے بارے میں اپنی لاعلمی کا اظہار کروں گا۔ شاید وہ مان جائیں۔ زیادہ سے زیادہ وہ مجھے پھر سرزنش کریں گے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ آپ اُن کے سامنے ہوں اور بحالتِ مجبوری میں نے طے کیا تھا کہ اُن سے کہہ دوں گا، آپ لوگ گھر پہ موجود ہیں، وہ دیکھ لیں۔"

"اور اسی لیے آپ نے اندر سے بیٹھک کی کنڈی لگا دی تھی۔"

"ہاں!" منیر علی نے سر جھکا لیا۔

"پر انھوں نے خود آپ کو اس کا موقع نہیں دیا۔"

"جی ہاں!" منیر علی ہچکچاتے ہوئے بولے۔

"کیوں نہیں دیا بڑے صاحب! آپ نے سوچا؟" منیر علی کی پلکیں پھڑکنے لگیں۔ "اس لیے نہیں دیا کہ وہ زہرہ بٹیا کو لے جانے کا ارادہ کر کے آئے تھے۔ اُنھیں اُسے لے جانا ہی تھا۔ اُنھیں یقین تھا کہ آپ کو اُن لوگوں کا پتہ معلوم ہے، پر آپ آسانی سے اُنھیں بتاؤ گے نہیں۔ آپ کچھ دوسرے لوگوں کو بھی اُن کے سامنے کر سکتے تھے اور آپ اُن کو غلط پتہ بھی بول سکتے تھے۔ وہ بٹیا کو اس لیے لے جانا چاہتے تھے کہ آپ سے ٹھیک پتہ معلوم کر لیں۔ آپ کو پھر بتانا پڑتا اور جب تک وہ اپنے خیال میں اُس پتے پر پہنچ کے یقین نہیں کر لیتے، زہرہ کو نہ چھوڑتے یا کبھی بھی نہ چھوڑتے۔"

"میرے خدا!" منیر علی نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

"ہاں بڑے صاحب!" بجّل نے بوجھل لہجے میں کہا۔ "اس لیے اُنھوں نے سب سے پہلے زہرہ بٹیا پر قبضہ کیا۔ پر وہ آپ سے کیا بات کرتے اور آپ اُن کو کیا جواب دیتے اور کیا وہ آپ کی بات سُن کے زہرہ کو چھوڑ دیتے۔ یہ آپ خوب جانتے ہو۔"

"آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ....." منیر علی اپنا منہ کھسوٹنے لگے۔

"بڑے صاحب! حوصلہ رکھو۔ آپ تو خدا والے ہو، پڑھے لکھے ہو۔ انھوں نے ہم کو دیکھ لیا ہے۔ پر اتنا کافی نہیں ہے۔ ہمارے دیکھنے سے اُن کی آنکھوں کو نیند نہیں آ جائے گی۔ ہم بھی پہلے آپ سے یہی بولتے تھے، ہم کو خیال نہیں تھا کہ اس سے زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔ آپ کا اس جگہ سے دُور ہو جانا ہی اچھا ہے۔ ہم یہاں نہیں رہ سکتے، نہیں تو ہمیشہ کے لیے آپ کے ساتھ رہتے۔ ادھر بے شک آپ اپنے محلّے داروں اور رشتے والوں کو بُلا کے پہرا بٹھا سکتے ہو، کُتّوں نے آپ کا گھر دیکھ لیا۔ وہ سونگھتے سونگھتے اِدھر پہنچ جائیں گے۔ آپ کب تک پہرا بٹھاؤ گے اور کب تک لوگ چوکسی کرتے رہیں گے۔ آپ خود یہ نہیں کرو گے، مجھ کو پتہ ہے کہ آپ اپنے آپ کو تماشا بنانا برداشت نہیں کرو گے۔ آپ بہت اکیلے ہو، ہر عزّت والا آدمی اکیلا ہوتا ہے۔ آپ کے سامنے جو آدمی ہیں، وہ آپ جیسے نہیں ہیں۔ اُن کا دل گوشت کا بنا ہوا نہیں ہے اور سمجھو بس اُن کے سینگ نہیں ہیں۔ وہ گنتی میں بھی زیادہ ہیں اور اُن کی آنکھ میں تنکا پڑ گیا ہے۔ میں بہت سوچ سمجھ کے آپ سے بول رہا ہوں۔ سویرا ہونے کو ہے اور سویرا ہونے سے پہلے آپ کو فیصلہ کرنا ہے۔ ہم لوگ آپ کے لیے اجنبی ہیں، پر ہم کو اتنا اجنبی مت سمجھو۔ تھوڑے کہے کو بہت جانو۔ آپ دونوں کام ایک ساتھ نہیں کر سکتے اور میں آپ کو اس کی رائے بھی نہیں دوں گا۔"

بجّل اپنی کہی ہوئی باتیں دہرا رہا تھا۔ ظاہر ہے، ہم منیر علی کے لیے اجنبی نہیں تھے تو اور کون تھے۔ اجنبیوں کے کہنے پر کون اس طرح اپنا گھر بار چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ منیر علی کے لیے یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں تھا اور بجّل اُن سے ساری بات نہیں کہہ سکتا تھا کہ اپنے آدمیوں کے واپس آنے کے بعد رستم کے یقین کو اور سند مل جائے گی۔ رستم خاں کو ہر وقت یہ احساس جلانے لگتا ہوگا کہ اُس نے کورا کو واپس کر کے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے۔ اُس کا کسی قدر تدارک زہرہ ہی سے ہو سکتا تھا۔ بیرو اور ماچھی سات آٹھ مہینے بعد کورا کو پوچھتے ہوئے اُس کے پاس آ سکتے تھے تو زہرہ کی خبر سُن کے بھی اُن کی واپسی کی اُمید کی جا سکتی تھی۔ رستم خاں چپ بیٹھنے والا آدمی نہیں تھا۔ زہرہ ہی کچھ اُس کی اشک شوئی کر سکتی تھی اور اُسی کے ذریعے وہ اپنی دانست میں منیر علی کی زبان کھلوا سکتا تھا۔ اس موقع پر وہ اپنے تمام دشمنوں کو بھی یہ کہہ کے اکٹھا کر سکتا تھا کہ جیسلمیر میں باہر کے لوگ آئے ہوئے ہیں اور وہ سب اکٹھا ہو بھی جائیں گے۔ میں نے سوچا، بجّل سے کہوں، وہ بھی فیض آباد سے جمرد، کپتن خاں کو کلکتے سے کانتے، جامو لالہ، شولی، گھوشتی وغیرہ کو اور ممبئی سے پیرو، ماچھی، زورا، چھیدا، ماروٹی اور دوسرے آدمیوں کو بُلا لے۔ ایسا ہی ہے تو پھر ایک مرتبہ بات طے ہو جائے۔ پھر منیر علی یہیں رہیں گے مگر میں نے اُس کا ذکر بجّل سے نہیں کیا۔ یہ طوالت غیر ضروری تھی۔ اتنے لوگوں کو درمیان میں ڈالنے سے بات پھیلتے پھیلتے کہاں تک جا پہنچتی۔ پھر مولوی صاحب اور کورا کا ذکر بھی آتا، نہ جانے کیا کیا ہوتا، پولیس، کچہری، تھانہ، عدالت۔ منیر علی جس بات سے گریزاں تھے، وہی ہوتی۔ میں چپ ہی رہا۔ بجّل نے دبے دبے لہجے میں منیر علی سے ہر بات کہہ دی تھی لیکن وہ یہ کیسے بتا سکتا تھا کہ وہ اُسی کے آدمی تھے جو رستم خاں کے پاس گئے تھے، جنھوں نے رستم خاں سے مولوی صاحب اور کورا کی بات چھیڑی تھی اور جورانا کی آنکھیں نکال لائے تھے۔ بجّل منیر علی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا اور کہنا بھی چاہتا تھا۔ منیر علی ویران نظروں سے اُس کی طرف دیکھتے اور اُس کی باتیں سُنتے رہے۔ بجّل خاموش ہوا تو اُنھوں نے پھر اُس سے اپنے گھر بار، کاروبار کا عذر کیا۔

"سب جل گیا بڑے صاحب! سمجھو سب جل گیا، کسی نے آگ لگا دی۔" بجّل کے لہجے میں تلخی آ گئی تھی۔ "آپ نے اپنے بچّوں اور غیرت کی عوضی میں یہ سب دے دیا، پھر ہم آپ سے بول رہے ہیں کہ اب آپ اس کے مالک نہیں رہے ہو، یہ سارا ہم نے آپ سے آپ کی بولی ہوئی قیمت پر خرید لیا ہے۔ قیمت کا چرچا ہمارے آپ کے بیچ اچھا نہیں لگتا۔ پر جو آپ بولو گے، ہم پلک بھی جھپکائیں تو ہمارے منہ پہ تھوک دینا۔ آپ سوچو، میں آپ سے

یہ کہہ کیسے رہا ہوں کہ آپ نئی جگہ اپنے آپ کو بے بس اور لاچار نہ سمجھو اور میں یہ سب یہاں دیمک اور زنگ لگنے کے لیے چھوڑے جا رہا ہوں، بڑے صاحب! آپ سے کوئی لالچ مجھ کو نہیں ہے، میری آپ سے دشمنی نہیں ہے۔ آپ بڑے ہو، میں چھوٹا۔ چھوٹے کی بات سن لو، منع مت کرو، اگر آپ کا ادھر جی نہ لگے تو کسی اور جگہ چلے جانا یا پھر کچھ مدت بعد ادھر ہی لوٹ آنا، سمجھو ہم سے کوئی گناہ ہو گیا۔ پر ہمیں معافی کا ایک موقع دو۔"

منیر علی کے چہرے پر پسینے کے بے شمار قطرے چمک رہے تھے۔ "کیا مجھے کچھ وقت نہیں مل سکتا؟" انھوں نے ٹوٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"نہیں بڑے صاحب! کوئی وقت مت لو، میں جانتا ہوں، یہ فیصلہ آپ کو بعد کو بھی کرنا ہے۔ پر بعد کو وقت پنجے میں نہیں رہا تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔"

منیر علی نے ایک جھرجھری لی۔ سر اٹھا کے چاروں طرف دیکھا اور لرزتے ہوئے ہونٹوں سے بولے "اللہ کی مرضی"۔

مجتبیٰ نے بڑھ کے اُن کے پیر پکڑ لیے۔

ہم کچھ ہی دیر وہاں ٹھیرے۔ فجر کی اذان نہیں ہوئی تھی، مگر کسی بھی لمحے ہونے والی تھی۔ ہم گھر سے باہر نکلے۔ گلیوں میں خاصا اندھیرا تھا۔ راستے میں دُور تک کوئی شخص دکھائی نہیں دیا۔ لاری کے اڈے تک پہنچتے پہنچتے اندھیرا سمٹنے لگا تھا۔ معلوم ہوا کہ لاری صبح چھ بجے سے پہلے روانہ نہیں ہوگی۔ اِدھر اُدھر مضافات سے آئے ہوئے چند مسافر بھی لاری کے انتظار میں اڈے پر سو رہے تھے۔ ہم نے بھی انتظار کیا۔ لاری آئی تو ہم لوگ اور سب مسافر اس میں بیٹھ گئے۔ پھر بھی کچھ نشستیں خالی رہ گئیں۔ سب نشستیں بھر جاتیں تبھی لاری چلتی اور ابھی چھ بجنے میں بھی کچھ وقت تھا۔ مجتبیٰ نے خالی نشستوں کے پیسے ادا کر کے ڈرائیور کو کسی نہ کسی طرح وقت سے پہلے چلنے پر راضی کر لیا اور ہم جلد ہی جیسلمیر کی حدود سے دُور نکل گئے۔ مسافروں کی تعداد کم تھی۔ ہم سیٹوں پر پاؤں پھیلا کے لیٹ سکتے تھے مگر ایک تو لاری ہچکولے بہت کھا رہی تھی، دوسرے لیٹنے کو جی بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ سفر زیادہ طویل نہیں تھا اور لاری کی رفتار تیز تھی۔ اونچے نیچے راستوں سے گزرتی، دھول اڑاتی جب پوکارن اسٹیشن پر پہنچی تو دھوپ خوب چڑھ آئی تھی۔ پوکارن سے کوئی ایک گھنٹے بعد جودھ پور جانے والی ریل گاڑی مل گئی۔ اُس نے ہمیں مغرب کے بعد جودھ پور جنکشن پہنچا دیا۔

مجتبیٰ نے مجھ سے کھانے کے لیے پوچھا لیکن مجھے بھوک ہی نہیں تھی۔ صبح پوکارن کے اسٹیشن پر ہم نے صرف چائے کی ایک ایک پیالی پی تھی۔ میں نے مجتبیٰ سے اصرار کیا کہ اگر اُسے بھوک لگی ہو تو وہ کھانا کھا لے لیکن مجتبیٰ میری بات سُنی اَن سُنی کرتا ہوا ویٹنگ روم میں چلا آیا تھا۔ یہاں پہلے سے دو مسافر بیٹھے تھے۔ ہمارے داخل ہوتے ہی انھوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور سر سے پیر تک ہمیں گھورنے لگے۔ ہمارا لباس اوّل درجے کے ویٹنگ روم میں بیٹھنے کا نہیں تھا اسی لیے انھیں تجسس ہوا ہوگا۔ ہمارے ساتھ پہلے بھی کئی بار ایسا ہوا تھا۔ ہم نے اپنا سامان ایک طرف رکھ دیا اور دونوں مسافروں کی نگاہیں نظرانداز کر کے صوفے پر لیٹ گئے۔ کمر کو سہارا ملا تو سارے جسم میں دُکھن ہونے لگی۔ مجتبیٰ کی بھی شاید یہی حالت تھی۔ وہ مسلسل بیڑیاں پی رہا تھا۔ ایک ختم نہیں ہوتی تھی کہ دوسری سلگا لیتا تھا۔ کل دوپہر اُس کے پاس بیڑی کا بنڈل ختم ہو گیا تھا۔ لاری میں جیسے ہی اُس کی نظر کسی بستی میں پہلی کھلی ہوئی دُکان پر پڑی، اُس نے لاری رُکوا کے بیڑیاں خرید لی تھیں۔ اُس وقت سے اب تک وہ اَن گنت بیڑیاں پی چکا تھا۔

تھوڑی دیر میں وہ دونوں مسافر چلے گئے۔ ہم ویٹنگ روم میں اکیلے رہ گئے۔ ویٹنگ روم صاف ستھرا تھا۔ مچھر دُور کرنے کے لیے میں نے پنکھا کھول دیا، گو پنکھے کا موسم نہیں تھا۔ نیند پھر بھی نہیں آئی۔ نیند آ جاتی تو کچھ وقت ہی گزر جاتا۔ مجھے ابّا جان کی بات یاد آ رہی تھی، جب میں کسی رات جلدی سو جاتا تھا تو وہ کہتے تھے، زیادہ سونے سے زندگی کم ہو جاتی ہے اور زندگی کے معنی ہی بیداری کے ہیں۔ سوچو جتنا زیادہ سویا، اُس نے اپنی زندگی میں خود ہی کمی کر لی۔ اس لحاظ سے میری زندگی کے دن بڑھ رہے تھے۔ ابّا جان آج سامنے ہوتے تو میں اُن سے ضرور کہتا، اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ آدمی کی زندگی زیادہ ہی ہو۔ یوں بھی ایک دن ہمیشہ کے لیے سو جانا ہے۔ کاش آدمی جسمی طور پر مجبور ہوتا کہ زیادہ سے زیادہ وقت سویا کرے۔ جتنی دیر آنکھ بند رہے اور جتنے کم لوگوں کا سامنا ہو، اچھا ہے مگر لوگ سوتے میں بھی تو پریشان کرتے ہیں اور ایک طرح آنکھ کھلی ہی رہتی ہے۔

دیوار پر لٹکی ہوئی گھڑی ٹک ٹک کر رہی تھی۔ جیسے جیسے سوئیاں آگے بڑھتی گئیں، میرے خون کی گردش تیز ہوتی گئی۔ رات کو صفائی کرنے والا مہتر کمرے میں داخل ہوا تو ہم دونوں باہر چلے آئے۔ سامنے پلیٹ فارم کی گھڑی میں پونے دس بجے تھے۔ درختوں اور دیواروں پر سناٹا چھا گیا تھا۔ پلیٹ فارم پر بھی زیادہ چہل پہل نہیں تھی۔ سامان ویٹنگ روم میں چھوڑ کے ہم اسٹیشن سے باہر ایک چھوٹے سے چائے خانے میں آ گئے۔ مجتبیٰ نے ایک ساتھ کئی پیالیاں پیں۔ چائے والے نے ہمارے کہے بغیر پانوں کی ایک طشتری ہماری میز پر بھجوا دی تھی۔ میں نے بہت دنوں بعد پان کھایا۔ گلوری میں لونگ جڑی ہوئی تھی۔ مجھے چمپا یاد آنے لگی۔ وہ بھی اس قسم کی گلوریاں بناتی تھی۔ مکرشنا جی نے اس کے لیے بازار سے ایک پان دان منگوا دیا تھا۔ کبھی کبھی وہ مجھے بھی پان دے دیتی۔ کہتی تھی، پیارے میاں! پان تمھارے منہ پر خوب رچتا ہے، خدا نظرِ بد سے بچائے۔ میں سمجھتا تھا کہ چمپا مجھے خوش کرنے کے لیے ایسا کر رہی ہے اور جب مجھے یہ احساس ہوتا تھا تو مجھے اُس پر اور غصہ آنے لگتا تھا۔ چمپا نے جولین سے نہ جانے کتنے خط لکھوائے ہوں گے۔ میں نے ارادہ کیا کہ جیسے ہی فرصت ملی، اُسے ضرور خط لکھوں گا مگر میں اُسے پکاروں گا کس لقب سے؟ اور کیا لکھوں گا؟ بہتر یہی ہے کہ کچھ لکھا ہی نہ جائے۔ زورا نے بتایا تھا کہ مارٹی روز جولین کی خیر خبر لینے گھر جاتا ہے۔ زورا کے ذریعے مارٹی کو معلوم ہو جائے گا کہ میں زندہ ہوں اور چمپا کو بھی خبر مل جائے گی۔

پلیٹ فارم پر واپس آ کے میں نے گھڑی دیکھی تو صرف بیس منٹ اوپر ہوئے تھے۔ مجھے شک ہوا کہ شاید گھڑی غلط ہے۔ ابھی اکیس منٹ ہی ہوئے تھے۔ گیارہ بجے کے قریب ہم نے اپنا سامان ویٹنگ روم سے اٹھوا لیا۔ اسٹیشن پر جیسے صبح ہو رہی تھی، رفتہ رفتہ مسافروں کی تعداد بڑھنے لگی۔ ہم ویٹنگ روم اور گیٹ کے درمیان ایک بینچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میری نگاہیں بار بار دوسرے پلیٹ فارم کو ملانے والے پل اور گیٹ پر جم جاتی تھیں۔

پلیٹ فارم پر گاڑی آ گئی تو میں نے مجتبیٰ کی طرف دیکھا، وہ منہ پر ہاتھ رکھے سکون سے بیٹھا تھا۔ "گاڑی اب چلنے ہی والی ہے۔" میں نے مضطرب لہجے میں اُسے ٹوکا۔

"ابھی دیر ہے رے!" وہ دھیمی آواز میں بولا۔

"اور اگر گاڑی چلی گئی؟"

"تو جانے دے۔" اُس نے سر جھٹک کے کہا۔

جو قلی ہمارا سامان اٹھا کے ویٹنگ روم سے لایا تھا، وہ کئی بار آ کے مجتبیٰ کو ٹوک گیا تھا، پھر وہ ہمارے قریب ہی آ کے بیٹھ گیا اور مجتبیٰ کی صورت دیکھنے لگا۔ "صاحب! کیا اسی گاڑی سے جانا ہے؟" اُس نے تلخی سے پوچھا۔

"بیٹھا رہ۔" مجتبیٰ نے اُسے جھڑک دیا۔

میں نے اپنے ہونٹ سی لیے تھے، ابھی سگنل نہیں ہوا تھا اور نہ گارڈ نے سیٹی دی تھی مگر پلیٹ فارم پر مسافروں کی نقل و حرکت میں سرگرمی نہیں رہی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ گاڑی روانہ ہونے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ میں مجتبیٰ کو دوبارہ ٹوکنا چاہتا تھا مگر میری بات منہ میں رہ گئی۔ میں بینچ پر بیٹھے بیٹھے اُچھل پڑا۔ مجھے اپنی بینائی پر اعتبار نہیں آیا۔ میں نے زور سے مجتبیٰ کا شانہ جھنجوڑا۔ گیٹ پر سب سے پہلے مجھے منیر علی کا چھوٹا لڑکا مجو نظر آیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ سب اندر آ گئے۔ سیاہ برقع اوڑھے ہوئے زہرہ ہی ہوگی، اُس کی چھوٹی بہن سلمہ بدن سے چادر لپیٹے ہوئے تھی۔ ارشد کے ماتھے پر پٹی بندھی تھی اور وہ لنگڑا لنگڑا کے چل رہا تھا۔ منیر علی قلی کے ساتھ تھے۔ انھوں نے شیروانی پہن رکھی تھی۔ ہم دونوں نے لپک کے انھیں گیٹ کے قریب ہی جا لیا۔ مجتبیٰ نے اُن کے ہاتھ سینے سے لگا لیے۔ "بہت دیر ہو گئی بڑے صاحب؟" اُس نے منمناتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ہاں بھائی! دیر ہو گئی۔" منیر علی شکستہ لہجے میں بولے۔

"سب ٹھیک ٹھاک رہا نا؟"

منیر علی نے ناتوانی سے سر ہلایا۔ مجتبیٰ نے پھر اُن سے کچھ نہیں پوچھا اور اُن کا ہاتھ تھامے ہوئے تیزی سے ایک جانب چل دیا۔ ہم سے آگے جانے والے قلی سیکنڈ کلاس کے ایک ڈبے کے سامنے ٹھیر گئے تھے۔

گاڑی نے رفتار پکڑ لی تھی۔

میرے سامنے کی نشست پر منیر علی بیٹھے ہوئے تھے۔ میری آنکھیں ابھی تک بے یقینی سے انھیں دیکھ رہی تھیں لیکن وہ کوئی اور نہیں منیر علی ہی تھے۔ میرے ذہن میں اُن کے آنے کا امکان بہت خفیف تھا حالانکہ میں نے مجتبیٰ کی تقریباً تمام ہدایتیں اپنے کانوں سے سُنی تھیں جو چلنے سے پہلے اُس نے اُنھیں کی تھیں اور پھر منیر علی نے اپنا بیشتر سامان بھی ہمارے ساتھ کر دیا تھا۔ ہم منہ اندھیرے ہی گھر سے نکل جانا چاہتے تھے۔ دُور تک یہ صندوق ہم اپنے سروں پر اٹھا کے لائے تھے۔ وہاں تک جہاں سے لاری کے اڈے پر پہنچانے کے لیے ہمیں سواری ملی، راستے میں کتنی ہی بار مجھے وہ بوجھ اٹھانا فضول معلوم ہوا۔ ہمیں ٹالنے کے لیے منیر علی کے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ صبح ہوتے ہی وہ اپنی رائے نہ بدل دیں، چپ چاپ چاہتے کہیں اور نکل جائیں۔ وہ کوئی بھی غلط یا صحیح فیصلہ کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے اس وقت تک ارشد ہی چلنے پھرنے کے قابل نہ ہو یا اُن کے ساتھ جانے سے انکار کر دے یا کوئی اور رکاوٹ پیش آ جائے۔ کوئی بھی بات ہو سکتی تھی۔ رائے بدلنے کے لیے اُن کے پاس خاصا وقت تھا۔ ہمارے بارے میں نئے نئے شبہات اُن کے دماغ میں پروان چڑھ سکتے تھے۔ انھوں نے رات کو ہمیں اُن چاروں آدمیوں سے نمٹتے دیکھا تھا۔

انھیں زیادہ سے زیادہ شام کو ۹:۱۰ بجے تک جودھ پور اسٹیشن پہنچ جانا چاہیے تھا۔ مجتبیٰ نے انھیں مشورہ دیا تھا کہ وہ کوئی موٹر کرائے پر حاصل کر لیں یا لاری سے آ جائیں لیکن زیادہ دیر نہ کریں۔ اوّل وقت ہی اِس شہر سے دُور ہو جائیں۔ محلّے والے پوچھیں تو کہہ دیں کہ وہ اجمیر جا رہے ہیں۔ روانگی میں تاخیر ہوئی تو اُن کا گھر سے نکلنا مشکل ہو سکتا ہے۔ مجتبیٰ کا اندازہ تھا کہ ارشد کی بے ہوشی زیادہ طول نہیں کھینچے گی اور اُدھر رستم خاں کے آدمی اپنے ساتھیوں کے ناکام واپس آ جانے پر منیر علی کے گھر کے اطراف فوراً پہرا نہیں لگا دیں گے۔ وہ خوب غور و خوض کر کے ہی کوئی قدم اٹھائیں گے لیکن احتیاطاً ہماری ٹوہ لینے کے لیے اِدھر کا رُخ ضرور کریں گے۔ اس دوران وہ آسانی کے ساتھ شہر سے نکل سکتے ہیں۔ مجتبیٰ نے چلتے چلتے انھیں تاکید کر دی تھی کہ اپنے ساتھ زیادہ سامان لانے کی کوشش نہ کریں ورنہ محلّے والوں کو اُن کے بیان پر شبہ ہو سکتا ہے کہ وہ اجمیر جا رہے ہیں۔ مجتبیٰ کو یہ بھی خدشہ ہوگا کہ دیر ہو جانے سے منیر علی پھر تذبذب میں نہ پڑ جائیں۔ اُس نے انھیں یہ ہدایت بھی کر دی تھی کہ وہ پڑوسیوں کو اپنی روانگی سے بالکل آخری وقت تک مطلع کریں اور جہاں تک بھی ہو، جو سواری ملے جس کرائے پر ملے، بیٹھ جائیں۔ اس طرح محلّے میں اگر کوئی مخبر ہوگا تو وہ کسی کو اُن کے گھر چھوڑنے کی اطلاع نہیں پہنچا سکے گا۔ مجتبیٰ نے مختصراً ایک ایک بات انھیں سمجھا دی تھی اور کہا تھا کہ بس وہ جودھ پور تک ہمت اور حوصلے سے کام لیتے رہیں۔ جودھ پور اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں وہ اُن کا منتظر رہے گا۔ منیر علی نے اُس کی کسی بات کی تردید نہیں کی تھی۔ جو کچھ وہ کہتا رہا، چپ چاپ سنتے اور سر ہلاتے رہے۔

منیر علی کے پاس زیادہ سامان نہیں تھا۔ صرف دو صندوق تھے۔ ایک بڑا سا تھیلا اور بغل میں دبا ہوا ایک چرمی ہینڈ بیگ تھا۔ وہ تجمل کو بتا رہے تھے کہ ہمارے آنے کے بعد انھیں گھر سے نکلنے میں زیادہ سے زیادہ چار گھنٹے لگے ہوں گے۔ انھیں ایک موٹر بھی مل گئی تھی لیکن کچھ ہی دور پہنچ کے وہ خراب ہو گئی۔ پھر وہ ایک لاری میں بیٹھ گئے اور جب لوکلان اسٹیشن پہنچے تو گاڑی کا وقت نہیں تھا۔ وہاں سے انھیں ایک اور لاری مل گئی۔ چلنے سے پہلے انھیں اپنی بوڑھی ملازمہ کا انتظام بھی کرنا تھا، وہ ایک زمانے سے اُن کے ہمراہ تھی۔ انھوں نے ہی اُس کے بیٹوں بیٹیوں کی شادیاں کی تھیں۔ ملازمہ رات کو مولوی صاحب کے مکان میں سوتی تھی۔ منیر علی مولوی صاحب کا مکان خالی نہیں رکھتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ آباد رہے گا تو اُس کی وحشت سوا نہیں ہو گی۔ ملازمہ کو انھوں نے عین وقت پر بتایا اور اُس سے کہہ دیا کہ اگر واپسی میں انھیں دن لگ جائیں تو وہ اپنے بیٹے یا بیٹی کو بلا کے گھر میں رکھ لے۔ انھوں نے ایک رقعہ بھی اُس کے نام لکھ دیا تھا۔ رقعے کی رُو سے وہ اُن کی مرضی سے گھر اپنی تحویل میں لینے کی مجاز تھی۔ اُن کے واپس نہ آنے کی صورت میں محلے والے اُسے پریشان نہیں کر سکتے تھے۔ دوسرا رقعہ انھوں نے شاہد صاحب کو لکھا تھا۔ شاہد صاحب وہی شخص تھے جن کی بابت پچھلی مرتبہ انھوں نے ہم سے بہت سی باتیں کی تھیں اور مجھے اُن سے ملوانے کے خواہش مند تھے۔ وہ بقول اُن کے اُن پر ایمان کی حد تک بھروسا کرتے تھے۔ ملازمہ سے انھوں نے دوسرے دن یہ رقعہ شاہد صاحب کو پہنچانے کے لیے کہا تھا۔ رقعے میں انھوں نے شاہد صاحب سے درخواست کی تھی کہ وہ اُن کی زمینوں اور پن چکی کی دیکھ بھال کرتے رہیں، واپسی میں انھیں شاید عرصہ لگ جائے۔ انھوں نے انھیں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ اگر یہ مدت واقعی طویل ہو گئی تو وہ ایک رسمی مختار نامہ لکھ کے بھیج دیں گے۔ اپنی منزل اور جیسلمیر سے اچانک چلے جانے کے بارے میں انھوں نے شاہد صاحب کو ایک لفظ بھی نہیں لکھا تھا۔ ایک اور رقعہ انھوں نے اپنے مرحوم بڑے بھائی کی اکلوتی شادی شدہ لڑکی کو بھی ڈاک سے بھیج دیا تھا۔ اُسے انھوں نے اپنی بیٹیوں کی طرح پالا تھا اور بیٹی ہی کہتے تھے۔ مجھے یہی وسوسہ تھا کہ وہ وہاں جانے کا فیصلہ نہ کر لیں مگر ایک تو وہ داماد کے گھر ٹھہرنا پسند نہیں کرتے تھے، دوسرے ان کا ایسے کسی عزیز کے ہاں جانا مناسب ہی نہیں تھا جس کے ٹھکانے سے محلے والے اور اُن کے دوسرے عزیز و اقارب واقف ہوں۔ بات تو پھر وہی رہتی ہے، بعد میں اُن کی موجودگی کسی سے ڈھکی چھپی نہ رہتی۔ منیر علی نے صبح معمول کے مطابق محلے کی مسجد میں فجر کی نماز ادا کی تھی اور نمازیوں سے اشارۃً بھی ذکر نہیں کیا تھا کہ کچھ دیر بعد وہ اُن سے رخصت ہو رہے ہیں۔

ڈبے میں روشنی کبھی بالکل مدھم پڑ جاتی، کبھی اتنی تیز ہو جاتی کہ آنکھیں چکا چوند ہونے لگتیں۔ گاڑی اندھیرے میں اپنا سفر تیز رفتاری سے طے کر رہی تھی۔ ڈبے میں اچھی خاصی گنجائش تھی۔ تجمل نے ارشد کو اوپر کی برتھ پر لٹا دیا تھا۔ زہرہ ایک کونے میں سمٹی دبکی ہوئی تھی۔ سلمہ بھی اُس کے پہلو سے چپکی ہوئی تھی اور گھبرا کے بار بار ڈبے میں چاروں طرف نظریں گھمانے لگتی تھی۔ … کا سر تجمل نے اپنے زانو پر رکھ لیا تھا۔ دن بھر نہ میں نے کچھ کھایا تھا، نہ تجمل نے اور شاید اُن لوگوں نے بھی کچھ نہیں کھایا ہو گا۔ تجمل نے جودھ پور اسٹیشن پر قلی سے کھانے کا کچھ سامان منگوا لیا تھا۔ زہرہ نے ابھی تک نقاب ڈھیلی نہیں کی تھی۔ منیر علی کی خواہش تھی کہ زہرہ اور سلمہ زنانے ڈبے میں بیٹھ جائیں مگر تجمل نے اُن کی تائید نہیں کی۔ اُن دونوں کو کھانا علیحدہ دے دیا گیا تھا۔ انھوں نے آ… میں بیٹھ کے کھا لیا۔ صبح ہوش میں آنے کے بعد سے اب تک زہرہ مسلسل سفر کر رہی تھی۔ "کب تک گھٹی بیٹھی رہے گی بٹیا! منہ کھول لے۔" تجمل نے ا… اُس کے پاس جا کے اُس کی کمر تھپ تھپاتے ہوئے کہا۔ "سفر میں اتنا پردہ نہیں کر…" وہ اور سمٹ گئی۔ جب تک منیر علی نے تجمل کی ہم نوائی نہیں کی، اُس نے نقاب سے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ تجمل نے منیر علی کو بھی ایک برتھ پر لٹا دیا۔ دونوں بیٹھے رہے اور وہ دونوں بھی، زہرہ اور سلمہ۔ مجھے احساس ہوا کہ شاید زہرہ میری وجہ سے آرام نہیں کر رہی ہے۔ مجھے کسی دوسرے ڈبے میں چلا جانا چاہیے تاکہ وہ پاؤں پھیلا کے بیٹھ سکے۔ ڈبے میں چار مسافر اور تھے مگر اُن کا اُسے اتنا خیال نہیں ہو گا جتنا میرا تھا۔ تجمل بھی اونگھنے لگا۔ سلمہ بھی کھڑکی سے ٹیک لگا کے غافل ہو گئی تھی۔ میں نے کھڑکی کی طرف منہ کر لیا اور ایسا ظاہر کیا جیسے مجھ پر بھی نیند کا غلبہ ہے۔ خاصی دیر بعد میں نے منہ پھیر کے دیکھا۔ وہ خود بھی اُسی نشست سے بیٹھی تھی۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ ہوا سے اُس کی نقاب اُڑی اُڑی جاتی تھی۔ مجھے دیکھ کے اُس نے گھبرا کے نقاب ہاتھ سے روک لی لیکن پھر اُسے خود ہی کچھ خیال آ گیا۔ اُس نے ہاتھ ہٹا لیا اور اُڑتی ہوئی نقاب سے اُس کا چہرہ جلنے بجھنے سا لگا، اُس بلب کی طرح جو ایک لمحے روشن ہوتا ہے، دوسرے لمحے بُجھ جاتا ہے یا اُن بدلیوں کی طرح جو کبھی چاند پہ چھا جاتی ہیں کبھی چاند اُن پر۔ میں نے خود ہی نظریں چرا لیں۔ زہرہ کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور چہرے پر خوابیدگی طاری تھی۔ شہابی رنگت پہ ایک دھندسی غالب تھی۔ پتہ نہیں وہ کیا سوچ رہی تھی۔ وہ کہاں جا رہی ہے، ہم لوگ کون ہیں، مولوی صاحب کے عزیز… رات کو کون لوگ آئے تھے، وہ اُسے کیوں لے جانا چاہتے تھے۔ اُس کے باپ نے اچانک گھر سے جانے کا ارادہ کیوں کر لیا۔ رات کو ہم وہاں نہ ہوتے یا ہماری آنکھ کھلنے میں اور دیر لگ جاتی تو زہرہ نہ جانے اس وقت کہاں ہوتی، کسی اندھیری کوٹھری میں! اور کن لوگوں کے درمیان! اُسے کیا معلوم تھا کہ اُس کی سہیلی کورا کو بھی وہی لوگ لے گئے تھے۔ وہ بھی اسی طرح پکار رہی ہو گی مگر اُس کی چیخ سن کے آنے والا کوئی نہیں ہو گا۔ زہرہ تو اپنے کمرے سے صحن … تک آتے آتے بے سدھ ہو گئی تھی۔ کورا بستیوں بستیوں انھی حادثات کی ز… پر رہی تھی۔ اُس کا باپ مر گیا تھا اور اپنے ہی لوگ اُس کے دشمن ہو گئے … ایک رات اُس نے اپنے بوڑھے اتالیق اُجین کو اپنی آنکھوں سے قتل ہو… دیکھا تھا اور وہ بدھ گیا سے رات کے اندھیرے میں تن تنہا سات آٹھ … تک بھاگتی ہوئی ہمارے گھر پہنچی تھی۔ کلکتے میں اُس نے مجھے سپاہیوں کے …

میں چھاپا مارتے ہوئے دیکھا تھا۔ اُس کا تو سبھی کچھ لُٹ گیا تھا۔ کوئی بھی نہیں تھا۔ نہ ماں نہ باپ۔ ایک میرا سہارا تھا، وہ بھی چھن گیا۔ مولوی صاحب نہ ہوتے تو نہ جانے اُس کا کیا ہوتا۔ مولوی صاحب کے ہمراہ بھی معلوم نہیں کتنی راتیں اور کتنے دن اُس پہ ایسے گزرے ہوں گے۔ ایک ہی آسرا ہو گا جس نے اُسے زندہ رکھا۔ اُسی آسرے نے مجھے زندہ رکھا تھا۔ اُسی آسرے پہ اُس نے اپنی اُن آنکھوں پر جو پھول مرجھانے سے سہم جاتی تھیں، سب کچھ گوارا کر لیا تھا۔ ممکن ہے اپنے بارے میں اُس نے زہرہ کو کچھ بتایا ہو۔ زہرہ نے ہزار بار اُس سے پوچھا ہو گا تو ایک آدھ بار اُس کی زبان بھی بہک گئی ہو گی۔ جیسے میں نے تجمل کو سب کچھ بتا دیا تھا، اُس نے بھی شاید زہرہ سے کچھ کہا ہو۔

گاڑی کسی اسٹیشن پہ ٹھہری تو منیر علی کسمسانے لگے اور مجھے جاگتا ہوا دیکھ کے اُٹھ بیٹھے۔ پھر انھوں نے چونک کے زہرہ کی طرف دیکھا۔ زہرہ نے فوراً اپنا رُخ بدل لیا تھا۔ منیر علی غنودہ آواز میں مجھے بھی آرام کا مشورہ دینے لگے۔ "زہرہ بی بی سے کہیے کہ لیٹ جائیں، دن بھر کی تھکی ہوئی ہیں۔" بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔ زہرہ کی جھلملاتی نگاہیں ایک ثانیے کے لیے مجھ پر مرکوز ہوئیں، پھر اُس نے گردن جھکا لی اور انگلیاں مروڑنے لگی۔ منیر علی پوری طرح بیدار ہو گئے تھے۔ انھوں نے گٹھری بنی ہوئی سلمہ کے پیر سیدھے کیے، اُس کے سر کے نیچے تکیہ رکھا اور اوپر کی برتھ سے چادر لٹکا دی، جہاں ارشد سو رہا تھا۔ وہ دونوں پردے کے پیچھے اوجھل ہو گئیں۔

ڈبے میں ہمارے سوا صرف دو مسافر اور رہ گئے تھے۔ انھیں بھی جے پور اسٹیشن اُتر جانا تھا۔ رات کے پچھلے پہر جب سب لوگ سوئے ہوئے تھے، اوپر کی برتھ سے منیر علی کا لٹکایا ہوا پردہ ہوا کے زور سے یا ارشد کے ہلنے جُلنے سے دفعتہ نیچے گر گیا۔ نیم دراز زہرہ ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھی اور اُس نے جلدی سے اپنے پیر سکوڑ لیے جیسے بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ اُس کے سر پہ برقع نہیں تھا۔ مُرغولی بال شانے پہ بکھرے ہوئے تھے۔ میں سامنے ہی بیٹھا تھا۔ اُس کی نظر سیدھی مجھ پر آئی اور چند لمحوں کے لیے اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ اُس کی بالکل وہی کیفیت تھی جو پہلی بار بیٹھک کا دروازہ کھلنے سے ہوئی تھی یا جو کسی چور کی چوری پکڑے جانے پر ہوتی ہے۔ اُس کی بے بسی دیکھ کے میرے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اُس نے اپنا چہرہ دوپٹے کے پلّو سے چھپا لیا۔ میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آیا۔ ڈبے میں کسی کی بھی آنکھ کھل سکتی تھی۔ زہرہ کھڑی ہو کے دوبارہ خود پردہ نہیں ڈال سکتی تھی۔ یک بارگی اُس نے پلو ہٹا کے پٹ پٹاتی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں سمجھ گیا، وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔ میں نے دبے پاؤں فرش پر جھک کر اور اُس کی جانب نظر کیے بغیر چادر ارشد کے بستر کے نیچے اچھی طرح دبا دی اور آ کے اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ دوبارہ پھر چادر نہیں گری مگر زہرہ رات بھر ایک پل کے لیے نہیں سوئی تھی۔ صبح اُس کی بھاری بھاری آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ جاگتی رہی ہے۔

بازاروں اور گلیوں میں خوب روشنی تھی۔ رات کے نو بجے کے قریب زرّیں کی حویلی کے سامنے ہمارا تانگا ٹھہرا۔ بوڑھا چوکی دار لاٹھی سنبھالتا ہوا ہماری طرف آیا اور تجمل پر نظر پڑتے ہی اُچھلنے چیخنے لگا: "استاد! قسم سے اُستاد ہو، استاد تجمل!"

تجمل نے تانگے سے کود کے جھٹ اُسے گلے لگا لیا: "کیسا ہے شیرا؟"

"تمھاری دعا لگ رہی ہے استاد!" وہ تیزی سے بولا۔ "اب کے بہت دن لگا دیے؟"

"کدھر!" تجمل نے ہنس کر کہا۔ "اب کے تو پہلے آ گیا ہوں رے!"

"بٹیا بہت ناراض ہے۔" وہ خفا ہو کے بولا۔

"کیسی ہے رے وہ؟" تجمل نے بے تابی سے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔ بس یاد بہت کر رہی تھی۔"

"سالے تو کیا وہ مجھے بھول جاتی۔ تیرا بھی دماغ اب پکّی ہو گیا ہے۔ اب تجھے چلا جانا چاہیے۔ چل جا کے اُسے خبر کر اور سامان اُتروا کے اندر رکھ دے۔"

شیرا نے میری طرف دیکھا ہی نہیں تھا، نہ اُس نے سامان اُتروایا۔ بھاگتا ہوا حویلی میں چلا گیا۔ تجمل نے ہم سب کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور منیر علی کے شانے پہ ہاتھ رکھ کے اندر جانے لگا۔ میں نے ارشد کو تھام رکھا تھا۔ اُسے تیز بخار تھا۔ سامان تانگے میں رکھا رہا۔ ہم حویلی کی چار دیواری میں داخل ہو گئے۔ ابھی ہم آدھے راستے میں بھی نہیں پہنچے ہوں گے کہ سامنے دروازے پر زرّیں کا سراپا سرسراتا ہوا نظر آیا۔ وہ چبوترے کی سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی دوڑنے لگی۔ تجمل نے رک کے اپنے دونوں بازو پھیلا دیے اور زرّیں کو بازوؤں میں بھر کے زمین سے اٹھا لیا۔ وہ اُس کی آغوش میں آتے ہی سسکنے اور تڑپنے لگی۔ تجمل اُسے اپنے بازوؤں میں چھپائے ہوئے چپ کھڑا رہا۔ لمحوں بعد اُس کی ٹمٹماتی ہوئی سی آواز اُبھری: "سنبھل رے!" اُس نے زرّیں کی کنپٹیوں پر ہاتھ رکھ کے اُس کا بھیگا ہوا چہرہ اُٹھایا اور اُس کی پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے بولا: "میں آ گیا ہوں۔ اِدھر دیکھ، میں تیرے لیے کون کون لایا ہوں۔"

زرّیں کو جیسے ہوش آ گیا ہو۔ وہ حیرت بھری نظروں سے ہم سب کو تکنے لگی۔ میں ارشد کے ساتھ سب سے پیچھے کھڑا تھا۔ جیسے ہی اُس کی نگاہ مجھ پر ٹھہری، اُس کے لب پھڑکنے لگے: "لاڈلا بھی ہے!" تجمل بلند آواز سے بولا: "اُس کی بعد میں خبر لینا، پہلے اِن سب کو عزت سے گھر لے جا۔ تو بہت بولتی تھی نا، اکیلی ہوں اکیلی ہوں، بابا تم آ جاؤ۔ اب ایک نہیں، تیرے دو دو بابا ہیں۔ اب تجھ کو شکایت نہیں ہو گی رے!" تجمل اُسے کھینچتا ہوا منیر علی کے پاس لے گیا۔ "اس کے سر پہ ہاتھ رکھو بڑے صاحب! یہ بھی تمھاری بیٹی ہے۔ انھیں سلام کر بٹیا!" وہ زرّیں کو ٹہوکا مارتے ہوئے بولا۔ منیر علی کسی قدر جھجکے۔ زرّیں نے جھک کے انھیں آداب کیا ہی تھا کہ تجمل کی جانب بے چینی سے دیکھتے ہوئے انھوں نے اُسے اپنے پہلو سے لگا لیا۔ "جیتی رہو، خدا ہمیشہ خوش رکھے۔" وہ لرزیدہ لہجے میں بولے۔

اُسی لمحے اندر سے جہاں گیر اور نیساں دروازے پر نمودار ہوئے اور …

قلانچیں بھرتے ہوئے جھل کے پاس آکے اُس سے لپٹ گئے۔ جھل نے اُن دونوں کو ایک ساتھ اپنے سینے سے چمٹا لیا تھا۔ "کیوں شہزادے!" وہ جہاں گیر کو دبوچتے ہوئے بولا۔ "جان نہیں بنائی؟ اور یہ پھول کی چھڑی بھی اکڑی کی اکڑی ہے۔"

وہ دونوں شکایتیں کرنے لگے۔ ایک ہی سانس میں بہت سی باتیں۔ پھر وہ جھل کا جواب سننے کے بجائے اُس کے بازوؤں سے نکل کے میری طرف جھپٹ پڑے۔ مجھے ارشد کا ہاتھ چھوڑنا پڑا۔ اُن دونوں نے میرے بازو جکڑ لیے تھے۔ نیساں کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور جہاں گیر نے اپنا سر میرے کندھے سے ٹکا دیا تھا۔ دیکھتے دیکھتے ایک ہنگامہ سا ہو گیا تھا۔ کسی کو بھی یہ خیال نہیں رہا تھا کہ اندھیرا ہے اور ہم راستے میں کھڑے ہیں۔ دیر نہیں گزری تھی کہ خانم بھی لپکتی جھپکتی آگئی اور حویلی کے سارے ملازم بھی۔ کوئی اِدھر جاتا، کوئی اُدھر۔ کبھی جھل کے پاس، کبھی میرے پاس، کبھی زہرہ کو دیکھتا جس نے اپنی نقاب ہٹالی تھی۔ خانم ہی کو سب سے پہلے احساس ہوا۔ وہ اور زریں، زہرہ کو دلھنوں کی طرح اندر لے جانے لگیں۔ نیساں نے سلمہ کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ میں نے اور جہاں گیر نے ارشد کا، منیر علی جھل کے ساتھ تھے۔ جس کمرے میں ہم سب پہنچے، وہاں تیز روشنی کر دی گئی۔ جھل نے چوکی پر پیر پسارتے ہی خانم سے کہا کہ اُسے تیز بھوک لگی ہے، فوراً کھانے کا انتظام کیا جائے۔ خانم مسکرانے لگی اور بتانے لگی کہ گھر میں زریں روز اس خیال سے کھانا زیادہ پکواتی ہے کہ شاید بابا کسی وقت آجائیں۔ روز ڈھیر سارا کھانا بچ جاتا ہے۔

ارشد کو میرے کمرے میں ایک صاف ستھرے بستر پر لٹا دیا گیا۔ جھل نے اُس کا زخم دوبارہ کھول کے دیکھا۔ اُسے گہری چوٹ لگی تھی۔ زخم کے چاروں طرف ورم آگیا تھا اور وہ بُری طرح کراہ رہا تھا۔ جھل نے زخم صاف کر کے پھر باندھ دیا اور ارشد کو دلاسا دے کے باہر چلا گیا۔ زریں گلاس میں دودھ گرم کر کے لے آئی تھی۔ میں نے اپنے ہاتھ سے ارشد کو پلایا۔ دوپہر تک مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اُسے کیسے چوٹ آگئی ہے۔ شام کو ریل میں جھل نے پہلی بار مجھے اُس کے بارے میں بتایا تھا۔ رستم کے آدمیوں نے منیر علی کو گرفت میں لینے کے بعد بطورِ احتیاط گھر کے تمام کمروں کی تلاشی لینی ضروری سمجھی۔ کونے کے کمرے میں ارشد موجود تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور ارشد جاگ رہا تھا۔ انھوں نے منیر علی کی طرح اُسے بے قابو کر دینا چاہا لیکن ارشد کو کمرے میں اندھیرے کی وجہ سے بچنے کا موقع مل گیا۔ اُس نے مزاحمت کی مگر وہ تین آدمی تھے۔ ایک نے اُس کا منہ بند کر کے چاقو کا دستہ اُس کی پیشانی پر مار دیا۔ دوسرے نے اُس کے پیٹ میں گھونسے مارے۔ ارشد نے پھر بھی اُن سے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش جاری رکھی۔ اُس نے اُس شخص کی انگلیاں دانتوں میں چبا لیں جس نے اُس کا منہ بند کر دیا تھا۔ وہ اُن کے ہاتھوں سے ایک بار نکل بھی گیا لیکن انھوں نے پے در پے وار کیے۔ ارشد نے منہ کے بل ٹھوکر کھائی۔ پیشانی کا زخم دوبارہ دیوار کے ساتھ ٹکرانے سے اور گہرا ہو گیا۔ اُس کے پاؤں میں بھی زخم پڑ گیا تھا۔ ارشد سے پھر نہیں سنبھلا گیا۔ وہ وہیں فرش پر ڈھے گیا۔

جھل نے چوکی دار سے اُستاد جامو کے چھوٹے بھائی جمرو کو کہلوایا تھا کہ وہ اپنے ساتھ کسی ڈاکٹر کو لے کے فوراً حویلی پہنچے۔ سب کے کپڑوں اور بالوں پر دھول جمی ہوئی تھی۔ زریں نے سبھی کو دھلے ہوئے تولیے نکال کے دیے۔ نیساں اور خانم باورچی خانے میں کھانے کا انتظام کرنے چلی گئی تھیں۔ جہاں گیر سارے گھر میں بھاگا بھاگا پھر رہا تھا۔ نہا دھو کے اور کپڑے بدل کر سب بڑے کمرے میں آگئے۔ نیساں اور زریں نے چوکی پر کھانا سجا دیا تھا۔ خانم نے سچ کہا تھا، گھر میں کھانے کا خاصا سامان تھا۔ پھر بھی نیساں نے بٹیریں اور مرغیاں بھون لی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا جیسے کسی چھوٹی موٹی دعوت کا اہتمام ہو۔ وہ پانچوں، زریں، خانم، نیساں، زہرہ اور سلمہ ایک طرف بیٹھ گئیں۔ اُن کے سامنے ہم چاروں بیٹھے، جھل، منیر علی، جہاں گیر اور میں۔ کھانے میں میٹھے چاول بھی تھے۔

جہاں گیر چپکے سے مجھ سے کہنے لگا کہ جب نیساں نے اُسے بتایا، بابر بھائی اور بابا چند مہمانوں کے ساتھ آئے ہیں تو اُس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا کہ کہیں ابا جان، فرخ، فریال، فارہہ اور اکبر تو نہیں آگئے۔ کہنے لگا، مجھ سے تو چلا بھی نہیں گیا۔ میں اُسے کیا جواب دیتا کہ منے! اُن کا ملنا ہماری قسمت میں نہیں ہے۔ پوچھنے لگا، اُن کا کچھ پتہ چلا؟ مجھے اُس کے سوالوں سے جھنجلاہٹ ہونے لگی۔ پتہ چلتا تو وہ میرے ساتھ ہی کیوں نہ ہوتے اور میں سب سے پہلے یہ خبر اُسے کیوں نہ سناتا۔ مجھے چپ دیکھ کے اُس نے پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ خود ہی سمجھ گیا اور موضوع بدل کے اپنی پڑھائی کے بارے میں بتانے لگا کہ وہ الٰہ آباد بورڈ سے میٹرک کے امتحان کی تیاری کر رہا ہے اور اُسے اُمید ہے، فرسٹ کلاس میں پاس ہوگا۔ اُس کی صحت بھی نسبتاً بہتر تھی اور وہ پہلے سے کسی قدر بڑا معلوم ہوتا تھا۔ اُدھر نیساں بار بار اُچک اُچک کے مجھے دیکھنے لگتی تھی۔ اُس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ میرے پاس آکے بیٹھ جائے۔ مجھے یقین تھا، وہ ضرور مجھ سے کسی وقت پوچھ بیٹھے گی کہ میرے لیے کیا لائے۔ اُس کی زبان رُکتی ہی نہیں تھی۔ مجھے کچھ ایسا لگا کہ آنکھوں آنکھوں میں وہ یہی بات کہہ رہی ہے۔ میں نے خود چلتے وقت اُس سے پوچھا تھا، "نیساں! بتا تیرے لیے کیا لاؤں۔" اُس نے وہی جواب دیا تھا جو اُسے دینا چاہیے تھا۔ کہا تھا، "بس آپ آجائیں۔" یہ سوچنا تو میرا کام تھا کہ کیا لے جانا ہے۔ اتنی دیر سے آنے کے بعد کوئی یوں خالی ہاتھ تو گھر نہیں لوٹتا۔ نیساں نے میرے پیچھے میرے لیے بہت دعائیں کی ہوں گی۔ میں اُس کے لیے ایک جوڑی ہاتھوں کی چوڑیاں بھی نہ لا سکا۔ میں نے طے کیا کہ جھل سے پیسے لے کے صبح صبح بازار نکل جاؤں گا اور بہت ساری چیزیں لاؤں گا، اتنی کہ نیساں گنتے گنتے، اُٹھاتے اُٹھاتے، دیکھتے دیکھتے تھک جائے گی۔

کھانے کے دوران ہی چوکی دار نے اطلاع دی کہ جمرو ڈاکٹر لے کے آگیا ہے۔ ہم کھانا تقریباً کھا ہی چکے تھے۔ میں نے آج پیٹ بھر کے کھانا کھایا تھا۔ جھل نے انھیں مردانے میں بٹھانے کو کہا اور ہاتھ دھو کر فوراً باہر چلا گیا۔ مردانے میں جمرو اکیلا نہیں تھا۔ فیض آباد میں اُس کے اڈّے کے کئی آدمی اُس کے

ساتھ موجود تھے۔ میں وہاں پہنچا تو شور مچا ہوا تھا۔ سب جھل کو گھیرے ہوئے تھے۔ میری آہٹ پر وہ سب میری طرف پلٹ پڑے۔ جمرو اپنا سر میرے سر سے مارنے اور قہقہے لگانے لگا۔ اُس نے جھک کے پہلو میں بے تحاشا گدگدیاں کیں۔ میں جتنا بھاگتا، اتنا ہی اُس کے قہقہے بلند ہوتے مگر پھر کمرے میں اچانک خاموشی چھا گئی۔ جمرو نے مجھے چھوڑ دیا۔ جھل اپنا ہاتھ اُٹھائے ہوئے چیخ رہا تھا۔ منیر علی وہاں آگئے تھے۔ "بڑے صاحب!" جھل اُن کی جانب تیزی سے مڑ کے بولا۔ "یہ سب... سب اپنے جانی ہیں۔ یہ مائی کا لال جمرو ہے، جمرو بدمعاش اور یہ سب اِس کے لنگوٹیے ہیں۔ سب ایک نمبر ہیں۔ آواز اور آنکھ خوب پہچانتے ہیں۔ یہ آدمی کے بچے ہیں۔ ان کو اپنا غلام سمجھو۔"

جمرو کے ساتھ سبھی نے جھکتے ہوئے انھیں سلام کیا اور نیچی نظریں کیے وہیں کھڑے رہے جہاں جہاں تھے۔

"کیا ڈاکٹر صاحب آگئے؟" منیر علی نے سراسیمگی سے پوچھا۔

جھل چونک پڑا اور جمرو کے بال پکڑ کے کھینچنے لگا۔ "ابے سب بھلا دیا تو کسے لایا تھا رے؟ کدھر ہے وہ؟ کسی عطائی قصائی کو تو نہیں پکڑ لایا؟"

جمرو نے ڈاکٹر کی طرف اشارہ کیا۔ ڈاکٹر کونے کی ایک کرسی پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ "نگینہ ڈھونڈ کے لایا ہوں اُستاد، بہت بڑا ڈاکٹر ہے۔ اس کی قینچی ایسے ہی چلتی ہے جیسا تمھارا..." جھل نے جمرو کو بات مکمل نہیں کرنے دی، اُس کے پیٹ میں زور سے مکا مارا۔ جمرو بلبلا گیا۔ "تمھارے سر کی قسم!" وہ کراہتے ہوئے بولا۔ "مریض کی کلائی پکڑنے کی دیر لگتی ہے، سمجھو مرض ایک دم دفع!"

جھل نے بڑھ کے ڈاکٹر کا بیگ اُٹھا لیا۔ میں نے اُس سے بیگ لینا چاہا مگر جمرو نے پہل کر دی۔ ڈاکٹر ایک معمر اور بردبار شخص تھا۔ باقی سب باہر رُک گئے۔ جمرو ہمارے ساتھ اندر آگیا۔ ارشد کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ بخار میں پھنک رہا تھا۔ ڈاکٹر دیر تک غور سے اُس کا معائنہ کرتا رہا۔ زخم کی مرہم پٹی کے بعد اُس نے دو انجکشن بھی ارشد کے بازو اور کولھے میں گھونپ دیے۔ ڈاکٹر کو چپ دیکھ کے منیر علی کانپتے ہوئے اُس سے پوچھنے لگے کہ کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے۔

"عادت سے مجبور ہے بڑے صاحب!" جمرو نے درمیان میں دخل دیا۔ "ڈیلی ہی منہ بنائے رہتا ہے۔ آدمی سالا اس کا پھولا ہوا گال دیکھ کے خود بیمار پڑ جاتا ہے۔ ہم کو بھی بیس چوٹیں کھا کے پتہ چلا، جب یہ ایسا منہ بنائے تو سمجھو سب ٹھیک ہے۔"

ڈاکٹر کو ہنسی آگئی۔ اُس نے منیر علی کو مطمئن کرنے کی کوشش کی اور نسخہ لکھ کے جمرو کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ڈاکٹر نے دودھ کے سوا ارشد کے لیے ہر غذا کی ممانعت کر دی تھی اور سخت احتیاط کی تاکید کی تھی۔

جمرو اور اُس کے ساتھی رات کے دو بجے تک مردانے میں بیٹھے جھل کے پیچھے ہونے والے ایک ایک واقعے کی تفصیل اُسے سناتے رہے۔ جمرو کی زبانی معلوم ہوا کہ کانتے دو دن کے لیے کلکتے سے آیا تھا۔ یقیناً وہ ممبئی جاتے یا واپس آتے ہوئے زریں کو دیکھنے کے لیے فیض آباد کے راستے سے گزرا ہوگا۔ جمرو بھی کانتے کے فیض آباد آنے کا وہی مہینہ بتا رہا تھا جو زورا نے مجھے اُس کے ممبئی پہنچنے کا بتایا تھا۔ کانتے نے کتنی ہی بار جھل سے کہا تھا کہ اُسے فیض آباد بھیج دیا جائے مگر جھل نے ہر دفعہ اُس کی خواہش سختی سے مسترد کر دی تھی، کانتے کا ممبئی میں جولین کے گھر رہنا بھی پسند نہیں کیا تھا۔ اِس میں کیا مصلحت تھی، شاید وہ اُسے وہیں کلکتے کے اڈّے پر رکھنا چاہتا تھا۔ جمرو کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دوران گھوشی کا دماغ پھر اُلٹ گیا تھا۔ اُس نے پیسے پہنچانے سے انکار کر دیا تھا اور ایک بار پھر زور دکھانے کی کوشش کی تھی۔ اُستاد جامو نے گھوشی کی لاش موجمدار کے علاقے میں بیچ سڑک پر پھنکوا دی تھی۔ پولیس نے جامو کو اور تمام اڈّوں کے آدمیوں کو بہت کھنگالا لیکن کسی نے ایک لفظ کہہ کے نہیں دیا۔ گھوشی کے مرنے کے بعد موجمدار کے علاقے میں پھر کوئی نہیں اُٹھا۔ اب تمام اڈّوں سے وقت پر پیسے آجاتے ہیں اور کسی قسم کی گڑبڑ نہیں ہے۔ شبولی اور لالہ دونوں جیل میں بند ہیں۔ دونوں ہاوڑا اسٹیشن پر کسی سیٹھ کی بغل سے روپوں کا بھاری تھیلا لے کے بھاگ رہے تھے۔ اچانک ریلوے لائن پر دوسری ٹرین آگئی۔ ٹرین کی رفتار تیز تھی، پار نہیں جا سکتے تھے۔ سیٹھ کے شور مچانے پر مسافروں نے انھیں بھاگتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ کسی نے اسٹیشن پر پڑی ہوئی لوہے کی کوئی چیز کھینچ کے ماری۔ شبولی وہیں گر گیا۔ نتیجے میں لالہ کو بھی رُکنا پڑا۔ دونوں دھر لیے گئے۔

"اچھا!" جھل کا چہرہ لال ہو گیا۔ "تو سچ بول رہا ہے جمرو؟"

"ہاں اُستاد! یہی سنا ہے۔" جمرو نے آہستگی سے کہا۔

"ہا، تھو! اپنے اڈّے کے آدمی اچکا پن کرنے لگے۔"

"اُستاد! ایسی موٹی تھی، وہ دونوں بہت دُور سے پیچھا کر رہے تھے۔ سالا سیٹھ تھیلا بغل سے چپکائے ہوئے تھا۔" جمرو نے دبی زبان سے کہا۔

"سونا بھرا تھا نا اُس میں!" جھل چیخ کر بولا۔ "پر یہ اٹھائی گیرا پن اُن کو کس نے سکھا دیا! چھین کے بھاگ گئے مداری!"

"ہاں اُستاد! کوئی اور شکل نہیں تھی۔"

"تو بھی بک رہا ہے؟" جھل نے اُلٹے ہاتھ سے جمرو کے منہ پر طمانچہ مارا۔

جمرو اُس کے پیروں پر جھک گیا۔ جھل تیزی سے حقہ گڑگڑانے لگا۔ حقہ زریں نے کھانے سے پہلے ہی اُس کے لیے تیار کر رکھا تھا۔ اِس کے بعد اُن میں سے کوئی نہیں بولا، نہ جھل نے کچھ پوچھا۔ رات بھی بہت ہو گئی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ اُٹھ کے جانے لگے۔ مجھے صبح بازار جانے کے لیے جھل سے پیسے مانگنے تھے لیکن میں بھی چلا آیا۔ جھل نہ جانے کب تک وہاں اکیلا بیٹھا رہا۔

مردانے سے باہر حویلی میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جیسلمیر کے مقابلے میں یہاں موسم زیادہ خنک تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سرسرا رہے تھے۔ مجھے بھی کچھ ہلکا پن محسوس ہو رہا تھا۔ کئی راتوں سے سونا نہیں ہوا تھا۔ باہر آکے خیال آیا کہ میں رات کہاں گزاروں گا، اُس کمرے میں ارشد موجود تھا جو زریں نے ایک طرح

میرے لیے مخصوص کر دیا تھا لیکن حویلی میں اور بہت سے کمرے تھے۔ برآمدے سے ملحق چھوٹا کمرہ عبور کر کے چند ہی قدم چل کے میرے پیر جامد ہو گئے۔ سامنے وسیع کھلے حصے کے اُس طرف دالان میں روشنی ہو رہی تھی اور کوئی تھم کے سہارے ننگے فرش پر بیٹھا ہوا کتاب پڑھ رہا تھا۔ میرے ذہن میں سب سے پہلے زرّیں کا نام آیا اور وہ وہی تھی۔ اُس نے پیازی رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ دوپٹا، کرتا، پاجامہ سبھی ایک رنگ کا تھا۔ "زرّیں!" میں نے اُسے درمیان ہی میں جا لیا اور حیرانی سے پوچھا۔ "تم ابھی تک جاگ رہی ہو؟"

"ہاں!" اُس کے من میں ہلکی سی لرزش ہوئی۔ "تم کہاں آرام کرو گے؟"

"کہیں بھی کہیں بھی لیٹ جاؤں گا۔ اتنا بڑا گھر ہے۔" میں نے ہچکچا کے کہا۔

"میں نے لائبریری کے برابر والا کمرہ صاف کر دیا ہے۔"

"کیا تم یہی بتانے کے لیے یہاں بیٹھی ہوئی تھیں؟"

"نہیں۔" وہ مدھم آواز میں بولی۔ "مگر یہ بھی ایک خیال تھا۔"

"اور اگر میں ساری رات وہیں بیٹھا رہتا؟"

اُس نے جواب نہیں دیا۔ فرش پر نگاہیں جمائے چپ کھڑی رہی۔ مجھے اُسے غور سے دیکھنے کے لیے چند لمحے مل گئے۔ پیازی رنگ کے لباس میں اُس کا اپنا رنگ اور نکھر آیا تھا۔ زرّیں اس عرصے میں کچھ اور دُبلی ہو گئی تھی اور اُس کا قد پہلے سے زیادہ بڑا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ میرے شانے تک آ رہی تھی۔ اسے شاید احساس ہو گیا کہ میں اُسی کی جانب دیکھ رہا ہوں۔ "کمرہ یاد ہے؟" کچھ توقف کے بعد وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"نہیں، میں تو بالکل نیا ہوں۔"

"میں نے سوچا کہ تم ....."

"تم مجھے اندر کسی سے کہلوا دیتیں۔" میں نے ترشی سے کہا۔

"سب سو گئے تھے۔"

میں نے اُس سے بحث نہیں کی لیکن میرا جی اُس سے اور باتیں کرنے کو چاہتا تھا۔ میری سمجھ میں لفظ نہیں آ رہے تھے۔ آخر میں نے اُس سے کمرے میں چل کے سو جانے کو کہا۔ دو سے اُوپر ہو چکے تھے۔ "کیا تمھیں نیند آ رہی ہے؟" چلتے چلتے میں نے پلٹ کے اُس سے پوچھا۔

وہ ابھی تک اپنی جگہ کھڑی تھی۔ "کوئی کام ہے؟"

"چائے مل سکتی ہے؟" میں نے یوں ہی کہہ دیا۔

"اِس وقت! چائے سے تو نیند اور دُور ہو جائے گی۔"

"سر کچھ بھاری بھاری ہے۔"

"سفر کی تھکن ہے، بال بھی خشک پڑے ہیں۔ تیل بھی تو نہیں ڈالتے۔"

"سفر کی تھکن ہے؟"

"سفر میں ان باتوں کی کہاں فرصت ملتی ہے۔"

"سر دبا دوں؟" اُس نے تھمی تھمی آواز میں کہا۔

"نہیں، درد نہیں ہے۔ بس تم اگر ہو سکے تو چائے پلا دو۔"

"ابھی لاتی ہوں۔"

"تم اس وقت اتنی دُور باورچی خانے میں جاؤ گی؟"

"باورچی خانہ گھر ہی میں ہے۔" وہ سرگوشی میں بولی۔

"رہنے دو۔"

"کیوں؟" اُس نے پلکیں اُٹھا کے مجھے بے تابی سے دیکھا۔

"بس نہیں۔ رات بہت ہو گئی ہے۔"

"تو کیا ہوا؟" میری بات سُنے بغیر وہ ایک طرف بھاگ گئی۔

لائبریری کے برابر ایک بڑے کمرے میں میرے کپڑے بستر پر رکھے ہوئے تھے۔ پاجامے میں کمر بند بھی تھا۔ مسہری کے قریب میز پر پانی سے بھرا ہوا جگ اور گلاس موجود تھا اور چند کتابیں اور رسالے۔ منہ پر چھپکا مار کے میں کرتا پہن ہی رہا تھا کہ اُس کی چاپیں سنائی دیں۔ شاید وہ دانستہ زمین پر زور زور سے قدم رکھ رہی تھی۔ میرا جسم ایک لمحے کے لیے سُن سا ہو گیا۔ زرّیں کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ "اتفاق سے دودھ چند ہی قطرے بچا تھا۔ مرلانے کے لیے چائے بنی اور وہ ارشد صاحب کے لیے...." اُس نے اپنی ہانپتی ہوئی آواز پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"مگر یہ ملائی کہاں سے آ گئی؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"دیگچی میں لگی ہوئی تھی۔ کالی چائے سے خشکی اور بڑھ جاتی۔" میں نے دو تین ہی گھونٹوں میں چائے ختم کر لی۔ "ٹھنڈی ہو گئی کیا؟" وہ پریشانی سے بولی۔

"دیر ہو جانے کے ڈر سے جلدی جلدی چائے پینے کی عادت ہو گئی ہے۔" اُس کے چھوٹے چھوٹے دانت چمکنے لگے۔ "آپ کہاں کہاں گئے؟"

"دُور دُور تک۔" میں نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔

وہ خاموش رہی پھر چند ثانیوں بعد بولی۔ "اب میں جاتی ہوں۔"

"نیند آنے لگی کیا؟"

"نہیں۔"

"تو بیٹھ جاؤ، کھڑی کیوں ہو؟"

وہ مسہری کے کونے میں پائنتی سے لگ کے بیٹھ گئی۔

"تم کیسی ہو؟" میں نے آہستگی سے پوچھا۔

"بالکل..... بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ چونک کے بولی۔

"اب تمھارا جی لگ رہا ہے!"

"ہاں۔" اُس نے اضطراب سے کہا۔

"جہاں گیر اور نیساں نے تمھیں زیادہ تنگ تو نہیں کیا؟"

"وہ دونوں بہت اچھے ہیں۔"

"میری وجہ سے تو نہیں کہہ رہی ہو؟"

"اُن کے آنے سے گھر ہی بدلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ نیساں مجھے کسی کام کو ہاتھ ہی نہیں لگانے دیتی۔ ہر وقت کُودتی اُچھلتی رہتی ہے۔ ذرا خاموش ہو تو گھر میں کمی سی محسوس ہوتی ہے اور جہاں گیر۔ میں نے ایک بار سختی سے کہا کہ تم پڑھائی میں دلچسپی کم لو گے تو میری تم سے کُٹّی۔ بس ہر وقت پڑھتا رہتا ہے اور روز رات کو مجھے آ کے بتاتا ہے کہ آج میں کتنا آگے بڑھ گیا، آج میں نے کیا سیکھا۔ میرے بغیر وہ کھانا بھی نہیں کھاتا۔"

"اور خانم۔۔!"

"خانم باجی!" وہ مرتعش لہجے میں بولی۔ "اُن کا بس چلے تو وہ مجھے اپنی آنکھوں سے ایک پل بھی اوجھل نہ ہونے دیں۔ حویلی کا یہ جو نقشہ بدلا ہوا ہے سب اُنھی کا کیا ہوا ہے۔ کھڑکیوں کے پردے، دروازوں کے پردے، دیواروں کا رنگ، سارا باغ بھی اُنھوں نے بدل کے رکھ دیا ہے۔ اب ہر طرف پھول ہی پھول کھلے ہیں۔ وہ روز کئی گھنٹے باغ پر صرف کرتی ہیں۔ بہت سلیقہ مند ہیں، بہت شائستہ۔ مجھے ہر وقت یہ احساس رہتا ہے کہ میری کوئی بات اُنھیں بُری نہ لگ جائے کیونکہ وہ بہت نازک ہیں۔ کبھی کبھی ستار بجاتی ہیں تو کھو جاتی ہیں۔ پھر اُنھیں کچھ خبر نہیں رہتی۔ میں نے اُن سے بہت کہا کہ خانم باجی! آپ مجھے بھی ستار سکھا دیں۔ میری ہر بات مانتی ہیں لیکن ایک یہی بات نہیں مانتیں۔ کچھ کھاتی پیتی بھی نہیں ہیں۔ بس دال، چاول، سبزی یا کبھی ہلکے قسم کا شوربہ۔ کہتی ہیں کہ کم اور ہلکا کھانے سے دو فائدے ہیں۔ ایک تو مزاج لطیف رہتا ہے، دوسرے خدانخواستہ کبھی بُرا وقت آ جائے تو اتنی پریشانی نہیں ہوتی۔ عجیب عجیب منطقی باتیں کرتی ہیں مگر کم ہی بولتی ہیں۔"

زرّیں نے پہلی بار مجھ سے اتنی باتیں کی تھیں۔ میں اُسے درمیان میں ٹوکنا نہیں چاہتا تھا تاکہ کہیں وہ رُک نہ جائے۔ وہ باتیں کرتے ہوئے بہت اچھی لگ رہی تھی۔ رخسار دہک رہے تھے اور لہجے میں ایک ہلکی سی لرزش تھی جیسے وہ ایک ساتھ سب کہہ دینا چاہتی ہو۔ میں اُس کا چہرہ تک رہا تھا لیکن اُس کی نگاہیں میری طرف نہیں تھیں۔ بولتے بولتے یکایک وہ رُک گئی۔ اُس کے کانوں کی لویں سُرخ ہو گئی تھیں۔ "کیا ہوا؟ تم رُک گئیں؟"

"کچھ نہیں۔" وہ جھینپ کر بولی۔ "وقت بہت ہو گیا ہے۔"

"ہونے دو۔ صبح ہونے میں اب دیر ہی کتنی ہے۔"

"دو راتوں سے جاگ رہے ہو۔ کچھ دیر کے لیے سو جاؤ۔"

"تمھیں یہ کس نے بتایا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"زہرہ کہہ رہی تھیں۔"

"اور کیا کیا کہہ رہی تھی؟"

"اور کچھ نہیں۔" وہ زیرِ لب تبسم سے بولی۔

"مگر میرے جاگنے سونے کا ذکر کیسے نکل آیا؟"

"بس باتوں باتوں میں۔"

"اتنی دیر میں اتنی باتیں ہو گئیں؟"

"ہاں! بہت سی باتیں۔"

"مثلاً کیا کیا۔ اور کیا بتایا اُن لوگوں نے؟"

"کوئی خاص بات نہیں۔"

"عام باتیں سہی۔ مجھے نہیں بتاؤ گی؟"

"وہ اپنے بارے میں، خاندان کے بارے میں اور بہن بھائیوں کے بارے میں بتاتی رہیں۔"

میں نے ہنکاری بھری۔

"زہرہ بہت خوب صورت ہیں۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"ہاں۔" میں نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مجھے بہت اچھی لگیں۔"

"خدا کرے تمھارا یہ تاثر قائم رہے۔"

"کیوں؟" وہ مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"اتنی دیر میں کسی کے بارے میں کوئی رائے کیسے قائم کی جا سکتی ہے۔"

"مجھے یقین ہے وہ ہر اعتبار سے اچھی ہوں گی۔ ویسے بھی وہ بہت اچھی لگتی ہیں۔ دل چاہتا ہے بس دیکھتے رہو۔ کاش اُن کا بھی یہاں دل لگ جائے اور وہ کبھی نہ جائیں۔"

"زرّیں! مجھے تم سے اُن لوگوں کے بارے کچھ کہنا تھا۔" میں نے تذبذب سے کہا۔

اُس کی غزالیں آنکھیں چمکنے لگیں۔

"گو اس کی ضرورت تو نہیں۔" میں نے ٹھہر ٹھہر کے کہا۔ "پھر بھی کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ خانم اور جہاں گیر کے بعد اب یہاں یہ لوگ آ گئے ہیں۔ بات ہی کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ ہمیں یہاں لانے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ اُن کا ایک بڑا سا گھر تھا۔ اتنا بڑا تو نہیں جتنا یہ ہے لیکن بہت سے گھروں سے اچھا تھا۔ ہمارے پاس اِس کے سوا چارہ نہیں تھا۔ یہ لوگ اپنا گھر چھوڑ کے یہاں آئے ہیں اور صرف ہماری وجہ سے۔"

"یہ سب کیوں کہہ رہے ہو؟"

"اب زیادہ لوگ ہو گئے ہیں تو ایک ....."

"حویلی بہت بڑی ہے۔ خوب رونق رہے گی۔" وہ تیزی سے بولی۔

"کاش ایسا ہی ہو۔"

"ایسا ہی ہو گا۔" وہ مسکرانے لگی۔

"ممکن ہے کبھی وہ اپنے گھر واپس چلے جائیں۔"

"ہم اُنھیں جانے ہی نہیں دیں گے۔"

میں کرسی پر پہلو بدلنے لگا۔ گھڑی نے تین بجا دیے تھے۔ مجھے زرّیں کو واپس بھیج دینا چاہیے تھا۔ صبح اُسے جلد اُٹھنا تھا مگر وہ جانے کے لیے کسمسانے لگی تو میں نے اُسے پھر روک لیا۔ لمحے بیت گئے۔ وہ یوں ہی بیٹھی رہی۔ کہنے کو تو میں نے اُس سے کہہ دیا تھا لیکن اب پچھتاوا سا ہو رہا تھا کہ زرّیں سے یہ سب کہہ کے میں نے اُسے دُکھ پہنچایا ہے۔ اُس کے لیے اتنا ہی بہت تھا کہ منیر علی اور زہرہ وغیرہ ہمارے ساتھ آئے ہیں۔ ظاہر ہے کوئی ایسی ہی بات ہو گی جو ہم اُنھیں یہاں لائے ورنہ ہم کہیں اور بھی لے جا سکتے تھے۔ زرّیں نے مجھ سے کُرید نہیں کی کہ اُن لوگوں کے ساتھ کیا حالات پیش آئے تھے۔ وہ خود بھی

حالات سے گزر چکی تھی اور اچھی بری نگاہ کی پہچان اُسے خوب ہوگئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ زندگی میں بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں دُہرایا نہیں جاتا، دُہرانے سے تکلیف ہوتی ہے۔ یہ دُنیا ہی ایسی ہے۔ یہاں وقت کا موسم یکساں نہیں رہتا اور کہہ کے بھی نہیں آتا۔ نہ اُس کا کوئی وقت مقرر ہے اور نہ ہر فرد پہ ایک جیسی گزرتی ہے۔ آدمی اُس دُنیا میں اکیلا نہیں رہتا، دوسرے بھی اُس کے ساتھ رہتے ہیں۔ سامنے کسی کی نگاہ بدل گئی یا اپنی ہی نگاہ چوک گئی۔ خود ذرا سی لغزش ہوگئی تو ساری تدبیریں خاک میں مل جاتی ہیں۔ زریں کو وقت کے آتار چڑھاؤ کا اچھی طرح تجربہ ہو چکا تھا سو اُس نے کچھ اور جاننے کی کوشش نہیں کی۔ وہ میرے سامنے بیٹھی رہی بالکل تصویر کی طرح نگاہیں جھکائے ہوئے۔ روشنی میں اُس کا سُرخ و سفید رنگ دہک رہا تھا۔ آج سے ڈیڑھ دو سال پہلے کی زریں اور اب کی زریں میں بہت فرق تھا۔ جب ریل میں یہ مجھے اُس کمینی نسترن کے ساتھ نظر آئی تھی تو اُس کا چہرہ جل سا رہا تھا، آنکھوں میں وحشت چھائی ہوئی تھی اور بلن سہما سہما گھبرایا گھبرایا لگتا تھا مگر یہ کسی پری کی طرح اُس وقت بھی ایسی ہی تھی۔ بتھل نے اُسے دیکھتے ہی کہا تھا ’لاڈ لے! یہ شہزادی کہاں سے لے آیا۔‘

اب زریں بہت بدلی ہوئی تھی۔ اب وہ ایک پُرسکون جھیل کے مانند تھی جس میں کنکر پھینکو تو ایک ارتعاش سا ہوتا ہے۔ پھر پانی سطح پر برف کی طرح جم جاتا ہے۔ اُس کے اِس سکون سے مجھے ہول آنے لگتا تھا۔ سفر میں ہزاروں بار مجھے اُس کا خیال آیا تھا۔ جیسے جیسے فیض آباد قریب آتا جا رہا تھا، مجھے گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی۔ نہ جانے کتنی باتیں میں نے اُس سے کہنے کے لیے سوچ رکھی تھیں۔ اب وہ سامنے بیٹھی تھی تو سب باتیں گڈمڈ ہوگئی تھیں۔ یوں ہی بیٹھے بیٹھے ایک گھنٹہ گزر گیا۔ پتہ ہی نہیں چلا۔ گھڑی نے چار بجائے تو وہ جیسے خواب دیکھتے دیکھتے بیدار ہوگئی۔ یکایک اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ”جا رہی ہو؟“ میری آواز ڈوبنے لگی۔

”اب چلنا چاہیے۔“

”ہاں جاؤ۔“

”طبیعت کیسی ہے اب؟“

”نیند نہیں آ رہی ہے۔“

”بستر پہ آ جائے گی۔ کیا میں ٹھہر جاؤں؟“

”نہیں۔“ میں نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں تمھیں پہنچا آتا ہوں۔“

”اب مجھے ڈر نہیں لگتا، حویلی میں اکیلی رہتی تھی۔“

”مگر تم تو چھپکلی سے ڈر جاتی ہو۔“

”چھپکلی کی بات اور ہے۔“ وہ ہنسنے لگی۔

ہم دونوں آہستہ آہستہ زنان خانے کی طرف آ گئے۔ ہوا میں خنکی اور بڑھ گئی تھی۔ صحن اور دالانوں میں بہت دھیمی روشنی تھی۔ میں اُس کے کمرے کے سامنے آ کے رُک گیا۔ چند لمحوں تک وہ وہیں ٹھہری رہی پھر تیزی سے اندر چلی گئی۔

میری آنکھ کھلی تو کمرے میں دن کا اُجالا پھیلا ہوا تھا اور جہاں گیر میرے سرہانے بیٹھا میرا کندھا ہلا رہا تھا۔ میں نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ میری نظر سیدھی گھڑی پر گئی۔ ایک بجنے والا تھا۔ میں ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھا۔ ”کیا وقت ہوا ہے؟“

”گھڑی دیکھیے۔“ وہ شوخی سے بولا۔

”گھڑی میں تو ایک بج رہا ہے۔“ میں نے سٹ پٹا کے کہا۔

”شاید کچھ پیچھے ہوگئی ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ وقت کی دوڑ میں گھڑی کی سوئیاں شاید کچھ پیچھے رہ گئی ہیں۔“ وہ تیکھے لہجے میں بولا۔ ”اب اُٹھ جائیے۔ آپی نے کہا ہے کھانا تیار ہو رہا ہے۔ کھا کے پھر سو جائیے گا۔“

”تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں اُٹھایا؟“

”صبح سے نیساں اور میں کئی بار یہاں آ چکے ہیں لیکن بابا نے منع کر دیا تھا کہ آپ سو رہے ہوں تو اُٹھایا نہ جائے۔ زریں باجی بھی دو مرتبہ دیکھ کے جا چکی ہیں۔ اب جلدی سے منہ ہاتھ دھو لیجیے۔ جب تک آپ تیار ہوں گے، کھانا دسترخوان پہ اُتارا جا چکا ہوگا۔“

”اور سب لوگ کہاں ہیں؟“

”یہیں گھر میں ہیں۔“ اُس نے سادگی سے کہا۔

مجھے اپنے آپ سے ندامت ہونے لگی۔ ایسا لگا جیسے جہاں گیر نے میری کوئی غلطی پکڑ لی ہے۔ اُس کا چہرہ کھِلا ہوا تھا۔ اُس نے میرا ہاتھ کھینچ کے مجھے بستر سے اُٹھا لیا اور میرے پیروں کے آگے چپل رکھ دیے۔ ”غسل خانے میں کپڑے موجود ہیں۔ میں یہیں بیٹھا ہوں، آپ تیار ہو کے آ جائیے۔“ اُس کے لہجے سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔

میں نے کسی معمول کی طرح اُس کی ہدایت پر عمل کیا۔ اس سے پہلے کہ میں بڑے کمرے کے دروازے میں قدم رکھتا، اندر سے ایک دم نیساں اُچھلتی ہوئی میرے پاس آ گئی اور میرے پہلو سے بے تابانہ چمٹ گئی۔ میں نے اُسے اور زور سے چمٹا لیا۔

”بابر بھائی!“ اُس کی آواز رُندھنے لگی۔

”ارے تم تو رو رہی ہو نیساں! ہائیں۔“ میں نے بے قراری سے کہا۔

نیساں کے نتھنے لرزنے لگے۔

”نیساں ہر وقت آپ کو پوچھتی تھی۔“ جہاں گیر نے کانا پھوسی کے انداز میں کہا۔

”میں آ گیا ہوں نیساں اور تم رو رہی ہو۔“

”بابر بھائی!“ اُس سے کچھ اور نہیں کہا جا سکا۔

”نیساں! میں نے بھی تمھیں بہت یاد کیا تھا۔“ وہ اور ہچکیاں بھرنے لگی۔ اُس نے اپنا چہرہ میرے بازو میں چھپا لیا۔ میں نے اُس کے ریشمیں بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”کیا یہاں۔ یہاں تمھارا... تمھیں کوئی...؟“ اُس نے فوراً میرا بازو چھوڑ دیا اور روتے ہوئے سر ہلانے لگی۔

”پھر کیا بات ہے؟“

وہ کچھ نہیں بولی۔ اندر سے خانم کی آواز آئی۔ وہ نیساں کو پکار رہی تھی۔ میں اُسے ساتھ لے کے کمرے میں داخل ہوگیا لیکن اندر جاتے ہی میری آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ خانم اور زریں کے درمیان زہرہ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ تینوں ایک ساتھ کھڑی ہوگئیں۔ ایک ہی رات میں زہرہ بالکل مختلف نظر آ رہی تھی۔ اُس نے زریں جیسے کپڑے پہن رکھے تھے۔ کپڑوں کی تراش خراش بھی زریں کی وضع کی تھی۔ سفید کُرتا، تنگ موری کا سفید پاجامہ اور سفید دوپٹا۔ کانوں کے آویزے بھی سفید تھے۔ ضرور زریں نے اُسے اپنا کوئی جوڑا دیا ہوگا۔ تینوں کو دیکھ کے ایسا لگتا تھا جیسے ایک زمانے سے ساتھ رہ رہی ہوں یا تلے اوپر کی بہنیں ہوں۔ میرے آنے پر تینوں نے کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو رازدارانہ انداز میں دیکھا۔ میں نے خانم کو آداب کیا ہی تھا کہ زہرہ نے جھک کے مجھے سلام کیا۔ زریں اُس کے پہلو میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ مجھ سے جواب نہ بن پڑا۔ ”صرف تمھارا انتظار تھا۔“ خانم میرے قریب آ کے شگفتگی سے بولی۔ ”خوب نیند لی۔“

”آنکھ ہی نہیں کھلی آپی!“ میں نے خفت سے کہا۔

”بس اب دسترخوان پہ بیٹھ جاؤ۔“ خانم حکمیہ لہجے میں بولی۔ ”آج سارا کھانا سلمہ اور نیساں نے پکایا ہے۔ خدا خیر کرے۔ دونوں بلیاں صبح سے باورچی خانے میں گھسی ہوئی تھیں۔ خوشبو تو اچھی آ رہی ہے؟“

”آپ دیکھیے گا آپی!“ نیساں چہک کے بولی۔ ”بابر بھائی! اپنی انگلیوں کا خیال رکھیے گا۔“

”کیوں؟“ مجھے ہنسی آ گئی۔

”بس یوں ہی لقمہ منہ میں لیتے وقت احتیاط رکھیے گا۔“

”نمک مرچ کا یقین جو نہیں ہے۔“ خانم چپکے سے بولی۔

نیساں نے سُن لیا تھا۔ وہ خانم کو کوئی جواب دینا چاہتی تھی کہ بتھل اور منیر علی ایک ساتھ اندر داخل ہوئے۔ میں انھی کا منتظر تھا۔ میری نظریں منیر علی کا چہرہ ٹٹولنے لگیں۔ فوری طور پر کچھ اندازہ نہیں ہو سکا۔ منیر علی چُپ چُپ سے تھے۔ اسی دوران جمّو اور سلمہ بھی نہ جانے کہاں سے گھومتے ہوئے دسترخوان پر آ کے بیٹھ گئے تھے۔ اچھا خاصا ہجوم ہوگیا تھا۔ بالکل گھر جیسا منظر تھا۔ گھر میں ابّا جان، امّی، فہمیدہ، فرخ، فرزانہ، فارعہ، اکبر، جہاں گیر اور میں سب اسی طرح اکٹھے بیٹھ کے کھاتے تھے۔ مجھے جولین یاد آنے لگی، وہ بھی یہاں ہوتی تو کیا حرج تھا۔ جہاں اتنے لوگ تھے وہاں دو تین افراد کے اضافے سے کیا فرق پڑ جاتا۔ نیساں اور سلمہ نے واقعی بہت لذیذ کھانا پکایا تھا۔ منیر علی کو جب معلوم ہوا تو اُن سے چُپ نہیں رہا گیا۔ کھانے کے بعد انھوں نے سلمہ اور نیساں کو اپنے پاس بلا کے اُن کی پیشانیاں چوم لیں۔ یقیناً وہ پُرسکون تھے۔ اُن کے ماتھے پر کوئی شکن نہیں تھی بلکہ اُن کی آنکھوں میں ایک تبسم کی چمک تھی۔ جہاں گیر نے سلفچی میں اُن کے ہاتھ دھلائے۔ انھوں نے اُسے گلے سے لگا لیا اور بہت سی دعائیں دیں۔

میں نے نیساں اور جہاں گیر سے کہا کہ دھوپ کم ہوتے ہی بازار چلیں گے۔ تیار رہنا۔ سہ پہر ہوتے ہی وہ میرے کمرے میں آ گئے۔ چوکی دار نے تانگا منگوا دیا تھا۔ میں نے سلمہ اور جمّو کو بھی ساتھ لے لیا۔ تانگا فیض آباد کے مختلف بازاروں میں گھومتا رہا۔ میں نے بتھل سے بہت سے روپے لے لیے تھے۔ رات کو ہم چراغ جلنے کے بعد گھر واپس پہنچے۔ میری جیب میں چند ہی روپے بچے تھے۔ جو کچھ وہ کہتے رہے میں انھیں دلاتا رہا۔ اُن سب کے جوتے، کپڑے، چوڑیاں، انگریزی بسکٹ، چاکلیٹ، کھیل کا سامان، ٹینس کا نیٹ وغیرہ۔ خانم کے لیے ساڑی، زریں اور زہرہ کے لیے سوٹ کا کپڑا بھی میں نے الگ بندھوا لیا تھا۔ دل سے ایک بوجھ اُتر گیا تھا۔ گھر میں جا کے وہ سب کو اپنی چیزیں دکھا رہے تھے۔ اُن کی باتیں سُن کے اور انھیں دیکھ کے میرے جسم میں سنسناہٹ ہونے لگی تھی۔

جمرو نے ڈاکٹر کے متعلق بالکل سچ کہا تھا۔ ارشد کی طبیعت چند ہی خوراکوں سے غیر معمولی طور پر سنبھل گئی تھی۔ زخم کا ورم بھی ختم ہوگیا۔ تیسرے دن صبح وہ باغ میں آنے کے قابل ہوگیا۔ اُسی دن بتھل نے جمرو سے کہہ کے ایک موٹر منگالی تھی۔ ساتھ ہی اُس نے زریں کی وسیع جائداد اور زمینوں کی نگرانی اور حساب کتاب کرنے والے منشی کو بھی بلا لیا تھا۔ وہ جمرو اور منشی کے ہمراہ منیر علی کو زمینیں دکھانے لے گیا۔ مغرب کے وقت وہ لوگ تھکے ماندے گھر واپس ہوئے۔ بتھل نے میرے سامنے منشی سے کہہ دیا تھا کہ اب تمام جائداد اور زمینوں کی دیکھ بھال منیر علی کیا کریں گے۔ منیر علی نے اُس وقت تو کچھ نہیں کہا لیکن جیسے ہی منشی گیا، انھوں نے عاجزی سے انکار کر دیا کہ وہ نہ تو یہ وسیع جاگیر سنبھالنے کی اہلیت اپنے اندر پاتے ہیں نہ مناسب سمجھتے ہیں اور نہ اُن کے ذہن میں جیسلمیر کی اپنی زمین کے کسی معاوضے کا تصور ہے۔ انھیں یقین ہے کہ اُن کی عدم موجودگی میں شاہد صاحب اپنا فرض نبھائیں گے۔ وہ یہاں سے یا کسی اور شہر سے مختار نامہ لکھ کے انھیں بھیج سکتے ہیں تاکہ شاہد صاحب کو معاملات نمٹانے میں دشواری نہ ہو۔

”بڑے صاحب!“ بتھل نے نرمی سے کہا۔ ”اُس کو بھول جاؤ، نہ شاہد صاحب کو خط لکھو۔ اگر وہ سب باقی رہتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اُسے جانے دو۔ ہم معاوضے کی بات نہیں کرتے، نہ بدل میں زمین کا کوئی ٹکڑا آپ کو دے رہے ہیں۔ آپ بھی معاوضے کا خیال دل سے نکال دو۔ ہم اِدھر آپ کو اپنے رُتبے کے موافق لائے ہیں۔ آپ زریں کو اپنی بیٹی سمجھ کے اس جائداد کی نگرانی کرو۔ آپ اپنے گھر میں ہو۔ ہم کو معلوم تھا کہ آپ یہی جواب دو گے۔ جب تک آپ میری بات نہیں مانو گے ہم سمجھیں گے آپ کے دل میں ہماری طرف سے کوئی بال ہے۔“

”نہیں نہیں۔“ منیر علی جذبات میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولے۔ ”یہ خیال مت کیجیے۔ میرے دل میں ذرا بھی بدگمانی ہوتی تو میں یہاں نہ آتا۔ اگر یہ آپ کا حکم ہے تو میں اسے قبول کرتا ہوں مگر میری بھی ایک درخواست ہے۔ جو کچھ مجھ سے ہو سکے گا، میں کروں گا مگر ایک بیٹی کی ملکیت سمجھ کے۔“

”جیسا آپ بولتے ہو ٹھیک ہے پر کارندہ مت سمجھنا بڑے صاحب اور نہ یہ سمجھنا کسی کو جواب دینا ہے۔ ابھی آپ کچھ نقدی زیور لائے ہو، زمین پر بیج ڈال دو اور چاہو تو بن چکی بھی چلا دو۔ آپ جیسا سمجھو کرو۔ ابھی نہیں، میں آپ

کو کچھ دن بعد ساری بات بول دوں گا کہ آپ کا اُدھر سے نکلنا کیوں ضروری تھا۔ میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔"

منیر علی چونک کے اُسے گھورنے لگے۔ "وہ کیا بات ہے۔ آپ ابھی کیوں نہیں بتا دیتے؟" وہ دہشت سے بولے۔

"ابھی مت پوچھو بڑے صاحب! ویسے وہ آپ کی بات نہیں ہے۔ اپنی ہی کچھ صفائی کرنا ہے۔ آپ کام کرو۔ کام کرنے کی ادھر آپ کو ضرورت نہیں ہے۔ آپ یہاں آرام سے بیٹھ کے کھا سکتے ہو پر آدمی کام چھوڑ کے بیٹھ جاتا ہے تو سمجھو اُس کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ کام کے بغیر آدمی بیمار جیسا ہے۔ ہاتھ پیر چلاتے رہو تو ہاتھ پیر بھی ساتھ دیتے ہیں ورنہ سالے پڑے پڑے سڑ جاتے ہیں۔ ابھی مجھ کو کلکتے کے ایک سیٹھ کی بات یاد آتی ہے۔ اپنی اُس سے تھوڑی بہت یاری تھی۔ زندگی بھر بھاگتا رہا، جوان رہا، سونا چاندی عزت خوب بنائی۔ لڑکے لوگ بڑے ہوئے تو باپ سے بولے کہ اب تم چھٹی کرو، گھر بیٹھ کے نوکروں پر حکم چلاؤ، ہم موجود ہیں تو تم کو کام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ سیٹھ مستی میں آ گیا۔ گھر آ کے بیٹھ گیا۔ دھندا تو لڑکوں نے سنبھال لیا پر اُدھر سیٹھ آدھا ہو گیا۔ پہلے سر بھاری بھاری رہنے لگا پھر سالا پورا جسم۔ ایک کے بعد ایک شکایت۔ بیماری بھی گدھ کی طرح ہوتی ہے۔ آدمی چلتا پھرتا رہے تو پرے رہتی ہے۔ دو ڈھائی سال میں سیٹھ کا کام تمام ہو گیا۔ میں اُدھر گیا تو لڑکے لوگ باپ کی میت پر رو رہے تھے۔ اب میں اُن سے کیا بولتا کہ خود ہی مارتے ہو، خود ہی روتے ہو۔ یوں جانا سب کو ہے۔ کام کر کے بھی آدمی سالا رکھا تھوڑی رہ جاتا ہے، پر ہاتھ پیر چلتے رہیں تو وقت کچھ بڑھ جاتا ہے اور پھر کچھ موت کا مزہ بھی آتا ہے۔"

"آپ درست کہہ رہے ہیں۔" منیر علی کسی قدر جوش سے بولے۔

"پتہ نہیں بڑے صاحب! کیا درست ہے کیا نادرست۔ پر جو دیکھا ہے، وہ آپ کو بول رہا ہوں۔ ویسے آپ نے مجھ سے زیادہ دیکھا ہے۔"

"صرف دیکھنے سے کیا ہوتا ہے، سمجھنا بھی کوئی چیز ہے۔"

"جب سمجھنے کا وقت آیا تو سرا اپنے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا، پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔" تجمل نے بوجھل آواز میں کہا۔

چند ہی دنوں میں ارشد بالکل تن درست ہو گیا تھا۔ پٹی بندھی ہوئی تھی لیکن زخم تیزی سے سوکھ رہے تھے۔ اُدھر منیر علی نے اپنے بڑے بیٹے تنویر علی کو خط کے ذریعے فیض آباد منتقل ہونے کی اطلاع دے دی تھی اور لکھ دیا تھا کہ فی الحال اُن کا ارادہ مستقل یہیں رہنے کا ہے۔ تنویر مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ منیر علی نے اُسے تاکید کر دی تھی کہ وہ کسی رشتے دار یا دوست کے خط کے جواب میں اپنے باپ کے موجودہ پتے سے لاعلمی ظاہر کرے۔ انھوں نے فیض آباد آنے کی وجہ سے اُسے بے خبر رکھا تھا اور لکھا تھا کہ یونی ورسٹی دو چار دن کے لیے بند ہو تو وہ فیض آباد آ جائے، علی گڑھ سے فیض آباد قریب ہے۔

تجمل کے ایما پر منیر علی نے تمام جائداد کے کاغذات اور نقشوں وغیرہ کی جانچ پڑتال شروع کر دی تھی اور انھیں پہلی بار یہ علم ہوا تھا کہ زرّیں کی یہ ساری جاگیر میرے نام سے ہے۔ اُن کے لیے یہ بات بہت عجیب تھی۔ تجمل سے انھوں نے اپنی حیرت کا اظہار کیا تو وہ ہنسنے لگا اور بولا۔ "میں آپ کو بولنا ہی بھول گیا تھا۔ یہ بھی بٹیا کا مذاق ہے بڑے صاحب! پر یہ اُس کے نام سے ہو یا اِس کے نام سے۔ یہ اور وہ دو نہیں۔ جو چلتا ہے چلنے دو۔ اِن دونوں نے دنیا کو ہم سے کچھ زیادہ ہی جانا ہے۔ سارے بکھیڑوں سے دُور ہیں۔"

ہماری عدم موجودگی میں بھی جمرو کا معمول تھا کہ وہ روز صبح آ کے زرّیں کی خیریت دریافت کرتا تھا۔ اب وہ صبح و شام اپنا بیشتر وقت یہیں گزارتا تھا۔ اُس کے ساتھ فیض آباد کے اڈے کے بہت سے آدمی بھی ہوتے۔ جس جس کو اطلاع مل رہی تھی، تجمل سے ملنے آ رہا تھا۔ لکھنؤ سے کلن خاں بھی خبر سن کے آ گیا تھا۔ رات کو بھی اُنھی لوگوں کی بھیڑ ہوتی۔ مانو سے حقہ تازہ ہو ہو کے آتا رہتا۔ وقفے وقفے سے گلوریاں اور ہر گھنٹے دو گھنٹے بعد چائے آ جاتی۔ ایک ہفتے تک تجمل گھر سے باہر نہیں نکلا۔ جب یہ لوگ نہ ہوتے تو منیر علی اور تجمل نہ جانے کیا کیا باتیں کرتے رہتے۔ پھر اُن کے درمیان اڈے کے لوگ آ جاتے تو منیر علی کچھ ہی دیر بعد اُٹھ کے اندر چلے جاتے۔ آنے والا ہر آدمی اپنے ساتھ کچھ نہ کچھ ضرور لاتا۔ گھر میں مٹھائیوں اور پھلوں کا انبار لگ گیا تھا۔ آموں کا موسم تھا۔ ٹوکرے کے ٹوکرے یوں ہی پڑے رہتے۔ تجمل انھیں ہزار بار منع کرتا لیکن وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کے قسم قسم کے آموں کے ٹوکرے لاتے رہے۔ تجمل کو میری طرح پھلوں میں آم اور امرود بہت مرغوب تھے۔ امرودوں کی تو اُسے ایسی پہچان تھی کہ جس امرود پہ انگلی رکھ دیتا، اُس میں واقعی جیسے شہد بھرا ہوتا۔

منیر علی کے خط لکھنے کے چوتھے دن شام کے وقت اچانک اُن کا بڑا لڑکا تنویر علی حویلی میں آ گیا۔ وہ بہت پریشان تھا مگر چند ہی گھنٹوں میں اپنے بہن بھائیوں سے مل کے اُس کی اضطراری حالت اعتدال پر آ گئی۔ تنویر علی میں اپنے باپ کی تمام خصوصیات موجود تھیں۔ وجاہت میں وہ اپنے بہن بھائیوں سے کم نہیں تھا۔ اُس کی آنکھیں بڑی اور روشن تھیں۔ ماتھا چوڑا لیکن جسم ارشد کے مانند اکہرا تھا۔ شیروانی پہنے ہوئے وہ بہت جامہ زیب لگتا۔ قد اوسط تھا لیکن شیروانی میں کچھ نکلتا ہوا محسوس ہوتا۔ خانم اور زرّیں نے اُس سے پردہ نہیں کیا۔ زہرہ اُن سے کتنی ہی مرتبہ اُس کا ذکر کر چکی ہوگی۔ منیر علی مجھ سے اُس کا تعارف کراتے ہوئے یہ بتانا نہیں بھولے تھے کہ میں نے ایم اے کیا ہے۔ وہ مجھ سے بہت گرم جوشی سے ملا۔ ارشد کے چہرے پر بھی اُس کے آنے سے کچھ اور بحالی آ گئی تھی۔ تنویر تیسرے ہی دن واپس چلا گیا۔ جاتے وقت وہ کہہ گیا تھا کہ موسمِ سرما کی تعطیلات گزارنے یہیں آ جائے گا۔

دس بارہ روز تک گھر میں اڈے کے لوگوں کی آمد و رفت، ارشد کی علالت، نیساں، جہاں گیر، سلمیٰ اور رجّو کے ساتھ باتوں میں اور پھر تنویر کے آ جانے سے دن گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا مگر تنویر کے جانے کے بعد جیسے ہر چیز اپنی جگہ ٹھہر گئی۔ ارشد نے باہر نکلنا شروع کر دیا تھا اور سنبھلا سنبھلا رہنے

لگا تھا۔ یقیناً جگہ بدلنے سے اُس پر خاصا اثر پڑا تھا۔ نیساں، جہاں گیر، سلمیٰ اور رجّو چاروں کے لیے مولوی صاحب اور ماسٹر صاحب پڑھانے آنے لگے تھے۔ وہ پڑھائی میں مصروف ہو جاتے تو میں گھر سے نکل جاتا۔ کبھی جمرو کے اڈے کی طرف چلا جاتا، کبھی بازاروں میں گھومتا رہتا۔ ایک دن صبح میں حویلی سے باہر نکلا ہی تھا کہ ارشد بھی میرے پیچھے پیچھے آ گیا۔ اُس نے میرے ساتھ چلنے کی خواہش کی۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ پھر عموماً ہم دونوں ساتھ ہی جانے لگے۔ وہ بہت کم بات کرتا، نہ کبھی اپنی کسی رائے کا اظہار کرتا، نہ اُسے گھر واپس پہنچنے کی جلدی ہوتی۔ جہاں جہاں میں جاتا، وہ میرے ساتھ چلتا رہتا۔ کئی مرتبہ میرے دل میں آیا کہ اُس سے کورا کا ذکر چھیڑوں لیکن پھر اچھا نہیں لگا۔ اُس نے خود کوئی ذکر نہیں کیا تو میرے لیے بھی مناسب نہیں تھا۔ راستے میں جگہ جگہ ہمیں اڈے کے لوگ ٹکرا جاتے تھے۔ وہ ہم دونوں کو قریب کے کسی ہوٹل میں لے جاتے یا تانگے میں سیر کراتے۔ ارشد اُن کی باتیں بہت تجسس سے سنتا تھا۔ اُس سے کچھ چھپانا بے کار تھا۔ اُسے یہیں رہنا تھا تو جلد یا بدیر سب کچھ معلوم ہو ہی جانا تھا۔ سو ایک دو بار میں اُسے جمرو کے اڈے بھی لے گیا۔ اڈے کا ایک حصہ ورزش، چاقو، بلّم، لاٹھی بازی وغیرہ کے لیے مخصوص تھا۔ میں اس طرف گیا تو لوگوں نے مجھے گھیر لیا اور مجھ سے بھی چاقو بازی کے لیے اصرار کیا۔ میں نے ارشد کی وجہ سے انھیں ٹال دیا مگر ایک دن جب ہم وہاں پہنچے تو جمرو کے ایک ساتھی متن نے مجھ پر اچانک چاقو سے حملہ کر دیا۔ ارشد چیخ اُٹھا۔ اُس نے مجھے بچانے کے لیے جھپٹ کے میرے پاس آنا چاہا۔ لوگوں نے اُسے پکڑ لیا۔ اسی اثنا میں متن کا پنجہ میرے ہاتھ میں تھا اور متن تڑپ رہا تھا۔ اڈے کے تمام آدمی قہقہے لگانے لگے۔ میں نے متن کو چھوڑ دیا مگر پلٹ کے اُس نے دوبارہ مجھ پر وار کر دیا۔ فاصلہ زیادہ تھا، مجھے متن کا بڑھتا ہوا چاقو والا ہاتھ درمیان ہی میں اُوپر اُٹھانے کا موقع مل گیا تھا۔ اِس داؤ میں ضروری ہے کہ اپنا اُوپر اُٹھا ہوا ہاتھ سلاخ کی طرح اکڑا لینا چاہیے۔ غیر اختیاری طور پر مقابل اپنا ہاتھ چھڑانے کے لیے کوشش کرے گا جب کہ اُسے اس کوشش کے بجائے دوسرے کھلے ہوئے ہاتھ سے کام لینا چاہیے یا جسم کو جھٹکا دے کے پوری طاقت سے پیچھے ہو جانا چاہیے مگر یہ اُسی صورت میں ممکن ہے جب داؤ کا جواب توقع کے مطابق ہو، خلاف نہ ہو۔ میں نے توقع کے خلاف متن کا ہاتھ درمیان میں پکڑ کے اُوپر اُٹھا دیا تھا۔ نتیجتاً اُسے گڑبڑانا لازم تھا۔ اُس نے اپنا چاقو والا ہاتھ آزاد کرانے کی کوشش کی۔ میں نے اس وقفے میں اُس کے منہ اور ناک پر ہاتھ رکھ کے اُس کی سانس بند کر دی۔ متن دو ایک گھونسے اور لاتیں مجھے مار سکتا تھا۔ اُس نے میرے جبڑے پر گھونسا مارا، پھر وہ ایک دو لاتیں ہی مار سکا۔ اُس کی سانس گھٹ گئی تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ اُس کے منہ سے نہیں ہٹایا۔ چنانچہ اُس نے چاقو چھوڑ دیا اور میں نے فوراً اُس کا منہ۔ بعد میں ارشد کو معلوم ہوا تو وہ بہت حیران ہوا کہ متن نے محض تفریح کے لیے مجھ پر وار کیا تھا۔ اس یقین کے ساتھ کہ میں اُس سے بچ جاؤں گا۔ متن میرے پیر پکڑ کے مجھ سے اپنی غلطیاں پوچھنے لگا۔

روز روز بازاروں میں پھرنے اور سڑکوں کا چکر لگاتے لگاتے میرا جی اُکتانے لگا۔ میں نے گھر سے نکلنا ہی کم کر دیا۔ ارشد دن چڑھتے وقت مجھ سے چلنے کے لیے کہتا تو میں اُس سے معذرت کر لیتا اور لائبریری میں آ کے بیٹھ جاتا۔ خانم نے لائبریری بھی از سرِ نو ترتیب دی تھی۔ پہلے بھی کئی مرتبہ میں یہاں آ کے بیٹھا تھا لیکن میں نے کبھی غور سے ان کتابوں کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ پہلے وہ الماریوں میں اس سلیقے سے سجی ہوئی نہیں تھیں۔ زرّیں کے خالو نے حویلی پہ قبضے کے بعد بہت سی کتابیں بکسوں میں بند کرا دی تھیں۔ خانم ہی نے آدمی کو بُلا کے اُن کی جزبندی کرائی تھی۔ ترتیب کا کام شہر کی پبلک لائبریری کے لائبریرین نے انجام دیا تھا۔ وقت گزارنے کے لیے میں نے چند کتابیں باہر نکال لیں۔ رفتہ رفتہ مجھے اندازہ ہوا کہ زرّیں کے باپ کوئی عالم شخص تھے۔ اُن کے پاس مختلف موضوعات کی کتب کا ایک بڑا ذخیرہ تھا۔ انگریزی کتابیں بھی خاصی بڑی تعداد میں تھیں۔ جیل کے بعد مجھے کبھی توجہ سے پڑھنے کا وقت نہیں ملا تھا۔ ملا تھا تو جی نہیں لگتا تھا۔ بمبئی میں کرشنا جی کی کتابوں کے صفحے اُلٹ پلٹ کے میں الماری میں واپس رکھ دیتا تھا۔ مدراس میں کرشنا جی کی بڑی لائبریری اُن کے سامان کے ساتھ فروخت کر دی گئی تھی۔ میرے لیے یہ مشغلہ نیا تھا۔ شروع شروع میں مجھے اکتاہٹ ہوئی مگر یہاں بہت سکون تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں کو ان کا عادی بنانے کی پوری کوشش کی۔ پھر کتابیں میری آنکھوں کی جیسے عادی ہو گئیں۔ مجھے بہت سی نئی نئی، عجیب عجیب سی باتیں معلوم ہوئیں۔

منیر علی آنے والے دنوں میں بے حد مصروف رہے۔ ہر دوسرے تیسرے روز وہ زمینوں پر چلے جاتے، کبھی شام کو لوٹ آتے، کبھی رات وہیں بسر کرتے اور دوسرے دن شام کو واپس آتے۔ ارشد تجمل کے پاس زیادہ بیٹھنے لگا تھا۔ تجمل کا بھی یہ تھا کہ جب تنہا ہوتا، ارشد کو پکارتا ہوا اندر آ جاتا یا اُسے مردانے میں اپنے پاس بُلا لیتا۔ جب تجمل جمرو کے اڈے پر جاتا تو اکثر ارشد کو بھی اپنے ساتھ لے جاتا۔ جہاں گیر اور ارشد کی عمروں میں بہت فرق تھا مگر جہاں گیر اُس سے ٹینس کھیلنے کے لیے اصرار کرتا تو وہ منع نہ کرتا۔ میں نے اس دوران میں بہت سی کتابیں پڑھ لی تھیں۔ دن کا بیشتر وقت میں لائبریری میں گزارتا۔ وہاں بہت کم لوگ آتے تھے۔ کوئی آتا تو دروازے سے دیکھ کے چلا جاتا کہ میں وہاں موجود ہوں یا نہیں یا دوپہر اور رات کے کھانے پر نیساں اور جہاں گیر میں سے کوئی بُلانے آ جاتا۔

ایک روز میں لائبریری میں آ کے بیٹھا ہی تھا کہ زرّیں زہرہ کے ساتھ وہاں آ گئی اور آتے ہی کہنے لگی۔ "ایک بات کہنی ہے۔"

میں نے کتاب بند کر دی اور تعجب سے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

وہ دونوں میرے سامنے کی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ زرّیں جھجکتے ہوئے بولی۔

"زہرہ کا ارادہ ہے کہ یہ فارم بھر دیں اور اسی سال امتحان دے دیں۔"
میں کیا کہتا۔ میں نے کہا: "بہت اچھا ہے۔"
"لیکن... لیکن کورس بڑا ہے۔" زریں سنجیدگی سے بولی: "کیا یہ ممکن ہوگا کہ ایک سال میں یہ ساری تیاری مکمل کر لیں؟"
میں نے مسکرا کے جواب دیا: "یہ تو اس پہ منحصر ہے کہ کورس کیا ہے اور اُسے یہ کتنی جلدی گرفت میں لیتی ہیں۔" میں استعداد کہنا چاہتا تھا لیکن میرے منہ سے نہیں نکلا۔
زریں میری بات سمجھ گئی اور زہرہ کی جانب چمکتی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولی: "زہرہ ماشاءاللہ بہت پڑھی لکھی ہیں لیکن کورس میں حساب وغیرہ بھی تو شامل ہے۔ میرا خیال ہے پہلے اُن کا ایک امتحان لے لیا جائے؟"
"بہت اچھا خیال ہے۔"
"سنا ہے فارم جانے کا وقت قریب ہے۔"
"مجھے معلوم نہیں۔" میں نے تذبذب سے کہا۔
"جہانگیر کے ماسٹر صاحب بتا رہے تھے۔"
"اُنھی سے صحیح معلوم ہوگا اور وہی ان کا امتحان بھی لیں گے۔"
"مگر کچھ مدد آپ کو بھی کرنی ہوگی۔" زریں فیصلہ کُن لہجے میں بولی: "کبھی وقت نکال کے زہرہ کو پڑھا دیا کریں۔"
"میں!— زریں! میں تو... میں نے کبھی کسی کو نہیں پڑھایا۔ میں تو جیسے سب بھول گیا ہوں۔" میں نے بے چینی سے کہا: "اتنی مدد تو تم بھی کر سکتی ہو۔"
"میں تو کروں گی ہی، گھر میں سبھی کریں گے، ارشد بھائی سے بھی میں نے وعدہ لے لیا ہے۔ تنویر صاحب آئیں گے تو اُن سے بھی کہا جائے گا۔ زہرہ کو پڑھنے لکھنے سے بہت دلچسپی ہے۔"
"جو کچھ مجھ سے ہو سکے گا، میں بھی کروں گا۔"
"بس یہی کہنا تھا۔ زہرہ! تم خود کیوں نہیں کہتیں؟"
زہرہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "میں کیا کہوں۔" وہ شرماتے ہوئے بولی۔
"تم بھی تو کہہ سکتی ہو، کیا تمھاری بات بابر نہیں سُنیں گے؟"
"جی!—" زہرہ نے اپنا چہرہ سینے میں چھپا لیا۔
لیکن زہرہ نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ وہ اپنے ناخن سے ہاتھوں پر بنے ہوئے مہندی کے ستارے کھرچتی رہی۔ زریں اٹھی تو وہ بھی ہڑبڑا کے کھڑی ہو گئی۔ میں نے سوچا بھی کہ کچھ دیر کے لیے انھیں روک لوں لیکن وہ دروازے سے باہر نکل گئیں۔ میں ارادہ ہی کرتا رہ گیا۔

دوسرے دن رات کو میں اپنے کمرے میں لیٹا ہوا کتاب پڑھ رہا تھا کہ دروازے پر کسی نے دستک دی۔ دروازہ کھلا ہی ہوا تھا۔ زریں ہوتی تو میں اُس کی آہٹ فوراً پہچان لیتا۔ وہ روز رات کو دودھ کا گلاس میز پہ رکھ جاتی تھی لیکن اُس رات بہت دیر ہو گئی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھا۔ میری آنکھوں پر ایک لمحے کے لیے دھند سی چھا گئی۔ وہ غرارہ پہنے ہوئے تھی، سر پہ آسمانی دوپٹا تھا۔ وہ زہرہ ہی تھی۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے وہ اندر کمرے میں آ گئی اور گلاس میز پر رکھ کے واپس جانے لگی۔ "زریں کہاں ہیں؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔
"اُن کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔" زہرہ دھیمے لہجے میں بولی۔
"کیا ہو گیا؟ کھانے کے وقت تو وہ بالکل ٹھیک تھیں؟"
"کھانے کے بعد ہی شاید طبیعت کچھ بگڑ گئی۔" زہرہ کی آواز میں لرزش تھی۔
"کچھ زیادہ خراب تو نہیں؟"
"نہیں، کوئی ایسی پریشانی کی بات نہیں۔ کہہ رہی تھیں، سر میں درد ہے اور دل گھبرا رہا ہے۔" زہرہ ٹھہر ٹھہر کے بولی۔
"کوئی دوا وغیرہ دی؟"
"میں نے سر کی مالش کر دی ہے اور گلاب کا عرق پلا دیا ہے۔ اب پہلے سے بہتر ہیں۔ یہ دودھ رکھا ہے۔" وہ واپس مڑتے ہوئے بولی۔
"زہرہ!" وہ دروازے پر پہنچ گئی تھی، میری آواز سن کے رُک گئی۔ مجھے خود پر حیرت ہوئی کہ میں نے اُسے کیوں آواز دی ہے۔ اُس نے مڑ کے ایک نظر مجھے دیکھا اور سر جھکائے ہوئے دروازے ہی پر کھڑی رہی۔ "کچھ دیر کے لیے ٹھہر جائیے۔" میں نے عاجزی سے کہا: "آپ کو جلدی تو نہیں ہے؟"
اُسے سر ہلانے میں دیر لگی۔
"مجھے آپ سے ایک بات پوچھنا ہے۔ اندر آ کے بیٹھ جائیے۔"
اُس کے سارے بدن میں ایک لہر سی اٹھی مگر وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی کرسی پر سمٹ کے کسی بُت کی طرح بیٹھ گئی۔
"آپ کو یاد ہوگا۔" میں نے اپنا حلق تر کرتے ہوئے کہا: "وہاں گھر میں، میں نے آپ سے کچھ کہا تھا۔ کیا آپ کو یاد ہے؟"
وہ تیز تیز سانس لے رہی تھی۔ جسم کا سارا خون چہرے پر جم گیا تھا، سینہ تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اُس نے یکبارگی سر اٹھا کے پھر جھکا لیا۔
"یاد ہے نا؟" میں نے لرزیدہ آواز میں پوچھا۔
اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔
"سنا ہے آپ کا مولوی صاحب کے گھر ہر وقت کا آنا جانا تھا۔ وہ بظاہر تو دو گھر تھے لیکن تھے ایک ہی۔ مولوی صاحب آپ کو اپنی بیٹی ہی سمجھتے تھے اور آپ نرجس کی سہیلی تھیں۔"
اُس کی پلکیں تھرتھرانے لگیں۔ "جی!" اُس نے زیرِ لب کہا۔
"بڑے صاحب سے اُن کے بارے میں کچھ معلوم ہوا ہے مگر آپ ممکن ہے اُن سے زیادہ جانتی ہوں۔ میں آپ سے منت کرتا ہوں، آپ مجھے کچھ بتلائیے۔"
"میں کیا بتاؤں؟" وہ سراسیمگی سے بولی۔
"جو کچھ بھی آپ جانتی ہوں۔ مثلاً آپ کے لیے یہ بات حیرت انگیز ہو

مولوی صاحب ایک طرح تمام دنیا سے قطع تعلق کر کے گوشہ نشین کیوں ہو گئے تھے، وہ پہلے کہاں تھے اور وہاں کیوں آ گئے تھے؟"
"وہ مجھ سے بہت کم بات کرتے تھے۔"
"لیکن نرجس تو آپ سے ہر وقت باتیں کرتی ہوگی۔ اُس نے آپ سے کچھ کہا ہوگا۔ آپ اُس کی رازدار سہیلی تھیں۔ ممکن ہے اُس نے آپ کو قسم دلا دی ہو یا آپ اپنے اور اُس کے درمیان ہونے والی باتیں دُہرانا مناسب نہ سمجھتی ہوں یا آپ کو کوئی اور جھجک ہو۔ یہ قسم توڑ دیجیے۔ آپ کو اُسی کی ... میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ یہ سب میرے سینے میں دفن ہو جائے گا۔ کسی جھجک کے بغیر سب کچھ بتا دیں۔ مجھ پر بھروسا کریں۔ یقیناً آپ کو یہ ... نہیں لگتا ہوگا مگر یہ اس لیے ضروری ہے کہ شاید نرجس کی بھلائی کا کوئی پہلو ... ہے اور آپ کی کسی بات سے اُس کی تلاش میں مدد مل سکے۔ کوئی ایسی ... جو آپ اباجان کو بھی نہ بتا سکی ہوں؟"
"میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔"
"یہ آپ کا احسان ہوگا۔"
"آپ یہ مت کہیے۔" وہ اُداسی سے بولی۔
"میں آپ کو ہر طرح سے یقین دلانا چاہتا ہوں۔"
"آپ مجھے آپ آپ کیوں کہہ رہے ہیں؟"
"اوہ! بس یوں ہی۔" میں نے خفت سے کہا: "یہ میری غلطی ہے۔"
"مجھے بہت ندامت ہوتی ہے۔"
"میں اب نہیں کہوں گا۔"
زہرہ کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے اور ہونٹوں پر کپکپی سی طاری تھی۔ میری سانس رُکنے لگی۔ "بڑے ابا (مولوی صاحب) سے میری کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔ بس سلام دعا۔ مجھے دیکھ کے کبھی وہ میری خیریت پوچھ لیتے اور کبھی کسی کھانے کی فرمائش کر دیتے۔ میرے ہاتھ کے شامی کباب انھیں بہت پسند تھے۔" زہرہ کی آواز بھرانے لگی۔
"اور نرجس!—" میں نے جلدی سے کہا۔
"نرجس تقریباً ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتی تھی۔ ہم دونوں کا دل ایک دوسرے کے بغیر نہیں لگتا تھا۔ کبھی مجھے ذرا سی دیر ہو جاتی تو وہ کھڑکی سے جھانک کے پوچھنے لگتی مگر اُس نے... اُس نے مجھے کبھی کچھ نہیں بتایا۔"
"کچھ نہیں بتایا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"جی ہاں! وہ اپنے بارے میں کچھ نہیں بولتی تھی۔"
"تو پھر تمھاری اُس سے اور کیا باتیں ہوتی تھیں؟" میں نے تند لہجے میں کہا۔
"سبھی طرح کی باتیں۔ تمام دنیا کے قصے کہانیاں۔"
"تین سال سے وہ جیسلمیر میں تھی۔ تین سال میں تم نے کبھی اُس سے نہیں پوچھا کہ وہ کون ہے، کہاں سے آئی ہے۔ اُس کے بارے میں یہ سب جاننے کا تمھیں تجسس نہیں ہوا؟"
"شروع شروع میں، میں نے یہ جاننے کی کوشش کی تھی مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ وہ اس ذکر پہ اور اُداس ہو جاتی تھی بلکہ رونے لگتی تھی۔ مجھ سے اُس نے کہا تھا کہ سب چھوٹ گئے۔ اب شاید کوئی نہیں۔ جو لوگ بچھڑ گئے، اُن کے ذکر سے کیا حاصل۔ پھر ہمیشہ مجھے ڈر رہتا تھا کہ میں اُس سے کچھ پوچھوں گی تو وہ رونے لگے گی۔ پھر بھی کبھی کبھی میرے منہ سے نکل ہی جاتا تھا۔ ایک دن اُس نے مجھ سے ہاتھ جوڑ کے کہا: زہرہ! مجھ سے کچھ مت پوچھا کرو۔ سمجھو مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔ پھر میں نے اپنی زبان بند کر لی۔"
"لیکن محلے والے، گھر میں آنے والے دوسرے لوگ تو اُس سے یہ سوال کرتے ہوں گے۔ انھیں وہ کیا جواب دیتی تھی؟"
"آنے والے طرح طرح کے سوال کرتے تھے۔ تمھاری ماں کہاں ہیں، کوئی بہن بھائی ہے یا نہیں۔ تم کہاں کی ہو۔ اُس کا ایک ہی جواب ہوتا کہ میرا کوئی نہیں ہے۔ ماں بچپن میں مر گئی۔ بہن بھائیوں میں کوئی نہیں ہے۔ بڑے ابا نے بتایا تھا کہ اُن کا تعلق کبھی مراد آباد شہر سے تھا۔ وہ بھی یہی کہتی تھی لیکن ساتھ میں یہ بھی کہ مراد آباد اُسے یاد نہیں ہے اور وہ مختلف شہروں میں رہی ہے۔ مختلف شہروں کے نام اُن کے سامنے لے دیتی۔ لوگ اُس سے ہمدردی کا اظہار کرتے اور ایک بات کے بعد دوسری بات پوچھنے لگتے۔ وہ کبھی ٹال جاتی، کبھی بات بنا دیتی۔ کوئی بہت کرید کرتا تو تنگ آ کے کہتی، مجھے کچھ نہیں معلوم، باوا سے پوچھ لو۔ مجھے احساس تھا کہ یہ ذکر اُس کے لیے تکلیف دہ ہے۔ اس لیے میں بھی اپنی طرف سے اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے لوگوں کو خاموش کر دینے کی کوشش کرتی تھی۔ میں نے محلے میں سبھی سے کہہ رکھا تھا کہ وہ اس کی ماں بہن بھائی عزیزوں اور گھر وغیرہ کے متعلق اُس سے کچھ نہ پوچھا کریں۔ اُسے کوئی بڑا صدمہ پہنچا ہے۔ اُس ذکر سے اسے وہ پرانی باتیں یاد آنے لگتی ہیں جن کا بھول جانا ہی اُس کے لیے اچھا ہے لیکن لوگوں کی زبان نہیں رُکتی تھی۔ وہ اُس کے سامنے کوئی نہ کوئی ایسی بات کہہ ہی دیا کرتے تھے۔" زہرہ سسکنے لگی۔
میں نے چند لمحے انتظار کیا۔ وہ چپ ہو گئی تھی اور دوپٹے کے پلو سے آنکھوں کے گوشے صاف کر رہی تھی مگر آنسو اُس کی آنکھوں میں اُمڈے ہی چلے آتے تھے۔ "مجھے کچھ اور بتاؤ۔" میں نے اضطراب سے کہا۔
"اور کیا بتاؤں؟" وہ شکستہ آواز میں بولی۔
"تم نے اتنے دن اُس کے ساتھ رہتے رہتے اپنے طور پر بھی تو کچھ اندازہ کیا ہوگا۔ کیا اُس نے تم سے کبھی بھولے سے بھی اپنے کسی عزیز رشتے دار کسی کا بھی ذکر نہیں کیا؟"
"کبھی نہیں کیا۔" وہ سسکتے ہوئے بولی: "وہ ہمیشہ کھوئی کھوئی رہتی تھی، ہر وقت گُم سُم، کچھ نہ کچھ سوچتی ہوئی یا دیواریں گھورتی ہوئی، سب سے الگ تھلگ، خاموش۔ ذرا سے کھٹکے پر چونک جاتی اور قریب شور مچا رہتا، اُسے خبر نہیں ہوتی۔ میرے سوا اُسے کسی سے ملنا پسند نہیں تھا لیکن جو بھی آتا تھا، وہ اُس سے خوش اخلاقی سے ملتی تھی۔ جب ہمارے گھر میں بیٹھی ہوتی اور کوئی آ جاتا تو فوراً اٹھ

کے اپنے گھر نہیں چلی جاتی تھی، کچھ دیر ضرور ٹھہرتی تھی۔ لوگ دُور دُور سے اُس کی خوب صورتی کا ذکر سُن کے اُسے دیکھنے آتے تھے۔ میں نے اکثر اُسے تنہائی میں چپکے چپکے روتے دیکھا تھا۔ اُسے نہ لباس کا شوق تھا، نہ زیور کا۔ نہ کہیں آنے جانے کا، بس کچھ تھا تو پھولوں کا۔ آپ نے گھر میں جو پودے دیکھے ہوں گے، وہ سب اُسی کے لگائے ہوئے تھے۔ گھر کا کام مختصر تھا۔ دو آدمیوں کا کھانا پکانا ہی کیا! وہ یہ کام نہایت تیزی سے کرلیتی تھی۔ ابتدا میں اُسے اتنا اچھا پکانا نہیں آتا تھا مگر اُس نے مجھ سے سیکھ لیا تھا اور جلد ہی اتنا اچھا پکانے لگی تھی کہ مجھے حیرت ہوتی تھی۔ میں اِدھر سے کھانا لے کے چلی جاتی یا وہ اُدھر سے آجاتی۔ ہم دونوں ساتھ مل کے ہی کھاتے تھے۔ یہی حال اُس کے پڑھنے کا تھا۔ کتاب فوراً ختم کرلیتی تھی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے روز بڑے ابا اُسے پڑھاتے تھے۔ وہ اُس کے لیے نئی نئی کتابیں خرید کے لاتے تھے۔ وہ بولتی کم اور سُنتی زیادہ تھی۔ بڑے ابا سے بھی اُس کی رسمی سی بات تھی جب کہ وہ اُس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اُس کے لیے قسم قسم کے کپڑے لاتے مگر وہ انھیں بس ایک دو بار پہنتی، پھر صندوق میں رکھ دیتی؛ وہ تمام لڑکیوں سے الگ تھی۔ میں نے اُس کی حالت دیکھ کے ہی اندازہ لگایا تھا کہ گزری ہوئی بہت سی باتیں اُس کے ذہن پر نقش ہیں۔ تین سال کے عرصے میں بھی وہ انھیں نہیں بھولی۔ کوئی ایسی بات ضرور تھی جسے وہ کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔ کبھی کبھی مجھے دھوکا ہوتا تھا، آپ مجھے معاف کریں،" وہ ہچکچاہٹ سے بولی۔ "جیسے بڑے ابا اُس کے اصل باپ نہیں ہیں اور وہ اُسے اُس کے تمام عزیزوں سے چُرا کے لے آئے ہیں لیکن اُس نے بڑے ابا کے متعلق کبھی کوئی بات نہیں کی۔ میں نے چھُپ کر اُن کے درمیان ہونے والی باتیں سُننے کی کوشش بھی کی مگر مجھے کچھ پتہ نہیں چلا۔ میں نے کتنی ہی بار اُس سے پوچھا تھا۔ نرجس! تم اتنی اُداس کیوں رہتی ہو۔ مجھے شبہ ہوتا ہے جیسے تم مجھ سے ناراض ہو۔ کہتی کہ میں تجھ سے کیسے ناراض ہوسکتی ہوں۔ میں اُسے سمجھاتی تھی کہ جو بچھڑ گئے یا جو چھُوٹ گیا کیا وہ واپس آسکتا ہے؟ میں نے طرح طرح اُس کا دھیان بٹانا اُسے خوش رکھنا چاہا۔ میری بات سُن کے کبھی کبھی وہ مسکرانے لگتی۔ کہتی "زہرہ! میں شروع سے بدنصیب ہوں۔ میں چاہتی تھی کہ اُس کی زبان کھُل جائے۔ شاید اس سے اُس کے دل کا بوجھ ہلکا ہوجائے۔ ایک بار میں جان بوجھ کے اُس سے رُوٹھ گئی۔ وہ مجھے منانے آئی تو میں اور رُوٹھ گئی۔ میں نے کہا۔ تم مجھے غیر سمجھتی ہو، اپنی بہن نہیں سمجھتیں، مجھ سے کچھ چھپاتی ہو، تمھیں یہ بھی خیال نہیں آتا کہ تمھیں یوں دیکھ کے میرا دل بھی تو اُداس ہوجاتا ہوگا۔ تم مجھ سے کچھ کہو گی تو کیا میں اُسے اپنے پاس محفوظ نہیں رکھوں گی؟ وہ رونے لگی اور بولی، تجھے کیا بتاؤں کوئی ایسی بات ہی نہیں ہے اور جو تو سُنے گی تو ڈر جائے گی۔ میں تجھے کھونا نہیں چاہتی۔ مجھے یہاں رہنے دے۔ وہ مجھے منانے کے لیے میری منتیں کرنے لگی اور جب میں نہیں مانی تو اپنے گھر چلی گئی۔ مجھ سے ایک لمحے بھی نہیں ٹھہرا گیا۔ وہ میرے گلے لگ کے پھوٹ پھوٹ کے روتی رہی۔ مجھے اپنے آپ پر بہت غصّہ آیا کہ میں نے اُس کا دل کیوں

دکھایا۔ مجھے معلوم تھا کہ ذرا سی بات پر اُس کے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے۔ ذرا سی بات پر اُس کی آنکھیں بھر آتی ہیں۔"

زہرہ کورا کا ذکر کررہی تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے اور رگوں میں چنگاریاں سی چٹخ رہی تھیں۔ "شاید تمھارے علم میں ہو، بڑے صاحب نے مولوی صاحب سے ارشد میاں کی بات کی تھی، اس بارے میں تمھاری اُس سے کوئی بات نہیں ہوئی؟"

"ہاں ہوئی تھی۔" وہ چونک کے بولی۔ "میں نے اُس سے پوچھا تمھارا کیا ارادہ ہے۔ کہنے لگی، میں کبھی شادی نہیں کروں گی۔"

"تم نے اِس کا سبب نہیں پوچھا؟"

"پوچھا تھا۔ اُس نے کوئی خاص جواب نہیں دیا۔ کہتی تھی کیا شادی کے بغیر لڑکیاں نہیں رہ سکتیں۔"

"پھر تم نے کیا کہا؟"

"میں نے کہا کہ اگر بڑے ابا آمادہ ہوجائیں تو تم کیا کرو گی۔ بولی، وہ نہیں ہوں گے۔ میں نے کہا، فرض کرو اگر وہ راضی ہوگئے تو انکار کرو گی۔ کہنے لگی، مجھ سے پوچھے بغیر وہ ایسا نہیں کریں گے اور اگر انھوں نے کہا تو انھیں منع کردوں گی۔ میں نے کہا، تم اُن کے سامنے زبان کھولو گی؟ بولی، ہاں، اگر ضرورت پڑی تو مجھے یہی کرنا ہوگا۔ پھر میں نے کہا، نرجس ارشد بھائی پڑھے لکھے ہیں۔ ہزاروں میں ایک ہیں اور اُن کی خواہش بھی یہی ہے... تم سے... میں نے ارشد بھائی کے متعلق اُس سے بہت کہا کہ اس طرح تم میرے قریب ہی رہو گی، میرے گھر، میری بھابی۔ اُس نے جواب دیا۔ ارشد بھائی بہت اچھے آدمی ہیں مگر مجھے شادی نہیں کرنی۔ پھر بولی اور پھر تو بھی تو یہاں نہیں رہے گی، کہیں چلی جائے گی تو کیا... خود چلی گئی۔" زہرہ کی آواز پھٹنے لگی۔

میں نے اپنے آپ کو بہت روک کے رکھا تھا۔ زہرہ رو رہی تھی، میں اُس کے سامنے رو بھی نہیں سکتا تھا۔ اچھا ہوا اُس نے نظریں اُٹھا کر میری طرف نہیں دیکھا، میرا سینہ کٹ سا رہا تھا۔ پھر مجھ میں اُس سے کچھ اور پوچھنے کی ہمت نہیں پڑی اور زہرہ کو شاید کچھ اور معلوم بھی نہیں تھا۔ درمیان میں کئی بار شبہ ہوا تھا کہ زہرہ مجھے کچھ بتانے سے گریز کررہی ہے لیکن وہ بتانے کی کوشش کرتی تو صاف پتہ چل جاتا۔ وہ تو بُری طرح سِسکیاں بھر رہی تھی۔ میں اپنے بستر سے اُٹھ کے اُس کی کرسی تک پہنچ گیا۔ میرے جی میں آیا کہ اُسے اُٹھا کے اپنے سینے میں بھینچ لوں اور کہوں کہ تم اتنا کیوں رو رہی ہو، میری طرف دیکھو۔ میرے ہاتھ اُٹھتے کے اُٹھتے رہ گئے۔ میری زبان سے بھی اُسے دلاسا دینے کے لیے ایک لفظ نہیں پھوٹا اور میں اُسے کیا دلاسا دیتا، بستر پر بیٹھ گیا اور اُس کی صورت دیکھتا رہا، وہ بھی وہیں بیٹھی رہی۔ نہ جانے کب تک خانم اُسے ڈھونڈتی ہوئی اِدھر آنکلی۔ اُسے دیکھ کے زہرہ گھبرا سی گئی۔ دروازہ بند نہیں تھا۔ خانم سیدھی اندر چلی آئی۔ "اے تم یہاں ہو؟" وہ ہانپتے ہوئے

زہرہ کے جواب دینے سے پہلے میں نے آہستگی سے کہا۔ "آپی! میں نے روک لیا تھا۔ مجھے کچھ معلوم کرنا تھا۔"

"میں پریشان ہوگئی تھی۔ نرگس کے کمرے میں دیکھا تو یہ وہاں بھی نہیں۔ اتفاق سے سلمہ کی آنکھ کھل گئی۔ میں بیچ کا دروازہ اسی لیے کھلا رکھتی ہوں کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو میں سامنے موجود رہوں۔ سلمہ بھاگی بھاگی میرے ہی پاس آئی کہ باجی کمرے میں نہیں ہیں۔ میں نے کہا، تم ٹھہرو، دیکھ کے آتی ہوں۔ نرگس کے پاس ہی ہوں گی۔ ٹھیک ہے، اب مجھے اطمینان ہوگیا۔"

"بیٹھیے آپی!" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"میں بھی چلتی ہوں۔" زہرہ گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔

"تم جاؤ، تو بیٹھو۔" خانم کے چہرے پر شگفتگی بکھر گئی۔ "سلمہ کو میرا انتظار ہوگا۔"

"بس باتیں نکل آئیں آپی اور خیال ہی نہیں رہا۔"

"باتوں کا تو یہی ہوتا ہے۔" خانم مسکرا کے بولی۔ اُس نے زہرہ کو اپنے بازو میں لپیٹ لیا۔ "زہرہ بہت پیاری ہے۔ پیاری پیاری باتیں کرتی ہے۔"

زہرہ یکایک خانم کے سینے پر سر رکھ کے بلکنے لگی۔

"اے! یہ کیا؟" خانم نے بے قرار نظروں سے میری جانب دیکھا۔ "کیا تم نے کچھ کہہ دیا ہے بابر میاں؟"

"نہیں آپی! میں نے کچھ نہیں کہا۔ اِن کے گھر کی بات ہورہی تھی۔"

"اوہ زہرہ! تم تو بہت صبر کی لڑکی ہو۔ یہ بچّوں کی طرح آنکھیں کیوں بھر لیں؟" خانم اُس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے شفقت کے لہجے میں بولی۔ "آؤ، میرے ساتھ چلو۔" وہ مجھ سے مخاطب ہو کے اجازت لینے لگی۔ "بابر! میں اسے اپنے ساتھ لیے جارہی ہوں۔"

میں نے کچھ نہیں کہا۔ میری آواز حلق میں اٹک گئی تھی۔

خانم جاتے جاتے دروازہ بھیڑ گئی تھی۔ روشنی گُل کرکے میں نے مسہری پر سونے کی کوشش کی لیکن ایک پَل کے لیے نیند نہیں آئی۔ کمرے میں ہر سُو اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میری آنکھوں میں روشنی نہیں رہی ہے اور کمرے کی دیواریں مجھ پر گرنے والی ہیں۔ میں نے کمرہ دوبارہ روشن کرنے کے لیے اُٹھنے کا ارادہ کیا مگر میرا سارا جسم تو ٹھنڈا سا بن گیا تھا۔ ساری رات زہرہ کی باتیں میرے کانوں میں گونجتی رہیں۔

زہرہ نے کوئی نئی بات نہیں بتائی تھی۔ وہی کچھ بتایا تھا جو میں نے سوچا تھا۔ جو میں پہلے سے جانتا تھا۔ منیر علی کے ملنے سے بھی پہلے، جلیسر جانے سے بھی پہلے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کہیں بھی چلی جائے، سات سمندر پار سہی، صدیاں بیت جائیں مگر وہ کورا ہی رہے گی اور میں اُس کے ساتھ رہوں گا۔ منیر علی اور زہرہ نے صرف میرے یقین کی تصدیق کی تھی۔ اُس کے بارے میں اگر مجھے اتنا یقین نہ ہوتا تو آٹھ پہر بھی نہ گزرتے۔ آٹھ سال تو بہت ہوتے

ہیں۔ وہ سب میرے لیے نیا نہیں تھا مگر اُس نے میرے جسم کی ساری طاقت کھینچ لی تھی۔ زہرہ کی ایک ایک بات میرے سینے میں چبھ رہی تھی۔ وہ شاید مجھ پر ماتم کرنے آئی تھی۔ وہ کورا کے لیے رو رہی تھی مگر اُس کا رونا دراصل میرے لیے تھا کہ میں کس اطمینان سے یہاں بیٹھا ہوں۔ وہ مجھے طعنہ دینے آئی تھی اور اصل میں وہ کورا ہی تھی جو اپنی سہیلی زہرہ کی شکل، اُس کی زبان میں اپنا حال بیان کرنے آئی تھی۔

ساری رات مجھ پر سکتہ سا طاری رہا۔ صبح نیساں ناشتے کے لیے بلانے آئی تو مجھ سے چلا نہیں گیا۔ میں صحن تک جا کے لوٹ آیا۔ نیساں میرا ناشتہ کمرے ہی میں لے آئی۔ نیساں کے اصرار پر میں نے چند لقمے زہر مار کرلیے اور اُس کے جاتے ہی حویلی سے نکل گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ جا کے سب کو بتائے گی اور پھر سبھی مجھے پوچھنے آئیں گے۔ مجھے اپنے آپ سے گھن آرہی تھی۔ ڈیڑھ مہینہ یہاں آئے ہوئے ہوگیا تھا۔ میں حجرو کے اڈّے پر تماش بینی کرتا اور لائبریری میں بیٹھا قصّے کہانیاں پڑھتا رہا تھا۔ جیسے مجھے کوئی اور کام نہیں تھا۔ سب کچھ نمٹ چکا تھا بلکہ مجھے راستوں کے پھیلاؤ اور اپنے سمٹاؤ کا شدّت سے احساس ہوگیا تھا۔ میری آنکھیں ایک فاصلے ہی تک دیکھ سکتی تھیں اور راستے حدِ نظر کے پار تک جاتے تھے۔ میرے پاؤں ایک وقت میں ایک ہی گلی میں دوڑ سکتے تھے۔ کیا یہ وہی احساس تھا کہ اب مجھے باہر نکلتے ہوئے خوف آتا تھا۔ میں اِس گلی سے جاؤں گا تو وہ کہیں اُس گلی سے نہ نکل جائے۔ میں سامنے کی طرف دیکھتا رہ جاؤں اور وہ پُشت ہی سے راستہ نہ بدل دے۔ اسی میں وقت گزر جائے گا اور کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ پھر ایک وقت ایسا آئے گا کہ راستے سجھائی دینا مشکل ہوجائے گا مگر ایسا نہیں تھا۔ اگر وہ کسی ملجے نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی تو میں اپنے آپ سے اوجھل ہوگیا ہوں گا۔

میرا خیال تھا کہ یہاں آنے کے کچھ دنوں بعد بھَل خود مجھ سے کہے گا۔ اُس کا چند دنوں تک یہاں ٹھہرے رہنا ضروری تھا اسی لیے میں نے اُس پر زور نہیں دیا لیکن بھَل یہاں آ کے مردانے میں بیٹھا حقّہ گڑگڑا رہا تھا اور اُسے کوئی خبر ہی نہیں تھی۔ گھر سے تو میں خود بھی کسی وقت نکل جاتا۔ فوراً نہیں تو پندرہ دن بعد، ایک مہینے بعد سہی مجھے اتنے دن نہیں لگتے۔ اتنے دن صرف بھَل کے انتظار میں لگے کیونکہ وہ راستے مجھ سے زیادہ پہچانتا تھا۔ وہ نہ ہوتا تو میں شاید کورا کے گھر تک نہ پہنچ پاتا۔ میں تو اُسی وقت چلنے کو کہہ رہا تھا جب منیر علی نے یہ کہہ کے بات ختم کردی تھی کہ مولوی صاحب سات مہینے پہلے اچانک ایک رات غائب ہوگئے۔ بھَل نے وہیں ٹھہرنے پر اصرار کیا یہاں تک کہ منیر علی کی زبان پر لانا مہتاب کا نام آگیا۔ بھَل کو اپنے ساتھ لے جانے کی وجہ سے مجھے بھی خاموش رہنا پڑا۔ اتنے عرصے کی دوڑ دھوپ کے بعد اب راستوں پر پہلے سے نشان لگانا ٹھیک معلوم ہوتا تھا اور یہ کام بھَل مجھ سے بہتر جانتا تھا اور اُس کی آنکھوں میں میری طرح بار بار اندھیرا نہیں چھا جاتا تھا۔ یہ جھجک تھی تو وقت کو یوں

گنوا دینے کے اندیشے کے سبب سے تھی۔ یہ انجام کا خوف نہیں تھا بلکہ وقت کو صحیح طور پر صرف کرنے کا خیال تھا۔ اس کے بعد چاہے کچھ ہو وقت گزر جائے اور کچھ نہ ملے۔ نہ ملے لیکن پھر وقت اکارت کر دینے کا پچھتاوا تو نہیں رہے گا۔ میرا وقت اسی کا وقت اور میرا انجام اسی کا انجام تھا۔ اپنے لیے نہیں تو مجھے اس کے لیے پھونک پھونک کے قدم اٹھانا چاہیے تھا۔

مجھے کم از کم اتنا تو معلوم ہو چکا تھا کہ وہ کسی چھت کے نیچے بلاؤں سے دور رہی ہے اور یہاں تک بھی کہ مولوی صاحب اسے رانا تہتاب کے پنجے سے بچا لے جانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ وہ اس کے ساتھ ہی تھے اور انھیں پھر اسے دنیا کی نظروں سے چھپانے کے لیے کوئی چھت کوئی دیوار میسر آ گئی ہوگی مگر اسے میرے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ اس کے اِرد گِرد تو اندھیرا ہی اندھیرا ہوگا۔ مولوی صاحب نے اس سے ایک ہی بات کہی ہوگی کہ میں جیل سے فرار ہو گیا ہوں اور کبھی نہ کبھی ضرور مل جاؤں گا۔ وہ مجھے ڈھونڈ رہے ہیں، میں بھی اسے ڈھونڈ رہا ہوں گا۔ وہ اسے یہ امید دلائے بغیر زندہ نہیں رکھ سکتے تھے لیکن مولوی صاحب کب تک اسے یہ دلاسا دیتے رہیں گے اور میری تلاش اس لیے نہیں کریں گے کہ اب میرا سایہ بھی اس پر نہیں پڑنا چاہیے۔ پھر مولوی صاحب اس پر ظلم کر رہے تھے ورنہ مجھے تلاش کرنا ان کے لیے کوئی ایسا مشکل نہیں تھا۔ جیل میں انھیں آسانی سے معلوم ہو جاتا کہ میں کہاں مل سکتا ہوں۔ اڈے کے آدمی ہمیشہ وہاں موجود رہتے تھے مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔

سڑکوں پر جگہ جگہ جمرو کے ساتھی مل جاتے تھے۔ حویلی کے عقب سے کھیتوں کھیتوں گزرتا ہوا میں شہر سے دور نکل آیا اور سارا دن ایک باغ میں پڑا رہا۔ باغ کا چوکی دار ایک مہربان آدمی تھا۔ اس نے مجھے برا بھلا نہیں کہا بلکہ اپنی کھاٹ میرے لیے چھوڑ دی۔ وہاں بہت سکون تھا لیکن میرا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ شام ہو گئی اور ہر طرف سناٹا چھا گیا تو حویلی میں واپس جانے کے بجائے میں نے وہیں سے اسٹیشن جانے کا ارادہ کیا لیکن پھر یہ سوچ کے میں حویلی ہی کی جانب مڑ گیا کہ اگر اس نے اور دیر کی تو میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ اس نے حیل و حجت کی تو پھر میں خود کہیں کسی طرف نکل جاؤں گا۔ میں نے جیسلمیر میں اس سے وعدہ کیا تھا کہ اسے مطلع کیے بغیر کہیں نہیں جاؤں گا۔ اس سے کہہ دینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ شاید وہ اسی انتظار میں ہو اور اس نے سمجھا ہو کہ میں خود کہیں جانا نہیں چاہتا، لائبریری میں بھری ہوئی کتابوں میں میرا جی لگ گیا ہے، نیساں کے ہاتھ کے کھانے میرے منہ کو لگ گئے ہیں، مجھے نہیں چھیڑنا چاہیے۔

حویلی تک پہنچتے پہنچتے رات گہری ہو گئی تھی۔ چوکی دار نے دروازے ہی پر مجھے بتا دیا تھا کہ بجھل کئی بار مجھے پوچھ چکا ہے۔ میں مردانے میں پہنچا تو جمرو کے اڈے کے بہت سے آدمی وہاں موجود تھے۔ کپتن خاں اور جمرو بجھل کے ساتھ چوکی پر دائیں بائیں بیٹھے ہوئے تھے۔ اڈے کا ایک آدمی مرلیا چائے کی پیالیاں تقسیم کر رہا تھا۔ مرلیا مرلی بجانے میں ماہر تھا اس کا نام مرلیا پڑ گیا تھا۔ مردانے میں شور گونجا ہوا تھا۔ وہ سب ا تھے کہ انھیں میرے اندر داخل ہونے کی خبر نہیں ہوئی۔ میں چپکے کونے میں دیوار سے لگ کے بیٹھ گیا۔ کپتن خاں اور جمرو میں کسی ع بابت جھگڑا ہو رہا تھا۔ مجھے یہ سن کے حیرت ہوئی کہ دو تین ماہ پہلے سے روشن نامی ایک طوائف کو بھگا کے لے آیا ہے اور اس نے میں اسے ایک علیحدہ گھر لے کے دیا ہے جہاں وہ ہر دوسرے تیسرے جاتا اور گھر کا سارا خرچہ اپنی جیب سے اٹھاتا ہے۔ کپتن خاں بجھل کر رہا تھا کہ اس لڑکی کو لکھنؤ واپس کر دیا جائے کیونکہ اس کا تعلق کے علاقے سے نہیں ہے اور علاقے کے تمام لوگوں کو پتہ چل گیا روشن کو کون لے گیا ہے۔ وہ ابھی تک انھیں روکے ہوئے ہے لیکن واپس نہیں گئی تو وہ اس کے علاقے سے لڑکیاں اٹھانے کی کوشش اور خون خرابہ ہو جائے گا۔ بجھل ان دونوں کی باتیں سر ہلائے بغیر سن رہا تھا۔ حقے کی نے اس کے منہ میں دبی ہوئی تھی۔ درمیان میں زور سے بول اٹھتے تھے جن میں سے کچھ جمرو کی ہم نوائی کر رہے کپتن خاں کی۔ کچھ خاموش بیٹھے بجھل کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ وہ ہو جاتے تو بجھل انھیں جھڑک دیتا۔ چائے تقسیم کرتے ہوئے مرلیا آیا تو ایک دم چلا اٹھا: "استاد! لاڈلے بابو تو ادھر بیٹھے ہیں"۔

مردانے میں ایک لمحے کے لیے سکوت ہو گیا۔ سب کی نگاہ مرکوز ہو گئی تھیں۔ "لاڈلے!" بجھل چونک سا گیا۔ اونچی آواز میں بو "آیا رے؟ اُدھر کیوں بیٹھا ہے؟" دوسرے ہی لمحے کپتن خاں لپکتا پاس آ گیا اور مجھے اٹھا کے چوکی پر لے گیا۔ "کدھر اڑ گیا تھا؟" بجھل نے تنک کے پوچھا۔

"کہیں نہیں تھا۔" میں نے تلخی سے جواب دیا۔

اس نے جھٹکے سے میری ٹھوڑی پکڑ کے ایک نظر مجھے گھ اور کپتن خان کو اشارہ کیا کہ وہ اپنی بات جاری رکھے۔ کپتن خاں کے پہلے جیسا زور نہیں رہا تھا۔ وہ دبے لہجے میں اپنی بات دہرا رہا چاہے تو وہ اس کے لیے ایک سے ایک حسین لڑکی فراہم کر سکتا کو وہ لڑکی واپس کر دینی چاہیے پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اس سودا کر کے اسے دوبارہ جمرو کے حوالے کر دے۔ جمرو نے جواب میں ہی تھی کہ بجھل نے ہاتھ اٹھا کے انھیں خاموش کر دیا۔ "کل دیکھیں نے ترشی سے کہا۔ ان لوگوں نے گفتگو کا موضوع تو بدل دیا مگ اٹھے نہیں۔ وہ بجھل کو اڈے لے جانے آئے تھے۔ کپتن خاں خاص بجھل کو سنوانے کے لیے ایک طوائف بلوائی تھی اور آج رات ا ناچ گانے کی محفل جمنے والی تھی۔ وہ بجھل کو دفعے دفعے سے ٹوک کہ وقت زیادہ ہو گیا ہے۔ بجھل کا شاید پہلے سے جانے کا ارادہ ہو

آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہ ان کے ساتھ گیا یا نہیں۔ وہاں سے اٹھ کے چلا آیا۔ بجھل نے مجھے روکا بھی نہیں تھا۔

دالان اور صحن میں روشنی ہو رہی تھی۔ زنان خانے کے تمام کمروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ کونے کے پہلے کمرے میں جہاں گیر میز پر جھکا ہوا کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس کے برابر ہی دوسری میز پر ارشد بیٹھا تھا۔ میں خانم کے کمرے کے سامنے سے گزرا تو نیساں کے تیز تیز بولنے کی آواز آئی۔ غالباً وہ بھی وہاں موجود تھے۔ میں نے سوچا، زریں کی خیریت معلوم کر لوں مگر میں آہستہ قدموں سے چلتا ہوا اپنے کمرے میں آ کے لیٹ گیا۔ اس موقع پر بجھل سے کچھ کہنا ٹھیک نہیں تھا اور ویسے بھی ٹھیک نہیں تھا۔ اتنے دنوں میں بجھل کے چہرے پر بحالی آ گئی تھی۔ یہاں بہت سے لوگ موجود تھے۔ حویلی کے علاوہ جمرو کے اڈے کے آدمی بھی۔ کپتن خاں بھی کبھی کبھی لکھنؤ سے آ جاتا تھا۔ زریں ہر وقت اس کا خیال رکھتی تھی۔ نیساں اس کا سر دبانے کا بہانہ کر کے اس کے پاس آ جاتی تھی۔ وہ جہاں گیر سے پنجہ لڑاتا تھا اور جب جہاں گیر اس کا مروڑ دیتا تھا تو وہ خوب قہقہے لگاتا تھا۔ ارشد جب دیکھو اسی کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ میرے ساتھ کیا تھا۔ ایک بستی سے دوسری بستی، ایک شہر سے شہر، دن بھر بھوکے رہنا، رات کو تھک کے کسی سرائے یا ہوٹل میں پڑ جانا۔ دن پھر لوگوں سے فقیروں کی طرح سوال کرنا۔ اجنبی جگہوں پر لوگ مشکوک نظروں سے دیکھتے تھے۔ کوئی کچھ سمجھتا تھا کوئی کچھ۔ بجھل کو یہ سب بھگتنے کی کیا ضرورت تھی۔ میری وجہ سے! لیکن جب وہ میرا خیال رکھتا تھا تو مجھے بھی اس کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔

میں نے بستر سے اٹھ کے دروازہ بند کر دیا اور کمرے کی تلاشی لی۔ مجھے وہاں اپنے مطلب کا کوئی تھیلا نہیں ملا۔ میں نے ایک چادر میں اپنے چند جوڑی کپڑے لپیٹ لیے۔ چیک بک اور بینک کے سارے کاغذات لی کے لفافے میں بند کر کے میں نے الماری میں ڈال دیے تھے۔ انھیں نکال کے میں نے صدری کی اندرونی جیب میں ڈال لیا۔ نقد رقم میرے پاس چند ہی روپے تھے جو اس روز بازار سے خریداری کے بعد بچ گئے تھے۔ یہ رقم بہت کم تھی مگر گھر کے کسی شخص سے مانگنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اسی پر قناعت کی۔ کرشنا جی کے روپے خرچ کرنے کے سوا کوئی صورت نہیں تھی۔ وہ انھوں نے بہرحال میرے ہی لیے چھوڑے تھے تاہم میں نے انھیں اپنے ذہن میں قرض سمجھا۔ کرشنا جی ہوتے اور میں ان سے مانگتا تو وہ میری جیب میں بہت سے روپے ٹھونس دیتے۔ جو روپے میرے پاس تھے اُن سے میں پانچ سو میل دور جا سکتا تھا۔ وہاں کسی بینک میں چیک داخل کرنے کے بعد تین چار دن انتظار کرنا پڑتا۔ پھر روپوں کی کمی نہ ہوتی۔ بجھل کے ساتھ سفر کرنے سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ سفر میں پیسے وافر ہونا کس قدر ضروری ہے۔ اس سے میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ جگھوں پر جا سکتا تھا۔

چادر کی گٹھڑی مسہری کے نیچے ڈال کے میں نے دروازہ کھول دیا۔ کوئی بھی مجھے دیکھنے آ سکتا تھا۔ زریں کے آنے کا امکان سب سے زیادہ تھا لیکن وہ نہیں آئی۔ شاید اس کی طبیعت ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ خاصی دیر بعد خانم کی آواز سنائی دی۔ اس نے مجھ سے کھانے کے لیے پوچھا۔ میں نے انکار کر دیا۔ وہ آ کے میرے سرہانے بیٹھ گئی اور جب تک اس نے میری کلائی اور پیشانی چھو کے اطمینان نہیں کر لیا، وہاں سے نہیں اٹھی۔ اس نے دودھ کا گلاس میز پر رکھ دیا تھا اور چلتے چلتے مجھے ہدایت کر گئی تھی کہ میں اسے پی کر ہی سوؤں۔ صبح تک میں جاگتا رہا اور اس درمیان میں میں نے گٹھڑی کھول کے کپڑے دوبارہ بکس میں رکھ دیے۔ گٹھڑی ساتھ لے جانے سے چوکی دار کو شبہ ہو جاتا۔

جس وقت میں اسٹیشن پہ پہنچا، اُجالا نہیں ہوا تھا۔ کھڑکی پر پوچھنے سے معلوم ہوا کہ پہلی گاڑی سات بجے کے قریب لکھنؤ کی طرف جائے گی۔ سات بجنے میں ابھی بہت دیر تھی۔ فیض آباد سے لکھنؤ کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ مجھے اپنی سمت کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ پہلی گاڑی لکھنؤ جا رہی تھی اس لیے میں نے وہیں کا ٹکٹ خرید لیا۔ فیض آباد سے میں جتنی دور ہو جاتا اتنا ہی اچھا تھا۔ بجھل کے ساتھ جنوبی اور وسطی ہند کے بہت سے علاقے میں نے دیکھ لیے تھے لیکن مراد آباد سے دور دراز کے علاقوں میں ابھی بہت سی جگہیں باقی رہ گئی تھیں۔ رات کو میں نے سوچا تھا کہ امرتسر سے اوپر پہاڑوں کی طرف نکل جاؤں گا مگر اسٹیشن پر آتے ہی مجھے اختلاج ہونے لگا تھا۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ بجھل کا چہرہ بار بار نظروں میں گھوم جاتا تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے جہاں گیر، نیساں، خانم، زریں، زہرہ وغیرہ حویلی کے سارے لوگ کہیں چھپے ہوئے مجھے دیکھ رہے ہیں۔ گاڑی آئی اور چلی گئی۔ میں بنچ پر بیٹھا مسافروں کو اترتے چڑھتے دیکھتا رہا۔

جب میں نے حویلی میں قدم رکھا تو دھوپ خوب نکل آئی تھی۔ بجھل مردانے میں ارشد کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ "لاڈلے!" میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے بھاری آواز میں کہا۔ "کہیں چلنے کا ارادہ نہیں ہے؟"

"کہاں؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"کیا اِدھر ہی بیٹھا رہے گا رے؟"

"بیٹھے تو تم ہو۔" میری آواز بھرّانے لگی۔

"بٹیا سے میں نے بول دیا ہے۔"

"کیا بول دیا ہے؟"

"چلنے کا۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کے بولا۔

"مگر کہاں؟ کہاں جاؤ گے؟" میں نے بوکھلا کے پوچھا۔

"پہلے کلکتے دو چار روز کے لیے چلیں گے۔"

"پھر؟"

"پھر کہیں اور نکل جائیں گے رے۔" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولا۔
مجھے یقین نہیں آیا، تجھل نے مجھے یقین دلانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ وہ ارشد کے ساتھ زنان خانے میں چلا گیا۔ جمرو کے اڈے کے لوگ جب آنا شروع ہوئے تو اُن کی زبانی پتہ چلا کہ تجھل آج ہی رات کلکتے جا رہا ہے۔ صرف ایک دن درمیان میں تھا۔ میں پھر اندر نہیں گیا۔ دن بھر مردانے ہی میں رہا لیکن جاتے وقت وہ سب لوگ سامنے تھے۔ سب کی آنکھیں لبریز تھیں۔ میں تجھل سے پہلے حویلی سے باہر آ گیا۔ جہاں گیر، ارشد اور منیر علی اسٹیشن تک ہمیں چھوڑنے آئے۔ جمرو کے اڈے کے تمام آدمی وہاں موجود تھے۔ کبن خاں اور منن ڈبے سے نہیں اُترے گاڑی چلی تو مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ وہ دونوں بھی ہمارے ساتھ کلکتے جا رہے ہیں۔

دوسرے دن دوپہر کو گاڑی ہاوڑا اسٹیشن پر ٹھہری تو ایک ہجوم نے ہمارا ڈبا گھیر لیا۔ جامو، کانتے، نصیب میاں، شولی، لالہ وغیرہ لیکن اُن کے ساتھ اور بھی بہت سے لوگ تھے۔ اُنھیں دیکھ کے میری آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔ وہاں پیرو، ماچھی، زورا، چھیدا اور ماسٹر مارٹی بھی تھے۔ مارٹی لوگوں کے اُوپر سے کودتا ہوا آ کے میرے گلے سے لپٹ گیا۔ ٹڈے نے زور سے میری ٹانگیں جکڑ لیں۔

"مارٹی!" میں نے اُسے جھنجوڑتے ہوئے پوچھا "تم یہاں کیسے آ گئے؟"

"اپن کو ادھر استاد کا میسج ملا، اُو در ٹکٹ کٹایا، پر پھر بھی سالا دیری ہو گیا۔"

"استاد کا میسج!" میری آواز سن سنانے لگی۔

"تم کو نہیں معلوم راجا!" وہ حیرانی سے بولا "اُو در تجھل دادا نے پیرو دادا کو میسج بھیجا تھا کہ ایک دم کلکتہ پہنچو۔"

"تجھل بھائی نے بھیجا تھا؟"

"ہاں! اُسی نے، اُس نے لکھا تھا کہ سب اگلا پچھلا گناہ معاف کرا کے آنا۔ ادھر تین چار مہینہ لگ سکتا ہے۔ اپن کو اُو در پاڑوں کے ایڈجسٹ منٹ میں دیری ہوا۔ دھندا بہت پھیل گیا ہے کنگ . . . ."

میں نے چبھتی نظروں سے تجھل کو دیکھا، وہ پیرو کا سینہ ٹھونکتے ہوئے کہہ رہا تھا "دادا! دم تازی کر کے آئے ہو؟ ابھی اُو پر دُور پہاڑوں پر چلنا ہے۔"

"نرکھ میں چل تجھل بھائی!" پیرو دہاڑتے ہوئے بولا۔

تجھل کی بات پر میرے کان کھڑے ہوئے۔ پیرو دادا سے وہ کیا کہہ رہا ہے؟ دُور پہاڑوں پر چلنے سے اُس کی کیا مراد ہے؟ لیکن اتنے میں کانتے نے مارٹی سے مجھے چھین لیا اور اتنی زور سے بھینچا کہ میری سانس رُکنے لگی۔ "لاڈلے! کدھر کھو گیا تھا جانی!" وہ میری گردن اور دونوں گال چومتے ہوئے کہنے لگا۔ "کانتے کو بھول گیا!"

"نہیں کانتے!" میں نے اُسے دبوچتے ہوئے کہا۔

"رفنڈا کیسے سے پوچھنا تھا، اپنے جانی کا کوئی خط پتر آیا؟"

"فرصت ہی نہیں ملی کانتے!"

"فرصت کی مت بول، بول دھیان ہی نہیں آیا۔"

"نہیں کانتے!" میری آواز بھرا گئی۔

"اب کیسا ہے تو؟"

"میں ٹھیک ہوں۔"

"کیا ٹھیک ہے، پہلے سے جان آدھی کر کے آیا ہے۔"

جامو نے مجھے جواب دینے کا موقع نہیں دیا، اُس نے کانتے کو گردن سے پکڑ کے مجھ سے جدا کر دیا اور میرے گلے سے لگ گیا۔ ٹڈا میری ٹانگوں سے چپکا ہوا تھا۔ اسٹیشن پر کلکتے کے اڈوں کے بہت لوگ موجود تھے۔ ڈبے کے سامنے اُن کی ایک بھیڑ لگی ہوئی تھی اور اُس نے پلیٹ فارم پر مسافروں کا راستہ روک رکھا تھا۔ جامو ابھی مجھ سے لپٹا ہی رہا تھا کہ زورا اور چھیدا نے مجھے اپنے اپنے بازوؤں میں چھپا لیا۔ برس نہیں گزرے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُنھوں نے مجھے کئی برسوں بعد دیکھا ہو۔ ماچھی، شولی، سارٹے، لالہ، نصیب میاں، کاکا، وہ کبھی تجھل کے پاس جاتے، کبھی میرے پاس آتے۔ منن اور کبن خاں کو اُنھوں نے گھیر لیا تھا۔ اُن کی چیخیں اور نعرے سن کے بہت سے مسافر اطراف اکٹھے ہو گئے تھے۔ جب پیرو میری طرف بڑھا تو سب نے اُس کے لیے جگہ چھوڑ دی۔ "لاڈلا! لاڈلا!" اُس نے دہاڑتے ہوئے مجھے سے پکڑ کے اُوپر اُٹھا لیا اور ناچنے لگا۔ "استاد! استاد! تجھل بھائی!" وہ تجھل کو مخاطب کر کے بولا "لاڈلا اپن کا ہے۔"

"تمہارا ہے پیرو دادا! تمہارا ہے۔" تجھل نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"ابھی اپن ادھر سے اس کو پارسل کر کے لے جائیں گا۔"

وہ سب قہقہے لگانے لگے۔ جیسے ہی پیرو نے مجھے اُوپر اُچھال کر اپنے بازو چھوڑے، میں جھپٹ کے نصیب میاں کے پاس پہنچا۔ وہ نزدیک آنے کی دیر سے کوشش کر رہا تھا۔ نصیب میاں سفید شیروانی میں ملبوس تھے، سر پہ دوپلی ٹوپی تھی، رنگ کھلا ہوا تھا لیکن عمر میں پہلے سے زیادہ کے معلوم ہوتے تھے۔ "نصیب میاں!" میں نے اُسے سینے سے

"بالم! اتنی دیر لگا دی۔" وہ اُداسی سے بولا۔

"ہاں! کچھ دیر ہی ہو گئی۔"

"دل کو کسی ٹھکانے پہ لگا دو نوشہ!"

"نصیب میاں!" میں نے اُس کی گردن میں منہ چھپا لیا۔

"بدنصیب سچ کہتا ہے۔" وہ مجھے گدگداتے ہوئے بولا "تم نے تل نہیں لگایا اِیں؟"

"کیسا تل نصیب میاں؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"بھول گئے! سجنا! کہا تھا کالا تل لگا کے پردے سے نکلا کرو۔"

[...]ہیں خاک لیکن بزرگوں سے سنتے آئے ہیں کہ نظر کا وار چاقو کے وار [سے] زیادہ تیز ہوتا ہے۔" مجھے شرم سی آ گئی۔ "ہائے سبحان اللہ۔ رخساروں پر [کیا] چمک ہے۔" اُس نے اُچک کے میری ٹھوڑی چوم لی۔

تجھل کو قریب دیکھتے ہی نصیب میاں اُس کے گلے سے لگ [گئے۔ "بھ]یا! ایسا اندھیر کہیں ہوتا ہے۔" وہ روہانسی آواز میں بولا "ہمارے [لی]ے بس دیواریں چھوڑ گئے تھے۔"

تجھل نے اپنا ہار اُس کی گردن میں ڈال دیا اور اُسے زور سے [جک]ڑ لیا۔

گاڑی آئے ہوئے نہ جانے کتنی دیر ہو گئی تھی۔ پلیٹ فارم [مس]افروں سے خالی ہو گیا تھا۔ تجھل نصیب میاں کو لے کے آگے بڑھ گیا [اور س]ب اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ گیٹ پر ٹی ٹی ہاتھ بڑھا کے رہ [گئ]ے۔ باہر بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں جن میں زیادہ تر ٹیکسیاں تھیں اُنھوں []نے شاید مسافروں کو بٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔ اسٹیشن سے اڈا دُور تھا۔ [س]ڑکوں پر آگے پیچھے گاڑیوں کی ایک قطار لگ گئی تھی۔ ایک ایک گاڑی میں [چھ]چھ سات سات آدمی ٹھنسے ہوئے تھے۔ ٹڈا میری گود میں آ کے دبک گیا تھا۔ [ایک] طرف مارٹی، دوسری طرف کانتے میرے شانوں سے چپکے ہوئے تھے۔ [اڈ]ے کی گلی کے نکڑ پر بہت سی گاڑیاں رُک گئیں۔ صرف چند ہی اڈے کی [عم]ارت کے سامنے آ کے ٹھہریں، اُن میں میں، تجھل، پیرو اور جامو تھے۔

گلی میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہی دکانیں، وہی مکانات [او]ر چہرے۔ دکانوں میں رونق پہلے سے کچھ زیادہ نظر آتی تھی۔ اڈے کی [عم]ارت کا روغن بھی تازہ تازہ تھا۔ تجھل کو گاڑی سے اُترتے دیکھ کے [گ]لی کے کئی آدمی اُس کی طرف دوڑ پڑے اور دیکھتے دیکھتے گلی میں شور [م]چ گیا۔ تجھل ہر ایک کا نام لے کے اُس کی خیریت پوچھتا رہا۔ اُن میں عورتیں [بھ]ی تھیں، بچے بھی۔ گلی کے ایک بوڑھے پستہ قد آدمی نے آ کے پیچھے سے [تج]ھل کا کُرتا پکڑ لیا اور کہنے لگا "بلو کا دم تمہارے کارن اٹکا ہوا ہے۔"

"کیوں بلو دادا!" تجھل نے پلٹ کے نرمی سے پوچھا۔

"تمہارا انتظار تھا، تمہاری پریا نے ہاتھ پاؤں بہت پھیلا لیے [ہ]یں بیل کی طرح بڑھتی جا رہی ہے۔" بوڑھا پھولی ہوئی سانسوں سے [بو]لا "اُسے کس کے پاس چھوڑ جاتا۔"

"ہمارا بوجھ اُٹھانے سے بھاگتے ہو؟"

"نانا! ایسا مت بولو۔" بوڑھا بلو منہ پر ہاتھ رکھ کے ایسے خوف زدہ لہجے میں بولا جیسے تجھل نے اُسے کڑی گالی دے دی ہو "اب تو اپنے ہاتھ ہی سے آگ دکھا دو استاد!"

"پریا کیسی ہے؟"

"دیکھو گے تو پہچان نہیں پاؤ گے۔"

"پر مجھ کو گئے ہوئے اتنے دن کدھر ہوئے ہیں بلو!"

"پر میں تو ایک ایک دن گن رہا تھا۔"

تجھل نے اُس کا ناتواں جسم دونوں ہاتھوں پر اُٹھا لیا "اب تجھے چلا ہی جانا چاہیے بلو! بدن تو تو نے پہلے ہی راکھ کر لیا ہے۔"

"میں کیا بولتا ہوں۔" بوڑھا بلو سسکنے لگا "اُس نے سارا خون چوس لیا ہے۔ مجھے اب اُسے دیکھ کے ڈر لگتا ہے۔"

"پر اُسے ڈولی میں بٹھا کے جانا۔"

"اب زیادہ ٹیم نہیں ہے، پر تم جلدی کر دگے تو . . . ."

جامو نے تجھل کے اشارے پر بلو کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اُسی لمحے محلے کی ایک موٹی، بھدی اور کالی عورت لُھبی بھیڑ کاٹتی، ہانپتی ہوئی سب سے آگے آ گئی اور تجھل کے گلے میں گیندے کے پھولوں کا ہار ڈالنے کی کوشش کرنے لگی۔ "اُستاد! سالی ایک اور کا بینڈ بجانے کی جُگاڑ میں لگی ہوئی ہے۔ ڈھبرا کا پیچ کس رکھا ہے۔" کانتے نے اُس کے کولھے میں چٹکی بھری، وہ مٹکنے لگی۔

"گھر امت، تیرا نمبر بھی آئے گا چھٹولے!" عورت دیدے نچاتے ہوئے بولی۔ اڈے کے لوگ بے تحاشا ہنسنے لگے۔ دروازے پر اور لوگ بھی جمع ہو گئے تھے اور گھر گھر کے اڈے کی طرف آ رہے تھے۔ جامو پیرو کی کمر میں ہاتھ ڈالے ہوئے اُسے اندر لے آیا۔ تجھل وہیں رہ گیا۔ میں بھی مارٹی اور ٹڈے کو لے کے اندر آ گیا۔ صحن کے بعد پہلے بڑے کمرے میں فرش پر چاندنی بچھی ہوئی تھی اور گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ تجھل کا حقہ تیار تھا۔ خمیرے کی خوشبو کمرے میں مہکی ہوئی تھی۔ میں تھوڑی ہی دیر وہاں بیٹھا پھر مارٹی اور ٹڈے کو دوسرے کمرے میں لے آیا۔

"مارٹی!" میں نے تیزی سے پوچھا "استاد نے تم لوگوں کو کیسا تار دیا تھا؟"

"اپن کو سالا اتنا ہی پتہ ہے کہ اُستاد کا ٹیلی گرام پیرو دادا کے نام آیا تھا، پیرو دادا اپن کو بلوایا اور بولا، چلیں گا، لاڈلے راجا کے پاس چلیں گا؟ اپن بولا، سر کے بل چلیں گا۔ دادا بولا، تار میں لکھا ہے واپسی میں بریک لگ سکتا ہے، سالا بوم مارنے سے پہلے سوچ سمجھ لو۔ اپن بولا، سوچنا ہی کیا ہے دادا! راجا کے لیے سالا گردن میں بریک لگ جائے۔ اُو در پاڑوں کا کام اُلٹا پلٹی کرنے میں دیری ہو گیا۔ پھر سالا یہ ٹما بھی دادا کے پیروں پڑ گیا۔ دادا اس کو لے جانا نہیں مانگتا تھا۔ پر یہ اُس کا پیر نہیں چھوڑا اور چھرا نکال کے اپنے کو مارنے لگا۔ قسم سے دادا ایک دم ترٹی میں آ گیا اور پھر اس کو بھی اُٹھا لیا۔ ابھی اپن کو ایدر آئے ہوئے ایک دن ہوتا پڑا ہے۔"

مارٹی کو کچھ اور معلوم نہیں تھا۔ ظاہر ہے تجھل ہر بات ٹیلی گرام میں نہیں لکھ سکتا تھا اور اگر اُس نے پیرو کو کچھ لکھا بھی ہو گا تو پیرو کو اپنے پاڑے کے کسی آدمی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں خاموش ہو گیا۔ مارٹی کا چہرہ تمتما رہا تھا جیسے اُسے اب بھی شک ہو کہ یہ دونوں ایک

دوسرے کے سامنے بیٹھے ہیں۔ راجا ڈارلنگ! ابھی کوئی ایسا داؤ چلاؤ کہ اپن کبھی بھی تمھارے پاس سے نہیں جا سکے۔ فادر جانتا ہے کہ اُودر تمھارے جانے کے بعد ایک مومنٹ کے لیے بھی اپن کا دل نہیں لگا۔"

میں صرف سر ہلا کے رہ گیا۔ ٹمّا بھی اُس کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا اور اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے میرے شانے دبا رہا تھا۔ "تم نے کوئن کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا راجا؟" مجھے چپ دیکھ کے مارٹی اضطراب سے بولا۔ وہ جولین کو شروع ہی سے کوئن کہتا تھا۔

"ٹھیک ہی ہوگی مارٹی!" میں نے بجھی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں کوئن ویسے آل رائٹ ہے راجا! ایک دم پرفیکٹ۔" مارٹی بوجھل لہجے میں بولا۔ "پر سائیلنٹ رہتی ہے۔ روز ہم اُس کو سویرے اُودر دیکھنے جاتا ہے۔ کوئن اپنا بہت ریگارڈ کرتی ہے۔ اپنے ہاتھ سے روز چائے پلاتی ہے اور، اور وہ . . . ."

"اور چمپا کا کیا حال ہے؟" میں نے اُس کی بات کاٹ کے پوچھا۔

"وہ اپن کی مدر کے مافق ہے۔ اُودر اپنی دو مدر ہے۔ ایک کوئن کی مدر، دوسری چمپا۔ میں اور ٹمّا ریگولرلی اُودر جاتا ہے تو وہ گھر میں اندر بلا کے بٹھاتا ہے اور روز تمھارے لیے پوچھتا ہے۔ پر کوئن نے کبھی اپن سے ایک ورڈ نہیں بولا۔ ہم سمجھتا ہے راجا! اُس کی آنکھ اپن سے پوچھتا ہے اور اپن روز جھوٹ بول دیتا ہے کہ راجا کا خبر آیا ہے، وہ سفر میں ہے اور بالکل فِٹ فاس ہے۔ کوئن جانتا ہے کہ اپن جھوٹ بول رہا ہے۔ پر اپن اور کیا بولے۔"

"وہ اسکول پڑھانے جاتی ہے؟" میں نے آہستگی سے پوچھا۔

"ڈیلی۔ پر اسکول سے آ کے گھر میں بند ہو جاتی ہے، کیں اور نہیں جاتی۔ اپن نے کتنا ٹائم مدر سے بولا، کوئن کو باہر نکالو، گھر میں بیٹھے بیٹھے سالا زنگ لگ جائیں گا۔ اُودر کرسمس کا ٹائم کوئن چرچ بھی نہیں گیا۔ کرسمس نائٹ پُسا اپن اکھّی رات اُس کے گھر پہ رہا۔ کوئن نے کپڑے بھی نہیں پہنا۔ اپن اُس دن پہلی بار کوئن سے ڈرتے ڈرتے بولا، کوئن! مارٹی کو بولو، وہاٹ از دی میٹر؟ مارٹی تمھارا اسلیو ہے۔ اِسمائل کر کے ایدر سے اُودر چلا گیا۔ کیسا اسمائل تھا وہ راجا! اپن سے نہ پوچھو، ایسا لگا کہ مارٹی کو چاقو مار کے چلا گیا ہے، مارٹی کے منہ پر تھوک کے چلا گیا ہے۔ ٹمّا بھی اپن کے ساتھ تھا۔ بول ٹمّا ماسٹر! ایسا تھا کہ نہیں؟" ٹمّا درمیان میں لقمے دیتا رہا۔

میں نے اپنے کان بند نہیں کیے۔ جو وہ کہتے رہے، سنتا رہا۔ ببّل نے نہ جانے اُسے بمبئی میں کیوں روک دیا تھا۔ جب خانم، نیساں اور منیر علی کا سارا گھر حویلی میں سما سکتا تھا تو جولین وہاں کیوں نہیں آ سکتی تھی۔ حویلی میں اُن سب کو اکٹھے بیٹھا دیکھ کے کتنی ہی بار مجھے اُس کا خیال آیا تھا۔ زرّیں سے اُس کی خوب نبتی۔ زرّیں جس طرح نیساں، خانم اور زہرہ کے آنے سے خوش تھی، جولین سے مل کے بھی بہت خوش ہوتی۔ مجھے معلوم تھا کہ مارٹی اُس کے بارے میں اسی طرح کی باتیں کرے گا۔ دو مہینے پہلے جب زر بیکانیر میں ملا تھا تو اُس نے اتنا کچھ نہیں بتایا تھا مگر میں جانتا تھا کیسی ہوگی۔ اُس نے کرشنا جی کی وہ رقم بھی لوٹا دی تھی جو میں نے بمبئی چلتے وقت اُسے دی تھی۔ مجھے سب اندازہ تھا لیکن مارٹی کی زبا کا ذکر سن کے میرا دل ڈوبنے لگا۔ میں نے مارٹی کو کوئی جواب نہ میرے ذہن میں اس کا ایک ہی جواب آیا تھا کہ آج یا کل کسی وقت ضرور خط لکھوں گا۔ اب مارٹی وہاں سے چلا آیا ہے۔ وہ سودا لینے خود بازار جاتی ہوگی۔ مارٹی کے روزانہ جانے سے کم از کم اُسے تنہائی محسوس نہیں ہوتی ہوگی۔ جولین کا چہرہ میری آنکھوں میں گھوم ر مارٹی اور ٹمّا دیر تک اُسی کی باتیں کرتے رہے۔

کانے مجھے پکارتا ہوا اُدھر آ گیا اور ہم تینوں کو چاندنی و کمرے میں لے آیا۔ وہاں سبھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ببّل، پیرو، ماچی اور جامو سامنے دیوار سے کمر ٹکائے ہوئے اُن کے آگے تھے مٹھائی کا ایک بڑا ٹوکرا رکھا تھا اور چائے کی پیالیاں تھیں۔ شولی او ٹوکری سے دونے اُٹھا اُٹھا کے لوگوں میں تقسیم کر رہے تھے پیرو کے سامنے الگ مٹھائی کا ایک ٹوکرا موجود تھا۔ کمرے میں تمام بھری ہوئی تھیں اور ہر شخص اپنی اپنی بولی بول رہا تھا۔ میں نے بیٹھنا چاہا لیکن پیرو نے آواز دے کے مجھے اپنے پاس بلا لیا گردن میں ہاتھ ڈال کے ببّل کو بمبئی کا حال سناتا رہا۔ میرا خیال تھ کے کھانے سے پہلے اُن میں سے کوئی نہیں ہلے گا لیکن مٹھائی نف اور چائے پینے کے بعد ببّل دفعتہً اُٹھ کھڑا ہوا اور پیرو کو لے فلیٹ میں چلا گیا جہاں کبھی زرّیں ٹھیری تھی۔ اُس کا زینہ اڈّے سے بھی اُوپر جاتا تھا۔ جامو بھی اُن کے ساتھ تھا۔ انھوں نے مجھ کو نہیں کہا حالانکہ میں اُن کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ وہ ضرور کوئی خا کرنے فلیٹ میں گئے تھے۔ فیض آباد میں بیٹھے بیٹھے ببّل کا اچانک کا ارادہ کرنا اور پیرو کو بمبئی کے یاڑوں کے آدمیوں کے ساتھ کلکتے بے سبب نہیں تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مجھے بتانے میں کیا فیض آباد سے کلکتے کے طویل سفر کے دوران ببّل مجھے کہیں بھ تھا۔ میں نے خاصی دیر اُن کے نیچے آنے کا انتظار کیا۔ وہ نہیں میں نے مارٹی اور ٹمّا کو باہر چلنے کا اشارہ کیا۔

گلی کے نکڑ ہی پر ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ ہم تینوں اُس میں گئے۔ ٹیکسی والے نے منزل کا پتہ پوچھا تو میں نے اُس سے کہہ د جہاں چاہے، لے جائے۔ میری جیب میں چند روپے پڑے تھے کلکتے کے بازاروں اور سڑکوں پر گھومتی رہی۔ ٹمّا اور مارٹی اشتیا عمارتیں اور دکانیں دیکھ رہے تھے۔ جدھر دیکھو، آدمی ہی آدمی تھے۔ میرا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ کلکتہ دیکھ لیں، پھر شاید فرصت کا ملے یا نہ ملے۔ یکایک میرا جی گھبرانے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے عمارتیں اور دکانیں گردش سی کرنے لگی ہوں۔ میں نے ٹمّے کو ایک طرف ہٹا کے باہر گھور کے دیکھا۔ ٹیکسی والا مختلف راستوں سے گزرتا ہوا اُس علاقے میں آ گیا تھا جہاں مولوی صاحب کا مدرسہ تھا۔ سب کچھ وہی تھا۔ گلی میں کچھ اندر جا کے مسجد اور مدرسہ تھا۔ میں نے ڈرائیور کا کندھا پکڑ کے اُسے روک دیا مگر دیر ہو گئی اور میں نیچے نہیں اُترا تو مارٹی مجھے جھنجوڑتے ہوئے پوچھنے لگا۔ "کیا بات ہے راجا استاد؟"

"کچھ نہیں مارٹی!" میں نے ہڑبڑا کے جواب دیا۔ "کچھ نہیں"۔

"تم نے ایدر ٹیکسی کو کیوں ہالٹ کر دیا؟"

"بس ایسے ہی"۔

"راجا! تمھاری آنکھ بھرا ہوا ہے"۔ وہ بے تابی سے بولا۔

"کچھ نہیں مارٹی!" میں نے منہ پھیر لیا۔ "آگے چلو"۔

ٹیکسی والے نے گاڑی اسٹارٹ ہی کی تھی کہ میں نے اُسے پھر روک دیا۔ "تم ٹھیرو مارٹی! میں ابھی آتا ہوں"۔ میں جلدی سے اُتر گیا۔

"کیدر؟ کیدر راجا؟"

"میں ابھی آیا"۔

"اپن بھی چلیں گا"۔ مارٹی بھی باہر آنے لگا۔

"نہیں، تم یہیں بیٹھو"۔ میں نے اُس سے التجا کی۔

"راجا! کوئی لفڑے کا بات تو نہیں؟" اُس نے سڑک پر چاقو نکال لیا۔

"میرے پاس بھی چاقو ہے مارٹی!" میں نے تلخی سے کہا۔ مارٹی نے نظریں جھکا لیں۔ میں اُسے چند لمحوں میں واپس آنے کی تاکید کر کے بھاگتا ہوا گلی میں پہنچا اور مدرسے کا دروازہ پھلانگ کے سیدھا دفتر میں داخل ہو گیا۔ سفید کی ٹوپی اور کھدر کے کرتے پاجامے میں ملبوس وہاں صرف ایک ادھیڑ آدمی بیٹھا تھا۔ مجھے یوں اندر آتا دیکھ کے اُس کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ "جناب!" میں نے اپنی سانسیں قابو میں کرتے ہوئے پوچھا۔ "مولوی محمد شفیق کا کچھ پتہ چلا؟"

"مولوی محمد شفیق!" وہ ذہن پر زور دیتے ہوئے بولا۔ دوسرے ہی لمحے مجھے احساس ہو گیا کہ میں بے کار یہاں آ گیا ہوں۔ میں اُس کا جواب سنے بغیر واپس آنے لگا۔ اُس نے سٹ پٹائے ہوئے لہجے میں مجھے روکا۔ "کیا تم مراد آباد والے مولوی محمد شفیق کو پوچھ رہے ہو؟"

"ہاں ہاں، اُنھی کو"۔ میں نے تیزی سے جواب دیا۔

"تم اُن کے کون ہوتے ہو؟"

"میری بات کا جواب دیجیے کیا اُن کی کوئی خیر خبر معلوم ہوئی؟"

"بیٹھو میاں!" وہ تحمّل سے بولا۔ "تم شاید ایک بار پہلے بھی آئے ہو؟"

"ہوں"۔ میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "کیا آپ کچھ جانتے ہیں؟"

"اللہ بہتر جانتا ہے"۔

"وہ کسی کو بھی دکھائی نہیں دیے؟"

اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"اور اُن کا سامان؟"

"جوں کا توں رکھا ہے۔ گل گلا گیا ہوگا۔ میں نے مدرسے کے متولی احسان الٰہی صاحب سے کہا تھا کہ کسی غریب کو دے دیجیے، کسی کے کام ہی آ جائے گا لیکن وہ بھلے آدمی نہیں مانے۔ تم بتاؤ کہ تم اُن کے کون ہوتے ہو؟"

"میں اُن کا ایک عزیز ہوں"۔ میں نے بیزاری سے کہا۔

"بھلا کیا رشتہ ہوتا ہے آپ کا اُن سے؟"

"کوئی بھی نہیں اور تمام رشتے"۔ میں نے شکستہ لہجے میں جواب دیا۔ وہ حیران نظروں سے میری صورت دیکھنے لگا۔

"تم نے انھیں کہاں کہاں تلاش کیا؟"

"بہت سی جگہوں پر"۔

"برس گزر گئے میاں! آخر تمھیں اُن کی اتنی . . . صبر کرو"۔ وہ کسمساتے ہوئے بولا۔ "اللہ کسی نہ کسی دن انھیں ضرور ملا دے گا"۔ میں اُٹھنے لگا تو اُس نے مجھ سے چائے پینے کے لیے اصرار کیا۔ "اگر اُن کا کوئی پتہ چلے تو تمھیں کہاں اطلاع دی جائے؟"

مجھے اُس کی بات عجیب سی معلوم ہوئی۔ "میرا پتہ"۔ میں نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں پھر کبھی آ جاؤں گا مگر . . . . مگر آپ مجھے . . . ."

میں نے اُسے اپنا نام صرف بابر بتایا اور پتہ فیض آباد کا لکھوا دیا۔

"خدا کرے، کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے"۔

"کہیں . . . . کہیں آپ مجھ سے کچھ چھپا تو نہیں رہے ہیں؟" میں نے اچانک لرزیدہ آواز میں پوچھا۔

"لاحول ولا قوت۔ میاں کیسی بات کرتے ہو"۔

"مجھے معاف کر دیجیے، یوں ہی خیال آ گیا تھا"۔ میں نے ندامت سے کہا اور فوراً وہاں سے اُٹھ کے باہر آ گیا۔ وہ مجھے آوازیں دیتا رہا۔ مجھے وہاں جانا اور اُس کا وقت برباد کرنا ہی نہیں چاہیے تھا لیکن مجھے کسی کے وقت کی کون سی فکر تھی۔ سبھی کا وقت ضائع ہو رہا تھا۔ ببّل کا اور نہ جانے کتنے لوگوں کا۔ جس طرح میرے پاس وقت ہی وقت تھا، میں سمجھتا تھا، سبھی میری طرح خالی بیٹھے ہیں، میرے سوا دنیا میں انھیں اور کوئی کام نہیں ہے۔ مولوی صاحب اور اُسے جدا ہوئے نو برس سے زیادہ ہو چکے تھے۔ ہر دن ایک دن کا فاصلہ اور بڑھ جاتا تھا۔ اب تو میرا چہرہ بھی مولوی صاحب کو یاد نہیں رہا ہوگا۔ مجھے سامنے دیکھیں تو شاید پہچان بھی نہ پائیں۔ ممکن ہے وہ بھی بہت بدل گئے ہوں اور وہ مجھے بھلانا ہی چاہتے ہوں گے، میرا چہرہ اپنی نظروں سے فراموش ہی کرنا چاہتے ہوں گے۔ کورا کے لیے بھی اُن کی یہی کوشش ہوگی مگر

یہی اُن کی سب سے بڑی بھول تھی۔ بے شک آنے والا ہر دن اُن کی آنکھوں میں مرتسم میرے نقش پر کچھ اور گرد ڈال دیتا ہوگا لیکن آنے والے ہر دن کورا کی آنکھوں میں یہ نقش اور اُجاگر ہو جاتے ہوں گے۔ مولوی صاحب اُسے یہ باور کرانے میں کبھی کامیاب نہیں ہوں گے کہ میں زندہ نہیں ہوں، مر چکا ہوں یا جیل میں ہوں، میں نے اُس رات دو آدمیوں کو چھرے مار دیے تھے۔ میں اُسے بھول گیا ہوں گا۔ یہ ناپختگی کی ایک واردات تھی کہ میں اُسے گھر سے لے کے چلا آیا۔ اچھا ہوا کہ وہ اُن کی پناہ میں آگئی۔ میرے ساتھ رہتی تو نہ جانے کیا کیا واقعات پیش آتے اور اب اگر میں اُسے مل بھی جاؤں تو ایک بدلا ہوا آدمی ہوں گا اور کورا جیسی لڑکی کے لیے میں کسی طرح موزوں نہیں ہوں گا۔ وہ اُس سے یہی کچھ کہتے ہوں گے۔ نہیں کہتے ہوں گے تو ایسا تاثر دیتے ہوں گے۔ وہ اشاروں کنایوں میں کہتے ہوں گے کہ جب میں اپنے گھر کا نہیں رہا، اُس گھر کا جہاں پلا بڑھا تھا تو کسی اور کا کیا ہو سکتا ہوں۔ وہ ایسی باتیں اُسی کی خاطر کرتے ہوں گے۔ کورا کے ساتھ رہتے رہتے اُنھیں اُس سے یہ ہمدردی ہو ہی جانی چاہیے۔ اُن کی ہمدردی کا اس سے بڑا ثبوت کیا تھا کہ اُنھوں نے اُس کے لیے ساری دُنیا سے رشتہ توڑ لیا تھا۔

اُنھیں حق تھا کہ وہ کورا سے کچھ بھی کہیں۔ اُس رات وہ نہ ہوتے تو کورا نہ جانے کہاں ہوتی حالانکہ اُس رات دریا کے کنارے چلنے پر اصرار بھی اُنھوں نے ہی کیا تھا۔ اگر ہم وہاں نہ جاتے تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ ہم اُن کے ساتھ مراد آباد چلے جاتے یا گھر ہی واپس ہو جاتے۔ ابا جان مجھے دیکھ کے گھر سے باہر نہیں نکال دیتے۔ ہم دونوں اُن کے پیروں پر سر رکھ کے معافی مانگ لیتے۔ پھر نہ اتنی مرتیں نہ فہمیدہ کا پردہ اُٹھتا، نہ گھر بکتا۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ اگر مولوی صاحب کہیں مل گئے تو میں اُن سے نہیں بولوں گا۔ اُنھوں نے مجھے اتنا نیچ اور ذلیل کیوں سمجھا تھا۔ جیل میں رہ کے سبھی بدل نہیں جاتے۔ لوگ جیل مجبوری میں جاتے ہیں۔ کس کا جی چاہتا ہے کہ وہ اپنے ہاتھ پاؤں توڑ کے بیٹھ جائے۔ مولوی صاحب کو مجھ پر ترس نہیں آیا کہ میں نے کورا کو بچانے کے لیے اور خود اُنھیں بچانے کے لیے ان لوگوں کو چاقو مارے تھے۔ میں اور کیا کرتا۔ کیا کورا کو یوں ہی جانے دیتا۔ بس اُنھوں نے سمجھ لیا تھا کہ میں نہیں بچوں گا اور اگر بچ بھی گیا تو مجھے برسوں کی قید ہوگی۔ اتنے سال گزرنے کے بعد جب میں باہر نکلوں گا تو پچھلی تمام باتیں بھول چکا ہوں گا۔ اُنھیں کیا معلوم تھا کہ میں نے اُسی کی خاطر وہاں اپنی تعلیم جاری رکھی تھی۔ میں نے اُسی کے لیے چاقو چلانا سیکھا تھا۔ کبھی تو خبر لیتے کہ مجھ پر کیا گزری، میں واقعی ویسا ہوں یا میری صورت بدل گئی ہے۔ وہ مجھے آزمائش کا ایک موقع تو دیتے۔ کورا اُن کی نہیں تھی، وہ میری

امانت تھی۔ امانت لوٹاتے وقت یہ خیال نہیں رکھا جاتا کہ مطلوب پاگل ہو گیا ہے یا مجرم ہے یا امانت لوٹانے کا اہل ہی نہیں رہا۔ مگر مولوی صاحب نے اُسے میری امانت ہی نہیں سمجھا ہوگا۔ وہ جانتے تھے کہ میں کورا کو کس طرح گھر سے لایا ہوں۔ میں نے اُنھیں ساری بات بتا دی تھی۔ مولوی صاحب کورا سے کچھ بھی کہتے ہوں لیکن اُنھیں اچھی طرح اندازہ ہو گیا ہوگا کہ وہ صرف میرے لیے زندہ ہے، میرے لیے زندہ رہے گی۔ وہ اُسے کچھ بھی تاثر دیتے ہوں، کہیں بھی لے جائیں، کورا کے پاس اپنا بھی ایک دل تھا اور وہ دل ضرور کہتا ہوگا کہ میں نے اُس کے پاس پہنچنے کے لیے کون سا جتن نہیں کیا ہے۔

جیسے زہرہ نے مجھے اُس کی حالت بتائی تھی۔ مولوی صاحب نے اُسے میرے مرنے کا یقین دلانے کی غلطی نہیں کی ہوگی۔ وہ اُسے آسرے پر قائم رکھ سکتے تھے۔ اُن کا خیال ہوگا کہ وقت کی سرد ہوا کے سامنے کورا کب تک ٹھہری رہے گی، ایک دن تھک جائے گی، اُس کی آس کبھی نہیں ٹوٹے گی۔ مولوی صاحب خود تھک جائیں گے۔ کسی دن اُنھیں مجھے تلاش کرنا ہی ہوگا اور مجھے تلاش کرنا اُن کے لیے ایسا مشکل نہیں ہوگا، جیل میں کسی سے بھی اُنھیں معلوم ہو جائے گا کہ میں کہاں مل سکتا ہوں۔

مارٹی، ٹلا اور میں جب اڈے واپس آئے تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ دکانوں کی روشنیاں جلی ہوئی تھیں۔ اڈے کے باہر لوگوں کی بھیڑ تھی۔ اندر بھی بہت گہما گہمی تھی۔ نصیب میاں، زورا، چھیدا، کانتے، مُتن، کبن خاں اور دوسرے سبھی مصروف نظر آتے تھے۔ سارٹے نے مجھے بتایا کہ استاد جھل کے آنے کی خوشی میں بکرے کاٹے گئے ہیں۔ میٹھے کی دیگیں بھی چڑھائی گئی ہیں۔ رات کو گلی کے آخری سرے پر میدان میں مجرا بھی ہوگا۔ وہیں کھانا کھلایا جائے گا۔ اڈے کی کالونی کے تمام مکینوں اور دوسرے اڈوں کے آدمیوں کو دعوت دی گئی ہے۔ میدان سے فقیروں نے ڈیرا جما دیا تھا۔ سارٹے اُنھیں میدان میں پہنچنے کی ہدایت کر رہا تھا۔ اڈے کے تقریباً سبھی لوگ وہاں موجود تھے۔ جھل، جامو اور پیرو کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں نے کانتے کو پکڑ کے پوچھا "جھل بھائی کہاں ہیں؟"

"کچھ تو ہی لبل لاڈلے! وہ رازدارانہ انداز میں بولا۔ "اُن کے بڑے چکر میں دکھائی دیتا ہے۔ شام تک اُوپر کے فلیٹوں میں تینوں کی مسکوٹ ہوتی رہی۔ اُستاد نے گاڑی بھیج کے اپنے منڈے وکیل کو بھی بلایا تھا۔"

"منڈے وکیل کو بھی؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"منڈے وکیل کے جانے کے بعد وہ تینوں بھی اُتر کے باہر چلے گئے۔ اب دیکھو سیاں کب لوٹتے ہیں۔"

"کچھ کہہ کے نہیں گئے؟"

کانتے نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں نے کوئی مضحکہ خیز بات کہہ دی ہو۔ مجھے اتنے دن جھل کے ساتھ رہتے ہو گئے تھے۔ وہ اُسی بات کا جواب دیتا تھا جو بتانا چاہتا ہو۔ کانتے کے اندازے کے مطابق اُسے جلد آ جانا چاہیے تھا لیکن وہ رات تک نہیں آیا۔

میدان میں سارے لوگ اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں ایک بار موجمدار اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بھرے مجمع میں جھل کو دھمکی دینے آیا تھا کہ اگر اُس نے میرے ساتھ آئی ہوئی لڑکی دوسرے دن شام تک نسترن کو واپس نہ کی تو اُس سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔ دوسرے دن موجمدار ہی نہیں رہا اور وہ علاقہ جھل کے علاقوں میں شامل ہو گیا۔ جہاں نسترن رہتی تھی۔ اُس روز رات کو ناچ گانا بھی ہوا تھا۔ کھانا بھی اسی طرح پکایا گیا تھا۔ جھل نے سارے محلّے کو دعوت دی تھی۔ آج لوگ اُس دن سے زیادہ تھے۔ نصیب میاں بولائے بولائے پھر رہے تھے۔ اِدھر میدان میں ننھے اچھل کود کر رہے تھے۔ اڈے کا سب سے موٹا، سب سے بھاری آدمی ٹالو اُن کے ساتھ مٹکنے لگا، کان پڑی آواز سنائی دینی مشکل ہو گئی۔ جھل ہی نے اُس کا نام ٹالو رکھا تھا، لوگ اُسے ٹلوا بھی کہتے تھے۔ ٹلوا یا ٹالو کی عادت کام ٹالنے کی تھی۔ ایک دو آوازیں تو وہ ایک کان سے سُن کے دوسرے کان سے اُڑا دیتا تھا۔ وہ اتنا بھاری تھا کہ اپنا جسم اُٹھاتے ہوئے اُسے زور لگانا پڑتا تھا۔ اُس کے سامنے بھنا ہوا مال بکرا رکھا ہو تو سارا کا سارا کھا جاتا اور ڈکار نہیں لیتا۔ اُس کی آنکھیں چھوٹی، سر چھوٹا، سارا چہرہ چھوٹا تھا، جیسے غلطی سے اُس کے پھیلے ہوئے جسم پر لگا دیا گیا ہو۔ بڑے سے بڑا وزن اُٹھانے میں اُس کی سانس نہیں پھولتی تھی۔ پل میں ہڈی توڑ دیتا اور جسم پر کتنے ہی بید، قمچیاں، ہنٹر کتنی ہی ضربیں پڑ جائیں، کھڑا سہتا رہتا۔ کسی زمانے میں بلم، چاقو زنی اور لٹھ بازی میں اُسے ملکہ حاصل تھا مگر اب بتدریج بھوٹا ہوتا جا رہا تھا۔ جیل میں وہ مختلف اوقات میں میرے ساتھ کوئی ڈیڑھ سال تک رہا تھا۔ ایک بار وہاں کسی لڑائی جھگڑے کی سزا میں اُسے قمچیاں ماری گئیں۔ وہ آنکھیں کھولے زمین پر بے حرکت کھڑا رہا، اُس پر کوئی اثر نہیں ہوا تو جیلر نے اُس کے لیے ایک سخت سزا تجویز کی۔ بھوکا رکھنے کی سزا۔ ٹلوا بھوک برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ایک دو وقت ہی میں ہاتھ پاؤں زمین پر مارنے لگا مگر منڈے وکیل نے اُس کی طرف سے اعلا حکام کو درخواست بھجوا دی۔ آئندہ اُسے بھوکا رکھنے کی سزا نہیں دی گئی۔ اب اُس کا زیادہ تر وقت اڈے کی دیکھ بھال، مغزیات کی تیاری اور جھل کے جسم کی مالش کرنے میں گزرتا تھا۔

ننھے اُس کے جسم میں ٹھوکے مارنے لگے۔ ٹالو کے جسم میں اگر کوئی ایک تنکا بھی چبھو دیتا تو وہ پندرہ بیس منٹ مسلسل ہنستا رہتا۔ جھل کی چیخ پکار بھی ہنسی کا یہ دورہ ختم نہ کرپاتی۔ ننھوں نے اُس کے سر پہ دوپٹا ڈال دیا۔ موٹے ٹالو نے بُرا نہیں مانا۔ وہ دوپٹا اوڑھ کے تھرکتا، مٹکتا میرے پاس آیا۔ اُس کی حالت دیکھ کے مجھے بھی ہنسی آگئی۔ کانتے نے میرے سر پہ دس کا نوٹ رکھ دیا جو اُس کے بجائے ایک ننھے نے اُچک لیا اور میری بلائیں لینے لگا۔ موٹے ٹلوا کو اڈے کے آدمیوں نے پھر اپنے گھیرے میں لے لیا اور اس سے دُور دُور کھڑے رہے۔ جھل کی سخت ممانعت بھی کہ کوئی اُس کے جسم میں گدگدی نہ کرے۔ ٹلوا بے تحاشا ہنس رہا تھا اور اُس کا سارا جسم پارہ بنا ہوا تھا۔ سارے میدان میں قہقہے گونج رہے تھے، اڈے کے آدمیوں کو ڈر تھا کہ اس دوران جھل نہ آ جائے۔ کہیں پندرہ بیس منٹ بعد ٹلوا کی ہنسی رُکی اور جیسے اُسے ہوش آیا۔

وہ تینوں نہیں آئے لیکن چائنا ٹاؤن کے اڈے سے ایک آدمی نے آ کے خبر دی کہ جھل کے آنے میں اور دیر ہو جائے گی لہٰذا کھانا شروع کر دیا جائے اور ناچ گانا بھی۔ اڈے کے بہت سے آدمیوں نے کھانا نہیں کھایا، البتہ فقیروں اور گلی کے لوگوں اور دُور دراز کے اڈوں کے آدمیوں کے لیے دیگیں کھول دی گئیں۔ کانتے نے مُجرا جمانے کی کوشش کی مگر جھل کے نہ آنے کی خبر سُن کے میدان میں ایک اُکھڑا پن پیدا ہو گیا تھا۔ سارٹے نے مجھے بتایا تھا کہ کئی گانے والیاں بُلائی گئی ہیں، وہ اڈے کی عمارت میں ٹھیری ہوئی تھیں۔ اُن میں سب سے پہلے گانے والی جمنا اپنے سازندوں سمیت میدان میں آ چکی تھی۔ میں وہاں رُکنا نہیں چاہتا تھا لیکن جھل کے انتظار میں بیٹھا رہا۔ جمنا کی آواز بُری نہیں تھی۔ عمر تیس سے کم نہیں ہوگی۔ مارٹی کے اشارے پر وہ میرے پاس آ کے ٹھیر گئی۔ پھر مارٹی، زورا اور چھیدا نے اُس پر روپے برسانے شروع کر دیے۔ کانتے اور کبن خاں نے اُنھیں روکا۔ ابھی اُس نے پہلی غزل بھی ختم نہیں کی تھی کہ جھل کے آنے کی گونج اُٹھی۔ اُس کے ساتھ پیرو اور جامو بھی تھے۔ وہ تینوں تھکے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ناچ گانا رُک گیا تھا۔ جھل کے قریب آنے پر جمنا نے اُسے جھک کے سلام کیا۔ "جمنا بائی! تیرے پیچھے لوٹ رہی ہو۔" جھل نے بھاری آواز میں کہا۔

"آپ کی نظر کا اثر ہے اُستاد!" اُس کا بدن لہرا گیا۔

"زبان کو بھی نرت سکھا دی ہے۔"

"سننے والے کو شاید پہچاننے لگی ہے۔" وہ شگفتگی سے بولی۔ "اب آپ نہ کبھی بلاتے ہیں، نہ آتے ہیں۔ جب پوچھو ایک ہی جواب ملتا ہے کہ اُستاد شہر میں نہیں ہیں۔"

"میں شہر میں نہیں تھا جمنا!"

"لیکن سُنا ہے، درمیان میں آئے تھے، ہماری طرف نہیں آئے؟"

"تیسرے چوتھے ہی روز تو پھر جانا ہو گیا تھا۔"

"کوئی اور شہر پسند آ گیا ہے؟"

"اپنے لیے سبھی شہر ایک جیسے ہیں پر کلکتے کی بات اور ہے۔"
"اور کلکتے سے دُور بھی رہتے ہیں۔" جمنا شکایتی لہجے میں بولی۔
"مالنی آپ کو بہت یاد کرتی تھی۔ پچھوایا بھی تھا لیکن....."
"مالنی کہاں ہے؟" بجھل نے اضطراب سے پوچھا۔
"آپ کو نہیں معلوم۔" وہ اداسی سے بولی۔ "جہاں جانا تھا، چلی گئی۔"
"چلی گئی! کب، کیسے جمنا؟"
"روگ لگا لیا تھا۔"
"کیسا روگ؟"
"یہی آنے جانے والوں میں سے کسی ایک کا۔"
"کون تھا وہ؟"
"اسی شہر کا تھا۔"
بجھل چند لمحوں تک خاموش کھڑا رہا، پھر درشتی سے بولا۔
"نام بتاؤ؟"
"اب نام بتا کے کیا ہوگا استاد! مالنی واپس نہیں آجائے گی۔ آپ ہوتے تو شاید اُس پگلی کو سمجھا پاتے۔ آپ کا بہت ذکر کرتی تھی چھوڑیے یہ بتائیے کہ اب جا تو نہیں رہے؟"
"جا رہے ہیں جمنا! جلدی ہی جانا ہے۔"
"پھر جا رہے ہیں؟"
"ہاں جمنا، تم سے یہی بولنا تھا۔ آج رات بھی تم سے باتیں نہیں ہو پائیں گی۔ لگتا ہے تم پیچھے نرت اور بھاؤ کو چھانتی رہی ہو۔ رستی ڈھیلی نہیں کی۔ بمبئی سے کچھ مہمان آئے تھے۔ یہ بیرو دادا ہے۔" بجھل نے بیرو کی گردن میں ہاتھ ڈال کے اُسے قریب کرتے ہوئے کہا۔
جمنا نے بیرو کو آداب کیا۔ "کبھی اُدھر بمبئی آؤ نا۔" بیرو مسکرا کے بولا۔
"کیسے آئیں۔ اس شہر نے پیروں میں بیڑیاں ڈال رکھی ہیں لیکن آپ بلائیں گے تو ضرور آئیں گے۔ بمبئی دیکھنے کی حسرت ہے۔"
"آؤ، خوشی سے آؤ، اپن تم کو آکھا بمبئی دکھائیں گا۔"
"ضرور آئیں گے۔"
"اُودھر بھی سب بجھل بھائی کا ہے۔ اپن تو اس کا غلام ہے۔"
"تم چاہو تو گانا شروع رکھو پر ہم کو جانا ہے۔" بجھل بولا۔
"آپ کے بغیر لطف نہیں آئے گا۔"
"ادھر بہت سے دیکھنے اور سُننے والے ہیں۔"
"آج سالی سویرے سویرے کھنڈت ہوگئی تھی۔ ٹلو کا منہ دیکھ لیا تھا۔" کانتے بیچ میں بولا۔ "استاد جانے دو، پھر کسی دن جمنا بائی کو بلالیں گے۔" سبھی نے کانتے کی تائید کی۔ بجھل نے اصرار بھی کیا کہ اُس کے اور چند لوگوں کے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا مگر سبھی کا جی اُکھڑ گیا تھا۔ کانتے نے شولی کو ہدایت کی کہ وہ اڈے جا کے دوسری گانے والیوں کو واپس بھیج دے جو جمنا کے ناچ کے بعد یہاں آنے والی جمنا بائی بھی شولی کے ساتھ چلی گئی۔ جن لوگوں نے بجھل کی وجہ نہیں کھایا تھا، اُن کے سامنے تھالیاں اور پلیٹیں رکھ دی گئیں کے دوران سب چُپ چُپ سے رہے۔ میری طرح سب کو یہ جاننے ہوگی کہ بجھل کہاں گیا تھا، ویسے کیوں آیا اور پھر اُسے کہاں جانا میں اُسی کی طرف دیکھ رہا تھا مگر وہ سر جھکائے لقمے ٹونگتا رہا۔ پیرو بھی زبردستی ہاتھ چلا رہے تھے۔ دھیان کہیں اور تھا۔ میرا تو میں وہاں سے اُٹھ جاتا اور پھر کبھی اُن کے سامنے نہ آتا۔ ایک وہ مجھے رد ھو کے، بُرا بھلا کہہ کے چُپ ہو جاتے۔
تھوڑی دیر میں میدان خالی ہوگیا۔ بجھل سب کے ساتھ آگیا۔ آتے ہی اُس نے کانتے کے ذریعے فرداً فرداً تقریباً بیس آ کو اڈے پر رکنے اور اوپری منزل کے ایک کمرے میں بیٹھ جا اُن میں بیرو، ماچھی، زورا، چھیدا، مارٹی، ٹلا، کپتن خاں اور مٹن جاموں، کانتے، سارٹے، شولی، لالہ، کدّا، وزیر، موسج، گجرو، ہلاکو پلٹو شامل تھے۔ بجھل نے جن جن لوگوں کے نام کانتے کو بتائے اُن کے سوا کوئی اوپر نہیں آیا۔ میرا نام اُن میں نہیں تھا لیکن بجھل میرا ہوئے مجھے اوپر لے آیا۔ جب سب بیٹھ گئے اور کمرے میں گہ طاری ہوگئی تو بجھل نے حقّے کی نے منہ سے ہٹائی اور گونجتی ہوئی میں بولا۔ "تم سے بولنے کی ضرورت نہیں تھی، مجھ کو پتہ ہے تمھا کیا ہوگا۔ پر تم میں سے ہر ایک کو میری طرف سے منع کرنے کی ا ہے۔ جس کے آگے پیچھے کوئی نہیں، مجھ کو اُس آدمی کی ضرورت پیچھے کوئی دیکھنے والا نہیں ہے یا تمھارا پیر کہیں اٹکا ہوا ہے یا اور فکر ہے تو میرا دھیان مت کرو، ابھی انکار بول دو۔ مجھ کو جا اور لاڈلے کو دور جانا ہے اور واپسی مشکل ہو سکتی ہے۔"
لمحوں تک سکوت چھایا رہا، سب متذبذب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ پھر سارٹے نے کھڑے ہو کے تیز لہجے میں کہا۔ "استاد! کدھر چلنا ہے؟"
"جہنّم میں چلنا ہے۔" بجھل گرج کے بولا۔ "تم کو اس سے واسطہ نہیں کہ کدھر چلنا ہے، میری بات کا جواب دو۔"
"جواب کیا دینا ہے استاد!" وزیر نے دبے لہجے میں کہا
"جدھر تم بولو گے، چلیں گے۔" گجرو کی جوشیلی آواز اُبھری
"نہیں، اچھی طرح سوچ سمجھ لو، میں تم کو جیل جانے، کسی کا کرنے یا ڈاکا ڈالنے کو نہیں بول رہا ہوں۔ کام ویسا نہیں ہے تمھارا ہاتھ چلتا ہے۔ اپنے کو تمھارے ہاتھ کی صفائی سے زیاد کی صفائی چاہیے۔ سب کچھ ادھر ہی چھوڑ کے چلنا ہوگا اور ایک چھدام بھی نہیں مل سکتا ہے۔ سمجھو استاد تم سے تمھاری جان

ہے۔"
"اپنی جان تمھارے پاس ہی ہے استاد!" کانتے سر جھٹک کے بولا۔
"چُپ رہ۔" بجھل نے اُسے جھڑک دیا۔
"کانتے ٹھیک بولتا ہے استاد!" ایک ساتھ کئی آوازیں گونجیں۔
"کانتے جو بولتا ہے ٹھیک ہے پر تم کانتے کے بولے پر مت ... اگر تم انکار کر دو گے اور استاد بُرا مانے تو تم سب مل کے استاد سے ... چھین لینا اور اس حرام کے تخم کو جوتیوں کا ہار ڈال دینا۔ اس کے ... تھوک دینا۔ ایسا میں اس لیے بولتا ہوں کہ تم اپنی مرضی کو اچھی طرح ... پٹ لو۔ یہ کوئی تمھارا امتحان نہیں ہے۔ میں نے بول دیا ہے کہ ... جانا ہے اور کام بھی بدلا ہوا ہے۔"
"حکم دو استاد!" سارٹے نے چاقو نکال کے اپنا گریبان چاک ... اور نوک سینے میں دھانس لی۔ بیرو، جاموں، کانتے اور میرے سوا ... نے اُس کی پیروی کی۔ پھر سب نے اپنے اپنے چاقو بجھل کے آگے ... ال دیے۔
"انھیں اُٹھا لو۔" بجھل نے تُرشی سے کہا۔ "گرمی مت دکھاؤ۔ میں ... سوچنے کے لیے ایک پورا دن دیتا ہوں۔" اُس نے پھر تکرار کی کہ ... کسی کو کوئی مجبوری ہے تو وہ کسی خوف، جھجک اور مروّت کے بغیر ... بتا دے۔ اُس کا یہ اصرار میری فہم سے بالاتر تھا۔ وہ ان سے کون سا ... لینا اور کہاں بھیجنا چاہتا تھا۔ ایسا کام جہاں سے واپسی مشکل ہو ... سکتی ہے۔ کئی باتیں میرے ذہن میں آئیں لیکن کسی کا کوئی مضبوط جواز ... نظر نہیں آتا تھا۔ کیا بجھل اُنھیں ہندوستان کے مختلف حصّوں میں ... علیحدہ علیحدہ بھیجنا چاہتا تھا کہ ایک سے دو، دو سے چار بھلے ہوتے ... ہیں۔ زیادہ آدمی زیادہ مقامات پر جا سکتے ہیں۔ پہاڑوں پر چلنے سے ... اس کی مراد یہ ہوگی کہ مولوی صاحب کو دُور دراز کے مقامات پر تلاش ... کیا جائے۔ کشمیر، سرحد، بلوچستان اور دوسرے پہاڑی علاقوں میں جہاں ... ابھی تک نہیں پہنچے تھے اور فیض آباد سے میں نے بھی وہیں جانے ... کا ارادہ کیا تھا مگر بجھل کی وجہ سے واپس آگیا تھا۔ کاش میں چلا ہی جاتا۔ ... مولوی صاحب جیسلمیر سے نکلنے کے بعد پھر کسی دُور افتادہ مقام پر ... چلے گئے ہوں گے۔ مراد آباد اور اپنے ملاقاتیوں سے دُور کے علاقوں میں۔ ... میں نے اُن کی، کورا اور آبا جان کی شکل و صورت، عادات و اطوار کے ... بارے میں سب کچھ بجھل کو بتا دیا تھا۔ وہ اُن کے متعلق تقریباً ہر بات ... جانتا تھا۔ بس اُن لوگوں کی صورت نہیں دیکھی تھی اُس نے۔ جب وہ کہیں ... اُنھیں پوچھتا تھا تو مجھے زبان کھولنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ ... چُپ کھڑا رہتا تھا۔ منیر علی نے بھی میری عدم موجودگی میں مولوی ... صاحب کی بہت سی باتیں اُسے بتائی ہوں گی۔ ممکن ہے زہرہ اور ارشد ... نے بھی اُس نے کچھ معلوم کیا ہو۔ ایک ہی بات کچھ سمجھ میں آتی تھی کہ کلکتے میں مختلف آدمیوں کو اکٹھا کرنے سے بجھل کا مقصد مولوی صاحب اور کورا یا آبا جان کا حلیہ بتا کے اُنھیں جگہ جگہ بھیجنا ہو مگر وہ سب کامیاب یا ناکام واپس کلکتے آسکتے تھے۔ اُن کی واپسی میں کیا اُلجھنیں پیش آسکتی تھیں اور بجھل کو یہ لہجہ اور یہ انداز اختیار کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ اُن سے یوں بھی یہ بات کہہ سکتا تھا۔ ضرور بجھل کو کچھ معلوم تھا، جو میں نہیں جانتا تھا۔
جو لوگ اُوپری منزل کے کمرے میں موجود تھے۔ اُن میں مارٹی، گجرو، ٹنڈے اور میرے سوا سب کی عمریں تیس سے اُوپر تھیں یا لگ بھگ۔ وزیر پرسوں آسنسول سے آیا تھا لیکن پہلے وہ کلکتے ہی میں رہتا تھا۔ بجھل نے کئی سال پہلے اُسے آسنسول کے موتی استاد کے پاس بھیج دیا تھا۔ اب بجھل نے اُسے بھی تار دے کے کلکتے بلایا تھا۔ سب کا پنجہ مضبوط تھا، نظر تیز تھی۔ وقت آنے پر اُن کا جسم بجلی کی طرح چمک اُٹھتا تھا۔ کئی کئی سال جیل میں رہ چکے تھے اور وہاں اُنھوں نے وقت ضائع نہیں کیا تھا۔ صبح و شام محنت کرتے یا ایک دوسرے سے پنجہ آزمائی کرتے رہتے تھے۔ بجھل نے اُنھیں اپنا فیصلہ سنانے کے لیے ایک دن کی مہلت دی تھی لیکن یہ محض اُس کی حجت تھی۔ اُسے معلوم ہوگا کہ وہ کل کیا جواب دیں گے۔ اُس نے اُنھیں بتایا کہ روانگی میں دو یا تین دن لگ سکتے ہیں اور تاکید کی کہ وہ نیچے اُتر کے کسی سے اس کا چرچا نہ کریں۔ نہ اب، نہ اُس کے جانے کے بعد۔ اُنھیں اپنے طور پر خود فیصلہ کرنا ہے۔ جو یہاں بیٹھے ہیں، وہ بس آپس میں مشورہ کر سکتے ہیں۔ باہر کے کسی آدمی سے نہیں اور وہ ایک ساتھ آکے اُسے بتانے کے بجائے الگ الگ اُس کے پاس آئیں گے۔ کوئی آدمی روبرو عذر پیش کرنے میں جھجک محسوس کرتا ہے تو وہ انھی آدمیوں میں سے کسی کے ذریعے بجھل کو بتا سکتا ہے۔ اُس نے آنے والے دو تین دنوں میں اُنھیں اڈے پر اپنے آس پاس رہنے کی ہدایت کی۔
اپنی بات مکمل ہونے کے بعد اُس نے سب کو وہاں سے چلے جانے کی اجازت دے دی اور خود بھی بیرو کے ساتھ اُٹھ کے نیچے آگیا۔ مجھے تنہائی کا کوئی موقع نہیں مل رہا تھا کہ اُس سے بات کروں اور پوچھوں کہ یہ سب کیا ہے۔ نیچے کچھ دیر ٹھیرنے کے بعد وہ بیرو اور جاموں کو لے کے فلیٹ میں سونے کے لیے چلا گیا۔ ماچھی، زورا، چھیدا، مارٹی، ٹلا، کپتن خاں اور میں دوسرے فلیٹ کے دونوں کمروں میں آکے بستروں پر لیٹ گئے لیکن کسی کو نیند نہیں آرہی تھی۔ اُنھوں نے تاش کھیل کے وقت گزارنا چاہا۔ اس میں اُن کا جی نہیں لگا تو وہ سب میری چارپائی کے اردگرد بیٹھ گئے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ کانتے اور مارٹی کی چارپائیاں میرے آس پاس تھیں۔ ٹلا اوداؤں پر میرے پیروں کو تکیہ بنائے سکڑا پڑا تھا۔ اُن سب کی نگاہیں بار بار مجھی پر مرکوز ہو جاتی تھیں جیسے میں اُنھیں کچھ بتا سکوں گا کہ استاد بجھل اُنھیں کہاں بھیجنے کا ارادہ

رکھا ہے۔ کانتے نے اُن کی غلط فہمی دُور کی۔ وہ اپنی اپنی چارپائی پر لیٹ گئے۔ ٹنڈا بھی اپنے بستر پہ چلا گیا۔ رات کو کسی وقت کانتے اُٹھ کے چپکے سے میری چارپائی پہ آ گیا اور سرگوشی میں بولا: "جاگ رہا ہے لاڈلے؟"
میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ کانتے میرے پہلو میں لیٹا کھُسر پھُسر کرنے لگا کہ وہ اس دوران جولین کے ہاں دو دو تین تین دن کے لیے جا چکا ہے۔ مجھے صرف ایک ہی بار کا پتہ تھا۔ وہ سمجھتا تھا میرے لیے یہ انکشاف ہوگا۔ میں نے اُسے نہیں بتایا کہ زورا اور مارٹی کی زبانی مجھے پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے۔ وہ جولین کی باتیں کرتے کرتے پوچھنے لگا کہ "زرّیں بہن کا کیا حال ہے؟ مجھے کبھی پوچھتی ہے؟"
"تمھارا بہت ذکر کرتی تھی۔" میں نے بدبداتے ہوئے کہا۔
"سچ!" وہ چمک کے بولا۔
"ہاں، بہت زیادہ۔"
"وہ ضرور کرتی ہوگی۔"
"پھر مجھ سے کیوں پوچھتے ہو؟"
"بمبئی سے لَوٹ کے میں وہاں بھی گیا تھا۔"
"مجھے زرّیں نے بتا دیا تھا۔"
"زرّیں بہن نے بتا دیا؟"
"مگر بتّھل بھائی سے نہیں کہا۔"
"نہیں کہا ہوگا، میں نے منع کر دیا تھا۔" وہ میرے پہلو میں کسمساتے ہوئے بولا۔ "لاڈلے! دل کرتا ہے کہ میں اُس کے پاس ہی رہوں اور جولی کو بھی وہیں بلا لوں۔ وہ بہت اکیلی ہے۔"
"میں بتّھل بھائی سے بات کروں گا کہ جولی کو بھی اُدھر بلا لیں۔"
"ایسا ہو جائے تو پھر کیا بات ہے؟" کانتے جوش میں بولا۔
"ایسا ہی ہو جائے گا۔"
"اور پھر میں یہ سب کام چھوڑ دوں گا۔ میں وہیں رہوں گا اور زری بہن کی زمینوں پہ ہل چلاؤں گا۔ چاقو کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔"
"پر چاقو تمھیں نہیں چھوڑے گا کانتے!"
"چھوڑے گا کیسے نہیں، میں اپنی انگلیاں کاٹ لوں گا۔"
"تمھیں وہ دونوں اتنی اچھی لگتی ہیں؟"
"وہ کانتے کی جان ہیں لاڈلے! میرا دُنیا میں اُستاد کے سوا کوئی نہیں ہے، پر اب وہ میری بہنیں بھی ہیں۔ جب بھی میں فیض آباد یا بمبئی گیا، تجھے کیا بولوں، اُنھوں نے اپنے بھائی کانتے کے لیے کیا کیا۔ کوئی ایک بات ہو تو بولوں۔ ایک دن بمبئی میں میری طبیعت ذرا ڈھیلی ہو گئی تو جولین پریشان ہو گئی۔ گھر میں ڈاکٹر کو بلا لائی، رات بھر بخار میں میرے سرھانے بیٹھی رہی اور میرا ماتھا چھو چھو کے دیکھتی رہی۔ اُدھر جب کبھی میں فیض آباد جاتا ہوں، زری بہن مجھے آنے نہیں دیتی۔ کوئی

نہ کوئی اَڑنگا لگا دیتی ہے۔ اِدھر میں کلکتے میں زیادہ تر اڈ... سالا باہر نکلو تو جیل کا دروازہ اپنی طرف کھینچتا ہے۔ تو جانتا... نے کبھی جیل سے منہ نہیں موڑا۔ جیل جا کے کچھ دن آرام کے... اُدھر بھی اِدھر جیسا اڈا ہے۔ پر میں جیل سے بچتا رہا، ابھی... لاڈلے! مجھے خیال آیا، وہ دونوں جیل میں اپنے بھائی کو خط... کانتے کچھ بزدل ہو گیا ہے لاڈلے! سُن رہا ہے؟" وہ مجھے... مار کے پوچھتا۔ "سُن رہا ہے؟" میں ہُوں ہاں کرتا رہا۔ رات... پہر اُسے رات گزرنے کا احساس ہوا۔ وہ مجھے سو جانے کی تا... دبے قدموں اپنے پلنگ پر چلا گیا۔ وہ ایک پل کے لیے نہیں سو... کی لمبی لمبی سانسیں رات بھر میرے کانوں میں سرسراتی رہیں۔
صبح نصیب میاں نے جب ہم سب کو ناشتے کے...
تو وہ تینوں موجود نہیں تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ منہ اندھیرے اڈ... گئے ہیں اور کہہ گئے ہیں کہ اُنھیں لَوٹنے میں وقت لگ سک... میاں سے یہ پوچھنا لاحاصل تھا کہ وہ لوگ کس طرف کا کہہ کے... دس گیارہ بجے تک ہم سب اُن کا انتظار کرتے رہے۔ پھر ماچھی ا... کلکتہ دیکھنے کی فرمائش کی تو کانتے نے ٹیکسیاں منگوا لیں۔ ما... بھی زبردستی اپنے ساتھ بٹھا لیا اور مختلف اڈوں میں گھومتے ... آنے والوں کے لیے یہ سب دلچسپی اور اشتیاق کا سامان تھا۔ لوگ اُن سے جوش و خروش سے بغل گیر ہوتے۔ ہر جگہ اُن کی... مٹھائی، بسکٹ، پھل اور مشروبات کا ڈھیر لگ جاتا۔ موجود... اڈے پر ہم زیادہ دیر ٹھہرے۔ وہیں ہمیں پتہ چلا کہ صبح کے... پیرو اور جامو کو لوگوں نے اِدھر سے گزرتے دیکھا تھا۔ وہ ا... سوار تھے اور اُن کے ساتھ سوٹ میں ملبوس ایک اجنبی شخص... ابھی بہت سے علاقے باقی تھے۔ اگر ہم اسی حساب سے ہر... لوگوں سے ملتے اور چائے وغیرہ پیتے رہتے تو کئی دن لگ ج... کھاتے کھاتے تھک گئے تھے اور میں جلد از جلد اڈے پہ وا... چاہتا تھا۔ میں نے ماچھی سے کہہ کے ٹیکسیوں کا رُخ اڈے... مُڑوا دیا۔
سہہ پہر کو ہم واپس پہنچے تو ہمیں دروازے ہی پر معلو... بتّھل اندر موجود ہے اور نچلی منزل کے بڑے کمرے میں ... کھلا ہوا تھا لیکن ٹلو اور دروازے پر پہرا دے رہا تھا۔ ہم نے اند... قدم بڑھائے تو ٹلو نے آنکھ مار کے ہمیں باہر ہی ٹھہرنے ک... اشارہ کر دیا اور چند لمحے بعد دروازے سے ہٹ کے ہمیں بتا... "ایک صاحب بیٹھا ہے، اُستاد بارہ بجے واپس آ گیا تھا، اُس... کئی آدمی اُس سے ملنے کے لیے آ چکے ہیں، سیٹھ گوپی رام ... گیا ہے۔" گوپی رام کلکتے کا مشہور دولت مند تھا۔ اُس کے کئی...

...ن شہروں میں چلتے تھے۔ شام تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ شام ہی کو ... گوپی رام کا ایک آدمی ہاتھوں میں دو بھاری تھیلے لٹکائے اڈے... ...ارت میں داخل ہوا۔ نصیب میاں نے اُسے دیکھتے ہی نعرہ لگایا۔ "ہٹو، ...ہرے ہٹو، لکشمی جی آ رہی ہیں۔" نصیب میاں کا اندازہ درست تھا۔ ...گوپی رام کے آدمی کی اطلاع سُن کے باہر آیا تو اُس نے ایک تھیلا ...ب میاں کی تحویل میں دے دیا۔ اِس تھیلے میں ضرور روپے ہوں گے۔ ...ے کی آمدنی کا تمام حساب نصیب میاں ہی کے پاس رہتا تھا۔ ...ا نصیب میاں سے سنبھالا نہیں جاتا تھا مگر وہ اُسے سینے میں دبوچے ...طرف نکل گیا۔
رات کو بتّھل نے دوبارہ اوپری منزل کے اُسی کمرے میں اُن ...یوں کو طلب کیا جنھیں کل رات اُس نے ایک دن کی مہلت دی تھی۔ ...سے پہلے جامو، پیرو اور کانتے کے سوا وہ سب باری باری اُس ...ل چکے تھے اور اپنا فیصلہ سُنا چکے تھے۔ "تم نے میری بات پہ دھیان ...دیا۔" بتّھل نے تھکی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا۔ "مجھ کو صرف بارہ ...ی چاہئیں۔ میں نے اسی لیے گنتی میں زیادہ کو بلایا تھا کہ ہر ایک ...پاس گنجائش رہے۔ وہ نہیں جائے گا تو اُستاد کو اُس کا بدل مل جائے گا، ...کو منع کرنے میں آسانی رہے گی۔ ٹھیک ہے، تم سب جانا چاہتے ...تو جا سکتے ہو۔ پر میں سب کو نہیں لے جا سکتا۔ چار ہم اِدھر بیٹھے ہیں۔ ...پیرو دادا، جامو، لاڈلا اور میں.... آٹھ کی اور ضرورت ہے۔ تو بھی ہو ...سکتے ہیں۔"
"ہم بھی تمھارے پاس بیٹھے ہیں اُستاد!" کبّن خاں تند و تیز لہجے ...ں بولا۔
"کبّن! تیرا کام اِدھر ہے۔"
"اپنے کو ساتھ لے کے ہی چلو۔" کبّن کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔
"اور اپنے کو بھی اُستاد!" کانتے چھنکتی ہوئی آواز میں بولا۔
"تو بھی اِدھر رہے گا، کبّن کے ساتھ۔ تم دونوں جامو کی جگہ اڈے کی ...دیکھ بھال کرو گے اور جس جس کو میں بولوں گا۔"
"اور اپن کو اُودر سے خواری کرنے کو مانگتا تھا!" ماچھی اشتعال ...ں بولا۔ "اپن کا نام بھی جانے والوں میں نتھی کرو۔"
ماچھی کے ساتھ اور لوگ بھی کھڑے ہو گئے اور واویلا کرنے لگے۔ ...ی زورا، چھیدا، ہلاکو، گجرو، وذیر، سبھی کا مطالبہ تھا کہ اُنھیں نہ چھوڑا ...ئے۔ صرف سارٹے اور ٹنڈا چپ رہے۔ پیرو اور جامو نے ہاتھ اُٹھا ...کے اُنھیں بیٹھنے اور چپ رہنے کی تلقین کی۔ وہ بیٹھ تو گئے مگر چپ ...نہیں ہوئے۔
"پھر تم نے اُن کو یہاں کیوں بلایا تھا جن کو لے جانا نہیں تھا۔" ...نتے کا اشارہ اپنی اور کبّن خاں کی طرف تھا۔ وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا

مگر بتّھل کا اُٹھا ہوا سر اور گھورتی ہوئی آنکھیں دیکھ کے اُس کی بات منہ ہی میں رہ گئی۔
"ٹرٹر مت کرو۔" بتّھل نے چلّا کے کہا۔ "تم کیا بولنا چاہتے ہو؟ تم کو پتہ ہے، اُدھر کیا مُنٹا ہے! ہم اُدھر نوٹنکی دیکھنے جا رہے ہیں! اُدھر مال پڑا ہے؟ تمھاری اماں کا ناچ ہو رہا ہے؟ سالے نخرا کر رہے ہو۔ مجھ سے شو بازی کرتے ہو مادر... میں نے کیا بولا ہے، تم نے سُنا نہیں میں نے کیا بولا ہے۔" پیرو نے اُس کے شانے پر آہستگی سے ہاتھ رکھا تو بتّھل نے اپنے ہونٹ بند کر لیے مگر وہ جیسے سُوج گئے تھے۔ پھر کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آئی۔
چند لمحے سنّاٹا رہا۔ پھر بتّھل ہی بولا: "مجھ کو کسی سے بیر ہے کیا! جو نہیں جا سکے گا، اُس کے کالک نہیں لگ جائے گی، اُس کا کام اِدھر ہے۔ اِدھر کس کو یہ اٹم بار دیکھنا ہے۔ چار آنکھیں، چار کان کھلے رکھنا ہے۔ تم بولو گے تو میں لاٹری ڈال لوں گا، پر کبّن خاں، کانتے اور ٹنڈا لاٹری میں شامل نہیں ہوں گے۔ سمجھ میں آئی! تم لوگوں سے ماں کا دودھ ابھی ابھی چھوٹا ہے کیا!"
"ابھی تمھارے سامنے یہ سب بچّہ ہی لوگ ہے اُستاد!" پیرو مسکرا کے بولا۔
"تو کہنا کیوں نہیں مانتے۔ ٹھمکا لگاتے ہیں۔"
"جیسا.... جیسا تم بولو گے، وہی ہوگا۔" کبّن اُس کے پیر پکڑتے ہوئے بولا۔ "ہم کو معاف کر دو۔ جامو! اُستاد سے بول، غصّہ تھوک دیں۔"
"کبّن! سوئیاں مت چبھو۔ بس کر۔" بتّھل نے بیزاری سے کہا۔
کبّن خاں نے اُس کے پیروں سے ہاتھ ہٹا لیے۔ پیرو کے کہنے پر کانتے نے آواز دے کے نیچے سے چائے منگوائی۔ چائے آنے تک سب سر جھکائے بیٹھے رہے اور بتّھل حقّہ گڑگڑاتا رہا۔ ٹنڈا کھسکتے کھسکتے سب سے پیچھے چلا گیا تھا۔ اُسی لمحے سارٹے نے مجھے کہنی ماری۔ میں نے نگاہیں اُٹھا کے دیکھا تو پیرو دادا مجھے بتّھل سے بات کرنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اُس سے کیا بات کروں۔ خود پیرو بھی اگر بتّھل سے کچھ کہتا تو وہ اُس کی بات ضرور سُنتا، وہ پیرو کا بہت لحاظ کرتا تھا مگر شاید پیرو اس موقع پہ بولنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔
"کیا مجھے کچھ کہنے کی اجازت ہے؟" میں نے دبے لہجے میں اچانک بتّھل کو مخاطب کیا۔
"نہیں! اجازت مانگتا ہے تو نہیں ہے۔" بتّھل سپاٹ آواز میں بولا۔ میں نے پھر کوئی بات نہیں کی۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ بتّھل نے ایک ہی گھونٹ میں پوری پیالی حلق میں انڈیل لی اور کانتے کو نیچے کے کمرے سے تھیلا لانے کا حکم دیا۔ کانتے فوراً تھیلا اُٹھا لایا۔ یہ وہی چرمی تھیلا تھا، ہینڈ بیگ کی طرح جو آج شام سیٹھ گوپی رام کا آدمی

اڈے پر دے گیا تھا۔ ٹھل نے اُسے اپنے ہاتھوں سے کھولا۔ اس میں تمنچے رکھے ہوئے تھے۔ ٹھل انھیں ایک ایک کر کے نکالتا رہا۔ ہم سب حیرت بھری نظروں سے دیکھتے رہے۔

"تم کو ان پہ ذرا ہاتھ صاف کرنا ہے۔" اُس نے سرد لہجے میں کہا۔

"اس سے تو ہاتھ بہک جائے گا اُستاد!" کانتے منمناتے ہوئے بولا۔

"ہاں! پر کیا کرے، ٹائم بدل گیا ہے۔"

"کسی تھرڈ کلاس زنانے نے اس کو بنایا ہے۔" کپتن خاں نے تمنچا ہاتھوں پر اُچھالتے ہوئے کہا۔ "اُستاد! میں نے اِسے چلایا ہے لیکن تمھاری قسم مزہ نہیں آیا۔"

"مزہ علی رضا لے گئے۔" وزیر بیچ میں بولا۔ "آسنسول میں موتی اُستاد نے بھی ایک رکھا ہوا ہے۔ آج تک ضرورت نہیں پڑی۔"

"ٹھائیں ٹھس۔" ماچھی منہ بگاڑنے لگا۔ "اُدھر بمبئی میں اپن کو چلانے کا تین چار چانس ملا تھا۔ ہر بار اپن کو ہاتھ میں لے کے ایسا لگا جیسے اپن سالا ٹمٹما ہو گیا ہے، لنگڑا لولا ہو گیا ہے۔ یہ اُن کے لیے ہے اُستاد جن کے ہاتھ پیر ٹھیک نہیں۔"

"پر جن کی نظر ٹھیک ہے۔" ٹھل نے اُونچی آواز میں کہا۔ "اس کا کھیل اُسی وقت جمتا ہے جب سامنے والے کے ہاتھ میں بھی یہ دھرا ہو، ویسے بھی کام کی چیز ہے۔ سب کے پاس یہ ہو جائے گا تو تم کیا کرو گے۔ جب تک چاقو کھولو گے، کام تمام ہو جائے گا۔"

"سب مرد، عورتیں کیسے ہو جائیں گے اُستاد!" کپتن خان تنک کے بولا۔ "ہاتھوں میں مہندی لگا کے یہ اور اچھا لگے گا۔ یہ سب سالا چمڑی والوں کا حرامی پن ہے۔ سالے شکل سے عورت لگتے ہیں۔" ٹھل کو ہنسی آنے لگی۔ "تمھی بتاؤ اُستاد! کوئی مرد سالا اتنا گورا چٹا لال انگارا ہوتا ہے جتنے یہ بندر ہوتے ہیں۔"

"لکھنؤ میں ایک گورے لونڈے پر کپتن خاں کا دل آ گیا تھا اُستاد! اسی لیے جلی جلی باتیں بول رہا ہے۔ لونڈے نے اس کو تگنی کا ناچ نچا دیا تھا۔"

"چپ بے۔" ٹھل نے جامو کی کمر پہ دھپ مارتے ہوئے کہا اور میری طرف دیکھا۔ "لاڈلے! کبھی تو نے بھی تمنچا چلایا؟"

"بمبئی میں کرشنا جی کے ہاں اُٹھا کے دیکھا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"تیری نظر بڑی تیز ہے۔ چاقو کی نوک کی طرح اس میں بھی نال سے آنکھ بندھی رہتی ہے۔ چاقو کا نشانہ چوک جائے تو فرصت مل جاتی ہے۔ اس کا نشانہ چوکے تو پانی پینے کا وقت بھی نہیں ملتا۔ ذرا دکھا تو دے ان بڑبولوں کو ہاتھ۔"

کمرے کے تمام دروازے بند تھے۔ کھڑکیاں بھی بند کر دی گئیں، دوسرا بلب بھی جلا دیا گیا۔ ٹھل، کپتن خاں، کانتے، پیرو، ماچھی، وزیر تمنچا چلانا خوب جانتے تھے۔ ٹھل نے اس کا میکنزم سب کو سمجھایا۔ مجھے پہلے ہی کرشنا جی سے اور مدراس میں ایس پی تشکلا کی زبانی تھوڑی بہت [illegible] ہو گئی تھی۔ جیل میں بھی میں نے اس کے متعلق بہت سی باتیں سُنی تھیں۔ میکنزم ہی کیا تھا۔ چھ گولیاں بھر کے چرخی گھمانی اور لبلبا جیسا کھٹکا [illegible] پڑتا تھا۔ ٹھل نے اپنی جگہ سے ہٹ کے چائے کی خالی پیالی ایک طاق میں رکھ دی اور مجھے تمنچا دے کے دُور جانے کا اشارہ کیا۔ کمرہ خاصا [illegible] تھا۔ نشانہ لینا کچھ ایسا مشکل نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے چاقو اُچھالنے [illegible] انداز سے تمنچا ایک طرف رکھا اور ہر طرح جانچ کے دیکھ لیا۔ میری ساری توجہ پیالی پر مرکوز تھی۔ سانس سینے میں روک کے میں نے ہاتھ منجمد کر لیا اور جھجکتے جھجکتے کھٹکا دبا دیا۔ میں نے اپنی آنکھیں فوراً [illegible] لی تھیں۔ اسی آن تیز چھناکا ہوا۔ میری سانس چلنے لگی۔ پیالی کرچی [illegible] ہو گئی تھی۔ سب مجھ سے لپٹ گئے۔ ٹھل نے پھر آدھا انچ کے قریب [illegible] کا پلاستر اپنے چاقو کی نوک سے اُدھیڑ دیا اور مجھ سے بولا۔ "لاڈلے! [illegible] گہرا کر دے۔"

پیالی بڑی تھی اس لیے نشانہ بنانا آسان تھا۔ دوسری بار محتاط ہونا پڑا۔ وہ ایک چھوٹا دائرہ تھا، انگور کے مانند۔ چاقو ہوتا تو ہاتھ چوکنے کا امکان نہیں تھا۔ کمرے میں روشنی بھی اتنی زیادہ نہیں [illegible] لیکن نشان زدہ جگہ بہر حال مجھے نظر آ رہی تھی۔ میں نے تمنچا سیدھا کیا۔ طاق کے عین مقابل کھڑا ہو گیا۔ مجھ سے کچھ جلدی ہو گئی۔ مجھے ابھی تعین کرنا چاہیے تھا۔ کھٹکا دباتے ہی طاق میں دھول سی اُڑ گئی۔ گو[illegible] طاق ہی میں لگی تھی مگر اصل نشانے سے نیچے تقریباً ایک پورے فاصلے پر۔ اس سے پہلے کہ ٹھل مجھے کوئی ہدایت دیتا، میں نے تیسری [illegible] چلانے کے لیے چرخی گھمائی۔ سب کنارے ہو گئے۔ پہلی گولی سے مجھے غلطی کا کسی قدر اندازہ ہو گیا تھا۔ تمنچا پھر اُسی جگہ رکھ کے میں نے نال [illegible] رُخ پہلے سے کچھ اونچا کیا۔ دھماکا ہوا تو ٹھل طاق کی طرف دوڑا۔ [illegible] کے پیچھے پیرو اور جامو بھی تھے۔ پیرو نے تیزی سے لوٹ کے مجھے گلے لگا لیا۔ پھر میں نے سارا تمنچا اُسی نشانے پر خالی کر دیا اور گولی کی ر[illegible] اُس کی سیدھ اور نال اور نگاہ کا توازن کچھ کچھ میری سمجھ میں آیا اور [illegible] کا پتہ چلا کہ اصل تو چاقو کی طرح ہاتھ اور نظر کا اعتماد ہے۔ ہاتھ میں [illegible] ہو یا نظر متذبذب ہو تو نشانہ ٹھیک لگ ہی نہیں سکتا۔ اتفاق سے لگ [illegible] تو لگ جائے۔ ٹھل نے کبھی مجھ سے کہا تھا کہ ہاتھ سے دیکھنے اور سننے [illegible] ڈال سچا نشانہ تبھی بنتا ہے، اُس نے کہا تھا کہ ہاتھ کو سمجھایا جائے [illegible] نظر آنے لگتا ہے اور وہ سننے بھی لگتا ہے، اُس کا مطلب ہاتھ اور نگ[illegible] توازن سے تھا۔ ہاتھ تبھی اُٹھے جب نگاہ اجازت دے اور کان فاصلہ [illegible] تعین کر سکیں۔ ہاتھ سے سننے اور دیکھنے کی قوت پیدا کرنے کے لیے ہاتھ کی جھجک نچوڑنی پڑتی ہے۔ میں نے دو غلطیاں کیں، دوسری اور [illegible]

مرتبہ۔ پانچویں بار تجربے کی غلطی تھی۔ نشانہ خطا ہو جانے کا امکان پچاس فی صد تھا مگر چھ گولیاں خرچ کرنے کے بعد میرا ہاتھ بڑی حد تک تمنچے پر رواں ہو گیا یا ٹھل کے بقول ہتھیار پکڑ میں آ گیا۔

میں دوبارہ گولیاں بھرنا چاہتا تھا لیکن ٹھل نے مجھے ہٹا دیا۔ میرے بعد جامو، سارٹے، مارٹی، زورا، ہلاکو، مٹڈا، گجرو، پلٹو، جینتی وغیرہ نے نشانے باندھنے شروع کیے۔ اُن میں سے کئی بندوق چلا چکے تھے۔ چائے کی بہت سی پیالیاں ٹوٹ گئیں۔ کسی کا نشانہ چوکا، کسی نے پہلے ہی تکے میں پیالی توڑ دی مگر ان سب کے لیے یہ کام کچھ ایسا دشوار ثابت نہیں ہوا۔ ایک دو غلطیوں کے بعد سبھی ٹھیک ٹھیک جگہ گولیاں مارنے لگے۔ ہر ایک نے ایک ایک تمنچا خالی کیا۔ البتہ دوسرے نشانے پر اُن کا ہاتھ خاصا بہکا۔ مٹڈے نے چھ گولیوں میں چار گولیاں ٹھیک چلا کے سب کو متحیر کر دیا۔ معلوم ہوتا تھا، مٹڈا پہلے سے تمنچا چلانا جانتا ہے، جان بوجھ کر چپ بیٹھا تھا۔ مارٹی نے تردید کی کہ مٹڈے نے آج پہلی ہی بار اسے ہاتھ لگایا ہے۔ ماچھی مٹڈے کو کندھے پر اُٹھا کے سارے کمرے میں گھومنے لگا۔

کوئی دو گھنٹے تک بند کمرے میں گولیاں گونجتی رہیں۔ ٹھل، پیرو، ماچھی، کانتے اور وزیر اُن لوگوں کو تمنچا چلانا بتاتے رہے جنھوں نے اُسے پہلے استعمال نہیں کیا تھا۔ خود پیرو اور ماچھی نے بھی نشانے لیے۔ اُن کے ہاتھ نے کوئی غلطی نہیں کی۔ کسی نے رات کا کھانا نہیں کھایا۔ کانتے نے تمام تمنچے واپس لے کے دوبارہ اُنھیں تھیلے میں رکھ دیا اور ٹھل کے اُٹھ جانے پر کھانے کے لیے ہم سب نیچے آ کے چاندنی والے کمرے میں بیٹھ گئے۔ وقت کا پتہ ہی نہیں چلا۔ بارہ بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔

جیسا کہ میرا اندازہ تھا، ٹھل کھانا کھاتے ہی پیرو اور جامو کے ساتھ اُوپر فلیٹ میں چلا گیا۔ دوسری صبح وہ پھر اڈے پر موجود نہیں تھا لیکن جلد واپس آ گیا اور ہم سب کو کلکتے سے کوئی بیس پچیس میل دُور ایک بڑے باغ میں لے گیا۔ تمنچوں کا تھیلا اُس کے ساتھ تھا۔ باغ کے چوکی دار سے تین بندوقیں بھی ہمیں وہیں مل گئیں اور اسی کے ذریعے معلوم ہوا کہ باغ کلکتے کے ایک رئیس گرو دیال کی ملکیت ہے۔ وہیں ہمارے لیے دوپہر کے کھانے کا انتظام تھا۔ ٹھل زیادہ دیر نہیں ٹھیرا۔ جامو کو چھوڑ کے وہ پیرو کے ساتھ اُسی وقت لوٹ گیا تھا۔ ہم سب نے جامو سے کچھ جاننے کی کرید کی تو اُس نے صاف سر ہلا دیا۔ جامو کی یہی عادت تھی۔ وہ درمیان کی بات کبھی نہیں کرتا تھا یا تو صاف منع کر دیتا یا صاف اقرار کر لیتا تھا۔ ایک بار منع کر دے تو لاکھ واسطے دیے جائیں، وہ زبان کھول کے نہیں دیتا تھا۔

سہ پہر تک کانتے، ماچھی اور وزیر ہم سب کو نشانے کی مشق کراتے رہے۔ میں نے اُس دن پہلی مرتبہ بندوق چلا کے دیکھی اور وہ مجھے تمنچے سے زیادہ سہل لگی۔ ٹھل واپس نہیں ہوا البتہ شام کو پانچ بجے موٹریں ہمیں اڈے پر لے جانے کے لیے آ گئی تھیں۔ ٹھل اور پیرو ہمیں وہاں بھی دکھائی نہیں دیے۔ اندھیرا ہونے کے بعد نصیب میاں اور ٹلوا کی آوازوں سے اڈے پر اُن کی آمد کی دھمک سُنائی دی۔ سب بڑے کمرے کے فرش پر ستا رہے تھے لیکن وہ ہمارے درمیان اتنی دیر ہی رہے جتنی دیر میں کھانا کھایا جا سکتا تھا۔ پھر اُوپر فلیٹ میں جا کے بند ہو گئے۔ چلتے چلتے ٹھل نے کانتے کو بُلا کے کہہ دیا تھا کہ وہ ہمیں کہیں جا کے گھما لائے۔ پیارے کا مشورہ دریا کے کنارے چلنے کا تھا کہ چاندنی رات میں کشتی کی سیر کریں گے مگر ماچھی نے ناچ دیکھنے کی ضد کی تو سب اُس کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ میں نے تھکن کا عذر کر کے اڈے ہی پر ٹھیرے رہنے کا ارادہ ظاہر کیا تو ماچھی، زورا، چھیدا اور مارٹی نے میرے بغیر کہیں جانے سے انکار کر دیا۔ کانتے نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی کہ لاڈلا یہیں رُک جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ پیرو اور جامو ہوتے تو وہ شاید اُن کی بات مان لیتے لیکن وہ اَڑ گئے۔ پھر مجھے بھی اُن کے ساتھ چلنا پڑا۔ اڈے سے باہر سڑک پر کانتے میرے قریب آ کے سرگوشی میں بولا۔ "لاڈلے! جی کو باندھ کے [illegible]"

میں نے اُس سے کچھ نہیں کہا کہ وہاں جانے میں مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے۔ وہاں میری ایک بہن ناچتی رہی ہے، میرا ایک بھائی پلتا رہا ہے۔ اور ان پہ پتہ نہیں کیا بیتی۔ میں تو اسی ڈر سے وہاں نہیں جاتا تھا کہ فمی کی طرح کوئی اور نہ مل جائے۔ مجھے یہ خوف بھی تھا اور میری نظریں ہر وقت، ہر طرف اُن کے لیے بھٹکتی بھی رہتی تھیں۔ وہ کہیں بھی ملیں، کسی حال میں، کسی طور اُن کی صورت نظر آ جائے۔ یہی بہت ہے۔ میری قسمت میں اُن سے انھی جگہوں پر ملنا رہ گیا تھا تو یہی سہی۔ اِس سے میرا اُن کا رشتہ تو نہیں ٹوٹ جاتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم، میں نے وہاں جانے سے کیوں احتراز کیا تھا۔ فمی کی مثال میرے سامنے تھی۔ مجھے تو ہر ایسی جگہ جانا چاہیے تھا جہاں بے آسرا لوگوں کو کوئی ٹھکانا ملتا ہو۔ اناتھ، آشرم، یتیم خانے، فٹ پاتھ، بالا خانے۔ کون اپنی مرضی سے وہاں جاتا ہے۔ کوئی چارہ نہیں رہتا، تبھی لوگ جاتے ہیں اور جو لوگ وہاں ہوتے ہیں، کون جانے کہاں کہاں سے آتے ہیں۔ اُنھیں زندہ رہنے کے لیے ایک چھت تو مل جاتی ہے اور ایک آس تو بندھی رہتی ہے کہ شاید کبھی دن پھر جائیں، اُن کے بچھڑے ہوئے مل جائیں۔ یہاں آ کے اُن کے رنگ، ناک نقشہ، اُن کے دل نہیں بدل جاتے۔ خانم اور چمپا بھی اِنھی جگہوں سے آئی تھیں۔ اُنھیں چھت تو مل گئی تھی لیکن گھر نہیں ملا تھا جس کے دروازے پر مکین کی حکومت ہو، راہ گیروں کی نہیں۔ لوگ نگاہیں جھکا کے اندر آیا کریں، سر اُٹھا کے نہیں۔ فمی بھی یہی چاہتی ہو گی کہ کاش وہ کچھ دیر صبر کرتی۔ میں اُسے کہاں نہیں جاتا۔ وہ دیکھتی تو سہی، میں اُسے سینے سے لگا کے زریں کی حویلی میں لاتا۔ مگر نہ مجھے ہوش رہا، نہ اُسے۔

موسم خنک تھا، جب ہم چلے تھے تو آسمان صاف تھا۔ اب گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ابھی رات کا ابتدائی

پھر تھا لوگوں کا آنا شروع ہوا تھا۔ تمام گلیاں روشنیوں سے جگ مگا رہی تھیں۔ چائے خانوں، پان، پھول، خوشبو اور دوسری دکانوں میں بڑے بڑے بلب یا گیس کے ہنڈے جل رہے تھے اور بالا خانوں کی کھڑکیوں، چھجوں، چبوتروں پر رنگ رنگ کے کپڑے پہنے، کاجل، سرخی، زیور، پھولوں سے آراستہ لڑکیاں اور عورتیں یا تو بیٹھی تھیں یا کھڑی تھیں، کہیں کہیں ریشمی پردوں کی آڑ میں، کہیں چلمن سے جھانکتی ہوئی۔ میں نے جھل کے ساتھ ہندوستان کا ایک بڑا حصہ دیکھا تھا اور ہم ہر بستی میں ان علاقوں سے ضرور گزرتے تھے۔ یہ علاقے ہر جگہ ایک جیسے ہوتے ہیں۔ دن بھر خاک اڑتی رہتی ہے، سرِ شام چراغ جل اٹھتے ہیں۔ دن جیسے یہاں نکلتا ہی نہیں ہے، جیسے جیسے اندھیرا بڑھتا جاتا، گلیاں جاگنے لگتیں اور دروازے کھل جاتے۔ ہر جگہ یہی ریت تھی۔

ہم سب نہا دھو کے اور کپڑے بدل کے آئے تھے۔ صرف مارٹی اور ماچھی پتلون پہنے ہوئے تھے، باقی سب کرتوں، پاجاموں اور واسکٹوں میں ملبوس تھے۔ میں نے وہ کرتا پہلی بار پہنا تھا جو زریں نے اپنے ہاتھ سے ترپا تھا، سفید ململ اور بند گلے کا۔ مونڈھوں پر بیل کڑھی ہوئی تھی۔ زریں نے میرے سامان میں بہت سے کپڑے رکھ دیے تھے۔ شیروانی بھی تھی، سلیم شاہی جوتیاں بھی۔ گلیوں میں مختلف اڈوں کے کئی آدمی ہمیں مل گئے انھوں نے اس وقت تک ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا جب تک مٹھائی کی دکان پر ہمیں چم چم نہ کھلا دی اور دودھ کی دکان پر لمبے لمبے گلاس نہ پلوا دیے۔ گلیوں میں اور بھی بہت سے لوگ کانتے، سارنگے، ہلاکو، چینی وغیرہ کو جانتے تھے۔ بالا خانوں سے متعلق آدمیوں کی نظر جیسے ہی کانتے پر پڑتی، وہ لپکتے ہوئے اُس کی طرف آتے اور پوچھتے "کدھر چلنا ہے؟" وہ عورتوں کے نام بھی گنانے لگتے۔ کوئی کہتا، "کانتے استاد! آج کل خورشید بیگم کا ستارہ چمک رہا ہے۔" کوئی کہتا، "ناہید جب سے رام پور سے لَوٹی ہے، گلے سے رس ٹپکتا ہے۔" کسی کا کہنا تھا کہ بنگال کا جادو دیکھنا ہو تو ہم اُس کے ساتھ چلیں۔ انھوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ہمارے ساتھ مہمان ہیں۔ مجھے بھی وہ مہمان ہی سمجھے ہوں گے اسی لیے اُن کا اصرار بڑھ گیا تھا۔ کانتے اُن سب کو ٹالتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ گلی کے نکڑ پر جھل کو گلوریاں کھلانے والا دبلا پتلا چوار بھی چھٹن صاحب دبلیا اوڑھے بیٹھا تھا۔ کانتے کو دور سے دیکھ کے اُس نے آنکھ پر ہاتھ کا سایہ کر لیا اور دھیرے مسکانے لگا "استاد! آج بھی نہیں آئے۔" وہ شکایتی لہجے میں بولا۔

"آ گئے ہیں، پر کام تھا۔" کانتے نے مختصر جواب دیا۔

"جانے کہنا، اتنا ترسانا اچھا نہیں ہے۔" وہ آہیں بھر کے بولا "میری طرف سے سرکار کو گلوریاں پیش کر دینا اور کہنا کہ شمع پردہ کر لے تو پروانے جلنا بند نہیں کر دیتے۔ کہنا کہ ہم بھی بہت دیوانے ہیں۔ ہم بھی تمھارے سر کی قسم، ایک دن....!"

کانتے نے جھٹ اُس کا منہ بند کر دیا "نا نا، چھٹن صاحب! ابھی سے ایسی باتیں! ابھی تو تمھارے سپنوں کے دن ہیں تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔ اُدھر اُس چھمک چھلّو شرفن کا کیا ہوگا؟"

"ہائے کانتے جی! کس کا نام لے دیا" وہ لہرا کے بولا "تم جیتا رکھے ہوئے ہو۔ تمھارے اندر وہی استاد بادشاہ کی خوشبو ہے۔" اُس نے کانتے کا گال چوم لیا۔ گلوریاں کھلانے سے پہلے اُس نے ہمارے کپڑوں پر خوشبو لگائی۔ جب میری باری آئی تو وہ پلکیں پٹ پٹانے لگا۔ دن بہت ہو گئے تھے۔ وہ مجھے نہیں پہچانا تھا۔ جیسے ہی اُسے میرا چہرہ یاد آیا، وہ اُچھل گیا اور دکان سے اُتر کے اُس نے مجھے تین فرشی سلام کیے "آہا، لاڈلے نواب! میں بھی تو کہوں، یہ بازار کا رنگ آج بدلا بدلا سا کیوں ہے اب کھلا کہ سب شہزادے کے دم قدم کی رونق ہے۔ سرکار! کہاں چلے گئے تھے؟"

"چھٹن صاحب! آپ خیریت سے ہیں؟" میں نے اُس سے گلے ملتے ہوئے کہا۔

"اپنی کیا پوچھتے ہیں۔ انتظار میں کٹ ہی جاتی ہے۔"

"کس کا انتظار ہے آپ کو؟"

"لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے۔ یہ تم بھی خوب ہے صیاد اپنے صید سے پوچھتا ہے کہ اُسے کیا غم ہے۔"

چھٹن صاحب کا لب و لہجہ وہی تھا۔ اُس کی باتیں ختم نہیں ہوتی تھیں۔ کانتے نے مجھے کھینچ کے اُن سے دور کیا۔ چھٹن صاحب نے ہم سب کے گلوں میں ہار ڈالے۔ کانوں میں عطر کی پھریریاں اٹکائیں اور اپنے ہاتھ سے سب کو گلوریاں کھلائیں۔ جھل اور نصیب میاں کے لیے کیلے کے پتوں میں گلوریاں الگ باندھ کے دیں۔

اتنے لوگوں کا کسی ایک بالا خانے پر اکٹھا جانا مناسب نہیں تھا۔ کانتے نے ہمیں دو ٹولیوں میں تقسیم کر دیا، سارنگے، کبن خاں، وزیر، ہلاکو اور چینی وغیرہ کو لے کر الگ ہو گیا۔ کانتے بمبئی سے آنے والوں کے ساتھ رہا۔ بہت سے دروازے بند تھے اور اندر سے ناچنے گانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لوگ جھریوں سے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہم کئی گلیوں سے گزرتے ہوئے ایک نسبتاً خاموش گلی میں داخل ہوئے۔ یہاں بڑے اور اونچے مکانات تھے۔ ایک جگہ اچانک میرے منہ پر گلاب کا پھول آ کے لگا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ یہ محض اتفاق ہے لیکن نشانہ ایسا صاف تھا کہ میری نظریں اِدھر اُدھر منڈلانے لگیں۔ بائیں طرف والے مکان کی پہلی منزل پر کھڑکی میں ایک سرو قد، خوب صورت لڑکی بنی سنوری کھڑی تھی۔ وہ بھی میری طرح گھبرا گئی مگر اُس نے سنبھل کے جلدی سے مجھے آداب کیا۔ میرے ہاتھ بھی غیر ارادی طور پر اُسے جواب دینے کے لیے اُٹھ گئے۔ دوسرے ہی لمحے وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ میں نے اُسے پہچان لیا تھا، وہ شہ پارہ تھی۔ کوئی ڈیڑھ سال پہلے جب میں جھل اور اُس کے دوست آسنسول کے استاد موتی، موجملار کے اڈے کے گھوشی اور کانتے کے ساتھ یہاں آیا تھا تو میں نے شہ پارہ کو دیکھا تھا مگر یہ وہ مکان نہیں تھا۔ گلی بھی دوسری تھی "راجا استاد!" مارٹی نے زور سے میرا بازو پکڑ لیا "اپن نے کیا دیکھا؟"

"بے پر کا پری دیکھا" کانتے نے مارٹی کی مبہوت آنکھوں کے سامنے انگلیاں نچاتے ہوئے کہا "آسمان سے نہیں اترا تھا۔"

ہم سب وہیں ٹھیر گئے۔ کھڑکی پر چند ثانیوں کے لیے مارٹی کے کہنے کے مطابق مختلف رنگوں کا ایک شعلہ سا بھڑکا تھا۔ شہ پارہ کو میری صورت یاد تھی۔ یقیناً اس نے جان کے پھول پھینکا ہوگا۔ میں آگے بڑھنا چاہتا تھا مگر مارٹی نے مجھے روک لیا "راجا استاد!" وہ لجاجت سے بولا "اُسی کے پاس چلو۔"

"وہ اب اِدھر گانا نہیں گاتی" کانتے نے سرسری انداز میں کہا۔

"تو پھر ادھر کیوں ہے؟"

"اِدھر ہی ہے۔ اب وہ صرف ایک خاص آدمی کے لیے گاتی ہے۔"

"اپن کے راجا سے زیادہ خاص آدمی اور کون ہوئیں گا۔ تم نے دیکھا نئیں۔ پرنسیز نے راجا کے اوپر پھول پھینکا تھا۔"

"پھینکا تھا۔ پر اُس کے لیے گانا بند ہے۔ آگے چل ماسٹر! آگے تیری آنکھ کے لیے اور سُرمہ ہے۔"

"نہیں کانتے! ایک دو مومینٹ اور ٹھیرو۔ پرنسیز مے ریٹرن۔"

"ابے، کیا گٹ پٹ کرتا ہے تخنیچو!" کانتے جھلا کے بولا۔

"آئی ایم ساری کانتے استاد! سالا زبان سلپ ہو جاتا ہے۔"

کانتے اُسے دھکادے کے چند قدم بڑھ گیا تھا۔ یک بارگی ہمارے بائیں طرف کے مکان کا دروازہ تیزی سے کھلا اور شہ پارہ نمودار ہوئی۔ وہ گلی میں آتے ہوئے جھجکی۔ کانتے خود ہی جھپٹ کے اُس کے پاس پہنچ گیا۔ پیچھے پیچھے ہم بھی گئے۔

"شپارے! کیا بات ہے؟" کانتے نے کسی قدر حیرانی سے پوچھا۔

"لاڈلے میاں کب آئے؟" شہ پارہ نے مترنم آواز میں پوچھا۔

"پرسوں!" کانتے نے میری جانب دیکھتے ہوئے ہچکچا کے جواب دیا۔

"اندر آئیے۔" وہ مضطرب لہجے میں بولی۔

"اجازت ہے؟" کانتے نے سر خم کر کے پوچھا۔

"آپ کا مزاج کیسا ہے؟" کانتے کو جواب دینے کے بجائے وہ جھل ملاتی آنکھوں کے ساتھ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"میں.... میں اچھا ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"اِدھر سے گزر رہے جا رہے تھے؟"

"مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ تم اب یہاں رہتی ہو۔"

"کانتے جی کو تو معلوم تھا، آپ نے پوچھا ہوتا تو بتا دیتے۔"

"میں بتا دیتا لیکن مجھے اور باتوں کا بھی پتہ تھا۔" کانتے بولا۔

"آپ کو کون روک سکتا ہے۔"

"روک تو کوئی نہیں سکتا پر تمھارا خیال آ جاتا تھا شپارے! اور تم سے زیادہ کریمن بیگم کا۔ وہ بہت دُہائیاں دیتی ہے۔"

"آپ نے بتایا نہیں کہ میں نے کتنی بار پوچھا ہے؟"

"بتا کے کیا کرتا، تم نے تو پہرے بٹھا لیے ہیں۔"

"شرمندہ کرتے ہیں۔ اب ایسا بھی کیا، کیا ہم اپنی مرضی سے ایک گھڑی کسی سے مل بھی نہیں سکتے۔"

"کریمن بیگم سے پوچھا ہوتا۔ اُس دن اُنھوں نے ہمیں لَوٹا دیا تھا۔ ہم لَوٹ گئے۔ غصہ تو بہت آیا پر کریمن بیگم کا کچھ دھیان آ گیا۔"

"ارے، اندر چلیے۔ میں بھی کتنی باؤلی ہوں، اتنی دیر سے آپ لوگوں کو دروازے پر کھڑا کیے ہوئے ہوں۔ اندر آئیے۔ آئیے نا۔"

کانتے نے اندر قدم نہیں رکھا۔ اسی دوران شہ پارہ کے پیچھے کریمن آ کے کھڑی ہو گئی۔ اُس نے کانتے کو اشاروں سے سلام کیا اور ہم سب کو مضطرب انداز میں دیکھنے لگی۔ شہ پارہ کو اُس کی موجودگی کا احساس نہیں ہوا تھا "پھر کبھی آئیں گے۔" کانتے نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یعنی دروازے پر آ کے لَوٹ جائیں گے؟" وہ مایوسی سے بولی۔

"جی تو نہیں چاہتا پر پھر... پھر سہی۔"

"کیوں؟ آئیے نا۔"

"کانتے جی کوئی غیر تھوڑی ہیں شپارے! پھر آ جائیں گے۔" پیچھے سے کریمن بیگم کی نرم آواز ابھری۔ شہ پارہ ایک لمحے کے لیے بدحواس سی ہو گئی۔ کریمن کہہ رہی تھی "تمھیں یاد نہیں کیا وقت ہو رہا ہے؟"

"مجھے یاد ہے مگر، مگر آپا جانی! یہ ہمارے مہمان ہیں۔"

"بے شک، سر آنکھوں پر۔" کریمن نے شائستہ لہجے میں کہا "زہے نصیب! ہمارے دروازے پر ان کا آنا عزت کا باعث ہے مگر تم...."

"میں نے شپارے کو بول دیا ہے کریمن بیگم!" کانتے زہرخند سے بولا "ہم کو پتہ ہے یہ کون سا وقت ہے۔ تم کو زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں"

"کانتے بابو! بخدا غلط مت سمجھنا۔"

"انھیں میں نے ہی بلایا ہے آپا جانی! کانتے جی کے ساتھ مہمان ہیں تم بھول گئیں۔ یہ لاڈلے میاں ہیں۔"

کریمن نے مجھے ٹٹولتی نگاہوں سے دیکھا "ہاں کچھ چہرہ تو یاد آتا ہے"

"لاڈلے میاں بہت دنوں بعد یہاں آئے ہیں۔ آئیے، آپ لوگ اندر آئیے۔ آپا جانی! ذرا فردوس کو بلا کے کہیے کہ مہمان آئے ہیں" کریمن کی پیشانی پر لکیریں پڑ گئیں "میں گاؤں گی نہیں۔" شہ پارہ نے ٹوٹی ہوئی آواز میں کہا "آپ لوگ آتے کیوں نہیں؟"

"نہیں نثارے!" کانتے تلخی سے بولا۔ "پھر کسی وقت۔"
"اس وقت کیا بات ہے؟"
"آجاؤ کانتے جی! نہیں آئے تو نثارے اداس ہو جائے گی کچھ دیر کے لیے نثارے کی خاطر ٹھہر جاؤ۔" مجھے حیرت ہوئی مگر یہ کرمن بیگم ہی کی آواز تھی۔ شہ پارہ کے رخسار دہکنے لگے۔

کانتے اندر جانے کے لیے آمادہ نہیں تھا لیکن نثارے اپنا ہاتھ اُس کی جانب بڑھا چکی تھی۔ کانتے نے اُس کا ہاتھ تھاما نہیں مگر اندر داخل ہو گیا۔ ہم سب ایک مرصّع کمرے کے فرش پر آ کے بیٹھ گئے۔ وہاں بیش قیمت قالین بچھا ہوا تھا۔ چھت خاصی اُونچی تھی اور درمیان میں ایک بڑا جھاڑ لٹک رہا تھا۔ جتنے قمقمے تھے، سبھی پر قندیلیں روشن تھیں۔ یہ مکان شہ پارہ کے پہلے مکان سے بہت بڑا تھا اور باہر سے دیکھ کے کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اندر سے اتنا صاف ستھرا اور سجا ہوا ہو گا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہم کسی نواب کے دیوان خانے میں آ گئے ہوں۔ کمرے کے چاروں طرف کٹی ہوئی جالیوں کی ایک دیوار تھی جس پر چھت تک قریب قریب محرابیں بنی ہوئی تھیں اور ان سب پر ریشمی پردے ڈوریوں سے بندھے تھے۔ محرابوں کے بعد ایک کمرے کے اطراف گلی جیسا راستہ، راستے کے اُس طرف بیل بوٹے کڑھی ہوئی دیوار اور نیلے، پیلے، سُرخ اور سبز شیشوں کی کھڑکیاں۔ اندر مکان سے آنے کے لیے ایک بڑا دروازہ تھا۔ سارا کمرہ روشن تھا۔ ہمارے بیٹھنے کے بعد شہ پارہ پہلے تو اِدھر اُدھر بھاگی بھاگی پھرتی رہی۔ کبھی اندر جاتی، کبھی باہر۔ پھر وہ ہمارے مقابل آ کے بیٹھ گئی۔ وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ اُس کے کانوں میں آویزے جھول رہے تھے۔ ناک میں ایک بڑی سی نتھ سُرخ دھاگے سے کان تک بندھی ہوئی تھی۔ ماتھے پر جھومر، گلے میں گلوبند، کلائیوں میں سنہری چوڑیاں، سر پہ گلابی دوپٹّا، چوڑی دار پاجامہ اور گھیر دار جمپر۔ باقی سارے کپڑے کیسری رنگ کے تھے۔ ڈیڑھ سال کی مدت میں وہ پہلے سے کچھ اور حسین نظر آتی تھی مگر اُس کے چہرے پر وہی معصومیت تھی جو میں نے پہلی مرتبہ دیکھی تھی۔ کرمن بیگم اندر چلی گئی تھی۔ شہ پارہ کے نازک ہونٹ بے چین سے تھے۔ "جب بھی پوچھا، یہی معلوم ہوا کہ آپ ابھی نہیں آئے۔" وہ آمڈی ہوئی آواز میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"میں بہت دُور دُور گیا تھا۔" میں نے آہستگی سے کہا۔
"کہاں کہاں؟" وہ اشتیاق سے بولی۔
"شہروں شہروں۔"
"کون کون سے شہر؟"
"ایک جگہ ہو تو بتاؤں۔ مجھے اب اُن کے نام بھی یاد نہیں رہے ہوں گے۔"
"حیدرآباد بھی جانا ہوا؟"
"ہاں!" میں نے چونک کے کہا لیکن اِس کی وجہ فوراً میری سمجھ میں آ گئی کہ کرمن شہ پارہ کو حیدرآباد ہی سے لائی تھی۔ "وہاں تو کئی دن رہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اور وہاں... وہاں بھی جانا ہوا۔" وہ تجسس سے بولی۔
"کہاں؟" میں نے متردّد آواز میں پوچھا۔
"وہیں، محبوب کی مہندی؟" وہ لفظ چبا کے بولی۔
"وہاں بھی گئے تھے مگر کیوں، تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"
"یوں ہی۔" وہ خوابیدہ لہجے میں بولی۔ "حیدرآباد بہت یاد آتا ہے۔"
"بہت خوب صورت شہر ہے۔ چار مینار، مکہ مسجد، قطب شاہی مزارات، گول کنڈے کا قلعہ، فلک نما، نہ جانے کیا کیا۔ دکانیں، عمارتیں، بازار سبھی بہت اچھے ہیں۔"
"وہاں آپ کس کس سے ملے؟"

مجھے شبہ ہوا کہ کہیں وہ خانم اور جہاں گیر کے بارے میں تو کچھ نہیں جانتی۔ ممکن ہے اسی لیے مجھ سے کُرید کے پوچھ رہی ہو مگر وہ کیسے جان سکتی تھی۔ "ہم تو یوں ہی سرسری گئے تھے، بس گئے اور آ گئے۔" میں نے کسمسا کے کہا۔

"میں نے سوچا، شاید کہیں میرا ذکر ہوا ہو۔"
"اتنا موقع نہیں ملا۔ تم وہاں کس کس کو جانتی تھیں؟"
"بہتوں کو۔ وہاں دن بہت گزارے ہیں۔ بہت لوگ جانتے تھے۔" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔

میرے دل میں آیا، خانم کا نام لے کے پوچھوں لیکن اگر اُسے کچھ بھی معلوم تھا، حیدرآباد سے کسی آتے جاتے کی زبانی تو شاید وہ سمجھ جاتی۔ حیدرآباد میں شاہ جی کا واقعہ بازار کے سارے لوگوں کو معلوم تھا۔ بعد میں اُنھیں یہ بھی پتہ چل گیا ہو گا کہ خانم کن لوگوں کے ساتھ گئی ہے۔ خانم سے وہاں سبھی واقف تھے۔ حیدرآباد اور کلکتے کے درمیان لوگ سفر کرتے رہتے ہوں گے۔ مزید کرمن کے ہاں آنے والے لوگوں نے خانم کا ذکر کیا ہو گا اور اُنھوں نے ہمارے حلیے بھی بتائے ہوں گے کہ ایسے ایسے دو آدمی خانم کے ہاں آ کے ٹھہرے تھے۔ ہمارے نکلنے کے بعد وہاں نہ جانے کیسی کیسی باتیں مشہور ہو گئی ہوں گی۔ ممکن ہے شہ پارہ جہاں گیر کے بارے میں بھی جانتی ہو۔ "ہم وہاں ایک کام سے گئے تھے۔ ایک شخص کی تلاش تھی۔"

"مل گیا وہ؟" شہ پارہ سرگوشی میں بولی۔
"ہاں مل تو گیا۔"
"نثارے! اور بھی لوگ بیٹھے ہیں۔" کانتے نے مسکرا کے اُسے ٹوکا۔
"ارے۔" وہ شرما گئی۔ "میں نے پہلے کسی کو دیکھا نہیں تھا اس لیے۔"
"ہم کو تو دیکھا تھا۔"
"آپ تو نہیں رہتے ہیں۔" اُس نے نگاہیں چُراتے ہوئے کہا۔

"تو اپنی بات کم ہو گئی؟"
"آپ کی بات اپنی جگہ ہے۔"
"کس جگہ ہے؟"
"اچھی ہی جگہ ہے۔" وہ دُہری ہو کے بولی۔
"چلو، آج رات اپنے کو ٹھیک نیند آ جاوے گی۔"
"آپ نے بتایا ہی نہیں کہ آپ کے ساتھ اور کون صاحب ہیں؟" وہ تیزی سے بولی اور کانتے کی طرف رُخ کر کے بیٹھ گئی۔
"صاحب کیا، یہ اسٹر ماسٹی ہے۔ بمبئی سے آیا ہے۔ نمبر ون ہے۔"
اُس نے ماجھی کو سلام کیا۔ ماجھی پریشانی سے پہلو بدلنے لگا۔ کانتے نے باری باری سبھی کا نام لیا اور شہ پارہ نے اُن سب کو زیرِ لب تبسم سے سلام کیا۔
"ابھی اپن ایک بات بولنا چاہتا ہے۔" ماجھی کی زبان اٹکنے لگی۔
"کہیے۔" وہ گنگناتی آواز میں بولی۔
"اپن کیا بولے۔ سالا تمھارے سامنے کون بول سکتا ہے۔ اپن ساری دُنیا گھوما پھرا پر اپن نے تم جیسا رانی نئیں دیکھا۔"
"رُک کے ماجھی!" کانتے نے ہانک لگائی۔
"رُک کے ہی بولتا ہوں کانتے دادا!" ماجھی کی آواز دھڑک رہی تھی۔
شہ پارہ نظریں نیچی کیے اُن کی باتیں سُنتی رہی۔ بالا خانے کی ایک لڑکی فردوس نے ہمارے درمیان کھانے پینے کا بہت سا سامان لا کے رکھ دیا۔ شہ پارہ کے اصرار پر ہمیں کچھ نہ کچھ کھانا پڑ گیا۔ فنجانوں میں بے دودھ کی چائے تھی۔ شہ پارہ اپنے ہاتھوں سے پھل تراشتی رہی۔ اُس کی بڑی بڑی پلکیں آنکھوں پر پردہ کیے ہوئے تھیں۔ جب وہ یہ پردہ ہٹاتی تبھی اُس کی گہری، بھیگی ہوئی سیاہ آنکھیں نظر آتیں۔ ماجھی ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھ رہا تھا، زورا اور چھیدا ابھی گُم سُم سے تھے۔ اس اثنا میں کرمن کئی مرتبہ اندر آئی، کچھ دیر بیٹھی اور چلی گئی۔ گلوری منہ میں رکھتے ہی کانتے ایک دم اُٹھ گیا۔ میں بھی کھڑا ہو گیا۔
"یہ کیا ہوا؟ آپ کہاں چلے؟" شہ پارہ حیرانی سے بولی۔ "اچانک آپ نے۔"
"بس تمھارا کہا پورا ہو گیا۔" کانتے نے سادگی سے کہا۔
"مگر ابھی تو..." وہ سراسیمگی سے بولی۔
"ان لوگوں کو کچھ سُنوا دیں۔ لاڈلے! تم اِدھر ہی بیٹھو۔ ہم واپسی میں تم کو اِدھر سے لے لیں گے۔"
"میں بھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔"
"آپ بھی چلے جائیں گے؟"
"نہیں، یہ اِدھر ہی رہے گا۔" میرے بجائے کانتے نے جواب دیا۔ "ہم آتے ہیں لاڈلے!" کانتے نے مجھے کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔

اِدھر شہ پارہ میرے پاس کھڑی ہوئی بجھی بجھی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ "آپ تو بیٹھیے۔" وہ ملتجی لہجے میں بولی۔ "کانتے جی آ جائیں گے۔"

"وہ تو آ جائیں گے مگر میں..." میں نے تذبذب سے کہا۔
"کچھ دیر اور سہی۔"
کہیں اور جانے کے بجائے خود میرا دل بھی وہیں بیٹھنے کو کر رہا تھا لیکن کرمن کی بات میرے ذہن میں محفوظ تھی۔ اُس نے دروازے پر شہ پارہ کو دبے لفظوں میں جتایا تھا کہ یہ ہمیں اندر بُلانے کا وقت نہیں ہے۔ میں اُسے یہی یاد دلانا چاہتا تھا۔ دُور کھڑی ہوئی کرمن کا چہرہ صاف غمازی کرتا تھا کہ اُسے میرا بیٹھنا ناگوار لگ رہا ہے۔ وہ اُلجھی ہوئی سی تھی۔ کانتے نے جاتے جاتے لَوٹ کے میری جیب میں کوئی چیز رکھی۔ میں نے ٹٹول کے دیکھا، روپے تھے۔ وہ سب چلے گئے۔ میں اُنھیں دیکھتا رہ گیا۔ اُسی لمحے کرمن نے شہ پارہ کو بُلا کے کچھ کہا۔ میں نے سوچا جیب میں جتنے روپے ہیں، سب کرمن کو دے دوں۔ شہ پارہ واپس آئی تو اُس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ "کیا کہہ رہی تھیں؟" میں نے آہستگی سے پوچھا۔
"کچھ نہیں۔" وہ ڈوبتی ہوئی آواز میں بولی۔ "کوئی خاص بات نہیں ہے۔"
"میں جانتا ہوں کیا کہہ رہی ہوں گی۔ میرا خیال ہے مجھے اُٹھ جانا چاہیے۔"
"نہیں۔" وہ بے تابی سے بولی۔ "وہ تو خواہ مخواہ کی فکر کرتی ہیں۔"
"کیسی فکر؟"
"ایسے ہی، آپ کو کیا بتاؤں۔" اُس کی آواز گھُٹ گئی۔
"اُنھیں میرے رُکنے پر اعتراض ہے۔ یہی بات ہے نا؟"
"ہاں، وہ اپنے پوروے ناخنوں سے کھُرچنے لگی۔ "اُن کا سوچنا بھی ٹھیک ہی ہے۔ آپ کو کچھ اندازہ ہو گیا ہو گا۔" اُس کے حلق میں جیسے کوئی چیز اٹک گئی۔ "یہاں ایک رئیس ہیں، سیٹھ کرم چند۔ اُنھوں نے پابندی لگا دی ہے کہ یہاں اُن کے سوا کوئی نہیں آئے گا۔"
"مگر کیا یہ بات تمھاری مرضی کے خلاف ہوئی ہے؟"
اُس نے آنکھیں میچ لیں اور کچھ توقف کے بعد بولی۔ "میری مرضی کہاں ہے۔"
"اس کا حق تو تمھیں تھا کہ ایسی پابندی لگواؤ یا نہیں۔ تم کرمن بیگم کو منع کر سکتی تھیں۔"
"آپ بالکل نہیں بدلے۔ بالکل وہی ہیں۔"
"وہی کیا؟" میں نے سٹ پٹا کے پوچھا۔
"پہلے جیسے۔"
"پہلے کیسا تھا؟"
"جیسے اب ہیں۔" اُس کے ہونٹ کھِل کھِلانے لگے۔ "آپ مجھے کیوں نہیں؟"

"میں سمجھ گیا، پھر مجھے واقعی یہاں نہیں ٹھہرنا چاہیے۔"

"مگر میں گا تو نہیں رہی ہوں۔"

"یہ تو تم ٹھیک کہتی ہو۔"

"آپ کا دل یہاں بیٹھنے کو نہیں چاہ رہا؟"

میں نے تیزی سے اثبات میں سر ہلایا۔

"مجھے یقین تھا کہ آپ ایک دن ضرور واپس آئیں گے۔ اب آپ اتنے دنوں بعد آئے ہیں تو میں آپ سے دو باتیں بھی نہ کر سکوں۔"

"یہ تو تم بہتر سمجھ سکتی ہو۔"

"آپ کے خیال میں کیا یہ نامناسب بات ہے؟"

"میں کیا کہوں، میں سمجھتا ہوں، تمھیں اتنا اختیار تو ہونا ہی چاہیے۔"

"آپا جانی کہتی ہیں، وہ پابندی لگانے کا اختیار رکھتے ہیں، انھوں نے کرایہ دیا ہے۔" وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔

"کتنا کرایہ؟" میں نے یوں ہی پوچھ لیا۔

"پتہ نہیں، بہت ہی ہوگا۔"

"تمھیں نہیں معلوم؟"

"میں معلوم کر کے کیا کرتی۔"

"تو پھر وہ تمھیں یہاں کیوں رکھے ہوئے ہیں؟"

"یہ تو اُن کی اور آپا جانی کی مرضی پر ہے۔ وہ چاہیں تو لے بھی جائیں، اُن کے پاس بہت دولت ہے۔ پر آپا جانی نے شاید انھیں منع کر دیا ہے کہ ابھی وہ مجھے سموچا کسی کی تحویل میں دینا پسند نہیں کرتیں۔ انھوں نے سو عُذر کر دیے کہ ابھی میری عمر کم ہے۔ مجھے ابھی اور سیکھنا ہے، ابھی اُن کا ایسا کوئی خیال نہیں، وہ کچھ عرصے اور مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے رکھنا چاہتی ہیں۔ البتہ جہاں تک گانے کی بات ہے، وہ مجھے کسی ایک شخص کے لیے وقف کر سکتی ہیں۔ انھوں نے یہی کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کسی دن آمادہ ہو جائیں اور سیٹھ جی مجھے یہاں سے لے جائیں یا پھر یہیں رکھیں اور میں بس انھی کے لیے محدود ہو جاؤں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سیٹھ جی ابھی آپا جانی کی منہ مانگی مُراد قبول کرنے میں ہچکچا رہے ہوں، آپا جانی نے کچھ زیادہ ہی طلب کر لیا ہوگا۔ یہ گھر بھی سیٹھ جی نے لے کے دیا ہے۔"

"تمھارا اپنا کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال کیا۔"

"سیٹھ جی کیسے ہیں؟"

"آدمی ہیں۔" وہ سرد آہ بھر کے بولی اور دیر تک چُپ بیٹھی رہی۔ کمرے میں میرے اور اُس کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اُس کی آواز بہت دھیمی تھی۔ جھن جھناتی، کھن کھناتی ہوئی۔ جی چاہتا تھا، وہ بولتی رہے۔ کسی بات پر وہ مُسکراتی تو ٹھوڑی کے قریب گڑھا سا پڑ جاتا۔ باتیں کرتے کرتے اُس کے ہونٹ جیسے جیسے لرزتے تھے، چہرے کا رنگ اور لال ہو جاتا تھا۔ اُس کا لہجہ بہت صاف، نرم، کسی موج کی طرح تھا لیکن پھر مجھ سے کچھ پوچھا نہیں گیا۔ میرا سر گھومنے سا لگا تھا۔

"آپ سنائیے۔ آپ نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟"

"کیا بتاؤں؟"

"ایک بات پوچھوں؟" وہ منتشر آواز میں بولی۔ "کبھی میرا چہرہ یاد رہا آپ کو؟"

"ہاں! کئی بار خیال آیا۔"

"سچ!" اُس کی پُتلیاں چمکنے لگیں۔ "میں نے آپ کے بارے میں بہت کچھ معلوم کیا۔"

"کیا کیا۔ تم نے کیا معلوم کیا؟" میں نے وحشت سے کہا۔

"یہی کہ آپ کے ساتھ کیا کیا گزری۔"

"تم کیا جانتی ہو؟"

"زیادہ نہیں، بس اتنا کہ آپ نے بہت دُکھ اُٹھائے ہیں۔"

"مجھے کُھل کے بتاؤ۔"

"آپ اپنی ہی باتیں جاننے کے لیے اتنے بے تاب کیوں ہیں؟"

"شاید تُم نے کچھ غلط سُنا ہو۔"

"مگر میں نے آپ کو دیکھا بھی تو ہے۔"

"کتنی بار!"

"بعض اوقات تو ایک ہی بار کافی ہوتا ہے۔" وہ لرزیدہ لہجے میں بولی۔

"ایک بار میں تُم نے کیا سمجھا ہوگا؟"

"بہت کچھ سمجھ لیا۔ میں نے آپ کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ جو لوگ میں نے اب تک دیکھے ہیں، آپ کی آنکھیں اُن سب سے الگ ہیں۔ جن لوگوں کے ساتھ آپ آئے تھے، اُن میں بھی الگ الگ نظر آ رہے تھے۔ میرا دل چاہا تھا کہ آپ کو روک لوں مگر ہمت نہیں پڑی، پھر میں آپ کا انتظار کرتی رہی کہ شاید آپ پھر آئیں۔ میں نے بہت سی باتیں سوچ رکھی تھیں کہ آپ آئیں گے تو کہوں گی لیکن اب کچھ یاد ہی نہیں آ رہا ہے۔ نہ جانے کیا کیا سوچا تھا۔ میں اس چار دیواری میں بند ہوں اور میرے پیروں میں گھنگروؤں کی زنجیر پڑی ہے۔ میں آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکتی اور میرے کرنے نہ کرنے سے ہوگا بھی کیا؟ ہو سکے تو اپنے کچھ دُکھ مجھے دے دیجیے۔ مجھے احساس ہے کہ یہ ایک مہمل سی بات ہے، کون کسی کے دُکھ سمیٹ سکتا ہے مگر مجھے معلوم نہیں کہ آپ کے سامنے اور کیا کہنا چاہیے۔"

"شہپارے!" میری آواز بیٹھ گئی۔ "تم نے کیا کیا سُنا ہے؟"

اُس نے سُنا کم تھا، اخذ زیادہ کر لیا تھا اور جتنا اخذ کیا تھا، اُسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اصل کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہے۔ وہ صرف اتنا ہی جانتی تھی کہ مجھے ایک طویل مدت جیل میں گزارنی پڑی ہے اور وہاں میں نے تعلیم بھی حاصل کی ہے۔ اُسے کسی نے بتایا تھا کہ شاید اس دوران میرے گھر والے مجھ سے کھو گئے ہیں، میں انھی کی تلاش میں شہروں شہروں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ اُسے خانم اور جہاں گیر کی بابت کچھ علم نہیں تھا لیکن وہ خانم سے واقف ضرور ہوگی۔ نسترن، چاند میاں، موجمدار کا واقعہ، زرّیں کا نام، فیض آباد میں اُس کی حویلی، یہ سب کچھ اُسے معلوم تھا۔ بمبئی کے چند واقعات بھی اُس کے علم میں تھے۔ اُس نے فہمیدہ کا ذکر نہیں کیا۔ کوئی بعید نہیں کہ فیض آباد سے یہ بات کلکتے تک پہنچ گئی ہو۔ اڈوں کے آدمیوں ہی نے اُسے یہ ساری باتیں بتائی ہوں گی۔ یہاں طرح طرح کے لوگ آتے رہے ہوں گے۔ شہپارہ نے اُن سے خود ہی پوچھا ہوگا اور انھوں نے اُس کی خاطر ناپ تول زبان کھولنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا ہوگا۔ بہرحال اُسے کورا اور مولوی صاحب کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا۔

"کیا یہ سب کچھ غلط ہے؟" اُس نے رنجیدگی سے پوچھا۔

"نہیں، بہت کچھ درست ہے۔ تو کیا تمھیں مجھ پر ترس آتا ہے؟"

"نہیں۔" وہ پریشان لہجے میں بولی۔ "یہ ترس نہیں ہے، آپ ایسا کیوں کہتے ہیں، جب مجھے کچھ پتہ نہیں تھا تو بھی میں نے کچھ یہی جانا تھا۔ اتفاق سے بعد میں اس کی تائید بھی ہو گئی۔ اسے ترس کہہ کے مجھے نادم مت کیجیے۔ ترس تو معذوروں، بے بسوں پر کیا جاتا ہے۔ ہاں، مجھ پر آپ ضرور ترس کھا سکتے ہیں۔ میں نہ آپ کی طرح آزاد ہوں، نہ مختار۔ آپ مرد ہیں اور خدا نے آپ کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت عطا کی ہے۔ آپ کے بازو مضبوط ہیں اور ابھی آپ کے سامنے ایک عمر پڑی ہے۔ خدا آپ کو بہت زیادہ عمر دے، بہت زیادہ اور آپ کی ساری مُرادیں بر آئیں۔"

"شہپارے!" میں نے خجالت سے کہا۔ "تم نے اگر میری بات محسوس کی ہے تو مجھے معاف کر دو۔ میری زبان قابو میں نہیں رہتی۔ کہنا کچھ چاہتا ہوں، نکل کچھ جاتا ہے۔ جنھوں نے دُکھ سہا ہے، دُکھ وہی سمجھ سکتے ہیں۔ تم بھی مجھے بہت دُکھی لگتی ہو۔ یقین کرو، پہلے بھی جب میں یہاں آیا تھا تو میں نے یہی محسوس کیا تھا لیکن میں تم سے کچھ کہہ نہیں سکا۔ تم نے کہہ دیا ہے۔ میرے لیے تمھاری طرح اور لوگ بھی دعا کرتے ہیں، پر کچھ ہوتا ہی نہیں۔"

"مایوس کیوں ہوتے ہیں۔"

"تم بھی تو مایوس نظر آتی ہو۔"

"مایوسی کے ساتھ ساتھ ایک اُمید بھی ہے، خدا کبھی تو سُنے گا۔"

"سب یہی کہتے ہیں۔"

"کوئی غلط تو نہیں کہتے، کیا دیکھتے دیکھتے لوگوں کی قسمتیں نہیں بدل جاتیں؟ اتنا اندھیر نہیں ہے۔"

"تم یہاں اس قید خانے میں بیٹھ کے یہ کہہ رہی ہو تو واقعی اندھیر نہیں ہے۔ تمھارے دُکھ بھی میں جانتا ہوں شہپارے! یقیناً وہی ہوں گے جو یہاں بہت سوں کے ہوتے ہیں۔ بہت کم لوگ خوش رہتے ہوں گے یہاں اور تم جیسی لڑکی تو بالکل نہیں۔" میں نے اُس سے یہ نہیں کہا کہ وہ نمی کی طرح معصوم ہے یا زرّیں، جولین اور نیساں کی بہن لگتی ہے۔

"قسمت کا تماشا ہے۔"

"تم سب یہ پسند نہیں کرتیں نا؟" اُس نے گردن جھکا لی۔

"مجھے یقین ہے، کرمن بیگم تمھاری اصل ماں بھی نہیں ہوگی۔"

"اب تو وہی سب کچھ ہیں۔"

"تمھیں کہاں سے لایا گیا تھا؟"

"مجھے کچھ یاد نہیں، صرف دُھندلا دُھندلا سا ایک نقش ہے۔" میرے پوچھنے پر اُس نے بہ مشکل تمام بتایا کہ وہ بہت چھوٹی تھی کہ کسی نے اُسے حیدر آباد کے بازار میں پہنچا دیا۔ اُسے صرف اتنا یاد ہے کہ اُس دن گھر میں بہت سے لوگ آئے تھے اور اُس کے باپ کی مسہری کے گرد بیٹھے رو رہے تھے۔ لوگوں کی دیکھا دیکھی وہ بھی رونے لگی۔ اُسے حیرت تھی کہ اُس کے باپ کو اچانک کیا ہو گیا ہے، وہ بولتے کیوں نہیں، اُٹھتے کیوں نہیں۔ اُس کا ایک بڑا سا گھر تھا، بہن بھائی تھے۔ اُن کی شکلیں اب تک اُس کے ذہن میں محفوظ تھیں۔ جب اُس کے ابا کو لوگ کندھوں پر اُٹھا کے لے جانے لگے تو وہ بھی باہر آ گئی۔ گلی میں بہت بڑا ہجوم تھا۔ لوگ اُسے سینے سے لگا کے پیار کرنے لگے اور انھی میں سے کسی شخص نے اُسے گود میں لے لیا۔ پھر جب اُسے ہوش آیا تو وہ ایک دوسری جگہ تھی۔ حیدر آباد کے بازارِ محبوب کی مہندی میں۔ وہ وہیں پلی بڑھی۔ بعد میں کرمن بیگم کلکتے سے حیدر آباد آئی تو شہپارہ اُس کے سپرد کر دی گئی کیونکہ جس عورت کے ہاں اُس نے پرورش پائی تھی، وہ کرمن بیگم کی قریبی عزیز تھی۔ "سب ایک خواب کے مانند ہے۔" اُس کی آواز ڈگمگانے لگی۔ "وقت کے ساتھ یہ دُھند بھی چھٹ جائے گی۔"

"کبھی نہیں چھٹے گی۔ اور گہری ہو جائے گی۔ آدمی یہی سمجھتا ہے کہ وہ بھول جائے گا لیکن بہت سی باتیں بھولنے کی نہیں ہوتیں۔ وقت کا اُن پر اثر نہیں ہوتا۔"

"ہو بھی جاتا ہے۔ کئی مثالیں تو میرے سامنے ہیں۔ وقت نے اُن کے زخم بھر دیے۔ انھیں اب کسی سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔"

"پتہ نہیں، یہ اچھا ہوتا ہے یا بُرا۔"

"اچھا ہی ہوتا ہے۔ یوں زندہ رہنا بھی ایک طرح وقت سے سمجھوتا کرنا ہے۔ وقت کے سامنے سر خم کر دینا ہے۔ صرف اِس بہانے کہ شاید رُت بدل جائے اور رُت کبھی بدل جاتی ہے، کبھی نہیں بدلتی۔ کسی کے لیے بدل جاتی ہے، کسی کے لیے نہیں اور آدمی عمر بھر اُس کے انتظار کے فریب میں رہتا ہے۔"

"کاش، میں تم سے کچھ کہہ سکتا لیکن فضول باتیں کرنے سے کیا حاصل۔ میری زبان کہتے کہتے رُک جاتی ہے۔"

"آپ کا اتنا کہنا ہی میرے لیے بہت ہے۔" اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ "مجھے احساس ہے کہ آپ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ دُکھی آدمی جھوٹ نہیں بولتا ورنہ اُس کے دُکھ جھوٹ ہوتے ہیں۔ دل پر بوجھ مت رکھیے گا۔ میری باتیں سُن کے آپ کا جی اور گراں ہو گیا ہو گا۔"

"یہ ذکر تو میں نے خود چھیڑا تھا نشارے! اپنے آنسو روک لو ابھی تھی تو مجھے صبر و ضبط کے لیے کہہ رہی تھیں۔ اب تاو ضبط کرنا کیسا مشکل ہے۔"

وہ کچھ نہیں بولی۔ دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھ کے گم سُم بیٹھی رہی۔

"ہم لوگ جا رہے ہیں نشارے! دیکھو واپسی کب ہوتی ہے لیکن جب بھی ہو گی، میں اِدھر ضرور آؤں گا۔"

"پھر جا رہے ہیں؟" وہ شکستہ لہجے میں بولی۔

"ہاں اور مجھے خود نہیں معلوم کہ کس طرف جا رہے ہیں۔ ممکن ہے جلدی آ جائیں یا ممکن ہے بہت دیر ہو جائے یا کبھی واپس نہ آ سکیں۔"

"نہیں نہیں۔" وہ بے قراری سے بولی۔ "ایسی بدفالیں منہ سے کیوں نکالتے ہیں۔ خُدا نے چاہا تو آپ کامیاب لوٹیں گے۔"

"کیا کہا جا سکتا ہے۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"میں آپ کا انتظار کروں گی۔"

"اور تم مجھے یاد آتی رہو گی۔" میں نے ڈولتی ہوئی آواز میں کہا۔ "تجھے ہر دم تمھارا احساس رہے گا۔ میں آ گیا تو ٹھیک ہے لیکن نہ آ سکا تو تم، تم...." سب کچھ میرے دماغ میں گڈمڈ ہو گیا کہ میں اُس سے کیا کہنا چاہتا تھا۔

"آپ آئیں گے، انشاءاللہ جلد واپس آئیں گے۔ میرا کوئی احساس نہ کیجیے گا۔ میں یہاں بالکل ٹھیک ہوں۔ حوصلے سے جائیے اور مایوسی دل میں مت لائیے۔" وہ مجھے تسلیاں دینے لگی۔

دیر ہو گئی تھی۔ اُن میں سے کوئی واپس نہیں آیا تھا۔ کرمن بیگم ایک بار آ کے چلی گئی تھی۔ شہہ پارہ میرے پاس ہی بیٹھی رہی۔ ایک لمحے کے لیے بھی اُٹھ کے کہیں نہیں گئی۔ میں سوچ رہا تھا کہ باہر جا کے کانتے وغیرہ کو خود تلاش کرنا چاہیے۔ معاً سامنے کے دروازے سے کرمن بیگم حواس باختہ انداز میں اندر داخل ہوئی۔ "وہ آ گئے ہیں۔" کمرے میں اُس کی تلملاتی آواز گونجی۔

"کون آیا جانی؟" شہہ پارہ نے آنکھیں پٹ پٹا کے پوچھا۔

"کرم جی!۔ وہ اُوپر چڑھ رہے ہیں۔ موٹر نیچے کھڑی ہے۔"

"تو آنے دیجیے۔" شہہ پارہ تحمل سے بولی۔

"میں چلتا ہوں۔" میں نے درمیان میں کہا۔

"آپ بیٹھیے۔ کہاں کانتے جی کو ڈھونڈتے پھریں گے۔"

"کیا یہ مناسب ہو گا؟" کرمن کتراتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "شاید اُنھیں یہ پسند نہ ہو۔"

"میں نے نہ گھنگرو باندھے ہیں، نہ گا رہی ہوں، نہ یہاں ساز ندے موجود ہیں۔"

"تم درست کہتی ہو مگر وہ محسوس کر لیں گے۔ مجھے جو اندیشہ تھا، وہی ہوا نا۔ وہ آ گئے نا۔ اُن کے مزاج سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ وہ تمھارے معاملے میں کتنے حسّاس ہیں، ہمیں اُن کا خیال رکھنا چاہیے۔ ہم پر اُن کے احسانات کچھ کم نہیں ہیں۔"

"مگر آپا جانی!" شہہ پارہ نے احتجاج کیا۔ "کیا یہاں ہمارا کوئی مہمان نہیں آ سکتا؟ ہم تھوڑی دیر کے لیے اپنے کسی مہمان کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے؟"

"میں نے تمھیں جتا دیا ہے، تم خود سمجھ دار ہو۔" کرمن ناراضی سے بولی۔

"کیا یہ نامناسب نہیں ہے کہ اُن کے آتے ہی ہم اپنے مہمان کو اٹھا دیں۔"

"تم جانو۔ وہ آ رہے ہیں۔"

دروازے پر کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی پھر چشم زدن میں سانولی رنگت، درمیانہ قد اور ادھیڑ عمر کا ایک شخص برآمد ہوا۔ اُس کی آنکھوں پر سنہرے فریم کا چشمہ لگا ہوا تھا۔ کھچڑی بالوں کی مونچھیں سب سے زیادہ نمایاں تھیں۔ اُس نے بند گلے کا ایک سلکن کوٹ پہن رکھا تھا۔ دھوتی سفید تھی۔ چہرے مہرے سے وہ اچھا خاصا صاف ستھرا شخص تھا۔ ہونٹ موٹے موٹے، ناک اُبھری ہوئی۔ کوٹ کے باہر گلے میں سونے کی زنجیر پڑی ہوئی تھی۔ انگلیوں میں کئی رنگوں کے پتھروں کی موٹی موٹی انگوٹھیاں تھیں۔ پہلے اُس نے شہہ پارہ کو دیکھا، پھر مجھے، پھر کرمن بیگم کو۔ اُس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اُس کے تیور اچھے نہیں ہیں۔ شہہ پارہ نے کھڑے ہو کے اُسے تسلیم کی۔ اُس نے سر کو ایک خفیف سی جنبش دی۔ میں نہیں اُٹھا تھا۔ "تشریف لائیے کرم جی!" شہہ پارہ نے شائستگی سے کہا۔

وہ آگے نہیں بڑھا۔ دروازے سے کچھ فاصلے ہی پر کھڑا رہا۔

"یہ لاڈلے میاں ہیں۔" کرمن نے جلدی سے کہا۔ "یہ استاد مچھل کے خاص آدمی ہیں۔"

سیٹھ کرم چند نے جواب نہیں دیا۔ شہہ پارہ اُس کے پاس جا کے ٹھیرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "کیوں! آپ بیٹھتے کیوں نہیں؟"

"کرمن بیگم۔" اُس کی بپھری ہوئی آواز اُبھری۔ "ہم اس کو کیا سمجھے؟"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔"

"تم مطلب خوب سمجھو ہو۔ کیا ہم اِدھر دوبارہ نہیں آئے؟"

"کون کم بخت کہتا ہے۔ یہ گھر آپ کا ہے، آپ کو غلط فہمی ہو گئی ہے۔"

"تمھارا خیال ہے، ہم کو کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ اِدھر ہمارے پیچھے کون آتا جاتا ہے کیا؟ اِدھر ہم نے اپنا کوئی آدمی نہیں چھوڑا ہو گا جو ہم کو پل پل کی خبر دے۔"

"سیٹھ صاحب! اگر آپ کا اشارہ لاڈلے میاں کی طرف ہے تو یہ ہمارے مہمان ہیں۔" کرمن عاجزی سے بولی۔ "آپ سکون سے کچھ دیر بیٹھیے ذرا سانس لیجیے۔ یہ بھی عزت دار آدمی ہیں۔"

"ہم کو اس سے کوئی ناتا نہیں ہے۔ یہ کون ہے، کدھر سے آیا ہے؟ ہماری بات تم سے ہے۔ تم سے ہمارا کیا طے ہوا تھا، اِدھر کوئی نہیں آئے گا، کوئی بھی نہیں آئے گا تو نشارے کے پاس نہیں۔ ہم کو پتہ چلا ہے کہ ابھی اِدھر سے بہت سے لوگ اُٹھ کے گئے ہیں۔ وہ اِدھر کیا کرنے آئے تھے؟ نشارے کے سوا اِدھر اور کون چیز دیکھنے کی ہے؟"

"خدا گواہ ہے سیٹھ صاحب! نشارے نے جو اُن کے سامنے گھنگرو باندھے ہوں۔ وہ اِس علاقے کے لوگ ہیں۔ اُن کا بھی کچھ لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔"

"ایک سے بنا کے رکھو۔ ہم تم کو پہلے ہی بول دیا تھا کرمن بیگم! یہ سب ہم کو ایک دانہ بھر بھی اچھا نہیں لگتا۔ نشارے کو ہم باہر کے کسی آدمی کے سامنے کرنا نہیں چاہتے اور ہم اس کے لیے بڑی سے بڑی قیمت چکانے کو تیار ہیں۔"

"آپ بیٹھیے تو سہی۔ پھر جو جی میں آئے کہہ لیجیے گا۔"

"تم کو معلوم ہے، ہم کو اِدھر کسی کے ساتھ بیٹھنا پسند نہیں ہے۔"

"لاڈلے میاں بس جانے ہی والے تھے۔"

"مگر یہ اِدھر کیوں ہے؟" اُس کی آواز بتدریج تیز ہوتی جا رہی تھی۔ کرمن بیگم کی خوشامدوں کے باوجود اُس کا پارہ نہیں ٹھیرا۔ شہہ پارہ نے بھی اُسے نرم لہجے میں سمجھانے کی کوشش کی۔ اُس نے اُس کی بات پر بھی توجہ نہیں دی۔ میں چلا آتا لیکن مجھے اُس کی بدزبانی بہت بُری لگی۔ شہہ پارہ کبھی میری طرف دیکھتی، کبھی اُس کی طرف۔ "یہاں اور کسی کا ہونا کرم چند کا اپمان ہے، بے عزتی ہے۔ اپنے مہمان سے بول کہ چلا جائے۔"

مجھے سخت غصہ آیا۔ جی میں آیا، بڑھ کے اُس کا گریبان پکڑ لوں۔ وہ شہہ پارہ کی توہین کر رہا تھا۔ کرمن بیگم نے شکایت کی۔ "آپ ایسا نہ کہیے یہ چلے جائیں گے۔ یہ خود رُکنے پر آمادہ نہیں تھے۔ سچ تو یہ ہے، ہم نے ہی انھیں روکا۔ ڈیڑھ دو سال بعد آج نظر آئے ہیں۔ دروازہ اسی لیے کھلا رکھا تھا کہ آپ کو بدگمانی نہ ہو۔ لاڈلے میاں!" کرمن اِس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ میری سُرخ آنکھیں دیکھ کے چُپ ہو گئی۔

"اپنے سیٹھ سے کہو کرمن بیگم کہ زبان سنبھال کے بات کرے۔ اسے بولنا نہیں آتا تو زبان بند رکھے۔" میں نے درشتی سے کہا۔

"لاڈلے میاں! خدا کے لیے خاموش رہیے۔ میری خاطر، شہہ پارہ کی خاطر۔" کرمن گڑگڑا کے بولی۔ "سیٹھ کرم چند جی نے ہمارے ساتھ بہت سلوک کیا ہے۔ جو یہ کہہ رہے ہیں، سب سچ ہے۔ شہہ پارہ باہر کے لوگوں میں صرف اِنھی کے سامنے آتی ہے، ماشاءاللہ آپ سمجھ دار ہیں، سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ اس سے پہلے کہ بات طُول کھینچے، میں منت کرتی ہوں کہ اپنے آپ کو قابو میں رکھیے۔"

"بات کو تو یہ سیٹھ کرم چند طُول دے رہا ہے۔"

"کرمن بیگم!" کرم چند گرجتی آواز میں بولا۔ "چھوکرے سے بولو کہ یہ ہمارا گھر ہے اور ہم کو اپنے گھر میں ایسی بات برداشت نہیں۔ چلے جاؤ چھوکرے!" وہ پہلی بار براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوا۔

"میں یہیں رہوں گا۔"

"تم اِدھر نہیں رہ سکتا۔"

شہہ پارہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "خدا کے لیے...."

"اس سے دُور رہو نشارے جان!" کرم چند نے چیخ کے کہا۔

شہہ پارہ نے اس طرح میرا ہاتھ چھوڑ دیا جیسے اُسے ڈنک لگ گیا ہو۔

"سیٹھ کرم چند!" میں نے نسبتاً پُرسکون آواز میں کہا۔ "حکم مت چلاؤ۔"

"ہم نے اِدھر روکڑا دیا ہے۔" وہ انگلیوں سے اشارہ کرتے ہوئے برہمی سے بولا۔ "حکم کا روکڑا، روکڑا ہو تو کھولو۔"

"ضرورت پڑی تو وہ بھی کھول دیں گے۔"

"اس کی ضرورت ایسے ہی وقت پڑتی ہے۔ اِدھر خالی بیلی نہیں چلتا۔"

"تم نے کتنا روکڑا دیا ہے؟" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"اِدھر دو لاکھ کرمن بیگم کی مانگ ہے۔"

"ہم چار لاکھ دیں گے۔"

"چار لاکھ!۔ ہم چھ لاکھ دے گا۔"

"میں اِسے دُگنا کر دوں گا۔"

"پہلے اِدھر لے آ۔" وہ حقارت سے بولا۔ "اور اس سے پہلے اِدھر سے چلا جا۔ جب پیسہ لے کے آئے پھر بات کرنا۔ دُگنا روپیہ دے گا! دیکھا ہے! آنکھیں پھٹ جائے گا۔"

"آنکھیں تیری پھٹیں گی سیٹھ کرم چند! ہم کو ایک پیسہ دکھانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں اسے یوں ہی تیرے سامنے سے لے جاؤں گا۔ پوچھ لے نشارے سے۔"

"مفت کا مال نہیں چھوکرے! بازار میں کھڑا ہے۔"

"پوچھ لے نشارے سے کہ وہ تیرے روپے کے ساتھ جانا چاہتی ہے یا میرے ساتھ۔ میری جیب میں اس وقت اتنے پیسے نہیں ہیں۔"

"ہا، ہا، نواب کا تھوکا... دن میں سپن دیکھتا ہے، پوچھ لے۔ پوچھ لے اور اپنے مغز سے یہ مستی بھی نکال دے۔"

"یہ کیسی باتیں ہو رہی ہیں۔ خدا کے واسطے یہ گفتگو بند کیجیے۔" کرمن ہذیانی انداز میں بولی۔ "سیٹھ جی! آپ ہی کچھ بڑے پن کا ثبوت دیجیے۔ یہ باتیں آپ کے شایانِ شان نہیں۔"

۔ اپنی شان پر جو کالک لگانا تھی وہ تم نے لگا ہی دی ہے کرمن بیگم! اب اور کیا چاہو ہو۔ چھوکرے سے بولو کہ چلا جائے ورنہ ہم اس کو دھکے دے کے باہر نکال دے گا۔"

"سیٹھ! تمھاری عمر کا دھیان ہوتا ہے تم صرف زبان سے کہتے ہو، میں ابھی تمھیں سیڑھیوں سے نیچے پھینک دوں گا۔"

"اوہ اوہ۔" کرمن دونوں ہاتھ کان پر رکھ کے واویلا کرنے لگی۔

سیٹھ نے پھر کچھ نہیں سنا۔ سیدھا دروازے کی طرف پلٹ گیا۔ میں سمجھا، وہ چلا گیا ہے۔ زینے پہ جا کے اُس نے تالی بجائی۔ اُسی لمحے زینے میں بھاری بھاری قدموں کی آہٹ گونجی۔ کرمن بیگم دہائیاں دینے لگی۔ آنے والے دو آدمی تھے، دو مشٹنڈے۔ پہلوانوں کے مانند۔ لباس سے فوجی معلوم ہوتے تھے۔ دونوں کی کمر سے چمڑے کی ایک ایک بیلٹ بندھی تھی اور بیلٹوں کے خانوں میں کارتوس بھرے ہوئے تھے۔ کندھوں سے ہولسٹر لٹک رہے تھے۔ چھرے بھی بیلٹ میں اڑسے ہوئے تھے۔ دونوں کے سینے چوڑے، جسم گٹھے ہوئے اور قد نکلتے ہوئے تھے۔ مونچھیں تلوار کی طرح کھنچی ہوئی تھیں۔ سر پر چھوٹی پگڑی کسی ہوئی تھی۔ اُن کی عمروں میں زیادہ فرق نہیں تھا، ایک کی چالیس ہوگی تو دوسرے کی تیس۔ رنگت خاکی تھی، جیسے بھوری مٹی۔ وہ اس طرح اندر آئے جیسے انھیں کسی چور کی تلاش ہو، دیدے پھاڑے ہوئے۔ اُن کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ آتے ہی انھوں نے چاروں طرف گھور کے دیکھا پھر اُن کی نظریں مجھ پر آ کے ٹک گئیں۔ "اِس کو اُٹھا کے نیچے پھینک دو۔" کرم چند نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"یہ اُستاد ٹھبل کے آدمی ہیں۔" کرمن سیٹھ کے سامنے آگئی۔

"اِن لوگوں نے بڑے بڑے استادوں کا نشہ ہرن کر دیا ہے کرمن بیگم!"

"میں کہتی ہوں، آپ انھیں روک لیجیے۔"

"ہم ان کو روکے لیتے ہیں۔ چھوکرے سے بولو، آخری موقع ہے۔ اِدھر سے دفع ہو جا۔ پھر کبھی اس گھر کی طرف سر اُٹھا کے نہ دیکھنا۔"

"لاڈلے میاں! میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔" اُس نے اپنا دامن میرے آگے پھیلا دیا۔ "سیٹھ جی اس وقت ہوش میں نہیں ہیں، کچھ سمجھ نہیں رہے ہیں لیکن تم ہوش مت کھونا۔"

دونوں آدمی مجھ سے ایک فاصلے پر آ کے ٹھہر گئے تھے۔ "سیٹھ کرم چند!" میں نے تلخی سے کہا۔ "بازو بھی دوسرے کا استعمال کرتے ہو۔"

"یہ بھی اپنا بازو ہے چھکڑ! روکڑے کا بازو اور روکڑا بازو ہلائے بغیر نہیں آتا۔ بولو، جلدی فیصلہ کرو۔ ہم اِن کو اشارہ کرے؟"

"بس کرو، بس کرو۔" کرمن چلانے لگی۔

"چپ ہو جاؤ!" کرم چند نے اُسے ڈانٹ دیا۔

"یہاں سے چلے جاؤ سیٹھ!" میں نے ترش لہجے میں کہا۔

"ہم جائے؟" وہ نخوت سے بولا۔ "پھینک دو اسے نیچے۔" اُس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ وہ مجھ پر ایک دم نہیں لپکے، پہلے مجھے نظروں میں تولتے رہے۔ میں نے اپنے کندھے گرائے رکھے لیکن میری آنکھیں اُنھی پر مرکوز تھیں۔ کرمن اور شہہ پارہ میرے آگے ڈھال بن کے کھڑی ہو گئیں۔ میں نے اُنھیں دھکے دے کے خود سے دور کیا۔ کرم چند کے آدمیوں نے خنجر نہیں نکالے۔ دونوں مجھے بازوؤں سے پکڑ کے دھکیلتے اور گھسیٹتے ہوئے زینے تک لے جانے کی جستجو میں ہوں گے۔ شروع شروع میں وہ یہی کر سکتے تھے۔ سیٹھ کمرے کے درمیان ایک ستون سے سہارا لے کے کھڑا ہو گیا۔ وہ آہستگی سے میرے قریب آئے جیسے مجھ سے دو بدو کچھ کہنا چاہتے ہوں کہ بہتر ہے میں اُنھیں ہاتھ نہ اُٹھانے دوں۔ میں اپنی جگہ سے نہیں ہٹا، اُنھیں آنے دیا۔ شہہ پارہ سسک رہی تھی۔ اُن دونوں نے ہاتھ بڑھائے مگر اس سے پیشتر کہ وہ میرے بازو پکڑ کے مجھے آگے دھکیلتے، میں نے خود پھرتی سے جھپٹ کے اُن کے دراز ہاتھ پہنچے سے پکڑ لیے اور زور سے جھٹکا دیا۔ دونوں ایک ساتھ فرش پر گرے اور قلابازی کھا گئے۔

اُن کے لیے یہ بہت غیر متوقع ہوگا۔ میں نے ایک ثانیے کے وقفے میں کچھ پیچھے ہو کے اپنا رُخ بدل لیا تھا۔ وہ اُٹھ تو جلدی گئے لیکن پھر انھوں نے مجھ پر حملہ کرنے میں جلدی نہیں کی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور استہزائی انداز میں مسکراتے ہوئے کھڑے ہو گئے پھر رفتہ رفتہ انھوں نے دوبارہ آگے بڑھ کے مجھ سے فاصلہ کم کیا۔ میں دوسری بار اُن کے ارادے کا تعین نہیں کر سکا تھا۔ کئی باتیں ممکن تھیں۔ یا تو وہ عام لوگوں کی طرح طیش میں آ کے مجھ سے چمٹ جاتے یا خنجر نکال لیتے یا کچھ اور کرتے لیکن وہ دو گز کی دوری پر آ کے ٹھہر گئے اور اچانک طوفان کی تیزی سے دونوں اِدھر اُدھر سے بیلوں کی طرح اپنے سر آگے کیے میرے سینے پر حملہ آور ہوئے۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ وہ ایسا کریں گے۔ میں دونوں کے بیک وقت زور کی تاب نہیں لا سکا۔ گو میں نے بچنے کی ایک کوشش کی تھی تاہم انھوں نے بہت عجلت کی۔ مجھے سنبھلنے کا ذرا سا موقع بھی نہیں دیا اور میرے ساتھ ہی گرے۔ وہ میرے جسم پہ دباؤ ڈالے ہوئے تھے کچھ اس طرح کہ بے فائدہ ٹانگیں چلانے کے سوا میرے لیے باقی جسم کو حرکت دینا مشکل ہو گیا تھا۔ اب ایک ہی صورت مناسب تھی کہ میں مزاحمت کے بجائے اپنا جسم ڈھیلا کر لوں، اس طرح قدرتی طور پر اُن کے ہاتھ سست پڑ جاتے کیونکہ ابھی ابتدا تھی۔ پہلا واقعہ انھوں نے اتفاق محمول کیا ہوگا۔ اپنے ڈیل ڈول پہ اُنھیں پورا اعتبار ہوگا اور سیٹھ کرم چند کو یہ جتانے کی بھی خواہش ہوگی کہ اُنھیں زیادہ ہاتھ پیر چلانے اور زور کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ وہ صرف ایک حملے میں مخالف کو زیر کر لیتے ہیں۔ چنانچہ مجھے یقین تھا، جلد ہی اُن میں سے کوئی اپنے دوسرے ساتھی کو یہ کہہ کے ہٹا دے گا کہ وہ اکیلا کافی ہے لیکن یہ سب فضول باتیں تھیں۔ کیا میرے پاس اُن کی رعایت ملنے کے سوا اپنے بچاؤ کا کوئی اور طریقہ نہیں رہ گیا تھا؟ ایسا نہیں تھا، ایک کی نسبت دو آدمیوں سے نمٹنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ اُن دونوں میں اپنے عمل کی یکسانی ممکن نہیں ہوتی۔ سوچ میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ وہ پہلے سے کتنی ہی منصوبہ بندی کریں مگر مخالف کے غیر متوقع جوابی داؤ پر غور کرنے اور آپس میں تبادلۂ خیال کرنے کا وقت نہیں ہوتا اور پھر ایک کو دوسرے کا ہر دم خیال رہتا ہے۔

میں اُن کے نیچے دبا رہا۔ مجھے اپنے اور اُن کے جسموں کے درمیان حرکت کے لیے ایک گنجائش درکار تھی۔ گنجائش اُنھیں دینی ہی تھی۔ وہ نہ دیتے تو میں نیچے سے زور کر کے اُنھیں ایسا کرنے پر مجبور کر دیتا۔ ظاہر ہے میری کشمکش سے اُن کا حرکت کرنا لازم ہو جاتا اور یہیں مجھے کوئی موقع مل جاتا۔ میرا کوئی ہاتھ کھلا ہوتا تو اتنی دیر بھی نہ لگتی۔ میں ترچھے ہاتھ سے اُن کے کولھوں اور کمر پہ ضرب لگا سکتا تھا۔ میں نے کسی کشمکش کا اظہار نہیں کیا۔ اُنھوں نے میری کنپٹیوں پر ضربیں لگائیں۔ وہ میری کراہیں اور چیخیں سننے کی آرزو میں ہوں گے مگر میں جیسے بے دم پڑا رہا۔ مجھے بے مزاحمت دیکھ کے اُنھیں کچھ تردد ہوا۔ اپنی دانست میں انھوں نے ذرا سا اُوپر اُٹھ کے میرا جائزہ لینا چاہا۔ میں نے پھر بھی کوئی جدوجہد نہیں کی۔ نتیجتہً اُن کی گرفت میں اور ڈھیل پیدا ہوئی اور انھوں نے گویا اپنے طور پر طے کر لیا کہ اب مجھے اُٹھا کے زینے میں پھینک دیا جائے۔ جیسے ہی اُن کا دباؤ کم ہوا اور وہ میرے جسم سے کسی قدر اُوپر ہٹے، میں نے اُسی لمحے سینے کے بل پوری طاقت کے ساتھ نیچے سے زور کیا۔ وہ منتشر سے ہو گئے۔ ایک میری ٹانگوں سے چمٹ گیا۔ میں نے دوسرے کا خیال ترک کر کے پہلے اُسی کے منہ پر گھٹنا مارا، پھر بے دریغ ٹانگیں چلاتے ہوئے کم از کم اُسے چند لمحوں کے لیے دور کر دیا۔ دوسرا جس کی عمر زیادہ تھی، غصے میں آ گیا تھا۔ اگر وہ مجھ سے لپٹا رہتا تو اتنی دیر میں دوسرا آ جاتا مگر اُس نے پہلی بار کی طرح مجھے مارنا شروع کر دیا۔ میری ٹانگیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ میرے کولھوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے مارنے کے سبب میرا ایک ہاتھ بھی آزاد ہو گیا تھا۔ دوسرے کو اُس نے دبا رکھا تھا۔ میرے لیے اب زیادہ دشواری نہیں تھی۔ میں نے کوئی پل ضائع کیے بغیر کھلے ہاتھ سے اُس کے منہ پر پنجہ مارا۔ وہ ہڑبڑا کے پیچھے ہٹا، اس طرح میرا دوسرا ہاتھ بھی کھل گیا۔ پھر میں نے اِدھر اُدھر کروٹ بدلنے کے انداز میں اپنے جسم کو تین چار جھکولے دیے۔ اس عمل سے یہی مراد تھی کہ وہ اور متذبذب ہو جائے حالانکہ میں اُس کی گردن پر ایک ترچھی ضرب لگا سکتا تھا لیکن مجھے خیال تھا کہ اُنھیں اپنے پیروں سے نیچے جانا چاہیے، اُنھیں کندھوں پہ اُٹھا کے موٹر تک لے جانے میں اور اُلجھن ہوتی۔ جس طرف میں کروٹ بدلنے کا ارادہ ظاہر کرتا تھا، اُسی طرف وہ بھی دباؤ ڈالتا تھا۔ وہ میری تیزی کا ساتھ نہیں دے سکا۔ چوتھی مرتبہ میں صاف اُس کے نرغے سے نکل گیا اور فرش پر لوٹتا ہوا ایک لحظے میں اُٹھ کے کھڑا ہو گیا۔

میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اب پیش قدمی مجھے کرنی پڑے گی۔ اتنی دیر میں میں اُن کے کس بل کا بڑی حد تک تخمینہ لگا چکا تھا۔ وہ زور میں کم نہیں تھے مگر انھیں اپنا زور مختلف طریقوں سے آزمانا نہیں آتا تھا۔ جیسا کہ میرا خیال تھا، پہلا آدمی میرے اُٹھنے کے دوران مجھے دوبارہ جکڑ لینے کے لیے پر تول رہا تھا۔ میں اُٹھ گیا تو اُس نے احتیاط مناسب سمجھی۔ دونوں کی پگڑیاں اُتر چکی تھیں اور لمبے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اُن کی آنکھوں سے خون اُبل رہا تھا۔ اُن کا یہ اشتعال میرے لیے بہت سود مند تھا۔ دونوں ہاتھ پھیلائے ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر کھڑے ایک قسم کی بھبکیاں دے رہے تھے۔ میری پیش قدمی سے قبل انھوں نے بہرحال ایک داؤ آزمایا۔ دونوں ایک ساتھ آگے سے بڑھے تھے لیکن ایک مجھ سے چمٹ گیا، دوسرا اُس کا ساتھ دینے کے بجائے میرے پیچھے چلا گیا۔ میں اِدھر سامنے کے آدمی کو ہاتھوں پر لیے ہوئے تھا کہ پیچھے والے نے جست لگا کے میرے بازوؤں میں بازو ڈال کے اُنھیں پابند کر دیا اور سامنے والا اطمینان سے میرے منہ پہ گھونسے اور طمانچے مارنے لگا۔

"ہُنہہ۔" کرم چند کے ہنسنے کی آواز آئی "مسخرا، اُستاد کا خاص آدمی۔"

کرمن ابھی تک اُس سے التجائیں کر رہی تھی۔ شہہ پارہ کو اشارہ کر کے میں نے خاموش رہنے کی تاکید کر دی تھی۔ وہ خوف زدہ آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

مجھے احساس تھا کہ یہ کرمن بیگم کا بالا خانہ ہے، معاملہ زیادہ کھنچ گیا تو شہہ پارہ کی بھی رُسوائی ہوگی۔ دوسرے کوئی ایسی ویسی بات ہو جانے سے ٹھبل کی ناراضی کا بھی اندیشہ تھا، ہمارے سفر میں بھی رکاوٹ پیش آ سکتی تھی۔ پھر اگر کانتے، ماچھی، مارٹی وغیرہ اس اثنا میں واپس آ جاتے تو یہ ماجرا دیکھ کے اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ پاتے لیکن ان اندیشوں کی خاطر میں اپنے ہاتھ پیر نہیں باندھ سکتا تھا۔ جو کچھ مجھے کرنا تھا، جلدی کرنا تھا۔ پیچھے والا آدمی میرے بازو مقفل کیے ہوئے تھا، اس کے باوجود میں سامنے والے کی طرف جھپٹا اور زینے کی طرف چند قدم بڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ مجھے یہ عمل پھر دہرانا تھا۔ پیچھے والا آسانی سے میرے بازو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ادھر آگے والا اپنے مکوں کا نشانہ بنائے ہوئے تھا اور اُس نے میرے دانتوں سے خون نکال دیا تھا۔ میں پیچھے والے کو ساتھ لیے ایک بار پھر سامنے کی طرف لپکا اور چند قدم اور آگے بڑھ گیا۔

میرا رُخ واضح طور پر زینے کی سمت تھا۔ وہ یہ سمجھے کہ اب میں بھاگنے کی فکر میں ہوں۔ اس سے زیادہ خوش گوار بات اُن کے لیے کوئی نہیں تھی چنانچہ اُنھوں نے مجھے بڑھنے دیا۔ سامنے والا البتہ اُلٹے

قدموں سے مجھ پر ہاتھ چلاتا ہوا آگے آگے رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ زینے پر وہ ہٹ جائے گا، وہیں میں اچانک بیٹھ کے اور پیچھے والے کو سر سے گزار کے زینے میں لوٹ دوں گا۔ اسے ڈوب کا واؤ کہتے ہیں۔ اتنی دیر تک مجھے اپنے سامنے کے آدمی کی ضربیں اور برداشت کرتے رہنا چاہیے تھا لیکن زینے کے پاس عین موقع پر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ ایک مرحلہ ایسا آگیا تھا کہ میں اچھل کے پیچھے والے کی ٹانگوں کے درمیان ایڑی مار سکتا تھا۔ میں نے آہستہ سے ٹانگ اٹھائی اور جتنی طاقت سے اپنے پیچھے کے آدمی پہ مار سکتا تھا، ماری۔ وہ ٹھیر نہیں سکتا تھا، بلبلاتا ہوا میرے بازوؤں میں جھول گیا۔ اپنے ساتھی کی ہولناک چیخ سن کے دوسرے کے ہاتھ سٹ پٹا گئے اور وہ بدحواسی میں مجھ سے چمٹ گیا۔ میں نے اس کا جسم زینے کے دروازے سے ٹکرا دیا۔ گشت سے اس کے سر پہ گہری چوٹ لگی ہوگی۔

میں زینے سے کچھ اندر کمرے میں آگیا کیونکہ مجھے پیچھے والے کو بھی دیکھنا تھا۔ اس کے پاس تمنچا بھی تھا اور خنجر بھی۔ میرے اندازے سے ضرب میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی پھر بھی ایک بار اسے غور سے دیکھ لینا بہتر تھا۔ وہ فرش پہ دہرا پڑا کراہ رہا تھا۔ اس کی آواز گھٹی ہوئی تھی۔ اس کے جلد حرکت میں آنے کا کوئی امکان نہیں تھا بلکہ بے سدھ ہونے کا امکان زیادہ تھا۔ میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کے احتیاطاً چاقو باہر نکال لیا۔ سامنے والے کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور بعید نہیں تھا کہ وہ آخری حربے کے طور پر تمنچا یا چاقو نکال لے۔ میرے پیچھے ہونے اور اس کے ساتھی کو دیکھنے کے دوران اس نے سنبھلنے میں چند لمحے لیے ہوں گے۔ میں نے مڑ کے اس کی طرف دیکھا تو وہ تمنچا باہر نکال چکا تھا۔

"نہیں!" کمرے میں شہہ پارہ کی سسکتی ہوئی چیخ گونجی۔ وہ کرم چند کا بازو پکڑے فریاد کر رہی تھی۔ میں نے چاقو کھول لیا تھا۔ اس نے جلدی سے چرخی گھمائی اور تمنچا مجھ پر تان لیا۔ اسے وہ دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے تھا۔ اتفاق کی بات تھی کہ آج سے ڈیڑھ دو سال پہلے کرمن بیگم کے بالاخانے پر ایسی ہی صورت پیدا ہوگئی تھی۔ اس وقت سیٹھ لکشمی داس نے ہم پر تمنچا تان لیا تھا۔ موتی نے اس کے اسی ہاتھ پر اتنی چابک دستی سے چاقو مارا تھا کہ سیٹھ دیکھتا رہ گیا تھا۔ تمنچے کے سامنے میرے لیے بھی موتی کی ترکیب پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے بھی دیکھ لیا تھا کہ میرے ہاتھ میں چاقو ہے۔ مجھے ایک ہی خدشہ تھا کہ چاقو کہیں اور نہ لگ جائے۔ سو بہت احتیاط سے اسے اچھالنا تھا۔ میری نظریں اس کے چہرے اور انگلیوں سے بندھی تھیں۔ ادھر کھٹکا دبانے کے لیے اس کے ماتھے پر شکن اور انگلیوں میں جنبش ہوئی، ادھر میں نے بجلی جیسی سرعت سے بائیں طرف ہو کے چاقو پھینکا۔ کمرے میں گولی کا تیز دھماکا ہوا۔ ساتھ ہی تمنچا اس کے ہاتھ سے گر گیا اور خون کی تلی چھوٹ پڑی۔ چاقو چھیلتا ہوا گزرا تھا اور اس کے سیدھے ہاتھ کی دو انگلیاں کٹ کے ہاتھ میں جھول رہی تھیں۔ میں نے بھاگ کے اس کا تمنچا اٹھا کے جیب میں ڈال لیا اور اس کی پیٹی سے خنجر بھی نکال لیا۔ دوسرے کو ٹھوکر مار کے میں نے اس کے دونوں ہتھیار بھی قبضے میں کر لیے۔ ان دونوں کو ان کی حالت پر چھوڑ کے میں دور چلا آیا۔ شہہ پارہ اور کرمن بیگم دیوانہ وار میرے پاس آ کے میرے ہاتھ اور شانے ٹٹولنے لگیں۔ میرے منہ سے ابھی تک خون جاری تھا۔ شہہ پارہ اپنے دوپٹے کے پلو سے اسے صاف کرنے لگی۔ کرمن اندر سے ٹھنڈا پانی اور ملازمہ بڑا سا اگالدان لے آئی۔ غرارے کرنے سے خون کچھ رک گیا لیکن ہونٹ کئی جگہ سے پھٹ گئے تھے۔ کرتے پر خون کی بوندیں گر گئی تھیں۔ شہہ پارہ نے ایک چمچا شکر میرے منہ میں ڈال دی اور میرے گال اور گردن سے پسینہ خشک کرتی رہی۔ کرمن پنکھا جھلنے لگی۔ میں نے اسے روک دیا۔

کرم چند ساکت و جامد کھڑا تھا۔ زینے پر اس کے آدمیوں کے آنے اور مجھ پر حملہ آور ہونے کے بعد صرف چند منٹ صرف ہوئے ہوں گے مگر وہ چند منٹ بہت طویل تھے۔ اسے اپنے کراہتے اور سسکتے ہوئے آدمیوں کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ وہ ٹھٹھری ہوئی نگاہوں سے مجھے تکتا رہا۔ میں نے سوچا، جا کے اسے ایک طمانچا ماروں مگر میں نہیں گیا۔ میں نے وہیں سے دھیمی آواز میں اسے مخاطب کیا۔

"کرم چند! ان کو اٹھا لو۔"

میری آواز سن کے اس نے ایک جھرجھری لی اور خاموش رہا۔ اپنے دونوں آدمیوں کو سنبھالنا اس کے لیے مشکل تھا اور اس کی شان کے خلاف بھی ہوگا۔ میرے اشارے پر کرمن نے گھر کے تمام ملازم اور سازندے بلا لیے۔ دونوں آدمی اس قابل نہیں تھے کہ نیچے جا سکیں۔ پہلے والا تو تقریباً بے ہوش ہو گیا تھا۔ وہ اسے پانی پلانے، جھنجوڑنے اور مالش کرنے لگے۔ دوسرے کی انگلیوں پر کپڑا باندھ دیا گیا۔ اس بات کا قطعی امکان تھا کہ سیٹھ کرم چند نیچے جاتے ہی پولیس کا رخ کرے۔ پھر میرے لیے پولیس کو سمجھانا اتنا آسان نہ ہوتا۔ کرم چند پہلے ہی انھیں بھر دیتا اور میرے پچھلے ریکارڈ کے باعث سارا الزام مجھی پہ آتا۔ کرمن اور شہہ پارہ پولیس میں اس کے خلاف گواہیاں دیتیں تب بھی دیر تو لگ ہی جاتی۔ مناسب یہی تھا کہ کرم چند پولیس تک جانے کی ہمت ہی نہ کرے۔ ایک اور احمقانہ بات میرے ذہن میں آئی کہ میں یہاں سے فرار ہو جاؤں اور اڈے پر جا کے چھپ جاؤں۔ پولیس اڈے پر پہنچ گئی تو مجھل اس سے نمٹ لے گا۔ پھر میں اسی وقت باہر نکلوں گا جب سفر کے لیے روانہ ہونا ہوگا۔ کرم چند نے اپنی آنکھوں سے یہ سب دیکھا تھا مگر میں نے اس کے سامنے مجھل کا حوالہ بھی دیا تھا۔

اسے کرمن کی ایک ایک بات یاد آ رہی ہوگی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ مزید کسی ہنگامے سے بچنے کے لیے پولیس کو درمیان میں نہ لائے لیکن اس نے پہلے ہی کرمن اور شہہ پارہ کی فریادوں پر کان نہیں دھرے تھے، اب کیا ضمانت تھی کہ وہ باز رہے گا۔ ساری بات وقت کی تھی۔ وقت کم تھا۔ ہمیں جلد ہی کلکتے سے روانہ ہونا تھا۔ ایک اور تدبیر بھی تھی کہ کرم چند کو اتنا تھکا کے اور شکست خوردہ کر کے بھیجا جائے کہ اس کے پولیس تک جانے کی نوبت ہی نہ آئے۔ میں نے ایک سازندے سے کہا کہ کلنتے جہاں کہیں بیٹھا ہو اسے بلا لاؤ مگر پھر میں نے اسے خود ہی منع کر دیا۔ وہ کرم چند کا پروردہ بھی ہو سکتا تھا۔ اسی گھر کے کسی آدمی نے ہمارے یہاں آنے کی خبر اسے پہنچائی تھی۔ "کرم چند! اب اپنے لیے تم نے کیا سوچا ہے؟" میں نے اپنی آواز تیز نہیں ہونے دی۔ "تمھیں یہاں کھڑکی سے نیچے پھینک دیا جائے یا شہ پارے اور کرمن بیگم کی شہادت پر پولیس کے حوالے کر دیا جائے یا ہم تمھیں تمھاری ہی موٹر میں اڈے پر لے جائیں جہاں تم تینوں کی ہڈیاں بھی نہ مل سکیں؟"

"ٹھیک ہے۔" وہ گہری سانس لے کے بولا۔ "ہم جاتا ہے۔"

"اور کبھی نہ واپس آنے کے لیے۔ تم یا تمھارا کوئی آدمی اگر پھر اس زینے پر چڑھتا دیکھا گیا تو وہ واپس زینے سے نہیں جائے گا۔"

"ہم سمجھتا ہے۔" وہ آہستگی سے بولا۔

"نہیں، اگر سمجھنے میں کوئی کسر رہ گئی ہو تو تم اور میں دونوں یہاں موجود ہیں۔ تم کو اپنے اور باڈی گارڈوں کو بلانے کی اجازت ہے۔"

"اب ان حرام زادوں کو دیکھ کے کیا کرے گا۔" وہ مایوسی سے بولا۔ "جو تم بولتے ہو وہ سب ٹھیک ہے، تم خوشامد نہ سمجھو تو ہم ایک بات بولے۔"

"بولو۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"ہم تمھارے گلے میں اپنی زنجیر ڈالنا چاہتا ہے۔"

"جاؤ، جاؤ۔" میں نے اسے دھتکار دیا۔

"ہم ٹھیک دل سے بولتا ہے۔"

"زیادہ باتیں مت کرو۔ دفع ہو جاؤ۔"

شہہ پارہ نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے تحمل کی التجا کی۔ جس آدمی کی انگلیاں کٹ گئی تھیں، وہ دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا تھا۔ اس کے چہرے سے ظاہر تھا کہ اسے شدید تکلیف ہے۔ سازندے اسے پنکھا جھل رہے تھے۔ دوسرا بے دم سا پڑا تھا۔ سازندے اسے نیچے لے جانے کے لیے اٹھانے لگے۔ میں نے انھیں ٹھیرنے کو کہا اور خود بڑھ کے دروازے پر اس آدمی کے پاس پہنچا جس کا خون پٹی باندھنے کے باوجود نہیں رکا تھا۔ پٹی کا کپڑا سارا لال ہو گیا تھا۔ میں نے سازندوں کو اس کی پٹی کھولنے کی ہدایت کی۔ شہہ پارہ اور کرمن بیگم میرے قریب آ کے بیٹھ گئیں۔ اندر سے کپڑا منگوا کے میں نے اس کی دوبارہ پٹی کی۔ جھولتی ہوئی انگلیاں سیدھی کر کے انھیں علیحدہ پٹی سے باندھا اور خون رکنے کے لیے کلائی پر ایک اور پٹی کس دی۔ پھر میں نے اس کا سارا ہاتھ لپیٹ دیا۔ میں نے دانستہ دیر لگائی تھی۔ کرم چند کا کوئی بھروسا نہیں تھا کہ نیچے جا کے اس کے دماغ میں کیا آ جائے۔ وہ چال بازی بھی کر سکتا تھا۔ پٹی سے نمٹ کے میں دوسرے آدمی کی طرف متوجہ ہوا۔ کرم چند کو ٹھیرانے کے لیے میری تدبیر کارگر ہوئی۔ اسی دوران زینے سے ان لوگوں کی آوازیں آنے لگیں۔ نیچے انھوں نے موٹر دیکھ لی ہوگی اس لیے ان کی رفتار تیز تھی۔ سب سے پہلے کلنتے اندر داخل ہوا اور بھونچکا سا ہو کے کمرے کی افراتفری دیکھنے لگا۔ "لاڈلے!" وہ بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "یہ کیا ہے؟"

"ہاں کچھ گرما گرمی ہو گئی۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"تونے اپنا منہ کیسے بگاڑ لیا؟"

"بس ہو گیا کلنتے!"

"ہوں۔" کلنتے پھنکار کے بولا۔ "کرمن بیگم! اپنے کو بولو، یہ سب سالا کیا ہے؟" اس نے کرمن کا گلا دبوچ لیا۔

ساتھ ہی ماچھی دہاڑا۔ "اپن کے لاڈلے پر کس حرام کے جنے نے ہاتھ اٹھایا؟" اس نے گالی دے کے پوچھا اور سیٹھ کرم چند کو گریبان سے اٹھا کے فرش پر پٹخ دیا۔

"چھوڑ دے۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "بات ختم ہو چکی ہے۔"

"اپن کیا دیکھ رہا ہے لاڈلے!" مارٹی نے بھی چاقو نکال لیا تھا۔ "یہ دو آدمی ساتھ لے کے آیا تھا۔"

"اور تجھ کو اتنی دیر لگی لاڈلے؟" کلنتے غصے سے بولا۔

"دیر ہی لگ گئی۔" میں اسے کیا بتاتا کہ میرے ہاتھ رک رہے تھے

"کیا یہ سور کے بچے تیرے کچھ لگتے تھے؟"

"کلنتے!" میں نے بیزاری سے کہا۔ "جانے دے۔"

"کیسے جانے دے۔" وہ سیٹھ کے منہ پر الٹے ہاتھ سے طمانچا مارتے ہوئے بولا۔ "کرمن! تو نے اس چوہے کی اولاد کو بولا نہیں کہ لاڈلا کون ہے؟"

"بتایا تھا، خدا کی قسم بتایا تھا۔" کرمن گڑگڑانے لگی۔

"پھر بھی یہ سالا نہیں مانا، ہائیں کون ہے یہ الو کا پٹھا؟"

"یہ سیٹھ کرم چند ہیں۔" کرمن سہمی ہوئی آواز میں بولی۔

"یہ ہے وہ سالا!" کلنتے نے فرش پر تھوک کے کہا۔ "کلکتے میں نیا نیا آیا لگتا ہے۔ شوقینی کرنے نکلا تھا، ادھر چڑیا بھی اپنے کو بولے بغیر نہیں اڑتا۔ لاڈلے نے ضرور تیرا اور تیری ماں کے یاروں کا دھیان کیا۔"

میں نے جا کے کانتے کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"اُستاد کے سامنے کیا یہ سوچا ہوا منہ لے کے جائے گا؟" کانتے ...ی سے بولا۔ "وہ کیا بولے گا۔"
"کچھ نہیں بتھل بھائی سُنیں گے تو کچھ نہیں کہیں گے۔"
"پر لاڈلے! پہلے اِدھر مجھ کو جواب دے، تجھ کو دیر کیوں لگی؟"
"بہت سی باتوں کا خیال تھا ورنہ کیا دیر لگتی۔" میں نے جھلا کے کہا۔
"وہی تو میں پوچھ رہا ہوں رے!"
"بتا دوں گا۔ تیری سمجھ میں اِس وقت کچھ نہیں آئے گا۔"
"ایمان سے اپنی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔" وہ سر جھٹکنے لگا۔
"میں چاہتا تھا کہ انھیں اُٹھا کے نہ لے جانا پڑے۔ تجھے یاد نہیں ...ہمیں آگے جلدی جانا ہے۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔
"لاتوں کے بھوت تیری باتوں سے مان جاتے۔ خیر، جو تو بولتا ہے ...پڑھا لکھا ہے۔ سمجھ کی بات ہے۔ میری کھوپڑی ذرا ساتھ نہیں دیتی۔" ...نتے اونچی آواز میں بولا۔
"ان کو نیچے پہنچانے کا انتظام کرو۔"
"زینے پر لوٹ دیتا ہوں۔ اپنے آپ چلے جائیں گے۔"
"لوٹنے کو تو میں بھی لوٹ سکتا تھا۔"
"یہی تو میں بول رہا ہوں۔"
"اور یہی بات تیری عقل میں نہیں آ رہی ہے۔ تجھ کو کچھ آگے ...پیچھے کا ہوش نہیں۔ تو چپ رہ۔"
کرم چند اور اُس کے آدمیوں کو نیچے چھوڑ کے وہ اُوپر آئے تو ...رے گرد اکٹھے ہو گئے۔ کمرے میں کچھ دیر تک سکوت طاری رہا۔ میں نے ...ن نہیں کھولی۔ ماچھی کرمن سے سوالات کرنے لگا۔ جب تک کرمن نے ...یں ایک ایک بات نہیں بتا دی، اُن کی تسلی نہیں ہوئی۔ سازندے ...یگے ہوئے کپڑوں سے قالین سے خون کے دھبے مٹانے کی کوشش کر ...ہے تھے۔ ایک ملازم چائے لے آیا۔ شہہ پارہ نے چائے دودھ اور چینی ...ا کے ہم سب کو پیش کی۔ رات بہت ہو گئی تھی۔ کانتے اُٹھا، اُس ...ے اُٹھ جانے پر سبھی اُٹھ گئے لیکن میں بیٹھا رہا۔
"کیوں لاڈلے!" کانتے ترشی سے بولا۔ "تو نہیں چلے گا؟"
"مجھے کرمن بیگم سے ایک بات کہنی ہے۔"
"کیا بات ہے لاڈلے میاں! بندی سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو ...معاف کر دینا۔" کرمن مضطرب آواز میں بولی اور میری شکل دیکھنے لگی۔
"کرمن بیگم! شیارے اب نہ کبھی گائے گی، نہ ناچے گی۔"
کرمن کے ہونٹ لرز کے رہ گئے۔
"تم نے سیٹھ کرم چند سے دو لاکھ کو کہا تھا، وہ میں تم کو دے ...دوں گا۔" میں نے اُس کے جواب دینے سے پہلے تیزی سے کہا۔ "شیارے اب میری ہے۔ اس کا تم سے کوئی واسطہ نہیں، ابھی میں سفر پہ جا رہا ہوں۔ تم کو پچیس ہزار روپے کل کانتے کے ذریعے مل جائیں گے۔ باقی رقم میرے آنے پر ملے گی جب میں شیارے کو یہاں سے لے جاؤں گا لیکن اس عرصے میں بالاخانہ بالکل بند رہے گا۔ کانتے تمھارے اور شہہ پارہ کے خرچ کے لیے پانچ سو روپے ماہانہ دیتا رہے گا۔ منظور ہے؟"
شہہ پارہ کی بے تاب نظریں میرے چہرے پر مچل رہی تھیں، کرمن نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ کمرے میں سوئی بھی گرتی تو آواز آ جاتی۔ وہ سب مجھے عجیب نگاہوں سے دیکھ رہے تھے جیسے میں پاگل ہو گیا ہوں۔ "شیارے تمھارے پاس میری امانت کے طور پہ رہے گی اور میں تمھیں صاف بتا دوں کہ مجھے یہاں سے اسے کسی اور بالاخانے پر نہیں لے جانا ہے۔ اگر تم اس سے کچھ بھی ہمدردی رکھتی ہو تو میری بات مان لو گی اور یوں بھی کہ یہ شیارے کی مرضی کے مطابق ہے۔ بولو، تمھارا کیا جواب ہے؟"
"تم حواس میں تو ہو لاڈلے میاں!" کرمن کانپتے لہجے میں بولی۔
"میں بالکل حواس میں ہوں۔" میں نے اپنی آواز پر ضبط پاتے ہوئے کہا۔ "تمھیں آج نہیں تو کل شہہ پارہ کو کسی نہ کسی کے حوالے کر ہی دینا ہے تو میرے حوالے کرنے میں کیا حرج ہے؟ یہ تمھارے ساتھ اتنے دن رہی ہے، کچھ تو اِس کی منشا کا خیال کرو۔ اگر تم نہیں مانو گی تو میں اسے یہاں سے اُٹھا کے نہیں لے جاؤں گا لیکن میں تم سے کہتا ہوں ایک دن یہ ضرور گھٹ گھٹ کے مر جائے گی۔ رقم کچھ کم ہو تو مجھے بتا دو۔ سیٹھ نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ تم نے دو لاکھ مانگے ہیں، وہ دو لاکھ پر آمادہ نہیں تھا ورنہ پہلے ہی دے دیتا۔"
"پھر کسی وقت بات ہو گی لاڈلے میاں! تم جا کے آرام کرو۔"
"بات اِسی وقت ہو گی۔ کیا تم مجھ پر یقین نہیں کرتیں؟ کیا تمھیں شک ہے کہ میرے پاس رقم نہیں ہے؟"
"میں تم پر شک نہیں کر رہی ہوں۔ بہتر یہ ہو گا کہ تم اُستاد بتھل سے پوچھ لو۔"
"اُن کی بات بعد کی ہے۔ پہلے تم بتاؤ، کیا تمھیں کوئی انکار ہے؟"
"میری عقل حیران ہے کہ میں کیا جواب دوں۔ ٹھیک ہے، میں نے سُن لیا ہے۔ اگر تمھیں میری مرضی کا اتنا پاس ہے تو مجھے کچھ سوچنے اور سمجھنے کا موقع دو۔"
"اس میں سوچنے سمجھنے کی کیا بات ہے۔ تم نے ہزار بار اس پر غور کیا ہو گا۔ نہیں، تم ہی شیارے تمھاری بیٹی نہیں ہے۔ تم نے بھی اسے خریدا ہے اور یہی سوچ کے خریدا ہے کہ کل تمھیں اس کے منہ مانگے پیسے مل جائیں گے۔ ایسا ہے کہ نہیں؟ پھر تمھیں کاہے کا پس و پیش ہے۔"
"یہ درست ہے کہ شہہ پارہ میرے پیٹ سے پیدا نہیں ہوئی لیکن یہ میری بیٹی کی طرح ہے۔ پوچھ لو شیارے سے کہ کیا میں نے کبھی اس سے اُونچے لہجے میں بات کی ہے۔"
"لیکن کوئی ماں اپنی بیٹی کو یوں لوگوں کے سامنے نہیں کر دیتی۔ تم اسے بیٹی تو کہتی ہو مگر ماں کی طرح اس کا خیال نہیں کر رہی ہو۔ مجھے نہیں معلوم، تم خود کیسے یہاں آئی تھیں۔ تم بھی ایسے ہی لائی گئی ہو گی جیسے شیارے کو لایا گیا تھا۔ پھر تم کیوں شیارے کا دُکھ محسوس نہیں کرتیں؟ اور اگر تم شروع سے یہاں ہو تو بھی کم سے کم شیارے کی ایک ہم صنف ہونے کے ناتے تمھیں میری پیش کش پر توجہ دینی چاہیے کیونکہ میں شیارے کے لیے تم سے بہتر ارادہ رکھتا ہوں۔ میں اس کے لیے غلط نہیں سوچ رہا ہوں۔ میں سیٹھ کرم چند نہیں ہوں۔"
"میاں!" وہ تند لہجے میں بولی۔ "کیسی باتیں کرتے ہو۔ ماشاءاللہ ابھی چڑھتی جوانی ہے، خون گرم ہے۔ زندگی کی اُونچ نیچ سے واسطہ نہیں پڑا ہے۔ یہاں ساری عمر لوگوں کو دیکھتے ہوئے بیت گئی ہے۔ کتنے لوگ آئے اور چلے گئے۔ آدمی کا بوجھ سنبھالنا سب سے مشکل کام ہے خصوصاً کوڑے کے ڈھیر پر بیٹھے ہوئے آدمی کا۔ اُجلے کپڑوں پر دھبے پڑ جاتے ہیں۔ آدمی کو تو سنبھال لو گے، نگاہیں نہیں سنبھالی جائیں گی۔ کیوں تنکے چھوتے ہو۔ کس بدنصیب کا جی یہاں رہنے کو چاہتا ہے پر جو لکھا ہے، اُسے کوئی کیسے مٹا سکتا ہے۔ زمین پر رہنے والے کو زمین ہی کی طرف دیکھنا چاہیے۔ تم دو ہی ملاقاتوں میں شیارے کے عزیز ہو گئے اور جو اُن کے ساتھ مدت سے ہے، اُسے اس کا بُرا بھلا سوچنے کے لیے تھوڑا وقت دینے کو بھی تیار نہیں ہو۔ رہی کرم چند کی بات تو کیا تمھارا خیال ہے، میں شیارے کو ہمیشہ کے لیے اُس ہرجائی کے حوالے کر دیتی؟ مجھے معلوم ہے کب تک اُس کی آنکھ سمٹی رہتی۔ شیارے کو پھر ایک دن یہاں آنا تھا اور پھر میں...... میں شیارے کو جُدا کر کے یہاں کیا خاک پھانکتی۔ میری پونجی شیارے کے سوا اور کیا ہے۔"
"سبھی ایسی باتیں کرتے ہیں۔ میں جانتا ہوں، سوچنے کا وقت مانگنا ٹالم ٹول ہے۔ حیدرآباد کا بازار بند نہیں ہوا ہے۔ تمھارے پاس پیسے ہوں گے تو تم دس لڑکیاں اور لے آؤ گی۔ پہلے یہاں ایک پری بیگم بھی تھی، اب نظر نہیں آ رہی ہے۔ وہ کہاں گئی؟ رقم زیادہ درکار ہو تو بتا دو۔ میں سودے بازی نہیں کروں گا اور تم۔ تمھیں یہاں بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم اب اللہ اللہ کیوں نہیں کرتیں۔ اگر تم یقین رکھتی ہو کہ اللہ میاں یہ باتیں ناپسند کرتا ہے تو اُسی کا احساس کر لو اور چاہو تو شیارے کے ساتھ ہی رہو۔ تم اتنا روپیہ لے کے کہاں جاؤ گی؟ کیوں اتنی ہوس کرتی ہو؟"
"زیادہ آڑی مت کر و کرمن!" کانتے اُسے چپ دیکھ کے ناراضی سے بولا۔ "لاڈلا اتنی باتیں بول رہا ہے۔"
"ٹھیک ہے میاں! تم جیسا کہتے ہو، وہی ٹھیک ہے۔" خاصی دیر بعد کرمن نے جھجکتے ہوئے زبان کھولی۔ "سفر سے واپس آ جاؤ۔ میرا وعدہ ہے شیارے تمھاری رہے گی۔"
شہہ پارہ اُس کے بازو سے چمٹ کے بلکنے لگی۔ کرمن نے اُس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ خود اُس کی آنکھوں میں بھی آنسو چھلک آئے۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "قسمت کو یہی منظور ہے تو کون اسے بدل سکتا ہے شیارے جان!"
"کیا تم خوش نہیں ہو شیارے؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔
اُس نے ڈبڈبائی نظروں سے مجھے دیکھا اور کرمن کو چھوڑ کے میرے پیروں سے لپٹ گئی۔ اُس کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اُسے اُٹھانے کے لیے اُس کے شانے تھامتے وقت میرے ہاتھ بھی کپکپانے لگے۔ جب میں نے اُسے کھڑا کیا تو اُس کا سر میرے کندھے پر ڈھلک گیا۔ "رو کیوں رہی ہو؟" میں نے اُسے پچکارتے ہوئے کہا اور اپنے دامن سے اُس کی آنکھیں خشک کرنا چاہا لیکن مجھ سے بھی آنسو نہیں رُکے جا سکے۔ جتنا میں رُکنے کی کوشش کرتا تھا، آنسو اتنے ہی اُمڈ اُمڈ کے چلے آتے تھے۔
کانتے میری کمر پہ تھپکیاں دیتا رہا، پھر شاید اُسی نے کچھ کہا تو کرمن بیگم نے آ کے شہہ پارہ کو تھام لیا اور اُسے مجھ سے جُدا کر کے دور لے گئی۔ میرا دل اُسے ایک لمحے کے لیے وہاں چھوڑنے کو تیار نہیں تھا لیکن میں اُسے ساتھ بھی نہیں لے جا سکتا تھا۔ سبھی خاموش تھے اور سبھی کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ کانتے کا سارا چہرہ بھیگ گیا۔ ضرور اُسے فیض آباد میں چمپا بیگم کے بالاخانے کی بات یاد آ گئی ہو گی۔
ہمیں رُخصت کرنے کے لیے شہہ پارہ ڈیوڑھی تک ساتھ ہی آئی اور مجھ سے زیرِ لب پوچھنے لگی کہ اب میں کب آؤں گا؟
"اگر کل کہیں نہ جا سکے تو کسی وقت آنے کی کوشش کروں گا۔ چلے گئے تو پھر دیکھو کب ملاقات ہوتی ہے۔ میں کانتے کو سب سمجھا دوں گا، وہ یہ سارا انتظام کرے گا۔ تم کسی چیز کی فکر مت کرنا۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو تو کانتے کو بُلا کے کہہ دینا۔ میں جلد واپس آنے کی پوری کوشش کروں گا اور اگر نہ آ سکا!......" شہہ پارہ نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔
کرمن بیگم بھی پاس ہی کھڑی تھی۔ باہر نکلنے سے پہلے میں نے اُسے تاکید کرنا ضروری سمجھا۔ "میں اگر نہ آ سکا تو کانتے اسی شہر میں موجود ہے۔ رقم اسی کے پاس ہو گی۔ یہ تمھیں ادا کر کے شیارے کو اپنے ساتھ لے جائے گا۔ تم چاہو گی تو کانتے تمھارے اور شیارے کے لیے کسی اچھی جگہ مکان کا بندوبست بھی کر دے گا لیکن اچھی طرح سن لو، تم نے درمیان میں کوئی چال چلی یا شیارے کو کسی اور کے سپرد کیا تو پھر سمجھ لینا میں اکیلا نہیں ہوں۔"
"زبان دے چکی ہوں میاں!" کرمن ٹھنڈی سانس بھر کے بولی۔

میں نے شہ پارہ کو ایک نظر دیکھا اور ڈیوڑھی سے باہر نکل آیا۔ اُس کی ٹمٹماتی آنکھیں دُور تک میرے ساتھ چلتی رہیں۔

گلی سنسان پڑی تھی۔ ٹلوا اڈّے کے باہر کھمبے کی روشنی میں چوسر کھیل رہا تھا۔ اُسی نے بتایا کہ جُھل، پیرو اور جامو اُوپر فلیٹ میں جا کے پھر نیچے نہیں آئے۔ تھوڑی دیر میں کبن خاں، وزیر اور وہ تمام آدمی بھی آ گئے جو ہم سے الگ ہو کے دوسرے بالاخانوں پر گئے تھے۔ کانتے نے وہیں کسی آدمی کے ذریعے اُن سے کہلوا دیا تھا کہ وہ ہمارا انتظار نہ کریں، گانا سُننے کے بعد خود اڈّے پر پہنچ جائیں۔ کبن خاں آہیں بھرتا ہوا آیا تھا۔ "لُوٹ لیا کلکتے والی نے۔ لُوٹ لیا کانتے! ہائے تمھارے کبن کو لُوٹ لیا۔" وہ کانتے کے سینے پر سر رگڑتے ہوئے بولا۔

"سنبھل کبن! ہر وقت مسخری اچھی نہیں ہوتی۔" کانتے ترشی سے بولا۔

کبن خاں یک لخت سیدھا ہو گیا اور کانتے کو گھورنے لگا۔ آنے والے شور مچاتے ہوئے آئے تھے پر ہم میں سے کسی نے اُن سے کچھ نہیں کہا تھا۔ "کانتے!" کبن خاں منہ بگاڑ کے بولا۔ "تیری ماں مر گئی ہے کیا؟"

"ہاں کبن! کچھ ایسا ہی جان لے۔"

"کیا بات ہے جانی؟" کبن خاں نے اُسے بازوؤں میں بھر لیا۔

"کبن! اس وقت کچھ بات مت کر، جا کے سو جا۔" کانتے اکتا کے بولا۔

"بتائے گا نہیں تو نیند نہیں آئے گی کتّو!"

معلوم نہیں، کانتے نے کبن خاں کو کیا بتایا۔ میں اُن کے درمیان سے ہٹ کے اُوپر چارپائی پر آ کے لیٹ گیا۔ مجھے گہری نیند آ گئی۔ صبح نصیب میاں نے میرے پیر کا انگوٹھا ہلایا تو میری آنکھ کھلی تھی۔ "اُٹھ جاؤ نوشہ! اُٹھو سونے والو کہ میں آ چکی ہوں۔" وہ آہستہ آہستہ مجھے آوازیں دے رہا تھا۔ "دھوپ منہ پر آ گئی ہے۔ نیچے شہزادے کا انتظار ہو رہا ہے۔" میں ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا۔ نصیب میاں سچ کہہ رہے تھے۔ دھوپ میرے سارے جسم پر پھیلی ہوئی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کے میں نیچے آیا تو سب میرا انتظار کر رہے تھے۔ سب کی نظریں مجھ پر مرکوز ہو گئیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ رات والی بات جُھل کو معلوم ہو گئی ہے لیکن نہ جُھل نے مجھ سے کچھ کہا، نہ کسی اور نے۔ ناشتے کے بعد میرا ارادہ کانتے کو بینک لے جانے کا تھا۔ پتہ چلا کہ گاڑیاں آ چکی ہیں۔ کل کی طرح آج بھی جُھل نے ہم سے گرو دیال کے باغ میں جانے کو کہا۔ وہاں سے واپسی شام کو ہوتی اور بینک بند ہو جاتا۔ بس یہی اچھا ہوا کہ جُھل اور پیرو ہمارے ساتھ نہیں گئے، نہیں تو مجھے باغ سے لَوٹ کے آنا پڑتا۔ راستے میں ایک بینک نظر آیا تو میں نے گاڑیاں رُکوا لیں اور کانتے کے ساتھ عمارت میں داخل ہو گیا۔ میں نے کانتے کے نام دو لاکھ روپے کا ایک چیک لکھ کے اور اُس کے اکاؤنٹ کا فارم بھر کے منیجر کے سامنے پیش کر دیا۔ وہ اتنی بڑی رقم کا چیک دیکھ کے تذبذب میں پڑ گیا۔ میں نے اُس کی تسلی کے لیے جمع کی ہوئی رقم کی رسیدیں دکھا دیں۔ ہم سے پوچھے بغیر اُس نے ہمارے لیے سوڈا لیمن کی ٹھنڈی بوتلیں لانے کا حکم دیا۔ میں انکار کرتا رہا۔ وہ نہیں مانا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ کیا میں بمبئی میں رہتا ہوں؟

"کبھی رہتا تھا۔" مجھے چلنے کی جلدی تھی سو میں نے مختصر بات کی۔

"کیا کاروبار ہے جناب کا؟"

"کوئی خاص نہیں۔" میں نے سرسری جواب دیا۔

"زمیں دار ہوں گے؟" وہ مسکرا کے بولا۔

"ہاں، یہی سمجھیے۔"

"اب اِدھر کلکتے میں رہنے کا ارادہ ہے؟"

"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔"

"کلکتے میں رہیں تو مجھے خدمت کا موقع دیجیے گا۔" میں نے سر ہلا کے حامی بھری۔

ضروری کاغذوں کی خانہ پُری کے بعد سب سے بڑا مرحلہ کانتے کے فارم کی تصدیق کا تھا۔ تصدیق وہی شخص کر سکتا تھا جس کا اکاؤنٹ بینک میں ہو۔ ڈھونڈنے سے ایسا آدمی مل بھی جاتا مگر وقت نہیں تھا۔ میں نے منیجر کی منت کی کہ وہ خود ہی تصدیق کر دے۔ وہ ہچکچایا۔ میں نے چیک اور فارم میز سے اُٹھا لیے، میں اُنھیں پھاڑنے ہی والا تھا کہ منیجر نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "آپ تو ناراض ہو گئے؟ یہ خانہ پُری کچھ ضروری ہوتی ہے۔" وہ مہذب لہجے میں بولا۔ "لائیے، میں دستخط کیے دیتا ہوں۔"

مختلف فارموں پر دستخط کرانے کے بعد اُس نے کانتے سے کہا کہ وہ تین چار روز میں چیک بُک لے جائے، وہ نہ آیا تو ڈاک سے بھیج دی جائے گی۔ کانتے نے اڈّے کے بجائے گلی کے ایک دست دکان دار کا پتہ لکھوا دیا تھا۔ منیجر ہمیں عمارت کے باہر تک پہنچانے آیا۔

کانتے سے ضبط نہیں ہوا۔ باغ میں نشانے بازی کی مشق کرتے ہوئے وہ پوچھ ہی بیٹھا۔ "لاڈلے! ایک بات بول! تیرے پاس اتنی دولت کدھر سے آئی؟"

مجھے شبہ تھا، اُسے سب معلوم ہو گا، بمبئی میں جولین اور چمپا نے شاید اُسے بتا دیا ہو گا مگر اس کا مطلب یہ تھا کہ جولین نے میری طرف سے اپنے نام کرشنا جی کی آدھی رقم کا چیک ملنے اور لَوٹانے کا کوئی ذکر اُس سے نہیں کیا تھا۔ "آ گئی بس۔" میں نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آسمان سے گری تھی۔"

"مجھ کو پتہ ہے لاڈلے! تُو نے زری بہن کی حویلی اور زمینوں کے کاغذات چُھو کے بھی نہیں دیکھے۔ مجھ سے بولنے میں کوئی حرج ہے کیا؟"

"نہیں کانتے! اچھا ہے تجھ کو پتہ رہے کہ یہ پیسہ بہت عزت کا نہیں ہے۔ اس کا ایک ایک پیسہ میرے لیے لاکھ روپے کے ... میں نے اس سے پہلے صرف ایک بار اس میں سے کچھ رقم نکالی ... جی نے جانے سے پہلے اپنی تمام جائداد اور نقدی میرے نام ... کرشنا جی کو تو تُو جانتا ہی ہے۔"

... اُنھوں نے!" وہ آنکھیں پھاڑ کے بولا۔ "میں نے اُن کی تصویر ... میں دیکھی تھی۔ وہ روز اُس پہ ہار ڈالتی ہے۔"

... تھے، جولین کو بھی وہ بہت پسند تھے اور مجھے اپنا بیٹا ... ایک ماں کے سوا اُن کا کوئی نہیں تھا، ماں بھی مر گئی۔ میرا ... نے لگا۔

... نے بازی بھول کے وہ مجھ سے کرشنا جی کی باتیں سنتا رہا ... اب فسانہ تھیں لیکن اب بھی کبھی کسی لمحے ایسا محسوس ہوتا ... شنا جی کسی گوشے میں چھپے کھڑے ہیں اور مجھے دیکھ رہے ... اچانک میرے سامنے آ جائیں گے۔ باغ میں گولیاں چل رہی ... سب نشانے لگا رہے تھے۔ میں اور کانتے چوکی وا لکی چارپائی ... کرشنا جی کی باتیں کرتے رہے۔ دوپہر کو پیرو اور جُھل باغ ... آتے ہی اُنھوں نے ایک ایک آدمی سے نشانے لگوا کے ... بھی کے ہاتھ تمنچوں اور بندوقوں پر رواں ہو گئے تھے۔ ٹنڈے ... ب میں تیز تھا۔ اُس نے ایک اُڑتے ہوئے پرندے کو گولی ... اِس کے باوجود جُھل نے اُسے ساتھ لے جانے سے صاف ...

... رات جب ہم اڈّے واپس پہنچے تو جُھل نے ہم سب کو ... کمرے میں بلا کے اپنی روانگی کا اعلان کر دیا۔ ساتھ جانے والوں ... کے نام اُس نے لیے اُن میں پیرو، جامو، زورا، مارٹی، وزیر ... مینی، منن میاں، پلٹو، جُھل اور میں شامل تھے۔ بارہ سے ... یں۔ اُس نے ماچھی کا نام نہیں لیا تھا۔ کبن خاں اور کانتے ... یں وہ پہلے ہی منع کر چکا تھا۔ ماچھی کا منہ لٹک گیا۔ جُھل کو ... حساس تھا۔ وہ ماچھی کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے نرمی سے ... یں ساتھ ہی رکھنا چاہتا تھا پر تجھے اُدھر بمبئی میں ہی رہنا ... پیرو بھی نہیں ہے۔ میں نے رائے بدل دی ہے۔"

... اپن سارا فٹ فاٹ کر کے آیا ہے اُستاد!" پیرو اداسی سے بولا۔

... پیرو کی منشا بھی یہی ہے کہ تجھ کو اُدھر سے اتنی دیر دُور نہیں ... ہم کو آنے میں دیر بھی لگ سکتی ہے۔"

... ملاری مرضی! اپن نے تو پہلے ہی بول دیا تھا۔"

... ماننے بھی سب سے پہلے بول دیا تھا۔"

... جُھل کے سوا کسی نے زبان نہیں کھولی اور ماچھی نے بھی پہل نہیں کی تھی، جُھل خود نہ کہتا تو ماچھی بھی چپ رہتا۔ "چھیدا ابھی بمبئی جا کے اڈّے کو دیکھے گا۔" جُھل نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "ٹنڈا بھی ان دونوں کے ساتھ اُدھر لَوٹ جائے گا۔"

"اپن روز سب کی چمپی کریں گا۔" ٹنڈا اُچھل کے بولا۔

"اُدھر سر اور بدن کھلا رکھنے کی نوبت آئے نہیں تو ایسا کرے گا ٹنڈے!" جُھل نے بوجھل آواز میں کہا۔ "بمبئی جا کے جولی کی خیر خبر رکھنا۔"

رات آگے بڑھتی جا رہی تھی اور جُھل کے جلد اُٹھنے کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ اگر میں بیچ میں کسی بہانے اُٹھ جاتا تو سب کو محسوس ہوتا کیونکہ جُھل سب کو مختلف ہدایتیں دے رہا تھا جیسے اس کے بعد ہم لوگوں کا پھر اکٹھا ہونا ممکن نہیں ہو گا۔ جُھل آج ہی رات یا کل صبح روانگی کا ارادہ رکھتا تھا۔ میرا وہاں بیٹھنا ضروری تھا۔ میرے لیے جُھل کے منہ سے نکلنے والی ہر بات تجسس انگیز تھی۔ ساری باتیں کسی نہ کسی طرح سفر سے متعلق تھیں مگر نہ کسی نے پوچھا تھا، نہ جُھل نے اب تک بتایا تھا کہ وہ کون سی سمت کا رُخ کرے گا۔ اُس کے لہجے سے ایک بات تو صاف نمایاں تھی کہ ہم کسی آسان سفر پر نہیں جا رہے ہیں اور سب ساتھ ہی جا رہے ہیں، الگ الگ نہیں، جیسا کہ ایک بار میرے ذہن میں آیا تھا۔ اُس کے لہجے میں یقین کی کمی تھی۔ کانتے اور کبن خاں کو اُس نے ہدایت کی کہ وہ اپنے ہاتھ پیر اور زبان کی باگیں کھینچے ہی رکھیں۔ ماچھی سے بھی اُس نے یہی کچھ کہا تھا۔ وہاں کلکتے کے دوسرے اڈّوں کے جو لوگ موجود تھے اور جو ہمارے ساتھ نہیں جا رہے تھے، اُن سے بھی وہ کچھ اسی قسم کی باتیں کر رہا تھا۔

اِس بار ہمارے کلکتے آنے کے بعد صورتِ حال وہ نہیں تھی، جو پہلے تھی۔ کانتے کی زبانی اشارتًہ مجھے معلوم ہوا تھا کہ جامو کی زیادہ سختی کی وجہ سے کچھ عرصے تک تو شہر کے اڈّوں میں کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی مگر رفتہ رفتہ لوگ اُکھڑنے لگے۔ ایک افواہ یہ بھی مشہور تھی کہ جامو نے جُھل کو کسی بڑی مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔ اِس لیے اُس کا کلکتے واپس آنا مشکل ہے، جُھل کی جامو سے کوئی کور دبتی ہے، جُھل بوڑھا ہو گیا ہے اور اب اڈّے سے بھاگنا چاہتا ہے۔ میرے اور اُس کے تعلق کے بارے میں بھی قسم قسم کی افواہیں پھیلی ہوئی تھیں، مثلاً یہ کہ جُھل کی کمزوری لاڈلا ہے، وہ بس اُسی کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ ان افواہوں کے نتیجے میں کئی آدمی اُکھڑ گئے اور شہر میں اُن کا بس نہیں چلا تو نواحی علاقوں میں جا کے اڈّا گیری کرنے لگے۔ جُھل پھر واپس جا رہا تھا۔ کسی وقت بھی یہ لوگ زور پکڑ سکتے تھے اور کانتے اور کبن خاں کے لیے اُلجھنیں کھڑی کر سکتے تھے۔ ان میں زیادہ تر موجمدار کے پُرانے آدمی تھے۔ اُس کے ختم ہونے کے بعد وہ بہ ظاہر جُھل کے ساتھ ہو گئے تھے مگر بباطن ساتھ نہیں تھے۔ گھوشی کی مثال سامنے تھی۔ جُھل اگر کلکتے میں رہتا تو شاید اُن کا رویہ یہ نہ ہوتا۔

نصیب میاں نے بھی دبے لہجے میں مجھ سے جامو کے سلسلے میں بات کرنی چاہی تھی، میں نے توجہ نہیں دی تو نصیب میاں چپ ہو گئے۔ وہ ایک طرح کی شکایت ہی تھی۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ فرصت ملی تو کسی سے کہے بغیر اُن لوگوں کے پاس جاؤں گا تاکہ اُنھیں پتہ چل جائے کہ بھّل کی دو آنکھیں نہیں ہیں۔ ایک مرتبہ میں گھونٹی کو بھی بھّل کے پاس پکڑ کے لایا تھا، بھّل نے میرے کہنے پر اُسے معاف کر دیا حالانکہ اُس نے اُسی وقت کہہ دیا تھا کہ یہ پھر کمینہ پن کرے گا۔ کاش بھّل میری بات نہ سنتا۔ ہمارے جانے کے بعد گھونٹی پھر بدل گیا اور جامو کو اُسے آخری سزا دینی پڑی۔ جامو کی بھی کوئی غلطی نہیں تھی۔ وہ سختی نہ کرتا تو اب تک تو آدمیوں نے نواحی علاقوں ہی میں اڈّے جمائے تھے، رفتہ رفتہ شہر میں جم جاتے۔ غلطی تو میری تھی کہ میں سب کچھ جاننے بوجھنے کے باوجود بھّل کے ساتھ لگا رہا۔ بمبئی آ کے اُس نے مجھے ڈھونڈ لیا تھا مگر اُس کے بعد بھی کئی مواقع مجھے اس سے دُور ہونے کے ملے تھے۔ البتہ اب دُوری کا کوئی امکان نہیں تھا۔

مگر اس وقت بھّل نے یہ بتا کے سب کو دنگ کر دیا کہ نواحی علاقوں میں جمنے والے تمام اڈّے شہر کے دوسرے اڈّوں کی طرح کانتے اور کبّن خاں کو مسلسل بھتّا پہنچایا کریں گے۔ "میں اُن سب کو دیکھ چکا ہوں۔ اُن لوگوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔" بھّل نے ہمیں بتایا۔ "صرف کاشی پور میں ایک سلطان باقی رہ گیا ہے۔ آج رات مجھے اُسی کو دیکھنا ہے۔"

میں سلطان کا ذکر کانتے سے سُن چکا تھا۔ ایک دو بار اُس سے جیل میں ملا بھی تھا۔ کسی زمانے میں وہ بھّل کے اڈّے سے متعلق تھا پھر قتل کے ایک معاملے میں اُسے چار سال دلّی جیل میں کاٹنے پڑے۔ واپس آیا تو بھّل نے اُسے اپنے ساتھ نہیں رکھا۔ وہ پہلے اِدھر اُدھر گھومتا رہا اور بعد میں موجمدار کے اڈّے سے مِل گیا پھر جب موجمدار کے تمام اڈّے بھّل کی تحویل میں آ گئے تو اُس نے سلطان کو نہیں نکالا۔ سلطان لمبے قد کا ایک پھرتیلا آدمی تھا۔ عمر اب کوئی تیس سے اُوپر ہو گی۔ چاقو پر اُس کی گرفت مضبوط تھی۔ بھّل ہی نے اُسے چاقو تھامنا سکھایا تھا۔ وہ بلند شہر کا رہنے والا تھا اور بھّل کے پاس بچپنے میں آ گیا تھا۔ درمیان میں سلطان نے اپنی عادت سے مجبور ہو کے پھر ہڑ لونگ مچانی شروع کی تھی۔ جامو نے اُسے تنبیہ کی مگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا۔ نتیجۃً جامو نے اُس سے اڈّا چھین لیا اور اُسے کلکتے سے نکل جانے کا حکم دیا۔ وہ شہر کی ایک نواحی بستی کاشی پور میں چلا گیا۔ وہاں اُس نے اِدھر اُدھر سے آدمی اکٹھے کرنے شروع کیے۔ پھر ایک دن کاشی پور کے اُستاد جلّو کو بے دخل کر کے خود اڈّے کا مالک بن بیٹھا۔ کاشی پور زیادہ آمدنی کا علاقہ نہیں تھا اور پھر سلطان شہر کے اڈّوں سے چھیڑ چھاڑ بھی نہیں کرتا تھا اس لیے جامو نے اُسے ڈھیل دی مگر ضرور جامو کو اُس سے نمٹنے کے لیے کسی مناسب موقع کی تلاش ہو گی۔ جامو [illegible] کرنے کے لیے کھلا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اِدھر جامو کو شہر [illegible] سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ بھّل کی زبان سے سلطان کا نام [illegible] کے کان کھڑے ہوئے۔ رات کا کھانا ہم نے خاصی دیر سے [illegible] اُوپر فلیٹ میں جانے کے بجائے مجھے، پیرو، جامو، کانتے [illegible] اور ماچھی کو لے کے اڈّے سے باہر نکل آیا۔ ظاہر ہے [illegible] چاہتا ہو گا۔ وقت گزرا جا رہا تھا۔ مجھے اُدھر شہ پارہ کی [illegible] نے دن بھر میرا انتظار کیا ہو گا۔ میں اب بھی نہ پہنچا تو وہ بار [illegible] وہ کھڑکی میں کھڑی ہر آنے جانے والے کو تکتی ہو گی۔ [illegible] آہٹ پر اُس کے کان لگے ہوں گے اور بار بار اُسے کریہہ نظروں کا سامنا کرنا پڑتا ہو گا۔ بچیس ہزار روپے کا چیک رکھا تھا جو میں نے بینک ہی میں لکھ لیا تھا لیکن دن بھر مجھے دونوں کو وقت نہیں ملا۔ ہم میں سے کوئی ایک ہی [illegible] تھا۔ میں نے نصیب میاں کی بابت سوچا تھا کہ اُنھیں جا [illegible] بھیج دوں گا لیکن اُن سے کہنا مناسب نہیں لگا۔

اڈّے سے کاشی پور کا فاصلہ دس میل سے کم نہ ہو گا [illegible]

تو سلطان اپنے آدمیوں کے ساتھ اڈّے کی گلی کے نکڑ پر [illegible] کی صحت پہلے سے اچھی تھی، رنگ کھل رہا تھا۔ قد تو اُس کا [illegible] تھا اب جسم بھاری پڑنے سے وہ کچھ اور توانا لگنے لگا تھا [illegible] پڑتے ہی اُس نے تن دہی سے اُسے سلام کیا اور اُس کے [illegible] اُس کے ساتھ کے سبھی آدمیوں نے اُس کی تقلید کی لیکن [illegible] کے کسی آدمی نے ہمیں سلام نہیں کیا۔ اُس کے انداز سے [illegible] کہ اُسے بھّل کے آنے کی خبر تھی۔ بھّل ہی نے کہلوایا ہو گا [illegible] لمحے اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ اُس نے بھّل سے پوچھا: [illegible]

"ہاں رے، راستہ بڑا ہے۔" بھّل نے بھاری لہجے [illegible]

سلطان ہمیں اڈّے کی عمارت میں لے گیا۔ عمارت بڑی نہیں تھی لیکن صاف ستھری تھی۔ صحن میں تخت پر سفید [illegible] تھی۔ اُس نے بھّل کو وہیں بٹھا دیا اور خود کھڑا رہا۔ بھّل [illegible] بھی تیار تھا۔ شروع شروع میں وہ کچھ گھبرایا ہوا نظر آتا تھا [illegible] کے چہرے پر ایک ٹھیراؤ پیدا ہو گیا اور وہ اپنے آدمیوں کو مدارات کے حکم دینے لگا۔ "رہنے دے۔ مجھ کو جلدی ہے۔" [illegible] اُسے منع کر دیا۔

"کیسے میرے بھاگ کھلے، اُستاد غریب کی جھونپڑی [illegible]" لچک دار آواز میں بولا۔ "مجھ کو بلا لیا ہوتا۔"

"تجھ کو دیکھنا تھا سلطانے کہ تو نے کیا تیر مارے ہیں [illegible]"

"تیر کیا!" وہ کندھے اُچکا کے بولا۔ "جینے کا سہارا کر لیا [illegible]

[illegible] سر ہلانے لگا۔ "پر اب کیا تیرے سر میں ہے؟"

"[illegible] اُستاد!" وہ برہمی سے بولا۔ "کیا تم یہی کہنے آئے ہو؟"

"[illegible] پاس وقت نہیں ہے سلطانے کہ میں تجھ سے لمبی باتیں [illegible] نے اِدھر کاشی پور میں اُستاد جلّو کو رکھا تھا اور اپنی جگہ جامو کو چھوڑ گیا تھا۔ تو نے جلّو سے اڈّا لے لیا۔ کیا یہ سمجھ کے [illegible] مر گیا ہے؟"

"[illegible] مانتا اُستاد! اب سب یہی کہتے ہیں کہ اُستاد ختم ہو گیا [illegible] بات دوسری تھی لیکن اپنے کو کسی اور کی تابع داری کرنی [illegible] اور پھر جامو نے خود ہی پھکیتی کی۔ بار بار ٹانگ اڑاتا تھا۔ [illegible] آدمیوں کے سامنے اپنے کو بے عزت کیا۔ پیٹھ پیچھے نہیں [illegible] سامنے کہہ رہا ہوں۔ ہم نے بھی سب تمھارے ہاتھوں سے سیکھا [illegible] ہم پر کچھ حق بنتا ہے۔ نئے نئے آدمی آ کے تمھارے سر پہ [illegible] پُرانے سالے اور پیچھے چلے گئے۔ کبھی تم نے نہیں پوچھا، [illegible] تیرے منہ میں کے دانت ہیں، خوار کیوں پھر رہا ہے۔ مجبوراً [illegible] موجمدار کی گلی میں جانا پڑا۔ میں جلّو کو اب بھی کاشی پور سے نہ [illegible] تو ٹھیک طرح چلتا۔ اپنی بھی کوئی عزت ہے اور یہ تمھاری [illegible] ہے۔"

[illegible] بھّل سب سنتا رہا، جامو اُس کے پیچھے کونے میں گردن [illegible] بیٹھا تھا۔ "اور کچھ بولنا ہو تو بول لے۔" بھّل نے تھمی ہوئی [illegible]

"[illegible] اور کیا بولوں، تم سب سمجھتے ہو۔" وہ بگڑ کے بولا۔

"[illegible] اور رہ گیا ہو تو بھڑاس نکال لے۔"

"[illegible] پہلے بھی ایسے کہنے کا موقع دیتے۔ سدا پھٹکارتے رہے جیسے تمھارا کوئی ناتا نہیں تھا۔ میں نے بھی پھر اپنا حق لے لیا ہے اُستاد!"

"[illegible] تو میں زندہ ہوں سلطانے! حصّے بخرے مرنے کے بعد کرتا۔"

"[illegible] نے پوچھا ہے تو ساری بات بتا دی ہے۔ تم سدا زندہ رہو۔ [illegible] لڑکا بچّہ تمھارا دشمن ہے۔"

"[illegible] ہے۔" بھّل مدھم لہجے میں بولا۔ "تو نے کبھی دھیان نہیں دیا [illegible] میرے سر پر کیوں چڑھ بیٹھا۔"

"[illegible] سے وہ بات نہیں ہوتی جو اور لوگ تمھارے ساتھ کرتے [illegible] ہو۔ اپنی زبان بھی چھوٹی ہوتی ہے، ہاتھ بھی۔ اپنے کو برداشت [illegible] بولتے ہیں۔"

"[illegible] بن۔ اڈّا کسی کے باپ کی جاگیر نہیں ہوتا اور اگر کوئی ایسا [illegible] تو یہ جاگیر زیادہ دیر تک نہیں رہتی۔ اڈّے کا بٹوارا، ماں باپ [illegible] طرح نہیں ہوتا۔ اُسی کو ملتا ہے جس کا سر اور ہاتھ پیر کانٹے [illegible] اُترتے ہوں، جو اس کا بوجھ اُٹھا سکے اور جس کا ہاضمہ ٹھیک ہو۔ تیرا ہاضمہ پہلے ہی سے خراب رہا ہے۔ تیرے ہاتھ پیر بہک جاتے ہیں سلطانے! ٹھیک چلتا چلتا پچھاڑی دکھانے لگتا ہے۔ تجھ کو تو منہ کھولنا بھی نہیں آتا۔"

"تمھارے ہی ساتھ رہا ہوں۔"

"میرے ساتھ رہ کے بھی میرے ساتھ نہیں رہا سلطانے! ورنہ جوتی نہیں مارتا، سُن لے! میں پھر جا رہا ہوں، کانتے اور کبّن کو جامو کی جگہ چھوڑ کے، تیری رائے کیا ہے؟"

"آج میری رائے پوچھنے کی ضرورت کیسے پڑ گئی۔" وہ زہرخند سے بولا۔

"اس لیے کہ بعد کو تو اپنی کھال میں ہی رہے۔ اوقات بھی بولتے ہیں اسے۔ کیوں لاڈلے؟" وہ مجھ سے مخاطب ہو کے بولا۔ میں چپ رہا۔ وہ کہنے لگا: "میں کانتے اور کبّن دونوں کو لایا ہوں، اور بھی لوگ ہیں۔ اپنا حق جتانا ہے تو چاقو کھول کے جتا لے اور ایک بار پھر ذرا غور سے دیکھ لے کہ کون لوگ میرے سر پہ بیٹھے ہیں۔ نکال لے اپنی حسرت ان کے سامنے چاقو کھولتے ہوئے تجھے لاج آتی ہے تو اور بھی ہیں۔ اِدھر میں بھی ہوں۔ دیکھتا ہوں تیرا ہاتھ کتنا کھلا ہے۔ ویسے ڈیل تو تو نے بیل کی طرح پھیلا لیا ہے۔"

"کیا تم اسی ارادے سے آئے ہو؟"

"میں نے تجھ سے کہلوایا تھا۔ تیرے خانے میں بھیجا ہوتا تو میرے پاس خود آ جاتا مگر تو نے میرا اِدھر انتظار کیا۔ شیر کی اولاد! چاقو یہ رکھا ہے۔ بول، کس کو دوں؟ فیصلہ کر لے کہ کس کا حق بنتا ہے۔ پھر تو ٹھنڈک پڑ جائے گی تیرے کلیجے میں؟ بٹوارا اسی طرح ہوتا ہے۔ تیرے تار کسنے کی ضرورت ہے تبھی سُر سیدھے نکلیں گے۔" سلطان کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔

"دیر نہ کر، رات بہت ہو گئی ہے۔ لوٹنا بھی ہے۔ میں بولتا ہوں سارا کلکتہ تیرا ہے، تیرے باپ کا ہے۔ ہم سب اِدھر سے اپنا بوریا بستر سمیٹ کے چلے جائیں گے۔ تو اِدھر مستی کرنا۔ جامو کو ہی اُٹھا لے یا جسے تو چاہے۔ اور بھی لوگ اُدھر اڈّے پر پڑے ہیں۔ تو بولے تو اُن میں سے کسی تیرے جوڑی دار کو بلا لوں؟"

سلطان نے کوئی حرکت نہیں کی، بُت کی طرح کھڑا رہا۔

"کیوں، کاہے جھجک کرتا ہے۔ اُٹھا ہتھیار۔"

سلطان دم سادھے اُسے تکتا رہا۔

"جب تک میری آنکھیں کھلی ہیں سلطانے! میرا واسطہ تجھ سے ہے۔ میں کُتیا کے پِلّے کو ہی کیوں نہ اپنی جگہ بٹھا جاؤں، تو اُس کو چاقو دکھائے گا، پر پیچھے تو پلٹے کہ میں کھڑا ہوں، بٹھایا تو میں نے اُسے ہے اور کچھ دھیان کر کے ہی بٹھایا ہو گا۔ اس سے تکرم اُس سے نہیں، مجھ سے ہے اور مجھ سے تکرم اُس وقت تک تیرے لیے بند ہے جب تک میرے پاس چاقو ہے اور میرے ہاتھ کو اسے سنبھالنا آتا ہے اور میں

کوٹ لوٹ کے آ تا رہوں گا۔ میرے بعد تو جس سے چاہے زنا کر کے دیکھ لینا۔ اب ان کے پیچھے تو میں ہوں۔"

سلطان نے اپنا چاقو نکال لیا۔ چند لمحوں تک وہ آنکھیں بند کیے اور ہونٹ بھینچے کھڑا رہا۔ پھر اُس نے جھپٹتے ہوئے انداز میں اپنا چاقو اور سر تجمل کے پیروں میں ڈال دیا۔

تجمل نے اُس کے بال پکڑ کے کھینچنے شروع کر دیے۔ سلطان ٹرکنے لگا۔ "اکیلا چاقو کچھ نہیں ہوتا لے! جانتا ہوں تیرا ہاتھ خوب چلتا ہے۔ پر صرف ہاتھ ہی نہیں چلتا، کچھ اور بھی چلتا ہے اور اُس میں تیرے کیڑے پڑے ہیں۔ چل میرے ساتھ۔"

تجمل نے اُسے اُٹھایا تو وہ سینے سے چمٹ گیا۔ تجمل اُسے اڈے ہی پر لے آیا۔ پھر جامو اور پیرو کے ساتھ اُوپر فلیٹ میں لے گیا۔

رات کے ڈھائی بجے ہوں گے۔ اب شہہ پارہ کے پاس جانے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ میں یا کانتے اتنی رات گئے۔ دروازہ کیسے کھٹ کھٹاتے۔ پہنچتے پہنچتے اور رات ہو جاتی۔ ہم دونوں بستروں پر لیٹ گئے مگر میرا جی نہیں مانا۔ میں نے آخر کانتے کو جھنجوڑا۔ وہ جاگ رہا تھا۔

"کانتے! اُسے بھی نیند نہیں آ رہی ہو گی۔ جا کے یہ چیک دے آ۔" میں نے اُس کی منت کی۔

"صبح دے آئیں گے لاڈلے!" وہ غنودہ لہجے میں بولا۔

"صبح اگر پھر وقت نہ ملا جیسے آج...."

"ایک دو دن دیر بھی ہو جائے تو کیا حرج ہے۔"

"وہ کیا سمجھے گی، تجھے اُس کا خیال نہیں آتا؟"

کانتے نے کچھ ہی دیر سوچا پھر ہم دونوں نیچے آ گئے۔ باہر دروازہ بند تھا۔ کانتے نے ٹلوا کو جگا کے دروازہ کھلوایا۔ سواری ڈھونڈنے میں اور وقت گزر گیا۔

وہاں گلیوں میں ابھی تک اِکّا دُکّا دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ سپاہی گشت کر رہے تھے۔ بعض بالا خانوں پر بھی روشنی تھی مگر کسی طرف سے گانے بجانے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ کرمن بیگم کا سارا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں ڈیوڑھی کے باہر نزدیک ہی ایک جگہ رُک گیا۔ کانتے نے مجھ سے بھی چلنے کو کہا لیکن میں آگے نہیں گیا۔ شہہ پارہ مجھے روک لیتی اور اُس کے سامنے کرمن بیگم کو چیک دیتے ہوئے بھی مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ کانتے نے آنے میں دیر لگا دی حالانکہ دروازہ کھلنے میں دیر نہیں ہوئی تھی۔

"کیا ہوا؟" اُس کے آتے ہی میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"دے دیا۔" وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

"کرمن بیگم ملی تھی؟"

"وہ بھی تھی۔

"کچھ کہتی تھی؟"

"کہنی کیا چھناں۔ اندر لے گئی، کوٹھے مٹکا کے بولنے لگی، ضرورت نہیں ہے۔ لاڈلے میاں جب بھی آئیں، آ کے تشریف لے جائیں۔ میں نے چیک اُس کے آگے ڈال دیا اور چلا آیا۔"

"پھر تجھے اتنی دیر کیسے ہو گئی؟"

"ڈیوڑھی میں شہپارے نے مجھے روک لیا۔ میرا خیال ہے وہ جاگ رہی تھی۔ دروازے پر دو تین ہی بار کھٹکا کیا ہو گا... پوچھتی رہی کہ لاڈلے کیوں نہیں آیا۔ میں نے بولا، لاڈلے کو کچھ..."

"کیسی تھی وہ؟"

"بہت خوش تھی لاڈلے! میں نے شہپارے کو اتنا... دیکھا۔ مجھے دیکھتے ہی گال پھول کی طرح کھل گئے۔ بس جانی... میں سمجھ، سارے پیسے وصول ہو گئے۔ تیرے آنے میں اگر... میں اُسے پیسے دے کے لے آؤں گا اور ممبئی سے جولی کو... بلا لوں گا۔ اُستاد نے اَڑی کی تو اُس کو بھی دیکھ لوں گا۔"

"ایسا ہو جائے تو کیا بات ہے کانتے! جتنی جلد... یہاں سے نکال لے، اچھا ہے۔ مجھ پر بڑا احسان ہو گا۔" کا... زور سے تھپیڑ مارا اور گلے لگا لیا۔

میں آ کے سو رہا۔ اُس دن نصیب میاں نے... اُٹھایا۔ آنکھ کھلی تو دن نکل آیا تھا۔ نیچے تجمل موجود نہیں تھا... کئی لوگ نہیں تھے۔ نصیب میاں نے مجھے بتایا کہ تجمل... دوسرے آدمیوں کو اسٹیشن پہنچانے گیا ہے۔ مجھ سے ناشتہ... گیا۔ نصیب میاں کو اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں تھا۔ پھر مار... پتہ چلا کہ وہ دونوں ہلاکو، جینی، پلٹو، زورا اور وزیر کے ہمرا... روانہ ہو چکے ہیں۔ اُن کی سمت کی خبر مارٹی کو بھی نہیں تھی... کے مطابق اُن کے ساتھ سامان زیادہ نہیں تھا۔ سوچنے سو... بھٹکنے سا لگا۔ ہزاروں وسوسے ذہن میں گردش کر رہے تھے... پہلے سے روانگی کے باعث مجھے اپنا یہ اندازہ درست مع... کہ تجمل اُنھیں مختلف مقامات پر بھیجنے کا ارادہ رکھتا ہے... وہ ایک ساتھ گئے ہیں، آگے کسی مقام سے جُدا جُدا بھی ہو... وہ یہیں سے دو دو جا سکتے تھے اور اس میں پردہ پوشی کی... بات تھی۔ کسی کو کچھ خبر نہیں تھی یا وہ سب مجھ سے چھپا ر... تجمل کی یہ احتیاط بے سبب تو نہیں ہو گی۔ جب ہمیں سا... تھا تو بتا دینے میں کیا رکاوٹ تھی اور نہ بتانے میں کون سی مصلحت...

دن کے باقی حصے میں وہ اڈے سے غائب رہا... متن کو لیے نہ جانے کہاں کہاں گھومتا رہا۔ رات کو اُس کی...

میں نے بالکل عہد کر رکھا تھا کہ آج اُس سے ضرور بات کروں گا لیکن پھر اُس کی صورت دیکھ کے میری ہمت پست ہو گئی۔ وہ بہت تھکا ہوا نظر آتا تھا۔ چہرے پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں، رات کا کھانا بھی اُس نے نہیں کھایا۔ میں نے متن اور سلطان کو ٹٹولنے کی کوشش کی تو اُن سے اس کے سوا کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی کہ وہ بازار میں خریداری کرتے رہے اور تجمل انھیں باہر چھوڑ کے شہر کی کئی دکانوں میں گیا۔ فلیٹ میں اُوپر سونے کے لیے جاتے وقت تجمل نے ہمیں جلد اُٹھنے کی تاکید کی اور بتایا کہ صبح ہم لوگوں کی روانگی ہے۔ مجھے کسی قدر سکون ہوا۔ ایک رات کی بات اور تھی مگر رات بھر ایک پل کے لیے میری آنکھ نہیں لگی۔ صبح سب سے پہلے میں نیچے آ گیا۔ ناشتہ کرتے ہی تجمل، نصیب میاں اور دوسرے لوگوں سے گلے مل کے اڈے سے چل پڑا۔

اسٹیشن پر ہمیں رخصت کرنے کے لیے بھیڑ نہیں تھی۔ کانتے تھا، کپتن خاں، ماچھی، سلطان، چھیدا اور ٹنڈا۔ اُس وقت سبھی تجمل کو دیکھتے رہ گئے جب اُس نے سلطان کو گاڑی سے نہیں اُترنے دیا، اپنے ساتھ ہی بٹھائے رکھا۔ میرے، سلطان اور تجمل کے علاوہ ڈبے میں سارٹے، متن اور مارٹی بھی تھے۔ کانتے اور کپتن خاں مجھ سے لپٹ کے رونے لگے اور نہ جانے کیا کیا کہتے رہے۔ جب تک گاڑی نہیں چلی، ٹنڈا میری ٹانگوں سے چپکا کھڑا رہا۔

میری آنکھوں پر پٹی نہیں بندھی تھی۔ میں گزرتے ہوئے تمام اسٹیشنوں کے نام صاف پڑھ سکتا تھا۔ جیسے جیسے گاڑی آگے بڑھتی گئی میری حیرت سوا ہوتی گئی۔ ہم بنگال عبور کر کے آسام کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اِن علاقوں سے کبھی میرا گزر نہیں ہوا تھا۔ تجمل درمیان میں کہیں نہیں ٹھیرا۔ دوسرے دن ہم شمالی آسام کے ایک بڑے قصبے یا ایک چھوٹے شہر ڈبرو گڑھ میں اُتر گئے۔ جیسے ہی گاڑی رُکی، سامنے پلیٹ فارم پر جامو کو دیکھ کے میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا مگر وہ ہمارے قریب نہیں آیا، دُور کھڑا ہمیں دیکھتا رہا۔ میں نے اُس کی طرف بڑھنے کا ارادہ کیا تو تجمل نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ جامو اجنبیوں جیسے انداز میں ہماری جانب سے گزرتا ہوا اسٹیشن سے باہر نکل گیا۔ اُس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا۔ وہ شخص کلکتے میں چائنا ٹاؤن کے اڈے سے تعلق رکھتا تھا۔ میں اُس کا نام تو نہیں جانتا تھا لیکن صورت آشنا تھا۔ صورت بھی مجھے یوں یاد رہ گئی کہ اُس کے خط و خال برمیوں اور چینیوں جیسے تھے۔ سفر کے دوران کتنے ہی موقع آئے کہ میں تجمل سے کچھ پوچھ سکوں مگر میں یہ سوچ کے ہر بار خود کو روک لیتا تھا کہ اب جلد ہی سب کچھ خود بخود معلوم ہو جائے گا، تجمل کب تک خاموش رہے گا۔ ڈبرو گڑھ کے پلیٹ فارم پر قدم رکھتے ہوئے میرا خون رگوں میں سن سنانے لگا تھا۔

شہر میں پختہ مکانات کم، لکڑی اور بانس کے گھر کثرت سے تھے۔ مچھروں کی بہتات تھی۔ ٹھنڈ بھی اچھی خاصی تھی۔ تجمل کے کہنے پر ہم سب نے گرم کپڑے پہن لیے تھے۔ ہمیں اسٹیشن سے بہت دور نہیں جانا پڑا۔ قریب ہی ایک سرائے جیسے ہوٹل میں پہنچ کے ہم ٹھیر گئے۔ وہاں ہم سے پہلے پیرو، زورا، جینی، پلٹو اور ہلاکو موجود تھے۔ سرائے میں ہمیں داخل ہوتے وقت اُنھوں نے بس ایک اچٹتی نظر سے دیکھا اور قہوہ پیتے رہے۔ ہم میں سے کسی نے آپس میں بات چیت نہیں کی۔ کچھ دیر بعد جامو بھی وہاں پہنچ گیا۔ تجمل کے ساتھ کئی ٹرنک سامان تھا، بستر بند الگ تھے۔ یہ چیزیں ہم جھونپڑیوں جیسے کمروں میں محفوظ کر کے شہر دیکھنے کے لیے باہر نکل آئے۔ متن، سارٹے اور سلطان کو تجمل نے ہوٹل ہی میں چھوڑ دیا تھا۔ ڈبرو گڑھ میں چھوٹے موٹے کئی بازار تھے۔ طرح طرح کی شکل و صورت، رنگ روپ کے لوگ نظر آ رہے تھے، عام طور پر پستہ قد اور سیاہ۔ اُس دن ہندوؤں کا کوئی تہوار تھا۔ بڑے بازار میں شور مچا ہوا تھا۔ سنکھ بج رہے تھے۔ لوگ جلوس کی شکل میں ایک بڑی مورتی اُٹھائے اُس پر پھولوں کی پتیاں پھینکتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ کچھ دُور جا کے ہمیں بدھوں کا ایک مندر بھی دکھائی دیا۔ اچانک تیز بارش ہو گئی۔ جلوس تتر بتر ہونے لگا۔ ہم بھی دوڑتے ہوئے ہوٹل میں واپس آ گئے۔

ہوٹل میں بجلی بھی نہیں تھی۔ لیمپ اور گیس کے ہنڈوں سے روشنی کی جاتی تھی۔ ہم سے کسی کل سیدھا نہیں بیٹھا جاتا تھا۔ مچھر کانوں میں بھن بھنا رہے تھے اور جسم سے چمٹ چمٹ جاتے تھے۔ رات کو کھانے کے وقت یکایک ہوٹل میں ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ سارٹے اور زورا میں کسی بات پر تو تو میں میں شروع ہوئی اور نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ ہم نے اور ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے دوسرے لوگوں نے بیچ بچاؤ کرایا تو ہنگامہ فرو ہو گیا۔ سارٹے اور زورا اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے لیکن ہوٹل کی فضا میں ایک تکدر پیدا ہو گیا تھا۔ ہوٹل کے بنگالی مالک نے اُنھیں تنبیہ کی اور ہم سے معذرت چاہی۔ بیچ بچاؤ میں تجمل اور پیرو کی بات چیت شروع ہو گئی تھی۔ وہ آپس میں ایک دوسرے سے ایسے ملے جیسے پہلی بار مل رہے ہوں۔ مسافروں اور ہوٹل کے لوگوں کو دُور دُور تک گمان نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ ایک دوسرے سے واقف ہیں۔ اُن میں تھوڑی ہی دیر بات ہوئی، پھر وہ اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ ہوٹل میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ رات شاید وہاں جلد ہو جاتی تھی۔ ہم تین تین ایک ایک کمرے میں تھے۔ تجمل، مارٹی اور میں ایک کمرے میں، دوسرے میں سارٹے، متن اور سلطان۔ کمرے میں اندھیرا کم تھا اور روشنی اس سے تیز کی بھی نہیں جا سکتی تھی۔ مجھے وحشت ہو رہی تھی اور ڈر سا بھی لگ رہا تھا جیسے ابھی کچھ ہو جائے گا۔ دل کبھی ڈوبنے لگتا، کبھی اتنا تیز دھڑکتا کہ میں ہانپنے لگتا۔ مجھ سے ایک کروٹ نہیں لیٹا جا رہا تھا۔

مارٹی کو نیند آ گئی تھی۔ تجمل اپنی چارپائی پر پڑا لمبی لمبی سانسیں

کھینچ رہا تھا۔ کمرے میں بہت سردی تھی۔ روزنوں سے ہوا اندر تک آ رہی تھی اور لیمپ کی بتی بھڑک اٹھتی تھی۔ رات کو کسی وقت مجھے تجمل کی آواز سنائی دی۔ میرا سارا جسم دہل سا اٹھا۔ وہ مجھی کو پکار رہا تھا۔ جواب دیتے ہوئے میری زبان لکنت کرنے لگی۔ وہ اٹھ کر میرے ہی بستر پر چلا آیا اور میرا سر تھپ تھپاتے ہوئے آہستگی سے بولا۔ "سو یا نہیں رے؟" میرا جی چاہا کہ چیخنے لگوں، میں نے اپنے ہونٹ بند ہی رکھے۔

"مجھ کو پتہ ہے تو مجھ سے خفا ہوگا پر میں تجھ سے کیا بات کرتا۔ تجھ سے ایک دن بھی چین سے نہ کاٹا جاتا۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے لرزیدہ لہجے میں کہا۔

"رسان سے رہ۔ کئی بار جی میں آیا، تجھ کو بول دوں پر اس لیے چپکا رہا کہ تو ٹھیک طرح ہاتھ پیر بھی نہیں چلانے دے گا۔"

"کیا بات ہے؟"

"بات بڑی نہیں ہے پر بڑی بھی ہو سکتی ہے۔"

"پہیلیاں مت بجھواؤ۔ جلدی بتاؤ۔"

"بولتا ہوں رے!" وہ خفگی سے بولا۔ "ادھر فیض آباد میں چلنے سے تین چار دن پہلے بمبئی سے شکلا کی چٹھی آئی تھی۔ میں نے تجھ کو نہیں دکھائی۔ شکلا نے لکھا تھا کہ تیرے باوا کو ڈیڑھ دو مہینے پہلے شیلانگ میں دیکھا گیا ہے۔"

"نہیں۔" میری آواز گلے میں گھٹ گئی۔

"ہاں رے! بیچ میں مت بول، سن تا رہ۔ چٹھی ملنے میں شکلا کو دیر لگی۔ وہ ادھر بمبئی میں نہیں تھا۔ شملے چھٹی پر گیا ہوا تھا۔ آکے اس نے چٹھی پڑھی لکھا تھا کہ تیرے باپ کی صورت کا آدمی شیلانگ میں دیکھا گیا ہے۔ ایک پولیس والے نے تیرے باوا کے سامنے اس کا اصل نام بولا تو وہ گھبرا گیا۔ ہوٹل میں اس نے دوسرا نام لکھوایا تھا پر اس کا حلیہ وہی تھا جو کرشنا جی نے چٹھیوں میں لکھا تھا۔ پولیس والے نے اس سے پوچھا کہ کیا تم صفدر زماں کو جانتے ہو؟ تیرے باوا نے منع کر دیا مگر اس کی گھبراہٹ دیکھ کے پولیس والا ہوشیار ہو گیا۔ اس کے پاس کوئی چالان نہیں تھا، نہ اسے کسی جرم کا پتہ تھا۔ وہ چپ چاپ چلا آیا اور اس نے بمبئی پولیس کو لکھا، چٹھی پڑھنے پر شکلا نے فوراً شیلانگ تار دیا۔ جواب آیا کہ وہ ادھر نہیں ہے۔ پولیس والا دوسرے ہی دن اسے دیکھنے گیا تھا مگر وہ ہوٹل سے جا چکا تھا پھر شکلا نے تجھ کو سارا حال لکھ کے بھیج دیا۔"

میرے کان جلنے لگے۔ تجمل کہہ رہا تھا کہ جیسے ہی اسے ایس پی شکلا کا خط موصول ہوا، اس کے دل میں آئی کہ وہ فوراً فیض آباد سے آسام کی طرف چل پڑے لیکن اس نے تامل کیا۔ شکلا کے خط کے مطابق ابا جان ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کے ساتھ گھر کا کوئی فرد نہیں تھا۔ میں نے ابا جان سے متعلق ایک ایک بات تجمل کو بتائی تھی اور بمبئی میں ابا جان کے دوست مولوی اکرم سے ملنے کا واقعہ بھی وہ مجھ سے سن چکا تھا۔ پھر اسے ان کے بارے میں جہاں گیر سے معلومات حاصل ہوئی ہوں گی۔ میرے گھر سے نکلنے کے بعد ایک عرصے تک ابا جان کے ساتھ وہی رہا تھا۔ اس نے بھی اسے یہی بتایا ہوگا کہ وہ ان کاغذات کی چھان بین میں شب و روز مصروف رہتے تھے۔ نہ انھیں صبح کی فکر تھی، نہ شام کی۔ کورا ان کاغذات کے ساتھ جو جواہر لائی تھی انھیں بیچ بیچ کے وہ اپنا گزارا کرتے تھے۔ مکان اور زمینوں کی فروخت سے بھی انھیں ایک معقول رقم حاصل ہوئی ہوگی، کچھ نقدی ان کے پاس بھی ہو گی۔ وہ جواہر اتنے بیش قیمت تھے کہ شاید انھیں اپنی نقدی چھونے کی ضرورت بھی نہ پڑی ہو۔ بمبئی میں کرشنا جی کے ساتھ میں جس جوہری سے ملا تھا، اس کی باتوں سے ان جواہر کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا تھا۔ کاش کورا اس رات خالی ہاتھ آجاتی، جواہر اور کاغذات سمیٹ کے اپنے ساتھ نہ لاتی پھر شاید یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ نہ یہ کاغذات ہوتے، نہ ابا جان اپنے آپ سے اتنے بے خبر ہوتے اور اتنی جلدی یوں زمرہ باغیں۔ ابا جان میری تلاش میں ضرور نکلتے یا رو پیٹ کے بیٹھ جاتے مگر سب گھر ہی میں رہتے اور فہمیدہ مجھے دیکھ کے اس طرح کھڑکی سے کود نہ جاتی۔ مولوی اکرم نے جب بھی ابا جان کو ٹوکا، انھوں نے ایک ہی بات دہرائی کہ مولوی اکرم! تم نہیں جانتے، ان کاغذات میں کیا چھپا ہوا ہے۔ میں ان میں صرف ہونے والے ایک ایک لمحے کی قیمت وصول کروں گا اور اس دوران انھوں نے فہمیدہ کو ضائع کر دیا۔ تجمل کو معلوم تھا کہ مرنے سے پہلے کرشنا جی نے ہندوستان بھر کی پولیس کو ابا جان کے بارے میں خط لکھے تھے۔ کرشنا جی کو امید تھی کہ ایک دن وہ ان کا سراغ یقیناً لگا لیں گے۔ کرشنا جی زندہ رہتے تو انھیں ڈھونڈنے کی اور کوئی تدبیر ضرور اختیار کرتے۔ ان کا کام ہی سراغ لگانا تھا لیکن وہ بھی چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ایس پی شکلا کو دو ایک جگہ سے کرشنا جی کے لکھے ہوئے خطوط کے جواب موصول ہوئے مگر سب بعد از وقت تھے۔ ابا جان وہ شہر چھوڑ کے پہلے ہی جا چکے تھے۔ کرشنا جی کی طرح شکلا جی کو بھی امید تھی کہ جلد یا بدیر کہیں سے کوئی تسلی بخش جواب آجائے گا۔ انھوں نے پھر اسی مضمون کے خط مختلف شہروں کو بھیجے تھے۔ ممکن ہے کہیں اور سے جواب آیا بھی ہو مگر شکلا جی نے مجھے اطلاع دینا اس لیے ضروری نہ سمجھا ہو کہ ابا جان اس شہر سے بھی روانہ ہو چکے ہوں۔ شکلا جی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی تمام کوششیں جاری رکھیں گے، بار بار ریمائنڈر بھیجتے رہیں گے۔

تجمل کہہ رہا تھا کہ فیض آباد میں جب شکلا جی کا خط ملا تو صرف ارشد اس کے قریب تھا۔ ارشد نے بی اے تک تعلیم حاصل کی تھی۔ تجمل نے ارشد سے مدد لی اور شیلانگ کے محل وقوع کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ یہاں تک کہ اس نے نقشہ بھی منگوا کے دیکھا۔ ہم ابا جان کی

تلاش میں گیا شہر کے قریبی علاقوں میں دانستہ نہیں گئے تھے کیونکہ ابا جان ایسے دور دور کے علاقوں میں جا سکتے تھے جہاں انھیں بدھ راہبوں، تبتی وارثوں یا شناساؤں سے آمنا سامنا ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔ چنانچہ وہ بمبئی گئے۔ بمبئی انسانوں کا جنگل ہے۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں ہوتی۔ نیچے کی منزل والے کو اوپر کی منزل والے سے تعلق نہیں ہوتا۔ بمبئی میں طویل قیام کے بعد ابا جان شہر بدلتے رہے ہوں گے۔ آج یہاں، کل وہاں، تین مہینے اس بستی میں، تین مہینے اس بستی میں۔ وہ فہمیدہ کے واقعے کا اعادہ نہیں چاہتے ہوں گے اور سب سے زیادہ فکر تو انھیں کاغذات کی ہوگی کہ ان کی کسی کو بھنک نہ مل جائے۔ زیادہ عرصے ایک جگہ رہنے سے آس پاس کے لوگ دلچسپی لینا شروع کر دیتے ہیں۔ کاغذات پر تحقیق کے لیے انھیں لائبریریوں کی ضرورت بھی پڑتی ہوگی۔ مولوی اکرم کے سوا انھوں نے کاغذات کا کسی سے ذکر نہیں کیا ہوگا۔ مولوی اکرم سے بھی تب کیا ہوگا جب انھیں ان پر پورا اعتماد ہو گیا ہوگا۔ ادھر مولوی صاحب اور کورا کے ساتھ بھی یہی تھا۔ کلکتے یا مراد آباد کے علاقوں اور بدھ راہبوں کے مرکزوں سے دور ہی رہنے میں ان کی عافیت تھی۔ جانگ قبیلے کے لوگ کورا کی جستجو میں تھے۔ ہم نے یہی سوچ کے بنگال اور آسام کے علاقوں کا رخ نہیں کیا تھا تاہم وہ کہیں اور نہ ملتے تو ہمیں اس طرف بھی آنا پڑتا۔

ابا جان کا کسی ایسی جگہ نظر آنا تجمل کے لیے چونکا دینے کا سبب تھا جہاں بدھ راہبوں کے قافلے گزرتے ہوں اور گرد و نواح میں بڑی بڑی بدھ خانقاہیں موجود ہوں۔ نو سال سے اوپر ہو چکے تھے۔ اس مدت میں کاغذات کی تفتیش کے بعد ابا جان نے اپنی دانست میں کوئی نتیجہ برآمد کیا ہوگا۔ اتنا وقت انھوں نے صرف گنوایا تو نہیں ہوگا۔ وہ پاگل تو نہیں تھے۔ ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد تجمل بھی اس نتیجے پر پہنچا کہ کہیں ان کے شیلانگ میں ہونے کا مطلب تبت کی طرف کوچ کرنا تو نہیں ہے۔ اگر انھیں خزانہ مطلوب تھا تو ایک نہ ایک دن تبت جانا ہی تھا۔ تجمل نے فوراً پیرو کو بمبئی اور وزیر کو آسنسول تار دیے پھر مٹن اور کبن خاں کو ساتھ لے کے کلکتے آگیا۔ اسے معلوم تھا کہ تبت میں داخلے کے لیے باقاعدہ پروانہ ضروری ہے اور اسے حاصل کرنے میں دن بھی لگ سکتے ہیں، درخواست نامنظور بھی ہو سکتی ہے۔ کلکتے کے بہت سے مال دار لوگوں کے کارخانے بنگال اور آسام میں پھیلے ہوئے تھے اور کلکتے کے استاد کی حیثیت سے اس کا واسطہ ان لوگوں سے پڑتا رہتا تھا۔ کسی سے کم، کسی سے زیادہ۔ کلکتے آنے کے بعد وہ مختلف جگہوں پر مختلف طبقوں کے لوگوں کے پاس جاتا رہا۔ ایک طرف اس نے نواحی علاقوں میں قائم ہونے والے اڈوں کا بندوبست کیا، دوسری طرف رات دن سفر سے متعلق معلومات حاصل کیں۔ اس نے چائنا ٹاؤن کے اڈے کے ایک تبتی باشندے سولم سے بھی رابطہ قائم کیا۔ سولم تبتی زبان بھی جانتا تھا اور ان راستوں سے گزر چکا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جسے ڈبرو گڑھ اترتے وقت میں نے جامو کے ساتھ اسٹیشن پر دیکھا تھا۔

ہم دونوں اکیلے بھی جا سکتے تھے لیکن تجمل کے کہنے کے مطابق وہ یہ مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ کچھ تو اسے خود بھی اندازہ تھا اور کچھ اسے بتایا گیا تھا کہ یہ سفر اور سفروں کے مانند اتنا آسان نہیں ہے۔ دشوار گزار پہاڑی راستے ہیں، اونچی اونچی برفیلی چوٹیاں ہیں۔ نہ ریل ہے، نہ موٹر۔ نہ سڑکیں ہیں، نہ منزلوں کے نشان۔ قدم قدم پر قبائلی قزاقوں کا خدشہ۔ کاغذات کا تعلق جانگ قبیلے سے ہوگا۔ جانگ قبیلے کے لوگ انھی کے لیے اب تک کورا کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ تجمل کے ذہن میں کچھ اور الجھنیں بھی ہوں گی اسی لیے اس نے اکیلے جانے کے بجائے لوگوں کو ساتھ لے چلنے کا فیصلہ کیا۔ اسے ابا جان کے تبت کی طرف کوچ کرنے کا ایسا ہی مکمل یقین ہوگا۔

سردی کے باوجود میرا سارا جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ اس کی باتیں مجھے ایک خواب معلوم ہو رہی تھیں۔ میں نے کسی بات کی تردید نہیں کی۔ شکلا جی نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ پولیس والے نے ابا جان کو تنہا دیکھا تھا، ان کے ساتھ کوئی اور نہیں تھا اور وہ ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میری نظروں میں ان سب کے چہرے گھوم رہے تھے۔ رہ رہ کے یہی خیال آ رہا تھا کہ ابا جان تنہا کیوں تھے۔ انھوں نے ان سب کو کہاں رکھا؟ کہیں وہ بھی ان سے جہاں گیر اور فہمیدہ کی طرح جدا تو نہیں ہو گئے؟ ممکن ہے پولیس والے ہی کو غلط فہمی ہو گئی ہو۔ پولیس کو دیکھ کے لوگ یوں بھی گھبرا جاتے ہیں اس لیے شاید اس نے خواہ مخواہ فرض کر لیا ہو کہ یہی شخص صفدر زماں ہیں لیکن تجمل کا یہ کہنا بھی قرین قیاس تھا کہ بالآخر انھیں تبت جانا ہی تھا۔ ان کا تنہا ہوٹل میں ٹھہرنا اور تبت کی سرحد سے قریب شیلانگ میں نظر آنا تجمل کے ہر شبہے کی تائید کرتا تھا۔ ابا جان، فرح، نزیال، فارحہ اور اکبر کو کسی محفوظ جگہ چھوڑ سکتے تھے۔ اتنی مدت میں ان کا بمبئی کے مولوی اکرم جیسا کوئی اور قابلِ اعتماد دوست بن گیا ہوگا یا ہو سکتا ہے کہ وہ گیا واپس چلے گئے ہوں اور سب کو کسی عزیز کے حوالے کر آئے ہوں۔ وہ گیا سے کوئی جرم کر کے تو آئے نہیں تھے جو واپس نہ جا سکتے۔ فہمیدہ کے بارے میں لوگوں نے پوچھا ہوگا تو انھوں نے کہہ دیا ہوگا کہ اس کی شادی ہو گئی یا وہ مر گئی اور جہاں گیر بھی مر چکا ہے۔ وہ تبت میں تین لڑکیوں اور ایک لڑکے کے کنبے کو ساتھ لے کے کیسے جا سکتے تھے۔

تجمل مجھے ٹہوکا مار کے پوچھنے لگا۔ "کیوں رے، تو کچھ نہیں بولتا؟"

میں کیا بولتا، میرے کچھ کہنے کی گنجائش ہی کہاں تھی۔ مجھے اس خیال سے وحشت ہو رہی تھی کہ ابا جان ان علاقوں میں آکے کسی بڑی مصیبت میں نہ گرفتار ہو گئے ہوں۔ ان کے ساتھ اگر کاغذات ہیں تو

وہ کہاں کہاں اُنھیں چھپاتے پھر رہے ہوں گے۔ جانگ قبیلے کے کسی آدمی کو اُن کی ہوا لگ گئی تو! . . . میرے جسم پہ کپکپی سی طاری ہو گئی تھی۔ تجھل میرے کان تھپتھپانے لگا۔

تیسرے دن ہم ڈبرو گڑھ سے تن سکیا روانہ ہو گئے۔ راستے میں تن سکیا پہلے آتا تھا مگر تجھل کو کلکتے میں لوگوں نے مشورہ دیا تھا کہ وہ پہلے ڈبرو گڑھ اُترے، وہاں سے اُسے ایسے آدمی مل سکتے ہیں جو چیک پوسٹ کے بجائے کسی اور راستے سے تبت کی سرحد پار کرادیں گے۔ تبتی باشندے روزانہ ادھر سے اُدھر منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارے چہرے اُن جیسے نہیں تھے، نہ ہم اُن کی زبان سے واقف تھے۔ دو دن تک سُولم ڈبرو گڑھ میں کام کے آدمی ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہا۔ ہوٹل میں مختلف قسم کے چند لوگ ہم سے ملنے کے لیے بھی آئے۔ کچھ تاڑ جھاڑ لینے آئے تھے اور کچھ کو سُولم اپنے ساتھ لایا تھا۔ اُنھوں نے پیرو اور تجھل سے علیحدہ علیحدہ بات کی۔ سب کی رائے یہی تھی کہ ہم آگے جانے کا ارادہ ترک کر کے اپنے سامانِ تجارت کا سودا یہیں کرلیں، یہاں بھی ہمیں خاصے اچھے پیسے مل جائیں گے۔ روانہ ہونے سے پہلے کلکتے میں تجھل نے بہت سامان خریدا تھا۔ قینچیاں، چمچے، بلیڈ، سگریٹ، تمباکو، تالیں، ریشمی کپڑا، گوٹا کناری، مفلر، کمبل، پرانے کوٹ، شراب کی بوتلیں وغیرہ وغیرہ۔ مارٹی کو ٹھیک خبر نہیں تھی۔ پیرو بھی اپنے ہمراہ تقریباً اتنا ہی سامان لایا تھا۔

تجھل نے کئی وجوہ سے ہمیں دو ٹولیوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اتنے زیادہ آدمی ایک ساتھ کہیں آتے جاتے دکھائی دیتے تو شک کا نشانہ بن سکتے تھے۔ تاوقتیکہ ڈبرو گڑھ میں کوئی بہتر صورتِ حال پیدا ہونے کی اُمید نہ بندھے، ہمارا ایک دوسرے سے الگ ہی رہنا مناسب تھا۔ تجھل کو بتایا گیا تھا کہ اگر اُسے آسانی سے پروانۂ راہ داری نہ ملا تو بعض مخصوص مقامی باشندوں سے اُسے رابطہ قائم کرنا ہوگا۔ یہ لوگ نوواردوں کو خوب لوٹتے اور طرح طرح پریشان کرتے تھے۔ دو الگ الگ قافلوں کی صورت میں اُن کے ہتھکنڈوں سے بڑی حد تک محفوظ رہا جا سکتا تھا۔ اس طرح اُن سے سودے بازی کرنے میں بھی آسانی رہتی۔ ایک قافلہ مقامی باشندوں کی بڑے معاوضے کی پیشکش قبول کر لیتا تو دوسرا انکار کر دیتا۔ دوسرے کو بھی ساتھ لے جانے کے لیے نتیجتاً انھیں کم پر آمادہ ہونا پڑتا۔ اس تدبیر میں اور بھی بہت سے تحفظات تھے۔ ایک قافلہ دوسرے کا نگراں رہتا۔ کوئی افتاد پڑنے کی صورت میں ایک دوسرے کے لیے ڈھال بن سکتا تھا۔ یہ دوسری بات تھی کہ دونوں قافلوں پر ایک ساتھ اُفتاد آتی۔ پیرو کو پہلے ڈبرو گڑھ بھیجنے میں تجھل کی یہی مصلحت تھی۔ اس کے علاوہ اُسے اُمید تھی کہ وہ شاید معاملہ طے کر کے ہی رکھیں اور اِدھر تجھل کو کلکتے میں سفر کے لیے معاون بعض اور لوگوں سے ملنے کا ایک دن مل جائے۔

دو دن گزر گئے تھے۔ مسافروں اور ہوٹل والوں کی نظر میں ابھی ہم دونوں گروہوں کا تعلق رسمی تھا، محض مسافرانہ میل ملاپ، جیسے ایک مقصد کے مسافر اچانک کہیں مل جاتے ہیں اور آپس میں دلچسپی لینا شروع کر دیتے ہیں مگر اس تاخر سے ہمیں کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا۔ ڈبرو گڑھ میں ہمیں اپنے مطلب کے آدمی نہیں مل سکے۔ تجھل کلکتے میں لوگوں کے دیے ہوئے بعض پتوں پر بھی گیا۔ سب قدم قدم پر سرحدی سختیوں اور پابندیوں کا عذر کر دیتے تھے۔ بستی میں مسلمان کم تھے لیکن ہم نے احتیاطاً اُن کے ٹھکانوں پر آباجان کے بارے میں بھی پوچھ کے دیکھ لیا۔ کسی سے کوئی کارآمد بات نہیں معلوم ہو سکی۔ ہم تقریباً تیس میل پیچھے ہٹ کے تن سکیا آ گئے۔ تن سکیا اور ڈبرو گڑھ کے راستے میں گھنے جنگلات تھے۔ کہیں کہیں ہمیں وہاں ہاتھی بھی دکھائی دیے۔ دونوں بستیوں کے درمیان دریائے برہم پترا کی ایک بڑی شاخ ہے جسے اسٹیمر سے پار کرنا پڑتا ہے۔ تن سکیا سے ہم اُوپر کی طرف آگے بڑھ گئے اور قصبہ دری ای میں آ کے دم لیا۔ یہاں ہندوستان کے پولیٹیکل ایجنٹ، انٹلی جینس افسر اور ٹریڈ ایجنٹ وغیرہ کے دفاتر تھے۔ دری ای میں بھی سُولم نے خاصی بھاگ دوڑ کی۔ تجھل کے پاس کلکتے کے بڑے آدمیوں کے کئی سفارشی خطوط تھے۔ وہ خطوط دکھانے کی نوبت نہیں آئی۔ ہمیں پروانۂ راہ داری میں پیش آنے والی دشواریوں کا ابتدا ہی میں علم ہو گیا تھا۔ پولیٹیکل ایجنٹ کے پاس جا کے ہم خواہ مخواہ اُس کی نظروں میں آتے۔ دری ای کے بعد ہم نے کچھ اور فاصلہ طے کر لیا اور دینگ اِنگ پہنچ گئے، دینگ انگ سے تھ نال پانگ، وہاں سے سار با۔ قصبہ سار با خاصا بڑا قصبہ تھا۔ یہاں بازار بھی تھے اور تبتی قلی بھی جگہ جگہ موجود تھے۔ ہم سار با میں ایک پہر ہی ٹھہرے ہوں گے کہ قصبہ موچی ما سے گزرتے ہوئے قصبہ نارا میں آ گئے۔

سار با سے نارا تک کا راستہ ہم نے کرائے کی جیپوں سے طے کیا تھا اور یہ ہمارے اب تک کے سفر میں سب سے مشکل راستہ تھا۔ نارا میں سکھ معقول تعداد میں بسے ہوئے تھے۔ ایک بڑا فوجی اڈا بھی تھا۔ سُولم شام کے وقت ہمیں ایک ایسی جگہ لے گیا۔ جہاں جنگی رقص ہو رہا تھا۔ نارا میں ایک اسکول بھی تھا، آخری اسکول۔ جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے جا رہے تھے، سردی بڑھتی جاتی تھی۔ کسی مقام پر سستانے کے لیے ٹھہر جاتے تو جسم جلنے لگتا۔ ہم نے ابھی تک یہی ظاہر کیا تھا کہ ہم سرحدی چوکی والنگ پر اپنا سامان فروخت کرنے جا رہے ہیں، ایسا عموماً ہوتا رہتا تھا اس لیے قلیوں، گائڈوں اور گزرنے والی بستیوں کے باشندوں نے ہم پر غیر ضروری توجہ نہیں دی۔ یہ ہندوستان تھا اور ہم آخری سرحدی چوکی والنگ تک کسی روک ٹوک کے بغیر جا سکتے تھے۔ نارا سے سات میل دُور قصبہ چنگ وتی تھا۔

چنگ وتی پر آ کے جیپیں لوٹ جاتی تھیں کیونکہ آگے اُن کے جانے کے لیے کوئی سڑک نہیں تھی۔ خچر اور گھوڑے ہی ان راستوں پر چل سکتے

[...]ے۔ وہیں ہمیں متعدد قلی مل گئے۔ اُن کے ساتھ اُن کے خچر بھی تھے۔ [...]ان خچروں پر لاد دیا گیا۔ ہم نے گائڈ اور قلیوں کی معیت میں پیدل [...]ہاڑ پر چڑھنا شروع کیا۔ قلی ایک منزل سے دوسری منزل تک جاتے تھے [...]نچہ ہم ہر منزل پر قلی بدلتے رہے۔ چنگ وتی کے بعد کا راستہ اور کٹھن [...] ہر طرف بڑے بڑے پاٹ کے دریا، گھاٹیاں، اُونچی چوٹیاں، کیڑے مکوڑے، [...]نگلات، درندے۔ ہمیں قلیوں اور گائڈوں کی مدد نہ ملتی تو شاید ہمارا [...]ے آگے جانا ناممکن ہو جاتا۔ یا تو ہم کسی قافلے کے انتظار میں پڑے رہتے [...]وٹ آتے اور قافلوں کے ساتھ ہم اسی صورت میں ہو سکتے تھے [...]ب ہمارے پاس اُن کی طرح اجازت نامہ ہوتا۔ اِدھر مارٹی کو تیز بخار [...]یا تھا۔ جہاں تک بن پڑا، وہ چلتا رہا۔ قلیوں نے اُسے چند بوٹیاں [...]لا دی تھیں۔ اس سے بخار کم ہونے کے بجائے اور بڑھ گیا۔ ہم نے [...]ے اُلٹا خچر پر لٹا دیا اور کمر سے رسّی باندھ دی اور چنگ وتی سے آٹھ [...]ں کی دوری پر خودرو گھاس سے گھری ہوئی بستی من زانگ میں آ کے [...]ے تبتی طبیب کو دکھایا۔ مارٹی کی وجہ سے ہمیں ایک دن من زانگ [...]ں قیام کرنا پڑا۔ اُس کی طبیعت کچھ سنبھلی تو ہم پھر آگے بڑھنے لگے۔ [...]زانگ کے کچھ ہی دُور بعد وڈ ننگ اور ساتی نامی دو بستیوں سے ہمارا [...]ر ہوا۔ دونوں میں دُہری شہریت کے لوگ رہتے ہیں۔ جز وقتی تبتی، جز [...]ی ہندوستانی۔ پیدل چلتے چلتے ہماری ٹانگیں اینٹھنے لگیں۔ پاؤں میں [...]ے پڑ گئے تھے لیکن کوئی بھی واپس جانے کو آمادہ نہیں تھا۔ ایک منزل [...]ے دوسری منزل کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا لیکن میدانی علاقوں کی نسبت [...]ی علاقوں میں ایک میل کا فاصلہ کئی میل کے برابر ہوتا ہے۔ جب ہم [...]لنے لگتے تو اور تیز چلنے لگتے۔ پہاڑوں پر رفتار پہاڑوں کی تابع ہوتی [...] آدمی کے نہیں۔ ڈبرو گڑھ سے ۱۴ دن کی مسافت کے بعد ہم آخری [...]دی چوکی والنگ کے قریب پہنچ گئے۔ باقی سب دُور ٹھہرے رہے۔ [...]ن میں اور تجھل سُولم کے ساتھ بستی میں داخل ہوئے۔ والنگ ہندوستانی [...]ب و تمدن کا آخری دروازہ ہے۔ یہاں بہت سی چیزیں آخری ہوتی [...]۔ آخری گھڑی جس سے وقت کا اندازہ ہوتا ہے، آخری ہندوستانی [...]گریزی اخبار، آخری چاکلیٹ، آخری ہندوستانی سکہ جو آگے نہیں چلتا، [...]ی کرسی اور میز، آخری تحریری قانون۔ آگے لاماؤں کے غیر تحریری [...]لن کی حکومت ہے۔ والنگ میں ہمیں کئی تبتی قافلے دکھائی دیے، [...]وضا بدھ بھکشوؤں کے۔ بھکشوؤں کے تبت میں داخلے پر کوئی [...]ندی نہیں ہوتی لیکن اُن کے ساتھ سامان مختصر ہوتا ہے، ایک آدمی [...]ضروریات کی حد تک۔ میں نے تجھل کو مشورہ دیا کہ کیوں نہ ہم بدھ [...]کشوؤں کے لباس میں تبت میں داخل ہوں۔ سامان یہیں بیچ دیں [...]ر چند لوگوں کو یہیں روک دیں جو اسے بیچتے رہیں اور واپس ڈبرو گڑھ [...] کے ہمارا انتظار کریں۔ تجھل تیار نہیں ہوا۔ تین دن ہم والنگ کی خاص

بستی کے نزدیک خیمہ لگائے پڑے رہے۔ پہاڑوں پر صرف ایک راستہ نہیں ہوتا۔ سُولم بھی اس کی تائید کرتا تھا کہ پہاڑوں سے اور راستے بھی نکلتے ہیں مگر میلوں کا فرق پڑ جاتا ہے۔ انھیں مقامی قلیوں کے تعاون کے بغیر عبور نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ وہ عام گزرگاہیں نہیں ہیں اس لیے قلی بھی شاذ و نادر ہی تیار ہوتے ہیں۔ مارٹی کی طبیعت پوری طرح نہیں سنبھلی تھی۔ متن بھی اَدھ موا سا نظر آتا تھا۔ ہر منزل پر جسم کو مزید کپڑوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ ۱۴ روز بعد والنگ میں ہمیں تین دن ٹھہرنے کو ملے تو اعصاب میں کسی قدر توانائی محسوس ہوئی۔

تیسرے دن سامان اور نقدی کی بڑی پیشکش اور ایک بندوق کے عوض چند تبتی قلیوں کا ایک گروہ ہمیں دوسرے راستے سے آگے لے جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ یوں ہم ہندوستان کی سرحدی چوکی والنگ سے براہِ راست تبت میں داخل ہوتے تو تبت کی پہلی سرحدی چوکی ساما سے فاصلہ بیس میل سے زیادہ نہ ہوتا۔ ان بیس میلوں کی مسافت میں دو دن صرف ہوتے ہیں۔ ہم نے ایک طویل اور دشوار گزار راستہ منتخب کیا تھا۔ درمیان میں تیز بہاؤ کے دریا بہتے تھے۔ ان دریاؤں کو عبور کرنے کا رسّیوں کے پُل کے سوا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ مُونج کی پتلی رسّیاں بٹ کے یہ بڑی رسّی بنائی جاتی ہے اور اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ قافلے اس پر سے گزر جاتے ہیں۔ دو رسّیاں ایک ساتھ چلتی ہیں اور انھیں یکساں دُوری پر آپس میں باندھ دیتے ہیں اور درمیان میں تختے تاروں سے جکڑ دیتے ہیں۔ بعض پُل صرف ایک رسّی کے ہوتے ہیں۔ دو پہاڑوں کے بیچ میں تار کی طرح رسّی تنی رہتی ہے۔ ان علاقوں میں رہنے والے انھیں پکڑ پکڑ کے آسانی سے درمیان کا فاصلہ عبور کر لیتے ہیں خصوصاً عورتیں کمر سے بچّہ باندھ کے روانی سے گزر جاتی ہیں۔ انھیں نیچے بہتے ہوئے پُرشور دریا سے بھی خوف نہیں آتا۔ ہم نے ان رسّیوں پر دریا کا پاٹ طے کرنے کا خطرہ مول نہیں لیا۔ ویسے بھی سامان کی وجہ سے ہم انھیں استعمال نہیں کر سکتے تھے۔

تبت کی پہلی چوکی ساما کے نزدیک ہم نے قلیوں کو باقی آدھا معاوضہ دے کے رخصت کر دیا اور نئے قلی تلاش کیے۔ ساما میں شدید سردی تھی۔ ہماری اُنگلیاں جمنے لگیں۔ ہونٹ پھٹے جاتے تھے۔ ہوا تیز ہوتی تو چہرے پر چاقو سے چلنے لگتے۔ کئی کئی مفلروں سے ہم نے اپنا سر اور گردن ڈھانپ رکھی تھی پھر بھی سردی کم نہیں ہوتی تھی۔ ساما سے آگے رات کو سونا مشکل ہو جاتا تھا۔ رات کو قلی لکڑیاں توڑ کے الاؤ روشن کر دیتے۔ الاؤ سے جسم میں کچھ حرارت آتی۔ دن کے درمیانی حصّے میں ہم کچھ دیر سو تے پھر چلنے لگتے۔ وزیر نے تجویز پیش کی کہ ہم میں سے آدھے لوگ بھکشوؤں کا لباس پہن لیں اور آدھے تاجروں کا روپ اختیار کر لیں تو بہتر ہوگا۔ بھکشوؤں کے ساتھ ہونے کی وجہ سے تبتی ہر جگہ ہمارا لحاظ

کریں گے اور ہم اُن کے شک سے بھی محفوظ ہو جائیں گے۔ بدھ بھکشو دنیا بھر سے تبت آتے ہیں، اُن کے لیے یہ لازم نہیں ہے کہ وہ تبتی زبان سے بھی واقف ہوں۔ سُولم کہتا تھا کہ قبائلیوں کے نزدیک بھکشو شاکیہ منی گوتم بدھ کا رُوپ سمجھے جاتے ہیں۔ بہّل کو وزیر کی یہ تجویز پسند تو آئی لیکن اُس نے عمل نہیں کیا۔

راستے میں قلی تبت کی کہانیاں سنانے لگتے تھے۔ سُولم اُن کا ترجمہ کر دیتا یا قلی گانے لگتے۔ کبھی سلطان، مارٹی، متن اور وزیر بھی اُن کی آوازوں سے الل ٹپ آوازیں ملانے لگتے۔ سہ پہر کو جیسے ہی دھوپ نرم پڑتی، پہاڑوں پر رفتہ رفتہ دبیز کُہر چھانے لگتی اور آگے کا راستہ دکھائی دینا مشکل ہو جاتا۔ دن میں تو کچھ نہیں ہوتا لیکن شام ہوتے ہی میرا جی گھبرانے لگتا۔ اندھیرے میں اُونچے پہاڑوں کے سائے دیکھ کے مجھے خوف سا لگتا تھا۔ جہاں تک بن پڑتا، شام کو بھی ہم چلتے رہتے، جب ناممکن ہو جاتا تو پڑاؤ ڈال دیتے۔ اب تک بستیاں قریب قریب آتی رہی تھیں، والنگ کے بعد غیر آباد پہاڑوں کی وجہ سے ہمارے کھانے پینے کا سامان کم ہونے لگا۔ ہر چند کہ ہم پہلے ہی خاصا ذخیرہ ساتھ لے کے چلے تھے۔ نتیجتہً ہمیں اپنی بندوقیں نکالنی پڑیں۔ شکار کی وہاں کوئی کمی نہیں تھی۔ جو کچھ بھی ہم دن میں مارتے، رات کو الاؤ پہ بھون لیتے۔ تبتی قلی بھی روزہ ہمارا شکار کیا ہوا بھنا گوشت کھا کے خوش خوش رہتے تھے۔

ہر تبتی قلی کلہاڑی اور تلوار سے ہر وقت مسلح ہوتا تھا۔ یاک یا بھیڑ کی اُون کا لباس، چمڑے کا جوتا، کانوں تک لمبی چوڑی اُونی ٹوپی اُن کا عام پہناوا تھا۔ بستیوں میں امیر لوگ فر کے کوٹ، سلک کی چادر اور اپنے مخصوص مفلروں میں ملبوس رہتے تھے۔ ساما کے بعد جن چھوٹی چھوٹی بستیوں میں ہم جاتے اور بستی کے لوگوں کو مہمانوں کی رسم کے مطابق تحائف پیش کرتے تو وہ اپنے گھر کے دروازے ہمارے لیے کھول دیتے۔ دروازہ کھلنے کے لیے تحائف ہی شرط نہیں تھے۔ مسافر جس دروازے پر چلا جائے، مہمان سمجھا جاتا ہے۔ وہاں میزبان اور مہمان گلوبند تبدیل کر کے دوستی کا اظہار کرتے ہیں اور ہمارے پاس گلوبندوں کی ایک وافر تعداد موجود تھی۔ مہمانوں سے میزبانی کی کوئی قیمت طلب نہیں کی جاتی۔ سارے راستے ہمیں کوئی سرائے نظر نہیں آئی۔ گو ہم ساما کے بعد دو تین ہی گھروں میں بہت مختصر وقت کے لیے مہمان ہوئے لیکن میزبانوں نے اس مختصر وقت میں بھی ہماری تواضع میں یاک کا دودھ، انڈے، تبتی شراب پیش کی، مکھن اور نمک ملی ہوئی چائے ہمیں پلائی۔ چائے کے بغیر وہ شاید زندہ نہیں رہ سکتے۔ سُولم کی وجہ سے اُن سے بات کرنے میں ہمیں زبان کی کوئی دقت نہیں تھی۔ وہ لوگ ہفتوں منہ ہاتھ نہیں دھوتے، پانی سے اُن کا جسم کٹنے لگتا ہے۔ اُن

لوگوں کی طرح ہم نے بھی ساما میں اپنے جسموں پر روغن کی مالش کرالی تھی۔

قلی عام طور پر ایک گیت سناتے تھے جس کا مفہوم کچھ اس طرح تھا: "تُو اپنے باہر سے نہیں، اندر سے ہے۔ تیرا ظاہر ایک دھوکا ہے، تیرا اصل تیرا باطن ہے۔ تیری اہمیت بس تیری اندرونی شخصیت سے ہے۔ سو اُسے پاک صاف رکھ۔"

ہر جگہ تبتی اسی پر عمل کرتے تھے، باہر سے بہت گندے مگر اندر سے دُھلے ہوئے۔ ہم نے کسی تبتی کو روتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ساما مختلف بستیوں میں ہوتے ہوئے تبت کے سب سے پہلے شہر زالپول میں داخل ہوتے ہی ہم نے چند معززین کے گھروں پہ جا کے حسبِ سابق تحائف پیش کیے۔ زالپول دریائے رونگو اور دریائے سونگو کے سنگم پر واقع ایک گندا شہر ہے۔ اس کا ایک دوسرا نام شیگا تھانگ بھی ہے۔ قلیوں نے ہمیں بتایا تھا کہ یہاں تبت کا ایک تیسرا بڑا افسر رہتا ہے جس کا لقب ہے زانگ بون (سول گورنر)۔ زالپول میں اگر ہم دو دن آرام نہ کرتے تو آگے نہیں چل سکتے تھے۔ پلٹو بھی اپنی ہمت سے چل رہا تھا، اُسے ٹھنڈ لگ گئی تھی اور کئی بار تیز بخار آ چکا تھا۔ میرے، پیرو، بہّل اور زورا کے سوا سبھی باری باری بیمار پڑتے رہے۔ پیرو بھی کھانسنے لگا تھا۔ اُن مجھے کچھ پتہ نہیں لیکن ہر منزل پر مجھے اپنی رگوں میں خون جمتا محسوس ہوتا تھا۔

رات کو جب پہاڑوں پہ دھند چھا جاتی اور میرا دل ہولنے لگتا تو میں الاؤ میں اور لکڑیاں ڈال دیتا، روشنی سے مجھے کچھ سکون ملتا تھا۔ کتنی ہی بار میں نے اُن سے کہا کہ واپس چلیں۔ یہ سُنتے ہی پیرو مجھے گھونسے مارتے اور قہقہے لگانے لگتا۔ صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مصنوعی قہقہے لگا رہا ہے۔

ہندوستانی سرحدی چوکی والنگ اور تبتی سرحدی چوکی کے سارا راستے میں پڑنے والی تمام بدھ خانقاہوں اور مندروں میں ہمارا جانا ایک معمول تھا۔ والنگ سے ساما تک ہم ایک طویل چکر کاٹ کے پہنچے تھے اس لیے وہاں کی خانقاہوں اور مندروں میں نہیں جا سکے۔ زالپول میں بستی کے لوگوں نے ہماری بہت خاطر کی۔ زالپول سے آگے چھوٹی چھوٹی بستیاں تھیں، ہم نے اتنی ہی دیر وہاں قیام کیا جتنی دیر میں کھانے پینے کا سامان اکٹھا کر سکتے تھے اور نئے قلیوں کو ڈھونڈ سکتے تھے۔ زالپول کے بعد برف پوش پہاڑوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا۔ دن میں برف پر دھوپ کی چمک سے آنکھیں درد کرنے لگتیں اور ہماری صرف آنکھیں کُھلی ہوئی تھیں۔ باقی سارا چہرہ اُونی ٹوپیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ بات کرنے کے لیے ہمیں ٹوپیاں سر سے اُوپر کرنی پڑتیں۔ بستی کی ای گانگ سے چند میل بعد دریائے پزانگ پر واقع ایک بستی ڈروواگومپا ہے۔ اس سے کچھ آگے قصبہ ساری ہے۔ ہم وہاں پہنچے تو اتفاق سے سالانہ مقدس میلا لگا ہوا تھا۔ تبت کے مختلف چھوٹے لاما وہاں موجود تھے اور بھکشوؤں کا ایک بڑا اجتماع تھا۔ میلے کی

وجہ سے ہم دو دن کے لیے وہاں رُک گئے اور ہم نے اپنا بیشتر وقت میلے ہی میں گزارا۔ راستے میں قلیوں کی مدد سے ہمیں چند تبتی لفظ آ گئے تھے۔

"باڈگے پاک بوکی" ۔ "اِن گی یاڈ" ۔ "ڈرو" ۔ خوب، تم تبتی زبان اچھی طرح جانتے ہو۔

"لاک": نہیں۔

"پاک بوشی گی مڈ": اچھی طرح نہیں۔

"لاکس سوتوجے چھے": مہربانی، آپ کا شکریہ۔

"پاہ لالنگ": اُٹھ جاؤ۔

"مہ تری یار": آگ روشن کرو۔

"چا بونگ": چائے بناؤ۔

جو قبیلہ جتنی بلندی پر ہوتا تھا، اتنا ہی معزز سمجھا جاتا تھا۔ جو جتنا نیچے اتنا ہی بے عزت۔ اس اعتبار سے ہم نیچے کی نسبت زیادہ عزت دار بستیوں سے گزر رہے تھے۔ ساری سے ہم چار راستوں کے سنگم گرٹشے لٹ سا کے مقدس مقام پر آ گئے۔ یہاں بھی ایک بڑا مندر تھا۔ گرٹشے لٹ سا سے ساداچوڈن تک ہمیں کوئی مکان نہیں ملا۔ تمام راستہ بلند ترین پہاڑوں، کھائیوں، گھاٹیوں اور چھوٹے بڑے دریاؤں سے ہو کے نکلتا تھا۔ قدم قدم پر رسیوں کے پُل، بعض صرف جانوروں کے لیے اور بعض انسانوں کے لیے مخصوص۔ بیشتر نشیب ہونے کے سبب یہاں ہر موسم میں سیلاب آتے ہیں۔ گرٹشے لٹ سا اور ساداچوڈن کا سارا علاقہ ہمارے تصور سے بعید تھا۔

ڈیڑھ مہینے کی مسافت کے بعد ایک دن جب قلیوں نے ہمیں بتایا کہ آگے چند میل کے فاصلے پر جانگ قبیلے کی بستی ہے تو کسی کو یقین نہیں آیا۔ اونچائی کے باوجود ہماری رفتار تیز ہو گئی۔ وہ کورا کا وطن تھا۔ جانگ قبیلے کی سرزمین پر قدم رکھتے ہوئے میرے پیر ڈگمگانے لگے۔ کورا انھی راستوں سے ہو کے گئی ہو گی۔ جبھی تو اُس میں ایسی ہمت تھی، ایسا عزم تھا۔

ہر بستی کے مانند جانگ قبیلے کے لوگوں نے ہماری آمد پر ہمیں مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ ہم نے کہیں اور جانے کے بجائے سیدھے جانگ قبیلے کے سردار کے رُو بہ رُو ہو کے اُسے چند تحائف پیش کیے۔ سُولم نے ہماری ترجمانی کی۔ سردار نے ہمارے سفر کا مقصد تجارت جان کے سر ہلایا، گلوبند بدلا اور اس طرح ہم نے کچھ کہے اور اُس سے کچھ سُنے بغیر روایتی انداز میں چند دن درونگ بستی میں رہنے کی اجازت حاصل کر لی۔

جانگ قبیلے کے لوگ عام تبتیوں کے مقابلے میں سُرخ و سفید اور لمبے چوڑے تھے۔ چھوٹے چھوٹے دانت، چمکتی ہوئی تیز آنکھیں۔ عورتیں بہت خوب صورت تھیں، اُن کے بال لمبے اور قد اُٹھتے ہوئے تھے۔ سُولم کی زبانی ہمیں معلوم ہوا کہ قبیلے کا موجودہ سردار عارضی ہے۔ ہر سردار کو مہلت دی جاتی ہے کہ وہ گیارہ مہینے کے عرصے میں کھوئے ہوئے متبرک کاغذات حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ ناکامی کی صورت میں اُسے یا تو قبیلہ بدر کر دیا جاتا ہے یا مار دیا جاتا ہے۔ بستی کئی پہاڑوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ قبیلے کا ہر شخص غور و فکر میں ڈوبا ہوا، پریشان اور گھبرایا ہوا نظر آتا تھا۔ ہمیں ابتدا ہی میں محسوس ہو گیا تھا کہ وہ ہماری نقل و حرکت کی پوری نگرانی کر رہے ہیں۔ ہم نے پیرو، وزیر، پلٹو، زورا، سارٹے، جینی، متن خاں اور ملا کو بستی سے دُور ایک فاصلے پر روک دیا تھا۔ بہّل نے انھیں ہدایت کی تھی کہ وہ چار روز بعد بستی کا رُخ کریں۔ ہم صرف پانچ، بہّل، میں، جامو، مارٹی اور سلطان بستی میں داخل ہوئے تھے۔ ہم بھی ہر طرح محتاط تھے۔ تمنچے ہم نے اپنے کوٹوں کی جیبوں میں رکھ لیے تھے۔ تین دن تک ہم بستی کے لوگوں سے سُن گُن لینے کی کوشش کرتے رہے مگر ہمیں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ قبیلے کے لوگ صبح و شام عبادت کرتے تھے۔ جس شخص چن وسا کے ہم مہمان تھے، اُس نے چوتھی رات زبان کھولی اور ہمیں بتایا کہ قبیلے کے لوگ برسوں سے ایک عذاب میں مبتلا ہیں، وہ اُن متبرک کاغذات کے امین نہیں رہے جو اُن کے قبیلے کے لیے باعثِ افتخار تھے۔ ہم نے کوئی تبصرہ کیے بغیر صرف دُکھ کا اظہار کرنے پر قناعت کی۔

دوسرے دن جب ہم اِرد گِرد کے پہاڑوں سے واپس بستی میں اپنے میزبان کے مکان پہ پہنچے تو سامان پر ایک نظر ڈالتے ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ اس کی تلاشی لی گئی ہے۔ انھوں نے کوئی چیز چوری نہیں کی تھی اور تمام چیزیں جوں کی توں ترتیب سے رکھ دی تھیں۔

بستی سے چند میل کی دُوری پہ بدھوں کی پتھروں سے بنی ہوئی ایک بڑی خانقاہ تھی۔ ابھی پیرو اور دوسرے لوگ چوتھا دن گزر جانے کے باوجود بستی میں نہیں آئے تھے۔ یقیناً کوئی بیمار پڑ گیا ہو گا یا انھیں کوئی اور اُفتاد پیش آ گئی ہو گی۔ ہم اُن کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ پانچویں دن ہم نے خانقاہ کی طرف جانے کا فیصلہ کیا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو راہب گوتم بدھ کی ایک بڑی مورتی کے سامنے عبادت کر رہے تھے۔ ہم بھی وہیں بیٹھ گئے۔ ہم سب کی نظریں اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔ عبادت ختم ہونے کے بعد راہب منتشر ہو گئے اور مختلف جگہوں پر بیٹھ گئے۔ ہم وہاں سے واپس آ رہے تھے کہ ایک مندر کے نزدیک سے گزرتے ہوئے میری سانس سینے میں اٹکنے لگی۔ ایک بوڑھے راہب کی شکل مجھے کچھ جانی پہچانی محسوس ہوئی۔ اُس کا چہرہ سپاٹ اور سر منڈا ہوا تھا۔ گالوں کی ہڈیاں نکلی ہوئی تھیں۔ وہ آنکھیں بند کیے ریاضت میں مصروف تھا۔ میں نے بہّل کا بازو زور سے پکڑ لیا۔ میری سسکی نکل گئی۔ بہّل نے مجھے سرزنش کی اور میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ میں انھیں اس حلیے میں بھی پہچان سکتا تھا۔ وہ ابّا جان کے سوا کوئی نہیں ہو

سکتا تھا۔

وہی اُن کی لمبی ناک، پتلے پتلے ہونٹ، دھنسی ہوئی آنکھیں بھاری چہرہ۔ اُن کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ بہ ظاہر وہ سکون سے پلکیں مُوندے بیٹھے تھے لیکن اُن کی پیشانی پر سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ جھل نے اپنے پنجے میں میرا ہاتھ جکڑ لیا تھا۔ میری پھٹی ہوئی آنکھیں اُنھی پر مرکوز تھیں۔ وہ میرے آبا جان ہی تھے۔ سولہ سترہ سال تک صبح و شام، ہر ساعت میں نے انھیں دیکھا تھا۔ اُن کے چہرے کا ایک ایک نقش میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ میں نے جھل کے پنجے سے اپنا ہاتھ چھڑا کے اُن کی طرف بڑھنا چاہا لیکن جھل نے میرا بازو کھینچ لیا۔

مندر کے اطراف آبا جان سے دُور و نزدیک پہاڑیوں پر انھی کی طرح دوسرے راہب اپنے آپ میں گُم بیٹھے تھے۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ جھل نے بھنچی ہوئی آواز میں مجھے ٹھہرے رہنے کی ہدایت کی اور آبا جان کو گھورتا رہا۔ میرے ہاتھ پیروں میں بالکل دم نہیں رہا تھا۔ جھل کی سرگوشی کی بھنک شاید آبا جان کے کانوں تک بھی پہنچ گئی تھی کہ انھوں نے یک بارگی پلکیں اُٹھا کے سرسری نظر سے ہماری جانب دیکھا۔ ہم سب اُن سے کچھ فاصلے پر سامنے ہی کھڑے تھے۔ دوسرے لمحے انھوں نے آنکھیں بند کرلیں مگر پھر فوراً کھول دیں۔ ہم سب نے جھل کی پیروی میں اُن کے آگے سر جھکا دیے۔ آبا جان کے کپکپاتے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اُن کی نظر سیدھی مجھی پر آئی۔ ایک لمحے کے لیے میرے سارے جسم پر رعشہ سا طاری ہوگیا اور مجھے اپنی آنکھوں کی دُھند میں ایسا دکھائی دیا جیسے اُن کی پلکیں پھڑکی ہیں اور اُن کا منہ کُھل گیا ہے لیکن یہ میرا وہم تھا۔ انھوں نے بس نگاہ بھر کے ہم سب کو دیکھا ہوگا اور ہاتھ اُٹھا کے ہمیں جواب دیا ہوگا کہ پہلے کے مانند پتھر کی طرح منجمد ہوگئے۔ جھل چند لمحے وہیں کھڑا رہا، پھر میرا ہاتھ تھامے ایک طرف چل دیا۔ میں نے مُڑ کے پیچھے دیکھنے کا کئی بار ارادہ کیا لیکن جھل کے خیال سے پگ ڈنڈی پر گرتا پڑتا اُس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ میری ٹانگیں لرز رہی تھیں اور دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ہم زیادہ دُور نہیں گئے۔ جھل قریب ہی ایک پہاڑی پر آکے بیٹھ گیا۔ جامو، مارتی، سلطان اور سُولم کی مضطرب سوالیہ نظریں بار بار میری اور جھل کی جانب اُٹھتی تھیں۔ جھل کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ "لاڈلے! تیری آنکھیں ٹھیک ہی بول رہی ہیں نا؟"

میری سسکیاں نکل پڑیں۔

جھل نے پھر مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ سر جھکائے کچھ سوچتا رہا۔ "کیا بات ہے اُستاد؟ کچھ اپنے کو بھی بولو۔" جامو نے بے چینی سے پوچھا۔

"کیا بولوں رے۔" جھل نے گہری سانس بھر کے تلخی سے کہا۔

"کون ہے وہ؟"

"وہی ہے جس کے لیے اِدھر آئے ہیں۔"

"نہیں۔" جامو حیرت سے اچھل پڑا اور میرا کندھا جھنجوڑنے لگا۔ "استاد ٹھیک کہتے ہیں کیا؟" وہ سٹ پٹاتے ہوئے بولا۔

میں نے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

"لاڈلے! لاڈلے!" جامو مجھے زور زور سے دبوچنے لگا۔ سُلطان اور سولم بھی مجھ سے چمٹ گئے اور مجھے پیار کرنے لگے۔

"کپڑے مت پھاڑو۔" جھل تندی سے بولا۔ "تو بھی بھانڈ ... جامو! اِدھر یہ تیرا اڈا نہیں ہے رے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے پر جھل بھائی! ..." جامو کچھ کہتے کہتے رُ...

"بیٹھا رہ۔" جھل ناگواری سے بولا۔

"قسم سے اپنے کو یقین نہیں آتا۔" جھل نے جواب نہیں ... تنک کے بولا۔ "ایسے منہ سی کر کے مت بیٹھو اُستاد!"

"تیری منشا ہے ناچنے لگوں کیا؟"

"تم تو فضول میں بگڑ رہے ہو۔" جامو منہ بنانے لگا۔

جامو کے ساتھ سلطان، مارتی اور سُولم بھی میرے پاس ... گئے۔ دُور آبا جان گُم سُم بیٹھے تھے۔ گو اُن کے چہرے کے بدلتے ... ہم آسانی سے نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن وہ کوئی جنبش کر... ہماری نظروں سے اوجھل نہ رہتی۔ دُور سے وہ کوئی بُت معلوم ... تھے۔ میرا خیال تھا، شاید وہ ایک بار پلٹ کے دیکھیں مگر انھوں ... ثانیے کے لیے بھی ہماری جانب نگاہ نہیں کی۔ ممکن ہے اُس ... میں اُن کے سامنے کھڑا ہوا تھا، اُن کے دماغ میں میرا خیال گز... کہیں میں اُن کا بیٹا بابر تو نہیں ہوں مگر انھوں نے فوراً یہ واہمہ جھٹک دیا ہوگا۔ اتنی مدت بعد اور اتنی دُور افتادہ جگہ میں انھیں ... نظر آسکتا ہوں۔ میرا چہرہ بھی پہلے سے بہت بدل گیا تھا۔ آبا جا... چہرہ یاد ہوگا جب میں گھر میں رہتا تھا۔ اُن کے خیال میں میں ... مر کھپ چکا ہوں گا۔ عجب نہیں کہ وہ اب مجھے کبھی یاد بھی ... ہوں۔ شروع شروع میں اگر کبھی میرا خیال آتا ہوگا تو اُن کا دل ... ہوگا اِس لیے انھوں نے میرا نام ہی سینے سے کھرچ کے پھینک... کہ کبھی اُن کا کوئی بیٹا تھا۔ وہ اتنے ہی سخت اور ضدی تھے۔ کسی سے ناراض ہو جائیں تو عمر بھر منہ نہ دیکھیں اور جب سخاوت ... گھر کا گھر لٹا دیں۔ جانگ قبیلے میں آتے ہی انھیں معلوم ہو گیا ہو... ابھی تک قبیلے کے لوگوں کو نہیں ملی ہے۔ یہ جان کے انھیں ب... رہنے کا گماں ضرور ہوا ہوگا۔ ہم وہیں پہاڑی پر بیٹھے انھیں دیکھ...

وہاں کوئی ایک مندر نہیں تھا۔ چھوٹے بڑے بہت سے ... کوئی اُس پہاڑی پر، کوئی اِس پہاڑی پر۔ سارا علاقہ اونچے نیچے ... پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اب تک ہمارا جتنے علاقوں سے ... ، اُن میں یہ جگہ سب سے سرسبز تھی۔ بستی اور مندروں کے ... قصبے کے اطراف سارے پہاڑوں پر برف جمی ہوئی تھی۔ ... درو نگ اور مندروں کو برف نے نہ جانے کیوں چھوڑ دیا ... طرف برف پوش پہاڑیوں کے بیچ میں یہ سبزہ زار علاقہ سفید ... رکھے ہوئے ایک گل دستے کے مانند تھا۔ ندی، نالے، آبشار ... پھولوں کے تختے۔ اونچے درختوں کے درمیان مسطح پہاڑوں پر جا بجا بلند و بالا عمارتیں تعمیر کی گئی تھیں۔ ہر سُو سکوت چھایا ہوا تھا۔ جھلملی ... پتوں سے چھَن چھَن کے عمارتوں پر بکھری ہوئی تھی۔ ہر جگہ ... دیو ہیکل مورتیاں نصب تھیں۔ کہیں پہاڑوں میں ترشی ہوئی، ... زمین پر اُگی ہوئی۔ مندروں کی دیواروں اور ستونوں پر بھی ایسے ... تھے۔ دیواروں میں ہزار ہا طاق تھے۔ اور ہر طاق میں ایک مورتی ... تھی۔ سب سے بڑا مندر ایک اُونچی پہاڑی پر واقع تھا۔ اُس کے ... ٹے بڑے مندر اور دوسری عمارتیں تھیں۔ سُولم کی زبانی ہمیں ... تھا کہ یہیں بدھوں کی کوئی ورسٹی جیسی ایک درس گاہ ہے۔ ... باہر سے بدھ یاتری اور طالبِ علم بدھ تعلیمات کے لیے آتے ... برسوں یہیں رہتے ہیں۔

دوپہر گزر گئی۔ آبا جان نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی، نہ ہی ... سے ہٹے لیکن ہم وہاں کب تک یوں بیٹھے رہتے۔ بستی کے ... راہب اور خدمت گار پجاری ہمارے اِرد گرد کی پگ ڈنڈیوں پر ... ہوئے ہمیں چھچلتی نظروں سے ضرور دیکھتے تھے۔ شام ہونے لگی ... سے نہیں اُٹھا۔ سورج کا سُرخ گولا پہاڑوں میں آدھا چُھپ گیا تھا ... کے جسم میں جنبش ہوئی۔ ہم سیدھے ہوگئے۔ آبا جان نے گردن ... جھٹک کے آنکھیں کھولیں، آسمان کی طرف دیکھا اور اپنے پاس ... کشکول نما برتن اُٹھا کے کھڑے ہوگئے۔ ہماری نگاہیں اُن کی ایک ... کا جائزہ لے رہی تھیں۔ میرا جی چاہتا تھا کہ وہ سب اُن کی طرف ... لیکن یہ بات میں اُن سے کیسے کہہ دیتا۔ پہاڑی پر کھڑے ہو کے آبا جان نے ... نظر ڈالی۔ اُن کے ساتھ نزدیک و دُور بیٹھے ہوئے دوسرے ... اُٹھتے گئے۔ انھوں نے اپنے قریب ترین ساتھی کو سر ہلا کے ... یا شاید اُس سے کچھ کہا۔ ہم اتنے فاصلے سے کچھ سُن نہیں سکتے ... کہ پہاڑ خاموشی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ یقیناً آبا جان کو خبر نہیں ... کہ لوگ اُن سے کچھ دُور ایک دوسری پہاڑی پر بیٹھے ہوئے اُن ... ہیں۔ مندر کی طرف جانے سے پہلے انھوں نے سر گھما کے سمتوں ... دیکھا۔ ہم پر اُن کی نظر نہیں پڑی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ... مندر کی عمارت میں گُم ہوگئے۔

ہم اُن کے تعاقب میں مندر کے راستے پر نہیں گئے۔ جھل مختلف پہاڑیوں کے چکر کاٹتا ہوا واپس بستی کے راستے پر چلنے لگا۔ بستی کسی قدر نشیب میں واقع تھی۔ مجھ میں جھل سے یہ پوچھنے کی ہمت نہیں تھی کہ وہ آبا جان کے پاس جانے کے بجائے بستی کی طرف کیوں جا رہا ہے۔ میں خود بھی بہت سی باتوں کا اندازہ کر سکتا تھا۔ میرا بس چلتا تو تمام پہاڑیاں پھلانگ کے آبا جان کے پاس پہنچ جاتا اور اُن کے قدموں پر سر رکھ کے اپنے سینے میں چاقو مار لیتا۔ مجھ سے تو اُن کے سامنے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ مجھے معاف کردیں۔ انھوں نے اپنی جو یہ حالت بنا رکھی تھی، یہ سب کچھ مجھ منحوس کے سبب سے تھا۔ اُن کا جسم ڈھانچا بن گیا تھا۔ ساری پسلیاں اُبھری ہوئی تھیں۔ کھال جیسے ہڈیوں پر منڈھ دی گئی ہو۔ بس اُن کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی۔ ایسی چمک جسے دیکھ کے ڈر لگے۔ ہم واپس بستی میں پہنچے تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ ہمارا میزبان چن وسا ہمارا منتظر تھا۔ وہ لوگ رات کا کھانا جلدی کھا لیتے تھے اور رات بھر جب تک نیند نہیں آتی تھی، چائے پیتے رہتے تھے یا دس دس بارہ بارہ کی ٹولیوں میں الاؤ کے گرد بیٹھے رات کا بیشتر حصہ گزار دیتے تھے۔ ان چار پانچ دنوں میں بستی کے بہت سے لوگ ہم سے واقف ہو چکے تھے۔ کل صبح اور پرسوں ہم نے بستی کی چند دکانوں کے نزدیک ایک کشادہ جگہ اپنا سامان صندوقوں سے نکال کے نمائش کے لیے سجایا تھا۔ دونوں دن ہمارے گرد ایک بھیڑ لگی رہی۔ لوگ خریدتے کم اور چیزیں حیرت سے دیکھتے زیادہ تھے۔ اُن کے لیے بہت سی چیزیں نئی تھیں۔ زنانہ ریشمی کپڑے عورتیں اور لڑکیاں چھو چھو کے دیکھتی تھیں۔ گاہکوں کے قیمت پوچھنے پر جھل نے چیزوں کے دام بتانے شروع کیے تو ہم سب کو حیرت ہوئی۔ وہ چوگنی، آٹھ گنی قیمتیں بتا رہا تھا۔ جامو اور جھل سامان کے پاس ایسے بیٹھے تھے جیسے اُن کا پیشہ یہی رہا ہو۔ وہ مول تول کر رہے تھے۔ ہم نے کسی کو کم قیمت پر سامان نہیں بیچا۔ قیمتیں زیادہ ہونے کی وجہ سے سامان زیادہ نہیں بک سکا۔ جھل کی خواہش بھی یہی تھی کہ سارا سامان ایک دم نہ بک جائے، ہمارے پاس ذخیرہ باقی رہے۔ سلطان نے لڑکیوں کے ہاتھوں میں چوڑیاں پہنائیں، اُن کے پیروں میں پازیب ڈالی، گھنگرو باندھے۔ وہ چل چل کے دیکھتیں تو چھن چھن کی آواز سُن کے بہت خوش ہوتیں۔ جامو نے لڑکیوں کے بالوں میں کلپ اور پنیں لگائیں اور چُٹیا گوندھنے کا طریقہ بتایا۔ جب تک ہم بازار لگائے بیٹھے رہے، بستی کی نوجوان لڑکیوں کا تانتا بندھا رہا۔ سُولم، سلطان، جامو اور مارتی اُن کی چٹیا، نیوں، گلوں، ہاتھوں اور پیروں میں زیور سجاتے رہے۔ جانگ قبیلے کی ہر لڑکی کا رنگ سُرخ و سفید، ہاتھ نازک، انگلیاں چھوٹی چھوٹی، پتلی پتلی، لمبی گردنیں اور بدن ریشم کے سے تھے۔ جامو اور سلطان زیور، چوڑیاں پہنا کے انھیں آئینہ دکھاتے تھے تو وہ شرما جاتی تھیں۔ اُن کے چھوٹے چھوٹے سفید دانت کھل

کھلانے لگتے تھے۔ سہ پہر کو دھوپ ڈھلنے کے بعد ہم نے سامان صندوقوں میں واپس رکھنا شروع کیا تو سلطان وہاں سے اُٹھنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ تجھل نے اُسے ڈانٹ کے اُٹھایا۔ وہ بار بار یہی کہتا تھا: "استاد! سلطان واپس نہیں جائے گا یا ادھر ہی بستی کی لڑکیوں کے ہاتھوں میں چوڑیاں پہناتا، جھومر سجاتا اور آئینہ دکھاتا رہے گا۔"

اُس وقت بھی اُسے بستی میں واپس چلنے کی جلدی تھی۔ جیسے ہی تجھل نے بستی میں اُترنے کے لیے قدم بڑھائے، سلطان پگ ڈنڈی پر قلانچیں بھرنے لگا۔ اس تیزی میں ایک پھسلواں جگہ اُس کا پاؤں رپٹ گیا اور پیر میں موچ آگئی۔ تجھل راستے بھر اُسے پھٹکارتا رہا۔ تکلیف کی وجہ سے سلطان سے چلا نہیں جا رہا تھا اسی لیے ہمیں بستی واپس پہنچنے میں دیر ہوگئی اور اندھیرا ہوگیا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں جا چکے تھے۔ بند مکانوں کی درزوں سے کہیں کہیں مدھم روشنی پھوٹ رہی تھی اور پہاڑوں میں ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ سردی اتنی زیادہ تھی کہ اگر ہم کچھ دیر اور پہاڑی پر بیٹھے رہتے تو ہمارے جسم اکڑ جاتے۔ آج یہ پہلا دن تھا کہ ہمیں اپنے آس پاس، آگے پیچھے نگرانی کے لیے کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پچھلے تمام دنوں وہ ہماری نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے اور اپنے خیال میں یہ سمجھ رہے تھے جیسے ہم اس سے بے خبر ہیں۔ جہاں جہاں ہم جاتے، اُن کی نگاہیں ہمارا پیچھا کرتی رہتیں، جدھر سے ہم گزرتے، لوگ ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے۔ وہ ہم سے کچھ کہتے تو نہیں تھے لیکن اُن کی چُبھتی ہوئی آنکھیں ہر لمحے ہمیں اپنے چہروں پر محسوس ہوتی تھیں۔ بستی کے مکانوں کے درمیان تنگ راستے سنسان پڑے تھے پھر بھی ہم تمام تر احتیاط سے، پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے بستی میں داخل ہوئے۔ کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا تھا۔ تجھل نے سب کو منع کر دیا تھا کہ وہ تنہائی میں بھی غیر ضروری اشاروں اور تبصروں سے اجتناب کریں۔ وہ خود بھی بس ضرورت کے وقت بولتا تھا۔ آگے جا کے ایک کُھلی اور ہموار جگہ ہمیں اندھیرے میں چند سائے رینگتے نظر آئے۔ شاید ہمارے بستی میں جلد نہ پہنچنے کی وجہ سے اُنھیں تشویش ہوگئی تھی۔ قریب جانے پر پتہ چلا کہ وہاں کئی نوجوان اور بوڑھے آدمی موجود ہیں۔ ہماری آہٹ سُن کے وہ چُپ ہوگئے اور ہمیں گھورنے لگے۔ اندھیرے میں اُن کے چہرے دھندلے دھندلے تھے، کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ہماری تلاش میں نکلنے والے تھے۔ اُن میں ہمارا میزبان چن وسا بھی تھا۔ کسی نے ہم سے کچھ پوچھا نہیں۔ چن وسا سب سے پہلے آگے بڑھا اور سلطان کی حالت دیکھ کے ٹھٹک گیا۔ کچھ کہے سُنے بغیر وہ ہمیں ایک طبیب کے پاس لے گیا۔ طبیب نے جڑی بوٹیوں کے تیل سے سلطان کے پیر کی مالش کر دی اور لیپ کر کے پٹے باندھ دیے۔ درد سے سلطان کا بُرا حال تھا مگر دیکھتے دیکھتے اُسے افاقہ ہونے لگا۔

چن وسا نے گھر آ کے اُسے گرم کپڑوں میں لپیٹ کے فرش پر ... کوئی ایسی نشہ آور چیز کھلا دی کہ سلطان گہری نیند سو گیا۔

مجھے اندیشہ تھا کہ سلطان کی چوٹ ہمارے کہیں آڑے ... پھر ایک رکاوٹ بن جائے گی۔ سفر میں بھی روز کوئی نہ کوئی ... اور ہماری رفتار میں فرق آ جاتا تھا۔ میری سمجھ میں اب تک ... آئی تھی کہ تجھل کو اتنے لوگ ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی۔ ہم تجھے ... رکاوٹیں اتنی ہی کم ہوتیں اور مجبوراً اُس نے سلطان کو کیوں ساتھ رکھا ... کی مسلسل تنبیہ کے باوجود تین دن سے سلطان اونگی بونگی حرکتیں ... بالکل بچوں کی طرح ضد کرنے لگتا۔ بعض اوقات تو مجھے اُس پر ... تھا۔ چن وسا کی فوری توجہ سے سلطان کی مشکل بہر حال دور ہو گئی ... ویسے آنے کا جواز بھی پیدا ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ بستی میں ... کے بعد تجھل کے ذہن میں ابا جان کے متعلق کوئی تدبیر ضرور ... جان کو دیکھ کے یوں وہاں سے لوٹ نہیں سکتا تھا لیکن ... ہر یا نہ ہو، وہاں سے لوٹے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ ہمیں ... میں واپس آنا ہی تھا۔ ہم نہ آتے تو ہماری تلاش میں دو ... نیچے ہمارا سامان بھی پڑا تھا اور ہمیں ابھی اور نہ جانے کب تک ... درمیان رہنا تھا۔ جانگ قبیلے کی ایک ہی بستی نہیں تھی جس ... ہوئے تھے، قریب قریب کے پہاڑوں پر قبیلے کی اور بھی ...

چن وسا نے ہمیں بتایا تھا کہ مندروں کے اُس پار بھی قبیلے کی ... مشرق، مغرب، جنوب، تینوں سمتوں کے پہاڑوں پر جانگ ... پھیلے ہوئے تھے۔ شمال کے پہاڑوں میں سال کے ہر مہینے ... تھی اس لیے وہاں کسی انسانی بستی کا قیام ناممکن تھا۔ چن و... باتوں میں ہمیں یہ جتا دینا بھی ضروری سمجھا تھا کہ بستیوں کے ... اور سردار کے احکام جلد منتقل کرنے کے عمدہ انتظامات مو...

چن وسا نے غلط نہیں کہا ہوگا۔ جانگ قبیلہ دوسر... نسبت زیادہ خوش حال اور مہذب تھا۔ بستی میں چند دکانو... صاف ستھرا مختصر بازار تھا اور بانس کے مکانوں کے ساتھ ... کے مکانات بھی بنے ہوئے تھے۔ ہر شخص ہر وقت مسلح ر... پاس ایک خنجر ہونا تو از بس لازم تھا۔ اُن کی زبان میٹھی، لگ... پر نرمی تھی۔ ہمارا قیام جس بستی میں تھا، اُسے تمام بستیوں میں ... مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ ایک تو یہ کہ وہ مندروں کے مقدم... تھی۔ سردار اور اُس کے رفقا بھی یہیں رہتے تھے۔ یہاں ر... مسلط ... اور اسی لیے راستے بھی پہاڑوں پر واقع دوسری بستیوں کے ... قدر کشادہ تھے۔ بستی کے درمیان سے ایک تیز ندی گزرتی ... کناروں پر قبیلے کے لوگ چھوٹی موٹی کاشت کرتے تھے ا... روایتیں درونگ کی مرکزی بستی کے متعلق مشہور تھیں، ہم ...

... رسم و رواج کے خلاف کوئی بات نہیں کی تھی۔ بازار میں سامان ... تجھل نے اگرچہ گاہکوں سے حجت کی تھی لیکن قبیلے کے معزز ... لوں میں تحائف بھی تقسیم کیے تھے تاہم ایک ذرا سی لغزش ... احتیاط خاک میں مل سکتی تھی۔ ہم وہاں اجنبی تھے اور جانگ ... وں کے تیور سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اجنبیوں کے معاملے ... حساس ہیں۔ کبھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ایک دوسرے کو ... نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

... سلطان کو علیحدہ کمرے میں لٹانے کے بعد چن وسا ہمیں اپنے مکان ... دوسرے بڑے کمرے میں لے آیا اور ہم یہ دیکھ کے دنگ رہ ... پہلے سے چند آدمی موجود تھے۔ پانچ بوڑھے آدمی، جن کے زرد ... چہرے آتش دان کے شعلوں کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ ... اُن کی موجودگی ہمارے لیے حیرت کا سبب تھی۔ حالانکہ فوراً ... نے یہ بتا کے ہماری اُلجھن دُور کرنے کی کوشش کی کہ آج ہمارے ... آنے پر اُس نے بستی کے چند معزز لوگوں کو مدعو کیا ہے اور ... ہمارا منتظر تھا۔ ہم نے قبیلے کی روایت کے مطابق انھیں سلام ... کے ساتھ ہی فرش پر بیٹھ گئے۔ اُن میں سے تین آدمیوں سے ... چکے تھے اور اُنھیں تحائف دے چکے تھے۔ اُن کی وہاں موجودگی ... ہو، اب یہ بات طے تھی کہ جب تک وہ موجود تھے، ہم ... نہیں جا سکتے تھے۔ ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ سوچ کے ... لوگوں کے ساتھ بیٹھنا پڑے گا، میرا دل ڈوبنے سا لگا۔ ... ابا جان کو دیکھا تھا، طرح طرح کے خیال آ رہے تھے۔ امی ... سامنے آ جاتا تھا۔ لگتا تھا جیسے سب کل کی بات ہے۔ فتی ... کانوں میں بجنے لگے تھے اور اُن سب کے چہرے۔ فرخ، ... ، اکبر۔ پتہ نہیں کون کہاں تھا، ابا جان اُنھیں کس کے پلے ... تھے۔ شاید اب کوئی بھی اُن کے ساتھ نہیں رہا تھا ورنہ وہ ... سے یہاں کیسے بیٹھے رہتے۔ پر ابا جان کا حوصلہ بہت بڑا تھا۔ ... جہل گیر کھو گئے۔ میں گھر سے نکل گیا اور بعد میں نہ جانے کون ... اُن کے حوصلے میں فرق نہیں آیا۔ اُنھیں یہ سب دیکھنے کی ... گئی تھی۔

... چن وسا ایک سن رسیدہ آدمی تھا لیکن جسم کی مضبوط ساخت کی ... اتنی عمر میں بھی توانا اور سُرخ نظر آتا تھا۔ قبیلے میں اُسے ... حاصل تھی۔ دوسرے امیر لوگوں کی طرح ایک ہموار جگہ پر اُس کے ... کا ایک پختہ مکان تھا جس کی دیواریں، چھت اور ستون پتھر ... بیرونی دروازہ لکڑی کا تھا۔ بستی میں کم ہی لوگوں کے پاس اس ... مکانات تھے۔ سردار نے اُسے ہماری مہمانی کے لیے خاص طور پر ... تھا۔ پہلے دو دن تک تو وہ محتاط محتاط رہا پھر رفتہ رفتہ اُس

کی پیشانی اور آنکھوں کا کھنچاؤ کم ہوا۔ اُس رات اُس نے خاصا اہتمام کیا تھا۔ یاک کا بُھنا ہوا گوشت، پہاڑوں پر کاشت کی ہوئی اُبلی ہوئی سبزیاں، یاک کا نمکین مکھن اور قسم قسم کی چیزیں موجود تھیں۔ ہم نے اپنی جانب سے اُس کی خدمت میں ولایتی شراب کی بوتل پیش کی۔ بوتل دیکھ کے چن وسا اور اُس کے بوڑھے ساتھیوں کی آنکھوں میں چنگاریاں سی لپکنے لگیں۔ پہلے چن وسا نے یہ تحفہ قبول کر لیا تھا لیکن پھر یہ کہتے ہوئے واپس کر دیا کہ اتنی قیمتی چیز کا اصل حق دار قبیلے کا سردار ہے۔ تجھل نے اُسے یقین دلایا کہ سردار کے لیے اُس کے پاس اور بوتلیں ہیں جو اُس نے چلتے وقت اُسے پیش کرنے کے لیے علیحدہ رکھ لی ہیں۔ چن وسا نے بوتل شکریے کے ساتھ قبول کر لی اور ہمیں بتایا کہ قبیلے کے برگزیدہ لوگوں نے عرصہ ہوا، کسی عہد کے بغیر خود ہی اپنے لیے شراب ممنوع قرار دے رکھی ہے لیکن تجھل کے اصرار پر اُنھوں نے چند گھونٹ حلق سے اُتار لیے۔ اندر سے چن وسا کی بلی جیسی آنکھوں والی گڑیا سی نوجوان خادمہ گرم گرم گوشت لا رہی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر خادم دروازے کے پاس مستعد کھڑا تھا۔ وہ سب کھانا کھا رہے تھے اور شراب پی رہے تھے، تجھل کو جیسے یاد نہیں رہا تھا کہ اُسے کوئی اور بھی کام ہے۔ پہلی بار وہ اُن سے پرانے واقف کاروں کے مانند باتیں کر رہا تھا۔ مجھ سے نہ کچھ کھایا گیا، نہ پیا گیا۔ میرے جی میں آتا تھا کہ تمنچا نکال کے اُن سب کو گولی مار دوں یا شراب کی پوری بوتل حلق میں اُنڈیل لوں، اپنا سر دیوار سے پھوڑ لوں۔

کمرہ گرم تھا۔ روشن دان بھی بند رکھے گئے تھے۔ ایک طرف کونے میں لکڑیاں جل رہی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی لکڑی زور سے چٹخ اٹھتی تھی۔ چھت سے اُوپر آگ کا دھواں نکلنے کا باقاعدہ انتظام تھا۔ کمرے کے درمیان دری جیسا ایک موٹا کپڑا بچھا ہوا تھا۔ سب لوگ کھانے کے اطراف دائرہ بنائے ہوئے بیٹھے تھے اور اُن سب کے جسموں کے کُھلے ہوئے حصے آگ کی روشنی میں لال ہو رہے تھے۔ تجھل چن وسا کی باتیں نہایت توجہ سے سُن رہا تھا اور سولم کے ذریعے بیچ بیچ میں ٹوکتا جاتا تھا۔ چن وسا بہت سی باتیں ہمیں پہلے ہی بتا چکا تھا۔ البتہ بعض ہمارے لیے نئی تھیں۔ میرے کان بھی کھڑے ہوگئے۔ چن وسا کے بیان کے مطابق ہفتے میں ایک بار سردار قبیلے کی تمام بستیوں میں جاتا تھا اور مہینے میں ایک بار جانگ قبیلے کی ہر بستی کے لوگ مندر میں اکٹھے ہوتے تھے۔ ہر چار مہینے بعد ایک بستی دوسری بستی کو دو دن دو راتوں کے لیے مہمان کے طور پر مدعو کرتی تھی۔ یہ ایک طرح کا میلا ہوتا تھا۔ قبیلے کی نوجوان لڑکیاں اور لڑکے زیور اور ہتھیار سجا کے ان میلوں میں جاتے تھے اور وہیں رشتے طے ہوتے تھے۔ اگر کوئی لڑکی بہت سے لڑکوں کو مطلوب ہوتی تو قبیلے کے معمر لوگ اُن میں سے ایک سے دوسرے کے لیے اپنا مطالبہ ترک کر دینے کی درخواست کرتے، بصورتِ دیگر قرعہ ڈال لیتے۔ قرعے پر بھی لڑکے آمادہ نہ ہوتے تو اُن کے درمیان مختلف قسم کے مقابلے ہوتے۔

جو مقابلہ جیت جاتا، وہی اپنی مطلوبہ کو لے جاتا۔ یا پھر لڑکی سے یہ کہا جاتا کہ وہ اپنی طرف سے اپنے امیدواروں کے لیے شرطیں عائد کرے۔ لڑکیاں عموماً بولتی نہیں تھیں مگر انھیں کوئی امیدوار ناپسند ہوتا تو وہ ہر ایک پر مختلف قسم کی شرطیں عائد کرتیں۔ جو لڑکا انھیں سب سے زیادہ پسند ہوتا، اُس کے لیے وہ شرطیں نرم رکھنے کا اختیار رکھتی تھیں۔ اُس وقت زیادہ دقت پیش آتی جب ایک لڑکی کے بہت زیادہ امیدوار ہوتے اور ایسا اکثر ہوتا تھا۔ اگر کورا یہاں ہوتی تو سارا قبیلہ اُس کا امیدوار ہوتا مگر وہ تو ایک شہزادی تھی، جانگ قبیلے کی ہونے والی ملکہ۔ میں نے چن وسا سے نہیں پوچھا کہ کیا اُس کے لیے بھی اسی طرح امیدوار کھڑے ہوتے مگر کورا اُن میں سے کسی کو پسند نہ کرتی۔ اُس کا رشتہ تو شروع ہی سے میرے ساتھ طے ہو گیا تھا۔ وہ کہتی تھی کہ اُس نے میرے ملنے سے پہلے مجھے دیکھ لیا تھا۔ کلکتے میں جب ہم ایک ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے تھے اور میرے ماتھے پر اُس کی انگلیاں سرسرا رہی تھیں، اُس نے مجھ سے یہی کہا تھا اور میں نے اُسے پہلی بار گیا اسٹیشن پر دیکھا تھا تو مجھے بھی اُس کا چہرہ جانا پہچانا محسوس ہوا تھا جیسے وہ مجھ سے کبھی بچھڑ گئی تھی پھر مل گئی۔ جیسے ہم دونوں ایک دوسرے کو ڈھونڈ رہے تھے۔ بُدھ گیا میں اپنے اتالیق اُجین کے قتل ہونے کے بعد وہ کسی اور جگہ پناہ لینے کے لیے نہیں گئی، سیدھی میرے گھر آئی تھی۔

چن وسا کہہ رہا تھا کہ پہلے یہ رسم دھوم دھام سے منائی جاتی تھی مگر اب مدت ہوئی، وہ جوش و خروش نہیں رہا ہے۔ لوگ ملتے ہیں تو عبادت کرتے ہیں۔ قبیلے کے بہترین لڑکے ہر سال اپنے متبرک کاغذات کے حصول کے لیے بستی سے نکل جاتے ہیں۔ کبھی واپس آ جاتے ہیں، کبھی نہیں۔ قبیلہ جانگ کو اپنے محلِ وقوع، اپنے ماضی، مقدس مذہبی مقام، برتر جسمی خصوصیات کے اعتبار سے دُور دُور تک مرتبت حاصل تھی۔ چن وسا کے بقول اُن کا یہ اعزاز قائم نہیں رہ سکا کیونکہ وہ مقدس امانت کی حفاظت نہیں کر سکے۔ اُن کی سرفرازی اُن سے چھن گئی اور وہ برسوں سے عذاب میں مبتلا ہیں۔ بجھل نے بوجھل لہجے میں پوچھا کہ آخر ایسا کیوں ہو گیا؟ اُس کے استفسار پر چن وسا کی آنکھوں میں ویرانی چھا گئی۔ اُس نے اضطراب آمیز انداز میں اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا، وہ گردنیں جھکائے ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھر رہے تھے۔ چن وسا کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے اور آواز گلوگیر ہو گئی۔ اُس کی زبان پر کورا کا نام آیا تو میرے کان سن سنانے لگے۔ چن وسا بتا رہا تھا کہ خدا نے اُسے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا، وہ آسمانوں سے اُتری ہوئی کوئی پری تھی، وہ ایک نیک اور بہادر سردار کی بیٹی تھی۔ سردار بے وقت مر گیا، قبیلے والوں نے اپنے محبوب سردار کی چہیتی اور اکلوتی بیٹی کی حفاظت نہیں کی، وہ اُسے کھو بیٹھے۔ اُسے اپنے باپ کی وصیت کے مطابق قبیلے کی رانی بننا تھا لیکن ابھی اُس کی عمر کم تھی۔ اُس کے چچا نے اُس کے ساتھ ظلم کیا اور قبیلے کی سربراہی کے لالچ میں اپنی بھتیجی کا حق غصب کر[illegible] یہاں رہتی تو وہ یقیناً اُسے زندہ نہ رہنے دیتا۔ اس لیے اُس[illegible] شفیق اور بزرگ اتالیق اُسے قبیلے سے دُور لے گیا اور اپنے[illegible] دستاویزیں بھی لیتا گیا۔ مجھے یہ ساری باتیں خود کورا نے بتائی تھیں[illegible] میں ایک بھکشو نے میرے گلے میں کورا کی دی ہوئی مالا د[illegible] مجھ پر حملہ کیا تھا اور میں نے اُسے خیمے میں ختم کر دیا تھا تو اُ[illegible] کچھ کہا تھا۔ ہر گیارہ مہینے بعد سردار مرتے رہے یا قبیلہ بدر کی[illegible] ہر سردار اپنا عہدہ سنبھالتے وقت قبیلے کے سامنے عہد کرتا[illegible] متبرک دستاویزیں واپس لا کے قبیلے کو شاد کام کرے گا۔ پھر[illegible] ہو جائیں گی۔ ناکام ہونے پر وہ خودکشی کر لیتا ہے یا قبیلے[illegible] موت کی سزا دے دیتے ہیں۔ کوئی معمر آدمی ہو تو اُسے قبیلہ[illegible] کر دیا جاتا ہے۔ قبیلے والے متفق ہو کے اپنے لیے نئے سردار[illegible] کرتے ہیں یا پھر کوئی شخص خود سرداری کے لیے آگے آتا[illegible] لیے جاتے ہیں، رفتہ دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ ہر سردار نئے[illegible] اِدھر اُدھر دوڑتا ہے۔ قبیلے والوں کے فیصلے کے مطابق[illegible] کامیاب ہو گا، وہی ہمیشہ قبیلے کا سردار رہے گا، وہ یا اُس کا[illegible]

چن وسا کی آواز یکایک پھٹنے لگی۔ وہ کہنے لگا کہ اُن[illegible]

تھے۔ پہلا لڑکا قبیلے کے اور بہت سے نوجوانوں کی طرح یہ عہد[illegible] چلا گیا کہ وہ اپنی متبرک امانت کا کھوج لگا کے ہی لوٹے گا۔ وہ[illegible] آ سکا۔ سات آٹھ ماہ تک وہ مارا مارا پھرتا رہا، پھر ایک دن ا[illegible] کسی نے مار دیا۔ میری رگوں میں خون جمنے لگا۔ مجھے اچانک ا[illegible] جیسے چن وسا براہِ راست مجھ سے مخاطب ہے اور مجھی کو سنا[illegible] یہ سب کچھ کہہ رہا ہے۔ میں نے اپنی ٹھٹھری ہوئی نظریں اُس[illegible] مجھ سے چن وسا کا بھیگا ہوا انگارا چہرہ دیکھا نہیں جا سکا۔ اُس[illegible] لفظ میرا سینہ کاٹ رہا تھا۔ میں نے اُن کے درمیان سے اُ[illegible] جانے کا ارادہ کیا لیکن میرا سارا جسم برف کا تودا بن گیا تھا یا[illegible] میں نے خود کو اُن سب کی نظروں سے چھپانے کی کوشش[illegible] بنا بیٹھا رہا۔ چن وسا کہہ رہا تھا کہ اُس کے بیٹے کی اُٹھان[illegible] تھی۔ وہ ایک بے باک، بے جگر آدمی تھا۔ یقیناً وہ اُس شخص[illegible] ضرور پہنچ گیا ہو گا جس کی تحویل میں قبیلے کی امانت تھی۔ کچھ[illegible] کے بعد اُس کا دوسرا بیٹا سردار بنا دیا گیا اور اُس کا حشر بھی وہی[illegible] سرداروں کا ہوتا رہا ہے۔ گیارہ مہینے اپنی مدت پوری کر[illegible] اُس نے خودکشی کر لی۔ اُس کا تیسرا بیٹا اپنے بڑے بھائی[illegible] ہندوستان چلا گیا۔ دو سال سے زیادہ ہو گئے ہیں، وہ واپ[illegible] اُس کے تینوں بیٹے بہت بہادر اور ہٹیلے تھے۔ انھیں اپ[illegible] عزت کا بہت پاس تھا۔ اب اُس کے پاس صرف ایک بیٹی[illegible]

بیوی اپنے دونوں بیٹوں کا صدمہ برداشت نہ کر سکی، پھر تیسرا بھی چلا گیا۔ وہ مر گئی۔ میں نے سوچا، چن وسا سے کہوں کہ اُس کا بیٹا خود ہی میرے آڑے آ گیا تھا۔ میں اُسے نہ مارتا تو وہ مجھے مار دیتا اور میرا اُسے مارنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مجھے تو یہ بھی خبر نہیں تھی کہ وہ کون ہے۔ میں تو خود اُس سے کورا کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا اسی لیے میں نے اپنی مالا کپڑوں سے باہر نکالی تھی۔ چن وسا کے دوسرے ساتھی بھی رو رہے تھے اور چن وسا بتا رہا تھا کہ ان کے بیٹے بھی اسی طرح ان سے جدا ہو گئے ہیں۔ انھیں کون بتاتا کہ اور بھی لوگ ہیں، جن کے گھر اجڑے ہیں۔ کاش کورا وہ کاغذات اپنے ساتھ نہ لاتی، انھیں وہیں چھوڑ کے آ جاتی۔ پھر نہ لوگ اُس کی تلاش کرتے، نہ اباجان یوں گھر سے بیگانہ ہوتے، نہ اتی مرتیں، نہ گھر بکتا۔ ہم دونوں گھر سے نکل جاتے تب بھی گھر تو موجود رہتا۔

بجھل، جامو، مارٹی اور سولم اُن کی صورتیں تک رہے تھے۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ بجھل نے سولم کے ذریعے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں اُن سے اپنی ہمدردی کا اظہار کیا۔ چن وسا نے کاغذات میں خزانے سے متعلق کسی بات کا ذکر نہیں کیا تھا مگر اُس نے اشارۃً بتایا کہ اگر وہ کسی سمجھ بوجھ کے آدمی کی تحویل میں آ گئے ہیں تو وہ شاید کبھی اس طرف ضرور آئے گا۔ میری توقع کے خلاف بجھل نے اُس سے اس کا سبب نہیں پوچھا۔ چن وسا نے خود ہی کہا کہ اُس رات بُدھ گیا میں اجین کے قتل کے بعد کورا یہ کاغذات لے کے فرار ہو گئی تھی۔ اُسے اِن کی اہمیت و افادیت، ان کے تقدس اور حرمت کا پورا اندازہ ہو گا اور وہ زندہ ہو گی تو کاغذات بھی محفوظ ہوں گے۔ ممکن ہے، وہ کسی شخص کو یہاں بھیجے یا کوئی شخص خود ہی یہاں آئے۔ ہم اُسی شخص کے انتظار میں ہیں۔ سالوں گزرے، یہاں سے سوداگروں کا ایک قافلہ گزرا تھا۔ قبیلے والوں کو شک ہوا۔ انھیں افسوس ہے، شک میں وہ سارے سوداگر مارے گئے۔ اُن کے پاس سے کچھ برآمد نہیں ہوا۔ چن وسا کو اس ماحول میں ہمیں یہ نہیں بتانا چاہیے تھا مگر غالباً یہی سب بتانے کے لیے اُس نے آج کی رات منتخب کی تھی۔ چن وسا کے نرم لفظوں کے پیچھے تنبیہہ و تاکید کی سختی صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ بجھل کے کان سُرخ نہیں ہوئے۔ وہ تجسس آمیز انداز میں چن وسا کی باتیں سُنتا رہا۔ وہ ہمارے غیاب میں سامان کی تلاشی لے ہی چکے

چن وسا زمانے بھر کی باتیں کر چکا تو بولا کہ قبیلہ ان کاغذات کے عوض زر و جواہر کے انبار دینے کے لیے تیار ہے۔ جو کچھ ان کے تصرف میں ہے، سب نثار کر دیں گے۔ قبیلہ بہت سی شرطیں پوری کر سکتا ہے۔ صرف ایک اس شرط پر کہ کاغذات انھیں واپس کر دیے جائیں۔ مقدس دستاویزات جانگ قبیلے کا اعزاز ہیں۔ وہ اُن کے پاس آ جائیں گی تو قبیلے سے یہ نحوستیں خود بخود ختم ہو جائیں گی۔ جو کچھ وہ اُن کے عوض صرف کریں گے، اُن کے طفیل دوبارہ جلد ہی حاصل کر لیں گے۔ مقدس دستاویزات جانگ قبیلے کی فضیلت ہیں۔ جس کی فضیلت ہے، وہ اُس کے سپرد کر دینی چاہیے۔ معلوم نہیں، بجھل، جامو، مارٹی اور سولم نے کیا سمجھا ہو۔ میں نے اپنے طور پر یہی جانا کہ سرِ دست چن وسا کی یہ پیش کش ہمارے لیے ہے اور کھلے لفظوں میں یوں نہیں ہے کہ انھیں ہم پر کاغذات کے امانت دار ہونے کا مکمل یقین نہیں ہے اور یہ پانچوں جہاں دیدہ بوڑھے آج رات بے سبب ہمارے سامنے اکٹھے نہیں ہوئے ہیں۔ ان کا مقصد کچھ اور ہے۔ کوئی نتیجہ اخذ کرنا، کوئی رائے قائم کرنا، اپنے سردار کو ہمارے بارے میں کسی قسم کی سند دینا۔ اُن کی آنکھیں ترازو کے پلڑے ہیں اور انھوں نے یہ باتیں دانستہ چھیڑی ہیں۔ اُن کا لہجہ متعین نہیں تھا۔ اس میں عاجزی بھی تھی، فریاد بھی، تلخی بھی اور ایک بیزاری بھی جھلکتی تھی یا یہ سب میرے دماغ کے ہیولے تھے اور کچھ بھی نہیں تھا۔

رات گئے تک وہ نہیں اُٹھے۔ آتش دان میں لکڑیاں کم ہو جاتیں تو کوئی بھی نئی لکڑیاں آگ میں جھونک دیتا۔ انھوں نے بہت کم شراب پی تھی۔ اتنی دیر میں صرف آدھی بوتل خالی ہوئی تھی۔ کاغذات کے ذکر پر چن وسا کی آواز کبھی تمتمانے لگتی، کبھی اُس پر یاسیت غالب آ جاتی۔ اباجان یہیں قریب تھے۔ اچھا ہوتا، وہ بھی اس وقت ہمارے درمیان ہوتے اور اپنے کانوں سے چن وسا اور اُس کے ساتھیوں کی باتیں سُن لیتے۔ میرے مساموں سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ اباجان کی صورت ایک لمحے کے لیے میری نظروں سے دُور نہیں ہوتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ بجھل کے پاس ایسی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ آج رات قبیلے کے لوگ اُن تک نہیں پہنچ جائیں گے اور آج رات اباجان یہاں سے کہیں دُور کسی اور طرف نہیں نکل جائیں گے۔ ہو سکتا ہے، انھوں نے اپنا مقصد حاصل کر لیا ہو اور جانگ قبیلے میں یہ اُن کا آخری دن ہو۔ بجھل کے پاس ایسی بھی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ مندروں میں کسی نے ہمیں اباجان کے سامنے چونکتے ہوئے نہیں دیکھا ہے۔ جانگ قبیلے سے متعلق جو بھکشو مستقل یہاں رہتے ہیں، وہ بھی چاروں طرف نظر رکھتے ہوں گے لیکن ہم میں سے کوئی بھی یہاں سے نہیں اُٹھ سکتا تھا، کوئی بھی نہیں۔ جامو نے کئی بار جماہیاں لے کے اپنی تھکن اور اکتاہٹ کا اظہار کرنا چاہا، انھوں نے توجہ نہیں دی۔

پھر رات کو کسی وقت چن وسا کے پانچوں بوڑھے ساتھی ٹوپوں اور کمبلوں سے اپنے جسم ڈھانپ کے کسمساتے ہوئے اچانک اُٹھ کھڑے ہوئے۔ شاید اب اُن کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ انھوں نے رسمی انداز میں ہم سے معذرت چاہی اور باہر نکل گئے۔ بجھل ہونٹ مسلنے لگا۔ اُن کے جاتے ہی جامو نے کچھ کہنا

چاہا مگر تجل نے اشارے سے اُسے روک دیا۔ "تیرے ساتھ ایسا ہونا نے جامو کستاد!" وہ تھکی ہوئی آواز میں بولا۔ "اِن لوگوں نے ہم پر بھروسا کیا ہے، سویرے ٹکڑوں کوں کرلینا۔ ابھی رات باقی ہے۔"

اور اُس وقت تجل کے لہجے اور اشارے سے مجھ پر یہ خدشہ کسی حقیقت کی طرح آشکارا ہوا کہ ان میں سے کوئی ہندوستانی سے واقف ہو سکتا ہے۔ جامو نہیں سمجھا۔ اُس نے حجت کی تو تجل نے اُسے ڈانٹ دیا۔ جاتے ہوئے چن وسا نے ہم سے کچھ نہیں کہا تھا اس لیے ہم اُسی کوٹھری نما کمرے میں لیٹ گئے۔ بہت دیر بعد جب مکان میں ہر آہٹ معدوم ہو گئی تو تجل میرے قریب کھسک آیا اور میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ "شہزادے! بدن کو نیچے ہی رکھنا۔"

"نہ جانے مجھے کیا ہو رہا ہے۔" میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

اُس نے مجھے اپنے بازوؤں میں کھینچ لیا۔ "کھونٹے پہ بندھا رہ لاڈلے!"

"میرا جی اُڑ رہا ہے۔"

"جی کو میان میں ہی رہنے دے۔"

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" میں نے ڈوبتی آواز میں کہا۔

"ٹھیک ہی ہو رہا ہے جانی!" وہ سرسراتے لہجے میں بولا۔

"میرا دماغ پھٹ جائے گا۔"

"تو اتنا بوجھ کیوں اُٹھاتا ہے، بس آنکھیں کھلی رکھ۔"

"کاش میری آنکھیں بند ہو جائیں!"

وہ مجھے تھپکنے لگا۔ "اپنا نہیں تو دوسروں کے ہاتھ پیروں کا ہی دھیان کرلے۔"

"ہم یہاں بیٹھے ہیں۔" میں نے دہشت سے کہا۔

"پر چھت کے نیچے ہیں۔"

"فرض کرو، اگر آج ہی وہ وہاں سے نکل گئے تو؟..."

"اِس سے بھلا اور کیا ہو گا رے!"

"لیکن پھر۔ پھر...!"

"پھر بہت سا منتا ختم ہو جائے گا، پر ایسا دِکھتا نہیں ہے۔"

"مگر تم نے سوچا کیا ہے؟"

اُس نے آنکھیں میچ لیں اور چُپ رہا۔

"مجھے بتانے میں کوئی حرج ہے؟"

"کوئی حرجا نہیں۔"

"تو پھر زبان کیوں نہیں کھولتے؟"

"زبان سالی اینٹھ رہی ہے۔"

"مجھے معلوم تھا، تمھارا جواب یہی ہو گا۔"

"تو کُہنی کیوں مارتا ہے۔" وہ درشتی سے بولا۔

"ایک بات کہوں؟" میں نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

"بول۔!"

"باقی سب لوگوں کو واپس کر دو۔"

"تیرا گھڑیال ٹھیک نہیں چل رہا ہے۔" اُس نے زور سے میرے بال پکڑ لیے۔

"تمھارا تو ٹھیک چل رہا ہے۔"

"بدل لے پھر۔" وہ ہنک کے بولا۔

میں نے پھر اُس سے بات نہیں کی لیکن نہ اُسے نیند آئی، نہ مجھے۔ ہم دونوں چُپ پڑے رہے تھے۔ جامو، مارٹی اور سُولم تھوڑی دیر بعد ہی سو گئے تھے اور ہلکے خراٹے لے رہے تھے۔ شاید دس پندرہ منٹ اور گزرے ہوں گے کہ دفعتہً تجل اُٹھ کے بیٹھ گیا اور میرا بازو ہلا کے کہنے لگا۔ "لاڈلے! ذرا گھڑی دیکھ۔"

ہم میں سے صرف مارٹی کے پاس گھڑی تھی۔ میں نے جلدی سے اُس کے کمبل میں ہاتھ ڈال کے جیب ڈھونڈنی چاہی۔ مارٹی ہڑبڑا اُٹھا۔

"ٹائم بتا دے، مارٹی!" میں نے آہستگی سے کہا۔

مارٹی گھبرا گیا۔ میرا ہاتھ اُس کے منہ کے قریب ہی تھا تاکہ اگر وہ زور سے بات کرے تو اُس کا منہ بند کر دوں۔ مارٹی کا ہاتھ سیدھا میری گردن پر آیا تھا لیکن دوسرے لمحے وہ ٹھہر گیا۔ "کیا بات ہے راجا اُستاد؟" وہ حیرانی سے بولا۔

"بات مت کر، ٹائم بتا دے۔"

مارٹی کی گھڑی میں تین بجے تھے۔ میں نے تجل کو بتایا تو وہ تیزی سے کھڑا ہو گیا۔ مارٹی کو اُس نے اُٹھنے نہیں دیا۔ چن وسا باہر جاتے ہوئے دروازہ بھیڑ گیا تھا اور ہم نے معمول کے مطابق اندر سے کُنڈی نہیں لگائی تھی۔ تجل پنجوں کے بل لپکتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا اور چند لمحے وہیں ٹھٹکا کھڑا رہا۔ دروازے کے پار کوئی آہٹ نہیں تھی۔ تجل نے آہستگی سے کُنڈی پکڑی پھر آہستہ آہستہ کواڑوں کو اندر کی طرف کھینچا۔ میں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تھی مگر اُس نے میرے سینے پر ہاتھ مار کے مجھے پیچھے ہی رہنے دیا اور خود کواڑ تھامے رہا۔ اُس کی تاخیر سے مجھے اُلجھن ہو رہی تھی۔ دروازہ ذرا سا کھلا ہو گا کہ ایک ہلکی چرچراہٹ کی آواز اُبھری اور سرد ہوا کا ایک تھپیڑا میرے گالوں سے ٹکرایا۔ مجھے جھرجھری آگئی۔ تجل بھی رُک گیا۔ دروازے کے کُھلے ہوئے حصے سے اُس نے آنکھیں لگا کے باہر دیکھا، باہر گہرا اندھیرا تھا۔ نہ جانے تجل کو کیا ہوا کہ اُس نے ارادہ بدل دیا اور کواڑ کھسکانے کے بجائے انھیں ایک دم کھول دیا۔

ہم کسی ضرورت کے تحت بھی رات کو اپنے کمرے سے نکل سکتے تھے۔ یہ قید خانہ نہیں تھا، ایک مکان تھا جہاں ہم مہمان تھے۔ تجل گھر کے کسی مکین کو اپنے کمرے سے باہر نکلنے کی خبر کرنا نہیں چاہتا تھا مگر

بھاری دروازہ آواز کے بغیر نہیں کُھل سکتا تھا ورنہ دیر بہت ہو جاتی۔ چن وسا کے گھر کی مکانیت سے ہم اچھی طرح واقف ہو چکے تھے۔ وہ کوئی پیچیدہ اور بڑا مکان نہیں تھا۔ قبیلے کے عام مکانوں کے لحاظ سے بڑا، شہروں کے مکانوں کی نسبت سادہ۔ ایک طرف دو کمرے بنے ہوئے تھے جن میں سے ایک میں ہم تھے، دوسرے میں سلطان۔ اُن کے آگے پختہ چھت کا ایک مختصر سائبان۔ سائبان بائیں طرف بھی انگریزی حرف ایل کی طرح چار دیواری تک چلا جاتا تھا۔ جہاں کوٹھریوں جیسے چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے۔ چن وسا، اُس کی بیٹی اور ملازم انھی میں رہتے تھے۔ سائبان کے بعد ایک کشادہ صحن تھا۔ ہمارے کمروں کے پچھواڑے بھی ایک تنگ سائبان کے ساتھ تھوڑا سا صحن تھا۔ ہر طرف درخت اور مختلف پودے لگے ہوئے تھے۔ پتھر کی ایک چھوٹی موٹی اور اُونچی نیچی دیوار سارے مکان کا احاطہ کرتی تھی۔ زمین نسبتہً ہموار تھی۔ ہمیں غسل خانے وغیرہ کے لیے سامنے صحن کی طرف کُھلنے والے دروازے سے نکل کے پیچھے جانا پڑتا تھا، کمروں میں صرف ایک ہی دروازہ تھا اور عقبی دیوار پر روشن دان کے مانند ایک کھڑکی تھی جو عموماً بند رہتی تھی۔ چھت کے ساتھ دیواروں پر بھی ایسے ہی موکھے بنے ہوئے تھے جنھیں درختوں کی چھال یا کسی اور قسم کے کپڑوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔

تجل نے مارٹی کو ہاتھ کے اشارے سے جاگتے رہنے کی ہدایت کی اور باہر نکل آیا۔ ہر سُو قبرستان جیسی خاموشی اور قبر جیسا اندھیرا تھا۔ قریب و دُور کی کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی۔ باہر آ کے اندازہ ہوا کہ ہَوا اچھی خاصی تیز ہے۔ میری انگلیاں ٹھٹھرنے لگیں۔ پیروں میں ہم اُونی جرابیں پہنے ہوئے تھے۔ میں نے تجل کا ہاتھ تھام لیا۔ ہم اندھوں کی طرح ہاتھ پھیلائے ٹٹول ٹٹول کے سائبان کے فرش پر قدم رکھ رہے تھے۔ پہلے رات کو کسی وقت باہر نکلنے کا اتفاق ہوتا تو ہم مشعل ساتھ رکھتے تھے۔ ساری رات سائبان کے ایک کونے میں بھی مشعل جلتی رہتی تھی۔ آج وہ بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ چن وسا کے ساتھی جاتے ہوئے اُسے اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے۔ تجل کی جیب میں بیٹری بھی ہو گی لیکن بیٹری اُسے استعمال نہیں کرنی چاہیے تھی۔ ہم نے قدموں کے اندازے سے سائبان کا فاصلہ طے کیا اور تھم پکڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ نیچے صحن میں اُترنے کے لیے سیڑھیاں تھیں۔ ہم تھم کے ساتھ چپکے ہوئے نیچے اُتر گئے۔ پہلے تجل، پھر میں۔ کپڑوں کے باوجود صحن میں قدم رکھتے ہی ایسا محسوس ہوا جیسے ہم ٹھنڈے پانی میں اُتر گئے ہوں۔ سردی سے میرے ہونٹ پھڑکنے لگے تھے۔ چند لمحوں میں کتنی ہی بار میں نے سر کو جھٹکا دیا۔ یہ گہرا اندھیرا کہر کی وجہ سے تھا، یخ بستہ کہر۔ پہلے ہی دو چار قدموں میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ باقی فاصلہ طے کرنا آسان نہیں ہے۔ میں تجل سے لوٹنے کے لیے کہنا ہی چاہتا تھا کہ وہ اور آگے چل پڑا۔ بیٹری اُس نے اب بھی روشن نہیں کی تھی۔ ہم تقریباً ایک ایک دو دو انچ کھسکتے ہوئے چار دیواری کی طرف بڑھتے گئے۔ ہم دونوں نے اپنے چہرے پوری طرح ڈھانپ رکھے تھے۔ صحن کے درختوں سے بچتے ہوئے ہم کسی نہ کسی طرح دروازے تک پہنچ گئے۔ دیوار پتھروں کی تھی اور زیادہ اونچی نہیں تھی۔ ہم کود کے بھی مکان کے باہر ہو سکتے تھے۔ میں ایک موہوم اُمید کے سہارے ہی تجل کا ساتھ دے رہا تھا کہ شاید دیوار کے اُس پار ایسا اندھیرا نہ ہو۔ تجل نہ جانے کس وجہ سے چپ تھا۔ غالباً مجھے یہ باور کرانے کے لیے کہ میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں اور بعد میں اُس سے کچھ کہنے کے لیے میرا منہ نہ پڑے۔ مکان میں کوئی شخص نہیں جاگا تھا۔ ہماری چاپیں صرف ہمی تک محدود رہی تھیں۔ کھردرے پتھروں پر پیر ٹکا کے ہم دونوں نے ایک ساتھ اپنے سر اُوپر کیے۔ تجل دیوار پر چڑھ گیا تھا کہ میں نے اُس کے پیر پکڑ لیے۔ ہم نے آپس میں بات کرنے سے پرہیز کیا۔ چار دیواری کے باہر تاحدِ نظر صرف ایک چیز نظر آتی تھی۔ بس دُھند جیسے برف سے سیاہ دُھواں اُٹھ رہا ہو اور ساری فضا پر چھا گیا ہو۔ آگے اُونچی پہاڑیاں تھیں اور آڑی ترچھی پگ ڈنڈیاں، ہمارے پیروں سے نامانوس راستے ہم کسی طرف بھٹک جاتے تو صبح تک کبھی لوٹ نہ پاتے۔ بستی سے مندروں کا علاقہ اتنی دُور نہیں تھا پھر بھی چند میل سے کم نہیں تھا اور ساری کی ساری چڑھائی تھی۔ بیٹری بھی ساتھ نہ دیتی۔

سائبان تک ہم رینگتے ہوئے واپس آئے لیکن سائبان میں آ کے ہم نے اپنی رفتار معمول کے مطابق کر لی۔ تجل نے بیٹری جلا دی۔ یہ جیسے اپنی آنکھیں واپس مل گئیں۔ سائبان میں بھی دُھند تھی اور بیٹری کی روشنی بھی اُس میں دُھندلا گئی تھی۔ بہرحال اب گھر کا کوئی مکین جاگ جاتا ہمیں اتنی فکر نہیں تھی۔ ہمارا کمرہ سامنے تھا۔ تجل اندر جانے کے بجائے سلطان کے کمرے کی طرف مُڑ گیا۔ اُس کا خیال ہو گا کہ باہر نکلے ہیں تو ایک نظر سلطان کو بھی دیکھ لیں۔ اسی کمرے میں ہمارا سامان رکھا ہوا تھا۔ دروازہ بند تھا۔ ظاہر ہے، اندر سے کُنڈی نہیں لگی ہو گی۔ تجل نے دروازے پر ہاتھ رکھ کے اُسے جھٹکا دیا تو وہ ایک ہلکی آواز کے ساتھ کُھل گیا۔ کمرے میں مدھم روشنی تھی لیکن اندر کا منظر دیکھ کے ہماری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ کمرے میں ایک اُونچی جگہ سلطان لیٹا ہوا تھا اور کوئی اُس کے سینے پر نیم دراز تھا۔ دروازہ کُھلتے ہی ایک گُھٹی ہوئی سسکی بلند ہوئی۔ وہ بجلی کی طرح سلطان کے سینے سے اُٹھ کے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہمیں دیکھنے لگی۔ تجل نے بیٹری کی روشنی اُس کے چہرے پر پھینکی تو اُس نے پھیر لیا اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔ ہمیں اُسے پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔ وہ چن وسا کی لڑکی تھی۔ گھر میں آتے جاتے بارہا ہمارا اُس سے آمنا سامنا ہوا تھا۔ ایک لمحے کے تذبذب کے بعد تجل نے بیٹری

دی اور دروازہ بھیڑ کے اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔

سلطان کو اپنی سُدھ بُدھ نہیں تھی۔ چن وسا کی نوجوان لڑکی تشانم کا سَر اُس کے سینے پر رکھا ہوا تھا۔ مجھے اپنی بینائی پر شبہ ہوا۔ تجھل کی بھی یہی حالت ہوگی۔ نہ جانے ہم نے کیا دیکھا تھا۔ روشنی میں تشانم کا رنگ چمک رہا تھا۔ میں نے اُسے دن میں بھی دیکھا تھا۔ وہ ایک شرمیلی اور نازک سی لڑکی تھی۔ اُس کے بال کورا کے بالوں کی طرح اتنے لمبے تھے کہ کولھوں تک آتے تھے۔ چہرے کا سنہرا رنگ دمکتا تھا۔ کوئی بھی ایک بار اُسے دیکھ لے تو بار بار دیکھنے کو جی چاہتا ہوگا۔ اُس کی آنکھیں بڑی بڑی اور شربتی تھیں۔ تجھل نے اُسے چند تحفے دیے تھے تو اُس کے گالوں پر سُرخی چھا گئی تھی۔ اُس وقت سلطان نے اپنے ہاتھ سے اُسے چوڑیاں پہنائی تھیں مگر یہ چار ہی دن پہلے کی بات تھی۔

کواڑ کھلا تو ہماری نظر سب سے پہلے مارٹی پر پڑی۔ وہ دروازے کے پاس ہی کھڑا تھا، ہاتھ میں کھلا چاقو تھا۔ تجھل نے اُس کے گال اور کان تھپ تھپائے اور آتش دان کی بھوبل میں پھونکیں مارنے لگا۔ مارٹی نے اُس میں کچھ اور لکڑیاں ڈال دیں۔ تجھل کچھ دیر تک ہاتھ تاپتا رہا پھر آکے چپ چاپ بیٹھ گیا۔ نہ اُس نے مجھ سے کچھ کہا، نہ میں نے اُس سے مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔

مجھے توقع تھی کہ صبح ہوتے ہی تجھل باہر نکلنے میں جلدی کرے گا لیکن وہ دیر میں بستر سے اُٹھا، پھر یوں ہی خاموش بیٹھا وقت گنواتا رہا۔ آج پہلا دن تھا کہ خلافِ معمول چن وسا ناشتے کے دوران ہمارے درمیان موجود نہیں تھا۔ اُس کے خادم نے بتایا کہ وہ سویرے ہی کسی کام سے باہر چلا گیا تھا اور اُسے ہدایت کر گیا تھا کہ مہمانوں کا خیال رکھنا۔ روز کی طرح منہ ہاتھ دھونے کے لیے گرم پانی تیار تھا۔ چن وسا کی خادمہ دودھ اور مکھن میں گندھے ہوئے جوار کے آٹے کی گرم روٹیاں، اچار اور جانگ قبیلے کا مخصوص ساگ لا رہی تھی۔ ہم سب نے کئی کئی پیالیاں چائے پی۔ خلافِ معمول آج تشانم بھی ہمارے سامنے نہیں آئی تھی۔ ناشتے کے بعد خاصا وقت گزار کے تجھل سلطان کے کمرے میں گیا۔ سلطان بستر میں دبکا ہوا چائے پی رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر تازگی تھی اور بالکل ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ رات اُسے گہری چوٹ لگی ہے۔ ٹیلیس کھلی ہوئی تھی مٹی کے ایک کونڈے میں آگ دہک رہی تھی اور سلطان اپنا پیر سینک رہا تھا۔ تجھل نے اُس سے رات کے متعلق کوئی بات نہیں کی، نہ ہی زیادہ دیر وہاں ٹھیرا۔ جب ہم اُسے چھوڑ کے جانے لگے تو سلطان بے چینی سے بولا "اب میں چل سکتا ہوں اُستاد!"

تجھل نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ پلٹ کے اُسے دیکھا اور ٹھیری ہوئی آواز میں بولا "ایک دن اور بتا لے رے، تیرے دن ویسے بھی مجھے کم دکھائی دیتے ہیں۔"

سلطان پلکیں جھپکانے لگا "تم کیا... کیا؟..." وہ ہکلانے لگا۔

"ٹھیک ہی بول رہا ہوں سلطانے شاہ!"

"تم مجھ سے کچھ خفا لگتے ہو۔" وہ لنگڑاتا ہوا کھڑا ہوگیا۔

"خفا تو تو ہم سے کچھ ہوگیا ہے ساجن؟" تجھل سرد لہجے میں بولا۔

"مجھ کو بتاؤ۔" سلطان چیخ کر بولا لیکن پھر اُس کی آواز خود بخود ماند پڑ گئی اور وہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولا "سلطانے کو غلط مت سمجھو استاد!"

تجھل کے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے کھلے اور بند ہوگئے۔ وہ صرف سَر ہلا کے رہ گیا اور مجھے چلنے کا اشارہ کیا۔ جامو، سولم اور مارٹی حیرت سے اُن دونوں کو تک رہے تھے۔ جامو وہیں رُک گیا۔ دروازے سے گزرتے ہوئے تجھل مڑ کے بولا "جامو! سلطانے اُستاد کے بدن میں مجھ کو کچھ چربی بڑھی ہوئی لگتی ہیں۔ ہو سکے تو ان کو چھانٹ دے۔ استاد کو شاید پھر رنگ دکھائی دینے لگے۔"

"اُستاد!۔ تجھل بھائی!" سلطان ہذیانی انداز میں بولا۔

تجھل اُس کے کمرے سے چلا آیا اور مجھے باہر آکے معلوم ہوا کہ اُس نے سامان کے لیے خادم کو قلی بلوانے بھیجا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آج پھر تجھل کا بازار لگانے کا ارادہ ہے۔ بازار سے واپس آتے آتے دوپہر ہو جائے گی۔ چند گھنٹے تو وہاں گزارنا ہی پڑیں گے۔ اُس نے صرف دو ٹرنک سامان اٹھوایا تھا۔ ہم قلیوں کے پیچھے چلنے لگے تو جامو بھی اندر سے آگیا۔ اُس کے چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ اُسے دیکھ کے تجھل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تیرنے لگی۔ سارے راستے جامو نظریں جھکائے چلتا رہا۔ اور دِنوں کی طرح بازار میں خوب چہل پہل تھی۔ ہم نے سامان نکالا تو دیکھتے دیکھتے بھیڑ جمع ہوگئی۔ تجھل نے آج بھی کوئی رعایت نہیں کی۔ وہ بہ ظاہر چیزوں کے دام بتا رہا تھا لیکن اُس کے لہجے میں تیزی اور چستی نہیں تھی۔ کبھی دام اتنے اُلٹ پُلٹ بتا دیتا کہ بعد میں تردید کرنی پڑتی۔ میں اُن سے الگ تھلگ ایک گوشے میں اپنے آپ کو سمیٹے بیٹھا تھا۔ میں نے نہ کسی گاہک سے بات کی، نہ سامان کو ہاتھ لگایا۔ تھوڑی سی چیزیں بکی ہوں گی کہ اُس نے یکایک سامان پھر سے ٹرنکوں میں بھرنے کو کہا اور قلیوں کو اُسے گھر پہنچانے کی ہدایت کی۔ میری رگوں میں سن سناہٹ ہونے لگی۔ اب ضرور تجھل کا اوپر جانے کا ارادہ ہوگا۔ اُدیرا باجان موجود ہیں مگر کیسے؟ میں جتنا سوچتا، اتنا ہی میرے دماغ میں اندھیرا ہونے لگتا۔ آج موسم میں کوئی غیر معمولی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ آج کا دن بھی کل کی طرح تھا لیکن تجھل کے اچانک اُٹھ جانے کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ اُس کے ذہن میں کوئی بات ضرور آئی ہے۔

آج چھٹا دن تھا۔ پیرو، زورا، سارنگے، منّن میاں، پلٹو، ہلاکو، جینی اور وزیر میں سے کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ اُن سب کو ایک ساتھ ہی آنا تھا۔ تجھل نے اُن سے اپنے جانے کے چار روز بعد بستی کا رُخ کرنے کو کہا تھا۔ وہ بستی سے زیادہ دُور نہیں تھے مگر وہ جگہ جانگ قبیلے کی حدود میں نہیں آتی تھی جہاں ہم اُن سے جُدا ہوئے تھے۔ وہ اگر راستہ گھوم کے نہ آتے تو زیادہ سے زیادہ دوپہر لگتے، کوئی ایسی ہی بات ہوگئی ہوگی۔ کوئی بھی بات ہو سکتی تھی۔ اُدھر جنگل بیابان تھا۔ قریب کوئی بستی بھی نہیں تھی۔ ہم نے جان بوجھ کے اُن کے پڑاؤ کے لیے ایک سنسان جگہ منتخب کی تھی۔ یہاں آنے کے بعد ہمارا اُن سے کوئی رابطہ نہیں ہو سکتا تھا۔ نہ یہاں سے کوئی جا کے اُن کی خبر لے سکتا تھا اور نہ وہاں سے کوئی آکے ہمیں اُن کے نہ آنے کا سبب بتا سکتا تھا۔ ایک دن کی دیر ہو سکتی تھی مگر اب دو دن گزر گئے تھے۔ اُنھیں خود جلد سے جلد ہم تک پہنچنے کی فکر ہوگی کہ کہیں قبیلے میں ہم پر کوئی افتاد نہ پڑ گئی ہو۔ اُنھیں اس حقیقت کا بخوبی احساس ہوگا کہ بستی میں ہمارا قیام بستی کے باشندوں کی مرضی پر منحصر ہے۔ ہم اپنے قیام کو طول دینے کا کوئی نہ کوئی معقول عذر اُنھیں ضرور پیش کریں گے لیکن اُسے قبول کرنے نہ کرنے کا سارا دار و مدار قبیلے کے لوگوں اور اُس کے سردار پر ہے اور اُنھیں یہ بھی احساس ہوگا کہ ہم جس مقصد کے لیے آئے ہیں قبیلے میں جا کے فی الفور ہمارا اُس سے سامنا پڑ سکتا ہے۔ تجھل نے سامان بچا بچا کے رکھا تھا تاہم قبیلے کے لوگوں کے خیال میں یہاں ہمارا قیام تجارتی اعتبار سے سودمند ثابت نہیں ہو رہا تھا تو ہمیں جلد ہی آگے کہیں اور چلے جانا چاہیے تھا۔ موسم بھی خراب نہیں تھا کہ آگے سفر کرنا ناممکن ہو۔

پیرو کے نہ آنے سے اب تک اُس کی کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی تھی بلکہ ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا تھا۔ کم وقفے میں یکے بعد دیگرے دو تجارتی قافلوں کی آمد کو قبیلے کے لوگ اتفاق سمجھنے میں اکراہ کرتے۔ گو ہماری پوری کوشش ہوتی کہ ہم یہ اکراہ دُور کریں۔ جُدا ہونے سے پہلے بستی میں دوبارہ ملنے کے متعلق ہمارے سامنے تجھل نے پیرو سے ہر بات صاف کر لی تھی۔ اُس وقت کچھ لوگوں کو دُور روک دینا ہی مناسب تھا۔ ایک ساتھ اتنے لوگوں کا بستی میں داخل ہونا موجودہ صورت کے مقابلے میں کسی کو بھی بہتر نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ہم آگے کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہوئے بھی کچھ نہیں جانتے تھے۔ ایسی صورت میں کچھ لوگوں کا پیچھے آنے کے لیے باقی رہنا اور پیچھے رہ جانے والوں کے لیے آگے چند لوگوں کا پیش قدمی کرنا ہی ٹھیک تھا۔ جانگ قبیلے کی مختلف بستیوں میں چار دیواریاں کھنچی ہوئی نہیں تھیں۔ کوئی بھی شخص یہاں آ جا سکتا تھا چنانچہ بستی کے مکین پہلے پہنچنے والے اجنبیوں سے فوراً ہی کوئی معاندت نہ رکھتے۔ اُنھیں اُن کی آمد کا مقصد پہچاننے میں کچھ وقت ضرور لگتا کہ اتنی دیر میں دوسرے لوگ پہنچ جاتے۔

آخری منزلوں میں ہم نے قلی بھی ایسے منتخب کیے تھے جو آگے جانے کے بجائے پیچھے واپس ہو جائیں۔ پھر پیرو سے الگ ہو کے جانگ قبیلے میں داخل ہونے سے پیشتر ہم نے ایک اور منزل پر پڑاؤ کیا تھا اور وہاں بھی قلی بدل دیے تھے۔ سارے سفر میں ہم قلیوں سے یہی کہتے آئے تھے کہ ہم دو قافلے ہیں، دونوں کی منزلیں مختلف ہیں۔ جہاں تک منزلیں یکساں ہیں، وہیں تک ساتھ ہے اور پیرو کے آجانے کے بعد ہم کُھل کے قبیلے والوں سے یہ اعتراف کر سکتے تھے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں ہیں۔ ہم نے سفر کا ایک بڑا حصہ ساتھ کاٹا ہے۔ بعد میں اُنھیں کسی ذریعے سے ہمارے سفر کی رفاقت کے سلسلے میں خبر مل جاتی تو آپس میں شناسائی کے اس اعتراف کے بعد اس خبر کی حیثیت اُن کے لیے انکشاف کی نہ ہوتی اور پیرو بستی میں آکے اُنھیں یہ کہہ کر خاموش کر سکتا تھا کہ اُس کا بیشتر سامان دوسری بستیوں میں فروخت ہو چکا ہے۔ باقی کے لیے اُس نے جانگ قبیلے میں اپنی قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا ہے جس کا اس نے دوسری بستیوں میں بہت شہرہ سُنا تھا اور اُسے معلوم تھا کہ ایک اور قافلہ بھی اُس طرف سامان لے کے گیا ہے۔ ضروری نہیں تھا کہ قبیلے میں سب سے پہلے اُن کی مڈبھیڑ ہمی سے ہو اور ہمیں اُنھیں یہ بتانے کا موقع مل جائے کہ وہ کس قسم کی بات کریں۔ قبیلے والوں کے سامنے ہم دونوں کے روبہ رو ہونے پر پیرو کا ردِ عمل تجھل کے طرزِ عمل سے مشروط ہوتا کہ وہ ایک دوسرے سے کس حد تک واقفیت کا اظہار کریں۔ یہ جانچنے کے لیے پیرو کو چند ہی لمحوں کی مہلت درکار ہوتی۔

اُنھیں بہرصورت اب آجانا چاہیے تھا۔ چلتے چلتے مارٹی اور جامو کی نظریں اپنے اردگرد پہاڑیوں پر منڈلانے لگتی تھیں۔ ابھی چند لمحے ہوئے، ہمارے پیچھے بستی میں اچانک شور اُٹھا تھا۔ سب یہی سمجھے کہ وہ آگئے ہیں لیکن پتہ چلا کہ ایک برفانی ریچھ بستی میں گھس آیا ہے اور کہیں چھپ کے بیٹھ گیا ہے۔ بستی والے اُس کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ اندیشہ ہے کہ وہ قبیلے کی کسی عورت یا بچے کو پکڑ کے نہ لے جاتے۔ جتنا وقت بیت رہا تھا، طرح طرح کے وہم آ رہے تھے۔ منّن میاں کی حالت ویسے بھی ٹھیک نہیں تھی۔ وزیر بھی کئی بار بیمار پڑ چکا تھا۔ وہ راستہ بھی بھٹک سکتے تھے۔ ممکن ہے اُنھیں قلی نہ مل سکے ہوں۔ اُن کے ساتھ بڑی تعداد میں سامان تھا۔ قبائلی قزاق بھی اُن کے آڑے آسکتے ہیں۔ کچھ بھی ممکن تھا۔

ابھی ہم بستی ہی میں تھے کہ راستے میں تجھل نے ایک بوڑھے آدمی کورو کے چن وسا کے متعلق دریافت کیا۔ تھوڑی سی تگ و دو کے بعد چن وسا سردار کے مکان کے قریب ایک عمارت سے باہر آتے ہوئے ہمیں مل گیا۔ سولم نے تجھل کی ترجمانی کی۔ تجھل نے کہا تھا کہ وہ اپنے معزز مہمان کی وساطت سے قبیلے کے سردار سے ملنا چاہتا ہے۔ یہ سن کے چن وسا کچھ متذبذب سا ہوگیا اور کوئی جواب دیے بغیر عمارت کے اندر چلا گیا۔ ہم باہر ہی ٹھیرے رہے۔ چن وسا واپس آیا تو اکیلا نہیں تھا۔ ایک معمر شخص بھی اُس کے ہمراہ تھا۔ دونوں نے جواب طلب نظروں سے ہمیں دیکھا لیکن کوئی سوال نہیں کیا اور کسی قدر تیز رفتاری سے ایک سمت چل پڑے۔

جتنا ہم آگے بڑھتے گئے، پگ ڈنڈی کشادہ ہوتی گئی۔ اونچائی کا ایک مختصر فاصلہ عبور کرنے کے بعد ہم سردار کے مکان کے سامنے موجود تھے۔ پہلے دن جب ہم سردار سے ملے تھے اور نوواردوں کی روایت کے مطابق ہم نے اُسے تحائف پیش کیے تھے تو وہ جگہ اور تھی۔ کچھ نیچے، اسی عمارت کے نزدیک۔ یہاں وہ خود رہتا تھا۔ پتھر کی اُونچی نیچی دیواریں ایک بڑے رقبے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ باہر دروازے پر کوئی خاص پہرا نہیں تھا۔ آس پاس اور بھی کئی لوگ اُدھر سے گزرتے ہوئے ہمیں نظر آئے ہم فصیل نما چار دیواری کے باہر انتظار کرتے رہے۔ ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کچھ ہی دیر میں ایک مستعد نوجوان بلند دروازے پر ظاہر ہوا۔ اُس کے حکم پر پہرے دار ایک طرف ہو گئے۔ دروازے میں قدم رکھتے ہوئے میرے پیر ڈگمگانے لگے۔

سامنے کوئی سو گز کی دُوری پر چھوٹی بڑی کئی عمارتوں کے بیچ میں ایک بلند و بالا دو منزلہ عمارت کھڑی تھی۔ سب سے پہلے اُسی پر نظر جاتی تھی کیونکہ وہی ان میں سب سے نمایاں تھی اور کسی قدیم چینی محل کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی۔ ڈھلواں چھت، اُوپری منزل پر اَن گنت دروازے، نیچے سے پھیلی ہوئی اُوپر جاتے جاتے ایک گول دائرے میں سمٹتی گئی تھی۔ اطراف میں قسم قسم کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ باغیچے میں بھی مختلف رنگوں کے پتھر کی لاٹیں ایستادہ تھیں۔ چار دیواری کے ساتھ اُونچے گھنے درخت تھے اور اُن کے درمیان کہیں کہیں کٹیائیں بنی ہوئی تھیں۔ اندر دروازے کے پاس ہی ایک اُونچی پہاڑی پر چشمہ پھوٹ رہا تھا اور اُس کے گرتے ہوئے پانی پر کسی آبشار کا گمان ہوتا تھا۔ کبھی یہ کورا کا گھر تھا۔ اسی دروازے سے گزر کے وہ بستی میں جاتی ہوگی۔ اس جگہ کے چپے چپے نے اُسے دیکھا ہوگا اور چپے چپے پر اُس کے قدموں کے نقش ثبت ہوں گے۔ میں کورا کے گھر میں تھا۔ جہاں اُس نے آنکھ کھولی تھی اور سارا بچپن، لڑکپن گزارا تھا۔ یہ سب کچھ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میں پہلے بھی یہاں آ چکا ہوں۔ کبھی کورا مل گئی تو میں اُسے بتاؤں گا کہ میں درونگ بستی کی سب سے اُونچی پہاڑی پر واقع اُس کے گھر گیا تھا تو اُسے یقین نہیں آئے گا۔ میں نے دل میں طے کیا تھا کہ ثبوت کے لیے یہاں کی کچھ مٹی جیب میں رکھ لوں گا۔ کہتے ہیں مٹی میں خوشبو ہوتی ہے۔ کورا یہ خوشبو پہچان لے گی سو وہ بہت حیرت زدہ ہوگی اور تب اُسے یقین آ جائے گا کہ میں کہاں کہاں گیا۔ کاش وہ اندر ہی موجود ہوتی۔ مجھے یہاں دیکھتی تو اُسے سکتہ سا ہو جاتا۔ سمجھتی کہ خواب دیکھ رہی ہے۔ آج سورج مشرق کے بجائے مغرب سے کیسے طلوع ہو گیا۔

میری آنکھیں سُن ہو گئی تھیں یا جیسے میں چلتے چلتے سو گیا تھا۔ بتھل نے ٹہوکا مار کے مجھے چونکا دیا۔ ہم بڑی عمارت کے بیرونی ستونوں سے گزر رہے تھے۔ چن وسا اور اُس کا ساتھی ہمیں عمارت کے باہر کھڑے ہوئے ملے۔ اُن کے ساتھ اور لوگ بھی تھے۔ اُن سب کی معیت میں ہم عمارت میں داخل ہوئے۔ اندر سے عمارت خاصی سجی ہوئی تھی مگر کوئی غیر معمولی سرگرمی نظر نہیں آتی تھی۔ عمارت کے مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے ہمیں ایک بڑے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ کمرے کے وسط میں دیوار سے لگے ہوئے تخت پر قبیلے کا کسرتی جسم اور درمیانے قد کا سردار اشی گا بیٹھا تھا۔ اُس کا رنگ شہابی تھا۔ مونچھوں اور سر کے بالوں کا رنگ بھورا، دانت چھوٹے چھوٹے، پیشانی چوڑی، سینہ اُٹھا ہوا اور ہونٹ پتلے پتلے تھے۔ ہم پانچوں نے قبیلے کی رسم کے مطابق اُسے تعظیم دی اور جب تک اُس نے بیٹھنے کا حکم نہیں دیا، کھڑے رہے۔ سردار کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں کسی جگنو کے مانند چمک رہی تھیں۔ بتھل نے اُسے جڑاؤ دستے کا ایک قیمتی خنجر پیش کیا۔ سردار نے اُسے تین چار بار اُلٹ پلٹ کے دیکھا اور اُس کے ہونٹوں پر ایک ثانیے کے لیے مسکراہٹ نمودار ہوئی پھر وہ پہلو بدل کے ہماری جانب متوجہ ہو گیا۔ پہلے دن کی طرح آج بھی اُس کا چہرہ اُس کے اندرونی اضطراب کی صاف غمازی کر رہا تھا۔ وہ جلد سے جلد ہماری زبان سے کچھ سننے کے لیے بے تاب تھا۔ بتھل نے کچھ کہنے سے پہلے وہاں موجود دوسرے لوگوں کی طرف متردد انداز میں نگاہ ڈالی۔ سردار فوراً سمجھ گیا اور اُس نے اُن سب کو باہر جانے کا حکم دے دیا۔ چن وسا بھی چلا گیا مگر تخت کے پاس کھڑا ہوا ایک شخص موجود رہا۔

”سُولم! سردار سے بولو کہ ادھر قبیلے میں ہم اس کی خاطرداری سے بہت خوش ہیں۔“ بتھل کی بھاری آواز گونجی۔ ”اور بولو کہ اپنے پاس اُس کا بدل دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔“

سولم نے بتھل کی کہی ہوئی بات تبتی زبان میں سردار سے دہرا دی۔ سردار نے سر ہلایا اور خاموش رہا۔

”بولو کہ ہم کو رات چن وسا کی زبانی ساری بات کا پتہ چلا ہے۔ ابھی ہم اس بارے میں قبیلے یا سردار کے لیے کوئی بھی کام کر سکتے ہیں تو ہم کو بولو اور ہم پر بھروسا کرو۔ ذرا ٹھیک ٹھیک بولو۔“

ہم سب چونک پڑے۔ سردار بھی اپنی نشست پر جما نہ رہ سکا اور متحیر نظروں سے بتھل کو گھورنے لگا۔ ”مگر تم لوگ کیا کر سکتے ہو؟“ وہ اضطراری لہجے میں بولا۔

”ہم لوگ سوداگر ہیں۔ سودا کرتے پھرتے ہیں۔ چن وسا نے بولا ہے کہ اِدھر قبیلے کے لوگ بہت دنوں سے پریشان ہیں۔ اگر کاغذات قبیلے کو مل گئے تو قبیلہ اپنا سب کچھ، جو کچھ بھی اس کے پاس ہے اور اپنے سے الگ کر سکتا ہے، حوالے کر دے گا۔ ایسا ہے کہ نہیں ہے؟“

”ایسا ہی ہے۔“ سردار کی آواز لپکنے لگی۔ ”کیا تم.... تم اس سلسلے میں کچھ جانتے ہو؟“

”سودا اچھا ہے تو ایک بازی ہم بھی کھیلیں گے۔“

”کیا تم کچھ جانتے ہو؟“ اُس نے دوبارہ پوچھا۔

”ابھی کچھ نہیں سمجھو، پر جب جاننے کا جتن کریں گے تو جان بھی لیں گے۔“ بتھل نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

سردار کی چمکتی ہوئی آنکھیں بجھ گئیں۔ ”بہت دن ہو گئے۔“ وہ مایوسی سے بولا۔ ”بہت دن ہو گئے ہیں۔“

”ہم کو پتہ ہے، دن بہت ہو گئے ہیں۔“ بتھل اُونچی آواز میں بولا۔ ”پر تم لوگوں نے دن بیت جانے سے اُمید نہیں کھو دی ہے۔“

”قبیلے کا آخری آدمی اپنی آخری سانسوں تک اُنھیں دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہے گا۔“ سردار نے جوش میں کہا۔

”تو پھر اب ہم کو بھی اپنے ساتھ شامل سمجھو۔ ہم کو ساری بات بول دو۔ کاغذات کدھر رکھے تھے؟ لڑکی کیسی اور کس عمر کی تھی؟ اُس کا رنگ روپ.....“

”وہ ہندوستان میں ہے۔“ سردار تیزی سے بولا۔ ”اور ہندوستان کوئی چھوٹا ملک نہیں ہے۔ قبیلے کے ہزاروں آدمی نو سال سے اُسے ڈھونڈتے رہے ہیں۔ تم کہاں کہاں جاؤ گے۔ تم ہر گھر میں گھس کے اُسے نہیں دیکھ سکتے۔“

”کوئی بھی ایسا نہیں کر سکتا۔ پر ہم ہندوستانی لوگ ہیں۔ تمہارے مقابلے میں ہم اُدھر زیادہ کھوج کر سکتے ہیں اور کام کے لیے بہت سے آدمی اکٹھے کر سکتے ہیں۔ منظور ہو تو بولو۔“

”منظور!“ سردار تلخی سے بولا۔ ”قبیلے میں کس کو یہ نامنظور ہو سکتا ہے۔“

”پھر جو کچھ رات چن وسا سے ہم نے سُنا تھا۔ ہم سمجھیں، وہ ٹھیک ہے۔ ہماری ایک شرط اور بھی ہے کہ کامیاب واپسی پہ جا تک قبیلہ سدا کے لیے صرف ہمارے اور ہمارے بھیجے ہوئے قافلے کو راہ داری دے گا، کسی اور کو نہیں۔“

”سب ہم کو منظور ہے۔“ سردار کے لہجے میں اُکتاہٹ آگئی۔

”ایسا مت بولو سردار! بولنے سے پہلے سوچ لو۔“

”پہلے کاغذات لے آؤ، پھر بات پکی کرو۔“

”پہلے بات پکی کرو۔“ بتھل نے زور دے کر کہا۔

سردار اچھل کے تخت سے اُتر آیا اور سیدھا بتھل کے پاس گیا۔ بتھل بیٹھا رہا۔ سردار چند لمحوں تک خشمگیں نظروں سے اُسے دیکھتا رہا پھر اُس کے پاس سے ہٹ کے کمرے میں ٹہلنے لگا اور اچانک بھڑک کے درشتی سے بولا۔ ”تم قبیلے کے سردار کے سامنے ہو۔“

”ہم جانتے ہیں۔“ بتھل نے تھمی ہوئی آواز میں کہا۔ ”پر سردار ایک ضرورت مند ہے اور ہم سوداگر۔ یہ سودا عام سودا نہیں، الگ قسم کا ہے۔ چیزوں کا نہیں، جان کا ہے۔ ہم سے اس معاملے پہ بات کرنا ہے تو ایک سردار کی طرح نہیں، دکان دار اور گاہک کی طرح بات کرو۔ ویسے ہم تمہاری جگہ میں ہیں، ہم کو اس کی پوری جان کاری ہے۔“

”تم آگے بات کرو۔“ وہ تلملا کے بولا۔

”ابھی تمہاری سرداری کی مدت کتنی رہ جاتی ہے؟“

”سات مہینے۔“ اُس نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

”بہت ہے۔“ بتھل نے آہستگی سے کہا۔ ”شاید ہم کو اتنا ٹائم نہیں لگے۔ ہم کو چار مہینے کا ٹائم بہت ہوگا۔“

”چار مہینے۔! کیسے چار مہینے؟“

”چار مہینے میں ہم یا تو تمہاری امانت تم کو لوٹا دیں گے یا پھر کبھی لوٹ کے نہیں آئیں گے۔“

”مگر تم..... تم اتنے اعتماد سے کیسے کہہ رہے ہو؟“ سردار کی آواز میں ایک خفیف سی لرزش پیدا ہو گئی تھی۔

”یہ سوچنا تمہارا کھٹ راگ نہیں ہے۔ تم ہر ہرے پر نظر رکھو۔“

”تم کیا چاہتے ہو؟“

”دیکھو سردار!“ بتھل اپنی نشست سے اُٹھ کے اُس کے تخت کے قریب آگیا اور دھیمے لہجے میں بولا۔ ”ہم زیادہ بات نہیں کرتے۔ تم بولتے ہو، نو سال سے زیادہ ہو گئے ہیں، تم نے ہر جتن کر کے دیکھ لیا ہے۔ تم کو کیا ملا ہے؟ اب ہم کو کچھ نہیں ملتا تو تم کو کوئی کھٹک نہیں ہونی چاہیے۔ یہ تمہارا اتنا بڑا گھاٹا نہیں ہے، جتنا اپنا ہے۔ خوار ہم ہوں گے، تم اِدھر ہی رہو گے۔ پر کام شروع کرنے سے پہلے ہم کو تم سے ہر بات صاف کر دینا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ سر جھٹک کے بولا۔ ”ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہمیں ہماری چیز مل جائے۔ جو چن وسا نے تم سے کہا ہے، سب دُرست ہے۔ ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں۔“

”ہم تمہارے وعدے پر بھروسا کرتے ہیں۔ پر کاغذ ہم کو مل گئے تو ہم اپنی جگہ اُن کو تمہارے حوالے کریں گے اور تم ہماری چیز ہمارے حوالے کرنا۔“

”تم جہاں بھی کہو۔“ سردار کی زبان اٹک رہی تھی۔ ”یہ ہمارا وعدہ ہے۔“

”ایک بات اور سُن لو۔ تم بولتے ہو، کاغذ دوسرے کے لیے بے کار ہیں، پر ایسا نہیں ہوگا۔ اِن کی اور لوگوں کو بھی ضرورت ہوگی۔ نہیں ہو گی تو پیدا کی جا سکتی ہے۔ آگے لاماؤں کو بھی اِن کی قدر معلوم ہوگی۔ پر ہم نے تم کو زبان دی ہے۔ چار مہینے تک تم ہم سے کچھ نہیں بولو گے۔ ہم اِدھر رہیں یا کہیں اور۔ ہم اپنے کچھ آدمی بھی اِدھر چھوڑ سکتے ہیں جو نیچے بستی یا اُوپر مندروں کے علاقے میں آتے جاتے لوگوں کی خیر خبر رکھ سکتے ہیں۔ ضرورت پڑی تو ہم اِدھر تمہارے آدمیوں سے بھی پوچھ گچھ کریں گے۔ پر یہ سب بعد کی بات ہے۔ تم نے یا تمہارے قبیلے کے کسی آدمی نے ہمارے درمیان دخل دینے کی کوشش کی تو تم کبھی کچھ نہیں پا سکو گے۔ ہم

کو مرتے وقت اکیلے جانا نہیں بتایا گیا۔ کوئی ٹیڑھی بات ہوئی تو پچھتانا تمھارا کام ہوگا، اپنا نہیں۔ ہم کو اِدھر تمھاری جگہ پہ اڑا نہیں جمانا ہے اور ہمارا تمھارا کوئی پرانا بیر بھی نہیں ہے اور نہ ہم تم سے کوئی پیشگی روکڑ مانگ رہے ہیں۔ سستے میں جا رہے ہو سردار! اچھی طرح سوچ لو۔ ابھی ہم اِدھر تمھارے مہمان ہیں۔"

"تمھاری باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ تم ضرور کچھ جانتے ہو؟"

"ہم نے بول دیا ہے، ابھی ہم نہیں جانتے۔ پر اگر جانتے بھی تو جب تک ہم نہ چاہتے، تم کچھ نہیں جان سکتے تھے۔ اتنی باتیں بولنے کا مطلب یہ ہے کہ تم سے کچھ اُلٹ نہ ہو جائے۔"

سردار کے جسم کا تمام خون اُس کے چہرے پر سمٹ آیا تھا اور وہ بیٹھے بیٹھے یوں اُچکنے لگا تھا جیسے اُس کے کپڑوں میں کوئی بچھو گھس گیا ہے۔ سولم نے یکساں اور رواں زبان میں جھل کی تمام باتیں اُسے منتقل کی تھیں۔ جھل کے چپ ہو جانے پر سردار گردن جھکائے اپنی انگلیاں مروڑتا رہا۔ ہم سب اپنی جگہوں پر ساکت بیٹھے ہوئے تھے۔ "سردار اتنی گا کو سوچنے کا ٹائم دو۔" جھل نے سولم سے کہا۔ اُس کا جملہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ یک لخت سردار تخت سے اُٹھ کر دوبارہ جھل کے سامنے آ کے کھڑا ہو گیا اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھورنے لگا۔ اُس کا سر جھل کے کندھے پر آ رہا تھا۔ جھل کی پلکوں میں جنبش نہیں ہوئی مگر اُس کی آنکھیں سردار کی آنکھوں کی طرح سرخ نہیں تھیں۔ تھکی اور بجھی ہوئی سی تھیں۔ یکایک سردار نے اُس کا گریبان پکڑ لیا۔ جامو نے اِدھر چاقو نکال لیا تھا، اُدھر تخت کے پہلو میں کھڑے ہوئے سردار کے آدمی نے بھی خنجر تان لیا تھا۔ جھل کا جسم بے حرکت رہا۔ پھر سردار نے اپنے ہاتھ پھیلائے تو جھل کے ہاتھ بھی پھیل گئے۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ زور سے پکڑ لیے۔

"تمھارے تارے قبیلے میں مجھ کو سب سے اچھے لگتے ہیں۔"

سردار کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا ہوگا کیونکہ سولم خاموش کھڑا جزبز نظروں سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ سردار کے چیخنے پر اُس کا آدمی بھاگتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

جب ہم سردار کے مکان سے باہر آئے تو دھوپ اُتر رہی تھی۔ دوپہر کا کھانا ہم نے سردار کے ساتھ ہی کھایا تھا۔ اُس کے حکم پر کمرے میں کئی خادم اور خادمائیں جمع ہو گئے تھے جنھوں نے ہمارے آگے پھل، بستی میں بنی ہوئی مٹھائیوں اور سردار کے لیے خاص طور پر پکائے ہوئے کھانوں کا ڈھیر لگا دیا تھا۔ چین سے آئی ہوئی خوشبودار چائے سب سے خوشں ذائقہ تھی۔ ہم نے ایسی چائے پہلے کبھی نہیں پی تھی، مسلسل وہی پیتے رہے۔ جھل اور سولم وہیں رہ گئے تھے۔ میں، مارتی اور جامو انھیں وہاں چھوڑ کے اُٹھنا نہیں چاہتے تھے مگر خود جھل ہی نے ہمیں باہر جانے کو کہہ دیا تھا۔ اِدھر اُدھر بے کار گھومنے اور گھر جانے کے بجائے ہم وہیں ایک پہاڑی پر بیٹھ کے اُن کا انتظار کرتے رہے۔ آج کا دن بھی گزرا جا رہا تھا۔ اب اُوپر مندروں کے علاقے میں جانے اور اندھیرا ہونے سے پہلے واپس آنے کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ دھوپ پہاڑوں پر چڑھ رہی تھی۔ ہم تینوں کی نگاہیں سردار کے مکان کے اُونچے دروازے پر لگی ہوئی تھیں اور شاید ہم ایک ہی بات سوچ رہے تھے کہ اگر جھل اور سولم کچھ دیر اور نہ آئے تو... لیکن سورج غروب نہیں ہوا تھا کہ دروازے پر ایک ساتھ کئی آدمی باہر نکلتے دکھائی دیے۔ اُن میں وہ دونوں بھی تھے، چن وسا اور قبیلے کے کئی لوگوں کے درمیان۔ ہم نے تقریباً بھاگتے ہوئے بستی کی طرف جانے والے راستے پر انھیں جا لیا اور جھل کا چہرہ دیکھ کے ہماری پھولی ہوئی سانسیں بیٹھنے لگیں۔

بستی کے مرکزی مقام پر باقی تمام لوگ منتشر ہو گئے۔ صرف چن وسا ہمارے ساتھ رہ گیا۔ راستے میں نہ جانے کیوں جھل بار بار آسمان کی طرف دیکھتا تھا۔ اُسے بھی دن نکل جانے کا احساس ہوگا۔ مجھے معلوم تھا، اب ہم اور کہاں جا سکتے ہیں۔ دروازہ چن وسا کی لڑکی تشانم نے کھولا مگر ہمیں مقابل دیکھ کے اُس کا سراپا کانپ سا گیا۔ وہ جلدی سے دروازے کی آڑ میں سمٹ گئی تھی کہ جھل نے جھٹ ہاتھ بڑھا کے اُسے اپنے بازو میں گھسیٹ لیا اور دوسرے ہاتھ سے اُس کی ٹھوڑی اُٹھا کے ماتھے کو بوسہ دیا۔ وہ اور سکڑ گئی۔ چن وسا مسکرانے لگا اور اپنی زبان میں پتہ نہیں کیا کیا کہتا رہا۔ "ہم پردیسی ہیں رانی!" جھل اُس کا سر تھپ تھپاتے ہوئے بولا۔ سولم نے فوراً ترجمہ کر دیا۔ تشانم نے ایک پل کے لیے بھی اپنی تھرتھراتی پلکیں نہیں اُٹھائیں۔ اُس کے نتھنے بری طرح پھڑک رہے تھے اور رخساروں کا سرخ رنگ جھل ملانے سا لگا تھا۔ جھل سے ہاتھ چھڑا کے وہ سرپٹ بھاگتی ہوئی آناً فاناً کہیں اوجھل ہو گئی۔ "بالکل بولتی گڑیا ہے، بغیر چابی کی۔" جھل نے ہنس کے کہا اور مارتی کی گردن پکڑ کے جھٹکے دینے لگا جو مبہوت سا کھڑا تھا۔ ہم سب سیدھے سلطان کے کمرے میں آ گئے۔ وہ آنکھیں موندے بستر پر آرام کر رہا تھا۔ ہماری آہٹ پر وہ اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ جھل نے تین چار بار اُس کا پیر جھنجوڑا اور مروڑ کے دیکھا۔ اب اُسے کوئی خاص تکلیف نہیں معلوم ہوتی تھی لیکن اُس کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔ جیسے دن بھر اُونگھتا رہا ہو۔ وہ گردن ڈالے ہوئے "ہوں ہاں" میں جھل کو جواب دیتا رہا۔ جھل اُس کے پاس چند منٹ سے زیادہ نہیں ٹھہرا ہوگا کہ جامو اور مارتی کو اپنے واپس آنے تک گھر میں رہنے کی ہدایت کر کے پھر سائبان میں آ گیا اور چن وسا کو بلا کے اُس نے مندروں کے علاقے میں جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ میں سمجھا کہ جھل چن وسا کی ٹوہ لینے کے لیے ایسا کہہ رہا ہے۔

شام ہو رہی تھی اور ابر چھا گیا تھا۔ چن وسا نے دبے لہجے میں وقت زیادہ ہو جانے کا عذر کر کے روکنے کی کوشش کی لیکن جھل اُس کی بات سنی اَن سنی کرتا ہوا دروازہ کھول کے باہر نکل آیا۔ سولم کو بھی اُس نے ساتھ رکھا تھا۔

اُوپر جانے کے خیال سے میرا دل ایک دم دھڑ دھڑانے لگا تھا۔ میں نے سوچا، جھل کو منع کر دوں۔ مجھ سے ابا جان کے سامنے نہیں جایا جائے گا، میں تو اُن کے سامنے کھڑا بھی نہ رہ سکوں گا، میں اُن سے کیا کہوں گا، میری زبان سے ایک لفظ نہیں پھوٹے گا اور اُنھوں نے اگر کچھ کہا تو مجھ سے سُنا نہیں جائے گا۔ مجھے اُن کی آنکھوں سے شروع ہی سے ڈر لگتا ہے۔ اسی لیے میں کورا کو لے کے گھر سے نکل گیا تھا۔ میں نے پہلے ہی اندازہ کر لیا تھا کہ وہ وہاں رہے گی تو مجھے اور اُسے ہر وقت اُن کی نگاہوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور اگر اُن کے منہ سے کوئی ایسی ویسی بات نکل گئی! وہ کچھ خیال ہی نہیں کرتے تھے، جو دل میں ہوتا تھا، فوراً کہہ دیتے تھے اور اُنھوں نے تو کہہ بھی دیا تھا۔ اگر میں جلدی نہ کرتا اور تین چار دن گھر میں اور رُک جاتا، اُن کی خوشامد کر لیتا کہ وہ کورا کو پولیس کے حوالے نہ کریں تو ممکن تھا، اس دوران وہ کورا کے لائے ہوئے کاغذات پر نظر ڈال لیتے اور شاید کورا سے اُن کا رویہ بدل جاتا۔ وہ اُسے محفوظ کر کے رکھتے مگر پھر وہ اُس سے جلد سے جلد چھٹکارا بھی حاصل کرنے کی کوشش کر سکتے تھے کیونکہ کورا کا گھر میں ہونا ایک مسلسل خطرہ تھا۔ میں نے ٹھیک ہی کیا تھا۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی صورت نہیں تھی کہ میں اُسے لے کے دُور نکل جاؤں۔ میرے سینے میں شور سا ہو رہا تھا۔ ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔ جھل اُوپر بڑھتا رہا۔ ہم بیچ میں کہیں نہیں رُکے تھے مگر آدھا راستہ طے کیا ہوگا کہ بوندا باندی ہونے لگی اور پھر ہر طرف وہی اندھیرا چھانے لگا جس سے مجھے بہت وحشت ہوتی تھی۔ شام ہوتے ہی پہاڑوں پر ہُو کا عالم طاری ہو جاتا جیسے دُنیا میں سب مر گئے ہوں اور پہاڑ اُن کے سوگ میں خاموش کھڑے ہوں۔ کچھ دیر تک اندھیرا سرمئی سرمئی سا رہا۔ پگ ڈنڈیاں نظر آتی تھیں۔ اُوپر پہنچتے پہنچتے ہر سو دھند پھیل ہوئی تھی۔ ابر کی وجہ سے چاند بھی چھپا ہوا تھا۔ ہوا تیز نہیں تھی اور دھند بھی ابھی بہت کم تھی۔ ہماری آنکھوں میں اتنا اندھیرا نہیں تھا اور جھل نے ٹارچ بھی روشن کر دی تھی۔ ایک دوسرے کو پکڑتے ہوئے ہم سنبھل سنبھل کے نم اور پھسلواں زمین پر پیر رکھ رہے تھے۔ ہمارے پیچھے کسی کی چاپ نہیں تھی۔ نیچے دُور ہی سے مندروں کے علاقے میں بھڑکتی ہوئی شعلوں کی روشنی دکھائی دینے لگی تھی۔ لگتا تھا کہ فاصلہ اب بہت کم رہ گیا ہے لیکن یہ نظروں کا دھوکا ثابت ہوتا تھا۔ بارش تیز ہو جاتی تو سارے کپڑے بھیگ جاتے۔ یہاں کوئی سایہ بھی نہیں تھا۔ بستی اور مندروں کے درمیان ایک بڑا علاقہ غالباً اس لیے خالی رکھا گیا تھا کہ مندر پُرسکون رہیں۔ اُوپر جانے کے لیے کہیں کہیں پہاڑوں پر سیڑھیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ ہم نے اپنی ڈگر نہیں چھوڑی اور اس احتیاط کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم بہت جلد مندروں کے علاقے میں پہنچ گئے۔ اُوپر زمین خشک پڑی تھی۔

تمام بڑے اور چھوٹے مندروں میں مشعلیں روشن تھیں۔ کھلے آسمان کے نیچے گوتم بدھ کی دیو قامت مورتی کے سامنے ایک بڑا الاؤ دہک رہا تھا اور مختصر تعداد میں راہب گم سم بیٹھے ہوئے تھے۔ سب سے بڑی عمارت کے اندر بھی دھیمی روشنی ہو رہی تھی اور راہ داری میں راہبوں کی چہل پہل تھی۔ گزرتے ہوئے چند ہی راہبوں نے رُخ پلٹ کے ہمیں دیکھا ہوگا۔ ہمارے کپڑے خاصے بھیگ گئے تھے۔ ٹھنڈ سے جسم جمے جا رہے تھے۔ سولم تو دانت کٹکٹا رہا تھا اس لیے ہم مورتی کے سامنے راہبوں کے ساتھ الاؤ کے گرد بیٹھ گئے۔ آگ کی تپش سے جسم میں کسی قدر حرارت محسوس ہوئی مگر میرے ہاتھ پیروں کی کپکپی دُور نہیں ہوئی۔ ہم کن انکھیوں سے وہاں موجود راہبوں کے چہرے غور سے دیکھتے رہے۔ اِن میں ابا جان نہیں تھے۔ ابا جان ہمیں اور بھی کئی مندروں میں نظر نہیں آئے۔ مندروں میں کسی نے ہماری موجودگی پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ جس وقت ہم بڑے مندر کی سیڑھیاں طے کر کے وہیں ایک درمیانی جگہ پر بیٹھے تو کھانا تقسیم ہو رہا تھا۔ یہ ایک بڑی عمارت تھی۔ بڑے بڑے ہالوں اور کمروں کے اطراف چوڑے اور لمبے تھموں پر ٹکی ہوئی راہ داری تھی۔ اندر ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے ایسی ہی تنگ اور کشادہ گلیاں تھیں۔ مشعلیں ہر کونے پر نصب تھیں لیکن روشنی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ کھانا تقسیم کرتے ہوئے پجاری جب ہماری جانب آئے تو ہم سے پوچھے بغیر ایک نے ہمارے آگے مٹی کا پیالہ رکھ دیا، دوسرے نے اُس میں پتلی دال اور سبزی کا ایک ایک چمچا ڈال دیا، تیسرے نے موٹی روٹیاں چٹائی پر رکھ دیں۔ راہ داری میں ہر طرف راہب قطار سے بیٹھے ہوئے تھے۔ جہاں تک ہماری نظر پڑتی تھی، ابا جان نہیں تھے۔ جھل اور سولم نے سیر ہو کے کھانا کھایا۔ میرے حلق سے ایک لقمہ بھی نہیں اُتر رہا تھا۔ کھانے کے بعد راہب منتشر ہونے لگے۔ ہم نے عمارت کے گرد پوری راہ داری کا چکر لگا کے دیکھ لیا لیکن مندروں میں رہنے والے تمام راہب صرف یہیں نہیں تھے اور بھی عمارتیں فاصلے فاصلے پر بنی ہوئی تھیں۔ چند کو ہم یہاں آنے سے پہلے ہی دیکھتے آئے تھے۔ ہمارا یوں ہر عمارت میں رُکنا اور کچھ دیر ٹھہر کے واپس آ جانا مناسب نہیں تھا پھر بھی ہم مختلف مندروں میں جاتے رہے۔ باہر کھلی ہوئی جگہوں پر اِکا دُکا راہب دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے آپ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ انھیں سردی بھی نہیں لگ رہی تھی۔ اندھیرے میں اُن کے خط و خال صاف نظر نہیں آتے تھے مگر اُن میں ابا جان ہوتے تو اُن کا جثہ ہم علیحدہ سے

پہچان سکتے تھے اور وہ ایسی مشقت کے عادی نہیں ہوں گے۔ اُنھیں یہاں آئے ہوئے وقت بھی زیادہ نہیں ہوا تھا یا شاید وہ عادی ہوں بھی، کون کہہ سکتا تھا کہ اتنے عرصے اُنھوں نے کہاں کہاں وقت گزارا ہے۔

چلتے چلتے ہماری ٹانگیں اکڑنے لگی تھیں۔ کئی عمارتوں میں اُن کا کوئی نشان نہ ملا تو ہم دوبارہ بڑے مندر میں آ گئے۔ اب ایک ہی صورت رہ گئی تھی کہ راہبوں کے آشرم کا رُخ کریں جہاں اَن گنت کٹیائیں بنی ہوئی تھیں۔ ہم نے اب تک سرائے یا آشرم میں جانے سے اسی سبب پہلو تہی کی تھی کہ ابھی رات زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ راہبوں کی ایک بڑی تعداد مندر میں موجود تھی۔ بڑے مندر کی عمارت میں دبی دبی سرگوشیاں گونج رہی تھیں اور اباجان کا دُور دُور پتہ نہیں تھا۔ کہیں وہ چلے نہ گئے ہوں۔ مجھے بار بار یہی خیال آ رہا تھا حالانکہ یہ عجیب سی بات تھی۔ جس دن ہم نے اُنھیں دیکھا تھا، اُنھیں اُسی دن یا اُس کے دوسرے ہی دن روانہ ہو نا رہ گیا تھا۔ اچھا ہے کہ وہ چلے ہی گئے ہوں۔ مجھے چاہے وہ نہ ملیں، پھر سے کہیں کھو جائیں مگر کسی طرح یہاں سے دُور ہو جائیں میرا دل اُن کے لیے یہی دعا کر رہا تھا۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے ہوں گے۔ خدا کرے، وہ کامیاب ہی لوٹے ہوں ورنہ پھر وہ زندہ نہیں رہیں گے۔ اتنے عرصے کوئی بھی اپنی اُمیدیں ناکام ہونے پر زندہ نہیں رہتا۔ ایک میں ہی بے حس تھا۔

تنجھل اور سُولم ابھی مایوس نہیں ہوئے تھے۔ راہبوں سے مندر خالی ہونے لگا۔ مشعلیں کم ہوتی گئیں اور ایک سوگوار سکوت عمارت کے در و دیوار پر مسلط ہو گیا تو ہمیں روک کے تنجھل خود عمارت میں گھومنے چلا گیا۔ وہ چھپتا چھپاتا گیا تھا اور خاصی دیر بعد واپس آیا۔ واپسی میں اُس کی چال ہی سے مجھے اُس کی ناکامی کا اندازہ ہو گیا تھا۔ مندر میں چند راہب رہ گئے تھے اور وہ سب کے سب مراقبوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ کئی پجاری ہمیں وہاں بیٹھا ہوا دیکھ کے جھجکتے ہوئے گزر گئے۔ اُن کا تعلق یقیناً مندر کے انتظام سے ہوگا۔ پھر ایک معمر پجاری نے آ کے نرم لہجے میں ہم سے پوچھا کہ ہمیں کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔ ہمارے بجائے سُولم نے جواب دیا کہ ہم ایک رات گزارنا چاہتے ہیں۔ سردی سے اُس کی آواز ٹھٹھر رہی تھی۔ پجاری نے ہم تینوں کو ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھا اور مشورہ دیا کہ ہم سرائے چلے جائیں، وہاں ہم رات آرام سے گزار سکیں گے لیکن تنجھل سرائے جانا نہیں چاہتا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ اباجان اپنی کٹیا سے باہر ہوں۔ ہم ہر کٹیا میں جھانک کے بھی نہیں دیکھ سکتے تھے تاہم ہمیں مندر سے اٹھنا ہی پڑا۔ ویسے بھی ہم وہاں ساری رات گزارنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ دُھند بڑھتی جا رہی تھی۔ اس سے ہمیں عمارتوں کے درمیان آنے جانے میں آسانی ہو گئی کیونکہ نقل و حرکت چند گز کے فاصلے ہی تک دیکھی جا سکتی تھی۔ یہاں سے وہاں، اس جگہ سے اُس جگہ تک مسلسل چلنے پھرنے میں رات کا بڑا حصہ بیت گیا تھا۔ سُولم اور تنجھل کی رفتار میں پہلے جیسی تیزی نہیں رہی تھی۔ میری ٹانگیں تو پہلے ہی شل تھیں۔ ناچار ہم سرائے میں آ گئے۔ یہاں مکمل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ پتھروں کی کٹیاؤں کے بیشتر دروازے بند تھے۔ پہلے ہم دو رویہ کٹیاؤں کے درمیان ڈھکے ہوئے راستوں کے چکر لگاتے رہے۔ وہاں بھی اُن کی کوئی سُن گُن نہیں ملی تو سرائے کے ایک وسیع و عریض ہال میں چلے آئے۔ سالانہ میلوں کے درمیان اس ہال میں گہما گہمی رہتی ہوگی، اب ویران پڑا تھا۔ اندر کسی حد تک گرمی تھی لیکن ایسی بھی نہیں کہ ہم کسی تھم سے کمر ٹکا کے رات گزار دیں۔ بڑے مندر کے پروہت نے کہا تھا کہ سرائے میں ہمیں بستر مل جائیں گے۔ یہاں کوئی شخص جاگا ہوا نہیں تھا۔ کسی متعلق آدمی کو ڈھونڈنے کی کوشش میں سُولم کو ہال کے انتہائی گوشے میں ایک شخص سوتا ہوا مل گیا۔ سُولم کسی جھجک کے بغیر اُسے جھنجوڑنے لگا۔ وہ ہڑبڑا کے اُٹھا اور ہمیں دیکھ کے بوکھلا سا گیا۔ حواس بجا ہوتے پر اُس نے ہال میں ایک جانب بنی ہوئی کوٹھریوں کی طرف ہذیانی انداز میں اشارہ کیا۔ وہاں بستروں کا انبار لگا ہوا تھا۔ اُسی شخص نے ہمیں کھلی ہوئی کٹیاؤں میں جانے کی صلاح دی تھی مگر ہم ہال کے کنارے دروازے کے قریب بستر لگا کے لیٹ گئے۔

رات بھی جیسے سردی سے کانپ رہی تھی اور ٹھٹھرتی ہوئی بیت رہی تھی۔ تنجھل اپنا جسم سکیڑے لمبی لمبی سانسیں کھینچ رہا تھا۔ سُولم بھی کروٹیں بدل رہا تھا۔ بستر سرد تھے۔ رفتہ رفتہ وہ ہمارے جسم کی حرارت سے گرم ہوئے اور اُن میں سیلن کی ایک بُو بھی بسی ہوئی تھی لیکن ہم کسی طور اُنھیں اپنے جسم سے جُدا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے بلکہ ہمارا بس چلتا تو اُنھیں اپنے اندر جذب کر لیتے۔ اگر ہم ہال میں کچھ اندر بستر لگاتے تو شاید اتنی ٹھنڈ محسوس نہ ہوتی۔ کنارے پر ہونے کی وجہ سے یخ بستہ ہوا ہمارے گالوں پر طمانچے مارتی گزر رہی تھی۔ ہم تینوں میں سے کسی کو بھی نیند نہیں آئی۔

رات کا آخری حصہ ہوگا کہ ہم نے کسی کی آہٹ سُنی۔ سب سے پہلے تنجھل چونک کے اُٹھا پھر میں۔ کھلے دروازے کے ستونوں میں ہمیں کوئی سایہ سا رینگتا ہوا نظر آیا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ دُور چلا جاتا اور دُھند میں اوجھل ہو جاتا، تنجھل بستر سے اُچھل کے پنجوں کے بل بھاگنے لگا۔ میں نے اور سُولم نے بھی بستر چھوڑ دیے۔ قریب جا کے تنجھل ٹھٹھک کے رُک گیا۔ وہ کوئی راہب تھا۔ تمام جسم کمبل کے سے لبادے میں لپٹا ہوا، سر اور منہ مفلروں میں چھپے ہوئے۔ اُس نے بھی ہماری چاپ سُن لی تھی، رُک کے ہماری طرف دیکھا۔ تنجھل فوراً اُس کے آگے آ گیا اور اس سے پہلے کہ راہب اُس سے کچھ پوچھتا، تنجھل نے اُس کے منہ پر ہاتھ مار کے مفلر نیچے کھینچ لیا اور بیٹری کی روشنی اُس کے چہرے پر پھینکی۔ میرے دل کی حرکت بند ہونے لگی۔ وہ اباجان ہی تھے۔ روشنی سے اُن کی آنکھیں چُندھیا

گئیں اور اُنھوں نے اپنا منہ پھیر کے ہذیانی انداز میں پوچھا "یہ کیا ہے؟" اُنھوں نے تبتی زبان میں کہا تھا۔

"ذرا ہمارے ساتھ آؤ بڑے صاحب!" تنجھل نے بیٹری بُجھا کے سرگوشی کی۔

اباجان نے پھر تبتی زبان میں سراسیمگی سے کچھ کہا۔

"بڑے صاحب! ہم کو پتہ ہے، آپ ہندوستانی سمجھتے ہو۔ جیسا میں بول رہا ہوں ویسا ہی کرو۔" تنجھل نے نرمی سے کہا۔ "ہم کو آپ سے کچھ بات کرنا ہے۔"

"میں... میں ہندوستانی سمجھتا ہوں۔" اباجان نے لرزیدہ لہجے میں کہا "مگر آپ، آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟"

"کچھ کام ہی ہے، پر یہ جگہ بولنے کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔"

"آپ کون لوگ ہیں؟"

"اپنے ہی ہیں۔ میں بولتا ہوں۔ گھبراؤ نہیں بڑے صاحب!"

"مگر آپ، آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"آپ کا بھلا ہی چاہتے ہیں؟"

"کیسا بھلا! میں... میں ایک۔"

"ادھر نہیں بڑے صاحب!" تنجھل نے تحمل سے کہا۔

"پھر کہاں؟" اباجان نے کسی قدر ناگواری سے پوچھا۔

"جہاں آپ اچھا سمجھو، کسی کٹیا میں چلو۔"

اباجان کی آواز وہی تھی، گو وہ سرگوشی میں بات کر رہے تھے لیکن ان کے لہجے میں وہی بھاری بھرکم پن تھا، وہی گونج تھی مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں تنجھل کی زبان سے کچھ نکل نہ جائے۔ اُنھیں غصہ آنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگتی تھی۔ تنجھل نے جب اُن کے چہرے سے مفلر کھینچا تھا تو وہ بہت گھبرا گئے تھے۔ اُن کا سارا وجود لرز کے رہ گیا مگر اُنھوں نے بہت جلد اپنی آواز پر قابو پا لیا اور تبتی زبان میں بات کرنے کی حجت بھی نہیں کی۔ میرا حلق خشک ہو گیا تھا۔ آنے والے لمحوں کے خیال سے میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔

"آپ کو کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے۔" اباجان نے ملائمت سے کہا۔

"ہو سکتا ہے بڑے صاحب! پر اُسے دُور کرنے کے لیے ہی اپنے ساتھ چلو۔"

اباجان نے زیادہ تامل نہیں کیا اور خود ہی کٹیاؤں کی طرف بڑھ گئے۔ ذہن میرے پیر کھینچے لے رہی تھی۔ تنجھل نے پشت سے میرا کوٹ پکڑ لیا۔ ہم آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے کھلی ہوئی کٹیاؤں کے وسط کی ایک کٹیا میں آ گئے۔ وہ زیادہ لمبی چوڑی نہیں تھی۔ زمین پر خشک گھاس بچھی ہوئی تھی اور اندر گھرا اندھیرا تھا۔ سُولم کو باہر رہنے کی ہدایت کر کے تنجھل نے دروازہ بند کر لیا۔ پتھروں کی ان موٹی دیواروں سے ہماری آواز باہر نہیں جا سکتی تھی۔ اباجان بالکل ساکت بیٹھے تھے۔ تنجھل نے دیاسلائی جلا کے چراغ روشن کر دیا۔ کٹیا میں لرزتی ہوئی روشنی پھیل گئی۔ "بڑے صاحب! زیادہ بات کرنے کا وقت نہیں ہے۔ ہم آپ کی تلاش میں بہت دُور سے آئے ہیں۔"

"میری تلاش میں!" اباجان نے تعجب سے کہا۔

"ہاں جی، آپ کی تلاش میں اور ہم کو سب پتہ ہے۔ آپ ہم سے کچھ چھپانا مت ورنہ ٹائم برباد ہوگا۔ پہلے میں بول دوں کہ ہم لوگ آپ کے غیر نہیں ہیں۔ اپنے دل سے ایسے تمام خیال نکال دو۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔" اباجان کی آواز ٹمٹما سی رہی تھی۔

"آپ کی سمجھ میں سب آ جائے گا۔ کل بھی ہم نے اِدھر آپ کو دیکھا تھا۔ پر آپ سے اتنے لوگوں کے سامنے بات کرنا ٹھیک نہیں تھی۔"

"آپ اپنا مقصد... آگے بات کریں۔"

"کیا بات کریں بڑے صاحب، سوچتے ہیں کدھر سے کریں۔" تنجھل کسمساتے ہوئے بولا۔ "آپ سُن بھی سکو گے یا نہیں۔"

"میں سب سُن رہا ہوں۔" اباجان نے بے چینی سے کہا "مگر میں آپ سے پھر کہتا ہوں، آپ کو کوئی بڑی غلط فہمی ہو رہی ہے۔"

"آپ صفدر خاں صاحب نہیں ہو!"

اپنا نام سُن کے اباجان کے ہونٹ پھڑکنے لگے۔ "میں۔ میرا نام۔ میں ایک بھکشو ہوں اور میرا نام صفدر خاں نہیں ہے۔" اُنھوں نے تیزی سے کہا۔

"اب تو کچھ بھی نہیں، پر پہلے کبھی تھا۔" تنجھل کی آواز دھیمی ہی رہی۔ "میں گیا شہر میں آپ کا پتہ بھی بول لوں کیا؟ بڑے صاحب! آپ اپنا حلیہ بدل سکتے ہو، نام تو نہیں۔ نام ایک ہی رہنا ہے۔"

"مگر میں آپ سے کیا کہہ رہا ہوں۔"

"میں جان رہا ہوں بڑے صاحب! خیر نام کا فیصلہ پھر کر لینا۔ اِدھر دیکھو یہ کون بیٹھا ہے۔ یہ کون بیٹھا ہے۔ اس جوان کا نام بابر ہے۔ یاد ہے آپ کو ایسا کوئی نام!"

"ب۔ بابر۔" اباجان کی آواز گھٹ گئی۔

مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اباجان مجھے بھی پہچاننے سے انکار کر دیں گے۔ ممی اور جہاں گیر کے جُدا ہو جانے پر اُنھوں نے پیچھے مڑ کے نہیں دیکھا تھا۔ تنجھل کی زبانی میرا نام سُن کے ان پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے مجھے تکنے لگے۔ تنجھل نے میری ٹھوڑی اُوپر اُٹھا کے بیٹری کی روشنی دکھائی۔ "کچھ جان پڑتا ہے بڑے صاحب؟"

اباجان کی پُتلیاں پھیل گئی تھیں اور اُن کے چہرے کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں لیکن میری سسکیاں نکل پڑیں۔

"نہیں۔ نہیں۔" اباجان کی دہلتی ہوئی آواز اُبھری۔

"روشنی اور کروں بڑے صاحب؟"

ابا جان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میں نے اُن کے قدموں پر سر رکھ دیا اور پھر مجھے نہیں معلوم کیا ہوا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ نہ جانے کب اُن کی کانپتی ہوئی سرد انگلیاں مجھے اپنے بالوں میں سرسراتی محسوس ہوئیں۔ میری ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ جب ابا جان نے میرا چہرہ اپنے استخوانی ہاتھوں سے سامنے کیا تب میں انھیں دیکھ سکا۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ انھوں نے جھپٹ کے میرا چہرہ اپنی گود میں دبوچ لیا۔ "بابر! " اُن کی دھڑکتی ہوئی آواز جیسے کہیں دُور سے آ رہی تھی: "یہ تو ہی ہے۔ بیرو! "

میری زبان پر فالج گر گیا تھا۔

"تو کہاں چلا گیا تھا؟ "

"اس سے کچھ مت پوچھو بڑے صاحب! ہاتھ پیر دیکھ لو۔ ٹھیک سلامت ہیں۔" تجھل نے کہا۔

"شاید میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ میرے دماغ میں نہ جانے کیا کیا۔۔۔" اُن کا گلا رُندھنے لگا: "لیکن میرا دل کہتا تھا، میرا بابر کبھی مجھ سے ضرور ملے گا۔"

وہ منہ ہی منہ میں نہ معلوم کیا کیا کہتے رہے۔

"اور اس کا دل بھی ایسا ہی بولتا تھا۔"

"اوہ میرے خدا۔ میرے خدا! " وہ میری پیشانی اور انگلیاں بے تحاشا چومنے لگے۔ اُن کے ہاتھوں کو قرار نہیں تھا۔ کبھی وہ میرا چہرہ ٹٹولتے، کبھی بازو۔ کبھی میری پیشانی کو بوسے دیتے، کبھی آنکھوں کو۔ انھیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اُن کے سامنے ہوں اور مجھے بھی یہ سب ایک تصور سا لگ رہا تھا۔ دیر ہو گئی، وہ مجھے اپنے سینے میں بھینچے آہیں بھرتے رہے "مگر تو۔ تو یہاں تک کیسے آ گیا؟ " انھیں ایک دم خیال آیا۔

"بس آ گیا بڑے صاحب! " تجھل نے کہا: "ہم نے سوچا، آپ جس چیز کی تلاش میں اِدھر آئے ہو، ہم راستے میں ہی جا کے آپ کو اس سے بڑی خبر دے دیں۔"

"آپ۔۔۔ آپ کا" ابا جان خفقانی انداز میں بولے: "کس چیز کی تلاش! "

"بڑے صاحب! ایسے وقت میں مجھ کو آپ سے کچھ بولنا نہیں چاہیے تھا۔ پر رات بھاگ رہی ہے۔ سویرا ہونے سے پہلے ہم کو اِدھر سے دفع ہو جانا چاہیے۔ ایک تو ہم کو اس کو دکھانا تھا پھر ایک بات اور بولنی تھی۔"

"کہیے، کہیے۔" ابا جان بے قراری سے بولے۔

"آپ بہت بڑے خطرے میں ہو۔"

"آپ کا کیا مطلب ہے؟ "

"میری بات پہلے پوری طرح سن لو بڑے صاحب! یہ قبیلے کے لوگ نو سال میں کٹ کھنے ہو گئے ہیں۔ اِن کے سر کا کوئی بھروسا نہیں ہے، کس وقت اُلٹ ہو جائے۔ اپنے آپ پر بھی شک کرتے ہیں۔ آپ سمجھتے ہو کہ آپ یہاں محفوظ ہو۔ اِدھر بھی ان کے لوگ آپ جیسے بہروپ میں ہوں گے۔ اِدھر آپ اکیلے ہو، ہم بھی اب آ گئے ہیں۔ پر جگہ اُنھی کی ہے اور راستے بھی سیدھے نہیں ہیں۔ اُن کی آنکھ میں کوئی دانہ پڑ گیا اور کسی دن زیادہ دیکھنے لگا کہ اِدھر ایسا کوئی ہے جو اُن کی امانت اپنے پلّے رکھتا ہے تو جنگل میں رہنے والے یہ لوگ جنگل کی بولی بولیں گے۔ ابھی ٹھیک طرح بات کرتے ہیں تو ٹھیک ہے۔" ابا جان نے بیچ میں دخل دینے کے لیے لب کھولے۔ تجھل نے انھیں روک دیا: "آپ سنتے رہو، مجھ کو پتہ ہے، آپ کیا جواب دو گے پر بڑے صاحب! سوچ سمجھ کے بولنا، اُلٹے جواب سے کام اُلٹا ہو جائے گا۔ آپ یہاں سے فوراً لوٹ چلو۔ ابھی آپ کو یہ شیر ببر سینہ زبر مل گیا ہے۔ یہ بھی آپ کے لیے دولت ہے۔"

"آپ کس امانت کی بات کر رہے ہیں؟ " ابا جان وحشت سے بولے۔

"وہی جو اُس رات لڑکی آپ کے پاس چھوڑ گئی تھی۔ بڑے صاحب! ہم کو سب پتہ ہے۔ ہم کو ٹوٹل کے ٹائم اکارت مت کرو۔ وہ اپنے کاغذوں کے لیے سینگ نکالے پھر رہے ہیں۔ میں نے اُن سے بولا ہے کہ یہ میں اُن کو دے دوں گا اور اس کے بدلے وہ ہمیں دولت دیں گے۔ تم آپ وہ ساری دولت لے لینا۔ پہلے لے لینا، بعد کو کاغذ اُن کے متھے مارنا۔ وہ بھی کچھ کم نہیں ہو گی۔"

"میرے پاس ایسے کوئی کاغذات نہیں ہیں۔" ابا جان نے تلخی سے کہا۔

"بڑے صاحب! ہم پہ بھروسا کرو، ہم کو کچھ نہیں چاہیے۔ ابھی دیکھو اِدھر بابر تمھارے سامنے ہے۔ اُدھر چھوٹا جہاں گیر بھی ہم کو مل گیا ہے۔"

"جہاں گیر! منا، وہ کہاں ہے؟ "

"وہ بھی بابر کے ساتھ ہے۔" تجھل نے فتی کا ذکر نہیں کیا۔ میرے منہ پر اُس کا نام آتے آتے رہ گیا لیکن میں فتی کے بارے میں اُن سے کہتا بھی کیا؟ کیا یہ بتاتا کہ وہ مجھے کہاں نظر آئی تھی اور کتنی دیر کے لیے؟

"اُدھر آپ کے دو بیٹے ہیں۔ اس کے پاس بھی بہت پیسہ ہے۔ نقدی، حویلی، جاگیر۔ پیڑھیاں کھائیں پھر بھی بچ جائے اور یہ سب نہ بھی ہوتا تو ہاتھ پیر کا تلا ہوا ہے۔ سر ذرا اس کا اکیس ہے۔ پر یہ سارا سونے کا ہے۔"

"منا کیسا ہے؟ " ابا جان رعشہ زدہ آواز میں بولے۔

"منا ایک دم ٹھیک ہے۔ پڑھتا ہے۔"

"وہ کہاں سے ملا؟ "

"اچھی جگہ ملا۔" تجھل نے تند لہجے میں کہا: "آپ میری بات کا جواب دو، یہ سب بعد میں، وقت ملے تو پوچھنا۔"

"آپ کیا پوچھ رہے تھے؟ "

"میں کاغذ کی بابت بول رہا تھا۔"

"مگر میرے پاس کوئی کاغذات نہیں ہیں۔"

"بڑے صاحب! نو سال سے آپ رات دن کیا کھوج رہے تھے؟ آپ یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ ٹھیک ہے، آپ کے پاس وہ نہیں ہیں تو آپ ہمارے ساتھ واپس چلو۔ ابھی ہم اِدھر سے نکل سکتے ہیں۔"

"میں۔۔۔ میں ابھی یہاں سے نہیں جا سکتا۔"

"آپ کو چلے جانا چاہیے بڑے صاحب! "

"مجھے یہاں سے جانے میں کچھ عرصہ اور لگے گا۔"

"وہی میں بول رہا ہوں، آپ اس عرصے کو جہنم میں ڈالو، سب چھوڑ کے ہمارے ساتھ چلے چلو۔ ہماری بات مان لو۔ نہیں تو لاڈلے سے پوچھ لو۔ میرا نہیں تو اِس کا ہی بھروسا کر لو۔ اس کا خون سچا ہے تو یہ آپ سے بیر نہیں کرے گا۔"

"میں نے آپ سے کیا کہا ہے، میں ابھی واپس نہیں جا سکتا۔"

"کوئی بھی اتنی مدت دوڑ دھوپ کرنے اور اِدھر دُور آنے کے بعد واپسی کو تیار نہیں ہو گا۔ مجھ کو پتہ ہے، آپ بھی انکار کرتے رہو گے۔ بڑے صاحب! میں نہیں بولتا کہ آپ کے کاغذ میں جو لکھا ہے، وہ سب اُس سے بیشی نہیں ہے، اس سے بہت بیشی ہو سکتا ہے۔ پر یہ سب چکر ہے۔ آپ کو لگام پکڑنے میں اتنا وقت لگا ہے۔ لگام اب بھی چھوٹ سکتی ہے۔ آگے راستہ اتنا صاف نہیں ہو گا۔ اب تک آپ دیواروں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پر اِدھر کوئی دیوار نہیں ہے۔ واپسی کا راستہ مشکل ہے۔ کہیں بیر اُلفت ہو گیا تو دوبارہ جانے کا موقع نہیں ملے گا اور اُٹھانے والا بھی اِدھر کوئی نہیں ہو گا۔ تھوڑے کہے کو بہت جانو۔"

"جناب! میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ ازراہِ کرم اس سلسلے میں کوئی دخل مت دیجیے۔ آپ کے بقول میں نے اتنی تگ و دو کی ہے تو لیں ہی نہیں کی ہو گی۔ میں یہاں تک آ کے پیچھے نہیں جا سکتا۔ ازراہِ مہربانی مجھے معذور سمجھیے۔"

"لیکن بڑے صاحب! ہم تو معذور نہیں ہیں۔"

"میں نے درخواست کی ہے۔"

"وہ دوڑ دھوپ اور تھی بڑے صاحب، یہ اور ہے۔ مجھ کو بیچ میں بولنا نہیں چاہیے۔ پر ساری زندگی اپنا کام یہی رہا ہے۔"

"دیکھیے، مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجیے۔"

"آپ ہم کو نہیں جانتے ہو۔ آپ کو ہمارے کہنے پر شک ہے نا۔ بابر کے گھلا پڑا ہے۔ اس کے پاس چاقو بھی ہے تمنچا بھی۔ دونوں کو چلانا بھی آتا ہے۔ میں اس کو دکھا کے آپ سے کچھ مانگنے نہیں آیا ہوں۔ پیسہ اپنے کو بھی اچھا لگتا ہے، پر اپنے سے زیادہ نہیں۔ آپ کے پاس پیسہ ہو گا، اپنا کچھ نہیں بگڑے گا۔ پر ہم کو یقین ہو کہ آپ کا بھی کچھ نہیں بگڑے گا تو ہم اِدھر سے چلے جائیں گے۔"

"میرے ذہن میں بدگمانی نہیں ہے۔ جانا نہ جانا آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔" ابا جان نے ترش روئی سے کہا: "آپ کا یہاں آنے سے صرف ایک یہی مقصد تھا تو مجھے افسوس ہے اور میرے پاس لفظ نہیں کہ بابر کے سلسلے میں آپ سے کچھ کہہ سکوں۔ میرے لیے یہ کسی معجزے سے کم نہیں ہے۔ میں مجبور ہوں، لوٹ نہیں سکتا۔ جتنا آپ اصرار کریں گے، مجھے شرمندگی ہو گی۔ میرا یہاں کچھ بگڑ جائے گا تو اس کا سزاوار میں خود ہوں گا۔ اگر اب بھی آپ کے دل میں ہے کہ میرے پاس کوئی کاغذات ہیں تو ایسا نہیں ہے۔ میں اتنی بڑی غلطی نہیں کر سکتا تھا کہ انھیں اپنے ساتھ لاتا۔"

"مجھ کو ایسا ہی لگتا ہے۔ ایسا ہے تو بہت اچھا ہے بڑے صاحب! "

"یہی سمجھیے۔"

"آپ بولتے ہو تو یہی سمجھ لیتے ہیں۔ پر آپ سے ایک بات اور پوچھنا ہے کہ آپ یہاں آ کے کتنا آگے بڑھے ہو؟ "

"میں اس بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔"

"بڑے صاحب! ہم اِدھر آ کے اور جان بوجھ کے آپ کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔ ہم کو کچھ نہیں، صرف آپ کی ضرورت ہے۔ ہم کو بولو کہ آپ کے راستے میں ابھی کیا روڑا ہے۔ آپ کو بول دینا چاہیے۔"

"کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔" ابا جان جھجکتے ہوئے بولے: "اگر آپ کی مراد میری مدد سے ہے تو مجھے کسی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔"

"آپ پوری بات نہیں سمجھ رہے ہو بڑے صاحب! اتنی باتیں سن کے بھی اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہو۔ ہم بولتے ہیں کہ ہم حصہ لینے نہیں آئے ہیں، جاننے کا حصہ۔ جو جان گیا ہے، اُسے آپ نہیں روک سکتے ہو، نہ اُس کا بھیجا پھیر سکتے ہو۔ پر وہ خود ہی آپ سے کچھ نہیں بول رہا ہے۔ معاملے کی بات ہوتی تو اتنی دیر نہ لگتی۔ آپ کے پاس کاغذ نہیں ہیں۔ پر آپ تو اِدھر ہو اور آپ ہی بتاؤ، یہ جانتے ہوئے کہ کوئی اور بھی اِدھر آ گیا ہے۔ آپ آگے ٹھیک کام کر سکتے ہو؟ وہ چاہے تو آپ۔۔۔ آپ۔"

"تجھل بھائی! " میں نے پہلی بار زبان کھولی۔ تجھل کی آواز میں لکنت آ گئی تھی۔ مجھے اُس کی آواز کی خوب پہچان تھی۔

"لاڈلے! تو چپ رہ، مجھ کو بولنے دے۔"

"ابا جان۔" میں نے اُن کے پیر پکڑ لیے: "تجھل بھائی کے متعلق غلط مت سمجھیے۔"

ابا جان کے پیر اس سردی میں پسینے سے بھیگے ہوئے تھے۔

"لیکن کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ مجھ سے کچھ حاصل ہو جائے گا؟ " وہ بھینچے

ہوئے لہجے میں بولے۔
"پرآپ کو بھی کچھ نہیں حاصل ہوگا، کسی کو بھی نہیں ہوگا۔"
"توآپ کوئی معاملہ کرنا چاہتے ہیں؟" اباجان نے زہر خندسے کہا۔
"نہیں بڑے صاحب! ہم نے پہلے منع کر دیا ہے۔"
"یعنی آپ صرف۔۔۔۔"
"جی بڑے صاحب! اپنے کو اندھی کل کی فکر نہیں ہوتی۔"
"میں آپ کو نہیں جانتا۔"
"بابر کے ہوتے ہوئے ایسا مت بولو، یہ سب جانتا ہے۔"
"لیکن میں۔۔۔ میں" اباجان کی زبان لڑکھڑانے لگی۔
"جھل بھائی سب آپ کی بہتری کے لیے کہہ رہے ہیں" میں
ہاتھ جوڑ کے اُن سے فریاد کی "آپ ہمارے ساتھ لوٹ چلیے۔ یہاں
قدم پر خطرہ ہے۔ آپ کو اب کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے،
ں اب کبھی آپ کے پاس سے نہیں جاؤں گا۔"
"ببرو!" اباجان میرے سر پہ اضطراری انداز میں ہاتھ پھیرنے
لے "ببرو! میں جلد ہی واپس آجاؤں گا۔ تجھے دیکھنے اور ملنے کی خبر
ننے کے بعد ایک لمحے کے لیے میرا دل یہاں نہیں لگے گا مگر تُو
ھتا نہیں ہے، میں تجھ سے کیا کہوں، بس اتنا جان لے کہ واپسی میرے
تیار میں نہیں ہے۔ اتنی دُور آکے میں اب واپس نہیں ہوسکتا۔
ری منزل قریب ہے، بہت قریب اور کوئی تصور نہیں کرسکتا کہ
ہ سب کیا ہے۔"
"لاڈلے! تُو اِدھر سے چلا جا۔ میں خود ہی بڑے صاحب سے
ت کرلوں گا۔ ابھی ذرا وقت ہے۔ باہر رہ کے میرا انتظار کر۔ اُدھر
ولم بھی کُھلے میں کھڑے کھڑے جم گیا ہوگا۔"
"جھل بھائی!" میں نے اُس سے التجا کی۔
"جا لاڈلے! تُو جا، بڑے صاحب تیرے ہی باوا ہیں۔ مجھ کو پتہ تھا،
ن سے اتنی ہی باتیں بولنی پڑیں گی اور بار بار۔ ایک بار اور سہی رے۔ بڑے
صاحب نے دل ٹھنڈا نہیں کیا۔ ہم لوٹنے کو بول رہے ہیں۔ کاغذ وہ اُدھر
جا کے جلادیں۔ جا، میں آتا ہوں۔"
میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کروں۔ جھل کی بات مان لوں یا میں
بیٹھا رہوں۔ میرا وہاں سے نہ اُٹھنے کو جی چاہتا تھا نہ بیٹھنے کو۔ میں وہیں بیٹھا
رہا تو جھل نے میرا کندھا پکڑ کے مجھے اباجان کے پہلو سے جدا کر دیا۔ پھر میں
نے مُڑ کے نہیں دیکھا۔
صولم باہر سردی سے کپکپا رہا تھا۔

صبح ہونے میں بس کچھ دیر جاتی تھی کہ جھل ہمیں کٹیا کے دروازے پر
کھڑا ہوا دکھائی دیا۔ ہم تینوں ٹپکتے ہوئے ہال میں اپنے بستروں پر آکے دراز

ہو گئے۔ مجھے اُس سے اباجان کے متعلق پوچھنے کی بے کلی تھی لیکن ہمت نہیں
پڑتی تھی۔ جھل کا چہرہ بھی اس طرح اندھیرے میں چھپا ہوا تھا کہ کوئی اندازہ
نہیں ہوسکتا تھا۔ "سب ٹھیک ہے لاڈلے!" کچھ توقف کے بعد جب بستر
میں کسی قدر گرمی ہوگئی تو اُس نے میری گردن میں ہاتھ ڈال کے کہا۔
"کیا وہ تیار ہوگئے؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔
"کیا بولیں رے" وہ پژمردگی سے بولا۔
"بتاؤ نا مجھے۔"
"دیوتوں کے آگے اپنا چاتو بھی سالا کپٹنے لگتا ہے۔"
"کیا کہہ رہے ہو؟"
"وہ بھی تو ایک دیوی کے جیل خانے میں ہے۔"
"کیسی دیوی؟"
"تیری طرح ایک دیوی کے۔"
میں سمجھ گیا کہ اُس کی مراد کیا ہے۔ "یعنی وہ تیار نہیں ہوئے!"
"ہو بھی گئے، نہیں بھی۔"
"کیا مطلب؟"
"ابھی کل دیکھیں گے۔"
"مگر ہم روز تو یہاں نہیں آسکتے۔"
"آنا ہی ہوگا لاڈلے!" وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔
تھوڑی ہی دیر میں اندھیرا چھٹنے لگا۔ ہم بے نیند وہیں پڑے رہے۔
سرائے میں لوگوں کی آمد و رفت کی گونج ہمارے کانوں میں بڑھنے لگی تو
ہم نے بستر چھوڑ دیا۔ بہت سے بھکشو ہال میں موجود تھے اور کچھ لوگ انھیں
چائے پلا رہے تھے۔ ہم بھی جا کے اُنھی میں شامل ہوگئے۔ ہلکا پھلکا ناشتہ
چائے کے ساتھ تھا۔ ہم نے بُھنے ہوئے گندم کی چند پھنکیاں لی
ہوں گی کہ اباجان ہال میں آتے نظر آئے اور ہمیں دیکھ کے کچھ رُک سے
گئے مگر کسی تاخیر کے بغیر آگے بڑھ کے بھکشوؤں کی قطار میں بیٹھ گئے۔
انھوں نے اپنا سر جھکا لیا تھا۔ چائے پیتے ہی جھل نے وہاں سے چلنے میں
جلدی کی۔ اباجان وہیں بیٹھے رہے۔ مندروں کے علاقے سے نیچے بستی
میں آتے ہوئے دھوپ کے چھینٹے پہاڑیوں پر پڑنے لگے تھے۔ رات کے
مقابلے میں ہماری رفتار تیز تھی اور پھر نیچائی بھی تھی۔
چن وسا نے ہم سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اُسے معلوم ہوگا کہ کل شام
جس وقت ہم اُوپر جا رہے تھے، رات کو ہماری واپسی ممکن نہیں تھی
لیکن جامو اور مارٹی بے چینی سے ہمارے منتظر تھے۔ سلطان بھی اپنے پیروں پر
سیدھا کھڑا ہوا تھا اور چُپ چُپ سا تھا۔ اُس دن بھی دوپہر تک ہم سب
بازار میں مال سجائے بیٹھے رہے اور جھل نے پہلی مرتبہ بستی کے بعض دکان داروں
سے اپنی لائی ہوئی چیزیں اُنھیں دکھا کے ہندوستان سے اُن کی مستقل رسد
کے متعلق بات چیت کی۔ اسی اثنا میں سردار کے مکان سے ہمارا بلاوا آگیا۔

اپنے خاص کمرے کے بجائے سردار مکان کے باہر ہی ہمارا انتظار کر رہا تھا۔
ہمیں دیکھتے ہی وہ فوراً اندر لے گیا۔ سلطان بھی ہمارے ساتھ تھا۔ کل کی نسبت
سردار آج کچھ زیادہ مضطرب نظر آتا تھا۔ آج بھی اُس نے ہمارے آگے
پھلوں اور کھانوں سے بھری ہوئی چینی کی پلیٹوں کا انبار لگا دیا لیکن
اُس کا مقصد بہت واضح تھا۔ وہ جھل کی زبان سے کچھ اور سننے، کچھ اور جاننے
کی جستجو میں تھا۔ لوٹ پھیر کے وہ اُس سے کاغذات ہی کا ذکر کرنے لگتا،
جیسے کل کی جھل کی کہی ہوئی باتوں سے اُس کا اعتبار اُٹھ گیا ہو اور وہ دوبارہ
اپنے سُنے ہوئے کی توثیق چاہتا ہو۔ جھل نے نہ کوئی تردید کی نہ اضافہ کیا۔
اُس نے اپنی گزشتہ روز کی گفتگو کے اعادے کے سوا کچھ نہیں کہا لیکن
شاید جھل کا لہجہ آج اتنا بے ساختہ اور برجستہ نہیں تھا کہ سردار کی تسلی ہو
سکے۔ وہ کچھ اور متفکر سا ہوگیا۔ جھل سے تحمل کی تلقین سن کے اُس کی کنپٹیاں انگارا
ہوگئی تھیں۔ شام تک اُس نے ہمیں اپنے مکان سے جانے نہیں دیا۔
ایک دن اور گزر رہا تھا۔ پیروا اور دوسرے لوگوں کا اب تک کوئی
پتہ نہ تھا۔ جھل کو یہی اُلجھن ہوگی اسی لیے وہ سردار سے ٹھیک طرح بات
نہیں کرسکا۔ سورج غروب ہونے پر جب اُس نے جامو، سلطان اور مارٹی
کو وہیں چھوڑ کے پھر اُوپر جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو جامو بہت مشکل سے
آمادہ ہوا۔ "اپن کو بھی ساتھ لے چلو کنگ!" جامو کے ساتھ مارٹی بھی مچلنے لگا۔
"دو تین راتیں اور کاٹ لے ماسٹر!"
"تم بولو تو ہزار راتیں کاٹ دے۔" مارٹی نے سینے پر ہاتھ رکھ کے
کہا۔ "پر ایدر سالا ایک دم قبر کے ماٹک ہے، اُلو بھی نہیں بولتا۔ راجا جانی کو ایدر
ہی چھوڑ دو کنگ!" اُس نے جھل سے التجائی لہجے میں کہا۔
"راجا کا اُوپر کام ہے رے۔" جھل اُسے چمٹاتے ہوئے بولا۔ "قبر کا
نقشہ پہلے ہی پتہ چل جائے تو اچھا ہے۔ ماسٹر! نکال دے ایک اور رات۔"
مارٹی ہنسنے لگا۔ "ایدر پڑے پڑے چاتو بھی کُھٹّل ہو جائیں گا۔ اپن
سوچتا ہے ان کو سردی مار گیا تو۔۔۔"
"چاتو دوسرے بن جائیں گے ماسٹر! ہاتھ کُھٹّل مت ہونے دینا۔"
"ہاتھوں میں اب کُھجلی ہو رہی ہے استاد!" جامو منہ بنا کے بولا۔
"اچھا ہی شگون ہے رے، بڑھنے دے۔"
ہم نے کئی مفلر گلے میں ڈال لیے تھے اور اُوور کوٹ بھی پہن لیے
تھے۔ تینوں کے پاس بیٹریاں اور بھرے ہوئے تمنچے تھے۔ چلتے وقت
بوڑھا چن وسا بالکل خاموش رہا تھا۔ جھل نے بھی اُس سے زیادہ بات نہیں
کی، نیچے ہی اندھیرا ہو چلا تھا۔ راستے میں ہمیں کل کے مقابلے میں زیادہ مشکل
پیش آئی مگر آج بارش نہیں تھی، آسمان بھی صاف تھا۔ ہم خاصی دیر سے
اُوپر پہنچے اور جیسے ہی ہم نے گوتم بدھ کی بڑی مورتی کے اطراف ہموار
زمین پر قدم رکھے، ہمیں مشعلوں کی روشنی میں بستی کے چند باشندے وہاں
گھومتے نظر آئے۔ بڑے مندر میں بھی وہ موجود تھے۔ رات کا کھانا ہم نے

بڑے مندر ہی میں کھایا۔ ہم نے اچھی طرح اطمینان کر لیا تھا کہ ہمارے
اُٹھنے پر وہ وہیں بیٹھے رہے ہیں لیکن باہر کچھ ہی فاصلے پر اور لوگ موجود
تھے۔ بڑے مندر سے قریب دو تین ہی مندروں میں جا کے ہمیں اندازہ
ہوگیا کہ اُن کی تعداد کم نہیں ہے، اس کے باوجود کل کی طرح ہم ایک
مندر سے دوسرے مندر میں جاتے رہے۔ ہم نے بعض مندروں میں دانستہ
دیر بھی لگائی اور گوتم بدھ کی مورتی کے سامنے ساکت و جامد بیٹھے رہے
لیکن جیسے ہی ہم عمارت سے باہر نکلتے، نزدیک و دُور وہ کہیں نہ کہیں نظر
آجاتے۔ ایک مندر سے دوسرے مندر کے درمیان جہاں فاصلہ زیادہ تھا
اور جہاں وسط میں مشعلوں کی روشنی نہیں پہنچ پا رہی تھی، وہاں گہرا اندھیرا
تھا۔ انھیں آزمانے کے لیے ہم ایک ایسی ہی جگہ اندھیرے میں لپٹے
خاموش کھڑے رہے مگر جلد ہی اُن کی چاپیں ہمیں اپنے قریب آتی
سُنائی دینے لگیں۔ نتیجتاً ہم آگے بڑھ کے روشنی میں آگئے۔ وہ غالباً سارے
علاقے میں بکھرے ہوئے تھے اور وہ کوئی ایک گروہ نہیں تھا، کئی تھے۔ اُن کا
طور طریق گلیوں میں گشت کرنے والے سپاہیوں جیسا تھا تاہم نہ وہ ہمارے
قریب آئے، نہ اُنھوں نے ہم سے کوئی باز پرس کی۔ جب تک دوسرا گروہ
اُنھیں نظر نہ آجاتا، پہلا ہم سے دُور دُور منڈلاتا رہتا پھر واپس ہو جاتا۔
سرائے تک جانا مشکل نہیں تھا لیکن ایسی صورت میں اباجان سے ملنا
ممکن نہیں تھا۔ سرائے میں بھی وہ موجود ہوں گے۔ جھل پھر ایک مندر میں جم
کے بیٹھ گیا۔ ہمیں گزشتہ روز کا تجربہ تھا کہ رات گئے مندر میں جلنے والی
مشعلوں کی روشنیاں کم ہونے لگتی ہیں۔ اس وقت سردی بھی تیز ہو جاتی ہے
اور دُھند بھی بڑھ جاتی ہے۔ یہ دوسری بات تھی کہ وہ اپنے ساتھ روشنی
لے کے چلیں مگر ایسا ہوتا تو ہمارے لیے آسانی تھی کہ اُن کی نقل و حرکت
ہماری نظروں میں آتی رہتی۔ میری توقع کے خلاف جھل مندر میں زیادہ دیر
نہیں بیٹھا۔ اچانک ہی وہ چل پڑا۔ مندر کے باہر کچھ ہی دُور دُھند
میں اُن کے سائے رینگ رہے تھے لیکن جس حد تک وہ ہمیں نظر آرہے
تھے، ہم بھی وہ اسی حد تک دیکھ سکتے تھے۔ جھل نے اُن کی موجودگی کا
خیال نہیں کیا اور اُن کے پاس سے گزرتا ہوا ایک طرف بڑھتا رہا۔ وہ سرائے
سے بھی آگے نکل گیا۔ راستے میں کئی ایسی پہاڑیاں اور جھنڈ پڑتے تھے
جہاں ہم چُھپ کے کسی مناسب وقت باہر آجاتے مگر جھل چلتا رہا اور
کسی قدر نشیب میں جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان واقع ایک دیوہیکل
عمارت کے سامنے آکے رُک گیا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا، ہم اِس طرف
پہلے نہیں آئے تھے۔ یہ جگہ بڑے مندر سے دُور تھی لیکن مندروں کے دُور
دراز تک پھیلے ہوئے سلسلے ہی سے تعلق رکھتی تھی اور ہموار نہیں تھی۔ گھنے
درخت، تنگ تنگ ڈنڈیاں اور اردگرد اُونچی نیچی زمین، ٹیلے اور پہاڑیاں۔
وہ ایک قدیم عمارت تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ یہاں کیوں نہیں ہیں مگر سامنے
عمارت کے بیرونی حصے میں سیڑھیوں کے پاس ایک مختصر الاؤ روشن کیے

وہ ہمیں دکھائی دے گئے۔ اُن کی تعداد چار سے زیادہ نہیں تھی۔ ہماری آمد کی آہٹ پا کے وہ چونکنے سے ہو گئے۔ ہم انھیں نظر انداز کرتے ہوئے عمارت میں داخل ہو گئے اور اندر جا کے پتہ چلا کہ وہ ایک وسیع عمارت ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنے نشیبی محلِ وقوع اور دوسری وسیع و عریض عمارتیں بن جانے کے سبب سے اُس کی حیثیت وہ نہیں رہی جو کبھی ہوگی۔ شروع کے تین چار گزرگاہ والے کمروں کے بعد ایک گول کمرے میں صرف ایک مشعل روشن تھی۔ بیچ میں گوتم بدھ کی ہشت پہلو مورتی تھی جو ایک بڑی چٹان تراش کے بنائی گئی تھی۔ اُس کی نسبت سے کمرہ بھی بڑا تھا۔ مورتی کے آگے ستونوں کی آٹھ قطاریں دیوار تک مثلث بناتی ہوئی پھیلتی گئی تھیں۔ چٹان میں قریب قریب ایک جیسی آٹھ شبیہیں کندہ تھیں تاکہ ستونوں کے ہر مثلث میں بیٹھنے والوں کے لیے گوتم بدھ کا چہرہ سامنے رہے۔ دیوار بھی مورتیوں سے منقش تھی۔ چار سمتوں میں چار دروازے تھے اور باہر سے اندر بڑے کمرے میں جانے کے لیے راستہ گلی کی شکل کا تھا۔ گلی میں دونوں طرف کمروں کے دروازے تھے۔ یقیناً وہاں بھی مورتیاں ہوں گی لیکن وہ سب بند تھے۔ صرف درمیان کا کمرہ کھلا ہوا تھا جس میں ہم داخل ہوئے تھے۔ ساری عمارت پر ایک ہیبت سی طاری تھی۔

باہر الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے بستی کے آدمی ہمارے پیچھے نہیں آئے۔ کمرے میں اِدھر اُدھر مختلف جگہوں پر گنتی کے چند ہی بھکشو موجود تھے اور انھیں جیسے اپنے آپ کا ہوش نہیں تھا۔ سب آنکھیں بند کیے بے جنبش، جسم باندھے اپنی مخصوص نشست میں کہیں کھوئے ہوئے تھے۔ شاید اُن کی سانس بھی نہیں چل رہی تھی۔ دروازے سے دوسری ستون کی قطار میں اباجان کو دیکھ کے میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ بجھل نے بھی انھیں دیکھ لیا تھا۔ سولم کو دروازے پر رُکنے کا اشارہ کر کے وہ دیوار کے ساتھ کھسکتا ہوا اباجان کے پاس پہنچ گیا۔ اباجان کے سر میں ایک خفیف سی جنبش ہوئی۔ انھوں نے ایک پھسلتی نگاہ سے ہمیں دیکھا ہوگا۔ بجھل اُن کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ اباجان اُٹھنا ہی چاہتے تھے کہ اُس نے اُن کی کمر پہ ہاتھ رکھ کے انھیں روک دیا اور اُن کے کانوں میں سرگوشی کی "ابھی نہیں، پھر کسی ٹائم، یہیں۔"

اباجان نے ہنکاری بھری اور آہستگی سے سر ہلایا۔

"ہم لوٹ رہے ہیں، آپ اپنا کام کرو۔" اِن چند لفظوں کے سوا بجھل نے اُن سے کچھ نہیں کہا اور فوراً وہاں سے ہٹ کے ستونوں کی ایک اور قطار میں چپ چاپ دوزانو ہو گیا۔ جب تک ہم وہاں رہے، اباجان نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی اور ہم نے زیادہ وقت نہیں لگایا۔ باہر موجود لوگوں کے بیچ میں ہوتے ہوئے کسی اور مندر کا رُخ کرنے کے بجائے ہم سیدھے سرائے میں آ گئے۔ اُس رات ہمیں بستر ڈھونڈنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی اور اُس رات ہم ہال میں تنہا نہیں تھے، اور بھی

کئی آدمی ہمارے ساتھ رات کاٹ رہے تھے۔ پتہ نہیں وہ کب تک جاگتے رہے۔ بجھل اور سولم کو بستر پہ کمر ٹکاتے ہی نیند آ گئی اور میری آنکھیں بھی کسی وقت بند ہو گئیں۔ سویرے بھکشو ناشتہ کر کے سرائے سے جا چکے تھے اور خوب اُجالا ہو چکا تھا کہ سرائے کے کسی پجاری نے ہمارے بالیں آ کے آہستگی سے پکارنا شروع کیا، تب ہم اپنے حواس میں آئے۔ سرائے سے نکلنے کے بعد بجھل نے واپسی میں کوئی عجلت نہیں کی۔ وہ یوں ہی تادیر بڑے مندر میں گشت کرتا رہا اور رات کی طرح بستی کے آدمی مندر کے علاقے میں اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔

اندازاً دن کے گیارہ بارہ بجے ہوں گے، کہیں درختوں پہ دھوپ کھل رہی تھی، کہیں ابر چھایا ہوا تھا۔ چن وسا کے مکان کی چار دیواری کے باہر ایک ٹیلے پر جامو، مارٹی اور سلطان سر جھکائے بیٹھے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی اُن کے جسم پھڑکنے لگے۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے وہ بھاگتے ہوئے خود ہمارے پاس آ گئے۔ میری طرح بجھل نے بھی یہی سمجھا ہوگا کہ بیڑہ آ گیا ہے اور وہ اس کی خبر سنانے کے لیے مضطرب ہیں لیکن اُن کے پاس ایسی کوئی خبر نہیں تھی۔ بستی میں ہمیں آئے ہوئے یہ آٹھواں دن تھا۔ جامو شکایت کرنے لگا کہ ہم نے اتنی دیر کیوں لگا دی۔ تینوں کہہ رہے تھے کہ رات بھر انھیں ایک پل کے لیے نیند نہیں آئی۔ وہ ہمارا کچھ اور انتظار کرتے، پھر انھوں نے طے کر لیا تھا کہ وہ تینوں سردار کے مکان کا رُخ کریں گے۔ "مجھ سے پوچھے بنا ایسا مت کیجو رے۔" بجھل نے اُسے سختی سے تاکید کی۔

"تم نے بولا تھا کہ سویرے جلد آ جاؤ گے۔" جامو ناراضی سے بولا۔

"جامو استاد! تیرا جی نہیں اٹک رہا ہے تو تُو لوٹ جا۔"

"یہ تم سے کون حرامی کہہ رہا ہے۔"

"پھر منہ ٹیڑھا کیوں کرتا ہے۔ اُدھر اُدھر اپنی اماں کو لے نہیں مٹکا رہی ہے۔" بجھل اپنا منہ کھسوٹنے لگا۔

جامو نے منہ پھیر لیا۔ ہم اندر مکان میں نہیں گئے۔ قلیوں کے ساتھ سلطان اندر جا کے سامان باہر لے آیا۔ ابھی بستی کے چوک میں ہم نے ٹرنک کھولے ہی تھے کہ دو مسلح آدمی ہمارے سروں پہ آ کے کھڑے ہو گئے۔ وہ سردار کا پیغام لائے تھے۔ بجھل نے دوپہر بعد آنے کا وعدہ کر کے انھیں لوٹانا چاہا لیکن انھوں نے اصرار کیا کہ سردار نے ہمیں فوراً حاضر ہونے کا حکم دیا ہے۔ ہم نے سامان ٹرنکوں میں واپس رکھ دیا اور قلیوں کے سپرد کر کے چوک سے اُٹھ گئے۔

آدھ گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم سردار کے سامنے تھے۔ وہ ایک لمبے چوڑے کمرے میں بستی کے مختلف عمر کے لوگوں کے ساتھ پتھر کے ایک اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔ یہ وہ کمرہ نہیں تھا جہاں وہ گزشتہ دو دنوں تک ہم سے ملتا رہا تھا۔ ہمارے اندر داخل ہوتے ہی تمام لوگ کمرے سے چلے گئے اور صرف وہی رہ گئے جو دیواروں کے ساتھ لگے ہوئے مستعد کھڑے

...نتی میں پندرہ سے کم نہیں تھے۔ ہم سب نے سردار کو قبیلے کے ...مطابق سلام کیا۔ خلافِ توقع اُس نے ہم سے بیٹھنے کو نہیں ...ں تک وہ ہم پر نگاہیں جمائے کچھ سوچتا رہا۔ اُس کا ایک پیر ...ل رہا تھا۔ کوئی بھی اندازہ لگا سکتا تھا کہ ہم سے بات کرنے ...وہ اپنی آواز اور لہجہ متعین کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

...م کیوں بلایا ہے؟" بجھل ہی نے پہل کی۔

...ردار کو زبان کھولنے میں جھجک ہوئی۔ "ہم نے تمھیں ایک بات ...کے لیے بلایا ہے۔" وہ تھمی ہوئی آواز میں بولا۔

...م نے ہر بات بول دی تھی۔"

...ہم نے سب کچھ کہہ دیا تھا لیکن یہ نہیں بتایا کہ اگر تم مقررہ مدت ...ں دستاویز ہمارے سپرد کرنے میں ناکام ہو گئے تو ہم تمھارے ساتھ ...کریں۔"

...بھی ہم نے بول دیا تھا۔" بجھل نے اونچی آواز میں کہا۔ ترجمہ کرتے ...کی زبان رُکنے لگی۔ "تم کو یاد نہیں رہا۔ ہم نے بول دیا تھا کہ اگر ...گئے تو ناکامی ہماری اپنی ہوگی، تمھاری نہیں۔ تم نو سال سے ...ہے ہو۔"

...میں یاد ہے لیکن ایسی صورت میں جب ہمیں یہ شبہ ہو چلا ہے ...ے میں ضرور کچھ جانتے ہو، ہم دستاویز کی اہمیت کے پیشِ نظر ...روایت کے مطابق تم پر کوئی پابندی عائد کر سکتے ہیں چونکہ ...بیلے میں ہو۔"

...بلا ہے تو ہم اِدھر سے چلے جاتے ہیں۔ پر ہم کوئی جکڑن قبول نہیں ...بجھل نے تیزی سے کہا۔

...یں جب ہم تم کو جانے دیں تب..."

...ردار!" بجھل کی آواز دھیمی پڑ گئی۔ "تم اپنے لیے بُرا کرو گے۔ تم ...یا تو سدا کے لیے اپنی چیز نہیں پاؤ گے۔"

...تمھیں نہیں کھوئیں گے، بلکہ تمھیں اِدھر ہی رکھیں گے، تمھیں یا ...وں کو۔ جب تک ہماری امانت ہمارے حوالے نہیں کر دی ...م تمھارے آدمی تمھارے حوالے نہیں کریں گے۔"

...ایسا کرو گے تو ہم سمجھیں گے، تم سودا کرنا نہیں مانگتے۔ تم کو کاغذ ...نہیں اور دوسرے سرداروں کی طرح تم نے بھی اپنی موت کا ...یا ہے۔"

...رتو ہے کہ تم اپنے آدھے آدمی ہمارے پاس امانت کے طور پہ ...انھیں اپنا مہمان رکھیں گے۔ کہو منظور ہے؟" سردار کی آواز ...بجنے لگی۔

...چھ منظور نہیں۔"

...تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم ہماری زمین پر ہو۔"

"اور تم کو بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اس زمین کی نکیل ہمارے ہاتھ میں ہے۔ سردار! ہم کو زیادہ بات کرنا اچھا نہیں لگتا۔ ایسا ویسا کوئی مٹا مت کھڑا کرنا۔ ہم نے بولا تھا، ہم کو آگے پیچھے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پیچھے چلے جائیں گے تو دنیا اُلٹی نہیں چلنے لگے گی۔ تم ایسا نہیں کر سکتے ہو۔ ہم کو نہیں لگتا، تمھارا سر اُوپر سے بس دیکھنے کا ہے اور تم اپنے آپ سے اتنے بگڑے ہوئے ہو، تم نے اپنے سر کو ہلایا جلایا نہیں ہے۔ تم کو ہم نے کھل کے بول دیا تھا کہ بیچ میں روڑا اٹکاؤ گے تو ہماری طرف سے بات ختم سمجھنا۔"

"اُلٹی سیدھی باتیں مت کرو۔ ہم یہ سودا اور پختہ کرنا چاہتے ہیں، ضمانت کے لیے تم اپنے تین آدمی ہمارے حوالے کر دو۔ ہم تمھارے درمیان پھر کوئی دخل نہیں دیں گے۔ تمھارا انتظار کریں گے۔"

"اب انتظار چھوڑ دو سردار!"

"کیا تمھیں ہماری شرط منظور نہیں؟"

"تم اپنے کانوں کی صفائی کراؤ۔"

"تم... تم ہماری پناہ میں ہو۔" سردار نے گرج کے کہا۔

"جب تک ہم اِدھر ہیں، اپنے کو تمھارا مہمان سمجھتے ہیں۔"

"لیکن یہ ہماری مرضی پر منحصر ہے۔"

"تو تم اپنی مرضی پوری کرو۔"

"ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے تمھارے درمیان کوئی دراڑ پیدا ہو۔ تمھارے آدمی یہاں محفوظ رہیں گے۔"

"دراڑ تم خود ڈال رہے ہو۔ اپنا کوئی آدمی اِدھر نہیں رہے گا۔"

"کیا تم نہیں جانتے کہ ہم تمھیں مجبور کر سکتے ہیں؟"

"ہاں، پر ہم مجبور ہوں، تب۔"

"تمھیں سوچنے کا وقت دیا جا سکتا ہے۔"

"ہم نے سب سوچ کے بولا ہے۔"

"ہم نہیں چاہتے کہ اپنے آدمیوں کو حکم دیں۔"

"ہم بھی نہیں چاہتے کہ تم یہ غلطی کرو۔" بجھل دبے لہجے میں بولا۔

لیکن سردار نے پہلے ہی سوچ رکھا تھا۔ کمرے میں نیزا بردار آدمیوں کی موجودی بے سبب نہیں تھی۔ وہ سردار اور بجھل کے درمیان ہونے والی گفتگو غور سے سن رہے تھے اور ہم نے آتے ہی دیکھ لیا تھا کہ اُن کے ہاتھوں میں نیزے ہیں اور کمر سے بندھی ہوئی پیٹیوں میں خنجر اُڑسے ہوئے ہیں۔ جہاں وہ کھڑے تھے، وہاں دیواروں پر تلواریں اور ڈھالیں آویزاں تھیں۔ اُن کی آنکھوں میں بھی خنجر کی سی چمک تھی اور وہ پر تولے ہوئے کھڑے تھے کہ کب سردار کا اشارہ ہو اور کب وہ آگے بڑھیں۔ دیوار کے ایک کنڈے میں لوہے کی زنجیر بھی لٹک رہی تھی۔ بہ طورِ خاص اس جگہ ہمیں طلب کرنے میں سردار کی مصلحت یہی ہوگی کہ ہم یہ

سب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں حالانکہ اُس کا بدلا ہوا لہجہ ہی ہمارے لیے کافی تھا۔ اُس نے دو میں سے ایک فیصلہ کرنے کے لیے ہمیں حکم دیا تھا۔ کوئی اور گنجائش نہیں رکھی تھی۔ پہلے تو ہم سمجھے کہ یہ سب محض دکھاوا ہے اور وہ اِس طرح یہ حقیقت جاننے کا متلاشی ہے کہ ہم نے کس بنیاد پر اُس سے کاغذات کا ذکر کیا ہے۔ کوئی بنیاد ضرور ہوگی اُس کے کہنے کے مطابق اگر ہم اپنے تین آدمی اُس کی تحویل میں دے دیتے تو اُس کا شبہ یقین میں بدل جاتا۔ ہم اُس کے یقین کے لیے اپنے آدمیوں میں سے کسی کو بھی داؤ پر نہیں لگا سکتے تھے، نہ اُس کا یقین ہمارے لیے سود مند تھا۔ ہمارے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ جھّل کی جگہ میں ہوتا تو بھی یہی جواب دیتا اور یہ ہمارا گمان تھا کہ وہ صرف حقیقت جاننے کی جستجو میں ہے۔ اُسے یقین آچکا تھا ورنہ وہ جھّل کی بات پوری ہونے سے پہلے ہاتھ اُٹھا کے اپنے آدمیوں کو حکم نہیں دیتا۔ ابتدا میں سردار کی آواز اکھڑی ہوئی اور بھری ہوئی سی تھی۔ رفتہ رفتہ اُس میں ٹھہراؤ آتا گیا۔ ہمیں اُس کے آدمیوں کے تیوروں سے اندازہ ہو چلا تھا کہ وہ کس حد تک آگے جا سکتے ہیں۔ جیسے ہی سردار نے ہاتھ اُٹھایا، اُنھوں نے نیزوں پہ اپنی گرفت مضبوط کرلی۔ وہ اگر مستعد تھے تو ہم بھی پوری طرح محتاط تھے۔ وہاں ایک دوسرے سے کچھ کہنے کا موقع نہیں تھا۔ جھّل نے کسی کو اشارہ نہیں کیا تھا مگر ہم سب کے ہاتھ بھی اپنی جیبوں کے قریب تھے۔ اُن کے ہاتھ میں نیزے تھے لیکن اُنھیں تولنے اور ہم پہ وار کرنے کے لیے پیچھے کی جانب اُن کے پاس جگہ نہیں تھی اور ہمیں معلوم تھا کہ وہ ہم پہ حملہ کرنے کے انداز میں نہیں جھپٹیں گے کیونکہ ہماری طرف سے کسی مزاحمت کا امکان اُن کے ذہن میں دُور دُور تک نہیں ہوگا۔ ہم نے اُنھیں اُن کی جگہ سے آگے بڑھنے دیا۔ دیوار سے ہٹتے ہی اُن کے نیزوں کی انیاں ہمارے سینوں کی جانب ہوگئی تھیں۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ اُن کی رفتار میں تیزی نہیں تھی۔ قبیلے کے بزرگ آدمی جو ہمارے آتے وقت یہاں بیٹھے ہوئے تھے، جاتے جاتے پیچھے کا دروازہ بند کرتے گئے۔ پیچھے ہٹنے اور بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ہوتا بھی تو ہمارے لیے بے کار تھا۔ ہمیں چپ دیکھ کے سردار کے بڑھتے ہوئے آدمیوں کے قدم اور سست ہو گئے۔ وہ یہی کر سکتے تھے کہ تین اطراف سے آکے ہم پر نیزے تان لیں اور سردار کے حکم کا انتظار کریں۔ تعداد میں وہ پندرہ تھے، ہم صرف چھ۔ اُن کے پاس نیزے تھے اور ہمیں چاقو نکالنے کی بھی مہلت نہیں تھی مگر کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ نیزے ہم سے بہت قریب نہیں ہونے چاہئیں تھے، پھر ہمارے لیے حرکت کرنا مشکل ہو جاتا۔ ہمیں ایک فاصلے پر اُنھیں روک دینا چاہیے تھا اور ہم نے اُنھیں یہ فاصلہ طے کرنے دیا۔ کسی سے کچھ کہنے سننے کا سوال ہی نہیں تھا۔ جامو، سلطان، مارٹی، سُولم اور میں۔ سب کی آنکھیں اور کان کُھلے ہوئے تھے۔

"سُوت کے"، جھّل نے آہستہ سے صدا لگائی۔ ایسی حا... جھّل کی ہدایت پر عمل کرنا مشکل ہوتا تھا۔ اُن کے نیزے ہم... ڈیڑھ گز دُور تھے اور دوسرے لمحے ہمارے سینے تک پہنچ... کہ دفعتہً ہم سب نیچے بیٹھ گئے۔ اُسی لمحے بجلی کی سی تیز... نے ضرورتہً اپنی نشست تبدیل کی اور اُسی مدت میں... کے نیزے پکڑ لیے اور انھیں ایک طرف دھکیلتے ہوئے بڑ... میں سے ایک کے ہاتھ میں ایک ہی نیزا آسکتا تھا لیکن نیزا... بعد ہماری جھونک اس قدر اچانک اور تیز تھی کہ قریب کھڑے آدمی اُس کی لپیٹ میں آگئے۔ نیچے جھکتے ہی ہم نے چاقو نکال... اوپر اُٹھتے ہوئے ایک ہاتھ سے نیزا پکڑا تھا تو دوسرے... کی ٹانگوں پر چاقو سے لکیریں ڈالتے گئے تھے۔ کمرے میں اُن... چیخیں گونجنے لگیں۔ جیسے ہی وہ فرش پر دھاڑتے ہوئے... اُچھل کے سردار کی طرف بھاگا۔ بس لمحے گزرے تھے۔ اُس... ابھی اپنے دیکھے ہوئے ہی پر ششدر تھیں کہ میں نے... پر پوری طاقت سے ترچھے ہو کے ہاتھ مارا۔ وہ اپنا جسم سنبھ... لڑکھڑاتا ہوا گرا ہی چاہتا تھا کہ میں نے خود اُسے سنبھال... پہلے کہ وہ خنجر نکال لیتا، میرے چاقو کی نوک اُس کی چھاتی پر...

اُدھر جامو، مارٹی، سلطان اور سُولم کے ہاتھوں میں... اور اُنھوں نے دوبارہ اُٹھنے کی کوشش کرنے والے آد... کے نیزوں سے زور ڈال رکھا تھا۔ کئی کی ٹانگوں اور کولھو... سے خون پھوٹ رہا تھا۔ جنھیں چاقو نہیں لگ پائے تھے... گرے ہوئے جامو، مارٹی، سلطان اور سُولم کے نیزوں اور چا... دباؤ میں تیزی سے بدل جانے والی صورتِ حال کا جیسے خود... رہے تھے۔ لمحہ بہ لمحہ اُن کی آنکھوں کی چمک معدوم ہوتی جا... نے اپنے سردار کو بھی دیکھ لیا تھا۔ میں نے ذرا جلدی کی، ا... سردار تک پہنچنے کا ارادہ نہ کرتا تو جھّل آجاتا۔ چند تانیوں... اسی غرض سے سردار کی طرف جھپٹا تھا لیکن مجھے دیکھ کے اور اُس نے اچانک ایک آدمی کی پیٹی سے خنجر نکال لیا۔ سر... میں پھڑکنے لگا تھا۔ جھّل نے خنجر زور سے سامنے کی دیوار پر... جہاں ایک عورت کی مورتی بنی ہوئی تھی۔ خنجر مورتی کی سیدھ... جا کے گڑ گیا۔

وہ پندرہ کے پندرہ پوری طرح جامو، سلطان، مارٹی... قبضے میں تھے۔ جنھیں چاقو لگے تھے، وہ بُری طرح کراہ رہے... کے بیر پٹخنے اور چیخنے چلانے ہی سے حواس باختہ ہو گئے... چاقو نہ کھولتے تو نیزے پکڑنے کے بعد وہ ہماری جھونک... کر لیتے لیکن اپنے ساتھیوں کی چیخیں سُن کے وہ منتشر ہو گ...

...سامنے یہی کچھ کیا جا سکتا تھا۔ جھّل نے ہاتھ سُوت کے ہلانے... نہ جاتا تو صرف لکیریں کھینچنے پر اکتفا نہ کرتے، اندر تک چلے جاتے... اُن میں سے زیادہ دیر تک نہ بلبلا پاتا۔ ہاتھ کھول کے ہلانے... کے چلانا مشکل ہوتا ہے۔ ایک دم نیچے بیٹھنا پھر فوراً... سا ہوا رکھنا اور نیزا پکڑنا، ایک ساتھ اتنے کام ہم نہ کرتے... نمٹنے میں وقت لگ جاتا۔ اُن کی تعداد زیادہ ہونے کے سبب... میں زیادہ وقت نہیں دینا چاہیے تھا۔ جامو کا اب بھی بس نہیں چلتا... سب کو ختم کردے۔ وہ جھّل کے اشارے کا منتظر تھا۔ جھّل نے... کوئی حکم نہیں دیا۔ مورتی کی آنکھ پھوڑنے کے بعد وہ کمرے کے... چپ کھڑا رہا۔ پھر اُس نے ٹھہری ہوئی آواز میں جامو سے کہا۔
"...رے جامو!"

...جامو نے فرش پر تھوکتے ہوئے نیزے سے ہاتھ اُٹھا لیے... مارٹی اور سُولم نے بھی جھٹکنے کے انداز میں نیزے سردار کے... پھینک دیے اور چند قدم پیچھے چلے آئے۔ سردار کے کسی آدمی... نے نہیں اُٹھایا۔ البتہ جامو، سلطان، مارٹی کے ہاتھ میں چاقو... کھلے ہوئے تھے۔ اِدھر سردار اپنی زبان میں چِلّا چِلّا کے نہ جانے... اُس نے میری گرفت سے نکلنے کی کوشش ختم کردی تھی۔... تھکے قدموں سے چلتا ہوا سردار کے پاس آیا اور اُس نے میرا... چھاتی سے ہٹا کے مجھے اُس سے دُور ہو جانے کی تاکید کی۔... سردار کی گردن چھوڑ دی۔

"...بیٹھ جاؤ سردار!" جھّل نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ اور ان کو باہر... دو۔" جھّل بھول گیا تھا کہ سردار اُس کی زبان نہیں سمجھ سکتا تھا۔... جھجکتے دیکھ کے اُسے اِس کا احساس ہوا اور اُس نے سُولم کو... کہا، "سردار کو بولو۔ اتنا ٹھیک ہے تو ہم بیٹھ جائیں"۔... سُولم نے اُس کی بات سردار سے دُہرادی۔

...سردار ہمیں اپنے خاص کمرے میں لے آیا تھا۔ جھّل، جامو اور سلطان... اصرار پر کھانے سے پہلے بستی کے معزز مہمانوں کے لیے خاص... بنی ہوئی تھوڑی سی شراب پی لی تھی۔ سردار کی نوجوان خادماؤں... کو اندر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ پلکیں ڈھانپے ہوئے... رہتی تھیں جیسے اُن کی آنکھیں بند ہوں، شرمائی اور سہمی ہوئی۔... رنگ رنگ برنگے کپڑے پہنے ہوئے، گندھی ہوئی دو چوٹیاں... لٹکی ہوئی۔ جوڑے کی جگہ بالوں میں جالی دار ٹوپی، کان سفید... بھرے ہوئے، تمتماتا ہوا سونے جیسا رنگ، سب کے نقش و نگار... ایک جیسے تھے۔ عمریں بھی تقریباً سب کی یکساں تھیں۔ جاپان... گڑیوں کی طرح اُن کے گالوں پر لال پھوٹی پڑتی تھی۔ جامو اُنھیں گل گُتھنی کہتا تھا۔ واقعی اُنھیں دیکھ کے ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے اُن کے گالوں میں تازہ تازہ چٹکی بھری ہو۔ ابھی کچھ دیر پہلے جامو جھّل سے کہہ رہا تھا۔
"اُستاد! یہ انار کی کلیاں اُدھر اپنی طرف چلی جائیں تو اُدھر کی ساری نقا... کبوتریوں کا دیوالا پٹ جائے"۔

جامو نے کورا کو نہیں دیکھا تھا۔ دیکھتا تو نہ جانے اُس کا کیا حال ہوتا۔ اُس کے گالوں پر بھی ایسی ہی سُرخی پھوٹتی تھی، ان سے کہیں زیادہ۔ جھّل کی نظریں بچا کے جامو نے ایک پیالہ اور پی لیا تھا۔ اُس کی آنکھیں چڑھنے اور زبان بہکنے لگی تھی۔ سردار کی خادماؤں کو وہ طرح طرح کے خطابات دے رہا تھا۔ بیٹھے بیٹھے ہمیں سہ پہر ہوگئی۔ ہم رخصت ہی ہوا چاہتے تھے کہ ایک خادمہ نے لپکتے جھکتے ہوئے اندر آکے سردار سے سرگوشی میں کچھ کہا۔ سردار کو یہ دخل اندازی بُری لگی۔ اُس نے برہمی سے اثبات میں گردن ہلائی۔ خادمہ اُلٹے قدموں کمرے سے واپس چلی گئی اور اُسی وقت ایک خادم اندر داخل ہوا۔ وہ پہلا مرد تھا جو ہمارے آنے کے بعد اس کمرے میں آیا تھا۔

پتہ نہیں اُس نے کیا کہا تھا کہ سردار کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ہماری جواب طلب نگاہیں بے اختیار سُولم کے چہرے پر مچلنے لگیں۔ وہ بھی بے چین ہو گیا تھا اور اُس کے منہ پر جیسے کوئی بات آتے آتے رہ گئی تھی۔ سردار نے چند سوال کرکے خادم کو لوٹا دیا اور بے تابانہ ہم لوگوں کو دیکھنے لگا۔

"کیا ہے سردار؟" جھّل نے پوچھا۔

"معلوم ہوا ہے کہ سوداگروں کا ایک اور قافلہ بستی میں آیا ہے"۔ اُس نے کسمساتے ہوئے جواب دیا۔

سُولم کے سوا ہم سب چونک پڑے اور ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"کون لوگ ہیں؟" جھّل نے ہلکی آواز میں پوچھا۔

"اپنے آپ کو سوداگر کہتے ہیں، سامان بھی اُن کے ساتھ ہے"۔

"سوداگر ہیں"۔ جھّل زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "ہو سکتا ہے، یہ وہی قافلہ ہو جو سفر میں دُور تک ہمارے سنگ رہا تھا یا کوئی اور ہو"۔

"تمھارے ساتھ؟" سردار نے تجسس سے پوچھا۔

"ہاں! پھر ایک جگہ ہم الگ ہو گئے تھے۔ چل کے دیکھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے، وہی لوگ ہوں پر وہ اِدھر آنے والے نہیں تھے۔ اُن میں سے کسی کو بُلا کے دیکھو"۔

"وہ باہر کھڑے ہیں"۔ سردار نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔ "وہیں جا کے بات کرتے ہیں"۔

ہمارے ساتھ چلنے پر سردار نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا اس لیے ہم بھی اُس کے پیچھے پیچھے باہر آگئے۔ پیرو، وزیر، مٹی میاں، زورا، پلٹو، جینی وزیرا اور ہلاکو۔ اُن آٹھوں کو دوبارہ دیکھنے کے لیے ہم سب جلد سے جلد اُن کے پاس پہنچ جانا چاہتے تھے لیکن کمرے سے نکلتے ہی جھّل نے سردار کو

روک لیا۔ ایک بات سُن لو سردار! ہم سے حجت مت کرنا۔" وہ سپاٹ آواز میں بولا۔ "اِن سے کاغذ کی کوئی بات مت بولنا۔"

سردار کی بھویں سُکڑ گئیں۔ تجّھل کی تاکید اُس کے لیے تعجب انگیز تھی۔

"پتہ نہیں، وہ اِدھر کس بات کی کھوہ میں آئے ہیں۔" تجّھل نے ترشی سے کہا۔ "سمجھ گئے؟"

"کیا مطلب؟" سردار کبیدگی سے بولا۔

"مطلب صاف ہے سردار!"

"لیکن وہ۔ کیا تمھارے خیال میں وہ بھی اُن کے بارے میں کچھ جانتے ہوں گے؟" سردار کی آواز پر حیرت چھائی ہوئی تھی۔

"ہم نہیں بول سکتے، پر وہ جان سکتے ہیں۔"

"مگر کیسے؟"

"کیسے ویسے ہم سے مت پوچھو، ہم احتیاط کو بول رہے ہیں۔ وہ بھی سوداگر ہیں۔ تمھارے آدمی نو سال سے ہندوستان میں سرمار رہے ہیں۔ یہ بھی ساری دُنیا گھومتے رہتے ہیں۔ ان کو بھی پتہ چل سکتا ہے۔"

"لیکن وہ یہاں کیوں آئیں گے؟" سردار اُلجھتے ہوئے بولا۔ "متبرک دستاویزیں ہندوستان سے گئی ہیں۔ وہ ہندوستان میں ہوں گی۔ یا تو دستاویزیں وہاں نہیں ہیں، یہیں ہیں یا پھر وہ اُنھیں لے کے آئے ہیں اور تمھاری طرح اُن کا سودا کرنا چاہتے ہیں یا اُنھیں ہندوستان میں کسی ایسی جگہ کا پتہ ہے جہاں دستاویزیں موجود ہیں اور وہ تقین کرنا چاہتے ہیں کہ ہم اُنھیں اس کے عوض کیا کچھ دے سکتے ہیں تاکہ وہ کوئی نفع بخش تگ و دو کر سکیں۔"

سردار کو قبیلے کا سردار یُوں ہی نہیں بنایا ہوگا۔ اس میں دوسروں سے زیادہ سُوجھ بُوجھ ہوگی۔ تجّھل کے کہنے کے مطابق اگر نئے آنے والوں کو بھی کاغذات کا کوئی علم ہو سکتا ہے تو سردار کے ذہن میں اُٹھنے والے تمام سوال جائز تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ تجّھل ان کا کیا جواب دے گا۔ "ہم نہیں جانتے کہ کون سی بات ٹھیک ہے، پر ایک بات تم نہیں بول رہے ہو۔" تجّھل نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "وہ کسی اور وجہ سے بھی اِدھر آ سکتے ہیں۔ کاغذ کے بارے میں ان کو کچھ جان پڑا ہو، کوئی ان کو لے کے ہم دونوں سے پہلے ہی اِدھر آ گیا ہو۔ اور کاغذ میں کچھ اور بھی لکھا ہو۔" تجّھل نے وضاحت نہیں کی کہ کاغذات میں اور کیا رمز ہو سکتی ہے۔ سردار نے اُن کا ذکر کرتے ہوئے خود بھی اس سے پہلوتہی کی تھی۔ کورا نے مجھے بتایا تھا کہ قبیلے میں چند ہی بزرگ لوگوں کو کاغذات کی متبرک حیثیت کی سوا دوسری خوبی کا علم ہے۔ اُس کا اتالیق اجین اسے جانتا تھا۔ "ہم ابھی کچھ نہیں بول سکتے۔" سردار کو متذبذب دیکھ کے تجّھل نے کہا۔ "یہ ہمارا خیال ہے۔ وہ ویسے بھی اِدھر آ سکتے ہیں۔ اِدھر کوئی دروازہ تو نہیں ہے اسی لیے ہم احتیاط کو کہہ رہے ہیں۔ اُن کو کچھ پتہ نہیں ہے اور پتہ چلا تو ہمارے کام میں حرجا

ہو سکتا ہے۔"

"اور اگر اُنھوں نے خود ذکر کیا؟"

"تو اگر وہ کاغذ اپنے ساتھ لائے ہیں، اُن سے لے لینا۔ ہم اپنا [...] اُٹھا کے چلے جائیں گے اور اگر اُنھوں نے ہماری طرح کی بات [...] جس سے سودا پہلے ہوا ہے، اس کا تم کو دھیان رکھنا ہوگا۔ تم اُن [...] کرنا، پر ہم کو ضرور بتانا۔ شاید تمھارا کام پھر کچھ جلدی ہو جائے۔ اس [...] بعد بھی اگر وہ کاغذ ہم سے پہلے لے کے تمھارے پاس آ گئے تو ہم کچھ [...] بولیں گے، تمھیں سلام کر کے اپنا منہ کالا کر لیں گے۔ پر تم اُن سے نہیں [...] گے کہ ہم سے بھی بات ہوئی ہے۔ تم نے ہم کو دیکھ لیا ہے، ابھی [...] معلوم ہوتا تھا، سردار کی سمجھ میں کچھ آیا ہے کچھ نہیں۔ وہ گومگو [...] میں گردن ہلاتا رہا۔ تجّھل نے اُس کی پشت پر ہاتھ رکھ کے آگے بڑھ [...] تلقین کی تو پیش قدمی کرتے ہوئے اُس کے پیر ہچکچانے لگے۔ ہم مکان [...] اندرونی حصّے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ دالان میں پہنچتے ہی ہماری نظر [...] پڑی۔ پیرو کے ساتھ صرف وزیر تھا اور ان کے گرد قبیلے [...] آدمی۔ ان دونوں کی حالت نہایت شکستہ تھی۔ داڑھیاں بڑھی [...] کپڑے گندے اور چہروں پر دھول سی جمی ہوئی۔ ہم نے اُنھیں اور [...] نے ہمیں دُور سے دیکھ لیا تھا۔ دونوں کی آنکھیں ٹمٹمانے لگیں۔ "وہ [...] اُن کے قریب جاتے ہوئے تجّھل نے سردار کا ہاتھ پکڑ کے بدبداتے کہا اور تیز قدموں سے پیرو کی طرف بڑھ گیا۔ دونوں ایک دوسرے [...] ملنے لگے۔ "تم... تم اِدھر کیسے آ گئے؟" تجّھل نے حیرت کا اظہار [...] ہوئے پوچھا۔

پیرو کو سمجھنے میں دشواری نہیں ہوئی کہ اُسے کیا کہنا چاہیے۔ [...] "زیادہ آگے نہیں جا سکے اُستاد!" وہ تھکی ہوئی آواز میں بولا۔ [...] "کئی آدمی راستے میں ہی مرنے ترٹنے لگے۔ اِدھر سالا چور پہاڑی لوگ [...] ایک رات اپن سے مسخری ماری۔ ان کو تو اپن نے سمجھ لیا، پر یہ اپنے [...] کو کیسے سمجھاتا۔ سب آگے پیچھے ایک دم لیٹ گیا۔ ابھی اپن کیا بو[...]" پیرو کے گلے میں کوئی پھانس سی چبھی ہوئی تھی۔ "اپن اِدھر آ گیا!" [...] سر جُھکا کے کہا۔

"ٹھیک کیا، ٹھیک کیا۔" تجّھل اُس کا کندھا تھپ تھپاتے [...] بولا۔ "اِدھر قبیلے کے لوگوں کے پاس گرمی بہت ہے۔ یہ تمھارے [...] قبیلے کا سردار اشی گا ہے۔"

پیرو نے گردن خم کر کے اُسے تعظیم دی۔ "اپن لوگ ابھی اِدھر [...] رہنا مانگتے ہیں سردار! اپن کا کئی آدمی سیدھا نہیں ہے۔"

سُولم نے پیرو کی ترجمانی کے فرائض انجام دیے۔

سردار نے انکار نہیں کیا اور مزید کوئی پوچھ گچھ کیے بغیر [...] ایک معمر آدمی کو بُلا کے پیرو اور اُس کے ساتھیوں کی دیکھ بھال [...]

[...] وہ معمر شخص چن وسا نہیں تھا۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ہمارے [...]نہیں رہیں گے، رہ بھی نہیں سکتے تھے۔ وہ آٹھ تھے اور چن وسا کا گھر [...]نہیں تھا۔ پیرو نے سردار کی اس مہربانی کے عوض اُسے کچھ سامان کی [...]ش کرنی چاہی۔ سردار نے توجہ نہیں دی۔ وہ گہری نظروں سے مسلسل [...]دیکھتا رہا۔

"باقی سب کِدھر ہیں؟" تجّھل نے کہنی مار کے پیرو سے پوچھا۔

"ایک کم ہو گیا ہے اُستاد!" پیرو نے دبی زبان سے کہا۔

ایسا لگا جیسے کوئی بہت زور سے میرے کانوں میں چیخا ہو یا جیسے [...]نے بہت اُوپر سے مجھے دھکا دے دیا ہو۔ تجّھل کی آنکھیں کُھلی کی کُھلی [...]تھیں۔ "ایک کم ہو گیا ہے۔" وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔ "نہیں... نہیں [...] لئے ہو دادا؟"

"اپن نے بہت روکا، پر راضی نہیں ہوا، چلا گیا۔"

"کون... کون؟" تجّھل نے دہشت سے پوچھا۔

پیرو ہونٹ چبانے لگا۔ "اپن کا متن میاں۔"

"متن میاں؟" جامو ہانپتے ہوئے بولا۔ "نہیں دادا!"

"ہاں۔" پیرو کی آواز بھرّا گئی۔

جامو نے اپنا سر پکڑ لیا۔ تجّھل، مارٹی، سُولم سلطان سبھی کی آنکھیں [...]ی گئی تھیں۔ چند لمحوں تک ہمیں بالکل احساس نہیں رہا کہ ہم سردار [...]سامنے کھڑے ہیں اور قبیلے کے دوسرے لوگ بھی یہاں موجود ہیں۔ پیرو [...]یں نگاہیں نیچی کیے کھڑے تھے اور ہم اُنھی کو تک رہے تھے جیسے [...]نے ہم سے مذاق کیا ہے اور ابھی ابھی اس کا اقرار کر لے گا۔ پیرو نے [...]ئی اقرار نہیں کیا لیکن اُسے جلد ہی اپنی غلطی کا اندازہ ہو گیا کہ سردار [...]بیلے کے لوگوں کے سامنے اُسے ہم سے کچھ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ وہ [...]مسکراہٹ لبوں پر بکھیرتے ہوئے سردار سے بولا کہ وہ اور اُس کے [...]بہت تھکے ہوئے اور بیمار ہیں۔ اُنھیں آرام اور علاج کی ضرورت ہے۔ [...]ی طبیب کا انتظام کر دیا جائے اور اُس کے مرے ہوئے آدمی کو بستی میں [...]بلکہ دفن کرنے کی اجازت دی جائے۔

ہم سب ساتھ ساتھ ہی باہر نکلے۔ مکان کی پہاڑی سے نیچے خاصے [...]، پر ایک جگہ وہ سائے کے سائے پڑے ہوئے تھے۔ ہلاکو اور زورا [...]وابھی آدھے نظر آ رہے تھے۔ جینی بُری طرح کھانس رہا تھا۔ پلٹو کو اُس [...]بھی تیز بخار تھا۔ متن میاں کی میّت اُن کے بیچ میں رکھی ہوئی تھی۔ [...]کو بھی کچھ ہوش آ گیا تھا۔ اُس نے متن میاں کے چہرے سے کپڑا ہٹایا [...]سُبکنے لگا۔ متن میاں کے چہرے پر سفیدی چھائی ہوئی تھی۔ اُس کی [...]ں بند تھیں جیسے گہری نیند سو رہا ہو اور کوئی خواب دیکھ رہا ہو یا کسی [...]مسکرا رہا ہو۔ اُس کے بند ہونٹوں میں کوئی شرارت سی چھپی ہوئی تھی۔ وہ [...]مرا ہوا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ لگتا تھا، ابھی آنکھیں کھول کے اُٹھ جائے گا اور سب کو ڈرا دے گا۔ جامو اُس کی لاش سے لپٹنے کے لیے بےتاب تھا۔ تجّھل نے اُسے میّت سے دُور رکھنے کے لیے سلطان کو اشارہ کر دیا تھا۔ قبیلے کے کئی آدمی بھی سردار کے مکان سے ہمارے ہمراہ آئے تھے۔ زورا، جینی، ہلاکو وغیرہ ہم سے دُور دُور ہی رہے اس لیے کہ تجّھل نے رسمی طور پر اُن کی خیریت دریافت کی تھی لیکن ہمیں دیکھنے کے بعد اُن کے گالوں پر خون دوڑنے لگا تھا۔

جامو متن میاں کا چہرہ بھی اچّھی طرح نہیں دیکھ سکا۔ تجّھل نے اُسے دُور دُور ہی رکھا۔ بچپن سے متن میاں جامو کے ساتھ رہا تھا۔ جامو کلکتے آ گیا تو وہ اُس کے بھائی جمرو کی نگرانی میں فیض آباد کے اڈّے کی دیکھ بھال کرنے لگا۔ اُس کی عمر بھی زیادہ نہیں تھی، نہ شادی ہوئی تھی اور ایک خالہ کے سِوا دُنیا میں اُس کا کوئی نہیں تھا۔ جامو اپنے بھائی جمرو کی طرح اُس کا خیال رکھتا تھا۔ شروع شروع میں جامو نے اُسے اڈّے سے دُور رکھنا چاہا تھا اور تعلیم بھی دلانے کی کوشش کی تھی مگر متن میاں چل نہیں سکا۔ جامو نے پھر اُسے باقاعدہ اڈّے ہی پر رکھ لیا۔ ابھی چند مہینے پہلے متن میاں نے فیض آباد کے اڈّے میں مجھ پر چاقو تان لیا تھا۔ سب سچ سمجھے لیکن وہ محض مذاق تھا۔ ہر وقت کسی نہ کسی کو چھیڑنا، مذاق کرنا اور ہنستے رہنا اُس کی عادت تھی۔ چاقو پر اُس کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ جامو ہی نے اُسے سب کچھ سکھایا تھا۔ تمنچے پر بھی اُس کا ہاتھ دوسروں کی نسبت زیادہ رواں ہو گیا تھا۔ تجّھل اسی لیے اُسے فیض آباد سے کلکتے لے آیا تھا کہ وہ ہاتھ کا سبجل اور نظر کا تیز تھا۔ اُس کے جسم میں بہت لچک تھی۔ درمیانہ قد، گُتھا ہوا، کھنچا ہوا بدن۔ وہ بدن جس میں کبھی بجلی دوڑتی تھی، اب اُسے اپنی خبر نہیں تھی۔ کون کیا کر رہا ہے، کون رو رہا ہے، ہنس رہا ہے۔ کون اُسے دیکھ رہا ہے۔ پہلے فرش پر تنکا گرنے سے اُس کے کان کھڑے ہو جاتے تھے۔

قبیلے کے بہت سے آدمی ہمارے اطراف اکٹھے ہو گئے۔ جب ہم متن میاں کی میّت کندھوں پر اُٹھائے بستی کے چوک میں آئے۔ جہاں پیرو کے ٹھیرنے کا انتظام کیا گیا تھا، وہیں متن میاں کو غسل دیا گیا۔ کفن کے بجائے اُسے چادروں سے لپیٹ دیا گیا۔ قبیلے کے آدمیوں کی رائے تھی کہ اُسے اسی طرح دفن کر دیا جائے مگر تجّھل نے غسل کے لیے اصرار کیا۔ میں تو باہر ہی بیٹھا رہا تھا۔ جامو کو بھی کسی نے اندر نہیں آنے دیا تھا۔ بانس کی ایک چارپائی پر متن میاں کو لٹا دیا گیا تھا۔ اُنھوں نے بستی سے بہت دُور ایک جگہ کی نشان دہی کی تھی۔ وہاں پہنچتے پہنچتے اندھیرا پھیل گیا تھا۔ ہمارے ساتھ مشعلیں بھی نہیں تھیں۔ اندھیرے ہی میں تجّھل، پیرو، سلطان، مارٹی، سُولم، ہلاکو اور زورا گڑھا کھودتے رہے۔ پلٹو اور جینی کو بیماری کی وجہ سے وہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔ زمین نرم تھی مگر پتھر ملے ہوئے تھے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کی کوشش میں اُنھوں نے قبر جیسا ایک گڑھا کھود لیا۔ متن میاں کو لٹانے سے پہلے تجّھل نے اُس کے منہ سے چادر کھول کے ٹارچ کی روشنی پھینکی ہی

نے جامو کو تھام لیا تھا کہ کہیں وہ اپنے اوسان نہ کھو بیٹھے۔ جامو خود ہی سنبھلا سنبھلا رہا۔ نہ وہ رویا، نہ اُس نے کوئی آہ بھری۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے متن میاں کو دیکھتا رہا۔ جھل نے ایک دو منٹ بعد نماز جنازہ ... متن میاں کی نماز بھی نہیں ہوسکی۔ اُس کی قبر پر مٹی ڈالتے ہوئے سورۂ فاتحہ اور جتنی آیتیں مجھے یاد تھیں، میں دل ہی دل میں پڑھتا رہا۔ لمحوں میں متن میاں منوں مٹی کے نیچے چھپ گیا اور ہم دیر تک اُس کی قبر پر چپ بیٹھے رہے۔

●

چن وسا کے مکان سے دُور بستی کے آخری سرے پر اُنھوں نے پیرو کے قیام کا بندوبست کیا تھا۔ اُن تک پہنچنے کے لیے ہمیں درمیان میں بستی کے ایک بڑے علاقے سے گزرنا پڑتا۔ ہم قلیوں اُنھیں وہاں چھوڑ کے واپس اپنے میزبان چن وسا کے مکان میں آ گئے تھے۔ بستی کے بہت سے لوگ متن میاں کی تدفین کے دوران سارے راستے ہمارے ہمراہ رہے تھے چنانچہ کسی سے کوئی بات نہیں ہوسکی۔ صرف ہلاکو کی زبانی سرسری طور پر اتنا پتہ چلا کہ ہمارے جُدا ہونے کے بعد دوسرے دن وہاں سخت سردی پڑنے اور تیز بارش ہونے لگی تھی۔ خیمے بھی اُس بارش میں نہ ٹھیر سکے۔ وہ سب بھیگ گئے۔ کوئی بستی قریب نہیں تھی۔ قریب میں جانگ قبیلے ہی کی بستی تھی اور جھل کی ہدایت کے مطابق تین دن گزرنے سے پہلے وہ وہاں نہیں آ سکتے تھے۔ دوسرے دن وہ سب بیمار پڑ گئے اور چھ دن ایک دوسرے کی خبرگیری کرتے رہے۔ ایک اچھا نہیں ہوتا تھا کہ دوسرا بیمار پڑنے لگتا۔ جو سامان انھوں نے اپنی غذا کے لیے اکٹھا کیا تھا، وہ بھی کم پڑنے لگا تھا۔ پھر اُنھیں جنگلی پرندوں کے شکار پر قناعت کرنی پڑی۔ چوتھی رات جب آسمان صاف تھا، قبائلی قزاقوں کے ایک گروہ نے اُن پر حملہ کر دیا۔ تمنچوں کی آواز پر وہ اپنے تین آدمی گنوا کے وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ لُوٹنے والے قلیوں ہی نے پیرو کے ٹھکانے کی خبر اُنھیں دی ہوگی۔ سامان اُٹھانے کے لیے وہ قلیوں کا انتظار کرتے رہے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ان میں سے کوئی جانگ قبیلے ہی میں آ کے قلی پکڑ کے لائے۔ متن میاں کی موت کے بعد وزیرا اور ہلاکو نے قلیوں کی تلاش میں جانگ قبیلے کی طرف بڑھنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر اُنھیں یہاں تک آنے کی ضرورت نہیں پڑی، قلی راستے ہی میں مل گئے۔

اُس رات اُوپر جانے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ جب ہم گھر لَوٹے تو رات بہت ہو چکی تھی۔ یوں بھی اگر ہم اُوپر جانے کا ارادہ کرتے تو آدھی رات سے پہلے وہاں نہ پہنچ پاتے اور میں خود جھل کو منع کر دیتا۔ میرا دل کرتا تھا کہ رات کو کسی وقت، جب سب سو جائیں تو اکیلا ہی اُوپر جاؤں۔ یقیناً ابا جان اُسی مندر میں ہوں گے جہاں کل رات ہم نے اُنھیں دیکھا تھا۔ میں ایک آخری کوشش کر کے اور دیکھ لیتا ہوں۔ میں اُن سے فریاد کرلوں گا اور اُس وقت تک اُن کے پیر نہیں چھوڑوں گا، جب تک وہ ہاں نہ کر دیں۔ میں اُن کے سامنے دیواروں سے ٹکریں مارتا رہوں گا اور اپنا سر لہولہان کرلوں گا۔ میں چاقو نکال کے کہوں گا کہ اگر وہ تیار نہ ہوئے تو میں اسے اپنے سینے میں اُتار لوں گا۔ میں اُنھی کا بیٹا ہوں، اِس لیے اُنھیں یقین آ جانا چاہیے کہ میں ایسا کر سکتا ہوں۔ میں اُنھیں جہاں گیر، اکبر، فتح، فریا، فارہہ سب کا واسطہ دے کے کہوں گا کہ وہ چلے جائیں۔ ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے مگر میں اتنی رات گئے اکیلا اُن تک کیسے جا سکتا۔ ضروری نہیں کہ وہ رات بھر ہمارے انتظار میں بیٹھے رہیں۔ چن وسا کے گھر سے ہم نے کچھ کھانا زہر مار کر لیا تھا۔ جامو کو نہ جانے کیا ہو گیا تھا، بالکل بے حرکت بیٹھا ہوا تھا۔ چن وسا کے کمرے سے جانے کے بعد جھل نے اُس کا سر اپنے بازوؤں میں چھپا لیا۔ وہ اُسے اپنے پہلو میں لیے لیٹ گیا۔ آتش دان میں آگ سُلگ رہی تھی۔ کمرے میں کوئی آواز نہیں تھی۔ کبھی لکڑی چٹخ جاتی تو یہ سکوت ایک لمحے کے لیے درہم برہم ہو جاتا۔ میری آنکھوں کے سامنے بار بار متن میاں کا سفید چہرہ آ جاتا تھا۔

دوسرے دن ہم نے بستی کے چوک میں سامان نہیں سجایا۔ جھل سے گھر سے نکلا اور اِدھر اُدھر بے مقصد گھومتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ پیرو اور دوسرے لوگوں کو دیکھنے جائے گا۔ دن کا ابتدائی حصہ تھا۔ اچانک مندروں کے علاقے کی پہاڑیاں چڑھنے لگا۔ پگ ڈنڈی پر بستی کے لوگ کی آمد و رفت جاری تھی۔ جدھر پھلوں کے باغات تھے، وہاں بھی لوگ تھے۔ جہاں نسبتاً چپٹی زمینیں تھیں، وہاں بھی وہ کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ باغات اور کھیتوں کا سلسلہ زیادہ دُور تک پھیلا ہوا نہیں تھا۔ جیسے جیسے چڑھائی بڑھتی جاتی تھی، جنگلی درختوں اور جھاڑیوں سے زمین ہی ڈھکتی جاتی تھی۔ مندروں کے علاقے کے اطراف کا وسیع رقبہ اُنھوں باغات اور کھیتوں کے لیے استعمال نہیں کیا تھا۔ اُسے جنگل ہی رہنے دیا گیا تھا۔ اُجالے کی وجہ سے ہم جلد اُوپر پہنچ گئے اور پہلے ہی مندر میں ہمیں دکھائی دے گئے۔ دن میں بھی وہ وہاں تعینات تھے۔ ہر جگہ، ہر مندر میں۔ بے چھت مورتیوں کے علاقوں میں بھی۔ تاہم ہماری آمد پر اُن کی نقل و حرکت میں کوئی غیر معمولی اضطراب نظر نہیں آیا جیسے اُنھوں نے ہمیں دیکھا ہی نہ ہو۔ ہم نے بھی یہی ظاہر کیا۔ ہم بڑے مندر میں ایک جگہ نہیں ٹھیرے۔ کہیں ٹھیر جاتے، پھر چلنے لگتے۔ کُھلی ہوئی بڑی مورتی اگر بستی سے مندروں کے علاقے میں آ کے سب سے پہلے پڑتی تھی مگر ہم اُس طرف جانے کے بجائے سیدھے بڑے مندر میں چلے گئے تھے، دوسرے اور مندروں میں۔ پھر ہم گھوم گھام کے بڑی مورتی کے پاس آئے تو پیرو اور زورا کو وہاں دیکھ کے مارٹی اچھل پڑا۔ "استاد!... اُو دز، اُو دز" وہ ہڑبڑاتا ہوا بولا۔

"دیکھ لیا ہے رے!" جھل نے ناگواری سے کہا۔ مارٹی سہم گیا۔ ہم سب نے ایک دوسرے سے گرم جوشی کے ساتھ ہاتھ ملا... گئے۔ اتنی گرم جوشی مسافروں، تماشائیوں اور سوداگروں ہی کے درمیان ہوتی ہے۔ پھر ہم ساتھ ساتھ ہی چلنے لگے۔ یہاں اُن سے کسی قدر کُھل کے بات ہو سکتی تھی۔ بڑی مورتی کے قریب ایک سنسان جگہ آ کے جھل کی رفتار کم ہو گئی، غیر ارادی طور پر چاروں طرف ہماری نگاہیں بھٹکنے لگیں، وہاں ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ہماری چالوں پر اُن کی آنکھیں کُھل ... اُنھوں نے اُنھیں ایک نگاہ بھر کے بھی نہیں دیکھا کہ سب آگے نکل گئے ... نے پھر پیچھے مُڑ کے بھی نہیں دیکھا۔ مختلف جگہوں سے ہوتے ہوئے ... بڑے مندر سے فاصلے پر نشیب میں واقع اُسی مندر کے پاس آ نکلا جہاں کل رات ابا جان ہمیں ملے تھے۔ بستی کے چند آدمی اب بھی ... پر اونگھ رہے تھے۔ دیر ہو گئی تھی لیکن سرائے میں کھانا مانگنے پر دوپہر کا کھانا مل گیا اور رات ہونے سے پہلے ہی ہم اُتر کے نیچے بستی ... پیرو کی قیام گاہ پہلے آتی تھی۔ وہ وہیں مُڑ گیا۔ ہم چن وسا کے گھر آ گئے۔

دوسرے دن پیرو سے ہماری ملاقات بستی کے چوک میں ہوئی۔ ایک روز ... کے بعد ہم اپنا سامان کھولے بستی کے لوگوں کے ہجوم میں گھرے ... تھے کہ پیرو، وزیر، زورا، ہلاکو اور پلٹو آ گئے۔ اُن کے چہروں پر تازگی ... ہوئی تھی۔ اُن کے لیے ہمارا اِس طرح مال کے ساتھ بیٹھنا اور گاہکوں ... تول کرنا بہت تعجب انگیز تھا۔ پیرو لوگوں کو پیچھے ہٹاتا ہوا اندر آیا: "مال بن رہا ہے اُستاد؟" اُس نے تیکھے لہجے میں صدا لگائی۔

"مال کدھر دادا! سالا اِدھر دیدے زیادہ پھاڑتا، دمڑی کم نکالتا ہے۔" ... نے مسکرا کے کہا: "تم بولو، کدھر کا چکر لگ رہا ہے۔ سردار کو تو بڑا مال لگایا ...؟"

"اپن کے پاس تم جیسا مال کدھر ہے۔ تم نے پہلے ہی جادو مار ... ہے۔ سالا اُلٹا پڑا ہے۔" پیرو نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

اِس کا مطلب یہ تھا کہ پیرو سردار سے مل کے آیا ہے۔ جھل بھی ... چاہتا ہوگا۔ پیرو کے لہجے سے اطمینان ظاہر ہوتا تھا۔ چونکہ ہم ... میں مصروف تھے اِس لیے وہ وہاں نہیں رُکا۔ جھل نے اُس دن ... کے داموں میں اچھی خاصی کمی کر دی تھی مگر لُٹس نہیں مچائی تھی۔ ... ین کے پاس پیسے نہیں تھے وہ اپنی پسند کی چیزیں محفوظ کرنے ... کے گھر بھاگتی ہوئی جاتی تھیں اور ہانپتی ہوئی واپس آتی تھیں۔ ہم صرف ... ق اور چند تھیلے لے گئے تھے۔ اُس دن کافی سامان بِک گیا۔ مردوں ... اجرا ہیں، دستانے، مفلر، قینچیاں، بلیڈ، بچوں نے کھلونے، چاکلیٹ ... عورتوں نے ریشمی کپڑے، مصنوعی زیورات اور آرائش و زیبائش کا سامان ... بِکری اور ہو جاتی اگر جھل صندوق بند کر کے اُٹھ نہ جاتا۔ سردار نے اُس روز ... نہیں بلایا تھا لیکن کسی وقت بھی اُس کا ہرکارہ ہماری طلبی کا حکم ... لا سکتا تھا۔ سامان گھر واپس بھجوا کے جھل کے ایما پر ہم سب پھر اُوپر ... لگے۔ دوپہر کا وقت تھا اور ابر چھایا ہوا تھا۔ بارش کے آثار تو نہیں تھے لیکن وہاں دیکھتے دیکھتے موسلا دھار پانی برسنے لگتا تھا۔ اِس کے باوجود جھل کو جلدی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہا تھا۔ تھوڑی دُور چل کے سانس لینے کے لیے رُک جاتا، پھر چلنے لگتا۔ سورج غروب ہونے سے پہلے ہم اُوپر نہیں پہنچ سکے۔ اُوپر مشعلیں روشن ہو چکی تھیں اور بھکشو اِدھر اُدھر سے سمٹ کے مندروں خصوصاً بڑے مندر میں جمع ہو رہے تھے۔ ہم بھی وہیں ایک گوشے میں اپنے جسم ڈھلکا کے بیٹھ گئے۔ رُک رُک کے چلنے سے تھکن زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ ٹانگیں اینٹھ سی رہی تھیں۔ جامو، سلطان، مارٹی اور سُولم سب جیسے چلتے چلتے، سوچتے سوچتے اور بولتے بولتے تھک گئے تھے۔ اُن کے چہرے سپاٹ تھے۔ بے جان جسم، جیسے اب سوچنے اور کرنے کو کچھ نہ رہ گیا ہو۔ کبھی اُوپر آنا، کبھی نیچے جانا۔ مندروں کے وسیع علاقے میں اِس سرے سے اُس سرے تک چکر لگاتے رہنا۔ پہاڑوں پر چڑھنا، اُترنا، نہ کھانے کا کوئی وقت، نہ سونے کا اور ہر وقت منہ بند رکھنا۔ وہ زبان سے کچھ نہیں کہہ رہے تھے لیکن اُن کی بے چمک آنکھیں اور اُن کے بے رنگ چہروں پر بہت کچھ لکھا ہوا تھا۔ پڑھنا چاہیں تو لوگ کورے کاغذ پر پڑھ لیتے ہیں۔ مجھے اُن سے نگاہیں ملاتے ہوئے خوف آتا تھا۔ ہر وقت یہ خیال رہتا کہ کہیں کوئی کچھ کہہ نہ دے، جھل سے یا مجھ سے۔

رات گئے تک جھل نے بڑے مندر سے حرکت نہیں کی۔ روشنیاں تدریج کم ہونے لگیں تو وہ کسمسانے لگے۔ ہم نے اپنے بکھرے ہوئے جسم سمیٹے اور اُٹھ کے اُس کے ساتھ چل دیے۔ معمول میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ایک مقام سے دوسرا مقام، ایک جگہ سے دوسری جگہ۔ بستی کے آدمی اس وقت بھی ہر جگہ موجود تھے اور اُن کی وہی حالت تھی کہ ایک گروہ ایک عمارت پر تعینات تھا تو دوسرا دوسری عمارت پر۔ وہ ہمارا تعاقب نہیں کرتے تھے کہ اُنھیں ایسا کرنے کی ضرورت تھی، نہ اُنھیں ہماری منزل جاننے سے کوئی غرض تھی کہ وہ ہر عمارت میں موجود تھے۔ کُھلے آسمان کے نیچے ایک جگہ سے دوسری جگہ کے فاصلے کے دوران کہیں بھی ہمارے ہونے سے اُن کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ہم لَوٹ پھر کے کسی عمارت ہی کی طرف آتے۔ بڑے مندر سے چلنے کے بعد وہ تیسری عمارت تھی جہاں قدم رکھنے پر ہماری رگوں میں جما ہوا خون کلبلانے لگا۔ ہم سے پہلے پیرو، وزیر، زورا، ہلاکو اور پلٹو وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمارے درمیان بس رسمی بات چیت ہوئی۔ کچھ دیر ٹھیر کے ہم ایک ساتھ باہر نکلے۔ اندھیرے میں آتے ہی جھل نے ہمیں دو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ مارٹی اور سُولم کی جگہ پیرو اور وزیر ہمارے ساتھ ہو گئے۔ اُدھر وہ پانچ کے پانچ ہی رہے۔ اِدھر جامو، سلطان، وزیر، پیرو، جھل اور میں ہم چھ۔ جھل نے سُولم کو آگے بڑھا دیا اور ہم سب ایک پتھر کی آڑ میں اُس وقت تک بیٹھے رہے جب تک ہمیں سُولم کے خاصے آگے نکل جانے کا یقین نہ ہو گیا۔ سُولم ہر مرتبہ ہمارے ساتھ رہا تھا اِس لیے راستوں سے خوب واقف ہو چکا تھا۔ بعد میں ہم کسی اور عمارت میں نہیں گئے بلکہ بیچ کی تمام عمارتیں چھوڑتے

ہوئے ایک طویل راستہ کاٹ کے اُسی نشیب میں آگئے جہاں اُونچے درختوں اور جھاڑیوں میں گھرا ہوا قدیم مندر واقع تھا۔ مندر کی چھت نظر آتے ہی ہم نے اپنی رفتار بے حد کم کر دی تھی۔ پنجوں اور ایڑیوں کے بل تقریباً رینگتے ہوئے ہم عمارت کے عقب میں پہنچ گئے۔ سُولم اور بستی کے آدمیوں کی دبی دبی آوازیں ہمیں سُنائی دے رہی تھیں۔ تِھل نے سُولم کو ہدایت کی تھی کہ وہ سیڑھیوں پر موجود آدمیوں کو کسی طرح روکے رکھے، روکنے سے اُس کی مراد یہ تھی کہ اُن کا دھیان بٹائے رکھے، سُولم اُن کی زبان جانتا تھا۔ وہ اُن سے چائے طلب کر سکتا تھا، الاؤ کے گرد کچھ دیر بیٹھنے کی اجازت حاصل کر سکتا تھا اپنے کسی آدمی کی طبیعت اچانک خراب ہونے کا عذر کر سکتا تھا۔ وہ کسی طرح بھی انھیں باتوں میں لگا سکتا تھا اور اس اثنا میں ہم پیچھے سے، جدھر سیڑھیاں نہیں تھیں، عمارت میں داخل ہو سکتے تھے۔ پہلی رات جب ہم یہاں آئے تھے تو صرف سامنے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ تِھل نے سُولم کو یہ ہدایت بھی دی تھی کہ پہلے وہ مندر میں جا کے عقبی دروازہ اگر بند ہو تو کھول دے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو کسی طور انھیں سیڑھیوں سے دُور لے جائے۔ سیڑھیوں سے انھیں دور لے جانا کچھ ایسا مشکل نہیں تھا۔ مندر سے واپسی پر کچھ دُور جانے کے بعد کوئی بھی آدمی چیخنے چِلّانے لگتا۔ یقیناً وہ صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے اُس طرف بھاگتے اور اس دوران ہم مندر میں داخل ہو جاتے۔ یوں ہم اُن سب پر پیچھے سے وار کر کے اُنھیں بے سدھ بھی کر سکتے تھے۔ اُس رات اور کل دن میں ہم نے اچھی طرح اطمینان کر لیا تھا کہ سیڑھیوں پر اُن کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ تین یا چار آدمی ہوں گے۔ سُولم کے جانے کے بعد ہم اندازاً آدھ گھنٹے کے وقفے سے اُس کے پیچھے روانہ ہوئے تھے۔ سُولم کو اندازاً آدھ گھنٹے بعد اُن سے رجوع ہونا چاہیے تھا۔ اُس نے یہی کیا۔ سیڑھیوں کی جانب سے اُن کی آوازیں آنے سے ظاہر تھا کہ عقبی دروازہ کھول دیا گیا ہے۔ ہم نے اپنی چاپ میں گھونٹنے کی پوری کوشش کی تھی۔ پچھلا دروازہ سامنے کے دروازے سے قریب نہیں تھا۔ ایک بڑی عمارت دونوں کے بیچ میں کھڑی تھی۔

دروازہ کھلا ہوا ہی تھا۔ سب سے پہلے تِھل اندر گیا۔ ہم سب دیوار کے ساتھ چپکے کھڑے رہے۔ چند ہی ثانیوں بعد تِھل نے واپس آ کے جامو سلطان اور وزیر کو وہیں روک دیا۔ مجھے اور پیرو کو ساتھ لے کے عمارت کے وسطی حصّے، ہشت پہلو ستونوں کے گول کمرے میں آ گیا۔ وہاں صرف تین بھکشو ایک چھوٹی سی مشعل کی ڈگمگاتی روشنی میں مراقبے میں غرق تھے اور اُن میں ابّا جان بھی تھے۔ تِھل کھسکتا ہوا اُن کے پاس جا کے اور اُن کے زانو پر ہاتھ رکھ کے بیٹھ گیا۔ ابّا جان کے منجمد سراپا میں ایک ہلکی سی لرزش ہوئی، اُنھوں نے گھوم کے ہم تینوں کو غور سے دیکھا پھر کچھ کہے بغیر اُٹھ کھڑے ہوئے اور عمارت کے تاریک حصّے میں آ گئے۔ اسی طرف عقبی دروازے کی راہ داری میں جامو سلطان اور وزیر چھپے کھڑے تھے۔ تِھل نے پیرو کو اشارہ کر کے اُنھیں بھی بُلا لیا۔

اُس رات عمارت کے اُس وسطی کمرے کی مکانیت کا ہمیں کچھ کچھ اندازہ ہو ہی گیا تھا۔ مرکزی مورتی سے دیوار تک پھیلے ہوئے ستونوں کی آٹھ قطاریں تھیں اور اندر آنے جانے کے لیے سامنے اور پیچھے کے راستوں کے علاوہ دائیں بائیں دو اور راستے تھے۔ ہر راستہ یکساں تھا لیکن ایک راستے کو اس اعتبار سے فوقیت حاصل تھی کہ اُس کے آگے سیڑھیاں تھیں، باقی راستوں کے سامنے صرف چبوترا تھا اس لیے اُسے سامنے کا دروازہ کہا جا سکتا تھا۔ اسی کی نسبت سے ابّا جان دائیں طرف کے راستے کے قریب بیٹھے ہوئے تھے کیونکہ اُدھر روشنی تھی اور وہ ہمیں آسانی سے نظر آ سکتے تھے۔ وہ بائیں طرف کا راستہ تھا جہاں ابّا جان مڑ گئے تھے۔ مڑتے ہی اُنھوں نے ایک دروازے پر آہستگی سے ہتھیلی کا دباؤ ڈالا اور کواڑ کھل گئے۔ اندر گھپ اندھیرا تھا مگر وہ بھی کوئی کمرہ ہی تھا۔ پتھر کے فرش اور دیواروں پر اُبھرے ہوئے نقش و نگار سے یہی معلوم ہوتا تھا۔ دیوار ٹٹولتے ہوئے چند قدم چل کے ابّا جان شاید پھر کسی دروازے پر آ گئے تھے۔ "احتیاط سے۔" اُنھوں نے سرگوشی میں کہا۔ "کواڑ بند کر دینا۔"

نیچے تنگ سیڑھیاں جاتی تھیں۔ ابّا جان بے آواز قدموں سے نیچے اُترنے لگے۔ اندر دو آدمی ایک ساتھ نہیں گزر سکتے تھے۔ ذرا بھاری آدمی ہو تو دیواریں شانوں سے چھِلنے لگیں اور اُسے ترچھا ہونا پڑے۔ ابّا جان ہم سب سے آگے تھے۔ پیچھے تِھل، پیرو، پھر میں اور میرے پیچھے جامو سلطان اور وزیر۔ ہم سب نے کمر سے ایک دوسرے کے کپڑے پکڑ رکھے تھے جیسے جیسے ہم اُترتے گئے، سیڑھیاں گھومتی گئیں۔ ابّا جان کے پاس بھی ایک چھوٹی بیٹری تھی جسے اُنھوں نے کچھ آگے جا کے روشن کر لیا اور ہم دیواریں، چھت اور قدمچے دیکھنے کے قابل ہو گئے۔ وہ سیڑھیوں کی کوئی سرنگ تھی۔ شاید پتھروں کا رنگ بھی سیاہ تھا۔ کوئی سو زینے اُترنے کے بعد سیڑھیاں کئی سمتوں میں بٹ جاتی تھیں۔ ہر سُو ایک عجیب قسم کی بُو پھیلی ہوئی تھی اور گیلا دھواں سا چھایا ہوا تھا لیکن سانس لینے میں ایسی دشواری نہیں ہو رہی تھی۔ یقیناً کہیں سے ہوا آنے کا کوئی انتظام تھا چاہے وہ گھٹی ہوئی ہوا آتی ہو یا دیر سے یہاں پہنچتی ہو۔ اتنی بہت سی سیڑھیاں نہ جانے کہاں کہاں جاتی تھیں۔ ابّا جان اس طرح بے جھجک آگے بڑھ رہے تھے جیسے اُنھوں نے ساری زندگی انھی راستوں پر کاٹی ہو۔ کوئی بھی اُوپر سے عمارت دیکھ کے قیاس نہیں کر سکتا تھا کہ اُس کے نیچے، زیرِ زمین یہ راستے بنے ہوں گے پتہ نہیں اُن کا کیا مقصد تھا۔ کہاں تک وہ جاتے تھے یا سب ایک جگہ جا کے ختم ہو جاتے تھے۔ جہاں ابّا جان ہمیں لے جا رہے تھے مگر ایسا نہیں ہو گا۔ ہم میں ہر شخص خاموش تھا۔ ابّا جان نے بھی اُوپر کمرے میں احتیاط کی تلقین کرنے کے سوا کوئی اور بات نہیں کی تھی۔ وزیر کی سانس پھول رہی تھی، اپنی کھانسی روکنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ تِھل اگر ابّا جان کی

ذرا اپنی بیٹری بھی جلا لیتا تو روشنی کچھ زیادہ ہو جاتی اور ہم بار بار ری دیواروں سے نہ ٹکراتے لیکن تِھل نے بیٹری جیب سے نہیں نکالی۔

ہم خاصے نیچے آ گئے ہوں گے کہ ایک کوٹھری پر آ کے سیڑھیاں ہو گئیں۔ ابّا جان نے بیٹری کی روشنی اُس کے اطراف میں ڈالی اُدھر گپھا تھی یا غار تھا۔ کسی بڑے تنور کے منہ جیسا راستہ اندر جانے کے لیے ہوا تھا۔ ہم سب سر جھکائے ہوئے آسانی سے اُس میں داخل ہو گئے۔ کوٹھری ہوا اور روشنی کے لیے کوئی روزن نہیں تھا۔ فضا گرم تھی۔ ایک طرف دیوار گوتم بدھ کی بلند قامت مورتی تراشی ہوئی تھی۔ ابّا جان نے بیٹری بجھا دی۔ رے اندھیرے میں ڈوب گیا۔ ہم سب اپنی جگہوں پر دم بخود کھڑے ے۔ یکایک ہمیں ایک گڑگڑاہٹ سُنائی دی جیسے کہیں زمین دہل گئی ہو ڑی چٹان اپنی جگہ سے ہل رہی ہو۔ ابّا جان نے جب بیٹری روشن کی تو ری آنکھوں کے سامنے ایک ناقابلِ یقین منظر تھا۔ ابّا جان وہ جسیم مورتی نے ناتواں جسم کے زور سے دھکیل رہے تھے اور مورتی اپنی جگہ سے کھسک ہی تھی۔

"میں آؤں بڑے صاحب؟" تِھل کی آواز کمرے میں گونجی۔

"آؤ۔" ابّا جان کھنکتے لہجے میں بولے۔

تِھل نے اُن کے قریب جا کے ایک جانب سے مورتی پر زور ا۔ وہ اُس سے نہیں ہٹی تو پیرو اُس کی مدد کو پہنچ گیا پھر ہم سب لیکن ہم تی کی وہ چٹان ایک انچ نہیں کھسکا سکے۔

"ہٹ جاؤ۔" ابّا جان نے کسی حد تک جھڑکنے کے انداز میں ہم سے ا۔ ہم نے اُن کے حکم کی تعمیل کی۔ پھر وہ خود ہی مورتی پر زور ڈالنے لگے اور رے کانوں میں وہی گڑگڑاہٹ گونجنے لگی۔ مورتی کا ایک حصّہ پیچھے ب رہا تھا اور دوسری جانب سے ایک حصّہ اُبھر رہا تھا۔ سب حیران تھے۔ جان کی نہ سانس پھول رہی تھی، نہ اُن کے تیور سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ی طاقت صرف کر رہے ہیں۔ "اسے کوئی نہیں ہٹا سکتا۔" مورتی ترچھی نے سے اندر ایک راستہ نظر آنے لگا تو ابّا جان دھیمی آواز میں بولے۔

"اُس میں کوئی گُر ہے بڑے صاحب!" تِھل نے نرم لہجے میں کہا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" ابّا جان نے جواب دیا۔ تِھل نے تکرار ں کی تو وہ خود ہی بولے۔ "تمام زینے ایسی ہی کوٹھریوں پر ختم ہو جاتے ہا۔ بدھ راہب اپنے نفس کو کڑی آزمائش میں ڈالنے کے لیے یہاں ے محبوس ہو جاتے ہیں پھر اُنھیں دُنیا کی کوئی آواز نہیں ستاتی۔"

"اِدھر تو راستہ کھوجنا مشکل ہے۔ ہر جگہ ایک جیسی سیڑھی ہے۔ آدمی کا سر چکرا جاتا ہو گا۔ یہ تو ایک دم بھول بھلیاں ہیں بڑے صاحب!"

ابّا جان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مورتی ہٹنے سے جو راستہ بن گیا تھا، سی تردد کے بغیر اُس کے اندر چلے گئے اور جب تک ہم سب دوسری رف نہیں پہنچ گئے اور اُنھوں نے مورتی دوبارہ دیوار کے برابر نہیں کی وہ آگے نہیں بڑھے۔ آگے کوئی زینہ نہیں تھا۔ غار کے اِس جانب ایک تنگ گلی تھی۔ چاروں طرف سے بند، کسی تابوت کی طرح۔ تابوت کی لمبائی چوڑائی محدود ہوتی ہے۔ اُس کی چوڑائی محدود تھی اور لمبائی لامحدود۔ زینے کے مانند اس میں بھی صرف ایک آدمی کے گزرنے کی گنجائش تھی۔ کچھ ہی دُور چل کے ہمیں ایک اور گلی کا موڑ نظر آیا۔ پھر اُن گلیوں کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔ ایک موڑ کے بعد دوسرا موڑ۔ ہر سمت دوراہے سہ راہے۔ دائیں بائیں، قدم قدم پر چکّردار راستے پھوٹتے تھے۔ ابّا جان جیسے آنکھیں بند کر کے، جدھر منہ اُٹھا، اُسی طرف جا رہے تھے۔ ایک گلی چھوڑ کے، دوسری گلی میں۔ تمام راستے اُنھیں ازبر تھے۔ وہ نہ کہیں رُکے، نہ اُنھیں کسی گلی کی شناخت میں کوئی دقت پیش آئی۔ ہر قدم پر میرا دل اُچھلنے لگتا تھا کہ اگر پیچھے غار والی مورتی دوبارہ نہ کُھلی! اگر ابّا جان راستہ ہی بھول جائیں تو ہم کبھی یہاں سے نہیں لوٹ سکتے تھے۔ گلیوں کی ہوا مسموم تھی اور دم گھٹنے سا لگا تھا۔ ابّا جان نہ جانے کہاں کہاں کن کن راستوں پر ہمیں گھما رہے تھے۔ وزیر کی طبیعت پہلے ہی خراب تھی کسی لمحے کسی کے بھی اعصاب جواب دے سکتے تھے۔ سینہ بند ہوا جاتا تھا۔ میری طرح سبھی کے حلق میں کانٹے چبھ رہے ہوں گے۔ سب موٹے کپڑے پہنے ہوئے تھے ورنہ بار بار دیواروں سے رگڑیں کھانے سے ہوئے شانے اور کہنیاں چھِل جاتیں۔ ذرا کہیں پیر اُلٹا پڑ جاتا تو دیواریں دھکا دیتی تھیں۔ زمین پر پھونک پھونک کر پیر رکھنے سے ٹانگوں میں درد اُٹھنے لگا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ گلیاں کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ شاید ابّا جان بھی راستہ بھول گئے ہیں لیکن آخر وہ اچانک ایک جگہ مڑ کے رُک گئے۔ دیوار پر روشنی ہوئی تو ہم دیکھ سکے۔ ہر طرف نیلی نیلی ہری، لال روشنیوں کے ستارے ٹمٹما رہے تھے۔ ہم ایک اوسط رقبے کے ہال میں موجود تھے۔ اسے ہال ہی کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ ابّا جان نے دیا سلائی جلا کے وہاں نصب ایک مشعل روشن کر دی تو چھت اور دیواریں جگمگانے لگیں جیسے ہر طرف رنگ برنگے شعلے جل رہے ہوں یا چھوٹے چھوٹے بلب۔ دیر سے اندھیرے میں رہنے کے بعد یک بارگی اتنی روشنیوں میں آ جانے سے ہماری آنکھیں خیرہ ہو گئی تھیں مشعل کی روشنی کے زیر و بم کے ساتھ ستارے بھی جھل مِلا رہے تھے۔ کبھی مدھم، کبھی تیز۔ فرش پر رنگوں کی بوندیں سی ٹپک رہی تھیں۔ وہاں نہ گوتم بُدھ کی مورتی تھی، نہ کسی اور کی۔ کمرے کی ہوا بھی اتنی پراگندہ نہیں تھی۔ جتنی گلیوں کی تھی۔ ہم حیرت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھتے رہے۔ میں نے کتابوں میں کہیں ایسے کمروں کا ذکر پڑھا تھا۔ چھت اور دیواروں میں جابجا چھوٹے چھوٹے شیشے اور پتھر جڑے ہوئے تھے جو روشنیاں منعکس کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے، وہ نگینے، ہیرے اور موتی ہوں۔ روشنیوں کی جھلملاہٹ سے نیند کی کیفیت طاری ہونے لگتی تھی۔ کمرے میں کوئی ستون نہیں تھا۔ ہر طرف دیواروں میں محراب نما در بنے ہوئے تھے جو سب کے سب بند تھے اور صرف وہیں یہ شیشے اور پتھر لگے ہوئے نہیں تھے۔

"بیٹھ جائیے۔" اباجان کی آواز بھی جھلملا رہی تھی۔ ہم سب فرش پر بیٹھ گئے اور ہٹ پٹاتی نظروں سے اُنھیں دیکھنے لگے۔ "یہیں سب کچھ ہے"۔ وہ سرد آواز میں بولے۔

"یہ تو اپن کو ایک سپنا لگتا ہے"۔ پیرو نے پہلی بار زبان کھولی۔

"اتنے نیچے اِدھر لوگ کیسے پہنچ گئے ؟" سلطان حیرت سے بولا۔

"یہ سب سوچنے کا وقت نہیں ہے"۔ اباجان نے تنک کے کہا۔

"یہ تو رنگ محل ہے"۔ اپنے لکھنؤ میں بھی ایسا نہیں ہے"۔ جامو خوابیدہ آواز میں بولا۔ "اُستاد! اِدھر سب ہیرے چھپے ہوئے ہیں۔"

"بڑے صاحب"! جھل نے جامو کی بات پر توجہ نہیں دی اور اباجان سے مخاطب ہو کے بولا۔ "میں نے آپ سے اُس رات اِن سب کے لیے بول دیا تھا۔ اِن کی زبان تیز ہے۔ اُنیس بیس ہو جائے تو دھیان مت دینا۔ یہ اپنا پیرو ہے، اس کا نام جامو ہے۔ یہ سلطانے، یہ وزیرا۔ اِدھر پانچ آدمی اُوپر بیٹھے ہیں اور دو بستی میں پڑے ہیں۔ ایک راستے میں دھوکا دے گیا، اُسے پرسوں ہم نے نیچے مٹی میں دبا دیا ہے۔ اِن سب کو باہر کی طرح جانو۔ ہم کو بولو کہ ہم کیا کر سکتے ہیں"۔

اباجان سر ہلانے لگے میرے اور جھل کے سوا سبھی نے اُنھیں سٹ پٹاتے ہوئے سلام کیا۔

اباجان نے گردن جھکا کے انھیں جواب دیا اور گونجتی ہوئی آواز میں بولے "آپ نے سب دیکھ لیا ہے ؟"

"دیکھ لیا ہے بڑے صاحب"! جھل نے تیزی سے کہا۔

"پھر کیا فیصلہ کیا ہے ؟"

"سوچنا کیا بڑے صاحب"!

"میرا مشورہ یہی ہے کہ آپ لوگ یہاں وقت ضائع نہ کریں۔"

"ہم آپ کے لیے اِدھر آئے ہیں"۔

"مجھے دیر لگے گی۔ بہتر ہے کہ تکرار نہ کریں"۔

"اِدھر آپ کے اب بہت سے ہاتھ ہیں۔ اپنے کو ابھی اکیلا مت سمجھو"۔

"چلتے وقت جھل بھائی نے سب کو بول دیا تھا کہ سارا اگلا پچھلا معاف کر کے چلنا۔ اپن حساب چکتا کر کے آیا ہے"۔ پیرو اٹک اٹک کے بولا۔ "اپن کو بولو یہ سب کیا ہے۔ اپن ابھی کدھر جائیں"۔

"آپ لوگ کچھ نہیں سمجھ رہے ہے"۔ اباجان کے لہجے میں بیزاری تھی۔

"قسم سے لاڈلا جانی آپ کے لیے بہت پریشان تھا بڑے صاحب"!

پیرو بولا۔ "ابھی اپن کی دو کوڑی کی رائے مانو تو اِدھر سے جلدی سے جلدی لوٹ چلو"۔

"نہیں پیرو دادا"! جھل نے تندی سے کہا۔ "بڑے صاحب ایسے نہیں جا سکتے۔ ہم بھی اُن کے بدلے ہوتے تو اِدھر تک آ کے نہیں لوٹتے۔ اپنے کو وقت کا دھیان ہے۔ رات جا رہی ہے۔ ہم کو شاید لوٹنا بھی ہوگا۔ میں نے پہلے ہی سب بتا دیا تھا۔ اب کیا اِس کو دہرانے کی ضرورت ہے۔ بولو بڑے صاحب"!

اباجان ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگے۔ اُن کی آنکھوں سے ہو مترشح تھی۔ جھل نے اُن سے پھر کوئی اصرار نہیں کیا۔ پیرو نے کچھ بولنے کی کوشش کی تو اُس نے اُسے بھی روک دیا۔ سب چپ اُن کا منہ تک رہے بمشکل تمام اُن کے لب کھلے اور اُن کی بوجھل آواز کمرے میں اُبھری۔ جس میں ہم بیٹھے ہوئے ہیں، بدھوں کے دور سے پہلے بنائی گئی تھی کسی زمانے میں یہ اس خطے کے حاکموں کی عشرت گاہ تھی۔ جب بدھ یہاں آنا شروع تو اُس وقت سیانگ نامی حاکم نے اِس عمارت کے اُوپر مندر تعمیر کروا دیا سب کچھ یہیں محفوظ کر دیا۔ بدھوں کے عروج کے وقت اِس خطے کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ یہاں جانگ قبائل کی ایک بڑی بستی تھی اور پہاڑی علاقوں کے مقابلے میں اُس کی زرخیز زمینیں اور دوسری خصوصیات اُس کی برتری کی تھیں اور ہیں بھی۔ بعد میں یہ علاقہ صرف مندروں کے لیے مخصوص کر اور قبائل کی بستی کو نشیب میں مختلف بستیوں میں بسا دیا گیا۔ روایت ہے جب بدھ یہاں آئے تو یہ عمارت حاکم سیانگ کی حرم سرا تھی۔ یہاں وہ خاص کنیزیں رہتی تھیں جنھیں دنیا کے مختلف حصوں سے لایا تھا اور یہ گلیاں اِسی لیے بنائی گئی تھیں کہ کہیں وہ بھاگ نہ جائیں ممکن کا کوئی اور مقصد بھی ہو، یہ عشرت کے کسی کھیل کے کام میں آتی ہوں میں یہ ایک بہترین پناہ گاہ بھی تھی۔ یہ جانگ قبیلے کی ثروت و دولت تھا۔ بدھ دنیوی آلائش و ترغیبات پسند نہیں کرتے۔ اُن کی تعلیمات سے کنارہ کشی اور قناعت پر مبنی ہیں۔ باور کیا جاتا ہے کہ جہاں جو انھوں نے تبلیغ شروع کی، حکومتوں اور لوگوں نے اپنا سب کچھ اُن کے حوالے کر دیا۔ راہبوں کا یہاں ٹھہراؤ ہوا تو یہ کثیر مال و اسباب بھی اُن کے ساتھ تھا۔ حاکم سیانگ نے اُن کی خوشنودی کے اظہار کے طور پر تمام خزانے سمیت اسے یہاں دفن کر دیا لیکن اُس کی نیت ٹھیک نہیں اُس نے تمام عمارت پاٹ کے ایک یہ کمرہ کھلا چھوڑ دیا تھا تاکہ وہ بعد کبھی اِسے نکال سکے۔ اُس کا خیال ہوگا کہ جب بدھوں کے اثر کا یہ زور جائے گا تو خزانہ دوبارہ اُس کی تحویل میں آجائے گا لیکن بدھ راہب اپنی تعلیمات عام کرتے گئے اور بستیاں اور علاقے اُن کے ساتھ ملتے گئے۔ یہاں رہبانیت کا ایک نیا دَور شروع ہوا۔ جگہ جگہ سے راہب علاقے میں جمع ہونے لگے اور گوتم بدھ کی تعلیمات کی تفسیریں اور اُن کے عملی نمونے پیش کرنے لگے اور اُنھوں نے یہاں نہایت عرق ریزی سے ایک دستاویز مرتب کی۔ بدھ کے اقوال اور تعلیمات کی تفسیر و تشریح پر مشتمل دستاویز مشہور ہے کہ اِن میں کوئی ایسا رقعہ بھی ہے جو گوتم بدھ کے ہاتھ سے گزر کے یہاں پہنچا تھا اور اِس میں مقدس نکات بھی تھے۔ اُسے بدھ کی نگاہ کی سند حاصل تھی۔ وہ دستاویزیں محترم ہو گئیں اور قسم قسم [illegible] اُس سے وابستہ ہو گئیں۔ ہر سردار نے اِسے جان سے زیادہ عزیز رکھا۔ اِس لیے نہیں کہ اُس میں مدفون خزانے کی تفصیلات درج تھیں بلکہ اِس لیے کہ گوتم بدھ کی امانت تھی۔ ممکن ہے کہ سینہ بہ سینہ حاکموں اور [illegible]وں کو کسی خزانے کی موجودگی کا علم منتقل ہوتا رہا ہو اور اُنھوں نے اُس کی تحقیق و جستجو کی کوشش کی ہو لیکن یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اِس کا اندازہ اِس سے ہو سکتا ہے کہ مجھے ایک مدت لگ گئی۔ وہ کوئی عام نقشہ نہیں تھا یا عمارتوں کا ہوتا ہے۔ حاکم سیانگ نے اسے پیچیدہ بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑا تھا۔ وہ سر بہ سر ایک سرِ نہاں تھا۔ اِس میں رمزیں ہی رمزیں تھیں۔ رموز و اسرار دریافت کرتے ہوئے مجھے اتنا وقت گزر گیا"۔ اباجان کی آواز ڈوبنے لگی۔

سب ٹکٹکی باندھے اُنھیں دیکھ رہے تھے۔ کسی نے بیچ میں دخل نہیں دیا۔ سب سنتے رہے جیسے اباجان کے موٹے موٹے لفظ اُن سبھی کی سمجھ میں آ رہے ہوں۔ میری آنکھیں جل رہی تھیں۔ امی اور نمی کی شکلیں بار بار سامنے آ جاتی تھیں جیسے اُن کی روحیں اس تہہ خانے میں آ گئی ہوں اور وہ سفید کپڑوں میں ملبوس میرے اور اباجان کے درمیان سر جھکائے کھڑی ہوں۔ اباجان کا بھی امی اور نمی سے کوئی تعلق تھا۔ شاید اُنھیں بھی وہ نظر آ رہی تھیں۔ اُن کی تھرتھراتی آواز سے پتہ چلتا تھا کہ اُن کی آنکھیں بھی جل رہی تھیں۔ کچھ دیر سناٹا طاری رہا۔ نہ وہ بولے نہ کوئی اور۔ بولتے بولتے نہ جانے وہ کیا سوچنے لگے تھے۔ کہاں کھو گئے تھے۔ پھر کسی کے ٹوکنے سے پہلے اُنھیں خود احساس ہو گیا کہ اور لوگ بھی یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ "مجھے وقت لگ گیا۔ خاصا وقت"۔ میری طرف نظریں اُٹھا کے اُنھوں نے پژمردگی سے کہا۔ "زمانہ کہاں سے کہاں چلا گیا۔ بابر کے گھر سے جانے کے بعد میں نے اِن کاغذات کی یوں ہی ورق گردانی کی تھی۔ اسی خیال سے کہ شاید لڑکی کا کوئی سراغ مل جائے۔ وہی بابر کو کسی سمت لے گئی ہو۔ اِن دونوں کا کوئی پتہ تو نہ چل سکا۔ کاغذات کے تہہ در تہہ اسرار میری آنکھوں میں کھبنے لگے"۔ مجھے ایسا لگا جیسے اباجان مجھی سے مخاطب ہوں۔ سب مجھے سنانے کے لیے یہ کہہ رہے ہوں۔ "حاکم سیانگ نے اُنھیں مشکل سے مشکل بنا دیا تھا۔ بہرحال جو وقت گزرنا تھا، وہ گزر گیا۔ وہ واپس نہیں آ سکتا"۔ اُنھیں جھرجھری سی آ گئی۔ "آپ لوگ اس کمرے کے بند در دیکھ رہے ہیں۔ اِن میں صرف چھ ایسے ہیں جن میں وہ سب رکھا ہوا ہے۔ اُنھیں تلاش کرنا ایک کارِ دارد ہے۔ آپ کا خیال ہوگا کہ جن دیواروں کے پیچھے خلا ہوگا وہ آسانی سے معلوم کیا جا سکتا ہے مگر ایسا نہیں ہے۔ تمام در ٹھوس ہیں۔ اِن میں یہ جو آپ ایک در کھلا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ میں نے اِس کا خزانہ ایک مناسب جگہ منتقل کر دیا ہے"۔

"اِسے آپ نے کھولا ہے ؟" جھل نے وحشت سے کہا۔

"ہاں۔ ابھی پانچ باقی ہیں۔ پہلے خزانے سے جو کچھ برآمد ہوا ہے میری توقع سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ باقی پانچ میں بھی اتنا ہی کچھ ہوگا اور میں اُنھیں کھولوں گا۔ اِس میں وقت صرف ہوگا۔ مہینے دو مہینے چھ مہینے یا سال۔ میں صحیح وقت نہیں بتا سکتا"۔

"ابھی اپن اِدھر ہیں۔ اپن کو بولو"۔ پیرو جلدی سے بولا۔

"آپ اِدھر ہیں اور میں نے آپ سے کوئی بات نہیں چھپائی ہے۔ گو میرے لیے یہ انتہائی دشوار مرحلہ تھا۔ مجھے یہ سب قبل از وقت محسوس ہوتا ہے مگر غالباً مجھے یہی کرنا چاہیے تھا۔" اُن کی آواز کہیں کھو سی گئی اور آپ کے ساتھ باہر ہے۔ بس یہی کافی ہے اور اس عمر میں آ کے مجھے اپنی بینائی اور سماعت پر کچھ اعتبار کرنا چاہیے۔ یوں بھی اب کچھ چھپانا شاید بہتر نہیں تھا کیونکہ میری شناخت ہو چکی ہے اور مجھے اس سارے کام میں اُس کے تحقیقی پہلو سے زیادہ غرض تھی۔ دوسری غرض بھی پیشِ نظر تھی لیکن اس قدر نہیں۔ مجھے آپ پر بھروسا ہے۔ کسی مجبوری سے نہیں۔ یہ میرے اپنے دیکھنے اور سُننے کا اعتبار ہے۔ یہ اعتبار غلط ہو تو غلطی میری ہوگی اس لیے کہ میں نے اپنا اختیار خود ترک کیا ہے، اُسے غصب نہیں ہونے دیا ہے۔ اتنی باتیں کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ میری احتیاط کو میرا شک نہ سمجھیں جو میں آپ پر کر سکتا ہوں، مجھ پر بھی اعتبار کریں۔ میں آپ کو یہی ایک بہتر مشورہ دے سکتا ہوں کہ آپ اُن پُرپیچ راستوں سے دُور ہی رہیں، یہ ایک گورکھ دھندا ہے۔ یہ راستے صرف میرے سینے میں محفوظ ہیں۔ نہ میں انھیں آسانی سے آپ کو منتقل کر سکتا ہوں، نہ آپ اتنی جلدی اُنھیں سمجھ سکتے ہیں اور یہاں آ کے آپ کے لیے اُن کا جاننا ضروری بھی ہے۔ ڈولیوں اور نشانات سے بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ لاحاصل ہے آپ نے جس غار میں مورتی دیکھی تھی، وہی جگہ جہاں زینہ ختم ہو جاتا ہے، وہ مورتی صرف میں ہی اپنی جگہ سے ہٹا سکتا ہوں۔ اُسے کھود کے یا مسمار کر کے راستے سے ہٹایا جائے گا تو آگے کے راستے خود بخود مسدود ہو جائیں گے۔ سیانگ نے اس میں یہی فنی خوبی رکھی تھی۔ مورتی گرائی جائے گی یا اُسے منہدم کیا جائے گا تو اُس کے پارکل کی چھت تھمی نہ رہ سکے گی۔ اُس کا ملبا نیچے گر کے گلی بند کر دے گا اور کوئی بھی پھر اندر نہیں آ سکے گا۔ سیانگ نے یہ اہتمام اِس خیال سے کیا ہوگا کہ جسے خزانے کی دستاویز کا حقیقی علم ہو وہی اُس تک پہنچ سکے، کوئی دوسرا نہیں۔ یہاں قدم قدم پر احتیاط کی ضرورت پڑتی ہے۔ آپ لوگ یہاں اندر ہوں اور اس دوران کوئی حادثہ پیش آ جائے کہیں پیر اُلٹا پڑ جائے، کوئی بھی غلطی ہو جائے۔ کوئی راستہ بند ہو جائے یا کسی اور قسم کی اُلجھن پیش آئے تو ہم کبھی باہر نہیں نکل سکتے۔ میں اتنے لوگوں کی زندگی خطرے میں ڈالنے کی رائے نہیں دے سکتا۔ یہاں بند ہواؤں میں تا دیر رہنا بھی مشکل ہے۔ بار بار اس طرف مندروں میں اور خاص طور پر اِس مخصوص عمارت میں آپ کا آنا بھی مناسب نہیں ہے۔ جانگ قبیلے کی اِس جستجو سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُنھیں اپنے متبرک کاغذات کے ساتھ دو دوسری دستاویز ہونے کا بھی کچھ علم ہے یا گمان ہے جس کا تعلق اس عمارت

کی زیرِ زمین دولت سے ہے۔ انھیں شبہ ہے کہ کوئی اِسے برآمد کرنے کی کوشش میں کبھی اِدھر رُخ کر سکتا ہے۔ ہر چند انھیں یقین ہوگا کہ وہ شخص اِسے حاصل نہیں کر سکتا مگر اس طرح اِس شخص کے ذریعے انھیں اپنے کاغذات کا سراغ مِل جائے گا اور وہ صرف یہی چاہتے ہیں۔ دو ہزار سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ اس مدت میں مَیں وہ پہلا شخص ہوں جو یہاں تک پہنچ سکا ہے۔ مجھے ہر وقت یہی اندیشہ تھا کہ کہیں کوئی زلزلہ نہ آگیا ہو، عمارت اپنی بنیادیں نہ چھوڑ چکی ہو اور کھنڈر نہ بن گئی ہو لیکن یہ عرصے تک بدھ راہبوں کا مرکز و محور رہی۔ اُنھوں نے اُس کی اچھی طرح دیکھ بھال کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اِسے بناتے اور مرمت کرتے رہے ہیں۔ عمارت کے نیچے جو زینے مختلف غاروں تک جاتے ہیں، وہ راہبوں کی عبادت و ریاضت کے کام آتے رہے ہیں۔ ممکن ہے اب بھی بہت سے غاروں میں راہب موجود ہوں تاہم یہاں آنے سے پہلے میں نے جانگ قبیلے کے اِس مقدس مقام کی تمام عمارتوں کی تصدیق کتابوں اور مختلف حوالوں سے کرلی تھی۔ میں نے آپ سے کھل کر سب بیان کر دیا ہے۔ آپ یہاں میرے ساتھ رہیں گے تو یہ خدشہ مجھے ہر لمحے کھٹکتا رہے گا کہ آپ کی ڈوری مجھ سے بندھی ہے۔ میں اپنی عمر گزار چکا ہوں۔ میرا وقت نہ جانے کب آجائے۔ میں نہ رہا یا مجھ پر کوئی اُفتاد پڑ گئی تو آپ یہاں سے باہر نہیں نکل سکتے۔ ایک شخص اور مجھ جیسا سانسیں گننے والا شخص کیا ضمانت دے سکتا ہے کہ اُس کے اعصاب ٹھیک ہی رہیں گے۔ آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ آپ نے مجھ سے بابر کا حوالہ دیا تھا۔ میں بھی آپ کو اُسی کا حوالہ دے سکتا ہوں۔"

"ہم سب سمجھ رہے ہیں بڑے صاحب!" تنجل نے سَر ہِلا کے کہا۔

"پر اِدھر کسی کا بھی پتا نہیں لکھا ہے۔ آپ اِس کو چھوڑو، ہم اِدھر رہ جائیں گے تو اپنے رونے والے اُدھر بہت کم ہیں۔"

"سمجھو بڑے صاحب اپن ٹکٹ کٹا کے آئے ہیں۔" پیرو اُچک کے بولا۔ "اپن ایک بات جانتا ہے کہ جیتے رہنا سالا بائی چانس ہے۔ اپن کا غم جانے دو۔ ابھی ہم آپ کو اِدھر چھوڑ کے اُودر تالی بجاتے رہیں۔"

"بڑے صاحب! ہم کو حکم کرو، لاڈلا اپنا بھائی ہے۔" جامو ابّا جان کے پاس جا کے بیٹھ گیا اور اُن کے پیر چھوتے ہوئے بولا۔

"اپنے کو بولو بڑے صاحب!" سلطان بھی لپک کے اُن کے پاس پہنچ گیا۔

"بولو تو ابھی اِدھر رُک جائیں!" جامو نے اضطراری لہجے میں کہا۔

ابّا جان اِن دونوں کے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کے مسکرانے لگے۔

میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"اپن اس کو ایک ہفتے سے پہلے کھود کے برابر کر دیں گے سب کسی رات کو اندر بند ہو جائیں گے۔ سالا باہر ڈھونڈتے پھریں گے کیوں تنجل بھائی!"

"کچھ ایسا ہی کرنا ہوگا دادا!" تنجل خوابیدہ لہجے میں بولا۔ "سب ہم تو آدھے کو اِدھر بھیجنا ہوگا۔ باقی سوچنا اپنا کام ہے۔ بڑے صاحب آپ اِدھر مندر میں ہمارا انتظار کرو۔ جب تک ہم نہ آئیں، اس طرف مت آؤ۔ ہم کل، پرسوں جب بھی ٹھیک ہوگا، آجائیں گے۔"

ابّا جان کے پاس شاید اب تمام لفظ ختم ہو چکے تھے۔ اُٹھے تو بھی اُن کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُوپر بائیں طرف مندر کے مرکزی حصے کو جانے والی راہ داری میں بنے ہوئے کمرے سے سب سے پہلے ابّا جان باہر نکلے۔ کچھ توقف کے بعد ہم سب۔ وسطی کمرے کی مشعل بجھ چکی تو ہر سُو تاریکی اور خاموشی کا تسلط تھا۔ سیڑھیوں کی جانب سے بھی کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ ہم اُس جانب گئے بھی نہیں بلکہ عقبی دروازے سے ملحق چبوترے سے پھسلتے ہوئے زمین پر آگئے۔ سُولُم زورا، بِلٹو، ہلاکو اور ہما ہمیں سرائے میں لیٹے ہوئے ملے۔ وہ جاگ رہے تھے۔ ہم نے بھی اُن کے پہلو میں بستر لگا لیے۔ ابّا جان وہیں رُک گئے تھے۔ ناشتے سے پہلے علی الصبح ہم نے مندروں کے علاقے سے اُترنا شروع کر دیا اور ابھی دھوپ پوری طرح پھیلی نہیں تھی کہ واپس بستی میں پہنچ گئے۔ چوک میں دوپہر تک سامان کی خریداری کے بعد تنجل نے سیدھے سردار کے مکان کا رُخ کیا۔ سردار کا چہرہ جیسے غصے میں تپا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ کچھ پریشان سا ہوگیا۔ اُس کے رویے میں یکسانی نہیں تھی تاہم اُس نے خادماؤں کو بُلا کے ہمارے لیے چائے اور دوسری چیزیں منگوانے کا حکم دے دیا تھا۔ چائے کے دوران جب تنجل نے بتایا کہ اُسے اپنا شبہ کچھ درست معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا قافلہ بھی کاغذات کے سلسلے میں دلچسپی رکھتا ہے تو سردار اُس کا منہ دیکھنے لگا۔ وہ اسی وقت ہمارے سامنے ہی پیرو کو طلب کرنے کا حکم دینے والا تھا۔ تنجل نے اُسے منع کیا کہ ابھی وہ کچھ صبر کرے۔ سردار نے تنجل کی ہدایت پر عمل نہیں کیا۔ بستی کے چوک میں وزیر اور ہلاکو سے ہماری ملاقات ہوئی تو ہمیں معلوم ہوا کہ ہمارے جاتے ہی سردار نے پیرو کو طلب کر لیا تھا۔

شام ہوتے ہی ہم پھر پگ ڈنڈیوں پہ آگئے۔

میں، تنجل، جامو، سُولُم، مارٹی اور سلطان صبح کپڑے بدلنے اور سامان اُٹھانے کے لیے کوئی آدھے گھنٹے ہی اپنے میزبان چن وسا کے گھر گئے تھے۔ اُس وقت چن وسا گھر سے نکل چکا تھا۔ شام کو ہم گھر کی طرف سے سردار کے ہاں سے آنے کے بعد کچھ وقت بستی کے چوک میں گزرا، پھر ہم چڑھنے لگے۔ میرے دل میں آیا تھا کہ تنجل سے کہہ کے سلطان کو روک لوں۔ آج دوسری رات تھی۔ سلطان پھر ہمارے ساتھ اُوپر جا رہا تھا۔ صبح گھر داخل ہوتے وقت میں نے سلطان کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ وہ چاروں طرف منڈلا رہی تھیں تاہم ہمارے سامنے نہیں آئی تھی۔ عموماً وہی دروازہ کھولتی تھی۔ دروازہ بھی خادمہ نے کھولا تھا۔ ہم کمرے میں گئے تو سلطان نہ جانے کب چپکے سے باہر نکل گیا۔ ہم تیار ہو چکے تھے تب کمرے میں اُس کی

آئی۔ پتہ نہیں وہ اُسے ملی یا نہیں۔ ورنہ وہ اتنی دیر میں نہ لَوٹتا۔ چہرہ کچھ بجھا بجھا سا تھا۔ میں تنجل سے نہیں کہہ سکا اور کہتا تو کیا تھا کہ وہ میری بات مان ہی لیتا۔

بڑے مندر میں رات کا کھانا کھا کے ہم دوسرے مندروں کی طرف پروگرام کے مطابق پیرو اور وزیر وغیرہ جو تھے مندر میں موجود نے چوتھا نمبر اُسے اپنی سہولت کے لیے دیا تھا۔ مندر وہاں گنتی سے نے جاتے تھے۔ وہاں سے ہم سب ساتھ ہو گئے۔ سولم نے آگے جا کے نمبر پر عمل کیا وہ قدیم مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے آدمیوں کے وقت تھا کہ ہم اندر پہنچ گئے۔ ابّا جان ہماری راہ تک رہے تھے۔ زیادہ نہیں گزری تھی۔ ہم نے ہتھوڑیاں، چھینیاں، میخیں اور خیمے کے دوسرے اوزار صبح ہی اپنے اُوور کوٹ کی جیبوں میں چھپا لیے کے ساتھ بھی یہی کچھ تھا۔ کل کی طرح مارٹی اور سولم کو ہم نے چھوڑ دیا تھا۔ اُن کی جگہ پیرو اور وزیر ہمارے ساتھ ہو گئے تھے۔ ہم تھے۔ زیرِ زمین زینوں اور سرنگوں سے گزر کے جیسے ہی ہم جلتی بجھتی کے کمرے میں پہنچے، ہم نے ایک پل برباد نہیں کیا۔ ابّا جان نے اپنے ہوئے دَر سے تین قد چھوڑ کے ایک دَر پہ نشان لگایا تھا۔ ہم نے اُسی پر میخیں اور ہتھوڑیاں چلانی شروع کر دیں۔ تمام دروں پر مٹی اور کسی قسم کا دبیز پلاستر کیا گیا تھا۔ ابّا جان نے فرش سے ایک گز اُوپر کے کھدائی کرنے کی ہدایت کی تھی۔ پلاستر نے پہلی چند ضربیں جیسے لَوٹا دیں۔ اتنے برس گزرنے کے بعد بھی اُس کی سختی اور مضبوطی میں فرق نہیں آیا تھا۔ فولاد کی چادر جیسا تھا۔ ہمارے پاس بڑے ہتھوڑے تھے۔ بہرحال جیسے تیسے ہم نے اپنا کام جاری رکھا اور فرش سے اُوپر تک مختلف جگہوں پہ ہتھوڑیاں مارتے اور چھینیاں چھوتے۔ ابّا جان کی کھدائی کا سامان کمرے ہی میں رکھا ہوا تھا۔ اس میں خاص طرح کی چھینیاں تھیں۔ وہ ہمارے اوزاروں سے زیادہ کارآمد ثابت ہوئی تھیں لیکن اچانک ابّا جان نے ہمیں روک دیا اور ہم میں سے تین آدمیوں کو زمین پر بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ تنجل پیرو اور وزیر اُن کے کہنے پر دیوار سے ہٹ گئے۔ دَر کی چوڑائی زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ گز ہوگی۔ لمبائی ابّا جان نے پہنچ کے محدود کر دی تھی۔ اتنی مختصر جگہ پہ بیک وقت ہم چھ آدمیوں کے چلانے سے ہاتھ اُلٹے سیدھے پڑ رہے تھے اور ہم ایک دوسرے میں اُلجھتے تھے۔ ابّا جان کو کسی نے ہاتھ نہیں لگانے دیا تھا۔ اُنھوں نے آدمیوں کو دیوار سے واپس بُلا لیا اور ہمیں دیوار میں قریب قریب چھینیاں لگانے کا مشورہ دیا۔ میں اس طرف، جامو اُس طرف، درمیان میں سلطان فاصلے سے دیوار کھودتے گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم اپنی مقررہ حد میں ترتیب سے نشان ڈال چکے تھے۔ کچھ نشان پہلے ہی پڑ چکے تھے۔ ابّا جان نے ہمیں وہاں سے ہٹا دیا اور تنجل، پیرو اور وزیر سے آگے بڑھنے کو کہا۔

قریب قریب ضربیں لگنے سے پلاستر کمزور ہو گیا تھا۔ تنجل پیرو اور وزیر کی چھینیوں سے جگہ جگہ پتھر جھانکنے لگے۔

ابّا جان نے ایک بار انھیں پھر ہٹا لیا اور ہمیں دوبارہ دیوار پر بھیجا۔ ہمارے ہاتھوں کو اُس وقفے میں سکون مِل گیا تھا۔ ہم نے وہ سارا پلاستر پتھروں سے جُدا کر دیا۔ اندر موٹے موٹے سیاہ پتھر ننگے ہو گئے۔ اُن کی لمبائی چوڑائی سے اُن کی جسامت کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ ہم وہاں سے ہٹنا نہیں چاہتے تھے۔ اس سے پہلے کہ ابّا جان ہمیں پھر بُلاتے اور ہماری جگہ اور لوگ آتے، ہم نے پتھروں پہ بے تحاشا ہتھوڑیاں مارنی شروع کر دیں۔ ہر ضرب پر پتھر کی ایک چیخ سی بلند ہوتی تھی۔ میخیں ٹھونکتے ٹھونکتے ہم پر دیوانگی سی طاری ہو گئی تھی۔

ابّا جان نے ہی تنجل سے کہا ہوگا کہ اُس نے اور پیرو نے ہم پر جھپٹ کے ہمارے ہاتھوں سے اوزار چھین لیے اور ہمیں پیچھے دھکیل دیا۔

وہ سامنے کی بات تھی جو ہماری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ ابّا جان اسی کا اشارہ کر رہے تھے۔ ہمیں پتھروں کے درمیان صرف درزوں کے مسالے پر نشانے لگانے چاہییں تھے۔ درزوں میں مسالے کی تعداد اچھی خاصی تھی اور یہ ہمارے لیے ایک اچھی بات تھی۔ پتھر موٹے ہونے کی وجہ سے درزیں زیادہ بھی نہیں تھیں۔ ایک گز کی لمبائی میں اُوپر سے نیچے تک چار پتھر آتے تھے اور اِدھر چوڑائی میں چھ۔ تنجل پیرو اور وزیر نے ابّا جان کی ہدایت کے مطابق اُن کے جوڑوں میں لگے ہوئے مال ہی کو گرانے پر توجہ مرکوز رکھی۔ بعد میں اُن کی جگہ ہم پہنچ گئے۔ پھر اُسی طرح ہم باریاں تبدیل کرتے رہے اور اُس کے بعد ہم نے ابّا جان کی رائے کے بغیر کوئی چھینی نہیں ٹھونکی۔ باری باری آنے سے ہمیں اتنی تھکن محسوس نہیں ہو رہی تھی لیکن جیسا کہ ابّا جان نے کل رات کہا تھا، وہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ سبھی کو حیرت تھی کہ اُنھوں نے تنِ تنہا ایک دَر کیسے کھود لیا تھا۔ اس کا ملبا وہیں پڑا تھا۔ ہمارے ہاتھوں میں ایک ہی رات میں چھالے پڑنے لگے تھے اور ابھی دَر پوری طرح کھدا بھی نہیں تھا۔ ساری رات کمرہ ٹھک ٹھک، ٹن ٹن کی صداؤں سے گونجتا رہا۔ اندر اتنی ٹھنڈ نہیں تھی جتنی باہر تھی۔ کھدائی کرتے کرتے ہمارا سارا جسم پسینے میں بھیگ جاتا تھا۔ ابّا جان بار بار تاکید کرتے تھے کہ ہم آہستہ آہستہ ضربیں لگائیں لیکن جیسے ہی باری آتی تھی اور چھینی ہتھوڑی ہاتھ میں آتی تھی، جی چاہتا تھا کہ پتھر کے دو ٹکڑے کر دیں، اِسے تحق کر دیں۔ کاش اُن پر ہمارے چاقو چل سکتے۔ درزیں پتھر کی بڑی جسامت کی وجہ سے اتنی ہی گہری تھیں۔ ہم نے فرش اور پہلے پتھروں کے ساتھ جڑا ہوا مسالا نہیں چھوا۔ اتنے نیچے ہاتھ چلانا مشکل تھا۔ پہلے پتھر فرش ہی سے پیوست رہے لیکن لکیر تک اُن کے درمیان کی تمام درزیں ہم نے کھوکھلی کر دی تھیں۔ اس طرح اُن کی باہم پیوستگی خود بخود ڈھیلی پڑ گئی۔ سامنے کے جوڑوں کی بھرائی کا انھیں کوئی سہارا نہ رہا تھا۔ ہماری ہتھوڑیوں سے اور دوسرے اُن کے اپنے وزن کے دباؤ سے ایک دوسرے پر اُن کے گرنے میں صرف ایک ہی کسر رہ گئی

تھی کہ ہم پیچھے سے اُن کا مسالا نہیں چھیڑ سکے تھے۔ اُسی کے بل پر وہ ابھی تک اٹکے ہوئے تھے اور اپنی جگہ قائم تھے مگر مسالا ہٹنے سے بیچ میں جو خلا پیدا ہو گئے تھے، اُن میں بڑی میخیں ڈالنے گاڑنے اور حرکت دینے کی گنجائش بہر حال نکل آئی تھی۔ ہمارے پاس کدال ہوتی تو اتنا وقت کبھی نہ لگتا۔ بستی سے کدالیں فراہم ہو سکتی تھیں لیکن انھیں ساتھ کیسے لایا جا سکتا تھا۔

ہمیں کوئی سا پہلا پتھر نکال دینا چاہیے تھا اسی لیے ہم نے اپنا سارا زور ایک ہی پتھر پر صرف کر رکھا تھا۔ پیچھے لگا ہوا مسالا ان مسلسل ضربوں کی تاب نہ لا سکا، اکھڑنے لگا۔ پہلے پتھر کے پچھلے جوڑ جیسے ہی کھلے وہ نیچے کے پتھر پر آ گرا۔ ہمارے ہاتھ اور بے قرار ہو گئے۔ ایک کے نکلنے کے بعد دوسروں کے پیچھے لگے ہوئے مسالے پر ہماری میخیں بآسانی پہنچ سکتی تھیں لیکن اسے اپنی طرف کھسکانا اور دوسروں سے جدا کرنا ہی کچھ کم دشوار نہ تھا۔ ہم نے اپنی انگلیوں سے مدد لی۔ انگلیاں چھلنے لگیں۔ پھر ہم نے میخیں ایک جانب اڑا کے زور لگایا۔ اُس کا ایک ذرا سا کونا ہی باہر نکل آتا تو وہ ہماری گرفت میں آ جاتا۔

اِسی ہڑ بڑ میں سلطان کی انگلی پر میری ہتھوڑی پڑ گئی اور وہ بلک پڑا۔ ابا جان فرش پر بیٹھے ہوئے تجھل اور پیرو سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ تیزی سے اُٹھ کے ہمارے پاس آ گئے۔ سلطان کے بائیں ہاتھ کی چھنگلیا کا پوروا ہتھوڑی سے پچک گیا تھا۔ میں نے جھٹ اُس کی انگلی اپنے منہ میں لے لی۔ مجھے آسنسول کے موتی اُستاد نے بتایا تھا کہ منہ کی گرمی سے خون نہیں جمتا اور لعابِ دہن اکسیر کا کام کرتا ہے مگر سلطان کو اِس سے افاقہ نہیں ہوا۔ اُسے بٹھا دیا گیا۔ تجھل ہولے ہولے اُس کا پوروا دباتا رہا۔ کام رک گیا۔ مجھے اُس سے بہت ندامت ہو رہی تھی حالانکہ سلطان کام جاری رکھنے پر آمادہ تھا بلکہ اصرار کر رہا تھا۔ تجھل نے ہم تینوں کو دیوار سے ہٹا دیا اور ابا جان کی ہدایت پر بڑی میخیں ڈھیلے ہونے والے پتھر کے نیچے اَڑا دیں۔ میخیں پوری طرح بیٹھ گئیں تو اُس نے انھیں ذرا اوپر اٹھا کے پتھر کو جھنجوڑا اور اُس وقت بے اختیار سب کی چیخیں نکل گئیں جب پتھر کا ایک کونا باہر نکل آیا۔ پھر اُسے سموچا باہر نکالنا دشوار نہیں تھا۔ اُس کی جگہ اندر ایک فٹ گہرا خلا ہو گیا تھا۔ دوسرے پتھروں کے پچھلے جوڑوں کے مسالے پر ضربیں لگانے کے لیے اب کوئی بڑی رکاوٹ نہیں تھی۔

دوسرا پتھر جلد ہی ہٹ گیا۔ پھر تیسرا اور چوتھا۔ آدھے پیرو وزیرا اور تجھل نکال چکے تھے کہ میں نے اور جامو نے اُن کے ہاتھوں سے اوزار لے لیے۔ سلطان نے بہت ضد کی مگر ہم نے اُسے بیٹھے رہنے دیا۔ باقی آدھے پتھر ہم دونوں نے جتنی جلدی ممکن ہو سکتا تھا، نکال باہر کیے۔ اندر کی اُدھڑی سی دیوار اب صاف نظر آنے لگی تھی۔ چھوٹے موٹے پتھر، کنکر، مٹی، چونا، ریت جو چیز بھی سامنے پڑی تھی، انھوں نے شاید وہ سب ملا کے مسالا تیار کیا تھا اور اُسے پاٹ دیا تھا۔ ہم نے مختلف جگہوں پر ہتھوڑیاں مار کے اُس کی پختگی کا کسی حد تک تخمینہ لگا لیا تھا۔ مسالا مضبوط تھا، پتھر کنکر اس میں جکڑے ہوئے تھے لیکن اُس کی کھدائی میں آگے کی دیوار دقت پیش آنے کا امکان نظر نہیں آتا تھا۔

تھکن ہماری ہڈیوں تک پہنچ گئی تھی۔ سب کی سانسیں اکھڑ تھیں۔ کمرے میں گرد و غبار جمع ہو گیا تھا اور روشنیاں بھی اُس میں گئی تھیں۔ نہ جانے کتنی بار پتھروں کا ریزہ ہماری آنکھوں میں پڑا تھا، نکالتے نکالتے آنکھیں لال ہو گئی تھیں۔ ناک اور منہ میں بھی گرد تھی۔ شدید پیاس لگ رہی تھی اور پانی کی وہاں کوئی صورت ہی نہیں پیرو اور وزیر مسلسل کھانس رہے تھے۔ دھول نے سب کے چہروں کا رنگ بدل دیا تھا۔ انگلیاں جگہ جگہ سے چھل گئی تھیں اور ابھی دیوار سامنے تھی اور کوئی بھروسا نہیں تھا کہ ابا جان نے صبح دریز ہے، ممکن ہے ساری محنت ہی اکارت چلی جائے۔ اُس کے باوجود دیوار کی کھدائی کے لیے تیار تھے۔ چلتے وقت تجھل نے مارٹی سے لی تھی۔ اُس نے ہمیں وقت بتایا اور باقی کھدائی ملتوی کرنے کا کر دیا۔ ابا جان نے اعتراض نہیں کیا۔ چار بج رہے تھے۔ ہمیں واپس تھا۔ ہم نے اپنے اوزار وہیں رکھ دیے۔

راستے میں ہم ایک چشمے پر منہ ہاتھ دھونے کے لیے کچھ دیر ٹھہ اتنا ٹھنڈا تھا کہ ہاتھ جلے جاتے تھے لیکن سرائے میں جانے سے پہلے ٹھیک ہی رہنا چاہیے تھا۔ چند قطروں سے حلق تر کر کے ہم سرائے سولم کے ساتھ وہ سب وہاں موجود تھے۔ بستر پر لیٹتے ہی جسم میں لگیں۔ ہتھیلیوں میں درد اُٹھ رہا تھا۔ صبح بس ہوا ہی چاہتی تھی مگر بغیر ہمارا سفر کرنا ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ اُس وقت تک ہمیں وہاں جب تک سرائے میں چائے کا انتظام نہ ہو گیا۔ اُس کے بعد ہم کہیں میچے بستی میں آ گئے۔

پیرو نے تجھل کو بتا دیا تھا کہ کل سہ پہر سردار نے اُسے اُس سے اُس کی کیا گفتگو ہوئی ہے۔ اُس کے بقول سردار نے کا ذکر چھیڑ دیا تو پیرو نے لاعلمی ظاہر نہیں کی۔ سردار نے اُس سے سوالات کیے جو تجھل سے کیے تھے اور پیرو نے تقریباً وہی جوابات نے سردار کو دیے تھے۔ اُس نے بھی تجھل کی طرح سردار سے راز دار لیا کہ وہ پہلے آنے والے قافلے سے اُن کے بارے میں کچھ نہیں کہے گا۔ سردار کی تسلی کے لیے اور کم وقت دیا تھا، یعنی صرف دو مہینے کو جب یہ سب سنا رہا تھا، مجھے خیال آیا کہ اُس نے سردار سے کیوں کر کی ہوں گی۔ سولم جیسا کوئی آدمی اُس کے ساتھ نہیں تھا گیا۔ پیرو ایک مرتبہ پہلے بھی ہماری عدم موجودی میں سردار سے مل ظاہر ہے سردار نے ترجمانی کے لیے ہندوستانی جاننے والے آدمی کو ضرور طلب کیا ہوگا اور قبیلے میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں

انی سے خوب واقفیت رکھتے ہوں۔ کاغذات کی گم شدگی کے بعد ان آنا جانا اُن کا معمول تھا۔ سینکڑوں آدمیوں نے ہندوستان کا رُخ ا اور پھر تشانم! میرے ذہن میں یہ بات آئی ہی نہیں تھی کہ سلطان سے کون سی زبان میں بات کرتا تھا۔ سلطان تبتی نہیں جانتا تھا۔ ہ کو صرف دیکھتا ہی نہیں رہا ہوگا، اُس نے اُس سے بہت سی باتیں گی عجیب عجیب باتیں۔ جیسے میں کیدا سے اور کورا مجھ سے کرتی ا کو بھی ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی آتی تھی۔ میں اُسی وقت سلطان سے چاہتا تھا لیکن یہ فرصت کی بات تھی۔ ہم چپ تھے۔ مندر سے ابا جان ل جا رہے تھے۔ آواز تو کیا، ہم نے اپنی چاپیں بھی معدوم کر رکھی بہر حال اگر تشانم ہندوستانی جانتی تھی تو اُس کا مطلب ہے چن وسا جانتا ہوگا۔ اُس کے دو بیٹے ہندوستان جا چکے تھے۔ ہو سکتا ہے وہ ہاں گیا ہو اور تشانم بھی گئی ہو اور کیا عجب سردار نے اُسی سبب سے ا کو ہماری میزبانی کے لیے مقرر کیا ہو کہ وہ اپنے مکان میں ہمارے ن ہونے والی گفتگو کی سن گن لے سکے۔ ایسا ہی ہوگا۔ تجھل نے اُسی ے ہم سب کو بند کمرے کے باوجود آپس میں گفتگو کرتے وقت احتیاط کی ن کی تھی۔ موٹی موٹی باتیں مجھ سے اوجھل ہو جاتی تھیں۔ میرا دماغ ہی ب کام نہیں کر رہا تھا۔ جب سے ابا جان کو دیکھا تھا، ہر لمحے بس اُنھی کا ن رہتا تھا یا کوئی دھیان ہی سرے سے نہیں تھا۔ ہر وقت دل اُڑتا دماغ خالی خالی۔

اُسی دن پیرو نے بھی بستی کے چوک میں دوسرے کنارے پر اپنا لگایا۔ مرد، عورتیں، لڑکیاں اور بچے پھر اُسی کی طرف ڈھلنے لگے۔ ہمارا وہ کئی بار دیکھ چکے تھے۔ پیرو کے پاس ہم سے مختلف سامان تھا اور نے قیمت بھی کم لگائی۔ زورا اور وزیر جیسے ہمیں جتانے کے لیے صدائیں رہے تھے۔ اِدھر مارٹی اور سلطان نے بھی آوازیں لگانی شروع کر دیں۔ اُن کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ بستی کے چوک میں اچھی خاصی بھیڑ تھی۔ تجھل نے کل کے مقابلے میں قیمتیں اور کم کر دیں۔ ہمارے دونوں خالی ہو گئے۔ اُس دن بھی چن وسا کے مکان سے ہم دو ہی صندوق تھے۔ پیرو نے خاصا سامان بیچ دیا۔ ہم نے احتیاطاً اپنے دستانے نہیں تھے، مبادا ہماری چھلی ہوئی انگلیوں پر اُن کی نظر پڑ جائے۔ بازار بڑھانے بعد جامو اور سلطان نے بستی کے دکان داروں سے مفلروں کے بدلے بھنا ہوا اناج، سردی سے بچنے کے لیے روغن اور کھانے پینے کی چند چیزیں خرید لی تھیں۔ اتنی ہی چیزیں کہ انھیں کھٹک نہ ہو۔ پیرو نے بھی لیا ہوگا۔ بازار سے چن وسا کے مکان میں آ کے ہم نے اپنے ساتھ لائے ٹنگری شکنزے بھی اُدھر کوٹوں میں چھپا لیے تھے۔ سورج غروب ہوتے اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ رات کو وہ ہمیں مقررہ جگہ پر مل گئے۔ مینی سالے اب بھی اُن کے ساتھ نہیں تھے لیکن وہ بتا رہے تھے کہ اُن کی حالت پہلے سے بہت بہتر ہے۔ تجھل نے ایک تبدیلی کی۔ سلطان کی زخمی چھنگلیا کی وجہ سے اُسے سولم کے ساتھ باہر رہنے دیا جس کا کام معمول کے مطابق مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے آدمیوں کی توجہ اتنی دیر تک اپنی جانب مبذول کرنا تھا جتنی دیر میں ہم مندر میں داخل ہوتے۔ بعد میں جب انھیں اندازے سے یقین ہو جاتا تھا کہ ہم اندر پہنچ گئے ہوں گے، وہ آزاد ہو جاتے تھے اور سرائے میں جا کے لیٹ جاتے تھے۔ سلطان اس تبدیلی پر بہت جھلایا۔ تجھل نے اُس کی بات نہیں سنی۔ اُس کے بجائے اُس نے زورا کو ساتھ رکھ لیا۔ زورا سلطان کا صحیح بدل تھا مگر جب تجھل سلطان کو اندر لے جانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا تو اُسے گھر چھوڑ دینے میں کیا حرج تھا۔ سولم کے ساتھ آج ایک آدمی کم ہوتا تو سیڑھیوں پر موجود آدمی اتنے پریشان نہ ہوتے۔ سلطان نے دلیل بھی دی کہ زورا کی جگہ اُس کی تبدیلی وہ لوگ محسوس کر لیں گے۔ یہ دلیل بھی تجھل کو متاثر نہ کر سکی۔ سالاؤ کی بھڑکتی روشنی میں مفلروں اور ٹوپوں سے لپٹے ہوئے چہروں پر وہ اتنی نگاہ کہاں رکھتے ہوں گے۔ وہ بستی کے عام باشندے تھے اور صرف دو رنگ بستی کے نہیں جس میں ہم ٹھیرے ہوئے تھے، جانگ قبیلے کی دوسری بستیوں سے بھی انھیں بلایا گیا ہوگا۔ ابھی وہ ہمیں اتنا نہیں پہچانتے ہوں گے کہ چہروں میں امتیاز کرنے لگیں اور یہ لازم نہیں تھا کہ آج بھی وہی لوگ سیڑھیوں پر ہوں جو کل یا پرسوں یہاں تعینات تھے۔

اباجان نے کوئی دیر نہیں کی۔ اندر پہنچتے ہی ہم نے اپنا ادھورا کام نمٹانا شروع کر دیا اور باریاں تبدیل کرتے رہے۔ دھول کل کی نسبت آج زیادہ اُڑ رہی تھی۔ مسالے میں مٹی کی آمیزش تھی۔ مٹی ملی ہونے کے سبب کھدائی میں اتنی دقت نہیں ہو رہی تھی۔ سبھی طرح کے چھوٹے بڑے پتھر مسالے میں ڈال دیے گئے تھے، وہی تنگ کر رہے تھے۔ انھیں چھوڑ کے ہم اُن کے اِرد گرد جمے ہوئے مسالے ہی پر ضربیں مارتے تھے اُس سے وہ خود جگہ چھوڑنے لگتے تھے۔ پیرو کے سمجھانے کے باوجود زورا کی ہتھوڑیاں ہم میں سب سے تیز پڑ رہی تھیں۔ کل ہمارے ہاتھ دکھنے لگے تھے تو آج عجیب قسم کے بودار مسالے نے سانس لینی مشکل کر دی تھی۔

جب میری باری ختم ہوتی تھی اور میں اباجان کے پاس آ کے بیٹھ جاتا تھا تو میرا جسم سکڑنے اور کھنچنے سا لگتا تھا۔ ہر لمحے یہ دھڑکا رہتا تھا کہ وہ کچھ پوچھنے نہ لگیں۔ میں انھیں کیا کیا جواب دوں گا مگر اباجان بیشتر مجھے دیکھتے ہی رہتے تھے، زبان سے کچھ نہیں کہتے تھے۔ کل بھی یہی ہوا۔ جامو اور سلطان کی باری بھی میرے ساتھ ختم ہوتی تھی۔ شاید انھی کی موجودگی کی وجہ سے وہ بات نہیں کرتے تھے۔ میری نظریں تو اُن کی طرف اٹھتی ہی نہیں تھیں۔ بس ایک بار انھوں نے میرے ہاتھ ٹٹول کے دیکھے تھے، میرے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ اُن کا دل چاہتا ہوگا کہ وہ مجھے اپنے سینے میں بھینچ لیں۔ مجھے اُن کی عادت معلوم تھی۔ جو اُن کے دل میں ہوتا تھا، کسی کو اُس کا پتہ نہیں

چلنے دیتے تھے۔ گھر میں ہر وقت ہم سب کا خیال رکھتے تھے لیکن ہمیشہ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ہم سب سے ناراض ہوں۔ صرف ممی ایسی تھی جو اُن سے ہر بات منوا لیتی تھی، وہ اُس کا کہا کبھی نہیں ٹال سکتے تھے۔ ممی اُن پر ایک طرح سے حکم چلاتی تھی۔ ہمیں اگر کوئی فرمائش کرنی ہوتی تو ہم ممی ہی کے ذریعے اباجان سے کہلواتے تھے۔ گیا میں صبح سویرے میں اُن کے ساتھ ٹہلنے کے لیے جاتا تھا تو مجھ سے بس پڑھائی وغیرہ کے متعلق پوچھتے تھے مگر ایک دفعہ جب جہاں گیر کوٹھے سے گر گیا تھا اور بے ہوش ہو گیا تھا تو اباجان تین تین حکیم ڈاکٹر بلا لائے تھے، مسلسل دو راتیں اُس کے سرہانے بیٹھے رہے تھے۔ جب تک جہاں گیر کو ہوش نہیں آ گیا، وہ اُس کے پاس سے نہیں اُٹھے۔ اُن کے قریب بیٹھ کے مجھے گھر یاد آنے لگتا تھا اور کبھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں گھر ہی میں بیٹھا ہوں اور میں بہت چھوٹا ہو گیا ہوں۔ چوکی والے کمرے میں امی جان پان لگا رہی ہیں، اباجان ہوں ہاں کر رہے ہیں اور امی انھیں سارے جہاں کی باتیں سنا رہی ہیں۔ اب نہ وہ گھر رہا تھا، نہ امی تھیں۔ وہ سب خواب کی طرح گزر گیا تھا۔ ممکن ہے مجھے دیکھ کے اباجان بھی یہی سوچ رہے ہوں۔ کاش میں اُن کا دل پڑھ سکتا۔

کئی گھنٹے گزر چکے ہوں گے۔ ہم نے کوئی دو فٹ اندر تک دیوار کھود لی تھی۔ ابھی تک اُس میں سے کوئی چیز برآمد نہیں ہوئی تھی۔ اباجان ہی کو معلوم تھا کہ ابھی اور کتنی کھدائی کرنی پڑے گی اور ہم نے اُن سے پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی کیونکہ وہ دیکھ ہی رہے تھے۔ جب تک وہ منع نہ کر دیں، ہمیں کھودنا ہی تھا۔ پانی ساتھ لانے سے بہت فائدہ ہوا۔ حلق میں گرد زیادہ ہو جاتی تھی تو ہم کلیاں کر کے منہ صاف کر لیتے تھے۔ ہم سے غلطی ہو گئی۔ کسی طرح ایک کیتلی لے آتے تو چائے بھی بن جاتی۔ فنجان جیب میں آسانی سے چھپائے جا سکتے تھے اور چائے کی پتی بھی۔ خشک لکڑیاں راستے ہی میں چنی جا سکتی تھیں۔ کیتلی لانا البتہ مسئلہ ہوتا لیکن اُس کا بھی کوئی حل نکالا جا سکتا تھا۔ باری ختم ہونے پر ہم خشک میوہ ٹونگنے لگتے تھے۔ ہم نے کوئی آدھ فٹ کھدائی اور کی ہو گی کہ اباجان ہمیں روک کے دیوار کا غور سے جائزہ لینے لگے اور انھوں نے چھینی ہتھوڑی اپنے ہاتھ میں لے کے فوراً آہستہ آہستہ ضربیں لگانا شروع کیں۔ وہ اتنی احتیاط سے ہاتھ چلا رہے تھے جیسے پتھر تراش رہے ہوں، کسی مورتی کے خدوخال اُجاگر کر رہے ہوں یا کسی چیز کے پرت اتار رہے ہوں۔ ہم چند منٹ تک پوری توجہ سے انھیں دیکھتے رہے پھر ہم نے انھیں ہٹا دیا اور اُن کے بتائے ہوئے طریقے پر چھینیاں پیوست کرنے لگے۔ اُن کی بات کچھ کچھ سمجھ میں آ رہی تھی۔ اباجان کو اندر ضرور کچھ نظر آ گیا تھا۔ اِس خیال سے سبھی کے ہاتھ پیر پھولے جاتے تھے کہ ہماری محنت رائگاں نہیں جائے گی، اباجان نے صحیح دَر پر نشان لگایا ہے۔ اٹھارہ دروں میں یہ دوسرا دَر ہے جہاں کچھ چھپا ہوا ہے۔ ہم مٹی کھرچتے، مسالا کریدتے اور پتھروں کو ہاتھ ہی سے نکالنے کی کوشش کرتے رہے۔ وہ دیوار کا نچلا

حصّہ تھا۔ فرش سے کچھ اوپر۔ میں، جامو اور زورا دیوار پر تھے کہ زورا اُچھل پڑا، اباجان، پیرو، وزیر اور تجمل سب اُس کی طرف دوڑ پڑے کی لگائی ہوئی چھینی اندر تک چلی گئی تھی یقیناً اُدھر کوئی خول تھا کے کہنے پر ہم نے اسی جگہ آہستہ آہستہ ہتھوڑیاں ماریں اور ایک سو بن گیا۔ سوراخ میں ایک بڑی مینخ ڈال کے اباجان نے اُسے اِد گھما کے دیکھا۔ مینخ کسی چیز سے ٹکرائی تھی۔ ہم نے سوراخ اور چوڑا تاکہ ہم اندر جھانک کے دیکھ سکیں۔ پہلے اباجان ہی نے اپنی ٹا کی روشنی میں جھانک کے دیکھا۔ جب وہ ہٹے تو اُن کے ہونٹ رہے تھے اور آنکھوں میں جیسے قمقمے روشن ہو گئے تھے۔ انھوں نے تجمل کے ہاتھ میں تھما دی۔ ہم سب نے اُسے دیکھ لیا تھا اور کی گنجائش کا اندازہ بھی کر لیا تھا۔ زورا نے سوراخ اور بڑا کر دیا اور مینخ ڈال کے دیوار کو اپنی جانب زور سے جھٹکا دیا۔ کھدتے کھد کا ایک حصّہ بہت پتلا اور کمزور ہو گیا تھا۔ زورا کے ایک ہی جھٹکے گیا اور خول میں رکھا ہوا مٹی کا ایک بڑا برتن نمایاں ہو گیا۔

سب کی سانسیں ایک دم بند سی ہو گئی تھیں۔ ایک دو پہلو سے چمٹے ہوئے لمحوں تک ہم اُسے خیرہ کن نظروں سے دیکھتے وہ بالکل ٹھیک حالت میں تھا جیسے اُسے رکھے ہوئے چند ہی دن ہو اُس کی شکل عجیب و غریب تھی، اُسے نہ گھڑا کہا جا سکتا تھا، نہ جار گھڑے کے مانند چوڑا ہوتا ہوا وہ درمیان سے کچھ پچک جاتا تھا مٹکے یا گھڑے کا درمیانی حصّہ بھینچ دیا جائے۔ اُس کی لمبائی کوئی ڈیڑھ دو فٹ کے قریب، چوڑائی کوئی سوا فٹ کے قریب ہو گی۔ چکنی مٹی برتنوں پر جو شیشے اور نگ وغیرہ چسپاں کر دیے جاتے ہیں، اُس پر کے شیشے اور نگینے پیوست تھے۔ جلد سفید رنگ کی تھی ایسی شکل کا نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک چپٹی نما ڈھکن سے وہ بند تھا۔ نہیں بڑھا، سب اباجان کے منتظر تھے۔ اباجان ہی نے سب انگلی میں چادر لپیٹ کے اُس کی جلد پر ہاتھ پھیرا اور اُس پر اُبھ نگینوں کو ٹٹولا۔ اُن کی انگلیاں لرز رہی تھیں۔ پھر انھوں نے غالباً وہ اُس کی مضبوطی کی پیمائش کرنا چاہتے تھے۔ "ذرا احتیاط اُن کی بھرائی ہوئی آواز اُبھری۔ "ٹوٹ نہ جائے۔"

زورا نے اُسے کولیا بھرنے کے انداز میں اُٹھانا چاہا تھا۔ میں نے اُس کی مدد کی۔ ہم آہستہ سے اُسے اُٹھا کے فرش آئے۔ اباجان نے نیچے چادر بچھا دی تھی تاکہ فرش کی ضرب کا کوئی کونا ٹوٹ نہ جائے۔ "ڈھکن ہٹا کے دیکھو۔" اباجان نے حکم دیا۔

تجمل کھڑا رہا۔ زورا نے بڑھنے کی کوشش کی۔ اُس نے دیا۔ میں نے کہا "ڈھکن ہٹا کے دیکھو۔" اباجان تذبذب سے بولے۔

"نہیں بڑے صاحب!" تجمل نے دبے لہجے میں کہا۔ "ہم کو

کے کیا کرنا ہے۔ اِس کو دیکھنا آپ کا کام ہے، ہم کو دوسرا در بولو۔"

"دیکھیے تو اِس میں کیا ہے۔ کیا ہے؟"

"ابھی اِدھر کیا ہوگا بڑے صاحب!"

"یقیناً تصور سے سوا ہوگا۔ میں اِس دَر سے کچھ اور توقع کر رہا تھا۔" اباجان کی آواز دھک دھک کر رہی تھی۔ "ذرا دیکھیے تو کتنا بھرا ہے۔"

تجمل نے مزید ردوقدح نہیں کی، مجھے حیرت تھی کہ اباجان اُس کا ڈھکنا خود ہی کیوں نہیں اُٹھا دیتے لیکن وہ انکسار میں پیش قدمی نہیں کرنا چاہتے ہوں گے۔ جن لوگوں نے اُسے نکالا تھا وہ انھی کو موقع دینا چاہتے ہوں گے۔ تجمل نے ڈھکن ہٹا کے بیٹری کی روشنی ڈالی۔ اندر سے کرنیں پھوٹنے لگیں۔ تجمل کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ اُس نے فوراً بیٹری بجھا دی۔ تجمل کو بہت اندر ہاتھ نہیں ڈالنا نہیں پڑا۔ وہ لبالب تھا۔ ہاتھ نکال کے تجمل نے مٹھی کھولی تو اُس کی ہتھیلی پر بہت سے پتھر جگمگا رہے تھے۔ تجمل نے اپنا ہاتھ اباجان کے آگے پھیلا دیا۔ ہم سب انھیں دیکھنے اُس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ تجمل کی ہتھیلی پر ستارے سے اُگ آئے تھے۔ اباجان مختلف دانے اُٹھا اُٹھا کے انگلیوں میں تولتے اور سر ہلاتے رہے۔

"مبارک ہو بڑے صاحب!" تجمل مسکراتے ہوئے بولا۔ اُس کے ساتھ سبھی نے یک زبان ہو کے انھیں مبارک باد دی۔ صرف میں چپ کھڑا رہا۔

اباجان نے زبان سے کچھ نہیں کہا، تجمل کا بازو پکڑ کے ایک نظر اُسے دیکھا اور بولے "آپ نے اِسے دیکھا!"

"ہاں بڑے صاحب!" تجمل نے متانت سے کہا۔

"اندازہ کر سکتے ہیں کہ حاکم سیانگ کے پاس کتنا بڑا ذخیرہ تھا۔ بے شک بدھ راہب بھی کچھ ذخیرہ اپنے ساتھ لائے تھے مگر...... مگر وہ اتنا نہیں ہوگا۔ اِس محل کی بناوٹ، اِس کمرے کی سجاوٹ سے اُس زمانے میں جانگ قبیلے کی خوش حالی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اِس میں بیشتر حاکم سیانگ کا جمع کیا ہوا ہوگا۔"

تجمل نے ہیرے دوبارہ برتن میں لوٹ دیے۔ "ابھی وقت ہے بڑے صاحب! اگلا در بولو۔"

"اگلا در... اگلا در۔" اباجان کہیں کھوئے ہوئے تھے۔ تجمل کی آواز پر چونک پڑے۔ "میں اُسی کے بارے میں سوچ رہا ہوں اور ذہن میں کچھ تازہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ دروں کے بارے میں کاغذات میں کوئی خاص وضاحت نہیں تھی یا شاید میں اُسے اخذ نہیں کر پایا ہوں۔ ایک جگہ کچھ اشارہ ملتا تھا، اُسی کی بنیاد پر میں نے ان دروں کی آزمائش کی تھی۔ ہمارا وقت ضائع نہیں ہوا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب ہمیں ایک چھوڑ کے بعد کا در آزمانا چاہیے لیکن آپ لوگ تھک گئے ہوں گے۔ میرا خیال ہے باقی کل پر چھوڑا جائے۔"

"ابھی ٹائم پڑا ہے بڑے صاحب! اپن لوگ اوپر کا پلستر ایک دم اُکھیڑ سکتا ہے۔" پیرو بولا۔ "جتنی جلدی ہو اچھا ہے۔"

ہم نے احتیاط سے برتن ایک کونے میں رکھ دیا تھا۔ اُسے لوٹ کر نہیں دیکھا گیا۔ اباجان کی خواہش یہی معلوم ہوتی تھی کہ وہ اُسے لوٹ کے ایک بار تمام کا تمام دیکھیں لیکن تجمل اور پیرو کی عجلت پر انھوں نے ارادہ دبا لیا۔ پہلے دَر کا تجربہ ہمیں خوب ہو چکا تھا۔ ہم نے اِدھر اُدھر چھینیاں مارنے کے بجائے ترتیب سے دیوار میں قریب قریب چھید کر دیے۔ پلستر تقریباً اُدھڑ چکا تھا اور اندر کے پتھر نظر آنے لگے تھے کہ تجمل نے چار بج جانے کی اطلاع دی۔ ہم نے کام چھوڑ دیا۔ دوسرے دن ہم نے دیوار کے پتھر نکال لیے۔ اُس رات ہم دیر سے پہنچے تھے۔ اِس لیے اندرونی دیوار کے پتھر نکالنے کے بعد پاٹا ہوا مسالا ڈیڑھ فٹ اندر تک ہی کھود سکے اور وقت ختم ہو گیا۔ تیسرے دن ہماری مینخیں خول تک پہنچ گئیں۔ اباجان نے پھر صحیح دَر پر نشان لگایا تھا۔ اندر سے دھاتوں کے ٹکڑوں اور زیورات کا ایک بڑا ذخیرہ پھر برآمد ہوا تھا۔ وہ سب لکڑی کے ایک چھوٹے سے منقش بکس میں رکھا ہوا تھا۔ سب اِن زیورات کو دیکھ کے دنگ رہ گئے۔ اِن میں طرح طرح کے گہنے تھے۔ ہار کے سوا ایسی طرز اور بناوٹ کے زیور اُس زمانے میں کہیں نہ بنتے ہوں گے۔ مختلف اوزان میں دھاتوں کے ٹکڑے الگ تھے۔ اباجان نے پتھروں سے گھس کے انھیں دیکھا۔ وہ سب قیمتی دھاتیں تھیں۔ پہلا در اباجان نے کھولا تھا، دو ہم نے۔ پہلے در کے متعلق ہمیں کچھ نہیں معلوم ہو سکا کہ اُس میں کیا نکلا تھا لیکن دوسرے دو دَروں سے جو چیزیں نکلی تھیں، وہی کچھ کم نہیں تھیں۔ میں اباجان سے کہتے کہتے رُک جاتا تھا کہ یہی در کافی ہیں لیکن کوئی اور مجھے اپنا ہم نوا نظر نہیں آتا تھا۔ دوسرے دَر کے بعد انھوں نے فوراً تیسرے دَر کے پلستر پر ہتھوڑیاں چلانی شروع کر دی تھیں۔ انھیں اِس کام میں شاید مزہ آنے لگا تھا۔ پانچ راتیں مینخیں ٹھونکتے ٹھونکتے چھینیاں مارتے مارتے ہمارے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے تھے مگر کوئی بھی اپنی تھکن کا دوسرے پر اظہار نہیں کرتا تھا بلکہ تقریباً ہر ایک کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ اُس کی باری ختم نہ ہو۔ دوسرا دَر کھلتے وقت اُن کے چہرے خوشی سے کھل اُٹھے تھے۔ جیسے وہ کوئی بازی جیت گئے ہوں۔ جیسے ہی خول نظر آیا، وہ چیخ چیخ کر اباجان کو بلانے لگے۔ اباجان کے مشورے کے بغیر اب وہ ایک ہتھوڑی بھی زائد نہیں چلاتے تھے۔ سلطان کی ضد پر دوسری ہی رات تجمل نے اُسے ساتھ لے لیا تھا۔ اب اوپر سُولم سمیت چار آدمی رہ گئے تھے۔ جینی اور سارنے بھی چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے تھے لیکن ابھی روز شام کو اوپر جانے اور صبح بستی میں واپس آنے کی قوت نہیں رکھتے تھے۔

اِس دوران تجمل اور پیرو نے الگ الگ سردار کے مکان پر ایک مرتبہ اور حاضری دی تھی۔ انھوں نے اُسے مطمئن کرنے کی اپنی سی کوشش کی ہو گی مگر وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ اُسے زیادہ دیر تک روک کے نہیں

رکھ سکتے تھے۔ اِس کا احساس اُنھیں چوتھی رات مندروں کے علاقے میں بستی کے لوگوں کی بڑھی ہوئی تعداد سے ہو گیا ہو گا۔ شام ہوتے ہی دونوں قافلوں کے آدمی اُوپر کا رُخ کیوں کرتے ہیں۔ مختلف مندروں میں کیوں پھرتے رہتے ہیں۔ اُنھیں وہاں کس چیز کی تلاش ہے۔ کیا وہاں اُن کے کچھ اور لوگ بھکشوؤں کے بہروپ میں چھپے بیٹھے ہیں یا وہ کسی آدمی کی جستجو میں اُدھر جاتے ہیں جو اُن کے خیال میں کاغذات لے کے اِدھر آ گیا یا آیا ہی چاہتا ہے۔ سردار اور اُس کے ساتھیوں کے ذہن میں اَن گنت سوال اُبھرتے ہوں گے۔ اُس نے ایک بار اچانک ہمارے تین آدمیوں کو یرغمال بنانے کا فیصلہ اسی لیے کر لیا تھا کہ اسے ان سوالوں کے جواب جاننے کی بے چینی تھی۔ کسی وقت بھی وہ ایسا ہی کوئی اور فیصلہ پھر کر سکتا تھا۔ کم از کم یہی کہ ہم پر مندروں میں جانے کی پابندی عائد کر دے یا صرف دن کا وقت مقرر کر دے۔ دِن کو ہم کسی صورت میں قدیم مندر کے زیرِ زمین راستوں میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ اُس نے ہمیں کھلا چھوڑ رکھا تو صرف اس لیے کہ ہمارے دو آدمی بستی میں بیمار پڑے تھے۔ ہمارا سامان بھی وہیں موجود تھا اور ہم بظاہر قبیلے کی زندگی میں کسی رخنے کا سبب نہیں بنے تھے اور ہمارے بقول ہم پر کوئی ایسی ویسی بندش عائد کرنے سے وہ کونپل مل جانے کا خدشہ تھا جو عرصے بعد قبیلے میں ہمارے آنے سے پھوٹی تھی۔ کاغذات ملنے کی یہ آس کسی طرح بندھی رہنی چاہیے۔ بنجل نے اُسے یہی تاثر دیا تھا کہ ہم بھی اُنھی کی کھوج میں ہیں مگر یہ تاثر کب تک قائم رہے گا۔ سردار کا پیمانۂ ضبط کب تک نہیں چھلک پائے گا۔ پیرو نے اُس سے دو مہینے اور بنجل نے چار مہینے کی مہلت مانگی تھی۔ یہ مہلت خود اُن کی عائد کردہ تھی اور محض اس وجہ سے تھی کہ سردار کے پاس سوچنے کا سامان رہے۔ سوچ، جو اُس کے عاجلانہ فیصلوں میں رکاوٹیں کھڑی کر سکتی تھی اور ہمیں کچھ فراغت دے سکتی تھی لیکن فیصلے کی بنیاد ابھی تک موجود تھی اور سردار بستی میں اکیلا ہی نہیں تھا اور بھی لوگ، قبیلے کے بزرگ لوگ اُس کی سوچ میں شریک تھے۔

جب بنجل نے اُس سے کاغذات کا ذکر کیا تھا تو سب کو حیرانی ہوئی تھی کہ اُس سے کوئی لغزش تو سرزد نہیں ہو رہی ہے مگر اُس نے بستی میں چند دن گزارنے کے بعد سردار سے یہ ذکر کیا تھا۔ اگر وہ نہیں کرتا تو ہم اس طرح اُوپر آ جا نہیں سکتے تھے اور سردار یہی کر سکتا تھا کہ وہ اُوپر چاروں طرف بستی کے آدمی پھیلا دے مگر وہ کچھ اور بھی کر سکتا تھا۔ وہ یہاں کا سردار تھا اور ہم پناہ گزین۔

ابھی تین دَر باقی تھے اور یقینی نہیں تھا کہ اُن تین کی نشان دہی بھی اباجان ٹھیک ہی کریں۔ ٹھیک بھی ہو تو ایک دَر کے کھلنے میں ڈھائی راتوں کا وقت لگتا تھا۔ گویا تین دَروں کے لیے ایک ہفتہ۔ مزید ایک ہفتے تک ہم روز اُوپر جاتے اور واپس آتے رہیں گے اور سردار اپنے آدمیوں سے صرف ہماری سرگرمی کی اطلاعات سنتا رہے گا! اگر ہم کسی غلط دَر پر ہتھوڑیاں چلانے لگے اور باقی تین دَر سب سے آخر میں نمودار ہوئے تو ایک مہینہ بھی لگ سکتا تھا۔ اگر ہم اپنے تمام آدمی اُوپر لے جاتے تو دو دَروں پر بیک وقت کام کر سکتے تھے۔ ہم سب وہیں بند ہو جاتے اور دِن رات وہیں رہتے تو چند دن لگتے۔ میں بنجل سے کہنا چاہتا تھا کہ یہی ایک تدبیر سب سے بہتر ہے۔ جینی اور سارٹے بھی ٹھیک ہو چلے ہیں۔ ایک رات پانی اور کھانا لے کے ہم سب بند ہو جائیں۔ وہ ہمارا سراغ کبھی نہیں لگا سکتے۔ تین دن تک ہم شب و روز محنت کر کے سارے در کھول لیں گے۔ ہو سکے تو کدالیں بھی ساتھ لے آئیں گے۔ اُس کے بعد جو ہو گا، دیکھا جائے گا۔ ہم اپنا کام تو کسی طور ختم کر ہی لیں گے اور ہمیں بار بار اُوپر نہیں آنا پڑے گا۔ تین دن بعد رات کے اندھیرے اور دُھند میں ہم برآمد ہوں گے تو کسی طرف بھی نکل جائیں گے۔ چلتے رہیں گے، چلتے رہیں گے اور جلد سے جلد اُس علاقے سے دُور ہوتے رہیں گے، نیچے رکھے ہوئے سامان پر خاک ڈال جائے۔ جتنا کچھ ہم بیچ چکے ہیں اور جتنا اور بیچ سکتے ہیں اُسی سے ہمارے پاس اتنے روپے ہوں گے کہ ہم آگے کسی منزل پر جا کے نئے قلی اور سامان مہیا کر لیں۔

اچھا ہی ہوا کہ میں نے بنجل سے اپنی اُس تدبیر کا ذکر نہیں کیا۔ اُسے بتانے سے پہلے ہی مجھے اُس میں خامیاں نظر آنے لگی تھیں۔ بنجل سنتا تو شاید بہت ہنستا۔ اُوپر جانے کے بعد تین دن تک ہم باہر نہیں نکلیں گے تو وہ اپنی ساری آبادیاں اُوپر لے آئیں گے۔ اُن کے پاس بہترین قسم کے یاک ہیں۔ جن کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جائے تو بھی راستے انھیں نظر آتے ہیں۔ بارش، برفانی طوفان وغیرہ کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔ چھولداریوں، وافر غذا اور دوسرے سامان کے بغیر ہم کتنی دُور جا سکیں گے۔

ایک دَر کا خزانہ اباجان کے کہنے کے مطابق وہ ایک محفوظ جگہ منتقل کر چکے تھے۔ دوسرے دو دَروں کا خزانہ ہم نے بس اُس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لیے چھو کے دیکھا تھا اور وہ بھی اباجان کی خواہش پر۔ جہاں تک میرے سامنے کی بات ہے کسی نے اباجان سے اُس کی منتقلی کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔ اُصولاً وہ بھی انھیں اُسی مخصوص جگہ پہنچا دینا چاہیے تھا۔ کاغذات سے اباجان کو تمام دروں سے نکلنے والے ذخیرے کا تھوڑا بہت علم ہو گا ہی اور اُنھوں نے اسی اعتبار سے اُس کے لیے کوئی بہت ہی محفوظ اور گنجائش کی جگہ ڈھونڈی ہو گی مگر کیا وہ پہلے سارا خزانہ اِسی جگہ پہنچانے کا ارادہ رکھتے تھے یا سارے در کھولنے کے بعد اُن کا ذخیرہ اُس کمرے میں کھلا رکھنے کا خیال تھا۔ کیونکہ وہ یہ تمام ہرگز اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے تھے۔ ایک بھکشو زادِ راہ میں یہ انبار نہیں لیے پھرتا۔ وہ تھوڑا تھوڑا ہی ہندوستان منتقل کر سکتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ ایک دَر سے نکلنے والے ذخیرے کے بقدر۔ اور یوں وہ قدیم مندر میں اپنی تلاش کی ہوئی محفوظ جگہ پر اتنا اعتبار نہیں کر سکتے تھے کہ تمام کا تمام پہلے وہاں پہنچا دیں اور اُس میں سے تھوڑا تھوڑا نکال کے ہندوستان لے جاتے رہیں اور ہندوستان کا طویل دورہ کر کے واپس آئیں تو اُس جگہ پر کسی کی نظر نہ پڑ سکے۔ یہ بے احتیاطی اباجان سے ممکن نہیں تھی۔

تمام دَر ایک ہی بار کھودنے سے یہ اطمینان ہو جاتا تھا کہ اب بار بار زحمت نہیں کرنی پڑے گی۔ دوبارہ خزانے کی دوسری قسط لینے ہندوستان سے آئیں تو صرف آنا اور لے جانا ہی رہ جائے اور اُس طرح کل ذخیرے کا بھی اندازہ ہو جاتا تھا۔ ہمارے شامل ہونے کے بعد صورت کچھ بدل گئی تھی۔ اب وہ تنہا نہیں تھے۔ تمام دَروں کا ذخیرہ ایک ساتھ لے جایا جا سکتا تھا مگر کہاں سے؟ سرنگوں سے براہِ راست یا اباجان کی محفوظ جگہ سے؟ وہ محفوظ جگہ کہاں ہے؟ ظاہر ہے قدیم مندر سے زیادہ دُور نہیں ہو گی یا ہو بھی سکتی ہے۔ ہم قدیم مندر سے اپنے سروں اور کاندھوں پر لاد کے کیسے برآمد ہوں گے۔ ہر طرف قبیلے کے آدمی بیٹھے ہوئے ہیں۔ سوچتے سوچتے میرا دماغ پھٹنے لگا تھا۔ اباجان تک پہنچنا، دَر کھودنا مجھے اتنی بڑی بات نہیں معلوم ہوتی تھی جتنا دروں سے نکلا ہوا ذخیرہ اپنے صندوقوں میں منتقل کرنا اور بستی سے بہ خیریت دُور ہو جانا۔ ہو سکتا ہے اباجان اور بنجل کے درمیان کوئی بات ہوئی ہو۔ بہرحال دونوں دَروں کی دولت وہیں پڑی رہی۔ اُسے اباجان نے پہلے دَر کے مانند منتقل نہیں کیا۔ جواہر کا برتن اور زیوروں کا صندوق دونوں کمرے کے ایک گوشے میں رکھ دیے گئے تھے اور تیسرے دَر کی کھدائی شروع کر دی گئی تھی۔

بنجل نے سردار سے ایک بار کنایتہً کہا تھا کہ مندروں کے علاقے میں کاغذات سے متعلق کوئی اشارہ مل سکتا ہے۔ بات واضح نہیں تھی مگر سردار کا ذہن وہاں موجود بھکشوؤں کی طرف جا سکتا تھا۔ گو وہ بھکشوؤں پر شک کرنا گناہ سمجھتے تھے۔ اُن کے دل میں اُن کا درجہ بہت بلند تھا لیکن اِن حالات میں بر بنائے مصلحت وہ یہ روایتی احترام بالائے طاق رکھ کے کوئی جرأت نہیں کر سکتے!۔ اور اُن کی نگاہ پھر فوراً ہندوستانی شکل و صورت کے بھکشوؤں پر جائے گی۔ اباجان اپنے منڈے ہوئے سر بدلے ہوئے حُلیے، تبتی زبان سے واقفیت کے باوجود صاف ہندوستان سے تعلق رکھنے والے آدمی تھے۔ دس مختلف قوموں کے بھکشوؤں کے درمیان اُن کے ہندوستانی خط و خال علیحدہ سے پہچانے جا سکتے تھے۔ ہم نے اپنی طرف سے اباجان یا کسی بھکشو سے اپنے تعلق کا شائبے کی حد تک بھی انھیں موقع نہیں دیا تھا مگر وہ خود ہی اپنے طور پر بھکشوؤں خصوصاً ہندوستان سے آنے والے بھکشوؤں کی نقل و حرکت پر نظر رکھنی شروع کر سکتے تھے۔

⚜

دوسرا دَر کھولنے کے بعد ہم سرائے میں کچھ وقت گزار کے دِن کے اوّل پہر بستی میں واپس آ گئے تھے اور بازار لگا کے ہم نے اپنا کچھ سامان اور نکال دیا تھا مگر جلد ہی پیرو اپنے صندوق لے کے چوک میں آ گیا اور اَونے پونے مال لٹانے لگا۔ جب تک ہم چوک میں بیٹھے رہے، پیرو کے سامان کے گرد تانتا بندھا رہا۔ اُس دن اُس کے پاس شاید ہی کچھ باقی رہ گیا ہو۔ اُنھی صندوقوں کا سامان جو وہ بستی کے چوک میں اپنی قیام گاہ سے نہیں لایا تھا، اُس نے ضرور کچھ روک کے رکھا ہو گا۔ مال فروخت کر کے پیرو نے بازار سے خریداری بھی کی۔ اناج کے تھیلے، چائے، چھینیاں، ہتھوڑی، کدالیں اور دوسری مختلف چیزیں اسی شام ہم اپنے وقت کے مطابق مندروں کے علاقے اور مختلف مندروں میں گھومتے رہے۔ پیرو ہمیں کہیں نہیں ملا۔ ہم قدیم مندر میں بھی تھوڑی دیر کے لیے گئے۔ اباجان بھی وہاں موجود نہیں تھے۔ رات گئے ہم سرائے میں آ کے لیٹ گئے اور صبح سویرے بستی میں واپس آ کے سیدھے سردار کے مکان پر پہنچے۔ ہماری آمد بے وقت تھی۔ سردار نے ہمیں اپنے خاص کمرے میں طلب کر لیا۔ اُس کی گردن تنی ہوئی تھی۔

"اپنے کو پتہ چلا ہے کہ دوسرے قافلے کے کچھ لوگ اِدھر بستی سے واپس جا رہے ہیں۔" بنجل نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔

سردار نے اثبات میں صرف ایک ہی مرتبہ گردن کو جنبش دی۔

"وہ کیا بولتے ہیں، ہو سکے تو ہم کو بتاؤ۔"

سردار چند لمحے چپ رہا پھر سپاٹ آواز میں بولا۔ "وہ جانا چاہتے ہیں۔"

"کدھر! تم نے پوچھا کہ وہ کدھر جانا چاہتے ہیں؟"

"ہم نے ضرورت نہیں سمجھی۔"

"تم نے ضرور پوچھا ہو گا۔" بنجل اُونچے لہجے میں بولا۔ "ایسا نہیں ہو گا کہ تم نے نہیں پوچھا ہو گا۔ تم کو اُنھوں نے غلط بولا ہو تو یہ دوسری بات ہے۔"

"تمھارے خیال میں وہ کس طرف جانا چاہتے ہیں؟" سردار نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"تم بھی سمجھتے ہو، ہم سے کیا پوچھتے ہو۔"

"ہم کچھ نہیں سمجھتے۔"

"سردار!" بنجل نے ترشی سے کہا۔ "اپنے سے کچھ چھپاؤ گے تو اپنا بھلا نہیں کرو گے۔ خیر، جانے دو۔ اُس نے تم سے جو کچھ بولا ہے، ہم کو مت بتاؤ۔ تم کو جلد ہی اُجلے کالے کا پتہ چل جائے گا۔ ابھی ہم تم سے ایک بات بولنے آئے ہیں، اپنے دو آدمی بھی اُن کے ساتھ کر دو، تمھارے لیے یہ اچھا ہی ہو گا۔"

"کس کے دو آدمی؟" سردار تردّد سے بولا۔

"ہمارے دو آدمی! سمجھو ہم کیا بول رہے ہیں۔ ہم کو تم نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔ ابھی ہم جائیں تو وہ لوگ اِدھر سے سالے کبھی اپنے ہاتھ پیر ٹھیک نہیں لے جا سکتے۔ پہلے بات ہم سے ہوئی ہے — اور تم نے وعدہ کیا ہے کہ تم اپنی مدد کرو گے۔ ہم نے تم سے کوئی مدد نہیں مانگی ہے۔ ایک بات بولتے ہیں، سوچ سمجھ کے فیصلہ کرو۔ وہ واپس جانے کو

بولتے ہیں یا کدھر ہی کو۔ بولو کہ یہ دو آدمی بھی اُدھر جانا مانگتے ہیں۔ ان کو بھی ساتھ رکھ لو۔ تمھاری بات وہ منع نہیں کریں گے اور منع کرے تو زور دے کے بولو کہ کچھ ہی دُور تک اُن کو ساتھ رکھو۔ جہاں کوئی دوسرا قافلہ ملے۔ اِن کو الگ کر دینا۔ اُدھر پھر اپنے آدمی خود نبٹ لیں گے اور تم کو یہ سب بولنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ وہ کبھی منع نہیں کریں گے۔"

"تم خود کیوں نہیں کہتے؟"

"تمھاری بات اور ہے۔ تمھارا اُس میں کچھ نہیں جاتا۔ پر ہم اِدھر بھاڑ جھونکنے نہیں بیٹھے ہیں۔ اپنا بہت کچھ جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے اپنا آدمی اُدھر سے اُن سے پہلے اِدھر واپس پہنچ جائے۔ اس میں تمھارا کیا حرج ہے؟"

"ہمارا کوئی حرج نہیں،" سردار بیزاری سے بولا۔

"پھر کیا ہے؟" تجّل نے کہا۔ "جیسا ہم بولتے ہیں ویسا ہی کرو۔ وہ سالا منمنائے گا پر ہم جانتے ہیں اُس نے تم کو اپنے جانے کا صاف مطلب نہیں بولا ہوگا۔ ہم اپنے آدمی ویسے بھی اُن کے پیچھے کر سکتے ہیں۔ پر راضی خوشی بات بن جائے تو ہمارا تمھارا دونوں کا بھلا ہے۔"

سردار نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ تجّل نے اُس کے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا۔ اُس سے اجازت لیے بغیر اُٹھ کے چلا آیا۔ اُسی دن سفر کے لیے کئی ضروری چیزیں ہم نے بازار سے خریدیں اور اُنھیں گھر میں رکھ کے شام کو ہم پیرو کی قیام گاہ پہنچے۔ سردار نے اُسے بلا کے کہہ دیا تھا۔ بستی کے دوسرے لوگ بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ پیرو ہم سے بہ ظاہر بے اعتنائی سے ملا۔ تجّل نے اُس سے اپنے دو آدمیوں کو ساتھ لے جانے کو کہا تو اُس نے بگڑے ہوئے منہ سے قبول کر لیا۔

رات بھر ہم چن وسا کے مکان ہی میں رہے۔ کوئی سات دن ہو گئے تھے۔ ہم کسی رات بھی ویرانے میں ایک آدھ گھنٹے سے زیادہ نہیں سوپائے تھے یا سہ پہر کو کبھی کبھی پہاڑی پر دو ایک گھنٹے۔ سبھی کی آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ ڈلوں میں رہ رہ کے درد اُٹھنے لگتا تھا اور جسم ٹوٹے سے جاتے تھے۔ چن وسا کے ساتھ رات کا کھانا کھا کے جیسے ہی ہم لیٹے، تن من کا ہوش نہیں رہا۔ سلطان اُس رات بھی دیر تک نہیں سو پایا ہوگا۔ اتنی راتوں بعد اُسے نشانم سے بات کرنے کا موقع ملا تھا۔ کھانے کے وقت میں نے کئی بار اُسے دیکھا تھا۔ اُس نے آج خوب صورت کپڑے پہن رکھے تھے اور شرمائی شرمائی سی لگتی تھی۔ گال اُس کے جیسے کچھ اور لال ہو گئے تھے۔

صبح ہوتے ہی مارٹی اور سُولم سفر کے لیے تیار تھے۔ اُنھوں نے تمنچے، کارتوس، دو صندوق، ایک بندوق، بستر اور چند تھیلے اپنے ساتھ رکھ لیے تھے۔ تمام چیزیں، جو کل تمام ہم نے اُن کے لیے خریدی تھیں، آدھی سے زیادہ خود روک لی تھیں خصوصاً چائے، کھانے پینے کا سامان اور کدال۔ بستی کے کنارے جینی، پلٹرا اور زورا روانگی کے لیے تیار کھڑے تھے اور ہماری آمد کے منتظر تھے۔ اُن کے پاس بھی دو بندوقیں تھیں۔ یاک کی کمر سے اُن سب کا سامان لٹکا دیا گیا جو پانچ یاکوں پر بخوبی آ گیا تھا۔ تین قلی اُن کے ہمراہ تھے۔ تجّل اور پیرو نے الگ الگ لے جا کے اپنے آدمیوں کو ہدایتیں دیں۔ سورج چڑھنے سے پہلے وہ ہم سے رخصت ہو گئے۔

۷

تجّل نے اُس دن بھی مندروں کے علاقے کا رُخ نہیں کیا۔ سارا دن یا تو ہم بستی کا چکر لگاتے رہے یا اطراف کے پہاڑوں پر گشت کرتے رہے۔ تجّل اور جامو نے بندوق سے بہت سے پرندوں کا شکار کیا۔ اُس میں سے اچھا شکار اُنھوں نے سردار کے لیے بھجوا دیا۔ پیرو نے اُس روز بھی بازار لگایا تھا۔ سہ پہر کو وہ بھی ہمیں پہاڑوں میں گھومتا ہوا مِل گیا تھا۔ ہم میلوں پگ ڈنڈیوں پر چلتے رہے تھے لیکن اندھیرا ہوتے ہوتے اپنے گھر لوٹ آتے تھے۔ دوسرا دن بھی کچھ مختلف نہیں تھا۔ میں نے اُن کی کچھ باتیں سُن لی تھیں اور چونکہ میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا اس لیے چُپ ہی رہا تھا۔ تیسرے دن ہم مندروں کے علاقے میں جا کے دن ہی دن میں واپس آ گئے۔ پیرو ہمارے ساتھ نہیں تھا۔ اباجان اُدھر کہیں ہمیں دکھائی نہیں دیے تھے۔ ہم قدیم مندر کی عمارت میں بھی نہیں گئے تھے اور اباجان سے ملنا مقصود بھی نہیں تھا۔ اب بھی بستی کے آدمی اُوپر تعینات تھے لیکن اُن کی تعداد نسبتہً کم تھی۔ سُولم کے نہ ہونے کی وجہ سے ہمیں لوگوں سے بات کرنے میں دقت ہو رہی تھی۔ اتنے عرصے میں جو تھوڑی بہت تبتی آ گئی تھی، ہم اُسی سے کام چلا رہے تھے۔ نشانم کے حوالے سے ہمیں یقین تھا کہ ہمارا میزبان بوڑھا چن وسا بھی ہندوستانی جانتا ہے مگر وہ اٹکل اٹکل سے ہماری تبتی سُنتا اور اشاروں میں ہمیں جواب دیتا رہا۔ اُس نے ایک ہندوستانی لفظ بھی منہ سے پھوٹ کے نہیں دیا لیکن سردار نے ایسا نہیں کیا۔ اُسے معلوم تھا کہ تبتی جاننے والا ہمارا آدمی اب ہمارے درمیان نہیں ہے۔ سو ہم تیسرے دن ولایتی شراب کی ایک اور بوتل، نفیس قسم کے کپڑے، قینچیاں اور آئینے لے کے اُس کے پاس پہنچے تو اُس نے ایک بوڑھے ترجمان کو فوراً بلا لیا۔ سردار توقع کر رہا ہوگا کہ ہم اُس سے کوئی اہم بات کہنے آئے ہیں لیکن ہمارے پاس آنے والے دنوں کے لیے اُمیدوں اور آرزوؤں کے اظہار کے سوا کچھ نہیں تھا۔ سردار بہت افسردہ تھا۔ تھکا تھکا سا، کھویا کھویا سا۔ اُس نے ہم سے زیادہ بات بھی نہیں کی۔ تجّل بھی زیادہ دیر اُس کے پاس نہیں بیٹھا۔

یہ تین دن ہم بستی کے پہاڑوں کی ایک طرح سے سیر کرتے رہے۔ دن بھر شکار کرتے اور گھر لوٹ کے سارا شکار چن وسا کے سپرد کر دیتے۔ وہ کچھ روک کے باقی سب بستی کے ممتاز لوگوں میں اپنے خادم کے ذریعے

تقسیم کرا دیتا۔ تین راتوں تک ہم اپنا شکار کیا ہوا بھنا گوشت کھاتے رہے۔ وہ یاک کے مکھن میں بھونا جاتا تھا۔ شروع شروع میں یاک کے دودھ اور مکھن سے ہمیں بہت کراہت محسوس ہوتی تھی، جی متلانے لگتا تھا۔ رفتہ رفتہ ہم اُس کی مہک کے عادی ہو گئے اور بہت سی چیزیں منہ کو لگ گئی تھیں۔ سُولم اور مارٹی کے جانے سے ہم خالی خالی سے ہو گئے تھے۔ ہم صرف چار رہ گئے تھے۔ تجّل، میں، جامو اور سلطان۔ اُدھر بھی پیرو کو ملا کے چار ہی آدمی تھے۔ وہ خود وزیر، سارٹے اور ہلاکو۔

اور ایک رات، ساری رات ہم سوتے رہے اور ناشتے کے بعد بید کی زنبیلیں اُٹھا کے پھر بستی کے اِرد گِرد پھیلے ہوئے پہاڑوں کی طرف نکل گئے۔ گزشتہ دو روز سے شکار لانے کے لیے یہ زنبیلیں ہم اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ چلتے چلتے ہم بستی سے خاصی دُور گھنے جنگل میں چلے آئے۔ پیرو بھی کچھ دیر بعد ہمارے ساتھ آ ملا تھا۔ جب تک اندھیرا نہیں ہو گیا، ہم سب اُونچے درختوں کے ایک جھنڈ میں پڑے رہے۔ وہیں ہم نے خشک لکڑیوں کا ایک گٹھا تیار کر لیا تھا۔ اندھیرا ہوتے ہی بستی میں واپس جانے کے بجائے ہم درختوں کے نیچے نیچے اور اُوپر بڑھتے گئے۔ جہاں تک ہم جوتے پہن سکتے تھے، پہنے رہے۔ بہت اونچائی پر آنے کے بعد ہم نے جوتے اُتار کے زنبیلوں میں رکھ لیے۔ موزوں پر ہی اکتفا کیا اور کانٹوں، جھاڑ جھنکاڑ سے بے نیاز آگے ہی بڑھتے رہے۔ آدھی رات کا وقت ہوگا کہ ہماری منزل سامنے تھی۔ قدیم مندر۔

تین دن تک یہاں آنے کے لیے ہم پہاڑوں میں ایسا ہی کوئی راستہ ڈھونڈنے کی تگ و دو کر رہے تھے۔ قدیم مندر دوسرے مندروں کے مقابلے میں کسی قدر نشیب میں واقع تھا اور بستی سے اُوپر ایک وسیع سبزہ زار پہاڑی سلسلے ہی سے متعلق تھا۔ اُس کے ایک جانب تو مندروں کا علاقہ تھا، دوسری طرف عموماً ڈھلوان، ستواں نشیبی سلسلہ تھا اور گھنا جنگل اُگا ہوا تھا۔ مندروں کے علاقے سے یہاں آنے کے لیے صاف راستے کی موجودگی میں لوگ یہ دُشوار گزار راستہ کیوں منتخب کرتے۔ انسانی پیروں سے بچے رہنے کی وجہ سے یہاں جھاڑ جھنکاڑ کی بہتات تھی۔ ہم سرِشام ہی قدیم مندر سے قریب ایک نشیب میں آ کے رُک گئے تھے۔ اس جگہ تک پہنچنے کے لیے ہمیں پہاڑوں پہاڑوں ایک طویل چکر کاٹنا پڑا تھا۔ ہم جنگل کے اندر اندر ہی چلتے رہے تھے۔ اُونچے درختوں نے ہماری نقل و حرکت پر ایک پردہ سا ڈال رکھا تھا۔ اُوپر سے کوئی ہمیں نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن جب تک دن تھا، بھولے بھٹکے کسی کی نظر ہم پر پڑ سکتی تھی۔ ہم نے اِسی لیے اندھیرا ہونے کا انتظار کیا۔ اُس وقت تک ہمیں کوئی دیکھ بھی لیتا تو یہی سمجھتا کہ ہم شکار کرتے کرتے اِس طرف آ نکلے ہیں مگر پھر ہمیں آج کا دن ملتوی کرنا پڑتا۔ تین دن سے ہم کسی ایسی جگہ کی نشان دہی کی کوشش میں تھے جو چڑھائی کا باقی سفر طے کرنے کے لیے مندروں سے دُور نہ ہو اور جہاں اندھیرا ہونے تک ہم آسانی سے چھپ سکیں۔ آگے ہمیں کھائیوں اور دوسری ہزار قسم کی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا۔ یہ باقی سفر ہمیں اندھیرے میں عبور کرنا تھا۔ لہٰذا وہ جگہ لازماً قدیم مندر سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہونی چاہیے تھی تاکہ رات ہی رات میں ہم وہاں پہنچ سکیں۔ آگے کا راستہ ہمارا دیکھا بھالا نہیں تھا مگر اتنے دنوں پہاڑوں میں رہنے کے بعد ہم پیش آنے والی دشواریوں کا نقشہ بخوبی اپنے ذہن میں قائم کر سکتے تھے۔ پھسلواں زمین پر پاؤں جماتے، درختوں کا سہارا لیتے، ایک دوسرے کی کمر سے رسّیاں باندھ کے، کہیں زمین سے چپکتے اور رینگتے کھائیوں اور کانٹے دار جھاڑیوں سے بچتے اور اپنی چاپیں دباتے ہوئے گہرے اندھیرے میں جس طرح ہم نے یہ مختصر فاصلہ عبور کیا، وہ خود ہمارے لیے تعجب انگیز تھا۔ کئی جگہوں پر عمودی چڑھائی نے ہمارا راستہ کاٹ کاٹ دیا اور ہم گھومتے ہوئے پھر اپنے راستے پر آ سکے۔ بعض جگہ تو سامنے ایک دیوار سی کھڑی معلوم ہوتی تھی۔ ہمیں تقریباً ساری رات لگ گئی مگر اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اُوپر پہنچنے کے لیے ہم ایسا کوئی راستہ اختیار کر سکتے ہیں۔ آخر کار قدیم مندر کی تاریکی میں ڈوبی ہوئی عمارت ہمارے سامنے تھی۔ ممکن ہے سیڑھیوں پر اب بھی بستی کے آدمی بیٹھے ہوں لیکن ہمیں اُنھیں دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ عقبی دروازے سے ہم اندر داخل ہوئے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور اباجان مشعل کی مدھم روشنی میں وہاں مراقبے میں ڈوبے ہوئے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد ہم زیرِ زمین کمرے میں موجود تھے۔ زنبیلوں میں کمبلوں کے نیچے دو کدالیں رکھی تھیں۔ اِن میں سے ایک پیرو لایا تھا۔ کھانے پینے کا سامان، خشک لکڑیوں کا گٹھا، چائے، کیتلی، مشکیزے ہمارے ساتھ تھے۔ شاید تجّل کو یقین تھا کہ اباجان باقی تین دروں پر نشانات لگانے میں غلطی نہیں کریں گے۔ اُس نے چار دن مقرر کیے تھے۔ تیسرے دن رات ہی کو ہم اپنا کام ختم کر چکے تھے لیکن وہ رات کا پچھلا پہر تھا۔ ہمارا باہر نکلنا مناسب نہیں تھا۔ ہم نے چوتھا دن لمحے لمحے گن گن کے گزارا۔ ان تین دروں سے مجموعی طور پر زیادہ بڑا ذخیرہ برآمد ہوا تھا۔ ہم آٹھ آدمیوں کے کپڑوں کی جیبوں، اباجان کے کشکول، اُن کے لبادے میں چھپی ہوئی ہمیانی اور بندھی ہی میں بہت سے پتھر آ گئے تھے۔ بڑا حصّہ ہم نے زنبیلوں میں محفوظ کر لیا تھا۔ جو باقی بچا، اُس کی پوٹلیاں بنا لی تھیں۔ جہاں تک ہو سکا ہم نے زیادہ سے زیادہ حفاظت اور کم سے کم مدّوں میں وہ سب سمیٹنے کی کوشش کی تھی۔ اباجان کو چار اور دوسرے برتن وہیں چھوڑ جانے کا افسوس تھا۔ تیسرے در سے نکلنے والا منقش بکس البتہ ہم نے جوں کا توں رہنے دیا تھا۔ اباجان نے پہلے در کا خزانہ جو ایک جگہ چھپا رکھا تھا، وہ پہلے ہی اُسے واپس کمرے میں لے آئے تھے۔

چار دن تک ہم نے آسمان نہیں دیکھا۔ کمرے میں ہر طرف بے ترتیبی

تھی۔ چھ دنوں کا ملبا، زر و جواہر کا انبار، ساتھ لایا ہوا سامان اور ہم نو آدمی۔ دیواروں میں جابجا لگے ہوئے شیشوں اور نگینوں کی روشنی آنکھوں میں چبھنے لگی تھی۔ تیسرے روز تک تو ہم باریاں تبدیل کرتے، نیند لیتے اور لکڑیاں جلا کے چائے بناتے رہے۔ چوتھے دن لیٹنے کے سوا ہمیں کوئی کام نہیں تھا۔ کسی نے بے ضرورت کمرے سے باہر قدم بھی نہیں نکالا تھا۔ ضرورت کے لیے اباجان نے وہیں ایک میخ ٹھکوا کے رسی باندھ دی تھی جو باہر کسی ایک سرنگ میں کچھ ہی دور تک جاتی تھی۔ وہاں دن اور رات کا کوئی امتیاز نہیں ہو پاتا تھا۔ تجمل کے پاس گھڑی تھی۔ سب وقفے وقفے سے اُس سے وقت پوچھتے تھے کہ کہیں تجمل سے اُس کے حساب میں کوئی چوک نہ ہو جائے۔ وقت کہیں چپکے سے نکل نہ جائے۔ سب کو اتنی عمریں شب و روز کاٹتے ہوئے ہو گئی تھیں لیکن لگتا تھا کہ یہ اُن کی زندگی کا پہلا دن ہے اور اُس سے پہلے وقت گزرنے کا اُنھیں کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ دن کے دس بجے تجمل نے کسی کے پوچھنے پر وقت بتایا تو اُنھیں یقین نہیں آیا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ شاید گھڑی خراب ہو گئی ہے۔ پھر کان لگا کے وہ اس کی ٹِک ٹِک غور سے سنتے تھے۔ اُنھیں ڈر تھا کہ کھدائی کرتے کرتے گھڑی پر کوئی ضرب نہ پڑ گئی ہو، سوئیاں آگے پیچھے نہ ہو گئی ہوں۔ سوئیاں ٹھیک ہی تھیں مگر وہ بس چکر لگا رہی تھیں اور وقت تھم گیا تھا۔ جیسے آدمی مر جائے اور اُس کی کلائی میں بندھی گھڑی چلتی رہے۔ سب گرے گرے جاتے تھے۔ سب نے برسوں تنگ کوٹھڑیوں میں بتائے تھے۔ یہاں چند دن بھی گزارنا دوبھر ہو گیا تھا۔ وہاں سورج تو نکلتا تھا۔ نئی ہوا تو ملتی تھی۔ یہاں برسوں پرانی ہوا بند تھی۔ زنگ لگی ہوئی شکستہ، بوڑھی ہوا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ہم بھی اس عرصے میں بوڑھے ہو گئے ہیں۔ یہاں آئے ہوئے ایک مدت ہو گئی ہے۔ چاندنی، دھوپ دیکھے ہوئے زمانہ گزر گیا ہے۔

تجمل نے ٹھیک گیارہ بجے کا وقت مقرر کیا تھا اور اُن کی تسلی کے لیے جیبی گھڑی فرش پر رکھ دی تھی تاکہ وہ خود اُسے دیکھتے رہیں۔ آدھ گھنٹے پہلے ہی وہ سب کھڑے ہو گئے تھے۔ ہمارا سامان کب کا تیار پڑا تھا لیکن تجمل نے وقت پورا کیا۔ چلتے وقت کسی نے پلٹ کے کمرے کو نہیں دیکھا۔ اباجان ہم سب سے آگے تھے اور اُن کی رفتار کسی قدر تیز تھی۔ سب سے پہلے وہی باہر نکلے پھر اُن کے اشارے پر ہم سب۔ باہر آتے ہی چکر سے آنے لگے تھے۔ چند لمحوں تک ہم دیواروں کی آڑ میں اپنی سانسیں درست کرتے رہے۔ ٹھنڈی تازہ ہوا سے سینے میں برف سی جمنے لگی تھی۔ عمارت میں مکمل سناٹا تھا۔ کسی جانب سے کوئی آواز چہکار نہیں تھی اور ہر طرف دھند چھائی ہوئی تھی۔ وہ تو بارش نہیں تھی ورنہ پھر ہمیں واپس سرنگوں میں جانا پڑتا۔

ہمیں اُسی راستے سے واپس جانا تھا جس سے چار دن پہلے ہم یہاں آئے تھے اور وہ سارا کا سارا نشیب تھا۔ اُوپر کسی طور چڑھ گئے تھے لیکن اب نیچے اُترنے کے خیال سے جی گھبرا رہا تھا۔ نیچے قدم قدم پر کھائیاں، پھسلن اور خار دار جھاڑیاں تھیں۔ ہمارے پاس رسّی تھی اور ہم نے یہی طے کیا تھا کہ اُوپر کسی درخت یا چٹان سے رسّی باندھ کے اس کے سہارے نیچے اُترتے رہیں گے، جہاں رسّی ختم ہو جائے گی، وہاں سے پھر اپنی آنکھوں اور پیروں سے کام لیں گے۔ نشیب کی ڈھلوان زمین کا حصہ اتنا بڑا نہیں تھا۔ رسّی کے آسرے ایک چوتھائی راستہ آسانی سے ضرور کٹ جاتا۔ باقی تین چوتھائی ہمیں خود طے کرنا پڑتا۔ اُس کے بعد زمین ہمارے قابو کی تھی۔ ہم چبوترے سے اُترا ہی چاہتے تھے کہ تجمل نے ہمیں روک دیا اور دیوار کے ساتھ چلتے ہوئے سامنے کے دروازے کی طرف جھانکنے لگا۔ بستی سے ہماری اچانک گمشدگی کو چار دن ہو گئے تھے۔ اُس سے پانچ چھ دن پہلے ہم نے راتوں کو مندروں کے علاقے میں آنے کا سلسلہ موقوف کر دیا تھا۔ سولم، مارٹی، زورا، پلٹو اور جینی کے بستی سے جانے کے بعد دن میں ہم ایک ہی مرتبہ اِدھر آئے تھے۔ اُس وقت عمارتوں پر بیٹھے ہوئے قبیلے کے آدمیوں کی تعداد کم تھی۔ ممکن ہے اُنھوں نے اُنھیں بالکل ہی ہٹا لیا ہو یا تعداد دوگنی کر دی ہو تو دس راتوں تک مسلسل یہاں ہمارے نہ آنے سے اُن کی جستجو میں کمی آ جانی چاہیے تھی۔ تجمل یہی دیکھنے گیا ہو گا کہ وہ اِدھر موجود ہیں یا نہیں۔ اگر قدیم مندر کی سیڑھیوں پر نہیں ہیں تو اور عمارتوں پر بھی نہیں ہوں گے۔ نہ ہونے کی صورت میں ہم نشیب کے پُرخطر راستے سے جانے کے بجائے مندروں کے علاقے کی ہموار زمینوں پر چلتے رہتے۔ ہمیں بستی واپس نہیں جانا تھا۔ آگے جا کے ایسے پہاڑ تھے جہاں اتنی ڈھلان نہیں تھی۔ ہم اُنھیں عبور کرتے ہوئے بستی سے بچتے ہوئے اپنی منزل پر پہنچ سکتے تھے۔ تجمل کو اس حقیقت کا احساس ہو گا کہ قدیم مندر کی سیڑھیوں پر قبیلے کے آدمیوں کا نہ ہونے کا مطلب دوسری تمام عمارتوں سے اُن کی دست برداری نہیں ہے۔ وہ راستے میں کسی اور جگہ بھی ہمیں مل سکتے تھے۔

تجمل لپکتا ہوا واپس آیا اور اُس نے اشاروں میں ہمیں بتایا کہ حسبِ سابق وہ موجود ہیں مگر چار سے زیادہ نہیں۔ ہم سمجھ گئے کہ اُس کا ارادہ کیا ہے۔ اُس کا مقصد تھا کہ کیوں نہ ہم عقبی راستے سے آگے بڑھیں جیسے پہلے یہاں آتے تھے۔ سب یہی چاہتے تھے مگر اُنھوں نے جلدی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ تجمل اباجان کا ہاتھ پکڑ کے عمارت کے پچھواڑے چلنے لگا تو سب اُس کے پیچھے پیچھے ہو گئے۔ سلطان کے اوسان ٹھکانے نہیں تھے۔ اُس کی گھٹی ہوئی چیخ سے جیسے ساری عمارت لرز اُٹھی۔ سلطان نے اپنی تیزی میں کسی چوکھٹ یا پتھر سے چوٹ کھائی تھی اور سامان سمیت چبوترے کے فرش پر لڑھک گیا تھا۔ یکایک عمارت میں بھاگم دوڑ مچنے لگی۔ وہ بیدار ہو گئے تھے اور ایک لمحے کی رعایت دیے بغیر مشعل اُٹھائے بھاگتے ہوئے اُس طرف آ رہے تھے۔ جدھر سے آواز آئی تھی۔ سامان وہیں چھوڑ کے اُسی لمحے ہم بھی ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے راہ داری

میں سمٹ گئے تھے۔ تجمل اور جامو، پیرو اور ہلاکو وسطی کمرے کی دوسری راہ داریوں کی طرف دوڑ پڑے۔ مشعل کی روشنی اور اُن کے جوتوں کی دھمک جیسے ہی راہ داری کے قریب آئی ہم چاروں کہیں اُوپر سے گرنے کے انداز میں باہر نکلے۔ ہماری طرف دو ہی آدمی تھے۔ ہم ایسی تیزی سے اُن پر جھپٹے تھے کہ اُنھیں ہمارا چہرہ دیکھنے کی بھی مہلت نہیں ملی۔ ایک کے ہاتھ سے مشعل چھوٹ کر فرش پر گر پڑی۔ صرف ایک بار اُن کی آواز اُبھری پھر وہ بے حس و حرکت ہو گئے۔ اُدھر سے جامو اور ہلاکو باقی دو کو کندھوں پر ڈالے ہوئے آ گئے تھے۔ جامو، سلطان اور ہلاکو نے اُنھیں نشیب میں پھینک دیا۔

قدیم مندر سے دُور تک راستہ صاف ملنے کا امکان تھا۔ اندھیرے اور دھند کی وجہ سے چلنے میں اگر دشواری پیش آ رہی تھی تو اُن کی پناہ بھی ہمیں حاصل تھی۔ جس راستے سے ہمیں پھر نیچے آنا تھا، وہاں تک درمیان میں اور بھی مندر پڑتے تھے۔ ہم پگ ڈنڈیاں بدلتے ہوئے اُن سے دُور دُور ہی رہے۔ سارا سامان چار آدمیوں نے اپنے کندھوں اور سروں پر اُٹھا رکھا تھا۔ اباجان اور ہم چار آدمیوں کے ہاتھ کھلے ہوئے تھے۔ کسی جانب سے اُن کی آہٹ ملنے پر ہم پوری طرح تیار تھے لیکن وہ سب غالباً عمارتوں کی چوکی داری تک ہی محدود تھے۔ راستے میں اور کہیں اُن سے ہماری مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔ بڑے مندر کے علاقے سے ہو کے اگر ہم آگے نکلتے تو فاصلہ اور کم ہو جاتا۔ وہ مرکزی جگہ تھی اور وہاں زیادہ آدمیوں کی موجودی کا اندیشہ تھا۔ اُس سے پہلے ہی ہم بستی کی مخالف سمت ایک نشیب میں اُتر گئے اور سامان ہم نے آپس میں بانٹ لیا۔ اباجان کے اصرار کے باوجود کسی نے اُنھیں بوجھ نہیں اُٹھانے دیا تھا۔ آگے درختوں کے درمیان ضرورت کے وقت ہم نے اُن کی چھوٹی بیٹری روشن کرنی شروع کر دی تھی۔ کئی گھنٹوں کی مسافت کے بعد ہمیں اطمینان ہوا کہ بستی بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ ہمارے قدم پھر اور تیز ہو گئے۔

یہ چوتھا دن اور پانچویں رات تھی۔ سولم، مارٹی، جینی، پلٹو اور زورا کو بستی سے گئے ہوئے آٹھ دن ہو چکے تھے۔ اب اُنھیں اپنی منزل پر پہنچ جانا چاہیے تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں پیرو کو چھوڑ کے ہم بستی میں داخل ہوئے تھے۔ اُن کے ساتھ صندوق بھی تھے اور دوسرا ضروری اسباب بھی۔ جانگ قبیلے کے قلیوں نے اُنھیں اپنی حدود سے باہر پہلی بستی میں پہنچا دیا ہو گا۔ وہاں سے وہ قلی بدل کے کچھ اور آگے قریب کی ایک اور بستی میں چلے گئے ہوں گے۔ وہاں سے اُنھوں نے پھر قلی بدلے ہوں گے اور ہندوستان کی سمت بڑھنے کے بجائے واپس جانگ قبیلے کی بستی کی طرف لوٹ گئے ہوں گے۔ اُسی جگہ پر جو جانگ قبیلے کی حدود کے پار بھی تھی اور اُس کے قریب بھی۔ متین میاں نے جہاں دم توڑا تھا۔ جب تک ہم نہ پہنچیں، کسی نہ کسی عذر سے اُنھیں اپنے ساتھ لائے ہوئے قلیوں کو روکے رکھنا تھا یا باقاعدہ اُن کے پاؤں کا سودا کر لینا تھا۔ دو بستیوں تک جانے اور قلی بدلنے سے مقصد صرف یہ تھا کہ جانگ قبیلے کے قلی اپنی بستی میں واپس جا کے اُن کے بارے میں آگے بڑھنے ہی کی اطلاع دیں۔ ہم نے حساب لگا کے سات دن مقرر کیے تھے۔ آج آٹھواں دن ختم ہو گیا تھا۔ اب اُنھیں پہنچ ہی جانا چاہیے تھا۔ پھر ہمیں وہاں ٹھیرنا نہیں تھا۔ اُنھیں لے کے چلتے ہی رہنا تھا۔

بستی کی حدود کا آخری پگوڈا آ چکا تھا جو جانگ قبائل کے علاقے میں داخل ہونے کے لیے ایک طرح سنگِ میل یا دروازے کا درجہ رکھتا تھا۔ پگوڈا ایک اُونچی پہاڑی پر واقع تھا اور اُس کی حیثیت محض علامتی تھی۔ جانگ قبیلے کی فضیلت کا نشان ہم اُس کے نیچے نیچے پہاڑیوں پر گزر رہے تھے کہ سلطان نے یک بارگی ہم سب سے ٹھیرنے کو کہا۔ اُس کا لہجہ بوکھلایا ہوا تھا۔ "کیا ہے رے؟" تجمل نے ناگواری سے پوچھا۔

"ذرا میرے سنگ آؤ۔"

"کدھر؟" تجمل نے سامان زمین پر رکھ دیا۔

"ذرا میری بات سنو۔"

"کیا بولنا چاہتا ہے؟"

"کچھ دیر کے لیے ٹھیر جاؤ۔ میں اُوپر پگوڈا تک جا کے آتا ہوں۔" سلطان کے لہجے میں عاجزی تھی۔

"اُدھر کیا ہے رے؟"

"اُدھر وہ ہے؟"

"وہ کون!" تجمل نے برہمی سے پوچھا۔

"وہی.... وہی" سلطان ہکلانے لگا۔

"صاف منہ کیوں نہیں پھاڑتا؟"

"میں نے آج رات اُس سے یہاں آنے کو کہا تھا، وہ پگوڈا کے پاس ہی کسی جگہ ہو گی۔ میں اُسے لے کے آتا ہوں۔"

تجمل نے اُس کے منہ پر زور سے طمانچہ مارا، سلطان گرتے گرتے بچا۔ "سیدھی طرح چل۔" تجمل درشتی سے بولا۔

"وہ اِدھر ہی ہو گی اُستاد!"

"ہونے دے۔" تجمل نے دہاڑ کے کہا۔

"وہ میرا انتظار کر رہی ہو گی۔" سلطان ہذیانی لہجے میں بولا۔

"کیا کرے! تو نے اُسے بولا تھا کہ ہم اِدھر سے آئیں گے؟" غصے سے تجمل کی آواز کانپنے لگی تھی۔

"ہاں بولا تھا۔"

تجمل اُس کا سر پکڑ کے جھٹکے دینے لگا۔ "چلتا ہے کہ نہیں۔"

"نہیں اُستاد! تجمل بھائی! نہیں۔"

"چلتا ہے کہ نہیں۔" تجمل نے اُس کے گال تھپڑا دیے۔

"نہیں اُستاد! تم کچھ اور مت سمجھو، وہ اپنی زبان سے ایک لفظ نہیں بولے گی۔ ایسا ہوا تو سلطانے تمھارے پیروں پر اپنا سَر کاٹ کے رکھ دے گا۔"

"اُدھر اپنے سر تیرے پیروں پر ہوں گے۔"

"ایسا نہیں ہوگا اُستاد!"

"اور ایسا ہو گیا تو!....." تجھل گرجنے لگا۔

"تو کیا ہوا۔ اتم میری خاطر اتنا بھی نہیں کرو گے۔"

"تیری خاطر..... تیری خاطر۔" تجھل ہانپتے ہوئے بولا۔ "تیری خاطر ہی بول رہا ہوں سور کے جنے۔ حرام کے تخم....."

"تم جو دل چاہے کہو۔ پر تم غلط سمجھ رہے ہو۔ تم کو اپنی اتنی فکر ہے تو مجھ کو اِدھر ہی چھوڑ دو۔ میں اُس کے بنا نہیں جاؤں گا۔"

"کتنی دیر تک نہیں جائے گا۔"

"جتنی دیر تک بھی۔"

"تُو اپنے آپے میں نہیں ہے سلطانے!" جامو بیچ میں بولا۔

"میں بالکل آپے میں ہوں اُستاد، ہوش میں نہیں ہے۔"

"اس کو بولو کہ اپنے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے۔" تجھل کی آواز سَرد پڑ گئی تھی۔ جامو اُس کے اور سلطان کے درمیان میں آ گیا۔

"وہ اِس بستی کی لڑکی ہے سلطانے اُستاد! ناگ کو ساتھ لے جائیں؟" ہلاکو نے دبی زبان میں کہا۔

"تم اس کے بارے میں ٹھیک نہیں سوچ رہے۔"

"وہ اِدھر نہیں آئی ہوگی۔" جامو نرم لہجے میں بولا۔ "اِس جاڑے اور اندھیرے میں لڑکی جات نے اکیلے کیسے سفر کیا ہوگا۔"

"نہیں آئی ہوگی تو ٹھیک ہے۔ میں بھی اِدھر ہی رہوں گا۔ تم لوگ آگے چلے جانا۔ سلطانے کی قسمت اُس کے ساتھ ہے۔"

"ہم تیرے بھلے کے لیے کہہ رہے ہیں۔" سارٹے آہستگی سے بولا۔

"میں اپنا بھلا تجھ سے اچھا جانتا ہوں۔"

"ہم تیرے دشمن نہیں ہیں سلطانے!"

"اور دوستی بھی نہیں کر رہے۔ میں اُس کو اُسی رات اُوپر مندر کی طرف بلا سکتا تھا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ہی تہہ خانے جاتی۔ پر سوچا، اُس کا اُدھر جانا ٹھیک نہیں ہے۔ پہلے کام ختم ہو جائے۔ سو میں نے اُس کو یہاں اتنی دُور آنے کو بولا تھا۔ وہ اِدھر تک آئے اور سلطانے چلا جائے۔ تم لوگ ساتھ نہیں دیتے تو سلطانے تم سے بھیک نہیں مانگتا۔"

"تو سمجھتا کیوں نہیں ہے؟" ہلاکو چیخنے لگا۔

"شور مت کرو۔"

"رہنے دے ہلاکو! اس کا ٹائم شاید آ ہی گیا ہے۔" تجھل دھیمے لہجے میں بولا۔

"میرا نہیں، اُس کا بھی۔"

تجھل نے اُس کا گریبان کھینچ لیا۔

"سلطانے کی بات مان لو تجھل بھائی!" ابا جان کی موجودی کے باوجود میں نے اُس سے عاجزی سے کہا۔

"لاڈلے!" اُس نے مجھے جھڑک دیا۔

"پیرو، سلطان کو سمجھانے لگا۔ ابا جان گُم سُم کھڑے سب کچھ سُن رہے تھے سلطان جھٹ اُن کے پیروں پہ گر گیا۔ "بڑے صاحب! آپ ہی اِن لوگوں سے کچھ بولو۔ میں اُس کے بنا نہیں جاؤں گا۔"

ابا جان نے تجھل کی طرف سَر اُٹھا کے دیکھا۔ جواب میں تجھل نے سلطان کے کولھے پر ٹھوکر مار کے اُسے ابا جان کے پیروں سے جُدا کر دیا۔ سلطان لڑھکتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

جامو نے اُسے پھر بازو سے پکڑ لیا۔ "کدھر ہے وہ؟" وہ تلخی سے بولا۔

"اُوپر ہی کسی جگہ ہو گی۔ شاید اُس نے اپنی آوازیں سُن لی ہوں۔" سلطان نے مضطرب لہجے میں کہا۔

تجھل سے پوچھے بغیر جامو اُسے دھکے دیتا ہوا سامنے بگوڑا کی پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ انھیں گئے ہوئے دیر ہو گئی۔ اُن کے جانے کے بعد کسی نے منہ سے ایک لفظ نہیں نکالا تھا۔ سب چپ وہیں بیٹھے رہے۔ پیرو تجھل کے پاس بیٹھا اُس کا زانو دبا رہا تھا۔

خاصی دیر بعد اُوپر سے چاپیں اُبھریں تو تجھل کے سوا سبھی دیکھنے لگے۔ وہ سلطان اور جامو ہی تھے اور اُن کے ساتھ وہ بھی تھی، سکڑی سمٹی ہوئی تشانم۔ اُس کا سَر اپا کانپ رہا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے میں اُس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ سلطان نے اُترتے ہی اُسے تجھل کے آگے کر دیا۔ لمحوں بعد پیرو کے ٹوکنے پر تجھل کے جسم میں جنبش ہوئی۔ وہ اُس کا شانہ تھپ تھپاتے ہوئے ایک طرف نکل گیا۔

ہم بڑھتے رہے۔

سویرا ہوتے ہوتے ہم آخری فاصلہ طے کر رہے تھے۔ دُور ہی سے اُونچائی پر دھند میں لپٹے ہوئے اُن کے ہیولے ہمیں نظر آنے لگے تھے اور وہ زورا، سُولم، مارٹی، جینی اور پلٹو کے سوا کوئی نہیں تھے۔ انھوں نے بھی ہمیں دیکھ لیا تھا اور ناچنے اُچھلنے لگے تھے۔ انھیں پڑاؤ کیے ہوئے ایک دن ہی ہوا تھا۔ تین قلیوں کو انھوں نے کسی طرح روکے رکھا تھا جن کے ساتھ پاک تھے۔ ہمیں آتا دیکھ کے انھیں قلیوں کے سامنے ناچنا، اُچھلنا اور شور نہیں مچانا چاہیے تھا۔ ہم وہاں اتنی ہی دیر ٹھیرے جتنی دیر اپنے ساتھ لایا ہوا سامان صندوقوں میں منتقل کر سکتے تھے۔ دھوپ ابھی پھیلی نہیں تھی کہ ہم نے سفر شروع کر دیا تھا۔ قلی ہماری رہبری کر رہے تھے۔ دو دن گزر گئے۔ قلیوں کے انکار کے باوجود ہم نے انھیں نہیں

چھوڑا تھا۔ تیسرے دن رات بھر کے پڑاؤ کے بعد صبح صبح اپنے خیمے اور دوسرا اسباب سمیٹ کے ہم نے ایک منزل سَر کی ہو گی کہ ایک سرسبز وادی میں آ گئے۔ وادی کے چاروں طرف پہاڑوں کی ایک فصیل تھی۔ وہ جگہ اتنی خوب صورت تھی کہ وہاں سے آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ مارٹی کی فرمائش پر قلی گانا گانے لگے تھے۔ ہم ایک تنگ گھاٹی سے گزر رہے تھے کہ یکایک جامو کے پہلو سے نکلتا ہوا ایک تیر زمین پر آ کے لگا۔ چشم زدن میں ہم یاکوں کی آڑ میں ہو گئے۔ اُوپر پہاڑوں پر ہر طرف آدمی موجود تھے اور وادی اُن کی صداؤں سے گونج رہی تھی۔ دوسرے ہی لمحے تجھل کھڑا ہو گیا۔

یاکوں کی آڑ میں ہوتے ہی ہم نے تمنچے نکال لیے تھے اور جن کے کاندھوں پر بندوقیں لٹک رہی تھیں، انھوں نے چشم زدن میں انھیں اُتار کے اپنے ہاتھوں پر اُٹھا لیا تھا مگر وہ کسی ایک جانب نہیں تھے۔ وادی کے اُوپر پہاڑوں کی اُونچی نیچی دیواروں پر تقریباً ہر جگہ وہ موجود تھے۔ اُن کی تعداد سو سوا سو کے قریب ہو گی۔ تجھل کے کھڑے ہو جانے کے باوجود کوئی تیر نہیں چلا۔ چند لمحوں تک ہم نے انتظار کیا پھر یاکوں کی غیر محفوظ اوٹ سے نکل کے اُن کے سامنے ہو گئے۔ اُن کی آوازیں ایک دم بند ہو گئی تھیں لیکن اُن کی کمانیں کھنچی ہوئی تھیں۔ اُن میں سے کئی کے ہاتھ میں نیزے تھے۔ فاصلہ زیادہ تھا اور ہم اُن کی شکلیں واضح طور پر نہیں دیکھ سکتے تھے۔ تجھل نے فوراً ہاتھ اُٹھا کے ہمیں بندوق نہ چلانے کا اشارہ کیا اور تیزی سے بولا۔ "جانے پہچانے دیکھتے ہیں۔"

سب کی نظریں سلطان اور تشانم پر آ کے رُک گئیں۔ "براتی ہیں اُستاد! اپنے سلطانے شاہ کو بدھائی دینے آئے ہیں۔" جامو نے زہر خند سے کہا۔ "سمدھیانے کو نہیں پہچانتے۔"

"نہیں، نہیں۔" سلطان نے تشانم کو کھینچ کے اپنے بازو سے چپکا لیا۔ "اِس نے انھیں نہیں بتایا۔ یہ نہیں بتا سکتی۔" وہ ہذیانی انداز میں بولا۔ "اسے کچھ نہیں معلوم تھا۔ ماں قسم....." تجھل کو گھورتے دیکھ کر اُس کی آواز لڑکھڑا گئی۔

"سُن رہے ہو اُستاد!"

"جامو!" تجھل نے درشتی سے کہا۔ "کھینچ کے رکھ۔"

"وہ نیچے اُتر رہے ہیں۔" اچانک ہلاکو بھینچی ہوئی آواز میں بولا۔ تجھل نے بھی دیکھ لیا تھا۔ نیزے اور کمانیں تانے ہوئے وہ چند قدم اور آگے آ گئے تھے۔ ہمارے لیے فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ایک کوشش کی جا سکتی تھی کہ اِدھر اُدھر جھپٹ کے ہم اِرد گرد کی چٹانوں، جھاڑیوں یا درختوں کی آڑ لے لیں، اس طرح نشانہ لینے میں کچھ آسانی ہو جاتی مگر اُن کی آنکھوں میں دھول جھونک کر بھی ایسا

کرنا ممکن تھا۔ شاید سب نے جان لیا تھا کہ اب کوئی اور کوشش بے سود ہے۔ سو ہم پوری طرح تیار تھے۔ اتنے فاصلے پر تمنچوں اور بندوقوں کے صحیح نشانوں کا کسی کو بھی یقین نہیں تھا۔ انھیں آگے آنا چاہیے تھا اور ہمیں اُس وقت تک کوئی گولی ضائع نہیں کرنی چاہیے تھی جب تک وہ خود پہل نہ کریں۔ پہل کرنے کی صورت میں ہمارے پاس اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ہم فاصلہ اور نشانے کی پروا کیے بغیر فیر کرنا شروع کر دیں اور جس کو قریب جو جگہ ملے وہ وہیں چھُپ جائے۔ اُن کی تعداد دس گُنی کے لگ بھگ ہو گی۔ یقیناً وہ قبائلی قزاق نہیں تھے جو پہاڑوں پر قافلوں کی تاک میں رہتے ہیں۔ وہ ہوتے تو اتنا انتظار نہ کرتے، نہ ایک تیر چلا کے دوسرا چلانے میں دیر کرتے۔ یہی کہ یہ تعین کرنے کی جستجو تھی کہ وہ کون لوگ ہیں اور کیوں اس طرح چاروں سمت سے ہماری طرف بڑھ رہے ہیں۔

دردِ تمگ بستی کے نزدیک جہاں سُولم، مارٹی، جینی، پلٹو اور زورا نے ہم سے پہلے پہنچ کے پڑاؤ کیا تھا، وہاں سے ہمیں چلے ہوئے دو دن ہو گئے تھے۔ انھی کے روکے ہوئے قلی ہمارے ساتھ تھے۔ جہاں تک بن پڑا، شام کو اندھیرا گھرا ہونے کے بعد بھی ہم نے اپنا سفر جاری رکھا۔ رات کو چلنا مشکل تھا ورنہ ہم کسی جگہ نہ ٹھیرتے۔ سب کا مقصد یہی تھا کہ جلد سے جلد دردِ تمگ بستی سے دُور ہو جائیں۔ راستے میں کسی قافلے سے ہماری مڈبھیڑ نہیں ہوئی تھی اور نہ ہم نے اپنے تعاقب کی کوئی آہٹ محسوس کی تھی۔ قلی بھی پرانے نہیں تھے۔ دردِ تمگ بستی سے نکل کے سُولم نے آگے دو منزلوں پہ انھیں تبدیل کیا تھا اور اُس کے کہنے کے مطابق کسی جگہ انھیں مشکوک نگاہوں سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ سولم، مارٹی، جینی، پلٹو کو سفر کے لیے ضروری اسباب سمیت ہم نے دس دن پہلے رخصت کیا تھا۔ اُن کے جانے کے تین دن بعد باقی ہم سب بستی سے اچانک غائب ہو گئے تھے۔ ہو سکتا ہے انھوں نے ہمارے پیچھے اِدھر اُدھر اپنے آدمی دوڑائے ہوں لیکن ہم بستی سے کہیں اور گئے ہی نہیں تھے جو انھیں مل جاتے۔ ہم بستی میں چند میل اُوپر ہی مندروں کے علاقے میں واقع قدیم مندر کے تہہ خانے میں مسلسل چار دن تک چھپے رہے تھے۔ تہہ خانے سے دوبارہ برآمد ہوتے وقت ہر سُو گہرا اندھیرا مسلط تھا۔ مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے آدمیوں کو ہماری سُن گُن مل گئی تھی مگر وہ کسی کو کچھ بتانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ دوسرے روز انھیں اُن کے اکڑے ہوئے جسم ہی ملے ہوں گے۔

گویا بستی کے لوگوں کی نظر میں ہمیں وہاں سے چلے ہوئے سات دن ہو گئے تھے۔ یہ عرصہ ہمارے دُور نکل جانے کے لیے کافی تھا۔ اب انھیں ہماری اُمید ترک کر دینی چاہیے تھی لیکن وہ

پھر ہمارے سامنے موجود تھے۔ وہ نہیں تھے تو پھر اور کون لوگ تھے۔ اگر تشانم نے اپنے باپ چن وسا کو بتا دیا تھا کہ سلطان نے چار دن بعد اس سے بستی کی سرحدوں پر مقدس پگوڈا کے علاقے میں ملنے کو کہا ہے تو انھوں نے مزید دو دن کیوں توقف کیا۔ جہاں تشانم ہمیں ملی تھی، وہیں وہ ہمارے راستے کی دیوار کیوں نہ بن گئے۔ اور انھوں نے تشانم کو ہمارے ہاتھوں میں کیوں جانے دیا۔ سولم، مارٹی وغیرہ کے دوبارہ ہمارے ساتھ شامل ہو جانے کے بعد انھیں پھر کس کا انتظار تھا۔ بستی کے قریب ہی انھوں نے ہمارے اطراف اس طرح اپنے آدمی کیوں نہیں کھڑے کر دیے۔ جامو کی طرح سبھی کو انھیں دیکھ کے فوراً ہی گمان ہوا تھا کہ تشانم نے انھیں ہماری خبر دی ہو گی لیکن جلد ہی سب کو احساس ہو گیا کہ یہ محض بدگمانی ہے، ایک بے جواز شبہ ہے۔ تشانم دو دن سے ہمارے ساتھ سفر کر رہی تھی۔ سب اُس کی باتیں، اُس کا چہرہ جیسے بھول گئے تھے۔ اُس کے چہرے پر پھولوں کی سی معصومیت اور اُس کی باتوں میں بچوں کی سی سادگی تھی۔ جب کوئی اُس کے سامنے سلطان کا نام لے کے چھیڑتا تو وہ بُری طرح شرما جاتی۔ دو دن سے سبھی اُسے چھیڑتے رہے تھے۔ جب اُس نے پہلی بار ہمارے سامنے اپنی ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں بات کی تو سب کو حیرت ہوئی حالانکہ سبھی کو معلوم تھا کہ وہ سلطان سے اسی زبان میں بات کرتی ہو گی۔ کورا کو بھی ایسی ہی ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی آتی تھی۔ کورا کے مانند سوچ سوچ کے کوشش کر کر کے بولنا، پلکیں پٹ پٹانا، کوئی لفظ سمجھ میں نہ آنے پر گھبرانا، بے چارگی سے مسکرانا اور شرمانا۔ اباجان کو بھی اُسے دیکھ کے کورا کی یاد آئی ہو گی۔ سلطان نے اُسے اشارہ کیا ہو گا جبھی وہ زیادہ تر اباجان کے ساتھ رہتی تھی، اُن کے پہلو بہ پہلو۔ دو دن سے وہی ہمارے لیے شکار کیے ہوئے گوشت کا کھانا پکا رہی تھی۔ تشانم اپنے گھر سے ہمیشہ کے لیے وداع ہو کے آئی تھی جیسے کورا ایک رات ہمارے گھر آئی تھی۔ اباجان نے نہیں سمجھا کہ وہ واپس جانے کے لیے نہیں آئی، وہ تو اُن کی بیٹی بننے کے لیے آئی ہے۔ وہ اُس کے سر پہ ہاتھ رکھ دیتے تو وہ اُن کی اپنی بیٹیوں سے زیادہ اُن کی خدمت کرتی۔

کمانوں اور نیزوں سے مسلح اِن لوگوں کو کسی اور ذریعے سے خبر ہوئی تھی۔ سولم کے ساتھ آنے والے قلیوں کو ہماری منزل کا پتہ نہیں تھا کیونکہ بِجّل کی ہدایت کے مطابق دوسری منزل پر انھیں بدلتے ہوئے سولم نے اُن سے ہندوستان کی طرف جانے کے لیے طے کیا تھا لیکن کچھ دُور آ کے اُس نے انھیں جانگ قبیلے کی طرف چلنے کا حکم دے دیا۔ سفر کی اس اچانک تبدیلی سے یہی مراد تھی کہ قلی چلتے وقت اپنی بستی کے لوگوں کو سولم کی منزل کی غلط نشان دہی کر کے آئیں۔ بس ایک ہی بات ممکن تھی کہ بڑے مندر کے تہہ خانے سے ہمارے نکلنے کے دوسرے دن جب انھیں وہاں موجود پہرے دار نظر نہیں آئے ہوں گے تو انھوں نے اُن کی تلاش کی ہو گی اور بڑے مندر کے نشیب میں اُن کی لاشیں پڑی ہوئی مل گئی ہوں گی۔ لاشیں بول نہیں سکتی تھیں لیکن اُن کی ناگفتنی صاف غمازی کرتی ہو گی کہ ہم گزشتہ رات یہاں موجود تھے۔ ہمارے سوا اُن کی موت کا کوئی اور سبب نہیں ہو سکتا چنانچہ انھوں نے ہمارا پیچھا کرنے کے بجائے سیدھے ہندوستان کے راستے کی سمت کوچ کیا۔ وہ پہاڑوں کے درمیان راستے ہم سے بہتر جانتے تھے اور گھوم کے ہم سے پہلے ہماری منزل پر پہنچ سکتے تھے۔

بِجّل نے کسی کو کوئی ہدایت نہیں دی تھی لیکن ہم سب نے خود ہی اپنی اپنی جگہیں متعین کر لی تھیں۔ اگر وہ وادی کے اطراف پہاڑوں پر ایک دائرے کی صورت میں بڑھتے ہوئے ہمارے گرد گھیرا تنگ کر رہے تھے تو ہمارے تمنچوں اور بندوقوں کا رُخ بھی اُنھی کی جانب تھا۔ پیرو کا رُخ کسی اور سمت تھا تو زولا کا کسی اور سمت۔ ہر ایک کی نگاہ اُوپر اُٹھی ہوئی تھی اور سب نے غیر ارادی طور پر سمتیں اپنی اپنی نگاہوں کے حصّے میں تقسیم کر لی تھیں۔ اباجان، تشانم اور قلی درمیان میں تھے اور اُن میں سے کسی کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ بِجّل نے بھی اپنے کندھے پر لٹکی ہوئی بندوق ابھی تک نہیں اُتاری تھی اور نہ اپنا تمنچہ جیب سے باہر نکالا تھا۔ وادی کے نشیب کی زمین مسطح نہیں تھی۔ درمیان میں ایک تیز ندی گزرتی تھی جس کے کناروں کی زمین کہیں کہیں اتنی اُوپر اُٹھی ہوئی تھی کہ ایک گھاٹی سی بن جاتی تھی۔ ہم نے فاصلہ کم کرنے کی غرض سے ندی کے کنارے کنارے چلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ منظر بھی بہت دل کش تھا۔ دھوپ نکل رہی تھی اور ندی کا چاندی جیسا پانی شور مچا رہا تھا۔ اِسی شور کے سبب ہمیں اپنے پیچھے اُن کی نقل و حرکت کا پتہ نہیں چلا۔ ہمارے وادی میں اُترنے سے پہلے وہ اُوپر کسی ایک سمت چھپے ہوئے تھے۔ جیسے ہی ہم نے وادی میں اُترنا شروع کیا، وہ اطراف کے پہاڑوں پر پھیلتے گئے اور انھوں نے اُس وقت پہلا تیر پھینکا اور صدائیں بلند کر کے ہمیں اپنی جانب متوجہ کیا جب ہم وادی کے مین بیچوں بیچ پہنچ گئے۔ خصوصاً اُس مقام پر جہاں نشیب گہرا تھا اور ہمارے فرار کا امکان اور مقاموں کی نسبت کم ہو جاتا تھا۔ وہ ایک گھاٹی کی شکل کا راستہ تھا مگر ندی کے دونوں طرف اُٹھی ہوئی زمین ڈھلوان تھی۔ اِسی ڈھلوان کی وجہ سے ہم اُوپر چاروں طرف دیکھنے پر قادر تھے اور وہ ہمیں دیکھ سکتے تھے۔

وادی میں کسی جگہ ندی کے دونوں کناروں پر اُٹھی ہوئی زمین عمودی ہوتی تو یہاں کے بجائے وہ اُسی جگہ کا انتخاب کرتے مگر ایسا کوئی مقام وادی میں شاید کہیں نہیں تھا۔ نشیب کا یہ گھاٹی نما حصّہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ انھیں ذرا سی دیر ہو جاتی تو ہم آگے نکل چکے ہوتے۔ سب کو چند لمحوں اور چند جستوں کے اِسی ایک موقع کی تلاش تھی۔

سب بتوں کے مانند گُنگ کھڑے بِجّل کی طرف سے کسی اشارے کے منتظر تھے۔ بِجّل تبھی کوئی اشارہ کرتا جب اُسے کسی لمحے کوئی رعایت یا گنجائش نظر آتی۔ ہمارے کسی بھی غلط فیصلے کی تلافی ممکن نہیں تھی۔ بِجّل سر اُٹھائے گھوم گھوم کے انھیں دیکھتا رہا۔

یکایک ماسٹر مارٹی کی گھٹی ہوئی چیخ پر سب اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ مارٹی اباجان کو روک رہا تھا جو ہم سے کچھ کہے بغیر اچانک درمیان سے نکل کے قریب کے ایک ٹیلے کی طرف بڑھ گئے تھے۔ اُن کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اباجان کا یہ اقدام اتنا غیر متوقع اور ناقابلِ فہم تھا کہ سب ایک لمحے کے لیے جیسے اپنے حواس کھو بیٹھے۔ جامو، سلطان اور میں نے انھیں روکنے کے لیے بیک وقت بھاگنے کا ارادہ کیا مگر بِجّل کی آواز نے ہمارے قدم جامد کر دیے۔ اباجان کی رفتار میں تیزی نہیں تھی۔ ہم سے کچھ دُور ایک ٹیلے پر پہنچ کے وہ ٹھہر گئے۔ میرا دم آنکھوں میں اٹکا ہوا تھا۔ اُوپر جا کے انھوں نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر لیے اور پہاڑوں سے اُترتے ہوئے لوگوں سے اشاروں اشاروں میں کچھ کہنا چاہا اور ہمیں یہ جان کے حیرت ہوئی کہ اُن کے اشاروں کے جواب میں وہ لوگ رُک گئے ہیں۔ جب انھوں نے اپنے سر جھکا کے اباجان کو تعظیم دی تو ہم سب کی سمجھ میں آیا کہ اباجان نے یوں آگے بڑھ جانے کی جرأت کس اعتبار میں کی ہے۔ وہ بھکشوؤں کے لباس میں تھے۔ اپنے مخصوص حلیے کے سبب دُور ہی سے وہ ہم میں سب سے الگ نظر آتے تھے۔ کھڑے کھڑے میں ہانپنے لگا تھا۔ جامو نے میرا بازو پکڑ لیا۔ "لاڈلے!" وہ آہستگی سے بولا۔ "نظر کو کسی ہی رکھنا۔"

"جامو بھائی!" میری آواز حلق میں گھُٹ کے رہ گئی۔

"لاڈلے جانی!" اُس نے میرے بازو میں اپنی انگلیاں گڑو دیں۔ "کبھی تُو نے یہ نہیں پوچھا کہ تیرے جامو بھائی نے کیسی کاٹی ہے؟"

میں نے پلٹ کے اُسے دیکھا۔ جامو اپنی آنکھیں چھپانے لگا۔ اُس کے ہونٹوں پر لرزتی ہوئی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ میرا جی چاہا کہ اُس کے گلے سے لپٹ جاؤں۔ جامو نے کوہنا مار کے مجھے چونکایا اور سامنے دیکھتے رہنے کی تلقین کی۔

اباجان کے ہاتھ ابھی تک اُٹھے ہوئے تھے۔ تمنچے کے کھٹکے پر میری اُنگلی جمی ہوئی تھی اور میری نگاہوں نے اُن کے گرد ایک ہالہ سا بنا رکھا تھا۔ اِدھر وہ لوگ ٹھیرے، اُدھر سلطان نے لکنتے ہوئے لہجے میں بِجّل کو مخاطب کیا۔ "اُستاد! یہ تشانم بولتی ہے، اِدھر آگ لگانے کا مطلب سفید جھنڈی ہے۔"

"ہتھیار بڑھا لو۔" بِجّل نے بوجھل آواز میں کہا۔ "سلطانے! تُو آگ لگا دے۔" یہ کہہ کے وہ نپے تلے قدموں سے اباجان کے پاس اُوپر ٹیلے پر چڑھ گیا۔ باقی سب لوگ نیچے ہی رہے۔ سلطان نے قلیوں اور تشانم کی مدد سے ایک مشعل میں آگ لگا دی۔ دھوپ میں اُس کے شعلے مرجھا رہے تھے تاہم اُوپر والوں نے اُسے دیکھ لیا ہو گا۔ صرف مشعل جلانے پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ آڑے وقت کے لیے یاکوں پر خشک لکڑیوں کا جو ڈھیر بندھا رہتا تھا، اُسے اُتار کے اُس میں بھی آگ بھڑکا دی گئی۔ اس طرح اُوپر سے گھیر کے آنے والوں کو ہماری طرف سے یہ پیغام منتقل کر دیا گیا کہ ہم مزاحمت کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ سب نے بِجّل کی ہدایت پر ہتھیار نیچے کر لیے تھے۔ جاتے جاتے وہ اشارہ کرتا گیا تھا کہ سامان نیچے چھوڑ کے ہم سب اُوپر آنے کی کوشش کریں۔ جس موقع کے ہم دیر سے منتظر تھے، اُس کی اُمید بندھ چلی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اباجان کی اپیل پر نظرِ ثانی کرتے یا رائے بدل دیتے، ہم نے ایک دوسرے کو نگاہوں سے ٹھوکے مارے۔ آگ جلانے کے بعد ہم نے چند ثانیوں کی تاخیر کی ہو گی کہ ایک ساتھ سب اِدھر اُدھر منتشر ہوتے ہوئے ٹیلے پر چڑھ گئے۔ ہم نے رفتار میں کسی عجلت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ یہاں ہم زیادہ بہتر طریقے سے انھیں دیکھ سکتے اور زیادہ محفوظ انداز میں اپنا دفاع کر سکتے تھے۔ یہاں جگہ خاصی کشادہ تھی۔ پتھریلی چٹانوں میں آڑ لینے کے لیے کئی گوشے موجود تھے۔ ہم نے دوبارہ اپنے ہتھیار اُوپر نہیں کیے۔ "ابھی ان کو اور نیچے آ جانا تھا بڑے صاحب!" بِجّل شکایتی لہجے میں اباجان سے بولا۔

"اُن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔" اباجان نے مایوسی سے کہا۔

"پر اُن کا ابھی اور نیچے آنا ٹھیک تھا۔"

"میرا خیال ہے ہمیں اُن سے بات کر کے دیکھنی چاہیے۔"

"وہ جو بولیں گے، وہ آپ بھی جانتے ہو بڑے صاحب!"

"لیکن ہمارے پاس اُن کی بات سننے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔"

"ہاں بڑے صاحب!" بِجّل نے گہری سانس لے کے کہا۔ "شاید اپنے کو بھی بعد میں یہی کرنا پڑتا۔ نا، پہ ذرا پہلے اُن کو نزدیک سے دیکھ لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔"

"اُن کے پاس کثیر تعداد میں ہتھیار ہیں اور ہماری نسبت وہ زیادہ بہتر جگہ پر ہیں۔ ایسی صورت میں ہمیں کوئی خطرہ مول نہیں لینا

چاہیے۔ صورتِ حال سمجھ لینی چاہیے۔" اباجان نے تذبذب سے کہا۔

"آپ اِدھر آرام سے بیٹھے رہو، ابھی ہم لوگ اُدھر جاکے اُن سے بات کرتے ہیں۔" تجمل نے سولم، پیرو اور مجھ سے آگے بڑھنے کے لیے کہا۔

"نہیں!" اباجان تندی سے بولے۔ "اگر میری رائے آپ لوگوں کی نظر میں کوئی حیثیت رکھتی ہے تو میں آپ کو اُن کے پاس جانے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ میں خود جاکے بات کرتا ہوں۔ آپ سے زیادہ یہ سب کچھ دیکھنے کا صدمہ مجھے ہوگا لیکن اِس کا امکان ہر وقت موجود تھا۔ ہماری ذرا سی بے احتیاطی ہمارے لیے نقصان دہ ہوسکتی ہے۔ دو میں سے ایک بات کا فیصلہ ہمیں ابھی کرلینا چاہیے کہ ہم زیادہ قیمتی ہیں یا ہمارا مال و اسباب۔"

"آپ کیا بول رہے ہو بڑے صاحب!" تجمل نے بے چینی سے کہا۔

"میں درست ہی کہہ رہا ہوں۔ میری رائے میں کسی قسم کی الجھن میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ سامنے ہمارے لیے اندیشے زیادہ تحفظات کم ہیں۔ سب کچھ اُن کے حوالے کرنے کے لیے ذہن آمادہ کرلیجیے۔ اِس آمادگی کے سوا کوئی اور تدبیر ہو تو مجھے بتائیے۔"

"آپ جو سوچ رہے ہو، صرف اتنا نہیں ہے۔"

"پھر کیا ہے؟"

"وہ نہیں جانتے کہ اپنے پاس کیسا سامان ہے۔ اُن کو اُس کا ابھی کچھ پتہ نہیں ہے۔ وہ تو ہم کو لینے آئے ہیں۔"

"لیکن ہمارے پاس اور کیا ہے۔ یہ سب اُن کے اطمینان کے لیے کافی ہوگا۔" اباجان نے بھاری لہجے میں کہا۔

"بہت تھوڑا ہے بڑے صاحب! اتنے سے اُن کا بھلا نہیں ہوگا۔ ہم نے اُدھر جاکے اُن سے بولا تھا کہ ہم اُن کے کھوئے ہوئے کاغذ واپس لانے کا جتن کریں گے۔ اُن کو یہ بولے بغیر ہم روز اُدھر اُوپر نیچے آجا نہیں سکتے تھے۔ مجھ کو یاد پڑتا ہے، میں نے پہلی بار آپ کو سب بول دیا تھا۔ اِن پتھروں کی نہیں، اُن کو کاغذ کی ضرورت ہے۔"

"لیکن کاغذات ہمارے پاس نہیں ہیں۔ مجھے یاد ہے آپ نے مجھ سے یہ کہا تھا مگر آپ نے بقول آپ کے کوئی حتمی وعدہ نہیں کیا تھا۔ بہتر ہے اُنھیں ہمارے سامان کی تلاشی لینے دیجیے۔"

"وہ ہم کو واپس لینے نہیں آئے ہیں۔ ہم نے اُن سے پورا وعدہ نہیں کیا تھا۔ پر نو سال تک کسی نے اِدھر آکے اُن سے ایسا بولا تھا؟ نو سال سے وہ سارے ہندوستان میں سر مارتے رہے ہیں۔ سمجھنے کی کوشش کرو بڑے صاحب!"

"میں سمجھ رہا ہوں لیکن کاغذ یہاں نہیں ہیں۔"

"یہ بات آپ مجھ سے بول رہے ہو، اُن کو کیسے بولا جائے؟"

"آپ اُن سے کہہ دیجیے کہ ہمارا وعدہ ابھی تک قائم ہے۔ ہم کاغذات اُنھیں واپس کردیں گے۔ اگر اُنھیں حاصل کرنا مقصود ہے تو ہماری بات کا یقین کرنا ہوگا۔"

"آپ اُن کو اپنے ساتھ لے چلو گے؟"

"جی!" اباجان ہچکچا کے بولے۔

"میں بولتا ہوں، وعدہ پورا کرنے کے لیے آپ اُن کو اپنے ساتھ لے چلو گے؟ وہ ایسا بولیں تو آپ کیا جواب دو گے؟"

"نہیں۔ میں ایسا نہیں چاہوں گا۔"

"بڑے صاحب!" تجمل نے نرم لہجے میں کہا۔ "آپ نے ان کو روک دیا ہے۔ ابھی آپ اِدھر ٹھیرو۔ ہم جاکے اُن کو دیکھتے ہیں۔ آپ سے وہ کچھ بولیں تو ہم سے آپ اپنے کو الگ بولنا۔"

"آپ سمجھتے ہیں کہ یہ آپ کے لیے سودمند ہے تو بہتر ہے، میں اُن سے یہی اظہار کروں گا لیکن آپ خود اُوپر جاکے اُن سے کیا بات کریں گے؟"

"ابھی اُدھر جاکے دیکھتے ہیں بڑے صاحب!"

"میں سمجھتا ہوں، میری بات شاید وہ مان جائیں۔"

"پر آپ ایسی بات ہی کیوں بولو جس کے نہ ماننے سے آپ کا بھرم بھی جاتا رہے۔"

"ہمیں احساس ہونا چاہیے کہ ہم سخت خطرے میں ہیں۔"

"اپن لوگ سب خطرے کی گھڑی میں جنم لیے تھے۔" پیرو آگے آکے تیزی سے بولا۔ "یہ اپن کے راجا کے بارے آپ ٹھیک جانتے ہو گے بابا!" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرانے لگا۔ "پر اپن کو ایک دم یقین ہے، راجا بھی ایسی گھڑی میں اِدھر آیا ہوگا۔ آپ بالکل ٹھکانے سے بیٹھو۔ اپن نے آپ سے بولا تھا، بولا تھا کہ اُودر سے سارا حساب چکتا کرکے آیا ہے۔"

"مگر، مگر...." اباجان نے آنکھیں بند کرلیں۔

"بڑے صاحب! آپ اِدھر ہمارے ساتھ ہی رہو۔" جامو نے لجاجت سے کہا۔

"درست ہے، درست ہے۔" اباجان اُکھڑی ہوئی سانسوں سے بولے۔

دیر ہو رہی تھی۔ وہ دُور کھڑے ہم لوگوں کو آپس میں باتیں کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے لیکن ہماری آواز اُن تک نہیں پہنچ رہی ہوگی۔ ہماری جانب سے وہ جلد از جلد کسی اِقدام کے منتظر ہوں گے۔ تجمل نے اباجان کی طرح چاروں طرف گھومتے ہوئے اپنے

ہاتھ اُٹھادیے۔ سولم، پیرو اور میں نے اُس کی تقلید کی۔ کچھ توقف کے بعد ایک طرف سے جواب میں ہاتھ بلند کیے گئے۔ تجمل نے پھر دیر نہیں کی۔ باقی لوگوں کو وہیں ٹھیرے رہنے کی تاکید کرکے وہ اُوپر پگ ڈنڈی پر چلنے لگا۔ جس جانب سے جواب آیا تھا، وہاں سے چند آدمی بھی ہماری طرف بڑھنے لگے۔ راستے میں تجمل نے ہم سے کوئی بات نہیں کی۔ ہم تیز تیز قدموں سے درمیان کا فاصلہ کم کرتے رہے۔ کبھی سامنے درختوں اور چٹانوں کی وجہ سے کہیں کہیں وہ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوجاتے تھے۔ ہم نے ہتھیار ہاتھوں میں نہیں اُٹھائے تھے۔ آدھ گھنٹے کے وقفے میں ہم اُن تک پہنچ گئے تھے۔ اُن میں سے آگے آنے والے آدمی اپنے پیچھے رہ جانے والوں سے اتنی دُور نہیں آئے تھے جتنے ہم اپنے لوگوں سے دُور ہوگئے تھے۔ جو لوگ سامنے آئے تھے، وہ جانگ نیلے ہی کے آدمی تھے۔ گنتی میں چھ، عمروں میں مختلف، زور میں یکساں۔ اُنھوں نے کسا ہوا لباس پہن رکھا تھا اور اُن کے چہروں پر سفر کی تھکن کے آثار نہیں تھے بلکہ تازگی کھلی ہوئی تھی، پوری طرح چاق و چوبند اور مستعد۔ ایک تبتی سپاہی کے پاس میدانِ جنگ میں جتنے ہتھیار ہوسکتے ہیں، اُن کے جسم اُن سب سے مزین تھے۔ ایک ادھیڑ عمر کا نسبتاً بلند اور تن درست و توانا شخص اُن میں سب سے نمایاں تھا اور ہمارا صورت آشنا تھا۔ اُس کی کمر سے ایک تلوار بھی لٹک رہی تھی۔ ہم نے اُسے قبیلے کے سردار کے خاص کمرے میں کئی بار دیکھا تھا۔ دوسرے آدمیوں کے ملنے اور دیکھنے کا اتفاق ہمیں شاید نہیں ہوا تھا۔ صورت شکل میں تمام تبتی ایک جیسے لگتے ہیں۔ ممکن ہے اُنھیں بھی ہم نے سردار کے مکان یا بستی میں کہیں دیکھا ہو۔ سب کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چمک رہی تھیں اور ہمی پر مرکوز تھیں۔ اُن کے چہرے انگارا ہو رہے تھے۔ کچھ دیر ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر تجمل نے کسی تمہید کے بغیر تدھم لہجے میں پوچھا: "سردار نے بھیجا ہے؟"

سولم نے فوراً اُسی کے لہجے میں ترجمانی کردی۔

"ہاں!" ادھیڑ عمر شخص نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔

"سردار کدھر ہے؟"

"بستی میں ہے۔"

"ہم کو ساتھ لے جانے کو آئے ہو؟"

"ہاں!" اُس نے مختصر جواب دیا۔

"اتنے بہت سے آدمی بلانے بھیجے ہیں؟"

"پیچھے اور بھی ہیں۔"

"اچھا!" تجمل نے سکون سے کہا۔ "پر کیوں؟"

"یہ ہم نہیں جانتے۔" وہ نخوت سے بولا۔

"سردار سے بولو کہ ہم اُدھر واپس آئیں گے۔ ابھی ہمارا بہت سا سامان اِدھر پڑا ہے۔ ہم نے اپنی طرف سے سردار کو جو بات بولی تھی، وہ ہم کو یاد ہے۔ اُس کو پورا کرنے کی ہم کوشش کریں گے۔" تجمل نے متانت سے کہا۔

"سردار نے ہمیں ایک ہی حکم دیا ہے، تمھیں واپس لایا جائے۔"

تجمل سرہلانے لگا۔ "تم کو پتہ ہے، ہم نے سردار سے کیا بولا تھا؟"

"تھوڑا بہت۔" اُس نے سر جھٹک کے کہا۔

"ابھی ہم کو کچھ نہیں ملا ہے۔"

"یہ سردار کو ہی جاکے بتانا۔"

"سردار سے تو ہم نے ساری بات صاف کرلی تھی۔ ہم نے بول دیا تھا کہ چار مہینے تک کدھر بھی آئیں، کدھر بھی جائیں۔ وہ بیچ میں روڑا نہیں ڈالے گا۔ چار مہینے بعد اگر ہم کو کچھ ہاتھ نہیں لگا تو اپنا کالا منہ لے کے اُس کے پاس نہیں لوٹیں گے۔ تم لوگوں نے نو برس چرخی چلائی ہے، ابھی تین ایک مہینے کے لیے کیوں اُتاؤلے ہوا کرتے ہو؟"

"ہم سے کوئی صفائی مت کرو، جو کچھ کہہ رہے ہو، سردار سے جاکے اُس کی وضاحت کردو۔"

"اُدھر جانے سے نہ سردار کا بھلا ہے نہ اپنا، تمھارے پاس اچھا بدن ہے، بھیجا بھی اچھا ہوگا۔ ابھی ہمارے پاس کچھ نہیں ہے تو جاکے سردار کو کیا دھینڈس دیں گے۔ ہمارا راستہ کیوں کھوٹا کرتے ہو۔"

"ہم نے سردار کا حکم تمھیں بتادیا ہے۔"

"اور ہم تم سے یہ نہیں بولیں گے کہ یہ سردار کا علاقہ نہیں ہے۔ تم یہ نہ کہہ کے اچھا ہی کروگے اور ہماری بات مان کے اور اچھا، سردار سے جاکے خود بات کرلو۔ ابھی بستی زیادہ دُور نہیں ہے۔"

"چار آدمی بھیج کے سردار ہی کو اِدھر بُلالو، ہم اُس کا انتظار کرلیں گے۔" یہ کہنے سے نہ جانے تجمل کا کیا مقصد تھا۔

اُس نے منہ بنایا۔ "ہمارے لیے سردار کا ایک ہی فرمان ہے۔"

"کوئی دوسرا نہیں؟" تجمل نے سرد لہجے میں کہا۔

"دوسرا بھی ہے۔"

"اُس کو بھی بولو۔"

"اُس کے بتانے کا وقت ابھی نہیں آیا۔" اُس نے ناگواری سے کہا۔

"تم اِدھر کب سے ہو؟" غالباً تجمل کو یہ جاننے کی جستجو تھی کہ وہ بڑے مندر کے علاقے میں اپنے چار آدمیوں کی موت کی اطلاع سُن کے آئے ہیں یا پہلے سے موجود ہیں۔ اُن کے تیور کو تراز و کرنے کے لیے یہ جاننا ضروری تھا۔

"تمھیں اِس سے کوئی غرض نہیں۔"

"غرض کیوں نہیں ہے سور ماسیاں!" معلوم نہیں سولم نے سیاں کا کیا ترجمہ کیا ہوگا۔ اُس شخص کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔

"تمھاری طرف سے کیا جواب ہے؟" اُس کی آواز بگڑنے لگی۔

"کیا جواب دیں پیرو دادا!" تجھل نے پیرو کی طرف دیکھ کے کہا۔

"ابھی کیا بولیں استاد!" پیرو کڑواہٹ سے بولا: "سالا اَڑیل ہے منہ کو لگام مانگتا ہے۔ اپن اتنی بات نہیں سُنتا۔"

تجھل چند لمحے چپ کھڑا رہا۔ ہمارے چاروں طرف پھیلے ہوئے آدمیوں کے ہاتھوں میں کمانیں تنی تھیں۔ ہماری ایک ایک جنبش اُن کی نگاہوں کی زد میں تھی۔ وادی میں ندی کی آواز کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ "اپنے لیے واپس جانے میں تمھارا ہی گھاٹا ہے۔" تجھل نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"ہم اپنا گھاٹا برداشت کرنے کو تیار ہیں۔ ہم تو ایک زمانے سے گھاٹے میں ہیں۔" سردار کے پیغام بر کی آواز تپی ہوئی سی تھی۔

"بولو پیرو دادا!"

پیرو نے تجھل کو جواب دینے کے بجائے سولم سے کہا: "اِس سے بولو سولم! سالا سردار کو اپن کچھ جاستی پسند آگیا ہے کیا۔ اُودر اپن کے لیے اپنی ماں بہن کو سامنے کریں گا یا خود لیٹنے کو!... اِس سے بولو کہ ابھی اپنا کچھ آدمی اپن کے ساتھ باندھ دے۔ پھر اپن دونوں ساتھ ساتھ ہندوستان کا سیر ماریں گا اور گھوڑے گھوڑے ردّی کاغذ کھوجیں گا۔"

میں نے پیرو کا ہاتھ دبا کے اُسے روکا۔ پیرو کے ہونٹ پھڑکنے لگے۔

سولم نے اپنی طرف سے قطع و برید کرکے پیرو کی پیش کش دُہرا دی۔

"اِس کا فیصلہ بھی سردار کرے گا۔"

"یہ چرٹی مار تو اپن کو ایک دم حکم کا غلام لگتا ہے۔"

"پالتو ہے دادا!"

"اپن میل بولنے کو تھا۔" پیرو چمک کے بولا۔

"تمھارے سردار کو کاغذات چاہئیں یا ہم؟" تجھل تھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

وہ جواب دیتے ہوئے ہچکچانے لگا: "کاغذات۔"

"تو ابھی اپن اُودر جا کے سردار سے منع بول دے تو کیا ہوئیں گا؟" پیرو نے تجھل کے کچھ کہنے سے پہلے درمیان میں دخل دیا: "تم بھی قبیلے کا آدمی ہے۔ ایدر تمھارے ساتھ اور سب لوگ قبیلے کا ہے سب سرملا کے آگے پیچھے کی سکوٹ کر لو اور سمجھو کہ ابھی اپن کیا بوم مارتا ہے۔ کاغذ ایدر نہیں ہے، اپنا سامان تلاشی کر لو۔ اپن اُسی کی جگاڑ میں اُودر جا رہا ہے بابا! اپن کو بھی مال بنانے کی جلدی ہے۔" پیرو بیزاری سے کہنے لگا: "اپن سے گھٹالا مت کرو۔ نو سال کیا، سالا نو ہزار سال لگ جائیں گا سب ایک ایک کرکے سو جائیں گا۔ رہنے والا بھی نہیں ہوئے گا۔ سولم! اِس کو بولو کہ ایدر بھی تھاڑا لوگ کم نہیں ہے۔ جو اپن ایدر بول رہا ہے اُودر بھی جا کے اتنا بولے گا۔" پیرو کی زبان میں لکنت آگئی تھی: "سولم! اِس کو بولو، کھوپڑی سیدھی رکھو اور اپنے آدمیوں سے سوچ بچار کر لو۔ اپن ایدر ہی ہیں۔ بولو کہ اپن کا غذ نہیں ہیں۔"

مجھے حیرت تھی کہ تجھل اور پیرو ایسی اور اتنی باتیں کیوں کر رہے ہیں، بالکل فضول۔ اُنھیں ابتدا ہی میں اندازہ لگا لینا چاہیے تھا کہ وہ کوئی اور بات سُننا نہیں چاہتے۔ گو سولم نے احتیاط برتی تھی، ترجمانی کرتے ہوئے پیرو کا لہجہ منتقل نہیں کیا تھا۔ وہ رواں اور ستھرے انداز میں اُنھیں اُس کی کہی ہوئی باتیں منتقل کرتا رہا تھا لیکن وہ سب اگر ہندوستانی نہیں جانتے تھے تو پیرو کا لہجہ اُن سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ اُنھوں نے ایک دوسرے کی طرف شعلہ بار آنکھوں سے دیکھا اور اُن میں سے ایک معمر شخص سر اُٹھا کے بولا: "ہم سمجھیں تم انکار کر رہے ہو؟"

"اپن سمجھیں تم انکار کر رہے ہو؟" پیرو بھڑک کے بولا۔

"دونوں کا انکار بُرا ہے دادا!" یکایک تجھل نے دھیرے سے کہا۔

"پھر کیا... کیا ہے تجھل بھائی؟" پیرو چونک پڑا۔

"سردار کی عزت تم سے بڑی ہے۔"

"مطلب تم... تم واپس جانے کو بولتے ہو کیا؟" وہ تعجب سے بولا۔

"ہاں دادا!" تجھل نے کسمسا کے کہا۔

پیرو کو جیسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ تجھل کو مشتبہ نظروں سے گھورنے لگا جیسے اُس نے جو سُنا ہے وہ تجھل نے نہیں کہا ہے مگر وہ تجھل ہی نے کہا تھا۔ پیرو کی آنکھیں کُھلی کی کُھلی رہ گئیں جب تجھل نے سولم سے کہا: "بولو کہ ملیو۔ پر اب کاغذ کا دھیان چھوڑ دو۔ اب تمھارا باپ اُن تک نہیں پہنچ سکتا۔ بولو کہ سردار نے کانٹا بیچ میں ڈال کے اپنا وعدہ توڑ دیا ہے۔ ہم بھی اب اُس کے پابند نہیں ہیں۔ کاغذ کو بھول جاؤ۔ اُدھر سردار نے اُس ٹائم تم میں سے بہت سے ہوں گے جب اُس نے ہم کو تولنے کے لیے اپنے آدمیوں کو اُٹھک بیٹھک کرائی تھی اور ہم نے اُس کو بولا تھا کہ اپنے کو اکیلے جانا ٹھیک نہیں لگتا۔ گنتی تمھاری زیادہ رہے گی۔ ہم تو اُدھر اپنے ٹھکانے سے سر کو اُدھار جان کے چلے تھے۔"

سردار کا پیغام بر فوراً کوئی جواب نہیں دے سکا، وہ نہ اُس کا کوئی ساتھی۔ اُنھیں بھی پیرو کی طرح جیسے تجھل کی بات پر اعتبار نہیں تھا۔ کئی لمحے گزر گئے۔ وہ چپ کھڑے اضطراری نگاہوں سے ہمیں تکتے رہے، پھر سردار کے پیغام بر نے سٹ پٹاتے ہوئے کہا: "تم نے

ٹھیک فیصلہ کیا ہے۔"

"جو بھی کیا ہے تم سے اُس پہ ٹھپا نہیں لگوانا ہے۔"

"اپنے ہتھیار اُتار دو۔"

"تھوڑی دیر میں بولنا، اپنے کپڑے اُتار دو۔"

"سرِدست ہتھیار ہی اُتار دو۔"

"ہاں ہاں۔" تجھل کے نتھنے پھولنے لگے: "ہتھیار بھی اُتار دیں گے بلا! اپنے لیے پھر کیا چوڑیاں لائے ہو۔ بولو گے تو اُن کو بھی پہن لیں گے۔ پر تمھارے پہننے کے بعد۔"

"ہم کہتے ہیں اپنے سارے ہتھیار ہمارے حوالے کر دو۔"

"تم بھی ایسا کرو گے تو اپنے کو کیا اُنھیں چاٹنا ہے۔"

"ہم... ہم ایسا نہیں کر سکتے۔"

"اِدھر تمھارے ساتھ یہ سب حرام کے جنے ہیں کیا! ایک بار پھر گنتی کر لو، بھُوسا بھر کے نہیں لائے ہو گے۔ دادا! سُنا؟ ہتھیار اُتارنے کو بولتے ہیں۔"

"اپنے کو سالے اُلّو کا پٹھا سمجھتے ہیں۔" پیرو پھنکارتے ہوئے بولا۔

"تمھارے ہتھیار ہمارے پاس محفوظ رہیں گے۔ سردار کے پاس جا کے یہ تمھیں واپس مل جائیں گے۔" اُن میں سے ایک نوجوان تیزی سے بولا۔

"اور تمھارے اپنے پاس۔"

"اِس کا مطلب ہے تم انکار کر رہے ہو۔ تم چلنا نہیں چاہتے۔"

"ہم نے جو بول دیا ہے، اُتنا ہی ٹھیک ہے۔"

"چھوڑو تجھل بھائی! یہ سالا کُتّے کی دم ہے۔" پیرو نے تلملا کے کہا: "سولم! ابھی اِس کو بولو کہ فیصلہ کرے۔ اپنے کو لے جانا مانگتا ہے تو ہتھیار کے سنگ۔ اپن سالا قبیلے سے سردار کی ماں بھگا کے نہیں لایا ہے۔ ایدر ایک چھوکری اُودر کی اپنی مرضی سے آئی ہے، مرضی بدلے تو لوٹ جائے۔ اپن نہ ایدر کا آدمی ہے، نہ سردار کا بچا کھاتا ہے۔ سالا ایک کے برابر ڈزن ڈزن بھرے ہے۔ پھر لو تنا ہے ہتھیار نکال دو۔ پھر بولیں گا، آنکھ الگ کر دو، کان الگ کر دو۔" پیرو منہ چڑا کے بولا: "مسخری ملتا ہے۔ قسم سے ابھی اُستاد بادشاہ کا خیال ہے۔ اپن کا خون بہت گندا ہے۔"

وہ تنائم کے ذکر پر ایک لمحے کے لیے چونکے تھے۔ شاید اُن کے لیے یہ اطلاع نئی تھی مگر اُنھوں نے پلٹ کے نہیں پوچھا کہ قبیلے کی کون سی لڑکی ہمارے ساتھ آئی تھی۔ تاہم اُن کے چونکنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ بڑے مندر کے تہ خانے سے ہمارے نکلنے اور تنائم کے ساتھ ہونے سے پہلے اُنھوں نے یہاں پڑاؤ ڈال دیا تھا۔ اُنھیں یقین ہوگا کہ اگر ہمیں ہندوستان کی طرف جانا ہے تو ہم اس جگہ سے ضرور گزریں گے۔ پیرو نے کہا تھا کہ وہ چاہیں تو ہمارے سامان کی تلاشی لے لیں۔ اُنھوں نے اِس پر توجہ نہیں دی۔ وہ طے کر کے آئے تھے کہ ہمیں بستی واپس لے کے جائیں گے تو ہمارا سامان چھیڑنا لاحاصل تھا۔ یہ کام وہ بستی میں جا کے بھی کر سکتے تھے۔ پیرو کہہ رہا تھا کہ ہم کوئی مجرم نہیں ہیں جو ہتھیار اُتار کے چلیں، اُنھوں نے بحث نہیں کی حالانکہ وہ کہہ سکتے تھے کہ پھر بستی سے کوئی اطلاع دیے، کسی سے کچھ کہے سُنے بغیر ہمیں یوں غائب ہو جانے کی کیا ضرورت تھی۔ اطلاع دینے میں کیا عذر تھا۔ یہ کوئی منظم پروگرام ہی ہوگا، دوسرا قافلہ بھی ہمارے ساتھ تھا جسے ہم نے اپنے جانے سے تین دن پہلے بستی سے روانہ کیا تھا۔ پیرو اور تجھل نے سردار کے سامنے خود کو دو قافلوں کے طور پر پیش کیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے آگے پیچھے آئے تھے۔ اب وہ دونوں ساتھ تھے۔ ہزار قسم کے وسوسے اُن کے ذہن میں گردش کرتے ہوں گے۔ کاغذ کی متبرک حیثیت کے علاوہ اُن کے بارے میں اور بھی بے شمار روایتیں مشہور تھیں۔ ہر چند کوئی بات واضح نہیں تھی۔ اس سلسلے میں اُن کا علم سُنی سُنائی باتوں سے زیادہ نہیں تھا۔ کسی مخفی خزانے کی روایت بھی اُن میں سے ایک ہوگی۔ اشاروں کنایوں میں اُنھوں نے اُس کا تذکرہ بھی کیا تھا مگر وہ یقیناً بڑے مندر کے تہ خانے میں چھپے ہوئے عظیم الشان خزانے کے متعلق کچھ نہیں جانتے تھے۔ کبھی اُنھوں نے ان کاغذات کی تحقیق کی باقاعدہ کوشش ہی نہیں کی تھی۔ ایک تو وہ اُنھیں چھوتے ہوئے ڈرتے تھے یا پھر وہ اُن کے رُموز جاننے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ ممکن ہے کبھی کسی نے ان کی تحقیق کی جرأت کی ہو اور قبیلے میں فساد کے خوف سے خاموش رہا ہو۔ اگر کبھی ایسی کوئی کوشش کی گئی تھی تو اُس کا علم چند لوگوں تک محدود رہا ہوگا۔ جس زمانے میں قبیلے کا سردار کورا کا باپ مارا گیا تھا، اُس زمانے میں اُس کے اتالیق اجین نے ہو سکتا ہے، کوئی رمز دریافت کر لی ہو جس کا علم کورا کے چچا کو بھی ہو گیا ہو اور اُس نے محض اسی سبب سے اپنے بڑے بھائی کو راستے سے ہٹا دیا ہو مگر اجین کاغذات اور کورا کو لے کے اُس کی دست برد سے دُور ہو گیا۔ بہرحال کاغذات سے متعلق اَن گنت روایتوں، قبیلے میں ہماری اچانک آمد اور ہمارے متضاد طرزِ عمل کے پیشِ نظر وہ ہمارے بارے میں اَن گنت قیاس آرائیاں کرنے میں حق بجانب تھے مگر اُنھوں نے اِدھر اُدھر اُلجھنے کے بجائے بس اپنا مقصد سامنے رکھا تھا کہ وہ کسی طور ہمیں سردار کے سامنے زندہ پیش کر دیں۔

پیرو اور تجھل کی زبانی ہتھیار اُتارنے سے حتمی انکار سُن کے وہ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ اُدھیڑ عمر شخص جو اُن میں سب سے بڑا عہدے دار تھا، ہمارے ہتھیار ہمارے ساتھ رکھنے پر آمادہ نہیں تھا مگر اس کے دوسرے

ساتھی اُس کے ہم نزانظر نہیں آتے تھے۔ اِس دوران پیرو بڑبڑاتا رہا۔ تجل نے اُس کی کمر تھپک کے اُسے کسی طرح چُپ کیا اور ہم سب اُن کے فیصلے کا انتظار کرنے لگے۔ اب کوئی اور اُمید باقی نہیں رہ گئی تھی۔ ہتھیار چھن جانے سے ہماری تعداد نہ ہونے کی برابر رہ جاتی۔ تجل، پیرو، سولم اور میں، چاروں اُن کی نا آمادگی کی صورت میں اپنے تمنچے اور چاقو نکالنے کے لیے مستعد تھے اور ہمیں اندازہ تھا کہ ہماری کسی بھی حرکت پر ایک لمحے میں چاروں طرف سے تیر برسنا شروع ہو جائیں گے۔ تیر چلنے کی نوبت آئی تو ہم میں سے کوئی بھی زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ میں نے طے کر رکھا تھا کہ ایک ہاتھ میں تمنچا، دوسرے میں چاقو لے کے جھٹ اُن کے غول میں گھس جاؤں گا۔ وہ اپنے آدمیوں کو اشارہ کرنے سے پہلے ہمارے جواب کا انتظار ضرور کریں گے۔ اسی مہلت میں ہم اُن پر جھپٹ سکتے تھے۔ تجل، پیرو، سولم نے بھی یہی سوچ رکھا ہوگا۔ اس موقع پر تمنچے سے کارگر کوئی اور ہتھیار نہیں ہوگا۔ نیچے ابا جان کے ساتھ کھڑے ہوئے ہمارے سارے آدمیوں کی نظر ہم پر ہوگی۔ وہ اب ایک ٹیلے پر تھے اور اُن کی بندوقیں اُوپر کھڑے ہوئے لوگوں کا نشانہ لے سکتی تھیں۔ وہ آخر دم تک نشانے لگاتے رہیں گے اور کسی کو بھی کسی حیران کُن نتیجے کی توقع نہیں ہوگی۔ ہم کتنی گولیاں چلائیں گے۔ ہمارے پاس کارتوس یقیناً اُن کی تعداد سے بہت زیادہ تھے مگر اُنھیں استعمال کرنے کا موقع ملتا تب نا۔ یوں بھی اُن کے ساتھ جانا تھا لیکن ہتھیاروں کے بغیر زندہ جانا بھی مُردوں کے مانند جانا تھا۔

ہتھیار اُن کے حوالے کرنے تھے تو بھرے ہوئے ہی کیوں، بندوقیں اور کارتوس خالی کر کے اور خنجروں، چاقوؤں کی دھار کُند کر کے ہی کیوں نہیں۔ ایک پل، دو پل کی دیر تھی۔ میں نے پیچھے مڑ کے نیچے کھڑے ہوئے ابا جان کی طرف دیکھا۔ اُن کا سَر جھکا ہوا تھا، میرے لیے دعا کر رہے ہوں گے۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ پھر اُن کا چہرہ دیکھنے کا وقت ملے گا یا نہیں۔ آنے والی گھڑی کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اگر مجھے ابا جان سے دو باتیں کرنے کا موقع مل جاتا تو میں اُن سے زریں، نیساں، شہ پارہ کے لیے کچھ کہتا اور اپنی بنڈی میں رکھی ہوئی چیک بک اُن کے حوالے کر دیتا۔ مجھے اُمید تھی کہ وہ ابا جان پر ہاتھ نہیں اُٹھائیں گے لیکن اُن کی موجودگی میں ابا جان میری لاش کو بھی اپنے سینے سے نہیں لگا سکیں گے۔ اُن چند لمحوں میں نہ جانے کیسے کیسے خیال آئے کہ میرا سارا وجود لرز لرز گیا۔ کچھ دیر پہلے پیرو نے ابا جان سے کہا تھا کہ میں خطرے کی کسی گھڑی میں پیدا ہوا ہوں گا۔ خطرے کی نہیں تو وہ نحوست کی گھڑی ضرور تھی۔ میرا وجود ہی نحس تھا۔ سب ایک آدمی کے سبب سے تھا۔ وہ

نہ ہوتا تو اتنے لوگ اس دور افتادہ، اجنبی جگہ پر یوں زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا نہ ہوتے۔ کاش عدالت میں تین آدمیوں کے قتل پر اُسے ابتدا ہی میں موت کی سزا مل جاتی! کتنے چاقو اُس کے جسم کے لیے کھلے تھے۔ کوئی ایک اُن میں سے لگ جاتا تو یہ وقت نہ آتا۔ معلوم نہیں، وہ چند آدمی دنیا سے کیوں نہیں اُٹھ جاتے جو خود بھی زندہ نہیں رہتے، دوسروں کو بھی چین سے نہیں رہنے دیتے۔ میرے قریب تجل پُر سکون انداز میں کھڑا تھا۔ پیرو بھی بظاہر مطمئن نظر آتا تھا۔ اندر ایک طوفان مچا ہوگا۔ اُس کی بیٹی گیتا اور بیوی کی پرچھائیاں آنکھوں میں لرز رہی ہوں گی۔ کاش وہ سب مل کے پہلے مجھے مار دیتے۔

ادھیڑ عمر شخص اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر کے جیسے ہی ہماری طرف متوجہ ہوا، میرے ہاتھ تیزی سے اپنی جیبوں کی طرف لپکے لیکن ہتھیار باہر نکالنے کی ضرورت نہیں پڑی، ایک لمحہ جاتا تھا کہ میرے تمنچے کی گولی اُس کے سینے میں پیوست تھی۔ اُس نے سر کی جنبش سے اپنے اقرار کا اظہار کر دیا تھا۔ کسی تاخیر کے بغیر جلوز۔ اُس نے اُونچی آواز میں ہمیں حکم دیا۔

✲ تجل اور پیرو پھر ایک پل کے لیے بھی اُن کے سامنے نہیں ٹھہرے۔ چپ چاپ نیچے ٹیلے پر آ گئے جہاں سب ہمارے منتظر تھے اور یہ جاننے کے لیے مضطرب کہ ہم کیا طے کر کے آئے ہیں۔ شاید وہ کسی عجوبے کی توقع کر رہے تھے۔ تجل نے اُن سے سامان اُٹھانے اور چلنے کے لیے کہا تو اُن کی گردنیں ڈھلکنے سی لگیں مگر اُنھوں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا یا کوں کا رُخ فوراً موڑ دیا گیا۔ جانگ قبیلے کے سارے آدمی اُوپر ہی رہے اور اطراف سے ایک جانب سمٹتے گئے۔ وادی سے نکلتے ہی وہ ہمارے اردگرد ہو گئے۔ اُنھوں نے خود کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ کچھ لوگ ہمارے آگے تھے، کچھ پیچھے، کچھ دائیں بائیں۔ کچھ ہم سے قریب تھے تو کچھ دُور۔ جو قریب تھے، اُن کے ہاتھوں میں نیزے تھے۔ دُور چلنے والوں کے ہاتھوں میں کمانیں تھیں، ابا جان اور تشانم ہمارے ساتھ ہی تھے۔ ایک بزرگ شخص نے ابا جان کے پاس آ کے اُنھیں الگ ہو جانے کی پیش کش کی تھی۔ ابا جان نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ ایسے حالات میں وہ اُن لوگوں سے جُدا ہونا مناسب نہیں سمجھتے جن کی رفاقت میں اُنھوں نے سفر کا آغاز کیا تھا۔ ہمارے ہمراہ اُن کی واپسی کا جواز موجود تھا۔ اِن دشوار گزار راستوں میں تنہا سفر کرنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ ہمارے لوٹنے کے بعد ابا جان اکیلے سفر نہیں کر سکتے تھے۔ اُنھیں راستے میں کسی دوسرے قافلے کی ہم رکابی کے منذر تک ہمارے ساتھ واپس چلنا تھا۔ بھکشوؤں

…کے قافلوں کی سفری رفاقت کوئی نئی بات نہیں تھی۔ …اریاں کم کرنے کے لیے کبھی تاجر بھکشوؤں کے قافلے …ہو جاتے تھے، کبھی بھکشو تاجروں کے ساتھ۔ یہی وجہ تھی …نے ہمارے ہمراہ ابا جان کی موجودگی پر کسی شبہے کا اظہار …۔ قریب آ کے اُنھوں نے تشانم کا چہرہ بھی دیکھ لیا تھا …بُرا بھلا کہا، نہ ابا جان کی طرح اُسے ہم سے جُدا ہونے …ش کی۔ جب سب بستی ہی کی طرف جا رہے تھے تو تشانم …یا اُدھر، بات ایک ہی تھی۔

…نے بہت سے مردوں کے درمیان تشانم صرف ایک لڑکی …کا سِن کے اُس کے سُرخ و سفید چہرے پر زردی چھا …۔ بلحہ جیسے اُس کا خون سوکھ رہا ہو۔ تجل نے اُسے …پر بٹھا دیا تھا مگر اُس کے بدن کی لرزش کم نہ ہوئی۔ سلطان …یب ہی تھا اور سرگوشیوں میں اُسے بار بار نہ جانے کیا …سے دے رہا تھا۔ پھر تجل بھی اُس کے پاس پہنچ گیا اور اُس …ہاتھ تھام کے اُس کے بدن کو ہلکے ہلکے جھٹکے دیے۔ گڑیا! …ہوئے بولا۔ یہ رنگ کیوں بدلتی ہے۔ وہ لال رنگ ہی …چھا لگتا ہے۔"

…انم کے ہونٹ سسکنے لگے۔

…نا۔" تجل اُس کی انگلیاں چومتے ہوئے بولا۔ "تیرا کیا ہے …دھر ہی ہے۔ بس تنگ مت جانا۔"

…نے اُسے ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا۔ دو دن سے وہ …تھی۔ تجل نے اُسے پہلی بار مخاطب کیا تھا۔ "بیچ میں چار …ے اور گھر سے بچھڑا کا رستہ بھی چھوٹا نہیں تھا۔ جب …دیا نواب کا ہے کا دھواں ہے۔ سجنی! بے رُت برکھا …لگتی۔" وہ ہنس کے بولا۔ "یہ لُوٹ پھیر تو ساری زندگی …کرا جلا ہی رکھ، جیسا لے کے آئی تھی ویسا۔ سمجھتی ہے نا؟" …نہیں تشانم کی کچھ سمجھ میں آیا یا نہیں مگر دیکھتے دیکھتے اُس …رنگ واپس آنے لگا۔ اُس کا مُرجھایا ہوا بدن جیسے پھر سے …۔ سہ پہر ہو گئی تھی، ابھی ہم نے وادی سے چند میل آگے …لیا ہوگا۔ اندھیرا گہرا نہیں ہوا تھا کہ اُنھوں نے اچانک سفر …، وہ ایک کشادہ اور ہموار جگہ تھی۔ قریب ہی پڑاؤ کے لیے …بگر ملنی مشکل ہوگی اسی لیے اُنھوں نے یہیں ڈیرے ڈال …کے ساتھ بار برداری کے لیے بیس کے لگ بھگ …باقی سامان بڑے بڑے تھیلوں میں اُن کی پیٹھ سے …تھا۔ وہ فاصلے فاصلے سے ہمارے اردگرد مختلف مقامات …تھے۔ اندھیرا ہوتے ہی اُنھوں نے مشعلیں روشن کر دیں

اور الاؤ جلا دیے۔ اُن میں سے چند لوگ ہماری پہرے داری چھوڑ کر کھانا تیار کرنے کے کام میں مصروف ہو گئے۔ جامو اور پیرو نے صبح صبح کئی پرندوں کا شکار کیا تھا لیکن اُنھیں ہم نے محفوظ رہنے دیا۔ سولم نے اُن سے پوچھ لیا تھا کہ وہ ہمارے لیے بھی کھانا تیار کر رہے ہیں یا نہیں۔ وہ منع نہیں کر سکے۔ سو ہم تین خیمے نصب کر کے اور بستر لگا کے لیٹے رہے۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ اُنھوں نے اِدھر اُدھر کئی چھوٹی بڑی چھول داریاں کھڑی کر لی تھیں اور ہمارے خیموں کے باہر متعدد آدمی پھیلا دیے تھے۔ جب تک اُنھوں نے کھانے کے لیے آواز نہیں دی، ہم باہر نہیں نکلے۔ سارا جسم ٹوٹ رہا تھا اور بخار سا محسوس ہو رہا تھا۔ اُنھوں نے وافر کھانا بھیجا تھا۔ کسی کو بھوک ہی نہیں تھی، سب نے ایک دوسرے کے خیال سے تھوڑا بہت حلق سے اُتار لیا۔ ابھی رات کا ابتدائی پہر تھا۔ کھانا کھا کے ہم کچھ دیر ہی باہر ٹھہرے ہوں گے کہ پھر خیموں میں آ کے پڑ گئے۔ تجل نے سب کو تاکید کی تھی کہ پوری رات آرام سے سوئیں مگر سب آنکھیں کھولے کروٹیں بدلتے رہے۔ کسی کے پاس دوسرے سے کہنے کے لیے شاید کچھ نہیں تھا، باہر الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے لوگوں کے گانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تجل، ابا جان، تشانم، وزیر اور سولم الگ خیمے میں تھے۔ میں، جامو، مارٹی، زورا اور جینی دوسرے میں، تیسرے میں پیرو، سلطان، پلٹو، بلاکو اور دو قلی تھے۔ تیسرا قلی تجل کے خیمے میں تھا۔ سب قریب ہی قریب تھے۔ کوئی زور سے بات کرتا تو دوسرے خیمے کے لوگ سُن سکتے تھے۔ رات گزرنے پر ہم سب نے باری باری خیمے کی جھریوں سے جھانک کے دیکھا۔ اتنی سخت سردی میں وہ باہر ہی موجود تھے۔ نہ جانے اُنھوں نے چھول داریاں کیوں نصب کی تھیں۔ کھانے کے دوران ایک شخص نے آ کے ہمیں متنبہ کرنا ضروری سمجھا تھا کہ فرار کی کوشش ہمارے لیے انتہائی عبرت ناک ہوگی۔ آگے کی منزلوں پر بھی اُن کے قبیلے جانگ قبیلے کے گروہ موجود تھے۔ سب سُن کے خاموش رہے۔

جیسے جیسے رات بڑھتی گئی، سردی میں اضافہ ہوتا گیا۔ میرا خیال تھا کہ سردی سے گھبرا کے وہ آخر کار چھول داریوں میں پناہ لیں گے۔ ممکن ہے تجل کے ذہن میں ہو کہ اُس لمحے باہر نکلنے کی ہم کوئی کوشش کر سکتے ہیں اور بارش ہو گئی تو لازماً اُنھیں اندر گھسنا پڑے گا۔ الاؤ بھی بجھ جائیں گے، مشعلیں بھی گُل ہو جائیں گی۔ آسمان صاف تھا۔ کہیں کہیں بادلوں کی ٹکڑیاں تاروں اور چاند پر چھا جاتی تھیں۔ بارش کا امکان نہیں تھا مگر کسی وقت بھی بارش ہو سکتی تھی۔ یہاں ایسا ہی ہوتا تھا۔ اچانک بادل گھِر کے آ جاتے اور موسلا دھار پانی برسنے لگتا لیکن جس طرح وہ بارش میں باہر

نہیں رہ سکتے تھے، ہم بھی اپنے خیموں سے نہیں نکل سکتے تھے۔ نکل کے کتنی دور جاتے! بارش کا سلسلہ نہ رکتا تو کہاں سر چھپاتے۔ آسمان سے اولے نہیں پڑتے تھے تو برف کا پانی گرتا تھا جیسے اوپر سلیں رکھی ہوں اور پگھل رہی ہوں۔ مُتّن میاں کا جسم برف کے اسی پانی نے ٹھٹھرا دیا تھا۔ پھر سامان ساتھ تھا۔ قُلیوں اور یاکوں کو اُٹھا کے اندھیری رات اور بارش میں پگ ڈنڈیوں پر چلنا ممکن ہی نہیں تھا۔ رات بھر وہ جاگتے ہی رہے تھے اس لیے اوّلِ صبح کھڑے ہو گئے اور ناشتہ کرتے ہی آگے بڑھنے لگے۔ اتنے آدمیوں میں رفتار تیز نہیں ہو سکتی تھی پھر ہم نے خود اپنی رفتار دھیمی رکھی تھی۔ دو دن میں جتنا طویل سفر ہم نے کیا تھا، اُنھیں اِس کے لیے تین دن لگتے۔ یہ دوسری بات تھی کہ وہ کسی اور راستے سے بستی میں داخل ہوں لیکن اُنھوں نے راستہ نہیں بدلا تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ وہ کوئی مختصر راستہ ہمیں دکھانا ہی نہ چاہتے ہوں۔ دوپہر کے کھانے کے وقت اُنھوں نے مکھن، خشک اناج اور رات کے بچے ہوئے گوشت اور چائے پر گزارہ کیا اور چلتے رہے۔ کل دوپہر سے اب تک اُن کے کسی آدمی نے ہمارے کسی آدمی سے غیر ضروری بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی، تشانم سے بھی نہیں اور اُن قلیوں سے بھی نہیں جو ہمارے ساتھ تھے۔ کئی مرتبہ مجھے ایسا لگا کہ اُن کی متجسس نظریں ہمارے سامان پر بھٹک رہی ہیں لیکن یہ ایک احساس ہی تھا، وہ چونک چونک کے بار بار ہماری نقل و حرکت دیکھتے رہتے تھے۔ کسی جگہ اُنھوں نے ہمارا سامان چھونے اور کریدنے کی زحمت نہیں کی۔ تمام ہیرے جواہر یہاں تک کہ تہہ خانے سے برآمد کیا ہوا منقش بکس بھی ہم نے ٹرنکوں میں محفوظ کر دیا تھا اور ٹرنکوں کا سامان تھیلوں میں۔ اُنھیں شاید کچھ معلوم نہیں تھا کہ ان صندوقوں میں کیا چھپا ہوا ہے۔ کچی آنکھوں کا کوئی شخص دیکھے تو آنکھیں پھٹ جائیں۔ اگر اُنھیں معلوم تھا تو وہ سب اُنھی کے ملاتے میں اُنھی کے پاس واپس جا رہا تھا سو اُنھیں تشویش کرنے کی کیا ضرورت تھی مگر اُنھیں کچھ پتہ ہی نہیں تھا۔

تمام راستے ابّا جان سر جھکائے کسی متحرک بُت کی طرح قدم بڑھاتے رہے۔ ہمارے ہمراہ ہونے کے باوجود بھی وہ سب سے الگ الگ تھے۔ اُنھوں نے اپنی جانب سے کسی سے کچھ کہنے، کچھ پوچھنے کی پہل نہیں کی البتہ وہ لوگ اُن سے وقفے وقفے سے پوچھتے رہتے تھے کہ اُنھیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔ ابّا جان ہر مرتبہ کبھی سر ہلا کے کبھی تبتی کے دو ایک لفظوں میں منع کر دیتے تھے۔ نو سال میں اُنھوں نے تبتی زبان سے بڑی حد تک واقفیت حاصل کر لی تھی، پڑھنے میں تو اُنھیں ملکہ حاصل ہو گیا ہو گا تبھی کاغذات میں لکھی ہوئی ہزاروں سال پہلے کی زبان اُن کی سمجھ میں آ گئی ہو گی [...] تبتی بولنے میں پڑھنے جیسی روانی نہیں ہو گی۔ تبت کے مقدس [...] خانقاہوں کی زیارت کرنے والے کسی راہب کے لیے لازم [...] نہیں تھا کہ اُسے تبتی سے خوب آشنائی ہو۔ دنیا بھر سے راہب [...] آتے تھے۔ ابّا جان نے تبتی محض کاغذات کا علم اخذ کرنے کے لیے سیکھی ہو گی۔ ہو سکتا ہے، وہ پہلے ہی اس میں کچھ شُدبُد رکھتے ہوں [...] وہ گیا میں پیدا ہوئے تھے، انھیں ہزاروں تبتی راہبوں سے [...] پڑا ہو گا۔ کوئی بعید نہیں کہ کاغذات کسی اور زبان میں ہوں [...] اور چینی ملی ہوئی زبان۔ بہر حال وہ کسی بہت مشکل زبان ہی میں [...] گے جو ابّا جان کو نو سال لگ گئے۔ یہ اُن کے نو سال کی ریاضت تھی جو صندوقوں میں پتھر اور دھاتوں کی شکل میں چھپی ہوئی تھی۔ صندوقوں میں قیمتی اوراق کی روحیں بند تھیں۔ ابّا جان ہی ٹھیک جانتے تھے کہ اُن میں کیا کیا بند ہے۔

دوسرے دن سہ پہر ہونے تک ہم اس طرف کے پہاڑ کے آخری سرے پر پہنچ گئے تھے۔ اِس طرف کے یوں کہنا چاہیے ایک گہرا نشیب درمیان میں راستہ کاٹ دیتا تھا۔ دوسری طرف بھی بلند و بالا پہاڑ تھے مگر اُن تک جانے اور آگے سفر جاری رکھنے کے لیے آمنے سامنے دونوں پہاڑی سلسلوں کے بیچ رسیوں اور [...] کے تختوں سے بنا ہوا پُل عبور کرنا پڑتا تھا۔ نیچے ہزاروں فٹ [...] میں دریا بہہ رہا تھا۔ دریا کے چوڑے پاٹ کے سبب پُل بھی [...] تھا۔ یہاں سے ہم دو دن پہلے گزر چکے تھے۔ پُل آنے پر سد[...] نے بے اختیار تجمل کی طرف دیکھا لیکن تجمل کے ماتھے پر کوئی شکن [...] آنکھ میں ہلکی سی چمک بھی نہیں اُبھری۔ یہی ایک ایسی جگہ تھی [...] سب کو سمٹ کے پُل پار کرنا تھا۔ تجمل کی ہدایت پر وادی سے [...] کے بعد اب تک ہم نے ہتھیار یوں ہی چھوڑ رکھے تھے۔ بندوقیں [...] پر جھولتی رہی تھیں اور تمنچے، چاقو جیبوں میں پڑے رہے تھے [...] بھی اِس مقام پر احتیاط کا احساس تھا۔ اوّل تو وہ قطار کے انداز [...] ہٹتے ہی نہیں۔ پُل کے اُس سرے پر دائیں بائیں پھیل گئے [...] انھوں نے پہلے اپنے آدھے آدمی عبور کرا دیے تب ہم سے بڑھنے [...] کہا۔ باقی آدھوں نے دوسری جانب ہمارے پہنچ جانے پر پُل [...] شروع کیا۔ دونوں اطراف اُدھر پہنچ جانے والے اور اِدھر رہ جانے والے لوگ ہمارے پُل سے گزرنے کے دوران ہتھیار اُٹھائے کھڑے رہے۔ اُنھوں نے بس ہمارے پیروں میں بیڑیاں اور ہاتھوں [...] ہتھکڑیاں نہیں ڈالی تھیں۔ تجمل اور پیرو نے ہتھیار ساتھ [...] پر اُن سے بے کار اصرار کیا تھا، یہ صرف ذہن کا دلاسا تھا۔ ابھی [...] اُن کی نظریں ہم سے اوجھل نہیں رہی تھیں۔ ہر طرف اُن کا [...]

[...]ہیں۔ ہماری حالت اُس قیدی سے مختلف نہیں تھی جسے [...]کے پیچھے ہتھیار دے دیا جائے۔ قیدی زیادہ سے زیادہ [...]گا، قریبی پہرے دار پر جھپٹے گا یا پھر خود کو مار لے گا۔ سارے [...]نے کر تو وہ تمنچے اور چاقو سے نہیں کاٹ سکے گا۔

[...]پُل طے کرنے میں خاصا وقت لگ گیا تھا۔ ہم ایک آدھ [...]اور چلے ہوں گے کہ ہلکی بوندا باندی ہونے لگی ویسے بھی اندھیرا [...]دھندلی کرنے لگا تھا۔ وہ ایک مناسب جگہ ٹھہر گئے۔ بوندا باندی [...]جاری نہیں رہی۔ شام کو آسمان خشک ہو گیا تھا۔ دن بھر [...]بچے راستوں پر چلتے چلتے پیر دُکھنے لگے تھے۔ میری پنڈلیاں [...]میں اینٹھ رہی تھیں لیکن میں نے کسی سے ذکر نہیں کیا۔ [...]رح سب کا یہی حال ہو گا۔ اونچائی پر ایک کوس کا سفر میدانی [...]کے کئی کوس کی تھکن کے برابر ہوتا ہے۔ بستی تک تاخیر سے [...]یہ بھی ایک سبب تھا کہ آگے بیش تر اونچائی تھی۔ پڑاؤ [...]ل کے معمول کے مطابق وہ اپنے کاموں میں مصروف ہو [...]پول داریاں نصب کرنے، کھانے پکانے، الاؤ جلانے اور [...]ں روشن کرنے کے لیے چند آدمی الگ ہو گئے تھے۔ باقی [...]کا کام ہماری نگہداشت کرنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ہمارے [...]ں اُنھوں نے ایک طرح کے مورچے قائم کر لیے تھے۔ جب [...]بان، تشانم اور قلیوں کو خیموں میں بھیج دیا اور خود ہم سب کے [...]باہر رہا اور ہم کسی ایک جگہ ٹک کے بیٹھنے کے بجائے ستار[...]نے تک ایک محدود فاصلے میں خواہ مخواہ اِدھر سے اُدھر چکر [...]رہے۔ کھانا کھاتے ہی تجمل نے الاؤ جلوا دیا تھا۔ سب موٹے [...]اور کمبلوں میں لپٹے ہوئے اس کے گِرد بیٹھے ہاتھ تاپتے رہے [...]ہمارے اِرد گرد منڈلاتے رہے۔ ہم سب پر سکوت طاری تھا۔ [...]توڑنے کے لیے پیرو بمبئی کے واقعات سنانے لگا۔ پھر تو قصوں [...]ل کا ایک تانتا سا بندھ گیا۔ پیرو کی زبان اُس کے سنانے اور [...]ت کے لیے ہاتھ کے اشاروں کا انداز اتنا تجسس انگیز تھا کہ [...]کھو گئے تھے اور کچھ دیر کے لیے اُنھیں بالکل یاد نہیں رہا کہ [...]ل اور کن لوگوں کے درمیان ہیں۔ پیرو کہیں اٹک جاتا یا بھول [...]زورا اور مارٹی اُسے اُکساتے اور یاد دلا دیتے "دلوا! وہ اُودر [...]ال جامنی بائی کا سالا کیا لفڑا تھا؟" پیرو کے چپ ہوتے ہی [...]نے کسمساتی آواز میں پوچھا۔

پیرو آہ بھر کے بولا "یہ کس کا نام لے دیا ماسٹر!"

"بولو نا دادا!" مارٹی نے اصرار کیا۔

"جانے دے ماسٹر! کیوں سوٹی مارتا ہے۔"

"اپن اُس ٹیم چھنگا اُستاد کے پاڑے میں تھا۔" زورا اشتیاق سے بولا۔ "پر اپن کے کان بند نئیں تھے۔ سُنا تھا کہ سالی نے اُودر تمھارے لیے لمبا پھندا ڈالا تھا۔"

"ابھی اپن کیا بولے۔" پیرو کی آواز کہیں کھو گئی۔ "ایک ٹیم تو اُس نے اپن کو نچا دیا تھا زورا دادا!"

"اپنے کو ایسا بول کے کیوں خوار کرتے ہو دادا؟" زورا کان پکڑتے ہوئے بولا۔ "اپن ابھی تمھارے پیروں کا مٹی بھی نئیں، دادا کدر سے ہو گیا۔"

پیرو اُسے کوئی جواب دینے کو تھا کہ وزیر نے جھجکتے ہوئے لہجے میں اسے ٹوکا "یہ وہ جامنی بائی والا قصہ بول رہے تھے تم....؟"

"جامنی بائی! جانی! کس منہ سے بولے۔" پیرو ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگا۔ "ایک نمبر فنٹوش تھا وزیرے! ایک ٹیم پورا اُودر اُس کا غلام تھا۔ کلر سالی کا بالکل جامن جیسا اور بدن! بدن کسی مندر کا مورت مافک تھا۔ روز اُس کو ہتھوڑی سے ٹھوکتا تھا یا چاقو سے کاٹ چھانٹ کرتا تھا۔ ایسا سنبھال کے رکھا تھا جیسا اُودر بمبئی میں ڈولی رام اپنی دکان کے کانچ کے پیچھے گوری میم کی مورتی سنبھال کے رکھتا ہے۔ ایک دم نیچے سے اوپر تک کھنچا ہوا، قطب کی لاٹ کی طرح، آنکھ بڑا بڑا، ہرنی مافک، بال سالا بس پیروں تک آنے سے بچ گیا تھا۔ کلوہ! جامنی نئیں ہوتا تو کسی محل کا رانی بنتا، رانی تو وہ اُس ٹیم بھی تھا۔ لوگ باگ اُس کو دادر کا رانی بولتا تھا۔ جب پاڑے سے نکلتا، ملکتا شیرنی بن سے نکلتا ہے، ایدر سے اُودر تک دادر کے جنگل میں سب کی بولتی بند ہو جاتا۔ پتہ نہیں سالی کدر سے آیا تھا۔ کچھ بولتا، بنگال سے آیا ہے، کچھ اُودر لنکا سے بولتا، جب آیا تو دادر کے پاڑے میں طوفان دادا بیٹھتا تھا۔ بولتے ہیں، جامنی بائی سے پہلے اُس کا بھائی ستارہ بمبئی آیا تھا اور آ کے دادر میں ہی اونچا نیچا کام کرنے لگا تھا۔ طوفان دادا کے آدمی نے ہفتا مانگا۔ ستارہ بھی آدمی سونا تھا، ہفتے کے بجائے طوفان کے آدمی کو ٹھینگا مارا، ہاتھ پاؤں الگ سمجھا دیا۔ بولتے ہیں، طوفان نے سالا حرامی پن کیا۔ اپن سب گنتے ہیں، پر وہ بہت نیچی جات کا تھا۔ لومڑی کا بچہ، ایک رات مالے پر جا کے طوفان کے آدمی نے ستارہ کو بجھا دیا۔ پھر کچھ دن بعد جامنی بائی کا دادر میں ایک دن بجلی چمکا۔ اِس سے پہلے اُودر کسی نے اُس کو نہیں دیکھا تھا۔ جامنی سیدھا طوفان کے پاڑے پہنچا اور جا کے بولا کہ اپنے بھائی کا بدلہ لینا مانگتا ہے۔ طوفان دادا سمجھا چھوکری مسخری کرتا ہے۔ جامنی بائی تیار ہو کے آیا تھا اور پتہ نہیں سالی لوہا پی کے آیا تھا یا جادو کر کے۔ اُسی ٹیم طوفان کو نرکھ کا ٹکٹ کٹا دیا۔ اپن کا دو ایک آدمی بھی اُودر تھا۔ بولتا تھا کہ جامنی کا ہاتھ اکھا خالی تھا۔ طوفان جیسا دیو آدمی کا اُس نے دیکھتے دیکھتے چٹنی پیس دیا۔ کیس چلا، کچھ تو عورت ہونے

کا سالی کو بخشش ملا، کچھ وکیل کے زور مارنے سے جامنی بائی کو صرف ۵ برس کا سزا پڑا۔ پانچ برس میں ابھی چار برس کاٹا تھا کہ جیل سے چھوٹ کے پھر دادر آ گیا اور طوفان دادا کے پاڑے پر آ کے ہی جم گیا۔ سالی کی عمر بھی کم تھا۔ چار برس بندی کے بعد بھی چھوکری لگتا تھا جیسے اُودر سالا بس شیشے کے سامنے بیٹھا رہا ہو۔ جیل سے بدن کو پورا تیر کمان بنائے ہوئے نکلا تھا۔" پیرو کی آواز بہکنے لگی اور وہ بولتے بولتے گم سا ہو گیا۔ سب انتظار کرتے رہے۔ چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد پیرو خود ہی بولا۔ "کیدر کیدر سے بولے۔ پورا اگن تھا سالا۔ چین اُٹھاتا تو پاڑے کے سارے آدمی کو تھرتھری لگ جاتا۔ کسی نے اونچا بوم مارا، اُس کو سدا کے لیے بنچا بٹھا دیا۔ گیروے اور نیلے رنگ کے سوا دوسرا کلر کا ساڑی نئیں پہنتا تھا۔ ادر دادر کے آزو بازو پاڑوں کے دادا لوگوں کو موت مانگتا تھا تو وہ اُودر جامنی بائی کے پاڑے کو اُن کا منہ پھیر دیتا تھا جس نے جامنی بائی سے مخول کیا، اپنے آپ سے مخول کیا۔ جامنی بائی کبھی خود سے کسی پاڑے میں نئیں گیا۔ وہ اُودر اپنے کو بند رکھتا تھا۔ پر دادا لوگ ایک عورت کا اُن کے اپنی خواری سمجھتا تھا۔ اُس ٹیم دادر کے بازو میں جانگڑی دادا کا بہت مشہوری تھا، اُس کو لوگ بلڈ آگ بھی بولتے تھے۔ جامنی بائی نے کچھ نئیں بولا تھا کہ جانگڑی نے آدمی بھیج کے بولا، اپن سے شادی بناؤ۔ تم رانی، اپن راجا، دونوں کا پاڑا مل جائیں گا۔ جامنی بائی جانگڑی کے آدمی کی بات سنتا رہا پھر اپنے ہاتھ کی چوڑی اُتار کے بھیج دیا۔ جانگڑی سمجھ گیا کہ ابھی جامنی بائی کا کیا مطلب ہے۔ چاقو اُس کے ہاتھ میں پیرتا تھا۔ آنکھ کا گرم اور دل کا جوان تھا، بولا، اپن آتا ہے، تیار رہو۔ ابھی لال کلر کا ساڑی پہننا۔ جامنی نے جواب بولا۔ کبھی آؤ، اپن ادھر ہی ہے۔ دوسرے دن جانگڑی ہار پھول لے کے گیا تھا جامنی نے لال کلر کا ساڑی پہن رکھا تھا، ہار پھول لے کے ایک طرف رکھا، جانگڑی کے آگے چاقو پھینکا اور سامنے آ گیا۔ جانگڑی نے چاقو اُٹھا لیا، چوما اور دس بارہ ہاتھ سے جاستی نہیں چلایا تھا کہ بازو پر نشان ڈلوا کے گر گیا۔ جامنی بائی کھڑا رہا۔ اُودر جانگڑی کا سارا آدمی بھی یہ تماشا دیکھتا تھا۔ جانگڑی نے پھر سے چاقو اُٹھا لیا۔ سب سمجھے کہ جامنی بائی پر پھینکے گا۔ پر جانگڑی نے اُس کو اپنی چھاتی میں اتار لیا۔"

پیرو کہہ رہا تھا کہ جامنی بائی نے جانگڑی کی آخری خواہش کے طور پر لال رنگ کی ساڑی پہنی تھی۔ سب کی آنکھیں پیرو کی طرف مرکوز تھیں۔ پیرو چپ ہو جاتا تو وہ مچلنے لگتے۔ پیرو کو اُس کی بہت سی باتیں یاد تھیں، ناقابلِ یقین باتیں، وہ اُس کے چاقو چلانے اور داؤ پیچ کے انداز بتا رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ بظاہر وہ ایک سیدھی سادی سی عورت لگتی تھی مگر جب چاقو اُٹھاتی یا سامنے آتا تو بالکل بدل جاتی۔ آنکھوں میں انگارے سے دہکنے لگتے۔ جامنی رنگ سُرخ ہو جاتا اور بدن پھڑکنے لگتا۔ پیرو کہتا تھا کہ داؤ تو اُس کی آنکھوں کے تھے جسے نظر بھر کے دیکھ لیتی بھول جاتا۔ ہاتھ اُٹھاتی کہیں تھی، مارتی کہیں تھی۔ کوئی اُس کے پہلے سے تعین نہیں کر سکتا تھا۔ سامنے آتے ہی ہرن کی طرح بھرتی۔ اُسے پینترے بدلنے اور جھپٹ کے وار کرنے کا ہنر تھا۔ سب سمجھتے تھے کہ وہ کوئی جادو کرتی ہے لیکن اُسے تو داؤ آتے تھے نیزا، بلم، چاقو وغیرہ اور خالی ہاتھ کے داؤ۔ اتنی کم اُس نے نہ جانے یہ سب کچھ کہاں اور کیسے سیکھا تھا۔ عموماً وہ اپنے تک محدود رہتی تھی، نہ اُسے اپنا پاڑا بڑھانے کی خواہش تھی۔ اڈے اُس کی تحویل میں آئے، اُن سب کے اُستادوں نے سے چھیڑ خانی کر کے اُس کی گود میں ڈال دیے تھے۔ جن اُس نے یوں ہی چھوڑ دیا، کئی پر اپنے آدمی بٹھا دیے۔ خود اپنے پاڑے میں تمام اَلا بلا آدمی نکال کے منتخب آدمی رکھے اپنی دو نوکرانیوں کے سوا وہ سارے پاڑے میں تنہا رہتی تھی سے بھی اُس کے تعلقات ٹھیک رہتے تھے۔ علاقے سے کسی آدمی کی شکایت آتی تو وہ اُسے سدھرنے کا صرف ایک دیتی تھی، دوسری شکایت پر اُسے پاڑے سے نکال دیتی کی کہانیاں اُس کے بارے میں مشہور ہو گئی تھیں مگر وہ اُن جیسے بے خبر تھی۔ اُس کے پاڑے کے آدمیوں کا کہنا تھا کہ کبھی کسی مرد کو قریب نہیں پھٹکنے دیا، پاڑے کے کسی آدمی زیادہ بات نہیں کی۔ علاقے کے لوگ اُسے جامنی دیوی کہنے لگے کہتے تھے کہ وہ کالی دیوی کا کوئی روپ ہے۔ پاڑے میں کوئی جاتا تو خالی ہاتھ واپس نہیں آتا تھا مگر اُس کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہوتی تو وہ اُس کے ساتھ خود باہر آ جاتی اور زیادتی والے سے باز پرس کرتی۔ دادر کے لوگ اپنے بعض فیصلے اُس سے کرانے لگے تھے۔ جانگڑی کی موت کے بعد ممبئی دادا نے پھر جامنی بائی کے علاقے کا رُخ نہیں کیا۔ سب لیا تھا کہ جامنی کو کریدنا اپنی موت کے مترادف ہے۔ جامنی کو ایک ہی شوق تھا۔ گانے اور ناچ دیکھنے کا شوق نے گاتے ہوئے دیکھا نہیں تھا۔ جاتی رات کو کبھی پاڑے منزل سے، جہاں وہ رہتی تھی، کبھی کبھی اُس کے گانے کی آنے لگتی اور وہ صرف رات کو گاتی تھی۔ پیرو کہتا تھا کہ اُس سننے کے لیے اُس کے پاڑے کے آدمی کان لگائے رہتے رات کو گانا اُس کا معمول نہیں تھا۔ ایسا کبھی کبھی ہوتا تھا اور جب

ج دیکھنا ہوتا تو کسی طوائف کو بُلا کے کمرہ بند کر لیتی اور تنہا اُس کا ج دیکھتی رہتی۔ مہینے میں دو ایک بار وہ ضرور کسی طوائف کو بُلاتی تھی رات کا کھانا اُس کے ساتھ کھاتی تھی، اُسے ایک جوڑا پہناتی روپے دینے کے بجائے سونے کا کنگن یا چوڑیاں دیا کرتی تھی۔

"ابھی تم نے کبھی کالا گلاب دیکھا ہے؟" پیرو نے اچانک سے پوچھا۔

"دیکھا ہے دادا!" جامو نے جواب دیا۔

"بس سمجھو جامنی بائی بھی ایک کالا گلاب تھا۔" پیرو خود سپردگی کے انداز میں بولا۔ "گلاب کی پتی جیسا، پر ٹہنی پہ کانٹا بہت تھا۔"

جھل سر جھکائے پیرو کی باتیں سن رہا تھا اور بڑی کے ن لگا رہا تھا۔ "آواز کیوں اٹک رہی ہے دادا؟" وہ سر اُٹھا کے لی مرتبہ درمیان میں بولا۔ "ابھی آگے زبان کھولو۔"

"آگے، آگے کیا زبان کھولے۔" پیرو سٹ پٹا سا گیا۔ "ابھی در رات بھی جانے کو ہے۔ جامنی بائی ایک رات سے بہت بڑا تھا، اپن کتنا چھان کے بولے۔"

"اُدھر جامنی بائی نے تم کو کب دیکھا؟"

"تم کچھ جانتا ہے اُستاد!" پیرو چونک پڑا۔

"آگے بولو، دادا!"

"قسم سے جھل بھائی! اپنے کو بولو، تم جامنی بائی کو جانتا ہے؟"

"کبھی نام سنا تھا۔"

"صرف نام! دیکھنے کی چیز تھا۔ اُودر ممبئی میں اپن نے تم کو پہلی بار دیکھا تو جامنی بائی بہت یاد آیا۔ تم اُس ٹیم ہوتا۔"

"اب وہ کہاں ہے دادا؟" ہلاکو نے بے چینی سے پوچھا۔

پہرے دار ہمارے قریب آتے اور کن انکھیوں سے جھانکتے ہوئے گزر جاتے۔ کل کی طرح اپنے خیموں میں سونے کے بجائے ہمارا الاؤ کے گرد بیٹھے رہنا اُن کے لیے حیرانی کا باعث ہوگا۔ رات آہستہ آہستہ بیت رہی تھی۔ الاؤ کے شعلوں نے کم از کم ہمارے اطراف کی سردی دُور کر دی تھی۔ تاہم ہوا کا کوئی تیز جھونکا چل جاتا تو آگ بھی ٹھٹھرنے سی لگتی۔ سولہ نے دیر ہوئی چائے کی کیتلی انگاروں پر رکھ دی تھی۔ پانی کھولتے کھولتے سوکھ گیا، کسی کو چائے پینے کا خیال نہیں آیا۔ جامو، ملٹو اور مارٹی پیرو کو تکے جا رہے تھے ابھی رات باقی تھی۔ پیرو کہنے لگا کہ اُس وقت جب جامنی بائی دادر کے علاقے میں اڈا جمائے ہوئے تھی اور بے تاج کی رانی تھی، پیرو کا بھی ماہم کے علاقے میں ایک اڈا تھا، زیادہ بڑا تو نہیں مگر آمدنی کے اعتبار سے بڑے اڈوں سے کم نہیں تھا۔ کچھ جوئے خانے اور شراب کی کئی بھٹیاں علاقے میں چلتی تھیں۔ اِدھر اُدھر کے پاڑوں کے آدمی آ کے پیرو کو جامنی بائی کے قصے سناتے تھے۔ پیرو ہاتھ کا سچا تھا۔ ماہم کا اڈا اُس نے اپنے ہاتھ ہی کے بل پر حاصل کیا تھا۔ ممبئی کے اور داداؤں کی طرح پیرو کے دل میں کبھی یہ خیال آتا تھا کہ وہ جامنی بائی کے ہاتھ سے چاقو چھین لے لیکن پیرو اُس کے بہت سے واقعات سن چکا تھا اور جب جامنی نے کبھی اُس علاقے کو نہیں چھیڑا تھا تو اُسے خواہ مخواہ اُس سے بیر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ دوسرے دادا جامنی بائی کو دادر کے علاقے سے بے دخل کرنے میں ناکام ہو گئے تھے۔ شاید اسی لیے اُنھوں نے مشہور کر دیا تھا کہ وہ کالا جادو کرتی ہے۔ پیرو کو ان روایتوں پر یقین نہیں تھا لیکن اگر اس میں ایک فی صد بھی سچائی تھی تو اُسے محتاط رہنا چاہیے تھا۔ پیرو کسی کے اُکسانے میں نہیں آیا۔

اِدھر چند دنوں سے پیرو کے آدمی اُس کے پاس شکایت لے کے آ رہے تھے کہ جامنی بائی کے آدمی اُس کے علاقے میں گھس کے پیسہ بنا رہے ہیں، اور بھی پاڑوں کے داداؤں کو یہی شکایت تھی۔ جامنی بائی کی شہرت کی وجہ سے اُس کے آدمی بے مہار ہوتے جا رہے تھے۔ دادر کے علاقے میں جامنی بائی کے ڈر سے وہ کچھ نہیں کر پاتے تو دوسرے علاقوں میں جا کے لوگوں کو تنگ کرتے۔ اُنھیں معلوم تھا کہ اب کوئی بھی جامنی بائی کے اڈے آنے کی کوشش نہیں کرے گا، سب اُس سے دُور دُور الگ رہنا ہی مناسب سمجھتے ہیں۔ سو کسی کو اُن کی شکایت کی جرأت بھی نہیں ہوگی۔ ہوتا بھی یہی تھا کہ جامنی بائی کی وجہ سے لوگ اُنھیں درگزر کر دیتے تھے لیکن رفتہ رفتہ اُن کا کٹ کھنا پن بڑھتا گیا۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ جامنی بائی خود اپنے آدمیوں کو دوسرے پاڑوں سے چھیڑ چھاڑ کے لیے بھیجتی ہے۔ پیرو کے لیے یہ بات خاصی تشویش کی تھی کہ وہ اُس کے علاقے تک پہنچ گئے ہیں مگر پیرو نے جلدی نہیں کی۔ خود علاقے میں گیا، اُنھیں سمجھایا کہ مان جاؤ۔ وہ پیرو کے منہ لگنے لگے۔ پیرو نے پھر تحمل کیا اور اُسی دن شام کو دادر کے علاقے میں پہنچا اور جامنی بائی کو کہلوایا کہ ماہم کا پیرو دادا ملنا چاہتا ہے۔ جامنی نے فوراً بلوایا۔ پیرو اکیلا پاڑے میں داخل ہوا تو وہ ایک تخت پر بیٹھی تھی۔ پیرو نے اُسے پہلی بار دیکھا تھا۔ پیرو کہہ رہا تھا کہ تخت پر وہ کوئی ملکہ معلوم ہوتی تھی۔ کچھ دیر کے لیے تو وہ بھول گیا کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے، اُسے دیکھتا ہی رہا۔ اُس کا بدن ترشا ہوا تھا، سانچے میں ڈھلا ہوا، گردن لانبی، سر اُٹھا ہوا، قد بڑا، بال کھلے ہوئے۔ گیروے رنگ کی ساڑی سے اُس نے اپنا سارا بدن ڈھانپ رکھا تھا۔ کانوں میں تازہ پھولوں کے گجرے، ناک میں لونگ اور کلائیوں میں چوڑیاں چڑھا رکھی

سوا بدن پہ کوئی زیور نہیں تھا۔ چمکتا ہوا جامنی رنگ، پیرو کے کہنے کے مطابق جیسے کوئی پکی ہوئی جامن شاخ سے توڑی جائے، زمین سے نہ اُٹھائی گئی ہو۔ عمر میں وہ بالکل لڑکی نظر آتی تھی۔ اُس لڑکی کے مانند جس کا شوہر شادی کے فوراً بعد چھن گیا ہو۔ سب سے نمایاں اُس کی آنکھیں تھیں، نیلاہٹ لیے ہوئے سیاہ آنکھیں جو گہری گہری، ڈوبی ڈوبی اور بڑی بڑی تھیں۔ اُن میں چنگاریاں سی لپکتی محسوس ہوتی تھیں۔ وہ بھی پیرو کو دیکھ کے چپ رہی پھر پیرو ہی کو کچھ ہوش آیا۔ سنبھل کے بولا: "جامنی بائی! اپن تم سے کچھ بولنا مانگتا ہے۔"

جامنی مجسمے کے مانند ساکت بیٹھی رہی۔ پیرو نے تلخی سے کہا کہ وہ اپنے آدمیوں کو روک لے۔ جامنی بائی کی آنکھیں کھلی رہیں۔ اُس نے جواب نہیں دیا۔ پیرو کو عجیب سا لگا: "اپن پھر اپنے آدمی اِیدر بھیجے کیا؟ ان کو روک لو جامنی بائی! اپن بھی ان سے اُودر نمٹ سکتا تھا، پر سوچا، پہلے تم کو بول دے۔" پیرو نے اشتعال میں کہا۔

جامنی بائی پیرو کی آواز پر جیسے خواب سے جاگی اور اپنی لانبی لانبی پلکیں پٹ پٹاتے ہوئے آہستگی سے بولی: "دادا! ابھی آرام سے بیٹھو۔" پیرو کہتا تھا کہ اُس کی آواز کھن کھنا رہی تھی۔

پیرو جھجکتے ہوئے ایک طرف بیٹھ گیا۔ جامنی بائی نے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ پیرو کے سامنے اُسی وقت صراحی اور گلاس رکھ دیے گئے۔ پہلی مرتبہ جامنی بائی نے کسی کو اس طرح شراب پیش کرنے کا حکم دیا تھا۔ پیرو نے ایک گلاس پی لیا اور بولا: "ابھی تمھارا کیا جواب ہے جامنی؟"

جامنی نے اپنے پاڑے کے سارے آدمیوں کو اندر بُلا لیا اور پیرو سے پوچھا: "اِن میں سے کون تھا دادا!"

پیرو نے تین آدمیوں کی طرف انگلی اُٹھائی: "ابھی اپن ان کو پہچانتا ہے، اور لوگوں کا اپن کو پتہ نہیں۔"

پیرو نے جن آدمیوں کی نشان دہی کی تھی اُن کے سوا کسی نے واویلا نہیں کیا۔ وہ پیرو کے آدمیوں کو اُلٹا الزام دینے لگے۔ "چپ رہو۔" جامنی نے ہاتھ اُٹھا کے کہا: "اُودر وہ تم کو کھینچ لے گئے تھے کیا؟ تم اِن سے کیوں نہ لڑے؟"

انھوں نے کچھ کہنا چاہا لیکن جامنی بائی کی آنکھوں میں آگ اور ہاتھ میں خنجر دیکھ کے کپکپانے لگے۔ پلک جھپکنے کی دیر تھی کہ جامنی کا خنجر اُٹھے اور اُن میں سے کسی ایک کے سینے میں پیوست ہو۔ خنجر اُس نے اُٹھا بھی لیا تھا مگر کچھ سوچ کے رُک گئی۔ بولی: "ابھی تم اپنا فیصلہ خود کرو۔" تینوں آدمی چند لمحے گم اُس کا چہرہ تکا کیے پھر ایک دم تیزی سے آگے بڑھے اور کتوں کی طرح پیرو کے قدموں [illegible] لپٹ گئے۔

پیرو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے: "ٹھیک ہے جلنی [illegible]" وہ اُٹھتے ہوئے بولا: "اپن اب جاتا ہے۔" پیرو نے کہنے کو [illegible] مگر اُس کا جی وہاں سے جانے کو نہیں چاہتا تھا۔

"بیٹھو دادا! کوئی اور کام ہو تو بولو؟"

"اپن کو اتنا ہی کام تھا۔" پیرو نے مدھم لہجے میں کہا۔

"ابھی اپن اِن کا فیصلہ بعد میں کریں گے۔ اپن کا [illegible] رہ گیا ہے۔" جامنی بائی سرد آواز میں بولی۔

"ابھی اتنا ٹھیک ہے جامنی بائی!"

پیرو کہہ رہا تھا کہ اُس نے اپنے سب آدمیوں کو باہر [illegible] کا حکم دیا۔ صرف وہ لوگ، پیرو اُس بڑے کمرے میں اکیلے رہ [illegible] پیرو اُس کے قریب ایک مونڈھے پر بیٹھا ہوا تھا۔ لوگوں [illegible] کے بعد وہ تادیر کچھ نہیں بولی۔ پیرو بھی خاموش رہا مگر اُسے خاموشی سے جلد ہی اکتاہٹ سی ہونے لگی۔ اُس کا جی چاہا [illegible] جامنی بائی سے اُس کے بارے میں کچھ پوچھے۔ بے شمار سوال [illegible] کے دماغ میں اُٹھ رہے تھے لیکن پیرو زبان بند کیے رہا [illegible] نے پہل کی اور اُس سے ماہم کے علاقے کے متعلق پوچھنے لگی۔ پیرو [illegible] ہوا کہ کہیں جامنی کی نظر اُس کے علاقے پر تو نہیں ہے مگر اُس [illegible] کسی جھجک کے بغیر جواب دیا: "علاقہ چھوٹا پر بھلا ہے۔" پھر [illegible] منہ سے بے اختیار نکل گیا: "کبھی اُودر اپنی طرف آؤ جامنی بائی [illegible]"

"تم بولتے ہو تو ضرور آئیں گے دادا!" وہ شگفتگی سے [illegible]

پیرو اُس سے کچھ اور نہیں کہہ سکا۔ وہ یہاں پہلی بار آیا [illegible] نہ جانے جامنی بائی کیا سمجھتی اور خود اُسے اچھا نہیں لگتا تھا [illegible] علاقے کا دادا ہو کے اُس پر اپنا تجسس ظاہر کرے چنانچہ [illegible] اختصار برتا اور رسمی طور پر جامنی بائی کا شکریہ ادا کر کے چلا [illegible]

پیرو بتا رہا تھا کہ وہ وہاں سے چلا آیا لیکن اپنے پاڑے آنے [illegible] بعد اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے جامنی بائی کی آنکھیں اُس کے [illegible] گئی ہیں اور اُسے گھور رہی ہیں۔ ابھی ایک رات نہیں گزری [illegible] کہ صبح اُسے اطلاع ملی۔ جامنی بائی کے پاڑے کے قریب کو[illegible] کے ڈھیر پر تین آدمیوں کی لاشیں پڑی ملی ہیں، پولیس نے جا[illegible] بائی اور اُس کے پاڑے کے کئی آدمیوں کو گرفتار کر لیا ہے۔ [illegible] کو اس خبر سے دُکھ ہوا۔ یقیناً یہ وہی تین آدمی ہوں گے جن [illegible] بارے میں کل شام جامنی بائی نے کہا تھا کہ ابھی اُن کا فیصلہ [illegible] ہے۔ پیرو دن بھر بے چین رہا۔ وہ تیار تھا کہ پولیس اُسے بھی [illegible] گی۔ پولیس کا کوئی آدمی اُسے بلانے نہیں آیا اور دوسرے دن [illegible]

[illegible] ملی کہ جامنی بائی اپنے ساتھیوں سمیت تھانے سے پاڑے [illegible] آگئی ہے۔ اُس کے تین دن بعد سرِ شام وہ پاڑے میں بیٹھا [illegible] کہ ایک آدمی نے آ کے اطلاع دی: "دادر کا جامنی بائی [illegible] پاڑے کی طرف آرہا ہے۔"

پیرو بہت حیران ہوا، خود دوڑا ہوا پاڑے کے باہر گیا۔ [illegible] بائی تنہا دروازے پر موجود تھی: "دادا! اپن آگئے۔" اُس نے [illegible] لے سے کہا۔

"تم... جامنی بائی!" پیرو وحشت سے بولا: "آؤ، آؤ، اندر آؤ۔ [illegible] اپن کوئی سپنا دیکھتا ہے کہ اپدر کھوپڑی کا کوئی کل اُلٹ [illegible] سا ہے۔"

جامنی بائی کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ سی کھِلی۔ وہ پیرو کے پیچھے اندر آنے لگی۔ پاڑے کے تمام لوگ اُسے دیکھ کے حیرت [illegible] سے اور اُس کی آمد کا مقصد جاننے کے لیے بے تاب۔ اس [illegible] لیے جامنی بائی کے بارے میں کبھی نہیں سُنا گیا تھا کہ وہ کسی [illegible] میں خود آئی ہو۔ وہ کہیں آتی جاتی نہیں تھی۔ پیرو اُسے ایک [illegible] اور صاف کمرے میں لے آیا اور پوچھا کہ وہ اُس کی کیا خاطر [illegible]

جامنی بائی نے کہا کہ اُسے بھیڑ بھڑکا پسند نہیں ہے۔ پیرو نے [illegible] تمام آدمیوں کو باہر نکال دیا: "تم نے بولا تھا، اپن اِدھر آگئے۔" [illegible] دھیمے دھیمے بولی۔

"تم نے اِیدر آ کے اپن کو بہت، بہت خوش کیا۔" پیرو کو مناسب [illegible] نہیں مل رہے تھے: "ابھی بولو، اپن کیا... کیا کرے؟"

"بیٹھے رہو دادا!"

"بیٹھا تو اپن اِیدر ہی ہے۔ پر اپنے کو..."

جامنی نے نظریں اُٹھا کے دیکھا تو پیرو بوکھلا گیا: "اپن [illegible] تم سے ملنے، تم کو دیکھنے آیا ہے۔" وہ ڈوبتی آواز میں بولی۔

"ہو، ہو۔" پیرو پہلو بدلنے لگا: "اپن تمھارے سامنے ہے۔"

"تم اِیدر دادا کیسے ہو گئے؟"

"کیوں، کیوں؟" پیرو کا خون بھڑکنے لگا: "تمھارا مطلب؟ [illegible] یہ سب باپ مرتے ٹیم نہیں لکھ گیا تھا جامنی بائی!"

"جانتے ہیں دادا!"

"پھر تم، تم کیا بولنا چاہتا ہے؟"

"کچھ نہیں دادا!" وہ کسی قدر اُداسی سے بولی۔

"نہیں، تم کچھ بولنا چاہتا ہے؟" پیرو نے تندی سے کہا۔

اُس نے اپنی نظریں جھکا لیں اور بیٹھی جیسے کچھ سوچتی رہی۔ [illegible] نے بھی بات وہیں چھوڑ دی لیکن اُس کا اضطراب سوا ہو [illegible] تھا۔ اُسے کچھ بولنے میں اس لیے دشواری پیش آرہی تھی کہ ابھی تک وہ جامنی بائی کی اچانک آمد کا سبب طے نہیں کر سکا تھا۔ دادر سے چلتے وقت اُس نے رسماً جامنی بائی سے آنے کو کہا اور اُس کا خیال تھا کہ رسماً ہی جامنی بائی نے حامی بھری تھی مگر اب وہ سامنے بیٹھی تھی اور اُس کے بدن سے اُٹھتی ہوئی بھینی بھینی اُبٹن جیسی خوشبو کمرے میں چھا گئی تھی۔ پیرو کا تذبذب بے جا نہیں تھا۔ اُسے اُس کے آنے سے ایک خوشی تھی تو کئی اندیشے بھی لاحق تھے۔ ممکن ہے اُس کا کوئی اور ارادہ ہو اور پیرو کو اپنی مروت کے اظہار پہ بعد میں پشیمانی ہو۔ وہ خواہ مخواہ جامنی بائی سے کوئی کد نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اس چھیڑ کا کوئی جواز ہوتا تو ٹھیک تھا۔ بمبئی میں بہت سے علاقے تھے جہاں جامنی بائی کی طرح دادا پاڑا چلاتے تھے اور بے دلیل ایک دوسرے کے معاملے میں دخل دینا پسند نہیں کرتے تھے لیکن کوئی دلیل پیدا ہونے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ بدنیتی بھی ایک دلیل ہے اور وہ کسی وقت بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ چاقو اور زور بھی ایک دلیل ہے۔ پاڑوں میں یہی ایک دلیل چلتی ہے۔ پیرو کو یہ گوارا نہیں تھا کہ وہ جامنی بائی کو ایک مہمان سے مختلف درجہ دے اور اُس کی خوشنودی کے لیے اپنی طبیعت کے خلاف کوئی بات کرے اور جامنی بائی پہ کوئی ایسا تاثر قائم ہو جیسے وہ کسی دفاعی حالت میں ہے۔ اپنے بارے میں وہ جامنی بائی کے منہ سے کوئی ایسی ویسی بات سُننے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔ جامنی بائی کے بجائے کوئی اور دادا آتا تو پیرو کو اتنی اُلجھن پیش نہ آتی مگر وہ جامنی بائی تھی۔ پیرو کو خود اپنی جانب سے خدشہ تھا۔ اپنے خون کی گرمی سے، اور اُسے یہ گرمی عزیز بھی بہت تھی۔ وہ جامنی بائی کا ارادہ سونگھنے کی جستجو میں تھا اور جامنی بائی تھی کہ آ کے گم صم سی بیٹھ گئی تھی۔

پیرو موضوع بدل کے اُس سے پوچھے بنا اپنے علاقے کے بارے میں بتانے لگا۔ اُسے کچھ جاننا تھا تو اِس کی یہی ایک صورت سمجھ میں آتی تھی۔ وہ بتا رہا تھا کہ اُس کا علاقہ کتنا زرخیز ہے یہاں کے لوگ، مکانات، کاروبار، گلیاں، یہاں کتنی بھٹیاں، کارخانے اور چھپے ہوئے گودام ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ کوئی دادا کسی دوسرے دادا کو اپنے علاقے سے متعلق ایسی باتیں نہیں بتایا کرتا جو پیرو نے اُس سے کہی تھیں۔ پیرو نے اُس سے کچھ نہیں چھپایا، نہ مبالغہ کیا۔ وہ اپنی کش مکش سے جلد از جلد نجات حاصل کرنا چاہتا تھا اور اس دوران وہ پوری طرح کسی بھی بدلی ہوئی صورتِ حال کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ ہر قسم کی صورتِ حال کے لیے۔ کوئی ایسی مغایت نہیں جس میں سبکی کا کوئی پہلو نکلتا، پیرو کو اپنے اس عزم سے طمانیت محسوس ہوئی۔ وہ پیرو تھا، پیرو کی جگہ کوئی دوسرا دادا ہوتا تو شاید یہ

فیصلہ نہ کر پاتا۔ جامنی بائی اُس کے علاقے کا حال سنتی رہی، نہ اُس نے اشتیاق کا اظہار کیا، نہ سردمہری کا، سو پیرو کا تجسس کم نہیں ہوا۔ پھر اُس نے اُن تین آدمیوں کا ذکر چھیڑ دیا جو دو دن پہلے ختم کر دیے گئے تھے۔ پیرو نے کہا کہ وہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔

"اُن کو جانے دو دادا!" جامنی بائی بے دلی سے بولی۔

"پر اپن نے اُن کو معاف کر دیا تھا۔"

"اپن نے نہیں۔" جامنی نے زیرِ لب کہا۔ "ابھی اُن کی بات چھوڑو۔ وہ چلے گئے ہیں۔"

"چھوڑ دو۔" پیرو نے جھٹک کے بولا۔

"ابھی اِدھر کی زندوں کی بات کرو۔"

"جو بولے کرے۔" پیرو نے تیزی سے کہا۔

"ابھی تم سدا کے لیے اِدھر باڑے میں رہنا چاہتے ہو؟"

"ابھی اپن کے ہاتھ پاؤں ایک دم ٹھیک ہیں۔"

اُس نے نظر بھر کے پیرو کو دیکھا اور کہنے لگی۔ "اِدھر تمھارا بہت من لگتا ہے کیا؟"

"لگتا کیا ہے، بس بیٹھا ہے۔"

"تم اس کو بڑھانا چاہتے ہو کیا؟"

"ابھی اپن نے ایسا سوچا نہیں ہے۔" پیرو نے تذبذب سے کہا۔ "پر جامنی بائی! اپن کو بولو، ایسا بولنے سے تم کیا... کیا..."

"سوچتے ہیں تم کو دادا نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

پیرو نے برجستگی سے کہا: "تم کو بھی نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

"ہاں!" جامنی بائی سر جھکا کے بولی۔ "پر اپن دادا ہے۔"

"اور اپن بھی۔" پیرو نے اونچی آواز میں کہا۔

جامنی بائی نے منع کیا تھا لیکن پیرو کے آدمی مٹھائیاں نمکین چیزیں اور چائے وغیرہ لے کے آگئے تھے، پیرو کے کہنے پر اُس نے چند کاجو منہ میں ڈال لیے اور چائے پی لی۔ "ابھی تم کچھ اور پیسے تو لو گے؟" پیرو نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"نہیں دادا!" جامنی بائی مخمور لہجے میں بولی۔

"اپن سوچا پہلے تم سے پوچھ لے۔"

چائے پینے کے بعد وہ پھر کسی سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ آنکھیں نیم وا کیے۔ پیرو کے پاس اب کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ وہ بھی سوچتا رہا اور جامنی بائی کے چہرے پر کچھ تلاش کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ آج بھی وہ گیروا ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ کھلے ہوئے بال اُس نے ایک ربن سے باندھ رکھے تھے۔ کانوں میں جھول کھلے ہوئے تھے، ناک میں سنہری لونگ چمک رہی تھی۔ جامنی رنگ پر اس کی چمک کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ پیرو کہتا تھا کہ جب وہ بات

کرنے کے لیے اپنے لبوں کو جنبش دیتی تو اُس کے سفید دانت موتیوں کے مانند لگتے۔ موتی جو پیازی رنگ کی مخمل میں رکھے ہوں۔ اندر سے اُس کے ہونٹ، اُس کا منہ پیازی رنگ کا تھا، باہر سارا جامنی۔ یکایک جامنی بائی کچھ بے چین سی ہو گئی اور اُٹھتے

"چلتے ہیں دادا!"

"یہ کیا۔ کیا؟" پیرو تعجب سے بولا۔ "اپن اس کو کیا سمجھے، تم نے بولا تھا تو اپن...."

"پر اتنے ٹیم کے لیے نہیں۔ تم کو آئے دیر کتنا ہوا ہے چلنے کو بولتا ہے۔" پیرو الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"پھر کبھی آئیں گے۔"

"وہ ٹھیک ہے۔ سو بار آؤ، ہزار بار آؤ، پر ابھی کیوں جا ہے۔ یوں چلا جائے گا تو اپن سمجھے گا، اپنے سے مہمان کا خیا نہیں ہوا۔ اپن جنگلی ہے۔"

"نہیں پیرو دادا!" وہ بکھری ہوئی آواز میں بولی۔

"پھر کیا ہے، بیٹھو۔ ابھی اپن بیٹھنے کو بولتا ہے جیسا ایدر آ کو بولتا تھا۔" پیرو نے کہا کہ وہ تو کچھ بولی ہی نہیں، وہی سر بے الاپتا رہا ہے۔

جامنی کچھ دیر کے لیے اور بیٹھ گئی اور اس اثنا میں اُ نے پیرو سے آس پاس کے علاقوں کے بارے میں چند باتیں پو کون سا علاقہ کس دادا کے پاس ہے، کیسا ہے۔ پیرو کو ان سوا پر حیرت ہوئی جیسے جامنی کو کچھ معلوم نہیں تھا لیکن وہ اُسے بتا رہا اور اُس نے ان باڑوں سے اپنے تعلقات پر کسی قسم کا تب کرنے سے گریز کیا۔

وہ جانے لگی تو پیرو اُسے دروازے تک چھوڑنے آیا۔ نے ایک آدمی سے کہہ کے اُس کے لیے وکٹوریا منگوائی تھی۔ و میں سوار ہوتے ہوئے جامنی کے ہونٹوں پر لرزش تھی۔ اُس نے پیرو سے پھر کسی دن اپنے باڑے آنے کو کہا۔ پیرو نے وعدہ کی جامنی بائی کے جاتے ہی پیرو کے آدمیوں نے اُسے گھیر لیا اور جا بائی کے آنے کا سبب پوچھنے لگے۔ پیرو کو خود کچھ پتہ ہوتا تو و انھیں بتاتا۔ "سب ٹھیک ہے بابا!" "ظاہر ہے" پیرو کے اتنا کہہ دینے سے وہ مطمئن نہیں ہو سکتے تھے۔

چار دن بعد کی بات ہے کہ پیرو کے باڑے میں ایک اجنبی شخص مٹھائی اور پھلوں کی دو ٹوکریاں لے کے آیا اور اُس نے تنہا میں انھیں صرف پیرو کے حوالے کیا۔ شکل و صورت سے وہ کس باڑے سے متعلق آدمی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ٹوکریاں جامنی بائی نے بھیجی تھیں۔ پیرو نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور تیسرے روز اپنی طرف سے

پھلوں، پھولوں اور مٹھائیوں پر مشتمل چار ٹوکریاں جامنی بائی کو بھیجیں۔ اُس نے بھی اپنے باڑے کے بجائے باہر کا ایک آدمی منتخب کیا۔ باڑے میں کسی کو علم نہیں ہو سکا کہ جامنی بائی کی طرف سے کوئی سوغات آئی ہے اور پیرو نے بھی جواباً اُسے ٹوکریاں بھیجی ہیں۔ جامنی بائی نے انھیں شکریے کے ساتھ قبول کیا اور کہلوایا کہ ہفتے کی شام اپنے باڑے میں وہ پیرو کی منتظر رہے گی۔ بیچ کے دو دن پیرو کے لیے نہایت اضطراب کے تھے۔ جامنی بائی کے پاس دوبارہ جانے کے خیال سے اُس کے دل و دماغ میں عجب عجب احساس جنم لے رہے تھے۔ اس دوران وہ خاکے بناتا، بگاڑتا رہا اور جب ہفتہ آیا، سورج ڈوبنے لگا تو اُس نے دادر کے علاقے کا رُخ کیا۔ وہ اپنے ساتھ کسی آدمی کو نہیں لے گیا تھا۔ جس وقت وہ جامنی بائی کے باڑے میں داخل ہوا، وہ نیلی ساڑی پہنے، ہونٹوں پر ایک ہلکی مسکراہٹ لیے اپنے مخصوص انداز میں دروازے پر کھڑی تھی۔ اُس کی چمکتی نظروں نے پیرو کا طواف کیا اور وہ اسے فوراً اندر لے گئی۔ سارے محل میں کوئی اور شخص نہیں تھا۔ البتہ اوپری منزل پر جامنی بائی کی دو خادمائیں موجود تھیں۔ پیرو ایک صاف ستھرے سجے ہوئے کمرے میں آ کے بیٹھ گیا۔ کمرے کی دیواریں رنگین تھیں۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر ریشمی پردے لٹکے ہوئے تھے۔ کمرے کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی چاندنی کے وسط میں دیوار کے ساتھ ایک مختصر قالین نما گدی بچھی ہوئی تھی اور ایک چھوٹی میز پر صراحی اور گلاس رکھے ہوئے تھے۔ جامنی بائی نے خود اُسے جام بنا کے دیا، اسی وقت گندمی رنگ اور بوٹے قد کی ایک خوب صورت لڑکی زرق برق کپڑے پہنے، گھنگرو چھنکاتی اندر آئی اور اُس کے آتے ہی ہارمونیم اور ستار کی آواز گونجنے لگی۔ سازندے کمرے ہی میں کہیں تھے، نظر نہیں آ رہے تھے لیکن جلد ہی پیرو کو پتہ چل گیا کہ وہ سامنے لٹکے ہوئے دبیز نیلے پردے کے پیچھے موجود ہیں۔ لڑکی نے دونوں کو جھک کے سلام کیا اور رقص کرنے لگی۔ پیرو کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سو رہا ہے اور کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ جامنی بائی ایک دوسرے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے اُس کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ اُسے اس طرح بیٹھا دیکھ کے کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کسی باڑے سے متعلق ہے، الا جا تو اُٹھانا جانتی ہے۔ وہ بس ایک عورت تھی، ایک لڑکی۔ پیرو نے چاہا کہ وہ اُس کے اور قریب ہو جائے، بہت قریب ہو جائے لیکن وہ خود اپنی جگہ سے نہ ہٹ سکا، نہ جامنی کی طرف ہاتھ بڑھا سکا، نہ اُس سے اپنی خواہش کا اظہار کر سکا۔ جامنی بائی کی طرف نظریں اُٹھاتے ہی اُس کا ارادہ متزلزل ہو جاتا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا: "وہ ایک دم رانی لگتا تھا۔ اپن سالا رانی سے کیسے بول سکتا تھا۔"

جامو نے درمیان میں دخل دے کے پوچھا: "دادا! اور تم؟ تم بھی بولو، تم اُس وقت کیسے لگ رہے تھے؟"

پیرو نے آہ بھر کے کہا: "اپن کیا جانے، پر ٹھیک ٹھاک ہی ہو گا۔"

پیرو نے اپنے بارے میں نہیں بتایا تھا کہ وہ خود کیسا معلوم ہو رہا تھا۔ اب بھی اُس کا سرخ و سفید رنگ اُس کے گالوں پر دمکتا تھا۔ اُس کے گھنگریالے بالوں پر ابھی تک سیاہی غالب تھی۔ لگ بھگ بیس سال پہلے کی بات تھی، اُس وقت پیرو کا کیا حال ہو گا۔ قد کا بڑا، کاٹھی کا مضبوط، خط و خال کا تیکھا۔ بڑی آنکھیں، کھلی پیشانی، چوڑے شانے اور اُبھرا ہوا سینہ۔ وہ بھی کوئی شہزادہ معلوم ہو رہا تھا۔ کسی راج کمار سے کیا کم۔ جامنی بائی اپنی جگہ بیٹھی رہی اور پیرو کن انکھیوں سے اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کے حواس میں ایک دھیما دھیما سرور رچ رہا تھا اور وہ یہ سرور توڑنے کے لیے اپنے آپ سے مزاحمت کر رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جامنی بائی کے سامنے مدہوش ہو جائے۔ لڑکی ناچتی رہی۔ جامنی بائی نے ناچ کے دوران اُسے دوسرا جام بنا کے دیا۔ پیرو نے منع نہیں کیا، وہ چسکیاں لیتا رقص دیکھتا رہا مگر اُس کا دھیان رقص میں نہیں تھا۔ وہ مسلسل جامنی بائی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ لڑکی نے ناچ کے دو تین بھاؤ بتائے ہوں گے کہ جامنی نے انگلی کے اشارے سے اُسے روک دیا اور پیرو سے پوچھا کہ کیا رقص جاری رکھا جائے؟ پیرو نے یوں ہی سر ہلا کے انکار کر دیا۔ اس میں اُس کے ارادے کو دخل نہیں تھا۔ پھر خادماؤں نے کھانا لگا دیا۔ کھانوں کی اقسام کم تھیں مگر وہ سب نفاست سے چنے ہوئے تھے اور نہایت لذیذ تھے۔ جامنی بائی اس قدر تکلف سے کھا رہی تھی کہ پیرو کو کہنا پڑا: "ابھی تم تو کچھ کھاتا ہی نہیں۔ ایدر بھی تم سے اپن ہی بولے گا۔"

"کھا رہے ہیں دادا!" وہ متبسم لہجے میں بولی۔

کھانے کے بعد جامنی بائی نے پھر اُس سے پوچھا کہ کب دوبارہ ناچ کا اہتمام کیا جائے۔ پیرو اس سے بات کرنا چاہتا تھا سو اُس نے کہا: "ابھی تمھارا مرضی ہو تو چلے گا۔"

جامنی بائی نے لڑکی کو نہیں بلایا اور اپنے لب بھینچے سی کے بیٹھ گئی۔ پھر وہی خاموشی۔ پیرو کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا کہ وہ کیا کہے، کیا کرے۔ کیا یوں ہی بیٹھا کبھی دیواریں، کبھی جامنی بائی کو گھورتا رہے۔ سکوت کے ایک طویل وقفے کے بعد جامنی کے لبوں میں جنبش ہوئی، اُس کی پلکیں تھرتھرائیں اور اُس کے ہونٹ سکڑنے اور پھیلنے لگے جیسے وہ کسی اذیت میں مبتلا ہو۔ "دادا!" وہ سرگوشیانہ

لہجے میں بولی: "اپن تم سے کچھ بولنا چاہتے ہیں۔"
"اپن کو حکم دو۔" پیرو نے مچل کے کہا۔
"حکم نہیں ہے۔"
"جو بھی بولو اپن سننے کے لیے بے کل ہے۔"
"ابھی اپن تم سے سب بولے دیتے ہیں۔" اس کی آواز سہمی ہوئی تھی۔
"ہاں، ہاں۔"
"پتہ نہیں، تم کیا بولو گے، پر اپن کو اس کی چنتا نہیں ہے۔"
"اپن کے من میں تمہارے لیے بہت جگہ ہے۔"
"اپن نے سوچا، تم سے سب کہہ دیں، کچھ نہ چھپائیں، جو کچھ اپنے پاس ہے، ابھی بول دیں، نہ تم روز ادھر آسکتے ہو، نہ اپن ادھر جا سکتے ہیں۔"
"تم بولو گی تو اپن روز ایدر آئے گا۔"
"اپن کو بھی ادھر آنے کے لیے کسی سے بولنے کی ضرورت نہیں ہے پر ایسا ٹھیک نہیں ہے۔" وہ آہستہ آہستہ بولی۔
"پھر جو ٹھیک ہے وہ بولو۔" پیرو نے بے تابی سے کہا۔
وہ چند لمحے چپ رہی پھر رکی رکی آواز میں بولی: "اپن سدا کے لیے تم کو اپنا اور اپنے کو تمہارا بنانا چاہتے ہیں۔"
پیرو کے کان سن ہو گئے: "جامنی بائی!"
جامنی بائی نے سر جھکا لیا: "اپن کو لاگ لپیٹ نہیں آتی، صاف بول دیے ہیں پر اس کو کچھ اور مت سمجھنا۔ اپن کی ابھی مرضی ہے۔"
"جامنی بائی!" پیرو کی سسکی نکل گئی۔
"تم کو بہت حیرت ہے کیا؟" وہ بولی۔
"نہیں، نہیں۔"
"کیا اپن کے لیے ایسا بولنا ٹھیک نہیں ہے؟"
"کیوں نہیں، کیوں نہیں۔" پیرو نے بدحواسی سے کہا۔
پیرو کا سارا جسم گنگ ہو گیا تھا۔ جو کچھ اس نے سنا تھا، اس کی بازگشت اس کے رگ و پے میں سن سنا رہی تھی۔ اس کے باوجود اسے اپنا سنا ہوا ایک سراب معلوم ہو رہا تھا۔ جامنی بائی کے اظہار میں کوئی بات صراحت طلب نہیں تھی۔ اس نے جو کہا تھا، اس میں کوئی تہ نشیں، کوئی رمز، کوئی آمیزش نہیں تھی۔ اسے صاف سنا، صاف پڑھا جا سکتا تھا۔ وہ دن کی طرح اجلا، رات کی طرح سیاہ تھا، پیرو کو ایسا محسوس ہوا جیسے جامنی بائی نے اسے اٹھا کے آگ میں پھینک دیا ہے۔ اس کے مساموں سے پسینہ رس رہا تھا۔ جامنی بائی نے ایک اضطراری نظر سے اسے دیکھا اور کہنے لگی کہ اسے احساس ہے، ایسا کتنا کتنا بڑا ہے، جو کہہ دیا اس کا لوٹانا کتنا مشکل ہے

لیکن اس نے سوچنے سمجھنے کے چند لمحوں کا عذاب بھگتا ... سود و زیاں کے چند لمحوں کا گناہ بھی کیا ہے۔ اسے معلوم ہے ... کا کہا ہوا ہے، اس کا سنا ہوا نہیں چنانچہ اس کا فیصلہ پیرو کے ... انکار سے مشروط نہیں ہے۔ پیرو کو اختیار ہے کہ وہ اسے تم ... یار دکرے۔ اس کا نہ کوئی دعوا ہے، نہ حکم۔ اسے بے شک ... میں خوشی ہوگی تو انکار میں دکھ مگر جو کچھ اسے ملے گا، وہ ا... قسمت کا لکھا تصور کرے گی۔ اس نے پیرو کو اپنا دیوتا تسلیـ... ہے اور دیوتا کی مرضی اس کی داسی کے لیے ہر حال میں مقد... ہوتی ہے۔ جامنی بائی کہنے لگی کہ زندگی میں پہلی بار اس نـ... سے کچھ کہا ہے اور اس کی التجا ہے کہ پیرو اسے پاڑے ... دادا کی فرمائش سمجھ کے قبول نہ کرے۔ اس نے اپنا سب ... دیوتا کے حوالے کر دیا ہے اور یہ کوئی بھینٹ نہیں جس کے ... دیوتا سے اس کی خوشنودی کا سودا کیا جائے۔ پیرو چاہے گا ... ابھی پاڑا چھوڑ دے گی۔ پیرو کہے گا تو وہ یہیں رہے گی۔ پیر... جھونپڑی میں لے جائے یا کسی محل میں، سینے سے لگائے یا ... سے پاش پاش کر دے لیکن اگر اسے اپنی آرزو کے اظہار کی ... دی گئی تو وہ اپنے دیوتا کے ساتھ کہیں دور جانا پسند کرے ...

پیرو سکتے کی سی حالت میں سنتا رہا۔ اس کے ... سب بہت خواب ناک، بہت عجیب تھا۔ اس دن جامنی ... کے اپنے پاڑے میں آنے کے بعد سے اس نے بہت سے ... بنائے تھے، ان میں ایسا کوئی خاکہ نہیں تھا۔ پیرو کی عمر زیاد... تھی۔ اس مختصر زندگی میں اس پر بہت سے وقت گزرے ... وہ کسی ایسے وقت سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ اس نے زندگ... بہت سے سوالوں کے جواب دیے تھے، یہ سب سے مختلف سو...

"جامنی بائی!" اس نے بہ مشکل اپنے حواس بجا کیے ... آواز میں بولا: "بس کرو، ابھی اپن تم کو کیا بولے۔"
"اپن نے کسی جواب کے لیے تم کو نہیں بولا ہے۔"
"جامنی بائی!" پیرو نے جھپٹ کے اسے اپنے با... میں بھینچ لیا۔ پیرو کہتا تھا کہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے ... تھیں لیکن وہ سب کہیں رکے ہوئے تھے جن کا علم پیرو ... تھا۔ اس رات اس کی آنکھیں پھٹ پڑیں، اس کا سارا ج... گیا۔ جامنی بائی بھی سسک رہی تھی۔ وہ اسے کوئی جواب ... دے سکتا تھا، کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ جامنی بائی نے بہت ... کر دی تھی۔ پیرو کا دماغ ایک اور شخص کے خیال سے لبر... بھی کسی شہزادی سے کم نہیں تھی۔ اس کے سینے میں بھی دل ...

... دھڑکتے تھے۔ پیرو لمحے گن رہا تھا کہ وہ کب آتی ہے۔ پیرو ... اس سے کہا تھا کہ وہ آخری سانسوں تک اس کی راہ تکتا رہے گا۔ ... لڑکی کے گھر والے عزت شان کے لوگ تھے اور وہ اپنی نازک ... بیٹی کے لیے کسی ریاست سے آنے والے ایک راج کمار ... کے خواب دیکھ رہے تھے۔ درمیان میں پیرو نے اس راج کمار کی جگہ ... لی مگر پیرو کے پاس کوئی ریاست نہیں تھی، نہ اس کا کوئی شجرہ ... نہ امتیاز، نہ پس منظر، نہ پیش منظر۔ بمبئی کے تھانوں میں اس ... کا نام سرِ فہرست تھا۔ وہ کئی بار جیل جا چکا تھا، اس کا ہنر صرف ... تھا۔ لڑکی والوں نے اسے مسترد کر دیا لیکن لڑکی نے نہیں۔ ... اپنے گھر والوں کو آمادہ کر رہی تھی اور اس نے پیرو سے کہا تھا کہ ... وہ انہیں منانے میں ناکام ہو گئی تو ایک دن سب کو چھوڑ کے ... اس کے پاس چلی آئے گی اور وہ ایسی ہی تھی۔ پیرو کو یقین تھا کہ ... بدل جائے گی، وہ نہیں بدلے گی۔ اسے ایک دن آنا ہے کیسی بھی لمحے ... ساری زنجیریں، سارے بندھن توڑ کے اپنی منزل، اپنے مرکز پر آ جائے ... پیرو کی ذات میں جذب ہونے اور پیرو کو اپنی ذات میں جذب ... کرنے۔ پیرو اس دن کا بے قراری سے منتظر تھا۔ اس نے جامنی بائی سے ... نہیں چھپایا، سب کچھ کہہ دیا۔ جامنی بائی کی آنکھوں کے سمندر میں ... ڈوب جانے کے لیے تلاطم سا برپا ہوا مگر دوسرے ہی لمحے اس میں ایک ... ٹھہراؤ آ گیا۔ پیرو کو اس تلاطم سے اتنی وحشت نہیں ہوئی جتنی اس ... سکون سے۔ جامنی بائی سر جھکائے خاموش رہی۔

رات گئے پیرو دادر کے پاڑے سے واپس آ رہا تھا تو اس ... کے پیر لڑکھڑا رہے تھے۔ اس کا سارا جسم جل رہا تھا اور سر خالی خالی ... تھا۔ اسی عالم میں کئی دن گزر گئے۔ پیرو جامنی بائی کے پاس نہیں گیا مگر ... جامنی بائی ہر لمحے اس کے سامنے ہی رہی۔ پھر ایک دن شام کو بے ارادہ ... اس کے قدم دادر کے پاڑے کی طرف اٹھ گئے۔ جامنی بائی کے کان ... جیسے اس کی آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔ پیرو کو دیکھتے ہی اس کا سراپا ... کھل گیا اور اس نے والہانہ نظروں سے اس کا استقبال کیا لیکن اس کے ... ہونٹوں پر سکوت کی مہر لگی رہی۔ پیرو اس کے بعد بھی کئی بار اس کے ... پاڑے میں گیا۔ جامنی بائی کی ڈبڈبائی نظریں اس کا سینہ کاٹتی تھیں۔ ... وہ وہاں بیٹھا رہتا تھا۔ چپ چاپ، گم صم اور چلا آتا تھا۔ جامنی بائی کبھی ... اس کے سامنے بیٹھی، کبھی اس کے پہلو میں سمٹی جام بنا کے دیتی رہتی اور ... وہ انہیں حلق میں انڈیلتا رہتا۔ جب جام زیادہ ہو جاتے تو جامنی بائی ... ہاتھ روک لیتی۔ گو پیرو اپنے پاڑے میں کسی کو اطلاع دے کے نہیں ... جاتا تھا مگر جامنی بائی کے ہاں اس کے آنے جانے کی خبر روپوش ... نہیں رہی۔ لوگ چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ وہ ان سے بے نیاز جامنی

بائی کے ہاں جاتا رہا۔ اس کے پاس اس سے کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا تب بھی وہ جاتا رہا۔ اس کے پاڑے کے ساتھی اسے متوحش نگاہوں سے دیکھنے لگے تھے۔ پیرو اب ان سے نہ علاقے کا حال پوچھتا تھا، نہ آمدنی کا حساب لیتا تھا۔ دن بھر یا تو وہ پاڑے کے کسی کمرے میں پڑا رہتا یا پھر کہیں نکل جاتا۔ اس نے پاڑے میں چاقو وغیرہ کی مشق کرانا اور زور کرنا چھوڑ دیا تھا اور سویرے ورزش کرنے کا معمول بھی بھول گیا تھا۔
پیرو کے جسم میں اس کے قبول دھواں سا بھرتا گیا۔ اتنا دھواں کہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا، آخر ایک روز اس نے اس لڑکی کو جامنی بائی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ جامنی نے اس سے کیا کہا ہے، اس نے اس سے کچھ بھی نہیں چھپایا۔ اسے امید تھی کہ وہ لڑکی کیا کہے گی کیونکہ اس کا دل پھول کی طرح نرم، شبنم کی طرح شفاف تھا۔ وہ پیرو کی مسیحا تھی، اس کا مداوا تھی۔ پیرو جب اپنا احوال کہہ کے اس کے پاس سے اٹھا تو اپنے آپ کو بے وزن محسوس کر رہا تھا لیکن وہ تقریباً ایک ہفتے تک جامنی بائی کے پاس نہیں گیا۔ ایک ہفتے بعد جب اس نے دادر کے پاڑے جانے کا فیصلہ کیا تو اس کا خون تیزی سے گردش کر رہا تھا مگر وہ اس کے عزم کی گردش تھی۔ سات دن بعد جامنی بائی نے پیرو کو دروازے پر دیکھا تو اپنے قابو میں نہ رہ سکی، اس کے بازوؤں میں چھپ کے بکھر سی گئی۔ وہ بہت کمزور نظر آ رہی تھی: "ابھی اپن آ گیا ہے۔" پیرو ہانپتے ہوئے بولا۔
"اتنے دن تم کدھر تھے دادا؟"
"اپن اپنے آپ کو بنا رہا تھا۔" جامنی بائی کی آنکھیں جھپکنے لگیں۔ اس کی سمجھ میں پیرو کی بات نہیں آئی تھی۔ پیرو نے اس کے کان میں چپکے سے کہا: "ابھی اپن تم کو ایدر سے لے جانا مانگتا ہے جامنی بائی!"
"دادا!" وہ تڑپ کے بولی: "تم کیا بولتے ہو؟"
"ہاں جامنی بائی! اپن نے بات کر لیا ہے۔"
"کس سے؟"
"اپنے آپ سے اور ابھی اس سے جس کا اپن نے بولا تھا۔ اس نے اپن سے بولا۔ پیرو! جاؤ، جامنی بائی کو لے آؤ۔ اس کو اپن نے ایک دم سب بول دیا تھا، سنتا رہا اور سن کے بولا، اُدر جاؤ، جامنی سے بولو، اپن دونوں ساتھ ساتھ رہے گا۔ نہ مانے تو بولو، ہم اس کی نوکرانی بن کے رہے گا یا اس سے الگ رہے گا۔ پھر بھی نہ مانے تو بولو، اپن بالکل الگ ہو جائے گا۔ اپن نے بولا۔ تم نہیں ہو گا تو ایدر اپنا کیا ہو گا۔ بولا، ابھی تم ایدر سے جاؤ، جامنی بائی ایسا نہیں کرے گا، اپن کو یقین ہے۔"

جامنی بائی کی مبہوت آنکھیں اُس پر مرکوز رہیں۔

"تم نے سُنا جامنی بائی، اپن کیا بولتا ہے؟"

"سُن لیا دادا!" وہ نڈھال ہو کے بولی۔

"بس ابھی تم تیار ہو جاؤ، چاقو اُٹھاؤ۔"

"چاقو!" وہ اچنبھے سے بولی۔

"ہاں جامنی بائی! چاقو۔"

"چاقو کیوں دادا؟"

"ابھی اپن جانتا ہے کہ ایدر دیدر پاڑے کے داداؤں نے تم کو لے جانے کا کوشش کیا تھا اور تم نے بولا تھا، اپن کے ہاتھ سے کوئی چاقو گرا دے تو اپن پھر ایک پل نہیں ٹھہرے گا، اسی کے ساتھ چلا جائے گا۔ ایسا بولا تھا نا؟"

"ہاں، پر تم سے نہیں بولے تھے۔"

"اپنے سے نہیں بولا، ٹھیک ہے پر اپن کو پتہ ہے اور اپن بھی ایک دادا ہے۔ اپن ابھی تمھاری بات پورا کرنے کی کوشش کرے گا۔ تم کو چاقو کے بل پر لے جائے گا اور اپن کے چاقو میں بل نہیں تو سالا تم سے دُور ہو جائے گا، اپنا منہ سدا کو نہیں دکھائے گا۔"

"نہیں دادا! اپن تم سے نہیں لڑ سکتا۔"

"کیوں نہیں لڑ سکتا؟" پیرو تلخی سے بولا۔ "اپنے کو بھیک نہیں چلتا۔" اُس نے تیز و تند لہجے میں جامنی سے کہا کہ اگر وہ چاقو نہیں اُٹھائے گی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اُس نے پیرو کے ساتھ رعایت کی ہے، بخشش کی ہے۔ پیرو ہمیشہ اس میں اپنی سُبکی محسوس کرتا رہے گا۔ زندگی بھر اُسے خلش رہے گی کہ جامنی بائی نے اُسے کسی سبب سے درگزر کیا ہے۔ وہ اپنے آپ سے نگاہ ملا کے رہنا چاہتا ہے، نگاہ چرا کے نہیں۔ اس کانٹے کے ساتھ نہیں کہ بمبئی کے ایک پاڑے کے دادا کی حیثیت سے وہ جامنی بائی کا اہل نہیں تھا۔ کوئی شک نہیں کہ جامنی نے پیرو کو ایک دادا کی صورت میں نہیں دیکھا تھا اور اُس نے صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ پیرو اُسے بھی ایک پاڑے کی دادا نہ سمجھے لیکن اپنی ذات کے سکون، آیندہ دنوں میں جامنی بائی کی نظروں میں اپنی سرخروئی کے لیے پیرو اُس سے چاقو اُٹھانے کا مطالبہ کر رہا تھا۔

جامنی بائی ششدر کھڑی تھی۔ اُس نے شدت سے انکار کر دیا اور بولی کہ یہ پیرو کا ہذیان ہے۔ کیا اُس نے اُس لڑکی سے بھی جس کی اجازت لے کے وہ جامنی بائی کے پاس آیا ہے، اِسی طرح کا کوئی مطالبہ کیا ہے۔ اگر پیرو نے اُس لڑکی سے کچھ نہیں کہا اور اُسے جوں کا توں قبول کیا ہے تو جامنی بائی کے سلسلے میں اُس کی یہ خواہش کیوں ہے۔

"وہ جامنی بائی نہیں ہے، پاڑے میں نہیں ہے۔" پیرو نے جھنجلا کے کہا۔ "اُس نے پہلے کسی کو ایسا نہیں بولا۔ جیسا جامنی نے بولا تھا۔"

"دادا! اپن تم سے نہیں لڑ سکتے۔" جامنی بائی ناتوانی سے بولی۔

پیرو نہیں مانا، کہنے لگا کہ جامنی بائی کے انکار کے معنی کے سوا کچھ نہیں کہ وہ پیرو کی شکست سے ہراساں ہے۔ اُسے یقین ہے کہ پیرو اُس پر قابو نہیں پا سکتا۔ پیرو کے لیے یہ صورتِ حال عذاب سے کم نہ تھی کہ اُس کے بارے میں ایسا سمجھا جائے۔

"پھر تم سمجھو اپن جو بولے تھے، اُس کو واپس لیتے ہیں۔ اُسی چھوکری کے پاس چلے جاؤ۔ اپن کا دھیان چھوڑ دو۔ اپن تم کو بھول جائیں گے۔" جامنی بائی شکست خوردہ لہجے میں بولی۔

پیرو نے کہا کہ اس طرح وہ اُس کے شبہے کی تصدیق کر رہی ہے۔ وہ پیرو کو رُسوا کرنا نہیں چاہتی مگر پیرو کے لیے اس سے بڑی رُسوائی کوئی نہیں کہ جامنی اُس کے خیال سے چاقو اُٹھانے سے باز رہے۔ "اپن جانتا ہے تم ایسا کیوں بولتا ہے۔ پھر تم ہم کو ابھی پیرو مت جانو، ما ہم کے پاڑے کا دادا جانو جو پچھلے کی طرح تمھارے پاڑے میں چاقو چھونے آیا ہے۔" اُس نے اشتعال میں کہا۔

"ایسا مت بولو۔" جامنی بائی ترشی سے بولی۔

پیرو ضد کرنے لگا۔ وہ ہم سے پوچھ رہا تھا، بتاؤ میں ایسے کیسے لے جاتا۔ پیرو کے احساسات سمجھنا ہمارے لیے دشوار نہیں تھا۔ پیرو نے اپنی زبان سے نہیں کہا لیکن اُسے بہت احساس ہوں گے۔ دوسرے پاڑوں کے داداؤں کا اور سب سے زیادہ اپنے آزار کا۔ وہ اُس عورت کو کیسے گھر لے جا سکتا تھا جس پر کلی اختیار کا اُسے اعتماد نہ ہو۔ اگر جامنی بائی پیرو کے بیان کے مطابق اُسی کے خیال سے پہلو تہی کر رہی تھی تو پیرو کے لیے ہمیشہ کا تازیانہ تھا۔

جامنی اُس سے التجا کرتی رہی لیکن جتنا وہ التجا کرتی، پیرو کا اصرار اتنا ہی بڑھتا جاتا اور جب جامنی بائی نے یہ محسوس کیا کہ اُس کا اکراہ پیرو کے لیے اُلٹا مہمیز کا کام دے رہا ہے تو اُس نے خاموشی اختیار کر لی۔ پیرو کہتا تھا کہ اُس وقت اُس کے چہرے پر گھٹا سی چھائی ہوئی تھی اور اُس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر اُس پر سناٹا طاری رہا۔ "ٹھیک ہے دادا!" وہ شکستہ لہجے میں بولی۔ "جیسا تم بولتے ہو، ٹھیک ہے۔"

پیرو نے آگے بڑھ کے اُسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ "جامنی بائی!" اُس نے رُندھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ابھی تم سمجھو … کیوں مانگتا ہے۔"

جامنی بائی کا سراپا اُس کی آغوش میں پھڑکتا رہا۔ پیرو نے … کی۔ اُسے خدشہ تھا، جامنی بائی اپنا ارادہ نہ بدل دے۔ "… کے سارے آدمی کو بلا لو۔" اُس نے جامنی بائی سے کہا۔

"… اُن کو کیوں دادا؟" جامنی بائی کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

"اپن چاہتا ہے، وہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اپن … تمھاری ماں کی، تمھارے بھگوان کی سوگند دیتا ہے اگر … چاقو میں کوئی چوری کیا، اپن کا دھیان کیا۔ پھر اپن چھاتی … کو آنا ر لے گا، سمجھا!"

صبح قریب ہی تھی۔ ہمارے اِرد گِرد چکر لگاتے ہوئے پہرے دار … لمحے کے لیے بھی نہیں بیٹھے تھے۔ نہ صرف وہ بلکہ اُن سے … لوگ بھی۔ اُن میں سے شاید کوئی نہیں سویا تھا۔ فاصلے فاصلے … الاؤ جل رہے تھے اور اُن کے اطراف بیٹھے ہوئے منتشر آدمیوں … ہتھیار اپنے ہاتھوں میں تیار رکھے تھے۔ پیرو سانس لینے کے لیے … تھا۔ ہم سب کی نگاہیں اُسی کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔ پچھل … بھی اُسی کی جانب تھا۔ ہر شخص دم بخود سا تھا۔ جامنی بائی … شکل و صورت پیرو نے بیان کی تھی، اُسے سُن کے سبھی کے … دل اُسے ایک بار دیکھنے کی خواہش جاگی ہوگی، ضرور پچھل … میں بھی۔ دیر ہوگئی تو جامو نے پیرو کو ٹوکا۔

پیرو نے اپنا بھاری سر ہلایا۔ باتیں کرتے کرتے اُس کا منہ جیسے سوکھ … بہکی بہکی آواز میں کہنے لگا کہ تھوڑی دیر میں جامنی بائی کے حکم پر … کے پاڑے کے سارے آدمی اکٹھے ہو گئے۔ اس دوران وہ … اپنے آپ میں گم بیٹھی رہی۔ پیرو اُس کے پاس تخت … دوسرے سرے پر تھا۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو وہ تخت … اُترائی۔ پیرو بھی اُس کے پیچھے پیچھے بیچ میں کھلی ہوئی جگہ پہنچ … جامنی بائی نے ساڑی کا پلو کمر سے باندھ لیا اور اپنے بکھرے … بالوں کی لٹوں میں گرہیں لگا دیں، سر کو کئی جھٹکے دیے اور اُلٹا … اُس جانب بڑھا دیا۔ پاڑے کے ایک آدمی نے فوراً چاقو … اُچھالا۔ جامنی بائی نے پھرتی سے اُسے اُچک لیا۔ چاقو … آتے ہی اُس کے سراپا میں ایک جھرجھری سی پیدا ہوئی … اپنی بڑی بڑی آنکھیں چند لمحوں کے لیے بھینچ لیں۔ اُس … میں جوار بھاٹا سا اُٹھ رہا تھا۔ آنکھیں کھول کے اُس نے … ایک نظر دیکھا۔ پیرو کو ایسا لگا جیسے اُس کی آنکھوں میں آگ بھڑک رہی ہے۔ "دادا!" اُس نے لرزیدہ آواز میں اُسے مخاطب کیا۔

"جامنی بائی!" پیرو نے وارفتگی سے کہا۔

مگر جامنی اُسے مخاطب کر کے رہ گئی۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹی اور یکایک اُس کے بدن میں ایک بجلی سی چمکی یا کوئی شعلہ سا لپکا۔ اُس کے پیچھے ہٹتے ہی پیرو نے بھی اپنا چاقو تان لیا۔ چشم زدن میں وہ دونوں آمنے سامنے تھے۔ پیرو کی نظر اُس کے چاقو سے بندھی تھی۔ اُس نے سُن رکھا تھا کہ جامنی بائی کی آنکھیں اُس کے مقابل کو متزلزل کر دیتی ہیں۔ یہ آنکھیں پیرو کے لیے اجنبی نہیں تھیں۔ وہ ان میں جھانکتا رہا تھا لیکن آنکھیں ہی نہیں، جامنی بائی کے سارے بدن سے چنگاریاں اُٹھتی محسوس ہوتی تھیں۔ پیرو کو اپنی توجہ مرکوز کرنے میں کسی قدر مشکل پیش آئی۔ اُسے اس بات کی خوشی تھی کہ جامنی کے ہاں اُس کے لیے رعایت کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے گویا اُس نے اُس کی دی ہوئی قسم کا پاس کیا ہے۔ یہ دیکھ کے پیرو کی رگوں میں دوڑتا ہوا خون اُبلنے لگا اور اُسے جامنی بائی کے دو تین ہی پینتروں سے اُس کے متعلق سُنی ہوئی روایتیں جھوٹ نظر آئیں۔ وہ نہ کسی جادو کا کرشمہ تھا، نہ اُس کی شرربار آنکھوں کا شعبدہ۔ وہ سب جامنی بائی کے چاقو کا تماشا تھا کہ اُسے چاقو تھامنا آتا تھا۔ پیرو نے بہت سے لوگوں کو چاقو اُٹھاتے، چاقو تولتے دیکھا تھا مگر جامنی بائی کا انداز سب سے جُدا تھا۔ وہ اپنے مخالف کو اپنے ممکنہ داؤ کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتی تھی۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر، ایک پل میں اِس بازو، دوسرے پل میں اُس بازو، اس کا بدن ہوا کے مانند تھا، سمندر کی اُٹھتی ہوئی لہر، پھرکی کی طرح۔ پیرو کو ابتدا ہی میں اندازہ ہو گیا کہ درمیان میں سوچنے کا کوئی لمحہ ملنا دشوار ہے سو جامنی بائی کا چاقو منتشر کرنے کی ایک ہی صورت اُس کے ذہن میں آتی تھی کہ وہ خود اُسی کا تیور اختیار کرے۔ اُسے اپنے داؤ کی آہٹ کا احساس نہ ہونے دے جیسا کہ جامنی بائی کا طریقہ تھا۔ جامنی بائی کا یہ طریقہ کوئی حربہ یا ہتھکنڈا نہیں تھا۔ چاقو پر پیرے ہوئے ہاتھ اور جسم کی قابو یافتگی کے اعتماد کے بغیر ایسا ممکن نہیں تھا۔ پیرو کی خواہش تھی کہ جو کچھ ہونا ہے، جلد سے جلد ہو جائے، دیر تک آمنے سامنے رہنے کی نوبت نہ آئے۔ وہ شروع ہی سے جامنی بائی کی کلائی پکڑنے کی فکر میں تھا۔ جامنی بائی نے اپنا ہاتھ اُس کے قریب نہیں پھٹکنے دیا اور پیرو پہلے ہی مرحلے میں اِدھر اُدھر سے بڑھ بڑھ کے جھپٹ جھپٹ کے اُسے دفاعی حالت میں لانے کی کوشش میں ناکام رہا۔ ظاہر ہے، پیرو نے اپنے جسم، دماغ

اور چاقو کی تمام صلاحیتیں آزما کے دیکھی ہوں گی۔ وہ بتا رہا تھا کہ جامنی بائی ہر مرتبہ اُس کے زغے سے پھدک کے نکل جاتی اور آناً فاناً پینترا بدل کے اُس پر جھپٹتی۔ پیرو کسی نہ کسی طرح، کبھی جھک کے، کبھی تیورا کے، کسی طرف لپک کے اور اپنے آپ کو اچانک سمیٹ کے اُس کا وار اکارت کر دیتا اور پھر اُسی کی تدبیر پر عمل کرتا کہ پلک جھپکتے میں چاقو تانے اُس پر اُٹھتا، بڑھتا اور دُرانہ اُس پر چھانے کی کوشش کرتا۔

جامنی بائی کے لیے پیرو جیسے کسی شخص کا تجربہ نیا ہو گا۔ ہم نے بمبئی اور کلکتے کے پاڑوں میں اُسے اپنے آدمیوں سے بارہا زور آزمائی کرتے دیکھا تھا۔ اب بھی اُس میں ایسی پھرتی تھی تو جوانی کے وقت کیسی ہو گی۔ اب کی نسبت جب ایک ہی فرق ہو گا کہ پیرو کے ہاتھ میں گرمی کے ساتھ دماغ میں گرمی زیادہ ہو گی جو جھل کے نزدیک ایک نامناسب بات تھی۔ اُس نے کئی بار مجھے تاکید کی تھی، لاڈلے، چاقو اُٹھاتے ہوئے سر الگ رکھنے کی کوشش کرنا۔ خون کی گرمی کے اثر سے سر دُور ہی رکھنا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں کہ آدمی اپنے جسم کی کھولتی ہوئی گرمی گردن سے اوپر نہ بڑھنے دے۔ جھل کا مطلب یہ نہیں تھا کہ سر برف کے مانند منجمد ہونا چاہیے۔ اُس کی مُراد یہ تھی کہ سر میں حبس نہ ہو، کھلا ہی رہے تو بہتر ہے۔ پیرو کو بھی یہ بات معلوم ہو گی۔ اُس نے ماہم کا پاڑا یوں ہی حاصل نہیں کر لیا تھا۔ بہت سے آدمیوں میں وہی آدمی اڈے کا مالک بنتا ہے جس کے جسم اور سر میں توازن ہو اور اس لحاظ سے جامنی بائی بمبئی کے ایک پاڑے کی دادا تھی اور اُس نے کئی پاڑے یوں ہی لوگوں کے سپرد کر دیے تھے۔ وہ بھی اس توازن سے ناآشنا نہ ہو گی۔

اُنھیں دس منٹ سے زیادہ گزر گئے تھے۔ مشہور تھا کہ جامنی بائی کو چند ہی لمحے لگتے ہیں۔ اُس کے آدمی چاروں طرف دم سادھے کھڑے تھے۔ بیچ میں پیرو کو ایک بار شبہ ہوا تھا کہ جامنی بائی اُس کے ساتھ رعایت تو نہیں برت رہی ہے مگر پھر خود ہی اُسے اس وہم کی تردید کرنی پڑی۔ کوئی پل ایسا نہیں گزرا تھا جب جامنی بائی نے اُس کے وار سے بچنے یا اُس پر وار کرنے کا موقع کھویا ہو۔ دونوں پسینے میں شرابور ہو گئے تھے۔ پیرو اُسے اور تھکا دینا چاہتا تھا کہ اس صورت میں شاید کوئی وار کارگر ہو جائے۔ دونوں ایک دوسرے پر چاقو کا کوئی نشان ڈالنے سے بچ رہے تھے اور ایک دوسرے کو گڑبڑا دینے کے خیال سے چاقو کی بھبکیاں دے رہے تھے۔ دونوں میں سے کوئی اپنی اس تگ و دو میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ گڑبڑا کے کوئی بھی چاقو نہیں چھوڑ دیتا۔ چاقو ہر حالت میں ہاتھ سے چپکا رہنا چاہیے۔ ہاں کوئی چارہ نہ رہے تو دوسری بات ہے۔ جو گڑبڑا کے چاقو چھوڑ بیٹھتا ہے، جھل کے کہنے کے مطابق اُ چاقو نہیں تھامنا چاہیے پھر اُسے چاقو تھامنا نہیں دوسرے کو متذبذب کرنے یا بوکھلا دینے سے اُن کا کسی بہتر داؤ کے لیے راہ ہموار کرنا تھا۔ ٹانگ اَڑا کے، بازو سے قینچی ڈالنے، توازن بگاڑنے اور کسی خاص جگہ پکڑنے وغیرہ میں کامیابی حاصل کرنا جو ابھی تک ممکن نہیں جامنی بائی، پیرو سے وزن میں بہت کم ہو گی۔ کلائی بھی کی طرح مضبوط نہیں ہو گی۔ پنجے کی پکڑ بھی پیرو کے م کم زور ہونی چاہیے لیکن کمزوری اور مضبوطی کا تعلق داؤ والوں سے ہوتا ہے۔ صحیح رگ اُنگلی کی زد پر آ جائے تو بھی تڑپنے لگتا ہے۔ جامنی بائی کو اپنی گرفت کا کوئی ہو گا جبھی وہ آس پاس کے پاڑوں کے داداؤں سے زو ہوئے نہیں جھجکتی تھی۔ ہر طرف دائرے کی شکل میں کھڑے کے بیچ میں کھلی جگہ زیادہ بڑی نہیں تھی۔ پیرو متعدد مرتبہ پھر کتا، پھڑپھڑاتا، بڑھتا تا کہ کسی ایک گوشے میں جا جگہ تنگ ہو جائے اور اُس پر ہاتھ ڈالنا آسان ہو جا اُس تنگ گوشے میں آنے سے پہلے ہی اُس کے ب طرح نکل جاتی تھی۔ اُس کے بدن میں بے حد لچک تھی ہونے، اپنے آپ کو تہہ کرنے میں اتنی دشواری نہ جتنی پیرو کو ہوتی تھی۔ دونوں کے بیچ دیر تک چو ہوتا رہا۔ پھر معاً پیرو کے ذہن نے کروٹ سی بدل یا میں اُمید کی کرن پھوٹی۔ اُس نے کسی تاخیر کے بغیر اُس کا ارادہ کر لیا۔

اُس نے طے کیا تھا کہ اب کے جب جامنی ہوئے اُس پر لپکے تو وہ اِدھر اُدھر بچنے کے بجائے ایک جامنی بائی کے قریب آنے پر ہی اُس کا بیٹھنا سود مند زیادہ ہوتا تو وہ اُس کی طرف بڑھتے بڑھتے پلٹ جاتی جانے پر اُس کے لیے پلٹنا بہت وقت طلب تھا میں پیرو پر ٹوٹ جاتی۔ اس گڑبڑاہٹ کے دوران اُس پیرو کے جسم کے کسی حصے پر لگ سکتا تھا اور اُس کا پنجہ کے قبضے میں آ سکتا تھا۔ خود جامنی بائی کے لیے اتنے کم سنبھلنا اور سنبھل کے پیرو کا پنجہ پکڑنا ممکن نہیں تھا ہونے کے باوجود اتنی جلد ارادہ بدلنے کا امکان سو ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اب تک وہ ایک دو ٹالتے رہے تھے۔ اس بار بھی پیرو پر جھپٹتے وقت جامنی ہو گی کہ پیرو کسی جانب بچ نکلے گا۔ پیرو کا یہ اقدام جا

ں دَور دَورہ تک نہیں ہو گا کہ وہ یوں اپنے آپ کو خطرے ال دے گا۔ یہ ایک طرح کی دحشت تھی مگر جسے دیکھ کے خود ست پٹا سکتی تھی۔ بہر حال پیرو اس موقع کی تاک میں ں ہی جامنی بائی اُس کی طرف تیزی سے بڑھتی ہوئی آئی، نے چند قدم پیچھے ہٹ کے پہلے تو اُسے یہ تاثر دیا کہ وہ اُس نہ وار سے بچنے کے لیے تیار ہے لیکن... جیسے ہی جامنی اُس کا فاصلہ ایک گز سے قریب رہ گیا تو دفعتہً وہ بیٹھ گیا۔ نے اپنے دونوں ہاتھ کھلے رکھے تھے اور اُس کا خیال تھا کہ ت پڑی تو وہ اپنا چاقو بھی چھوڑ دے گا۔ جامنی بائی بیچ میں پیرو کے جسم سے تیزی سے ٹکرائی مگر ابھی پیرو ہاتھ اُٹھا کے ا بازو یا کلائی پکڑ بھی نہیں پایا تھا کہ وہ اپنے بدن کی پوری ن سے اوپر اُچھلی اور پیچھے پیرو کے دوسری جانب لوٹ گئی، پر دو ایک قلابازیاں کھاتی ہوئی وہ کچھ دُور جا کے کھڑی ہو گئی۔

پیرو کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے دھند سی چھا گئی وہ جلد ہی اپنی جگہ سے اُٹھ کے کچھ پیچھے آ گیا اور اِس سے ر اب جامنی بائی اُس پر لپکتی، وہ ترچھا ہو کے، ایک ہاتھ بڑھا، ناک کی سیدھ میں کیے چند قدم جست لگا کر پھر جامنی کے قریب ائی اور بات اِس کے سوا اُس کے دماغ میں نہیں آ رہی تھی کہ منی بائی کا اور اپنا فاصلہ کم سے کم رکھے۔ اُس نے کچھ ایسا محسوس ا کہ جامنی بائی فاصلہ کم رہنے سے کترا رہی ہے۔ اگر یہ اُس کا ہی تھا، تو بھی اب زیادہ دیر تک پیرو یہ آنکھ مچولی جاری رکھنے نہیں تھا۔ فاصلہ کم ہونے پر جلد سے جلد کوئی نتیجہ برآمد ہونے تھی۔ اِدھر یا اُدھر، جو کچھ بھی ہو۔ پیرو کا چاقو والا ہاتھ اپنے دراز رہنے کی وجہ سے جامنی بائی دائیں بائیں ہو کے اُس ر اُچکنے کی کوشش کرتی یا پہلو سے بچ نکل کے پیرو کو پھر پر مجبور کر دیتی۔ پیرو کی خواہش تھی کہ جامنی بائی اس موقع سے اُٹھائے اور اُس کے پنجے پر جھپٹا مارے۔ بس یہیں سب رہا تھا کہ وہ جامنی بائی سے پنجہ چھڑا لیتا ہے اور خود اُس قبضے میں کر لیتا ہے یا نہیں۔

پیرو کی نگاہیں چاقو پر جمی ہوئی نہیں تھیں کیونکہ اُس کی ت نہیں تھی۔ جامنی سامنے سے اُس کے اُٹھے ہوئے ہاتھ چاقو کی نوک پر آنے سے تو رہی اسی لیے پیرو اس طرف بے فکر تھا اور سامنے دیکھنے کے بجائے اِدھر اُدھر جامنی بائی ل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا اور ہر قسم کی صورتِ حال لیے مستعد تھا۔ جامنی بائی اُسے بڑھتا ہوا دیکھ کے فوراً ہی جانب ہوئی، پھر دائیں جانب۔ ایک آن میں اُس نے کئی پینترے بدلے۔ پیرو نے اپنا ہاتھ سیدھا ہی رکھا اور اس طرح جامنی بائی کو کوئی رائے قائم کرنے پر آمادہ کرنا چاہا۔ جامنی کے لیے اس میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ کسی طرف بھی ہو سکتی تھی مگر پیرو کا اس انداز میں چاقو اُٹھائے، ہاتھ پھیلائے رکھنا اُسے شک میں ڈال سکتا تھا۔ وہ پیرو کے انتہائی بائیں جانب ہو گئی۔ نتیجتہً پیرو کو بھی رُخ بدلنا پڑا لیکن اُس نے اپنا ہاتھ ویسے ہی پھیلائے رکھا۔ جامنی بائی اِس اثنا میں بڑھ چکی تھی۔ پیرو نے رُخ بدلنے میں دانستہ دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ اُدھر سے بڑھی، اِدھر سے پیرو پلٹ کے جامنی کے سامنے ہو گیا۔ جامنی بائی اتنی تیزی میں تھی کہ پیرو کو اپنا ہاتھ کھینچنے کی مہلت نہیں ملی، وہ عین اُس کے مقابل آ چکی تھی اور چاقو ٹھیک اُس کے سینے میں پیوست ہوا، دوسرے ہی پل وہ پیرو کے بازو پر جھول رہی تھی اور پیرو کا سارا جسم چکرا رہا تھا۔

وزیرا اور مارٹی کی سسکیاں نکل گئیں۔ سبھی پتھرائی ہوئی نظروں سے پیرو کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ پیرو کا سر جھکا ہوا تھا اور اُس کا جسم ایک ڈھیر لگ رہا تھا۔ کسی کو کچھ اور پوچھنے کی ہمت نہیں پڑی۔ جھل بھی گم صم بیٹھا تنکوں سے آگ کرید رہا تھا۔ خاصی دیر بعد جامو نے جھجکتے ہوئے زبان کھولی۔ "دادا! پر، پر ایسا کیسے ہو گیا؟" اُس کی آواز حلق میں اٹک رہی تھی۔

"ہو گیا جانی! سب ایسا ہی ہوا۔" پیرو بھاری لہجے میں بولا۔

"جامنی بائی اپن سے مسخری کر رہا تھا۔ وہ سب ممول تھا جامو! اپن سالا سمجھتا تھا، اپن جامنی بائی کو نچاتا ہے، وہ اُودھر اپنے کو نچاتا تھا۔ اتنے آدمیوں کے بیچ اپنے پیرو کو ذلیل کرنا نہیں مانگتا تھا۔ اتنا ٹیم اُس نے اپن کے لیے لیا تھا۔"

"نہیں دادا!" جامو منتشر لہجے میں بولا۔

"اپن نے آخری ٹیم اُس کا مسکان دیکھا تھا۔ وہ اودھر اپن کے بازو پر ہی پڑا تھا۔ ہنستا ہوا بولا، اپن ہار گئے دادا! اپن سے کچھ نہیں بولا گیا۔ بولا تو وہ کان بند کر چکا تھا۔ تم سمجھتا ہے جامو اُستاد! اپن نے پلٹنے میں دیر کی کہ اُودھر سے وہ چل پڑا تھا۔ وہ جان کے چل پڑا تھا جامو! وہ چاہتا تو کسی اور طرف کو جا پڑتا۔"

پیرو ٹھیک ہی کہتا تھا، جب اُس نے جامنی بائی سے وار کیا تھا تبھی جامنی بائی نے یہ طے کر لیا ہو گا۔ جامو نے اُس سے کچھ اور نہیں کہا۔ پیرو کی آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں۔ اُس نے درمیان میں جس لڑکی کا ذکر کیا تھا، اُس کا نام نہیں بتایا، نہ کسی نے پوچھا مگر میں اور جھل اُسے دیکھ چکے تھے۔ وہ گیتا کی ماں کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔

الاؤ میں آگ دہک رہی تھی۔ آگ دھیمی ہو جاتی تو لکڑیاں اور پھونک دی جاتیں، رات بھر آسمان صاف رہا اور تارے ٹمٹماتے رہے اور پہرے دار ہمارے اطراف چکر لگاتے رہے۔ اندھیرا دُھندلا ہو تو رہا تھا۔ سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ یوں بیٹھے بیٹھے نہ جانے کتنا وقت اور بیت گیا کہ سورج کی پہلی کرن نمودار ہوئی۔ جانگ قبیلے کے آدمیوں نے فوراً جھول داریاں لپیٹنی شروع کر دیں اور اُن کے کچھ آدمی ناشتہ تیار کرنے میں مصروف ہو گئے۔ باقی سب ہمارے قریب ہی منڈلاتے رہے۔

اندھیرا پوری طرح چھٹ چکا تھا کہ اُنھوں نے ہمیں آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ ابتدا میں اُن کی رفتار تیز تھی، رفتہ رفتہ سست ہوتی گئی۔ گزشتہ دو دن میں وہ مسلسل چلتے رہے تھے یا جاگتے رہے تھے۔ جس رفتار سے وہ فاصلے طے کر رہے تھے، دوبگ بستی تک پہنچنے میں مزید ایک دن اور لگ سکتا تھا۔ تشانم اباجان کے ساتھ تھی۔ دونوں کی آنکھوں سے عیاں تھا کہ رات بھر خیمے میں کروٹیں بدلتے رہے ہیں۔ ہم نے اپنے تھیلے بھی یاکوں پر ڈال دیے تھے۔ دھوپ نکلنے سے سردی کچھ کم ہو گئی تھی۔ آگے اونچائی ہی اونچائی تھی۔ اونچائی پر مسلسل نہیں چلا جا سکتا۔ چنانچہ وقفے وقفے سے سب دم ضرور لیتے تھے۔ اب یہ وقفے پہلے سے طویل ہو گئے تھے۔ آگے جا کے اُن کی رفتار کچھ اور سست پڑ گئی اور ہم ایک اونچا پہاڑی راستہ طے کر کے پھر نیچے اُترنے لگے اور ایک مختصر وادی میں آ گئے۔

ابھی دوپہر نہیں ہوئی تھی کہ کھانا کھانے کے لیے وہ یہیں ٹھیر جاتے حالانکہ وادی نہایت خوب صورت تھی، چاروں طرف پہاڑ کے بیچ میں کسی بڑے کٹورے کی ہینڈی کے مانند۔ بڑے بڑے تودے پہاڑوں سے ٹوٹ کر کبھی نیچے آ گئے ہوں گے۔ جگہ جگہ وہی بکھرے ہوئے تھے۔ پانی کی افراط تھی۔ اُوپر سے گرتے ہوئے چشموں نے نشیب میں ایک جھیل سی بنا دی تھی۔ پتھروں کی وجہ سے درخت زیادہ نہیں تھے۔ کہیں کہیں اُن کے ساتھ ملی ہوئی جھاڑیاں زمین سے پھوٹ آئی تھیں۔ ہم سب ایک دوسرے کے آگے پیچھے تھے، اباجان اور تشانم سب سے پیچھے۔ ہمارے تینوں قلی یاکوں کے ساتھ تھے، تقریباً سارا سامان یاکوں پر لدا ہوا تھا۔ جینی اور پلٹو ہم سب سے آگے تھے، زیادہ دُور نہیں جانگ قبیلے کے آدمیوں کی نگہداشت کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ہمارے ہتھیار بھی جیبوں میں پڑے ہوئے تھے اور بندوقیں شانوں پر لٹکی ہوئی تھیں۔ وادی کے درمیانی حصے میں آتے ہی یکایک جینی

اور پلٹو کی زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں [illegible] انھی کی طرف دیکھنے لگے۔ ابھی ہم کچھ سمجھنے کی کوشش کر [illegible] کہ اچانک پلٹو نے جینی کو کمر سے اُٹھا کے زمین پر پٹخ دیا [illegible] نکال لیا اور اس پر ٹھوکریں مارنے لگا۔ ہم سب اُنھی کی طرف [illegible] جینی بُری طرح چیخ رہا تھا۔ تنجل نے پلٹو کا چاقو والا ہاتھ [illegible] ہم سب جھک کے جینی کو دیکھنے لگے، وہ زمین پر ٹانگیں پٹخ [illegible] مار رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے جانگ قبیلے کے سارے آدمی ہماری [illegible] پڑے اور ہمارے گرد اُن کا ایک گھیرا سا بن گیا۔ ہر شخص [illegible] کے جینی کو دیکھنا چاہتا تھا۔ وادی میں شور مچ گیا تھا [illegible] کو پکڑ کے اُٹھایا۔ تنجل نے پلٹو کو الگ پکڑ رکھا تھا اور پلٹو [illegible] سے گالیاں اُبل رہی تھیں۔ تنجل نے چیخ کے اُسے چپ [illegible] تلقین کی اور ٹھیک اسی لمحے ہم جیسے ہی جینی کو اُٹھا کے اور ہمارے چہرے اُن کی متجسس آنکھوں کے مقابل ہوئے [illegible] ہاتھ اُٹھے ہوئے تھے اور خالی نہیں تھے۔ ہم نے بے دریغ [illegible] برسانی شروع کر دیں۔

وہ ہمارے بہت قریب تھے دوسری طرف پلٹو اور جینی [illegible] تمنچے تانے اُن پر گولیاں برسا رہے تھے۔ اُن کے گھیرے میں [illegible] کے جتنے آدمی تھے، وہ دھڑا دھڑ گرنے لگے اور جیسے ہی [illegible] کے آدمی آگے والوں کے ہٹنے پر سامنے آئے، اُن کا بھی [illegible] ہوا۔ ابھی وہ اس ناگہانی کو ٹھیک طرح سمجھ بھی نہیں پائے [illegible] تیس آدمی وہیں ڈھیر ہو گئے، باقی اندھا دھند بھاگنے لگے [illegible] کے وہ کچھ فاصلے پر رُکتے اور ہم پر نیزے تانتے یا کمانیں [illegible] سب کو احساس تھا کہ آگے جا کے اُنھیں ایک لمحہ بھی ملا تو [illegible] نیزے پھینک سکتے ہیں یا تیر چلا سکتے ہیں۔ اُنھیں کوئی [illegible] نہیں دینا تھا۔ ہماری گولیوں نے اُن کا دوڑتے ہوئے تعاقب [illegible] اور منتشر کو راستے میں ہی جا لیا۔ ہر سو اُن کی چیخیں گونج رہی [illegible] اور ہم میں سے کسی کو ایک دوسرے کی جانب دیکھنے کا ہوش [illegible] تھا۔ وہ دہشت زدہ انداز میں پیچھے بھاگ رہے تھے پھر جسے [illegible] قریبی پتھر کی آڑ ملی، وہ وہیں چھپ گیا۔

اُس وقت ہمارے کانوں میں تنجل اور ہیرو کی آواز [illegible] چلا چلا کے ہمیں اور آگے بڑھنے کو کہہ رہے تھے تاکہ تمنچے [illegible] گولی کا فاصلہ اپنی حد ہی میں رہے، کوئی نشانہ خطا نہ [illegible] اُن کے مرے ہوئے اور تڑپتے ہوئے آدمیوں کو سرسری نظر [illegible] کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اُن کی ایک بڑی تعداد [illegible] ہو گئی ہے۔ سارے تمنچے بھرے ہوئے تھے اور ہر ایک کے [illegible] میں تمنچا تھا، بعض کے پاس دو بھی تھے۔ پتھروں کی آڑ میں [illegible]

نیزے سے ہم پر نشانہ لگانے کے لیے اُنھیں بہر صورت آڑ سے نکلنا پڑتا کیونکہ اُن کے پاس ہماری طرح بندوقیں اور تمنچے نہیں تھے۔ کچھ آگے بڑھ کے ہم بھی احتیاطاً ٹوٹی ہوئی چٹانوں کے ان تودوں کے پیچھے ہو گئے جو وادی میں جا بجا پڑے تھے۔ ہم نے کچھ دیر انتظار کیا اور اسی اثنا میں اپنے خالی تمنچے بھر لیے۔ اُن میں سے کوئی باہر نہیں نکلا۔ اُنھیں وہاں سے نکالنے اور اپنی سمتوں کا اندازہ کرانے کے لیے ہم نے آپس میں صدائیں لگانی شروع کر دی تھیں۔ اُن میں سے چند ہی نے نشانہ لینے کی جرأت کی اور تیروں کے بجائے نیزے پھینکے۔ اُن کے آگے ہم نے فیر کر دیے تھے پھر بھی اُن کے کئی نیزے ہمیں لگتے لگتے بچے۔ ہم اپنی تعداد کے مطابق پتھروں کو نشانہ بنا سکتے تھے، پتھروں کی تعداد جہاں وہ چھپنے میں کامیاب ہو گئے تھے، ہم سے زیادہ تھی اور یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ سامنے جن پتھروں کو ہم نشانہ بنائے ہوئے ہیں، اُس کے پار وہ موجود بھی ہیں یا نہیں۔ ایک مرتبہ ہماری آوازوں پر اپنی اپنی آڑ سے نیزے پھینکنے کے بعد وہ خاموش ہو گئے۔ بہتر یہی تھا کہ ہم کچھ توقف کریں۔ وہ جاتے کہاں، وادی کے ہر طرف اُونچے پہاڑ تھے۔ اُن کی کوشش یہی ہونی چاہیے تھی کہ وہ کسی طرح اُن تک پہنچ کے وہاں پھیلے ہوئے درختوں کے جھنڈ میں جا چھپیں اور رینگ رینگ کے آگے بڑھتے رہیں یا وہاں سے ہم پر تیر اور نیزے پھینکیں۔ پہاڑوں پر پگ ڈنڈیوں کے بغیر چلنا مشکل تھا۔

دن کے بارہ بجے کا عمل ہو گا۔ دھوپ ساری وادی میں کھلی ہوئی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ وہ دھوپ مرجھانے کے وقت کا انتظار کریں۔ اندھیرے میں اُن کا پہاڑوں کی دیواروں کی جانب رینگنا آسان تھا۔ اس لیے ہمیں اُنھیں زیادہ وقت نہیں دینا چاہیے تھا۔ جتنی جلد ممکن ہو سکے باقی رہ جانے والے اُن تمام آدمیوں کو نشانہ بنا دینے میں ہمارے لیے بہتری تھی۔ آگے بڑھنے کی وجہ سے ہمارا دائرہ وسیع ہو چکا تھا اور ہم ایک دوسرے سے خاصی دُور ہو چکے تھے۔ آوازیں بلند کر کے ہی دوسرے کو مخاطب کیا جا سکتا تھا اور آوازیں بلند کرنا اب مناسب نہیں تھا۔ مجھے اباجان کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ اُنھیں دیکھنے کے لیے میں ایک تودے پر چڑھ گیا مگر اُن کا اور تشانم کا دور و نزدیک کوئی پتہ نہیں چل رہا تھا۔ تنجل اور جامو بھی میری طرح اُوپر تودوں پر آ گئے تھے جامو کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نے اُترنے اور آگے جانے کا اشارہ کیا۔ میرے قریب صرف سارٹے تھا۔ میں دوڑ کے اُس کے پاس پہنچا اور اُسے ساتھ لے کے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ جامو کے کہنے سے پہلے ہی میرا خیال تھا کہ انتظار کرنے کے بجائے ہم قریب قریب کی تمام جگہوں پر، جہاں اُن کے چھپنے

کا امکان ہے، خود ہی اُن کے سامنے پہنچ جائیں؛ دو آدمی ایک ساتھ چلیں۔ ہم پنجوں کے بل اپنی جانب انتہائی قدم رکھتے ہوئے سامنے کے تودوں کے نزدیک ہوتے رہے۔ دونوں کھلے ہوئے تھے کسی جانب سے بھی نیزا یا تیر آ سکتا تھا۔ بہت سے تودوں کے ساتھ جھاڑیاں بھی اُگی ہوئی تھیں اور وہ جھاڑیوں میں تودوں کی نسبت وہ زیادہ محفوظ تھے کیونکہ وہاں سے وہ نشانہ لے سکتے تھے۔ ہماری نگاہیں وہیں منڈلا رہی تھیں جہاں جھاڑیاں تھیں۔

میرے ایک ہاتھ میں چاقو، دوسرے میں تمنچا تھا۔ سارٹے کے دونوں ہاتھوں میں تمنچے تھے۔ ایک بڑے تودے کی دیوار سامنے آتے ہی ہم دونوں مخالف سمتوں میں تیزی سے بھاگے۔ سارٹے اُدھر سے، میں اِدھر سے۔ جیسے ہم اچانک زمین سے پھٹے ہوں، ہم دونوں دونوں اطراف سے اُن پر جھپٹے۔ وہاں پانچ چھ آدمی دبکے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے حواس باختگی سے نیزے پھینکنے چاہے مگر تمنچے کی گولیوں نے اُنھیں وہیں ختم کر دیا۔ میں نے کھٹکا دبانے کے ساتھ ساتھ چاقو بھی اُن پر پھینکا تھا اور میں چاقو ایک آدمی کے سینے سے نکال ہی رہا تھا کہ وادی میں گولیاں چلنے اور چیخنے چلانے کی آوازیں گونجنے لگیں۔ یکے بعد دیگرے ایک دم گولیوں کا شور اُٹھتا۔ میں اور سارٹے آگے ہی بڑھتے گئے۔ ہم دونوں نے اچانک اُن کے سروں پر پہنچ پہنچ کے کوئی دس گیارہ آدمی ٹھکانے لگا دیے تھے۔ دوسری جانب گولیاں چلنے کی آواز [illegible] سے [illegible] نہ ہوتا تھا کہ ہماری طرح اور بھی لوگ اُنھیں ڈھونڈنے [illegible] کامیاب [illegible] گئے ہیں تقریباً ایک گھنٹے تک وقفے وقفے سے پہا [illegible] ں گولیوں [illegible] دھماکے ہوتے رہے پھر خاموشی چھا گئی۔ ہم ایک [illegible] میں دُور تک [illegible] چلے گئے تھے مگر ہمارا دُور آنا بے کار ثابت [illegible] جگہ وہ مجھے اور سارٹے کو نظر نہیں آئے۔

ابھی ہم لوٹنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ [illegible] زور سے بولنے کی آواز گھومنے لگی۔ ہم نے [illegible] کی کوشش [illegible] مگر کوئی تبتی میں بول رہا تھا اور یہ شولم ہی کی آواز ہو سکتی تھی۔ ہم نے پیچھے مُڑ کے دیکھا۔ شولم ہیرو کے ساتھ ایک اُونچے ٹیلے پر کھڑا دونوں ہاتھ منہ سے لگائے مخاطب تھا۔ شولم کے مخاطب جانگ قبیلے کے بچے کھچے لوگ ہی ہو سکتے تھے۔ یقیناً وہ اُن سے کہہ رہا ہو گا کہ سامنے آ جائیں اور اپنے ہتھیار پھینک دیں مگر شولم کی آواز کتنے آدمی سُن رہے ہوں گے، گنتی کے چند آدمی۔ آدھے سے زیادہ وہ گولیوں کی پہلی دوسری باڑھ ہی میں تمام ہو چکے تھے۔ ابتدا میں آنا فانا [illegible] کچھ نہ ہوتا تو شاید اُن کے ہتھیار اُن کے کسی کام آ جاتے۔

تنجل نے پہلی رات سو کے اور دوسری جاگ کے لیں ہی نہیں

گنوائی تھی۔ پہلی رات ہمارے سو جانے کے بعد حفظِ ماتقدم کے طور پر انھیں جاگنا ہی تھا۔ دوسری رات ہم انھیں جگائے رکھنے کے لیے دانستہ جاگتے رہے۔ دو دن نیند کے بغیر، پہاڑوں پر مسلسل سفر اُن کے جسم بوجھل کر دینے کے لیے بہت تھا اور ابھی آدھا سفر بھی طے نہیں ہوا تھا۔ بقیہ آدھے کے خیال سے اُن پر ایک بوجھ سا طاری ہو گا اور ہماری جانب سے کسی وقت بھی کسی اقدام کا کھٹکا اُن کے لیے الگ ایک وحشت کا سبب ہو گا۔ صبح آگے بڑھتے ہوئے اُن کے قدموں میں پہلے جیسی مستعدی نہیں رہی تھی۔ ہِنجل پرسوں یا کل کسی وقت بھی جینی اور ملیٹو کو اسی طرح آگے بھیج کے اور اُن کے درمیان جھگڑا کرا کے اُنھیں اپنے قریب کر سکتا تھا۔ ہم سب کا جینی اور ملیٹو کو آپس میں جھگڑے سے باز رکھنے کے لیے اُن کے پاس بھاگنا ایک فطری عمل تھا۔ ہم سب جب ایک جگہ اکٹھے ہو گئے تھے تو اُن کا بھی ہر طرف سے ہماری جانب بڑھنا لازم تھا لیکن اُن کے سان و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ ہم بس اپنے قریب اُن کے گھیرے کا انتظار کر رہے ہیں، پلٹتے ہی اُن پر گولیاں چلا دیں گے اور انھیں ہتھیار تولنے کے لیے بھی ایک لمحہ نہیں ملے گا۔ پرسوں نہیں تو کل ہم انھیں یوں اپنے نزدیک بلا سکتے تھے مگر اچھا یہی تھا کہ دو راتوں اور دو دنوں کی تھکن اُن پر غالب آ جائے اور اس دوران انھیں کسی قدر یہ اطمینان بھی ہو جائے کہ کسی قسم کی مزاحمت کا امکان نہیں ہے۔ ہِنجل نے اپنے اس ارادے کے بارے میں پہلے سے کسی سے کچھ نہیں کہا تھا۔ جینی اور ملیٹو کو آگے بھیجنے کے بعد ہی اُس نے ہم سب کو بتایا تھا کہ تیار رہیں۔ سب اپنی جگہ چوکنے تھے۔ سبھی کے ذہن میں ایک شبہ تھا کہ ہِنجل واپسی کے لیے ایسے ہی آمادہ نہیں ہو گیا ہو گا اسی لیے سب اُس کے اشارے کے منتظر تھے۔ جینی اور ملیٹو نے آپس میں اُلجھنے میں نہ دیر کی تھی، نہ جلدی۔ اُن کے کسی طور سے یہ ظاہر نہیں ہوا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو نفل ہی مار رہے ہیں۔ ایک لمحے کو ہِنجل کے کہنے کے باوجود مجھے کچھ ایسا لگا تھا کہ وہ حقیقتاً آپس میں بھڑ گئے ہیں۔ ملیٹو نے جینی کو کمر سے پکڑ کے زور سے زمین پر پٹخ دیا تھا اور جاتو تان کے اُسے مارنا ہی چاہتا تھا کہ ہِنجل نے لپک کے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وادی میں سطحِ زمین زیادہ لمبی چوڑی نہیں تھی۔ آگے ایک اونچا پہاڑی سلسلہ تھا جانگ قبیلے کے آدمیوں کے لیے فرار کے راستے مسدود تھے۔ اندھیرا ہونے میں خاصا وقت پڑا تھا۔ آگے ایسا کوئی موقع ملتا یا نہ ملتا۔

آمنے سامنے ہر جانب لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ میں نے اس سے پہلے کبھی ایک ساتھ اتنے آدمی مرے ہوئے نہیں دیکھے تھے۔ زمین بہت سی جگہوں پر لال ہو گئی تھی۔ جا بجا خون کے لوتھڑے اور چھینٹے پڑے ہوئے تھے۔ ہم انھیں پھلانگتے ہوئے اُس مقام تک جا پہنچے جہاں سے چلے تھے۔ میری سانس اکھڑ رہی تھی اور دل دھڑ دھڑا رہا تھا۔ پتہ نہیں سارٹے کا کیا حال تھا لیکن اُس کی آنکھیں بھی پھٹی ہوئی تھیں۔ سُولم اور پیرو کو تو ہم نے تودے پر کھڑے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ آگے بڑھنے پر جب جامو، پلٹو، ہلاکو، مارتی اور ہِنجل کے چہرے نظر آئے تو ہمارے حواس کسی قدر بجا ہوئے۔ اباجان اُن میں نہیں تھے، تشانم بھی۔ معذور ہِنجل نے جینی اور ملیٹو کو اشارہ کرتے ہوئے انھیں بھی کچھ اور پیچھے ہو جانے اور اپنے آپ کو محفوظ کرنے کی تلقین کی ہوگی اور وہ یہیں کہیں کسی آڑ میں چھپے ہوں گے۔ ایک طرف جامو بندوق تانے جانگ قبیلے کے پانچ آدمیوں کو روکے کھڑا تھا۔ ملتی پشت سے اُن کے ہاتھ رسیوں سے باندھ رہا تھا۔ جامو کے ماتھے پر خون بہہ رہا تھا۔ نیزا اُس کی آنکھ اور گال سے گزرتا ہوا گردن تک چلا گیا تھا۔ ہمیں دیکھ کے اُس کے ہونٹ بدبدانے لگے اور وہ چیخ کے بولا، ”لاڈلے! سلطانے کو دیکھ۔“

سلطان کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جامو سے کچھ دور ہِنجل، جینی، زورا، ہلاکو اور ملیٹو کسی پر جھکے ہوئے تھے۔ یقیناً کوئی بہت زیادہ زخمی ہو گیا تھا۔ میں اُن کی طرف نہیں گیا اور اِدھر اُدھر پڑی ہوئی لاشوں میں سلطان کو تلاش کرتا رہا۔ سارٹے دوسری جانب نکل گیا تھا۔ سُولم اور پیرو بھی تودے سے اُتر کے میرے آس پاس منڈلا رہے تھے۔ جانگ قبیلے کے آدمی اپنے مخصوص لباس کی وجہ سے علیحدہ پہچانے جا سکتے تھے، سو اُن کے اوندھے جسم سیدھے کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ سلطان اپنے چوڑے چکلے جسم اور کپڑوں کے سبب دور سے نظر آ جاتا۔ میں اُسی کو ڈھونڈ رہا تھا کہ ایک بڑے پتھر کے نزدیک کسی کی کراہ میرے کانوں میں پڑی۔ وہ سلطان ہی تھا اور اپنے بل پر اُٹھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اُس کی پنڈلی میں نیزا لگا تھا اور گوشت پھاڑتا ہوا گزر گیا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں پھولے جاتے تھے، سلطان بے حال تھا، آواز بھی حلق سے نہیں نکل رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں مگر اسی اثنا میں اُسے ڈھونڈتا ہوا پیرو بھی اس طرف آ نکلا اور سلطان کا زخم ایک نظر دیکھتے ہی اُسے اپنے کندھے پر ڈال کے جھیل کی سمت بھاگنے لگا۔ اُس نے مجھے ہدایت کی کہ میں مرہم پٹی اور دواؤں کا صندوقچہ لے کے اُس کے پاس پہنچوں۔ مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ سامان میں یہ صندوقچہ کدھر رکھا ہے۔ اتنا مجھے یاد تھا کہ ہِنجل نکلتے ہی سے اُسے اپنے ساتھ لے کے چلا تھا اور جانگ قبیلے سے چلتے وقت بھی سامان میں رکھنا نہیں بھولا تھا لیکن سارا سامان راستے میں اُلٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ سارٹے نے بھی پیرو کو سلطان کا جسم کندھے پر لادے جھیل کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ بھی اُدھر جا رہا تھا مگر میں نے اُسے روک لیا اور صندوقچے کے بارے میں پوچھا۔ مجھے کچھ بتانے کے بجائے وہ خود سامان کھنگالنے چلا گیا۔ جتنی دیر میں سارٹے واپس آتا، میں اُس طرف لپکا جدھر ہِنجل، ہلاکو، جینی اور ملیٹو تھے۔ وہاں وزیر بے سدھ پڑا تھا اور وہ سب اُسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وزیر کا ایک شانہ خون میں نہایا ہوا تھا اور اُس کی سانس آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ جس وقت میں اُن کے پاس پہنچا، ہِنجل وزیر کو آہستہ آہستہ پکار رہا تھا۔ وزیر نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ دیکھتے دیکھتے اُس نے سانس بھی بند کر لی اور اُس کے ہاتھ میں دبا ہوا تمنچا چھوٹ پڑا۔ سب ایک دوسرے کو ویران آنکھوں سے دیکھا کیے۔ ہِنجل نے جلد ہی وزیر کے منہ پر کپڑا ڈال دیا۔ سب اُس کے پاس سے اُٹھ گئے تھے، سارٹے کو سامان میں صندوقچہ نہیں ملا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر پڑا تھا جیسے ہی اُس نے لوٹ کے سلطان کے بارے میں ہِنجل کو بتایا، سب جھیل کی طرف دوڑ پڑے۔ مجھ سے چلا نہیں گیا۔ میں وزیر کا سر اپنی گود میں بھینچے وہیں بیٹھا رہا۔

وزیر کی قبر ایک اونچی جگہ کھودی گئی۔ بڑے مندر کے تہہ خانے میں پتھریلی دیواریں کھودنے کی ہمیں مہارت ہو ہی گئی تھی۔ مٹی کی قبر کھودنے میں کیا دیر لگتی۔ چاروں طرف سناٹا ہو جانے کے بعد اباجان اور تشانم بھی کسی چھپی ہوئی جگہ سے باہر نکل آئے تھے۔ اباجان اور پیرو نے مل کے وزیر کو جھیل پر نہلایا اور اباجان ہی نے بھکشوؤں کے لباس میں اُس کی نماز ادا کی۔ ہم سب سر جھکائے کھڑے رہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے اندر اندر متن میاں کی طرح وزیر کو بھی منوں مٹی کے نیچے دبا دیا گیا اور ہم اُسے ویرانے میں تنہا چھوڑ کے آگے بڑھ گئے۔

سلطان کی پنڈلی کی مرہم پٹی کر دی گئی تھی مگر اُس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ زورا، جامو اور ہِنجل بھی زخمی ہوئے تھے۔ ہلاکو کے سر پر کسی نے پتھر کھینچ مارا تھا۔ ہِنجل کا پیر بھاگتے ہوئے رپٹ گیا تھا اور اُسے چلنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ زورا کی پسلیوں سے نیزا چھلتا ہوا گزر گیا تھا۔ قسمت تھی جو بچ گیا۔ سلطان کے مقابلے میں سب کے زخم معمولی تھے۔ ہمارے تینوں قلیوں میں سے ایک ہی زندہ بچا تھا۔ باقی دو نے موقع دیکھ کے قبیلے کے لوگوں کے ساتھ بھاگنے کی غلطی کی اور نشانے پر آ گئے۔ قبیلے کے زندہ رہ جانے والے پانچوں آدمیوں کے ہاتھ ہِنجل نے کھلوا دیے تھے اور انھیں اپنے ساتھ ہی رکھا تھا۔ بہت سے یاک مر گئے تھے۔ ہمارے اور اُن کے یاکوں کو ملا کے کُل گیارہ یاک تھے۔ اتنوں کی ضرورت نہیں تھی لیکن زندہ یاکوں کو بے آسرا چھوڑ دینے سے بہتر تھا کہ انھیں ساتھ لے کے ہی چلیں۔ چھولداریاں، کھانے پینے کا سامان، کدالیں اور سفر کے لیے دیگر ضروری اشیا کا ایک بڑا ذخیرہ ہمیں قبیلے کے لوگوں کے اسباب میں ملا تھا۔ ہم نے وہ سب کا سب اپنے ساتھ نہیں رکھا۔ ضرورت کے مطابق ہی اُس میں سے کچھ رکھ کے باقی وہیں چھوڑ دیا۔ سورج ڈوبنے میں ابھی دیر تھی کہ ہم وادی سے چل پڑے اور اندھیرا تیز ہونے کے بعد بھی چلتے رہے۔ مشعلوں کی اب ہمارے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔ آگے بشیر نجانی تھی۔ مارتی اور زورا بیٹریاں اور مشعلیں روشن کر کے راستہ دکھاتے رہے۔ جب سردی بہت بڑھ گئی اور بادل چھانے کی وجہ سے اندھیرا گہرا ہو گیا تو ہمیں ٹھہر جانا پڑا۔ لکڑیاں رسّی سے باندھ کے سلطان کے لیے ایک چارپائی نما جھلنگا سا اسٹریچر بنا دیا گیا تھا جس کے آگے پیچھے نکلے ہوئے کنارے قبیلے کے آدمی اُٹھائے ہوئے تھے۔ کبھی ہم بھی اُسے کندھا دے دیتے تھے۔ تشانم اُسی کے سرہانے کے ساتھ بندھی ہوئی چل رہی تھی۔ سہ پہر سے اب تک سلطان کو ہوش نہیں آیا تھا۔ تشانم کے منہ کو چُپ لگ گئی تھی۔ اباجان کا بھی یہی حال تھا۔ وادی سے چلنے کے بعد وہ بھی سلطان کے اسٹریچر کے ساتھ ساتھ ہی تھے۔

پڑاؤ کی جگہ رُکتے ہی ہم نے سلطان کے لیے ایک علیحدہ خیمہ لگا دیا۔ تشانم اور اباجان کو اُس کی دیکھ بھال کے لیے وہیں رہنے دیا۔ کسی کو نیند نہیں آ رہی تھی اور کوئی کسی سے نہیں بول رہا تھا۔ رات کو کئی بار ہم لوگ سلطان کو دیکھنے گئے۔ تشانم رات بھر اُس کے بالیں بیٹھی رہی تھی۔ قبیلے کے آدمیوں کو بھی ہم نے ایک الگ خیمے میں بند کر دیا تھا۔ باری باری ایک ایک گھنٹے کے لیے سب پہرا دیتے رہے مگر کسی نے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ صبح ہوتے ہی ہم نے خیمے اکھاڑ لیے اور سامان سمیٹ کے یاکوں پر لاد دیا۔ دوپہر کو سلطان کی حالت کسی قدر سنبھل گئی تھی۔ اُس نے آنکھیں کھولیں مگر چند لمحے اِدھر اُدھر دیکھ کے وہ پھر غافل ہو گیا۔ اُسے تیز بخار چڑھ گیا تھا۔ قبیلے کے لوگوں نے اُس کے لیے کئی بوٹیاں تجویز کیں۔ جامو نے انھیں سلطان کو کھلانے سے پہلے خود قبیلے کے آدمیوں پر اُن کا تجربہ کیا کہ کہیں وہ کوئی دھوکا نہ کر رہے ہوں۔ درمیان میں پڑنے والا رسیوں کا پل ہم نے سویرے ہی عبور کر لیا تھا۔ دوسرے دن رات تک ہم نے ایک بڑا فاصلہ طے کر لیا تھا اور اُسی سرسبز و شاداب، وسیع و عریض وادی تک آ گئے تھے جہاں سے ہمیں لوٹنا پڑا تھا۔ چلتے چلتے ہِنجل کا پیر بھی سوجنے لگا تھا۔ رات کو زورا اور مارتی نے یاک کے مکھن میں نمک ملا کے مالش بھی کی مگر صبح اُس کی تکلیف اور بڑھ گئی تاہم وہ چلتا رہا۔ دوپہر کے کھانے کے لیے ہم ایک جگہ آدھ پون گھنٹے کے لیے ٹھہرے تھے۔ تیسرے دن

اندھیرا ہونے تک ہم نے اپنے راستے میں پڑنے والے پہاڑوں کی اونچی دیواریں عبور کرلی تھیں لیکن چوتھے دن صبح رات بھر کے پڑاؤ کے بعد صرف ایک میل کے قریب آگئے آئے ہوں گے کہ آسمان پر یکایک کالے بادل گھر آئے اور ہم خیمے نصب کرنے کے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کر ہی رہے تھے کہ موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ سلطان بھی بھیگ گیا ہر چند ہم نے اس کے اسٹریچر پر فوراً چھول داری ڈال دی تھی۔ خیموں کی میخیں ٹھونکتے ٹھونکتے ہم سبھی شرابور ہو گئے تھے۔ بارش جس تیزی سے آئی تھی، اسی تیزی سے گزر گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں مطلع صاف ہو گیا اور تازہ دھوپ چمکنے لگی لیکن تجھل نے پھر آگے بڑھنے سے سب کو روک دیا تھا۔ سلطان کے جسم پر کپکپی طاری تھی۔ اسٹریچر کے جھٹکوں اور بارش نے اس کے رہے سہے اوسان بھی چھین لیے تھے۔ سب اسے مختلف قسم کی دوائیاں دیتے رہے اور اس کے گرد ہی بیٹھے رہے۔ سلطان کسی طرح قابو میں نہیں آیا۔ جتنا اس کا دھیان کرتے، وہ اتنا ہی اور بکھر جاتا۔ پھر اسی دن شام کو اس نے نہ جانے کیسے آنکھیں کھول دیں، پٹ پٹاتی پلکوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ تشانم اس کی نظروں کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس پر نظر پڑی تو مسکرایا۔ پھیکی پھیکی مسکراہٹ۔

"کیا ہے سلطانے ؟" تجھل نے بے چینی سے پوچھا۔

"اُستاد!" بہ مشکل وہ ڈوبتی اور لرزتی آواز میں بولا۔ "اِس کا دھیان رکھنا۔ اب تھی اس کا..."

"کیا بولتا ہے رے"، تجھل مضطربانہ اس کا گال تھپ تھپانے لگا۔

"اپنے پاس وقت نہیں ہے"۔ سلطان کی آواز پر رعشہ طاری تھا۔

"نہیں رے!" تجھل نے تندی سے کہا۔

معلوم نہیں، تجھل کی آواز اس کے کانوں میں پہنچی بھی یا نہیں۔ وہ تشانم کو دیکھ رہا تھا اور اس سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کئی ٹیڑھی میڑھی لکیریں نمودار ہوئیں اور وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا، تشانم پر آنکھیں جمائے لیٹا رہا۔ دیر تک اس کی آنکھیں نہیں ہٹیں۔ تجھل نے پھر ہاتھ بڑھا کے انھیں خود ہی بند کر دیا۔

تشانم کے سینے سے نہ کوئی آہ بلند ہوئی نہ اس کے آنسو نکلے وہ بُت کی طرح ٹکٹکی باندھی بیٹھی رہی۔ سلطان کو جب قبر میں اُتارا جا رہا تھا تو بھی وہ کچھ نہیں بولی۔ اس دوران تجھل، پیرو، جامو اور آبا جان اُسے تھامے رہے، بازوؤں سے پکڑے، گردن میں ہاتھ ڈالے مگر آنسو اس کی آنکھوں میں جیسے منجمد ہو گئے تھے۔ سبھی اپنے اپنے طور پر اس سے کچھ نہ کچھ کہہ رہے تھے۔ مارتی، ملاکو، زودا، بلیتو، سولم جینی سارنے اور میں نے بھی اس سے بہت کچھ کہا لیکن اس نے جیسے کسی کی بات ہی نہیں سُنی۔ اندھیرا ہونے لگا تھا لیکن ہم نے اُسی کے خیال سے جلدی کی کہ وہ سلطان سے جتنی جلد اور جتنی دُور ہو جائے اچھا ہے۔ مرنے والوں کے ساتھ کون رہتا ہے۔ مرنے کا مطلب ایک مستقل دُوری ہے۔ سارے رشتے زندگی کے ہیں۔ رات کو ہم نے خاصا آگے جا کے یاکوں سے سامان اُتارا۔ اس رات کسی نے کھایا پیا نہیں۔ جانگ قبیلے کے آدمیوں کو گوشت کے پارچے مکھن اور بُھنا ہوا اناج دے دیا گیا، وہی انھوں نے کھا لیا۔

ہم سب ایک ہی خیمے میں تھے۔ تشانم رات بھر ایک کونے میں ساکت و جامد بیٹھی رہی۔ تجھل اس کے ماتھے، ہاتھوں اور گالوں کو پیار کرتا تھا، اُسے جھنجوڑتا تھا مگر تشانم کا بدن سُن پڑا تھا۔ رنگ بالکل سفید ہو گیا تھا جیسے رفتہ رفتہ کوئی اس کا خون چوس رہا ہو۔ ساری رات کوئی بھی اس کے پاس سے نہیں ہٹا۔ نہ تجھل، نہ آبا جان، نہ پیرو۔ پیرو نے اس کی دل جوئی کی سب سے زیادہ کوشش کی تھی۔ عمر میں تشانم اس کی بیٹی گیتا کے برابر ہی ہو گی اور پیرو ہی کی کوشش سے تشانم کی آنکھیں بھیگیں۔ صبح ہونے سے کچھ پہلے پیرو نے اُسے اُٹھا کے اپنے سینے میں بھینچ لیا تھا اور اس کا بدن گدگدانے لگا تھا۔ تشانم کی آنکھوں سے آبشار سا بہہ نکلا۔ ایسے بلک بلک کے روئی کہ میں نے کبھی کسی کو ایسے روتے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ جیسے ہم سبھی کو رونا یاد آگیا تھا۔

ہم شہر زاپول سے بھی آگے بڑھ آئے۔ زاپول کی بستی میں داخل ہونے کے بجائے ہم دور ہی دُور سے راستہ کاٹ کے نکل گئے۔ راستے میں اور بھی کئی بستیاں پڑیں مگر جیسے ہی دُور سے اُن کے نشانات نظر آتے، ہم راستہ بدل دیتے۔ چاہے کتنا ہی چکر کاٹنا پڑتا۔ ندی، نالے، دریا، پل، ستواں پگ ڈنڈیاں۔ گھاٹیاں۔ سلطان کو دفن کرنے کے چار دن بعد تک ہم روز رات کو چند گھنٹوں کے لیے ٹھیر کے مسلسل چلتے رہے۔ جامو کا زخم سوکھ گیا تھا لیکن تجھل کے پیر کی سوجن بڑھتی جا رہی تھی۔ ہم اصرار کرکے اُسے یاک پر بٹھا دیتے اور دن میں دو بار اس کے پیر پر لیپ کرتے۔ اسی وجہ سے سفر میں کچھ رکاوٹ نہیں پڑی۔ سردی کی شدت بھی کچھ کم ہو گئی تھی اور آگے راستے اتنے پیچیدہ نہیں تھے۔ ساری پیچیدگی ہمارے عام راستوں سے ہٹ جانے کے سبب سے تھی۔ پانچ دن تک تشانم ہمارے ساتھ رہی۔ کھوئی کھوئی سی ساتھ چلتی رہی۔ جب کہتے، اُٹھ جاتی۔ جب کہتے، بیٹھ جاتی۔ جب نظر پڑتی اس کی آنکھیں چھلکتی ہوئی دکھائی دیتیں سو ہر کوئی اس کے چہرے کی طرف نگاہ کرنے سے پہلو تہی کرتا تھا۔ سولم تبتی سے خوب واقف تھا اور تشانم کو چونکہ ہندوستانی ٹوٹی پھوٹی ہی آتی تھی اس لیے بیشتر اس کے قریب رہتا تھا، سائے کی طرح اس کے ساتھ لگا ہوا۔ آبا جان بھی اس کے ساتھ ساتھ رہتے تھے اور لیں بھی۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ اُسے کچھ قرار آگیا ہے۔ قرار اُسے ضرور آگیا تھا لیکن پانچویں دن سہ پہر کے وقت ہم نے دو بلند پہاڑوں کے درمیان رسّیوں کا پُل عبور کیا ہی تھا اور پل سے چند قدم آگے آئے تھے کہ تشانم کو اچانک نہ جانے کیا ہوا، وہ واپس دیوانہ وار پل کی طرف بھاگی۔ ملاکو نے اس کا پیچھا کرنے کی کوشش کی مگر پل تک چند ہی قدم کا فاصلہ تھا۔ تشانم ہزاروں فٹ نیچے گھاٹی میں بہتے ہوئے دریا میں کود گئی۔ مارتی بھی گرتے گرتے بچا۔ جب تک ہم سب وہاں پہنچے، دریا کی تیز لہریں اُسے بہا کے لے گئیں۔ سب نیچے جھانکتے رہ گئے۔ پیرو نے اپنا منہ کھسوٹ لیا اور آبا جان سینے میں سر چھپا کے بیٹھ گئے۔

کسی کو یقین نہیں آتا تھا کہ تشانم چلی گئی ہے۔ سب کی نظریں اس طرح بھٹک رہی تھیں کہ شاید ابھی وہ کسی جانب سے واپس آجائے گی۔ ہم بہت دیر تک وہیں بیٹھے رہے۔ نیچے گھاٹی میں اُترنا مشکل تھا ورنہ ہم اُسے نیچے جا کے دیکھتے۔ نیچے جانے کا صرف ایک راستہ تھا کہ دریا میں چھلانگ لگا دی جائے۔ ہم اور آگے بڑھ گئے مگر سب کے پیروں کو جیسے زنگ سا لگ گیا تھا۔ گرتے پڑتے اندھیرا ہونے تک ہم پھر ایک جگہ آ کے ٹھیر گئے۔

تشانم بھی اُسی مٹی کی بنی ہوئی تھی جس کی کورا تھی۔ اس کی بہت سی باتیں کورا سے ملتی جلتی تھیں۔ اس کے لانبے بال، آنکھیں، پیشانی، اس کے مسکرانے اور شرمانے کا انداز۔ تشانم کو اگر کورا کی طرح کوئی آسرا ہوتا کہ سلطان واپس آجائے گا، تو وہ کبھی ایسا نہ کرتی، ساری زندگی اس کا انتظار کرتی رہتی لیکن اس نے اپنی آنکھوں سے سلطان کو ہمیشہ کے لیے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اُسے کورا جیسا کوئی آسرا نہیں رہا تھا۔ کورا کی طرح جھوٹ موٹ کا سہی۔ ہم نے تشانم سے کون سی بات کہنے کی کوشش نہیں کی تھی، جتنی بھی تسلیاں ممکن تھیں، دیتے رہے تھے۔ سب کا خیال تھا کہ انھوں نے روٹھی ہوئی تشانم کو منا لیا ہے۔ مجھے شبہ تھا کہ تشانم ایسے کیسے بہل جائے گی۔ جامو نے اُسے اپنی بہن بنا لیا تھا اور کہا تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے اُسے کسی بات کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ آبا جان اور پیرو اُسے بیٹی بیٹی پکارتے تھے۔ اگر وہ سلطان کے بدلے سب سے کچھ نہ کچھ مانگتی تو جس کے پاس جو کچھ تھا، وہ اس کے حوالے کر دیتا مگر کیا اس طرح سلطان کی قیمت ادا ہو جاتی۔ قیمتیں تو انھی چیزوں کی ہوتی ہیں جنھیں لوگ بیچنے اور خریدنے کے لیے آمادہ ہوں۔ یہاں تو صرف خریدار تھے۔ دُکھ کے بدلے سُکھ کا سودا کرنے کے خریدار، سب اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ بے شک تشانم کو سلطان کی قیمت مقرر کرنے کا اختیار تھا مگر وہ اس کی کیا قیمت لگاتی۔ ہر چیز کی قیمت نہیں ہوا کرتی۔

کورا سے بھی لوگ ایسا ہی کہتے تھے۔ زہرہ نے مجھے یہی کچھ بتایا تھا۔ جیسلمیر میں رانا مہتاب کی پیش کش، ارشد کا پیام اور نہ جانے اتنے عرصے میں کس کس نے کورا کے لیے مولوی صاحب کے آگے خزانے بچھائے ہوں گے اور صرف مولوی صاحب ہی جانتے ہوں گے کہ کورا کو کھلونوں سے قائل کرنا کتنا مشکل ہے۔ لوگ کہتے ہیں، وقت کے ساتھ بہت سی چیزیں بدل جاتی ہیں، عادتیں چھوٹ جاتی ہیں، آدمی زندہ رہنے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتا ہے۔ کپڑا نہ ہو تو پتّوں سے ستر پوشی کر لیتا ہے، کھانا نہ ہو تو گھاس پھوس کھا لیتا ہے۔ ہر چیز کا کوئی نہ کوئی بدل مل جاتا ہے۔ آدمی کا بدل بھی مل جاتا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو دُنیا کب کی ختم ہو جاتی مگر سب کو نہیں ملتا۔ جن کا نصیب کالا ہو، انھیں نہیں ملتا۔ مولوی صاحب نے کورا کے لیے کیا کچھ نہیں کیا ہو گا۔ اُسے پڑھایا لکھایا، اس کے لیے اپنا گھر بار، اپنا وطن چھوڑ دیا۔ در بدر مارے مارے پھرتے رہے۔ انھوں نے کورا کو اپنی دانست میں ہزار تسلیاں دی ہوں گی مگر یہ اُن کی تسلیاں نہیں تھیں جو کورا کی آنکھیں روشن تھیں۔ وہ اس کی اپنی تسلی تھی۔ وہ اپنے آپ سے بھی تو کچھ کہتی ہو گی، اس کا دل بھی اس سے کچھ کہتا ہو گا۔ اس کا دل کہتا ہو گا کہ میں اُسے کہاں کہاں ڈھونڈ رہا ہوں۔ میری نظریں اسے اپنے بدن پر چبھتی محسوس ہوتی ہوں گی کیونکہ اس کی نظریں بھی مجھے اپنے اِرد گرد محسوس ہوتی تھیں۔

مولوی صاحب نے اُسے جو کچھ بتایا ہو، امکان اِسی بات کا زیادہ ہے کہ انھوں نے اُسے میرے مر کھپ جانے کا یقین دلانا چاہا ہو گا۔ وہ میرا آسرا چھوڑ دے، اُن کے خیال میں کورا کو اِسی صورت میں صبر آسکتا ہے۔ انھیں نہیں معلوم تھا کہ کورا نے اُن کی بات کا بالکل یقین نہیں کیا ہے۔ وہ چپ ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس کے دل میں اُمید کی ساری کونپلیں جل گئی ہیں۔ اس نے مولوی صاحب سے حجت نہیں کی ہو گی کہ وہ نہیں مانتی۔ بس وہ چپ ہو گئی ہو گی۔ اتنے عرصے کورا کے ساتھ رہنے کے باوجود مولوی صاحب کو پتہ نہیں چلا تو اور کتنے عرصے نہیں چلے گا۔ آخر وہ تھک جائیں گے اور ایک دن انھیں احساس ہو گا کہ انھوں نے میری طرف سے بے خبری برت کے کتنا بُرا کیا ہے۔ میرے ذہن میں بار بار یہی بات آتی تھی ورنہ پھر کیا وجہ تھی کہ مولوی صاحب نے کبھی پلٹ کے میری خبر نہیں لی۔ وہ ایسا کر سکتے تھے۔ میں مر تو نہیں گیا تھا اور مر گیا تھا تو انھیں کم از کم اس کی تصدیق ضرور کرنی چاہیے تھی۔ وہ میری طرف سے بالکل ناطمئن ہوں گے۔ تجھل نے ایک بار

اشارۃً مجھ سے کہا تھا، لاڈلے! کیا پتہ، مولوی صاحب ابھی تک اُن بھکشوؤں سے خوف زدہ ہوں جو کورا کی تلاش میں سارے ہندوستان میں منڈلا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کبھی اُن بھکشوؤں سے اُن کا کوئی واسطہ پڑا ہو اور انھیں شبہ ہو کہ مجھ سے رابطہ قائم کرنے کے بعد کورا اتنی محفوظ نہیں رہے گی جتنی اُن کے پاس ہے۔ میں تجھل کی بات سُن کے خاموش ہو گیا تھا۔ بحث کرنے سے کیا حاصل تھا۔ میں جانتا تھا کہ ایسا کہنے سے تجھل کی مُراد مجھے سمجھانا ہی تھا۔ ایسا تھا تو بھی مولوی صاحب اپنا بوجھ کم کرنے کے لیے میری تلاش ضرور کرتے۔ وہ مجھے تلاش کرنا ہی نہ چاہتے تھے۔ وہ کورا کو اپنے پاس سے جُدا کرنا ہی نہ چاہتے ہوں گے۔ انھیں خدشہ ہوگا کہ کورا پھر اُن سے چھن جائے گی اور یہ سب تو اُن کے اپنے اندر کی باتیں تھیں۔ کورا سے انھوں نے کیا کہا ہوگا۔ میرے نہ آنے کی کیا تاویل دی ہوگی۔ جو کچھ بھی دی ہوگی۔ یہ مولوی صاحب کی بھول تھی کہ انھوں نے جو کہا ہے، کورا نے اُسے قبول کر لیا ہے۔ کورا اپنی تاویل سے قائم تھی۔ اپنے دل کی تاویل سے۔ اور تشانم! وہ کس تاویل پر بھروسا کرتی۔ اُس کے سامنے کوئی پردہ نہیں پڑا تھا۔ وہ خود کو کیا باور کراتی!۔

انھی راستوں سے ہمیں ہندوستان میں داخل ہونا تھا جن سے ہم یہاں آئے تھے۔ سرحدی چوکیوں اور بستیوں سے گزر کے نہیں، اور اب کے ہمیں زیادہ احتیاط کرنی تھی کہ ہمارے پاس دُنیا کا بیش قیمت سامان تھا۔ زر و جواہر، لعل و یاقوت، ہزاروں سال پہلے کے برتنوں اور زیورں سے بھرے ہوئے صندوق۔ آدھے سے زیادہ راستہ ہم نے کسی نہ کسی طرح طے کر لیا تھا۔ ہر دن ہمیں ہندوستان کی سرحد سے اور قریب کر دیتا تھا۔ کوئی بیسویں اکیسویں دن پہلی بار ایک بڑا قافلہ ہمیں ہندوستان کی سمت سے آتا نظر آیا۔ ہم آگے بڑھنے کے بجائے ٹھیر گئے اور قافلے کے کچھ قریب ہونے کا انتظار کرنے لگے مگر وہ سب بھکشو تھے جو اپنے مخصوص لباس کے باعث دُور سے پہچانے جاتے تھے۔ ویسے تو کوئی بات نہیں تھی لیکن ہمارے ہمراہ جانگ قبیلے کے چار آدمی اور ایک تبتی قلی تھا۔ ایک آدمی کو حکم عدولی پر جامو نے گولی مار دی تھی۔ قافلے کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے وہ شور مچا سکتے تھے۔ زورا، بلاکو اور سُولم نے انھیں اُس کے سامنے ہی نہیں ہونے دیا۔ وہ تینوں فوراً انھیں دُور لے گئے۔ ابا جان کی وجہ سے قافلے کے بھکشو کچھ دیر کے لیے رُک گئے۔ ابا جان اور اُن کے درمیان چند جملوں کا تبادلہ ہوا۔ انھوں نے ہماری خیریت بھی پوچھی اور مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ ہم نے سکون کی سانس لی۔ ہو سکتا تھا کہ آگے جا کے اُن سے کوئی ہمارے بارے میں استفسار کرتا لیکن ہماری گنتی کم تھی۔ ابا جان ہمارے ہمراہ تھے اور اس دوران ہمارے حلیے یک سر بدل گئے تھے۔ چہرے پر داڑھیاں بڑھی ہوئی تھیں۔ انھیں دیکھ کے ہم نے بندوقیں پہلے ہی چھپا دی تھیں۔

اس سے پہلے بھی راستے میں اکا دکا چھوٹے موٹے قافلے ٹکرائے تھے مگر اُن کے سامنے وہ ایک لفظ نہیں بولے۔ انھیں اندازہ تھا کہ ہماری بندوقیں اور تمنچے اُن کی کسی بھی آواز پر چلنے لگیں گے اور صرف وہی نہیں جائیں گے، قافلے کے لوگ بھی ختم ہو جائیں گے۔ انھیں یہ بات پہلے بتا بھی دی گئی تھی۔ بھکشوؤں کا قافلہ بہت بڑا تھا اور ویسے بھی اُن پر بندوق اُٹھاتے ہوئے ہمارا جھجکنا لازم تھا اسی لیے ہمیں انھیں ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل کرنا پڑا کہ وہ اس موقع سے کوئی فائدہ اُٹھانے کی غلطی نہ کریں۔

ڈیڑھ مہینے کی مسلسل مسافت کے بعد ہم ہندوستانی سرحد کے خاصے نزدیک ہو گئے۔ قبیلے کے آدمی اور قلی ہمارے ساتھ تھے لیکن انھیں مزید آگے لے جانا مناسب نہیں تھا مگر ہمیں اُن کی اب بھی ضرورت تھی۔ وہ وقت آ پہنچا تھا جب ہمیں اُن کے بارے میں کوئی نہ کوئی فیصلہ کر لینا تھا۔ جامو کی رائے تھی کہ انھیں مار دیا جائے۔ بلاکو، جینی، مارٹی اور سارٹے بھی اُس کے ہم نوا تھے۔ تجھل بیچ میں نہیں بولا۔ پیرو نے منع کر دیا اور انھیں اپنے ساتھ ہی رکھا مگر دوسرے دن جیسے ہی ایک گہری گھاٹی پر نظر پڑی، پیرو نے ہمیں ٹھیر جانے کا حکم دیا۔ قبیلے کے آدمیوں اور قلی کو رسیوں سے باندھ کے یکے بعد دیگرے نیچے گھاٹی میں اُتار دیا گیا۔ کدالیں، میخیں، ایک خیمہ، مشکیزے اور سفر کا ضروری سامان بھی اُن کے اُترنے کے بعد نیچے چھوڑ دیا گیا۔ ہزاروں فٹ گھاٹی کی تہہ سے انھیں اوپر چڑھنے اور کسی قریبی بستی پہنچنے میں کئی دن لگتے اور اس دوران ہم کب کے تبت کی سرحد پار کر چکے ہوتے۔ انھیں ایسے چھوڑ دینے پر کوئی بھی تیار نہ ہوتا، اگر ہمیں یہ اندیشہ ہوتا کہ وہ ہمارے سامان کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔ وہ صندوق میں بھری ہوئی چیزوں کے متعلق قطعاً لاعلم تھے۔ جس وقت بڑے مندر کے تہہ خانے سے نکل کے راتوں رات ہم اُس مقام پر پہنچے تھے جہاں سُولم ہمارا انتظار کر رہا تھا تو ہم نے اپنی جیبوں اور تھیلوں میں بھرا ہوا سامان اُس کے ساتھ لائے ہوئے صندوقوں میں منتقل کرتے وقت اس بات کی خاص احتیاط کی تھی کہ تینوں قلی اُسے نہ دیکھ پائیں۔ انھیں اِس دوران دُور رکھا گیا تھا۔

اونچے پہاڑوں کا سلسلہ ابھی تک جاری تھا مگر سردی میں بتدریج کمی ہو رہی تھی۔ دن میں ہم اپنے اُوورکوٹ اُتار دیتے تھے۔ سردی کا موسم بھی بدل گیا تھا۔ راستے میں باری باری سبھی بیمار پڑے تھے۔ سب کے بدن کی کھال جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ منہ کھولتے ہوئے ہونٹ دکھتے تھے، رات کو لیٹتے تو رگیں تڑخنے لگتیں۔ ابا جان بہت کم کسی سے بولتے تھے، مجھ سے بھی نہیں۔ تقریباً سبھی کے منہ سلے ہوئے تھے۔ ہمارے ساتھ اب کوئی رہبر نہیں تھا۔ صرف ایک اندازہ تھا کہ ہم سرحد کے قریب ہو رہے ہیں، سرحد اب آیا ہی چاہتی ہے۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ کہیں بھی سرحدی بستیوں کے آثار نظر نہیں آئے۔ اُس وقت ہمیں راستہ بھٹک جانے کا شبہ ہوا۔ اب تک ہم بستیاں کاٹ کاٹ کے گزر رہے تھے مگر اب ہمیں خود اُن کی تلاش تھی۔ اونچائی سے ہم چاروں طرف نظریں دوڑاتے رہتے کہ کہیں انسانی زندگی کے نشانات دکھائی دے جائیں۔ کئی دن تک ہم اِسی تگ و دو میں رہے۔ اس عرصے میں کسی بھی قافلے سے ہمارا آمنا سامنا نہیں ہوا۔ یقیناً ہم کسی ویران جگہ آ گئے تھے۔ یہاں سبزہ بھی برائے نام تھا اور آگے دُور تک عموماً چٹیل پہاڑوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا جن پر کہیں کہیں برف پڑی ہوئی تھی۔ اگر سرحد اتنی ہی دُور تھی تو ہمیں قبیلے کے آدمیوں اور قلی کو گھاٹی میں نہیں اُتارنا چاہیے تھا۔ شاید انھوں نے ہی ہمارا رُخ کسی دوسرے راستے کی طرف موڑ دیا تھا لیکن سمت کی پہچان مشکل نہیں تھی۔ ابا جان کے پاس قطب نما کی ایک چھوٹی ڈبیا تھی۔ سورج سے بھی سمت کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ ہم نے اپنے اندازے کے مطابق جنوب کی سمت سفر جاری رکھا اور زمین جیسے ہمارے پیروں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتی گئی۔ ہر سُو پہاڑ ہی پہاڑ، میدانوں کو دیکھے ہوئے مہینے گزر گئے تھے۔ سب کی رفتار تیز تھی۔ ہندوستان کی سرحد نزدیک آنے کے خیال سے سبھی کے قدم اُٹھ رہے تھے لیکن ایسا لگتا تھا، یہ پہاڑ کبھی ختم نہیں ہوں گے، ساری زندگی ہم انھی کے گرد گھومتے رہیں گے۔ سامنے جب کوئی اونچا پہاڑ دیوار بنا کھڑا نظر آتا تو جی چاہتا، برمے سے اِس میں سوراخ کر دیں۔ ایک مختصر فاصلہ طے کرنے کے لیے ایک پہاڑ کے کئی چکر کاٹنے پڑتے تھے، تب کہیں وہ سامنے سے ہٹتا تھا مگر اُس کے ہٹتے ہی دوسرا سامنے آ جاتا تھا۔ تبت کی پہلی سرحدی چوکی کا نام ساما تھا اور اُس کے پاس بہت سی چھوٹی بڑی بستیاں آباد تھیں۔ ساما یا کسی دوسری بستی کی دُور دُور تک کوئی علامت موجود نہیں تھی۔

قبیلے کے لوگوں کو جدا ہوئے دس روز سے زیادہ ہو چکے تھے۔ ہم چلتے رہے۔ چلنے ہی کی صورت میں کوئی بستی ملنے کا امکان تھا اور آخر گیارھویں روز بلندی سے مشرقی نشیب میں واقع ایک چھوٹی بستی ہم نے ڈھونڈ ہی لی۔ کسی سیاح کو دنیا کا کوئی نیا خطہ دریافت کرنے کی اتنی خوشی اور حیرت نہیں ہوئی ہوگی جتنی ہمیں گنتی کے چند مکانوں پر مشتمل وہ بستی دیکھ کر ہوئی۔ سب لوگ آگے جا کے رُک گئے اور سُولم اور پیرو تقریباً بھاگتے ہوئے بستی کی جانب بڑھے۔ جب تک وہ نہیں لوٹے، ہم اُن کا بے چینی سے انتظار کرتے رہے اور جب وہ لوٹے تو اکیلے نہیں تھے، اُن کے ہمراہ یاکوں کے ساتھ چار آدمی بھی تھے۔ یقیناً وہ قلی ہی ہو سکتے تھے اور وہ قلی ہی تھے۔ انھی کے ذریعے ہمیں معلوم ہوا کہ ہم آسام کی طرف جانے کے بجائے جنوب مغرب میں بھوٹان کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ بھوٹان کا سارا علاقہ عبور کر کے ہی ہندوستان میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔ وہ جگہیں اور وہاں کے لوگ ہمارے دیکھے بھالے نہیں تھے۔ بھوٹان زیادہ دُور نہیں رہ گیا تھا لیکن ہم نے قلیوں کو آسام کی سرحد کی جانب چلنے کو کہا۔ انھیں ایک بڑے معاوضے کی پیش کش کی گئی تھی اور کچھ رقم پیشگی بھی دے دی گئی تھی۔ ساتھ ہی اُن سے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر وہ ساما کی سرحدی چوکی تک ہمارے ساتھ چلیں گے تو ہم اپنا بچا ہوا تجارتی سامان اور چند یاک بھی اُن کے حوالے کر دیں گے۔ وہ آنا کانی کر رہے تھے لیکن ابا جان کا اصرار کارگر ثابت ہوا، وہ مان گئے۔ آیندہ ایک ہفتے کی مسافت سے ہمیں اندازہ ہوا کہ ہم کتنے مختلف راستے پر اپنی منزل سے کتنی دور چلے گئے تھے۔

ایک ہفتے بعد جب قلیوں نے ہمیں بتایا کہ ساما کی سرحدی چوکی اب ایک دن کے فاصلے پر رہ گئی ہے تو سب ایک دوسرے کو ناقابلِ یقین نظروں سے دیکھنے لگے۔ گویا چند میل کے فاصلے پر ہندوستان تھا۔ دو یا تین دن کا سفر۔ سبھی کی بجھی ہوئی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ ہم نے قلیوں سے کہہ دیا تھا کہ ساما آنے سے کچھ دُور پہلے ہی وہ ہمیں مطلع کر دیں۔ اب تک ہم نے انھیں نہیں بتایا تھا کہ ہندوستان میں واپس ہونے کے لیے ہمارے پاس راہ داری کا باقاعدہ پروانہ نہیں ہے ورنہ وہ شروع ہی میں آئیں بائیں شائیں کرتے۔ ابا جان کا کچھ نہیں تھا۔ بھکشو پروانۂ راہ داری کی قید سے آزاد تھے۔ جیسا کہ ہمیں توقع تھی، یہ سُن کے قلی منہ بنانے لگے اور انھوں نے پروانے کے بغیر ہمیں آگے لے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ یہاں تک آ کے ہم اُن سے کوئی ضد بھی نہیں کر سکتے تھے۔ بستیاں قریب تھیں اور ہمارا کوئی بھی نارو اعمل ہمیں اُن کی نظروں میں مشکوک کر سکتا تھا۔ جاتے وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ پروانے

کے بغیر قلی بڑی مشکل سے ہمیں تبت میں داخل کرانے کے لیے تیار ہوئے تھے۔ ہم نے انھیں ایک بڑی رقم کی پیش کش کی اور اپنے تمام یاک اور ایک بندوق بھی اُن کے حوالے کر دینے کا وعدہ کیا۔ پچھلے تجربے کے مطابق ہمیں اندازہ تھا کہ اُن کا انکار ہماری طرف سے محض رقم میں مزید اضافے کے لیے ہے۔ وہ انکار کرتے رہے اور جب انھیں یہ یقین ہو گیا کہ اب ہم اس سے زیادہ نہیں بڑھیں گے تو وہ چُپ ہو گئے۔

ہم ساما نہیں گئے بلکہ کچھ پیچھے لوٹ کے ایک جانب پہاڑوں پر چڑھنے لگے۔ ایک دن، دو دن، تین دن، پورے پانچ دن بعد ہمارے ڈگمگاتے قدم ہندوستان کی زمین چھو رہے تھے۔ ہم ہندوستان کی پہلی سرحدی چوکی وانگ کے اطراف گھومتے ہوئے اُس سے کچھ آگے ساتی نامی ایک قصبے کے گرد و نواح میں آ گئے تھے۔ ساتی سے ہم پہلے بھی گزر چکے تھے۔ یہاں دُہری شہریت کے لوگ رہتے تھے۔ جُز وقتی تبتی، جُز وقتی ہندوستانی۔ ہم ساتی کی بستی میں بھی نہیں گئے۔ قلیوں نے ہمیں وہاں چھوڑ کے واپس جانا چاہا تھا۔ ہم نے انھیں کسی نہ کسی طرح اور آگے چلنے پر آمادہ کر لیا اور دو دن کی مزید مسافت کے بعد وہ ہمیں قصبہ من زانگ کے علاقے میں لے آئے۔ ہمیں یاد تھا کہ من زانگ سے دوسری منزل قصبہ موچی ما کا فاصلہ تقریباً آٹھ میل کے برابر ہے اور ان آٹھ میلوں میں بڑے پاٹ کے دریا، گھاٹیاں، اونچی چوٹیاں، کیڑے مکوڑے، جنگلات اور درندوں کی کثرت ہے۔ چن وتی سے ہمیں جیپیں مل سکتی تھیں۔ قلی من زانگ سے آگے بڑھنے پر قطعاً تیار نہیں تھے لیکن اُن کے بعد بار برداری کے لیے خچروں اور نئے قلیوں کی تلاش میں ہمیں مجبوراً قصبہ من زانگ میں داخل ہونا پڑتا۔ خچروں اور یاکوں کے بغیر آٹھ میل کا یہ دشوار گزار راستہ طے کرنا ہمارے لیے ناممکن تھا۔ قلی ہماری کمزوری سے خوب واقف تھے۔ سامان تو ہم کسی طرح اپنے کندھوں پر اُٹھا لیتے مگر جُھل کے لیے پیر کی سوجن کی وجہ سے زیادہ دُور چلنا نقصان دہ ثابت ہوتا۔ وعدے کے مطابق ہمیں اپنے تمام یاک اُن کے رخصت ہونے پر اُن کے حوالے کر دینے تھے۔ جامو کو اُن پر غصہ آ رہا تھا۔ پیرو نے اُسے تھامے رکھا اور جھول داریاں، کدالیں، خیمے، باقی بندوقیں، گرم کپڑے اور مزید نقدی کے معاوضے پر انھیں ہموار کر لیا۔ قلیوں کو بھی واپس جانے کی جلدی تھی۔ انھوں نے ہمیں ایک ہی دن میں من زانگ سے چن وتی پہنچا دیا۔ جس وقت ہم چن وتی کی سرزمین میں داخل ہوئے، سورج چمک رہا تھا۔ گنگنی سی ہوا چل رہی تھی۔ اجنبی اجنبی سی ہوا۔ جسم چھپائے جاتے تھے۔ ہمارے سامنے کچھ فاصلے پر لکڑی اور بانس کے مکانات کے جھنڈ تھے مگر ہم اُن سے دُور ہی رہے۔

سب کے پیر جیسے زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ مارٹی نے قلیوں کو اپنی گھڑی بھی دے دی۔ سردی بے حد کم ہو گئی تھی۔ ہم نے جتنی چیزوں کا اُن سے وعدہ کیا تھا، اُس سے بڑھ کر جو کچھ ہمارے پاس زائد تھا، سب اُن کے سپرد کر دیا۔ یوں بھی ہمیں اپنا سامان کم کرنا تھا۔ قلیوں کے جانے کے بعد اور جیپوں کی تلاش میں نکلنے سے پہلے ہم نے اپنے حلیے ٹھیک کیے۔ سب نے شیو کیا، ایک دوسرے کے بالوں کی لٹیں قینچی سے تراشیں اور نئے کپڑے بدل لیے۔ ابا جان نے بھی اپنا بھکشوؤں کا لباس اُتار دیا۔ اُن کے پاس کوئی اور لباس نہیں تھا۔ میرا کرتا، پاجامہ اور صدری پہن کے انھوں نے اُوپر سے بندھی پہن لی۔ زریں نے یہ سارے کپڑے اپنے ہاتھوں سے سیے تھے۔ سورج ڈوبتے وقت جیپیں ملنا ممکن نہیں تھا اس لیے ہم نے سُولم اور جامو کو جلد سے جلد آگے روانہ کر دیا اور خود اپنے سروں پر صندوقوں کا بوجھ اُٹھائے چن وتی کی بستی کی طرف بڑھنے لگے۔ مجھے یقین تھا کہ میری طرح سبھی کے دل دھڑک رہے ہوں گے۔ ابھی ہم بستی کے کنارے پہنچے تھے کہ سُولم اور جامو واپس ہوتے دکھائی دیے۔ اُن کے ساتھ خچر اور قلی تھے۔ کچھ پوچھنا بیکار تھا۔ انھیں جیپیں نہیں مل سکی ہوں گی۔ ہم نے سامان خچروں پر لاد دیا۔ چن وتی سے اگلا قصبہ نالا سات میل کی دوری پر تھا مگر وہاں پہنچتے پہنچتے اندھیرا ہو گیا۔ قلی اندھیرے کے باوجود ہمیں بستی تک پہنچانے کے لیے تیار تھے لیکن پیرو نے انھیں روک دیا۔ اُسے بدھوں کا ایک مندر نظر آ گیا تھا۔ بستی میں جانے سے بہتر تھا کہ رات ہم مندر کی عمارت میں گزار دیں۔ پھر قلی بھی ہمارے ساتھ ٹھہر گئے۔ ابھی صبح پوری طرح نمودار نہیں ہوئی تھی کہ جامو اور سُولم کسی سے کچھ کہے بغیر پھر جیپوں کی تلاش میں نکل گئے۔ واپس آئے تو اُن کے ساتھ دو جیپیں تھیں۔ نالا سے قصبہ موچی ما، پھر سارما، تھرونال، پانگ، پھر ونگ انگ۔ تین دن بعد کہیں خچروں، کہیں جیپوں کے ذریعے شب و روز سفر کرتے ہوئے قصبہ دری ای میں آ کے ہم نے دم لیا مگر بس دم لینے کی حد تک۔ ہمیں معلوم تھا کہ دری ای میں ہندوستان کے پولیٹیکل ایجنٹ، انٹلی جنس افسر اور ٹریڈ ایجنٹ کے دفاتر موجود ہیں اور پولیس اسٹیشن بھی۔ صندوقوں میں بھرے ہوئے سامان کی وجہ سے ہمیں خود کو چھپائے رکھنا پڑ رہا تھا۔ زیادہ احتیاط میں بھی اندیشے تھے، کوئی بھی شک کر سکتا تھا۔ چن وتی سے جتنے قلی اور ڈرائیور ہمیں ملے، ہم نے انھیں یہی بتایا کہ ہم انھی قصبوں کے اطراف تجارت کی غرض سے گھوم رہے

تھے۔ اب واپس اپنے گھروں کو جا رہے ہیں اور ہم دو قافلے ہیں جو چن وتی میں اتفاق سے ایک دوسرے سے مل گئے تھے۔ ہم نے اپنے چہروں، لباس اور انداز سے طویل سفر کے نشانات مٹا دینے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ بہر حال انھیں ہم پر شک نہیں ہوا۔ ہم پر نہ ہمارے سامان پر اور جیسے جیسے ہم پہاڑی علاقوں سے میدانی علاقوں کی طرف بڑھتے گئے، ہمارے اندیشے بھی کم ہوتے گئے لیکن کسی قدر اطمینان سب کو اُسی وقت حاصل ہوا جب ہم نے تن سکیا ریلوے اسٹیشن پر کلکتے جانے کے لیے ریل گاڑی میں قدم رکھے۔

ساری بندوقیں قلی لے گئے تھے، تمنچے، چاقو البتہ ہماری جیبوں میں موجود تھے۔ چیکنگ، پولیس والوں اور مسافروں کی نظروں سے بچنے کے لیے ہم نے فرسٹ کلاس کے ٹکٹ لیے تھے حالانکہ ہمارے کپڑے فرسٹ کلاس مسافروں جیسے نہیں تھے۔ کاش ہمیں کسی مقام پر اپنے صندوق سوٹ کیسوں سے بدلنے اور نئے کپڑے بنوانے کا وقت مل جاتا مگر کسی جگہ زیادہ دیر تک ٹھہرنا ہمارے لیے مناسب ہی نہیں تھا۔ جلد سے جلد سرحد سے دُور، انسانوں کی بھیڑ میں گم ہو جانا ہی قرینِ مصلحت تھا۔ اگر صندوق میں وہ سامان نہ ہوتا جو اب موجود تھا تو ہمیں قدم قدم پر یہ احتیاط کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک ڈبے میں بیٹھنے کے بجائے ہم دو ٹولیوں میں منقسم ہو گئے تھے۔ جُھل، ابا جان، میں، بلاکو، مارٹی اور سارٹے ایک ڈبے میں، دوسرے میں پیرو، جامو، پلٹو، سُولم، زورا اور جینج۔ لگ بھگ چھ مہینے ہو رہے تھے۔ چھ مہینے بعد ریل گاڑیاں، اسٹیشن، بجلی، قسم قسم کی اشیا، طرح طرح کے لوگ، بھاگتے چیختے چلاتے ہوئے آدمی پھر ہماری نظروں کے سامنے تھے۔ ہر طرف شور ہی شور۔ قصبہ دری ای میں بہت دنوں بعد ہم نے ہندوستانی طرز کا کھانا کھایا تو مرچوں سے منہ جل گیا۔ دودھ میں کھولتی ہوئی چائے کا ذائقہ بھی سیٹھا سیٹھا سا تھا۔ سب کچھ بدلا بدلا، نیا نیا سا تھا جیسے ہم کسی نئی دُنیا میں آ گئے ہوں یا ہم نے دوسرا جنم لیا ہو۔ مجھے اپنے ہر طرف پتنگے سے اُڑتے محسوس ہو رہے تھے اور ایسا لگ رہا تھا جیسے میں سیدھا کورا کے پاس جا رہا ہوں۔ میری انگلیاں بے اختیار گردن میں پڑی اُس کی دی ہوئی مالا کے دانے ٹٹولتی تھیں اور ہر لمحے مجھے گمان ہوتا تھا کہ میری مالا کھو گئی ہے۔ اُس کی کوئی ایک ایسی چیز تو میرے پاس موجود تھی جسے میں چھو سکتا تھا۔ جب بھی مالا کے دانوں سے میری انگلیاں مَس ہوتیں، لگتا جیسے اُس کے ہاتھ میرے ہاتھوں میں ہیں اور وہ میرے سینے سے لگی ہے، مجھے ٹوک رہی ہے، ٹہوکے مار رہی ہے، میں سو گیا ہوں تو مجھے جگا رہی ہے، وہ میرے سامنے کھڑی ہے۔ بس میں اُسے دیکھ نہیں سکتا لیکن میں اُسے چھو سکتا ہوں۔ میں اندھا یہ خواب ہی دیکھتا رہتا تھا۔

ہر لمحہ ہمیں کلکتے سے قریب کر رہا تھا۔ میری طرح ہر کوئی لمحے گن رہا ہو گا۔ گاڑی کسی بڑے اسٹیشن پر ٹھیرتی تو کبھی وہ دوسرے ڈبے سے ہمیں پوچھنے آ جاتے، کبھی میں، مارٹی، بلاکو، سارٹے اُن کے پاس چلے جاتے۔ سارٹے کو کلکتے پہنچنے کی سب سے زیادہ بے کلی تھی۔ کہتا تھا جب ہم اچانک اڈے پہنچیں گے تو کانتے اور کپتن خاں حیران رہ جائیں گے۔ اتنے دن ہو گئے تھے، اُدھر اڈے پر وہ سب نہ جانے کیا سمجھ رہے ہوں گے کہ ہم کبھی لوٹ کے آئیں گے بھی یا نہیں۔ جُھل نے کسی کو نہیں بتایا تھا کہ اُس کا ارادہ کس طرف جانے کا ہے مگر اُس نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ واپس آنا نہ آنا اتفاق ہے، ایک حادثہ۔ انھیں معلوم تھا کہ اُس نے بارہ آدمی اُن لوگوں میں سے منتخب کیے تھے جن کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو، جن کے پیر بندھے ہوئے نہ ہوں۔ تمنچوں اور بندوق کی مشقیں، جانے سے پہلے جُھل کا دن دن بھر اڈے سے باہر رہنا، انھیں یہ سب باتیں یاد آتی ہوں گی۔ وقت گزرنے کے ساتھ اُن کی پریشانی بھی بڑھتی جا رہی ہو گی۔ سب ایک دوسرے کا منہ تکتے ہوں گے کہ ہماری کوئی خیر خبر ملی؟ ہمیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا؟ کانتے کے نام زریں کے روز نہیں تو ہفتے میں ایک دو بار ضرور خط آتے ہوں گے۔ کانتے اُلٹے سیدھے جواب دیتا ہو گا۔ بمبئی سے جولین اور چمپا کے خط بھی اُس کے نام آتے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے، وہ جولین اُس کی ماں اور چمپا بیگم کو فیض آباد ہی لے آیا ہو۔ کہتا تھا کہ استاد ناراض ہوں گے مگر ایک بار جب جولین فیض آباد آ ہی جائے گی تو استاد اُسے بمبئی واپس نہیں بھیج دیں گے۔ اگر کانتے واقعی اُسے فیض آباد لے آیا ہے تو حویلی میں ہر وقت ایک ہنگامہ رہتا ہو گا۔ منیر علی، زہرہ، سلمٰی، ممو میاں، ارشد، خانم، نیساں، جہاں گیر، روز ڈاکیے کا انتظار ہوتا ہو گا۔ نیساں پانچوں وقت مصلّے پر بیٹھی دعائیں کرتی ہو گی: الٰہی! بابر بھائی کو سلامت رکھنا، انھیں کامیاب و کامران لوٹانا۔ اِس عرصے میں نیساں اور بڑی ہو گئی ہو گی۔ جہاں گیر نے بھی میٹرک کا امتحان پاس کر لیا ہو گا۔ نہ جانے کیا کیا بدل گیا ہو گا۔ منیر علی فیض آباد میں رہ سکے یا نہیں، واپس جیسلمیر جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا لیکن، اگر رانا مہتاب کے آدمیوں کو اُن کا کوئی پتہ لگ گیا ہو! میرے دماغ میں سب کی شکلیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ سینہ بھی بند ہونے لگتا، کبھی جیسے اس کے سارے دروازے کھل جاتے اور روشنی سی بھر جاتی۔

گاڑی تیز رفتاری سے بنگال کی طرف بڑھ رہی تھی۔ سب اپنی

نشستوں پر بجے کہیں گم تھے۔ بجل کو نچلی برتھ پر لٹا دیا گیا تھا۔ اس کے پاؤں میں تکلیف کچھ زیادہ ہی تھی۔ چہرے سے اس کا اظہار نہیں ہوتا تھا مگر اس کی خاموشی بتا رہی تھی کہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے اس کے پیر اپنے زانوؤں پر رکھ لیے تھے۔ میرے مقابل ابا جان کھڑکی کی طرف منہ کیے گھومتی ہوئی زمین دیکھ رہے تھے۔ کمر ڈبے کی دیوار سے ٹکی، آنکھیں خالی خالی، پیشانی پر شکنیں، معلوم نہیں کہاں کھوئے ہوئے تھے۔ جت میں کہیں توقع نہیں ملا تھا میرا خیال تھا گاڑی میں وہ مجھے اپنے پاس بلا کے ضرور پوچھیں گے کہ تو اتنے دن کہاں رہا، یہ لوگ کون ہیں۔ ان لوگوں کے بارے میں انھوں نے کوئی رائے ضرور قائم کی ہوگی۔ اتنے دن ساتھ رہنے کے بعد کوئی بات اُن سے ڈھکی چھپی نہیں رہی ہوگی مگر انھوں نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ سارے سفر کے دوران انھوں نے مجھ سے بہت کم بات کی تھی۔ ہاں مجھے دیکھتے ضرور رہے تھے، بارہا میرے دل میں آیا، اُن سے پوچھوں، وہ فریال، فرخ، فارعہ اور اکبر کو کس کے پاس چھوڑ کے آئے ہیں لیکن ڈر لگتا تھا، نہ جانے کون سا جواب سننے کو ملے، اُن کے پاس بتانے کو کچھ ہو نہ ہو۔ شاید بجل نے اُن سے کچھ پوچھا ہو۔ وہ دونوں آپس میں کبھی کبھی چپکے چپکے باتیں کرتے رہتے تھے۔ ممکن ہے بجل نے انھیں بتایا ہو کہ اُن کی خواہش کے مطابق میں نے اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھا تھا۔ وہ یہی چاہتے تھے کہ میں بہت پڑھوں لکھوں اور بڑا افسر بن جاؤں۔ شاید بجل نے اُن سے نہیں کہا کہ میں نے قتل کے جرم میں سات سال جیل کی سزا کاٹی ہے۔ مجھے بہت اچھا چاقو چلانا آتا ہے۔ بلکہ بھی، لاٹھی بھی، تمنچا چلاتے ہوئے تو انھوں نے خود ہی دیکھ لیا ہوگا۔

مجھے احساس ہوتا تھا، ممکن ہے وہ اپنی جھجک کی وجہ سے مجھی سے توقع کرتے ہوں کہ میں اُن سے ثمی، فریال، فرخ، فارعہ اور اکبر کے بارے میں پوچھوں گا۔ ممکن ہے سوچتے ہوں، کیسا بھائی ہے جسے اپنی بہنوں اور بھائی کے نام بھی یاد نہیں رہے ہے۔ بھائی اُن سے کیا کہتا، اگر اُس نے ثمی کو بھوکی نظروں کے درمیان بیٹھا نہ دیکھا ہوتا تو کسی اور کے بارے میں پوچھتے ہوئے اس کی ہمت یوں جواب نہ دے جاتی۔ غالباً ہم دونوں کو ایک دوسرے سے کوئی سوال کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہمیں خود ہی جواب نظر آتے رہیں تو ٹھیک ہے۔ میں نے بجل سے یہ معلوم کرنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی تھی کہ وہ کلکتے جا کے ٹھہر جائے گا یا سیدھا فیض آباد جانے کا ارادہ ہے جہاں جہاں گیر ہے۔ ابا جان اُسے دیکھنے کے لیے بے چین ہوں گے۔ ایک مدت بعد وہ اُن کے سامنے آئے گا تو اُن کا کیا حال ہوگا اور جہاں گیر بھی سکتے میں رہ جائے گا۔ ہو سکتا ہے بجل نے اُن سے کہا ہو کہ دو چار دن کلکتے میں ٹھہر کے پھر فیض آباد چلیں گے۔ بہرحال ابا جان کو معلوم ہوگا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور اُن کے ذہن میں آگے کے بھی خاکے ہوں گے۔ وہ فیض آباد میں رہیں گے یا کہیں اور۔ اب اُن کا اپنا کوئی گھر نہیں ہے۔ ظاہر ہے، اب وہ گیا تو نہیں جائیں گے اور زریں انھیں کیوں جانے دے گی۔ حویلی میں جا کے ابا جان سب سے زیادہ اسی کو پسند کریں گے۔ وہ اُن کا اسی طرح خیال رکھے گی جس طرح بجل کا۔ شاید وہ دوسروں کا خیال رکھنے ہی کے لیے پیدا ہوئی تھی۔ ثمی کی بہت سی خصوصیات اُس میں موجود تھیں۔ ابا جان نے ثمی کو کھو دیا مگر زریں سے مل کے بڑی حد تک ثمی کا ازالہ ہو جائے گا مگر یہ سب میرے اپنے ذہن کے خیال تھے۔ میں ابا جان کے دل میں چھپا نہیں بیٹھا تھا۔ نو سال میں انھوں نے بہت سے خواب دیکھے ہوں گے۔ اب ان کی تعبیر کا وقت آیا ہے۔ اتنی بڑی دولت سے وہ کیا کیا خریدیں گے۔ محلات، جاگیریں، کوئی ریاست۔ ان پتھروں سے وہ اپنے خوابوں کی کیسی کیسی تعبیریں تراشیں گے۔ اُن کا شمار دُنیا کے مال دار ترین لوگوں میں ہونا چاہیے۔ اب خزانہ اُن کے ساتھ تھا اور وہ خزانے کے ساتھ۔

بجل آنکھیں موندے لیٹا تھا۔ ساری رات گزر گئی۔ ابا جان تھوڑی دیر کے لیے لیٹتے، پھر اٹھ کے بیٹھ گئے وہ کھڑکی سے کبھی کبھی نظر اٹھا کے میری طرف دیکھ لیتے۔ رات کو انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں بھی لیٹ جاؤں مگر مجھے نیند ہی نہیں آ رہی تھی۔ میں رات بھر بیٹھا رہا۔ صبح سویرے گاڑی نیو کوچ بہار سے ایک میل تک آئی ہوگی کہ اچانک رک گئی۔ ہم نے دروازہ کھول کے دیکھا۔ گاڑی دونوں طرف سے پولیس نے گھیر لی تھی۔ ابھی گاڑی ٹھیرے چند لمحے بھی نہ گزرے ہوں گے کہ ایک پولیس افسر دو سپاہیوں کے ساتھ ہمارے ڈبے میں داخل ہوا۔ پہلے اُس نے انگریزی میں مخل اندازی کی معافی چاہی لیکن دوسرے ہی لمحے جیسے ہی اُس نے ہماری صورتیں دیکھیں، صورتیں کیا لباس دیکھے تو ناک بھوں چڑھا کے بولا "تم لوگوں کے پاس فرسٹ کلاس کا ٹکٹ ہے؟" اُس نے انگریزی میں کہا۔ اُس کی نگاہیں ہمارے چہروں اور سامان پر پھسل رہی تھیں۔ اُسے یقین نہیں تھا کہ ہمارے پاس فرسٹ کلاس کا ٹکٹ ہوگا۔

"بابو کیا گٹ پٹ کرتا ہے رے؟" بجل نے بوجھل آواز میں مجھ سے پوچھا۔

"ٹکٹ کو پوچھ رہے ہیں۔" میں نے ترشی سے جواب دیا۔ مجھے پولیس افسر کے لہجے پر غصہ آ رہا تھا۔ اُس کی نظروں میں حقارت تھی۔ "ہمارے پاس ٹکٹ ہیں۔" میں نے آہستگی سے انگریزی میں کہا۔

مجھے انگریزی میں بات کرتے دیکھ کے وہ چونکا ہوا اور جھجک کے بولا "دکھاؤ۔" اُس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا تھا۔

میں نے سوچا، کہوں دکھاتے ہیں مگر پہلے بات کرنے کی تمیز سیکھو۔ میں چپ رہا۔ بجل نے اپنی جیب سے ٹکٹ نکال لیے تھے۔ "دکھاؤ بابو صاحب کو۔"

میرے ہاتھ سے ٹکٹ لینے کے باوجود اُس کا شک کم نہیں ہوا۔ لوٹ پلٹ کے کبھی ٹکٹ کو دیکھتا، کبھی ہمیں، کبھی سامان کو۔ "ٹھوک بجا کے دیکھ لو، جعلی نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔

"آپ لوگ کہاں سے آ رہے ہیں؟"

"ٹکٹ میں لکھا ہے۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"ہوں!" وہ سر ہلانے لگا اور کچھ توقف کے بعد متجسس آواز میں بولا "آپ لوگ کیا کرتے ہیں؟"

"کیا ٹکٹ کے ساتھ یہ سب بتانا بھی ضروری ہے؟"

"نہیں۔ اتنا بھی ٹھیک ہے۔" اُس کے لہجے میں نرمی آ گئی تھی، نرمی اُسی لمحے آ گئی تھی جب میں نے اُسے انگریزی میں جواب دیا تھا۔ بجل نے مجھے اشارہ کر دیا تھا ورنہ میں اُس سے چند باتیں ضرور پوچھتا۔ بجل کا خیال ہوگا کہ وہ پولیس افسر ہے۔ ہمارے سامان پر بھی شک ظاہر کر سکتا ہے، کسی وقت بھی کوئی حکم چلا سکتا ہے اور ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ساری گاڑی پولیس والوں نے گھیر رکھی ہے۔ ڈبے میں موجود اُس کے ساتھ آنے والے دونوں سپاہیوں کی نظریں صندوقوں پر جمی ہوئی تھیں۔ اِس سے پہلے کہ وہ اپنے افسر کو کوئی اشارہ کرتے، افسر نے مجھ سے وضاحت کی اور کہنے لگا کہ گاڑیوں کی یہ چیکنگ مسافروں کے فائدے کے لیے ہے۔ میں نے اپنے لفظ منہ ہی میں دبائے رکھے۔ وہ واپس چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد گاڑی روانہ ہوگئی۔

میں نے مڑ کے دیکھا، ابا جان کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ مجھے احساس ہی نہیں رہا تھا کہ ابا جان بھی ڈبے میں بیٹھے ہیں اور وہ انگریزی بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ خود بولنے کے بجائے مجھے اُن کے پولیس افسر سے بات کرنے کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ پولیس افسر کسی نہ کسی طرح واپس چلا گیا تھا اور گاڑی بھی روانہ ہوگئی تھی لیکن جاتے وقت اُس کی آنکھوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ٹکٹ سے ضرور مطمئن ہو گیا ہے، ہم سے نہیں۔ وہ اپنا اطمینان کرنے پھر واپس آ سکتا تھا یا گاڑی کے ساتھ چلنے والی پولیس کو چوکنا کر سکتا تھا کہ وہ ہم پر نگاہ رکھیں۔ مجھے اُس سے اتنی درشتی سے بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ مبادا وہ ناراض ہو جاتا، پھر سب خاک ہو جاتا۔ ملدا نتے بھر مجھے پچھتاوا ہوتا رہا۔ ہر چند میں نے کوئی غلط بات نہیں کہی تھی لیکن مارٹی کے بقول افسر تو افسر ہی ہوتا ہے۔ تمام راستے مجھے بے چینی رہی۔ جہاں گاڑی رکتی، میں سب سے پہلے باہر جھانک کے دیکھ لیتا کہ پولیس نے گاڑی کے گرد دوبارہ تو گھیرا نہیں ڈال دیا ہے۔ مجھے خزانے کی فکر نہیں تھی۔ اُس کا مجھے کیا کرنا تھا مگر جہاں تک ابا جان کہتے، ہمیں بہ حفاظت اُسے وہاں تک پہنچا دینا تھا۔ شام ہو رہی تھی۔ گاڑی تیزی سے کلکتے کے نزدیک ہوتی گئی۔ پھر کوئی نہیں آیا۔ میں سوچ رہا تھا، اگر بجل نے ابا جان کو میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے تو میرے رواں انگریزی بولنے پر انھیں ضرور حیرت ہوئی ہوگی۔

ابھی کلکتہ آنے میں درمیان کے دو ایک اسٹیشن باقی تھے کہ بجل نے پیرو، زورا، مارٹی اور ابا جان کو ایک ڈبے میں کر دیا اور خود دوسرے ڈبے میں چلا آیا۔ میں بھی اُس کے ساتھ آ گیا۔ ہم نے وہ سب صندوق بھی اُسی ڈبے میں منتقل کر دیے تھے جس میں ابا جان تھے اور اپنے ساتھ صرف وہ سامان رکھا تھا جس میں خزانہ نہیں تھا۔ یہ احتیاط سب کی سمجھ میں آتی تھی اس لیے کسی نے اعتراض نہیں کیا، بجل چھ مہینے بعد کلکتے واپس جا رہا تھا، سامان مختلف ہوتا تو بات اور تھی۔ ہمارے پیچھے کلکتے میں بہت کچھ بدلا ہوا ہو سکتا تھا۔ پیرو، زورا اور مارٹی کا تعلق بمبئی کے باڑوں سے تھا، انھیں کلکتے میں اڈے کے چند آدمیوں کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔ گاڑی سے اترتے وقت ہمارا ایک دوسرے سے جدا جدا رہنا ہی بہتر تھا۔ اب کے اسٹیشن پر کوئی ہمیں لینے کے لیے آنے والا نہیں تھا لیکن وہاں مختلف اڈوں کے چند آدمی ہمیشہ موجود رہتے تھے۔ اسٹیشن تقریباً ہر وقت مسافروں سے بھرا ہوتا تھا۔ کسی بھی اڈے کا آدمی ہمیں وہاں مل سکتا تھا۔

گاڑی گونجتی ہوئی ہاوڑا کے پلیٹ فارم میں داخل ہوئی تو میری رگوں میں خون جمنے لگا۔ ہم پہلے اترے، بعد میں پیرو اور ابا جان وغیرہ۔ بجل لنگڑا لنگڑا کے چل رہا تھا۔ پلیٹ فارم سے گزر کے ایک دوسرے کے پیچھے جب ہم گیٹ سے باہر آ گئے تھے اور ٹیکسیوں کی طرف بڑھنا ہی چاہتے تھے کہ سامنے سے ایک آدمی بھاگتا ہوا ہماری طرف آیا۔ میں نے اُسے پہچان لیا۔ وہ بدرو تھا۔ بھیم لوچہ کے اڈے کا آدمی۔ آتے ہی اُس نے بجل کے پیر پکڑ لیے اور ہانپتے ہوئے بولا۔

"استاد تم!"

"کیسا ہے رے بندرو؟" بجل اُسے بندرو ہی کہتا تھا۔

"تم... تم کدھر تھے استاد!" وہ حواس باختگی سے بولا۔

"ذرا دور چلے گئے تھے۔"

"دور چلے گئے تھے۔" اُس کی آواز بھرا رہی تھی۔ "پر تم ادھر

کب آئے؟"

"ابھی اُترے ہیں رے!" تجمل نے تنک کے کہا۔

"ابھی!" وہ گھبرا کے بولا۔

"ہاں رے!"

"لوگ اِدھر نہ جانے کیا کیا بولتے تھے۔"

"اُن کو بولنے دے۔ کانتے کیسا ہے؟"

"کانتے! کانتے تو جیل میں ہے استاد!"

"جیل میں! کب سے ہے؟"

"مہینے سے! تم کو کچھ نہیں پتہ؟" وہ سٹ پٹا کے بولا۔

تجمل نے اُس کے بال پکڑ لیے۔ "کھل کے بول۔"

"قسم سے اُستاد! تم کو کچھ نہیں پتہ؟" وہ گھگھیانے لگا۔

"منہ کھلا رکھ۔" تجمل نے گرجتے ہوئے پوچھا۔

بدرو لڑکھڑا گیا۔ "استاد! استاد! تم کو کچھ پتہ نہیں ہے تو ابھی اِدھر سے لَوٹ جاؤ۔" وہ بدحواسی سے بولا۔ "پولیس تم سب کو ڈھونڈ رہی ہے۔ اِدھر سب اُلٹا ہو گیا ہے۔ کبن خاں کو مار کے رتنا حرامی تمھارے اڈّے پر بیٹھا ہے۔ شولی، لالہ، فتا، سب، سب ایک دم۔"

تجمل بے اختیار اس کا منہ تھپڑانے لگا۔

سب نے بدرو کے گرد گھیرا ڈال دیا تھا۔

بدرو بھاگا نہیں، وہیں کھڑا تجمل کے سامنے سر جھکائے گھگھیاتا رہا۔ تجمل کے طمانچوں سے اُس کا منہ لال ہو گیا تھا۔

"میں، میں سچ بولتا ہوں۔" وہ خوف زدہ آواز میں بولا۔

"وہ لوگ کدھر ہیں؟" جامو نے بڑھ کے اُس کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔

"کچھ اِدھر جیل میں، کچھ کبن.... کبن خاں کے ساتھ......"

"منہ سے پھوٹتا کیوں نہیں؟" جامو وحشت سے بولا۔

"شولی، فدا، دلن، بسوا، لالہ...."

"ہاں ہاں، صاف صاف بول۔"

"سب سب ختم ہو گئے۔" بدرو نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں۔" جامو ہذیانی انداز میں بولا۔ اُس کی انگلیوں نے بدرو کا گریبان پھاڑ دیا تھا۔ وہ اُسے جھنجوڑنے لگا۔

کسی میں کچھ اور سُننے کی ہمت نہیں تھی۔ اسٹیشن پر چلتے ہوئے مسافر ہماری طرف متوجہ ہونے لگے تھے۔ پیرو، مارتی، زورا، ابّا جان ہم سے پیچھے تھے۔ ہم بدرو کے پاس ٹھیرے تو وہ ہمارے پہلو سے گزرتے ہوئے ہم سے آگے نکل گئے لیکن کچھ ہی دُور جا کے رُک گئے۔ اسٹیشن پر شور مچا ہوا تھا۔ البتہ اُن کے کانوں تک بدرو کی باتیں ضرور پہنچی ہوں گی اور نہ بھی پہنچی ہوں تو ہمارے چہرے تو اُن کے سامنے ہی تھے۔ ہم سب کی آنکھیں اُبل کے جیسے باہر نکل آئی تھیں۔ پیرو نے ہمارے پاس آنے میں پھر چند لمحوں ہی کا توقف کیا ہوگا۔ زورا، مارتی اور ابّا جان کو وہیں روک کے وہ فوراً ہماری جانب جھپٹا اور اُس کی مضطربانہ نگاہیں ہم پر منڈلانے لگیں۔ "کیا لفڑا ہے تجمل بھائی؟" وہ تذبذب سے بولا۔ "یہ چڑیا کا کون ہے؟"

"کچھ نہیں دادا!" تجمل نے بھاری آواز میں کہا۔ "تم آگے بڑھو۔"

"اپن بڑھے گا، پر ادھر یہ کیا بولتا ہے؟"

"بولتا ہے کچھ لَوٹ پلٹ ہو گیا ہے۔"

"کیسا؟" پیرو نے حیرانی سے پوچھا۔

اِسی اثنا میں سارنگ، بدرو کو جامو سے چھین کے الگ لے گیا تھا۔ ہم سب کے ایک جگہ اکٹھے ہو جانے اور بدرو کا کُرتا پھٹ جانے کی وجہ سے آتے جاتے لوگ رُک رُک کے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ سارنگ بدرو کو دُور نہ لے جاتا تو ہمارے اِردگرد بھیڑ اکٹھی ہو جاتی۔ ہمیں فوراً منتشر ہو جانا چاہیے تھا مگر کسی کے بدن میں جان ہی نہیں رہی تھی۔ میرا دل زور زور سے دھڑ دھڑا رہا تھا۔ جامو نے اپنا سر بلاکو کے شانے پر رکھ دیا تھا اور بلاکو کسی بُت کے مانند بے جان کھڑا تھا۔ جینی، پلٹو، شولم پھٹی ہوئی آنکھوں سے تجمل کو گھور رہے تھے۔ تجمل کے ماتھے پر شکنوں کا جال بڑھتا جا رہا تھا۔ بدرو ہم سے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا مگر میری طرح کسی کو یقین نہیں آ رہا ہوگا کہ اُنھوں نے جو کچھ سُنا ہے، وہ سب سچ ہے اور بدرو ہم سے مذاق نہیں کر رہا ہے۔ پتہ نہیں سارنگ بدرو کو ایک کونے میں لے جا کے اُس سے اور کیا پوچھ رہا تھا اور بدرو اُسے اور کیا بتا رہا تھا۔ ابّا جان ہم سے کچھ فاصلے پر تھے اور اضطراری انداز میں ہم پر نگاہیں جمائے ہوئے تھے۔ تجمل کے بجائے جینی نے جھجکتے ہوئے زبان کھولی اور مختصراً بدرو سے سُنا ہوا معاملہ پیرو کو بتایا تو پیرو کے ہونٹ کپکپانے لگے۔ "ایسا!" وہ سر جھٹک کے بولا۔ "یہ رتنا کُتیا کا جنا کون ہے؟ اپن نے اِس کا نام پہلے نہیں سُنا۔"

"وہ اِدھر پہلے کلکتے میں ہی تھا۔ روز چھینا جھپٹی، ٹِن ٹِن کرتا رہتا تھا۔ استاد نے آخری بار بلا کے بولا کہ ۲۴ گھنٹے کے اندر کلکتے سے منہ کالا کر لو۔ سالا اُس وقت چلا گیا تھا۔ بعد کو معافی کے لیے آدمی بھیجا۔ استاد بولا، ہم اپنا فیصلہ واپس نہیں لیتا۔" جینی کی آواز غصّے سے تمتا رہی تھی۔

"ابھی اِدھر کیا کھڑے ہو؟" پیرو پھنکارتے ہوئے بولا۔ "اڈّے کی طرف چلو۔ چلو۔" اُس نے جامو کو دھکا دے کے دو قدم آگے کر دیا۔

"چلتے ہیں دادا!" تجمل نے سر ہلا کے آہستگی سے کہا۔

"ابھی اپن دیکھے گا، وہ کس کا تخم ہے؟"

"دکھائے گا دادا! پر تم ابھی اِدھر سے جاؤ۔ بڑے صاحب اُدھر کھڑے ہیں، ہم اندر جاتے ہیں۔" تجمل نے سرد لہجے میں کہا پھر مجھ سے مخاطب ہو کے بولا۔ "لاڈلے! تو دادا، زورا، مارتی اور ابّا کے ساتھ ابھی فیض آباد نکل جا۔ پیچھے ہم آتے ہیں۔"

"فیض آباد جانے کا بولتے ہو تجمل بھائی!" پیرو نے تلخی سے کہا۔

"ہاں دادا! تم اُدھر لاڈلے کے ساتھ چلے جاؤ۔ میں بھی آنے میں دیر نہیں کروں گا۔ دیر ہو جائے تو اُدھر ہی سے بمبئی چلے جانا۔ وہاں سے تم کو آئے ہوئے ٹائم ہو گیا ہے۔"

"تجمل بھائی! اپن سے کوئی غلطی ہو گیا ہے کیا؟"

"بات مان لو دادا! بڑے صاحب کا فیض آباد پہنچ جانا ٹھیک ہے۔"

"پر اپن کیسے جا سکتا ہے۔"

"تم کو جانا ہی ہے دادا! کوئی سی بھی گاڑی پکڑ لو۔ اُدھر بھی تمھارا ایک بیٹا ہے۔ اپنی گیتا کی خاطر جاؤ، جلدی کرو۔"

"کیسا بولتا ہے اُستاد!"

"ہٹ مت کرو دادا! ہٹ مت کرو۔" تجمل نے جھنجلا کے کہا۔

"اپن ایک دم نہیں جائے گا تجمل بھائی!" پیرو درشتی سے بولا۔

"بڑے صاحب کے ساتھ کوئی ہونا چاہیے دادا!"

"پھر کسی اور کو بولو۔"

"لاڈلا بھی جا رہا ہے۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔" میں نے تیزی سے حتمی لہجے میں کہا۔

تجمل نے اپنی سُرخ آنکھیں مجھ پر مرکوز کر دیں۔ "چُپ رہ۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔ میرے بجائے کسی اور کو بھیج دو۔"

"تو نہیں جائے گا تو پھر کون جائے گا رے۔" تجمل نے بکھری ہوئی آواز میں کہا۔ "سمجھتا کیوں نہیں ہے۔"

"میں سب سمجھ رہا ہوں۔"

"جا کے جلدی لوٹ آنا۔ دادا تم بھی اس کے ساتھ...."

"نئیں تجمل بھائی!" پیرو نے تجمل کی بات پوری نہیں ہونے دی۔ "اپن سے جاستی مت بولو۔ اِدھر سے ابھی کوئی بھی نئیں جائے گا، سمجھا، کوئی بھی نئیں۔ ٹیم جا رہا ہے۔ اپن کے پاس ٹیم کی کمی ہے۔"

"ٹائم تو تم برباد کر رہے ہو دادا!"

"ابھی تم سب کچھ اپن پہ چھوڑ دو۔ تم بڑے صاحب کے ساتھ اُدھر چلے جاؤ۔ پیچھے ہم آتا ہے، تم کو آرام کی ضرورت ہے، پیر بہت سوج گیا ہے۔ ابھی اس کو اور زیادہ مت پریشان کرو۔" پیرو نے نرمی سے کہا اور جامو کی طرف دیکھ کے بولا۔ "کیوں جامو اُستاد! اپن ٹھیک بولتا ہے نا؟"

"ہاں۔" جامو بے خیالی سے بولا۔ وہ نہ جانے کہاں کھویا ہوا تھا۔ "جیسا تم بولتے ہو، ٹھیک ہے دادا!"

"ابھی استاد کو فیض آباد جانے دو۔" پیرو نے دوبارہ کہا۔

"ہاں استاد!" جامو دھیرے سے بولا۔ "تم چلے جاؤ۔"

جامو کی زبان سے یہ مشورہ سُن کے تجمل نے آنکھیں بھینچ لیں، اُس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی اور نتھنے پھڑکنے لگے تھے۔ اُس نے اپنا سوجا ہوا پیر زور سے زمین پر پٹخا اور کوئی آہ بلند نہیں کی۔ پیرو چُپ ہو گیا، جامو کو بھی فوراً احساس ہو گیا کہ اُس نے پیرو کی تائید کر کے تجمل کو دُکھ پہنچایا ہے۔ کلکتے اُتر کے اور اتنا کچھ سُن کے تجمل کے یوں واپس چلے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جامو اُس کے سامنے سے ہٹ گیا۔ کچھ دیر تک سب خاموش رہے، سارنگ ابھی تک بدرو کے ساتھ دُور کھڑا اپنے کانوں میں آگ لگا رہا تھا۔ ہمارا اسٹیشن پر اس طرح زیادہ دیر ٹھیرے رہنا مناسب نہیں تھا۔ ابھی صرف بدرو ہی نظر پڑا تھا اڈّے کے دوسرے آدمی بھی اسٹیشن پر موجود ہوں گے۔ کسی لمحے وہ ہمیں دیکھ سکتے تھے۔ جامو، میں اور پیرو، ہم تینوں میں سے کسی ایک کا ابّا جان کے ساتھ جانا ضروری تھا مگر تینوں میں سے کوئی بھی آمادہ نہیں تھا۔ تجمل نے کسی اور سے نہیں کہا تھا۔ اُن میں سے شاید ہی کوئی کبھی تجمل کے ہمراہ فیض آباد گیا ہو۔ ہم تینوں کے سوا تجمل کسی اور سے کہتا تو وہ بھی انکار کر دیتا۔

بہرحال ہمیں جلد ہی کوئی فیصلہ کر لینا چاہیے تھا۔ جتنا وقت گزر رہا تھا، تجمل کی بات مجھے ٹھیک ہی لگ رہی تھی کہ ابّا جان کو پہلی گاڑی سے یا کسی بھی ذریعے سے فیض آباد کی طرف روانہ کر دیا جائے۔ میں نے سوچا، تجمل سے کہہ دوں، میں ہی چلا جاتا ہوں۔ ابھی ہم اسٹیشن پر ہیں۔ اسٹیشن سے نکلنے کے بعد کسی کو پتہ نہیں ہے کہ آگے کیا حالات پیش آئیں۔ کوئی اُن کے ساتھ نہیں گیا تو پھر ابّا جان کہاں جائیں گے۔ کلکتے میں اپنے اڈّے پر رتنا بیٹھا ہوا ہے۔ دوسرے اڈّے بھی اُسی کے زیرِ اثر ہوں گے۔ بدرو کے بقول پولیس ہماری تلاش میں تھی۔ اتفاق سے پولیس کے کسی آدمی نے ہمیں اب تک نہیں دیکھا تھا لیکن چھ مہینے میں سارے پولیس والے بدل نہیں گئے ہوں گے کہ تجمل اور دوسرے لوگوں کے چہرے نہ پہچان سکیں۔ اسٹیشن سے نکلتے ہی ہمارا اور اُن کا سامنا ہو سکتا تھا۔ پھر نہ معلوم کیا ہو۔ تجمل نے اسی خیال سے زورا، مارتی، پیر

اور ابا جان کو پہلے ہی اپنے سے جدا کر دیا تھا کہ ہمیں اپنے پیچھے گزرنے والے شب و روز کا کوئی علم نہیں تھا۔ اُس وقت بجھل کی یہ احتیاط مجھے فضول لگی تھی۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ گاڑی سے اُترنے کی دیر ہے، بدرو چنگاریاں لیے کھڑا ہے۔ مرغزار کے ختم ہونے کے بعد دو ایک بار صرف گھوشی نے پیچھا کیا تھا۔ بجھل کئی کئی مہینے میرے ساتھ اڈے سے بے خبر کبھی جنوبی ہندوستان کبھی وسطی ہندوستان گھومتا رہا تھا۔ جب میں نے بمبئی میں کرشنا جی کو ختم کرنے والے لوگوں کو پہچاننے کے لیے جھنگا اُستاد سے پالا لیا تھا تو اُس دوران بجھل بھی وہیں آ گیا تھا اور اُس کے ساتھ کانتے، جامو وغیرہ بھی تھے۔ اڈا چلتا رہا۔ ہم واپس آئے تو کہیں سے کوئی شکایت نہیں ملی تھی۔ تبت کی طرف جاتے وقت بجھل شہر کے تمام اڈوں پر عود گیا تھا اور اُسے یقین ہو گا کہ اُس کے پیچھے کوئی اُلٹی سیدھی حرکت نہیں کرے گا تبھی اُس نے سفر کا ارادہ کیا ہو گا اور تبھی اُس نے کبن خاں اور کانتے پر بھروسا کر لیا تھا ورنہ وہ جامو کو یہیں چھوڑ دیتا۔ ایک سلطان محبت کرتا تھا مگر بجھل اُسے اپنے ساتھ لے گیا تھا اور سلطان سے یہ توقع بھی نہیں تھی کہ وہ بجھل کے خاص اڈے پر اُس کی عدم موجودگی میں کوئی گڑبڑ کرے گا۔ جامو سے اُس کی نہیں بنتی تھی مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اُس کی نگاہیں بجھل کے اڈے پر لگی ہوئی ہیں۔ گھوشی کو اپنی غلطی کی سزا فوراً مل گئی تھی۔ پہلی بار تو میں نے ہی اُسے بجھل کے پاس لا کے معافی دلوائی تھی۔ بجھل تیار نہیں تھا، میں نے سفارش کی تھی اس لیے اُسے درگزر کر دیا تھا۔ گھوشی کے دماغ میں خناس سمایا ہوا تھا، باز نہیں آیا۔ دوسری بار پھر غداری کی اور جامو نے اُسے ہمیشہ کے لیے چپ کر دیا۔ اُس کے بعد دُور دُور کوئی دوسرا گھوشی نظر نہیں آتا تھا۔ ہمارے روانہ ہوتے وقت تمام اڈے ٹھیک ٹھاک چل رہے تھے۔

بجھل کبن خاں اور کانتے کے بجائے اڈے پر اپنی مورت رکھ جاتا تو بھی سب کچھ ایسے ہی رہنے کی اُمید تھی۔ تاہم بجھل نے اپنی مورت نہیں رکھی تھی، وہ کبن خاں اور کانتے کو اپنی جگہ چھوڑ گیا تھا۔ کانتے کا خون کچھ زیادہ گرم تھا لیکن کبن خاں اُسے سرد رکھنے کے لیے موجود تھا۔ مشہور تھا کہ چاقو ہاتھ میں آتے ہی کبن خاں کا رنگ بدل جاتا ہے، وہ کوئی دوسرا آدمی نظر آتا ہے پھر اُس کا چاقو ہوا سے باتیں کرتا ہے۔ وہ چاہتا تو لکھنؤ شہر کے سارے اڈے اُس کے چاقو کی نوک پر ہوتے مگر وہ اپنے ایک ہی اڈے میں مست رہتا تھا اور وہاں بھی ٹک کے نہیں بیٹھتا تھا۔ کبھی فیض آباد، کبھی کلکتے، کبھی آگرے، کبھی دلّی۔ جہاں جہاں سے اُسے خبر ملتی کہ کوئی اچھی گانے والی اور اچھے ناک نقشے والی آئی ہے کبن خاں سارے کام چھوڑ کے پہلے وہیں کا رُخ کرتا۔ مہینے میں دو ایک بار زریں کی خیر خبر لینے فیض آباد ضرور جاتا تھا۔ کبھی وہ خالی ہاتھ نہ جاتا۔ زریں کو اپنی بہن کی طرح سمجھتا تھا۔ شکل و صورت سے وہ کوئی نواب لگتا تھا۔ ململ کا کرتا، دوپلی ٹوپی۔ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ اسے ہتھیار اُٹھانا آتا ہے۔ اُجلی نکھری رنگت، سُرخی مائل، ڈیل ڈول میں کسرتی جسم کا، عمر بھی درمیانی تھی۔ جس کام کا ارادہ کر لیتا، اُس میں جُٹ جاتا۔ لکھنؤ میں لاڈو میاں کی بڑی دھوم تھی کہ اُس کے پاس بازار کا علاقہ تھا۔ ایک مدت تک یہ دستور رہا کہ لکھنؤ کے کسی دوسرے اڈے کا کوئی آدمی بازار کا رُخ کرتا تو پہلے لاڈو میاں کے اڈے پر اپنی آمد کی خبر کرا دیتا یا وہاں متعین لاڈو میاں کے کسی آدمی کی ہمراہی میں اندر داخل ہوتا۔ یہ ایک رسم بن گئی تھی جس کا لاڈو میاں کی وجہ سے سبھی پاس کرتے تھے اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ لاڈو میاں نے اپنے بڑے سے بڑے مخالف کو بازار میں داخل ہونے سے منع کیا ہو۔ اطلاع دینا شرط تھی اور اطلاع ہو جانے پر کبھی کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کی جاتی تھی۔ اس میں نہ کوئی الجھاؤ تھا، نہ جواب کا انتظار کرنا پڑتا تھا اس لیے لوگ اطلاع دینے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔ کہتے ہیں، ایک زمانے سے لاڈو میاں بازار کے اڈے پر جما ہوا تھا۔ یہ سب سے زیادہ آمدنی کا علاقہ تھا اور شہر و اطراف کے منتخب آدمی وہاں موجود تھے۔ دن بھر یہ لوگ شہ زوری کرتے رہتے، رات کو بن ٹھن کے بازار میں نکلتے۔ لکھنؤ کے اڈوں کی صورت دوسرے شہروں کے اڈوں سے کچھ مختلف تھی۔ وہاں بڑے نواب اور راجا لوگ ہر ماہ ایک مخصوص رقم بھجواتے تھے، باقاعدہ طور پر اڈے صرف کہیں کہیں قائم تھے لیکن اپنے اپنے علاقے موجود تھے جو ایک طرح سے اڈوں کی حیثیت رکھتے تھے۔

وہ کبن خاں ہی تھا جس نے پہلی مرتبہ بازار میں اپنی آمد کی رسمی اطلاع لاڈو میاں کے اڈے پر نہیں بھجوائی۔ یہاں تک بھی کوئی بات نہیں تھی۔ کبن خاں رات کو علاقے میں داخل ہوتے وقت ناکوں پر بیٹھے ہوئے لاڈو میاں کے آدمیوں سے بھی کہہ سکتا تھا کہ وہ گانا سُننے اندر جا رہا ہے۔ لاڈو میاں نے شہر کے دوسرے اڈوں کے چند خاص آدمیوں کو اس رسم سے مستثنا قرار دے رکھا تھا مگر کبن خاں کا شمار اس زُمرے میں بھی نہیں تھا۔ کبن خاں کے ساتھ اپنے اڈے کا صرف ایک آدمی تھا۔ جب وہ وہاں پہنچا اور اُس نے لاڈو میاں کے کسی آدمی سے رابطہ قائم نہیں کیا تو اُنھیں فکر ہوئی اور ابھی کبن خاں ایک بالاخانے پر چڑھنے کے لیے قدم بڑھا ہی رہا تھا کہ ایک شخص نے اُس کا راستہ روک لیا۔ کبن خاں نے دو تین واروں میں اُسے اپنے سامنے سے ہٹا دیا اور اُوپر چلا گیا۔ اُس نے دیر تک گانا سُنا، ناچ دیکھا اور وہیں کے کسی آدمی کے ذریعے اُسے خبر ملی کہ نیچے لاڈو میاں اپنے

ساتھیوں سمیت موجود ہے۔ یہ سُن کے گانے والی نے گانے سے انکار کر دیا تھا۔ کبن خاں نے اُس کے اور اپنے درمیان چاقو رکھ دیا۔ نتیجتہ محفل جمی رہی اور وہ ناچتی گاتی رہی۔ آدھی رات کے وقت جب کبن خاں اُٹھا تو نیچے سب سے پہلے لاڈو میاں سے اُس کی مڈبھیڑ ہوئی۔ لاڈو میاں نے اُسے یاد دلایا کہ یہاں کا کیا دستور ہے۔ کبن خاں نے ہنس کے جواب دیا، معلوم ہے، پر اپنا بھی کوئی دستور ہے۔ لاڈو میاں نے فیصلہ کرنے میں تاخیر نہیں کی۔ دوسرے ہی لمحے اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا مگر کبن خاں نے کسی اعتماد ہی میں یہ خطرہ مول لیا تھا۔ چند پل گزرے ہوں گے کہ اُس نے لاڈو میاں کے آدمی کا ہاتھ ننگا کر دیا تھا۔ لاڈو میاں کے لیے یہ خلافِ توقع تھا۔ پہلے تو وہ خیرہ کُن نظروں سے کبن خاں کو دیکھتا رہا پھر کسی اور آدمی کو آزمانے کے بجائے اُس نے خود چاقو سنبھال لیا اور کبن خاں کے مقابل آ گیا۔ کبن خاں اس کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ لاڈو میاں کو زندگی میں بہت کم ہتھیار اُٹھانے کی ضرورت پڑی تھی۔ یا تو وہ ہتھیار اُٹھاتا ہی نہیں تھا۔ اُٹھا لیتا تھا تو چاقو پوری طرح اُس کے قابو میں ہوتا تھا۔ اپنی مرضی کا فیصلہ کر کے ہی لاڈو میاں ہتھیار بند کرتا تھا۔ کبن خاں پر وار کرنے سے پہلے اُس نے اُسے موقع دیا کہ وہ چلا جائے اور آیندہ ایسی غلطی نہ کرے۔ کبن خاں نے جواب میں اُس پر چاقو تول لیا۔ گلی میں اُس وقت سناٹا چھا گیا تھا۔ قریب قریب کے تمام بالاخانوں پر ناچ گانا بند ہو گیا تھا اور راہ گیر ان کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ کبن خاں کو دو ایک ہی مرتبہ لاڈو میاں کے داؤ سے بچنا پڑا ہو گا کہ دیکھتے دیکھتے وہ پہلو سے اُچھل کے تیزی سے چیتے کی طرح لاڈو میاں کے جسم پر گرا اور اُس کے چاقو والے بازو میں اپنے بازو سے پیچ ڈال دیا۔ کبن خاں نے ایک لمحہ نہ جانے دیا۔ دوسرے ہی لمحے اُس نے دوبارہ اُچھل کے اس زور کا جھٹکا دیا کہ چاقو تو لاڈو میاں کے ہاتھ سے گرا ہی گرا تھا، اُس کے کلائی کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی۔ بہت سے لوگوں نے یہ منظر دیکھا تھا۔ کبن خاں نے منٹوں سے زیادہ وقت نہیں لیا تھا۔ لوگوں نے بس دو باتیں دیکھیں۔ کبن خاں کا اچانک لاڈو میاں سے بھڑنا اور اگلے چند لمحوں میں لاڈو میاں کا ہاتھ جھٹکنا۔ لاڈو میاں کے کسی اور آدمی نے بڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ چلتے چلتے کبن خاں اُس سے کہتا گیا کہ صبح سورج نکلنے سے پہلے وہ بازار کے اڈے پر نظر نہ آئے۔

اور یہی ہوا۔ سویرے کبن خاں ابھی سو کے نہیں اُٹھا تھا کہ لاڈو میاں کے آدمی اُس کے گھر کے باہر کھڑے تھے، وہ اُسے اپنے اڈے پر لے جانے آئے تھے۔ کہتے تھے کہ لاڈو میاں رات کو اڈے واپس نہیں آیا، وہیں سے کہیں اور چلتا بنا، اب کبن خاں آ کے اڈا سنبھالے۔ کبن خاں نے انکار کر دیا اور کہا، وہ اپنے ہی آدمیوں میں سے کسی کو چُن لیں اور بس آیندہ لاڈو میاں کی ڈالی ہوئی رسم کا اعادہ نہ کریں۔ کبن خاں نے جان بوجھ کے منع کر دیا تھا۔ ایک تو وہ اپنا اڈا ہی نہیں دیکھ پاتا تھا، دوسرے اس طرح وہ لاڈو میاں کے ساتھیوں کا آپس میں جھگڑا کرا کے اُن کی طاقت کمزور کر دینا چاہتا تھا۔ اڈے کی گدی کے لیے ساتھیوں کا آپس میں لڑنا لازم تھا۔ لاڈو میاں کے جانے کے بعد کئی آدمی مارے گئے۔ ایک کے بعد ایک، کبن خاں بیٹھا سُنتا رہا۔ پھر بازار میں لاڈو میاں کا ایک پرانا آدمی گلو کسی طور جم گیا۔ گلو نے بعد میں اپنا نام بدل کے گلباز رکھ لیا تھا۔ وہ ہمیشہ ایک کان میں بالا پہنتا تھا۔ گلاب کا پھول اُس میں ٹنکا رہتا اور گردن میں موتیا کا ہار پڑا رہتا تھا۔ جب بھی کبن خاں بازار جاتا، گلباز بالے سے پھول نکال کے فوراً جیب میں رکھ لیتا اور گردن سے ہار اُتار کے کبن خاں کی کلائی میں باندھ دیتا۔ لاڈو میاں کے بازار سے جانے کے بعد جتنے بھی آدمی اُس کی جگہ آئے، سب کبن خاں کا اتنا ہی لحاظ کرتے تھے۔ کبن نے کبھی کسی سے کوئی مطالبہ نہیں کیا، کوئی حکم نہیں چلایا تھا، درمیان میں کبھی دخل نہیں دیا تھا۔ اڈے پر لاڈو میاں کے پرانے ساتھی ہی قابض تھے مگر ہر طرف یہی چرچا تھا کہ بازار کے اڈے پر اصل راج کبن خاں ہی کا ہے۔ بازار میں جب بھی کوئی نئی لڑکی آتی تھی، اُسے لاڈو میاں کے ساتھیوں کے سامنے ناچ اور گانے کا ایک دَور ضرور کرنا پڑتا تھا مگر اب اس تقریب کا اہتمام صرف کبن خاں کے لیے ہوتا تھا۔ کبن خاں کو اور کیا چاہیے تھا، اُس کے لیے اتنا ہی بہت تھا۔ جامو نے ایک بار مجھے کبن خاں کا واقعہ سنایا تھا۔ اُس وقت یہ واقعہ گزرے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ کبن خاں کے بارے میں اور بھی عجیب اور انوکھی باتیں مشہور تھیں۔ عجب پاگل سا تھا۔ ایک دفعہ ایک نواب نے اُس کی کسی بات سے خوش ہو کے اُسے دس ہزار روپے دیے۔ کبن خاں رقم لے کے اپنے اڈے واپس جا رہا تھا کہ راستے میں ایک جگہ بھیڑ دیکھی۔ ہندوؤں کا مجمع تھا اور پنڈت زیرِ تعمیر مندر کے چبوترے پر کھڑا مندر کی عمارت مکمل ہونے کے لیے دان مانگ رہا تھا۔ کبن خاں نے چپکے سے اپنے آدمی کے ہاتھ نوٹوں کی گڈیاں اُسے بھجوا دیں اور اس سے قبل کہ پنڈت اُس کا شکریہ ادا کرتا، کبن خاں فوراً وہاں سے کھسک گیا۔ سب لوگ دیکھتے رہ گئے۔ اُس کی صرف ایک بہن اور ماں ہی زندہ تھی۔ بہن کی شادی ہو گئی تھی۔ ماں سیتاپور میں رہتی تھی۔ معلوم نہیں، اُنھیں خبر بھی ہوئی یا نہیں۔

یہی کچھ تھا جو بجّھل نے کبّن خاں کو کلکتے کا اپنا خاص اڈّا سونپ دیا تھا۔ کبّن خاں نے غیر ذمّے داری اور غفلت نہیں برتی ہوگی۔ کوئی اور بات ہوئی ہوگی۔ شولی، لالہ، فدا، اڈّے پر جتنے لوگ تھے سبھی کی گرفت چاقو پر مضبوط تھی۔ کانٹے پلک جھپکتے میں دوسرے کو بے بس کر دیتا تھا۔ اُس سے چاقو گروا لینا یا چھینا ایسا آسان نہیں تھا۔ شہر میں سبھی جانتے تھے کہ بجّھل کے آدمیوں سے چھیڑ چھاڑ کا نتیجہ لمحوں میں نکل آتا ہے اور کبھی اچھا نہیں نکلتا۔ نہ جانے اُن سب کو کیا ہو گیا تھا۔

ابّا جان کے ساتھ سامان اُٹھائے ہوئے قلی بے چین ہو رہے تھے اور ابّا جان بھی۔ مارٹی بھی ہمارے پاس آگیا تھا سو ہاں اُن کے پاس صرف زورا رہ گیا تھا یا قلی۔ زرّیں کا پتہ بتا کے سامان کے ساتھ صرف ابّا جان کو فیض آباد بھیج دینا بھی کسی حال میں درست نہیں تھا۔ پھر فیض آباد ہی کیوں۔ ابّا جان اپنے ٹھکانے پر ہی کیوں نہ جائیں جہاں فرخ، فریال، فارہ اور اکبر کو چھوڑ کے آئے ہیں۔ میں نے اُن سے اُن کا ٹھکانا نہیں پوچھا تھا مگر کوئی ایسی جگہ ہوگی جہاں اُنھیں واپس جانا ہوگا۔ ساری حجّت تو اس سامان کے سبب سے تھی جس میں بچھو بھرے ہوئے تھے۔ ممکن ہے ابّا جان خود بھی تنہا سفر کرنا پسند نہ کریں، نہ اُنھیں ایسا مشورہ دینا مناسب تھا لیکن سرِدست کوئی بجّھل سے الگ ہونے اور اُن کے ساتھ جانے پر تیار نہیں تھا تو پھر یہاں اُنھیں کہاں ٹھہرایا جائے یا اپنے ساتھ ہی رکھا جائے! دوسرے اڈّوں کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ بدرو کی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ آخر ہم کیوں پولیس کو مطلوب ہیں لیکن اب کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ پولیس کی نظر ہمارے بعد فوراً انھی صندوقوں پر پڑے گی۔ اتنے بڑے شہر میں انھیں چھپانے اور ابّا جان کو کسی محفوظ جگہ ٹھہرانے کا کوئی گوشہ، کوئی تہہ خانہ کم از کم میرے علم میں نہیں تھا۔ ہر جگہ مشکوک تھی۔ ایک کانسٹیبل کے نگاہ بھٹکنے اور صندوق کھولنے کی دیر ہوتی کہ سارے شہر کی پولیس حرکت میں آ جاتی۔ ان میں بہت سے پتھر ایسے تھے جن کی چمک سے آنکھیں پھٹ جائیں، صندوق کھلتے تو بات کہاں سے کہاں پہنچ سکتی تھی پھر نہ ہم کچھ بتلاتے، نہ وہ کچھ کھوج پاتے۔ دونوں صورتوں میں سلاخیں مقدّر تھیں۔ ابّا جان کے لیے بھی، ہمارے لیے بھی۔

میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ میں بجّھل سے کہہ دیتا ہوں، میں ہی چلا جاتا ہوں لیکن ارادے کے باوجود میری زبان نہیں کھلی۔ ابّا جان کو حویلی میں پہنچا کے میں فوراً لوٹ سکتا تھا۔ ایک ڈیڑھ دن کا فرق پڑتا۔ دوسرے دن میں پھر کلکتے میں ہوتا مگر یہ رات کوٹھی مجھے پہاڑ معلوم ہوتی تھی۔ میں انھیں چھوڑ کے چلا جاؤں کیونکہ ابّا جان اور اُن کے ساتھ دُنیا کا قیمتی ترین سامان ہے؟ میرا دماغ بالکل کام نہیں کر رہا تھا۔ "ٹھیک ہے بجّھل بھائی! ابھی اپن کی بات سنو۔" یکایک پیرو نے اچک کے نرم لہجے میں بجّھل کو مخاطب کیا۔ پیرو بھی یہی کچھ سوچ رہا تھا۔ وہ کہنے لگا کہ ہم میں سے کوئی فیض آباد نہیں جائے گا۔ سب یہیں رہیں گے۔ ابّا جان بھی اور جس طرح ہم دو اسٹیشن پہلے ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے تھے، فوراً پھر الگ ہو جاتے ہیں۔ پیرو، زورا، مارٹی اور ابّا جان شہر کے کسی ہوٹل میں ٹھہر جاتے ہیں، بجّھل اور دوسرے لوگ اِدھر اُدھر کی سُن گُن لینے کے لیے روانہ ہو جائیں یا سیدھے اڈّے کی طرف نکل جائیں۔ بجّھل نے نہ ہاں کی نہ ناں۔ وقت نہیں تھا۔ جامو نے کسی توقف کے بغیر اُسے محمد علی اسٹریٹ پر واقع اوسط درجے کے ایک ہوٹل کا پتہ بتا دیا۔ بجّھل کی خاموشی ہی تائید تھی۔ پیرو نے اُس سے باقاعدہ طور پر پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھی، مارٹی کو لے کے آگے بڑھ گیا اور مسافروں کے ہجوم میں گم ہو گیا۔ میں اُن کے ساتھ نہیں گیا۔ بجّھل نے مجھے پہلے ہی اُن سے الگ کر دیا تھا۔ پیرو مجھے لے جانا بھی چاہتا تو میں نہ جاتا۔ اُدھر جینی سانٹے کو بُلانے کے لیے بھاگتا ہوا اُس کے پاس پہنچا، چند قدم کا فاصلہ طے کر کے ہم اسٹیشن سے باہر تھے۔

اچھا یہی تھا کہ جس طرح بھی ہو سکے ابّا جان جلد سے جلد شہر سے اور ہم سے دُور ہو جائیں۔ ہوٹل بھی کوئی مناسب جگہ نہیں تھی۔ کسی کو بھی شک ہو سکتا تھا مگر ایسی صورت میں پیرو ہی کی تجویز بہتر تھی۔ کلکتے میں رہ کے وہ ہم سے قریب بھی رہے گا، دور بھی۔ کسی وقت اُس کی ضرورت پڑتی تو وہ برابر موجود ہوگا، وہ ہم سے اور ہم اُس سے رابطہ رکھ سکتے تھے۔ پیرو پہلی بار کلکتے آیا تھا۔ اڈّوں کے کم ہی لوگوں نے اُس کا چہرہ دیکھا ہوگا۔ درمیان میں چھ مہینے کی مدّت کا فاصلہ تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ اُس کے نقوش اُن کی آنکھوں میں محفوظ رہے ہوں۔ ابھی صرف بدرو نے پیرو کو ہمارے ساتھ دیکھا تھا، کسی اور کی نظر نہیں پڑی تھی۔ شاید بدرو نے توجہ نہ دی ہو۔ جس وقت اُس نے ہمیں اسٹیشن پر دیکھا تھا پیرو ہمارے ہمراہ نہیں تھا۔ پیرو کے ہمارے پاس آتے آتے سانٹے اُسے دُور لے جا چکا تھا اور بدرو کو اُس وقت کسی اور طرف دیکھنے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی لیکن اگر بدرو نے پیرو کو دیکھ لیا ہے تو وہ ہم سے جُدا ہو کے یہ خبر عام کر سکتا تھا۔ ہم اُسے منع کرتے تو وہ خواہ مخواہ وہم میں پڑ جاتا۔ بدرو کیا، آگے کچھ اور آدمی بھی پیرو کو پہچان سکتے تھے۔ پیرو، مارٹی اور زورا کے چہروں پر نقاب

...ں پڑی تھی۔

ادھر بجّھل کی کلکتے میں آمد کی خبر پھیلتی، اُدھر اتفاق سے ...پیرو کو پہچان لیتا یا بدرو کے پیٹ کو سہار نہ ہوتی تو تانے ...ے ملانے والے اپنی عادت سے باز نہ آتے۔ دونوں کی ایک ...کلکتے میں آمد، دونوں کا الگ الگ ہو جانا۔ پیرو کا ہوٹل میں ...تاک جھانک کرنے والوں کو چونکانے کے لیے بہت تھا۔ پتہ ...ں کن کن اڈّوں کے آدمی بجّھل کے لیے اپنے سینے میں زہر ...ئے ہوئے ہوں گے۔ موجدار کے اڈّے کے لوگ اُن میں ...پیش تھے۔ رتنا نے اُنھیں اُکسایا ہوگا تو اُنھوں نے بخوشی ...کا ساتھ دیا ہوگا اور سب کو فکر ہوگی کہ بجّھل کسی دن کلکتے ...ں نہ آ جائے، سب سے زیادہ فکر رتنا کو ہوگی۔ اُنھوں نے ...ے طور پر ضرور یہ طے کیا ہوگا کہ جیسے ہی بجّھل کلکتے آئے اُسے ...لے کی مہلت نہ دی جائے۔ پہلے ہی ہلّے میں اُسے اُس ...ساتھیوں سمیت کلکتہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا جائے۔ دوسرے ...وں کی مدد کے بغیر رتنا تنہا یہ کام انجام نہیں دے سکتا تھا یا ہو ...تا ہے اُس نے سوچا ہو کہ ایک بار بجّھل کے خاص اڈّے ...قبضہ کر لیا جائے، بعد میں اِدھر اُدھر کے اڈّے خود بخود ساتھ ...ہو جائیں گے۔ رتنا نے اُنھیں یقین کی حد تک فریب دیا ہوگا کہ ...ھل کا واپس آنا ممکن نہیں ہے اور اگر وہ آ بھی جائے گا تو اڈّا ...ھن جانے کے بعد وہ پہلے جیسا بجّھل نہیں ہوگا۔ رتنا نے اُنھیں ...لانے کے لیے بہت حربے اختیار کیے ہوں گے، طرح طرح ...کی باتیں بنائی ہوں گی۔

مگر خود رتنا نے اپنے آپ کو کس طرح مطمئن کیا ہوگا؟ ...ہر لمحے بجّھل کی واپسی کا دھڑکا ہوگا۔ کیا اُس کے ذہن ... ایسا کوئی امکان نہیں تھا یا وہ اُس کی واپسی کو کوئی اہمیت ...نہیں دیتا تھا۔ وہ بجّھل کو بھول گیا تھا یا اُسے بجّھل کی عمر گزر ...نے، بوڑھا ہو جانے کا گمان ہو چلا تھا۔ رتنا اتنے سال کلکتے ...سے باہر رہ کے اپنے اعتماد کا زور کرتا، اُسے پروان چڑھاتا رہا ...وہ اکیلا کلکتے نہیں آ رہا ہوگا، رتنا کو یقیناً بجّھل کے اڈّے کے ...آدمی سے بھنک مل گئی تھی کہ بجّھل کسی لمبے سفر پر روانہ ہوا ہے ...لگتا ہے کہ اُس کی واپسی مشکوک ہے۔ اُسے کسی نے بتایا ہوگا ...نے سے پہلے بجّھل نے اپنے بہت سے لوگوں کو اکٹھا کر کے ...کہا تھا کہ اُسے بارہ ایسے آدمیوں کی ضرورت ہے جو اپنے آگے ...پیچھے کی فکر نہ رکھتے ہوں اور جو اپنا سب کچھ تج کے اُس کے ساتھ ...جا سکیں۔ اُس نے اُن میں سے بارہ آدمی چُنے تھے۔ جو رہ گئے ...وہ سب بجّھل کے پرانے آدمی تھے مگر کسی نازک لمحے اُن

کے منہ سے بات نکل گئی ہو یا کبّن خاں اور کانٹے ہی سے کوئی ناراض ہو گیا ہو۔ آدمی کا کیا بھروسا۔ کوئی پتھر مار دے تو چپ رہے اور ایک تنکا چبھ جائے تو چیخ پڑے۔ کچھ بھی ہو۔ رتنا نے خوب سوچ سمجھ کے ہی بجّھل کے اڈّے کی طرف قدم بڑھائے ہوں گے۔ ہتھیار سنبھالنے کا سلیقہ اُسے کچھ زیادہ ہی آ گیا ہوگا مگر رتنا کے لیے یہ خبر کہ بجّھل کلکتے آ پہنچا ہے کسی حادثے کا درجہ نہ رکھتی ہو۔ پیرو کا الگ ٹھیرنا تشویش کا سبب بن سکتا تھا۔ پیرو اور اُس کے ساتھی وہاں کیوں موجود ہیں۔ اُن کے ساتھ وہ بزرگ شخص کون ہے اور اُن صندوقوں میں کیسا سامان بھرا ہے۔ یہ لوگ اتنے دنوں تک کہاں تھے، کہاں سے آ رہے ہیں؟ بجّھل اور پیرو کا بیک وقت کلکتے میں نظر آنا محض اتفاق نہیں ہوگا اور ضروری نہیں کہ انھیں یہیں آ کے اپنے اڈّے کے متعلق خبر ملی ہو، وہ کوئی منصوبہ بنا کے نہ آئے ہوں۔ بہر صورت رتنا کے آدمی ہمارے پیچھے تو سائے کی طرح لگے ہی ہوں گے۔ قدم قدم پر پیرو کی نگرانی بھی کرتے رہیں گے۔ سو پیرو کا ہوٹل میں ٹھیرنا کچھ زیادہ سود مند نظر نہیں آتا تھا مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ پیرو سامنے کا آدمی نہیں ہے۔ ممکن ہے رتنا کے آدمی بے سبب اُس سے اُلجھتے ہوئے ترچھی پیرو پر آڑی ترچھی نگاہیں ڈالنا ایسا آسان بھی نہیں تھا۔ شاید اُنھیں معلوم ہو کہ پیرو کون ہے۔ رہا پولیس کا، تو پولیس کا بھی کسی الزام کے بغیر پیرو کے گرد حصار ڈالنے کا امکان نہیں تھا۔ کلکتے کی پولیس میں اُس کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے، نہ بمبئی سے کلکتے آنے جانے پر کوئی پابندی عائد ہے، نہ ہوٹل میں ٹھیرنا جرم ہے۔ اِن تمام باتوں کے سوا پیرو خود بھی تو ہر ممکن احتیاط کرے گا، اپنے لیے نہیں تو ابّا جان کے لیے۔ اُسے اندازہ ہوگا کہ ایک ذرا سی چوک کتنے بڑے حادثوں سے دوچار کر سکتی ہے۔

دھوپ چڑھ رہی تھی اور اسٹیشن کے باہر حسبِ معمول انسانوں کا سمندر بہہ رہا تھا۔ وہی عمارتیں، وہی سواریاں، وہی لوگ، وہی چیخ پکار مگر سب اجنبی اجنبی سا لگ رہا تھا۔ ہم کسی سواری میں نہیں بیٹھے۔ بجّھل لنگڑا لنگڑا کے چل رہا تھا۔ اِس وقت سب کے ذہن میں یہی تھا کہ ہم سیدھے اڈّے کی طرف جائیں گے۔ باہر آ کے احساس ہوا کہ مزید کچھ جانے بوجھے بغیر اڈّے کا رُخ کرنا قرینِ عقل نہیں ہے۔ ابھی ہم کچھ بھی نہیں جانتے تھے کہ یہ سب کیوں اور کیسے ہو گیا۔ بدرو نے صرف چند باتیں بتائی تھیں جنھیں سُن کے حواس ہی برقرار نہیں رہے۔ وہی باتیں اتنی اچانک تھیں کہ کچھ اور جاننے کی سکت نہیں تھی۔ سانٹے بدرو کو الگ لے گیا تھا مگر باہر آ کے اُس نے اپنے ہونٹ بند رکھے، نہ کسی نے اُس

سے کچھ پوچھا۔ پہلے ہمیں سکون کی کسی جگہ بیٹھ کے اپنے اوسان درست کرنے چاہئیں تھے۔ بدلُو ہمارے ساتھ ہی تھا۔ پلٹو نے اُسے ایک چادر دے دی تھی جس سے اُس نے اپنا گریبان چھپا رکھا تھا۔ اسٹیشن سے ہم نے سوگز کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ اپنے ہی اڈّے کا ایک آدمی نظر آگیا۔ ہلاکو نے جینی کو، جینی نے جامو کو ٹہوکا اور جامو نے اُسے آواز دی۔ وہ ہریالا تھا۔ دُبلا پتلا، لمبا، ادھیڑ عمر۔ ہریالے نے مڑ کے دیکھا اور اُچھل پڑا۔ ہمیں دیکھ کے اُس کا بھی وہی حال ہوا جو بدرو کا ہوا تھا۔ جیسے ہم بھوت ہوں اور مرنے کے بعد دوبارہ نمودار ہوئے ہوں۔ ہریالا پہلے تو سٹپٹایا سا رہا، پھر بجھل کے پیروں پر جُھک گیا۔ بجھل نے اُس کی گُدّی پکڑ کے کھڑا کیا تو ہریالے کا جسم اُس کی انگلیوں میں جھول سا گیا جیسے اُس کی جان نکل گئی ہو۔ "سیدھی طرح کھڑا رہ۔" بجھل نے جھن جھناتی آواز میں کہا۔

ہریالے سے بولا نہیں جا سکا۔

سامنے ایک ہوٹل تھا۔ جامو نے ہریالے کو اُسی طرف چلنے کا اشارہ کیا اور اندر بیٹھنے کے بجائے ہم باہر پڑی ہوئی تپائیوں پہ بیٹھ گئے۔ ایک ایک پل کاٹنا دوبھر ہو رہا تھا سب کا دل یہی جی چاہتا ہوگا کہ اُڑ کے اڈّے پہنچ جائیں اور رتنا سے پہلے کسی اور کو نہ دیکھیں۔ ہریالے کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ "مجبور تھے استاد! بہت مجبور تھے۔"

"آگے بول سُور کی اولاد!" جامو نے گرج کے کہا۔

"ماں قسم اپنے کا کوئی دوش نہیں ہے۔" وہ لرزیدہ آواز میں بولا۔ "ہم تو خوار ہو گئے۔ ایک دم گُتّے بن گئے جامو استاد!"

"تُو ابھی زندہ کیوں ہے حرام زادے!" ہلاکو نے غصّے سے کہا۔

"سب جگاڑ میں لگے ہوئے تھے پر پر......"

فضول کی باتیں کرنے سے کیا حاصل تھا۔ بجھل نے ہاتھ اُٹھا کے ہلاکو کو روک دیا اور پھر جو کچھ ہریالے نے بتایا، اُسے سُن کے سب کے چہروں سے خون پھوٹنے لگا۔ ہریالے کے کہنے کے مطابق یہ کوئی ڈیڑھ مہینے پہلے کی بات تھی، وہ چھ بجے شام کو اڈّے پہ گیا تھا۔ کتن خاں اڈّے کے دوسرے آدمیوں کے ساتھ بیچ صحن میں رکھی ہوئی چوکی پہ بیٹھا تھا۔ نورا اُس کی انگلیاں چٹخا رہا تھا اور کتن خاں بہت خوش نظر آتا تھا۔ ہریالا اُسے سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گیا۔ کتن خاں نے اُس کی خیریت پوچھی۔ ہریالا بتا رہا تھا۔ اُس نے پوچھا "استاد کب آ رہے ہیں؟" کتن خاں نے مسکرا کے جواب دیا۔ "جلد ہی آ جائیں گے بس آتے ہوں گے۔ جلدی آ جائیں گے۔" بجھل کے بارے میں پوچھنے والوں کو وہ یہی

جواب دیا کرتا تھا۔ کالنتے وہاں موجود نہیں تھا۔ کتن خاں نے کہ وہ کہیں گیا ہوا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ کلکتے سے باہر ہے۔ ہر حسبِ معمول تھی۔ کتن خاں سے کسی کو کوئی شکایت نہیں تھی، میں کم از کم ایک بار رات کو محفل جمتی تھی۔ روز صبح اُٹھ کر علاقے کا چکّر لگاتا، دوسرے تیسرے روز دوسرے اڈّوں علاقوں کا۔ کالنتے کا بھی یہی معمول تھا۔ درمیان میں سیالدہ کے لوگوں نے من مانی کرنے کی کوشش کی تھی۔ تھوڑا بہت جھگڑا ہوا۔ کالنتے اور کتن خاں نے جا کے معاملہ رفع دفع کر دیا۔ اپنے اڈّے کے لوگوں کو کتن خاں سے ایک ہی شکایت تھی کہ وہ حد سے زیادہ درگزر سے کام لیتا ہے۔ دوسرے اڈّوں سے آمدنی کا بھتا بھیجنے میں لوگ ٹال مٹول کرنے لگے تھے۔ اِدھر اُدھر کے علاقے کے لوگ بھی دھندے کی چوری کرنے لگے تھے۔ کتن خاں بہت دیر میں سختی کرتا تھا۔ کالنتے ہی عموماً کر کے لاتا تھا۔

ہریالا تھوڑی دیر بیٹھ کے چلا آیا۔ رات کو وہ اڈّے پر نہیں تھا۔ اُسے ہونا بھی نہیں چاہیے تھا۔ سارے کے سارے لوگ اڈّے پر نہیں رہتے تھے۔ ہریالا اڈّے سے مستقل وابستہ نہیں تھا۔ صبح علاقے میں شور مچا تو وہ بھاگا ہوا اڈّے پہنچا۔ پولیس پہرا دے رہی تھی اور بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ اِرد گِرد کی ساری دکانیں بند تھیں۔ اُسے قریب نہیں جانے دیا گیا۔ اُس وقت اُس کا وہاں سے فرار ہو جانا ہی ٹھیک تھا لیکن اُسے لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ کتن خاں، شولی، لالہ، فدا، بسوا، نصیرا وغیرہ اڈّے کے بہت سے لوگ مارے گئے ہیں، ۱۴ آدمی۔ دوپہر کو اُن کی لاشیں علاقے کے لوگوں کے حوالے کر دی گئیں۔ سب خون میں لت پت تھے۔ اِدھر پولیس نے اڈّے کے آدمیوں کو پکڑ پکڑ کے گرفتار کرنا شروع کر دیا تھا لہٰذا مرنے والوں کی تجہیز و تکفین کریا کرم کا کام مشکل ہو گیا تھا۔ علاقے کے باسی لاشیں جمع کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ شام تک لاشیں پڑی رہیں۔ بہر حال کچھ لوگوں نے مل کے اُنھیں قبروں میں چھپا دیا یا جلا دیا۔ آیندہ چھ سات روز تک کہیں چھپا رہا کیونکہ پولیس کا خیال ہے کہ یہ سب اپنے اڈّے کے آدمیوں ہی کا کیا دھرا ہے اور آپس کے جھگڑے کا نتیجہ ہے۔ وہ کالنتے کی تلاش میں تھے لیکن وہ کلکتے میں موجود نہیں تھا۔ جیسے ہی وہ واپس آیا، اُسے گرفتار کر لیا گیا۔ شاید دوسرے یا تیسرے ہی روز وہ واپس آگیا تھا۔ نصیب میاں اڈّے پہ کہیں چھپے ہوئے تھے، اُنھیں بھی پولیس پکڑ کے لے گئی۔ پندرہ بیس روز تک اڈّا سنسان پڑا رہا۔ پھر

بنا۔ پھر چند دن بعد ہی اُٹھا لیا تھا اور علاقوں سے بھی متعدد پکڑے گئے۔ رفتہ رفتہ وہ چھوٹتے گئے لیکن کالنتے اور کئی کو اُنھوں نے اب تک نہیں چھوڑا ہے۔

بیشتر الزام کالنتے پہ آ رہا ہے اور یوں طرح طرح کی باتیں گرم ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ کتن خاں اور کالنتے نے مل کے بجھل اور اُس کے ساتھیوں کو سفر میں کسی جگہ ختم کروا دیا۔ بجھل اڈّے کی خبر سُن کے مزید واپس آتا یا کسی کو بھیجتا پھر کالنتے نے کتن خاں کو راستے سے ہٹا دیا۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ کلکتے سے عدم موجودگی کا عذر پیش کر کے بے گناہی ثابت کر سکے گا۔ شاید کر بھی سکے۔ کچھ لوگ بجھل ہی کو اصل سبب سمجھتے ہیں، کہتے ہیں یہ سب اُسی کی کوئی ترکیب ہے، اُس کے اشارے پر ہوا ہے۔ وہ باہر چلا گیا تاکہ اُس پہ کوئی حرف نہ آئے اور اس طرح اپنے ناپسندیدہ لوگوں کو اُس نے رستے سے ہٹا دیا۔ یہ لوگ سر چڑھ گئے اور آگے جا کے مشکلیں پیدا کر سکتے تھے۔ کچھ کہتے ہیں کہ بجھل کتن خاں سے خوف زدہ تھا یا اُن کے درمیان ایک عورت کا جھگڑا تھا۔ بجھل کتن خاں کی بہن کو اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ کچھ کہنا تھا کہ اڈّے کے دوسرے آدمی بجھل کے فیصلے سے ناخوش تھے کہ اُس نے لکھنؤ کے ایک اجنبی آدمی کو اڈّے پہ استاد بٹھا دیا ہے جب کہ یہ حق پُرانے آدمیوں کا تھا۔ اُس نے آدمیوں پہ اعتبار نہیں کیا۔ اور کالنتے نے نہیں اُنھی ناخوش آدمیوں نے کتن خاں کو ہٹا کے گویا بجھل سے بدلہ لیا ہے۔ ہریالا بتانے کیا کیا کہہ رہا تھا ہم نے بیچ میں دخل نہیں دیا۔ جو وہ کہتا سنتے رہے۔ اِن باتوں پر توجہ دینا وقت ضائع کرنا تھا۔ ہریالا پھر خود کھلنے لگا۔ یوں لوگ عجب عجب باتیں کرتے ہیں مگر کسی کو اُن پہ یقین نہیں ہے اور وہ یقین کرنا بھی نہیں چاہتے۔ سب جانتے ہیں وہ کون ہو سکتا ہے مگر وہ کھلے عام اُس کا نام نہیں لے سکتے۔ اُنھوں نے اپنی آنکھوں سے کچھ نہیں دیکھا ہے۔ رتنا واقعے کے پندرہ روز بعد کلکتے میں دکھائی دیا تھا۔ آنے کے بعد وہ مختلف اڈّوں پہ آتا جاتا رہا۔ پھر کوئی بیس بائیس دن پہلے وہ اپنے اڈّے کے علاقے میں آیا۔ اُس نے سیٹھ مول جی سے اڈّے کی عمارت کرائے پر لینے کا مطالبہ کیا۔ معلوم ہوا کہ سیٹھ نے انکار کر دیا تھا، کہتا تھا کہ اُسے استاد بجھل کے آنے کا انتظار ہے، جب تک وہ نہیں آ جائے گا، وہ عمارت کسی کو نہیں دے گا لیکن رتنا نے اُس کی ایک نہیں سُنی اور چابی لیے بغیر نہیں ٹلا۔ ہریالے کو معلوم نہیں تھا کہ عمارت بجھل کی ملکیت ہے۔ بجھل نے احتیاط کے طور پر اُسے مول جی کے نام کر دیا تھا اور خود کو اُس کا کرائے دار ظاہر کرتا تھا۔ مول جی بجھل سے کوئی اُلجھن پیدا نہیں کر سکتا تھا۔

اڈّے پہ بیٹھ کے رتنا تین چار دن تو چُپ چپ رہا، پھر اُس نے لوگوں کو اکٹھا کرنا شروع کیا۔ دوسرے اڈّوں کے آدمیوں کی آمد و رفت بڑھ گئی خصوصاً موچی پاڑے کے اڈّوں کے آدمیوں کی۔ پھر رتنا علاقے میں غتر بود کرنے لگا۔ اس کے ساتھ اِدھر اُدھر کے اَن گنت آدمی تھے۔ اُس نے بجھل کے پُرانے ساتھیوں کو پیش کش کی کہ وہ حسبِ سابق دھندا کرتے رہیں اور اڈّے سے اپنی وابستگی جاری رکھیں جس نے انکار کر دیا، اُس کے لیے اپنے ہی علاقے میں دھندا کرنا مشکل کر دیا گیا۔ کچھ لوگ انتظار کرتے رہے کہ شاید کوئی پلٹ کے آ جائے، استاد بجھل، جامو، سارنگ، ہلاکو، جینی، پلٹو وغیرہ میں سے کوئی بھی۔ ممکن ہے لاڈلا ہی آ جائے۔ پر اُن کی کہیں سے کوئی خیر خبر نہیں ملی۔ کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ رتنا سے وابستگی کے بغیر دھندا کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ بجھل کے پُرانے آدمیوں کے پیچھے ایک ایک پہ چار چار آدمی سائے کی طرح لگے رہتے تھے اور اپنے آدمی باہر ہی کتنے رہ گئے تھے۔ وہ یا تو جیل میں تھے یا مارے گئے تھے یا کہیں روپوش ہو گئے تھے۔ جو چھوٹے موٹے رہ گئے تھے، اُن کا کوئی والی وارث نہیں تھا پھر بھی یہ لوگ، ہریالے کے بقول استاد فیضو اور استاد پنجابی کے پاس گئے اور کہا کہ وہ بجھل کے دوست ہیں اور خاموش بیٹھے ہیں۔ دونوں نے ایک ہی قسم کا جواب دیا کہ ابھی خاموش رہنا بہتر ہے پولیس کے تیور بگڑے ہوئے ہیں۔ لوگ اور بھی کئی جگہ گئے تقریباً ہر جگہ سے مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا۔ لوگوں کو کالنتے اور اپنے اڈّے کے دوسرے آدمیوں کے چھوٹنے کا انتظار تھا اور یقین تھا کہ کالنتے ہی آ کے کچھ کرے گا۔ اُسے پولیس نے نہیں چھوڑا۔ ہریالا کہہ رہا تھا کہ پولیس نے ہمارے متعدد آدمیوں کا چلکا لیا تھا اور تھانے پر اُن کی صبح و شام حاضری لازمی قرار دے دی تھی۔ پولیس کے اِس رویّے سے تنگ آ کے کچھ لوگ دانستہ آ کے سیدھے ہاتھ ڈال کے جیل میں چلے گئے۔

ہریالا رتنا کے اڈّے سے اپنے تعلق کی ہزار تاویلیں دے رہا تھا اور بار بار ٹھہر کے ہمارے چہرے دیکھتا تھا۔ وہ رُک جاتا تو جینی، پلٹو اور ہلاکو جو اُس کے پاس ہی بیٹھے تھے، اُسے زور سے کہنیاں مارنے لگتے۔ "بھونکتا رہ۔" وہ چیخ کے کہتے اور ہریالا بوکھلا کے پھر بولنے لگتا۔ وہ بتا رہا تھا، رتنا نے اڈّا سنبھالتے ہی شہر کے تمام اڈّوں پر کہلا بھیجا تھا کہ اب اُنھیں بھتا بھیجنے کی ضرورت نہیں، یہ بھتا وہ اپنے پاس رکھیں۔ پھر اُس نے کچھ دن پہلے رنڈی نچوائی، اُس میں شہر کے کئی استاد شریک ہوئے۔ استاد فیضو اور استاد پنجابی نہیں آئے تھے لیکن اُن کے اڈّے سے کچھ لوگ ضرور شامل ہوئے تھے۔ رات بھر رنڈی ناچتی رہی اور خراب

بنی جاتی رہی۔ رتنا نے علاقے کے عام لوگوں کے لیے کھانے کا انتظام کروایا تھا۔ تقریباً سارا کھانا بے کار گیا۔ علاقے سے گنتی کے چند فقیر بھکاری ہی شریک ہوئے یا وہ لوگ جنھیں زبردستی وہاں لایا گیا تھا۔ ہریالا کہہ رہا تھا کہ علاقے میں رہنے والے ایک دوسرے سے بجھل کے متعلق پوچھتے ہیں اور کوئی کسی کو جواب نہیں دے پاتا۔ رتنا نے شروع شروع میں سختی کی تھی پھر نرمی کرنے لگا۔ علاقے میں وہ تین چار دن کے وقفے سے گھوم لگاتا ہے مگر کسی سے زیادہ بات نہیں کرتا، گزرتا ہوا چلا جاتا ہے۔ لوگ اُس سے بات کرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ علاقے کی دکانیں اب جلد ہی بند ہو جاتی ہیں۔ رات کو لوگ اپنے گھروں پہ ہی رہتے ہیں۔ اڈّے کے اِردگرد کی تمام گلیوں کی عورتیں صرف ضرورت کے وقت باہر نکلتی ہیں، مکانوں کی کھڑکیاں اور فلیٹوں کی بالکنیاں خالی رہتی ہیں۔

ابتدا میں آسنسول سے استاد مرتی آیا تھا۔ سُنا ہے جیل میں کانتے سے ملنے گیا تھا اور دو تین اڈّوں کے بھی اُس نے چکر لگائے تھے لیکن پولیس نے اُس کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ لوگ کہتے ہیں، ایک دن اُسے حوالات میں بھی رکھا۔ تین چار دن بعد پھر اُسے کسی نے کلکتے میں نہیں دیکھا، اڈّے پہ بیٹھے ابھی رتنا کو دو ایک روز ہی ہوئے تھے کہ ایک شام پولیس افسر دَت چند سپاہیوں کے ساتھ اُس کے پاس آیا تھا۔ آیا اور چلا گیا۔ معلوم نہیں، دونوں کے درمیان کیا بات ہوئی۔ علاقے میں پولیس گشت کرتی رہتی ہے۔ کئی دن پہلے کی بات ہے، رتنا بازار سے گزر رہا تھا، اُس کے ساتھ کچھ اور آدمی بھی تھے کہ اچانک تیجا ایک گلی سے نمودار ہوا اور کھلے چاقو کے ساتھ رتنا کے عین سامنے آ گیا۔ رتنا کے ساتھی اُس پر دوڑے مگر رتنا کو خود چاقو کھولے دیکھ کے پیچھے ہٹ گئے۔ تیجا نے اتنا وقت دیا تھا کہ رتنا چاقو کھول سکے۔ وہ چاہتا تو جھپٹ کے اُس کے سینے میں چاقو گھونپ دیتا یا اُس کی جانب اچھال دیتا۔ گلی میں سکوت چھا گیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ تیجا نے اپنی طرف سے بہت کوشش کی، رتنا کو کئی بار پچھاڑا مگر آخر رتنا نے اُس سے چاقو چھین لیا۔ رتنا تیجا کو مار سکتا تھا، اِس کے بجائے اُس نے تیجا کا چاقو اُسے واپس کیا اور ایک طرف چل دیا۔

تیجا کھڑا دیکھتا رہ گیا اور اُسی دن اُس نے علاقے کی ایک دکان سے چوری کی، ایسی چوری کہ پکڑا جائے۔ تیجا اُسی دن جیل چلا گیا۔ اُس نے اتنے دنوں تک اپنے آپ کو کہیں چھپائے رکھا تھا۔ ہریالا بتا رہا تھا کہ تیجا نے رتنا کے ہاتھوں اپنا چاقو چھنوایا۔ ہم نے تبصرہ نہیں کیا لیکن کسی کو یقین نہیں آتا تھا۔ تیجا کا ہاتھ خوب رواں تھا۔ اُس کے جسم میں بجلی بھری ہوئی تھی۔ بچپن ہی سے وہ بجھل کے ساتھ تھا اور اڈّے کا خاص آدمی تھا۔ تبت جانے

سے پہلے اُس نے ہمارے ساتھ تنہا چلانے کی بھی مشق کی تھ... بجھل نے اُسے کلکتے میں چھوڑ دیا تھا۔ تیجا کو بھی نہ جانے کیا... اس کا مطلب یہی تھا کہ رتنا نے اپنا ہاتھ خوب مانجھ کے ا... کا رُخ کیا ہے۔

چائے پڑے پڑے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ کسی نے ایک گ... بھی حلق سے نہیں اُتارا تھا۔ سب یکایک کھڑے ہو گئے۔ ب... بجھل اُٹھ گیا تھا۔ "بند کر دے!" اُس نے تمتمائے ہوئے لہجے... لے کہا اور یکایک آگے چل پڑا۔ ہریالا اور بدلو بھی ہمارے... چلتے رہے۔ ہماری رفتار خاصی تیز تھی۔ کچھ دُور جا کے سڑک... پہ چنگاما مل گیا۔ ہمیں دیکھ کے اُس کا رنگ ایک لمحے کے... سفید پڑ گیا۔ چنگاما کا تعلق چاٹگام شہر سے تھا۔ نام اُس کا... تھا مگر سب اُسے چنگاما ہی کہتے تھے۔ اُستاد دھوبی کے اڈّ... آدمی تھا۔ جب میں جیل میں تھا تو وہ وہاں کبھی کبھی چار، چھ مہی... آ جاتا تھا۔ ہم نے چنگاما سے کچھ نہیں پوچھا تھا مگر شاید بدرو... ہریالے نے اپنے کہے ہوئے کی تصدیق کے لیے اُسے ا... کر دیا تھا۔ چنگاما نے کم و بیش وہی باتیں بتائیں جو پہلے ہ... ہریالا منہ سے پھوٹ چکے تھے۔ البتہ چنگاما کا کہنا تھا کہ رتن... آگے موجدار کے آدمی تھے اور رتنا خود بھی باہر سے آدمی لا... رات کو اُنھوں نے اڈّا چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ اڈّے ک... اُنھی کے ایک آدمی نے کھولا تھا جو کئی دن سے کیتن خان ک... سے اڈّے ہی پہ رہتا تھا۔ پولیس کو وہ آدمی اب تک نہیں... بجھل کچھ اور سننا نہیں چاہتا تھا۔ اُس نے نگاہ اُٹھا کے چ... کو چپ ہو جانے کی تلقین کی۔ چنگاما کی زبان جیسے منجمد ہو گئی...

اڈّے کا فاصلہ چار پانچ میل سے کم نہیں ہوگا۔ اسٹیشن... خاصی دُور تک پیدل آ گئے تھے۔ میں نے سوچا ٹیکسی کو آواز... جتنی دیر ہو رہی تھی، دل اُڑتا جا رہا تھا۔ جسم میں کوئی چیز جل... تھی جیسے کوئی چیز اٹک گئی ہو، سارے جسم میں پھانسیں چ... ہوں۔ راستے میں اڈّوں کے اور آدمی بھی مل سکتے تھے۔ اس سے... کہ کوئی ہم سے پہلے پہنچ کے رتنا کو اطلاع دے، ہمیں خود ہی... اپنی آمد کی خبر کر دینی چاہیے۔ درمیان میں کہیں ہمیں پولیس بھی... سکتی تھی لیکن معلوم نہیں، بجھل کیا سوچ رہا تھا۔ جب اڈّے... طرف جانا مقصود تھا تو کسی سواری میں کیوں نہیں، دیر کا... تھی۔ کیا ابھی کچھ اور جاننے اور سوچنے کو رہ گیا تھا۔ بجھل چل... پاؤں میں تکلیف کے باوجود تیز تیز۔ بیچ میں ہاوڑا کا بڑا... پڑتا تھا۔ ہم وہاں سے راستہ کاٹ کے بھی نکل سکتے تھے... وہ اُسی طرف جا رہا تھا۔ تھانے کے قریب اُس نے مڑ کے... دیکھا اور سُولم کو بُلایا: "چاہے تو نکل جا رے!" اُس نے آہ...

...ولم سے کہا۔

سُولم بڑھ کے اُس کے گلے سے لپٹ گیا۔ سُولم چاٹگام ...کے اڈّے سے وابستہ تھا۔ بجھل نے تبت جاتے ہوئے ...ں سے اُسے اپنے ساتھ لیا تھا۔ اڈّے کے چند خاص آدمیوں ...و اکسی کو معلوم نہیں تھا کہ سُولم ہمارا ہم سفر ہے اور وہ ہمارے ...بھی نہیں گیا تھا، ہم سے پہلے جامو اور ہیرو وغیرہ ایک دن ...ڈبروگڑھ کے لیے کلکتے سے روانہ ہوئے تھے۔ سُولم بھی ...کے ساتھ تھا۔ سُولم اُسی وقت ہم سے الگ ہو سکتا تھا۔ اگر ...پولیس کا کوئی چکر پڑنے والا تھا تو اس طرح سُولم صاف ...نکل جاتا مگر سُولم کیسے جاتا۔ تبت میں وہ قدم قدم پہ ہمارے ...پہلو رہا تھا، تیرے میرے عذاب میں خواہ مخواہ کا شریک۔ ...ار بیمار پڑا، مرتے مرتے بچا، کبھی شکایت کا ایک حرف زبان ...لایا، ہمیشہ کی طرح اُس کا چہرہ مسکراتا ہی رہا۔ اب وہ کیسے ...جاتا! بجھل نے اصرار بھی کیا۔ سُولم کی آنکھیں بھر آئیں۔ بجھل پھر ...کے شانے پر ہاتھ رکھے بڑھتا رہا اور اس وقت ایک ثانیے ...لیے میرا سارا جسم جھنجھنا سا گیا جب بجھل آگے جانے کے بجائے ...نے کے پھاٹک میں داخل ہونے لگا۔ دروازے پر تعینات ...ری نے اُسے غور سے دیکھا اور زور سے سیٹی بجائی۔ جواب میں ...بھی سیٹیاں بجنے لگیں اور ہم عمارت کے آگے چھوٹا ہوا مختصر ...ن عبور کر کے چبوترے پر نہیں چڑھے تھے کہ سپاہی چاروں طرف ...اُبل پڑے اور ہمارے گرد پھیل گئے۔ اُسی لمحے ایک دراز قد، ...بڑی عمر افسر بھاگتا ہوا اندر سے آیا اور ٹھٹک کے ہم سے کچھ فاصلے ...ڑا ہماری صورتیں گھورنے لگا: "استاد بجھل!" وہ حیرت سے بولا۔

"ہاں سورتی بابو!" بجھل نے تھکے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"تم، تم... سب!" انسپکٹر کی آواز گلے میں اٹک گئی۔

"سوچا، ہمی چلے جائیں، تمھیں تکلیف ہوگی۔ شہر اُترتے ہی ...لا کہ تم لوگوں کو اپنی تلاش ہے۔" بجھل نے رُک رُک کے کہا۔

"تلاش! مگر تم لوگ، تم سب کہاں تھے؟"

"اِدھر سے دُور تھے۔"

"آؤ، آؤ۔ اندر آ جاؤ۔"

"اندر ہی جانے کے لیے آئے ہیں۔"

انسپکٹر سورتی جیسے ابھی سو کے اُٹھا ہو اور خواب دیکھتا ...ا ہو۔ وہ کچھ اس طرح ہڑبڑاتی پلکوں سے ہمیں دیکھ رہا تھا، کبھی ...ں کبھی سپاہیوں کو اور اپنے آپ کو۔ بجھل دو قدم چل کے ...ترے پر چڑھ گیا۔ انسپکٹر جھجکتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھا، ...کے پیچھے پیچھے ہم چلے۔ "بیٹھ جاؤ۔" اُس نے تذبذب سے

کہا۔ کُرسیاں چار سے زیادہ نہیں تھیں، بجھل کھڑا رہا۔

"ٹھیک ہے سورتی بابو!"

سورتی نے دوبارہ بیٹھنے کو نہیں کہا: "ہمیں تمھاری تلاش تھی، تمھیں ٹھیک بتایا گیا۔ ہمیں تمھاری تلاش تھی۔" سورتی کی آواز لپک رہی تھی۔

"اِسی کارن ہم خود آ گئے۔"

"مگر یہ سب کیا ہوا ہے؟" سورتی اضطراب سے بولا۔

"یہی اپنے کو بھی تم سے پوچھنا ہے۔"

"تم کچھ نہیں جانتے؟" اُس کے لہجے میں مضحکہ تھا۔

"تھوڑا بہت جانا ہے، پر اصل تو تم سے پوچھنا ہے۔"

"ٹھہرو!" وہ ایک دم اُٹھ کے بولا: "ڈی ایس پی صاحب بھی یہیں ہیں۔ ڈی ایس پی راجندر ماتھر۔" سورتی تیز قدموں سے باہر چلا گیا اور اُسی لمحے واپس آ گیا۔ وردی میں ملبوس ایک شخص کمرے میں داخل ہو ہی رہا تھا۔ درمیانہ قد، بھاری جسم، سر کے آدھے بال اُڑے ہوئے، چھوٹی آنکھیں، سُرمئی رنگ۔ وہ یقیناً ڈی ایس پی ماتھر ہوگا۔ بجھل نے ایک ہاتھ اوپر اُٹھا کے اُسے سلام کیا۔

"سلام ساب۔"

"سلام۔" وہ گردن ہلا کے گونجتی آواز میں بولا: "اُستاد بجھل!"

"ہاں ساب!" بجھل نے نرمی سے کہا۔

"تم کہاں تھے؟"

"سفر پہ تھے ماتھر جی!"

"کون سے سفر پہ؟"

"ذرا دُور چلے گئے تھے۔"

ماتھر کے ہونٹ باہر نکل آئے: "کہاں؟"

"کوئی ایک جگہ ہو تو نام لیں۔ دُور دُور گھوم رہے تھے۔"

"بتانا نہیں چاہتے؟" وہ جز بز ہو کے بولا۔

"اِدھر کلکتے میں نہیں تھے ماتھر جی!"

"مگر یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ کون سی جگہ تھے؟"

"دھیرج رکھیں ساب! وقت آئے گا تو اُس کو بھی بول دیں گے۔" بجھل نے کسمسا کے کہا: "آپ کو اپنی جو کارروائی کرنی ہے، کرو۔"

"جانتے ہو تم پر کیا الزام ہے؟"

"اپنی ساری زندگانی الزام ہے۔ اب کیا کوئی پیچھے سے بڑھ کے ہے۔"

"بہت بڑھ کے اُستاد!" ماتھر کی آواز کڑک رہی تھی: "یاد ہے، میں نے پہلے بھی کئی بار کہا ہے، ایک آخری وقت ضرور

آئے گا۔ تم بچ نہیں سکو گے۔"

"یاد ہے مائی باپ! اپنی بھی ایک بات شاید سرکار کو یاد ہو۔ میں نے بولا تھا، آخری وقت آئے گا تو کون روکے گا۔ ہر بار ایسا لگتا ہے کہ اب کے آگیا، پر نٹ کھٹ بغل سے ہو کے نکل جاتا ہے۔" تجمل نے مدھم لہجے میں کہا۔

"ہمیں اوپر سے سخت حکم ہیں۔"

"ہم آپ کے سامنے ہیں ماتھر جی! اسٹیشن سے آگے پہلا بڑا تھانا یہی پڑتا تھا، سو ہم اِدھر ہی آگئے۔"

ماتھر نے ہنکاری بھری اور کنپٹیاں مَسلتا ہوا تیزی سے بولا۔ "تو تم کہتے ہو تم یہاں اس شہر میں نہیں تھے؟"

"ہاں ساب! ایسا ہی بولا ہے۔"

"مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ تم یہاں تھے یا نہیں۔"

"آپ ٹھیک بولتے ہو، پھر آپ کیا پوچھتے ہو۔ آپ کے لیے نہیں پڑتا، پر اپنے لیے بہت پڑ گیا ہے۔"

"کتنے دنوں سے تم باہر تھے؟" وہ پہلو بدل کے بولا۔

"آدھے سال سے اوپر ہونے کو ہو گا۔"

"باہر کیا کر رہے تھے؟"

"ہم لوگ کیا کر سکتے ہیں۔" تجمل نے تنک کے کہا۔ "سارے سوال اِدھر ہی کر لو گے تو اُدھر کے لیے کیا بچے گا۔ باہر کبوتر اڑا رہے تھے۔"

ماتھر کے نتھنے سلوٹیں پڑ گئیں کچھ بولتے بولتے رہ گیا۔ کمرہ بڑا تھا۔ میز کے پیچھے اور ہمارے دائیں بائیں کئی سپاہی مستعد کھڑے تھے۔ ماتھر نے چاروں طرف ایک اچٹتی نظر ڈالی اور انسپکٹر سورتی سے سرگوشیانہ لہجے میں کچھ کہنے لگا۔ سورتی فوراً باہر چلا گیا۔ چند لمحے یوں ہی گزر گئے۔ ہلاکو میرے قریب میرا بازو پکڑے کھڑا تھا، جامو تجمل کے پاس تھا۔ باقی سب پیچھے تھے۔ یکلخت ماتھر سپاٹ لہجے میں بولا۔ "میں نے تم سے بولا ہے۔ اُوپر سے بہت زور ہے۔"

"ہو گا، ضرور ہو گا۔ پر زور تو دونوں طرف سے لگ رہا ہے۔ اوپر سے بھی، نیچے سے بھی۔ نیچے والے بھی کم زور نہیں ہوتے۔ پھونکوں سے آگ جلا دیتے، بجھا دیتے ہیں۔ آپ کوئی نئے تو نہیں ہو، جانتے ہو، اُوپر کا زور کب تک چلے گا۔ نیچے والے سارا دھواں اڑا دیں گے۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"اپنا کہنا کیا، سرکار کی دہائی دیتے ہیں۔"

"استاد تجمل!" ماتھر نے اونچی آواز میں کہا۔ "بہتر ہے سیدھی بات کرو۔ جو کچھ ہوا ہے، وہ نہایت سنگین ہے۔ ابھی تک ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچے ہیں لیکن سب کا خیال ہے کہ ...."

"پھر دیر کس بات کی ہے۔" تجمل بیچ میں بولا۔

"دیر شاید تمہارے آنے کی تھی۔" ماتھر نے تلخی سے کہا۔

"ہمارے سر تمہارے ساتھ ہیں۔"

"سروں کا فیصلہ بھی ہو جائے گا لیکن اس سے پہلے تمہارے پاس موقع ہے، تمھیں جو کچھ کہنا ہو، کہہ سکتے ہو۔"

"ایک ہی جگہ پھر سب بول دیں گے۔"

"تمہارا یہاں کا بیان بھی اُدھر کام دے گا۔"

"آپ کے سنگ رہتے ہوئے اپنے کو بھی تھوڑی بہت جانکاری ہو گئی ہے۔ بیان کا بلٹا کرنے میں صرف زبان ہلتی ہے۔"

"تو تم یہاں کچھ کہنا نہیں چاہتے؟"

"ایک ہی بار جو بولنا ہو گا، بول دیں گے۔ اُدھر بولنے کے کواڑ بند نہیں ہو جائیں گے۔ آپ حکم کرو۔"

"ہمارے پاس تمہارے وارنٹ نہیں ہیں۔"

"آپ کی انگلی ہی وارنٹ ہے، وارنٹ بننے میں کیا ٹائم لگتا ہے۔"

"لیکن اگر تم چاہو تو اس کی نوبت نہیں آئے گی۔"

ماتھر کی بات سن کے تجمل کے ہونٹوں پر جمی ہوئی پپڑی تڑخنے سی لگی۔ اس کا باچھا پھیل گیا۔ جیب سے بیڑی کا بنڈل نکال کے اس نے بیڑی سلگائی۔ "ذرا پانی پلاؤ حوالدار!" اس نے قریب کھڑے ہوئے حوالدار سے کہا۔ ماتھر کے اشارے پر وہ ایک گلاس میں پانی لے آیا۔ تجمل نے ایک ہی سانس میں سارا پانی حلق میں انڈیل لیا اور بیڑی کے دو ایک لمبے کش کھینچ کے بولا۔

"ابھی گاڑی سے آتے ہی سب سے پہلے یہ جھٹکے کا مال بدرو ملا تھا، بولتا تھا، لوٹ جاؤ، پولیس تمہاری تلاش میں ہے۔ پھر لالہ ہریالا بنا، حرام کا جنا ملا۔ یہ بھی یہی بولتا تھا، پر ہم آگے پیچھے کدھر بھی نہیں گئے۔ سیدھے اِدھر ہی آ رہے ہیں۔ ہم کہیں اور بھی جا سکتے تھے، اننا سن کے اپنے کو بھی پولیس کی تلاش تھی۔"

"تمہارے کہنے کا مطلب ہے۔" ماتھر کی آنکھیں سکڑ کے اور چھوٹی ہو گئیں۔ "یہاں آنے سے پہلے تمھیں کچھ بھی معلوم نہیں تھا؟"

"ایسا ہی سمجھو۔"

"یعنی تم اس عرصے میں بالکل بے خبر رہے؟"

"اتنے دنوں بعد پھر آپ کے درشن نہیں ہوتے۔"

"ہوں استاد تجمل!" ماتھر اُچک کے بولا۔ "تم ایسی کون سی جگہ تھے جہاں تمھیں اپنے آدمیوں کی بھی خبر نہ مل سکتی ہو۔ شاید اُن لوگوں نے تمھیں بتایا ہو۔" ماتھر کے لہجے کا طنز چھپا ہوا نہیں تھا۔ "اس واقعے کو ڈیڑھ مہینہ ہو رہا ہے۔ گلی گلی اس خبر کا چرچا ہے۔ تمھیں

...نے نہیں بتایا کہ تمہارے پیچھے کیا کیا ہوا، کیا ہو رہا ہے ...م نے بھی لوٹ کے خبر نہیں لی؟"

ڈی ایس پی ماتھر لوٹ پھیر کے ایک ہی بات کی تکرار ...رہا تھا جس کا تجمل کے پاس جواب نہیں تھا۔ کھڑے ...ی ٹانگیں دکھنے لگی تھیں۔ سینے میں ایک زمانے سے یوں ہی ...ہوں۔ میرا دل کہیں دھنسا جا رہا تھا۔ ہمیں شاید سیدھے اڈے ...کی طرف جانا چاہیے تھا۔ بعد میں یہاں آنا پڑتا تو اتنی گھٹن نہ ...ی۔ ماتھر کی چمکتی نظریں تجمل پر مرکوز تھیں۔ "ہم کچھ بولیں گے تو تم ...ں سمجھو گے۔" تجمل نے سانس لے کے کہا۔

"ہمیں سمجھاؤ، استاد تجمل! ہم سمجھنا چاہتے ہیں۔"

"اپنے لیے یہ بعد کی بات ہے۔"

"اور پولیس کے لیے پہلی۔"

"رسّی کا ایک سِرا نہیں ہوتا اور ٹوٹی ہوئی ہو تو بہت سے ہوتے ہیں۔"

"پولیس تمہارے باہر ہونے کی شہادت طلب کرے گی۔"

"اور ہم اپنے اِدھر ہونے کی پولیس سے نہیں کریں گے، جانے ...ماتھر جی! اس بات کو جانے دو۔" تجمل نے زہرخند سے کہا۔

"مگر اِس بات پر تم گرفتار کیے جا سکتے ہو اور یہی بات ...یں آگے جا کے ثابت کرنی پڑے گی۔" ماتھر دھمکتے لہجے میں بولا۔

"اور ہم کیا بول رہے ہیں۔ آگے والوں کو بھی کچھ ثابت کرنا ...ے گا۔ آگے والے ایک آنکھ سے دیکھتے، ایک کان سے سنتے ...ں کیا! وہ پہلے اپنے ماتھے کا ٹھپا دیکھیں گے، پھر بات کریں ...ے جیسا تم کر رہے ہو۔"

"ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا، تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"کچھ سمجھنے کے لیے آنکھیں بدلنا پڑیں گی ماتھر جی! ساون کے ...ندھے کو ایک ہی رنگ سوجھتا ہے۔ اپنے کو تم نے سدا سلاخوں ...اور زنجیروں کے ساتھ دیکھا ہے، من میں ایک ہی مورت بنائی ہے۔ ...ر بار ہمی پر بجلی گرے گی سرکار! جس کے جدی ہوتی ہے اُسی سے ...پوچھتے ہو، وہ کدھر کو تھا۔ ٹھپے پر ٹھپا ہی لگاتے جاؤ گے۔" تجمل ...کی آواز چیخنے لگی تھی۔ "گریبان تمھی کو پکڑنا آتا ہے کیا! ہم کو اُوپر ...چڑھنا نہیں آتا۔"

"دیکھو تجمل! بگاڑ کرنے سے بگاڑ پیدا ہو گا۔" ماتھر نے اپنا لہجہ ...نرم رکھنے کی ناکام کوشش کی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے ...چمک رہے تھے۔ "اپنی یہ مورت تمھی نے بنائی ہے، تمھی اسے بدل ...سکتے ہو۔ معاملہ اُلجھانے کی کوشش مت کرو۔ اس طرح کی باتیں کر کے ...تم کیا جتانا چاہتے ہو۔ میں کہتا ہوں، تم اپنے لیے بُرا کر رہے ہو۔ شاید ...بہت بُرا۔ تم کس کے سامنے بیٹھے ہو، کسی ایسے شخص کے سامنے نہیں

جو تمھیں نہ جانتا ہو، میں تمھیں اُس وقت سے جانتا ہوں جب میں ایک معمولی سپاہی تھا اور میں کیا، یہاں سبھی جانتے ہیں کہ تجمل...."

"کوئی نہیں جانتا ماتھر جی!" تجمل اُس کی بات کاٹ کے بولا۔

"کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون ہے، کیا کرتا ہے، کہاں رہتا ہے۔ کتنے دن گھر میں، کتنے دن گھر سے باہر۔ کن لوگوں کے ساتھ اُس کا اُٹھنا بیٹھنا ہے۔ اُس کی جیب میں ہمیشہ ایک ہتھیار رہتا ہے۔ اُس کے اشارے پر زندگی اور موت کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اُس کی کوئی کل سیدھی نہیں، اُس کی نہ دوستی اچھی ہے، نہ دشمنی۔ کتنے فائل بھرے ہوئے ہیں۔ کیا میں اُن سب کو گنواؤں جو میرے علم میں ہیں۔ جو میرے علم میں نہیں، اُن کی تعداد اور زیادہ ہو گی۔ تمہارا سارا ریکارڈ کاغذوں میں محفوظ ہے۔ ستارے اچھے لے کے آئے ہو، ہر بار ساتھ دے جاتے ہیں مگر کب تک...."

ڈی ایس پی ماتھر کی زبان میں جیسے آگ سُلگی ہوئی تھی۔

اس دوران انسپکٹر سورتی واپس آگیا۔ ماتھر نے رُک کے اُس کی طرف بے چینی سے دیکھا۔ سورتی نے اثبات میں گردن ہلائی اور انگریزی میں کچھ کہا جسے میں سن نہیں سکا۔ سورتی کو اپنے قریب رکھی کرسی پر بیٹھنے کا حکم دے کے ماتھر بگڑے ہوئے منہ سے بولا۔ مگر اُس کے لہجے میں کسی قدر ٹھیراؤ آگیا تھا۔ "سنو، ہم نے شہر میں اپنی تمام کوشش کی ہے۔ کوئی کونا نہیں چھوڑا ہے۔ ہم نے متعدد آدمیوں کو پکڑا اور اُن سے کچھ اگلوانے، کچھ جاننے کا ہر جتن کیا ہے۔ کہیں سے کوئی سراغ نہیں ملا، کوئی سِرا جسے پکڑ کے ہم آگے بڑھ سکتے۔ استاد تجمل اچانک اپنے آدمیوں کے ساتھ کہیں چلا جاتا ہے، اپنا پتہ دیے بغیر، اُس کے خاص آدمی نہیں جانتے کہ وہ کس طرف گیا ہے، وہ لکھنؤ کے ایک بدنام شخص کبن خاں کو اپنے اڈے پر چھوڑ جاتا ہے۔ کبن خاں کی موت سے تین دن پہلے استاد تجمل کا ایک اور خاص آدمی کانتے یکایک شہر سے غائب ہو جاتا ہے اور اُس کی غیر حاضری میں وہ سب کچھ ہو جاتا ہے جس کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا، جب کانتے واپس آتا ہے تو آئیں بائیں شائیں کرتا ہے۔ نہیں بتاتا کہ کہاں گیا تھا۔ وہی کچھ بولتا ہے جو تم کہہ رہے ہو، تم واپس آتے ہو تو تم بھی لاعلمی ظاہر کرتے ہو۔ پھر پانی کہاں گرے! نگاہ کس طرف بھٹکے! ہم کون سا سِرا پکڑیں؟"

تجمل نیم وا آنکھوں سے سنتا رہا۔ "جواب دو تجمل؟" ماتھر درشتی سے بولا۔

"کیا جواب دیں ماتھر جی! آپ سارا کچھ بول دیے ہو۔ اب اپنی زبان کھولنے کو کیا رہ جاتا ہے۔" تجمل نے زیرِلبی سے کہا۔

"ایسی صورت میں کیا یہ نہ سمجھا جائے کہ تمھیں سب تسلیم ہے؟"

"آپ کی خوشی اس میں ہے تو تسلیم قبول۔"

"تم ایک پولیس اسٹیشن پر بیٹھے ہو استاد تجمل! اور ایک ذمّے دار آدمی سے مخاطب ہو۔" ماتھر نے بیزاری سے کہا۔

"ہتھکڑیاں منگواؤ اور ڈال دو ہم سب کے ہاتھوں میں۔"

"میرا خیال ہے تم سے مزید گفتگو کرنا بے کار ہے۔"

"پر ایک بات رہ گئی ہے، آپ کی مرضی ہو تو بولیں۔" تجمل نے سرد لہجے میں کہا اور اپنی ٹانگ اُٹھا کے ایک جھٹکا دیا۔ مسلسل کھڑے رہنے سے اُس کی تکلیف اور بڑھ گئی ہوگی۔

"تم... تم بیٹھ جاؤ استاد!" ہلاکو نے جھجکتے ہوئے اُسے مشورہ دیا۔

تجمل نے اُلٹے ہاتھ سے جھٹ اُس کے منہ پر طمانچہ رسید کیا۔ ہلاکو میرا بازو پکڑے ہوئے تھا، اُس کی جھونک میں، مَیں بھی کرسی پر گرتے گرتے بچا۔

"حواس میں رہو تجمل!" سورتی نے ناراضی سے کہا۔

ماتھر نے انسپکٹر سورتی کی مداخلت پر منہ بنایا اور میز پر تھپکی دے کے اُسے چپ رہنے کی تلقین کی۔ "تم کیا کہہ رہے تھے؟" دوسرے ہی لمحے اُس نے تجمل سے پوچھا۔

"بولتا تھا، ایک بات رہ گئی ہے، آپ کی مرضی ہو تو بولیں۔"

"ہاں ہاں کہو۔" ماتھر نے تجسس سے کہا۔

"اپنے آدمی' اپنے کو واپس کر دو۔"

ماتھر اپنی کرسی پر سیدھا نہیں رہ سکا۔ "کیا... کیا؟"

"ہم آپ سے اپنے آدمی واپس مانگتے ہیں۔" تجمل نے ٹکی آواز میں کہا۔

"تمہارے آدمی تمہیں واپس کر دیں۔" ماتھر نے اضطراب سے دُہرایا۔ "یہی کہہ رہے ہو تم؟"

"آپ نے ٹھیک سُنا ہے۔"

"تم... تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟"

"کیوں صاب! ہم اُن کو آپ سے نہیں مانگ سکتے؟"

"تم کیا، کیا بک رہے ہو؟"

"ٹھیک ہی بک رہے ہیں ماتھر جی! اِدھر اُدھر کی بات چھوڑو۔ ساری دنیا کی چوکی داری کرتے پھرتے ہو، اپنے آدمیوں کی رکھوالی نہیں کی گئی۔ ہم کس کے پاس جائیں اور اُن کو آپ سے پھر کون واپس مانگنے آئے گا۔ مدعی بننے کا حق صرف تمھی کو ہے، ہم کو نہیں ہے؟"

ماتھر لمحوں تک ساکت نظروں سے تجمل کی صورت دیکھتا رہا۔ اُس نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا پھر جیسے اچانک اُسے کچھ خیال آ گیا ہو، اُس کے ہونٹوں پر استہزائی مسکراہٹ کھل اُٹھی۔

"خوب' خوب استاد تجمل! اچھا پینترا بدلا ہے تم نے۔"

"کیوں سرکار! ہم نے زبان کھولی تو پینترا ہو گیا۔"

ماتھر کے چہرے پر درشتی کی لکیریں اُبھر آئیں۔ "تمہارے دماغ میں اگر یہ خناس ہے کہ یوں دھیان بٹا کے اور معاملے اُلجھا کے تم کچھ حاصل کر سکو گے تو اسے نکال دو۔ اِس طرح تمھیں شاید کچھ وقت ضرور مل جائے مگر دُور جا کے نتیجہ وہی نکلے گا۔ ان حالات میں نکلنا چاہیے۔ اچھی طرح کانوں میں ڈال لو، پولیس اس مرتبہ تمھیں کوئی بخشش دینے کو تیار نہیں ہے۔"

"میری بات کا جواب دو ماتھر جی! اپنے آدمی کدھر ہیں؟"

"میری جیب میں ہیں۔" ماتھر بھڑک کے بولا۔

"ہم بولتے ہیں اُن کو ہمیں واپس کر دو۔"

"ورنہ' ورنہ تم کیا کرو گے؟" ماتھر کی چیختی آواز گونجی۔

"جو بن پڑے گا، کریں گے۔"

"تجمل! تجمل! فضول کی باتیں نہ کرو۔" ماتھر جھنجلا کے بولا۔

"اپنی باتیں فضول لگتی ہیں صاب! ہمارے آدمی چلے گئے، ایک نہیں کئی۔ ہمی سے بولتے ہو، گھنٹی مت بجاؤ، شور مت کرو، ہم اپنے آدمی اِدھر چھوڑ گئے تھے۔ ایک سے ایک ہیرا تھا اُن میں۔ آپ اُن کو نہیں جانتے۔ ہم جانتے ہیں، وہ کون تھا؟ اُن کا ہاتھ کتنا سجل تھا، اُن کے پٹھوں میں لوہا بھرا ہوا تھا، رگوں میں بجلی دوڑتی تھی۔ اُن کے دل کی چادر بہت بڑی تھی، سب کچھ اُس میں سما جاتا تھا۔ اُن کا بدل تمہارے تینوں میں صرف آتا کرو دا اڈّے کے آدمی تھے۔ پر اپنے وہ بھائی تھے، بیٹے تھے، ہمارے ہاتھ پیر تھے۔ ہم سے ٹھٹول کرتے ہو کہ تم نے اپنی ہی ہڈیاں چبا لیں، اپنی ہی بوٹیاں نوچ لیں، آپ بولتے ہو کہ ہمارے پاس تمہارے پچھلے کاغذ الماریوں میں بند ہیں۔ اُن میں کہیں لکھا ہے کہ تجمل نے پیچھے سے کبھی چھرا گھونپا ہے، اُلٹی طرف سے ناک پکڑی ہے۔ اُن کو آگے سے ہٹانا ہوتا تو اُن کا سُرمہ بھی آپ کو نہیں ملتا۔ چار پانچ مہینے پہلے کلکتے سے جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کبتن خاں اپنے ہی آدمیوں کے بیچ بیٹھا تھا ماتھر جی! کبتن خاں نے اپنا کوئی خزانہ چھپا لیا تھا یا اپنی جاگیر پر قبضہ کر لیا تھا؟ اُس نے اپنی ماں کے ساتھ حرام کیا تھا تو دوسروں نے کیا کیا تھا۔ ہم اُسے اُدھر بٹھا کے گئے تھے۔ کچھ سوچ سمجھ کے ہی بٹھایا ہوگا۔ اُدھر آپ کے سر کی جگہ اُوپر پیر اُگ آتے ہیں تو بھی آپ کو سامنے نظر آتے ہیں۔"

تجمل کی آواز چھلائی ہوئی تھی۔ سرد، سپاٹ۔ کمرے میں ایک اُسی کی آواز گونج رہی تھی اور جیسے ہر چیز بےآواز ہو گئی

ں دیواروں کے ساتھ کھڑے ہوئے سپاہی ٹکٹکی باندھے اُسی
ک رہے تھے۔ بتوں کے مانند بے حرکت۔ انسپکٹر سورتی اور
ر کے چہروں پر دُھند سی چھائی ہوئی تھی۔ تجمل نے ایک لمبے
کرا اپنا سوجا ہوا پیر اُٹھا کے دوبارہ زمین پر ٹکایا اور کہنے لگا۔
ی نہیں ملا۔ بولتے ہو، شہر کا کونا کونا چھان مارا۔ کوئی نہیں ملا!
ی کو دیکھنا نہیں چاہا! اُن سور کی اولادوں نے آنکھوں پر چربی
ھادی، سامنے موٹا ہی موٹا دکھائی دیا۔ انھی لوگوں پر کانٹا پھینک
جو سالے پہلے ہی تڑپ رہے تھے۔ کدھر دیکھا! کدھر کو دیکھا؟
را اپنا ریکارڈ ہے تو اپنے پاس بھی وردی والوں کا ریکارڈ ہے۔"

تجمل چپ ہو گیا۔ میرے جی میں آئی کہ میں بولوں، میں ڈی
ں پی ماتھر سے ایک سوال کروں لیکن تجمل کی طرف دیکھ کے
ںنے خاموشی مناسب سمجھی۔ ماتھر کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔
ل کے چپ ہو جانے پر وہ چونک سا پڑا۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم
ے ان تمام پہلوؤں پر غور نہیں کیا ہوگا۔ ہم نے کوئی..." وہ بھن
ناتے ہوئے لہجے میں بولا اور اُس کی بات منہ ہی میں رہ گئی۔ کمرے
ے باہر سے سیٹیاں بجنے اور گاڑیاں رکنے کی آوازیں آنے لگی
یں۔ انسپکٹر سورتی یک لخت کھڑا ہو گیا۔ پھر ماتھر بھی۔ دونوں سپاہیوں
داشارہ کرتے ہوئے فوراً ہی باہر چلے گئے۔ سائبان میں گونجتی ہوئی
یلوٹ کرنے اور جوتوں کی کھٹ کھٹ کی آوازیں ہم سے قریب
ر ہی تھیں مگر پھر وہ دُور ہوتی گئیں۔ ماتھر اور سورتی دیر تک
یں آئے، اس دوران ہم ایک دوسرے کو بس دیکھا کیے۔ کسی نے
یک لفظ دوسرے سے نہیں کہا، نہ تجمل نے۔ سب وہیں کھڑے
تھر کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ ماتھر نہیں آیا۔ آٹھ دس منٹ
عد انسپکٹر سورتی تیز رفتاری سے اندر داخل ہوا اور تردد آمیز لہجے
یں بولا۔ "میرے ساتھ آؤ۔"

تجمل کی آنکھوں سے سُرخی اُبلنے لگی لیکن وہ کچھ کہے بغیر
ورتی کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ سائبان میں دبا دبا مُرا مُرا سا شور
ٹھا ہوا تھا اور سپاہیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ سب کے سب
اصلے فاصلے پر منظم کھڑے تھے۔ بیچ کے دو تین کمرے چھوڑ کے
ورتی ایک کشادہ گلی نما راستے میں مڑ گیا اور کچھ آگے جا کے ایک بڑے
مرے میں آ گیا جو ایک ہال سے مشابہ تھا۔ کمرے کی چھت اُونچی
ور گنبد کی شکل کی تھی۔ وہاں کئی پولیس افسران بیٹھے تھے۔ اُن کی
ٹریں اور بیجوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اعلا افسران ہیں۔ ڈی
یس پی ماتھر بھی اُن میں موجود تھا۔ وسط میں ایک چوڑی میز کے
ک طرف کی کرسیوں پر وہ سب بیٹھے ہوئے تھے۔ اس طرف کی
رسیاں خالی تھیں۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے، جیسے ہی ہم اندر

پہنچے، ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔ "استاد تجمل! بیٹھ جاؤ۔" سورتی نے بلند آواز سے کہا۔ تجمل نے اس بار کوئی تعرض نہ کیا۔ بدو، ہریالا اور چنگا ما بھی ہمارے ساتھ آ گئے تھے، انسپکٹر سورتی نے اُن تینوں کو باہر چلے جانے کا حکم دیا لیکن تجمل نے انھیں روک لیا۔ ماتھر، سورتی کو ایک جانب بیٹھنے کو کہہ کے ہم سے مخاطب ہوا اور بتانے لگا کہ ہمارے سامنے کون کون افسران موجود ہیں، اُس کے کہنے کے مطابق اِن میں دو ایس پی، دو ڈی ایس پی، تین انسپکٹر اور ایک سب انسپکٹر تھے۔ انسپکٹر داؤ دیال کا تعلق خاص ہمارے علاقے سے تھا اور وہی کبتن خاں کے معاملے میں تفتیش پر مامور کیا گیا تھا۔ سب کی مضطرب نظریں ہم پر جمی ہوئی تھیں۔ ایس پی رائے کے سوا اُن میں سے میں کسی کو نہیں جانتا تھا۔ رائے اُس زمانے میں سب انسپکٹر تھا جب تین آدمیوں کے قتل کے جرم میں مجھے پہلی بار تھانے لایا گیا تھا۔ اب اُس کا ڈیل ڈول خاصا بڑھ گیا تھا، چہرہ بھی بھاری ہو گیا تھا۔ رائے نے شاید مجھے نہیں پہچانا۔

"میں نے ضروری سمجھا کہ یہ لوگ بھی موجود ہوں۔" ماتھر شائستگی سے بولا۔ "جو کچھ تم کہنا چاہو، ان کے سامنے کھل کے کہہ سکتے ہو۔"

"اپنے کو ایک بات بار بار بولنا نہیں آتا۔" تجمل نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے کہا۔ "جو ہم نے بولا ہے' ایک دم کھل کے بولا ہے۔ آپ ہی اِن کو بتا دو۔"

"میں نے' میں نے انھیں بتایا ہے۔" سورتی کی جھجکتی ہوئی آواز اُبھری۔ "لیکن اچھا ہے تم براہِ راست انھی لوگوں سے بات کرو جن کا تعلق اس معاملے سے ہے۔"

"آپ آگے بولو، اپنے کو کچھ اور نہیں بولنا۔"

سب کے بیچ بیٹھے ہوئے افسر ایس پی جوشی نے ایس پی رائے سے کچھ کہا۔ رائے نے اپنے قریب موجود ماتھر کو متوجہ کیا۔ چند منٹ تک وہ آپس میں کانا پھوسیوں کے انداز میں باتیں کرتے رہے، جوشی کی بات سُن کے ماتھر نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ "استاد تجمل! کیا دوبارہ تمھیں یہ جتانے کی ضرورت ہے کہ تمھارے سامنے اس وقت پولیس کے اعلا عہدے دار موجود ہیں۔ سات دن ڈیڑھ مہینے سے یہ اِسی کیس کی تفتیش میں مصروف ہیں۔"

"مولا بھلی کرے سرکار۔"

"تم جانتے ہو گے کہ یہ پولیس کے منتخب لوگ ہیں۔"

"یہ بھی اپنے کو اچھی طرح جانتے ہوں گے۔"

"تمیز سے بات کرو تجمل!" انسپکٹر داؤ دیال نے جھنجلاتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ اڈّا نہیں ہے۔"

"جدھر اڈّے کے لوگ اُدھر اڈّا ہے داؤ جی!" تجمل نے

"لمی سے کہا: "تم کیا اپنے رشتے داروں سے بات کر رہے ہو؟"

"یہ انتہا ہے سر!" داؤد دیال اشتعال سے بولا: "یہ ہی از اسلیوٹلی اے باؤ باس...." اس نے اپنی آواز بھینچ لی۔

"اپنے کو زیادہ یاد ہیں داؤ جی!" ببھل نے اُس کے لہجے سے اندازہ لگا لیا تھا کہ انسپکٹر داؤد دیال انگریزی میں گالی بک رہا ہے یا بکنا چاہتا ہے۔ اچھا ہی ہوا جو داؤد دیال نے اپنی آواز کی لگام تھام لی ورنہ اس کا جواب میں اُسے ضرور دیتا۔

"نو، نو" ایس پی جوشی نے ہاتھ کے اشارے سے داؤد دیال کو تنبیہہ کی اور انگریزی میں بولا: "تم کن لوگوں سے مخاطب ہو! ایک ذرا تحمل کرو۔" پھر اُس نے ماتھر سے کہا کہ وہ اپنی بات جاری رکھے۔ ماتھر نے اُس سے درخواست کی تھی کہ اُسی کو بولتے رہنے دیا جائے۔

"استاد ببھل!" ماتھر کے لہجے میں ملائمت تھی: "میں تم سے کہہ رہا تھا کہ ہم نے ہر پہلو پر غور کیا ہے، یقیناً یہ بات ہمارے لیے بھی تعجب کی تھی اور ہے کہ ببھل نے اُس شخص کو کیوں ختم کر دیا جو چار مہینے سے اُس کے اڈے پر بیٹھا ہوا تھا اور جیسا کہ ہمیں معلوم ہوا، وہ تمھاری مرضی سے بیٹھا تھا۔ بے شک! مجھے یاد نہیں پڑتا کہ تمھارے ریکارڈ میں پُشت سے چھرا گھونپنے والی کوئی روداد لکھی ہو۔ سب تم سے واقف تھے اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ببھل اپنے ہی گھر کو کیوں آگ لگا لے گا، اپنا ہی گلا کیوں گھونٹ لے گا۔" مجھے ماتھر کی باتوں پر بہت حیرت ہو رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا: "تمھیں کبن خاں سے بقول تمھارے ایسی ہی کوئی کد ہو گئی تھی تو تم نے یہ طریقہ ہی آخر کیوں اختیار کیا، تم سامنے آ کے بھی بات کر سکتے تھے۔ کبن خاں کے متعلق بھی ہم نے معلومات حاصل کیں۔ پتہ چلا کہ وہ لکھنؤ کا ایک بڑا استاد تھا اور بظاہر اُس کا تم سے کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ وہ تمھاری عزت کرتا تھا اور پوچھنے پر لوگوں کو بتایا کرتا تھا کہ استاد بس آ ہی رہے ہوں گے۔ پھر کون سی ایسی نازک بات تھی جو تمھارے اور کبن خاں کے بیچ تنا تنی کی بنیاد بن گئی۔ ہمیں بالکل یقین نہیں آتا تھا اور ہمیں....."

ماتھر جوشی کی طرف دیکھ کے تذبذب سے بولا: "ہمیں اب بھی یقین نہیں ہے۔ اُس وقت ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو پکڑ لیں۔ اُسی دن ڈیڑھ سو کے لگ بھگ آدمی تھانوں میں لائے گئے۔ دوسرے دن بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور ابھی تک کسی نہ کسی حد تک ہے۔ تمھارا یہ خیال کہ پولیس نے نظرِ جبر کے کام لیا ہے تو یہ تمھاری غلطی ہے، صرف بدگمانی۔ ہم نے تقریباً سارے ہی اڈوں سے آدمی پکڑے تھے۔ اس واقعے کے متعلق وہ خود بھی حیرت کا اظہار کرتے تھے اور اُن کی رایوں میں بہت فرق تھا۔ طرح طرح کی باتیں کرتے تھے۔ اُن کے ساتھ اڈوں کے اُستادوں کو بھی تھانے میں بلایا گیا۔"

"تمھیں یہ سُن کے شاید دکھ ہوگا، اچنبھا بھی کہ انھوں نے تمھارے نام پر کوئی خاص دلچسپی ظاہر نہیں کی، اُن کا برتاؤ سرد تھا۔ ہاں گنتی کے چند اُستادوں نے ضرور تمھارے لیے باتیں کیں مگر اُن میں اکثریت ایسے اُستادوں کی تھی جو تم سے ہمدردی نہیں رکھتے تھے۔ وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں تمھاری طرف اشارہ کر رہے تھے اور ہمیں معلوم تھا کہ اُن کا یہ رویّہ بے وجہ نہیں ہوگا۔ اس کے پیچھے بہت سے غصّے ہوں گے، برسوں پرانے غصّے، برسوں پرانی جھوجھل۔ وہ شہر کے تمام اڈوں پر تمھارا راج کیوں کر مانتے ہوں گے۔ ہر وقت داؤ کی تاک میں لگے رہتے ہوں گے کہ کب موقع ملتا ہے۔ اس سے اچھا موقع اُن کے پاس اور کب آتا کہ تم کلکتے میں موجود نہیں تھے۔ سو ہم نے تمھارے خلاف اُن کے بیانات پر زیادہ دھیان نہیں دیا لیکن انھیں ٹٹولنے اور کریدنے کے کام میں بھی غفلت نہیں برتی، نتیجہ صفر رہا۔ وہ کسی کا نام نہیں لیتے تھے، کسی کا بھی، تمھارا بھی کھل کے نہیں۔ ساتھ ساتھ ہم نے محلے کے اَن گنت لوگوں کے بیانات قلم بند کیے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ اُن میں تقریباً سبھی نے تمھارے لیے اچھی رائے کا اظہار کیا۔ انھوں نے کبن خاں کو بھی بُرا نہیں کہا۔

ماتھر کا اندازِ خطابت کا سا تھا مگر نرم، دھیما اور صاف صاف۔ اُس میں کوئی اُلجھاؤ نہیں تھا۔ اُس کی زبان رواں اور عام پولیس افسروں سے الگ تھی۔ میری طرح سبھی نے سکون کی سانس لی ہوگی۔ ماتھر وہی سب کچھ کہہ رہا تھا جو ہم کہتے۔ اُس نے بتایا کہ کسی نے اقرار نہیں کیا اور پولیس کو ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا جس کی مدد سے وہ واضح طور پر کسی طرف کا رُخ کر سکتی۔ کوئی نشان نہیں تھا، جن لوگوں کو پکڑا گیا، انھوں نے اُس رات اپنے اڈوں، گھروں یا کسی اور جگہ اپنے موجود رہنے کی شہادتیں دلوا دی تھیں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ہمارے اڈے کے لوگوں نے مختلف نام لیے جن میں موجدار کا اڈا سرِفہرست تھا۔ پولیس کا سب سے زیادہ زور موجدار کے اڈے کے آدمیوں ہی پر رہا لیکن وہاں سے بھی انھیں کچھ حاصل نہیں ہوا۔ جس رات لوگ اڈے میں داخل ہوئے تھے، انھیں کسی نے آتے جاتے نہیں دیکھا۔ اُس بار گشت کرنے والی پولیس نے بھی نہیں۔ باہر پہرا دینے والا اٹھوا نامی شخص صبح بدمست پڑا تھا۔ دنوں پہلے اڈے پر آنے جانے والے لوگوں کے بارے میں بھی پوچھ گچھ کی گئی اور کچھ ایسے آدمیوں

سامنے آئے جن کا تعلق کلکتے سے نہیں تھا اور جو اُس رات کے بعد کبھی نہیں دیکھے گئے۔ پولیس کا خیال ہے کہ وہی لوگ [illegible] مگر وہ کہاں چلے گئے۔ کلکتے کے گرد و نواح میں بھی اُن کی تلاش کی گئی لیکن اُن جیسے حلیوں کے کسی ایک شخص کی بھی [illegible] کسی نے نہیں کی۔ پھر وہ کون تھے؟" ماتھر بلند آواز میں [illegible] سے پوچھ رہا تھا: "کون تھے وہ ببھل؟ اگر ہماری جگہ تم ہوتے [illegible] نتیجے پر پہنچتے؟"

ببھل نے کوئی جواب نہیں دیا، ماتھر کہنے لگا: "اور پولیس کو [illegible] اُن تین چار آدمیوں کی کھوج ہی نہیں تھی جو چند روز پہلے [illegible] خاں کی اجازت سے اڈے پر آ کے ٹھہر گئے تھے۔ اُن کے [illegible] بھی چند اور آدمی ہوں گے جنھوں نے انھیں وہاں بھیجا تھا۔ [illegible] چار آدمیوں کے لیے یہ مشکل تھا کہ وہ اپنے آپ کو نقصان [illegible] بغیر ایک ہی حملے میں اڈے کے گیارہ چاقو باز آدمیوں [illegible] کر دیں اور انھیں ایک پل کی مہلت نہ دیں۔ اُس رات [illegible] سے بھی لوگ اُن کی مدد کو اِدھر آئے ہوں گے اور جس طرح اندھیری رات اور سنسان گلی میں روپوش ہو کے آئے تھے [illegible] طرح واپس چلے گئے۔ یکے بعد دیگرے وہ یا تو صبح سویرے [illegible] سے نکلے یا انھیں اڈے کے قریب مقررہ وقت پر کوئی [illegible] آ کے لے گئی۔ بہرحال وہ کس وقت آئے، کس طرح آئے [illegible] کی تفصیل میں جانے سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ کون [illegible] کہاں چھپ گئے؟ بتاؤ ببھل! وہ کون ہو سکتے ہیں؟"

"آپ جیسا بولو، جواب دے دیں۔" ببھل نے تیکھے لہجے میں [illegible] "پھر تو وہ ہمی ہو سکتے ہیں۔"

"ہاں! وہ تم بھی ہو سکتے ہو، تم یا تمھارے آدمی۔ کرائے کے [illegible] کلکتے سے دُور کے آدمی۔ شہر میں اور کسے یہ جرأت ہو سکتی [illegible] کہ وہ استاد ببھل کے اڈے پر اس طرح جانے کی جرأت کر سکے۔"

"تالی بجاؤ بچو!" ببھل نے ہماری طرف منہ کر کے تیزی سے [illegible] کسی نے تالی نہیں بجائی اور ماتھر نے بھی ببھل کی بات سُنی اَن [illegible] کر دی۔ انسپکٹر داؤد دیال کو کرسی جیسے کاٹ رہی تھی، وہ بار [illegible] ایس پی جوشی اور ایس پی رائے کو دیکھتا تھا مگر اُن دونوں کی [illegible] ایک ہی جانب مرکوز تھیں، ہماری جانب۔

"تمھارے سامنے ہمیں کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے لیکن بہتر [illegible] تم خوب سمجھ لو۔ حقیقت جھٹلانے کے بجائے اُسے تسلیم کرنے [illegible] لیے تمھیں یہ سب بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ہم اُن افواہوں [illegible] بے خبر نہیں رہے ہیں جو اس بیچ تمھارے اور کبن خاں کے [illegible] کے بارے میں شہر میں اُڑتی رہی ہیں۔ شاید تم بھی جانتے ہو گے کہ لوگ کیا کچھ کہتے ہیں۔ اِن افواہوں کو سہارا بنانے کے بجائے ہم نے ٹھوس شہادتوں ہی پر اپنی نگاہ جمائے رکھنی چاہی ہے لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ ہم اُن کی جانب سے اپنے کان بالکل بند رکھیں۔ کہیں حقیقت اُنھی میں نہ چھپی بیٹھی ہو، یہ افواہیں کوئی ایسا خاکہ کھینچنے پر ہمیں اُکساتی رہتی تھیں جو کسی حقیقت کے لگ بھگ ہو۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ ہم نے کتنے خاکے بنائے اور مٹا دیے ہوں گے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہنے سے انھیں اِدھر اُدھر مارتے رہنا ہی ٹھیک تھا۔"

اُسی لمحے سب انسپکٹر سہائے اُٹھ کے دبے پاؤں ماتھر کے پاس آیا اور میز پر اُس کے سامنے ایک کاغذ رکھ کے واپس اپنی کرسی پر چلا گیا، داؤد دیال نے اُسے بھیجا تھا۔ ماتھر نے کاغذ پر ایک سرسری نظر ڈالی اور سر ہلانے لگا اور مزید کوئی توقف کیے بغیر ببھل کی طرف سر اُٹھا کے بولا: "کبن خاں تمھارا دوست تھا، اچھا دوست، تم اُسے اپنے ساتھ کلکتے لائے تھے۔ یہاں کا رنگ ڈھنگ لکھنؤ سے الگ تھا، اُس کے لیے نیا اور چونکا دینے والا تھا۔ وہ تمھاری مرضی سے آیا تھا مگر ایک دن اُس نے تم پر چاقو کھول لیا اور مطالبہ کیا کہ اڈے سے نکل جاؤ۔ تم نے بھی چاقو کھول لیا لیکن تمھارے چاقو نے زندگی میں شاید پہلی بار تم سے دھوکا کیا۔ اڈے کی ریت کے مطابق تمھیں اڈا فوراً چھوڑ دینا اور کبن خاں کا حق مان لینا چاہیے تھا، تمھیں یہ بھی قبول نہ ہوگا کہ تم اڈے کے دوسرے آدمیوں کی طرح اُسے اُستاد مان کے وہیں رہو، نہ کبن خاں اس پر تیار ہوتا، اُس نے تمھارے ساتھ رعایت کی کہ تم جلد از جلد کلکتہ چھوڑ دو، جن لوگوں کے سامنے چاقو نکلے تھے، اُن سب کے ساتھ۔ اڈے کے باقی آدمیوں کو قابو میں رکھنے کے لیے کبن خاں کو ایسا جتانا لازم تھا کہ تم نے اپنی مرضی سے اڈا چھوڑا ہے کیونکہ تمھارے بعد یہاں اُسے اپنے پیر جمانے کے لیے اُن کے ساتھ کی ضرورت تھی۔ جاں بخشی کے بدلے اور عزت سے کلکتے سے نکل جانے کے لیے تمھیں بھی ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ تم نے اپنے خاص آدمی کالنتے سے بھی یہی کہا، دوسرے آدمیوں سے بھی۔ سُنا ہے تم نے اُن سے کہا تھا کہ تم ایک لمبے سفر پر روانہ ہو رہے ہو جہاں سے تمھاری واپسی ناممکن ہو سکتی ہے، تم نے ایک لمبے سفر کا ڈھونگ رچایا تھا مگر تم نے یہ فیصلہ دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ تمھارے ساتھ جانے والے بھی تمھیں ٹوکتے، کھٹکاتے رہے ہوں گے۔ تم نے کبن خاں کو وقت دیا تھا اور تم اُس سے دوبارہ چاقو کھلوانے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ اب جب تم اپنا چاقو گنوا بیٹھے تھے تو اڈے سے تمھارے ساتھ نکلنے

والے دوسرے کیسے کپتن خاں کے آگے آنے کی ہمت کر سکتے تھے۔

"کپتن خاں جانتا تھا کہ اڈّے پر کانتے ہی ایک ایسا آدمی ہے جو اُس کے لیے پریشانی پیدا کر سکتا ہے۔ اُس نے تمھاری زبانی کانتے کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اڈّے میں وہ بھی اُس کا برابر شریک ہے۔ کانتے یہی سمجھتا رہا کہ اُستاد واپس آجائیں گے۔ وہ کپتن خاں تمام لوگوں سے یہی کہتا رہا کہ ایک دن اُستاد تو واپس آنا ہے مگر کانتے کو کپتن خاں کے لچھن سے کھٹکا ہو گیا تھا یا تمھارے کسی آدمی نے اُس سے مل کے تمام حقیقت سے باخبر کر دیا تھا۔ کانتے نے کپتن خاں پر یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ سب جان چکا ہے۔ وہ آدمی جو تین چار دن پہلے اڈّے پر آکے ٹھیرے تھے، ہو سکتا ہے کانتے ہی نے کپتن خاں سے اُن کی سفارش کی ہو۔ پھر کانتے ایک دن غائب ہو گیا اور واپس آیا تو!...." ماتھر نے ایک گہری سانس بھر کے کہا۔ "تم نے سُنا استاد بُجھل!"

"آپ کو اُدھر کچہری میں ہونا چاہیے تھا ساب!"

"نوٹنکی میں زیادہ اچھا رہتا استاد!" پیچھے سے بلّا کرنے سرگوشی کی۔

"انکار کرو بُجھل! ہم تمھارا انکار سننے کے لیے تیار ہیں۔" ماتھر کی آواز دوبارہ گونجی۔ "تمھارے پاس شاید کوئی جواب نہیں ہے۔"

"لگتا ہے یہ اُدھر ہی کہیں پیچھے چھپا بیٹھا تھا استاد!" جامو بُدبُداتے ہوئے بولا۔

"اُستاد! وہ جواب مانگتا ہے۔" جینی نے بُجھل کو ٹوکا۔

"کیا بولیں رے۔"

وہ سب ایسی نظروں سے ہمیں دیکھ رہے تھے جیسے ہم کپڑے نہ پہنے ہوئے ہوں۔ میرا خیال تھا کہ یہ سُن کے بُجھل زور زور سے قہقہے لگائے گا یا ماتم کرے گا لیکن کرسی پر اُس کا جسم ڈھیری بنا رہا جیسے اُسے پہلے سے معلوم تھا کہ یہ سب سُننا پڑے گا۔ ماتھر کے خاکے میں کوئی عیب نہیں تھا۔ حقیقت سے کتنا ہی دُور ہو مگر اُس میں حقیقت کا رنگ ضرور جھلکتا تھا۔ بہت سی باتوں کی ہم تردید ہی نہیں کر سکتے تھے اس لیے کہ تان تو ایک ہی بات پر آکے ٹوٹتی کہ پھر ہم کہاں روپوش تھے۔

بُجھل کو فوراً اپنی ٹانگ کسی کو دکھانی چاہیے تھی۔ آرام کے بغیر زخم اور پھیل جانے کا اندیشہ تھا۔ بار بار میرے دل میں ہمک اُٹھتی تھی کہ ایک بار ہمت کر کے سب کچھ صاف صاف کہہ دوں۔ بس کریں، وہ اِن لوگوں سے باز پُرس کیوں کر رہے ہیں، صرف مجھے پکڑ لیں، مجھے پھانسی دے دیں۔ بے کار باتوں سے کیا فائدہ۔ سب کا خون میری گردن پر ہے۔ تبت میں مرنے والے سو سے اُوپر آدمیوں کا، مٹّن میاں کا، وزیر کا، تشانم کا، سلطان کا۔ یہاں اڈّے ختم ہونے والے سبھی لوگوں کا اور نہ جانے کس کس کا۔ مجھے تو نام بھی نہیں رہے۔ میں نہ ہوتا تو ان میں سے کوئی بھی مرنے والا نہیں اَمّی اتنی جلدی تھوڑی مرجاتیں۔ اُن کے دل میں بہت سی آرزو تھیں اور ممتی نے ابھی دیکھا ہی کیا تھا۔ کرشنا بھی کہتے تیری وجہ سے میری زندگی بڑھ گئی ہے، کاش اُنھیں معلوم ہو میں اُن کی زندگی کم کرنے کے لیے اُن کے پاس آیا ہوں۔ اِ افسانے تراشنے، اتنی باتیں کرنے اور کھوکھ کے لگانے کی کیا ضر ہے۔ ایک ہی شخص کو پکڑ لیا جائے، اُسے کیوں نہ مار دیا جائے

"بولو بُجھل! چُپ کیوں ہو گئے؟" ماتھر نے تیکھے لہجے کہا۔ "تمھاری زبان سُن کیوں ہو گئی ہے؟ کہہ دو کہ سب جھوٹ

"ابھی کتھا کا زور تو ٹوٹنے ماتھر ساب!" بُجھل خوابیدہ آواز میں

"اندازہ تھا کہ تم یہی کچھ کہو گے۔ کون جانے یہ زور کس کو توڑ کے ٹوٹے گا۔"

"پھندا اتنا اندھا نہیں ہوتا سرکار! گردن پہچانتا ہے۔" بُجھل بیڑی سُلگاتے ہوئے کہا۔ صبح سے اب تک وہ مسلسل بیڑی پی رہا تھا اور کھانس رہا تھا۔

"کیس عدالت میں ہے، فیصلہ اُسی کو کرنا ہے۔ پولیس میں وہ کیا فیصلہ کر سکتی ہے۔ تمھارے آدمی اِدھر اُدھر کی باتیں کیس سلجھانے کے بجائے پیچیدہ اور پُراسرار بنا رہے ہیں۔ چُپ ہے۔ نہیں بتاتا کہ کہاں گیا تھا؟"

"وہ کیوں بتائے گا؟"

"کیوں؟ وہ کیوں نہیں بتاتا؟"

"جو کارن اپنے ساتھ ہے، وہی کچھ اُس کے ساتھ ہو گا۔ اڈّے والے اپنا اتا پتہ بتانے لگیں تو کتنے دن چلیں

"تو اڈّے والے پھر اپنے گلے میں پھندا ڈال لیں گے۔"

"اس کا ٹائم آئے گا تو وہ دیکھ لے گا۔" بُجھل نے بیزاری

"اس کا ٹائم آنے میں دیر ہی کیا ہے۔"

"اپنا گلا اتنا سستا نہیں ہے ماتھر ساب! میں آپ کو بولا تھا، یہ بعد کی بات ہے، آپ زیادہ حجت مت ک

"لیکن بُجھل! اگر تم ابتدا ہی میں یہ اُلجھن دُور کر دو تو اِس تمھارا بھی بھلا ہو گا، ہمارا بھی۔"

"ہمارا بھلا چھوڑ دیوتا! اپنا سوچو۔ آپ کو دکھائی نہ دیتا تو ہم بولتے ہیں، اِس طرف دھیان مت دو۔"

"ہم نے ایسا ہی کیا تھا استاد!"

"کدھر کیا تھا ساب! پھر آپ ایسے سَر میں نہیں گا

آگے جا کے ہم نے بول دیا کہ ہم اُدھر اپنی ماں بہن نچوا رہے ہے تو آپ کون سی کتھا سناؤ گے پھر کس پہ کمبل ڈالو گے؟"

"یقیناً ہمیں اپنی سوچ کا رُخ بدلنا ہو گا۔"

"پھر پہلے ہی ایسا کر لو۔ ہم بھی کسی آدمی کے جنے ہیں۔"

"مگر، مگر تم اپنے آپ کو...." ماتھر کہتے کہتے رہ گیا۔

درمیان میں بیٹھے ہوئے ایس پی جوشی کی بھاری آواز نے ے خاموش کر دیا تھا۔ "استاد! ہم کو بولو، ہم پھر اور کس طرف یان دیں؟"

"ابھی ہم ادھر آئے ہیں جوشی ساب!" بُجھل نے نرمی سے کہا۔

"لیکن تمھارے دماغ میں شک کی کوئی دِشا (سمت) ضرور ہو گی۔"

"ابھی کوئی نہیں ہے ساب بہادر! پر جدھر بھی ہے، اپنے زیادہ دُور نہیں ہے۔" بُجھل نے کہا۔

"تم سمجھتے ہو کہ تم اُن تک پہنچ جاؤ گے؟"

"نہیں پہنچے تو ماں کا دودھ حرام ہو گا۔"

"تمھارے کہنے کا مطلب ہے تمھیں جانے دیا جائے؟"

"اب نہیں تو آپ دس دن بعد جانے دو گے۔ ہم تب بھی ن کے پاس پہنچیں گے۔ پر شاید ذرا دیر لگ جائے۔ اُن حرام کے لوں کو ٹائم مل جائے گا۔"

"مگر دیر تو تمھیں اُنھیں ڈھونڈنے میں لگ سکتی ہے کیونکہ بولتے ہو، تم کو ابھی کچھ معلوم نہیں ہے۔"

"اپنے کو زیادہ دیر راس نہیں آتی۔"

"کتنا سمے کھپے گا؟"

"بہت زیادہ نہیں۔" بُجھل کی آواز تپ رہی تھی۔

"پر اتنے وشواس سے تم تبھی کہہ سکتے ہو جب تم کو کسی دمی کسی ٹولی یا کسی خاص دِشا پر شک ہو۔"

"اپنے پاس آپ کی آنکھیں نہیں ہیں۔"

"لیکن تم کو اِدھر سے جانے دینے کا مطلب یہ نہیں ہو گا کہ کو اور خون خرابے کی کھلی چھٹی دے دیں؟"

"ہم اتنے اُلّو کے پٹھے نہیں ہیں جوشی ساب!" بُجھل نے دگی سے کہا۔ "پھر ہم سیدھے اِدھر کو نہیں آتے۔ اپنا کوئی ایک آدمی ھر جیل میں بند نہیں ہے۔"

"مگر اس کی کیا ضمانت ہے کہ تم....."

بُجھل اُس کی بات کاٹ کے بولا۔ "آپ کو ایسا نہیں بولنا ہیے۔ اتنی فوج پھر کا ہے کو اکٹھی کر رکھی ہے۔ ضمانت اپنے کیا دینا ہے۔"

ایس پی جوشی کا چہرہ کچھ اور بھاری ہو گیا۔ غیر اختیاری طور پہ اُس کی نظریں اپنے آس پاس بیٹھے ہوئے افسروں پر پھلنے لگیں اور ایس پی رائے پر آکے ٹک گئیں۔ رائے کسمسانے لگا۔

"آئی ڈونٹ تھنک۔" وہ انگریزی میں بولا۔ "اب بھی کوئی گنجائش موجود ہے۔ سب ہمارے جانے پہچانے لوگ ہیں۔ موقع کا استحصال کرنے والے، داؤ پیچ کے ماہر، ریاکاری جن کی سرشت میں داخل ہے۔" رائے کی آواز اچٹتی ہوئی تھی۔

"یعنی، یعنی انھیں روک کے رکھا جائے؟" جوشی نے متذبذب سے کہا۔

"ان حالات میں یہی مناسب نظر آتا ہے۔"

"مگر جناب!" ماتھر بیچ میں بولا۔ "میرا خیال ہے ہمیں ایک بار از سرِ نو غور کرنا چاہیے، یہ فیصلہ تو ہم کسی وقت بھی کر سکتے ہیں۔"

"ماتھر جی!" ایس پی رائے نے اضطراری انداز میں کہا۔ "کوئی معمولی رعایت بہت مہنگی پڑ سکتی ہے۔ اِن کو کھلا اور بِنا ڈالے بغیر چھوڑ دینے کے ساتھ ہمیں کچھ اور خونی خبروں کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔ کیا انھیں گلی گلی بھونکنے، کاٹنے کی اجازت دے دی جائے؟" وہ حقارت سے بولا۔ "ہمیں ہر لمحے یہ حقیقت پیشِ نظر رکھنی ہے کہ یہ کون ہیں۔ کتنے بڑے کمینے، کتنے بڑے گھٹیے۔"

مجھ سے بیٹھا نہیں گیا، اس سے پہلے کہ رائے کی زبان سے کچھ اور نکلتا، میں کھڑا ہو گیا۔ "یہ کسی نئے خطاب سے نوازیے جناب! یہ سب تو بہت پُرانے ہو چکے ہیں۔" میری آواز تھرتھرانے لگی تھی۔ جامو نے پیچھے سے ٹھوکا مار کے مجھے خاموش رہنے کی تلقین کی لیکن میں کھڑا رہا۔

"وہ سب اچھل سے گئے۔" "ہُو از ہی؟" جوشی اضطراب سے بولا۔

"یہ لاڈلا ہے۔" انسپکٹر داؤ دیال نے تیزی سے جواب دیا۔

"لاڈلا! کیا یہ نووارد ہے؟"

"نہیں جناب! خاصا پُرانا آدمی ہے۔"

"یہ انگریزی کچھ سمجھتا ہے؟" جوشی تعجب سے بولا۔

"کیا، کیا یہ وہ تو نہیں ہے جس نے قتل کے جرم میں لمبی سزا کاٹی تھی اور جیل میں اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کی تھی؟"

"وہی ہے جناب!"

"اس کے باوجود یہ، یہ اِنھی لوگوں میں ہے۔"

"منہ کو خون لگ گیا ہے جناب!"

"ہاں ہاں۔" جوشی نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور مجھ سے انگریزی میں پوچھا۔ "تھی ہو وہ؟"

"میں کوئی بھی ہوں جناب مگر مجھے آپ کا یہ انداز بالکل اچھا نہیں لگا۔" میں نے ہندوستانی میں جواب دیا۔ "آپ اس

لہجے اور طور طریق کے بغیر بھی کوئی رائے قائم کرسکتے ہیں۔ ہم آپ کی چار دیواری ہی میں بیٹھے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں ہمارے فتنے اب کون سا حساب باقی ہے جو آپ اِس طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ کیا آپ نے ہم سے ہمارے پچھلے تمام گناہوں کے واجبات وصول نہیں کیے ہیں۔ آپ ہمیشہ اُنھی کے حوالے سے ہمیں پہچانتے رہیں گے۔ کوئی اور پیمانہ نہیں ہے آپ کے پاس؟" میرے منہ میں جو آیا میں نے کہہ دیا۔

اُن سب کی آنکھیں ایسے کھلی ہوئی تھیں جیسے۔۔ انھی سے سن رہے ہوں۔ نظر چوکی تو تماشا ختم ہو جائے گا۔ "تعجب ہے۔ یہ بہت بہت عجیب ہے۔" جوشی بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

"مجھے یاد پڑتا ہے یہ فرسٹ کلاس طالب علم تھی۔" تھم نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کیا ایسا نہیں تھا؟"

"اُس سال اِس نے ٹاپ کیا تھا۔"

"تمھیں دیکھ کے خوشی ہوئی اور۔۔۔" جوشی نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "افسوس بھی۔۔۔" میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تو وہ بولا۔ "تم کو کچھ اور کہنا ہے؟ میں سمجھتا ہوں ہمیں تم سے بات کرنے میں آسانی رہے گی۔" اُس نے رائے کی بدزبانی پر ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

"مجھے کچھ نہیں کہنا سب جھل بھائی کہہ چکے ہیں۔ میں وہی کچھ دُہراؤں گا اور میں ان کے سامنے کیا بول سکتا ہوں۔" میں نے ترشی سے کہا۔ "لیکن مجھے ایک بات کہنی ہے۔ رائے صاحب نے ایک طرح سے اعتراف کرلیا ہے کہ وہ ہم نہیں تھے ورنہ ہمیں چھوڑ دینے سے اُن کے ذہن میں یہ اندیشے پیدا نہ ہوتے جن کا اظہار ابھی انھوں نے کیا ہے۔ دوسرے ایک بات اور، ہم نہیں بتارہے کہ ہم کہاں تھے، کدھر اپنے سر پھوڑ رہے تھے۔ آگے جاکے بھی ہم نے اِس معاملے میں زبان بند ہی رکھی تو کیا صرف اس بنیاد پر گیارہ آدمیوں کے خون کا فیصلہ کر دیا جائے گا؟"

وہ سُنتے رہے، اُن میں سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"بیٹھ جا رے!" جھل نے مجھے جھڑک دیا۔

لیکن میں نہیں بیٹھا۔ "کون آپ کے آگے ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔" میری آواز خود بخود تیز ہوتی گئی حالانکہ میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔ "ہمیں مت جانے دیجیے، بالکل مت جانے دیجیے لیکن ایک بات پر اچھی طرح غور کرلیجیے کہ آدمی ہمارے گئے ہیں اور ہمیں صرف ہتھیار چلانا نہیں آتا، کچھ اور بھی آتا ہے۔ کچھ ہم بھی جانتے ہیں کہ کیا کچھ ہوتا ہے۔ ایک ڈر کے بعد کون سا ڈر ہے۔ ہمارے پاس ارادے کی کمی ہے، نہ اُسے عمل میں لانے کے لیے

ذرائع کی۔ میرا مطلب آپ خوب سمجھ رہے ہوں گے۔ اِس وقت بھی ہم بڑی سے بڑی ضمانت آپ کے سامنے پیش کرسکتے ہیں مگر اِس کی ضرورت نہیں، تین چار دن یا دس پندرہ دن کے پھیر سے بہت بڑا فرق نہیں پڑے گا۔ ہمیں علوم ہے کہ آگے جاکے کیا کچھ ہوگا۔ جو مر گئے ہیں، وہ واپس نہیں آسکتے مگر اُن کا خون اتنا ارزاں نہیں تھا۔ اُن کی روحوں کو جواب ہمیں دینا ہے آپ کو نہیں، وہ ہمارے آدمی تھے۔" میری آواز تھرانے لگی تھی۔ "آپ جو دل چاہیں کریں۔ جیسا خاکہ چاہیں بنائیں۔ خوب تاویل کریں۔ آپ کو اختیار ہے لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم بھی اپنے اختیار سے ناآشنا نہیں ہیں۔" میں نے بہت روکا مگر میری آنکھوں میں بُری طرح کھولن ہو رہی تھی۔ میں اپنا منہ چھپا کے ایک دم بیٹھ گیا۔ جھل میری کمر پر تھپکیاں دینے لگا۔

"کدھر مستی کر رہا ہے رے!" وہ ناراضی سے بولا۔

دیر تک سکوت رہا۔

کمرے میں اُن کی دبی دبی سرگوشیاں بھن بھناتی رہیں۔ میں نے نہ پھر اُن کی کوئی بات سُننے کی کوشش کی تھی نہ اُن کی طرف دیکھنے کی۔ میں نے اُسی لمحے اپنا بوجھل سر اُٹھایا جب ماتھر کی آواز کانوں میں پڑی۔ "تم لوگ ذرا باہر بیٹھو۔" وہ جھل سے کہہ رہا تھا۔

اُسی وقت انسپکٹر سورتی درمیان کا فاصلہ عبور کرکے چھ ہوا ہمارے پاس آیا اور اُس نے ہمیں باہر چلے جانے کا اشارہ کیا۔ ہم سب اُٹھ گئے۔

"جلدی کرنا ساب! سالی ساری دوپہر پالیپٹ لی۔" چلتے چلتے جھل نے پلٹ کے اُونچی آواز میں کہا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

انسپکٹر سورتی نے سائبان میں پڑی ہوئی بینچوں پر بٹھا دیا۔ آس پاس، دور و نزدیک مسلح سپاہی جمے ہوئے کھڑے تھے۔ تھانے کا یہ حصہ عام لوگوں کے لیے ممنوع کر دیا گیا۔ سائبان کے اُس طرف احاطے میں موجود لوگ اُچک اُچک ہمیں دیکھنے کے لیے بے چین نظر آتے تھے۔ بریالا، بدرو، چنگا ماما ابھی تک ہمارے ساتھ تھے۔ ہمیں وہاں بٹھا کے سورتی واپس چلا گیا۔ دیر ہوگئی، کسی نے لوٹ کے خبر نہیں لی۔ سب گُم سُم ایک دوسرے کے بازوؤں سے بازو ٹکائے بیٹھے۔ دھوپ پیلی پڑ گئی تھی۔ صبح سے اب تک ایک کھیل بھی کسی کے منہ میں نہیں گئی تھی، صبح کسی اسٹیشن پر بس ایک ایک پیالا چائے سب نے پی تھی اور خیال تھا کہ کلکتے اُتر کے، ہو

پی لیں گے۔

آدھ گھنٹا گزر گیا۔ پھر ایک گھنٹا۔ برامدے سائبان سے بڑے کمرے کی طرف جاتے ہوئے راستے پر کسی کی آمد کا گمان ہوتا تھا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹا گزر جانے کے بعد بھی اندر سے کوئی نہیں آیا۔ کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا کہ کیا حکم آئے گا۔ میرا سارا جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ نہ جانے میں نے کیا کیا اول فول بک دیا تھا۔ مجھے چپ ہی رہنا چاہیے تھا۔ میری کسی بات سے اُن پر غلط اثر پڑ گیا تو کوئی بھی مجھے معاف نہیں کرے گا۔ گو باہر آنے کے بعد کسی نے ایک لفظ بھی مجھ سے نہیں کہا تھا لیکن تسلی آدمی اپنے آپ کو بھی تو دیتا ہے۔ اگر انھوں نے ہمیں نہ جانے دیا تو پھر معلوم نہیں، کتنے دن لگ جائیں۔ پیرو کب تک ہوٹل میں ٹھیرا رہے گا اور ابا جان!۔۔۔ پیرو اکیلا ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ اگر انھوں نے واقعی ہمیں نہ جانے دیا اور دیر ہوگئی تو اس مدت میں وہ پیرو تک بھی پہنچ سکتے ہیں اور ابا جان تک اور اُن کے مال و اسباب تک اور پیرو یہ سُن کر ہمیں روک لیا گیا ہے، ہوٹل میں خاموش نہیں بیٹھا رہے گا وہ خود ہم تک پہنچنے یا ہماری ضمانت کا بندوبست کرانے کی کوشش کرے گا۔ کوئی بعید نہیں کہ وہ سیدھا رتنا کے پاس فیصلہ کرنے پہنچ جائے۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا، اسٹیشن سے رخصت ہوتے وقت جھل نے پیرو سے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ اپنے اڈے پر جانے کے بجائے تھانے جا رہا ہے۔ پیرو کے لیے یہ خبر نئی ہوگی اور وہ کوئی اُلٹا سیدھا قدم اُٹھا سکتا ہے۔ بدرو کی زبانی پیرو نے یہ ضرور سُنا تھا کہ پولیس ہماری تلاش میں ہے۔ امکان تو نہیں کہ وہ سوچے سمجھے بغیر کوئی ارادہ کرے، پیرو کو خیال ہوگا کہ اُس کی غیر معمولی نقل و حرکت سے ہوٹل والے اُس علاقے کے آدمی جہاں ہوٹل واقع ہے، مشکوک ہو گئے تو اُس کے لیے ابا جان کو چھپانا مشکل ہو جائے گا اور ابا جان کے عیاں ہونے کا مطلب ہے، سب کچھ عیاں ہو جانا۔ تیجوروں کو زبان مل جائے گی۔ ہیرے جواہر بول لیں گے۔ اس دوران رتنا کو بھی خبر مل سکتی تھی کہ بمبئی کا پیرو دادا ہوٹل میں ٹھیرا ہوا ہے۔

ہم نے ان سے کہنے کو تو کہہ دیا تھا کہ وہ چاہیں تو ہمیں اندر رکھیں چونکہ ہمیں چند دنوں بعد پھر باہر آجانا ہے لیکن ہم جانتے تھے کہ یہ چند دن ہمارے لیے کتنے جان لیوا اور عذاب ناک ثابت ہوں گے۔ ابا جان کے ساتھ فیض آباد جانے کے لیے میں اور پیرو دونوں آمادہ نہیں ہوئے تھے تو ہم بھی ایک گاڑی سے وہاں جاسکتے اور اُنھیں حویلی تک پہنچا کے دوسری گاڑی سے واپس

آسکتے تھے۔ صرف ایک دن کا کھیل پڑتا لیکن کتن خاں اور اُس کے ساتھ مرنے والے ہماری جگہ ہوتے اور اُنھیں یوں ہمارے ختم ہو جانے کی خبر ملتی تو کیا وہ اس ایک دن کی تاخیر گوارا کر لیتے۔ وہ تو تھانے تک بھی نہ آتے۔ آندھی اور طوفان کی طرح پہلے اڈے کا رُخ کرتے اور لال ہاتھوں، لال کپڑوں اور کھلے چاقوؤں کے ساتھ پھر تھانے آتے۔ جھل نے تو اتنا بھی اپنے سینے پر جبر کر لیا تھا۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد بڑے کمرے کی جانب سے اُن کے بوٹوں کی گونج سنائی دی۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے ڈی ایس پی ماتھر، انسپکٹر واڈ دیال، انسپکٹر سورتی ہمارے سامنے تھے۔ ماتھر کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ "استاد جھل!" وہ کسی قدر بے توازن آواز میں بولا۔ "تم جاسکتے ہو۔"

میری رگوں میں ایک بجلی سی چمکی۔ سب نے ایک دوسرے کی طرف چونک کے دیکھا اور سبھی کے چہروں پر جیسے آگ بھڑکنے لگی۔ "آگے بولو ماتھر ساب!" جھل نے آہستگی سے کہا۔

"آگے کچھ نہیں استاد لیکن تم جانتے ہو گے، ہمیں یہ فیصلہ کرنے میں کتنی دشواری ہوئی ہوگی، خیال رکھنا کسی بھی صورت میں پہلے تم پولیس کو مطلع کرو گے اور ہمارے بھروسے کو ٹھیس نہیں پہنچاؤ گے۔"

جھل کے ہونٹ بند رہے۔

"تمھیں صرف اس اُمید پر جانے کی اجازت دی جارہی ہے کہ تم پولیس کی مدد کرو گے۔ یہ مت سمجھنا کہ ہم تم سے کہیں دُور رہیں گے اور یہ بھی جان لو کہ ابھی تمھارے باقی تمام آدمی جیل میں ہیں، تمھاری کوئی بھی خلافِ قانون حرکت اُن کے لیے مصیبتیں کھڑی کرسکتی ہے۔ تم نے فرار ہونے کی کوشش کی یا ذرا سی بھی غلطی کی تو اُن سب کا ہرجانہ اُنھی کو ادا کرنا ہوگا اور تم بھی نہیں بچ سکو گے۔ بہتر یہی ہے کہ احتیاط سے قدم اُٹھانا۔ تمھاری بات مان لی جائے کہ کتن خاں کو کچھ اور لوگوں نے ختم کیا ہے تو اب تمھیں یہاں دیکھنے کے بعد وہ تم پر ہتھیار پھینکنے کے لیے بے چین ہوں گے اِس لیے بھی تمھیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اِس سلسلے میں اگر تمھیں مستقل طور پر یا کسی وقت بھی پولیس کی رکشا کی ضرورت پڑے تو پولیس تمھاری مدد کے لیے تیار رہے گی۔"

"آپ آرام کرو ساب! اپنی فکر چھوڑ دو۔ اپنے کو جس دن بیاکھیوں کی ضرورت پڑی، اُس دن یہ ہتھیار" جھل نے جیب میں پڑے ہوئے چاقو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آخری بار اپنا کام ضرور دکھائے گا۔ دوسروں کے لیے ہی نہیں، یہ اپنے

لیے بھی ہے۔"
"تم نے سُنا کہ ہم نے کیا کہا ہے؟" ماتھر تُرشی سے بولا۔
"سُن لیا ہے سرکار!"
"سُن لیا ہے تو ٹھیک ہے، یہ بھی سُن لو کہ اگر تم نے غیر ضروری طور پر ہمیں اُلجھانے اور غیر متعلق لوگوں سے بدلہ لینے کے لیے استعمال کیا تو اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا۔ پولیس کوئی خون خرابہ، جھگڑا، دنگا پسند نہیں کرے گی۔"
"پھر پولیس کا کام کیسے چلے گا؟"
ماتھر نے جیسے سُنا ہی نہیں، منہ بنا کے بولا۔ "ایک بات اور تم سے کہنی ہے۔ ہم کو معلوم ہوا ہے کہ تمھارے پُرانے اڈّے پر اب رتنا نامی ایک آدمی بیٹھا ہے۔ تم جانتے ہو کہ انسپکٹر داؤ دیال جی کا تعلق تمھارے علاقے سے ہے اور اُنھوں نے اُس کے بارے میں ہر طرح کی پُوچھ گچھ کر لی ہے۔ رتنا نے تمھارا اڈّا باقاعدہ طور پر عمارت کے مالک سے لیا ہے اور انسپکٹر داؤ دیال کو ہر طرح مطمئن کیا ہے۔ اڈّے پر اُس کے قبضہ جمانے سے ہمیں بھی اُس پر شبہ ہوا تھا کہ کہیں اُس نے تم سے کوئی پرانا بدلہ تو نہیں لیا ہے۔ ہو سکتا ہے، اڈّا لیتے وقت اُس کے دماغ میں یہی بات ہو لیکن اِس کے سوا کچھ نہیں۔ جیل میں بند تمھارے آدمیوں کی شکایت پر ہم نے اُس کے بارے میں پوری انکوائری کی ہے۔ شروع شروع میں تمھارے آدمی اُس کا نام نہیں لیتے تھے لیکن جب وہ اڈّے پر بیٹھ گیا تو صرف اُسی کا نام لینے لگے۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہم نے اُس کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھی ہے مگر ہمیں کوئی ایسی بات دکھائی نہیں دی جس سے ہمارا شک آگے بڑھتا۔ وہ واقعے کے کوئی پندرہ دن بعد کلکتے آیا تھا اور اُس کے بیان کے مطابق یہ اُس کے اُستاد، اُستاد تجھل کا پُرانا اڈّا ہے اس لیے جیسے ہی اُس نے یہ سب سُنا، وہ اڈّا جمانے کے لیے اِدھر آ گیا۔ ممکن ہے تم اپنی پرانی جگہ پر اُس کی بیٹھک پسند نہ کرو اور اُسے ہٹانے کی کوشش کرو۔ وہ خود ہٹ جائے تو کسی کو اعتراض نہ ہوگا لیکن تم نے اُس کے ساتھ زور زبردستی کی تو پولیس تماشا نہیں دیکھتی رہے گی۔ میں نے تمھیں بتا دیا ہے کہ رتنا وہاں عمارت کے مالک کی اجازت سے بیٹھا ہے۔"
"داؤ جی نے بھروسا کر لیا ہے تو پھر ٹھیک ہی ہوگا۔" تجھل انسپکٹر داؤ دیال کی طرف نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "آپ کو کچھ اور بولنا ہو تو بولو۔"
"اور کچھ نہیں۔" ماتھر نے نرمی سے کہا۔
"چوڑیاں ابھی رہ گئی ہیں۔"
"کیا مطلب؟"
"مطلب یہ کہ اپنے کو چوڑیاں پہنا کے بھیجو۔"
"دیکھو تجھل!" ماتھر کا لہجہ بگڑ گیا۔ "میں تمھیں وارن کرتا ہوں۔"
"اب آپ کے سامنے کیا بولیں ماتھر ساب! کوئی دوسرا ہوتا تو زبان سالی اینڈتی نہیں، اِدھر زندگی بھر سوچا کہ پولیس یہ گورکھ دھندا کیسے چلاتا ہے، اپنے کو آج پتہ چلا کہ اِدھر آپ بھی تو ہوتے ہو۔"
"جاؤ، جاؤ تجھل!" ماتھر اُس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے بولا۔
وہ تجھل کے ساتھ چبوترے کے زینے تک آیا۔ "اپنے آپ یاد رہو گے۔" نیچے اُترتے ہوئے تجھل نے زیر لبی سے کہا۔
ماتھر نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں میچ لیں اور رُکی رُکی آواز میں بولا۔ "جاؤ اُستاد! اپنا بھروسا تمھارے ساتھ ہے۔"
تجھل نے اُس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے۔

شام ہو چکی تھی مگر سورج ابھی چھپا نہیں تھا۔ گلی میں معمول کے مطابق چہل پہل تھی۔ ساری دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ نکڑ پر واقع ملباری کے تکونے ہوٹل میں زور زور سے گراموفون بج رہا تھا۔ اُس سے ملحق دھرما پان والا نیلی قمیص پہنے اور گلے میں تازہ نوٹوں کے ہار ڈالے اپنی دکان پر گاہکوں میں مصروف تھا۔
تجھل، جامو، بلاکو، جینی، پلٹو، سُولم، سارنگ، میں اور بدرو چنگا سمیت ہم کل گیارہ آدمی تھے۔ ٹیکسیوں سے ہم ... ہی پر اُتر گئے اور بغیر گلی میں داخل ہو گئے۔ تھانے سے یہاں تک راستے میں کسی جگہ رُک کے ہم نے ایک گھونٹ بھی نہیں پیا تھا۔ شاید کسی کو بھی بھوک پیاس نہیں لگ رہی ... سب کو جلد سے جلد علاقے پہنچنے کی بے کلی تھی۔ پولیس ... سے اتنا کچھ سُننے کے بعد مجھے کچھ شبہ ہونے لگا تھا کہ ہو ... ہے وہ رتنا نہ ہو، کوئی اور ہی ہو۔ ضروری نہیں کہ جو کچھ ہر ... اور چنگا نے رتنا کے بارے میں بتایا تھا، وہ حرف بہ حرف ٹھیک ہی ہو۔ اڈّے پر قبضہ جمانے کی وجہ سے وہ سب رتنا کو سب کچھ سمجھ رہے ہوں، ممکن ہے رتنا بعد ہی میں آیا ... اڈّا بے آسرا دیکھ کے اُس کی نیت خراب ہو گئی ہو مگر ... نے تھانے سے نکل کے ٹیکسی ڈرائیوروں کو کسی اور علاقے ... پتہ نہیں بتایا۔ سیدھے اڈّے ہی چلنے کی ہدایت کی اور اب ... خاص اڈّے کی گلی میں موجود تھے۔ ٹیکسیوں سے اُترتے وقت ... اتفاق سے کسی کی نظر ہم پر نہیں پڑی لیکن جیسے ہی ہم چند ... آگے بڑھے، گلی میں چوڑیوں کی دُکان کے مالک ادھیڑ عمر آ...

بھائی نے ہمیں دیکھ لیا۔ "اُستاد!" اُس کی کھنکتی ہوئی آواز نے ہمارے قدم روک لیے۔ آدم بھائی ہمارے سامنے ششدر کھڑا تھا۔
تجھل نے اُس کا بازو پکڑ کے پوچھا۔ "کیسے ہو کنھیا جی؟"
ہر وقت چوڑیاں پہننے والی عورتوں کا ہجوم اُس کے گرد لگا رہتا تھا اس لیے تجھل اُسے کنھیا کہتا تھا۔
آدم بھائی اُچھل کے تجھل کے سینے سے چمٹ گیا اور سُبکنے لگا۔ آدم بھائی کے نظر پڑنے کی دیر تھی، ہم نے بہ مشکل چند گز کا راستہ طے کیا ہوگا کہ گلی میں ایک شور سا مچنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے راہ گیروں اور دکان داروں کی ایک بڑی تعداد ہمارے اطراف جمع ہو گئی تھی۔ وہ سب مبہوت نظروں سے ہمیں دیکھتے تھے۔ غالباً اُن سب کو باور کرا دیا گیا تھا کہ ہم کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ وہ ہمارے قریب آ آ کے، ہماری آوازیں سُن سُن کے جب تک یقین نہ کر لیتے تھے، اُن کی آنکھوں کی حیرت دُور نہیں ہوتی تھی۔ اِس سرے سے اُس سرے تک گلی خاصی لمبی تھی۔ ابھی ہم اِس سرے پر تھے کہ دُور دُور تک ہماری آمد کی خبر پہنچ چکی تھی اور ہم اپنے ہی علاقے میں تماشا سے بن گئے تھے۔ دونوں طرف سے لوگ بھاگ بھاگ کے، اُمڈ اُمڈ کے ہمیں دیکھنے ہماری طرف بڑھے چلے آتے تھے اور اوپر جدھر دیکھو، بالکنیوں اور کھڑکیوں میں عورتوں اور بچوں کے چہرے نظر آتے تھے۔ ہمارے لیے چند قدم آگے بڑھنا دشوار ہو گیا۔ گلی کے پُرانے مکین پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہمارے پاس آتے، تجھل کو سلام کرتے، خیریت پوچھتے اور ایک ہی سانس میں نہ جانے کیا کیا کہنے لگتے۔ کوئی کپتن خاں کا نام لیتا، کوئی زورا کا، کوئی شولی لالہ کا۔ سب کا ایک ہی سوال تھا کہ ہم کہاں منہ کالا کرنے چلے گئے تھے۔ اڈّے کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا مگر اس طرح وہاں تک پہنچنے میں رات ہو جاتی۔ معلوم نہیں، تجھل نے نکڑ پر اُترنے کو کیوں ترجیح دی تھی۔ ٹیکسیاں اڈّے کی عمارت تک بھی آ سکتی تھیں۔
یہ سلسلہ دیر تک نہ رُکتا اگر تجھل اُنھیں اپنے قریب آنے کے بجائے دُور ہٹانا نہ شروع کر دیتا۔ ہم سبھوں کو بھی وحشت ہونے لگی تھی چنانچہ سبھی نے لوگوں کو پیچھے ہٹ جانے کی تاکید کی۔ شروع میں مشکل پیش آئی لیکن پھر لوگ خود بہ خود پیچھے ہٹتے اور کنارے ہوتے گئے۔ وہ کچھ سہم سے گئے تھے اور اُن کے چہروں سے ظاہر تھا کہ ہمارے رویے کی یہ اچانک تبدیلی اُنھیں اچھی نہیں لگی ہے۔ پھر کوئی قریب نہیں آیا اور خاموشی بھی طاری ہو گئی۔ ہمارے لیے راستہ صاف ہو گیا تھا۔ لوگوں کے اتنے قریب آنے سے تجھل کے پیر کو ذرا تکلیف پہنچی ہوگی مگر وہ تیز قدموں سے لنگڑا لنگڑا کے فاصلہ کم کرتا رہا۔ جب ہم اڈّے کی عمارت کے نزدیک پہنچے تو اردگرد سناٹا چھا گیا تھا حالانکہ وہ سب وہیں موجود تھے۔ ہم سے کچھ دُور دُور ہی گلی میں دیواروں، دکانوں اور مکانوں کی سیڑھیوں اور چبوتروں پر سمٹے ہوئے۔ چند لمحے بعد اڈّے کی عمارت ہمارے رُو بہ رُو تھی۔ تجھل نے سر اُٹھا کے ایک نظر ساری عمارت کا جائزہ لیا۔ رتنا نے نیا رنگ روغن کرایا تھا۔ بڑا دروازہ بند تھا۔ دروازے کے قریب ٹلا کے بیٹھنے کی چوکی خالی پڑی تھی البتہ دروازے کے باہر دو آدمی کواڑوں سے چمٹے کھڑے تھے۔ میں نے اُنھیں پہلے نہیں دیکھا تھا۔ دونوں کی عمریں تیس سال سے کم ہوں گی۔ جسم کے ہلکے اور رنگ کے کالے تھے۔ دونوں پوری طرح تیار تھے۔
جامو اور بلاکو میرے ساتھ تھے۔ اُنھیں کسی پہلو قرار نہیں تھا۔ اُن کے جسم پھڑک رہے تھے اور سارا خون جیسے آنکھوں میں اُتر آیا تھا۔ میرے ہاتھ پیروں پر بھی ایک لرزش سی طاری تھی۔ ظاہر ہے، رتنا کو پہلے سے اطلاع مل گئی ہوگی۔ یہ ناممکن تھا کہ گلی میں ایسا شور مچا ہو اور گلی کے اڈّے کے کانوں تک نہ پہنچا ہو۔ ممکن ہے رتنا کو ہمارے گلی میں داخل ہونے سے پہلے ہی خبر ہو گئی ہو۔ جس وقت ہم پولیس افسروں کے سامنے موجود تھے، مجھے حیرت تھی کہ تجھل وہاں رتنا کا نام کیوں نہیں لے رہا ہے، اشارتہً بھی نہیں۔ ایک بار میں نے ارادہ بھی کیا کہ اُسے یاد دلاؤں لیکن یہ خیال کر کے چپ رہا کہ تجھل خود اُس کا نام کیسے بھول سکتا ہے۔ چلتے چلتے ایس پی ماتھر ہی نے رتنا کا ذکر کیا تھا اور تجھل اس پر بھی اپنی آنکھیں بجھائے بیٹھا رہا۔
"رتنا جی سے بولو، تمھارے مہمان آئے ہیں۔" تجھل نے سرد لہجے میں ان دونوں آدمیوں سے کہا جو دروازے پر تالا بنے کھڑے تھے۔
"رتنا اُستاد ابھی آرام کرتا ہے۔"
اِدھر سے جامو، اُدھر سے تجھل نے پلک جھپکتے میں ہاتھ بلند کر کے اُن کے سروں پر مارے۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ دونوں وہیں بیٹھ گئے اور ابھی چیخ بھی نہیں سکے تھے کہ جامو اور تجھل نے بال پکڑ کے اُنھیں اوپر اُٹھایا اور گردن کو ہلکا سا جھٹکا دے کے اُنھیں دائیں بائیں دھکیل دیا۔ جینی نے بڑھ کے دروازے پر ٹھوکر ماری۔ دروازہ مقفل نہیں تھا، چوپٹ کھل گیا۔ اندر کمروں اور دروازوں کے مابین کھلی ہوئی مختصر جگہ پر پانچ آدمی چاقو تولے کھڑے تھے۔ ہمارے چاقو جیبوں ہی میں رکھے ہوئے تھے۔ وہ منتظر تھے۔ ہمیں اندر گھستا دیکھ کے وہ ایک دم ہم پر جھپٹے لیکن ہماری

نگاہوں نے اُنھیں تاک لیا تھا۔ پتہ نہیں کیا ہوا، ہمیں کچھ ہوش ہی نہیں تھا۔ میں نے اپنے قریب موجود صرف جامو کو دیکھا تھا۔ وہ چیختا ہوا ایک آدمی پر اُچھلا اور اُس کی جھونک میں اُس نے دو اور آدمیوں کو گرا دیا۔ میں نے بھی کچھ یہی کیا تھا۔ جب مجھے اپنی سُدھ بُدھ ہوئی تو وہ پانچوں زمین پر پڑے تھے اور اُن کے چاقو اِدھر اُدھر گرے ہوئے تھے۔ اُنھیں دوبارہ چاقو اُٹھانے کی فرصت نہیں ملی۔

سامنے کے دونوں کمروں کے دروازے بند تھے مگر دفعتہً ایک دروازہ کھُلا اور ایک ساتھ کئی آدمی تیزی سے باہر نکلے۔ تجھل کے چہرے سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ اِن میں رتنا نہیں ہے لیکن یہ کون سا طریقہ تھا کہ خود آنے کے بجائے اُس نے پھر اپنے چند آدمی بھیج دیے تھے۔ کیا اُس کے دماغ میں یہ تھا کہ تجھل اڈّے تک آ کے اوسان آدمیوں کو دیکھ کے واپس ہو جائے گا یا وہ تجھل کا ارادہ آزمانا چاہتا تھا یا اُس کا خیال یہ تھا کہ اس طرح ہم آدھے ہو کے اُس کے مقابل پہنچیں گے۔ اڈّوں پر کہیں ایسا نہیں ہوتا مگر اڈّے ایسے حاصل بھی نہیں کیے جاتے جیسے رتنا نے کیا تھا۔ ”کیا، کیا ہے؟“ اُن میں سے ایک دراز قد اور پھیلے ہوئے جسم کے ایک شخص نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ ”یہ رتنا اُستاد کا اڈّا ہے۔“

”اُسی کے دوار پہ آئے ہیں لڑے۔“ تجھل مدھم لہجے میں بولا۔

”تم کو باہر بولا نہیں کہ ابھی رتنا اُستاد کے آرام کا ٹیم ہے۔“

”اُس گیدڑ کے تخمے کو بول، اکٹھا آرام کر لینا۔“ جامو کی آواز بھڑک رہی تھی۔ ”ابھی اِدھر اُس کی ماں کے بھلّا آتار آئے ہیں۔“

”چمڑی سے مت بھٹ کنجر!“ وہ دہاڑ کے بولا۔ ”اندر ہی رہ کے بول۔“

جامو کا سارا جسم ایک لمحے کے لیے بل کھا گیا۔ وہ جلاکو، مینی اور سارنے بیک وقت اُن پر جھپٹنے والے تھے کہ تجھل کی آواز سُن کے رُک گئے۔

”ہاں، اِن کو پرے ہی رکھو تجھل!“ رتنا کے آدمیوں میں سے ایک نے زمین پر تھوک کے کہا۔ ”ابھی اِدھر جو اس کی بہن کے جُنیا سوار کھڑے ہیں، وہ اس کو نہیں نپیتے؟“

تجھل جواب دینے کے بجائے لنگڑاتا ہوا خود اُن کے پاس جانے لگا لیکن درمیان ہی میں جامو اُس کے آڑے آ گیا۔ ”تم پیچھے ہٹو اُستاد!“ وہ چیخ کے بولا۔ تجھل رُک گیا۔ جامو نے بولائے ہوئے انداز میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور ایک جھرجھری لے کے جیسے جسم کی گرد جھاڑ رہا ہو، اُن کی جانب آہستہ آہستہ قدم بڑھانے لگا۔ وہ اُسے ٹھہر جانے کا حکم دیتے رہے مگر جامو اپنی اُبلی ہوئی آنکھیں اُن پر مرکوز کیے بڑھتا رہا اور اُن کے مقابل ہی جا کے ٹھہرا۔ تین اطراف سے وہ اُن کے نرغے میں تھا۔

میری سانس سینے میں اٹکنے لگی تھی۔ سب کے پاس تمنچے تھے، میری جیب میں بھی لیکن کسی نے تمنچا باہر نہیں نکالا۔ جامو اُن کے بیچ میں پہنچ کے بُت کی طرح جم گیا تھا۔ اُس کی حالت کسی پاگل سانڈ جیسی تھی جو سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا راہ گیروں پر پلٹ کے وار کرنے کے لیے تیار ہو اور اپنے سینگ تول رہا ہو۔ کتن خاں اور جامو کا بچپن سے سنگ ساتھ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو بالکل بھائیوں کی طرح سمجھتے تھے۔ جامو کی نظروں میں اُسی کا چہرہ سمایا ہو گا۔ اسی جگہ وہ اُسے چھوڑ کے گیا تھا۔

اُنھوں نے چاقو نہیں چلائے کیونکہ جامو اُن کی دست بُرد سے قطعاً دُور نہیں تھا اور اُنھوں نے دیکھ لیا تھا کہ اُس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ ”لوٹ جاؤ، ہم بولتے ہیں، لوٹ جاؤ۔ تمھارا ٹیم گیا۔ یہ اڈّا اب رتنا اُستاد کا ہے۔“ اُن میں سے ایک آدمی نے ہکلا کے کہا۔ وہ سب جامو کے گرد چاقو گھما رہے تھے۔ ”اپنا وقت تو دم کے ساتھ ہے۔ جا کے اُس زنخے کو بول، دیری نہ کر، جھنجھنا لے کے آ جا۔“ جامو نے اس کے بازو کو تھپکی دی تو سب بدک پڑے۔

”ابھی پیچھے رستہ کھُلا ہے۔ زیادہ اٹکل مت کر۔“ پھیلے ہوئے جسم کا آدمی دھتکارتے ہوئے لہجے میں جامو سے بولا۔ ”یقتنیا پھیر لے۔“

جامو نے پھر زبان سے کچھ نہیں کہا۔ جس شخص کے بازو پہ تھپکی دینے کے لیے اُس نے ہاتھ بڑھایا تھا، چشمِ زدن میں اُسی کی گردن پہ ہاتھ ڈال کے اسے اپنی طرف کھینچ لیا اور صرف اُسی کو نہیں، اُس نے دوسرے ہاتھ سے اُس کے مقابل کھڑے ہوئے آدمی کی گردن بھی دبوچ لی تھی۔ ایک ساتھ کئی چاقو چلے، وہ جامو کا داؤ بالکل نہیں سمجھ پائے تھے۔ جامو نے پل بھر کی مہلت میں اُن کے ساتھیوں کے ٹینٹوے پر ایسی جگہ چٹکی بھری تھی کہ وہ بُری طرح تڑپنے لگے تھے۔ اُن کی آواز بھی نہیں نکل رہی تھی اور اِن میں جامو کی پکڑ سے خود کو چھڑانے کے سوا کوئی سکت نہیں تھی۔ جامو نے اپنے دونوں ہاتھوں کی دو دو انگلیاں اُن کی ٹھوڑی کے نیچے پیوست کر دی تھیں، کسی کانٹے کی طرح۔ اُن کے پھڑکتے اور ملتے جسموں کا سارا زور بھی جامو کے اُن کانٹوں سے چھٹکارا پانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ دونوں مکمل طور پر جامو کے قبضے میں تھے اور اُن کے اطراف اُن کے ساتھی جیسے ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے۔ جامو نے ایک ثانیے میں متعدد پینترے بدلے تھے اور اُنھیں اپنی انگلیوں کی میخوں میں پیوست کیے اِدھر اُدھر تھرکتا گھومتا رہا تھا۔ ہر طرف جامو کے پاس اُن کی ڈھال موجود تھی۔ جامو کے بجائے چاقو اُنھی کے جسموں پر لگتے۔ نتیجتہً باقی آدمیوں کو پیچھے ہونا پڑا۔ اگر وہ آگے آتے تو اُن کے چاقوؤں سے اُنھی کے ساتھیوں کے جسم چھلنی ہوتے۔ جامو اپنی جگہ جما ہوا نہیں کھڑا تھا۔ لمحے بھر بعد اُس کے بدلے ہوئے پینترے کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ وہ اپنے ہاتھ آگے پیچھے کرتا تو اس کی چٹکی میں جکڑے ہوئے دونوں آدمی لازماً اُسی کے ساتھ جدھر وہ چاہتا، گھوم جاتے۔

ہم سب قریب ہی کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ جامو سے ذرا بھی چوک ہو جاتی تو چاقو اُس کے جسم سے دُور نہیں تھے۔ دونوں آدمی نڈھال سے ہونے لگے۔ جیسا کہ تجھل اکثر مجھ سے کہتا تھا کہ داؤ میں بس لمحوں کا اُلٹ پھیر ہونا چاہیے۔ جامو نے اس سے زیادہ وقت نہیں لیا تھا۔ تجھل بھی اُن کے سامنے جا کے یہی کچھ کرتا جو جامو نے کیا تھا اور کوئی بھی شخص جس کی انگلیاں لوہے کی طرح سخت اور چاقو جیسی دھار رکھتی ہوں۔ ترازو کی اُس ڈنڈی کے مانند جو بہت بڑا بوجھ سہار لیتی ہے۔ زیادہ آدمیوں کے درمیان اسی قسم کا کوئی غیر متوقع داؤ سود مند ہوتا ہے لیکن جامو کو دیر تک اس پر قائم نہیں رہنا تھا، فوراً کوئی نیا رُخ بدلنا چاہیے تھا۔ زیادہ وقت ایک ہی داؤ پر اڑے رہنے سے مقابل کے لوگوں کو اپنے بچاؤ کے علاوہ جوابی حربے اختیار کرنے کا بھی موقع مل جاتا ہے اور جامو کو اُنھیں یہ موقع نہیں دینا تھا۔ میرا خیال تھا، جامو جلد ہی ان دونوں نیم جاں آدمیوں کو اُن کے ساتھیوں پر دھکیل دے گا اور اسی اثنا میں دوسرے آدمیوں کو پکڑے گا یا خود چاقو سے اُن پر وار کرے گا۔ اپنے دو ساتھیوں کی جاں بلبی دیکھ کے اُن کے ہاتھ پیر ویسے ہی ٹھیک طرح کام نہیں کریں گے۔ وہ جامو کے پنجے سے اُنھیں چھڑانے کے لیے اپنے چاقو زمین پر بھی پھینک سکتے تھے۔ اسی بات کا امکان زیادہ تھا۔ اس طرف ہم بھی اُن کے قریب موجود تھے اور ہمارے اتنی دیر خاموش رہنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہم ہر صورت میں یوں ہی کھڑے رہیں گے۔ اُن کے پیچھے ہو جانے کے باوجود جامو گھوم گھوم کے اُنھیں اُکسا رہا تھا تاکہ وہ اُس پر وار کرنے کا پھر ارادہ کریں اور اپنے ہی ہاتھوں اپنے ساتھیوں کو چاقو گھونپ دیں۔

جامو کے ذہن میں کچھ اور بھی ہو سکتا تھا لیکن اُسے کچھ اور سوچنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اندر سے یک بارگی چند آدمیوں کے بھاگنے کی آوازیں آئیں۔ جامو نے پھر بھی اُنھیں نہیں چھوڑا۔ آنے والے چھ آدمیوں میں سب سے نمایاں جو آدمی تھا، وہی رتنا ہو گا۔ مجھے اُس کا چہرہ کچھ کچھ جانا پہچانا محسوس ہوتا تھا۔ شاید کبھی جیل میں دیکھا ہو مگر اب اُس کے جسم اور شکل و صورت میں بہت فرق ہو گیا تھا۔ اُس کا جسم پہلے کی نسبت بندھا ہوا تھا۔ درمیانہ قد، سانولا رنگ، گول چہرہ اور مسّوں نشانوں کی بھرمار، تنگ پیشانی۔ لمبی ناک، پتلے پتلے ہونٹ، آنکھیں بڑی نہ چھوٹی، بال سلیقے سے کڑھے ہوئے۔ درمیان میں مانگ، کُرتا پاجامہ، اُوپر سے واسکوٹ، گلوبند میں ملبوس اُوچے رنگ کے بڑے سے نگینے کی انگوٹھی، کلائی میں سُرخ ڈورا۔ اُس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہو گی۔ وہ تیز قدموں سے باہر آیا تھا۔ آتے ہی اُس کی نظر جامو پر پڑی جو اُس کے دو آدمیوں کو اپنی انگلیوں سے تھامے ہوئے تھا۔ رتنا دروازے کے پاس ہی رُک گیا۔ اُس کے ساتھ آنے والے آدمی جامو سے لپٹنے کے لیے جست لگانا ہی چاہتے تھے کہ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے اُنھیں جھڑک دیا اور سر گھما کے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اُس کے دیدے مچل رہے تھے۔ ہر چیز جیسے بے دم، بے آواز ہو گئی تھی۔ جامو نے دونوں آدمیوں کو اِدھر اُدھر دھکیل دیا تھا لیکن خود وہیں کھڑا رہا۔ رتنا نے اُس کی طرف توجہ نہیں دی۔ اُس کی گھومتی ہوئی نظریں تجھل پر آ کے ٹھہر گئی تھیں۔ تجھل بھی اسی کو گھور رہا تھا۔ رتنا کے سکڑے ہوئے ہونٹ پھیلتے گئے۔ ”جان پڑتا ہے کہیں دیکھت ہیں۔“ یکایک وہ استہزائی لہجے میں بولا۔

تجھل کے لبوں میں جنبش نہیں ہوئی۔

”اوہو ہو!“ وہ اچک کے بولا۔ ”تجھل اُستاد آئے ہیں۔“

”ذرا جلدی پہچان لیا۔“ تجھل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”پر اس کو، اس کو کیا بولے ہیں؟“ اُس نے زمین پر اوندھے پڑے اپنے آدمیوں کی طرف نگاہ کرتے ہوئے چلبلے پن سے پوچھا۔

”بولنا بھی آ گیا ہے تجھ کو۔“

”اور بھی بہت کچھ آوے ہے تمھارے سر کی قسم۔“

”تو پھر دیر کا ہے کو کرتا ہے؟“

”اندر چل کے کچھ جل پانی کر لیو، پہلی بیر اِدھر آئیو ہو۔“

”اب تو تیرا خون ہی پییں گے۔“

”بہت کڑوا ہے اُستاد! لگے ہے، تجربا بھی بدن کے سنگ کچھ ڈھلک گیو ہے۔ آتے کسی نے بولا نہیں کہ رستہ

کدھر کو جاوے ہے۔"

اُس کا وجود میری طرح کسی کو بھی ایک پل کے لیے برداشت نہیں ہو رہا ہوگا اور وہ اس قسم کی باتیں کر رہا تھا۔ ایک نظر دیکھنے سے معلوم ہو جاتا تھا کہ وہ کیسا آدمی ہے۔ اُس کے منہ ہی لگنا فضول تھا۔ ہم سب بجھل کے اشارے کے منتظر تھے جابو رتنا کے قریب ہی کھڑا تھا اور ہم میں سے بھی کسی کو اُس کے پاس پہنچنے میں دیر نہ لگتی۔ ایسے آدمی کے لیے سوچنا ہی کیا تھا۔

"زیادہ چرچر مت کر۔" بجھل نے بھاری آواز میں کہا۔ "جو بچار کرنا ہے کر لے۔ تیرے پاس ابھی تھوڑا ٹائم ہے۔"

"اب بھی کوئی بچار رہو رہے ہے؟" وہ آنکھیں مٹکا کے بولا۔ "ہتھیار کو تجھ پہ اُٹھتے لجا آئے گی۔ اچھا ہے اس کو بیچ میں مت لا۔ اپنا فیصلہ خود ہی کر لے۔ ہم لوٹ آئے ہیں۔"

"او تو ہم کو بھی دکھے ہے، تم لوٹ آیو ہو پر ذرا دیری میں آیو ہو۔ ادھر سارا کچھ بدل گیو ہے۔ سیدھے اِدھر ہی آئے ہے ہو؟"

بجھل نے جواب میں چاقو نکال لیا۔

"اپنے پلے بھی ہوئے ہے استاد! اس کو بھیتر ہی رکھ لیو تو ٹھیک ہے۔ ہم بول دیں کہ بڑا گھاٹا ہوئے گا۔ ابھی تمھاری کھوپڑیا میں پہلے کا کوئی دھیان ہے تو اُس کو نکال دیو۔ اڈے پر اب ہم بیٹھے ہیں اور کسی سے مار کے نہیں بیٹھے ہیں۔ دمڑی دے کے لیو ہے اور جب لیو ہے تو جانے بھی ہیں کہ اس کو رکھا کیسے جاوے ہے۔ ہم ادھر نا ہی آتے تو بدلے کوئی آجاتا۔ بہت سے حرامیوں کے تن میں چوہے دوڑے تھے۔ شکر کرو کہ ہم آئی گئے۔ تمھارا سالا آدمی سالا ناک کٹا کے بیٹھ گیو تھے۔ کچھ اِدھر بکھر گئے، باقی اُدھر ہجرے میں چلے گیو۔ بولت ہیں کہ اپنوں کو ڈس لیو۔ تمھارا کانٹا ابھی تک من میں چبھے ہے۔ پر تمھارا سمے بھر گیو ہے۔ تم سے کیا بولیں۔ سمجھے کہ ناہیں؟ آیو ہو تو ادھر دھیرج سے بیٹھو، پر اڈے کا بچار من سے نکال دیو۔"

"ضرور تجھے کسی چھنال نے جنا تھا۔"

"کسی دھوکے میں مت رہیو استاد! بعد کو بڑی نندا ہوئے گی۔ تمھارے نکل لینے کے بعد ہم اُدھر رات دن برسوں سالا کھی ناہی مارت تھے۔ چھاتی میں تمھاری بات اٹکائے کے گیو تھے۔"

پتہ نہیں، بجھل کو کس بات کا انتظار تھا، وہ اور کیا سننا چاہتا تھا۔ رتنا کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی اور بجھل کا چاقو اُس کے ہاتھوں میں سرد پڑا تھا۔ اندھیرا تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ میں نے بے چینی سے بجھل کی طرف دیکھا مگر وہ جیسے اپنے آپ میں گم تھا۔ رتنا کے خاموش ہو جانے کے بعد چند لمحے وہ سُن کھڑا رہا۔ "کا سوچن لاگے استاد!" رتنا نے ہی تمسخرانہ لہجے میں اُسے ٹوکا۔

بجھل نے اپنا چاقو اُس کی جانب اُچھال دیا۔ رتنا کو اِس کی توقع نہیں تھی۔ غیر اختیاری طور پر وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا لیکن چاقو زمین پر گرنے ہی والا تھا کہ اُس نے پھرتی سے اُسے ہاتھ میں اُچک لیا۔ "ناہی مانو گے۔ لاگے ہے آج دن آیو گیا۔" وہ چاقو کی دھار پر انگلی پھیرتے ہوئے بولا۔ "ابھی اتنا بہت ہے استاد!" اُس کی آواز ایک دم بدل گئی۔ "اُلٹے پیروں اِدھر سے لوٹ لیو۔" اُس نے چاقو واپس بجھل کی طرف پھینک دیا۔ بجھل نے ہاتھ بڑھا کے اُسے تھام لیا۔ رتنا نے اس دوران اپنا چاقو بھی نکال لیا تھا۔

"جلدی کر بھانڈ کے جنے! اندھیرا بڑھ گیا ہے۔ دن میں ہی تجھ کو ٹھیک دکھائی نہیں دیتا، اندھیرے میں کیا سوجھے گا۔"

"لاگے ہے آج دن آیو گیا۔" وہ سر جھٹک کے بولا۔ "بچپن میں ایک کہاوت سنیو تھے۔ گیدڑ کی موت آوے ہے تو شہر کی طرف بھاگے ہے۔ ہے کالی میا! من میں تیرے داس کی ایک ہی اچھا تھی کہ تیرے چرنوں استاد بجھل کے خون کا چڑھاوا دیویں۔" رتنا اپنا چاقو چومتے اور آسمان کی طرف نگاہ کرتے ہوئے ہذیانی انداز میں بولا۔ اُس نے چاقو بجھل پر تول لیا تھا مگر اچانک رُک گیا اور اچھل کے کہنے لگا۔ "پر اِدھر نہیں، اندر چلو! اندر چلو، اُدھر جگہ بڑی ہے۔ تم کو بھی شکایت نہیں ہوئے گی اور اُدھر کالی میا کی مورتی بھی درشن دیوے ہے۔ اس کے آگے ہی بلی ہو۔" یہ کہتے ہی وہ مُڑ گیا۔

بجھل بھی غالباً یہی چاہتا تھا۔ اُس نے اعتراض نہیں کیا۔ اس طرف جگہ بہت تنگ تھی۔ پیچھے گلی کے کھلے دروازے سے لوگ اندر جھانک رہے تھے مگر اُن میں سے کوئی اندر نہیں آیا تھا، اُن کا گھٹا گھٹا شور ہمارے کانوں میں گونج رہا تھا۔

بیچ کا کمرہ پھلانگ کے ہم صحن میں آگئے۔ صحن کا نقشہ بدلا ہوا تھا۔ فرش دھلا ہوا، دیواروں پر نئی سفیدی ہوئی دی تھی۔ دیوار کے ساتھ لگی بڑی چوکی پر گیرو رنگ کی چادر بچھی تھی۔ سامنے مونڈھے پڑے تھے۔ صحن کی یہ صفائی ستھرائی کبن خاں کی زندگی میں ہوئی ہوگی۔ وہ کپڑے بھی صاف ستھرے پہنتا تھا اور ہر وقت بنا سنورا رہتا تھا۔ صحن خاصا کشادہ تھا۔ اندر پہلے سے کچھ اور آدمی موجود تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ رتنا نے اپنے خاص آدمیوں کو باقاعدہ اکٹھا کیا ہوا تھا یا وہ اڈے کے گرد

ہی گھومتے رہتے تھے اور گلی میں ہمارے اطراف بھیڑ دیکھتے ہی یہاں آگئے تھے۔ اُن میں سے چند کے چہرے مجھے دیکھے ہوئے لگتے تھے۔ شاید وہ موجدار کے اڈے کے لوگ تھے یا کسی اور اڈے کے ہوں گے۔ بجھل، بلاکو، جامو، سارنگے وغیرہ انھیں خوب جانتے ہوں گے۔ صحن میں آتے ہی رتنا اُس طاق کی طرف مُڑ گیا تھا جہاں زبان نکالے ہوئے کالی دیوی کی سیاہ مورتی رکھی تھی۔ وہ ہاتھ جوڑے طاق کے کونے سے سر رگڑ رہا تھا اور اُس کا چاقو مورتی کے قدموں میں پڑا تھا۔ باقی لوگ صحن میں ہر طرف دربانوں اور پہرے داروں کے مانند کھڑے تھے۔ انھیں آپس میں اشارے کرنے کے سوا اور وقت نہیں ملا ہوگا۔ اُن کے پیچھے ہم فوراً اندر آگئے تھے۔

صحن میں روشنی کی کمی نہیں تھی، تمام بتیاں جلی ہوئی تھیں۔ کالی دیوی کے پاس سے ہٹ کے رتنا چوکی کے سرے پر پاؤں لٹکا کے بیٹھ گیا۔ ہم سب چوکی کے نزدیک ایک طرف موجود تھے، اپنے ہی گھر میں اجنبی بنے ہوئے۔ ہر پل جسم کانٹا ہوا گزر رہا تھا۔ یہ دیکھنے کے لیے ہم یہاں نہیں آئے تھے۔ سب اپنے ہاتھ پیروں کو بہ مشکل روکے ہوئے تھے۔ کسی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ آگے بڑھ کے رتنا کی انتڑیاں نکال دے، اُس کی کھال ادھیڑ دے، آنکھیں پھوڑ دے۔ اگر بجھل یہ سمجھتا تھا کہ وہ رتنا ہی ہے جس نے کبن خاں اور اپنے دوسرے آدمیوں کو آنکھیں کھولنے کی مہلت نہیں دی تھی تو سامنے آنے کے بعد رتنا بھی اتنی دیر کا مستحق نہیں تھا مگر بجھل کا جی شاید پتھر کا ہو گیا تھا۔ چاقو اُس کے ہاتھ میں موجود تھا اور وہ رتنا کے چوکی سے اُٹھنے کا منتظر تھا۔ جب بجھل نے اڈے کی عمارت کے بجائے گلی کے نکڑ پر ٹیکسیاں رکوائی تھیں اور گلی کے لوگوں نے ہمیں آگھیرا تھا، اُس وقت مجھے خدشہ ہوا تھا کہ کہیں رتنا اِس عرصے میں اڈے سے نکل نہ جائے۔ اڈے کا ایک دوسرا راستہ پچھلی گلی میں کھلتا تھا لیکن رتنا نہ تو پچھلے دروازے سے باہر گیا، نہ اُس نے چاقو اُٹھانے سے اجتناب کیا بلکہ کچھ ایسا لگتا تھا جیسے اُسے ہمارا انتظار ہی ہو۔ جس شخص نے کبن خاں کو اس طرح راستے سے ہٹایا ہو، ہماری آمد کی اطلاع سُن کے وہ یوں اڈے پر بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا۔ پھر شاید وہ رتنا نہیں تھا۔ بجھل بھی کچھ یہی سمجھ رہا تھا مگر یہ رتنا کی کٹ حجتی بھی ہو سکتی تھی۔ اس طرح وہ ہم لوگوں پر کچھ اور ثابت کرنا چاہتا ہوگا جو اُس نے پولیس پر ثابت کیا تھا اور رتنا تبھی کچھ ثابت کرنے کی کوشش کر سکتا تھا جب اُسے اپنے بازوؤں کا کچھ زیادہ ہی اعتماد حاصل ہو، خالی خولی نہیں۔ اڈے پر قبضہ جمانے کے لیے پہلے کبن خاں کو ایسے ہی ختم کیا جانا چاہیے تھا۔ سامنے آکے وہ کبن خاں، لالہ، شولی، قدے، کانتے، کس کس کا سامنا کرتا۔ ایک کبن خاں ختم ہو جاتا تو اڈا اُس کے ہاتھ میں نہ آتا اور ایک وقت کو آ بھی جاتا تو دوسرے چین نہ لینے دیتے۔ اڈے پر ایک سے ایک آدمی موجود تھا۔ اس طرح اڈے پر کوئی باقی نہیں رہا تھا اور اڈا حاصل کرنے کے بعد وہ اُس کے بازوؤں ہی کا زور تھا جو کلکتے کے دوسرے اُستادوں کو اُس سے دُور رکھے ہوئے تھا اور اب وہ اسی کس بل پر بجھل کے سامنے موجود تھا۔ اُس بجھل کے سامنے جسے وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اُس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا مگر خوف اور گھبراہٹ کے آثار نظر نہیں آتے تھے یا وہ اُنھیں چھپانے پر قادر تھا۔

مورتی کے پاس سے ہٹ کے چند ثانیوں تک وہ سر جھکائے چپکا بیٹھا رہا پھر اچانک کالی دیوی کا نعرہ لگا کے چوکی سے اُٹھ گیا۔ ہم نے روکنا چاہا مگر بجھل چند قدم چل کے اُس کے مقابل آگیا۔ رتنا نے اُس کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی دونوں ہاتھ پھیلا دیے تھے۔ بائیں ہاتھ میں چاقو چمک رہا تھا مگر یکایک وہ پیچھے ہٹ گیا جیسے اُسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ "ہائیں!" وہ متوحش لہجے میں بولا۔ "پیر میں چوٹ لگے ہے۔ تم سے ٹھیک تنی چلا بھی نہ جاوے ہے۔"

"آگے بڑھ۔" بجھل نے بھری ہوئی آواز میں کہا۔

"بڑھنے کو بڑھ جاویں گے پر کالی میا کا بولے گی؟ چوٹ کھائے کی بھینٹ سویکار نا کرے گی۔"

"آگے بڑھ۔" بجھل کی آواز صحن میں گونجنے لگی۔

"نائیں استاد! ہم کو مجبور مت کریو، ابھی پاؤں ٹھیک کر لیو۔ پھر جاوے تو ہم کدھر جاوے ہیں۔"

"یہ گو تو بھلا چنگا ہے رستم کے تھوکے۔"

"او تو تم کو پتہ چل جائے گا۔ رستم کے تھوکے ہیں یو رستم پہ تھوکتے ہیں۔ اپنے پاؤں کی یہ حالت ہوتی تو تم کیا آگے بڑھ جائے تے! نانا استاد! اپنے دھرم میں چوٹ کھائے پہ ہتھیار اُٹھانا پاپ ہے۔"

بجھل نے اُس سے نہیں کہا کہ ہتھیار اندھوں پر اُٹھانا پاپ نہیں ہے، اُسے چوری سکھانا پاپ نہیں ہے۔ بجھل کے بولنے سے پہلے جامو سنسناتی آواز میں بولا۔ "جان دے اُستاد کو تو نے معاف کر دیا ہے تو ادھر سے کوئی دیوی کے لیے چن لے۔"

"ہمارے من کی حسرتیا بھی نکال لیو دیں گے۔ پہلے جڑ کو تو

کاٹ دیویں اور تم کو ایسے ہی کھُجلی ہو رہے ہے تو ادھر کھڑے آدمی تالی بجانے کو ناہی ہیں۔ کل کرا پنی بہنالے کے آؤ اور بولیو کہ رتنا اُستاد ابھی پہلے اِس پہ ہتھیار اُٹھاؤ تو کا ہم تمھاری بات مان لیویں گے۔ پہلے استاد کو دیکھ لیویں اور استاد ہم کو۔ برسوں ان ہاتھوں کی گھسائی پھر کس کارن کیے تھے تم بولو گے تو تمھارا المبر بھی آجاوے گا۔ اڈّے پر بیٹھے ہیں اپنی ماں ...“ وہ گالی دے کے بولا۔ تجھل کی آنکھیں بھاری ہو گئی تھیں۔ میرا اندازہ ٹھیک نکلا۔ اب اُسے کچھ اور نہیں سننا چاہیے تھا۔ وہ دو قدم آگے بڑھ گیا۔ رتنا کو جلد ہی احساس ہو گیا کہ وہ فضول باتیں کر رہا ہے۔ تجھل کو آگے آتے دیکھ کے ایک آن میں اُس نے اپنا جسم سیدھا کیا اور اُس کے ہاتھ پیر پھڑپھڑانے لگے۔ ”میا کی سوگند“ وہ چیختے ہوئے بولا۔ ”کچھ اور مت سمجھیو اِی کہ ہم کوئی رتی تڑا دے ہیں، ہم کو کا معلوم نہ تھا کہ ایک دن الیو آوے گا، سومیا کو تمھارا ہی بچن دیوے تھے“ وہ دیوانوں کی طرح اپنا سر ہوا میں پٹخنے لگا۔ ”نہیں مانت ہو تو ٹھیک ہے، میا ملنے! آؤ خود دیکھ رلیو ہے۔“ اُس نے طاق میں رکھی مورتی پر ایک نظر ڈالی اور ہاتھ جوڑ کے نعرہ لگایا ”جے بھوانی کی!“ اُس کے دونوں ہاتھ تجھل کو اپنے شکنجے میں کسنے کے لیے پھیل گئے۔

اُس نے اچھل کے تجھل سے اپنا فاصلہ اور کم کر لیا۔ تجھل کا چاقو بھی بائیں ہاتھ میں تھا۔ وہ رتنا کی طرح اچھلا اور کودا نہیں، کچھ آگے جا کے رُک گیا۔ رتنا کو بھی ٹھیرنا پڑا مگر اُس کے ہاتھ پہلے ہی حملے میں تجھل کا نشانہ لینے کے لیے بے قرار تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ رتنا کے ہونٹ بھنچے ہوئے، نتھنے پھولے ہوئے تھے اور اُس کی آنکھیں سر سے پاؤں تک تجھل کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ وہ ہاتھ جھٹک جھٹک کے تجھل کو جنبش کرنے پر اُکسا رہا تھا جو اپنی جگہ جم سا گیا تھا۔ رتنا کو اُس پر حملہ کرنے کے لیے بظاہر کوئی رکاوٹ نہیں تھی مگر تجھل کی اِس بے حرکتی نے اُسے اور زیادہ محتاط کر دیا تھا اور وہ کچھ تلملانے لگا تھا۔

صحن میں سکوت مسلط تھا۔ ہر طرف حصار بنائے رتنا کے آدمی جیسے لمحے گن رہے تھے۔ اُن کی گردنیں آگے نکلی ہوئی تھیں، آنکھیں پھٹی ہوئی۔ ہم بھی ایک کونے میں دم روکے کھڑے تھے۔ ہلاکو اور سانٹے میرے بازوؤں سے چپکے ہوئے تھے۔ جامو اپنا گال کھرچ رہا تھا۔ سب کی نظریں ایک ہی طرف لگی ہوئی تھیں۔ بہت دنوں بعد تجھل کسی کے سامنے یوں چاقو کھولے کھڑا تھا، ہمیں کسی اور بات کی اتنی فکر نہیں تھی جتنی رتنا کی طرف سے تھی۔ اُس سے کوئی بھی حرکت بعید نہیں تھی اور اِدھر تجھل کا پیر سُوجا ہوا تھا۔

رتنا کے جسم پر ایک ہیجان طاری تھا۔ تجھل کو ایک جگہ جمے دیکھ کے اُس کی حالت کچھ اور اضطراری ہو گئی تھی۔ وہ پیچھے نہیں ہٹا البتہ ایک طرف ہو گیا جو پیچھے ہٹنے ہی کے مترادف تھا۔ تجھل وہیں کھڑے کھڑے مڑ گیا۔ رتنا نے اُسے ایک جھپکی دی، کارگر نہیں ہوئی تو وہ دائیں طرف ہو گیا۔ تجھل کو پھر دائیں طرف اپنا رُخ بدلنے میں دشواری نہیں ہوئی۔ تین چار بار وہ یہی عمل دُہراتا رہا۔ اُس کا خیال ہوگا کہ تجھل کے لیے اِس حالت میں چلنا مشکل ہے چنانچہ وہ اُسے جتنا تھکا سکتا ہو، تھکا دے لیکن تجھل جدھر جدھر وہ چلا جاتا، ایک پل میں اُسی طرف منہ کر لیتا، اُس نے ایک قدم بھی نہیں بڑھایا۔ وہ رتنا سے جو کچھ کہنا چاہتا تھا، رتنا بھی اُسے سمجھ گیا تھا اِس لیے وہ اُس کے قریب آنے اور ایک جگہ جمے رہنے کے موقع سے فائدہ اُٹھانے کے بجائے پہلے اُسے تھکا دینے کی تگ و دو میں تھا۔ رتنا کے لیے یہ صورتِ حال عجیب اور وحشت انگیز تھی کہ کوئی اِس طرح چاقو تانے کھڑا رہے۔ ایک انچ بھی ہل کے نہ دے اور وہ اُس کے قریب نہ جا سکے۔ اگر تجھل نے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ یوں ہی اپنے محور پر گھومتا رہے گا تو رتنا نے بھی اِسی تکرار کی ٹھان لی تھی۔ رتنا کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو کچھ دُور جا کے اور فاصلہ بڑھا کے تجھل کی طرح ایک جگہ جم جاتا اور جب تک وہ حرکت نہ کرتا، اُس وقت تک تحمل کرتا۔ شاید اِس طرح تجھل کو بڑھنا ہی پڑتا مگر رتنا کو ہر دم یہ احساس ہوگا کہ اُس کے سامنے کون ہے اس لیے وہ اُس کے قریب آنے اور اُس پر جھپٹنے سے پہلو بچا رہا تھا، مبادا تجھل کچھ اور ہی سوچے ہوئے ہو۔ کسی پر بھی یہ احساس ہر دم غالب رہتا۔ مشہور تھا کہ تجھل کو صرف ارادے کی دیر لگتی ہے۔ اُس کے اُٹھے ہوئے ہاتھ ہوا میں اُڑتے ہوئے پرندوں کے مانند ہوتے ہیں، جن کا کوئی پتہ نہیں چلتا کہ وہ کس طرف مڑ جائیں گے، کون سی شاخ پر جا بیٹھیں گے۔

تجھل کے ہاتھ گرے ہوئے نہیں تھے۔ رتنا کی طرح وہ بھی اُنھیں پھیلائے ہوئے تھا۔ اُس کا سر، آنکھیں، کاندھے متحرک تھے مگر وہ ایک جگہ کھڑا تھا۔ خاصی دیر بعد رتنا کے ذہن میں وہی تدبیر آئی جس پر اُسے پہلے سے عمل کرنا چاہیے تھا، یعنی اُس نے اپنا فاصلہ زیادہ کر لیا۔ تجھل پھر بھی نہیں ہٹا۔ رتنا کے لیے یہ ناقابلِ برداشت تھا۔ کچھ دیر تو وہ انتظار کرتا رہا، پھر ”جے بھوانی“ کا نعرہ لگا کے دہاڑتا ہوا آگے آیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ سیدھے تجھل کے پیٹ میں چاقو گھونپ دے گا لیکن وہ صرف آزمائشاً آیا تھا۔ تین چار فٹ کا فاصلہ رہ گیا تو وہ اچانک پلٹ کے دائیں طرف ہو گیا۔ پھر وہیں سے اُلٹے قدموں واپس آگیا۔ اِس تیزی سے آ کے اُس کا ایک دم پلٹ جانا آسان کام نہیں تھا۔ اُس سے اُس کے جسم کی پھرتی اور زور کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ اُسے اپنے جسم پر پورا قابو حاصل تھا۔ اُس کی بات اس حد تک درست ہی لگتی تھی کہ وہ برسوں خالی نہیں بیٹھا رہا ہے، جسم کو تراشتا خراشتا رہا ہے۔ یہ سب اُس کے کینے ہی نے کرایا ہوگا جو کلکتے سے نکالے جانے پر وہ تجھل کے لیے اپنے دل میں بھر کے گیا تھا۔ کوئی بات ضرور ہو گی جو اتنے عرصے بعد اُس نے کلکتے واپس ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ایک فاصلے پر لوٹ کے وہ چند لمحے اپنی سانسیں درست کرتا رہا، پھر زقند کے انداز میں اُس نے دوبارہ تجھل کی جانب دوڑ لگائی مگر اس بار وہ کچھ اور ہی ارادہ کر کے گیا تھا۔ تجھل کے قریب جا کے پہلے تو اُس نے حسبِ سابق اپنی موج تک سنبھالی اور دائیں طرف مڑا۔ وہ واپس ہونے کے بجائے بائیں طرف آنا چاہتا تھا کہ تجھل نے دفعتہً اپنا چاقو پھینک دیا اور عین اُسی لمحے ایک قدم آگے بڑھ کے دائیں ہاتھ کو زور سے جھٹکا دیا۔ میری کھلی آنکھوں کی بینائی شاید ایک لمحے کو جاتی رہی تھی۔ دوسرے لمحے تجھل کا پنجہ رتنا کے چاقو والے ہاتھ کا پہنچا پکڑے ہوئے تھا۔ ابھی ہمیں اپنے دیکھے ہوئے پر یقین نہیں آیا تھا کہ رتنا نے بگڑ کے تجھل کے زخمی پیر پر ٹھوکر ماری اور اپنے دوسرے ہاتھ سے اُس کی ٹھوڑی پر ضرب لگانی چاہی۔ تجھل کو اندازہ ہوگا کہ رتنا یہی کچھ کرے گا اسی لیے اُس نے اُس کا دوسرا ہاتھ کھلا رہنے دیا تھا۔ رتنا دیکھ نہیں سکا کہ تجھل نے اس اثنا میں اپنا خالی ہاتھ سر کے اوپر موڑ کے رکھا ہوا ہے، اگر اُس نے دیکھ لیا تھا تو سمجھ نہیں سکا یا اُس وقت دیکھا جب وہ ضرب کے لیے اپنا ہاتھ بڑھا چکا تھا۔ تجھل نے کچھ آگے کھسک کے اُس کی ضرب اور یقینی بنا دی اور ضرب برداشت کر لی مگر اِدھر رتنا کا ہاتھ اُس کی ٹھوڑی تک پہنچا کہ اُدھر اوپر کسی کلہاڑی کے مانند اُس نے اپنے اُٹھے ہوئے ہاتھ سے ضرب لگائی۔ تجھل نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ جس وقت وہ اوپر سے اپنی ٹھوڑی تک رتنا کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر ضرب لگائے تو رتنا کا ہاتھ ٹھوڑی سے نیچے گر کے اپنے اور اُس کے درمیان معلّق فاصلے کے درمیان جھولتا نہ رہ جائے ورنہ ضرب کا نتیجہ نہ نکلتا۔ کوئی نتیجہ اسی صورت میں برآمد ہو سکتا تھا کہ رتنا کا ہاتھ کہیں اٹک جائے۔ آگے کھسکنے کی یہی وجہ تھی۔ رتنا کا ہاتھ تجھل کی ٹھوڑی سے ہٹ کے اُس کے سینے پر آ کے ٹکا تھا۔ صحن رتنا کی چیخ سے گونج اُٹھا۔ تجھل نے ساتھ ہی اُس کے چاقو والے ہاتھ پر پنجے سے زور دیا تھا۔ چاقو اب رتنا سے سنبھلا نہیں رہ سکتا تھا، وہ تو گرا ہی تھا، رتنا بھی لڑکھڑانے لگا۔ تجھل نے اپنے زخمی پیر سے اُس کے پیٹ میں ٹھوکر ماری اور جیسے ہی وہ زمین پر چِت گرا، تجھل نے بڑھ کے اُس کی ٹھوڑی پر اپنا پیر جما دیا۔ رتنا میں اُٹھنے کی سکت ہی نہیں رہی تھی۔ اُس کا ایک ہاتھ ٹوٹ چکا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اُس نے تجھل کا پاؤں پکڑنے کی کوشش کی مگر نیچے اُس کی ٹھوڑی دبی ہوئی تھی۔ جتنا وہ زور کرتا، ٹھوڑی پر تجھل کے پیر کا دباؤ اُتنا ہی بڑھتا جاتا۔ تجھل نے جھک کے اُس کا چاقو اُٹھایا اور صحن میں چاروں طرف سر گھما کے دیکھا۔ رتنا کے آدمی اُسے گھور رہے تھے۔ رتنا کے دوبارہ زقند لگانے اور زمین پر چِت گرنے کے درمیان کا عرصہ اتنا مختصر تھا کہ سب کو اپنی آنکھوں کا دھوکا معلوم ہوتا ہوگا مگر رتنا اُن کے سامنے فرش پہ پڑا کراہ رہا تھا۔

ہم سب نے اپنے چاقو نکال لیے تھے مگر جامو کے پکارنے پر رتنا کے آدمی آگے نہیں بڑھے اور پھر ہر طرف سے گرنے والے چاقوؤں کی جھنکار فرش پر اُٹھی۔ اُنھوں نے اپنے چاقو تجھل کے پیروں پر ڈال دیے تھے۔

ہم سب فوراً صحن میں بکھر گئے۔ سولم نے تمنچا نکال لیا تھا لیکن رتنا کے آدمیوں کو ایک طرف سمٹے اور ننگے ہاتھوں دیکھ کے اُس نے تمنچا واپس جیب میں رکھ لیا۔ شاید اُسے اُن لوگوں کو یہ جتانا مقصود تھا کہ ہمارے پاس تمنچے بھی ہیں۔ سولم کی یہ احتیاط اب بے معنی تھی۔ صحن کا ایک چکر لگا کے جامو لپکتا ہوا تجھل کے پاس پہنچا۔ ”تم ابھی ہٹ جاؤ۔“ وہ بھرّاتی آواز میں ضد کرنے لگا کہ رتنا کو اُس کے حوالے کر دیا جائے۔

تجھل نے پہلے انکار کر دیا مگر پھر مان گیا۔ ”اُٹھا کے اُدھر بیٹھک میں پھینک دے۔“ اُس نے ترشی سے کہا۔

”مورتی کو بھی پھر اُدھر لے جاؤں استاد؟ دیوی کے سامنے ہی اس کی بلی ہوتی۔“ جامو مچل کے بولا۔

”اتنے جلدی چھٹکارا دلا دے گا، اُدھر لے جا کے ذرا اس کی خاطر تو کر لے رے! اڈّے کا استاد ہے یہ۔“

رتنا بھی یہ سب سُن رہا تھا، اُس نے کراہتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی کہ تجھل نے اُس کے منہ سے پیر ہٹا کے کولھے پہ ٹھوکر ماری۔ رتنا ٹانگیں پھینکنے اور بلکنے لگا۔ اُسے اُٹھاتے ہوئے جامو نے اُس کا وہی ہاتھ پکڑا جو ٹوٹ چکا تھا۔ رتنا کی چیخیں نکل

گئیں مگر جامو اُسے ٹھوکریں مارتا ہوا صحن سے لے گیا۔ اُدھر سے جینی اُس کے پیچھے بھاگا۔ تجھل ہی نے اُسے جامو کے ساتھ جانے کا اشارہ کیا ہوگا۔

میں جامو کے ساتھ اندر نہیں گیا تھا۔ رتنا کے گرنے ہی صحن میں کچھ دیر کے لیے کھلبلی سی ہوئی تھی، پھر جیسے ہر چیز ٹھہرتی گئی۔ ہریالا، بدرو اور چنگاما ایک کونے میں دبکے ہوئے تھے۔ رتنا کے آدمیوں کی جانب سے اطمینان کرنے کے بعد میں لوٹا تو تجھل صحن کے وسط میں اُسی جگہ خاموش کھڑا تھا۔ میں اُس کا ہاتھ تھام کے چوکی تک کھینچتا ہوا لے آیا: "بیٹھ جاؤ۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

اُس نے بجھی بجھی نظروں سے مجھے دیکھا اور میری بات مان لی۔ پھر میں نے فرش پر اکڑوں بیٹھ کے اُس کا پیر اپنے زانوؤں پر رکھ لیا: "سب ٹھیک ہے رے!" وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولا لیکن میں نے اُس سے پوچھے بغیر پٹی کھول دی۔ کپڑے کا رنگ سفر کی گرد اور جیل سے میلا چکٹ ہو گیا تھا۔ وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ پورا پیر پھولا ہوا تھا۔ صاف دکھائی دیتا تھا کہ اندر سے پک چکا ہے اور اوپر تک پہنچ رہا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں۔ اُسے دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں خود پھولنے لگے تھے۔ پٹی کھول کے میں نے غلطی کی تھی۔ تجھل کو بھی اُسے دیکھنے کا موقع مل گیا اور صحن میں کھڑے ہوئے دوسرے لوگوں کو بھی۔ گلی میں اڈّے کے قریب مدن پہلوان نامی ایک جراح رہتا تھا مگر باہر لوگوں کا ہجوم تھا، مدن بھی اُنھی میں شامل ہوگا۔ ایسے میں اُسے ڈھونڈنا آسان نہیں تھا۔ مجھے یاد تھا کہ بیٹھک کے برابر والے کمرے میں مرہم اور دواؤں کا ایک صندوقچہ رکھا رہتا ہے، ممکن ہے اب بھی وہ اُسی جگہ ہو لیکن اب عارضی دواؤں کا وقت نکل چکا تھا۔ مدن کو فوراً تلاش کرنا چاہیے تھا۔ میں کسی کو بلا کے اور اُسے تجھل کے پاس چھوڑ کے باہر مدن کے پاس جانے کو سوچ ہی رہا تھا کہ گلی میں شور اُمڈا اور سیٹیاں بجنے لگیں۔ ابھی میں کچھ سمجھ نہیں پایا تھا کہ چند سپاہی، انسپکٹر داؤ دیال اور پولیس کا ایک اور افسر تقریباً بھاگتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ داؤ دیال اور دوسرے افسر دونوں کے ہاتھوں میں تمنچے تھے۔ تمام دروازے کھلے ہوئے تھے۔ گلی میں لوگوں کی بھیڑ تھی۔ پولیس کی آمد کسی وقت بھی متوقع تھی لیکن مجھے یہ دیکھ کے حیرانی ہوئی کہ ملاکو بھی اُن کے ساتھ تھا۔ ابھی چند منٹ پہلے میں نے اُسے یہیں دیکھا تھا۔ داؤ دیال گھبرایا ہوا آیا تھا اور تمنچا تانے چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھ رہا تھا: "آؤ داؤ جی! آؤ۔ بڑی دیر کر دی۔" تجھل نے اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، میں نے اُسے اُٹھنے نہیں دیا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" وہ بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ابھی ادھر اپنے پاس رسان سے بیٹھو۔"

"رتنا کدھر ہے؟" داؤ دیال کی نظریں ہر طرف منڈلا رہی تھیں۔

"اُدھر بیٹھک میں بلی کے لیے تیار ہے۔"

"اپنے ماتھر ساب بہادر کدھر ہیں؟" تجھل نے اُس کی بات کا جواب نہیں دیا۔

"وہ بھی آ رہے ہوں گے لیکن لیکن تجھل یہ سب کیا ہے؟"

"اس کو ہی دکھانے کے لیے آپ کو بلوایا تھا۔ اچھا ہوا، رستے میں مل گئے۔ سب ٹھیک ہے ساب! تمنچے کو اندر پیٹی میں ڈال لو۔ بھاری بہت لگتا ہے۔"

داؤ دیال خود ہی دیکھ رہا تھا کہ تمنچے کی ضرورت نہیں ہے۔ اُس نے اُسے ہولسٹر میں اُڑس لیا، اُس کے ساتھی افسر نے بھی۔

"مگر یہ، یہ اندر کون چیخ رہا ہے؟" داؤ دیال وحشت سے بولا۔ بیٹھک سے بار بار رتنا کی چیخیں اُٹھ رہی تھیں۔ جامو کے ہاتھ نہیں رُکے ہوں گے۔

"آواز بھی نہیں، پہچانتے؟ اور کون ہوگا داؤ جی۔"

"تمھیں، تمھیں اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔"

"اپنے گیارہ بالکوں کو مٹی کرنے کی اجازت پھر آپ ہی نے دی ہوگی۔ ابھی دھیرج رکھو، ماتھر ساب کو آ جانے دو۔"

"بیٹھک کا دروازہ کھلواؤ۔" وہ حکمیہ لہجے میں بولا۔

"دروازے پر تالا نہیں پڑا ہے۔ پر اندر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ اِدھر یہ سلطانیے حاضر ہیں۔" تجھل رتنا کے آدمیوں کی طرف منہ اُٹھا کے بولا: "پہلے انھی کو دیکھ لو۔ دو چار کام کے مل جائیں گے۔ ویسے سبھی اپنے کو اُٹھائی گیرے دکھائی دیوے ہیں۔"

انسپکٹر داؤ دیال نے تجھل کی بات آدھی سُنی، آدھی نہیں سرپٹ بیٹھک کی طرف دوڑا۔ بیٹھک کا دروازہ بند تھا مگر اندر سے کنڈی نہیں لگی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی سپاہی بھی اندر دوڑ پڑے اور اُنھوں نے جامو اور جینی کو پکڑ کے باہر دھکیل دیا لیکن رتنا کی چیخیں بند نہیں ہوئیں۔ تجھل بھی پھر چوکی پر بیٹھا نہیں رہا، کسی تاخیر کے بغیر میرے زانو سے اُس نے اپنا پاؤں کھینچا اور تیز قدموں سے لنگڑاتا ہوا بیٹھک کی طرف جانے لگا۔ ابھی وہ اندر نہیں گیا تھا کہ ڈی ایس پی ماتھر، ایس پی جوشی اور ایک دوسرا افسر کئی سپاہیوں کے ساتھ ہڑبڑائے ہوئے صحن میں داخل ہوئے۔ تجھل رُک گیا: "آپ ہی کا انتظار تھا ماتھر ساب!" تجھل نے اُس

کے قریب جا کے زیرلبی سے کہا۔

"شاید مجھ سے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہو گئی ہے استاد تجھل!" ماتھر تمتمائی ہوئی آواز میں بولا۔ اُس کا چہرہ بھی لال ہو رہا تھا۔

"آپ ہی کے بولوں کا خیال تھا سرکار! ورنہ اُس بے ہینگے کی اِدھر راکھ بھی نہیں ملتی۔ ہاں اپنے ہاتھوں میں زندگی بھر اُٹھین ہوتی رہے گی۔"

"ماتھر پلکیں پٹ پٹانے لگا: "مجھے یقین تھا، مجھے یقین تھا کہ تم نہیں بھولے ہو گے۔" وہ جوش میں بولا۔

"آپ نہیں ہوتے تو شاید بھول بھی جاتے۔"

"مگر تم یہاں، یہ سب ....؟" ڈی ایس پی ماتھر سٹ پٹائے ہوئے لہجے میں بولا اور کچھ کہے بغیر تجھل کا منہ تکنے لگا۔

کوئی جواب دینے کے بجائے تجھل بیٹھک کی طرف مُڑ گیا۔ ماتھر اور جوشی بھی اُس کے ساتھ اندر چلے گئے۔ انسپکٹر داؤ دیال وہاں پہلے سے موجود تھا۔ تجھل کے سوا ہم میں سے کوئی بھی اندر نہیں گیا۔ جامو اور جینی کو سپاہیوں نے پکڑ رکھا تھا وہ اُن سے اپنے آپ کو چھڑانے کی بے کار کوشش کر رہے تھے۔ اندر سے رتنا کے بلکنے کی آوازیں اچانک اور تیز ہو گئیں، دیر تک وہ باہر نہیں نکلے۔ تجھل کے پیر پر اب پٹی نہیں تھی۔

جس وقت سپاہی رتنا کو تھامے باہر لائے، اُس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ جامو نے اُسے اَدھ مُوا کر دیا تھا۔ منہ اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ جامو نے شاید اس کی کہنیاں زمین سے رگڑی تھیں، وہ بھی زخمی تھیں۔ اُس کی گردن ڈھلکی ڈھلکی جاتی تھی۔ پیروں کی انگلیاں کچلی ہوئی نظر آتی تھیں۔ گریبان چاک تھا اور پھٹی ہوئی واسکوٹ کندھے پر جھول رہی تھی۔

"تم سب بھی ہمارے ساتھ چلو گے۔" ایس پی جوشی نے باہر آ کے حکم دیا۔

تجھل نے سر اُٹھا کے تند نظروں سے جوشی کو دیکھا، پھر ماتھر کو۔ میں درمیان میں بولنا چاہتا تھا کہ ہم سب کو لے چلو، تجھل کو یہیں رہنے دو لیکن جب تجھل ہی کے ہونٹ پھڑپھڑا کے رہ گئے تو میں بھی خاموش رہا۔

سپاہیوں کی تعداد کم تھی اور رتنا کے آدمیوں سمیت ہماری زیادہ۔ اُنھوں نے پہلے رتنا کے آدمیوں کو ہنکاتے ہوئے باہر نکالا۔ جب سے پولیس اڈّے پر آئی تھی، اُن کی نظریں اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔ ممکن ہے اُن میں سے کسی نے بھاگنے کا بھی ارادہ کیا ہو لیکن اتنے لوگوں کی موجودگی میں اس کا کوئی امکان نہیں تھا۔ پلٹو، سارسٹے، سَوَلم کے ساتھ ہریالا، بدرو اور چنگاما مسلسل اُن پر نظر رکھے ہوئے تھے اور پھر پولیس بھی موجود تھی۔

گلی میں اب بھی لوگوں کے ٹھٹھ لگے ہوئے تھے۔ باہر رہ جانے والے سپاہی سیٹیاں بجا بجا کے اور لاٹھیوں کے زور پر اُنھیں عمارت سے دُور رکھے ہوئے تھے۔ آگے پیچھے پولیس کی کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ احتیاطاً وہ پورا انتظام کر کے آئے تھے۔ رتنا باہر نکلا تو پولیس کو ایک دوسرے پر ٹوٹتے ہوئے لوگوں کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ ہر سو چیخ پکار مچنے لگی جیسے بھیڑ میں کسی کو سانپ نظر آ جائے۔ اس کے پیچھے ہم تھے۔ رتنا اور تجھل کو علیحدہ ایک جیپ میں بٹھا دیا گیا۔ پھر ایک بڑی بند گاڑی میں وہ ہمیں ٹھونسنے لگے۔ میں اور ملاکو گاڑی سے نیچے تھے کہ اچانک ایک کنکری میرے سینے پر آ کے لگی۔ میری نظر ٹھیک اُسی سمت گئی جدھر سے کنکری آئی تھی۔ وہاں مجھے لوگوں کے بیچ میں بند دکان کے ایک چبوترے پر پیرو دادا کھڑا ہوا نظر آیا۔ میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ پیرو نے آنکھ کے اشارے سے مجھے تسلی دی اور اپنا چہرہ لوگوں کے پیچھے چھپا لیا۔ اُسی وقت سپاہیوں نے ہماری پیٹھ پر ہاتھ مار کے ہمیں گاڑی پر چڑھنے کا حکم دیا اور لوگ بھر گئے، نیچے کوئی باقی نہ رہا تو وہ کونے میں بندوقیں اُٹھائے کھڑے ہو گئے۔ دروازہ بند کر دیا گیا اور گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ گاڑی کے اُوپری حصّے میں لوہے کی جالیاں لگی ہوئی تھیں، میں نے اُن سے جھانک کے دوبارہ پیرو [illegible] کی لیکن اُس کا چہرہ مجھے پھر نظر نہیں آیا۔

علاقے کا تھانا دُور نہیں تھا۔ گاڑیوں کی رفتار سڑک پر لوگوں کی بھیڑ ہونے کی وجہ سے [illegible] سست رہی۔ گلی کی ساری دکانیں بند ہو گئی تھیں۔ چند منٹ بعد جب گاڑی کا [illegible] دروازہ کھلا تو ہم تھانے کے احاطے میں تھے۔ سپاہی بندوقیں اور سنگینیں لیے ہر جانب پھیلے ہوئے تھے۔

سب کو ایک کمرے میں کر دیا گیا۔ وہ حوالات تو نہیں تھی لیکن آنے کے بعد وہاں سے باہر نکلنے پر پابندی عائد تھی۔ [illegible] پر سپاہی پہرا دے رہے تھے۔ رتنا کے آدمیوں کو کسی دوسرے [illegible] میں رکھا گیا ہوگا۔ کمرے میں سیلن کی بساند پھیلی ہوئی تھی اور ایک چھوٹی میز، دو کرسیوں اور دیواروں کے ساتھ لوہے کی متقل [illegible] کے سوا کچھ نہیں تھا۔ درمیان میں چھت سے لٹکا ہوا کم روشنی کا ایک بلب ٹمٹما رہا تھا۔ فرش ننگا تھا۔ میرے جوڑ جوڑ [illegible] ہو رہا تھا۔ سب دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے فرش پر بچھ گئے۔ پہلے ہی سب کے کپڑے گندے تھے اور گندے ہو جانے

سے کیا فرق پڑتا تھا۔ میبنی سب سے زیادہ تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ ٹانگیں سکیڑ کے لیٹ گیا۔ بلاکو اُس کی ٹانگیں دبانے لگا۔ رات کا ابتدائی حصہ تھا۔ ہمیں وہاں آئے ہوئے گھنٹے بھر سے زیادہ ہوگیا۔ کوئی ہمیں پوچھنے نہیں آیا، نہ تجھل لوٹا۔ مچھروں نے بیٹھنا دشوار کر دیا تھا۔ پلٹو ابتدا میں گالیاں بک رہا تھا۔ کسی نے کوئی جواب نہیں دیا تو گھٹنوں میں سر دیے چپ بیٹھ گیا۔

اڈے پر یا اس کمرے میں لانے سے پہلے انھوں نے ہماری تلاشی بھی نہیں لی تھی۔ تلاشی لیتے تو تمنچے دیکھ کے اُن کی آنکھیں ضرور خیرہ ہوتیں۔ رات دھیرے دھیرے بڑھ رہی تھی۔ کسی کے پاس گھڑی نہیں تھی لیکن جھینگروں کے شور اور پہرا دیتے ہوئے بولوں کی گونج بڑھ جانے سے وقت کا اندازہ ہوتا تھا۔ سب کی آنکھیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ کئی گھنٹے گزر گئے ہوں گے۔ تجھل واپس نہیں آیا۔ سپاہیوں نے ہم سے کھانے کو بھی نہیں پوچھا تھا۔ سولم نے اُن سے پانی منگوا لیا تھا۔ صبح سے اب تک ہم نے صرف پانی پیا تھا۔ تجھل کے نہ آنے کی وجہ سے سبھی بے چین تھے۔ معلوم نہیں، انھوں نے اُسے ہم سے علیحدہ کیوں کر دیا تھا۔ اب کون سی بات پوچھنے کو رہ گئی تھی۔ اُس کے روکنے کا کوئی مقصد ضرور ہوگا۔ رتنا تھانے آ کے مکر گیا ہوگا یا ہو سکتا ہے، ہم سے چوک ہو رہی ہو، رتنا کے سوا کسی اور طرف ہمارا دھیان ہی نہیں جاتا تھا۔ ایسی حالت میں کوئی بھی اعتراف کر لیتا مگر جیسے ہی رتنا کے حواس درست ہوئے ہوں گے، اُسے اپنے کیے ہوئے کی اہمیت کا اندازہ ہوا ہوگا مگر ایک رتنا ہی اکیلا نہیں تھا، اُس کے ساتھی بھی اُس کے شریک تھے اور جیسا کہ تجھل نے انسپکٹر داؤ دیال کو اشارہ کیا تھا کہ سلطانی گواہوں کی موجودی میں رتنا کو تنگ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اتنے بہت سے آدمیوں میں دو ایک آدمیوں کو زندگی یقیناً زیادہ عزیز ہوگی۔ ہم میں سے کوئی ماتھر اور جوشی کے ساتھ بیٹھک میں نہیں گیا تھا مگر جب وہ واپس رتنا کو لے کے آئے تھے تو اُن کے چہروں پر چھائے ہوئے اضطراب سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کچھ سمجھ کے، کچھ جان کے آئے ہیں۔ کوئی ایسی بات جو اُن کی توقع کے خلاف تھی۔ پھر تھانے لے چلنے کے لیے جوشی کا حکم سن کے تجھل کے متوحش ہونے کا بھی یہی سبب ہوگا کہ یہ تجھل کے لیے ناقابلِ فہم تھا۔ وہ اُسے تھانے لے کے آ گئے اور اب اُسے روکے ہوئے تھے۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ کب تک یہاں رہنا پڑے۔ ساری رات، سارا دن اور نہ جانے کتنے دن، سب کے جسم فرش پر اینڈے ہوئے، لوتھڑے سے پڑے تھے، ایک دوسرے پر ڈھئے ہوئے جیسے اب اِن میں کچھ باقی نہ رہا ہو، سب ہار گئے ہوں۔ وہ زبان سے کچھ نہیں کہتے تھے لیکن مجھے ہر لمحے یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ مجھی کو اپنے دل میں بُرا بھلا کہتے ہوں گے۔ کہتے ہوں گے کہ اِس کا سایہ ہی منحوس ہے۔ ہر روز ہزاروں کی گنتی کم ہو جاتی ہے، اِسے موت کیوں نہیں آ جاتی۔ کبن خاں کا خیال کر کے جامو کے سینے میں دھواں بھر جاتا ہوگا۔ شولی، لالہ، سارٹے ساتھ ہی جوان ہوئے تھے۔ ہر بات زبان ہی سے نہیں کہی جاتی، آنکھیں کہتی ہیں، چہرہ کہتا ہے۔ اُن کی چبھتی نظریں مجھے اپنے چہرے، اپنے سارے جسم پر محسوس ہوتی تھیں اور مجھے خود اُن کے سامنے نگاہیں اُٹھاتے ڈر سا لگتا تھا۔

آدھی رات کا وقت ہوگا، بلاکو نے مجھے جھنجوڑا۔ "لاڈلے سن رہا ہے؟"

میں نے ہڑبڑا کے اُسے دیکھا۔ تھانے میں اچانک کسی کے چیخنے چلانے کی آوازیں اُٹھنے لگی تھیں۔ کوئی بُری طرح آہ و بکا کر رہا تھا، آوازیں قریب کی نہیں تھیں۔ سب چونک اُٹھے۔ ایک خیال میرے دل میں سردی کی لہر کی طرح اُٹھا اور میں نے فوراً اُسے جھٹک دیا، کوئی جانی پہچانی آواز نہیں تھی۔ پھر وہ صدائیں بڑھتی گئیں۔ میبنی بھی اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ سولم نے دروازے کے پاس جا کے سپاہیوں سے پوچھا "کس کی شامت آئی ہے؟"

"تیرے بھائی بند ہی ہوں گے رے!" وہ حقارت سے بولا۔

سولم کا پوچھنا بے کار تھا۔ سپاہیوں کو کیا معلوم ہوگا۔ وہ تو کب سے یہیں کھڑے پہرا دے رہے تھے۔ سڑاک سڑاک اور چیخیں۔ ایک کے بعد ایک بدلتی ہوئی آواز۔ یہ آوازیں بہت دیر تک تھانے کے در و بام میں سنسناتی رہیں، کبھی مدھم، کبھی تیز۔ پھر ایک دم گہری خاموشی طاری ہو گئی۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد ہمیں اپنے کمرے کے باہر چاپیں سنائی دیں۔ وہ ہماری ہی طرف آ رہے تھے۔ سب کھڑے ہو گئے۔ اُن میں تجھل کی چاپ الگ سے پہچانی جا سکتی تھی۔ میرا سر گھومنے لگا۔ چند ہی لمحوں میں انسپکٹر داؤ دیال کے ساتھ تجھل کمرے میں داخل ہوا۔ میری نظر سب سے پہلے اُس کے پیر پر گئی اور میری گردن خود بہ خود جامو کے شانے پر ڈھلک گئی۔ جامو نے مجھے زور سے چمٹا لیا۔ تجھل کے پیر میں سفید پٹی بندھی ہوئی تھی۔

داؤ دیال دروازے ہی سے لوٹ گیا۔ تجھل فرش پر بیٹھ گیا۔ سب اُس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ "بات آنکھ ذرا دو لے۔ یہ جگہ بھی بُری نہیں ہے۔ کچھ کھایا پیا تو نہیں ہوگا؟"

"بھوک ہی سالی نہیں ہے استاد!" سارٹے منہ بنا کے بولا۔

"سویرا ہونے میں زیادہ ٹائم نہیں ہے۔ تھوڑی دیر پڑ کے ڈال لو۔" تجھل نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

"نیند بھی نہیں پٹ رہی ہے استاد!" بلاکو دبے لہجے میں بولا اور مچل کے کہنے لگا۔ "تم بولو، کیسی رہی؟"

"سویرا لوٹنے دے رے۔" تجھل ٹانگیں پھیلا کے فرش پر لیٹ گیا۔ سارٹے اُس کا سر اپنے زانو پر رکھ کے آہستہ آہستہ دبانے لگا۔

صبح ہونے میں ابھی بہت دیر تھی۔ سبھی کروٹیں بدلتے رہے۔ تجھل کو بھی نیند نہیں آئی تھی۔ دروازے پر کھڑے ہوئے پہرے دار بھی بنچ پر بیٹھ گئے تھے۔ تجھل نے کچھ نہیں بتایا تھا اور جاننے کی ہمت ہی نہیں تھی۔ پیرو، زورا، مارٹی اور اباجان بھی اُدھر ہوٹل میں جاگ رہے ہوں گے۔ اباجان نے پیرو سے ضرور پوچھنا چاہا ہوگا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ نہ جانے پیرو نے انھیں کیا جواب دیا ہوگا۔ کہا ہوگا، بڑے صاحب! آپ کیوں فکر کرتے ہیں، ابھی بہت سے لوگ زندہ ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سورج آتے آتے کہیں رُک گیا ہے یا رستہ ہی بھول گیا ہے۔ رات کھنچتی ہی جا رہی تھی۔ امّی جان بچپن میں ہم سب سے کہا کرتی تھیں، خدا نے ہر چیز کی ایک مدت مقرر کی ہے، خدا کے سوا کسی کو بھی دوام نہیں ہے۔ شاید اندھیرے کی مدت بھی تمام ہو گئی تھی۔ رات کی چادر کھنچتے کھنچتے آخر پھٹ گئی۔ امّی جان کی باتیں اُس وقت کبھی ہماری سمجھ میں آتی تھیں، کبھی نہیں۔ میں اُن سے طرح طرح کے سوال کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے، جب اُن سے کوئی جواب نہ بن پڑتا تو وہ ڈانٹ کر کہتیں، بس ایسا ہی ہے۔ تو بہت بنتی ہے، بال کی کھال نکالتا ہے۔ وہ ہوتیں تو میں اُن سے پوچھتا، امّی! بہت سی مدتیں تو کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ بہت سے اندھیرے تو کبھی ختم نہیں ہوتے۔ رات ہوتی ہے، دن نکلتا ہے مگر اندھیرا نہیں جاتا، بہت سے اندھیرے سورج کی روشنی بھی دُور نہیں کر سکتی، نہ اندھیرا جاتا ہے، نہ موت آتی ہے۔

صبح ابھی پوری طرح نمودار نہیں ہوئی تھی کہ کسی سپاہی نے دروازے سے آواز لگائی۔ "استاد تجھل! تیار ہو جاؤ۔"

تجھل نے سارٹے کے زانو سے سر اُٹھایا اور آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ کسی کی آنکھ ہی نہیں لگی تھی جو اُٹھنے میں وقت لگتا، تجھل کے کہنے پر سب یک لخت کھڑے ہو گئے۔ دروازے پر کھڑے ہوئے سپاہی ایک طرف ہٹ گئے اور ایک سپاہی ہمیں تھانے کے عقبی حصے میں لے آیا۔ وہاں کھلے ہوئے نلوں سے شر شر پانی بہہ رہا تھا۔ تجھل، جامو، سارٹے اور میرے سوا سبھی نے اپنے سر نلوں کے نیچے کر دیے۔ منہ ہاتھ دھو کے ہم واپس اُسی کمرے میں آئے تو میز پر ناشتہ لگا ہوا تھا۔ کچوریاں، سلائس، مکھن اور چائے۔ ایک سپاہی گلاسوں میں چائے انڈیلتا رہا، منہ کو سب کچھ اجنبی سا لگ رہا تھا۔ ہر ایک نے دو دو گلاس چائے پی اور کچھ نہ کچھ ضرور کھایا پھر بھی پلیٹوں میں بچا رہ گیا۔ ناشتہ کرتے کرتے کمرے میں خاصا اُجالا ہو چکا تھا مگر ہم اُس وقت تک وہیں رہے جب تک دوسری بار سپاہی نے آ کے ہمیں باہر آنے کو نہیں کہا اور وہ کوئی دس پندرہ منٹ بعد ہی آ گیا تھا۔

دالان میں ہمارے پہنچتے ہی ایک جانب سے انسپکٹر داؤ دیال آ گیا اور اُس کے ساتھ ایک دوسرا افسر سب انسپکٹر سورتی۔ دونوں کے چہرے نکھرے، دُھلے ہوئے تھے، لباس بے شکن تھا اور داڑھیاں مُنڈی ہوئی تھیں مگر بھاری پپوٹے اور ماتھے کی شکنیں چغلی کھا رہی تھیں کہ وہ رات بھر جاگتے رہے ہیں۔ ہمیں دیکھ کے دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی پھیل گئی۔ دالان کے سامنے وہی گاڑی کھڑی تھی جو گزشتہ رات ہمیں اڈے سے لائی تھی۔ داؤ دیال ڈرائیور کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ سب انسپکٹر سورتی اور دوسرے سپاہی گاڑی کے پچھلے بند حصے میں ہمارے ساتھ بیٹھے۔ آدھ پون گھنٹے کی مسافت کے بعد گاڑی جس عمارت میں جا کے ٹھیری، وہ میری اچھی طرح دیکھی بھالی ہوئی تھی۔ جس وقت میرا مقدمہ جاری تھا، مجھے روز ہی جیل سے یہاں لایا جاتا تھا۔ تجھل آہستگی سے نیچے اُترا، پھر اُس نے جامو کو بُلایا اور سارٹے کو بھی۔ مجھے یا اور کسی کو نہیں۔ باقی سب کو وہیں بیٹھے رہنے کی ہدایت کر کے وہ چلا گیا۔ سپاہیوں میں بھی صرف دو سپاہی ہماری نگرانی کو رہ گئے تھے، دھوپ خوب چڑھ آئی تھی اور کچہری میں لوگوں کا ہجوم بڑھ گیا تھا۔ گاڑی کھلی ہوئی تھی اور ہم آتے جاتے لوگوں کو بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ وہی لوگ، اُسی طرح کے لوگ۔ ہتھکڑیاں لگے، منہ چھپائے، سر جھکائے لوگ۔ عمارت میں اُتنی ہی بھیڑ تھی جتنی نو سال پہلے ہوتی تھی۔ جیسے کل کی بات ہو، جیسے کل رات ہی کورا مجھ سے جُدا ہوئی ہو۔ مجھے پسینہ آنے لگا۔ تجھل کوئی دو گھنٹے بعد لوٹا۔

گاڑی کا دروازہ پھر بند کر دیا گیا اور کچھ دیر بعد جب اُسے دوبارہ کھولا گیا تو ہماری آنکھیں چُندھیا گئیں۔ گاڑی اڈے کے باہر کھڑی تھی۔ سب کے حواس گُنگ تھے۔ چند لمحوں تک تو سب پر سکتہ سا طاری رہا، پھر سب ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

پلٹو، ہُڑک ہُڑک کے رونے لگا اور اُس نے سبھی کی آنکھیں بھگو دیں۔ انسپکٹر داؤ دیال بھی گاڑی سے اُتر آیا تھا اور ایک طرف بھال کا بازو تھامے کچھ کہہ رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں جھلملا رہی تھیں۔ گلی میں دیکھتے دیکھتے لوگ پھر جمع ہونے لگے۔ اڈّے کے رسمی مالک مُول جی نے آکے تالا کھولا۔ ساری عمارت ویران پڑی تھی۔ بڑے دروازے سے کمرے تک کے کُھلے حصّے میں سامنے فرش پر رتنا کے آدمیوں کا کل کا خون جما ہوا تھا۔ سارے کمروں کے دروازے کھول دیے گئے تھے۔ گلی کے لوگ عمارت میں گھس آئے اور پھر تو اُن کا ایک تانتا سا بندھ گیا۔ جو بھی آتا، کچھ نہ کچھ لے کے ضرور آتا۔ پھولوں اور مٹھائی کے دونوں کا انبار لگ گیا۔

ہم سب ایک دوسرے کے چہرے دیکھ رہے تھے۔ بھجّو، صحن کے وسط میں پڑی ہوئی چوکی پر آکے بیٹھ گیا تھا اور حقّے کی نَے اُس کے منہ میں دبی ہوئی تھی۔ ننھیا منھیا اُس کے لیے تازہ حقّہ بھر کے لایا تھا۔ سب ایک خواب سا معلوم ہوتا تھا۔ آنے والوں کو بھی اس خبر پر یقین نہیں آیا ہوگا کہ بجھل اڈّے پر واپس آگیا ہے اس لیے وہ خود اپنی آنکھوں سے اُسے دیکھنے آرہے تھے۔ کوئی اُس کے ہاتھ پکڑتا، کوئی پیر چھُوتا، کوئی سلام کرتا، خیریت پوچھتا، رتنا کی شکایت کرتا، کوئی رونے لگتا اور کبن خاں کا ذکر چھیڑ دیتا۔ اس دوران ہریالا اور بدرو اُس ہوٹل سے ہمارا سامان لے آئے تھے جہاں کل صبح اسٹیشن سے نکلنے کے بعد ہم نے اُسے چھوڑ دیا تھا مگر کسی نے کپڑے نہیں بدلے۔ سہ پہر بجھل کو ایک لمحے کی فرصت نہیں ملی اور سہ پہر کو ہی گلی میں ایک بار پھر شور اُمڈا۔ ہم سب باہر کی طرف بھاگے۔ وہ سب آرہے تھے، وہ سب۔ سب سے آگے کانتے تھا، برابر میں نصیب میاں، لکھوا، گلّو، لیلا، ہرچرن اور اُن کے پیچھے وہ سب۔ گلی میں دُور دُور تک اُنھی کے سر نظر آتے تھے۔ سب کی داڑھیاں بڑھی ہوئی، بال بکھرے ہوئے، آنکھیں ویران اور چہروں پر دہشت برس رہی تھی۔ کانتے نے جیسے ہی دیکھا، دیوانگی سے میری طرف چیختا ہوا لپکا، اِدھر سے میں بڑھا۔ اُس نے مجھے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا اور میری گردن سے سر رگڑنے لگا۔ وہ بار بار میرا چہرہ دیکھتا اور مجھے جکڑ لیتا، میرے گالوں کو پیار کرتا۔ کبھی میری ٹھوڑی چومتا، کبھی پیشانی۔ پھر میرے سینے پر اُس کا سر ڈھلک گیا۔ وہ سسکنے لگا۔

میں اُسے سنبھالنا چاہتا تھا مگر میرا جسم خود ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔ اُسے دلاسا دیتے ہوئے میری زبان کانپنے لگی اور آنکھوں سے آنسو پھوٹ پڑے۔

اچھا ہی ہوا کہ جامو نے جھٹ بیچ میں آکے اُسے میرے بازوؤں سے کھینچ لیا اور نصیب میاں میرے سینے سے لپٹ گئے۔ پھر گلّو، لیلا، ہرچرن، اکبر، لکھوا، بَتن، کسی کو کچھ ہوش ہی نہ رہا۔ ہوش اُس وقت آیا جب بجھل کی بھاری آواز گونجی۔

"اندر چلو رے۔"

بجھل کو دروازے پر کھڑا دیکھ کے سب ہمیں چھوڑ کے دیوانہ وار اُسی کی جانب دوڑ پڑے اور اُنھوں نے اُس کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ "اندر چلو۔" بجھل نے آنکھیں میچ کے کہا۔

اندر آکے وہ بالکل پاگل ہو گئے تھے۔ بار بار گلے ملتے، کوئی دوڑ کے اُس کے پاس جاتا، کوئی اِس کے پاس۔ کسی ایک جگہ کوئی ٹکتا ہی نہ تھا اور کسی کے پاس کہنے کے لیے شاید کچھ نہیں تھا۔ کوئی زبان کھولنے کی کوشش کرتا تو آواز ساتھ نہ دیتی۔ بس وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے، پھر جھپٹ کے اپنی آغوش میں بھر لیتے۔ ہماری واپسی کی اُنھیں کوئی اُمید ہی نہ رہی ہوگی یا اُنھوں نے بہت شدّت سے انتظار کیا تھا۔ سب ٹوٹے پھوٹے، بکھرے ہوئے سے تھے۔ لگتا تھا، ڈیڑھ مہینے سے وہ اپنی آنکھوں، اپنے سینے پر جبر کرتے رہے ہیں۔ اُنھیں اڈّے پر موجود ملاقے کے لوگوں کا بھی خیال نہیں آیا۔ بجھل سر جھکائے بیٹھا تھا اور وہ اُس کی گود میں، اُس کے ہاتھوں، اُس کے پیروں پر سر رکھے بچّوں کی طرح بلک رہے تھے۔ کانتے دیر تک بجھل کے زانوؤں پر سر رکھے سسکیاں بھرتا رہا۔ بجھل نے اُس سے ایک لفظ نہیں کہا تھا مگر کانتے کی آنکھوں کی جھڑی نہیں تھمی۔ اُدھر جامو بیٹھک کے قریب نصیب میاں سے چمٹا ہوا ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ نصیب میاں نہ جانے اُس سے کیا کیا کہہ رہے تھے۔

اب تک کسی نے دھیان نہیں دیا تھا مگر لیلا کو خیال آ ہی گیا۔ میرے پاس آکے وہ بے قراری سے پوچھنے لگا۔ "وزیرے کدھر ہے؟" میں اُسے کیا جواب دیتا۔ میری خاموشی پر اُس کا منہ کھُلے کا کھُلا رہ گیا۔ میں نے اُسے نہیں بتایا کہ صرف وزیرے ہی نہیں، سلطان اور منّن میاں بھی...... لیکن لیلا نے پھر کسی کے بارے میں پوچھا ہی نہیں۔ اُس کا منہ بگڑنے لگا تھا۔ میں نے اُسے اپنے سینے میں دبوچ لیا۔

اڈّے پر پہلے ہی خاصے لوگ موجود تھے۔ اُن کے آنے سے صحن بھر گیا۔ باہر سے لوگوں کی آمد رات تک جاری رہی۔ سیٹھ مول جی اور گلی کے دوسرے لوگوں نے سب کے لیے رات کے کھانے کا انتظام کیا تھا۔ کبن خاں اور اُس کے ساتھ جانے والوں کی موت کے کھانے کا اُدھار اُن پر واجب تھا۔ کسی کا

جی کھانے کو چاہتا ہی نہیں تھا لیکن سب نے اصرار کر کے فرش پر بچھے ہوئے دستر خوان پر ہمیں بٹھا دیا۔

رات گئے ملاقے کے سبھی لوگ واپس چلے گئے مگر اڈّے کے وہ سارے آدمی جن کے گھر موجود تھے، اپنے گھروں کو نہیں گئے۔ سارے بجھل کو اُوپر والے کمرے میں لے گیا۔ سب اِدھر اُدھر مختلف کمروں میں پڑ گئے یا صحن ہی میں دریاں بچھا کے لیٹ رہے۔ کانتے، جامو، لیلا اور جینی کے ساتھ میں بھی اُوپری منزل کے ایک کمرے میں چلا گیا۔ زریں کو جب میں لستری کے چنگل سے چھڑا کے اڈّے پر لایا تھا تو وہ یہیں ٹھیری تھی۔ سب گم صُم سے تھے اور ایک دوسرے سے کچھ پوچھتے ہوئے جھجک رہے تھے۔ نصیب میاں بھی کچھ دیر بعد اُوپر آ گئے اور ہمیں چُپ دیکھ کے تسلّیاں دینے لگے اور وہ خود ہی سب کچھ بتانے لگے۔ پھر لیلا بھی چُپ نہ رہ سکا اور کانتے کی زبان بھی آگ اُگلنے لگی۔ ساری رات یوں ہی گزر گئی۔ اُوپر آسمان پر کبھی تارے نکل آتے، کبھی بدلیاں چھا جاتیں۔ صبح کے قریب ہلکی ہلکی بوندیں گرنے لگیں مگر سب چارپائیوں پر پڑے رہے۔ اُن کے چہرے پہلے ہی بھیگے ہوئے تھے، رات بھر بھیگتے رہے تھے۔ کسی کو ایک پل کے لیے نیند نہیں آئی تھی۔

میں سمجھ رہا تھا، جیسے ہی پیرو کو تھانے سے ہماری اڈّے واپسی کی اطلاع ملے گی، وہ سیدھا اڈّے کا رُخ کرے گا لیکن وہ رات تک نہیں آیا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ اُسے خبر نہ ہوئی ہو۔ کل تھانے جانے کے لیے ہم گاڑی میں بیٹھ رہے تھے تو وہ موجود تھا۔ گویا وہ سارے دن ملاقے ہی میں منڈلاتا رہا تھا چونکہ اُسے یقین ہوگا کہ اسٹیشن سے نکلنے کے بعد کہیں اور جانے کے بجائے ہمارے قدم سیدھے اڈّے کی طرف بڑھیں گے لیکن ہم آگے گئے ہی نہیں، وہیں اسٹیشن سے قریب پڑنے والے پہلے بڑے تھانے کی چار دیواری میں داخل ہو گئے۔ ممکن ہے وہ ملاقے کے تھانے کے اطراف بھٹکتا رہا ہو۔ ہم وہاں ہوتے تو اُسے دکھائی دیتے مگر رات کو اُس نے اپنی آنکھوں سے ہمیں پولیس کی گاڑیوں میں بیٹھتے دیکھا تھا اور اُسے خوب اندازہ ہوگا کہ ہم اپنے ملاقے ہی کے تھانے میں جا سکتے ہیں چنانچہ اُس نے کسی بھی ذریعے سے سُن گُن لینے کی کوشش ضرور کی ہوگی، تھانے کے قریب کسی ہوٹل میں بیٹھ کے کسی سپاہی سے رابطہ قائم کر کے۔ ہم صرف ایک رات وہاں رہے تھے، صبح ہوتے ہی کچہری چلے گئے تھے۔ رات کو تھانے کے گرد اُس کا چکّر لگانا مشکوک ہوتا اور اُسے کچھ پتہ بھی نہ چلتا لیکن ہم دوپہر

کو تو اڈّے واپس آ گئے تھے۔ ہمیں تھانے جاتے ہوئے دیکھنے کے بعد کیا وہ مایوس ہو کے ہوٹل کے کمرے میں بند ہو گیا؟ اُس کے خیال میں تھانے سے ہمارا ایک تو لَوٹنا مشکل تھا اور اِس کا اِدھر اُدھر کے لوگوں سے ہمارے بارے میں پوچھنا نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ یقیناً ایسا نہیں ہوگا۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اُسے سب معلوم ہو گیا ہوگا۔ جاننے کے باوجود وہ نہیں آیا۔ اُسے کچھ اطمینان ہو گیا ہوگا یا وہ بجھل کی جانب سے بلاوے کا منتظر تھا۔ اڈّے پر ہماری واپسی اور رتنا کے اندر جانے کے بعد وہ زیادہ محفوظ ہو گئے تھے۔

مجھے بار بار خیال آتا تھا اگر ہم سیدھے اڈّے پر چلے آتے تو شاید سب کچھ بدلا ہوا ہوتا۔ ہم ایک دن بعد اس طرح اڈّے پر موجود نہ ہوتے۔ کہاں ہوتے؟ کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ بے شک پھر سینے پر اتنا بوجھ نہ ہوتا، رتنا اور اُس کے آدمیوں کو لاشوں میں تبدیل کرنے کے بعد ہی ہم اڈّے سے نکلتے اور اس کے بعد جو کچھ ہوتا دیکھ لیتے لیکن اِس کے بعد کیا ہوتا؛ جتنے لوگ یہاں موجود تھے، اُن میں سے پھر کوئی بھی باہر نہ آتا۔ کانتے، نصیب میاں، لیلا اور دوسرے سب لوگوں کے چہرے پھر کہیں اور ہی دیکھنے نصیب ہوتے۔ رتنا کو ختم کرنے اور اڈّے پر بیٹھ جانے کے بعد پولیس کو ہمارے پاس پہنچنے میں دیر نہ لگنی چاہیے۔ ہم رتنا اور اُس کے آدمیوں کو زندہ زمین میں دفن کر دیتے اور اُن کی ہڈیوں کی راکھ پر بھی کسی کی نظر نہ پڑنے دیتے لیکن پولیس ہمارے ہی پاس اُن کا پتہ لینے آتی۔ ہم تصوّر ہی کر سکتے تھے کہ پھر کیا کچھ ہو سکتا تھا۔ بدرو کی باتیں سُننے کے بعد سب کی آنکھوں میں خون کے سوا کچھ نہیں تھا۔ بجھل جب اچانک تھانے کی چار دیواری میں جانے لگا تھا تو سب کو اچنبھا ہوا تھا اور پولیس افسروں کے سامنے اتنی دیر تک اُس کی فضول باتیں سُن کے سبھی کے جسم تلملا رہے تھے۔ اُس وقت کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ سب کے دل میں ایک ہی بے کلی تھی کہ وہ کسی طرح جلد از جلد اڈّے پر پہنچ جائیں۔

اندھے پن میں ہمارے پیر کہیں بھی پڑ سکتے تھے۔ بدرو اور ہریالے نے جو کچھ کہا تھا، اُس کی تصدیق پولیس کے سوا کسی اور سے نہیں ہو سکتی تھی۔ یوں بھی بدرو کے بقول پولیس کو ہماری تلاش تھی تو ہمیں اُس سے چھپنا بھی نہیں چاہیے تھا ورنہ بدرو نے مشورہ دیا تھا کہ ہم اسٹیشن ہی سے لَوٹ جائیں۔ پولیس ہی سے ہمیں اپنی تلاش کی اصل وجہ معلوم ہو سکتی تھی۔ ہم اڈّے کی طرف جا رہے تھے لیکن ہو سکتا تھا کہ ہم کبھی وہاں تک نہ پہنچ پاتے، راستے

ہی میں ہمارے آگے رکاوٹیں کھڑی کر دی جاتیں اور پھر پولیس کا طور یہ نہ ہوتا۔ اُن کے طور کا اندازہ ہمیں ابتدا ہی میں ہو گیا تھا۔ اُس وقت جب تھانے میں ہمارے آنے سے کھلبلی مچ گئی تھی۔ اُن کا رویّہ اس سے قطعاً مختلف ہوتا اگر وہ ہمیں خود کھینچ کے لاتے اور ہماری تلاشی لے کے تمنچے اور ہتھیار برآمد کرتے، وہ ہم سے پوچھتے کہ ہم اتنے دنوں کہاں رہے ہیں، ہم وہی جوابات دیتے جو ہم نے دیے تھے۔ ہم اُنھیں کبھی نہ بتاتے کہ ہندوستان میں تھے ہی نہیں لیکن شاید وہ اِس طرح نہ سمجھ پاتے جس طرح اُنھوں نے اب سمجھا بوجھا تھا۔

رتنا کیوں اندر نہیں گیا؟ رتنا نہیں تو پھر اور کون تھا؟ کبن خاں نے اتنے مختصر عرصے میں اتنے بڑے دشمن کیسے پیدا کر لیے۔ ہمیں تو اتنا بھی پتہ نہیں تھا کہ ہمارے وارنٹ نکلے ہوئے ہیں یا نہیں۔ اُنھوں نے وارنٹ غالباً اس لیے جاری نہیں کیے تھے کہ ہم کسی طرح کلکتے واپس آ جائیں۔ تھانے سے نکل کے جیسے ہم علاقے میں داخل ہوئے تھے ویسے کبھی نہ جا پاتے۔ نہ اڈّے پر رتنا کے سامنے ہم لیں اپنے ہاتھ روکے رکھ سکنے پر قادر ہوتے، ہماری آنکھیں بھٹکتی رہتیں اور ہمارے پاؤں اوندھے سیدھے پڑتے۔ پولیس بھی اڈّے پر آنے میں اتنی دیر نہ لگاتی اور نہ بتّھل رتنا کو اتنا وقت دیتا۔ وہ اڈّے کی عمارت کے بجائے گلی کے نکڑ پہ نہ اُترتا۔ ہم اپنے ہی گھر چوروں کی طرح داخل ہوتے۔ اُنھوں نے ہماری عدم موجودی میں ہمارے بارے میں جو ذہن میں بٹھا لیا تھا، وہ ہماری اپنی ہی وجہ سے تھا کہ ہم موجود نہیں تھے۔ اُنھوں نے دوسرے شہروں کی پولیس سے بھی ہمارے متعلق یقیناً کوئی رابطہ رکھا ہوگا اور ہر جگہ سے اُنھیں نفی میں جواب ملا ہوگا۔ دو تین دن حوالات میں رکھ کے ہمیں جیل بھیجنے کی اجازت حاصل کر لینا اُن کے لیے مشکل نہیں تھا اور پتہ نہیں، وہاں سے ہماری واپسی کب ہوتی۔ اڈّے سے نکلنے کے بعد یا اڈّے پر ہماری موجودی کے دوران وہ ہم تک پہنچتے تو پھر واپسی اُنھی کی مرضی پر منحصر ہوتی اور اس بات پر کہ ہم نے رتنا کے ساتھ کتنی رعایت کی ہے یا کوئی رعایت نہیں کی یا دھر شہر کے اڈّوں کے اُستاد پولیس کے کانوں میں روز نیا شوشہ چھوڑ کے ہمارے دن بڑھاتے رہتے۔

اڈّے پر اُس رات ایک نصیب میاں ہی تھے جو بچ گئے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ سب کچھ اچانک ہوا۔ معمول کے مطابق رات گئے عمارت کے دروازے بند کر دیے گئے تھے۔ اندر پندرہ آدمی تھے، تین وہ جنھیں چار دن سے کبن خاں نے اُس وقت تک رہنے کی اجازت دے دی تھی جب تک وہ اپنا کوئی انتظام نہ کر لیں۔ تینوں کلکتے میں نووارد تھے۔ اُنھوں نے بتایا تھا کہ وہ دلّی سے آئے ہیں اور پولیس اُن کا پیچھا کر رہی ہے۔ اُس رات تینوں اچانک غائب ہو گئے۔ نصیب میاں یا کسی اور کے ذہن میں دُور دُور تک گمان نہ تھا کہ وہ رتنا کے آدمی ہو سکتے ہیں۔ پوچھ گچھ کے وقت وہ کسی کی طرف اشارہ نہیں کر سکے مگر پندرہ دن بعد اُنھیں جب رتنا کے اڈّے پر بیٹھنے کی خبر ملی تو اُن کے ساتھ سبھی نے شور مچایا۔ اُن کے پچھلے بیانات مختلف تھے پھر بھی پولیس نے رتنا کے سلسلے میں ہر طرح کی تفتیش کی ہوگی لیکن رتنا نے ہر گوشہ بند کر رکھا تھا، کوئی روزن کھلا ہوا نہیں تھا۔

کانتے کہتا تھا کہ جیسے ہی وہ کلکتے واپس آیا، اُسے اڈّے تک نہیں پہنچنے دیا گیا۔ راستے ہی میں روک لیا گیا۔ وہ بتا سکتا تھا کہ وہ فیض آباد اور بمبئی گیا ہوا تھا لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ پولیس جولین کے گھر یا زرّیں کی حویلی پہنچے، وہ یہ بات کسی وقت بھی بتا سکتا تھا جب کوئی چارہ نہ ہوتا۔ گاڑی سے اُترنے کے بعد اُس کے لیے بھی سب کچھ عجیب اور ناقابلِ فہم تھا۔ وہ سیدھا اڈّے کی طرف جا رہا تھا لیکن اُسے جیل پہنچا دیا گیا۔ وہاں اڈّے کے دوسرے ساتھی بھی موجود تھے، کانتے نے اُن کی باتوں اور پولیس کے رویّے سے اندازہ لگا لیا تھا کہ ابھی جیل سے باہر نکلنا اُس کے اور دوسروں کے لیے مفید نہیں رہے گا۔ شاید اس دوران بتّھل واپس آ جائے یا پولیس خود اصل لوگوں تک پہنچ جائے۔ اُسے کلکتے میں چلنے والی ہوائیں یکسر بدلی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ پولیس نے اُس پر بید برسائے، پوچھ گچھ کا کوئی ایسا طریقہ نہیں رہ گیا تھا جو روا نہ رکھا گیا ہو۔ کانتے انکار کرتا رہا اور دانستہ چُپ رہا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اُس کا دماغ ہی ٹھیک کام نہیں کرتا تھا۔ اڈّے کے اتنے لوگوں کے بیچ میں بھی وہ خود کو تنہا تنہا محسوس کرتا تھا۔ جو مناسب سے مناسب بات اُس کے سر میں آ سکتی تھی، وہ یہی تھی اور وہ اس پہ کاربند رہا۔ اس عرصے میں فیض آباد سے جمرو، بمبئی سے ماچھی چھیدا، آسنسول سے اُستاد موتی اُس کی خبر لینے آئے۔ پولیس اُن کے پیچھے پڑ گئی۔ کانتے نے یہ کہہ کر اُنھیں لوٹا دیا کہ اُستاد بس اب آ ہی رہے ہوں گے اور وہ اُنھیں کسی وقت بھی بلا سکتا ہے۔ جیل میں اُس کے ساتھی ہر لمحے اُس پر زور دیتے تھے۔ ایک مرتبہ اُنھوں نے جیل سے فرار ہونے کا خاکہ بھی بنایا۔ کانتے نے اُنھیں منع کر دیا اور ایک بار رتنا کی طرف سے ایک آدمی نے آ کے اُسے پیشکش کی کہ وہ جیل سے چھوٹ کے اپنے پرانے اڈّے ہی پر واپس آئے۔ رتنا اُسے اپنا منتظر ملے گا۔ رتنا نے کہلوایا تھا کہ وہ اُستاد بتّھل کا اڈّا خالی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کانتے نے جواب میں رتنا

کی طرف سے بھیجے جانے والے آدمی کو ہاتھ پھیلانے کو کہا۔ جب اُس نے ہاتھ پھیلایا تو کانتے نے اُس کی ہتھیلی پر تھوک دیا اور کہا جا کے اسے رتنا کے منہ پر مل دینا۔

کانتے بتا رہا تھا کہ اُس نے ڈیڑھ مہینے کا عرصہ جیل میں نہیں، جیسے کسی بھٹّی میں گزارا ہے۔ بار بار اُس کے جی میں آتا تھا کہ وہ واقعے کے دوران اپنی عدم موجودی کا ثبوت فراہم کر کے یہاں سے نکل جائے، کانتے کو بھی احساس ہوگا کہ رتنا نے کسی برتے پر یہ جرأت کی ہوگی۔ اپنے اور دوسروں کے بل پر، مبادا اُس سے کوئی لغزش سرزد ہو جائے اس لیے کانتے خود کو تھامے رہا، وہ بمبئی سے پیرو دادا کے آدمیوں، فیض آباد سے جمرو کے ساتھیوں، لکھنؤ سے کبن خاں کے دوستوں اور آسنسول سے اُستاد موتی کے شاگردوں کو کلکتے بلا کے اڈّے کا رُخ کر سکتا تھا مگر اُسے اچھا نہیں لگتا تھا کہ اوروں کے کندھوں پہ بندوقیں رکھ کے چلائی جائیں۔ وہ خود ہی وہاں جانا چاہتا تھا اور کسی مناسب موقع کا منتظر تھا۔ اُسے بتّھل کا بھی انتظار تھا۔

بتّھل جیسا کہ اکثر کہا کرتا تھا کہ ہتھیار اُٹھانے سے پہلے تیشہ دیکھ لو، ہتھیار سر پہ رکھ کے چلاؤ۔ ظاہر ہے بتّھل کی مراد نہ تو باقاعدہ تیشہ دیکھنے سے تھی، نہ ہتھیار سر پر رکھنے سے۔ ہمارے پاس بالکل وقت نہیں تھا۔ پیرو یا میں ابا جان کو لے کر فیض آباد چلے جاتے تو وقت کی تنگی کا اتنا احساس نہ ہوتا۔ جتنی دیر ہمیں تھانے میں لگی تھی، اتنی دیر میں رتنا کو پیرو، زورا اور مارتی کے بارے میں یہ خبر نہیں مل پائی ہوگی کہ وہ ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے ہیں۔ بدرو نے اگر پیرو کو ہم سے باتیں کرتے اسٹیشن پر دیکھ لیا تھا تو بدرو ہمارے ساتھ ہی تھا۔ شام ہی کو ہم رتنا کے پاس پہنچ گئے تھے۔ شام کو ہم اُس کے پاس نہ پہنچ پاتے، تھانے میں ہمیں کچھ اور وقت لگ جاتا، ایک رات اور، ایک دن یا کئی دن تو شاید رتنا کلکتے میں پیرو کی موجودی سے بے خبر نہ رہتا اور یہ جاننے کے بعد اُسے جا تو اُٹھا کے پیرو کے سامنے پہنچ جانے کی ضرورت نہیں تھی، پولیس کو اشارہ کر دینا کافی تھا۔ پیرو کے پاس رتنا کی بے خبری جتنا ہی وقت تھا۔ پیرو تک پولیس کے پہنچ جانے کا مطلب ابا جان تک پہنچنا تھا جن کے پاس جادو کے پتھر صندوقوں میں رکھے ہوئے تھے۔ اُن کی ایک جھلک سے نہ صرف ابا جان اور پیرو کے سامنے کے دروازے بند ہو جاتے، ہماری باقی زندگیوں کا فیصلہ بھی ہو جاتا۔ جتنے کم سے کم وقت میں ہم تھانے سے نکل جاتے، اتنا ہی ہمارے لیے بہتر تھا۔ آنے والا ہر لمحہ لٹکتی ہوئی تلوار کے مانند تھا جو کسی وقت بھی ہماری گردن پہ گر جاتا، گو پیرو کسی دیوار، کسی تلوار سے کم نہیں تھا۔ وہ کسی کے خود تک پہنچنے سے پہلے ہی اُس کی آہٹ سونگھ لیتا لیکن ہمیں اپنے طور پر اُسے اُلجھن میں ڈالنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہیے تھا۔ ہمارے لیے بس یہی ایک بہتر صورت تھی کہ ہم دوبارہ تھانے واپس آئیں تو رتنا اور اُس کے ساتھی بھی ہمارے ہمراہ ہوں۔

سب سویرے ہی اُٹھ گئے اور نہا دھو کے کپڑے بدل کے، ناشتہ کیے بغیر اڈّے سے نکل گئے۔ علاقے کے بہت سے لوگ بھی ہمارے ساتھ ہو گئے تھے۔ پہلے ہم شمشان گھاٹ گئے۔ اتنے دنوں میں لالہ، بسوا، مندھرا اور کرمے کی راکھ بھی ہوا کہاں سے کہاں لے گئی ہوگی۔ جتنی دیر مندر کے پنڈت جی کچھ پڑھتے رہے ہم چپ کھڑے رہے۔ وہاں سے ہم قبرستان گئے۔ جن لوگوں نے کبن خاں، شولی، فیضو، دلّن، نصیرا، بندے اور سادو کو دفن کیا تھا، اُنھی نے اُن کی قبروں کی نشان دہی کی۔ گلی میں رہنے والے قاضی صاحب نے تلاوت کی۔ جامو کے ہوش و حواس جاتے رہے تھے، وہ کبن خاں کی قبر سے چمٹ کے پھوٹ پھوٹ کے روتا رہا۔ بتّھل نے بہ مشکل تمام اُسے وہاں سے اُٹھایا۔ واپسی میں راستے بھر جامو گُنگ بیٹھا رہا۔

اڈّے پر آ کے بتّھل نے کئی آدمیوں کو شہر کے مختلف اڈّوں کی طرف جانے کی ہدایت کی اور کہا، اُستادوں سے جا کے بول دیں، آج رات تک مُرکا ہر ابھتا اڈّے پر پہنچ جائے۔ بتّھل نے اور کوئی دوسری بات نہیں کی تھی۔ مجھے یہ سب قبل از وقت معلوم ہوتا تھا۔ اڈّے کے آدمی اُس کا پیغام پہنچا کے سہ پہر تک لوٹ آئے تھے۔ شام ہی سے اُستادوں کی آمد شروع ہو گئی اور رات ہونے تک جن جن کو بتّھل نے کہلوایا تھا، شاید ہی اُن میں سے کوئی باقی رہ گیا ہو۔ کوئی اُستاد نہ آ سکا تھا تو اُس نے رقم بھیج دی تھی اور جس نے رقم نہیں بھیجی تھی، اُس نے خود آ کے بتّھل سے مہلت مانگ لی تھی۔ بتّھل نے اُن سے اپنے پیچھے ہونے والے واقعات کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ خود ہی طرح طرح کی باتیں کرتے رہے، بتّھل چُپ چاپ سنتا رہا۔

مرگھٹ اور قبرستان سے لوٹ کے بتّھل دن بھر بیٹھا ہی رہا تھا مگر صبح چلنے سے اُس کا زخم اور بگڑ گیا۔ دن میں دو بار مدن پہلوان نے مرہم پٹّی کی تھی اور اُسے مشورہ دیا تھا کہ وہ ایک جگہ بیٹھا رہے یا بستر پہ آرام کرے۔ دوپہر کو اُسے تیز بخار آ گیا تھا لیکن وہ بیٹھک میں آنے والے اُستادوں اور دوسرے لوگوں سے ملتا رہا اور حقّہ پھونکتا رہا، دوسرا دن بھی گزر رہا تھا۔ پیرو، زورا اور مارتی میں سے کوئی بھی اڈّے پر نہیں آیا۔ بتّھل جیسے کلکتے میں اُن

ں موجودی بھول گیا تھا یا وہی کہیں راستہ بھٹک گئے تھے۔ میں نے کئی بار سوچا کہ میں ہی بجھل کو اشارہ کروں اور کہوں۔ اب میں ابّاجان کو لے کے فیض آباد چلا جاتا ہوں لیکن بجھل کا جسم پھنک رہا تھا۔ ایسی حالت میں اُسے چھوڑ کے ایک لمحے کو بھی میرا کہیں جانے کو جی نہیں کرتا تھا۔ اگر وہ خود ہی فیض آباد جانے کا ارادہ کرتا تو اس سے اچھی کوئی بات نہیں تھی۔ وہیں اُسے آرام مل سکتا تھا۔ زرّیں کی دیکھ بھال سے وہ چند دن میں ٹھیک ہو جاتا۔ زرّیں اُسے اُٹھنے ہی نہ دیتی اور زرّیں کی بات وہ ٹال ہی نہیں سکتا تھا مگر ایک تو یہ وقت اُس کے کلکتے سے ہٹنے کا نہیں تھا، نہ اُس کی حالت فیض آباد تک کے سفر کی متحمل تھی۔ وہ انھیں بھولا تو نہیں ہوگا۔ اُس کے ذہن میں کوئی ایسی ہی بات ہوگی جو اُس نے انھیں اڈّے پر نہیں بلایا یا کوئی آدمی اُدھر نہیں بھیجا، مجھ سے بھی انھیں جا کے دیکھنے کو نہیں کہا اور جب اُس نے خود مجھے اجازت نہیں دی تھی تو میرے کہنے کا کیا سوال پیدا ہوتا تھا۔

رات کو اُوپری منزل پر سونے کے لیے ہم لیٹے تو کانتے میری چارپائی پر ہی آگیا اور مجھ سے لپٹ کے ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگا۔ اُس سے ایک بات پوچھنے کے لیے کئی مرتبہ میرے دل میں ہمک اُٹھی تھی لیکن کوئی مناسب موقع ہی نہیں ملا جو میں اُس سے شبہ پارہ کے متعلق پوچھتا۔ مجھے یقین تھا کہ دوسرے تیسرے دن رقم ادا کر کے وہ اُسے کریمن بیگم کے ہاں سے لے آیا ہوگا۔ بیعانہ تو وہ میرے ساتھ ہی دے آیا تھا۔ میں نے جھجکتے ہوئے سرگوشی میں اُس سے شبہ پارہ کا ذکر کیا تو وہ بے چین ہو گیا۔

"مجھ کو سمجھ نہیں آتی تھی کہ تُو نے اب تک اُس کے بارے کوئی بات کیوں نہیں کری۔" وہ اُداسی سے بولا۔ "کیا تُو جانتا تھا کہ اُس رات مَیں نے تجھ سے جھوٹ بولا تھا؟"

"کیسا جھوٹ؟" میں اُٹھ کے بیٹھ گیا۔

"تجھ کو میری بات کا یقین آگیا تھا؟"

"کیا کہہ رہا ہے؟" میں نے ترشی سے کہا۔

"میں نے اُس رات تجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ تجھے نیچے چھوڑ کے چیک ہاتھ میں تھامے جب میں اُوپر پہنچا تو سوائے باجے طبلے والوں کے اُدھر کوئی نہیں تھا۔ اُن لوگوں نے بولا کہ کریمن سویرے ہی اِدھر سے شپارے کو لے کے بھاگ گئی ہے۔"

"نہیں نہیں۔" میں نے ڈولتی آواز میں کہا۔

"تجھ کو اُستاد کے ساتھ جانا تھا اس واسطے میں نہیں بولا" وہ حرام زادی اُسے اُسی دن لے کے شہر سے نکل گئی تھی۔

[illegible]

نے اُس سے زیادہ دینے کو کہا تھا۔ پھر وہ اُسے کیوں لے گئی۔

"لے گئی، دل میں خرابی آگئی تھی اور ہو سکتا ہے کریمن چند سیٹھ نے اپنے آنے کے بعد کچھ بڑھی بولی دے کے کسی کو بھیجا ہو۔"

میرا دل بیٹھنے لگا۔ شپارے کی قسمت ہی خراب تھی۔

"میں اُسے کدھر ڈھونڈتا۔" کانتے بولا۔ "پر میں نے سوچ لیا تھا، اپنے کو پتہ چل گیا تو اُس سالی حرام کی پِلّی کی آنکھیں ضرور نکال لوں گا۔ میں نے جمرو کو فیض آباد، کبّن خاں کے لنگوٹیوں کو لکھنؤ اور ماچھی کو بمبئی چٹھی ڈال دی تھی کہ آس پاس جدھر بھی اس چوکھٹے کی عورت دکھائی دے، اپنے کو ترت لکھو۔"

"تو کیا تجھے وہ مِل گئی؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"وہ نہیں ملی۔ یہ تیسرے دن کی بات ہے۔ میں نیچے بیٹھک میں آ کے بیٹھا تھا کہ ٹلو بھاگا ہوا آیا، بولا، کانتے استاد! ابھی اُدھر ایک مائی بُرقع اوڑھے کھڑی تمھارا نام لیتی ہے۔ اپنا سَر گھوم گیا، جا کے دیکھا تو وہ ایک کونے میں دبکی کھڑی تھی، منہ ڈھکا ہوا تھا۔ مت پوچھ لاڈلے! اپنا کیا حال ہوا، دیر تک سر سے پیر تک اُس کو دیکھتا رہا۔"

"کیا وہ شپارے تھی؟" میں نے اچھل کے پوچھا۔

"یہی تو میں بولتا ہوں۔ اپنا مغز بالکل پھر گیا تھا۔" کانتے نے مجھے زور سے دبوچ لیا۔ "وہ شپارے ہی تھی۔" وہ تیزی سے بولا اور کہنے لگا کہ وہ اکیلی تھی، اُس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ گلابی پاؤں خ[illegible] دھول میں اَٹے ہوئے تھے۔ بُرقعے پر سلوٹیں پڑی ہوئی۔ کانتے اُسے کسی تاخیر کے بغیر اُوپر کے فلیٹ میں لے آیا۔ اُس نے نقاب اُلٹی تو کانتے کو اُس کا چہرہ دیکھنے کا موقع ملا۔ شبہ پارہ کے رخساروں پر سفیدی چھائی ہوئی تھی، آنکھیں ویران اور سہمی ہوئی تھیں۔ "کانتے بھائی! میں آگئی ہوں۔" اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں کانتے سے کہا اور بتایا کہ کریمن بیگم اُسے زبردستی یہاں سے لے گئی، اُس نے لاکھ منع کیا، کریمن نے اُس کی ایک نہ سُنی۔ وہ اُس کے ساتھ چلی تو گئی لیکن راستے بھر روتی ہوئی اور اُس نے راستے ہی میں دل پکا کر لیا۔ بنارس کے اسٹیشن پر گاڑی ٹھیری تو کریمن بیگم سو رہی تھی۔ شبہ پارہ نیچے اُتر آئی اور دوسرے پلیٹ فارم پر کھڑی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ وہ گاڑی الٰہ آباد جا رہی تھی۔ الٰہ آباد سے وہ کلکتے جانے والی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ وہ زنانے ڈبّے میں بیٹھ کے ڈبّے سے تبھی اُتری جب کلکتہ آگیا۔ رکشے میں بیٹھ کے وہ سیدھی اڈّے پر چلی آئی۔ کانتے نے [illegible]ت سینے سے لگا لیا۔

وہ بہت نڈھال تھی۔ کانتے نے اُس کے لیے دوپہر تک [illegible]جوڑا سلوایا۔ اڈّے پر شولی، لالہ اور کبّن خاں کے سوا کسی اور [illegible]س نے شبہ پارہ کی صورت نہیں دیکھنے دی۔ کبّن خاں دن میں [illegible]مرتبہ اُسے پوچھنے جاتا تھا۔ لالہ اور شولی بھی ہر وقت اُس کی [illegible]ی میں رہتے تھے۔ چار دن تک وہ زرّیں کی طرح اڈّے ہی [illegible]ہی، کانتے کہتا تھا، جب تک اُس کا اصل رنگ چہرے پر واپس [illegible]ں آیا، اُسے نیند نہیں آئی۔ چار دن میں وہ سب سے بہت [illegible]دس ہو گئی تھی، کبّن خاں کو بھائی صاحب کہتی تھی اور کبّن خاں [illegible]ے بھنّو کہہ کے مخاطب کرتا تھا۔ یہاں اُس کا زیادہ دنوں تک [illegible]ا ٹھیک نہیں تھا اور نہ کلکتے میں کوئی مکان لے کے اُسے [illegible]ا رکھا جا سکتا تھا۔ کبّن خاں کا اصرار تھا کہ میری واپسی تک [illegible] پارہ کو گاؤں میں اُس کی ماں کے پاس بھیج دیا جائے۔ کانتے [illegible]اُس کا مشورہ نہیں مانا، وہ اُسے فیض آباد زرّیں کی حویلی [illegible]لے جا سکتا تھا مگر وہاں پہلے ہی خاصے لوگ تھے۔ چار دن [illegible]رات کو کانتے اُسے لے کے اڈّے سے باہر نکلا اور بمبئی [illegible]نے والی گاڑی میں بیٹھ گیا، دوسری طرف سے کبّن خاں، لالہ [illegible]ولی اسٹیشن پر آ گئے۔ شولی نے اُسے بالیاں، لالہ نے چوڑیاں [illegible]بن خاں نے بہت سی چیزیں دے کے رخصت کیا۔

جولین شبہ پارہ سے مل کے بہت خوش ہوئی۔ کانتے [illegible]اُسے سب کچھ بتا دیا تھا۔ جولین بھی اکیلی اکیلی، ویران ویران [illegible]رہتی تھی۔ شبہ پارہ کے آ جانے سے جیسے اُس کا کوئی کھویا ہوا [illegible]مل گیا تھا۔ کانتے نے جب اُس سے کہا کہ جولی! یہ لاڈلے [illegible]مانت ہے تو بولی، میرے لیے اُن کی جگہ ہے۔ وہ وہاں ٹھیرا [illegible]ف دو دن لیکن یہ اطمینان کر کے ہی اُس نے واپسی کا ارادہ [illegible]شبہ پارہ وہاں خوش رہے گی۔ چار مہینے میں وہ چار بار بمبئی [illegible]ور ہر مرتبہ فیض آباد ہوتا ہوا آیا۔ کانتے کے مطابق اُس کے [illegible]رے منتقل کیے ہوئے روپوں میں سے اُسے ایک چھدام نکالنے [illegible]ورت نہیں پڑی۔ میں نے بینک میں اُس کے نام کرتے ناجی [illegible]یے ہوئے روپوں میں سے ڈھائی لاکھ روپے منتقل کیے تھے۔ [illegible]ہ پچیس ہزار شبہ پارہ کے لیے اور پچیس ہزار احتیاطاً مزید کسی [illegible]کے لیے۔ کریمن بیگم کے نصیب میں یہ دولت نہیں تھی تو [illegible]ور کانتے کیا کر سکتے تھے۔

میں نے کانتے کے ہاتھ چوم لیے۔ رات بھر وہ مجھے اُسی کی [illegible]سناتا رہا۔ میرا بس چلتا تو میں اُسی وقت اُڑ کے شبہ پارہ کو [illegible]پہنچ جاتا۔ گھریلو لباس میں وہ بالکل بدلی ہوئی نظر آتی ہوگی [illegible]ی گھر میں نظر آتی تھی۔ بکھرے بال، سَر پہ نہ دوپٹے کا ہوش [illegible]ں میں جوتی۔ گھر میں اِدھر سے اُدھر پھدکتی ہوئی۔ آوازیں

پڑتی رہیں۔ ایک لمحے باورچی خانے میں، دوسرے لمحے چھت پر کپڑے پھیلانے، چمپا بیگم کے کوٹھے پر اُس کا رنگ ہی کچھ اور تھا۔ کسی گڑیا کی طرح سجی ہوئی جسے جہاں چاہو اُٹھا کے رکھ دو، تی جیسے اپنی روح کے بغیر زندہ تھی، کانتے کہہ رہا تھا۔ جب بھی وہ بمبئی جاتا، شبہ پارہ پہلا سوال یہی کرتی۔ "کانتے بھائی! کوئی خط آیا؟ کب آ رہے ہیں؟" کانتے ہر مرتبہ اُس سے جھوٹ بول کے چلا آتا۔

تیسرے دن صبح بجھل نے ٹیکسی منگوائی اور مجھے اپنے ساتھ بیٹھنے کو کہا۔ میں سمجھا کہ وہ پیرو سے ملنے جا رہا ہے۔ پیرو اور ابّاجان کو دیکھے ہوئے تین ہی دن ہوئے تھے لیکن معلوم ہوتا تھا ایک مدت گزر گئی ہے۔ ٹیکسی شہر کی سڑکوں پر گھومتی رہی اور سیالدا اسٹیشن پر آ کے ٹھیر گئی۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی، بجھل سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ وہ میرا ہاتھ تھامے آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا پُل عبور کر کے پلیٹ فارم پر آگیا۔ گاڑی لگی ہوئی تھی۔ وہ فرسٹ کلاس کے ایک ڈبّے میں جا کے برتھ پر لیٹ گیا۔ ہمارے ساتھ کوئی سامان نہیں تھا۔ "کہاں جا رہے ہو؟" مجھ سے ضبط نہیں ہوا تو میں نے پوچھ لیا۔

"بٹیا کے پاس۔" وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

"اور وہ لوگ؟" میں نے جھجک کے پوچھا۔

"آ جائیں گے رے۔"

ابھی گاڑی چلنے میں کچھ ہی دیر ہوگی کہ پیرو، زورا، مارٹی اور ابّاجان مجھے قلیوں کے ساتھ پلیٹ فارم پر آتے دکھائی دیے۔ وہ گاڑی کے پچھلے حصّے کی طرف جا رہے تھے کہ میں اُتر کے اُن کے پاس پہنچ گیا۔ "اِدھر اِدھر، بجھل بھائی اِدھر ہیں۔" میں نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

پیرو نے مجھے ٹانگوں سے اُٹھا کے اُوپر کر لیا۔ میری نظر فوراً ابّاجان پر گئی۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ اتنے دنوں بعد میں نے اُن کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی تھی۔ پیرو مجھے اُٹھائے اُٹھائے اُن کے پاس لے گیا۔ "بڑے ساب! ابھی اِس کو دیکھتے ہو، ایک دم عربی گھوڑا کے مافک ہے۔ کیا بولتے ہیں اِس کو دُل دُل دُل دُل۔" وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا اور اُس نے مجھے اُوپر اچھال کے فرش پر پھینک دیا۔ ابّاجان میری کمر پر تھپکی دیتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ ڈبّے میں داخل ہوتے ہی وہ سب بجھل کی برتھ کی طرف لپکے۔ پیرو، بجھل کا جسم جگہ جگہ سے ٹھونکنے لگا۔ بجھل نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے سب کو باری باری دیکھا اور اُٹھنے کی کوشش کی تو پیرو نے اُس کی چھاتی پر ہاتھ مار کے اُسے اُٹھنے نہیں دیا۔ ابّاجان بجھل

کے سرہانے بیٹھ کے اُس کا ماتھا چھونے لگے۔ اُنھوں نے اُس کی نبض بھی دیکھی۔ تجمل نے گردن اُن کے ہاتھوں پہ ڈال دی اور ابا جان نے اُس کا چہرا اپنے ہاتھوں میں بھینچ لیا۔

شاید اُن کے آنے ہی کی دیر تھی، گاڑی پلیٹ فارم پر رینگنے لگی۔ اُنھوں نے سامان سوٹ کیسوں اور چرمی تھیلوں میں بھر لیا تھا۔ دو ایک ٹین کے بکسے بھی تھے۔ سب نے کپڑے صاف ستھرے اُجلے تھے۔ ابا جان کا خط بنا ہوا تھا۔ سر پہ دو پلی ٹوپی، کرتا پاجامہ، اُوپر سے بنڈی پہنے ہوئے تھے اور چہرہ بھی اُجلا اُجلا، نکھرا نکھرا تھا۔ تبت میں ہم نے جس بھکشو کو دیکھا تھا، وہ اِس سے قطعی مختلف تھا لیکن وہ بہت دُبلے اور کمزور لگ رہے تھے۔ ہڈیاں گِنی جا سکتی تھیں۔ راستے میں صرف دو ٹکٹ چیکر، ایک بردوان اسٹیشن پہ، دوسرا مغل سرائے پہ ٹکٹ چیک کرنے آئے تھے اور مطمئن ہو کے چلے گئے مگر جب تک گاڑی فیض آباد تک نہیں پہنچ جاتی تھی، ہمارے مطمئن ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پچھلا تجربہ سامنے تھا۔ گاڑی کسی جگہ ٹھیرتی تو پولیس کے آنے کا دھڑکا لگا رہتا، کوئی ایک معمولی سپاہی ڈبّے میں اچانک آ کے ہمارے سامان پہ اُنگلی اُٹھا سکتا تھا، وہ تلاشی کا مطالبہ کرتا تو انکار کیسے کیا جاتا۔ انکار میں زور تبھی ہو سکتا ہے جب ایسا سامان ساتھ نہ ہو جو ہم چھپائے ہوئے تھے۔ محل، قلعے، ہاتھی، گھوڑے، غلاموں کی فوج، باندیاں، زرنگار ملبوسات، عزت، شان، سبھی کچھ ان صندوقوں میں بند تھا۔ جس کی نظر پڑتا، سُن ہو جاتا، دماغ پھٹ جاتا۔ فرسٹ کلاس کے مسافروں کے سامان کی اِس طرح تلاشی نہیں لی جاتی لیکن یہ کوئی قانون نہیں تھا، کسی کو کسی جگہ بھی شک ہو سکتا تھا۔

گاڑی کی رفتار ابتدا میں تیز تھی، بعد میں سُست پڑ گئی۔

ایک اسٹیشن پر لیٹ ہوئی تو لیٹ ہوتی گئی۔ آسنسول سے آگے میں ابا جان کی برتھ پر جا کے بیٹھ گیا تھا۔ میں نے ارادہ کیا کہ فرخ فرمالی، فارہ اور اکبر کے بارے میں اُن سے پوچھوں مگر ابا جان ہی کے خیال سے پوچھنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی، کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو میرے کریدنے پر اُن کے زخم تازہ ہو جائیں گے۔ پھر یہ بھی خیال آتا تھا، وہ اپنے دل میں کہیں یہ نہ سوچ رہے ہوں کہ نو سال میں میرے ذہن پر دھول جم گئی ہے تاہم میں نے لب نہیں کھولے۔ آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں اُنھیں بتانا ہی تھا۔ مجھے نہیں تو جہاں گیر کو میری طرح جہاں گیر کو اُن سے پوچھتے ہوئے کوئی جھجک نہیں ہو گی کیونکہ اُس کے سامنے نمی گھر سے تو نکلی مگر اُس نے اُسے محفل میں ہار سنگھار کیے بیٹھے نہیں دیکھا تھا۔ فیض آباد قریب آتے آتے گاڑی لیٹ ہونے کے سبب دُور ہو جاتا تھا۔ گاڑی کو رات میں کسی وقت پہنچنا تھا لیکن وہ ساری رات گزار کے کہیں صبح پانچ بجے فیض آباد کے علاقے میں داخل ہوئی۔ میں دروازے پر دستہ تھامے اسٹیشن آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ زرّیں، خانم، نیسار، منیر علی، زہرہ، جہاں گیر، سب کے چہرے بار بار سامنے آ جاتے تھے۔ میری رگوں میں سنسناہٹ سی ہونے لگتی تھی، مارٹی بھی میرے پہلو میں دروازے پر آ کے کھڑا ہو گیا تھا۔

تجمل کو پھر اُٹھنا پڑا۔ اسٹیشن پر مسافروں کا میلا لگا ہوا تھا۔ ہم نے کچھ دیر بھیڑ چھٹنے کا انتظار کیا، تب باہر نکلے۔ گیٹ پر ٹکٹ چیکر نے ایک سرسری نظر ہمارے ٹکٹوں پر ڈالی، پھر سامان پہ، ایک پل کو اُس کی آنکھوں میں تلخی سی اُبھری مگر وہ کے دوسرے مسافروں کی طرف دیکھنے لگا۔ قلیوں نے ہمیں فوراً تانگوں تک پہنچا دیا۔ تانگے کے جھٹکے تجمل کے پیر کے لیے تکلیف دہ ہوتے لیکن کوئی اور سواری ہی نہیں تھی۔ اسٹیشن سے کچھ دُور ۔۔۔ چنگی پڑتی تھی۔ تانگا آگے نکل جاتا مگر سڑک کے بیچ میں ایک دُبلے پتلے پستہ قد آدمی نے ہاتھ اُٹھا کے اُسے رکنے کا ۔۔۔ دیا۔ "کچھ نہیں ہے میرے سرکار!" کوچوان نے گھوڑے کی باگیں تھامتے ہوئے ہنس کر کہا۔

چنگی والے نے اُس کی بات نہیں سُنی اور پائدان پر ۔۔۔ ہوئے بکسے چھو کے منہ بناتے ہوئے بولا "یہ کیا ہے؟"

"میرے جواہرات ہیں۔" تجمل نے گونجتی آواز میں کہا۔

اُس نے ناراضی سے تجمل کی طرف سر اُٹھا کے دیکھا، ۔۔۔ پلکیں جھپکا کے رہ گیا۔ "ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔" وہ کسمسا کے بولا۔

"ٹھیک ہی بولا ہے، اِدھر چنگی میں ہیرے جواہرات ۔۔۔ کے کیا دام ہوتے ہیں۔" تجمل نے نرمی سے کہا۔ "رونہ کاٹ ۔۔۔

"سامان کھول کے دکھاؤ۔"

"شامت کر باد شاہ۔" پیرو نے درشتی سے کہا۔ "اپن کو ۔۔۔ ہے۔" اُس نے دس روپے کا نوٹ نکال کے اُس کے حوالے ۔۔۔ "رونہ کاٹ کے رکھنا، واپسی میں اپن اِدھر سے لے لیں گے۔"

"سامان دکھا کے دام لگیں گے۔" چنگی والا تانگے کا بمبہ تھام کے بولا جیسے تانگا روک لے گا۔

کوچوان نے اُسے بیچ میں سمجھانے کی کوشش کی اور ۔۔۔ سے بولا "دس روپے اور دے دو جنابِ عالی! دس روپے رونہ کٹ جائے گا تو باقی کیا بچے گا، کچھ غریب لوگوں کا بھی خیال ۔۔۔

"ایسا ہے۔" پیرو نے جیب سے دس روپے کا ایک نوٹ اور نکالا۔ "ایسا ہے تو پہلے بولتا۔ اِدھر یہ خالی پیلی آنکھیں کیوں ۔۔۔ ہے، سالا اپنے کو کیا سمجھ کے بوم مارتا ہے۔"

کوچوان نے چنگی والے کو آنکھ مار کے اشارہ کیا، اُس نے ۔۔۔ کھڑے چنگی پہ بیٹھے ہوئے منشی کو دونوں نیچے کھول کے ۔۔۔ بندسہ بنایا اور دو نوٹ کے رسید لے آیا، چلتے چلتے وہ سلام ۔۔۔ بھولا "ناراض مت ہونا جناب!"

تانگے والے نے چابک اُٹھا کے گھوڑے پہ زور سے مارا، ۔۔۔ سرپٹ شہر جانے والی سڑک پر دوڑنے لگا۔

ہمارے پاس چنگی کی رسید تھی لیکن آگے کسی موڑ پر کسی ۔۔۔ نے ہمیں نہیں روکا، صرف مٹھائی اور دودھ کی اکا دکا دکانیں ۔۔۔ ہوئی تھیں۔ سڑکوں پر ویسے سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بازار سے ۔۔۔ حویلی تک جانے والا راستہ مختصر تھا۔ میرے دل میں سائیں ۔۔۔ سی ہو رہی تھی۔ حویلی قریب آ رہی تھی۔ ابا جان کو دیکھ کے ۔۔۔ کی کیا حالت ہو گی اور زرّیں تجمل کو دیکھ کے کیا کہے گی، ۔۔۔ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

کچھ ہی دیر میں حویلی ہمارے سامنے تھی۔

"آگے پھاٹک پہ پہنچ کے بلما" میرے بولنے سے پہلے ۔۔۔ نے اُونچی آواز میں کوچوان سے کہا۔ اُس نے باگیں کھینچ لیں ۔۔۔ تانگا ہچکولے کھاتا ہوا ٹھیر گیا۔ سب سے پہلے میں نیچے اُترا۔ حویلی ۔۔۔ پھاٹک بند تھا۔ بوڑھا چوکی دار شیرا وہاں موجود نہیں تھا۔ پیرو ۔۔۔ تجمل کو سہارا دے کے نیچے اُتارا۔ ابا جان، زہرا اور مارٹی نظریں ۔۔۔ اُٹھا کے حویلی دیکھ رہے تھے، باہر سے ساری عمارت کا رنگ ۔۔۔ تھا اور وہ کسی چھوٹے قلعے سے مشابہ تھی۔ میں بھاگ کے دروازے ۔۔۔ پہنچا اور میں نے زور زور سے کنڈا کھٹ کھٹانا شروع کر دیا۔

"کون ہے؟" اندر سے شیرا کی لڑکھڑاتی آواز گونجی۔ ساتھ ہی اُس ۔۔۔ پھاٹک کی کھڑکی کھول دی۔ مجھے سامنے دیکھ کے وہ آنکھیں مسلنے ۔۔۔ اور لڑکھڑائے ہوئے لہجے میں چیخا "لاڈلے میاں!"

"شیرا چاچا" میں نے اُسے کولیا میں بھر لیا۔ مجھے یہ احساس ۔۔۔ نہیں رہا کہ ابا جان پیچھے آ رہے ہیں۔

جیسے ہی شیرا کی نظر تجمل پر پڑی، وہ اُچھلنے لگا اور میری گرفت ۔۔۔ آزاد ہو کے اُس کی جانب بھاگا۔

"ابھی تک چل رہا ہے رے؟" تجمل اُس کا بازو جھنجوڑتے ۔۔۔ بولا۔

"تم نے جو ادھر باندھ رکھا ہے۔ بٹیا رکے ہوئے ہے۔"

"بٹیا کیسے ہے؟" تجمل نے تمتمائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"اپنے سے مت پوچھو، خود ہی دیکھ لینا۔"

"جا کے جلدی بول، اِدھر کیا مستا رہا ہے۔"

نیرا جستیں لگاتا، چیختا ہوا اندر عمارت کے دروازے پر جا کے کواڑ دھڑ دھڑانے لگا۔ کوچوان، پیرو، مارٹی اور زہرا جلدی جلدی سامان اُٹھا لائے۔ شیرا کو زیادہ چلّانے کی ضرورت نہیں پڑی، کسی نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور بھرے ہوئے گلے سے پوچھا "کیا بات ہے شیرا چاچا؟" میں نے آواز پہچان لی۔ وہ زرّیں ہی تھی۔

"دیکھو کون آیا ہے۔" شیرا نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

زرّیں نے کچھ اور نہیں پوچھا، ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ میری آنکھیں دھندلا گئیں۔ زرّیں کے سراپا کا ایک جھماکا سا ہوا، پہلے تو وہ ذرا سی ٹھٹکی، پھر کسی سہمی ہوئی ہرنی کی طرح، بجلی کی طرح کوندتی، چبوترے کی سیڑھیاں پھلانگ کے تجمل کے سینے سے آ لگی۔

تجمل اُس کے سر پہ اپنا سر رکھے آنکھیں میچے لمحوں تک چپ کھڑا رہا، زرّیں بُری طرح سسکنے لگی تھی۔ "تا، تا" تجمل بوجھل لہجے میں بولا "آ گیا ہوں ری! اب کے تو جب بولے گی، جبھی کو لوٹوں گا۔ نہیں بولے گی تو نہیں جاؤں گا۔" تجمل نے اُس کی ٹھوڑی اُٹھا کے چہرہ سامنے کیا اور اُس کی پیشانی چومنے لگا اور اُس کی پگھلتی ہوئی آنکھوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ زرّیں تڑپا لرز رہی تھی، اُسے یہ بھی دھیان نہیں رہا تھا کہ کچھ اجنبی لوگ بھی کھڑے ہیں۔ ہم سب اُسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میری سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ پیرو نے سر جھکا لیا۔ "سنبھل ری۔" تجمل نے اپنے بازوؤں کا حصار کھول کے ابا جان کی طرف اشارہ کیا۔ "اِدھر دیکھ، پہچان تو کون ہیں یہ؟ چہرہ کچھ جانا پہچانا لگتا ہے؟"

زرّیں کی بھیگی پلکیں پٹ پٹانے لگیں۔ اُسے فوراً اپنے دوپٹے کا ہوش آیا۔ تجمل نے اپنی آستین سے اُس کی آنکھیں پونچھ دی تھیں۔ زرّیں کا چہرہ آگ کی طرح دہک رہا تھا۔ اُس نے لرزتے ہونٹوں سے گردن خم کر کے سٹ پٹائے ہوئے انداز میں ابا جان کو سلام کیا۔

"ابھی سنبھالو اِسے بابا! دیکھ لو نمی جیسی ہے نہیں۔"

نمی کے نام پر ابا جان چونکے، زرّیں بھی۔ اُس نے حواس باختگی سے پہلے میری طرف دیکھا، پھر ابا جان کی طرف اور اُنھیں دوبارہ سلام کیا۔ ابا جان نے آگے بڑھ کے اپنے کانپتے ہاتھ اُس کے سر پہ رکھ دیے اور کچھ بولے نہیں کہ تجمل نے نمی کا نام کیوں لیا ہے، وہ گنگ سے ہو گئے تھے۔

اُسی لمحے جہاں گیر اندر کے دروازے پر سمندر کی لہر کے مانند اُمڈتا ہوا آیا۔ اُس نے پہلے مجھے دیکھا تھا اور میری طرف بڑھا تھا لیکن تجمل سے جا کے لپٹ گیا، ابا جان زرّیں کے سامنے دروازے کی جانب پشت کیے کھڑے تھے اس لیے

اُس کی نظر اُن پر نہیں جا سکی اور اُس کے سان و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ ابا جان یہاں آ سکتے ہیں۔ وہ اکہری ہڈی کا شروع ہی سے تھا، اب اور لمبا ہو گیا تھا۔ بانس کی طرح اُوپر اُٹھا جا رہا تھا۔ بجھل نے اُس کے کولھے پکڑ کے اُسے اُوپر اچھال دیا۔ "کیسا ہے شیخو پیا؟" وہ اپنا سر اُس کے پیٹ سے رگڑتے ہوئے بولا۔ "پہلے منّھی تو دے دے۔"

"بابا! ہم آپ سے بہت ناراض ہیں۔" وہ مچل کے بولا۔ "ایک خط بھی نہیں لکھا، ایک سطر بھی۔"

"اُنگلیاں ہی جام ہو گئی تھیں لے۔"

"آپ وعدہ کر کے گئے تھے۔ کسی سے دو لفظ نہیں لکھوا سکتے تھے؟ چھ مہینے میں پانچ منٹ بھی آپ کو نہیں ملے؟"

"معاف کر دے شہزادے! غلطی ہو گئی۔"

جہاں گیر اُس کے گلے میں بانہیں ڈال کے جھول گیا۔ "بابا! روز آپ کا انتظار ہوتا تھا۔ زرّی باجی صبح و شام شیرا ماما سے پوچھتی تھیں، ڈاکیا گزر گیا؟ آپ ایسے کہاں چلے گئے تھے؟ کتنی دور؟ وہاں سے خط بھی نہیں آ سکتا تھا کیا؟" وہ ایک ہی سانس میں نہ جانے کیا کیا کہتا رہا اور بجھل سر ہلاتا رہا۔

"ذرا دیدے کھول، دیکھ تو تیرے لیے کیا لایا ہوں۔"

"کیا ہے؟" جہاں گیر بے تابی سے بولا۔ "مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ آپ اور بابر بھائی آ گئے، یہی بہت ہے۔ دل میں عجیب عجیب ہَول آتے تھے۔ سبھی دعائیں کرتے تھے۔"

"اِدھر تو دیکھ، پیچھے کون کھڑا ہے۔"

"کون؟" جہاں گیر نے مڑ کے پلٹ کے دیکھا۔ ابا جان اُس کی باتیں سُن رہے تھے اور اُن کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو جاری تھے۔ جہاں گیر اُنھیں دیکھ کے مبہوت رہ گیا۔ ابا جان نے اپنے ہاتھ پھیلا رکھے تھے۔ وہ کسی سحر زدہ معمول کی طرح اُن کے بازوؤں میں چھپ گیا، پھر جیسے سوتا پھوٹ پڑے، ایسا گرج گرج کے رویا کہ سبھی کی آنکھیں جلنے لگیں۔ اندر سے منیر علی، خانم، زہرہ سلمٰی، مجّو میاں، ارشد اور نیساں سبھی آ گئے تھے۔ نیساں اور بڑی ہو گئی تھی۔ مجھے دیکھا تو دیوانی سی ہو گئی، اُسے دیکھنے کو میرا دل بہت چاہتا تھا۔ پہاڑوں میں کتنی ہی بار مجھے اُس کا خیال آیا تھا اور کبھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ نیساں میرے ساتھ ساتھ ہی چل رہی ہے۔ کرشنا جی کہتے تھے کہ آدمی کبھی کہیں اکیلا نہیں جاتا، اُس کے ہم سفر بہت سے لوگ ہوتے ہیں، جنھیں وہ چھو نہیں سکتا پر جنھیں دیکھتا رہتا، جن سے باتیں کرتا رہتا ہے۔ نیساں کی پرچھائیں بھی جیسے میرے ساتھ ہی گئی تھی اور مجھے ایک ہی بات ستاتی رہتی تھی کہ کہیں وہ حویلی میں آ کے پچھتاتی نہ ہو، کوئی اُس سے ناراض نہ ہو گیا ہو، چھپکے چھپکے روتی نہ ہو۔

اُس کا رنگ اور کھل گیا تھا، شہابی شہابی، ایسی بدلی ہوئی لگ رہی تھی جیسے میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ میرے پاس دوڑی ہوئی آئی اور قریب آ کے ایک لمحے کو سہم کے رُک گئی۔ "بابر بھائی!" وہ سسکاری بھرتے ہوئے بولی۔ دوسرے ہی لمحے اُٹھا میں نے اُسے کھینچ کے اپنے پہلو میں سمیٹ لیا۔ میں اُسے سنبھالتا نہیں تو شاید وہ اپنے پیروں پر تھمی نہ رہتی، صرف ایک بار اُس نے منہ اُٹھا کے مجھے بسورتی نظروں سے دیکھا اور اپنا چہرہ میرے شانے میں چھپا کے بلکنے لگی، میں اُسے روکنا چاہتا تھا کہ دوسری طرف سے سفید ساڑی میں ملبوس خانم میرے پہلو میں آ کے کھڑی ہو گئی تھی۔ وہی رنگ روپ، جھیل جیسی آنکھوں میں موتی لرزتے ہوئے۔ خانم کی عمر بڑھتے ہوئے وقت کے ساتھ کچھ گھٹ رہی تھی۔ چہرے پر نور سا بکھرا ہوا تھا۔ میں نے بڑھ کے اُس کے کندھے پر اپنا ماتھا ٹکا دیا۔ خانم کی نرم و نازک لمبی لمبی اُنگلیاں جن سے وہ ستار بجایا کرتی تھی، میری گردن پر منڈلانے لگیں۔ اُس کے پیچھے زہرہ سمٹی کھڑی تھی، منیر علی لپکتے ہوئے میری جانب بڑھے، وہ دونوں پیچھے ہٹ گئیں۔

پھاٹک اور عمارت کے درمیان کھلے کشادہ حصّے پر سبزہ اُگا دیا گیا تھا، احاطے اور عمارت کی دیواروں کے ساتھ والی کیاریوں میں رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے، اندر حویلی میں اب کوئی موجود نہیں رہا ہوگا۔ تمام ملازم بھی وہیں آ گئے تھے۔ دیر تک کسی کو ہمارے کھڑے رہنے کا احساس نہیں ہوا، کوئی کبھی میری طرف بڑھتا، کبھی بجھل کی طرف۔ جہاں گیر کو ابا جان کی آغوش میں مسلسل سسکتے دیکھ کے پیرو نے اُسے اُن سے الگ کر کے اپنی چھاتی سے چمٹا لیا تھا۔ خانم کے ٹوکنے پر بجھل نے اندر جانے کے لیے قدم بڑھائے تو لنگڑانے لگا۔ ایک بار پھر سبھی اُس کے گرد جمع ہو گئے۔ زرّیں نے نظر بھر کے دیکھا تو بجھل نے ہنستے ہوئے کہا۔ "کچھ نہیں رے، ذرا چوٹ لگ گئی ہے۔" وہ جلد ہی زرّیں کے کندھے کا سہارا لیے بدلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

مردانہ حصّے کے پہلے بڑے کمرے کا رنگ ہی بدلا ہوا تھا۔ فرش پر قالین، دیواروں کے ساتھ آرام کرسیاں، چھت کے بیچ میں ایک چھوٹا فانوس لٹکا ہوا۔ سامنے کی دیوار کے ... ایک بڑا تخت بچھا ہوا تھا۔ بجھل وہیں جا کے بیٹھ گیا۔ ... آئے چند ہی منٹ ہوئے ہوں گے کہ زرّیں نے ایک ... کے بجھل کے آگے رکھ دیا، نیساں ایک ملازمہ کے ساتھ ...

... پیالیاں رکھ گئی۔ ہم نے ناشتہ نہیں کیا تھا۔ حویلی میں بھی ... ابھی سو کے اُٹھے ہوں گے۔ زرّیں، نیساں، زہرہ، خانم، سلمٰی، مجّو میاں سبھی بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ زرّیں کے اتنا ... بجھل نے ہم سب کو نہانے اور کپڑے بدلنے کا مشورہ دیا۔ مارٹی ... زورا جھجکی رہے تھے۔ سب کے کپڑے میلے ہو گئے تھے اور ... کے پاس دُھلے ہوئے کپڑے تھے بھی نہیں مگر بجھل کے ... نے پر سبھی اُٹھ گئے۔ منیر علی ابا جان کو بھی ایک طرف لے گئے۔ ... کر کے جب سب واپس مردانے میں آئے تو سبھی نئے کپڑے ... ہوئے تھے جیسے اُنھیں معلوم تھا کہ ہمارے ساتھ اور لوگ ... ہوں گے۔ زرّیں نے میرے اور بجھل کے لیے کپڑے سی کے ... رکھے ہوں گے، پیرو اور زورا کو بجھل کے جوڑے ٹھیک آ ... ہوں گے اور مارٹی کو میرے کپڑے، ابا جان پہلے ہی ... کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ کرتوں اور پاجاموں میں چھوٹے ... سائز کا اتنا فرق محسوس نہیں ہوتا، مارٹی کو میں نے پہلی بار ... لباس میں دیکھا تھا۔ ململ کے کڑھے ہوئے کرتے اور چھوٹی مُہری ... پاجامے میں وہ عجیب سا لگ رہا تھا، بانکا سا، خود کو بار ... دیکھتا تھا۔ وہیں تخت پر ایک لمبا دسترخوان بچھا دیا گیا۔ اتنی ... میں نہ جانے اُنھوں نے کیا کیا تیار کر لیا تھا۔ قیمہ، پراٹھے، آلو ... ترکاری، پوریاں، حلوہ، مکھن، ٹوسٹ، بسکٹ اور چائے۔ دعوت ... کا سماں تھا، سب چیزیں دسترخوان پر چُن دی گئیں تو بجھل نے ... نیساں وغیرہ کو بھی ہمارے ساتھ بیٹھ جانے کو کہا۔ ابا جان ... کو کچھ نہیں تھا۔ پیرو، زورا اور مارٹی سے اُنھوں نے پردہ پہلے ... نہیں کیا تھا کیونکہ وہ بجھل کے ساتھ آئے تھے اس لیے ... نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی ہوگی۔ زہرہ بھی نیلی چادر ... پر ڈالے وہیں موجود تھی، نیلی چادر میں اُس کے چہرے کا ... جیسا رنگ دمک رہا تھا، منیر علی اور ارشد بھی پہلے سے ... نظر آتے تھے، ارشد بالکل تن درست معلوم ہوتا تھا، مجھے یہی ... تھا کہ فیض آباد کی آب و ہوا اور ماحول سے منیر علی اُکتا تو ... گئے ہوں گے۔ خانم، زرّیں، نیساں یا جہاں گیر کی کوئی بات ... کے لیے ناگوارِ خاطر ہو سکتی تھی، اپنا گھر بار یاد آتا ہو گا اب ... سے لگتا تھا جیسے وہ برسوں سے یہیں رہ رہے ہوں، اسی ... میں۔ مردانے میں سب سے اُونچی آواز اُنھی کی تھی، سب ... بادا جان کہتے تھے، خانم بھی۔

بجھل کی ہدایت پر تقریباً سارے بکسے لائبریری کے نیچے ... ہوئے تہہ خانے میں رکھ دیے گئے۔ ابا میاں نے اُنھیں کھول ... دوبارہ دیکھنے کا تجسس ظاہر نہیں کیا، اُن پر تو جیسے سکوت سا چھا گیا تھا۔ سر اُٹھا کے سب کو تکنے لگتے اور کسی کے مخاطب ہونے پر چونک جاتے، نہ جانے کیا سوچ رہے تھے مگر چہرے سے کوئی خاص بے چینی ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ بجھل نے نام لے لے کے پیرو، زورا، مارٹی کو اُن سب سے ملوایا تھا۔ زرّیں بجھل سے کچھ کہنے کے لیے سامنے آئی تو وہ پیرو سے کہنے لگا۔ "یا بنی گیتا ہے دادا!"

"اپنی جان ہے بجھل بھائی!" پیرو نے دونوں ہاتھوں سے زرّیں کا چہرہ تھام لیا اور ٹکٹکی باندھ کے اُسے دیکھتا ہوا بھرّائی ہوئی آواز میں بولا۔ "اپن بجھل بھائی کا غلام ہے، اپنی گیتا بھی ایک دم تیرے مانک ہے، بالکل ایسا ہی گڑیا جیسا۔"

"کہاں ہیں وہ؟" زرّیں نے زیرِ لب پوچھا۔

"ابھی اُس کو اِدھر بلائے گا یا تم کو ہی اُدھر لے جائے گا، کیوں بجھل بھائی! گیتا اُس کو دیکھ کے کتنا خوش ہوئے گا۔"

"راج کماری کو اِدھر ہی بلا لو، رانی کو بھی۔"

"ہاں ہاں یہیں بلا لیجیے۔" زرّیں چہک کے بولی۔

"اندر آ کے تو پھر وہ واپس جانے کو نہیں بولیں گی۔"

"ٹھیک ہے، پھر وہ ہمارے ساتھ ہی رہیں گی۔"

"ارے بجھل بھائی!" پیرو ہنس کے بولا۔ "اِس کا دل بھی تمھارے جیسا ہے۔"

"اِس کا دل کسی نے نہیں دیکھا دادا! پاتال سے نیچے ہے۔" بجھل نے سانس بھر کے کہا۔ "بغیر ہتھیار کے لڑتی ہے۔"

"لوگ باگ جیسا بولتا ہے، اپنے کو ایسا ہی لگتا ہے، اُوپر والے نے اِس کو اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔"

زرّیں شرما کے بھاگ گئی۔

دوپہر ہونے سے پہلے جامو کا چھوٹا بھائی اور فیض آباد کے اڈّے کا اُستاد جمرو ڈگمگاتے قدموں سے مردانے میں داخل ہوا اور بجھل کے گلے لگ کے بین کرنے لگا۔ وہ اکیلا نہیں آیا تھا، اڈّے کے اور بھی لوگ اُس کے ساتھ تھے۔ جمرو کو کلکتے میں ہونے والی ہر بات کا علم تھا، کانتے نے بتایا تھا کہ وہ جیل میں اُس سے ملنے کے لیے آیا تھا مگر کانتے نے اُسے لوٹا دیا۔ پچھلی مرتبہ یہیں اسی جگہ کبن خاں اور جمرو میں کسی عورت پر جھگڑا ہو رہا تھا۔ دونوں بجھل کو اپنی اپنی کہانی سنا رہے تھے مگر دونوں ایک دوسرے پہ جان چھڑکتے تھے۔ جامو نے کبن خاں سے کہا تھا کہ وہ گاہے گاہے لکھنؤ سے آ کے فیض آباد کے اڈّے کو دیکھتا رہے اور جمرو کو اُلٹی سیدھی حرکتوں سے باز رکھے۔ ابھی جمرو نے کبن خاں ہی کے بارے میں سنا تھا، اُسے معلوم نہیں تھا کہ ہم اُس کے ساتھ چلے بڑھے ہوئے منّن میاں کو واپس نہیں لا سکے

ہیں۔ نجّھل کو کسی نہ کسی لمحے اُسے یہ بتانا ہی تھا۔ اُس کے آنے پر منیر علی اباجان کو دوسرے کمرے میں لے گئے تھے۔ کچھ دیر بعد میں بھی وہاں سے اُٹھ گیا۔ مجھ سے جمرو کی لال آنکھیں دیکھی نہیں جاتی تھیں۔ جمرو کو آئے دیر نہیں ہوئی تھی کہ زرّیں نے شیر سے کہہ کے اُسے اندر بُلوا لیا اور جلد سے جلد کسی ڈاکٹر کو لے آنے کو کہا۔ پہلے بھی ایک بار جمرو میرے لیے فیض آباد کے ایک مشہور ڈاکٹر کو لایا تھا۔ زرّیں ہی نے اڈّے پر کہلایا ہوگا کہ ہم لوگ حویلی میں ہیں۔ زرّیں کی بات جمرو کے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی، وہ فوراً باہر چلا گیا اور آدھ گھنٹے کے اندر واپس آیا تو ڈاکٹر اُس کے ساتھ تھا۔

زرّیں نے نجّھل کا پلنگ وہیں مردانے میں لگوا دیا تھا اور اُسے اُٹھنے سے بالکل منع کر دیا تھا۔ نجّھل نے پھر وہاں سے جنبش نہیں کی، ضرورتاً ہی اُٹھا ہو تو اُٹھا ہو۔ زرّیں کے کہنے پر دوپہر کا کھانا جمرو نے ہم لوگوں کے ساتھ ہی کھایا، پھر اڈّے کے تمام لوگوں کو لے کے چلا گیا۔ پیرو، زورا، مارٹی اور اباجان کے لیے الگ الگ کمروں کا انتظام کیا گیا تھا لیکن وہ تینوں ایک ہی کمرے میں آ گئے۔ منیر علی، اباجان کے ساتھ سائے کی طرح لگے ہوئے تھے، جہاں گیر بھی اُنھی کے ساتھ تھا۔ شام کو جمرو، پیرو اور زورا کو اڈّے پر لے گیا۔ مارٹی میری وجہ سے وہیں رہ گیا تھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا تھا۔ رات کو نجّھل کو پھر بخار آ گیا۔ زرّیں نے اُسے گرم دودھ کے ایک کٹورے اور دواؤں کے سوا کچھ کھانے کو نہیں دیا اور رات گئے تک سرھانے بیٹھی اُس کا سر دباتی رہی۔

تین دن تک وقت کا کچھ پتہ ہی نہیں چلا، کوئی مصروفیت بھی نہیں تھی مگر ایک دوسرے کو دیکھنے اور باتیں کرنے ہی سے کسی کو فرصت نہیں ملی تھی۔ اباجان بھی جیسے ساری دُنیا سے بے خبر ہو گئے تھے۔ دوسری صبح وہ منیر علی کے ساتھ زمینوں پر چلے گئے۔ رات کو لوٹے تو منیر علی انھیں اندر لے گئے۔ میں نے اندر جا کے دیکھا تو ایک طرف سلمہ اُن کے پہلو میں بیٹھی تھی، دوسری طرف نیساں۔ دونوں کی زبانیں چہک رہی تھیں۔ وہ کبھی نیساں کی بات سُننے، کبھی سلمہ کی، کبھی جہاں گیر بیچ میں بولنے لگتا۔ زہرہ اور خانم بھی وہیں موجود تھیں۔ منیر علی کے قہقہے گونج رہے تھے۔ مجھے خدشہ ہوا کہ اباجان کا غصہ تیز ہے، نیساں اور سلمہ کوئی گستاخی نہ کر بیٹھیں لیکن اباجان اُن کے درمیان بچے بنے بیٹھے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ حویلی میں دو ایک پہر ٹھیرنے کے بعد واپس جانے کے لیے اصرار کریں گے، فرخ، فریال، فارعہ اور اکبر کے پاس۔ چار دن تک اُنھوں نے اُن کا ذکر ہی نہیں کیا اور نہ کہیں جانے کا کوئی اشارہ کیا۔ کئی مرتبہ میں نے جہاں گیر کو اُن سے چپکے چپکے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ جہاں گیر نے اُن سے ضرور پوچھا ہوگا۔ میں جہاں گیر سے معلوم کر سکتا تھا لیکن نہ جانے کون سی بات مجھے روک لیتی تھی۔ اس دوران اباجان کو زرّیں، خانم، منیر علی اور میرے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو گیا ہوگا۔ وہ، جہاں گیر اور منیر علی آپس میں صرف موسم کی باتیں تو نہیں کرتے رہتے ہوں گے۔ اباجان کے چہرے سے طویل سفر کے آثار مٹ رہے تھے اور اُن کے ہونٹوں پر دھیمی دھیمی مسکراہٹ رچنے لگی تھی۔ چار دن تک اُنھوں نے تہہ خانے کا سامان بھی نہیں ٹٹولا تھا۔

پیرو، زورا اور مارٹی کو بھی شاید واپسی کی جلدی نہیں تھی، وہ یکسر بدلے ہوئے تھے۔ ارشد زیادہ تر اُنھی کے ساتھ رہتا تھا۔ نیساں، سلمہ، مجو میاں، زہرہ، خانم ہمہ وقت اُن کے اردگرد رہتی تھیں یا پھر وہ جمرو اور اڈّے کے آدمیوں میں گھرے رہتے تھے۔ زرّیں تو مستقل نجّھل کے پلنگ سے بندھ گئی تھی حالانکہ اب نجّھل کی طبیعت نسبتاً بہتر تھی۔ زخم سکڑنا شروع ہو گیا تھا، بخار بھی پھر نہیں آیا تھا۔

حویلی میں ایک دُھوم سی مچی ہوئی تھی۔ جسے دیکھو بھاگا بھاگا پھر رہا ہے۔ نیساں، زہرہ باورچی خانے میں کھانا پکا رہی ہیں، سلمہ سبزی کاٹ رہی ہے۔ خانم ملازماؤں سے صفائی کرا رہی ہیں۔ بستروں کی چادریں بدلوا رہی ہیں۔ صحن میں جھاڑ کاڑ کروا رہی ہیں کبھی شربت آ رہا ہے کبھی چائے۔ صبح و شام انواع و اقسام کے کھانے پک رہے ہیں۔ پکانے کے دوران حسبِ معمول نیساں چہکتی رہتی تھی، بابر بھائی! بریانی کیسی ہے! اُلٹے پلٹے کیسے ہیں؟ جس چیز کے بارے میں وہ پوچھتی تھی، اس کا مطلب تھا کہ اس نے پکائی ہے۔ میں اُسے چڑانے کے لیے کہہ دیتا "بہت بے مزہ ہے" وہ میرے سامنے سے جھٹ پلیٹ اُٹھا لیتی اور صورت رُمسی ہو جاتی۔ جب تک میں اُس کے ہاتھ سے پلیٹ واپس نہ لے لیتا، اُس کے گالوں کی سُرخی واپس نہ آتی۔ آتے ہی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ جہاں گیر نے اچھے نمبروں سے میٹرک کر لیا ہے اور فرسٹ ایئر کی تیاری کر رہا ہے۔ ارشد بھی ایم اے کر رہا ہے۔ وہ جہاں گیر، نیساں، سلمہ، مجو میاں کو روزانہ کئی گھنٹے پڑھاتا اور منیر علی کے ساتھ زمینوں پر نکل جاتا۔ اُس کے علاوہ دو اور ٹیوٹر بھی انھیں پڑھانے آتے تھے۔ نیساں نے مجھے بتایا کہ خانم اب اُسے زیادہ نہیں ڈانٹتی ہیں، وہ کبھی کبھی کمرے میں بند ہو کے ستار بجا لیتی ہیں۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے منیر علی کا لڑکا تنویر علی

علی گڑھ سے آ جاتا ہے۔ وہ دو تین دن سے زیادہ نہیں رہتا۔ مگر اُس کے آ جانے سے بہت رونق ہو جاتی ہے۔ زرّیں بہن کتابیں پڑھتی رہتی ہے یا وہ اور خانم مل کے گھر سجاتی رہتی ہیں۔ کبھی زرّیں، خانم سے فرمائش کر کے ستار سنتی ہے مگر اُن دونوں کے سوا کوئی نہیں ہوتا۔ نیساں کہتی تھی کہ زرّیں باجی ہر وقت کھوئی کھوئی سی رہتی ہیں، بعض اوقات تو اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلتیں۔ رات کو دیر تک باغ میں اکیلی بیٹھی رہتی ہیں لیکن جب بھی باوا (منیر علی)، یا خانم اُن کے پاس جا کے طبیعت پوچھتے ہیں، گھبرا جاتی ہیں جیسے چوری پکڑ لی گئی ہو۔ باوا جب بھی باہر جاتے ہیں تو وہ دروازے تک اُنھیں رُخصت کرنے آتی ہیں اور جب وہ لوٹتے ہیں تو پہلے اُنھی کو پوچھتے ہیں۔

اتنے دن ہو گئے تھے، زرّیں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اُس رات میں کمرے میں آ کے لیٹا ہی تھا کہ زرّیں کی خوشبو مجھے دروازے پر محسوس ہوئی، خوشبو بھی چاپ کی طرح ہوتی ہے۔ کوئی آہٹ نہیں ہوئی تھی، وہ دبے پاؤں دروازے پر آئی تھی لیکن مجھے محسوس ہو گیا تھا کہ کوئی آیا ہے اور یہ وہی ہو سکتی ہے۔ میں ایک دم اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ "آؤ، وہاں کیوں کھڑی ہو؟ اندر آ جاؤ۔" میں نے مضطرب لہجے میں کہا۔

وہ جھجکتی سمٹتی اندر آئی۔ لمبے بال کُھلے ہوئے تھے اور دوپٹے سے لٹیں جھانک رہی تھیں۔ ہرا دوپٹا اُس کے سُرخ و سفید رنگ پر کھلتا تھا۔ میں اُسے کن انکھیوں ہی سے دیکھ رہا تھا، اب اُس کا سراپا میری کھلی آنکھوں کے سامنے تھا۔ آڑا پاجامہ اور کرتا اُس کا خاص لباس تھا۔ اس میں اُس کا نکلتا ہوا قد ابھر کر آتا تھا۔ صرف چوڑیاں کلائیوں میں تھیں یا کانوں میں بالے۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی نئی زرّیں کو دیکھ رہا ہوں۔ "بیٹھ جاؤ۔" میں نے بھری ہوئی آواز میں کہا۔ اُس سے کہنے کو کوئی بات ہی میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ وہ سر جھکائے بیٹھ گئی تھی، اچھا ہوا جو اُس نے سر جھکا لیا تھا۔ مجھے اُسے دیکھنے کا خوب موقع مل گیا۔ "اباجان کو دیکھا؟" میں نے یوں ہی پوچھ لیا، مجھے کچھ نہ کچھ تو کہنا تھا۔

"بالکل تمھارے ہی اباجان ہیں۔" وہ مسکرا کے بولی۔

"کیا مطلب؟" میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"میرا مطلب ہے تمھارے جیسے۔" وہ تیزی سے بولی۔ "اُن کا چہرہ، ناک نقشہ تم سے اور جہاں گیر سے کتنا ملتا ہے، وہی لمبی ناک، اونچا قد، گہری بھویں، با چھا تو بہت ہی ملتا ہے۔"

"تمھیں انھیں ہمارے ساتھ دیکھ کے تعجب تو بہت ہوا ہوگا۔"

"نہیں۔" وہ اعتماد سے بولی۔ "مجھے یقین تھا ایک دن وہ ضرور مل جائیں گے۔"

"تمھاری بات ہوئی؟" میں نے آہستگی سے پوچھا۔

"ہر وقت ہی ہوتی ہے۔"

"کیا بات کرتے ہیں؟"

"بہت خوش ہیں، بہت ہی خوش۔"

"میرے بارے میں کچھ کہتے ہیں؟" میں نے تذبذب سے پوچھا۔

"پوچھتے رہتے ہیں۔"

"کیا، کیا پوچھتے رہتے ہیں۔"

"تم سامنے نہیں ہوتے تو انھیں گھبراہٹ سی ہونے لگتی ہے۔"

"ہُوں۔" میں نے ہنکاری بھری اور چپ ہو گیا۔

"تم تو ایسے معلوم کر رہے ہو جیسے تمھاری اُن سے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ تم انھیں دیکھتے بھی جیسے نہیں ہو۔"

"سچ پوچھو تو ایسا ہی ہے، اتنے دنوں سے وہ ساتھ ہیں اور میری اُن سے کبھی ایک آدھ جملے سے زیادہ بات نہیں ہوئی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، اُن سے کیا کہوں، اُن کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوگا۔"

"تمھیں اُن کا خیال رکھنا چاہیے۔"

"مجھ سے اُن کے سامنے بولا ہی نہیں جاتا۔"

"وہ تم سے بہت سی باتیں کرنے کے آرزومند ہوں گے۔"

"ہو سکتا ہے لیکن زرّیں! مجھے ..... مجھے اُن سے ڈر لگتا ہے۔" وہ کِھل کھلا کے ہنس پڑی۔ کمرے میں جیسے ستار سے جھنجھنا گئے۔

"میں تم سے بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"تمھیں تو شاید سبھی سے ڈر لگتا ہے۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"ہاں زرّیں!" میری آواز ڈوب گئی۔ "شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔"

"یا شاید تم اپنے آپ سے ہی اتنی باتیں کر لیتے ہو کہ پھر کسی اور سے کچھ کہنے سُننے کو دل نہیں کرتا ہوگا۔"

میں اُس کی صورت دیکھنے لگا اور میرا جی چاہا کہ اپنا منہ کھسوٹ لوں۔ آتے ہوئے میں سوچ رہا تھا، اب کے زرّیں سے ڈھیر سی باتیں کروں گا۔ اُس سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ زرّیں اپنے دل میں سمجھتی ہوگی کہ میں اُس پر اعتبار نہیں کرتا یا اُسے دُور سمجھتا ہوں۔ ہر بار فیض آباد آتے وقت میں ایسا ہی سوچتا تھا اور ہر بار میری زبان پر فالج سا گر جاتا تھا۔ "زرّیں! تم، تم نہ جانے کیا سوچتی ہوگی، میں جانتا ہوں، اچھی طرح جانتا ہوں۔" میں نے جذباتی انداز میں کہا۔

"تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟" وہ سراسیمگی سے بولی۔

"میں ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں، میں تمھیں کیا بتاؤں زرّیں۔"

"میں سمجھتی ہوں۔" اُس نے مجھے کچھ کہنے نہیں دیا۔
"کیا سمجھتی ہو؟"
"مایوسی گناہ ہے، ایک دن ضرور ایسا آئے گا۔" وہ وثوق سے بولی۔ "جسے تم اپنا کہہ سکو۔"
"شاید کبھی نہ آئے۔" میں نے شکستہ لہجے میں کہا۔
"اللہ میاں نے چاہا تو ضرور آئے گا۔"
"کوئی اس کے سوا کہہ بھی کیا سکتا ہے۔"
"اباجان کے مِل جانے کے بعد ایسی بات نہیں کرنی چاہیے۔"
"شاید میں بہت تھک گیا ہوں زرّیں!" میں نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "اب میرا دل کچھ اور چاہتا ہے۔"
"کیا چاہتا ہے؟"
"مرجانے کو چاہتا ہے، مجھے سنکھیا دے دو۔"
"تم نے پھر ایسی باتیں شروع کر دیں۔" وہ بے چینی سے بولی۔
"میں سب کو بہت دُکھ دیتا ہوں، تم سمجھتی ہو، مجھے اِس کا احساس نہیں ہے۔ میری وجہ سے کتنے لوگ پریشان رہتے ہیں، مر تک جاتے ہیں۔"
"مرنا تو سب ہی کو ایک دن ہے، جس کا وقت آئے گا، اُسے کون روکے گا۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو کسی کے لیے مر تک جاتے ہیں۔"
"جو چاہے کہہ لو اور آدمی خود کو کس طرح تسلی دے۔"
"تم بھی تو دوسروں کے لیے خود کو داؤ پر لگا دیتے ہو، دوسرے بھی تو تمھیں تنگ کرتے ہیں، وہ نہیں سوچتے ہوں گے کہ مرجائیں تو شاید تمھیں کچھ سکون مل جائے، تمھارا بوجھ کچھ کم ہو جائے۔"
"زرّیں!" میری آواز حلق میں پھنس گئی۔
"سبھی تمھارے لیے دعائیں کرتے ہیں۔" وہ ڈگمگاتے ہوئے لہجے میں بولی۔
"لیکن میں تو کسی کے لیے کچھ بھی نہیں کرتا، میں نے تمھارے لیے کیا کیا ہے۔ میرا جی تمھارے لیے بہت کچھ کرنے کو چاہتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ تم ہر وقت خوش رہو۔ مجھے معلوم نہیں کہ تم یہاں کس طرح رہتی ہو۔ تمھیں میرا، میرا اتنا خیال ہے۔ زرّیں! تم مجھے بہت یاد آتی تھیں۔ کاش! کاش میں ہمیشہ تمھارے پاس رہتا اور تمھارے ماتھے پر ایک شکن بھی نہ آنے دیتا۔ میں تمھارے لیے ..." میں نہ جانے کیا کیا کہہ گیا تھا۔ اُس کی لبریز آنکھیں دیکھ کے میری زبان ٹھٹھر گئی۔ اُس کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔
میں پلنگ سے اُٹھ کے بے اختیار اُس کے پاس پہنچ گیا اور میں نے اُس کے شانے تھام کے اُسے اُٹھا لیا، زرّیں کو چکر سا آگیا تھا، میرے ہاتھ بھی کپکپانے لگے تھے۔ میں نے اُسے جلدی سے پھر کرسی پر بٹھا دیا۔ اُس کا سینہ دھڑک رہا تھا۔ میں فرش پر اُس کے پیروں کے نزدیک بیٹھ کے ہانپنے لگا اور پتہ نہیں مجھے کیا ہوا، میرا سر اُس کے پیروں پر جھک گیا۔ میں اُس کے پیروں پر اپنا سر رکھ کے رونا چاہتا تھا کہ اُس نے پاؤں کھینچ لیے اور کرسی سے اُٹھ کے خود بھی میرے مقابل فرش پر بیٹھ گئی اور گھٹنوں میں منہ چھپا کے سسکنے لگی۔ میں بیٹھا اُسے تکتا رہا۔ میرا سارا جسم بے جان سا ہو گیا تھا۔ بے شمار لمحے گزر گئے ہوں گے۔ زرّیں کو دیکھنے کوئی بھی اِس طرف آسکتا تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ "مت، زرّیں! خدا کے لیے مت رو۔" میں نے بدقت کہا۔
"تمھیں رُلانا مقصود نہیں تھا۔ میں تو تمھیں بتانا چاہتا تھا کہ تم ... تم کہیں ... کہیں مجھے ..."
"کچھ مت کہو، مجھے معلوم ہے۔" وہ ٹوٹی ہوئی آواز میں بولی۔
"میں نے سوچا ہے صرف ایک بار اور جاؤں گا، پھر یہیں آجاؤں گا۔"
"خدا نے چاہا تو تمھیں پھر جانے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی اور اگر خدانخواستہ تم یوں ہی واپس آ گئے تو میں تم سے دوبارہ جانے کو کہوں گی۔ کیا اِس سے بڑا کوئی اور مقصد ہو سکتا ہے؟"
"زرّیں! تم، تم کتنی ..." میرے ہونٹ بھینچ کے رہ گئے۔
"کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟" وہ سادگی سے بولی۔
"تم ٹھیک کہتی ہو مگر زمین بہت بڑی ہے۔"
"آدمی کا حوصلہ زمین سے بڑا ہوتا ہے۔ کاش میں بھی تمھارے ساتھ چلتی۔"
"ضرور لے چلتا، تمھیں اندازہ نہیں کہ کہاں کہاں جانا پڑتا ہے۔ گلیوں میں، بازاروں میں، کیسے کیسے گلی کوچوں میں، کبھی اِس دروازے، کبھی اُس دروازے، صبح یہاں، شام وہاں، بے منزل۔"
"مجھے اندازہ ہے لیکن جلدی جلدی گھوم کر واپس آسکتے ہو۔"
"ہر بار یہ خیال آتا ہے کہ یہاں تک آ گئے ہیں تو اور آگے دیکھ لیں، اِسی میں وقت گزر جاتا ہے۔ کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔"
وہ اپنی گونجتی، کھنکتی آواز میں مجھے تسلیاں دیتی رہی۔ میری خاموشی پر اُس نے موضوع بدل دیا اور خانم، نیساں، زہرا وغیرہ کی باتیں کرنے لگی۔ اِس طرح کبھی اُس نے مجھ سے اتنی باتیں نہیں کی تھیں۔ کمرے میں جیسے کوئی مینا چہچہا رہی تھی۔ مجھے سب عجیب سا لگ رہا تھا۔ وہ مائیوں میں بیٹھی دُلھن کے مانند سمٹی بیٹھی تھی اور اُس کی پلکیں پٹر پٹر جھپک رہی تھیں۔ گھڑی نے دو بجائے تو وہ چونک اُٹھی۔ "میں اب جاتی ہوں۔"
"کچھ دیر اور بیٹھو۔"
"باباکی دوائی کا وقت ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے، ٹھیک چھ چھ گھنٹے بعد انھیں گولیاں دیتے رہنا چاہیے، تو اتر میں فرق نہیں آنا چاہیے۔"
"میں تمھیں پہنچا آتا ہوں۔"
"اب تم آرام کرو، رات بہت ہو گئی ہے۔"
"رات تمھارے لیے نہیں ہوئی؟"
"مجھے دن میں کون سا کام ہوتا ہے۔"
"اور میں تو یہاں دن بھر پھاوڑا چلاتا رہتا ہوں۔"
اُس نے مسکراتی، جھلملاتی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور دروازے تک جاتے جاتے بولی۔ "دودھ پی لینا۔"
دالان میں چاندنی چمک رہی تھی اور خنک ہوا چل رہی تھی۔ مردانے تک وہ میرے ساتھ چلتی رہی۔ سارے کمرے بند تھے۔ میں نے سوچا، کہوں، تجمل کو دوا پلا کے پھر واپس آجائے، مجھے بہت سی باتیں یاد آرہی ہیں اور نیند بھی نہیں آرہی۔ تجمل کے کمرے کے دروازے پر اُس نے ہلکی سی تھپکی دی اور پلٹ کے مجھے سرگوشی میں شب بخیر کہتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔
صبح ناشتے کے بعد ہم سب تجمل کے پاس چوکی پر بیٹھے تھے۔ تجمل نے اپنا پیر کھول رکھا تھا اور دبا دبا کے دیکھ رہا تھا۔ ورم بھی مُرجھا گیا تھا۔ اتفاق سے اُس وقت مردانے میں، پیرو، زورا، رتی، اباجان اور میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ چار دن کی چھٹی کے بعد ارشد جہاں گیر کو پڑھانے کے لیے لائبریری میں چلا گیا تھا، منیر علی بھی تھوڑی دیر پہلے کسی کام سے اُٹھ کے اندر چلے گئے تھے۔ تجمل نے اباجان سے کہا۔ "آپ آپ چلے جاؤ بابا!" وہ اپنا پیر ٹھونکتے ہوئے بولا۔ "ابھی اِدھر دیکھ لو، سب ٹھیک ہے۔ بٹیا جانے دیتی تو میں بھی آپ کے ساتھ ہو جاتا پر پیرو دادا تو ساتھ ہے۔"
میرے کان کھڑے ہو گئے۔
"اپن کا ایسے چھوٹنے کو جی نہیں بولتا۔" پیرو نے اُداسی سے کہا۔ "بمبئی سے نکلے ہوئے دن ہو گئے دادا! وہ تمبوڑا ماچھی بھی دُکھ گیا ہوگا، گیتا اور رانی بھی دروازہ دیکھتی ہوں گی۔"
"ایسا تو اپن بھی سوچتا ہے تجمل بھائی۔"
"پھر آجانا۔"
"ٹھیک ہے، جیسا تم بولتا ہے۔"
"لیکن مجھے بھی آپ لوگوں سے کچھ کہنا تھا۔" اباجان سنتے ہوئے بولے۔
"بولو بابا!" پیرو نے اضطراب سے کہا۔
"مناسب لفظ نہیں مل رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا، کس طرح کہنا چاہیے۔"
اباجان کی زبان اٹک رہی تھی۔ "یہاں وہ سب لوگ، جامو وغیرہ بھی موجود نہیں ہیں لیکن بہرحال آپ تو یہیں ہیں، خدا کے لیے کچھ اور مت سمجھیے۔ میری درخواست ہے کہ ..."
"بولو بابا! ایسی کیا بات ہے۔" تجمل تردد سے بولا۔
"میری خواہش ہے کہ اُن ..." اباجان کہتے کہتے پھر رُک گئے۔ "میری خوشی اِسی میں ہو گی اگر آپ۔" چند لمحوں کے توقف سے وہ دھیمی آواز میں بولے۔ "اگر اِن پتھروں میں بھی شریک ہوں۔"
"بس بس بڑے صاحب!" تجمل کا قہقہہ مردانے میں گونجنے لگا۔ "دادا! سُنتے ہو، بابا کیا بولتے ہیں۔"
"سُنتا ہے تجمل بھائی!"
اباجان کے چہرے پر سُرخی چھا گئی۔ "آپ نے انکار کیا تو میرے لیے بھی یہ پتھر رہیں گے۔ یہ بہت ہیں، پشتوں تک چلیں گے اور ختم نہیں ہوں گے۔ میں انھیں رکھ کے کیا کروں گا، میں اکیلا انھیں اتنی بڑی تعداد میں لا بھی نہیں سکتا تھا، یہ سب آپ ..."
"رہنے دو بابا!" تجمل نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ابھی بس کرو۔"
"انکار کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔"
"نہیں آئے گی بابا! نہیں آئے گی۔"
"آخر آپ کو عذر کیوں ہے؟"
"ابھی کیا بولیں بابا!" تجمل نے ٹھنک کے کہا اور چاقو نکال کے بولا۔ "اپنے کو اِس سکے کی لت پڑ گئی ہے۔ یہی اپنا دھن ہے۔"
اباجان متذبذب نظروں سے تجمل کا چہرہ دیکھنے لگے۔
"ہم تو اور آپ کو دیکھنے گیا تھا بابا! گیتا کی قسم لے لو، اپنے من میں کوئی چکر وکر نہیں تھا۔"
"مجھے علم ہے لیکن کیا یہ اچھا نہیں ہوگا کہ ہم سبھی اِس میں شریک ہوں کیونکہ سب اِس میں برابر کے شریک رہے ہیں۔ شاید وہیں میں نے آپ سے کہا تھا کہ مجھے اُن سے زیادہ اپنے کھوئے ہوئے کو دیکھنے کی جستجو تھی مگر یہ جستجو بھی کسی سبب سے تھی۔ بے شک سب سے بڑا سبب یہی سب کچھ تھا لیکن یقین کیجیے، میرے دماغ میں اتنا کچھ نہیں تھا، نہ میری استطاعت تھی کہ میں اتنا کچھ لا سکوں۔ یہ دُنیا کے بیش قیمت نوادر ہیں۔ مجھے تھوڑی بہت شُدبُد ہے مگر اِس کی صحیح قیمت کا اندازہ کرنا میرے لیے بھی مشکل ہے، اِس سے ہم نئی زندگی شروع کر سکتے ہیں اور اسے استعمال کرنے کا، میں جہاں تک سمجھتا ہوں، ہمیں جائز حق پہنچتا ہے۔ جس چیز کی طرف آپ اشارہ کر رہے ہیں اُس

میں اس کی کارفرمائی کا بھی دخل ہے، نہیں ہے کیا؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں یہ سب سمیٹ کے خوش رہ سکوں گا؟ مجھے سکون مل جائے گا؟"

"ابھی آپ ایسا کیوں سوچتے ہو؟ آپ کے پاس ہے تو اپنے پاس ہے۔ ادھر سب آپ کے لاڈلے جیسے ہیں، ضرورت ہوئی تو آپ ہی کے در پر آئیں گے، اپنے بابا کے پاس۔"

ابا جان اصرار کرتے رہے۔ ماسی اور زورا بھی شدومد سے بیچ میں بولنے لگے تھے، انھوں نے ابا جان کی کوئی بات نہیں سُنی۔ کہنے لگے، سمجھ لیجیے، ہمارا حصّہ آپ کے پاس امانت ہے۔ طرح طرح کی دلیلیں دے کے انھیں خاموش کر دیا۔ میں چپ سُنتا رہا۔

اُسی دن کچھ دیر بعد ہی ابا جان، میں اور بیرو تہہ خانے میں داخل ہوئے۔ بیرو اور میں نے بکسے کھولے۔ ابا جان نے جھیلی پر جانچ کے دس بارہ پتھر الگ کر لیے اور اُسی دن دوپہر کو ہم تینوں لکھنؤ روانہ ہو گئے۔ وہاں حضرت گنج کے علاقے میں واقع کارلٹن ہوٹل میں ٹھیرے، یہ لکھنؤ کا سب سے بڑا ہوٹل تھا۔ شام کو ہم پہنچے تھے اور شام ہی کو میں اور بیرو صرافے کی طرف نکل گئے۔ رات تک جوہریوں کی آمد کا سلسلہ بندھا رہا۔ دوسرے دن صبح اُن کے ساتھ چند نواب بھی آئے۔ تیسرے دن رات کو ہم واپس فیض آباد پہنچے تو تینوں کی بنڈلیوں میں ڈھائی لاکھ روپے موجود تھے۔ ابا جان کو بہت جلدی تھی، سودے بازی کرنے تو شاید تین لاکھ تک رقم ہو جاتی۔ چلتے وقت انھوں نے لکھنؤ سے سب گھر والوں کے لیے بہت سی چیزیں خریدیں۔ سب کے لیے سونے کی چوڑیاں، کپڑے، جوتیاں، پھل اور مٹھائیاں، کچھ رقم رکھ کے باقی سب انھوں نے منیر علی کے پاس جمع کرا دی۔ منیر علی بھی نوٹوں کی اتنی گڈیاں دیکھ کے حیرت زدہ رہ گئے۔

راستے میں اُن کی اور بیرو کی باتوں سے مجھے پتہ چل گیا تھا کہ وہ فرخ، فریال، فارہہ اور اکبر کو بمبئی میں اپنے دوست مولوی محمد اکرم کے ہاں ٹھیرا آئے ہیں۔ مولوی محمد اکرم سے میں بھی ملا تھا۔ وہ نہایت شریف آدمی تھے۔ یقیناً ابا جان کی نظر میں اُن سب کی حفاظت کے لیے اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہو گی لیکن انھیں گھر سے نکلے ہوئے سال سے کم کیا لگا ہو گا، چھ مہینے تو ہمی کو ہو گئے تھے۔ ہم پہنچے تھے تو وہ وہاں موجود تھے۔ بھکشوؤں کے طور طریق سیکھنے، کسی قافلے کے ساتھ جانے، تبت تک کے سفر، بڑے مندر اور خزانے والے مندر تک رسائی حاصل کرنے میں انھیں سال سے زیادہ کا عرصہ بھی لگ سکتا ہے۔ جب سے میں نے یہ سُنا تھا، اس کے باوجود کہ میں مولوی اکرام کے گھر جا چکا تھا، میرا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ میں یہ کیسے بھول سکتا تھا کہ فتی اسی علاقے سے گھر سے باہر نکلی تھی۔ مولوی اکرم کے رہن سہن سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بس عزت سے اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ ابا جان نے چلتے ہوئے انھیں کوئی بڑی رقم دی ہو گی۔ میں جلد سے جلد بمبئی جانا چاہتا تھا۔ چاہے ابا جان ابھی جانے کا ارادہ نہ کریں مگر ابا جان نے دوسرے ہی دن صبح بمبئی جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ زریں، خانم، نیساں اور زہرہ نے سفر کی تیاری شروع کر دی تھی۔ جہاں گیر بھی ہمارے ساتھ جانے کے لیے مچل رہا تھا، خانم کے کہنے پر چپ ہو گیا۔ صرف ایک رات درمیان میں تھی مگر مجھ سے یہ رات کاٹی نہ جاتی تھی۔ رات کے کھانے کے وقت ہم گھر پہنچ گئے تھے، مجھ سے کھانا بھی نہیں کھایا گیا۔ فرخ، فریال، فارہہ اور اکبر کے چہرے نظروں میں گھوم رہے تھے۔ اب وہ بہت بڑے ہو گئے ہوں گے۔ مجھے شاید پہچان بھی نہ پائیں۔ کاش میں ابا جان اور بیرو کے درمیان ریل میں ان سب کے متعلق ہونے والی باتیں نہ سُن پاتا، اسی لیے میں ابا جان سے نہیں پوچھتا تھا۔

کھانے کے بعد خانم میرے قریب آ کے چپکے سے بولی۔

"بابر میاں! مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

"کیا بات ہے آپی!" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"تم میرے کمرے میں آ جانا ویسے کوئی خاص بات نہیں ہے۔"

"پھر بھی کچھ تو بتائیے؟"

"پریشان مت ہو۔ شاید میں تم سے ابھی نہ کہتی مگر تم جا رہے ہو اس لیے تمھیں بتا دینا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔"

میرے جسم میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔

رات گئے تک خانم کو فرصت نہیں ملی۔ میں کئی بار اُس کے کمرے کی طرف گیا لیکن وہاں کوئی نہ کوئی بیٹھا ہوتا تھا۔ ضرور ایسی کوئی بات تھی جو خانم صرف مجھی سے کرنا چاہتی تھی۔ جب تک میں خانم کے کمرے میں نہیں گیا، مجھے وحشت ہوتی رہی۔ "میں نے تمھیں پریشان کر دیا۔" خانم مجھے دیکھتے ہی بولی۔ "میں نے کہا تھا ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے تم کھڑے کیوں ہو، اطمینان سے بیٹھو۔"

میں نے اُس کی ہدایت پر عمل کیا۔

"بات یہ ہے کہ ابھی کوئی دو ہفتے ہوئے، باوا نے مجھ سے ایک مشورہ لیا تھا۔" خانم رازدارانہ انداز میں بولی۔

"کیسا مشورہ؟"

"انھوں نے زریں کا ذکر کیا تھا۔ کہہ رہے تھے، میری خواہش ہے کہ زریں کو اپنی بٹیا بنا لوں، ویسے وہ مجھے زہرہ ہی کی طرح عزیز ہے۔ میں تم سے مشورہ کر رہا ہوں، بات نہیں دے رہا۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ بہت نازک معاملے ہوتے ہیں اور پھر ایک گھر میں رہنے سے تو اور بھی زیادہ نازک۔ وہ تنویر علی کی طرف اشارہ کر رہے تھے اور انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ جی چاہتا ہے زریں گھر سے کہیں اور نہ جائے، البتہ جب تک میری طرف سے اشارہ نہیں ملے گا، وہ اپنی تمنا کبھی زبان پر نہیں لائیں گے اور اگر میری طرف سے انھیں کوئی اُمید افزا جواب نہ ملا تو وہ اس کا بالکل بُرا نہیں مانیں گے۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ انھوں نے بھی دوبارہ اشارۃً کنایۃً بھی مجھ سے نہیں پوچھا۔ میں نے تمھیں یہ اس لیے بتایا ہے کہ تم سے مشورہ کروں؟"

"آپی! میرا مشورہ، میں... میں" میں نے سٹ پٹاتے ہوئے کہا۔

"میں نے کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ تنویر لائق لڑکا ہے، سب کا دیکھا بھالا ہے۔ میں نے سوچا تم سے ذکر کر دوں۔"

"میں، میں کیا کہہ سکتا ہوں، آپ مجھل بھائی اور خود زریں سے پوچھ لیجیے۔" میری آواز بھرانے لگی تھی۔

"مجھ سے پوچھا نہیں جاتا بابر میاں!"

"پھر، پھر میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"تم نے سُنا ہو گا کہ لڑکیاں گھر میں اُگی بیری کی طرح ہوتی ہیں۔ پتھر تو آئیں گے اور یہ کوئی پتھر نہیں۔ اسی طرح رشتے ہوتے ہیں۔ لڑکیوں بالیوں کو دیر تک گھر میں بٹھانا اچھا نہیں سمجھا جاتا، کبھی نہ کبھی تو ہم سب کو اس مسئلے پر غور کرنا ہو گا۔"

مجھ سے کوئی جواب نہ دیا جا سکا۔

"تم سوچ لو، باوا کو کہے ہوئے دو ہفتے سے زیادہ ہو رہے ہیں۔ انھوں نے لوٹ کے نہیں پوچھا، وہ بہت سمجھ بوجھ کے آدمی ہیں۔ دوبارہ نہیں کہیں گے لیکن بالفرض انھوں نے پھر ذکر چھیڑا تو میں کیا جواب دوں؟"

"آپ جو مناسب سمجھیں، کہہ دیجیے گا۔"

"میری تو عقل کام نہیں کرتی۔"

"مجھ سے کچھ مت پوچھیے، میں کیا بتا سکتا ہوں۔"

"زریں کا ہمارے سوا کون ہے۔"

"آپ مجھ سے زیادہ بہتر سمجھ سکتی ہیں۔"

"مگر تم نے اس بارے میں کبھی غور تو کیا ہو گا؟"

"شاید کبھی نہیں۔"

"تمھاری رائے ہو تو میں بابا (مجھل) سے ذکر کروں۔"

"آپ کر دیجیے، چاہیں تو پہلے زریں سے پوچھ لیجیے۔" میں نے یوں ہی کہہ دیا۔

"زریں بے چاری کیا کہے گی۔"

"تو پھر جیسا آپ کا جی چاہے۔"

"تم بھی کچھ بتاؤ، تمھاری کیا رائے ہے۔ آگے بات کروں یا چپ رہوں؟ ضروری نہیں کہ تم فوراً جواب دو۔ میں نے کہا نا کہ انھوں نے باقاعدہ بات نہیں کی ہے، محض اپنی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ اُن کی جگہ میں ہوتی تو میں بھی یہی کرتی۔ زریں ہے ہی اتنی اچھی، ہر کوئی اُسے اپنے گھر کی دُلھن بنانا چاہے گا۔"

نیساں چہکتی ہوئی کمرے میں اچانک داخل ہوئی تو خانم چپ ہو گئی۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ نیساں نہ آتی تو نہ جانے کب تک مجھے خانم کی یہ اجنبی اجنبی باتیں سُننی پڑتیں۔ خانم سے کچھ کہے بغیر میں نیساں ہی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا۔ "آپ یہاں چھپے بیٹھے تھے، ہم نے حویلی کا کونا کونا چھان لیا۔" نیساں چہکتے ہوئے بولی اور میری اُنگلی پکڑے پکڑے ایک طرف چل پڑی۔ پھر مجھے اُس وقت کچھ ہوش آیا جب میں نے اپنے سامنے زہرہ کو کھڑے دیکھا۔ زہرہ جیسے میرے ہی انتظار میں کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کے اُس کا کُندن دمکنے لگا۔ "لائیے زہرہ آپا!" نیساں شوخی سے بولی۔ "بابر بھائی آپ ذرا آنکھیں تو بند کیجیے۔ بند کیجیے نا۔" میں نے آنکھیں بند کر لیں اور دوبارہ نیساں کے حکم پر کھولیں تو وہ میرے سامنے ایک سوئٹر لہرا رہی تھی۔ "بتائیے، کیسا ہے؟"

"اچھا ہے، بہت اچھا..."

"رنگ پسند ہے آپ کو؟"

"ہاں، سب کچھ پسند ہے۔"

"زہرہ آپا نے اپنے ہاتھوں سے بُنا ہے۔ ذرا آپ اِسے پہن کے دکھائیے۔" وہ مچلتے ہوئے بولی۔ میں نے اُس سے حجت نہیں کی ورنہ وہ ضد کرنے لگتی۔ اُس نے پیچھے سے اور کندھوں سے سوئٹر کھینچ کے درست کیا اور گھوم گھوم کے جائزہ لینے لگی۔ "سچ بابر بھائی! آپ اِس میں کتنے اچھے لگ رہے ہیں۔" وہ جوش میں بولی۔ "ایک رتی کم نہ زیادہ، بالکل نپا تُلا آیا ہے۔ معلوم ہے، زہرہ آپا نے صرف اندازے سے بنایا ہے۔"

میں نے زہرہ کو ایک نظر دیکھا، وہ سر جھکائے اُنگلیاں چٹخا رہی تھی اور ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ میں اُس کا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکا۔

"زہرہ آپا کہتی ہیں کہ آپ اُن لوگوں کو لے کے جلدی آئیے گا، سب انھیں دیکھنے کے لیے بے چین ہیں۔" نیساں تیز تیز لہجے میں بولی۔ میں نے اُس سے یہ بھی نہیں کہا کہ زہرہ خود کیوں نہیں بولتی، وہ گونگی تو نہیں ہے۔ نیساں کو شاید احساس

ہو گیا کہ میں اُس کی باتیں توجہ سے نہیں سُن رہا ہوں اُس کا چہرہ بجھنے لگا وہ زرک کے ٹمٹماتی آنکھوں سے مجھے تکنے لگی۔ وہ پریشان سی ہو گئی تھی، میری طبیعت پوچھنے لگی۔ میں نے اُس کی پیشانی کو بوسہ دیا، اُس کے ہاتھ چومے اور اس سے پہلے کہ اُس کی ملتجی آنکھیں چھلکنے لگتیں، میں منہ پھیر کے چلا آیا اور اپنے کمرے میں آ کے میں نے دروازہ بند کر لیا۔ مجھے اپنا جسم خالی خالی سا لگ رہا تھا۔ کھوکھلا، راکھ کا ڈھیر۔ ساری رات میں دیواروں پر روشنی کے لرزتے سائے دیکھتا رہا۔ کسی نے دروازے پر دستک دی تو پہلی دستک پر میں نے اُٹھ کے دروازہ کھول دیا۔ میں سمجھا، شاید زریں ہو گی مگر وہ جہاں گیر تھا اور یہ بتانے آیا تھا کہ اب مجھے تیار ہو جانا چاہیے۔ میں نے چونک کر اُسے دیکھا، بالکل دھیان نہیں رہا تھا کہ صبح ہمیں یہاں سے روانہ ہو جانا ہے۔

گاڑی صبح چھ بجے جاتی تھی۔

ہم ٹھیک ساڑھے چار بجے حویلی سے نکل گئے تھے۔ رات کو شاید کوئی نہیں سو پایا تھا۔ منیر علی، ارشد، جہاں گیر، جمرو اور دُوسرے لوگ ہمیں اسٹیشن تک رخصت کرنے آئے تھے۔ گاڑی وقت پر روانہ ہوئی۔ ہمیں ایک ڈبا خالی مل گیا تھا۔ تجمل کی ہدایت پر پیرو نے ٹکٹ فرسٹ کلاس ہی کے لیے تھے۔ نشستیں بہت آرام دہ تھیں۔ کچھ دیر تک وہ سب باتیں کرتے رہے پھر برتھوں پر لیٹ گئے۔ لکھنؤ اسٹیشن گزر گیا اور سندیلہ آیا تو مجھے سمت کا اندازہ ہوا، لکھنؤ سے براہِ راست بمبئی جانے کے بجائے ہم دلّی کی طرف جا رہے تھے گویا دلّی سے پھر ہمیں بمبئی جانے والی گاڑی میں بیٹھنا تھا۔ اسٹیشن پہ اسٹیشن گزرتے رہے۔ بریلی اسٹیشن پر مارتی نے مٹھیاں کھول دیں۔ سب یہ دیکھ کے ہنسنے لگے کہ زریں نے اتنا بہت سا کھانا ساتھ کر دیا ہے۔ میں بھی دسترخوان پر بیٹھ گیا اور آخر تک اُن کا ساتھ دیتا رہا۔ یہ بریلی اسٹیشن تھا۔ بریلی سے مُرادآباد صرف باون میل کی دوری پر واقع ہے۔ درمیان میں رام پور کا شہر آئے گا، پھر مُرادآباد۔ مرادآباد کی طرف سے گزرنے کے خیال سے میرے ذہن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ اتنے دن گزر گئے تھے۔ جبل پور سے منیر علی کو لے کے ہم سیدھے فیض آباد چلے آئے تھے، اس کے بعد تبت کی طرف روانہ ہو گئے۔ مولوی صاحب کہیں اِس عرصے میں اپنے شہر واپس نہ آ گئے ہوں، انھیں کہیں عافیت نہ ملی ہو تو آخر انھوں نے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ گاڑی بریلی سے چل چکی تھی، جیسے جیسے مرادآباد قریب آتا جا رہا تھا، میرا گمان جڑ پکڑتا جا رہا تھا۔ ایک نظر دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔ کتنا فرق پڑے گا۔ زیادہ سے زیادہ چند گھنٹوں کا مگر میں اباجان سے کس طرح کہہ سکتا تھا کہ ایک پہر کے لیے مُرادآباد رُک جائیے۔ یوں بھی ہمیں شام کو دلّی پہنچ کے رات کے ۹ بجے تک بمبئی کی گاڑی کا انتظار کرنا تھا اور صبح کو نہیں، شام کو ہم بمبئی پہنچیں تو کون سا گھاٹا ہو جائے گا، بعد میں پھر کب اس طرف آنا ہو۔ میں سوچتا رہا کہ ان سے کس طرح کہوں، وہ کُرید کرنے لگیں گے۔ گاڑی تیز رفتاری سے مرادآباد کی سمت بڑھ رہی تھی، میری بے چینی بھی بڑھتی جا رہی تھی، کھانے کے بعد اباجان نے سامنے کی برتھ پر لیٹ کے آنکھیں موندیں تو مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے پیرو کو جھنجوڑا۔ "دادا! میری ایک بات مانو گے؟" میں نے اُس سے سرگوشی میں التجا کی۔

"بول جانی!" وہ تعجب سے بولا۔ "کوئی گھپلا ہے!"

"گھپلا دپلا کچھ نہیں، تم اباجان سے کوئی بہانہ کر کے کچھ دیر کے لیے مرادآباد رُک جاؤ تو تمھارا بڑا احسان ہو گا، انھیں مت بتانا کہ میں نے کہا ہے۔ مجھے وہاں بس تھوڑی دیر لگے گی۔ شام کو مرادآباد سے ایک گاڑی پانچ چھ بجے کے قریب دلّی جاتی ہے، اُس سے بھی بمبئی کی گاڑی کا میل بنتا ہے۔ سفر میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ دادا! اباجان کو تم کسی طرح سمجھا دو۔"

پیرو نے ایک دو لمحے کے لیے سوچا اور عجیب سی نظروں سے میری صورت دیکھتے ہوئے سر ہلانے لگا۔ وہ اباجان کے پاس جانے کے لیے اُٹھ گیا تو میں رُخ بدل کے کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا معلوم نہیں، پیرو نے اباجان سے کیا کہا۔ مجھے تبھی پتہ چلا جب اُس نے اُوپر کی برتھوں پر لیٹے ہوئے مارتی اور زورا سے نیچے آ کے سامان سمیٹنے کو کہا۔

رام پور اسٹیشن سے مُرادآباد کا فاصلہ صرف سولہ میل تھا آدھے گھنٹے میں گاڑی پہنچ جاتی تھی مگر یہ آدھا گھنٹا جیسے پھیل گیا تھا۔ کٹ گھر کے اسٹیشن سے پہلے رام گنگا کے پُل پر گاڑی ٹھیر گئی۔ دریا میں پانی زیادہ تھا۔ جب تک پُل صاف نہیں ہو گیا، گاڑی کھڑی رہی پھر گھسٹ گھسٹ کے چلنے لگی۔ میں اکیلا ہوتا تو کٹ گھر پر ہی اُتر جاتا۔ یہاں سے مولوی صاحب کا محلہ فیض گنج زیادہ قریب تھا۔ تانگا دس منٹ میں مجھے اُن کے محلے پہنچا دیتا۔ میری مالا کے دانے سینے میں چبھ رہے تھے لو میرا رُواں رُواں کانپ رہا تھا۔ کیا عجب کہ زریں کی بات سچ ہی ہو جائے۔

دس منٹ کی تاخیر سے گاڑی مُرادآباد کے اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ اسٹیشن کے سامنے ہی اسلامیہ مسافر خانہ تھا۔ میں وہاں پہلے بھی جا چکا تھا۔ ہمارے پاس سامان زیادہ نہیں تھا۔ ایک ہی [illegible] لی نے اُسے مسافر خانے تک پہنچا دیا۔ مسافر خانے کے منتظم کو [illegible]ب صوفی جی کہتے تھے۔ رجسٹر پر انھوں نے ہمارے ناموں کا [اِ]ندراج کیا۔ پیرو، زورا اور مارتی کے نام ہم نے بدل دیے، خواہ مخواہ وہ [illegible]و نکتے، اُوپر کی منزل کے ایک روشن اور صاف ستھرے کمرے [میں] اباجان، زورا اور مارتی کو ٹھیرا کے میں اور پیرو فوراً مسافر خانے سے نکل آئے اور تانگے پر بیٹھ کے محلہ فیض گنج جا کے ہی رُکے [illegible]ہ مولوی صاحب کے مکان کی گلی میں پہنچنے میں ہمیں دو چار [م]نٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ میں نے دھڑکتے ہاتھوں سے دروازہ [کھٹ]کھٹایا، اندر سے کسی لڑکی کی آواز آئی، میرا دل دھک دھک [ک]ر رہا تھا۔ "کیا مولوی محمد شفیق صاحب یہیں رہتے ہیں؟" میں نے [ہک]لاتی آواز میں پوچھا۔

دوسرے ہی لمحے میرا دل ڈوبنے لگا۔ "مولوی محمد شفیق [ص]احب" اُس نے کواڑ کی آڑ میں کھڑے ہو کے تذبذب سے [دُ]ہرایا۔ "اب وہ یہاں نہیں رہتے، ہم نے یہ مکان اُن سے [خ]رید لیا ہے۔"

"آپ نے خرید لیا ہے! کب؟"

"ڈیڑھ مہینے سے زیادہ نہیں ہوا۔"

"کیا وہ یہاں آئے تھے؟"

"جی ہاں، انھی سے ہم نے لیا ہے۔"

"آپ کے گھر میں اِس وقت کوئی مرد نہیں ہے؟"

"بھائی سو رہے ہیں۔"

"کب تک اُٹھ جائیں گے؟"

"آپ اباجی کی دکان پہ چلے جائیے، منڈی چوک میں اُن [کی] بسلا خانے کی دکان ہے۔"

"کس نام سے؟"

"وہ جھجک کے بولی۔ "حافظ صاحب کی دکان کسی سے پوچھ [ل]یجے گا۔"

"آپ کا بہت شکریہ۔"

"آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟"

"ہم پردیسی ہیں، مولوی شفیق صاحب کے واقف کار۔"

منڈی چوک بھی دُور نہیں تھا۔ حافظ صاحب کی دُکان [تلاش] کرنے میں ہمیں دیر نہیں لگی۔ دُکان پہ ایک پستہ قد شخص [بیٹھ]ا ہوا تھا۔ چھوٹی خشخشی داڑھی، سُرمئی رنگ، سر پہ بید کی ٹوپی۔ [مولوی] صاحب کا نام سُن کے وہ گھبرا سا گیا۔ "سُنا ہے آپ ہی [نے] اُن کا مکان خریدا ہے؟"

"جی ہاں، ابھی حال میں خریدا ہے۔" وہ کسی قدر ترشی سے بولا۔

"تو کیا وہ یہاں آئے تھے؟"

"اُن کے بغیر سودا کیسے ہو سکتا تھا۔"

"کب آئے تھے؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"یہی کوئی ڈیڑھ مہینے پہلے کی بات ہے۔"

"پھر وہ کہاں چلے گئے؟"

"میں نہیں کہہ سکتا، وہ ایک عرصے بعد مرادآباد آئے تھے۔ صرف دو دن کے لیے مسافر خانے میں ٹھیرے تھے۔ برتلا سے آگے اُن کی کچھ زمین تھی اور یہ مکان، دونوں کا سودا کر کے واپس چلے گئے۔"

"زمین کن صاحب نے خریدی؟"

"میں واقف نہیں ہوں۔" وہ اُلجھ کے بولے۔ "البتہ مجھے اتنا علم ہے کہ انھوں نے زمین بھی بیچی ہے۔"

"کیا انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ کہاں سے آ رہے ہیں کہاں رہتے ہیں؟ ظاہر ہے آپ نے پوچھا تو ہو گا؟"

"حیدرآباد میں کہیں قیام بتا رہے تھے۔"

"حیدرآباد میں! وہاں اُن کی ایک بہن بھی رہتی تھیں، کیا وہ کوئی پتہ دے گئے ہیں؟"

کاغذ پر انھوں نے مرادآباد ہی کا پتہ لکھوایا تھا۔"

"کیا اُن کے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟"

"ہو سکتا ہے، میں نے عرض کیا نا، وہ مسافر خانے میں ٹھیرے ہوئے تھے۔ کوئی نو دس سال میں وہ مرادآباد واپس آئے تھے۔ اِس عرصے میں دُنیا بدل گئی۔"

"لیکن میں کچھ اور پوچھ رہا ہوں۔"

"جو آپ پوچھ رہے ہیں، اُسی کا جواب دے رہا ہوں۔"

"وہ یہاں اور لوگوں سے بھی ملے ہوں گے، یہ اُن کا شہر ہے، کیا آپ مجھے چند ایسے لوگوں کے نام نہیں بتا سکتے ہیں جن سے وہ ملے ہوں؟ ممکن ہے انھیں انھوں نے اپنا پتہ بتایا ہو۔ دیکھیے ہم بہت دُور سے آ رہے ہیں۔ ہمیں مولوی صاحب سے ایک ضروری کام ہے۔ آپ ہماری کوئی مدد کر سکتے ہوں تو مسافر سمجھ کے کر دیجیے۔ خدا آپ کو اِس کا اَجر دے گا۔"

"عزیزم! مجھے جو کچھ معلوم تھا، میں نے بتا دیا۔ مجھے مکان سے غرض تھی، کچھ اور جاننے بوجھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اپنی ہی اُلجھنیں کیا کم ہیں، آپ چاہیں تو میں کچھ نام بتاتا ہوں، اِن لوگوں سے مل لیں مگر میرا خیال ہے، آپ کو ناکامی ہو گی۔ مولوی صاحب بہت جلدی میں آئے تھے۔ جلد سے جلد سودا کرنے کی فکر تھی۔ آئے اور چلے گئے۔"

اُس کے بتانے پر ہم دوبارہ فیض گنج گئے اور وہاں دو

تین آدمیوں سے ملے۔ مولوی صاحب کی اُن سے ملاقات ہوئی تھی اور اُنھیں اتنا ہی معلوم تھا، جتنا بساطی حافظ صاحب کو۔ مولوی صاحب بہت مجبوری ہی کی حالت میں یہاں آئے ہوں گے اور اُنھوں نے زیادہ لوگوں سے ملنا گوارا نہیں کیا ہوگا۔ اچانک میرے ذہن میں آیا کہ مولوی صاحب نے مسافر خانے میں مسافروں کی آمد و رفت کے رجسٹر پر اپنا پتہ ضرور لکھوایا ہوگا۔ میں اور پیرو کہیں اور جانے کے بجائے تانگے میں بیٹھ کے فوراً مسافر خانے واپس پہنچے۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی لیکن منتظم صوفی جی ہمیں رجسٹر دکھانے سے کترانے لگے۔ میں نے بہت التجا کی تو کہنے لگے۔ "آپ عادل صاحب سے مل لیجیے۔ وہ کہہ دیتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

عادل صاحب کا دفتر مسافر خانے کے وسط میں واقع تھا۔ وہ لمبے قد، گندمیں رنگ، کشادہ پیشانی کے ایک نرم خو شخص تھے۔ عمر چالیس سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ سفید بے داغ شیروانی اور ترکی ٹوپی میں ملبوس تھے۔ میں نے اُن سے درخواست کی اور بتایا کہ مجھے مولوی صاحب کے پتے کی شدید ضرورت ہے، آپ کا بڑا کرم ہوگا۔"

اُنھوں نے صوفی جی کو اندر بُلا لیا اور مجھے رجسٹر دکھانے کو کہا۔ ڈیڑھ مہینے پہلے کے مسافروں کی فہرست دیکھ کے اِس کی تصدیق ہوگئی کہ مولوی صاحب مسافر خانے میں ٹھیرے تھے اور اُن کے ساتھ ایک بُرقع پوش خاتون بھی تھیں یعنی اُن کی بیگم۔

"کیا اُن کی بیگم بھی اُن کے ساتھ تھیں؟"

"رجسٹر تو یہی بتا رہا ہے جناب!" صوفی جی منہ بنا کے بولے۔

"کیا آپ نے اُنھیں دیکھا تھا؟"

"میاں!" وہ ناراضی سے بولے۔ "ہم یہاں آپ کے خیال میں دوسروں کی عورتوں کو تکتے رہتے ہیں؟ یہاں شُرفا ٹھیرتے ہیں۔"

رجسٹر پر لکھے ہوئے لفظ میرے سامنے تھے۔ اُنھیں دیکھتے دیکھتے میری آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ اگلے خانوں میں مولوی صاحب کا پتہ درج تھا۔

"آپ پتہ دیکھ رہے تھے؟" عادل صاحب نے مجھے ٹوکا۔ اُن کی آواز مجھے کہیں دُور سے آتی محسوس ہوئی۔

اُسی لمحے صوفی جی نے میرے سامنے سے رجسٹر اُٹھا لیا۔ پیرو دادا نے پیچھے سے مجھے کہنی ماری۔ "راجا! صاحب کیا پوچھ رہا ہے؟"

میں نے پھٹی ہوئی آنکھوں سے عادل صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے گھور رہے تھے۔ میں نے نہیں سُنا تھا کہ اُنھوں نے مجھ سے کیا کہا ہے۔

"انھی صاحب کا پتہ آپ کو درکار تھا؟" عادل صاحب تذبذب سے بولے۔

"ہاں!" میں نے سر جھکا کے ڈولتی آواز میں کہا۔

"آپ کو کچھ اور پوچھنا ہے؟"

"نہیں، کچھ اور نہیں۔" میں جلدی سے کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"روزانہ پچاسوں مسافر آتے جاتے ہیں لیکن مولوی صاحب کا آنا مجھے یاد ہے۔ کچھ یوں بھی کہ ایک زمانے میں اُن کا تعلق بھی اِسی شہر سے تھا۔ میں اِن دنوں مسافر خانے کی نئی عمارت کی تعمیر کے سلسلے میں مصروف ہوں اِس لیے ایک ہی بار اُن سے ملاقات ہو سکی، وہ بھی سرسری۔ مولوی صاحب بھی کچھ جلدی میں تھے، دو تین ہی روز رہے ہوں گے۔" عادل صاحب جیسے اپنے آپ سے کہہ رہے تھے، اُن کی آواز دھیمی تھی۔ "مجھے کچھ بتائیے؟" وہ چونک کے بولے۔ "شاید میں آپ کے کسی کام آسکوں۔"

"اپن اُس کی کھوج میں ہے۔" پیرو نے تیزی سے کہا۔ "ام وہ کچھ اور بولتا تھا کیا، اپنا مطلب ہے کہ آپ؟..."

"نہیں۔" عادل صاحب پیرو کی بات کاٹ کے بولے۔ "ولام عرصہ ہوا، وہ یہ شہر چھوڑ کے جاچکے ہیں۔ پہلے بھی وہ گھومتے ہی رہتے تھے، پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ ایسے لوگ عموماً تنہائی پسند ہوتے ہیں۔ میں مجھ سے خاصے بڑے ہیں۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ لیے دیے رہنے والے شخص ہیں۔ سلام دعا، مزاج پُرسی ہی تک بات ہوئی۔ مسافر خانے کی نئی عمارت کا نقشہ دیکھ کے بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے، سارے شمالی ہند میں یہ اپنی نوعیت کا واحد مسافر خانہ ہوگا۔ میں نے کہا، بس دُعا کیجیے، یہ کام کسی طرح تکمیل پا جائے۔ کوک... کے متعلق پوچھا جو مسافر خانے کی تعمیر میں پیش پیش ہیں۔ کوک... صاحب ایک مشاعرے میں امروہہ گئے ہوئے تھے۔ واپس آئے تو مولوی صاحب جاچکے تھے۔ میں نے اُن سے مولوی صاحب کا ذکر کیا تو ملاقات نہ ہونے کا افسوس کرنے لگے۔ صورت یہ ہے جناب، یہاں از خود کوئی دفتر میں آجاتا ہے تو ملاقات ہو جاتی ہے ورنہ اپنی جانب سے مسافروں کے معاملات میں غیر ضروری طور پر مخل نہیں ہوتے۔" چند لمحے رُک کے عادل صاحب بولے۔ "افسوس کہ اُن کے بارے میں مجھے کچھ اور معلوم نہیں ہے۔ کوئی اور خدمت ہو تو فرمائیں ہے۔"

"آپ کا شکریہ صاحب!" پیرو نے سیلوٹ کے انداز میں سلام کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کی مہربانی...."

میں عادل صاحب کو سلام کیے بغیر باہر چلا آیا۔ میرے ڈگمگا رہے تھے اور مجھے چکر سے آرہے تھے۔ پیرو میرے ساتھ نہیں آیا تھا۔ پتہ نہیں، وہ عادل صاحب سے اور کیا باتیں کر رہا تھا، خواہ مخواہ وہ کسی ٹنٹ میں پڑ جاتے! مولوی صاحب کے بارے میں اُنھیں اِس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں تھا، معلوم ہوتا تو چھپاتے نہیں۔ وہ طبیعت کے گھنے، بات چھپانے والے آدمی نظر نہیں آتے تھے۔ میں مسافر خانے سے باہر اسٹیشن روڈ پر آکے کھڑا ہوگیا۔ میری سانس پھولی ہوئی تھی اور سارے جسم سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ سامنے ہی اسٹیشن تھا جہاں مسافروں کی بھیڑ لگی تھی۔ تانگے والوں کے شور میں ہر آواز دب گئی تھی۔ شاید ابھی ابھی کوئی گاڑی آئی تھی۔ ممکن ہے، آنے والی گاڑی کہیں آگے جا رہی ہو! یکایک میرے ذہن میں آیا، میں اسی گاڑی سے نکل سکتا ہوں۔ ابا جان، زورا اور مارٹی مسافر خانے کی اُوپری منزل کے ایک کمرے میں موجود تھے۔ اِس سے پہلے کہ اُن میں سے کسی کی نظر مجھ پر پڑے، مجھے جلد سے جلد یہاں سے دُور ہو جانا چاہیے، اُوپر جاؤں گا تو مجھے اُنھی کے ساتھ جانا پڑے گا مگر ابا جان کے خیال سے میں ٹھیر رہا۔ اِس طرح میرے چلے جانے پر وہ بہت پریشان ہو جائیں گے۔ نہ جانے کیا کیا سوچیں اور کتنی دیر تک انتظار کرتے رہیں حالانکہ پیرو فوراً سمجھ جائے گا کہ میں کس طرف جا سکتا ہوں مگر وہ ابا جان کو کس طرح مطمئن کر سکے گا۔ بہتر ہے کہ ایک رقعہ لکھ کے کسی آدمی کے ہاتھ ابا جان کے کمرے میں بھیج دوں کہ وہ میرا انتظار نہ کریں، میں چند روز بعد اُن سے بمبئی آملوں گا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ پیچھے سے پیرو آگیا اور میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے واپس اندر لے گیا۔ میں اُس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

چند منٹ بعد ہم سب سامان کے ساتھ مسافر خانے سے نکل آئے اور تیز قدموں سے اسٹیشن کی طرف بڑھنے لگے۔ شام کے چار بج رہے تھے۔ گاڑی تیار کھڑی تھی، ہمیں ایک دو منٹ کی تاخیر ہو جاتی تو چھوٹ جاتی۔ دو مسافروں کے سوا سارا ڈبا خالی پڑا تھا۔ کچھ دُور تک تو گاڑی رینگ کے چلتی رہی پھر اُس نے رفتار پکڑ لی۔ مراد آباد سے حیدر آباد جانے کے لیے یہی ایک سیدھا راستہ تھا۔ اگر میں اُن سے جُدا بھی ہوتا تو مجھے اسی طرف دلّی سے گزر کے آگے جانا پڑتا۔ یہاں نہیں تو دلّی اسٹیشن پر میں اُن کی نظروں سے اوجھل ہو سکتا تھا۔

مسافر خانے کے روزنامچے پر لکھے ہوئے لفظ میری آنکھوں میں گھوم رہے تھے۔ ہر جگہ وہی لفظ لکھے ہوئے نظر آتے تھے۔ حمایت نگر کا علاقہ حیدر آباد میں تجمل اور میں پہلے بھی اِس علاقے سے گزرے تھے، ہو سکتا ہے اُس مکان کے اِرد گِرد بھی گئے ہوں جہاں مولوی صاحب نے اپنا قیام لکھوایا تھا۔ ہم نے علاقے کی تمام مسجدوں، مدرسوں میں اور جہاں جہاں ممکن تھا، جا کے پوچھ لیا تھا مگر مولوی صاحب وہاں کہیں ہوتے تو کوئی بتاتا۔ وہ اُن دنوں حیدر آباد سے سینکڑوں میل دُور جیسلمیر میں بسے ہوئے تھے۔ جیسلمیر کے بعد ہمیں دوبارہ حیدر آباد جانے کا موقع نہیں ملا۔ میں نے طے کیا تھا کہ سب سے پہلے وہیں جاؤں گا۔ حیدر آباد میں صاحبِ علم لوگوں کی بڑی قدر ہوتی ہے۔ جیسلمیر سے مولوی صاحب سارا گھر چھوڑ کے چلے تھے، اُنھیں کسی ایسی جگہ جانا چاہیے تھا جہاں اُن کے چند شناسا موجود ہوں۔ جن حالات میں اُنھیں جیسلمیر سے دُور ہونا پڑا تھا، خصوصاً ایسی صورت میں، جب ایک نوجوان لڑکی بھی اُن کے ساتھ تھی، اُنھیں دربدر مارے مارے پھرنے کے بجائے کسی ایسے ٹھکانے کا رُخ کرنا چاہیے تھا جہاں ہاتھ پھیلائے بغیر کوئی سہارا مل جانے کی توقع ہو۔ عارضی طور پر سہی۔ چلتے وقت اُن کے پاس پیسے بھی کم تھے۔ صرف اتنے جو رستم خاں نے جیسلمیر سے فرار کراتے ہوئے اُنھیں دیے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ عرصہ ہوا، حیدر آباد میں اُن کی اکلوتی بہن بیاہی گئی ہے۔ میں اُس کا گھر تلاش نہیں کر سکا تھا لیکن مولوی صاحب کو اپنی بہن کا پتہ معلوم ہوگا، اُس کے شوہر کے رشتے دار، جان پہچان والے وہاں موجود ہوں گے۔ جیسلمیر سے آنے کے بعد تجمل نے اچانک تبت جانے کا ارادہ کر لیا ورنہ میں ایک مرتبہ حیدر آباد ضرور جاتا۔

رجسٹر میں مولوی صاحب نے اپنے ساتھ سفر کرنے والی لڑکی کو اپنی بیگم کی حیثیت سے درج کرایا تھا۔ ظاہر ہے، مراد آباد میں وہ اُس سے اپنا کوئی اور رشتہ نہیں بتا سکتے تھے۔ یہاں سب جانتے تھے کہ اُنھوں نے شادی نہیں کی ہے۔ کورا کو وہ اپنی بیٹی نہیں بتا سکتے تھے۔ جیسلمیر سے عزت و عافیت کے ساتھ نکلنے کے بعد وہ معلوم نہیں اور کہاں کہاں سر چھپاتے پھرے ہوں۔ اُنھیں کوئی ایسا ہی اندیشہ ہوگا، اِسی لیے وہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد اب بھی کورا کو افشا نہیں کرتے تھے۔ یقیناً گزشتہ برسوں میں اُنھیں کورا کی تلاش میں گھومنے والے جانگ قبیلے کے لوگوں سے کوئی واسطہ پڑا ہوگا جبھی وہ اتنی احتیاط برتتے تھے۔ اب اُنھیں جیسلمیر کے رانا مہتاب کے آدمیوں سے بھی خدشہ ہوگا کہ وہ اُنھیں دوبارہ نہ تلاش کر لیں۔ میرا دل نہیں مانتا تھا مگر ایک اور بات بھی ہو سکتی تھی جس سے مولوی صاحب خوف زدہ ہوں۔ مبادا اُنھیں میرا خیال ہو کہ میں کہیں اُن سے اپنی امانت واپس لینے نہ آجاؤں۔ ممکن ہے میری ہی وجہ سے ایسا ہو۔ تھوڑا بہت قاعدہ قانون اُنھیں بھی معلوم ہوگا کہ مجھے قتل کی سزا میں کم سنی کی وجہ سے رعایت مل سکتی ہے یا پھر اُنھیں میرے مقدمے کے فیصلے کا علم ہوگیا تھا۔ اُنھیں پورا

یقین ہوگا کہ سات سال بعد جیل سے باہر آنے کے بعد میں اُسی کو تلاش کروں گا، کہیں اور نہیں جاؤں گا۔ جیل کے سات سال میں ایک ایک دن، ایک ایک لمحہ گن گن کے ہی کاٹوں گا، ایک ہی اُمید مجھے وہاں زندہ رکھے گی کہ باہر کوئی میرا منتظر ہے، جیل کا دروازہ کھلنے کی دیر ہوگی کہ میری آنکھیں پھر تڑپے تڑپے اُسے دیکھنے کے لیے بھٹکتی پھریں گی۔ اُنھیں خوب اندازہ ہوگا کہ وقت کی دھول میرے سینے سے اُس کی تصویر مٹا نہیں دے گی۔

میری خبر رکھنا اُن کے لیے مشکل نہیں تھا۔ جیل کے سوا میرا تو کوئی اور ٹھکانا نہیں تھا۔ میرا پتہ بہت آسان تھا۔ وہ مجھے خط لکھ سکتے تھے، مجھ سے آ کے مل سکتے تھے، خود نہیں تو اپنا کوئی پیغام بر بھیج سکتے تھے اور اُن کے دل میں اِس رسم و راہ سے اگر کوئی وسوسہ تھا کہ اس طرح جیل کے حکام کو میرے حوالے جاننے کا موقع مِل جائے گا اور نتیجتاً اُن کے اور کورا کے سکون میں کوئی رخنہ پڑ سکتا ہے تو وہ کوئی اور تدبیر اختیار کر سکتے تھے۔ شروع میں نہیں تو تین چار سال بعد وہ اپنے نام اور پتے کے بغیر اپنی اور کورا کی خیریت کا دو سطری خط لکھ سکتے تھے۔ میرے لیے تو ایک اشارہ بہت ہوتا۔

جیل میں اُن کا خط نہ آنے اور میری خبر نہ لینے کی میں نے اپنے طور پر بہت سی تاویلیں کر رکھی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ مولوی صاحب نے یہ خاموشی جان بوجھ کے اختیار کی ہوئی ہے۔ میں نے اُنھیں اپنے اور کورا کے بارے میں تقریباً سبھی کچھ بتا دیا تھا۔ وہ سمجھتے ہوں گے کہ جس رات دریا کے کنارے اجنبی لوگوں نے ہم پر حملہ کیا تھا اور کورا کو ہم سے چھین لے جانے کی کوشش کی تھی، وہ جانگ قبیلے کے لوگ یا اُن کے بھیجے ہوئے آدمی بھی ہو سکتے ہیں۔ اُس رات وہ ناکام ہو گئے، میں جیل چلا گیا لیکن مولوی صاحب کے خیال میں جیل میں بھی وہ میری طرف سے پوری طرح چوکنا ہوں گے۔ اُنھیں سرا پکڑنے کی فکر ہوگی۔ مولوی صاحب بھی اُسی روز کلکتے سے چلے گئے ہوں گے اور اُنھوں نے خط یوں نہیں لکھا کہ میں اُن کے آبائی شہر سے واقف ہی تھا۔ یہ میرے اور اُن کے درمیان کی بات تھی، کسی تیسرے کو اس کا علم نہیں تھا۔ میں سمجھا تھا کہ مولوی صاحب نے حفظِ ماتقدم کے لیے مجھ سے کوئی رابطہ قائم نہیں کیا ہے، یہی سوچ کر کہ رہا ہونے پر میں سیدھا مراد آباد ہی آؤں گا اور مراد آباد جیسے شہر میں اُنھیں ڈھونڈنا میرے لیے دشوار نہیں ہوگا۔ اِس دوران کورا نے بھی اُنھیں اپنے بارے میں بہت کچھ بتایا ہوگا چنانچہ جانگ قبیلے کے لوگوں کے سلسلے میں وہ اور حساس ہو گئے ہوں گے۔ اُنھیں قدم قدم پر اُن کی طرف سے خطرہ ہوگا۔ جیل سے نجات پانے کے بعد میں نے سیدھے مراد آباد ہی کا رُخ کیا تھا۔ مولوی صاحب میرے لیے وہاں کوئی خبر نہیں دے کے گئے تھے۔ وہ میرے سے مراد آباد گئے ہی نہیں۔ مجھے کچھ بھی نہیں معلوم تھا کہ اُس رات کے بعد اُن دونوں کو کیا اُفتاد پیش آئی۔ پہلی بار جیسلمیر میں منیر علی کا گھر ملنے ہی پر اُن کے بارے میں ٹھیک پتہ چل سکا اور پہلی بار مجھے کچھ ایسا گمان ہوا کہ اُنھیں میرا اندیشہ بھی ہو سکتا ہے۔

مجھ سے، میرے سائے سے کورا کو دُور رکھنے کے لیے اُنھوں نے یہ سب کچھ کیا ہوگا۔ وہ ایک سزا یافتہ آدمی کو کورا کے لیے مناسب نہیں سمجھتے ہوں گے، اُن کا ایسا سوچنا بھی ایک طرح سے برحق تھا۔ میرا اُن سے رشتہ ہی کون سا تھا، دِنوں کی ملاقات تھی۔ رشتہ اُن کا کورا سے تھا جو اِتنے دِنوں تک اُن کے ساتھ رہی۔ میں اُن کا کون ہوتا تھا۔ جیل میں اکثر لوگ بدل جاتے ہیں، اُنھیں کیا پتہ تھا کہ میں نے وہاں تعلیم بھی جاری رکھی ہے۔ میں ہر لمحے اُس کے لیے دعائیں کرتا تھا۔ اُس کا چہرہ میرے سامنے رہتا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ اُس نے میرے بغیر بہت دُکھ اُٹھائے ہیں۔ میں اِدھر جیل میں ہوں تو وہ بھی زندگی جیل کے مانند کاٹ رہی ہوگی۔ مجھے تو سلاخوں کا بہانہ تھا، وہ تو سلاخوں کے بغیر قید ہوگی۔ اس لیے مجھے جیل سے اُس کے لیے ایک مکمل آدمی، ایک ستون بن کے نکلنا چاہیے۔ راتوں کو جاگ جاگ کے میں اسی لیے پڑھتا رہتا تھا۔ اُسی کی وجہ سے میں نے جیل میں رہنے کے باوجود ٹاپ کیا تھا، اُسی کی وجہ سے [illegible] نے بتھل سے ہنر سیکھے تھے۔ مجھے تجربہ ہو گیا تھا کہ زندگی گزارنے کے لیے آدمی کو ہر اعتبار سے مستعد اور مسلح رہنا چاہیے، سب کچھ مجھے خود ہی کرنا ہے، اپنا گھر بنانا ہے۔ میں اُس کا پاسبان ہوں، میری چھاؤں میں آ کے وہ گزرا ہوا سب کچھ بھول جائے گی۔ بتھل نے بھی کبھی [illegible] سے یہ نہیں کہا تھا کہ رہا ہونے کے بعد مجھے اڈّے پر کام کرنا [illegible]۔ وہ تو میرے لیے وہی خواب دیکھتا تھا جو میں خود دیکھا کرتا تھا۔ وہ [illegible] ایک بڑا وکیل بنانا چاہتا تھا۔ مولوی صاحب کو میری فکر ہوتی تو اُنھیں یہ سب معلوم ہوتا۔ اُن کے ذہن میں بس ایک ہی بات ہوگی کہ [illegible] جیل چلا گیا ہوں، تین آدمیوں کے قتل کے جرم میں۔ سو میرے بدن [illegible] کوڑھ نمودار ہو گیا ہوگا، میرا چہرہ سیاہ ہو گیا ہوگا۔ اُن کے خیال میں [illegible] جا کے ہر شخص کا چہرہ، رنگ روپ بدل جاتا ہوگا۔

وہ اُنھیں اِتنی عزیز ہو گئی ہوگی کہ اُسے جُدا کرنے کا تصور [illegible] اُن کے لیے عذاب ہوگا۔ وہ اُس کے لیے کسی ایسے شخص کی تلا[illegible] میں ہوں گے جو اُنھی کے ساتھ رہے، کورا کو اُن کی آنکھوں سے دُ[illegible] نہ لے جائے۔ ایسا ایک شخص اُنھیں جیسلمیر میں ملا تھا، ارشد، منیر علی [illegible] بھتیجا۔ منیر علی کے خاندان کو وہ اچھی طرح پرکھ چکے تھے۔ ارشد [illegible]

تعلیم یافتہ لڑکا تھا، اُنھوں نے اُسے بھی مسترد کر دیا۔ منیر علی کے بہ قول رانا مہتاب نے اُنھیں بہت بڑی دولت کی پیش کش کی تھی، وہ اُس کی دولت کو بھی خاطر میں نہیں لائے۔ اِس عرصے میں نہ جانے کتنے لوگوں، کتنے خاندانوں نے اُن سے کورا کے لیے درخواست کی ہوگی۔ مولوی صاحب نے کہیں حامی نہیں بھری تھی۔ کیا اُنھیں اِس حقیقت کا احساس نہیں تھا کہ ایک نہ ایک دن کورا کو اُن سے جُدا ہو جانا ہے۔ ہر لڑکی کو ایک گھر سے رخصت ہو کے دوسرا گھر بسانا پڑتا ہے۔ میں سامنے نہیں تھا اور میں مطلوب بھی نہیں تھا تو وہ کورا کے لیے کس شخص کی تلاش میں تھے؟ اُنھیں کس دن اور کس شخص کا انتظار تھا؟ کون آنے والا تھا؟ شاید کوئی بھی نہیں۔ نہ میں، نہ کوئی اور۔ بس اُنھیں ایک ٹمٹماتی اُمید، موہوم سی توقع ہوگی کہ کسی دن کورا خود تھک جائے گی اور پھر وہ جو چاہیں گے، اُس کے لیے فیصلہ کر سکیں گے۔ اُنھوں نے جتنے لوگوں کو مسترد کیا ہوگا، بیشتر کورا کے سبب سے کیا ہوگا۔ اُنھوں نے دیکھ لیا تھا کہ وقت نے کورا کا ارادہ اور فروزاں کر دیا ہے۔ میں اُس کے پاس نہیں تھا لیکن میری سانسیں اُس کے سینے میں بسی ہوئی ہیں، میری پرچھائیاں ہر لمحے اُسے حصار میں لیے رہتی ہیں۔ وہ مولوی صاحب کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اُن کے ساتھ نہیں ہے، اُس کی اپنی الگ ایک دنیا ہے۔

بعد میں زہرہ نے اِس کی تصدیق کر دی تھی۔ ہر چند کہ مجھے اِس تصدیق کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ وہی ہوگی، اُس کا قد بڑھ گیا ہوگا، اُس کا رنگ نکھر گیا ہوگا، شکل و صورت میں وہ پہلے سے بہت بدل گئی ہوگی لیکن وہ ہوگی وہی، جہاں جس رات وہ مجھ سے جُدا ہوئی تھی، ویسی ہی۔ زہرہ نے کہا تھا کہ وہ ہر وقت کچھ سوچتی رہتی ہے، کھوئی کھوئی رہتی ہے۔ نہ اُسے لباس کا شوق ہے، نہ زیور کا۔ کوئی آ کے خود اُسے پوچھ جائے تو ٹھیک، نہ آئے تو شکایت نہیں کرتی، گھنٹوں تنہا بیٹھی دیواریں تکتی رہتی ہے۔ اِتنا عرصہ مولوی صاحب کے جاننے کے لیے کافی تھا کہ اُس کی منزل تو ایک ہی ہے، اُسے ایک ہی شخص کا انتظار ہے، وہی اُس کی نیند، وہی اُس کا خواب ہے۔ وہی اُس کی رُوح ہے۔ وہ اُس کے لیے زر و جواہر اکٹھے کر دیں یا اُسے دیواروں میں بند، تہ خانوں میں محبوس کر دیں۔ بیڑیاں ڈال دیں یا ساری دنیا کی خوشیاں اُس کے قدموں میں بکھیر دیں۔ اُس کی خوشی تو ایک ہی شخص میں نہاں ہے۔ نو برس گزر چکے تھے۔ مولوی صاحب کو اور کتنے برسوں کا انتظار تھا۔ نو برس کیا، نو صدیاں، نو جُگ بیت جائیں۔ وہ تو وہی رہے گی۔ مولوی صاحب نہیں جانتے تھے کہ کبھی کبھی دو آدمیوں سے ایک آدمی کی تکمیل ہوتی ہے۔ وہ دو آدمی جو بظاہر الگ الگ نظر آتے ہیں، بباطن ایک ہوتے ہیں۔ مولوی صاحب کا خیال ہوگا کہ وقت دُنیا بدل دیتا ہے، وقت ایک دن اُسے بھی منقلب کر دے گا۔ اُنھوں نے اُس سے جانے کیا کیا کہا ہوگا کہ میں مر گیا ہوں مگر اُنھوں نے ایسا نہیں کہا ہوگا اور کہا ہوگا تو اُس نے تسلیم نہیں کیا ہوگا۔ اُس کا دل بھی ایک آئینہ ہے، وہ بھی اُس سے کچھ کہتا ہوگا جیسے میرا دل کہتا ہے۔ مولوی صاحب نے جینے کے لیے اُسے طرح طرح کے آسرے دیے ہوں گے لیکن وہ ایک ہی آسرے پر زندہ تھی، اپنے آسرے پر۔

زہرہ تو مجھے بہت بعد میں ملی تھی۔ زہرہ سے ملنے سے پہلے ہی، میں اُس کے بارے یہ سب کچھ جانتا تھا۔ میرا یہ یقین ہی میری زندگی تھا۔ مولوی صاحب اُسے دُور دُور لیے پھرتے رہیں، سات سمندر پار لے جائیں۔ ایک دن اُنھیں میری یاد ضرور آئے گی۔ ایک دن وہ خود نڈھال ہو جائیں گے۔ وہ کورا پر ایک سب سے بڑی مہربانی ضرور کریں گے جسے اب تک وہ نہیں سمجھے تھے اور سمجھتے تھے تو اپنے آپ سے ضد کر رہے تھے۔ بے شک اُنھیں کورا بہت عزیز ہو سکتی تھی۔ اُن کا بھی زندگی میں کوئی اپنا نہیں تھا۔ ایک کورا ملی تھی اور کورا کون تھی، وہ جو سر بہ سر ایک نور تھی۔ اُس کا چہرہ چمکتا رہتا تھا۔ اُن کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو اُسے اتنا ہی عزیز رکھتا۔ ایک ابّا جان ہی تھے جنھوں نے اُس کی قدر نہیں کی۔ جب وہ گھر آئی تھی تو فتی نے بے ساختہ کہا تھا، بالکل گڑیا ہے، جی چاہتا ہے طاق میں سجا کے رکھ دوں اور بس دیکھتی رہوں۔ امّی کو بھی وہ اتنی اچھی لگی تھی کہ اُنھوں نے بُری طرح اُس کی بلائیں لی تھیں، چشمِ بد دُور، خدا نظرِ بد سے بچائے۔ یہ کہتے کہتے اُن کی زبان نہیں تھکتی تھی۔ ابّا جان ذرا سا تحمل کر لیتے تو دیکھتے، وہ فتی سے زیادہ اُن کی خدمت کرتی، اُنھیں اپنے بیٹوں بیٹیوں سے زیادہ وہ پیاری ہوتی۔ ابّا جان نے اُس کی طرف نگاہ بھر کے دیکھا ہی نہیں۔ اتنا بھی نہ سوچا کہ وہ اُن کی پناہ میں آئی ہے، اُس کا کوئی نہیں ہے۔ وہ بے سہارا لڑکی اُن کے گھر کو اپنا گھر سمجھ کے راتوں رات بُدھ گیا سے بھاگتی ہوئی آئی ہے، اُس نے کچھ سمجھا ہوگا تبھی اِس طرف کا رخ کیا۔ ایسے کون کسی کے گھر آ جاتا ہے۔ ابّا جان کو اُس کا نہیں تو کم از کم میرا ہی پاس رکھنا چاہیے تھا۔ میں بھی اُسی گھر کا ایک فرد تھا۔ مجھے کسی کو اپنی مرضی سے اپنے گھر میں رکھنے کا حق نہیں تھا؟ ابّا جان وہاں اُس کا رہنا مناسب نہیں سمجھتے تھے تو کہیں اور بھیج دیتے۔ زمین اتنی تنگ نہیں تھی۔ وہ چاہتے تو اُس کے لیے ایک گھر بنا سکتے تھے۔ وہ خالی ہاتھ نہیں آئی تھی، اپنے ساتھ دولت بھی لائی تھی۔ ہیرے جواہر سے بھری پوٹلی۔ اُس کے لیے جو ابّا جان نہیں کر سکے، وہ مولوی صاحب، ایک اجنبی آدمی نے کیا۔

مولوی صاحب ایک بار میری ٹوہ لے کے تو دیکھتے کہ میری

گردن کتنی جھکی ہوئی ہے، مجھ سے اُن کے سامنے نگاہیں بھی نہیں اُٹھائی جاسکیں گی۔ میں نے اُن کا سکھ چین چھین لیا تھا۔ اُنھوں نے اُس کے لیے کتنی پریشانیاں اُٹھائی تھیں، ساری زندگی اُس پر قربان کردی تھی۔ زمانے بھر کی نگاہوں سے اُسے بچائے رکھے ہوئے تھے۔ میرے پاس اُن کے احسانات کا کوئی بدل نہیں تھا۔ مولوی صاحب نہ ہوتے تو آج وہ کہاں ہوتی۔ اُنھیں پیسوں کی کوئی تنگی ہوگئی تھی کہ وہ مرادآباد میں اپنی آبائی زمین اور مکان بیچنے آئے تھے۔ اُس مکان اور زمین سے اُنھیں کیا ملا ہوگا، چند ہزار روپے! کام بھی وہ ایسا ویسا نہیں کرسکتے تھے، ہر وقت اُنھیں دھڑکا لگا رہتا ہوگا۔ رانا مہتاب کے واقعے کے بعد وہ اُسے ایک لمحے کے لیے تنہا چھوڑنا نہیں چاہتے ہوں گے لیکن گھر چلانے کے لیے اُنھیں گھر سے باہر تو نکلنا پڑتا ہوگا۔ بھیک بھی جسم ہلائے بغیر نہیں ملتی۔ یہاں میری جیب میں خزانے کی کنجی رکھی تھی، کرشنا جی کی ساری دولت جوں کی توں بینک میں پڑی تھی۔ میں نے صرف نیساں کے لیے ساٹھ ہزار روپے کی رقم خرچ کی تھی، شہ پارہ کے لیے دی جانے والی رقم کرمین بیگم کے نصیب ہی میں نہ تھی۔ کانتے نے مجھے پچیس ہزار روپے والا پیشگی چیک واپس کردیا تھا اور کلکتے کے بینک میں جمع کیے جانے والے روپے میں سے ایک پائی بھی خرچ نہیں کی تھی۔

کرشنا جی نے یہ سب میرے لیے کیا تھا۔ میرے سوا کوئی اس کا مالک و مختار نہیں تھا۔ اُن کی روح بھی اس بات سے خوش ہوتی کہ وہ روپے میں نے خود پر خرچ کیے ہیں۔ میرے ہی سکھ کے لیے اُنھوں نے ایسا کیا تھا۔ جس وقت اُنھوں نے وصیت لکھوائی تھی، اُن کی ماں زندہ تھیں لیکن اپنی ماں کے نام اُنھوں نے کچھ نہیں لکھوایا اس لیے کہ وہ اُن کے لیے اپنی جگہ ایک اور بیٹا چھوڑ کے جا رہے تھے۔ اُنھیں یقین ہوگا کہ اُن کے بعد میں اُن کی ماں کی خدمت میں کوئی دریغ نہیں کروں گا۔ کرشنا جی کی طرح اُن کی ماں نے بھی مجھے اس کا موقع نہیں دیا۔ وہ مجھ پر اتنا بڑا بوجھ لاد کے چلے گئے تھے۔ پتہ نہیں کیوں! جب اُنھیں معلوم تھا کہ مجھے پیسے خرچ کرنا نہیں آتا اور بہت سی چیزیں پیسوں سے خریدی بھی نہیں جا سکتیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اِن روپوں کا کیا کروں۔ بنڈی میں رکھی ہوئی چیک بک مجھے بہت بوجھل لگتی تھی۔ مولوی صاحب ہوتے تو میں یہ سب اُن کے حوالے کردیتا۔ کورا کی امانت رکھنے کے معاوضے کے طور پر نہیں۔ اُس کا تو معاوضہ ہی نہیں ہوسکتا۔ اُس کے لیے تو کرشنا جی کی دولت کیا، قارون کا خزانہ بھی ہیچ ہے۔ بس جیسے کرشنا جی کا جی چاہا تھا کہ وہ چلتے وقت میرے نام یہ سب کرجائیں، میرا بھی یہی جی چاہتا تھا کہ کرشنا جی نے مجھے اپنی جان بچانے کا معاوضہ نہیں دیا تھا۔ وہ مجھے اپنا عزیز، اپنا بھائی سمجھتے تھے۔ میں بھی مولوی صاحب کو اپنے ابّا جان، کرشنا جی اور بجّھل کی طرح سمجھتا تھا۔ ایک بار وہ مُڑ کے دیکھتے، آزمائشاً ہی سہی، کورا کو مجھ سے دُور رکھ کے تو اُنھیں مجھ سے اتنی مایوسی نہ ہوتی۔ میں اُن کا دست و بازو ہی بنتا، پھر اُنھیں سر چھپانے کے لیے بستی بستی کوچے کوچے خاک نہ چھاننی پڑتی۔ وہ دیکھتے تو سہی کہ کتنے لوگ اُنھیں پلکوں پر بٹھاتے ہیں۔ کوئی اور نہ بھی ہوتا تو میں اکیلا بہت تھا۔ میں اُنھیں کوئی کام نہ کرنے دیتا۔ میرے بازوؤں میں منوں بوجھ اُٹھانے کی طاقت ہے۔ کچھ اور نہیں تو میں مزدوری ہی کرسکتا ہوں، میرے ہاتھ بیراگی کی وجہ سے بندھے ہوئے ہیں۔ مجھ سے کوئی کام ہی نہیں ہوتا ورنہ میں کیا نہیں کرسکتا۔ کرشنا جی کی دولت ایک اتفاق ہے۔ میں نے نہ اس کی طلب کی تھی، نہ مجھے اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس کے بغیر بھی میں کچھ کرنے کی تھوڑی بہت اہلیت ضرور رکھتا ہوں، میرے ہاتھ کٹے ہوئے تو نہیں ہیں۔

شاید مولوی صاحب کو یہی گمان ہوگیا تھا کہ میں کورا کو اُن سے جُدا کردوں گا۔ میں ایسا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ وہ مجھے اتنا کم ظرف، بے حس اور تنگ دل کیوں سمجھتے تھے۔ وہ مجھ پر ہی نہیں، کورا پر بھی جبر کر رہے تھے، کیا اتنے دنوں تک وہ نہیں جان سکے تھے کہ کورا اپنی بھی نہیں ہے۔ وہ اُس کے لیے بہترین لباس، غذائیں فراہم کرسکتے ہیں مگر کیا وہ اُس کے ہونٹوں کے لیے مسکراہٹ اور اُس کی آنکھوں کے لیے چمک بھی مہیا کرسکتے ہیں۔ اُنھیں کورا کا اس قدر خیال ہے تو ایک سامنے کی بات اُن کی عقل میں کیوں نہیں آرہی ہے۔ میری صورت، میری ہیئت کورا کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ میں اچھا ہوں یا بُرا، میرے چہرے پر سیاہی ملی ہوئی ہے یا سفیدی۔ میں جیل سے جانور بن کے نکلا ہوں یا آدمی۔ میں جیسا بھی ہوں، وہ مجھے اپنی قسمت سمجھ کے قبول کرلے گی اور یہی حال میرا ہے۔ اگر مجھے زہرہ سے یہ معلوم ہوتا کہ وقت نے کورا کی شکل بگاڑ دی ہے، وہ سب کچھ بھول گئی ہے، مولوی صاحب نے اُس کا ہاتھ ارشد کے ہاتھ میں دے دیا ہے یا وہ رانا مہتاب کے محل میں حکومت کرتی ہے تو میں یہ سب اپنی قسمت کا لکھا سمجھ کے قبول کرلیتا۔ وہ جہاں ہوتی، جیسی ہوتی میرے لیے تو وہی تھی۔ اُس کا میرا کوئی مول تول کا رشتہ نہیں تھا کہ اگر یوں ہے تو اُس کا جواب یوں ہوگا، میری آنکھوں سے بینائی چلی جائے گی تو وہ مجھے اپاہج سمجھ کے مسترد کردے گی، وہ میری دسترس سے دُور ہوجائے گی تو اُس کی تصویر میرے سینے میں دھندلی پڑجائے گی۔

میری سفیدی پر اُس کی سفیدی کا انحصار نہیں تھا۔ مولوی صاحب کو زندگی میں کورا کی طرح کوئی شخص نہیں ملا تھا تو یہ میری یا اُس کی غلطی نہیں تھی۔ اب تو سب کچھ اُن کے سامنے تھا۔ کون اُنھیں جا کے بتاتا کہ ایک دن نہیں، ایک برس نہیں، اب نو برس سے اُوپر ہوچکے ہیں۔ جیل میں تو مجبوری تھی لیکن جیل سے باہر ایک ایک پل مجھے ڈستا رہا ہے۔ میں نے اُنھیں گلی گلی ڈھونڈا ہے، کہاں کہاں نہیں گیا ہوں، میرے پیروں میں چھالے تک پڑ گئے، میری آنکھیں اُس کی پرچھائیں بھی نہ دیکھ سکیں۔ کون اُن سے جا کے کہتا کہ میری رگوں میں ہر وقت کھولن ہوتی رہتی ہے، جی اُکھڑا اُکھڑا رہتا ہے۔ سوچتا کچھ ہوں، ہو کچھ جاتا ہے۔ میں اپنے آپ کو بہت سمجھاتا ہوں لیکن دوسرے ہی لمحے سب بھول جاتا ہوں۔ کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو خوب طمانچے ماروں، اپنا جسم شکنجے میں کس لوں، کسی کنویں میں چھلانگ لگادوں یا ریل کے نیچے آجاؤں۔ مجھے موت بھی نہیں آتی۔ کتنے لوگ میری وجہ سے پریشان رہتے ہیں اور مجھ سے کسی سے سیدھے منہ بات بھی نہیں ہوتی۔ وہ سب بہت اچھے ہیں جو مجھے نہ جانے کیا سمجھ کے معاف کردیتے ہیں۔ زرّیں میری خاطر کلستی رہتی ہے۔ نیساں میرے لیے جب دیکھو مصلّے پر پیشانی رگڑتی رہتی ہے، جولین کو میں ایک خط بھی نہ لکھ سکا۔ مولوی صاحب کچھ اور نہیں تو مجھے ایک چٹکی زہر ہی بھیج دیتے، ایک بار میرے سامنے آ کے چھرا گھونپ دیتے۔ کون میری طرف سے جا کے اُن کے آگے ہاتھ جوڑے کہ وہ میری خطائیں معاف کردیں۔ خدا بھی اپنے بندوں کو معاف کردیتا ہے۔

گاڑی تیز رفتاری سے دلّی کی طرف بڑھ رہی تھی۔

میں کھڑکی پر سر ٹکائے بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ کتنے اسٹیشن آئے اور گزر گئے ہیں۔ میرے سر میں بھی کوئی ریل سی چل رہی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر بعد کسی نے میری پشت پر تھپکی دی، میں ہڑبڑا سا گیا۔ مارٹی ہاتھ میں چائے کا گلاس لیے سامنے کھڑا تھا اور ابّا جان سمیت اُن سب کی نگاہیں مجھ پر منڈلا رہی تھیں۔ ڈبے میں روشنی بہت کم ہوگئی تھی۔ گاڑی کسی اسٹیشن پر ٹھیری ہوئی تھی۔ پلیٹ فارم پر اُمڈتا ہوا شور ڈبے میں گونج رہا تھا۔ میں سمجھا، دلّی آگئی ہے۔ میں نے سٹ پٹاتے ہوئے لہجے میں مارٹی سے پوچھا، وہ پلکیں جھپکانے لگا۔

"دلّی ابھی دُور ہے راجا اُستاد!" اُس نے چائے کا گلاس میری طرف بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔ "ابھی ادھر گڑھ مکتیشر پڑتا ہے۔"

مجھے مارٹی کی بات کا یقین نہیں آیا لیکن دلّی آجاتی تو وہ سب اُترنے کی جلدی کرتے۔ گویا مرادآباد سے دلّی کا آدھا فاصلہ ابھی باقی تھا۔ میں نے مارٹی کے ہاتھ سے چائے کا گلاس لے لیا۔ منع کرتا تو وہ فضول میں اصرار کرنے لگتا۔ میرے مقابل کی نشست پر دیوار سے ٹیک لگائے ابّا جان نیم دراز تھے۔ پیرو اُن کے پاس بیٹھا تھا۔ زورا دروازے پر کھڑا تھا۔ مرادآباد سے چلنے والے دونوں مسافر اب ڈبے میں موجود نہیں تھے۔ میں نے چائے ختم نہیں کی تھی کہ پیرو اُٹھ کے میرے پاس آگیا اور میری گردن میں بازو ڈال کے مجھے دبوچنے لگا۔ میں کسمسا کے رہ گیا۔ "ایسا بھی کیا سوچتا ہے لاڈلے جانی؟" پیرو مجھے گدگداتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔

میں سر جھکائے خاموش رہا۔

"اپنے کو نئیں بولے گا؟" وہ شکایتی لہجے میں بولا۔

میرے دل میں آیا، پیرو سے کہہ کے دیکھوں، اچھا ہے اُسے بتلا دینا چاہیے کہ میں دلّی سے اُن کے ساتھ جانے کے بجائے حیدرآباد جانے والی گاڑی میں بیٹھ جاؤں گا۔ حیدرآباد سے بمبئی زیادہ دُور نہیں ہے۔ اُن کے پہنچنے کے دو تین روز بعد میں خود وہاں پہنچ جاؤں گا۔ پیرو سے کہہ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ وہ ابّا جان سے کوئی بھی عذر کر دے گا لیکن وہ اُن سے کیا عذر کرسکتا ہے۔ فیض آباد میں ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ابّا جان میرے اچانک راستہ بدل دینے اور ساتھ چھوڑ جانے سے بہت حیران ہوں گے۔ وہ پیرو سے طرح طرح کے سوال کریں گے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ خاموش ہوجاتے مگر اب وہ بہت شش و پنج میں پڑجائیں گے اور اگر کچھ کہیں گے نہیں تو اُن کے دل میں بے شمار وسوسے پیدا ہوں گے۔ یہ بہت عجیب بات ہے، نو سال بعد بھائی بہنوں کو دیکھنے کی صورت پیدا ہوئی ہے اور میں جا رہا ہوں۔ ابّا جان کو خود بھی فرخ، فریال، فارہہ اور اکبر کی صورتیں دیکھنے کی بہت بے چینی ہوگی۔ نو سال سے وہ جس دن کی آرزو کر رہے تھے، وہ دن قریب ہی تھا۔ اب وہ دن آنے میں بظاہر کوئی رکاوٹ نہیں تھی، جہاں گیر بھی اُنھیں مل گیا تھا۔ امّی اور فمی اُنھیں بہت یاد آرہی ہوں گی۔ ابّا جان جہاں گیر کو بھی فیض آباد سے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ بجّھل نے روک دیا۔ بہرحال میں ساتھ تھا۔ فرخ، فریال، فارہہ اور اکبر کے لیے میں مرچکا ہوں گا۔ مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھ کے اُن کی حیرت اور مسرت کا ٹھکانا نہیں ہوگا۔ ابّا جان مجھے اُن کے سامنے لے جا کے پہلے پہیلیاں بجھوائیں گے کہ پہچانو، یہ کون ہے۔ کچھ یاد آتا ہے کہ کہیں دیکھا ہے؟ شاید فرخ پہچان لے یا سبھی۔ جہاں گیر پہلی نظر میں مجھے نہیں پہچان پایا تھا۔

ابّا جان کی اِس وقت ایک ہی تمنا ہوگی کہ جلد سے جلد بمبئی پہنچ کے مجھے اُن کے سامنے کھڑا کردیں۔ یہ منظر دیکھنے کے لیے اُن کی آنکھیں ترس رہی ہوں گی۔ درمیان میں میرے چلے جانے سے

انھیں بے حد اذیت ہوگی۔ پیرو انھیں مطمئن کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا لیکن ظاہر ہے، وہ اتنی آسانی سے مطمئن نہیں ہوں گے۔ کاش میں خود اُن سے کہہ سکتا کہ صرف دو دن کے لیے مجھے اجازت دے دیجیے۔ میری آنکھیں بھی اُن سب کے چہرے دیکھنے کے لیے بے تاب ہیں، شاید اباجان سے زیادہ۔ فیض آباد میں وہ ٹھیر گئے تھے اور بمبئی جانے کے آثار نظر نہیں آتے تھے تو سب سے زیادہ بے کلی مجھی کو ہو رہی تھی۔ بمبئی میں مولوی اکرام کے فلیٹ پر میں کئی بار جا چکا تھا۔ کرشنا جی نے سارے ہندوستان کے تھانوں میں گشتی خط روانہ کیے تھے۔ انھی خطوط کے نتیجے میں اباجان کا سراغ مل سکا تھا۔ اباجان نے مجھے نہیں ڈھونڈا مگر میں نے، ہٹھل نے، کرشنا جی نے، ایس پی تنکلا نے انھیں ڈھونڈا تھا۔ سلطان، سولم، جبینی، پلٹو، وزیر، مٹن میاں، پیرو، زورا، مارٹی، ہلاکو، سبھی اس میں شامل تھے۔ کبن خاں، کلنتے اور بہت سے لوگ علیحدہ، غور کیا جائے تو وہ سبھی۔ ہم اباجان ہی کی وجہ سے تبت گئے تھے۔ یہاں بھی جہاں جہاں میں اور ہٹھل جاتے رہے، مولوی صاحب کے ساتھ انھیں بھی پوچھتے تھے۔ بمبئی میں جوہریوں کے پاس جہاں وہ کورا کے لائے ہوئے ہیرے جواہر بیچتے تھے، میں نے اور کرشنا جی نے اُن سے اُن کا پتہ حاصل کرنے کے لیے کیا کیا جتن کیے تھے۔ ممکن ہے، اباجان کو ہٹھل نے کچھ بتایا ہو کہ ہم نے کوئی در، کوئی گھر نہیں چھوڑا تھا۔ فیض آباد میں مجھے اگر ذرا سی بھنک مل جاتی کہ فرخ، فریال وغیرہ بمبئی میں مولوی اکرام کے فلیٹ میں ہیں تو میں شاید کسی سے کہے بغیر بمبئی چلا جاتا، میں اتنی دیر نہ ٹھیرتا۔ مجھے اپنی ننھی پارہ صفت فرخ اور بھوری آنکھوں بھورے بالوں والی فریال کو گلے لگانے کی اباجان سے زیادہ حسرت تھی۔ مجھے پہلے انھی کے پاس جانا چاہیے تھا۔ یقیناً میں دو دن بعد بھی بمبئی سے حیدرآباد جا سکتا ہوں لیکن دو دن کیا، مجھ سے تو ایک لمحہ بھی نہیں گزارا جا رہا۔ ایسی صورت میں میں انھیں کیا دیکھ سکوں گا اور اُن سے کیا بات کر سکوں گا۔ مجھے ہر لمحے حیدرآباد کا خیال رہے گا۔ اتنے عرصے بعد تو مولوی صاحب کا کوئی نشان ملا تھا۔ اُن کا کوئی بھروسا نہیں کہ کل وہ اپنا گھر چھوڑنے کا ارادہ کر لیں، کسی اور طرف نکل جائیں۔ جہاں تک میرے امکان میں ہے، مجھے کسی تاخیر کے بغیر مسافرخانے کے رجسٹر پر مندرج پتے پر پہنچ جانا چاہیے۔ مجھے ایک طرف سے تسلی ہوگئی تھی کہ فرخ، فریال وغیرہ مولوی اکرام کے ساتھ ایک گھر میں محفوظ ہیں۔ اباجان اُن کا انتظام کر کے ہی تبت کے سفر کو نکلے تھے اور اب اباجان انھی کے پاس واپس جا رہے تھے۔ پیرو، زورا اور مارٹی بھی اُن کے ساتھ تھے۔ ایک میرے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے اُن سب سے بچھڑے ہوئے جہاں اتنے برس گزر گئے ہیں، وہاں دو دن اور سہی۔ جب تک میں وہاں پہنچ نہ جاؤں، بہتر ہے، اباجان اُن سے میرا تذکرہ ہی نہ کریں۔ اُدھر حیدرآباد میں وہ بہت اکیلی ہوگی۔ فرخ، فریال کو میرا انتظار نہیں ہے، انھیں میرے بارے میں کوئی علم ہی نہیں لیکن وہ تو اپنی آہٹ پر بھی چونک جاتی ہوگی۔ فرخ، فریال ایک دوسرے کے ساتھ ہیں، اُس کا وہاں کوئی بھی ہم زباں، ہم نفس نہیں ہوگا۔ زہرہ کہتی تھی کہ وہ کسی کو اپنا حال نہیں بتاتی، کسی سے کوئی شکایت نہیں کرتی۔ مولوی صاحب کی دیوار کے سائے کے باوجود وہ بے سایہ تھی، ہر دم، ہر پل اُس کی آس بندھتی، ٹوٹ جاتی ہوگی۔ اباجان کو نہیں معلوم کہ وہ کون ہے۔ میں انھیں کیا بتاؤں کہ یہ وہی لڑکی ہے جسے انھوں نے اپنے گھر میں پناہ دینے میں حیل و حجت کی تھی اور جس کے لیے میں گھر سے چلا آیا تھا۔ اُس کے لیے میں نے پورے سات سال جیل میں کاٹے تھے۔ اباجان کی وہ کوئی نہیں ہوتی تھی لیکن میرے لیے سبھی کچھ تھی۔ اباجان نے اب تک نہیں سمجھا تھا تو انھیں اب سمجھ لینا چاہیے کہ میں اُس کے بغیر شاید کچھ بھی نہیں ہوں۔ وہ مجھ سے دُور ہے، مجھ سے الگ نہیں۔ میں اُس کا کوئی روپ ہوں یا وہ میرا دوسرا روپ ہے۔

پیرو میرے پاس ہی بیٹھا تھا لیکن میں اُس سے حیدرآباد جانے کے متعلق اپنے ارادے کا ذکر کرتے کرتے رہ جاتا تھا۔ سامنے اباجان کی نظریں ہمی پر لگی ہوئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے انھیں میرے بارے میں کچھ شبہ سا ہو گیا ہے یا یہ میرا وہم تھا۔ وہ آنکھیں کھولے کسی سوچ میں گم تھے اور ایک دم چونک کے میری طرف دیکھنے لگتے تھے۔ میں اُن کے سامنے پیرو سے کوئی بات کرتا اور بعد میں پیرو اُن سے میرے حیدرآباد جانے کا کوئی جواز پیش کرتا تو وہ فوراً سمجھ جاتے کہ پیرو کو میں نے مجبور کیا ہے، پیرو کا کوئی کام نہیں، میرا ہی کام ہے۔ میں نے انتظار کیا کہ اباجان کی توجہ کسی دوسری جانب مبذول ہو تو میں پیرو کو بتاؤں۔ ہاپوڑ اسٹیشن بھی آ کے گزر گیا۔ ہاپوڑ آنے کا مطلب تھا کہ دلی صرف تیس میل دُور رہ گئی ہے۔ ڈبے میں کم روشنی کے قمقمے روشن ہو گئے تھے اور کھڑکی سے باہر کچھ نظر آنا مشکل ہو گیا تھا۔ گڑھ مکتیشر کا پل عبور کرنے کے بعد گاڑی کی رفتار کسی قدر سست پڑ گئی تھی۔ غازی آباد بھی آ گیا۔ اباجان نے ایک پل کے لیے پلکیں نہیں جھپکائیں اور گاڑی دلی کی حدود میں داخل ہو گئی۔ اب ایک ہی صورت تھی، اگر پیرو سے کوئی بات کرنے کا موقع نہیں ملتا تو زورا اور مارٹی کو سمجھا کے میں دلی اسٹیشن ہی پر کہیں گم ہو جاؤں، دلی اسٹیشن بہت بڑا ہے، میں وہاں ہجوم میں رَل مِل سکتا ہوں۔ میری جیب میں ایک دو روپے

ہی پڑے تھے لیکن روپوں کے بغیر مجھے اپنا سفر کسی نہ کسی طرح جاری رکھنا تھا۔

دلی اسٹیشن پر میرے قدم بہک سے رہے تھے۔ دس نمبر پلیٹ فارم پر گاڑی آ کے ٹھیری تھی۔ رات کے ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ سارا اسٹیشن روشنیوں سے جگمگا رہا تھا اور ہر طرف گاڑیوں، مسافروں، قلیوں کا شور پھیلا ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ رات دس بجے کے قریب حیدرآباد کے لیے گاڑی جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے، اس دوران وقت تبدیل ہو گیا ہو تاہم میں ناگ پور تک جانے والی کسی گاڑی میں بیٹھ سکتا تھا یا ایسی کسی گاڑی میں جو اورنگ آباد تک جائے۔ ایسی ایک گاڑی بھوپال اور منماڑ سے گزرتی ہوئی بمبئی تک جاتی تھی اور منماڑ سے مجھے اورنگ آباد اور حیدرآباد کے لیے دوسری گاڑیاں مل سکتی تھیں۔ اباجان چند قدم آگے بڑھ گئے تھے۔ مارٹی اور زورا مختصر سامان کے ساتھ اُن کے ہمراہ تھے۔ میں کچھ دیر تک اُن کے پیچھے پیچھے پیرو کے ساتھ چلتا رہا پھر جب وہ کچھ اور آگے [illegible] گئے تو میں نے پیرو کا ہاتھ پکڑ کے آہستگی سے کہا۔ "دادا! [illegible] ایک بات کرنی ہے۔"

پیرو ایک ثانیے کے لیے رُک گیا اور میری طرف تند نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اپن جانتا ہے، تو ابھی کون سی بات بولنا مانگتا ہے۔"

"تم کیا جانتے ہو؟" میں نے مضطرب لہجے میں کہا۔

"تم اکیلا کدھر کو بھی نہیں جائے گا راجا!"

"دادا!" میں نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

وہ مجھے سینے سے چمٹاتے ہوئے بولا۔ "اپن جانتا ہے۔"

"دادا! میرا اُدھر جانا ضروری ہے۔" میری آواز بھرا گئی۔

وہ سر ہلانے لگا۔ "اپن بھی تمھارے ساتھ چلے گا۔"

"نہیں دادا! تم اباجان کے ساتھ جاؤ، میں تم سے وعدہ کرتا ہوں، جلدی واپس آ جاؤں گا، دیر بالکل نہیں کروں گا۔ تم اباجان سے کوئی بہانہ کر دو، میری طرف سے مت کہنا۔"

"اپن نے بڑے صاحب سے بول دیا ہے۔"

"تم نے، تم نے اُن سے بات کر لی ہے؟"

"دلی سے پہلے ہی اُس کو بولنا تھا۔"

"تم نے اُن سے کیا کہا؟"

"بول دیا راجا!" وہ ٹھنک کے بولا۔ "اپن نے بولا، ابھی تم زورا اور مارٹی کے ساتھ سیدھا بمبئی جاؤ، اپن لوٹ کے آتا ہے۔"

"پھر وہ کیا بولے؟" میں نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"تھوڑا دیر چپ رہا پھر بولا، ٹھیک ہے۔ اپن بھی تمھارے ساتھ چلے گا۔"

"نہیں، نہیں۔"

"اپن نے منع کرا، پر وہ بولا، ابھی سب ساتھ ساتھ ہی بمبئی چلے گا۔ دو تین دن سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دو تین دن بعد اپن لوگ بمبئی پہنچ سکتا ہے۔"

"مگر تم نے اُن سے کس طرح کہا تھا؟"

"وہی جو اپن بولتا ہے۔"

"میرا تو نہیں بتایا تھا؟"

اُس نے مجھے آگے کی طرف دھکا دیا۔ اباجان، زورا اور مارٹی آگے مسافروں میں گم ہو گئے تھے۔ "ابھی تھوڑا بہت چلتا ہے۔" وہ اپنے سر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"دادا! دادا!" میں نے اُسے روکنے کی کوشش کی۔ "میری بات سنو۔"

"گاڑی کا ٹیم نکلا پڑتا ہے راجا!"

"پہلے میری ایک بات سن لو۔"

وہ ٹھیر گیا۔ "ابھی سب ٹھیک ہے راجا!"

"دادا! اُن سے کہو وہ چلے جائیں۔ اُن کا ہمارے ساتھ جانا مناسب نہیں ہے۔" میں نے عاجزی سے کہا۔

"اپن اُس سے ایسا نہیں بول سکتا۔"

"انھیں وہاں نہیں جانا چاہیے، اتنے بہت سے لوگوں کے چلنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں، تم بھی مت جاؤ۔ خواہ مخواہ تم سب پریشان ہو گے۔ تم سمجھتے کیوں نہیں؟"

"اپن سب سمجھتا ہے۔" وہ ناراضی سے بولا۔

"میں کوئی غلط بات نہیں کہہ رہا ہوں۔ تمھارا اور سب کا وہاں جانا بالکل لاحاصل ہے۔ تم بھی تنگ ہو گے، مجھ پہ بھی بوجھ رہے گا یا پھر... پھر ایسا کرو، صرف تم بھی چلو اور ان سب کو بمبئی کی گاڑی میں بٹھا دو۔"

"وہ لوگ نہیں مانے گا راجا! اپن نے بول کے دیکھا ہے۔"

"لیکن تم، تم...."

"ابھی اُودر جا کے دیکھے گا، پہلے ایدر سے نکلے۔"

"ٹھیک ہے، پھر میں بھی بمبئی چلتا ہوں۔"

پیرو میری بات سنی اَن سنی کرتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ اباجان، زورا اور مارٹی ہمارے انتظار میں آگے جا کے رُک گئے تھے۔ ہم اُن کے پاس پہنچے تو معلوم ہوا کہ حیدرآباد جانے والی گاڑی روانہ ہونے میں کچھ ہی دیر باقی ہے۔ میں نے اُن کے پیچھے پیچھے ہو کے وہاں سے بھاگ جانا چاہا لیکن پیرو میرے ساتھ ساتھ ہی رہا۔ اُس

نے جیب سے روپے نکال کے مارٹی اور زورا کو دیے اور انھیں پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے ٹی ٹی سے ٹکٹ کی تبدیلی کے متعلق معلومات کرنے کی ہدایت کی۔ اُن کے واپس آنے سے پہلے ہم فرسٹ کلاس کے ایک ڈبّے میں بیٹھ گئے تھے۔ میں نے باہر ڈبوں پر لگی ہوئی تختیوں میں حیدرآباد کا نام دیکھ لیا تھا۔ اب کہنے سننے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ تھوڑی دیر میں گاڑی بھی چل پڑی۔ میرے جسم پر رعشہ سا طاری تھا۔

آج کی رات، کل کا پورا دن، کل کی ساری رات، پھر کہیں دوسرے دن دوپہر کو یہ سفر ختم ہونا تھا۔ درمیان میں گاڑی لیٹ ہو جائے تو شام بھی ہو سکتی تھی، رات بھی۔ ریل گاڑی کے سوا اور کوئی تیز ترین ذریعہ نہیں تھا۔ دلّی اسٹیشن کے دُور ہوتے ہی اُنھوں نے فرش پر چادر بچھا کے کھانا لگا دیا۔ انھوں نے مجھ سے کہا تو میں بھی اُن کے ساتھ فرش پر آ گیا۔ صبح فیض آباد سے چلتے ہوئے زرّین نے اتنا بہت سا کھانا ساتھ کر دیا تھا کہ دوپہر کو کھانے کے باوجود باقی رہ گیا تھا۔ شاید میری طرح کسی کو بھوک نہیں لگ رہی تھی۔ اباجان نے چند لقمے لیے ہوں گے کہ ہاتھ کھینچ لیا۔ میں اُن سب کے خیال سے بیٹھا رہا۔ نوالے حلق میں اٹک رہے تھے۔ نیساں نے میٹھے چاول بطورِ خاص میرے لیے پکائے تھے۔ مجھ سے وہ بھی نہیں کھائے گئے۔ انھوں نے جیسے ہی کھانا سمیٹا، میں اُوپر کی برتھ پر جا کے لیٹ گیا۔ اباجان میری برتھ کے عین نیچے تھے اس لیے نہ وہ مجھے دیکھ سکتے تھے، نہ میں انھیں۔ ڈبّے میں چھ مسافروں کی گنجائش تھی۔ دو پہلے سے موجود تھے۔ ایک خوش پوش، صحت مند، سانولے رنگ اور بھرے ہوئے چہرے کا نوجوان۔ دوسری اُس کے ساتھ سونے جیسی رنگت، کتابی چہرے کی ایک لڑکی۔ اُس نے کاسنی ساڑی پہن رکھی تھی۔ کانوں میں سفید آویزے لٹک رہے تھے، گلے میں ہار، ہاتھوں میں چوڑیاں۔ وہ نوجوان کی بیوی ہو سکتی تھی یا بہن بھی۔ ڈبّے میں داخل ہوتے وقت میں نے اُسے ایک نظر ہی دیکھا تھا اور نہ جانے کیوں مجھے شبہ ہوا تھا جیسے میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ بعد میں مجھے اُس کا چہرہ نظر نہیں آیا۔ وہ ہم سب کی طرف پیٹھ کر کے اور ساڑی کا پلو سر پہ ڈال کے کونے میں بیٹھی رہی۔ ہم پانچ آدمیوں کو ڈبّے میں دیکھ کے نوجوان نے دبے لفظوں میں اعتراض کیا لیکن پیرو نے اُسے سمجھایا کہ ایک مزید آدمی کی موجودگی سے اُسے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ وہ چپ تو ہو گیا مگر دیر تک اُس کے چہرے پر کھنچاؤ رہا۔ ڈبّے میں برتھیں بھی صرف چھ تھیں۔ تین اُوپر، تین نیچے۔ نیچے کی برتھوں پر نوجوان، اُس کے ساتھ والی لڑکی اور اباجان تھے۔ اوپر ایک پر میں، دوسری پہ پیرو، تیسری پہ ایک دوسرے کے سروں کی طرف پیر کیے زورا اور مارٹی۔ برتھ پر آ کے میں نے جیسے ہی آنکھیں موندنے کی کوشش کی، میرا دل ڈوبنے سا لگا جیسے میں کہیں گرنے لگا ہوں، میں نے پھر آنکھیں بند ہی نہیں کیں۔

رات کے سناٹے میں گاڑی کا شور بڑھ گیا تھا۔ رفتار بہت تیز تھی۔ ڈبّے میں ہلکی روشنی کا بلب روشن کر دیا گیا تھا۔ پیرو، زورا اور مارٹی جلد ہی بے سدھ ہو گئے۔ گاڑی چلے ہوئے دیر ہو گئی تھی، اُوپر میری طبیعت بہت گھبرانے لگی تو میں نے نیچے اُترنے کا ارادہ کیا مگر سب کی نیند میں خلل پڑنے کے خیال سے وہیں پڑا رہا۔ مجھے حبس سا محسوس ہو رہا تھا۔ نیچے ایک عورت بھی موجود تھی۔ میرا اُترنا ویسے بھی مناسب نہیں تھا۔ ظاہر ہے، میں اباجان ہی کی برتھ پر جا کے بیٹھ سکتا تھا۔ باقی دو برتھوں پر نوجوان اور لڑکی آرام کر رہے تھے۔ اِسی دوران کسی لمحے میں نے کروٹ بدلی تو میری نظریں سیدھی اُس لڑکی پر گئیں جو نیچے میری برتھ کے عین مقابل لیٹی تھی۔ وہ بھی جاگ رہی تھی۔ کم روشنی کے باوجود میں اُس کا سانولا چہرہ اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ اُسے فوراً احساس ہو گیا کہ کوئی اُس کی جانب دیکھ رہا ہے۔ ایک ثانیے کے لیے اُس کے سارے بدن میں ایک لہر سی کوندی۔ وہ چادر اوڑھے ہوئے تھی، اُس نے اپنا منہ چشم زدن میں دوسری طرف پھیر لیا۔ مجھے پھر وہی گمان ہوا جو اُسے پہلی بار دیکھ کے ہوا تھا۔ میں نے یقیناً اُسے پہلے کہیں دیکھا تھا۔ کہاں اور کب؟ یہ کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ میں نے ذہن پر بہت زور دیا۔ ایک بار نہیں، کئی بار میں نے اُسے دیکھا تھا۔ پھر یکایک مجھے یاد آیا۔ ہو نہ ہو، یہ سونیا ہے۔ سونیا کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ جیل میں، میں نے امتحانات دینے شروع کیے تھے اور ایف اے میں اوّل آیا تھا تو جیلر صاحب اتنے خوش ہوئے کہ مجھے بیوی بچوں سے ملوانے اپنے گھر لے گئے۔ اُن کے گھر والے مجھے دیکھ کے سہمے ہوئے تھے۔ جیلر صاحب نے اُنھیں بتایا۔ "یہ ہے وہ قیدی لاڈلا۔ نام اس کا ظہیر خاں ہے مگر جیل میں سب اِسے لاڈلا کہتے ہیں۔" بعد میں، میں اُن کے گھر باقاعدہ آنے جانے لگا تھا۔ جیلر صاحب میری تعلیم میں خاصی دلچسپی لیتے تھے۔ ہر امتحان میں اوّل آنے پر وہ انعام میں مجھے کتابوں کا تحفہ دیا کرتے تھے۔ وہ جیلر صاحب کی لڑکی سونیا تھی۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات تیسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں

سب رنگ ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ

بازی گر

تیسرا حصہ

امنگوں

جھلملوں آنسوؤں

اور

آہوں کی داستان

ایک آدمی کی عبرتناک سرگزشت

راوی: بابو زماں خاں
تحریر: شکیل عادل زادہ

ضرور سونیا نے مجھے پہچان لیا تھا مگر اُس نے منہ کیوں چھپا لیا؟ ڈبے میں داخل ہوتے وقت مجھے دیکھ کے وہ پیٹھ کر کے بیٹھ گئی تھی۔ ہم لوگوں نے کھانا کھایا، ماباجان کے لیے بستر لگایا، اِس تمام عرصے وہ سر جھکائے ایک کونے میں سکڑی سمٹی بیٹھی رہی۔ مجھے دیکھتے ہی اُسے سلام کرنا چاہیے تھا۔ شاید میں بھی یہی کرتا، اگر پہلی نظر میں اُسے پہچان لیتا۔ جیل میں اُسے میں بلاناغہ پڑھانے جاتا تھا۔ جیلر صاحب مجھے اس قدر پسند کرنے لگے تھے کہ انھوں نے مجھ سے سونیا کو پڑھائی میں مدد دینے کی خواہش ظاہر کی۔ اِس میں میرا بھی بھلا تھا۔ ہر روز دو ایک گھنٹے اُسے پڑھا کے میں واپس سلاخوں کے پیچھے آجاتا تھا۔ اُس وقت وہ ایف اے کے پہلے سال میں تھی اور میں بی اے کے پہلے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ ایف اے میں بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوئی، میں نے بھی بی اے میں فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔ وہ بہت سنجیدہ، متین اور حسین تھی۔ ہم دونوں میں تعلیمی موضوعات کے سوا دوسری باتیں کم ہی ہوتی تھیں۔ میں جب دوپہر کو وہاں جاتا تو وہ کمرے میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی ہوتی۔ واپس آنے لگتا تو دروازے تک مجھے چھوڑنے آتی۔ اُس کا سونا رنگ کچھ اور نکھر گیا تھا اور چہرے پر پہلے سے زیادہ سنجیدگی نظر آتی تھی۔ مجھے خوب یاد تھا، شروع شروع میں وہ مجھ سے میرے بارے میں طرح طرح کے سوال کرتی تھی، میرے کتنے بھائی بہن ہیں، میرا گھر کہاں ہے؟ اُسے حیرت تھی کہ میں قتل جیسا جرم کیسے کر سکتا ہوں۔ ہو نہ ہو، میں کسی دھوکے میں پکڑا گیا ہوں اور کسی خوف سے میں نے سارا الزام اپنے سر لے لیا ہے۔ کئی بار اُس نے ٹوہ لینے کی کوشش کی، آخر ایسی کیا بات تھی جو میں اس انتہائی اقدام پر مجبور ہو گیا۔ جب وہ یہ سمجھنے لگی کہ ان سوالات کے جوابات میرے پاس نہیں ہیں اور مجھے ان سے تکلیف پہنچتی ہے تو وہ محتاط ہو گئی۔ یوں بھی وہ بولتی کم، سوچتی زیادہ تھی، ہر وقت نگاہیں نیچی کیے دھیمے دھیمے مسکراتی رہتی، شرماتی رہتی۔ اُسے کپڑے پہننے کا خوب سلیقہ تھا، بال بہت لمبے تھے۔ اُس کے قریب بیٹھ کے سوندھی سوندھی خوشبو محسوس ہوتی تھی۔ کبھی مجھے ایسا لگتا جیسے میں کوراکے سامنے بیٹھا ہوں۔ میرا بہت خیال رکھتی تھی۔ گھر میں کوئی نئی چیز پکی ہوتی تو میرے سامنے لا کے رکھ دیتی۔ جیلر صاحب کے ہاں کھانا کھاتے مجھے اچھا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ لگتا تھا جیسے سونیا مجھ پہ ترس کھا کے میری تواضع کر رہی ہے۔ میرے انکار پر وہ مضطرب ہو جاتی۔ اُس نے مجھے ناخن تراش، کنگھے، رومال اور چھوٹی موٹی بہت سی چیزیں دی تھیں۔

میں ایم اے کی تیاری کر رہا تھا۔ ایک دن سونیا نے مجھے بتایا کہ جیلر صاحب کا تبادلہ ہو گیا ہے، اب وہ لوگ جلد ہی یہاں سے

چلے جائیں گے۔ یہ خبر سناتے ہوئے سونیا کی آواز بھ[illegible] اُس کی گھنیری پلکوں پر آنسو جھلملا رہے تھے۔ میں کیا کہہ سکتا تھا۔ مجھ سے پوچھنے لگی "رہا ہونے کے بعد آپ ہمارے گھر آئیں گے؟ آپ سیدھے ہمارے ہی گھر آئیں۔" میں نے اُس کی خاطر ہاں کر دی تھی۔ اُس نے بتایا تھا کہ جیلر صاحب گھر میں اکثر میرا ذکر کرتے ہیں، کہتے ہیں، جیل سے چھوٹنے کے بعد وہ میرے لیے اعلا ملازمت کی کوشش کریں گے۔ کہتے ہیں، دیکھنا، لاڈلا ایک دن نام پیدا کرے گا۔ میں سنتا رہا، پھر جیلر صاحب کا تبادلہ ہو گیا اور سونیا بھی چلی گئی۔ جیلر صاحب کا گھر جیل کی چار دیواری کے اندر تھا مگر وہ ایک گھر تھا۔ اُن کے جانے کے بعد اُس کے دروازے ہمیشہ کے لیے مجھ پر بند ہو گئے۔ نیا جیلر بہت درشت تھا۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد مجھے کبھی موقع ہی نہ ملا کہ ان لوگوں کے بارے میں کسی سے پوچھتا۔

یہ سونیا ہی تھی، وہ نہ ہوتی تو مجھے دیکھ کے اس طرح نہ چونکتی اور یوں منہ نہ چھپاتی۔ کوئی اجنبی لڑکی ایسا نہیں کر سکتی۔ میں اسے ہزاروں میں پہچان سکتا ہوں۔ آتے وقت میرے سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اتنے برسوں بعد سونیا مجھے اس طرح اچانک نظر آ جائے گی۔ میں نے اُس وقت بس اُس کی ایک جھلک دیکھی تھی مگر سونیا نے خود مجھ سے بات کیوں نہیں کی۔ میری سمجھ میں اس کا کوئی سبب نہیں آ رہا تھا۔ شاید یہ نوجوان ہی اس کا سبب تھا جو اُس کے ساتھ تھا۔ وہ اُس کے سامنے مجھ سے اپنی کسی پرانی واقفیت کا اظہار کرنا نہیں چاہتی ہو گی یا مجھ سے میرے ساتھ آنے والے لوگوں کو دیکھ کے کچھ خوف زدہ ہو گئی تھی۔ پیرو، زورا قد و قامت میں بہت سے لوگوں میں نمایاں تھے۔ اُن کے لہجے بھی مختلف تھے۔ ممکن ہے اُس نے کچھ اور سوچا ہو۔ سوچا ہو کہ جیل کے آخری سالوں جب وہ وہاں سے جا چکی تھی، میں بدل نہ گیا ہوں۔ اُس نے ایک قیدی کو اپنے گھر دیکھا تھا، ایک آزاد شخص کو نہیں۔ مجھے کھلا دیکھ کے اُس کے دل میں کوئی خوف جاگزیں ہو گیا ہو گا۔ اُسے معلوم تھا کہ میں نے تین قتل کیے ہیں۔ اُس کے باپ جیلر تھے اور جیل کے قیدیوں کے بارے میں وہ اُن سے روز ہی کچھ نہ کچھ سنتی ہو گی۔ بہت سی باتیں ہو سکتی تھیں جو وہ مجھ سے اپنا تعلق ظاہر کرنا نہیں چاہتی ہو گی۔ آدمی پلک جھپکتے بدل جاتا ہے۔ پھر یہاں تو اتنے سال گزرے تھے۔

مجھے بھی پھر اُس سے کچھ نہیں کہنا تھا۔ نوجوان ضرور اُس کا شوہر ہو گا۔ وہ خوش قسمت تھا جو اُسے سونیا جیسی لڑکی ملی۔ سونے میں تولی جاتی تو بھی اس کی قیمت زیادہ ہوتی۔ میں نے اُسے بہت قریب سے دیکھا تھا۔ وہ اُس وقت بھی اتنی اچھی تھی تو اب [illegible] کی اچھائیوں میں اضافہ ہی ہوا ہو گا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ [illegible] شادی حال میں ہوئی ہے۔ پتہ نہیں، وہ کہاں جا رہی تھی۔ اپنی سسرال، سیر و تفریح کی غرض سے، یا اپنے میکے یا کہیں اور —

نوجوان اوسط قد کا ایک صحت مند شخص تھا۔ پڑھا لکھا بھی نظر آتا تھا۔ سونیا کے لیے کوئی پڑھا لکھا لڑکا ہی موزوں ہو سکتا تھا۔ نوجوان کا تعلق کسی بڑے گھر سے ہو گا۔ فرسٹ کلاس میں پیسے والے ہی سفر کر سکتے ہیں۔ میں نے سونیا کو اُس سے باتیں کرتے نہیں دیکھا تھا لیکن وہ خوش و خرم زندگی گزار رہے ہوں گے۔ سونیا کے ساتھ کون خوش نہیں رہ سکتا۔ سلیقہ مند وہ شروع سے تھی۔ سارا گھر آئینہ رکھتی تھی۔ اُس کی چھوٹی بہن بملا اُس کے بالکل برعکس تھی۔ وہ گھر بگاڑتی تو یہ سنوارتی رہتی تھی۔ سونیا کے لیے نوجوان کو یہ بتا دینے میں کیا حرج تھا کہ میں کبھی جیل میں اُسے پڑھایا کرتا تھا۔ سونیا کو اُس پر اتنا اعتماد ہونا چاہیے تھا۔ بہر حال وہی بہتر سمجھتی ہو گی۔ اچھا ہی ہوا جو اُس نے مجھے نہیں پہچانا۔ ابا جان کو بھی پتہ چل جاتا کہ میں نے ایک طویل سزا کاٹی ہے پھر سونیا کو بھی مجھے اپنے بارے میں بہت کچھ بتانا پڑتا۔ یہ بھی ایک وجہ ہو سکتی تھی کہ وہ میری ہی خاطر خاموش رہی ہو۔

میں نے کروٹ بدل کے اپنی آنکھیں اُس کی جانب سے ہٹا لیں۔ رات کو پھر کسی وقت بے اختیار میں نے نیچے دیکھا تو وہ کھڑکی کی طرف منہ کیے نڈھال بیٹھی تھی، گم صم۔ اُسے میری آہٹ محسوس نہیں ہوئی۔ میں اُسے آنکھیں نیم وا کیے دیکھتا رہا۔ سونیا کی گہری گہری سانسوں کا اندازہ اُس کے سینے کے تموج سے ہو رہا تھا۔ کھڑکی کا آدھا شیشہ کھلا ہوا تھا اور سونیا کے بال اُڑ رہے تھے۔ اُسے کوئی تکلیف تھی۔ وہ تھکی تھکی، بہت اُداس لگ رہی تھی اور یہ دیکھ کے مجھے بہت حیرت ہوئی کہ اُس کے رُخسار بھیگے ہوئے ہیں۔ قمقمے کی مدھم روشنی میں اُس کے آنسو چمک رہے تھے۔ میں نے سوچا، نیچے جا کے اُس سے پوچھوں، اُسے کیا دکھ ہے، اُس کی طبیعت تو خراب نہیں ہے۔ نوجوان سو رہا تھا۔ میں سوچتا ہی رہ گیا۔ میرا نیچے جانا کہیں سونیا کے لیے کسی اُلجھن کا سبب نہ بن جائے۔ میرے لیے خود کو روکنا بہت مشکل ہو گیا تھا لیکن وہ اجنبیت کا رویہ نہ رکھتی تو میں فوراً چلا جاتا۔ کوئی اسٹیشن آ رہا تھا۔ گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی تو سونیا کو جیسے ہوش آیا۔ اُس نے گھبرائے ہوئے انداز میں سر اُٹھا کے میری طرف دیکھا۔ میں نے حرکت نہیں کی۔ یوں ہی دم سادھے پڑا رہا۔ سونیا نے اپنے بدن پر جلدی سے چادر لپیٹی اور کچھ اور سمٹ کے بیٹھ گئی، جیسے اُسے سردی لگ رہی ہو۔ اسٹیشن پر گاڑی چند منٹ کے لیے ٹھہری تھی، دوبارہ چلی تو وہ اُسی نشست سے سر ٹکائے جاگتی رہی۔ اِس دوران کئی بار اُس کی ڈوبی ہوئی بے چین نظریں میری جانب اُٹھیں۔ وہ رات بھر نہیں سوئی۔

ڈبے میں سورج کی روشنی خوب پھیل گئی تو میں اپنی برتھ سے اُٹھا۔ پیرو، زورا اور مارٹی پہلے ہی نیچے آ گئے تھے۔ نوجوان بھی جاگ گیا تھا۔ میں نے احتیاط کی تھی کہ سونیا سے نگاہیں چار نہ ہوں۔ جھانسی اسٹیشن پر گاڑی ٹھہری تو پیرو نے مارٹی کو ناشتے وغیرہ کا انتظام کرنے کی ہدایت کی۔ مارٹی کے ساتھ میں بھی پلیٹ فارم پر چلا آیا۔ کچھ دیر میں ابا جان، پیرو اور زورا بھی ہمارے پیچھے پیچھے چلے آئے۔ سب نے ایک ایک پیالی چائے، باہر اسٹال ہی پر پی لی۔ ابا جان نے پوریاں، کچوریاں کھانے سے انکار کر دیا تھا چنانچہ گاڑی کے ساتھ چلنے والے بیرے کو ڈبے میں ناشتہ فراہم کرنے کا آرڈر دے دیا گیا۔ صبح ہونے کے بعد یہ پہلا اسٹیشن آیا تھا اِس لیے گاڑی کے تقریباً آدھے مسافر نیچے اُتر آئے تھے۔ ٹھیلوں اور خوانچے والوں کی صداؤں نے سارا اسٹیشن سر پر اُٹھا رکھا تھا۔ میں اور مارٹی گاڑی کے اِس سرے سے اُس سرے تک بے مقصد چکر لگاتے رہے۔ مراد آباد میں مولوی صاحب کا پتہ معلوم نہ ہو جاتا تو میں ایک ایک ڈبے میں جھانک کے دیکھتا۔ سفر میں پہلی مرتبہ مجھے مسافروں کے چہرے ٹٹولنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ جتنی دیر میں باہر رہا، سونیا کا چہرہ میری آنکھوں میں گھومتا رہا۔ درمیان میں مارٹی نے نہ جانے کیا کیا باتیں کیں، میں جواب میں بس ہُوں ہاں کرتا رہا۔ مجھے کچھ ایسا شبہ ہو رہا تھا کہ ڈبے میں ہمارے واپس پہنچنے پر وہ دونوں وہاں موجود نہیں ہوں گے۔ سگنل گر گیا تھا۔ میں نے اور مارٹی نے جلدی جلدی اپنے ڈبے تک کا راستہ طے کیا۔

وہ وہیں تھے۔ سونیا اور نوجوان اب ایک ہی برتھ پر قریب قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے آنے پر نوجوان کچھ اُچھل سا گیا۔ اُس کی پھٹی ہوئی آنکھیں یکایک مجھ پر آ کے جم گئی تھیں۔ اُس کی نظروں میں اضطراب بھی تھا، ویرانی بھی تھی۔ سونیا نے ساڑی کا پلو اپنے سر پر سرکا لیا تھا اور ترچھی ہو گئی تھی لیکن گھونگٹ کی آڑ سے اُس کا آدھا چہرہ جھانک رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ سونیا نے نوجوان کو میرے بارے میں کچھ بتا دیا ہے۔ اس کے باوجود وہ میری نگاہوں سے اوجھل رہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں زورا کے ساتھ خود ایک کونے میں آ کے چپ چاپ بیٹھ گیا تھا۔ گاڑی چلنے سے پہلے بیرا ناشتہ رکھ گیا تھا۔

ابا جان نے اُن دونوں کو بھی مدعو کیا اور مکھن، ٹوسٹ، آملیٹ وغیرہ کی پلیٹیں اُن کی جانب بڑھا دیں۔ پیرو اور ابا جان کے اصرار پر نوجوان نے سپر ڈال دی تاہم اُس نے ایک ٹوسٹ اور ذرا سے آملیٹ کے سوا کچھ نہیں کھایا۔ سونیا نے کچھ بھی نہیں لیا۔ میں نے آتے ہی محسوس کیا تھا کہ نوجوان کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا ہے۔ اُس کے سانولے چہرے پر کبھی سرخی نمودار ہو جاتی، کبھی سفیدی جھلکنے لگتی۔ اُس کی حالت کچھ اضطراری سی تھی۔ کبھی وہ سونیا کی طرف دیکھتا، کبھی میری طرف اور کبھی ڈبے میں چاروں طرف نظریں دوڑاتا۔ سونیا البتہ ساکت بیٹھی تھی۔

گاڑی پہاڑی سلسلے میں داخل ہو گئی تھی، کھڑکیوں سے ہری بھری پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں، ہم تبت کے پہاڑ دیکھ چکے تھے۔ یہ پہاڑ اُن کے مقابلے میں چھوٹے چھوٹے ٹیلے دکھائی دے رہے تھے۔ ناشتے کے بعد نوجوان سرگوشیوں میں سونیا سے چند لمحے باتیں کرتا رہا پھر ابا جان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ابا جان کے استفسار پر اُس نے بھی اپنی منزل حیدر آباد بتائی اور کہا کہ وہ اپنے ایک عزیز کے ہاں جا رہے ہیں۔ اُس نے انھیں بتایا کہ فی الحال وہ دلّی ہی سے سوار ہوئے ہیں۔ میں اُس سے دور تھا۔ گاڑی کے شور کی وجہ سے اس کی ایک آدھ ہی بات سنائی دے جاتی تھی لیکن اس کے لہجے کی بے چینی مجھ سے چھپی نہ رہ سکی۔ ابا جان نے بھی اِسے محسوس کیا ہو گا۔ اتنی دیر میں مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ نوجوان مجھ سے اچھی طرح واقف ہو گیا ہے۔ ابا جان سے باتیں کرتے کرتے وہ چونک کے ایک دم میری طرف دیکھنے لگتا اور اُس کی نظریں سٹ پٹا سی جاتیں۔ میں اُس کی اِس دہشت کا سبب سمجھنے سے قاصر تھا۔ آخر سونیا نے اسے میرے بارے میں ایسی کون سی بات بتائی ہے جو وہ اتنا اُلجھا ہوا نظر آ رہا ہے۔ بینا اسٹیشن تک زورا اور مارٹی نیچے بیٹھے رہے تھے پھر جب اونگھنے لگے تو اُوپر چلے گئے۔ اُدھر ابا جان نے بھی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ بینا اسٹیشن کے بعد نوجوان از خود میری برتھ پر چلا آیا۔ مجھے تعجب ہوا لیکن میں نے اُٹھ کے اُس کا استقبال کیا۔ "مجھے .... مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔" وہ کسی تمہید کے بغیر سرگوشیانہ لہجے میں جھجکتے ہوئے بولا۔

"مجھ سے؟" میں نے تذبذب سے کہا۔ "میں، میں ..."

"مجھے آپ کے بارے میں معلوم ہو چکا ہے۔" اُس کی آواز گھٹی ہوئی تھی۔

"میرے بارے میں!"

"ہاں!" [illegible]

مجھے آپ کو دیکھنے کی آرزو تھی، واقعی جیسا میں نے سنا تھا، آپ ویسے ہی ہیں۔" وہ آدھی انگریزی آدھی ہندوستانی میں بولا۔

میں پلکیں پٹ پٹا کے رہ گیا۔

"سونیا کو آپ پہچان گئے ہوں گے۔"

مجھے جواب دینے میں تامل ہوا۔ "آپ کے ساتھ سونیا ہی ہیں؟"

"وہی ہے۔" وہ گہری سانس لے کے بولا

"مجھے شبہ تو ہوا تھا۔"

"میں آپ سے اسی کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" ایک لمحے توقف سے وہ بولا۔ اُس کے ہونٹوں میں لرزش تھی۔

"کیا؟ کیا؟" میں نے سٹ پٹا کے کہا۔ "میں سن رہا ہوں۔"

"سونیا نے مجھے سب بتا دیا ہے۔ اُس نے بہت پہلے بتا دیا تھا اور میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر آپ کبھی لوٹ کے آگئے تو میں چلا جاؤں گا۔" وہ بھنچی بھنچی آواز میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"بہتر یہی ہے کہ میں کسی لاگ لپیٹ کے بغیر آپ سے بات کروں، میری صاف گوئی آپ کو گراں گزرے تو مجھے معاف کر دیجیے گا۔ مجھے آپ اپنا دوست، اپنا بھائی ہی سمجھیے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ سونیا کو آپ کا بہت انتظار تھا۔"

"میرا انتظار!"

"آپ ہی کا انتظار۔ اور اُس نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ کبھی آپ لوٹ آئے تو...." اُس کی آواز حلق میں پھنس گئی۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔"

"سونیا کی خوشی کے لیے میں اپنی جان تک قربان کر سکتا ہوں۔ میں نے اُسے اپنی زندگی سمجھا ہے۔ وہ بھی مجھے بہت پسند کرتی ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ سونیا صرف آپ کو اپنا دیوتا سمجھتی ہے۔"

"مجھے!" میرے کان سن سنانے لگے۔

"شاید آپ کو اس کا اتنا احساس نہ ہو۔ سونیا نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ اپنی زبان سے کچھ نہیں کہتے تھے۔ آپ ایک قیدی تھے، آپ کہہ بھی کیا سکتے تھے۔ اُسے آپ کی بہت فکر تھی کہ جیل سے نکلنے کے بعد نہ معلوم آپ کو کیسی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ جیل سے نکلے ہوئے آدمی کو دنیا بہت ستاتی ہے، اچھوت سمجھتی ہے۔ وہ طرح طرح سے سوچتی تھی۔ اُسے ایک اور بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں سونیا کا مذہب آپ کو اُس کے دروازے پر آنے سے نہ روکتا ہو مگر یقین کیجیے، سونیا صرف آپ کی منتظر تھی۔"

میرا سارا جسم منجمد ہو گیا۔

"وہ مجھ سے بہت قریب رہی ہے، بہت زیادہ۔" وہ تیزی سے بولا۔ "لیکن وہ ویسی ہی آئینہ ہے جس طرح آپ سے جدا ہوئی تھی، آپ وقت پر مل گئے، کچھ دیر سے ملتے تو پتہ نہیں کیا ہوتا۔ شاید میں اپنا وعدہ پھر بھی نبھاتا۔"

میں اُسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا کیا۔

"مجھے خوشی ہے، اب سونیا کو چین آ جائے گا۔"

"بس کیجیے۔" میں نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔

کچھ دیر وہ خاموش رہا پھر اُس کی دھیمی آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ "اس نے خود کو سدا آپ کی امانت سمجھا ہے۔ وہ روز جاپ کرتی تھی، بھگوان سے آپ کے لیے پرارتھنا کرتی تھی۔"

میرا سر جھن جھنا رہا تھا۔ "معلوم نہیں، آپ.... آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" میں نے ہانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آپ کے لیے یہ سب کچھ عجیب ہو سکتا ہے لیکن ہے ایسا ہی، جو میں کہہ رہا ہوں، رہی ہے۔" وہ اٹک اٹک کے بولا۔ "یقین کیجیے مجھے کوئی دکھ نہیں ہے۔ کوئی بھی نہیں.... میں، میں۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا اور حلق تر کر کے بولا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ جیل سے رہا ہونے کے بعد آپ کے ساتھ زندگی کا کیا برتاؤ رہا اور آپ نے اس سے کیسا سلوک کیا۔ آپ کہاں ہیں، کیا کرتے ہیں، کتنے بندھنوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے پر یہ سوچنا میرا کام نہیں۔ نہ.... نہ سونیا کا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس کے لیے دوسری باتیں اتنی اہمیت نہیں رکھتیں جتنی اہمیت صرف آپ رکھتے ہیں، آپ جیسے بھی ہیں، اُس کا بھاگیہ ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ سونیا کا آدرش ایسا ویسا نہیں ہوگا۔ آپ اُتنے ہی اچھے ہوں گے جتنے اُس کے تصور میں رہے ہیں جیسا اُس نے آپ کو دیکھا تھا۔ آپ کے لیے اُس کی پرارتھنائیں بھگوان نے ضرور سنی ہوں گی۔"

مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں مگر وہ خواب نہیں تھا۔ نوجوان میرے سامنے بیٹھا تھا۔ اُس کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ وہ سب کچھ خود ہی بولتا رہا۔ مجھے اُس نے کچھ نہیں کہنے دیا یا خود میری زبان گنگ ہو گئی تھی۔ میں کسی بت کی طرح بیٹھا سنتا رہا مگر آدمی اتنا ہی سن سکتا ہے جتنا وہ اس کا اہل ہے۔

"آپ.... آپ چپ کیوں ہیں؟" وہ بے تابی سے بولا۔

"میں، میں کیا کہوں۔" میں نے بدحواسی انداز میں کہا۔

"آپ ذرا جا کے سونیا کو دیکھیے تو سہی۔ اُس نے رات آپ کو دیکھا تھا۔ نہ جانے یہ رات اُس نے کس طرح کاٹی ہوگی۔" میری نظریں غیر ارادی طور پر سونیا کی طرف جھپٹیں، نوجوان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی لیکن اُس کی تڑپتی آنکھیں اُس مسکراہٹ کی چغلی کھا رہی تھیں۔ مجھے شبہ ہوا تھا کہ وہ مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہا ہے یا اُسے میری کوئی آزمائش تو مقصود نہیں ہے۔ اُس کی ہندوستانی شستہ اور انگریزی رواں تھی۔ کبھی وہ تیز تیز بولنے لگتا، کبھی اُس کی آواز ڈوبنے لگتی۔ میں نے اپنے حواس جمع کرنے کی کوشش کی۔ مجھے یہ بھی احساس نہیں رہا تھا کہ ابا جان کی آنکھ کسی وقت بھی کھل سکتی ہے یا اوپر سے کوئی نیچے آ سکتا ہے۔ "آپ کیا سوچ رہے ہیں؟" وہ سراسیمگی سے بولا۔

میں نے سر جھکا لیا۔ میرا سینہ پھٹنے لگا تھا۔

"شاید آپ کے ذہن میں میرے بارے میں سوال گونج رہے ہوں، میں کون ہوں اور سونیا سے اپنے کس رشتے، کس حوالے سے بات کر رہا ہوں۔ میں اُس کا کوئی بھی نہیں ہوں اور سب کچھ ہوں۔ شاید اُس کے لیے میں کچھ بھی نہیں ہوں، پر وہ میرے لیے سب کچھ ہے۔ میرے لیے وہ ایک دیوی کے مانند ہے، میری بھگوان! اُس کے لیے میں ایک دوست، پجاری، ایک ہمدرد سے زیادہ کچھ نہیں۔ دیوی کو اپنے پجاری پر ترس آ گیا تھا اس لیے وہ اُس پر مہربان ہو گئی مگر اُس کے من میں آس اپنے دیوتا ہی کی بندھی تھی۔ سو بھگوان نے اُس کی سن لی۔ ہو سکتا ہے، آپ کے دماغ میں یہ بات چبھی ہو کہ رات آپ کو دیکھنے کے باوجود سونیا آپ سے چھپ گئی تھی۔ اُس کی جھجک فطری تھی، اتنے عرصے کی تمنا کے بعد اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا ہوگا۔ کسی کو بھی نہیں آ سکتا کہ اتنی بڑی خوشی ناگہاں کیسے مل سکتی ہے، جیسے آپ کو بھگوان نے اُس کے پاس بھیجا ہے۔ ہمارا کہیں اور جانے کا پروگرام تھا، اچانک حیدرآباد کا ارادہ ہو گیا اور ہم اس گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی بھی وقت پر مل گئی ورنہ ہمیں تو خاصی تاخیر ہو گئی تھی۔ آج ہی سونیا کی دعاؤں کی گھڑی لکھی تھی۔ آپ کو دیکھ کے سونیا ایک اور عذاب سے دوچار ہو گئی ہو گی۔ میں بھی یہاں موجود تھا، اُس کے سامنے ہی بیٹھا تھا۔ اُسے میری دیوار کا خیال آ گیا ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں، میرے لیے یہی کیا کم ہے کہ اُسے میرا اتنا احساس تھا۔ میری بھگتی کا حاصل اتنا ہی ہے تو مجھے سب کچھ مل گیا ہے۔ رات اُس نے مجھے نہیں بتایا تھا، مجھے صبح معلوم ہوا۔ وہ روک رہی تھی مجھے۔ کہہ رہی تھی، بس اپنے تک رکھنا، یہ وہی ہیں۔ نہ جانے مجھے کیا سمجھ کے روک رہی تھی۔ میں آپ کے پاس اُس کی اجازت کے بغیر آیا ہوں کیونکہ سونیا کی محرومی میری بھی محرومی ہے۔ رات جس وقت آپ کو اُس نے یکایک ڈبے میں داخل ہوتے دیکھا تھا، وہ ایک اور بات سے بھی ہراساں تھی۔ ہم چار دن سے اپنے سائے سے بھی بھاگتے پھر رہے ہیں۔ پولیس ہمارے پیچھے ہے۔"

"پولیس!"

"ہاں!" وہ ٹھنڈی سانس لے کے بولا۔ "لکھنؤ میں ہم تقریباً پکڑے گئے تھے۔ پٹنے میں بھی یہی ہوا، قسمت تھی جو بچتے رہے۔ لکھنؤ میں اتفاق سے ہمیں وقت پر سواری مل گئی اور ہم اُن کی نظروں سے دور ہونے میں کامیاب ہو گئے۔"

"کیا بات ہے؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"میں آپ کو کیا بتاؤں۔" وہ پژمردہ لہجے میں بولا۔ "مگر شاید آپ سے کچھ چھپانا نہیں چاہیے۔ لمبی کہانی ہے۔ آپ سونیا کے پتا جی کشور بابو سے واقف ہی ہیں۔ ویسے ہر آدمی کے لیے وہ دل کے بہت اچھے ہیں لیکن میرے اور سونیا کے لیے بہت کٹھور بن گئے تھے۔ ہم نے انھیں منانے کے بہت جتن کیے لیکن وہ مجھ سے کوئی بیر رکھتے تھے۔ وہ پولیس کے ایک بڑے افسر ہیں۔ اُن کے پاس عزت ہے، حیثیت ہے۔ میرے پتا جی میرے بچپن ہی میں مجھے چھوڑ گئے تھے۔ ماتا جی نے جیسے تیسے مجھے اور میرے چھوٹے بھائی کو پڑھایا ہے۔ چھوٹا بھائی بی اے میں ہے۔ میں ایم اے کے بعد اچھی ملازمت حاصل کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کی لیکن اتنی آسانی سے کہاں ملتی ہے۔ کشور بابو سونیا کے لیے کسی اور طرح کا شخص پسند کرتے تھے۔ کئی جگہ سے بات آئی، بڑے بڑے گھرانوں سے۔ سونیا ہی تیار نہیں ہوتی تھی۔ ہم دونوں بردوان میں ساتھ پڑھتے تھے۔ وہیں میں نے سونیا کو پہلی بار دیکھا تھا مگر اُسے دیکھے بنا بھی میں اُسے دیکھتا رہا تھا۔ سونیا سے جب ہمت کر کے کچھ کہا تو اُس نے اُسی وقت مجھے بتا دیا تھا کہ اُس کا روم روم کہیں اور بندھا ہوا ہے لیکن اِس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ سونیا مجھ سے کنارہ کر لیتی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے بوجھتے رہے۔ ہمیں ایک دوسرے کو دیکھے بغیر چین بھی نہیں آتا تھا۔ میں کبھی کالج نہیں جاتا تھا تو وہ مجھے پوچھنے گھر چلی آتی تھی۔ میں نے سونیا سے دوبارہ کبھی کچھ نہیں کہا۔ میں جان گیا تھا کہ میرا کہنا لاحاصل ہے، سونیا اپنی دنیا میں مگن ہے، میں تو اُس کی بھگتی کرتا رہا۔ شروع شروع میں جب ہمیں یہ معلوم ہوا کہ آپ جیل سے رہا ہو گئے ہیں تو میں آپ کو کلکتے ڈھونڈنے بھی گیا۔ وہاں استاد جبل نامی ایک شخص کے گھر جا کے بھی آپ کو پوچھا، معلوم ہوا کہ آپ وہاں آئے ہی نہیں۔ اُن سب کو آپ کے نہ آنے پر حیرت تھی۔ سونیا کا خیال تھا کہ آپ کے لیے اُس کا کھوج لگانا کچھ ایسا مشکل نہیں ہوگا، کشور بابو کے بارے میں آپ کسی سے بھی پوچھ سکتے تھے۔ اُسے اُمید تھی، ایک دن آپ ضرور آئیں گے۔ جتنے دن گزرتے جا رہے تھے، اُس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔"

"ایک بار پھر میرا کلکتے جانا ہوا، پوچھنے پر کسی نے ٹھیک بات ہیں بتائی۔ اتنا پتہ ضرور چلا کہ آپ آئے تھے اور اب آپ کا ری ٹھکانا معلوم نہیں۔ جب بہت دن بیت گئے، سال گزر گئے رکشور بابو نے آخر اپنا حکم جاری کر دیا۔ اس بیچ کلکتے کے ایک بڑے دمی کا رشتہ سونیا کے لیے آیا تھا، لڑکا آئی سی ایس ہے۔ کشور بابو نے اس مرتبہ سونیا سے پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھی، صاف صاف کہہ دیا کہ اب وہ اس کی ایک نہیں سُنیں گے۔ باہر لوگ قسم قسم کی باتیں کرتے تھے۔ وہ بھی ٹھیک کہتے تھے۔ سونیا کی ایک چھوٹی بہن بھی جوان تھی۔ سونیا کا بس چلتا تو وہ عمر بھر آپ کی راہ تکتی۔ جب کوئی چارہ نہ رہا تو اُس نے کشور بابو سے بلا نام لیا میرے سوا وہ اور کسی کی طرف اشارہ کرتی۔ کشور بابو نے مجھے بلایا اور بُرا بھلا کہہ کے گھر سے نکال دیا۔ انھوں نے دھمکی دی کہ اگر میں پھر کبھی سونیا سے ملا تو میرے حق میں بُرا ہوگا۔ سونیا میری بے عزتی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اُس نے ارادہ کر لیا کہ وہ یہ گھر ہی چھوڑ دے گی۔ جہاں اُس کی مرضی نہیں چلتی، اُس گھر میں رہنے سے کیا حاصل۔ سونیا کا بھری دُنیا میں ایک میں ہی سہارا تھا، ہم نے پھر بھی کشور بابو کی بڑی منتیں کیں۔ انھوں نے کان بند کر لیے تھے۔

"گھر سے یوں نکلنا بھی ایسا آسان نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ آگے کتنی دشواریاں پیش آ سکتی ہیں، ہم کہاں جائیں گے، کہاں جا کے چھُپیں گے۔ قریب کی کسی جگہ جا بھی نہیں سکتے تھے۔ ہمیں اتنی دور چلا جانا چاہیے تھا جہاں ہمیں تلاش کرنے والے ہاتھ پہنچنے کا امکان نہ ہو۔ ہمارے پاس پیسوں کا بھی بندوبست نہیں تھا۔ سونیا گھر سے روپے لینا نہیں چاہتی تھی۔ کچھ اُس کی اپنی بچت تھی، کچھ پیسے اُس نے اپنی چھوٹی بہن بِمّو سے لیے۔ میں نے ماں کو بتا دیا تھا، اُس نے مجھے منع کیا لیکن میری ضد کے آگے وہ بھی مجبور ہو گئی۔ اُس نے مجھے وہی کپڑے دیے جو میری شادی کے لیے جانے کب سے تیار کر رہی تھی۔ جو کچھ اُس نے بچا رکھا تھا سب میرے حوالے کر دیا۔ دلّی آ کے میں نے روزگار کی تلاش کی۔ یہاں پتا جی کے ایک جگری دوست رہتے تھے، وہ بھی نہیں تھے۔ پتہ چلا کہ وہ حیدرآباد چلے گئے ہیں۔ ویسے ہمارا ارادہ بمبئی جانے کا تھا مگر بمبئی جا کے بھی یہی حالات پیش آتے اس لیے ہم حیدرآباد کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ فرسٹ کلاس میں سفر کرنے کا سبب یہ ہے کہ پولیس والے اُونچے درجے کے مسافروں کا لحاظ کر لیتے ہیں لیکن اب تو ایسا جان پڑتا ہے جیسے کسی نے ہمیں اِس گاڑی میں بیٹھنے پر اُکسایا تھا اور خاص کر اسی ڈبے میں۔ آپ جو یہاں آنے والے تھے۔" وہ چپ ہو کے مجھے سہمی سہمی نظروں سے دیکھنے لگا پھر رُندھی ہوئی آواز میں بولا "ہم جا رہے تھے اس لیے کہ ہمارے سامنے کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ آگے جا کے ہمیں کسی جگہ ذرا سانس لینے پر ایک دوسرے کا ہو جانا تھا مگر یہ ایک طرح کا دکھاوا ہوتا۔ زمانے کی نگاہوں اور باتوں سے بچنے کے لیے ایک دکھاوا۔ مجھے اپنے وچن پر قائم رہنا تھا جب تک سونیا خود اُسے توڑنے کو نہ کہہ دیتی۔ وہ جانتی ہے کہ میں ایسا ہی کرتا۔ اسی بھروسے پر وہ میرے ساتھ آئی تھی۔ میرے لیے یہی کیا کم مان تھا کہ وہ ہر دم، ہر پل میرے ساتھ رہے گی میری آنکھوں کے سامنے۔ آپ یقین کیجیے، بعد میں بھی کبھی آپ کے ملنے پر سونیا کو مجھے میرا وچن یاد دلانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ میں خود ہی ہٹ جاتا۔ میں اُس کے سُکھ...."

میں نے اپنا منہ کھسوٹ لیا۔ "بس کرو، بس کرو۔"

وہ ٹھٹک گیا۔ "میں آپ سے...."

"نہیں، نہیں۔" میری آواز بھرّا رہی تھی۔ "مجھے یقین ہے تم یہی کرتے مگر میں.... میں۔"

"آپ اُٹھیے تو سہی۔ جا کے اُسے دیکھیے، اُس کی آنکھوں میں جھانک کے دیکھیے، معلوم ہوتا ہے رات بھر وہ روتی رہی ہے۔"

میں اُس سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ مجھے تنہا چھوڑ دے، مجھ سے کچھ نہ کہے کوئی بات نہ کرے۔ وہ میرے سامنے بیٹھا رہا۔

"اُس پر ایک ایک پل بھاری گزر رہا ہوگا۔" ایک بار جا کے اُسے...."

"نہیں۔" میں نے اپنے ہونٹ کاٹ لیے۔

"میں سمجھ سکتا ہوں آپ اپنی کن اُلجھنوں میں پھنسے ہوں گے۔" میں نے کہا نا، میں نے جان بوجھ کے آپ سے کچھ نہیں پوچھا کہ آپ کہاں جا رہے ہیں، کہاں رہتے ہیں، کیا کرتے ہیں، زنجیریں صرف جیل کے اندر ہی نہیں ہوتیں۔ کوئی ایسی ہی بات ہوگی جو آپ نے لوٹ کے سونیا کی خبر نہیں لی۔ آپ کے ساتھ بھی کچھ وہی حالات ہو سکتے ہیں جو میرے ساتھ رہے ہیں، مجھ سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں پر میرے لیے اور کون سا وقت تھا جسے مناسب سمجھ کے میں آپ سے کچھ کہتا۔ جب تک اُس نے آپ کو دیکھا نہیں تھا، میں سنبھالا دیتا رہا، اب وہ مجھ سے نہیں سنبھلے گی۔ میں آپ سے کیا کہہ رہا ہوں کہ وہ ایک ہی آس پر زندہ رہی ہے۔ وہ آپ سے کچھ زیادہ نہیں مانگے گی۔"

"خدا کے لیے کچھ اور مت کہو۔" میں نے لڑکھڑاتی آواز میں التجا کی۔

"مجھے بتائیے کیا بات ہے؟ آپ کیا سوچ رہے ہیں؟"

"اب میں تم سے کیا کہوں، مجھ سے کچھ مت پوچھو۔" میں نے آپ سے بنتی کی ہے، مجھے اپنا دوست، اپنا بھائی سمجھیے۔"

"مگر میں تمھیں کیا بتاؤں، تم کچھ نہیں سمجھو گے، نہ میں تمھیں سمجھا سکتا ہوں۔"

"ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو لیکن سونیا، وہ تو...."

"بس یہ سمجھو کہ میں اُس کے سامنے آنے کے لائق نہیں ہوں۔"

"اطمینان رکھیے، وہ شاید آپ سے زیادہ آپ کو پہچانتی ہے۔"

"مجھ سے اتنی باتیں مت کرو۔"

"پھر میں جا کے اُس سے کیا کہوں؟"

"تم اُس سے.... اُس سے کہو۔" میری زبان بہکنے لگی۔ "میں مر گیا ہوں۔ اُس نے جس شخص کو دیکھا ہے وہ اُس کی آنکھوں کا دھوکا ہے۔ کچھ بھی کہہ دو، کہہ دو کہ وہ ایک بہت بُرا آدمی ہے اور مجھے اگر اُسے کوئی حکم دینے کا حق ہے تو اُس سے کہہ دو کہ تمھیں اُس کے پاس میں نے بھیجا ہے۔ تم مجھ سے ہر اعتبار سے بہتر ہو، تمھارا دل بہت بڑا ہے۔ تمھارا میرا کوئی مقابلہ نہیں، میں تمھارے پاؤں کی دھول بھی نہیں ہوں۔ سونیا مجھے بہت عزیز ہے، میں اُسے کبھی نہیں بھول سکتا۔ میں نے کتنی بار سوچا کہ اُس کے پاس آؤں لیکن مجھے وقت نہیں مل سکا۔ میں جیل سے نکل کے بھی جیل میں ہوں۔ اِس جیل میں اور اُس جیل میں بس تھوڑا سا فرق ہے۔ پنجرا نہ ہو تو پرندے کے پر کاٹ دیے جاتے ہیں۔ آدمی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہے۔ اچھا ہوا تم مجھے مل گئے۔ جیلر صاحب کبھی خود ہی تسلیم کر لیں گے کہ تم سے بڑا آدمی سونیا کے لیے کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ تمھیں کسی بات کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں کچھ اور نہیں کر سکتا تو تمھارے اور سونیا کے لیے ایک گھر مہیا کر سکتا ہوں، جہاں کوئی تم تک تمھاری اجازت کے بغیر نہیں پہنچ سکے گا۔ تم چاہو تو سونیا کے لیے اُسے جنّت بنا سکتے ہو۔ کہو گے تو میں خود بھی وہیں رہوں گا، میں سونیا سے دُور نہیں رہوں گا۔" میرے منہ میں جو آیا، میں کہتا رہا۔

"آپ.... آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟" وہ شکستہ لہجے میں بولا۔ "شاید آپ نے میرا کہا دھیان سے نہیں سُنا۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں؟"

"تمھاری ہر بات میرے دل نے سُنی ہے لیکن اُنھی لوگوں سے کچھ کہنا چاہیے جو کوئی جواب دینے کا حوصلہ رکھتے ہوں، میں تو خود مت تہی دست ہوں۔"

"آپ اُس سے یہی کچھ خود کہہ دیجیے۔"

"مجھے اُس کے پاس جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔"

"مجھے آپ سے زیادہ...."

"ٹھیرو! میری بات سنو، شاید وقت مناسب نہیں ہے مگر جو میں اُس سے نہیں کہہ سکتا، تم سے کہہ سکتا ہوں۔ تم حیدرآباد جانے کے بجائے بمبئی چلے جاؤ، تم نے مجھے اپنا بھائی اور دوست کہا ہے تو میں تم سے جو کہہ رہا ہوں اُسے غور سے سُننا، منع مت کرنا۔ تم بمبئی چلے جاؤ، دو تین روز میں مجھے بھی وہاں آ جانا ہے۔ بمبئی جا کے تم کسی اچھے ہوٹل میں ٹھیر جاتا، میں تمھیں کسی گھر کا پتہ بھی دے سکتا تھا لیکن بہتر ہے تم وہاں میرے ساتھ ہی چلو، وہاں ایک گھر نہیں کئی گھر ہیں اور کئی گھر بن سکتے ہیں۔ وہاں بہت اچھے لوگ ہیں۔ سونیا اُن کے پاس بہت خوش رہے گی۔ وہ ایک طرح سے اپنے ہی گھر جائے گی اور وہاں میں بھی ہوں گا، پھر میں اُس سے کوئی بات کر سکوں گا اور وہ خود سمجھ جائے گی۔ میں ایک بہت ضروری کام سے حیدرآباد جا رہا ہوں ورنہ تمھارے ساتھ ہی چلتا۔"

وہ گم صم نظروں سے مجھے تکتا ہوا تیزی سے اُٹھ گیا اور چند قدم کا فاصلہ طے کر کے سونیا کے پاس بیٹھ گیا۔ سونیا نے یک بارگی سر اُٹھا کے اُسے دیکھا۔ بِمل کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ اس سے قبل کہ سونیا میری طرف رُخ کرتی، میں نے سر جھکا لیا۔ گاڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اباجان شاید بہت گہری نیند سو رہے تھے۔ اُوپر زورا، مارٹی اور بیرو کی برتھوں پر بھی خاموشی طاری تھی۔ ڈبے میں صرف گاڑی کا شور تھا اور اس شور کے باوجود ایک سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ میرے کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ چند لمحوں بعد مجھے نوجوان بِمل کی سرگوشیاں سُنائی دیں۔ مجھے یہ بہت عجیب سا لگا کہ وہ میرے متعلق باتیں کر رہا ہے اور میں یہاں بیٹھا ہوں۔ اُسے میرے پاس سے اُٹھے دیر نہیں ہوئی تھی۔ میں نے خود سونیا کے سامنے جانے کا ارادہ کیا اور اُسی لمحے یک لخت اُٹھ بیٹھا لیکن فرش پر پیر رکھتے ہی میرا دل دھڑ دھڑانے لگا تھا۔ مجھے آتا دیکھ کے بِمل کھڑا ہو گیا۔ سونیا نے بھی چونک کے میری طرف دیکھا، اُس کی نظروں میں کوئی بجلی تھی کہ میرے جسم پر ٹوٹ کے گری۔ میرے پیر لڑکھڑا گئے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں نے یہ فاصلہ کس طرح عبور کیا۔ جب میں اُس کے پاس پہنچا تو میری آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ میں نے واپس بھاگنا چاہا لیکن میرے پیروں میں بالکل جان نہیں رہی تھی۔ بِمل نے میرے لیے جگہ چھوڑ دی تھی۔ نہ جانے کتنے لمحے ایسے ہی بیت گئے ہوں گے۔ میری سانس پھولی ہوئی تھی، میں سُن بیٹھا رہا۔ وہ میرے قریب ہی تھی، اتنے قریب کہ میں اُس کے بدن سے اُٹھتی ہوئی خوشبو سونگھ سکتا تھا۔ یہ خوشبو میں خوب پہچانتا تھا۔

"سونیا!" بمل نے میرے بجائے اُسے ٹوکا۔ سونیا کی گھٹری میں لرزش سی ہوئی۔ "دیکھو کون بیٹھا ہے۔"

"ہاں ہیں، میں ظہیر ہوں لاڈلا۔" میں نے حواس باختگی سے کہا۔

اُس نے جھٹکے سے سر اُٹھایا۔ مجھ سے اُس کا چہرہ نہ دیکھا جا سکا۔ اُس کے گالوں کا شہابی رنگ جیسے جل رہا تھا۔ آنکھیں انگارا تھیں، پپوٹے سُوجے ہوئے تھے۔ نتھنے اور ہونٹ پھڑ پھڑا رہے تھے۔ پھر اُس نے اپنا منہ چھپا لیا۔

"وہاں، وہاں سے نکل کے مجھے ایک دن بھی چین نہیں ملا۔" میں نے ڈولتی آواز میں کہنے کی کوشش کی۔ "کتنی ہی بار تمھارا خیال آیا لیکن کچھ ایسی ہی رکاوٹیں تھیں جو میں نہیں آسکا۔ میں تمھیں نہیں بھولا تھا۔ تمھیں کون بھول سکتا ہے، تم اتنی اچھی، اتنی ....."

میری زبان لکنت کر رہی تھی۔ "مجھے یقین تھا کہ تم میرے آنے کی توقع کر رہی ہوگی، چلتے وقت میں نے تم سے وعدہ بھی کیا تھا۔ مجھے سب کچھ یاد ہے، وہاں کی ایک ایک بات، گھر کا سارا نقشہ، یہاں تک کہ دیواروں کا رنگ بھی۔ تمھارے ہاتھ کے کھانوں کا ذائقہ، تمھارے کپڑوں کے رنگ، مجھے سب کچھ یاد ہے۔ اتنے دن ساتھ رہا تھا۔" لفظ میرے منہ میں گڈ مڈ ہو گئے تھے۔ نہ جانے میں کیا کہنا چاہتا تھا اور کیا کہہ رہا تھا۔ اُس کی سسکاری سُن کے میرے حواس اور منتشر ہو گئے۔ "مت رو، مت رو۔" میں نے مضطرب لہجے میں کہا۔ "قسمت نے ہمیں پھر ملا دیا ہے۔ میں اب تمھارے سامنے موجود ہوں۔ سمجھو آج سے سارے دُکھ ختم ہو گئے۔ سمجھو مجھے آج ہی جیل سے رہائی ملی ہے، مجھے سب معلوم ہو گیا ہے۔ بمل بابو نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔" یکایک مجھے خود بخود احساس ہوا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ مجھے جھرجھری سی آگئی۔ میں نے اپنا خشک حلق تر کرنے کے لیے چند لمحے توقف کیا۔ "میں نے ان سے، بمل بابو سے کہا ہے کہ یہ بمبئی چلے جائیں۔" میری آواز بھٹکی ہوئی تھی۔ "چند دن بعد مجھے بھی وہاں پہنچ جانا ہے۔ میں آجاؤں گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم سب ساتھ رہیں گے۔ وہاں اور لوگ بھی ہیں۔ میں تمھیں اپنے ساتھ حیدرآباد لے چلتا لیکن میں اکیلا نہیں ہوں۔ سامنے کی برتھ پر یہ میرے ابا جان سو رہے ہیں۔ اُوپر کی برتھوں پر جو لوگ ہیں، وہ بھی غیر نہیں ہیں مگر ان کی موجودگی میں تم گھٹن محسوس کرو گی اور پھر میں تو آ ہی رہا ہوں، تمھیں شاید زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے۔ وہیں تم سے ٹھیک طرح باتیں ہوں گی، وہاں وقت ہی وقت ہوگا۔"

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بمل کے ٹوکنے پر بھی نہیں۔ میرے سر میں بھن بھناہٹ سی ہو رہی تھی۔ وہ اپنے آپ میں سمٹی بیٹھی رہی۔ مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا کہ اُس سے اور کیا کہوں۔ اُس کے سامنے میں خود کو بھی اجنبی لگ رہا تھا۔

"سونیا! سونیا!" بمل نے آہستگی سے اُسے دوبارہ مخاطب کیا۔ اُس کی لمبی لمبی انگلیاں آپس میں پیوست تھیں۔ وہ کسمسانے لگی۔

"یہ کیا!" بمل شکایتی لہجے میں بولا۔ "تم نے سُنا، ظہیر صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟ ٹھیک ہے نا!"

وہ دُلھنوں کی طرح سر ہلا کے رہ گئی۔

"تم نے جیسا مجھے بتایا تھا، یہ بالکل ویسے ہی ہیں۔ میں نے اپنے دماغ میں ان کی جو تصویر بنائی تھی، یہ اُس سے بہت ہی ملتے جلتے ہیں کسی راج کمار یا شہزادے کی طرح۔ ان کا چہرہ مجھے اجنبی محسوس نہیں ہوا۔" وہ تیزی سے بولا۔

سونیا کے سراپا میں ایک ثانیے کے لیے کوئی چمک سی اُٹھی اور ماند پڑ گئی، بے اختیار میرا جی چاہا کہ اُسے اپنے بازوؤں میں بھر لوں، اُسے خوب پیار کروں، اُس کے تمام آنسو پی لوں لیکن میرے بازو اینٹھے رہے۔ پھر بمل بھی چپ ہو گیا، دیر تک سکوت طاری رہا، یہاں تک کہ گاڑی کی رفتار مدھم پڑنے لگی۔ میں نہیں اُٹھا۔ سونیا کو اس حالت میں چھوڑ کے اُس کے پاس سے اُٹھ جانا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا تھا۔ میں اپنے ذہن میں وہ لفظ ڈھونڈ رہا تھا جو سونیا سے کہہ سکوں اور اُسے تسلی دے سکوں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُس نے کچھ سُنا ہی نہ ہو اور میرا کہا سب رائگاں گیا ہو یا میری زبان سے کوئی لغزش ہو گئی ہو۔ بمل کہتا تھا، آنکھوں کی روشنی اتنی ضروری نہیں جتنی سر کی ضروری ہے۔ سر میں اندھیرا بھرا ہو تو آنکھوں کو بھی نظر نہیں آتا۔ اُسی لمحے بمل مجھ سے معذرت کر کے اُٹھ کھڑا ہوا، صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے سونیا سے بات کرنے کا موقع دینا چاہتا ہے۔ میری زبان سے ایک لفظ نہیں پھوٹا۔ چند منٹ بعد بمل واپس آیا تو گاڑی آہستہ آہستہ رُکنے لگی تھی۔ کوئی اسٹیشن آ رہا ہوگا۔ ابا جان کی آنکھ کھُل جانے کا اندیشہ تھا لیکن میں وہاں سے نہیں اُٹھا۔ میں نے سوچ لیا تھا، ابا جان بمل کی جگہ سونیا کے پاس مجھے بیٹھا دیکھ کے چونکیں گے تو میں اُن سے کوئی بھی بہانہ کر دوں گا، کہہ دوں گا کہ سونیا میرے ایک محسن کی بچی ہے۔ گاڑی ٹھیری تو ابا جان آنکھیں ملتے اُٹھ بیٹھے اور وہی ہوا۔ اِدھر اُدھر بھٹکتی ہوئی اُن کی نظریں مجھ پر پڑیں تو ٹھٹک سی گئیں لیکن دوسرے ہی لمحے وہ مسکرانے لگے۔ انھوں نے پیرو کو آواز دی۔ پیرو پہلے ہی جاگ گیا تھا اور نیچے اُترنا ہی چاہتا تھا۔ گاڑی کسی غیر متوقع اسٹیشن پر ٹھیری تھی۔ اسٹیشن پر چہل پہل نہیں تھی۔ پیرو کے ساتھ زورا اور مارٹی بھی یکے بعد دیگرے نیچے آگئے۔ وہ تینوں بھی مجھے سونیا کے پاس اتنے قریب بیٹھے دیکھ کے حیران ہوئے لیکن منہ سے کچھ نہیں بولے۔ میرا یہاں بیٹھنا اُن کے لیے اتنا عجیب نہیں ہوگا جتنا ہم تینوں کا گم صُم ہونا۔ بمل ہی کو اس کا احساس ہوا۔ وہ مجھ سے مارٹی، زورا اور پیرو کے مشاغل کے بارے میں پوچھنے لگا۔ اُس کی آواز اُچٹتی ہوئی تھی۔ مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو میں نے کہہ دیا، "یہ سب بمبئی میں تجارت کرتے ہیں۔" بمل نے زیادہ پوچھ گچھ نہیں کی۔ مارٹی نے ڈبے سے اُتر کے تحقیق کر لی تھی کہ آگے لائن کلیر نہیں ہے۔ گاڑی کے دوبارہ حرکت میں آنے میں دیر لگ گئی۔ میں کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا اور بمل کو اپنے امتحانات اور موضوعات کے بارے میں اُلٹے سیدھے جوابات دیتا رہا۔ پھر میں نے اُٹھنے کا ارادہ کیا اور کن انکھیوں سے سونیا کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ یوں ہی سر جھکائے ساکت بیٹھی تھی۔ "میں بس دو دن بعد وہاں پہنچ جاؤں گا۔" میں نے بدبداتے ہوئے کہا۔ سونیا نے ضرور سُن لیا تھا۔ اُس کے بدن میں اچانک ایک تلاطم سا نمودار ہوا۔ اُس کی آنکھوں میں بھنور آیا ہوا تھا۔ میں تیزی سے پلٹ کے سامنے کی برتھ پر آ بیٹھا۔ میری سانس اُکھڑ گئی تھی۔ یہاں آ کے مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں بہت دور سے بھاگتا ہوا آ رہا ہوں اور میرا جسم ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ سونیا کی آنکھوں میں کوئی سمندر بھرا تھا۔ اُس کی نظریں میرے سارے جسم میں سوئیوں کی طرح چُبھی ہوئی تھیں۔ پیرو کو کچھ اندازہ ہو گیا تھا، اُس نے میرا سر اپنی آغوش میں چھپا لیا اور میری کمر پر آہستہ آہستہ گھونسے مارنے لگا۔ میرا سینہ اُمڈ رہا تھا لیکن میں رو بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے اپنے آنسو آنکھوں ہی میں گھونٹ رکھے تھے۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ گاڑی کسی اسٹیشن پر رُکی تو وہ کھانے پینے کا سامان لے آئے۔ میں نے صاف منع کر دیا تھا۔ سونیا اور بمل نے بھی کچھ نہیں کھایا حالانکہ ابا جان نے اُن سے بہت اصرار کیا تھا۔ مارٹی اور پیرو کی باتوں سے مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اگلا اسٹیشن ناگ پور ہے۔ بمبئی جانے کے لیے بمل کو ناگ پور ہی پر اُتر جانا چاہیے تھا۔ بمل سے اُس کا ارادہ پوچھتے یا اُسے ٹوکتے ہوئے مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ اگر اُس نے میری بات مان لی ہے تو اُسے خود احساس ہوگا۔ بہتر یہی تھا کہ وہ بمبئی چلے جائیں۔ مجھے یقین تھا، وہاں جولین کے ساتھ سونیا کا دل کچھ بہل جائے گا۔ شبہ پارہ بھی وہاں موجود ہے۔ سونیا مولوی اکرام کے ہاں فریح اور فریال وغیرہ کے ساتھ بھی ٹھیر سکتی تھی۔ پھر پیرو دادا کا گھر بھی تھا جہاں گیتا اور اُس کی ماں ہر وقت اُس کا خیال رکھتیں لیکن ناگ پور اُترنے سے پہلے مجھے بمل کو کچھ روپے دے دینے چاہئیں تھے۔ میری جیب میں چیک بُک تھی، نقدی نہیں تھی۔ بمبئی کے بینک میں ساٹھ ہزار چھوڑ کے تقریباً سارے روپے محفوظ تھے۔ میں چیک کاٹ کے اُسے دے سکتا تھا۔ دو دن تک انھیں وہاں کسی اچھے ہوٹل میں رہنے کے لیے روپوں کی ضرورت پڑے گی۔ چیک کی وصولی میں دیر لگ سکتی ہے۔ اچھا تھا کہ نقد رقم اُن کے ساتھ ہو اور چیک کا یہ تھا کہ بعد میں بمل کے دل میں کچھ اور خیال آجائے، وہ چیک بھنانے سے کترانے لگے۔ مجھے معلوم تھا کہ پیرو کے پاس بھی بڑی رقم نہیں ہے، ہاں ابا جان کے پاس لکھنؤ میں تیتھروں کی فروخت سے حاصل کی ہوئی ڈھائی لاکھ روپے کی رقم موجود ہوگی۔ اُس میں سے انھوں نے زیادہ سے زیادہ کتنا خرچ کیا ہوگا۔ ابا جان سے روپے مانگنے کی مجھے ہمت نہیں پڑتی تھی، پیرو کے ذریعے ہی اُن سے کہلوایا جا سکتا تھا لیکن پیرو کے لیے اُن کے آگے ہاتھ پھیلانا مناسب نہیں تھا۔ ابا جان فوراً سمجھ جاتے کہ پیرو کو اُن کے پاس میں نے بھیجا ہے اور رقم کی ضرورت اصل میں مجھے ہے، وہ اگر پوچھیں گے نہیں تو سوچیں گے ضرور کہ آخر ریل کے ڈبے میں رقم کی یہ ضرورت اچانک کیسے پیش آگئی۔ میں سوچتا رہا کہ ابا جان سے کس طرح کہوں۔ اگر انھوں نے منع کر دیا؟ منع کر دیا تو بہرحال میرے پاس چیک بُک موجود ہے، شاید وہ منع نہ کریں۔ میں نے اُن سے بات کرنے کا عزم کر لیا۔ میں جھجکتا ہوا اُن کے پاس اُن کی برتھ پر پہنچا، پھر میں نے آہستگی سے کہا کہ مجھے کچھ روپوں کی ضرورت ہے۔

انھوں نے چونک کے مجھے دیکھا مگر دوسرے ہی لمحے اپنے سرہانے رکھا ہوا چرمی کیس میری طرف بڑھا دیا، دوسرے ہاتھ سے انھوں نے جیب سے چابی نکالی اور بولے۔ "اِس میں سے لے لو۔"

میں نے چرمی کیس چادر کی آڑ میں کھولا۔ اُس میں کئی گڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ ساری رقم نہیں تھی۔ یقیناً ابا جان نے باقی رقم کہیں اور بھی رکھی تھی۔ میں نے سو سو کے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی۔ میرے اندازے کے مطابق دس ہزار روپے ہوں گے۔ گڈی بنڈی کی جیب میں رکھ کے میں نے چرمی کیس بند کیا اور ابا جان کے حوالے کر دیا۔ روپے جیب میں آنے سے مجھے کچھ تسلی ہو گئی تھی۔ کچھ دیر تک میں اپنی جگہ چپ بیٹھا رہا، پھر میں نے بمل کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ اُس کے میرے پاس آنے سے ابا جان کا ماتھا ٹھنکا ہوگا کہ میں نے یہ رقم کس کے لیے لی ہے لیکن مجھے اس بات کی اتنی فکر نہیں تھی۔ بمل کے آجانے پر ابا جان نے ہماری

طرف نظر نہیں کی۔

"ناگ پور آرہا ہے۔" میں نے بمل سے سرگوشی میں کہا۔ "یہاں سے بمبئی کے لیے گاڑی مل جائے گی۔" وہ اثبات میں سر ہلانے لگا۔

"مجھے شاید زیادہ وقت نہ لگے، اس عرصے میں تم بمبئی کے کسی اچھے ہوٹل میں ٹھہر جانا۔ میرا خیال ہے تاج محل ہوٹل مناسب رہے گا، وہ سب سے بڑا ہے۔ اونچے ہوٹلوں میں مسافروں کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ میں کوئی وقت نہیں دے سکتا لیکن میری کوشش یہی ہوگی کہ جلد سے جلد پہنچ جاؤں، تمھیں میرا انتظار کرتے رہنا ہے۔ چاہے مجھے دو دن سے زیادہ لگ جائیں، شاید ایسا ہو نہیں" وہ خاموشی سے سنتا رہا۔

"کسی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں، میرے آنے کے بعد سمجھو ہر مسئلہ حل ہو جائے گا۔" میں نے گڈی اپنی نشست کے نیچے دبا رکھی تھی۔ "یہ رکھ لو۔" میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کے گڈی کھسکاتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا ہے؟" گڈی دیکھ کے اُس کی آنکھوں میں وحشت اُتر آئی۔

"کچھ نہیں ہے، بس اسے رکھ لو، تمھیں وہاں ضرورت پڑے گی۔"

"میرے پاس ابھی کچھ پیسے ہیں۔" وہ سراسیمہ لہجے میں بولا۔

"پھر بھی احتیاطاً انھیں رکھ لینا چاہیے۔"

"نہیں نہیں۔" وہ کسی قدر پیچھے ہٹ کے بولا۔

"منع کرو گے تو مجھے دکھ ہوگا، کیا میں تمھیں یاد دلاؤں کہ تم نے ابھی ابھی مجھے کیا کہا ہے، سب دیکھ رہے ہیں، انکار مت کرو۔"

"مگر...!" وہ کسمسانے لگا۔

"مگر کچھ نہیں۔" میں نے ترشی سے کہا۔ "پھر کیا میں یہ سمجھوں کہ جو تم نے کہا تھا، سب غلط تھا۔"

"لیکن اس کی شاید ضرورت نہ پڑے، دو دن بعد تو آپ ہی جائیں گے۔" وہ کھوئے ہوئے انداز میں بولا۔

"پھر بھی رکھ لینے میں کیا حرج ہے۔"

اُس نے بہت انکار کیا لیکن میری ضد پر آخر ہار مان لی۔ گڈی جیب میں ڈال کے وہ ندامت کا اظہار کرتا رہا اور کچھ دیر تک میرے پاس بیٹھا، پھر اسباب سمیٹنے کے لیے اُٹھ گیا۔ وہ پہلے سے زیادہ شکستہ اور آزردہ نظر آرہا تھا۔ اپنی برتھ پر جا کے اُس نے سونیا سے کچھ کہا، سونیا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُن کے پاس زیادہ سامان نہیں تھا۔ ایک بستر بند، دو سوٹ کیس، چمڑے کا ایک کھلا ہینڈ بیگ۔ اُنھیں سامان سمیٹتے دیکھ کے ابا جان بمل سے پوچھے بغیر نہ رہ سکے کہ کیا وہ ناگ پور اُترنے کا ارادہ رکھتا ہے؟

"ہاں۔" بمل نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "کچھ پروگرام بدل گیا ہے۔"

"اچھا! ہمارا خیال تھا، سفر ساتھ کٹے گا۔"

"بس سوچا، پہلے بمبئی کیوں نہ چلیں۔"

ابا جان تذبذب میں پڑ گئے لیکن وہ بمل سے اور کیا پوچھ سکتے تھے، چپ ہو رہے۔ سونیا برتھ پر بچھا ہوا گدا اُٹھانے کے لیے ایک بار اُٹھی تھی، پھر پاؤں لٹکا کے بیٹھ گئی۔ اُس کا رُخ میری ہی طرف تھا لیکن اُس کا سر جھکا ہوا تھا اور ساڑی کے پلو کے گھونگٹ نے اُس کا آدھا چہرہ اوجھل کر دیا تھا۔ ساڑی پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ جب ہوا کا تیز جھونکا آتا تو اُس کا گھونگٹ اُڑا دیتا اور اُس کے چہرے پر بالوں کی لٹیں بکھر جاتیں۔ سونیا کا قد پہلے ہی نکلتا ہوا تھا۔ ساڑی میں وہ اور لمبی دکھائی دے رہی تھی۔ اُس کے ترشے ہوئے ہونٹوں پر کچھ کپکپاہٹ سی لرزش تھی۔ رخساروں کا سونے جیسا رنگ کھلایا ہوا تھا۔ سونیا کو میں نے متعدد بار دیکھا تھا، ایک زمانے میں تو روز ہی دیکھتا تھا لیکن اِس وقت وہ مجھے کوئی مجسمہ لگ رہی تھی، ترشا ہوا قدرت نے جیسے اُسے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہو، شائستہ اور پُر وقار۔ بمل ٹھیک ہی کہہ رہا ہوگا کہ بڑے بڑے لوگوں کے ہاں سے اُس کے رشتے آئے تھے۔ سونیا کسی محل ہی میں موزوں لگتی۔ جیلر کی بھی جب میں اُسے پڑھانے جاتا تھا، اُس کی چھب بہت سی لڑکیوں سے الگ تھی۔ ٹھیر ٹھیر کے ہلکی دھیمی آواز میں باتیں کرتی تھی۔ میں نے کبھی اُس کے لباس پر ایک دھبا نہیں دیکھا تھا۔ کتابوں، گھر کی آرائش اور کھانوں، ہر بات سے اُس کی نفاست پسندی جھلکتی تھی۔ جتنی وہ نازک ہے، اتنے ہی اُس کے احساسات بھی نازک ہیں۔ سونیا کو اُس دیکھ کے میرا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ بار بار میری نظریں اُس کی طرف مرکوز ہو جاتی تھیں، مجھے بھی اُس دوران کسی بار وہ مجھے ضرور دیکھے گی مگر اُس نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی۔ پتہ نہیں بمل نے اُسے کیا بتایا تھا۔ گاڑی کی رفتار سست پڑنے کے ساتھ ساتھ بمل کا اضطراب بڑھ گیا۔ ناگ پور شہر کے آثار کھڑکیوں سے نظر آنے لگے تھے۔

تھوڑی دیر میں وہ چلے جائیں گے، بچھڑتے ہیں، ہمی رہ جائیں گے۔ میں نے اُن سے جانے کو کہہ تو دیا تھا لیکن اب کچھ عجیب معلوم ہو رہا تھا کہ یہ ہم سے جدا ہو رہے ہیں۔ کل صبح وہ مسلسل سفر کرتے رہیں گے۔ اُنھیں شاید یوں نہیں جانا چاہیے۔ بمل پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ پولیس اُن کے پیچھے ہے، وہ بہت حواس باختہ، گھبرایا گھبرایا نظر آرہا ہے۔ راستے میں کسی کو شک گیا تو نئی اُلجھنیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ بمبئی تو وہ پہلی مرتبہ جا رہے ہیں، بمبئی کا ہنگامہ دیکھ کے دونوں ویسے ہی اکتا جائیں گے۔ میرے جی میں آئی، اُنھیں روک لوں۔ جیسے ابا جان، پیرو، زورا اور مارٹی وغیرہ ساتھ جا رہے ہیں، یہ بھی کیوں نہ چلیں، جس طرح وہ سب وہاں رہیں گے، یہ بھی رہ لیں گے۔ اسی اثنا میں گاڑی ناگ پور اسٹیشن میں داخل ہو گئی۔ مارٹی نے دونوں کے سوٹ کیس اور بستر بند اُٹھا کے دروازے کے قریب رکھ دیے تھے۔ اب میرا اُنھیں روکنا ٹھیک نہیں تھا۔ میں بھلا اُن سے کیا کہوں گا اور ابا جان کیا سوچیں گے۔ درمیان کا یہ مختصر عرصہ وہ کسی طرح گزار ہی لیں گے۔ آخر گھر سے بھی تو یہاں تک آئے ہیں۔ ناگ پور سے بردوان خاصی دُور ہے، آگے وہ اور دُور ہوتے رہیں گے۔ جیلر صاحب نے تمام ہندوستان میں منادی تو نہیں کرا دی ہوگی۔ بمل ایک ہوش مند تعلیم یافتہ نوجوان ہے، سنبھل سنبھل کے ہی قدم اُٹھائے گا۔ میں اُنھیں روکتے روکتے ٹھہر گیا۔

سونیا بھی کھڑی ہو گئی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی پہلے مارٹی اُترا اور اُس نے زورا کی مدد سے دونوں سوٹ کیس اور بستر بند نیچے اُتار دیے۔ بمل نے ابا جان کو سلام کیا۔ میرا خیال تھا، سونیا بھی اُنھیں سلام کرے گی مگر اُسے تو جیسے اپنی کوئی سُدھ بُدھ نہیں تھی۔ وہ بمل کے پیچھے سہمی ہوئی ایک طرف کھڑی رہی۔ اُس کا چہرہ میرے مقابل تھا۔ پتھر کی آنکھیں، رخساروں پر ویرانی چھائی ہوئی۔ وہ چکرائی چکرائی، گری گری سی نظر آتی تھی۔ بمل نیچے اُتر گیا تو وہ دروازے تک چلی۔ ابا جان بھی اُنھیں رخصت کرنے کے لیے کھڑے ہو گئے تھے۔ میں نے ارادہ کیا تھا، جتنی دیر گاڑی ٹھیرے گی، میں اُنھی کے پاس رہوں گا اور جو میں سونیا سے نہیں کہہ سکا تھا، اِس دوران کہنے کی کوشش کروں گا۔ سونیا کے قدم لڑکھڑا رہے تھے، دروازے تک پہنچ کے وہ ٹھیر گئی اور اُس نے پلٹ کے میری جانب دیکھا، اُس کی آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں۔ میرے سارے جسم میں ایک سرد لہر سی اُٹھی۔ سونیا کی سانس چل رہی تھی۔ اُس نے اپنے ہونٹ بھینچ رکھے تھے۔ ابا جان قریب ہی کھڑے تھے۔ میں نے سونیا کو سہارا دینے کے لیے قدم آگے بڑھائے اور مجھے ایسا لگا کہ وہ مجھ سے گلے ملنے کی آرزومند ہے۔ اُس کی آنکھیں یہی کہہ رہی تھیں۔ بے اختیار میں نے اپنے بازو پھیلا دیے۔ سونیا جیسے ٹوٹ کے گری۔ دوسرے ہی پل وہ میرے بازوؤں میں سمٹی ہوئی تھی اور اُس کا دل! اُس کے سینے کی تیز تیز دھڑکنیں سُن کے میرا جسم لرزنے لگا۔ میں نے اُسے اور زور سے دبوچ لیا۔ سونیا چند لمحوں تک سسکتی رہی، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ میرے اندر پیوست ہو جانا چاہتی ہے، میرے جسم کا جزو بن جانا چاہتی ہے مگر یکایک اُس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور اُس کی گردن میرے شانوں پر ڈھلک گئی۔

اُسی لمحے مجھے ابا جان کی چیخ سنائی دی۔

مجھے نہیں معلوم کیا ہوا، میرا جسم مفلوج ہو گیا تھا۔ ابا جان نے جھپٹ کے سونیا کو مجھ سے چھین لیا تھا۔ اُنھوں نے اُسے فوراً برتھ پر لٹا دیا۔ اُن کی چیخ سُن کے مارٹی، زورا اور بمل آناً فاناً اوپر چڑھ آئے تھے۔ میں گنگ نظروں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ آتے ہی اُنھوں نے دروازہ بند کر دیا اور سب سونیا کے گرد گھیرا ڈال کے بیٹھ گئے۔ اُسی دم پیرو میری طرف لپکا۔ "راجا! اُس کی سن سناتی آواز میرے کانوں میں گونجی، وہ مجھے جھنجوڑ رہا تھا۔ "جلدی بول، کون ہے یہ؟"

"یہ.... یہ سونیا!" میری زبان ٹھٹھر گئی۔

"سونیا! کون سونیا؟ اپن کو جلدی بول۔"

"یہ جیلر صاحب کی لڑکی سونیا ہے۔" میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "اِسے کیا ہو گیا ہے؟"

"تو کیسے جانتا ہے اِسے؟"

"وہ، وہ، میں اور وہ....." مجھے ہر چیز گھومتی نظر آرہی تھی۔

"دیری نہ کر۔" وہ غصّے سے بولا اور مجھے جھٹکے دینے لگا۔

میں نے اُسے نہ جانے کیا بتایا۔

"ٹھیک ہے راجا!" وہ میری کمر تھپ تھپاتے ہوئے بولا۔

"اِسے کیا ہو گیا ہے دادا؟"

"کچھ نہیں راجا! ابھی ہوش میں رہنا، ایک دم ہوش میں۔"

وہ تیزی سے بمل کی طرف پلٹ گیا، بمل سونیا کے پیر پکڑے پاگلوں کی طرح اُسے پکار رہا تھا۔ زورا نے بدقت تمام اُسے کھینچ کے سونیا کے پاس سے ہٹایا۔ بمل مجھ سے آکے چمٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ میری آنکھیں سرد پڑی تھیں، میں بے حس و حرکت کھڑا اُنھیں دیکھتا رہا۔ مارٹی نے ساری کھڑکیاں گرا دی تھیں۔ ابا جان نے سونیا کو چادر سے ڈھانپ دیا۔ چند لمحے ابا جان اور پیرو اُس کے سرہانے بیٹھے سرگوشیاں کرتے رہے۔ ابا جان کے چہرے کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔ کسی تاخیر کے بغیر اُنھوں نے اپنا سامان اور جیبیں ٹٹولنا شروع کر دیا۔ نوٹوں کی بہت سی گڈیاں اُنھوں نے پیرو کے حوالے کر دیں، پیرو نے اُنھیں میری جیبوں میں ٹھونس دیا اور کچھ زورا اور مارٹی کی طرف پھینک دیں، زورا دروازے پر پشت

کر کے ہینڈل تھامے کھڑا تھا۔ اُدھر مارٹی نے سامان سمیٹ لیا تھا۔ اُسی وقت پیرو بمل کے پاس آیا: "اپن کی بات دھیان سے سنو۔" اُس نے بمل کا بازو تھام کے تیز لہجے میں کہا: "ابھی اپنے کو باندھ کے رکھو بابو صاحب! وہ چلا گیا ہے۔ پر تم کو ابھی اپنے کو ٹھیک رکھنا ہے۔ ابھی پولیس آئے گا۔ سمجھا!! ایدر پولیس آئے گا۔" وہ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہہ رہا تھا: "جیسا ہوا ہے، اُن کو ویسا ہی بولنا۔ اُن لوگ سے کچھ مت چھپانا۔ ایک بھی بات تئیں اپن لوگ ایدر سے نکل رہا ہے۔ ایدر اپنے رہنے سے اور اُلٹا ہو جائے گا اور... اور ایک دم فکر نئیں کرنا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا اور تم بھی راجا!" وہ میرے گالوں میں انگلیاں گاڑ کے بولا۔ "بڑا صاحب ایدر اکیلا ہے، اُس کو پریشان مت کرنا۔" وہ یہ کہتا ہوا سامان اُٹھا کے نیچے اُتر گیا۔ چلتے چلتے بھی وہ ہاتھ کے اشارے سے مجھے اور بمل کو تلقین کرتا رہا۔ اُن کے جاتے ہی ابا جان نے کھڑکیاں اوپر کر دیں اور بمل کے پاس آ کے بیٹھ گئے۔ اُنھوں نے اُس کے ہاتھ پکڑ کے سینے سے لگا لیے۔ بمل اُن کے شانے سے لگ کے بلکنے لگا۔

کچھ ہی دیر میں گاڑی رینگنے لگی اور پچھلے ڈبے ابھی پلیٹ فارم کے کنارے تک آئے ہوں گے کہ ابا جان نے اُٹھ کے زنجیر کھینچ دی۔ اچانک پہیے گھسٹنے کا شور بلند ہوا۔ گاڑی جھٹکے لیتی ہوئی رُک گئی۔ جیسے ہی گاڑی ٹھہری، ابا جان نے دروازہ کھول کے چلّانا شروع کر دیا: "ڈاکٹر! ڈاکٹر! کسی ڈاکٹر کو بلاؤ۔" وہ مسلسل چیخ رہے تھے۔ مجھے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ اُنھیں چیختے دیکھ کے میں بھی دروازے کی طرف لپکا۔ میں نے غیر ارادی طور پر نیچے اُترنے کے لیے قدم بڑھائے ہی تھے کہ ابا جان نے مجھے روک لیا اور کہنی مار کے اندر کی جانب دھکا دے دیا۔

سورج ڈوبنے کے قریب تھا۔ بہت سے مسافر نیچے اُتر آئے تھے۔ ایک طرف سے گارڈ اور اُس کے ساتھ کچھ سپاہی ہمارے ڈبے کی طرف تیز قدموں سے چلے آ رہے تھے۔

تھوڑی دیر میں ہم ریلوے تھانے میں پولیس افسر کے سامنے بیٹھے تھے۔ ہمارے اِرد گِرد سپاہی کھڑے تھے، تھانے کے گیٹ پر لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔ قریب ہی اسٹریچر پر سونیا لیٹی تھی اور میز کے اُس طرف بیٹھا ہوا بھاری جسم، گندمی رنگت کا ایک ادھیڑ پولیس افسر ابا جان سے سوالات کر رہا تھا: "یہ کس کے ساتھ ہے؟" اُس نے اسٹریچر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے درشتی سے پوچھا۔

"اپنے ہی ساتھ سمجھیے۔" ابا جان نے اٹکتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا ہوا اسے؟"

"خدا جانے کیا ہو گیا، اچانک، بالکل اچانک..." ابا جان کی آواز ڈگمگا رہی تھی۔

"نام؟" پولیس افسر نے سرد لہجے میں پوچھا: "آپ کا نام؟"

"صفدر علی۔" ابا جان بے تابی سے بولے: "مگر آپ یہ سب کچھ بعد میں پوچھ لیجیے گا، پہلے کسی ڈاکٹر کو بلا لیجیے۔"

"ڈاکٹر بھی آ رہا ہے۔" پولیس افسر کی متجسس نظریں ابا جان کے چہرے پر جمی رہی تھیں: "اس بیچ اِدھر کی کارروائی بھی ہو جائے۔"

"جیسا آپ بہتر سمجھتے ہوں لیکن ڈاکٹر کب آئے گا؟"

"آدمی بھیج دیا گیا ہے۔" وہ تندی سے بولا: "کیا کرتے ہیں آپ؟"

"تھوڑی بہت زمین داری ہے۔"

"کون سی جگہ رہتے ہیں؟"

"بمبئی میں!" ابا جان نے جواب دیا۔

"زمین داری بھی بمبئی میں ہے؟"

"جی، وہ فیض آباد میں ہے۔" ابا جان ناگواری سے بولے۔

"یہ لڑکی آپ کی کون ہے؟"

ابا جان کو جواب دینے میں دشواری پیش آئی۔ اُنھوں نے پہلے بمل کی طرف پھر میری طرف دیکھا مگر ہم دونوں کو درمیان میں دخل دینے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اِسی دوران ایک سپاہی ہاتھ میں ڈاکٹر کا بیگ سنبھالے اندر داخل ہوا، اُس کے پیچھے ایک سفید پوش معمر شخص بھی تھا، وہی ڈاکٹر ہوگا۔ پولیس افسر اپنی نشست سے اُٹھ گیا۔ ہم بھی کھڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر سونیا کے اسٹریچر کی طرف پلٹا تو میرا دل دہلنے لگا۔ مجھ سے اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ پولیس افسر نے سونیا کے بدن سے چادر ہٹا دی۔ سونیا کا چہرہ پھر میرے سامنے تھا۔ پہلے سے بدلا ہوا، پُرسکون، مسکراتا ہوا، ابا جان نے شاید اُس کے بال کھول دیے تھے۔ سرخی مائل سیاہ بالوں کی اوٹ میں اُس کا چہرہ کسی پھول کے مانند کھلا ہوا تھا یا چاند کی طرح روشن تھا۔ لگتا تھا، اُس نے آنکھیں موند لی ہیں، ابھی ابھی کھول دے گی۔ اے کاش یہ آنکھیں کھول دے۔ میرا دل دعائیں کر رہا تھا۔ "اے خدا! یہ آنکھیں کھول دے، میں اس سے ایک بات کہہ سکوں، جو اس کی مرضی ہوگی، جو یہ کہے گی، میں وہی کروں گا۔" سونیا نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ ڈاکٹر چند ثانیوں تک ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھتا رہا۔ اُس نے جھجکتے ہوئے سونیا کی کلائی ٹٹولی اور سینے پر آلہ رکھ کے دیکھا۔ بمل کا منہ کھلا ہوا تھا، وہ دہشت زدہ آنکھوں سے ڈاکٹر کو دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر کو چند لمحوں سے زیادہ نہیں لگے۔ وہ پولیس افسر کو اشارہ کرتا ہوا وہاں سے ہٹ گیا۔ سونیا کا بدن دوبارہ چادر

سے چھپا دیا گیا۔

ابا جان نے ڈاکٹر سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی مگر وہ سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا اور ابا جان کا کندھا تھپتھپاتا ہوا اُٹھ گیا۔ بمل گڑگڑاتا ہوا کچھ دور تک ڈاکٹر کے پیچھے چلتا رہا مگر آگے اُسے سپاہیوں نے تھام لیا۔ بمل منہ چھپا کے سسکاریاں بھرنے لگا۔

ڈاکٹر کو دروازے تک پہنچا کے پولیس افسر واپس آیا تو اُس نے سپاہیوں کو اسٹریچر اُٹھانے کا حکم دیا۔ ہم بھی ساتھ جانے کے لیے بڑھ گئے تھے مگر پولیس افسر کی بھاری آواز نے ہمیں روک دیا: "آپ ابھی یہیں ٹھہریے۔"

"پر اِسے آپ کہاں بھیج رہے ہیں؟" ابا جان لپکتے ہوئے

"ڈاکٹر کا کام ابھی باقی رہ گیا ہے۔" پولیس افسر نے خشونت سے کہا۔

"لیکن، لیکن..." ابا جان اُس کی تند نظریں دیکھ کے چُپ ہو گئے۔

"تسلی سے بیٹھو۔" وہ تلخی سے بولا: "جو کچھ آپ سے پوچھا جائے، اُس کا ٹھیک ٹھیک جواب دیجیے، آپ [illegible]دار آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ معاملہ سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ ہمیں آپ سب کے بیانات کی ضرورت پڑے گی۔"

"مجھے اندازہ ہے۔" ابا جان سر ہلا کے بولے: "مجھے خوب اندازہ ہے۔"

"اچھی بات ہے۔" اُس نے سپاٹ لہجے میں کہا: "ڈاکٹر کہتا ہے یہ آدھ گھنٹے پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔"

"ہو سکتا ہے، تقریباً اتنے ہی وقفے سے یہ بے سُدھ ہے۔"

"کیا بیماری تھی اِس کو؟"

"کوئی بھی نہیں، کچھ دیر پہلے اچھی بھلی تھی۔"

"پھر ایک دم یہ کیا ہوا؟" وہ جھڑکتی آواز میں بولا۔

"کیا کہا جا سکتا ہے۔"

"یہ کوئی معقول جواب نہیں ہے۔"

"اس کے سوا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔"

"ہُنہ۔" وہ ٹھہر کے اپنے برابر بیٹھے ہوئے سپاہی کو سرگوشی میں کوئی ہدایت دینے لگا۔ سپاہی کاغذ پر تیزی سے کچھ لکھ رہا تھا۔

"دیکھو بڑے میاں!" پولیس افسر کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ اُس کے تخاطب سے ابا جان پر اضطراری کیفیت طاری ہونے لگی۔ "اپنے بارے میں تم کو پتہ نہیں ہے۔" وہ منہ بنا کے بولا: "ہم نے اب تک بہت لحاظ کیا ہے لیکن ہم سیدھے آدمیوں کے ساتھ سیدھے، ٹیڑھوں کے ساتھ پھر بہت ٹیڑھے ہیں۔ ایسی ویسی کوئی بات ہو تو ابھی بول دو۔"

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟" ابا جان کپکپاتے ہوئے بولے۔

"ہم ایک نمبر صاف بات کر رہے ہیں۔ ہم سے اُلٹا سیدھا بولو گے تو سب اُلٹا ہو جائے گا، اپنی بزرگی کا خود خیال کرو، ٹھیک ٹھیک سب بول دو۔"

"آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"جو ہم پوچھنا چاہتے ہیں، وہ تم خود بتا دو تو اچھا ہے ورنہ ہم پوچھیں گے تو شکایت مت کرنا۔"

"آپ کو کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے۔"

"ایسے کیسوں میں ہم کو یہ غلط فہمی ہو جایا کرتی ہے۔ ہم کو غلط فہمی ہو گئی ہے تو تم اُسے دُور کر دو۔"

"مجھے وہ طریقہ بتا دیجیے۔"

پولیس افسر کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں: "تم لوگ کہاں جا رہے تھے؟" وہ تحکمانہ لہجے میں بولا۔

"حیدرآباد۔"

"حیدرآباد کیوں؟"

"کام سے؟"

"کس کام سے؟"

"ذاتی کام سے۔"

"آ کہاں سے رہے ہو؟"

"فی الحال دلّی سے لیکن کل صبح ہم فیض آباد سے چلے تھے۔"

"یہ دونوں کون ہیں؟"

"ایک میرا بیٹا ہے، دوسرا..." ابا جان کہتے کہتے رُک گئے۔

"دوسرا کون ہے؟" وہ تیزی سے بولا۔

"اِسے بھی بیٹا سمجھیے۔"

"سمجھیے کیا، صاف صاف بتاؤ۔"

"یہ میرا ہم سفر ہے۔"

"ہم سفر ہے۔" وہ چونک کے بولا: "تمھارا اِس کا بس سفر کا ساتھ ہے؟"

"میں یہی کہہ سکتا ہوں۔" ابا جان دھیمی آواز میں بولے۔

"لڑکی تمھاری کون ہے؟" وہ ترش روئی سے بولا۔

"لڑکی بھی میری ہم سفر تھی۔"

"میں پوچھتا ہوں لڑکی سے تمھارا رشتہ کیا ہے۔" وہ اونچی آواز میں بولا۔

"آدمیت کا رشتہ تھا۔"

"صرف آدمیت کا؟"

"دیکھیے جناب! ایسے سوالات کرنے سے پہلے بہتر ہے کہ آپ لڑکی کے بارے میں ڈاکٹر کی رپورٹ کا انتظار کریں۔" ابا جان نے عاجزی سے کہا۔ "آپ جو سمجھ رہے ہیں، وہ غلط ہے۔ ہم سے ہمدردی کرنے کے بجائے آپ ہمی کو...."

"بڑے میاں! جانتے ہو کہاں بیٹھے ہو؟"

"جانتے ہیں، اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"جانتے تو ایسی باتیں نہ کرتے۔ رپورٹ کا کیا ہم کو انتظار نہیں ہے پر اُس سے پہلے تمھاری رپورٹ مکمل کر لیں تو کیا حرج ہے۔"

"کوئی حرج نہیں، ضرور کیجیے۔"

"رپورٹ آنے تک تم لوگ یہیں رہو گے۔"

"جیسا آپ مناسب سمجھیں۔" ابا جان کچھ اور کہنا چاہتے تھے ُر کہہ نہ سکے۔

دفعتہً برابر بیٹھے ہوئے سپاہی نے پولیس افسر سے کانا پھوسی کے نداز میں کچھ کہا۔ وہ مضطرب ہو گیا اور چلّا کے بولا۔ "تم لوگوں نے ن کی تلاشی لی؟" اِردگرد کھڑے سپاہیوں نے انکار میں گردن ہلائی۔ پولیس افسر نے انھیں سخت سُست کہا، یہاں تک کہ گالیاں بکنے لگا۔

"میں سمجھتا ہوں، یہ قبل از وقت ہے۔"

پولیس افسر نے جیسے کچھ نہیں سُنا۔ میں چپ چاپ بیٹھا اُن کی باتیں سُن رہا تھا مگر جب سپاہی ابا جان کی تلاشی لینے کے لیے اُن کے سامنے کھڑا ہو گیا تو میری رگوں میں کھولن ہونے لگی۔ میں نے درمیان میں دخل دینے کا ارادہ کیا لیکن اس سے پہلے کہ میں زبان کھولتا، ابا جان نے آنکھ کے اشارے سے مجھے تحمل کی تلقین کی۔ سپاہی نے سب سے پہلے ابا جان ہی کی تلاشی لی۔ اُس نے نہ صرف اُن کی جیبیں کھکھوڑیں بلکہ تمام جسم ٹٹول کے دیکھا۔ ابا جان کی بنڈی کی جیبوں سے نوٹوں کی دو ایک گڈیاں، ٹکٹ، چند مڑے تڑے کاغذات، دو شکستہ نوٹ بکیں، ایک بڑی نوٹ بک جیسی چیزوں کے سوا کچھ برآمد نہیں ہوا۔ سپاہی اُن کی جیب سے ایک ایک چیز نکال کے پولیس افسر کو دکھاتا رہا۔ بمل کی جیب سے بھی ایک گڈی نکلی، وہی گڈی جو ناگ پور اسٹیشن آنے سے پہلے میں نے اُسے دی تھی، اس کے علاوہ ایک چھوٹی ڈائری، ایک بٹوا، رومال، کنگھی، قلم، ریل کے ٹکٹ، چند خط، کاغذ اور تین چار سو کے کُھلے نوٹ۔ اس کے سوا کچھ نہیں نکلا۔ سپاہی اُن دونوں کی تلاشی لے کے میرے پاس آیا۔ میری جیب سے اُسے چیک بک، بینک سے متعلق دو ایک رسیدیں، زرّیں کا دیا ہوا رومال، نیساں کی دی ہوئی جیبی حمائل شریف، نیساں ہی کے دیے ہوئے گلاب کے پھول کی خشک پتیاں ملیں اور چاقو۔ چاقو دیکھ کے سپاہی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اُس نے اُسے بے تابی سے افسر کے حوالے کر دیا۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا کہ میری جیب میں چاقو بھی ہے۔

"چاقو!" افسر چاقو اُلٹ پلٹ کے اور دھار پہ اُنگلی پھیرتے ہوئے حیرت سے بولا۔ "یہ کس کی جیب سے نکلا ہے؟"

"اِس کی۔" میری تلاشی لینے والے سپاہی نے مستعدی سے کہا۔

"خاص قسم کا ہے۔" افسر بڑبڑایا۔ "اِن عزت دار لوگوں کو بھلا ایسا چاقو رکھنے کی ضرورت کیوں پڑ گئی؟" وہ چاقو پر اس طرح نظریں جمائے ہوئے تھا جیسے اُسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔

میں چپ رہا۔ سپاہی کا ہاتھ میرا جسم ٹٹولتے ہوئے میرے گلے تک پہنچ گیا تھا۔ ہار کے دانے اُس کی اُنگلیوں میں چبھے تو وہ بے چین ہو گیا۔ "یہ کیا ہے؟" وہ بھڑکتی آواز میں بولا۔

"ہار ہے۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"ذرا باہر نکالو۔" اُس نے حکم دیا۔

میں نے کسی حجّت کے بغیر ہار نکال کے اُس کے سامنے کر دیا۔ ابا جان اُسے دیکھ کے پلکیں جھپکانے لگے۔ ہیرے جواہر کے معاملے میں اُن کی نظریں بہت تیز تھیں۔ شاید انھیں یاد آ گیا ہو کہ یہ ہار انھوں نے کب اور کہاں دیکھا تھا۔ ممکن ہے، انھیں کراچی یاد آ گئی ہو۔ سپاہی نے ہار ہاتھوں میں تولتے ہوئے پولیس افسر کے سامنے احتیاط سے میز پر رکھ دیا۔ گو اندھیرا بڑھ گیا تھا مگر ہار کے سفید موتی دمک رہے تھے۔ پولیس افسر اُسے ٹٹولتا رہا۔ "قیمتی معلوم ہوتا ہے، سچّے موتیوں کا۔" اُس کے برابر بیٹھے ہوئے سپاہی نے بھی ہار چھو کے دیکھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہ کہیں چاقو کی طرح ہار بھی اپنی میز پر نہ رکھ لے۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اگر اُس نے ہار واپس نہ کیا تو میں جھپٹ کے خود اُسے اُٹھا لوں گا لیکن پولیس افسر نے ہار اپنے پاس نہیں رکھا، مجھے واپس کر دیا۔

"بیٹھ جاؤ بڑے میاں!" وہ دوبارہ ابا جان سے مخاطب ہوا۔ ابا جان نے فوراً اُس کے حکم کی تعمیل کی۔ "ہاں تو تم لڑکی سے اپنا کیا رشتہ بتا رہے تھے؟ آدمیت کا رشتہ؟ اس سے بڑا رشتہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ یہی بتایا تھا نا تم نے؟"

"یہی کہا تھا جناب!" ابا جان نے دھیمی آواز میں کہا۔

"رپورٹ میں کیا یہی لکھ لیا جائے؟"

"قلم آپ کے ہاتھ میں ہے، آپ حاکم ہیں۔"

"یہ رشتہ اِدھر نہیں چلتا بڑے میاں! آگے کٹہرے میں جا کے بھی نہیں چلے گا، سمجھے؟ ابھی تم کو احساس نہیں ہے کہ معاملہ کتنا آگے جا سکتا ہے۔ ہم تم سب کو علاقے کے تھانے کے حوالے بھی کر سکتے ہیں۔ بعد میں ہمیں یہی کرنا پڑے گا۔ وہ لوگ ذرا دوسری قسم کے ہیں، اُن کی زبان بھی دوسری ہے۔"

"پہلے آپ میری بات سن لیجیے۔" ابا جان نے درخواست کی۔

"اور میں بیاں کیا جھک مار رہا ہوں۔" وہ اپنے سے بولا۔

"آپ بدگمانی کر رہے ہیں، پہلے آپ اپنے دل سے یہ نکال دیجیے۔"

"تمھارا مطلب ہے کہ جو تم کہتے جاؤ، ہم اُسے منظور کرتے چلے جائیں؟ یہ بال دیکھ رہے ہو؟ تم سے زیادہ سفید تو نہیں ہیں پر اِن پہ دھوپ بالکل نہیں لگی ہے۔ ساری عمر یہی کھیل تماشا دیکھتے بیتی ہے۔" اُس کا لہجہ اچانک سخت ہو گیا۔ "جو تم سے پوچھا جائے، اُسی کا جواب دو۔" وہ پھر تلملاتی آواز میں پوچھنے لگا۔ "لڑکی کا نام؟"

ابا جان نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔ "کماری سونیا۔"

"کماری سونیا!" وہ آنکھیں پھاڑ کے بولا۔

"جی!"

"اور تم نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟" وہ کاغذ دیکھتے ہوئے بولا۔ "صفدر علی! — تم نے اپنا یہی نام بتایا تھا؟"

"جی ہاں!"

"صفدر علی!" وہ غصّے سے بولا۔ "یہ لڑکی کون تھی؟"

"کسی شریف گھرانے ہی سے تعلق رکھتی تھی۔"

"میں اُس کی ذات پات نہیں پوچھ رہا۔ — ! چکّر بتاؤ۔"

"کیسا چکّر جناب! یہ محض ایک حادثہ تھا۔ لڑکی میرے اور میرے بیٹے کی ہم سفر تھی۔ دِلّی سے ہم...."

"یہ میں نے پہلے بھی سُن لیا ہے۔ اتنی سی بات سے کام نہیں بنے گا۔" اُس نے رازدارانہ لہجے میں ابا جان سے پوچھا۔ "لڑکی تنہا تھی؟"

"نہیں۔" ابا جان نے ٹھنڈی سانس بھر کے جواب دیا۔

"پھر کس کے ساتھ تھی؟" وہ جھنجلا کے بولا۔ "آکاش سے اُتری تھی؟"

"وہ... وہ...." ابا جان سراسیمہ نظروں سے مجھے اور بمل کو دیکھنے لگے۔

انھوں نے اپنی بات پوری نہیں کی تھی کہ پولیس افسر کی تیز آواز گونجی۔ "ہاں، ہاں بولو۔ رُک کیوں گئے۔ کون سی ایسی بات ہے جو تمھیں بتاتے ہوئے شرم آ رہی ہے، اِن دونوں کو باہر بھیج دیں؟ لڑکی کو کسی نے...."

مجھ سے ضبط نہیں ہوا۔ میں نے ابا جان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "آپ کو جو کچھ پوچھنا ہو، مجھ سے پوچھیے۔" میری آواز کانپ رہی تھی۔ "آپ کے خیال میں آپ کو ہم پر کوئی شبہ ہے تو اُسے دور مت کیجیے۔ میں اپنے جرم کا اقرار کر لیتا ہوں۔ مجھے حوالات میں ڈال دیجیے مگر ان سے فضول سوالات مت کیجیے۔"

پولیس افسر نے گھورتی نظروں سے مجھے سر تا پا دیکھا۔ "چاقو اِسی کی جیب سے نکلا تھا؟" اُس نے بپھرے ہوئے لہجے میں سپاہی سے پوچھا۔

"ہاں، میری جیب سے نکلا تھا۔" سپاہی کے جواب دینے سے پہلے میں نے چیخ کر کہا۔ "میں چاقو چلانا خوب جانتا ہوں، یہ ہمیشہ میرے پاس رہتا ہے۔"

"تمیز سے بولو، یہ پولیس اسٹیشن ہے۔"

"معلوم ہے، پولیس اسٹیشن ہے مگر آپ بھی سیدھی طرح بات کریں۔"

"تم ایک پولیس افسر سے بات کر رہے ہو۔"

"پولیس افسر ہی ہیں، خدائی فوج دار نہیں ہیں، میں نے آپ جیسے پولیس افسر بہت دیکھے ہیں۔"

"کیا بکتا ہے۔" اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔

ابا جان مجھ پر ناراض ہونے لگے۔ "یہ پولیس افسر ہیں۔" انھوں نے مجھے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔ "اِن کا کام ہی یہ ہے۔ افسروں سے اِس طرح بات نہیں کرتے۔ معاف کیجیے۔" وہ اُس سے مخاطب ہو کے لجاجت سے بولے۔ "اس کا غصّہ کچھ تیز ہے، ابھی خون گرم ہے، اِس کی باتوں پر توجہ مت دیجیے۔"

"اسے کھونٹے سے باندھ کے رکھو۔" پولیس افسر کے برابر بیٹھے ہوئے سپاہی نے گرج کے کہا۔ "اس سے کہو زبان بند رکھے، صاحب کا غصّہ ابھی دیکھا نہیں ہے۔ ابھی تک تم لوگوں سے نرمی سے بات کر رہے ہیں۔ تم کو ہوش نہیں ہے کہ تم اپنے ساتھ کیا لائے تھے۔ ایک بے جان لڑکی — اور نوجوان لڑکی۔"

پولیس افسر نے سپاہی کو جھڑک دیا اور تلخ لہجے میں بولا۔ "ابھی اِس نے جرم کا اقرار کیا ہے۔"

"کیا ہے۔" میں نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ابا جان اپنی کرسی سے اُٹھ کے تیزی سے میری طرف لپکے اور کپکپاتے ہاتھوں سے میرا شانہ جھنجوڑنے لگے۔ "آپ، آپ اطمینان سے بیٹھیے۔" میں نے متوحش لہجے میں کہا۔ "ان کے کسی سوال کا جواب مت دیجیے، ٹھیک ہے، یہ ہمیں حوالات میں ڈال دیں۔"

"بیروا! خدا کے لیے خاموش رہ" ابا جان میری منت کرنے لگے۔ میری آنکھوں میں گھٹن ہونے لگی، ایک مدت بعد میں نے ابا جان کی زبان سے بیرو سنا تھا، تبت میں ملنے کے بعد سے اب تک انھوں نے مجھ سے اس طرح بات نہیں کی تھی۔

"اپنی جگہ بیٹھو بڑے میاں" پولیس افسر نے دھتکارتے لہجے میں ابا جان کو مخاطب کیا۔ "یہ ٹھیک کہتا ہے، تم چپ رہو۔ ابھی اس سے ہمی کو دو باتیں کر لینے دو۔"

"جناب! اس کا کہا درگزر کر دیجیے۔" ابا جان نے فریاد کی۔ "میں آپ سے پھر درخواست کرتا ہوں، آپ میڈیکل رپورٹ کا انتظار کر لیں۔" ابا جان میرے پاس ہی کھڑے رہے۔

"وہ تو جب آئے گی، دیکھیں گے، میں اس کے لیے ہتھکڑیاں منگواتا ہوں۔ ابھی اس نے کیا اعتراف کیا ہے۔" وہ طیش میں بولا۔

"آپ کے پاس اس کے سوا کیا رکھا ہے۔"

"تجربہ کار معلوم ہوتا ہے۔"

"بہت زیادہ، آپ سے زیادہ۔" میں نے اونچی آواز میں کہا۔ "مگر میں نے زندگی میں آپ جیسا شخص نہیں دیکھا۔ شاید آپ کو پہلی بار ایسا تماشا دیکھنے کو ملا ہے۔ مجھے آپ ایک پولیس افسر سے زیادہ مداری معلوم ہوتے ہیں، ان دونوں کو چھوڑ دیجیے، مجھے گرفتار کر لیجیے۔ میرے اعتراف کے بعد انھیں روکنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اپنی رپورٹ مکمل سمجھیں اور اسے فریم میں لگا کے اوپر بھیج دیں۔"

ابا جان دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کے بیٹھ گئے۔

"قاعدہ قانون کچھ ہم بھی جان سکتے ہیں، ہم آپ کے پاس اس لیے نہیں آئے تھے کہ آپ اس طرح کی باتیں کریں گے اور چھان بین کیے بغیر، سوچے سمجھے بغیر جو منہ میں آئے گا، کہتے رہیں گے۔ اگر آپ کی کوئی لڑکی ہوتی اور یہ سب کچھ آپ کے ساتھ پیش آتا؟ ہماری جگہ آپ ہوتے تبھی کچھ جان سکتے تھے کہ بہت سی باتیں زبان پر نہیں لائی جا سکتیں۔ نہ معلوم کون کس عالم میں آپ کے پاس آتا ہے، کون سے کانٹے اس کے سینے میں چھپے ہوتے ہیں۔ آپ کو اس لڑکی کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، نہ سوچنے کا ہے۔ وہ چلی گئی ہے لیکن اس کے پوچھنے والے موجود ہیں۔ جو باتیں آپ کی سمجھ میں نہیں آسکتیں، انھیں آپ کیوں جاننا چاہتے ہیں۔ آپ کے پاس ایک ہی لاٹھی، ایک ہی پیمانہ ہے۔ یہ کچھ نہیں جانتے۔" میں نے ابا جان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "انھوں نے جو کہا ہے، اس سے زیادہ انھیں معلوم نہیں ہے۔ پر میں جانتا ہوں کہ وہ کون تھی۔ وہ میرے ساتھ تھی۔ میں اسے برسوں سے جانتا ہوں۔ وہ ایک ایسے گھر کی لڑکی تھی جہاں سر اونچے نگاہیں نیچی رکھی جاتی ہیں۔ وہ کسی گھر کی ناموس تھی۔ وہ اتنی پاک، اتنی اچھی تھی کہ اس کے متعلق بدگمانی کرنا گناہ ہے۔ اس کی اجازت آپ کو نہیں دی جا سکتی۔ آپ کم سے کم اتنا کر سکتے ہیں کہ خاموش رہیں، آپ کو ایک مجرم کی تلاش ہے، میں سامنے موجود ہوں۔ کیا اتنا کافی نہیں ہے کہ مجرم آپ کی دسترس میں ہے۔ ایسی ویسی غیر ضروری باتوں سے آپ کو کیا ملے گا۔ وہ میرے بازوؤں میں ختم ہوئی تھی۔ میرے لیے، سب کچھ میرے لیے۔" میری آواز بھرّانے لگی۔ "یہ کسی کا قصور نہیں ہے، میرا قصور ہے۔ مجھے اس کی سزا دے دیجیے، ان لوگوں کو جانے دیجیے۔ وہ میں ہی تھا، یہ نہیں تھے۔ ضرورت پڑی تو میں آپ کو اپنا ریکارڈ بھی بتا دوں گا۔ اس سے آپ کی کچھ تسلی ہو جائے گی کہ آپ نے ٹھیک آدمی کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالی ہیں۔"

میرے خاموش ہو جانے کے باوجود پولیس افسر دیر تک مجھے گھورتا رہا۔ سپاہی ہتھکڑی لیے سامنے کھڑا تھا، میں نے اس کے آگے ہاتھ بڑھا دیے۔ ابھی سپاہی نے مجھے ہتھکڑی نہیں پہنائی تھی۔ وہ پولیس افسر کے حکم کا منتظر تھا کہ بمل ہذیان بکنے لگا۔ "نہیں، نہیں ٹھیرو، ٹھیرو۔" وہ چیختے ہوئے بولا اور سپاہی پر جھپٹ پڑا۔ اس نے اپنے ہاتھ اس کے آگے کر دیے۔ "میرے ہاتھوں میں، میرے ہاتھوں میں۔" وہ دیوانگی سے بولا۔ "انھیں میرے ہاتھوں میں ڈال دو۔ وہ ان کے ساتھ نہیں میرے ساتھ آئی تھی، بردوان سے، میں اسے بردوان سے لایا تھا۔ ہم دونوں حیدرآباد جا رہے تھے، یہ لوگ بس اتفاقاً، بالکل اتفاقاً ہمیں مل گئے تھے۔ میں تمھیں بتاتا ہوں۔ وہ بردوان کے ایک بڑے گھر کی لڑکی ہے۔ اس کے باپ بہت بڑے افسر ہیں۔ وہ میرے ساتھ اپنے گھر والوں کی اجازت کے بغیر جا رہی تھی۔ ہم دونوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ہم گھر ہی چھوڑ دیں۔ یہ لوگ ہمیں دلی میں ملے تھے، گاڑی میں، اسٹیشن پر۔" بمل سانس لیے بغیر کہتا رہا۔ "سب میرا قصور ہے۔ نہ میں اسے گھر سے لاتا، نہ وہ اس طرح روٹھ کے جاتی۔"

وہ بین کرنے لگا۔ میں نے اس کی زبان بند رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن بمل اپنے آپے میں نہیں رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو ابل رہے تھے۔ آواز پھٹی ہوئی تھی۔ اسے جیسے خود معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، نہ جانے کیا کیا بکے جا رہا تھا۔

"بیٹھو، بیٹھو، شور مت مچاؤ۔" پولیس افسر نے گرج کے کہا اور سپاہیوں کو حکم دیا کہ اسے قابو میں رکھیں۔

"انسپکٹر صاحب! یہ سب غلط کہہ رہے ہیں۔ مجھے پھانسی دے دیجیے۔ مجھے سولی پر لٹکا دیجیے۔ میں زندہ رہنا نہیں چاہتا، اس کے بغیر میں زندہ رہ بھی نہیں سکتا۔ ان کا کوئی دوش نہیں ہے، کوئی دوش نہیں ہے۔ یہ نہ جانے کہاں جا رہے تھے۔ ان سے کچھ مت پوچھیے۔" سارا کمرہ اس کی بلکتی آوازوں سے گونج رہا تھا۔

"بیٹھو۔" پولیس افسر نے خود کرسی سے اٹھ کے اسے بٹھانے کی کوشش کی۔ "اوسان میں رہو، جو کہنا چاہتے ہو، رسان سے کہو۔"

"مجھے کچھ نہیں کہنا، آپ سے میری صرف ایک بنتی ہے۔" وہ گڑگڑا کے بولا۔ "مجھے اس کے ساتھ ہی جلا دیجیے۔ میں اس کے ساتھ ساتھ....."

"دھیرج رکھو۔" پولیس افسر نے ٹھیر ٹھیر کے کہا۔ "تم کہتے ہو کہ وہ تمھارے ساتھ تھی۔"

"ہاں ہاں، میرے ساتھ۔" بمل سینے پر ہاتھ مار کے بولا۔ "ہم بردوان سے آ رہے تھے، بردوان سے۔"

"تم بردوان میں رہتے ہو؟"

"جی، جی۔" وہ ہچکیوں کے درمیان بولا۔ "پانچ دن پہلے ہم بردوان سے چلے تھے۔"

"ان دنوں میں کہاں رہے؟"

"پٹنے، لکھنؤ، دلی۔ دلی سے ہم حیدرآباد جا رہے تھے۔"

"پھر کیا ہوا؟"

بمل نے اپنے بال کھسوٹ لیے۔ "مجھے اس کے سامنے رہنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ مجھے اسی وقت ہٹ جانا چاہیے تھا جب اس نے اپنے دیوتا کو دیکھا تھا۔ میں نے ہی اس کے لیے مشکل پیدا کر دی تھی۔ مجھے اس کا خیال رکھنا چاہیے تھا کہ میرے سامنے ہونے کی وجہ سے وہ کتنی الجھن میں گھر گئی ہوگی۔ میں چلا جاتا تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ میرا کیا کام رہ گیا تھا جو میں اس کے سامنے موجود رہا۔"

"تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"یہی بات تھی انسپکٹر صاحب! یہی بات تھی، میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں، میری بات کا یقین کیجیے۔"

"تمھاری باتیں بالکل سمجھ میں نہیں آرہی ہیں، کھل کے بتاؤ۔"

"آپ کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا، آپ کچھ مت پوچھیے۔" وہ دیوانوں کے مانند چلانے لگا۔ "وہ کہاں ہے؟ اسے آپ نے کہاں بھیج دیا ہے؟ مجھے اس کے پاس لے جائیے، صرف ایک بار، ایک بار کے لیے، میں اس سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ وہ کہاں ہے انسپکٹر صاحب؟ مجھے اس کے پاس لے چلیے۔"

"لے چلیں گے، تمھیں اس کے پاس بھی لے چلیں گے۔" پولیس افسر نے مضحکہ خیز انداز میں اسے چمکارتے ہوئے کہا۔ "مجھے بتاؤ، تم نے اس کے ساتھ کون سی زیادتی کی تھی، کس بات کی معافی مانگنا چاہتے ہو؟"

"میں نے اس کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے، سب سے بڑا دوشی میں ہوں، میرے دل میں ضرور کوئی کھوٹ آگئی تھی انسپکٹر صاحب!"

"کیسی کھوٹ؟" پولیس افسر متجسس لہجے میں بولا۔ "تم نے اسے دھوکا دیا تھا؟"

"نہیں، نہیں۔" وہ وحشت سے اپنا سر جھٹکنے لگا۔

"پھر..... پھر تم نے کیا کیا؟" پولیس افسر نے چلبلے پن سے پوچھا۔ "تم کہتے ہو کہ تم اسے بھگا کے لائے تھے؟"

"ایسا مت کہیے۔" بمل ہذیانی انداز میں بولا۔ "وہ دیوی تھی۔"

"پانچ دن تک تم اس دیوی کے ساتھ رہے، تنہا، تم نے اس کے ساتھ ضرور کوئی....." پولیس افسر اپنی اوچھی بات پوری نہیں کر سکا تھا کہ بمل نے اس کا گریبان پکڑ لیا اور اس کے منہ پر طمانچے مارنے لگا۔ قریب کھڑے ہوئے سپاہیوں نے اسے کمر سے پکڑ لیا تھا مگر اس کی پچھاڑوں سے وہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا، اس کے جسم میں نہ جانے کہاں سے اتنی طاقت آ گئی تھی کہ وہ کسی کے ہاتھ نہیں آیا، چند لمحوں تک وہ دیوانہ وار کمرے میں منڈلاتا، شور مچاتا رہا، وہ سامنے کے دروازے سے بھاگ جانا چاہتا تھا، وہاں سپاہیوں کی دیوار دیکھ کے پلٹ پڑا، جس لمحے اس نے پولیس افسر کے گریبان پر ہاتھ ڈالا تھا، میں بھی بڑھ گیا تھا مگر ایک طرف سے ابا جان میرے بازو سے چمٹ گئے تھے، دوسری طرف سے سپاہیوں نے مجھے روک لیا تھا۔ پولیس افسر ایک کونے میں ہو گیا تھا اور چیخ چیخ کے سپاہیوں کو حکم دے رہا تھا۔ اتنی دیر میں بمل نے پولیس افسر کی میز پر رکھا ہوا چاقو اٹھا لیا۔ جیسے ہی میں نے اس کے ہاتھ میں چاقو دیکھا، ابا جان اور سپاہیوں کی گرفت سے خود کو چھڑا کے میں نے اس کی جانب جست لگائی۔ میں اسے ضرور تھام لیتا لیکن مجھے دیر ہو گئی۔ بمل چاقو اتار چکا تھا۔ میں نے جب اسے سنبھالا اور چاقو اس کے سینے سے باہر نکالا تو وہ اتنا ہی کہہ سکا کہ اسے سونیا کے ساتھ ساتھ جلایا جائے، اس کے سوا اسے کچھ کہنے کا وقت نہیں ملا۔ اس نے میرے

سارے کپڑے میرے ہاتھ خون سے رنگ دیے۔

اس رات کے بعد میں نے پولیس افسر کو نہیں دیکھا۔ اُس کے بجائے دوسرے کئی افسران پولیس اسٹیشن آگئے تھے۔ میں نے انھیں سونیا کے باپ جیلر صاحب کا پتہ بتادیا تھا۔ اباجان کے استفسار پر ایک سپاہی کے ذریعے ہمیں میڈیکل رپورٹ کا پتہ بھی چل گیا تھا لیکن اُنھوں نے ہمیں تیسرے دن صبح آزاد کیا۔ ہم حوالات کی کوٹھری سے باہر آئے تو جیلر صاحب وہاں موجود تھے، انھیں اپنے سامنے دیکھ کے مجھ پر کپکپی طاری ہوگئی تھی۔ اُن کی آنکھیں سوجی ہوئی ، اُبلی ہوئی تھیں۔ مجھ سے اُنھیں سلام بھی نہیں کیا جاسکا۔ وہ پہلے سے بہت بوڑھے نظر آرہے تھے۔ میں اُن کے سامنے کسی مجرم ہی کی طرح کھڑا تھا۔ سب مجھے اُن سے بہت ڈر لگ رہا تھا کہ یہ مجھ سے کیسے کیسے سوال کریں گے مگر جیلر صاحب نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا، ایک لفظ بھی نہیں۔ وہ مجھے خالی خالی نظروں سے تکتے رہے اور انھوں نے خود ہی بڑھ کے مجھے گلے لگا لیا۔ میری ہچکیاں بندھ گئیں، جیلر صاحب اُلٹا مجھے تسلی دینے لگے۔

اُسی دن وہ سونیا اور ممل کو اپنے ساتھ لے گئے۔ میں نے ساتھ چلنے کو کہا تھا لیکن اُنھیں اپنا ہی ہوش نہیں تھا جو مجھے جواب دیتے۔ میں خود رُک گیا، میں وہاں جا کے کیا کرتا۔ میں نے چلتے وقت اُن سے سونیا اور ممل کے چہرے دیکھنے کی بھی التجا نہیں کی۔ جس وقت اُن کی گاڑی روانہ ہونے والی تھی، اُن کے ڈبے کے گرد بھیڑ لگ گئی تھی، بہت سے پولیس افسران، مسافر، اسٹیشن کے لوگ انھیں رخصت کرنے آئے تھے۔ بھیڑ میں مجھے وہاں پیرو، زورا اور مارٹی بھی کھڑے نظر آئے۔

جیلر صاحب کی گاڑی ۲ بجے کے قریب چلی گئی تھی۔ ۵ بجے ہم بھی ایک گاڑی میں بیٹھ گئے تھے۔ ہمارے سوار ہوتے ہی پیرو، زورا اور مارٹی بھی ڈبے میں آگئے۔ اُن سب کے چہرے دھندلائے ہوئے تھے اور تھکے ہوئے بھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کون سی گاڑی میں بیٹھے ہیں، کس طرف جارہے ہیں۔ میرا دل اب کہیں جانے کو نہیں چاہتا تھا۔ اباجان ساتھ نہ ہوتے تو میں کسی طرف بھی نکل جاتا، کسی ویرانے کی طرف، جہاں آدمی نہ بستے ہوں۔ اباجان نے مجھے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا، میں بیٹھ گیا۔ وہ ٹھہرے رہتے تو میں بھی ٹھہرا رہتا، مجھے اپنی طرف سے کچھ نہیں کہنا تھا، وہ جہاں چاہیں لے جائیں۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا، کوئی ضد نہیں کروں گا۔ ڈبے میں چڑھتے ہی میں ایک برتھ پر آکے پڑ رہا۔ میرا بند بند دُکھ رہا تھا۔ گاڑی چلی تو پیرو دادا میری برتھ پر آگیا اور میرا سر اپنے زانوؤں پر رکھ کے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ مجھے سب کچھ اپنی آنکھوں کا دھوکا لگ رہا تھا جیسے میری آنکھیں جھوٹ دیکھ رہی ہوں۔ اپنا وجود بھی مجھے ایک دھوکا نظر آتا تھا۔ پیرو کی تھپکیوں سے میرا جسم اور ڈھیر ہونے لگا مگر میں اُسے روک بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں لیکن بینائی صرف آنکھوں کی تھوڑی ہوتی ہے۔

اُن تینوں کے آنے کے باوجود ڈبے کے سکوت میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ وہ سب ایک دوسرے سے بے تعلق سے اپنی نشستوں پر خاموش بیٹھے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں اندھیرا ہوگیا تھا۔ گاڑی اسٹیشنوں پر ٹھیرتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ اسٹیشن آنے پر کوئی باہر نہیں گیا۔ رات کو پیرو میرے پاس سے اُٹھ کے چلا گیا وہ جب تک بیٹھا رہا، مجھ پر بوجھ بنا رہا۔ سب مختلف برتھوں پر لیٹ گئے تھے لیکن اُن میں سے کسی کو نیند نہیں آئی تھی۔ وہ کروٹیں بدلتے اور گہری گہری سانسیں بھرتے رہے۔ رات کو کسی وقت اباجان اپنی برتھ سے اُٹھ کے میرے پاس آگئے۔ اُنھوں نے جھکتے ہوئے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور جھک کے میرا چہرہ دیکھا، میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اُن کے ہاتھ مجھے اپنی پیشانی پر برف کی طرح سرد محسوس ہوئے۔ اباجان بے چینی سے میرے ہاتھ، کلائیاں اور میری گردن ٹٹولنے لگے۔ میرا سارا جسم جل رہا تھا وہ فوراً ہی پلٹ گئے۔ مجھے سامان کھکھوڑنے کی آواز آئی۔ چند لمحوں بعد وہ واپس آئے تو اُن کے ہاتھ میں گلاس تھا۔ اُنھوں نے آہستگی سے مجھے دوا پینے کے لیے کہا، میں نے کسی اکراہ کے بغیر دوا حلق میں انڈیل لی۔ پیرو، زورا اور مارٹی بھی اُٹھ گئے تھے۔ اباجان پھر وہیں میرے سرہانے بیٹھ گئے اور میرا سر دبانے لگے۔ اُنھوں نے کوئی اشارہ کیا ہوگا جبھی پیرو، زورا اور مارٹی میرے سامنے سے ہٹ گئے تھے۔ اباجان نے میرا جسم کمبل، چادروں سے لپیٹ دیا تھا۔ وہ وہیں بیٹھے نہ جانے کیا کیا پڑھ کے پھونکتے رہے "برو! برو!" بار بار وہ چونک کے میرے کانوں میں سرگوشی کرتے۔ انھیں بار بار شاید یہ خدشہ ہوتا تھا کہ کہیں میں مر تو نہیں گیا ہوں۔ ہر بار میں آنکھیں کھول کے اُنھیں یقین دلا دیتا تھا کہ میں ابھی زندہ ہوں۔ میں اُن سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ بے فکر ہوکے سو جائیں، میرے لیے اتنے پریشان نہ ہوں، موت میری قسمت میں شاید نہیں لکھی ہے، میں اتنی آسانی سے نہیں مروں گا، مرنے والے اور لوگ ہوتے ہیں۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ مجھے کچھ ہوش نہیں ہے، انھیں کیا بتاتا کہ ہوش جاتا ہی نہیں، کسی بچھو کی طرح میرے جسم میں کہیں چمٹ کے بیٹھ گیا ہے، اندر ہی اندر مجھے ڈنک مارتا رہتا ہے۔ میں کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کرتا ہوں تو میری رگیں کاٹنے لگتا ہے۔ میں آنکھیں بند کرتا ہوں تو مجھے بہت عجیب عجیب شکلیں نظر آتی ہیں۔ بے ہنگم سا ایک شور سنائی دیتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی چپکے چپکے میری جان کھینچ رہا ہے، کوئی میری روح مٹھی میں بند کر لیتا ہے۔

میں اباجان سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ اپنی برتھ پر چلے جائیں، مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں لیکن میرے ہونٹ تھرتھرا کے رہ جاتے تھے۔ میرے حلق سے آواز ہی نہیں نکلتی تھی۔ رات کا آخری پہر ہوگا کہ پیرو نے اُنھیں میرے پاس سے اُٹھا دیا اور خود اُن کی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اباجان کے ہٹ جانے سے میرے سر سے کوئی بار سا اُتر گیا تھا۔ صبح سورج جب خوب نکل آیا تھا اور گاڑی تیز رفتاری سے بھاگ رہی تھی کہ اباجان نے ایک بار پھر مجھے دوا پلائی۔ کچھ ہی دیر بعد مجھ پر غشی سی طاری ہونے لگی۔ دوبارہ اُن کے اُٹھانے پر ہی میری آنکھ کھلی۔ گاڑی ٹھیری ہوئی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ باہر اسٹیشن پر بھاگ دوڑ مچی ہوئی تھی۔ میرے اُٹھتے ہی مارٹی بھیگی ہوئی تولیا سے میرا منہ صاف کرنے لگا۔ زورا کے ہاتھ میں تھمے ہوئے گلاس سے میں نے کُلّی کی۔ تمام سامان دروازے کے قریب رکھا ہوا تھا۔ سامان دیکھ کے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ یہیں اترنا چاہتے ہیں۔ زورا اور مارٹی نے مجھے سہارا دے کے اُٹھانا چاہا، میں نے اُنھیں اپنے پاس سے ہٹا دیا، میں اپنے پیروں پر کھڑا ہوسکتا تھا۔ ڈبے سے اُترتے ہی اسٹیشن کی عمارت دیکھ کے میرا ماتھا ٹھنکا۔ یہ حیدرآباد کا نام پلی اسٹیشن تھا۔

"ابھی ذرا سنبھل کے راجا!" پیرو نے میرا بازو زور سے تھام لیا۔

وہ حیدرآباد ہی آئے تھے۔ فضول اپنا وقت ضائع کرنے آئے تھے۔ کاش ناگ پور سے چلتے وقت میں اُن سے کہہ سکتا کہ وہ اپنا راستہ کھوٹا نہ کریں، میں بھی اُنھی کے ساتھ چل رہا ہوں، میرا کہیں اور جانے کا ارادہ نہیں ہے، میں اُن سے وعدہ کرتا ہوں کہ اب کوئی ضد نہیں کروں گا، کسی سے بھی نہیں۔ وہ کہیں گے تو میں گھر سے باہر بھی نہیں نکلوں گا۔ میرا دل کہتا ہے، یہاں کوئی نہیں ہوگا مگر اب وہ حیدرآباد آہی گئے تھے تو نہ میرا اُن سے لوٹ جانے کو کہنا مناسب تھا، نہ اس سے کچھ حاصل تھا، میں اُن کے ساتھ ساتھ قدم بڑھاتا رہا۔ اسٹیشن پر معمولی سی بھیڑ تھی، باہر آنے پر بہت سے لوگوں نے ہمیں گھیر لیا، ہر شخص ہمیں اپنے ہوٹل لے جانے کے لیے اصرار کر رہا تھا لیکن اباجان نے شاید پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ وہ کون سے ہوٹل میں ٹھیریں گے۔

ابھی بتیاں نہیں جلی تھیں، شام کی سُرمئی روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی، اسٹیشن کے سامنے تینوں اطراف ہوٹل اور چائے خانے بنے ہوئے تھے اور سڑک پر سائکلوں، رکشاؤں، گاڑیوں کا شور گونج رہا تھا، سواری کے انتظار میں ہم باہر کھڑے تھے کہ کچھ ہی دیر میں ایک جانب سے زورا ویگن میں بیٹھا ہوا آیا۔ ہم اُسی میں سوار ہوکے عابد شاپ روڈ پر واقع ویکاجی ہوٹل میں اُتر گئے۔ یہ ایک بڑا، سرسبز اور صاف و شفاف ہوٹل تھا، کسی محل کے مانند جس حصے میں ہم آکے ٹھیرے، اُس کی سجاوٹ بھی شاہانہ تھی۔ وہ پورا ایک مکان تھا، سونے کے لیے دو کمرے، بیٹھنے کا ایک وسیع کمرہ، قالین، فانوس، صوفے، بڑی گول میز، آئینے، کھڑکیوں پر رنگ برنگے پردے، وہاں دُنیا بھر کی چیزیں موجود تھیں۔ مؤدب باوردی خدمت گار الگ۔ پیرو کی طلبی پر حجام کمرے میں آگیا، نہانے اور کپڑے بدلنے کے بعد اُن کے چہروں کی اصل رنگت کچھ واپس آئی، اباجان کے کہنے پر میں نے بھی کپڑے بدل لیے تھے۔ چائے پی کے وہ چاروں نشست گاہ میں میرے گرد بیٹھ گئے اور خاموش ہی بیٹھے ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے۔ اُن کے پاس ایک دوسرے سے کہنے کے لیے کوئی بات نہیں تھی۔ بار بار اُن کی سوالیہ نظریں میری طرف اُٹھتی تھیں جیسے پوچھتے ہوں، اب کیا حکم ہے لیکن پیرو نے زیادہ دیر تک مجھے اُن کی چبھتی نظروں کا ہدف نہیں بننے دیا۔ ہمیں وہاں ہوٹل کے کمرے میں ٹھیرے ابھی ایک گھنٹے سے زیادہ نہ گزرا ہوگا کہ اُس نے مجھے اُٹھنے کا اشارہ کیا۔ اُس کے اشارے پر میں سٹ پٹا گیا تھا مگر فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔ ہم دونوں اُن سے کچھ کہے بغیر کمرے سے باہر آگئے تھے، ہوٹل کی گزرگاہ میں رُک کے اُس نے سرگوشیانہ لہجے میں پوچھا "جانی! ابھی چلے!"

"کہاں؟" میں نے بدحواسی سے کہا۔

"اُودر ہی۔ ابھی ٹیم ہے راجا! دیا جلے دیری نہیں ہوا ہے۔ ہاتھ پیر ٹھیک چلتا ہے تو ابھی اودر جاکے دیکھتا ہے۔"

"نہیں دادا! کہیں مت جاؤ۔"

"کیوں راجا؟" وہ حیرانی سے بولا۔

"بس دادا! گھر چلو۔"

"اوئے نئیں۔" وہ میری پیٹھ پر دھپ مارتے ہوئے بولا۔ "ایسا کیسے بولتا ہے، ایدر پھر کیا مخول کرنے کو آیا ہے؟"

"ہاں! ایسا ہی لگتا ہے۔" میں نے بے چینی سے کہا۔ "میرا جی

ب.... کہیں جانے کو نہیں چاہتا۔ وہاں جانے سے کچھ بھی ں ہوگا، کہیں بھی، کہیں بھی جانے سے کچھ نہیں ہوگا، بس دادا! لوٹ چلو۔ ادھر بھی کوئی نہیں ہوگا۔"

"کیسے نہیں ہوگا۔" وہ ٹنک کے بولا۔ "اُدھر تو نے اپنی کھوں سے پتہ دیکھا تھا۔"

"دیکھا تھا لیکن....."

اُس نے مجھے گلے سے چمٹا لیا اور کہنے لگا کہ یوں حوصلہ ہیں ہارتے۔ آدمی کو آخری دم تک اُمید باقی رکھنی چاہیے۔

"دادا! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" میں نے ڈوبتی آواز میں کہا۔

"کاہے کا ڈر۔" وہ میرے بازو پکڑ کے جھنجوڑنے لگا اور بے قراری سے بولا۔ "اپن یہ کیا سُنتا ہے راجا جانی! قسم سے بھئی مائی ایدر ہوتا تو ابھی تیرے کو اُلٹے ہاتھ کا دکھاتا۔"

"میری بات مان لو دادا!" میں نے عاجزی سے کہا۔

"ابھی سب کچھ اَپن پر چھوڑ دے راجا! اپنے پر اتنا بوجھ مت ال۔ ایدر اپن کا کچھ ٹھیک چلتا ہے۔" وہ آنکھیں مٹکا کے بولا۔ پھر نرمی سے کہنے لگا۔ "پر اپن سمجھتا ہے ابھی تیرے ماتھے سے اور ناگ پور والا پرٓی کا نشہ نہیں اُترا ہے، ایسے اُتر بھی نہیں سکتا راجا! وہ تجھ کو جامنی بائی والا بات یاد ہوگا۔ اودر بھی سالا ایسا ہی کچھ ہوا تھا۔ اُدھر جا کے جامنی بائی ابھی تک اپن سے مستی کرتا ہے۔ جا تو وہ اپنے کوہار کے نہیں گیا تھا، اپن کی چھاتی میں بھونک کے گیا تھا پر راجا! تیرے دادا نے مَرد بن کے ہی جامنی بائی کا داؤ بھگتا یا ہے۔ جامنی بائی کے ٹیم اپن بھی تیری عمروں کا تھا۔ سونیا اپن کو بھی....." اس کی آواز بھرا گئی۔ "وہ ایک دم دیوی کے مافک" میرا جسم تھرانے لگا تھا۔

پیرو مجھے دھکیلتا ہوا تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ "ابھی چل کے اُودر دیکھتا ہے۔" وہ حتمی لہجے میں بولا۔ "سالا اب نہیں تو سویرے کا گاڑی پکڑ لے گا، ابھی تو اپنے من میں اندھیرا رکھ کے ہی چل۔ زیادہ سے زیادہ لوٹ آئے گا، پھر اور کیا ہوئے گا۔" وہ ہوٹل سے باہر آگیا تھا، گیٹ کے سامنے ہی ہمیں ہاتھ کا رکشا مل گیا۔ اُسے یاد تھا کہ مراد آباد کے مسافر خانے کے رجسٹر میں مولوی صاحب نے حمایت نگر کا پتہ لکھوایا تھا۔ عابد شاپ روڈ سے وہاں کا فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا، روشنیاں جل چکی تھیں لیکن ابھی اندھیرا گہرا نہیں ہوا تھا، سڑکوں پر ہر جانب راہ گیروں اور سواریوں کا اژدہام متحرک تھا۔ ساری دُکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ کنگ کوٹھی سے گزرتا ہوا رکشا جلد ہی حمایت نگر کے علاقے میں داخل ہوگیا۔ پیرو نے پہلے ہی نکڑ پر اُسے چھوڑ دیا اور اندر جوڑی گلی میں کچھ وقت تک پیدل ہی چلتا رہا، اُس کی تیز رفتاری کا مجھے بھی ساتھ دینا پڑ رہا تھا۔ پیرو کو پورا پتہ ازبر تھا۔ راستے میں ایک راہ گیر کو متوجہ کر کے اُس نے خرم منزل کا پتہ پوچھا، وہ شخص خود نووارد تھا مگر کچھ آگے چل کے پرچون کی ایک دُکان سے ہمیں خرم منزل کا راستہ معلوم ہوگیا۔ حمایت نگر کے سارے علاقے میں بڑے بڑے مکانات تھے اُن کی طرزِ تعمیر ہی سے ظاہر تھا کہ وہاں بڑے لوگ رہتے ہیں، یہاں مولوی صاحب کے رہنے کا ویسے بھی کوئی امکان نہیں تھا لیکن پیرو دُکان دار کے بتائے ہوئے راستے پر آگے بڑھتا رہا، چند منٹ کی مسافت کے بعد ہم خرم منزل کے سامنے تھے۔ لمبی چوڑی چار دیواری کے اندر وہ ایک جدید طرز کی کوٹھی تھی چار دیواری میں ہر طرف اُونچے اُونچے درخت اُٹھے ہوئے تھے، یہاں آ کے جیسے مجھے کچھ ہوش آگیا تھا، میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا مسافر خانے کے رجسٹر پر یہی پتہ لکھا تھا، کیا عجب وہ یہیں ہوں کوئی تو بات ہوگی جو مولوی صاحب نے یہاں کا پتہ لکھوایا تھا کیا معلوم ابھی وہ میرے سامنے کھڑے ہوں میرے سارے جسم سے پسینہ پھوٹنے لگا تھا، لوہے کے بڑے گیٹ پر سیاہ رُو دربان کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، وضع قطع سے وہ کوئی عرب معلوم ہوتا تھا، پیرو نے اُسے سلام کیا اور تصدیق کی کہ خرم منزل یہی ہے دربان نے اثبات میں جواب دیا۔ پیرو نے اُس سے مولوی صاحب کا نام لیا۔

"نکو بابا!" دربان اُلجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "یہاں اس نام کوئی آدمی نہیں رہتا، یہاں نواب غازی ثروت یار جنگ رہتے میں نے ایک گہری سانس لی۔ یہ سُن کے مجھے کچھ سکون تھا۔ "ایدر مولوی محمد شفیق نام کا کوئی آدمی نہیں رہتا؟" پیرو نے تکرار کی۔

"ابھی کیا بولانا آپ کو!" دربان نے تلخی سے کہا۔

"کبھی رہتا بھی نہیں تھا؟"

دربان نے اُسے بتایا کہ جب سے کوٹھی تعمیر ہوئی ہے یہاں ایک ہی خاندان رہتا ہے، نواب قدرت یار جنگ کا خاندان۔

پیرو اُس کا جواب سُن کے چند لمحے دم سادھے کھڑا رہا، میں نے بیچ میں دخل نہیں دیا۔ "کیا اپن نواب صاحب کو مل سکتا۔" پیرو نے اُس سے التجا کی۔ "اپن بہت دُور سے آئے ہیں، ہو سکے تو اپنے ساتھ تھوڑا مہربانی کرو۔"

دربان کسمسانے لگا اور آخر پیرو کے اصرار پر آمادہ ہوگیا۔ وہاں ٹھہرا کے اور دروازہ بند کر کے وہ کوٹھی میں گیا اور چند ہی منٹ بعد واپس آگیا، نواب صاحب نے اجازت دے دی تھی۔ دربان ہمیں عمارت کے ایک آراستہ کمرے میں لے جا کے بٹھا دیا۔ اندر سے ایک ملازم نے آکے ہمارے آگے خشک میوہ، میوے کے پیالے رکھ دیے۔ کچھ دیر بعد شیروانی میں ملبوس، درمیانے قد، مضبوط کاٹھی کا ایک شخص اندر داخل ہوا، عمر پچیس (۲۵) سال کے قریب ہوگی، رنگ سرخی، آنکھیں بڑی اور لال لال تھیں، ہم دونوں کھڑے ہو گئے۔ "بہ نیاز مند کو ثروت یار کہتے ہیں۔" وہ بھاری آواز میں بولا اور ہمیں بیٹھ جانے کا اشارہ کیا، وہ ہمیں دیکھ کے کچھ متذبذب سا ہوگیا تھا لیکن متانت سے پوچھنے لگا کہ وہ ہماری کیا خدمت کر سکتا ہے۔

"اپن کو ایک آدمی کی تلاش ہے نواب صاحب!" پیرو نے دبے لہجے میں زبان کھولی۔ "اپن کو پتہ لگا تھا کہ وہ ایدر ہی رہتا ہے۔"

"کون سے آدمی کی؟" نواب نے تردد سے پوچھا۔

"اُس کا نام مولوی محمد شفیق ہے۔"

"مولوی محمد شفیق!"

"ہاں ہاں۔" پیرو نے اضطراب سے کہا۔ "اپن کو مراد آباد سے پتہ چلا تھا کہ وہ ایدر ہی رہتا ہے۔ اپن نے اس واسطے آپ کو تکلیف دیا ہے کہ اگر وہ ایدر نہیں رہتا تو شاید آپ کو اُس کے بارے....."

"آپ مراد آباد والے مولوی شفیق صاحب کو پوچھ رہے ہیں؟"

میرے کان دھمکنے لگے تھے، پیرو کے بجائے میں نے تیزی سے کہا۔ "ہاں ہاں وہی، وہی مولوی شفیق صاحب! کیا، کیا آپ انھیں جانتے ہیں؟"

اُس کے ماتھے پر سلوٹیں پڑ گئیں۔ "ہاں۔" وہ پلکیں پٹ پٹاتے ہوئے بولا۔ "مجھے اُن سے کسی قدر نیاز حاصل ہے لیکن اصل میں....." ایک دم وہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا اور متوحش نگاہوں سے ہمیں گھورتا ہوا بولا۔ "معاف کیجیے، مجھے آپ حضرات کے تعارف کا موقع نہیں مل سکا۔"

"اوہ۔" پیرو اُچھل کے بولا۔ "اِس کا نام بابر زماں ہے اور اپن کا صفدر علی۔" پیرو کو جلدی میں کوئی اور نام یاد نہ آیا تو اُس نے جان ہی کا نام لے دیا۔

"خوب!" نواب نے سَر ہلا کے کہا۔

وہ کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا کہ پیرو نے اُسے بولنے نہیں دیا۔ "اپن مولوی صاحب کی کھوج میں ہے، بہت دِنوں سے اُس کا کوئی پتہ نہیں چلا، جیسے ہی اپن کو مراد آباد میں ایدر کا معلوم ہوا، اپن سیدھا ادھر ہی آگیا، اپن بہت مجبوری میں آپ کے پاس آیا ہے، اگر آپ کچھ جانتے ہو تو اپن کو بتا دو، آپ کا بڑا احسان ہوگا۔" پیرو نے ایک ہی سانس میں کہنے کی کوشش کی۔

"ضرور، ضرور۔" نواب جھجکتے ہوئے بولا۔ "مگر ایسی کیا بات ہے جو آپ کو اُن کی اس قدر تلاش ہے۔"

"ایسا ہی کچھ ہے نواب صاحب!" پیرو نے اضطراری لہجے میں کہا۔

"اگر آپ مناسب سمجھتے ہوں تو مجھے کچھ بتائیں۔"

"ابھی اپن آپ کو کیا بولے۔ سمجھو اپن کو اُس کا کوئی چیز لوٹانا ہے۔" نواب غور سے سُنتا رہا، پیرو کا جواب سُن کے اُس کی آنکھوں کی بے چینی کم نہیں ہوئی، شائستگی سے بولا۔ "آپ کی بات مجھ پر واضح نہیں ہوئی، شاید آپ کی مراد ہے کہ آپ کو اُن کی کوئی امانت لوٹانی ہے اور وہ آپ کو نہیں مل رہے ہیں؟"

"ایک دم ایسا ہی۔" پیرو اُچک کے بولا۔

نواب مولوی صاحب کے بارے میں مزید کچھ جاننا تھا۔ میں نے سوچا، اُس سے وضاحت کر دوں لیکن میری سانسیں حلق میں اٹکی ہوئی تھیں۔

"آپ مولوی صاحب قبلہ کے کوئی عزیز....."

نواب کی بات ادھوری رہ گئی۔ پیرو نے بے عجلت کہا۔ "ایسا کوئی بات نہیں ہے جو آپ کچھ اور سوچو۔ ابھی اپن کا بات ذرا دھیان سے سنو نواب صاحب! یہ مولوی صاحب کا رشتے دار ہے اور اپن کا اس سے چھوٹے بڑے کا ناتا ہے۔ اپن کا بیٹا مافک سمجھو، یہ اودر بمبئی میں اپن کے باڑے میں ساتھ کام کرتا ہے۔" پیرو ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "ابھی کچھ سمجھا نواب صاحب! مولوی صاحب آٹھ نو سال سے مراد آباد میں نہیں رہتا، یہ اُس کے لیے بہت پریشان ہے۔" پیرو نے رُک کے پوچھا۔ "ٹھیک ہے؟" نواب نے مسکراتے ہوئے سَر ہلایا۔

"ایدر یہ بمبئی میں تھا کہ مولوی صاحب سالوں بعد وطن لوٹا اور اپنا مکان بیچ کے پھر کہیں چل دیا۔ بمبئی سے گھر لوٹنے پر اس کو پتہ چلا کہ مولوی صاحب مراد آباد آیا تھا اور مسافر خانے میں ٹھہرا تھا کاغذ پر ایدر آپ کا پتہ لکھا تھا۔ ابھی آپ نہیں سمجھے ہو تو اپن کو بولو۔"

"نہیں نہیں۔" نواب نے کسی قدر خجالت سے کہا۔ "میں سمجھ گیا۔ آپ کو میری یہ حجت ناگوار گزری ہے تو مجھے افسوس ہے، آپ اتنی دُور سے تشریف لائے ہیں، آپ کے کسی کام آنے پر مجھے مسرت ہوگی مگر ایک بات غور طلب ہے۔ آپ فرما رہے ہیں کہ مولوی صاحب سالوں بعد مراد آباد آئے تھے اور وہاں سے پھر کہیں چلے گئے۔ لازماً وہ مراد آباد میں مشترک دوستوں اور عزیزوں سے ملے ہوں گے، اُن سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہنی چاہیے کہ کسی امانت کی

واپسی کے سلسلے میں اُن کے عزیز بابرزماں صاحب اُن کے لیے مضطرب ہیں، مولوی صاحب کو اُن کے ذریعے بابرزماں صاحب کا پتہ بھی مل جانا چاہیے۔ ظاہر ہے، مراد آباد سے اپنی عدم موجودگی کے سبب آپ نے اتنی احتیاط یقیناً کی ہوگی کہ اگر کبھی بھولے بھٹکے وہ اِدھر آنکلیں تو آپ کا بمبئی کا پتہ دے دیا جائے۔ آپ کی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے آپ سے رابطہ قائم نہیں کیا، گویا انھیں اُس امانت کے سلسلے میں کوئی تردد نہیں ہے اور وہ اپنی گوشہ نشیں زندگی میں کسی کی دخل اندازی پسند نہیں کرتے۔" نواب کا لب و لہجہ شائستگی سے عاری نہیں تھا۔ "آپ نے اس پہلو پر غور نہیں کیا؟" وہ تیکھے لہجے میں بولا۔

پیرو نے پہلو بدل کے میری طرف دیکھا اور تندی سے کہنے لگا۔ "نواب صاحب! آپ ٹھیک ہی بولتا ہے، شاید ایسا ہی ہو کہ وہ اس سے ملنا نہیں چاہتا ہو۔ اُودا برس گزر گئے، آپس میں ایسا ہی کوئی اَٹیس بیس بات ہو گیا تھا جو وہ سدا کے لیے روٹھ کے چلا گیا، خط پتر کچھ بھی نہیں بھیجا۔" پیرو کو پھر بہانہ ہی تراشنا پڑا، کسمساتا ہوا بولا۔ "ابھی یہ اُس سے مل کے معافی مانگنا چاہتا ہے، مولوی صاحب کی بہو نے اُس کا جو جائداد ہتھیا لیا تھا، یہ اُس کا بیٹا، اب اُس کو واپس کرنا چاہتا ہے، اِس کو اُس سے ملنے دیو، دونوں ایک بار ملے گا تو سارا بادل خلاص ہو جائے گا۔"

نواب نے ہنکاری بھری اور پہلی بار اُس کے چہرے پر بشاشت کے آثار نمودار ہوئے مگر چند ثانیوں کے لیے، پھر وہ جیسے کہیں کھو سا گیا۔ "ابھی آپ کیا سوچنے لگے ہو نواب صاحب! کیا آپ کو اپنے بولے پر یقین نہیں آتا ہے؟" پیرو نے اُسے چپ دیکھ کے ٹوکا۔

"نہیں حضرت!" وہ سر اُٹھا کے بوجھل لہجے میں بولا۔ "ایسی بات نہیں ہے۔"

"پھر آپ چپ کیوں ہوتے ہو؟"

"سوچتا ہوں، کیا بتاؤں! آپ کے کس کام آسکتا ہوں۔" نواب نے افسردگی سے کہا۔ "کاش میں آپ سے یہ سب کچھ نہ پوچھتا۔ آپ کا اضطراب دیکھ کے مجھے کچھ وحشت سی ہوئی تھی، چونکہ بہرحال مولوی صاحب سے ایک ربطِ خاطر مجھے بھی رہا ہے۔ نہ جانے آپ نے میری ان غیر ضروری باتوں سے کیا توقع باندھ لی ہو، مجھے آپ کو پہلے ہی بتا دینا چاہیے تھا کہ میں مولوی صاحب قبلہ کے موجودہ کوائف سے قطعی لاعلم ہوں۔"

"کیا مطلب! ابھی آپ کیا بولتے ہو نواب صاحب؟"

"ہاں حضرت! سچ یہی ہے کہ میں اُن کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ آپ کی تاثر انگیز باتیں سن کے مجھے اب خفت ہو رہی ہے کہ میں آپ کے کسی کام نہیں آسکتا۔"

"آپ کو، آپ کو کچھ نہیں معلوم؟"

"یہی سمجھیے۔" وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔ "میں آپ کو بتاتا ہوں، مولوی صاحب سے میری شناسائی والدِ مرحوم کے توسط سے ہوئی تھی۔ اُن دونوں کے مراسم دیرینہ تھے۔ میرا اُن کا تعلق بھی و... ادب سے زیادہ نہیں رہا۔ دو سال ہوئے، والد صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ کوئی ڈیڑھ مہینے پہلے غالباً اتنا ہی عرصہ ہوا ہوگا، مولوی صاحب یہاں تشریف لائے تھے۔"

"وہ یہاں آئے تھے؟" میں نے ڈولتی آواز میں پوچھا۔

"جی ہاں، وہ تشریف لائے تھے۔" وہ زیرِلبی سے بولا۔

"پھر وہ کہاں! اِن کا مطلب ہے" وہ کچھ بول کے نہیں گیا؟"

"میں یہی عرض کر رہا ہوں۔" نواب کے لہجے میں مایوسی شامل تھی۔ "بہت عرصے پہلے جب وہ تشریف لاتے تھے، یہیں قیام کرتے تھے لیکن اب زمانے بعد اُن کا آنا ہوا، انھیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اُن کے رفیقِ خاص، والد صاحب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اصل میں وہ انھی سے ملنے آئے تھے۔ والد جان کی موت اُن کے لیے ایک بڑا صدمہ تھی۔ دیر تک سکتے میں بیٹھے رہے۔ ویسے بھی کچھ پریشان نظر آتے تھے۔ میں نے اُن سے گزارش کی کہ وہ یہیں ٹھہریں جس طرح والد صاحب مرحوم کے وقت ٹھہرا کرتے تھے، اِس گھر کے مکینوں میں اب کوئی نیرنگ نہیں رہا۔ وہ عجلت میں تھے، فرمانے لگے، میں ایک ضروری کام سے مراد آباد جا رہا ہوں، جلد ہی و... ہوگی۔ پھر یہیں حیدرآباد میں مستقل قیام کا ارادہ ہے۔ ان شاء اللہ ملاقات ہوتی رہے گی۔ میں نے عرض کی کہ یہاں بہت جگہ ہے، میری خواہش ہے کہ حیدرآباد آکے آپ غریب خانے ہی کو اپنا گھر سمجھیں، آپ کو کہیں اور قیام کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ چپ ہو گئے، کوئی جواب نہیں دیا۔ اُن کے چہرے کے غبار سے یہ احساس ہو چلا تھا کہ وہ کسی دکھ میں ہیں لیکن کچھ پوچھنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ غالباً اُن کا یہیں آنے کا خیال ہوگا جو انھوں نے یہاں کا پتہ لکھوایا تھا۔ اب آپ سے معلوم ہوا کہ وہ مراد آباد سے رو... ہو چکے ہیں، ضرور راستے میں کوئی اُلجھن پیش آگئی ہوگی جو اب تک نہیں آسکے۔ یہی کچھ تشویش کا باعث تھا اور ہے جو مجھے آپ سے اتنا کچھ جاننے کی جستجو ہوئی اور آپ کی دل شکنی ہوئی۔ دنیا بہت بُری ہے، اپنے سائے سے بھی آدمی کو شک ہوتا ہے۔ کسی شخص کے ماتھے پر اُس کی نیت نہیں لکھی ہوتی، اتنے دنوں بعد کوئی انھیں اچانک اس طرح پوچھتا ہوا آتا ہے تو ایک... پیدا ہو جاتا، میرا خیال ہے قدرتی امر ہے، آپ بھی میری جگہ ہوتے تو....."

وہ فضول باتیں کر رہا تھا، میں نے اُس کی بات کاٹ کے پوچھا۔ "اُن کے ساتھ کوئی اور نہیں تھا؟" میری آواز مجھی کو بوجھ لگ رہی تھی۔

"نہیں"، نواب نے مستعدی سے کہا۔ "وہ اکیلے آئے تھے۔"

لمحوں سکوت چھایا رہا، پھر نواب ہی نے یہ خاموشی توڑی، کہنے لگا۔ "ایک خیال آتا ہے، ہو سکتا ہے وہ حیدرآباد واپس آگئے ہوں اور یہاں کسی سبب سے نہ آسکے ہوں۔ وہ ایک خوددار باوضع آدمی ہیں۔ ممکن ہے انھوں نے یہاں رہنا مناسب سمجھا ہو۔ حیدرآباد کوئی چھوٹا شہر نہیں، آدمیوں کا جنگل ہے، ہو سکتا ہے کہ مولوی صاحب..."

پیرو یکایک کرسی سے اُٹھ گیا، اُس کے ساتھ ہی میں بھی۔ نواب ہڑبڑا سا گیا اور لجاجت آمیز لہجے میں ہم سے کچھ دیر مزید ٹھہرنے کا اصرار کرنے لگا۔ چائے پڑے پڑے ٹھنڈی ہو گئی ہوگی، نواب کو اُس کا خیال آیا تو وہ اور خجل ہو گیا مگر کچھ کھانے اور پینے کو جی نہیں کر رہا تھا۔ ہم نے جیسے تیسے معذرت کر لی۔ پوچھنے لگا، کہاں قیام ہے، کب تک رہنے کا ارادہ ہے، اپنا مہمان بنانے کی دعوت بھی اُس نے دی۔ آخر تک رد کرتا رہا، عمارت کے دروازے تک وہ ہمیں چھوڑنے آیا، ہم باہر آگئے تھے کہ پیچھے سے اُس کی آواز پھر سنائی دی اور اس سے پہلے کہ ہم پلٹ کے اُس کے پاس پہنچتے وہ خود لپکتا ہوا ہمارے پاس آگیا اور نرم لہجے میں بولا۔ "مناسب ہو تو مجھے اپنا پتہ دیتے جایئے۔ خوش قسمتی سے کبھی مولوی صاحب واپس آگئے، جلد یا بدیر تو مجھے آپ تک رسائی کے لیے آسانی رہے گی۔ میری دعا ہے، خدا کرے ایسا ہی ہو۔" اور خود ہی بولا۔ "یقین رکھیے۔ میں مولوی صاحب کو آپ کی آمد کی اطلاع نہیں دوں گا، پہلے آپ کو خبر کر دی جائے گی۔ کوئی عجب نہیں کسی دن وہ آہی جائیں۔ آپ کے اور اُن کے درمیان رفاقت کا وسیلہ بننے میں مجھے خوشی ہوگی۔" جانے وہ کیا کیا کہتا رہا، میں نے اُسے بمبئی میں جولین کا پتہ دے دیا۔

راستے میں نہ پیرو مجھ سے، نہ میں نے اُس سے کوئی بات کی۔ خرم منزل سے نکلنے کے بعد دور تک آہستہ قدموں سے ہم پیدل چلتے رہے۔ سڑکوں پر اتنی چہل پہل نہیں تھی، اِکّا دُکّا دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ بہت دور آکے پیرو رکشا میں بیٹھ گیا، وہ بہت تھکا تھکا لگ رہا تھا۔ ہوٹل میں بھی وہ چپ چپ رہا۔ تاجان، زورا اور مارتی میں سے شاید کوئی باہر نہیں گیا تھا، سب ہمارے منتظر تھے اور انھوں نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ اُن کی وجہ سے ہم بھی کھانے پر بیٹھ گئے اور کھانے کے دوران پیرو سر جھکائے لقمے ٹونگتا رہا۔ درمیان میں مارتی نے پیرو سے مخاطب ہونے کی جرأت کی اور پوچھا، "دادا! طبیعت تو ٹھیک ہے؟" پیرو نے اُسے جھڑک دیا۔ اُن کے پاس کوئی اور کام نہیں تھا۔ کھانا کھا کے کچھ دیر تو کھڑکیوں پر کھڑے باہر کا منظر دیکھتے رہے پھر اپنے اپنے بستروں پر چلے گئے۔ زورا، پیرو کی ٹانگیں دبانے اُس کے بستر پر آیا تھا۔ پیرو نے اُسے بھی منع کر دیا، وہ میرے ساتھ ہی کے بستر پر لیٹ گیا تھا اور رات گئے تک کروٹیں بدلتا، گہری گہری سانسیں بھرتا رہا۔ اُس کی اس گھٹن سے مجھے بہت اذیت ہو رہی تھی۔ میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا مگر اُسے شاید کچھ ایسا ہی یقین تھا کہ صرف جانے کی دیر ہوگی، مولوی صاحب خرم منزل کے دروازے پر ہمیں اپنے منتظر ملیں گے۔

اُسے کیا خبر تھی کہ میں اور تجمل مہینوں شہروں شہروں گلیوں کوچوں کی خاک چھانتے رہے ہیں۔ ہر جگہ ایک ہی جواب ملتا تھا۔ میں پیرو سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ میری وجہ سے اتنا پریشان نہ ہو، میں تو اس کا عادی ہو چکا ہوں جیسے بھکاری دروازے پر دستک دے کے نامراد لوٹنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ میرے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، آدمی کا نصیب ہی کالا ہو تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔ میرا نصیب یاوری کرے گا تو مولوی صاحب مجھے خود ڈھونڈ لیں گے۔ کبھی اُن کے دل میں خدا رحم ڈال دے۔ میرے لیے نہیں تو کورا کے لیے سہی۔ جو زہرہ کہتی تھی، وہی نواب ثروت یار نے بتایا تھا اور وہی مراد آباد میں عادل صاحب کہتے تھے کہ مولوی صاحب کو سکھ نہیں ہے۔ انھیں کہیں بھی چین نہیں ملے گا۔ وہ کورا کو مجھ سے دور رکھنے کے کتنے ہی جواز ڈھونڈیں لیکن اُن کا دل ضرور انھیں ٹوکتا ہوگا کہ کورا کسی کی امانت ہے۔ کورا کی خاموشی، اُس کی اُداسی ہی بار بار انھیں اس امانت کا احساس دلاتی ہوگی۔ انھیں اتنے عرصے میں یہ جان لینا چاہیے تھا کہ کورا کے ہونٹوں کی مسکراہٹ واپس لانے کے لیے کوئی دوسری تدبیر ممکن نہیں ہے۔ وہ لاکھ اُس کا سایہ بنے رہیں، اُس کے لیے دنیا بھر کا عیش فراہم کر دیں، اپنی جان نچھاور کر دیں مگر اُس کی آنکھوں، اُس کے سینے سے وہ میرا چہرہ نہیں کھرچ سکتے۔ ارشد کا رشتہ، رانا مہتاب کا رشتہ، کتنے رشتے اُس کے لیے آئے ہوں گے، اُن سب کو مسترد کر دینے کا سبب محض یہی نہیں ہوگا کہ وہ کسی شہزادے کے انتظار میں تھے یا اُس کی جدائی کا تصور اُن کے لیے بہت شاق تھا۔ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہوں گے کہ اُس دن اُن کا سایہ بھی کارگر نہیں

ہوگا جس دن اُس کی آس ٹوٹ گئی۔ اُنھوں نے اتنے دنوں میں خوب جان لیا ہوگا کہ وہ کسی کا گھر نہیں بسا سکتی۔ وہ اُس کا آخری دن ہوگا جس دن میرے بجائے وہ اُسے کسی اور کے حوالے کرنے کا گناہ کریں گے یا پھر مولوی صاحب کو یہ توقع ہے کہ ایک دن وہ خود تھک جائے گی؛ وقت کی گرد بہت کاری ہوتی ہے، بڑے بڑے شگاف بھر جاتے ہیں۔

مولوی صاحب کو اسی دن کا انتظار ہوگا، اُس لمحے کا جب وہ اُس کے متعلق جو چاہیں فیصلہ کر سکیں لیکن اگر وہ لمحہ نہیں آیا! یہ تلخ حقیقت بھی تو اُن کے ذہن میں ہونی چاہیے کہ وہ لمحہ نہ آنے کی صورت میں کیا کریں گے: کیا وہ زندگی بھر لیں ہی اُسے زمانے بھر کی نظروں سے بچائے شہر شہر مارے مارے پھرتے رہیں گے، اور کیا اپنی زندگی کا اُنھیں ایسا اعتماد ہے۔ نو سال اُن کی زندگی میں بڑھے نہیں گھٹے ہی ہیں، پھر اُنھوں نے کورا کے لیے کون سا سائبان دیکھ رکھا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھی بات اُن کے ذہن میں نہیں ہے، بس اُنھیں کورا اتنی عزیز ہو گئی ہے کہ وہ اُسے کسی طرح جُدا کرنا نہیں چاہتے۔ دُنیا میں اُن کا اپنا کوئی بھی نہیں رہ گیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اُن کا گھر بنا ہے اور اس گھر میں کورا جیسی لڑکی ہے۔ کورا کی صورت میں اُنھیں سب کچھ مل گیا تھا۔

وہ اُسے دیوانگی کی حد تک چاہتے ہوں گے جبھی وہ کچھ نہیں سوچتے۔ زہرہ کہتی تھی کہ مولوی صاحب کو دُنیا میں جیسے کورا کے سوا کسی سے واسطہ نہیں تھا۔ وہ یہ بھول گئے تھے کہ لڑکیاں تو پرائی ہوتی ہیں، اُنھیں کسی نہ کسی روز گھر سے جانا ہی ہوتا ہے۔ ارشد کے لیے منیر علی کی بات مان کے وہ اُس سے دُور نہیں ہو جاتے۔ ارشد اور منیر علی اُنھیں اپنے ساتھ ہی رکھتے مگر ایک تو اُنھیں کورا کی طرف سے اطمینان نہیں ہوگا کہ وہ اُن کا فیصلہ قبول کر لے گی، دوسرے اُنھیں اپنی طرف سے اطمینان نہیں ہوگا کہ وہ کورا کی اتنی جُدائی بھی برداشت کر سکیں گے، کورا پر سے اُن کا اختیار جو ختم ہو جائے گا۔ وہ کسی اور کی مِلک ہو جائے گی اور اُن کی حیثیت ثانوی ہو جائے گی۔ اس کے سوا اور کیا بات ہو سکتی ہے، پر ایک دن وہ خود سپر ڈال دیں گے، ایک دن اُنھیں میری تلاش میں نکلنا ہی ہوگا، کلکتہ جیل جا کے وہ میرے بارے میں پوچھ گچھ کریں گے اور وہاں سے مجھ تک پہنچنے میں اُنھیں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ وہ لامحالہ اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ کورا کے لیے وہ کوئی اور فیصلہ نہیں کر سکتے۔ یقیناً وہ مجھ سے بہت خوف زدہ ہو گئے ہیں لیکن کبھی نہ کبھی اُنھیں مجھ قاتل، سزا یافتہ، مجھ آوارہ کے پاس آنا ہی پڑے گا۔ کورا کی آہیں ایک دن ضرور رنگ لائیں گی۔

کمرے میں نسبتاً گرمی تھی، میں بستر پہ لیٹا ہوا اِنھی بھول بھلیّوں میں بھٹکتا رہا، روز ہی یہ بے سروپا تاویلیں میرے سر میں بلبلانے لگتی تھیں۔ ہر روز میں ارادہ کرتا تھا کہ اب کچھ نہیں سوچوں گا، اندھوں کی طرح سب دیکھتا، بہروں کی طرح سب سُنتا رہوں گا، میں خود کو کوئی فریب نہیں دوں گا مگر یہ میرے بس میں ہی نہیں تھا۔ آدمی معذور و لاچار ہو تو قرار آجاتا ہے کہ کوئی دیکھ نہیں سکتا، کوئی سُن نہیں سکتا، کوئی چل نہیں سکتا۔ جن کے ہاتھ پیر سلامت ہیں، وہ تو معذور و مفلوج سے بدتر ہیں کہ اُن کی آنکھوں کی روشنی محض ایک فریب ہے، وہ دیکھنے کے باوجود بھی نہیں دیکھ سکتے اور سُننے کے باوجود نہیں سُن سکتے۔ اُن کی مدد ہی اُن کی لاچاری ہے۔ کس کے پیروں میں ایسی جان ہے کہ وہ ساری سمتیں کھوج سکے۔ کس کی آنکھوں میں وہ نور ہے کہ دیوار کے پار دیکھ سکے۔

آدھی رات گزر گئی ہوگی، ہوٹل میں ہر طرف سکوت چھایا ہوا تھا اور فضا میں مسلسل کوئی سیٹی سی گونج رہی تھی۔ کبھی دُور سڑک پر کوئی گاڑی گزرتی تو دیر تک بازگشت سُنائی دیتی رہتی۔ پھر سناٹا چھا جاتا۔ میں آنکھیں بند کیے اپنے گلے میں پڑی کورا کی دی ہوئی مالا کے دانے گنتا رہا۔ کسی لمحے مجھ پر غنودگی طاری ہو گئی تھی کہ یکایک باہر نشست گاہ میں اُبھرتی قدموں کی آہٹ سے میری آنکھ پھر کھل گئی، کسی نے ایک نظر اندر جھانک کے دیکھا۔ نشست گاہ میں مدھم روشنی کے باوجود میں پہچان گیا کہ وہ مارتی ہے۔ دوسرے لمحے وہ دروازے سے ہٹ گیا اور میں نے اُسے دائیں طرف جاتے دیکھا جب کہ اُس کا کمرہ بائیں طرف تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں واپس جاتا تو بستر سے مجھے نظر آجاتا۔ دیر ہو گئی اور وہ نہیں پلٹا تو مجھے اُلجھن ہونے لگی کہ اس وقت وہ تنہا وہاں کیا کر رہا ہے۔ پیرو کی آنکھ کھلنے کے خیال سے میں آہستگی سے اُٹھ کے دبے پاؤں چلتا ہوا کمرے سے باہر نکلا اور یہ دیکھ کے میرا دل بیٹھنے لگا کہ مارتی کھڑکی پر کہنیاں ٹکائے گم صُم کھڑا باہر چھایا ہوا اندھیرا تک رہا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ اُسے بھی میری طرح نیند نہیں آرہی ہے، شاید وہ سبھی جاگ رہے ہوں۔ اُس وقت بادل گرج رہے تھے، ہوا بھی بند بند تھی۔ بارش کے آثار تھے۔ میں اُس کے قریب پہنچا تبھی اُسے میرے آنے کا احساس ہوا اور وہ کچھ بوکھلا سا گیا۔ "راجا اُستاد!" وہ سرگوشی میں بولا۔ "تم؟ ابھی تم بھی.....!"

"کیا بات ہے مارتی؟" میں نے اُس کا بازو پکڑ کے پوچھا۔

"کچھ نہیں راجا!" وہ نگاہیں چراتے ہوئے بولا۔

"تم ابھی تک جاگ رہے ہو؟"

وہ سر کھجانے لگا۔ "سالا بستر اپن کو چبھتا ہے، ایک دم اندر کو کھینچ لیتا ہے۔ لگتا ہے آدمی اندر زمین میں دھنس رہا ہے۔"

"مجھ سے کچھ مت چھپاؤ مارتی! مجھے بتاؤ، تمھیں کیا پریشانی ہے۔"

"کچھ نہیں راجا۔" وہ کسمسا کے بولا۔ "اپن بالکل فٹ فاٹ ہے۔"

"بس چند دن کی تکلیف اور ہے مارتی!"

"کیا تکلیف؟" وہ چونک کے بولا۔

"میں جانتا ہوں مارتی! بمبئی سے نکلے ہوئے تمھیں کتنے دن ہو گئے۔ بمبئی یاد آرہی ہوگی، مہینے ہو رہے ہیں۔"

"ابھی تم کیا بولتا ہے۔" وہ بے تابی سے بولا۔ "اپن کے لیے اس سے بڑا پلیزر کیا ہو سکتا ہے کہ اپن تمھارے ساتھ ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن....."

"ابھی آگے کچھ نہیں بولنے کا۔" اُس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ایسا اسٹرینج باتیں کرے گا تو بائی گاڈ اپن ابھی چاقو اُتار لے گا۔"

"مارتی!" میں نے بے اختیار اُسے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ مارتی اچانک بُری طرح سسکنے لگا اور رُندھی ہوئی آواز میں بولا۔ "ابھی تمھارے سوا اپن کا اپدر کوئی نہیں ہے راجا!"

"ہاں ہاں۔" میں نے ڈوبتے لہجے میں کہا۔ "مگر تمھیں ایسا خیال کیوں آیا۔ مجھ سے اگر کوئی غلطی ہو گئی ہے تو مجھے معاف کر دو۔ میں تمھیں کیا بتاؤں کہ کبھی مجھے اپنا بھی ہوش نہیں رہتا۔"

"اپن کو پتہ ہے، ابھی جانتا نہیں ہے تو کچھ کچھ سمجھتا ہے۔ تم اباجان کے ملنے کے بعد بھی کتنا ڈسٹرب ہے، پر اپن تو تمھارا نوکر ہے۔" وہ ہچکیوں سے بولا۔ "ابھی تم کو شرتھ بولے۔ کبھی اپنے کو ایسا لگتا ہے کہ تم اپن سے روٹھا ہوا ہے۔ تم اپن کے ساتھ رہ کے بھی بہت دُور ہے۔ مارتی پر تمھارا بھروسا نہیں ہے کہ تم اُس کو اپنا دکھ شیئر کر سکو۔ اپن اس سے بہت خوار ہوتا ہے راجا!"

"ایسا مت سوچو مارتی! ایسی باتیں مت کرو۔" میں نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم وہ جان کے کیا کرو گے جو تمھارے بس میں نہیں ہے۔ پہلے ہی میری وجہ سے تم اتنے دکھ اُٹھا چکے ہو، کیا اور پریشان ہونا چاہتے ہو۔"

مارتی جانے کب سے بھرا بیٹھا تھا، مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ میرے چھیڑنے کی دیر ہوگی اور اُس کی آنکھوں سے اتنے سوتے پھوٹ پڑیں گے۔ وہ بچوں کی طرح بلک بلک کے رونے لگا تھا۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کے میرے ہاتھ پیروں میں بھی جان نہیں رہی تھی، میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اُسے کیسے سمجھاؤں، کیا کیا بتاؤں لیکن میں نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں اُس کا غبار دُور کرنے کی کوشش کی۔

میں نے اُس سے کہا کہ یہ بھروسے کی بات نہیں ہے، اُس پر بھروسا نہ ہوتا تو بھلا بھائی اُسے اپنے ساتھ تبت کیوں لے جاتے جہاں سے زندہ واپس آجانا کسی معجزے سے کم نہیں، کوئی اعتبار ہی تو تھا جو اُسے بمبئی سے بلایا گیا تھا، کسی پر کوئی ایسا ناز ہی ہوتا ہے جبھی اُس سے کوئی مطالبہ کیا جاتا ہے اور یہ تو ایک طرح زندگی کا معاملہ تھا۔ اُس نے ایسا کیوں تصور کر لیا۔ میں نے مارتی کو کبھی اتنا نڈھال اور شکستہ نہیں دیکھا تھا۔ میرے لیے اُس کا یہ رُوپ بالکل نیا تھا۔ یقیناً مارتی کو میرے ہی کسی رویے سے دُکھ پہنچا تھا۔

رات کھانے کے وقت پیرو نے بھی اُسے جھڑک دیا تھا۔ نواب ثروت یار کے ہاں سے واپسی پر میرے اور پیرو کے مضطرب چہرے دیکھ کے اُس کے دل میں طرح طرح کے خدشے سر اُبھار رہے ہوں گے۔ ہمارا اچانک مراد آباد تک جانا اور راستے میں بمبئی جانے کے بجائے حیدرآباد کا ارادہ کر لینا بھی اُس کے لیے تشویش کا سبب ہوگا۔ اُسے یہی دھڑکا لگا ہوگا کہ اگر ایسی ویسی کوئی بات ہے تو اُس سے کیوں چھپائی جا رہی ہے۔ مارتی کی یہ گھٹن بے جا نہیں تھی۔ کلکتے اور فیض آباد میں اُسے یہی گمان ہو گیا تھا کہ میں اُس سے دُور دُور رہتا ہوں، اُس سے بہت کم بات کرتا ہوں لیکن اُس نے صرف اپنی طرف دیکھا۔ میں بھلا سے، پیرو سے، زہرا، کالے میاں، اباجان، زریں، جہاں گیر، کس سے ہر وقت ہمکنار رہتا تھا؟ پر اِس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ میری نظر میں وہ بے حیثیت، بے منزلت تھے۔ میں تو اُن کے سامنے دانستہ کم کم آتا تھا کہ مجھ سے اپنا چہرہ چھپایا نہ جاتا تھا۔ جب بھی میں اُن کے سامنے جاتا تھا، اُن سب کی منڈلاتی نگاہیں مجھے اپنے جسم میں کھبتی محسوس ہوتی تھیں۔

میں نے اُس سے ہاتھ جوڑ کے معافی مانگی تو وہ اور منتشر ہو گیا، اُلٹا میرے پیر پکڑ کے گڑگڑانے لگا کہ وہ تو میرا غلام ہے۔ جب تک میں نے اُسے اُٹھا کے صوفے پر نہیں بٹھایا، وہ میرے پیروں سے چمٹا اپنا سر رگڑتا رہا۔ میں نے اُس سے کہا کہ اگر کچھ جان کے ہی اُس کا تکدر دُور ہو سکتا ہے تو میں اُسے سب کچھ بتائے دیتا ہوں کہ وہ کوئی راز نہیں ہے لیکن اُس سے اُسے رنج کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا، وہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے جاننا میری اور اُس کی دل داری کی شرط ہو، وہ اباجان کو بھی شاید نہیں معلوم، جہاں گیر کو بھی۔ اُسے دُہراتے ہوئے میرا سینہ بہت جلتا ہے، میری رگوں میں اینٹھن ہونے لگتی ہے، مجھ سے اُسے سنایا نہیں جاتا۔ بس وہ سمجھ لے کہ میری کوئی چیز کھو گئی ہے جو مجھے اپنی زندگی سے زیادہ عزیز ہے۔ مارتی کا کوئی بڑا مطالبہ نہیں تھا، اُسے جیسے بس کسی لفظ کی ضرورت تھی۔ مجھ سے یہ سُن کے وہ شرمسار سا ہو گیا تھا

سو مجھے اپنی زبان تھامنی پڑی۔ اُس کی اس عاجزی سے مجھے ندامت ہونے لگی تھی، میں نے موضوع ہی بدل دیا اور اُس کی دل بستگی کے لیے کہا: "اب ہم بمبئی جا رہے ہیں وہاں خاصی فرصت ہوگی، ہم اکٹھے گھومیں پھریں گے تم مجھے جہاں چاہو، ساتھ لے جانا۔ مجھے یاد ہے تبت سے جاتے وقت تم نے کہا تھا کہ میں تمھیں چاقو وغیرہ کے تمام داؤ باقاعدہ سکھاؤں۔ جو کچھ مجھے آتا ہے، وہ سب تمھیں بتادوں گا، بلم اور لاٹھی چلانا بھی۔ ویسے تمھارا ہاتھ اب کافی رواں ہوگیا ہے، جو تھوڑی بہت جھجک ہے، مشق سے دور ہو جائے گی۔ اصل میں تمھاری خامی بس نگاہ اور یک سوئی کی ہے، ٹھیک ٹھیک ہاتھ چلاتے چلاتے تم اچانک بہک جاتے ہو۔ مجھل بھائی کے کہنے کے مطابق چاقو سے زیادہ نظر کی مشق کرنی چاہیے، ہاتھ کی لرزش کی تلافی ممکن ہے، نظر کی نہیں۔ چاقو تو بعد کی بات ہے، وہ کہتے ہیں کہ مقصد بھی چاقو اٹھانے کا کوئی ہونا چاہیے، بے کار میں نہیں، دھاندلی میں نہیں، چاقو بازی پورے جسم کا کھیل ہے مارٹی!" میں نے اُسے اس کی سمجھ میں آنے والے لفظوں میں بتلانے کی کوشش کی کہ چاقو چلاتے وقت پورے جسم کی حاضری ضروری ہے، اپنے آپ کو بھول جانے کی اور کچھ کرتے رہنے سے کچھ آتا ہے۔ یہ اپنے آپ کو داؤ پر لگا دینے کی مشق ہے۔

وہ میری باتیں سر جھکائے سنتا رہا، اُس نے درمیان میں دخل نہیں دیا لیکن جیسے ہی میں خاموش ہوا، وہ بکھری ہوئی آواز میں بولا: "راجا استاد! اپن کو یاد ہے اُدھر تبت میں تم کو ایسا بولا تھا لیکن اُس کو بھول جاؤ، مارٹی تم کو آگے کبھی ایسا نہیں بولے گا۔"

"کیوں مارٹی؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"بس اپن کو ابھی چاقو سے اتنا انٹریسٹ نہیں رہا۔"

"مگر کیوں؟"

"اپن نے چاقو سے بڑی دنیا دیکھا ہے۔" وہ پھڑکتے ہونٹوں سے بولا۔ "چاقو جہاں سالا کھٹل ہو جاتا ہے، ایک دم خلاص، اُدھر ایسا کوئی ہتھیار نہیں چلتا، اُدھر دوسرا ہتھیار ہوتا ہے جو دکھائی نہیں دیتا پر جس کی دھار بہت شارپ ہوتا ہے۔ اپن اب چاقو نہیں اٹھائے گا راجا استاد! ضرورت پڑے تو بھی اوائڈ کرنے کی سوچے گا، مجبوری الگ بات ہے۔"

"یہ تو آج کیسی باتیں کر رہا ہے مارٹی؟"

"اپن سینٹ پرسینٹ ریلٹی بولتا ہے، ہتھیار دھوکا دے جاتا ہے راجا! جو اپن جس ہتھیار کی بات کرتا ہے اُس کا کوئی توڑ نہیں ہے اور اُس کا کوئی داؤ پیچ نہیں ہے، ایک دم نیٹ اینڈ کلین۔"

"مارٹی!" میں نے متجسس لہجے میں کہا۔ "شاید میں سمجھ رہا ہوں، تمھارا اشارہ کس طرف ہے۔"

"ہاں راجا!" وہ تمتماتی آواز میں بولا۔ "تم یہ بات جلد سمجھ سکتا ہے کیونکہ تم اور مجھل باڑے کا آدمی نہیں ہے۔ اپن کو ایسا لگتا ہے کہ کسی ڈریم لینڈ گیا تھا، ایک دم اوپر آسمان پر، جہاں فرشتہ لوگ رہتا ہے۔ اُدھر زریں جیسا سسٹر ہے، اُدھر وہ ناٹی سوئٹی نیساں ہے۔ جہاں گیر، زہرہ، بڑے صاحب، مغل خانم اور ارشد صاحب ہے، وہ سب اپن سے تیز چاقو رکھتا ہے۔ آدمی کے آر پار ہو جاتا ہے۔ اپن نے دیکھا، اُدھر مجھل دادا بھی شرماتا ہے۔ وہ زریں سسٹر اُس پر حکم چلاتا ہے، دادا سر جھکا کے سنتا رہتا ہے۔ ابھی اپن کو پتہ چلا، چاقو سالا تو بہت چھوٹا ہتھیار ہے اور اڈّا، باڑا سب مخول ہے۔ اُدھر دیکھو، مجھل دادا چاقو کا جادو کرتا ہے۔ سوتے میں بھی مارے تو ٹارگٹ پر لگے لیکن مجھل دادا چاقو اتنا کہاں اٹھاتا ہے۔ ہتھیار تو وہ آخر کو چھوتا ہے، جب کوئی وے آؤٹ نہیں ہوتا۔ پہلے وہ اَن سین ہتھیار سے ہی کام لیتا ہے اور اُس کو اس میں بھی وہی جادو آتا ہے۔ سب مجھل دادا نہیں بن سکتا۔ ابھی اپن ایک بات خوب سمجھتا ہے، مجھل دادا بھی اڈّاگیری میں بلیو نہیں کرتا۔ اپن نے اس کو اسی پیراڈائز میں زیادہ گلیڈ دیکھا ہے۔ ہر آدمی اُس کے مانک دو کشتی میں سوار نہیں ہو سکتا۔ ایک مجھل دادا، پیر دادا، جامو بھائی، ہزاریں سالا گنتی کا دس بیس لوگ باگ اُدھ پاڑا اور اِدھر زریں سسٹر کا حویلی میں بیلنس کرنا بہت چکر کا کام ہے، ایزی جاب نہیں۔ اپن ایک ہی کشتی سے سیفلی کنارے پہنچ سکتا ہے تو دوسر کا لفڑا کیوں کھڑا کرے راجا!" وہ ہکلاتے لہجے میں بولا۔ "ابھی اپن کو ایسا جان پڑتا ہے کہ پہلی بار کنارے کو دیکھا ہے، ابھی مارٹی حرام کے جنے نے دیکھنا سیکھا ہے۔"

میں گنگ نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔ میری نظروں میں اُس مارٹی کی شکل گھوم رہی تھی جسے میں نے پہلی مرتبہ بمبئی کی ایک گلی میں دندناتے دیکھا تھا۔ وہ جولین کے گھر پر میری آمد و رفت پر مجھ سے دھاندلی بازی کرنے لگا تھا۔ میں نے اُسے ٹالنا چاہا لیکن وہ ایک نمبر کا بحثی تھا۔ نقرے کسے تو بھی در گزر کر کے آگے بڑھ گیا لیکن ایک دن اُس کا رویہ برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔ نتیجتاً مجھے اُس کے سامنے آنا پڑا۔ چاقو میں اُس کا ہاتھ بہت کچا تھا، مجھے کچھ بھی دیر نہیں لگی۔ گلی سے میرے لوٹتے وقت اُسے اپنی سُدھ بدھ نہیں تھی لیکن اس کے بعد وہ بمبئی کے کوچے کوچے مجھے تلاش کرتا رہا اور آخر ایک دن اُس نے مجھے ڈھونڈ ہی لیا۔

میں نے مارٹی کی کسی بات کی تردید نہیں کی۔ مجھے مبہوت دیکھ کے وہ سٹ پٹا سا گیا: "ابھی تم کیا سوچتا ہے راجا! بولو کہ ایسا ہے کہ نہیں؟ کیا اپن ابھی سب جھوٹ بولتا ہے؟"

"نہیں نہیں۔" میں نے اُلجھی ہوئی سانسوں سے کہا۔

"راجا! ابھی مارٹی تم سے ایک ریکوئسٹ کرنا مانگتا ہے۔"

"کیا... کیا ہے مارٹی؟"

اُس کی پلکیں کانپ رہی تھیں۔ "تم بمبئی میں ابھی کیدر رہنے کا ہے؟" وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"بمبئی میں!" میں نے چونک کے کہا۔ "مجھے... مجھے ابھی کچھ نہیں معلوم مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟"

میرے گھٹنوں پر سر رکھ کے وہ دھڑکتی آواز میں کہنے لگا "ابھی اباجان کہیں نہ کہیں اپنا ریگولر ٹھکانا تو بنائے گا؟"

"ہاں ہاں۔" میں نے ترشی سے کہا۔ "اب وہ کب تک بھٹکتے رہیں گے۔ اپنی جس ضد میں انھوں نے گھر بار برباد کر دیا تھا، آخر انھیں اس میں کامرانی نصیب ہوئی لیکن مارٹی! اس سلسلے میں اباجان سے میری کوئی بات نہیں ہوئی ہے، میں کچھ نہیں بتا سکتا کہ اُن کے دل میں کیا ہے۔ کیا معلوم، ابھی وہ کسی اور دُھن میں ہوں۔"

"اپن ایسا نہیں سمجھتا، ابھی وہ بہت تھکا ہوا لگتا ہے، بالکل ٹوٹا پھوٹا۔ ابھی وہ سارا اٹینشن گھر دوبارہ جوڑنے پر ڈائی وَرٹ کرے گا۔"

"ہونا تو یہی چاہیے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"اور اُس گھر میں راجا! پھر تم بھی وہیں رہے گا۔ نہیں رہے گا تو بھی وہ گھر تو تمھارا ہی ہوگا۔" وہ حسرت بھرے لہجے میں بولا۔ "راجا! اُس میں مارٹی کے لیے بھی کوئی کونا ریزرو رکھو۔ دروازے پر سرونٹ کوارٹر میں۔ اپن بھی وہیں تمھارے سنگ رہنا مانگتا ہے، مارٹی پرامز کرتا ہے، عمر بھر تمھارا اور اباجان کی سروس میں رہے گا۔" کہنے لگا کہ میں اباجان سے اُس کی سفارش کر دوں۔

میں نے اُس کی پیشانی چوم لی۔ "تجھے سفارش کی ضرورت ہے؟" میں نے ناراضی سے کہا۔ "تو بالکل پگلا ہو گیا ہے مارٹی! اباجان تجھے اتنا کچھ جاننے، دیکھنے کے باوجود بھی سفارش چاہیں گے؟ ہر آدمی اپنی سفارش آپ ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے اباجان تجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں، جب کوئی کام پڑتا ہے، پہلے تجھی کو آواز دیتے ہیں۔"

"ایسا ہی ہے۔" وہ تیزی سے بولا۔ "کاش اُوپر والا مارٹی کے لیے اس کو ایسا ہی رکھے، اپن بھی راجا! اُس کو شکایت کا چانس نہیں دے گا۔ اُس کا سرونٹ بن کے رہے گا۔ جو وہ بولے گا، کبھی پلٹ کے سوچے گا بھی نہیں۔"

"مارٹی!" میں نے اُس کے گال پر ہلکی سی چپت لگائی۔ "کیسی اوٹ پٹانگ باتیں کر رہا ہے، گھر کا ہر آدمی ایک دوسرے کا لو کرتا ہے۔"

وہ مسرت سے اپنا سر میرے گھٹنوں سے رگڑنے لگا اور اُس نے مجھے بتایا، اُسے یقین ہے کہ فیض آباد میں زریں نے اباجان سے کیا کہا ہوگا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اُس نے اباجان سے یہ التجا نہ کی ہو، وہ بمبئی سے فرخ، فریال، نادرہ اور اکبر کو لے کے یہیں آجائیں۔ حویلی میں بہت جگہ ہے۔ اباجان نے اس سے وعدہ بھی کر لیا ہوگا کہ زریں کی بات ٹالنا کسی کے لیے بہت مشکل ہے۔ مجھل اور منیر علی نے بھی اُن سے یہی اصرار کیا ہوگا۔ مارٹی کی قیاس آرائی غلط نہیں ہوگی۔ اباجان کے ذہن میں یہی کچھ ہونا چاہیے۔ وہ مستقل طور پر نہیں تو کسی مدت کے لیے زریں کی حویلی میں قیام کا ارادہ کر سکتے ہیں۔ اس عرصے میں جب تک اُن کے خوابوں کا محل تعمیر ہو جائے، انھیں کہیں نہ کہیں تو عارضی طور پر ٹھیرنا ہوگا اور زریں کی حویلی سے بہتر جگہ کون سی ہو سکتی ہے۔ وہاں اُن کے دو بیٹے پہلے ہی سے رہتے تھے اور اُسے اپنا گھر سمجھتے تھے۔ حویلی میں اتنے دن رہنے کے بعد انھوں نے وہاں کے مکینوں کو خوب پرکھ لیا ہوگا۔ وہاں سے رخصت ہوتے وقت وہ دل گرفتہ بھی نظر آتے تھے۔

مارٹی اس بات پر بہت خوش تھا کہ اگر اباجان نے واقعی فیض آباد میں بسنے کا ارادہ کر لیا تو وہ سب وہیں رہیں گے اور وہ اُن سب لوگوں سے قریب رہے گا، خصوصاً زریں سے۔ کہہ رہا تھا کہ زریں نے اُس کے لیے کئی جوڑی کپڑے بنوائے تھے، وہ صبح و شام اُسے پوچھتی تھی۔ نیساں اُس کے لیے طرح طرح کی چیزیں پکا کے لاتی تھی۔ زریں کے نام پر مارٹی آب دیدہ ہو جاتا تھا، کہتا تھا کہ مریم کی کوئی بیٹی ہوتی تو اُسی کی طرح ہوتی۔ اُس نے مجھ سے نہیں چھپایا کہ چلتے وقت زریں نے اُسے کیا تاکید کی تھی۔ زریں نے اُس سے کہا تھا کہ وہ میرے قریب ہی رہنے کی کوشش کرے، میرا کچھ ٹھیک نہیں ہے کس وقت کیا من میں سما جائے، میں کس طرف نکل جاؤں، کن خطروں میں گھر جاؤں۔ اُس نے مارٹی سے کہا تھا کہ اُسے میری کوئی بات بُری لگے تو خاطر میں نہ لائے۔ مجھے معاف کر دے اور نہ جانے کیا کیا۔ زریں نے مارٹی سے کیا، سبھی سے یہی کچھ کہا ہوگا۔ زور اُسے پیرو سے مارٹی اُس کا ذکر اس انداز میں کر رہا تھا جیسے عبادت کر رہا ہو۔ زریں کی ایک ایک بات اُس کے دل پر نقش معلوم ہوتی تھی اور مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے زریں یہیں موجود ہو، کسی دیوار کی آڑ میں چھپی ہوئی ہماری باتیں سن رہی ہو۔

بادلوں کی گرج تیز ہو گئی تھی اور ساتھ ہی موسلا دھار بارش۔ چند منٹ کے لیے بجلی چلی گئی تھی اور گھپ اندھیرا چھا گیا تھا لیکن

ہم دونوں وہیں نشست گاہ کے صوفے پر بیٹھے رہے۔ مارٹی کو شاید کوئی شبہ تھا کہ آج کے بعد پھر ایسی تنہائی کا موقع ملے نہ ملے۔ وہ مجھے شو کے ہلتا، گنتی گنتا رہا کہ وہ کتنے پھول ایسے چہرے ہیں جو میرے لیے کھلائے رہتے ہیں۔ وہ جیسے مجھے میرا بھولا ہوا یاد دلا رہا تھا۔ اُن سب کے بارے میں ایسے انکشاف کے انداز میں بتلا رہا تھا جیسے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ مارٹی نے چند دنوں میں جیا ناہر جیا ہے میں اُس سے بے خبر ہوں۔ اُسے کیا اندازہ تھا کہ منیر علی کو کن حالات میں اپنا آبائی گھر چھوڑنا پڑا، نیساں اور خانم کس طرح حویلی میں آ گئی تھیں اور زرّیں؛ زرّیں کو اُس کی سگی خالہ نے نسترن جیسی سفاک عورت پر بھروسا کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مارٹی ان سب کی داستانوں سے کہاں آشنا تھا۔ میں نے اُسے نہیں ٹوکا کہ یہ سب تو میرے رگ و پے میں کھبا ہوا ہے، اُسے اتنا کچھ جتلانے کی ضرورت نہیں ہے، کیا مجھے احساس نہیں ہے کہ پیرو اپنی اکلوتی بیٹی گیتا سے کتنے مہینوں سے دور ہے۔ گیتا کے بغیر اُسے ایک پل چین نہیں آتا تھا اور وہ جولین! مارٹی مجھے بتا رہا تھا کہ بمبئی سے میرے جانے کے بعد اُسے چپ سی لگ گئی ہے۔ کانتے بھی یہی کچھ کہتا تھا۔ وہاں چمپا بیگم اور شہ پارہ بھی موجود ہیں۔ وہ سب میرے لیے دست بدعا رہتے ہیں۔ مجھے سب معلوم ہے لیکن بس اچانک نہ جانے کیا ہو جاتا ہے۔ میں نے کبھی نہیں چاہا کہ میری کوئی بات کسی کی آنکھوں میں کھٹکے، کسی کی پیشانی پر شکن کا سبب بنے۔ سب خود بخود ہو جاتا ہے۔ بہرحال ایک دن کی بات اور تھی، مارٹی کے تنکے چبھونے سے پہلے میں نے طے کر لیا تھا کہ اب کوئی ضد نہیں کروں گا۔ قبل بھی پیر ٹھیک ہو جانے کے بعد مولوی صاحب کو ڈھونڈنے کے لیے باہر چلنے کو کہے گا تو میں منع کر دوں گا۔ گھر سے نکلنے کا نتیجہ میں نے خوب دیکھ لیا ہے۔ جتنا کم لوگوں سے واسطہ پڑے، اتنا ہی اچھا ہے۔ راستے میں اچانک کوئی بھی مل جاتا ہے، کبھی کرشنا جی، کبھی تنانم، کبھی سونیا۔ پیرو سے میں حیدرآباد چلنے کی ضد نہ کرتا تو سونیا مجھے کبھی نہیں ملتی اور یوں اُس کی آگ اُس کے سینے میں دبی رہتی جیسا کہ اتنے دنوں تک دبی رہی تھی۔

صبح ہونے والی تھی اور بارش کم نہیں ہوئی تھی۔ مارٹی نے مجھے کچھ دیر سو جانے کا مشورہ دیا، نیند ہی نہیں آ رہی تھی۔ میں نے اُس سے کہا، اگر اُسے نیند آ رہی ہے تو جا کے سو جائے مگر وہ تو میرے خیال سے کہہ لیا تھا، وہیں بیٹھا رہا اور خوابیدہ لہجے میں مجھ سے بولا۔ "راجا اُستاد! ابھی اُودر بمبئی جا کے تم کتنے دنوں بعد اپنا بہن بھائی سے ملے گا؟"

مجھے جھرجھری آ گئی۔ "برسوں بعد!" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "دس سال سے زیادہ ہو گئے، اب تو اُن کی شکلیں بھی بدل گئی ہوں گی۔"

"راجا!" وہ چمکتی آنکھوں سے بولا۔ "ابھی کیسا لگتا ہے تم کو؟ اپن تمہاری جگہ ہوتا تو سالا ہارٹ فیل ہونے کو ہوتا۔ اپن سوچتا ہے اتنے دنوں بعد تم اُن سے ملے گا تو کیسا سین ہوگا۔"

"ہاں مارٹی!" میں نے ڈگمگاتی آواز میں کہا۔ "پر شاید وہ پہلی نظر میں مجھے نہ پہچان پائیں، مجھ سے ڈر جائیں۔"

"ارے نئیں۔" وہ تیزی سے بولا اور ہنسنے لگا۔ "ابھی کوئی تمہارے سر پہ سینگ اُگ گیا ہے، اُودر جو بلڈز ہوا کرے گا، اُس کی آنکھیں کھلا رہ جائے گا کہ ابھی یہ کون سامنے پرنس کھڑا ہے، سمجھے گا ڈریم دیکھتا ہے۔"

میں نے مارٹی سے کہنا چاہا کہ اُنھیں تو منہ پھیر لینا چاہیے کہ کیسا بھائی ہے جو انھیں چھوڑ کے چلا گیا تھا جس کی وجہ سے اُن کی ماں چھن گئی، سارا گھر اُجڑ گیا، اُن کی بہن فہمیدہ روٹھ گئی، جہاں گیر جدا ہو گیا۔ مجھے دیکھ کے تو اُن کے سارے زخم تازہ ہو جائیں گے۔ انھیں تو مجھ پر تھوکنا، مجھے جوتے مارنا چاہیے۔ "ابھی اُودر ہی کی سوچتا ہے نا راجا اُستاد!" میری خاموشی پر مارٹی نے آنکھ مار کے مجھے چٹکی بھری۔

"ہاں مارٹی!" میں نے بوجھل لہجے میں کہا۔

"شاید ابا جان بھی اندر سے بہت گلیڈ ہوگا۔"

"ہاں شاید بہت زیادہ۔"

"ابھی اُن لوگ کو ایک دم پتہ نئیں ہے کہ اپن لوگ پہنچنے والا ہے۔ بیچ میں ابا جان کو چٹھی بھیجنے کا ٹائم نہیں مل سکا۔ ایدر فادر، اُودر برادر، دونوں کو آگے پیچھے دیکھے گا تو اُن کا کیا ہوگا۔ دھاٹ اے سرپرائز راجا! اپن یہی دیکھنے کو اینکشس ہے۔" وہ چہکتے ہوئے بولا۔ "ابھی اُس ٹائم تم اپن کو ساتھ رکھنا، اپن تم کو سنبھالے رکھے گا۔"

"ٹھیک ہے مارٹی!" میں نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

اُس کی آواز بھڑک رہی تھی جیسے میں نہیں، نو سال بعد وہ اپنے بہن بھائیوں سے ملنے جا رہا ہے۔ اُسے مجھ سے کسی اور جواب، کسی اور لہجے کی توقع تھی۔ جو اُس کی آنکھیں بجھنے لگیں۔ کچھ لمحوں تک وہ مراسیمہ نظروں سے میری صورت تکتا رہا، پھر گردن ڈال کے خاموش بیٹھ گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ مارٹی نے یہ ذکر دانستہ چھیڑا ہے، اُس کا مقصد میرا دھیان بٹانا ہے۔ میں خود بھی چاہتا تھا لیکن میرا دماغ بار بار بھٹک جاتا تھا، میری آنکھوں میں یکایک سونیا کا چہرہ اُتر آتا تھا اور مجھے ایسا گمان ہوتا تھا کہ وہ ابھی تک میرے جسم سے پیوست ہے اور میرے بازوؤں میں جھول رہی ہے۔ ابھی وقت ہے، میں اُسے بچا سکتا ہوں۔ بار بار وہ میرے سامنے آ کے کھڑی ہو جاتی تھی۔ فیض آباد سے چلتے وقت ترنم، ثریا،

فارہ اور اکبر کو دیکھنے کے تصور سے میری رگوں میں سنسنی دوڑنے لگتی تھی مگر اب سارا جسم پتھر جیسا ہو گیا تھا۔ میرا کسی سے ملنے، کسی کو دیکھنے، کسی سے بولنے کو جی نہیں کرتا تھا۔ میرا وجود خود میری چڑ بن گیا تھا۔

مارٹی دیر تک گم صم بیٹھا رہا۔ میں نے بھی کچھ نہیں کہا لیکن پھر میں نے ہی اُس کے بکھرے بال سنوارتے ہوئے اُسے کچھ دیر کے لیے کمر ٹکا لینے کی تلقین کی، وہ اور مچل گیا اور اضطراری لہجے میں بولا۔ "اپن بولتا ہے راجا! ابھی سب بھولنے کا ٹرائی کرو۔"

"کیا بھولنے کی؟" میں نے ناتوانی سے کہا۔

"بس راجا! ابھی سامنے بھی کچھ کم دیکھنے کا نئیں پڑا ہے، تم تو بہت بہادر ہے راجا!"

"ہاں مارٹی! بہت بہادر..."

"ابھی اپن تمہارے آگے کیا منہ کھولے لیکن راجا! اُودر سب فنش ہو گیا ہے، لوٹ کے کچھ نئیں آنے کا۔"

"میں... میں جانتا ہوں۔" میں نے پھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"وہ تو کوئی بجلی تھا راجا! چمکا اور بجھ گیا، اپن کو بھی بہت یاد آتا ہے۔ قسم سے ابھی اپن کو سب دھوکا لگتا ہے۔ لگتا ہے اپن کی آنکھ نے مسخری کیا ہے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ بھرّائے لہجے میں بولا۔ "وہ تو موم کا بنا تھا، کانچ کا موتی۔" کہنے لگا کہ مرنے والے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ نجات تو صرف اُنھی کو ملتی ہے، زندگی بھر وہ ترکِ ایثار کا درجہ رکھتے ہیں، پھر اچانک اُن پہ یہ کیسی خود غرضی طاری ہو جاتی ہے۔ مارٹی مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ یہ کون سا طور ہے، اذیت سہنے والے دوسروں کو ایک مستقل اذیت سے دوچار کر کے کیوں چلے جاتے ہیں۔ انھیں یہ خیال کیوں نہیں آتا کہ دوسروں کے پاس تلافی کے لیے پھر کوئی گوشہ نہیں رہ جاتا۔ دوسروں کو اتنی مہلت تو دینی چاہیے۔ وہ مجھے بہلا رہا تھا۔ بھینچے ہوئے ہونٹوں سے بولا۔ "راجا! ابھی سمجھو اُوپر والے نے اُس کا لائن اُسی مانگ کھینچا تھا۔"

پیرو کی طرح اُس نے بھی مجھے وہی تسلیاں دلاسے دینا شروع کر دیے تھے جو مجھے اور ہلکان کر دیتے تھے، جن سے میری رگوں میں خون جمنے لگتا تھا مگر اُن کے پاس کہنے کے لیے اور کیا تھا، یہی کچھ کہہ سکتے تھے۔ انھوں نے سونیا کو زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ اُن کے لیے بس وہ ایک جھماکا تھی۔ سونیا کے ساتھ سفر کرنے والے نوجوان مل کمار نے وہ سب کچھ انھیں نہیں بتایا تھا۔ اُس کا لفظ لفظ میرے دل پر نقش تھا، وہ اُن کے بازوؤں پر ٹوٹ کے نہیں گری تھی۔ انھوں نے اُس کی دھڑکنیں کہاں سنی، اُس کی خوں بار آنکھیں کہاں دیکھی تھیں، اُس کی لرزیدہ سانسیں اُن کے سینے پر کہاں بکھری تھیں۔ انھوں نے اُس کے بدن میں گونجتا ہوا شور کب سنا تھا۔ وہ ابھی تک میرے کانوں میں دھمکتا تھا۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ میں نے کیا کیا سنا، کیا کیا دیکھا تھا۔ سب میری وحشت، میرے ہذیان کا خمیازہ ہے۔ سب کچھ جاننے کے باوجود کچھ نہ جاننے کا جرم ہی مجھ سے سرزد ہوا تھا جو وہ چلی گئی۔ مارٹی کو وہ سب کیا اور کتنا معلوم تھا، یہ تو بس میرا دل جانتا تھا کہ میں اُسے روک سکتا تھا۔ موت کے کسی بہانے کی اُسے تلاش تھی تو میرے پاس بھی اُس کے جینے کا کوئی بہانہ تھا۔ میں نے اُس کے اظہار میں تنگی برتی۔ مجھے حیدرآباد جانے کی ایسی ہی بے کلی تھی تو اُسے ساتھ رکھنے میں کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑتا۔ میں نے اُسے بمبئی جانے اور ہوٹل میں ٹھیرنے کا مشورہ کیوں دیا تھا۔ اگر مجھے ابا جان کا لحاظ تھا تو ابا جان کو مزید میرے بارے میں جاننے سے کون سا فرق پڑتا تھا۔ اڈّا، چاقو، سبھی کچھ انھوں نے دیکھ لیا تھا۔ سونیا کے بارے میں وہ کچھ جان کے کیا کر لیتے مگر میرے حواس ہی ٹھکانے نہیں تھے۔ مل اس سے زیادہ مجھ سے کیا کہتا اور کس زبان میں کہتا۔ جو اُس نے نہیں کہا تھا، وہ سب سونیا کے ہونٹوں کی لرزش، اُس کی بے قرار خاموشی نے کہنا چاہا تھا۔ آدمی، خنجر، گولی، ہتھیار ہی سے ہلاک نہیں ہوتا، کسی کے لیے بس ایک اجنبی نگاہ کا چھرا ہی بہت ہوتا ہے۔ مارٹی نہیں جانتا تھا کہ میں نے اُسے قتل کیا ہے۔ جتنا میں سوچتا تھا، اتنا ہی مجھے اپنے جرم کی سنگینی کا احساس سوا ہوتا تھا، اتنا ہی میرا دل ڈوبنے لگتا تھا۔ سورج کی روشنی پھیلنے تک مارٹی مجھ سے اُسی کی باتیں کرتا رہا، طرح طرح میری دل جوئی کی کوشش کرتا، مجھے طمانچے مارتا رہا۔

صبح کے ساتھ ہی بارش بھی ختم ہو گئی تھی۔ ابا جان سب سے پہلے اُٹھے تھے۔ انھیں نشست گاہ میں آتے دیکھ کے ہم دونوں کھڑے ہو گئے۔ غسل کے لیے گرم پانی کا انتظام تھا۔ سب غسل کر کے نشست گاہ میں جمع ہو گئے اور وہیں سب نے ایک ساتھ ناشتہ کیا۔ صبح صبح ایک انگریزی، ایک اردو اخبار بیرا کمرے میں ڈال گیا تھا، ابا جان اطمینان سے بیٹھے اخبار پڑھتے رہے۔ مجھے بمبئی جانے والی گاڑی کے وقت کا کوئی اندازہ نہیں تھا لیکن انھیں اور پیرو کو روانگی کی کوئی جلدی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ ممکن ہے وہ کسی ایسی گاڑی سے سفر کرنا چاہتے ہوں جو دن میں بمبئی پہنچے۔ یہی سوچ کے میں نے اُن سے کچھ نہیں پوچھا۔ آسمان بالکل صاف ہو گیا تھا اور دھوپ کھڑکیوں سے اندر کمرے تک آ

گئی تھی۔ کوئی دس بجے ہوں گے کہ دفعتہً پیرو نے مجھے اُٹھنے کا اشارہ کیا، میں نے بدحواسی سے اُسے دیکھا۔ "چلو راجا! ابھی باہر چلنے کا ہے۔" وہ کرسی سے اُٹھتے ہوئے بولا۔

"کہاں دادا؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"ابھی ذرا باہر کی سیر کرتا ہے۔"

"ابھی اپن بھی ساتھ چلے دادا؟" ماسٹی بیچ میں تیزی سے بولا۔

"تم ادھر ہی رہنے کا ماسٹر!" پیرو نے تنک کے کہا۔

"مگر تم، تم کہاں جا رہے ہو دادا؟" میں نے سراسیمگی سے پوچھا۔

پیرو نے جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھی، میرا بازو پکڑ کے اُس نے جھٹکے سے مجھے اُٹھا لیا۔ دروازے سے نکلنے سے پہلے جب اُس نے رُک کے اباجان سے کہا کہ وہ دوپہر کے کھانے پر ہمارا انتظار نہ کریں، ہمیں دیر بھی ہو سکتی ہے تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ اتنی دیر کے لیے وہ کہاں جانے کا ارادہ رکھتا ہے؟ باہر آتے ہی میں نے اُس سے پھر پوچھا۔

"ابھی ذرا اور گھوم کے دیکھتا ہے۔" وہ نرمی سے بولا۔

"اب اور کیا دیکھنا رہ گیا ہے دادا!"

"ابھی شہر بہت بڑا ہے۔"

"نہیں دادا!" میں نے اُس کے آگے آ کے راستہ روک لیا۔ "واپس چلو دادا! کہیں مت جاؤ، میں تمھارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں، ٹھوکریں کھانے سے کیا فائدہ، مجھے اب کسی کو نہیں ڈھونڈنا، مجھے کسی کی تلاش نہیں ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں دادا! بعد میں بھی میں تم سے... کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔ اب گھر چلو، وقت ضائع کیوں کرتے ہو؟"

وہ مجھے اپنے سامنے سے ہٹاتے ہوئے بیزاری سے بولا۔ "ابھی ٹھیک طرح چل، ادھر ہوٹل کا سارا لوگ دیکھتا ہے۔"

"دادا! میری بات مان لو۔"

"ابھی ایک دن سے سالا ٹیم میں کون سا بَل آ جائے گا۔ اُودر جا کے بھی اپن کو ٹیم کا کون سا حساب چکانے کا ہے۔"

"ایک دن میں تم کہاں کہاں جا سکو گے، میں اس شہر میں خوب گھوم چکا ہوں، جتھل بھائی کے ساتھ بھی، اکیلا بھی۔ یہ شہر دُور دُور تک پھیلا ہوا ہے۔ سیدھے بمبئی چلو، مولوی صاحب کے دل میں کبھی خدا ڈال دے گا تو وہ خود مجھے ڈھونڈ لیں گے۔"

"ابھی اڑی مت کر راجا!" وہ تندی سے بولا اور آگے ہی بڑھتا رہا۔

"اُدھر بمبئی میں گیتا تمھارے لیے بے چین ہوگی۔ بھابی الگ راہ تکتی ہوں گی۔ اباجان بھی اُن سب سے ملنے کے لیے لمبے رُکن رہے ہوں گے۔ ایسا ہی ہے تو بمبئی سے ہو کے پھر یہاں آ جائیں گے۔"

"پھر بھی آ جائے گا، ابھی ادھر آیا ہے تو اس بہانے تھوڑا سیر بھی کر لے۔"

"مجھے معلوم ہے تم سیر کرنے نہیں جا رہے ہو۔"

"سیر بھی ساتھ ساتھ ہو جائے گا جانی!"

"پتہ نہیں دادا! میں تمھیں کس طرح سمجھاؤں، ہو سکے تو میری بات سمجھنے کی کوشش کرو، دادا مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا، انھیں ڈھونڈنے کے خیال سے میرا دل اب بہت گھبرا رہا ہے۔" میں نے اٹک اٹک کے کہا۔ "اچھا ہے کہ لوٹ چلو۔ اِس وقت ہمارا بمبئی جانا ہی ٹھیک ہے، دیر بھی ہو سکتی ہے، کچھ بھی ہو سکتا ہے، ہوتا رہا ہے اس لیے میں کہہ رہا ہوں، راستہ کیوں کھوٹا کرتے ہو؟"

اُس نے پلٹ کے مجھے گھور کے دیکھا اور منہ اُٹھائے چلتا ہی رہا، ہوٹل سے چند قدم آگے عابد شاپ روڈ کے چوراہے پر میں نے اُس سے ایک بار پھر منت کی تو وہ ناراض ہونے لگا۔ "ابھی ایسا کیا ہے راجا! اپن بولتا ہے، ابھی ایک دن اور ٹھیر جا تو سارا دنیا اُلٹ جائے گا کیا۔ کواڑ کھلوانے کے لیے کھٹ کھٹ ہی کرنا پڑتا ہے، سمجھا جانی! ابھی کچھ بولے گا تو کوئی سُنے گا، اُودر اوپر والے کو ایک طرف دھیان لگانا ہی نئیں ہوتا، ہاتھ پاؤں چھوڑ کے بیٹھ جائے گا تو وہ بھی منہ پھیر لے گا۔"

وہ سب ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر اپنی زبان بند ہی رکھی۔ اُسے کوئی جلدی نہیں تھی تو مجھے اس قدر اصرار تکرار کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اُس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا جیسے میں کہیں بھاگ جاؤں گا۔ اُس نے رکشا نہیں کیا، پیدل ہی عابد شاپ روڈ کے چوراہے سے دائیں طرف مڑ گیا اور سو ڈیڑھ سو قدم چلنے کے بعد جیسے ہی کسی مسجد کے مینار نظر آئے، اُس کے قدم رُکنے لگے۔ مسجد سے متصل پرچون کی ایک دُکان پر جا کے اُس نے مولوی صاحب کا نام اور حلیہ بتایا۔

رات نواب ثروت یار نے خیال ظاہر کیا تھا کہ شاید مولوی صاحب حیدرآباد ہی میں ہوں اور اب تک کسی وجہ سے اُن سے ملنے نہ آ سکے ہوں۔ پیرو کے من میں یہی بات سما گئی۔ ہو سکتا ہے کہ ایسا ہی ہو، مولوی صاحب نے تھک ہار کے حیدرآباد میں مستقل طور پر بسنے کا ارادہ کر لیا ہو ورنہ وہ نواب

ثروت یار سے اس کا تذکرہ کیوں کرتے۔ وہ ایک عالم آدمی ہیں، حیدرآباد میں ایسے لوگوں کی بہت قدر کی جاتی ہے، یہاں انھیں روپے پیسے کی اتنی مشکل پیش نہیں آ سکتی تھی جتنی اور شہروں میں۔ یہاں نواب ثروت یار جیسے اُن کے اور شناسا بھی ہوں گے۔ کسی زمانے میں اُن کی بہن بھی یہاں بیاہی گئی تھی۔ میں نے انھیں ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن ناکامی کے سوا کچھ نہیں ملا۔ بہرحال مولوی صاحب تو اپنی بہن کے سسرالیوں سے خوب واقف ہوں گے۔ اگر وہ لوگ واقعی حیدرآباد ہی میں موجود ہوئے۔ مولوی صاحب روپے پیسے سے اتنے ہی تنگ ہو گئے تھے جو انھیں مرادآباد میں اپنا مکان بیچنے کی ضرورت پڑی اور پہلی بار یہاں اپنے واقف کاروں کے سہارے کی۔ اب تک وہ اپنے جاننے والوں سے دُور دُور رہے تھے، کاش انھیں معلوم ہوتا، انھیں کسی کی مدد، کسی کا سہارا لینے، کسی کے سامنے اپنا اُٹھا ہوا سر جھکانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرے پاس کرتار جی کے چھوڑے ہوئے اتنے روپے ہیں کہ وہ ساری زندگی شاہوں کی طرح بسر کریں تو بھی بچ جائیں اور کرتار جی بھی اگر یہ سب نہ چھوڑتے تو بھی میرے ہاتھ پیر سلامت تھے۔ میں نے جیل میں کچھ حاصل ہی کیا تھا جو باہر آ کے میرے کام آ سکتا تھا۔

پہلے ہم عابد شاپ روڈ کے نزدیک ترین علاقوں میں گھومتے رہے، پھر کچھ اور آگے بڑھ گئے۔ ہر محلے، گلی، اسکول اور فاصلے فاصلے سے عام ضروریاتِ زندگی کی دُکانوں پہ جا کے پیرو مولوی صاحب کا نام لے کے پوچھتا رہا۔ پیرو اُن سے یہ وضاحت بھی کر دیتا تھا کہ مولوی صاحب ایک ڈیڑھ ماہ پہلے ہی اس علاقے میں آئے ہوں گے۔ یہ مدت محلے والوں اور دکان داروں سے شناسائی کے لیے بہت کم تھی لیکن یہ بھی ہے کہ محلے میں آنے والے کسی اجنبی پر فوراً ہی نظر پڑ جاتی ہے۔ درمیان کے بہت سے علاقے دیکھتے ہوئے ہم چارمینار کے نزدیک آ گئے۔ سہ پہر ہو گئی، کہیں کوئی شخص مولوی صاحب کے نام اور حلیے پر نہیں چونکا۔ ہر جگہ سے ایک ہی جواب ملتا تھا۔ جنچل گوڑا، یاقوت پورہ، بھورے کی کھڑکی، شاہ گنج، پتھر گٹی، چار کمان کا سارا علاقہ، لاڈ بازار، عبل گنج، معظم جاہی، مکرم جاہی مارکیٹ، بیگم بازار، نرائن گوڑا وغیرہ۔ جہاں جہاں بھی ممکن ہو سکا، ہم اِدھر سے اُدھر چکر کاٹتے رہے۔ معظم جاہی مارکیٹ سے نکل کے پیرو نے دن بھر کے لیے رکشا کرائے پر لے لیا تھا جسے ہم نے چارمینار پر چھوڑ دیا اور آگے پھر پیدل چلتے رہے۔ راستے میں صرف ایک جگہ چند منٹ ٹھیر کے ہم نے چائے پی تھی۔ پیرو ایک ہی دن میں سارا حیدرآباد چھان مارنے کی دھن میں نظر آتا تھا۔ احتیاطاً وہ اِرد گرد کے مدرسوں اور مسجدوں کے بارے میں بھی پوچھ لیتا تھا چنانچہ ہم انھیں راستے میں چھوڑتے جاتے تھے۔

جس وقت ہم پتھر گٹی کے علاقے سے گزر رہے تھے، دھوپ اُوپر چلی گئی تھی۔ بازاروں میں بھیڑ بھی بڑھ گئی تھی۔ سائیکلوں پر دفتر سے لوٹنے والوں کا ہجوم ہر طرف رواں دواں تھا۔ دُکانوں پر بھی خوب رونق ہو گئی تھی۔ اسکول چار بجے کے قریب بند ہو گئے تھے۔ مدرسے بھی عصر کے وقت بند ہو گئے تھے لیکن مسجد کے مدرسوں میں کوئی نہ کوئی شخص ہمیں ایسا ضرور مل جاتا تھا جو وہاں پڑھانے والے اُستادوں کے بارے میں واقفیت رکھتا ہو۔ ابھی ہم پتھر گٹی ہی میں تھے اور موسیٰ ندی کا پل ہم نے پار نہیں کیا تھا کہ اچانک ایک جگہ پیرو نے میرا بازو تھام لیا اور بدبداتے ہوئے بولا۔ "راجا! ابھی لگتا ہے، اپن لوگ کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔"

میں نے بے اختیار پلٹ کے دیکھنا چاہا لیکن پیرو کے ہاتھ دبانے پر میں ٹھٹھک کے رہ گیا اور مجھ سے چند ہی لمحوں کا توقف ہو سکا کہ دو قدم آگے بڑھ کے میں ایک دُکان کے سامنے رُک گیا۔ پیرو کا اندازہ درست تھا۔ ایک شخص ہم سے کچھ فاصلے پر نپے تُلے قدموں سے ہمارے پیچھے آ رہا تھا۔ ہمیں یکایک ٹھیرا دیکھ کے اُس کی رفتار ایک ثانیے کے لیے منتشر ہوئی مگر وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ وہ ایک دُبلا پتلا، پھرتیلا سا تیس سال کے قریب عمر کا شخص تھا۔ رنگ سیاہ اور وضع قطع سے الگ پہچانا جا سکتا تھا۔ میں اور پیرو چمڑے کی دُکان پر مختلف چیزوں کے نرخ پوچھتے رہے مگر ہماری نگاہیں اُسی پر مرکوز تھیں۔ کچھ آگے جا کے وہ پان کی ایک دُکان پر ٹھیر گیا۔ اُس نے پان کا بیڑا منہ میں رکھا، سگریٹ سلگایا اور بے نیازی کے انداز میں ہماری طرف بھی اُچٹتی نظریں ڈالتا رہا، اسی دوران میری نظر سڑک کے پار ایک اور شخص پر بھی گئی۔ مجھے اُس پر بھی وہی شبہ ہوا۔ میں نے آنکھوں آنکھوں میں پیرو کو اشارہ کیا تو وہ سر ہلانے لگا۔ "یہ کون لوگ ہو سکتا ہے؟" وہ اُلجھی ہوئی آواز میں بولا۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"تو پہلے بھی ادھر کئی بار آ چکا ہے نا!"

"ہاں۔" میں نے تذبذب سے کہا اور اس لمحے مجھے شاہ کبیر کا خیال آیا۔ میں نے مختصراً اُسے شاہ کبیر کا واقعہ سنایا۔ "ہم چل کے اُن سے پوچھتے ہیں دادا!"

"نئیں۔" اُس نے کچھ سوچتے ہوئے انکار کر دیا۔

"پھر سیدھے ہوٹل واپس چلو اور بمبئی چلنے کی تیاری کرو، ضروری نہیں کہ مولوی صاحب نے جو ثروت یار سے کہا تھا وہی ٹھیک ہو۔ ممکن ہے، مرادآباد سے وہ کہیں اور چلے گئے

ہوں، کچھ اور دماغ میں سما گیا ہو۔"

"ابھی دو تین جگہ مل کے دیکھنا ہے۔ ہوٹل کی طرف جانا بھی ابھی ٹھیک نہیں ہے۔" وہ سہمی ہوئی آواز میں بولا۔

پتھر گٹی سے آگے پل عبور کر کے ہم نے تین چار جگہ اور بھی مولوی صاحب کو پوچھنے کی کوشش کی مگر سرسری طور پر اس عرصے میں پیچھا کرنے والے دونوں آدمی بھی ساتھ ساتھ آتے رہے حالانکہ ہم نے رفتار کم کر کے انھیں اپنے پاس آنے اور بات کرنے کا کئی بار موقع دیا تھا۔ وہ نہ ہمارے قریب آتے تھے، نہ ہم سے کچھ پوچھنا یا اُلجھنا چاہتے تھے۔ میں نے بہت غور کیا مگر شاہ کبیرا کی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اور ظاہر ہے کہ بے سبب انھوں نے ہمیں اپنی نگاہوں کا مرکز نہیں بنائے رکھا ہوگا۔ صورت شکل سے وہ سادہ لباس والے بھی نہیں معلوم ہوتے تھے اور یہ امکان بھی نہیں تھا کہ انھیں ہم پر کسی اور کا دھوکا ہو گیا ہو۔ اتنی پختہ غلط فہمی بھی قرینِ قیاس نہیں تھی۔ پتھر گٹی سے ہم نے خاصا راستہ پیدل طے کیا تھا، کہیں بھی وہ ہمارے راستے کی رُکاوٹ نہیں بنے اور نہ کہیں انھوں نے ہمیں اپنی آنکھوں سے اوجھل ہونے دیا۔ عابد شاپ روڈ سے ہم رکشا میں بیٹھ سکتے تھے لیکن یہ یقین نہیں تھا کہ وہ ہمارے پیچھے دُوسرے رکشا میں نہیں آئیں گے۔ پل عبور کرنے کے بعد ہم نے ایک تنگ گلی سے نکل کے کسی اور طرف نکلنا چاہا، راستہ ہمیں معلوم نہیں تھا۔ ہم گلی میں گھستے گئے۔ بہت دُور چکر کاٹ کے جیسے ہی ہم باہر نکلے، وہ موجود تھے۔ ایک دُوسرے سے دُور کھڑے ہوئے اور وہاں ہمیں احساس ہوا کہ وہ صرف دو نہیں ہیں۔ جتنے اِردگرد ہماری نظروں میں آ سکے، اُن کی تعداد پانچ سے کم نہیں تھی۔ اُن میں ایک سائیکل سوار بھی تھا۔ چلتے چلتے پیرو نے کہنی مار کے بظاہر پُرسکون لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ "رانا! ابھی پہچاننے کی کوشش کر۔"

"مجھے کچھ یاد نہیں پڑتا کہ میں نے انھیں پہلے کہیں دیکھا ہے۔"

"اڈّے پاڑے کے لوگ دکھائی دیتا ہے۔"

"مجھے بھی کچھ یہی لگتا ہے۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"ابھی دبا کے ہی رکھنا۔" اُس نے مجھے تحمل کی تاکید کی۔

میں خود اُس سے یہی منت کرنا چاہتا تھا۔ ہمیں اپنی جانب سے کوئی پیش قدمی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ بہتر یہی تھا کہ ہم کسی طرح راستہ کاٹ کے ہوٹل واپس پہنچ جائیں۔ میں نے پیرو کو مشورہ دیا، اگر ہمارا ہوٹل جانا سرِدست مناسب نہیں ہے تو ہم انھیں تھکانے بھٹکانے کے لیے اِدھر اُدھر گھومتے رہیں، دیکھتے ہیں وہ کہاں تک جاتے ہیں لیکن میں نے کہنے کو کہہ دیا تھا، مجھے خود اپنی بات کی بے وزنی، بے یقینی کا احساس تھا۔ پہلے ہمیں اُن کے مقصد کا کوئی اندازہ ہونا چاہیے تھا، اس کے بعد ہی کوئی اقدام مناسب تھا۔

اُس وقت ہم ایک بڑی سڑک سے گزر رہے تھے کہ ایک بس آ کے رُکی، وہ سکندر آباد جا رہی تھی۔ سکندر آباد شہر حیدر آباد سے ملا ہوا ہی ہے۔ صرف ایک ندی درمیان میں پڑتی ہے۔ سکندر آباد سے ہم کسی دوسری بس میں واپس آ سکتے تھے۔ بس کچھ آگے جا کے رُک گئی تھی۔ ہم نے اپنی رفتار سست کر دی اور جیسے ہی بس چلی ہم بھاگ کے پائدان پر چڑھ گئے، ان میں سے کوئی بس میں نہیں آ سکا تھا لیکن ایک اسٹاپ چھوڑ کے دُوسرے اسٹاپ پر جو شخص دُوسرے مسافروں کے ساتھ ہڑبڑاتا ہوا بس میں داخل ہوا، وہ اُن پانچوں میں سے ایک تھا جنھیں ہم نے موسیٰ ندی کے پل کے پار آ کے دیکھا تھا۔ بس شہر میں چل رہی تھی اس لیے اُس کی رفتار تیز نہیں تھی، فاصلہ بھی کم تھا اور دو اسٹاپوں پر رُکنے کی وجہ سے اس شخص کو خاصا وقت مل گیا تھا۔ اتنی دیر میں کوئی بھی تیز رسا آدمی چلاتا ہوا بس پکڑ سکتا تھا۔ وہ پائدان کے قریب ایک نشست پر بیٹھ گیا اور خاموش رہا۔ بس معظم جاہی مارکیٹ سے آگے جا کے عابد شاپ روڈ پر آئی تو پیرو اُتر گیا۔ پیچھے وہ بھی اُتر گیا۔ نیچے اُتر کے کچھ دُور چلنے کے بعد ہم نے دیکھا کہ وہ سب موجود ہیں۔ ضرور کسی دوسری سواری سے وہ بس کا پیچھا کر رہے تھے۔

پیرو کی آنکھوں کی لالی بڑھ گئی تھی۔ ہمیں جلد ہی کوئی تدبیر کرنی چاہیے تھی مگر اتنی آسانی سے کوئی بھی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ انھوں نے اب تک ہماری جانب کوئی کنکر نہیں پھینکا تھا اور اُن کے تیوروں سے آگے بھی کوئی ایسا امکان نظر نہیں آتا تھا تاہم ہر طرف سے ہم اُن کی نظروں کے حصار میں تھے۔ یہ نتیجہ اخذ کرنا اب مشکل نہیں تھا کہ انھیں کسی بھی وجہ سے ہماری ضرورت ہے اور فی الحال انھیں ہمارا ٹھکانا جاننے کی بے چینی ہے۔ ہوٹل قریب ہی تھا، زیادہ سے زیادہ آدھ فرلانگ کے بہ قدر فاصلہ ہوگا۔ ہم ہوٹل پہنچ کے ابا جان، زورا اور مارتی کو لے کر اسٹیشن کی طرف نکل سکتے تھے اور کسی بھی پہلی گاڑی میں بیٹھ سکتے تھے۔ وہ تب بھی ہمارا پیچھا کرتے تو کہاں تک! بمبئی تک! بمبئی میں اُن سے نمٹا جا سکتا تھا لیکن کوئی ضمانت نہیں تھی کہ وہ یہی سلسلہ برقرار رکھیں گے، محض تعاقب ہی اُن کا مقصد ہے، وہ یوں آسانی سے ہمیں حیدر آباد سے جانے دیں گے۔ اُن سے یہاں بھی نمٹا جا سکتا تھا لیکن جو بات میرے ذہن میں تھی، وہی پیرو کے لیے رکاوٹ بنی ہوئی تھی، ایک ذرا سی جلد بازی سے کوئی بھی بڑی اُلجھن کھڑی ہو سکتی تھی۔ بمبئی پہنچنے میں خواہ مخواہ اور دیر لگ سکتی تھی۔ ابا جان بھی ہمارے ہم سفر ہونے کی وجہ سے لازماً ملوث ہوتے۔ زورا، مارتی، پیرو اور میری بات ہوتی تو یہ آنکھ مچولی اتنی دیر نہ

رہتی۔ بار بار یہ اندیشہ میرا جسم جھنجھنا دیتا تھا کہ کہیں پیرو کا پیمانہ نہ چھلک جائے۔ اُس کی زندگی میں شاید یہ پہلا موقع ہوگا کہ اُسے ذلت کی حد تک یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ پیرو کو نہیں جانتے تھے۔ وہ کس سے یہ مذاق کر رہے ہیں، کون اُن کے سامنے ہے۔ بمبئی شہر کا سب سے بڑا دادا، بمبئی کے سارے پاڑے جس کی ملکیت ہیں۔ پیرو کی پیشانی پر شکنوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ میری رگوں میں بھی خون جل رہا تھا، انھیں مزید وقت نہیں دینا چاہیے تھا اور نہ اپنی کش مکش اور تردّد کا کوئی تاثر۔ رفتہ رفتہ وہ پانچ ہو گئے تھے، آگے اور بڑھ سکتے تھے۔ عابد شاپ روڈ پر ہوٹل کی طرف جانے کے بجائے پیرو ساڑیوں کی ایک دُکان میں داخل ہو گیا تھا۔ وہ وہاں مختلف رنگوں کی ساڑیاں دیکھتا پرکھتا رہا اور اُس نے کوئی سو ساڑیوں میں سے دو قیمتی ساڑیاں منتخب کیں، یقیناً ایک گیتا کے لیے، دوسری اس کی ماں کے لیے۔

پیکٹ بغل میں دبا کے ہم دُکان سے باہر نکلے تو انھیں اپنا منتظر پایا۔ وہ اِدھر اُدھر منتشر تھے۔ پیرو نے جیسے اُن کی طرف نہیں دیکھا اور دُکان سے نکلتے ہی گزرتا ہوا ایک رکشا روک کے اُس پہ بیٹھ گیا۔ شام ہو گئی تھی اور دھیرے دھیرے اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ ہم نے کہیں پیچھے مُڑ کے نہیں دیکھا کہ وہ ہمارے ساتھ آ رہے ہیں یا نہیں۔ اب اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی، انھیں آنا ہی چاہیے تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم پھر موسیٰ ندی کے پل کی طرف آ گئے تھے لیکن ہم نے پل پار نہیں کیا، اس سے پہلے ہی اُتر گئے اور اسی سنسان سی گلی میں داخل ہو گئے جہاں ہم شام کے ابتدائی وقت آ چکے تھے۔ گلی کے ایک طرف خشک ندی کا پاٹ تھا، دوسری جانب مکانات۔ ہم مسلسل اندر گلی میں بڑھتے رہے اور ایک نسبتہً خاموش اور کم آباد مقام پر پیرو نے مجھے ٹھیرنے کا اشارہ کیا۔ وہاں سے چند قدم بعد دوسری گلی کا نکڑ تھا۔ اس طرف بجلی کے کھمبے نہیں تھے لیکن دُور پل پر نصب روشنیاں جل گئی تھیں اور اندھیرا اتنا گہرا نہیں ہوا تھا کہ ہم اپنے نزدیک ہوتے ہوئے لوگوں کو نہ دیکھ سکیں۔ وہ دو آدمی تھے جو ہمیں ٹھیرا دیکھ کے پہلے کی طرح ٹھیرے نہیں، آگے آتے رہے، اُن کی چال البتہ مدھم پڑ گئی تھی۔ ابھی وہ ہمارے مقابل نہیں آئے تھے کہ گلی کے قریبی نکڑ سے ہم نے اُن کے دو اور ساتھیوں کو آتے دیکھا۔ اسی اثنا میں پہلے دو آدمی ہم سے ذرا سا فاصلہ رکھتے ہوئے جیسے ہی بے نیازانہ ہمارے مقابل سے گزرے، پیرو نے روک لیا، انھیں آگے نہیں جانے دیا۔ ساڑی کا بنڈل میری طرف اُچھال کے وہ جست لگانے کے مانند آگے بڑھا۔ دوسرے ہی پل اُن دونوں کی گردنیں اُس کے پنجے میں دبی ہوئی تھیں۔ "بولو سالا! ابھی تم کیا مانگتا ہے؟"

"کچھ نہیں، کچھ نہیں۔" وہ بُری طرح سٹ پٹا گئے تھے۔ "کیا، کیا، تم...."

پیرو نے اُن کی گردنیں پکڑے پکڑے یکے بعد دیگرے اُن کے کولھوں کے اُوپر ریڑھ کی ہڈی کے کنارے گھٹنے مارے۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ اُن کی چیخ بھی نہیں نکل سکی۔ "بول، ابھی تم سور کا جنا اپن لوگ کا پیچھا کیوں کرتا ہے؟"

"نہیں، نہیں۔" بہ مشکل تمام وہ کراہتے ہوئے بولے۔ "تم کو دھوکا ہوا ہے، ہم لوگ تو اپنی راہ جا رہے تھے۔"

"اپنا راہ جا رہا تھا۔" پیرو نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ "ابھی تم ٹھیک جگہ چلا جائے گا، ایک دم اپنا ٹھکانے پر۔"

"ہم کو معاف کر دو، ہم کو۔" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولے۔ "ہماری کوئی غلطی نہیں ہے، ہم کو معاف کر دو۔"

"ابھی تم کو خلاص کرے یا ٹھیک ٹھیک بولتا ہے؟"

پیرو نے اُن کی گردن پر پنجے کی گرفت سخت کر دی تھی۔ وہ تڑپتے، گڑگڑاتے ہوئے بولے۔ "ہماری بات سنو، ہم سب بولے دیتے ہیں، ابھی ہم کو کچھ انکار نہیں ہے، ذرا صبر کرو۔" درد کی شدت سے اُن کی آنکھیں نکل آئی تھیں۔ پیرو نے اُن کی گردن پر دباؤ بڑھا دیا۔ "مائی باپ، بالکل دھوکا ہو گیا تھا۔" وہ زمین پر پاؤں پٹخنے لگے۔ "ہماری آنکھیں بالکل بہک گئی تھیں۔ تم وہ نہیں ہو جس کی ہم کو تلاش تھی۔"

پیرو کا غصہ اور بڑھ گیا۔ "ابھی تم کو پتہ چلا کہ اپن وہ نئیں ہے۔ اپن تم کو بولتا ہے کہ اپن وہی ہے، ایک دم وہی۔"

"نہیں دادا! بالکل نہیں، بہت بڑی غلطی ہو گئی۔ تم کو اپنی ماں کا، اپنی بہن کا واسطہ تم کو۔ ہم کو چھوڑ دو۔" وہ دونوں دُہائیاں دے رہے تھے اور ساتھ ہی اپنے آپ کو گالیاں دیتے جاتے تھے۔ اُن کی آہ و بکا سُن کے اُن کے وہ دو ساتھی پلٹ آئے جو چند قدم آگے گلی کے نکڑ سے داخل ہوئے تھے اور ایک نگاہ ہمیں ساکت کھڑے دیکھ کے آہستہ قدموں سے آگے بڑھ گئے تھے۔ انھوں نے جان بوجھ کے اپنے ساتھیوں کی طرف متوجّہ ہونے میں دیر لگائی ہوگی لیکن پھر وہ دیوانگی سے ہماری جانب لپکے اور اجنبیوں کے لہجے میں پوچھنے لگے۔ "کیا، کیا بات ہے؟" وہ پیرو کے بازو پکڑ کے اُس کی دست بُرد سے ان دونوں کی گردنیں چھڑانے کی کوشش کرنے لگے اور ساتھ ہی نرم و سخت لہجے میں اُسے سمجھا رہے تھے۔ "بس کرو اُستاد، غصّہ تھوک دو، غلطی آدمی سے ہوتی ہے۔"

اُن کی ڈھٹائی حیرت انگیز تھی۔ وہ راہ گیروں کے انداز میں

ہم سے مخاطب تھے جیسے پیرو کی گرفت میں لٹکتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے اُن کا کوئی تعلق نہ ہو۔ "اب جانے دو، اُنھیں چھوڑ دو، اتنا بہت ہے۔ اپنے کیے کی اُنھیں کافی سزا مل گئی ہے۔"

اُنھوں نے پیرو کو دونوں جانب سے کھینچنا شروع کر دیا تھا۔ ایک دو لمحوں تک تو میں اس خیال سے الگ خاموش کھڑا دیکھتا رہا کہ پیرو کے اشارے کے بغیر میری مداخلت ٹھیک نہیں ہے۔ اچھا ہے، بات طول کھینچنے سے پہلے یہیں ختم ہو جائے لیکن وہ چیلے بن رہے تھے۔ میں نے پھر بھی توقف کیا اور مجھے ایسا لگا کہ وہ پیرو کے بازو جکڑ کے اپنے دونوں ساتھیوں کو چھڑانا ہی نہیں چاہتے، پیرو پر اُن کی جانب سے لوٹ کے ہاتھ اٹھانے کا موقع دینے کی تاک میں بھی ہیں۔ یہ اُن کی نادانی تھی یا کٹ حجتی، ساتھی دیتے میں اُنھیں پیرو کے متعلق کوئی اندازہ قائم کر لینا چاہیے تھا۔ کاش کوئی اُنھیں بتا سکتا کہ اُن کی دُگنی تعداد کے لیے بھی اکیلا پیرو کافی ہے اور پیرو کو اتنا وقت بھی یوں لگا ہے کہ اُسے اُن سے کچھ جاننا مقصود ہے۔ پیرو نے اُن کے دونوں ساتھیوں کو تقریباً معطل کر دیا تھا۔ اُن کے ہاتھ کھلے ہوئے تھے لیکن اُن سے کام لینے کا اُنھیں یارا نہیں تھا۔ اُن کی گردنوں میں پیرو کے پنجوں کی انگلیاں اس طرح پیوست ہو گئی تھیں کہ جسم کی ذرا سی حرکت پر اُن کی اذیت دوچند ہو جاتی تھی۔ پیرو نے بعد میں آنے والے آدمیوں کی دخل اندازی پر اتنا دھیان نہیں دیا تھا جتنا پہلے آدمیوں کی گرفت پر۔ جب دوسروں کی کھینچا تانی میں شدت آ گئی تو پیرو نے اُن کی ٹانگوں پر پیروں سے ضربیں لگائیں۔ وہ پاگل سے ہو گئے اور ایک نے پیرو کی کمر پر پوری قوت سے سر مارا۔ پیرو لڑکھڑا گیا تھا لیکن اُس کے پنجے اُن کے ساتھیوں کی گردن سے نہیں ہٹے بلکہ اس کش مکش میں پیرو کی انگلیوں کی پیوستگی اُن کے لیے اور کاری ہو گئی تھی۔ اُن کے حلق سے گھٹی گھٹی خرخراتی آوازیں نکلنے لگی تھیں۔ اِدھر میں نے ساڑی کا پیکٹ پھینک کے کھلے ہوئے دونوں آدمیوں سے نمٹنے کے لیے قدم بڑھا دیے تھے لیکن مجھے رُکنا پڑا۔ میری توقع کے خلاف پیرو نے اچانک پہلے والوں کو جھٹکا دے کے چھوڑ دیا تھا۔ اُسی لمحے وہ پچھاڑ سا کھاتا ہوا دو قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ جس طرح مجھے توقع نہیں تھی، اُسی طرح پیرو کو کھینچنے، گھسیٹنے والے آدمیوں کو بھی اُس کی اس ناگہاں دست برداری یا پینترے کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ وہ پیرو کو پیچھے ہٹتا دیکھ کے اپنی دانست میں اُسے قابو میں کرنے اور کوئی دوسرا موقع نہ دینے کے خیال سے بے تحاشا اُس پر جھپٹے۔ پیرو کو جیسے اُن کے اس ردِ عمل کا یقین تھا۔ اُن کے دوبارہ قریب آنے پر اُسے اُن دونوں کی گردنیں اپنے بازوؤں میں جکڑنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔

پہلے والے آدمی آزاد ہو گئے تھے لیکن پیرو کے جھٹکے سے اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکے تھے۔ اندھوں کی طرح ڈگمگاتے ہوئے زمین پر اوندھے گرے۔ میری آنکھیں اُنھی پر جمی ہوئی تھیں اور میرے قدم ان کے اُٹھنے کے منتظر تھے۔ وہ نیم جاں ہو گئے تھے مگر ہوش و حواس کچھ قائم تھے۔ گرتے ہی اُنھوں نے اُٹھنے کی کوشش کی اور بھاگنا ہی چاہتے تھے کہ اُنھیں اپنے ساتھیوں کی چیخیں سنائی دیں جن کے سر پیرو کے بازوؤں کے شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے اور جن کے جسم بُری طرح پھڑپھڑا رہے تھے۔ پیرو نے مجھے اشارہ نہیں کیا تھا پر مجھے ایک ایک پل کاٹنا دوبھر ہو رہا تھا۔ ہمیں زیادہ وقت بالکل نہیں لگانا چاہیے تھا۔ گو گلی میں آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی، اندھیرا ابھی بڑھ رہا تھا۔ ہم جس جگہ تھے، وہ شاید کوئی گودام تھا۔ چالیس پچاس گز کے لگ بھگ اِدھر اور آگے گلی کے قریبی نکڑ تک اُدھر ایک شکستہ دیوار کھنچی ہوئی تھی۔ درمیان میں لکڑی کے لمبے چوڑے دروازے پر بھاری تالا لگا ہوا تھا۔ پیرو نے یہ جگہ اِسی لیے منتخب کی تھی لیکن مقابل ندی کے پشتے کی پتھریلی دیوار کے باوجود نزدیک ہی گلی کے ساتھ ٹوٹے پھوٹے، کچے پکے مکانات کی قطار دُور تک چلی گئی تھی۔ اُن کی چیخیں سُن کے دُور دُور کے مکیں اور راہ گیر متوجہ ہو سکتے تھے۔ یہ بھی طے نہیں تھا کہ جتنے لوگ ہماری نظر میں آئے ہیں، اُن کی تعداد اتنی ہی ہو۔ گلی کے دہانوں پر اور بھی لوگ ہو سکتے تھے۔ سائکل سوار کا نہ ہونا بھی بے سبب نہیں ہوگا۔ میرے ذہن میں یہی خدشے منڈلا رہے تھے۔ پیرو بھی اِن سے بے خبر نہیں ہوگا۔

جیسے ہی میں اُٹھتے ہوئے اُن دونوں آدمیوں کو اُن کے سنبھلنے سے پہلے تھامنے کے خیال سے آگے بڑھا، وہ اُلٹے قدموں یکایک پیچھے کی طرف بھاگے۔ اُنھوں نے چند لمحوں کے لیے مجھے متذبذب کر دیا تھا۔ اس اثنا میں اُنھیں چاقو نکالنے کی مہلت مل گئی تھی اور چاقو ہاتھ میں آجانے کے بعد اُن میں جیسے جان سی آ گئی تھی۔ ایک میری طرف، دوسرا پیرو کی جانب ہاتھ پھیلاتا، چاقو لہراتا آنے لگا۔ اُن کی حد سے زیادہ چیختی، پھنکارتی اور جھنکاریں میرے لیے اُن کے خوف کا مظہر تھیں۔ دوسرا جس کا رُخ پیرو کی طرف تھا، پہلے مجھے اُسے روکنا چاہیے تھا۔ پیرو نے بھی دیکھ لیا ہوگا۔ وہ پلٹ کے اُن کے ساتھیوں ہی کو آگے کر سکتا تھا مگر مناسب یہی تھا کہ اُسے پیرو کی طرف جانے ہی نہ دیا جائے۔ ہم دونوں میں سے وہ مجھی کو پہچانتے ہوں گے۔ پیرو پہلی بار حیدر آباد آیا تھا۔ وہ میں ہی ہو سکتا تھا۔ اگر

وہ مجھے پہچانتے تھے تو اُنھیں شاہ کبیر والا واقعہ بھی یاد ہوگا۔ چاقو ہاتھ میں آ جانے کے باوجود اُن کی احتیاط اور جھجک کا یہی مطلب ہو سکتا تھا اور یہی وجہ ہو گی کہ اُن کی نظریں میری طرف اُٹھتی رہی تھیں۔ اپنی بوکھلاہٹ میں وہ کوئی بھی اوچھا پن کر سکتے تھے۔ میں نے جب پیرو کی طرف بڑھنے والے آدمی کو روکنے کے لیے اُس کے راستے میں آنا چاہا تو وہ گھبرا گیا اور اُس کا رُخ میری ہی طرف ہو گیا۔ پھر معاً ایک ہی تدبیر میرے دماغ میں آئی کہ کوئی توقف کیے بغیر میں اُسے منتشر کرنے کے لیے بے مقصد ہاتھ پیر چلاؤں اور کروٹیں بدلتا رہوں۔ یہ ایسا بے مقصد بھی نہیں تھا۔ پہلے بھی جیل میں ایک مرتبہ میرے اور کانتے کے ساتھ یہی کیا تھا۔ اس طرح اُن کے فیصلے کی قوت درہم برہم ہو سکتی تھی اور کسی بھی لمحے اُن کا ہاتھ میرے قبضے میں آ سکتا تھا۔ ایک کا آنا ہی کافی تھا اور یہی ہوا۔ مجھے آناً فاناً کئی زاویے بدلنے پڑے کہ اُن میں سے ایک کا ہاتھ میرے پنجے میں جکڑا ہوا تھا۔ دوسری طرف سے بھی میری نظریں غافل نہیں تھیں لیکن مجھ سے بس ایک پل کی چُوک ہو گئی۔ مجھے خیال نہیں رہا تھا کہ دوسرے پر اتنی وحشت طاری ہو سکتی ہے، اُس نے اپنے ساتھی کو میرے قبضے میں دیکھ کے دیوانہ وار مجھ پر چاقو تول لیا۔ اب مجھے لازماً اُس کے ساتھی کو اُس کے سامنے کر دینا چاہیے تھا۔ میں نے کچھ جلدی کر دی تھی سو وہ اپنا بڑھا ہوا ہاتھ کھینچ نہیں سکا۔ اُس نے روکنے کی بھی کوشش کی لیکن چاقو اُس کے ساتھی کی پسلی سے گزر گیا تھا۔ اِدھر اُس نے حواس باختگی سے چاقو کھینچا، اُدھر چشم زدن میں میں نے اُس کے زخمی ساتھی کو ایک جانب دھکیل کے اور کسی قدر ترچھا ہو کے اُس کے جبڑے پر ضرب لگانا چاہا۔ اُس کا سمٹا ہوا چاقو والا ہاتھ جتنی دیر میں دوبارہ میری طرف کھلتا، اتنی دیر میں ضرب لگا کے میرا ہاتھ واپس آ سکتا تھا۔ وہ ایسا گڑبڑا گیا تھا کہ چاقو اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ پھر اُسے زمین پر پٹخنے اور ٹھوکریں مارنے میں مجھے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ زخمی ہونے والا آدمی زمین پر لوٹ رہا تھا اور دھاڑیں مار رہا تھا۔ چاقو اُٹھانے کی تو کیا، اُس میں اپنا جسم سنبھالنے کی سکت بھی نہیں تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اُسے گہرا زخم نہیں لگنا چاہیے تھا۔ لگا بھی ہوگا تو صرف ایک جگہ۔ میں اُسے بروقت نہ کھینچ لیتا تو وہ اب تک دم توڑ رہا ہوتا۔

مجھ سے قریب ہی پیرو نے اُن دونوں کی گردنیں جکڑی ہوئی تھیں۔ "ابھی ایک دم سب بول دو، منٹ میں تم کو سدا کے لیے چُپ کر دے گا۔" وہ اُن سے بار بار پوچھ رہا تھا کہ وہ سب کچھ صاف صاف بتا دیں۔ اِس طرف میں نے بھی ایک آدمی کو دبوچ کے اُس کے نرخرے پر چٹکی بھر رکھی تھی۔ اُنھیں اگل ہی دینا چاہیے تھا۔ مُردار اُنھیں مدد کے لیے کسی اور ساتھی کے آنے کی اُمید ہو گی جبھی اُنھوں نے اتنا وقت بھی لے لیا تھا مگر اب اُن کے پاس کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ اُن کا ایک ساتھی زمین پر پڑا سسک رہا تھا۔ خون سے اُس کے کپڑے تربتر ہو گئے تھے، پہلے تو وہ اپنی پُرانی رٹ لگاتے رہے پھر اُنھوں نے جھجکتے، اٹکتے ہوئے زبان کھولی کہ اُنھیں آکا نے ہمارا پیچھا کرنے کے لیے بھیجا ہے۔

"آکا کون؟" پیرو نے قہر آلود لہجے میں پوچھا۔

"آکا بھائی اِدھر شہر کا سب سے بڑا دادا ہے۔"

"کیا بولا تھا، اُس گیدڑ کا اولاد نے؟"

"اُس نے ہم کو صرف تمھارا پیچھا کرنے بولا تھا۔"

"کیوں؟ اودر اُس کا ماں کو نیند نئیں آتا کیا؟"

"ہم کو کچھ اور نہیں معلوم، ہم تو حکم کے غلام ہیں۔"

"تم آتو کا پٹھا ہے، کیدر رہتا ہے وہ؟"

"اُس نے ابھی بازار میں ٹھکانا کر رکھا ہے۔"

"بازار میں!" میں نے تندی سے پوچھا۔ "بازار میں تو ہم شاہ کبیر کو نکال کے کالے دِلوا کو چھوڑ کے ...."

دفعتاً گلی میں بائیں جانب سے بھاگتے ہوئے آدمیوں کی چاپیں سنائی دیں۔ میری آواز حلق میں گھُٹ گئی۔ میں نے گھوم کے دیکھا تو وہ کئی آدمی تھے، ہم سے زیادہ دُور نہیں تھے اور ایک دوسرے کے پیچھے شور مچاتے ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ وہی ہوا جس کا اندیشہ مجھے بے چین کیے ہوئے تھا۔ اُن تینوں اور اُن کے زخمی ساتھی کی چیخ پکار نے آخر گلی کے مکینوں اور راہ گیروں کو متوجہ کر لیا۔ پیرو نے بھی اُنھیں دیکھ لیا تھا لیکن اُس نے اپنے بازوؤں میں جکڑے ہوئے آدمیوں کی گردنیں نہیں چھوڑیں، نہ میں نے اپنے دبوچے ہوئے آدمی کے نرخرے سے ہاتھ ہٹایا۔ ہم اُنھیں یوں کیسے چھوڑ سکتے تھے، بھاگنے کا محل بھی نہیں تھا۔ درمیان میں آنے والوں کا اتنا ہی احساس تھا تو ہمیں کسی ایسی جگہ اُنھیں نہیں چھیڑنا چاہیے تھا لیکن وہ کوئی جگہ تو ہوتی۔ ہم نے ان سے جلد از جلد نمٹنے کی پوری کوشش کی تھی، چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے ہوں گے، اتنی دیر بھی اُنھی کے لیت و لعل کی وجہ سے ہوئی۔ وہ اڈے کے آدمی تھے اور اتنی جلدی زبان نہیں کھول سکتے تھے۔ کسی کی دخل اندازی کا تو ہر لمحے امکان تھا۔ وہ اگر فیل نہ مچاتے تو بھی یہاں کوئی کسی وقت پھٹک سکتا تھا۔ جیسے ہی گلی کے لوگ ہمارے نزدیک آئے، پیرو کے اشارے پر میں نے اپنے قابو میں کیے ہوئے آدمی

پھر زور بڑھا دیا اور پے درپے اُس کے منہ پر ہاتھ رسید کیے۔ ساتھ ہی پیرو نے اپنے بازو اُن کی گردنوں پر اور تنگ کر دیے۔ نتیجتہً اُن کا بین بھی بڑھ گیا۔ "ابھی ایک دم چالو رکھو۔" پیرو کے لہجے میں کوئی لچک نہیں تھی۔

"ہم کو اِس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم۔" ایک نے گھگھیاتے ہوئے کہا۔ باقی دونوں نے بھی تڑپتے ہوئے یہی تکرار کی۔

"تم کہہ رہے تھے کہ آکا نے بازار میں ٹھکانا بنا رکھا ہے؟" میں نے لیکتی آواز میں پوچھا۔

"ہاں، ہاں تمہارے جانے کے بعد کالے دادا کچھ دن ہی اُدھر ٹھیک چلا۔ شاہ کبیر حرام زادہ تو پھر اُدھر کبھی نہیں پھٹکا لیکن آکا نے تو کالے دادا کو بازار سے نکال دیا۔ اِدھر شہر میں اب آکا کا ہی راج ہے دادا!"

"لیکن وہ ہم سے کیا چاہتا ہے؟"

"ماں قسم، اپنے کو کچھ نہیں معلوم۔" وہ بلکتا ہوا بولا۔ "جو تم سے جھوٹ بولے، وہ اپنی بہن سے منہ کالا کرے۔"

پیرو نے جھپکتی پلکوں سے میری طرف دیکھا، اُن کی بات میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہی تھی لیکن اس عالم میں وہ جھوٹ نہیں بول سکتے تھے۔ گلی سے اُمڈتے ہوئے لوگوں کی آمد اور شور کے باعث اُن سے کچھ اور جاننا دشوار ہو گیا تھا۔ آتے ہی کوئی میری، کوئی پیرو کی اور کوئی زخمی آدمی کی طرف لپکا۔ زخمی شخص نے بھی انھیں دیکھ کے کچھ زیادہ ہی ڈکرانا شروع کر دیا تھا۔ پیرو کی گرفت میں جکڑے تینوں آدمیوں کی آوازیں بھی اُونچی ہو گئی تھیں۔ جو ہم تک پہنچ چکے تھے، اُن کے پیچھے بھی لوگ بھاگے ہوئے آ رہے تھے، اُن میں گلی کے لڑکے وغیرہ بھی شامل تھے۔ کئی آدمی مجھ اور پیرو کو سمجھانے اور کمرے پکڑ کے کھینچنے لگے تھے۔ پیرو نے انھیں منع بھی کیا کہ بہتر ہے وہ دُور دُور رہیں اور بیچ میں نہ بولیں۔ وہ باز نہیں آئے بلکہ تحمل تحمل کی صدائیں بلند کرنے لگے۔ جب اُن کا شور نہیں تھما اور دست درازی جاری رہی تو پیرو نے گرجتی آواز میں انھیں تنبیہ کی کہ وہ دونوں آدمیوں کی گردنیں توڑ دے گا اور اُن سب کے لیے بھی کوئی اچھا نتیجہ برآمد نہیں ہو گا۔ پیرو کی تنبیہ اتنی کارگر نہیں ہوئی تھی جتنی اُن دونوں کی التجا جو اُس کے شکنجے میں کسے ہوئے تھے۔ انھوں نے ایک ساتھ سسکتے ہوئے التجا کی کہ وہ دور دُور رہ کے اُن کے لیے بہتری کریں گے، یہ ہمارا اِن کا آپس کا معاملہ ہے۔ لوگوں نے مجبوراً ہاتھ کھینچ لیے تھے لیکن اُن کا اضطراب سوا ہو گیا تھا۔ وہ ہمارے قریب ہی منڈلاتے رہے۔ کوئی کچھ، کوئی کچھ کہہ رہا تھا۔ زخمی آدمی کے لیے کوئی چارپائی منگوانے، کوئی اسپتال لے چلنے، کوئی وہیں ڈاکٹر کو بلوانے کا

مشورہ دے رہا تھا۔ اُسی دم میرے کانوں میں پولیس کی آواز بھی آئی، کسی نے پولیس کا نام بھی لیا تھا۔

پیرو کو جیسے کچھ سنائی، کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ "کام کا بات بولو۔" اُس نے سرد لہجے میں دوبارہ ان دونوں کو مخاطب کیا۔ "کالے دادا ابھی کیدر ہے؟"

"کالے دادا آکا کے ساتھ ہی کام کرتا ہے۔"

"تم نے ہمیں کیسے پہچانا؟" میں نے درمیان میں تیزی سے پوچھا۔

"ہم نے تم کو شاہ کبیر کے کا ناڑا کاٹتے دیکھا تھا۔ آکا نے اُن سب کو جو اُس وقت وہاں موجود تھے، بولا تھا کہ اگر تم کبھی جیدابا میں پھر دکھائی دو تو ہم تمہارا پیچھا کریں اور ٹھکانا معلوم کر کے ہی لوٹیں۔"

"اپن ابھی یہی پوچھتا مانگتا ہے کہ اُس کتے کا پلے نے تم کو ایسا کیوں بولا؟"

"ہم نے لوٹ کے نہیں پوچھا تھا دادا! آکا جو بات بولنا نہیں چاہتا، اُس کو کوئی بھی نہیں جان سکتا۔" وہ سہمی ہوئی آواز میں بولا۔ "ایک منٹ میں وہ آدمی کو ٹانگ دیتا ہے۔"

"ابھی اُودر مل کے اُس کا چوکھا بھی دیکھ لیتا ہے۔ آکا اپن لے تھ اُترائی میں اُس کا ماں کو نہیں دیا تھا۔"

"ہم کو سب پتہ ہے دادا! ابھی ہم کیا بولے۔"

"اپن کو تمہاری طرح وہ بھی کوئی اُٹھائی گیرا لگتا ہے۔"

"ایک دفعہ اُدھر مجتے دادا نے سامنے بول دیا تھا کہ آکا تو سالا چور کی دال ہے، آکا اُسی بادشاہ کا ہے جس نے بیچ بازار میں شاہ کبیر کا تختہ کر دیا تھا۔ مجتے کو پھر شہر ہی چھوڑنا پڑا۔ آکا بس چاقو کا بات سمجھتا ہے۔"

دیکھتے دیکھتے ہمارے گرد خاصی بھیڑ جمع ہو گئی تھی اور اُن کی تعداد لمحہ بہ لمحہ بڑھ ہی رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گلی اور گردو نواح کے سارے لوگ یہیں ٹوٹ پڑیں گے۔ زخمی شخص کو انھوں نے چارپائی پہ اُٹھا کے دُور کر دیا تھا اور بہت سے لوگ اُس پر جھکے ہوئے تھے۔ گو انھوں نے ہمیں روکنے کی جرأت نہیں کی تھی لیکن وہ تلے کھڑے تھے اور ایک دوسرے کو اکسانے کے ساتھ، تحمل کی تلقین بھی کر رہے تھے۔ پیرو نے اُن دونوں آدمیوں سے پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ چند لمحے وہ یوں ہی خاموش کھڑا خونخوار نظروں سے آمنے سامنے دیکھتا رہا اور اُس نے مجھ سے آنکھ کے اشارے سے کچھ پوچھنا چاہا۔ میں جواب میں اُس سے یہ کہنا، اگر صرف اتنی سی بات تھی کہ کالے کے بعد آکا نامی کسی شخص نے بازار کا اڈا سنبھال لیا تھا اور ہماری واپسی کی طرف سے ٹھٹکا تھا تو اُسے یہ طریقہ کار اختیار کرنے کی کیا ضرورت تھی اور ہم اتنی سی بات پہ اِس قدر دھیان کیوں دیا تھا۔ یا تو وہ ابھی تک

کچھ چھپا رہے تھے یا انھیں واقعی کچھ معلوم نہیں تھا مگر اب اُن سے کچھ اور جاننے میں وقت برباد نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ہمیں کسی طرح فی الفور یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔ میں نے پیرو سے کچھ نہیں کہا۔ میرا سارا جسم جکڑا رہا تھا۔ یہاں سے نکلنا بھی اب آسان نہیں رہا تھا۔ گلی میں جیسے آگ لگ گئی تھی۔ لوگوں نے زندگی میں جیسے پہلی بار کوئی ایسا تماشا دیکھا ہو۔ اِس سے پہلے کہ اُن میں سے کوئی سر پھرا میری اور پیرو کی طرف بڑھنے کا ارادہ کرتا، پیرو نے اُن دونوں کو دھکا دے کے چھوڑ دیا۔ دونوں چکراتے ہوئے چوپٹ زمین پر گرے، ملتھے پر چوٹ لگی ہو گی۔ میں بھی پیرو کی پیروی میں فوراً اُس شخص کے جسم سے اُٹھ گیا تھا جس کی سانسیں میرے دباؤ اور ضربوں کی وجہ سے اکھڑنے لگی تھیں۔ تینوں نڈھال ہو گئے تھے۔ آنکھیں پھٹی پھٹی، منہ کھلا ہوا، رنگ پیلا۔ پیرو نے اُن میں سے ایک کا شانہ تھپکا تو وہ سر تا پا لرزنے لگا۔ "اُس حرام کا جنے کے پاس اپن کو لے کے چلو، ابھی اُس زنانے کا پردہ اُٹھا کے دیکھتا ہے۔"

"دادا!" وہ ہکلانے لگا۔

"دیری مت کرو، اپن کے پاس ابھی ٹیم زیادہ نہیں ہے۔" پیرو نے تلخی سے کہا اور باقی دونوں کو حکم دیا کہ وہ جا کے اپنے ساتھی کو سنبھالیں۔ لوگوں پر سناٹا چھا گیا تھا۔ پیرو اس آدمی کو دھکیلتا ہوا آگے بڑھا تو وہ سُن کھڑے رہے اور خود بخود راستے سے اُن کی بھیڑ چھٹتی گئی، ہمیں اُن کے درمیان راستہ بنانے، اُن سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ پیرو نے نکڑ کے قریب مڑ کے دیکھا تو وہ ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ پیرو کے مڑنے پر اُن میں ایک کھلبلی سی مچی اور غیر ارادی طور پر اُلٹے قدموں اُن کا ریلا کچھ پیچھے ہٹ گیا۔ ہم نکڑ سے دوسری گلی میں داخل ہو گئے تھے لیکن کچھ ہی دُور گئے ہوں گے کہ پیچھے سے پھر اُن کا شور اُٹھا جو ہمارے قدموں کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہا تاہم ہم اپنی رفتار سے چلتے رہے اور اُنھوں نے کہیں ہمارے اور اپنے درمیان کا فاصلہ کم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ہمارے ساتھ آنے والا آدمی بار بار پلٹ کے کبھی انھیں، کبھی ہمیں دیکھتا تھا۔ گلی میں آگے چل کے ہمیں اور بھی بہت سے آدمی اپنی طرف دوڑتے دکھائی دیے جو ہمیں اور ہمارے پیچھے ہجوم کو آتا دیکھ کے جہاں جہاں تھے، وہیں ٹھٹھک کے رہ گئے۔ مجھ سے پیرو کی رفتار کا ساتھ نہیں دیا جا رہا تھا۔ اندر گلیوں میں دو منزلہ، سہ منزلہ پختہ عمارتیں بھی بنی ہوئی تھیں جن کی کھڑکیوں، چھجوں اور دروازوں سے عورتیں جھانک رہی تھیں۔ آگے جن لوگوں کے سامنے سے ہم گزرتے تھے، وہ دہشت زدہ نظروں سے ہمیں گھورتے ہوئے ایک طرف سمٹ جاتے تھے۔ پیچھے طرح طرح کی آوازیں گونج رہی تھیں، جانے وہ ہمیں کیا سمجھ رہے تھے۔ پیرو دوسری گلی کے پہلے ہی موڑ پر پھر مڑ گیا۔

"دادا!" "اب اِدھر آکا کے پاس جانے کا ارادہ ملتوی کر دو، اُسے پھر کبھی آ کے دیکھ لیں گے۔ موقع ملتے ہی میں نے دبے لفظوں میں اُس سے درخواست کی۔

اُس نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور آہستگی سے میرا ہاتھ دبایا۔ یہ ایک مصنوعی اور جبری مسکراہٹ نہیں تھی۔ اُس کے چہرے پر چھائے ہوئے سکون سے میرے قدم بھی زمین پر جمنے لگے تھے۔ دوسرے ہی لمبے گلی میں ایک روشن حصے میں اُس نے ہمارے ساتھ آنے والے آکا کے آدمی کی کنپٹی پر ایک ضرب لگائی۔ وہ وہیں لڑکھڑا کے گر گیا اور اپنی سُدھ بُدھ کھو بیٹھا۔ پیرو نے اُسی وقت جیب سے چاقو نکال کے ہوا میں اُچھال دیا۔ یہ دیکھ کے میرے سر میں چھناکا سا ہوا۔ میں نے بے اختیار اُس کے ہاتھ پر جھپٹا مارنے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا تھا لیکن پیرو کا مقصد کچھ اور نہیں تھا، میرا ہاتھ اینٹھ کے رہ گیا۔ پیرو میری کمر تھپکتا ہوا اُسی لمحے آگے چل پڑا تھا، رفتہ رفتہ شور کم ہوتا گیا اور آگے جا کے بالکل ختم ہو گیا۔ گلیوں کے راستے ہمیں معلوم نہیں تھے، نہ ہم نے کسی سے راستہ پوچھا، نہ لوٹ کے دیکھا۔ تین چار گلیوں کا چکر کاٹ کے ہم آخر ایک بڑی سڑک پر نکل آئے اور وہاں آ کے مجھے ایسا لگا جیسے ہم کسی تہہ خانے، کسی محبس سے نکل آئے ہوں۔ اندھیرا خاصا گہرا ہو گیا تھا اور سڑکوں پر ہر سمت روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ رکشا ملنے میں ہمیں دیر نہیں لگی۔ گدی پر بیٹھ کے ہماری نظر گلی کے نکڑ پر گئی۔ وہاں کئی آدمی کھڑے تھے اور ہماری طرف بوکھلائے ہوئے انداز میں اشارے کر رہے تھے۔ یقیناً وہ کسی دوسرے راستے سے سڑک پر آئے ہوں گے۔ ہم سے نگاہیں چار ہوتے ہی اُن کے جسم چوبیں ہو گئے۔ پیرو نے اُن کی جانب سے منہ پھیر کے رکشا والے کو ٹہوکا مارا، رکشا تیز رفتاری سے سڑک پر دوڑنے لگا۔ اتفاق سے رکشا والا بھی خاصا پھرتیلا تھا، وہ گھوڑے کے مانند رکشا کھینچتا ہوا ہمیں جلد ہی وہاں سے دُور لے آیا۔ اُس کی چال میں غیر معمولی تیزی کچھ پیرو کے دیے ہوئے نوٹ کی وجہ سے بھی آ گئی تھی۔ ہم سڑکوں پر چلنے والی بے شمار سواریوں میں مِل جُل گئے تھے۔ بازاروں میں ابھی خوب چہل پہل تھی۔ مجھے بار بار پیچھے دیکھنے کی بے کلی ہوتی تھی لیکن میں پہلو بدل کے رہ جاتا تھا۔ ویسے معاملہ اگر صرف آکا کا تھا تو اتنی تشویش کی بات نہیں تھی، چاہے اُس کے ساتھی اب بھی ہمارا پیچھا کر رہے ہوں۔

پیرو نے رکشا والے کو منزل کا پتہ نہیں بتایا تھا۔ وہ صرف چوراہوں پر اُسے ہدایت دیتا تھا۔ براہ راست نہ سہی مگر ہم برنس عابد شاپ روڈ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ابھی رکشا عابد شاپ روڈ سے دُور تھا اور ہم ایک گنجان بازار سے گزر رہے تھے کہ فرخ ہم

پھر آگے چوراہے پر بھیڑ دیکھ کے مجھ سے رکشا میں سیدھا نہ بیٹھا جا سکا۔ میں نے پیرو کو اور پیرو نے مجھے بیک وقت کہنی ماری۔

وہاں پولیس ہی موجود تھی۔ رکشا واپس کرنے کا وقت گزر گیا تھا۔ کئی رکشا رکے ہوئے تھے اس لیے آمدورفت میں خلل پیدا ہو گیا تھا۔ پولیس غالباً کرائے کی ہر سواری کو چیک کر کے آگے جانے کی اجازت دے رہی تھی۔ کوئی اور بات بھی ہو سکتی تھی، کوئی حادثہ۔ پیرو نے رکشا رکنے کے لیے رکشا والے کو آواز دی مگر وہ اپنی جھونک میں کچھ اور آگے بڑھ گیا اور چوراہے سے ہمارا فاصلہ مزید کم ہو گیا۔ چند گز بعد بائیں طرف ایک گلی نظر آ رہی تھی۔ پیرو نے آگے جانے کے بجائے اُسے رکشا وہیں لے چلنے کا حکم دیا۔ گلی نہ ہوتی تو ہمیں رکشا سے اُترنے کا فیصلہ کرنا پڑتا۔ جلدی میں پیرو کو یہی صورت سمجھ میں آئی تھی۔ گلی میں راستہ تنگ تھا اور بازار کی طرح اُجالا بھی نہیں تھا۔ پیرو نے نسبتاً ایک تاریک جگہ رکشا رکوا کے مجھ سے سرگوشی میں کہا کہ میں اُترکے جلد سے جلد ہوٹل پہنچنے کی کوشش کروں اور اُس کا انتظار کیے بغیر اَبا جان، زورا اور مارتی کو لے کے فوراً اسٹیشن چلا جاؤں۔

"تم کیا کہہ رہے ہو دادا؟" میں نے دہشت سے کہا۔

"اپن ٹھیک ہی بول رہا ہے راجا! سمجھا کرو جانی!" وہ آنکھ میچتے ہوئے بولا۔ "ہو سکتا ہے اپن بھی ابھی ہوٹل پہنچ جائے۔"

میرے انکار پہ وہ ناراض ہونے لگا۔ "دیر مت کر راجا! ادھر تو گلی سے نکل کے پیدل ہوٹل پہنچنے کا کوشش کر۔ جتنا دیر میں اپن پولیس کے سامنے ہو گا، تو ہوٹل جا کے اُن لوگ کو نکال سکتا ہے۔ اُن کو جا کے بول کہ ابھی ادھر سے ٹکٹ کٹا لے، اپن پیچھے آتا ہے۔ ایسا ہی ہے تو تو اُن لوگ کو بھیج کے اپن کا اُودھر ہی انتظار کرنا۔ ابھی اپن کیا بول سکتا ہے کہ آگے پیچھے ہی اُودھر پہنچ جائے۔ سمجھا؟"

"نہیں دادا! میں تمھیں اکیلا چھوڑ کے نہیں جاؤں گا۔"

"مان لے راجا!" وہ میری ٹھوڑی میں ہاتھ ڈال کے بولا۔

"جو تم مجھ سے کہہ رہے ہو، وہ خود کیوں نہیں کرتے؟"

"ابھی سمجھ راجا!" وہ ضدی سے بولا۔

"فضول باتیں کیوں کر رہے ہو؟" میں نے بیزاری سے کہا۔ پیرو کا مطلب میں خوب سمجھ گیا تھا۔ اُس کا مقصد یہ تھا کہ اگر پولیس حرکت میں آ گئی ہے تو وہ خود اُن کے سامنے جا کے تھوڑی دیر کے لیے اُن کی توجہ میری طرف سے ہٹائے گا۔ پولیس سرِدست ایک آدمی کا ہاتھ آ جانا غنیمت سمجھے گی۔ میں اِس دوران چھپتا چھپاتا ہوٹل پہنچ سکتا ہوں۔ سڑکوں پر اتنے لوگوں کے ہجوم میں مجھ اکیلے راہ گیر پہ کسی کی نظر مشکل سے جائے گی۔ ہم دونوں کو سب نے ساتھ ساتھ ہی دیکھا تھا۔ راستے بھی میرے لیے اتنے اجنبی نہیں ہیں۔ وہ بالکل اُلٹی بات کہہ رہا تھا۔ اُس کے مقابلے میں مجھے یہاں زیادہ لوگ پہچانتے تھے۔ میں نے اُس سے کہا کہ ہم سیدھے اُسی چوراہے سے گزر کے جاتے ہیں، جہاں پولیس سواریاں چیک کر رہی ہے۔ پیرو کے ذہن میں ہو گا کہ مجھے یہاں اُتار کے وہ گلی سے کسی اور طرف نکل جائے گا اور اگر آسانی سے ہوٹل پہنچ سکا تو ٹھیک ہے ورنہ پولیس کے سامنے آ جائے گا۔

پولیس کو ہمی مطلوب ہیں تو وہ دوسرے چوراہوں پر بھی آ گئی ہو گی۔ اِدھر اُدھر بھٹکنے، ٹکریں کھانے کی بہ نسبت یہی درست معلوم ہوتا تھا کہ ہم دونوں کسی تاخیر اور ردوقدح کے بغیر اُن کے سامنے سے گزر کے جائیں۔ یہاں سے بچ نکلنے سے مراد یہ نہیں ہے کہ ہم ہوٹل چھوڑنے سے گاڑی میں بیٹھنے تک بھی اُن کی نظروں سے دور پوشش رہنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ یہاں نہیں تو کہیں اور کسی جگہ، کسی لمحے وہ ہمیں شناخت کر سکتے تھے اور اگر اُس وقت اَبا جان، زورا اور مارتی بھی ہمارے ساتھ ہوئے! ہم نے کوئی ایسا بڑا جرم نہیں کیا تھا۔ اُن لوگوں نے ہمیں خود اِس اقدام پہ مجبور کیا تھا۔ وہ چار تھے، ہم دو۔ ہمارے بارے میں ملنے والی اطلاعات سے پولیس شک میں پڑ گئی تھی تو اُن چاروں کے رنگ ڈھنگ سے بھی وہ اچھی طرح واقف ہو گی اور وہ چاروں بھی اب ذرا احتیاط ہی سے بیان دیں گے۔ اُنھیں یہ تو اندازہ ہو گیا تھا کہ ہمارا تعلق بھی کسی اکھّے سے ہونا چاہیے۔ ساڈے کے لوگ تنہا نہیں ہوتے۔ بچُھل کا بھی اُنھیں خیال ہو گا کہ وہ میرے ساتھ نہیں تھا۔ چوہے بلی کا کھیل کرنے کے بجائے ہمیں خود کو پولیس کے سامنے پیش کر دینا چاہیے تھا۔ اُنھوں نے ہمیں بھاگنے چھپنے کی کسی حالت میں لیا تو اُن پر اور بُرا اثر پڑے گا۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے؟ میں نے پیرو سے یہی کچھ کہا۔ اُسے میری بات ماننے میں تامل تھا۔ میں نے اُس سے پوچھے بغیر رکشا والے کو رکشا لوٹانے کی ہدایت کی۔ ہم دونوں یہیں رکشا سے اُتر کے پیدل الگ الگ ہوٹل کی جانب جانے کی تگ و دو کر سکتے تھے لیکن اگر دونوں میں سے کوئی بھی ہوٹل واپس نہ پہنچتا تو بات تو وہی ہوتی۔ اَبا جان، زورا اور مارتی کو بمبئی تک روانہ کیا جا سکتا تھا مگر نہ تو میں نہ پیرو، دونوں ایک دوسرے کے بغیر اِس طرح بمبئی جانے کا تصور ہی نہیں کر سکتے تھے۔

رکشا پھر اُسی سڑک پر آ گیا تھا۔ اِس اثنا میں چوراہے پر بھیڑ کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ پیرو خاموش بیٹھا رہا۔ ہمارا رکشا آگے کے دُور سے ایک سپاہی نے سیٹی بجائی۔ رکشا کی رفتار پہلے ہی مدھم پڑ گئی تھی۔ اُنھیں ہماری ہی تلاش تھی۔ ہمیں وہیں اُتار لیا...

❋ "دونوں تگ ملزم ہیں حضرت!" حوالدار نے تھانے کے اندر گندمی رنگ اور فربہ جسم سب انسپکٹر کی میز پہ ہمیں لے جا کے کہا۔

سب انسپکٹر کسی فائل کی ورق گردانی میں مصروف تھا، اُس کے کلّے میں پان دبا ہوا تھا۔ وہ حوالدار کی آواز پہ چونک پڑا اور چشمہ بدل کے تیکھی نگاہوں سے ہمیں گھورنے لگا۔ "آج مُجا ملوچ جیا! یہ ہیں، وہ رستم، سہراب۔ تھا اُن کا انتظار، وہ شہہ کار آ گئے۔" وہ آنکھیں جھکاتے ہوئے بولا۔ "آئیے، آئیے۔"

میں اور پیرو ساکت کھڑے رہے۔

"کیا بولتے ہیں دونوں بہادراں؟"

"بولنے کیا حضرت! وہی جو سارے لوگاں وردی والا لوگاں کو دیکھ کے بولتے ہیں۔" حوالدار ہنس کے بولا۔

سب انسپکٹر معنی خیز انداز میں سر ہلانے لگا۔ "پہلی ملاقات میں ایسا ہی ہوتا ہے۔" وہ چلبلے پن سے بولا۔ "اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں۔"

"اُدھر محلّے والا لوگاں سے پہچان کرا لیا ہے۔ بولتے تھے، وہاں اُن کو بھی چاقو دکھاتا تھا۔"

"ایسا! لیکن اُدھر محلّے والے ننگے پیر تھے کیا؟"

"جی، جی فرینڈ صاحب آپ کیا؟..." حوالدار گھبرا گیا۔

"خیر خیر۔" سب انسپکٹر حوالدار کی بات کاٹ کے مسکراتے ہوئے بولا۔ "یہاں یہ کام زیادہ سلیقے سے کیا جاتا ہے۔" پھر وہ تیکھی آواز میں کہنے لگا۔ "ذرا پانی وانی پلاؤ مہمانوں کو، تھکے ہوئے ہوں گے۔ پھر کچھ کام کی بات بھی ہو جائے۔"

حوالدار کے زرد دانت کھل اُٹھے۔ "جو مانگیں گے، ملے گا حضرت! سرکاری مہمان ہیں۔ اِدھر سب چیز کا انتظام ہے۔"

"ریاست میں بھی مہمان لگتے ہیں؟ کیوں؟"

میں نے اور پیرو نے کوئی جواب نہیں دیا۔

سب انسپکٹر کے گول چہرے پہ سُرخی چھانے لگی۔ "بلاؤ ذرا فضل صاحب کو، بہی کھاتا اِدھر ہی لے کے آ جائیں۔" اُس نے حوالدار کو حکم دیا اور فائل سامنے سے ہٹا کے پان کی ڈبیا کھولی اور ایک اور بیڑا منہ میں دبا کے بولا۔ "چاقو، خون، ہاتھا پائی، دھونس، دھاندلی، دہشت گردی، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۵۰۶۔ سُن رہے ہو؟" ہم سے مخاطب تھا۔

"سُن لیا ہے۔" پیرو نے بھاری آواز میں جواب دیا۔

سب انسپکٹر کی آنکھوں کی چمک اور تیز ہو گئی۔ "سُن لیا ہے، اچھا کیا ہے۔ پھر یہ بھی جانتے ہو گے کہ ان باتوں کے لیے موٹی موٹی کتابوں میں کیا کچھ لکھا ہوتا ہے۔"

"یہ بھی جانتا ہے۔" پیرو نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"بہت اچھا ہے، ویری گڈ، ویری گڈ۔" وہ پلکیں پیٹتے ہوئے بولا۔ "تجربہ کار معلوم ہوتے ہو۔"

"آپ ہی لوگ سے سب سیکھا ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے، کچھ زیادہ ہی سیکھ لیا ہے۔"

"ابھی یہ آپ سمجھو۔" پیرو تنک کے بولا۔

اتنے میں عمر رسیدہ محرّر دوسرے کمرے سے روزنامچہ لے کے آ گیا۔ اُس کا نام سب انسپکٹر نے فضل لیا تھا۔ فضل تھکا تھکا، بگڑا ہوا منہ لے کے اندر آیا تھا لیکن ہم پر نظر پڑتے ہی اُس کا جسم اکڑ سا گیا۔ سب انسپکٹر نے اُس کے ساتھ حوالدار کو بھی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا، دو سپاہی ہمارے دائیں بائیں کھڑے رہے۔ "دیکھ رہے ہو؟" سب انسپکٹر نے ہماری طرف نگاہیں جماتے ہوئے محرّر فضل سے کہا۔

"دیکھ رہا ہوں جناب!" محرّر مستعدی سے بولا۔ "نام ور لوگ جان پڑتے ہیں۔"

"آمنی کاٹنے کے بعد ہی یہ نظر پیدا ہوتی ہے، یہی بول رہا ہوں۔" سب انسپکٹر نے آنکھ کے کہا۔ "ذرا احتیاط سے قلم چلانا۔ یہ اور تو سب کچھ لکھو لو گے، یہ تیور کیسے لکھو گے؟ سینہ چار انگل آگے نکلا ہوا ہے۔"

"یہ بھی لکھوا دو صاحب!" پیرو نے اُونچی آواز میں کہا۔ "پہلی بار کسی کو دیکھا ہے کیا؟"

"یہ تو ابھی معلوم ہو جائے گا، کس نے کس کو پہلی بار دیکھا ہے۔" سب انسپکٹر کے بجائے محرّر فضل نے تیوری چڑھا کے کہا۔ "سوچ سمجھ کے زبان چلاؤ۔"

"یہ ہنر آتا تو ہم کو یہاں دیدار کیسے نصیب ہوتا۔" میری توقع کے خلاف سب انسپکٹر نے تھمے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پہلے شجرہ لکھ لو فضل میاں! باقی باتیں اطمینان سے ہوں گی۔"

"بہتر ہے جناب!" محرّر نے ناگواری سے کہا اور بہ عجلت روزنامچہ کھولنے لگا۔ قلم روشنائی میں ڈبو کے تلملاتے ہوئے اُس نے پھر ہم سے پوچھا۔ "نام؟ نام بولو۔"

"ابھی پہلے اپن کا بات سُن لو۔" پیرو نے بوجھل لہجے میں کہا۔

"میں نے کیا پوچھا ہے۔" وہ غصے سے بولا۔ "نام بولو۔"

"اِس کو بھرنے کا ایسا ہی شوق ہے تو اپن ابھی ادھر تمھارے ہی پاس ہیں۔"

"ساتھ ساتھ یہ شوق بھی جاری رہے تو کیا فرق پڑتا ہے۔" سب انسپکٹر اِٹھلاتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اپنے فضل میاں کا قلم گرمی میں ہی کچھ روانی دکھاتا ہے، عزت بھاؤ کے چڑھاؤ میں۔ ٹھنڈا کھانے کی عادت نہیں ہے اِن کو۔"

"اپن بولتا ہے، اس کو لکھنے کا ابھی ایسا ضرورت نہیں ہے۔"

"کیا خیال ہے فضل میاں! ہم کرسی چھوڑ کے چلیں؟"

"آپ ابھی اپن کی جگہ آ جاؤ تو زیادہ سمجھ میں آ جائے گا۔" پیرو نے ترشی سے کہا۔ "اپن ادھر ایک دم اجنبی ہے، تمھارے شہر کا یہی ریت ہے

تو ٹھیک ہے، ابھی اپن ایدر آ ہی گیا ہے پر کاغذ کالا کرنے سے پہلے اچھا ہے اپن کا بات دھیان سے سن لو، اس کے بعد جو مرضی ہو کرنا۔ کرسی پر تم بیٹھا ہے اپن نہیں جس سُر میں چاہو بولو، جواب میں اپن ٹھیکا لگائے گا تو تم کو اچھا نہیں لگے گا، بات بھی اولٹا ہو جائے گا۔ ایدر اگر چھان پھٹک کرنا پولیس کو نہیں آتا تو اپن سکھانے کو بولا۔ یہ بال اپن نے بھی دھوپ میں سپید نہیں کیا ہے، ابھی تم سے بڑا بھی کرسیاں دیکھا ہے اور تم سے بڑا....“ پیرو نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور دبی ہوئی آواز میں بولا: ”ابھی اجازت ہو تو کچھ بولے۔“

سب انسپکٹر متجسس نگاہوں سے اُسے دیکھتا رہا اور کچھ نہیں بولا۔ پیرو نے اس کی باقاعدہ اجازت ضروری نہیں سمجھی اور مختصراً اُسے بتانے کی کوشش کی کہ موسیٰ ندی کے گھاٹ پر ہم ایک شناسا کو ڈھونڈنے گئے تھے کہ چار آدمیوں نے ایک سنسان سی جگہ ہمیں گھیر لیا اور چاقو تان کے رقم کا مطالبہ کرنے لگے۔ ہمیں ناچار انھیں سنبھالنا پڑا۔ بھاگ جاتے تو بات اتنی آگے نہ بڑھتی لیکن وہ اَڑے رہے اور ہم نے وہی کیا جو اس صورتِ حال میں کوئی بھی کر سکتا تھا۔

بات بہت سیدھی تھی، پیرو یہی کہہ سکتا تھا کہ سب کچھ حادثتہً پیش آیا تھا، بالکل اچانک۔ یہ بتانا بے معنی تھا کہ وہ مسلسل ہمارا پیچھا کر رہے تھے اور ہم عمداً انھیں ایک ایسے مقام پر لے آئے تھے جہاں اُن کا مقصد آسانی سے جانا جا سکے۔ اس بات پر کسی کو یقین نہ آتا۔ وہ ہزار سوال کرتے کہ پھر ہم نے تھانے میں آ کے اُن کی شکایت کیوں نہیں کی، سڑکوں پر تعینات کسی سپاہی سے مدد کیوں نہیں لی۔ وہ لوٹ کے پوچھتے کہ آخر پھر اُن چاروں کے تعاقب کا کون سا اہم مقصد ہم پر منکشف ہوا۔ بات آکا اور کالے تک بھی پہنچ سکتی تھی۔ البتہ پیرو نے شک ظاہر کیا کہ شاید وہ بہت پہلے سے ہماری تاک میں تھے۔ شام کے وقت عابد شاپ روڈ سے ہم نے ساڑیاں خریدی تھیں۔ وہاں کہیں کسی نے ہمارے پاس موجود رقم کی جھلک دیکھ لی ہوگی۔ سب انسپکٹر، حوالدار، محرر اور سپاہی خاموشی سے پیرو کی روداد سنتے رہے، بیچ میں نہیں بولے۔ پیرو نے انھیں اس کا موقع بھی نہیں دیا تھا لیکن محلّے والے پہلے ہی اُن کے کان بھر چکے تھے۔ خود اُن چاروں آدمیوں نے بھی اُن سے کچھ کہا ہی ہوگا۔ گو ہمارے وہاں گلی سے نکلنے اور یہاں تھانے تک آنے میں اتنا وقت نہیں لگا تھا۔ اس اثنا میں انھیں اُلٹی سیدھی بے ربط شہادتیں ہی سننے کو ملی ہوں گی لیکن لوگوں نے کتنے مبالغے سے کام لیا تھا، ہم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے تھے۔ بہرحال کچھ کہنا خاموشی سے بہتر تھا، پیرو نے اختصار پر اکتفا کیا۔ اِس طرح اُن پر یہ ظاہر کرنا بھی مقصود تھا کہ وہ ایک نہایت معمولی بات پر حجت کر رہے ہیں۔“ پیرو کے چپ ہوتے ہی سب انسپکٹر دھمکتی سی آواز میں بولا: ”کیسا سادہ اور معصوم سا واقعہ ہے۔ اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا۔ کیوں فضل میاں! وہ کیا کہا ہے کسی شاعر نے ع اِس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا“

”کار سوائی کرو صاحب، اپنے کو ابھی اور کچھ نہیں بولنا۔“

”تم اور بول بھی کیا سکتے ہو؟“ یک لخت وہ بھڑک کے بولا: ”تم نے سمجھا ہے کہ یہاں سب اُلّو کے پٹھے بیٹھے ہیں۔ تمھارے بہ قول اُن کی خطا اتنی تھی کہ اُنھوں نے رقم کے لیے تم پر چاقو نکالا تھا اور تم نے اُن پر قابو پا لیا تھا۔ اس دوران اُن کا ایک ساتھی زخمی ہو گیا۔ خون سے نہ صرف اُس کے کپڑے تر بتر ہوئے بلکہ زمین لال ہو گئی۔ پھر وہ سسکتے بلکتے تم سے معافیاں مانگتے رہے، تم نے نہیں چھوڑا۔ محلّے والے بیچ بچاؤ کرانے کے لیے آگے بڑھے تو تم نے انھیں بھی جھڑک دیا۔ الٹی انھیں دھمکی دی کہ اُن کی مداخلت کا نتیجہ بُرا ہوگا۔ اُن کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے بجائے تم نے انھیں مشتعل کر دیا، انھیں چاقو دکھایا۔ سارے محلّے میں غنڈہ گردی مچا دی اور پھر تم وہاں سے سر اُٹھائے ہوئے چل دیے۔ تمھارا خیال ہے، ہم تمھاری کہانی پر یقین کر لیں گے اور آگے جا کے بھی تم یہی رنگ لگاؤ گے۔ یہاں سے وہاں تک سب اندھے اور بہرے بیٹھے ہیں“

وہ کسی حد تک ٹھیک ہی کہہ رہا تھا، پیرو کے بیان میں بہت سے سقم تھے مگر اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا تھا۔ ہم اُسے اور کس طرح باور کراتے کہ ہمارا کوئی قصور نہیں تھا۔ ہمارے سان وگمان میں بھی نہ تھا کہ یہاں بھی کوئی ہمارا منتظر ہوگا۔ ہم تو اپنے ہوٹل جا رہے تھے کہ وہ راستے کا پتھر بن گئے۔ سب انسپکٹر آنکھیں لال پیلی کیے گرجتا رہا، اُس نے جیسے پہلے ہی ہمارے بارے اپنے ذہن میں کچھ طے کر رکھا تھا۔ اس کے باوجود پیرو نے اُسے مطمئن کرنے کی پوری کوشش کی۔ اُس نے اُسے بتایا کہ سب کچھ اتنی تیزی سے پیش آیا کہ کسی کے بھی اوسان ٹھکانے نہ رہ سکتے تھے۔ اُن کے پاس چاقو تھے اور اُن کی تعداد ہم سے زیادہ تھی۔ قابو پا کے انھیں فوراً چھوڑ دینے میں اندیشہ تھا کہ وہ پلٹ نہ پڑیں۔ اُن سے دست برداری بھی ممکن تھی جب اُن کی طرف دوبارہ ایسی جرأت نہ کرنے کا اعتبار ہو جائے۔ ذرا سی چوک ہو جاتی تو وہ چاقو جو اُن کے ساتھی کو لگا تھا، ہمیں نشانہ بنا سکتا تھا۔ ہمارے پاس معقول رقم کا جو اثاثہ تھا، اُس کے چھن جانے کا ہر خدشہ تھا۔ اس پردیس میں پھر ہم کہیں کے بھی نہ رہتے۔ کیا انھیں سبق نہیں ملنا چاہیے تھا کہ آیندہ وہ کسی اجنبی پر ہاتھ ڈالتے ہوئے یہ تجربہ نہ بھولیں۔ ایسے لوگوں کا تعلق عموماً شہر کے کسی نہ کسی دادا کے گروہ سے ہوتا ہے۔ ہماری کوشش یہ تھی کہ احتیاطاً ہم اُن کے سرغنہ

کا نام بھی جان لیں، کہیں دور ذہن کے کسی گوشے میں ایک یہ احساس بھی چھپا ہوا تھا کہ انھیں ہمارے کسی دشمن نے تو تعینات نہیں کیا ہے۔ ہمارے شہر کا کوئی دشمن کرائے پر یہاں اُن کی خدمات حاصل کر سکتا تھا۔ اُن سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ اپنے رنگ ڈھنگ سے وہ چھٹے ہوئے ہی معلوم ہوتے تھے اور کسی رعایت کے لائق نہیں تھے۔ پیرو نے اعتراف کیا کہ لوگ بے شک درمیان میں آئے تھے لیکن انھیں پورا واقعہ ہی معلوم نہیں تھا۔ وہ آتے ہی کچھ جانے بوجھے بغیر ہمیں ہم سے اوندھے سوندھے جھگڑنے لگے جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ اُن لوگوں کی شہ پا کے وہ ہمارے لیے اور خطرہ بن سکتے تھے۔ زخمی شخص کی طرح کہ انھیں شیر کرنا بشر کی توہین ہے۔ ہمیں یہ بھی بھروسا نہیں تھا کہ آنے والے محلّے کے لوگوں میں کتنے اُن کے ساتھی، شناسا اور اُن کے ہی خواہ ہیں، ان کا تعلق بھی کہیں اُس محلے اور اس کے مکینوں سے تو نہیں ہے اسی لیے ہم نے انھیں اپنے قریب پھٹکنے کی اجازت نہیں دی۔ اپنی جان اور اثاثے کی حفاظت کے لیے لازم تھا کہ ہم مشتعل محلّے والوں کو دور ہی رکھیں۔ ہم نے یہی کیا، یہی ہمیں اپنے لیے بہتر نظر آتا تھا۔ محلّے والوں سے ہمیں کسی سلوک کی اُمید نہیں رہی تھی۔ وہ ایک پورا ہجوم تھا، ہم صرف دو تھے اسی لیے ہم اُن چاروں میں سے ایک کو ڈھال بنائے ہوئے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ پیچھے پھر بھی وہ شور مچاتے رہے۔ انھیں روکنے کے لیے آخری چارۂ کار کے طور پر ہمیں اُس آدمی کو بے بس کرنا اور چاقو دکھانا پڑا لیکن ہم نے اُسے چاقو مارا نہیں۔

”تم نے بڑا احسان کیا۔“ سب انسپکٹر کی آواز میں زہر بھرا ہوا تھا۔ ”اور تم، تم نے اُس کے بعد پولیس میں آنا بھی ضروری نہیں سمجھا کیونکہ سارا فیصلہ تو تم نے خود کر دیا تھا۔“

”اپنا ارادہ پہلے ایدر ہی آنے کو تھا پر راستے میں بدل گیا۔ اپن اُلجھن میں پڑ گیا تھا کہ ابھی پہلے ایدر آئے یا اپنا ٹھور ٹھکانا کرے۔ رات ختم ہو گیا تھا۔ اپن بعد کو بھی ایدر آ سکتا تھا۔ ساتھ اور بھی بہت سا بات اپن کے مغز میں بھرا تھا، اُس کو بولنے کا ضرورت نہیں۔ تم ابھی خوب سمجھتا، جانتا ہوگا۔“

پیرو نے وہ عام سی کہانی یوں ہی نہیں دُہرائی تھی۔ اُسے احساس تھا کہ بعد میں اُسے کیسے کیسے سوالوں سے سابقہ پڑ سکتا ہے۔ وہ کسی جھجک کے بغیر ہر سوال کا جواب دیتا رہا اور پورے شدّ و مد کے ساتھ تھا اور وہ سب کچھ ایسا بے جواز، بے دلیل بھی نہیں تھا جیسا مجھے پہلے نظر آتا تھا۔ سب انسپکٹر کسی وکیل کی طرح اُس سے جرح کرتا رہا۔ اس نے آکا اور کالے کا نام نہیں لیا تھا۔ اُس کا مطلب تھا کہ محلّے والوں اور اُن چاروں نے آکا اور کالے کے بارے میں پولیس کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ محلّے والے دیر سے درمیان میں آئے تھے۔ اس سے پہلے وہ تینوں آکا اور کالے کے متعلق ہمیں خاصا کچھ بتا چکے تھے۔ آنے کے بعد محلّے والوں نے باقی کچھ اُن تینوں کی زبانی سنا تھا۔ پتہ نہیں وہ اُن کے کس قدر پلّے پڑا۔ وہاں اُس وقت بہت ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔ اذیت میں وہ تینوں بھی ٹوٹے پھوٹے بے ربط سے فقرے بول رہے تھے۔ بہرصورت سننے والوں سے آکا اور کالے کے سلسلے میں پولیس کو کچھ پتہ بھی چلا تھا تو وہ کوئی رائے قائم نہیں کر سکی تھی ورنہ سب انسپکٹر اس کا ذکر کرنا نہ بھولتا۔ خود اُن چاروں نے بھی اپنے اڈّے اور استاد کا نام لینے میں احتیاط کی ہوگی اور کوئی اور ہی کہانی بتائی ہوگی۔ پیرو کو جیسے یقین تھا کہ اُنھوں نے آکا اور کالے کا نام نہیں لیا ہوگا اس لیے وہ اپنی روداد پر اصرار کرتا رہا اور اُس نے اپنے بیان میں سرِ مو تبدیلی نہیں کی۔ یہ بھی ایک تدبیر ہوتی ہے کہ ابتدا میں جو منہ سے نکل جائے اُس پر آخر تک جما رہا جائے اور پیرو کے منہ سے یہ سب کچھ یوں ہی نہیں نکل گیا تھا مگر ایسا لگتا تھا کہ سب انسپکٹر کو ہم سے کوئی پرانی عداوت ہے، ہماری صورتوں سے چڑ ہے یا بہت دنوں بعد تھانے میں کوئی ایسا معاملہ اُس کے سامنے آیا ہے۔ اُسے شاید بہت سی باتوں پر حیرت تھی، اُن چاروں پر ہمارا قابو پانا جن کا ریکارڈ پولیس کے پاس موجود ہوگا۔ بیچ میں پڑنے والوں کو ہمارا پھٹکار دینا اور اُن کی بھیڑ چھانٹتے ہوئے آسانی سے نکل جانا۔ ایک نہیں کئی حیرتیں اُس کے دماغ میں کلبلا رہی ہوں گی۔ بعد میں جائے وقوع پر پہنچنے والے سپاہیوں سے محلّے والوں نے خوب حاشیہ آرائی کی ہوگی۔ انھیں بتایا ہوگا کہ کس طرح ہم نے اُن کی گردنیں دبوچ رکھی تھیں۔ سب انسپکٹر کی وحشت سے ظاہر ہوتا کہ اُسے حیرت ہمارے بیان پر نہیں، خود ہم پر ہے۔ ہم کون ہیں، ہمارے بارے میں جاننے کے لیے وہ بُری طرح بے چین نظر آتا تھا۔ کرید کرید کے متعلق اور غیر متعلق سوال کرتا تھا مگر وہ پیرو سے کچھ اور حاصل نہ کر سکا۔

ہم نے اُسے اپنے نام بھی مختلف بتائے تھے، ولدیت بھی مختلف، پتے بھی خود ساختہ۔ پیشہ کاروبار بتایا تھا اور کہا تھا کہ بمبئی کے بھنڈی بازار میں ہمارا ایک ٹھیا ہے۔ اس کے علاوہ سارے ہندوستان سے مختلف قسم کی چیزیں ہم بمبئی سپلائی کرتے ہیں۔ حیدرآباد کاروبار ہی کی غرض سے آج پہلی بار آنا ہوا ہے۔ آج سہ پہر ہی آئے تھے۔ ہمارا مختصر سامان موسیٰ ندی کے گھاٹ کے ہنگامے کی نذر ہو گیا۔ کپڑوں کے علاوہ ہم نے جو ساڑیاں خریدی تھیں، وہ بھی وہیں رہ گئیں۔ پیرو یہ بتانے سے بھی نہیں چُوکا کہ سامان میں کچھ رقم اور جیولری کے نمونے تھے۔ رقم معمولی تھی لیکن وہ سب کچھ ہم سے چھن گیا۔ ویکاجی ہوٹل، زودرا، مارتی اور آبا جان کی ہوا بھی اُسے ہم نے نہیں لگنے دی۔ نام اور ولدیت کے سوا میں

ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ سب کچھ پیرو ہی بولتا رہا۔ میرے اور پیرو کے لہجے کا فرق سب انسپکٹر کو فوراً محسوس ہو گیا تھا اسی لیے کہنا پڑا کہ میں دلی میں پیدا ہوا تھا، عرصے سے بمبئی میں ہوں اسماعیل (پیرو) کے ساتھ ہی کام کرتا ہوں۔ پیرو نے سب انسپکٹر کو اچھی طرح جتا دیا تھا کہ وہ آگے جا کے یہی سب کچھ دہراتا رہے گا۔ اُس کے عزم، اُمید اور بے باکی سے سب انسپکٹر تلملا رہا تھا۔ پیرو چاہتا یہی تھا کہ وہ اُسے اپنے اعتماد سے متزلزل کر سکے، ہمیں یہاں سے کسی طور اسی وقت نجات مل جائے۔ اُدھر ہوٹل میں اباجان راہ تک رہے ہوں گے۔ ہم اُن سے واپسی میں دیر ہو جانے کا کہہ کے آئے تھے لیکن دیر سے مراد یہ نہیں تھی کہ رات واپس ہی نہ پہنچیں۔ وہ نہ کسی سے پوچھ سکتے تھے، نہ اُنھیں کوئی ایسا نشان معلوم تھا جہاں ہمارا سُراغ لگا سکیں۔ اباجان کے علاوہ اور بھی بہت سی وجوہ سے ہمارا اسی وقت یہاں سے نکل جانا سود مند تھا۔ ایک رات گزر جانے کے بعد ضروری نہیں تھا کہ صبح ہی وہ ہمیں متعلقہ حاکم کے سامنے پیش کرے۔ وہ ہمارے بارے میں اور معلومات اکٹھی کرنے کے لیے ہمیں روک سکتا تھا، جس سے اور پیچیدگی ہی پیدا ہوتی۔ چھان بین کرنے پر اُسے یہ بھی معلوم ہو سکتا تھا کہ میں نے کچھ عرصے پہلے محبوب کی ہنڈی میں ... ناہ کمپ کر بے دخل کر دیا تھا اور پیرو نہیں تو میں پہلی بار حیدرآباد نہیں آیا ہوں اور جانے کیا کیا۔ پیرو نے اپنے پاس موجود رقم کا تذکرہ اسی وجہ سے بار بار کیا تھا کہ لے دے کے کام بن سکے تو بھی برا نہیں ہے۔ سب انسپکٹر کے چہرے میں جنبش نہیں ہوئی۔ اُس کا انداز، لب و لہجہ پہلے کی نسبت یک سر بدلا ہوا تھا۔ آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ شدتِ غضب میں اُس کی زبان ہکلانے لگتی تھی۔ پیرو نے خود کو بہت روکا لیکن سب انسپکٹر کی اوٹ پٹانگ باتوں پر اُس کی آواز بھی تمتمانے لگتی تھی۔ مجھے کرشنا جی بہت یاد آ رہے تھے، وہ بھی ایک پولیس افسر تھے۔ ہمیشہ نرمی اور اخلاق سے بات کرتے اور بڑے بڑے معاملات منٹوں میں حل کر دیتے۔ ایک یہ شخص تھا، ہمیں کوئی جانور سمجھ رہا تھا جیسے ہم کوڑے کے ڈھیر سے اُٹھ کے آئے ہوں۔

"بس صاحب! ابھی اپنے سے زیادہ چک چک مت کرو۔" دیر بہت ہو گئی تو پیرو نے بیزاری سے کہا۔ "ابھی آپ کو جو کرنا ہو، فیصلہ کر دو۔ اپن کو جو منہ ماری کرنا تھا، کر دیا۔ ہو سکے تو اپنے پر بھروسا کرو، نہیں کرتا تو ادھر اپنا حکم نہیں چلتا۔ اپن اُودھر جا کے ہی ابھی کچھ بولے گا، جدھر کوئی سُنے گا بھی۔ ادھر ایک اکیلا تمھی ہے۔ آگے تم سے بڑا بھی کوئی حاکم بیٹھتا ہے۔ سالا اتنا سا بات آسمان پر چڑھا رہا ہے۔ ابھی کون سا دُنیا اُوپر نیچا ہو گیا ہے۔ اپن کی سمجھ میں ایک دم تمھارا کیڑا نہیں آیا۔ تم کوئی ادھر کا بادشاہ ہے! کیا ہے تم؟ کیا مانگتا ہے؟ اپنے کو تم یا تو چڑیلا یا پھر کوئی بہت اونچا آدمی لگتا ہے۔ لگتا ہے پولیس میں نوا نوا آیا ہے۔ پہلے کسی نوٹنکی میں کام کرتا تھا کیا؟"

"اوقات سے مت بڑھو۔" حوالدار نے کھڑے ہو کے کہا۔ وہ اُٹھا اسی طرح تھا کہ بڑھ کے پیرو کو طمانچہ مارے گا لیکن پیرو کا چہرہ دیکھ کے ٹھٹک گیا اور آتشیں لہجے میں بولا۔ "یہ ...... تھانا ہے۔"

"اپن بھی کوٹھا نہیں سمجھ رہا ہے۔"

"یہ اندلس کے کمرے کے لوگ ہیں جناب!" محرر فضل نے لقمہ دیا۔

"پھندا ابھی ادھر منگوا لو۔" پیرو نے تلخی سے کہا۔

"تم اپنے لیے بہت بُرا کر رہے ہو۔"

"تم ابھی اپنے ساتھ کون سا اچھا کر رہا ہے۔"

"ٹھیک ٹھیک بول دو تو تمھارے حق میں اچھا ہو گا۔" ...نے سب انسپکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے بوکھلائی ہوئی آواز میں...

"کیا تعلق تھا اُن لوگوں سے تمھارا؟ کتنی رقم کا معاملہ تھا؟"

"ابھی تم اپن سے مخول کرتا ہے حوالدار!"

"دیکھو، صاحب کا غصہ مول مت لو۔"

"صاحب کے پاس اور کوئی چیز ہو تو سودا ابھی کرے۔ تو ایک ہی چیز رکھتا ہے۔"

"ہم بولتے ہیں ایسی ویسی کوئی بات ہے تو بالکل مت چھپاؤ۔ جھوٹوں اور دھوکا دینے والوں کے لیے صاحب کے پاس کوئی گنجائش نہیں ہے۔"

"ابھی تم بار بار کیا ٹنگی مارتا ہے۔" پیرو نے بگڑتے ہوئے ...میں کہا۔ "اپنے کو حوالات کا رستہ دکھاؤ۔ ابھی ویری کس بات کا۔"

"حرام زادے!" سب انسپکٹر دہاڑنے لگا۔ "اب حوالات جانے کی جلدی ہے۔ پہلے سیدھے اِدھر آتے ہوئے میّا مرتی تھی۔"

"اپن کا منہ میں بھی زبان ہے اور چلّانا بھی تم سے اچھا آتا ہے۔ بولو جتنا اپن سن سکے۔" پیرو کی آواز بھرّا گئی تھی۔ میں فوراً اُس کا شانہ تھام لیا۔ مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں وہ جھپٹ سب انسپکٹر کی زبان نہ کھینچ لے۔ سب انسپکٹر کو بھی شاید کچھ ... ہو گیا تھا۔ پسینے سے اُس کی پیشانی خرابور ہو گئی تھی۔ ایک ... کے توقف کے بعد کمرے میں پھر پیرو کی آواز گونجی۔ "ابھی اپن آخری بات بولتا ہے۔" اُس کا لہجہ حیرت انگیز حد تک نرم تھا۔ "اپن کو عدالت پیشی سے ایک دم کرامت سمجھو۔ جاننا آگے کیا ہونا ہے، کیا ہو سکتا ہے۔ تم کیا، اپن کیا کر سکتا

تم کتنا، اپن کتنا دور جا سکتا ہے۔ اپن بولتا ہے کہ ادھر تمھارا شہر ہی رہے گا۔ جب بولو گے، چلا آئے گا۔ ابھی یقین نہیں آتا تو ساتھ ہوٹل میں سپاہی رکھ دو۔ جب تک تم خلاصی کی گھنٹی نہیں بجائے گا، اپن ادھر سے بھاگے گا نہیں۔ اپنے پاس بڑا رقم بھی ضمانت میں اس کو ابی ابھی ادھر چھوڑ سکتا ہے۔ اپنا تمھارا کوئی دشمنائی نہیں ہے۔ ہے تو بولو، پھر اپن تم سے کسی دوسرا ڈھب میں بات کرے۔"

سب انسپکٹر خشونت آمیز نظروں سے ہمیں دیکھا کیا اور اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پہلی بار مجھے اُس کے چہرے پر کسی قدر نرمی کے آثار نظر آئے تھے۔ میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ اے کاش، خدا اس کے دل میں کچھ رحم ڈال دے۔ میرا نفس نفس اُس لمحے یہی دُعا کر رہا تھا۔ پیرو نے ہر جتن کر کے دیکھ لیا تھا۔ اب سب کچھ انسپکٹر پر منحصر تھا۔ دیر تک وہ گومگو کی حالت سے دوچار رہا مگر رفتہ رفتہ اُس کے چہرے پر وہی کھنچاؤ پیدا ہو گیا اور اُس نے یکایک مشتعل آواز میں حوالدار کو حکم دیا۔ "ان کی تلاشی لو۔"

پیرو نے پھر کچھ نہیں کہا، نہ میں نے۔ حوالدار تلاشی کے لیے اُٹھا تو ہم نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ مزاحمت کرنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا۔ میری جیبوں کا سارا سامان ناگ پور اسٹیشن کے تھانے ہی میں رہ گیا تھا۔ انھوں نے جیبوں اور نیفے کی تلاشی بہ آسانی کی۔ گریبان تک اُن کے ہاتھ نہیں گئے اور میری مالا میرے پاس ہی محفوظ رہ گئی۔ پیرو نے بھی اپنا چاقو اُسی گلی میں پھینک دیا تھا جہاں ہم نے پولیس دیکھ کے رکشا مُڑوا دیا تھا، البتہ پیرو کی جیب سے نوٹوں کی کئی گڈیاں برآمد ہوئیں۔ ہزاروں روپے کے یہ قدرے سونیا کے بے سُدھ ہو جانے کے بعد ناگ پور اسٹیشن پر جب پیرو، زہرا اور طارق مجھ سے اور اباجان سے الگ ہو گئے تھے تو زر و جواہر کی پوٹلی اور لکھنؤ میں بیچے جانے والے پتھروں کی ڈھائی لاکھ کے قریب رقم بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ یہی سب سے بڑی وجہ اُن کے الگ ہونے کی بھی تھی۔ انھوں نے طے کیا تھا کہ وہ اسٹیشن پر اُتر جائیں اور جیسے ہی گاڑی پلیٹ فارم سے کچھ آگے نکلے، اباجان زنجیر کھینچ کر اور پولیس کو طلب کر کے سونیا کی لاش اُس کے حوالے کر دیں۔ وہ تینوں ساتھ ہوتے تو اور طوالت پیش آ سکتی تھی، خصوصاً نایاب پتھروں اور اتنی بڑی رقم کی موجودگی میں۔ حیدرآباد آ کے انھوں نے وہ تمام چیزیں یقیناً اباجان کو واپس کر دی ہوں گی لیکن پیرو کی جیب سے گڈیاں نکلنے سے ظاہر تھا کہ اباجان نے کچھ رقم احتیاطاً اُس کے پاس ہی رہنے دی ہے یا ممکن ہے پہلے ہی سے پیرو کے پاس اتنے روپے ہوں، مغل نے اُسے دیے ہوں۔ بہرحال مجھے ٹھیک طرح کچھ علم نہیں تھا کہ کتنی رقم اباجان کے پاس ہے کتنی دوسروں کے پاس۔

گڈیاں دیکھ کے اُن کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں۔ وہ گم صم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور سب انسپکٹر کوئی فیصلہ نہ سنا سکا مگر یہ محض چند لمحوں کا تذبذب و تردد تھا کہ اُس نے حقارت آمیز انداز میں حوالدار کو اشارہ کیا۔

حوالدار نے زیرِ لب اُس سے کچھ کہنے کی کوشش کی تو سب انسپکٹر آنکھیں نکال کے اُس پر گرجنے لگا۔ "۳۰۲ بن گئی تو تمھارا باپ آ کے سنبھالے گا؟"

"۳۰۲ ابھی ایک دم نہیں بنتا ہے صاحب!" پیرو نے دبی زبان سے کہا۔

سب انسپکٹر نے جیسے سُنا ہی نہیں۔ اُس نے سرگوشی میں حوالدار سے کچھ کہا۔ حوالدار نے وفاداریوں کے انداز میں سر جھکایا اور ہمارے دائیں بائیں کھڑے ہوئے سپاہیوں نے ہمارے گرد محاصرہ تنگ کر لیا۔

وہ ایک تنگ و تاریک کمرہ تھا۔ تین اطراف مٹیالی دیواریں اور ایک طرف سلاخیں تھیں، سلاخوں سے باہر ٹمٹماتے ہوئے قمقمے نے اندر کسی قدر اُجالا کر رکھا تھا۔ شروع میں ہم اندھوں کی طرح داخل ہوئے تھے لیکن کچھ دیر میں آنکھیں مانوس ہو گئیں۔ فرش پختہ اور ٹھنڈا تھا، کمرے میں کوئی بُرسی سی پھیلی ہوئی تھی۔ دن بھر چلتے رہنے سے ویسے ہی سارا جسم ٹوٹ سا رہا تھا، پیرو اندر آتے ہی دیوار سے ٹیک لگا کے خاموش بیٹھ گیا تھا۔ اب اُسے خیال آ رہا ہو گا کہ صبح میری بات مان لیتا تو یہ نوبت نہ آتی مگر اس کا کیا قصور تھا۔ قصور تو سارا نصیب کا تھا۔ نصیب جس کے سامنے زر و جواہر بھی کچھ نہیں کر پاتے، آدمی دیکھتا رہ جاتا ہے۔ جب میں پیرو کو منع کر رہا تھا تو مجھے کون سا الہام ہوا تھا۔ میں نے تو اُن سبھی کے خیال سے کہا تھا کہ اگر پھر کہیں مولوی صاحب کا کوئی غلط سلط پتہ ملا تو انھیں اور دیر ہو جائے گی۔ یہ سب تو میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔ رات ابھی زیادہ نہیں ہوئی تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اباجان کی بے کلی بھی بڑھ رہی ہو گی۔ زہرا اور طارق نیچے ہوٹل کی راہ داری اور دروازے تک جا جا کے دیکھتے ہوں گے۔ ممکن ہے تلاش میں اب تک نکل کھڑے ہوئے ہوں مگر وہ کہاں تک جائیں گے اور کس سے کیا پوچھیں گے۔ کوئی بھی نہیں تھا جو اُن سے اتنی سی بات جا کے کہہ دیتا کہ وہ سیدھے بمبئی چلے جائیں، اب ہمارا انتظار نہ کریں، ہمارا کچھ طے نہیں ہے، جانے کتنی دیر لگ جائے۔ جب تک ہم سب انسپکٹر کے سامنے تھے، ایک اُمید سی بندھی ہوئی تھی مگر اب کچھ نہیں رہا تھا۔ پولیس زخمی شخص کی ڈاکٹری رپورٹ کا انتظار کرے گی اور مزید تفتیش بھی۔ وہ ہمیں حوالات میں کئی دن روک سکتے تھے۔ بعد میں منصف کے سامنے پیش ہونے پر بھی کچھ ٹھیک نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر میں اور کیا فیصلہ کرے۔ ایک رات

کیا، بہت سی راتیں لگ سکتی تھیں۔ اُدھر آکا کی بھی یہی خواہش ہوگی کہ ہم یہاں سے کبھی نہ نکلیں۔

سلاخوں سے باہر پہرے پر ایک ہی مسلح سپاہی تھا۔ وہ گاہے گاہے ہماری طرف گشت لگاتا اور کمرے سے کچھ دور رکھی ہوئی کرسی پر جا کے بیٹھ جاتا تھا۔ حوالات میں ہمارے سوا کوئی نہیں تھا ورنہ تھوڑی بہت آواز چہکار مزید ہوتی۔ ہمارے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ میں نے اور پیرو نے برسوں جیل میں گزارے تھے۔ ابھی ایک روز پہلے تین دن ناگ پور کی حوالات میں رہنا پڑا تھا۔ اس سے پہلے تبت سے نکلتے آنے کے فوراً بعد بھی ہم نے تھانے ہی کا منہ دیکھا تھا۔ تبت میں منڈ کے تہہ خانے بھی حوالات سے کم نہیں تھے لیکن یہاں ایک ایک پل کاٹنا مشکل ہو رہا تھا۔ پیرو کی خاموشی سے مجھے اور گھٹن ہو رہی تھی۔ کئی بار میں نے اُسے ٹوکنے، اس سے بات کرنے کا ارادہ کیا لیکن اُس کا پھولا ہوا چہرہ دیکھ کے میری ہمت نہیں پڑی اور مجھے اُس سے کہنا بھی کیا تھا۔ کون سی ایسی بات تھی جس کا جواب مجھے دینا تھا یا اُس سے کچھ جاننا تھا۔ میری طرح اُس کی نگاہوں میں بھی اُن تینوں کے چہرے گھوم رہے ہوں گے۔ رات بھر انھیں ایک پل نیند نہیں آئے گی۔ کوئی اور ہوتا تو انھیں اتنی بے تابی نہ ہوتی۔ وہ ہم تھے جو ہتھیار کے بغیر نہیں چلتے اور جن کے پاس ہتھیار ہوتا ہے نشانے بھی کچھ انھی کی طرف لپکتے ہیں۔ ہمارے نہ پہنچنے سے طرح طرح کے وسوسے ان کے ذہن میں اُٹھ رہے ہوں گے۔

ہر سو خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ حوالات عمارت کے اندرونی حصے میں تھی مگر اتنی دور بھی نہیں کہ باہر کی کوئی سن گن نہ مل سکے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے ہمیں یہاں بھیج کے تھانے کا دروازہ بند کر دیا ہے یا تھانے کے اوقات مقرر ہیں۔ گشت لگانے والا سپاہی بھی دیر سے اِدھر نہیں آیا تھا۔ پیرو نے ٹانگیں زمین پر پھیلا لی تھیں۔ خاصا وقت گزرنے کے بعد کہیں جا کے سپاہیوں کی چاپوں سے کمرے کا سناٹا ٹوٹا۔ وہ چار پانچ سپاہی تھے۔ جو تھوڑے لمحے سلاخوں پر نمودار ہوئے۔ میں نے بے چینی سے پیرو کی طرف دیکھا لیکن اُس کے جسم میں کوئی جنبش نہیں ہوئی۔ یوں ہی دم بخود سا بیٹھا رہا جیسے اسے معلوم تھا کہ سپاہی محض ہمارا نظارہ کرنے آئے ہیں۔ وہ چند لمحے کھڑے کانا پھوسی کرتے رہے اور جیسے آئے تھے، واپس چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد پھر وہی قبرستان جیسی خاموشی چھا گئی۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا تو میں نے پیرو کو ٹہوکا دیا۔ "کیا ہے دلوا!" میں نے تند لہجے میں کہا۔ "کیا سوچ رہے ہو تم؟"

وہ اُچھل پڑا اور میرے گلے میں بازو ڈال کے مجھے دبوچنے لگا۔ "کیا راجا!" وہ زہرخند سے بولا۔ "ابھی کیا سوچے گا سالا۔"

"جو ہونا تھا، اُسے تم اور میں کیسے روک سکتے تھے؟"

"وہ تو ہو ہی گیا ہے راجا!" وہ سانس بھر کے بولا۔

"پھر کیا ہے؟ تم ایسے کیوں بیٹھے ہو؟ ہم اور کیا کر سکتے تھے یار مت بیٹھو، مجھے عجیب سا لگ رہا ہے۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

"ارے راجا!" اُس نے مجھے زور سے بھینچ لیا اور اُس کی آواز تمتمانے لگی۔ "ایسا بولا نا اب بجھل بھائی کا لاڈلے مافق۔ اپن بولے راجا! اپن کچھ تیرے ہی بارے سوچ رہا تھا۔"

"میرے بارے میں کیا؟" میں نے برہمی سے کہا۔ "میں کوئی اندھا ہوں، سب دیکھ نہیں رہا ہوں۔ یہ تمھارے منہ پر یہ چُپ اچھی نہیں لگتی۔"

وہ ہنسنے لگا۔ یہاں تک کہ اُس کی آواز ہمارے نگراں سپاہی تک جا پہنچی کہ وہ دوڑتا ہوا سلاخوں تک آیا اور بے تابانہ گھورنے لگا۔ "کیا، کیا بات ہے؟" اُس نے متردد لہجے میں ہم سے پوچھا۔

"ابھی کچھ نئیں ہے حوالدار!" پیرو نے اُونچی آواز میں جواب دیا۔

وہ ہٹا نہیں، وہیں کھڑا ہمیں تکتا رہا، پھر اِدھر اُدھر دیکھ کے سرگوشی میں بولا۔ "اِدھر آؤ۔"

پیرو ایک لمحے کے توقف کے بعد اُٹھ کھڑا ہوا اور سلاخوں کے پاس جا کے کھڑا ہوگیا۔

"تم کو" سپاہی نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "تم کو کسی چیز کی ضرورت تو نئیں ہے۔ اپنا مطلب ہے، بیڑی ویڑی، سگریٹ پان ایسا ہو تو اپنے کو اشارہ کر دینا۔"

"اپن کو ابھی ایک ہی آدمی ٹھیک دکھائی دیا ہے۔" نوٹوں کی ساری گڈیاں انھوں نے اپنی تحویل میں لے لی تھیں مگر پیرو نے روپے جانے کہاں چھپا رکھے تھے کہ ان کی نظروں میں نہیں آ سکے۔ جیل، حوالات اور اڈے پاڑے کے لوگوں کے لیے دوسرا گھر ہوتی ہیں۔ پیرو ایسے موقعوں کے لیے احتیاطاً کچھ بچا کے، چھپا کے ہی رکھتا تھا کہ اس نے جھٹ گریبان میں ہاتھ ڈال کے چند نوٹ نکالے اور مٹھی میں دبا کے اس کی طرف بڑھا دیے۔ "نکو بابا! نکو۔" سپاہی خالص حیدرآبادی لہجے میں بولا اور اُس نے روپے لینے سے انکار کر دیا مگر جب پیرو نے نوٹ اُس کی جیب میں ٹھونس دیے تو اُس نے زیادہ پس و پیش بھی نہیں کیا۔ بڑبڑاتے ہوئے کہنے لگا۔ "وہ سالا ایسا ایک نمبر کا حرامی ہے۔ پر تم اِدھر کائے کو پھنس گیا بابا۔ یہ ایسا اُلٹ پلٹ اپن کے ساتھ ہوتا رہتا ہے۔"

وہ سب انسپکٹر کو گالیاں دینے اور ہم سے ہمدردی کا اظہار کرنے لگا اور بولا۔ "ہم سمجھتا ہے تم لوگاں ایسا نہیں ہے۔ کاروباری آدمی جان پڑتا ہے۔ ابھی فکر نکو کرو، سالا گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے۔ کبھی تولا، کبھی ماشہ، کوئی پتہ نئیں، ابھی فیصلہ بدل ہو

ایک رات اِدھر کاٹ دیو، سویرے تک وہ بھی ٹھنڈا پڑ جائے گا۔"

"ابھی یہاں کوئی بڑا افسر نئیں بیٹھتا؟"

"بیٹھتا ہے۔" وہ تیزی سے بولا۔ "انسپکٹر رکنی صاحب، نام ان کا رکن الدین ہے۔ یہاں سب رکنی رکنی صاحب بولتے ہیں۔ ابھی تھانے میں آیا ہے۔ آدمی فرسٹ کلاس ہے۔"

"اُس سے بولو کہ اپن اُس سے ملنا مانگتا ہے۔"

"ایسا نکو۔" وہ آنکھ مار کے بولا۔ "جلدی مت کرو، موقع دیکھ کے بات کرے گا۔ میڈیکل رپورٹ بھی آجائے تو اچھا ہے، سالے کی ہوا اس نکل جاوے گی۔ زیادہ زخم تو نئیں لگا تھا اُس کو؟"

"نئیں۔" پیرو نے ترشی سے کہا۔ "بھینسے کا جنا تھا۔"

"ٹھیک ہے، تم یہی بیان بولنا۔ اُدھر محلے والاں کو تم کیوں ناراض کر دیو بابا! اُن لوگاں نے ہی سالا زہر بھرا ہے۔"

"تم اُدھر جا کے افسر تک اپنا بات پہنچانے کا کوشش کرو ورنہ بولو تو اپن ایدر شور مچانا چالو کرتا ہے۔"

"نکو، ابھی اپنے کو کیوں مروانے کی فکر میں ہے۔" وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ابھی صبر کرو۔ تم کو چائے پانی بھیجے کھانا وانا۔"

پیرو نے چائے کے لیے کہہ دیا اور چند منٹ بعد ہی ہمیں چائے پہنچا دی گئی۔ پیرو کے ساتھ میں نے بھی زہر مار کی۔ سپاہی دیر تک نہیں پلٹا تو پیرو نے کھنکار کے اُسے اشارہ کیا اور قریب آنے پر اس سے انسپکٹر سے ملنے کی بابت پوچھا۔

"رکنی صاحب بولتے ہیں ابھی سویرے دیکھیں گے۔" وہ خفگی سے بولا۔

"اُس سے بولو کہ ابھی اپن کو ضروری بات بولنا ہے۔"

"ایسا کیسے بولے، افسر آدمی ہے بابا! مرضی کا مالک، ابھی ایک رات گزار ہی دیو۔" اُس نے پچکارتے ہوئے کہا۔ "سویرے سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"سویرا کس نے دیکھا ہے، جیسا اپن بولتا ہے، ابھی ویسا ہی جا کے اُس کو بولو، بولو کہ اپن تھانے کے بارے میں بات کرنا مانگتا ہے۔ اُدھار واپس کرنے کو نئیں بولے گا۔ نا اُس کا چھوکری کے لیے اپنے چھوکرے کا کوئی بات کرے گا، سمجھا!"

"نکو بابا!" وہ کان پکڑتے ہوئے بولا۔ "ایسا کائے کو بولتے ہو۔ دیواراں کے بھی کان ہوتے ہیں۔"

"ابھی تم جا کے اُس کو ایسا ہی بولو۔"

"ابھی سمجھا کرو بابا! کام کی بات بول رہا ہوں۔ غصہ دھیما ہی رکھو۔ اِدھر زیادہ تیزی ٹھیک نئیں ہوتا ہم خود جا کے اُس کو بولے تھے، دوسروں سے بھی کہلوایا تھا۔ بار بار اس کو..." پیرو کے اصرار پر وہ جھنجلا گیا۔ کہنے لگا کہ جتنا اُس کے بس میں ہے، وہ اتنا ہی کر سکتا ہے۔ اُس کے اختیار میں ہوتا تو ابھی دروازہ کھول کے ہمیں باہر کر دیتا۔ پیرو نے اُسے شور مچانے کی دھمکی دی تو وہ یہ کہتا ہوا سلاخوں سے ہٹ گیا کہ ٹھیک ہے، وہ ایک اور کوشش کر کے دیکھتا ہے لیکن ہمیں زیادہ اُمید نہیں رکھنی چاہیے۔

سپاہی کے انتظار میں پیرو دروازے کے پاس ہی کھڑا رہا پھر تھک کے بیٹھ گیا۔ سب انسپکٹر فیروز کی موجودی میں انسپکٹر رکن الدین پر ہماری درخواست یا مطالبے کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔ اُس نے پہلے سب انسپکٹر کو طلب کر کے ساری صورتِ حال سمجھنی چاہی ہوگی۔ سپاہی کے بقول وہ کتنا ہی معقول آدمی ہو لیکن اپنے ماتحت افسر کا کہا ہی اُس کے لیے مقدم ہونا چاہیے۔ خاصا وقت گزرنے کے بعد بھی سپاہی نے آ کے کوئی جواب نہیں دیا تو پیرو نے مجھ سے کہا۔ "ابھی قبل مچا کے دیکھے راجا؟"

"کوئی فائدہ نہیں، بات اور خراب ہو سکتی ہے۔"

"ابھی اور کتنا اُلٹا ہوگا۔"

"پھر بھی ہمیں احتیاط ہی لازم ہے۔"

"ابھی سب گرمی پر ہے راجا! ٹھنڈا ہونے پر اور دیری لگ سکتا ہے۔" اُس کا اندیشہ غلط نہیں تھا۔ اسی وقت کچھ ہو سکتا تھا، رات گزرنے کے بعد اور بل پڑ سکتے تھے مگر کیا ہمیں اس خدشے کا پہلے احساس نہیں تھا جو ہم نے کوئی کسر چھوڑ دی تھی۔ میں نے اُس کی تائید نہیں کی۔ جھگڑا ٹنٹا کرنے میں اُن سے کسی نرمی کی اُمید کم، سختی کے امکان زیادہ تھے۔ وہ ہم دونوں کو الگ بھی کر سکتے تھے۔ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ پہلے ہمیں تھانے کے افسروں اور یہاں کے قاعدے دستور کے متعلق کوئی اندازہ قائم کر لینا چاہیے تھا۔ پیرو نے میرے مشورے پر نہ تو شور مچایا، نہ نگراں سپاہی کو دوبارہ متوجہ کیا مگر اُسے کسی کل چین نہیں تھا۔ میں نے اُسے جھوٹی تسلی دینے کی کوشش کی کہ وہ آبا جان کی اتنی فکر نہ کرے۔ وہ کچھ سمجھ ہی جائیں گے، اس کے سوا وہ کیا کر سکتے ہیں۔ زورا اور مارتی بھی اُن کے پاس موجود ہیں۔ اگر ایک رات کی بات ہے تو ایک رات میں کیا فرق پڑتا ہے۔ صبح اُن تک پیغام پہنچانے کی شاید کوئی شکل نکل آئے۔

ہمیں چائے پیے آدھ پون گھنٹے کے قریب ہی ہوا ہوگا کہ ہمیں اپنی طرف آتے ہوئے سپاہیوں کی آہٹیں پھر سنائی دیں۔ وہ ہمارے دروازے ہی پر آ کے رُک گئے تھے۔ میری رگوں میں خون دھڑکنے لگا تھا۔ ہم دونوں ایک ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ نگراں سپاہی نے دروازہ کھولا اور تلخ و ترش لہجے میں ہمیں باہر آنے کا حکم دیا۔

حوالات سے کوئی پچاس گز دور سب انسپکٹر فیروز کے کمرے سے ملحق وہ ایک کشادہ، صاف ستھرا اور روشن کمرہ تھا۔ جہاں ہم سپاہیوں کے ساتھ نپے تلے قدموں سے داخل ہوئے۔ کمرے کے دائیں کونے

کی میز کے بیچ میں ایک بڑی کرسی پر بھاری جسم، لمبے قد، سانولی رنگت کا پچاس سالہ باوردی شخص بیٹھا ہوا تھا۔ وہی انسپکٹر رکن الدین ہوگا۔ ہمیں لانے والے سپاہیوں کے علاوہ وہاں پہلے سے ایک سپاہی موجود تھا۔ میز کے بائیں طرف کرسی پر سیاہ شیروانی، ترکی ٹوپی میں ملبوس ادھیڑ عمر کا ایک اور شخص بھی بیٹھا ہوا تھا جو انسپکٹر کا کوئی ملاقاتی ہو سکتا تھا۔ سلام کے بعد ہم خاموش کھڑے رہے۔ لمحوں تک انسپکٹر ہمیں گہری نظروں سے گھورتا رہا، پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی لرزاں ہوئی۔ "کیا چکر ہے؟" اس کی آواز میں آتنی بے اعتنائی نہیں تھی۔

"کچھ نہیں صاحب! ابھی کیا بولے۔" پیرو نے نرم لہجے میں کہا۔ "اپن ایدر تمھارے شہر میں ایک دم نوا ہے۔ سر سے پاؤں تک پھنس گیا ہے۔ ابھی اپنا کچھ خیال کرو صاحب!"

"تمھارے خلاف یہاں بہت سی شکایتیں ہیں۔"

"اپنے کو پتہ ہے پر اپن شکایت لے کے ابھی کیدر جائے صاحب! ایدر اپن لوگوں کا کوئی نئیں سنتا کیا؟"

"بے کار کی باتیں مت کرو۔" انسپکٹر نے ناگواری سے کہا۔

"بے کار کا کیسا صاحب؟ اپن ایدر حوالات میں پڑا ہے۔" پیرو نے جھلاہٹ سے کہا۔ "آپ بولتا ہے، بے کار کا بات ہے۔ ایسا ہے تو اپن کو واپس حوالات بھیج دو۔"

"تم نے وہاں چاقو بازی کی، جانتے ہو، ایک آدمی زخمی ہو گیا ہے۔"

"زخمی تو ایک کو ہونا تھا صاحب! وہ نئیں ہوتا تو اپن لوگ ہوتے۔ چاقو اس کے پاس تھا، اپن کے پاس نئیں۔"

"معاملہ کیا تھا؟" انسپکٹر نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔ وہ بھی وہی کچھ دہرا رہا تھا جس کا جواب ہم دے چکے تھے۔

"معاملہ کیا ہوتا صاحب! اپن کے پاس مال تھا اور وہ سالا اٹھائی گیرا۔ اپن ایک دم بے قصور ہے۔ اپنا تو سارا کپڑا لتا، مال نمونہ بھی اُودر رہ گیا۔ ایدر آتا اپنے کو لٹکایا جا رہا ہے۔" پیرو نے اس سے اجازت لیے بغیر شروع سے آخر تک اسے وہی روداد سنائی جو سب انسپکٹر فیروز سے کہہ چکا تھا لیکن اس بار اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ انسپکٹر پورے انہماک سے سنتا رہا۔ اس کے برابر بیٹھے ہوئے ملاقاتی کی آنکھیں بھی چمک رہی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کو بار بار کن انکھیوں سے دیکھتے تھے۔ "ابھی اپن اُودر اتنا آدمی میں ایک دم خوار..."

پیرو کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ انسپکٹر رکن الدین بیچ میں بولا۔ "یہ سب باتیں ہم سن چکے ہیں۔"

"اپن کے پاس پھر کوئی نوا بات نئیں ہے۔"

"اب تم کیا چاہتے ہو؟" انسپکٹر نے بھاری آواز میں پوچھا۔

"ابھی آپ بھی اپن سے دل لگی کرتا ہے صاحب!"

"ٹھیک ہے۔" وہ پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ "صبح بات کریں گے۔"

"صبح کیا صاحب! آپ چاہے تو ابھی فیصلہ کر سکتا ہے۔"

"کیسے کیسے۔" انسپکٹر ڈکھائی سے بولا۔ "فیصلہ کرنا ہمارا کام نہیں، اطمینان رکھو، اس طرف سے رپورٹ مناسب ملی تو معاملہ جلد ہی طے ہو جائے گا۔ یہاں حوالات میں بھی تمھیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی، اس وقت میں تمھارے لیے یہی کر سکتا ہوں۔"

"آپ بہت کچھ کر سکتا ہے، آپ بھی حاکم ہو، اگر اپنا بات آپ کے دل کو لگتا ہے تو آپ ہی انصاف کر دو۔ نئیں لگتا تو اپنا کوئی زور نئیں ہے۔" پیرو نے اسے بھی شہر میں موجود رہنے اور طلبی پر بروقت حاضر ہونے کا یقین دلانا چاہا۔ انسپکٹر نے اس کی ہر بات سکون سے سنی لیکن اس کا جواب کچھ مختلف نہیں تھا، اس کے باوجود پیرو جانے کس آسرے میں وہاں کھڑا اپنا گلا خشک کرتا رہا۔ انسپکٹر نے صاف انکار کر دیا تھا۔ نتیجتاً اس حجت و تکرار کا وہی تھا۔ انسپکٹر کی صرف شکل و صورت، صرف لب و لہجہ بدلا ہوا تھا۔ باقی اس میں اور سب انسپکٹر میں کیا فرق تھا۔ میں نے حوالات میں واپس چلنے کے لیے پیرو کو کہنی ماری۔ وہ واپس چلنے کے لیے پلٹ گیا تھا کہ انسپکٹر کے برابر بیٹھے ہوئے ملاقاتی کی آواز سن کے ٹھہر گیا۔ ملاقاتی نے پہلی بار بیچ میں دخل دیا تھا۔ وہ شائستگی سے کہہ رہا تھا۔ "جانے دیجیے رکنی میاں! یہاں نو وارد ہیں۔"

انسپکٹر نے حیرتی نظروں سے اسے دیکھا اور اس کی پیشانی پر لکیریں کھنچ گئیں۔ یقیناً اسے یہ دخل اندازی اچھی نہیں لگی تھی لیکن وہ شگفتگی سے بولا۔ "خاں صاحب! آپ ان لوگوں سے واقف نہیں، یہاں ایک سے ایک مداری، ٹھگ باز آتا ہے۔"

"مگر مجھے یہ کچھ سچے لوگ نظر آتے ہیں۔" وہ متانت سے بولا۔ "معلوم ہوتا ہے، ان کے ساتھ واقعی کوئی زیادتی ہوئی ہے۔"

"آپ نے دوسری جانب کی روداد نہیں سنی۔ آج شام خوب تماشا کیا تھا انھوں نے۔"

"مجھے ان معاملات اور ایسے لوگوں کا کچھ زیادہ تجربہ تو نہیں ہے، ظاہر ہے آپ ہی کی پرکھ مسلّم ہے لیکن میں نے جو کچھ یہاں سنا ہے، اسی سے قیاس کر سکتا ہوں۔ میرا خیال ہے جس صورتِ حال سے یہ لوگ دوچار ہوئے، اس پر تو انھیں بہادری کا کوئی انعام دینا چاہیے۔"

انسپکٹر ہنسنے لگا۔ "یہ ثابت ہوا تو یقیناً کوتاہی نہیں کی جائے گی۔"

"رکنی میاں! وہ شخص دل سوزی سے بولا۔ "کیا آپ انھیں چھوڑ نہیں سکتے؟"

"زخمی شخص کی وجہ سے سردست ایسا ممکن نہیں ہے تا، لیکن"

نے دبے لہجے میں کہا۔

"اپن بولتا ہے صاحب! اپن ابھی ایدر ہی رہے گا۔" پیرو نے مضطرب آواز میں مداخلت کی۔

"ہو سکے تو کوئی رعایت کر دیجیے۔" اس شخص کے نازبردارانہ لہجے میں ایک تحکم بھی تھا۔

"خاں صاحب! آپ..." انسپکٹر پلکیں پٹ پٹانے کے سوا آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

"ہاں ہاں رکنی میاں!" وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر، اصل میں معاملے کی تہہ تک پہنچنے اور خود ان کی بھلائی کے لیے ان کا ابھی یہاں رہنا بہتر ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں، بات اتنی بڑی نہیں ہے۔"

انسپکٹر رکن الدین اس شخص سے بہت متاثر معلوم ہوتا تھا، وہ نہایت تعظیم و ادب کے ساتھ اس سے مخاطب تھا۔ شاید وہ اس کی بات رد نہ کرے۔ اے خدا ایسا ہی ہو۔ میرے کان ان کے درمیان ہونے والی گفتگو پر لگے ہوئے تھے اور میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ رکھا تھا۔ پیرو بھی ساکت و جامد کھڑا تھا۔ خاں صاحب کے عزم سے انسپکٹر خاصا مخمصے میں پڑ گیا تھا۔ "میری درخواست ہے کہ آپ ان اجنبیوں پر اتنے مہربان نہ ہوں۔" انسپکٹر تیکھی آواز میں بولا۔ "اطمینان رکھیے، ان کے ساتھ ناانصافی نہیں ہونے دی جائے گی۔"

"انھیں اب خاصا سبق مل چکا ہے، ریاست میں آئے ہیں، اچھا نہیں لگتا کہ...."

"پولیس میں آپ جیسے نرم خو صاحب دل آ جائیں تو ایک دن بھی کام نہ چلے۔" انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ فرما رہے ہیں تو ٹھیک ہے مگر...."

"یعنی میری ضمانت کی بات ہے نا؟" خاں صاحب نرمی سے بولے۔

"ہاں کچھ یہی خانہ پری وغیرہ..." انسپکٹر نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"چلیے یوں ہی سہی۔"

"ابھی آپ اپن پر بھروسا رکھو۔" پیرو نے جلدی سے کہا۔

"ایک تجربہ اور سہی۔"

"تجربۂ تکلیف دہ بھی ہو سکتا ہے۔"

"شاید ایسا نہ ہو۔" خاں صاحب پُر اُمید نظروں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ "اور ہو گا بھی تو کوئی ایسا رنج نہیں ہو گا۔"

ہم وہیں کھڑے رہے اور اس وقت میری آنکھیں ابل پڑیں جب انسپکٹر کی ہدایت پر محرر فضل نے خاں صاحب کے سامنے ایک کاغذ لا کے رکھا اور خاں صاحب نے کسی چون و چرا کے بغیر اس پر دستخط کر دیے۔ اسی لمحے انسپکٹر رکن الدین نے ہمیں متنبہ کیا کہ اس نے خاں صاحب فیض علی خاں کے حکم کی تعمیل کی ہے اس لیے کہ وہ انھیں ایک محترم، معتبر شخص سمجھتا ہے۔ بہتر ہے کہ ہم ان کے اعتبار کو زک نہ پہنچائیں ورنہ پھر اس سے برا کوئی نہیں ہو گا۔

ساتھ ہی اس نے فیض علی خاں کو سرگوشی میں کوئی مشورہ دیا۔ وہ مشورہ ہی ہو سکتا تھا۔ خاں صاحب خوش خلقی سے سنتے، مسکراتے رہے۔ ان کے چہرے پر اپنے فیصلے کا کوئی پچھتاوا نہیں تھا بلکہ وہ خوش و خرم نظر آ رہے تھے۔ پیرو نے آگے بڑھ کے ان کے ہاتھ پکڑ لیے اور سینے سے لگائے۔ میں نے بھی پُرنم آنکھوں سے ممنونیت کے چند ٹوٹے پھوٹے لفظ کہنے چاہے۔

میری طرح پیرو کو بھی حیرت ہوئی ہو گی، انسپکٹر نے چلتے وقت ہم سے یہ جاننے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ ہم کہاں ٹھہریں گے اور کسی وقت ہماری طلبی کی ضرورت پڑی تو سپاہی کس ٹھکانے پر ہمیں اطلاع دیں گے۔ چونکہ اب ساری ذمے داری خاں صاحب کی تھی، شاید اس لیے وہ مزید کسی تردد کی زحمت کرنا نہیں چاہتا تھا، یہ بھی ہو سکتا تھا، وہ ہمارے پیچھے سپاہی روانہ کر دینے کا ارادہ رکھتا ہو کہ وہ ہمارا ٹھکانا دیکھ کے آئیں اور حفظِ ماتقدم کے طور پر ہوٹل والے کو ہم پر نگرانی کرنے کی ہدایت بھی دیے

آئیں۔ ہم نے سلام کیا، دونوں کا ایک بار پھر شکریہ ادا کیا اور تھانے سے باہر جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔ کوئی سپاہی ہمارے پیچھے نہیں تھا۔ عمارت سے سڑک تک ایک بڑا میدان پھیلا ہوا تھا، میدان تھانے کے احاطے میں تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ قدم زمین پر نہیں رکھے جا رہے تھے۔ سارا جسم سُن سا ہو گیا تھا۔ ہم بالکل آزاد تھے۔ سب کچھ ایک خواب سا معلوم ہوتا تھا۔ ابھی ہم احاطے کے اندر تھے، عمارت سے صدر دروازے سے قریب کہ پیچھے سے کسی نے پکارا، وہ خاں صاحب تھے۔ انھیں لپکتے قدموں سے آتا دیکھ کے ہم ٹھیر گئے اور فاصلہ کم کرنے کے لیے عمارت کی طرف پلٹ گئے۔

"اب اس وقت کہاں ٹھیریے گا؟" انھوں نے تیز تیز سانسوں سے کہا۔

"ابھی کوئی ہوٹل غوٹل دیکھے گا بڑے صاحب!"

"آئیے، میں آپ کو چھوڑ دوں۔" وہ خوش اطواری سے بولے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ہم نے اخلاقاً انھیں اس زحمت دہی سے منع بھی کیا مگر ہمیں معلوم تھا کہ خاں صاحب اپنی تسلی کے لیے ہمیں ہوٹل چھوڑنا چاہتے ہیں، یہ ایک جائز بات تھی۔ انسپکٹر رکن الدین نے انھیں احتیاط کی تلقین کی ہوگی۔ کسی ردِّ و قدح کا محل نہیں تھا۔ ہمیں فی الوقت کسی بھی ہوٹل میں ٹھیر جانا چاہیے تھا جو قریب ہو یا جہاں خاں صاحب لے جائیں۔ ہوٹل میں کچھ دیر ٹھیر کے اسی وقت یا پھر صبح ہم ابا جان سے مل سکتے تھے۔ کم از کم سلاخوں اور پہرے داروں سے تو ہمیں نجات مل گئی تھی۔ ویسے بھی خاں صاحب نے جس انداز سے کہا تھا، اسے کوئی بھی رد نہیں کر سکتا تھا۔ احاطے کے اندر ہی اُن کی موٹر کھڑی تھی۔ ایک باوردی ڈرائیور بھی ساتھ تھا جس نے انھیں دیکھتے ہی دروازہ کھولا۔ میں آگے بیٹھ گیا، پیرو اُن کے ساتھ پچھلی نشست پر۔ اندر گدّیاں نرم اور مخملی تھیں اور خس کی خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ موٹر، ڈرائیور، خاں صاحب کے لباس اور نپی تلی پُراعتماد اور پُرشکوہ گفتگو سے اُن کی امارت کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ غالباً وہ حیدرآباد کے کوئی بڑے رئیس تھے، دل کے بھی رئیس تھے۔

موٹر تھانے کے احاطے سے نکل کے تیزی سے سڑک پر دوڑنے لگی۔ سڑکیں روشن مگر خالی پڑی تھیں۔ ساری دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ اکا دکا گاڑیاں چل رہی تھیں۔ موٹر نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا ہوگا کہ خاں صاحب نے تذبذب سے کہا۔ "اب اتنی رات کو آپ کہاں ٹھیریں گے۔ میں تو بھول ہی گیا تھا کہ آپ کے پاس ضروری سامان وغیرہ بھی نہیں ہے۔"

"اپن کے پاس ابھی کچھ پیسہ ہے بڑے صاحب! ایک رات کسی طرح کاٹ دے گا، سویرا ہونے پر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ہوٹل والے بے سامان اور بے وقت مسافروں کو دیکھ کے متعجب نہیں ہوں گے؟" وہ تشویش سے بولے۔

"ہوٹل والا پہلے پیسہ دیکھے گا، بعد میں کچھ اور۔ ہوٹل میں آنے کا کوئی وقت تھوڑی ہوتا ہے بڑے صاحب!" پیرو نے مسکرا کے کہا۔

خاں صاحب نے شیروانی کی جیب سے گھڑی نکالی اور بدلتے ہوئے بولے "دس سے اُوپر ہو چکے ہیں۔ میری رائے ہے، اگر آپ مناسب سمجھیں تو غریب خانہ حاضر ہے۔ اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بجائے آج رات میرے ہی یہاں قیام فرمائیں۔ صبح کسی ہوٹل میں جائیں تو بہتر رہے گا۔"

"نئیں بڑے صاحب! اپن نے پہلے ہی آپ کو بہت تکلیف دیا ہے۔"

"تکلیف کی آپ نے، خوب کہی، آدمی آدمی کے کام آتا ہے۔ اتفاق کہیے کہ قریب ہی ایک تقریب میں شرکت کے لیے آنا ہوا تھا، اِدھر سے گزرا تو سوچا، بہت دن ہو گئے ہیں رکنی میاں سے بھی مل لوں حالانکہ یہ کوئی وقت نہیں تھا مگر کچھ یہی طے تھا کہ میں وہاں جاؤں اور آپ لوگوں سے ملاقات ہو۔ شاید میں صحیح وقت پر پہنچ گیا۔ یہ پولیس والے کسی کی نہیں سنتے۔ صبح شام اتنے بہروپیوں سے واسطہ پڑتا ہے کہ شک آنکھوں میں رچ بس جانا ہی چاہیے۔ رکنی میاں بہرحال ایک معقول آدمی ہیں، ابھی پرانے وقتوں کی پاس داری ہے اُن میں۔ غالباً یہی ایک وجہ اُن سے میرے تعلق کی بھی ہے۔"

"آپ نئیں ہوتے تو اپن اُدھر ہی خوار ہو رہا ہوتا۔"

"بھول جائیے اب بیتی بات کو۔ زندگی ہے تو یہ حادثے ہوتے رہیں گے، اسی کا نام زندگی ہے۔ میری مانیں تو غریب خانے ہی چلیں، وہاں کچھ سکون ملے گا اور شاید کوئی تکلیف نہ ہو پائے۔ مہمان خانہ موجود ہے، ویسے جب تک آپ کا جی چاہے، اپنا گھر سمجھ کے رہیے لیکن کم از کم آج کی رات تو...."

"بڑے صاحب!" پیرو نے لجاجت سے کہا۔ "ابھی آپ نے بہت کر دیا ہے، اپنے کو اور شرمندہ مت کرو۔"

"ارے رے۔" خاں صاحب نے پیرو کے زانو پر تھپکی دی۔ "کیا بات کرتے ہیں آپ! آپ کی میزبانی سے میری عزت افزائی ہوگی۔ سچ پوچھیے تو میرا جی خوش ہوگا۔"

"ہم پھر آ جائیں گے۔" میں نے لفظ چباتے ہوئے کہا۔

"برخوردار! تکلف کیسا، یہ لکھنؤ نہیں ہے میاں، دکن ہے۔

یہاں اتنے تکلفات نہیں کیے جاتے۔ مہمانوں کو یہاں باعثِ رحمت باعثِ عزت سمجھا جاتا ہے۔ اب کچھ اور نہ کہیے۔ میری کوتاہی ہے۔ اس بے سروسامانی کی حالت میں مجھے پہلے ہی آپ سے کہیں اور جانے کو نہیں پوچھنا چاہیے تھا۔ آپ کے لیے یہ شہر اجنبی ہے۔ ایک حادثہ پیش آ چکا ہے، یقین کیجیے غریب خانے پر کوئی زحمت نہیں ہوگی۔ جس کام سے آئے ہیں اس میں بھی رخنہ نہیں پڑے گا۔"

پیرو عجب کش مکش سے دوچار تھا۔ انکار کی مجال بھی نہیں تھی اور اقرار سے چین بھی نہیں ملتا۔ خاں صاحب نے انکار کا کوئی گوشہ رکھا ہی نہیں تھا، ہمارے پاس تکلف کے سوا کوئی اور عذر نہیں تھا۔ نہ یہ ممکن تھا کہ ہم گاڑی سے کود جائیں یا ڈرائیور کو گاڑی ٹھیرانے کا حکم دیں اور ایک طرف چلتے بنیں۔ تھانے سے نکلنے کے بعد خاں صاحب کو ضرور کوئی تشویش لاحق ہو گئی تھی اور وہ معاملہ ختم ہونے یا ہمیں اچھی طرح جان بوجھ لینے تک اپنے ساتھ ہی رکھنا چاہتے تھے۔ اُن کی باتوں سے اس تکدّر کا اظہار نہیں ہوتا تھا، حلم، مروت اور انکسار ہی جھلکتا تھا لیکن اندر کوئی اندیشہ پنہاں ہوگا جبھی وہ اس قدر اصرار کر رہے تھے۔ ہمارے زیادہ انکار سے اُن کے خدشات اور سوا ہو سکتے تھے، وہ اسے اپنی سبکی بھی سمجھتے۔ اُن کے پاس عاقبت اندیشی کے علاوہ ہماری میزبانی کے کئی جواز موجود تھے۔ ہمارا اجنبی ہونا، ہماری بے سروسامانی، رات کا وقت۔ وہ کچھ غلط نہیں کہہ رہے تھے۔ اتنی سی بات تھی کہ ایک شخص ہمیں ہوٹل میں ٹھیرنے کے بجائے اپنے گھر لے جانے کا آرزومند تھا۔ کاش ہم اُن سے کہہ سکتے کہ اتنی سی بات ہمارے لیے کتنا بڑا عذاب ہے۔ ہمارے انتظار میں اُن تینوں کی آنکھیں جل رہی ہوں گی۔ پیرو جز بز بیٹھا رہا، میری عقل بھی خبط ہو گئی تھی۔

"غریب خانہ شہر سے کچھ الگ ہے، یوں سمجھیے کہ ایک سرے پر مگر سواری موجود ہے، سویرے آپ لوگ جہاں کہیں گے، پہنچا دے گی۔" وہ کہہ رہے تھے۔

"ابھی بس کرو بڑے صاحب!" پیرو کی آواز بھرّا رہی تھی۔

گاڑی مختلف سڑکوں سے گزر رہی تھی۔ خاں صاحب نے ڈرائیور سے کچھ نہیں کہا تھا لیکن اب تک کئی ہوٹل گزر گئے ہوں گے، وہ کہیں نہیں رکا۔ اس کے کہیں نہ ٹھیرنے کا مطلب یہی تھا کہ وہ اپنے مالک کی خواہش کے مطابق گھر ہی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ موٹر بازاروں کی سڑکوں سے گزر کے آقامتی علاقوں میں داخل ہو گئی تھی، ہمیں فوراً کچھ کرنا چاہیے تھا۔ پیرو نے ایک بار پھر خاں صاحب کی منت کی، انھیں سمجھانا چاہا۔ خاں صاحب آزردہ سے ہونے لگے۔ ہمارے لیے اُن کی دل شکنی کی اتنی اہمیت نہیں تھی جتنی دوسری باتوں کی۔ آقامتی علاقہ آ گیا تھا کے اور گنجان ہو گیا تھا۔ بس یہی ہو سکتا تھا کہ ہم کسی تاخیر کے بغیر ڈرائیور اور خاں صاحب کو بے بس کر دیں لیکن ہوٹل تک پہنچتے پہنچتے اور ہوٹل سے اسٹیشن تک جاتے جاتے ہر بات ممکن تھی۔ مجھے موٹر چلانی نہیں آتی تھی، البتہ پیرو خوب جانتا تھا مگر نہ جانے وہ کیا سوچ رہا تھا۔ ہم دونوں خاں صاحب کی موجودگی میں ایک دوسرے سے بات بھی نہیں کر سکتے تھے۔ میں بار بار نگاہیں اُٹھا کے اُس کی طرف دیکھتا تھا کہ خاں صاحب درمیان میں آ جاتے تھے۔ موٹر بھاگتے بھاگتے ایک ایسے علاقے میں آ گئی تھی جہاں دُور تک بڑے بڑے رقبوں پر حویلی نما مکانات بنے ہوئے تھے اور ساتھ ہی ویرانی بھی بڑھ گئی تھی۔ یہی موقع پیرو کے فیصلہ کرنے کا تھا۔ اُس کی خاموشی سے بے چینی ہو رہی تھی۔ سڑکیں کشادہ اور صاف تھیں اس لیے موٹر کی رفتار بھی خاصی تیز تھی۔ خاں صاحب اپنے بمبئی کے سفر کے واقعات نہایت اشتیاق سے سُنا رہے تھے۔ یکایک موٹر اُونچائی پر چلتی ہوئی ایک بڑے دروازے پر جا کے رُک گئی، وہ دروازہ اتنا بڑا تھا کہ ہاتھی گزر سکتا تھا۔ موٹر دیکھتے ہی باہر بیٹھا مسلح دربان اُچھل کے کھڑا ہو گیا اور چھوٹے دروازے سے اندر کی طرف لپکا۔ دُوسرے ہی پل بڑا دروازہ کھل گیا۔

اندر سامنے ہر طرف چمن زار پھیلا ہوا تھا اور اُونچے گھنے درختوں کی قطاریں۔ بیچ میں ہماری نگاہوں کے سامنے سہ منزلہ عمارت تھی، وہ کسی محل سے کم نہیں تھی۔ کوئی بہت بڑی حویلی۔ بُرج، جھروکے، محرابیں، بارہ دری، پچّی کاری، سنگِ مرمر اور لال پتھر سے بنی ہوئی کئی حصّوں پر مشتمل دیوہیکل عمارت۔ خاں صاحب کی وضع قطع، انداز و اطوار سے اُن کے متموّل ہونے کا ہمیں بہت کچھ اندازہ ہو گیا تھا لیکن اتنا بھی نہیں۔ دروازے کے اندرونی حصّے میں بھی کئی چاق و چوبند ملازم موجود تھے۔ ایک اُونچی قلعے کی فصیلوں جیسی دیوار عمارت کا احاطہ کرتی تھی۔ سب کچھ نو تعمیر شدہ معلوم ہوتا تھا۔ موٹر حویلی کے خاص دروازے کے سامنے جانے کے بجائے دائیں طرف مڑتی ہوئی ایک پورٹیکو میں آ کے رُک گئی۔ ڈرائیور نے پھرتی سے دروازہ کھولا، پہلے خاں صاحب اُترے۔ پیرو کی نگاہیں چاروں طرف گھوم رہی تھیں "ابھی اپنے کو آپ کیدھر تاج محل میں لے آیا بڑے صاحب!" وہ

حیرت سے بولا۔

خاں صاحب کچھ جھینپ گئے، کوئی جواب نہیں دیا اور پُرتپاک انداز میں آگے بڑھنے کے لیے ہمیں ہاتھ کا اشارہ کیا۔ ہمارے قدم رُک رہے تھے۔ فرشی منزل کی کرسی خاصی اُونچی تھی۔ چند سیڑھیوں کا زینہ طے کرنے کے بعد محرابوں کا سائبان تھا اور اس کے پار کھڑکیوں اور کمروں کے متعدد دروازے نظر آ رہے تھے۔ سائبان میں آ کے ہی اندر عمارت کی زیبائش و آرائش کا تخمینہ لگایا جا سکتا تھا۔ کسی ملازم نے آ کے ایک طرف کا منقش دروازہ جلدی سے کھول دیا اور ہم خاں صاحب کے ساتھ ساتھ ہم ایک وسیع کمرے میں آ گئے۔ کمرے کے فرش پر دھنس جانے والا غالیچہ بچھا ہوا تھا۔ دریچوں پر ریشمی پردے اور دروازے کے مقابل دیوار کے ساتھ بچھی ہوئی چوکی پر گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ اطراف کی تمام دیواروں کے ساتھ مخملی گدے لگے تھے۔ کمرے کی نشست فرشی تھی۔ معلوم نہیں، خاں صاحب ہمیں یہاں کیوں لائے تھے کہ گزرتے ہوئے ہم دوسرے دروازے سے نکل گئے۔ پھر جس کھلے حصے میں آئے، وہ الگ ایک مکان تھا، حویلی سے ملحق بھی، حویلی سے الگ بھی۔ یہ مہمان خانہ ہی ہو سکتا تھا جہاں بہت سے مہمان ایک ساتھ ٹھیر سکتے ہوں۔ یہاں آتے ہوئے جہاں جہاں سے ہم گزرے، ساری راہ داریاں، صحن اور دالانوں میں رنگ برنگی روشنیاں کِھلی ہوئی تھیں۔ کہیں خوابیدہ سی، کہیں دن کا سا سماں تھا۔ سب کچھ ایک پُراسرار سی فضا لگتا تھا۔ ہم جیسے کہانیوں کے کسی گھر میں آ گئے ہیں۔ سونے کے کمرے کی سجاوٹ بھی قابلِ دید تھی۔ خاں صاحب نے ہم سے کھانے کے لیے اصرار کیا۔ دن بھر ہم نے چائے اور بسکٹوں کے سوا کچھ نہیں کھایا تھا۔ بھوک اب بھی نہیں لگ رہی تھی لیکن خاں صاحب نے ہماری خدمت پر مامور ایک چاق و چوبند ملازم کو مشروبات اور پھل وغیرہ لانے کے لیے کہہ دیا تھا اور پیرو سے رازدارانہ انداز میں پوچھا کہ اگر کسی خاص مشروب سے شغف ہو تو ہم تکلف نہ کریں۔ پیرو نے ہنس کے ٹال دیا۔ "ابھی آپ آرام کرو بڑے صاحب! رات بہت ہو گیا ہے، اپنے لیے اتنا مت جاگو۔"

"کیا آپ لوگوں کو نیند آ رہی ہے؟" خاں صاحب نے کسمساتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" پیرو سر اُٹھا کے بولا۔ "اپن تو آپ کے لیے بول رہا ہے۔"

"میری چھوڑیے۔ رات یوں ہی آنکھوں میں کٹ جاتی ہے۔"

"ایسے تو رات کو بہت ہلا گلا ہوتا ہو گا بڑے صاحب؟"

"ہاں۔" خاں صاحب نے بوجھل لہجے میں کہا۔ "کبھی ہوتا تھا، اب زمانے سے کچھ نہیں ہوتا، اداسی چھائی رہتی ہے۔"

"ایسا کیا بڑے صاحب؟"

"کچھ ایسا ہی ہے۔" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولے۔

پیرو نے مناسب نہیں سمجھا کہ وہ اس کا سبب پوچھے۔ حیدرآباد شہر کے موسم اور خوب صورتی کی تعریف کرنے لگا۔ اتنی دیر میں پھل اور مشروبات آ گئے تھے۔ تلا ہوا گوشت بھی رکھا تھا۔ خاں صاحب نے بھی رسماً ہمارا ساتھ دیا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے، حیدرآباد کے بارے میں بتاتے رہے لیکن شاید یہ میرا خیال ہو یا توجہ نہ دی ہو کہ خاں صاحب باتیں کرتے کرتے گم سے ہو جاتے تھے، وہ کچھ بے چین معلوم ہوتے تھے۔ لوٹ پھیر کے بات پھر پیرو پر آ گئی بلکہ پیرو نے از خود ہی یہ ذکر چھیڑا تھا، اپنے ذہن کا غبار دور کرنے کے لیے اس نے ممنونیت کے انداز میں کہا۔ "ابھی اودوسلا خون پار بیٹھا سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ادھر مل آ جائے گا۔"

"ہاں۔" خاں صاحب کسی قدر کتراتے ہوئے بولے۔ "اتفاق اسی کو کہتے ہیں۔" پھر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے تیکھے لہجے میں کہنے لگے۔ "ویسے آپ لوگ اچھی خاصی مصیبت میں پھنس گئے تھے۔ میں آپ کو بتاؤں کہ رُکنی میاں نے چلتے وقت مجھ سے کیا کہا تھا!"

"کیا بولا تھا بڑے صاحب!" پیرو نے تجسس سے پوچھا۔

"رُکنی میاں کو شبہ تھا۔" انھوں نے میری طرف نگاہیں اٹھاتے ہوئے کہا۔ "کہ صاحب زادے پہلے بھی حیدرآباد آ چکے ہیں۔"

مجھے اپنے کانوں پر دھوکا ہوا، پیرو بھی اچھل سا گیا۔ "اور کیا بولا تھا اس نے؟" پیرو نے منتشر آواز میں پوچھا۔

"کچھ یہی کہ بازارِ حسن میں برخوردار نے کبھی شاہ کبیرے جیسے ایک مرکھنے دادا کو ایک ہی حملے میں چاروں شانے چت کر دیا تھا۔ یہ واقعہ میرے لیے نیا نہیں تھا اور میں عرض کروں کہ مجھے انھیں دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ یہاں بہت دھوم مچی تھی اس سکندر خاں کی۔ دست و بازو کی چاقو بازی میں تو وہ نامی گرامی دور دور تک اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ جس راستے سے گزرتا تھا، فرفر وہ راستہ چھوڑ دیتے تھے۔ جس کی چاہے پل میں آن آبرو اتار دے۔ سارے شہر میں ستاتا پھرتا تھا۔ پھر سنا کہ ایک دن کسی نوجوان نے ایک خلقت کے سامنے اسے بے جامہ کر دیا۔ بہت دنوں تک یہاں اس کا چرچا ہوتا رہا۔ ہم نے تو خیر صرف سُنا ہے، جو لوگ موجود تھے، کہتے ہیں کہ لپک ایک بجلی چمکی تھی۔ نوجوان نے اس چابک دستی سے سوت سے ہاتھ چلایا تھا کہ ازار بندی کٹا جسم پر خراش تک نہیں آئی۔ شخص شاہ کبیرا، پھر نہ جانے کون سے کنوئیں میں جا ڈوبا کہ آج تک شہر میں دکھائی نہیں دیا۔" خاں صاحب کی چمکتی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

میرے حواس منتشر ہو گئے تھے۔ پیرو کے جسم کا بھی سارا خون جیسے چہرے پر سمٹ آیا تھا۔ خاں صاحب کو اگر یہ سب معلوم تھا تو انھوں نے اب تک ہم سے کیوں چھپایا۔ "آپ کیا بول رہا ہے بڑے صاحب؟" پیرو نے ہیجانی آواز میں کہا۔

وہ مسکرانے لگے اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولے۔ "مگر آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کو یہاں لایا ہوں اور میرے خیال میں اگر مجھے کوئی خوش فہمی نہیں تو اتنا ہی کافی ہے، رُکنی میاں اچھی طرح جانتے ہیں کہ انھوں نے کس پہ اعتبار کیا، کس کی بات مانی ہے۔ اس لیے جو گزر گیا ہے سمجھیے، اب وہ دفن ہی ہو گیا۔ رُکنی میاں نے جب برخوردار کے متعلق اپنا شبہ ظاہر کیا تو میں نے ٹوٹ کے نہیں کہا کہ شاہ کبیرے والے واقعے سے مجھے بھی تھوڑی بہت واقفیت ہے۔ پہلے تو میں اسے ان کا مبالغہ سمجھا تھا، کوئی بڑی غلط فہمی جو پولیس والوں کو عموماً ہو جاتی ہے۔ میرے سامنے جو نوجوان تھا، وہ میرے تصور سے قطعی مختلف تھا۔ شاہ کبیرے جیسے گینڈے سے نمٹنے کے لیے کچھ اسی کے قماش کا آدمی میرے ذہن میں ابھرتا تھا۔ غالباً یہی بات رُکنی میاں کے دماغ میں کھٹک رہی ہو گی جو وہ شبہے کی بات کر رہے تھے۔ دونوں واقعے بے شک مختلف تھے لیکن انھوں نے غور نہیں کیا، دونوں میں بہت سی باتیں ملتی جلتی تھیں۔ چار تربیت یافتہ، ہٹے کٹے چاقو باز اور ملکے والوں کا ہجوم۔ میں آپ کو سچ بتاؤں کہ رُکنی میاں سے یہ جان کے خوشی ہوئی کہ میں نے جی داروں کے لیے کچھ کیا ہے، ان لوگوں کے لیے جنھیں دیکھنے کی مجھے تمنا تھی۔"

خاں صاحب ہی بولتے رہے۔ ہم دونوں گنگ نظروں سے انھیں دیکھا کیے۔ کہنے لگے۔ "رُکنی میاں ایک پولیس والے ہیں، ابھی تک تو پولیس ہی کی آن کے پاس ہے۔ شاہ کبیرے کی بات کو دن گزر گئے ہیں مگر اُوپر حاکموں میں اپنی سُرخ روئی کے لیے وہ قصۂ پارینہ اچھال سکتے تھے۔ بات آگے بڑھانے کے لیے کوئی بھی رنگ دینا ان کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اتنا کہاں احساس کہ جرأت اور بہادری بھی کوئی چیز ہے۔ میں جانتا ہوں، پہلے بھی شاہ کبیرے سے بھڑنے میں پہل آپ نے نہیں کی تھی، وہی آپ کے منہ لگا تھا۔ اس گیدڑ کی موت آئی تھی جو اس نے آپ لوں کی طرف رُخ کیا۔ جہاں تک مجھے پتہ چلا ہے، آپ نے مروتی کی تھی۔ مغنیہ خانم نے آپ کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اسے اس کا اختیار تھا لیکن کبیرے نے پر کاٹ راہ داری دینے سے پہلے اپنے ٹھکانے پہ خانم کو بزم آرائی کے لیے مجبور کیا۔ خانم اس کے سنگین نتائج سے آگاہ تھی، وہ تیار ہو گئی لیکن آپ اس معاملے پر آمادہ نہیں ہوئے چنانچہ آپ نے وہی کیا جو کوئی بھی غیرت مند کر سکتا تھا۔ یہی کچھ تھا نا؟" خاں صاحب رُک کے بولے۔

دیر تک کے لبوں پر سکوت طاری رہا۔ خاں صاحب نے اس کے جواب کا انتظار نہیں کیا، خوابیدہ لہجے میں بولے۔ "خانم! وہ یہاں دکن کا موتی تھی۔ مجھے کئی بار اس کی بزم میں بیٹھنے کا موقع ملا ہے۔ مصر کی ملکہ! عادات و اطوار میں شہزادیوں جیسی۔ میں نے اتنی باوقار عورت زندگی میں نہیں دیکھی۔ بازار میں نہ بیٹھتی تو یقیناً کسی محل کی نور جہاں ہوتی۔ فن کو فن کی طرح برتتی تھی۔ بازار کی ہوا نہیں لگنے دی۔ کتنے رئیسوں، نوابوں نے آرزو کی لیکن اسے فن سے عشق تھا۔" خاں صاحب خانم کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے رہے۔ "آخر میں تو وہ بالکل محدود ہو گئی تھی۔ پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی اور پیسے کی اسے ہوس بھی نہیں تھی۔ آخر ایک دن وہ چلی گئی۔ خانم کو شاید اسی دن کا انتظار تھا۔ کبھی تو پلٹ کے نہیں دیکھا کہ پیچھے کتنے لوگ اداس ہو جائیں گے۔ کہاں لے گئے آپ اسے؟" وہ شگفتگی آمیز یاسیت سے بولے۔ "کیسی ہے وہ؟"

پیرو کی آنکھیں دہک رہی تھیں۔ "ابھی ابھی آپ اور کیا اپن کے بارے جانتا ہے بڑے صاحب؟" وہ دھمکتی آواز میں بولا۔

"اور کیا!" خاں صاحب سنبھل کے بولے اور ہنسنے لگے۔ "اتنا کچھ بھی یوں یاد رہ گیا کہ خانم کو شاید یہاں کوئی بھی فراموش نہیں کر سکا ہے اور شاہ کبیرے کا واقعہ بھی لوگ ابھی تک حیرت سے دہراتے ہیں۔ ایک اور بات بھی تھی۔ یہاں کے ایک رئیس نواب عالم تاب، جن سے اپنی بھی اچھی خاصی یاد اللہ ہے، خانم سے بہت متاثر تھے۔ ان کی شیفتگی اور قدر افزائی دیکھ کے آخری دنوں میں خانم نے نغمہ سرائی انھی کے لیے محدود کر دی تھی۔ سنا ہے، نواب عالم تاب نے اسے روکنا چاہا لیکن خانم جانے کا فیصلہ کر چکی تھی، ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نواب اسٹیشن تک اسے منانے گئے تھے، وہاں ان کی گردن پر چاقو رکھ دیا گیا اور خانم نے ان کے حق میں فیصلہ نہیں دیا۔ کچھ نواب صاحب کے معاملے کی وجہ سے بھی مجھے واقعہ یاد رہا۔ پتہ نہیں، خانم کو اب نواب کی یاد آتی ہے یا نہیں، یہ تو آپ لوگ ہی بہتر بتا سکتے ہیں، بہرحال وہ جہاں بھی ہو، خدا کرے خوش ہو۔ خوب عورت تھی، پاک باز، متین، وضع دار۔ کہاں ہے آج کل وہ؟ ضرور کسی اچھے گھر میں ہو گی۔"

"ہو سکتا ہے پر اپن کو اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔" پیرو نے اُلجھی ہوئی آواز میں کہا۔

خاں صاحب کچھ بے قرار سے ہو گئے، تیزی سے بولے۔ "مگر وہ تو، جہاں تک میں نے سنا ہے، صاحب زادے کے ساتھ ہی گئی تھی اور ایک صاحب بھی ان کے ہمراہ تھے۔"

"وہی اس کو کہیں لے گیا۔" پیرو نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟ یعنی خانم سے آپ کا کوئی واسطہ نہیں؟ آپ کو نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے اور کیسی ہے؟"

"ایسا ہی ہے کچھ۔" پیرو نے ہونٹ سکوڑ کے جواب دیا۔

خاں صاحب کے چہرے پر دھند سی چھا گئی۔ انھوں نے ایسی نظروں سے ہمیں دیکھا جیسے ہماری بات کا انھیں یقین نہ آیا ہو۔ پھر کہنے لگے۔ "رات بہت ہو گئی ہے اب آپ آرام کریں صبح ان شاء اللہ گفتگو کریں گے۔" یہ کہتے ہی وہ اٹھ گئے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے بولے۔ "تمھیں دیکھ کے مجھے خوشی ہوئی ہے۔ شہزادوں کی طرح نرم و نازک لگتے ہو، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تم نے شاہ کبیر کو زچ کیا ہوگا۔"

خاں صاحب کے جانے کے بعد ہم دونوں کمرے میں تنہا رہ گئے اور پیرو میری۔ میں پیرو کی صورت دیکھتا رہا۔ اپنے کو کچھ لفڑا لگتا ہے راجا!" بہت دیر بعد وہ جلی ہوئی سی آواز میں بولا۔

"یہاں سے کسی طرح نکل چلو راجا!"

"ابھی تیرا مغز پھر گیا ہے جانی! کیسے ادھر سے جا سکتا ہے۔"

"مجھے لگتا ہے، خاں صاحب ہمیں جان بوجھ کے لائے ہیں۔"

"ہنہ!" وہ غبار آلود لہجے میں بولا۔ "پر ابھی کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کر لے۔ سویرا ہوتے دیکھے گا، ابھی اپن کچھ بول نہیں سکتا۔"

میرا سارا جسم ترترح سا رہا تھا، ہم دونوں بستروں پر لیٹ گئے اور کروٹیں بدلتے رہے۔ رات رینگ رینگ کے گزر رہی تھی۔ جانے کس وقت پیرو اٹھ کے بیٹھ گیا۔ میری آنکھیں بھی کھلی ہوئی تھیں۔ وہ بستر سے اٹھا تو میں بھی اس کے ساتھ اٹھ بیٹھا، ہم دروازہ کھول کے دالان میں آ گئے۔ ساری حویلی پر سکوت طاری تھا۔ تمام دروازے بند تھے۔ کھڑکیوں سے باہر باغ کا منظر نظر آتا تھا لیکن پھیلتی روشنی میں درختوں کے سایوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ صحن میں لگے ہوئے سفید فوارے سے پانی رِس رہا تھا اور اسی کی آواز اطراف میں گونجی ہوئی تھی۔ ہم نے چند قدم کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ ایک بندوق بردار ملازم چوکنا ہو گیا لیکن اس نے ہم سے کچھ کہا نہیں۔ ہم ٹہلتے ہوئے چپ چاپ کمرے میں واپس آ گئے اور سورج نکلنے کا انتظار کرنے لگے۔ علی الصباح پیرو نے غسل کیا، گرم پانی موجود تھا، ادھر پیرو غسل سے فارغ ہوا ادھر ملازم قہوہ لے کے آ گیا، خاں صاحب کے انتظار میں آٹھ بج گئے۔ آٹھ بجے کے قریب کہیں وہ نمودار ہوئے اور ہم لوگوں کو کھانے کے کمرے میں لے آئے جہاں فرشی نشست پر خوان سجا ہوا تھا۔ باقاعدہ کھانے کا اہتمام تھا۔ خاں صاحب کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا انھوں نے بھی ہماری طرح رات جاگ کے گزاری ہے۔ پوچھنے لگے کہ رات کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟ ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ ناشتہ بس رسمی طور پر کیا گیا۔ "ابھی اپنے کو چلنا کو بڑے صاحب!" جیسے ہی موقع ملا پیرو نے بے تابی سے کہا۔

"ایسی بھی کیا جلدی، یہاں آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہے تو اب یہیں ٹھہریے۔" ہم نے پھر جھڑکی تو وہ اور مچل گئے، بولے۔ "آپ اپنا کام کر کے شہر چلے جائیں مگر واپس یہیں آئیں۔" اتنا ہی بہت۔ ہم نے ان سے وعدہ کر لیا مگر دس بج گئے اور انھوں نے زبان سے کچھ نہیں کیا تو ہم نے انھیں پھر ٹوکا، پہلو بدلتے ہوئے کہنے لگے۔ "آپ سے ایک بات کہنی ہے۔"

"جو حکم دینا ہے، بولو بڑے صاحب!"

"حکم نہیں، درخواست سمجھیے۔"

"آپ ہمارے محسن ہیں بڑے صاحب! فرمائیے کیا کام ہے" میں نے کہا۔ معاً میرے ذہن میں یہی خیال آیا تھا کہ خاں صاحب ہم سے شاہ کبیر جیسے کسی شخص کے متعلق کوئی بات کرنا چاہتے ہیں۔

"دیکھیے، ایسا ہے کہ" وہ لفظ چباتے ہوئے بولے۔ "مناسب ہو تو مجھے خانم کا اتا پتہ بتا دیجیے۔"

"خانم کا! پر اپن بول چکا ہے کہ اپنے کو کچھ نہیں پتہ۔"

"لیکن آپ چاہیں تو پتہ چلا سکتے ہیں۔"

"ابھی ایسا کیا بات ہے بڑے صاحب! اکھل کے بولو کو سیدھا بات ٹھیک لگتا ہے۔"

"ہاں! میں آپ کو سب صاف صاف بتائے دیتا ہوں" بڑبڑاتے ہوئے بولے۔

"جب سے خانم گئی ہے، نواب نہیں سنبھلے، خانم ان کی ... لے گئی ہے۔ حالت یہ ہے کہ بتدریج رنڈ گری چلی جاتی ہے۔ دنیا سے بے خبر، نہ کہیں آنا نہ جانا، نہ کسی سے ملنا جلنا، منہ کو چپ لگ گئی ہے۔ بس دیواریں تکتے رہتے ہیں۔ بہت سے ڈاکٹروں کو آپ جانیں، یہ ڈاکٹر حکیم کے بس کا روگ بھی نہیں ہے۔ شاید ... کو بھی علم نہیں تھا کہ خانم نے وہ اس قدر بندھ چکے ہیں، ایک ہی کا نام وردِ زباں ہے۔"

"ایسا؟" پیرو نے متعجب ہو کے کہا۔

"میں آپ کو کیا بتاؤں، نواب کا کیا حال ہے۔ ان کے چیز کی کمی ہے اور ان کے متعلقین، احباب نے کون سا جتن کیا ہوگا۔ ہم نے ادھر ادھر خانم کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کہیں نہیں ملی۔ پھر آپ نظر آ گئے، اب اتنے دنوں پھر امید کی کوئی کرن پھوٹی ہے۔"

"ہا! ابھی اتنا سا بات تھا تو آپ نے اپنے کو پہلے کیوں بولا۔ اپن ابھی حیدرآباد سے جا کے پہلا کام خانم کو ڈھونڈنے گا اور جیسے ہی اس کا ٹھکانا پتہ چلا، آپ کو بولے گا۔"

"یہ ایک شخص کی زندگی کا سوال ہے۔"

"اپن سمجھتا ہے، ایسا کبھی کبھی ہو جاتا ہے، آپ ایک دم فکر کرو بڑے صاحب! اپن سے جو بن سکا کرے گا۔ نواب سے جلد

دوا ابھی کچھ دن اور کاٹ لے۔"

"ان پر تو ایک ایک لمحہ عذاب کی طرح گزر رہا ہے۔"

"اپن بولتا ہے، ابھی اپن جیسا کوشش کرے گا۔"

"دیکھیے، اگر آپ کو کوئی بھی اتا پتہ معلوم ہو تو..."

"آپ کیا بولتے ہو بڑے صاحب!"

"آپ کو نہیں معلوم تو صاحب زادے کو معلوم ہوگا۔ مجھے معلوم ہے، آپ نہیں تھے۔ صاحب زادے کے ہمراہ کوئی اور صاحب تھے اور وہ کوئی دُور کے آدمی بھی نہیں معلوم ہوتے تھے۔ دونوں ساتھ ساتھ آئے تھے، ساتھ ساتھ واپس گئے تھے، سب نے یہی جانا تھا کہ صاحب زادے ان کے بیٹے، بھائی یا شاگرد ہی ہو سکتے ہیں، ایسا بھی کیا ہے کہ اب ان کو ان کی منزل نشان کچھ معلوم نہ ہو۔ ہم خانم سے بس درخواست ہی کر سکتے ہیں لیکن ایک شخص کے لیے، ایک شخص کی زندگی کے لیے خانم تک پہنچنا ضروری ہے۔"

خاں صاحب کا لہجہ درد مندانہ اور التجا آمیز تھا، میں ان سے کیا عذر کرتا کہ ان کے بقول کتنوں نے اس وقت مجھے بتھل کے ساتھ یہاں دیکھا تھا، ہم کئی دن خانم کے ہاں رہے تھے، میں نے خاں صاحب سے کہا کہ حیدرآباد سے نکلتے ہی ہم جدا ہو گئے تھے، میں بمبئی چلا گیا تھا لیکن وہ بمبئی نہیں آئے، اس کے بعد کچھ نہیں معلوم۔ بتھل کا میں نے نام نہیں لیا، صرف اتنا کہا کہ اس آدمی سے میرا تعلق گہرا نہیں تھا، اتفاقی تھا، سفر کے دوران ایک ناروا واقعہ ہو گیا تھا، جا تو تک نکل آئے تھے۔ وہ یہ سب دیکھ رہے تھے، انھوں نے مشکل وقت میں میری مدد کی، لازماً ہم دونوں میں ربط ضبط بڑھ گیا اس قدر کہ انھوں نے جب مجھ سے چند دنوں کے لیے اپنے ساتھ حیدرآباد چلنے کی درخواست کی تو میں منع نہ کر سکا، انھوں نے مجھے ایک بڑی رقم دینے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ مجھے کچھ نہ کچھ تو خاں صاحب سے کہنا تھا، میں یہی بے سروپا باتیں کرتا رہا۔ میں نے ان سے کہا، باتوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ حیدرآباد کے رہنے والے ہیں، بمبئی میں مستقل قیام کا ارادہ بھی ظاہر کر رہے تھے، میں نے انھیں بمبئی کا پتہ دیا تھا لیکن وہ وہاں آئے نہیں۔

خاں صاحب کو میری ان فضول باتوں کا کچھ یقین آیا کچھ نہیں، وہ متذبذب انداز میں پلکیں جھپکاتے رہے اور کچھ توقف کے بعد بولے۔ "صاحب زادے! زمانہ ہم نے بھی دیکھا ہے۔ میں آپ سے حجت نہیں کروں گا لیکن آپ خود سوچیے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"میں سب کچھ ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں۔" میں نے ناگواری سے کہا۔

وہ اصرار کرنے لگے کہ اب بھی ان کی آخری امید ہیں، انھوں نے اور نواب کے دیگر بہی خواہوں نے ہندوستان میں شاید کوئی ایسی قابلِ ذکر جگہ نہیں چھوڑی ہے جہاں خانم کی تلاش نہ کی ہو، آگرہ، لکھنؤ، کان پور، بمبئی، کلکتہ، بھوپال، جانے کہاں کہاں کی خاک چھانی ہے۔ اب بالکل ناامیدی کے عالم میں آخر ہماری صورت دکھائی دی ہے۔ ہم اپنی بات پر جمے رہے۔ بالآخر خاں صاحب کے دل میں جو بات تھی ان کی زبان پر آ گئی۔ ہٹیلے لہجے میں کہنے لگے۔ "دیکھیے صاحب! جب تک آپ میری درخواست قبول نہیں کریں گے، میں آپ کو یہاں سے جانے نہیں دوں گا۔"

"اپن کیا بولے بڑے صاحب! آپ کو اپنے لیے کچھ بھی..."

"سب کچھ آپ کے ہاتھ میں ہے۔"

"ہم نے آپ کو سب بول دیا ہے..."

"ذرا صبر و سکون سے کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے غور کر لیجیے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ نواب ایک بہت اچھے آدمی ہیں، دھن دولت کی یہاں کوئی کمی نہیں ہے۔ نواب کی زندگی ہی سے یہ سب کچھ ہے، ان کی زندگی کے لیے..."

"بڑے صاحب!" پیرو نے ان کی بات کاٹ کے کہا۔

"ابھی بس کرو۔"

"آپ کو میری بات کا یقین نہ ہو تو میں نواب کی صورت آپ کو دکھلائے دیتا ہوں، انھیں دیکھ کے شاید آپ کو ترس آ جائے۔"

"اپنے کو ایک دم بھروسا ہے، آپ جو بول رہے ہو، ٹھیک ہے پر یہ ایسا کوئی بڑا بات نہیں ہے۔ اپن نے آپ سے بولا تھا کہ ابھی باہر جاتے ہی سب کچھ کرے گا۔"

خاں صاحب نے جیسے سنا ہی نہیں، تنک کے بولے۔ "مجھے شبہ ہے کہ آپ کو خانم کا ٹھکانا معلوم ہے، معلوم ہونا بھی چاہیے، آپ چھپا رہے ہیں، ایسی ویسی کوئی بات ہے تو آپ اطمینان رکھیں، میں زبان دیتا ہوں۔"

"اپنے کو آپ کیوں آدھا کر رہا ہے بڑے صاحب!"

"پھر میں یہی سمجھوں کہ آپ بتانا نہیں چاہتے۔"

"یہی آپ کو ٹھیک لگتا ہے تو ابھی آپ ایسا ہی سمجھو۔"

"مگر ہمیں ہر صورت میں یہ معلوم کرنا ضروری ہے۔" خاں صاحب کے لہجے میں اچانک تندی آ گئی تھی۔

"ایسا! اپن کو شک تھا، ابھی کچھ دیر بعد آپ ایسا ہی نہ بولے۔"

"اپن بولتا ہے، آپ غلطی پر ہے۔"

"بہتر ہے کہ آپ میری مدد کریں۔" خاں صاحب نے سرد آواز میں کہا۔ "ورنہ..." وہ جھجکتے ہوئے بولے۔ "ورنہ میں آپ سے کہوں گا کہ پھر آپ بھی غلطی پر ہیں۔"

"اگر اپن ابھی کچھ بتا دے تو آپ کو یقین آ جائے گا؟"

"ضرور! لیکن، لیکن پہلے ہم تصدیق ضرور کریں گے۔"

"اپن ابھی سب سمجھ گیا۔" پیرو نے تمتماتی آواز میں کہا۔ "اپن

کو نہیں معلوم بڑے صاحب!"

"نہیں معلوم!" خاں صاحب نے سر اُٹھا کے حتمی لہجے میں کہا۔ "تو، تو اس کے معنی ہیں آپ لوگ یہاں سے جانا نہیں چاہتے۔"

"آپ کیا بولتے ہو؟"

"ہاں! جو آپ لوگوں نے سُنا ہے، وہی۔"

"ابھی کون اپن کو روک سکتا ہے۔"

"کوشش کر لیجیے، پشیمانی ہو گی۔ یہ حویلی تھوڑی بہت نظر میں آ ہی گئی ہو گی۔ یہاں اجازت کے بغیر پرندہ بھی پر نہیں مارتا اور یہ شہر حیدرآباد ہے۔ اس حویلی کے مکینوں کے اثر و رسوخ کا اندازہ تمھیں یہاں اپنی موجودی سے ہو جانا چاہیے۔" خاں صاحب آپ سے تم پر آ گئے تھے، تحکمانہ لہجے میں بولے۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ تھانے سے تم یہاں اس آسانی سے آ سکتے تھے؟"

"سب سمجھتا ہے اور ابھی سب سمجھ رہا ہے، وہ چار بھی تمھارا آدمی تھا جو دوپہر سے اپن کا پیچھا کر رہا تھا۔"

"تم نے ٹھیک جانا، وہ تم سے مڈبھیڑ نہیں چاہتے تھے، انھیں صرف تمھارا پتہ جاننا تھا، اس سے زیادہ انھیں کوئی اور ہدایت نہیں دی گئی تھی اور اس سے زیادہ انھیں کچھ اور معلوم بھی نہیں تھا۔"

"اور وہ سب آقا جانتا ہے۔"

"ہاں! آقا کو ہم نے حکم دیا تھا کہ دوبارہ جب کبھی تم حیدرآباد میں نظر آؤ، تمھارا تعاقب کیا جائے، آخر تم لوگ آ ہی گئے۔ ہمیں اندازہ تھا کہ تم سیدھے سبھاؤ کچھ نہیں بتاؤ گے، جو لوگ سرِ بازار نواب عالم تاب کی گردن پر چاقو رکھ سکتے ہیں، شاہ کبیر سے مجیٹا کر سکتے ہوں، جو جن کے اشارے پہچانتا ہو، اُن کا تعلق کس قبیل کے لوگوں سے ہو سکتا ہے۔ ہم تمھیں کوئی زحمت دینا اور تمھارے راستے میں کوئی رکاوٹ بننا نہیں چاہتے تھے، تم خود اپنے راستے کی دیوار بن گئے۔ تمھارے تعاقب سے ہمارا مسئلہ حل ہو سکتا تھا۔ ہمیں تم سے کوئی غرض نہیں، خانم سے ہے لیکن وہ صورت نہیں بنی تو دوسری اور بھی موجود ہیں۔ ایک یہی ہے کہ تم حالات کا اچھی طرح تخمینہ لگا کے ہمیں بھی اُلجھن سے بچاؤ اور خود کو بھی۔ اب تم سب کچھ جان گئے ہو تو تمھارا تعاقب فضول ہے۔ تھانے سے تم یہاں آ گئے ہو، تمھیں لمبی سزا دلوانے کے لیے اُس آدمی کو ختم کیا جا سکتا تھا جو ابھی تک زخمی ہے اور وہ کسی بھی وقت مارا جا سکتا ہے۔ تھانے اور جیل سے نجات آسان تھی مگر اس حویلی سے مشکل ہے، اس کی فصیلیں اونچی ہیں اور یہاں مسلح پہرے داروں کی ایک فوج موجود ہے اور یہاں یہاں کے مکینوں کا قانون چلتا ہے، تم یہاں سسک سسک کر مر جاؤ گے اور کسی کو خبر نہیں ہو گی۔ خانم ہمیں مطلوب ہے، تم سے بس اتنا کہنا تھا۔ سمجھ دار آدمی ہو۔ تمھاری نجات بہرحال اب بھی تمھاری دسترس میں ہے، کوئی مطالبہ ہو تو کہہ سکتے ہو۔"

ابھی خاں صاحب یہ کہہ ہی رہے تھے کہ اردگرد کھڑے ملازموں میں ہلچل سی مچی اور ایک بھاری بھرکم شخص چکن کی شیروانی میں ملبوس اندر داخل ہوا۔ تمام ملازمین سر جھکا کے کھڑے ہو گئے۔ سرخ و سفید رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، مونچھیں تلوار کے مانند، اُس کی چال شاہانہ تھی، وضع قطع سے کوئی نواب معلوم ہوتا تھا۔ خاں صاحب بھی اُسے دیکھ کے یک لخت اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم دونوں بھی بے اختیار اُٹھ گئے۔ خاں صاحب نے جھک کے اُسے سلام کیا، اُس نے سر کی جنبش سے جواب دیا اور خشمگیں نظروں سے ہمیں دیکھتا ہوا گونج دار آواز میں بولا۔ "ان کو سب بتا دیا ہے تم نے؟"

"سرکار!" خاں صاحب نے گردن خم کر کے کہا۔ "میں ہر بات تفصیل سے کہہ دینے کی کوشش کی ہے۔"

"ان سے کہہ دو کہ انھیں جتنی رقم کی ضرورت ہو، دے دی جائے۔"

"میں نے اشارہ کر دیا ہے۔" خاں صاحب نے زیر لبی سے کہا۔

"اشارہ نہیں، کھل کے بات کرو۔" نواب نے گرجتے ہوئے کہا۔

خاں صاحب اُس کے آتے ہی حواس باختہ سے ہو گئے، بدحواسی ہی میں انھوں نے ہمیں بتایا کہ نواب عالم تاب کے بڑے بھائی نواب عالم گیر ہم سے مخاطب ہیں۔ یہ حویلی بھی اُنھی کی معلوم ہوتی تھی۔ خاں صاحب اُس کے سامنے محض ایک کارندے نظر آ رہے تھے۔

"اپن کو رُپے پیسے کا ایک دم ضرورت نہیں ہے نواب۔" پیرو نے تلخی سے کہا۔ "ابھی آپ بڑا آدمی ہے تو اپن بھی بھکاری نہیں ہے، جو خاں صاحب نے بولا ہے، اپن نے اچھی طرح سُن لیا ہے پر ابھی آپ بھی سُن لو، کوئی اپن سے اس طرح کچھ نہیں لے سکتا، اپنا روپیہ پیسا اپنے پاس رکھو۔ اپن خانم سے بات کرے گا اور سب جا کے بول دے گا۔ وہ ایسا دل کا پتھر نہیں ہے۔"

"انھیں بتا دو خان کہ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں۔" نواب نے ہم سے مخاطب ہونے کے بجائے خاں صاحب سے کہا۔

"ابھی سیدھا اپن سے بات کرو نواب صاحب! اپن کو دو، ابھی تم کو چوبداروں سے ناتا پڑتا ہے، اپن بولتا ہے، ایسا تم سے کچھ نہیں جان سکتا، چاہے اپن اندر سے کبھی نہیں نکلے۔"

"ہم کو خانم کا پتہ ابھی چاہیے۔" وہ دھمکتے لہجے میں بولا۔

"اپن نہیں جانتا۔" پیرو نے بھی اُسی لہجے میں جواب دیا۔

"پھر تم لوگ یہاں سے نہیں جا سکتے۔"

"پھر تم بھی اپنے لیے اچھا نہیں کرے گا۔"

"انھیں یہیں رکھو۔" نواب نے خاں صاحب کو حکم دیا۔ "نہیں تو کچھ دیر بعد، کچھ دنوں بعد ان کی سمجھ میں آ جائے گا کہ

کہاں ہیں۔"

"اپن کو پتہ ہے، اپن بہت بڑا محل میں ہے۔ ادھر تمھارا راج چلتا ہے، تم ادھر کا نظام بادشاہ ہے پر اپن تمھارا چاکری میں نہیں ہے، اپن اس زبان میں بات سُننے کا عادی نہیں ہے جس میں ابھی تم بولتا ہے۔"

"سرکار! یہ گستاخ لوگ ہیں، آپ ان کے منہ نہ لگیں۔ میں ان سے نپٹ لوں گا۔" خاں صاحب تیزی سے بولے۔

"تم کیا نمٹے گا، تم ایک دم چلا آدمی ہے، اُلو کا پٹھا!"

"ان کو تہہ خانے میں بند کر دو۔" نواب نے اشتعال سے کہا۔

"تم نہیں جانتا نواب! نہیں جانتا کہ تمھارے آگے ادھر کون لوگ ہے، تم ادھر اپنے کو تہہ خانے میں بند کرے گا، اپن سالا مر جائے گا اور ابھی تم کو کچھ نہیں بولے گا۔ تم کو کچھ جاننا ہے تو اپن کو چھوڑنا پڑے گا، ویسے تم کچھ نہیں جان سکتا۔"

"خان! ہم کو شک ہے کہ تم نے انھیں پوری بات نہیں بتائی۔"

"خان نے اپن کو سب بول دیا ہے۔"

"ہم اپنے بھائی کی زندگی کے لیے ہر ممکن تدبیر پر عمل کریں گے۔"

"تم اپنے اور بھائی کے ساتھ بُرا کر رہا ہے۔ اپن کو ابھی جانے دو۔ تمھارا سر میں ابھی کچھ گرد ہے تو سمجھنے کا کوشش کرو، خانم کوئی کھلونا نہیں ہے، اُس کا مرضی ہوئے گا تو ادھر آئے گا، تم دھن دولت میں ابھی سمجھتا ہے کہ سب خرید لے گا۔ آدمی خرید لے گا، تم بھول گیا ہے کہ خانم نے چلتے وقت نواب کو انکار بول دیا تھا۔"

"آپ اندر تشریف لے جائیں سرکار!" خاں صاحب نے بیچ میں عاجزی سے کہا۔ "میں یہاں موجود ہوں۔"

"ان سے کہو خان ہم انھیں ایک لاکھ رُپے تک دے سکتے ہیں۔"

"ایک لاکھ!" پیرو نے زہرخند سے کہا۔

"دو لاکھ، تین لاکھ، پانچ لاکھ۔"

"بیس لاکھ!" پیرو نے زمین پر تھوک کے کہا۔ "تم بار بار روپے کی بات کیا کرتا ہے نواب! ابھی کتنا روپیہ ہے تمھارے پاس! ایسا ابھی کتنا حویلی ہے۔ اپن سے سودا کرو، اپن یہ سب خرید لے گا۔ تم کو، تمھارا سارا خاندان کو۔ تم سالا بیچتا کیا ہے۔"

نواب کے ہونٹ کپکپانے لگے۔ "یہ، یہ لوگ پاگل معلوم ہوتے ہیں۔"

"خادم نے پہلے ہی عرض کیا تھا، ان کے منہ نہ لگیں۔" خاں صاحب نے نواب کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"ابھی ادھر تمھارا کوئی مائی بہن ہے تو اپنے کو دکھاؤ، اپن اس کا بولی دے گا، سمجھا۔"

"اوہ، اوہ۔" نواب نے اضطراری انداز میں پیرو پر جھپٹنے کے لیے قدم بڑھائے لیکن خاں صاحب آڑے آ گئے۔ "ہم اس کا خون پی جائیں گے۔" نواب کے منہ سے کف جاری تھا۔

"ابھی بُرا لگا نواب! خانم بھی اپنا مائی بہن ہے۔"

"وہ ایک بازاری عورت ہے۔"

"اور اُس بازاری عورت میں تمھارے بھائی کا جان اٹکا ہوا ہے، تم اُس کو رانی بنا کے ادھر لانا مانگتا ہے، ابھی بس کرو نواب! اپن اُس کو سر پہ بٹھا کے ادھر سے لے گیا تھا، آخر دم تک اُس کا رکھوالی کرے گا، سمجھا! ابھی اُس کا کوئی گھر بھی ہو سکتا ہے، وہ شادی بھی بنا سکتا ہے، تمھارے مافق کسی عزت والا گھر سے اُس کا ناتا جڑ سکتا ہے، ابھی تم کو کیسے بول دیوے کہ وہ کیدر ہے۔"

"تمھیں بتانا ہی پڑے گا، ہم ہر قیمت پر اُسے حاصل کریں گے۔" نواب کے بولنے سے پہلے خاں صاحب نے برہمی سے کہا۔

"تم سب گھاس کھا گیا ہے سالا۔"

نواب کے اشارے پر مسلح پہرے دار ہماری طرف جھپٹ پڑے۔ میں نے اور پیرو نے سامنے آنے والے دو آدمیوں کو فوراً بے دم کر دیا تھا لیکن اُن کے پیچھے والوں نے بندوقیں ہمارے سینوں پر ٹکا دیں۔ پیرو نے نال پکڑ بھی لی تھی مگر دوسرے نے بندوق کی بٹ پوری طاقت سے پیرو کے سینے میں ماری۔ پیرو اگر پیچھے نہ ہو جاتا تو اُس کی پسلیاں ضرور ٹوٹ جاتیں۔ کمرے میں اچانک کئی پہرے دار آ گئے۔ وہ سب کے سب چاق و چوبند تھے، سیاہ فام، تنومند اور گھنیے، بندوقیں ہاتھ میں لیے ہوئے۔ ہاتھ پیر چلانا بے سود تھا، نواب ابھی موجود تھا، پیرو نے قہر آلود آواز میں اُس سے کہا۔ "نواب! تم نہیں جانتا، ایک دم نہیں جانتا کہ اپن کون لوگ ہے، تم اپنے لیے بُرا کر رہا ہے، ابھی اپن ادھر اکیلا نہیں ہے۔ تمھارا حویلی خاک ہو جائے گا، ادھر پھر کوئی بھی نظر نہیں آئے گا۔ اپن کے آدمی کو ادھر پہنچنے میں کوئی دیر نہیں لگے گا، تم سالا بہت خوار ہو گا۔" پیرو جانے کیا کیا کہتا، چیختا، دھاڑتا رہا۔ وہ ہمیں دھکیلتے ہوئے حویلی سے باہر لے آئے۔

وہ اصطبل سے ملحق ایک کوٹھری تھی جہاں گھوڑوں کا چارہ رکھا جاتا تھا۔ کوٹھری میں اوپر چھت کے ساتھ روشن دانوں کے سوا ایک ہی سلاخوں والی کھڑکی تھی اور آمد و رفت کے لیے لکڑی کا دروازہ۔ قریب ہی تھان سے بندھے ہوئے گھوڑے منہنا رہے تھے، کوٹھری میں سیلن کے علاوہ غلاظت کی بُو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ صبح سے شام ہو گئی۔ میں نے پیرو سے کہنے کی کوشش کی کہ اُنھوں نے نواب عالم تاب کے متعلق جو کچھ کہا ہے، ممکن ہے، غلط نہ ہو، میں نے خود دیکھا تھا، اسٹیشن پر جب خانم نے اُس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا تو اُس کا کیا حال ہوا تھا۔ وہ دم بخود رہ گیا تھا۔ ہو سکتا ہے یہی سب ہو، ہمیں کسی اور طرح بھی سوچنا چاہیے ورنہ جیسا وہ

کہہ رہے ہیں، انھوں نے ہمارے ساتھ یہی سلوک روا رکھا تو ہم یہاں گھٹ گھٹ کے مر جائیں گے اور کسی کو بھی ہمارا سُراغ نہیں ملے گا۔ پیرو اُلٹا مجھ پہ بگڑنے لگا: "تیرا مطلب ہے، ابھی ہم اُس کو فیض آباد کا پتہ بول دے گیا!" میں چپ ہو گیا، وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔

دو دن گزر گئے، خاں صاحب سلاخوں کی کھڑکی کے پاس آ کے صبح و شام ہمیں سمجھاتے، دھمکاتے رہے تھے۔ پیرو جواب میں انھیں گالیاں بکتا رہا۔ ہم نے کوٹھری سے نکلنے کی ہر ممکن صورت پر غور کر کے دیکھ لیا تھا لیکن باہر ایک نہیں کئی پہرے دار ہر وقت تعینات رہتے تھے اور تینوں وقت کھانا دے جاتے تھے۔ تیسرے دن جیسے ہی رات کے وقت دروازہ کھلنے کی آہٹ ہوئی، پیرو لپک کے دروازے کی آڑ میں چھپ گیا، دوسری طرف میں چھپا۔ ابھی کھانا لانے والے نے سر اندر ڈال کے جھانکا ہی تھا کہ پیرو نے اُس کی آنکھوں پہ مٹھی ڈال دی اور منہ پر ہاتھ رکھ کے اندر گھسیٹ لیا۔ یہ دیکھ کے اُس کے پیچھے موجود پہرے دار سٹ پٹاتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اِس طرف سے میں اُس پر جھپٹا اور میں نے اُس کی بندوق چھین لی۔ اِدھر پیرو نے جھٹ اُس کی کمر سے کارتوس کی پیٹی اُتار لی۔ ہم نشانہ لیے ہوئے باہر نکلے۔ ہم نے باہر ایک پہرے دار پر گولی بھی چلا دی تھی لیکن ہم دروازے تک نہیں جا سکے۔ ہر طرف گولیاں چلنے لگی تھیں، نتیجتہً ہمیں بندوق پھینک دینی پڑی اور سزا کے طور پر انھوں نے ہمیں اصطبل کے بجائے حویلی کے تہہ خانے میں بند کر دیا جہاں ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی، سر پھوڑنے کے لیے چاروں طرف پتھریلی دیواروں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اصطبل کی کوٹھری اس اندھیرے غار سے بسا غنیمت تھی۔ خاں صاحب پہرے داروں کی معیت میں روزانہ نت نئی دھمکیاں لے کے تہہ خانے کی سیڑھیاں طے کرتے تھے۔ پیرو نے اُن سے بات کرنا ہی بند کر دیا تھا۔ نواب جہاں گیر پھر نہیں آیا۔

تہہ خانے میں آئے ہمیں چوتھا دن ہو گا کہ خاں صاحب کئی پہرے داروں کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ اُن کے حکم پر پہرے داروں نے ہمیں بے بس کر کے رسیوں سے باندھ دیا اور بیدوں سے مسلسل ضربیں لگاتے رہے مگر ہم نے زبان نہیں کھولی۔ میرے اور پیرو کے جسم پر جگہ جگہ نیل پڑ گئے تھے، تہہ خانے میں مچھروں کی بہتات تھی۔ سورج کی روشنی آتی ہی نہیں تھی۔ سیلن اور مچھروں کی وجہ سے مجھے سخت بخار آ گیا، پیرو کی طبیعت بھی گری گری رہنے لگی۔

حویلی میں آئے نواں اور تہہ خانے میں بند ہوئے چھٹا دن تھا کہ انھوں نے ہمیں باہر نکال لیا اور حویلی ہی کے ایک حصّے میں لے جا کے پھر بند کر دیا۔ وہ ملازموں ہی کا حصّہ ہو سکتا تھا۔ وہاں روشنی تھی اور ہوا بھی خوب آتی تھی لیکن ساتھ ہی اردگرد پہرے داروں کی تعداد بھی بڑھا دی گئی تھی۔ ہماری ایک ذرا سی آہٹ پہ پہرے دار فوراً مستعد ہو جاتے تھے۔ خاں صاحب نے بھی اب [illegible] کر دیا تھا۔ صرف ایک ملازم دروازے پہ کھانا رکھ کے چلا جاتا [illegible] کے کسی اور شخص نے پھر کوئی رابطہ ہم سے قائم نہیں کیا تھا۔ [illegible] آ کے میری طبیعت کچھ سنبھل گئی تھی لیکن ہم دونوں شب [illegible] ایک دوسرے کا چہرہ ہی دیکھتے رہتے تھے۔ پتہ نہیں بابا جا[illegible] اور طوطی کا کیا حال ہو گا۔ کہاں کہاں مارے پھر رہے ہوں گے [illegible] نے متعدد بار پہرے داروں سے بات کرنے کی کوشش کی [illegible] خاموشی کے سوا انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

گیارھویں دن بعد رات کا وقت تھا، خاصی رات ہو گ[ئی تھی] کمرے میں زرد بلب کی مدھم روشنی ٹمٹما رہی تھی اور ہر سو خاموشی تھی کہ اچانک دروازہ کھلا۔ میں اور پیرو ہڑبڑا کے اُٹھ گئے [illegible] پہرے دار بندوقیں آگے کیے تیزی سے اندر آئے۔ اُن کے پیچھے سیاہ چادروں میں لپٹی ہوئی دو عورتیں بھی موجود تھیں۔ چہروں پر [نقاب] پڑی ہوئی تھی، صرف آنکھیں اور سُرخ و سفید پیشانی کھلی ہو[ئی تھی۔] سیاہ نقاب میں اُن کے شہابی رنگ دمک رہے تھے۔ دونوں [کے] قد نکلتے ہوئے تھے، ایک نسبتہً فربہ، دوسری دبلی پتلی۔ اُن [کے آتے ہی] پہرے دار کمرے کے کونوں میں سمٹ گئے۔ دونوں عورتیں [محتاط] انداز سے چلتی ہوئی ہم سے کچھ فاصلے پر آ کے رک گئیں۔ انھو[ں نے] پلٹ کے ہاتھ کے اشارے سے پہرے داروں کو کمرے سے [نکل جانے] کا حکم دیا۔ پہرے داروں نے تعمیل میں تامل کیا لیکن دوسر[ے لمحے] وہ دونوں کمرے سے نکل گئے۔

ہم دونوں گنگ کھڑے تھے۔

اُن کا ہمارا فاصلہ دو تین گز سے زیادہ نہیں ہو گا، میری ج[یرت] بھری نظریں انھی پر مرکوز تھیں۔ رات خاصی ہو گئی تھی، ایسے وقت دو عورتوں کا اچانک ہمارے پاس آنے سے کیا مقصد ہو سکتا ہے [illegible] کی آنکھیں بھی پھٹی ہوئی تھیں۔ دونوں کی شہابی پیشانیاں اور بڑ[ی] سیاہ آنکھیں ہی کھلی ہوئی تھیں، اِس کے سوا اُن کی ظاہری و[ضع] نے ان کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ وہ [illegible] قدموں سے اندر آئی تھیں، پہرے داروں کو کمرے سے نکل جانے کا [حکم دیتے] وقت اُن کے لہجے میں لرزیدگی کے باوجود تمکنت تھی۔ ایک عور[ت کا] بدن فربہ تھا، اُس کی عمر دوسری عورت سے یقیناً زیادہ تھی [illegible] نے پہرے داروں کو چلے جانے کا حکم دیا تھا۔ اُن کے جانے کے بعد [وہ] گُم صُم کھڑی رہیں جیسے کہیں کھو گئی ہوں یا یہاں آ کے سب کچھ [بھول گئی] ہوں۔ وہ سر تا پا چادروں میں چھپی ہوئی تھیں تاہم اُن کے سراپا [illegible] صاف نمایاں تھا۔ اِدھر میرا جو حال تھا، وہی پیرو کا تھا۔ چند دن [illegible] خاں صاحب نے بھی آنا بند کر دیا تھا، نواب ایک ہی بار آیا تھ[ا۔]

[اِس] وقت بعد رات کے وقت کسی کا آنا اور وہ بھی دو عورتوں کا، کسی خاص ہی مقصد کی غمازی کرتا تھا لیکن وہ مقصد سمجھ لینے تک ہماری طرف سے خاموشی ہی مناسب تھی۔ کوئی بھی بات ہو سکتی تھی، وہ نواب کا کوئی نیا حکم سنانے آئی ہوں مگر نواب کو بھلا اُن کے توسط کی کیا ضرورت؟ ویسے نواب کی اجازت کے بغیر تو اس طرح کسی کا ہمارے پاس آنا ممکن ہی نہیں تھا، اب تک ہم نے یہی دیکھا تھا، خاں صاحب نے بھی ہمیں بتایا تھا کہ حویلی میں نواب کی اجازت کے بغیر پرندہ بھی پر نہیں مارتا۔ میرا سر گھوم رہا تھا، کیا نواب کو ہماری کوئی اور آزمائش مقصود ہے؟ کسی لمحے مجھے یہ گمان بھی ہوا تھا کہ کہیں یہ سب کچھ میرے منتشر حواس کا فریب تو نہیں ہے؟ شاید میں کوئی بے ہنگم سا خواب دیکھ رہا ہوں؟ مگر وہ سامنے کھڑی تھیں اور میرے برابر ہی پیرو موجود تھا۔ لمحوں تک سناٹا رہا، نہ ہم نے کچھ کہا، نہ اُن کے لبوں میں جنبش ہوئی البتہ اُن کی نظروں کو قرار نہیں تھا۔ کبھی فرش پر گڑ جاتیں، کبھی ہمارے گرد منڈلانے لگتیں۔ ایسا لگتا تھا، دونوں کے پاؤں زمین سے اکھڑے ہوئے ہیں اور وہ اپس بھاگ ہی جانا چاہتی ہیں، غالباً انھیں کہیں اور جانا تھا، بھٹک کے ادھر آ گئی ہیں۔ اِس سے پہلے کہ ہم زبان کھولتے اور اُن سے کچھ جاننے کی کوشش کرتے، میرے بائیں طرف کھڑی ہوئی بڑی عمر کی عورت کو خیال آیا، اُس نے تھرتھراتی آواز میں ہمیں آداب کیا، دوسری نے ہراساں ہوتے ہوئے اُس کی پیروی کی۔

میں نے سراسیمگی سے پیرو کی طرف دیکھا۔ ہم نے جھجکتے ہوئے سر ہلا کے اُن کے سلام کا جواب دیا۔

"ہم، ہم..." اُس نے ہانپتے ہوئے کہنا چاہا۔ "ہم آپ کے..." اُس کی آواز حلق میں گھٹ رہی تھی، وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

"ہاں ہاں بولو مائی!" پیرو نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

چند لمحے خاموشی طاری رہی پھر وہی عورت لڑکھڑاتی زبان سے بولی: "ہم آپ سے کچھ کہنے..." اُس کا سر پاپل سا کھا گیا۔

"ابھی کچھ بولے گا نہیں تو اپن کیا جواب دے گا۔" پیرو نے تنک کے کہا۔

"ہم آپ کے پاس بہت اُمید لے کے آئے ہیں۔" وہ تیز سانسوں سے بولی۔

"کیسا اُمید؟" پیرو نے سنسناتے لہجے میں پوچھا۔ "ابھی آرام سے کھل کے بولو۔"

"آپ سے ایک التجا کرنی ہے۔"

"اپن سے؟" پیرو تذبذب سے بولا۔ "تم کسی غلط جگہ آ گیا۔ اپن تو ایدر قیدی ہے مائی!"

وہ کسی مجرم کی طرح سر جھکائے چپ رہی، اُس کا سینہ دھڑک رہا تھا۔ ایک تاملانے کے سکوت کے بعد اُس کی کسمساتی آواز ابھر کے گونجی: "ہمیں اِس کا احساس ہے لیکن..."

"تم... تم کون ہے؟" پیرو نے اُس کی بات کاٹ کے تیزی سے پوچھا۔

"ہم بہت بدنصیب ہیں۔" اُس نے دبی زبان سے کہا۔

"اپن سے سیدھا بات کرو۔"

"ہم چھوٹے نواب کی بیگم ہیں اور یہ... یہ اُن کی بہن..."

وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولی۔

"تم چھوٹے نواب کا بیگم ہے؟"

وہ اضطراری انداز میں سر ہلا کے رہ گئی۔

"ابھی تم لوگ بھی اپن سے مخول کرتا ہے۔" پیرو نے تلخی سے کہا۔ "لگتا ہے نواب کے پاس سارا اختیار، آدمی ختم ہو گیا ہے جو اُس نے ابھی ایدر تم کو ٹھمکا لگانے کو بھیجا ہے۔"

"خدا کے لیے اپنی زبان قابو میں رکھیے۔" وہ ہیجانی لہجے میں بولی۔ "کوئی بدگمانی کرنے سے پہلے ہماری بات سُن لیجیے۔ چھوٹے نواب صاحب کو کسی بات کا ہوش نہیں ہے اور بڑے نواب کو علم نہیں ہے کہ ہم یہاں آپ کے پاس دامن پھیلانے آئے ہیں۔"

"ابھی تم پتہ نہیں کیسا بولتا ہے۔" پیرو نے وحشت سے کہا۔ "تمھارا مطلب ہے، تم نواب کا بیگم ہے؟"

"ہمیں اندازہ ہے آپ کے لیے یہ یقین کرنا مشکل ہو گا۔" وہ پژمردگی سے بولی۔ "مگر ہم نے یہی کہا ہے۔"

"اپن نے بھی سُن لیا ہے۔" پیرو نے تندی سے کہا۔ "جاؤ مائی! اپن بولتا ہے ابھی ایدر سے لوٹ جاؤ۔ ابھی اپن کا زبان بھی کھلا ہے، ہاتھ بھی۔ اور بھی سب بند نہیں ہے، سمجھا۔ ایدر رہتے رہتے اپن کو ابھی زنگ نہیں..."

"نہیں نہیں۔" اُس کی سیاہ آنکھوں میں شعلے سے لپکنے لگے اور وہ ہذیانی انداز میں بولی۔ "بہتر ہے، سوچ سمجھ کے منہ سے کچھ نکالیے، ہم نے یہاں آ کے کوئی گناہ، کوئی جرم نہیں کیا ہے۔" اُس کی لرزتی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔

میں نے سوچا، پیرو کو مزید ایسی ویسی باتوں سے باز رکھنے کے لیے درمیان میں دخل دوں، اُسے کم سے کم اتنا خیال رکھنا چاہیے کہ سامنے عورتیں ہیں مگر اپنی دخل اندازی سے مجھے اُس کی ناراضی کا خدشہ تھا اور اُس نے مجھے اِس کا موقع بھی نہیں دیا۔ حویلی میں بیتنے والا وقت شاید اُس پر مجھ سے زیادہ گراں گزرا تھا۔ آج کئی دن بعد کسی نے آ کے ہماری خبر لی تھی اس لیے پیرو کے تڑختے جسم میں آگ سی بھڑک اٹھی تھی، وہ زہرخند سے بولا: "تم اپن کو کیا سمجھ کے ایدر آیا ہے، ایدر ابھی بہت سا بال دھوپ کھا کے نہیں پکا ہے، اتنا بہت سمجھو کہ اپن نے

آتنا دیر ی تمھارا بات سن لیا اور ٹھیرا رہا ہے۔ جس راستے سے آیا ہے، ابھی ٹھیک ہے اُسی سے لوٹ جاؤ۔ آور جا کے نواب کو بولنا، یہ نوشکی ابن بہت دیکھتا رہا ہے۔ ابن ابھی ادھر ہی ہے، گھر کا اصلی زنانیوں کو بھیجے گا تو ابن ضرور کچھ سوچے گا۔"

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔" وہ بلکتے ہوئے بولی۔ "خدا کے لیے پہلے ہماری التجا سن لیجیے۔ اُس کے بعد جو مرضی ہو، کہہ لیجیے گا۔ آپ کے قول اور ارادے کے بارے میں سنا تھا جو اتنی جرأت بھی کر سکے۔ آپ ہمیں اس حویلی کی عزت نہیں سمجھتے تو اپنی ماں بہن ضرور سمجھ سکتے ہیں۔ کیا اتنا بھی آپ کے بس میں نہیں ہے؟ آپ کا ان رشتوں سے کبھی واسطہ نہیں پڑا؟ کیا ہم کسی ایسے رشتے کا بھرم لے کے آپ کے پاس نہیں آسکتے تھے؟" وہ گھٹے ہوئے لہجے میں بولی اور یکایک اُس کے سراپا میں ایک لہر سی اٹھی۔ اُس نے بے تابانہ اپنے چہرے پر پڑی ہوئی نقاب کھینچ لی اور اُسی وحشت و اضطراب میں اپنے ساتھ والی عورت کی نقاب بھی کھسوٹ لی۔ "آپ نے ضرور زمانہ دیکھا ہوگا۔" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "ہم بدبختوں کو بھی دیکھ لیجیے۔ اگر کچھ نظر آتا ہے تو.... ورنہ ہم سمجھیں گے، خدا ہم سے روٹھ گیا ہے۔ ہمارے نصیب ہمارے ساتھ...." اُس کے سینے نے اُس کی آواز کا ساتھ نہیں دیا اور اُس کے نازک ہونٹ پھڑپھڑا کے رہ گئے۔

پیرو کو جیسے سکتہ ہوگیا تھا، وہ دم بخود کھڑا رہا۔ یہ اسرار آج بھی شن ہوگیا تھا۔ اُن کے بے نقاب چہرے ہمارے سامنے تھے۔ انھوں نے غلط نہیں کہا تھا، اُن کا رنگ روپ شہزادیوں ہی کی طرح تھا۔ اُن کی کھلی پیشانی، آنکھوں، آواز کی کھنک اور لب و لہجہ کی نفاست اور فصاحت سے کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ ایسی نازک اندام اور مہ جمال ہوں گی، اُن کا شمار اُنھی لوگوں میں ہوتا تھا جن کا ذکر قصوں کہانیوں میں ہوتا ہے، جنھیں پھولوں اور پریوں سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ کمرے میں چاندنی سی چھٹک گئی تھی۔ جو عورت ہم سے مخاطب تھی اُس کی عمر تئیس چوبیس سال سے زیادہ نہیں ہوگی، دوسری اُس سے کم عمر تھی۔ بڑی کے نقش و نگار اُس کے بدن سے مختلف تھے، تیکھے تیکھے الگ الگ، کٹے اور ترشے ہوئے سے۔ چہرے سے اُس کے بدن کی فربہی کا گمان معدوم ہوجاتا تھا۔ دوسری لڑکی جیسا کہ اُس نے بتایا تھا، نواب کی بہن ہی ہوسکتی تھی۔ کتابی چہرہ، ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ اور لمبی لمبی پلکیں۔ دبلی پتلی ہونے کی وجہ سے وہ قد میں ذرا بڑی نظر آتی تھی، اُس کی ناک میں سونے کی لونگ دمک رہی تھی۔ دونوں کی کلائیوں میں سنہری چوڑیاں، کانوں میں ہیروں کے آویزے جگ مگا رہے تھے۔ اُن سے نگاہیں ملانا مشکل تھا۔ دونوں کا رنگ سرخ و سفید تھا، بلور کی طرح صاف و شفاف چہرے، پاکیزگی، تمکنت اور یاسیت اُن پر چھائی ہوئی تھی، جیسا کہ لوگ کہتے ہیں، خدا نے فرصت ہی میں انھیں تراشا تھا، کوئی بھی ایک نظر دیکھ کے کہ کہاں کا واسطہ مخمل و اطلس ہی سے رہا ہے۔

"ہم بہت مجبوری کی حالت میں آئے ہیں مگر کسی ا ہمیں گنگ دیکھ کے اُس نے زیر لب کہا۔

"پر آپ آپ ادھر کیوں آیا ہے؟" پیرو تھکی ہوئی آ

"ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کس منہ سے کہیں۔" وہ ا سے بولی۔ "ایک اپنے بھائی کی، دوسری اپنے شوہر کی زندگی مانگنے آئی ہے۔"

"ابھی آپ کیسا بولتا ہے؟" پیرو نے بوجھل لہجے میں "موت کا دھندا اوپر والا ہی کرتا ہے۔ ادھر اپنا زندگی ہی بس ہے تو دوسرے کو کیا دے گا۔"

"بخدا اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔ یقین کیجیے یہاں آپ کو اس حالت میں دیکھ کے بہت دکھ ہوا ہے۔ اختیار میں ہوتا تو ہم کبھی یہ ستم روا نہ رکھنے دیتے۔ ہم آپ کو بتا آپ کو اندازہ ہوگا ہی کہ حویلی میں ہماری حیثیت ایک تماش سی ہے۔ منہ میں زبان رکھتے ہوئے بھی ہم بے زبان ہیں، ہاتھ ہوتے ہوئے بھی بہت بے دست و پا ہیں۔ ہمیں معلوم ہو چکا یہاں کس طرح آئے تھے اور آپ کے ساتھ کیا کچھ ہوتا رہا۔"

"ابھی آپ کام کا بات بولو۔ ادھر آپ کا زیادہ دیر ٹھ رہنا ٹھیک نہیں ہے۔" پیرو نے آہستگی سے کہا۔

"ہم کیا کہیں، یہاں آنے کو آ گئے ہیں لیکن آپ کے منت کرتے ہوئے ہماری آواز ساتھ نہیں دیتی، ہمیں آپ مانگنے کا حق نہیں پہنچتا، ہم اپنا یہ حق جتانے کے لیے کسی ناز رشتے ہی کا سہارا لے سکتے تھے۔ اسے آپ خود غرضی کہہ لیں۔ اگر آپ کا دل ہمیں کسی معتبر رشتے کی عزت دینا گوارا نہیں اور رشتہ تو ہمارے آپ کے درمیان موجود ہے، انسان کا رشتہ کو اُسی کا واسطہ دیتے ہیں۔ کاش ہم کسی قابل ہوتے۔ اس ستم ظر احساس ہے کہ آپ کی کوئی مدد کرنے کے بجائے الٹا ہم آ کچھ طلب کرنے آئے ہیں۔ جس رشتے کے حوالے پر ہمیں اما اُس کی پاس داری کے ہم خود متحمل نہیں، کاش ہمارا حوصلہ اتنا ہوتا کہ ہم آپ کے لیے اس بند حویلی کے دروازے کھول سکتے۔ شرم سار ہیں۔"

"ابھی اس کو جانے دو۔ آپ نے اپنے بولنے کو کچھ نئیں چھو" پیرو کی آواز ڈھلک گئی تھی۔ "آپ اپنا بات کرو۔ ابن آپ ابھی کیا کر سکتا ہے؟"

"آپ چاہیں تو بہت کچھ کر سکتے ہیں۔" وہ بے قراری سے بولی۔ "ہم آپ سے کہنے آئے ہیں کہ جو کچھ آپ نے سنا ہے، غلط نہیں ہے۔ چھوٹے نواب صاحب کا یہی حال ہے۔ روز بہ روز اُن کا ہوش اُن سے چھنتا جا رہا ہے۔ انھیں کسی کی فکر نہیں جیسے سب کو بھول گئے ہوں، حتیٰ کہ اپنے آپ کو بھی۔ نہ کھانے کا ہوش ہے، نہ پہننے کا۔ لباس تبدیل کیے ہوئے دن ہو جاتے ہیں۔ صبح و شام بس خیالوں، خوابوں کی دنیا میں گم دیواریں تکتے رہتے ہیں۔ جسم میں خون ہی نہیں رہا ہے۔ اگر آپ نے پہلے انھیں دیکھا ہے تو اب شاید مشکل سے پہچان پائیں۔ شروع میں کسی کو کچھ پتہ ہی نہیں چلا کہ انھیں کون سا دکھ کھائے جا رہا ہے۔ اُس کی نظر لگ گئی ہے لیکن پھر کچھ چھپا نہ رہ سکا۔" میرے کان سنسنا رہے تھے۔ اُس کا ایک ایک لفظ حسرت و شکایات سے لبریز تھا۔ جلی ہوئی سی آواز، آدمی بس سنتا دیکھتا رہ جائے۔

"آپ اُس کے لیے ابن کے پاس آیا ہے؟" پیرو نے حیرت آمیز لہجے میں کہا۔ "آپ بولتا ہے، وہ آپ کا.... آپ کا شوہر ہے؟"

اُس کی آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے۔ کپکپاتے ہونٹوں سے بولی۔ "جی، ہم انھی کی بات کر رہے ہیں۔"

"ابھی ابن سمجھا۔" پیرو نے گہری سانس لے کے کہا اور بدحواسی سے بولا۔ "پر.... پر آپ جانتا ہے آپ کیا بول رہا ہے؟"

"ہم اپنے ہوش و حواس ہی میں یہاں آئے ہیں، جانتے ہیں کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔ اُن کی خوشی ہمیں جان سے زیادہ عزیز ہے۔ ہم اپنی جانب سے اگر اُن کی کوئی چارہ گری کر سکتے ہیں، انھیں کوئی سکھ دے سکتے ہیں تو وہ یہی ہے۔ اُن کی حالت ہم سے دیکھی نہیں جاتی۔ ہم سے کیا، کسی سے بھی نہیں دیکھی جاتی۔ آپ کا اُن سے واسطہ نہیں پڑا، یہاں کسی سے بھی پوچھ لیجیے کہ وہ دل کے کتنے اچھے ہیں۔ انھوں نے کبھی کسی کو دکھ نہیں دیا۔ کبھی کسی سے سر اٹھا کے، اونچے لہجے میں بات نہیں کی۔ بڑی سے بڑی ناروا بات مسکرا کے ٹال دینا اُن کی عادت رہی ہے۔ ہم آپ کو کیا بتائیں، اُن کے مزاج میں کیسی فقیری، قلندری ہے۔ دوسروں کے کام آنا، حویلی کے معمولی سے معمولی ملازم کا دکھ بانٹنا، اُن کی خیر خبر رکھنا ہی اُن کا شیوہ رہا ہے۔ ہم اگر کہیں کہ برداشت اور رواداری اُن پر ختم ہے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ یہ ہم اُن سے اپنی خاص نسبت کی طرف داری میں نہیں کہہ رہے ہیں، حقیقت یہی ہے لیکن جب سے انھیں چپ لگی ہے، گزرا ہوا سب خواب ہوگیا ہے۔ اب وہ کسی کی طرف پلٹ کے بھی نہیں دیکھتے، کون مر رہا ہے، کون جی رہا ہے۔ کسی سے نہیں پوچھتے کہ اُس پر کیا گزرتی ہے۔ سبھی کو بھول گئے ہیں۔ ہم جانتے ہیں، وہ کتنے خود دار اور غیرت مند ہیں۔ اپنی خو کے مطابق وہ یہی کر سکتے تھے کہ اپنی آگ اپنے ہی سینے تک محدود رکھیں مگر انھیں خیال نہیں رہا کہ یہ آگ اُن کی زنجیروں سے بندھے ہوئے لوگوں تک کیسے نہیں پہنچے گی، یہ زنجیریں تو انھوں نے خود پہنائی تھیں۔ یہاں حویلی سے خوشی روٹھ گئی ہے، دن ہو گئے، روز بروز یہ ویرانی بڑھتی ہی جاتی ہے، کوئی خوش نہیں، وہ چپ ہیں تو سبھی کو چپ لگ گئی ہے، حویلی کا ہر شخص اُن کے لیے دعا کرتا ہے، کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کرے، کہاں جائے، کون سے در پر جا کے دستک دے، کون سی کھوہ میں اُن کی روح جا چھپی ہے۔ یہاں کتنے ایسے ہیں جو اُن کے لیے اپنی جان لٹانے کے منتظر ہیں پر انھیں معلوم تو ہو، کہیں سے کوئی اشارہ تو ملے کہ مراد کی منزل کون سی ہے۔"

وہی بولتی رہی ہیں اور پیرو دزدیدہ نظروں سے اُسے تکتے رہے۔ اُس کے رخساروں پر آنسو لرز رہے تھے، کمرے میں ہر سو اُس کی آواز بکھری ہوئی تھی۔ دوسری لڑکی کی آنکھیں بھی بھری ہوئی تھیں، اُس کے ہونٹوں کی لرزش سب کچھ کہہ رہی تھی، نواب کی بیگم نے ایک لمحے توقف کیا اور اُمڈتی نگاہوں سے مجھے اور پیرو کو دیکھنے لگی، پیرو بُت کی طرح ساکت کھڑا رہا۔ "یہاں آپ کے پاس ایک دل شکستہ بہن اور ایک تیرہ نصیب سہاگن ہی نہیں آئی ہے۔" وہ سسکیاں بھرتے ہوئے بولی۔ "چھوٹے نواب صاحب ہمارے نہیں سبھی کے...."

"ابھی بس کرو۔" پیرو نے سر جھٹک کے کہا۔ "ابھی آپ کو اور کچھ بولنے کا ضرورت نئیں ہے، ابن ابھی سب سمجھتا ہے۔ پہلے بھی جانتا تھا پر ابن.... ابن کیا بولے۔"

"ہم آپ سے ہاتھ جوڑ کے درخواست کرتے ہیں۔" وہ عاجزی سے بولی۔ "خدا کے لیے...."

"نئیں، نئیں ابھی ایسا مت کرو۔" پیرو نے کسی قدر ترشی سے کہا۔ "ابھی آپ ہی سوچو، ابن ادھر پنجرے میں بند اپنا خون کیوں پی رہا ہے۔"

"ہم سمجھتے ہیں، یقیناً کوئی ایسی نزاکت ہوگی جو آپ کو یہ سب کچھ سہنے پر مجبور کر رہی ہے، کوئی ایسی ہی بات، بڑی بات ہو سکتی ہے لیکن آپ یقین کیجیے، ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں، ہم آپ کی پاس داری پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔ آپ سے مشورہ کیے بغیر آپ کی اجازت لیے بغیر ہم کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔ ہم قسم کھاتے ہیں کہ یہاں کسی اور سے اس کا تذکرہ بھی نہیں کریں گے۔ ہم خود جا کے اپنے طور پر، خانم سے درخواست کریں گے، چاہے ہمیں دنیا کے آخری کنارے تک جانا پڑے۔ ہم خانم سے گزارش ہی کر سکتے ہیں، باقی سب کچھ اُن کی مرضی و منشا پر منحصر ہے۔ ہم پر اعتماد کیجیے، ہم انھیں کسی ناروا صورتِ حال سے دوچار کرنے کی لغزش نہیں کریں گے۔ ہمارا مقصد اُن کی زندگی میں زہر بونا نہیں ہے، ہم بھی عورت ہیں، اچھی طرح جانتے ہیں کہ گھر میں بیٹھی ہوئی ایک عورت کی عزت و آبرو کیا چیز ہوتی ہے، ہم ایک کوشش ہی کر سکتے ہیں، ہمیں اُن کے پاس جا کے

سب کچھ بیان کر دینے کا ایک موقع ضرور دیا جائے۔ ہمیں یقین ہے، خانم کا دل اتنا سخت نہیں ہوگا۔ اُن کے دل میں چھوٹے نواب کے لیے ضرور کوئی گوشہ ہوگا، کوئی دبی ہوئی چنگاری۔ وہ چاہے ہمیں دھتکار دیں یا نامراد لوٹا دیں مگر ہمیں ایک یہ جتن بھی کر لینے دیجیے۔ آپ ہم پہ اتنا رحم نہیں کریں گے؟" وہ بین کرتی ہوئی آواز میں بولی۔

"ابھی کم بولو بیگم صاحب!" پیرو نے شکستہ لہجے میں کہا۔ "جو آپ بولتا ہے، سب ٹھیک ہے، اپنے کو اس میں کوئی کھوٹ دکھائی نہیں دیتا، اپنے کو اس پہ پورا بھروسا ہے پر اپن کے پاس ابھی کچھ بھی نیا نہیں ہے، وہی سب ہے جو اپن پہلے ہی ایدر بڑے نواب اور اُس گرگٹ کا اولاد خان کو بول چکا ہے۔"

"نہیں!" وہ تقریباً چیختے ہوئے بولی۔ "ہم تو بہت اُمید، بہت آرزو لے کے..." اُس کا چہرہ جل رہا تھا، خفقانی انداز میں کہنے لگی۔ "خدا کے لیے ہمیں مایوس مت کیجیے۔"

"آپ زیادہ بولے گا تو اپن کو دُکھ ہوگا۔" پیرو کے لہجے میں افسردگی کے ساتھ بے چارگی بھی شامل تھی۔ "اپنے کو سنبھالو بیگم صاحب!"

"ہم یہاں سے یوں نہیں جائیں گے۔" وہ رُندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "آپ کو ہم پر، ہماری باتوں پر اعتبار نہیں آیا، یا تو آپ نے توجہ سے نہیں سُنا یا پھر ہماری زبان نے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔ ہم آپ سے کس طرح کہیں، اپنی زبان میں کہاں سے اثر لائیں جو آپ کا پتھر پگھلا سکے۔"

"ایدر ایسا پتھر نہیں ہے بیگم صاحب!" پیرو نے رُک رُک کے کہا۔ "اپن نے سب دھیان سے سُنا ہے، جو آپ نے نہیں بولا، اُس کو بھی سُنا ہے اور ابھی اپن بولے، اپن نے ایسا کم ہی دیکھا، کم ہی سُنا ہے، پر ابھی سمجھا کرو بیگم صاحب! اپن کے پاس بولنے کو کچھ اور ہوتا تو اپن ایدر خوار نہیں ہو رہا ہوتا۔ ابھی کوئی اور حکم کرو۔"

"حکم دینے کے ہم کہاں لائق ہیں، حکم تو ہمیں دیجیے۔ بتلائیے ہم اب کیا کریں؟ ہم کہاں جائیں؟ کس در پہ جا کے فریادی ہوں؟ کس کے آگے جھولی پھیلائیں، خاں صاحب اور بڑے نواب کی بات الگ ہے۔ للہ ہمیں آپ اُن کے ہاں جانے سے مت روکیے، ہم پر احسان کیجیے! اگر آپ خانم کے پاس ہمارا جانا مناسب نہیں سمجھتے تو کوئی اور تدبیر کیجیے تاکہ ہمارا جلتا ہوا گھر بچ سکے۔ ہم خانم کے بارے میں بالکل اندھیرے میں ہیں، آپ ہی بہتر سمجھ سکتے ہیں کہ ہمارے لیے کون سی راہ موزوں ہو سکتی ہے مگر ہمیں کوئی آسرا ضرور دیجیے۔ ہم آپ سے خدا کو درمیان میں لا کے وعدہ کرتے ہیں کہ ہم ہر ممکن احتیاط کریں گے، اگر ایک بار ہمیں خانم کے پاس حاضری کی اجازت مل جائے تو ہمیں یقین ہے، ہم اُن کے در سے خالی نہیں لوٹیں گے۔ اُن کے بغیر وہ جی نہیں سکیں گے۔ اُنھوں نے یوں ہی گھٹ گھٹ کے اپنے آپ کو خاک کر دینے کی ٹھان لی ہے۔ خانم کا ایک اشارہ اُن کے لیے بہت ہوگا، وہی اُن کی منزل، وہی اُن کی مسیحا ہیں۔ خانم چاہیں گی تو زندگی بھر اُن کی خدمت کریں گے یا وہ ہمارے لیے جو بھی فیصلہ کریں، زبان سے ایک لفظ کہیں تو گناہ گار۔ ہمارے دل میں اُن کے لیے عزت ہے، جب وہ اُنھیں عزیز ہیں تو بھلا ہمیں کیوں نہ ہوں گی، اُن میں یقیناً کچھ خوبیاں ہوں گی جو وہ اُنھیں یاد کرتے ہیں۔ ہماری مدد کیجیے۔" وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔ "آپ کو اپنی ماں، اپنی اولاد کا واسطہ، اُنھیں کسی طرح بچا لیجیے۔ ہم ایسے نہیں جائیں گے، آپ کی طرف سے کوئی اُمید لیے بغیر ہم یہاں سے نہیں جائیں گے۔ یہیں دیواروں سے سر پھوڑ کے مر جائیں گے۔ اِس کے سوا ہمارے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔" اُس کا لہجہ [illegible] ہو گیا تھا۔ اُس کا بس نہیں چلتا تھا کہ اپنے بال نوچ لے۔ اُس کے لہجے میں ایسی شدت تھی کہ جو کچھ وہ کہہ رہی ہے، اُسے کر گزرنے کا عزم ہے۔ اُس کی چادر سر سے ڈھلک کے شانے پر گر گئی تھی، اُسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ پیرو کی پیشانی پر بے شمار لکیریں کھنچ گئی تھیں۔ میرا دل بھی بوجھل تھا، پیرو کو چُپ دیکھ کے اُس پر دیوانگی سی طاری ہو گئی۔ اچانک اُس نے چادر سے اپنا دوپٹا کھینچا اور مضطربانہ آگے بڑھ کے پیرو کے قدموں پر ڈال دیا۔

پیرو سٹپٹاتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ "یہ... یہ آپ کیا..." وہ بوکھلائی ہوئی آواز میں بولا۔

قریب کھڑی ہوئی لڑکی کے بُت میں پہلی مرتبہ جنبش ہوئی، اُس نے لپک کے اپنی بھابی کا شانہ تھام لیا مگر اُسے تو خود سہارے کی ضرورت تھی، وہ بہت گری گری، لُٹی لُٹی سی نظر آتی تھی۔ اپنی بھابی کو لرزتے ہونٹوں سے سمجھاتے ہوئے وہ خود بھی سسکیاں بھرنے لگی۔ میرا دم گھٹ رہا تھا، جی کرتا تھا، یہاں سے بھاگ کے اندر کمرے میں چلا جاؤں یا اُنھیں خانم کے بارے میں سب کچھ بتا دوں۔ میں کچھ کہنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ پیرو کی تھمی ہوئی آواز گونجی۔ "ابھی حوصلہ رکھو بیگم صاحب!" دوسرے لمحے پیرو پلٹ کے سائبان میں پڑے ہوئے مونڈھوں کی طرف بڑھا اور میری طرف دیکھا، میں نے بھی جلدی سے ایک مونڈھا اُٹھایا۔ ہم نے اُن کے قریب مونڈھے رکھ دیے۔ "ابھی سنبھل کے آرام سے بیٹھو۔" پیرو نے نرمی سے کہا۔ "تسلّی رکھو بیگم صاحب!"

پیرو کو اُن سے بیٹھنے کے لیے دوبارہ کہنا پڑا مگر جب ہم خود نہیں بیٹھ گئے، وہ کھڑی رہیں۔ بیگم کی سانس اُکھڑی ہوئی تھی، دونوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیل جاری تھا۔ اُنھیں کھڑے اتنی دیر ہو گئی تھی، ہمیں پہلے ہی اُن سے بیٹھنے کو کہنا چاہیے تھا۔ مونڈھے پر ٹک کر مجھے کسی قدر سکون ملا تھا۔ اُن کے چہرے پر چھائے ہوئے ہیجان میں بھی کچھ کمی ہوئی تھی مگر ہیجان کی جگہ یاسیت نے لے لی تھی۔ دونوں کا جھکا ہوا سر اُس وقت اُٹھا جب پیرو نے کہا۔ "ابھی اپن کا بات سنو۔" اُس کی آواز ڈوبی ہوئی تھی۔ "آپ کو دیکھ کے اپنے کو ابھی ایک آدمی کا یاد آتا ہے، اُس کا دل بھی ایک دم شیر کے مافک تھا، سمندر کے مافک، سارا دُنیا اُس میں ڈوب جائے اور پتہ نہ چلے، وہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ ایسا ہی کانچ کا بنا ہوا۔ اپن کو ابھی خیال آتا ہے، پیچھے اپن نے آپ کو الٹا سیدھا بول دیا تھا، ابھی ہو سکے تو اُس کو بھلا دو، اپنے کو سپنے میں بھی ایسا خیال نہیں آ سکتا تھا کہ آپ [illegible] کے پاس آ جائے گا، ایدر آپ کا آنا ہی اپنے لیے سب سے بڑا ہی ہے، نواب کا حالت ایسا ہی ہوگا جو آپ کو پہلے سے [illegible] لے آیا۔ اپنے من سے یہ شبہ ابھی نکال دو کہ اپن نے ایک کان سے سن کے دوسرے کان سے اُڑا دیا ہے۔ اپن نے سب بات سینے ہی سے سنا ہے کیونکہ آپ نے بھی اُسی سے سب بولا ہے، اپنے کو ایک دم انکار ہے، نواب سے اپنا کوئی دشمنی نہیں ہے، اُس نے اپنا کچھ مار کے نہیں رکھ لیا ہے، ابھی ایسا کچھ ہو جاتا ہے، آدمی کو کوئی آدمی ایسا تماشا بنا دیتا ہے، کتنا لوگ ہے جو ایک دوسرے سے دُور ہو گیا ہے، ایک دوسرے کو کھوجتا پھرتا ہے، آدھا آدھا آدمی، کوئی ایدر، کوئی پار، پر دیوار ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے، دونوں ادھورا رہتا ہے، یہ چکر ابھی تھوڑا بہت سمجھتا ہے۔" پیرو نے اچٹتی نظر سے میری طرف دیکھا اور گہری سانس لے کے بولا۔ "وہ لوگ اُن لوگوں سے ابھی [illegible] اچھا ہے جن کو کسی کا ملنے کا کوئی اُمید بندھا ہے، پر جن سے جو [illegible] کے لیے روٹھ گیا ہے، واپس کبھی نہیں آنے کا، ابھی اُن کے بارے [illegible] کیا بولے گا؟" پیرو کی آواز بھن بھنانے لگی تھی۔ "اپن کا مطلب ہے..." وہ چونک سا گیا اور سیدھا ہو کے بولا۔ "اپن ابھی اتنا خوب جانتا ہے [illegible] اپن سے جو ہو سکا ضرور کرے گا، آپ نے جس رشتے کا بول کے اپن کو [illegible] دیا ہے، اپن اُس کا بھرم رکھنے کا کوشش کرے گا، پر پہلے اپن [illegible] سے نکلنا ضروری ہے تبھی کوئی بات بن سکتا ہے۔"

"مگر یہ... یہ ہمارے بس میں..." وہ منتشر لہجے میں بولی۔

"جس اعتبار کی بات آپ کرتا ہے، اِس ٹیم اپن کو اُس کا آپ [illegible] زیادہ ضرورت ہے۔" پیرو نے تیزی سے کہا۔

"اگر یہ ہمارے لیے ممکن ہوتا تو آپ سے منت کرنے سے پہلے ہم [illegible] کرتے، بخدا ہمیں ایسا کوئی شبہ نہیں ہے کہ باہر جا کے آپ زبان [سے] پھر جائیں گے، ہمیں آپ کے قول پر مکمل بھروسا ہے۔ یہ اندیشہ اُن [لوگوں] کو ہو سکتا ہے جنھوں نے آپ کو یہاں محصور کر رکھا ہے۔ ہم کھلے [دل] سے یہاں آئے ہیں، نہ کسی شرط کے اہل ہیں، نہ اسے مناسب سمجھتے [ہیں۔ ک]سی سے کچھ طلب کرنے کے یہ انداز نہیں ہوتے، ہماری معذوری [کو] شرط وغیرہ سے وابستہ مت سمجھیے۔ ہم تو اتنے بے بس ہیں کہ ... لوگوں [کو قائ]ل بھی نہیں کر سکتے۔ بجائے یہ کہ ان سے یہ دروازے کھولنے اور پہرے ہٹانے کے لیے کہہ سکیں۔"

"تو آپ اُس وقت کا انتظار کرو بیگم صاحب جب بڑے نواب کا آنکھ کھل جائے اور اُس کا ماتھا ٹھکانے پر آ جائے۔ اُس کو جا کے بولو، اپن ایدر ہی مر جائے گا، اپن کا سر بہت پہلے سے گروی رکھا ہوا ہے، ہم اِس طرح کچھ نہیں بتائے گا، وہ اپن کو نہیں جانتا، خود اپنے لیے کانٹے بو رہا ہے۔ کبھی نہ کبھی اپنا آدمی ایدر اپنا بو سونگھتا ہوا ضرور آ جائے گا اور اپن بولتا ہے، پھر بہت بُرا ہوگا، وہ لوگ حساب ہمیشہ صاف رکھتا ہے۔"

"یہ سب کچھ ہمیں جتانے سے کیا حاصل؟ یہ حویلی جل رہی ہے، اِس کے بعد اور کیا ہو سکتا ہے۔" وہ تیز لہجے میں بولی۔ "ہمارے لیے تو ہم سے سب کچھ دُور ہی ہوتا جا رہا ہے۔ نہ معلوم کیوں ہمیں کچھ ایسا گمان ہوتا ہے کہ آپ کو کوئی ضد سی ہو گئی ہے۔ اگر واقعی ہمارا قیاس درست ہے تو ایک شخص کی زندگی کی خاطر آپ کو یہ ضد ترک کر دینی چاہیے۔ کچھ لوگ پاگل ہو گئے ہیں تو اُن کی سزا ایک آدمی کی زندگی نہیں ہو سکتی، ہم یہی سوچ کے آئے تھے کہ آپ کو سارا حال بتا دیں، کہیں بڑے نواب صاحب کے یہ باتیں آپ تک منتقل کرنے میں کوئی چوک ہو گئی ہو۔ یہاں آنے کے لیے ہمیں کیسی کیسی دیواریں عبور کرنی پڑی ہیں، ہمی جانتے ہیں۔ کئی دن سے لالچ باندھ رہے تھے۔ بڑے نواب صاحب آج دربار کی کسی تقریب میں گئے ہوئے ہیں، اسی باعث یہاں تک رسائی حاصل کرنا ممکن ہو سکا۔"

"ضد کا بات نہیں بیگم صاحب! ضد کس بات کا؟ ایدر مار کھانے، اپنا خون جلانے اور کتا بننے کا ضد؟" پیرو نے درشتی سے کہا۔ "یہ بڑے نواب کیا سمجھ کے..."

اس سے پہلے کہ پیرو کچھ کہتا، وہ گڑگڑا کے بولی۔ "اُن کی بات جانے دیجیے۔ نہ جانے اُنھیں کیا ہو گیا ہے، اِس ظلم کا اُن کے پاس کیا جواز ہے، کیا سوچ کے اُنھوں نے یہ غیر انسانی، غیر اخلاقی رویہ اختیار کیا ہے، یہ اُنھی کی سوچ کی بات ہے۔ ہم تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ چھوٹے بھائی کی محبت نے اُن کے قلب و ذہن بُری طرح متاثر کیے ہیں، خانم کی تلاش میں اُنھوں نے اور اُن کے فرستادوں نے کوچے کوچے کی خاک چھانی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اب اتنے عرصے بعد کہیں سے اُنھیں آپ کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ اپنے حواس میں نہیں رہے۔ ہم آپ سے کہتے ہیں کہ اُن کی دیوانگی، بھائی کی طرف سے مسلسل مایوسی کے سبب ہی سے ہے۔ ضد اُن کے مزاج میں شروع سے ہے، وراثت میں ملی ہے۔ دوسرے بھائی کی بھی یہ ضد ہی ہے جو اُنھوں نے خود پر طاری کر رکھی ہے، بڑے نواب صاحب نے آپ کے متعلق غلط اندازہ لگایا تھا۔ اُنھیں معلوم نہیں تھا کہ لوگ اتنے بڑے حوصلے اور بات کے دھنی ہو سکتے ہیں، اب وہ ایک غلطی کے بعد اُس پہ اصرار کر کے دوسری

بڑی غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں، ممکن ہے کل انھیں اِس کا احساس ہو جائے اور کل وہ آپ سے معذرت کر کے عزت کے ساتھ آپ کو رخصت کر دیں لیکن سرِ دست یہ ہماری خوش اندیشی ہی ہے تاوقتیکہ خدا انھیں کسی ایسی نیکی کی توفیق عطا فرمادے۔ وہ کل نہ جانے کب آئے، دس گیارہ دن گزر چکے ہیں، اِدھر ہم سے ایک پل نہیں کاٹا جاتا، جو وقت گزر رہا ہے، وہ ہمیں اندھیروں کی طرف لیے جارہا ہے، ہم اِس بھروسے میں مزید انتظار کے متحمل نہیں ہو سکتے کہ کل بڑے نواب صاحب کا جنون دھیما پڑ جائے گا۔ بس یہی کچھ آپ کے گوش گزار کرنا تھا، ہر طرف سے مایوسی کے بعد اب ایک آپ ہی ہمارا آسرا رہ گئے ہیں، معلوم نہیں خدا کی کیا مصلحت ہے کہ اُس نے ایسے وقت میں جب سب کچھ بکھرا جارہا ہے، خانم کے متعلق کچھ جاننے والوں کو ہماری طرف بھیج دیا ہے۔ شاید اسے ہم عاجزوں کی کوئی اور آزمائش مقصود ہے۔" وہ سسکتے ہوئے بولی۔ "ہمیں ہر قیمت پر اُن کی سلامتی چاہیے، جو کچھ بھی ہمارے پاس ہے، اُس کی قیمت پر، اپنی قیمت پر۔ خانم ہی نہیں، ہم خود کو ہر اُس شخص کی غلامی میں دینے کے لیے آمادہ ہیں جو انھیں قرار دے سکے، اُن کے سوا ہماری زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ ہمیں بس... بس اتنا ہی کہنا تھا۔"

"ابھی آپ اور کیا بولے گا۔" پیرو نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ابھی تو ہی اِن کو کچھ سمجھا رے بابا! یہ کیا دوسرے کا سوچے بنا بولتا ہے، کیسا کیسا پتھر پھینکتا ہے، تیرا زبان شاید اُن کی سمجھ میں آجائے کہ اپن کو ابھی کس بات کا خوف، کس کا پاس ہے۔ اِن کو بول، اپن بھی گھر گرہستی والا آدمی ہے اور باہر لوچھنے والا ابھی کچھ کم نہیں ہے، اُودر کون گلی گلی اپن کے لیے سر پھوڑتا ہوگا، اپن کو کیدر جانا تھا، کیدر آگیا ہے، گھر سے کتے دور ہے، ابھی کون روتا، کون شور مچاتا ہوگا، کس کو چمڑی بچوانا اچھا لگتا ہے، ابھی تو ہی اِن کو کچھ بول۔"

"میں کیا کہوں دادا!" میں نے بدحواسی سے کہا۔ "میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا، تم نے سب کچھ تو کہہ دیا ہے۔"

"اِن کو بول دے، ابھی اپن کو ادھر سے نکالنے کا کوئی کوشش کرے۔" پیرو بھن بھناتی آواز میں بولا۔ "اپن سیدھا خانم کے پاس جائے گا۔"

"ہم مجبور ہیں۔" وہ عاجزی سے بولی۔ "یہاں آنے سے یہ مراد نہیں ہے کہ پہرے دار ہمارے ساتھ کوئی اور سلوک بھی کر دیں گے۔ جانے کتنی منتیں کر کے ہم نے اُن سے یہاں تک آنے کی اجازت حاصل کی ہے۔ ہمیں اُن سے آگے کسی رعایت کی امید نہیں ہے، یہاں بڑے نواب کا حکم اوّل و آخر ہے، سب کچھ انھی کے حکم سے ہوتا ہے۔ اُن کے نمک خوار اپنے آقا کے ساتھ اپنی دانست میں اتنی بڑی دغا نہیں کریں گے۔"

"پر آقا تو اُن کا چھوٹا نواب بھی ہے۔"

"لیکن ہم کس کس کو یہ سمجھاتے پھریں گے کہ اُن کی اس ز... اس حویلی کا مفاد ہی وابستہ ہے۔ یہاں سے بڑے دروازے تک... میں طرح طرح کے لوگ موجود ہیں، ہم کس کس کو قائل کریں... وہ اپنے سر ہمیں دے دیں؟ ہمیں معلوم ہے، بڑے نواب آ... کو گولی مار دیں گے۔"

"پھر کچھ اور سوچو، بیگم صاحب! اپن کو ادھر سے نکالنے... ترکیب کرو، بس یہی ایک راستہ ہے۔"

"یہ مطالبہ کر کے آپ ہمیں ہماری ناتوانی کا احساس کر... ہیں، ہم نے پہلے ہی اس سلسلے میں بہت سوچا ہے لیکن ... کچھ کام نہیں کرتا، یہ ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ یقین کیجیے سچ کہہ رہے ہیں۔ ہماری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں ہے..."

"اپن جانتا ہے، آپ ایک دم سچ بول رہا ہے پر یہ... صورت ہے کہ اپن جلد سے جلد ادھر سے نکل جائے۔"

"آپ کے کہنے پر ہم پھر کوشش کریں گے۔" وہ تشکر... بولی۔ "لیکن اپنی سرخ روئی کا کوئی امکان ہمیں نظر نہیں... اگر ہم واقعی ناکام رہے تو کیا، کیا...."

"ہاں بیگم صاحب!" پیرو نے نظریں چراتے اور لفظ چ... کہا۔ "اپن کو بھی مجبور سمجھو، اتنا سب جان کے اپن کے دل کے لیے بڑا مان ہے۔ ابھی اپن کا بات مانو، گھر لوٹ جاؤ، را... ہو گیا ہے، بڑے نواب کے آنے سے پہلے آپ کو چلا جانا، ابھی اُس کے پاس جا کے اور یہ دوپٹا اُس کے پیروں پر ڈال کر وہ تمھارا بات دھیان سے سُن لے، اُس سے بولو، اپن... سے کچھ نہیں بولے گا، سیدھا ادھر سے چلا جائے گا، جو ہو گیا اتنا ہی ٹھیک ہے، ادھر ابھی اپنا بہن بیٹی رہتا ہے۔ اُس... ہوئے ادھر کیا لفڑا کرے گا؟"

"وہ اپنے سوا کسی کی نہیں سُنتے، ہم وہاں گئے تو آ... اور جوادیں گے۔"

"پھر اُوپر والے سے دعا کرو، ابھی وہی کچھ اُلٹ پھیر کر..."

"مگر آپ.... آپ ہمیں خانم کے پاس کیوں نہیں... ہم زبان دے رہے ہیں، ہم یہاں کسی سے نہیں کہیں گے کہ..."

"آپ کیسا بولتا ہے۔" پیرو نے ترشی سے کہا۔ "ابھی خانم کے پاس اکیلا کیسے جائے گا؟"

"کسی طرح بھی جائیں، کسی کو خبر نہیں ہونے دیں گے۔"

"اور اُودر خانم نے منع بول دیا تو؟"

"ہمیں یقین ہے، ہم انھیں منا کے ہی لوٹیں گے..."

"اگر خانم تیار نہیں ہوا؟"

"تو، تو.... مگر ایسا نہیں ہوگا۔" وہ پھٹی پھٹی آواز میں بولی۔

"پھر ہم اپنے مقدر پر صبر و شکر کر لیں گے۔"

"اور ادھر، پھر ادھر اپن کا کیا بنے گا"

"آپ، آپ!" چند لمحوں کے لیے وہ تذبذب میں پڑ گئی پھر بے تابی سے بولی۔ "آپ تو ویسے بھی یہاں ہیں، خانم کے انکار سے آپ پر کیا فرق پڑے گا کیونکہ یہ سب کچھ تو ہمی تک محدود رہے گا۔ آپ کی آزادی کا دار و مدار بڑے نواب صاحب کی مرضی و منشا پر ہے اور اگر ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے، جیسا کہ ہمارا دل کہتا ہے تو بڑے نواب صاحب پھر کیا حجت کریں گے۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا؟" اُس کی آواز یکایک چمکنے لگی جیسے کسی ڈوبتے ہوئے کو کنارہ نظر آجائے یا گھپ اندھیرے میں کہیں سے روشنی کی کرن پھوٹ پڑے۔ "ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی اجازت سے ہم اپنے طور پر ایک کوشش کرتے ہیں، خانم کی خدمت میں حاضری دیتے ہیں، انھوں نے ہماری التجا سن لی اور وہ آگئیں تو سب خود بخود ٹھیک ہو جائے گا اور خدانخواستہ ہم، ہم ناکام ہو گئے تو اس سے آپ کی قید و بندکی مدت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، وہ تو اُتنی ہی رہے گی جتنا بڑے نواب کا حوصلہ ہے۔"

"آپ ٹھیک ہی بولتا ہے۔" پیرو نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "پر اپن کیسے خانم کا پتہ دے سکتا ہے۔"

"کیوں نہیں، بشرطیکہ آپ کو ہم پر...."

"اپن بول دیا ہے، ابھی ایسا کوئی بل اپنے من میں نہیں ہے۔" پیرو کے لہجے میں آزردگی کے ساتھ تندی بھی تھی۔ "اپن ایسے کچھ نہیں بول سکتا۔"

"یقیناً وہی بات ہو سکتی ہے۔ خانم کی موجودہ زندگی میں کوئی رخنہ پڑنے کا اندیشہ ہی آپ کے لیے رکاوٹ بنا ہوا ہے؟"

"ایسا ہی سمجھ لو۔"

"مگر... مگر ہم آپ سے کوئی وعدہ کر رہے ہیں۔"

"اِن سے زیادہ تکرار مت کرو بیگم صاحب!" پیرو نے کسی قدر ناگواری سے کہا۔ "لگتا ہے یا تو ادھر اپنا ہی ماتھا گھوم گیا ہے یا، یا آپ ابھی سوچنا سمجھنا بھول گیا ہے۔"

اُس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، اُس نے پھر کچھ کہنے کے لیے لب کھولے تھے لیکن پیرو کا چہرہ دیکھ کے اُس کی آواز حلق میں گھٹ گئی۔ انھیں اب اُٹھ جانا چاہیے تھا، دونوں وہیں بیٹھی رہیں اور کچھ بولیں بھی نہیں، اس سکوت سے تو اُن کا بولتے رہنا ہی بہتر تھا، کمرے میں جیسے ہوا بند ہو گئی تھی اور دھواں سا اُمڈنے لگا تھا۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے لیکن اُن کی وحشت اور ویرانی دیکھی نہیں جاتی تھی۔ ہم انھیں یوں چھوڑ کے کہیں جا بھی نہیں سکتے تھے۔ انھیں یہ احساس تک نہیں رہا تھا کہ رات گزرتی جارہی ہے، نواب رات بھر کے لیے نہیں گیا ہوگا، یہاں آنے کے بعد اگر اُسے کسی طرح خبر ہو گئی تو وہ سب کو ختم کر دے گا، دیر ہو جانے پر پہرے دار بھی اندر آسکتے تھے۔ وہ دروازے پر مستعد کھڑے ہوں گے، میرا خیال تھا کہ نواب کی بہن اپنی حرماں نصیب بھابی کو سمجھا لے گی کہ انھیں اب اُٹھ جانا چاہیے، پتھروں کے سامنے داد و فریاد سے کیا حاصل مگر وہ بھی اُسی کے مانند بے حس و حرکت بیٹھی رہی، ضرور انھوں نے یہی ٹھان لی تھی کہ وہ یوں واپس نہیں جائیں گی۔

پیرو کے کندھے جھکے ہوئے تھے، وہ کچھ بیمار بیمار نظر آرہا تھا۔ اُس کی پوری زندگی میں کبھی ایسا نہیں ہوا ہوگا کہ دو اجنبی عورتیں کسی حویلی کی پردہ نشیں عورتیں یوں اچانک سامنے آکے کھڑی ہو جائیں اور آہ و بکا کرنے لگیں، میری طرح اُس کا جی بھی یہی چاہ رہا ہوگا کہ وہ انھیں سب کچھ بتا دے، کسی طور تو اُن کا گریہ تھمے۔ انھیں کس طرح یقین دلایا جائے کہ اُن کے کہے ہوئے پر شبہ نہیں ہے، وہ سچ ہی کہہ رہی ہیں، ایسی جلن اور کاٹ سچ ہی میں ہوتی ہے، وہ جھوٹ بول بھی نہیں سکتیں، وہ اپنے خال و خد، رنگ اور وضع قطع میں پھولوں کی طرح نرم و نازک ہیں، انھیں جھوٹ بولنا آتا تو اُن کے چہروں پہ شاید یہ پاکیزگی اور اُن کی آواز میں ایسی معصومیت، سادگی اور بے باکی نہ ہوتی۔ وہ کسی سے یوں بھی کچھ مانگیں تو انکار کرتے نہ بنے، اُن سے تو اُونچی آواز میں بات کرتے ہوئے لوگ ڈرتے ہوں گے کہ انھیں گراں نہ گزرے، اُن کی ایک جھلک دیکھنے، اُن کی زبان سے کوئی حکم سننے اور اُن کی نگاہ کے ایک اشارے کے لوگ منتظر رہتے ہوں گے اور وہ یہاں بھکارنوں کی طرح جھولی پھیلائے بیٹھی تھیں، نواب عالم تاب میں کوئی ایسی ہی بات ہو گی جو اُس کی دل وہی انھیں اتنی عزیز تھی۔

میں نے اسٹیشن پر اُسے دیکھا تھا، وہ ایک وجیہہ اور خوش پوش آدمی تھا۔ خوش طبع اور حساس بھی معلوم ہوتا تھا مگر وہ چند لمحوں کی ملاقات تھی، اُس میں کسی کے بارے میں کیا جانا جا سکتا تھا، آدمی کے اَن گنت پرت ہوتے ہیں، ظاہر میں تو صرف ایک ہی پرت نظر آتا ہے، میں نے دیکھا تھا کہ خانم کا انکار سُن کے اُس کے چہرے پر ربت سی اُڑنے لگی تھی، میں سمجھا تھا، بھسل بھی یہی سمجھا ہوگا کہ چند دنوں میں دیگر نوابوں کی طرح وہ بھی سب کچھ بھول جائے گا، یہ تو خانم ہی جان سکتی تھی کہ نواب کی نظروں میں اُس کا درجہ کیا تھا مگر خانم کو بھی اتنا اندازہ نہیں ہوگا جبھی وہ اُسے چھوڑ کے چلی گئی یا پھر جہاں گیر کی وجہ سے اُس نے ایسا ستم کیا، جہاں گیر کے بغیر وہ کہیں بھی نہیں رہ

سکتی تھی، نواب سے اقرار کرنے کی صورت میں جہاں گیر اُس سے جُدا ہوجاتا تھا، اپنے رتبے کے لیے نواب کیا، وہ دُنیا ترک کرسکتی تھی۔ خانم کے طور طریق سے کبھی احساس نہیں ہوا تھا کہ وہ حیدرآباد سے آنے پر مل گزرتہ ہے۔ اُس نے ستار کو بھی ہاتھ لگانا چھوڑ دیا تھا۔ حویلی میں وہ اتنی جلدی گھل مل گئی تھی جیسے ہمیشہ سے وہیں رہتی ہو۔ جہاں گیر کے ساتھ اُسے زریں بھی مل گئی تھی، دونوں ذرا کہیں اوجھل ہوجاتے تو وہ بے تاب ہو جاتی۔ خانم کے دل میں کوئی غبار چھپا ہوا ہوتا تو کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی پر ضرور ظاہر ہوتا۔ نواب عالم تاب کو سمجھنے میں یا تو اُسے دھوکا ہوا تھا یا پھر خانم کے جانے کے بعد نواب کو اُس کے کھو دینے کا احساس ہوا ہوگیا تھا، بچھڑنے کے بعد ہی کسی کا پتہ چلتا ہے، پھر جو کچھ بھی تھا کسی سبب کے بغیر نہیں تھا۔ یہ ایک نواب کی محض ضد نہیں ہوگی کہ دولت و حشمت کے باوجود وہ ایک شخص سے محروم ہوچکا ہے، یہ کچھ اور بھی ہوگا۔ یہ بس کوئی آندھی ہے، ایک آگ سی ہے جو خود بخود جل اُٹھتی ہے اور آدمی کا سارا وجود لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ نواب کی بہن اور بیگم کو کیا معلوم تھا کہ جو کچھ اُنھوں نے کہا ہے، اُس کے معانی سے وہ خود اتنی آشنا نہیں ہیں جتنا سننے والے ہیں، وہ کن لوگوں کو یہ سب کچھ بتا رہی ہیں، جنھیں خاک چھانتے ہوئے برسوں گزر گئے ہیں۔ خانم کو حیدرآباد سے گئے دن ہی کتنے ہوئے تھے اور وہ نواب سے اُس طرح جُدا نہیں ہوئی تھی جس طرح دوسروں سے کوئی بچھڑ گیا تھا۔

وہ وہاں سے نہیں اُٹھیں، اُن کے رخساروں پہ زردی کھنڈی ہوئی تھی، پھول جیسے چہرے کمھلا گئے تھے۔ پیرو سر جھکائے بیٹھا شاید خود سے نبرد آزما تھا، کمرے پر بظاہر سکوت چھایا ہوا تھا مگر گریہ و بین کرتا ہوا سکوت، دیر ہوگئی، وہ وہیں نیم جاں، ناتواں بیٹھی رہیں۔ آخر پیرو نے اُنھیں سمجھانے کے لیے جھجکتے ہوئے دوبارہ زبان کھولی۔ چھیڑنے کی دیر تھی، بیگم پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی، پیرو نے ہونٹ بھینچ لیے اور بے بسی سے میری طرف دیکھنے لگا۔ دوسری کی آنکھیں بھی پھر اُمڈنے لگی تھیں، آنسوؤں کے سوا اُن کے پاس کہنے کے لیے شاید کچھ نہیں رہ گیا تھا، اُن کی آہ و زاری سے میرا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا، سارا جسم جیسے رسّیوں سے جکڑا ہوا تھا۔ مجھ سے چپ نہ رہا گیا، میں نے کہا۔ ”بیگم صاحبہ! آپ کچھ سمجھنے کی کوشش کیجیے۔“ میری آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ ”آپ ہمیں اتنا پشیمان نہ کیجیے۔“ میں پہلی مرتبہ اُن سے مخاطب ہوا تھا، میری آواز پر اُن کی مضطرب نظریں مجھی پر مرکوز ہوگئیں، اُنھیں میرے لہجے پر حیرت سی ہوئی تھی اور ایک لمحے کے لیے اُن کے سراپا متزلزل ہوگئے تھے، میں نے تیز سانسوں سے کہا۔ ”خانم اب کسی گھر میں رہتی ہیں، کسی چار دیواری میں۔ یہاں سے بہت دُور، ایسی ہی کسی حویلی میں۔ بازار کی آزادی سے گھر کے کسی زنداں میں مقید ہونے کا فیصلہ اُن کا اپنا تھا، کوئی اُنھیں فریب دے کے یا ورغلا کے نہیں لے گیا۔ وہ بازار کی زندگی ترک کرنے کے لیے نہ جانے کب سے کسی سہارے کی منتظر تھیں کہ ہم لوگ اُن کے سامنے آ گئے۔ ہم اُن کی محفل میں نہیں گئے تھے، کوئی اور ہی بات ہمیں اُن کے دروازے پر لے گئی تھی اور اُنھوں نے یہی بہتر سمجھا کہ وہ ہمارے ساتھ چلی جائیں۔ اب وہ ایک بھرے پُرے گھر میں رہتی ہیں جہاں سب اُن کی عزت کرتے ہیں کیونکہ اُنھوں نے خود کو اس عزت اور محبت کا مستحق ثابت کیا ہے۔ جس وقت وہ ہمارے ساتھ اس شہر کو خیرباد کہہ کے جا رہی تھیں، نواب صاحب اسٹیشن آئے تھے۔ میں وہاں موجود تھا۔ اُس وقت مجھے تھوڑا بہت اندازہ ہوا تھا کہ نواب صاحب کو خانم سے کس قدر وابستگی ہوسکتی ہے حالانکہ نواب صاحب کے آنے کا انداز نوابوں جیسا ہی تھا، لاؤ لشکر کے ساتھ آئے تھے، صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کچھ طے کر کے آئے ہیں لیکن خانم نے بھی کوئی عزم کر رکھا تھا اور وہ جن لوگوں کے ساتھ جا رہی تھیں، وہ بھی کسی کا ہاتھ تھام کے چھوڑنا نہیں جانتے تھے۔ فیصلہ خانم پر آ کے ٹھہرا تھا اور خانم نے نواب صاحب سے معذرت کر لی تھی۔ نواب صاحب نے ظرف کا ثبوت دیا اور ہوش مندی کا بھی۔ وہ خاموشی کے ساتھ راستے سے ہٹ گئے۔ اُن کا یہ وہم دُور ہوگیا تھا کہ ہم خانم کو بہ جبر کہیں لے جا رہے ہیں۔ اتنی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے مگر ضروری ہے کہ آپ کو پوری بات معلوم ہوجائے۔ شاید آپ کو احساس ہو، بازار اور گھر میں کیا فرق ہوتا ہے۔ خانم کسی گھر سے بازار میں نہیں گئی، اب وہ بہت پُرسکون اور مطمئن نظر آتی ہیں۔ ہم یہ بات وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اُنھوں نے اپنی یہ نئی دُنیا دل و جان سے قبول کی ہے، معلوم ہوتا ہے جیسے وہ برسوں سے اُس حویلی میں آباد ہوں، وہیں پیدا ہوئی ہوں۔ جو لوگ اُنھیں لے گئے تھے، وہ ایک طرح سے اُن کے ضامن بھی ہیں اور سرپرست بھی۔ اُن پر اُن کی پاسبانی کا فرض عائد ہوتا ہے، جب تک وہ بازار میں تھیں، کوئی اُن کی عزت کا نگہ دار نہیں تھا اور وہاں اِس کی ضرورت بھی نہیں تھی لیکن اب وہ ایک گھر میں ہیں، کسی گھر کی آبرو ہیں۔“

”ہم..... ہم اِس سے منکر نہیں ہیں، ہم تو..... “ وہ جھجکتی آواز میں بولی۔ ”ہم تو..... “

”پہلے مجھے کہنے دیجیے۔“ میں نے تیزی سے کہا۔ ”آپ وہی کہنا چاہتی ہوں گی جس کا اظہار آپ نے پہلے بھی کیا ہے، یہی کہ خانم بازار میں واپس نہیں آ رہی ہیں، یہاں بزم آرائی کے لیے نہیں، اِس مرتبہ اُن کا درجہ دوسرا ہوگا، پہلے وہ نواب صاحب کی خاص محفلوں تک محدود تھیں، اب وہ اِس معزز خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے گھر میں قدم رکھیں گی۔ اُنھیں وہ رتبہ دیا جائے گا جس پر کوئی بھی عورت فخر کرسکتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر ضروری ہوا تو نواب صاحب اور اُن کی دل جوئی، خوشنودی اور یکسوئی کے لیے آپ بھی درمیان سے ہٹ جائیں گی، یہی کچھ آپ کی مراد ہے نا؟“

”ہاں ہاں۔“ وہ بکھرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”یہی ہم نے..... “

”ہمیں یقین ہے کہ آپ نے سب کچھ عقل و ہوش ہی میں کیا ہے، یہی کچھ آپ کے بس میں ہے، کسی کے لیے یہی کیا جاسکتا ہے اور جب آپ ہم اجنبیوں کے پاس آسکتی ہیں تو نواب صاحب کے سکھ چین کے لیے بہت دُور تک بھی جاسکتی ہیں۔ آپ کی نیت اور ارادے پر ہمیں نہ کوئی شبہ ہے، نہ اعتراض۔ نہ یہ دیوانگی ہے نہ مبالغہ۔ نواب صاحب کو آپ ہم سے بہتر جانتی ہیں، اس حویلی کے دوسرے نگہبان اور نواب ہونے کے علاوہ بھی اُن کی ذات میں یقیناً کچھ غیر معمولی صفات ہوں گی جو یہاں سبھی اُن کے لیے بے چین ہیں۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ صرف شوہر و بیوی کا تعلق نہیں، اُن سے آپ کا رشتہ اِس سے سوا ہے اور اُن کی حالت اتنی ہی پریشان کُن ہوگی کہ آپ کے پاس اور کوئی چارہ نہیں رہا ہے۔ جہاں تک میں سمجھا ہوں، آپ کے ذہن میں یہی بے اطمینانی ہے کہ ہم نے یہ اذیت ناک حقیقت پوری طرح محسوس نہیں کی ہے جس سے آپ دوچار ہیں یا دوسرے لفظوں میں ہم نے نواب صاحب کی موجودہ حالت اعتنا کے لائق نہیں سمجھی ہے، اسے اُس توجہ اور ہمدردی سے نہیں دیکھا ہے جو اگر کسی اور وجہ سے نہیں تو انسان ہونے کے ناتے ہم پر واجب ہے۔ ایسی بات نہیں ہے، بے شک کسی کو کسی کی جُدائی اور محرومی کا اتنا ہی شدید قلق ہوسکتا ہے جو نواب صاحب کو ہے جس سے اُن کا یہ حال ہوگیا ہے۔ آپ تو گیارہ دن بعد آئی ہیں، ہم گیارہ دن سے اس جہنم میں جانے کس گناہ کا عذاب بھگت رہے ہیں۔ نواب صاحب کی یہ کیفیت ہم سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے، نہ ہم نے اس حویلی کے مکینوں کا کبھی کچھ بگاڑا ہے، نہ اُنھوں نے ہمارا۔ پھر کوئی اتنی ہی بڑی بات ہوسکتی ہے کہ بڑے نواب ہمیں یہاں مجرموں کی طرح زنداں میں ڈال دینے پر مجبور ہوگئے۔ اُن کے پاس اُن کی دانست میں یہ ناخوش گوار قدم اُٹھانے کے سوا کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔ یہ حقیقت ایسی نہیں ہے جو آسانی سے نہ سمجھی جاسکے، جیسا کہ آپ نے کہا ہے کہ وہ اپنے بھائی کے صدمے سے اپنے حواس کھو چکے ہیں مگر اُن کے اِس جنون کا ہدف آپ نہیں، ہم ہیں۔ بیدوں کے نیل ہمارے جسم پر پڑے ہیں، اصطبل کی کوٹھری اور اندھیرے تہ خانے میں ہمیں رکھا گیا تھا، ہر طرف سے بندوقیں ہم پر تنی ہوئی ہیں۔ ہم سے زیادہ اور کسے نواب عالم تاب کے حال سے آگہی ہوگی۔ بڑے نواب نے ہمیں جانوروں کی طرح برتا ہے جیسے ہم اُن کے زرخرید غلام ہوں، اُنھیں کسی قانون، اخلاق کا پاس نہیں رہا ہے، کوئی احساس نہیں کہ ہمارے اس طرح روپوش ہو جانے سے اور کتنے لوگ متاثر ہوں گے۔ ہم آپ کو بتائیں کہ یہاں ہم اکیلے نہیں آئے تھے، کوئی اور بھی ہمارے ساتھ تھا، کچھ اور لوگ۔ یہ شہر ہمارے لیے بھی اجنبی ہے، اُن کے لیے بھی، اُن سے ہم بس رات کو دیر سے آنے کا کہہ کے نکلے تھے، اب پورے گیارہ دن گزر چکے ہیں، ہو دوسروں کی وابستگیاں بھی اتنی شدید ہوسکتی ہیں، راہ تکتے تکتے اُن کی آنکھیں پتھر ہوگئی ہوں گی۔ وہ بھی ایسے بدحواس اور دیوانے ہوسکتے ہیں کہ کچھ کر گزریں۔ ہم آپ کو کیا کیا بتائیں کہ کن حالات میں ہم یہاں آئے تھے۔ ہمیں کہاں جانا تھا، کن لوگوں کے پاس، جنھیں کھوئے ہوئے برس ہو چکے ہیں، ایک زمانے بعد اب کہیں اُن کے چہرے دیکھنے کی اُمید بندھی تھی۔ ایک بوڑھا کن کن منزلوں سے گزر کے ایک مدت بعد اپنے گھر واپس جا رہا تھا، یہ حادثہ سے..... “ میری آواز بھرّانے لگی، ابا جان کا اشک بار چہرہ بار بار آنکھوں کے سامنے آجاتا تھا۔ ”بڑے نواب نے ہمیں ہی قید نہیں کیا، ہمارے رونے والوں کو بھی کہیں کا نہ رکھا۔ یہ کیسا زنداں ہے جس کی کوئی تاریخ، کوئی مدت مقرر نہیں ہے، زندان، نہ گلہ، اتنی اجازت بھی نہیں کہ باہر بھٹکتے ہوئے اپنے عزیزوں کو مطلع کر سکیں۔ آدمی مر جائے تو چین آجاتا ہے لیکن اِس طرح اچانک گم ہوجائے اور کوئی سراغ نہ ملتا ہو تو..... “

میرا گلا گھٹنے لگا تھا، میں نے سانس لینے کے لیے توقف کیا۔ اُن دونوں کی نظریں مجھی پر ٹکی ہوئی تھیں، پہلی بار نواب کی بہن نے کچھ کہنا چاہا مگر اپنی بھابی کو دیکھ کے وہ بے تابی سے پہلو بدل کے رہ گئی۔

”میں آپ سے یہی کہنا چاہتا ہوں، کیا اتنا کافی نہیں ہے۔“ میں نے ٹھیرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اِس کے باوجود آپ کو شکوہ ہے کہ ہم نے آپ کی باتوں پر غور نہیں کیا یا ہمیں چھوٹے نواب پر گزرنے والے وقت کی شدت کا احساس نہیں۔ آپ کے آنے سے پہلے بھی ہم خوب جانتے تھے، بڑے نواب نے اچھی طرح یہ سب کچھ ہمیں باور کرا دیا تھا مگر ہمارے پاس کرنے اور کہنے کو کچھ ہوتا تو اب تک صورتِ حال مختلف ہوتی۔ آپ کا اظہار نمک چھڑکنے کے مترادف ہے، اس کا جواب تو ہم خود ہیں، یہ قید خانہ، یہ ہتھیار بند پہرے دار، ہمارے جسموں پہ پڑے ہوئے داغ۔ بڑے نواب نے پہلے ہی دن ہمیں یہ حکم دیا تھا کہ اگر ہم خانم کا پتہ بتا دیں تو یہ دروازے ہمارے لیے کھل جائیں گے۔ گویا وہ خانم کو کسی طور یہاں لے آئیں گے اور ہمیں رہائی نصیب ہوجائے گی ورنہ پھر ہمارا مقدر۔ ایک لامحدود قید اور اُس کے علاوہ بھی بہت کچھ۔ جنون کی بات ہے تو کسی دن غلاموں کو ہم پر ہتھیار اُٹھانے کا حکم بھی صادر کیا جاسکتا ہے۔ اِس طرح ہمارے یہاں موجود رہنے سے بڑے نواب پر جو اعصابی دباؤ ہے، وہ مزید کم ہوجائے گا اور اپنے چھوٹے بھائی کی ناگفتہ بہ حالت کے انتشار میں اُن کی آسودگی کا کوئی پہلو نکل آئے گا کہ اُنھوں نے کچھ نہ کچھ تو کیا۔ ہمیں معلوم ہے، ہم سراسر اُن کے رحم و کرم پر ہیں۔ کل کچھ بھی ہوسکتا ہے اس لیے کہ ہوتا رہا ہے۔ بڑے نواب سے

کچھ بھی بعید نہیں۔ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود ہماری زبان بند ہے۔ آخر کیوں؟"

"ہم اندھے نہیں ہیں' سب کچھ ہمارے سامنے ہے کسی دلیل یا تاویل کا محل ہی کہاں ہے۔ ہمارا دل' یہ سب جان کے' دیکھ کے بہت دکھتا ہے۔" پہلی مرتبہ نواب کی بہن نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ اس کی آواز میں شستگی اور کھنک کے ساتھ کوئی چمک سی تھی اور اپنی بھابی سے زیادہ اعتماد بھی۔ "ہم نے بڑے نواب کی وکالت نہیں کی ہے' نہ ہمارے یہاں آنے کا یہ مقصد تھا۔ ایک شخص دیوانہ ہوگیا ہے تو سزاوار ہم کہاں ٹھیرتے ہیں۔ ہم نے تو آپ سے کچھ اور گزارش کی ہے کہ آپ کے لیے اس محبس سے نکلنے کی کوئی صورت پیدا ہو اور ہم' ہمارا گھر بھی بڑھتی ہوئی بلاؤں سے محفوظ رہے مگر شاید... شاید یہ ممکن نہیں ہے ورنہ آپ ضرور..." اس کی آواز بجھتی گئی۔

"ہاں! یہ..... یہ ایسا آسان نہیں ہے جیسا آپ کہہ رہی ہیں۔ اس حویلی سے نکل کے آپ میں سے کون خانم کے پاس جائے گا؟ یہاں سے وہ بہت دور ہیں۔ آپ نے سنا ہے....."

"وہ کتنی ہی دور ہوں۔" میری بات پوری ہونے سے پہلے نواب کی بیگم لیکتی آواز میں بولی۔ "ہم کسی طرح چلے جائیں گے۔ یہ ہم پر چھوڑ دیجیے۔"

"کیسے؟ آپ یوں کیسے چلی جائیں گی؟"

"ہم کسی کو بتائے بغیر یہاں سے نکل جائیں گے اور دیکھیے گا' سرخرو ہی واپس آئیں گے۔"

"معلوم ہوتا ہے' آپ اپنی ہی دنیا میں رہی ہیں' دھوپ سے آپ کا واسطہ پہلی بار پڑا ہے۔ ہمارے لیے زبان ہلا دینا کیا مشکل ہے' ہم آپ کو خانم کے بارے میں سب کچھ بتائے دیتے ہیں' یقیناً اس طرح آپ کی مراد بر آئے گی' ساتھ ہی ہمیں بھی نجات مل جائے گی مگر آپ نے بہت سے نشیب و فراز پر غور نہیں کیا۔ آپ ایک خاتون' کس طرح کسی کو بتائے بغیر زمانے کی نظروں سے خود کو چھپاتے' بچاتے ہوئے وہاں تک پہنچ سکیں گی اور آپ کامیاب بھی ہوگئیں تو خانم کیا اس طرح کوئی صحیح فیصلہ کرسکیں گی۔ وہ فوراً ہامی بھر لیں گی' اس لیے کہ ہم دونوں کی گم شدگی کی خبر ان تک پہنچ گئی ہوگی اور ان کے لیے سلسلہ جوڑنا کچھ ایسا دشوار نہیں ہوگا۔ وہ ہماری خاطر سب کچھ کرسکتی ہیں لیکن یہ سب بعد کی باتیں ہیں' یہاں اور بھی لوگ ہم سے غرض رکھنے والے موجود ہیں' وہ زمانہ دیکھے ہوئے ہیں' انھیں آدمی کی آہٹ سننے کی دیر بھی نہیں لگتی اور ان کے سر بڑے نواب کے سر سے زیادہ کشیدہ ہیں۔ وہ آپ کو وہاں سے واپس نہیں آنے دیں گے اور اس حویلی میں پھر شاید کوئی بھی باقی نہ رہے۔ آپ ان سے واقف نہیں ہیں اور اگر یہ سب کچھ ان سے روپوش بھی رہا' انھیں کوئی بھنک مل سکی کہ آپ کی آمد سے ہماری قید و بند کا کوئی تعلق نہیں ہے' خانم کو بھی آپ نے اس کا احساس نہ ہونے دیا تو بھی خانم اس عالم میں گھر سے نکلنے پر کیسے تیار ہو جائیں گی جب خود ان کے گھر میں ماتم بھی ہوئی ہو' ان کے گھر کے دو افراد لاپتہ ہوں اور اگر آپ نے ہمارے متعلق سب کچھ بتا کے خاموش رہنے پر آمادہ کرلیا یا خانم مصلحتاً خود ہی زبان بند رکھنا مناسب سمجھا اور وہ گھر کے تمام لوگ ایک دوسرا صدمہ دے کے چپ چپاتے آپ کے ساتھ نکل بھی آئیں' بے شک ہمارے نام پر وہ چلی آئیں گی لیکن کیا ہمیں یہ گوارا ہوگا؟ گوارا کرلینا چاہیے کہ وہ یہاں اس انداز سے اور اس بنیاد پر چلی آئیں' ہماری آزادی کی قیمت پر؟ ہم اپنے گھر کی حرمت یوں ارزاں کر دیں؟ زندگی اور موت کا کھیل ہمارے لیے نیا نہیں ہے' بڑے نواب کا جو ہے' کسی دن ہم ضرور تھک جائیں گے' وہ ہمارا آخری دن ہوگا' اسے آپ ضد سمجھتی ہیں تو غلط نہ ہوگا مگر یہ ضد بے جواز نہیں ہے' ہم لوگوں سے مزید کیا توقع رکھ سکتے ہیں جن کے لیے اپنی غرض سب سے بڑی ہے' ہمیں یاد ہے' بڑے نواب نے پہلے ہی دن خانم کے بازار کا طعنہ دیا تھا۔ وہ گالی انھوں نے خانم ہی کو نہیں' ہمیں بھی دی تھی۔ انھوں نے ہمیں لاکھوں روپے کی پیش کش کی تھی اس لیے کہ ان کے پاس یہی پیمانہ ہے مگر کچھ چیزیں بے مول بھی ہوتی ہیں جسے دوسروں سے کا احساس نہیں' جو زندگی کی حد تک شقی القلب ہو' ہم اسے خانم بتا دیں! اور اس کی کیا ضمانت ہے کہ خانم کے آنے کے بعد بڑے ہم سے دست بردار ہو جائیں گے؟ وہ ہمارے چہرے محفوظ کیوں نہ کر لیں گے تاکہ خانم کو ان کے کسی حکم سے سرتابی کی مجال نہ ہو۔ جب خانم میں مبتلی تھیں' اس وقت سب کچھ ممکن تھا لیکن اب ایسا نہیں جہاں خانم رہتی ہیں' اس گھر کی عزت بھی آپ کی حویلی سے کم نہیں ہے۔ وہاں فرشتے رہتے ہیں' آپ کا اصرار ہے کہ سب کچھ ہی تک محدود رہے گا مگر ہم اس مفروضے پر اتنی بڑی غلطی' اتنا بڑا جرم کر سکتے۔ ہاں ہم نے وعدہ کیا ہے کہ ہم جا کے خانم سے بعینہٖ یہ سب کچھ گوش گزار کر دیں گے' یہی ایک شریفانہ طریقہ ہے۔ خانم آ جائیں ہم ان سے کہیں گے تو وہ کبھی منع نہیں کریں گی۔ وہ یہ نیکی ضرور کریں گی لیکن پورے وقار کے ساتھ۔ وہ اس حویلی میں اپنی مرضی سے قدم رکھیں گی' جبر سے نہیں' ہم بڑے نواب یا کسی اور کو اس کی اجازت نہیں دیں گے۔ خانم کھلی اور ناآلودہ فضا ہی میں اپنے لیے بہتر فیصلہ کر سکیں گی' اس طرح اور ان حالات میں نہیں۔ اگر آپ مذہ میں زبان رکھتی ہیں اور جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں' درست سمجھتی ہیں تو ذرا سا حوصلہ کیجیے۔ بڑے نواب کے پاس جا کے کہیے کہ وہ اپنا دماغ درست کریں' وہ آگ سے کھیل رہے ہیں' بڑے نواب کی لگام کھینچنا آپ کے بس میں نہیں ہے تو کسی طور ہمیں یہاں سے نکالنے کی سبیل کیجیے۔ ہم بھی اس رشتے کا احترام کریں گے جس کا آپ نے حوالہ دیا ہے۔"

رگوں میں خون کی گردش کے ساتھ میری آواز بھی تیز ہوگئی تھی' اس سے پہلے کہ میرے منہ سے کچھ اور نکل جاتا' میں نے اپنی زبان روک لی۔ وہ ہمہ تن گوش سنتی اور میری صورت دیکھتی رہیں' میری خاموشی پر چونک سی گئیں' میں نے پھر کچھ اور نہیں کہا۔ پیرو بھی چپ رہا' نواب کی بہن پٹ پٹاتی پلکوں سے کبھی مجھے' کبھی اپنی بھابی کو دیکھتی تھی' اس کے نتھنے پھڑک رہے تھے اور ہونٹوں کے گوشے بار بار کپکپانے لگتے تھے۔ بیگم سر جھکائے گہری سانسیں بھرتی رہی۔ آنسوؤں سے مجھے بہت وحشت ہوتی ہے۔ مجھے یہ جان کے کچھ تسلی ہوئی کہ ان کی آنکھیں پہلے کی طرح لبریز نہیں ہیں اور نہ ان میں پہلی جیسی وحشت اور ویرانی ہے۔ دونوں کے چہروں پر اضطراب کے بجائے یاسیت آمیز سکون چھایا ہوا تھا جو ہر دلیل ختم ہو جانے اور سارے جتن کرلینے کے بعد ہی نظر آتا ہے۔ انھوں نے کچھ نہیں کہا' ہمارے سامنے بیٹھی رہیں۔

"ابھی آپ کیا سوچتا ہے۔" پیرو نے یہ سکوت توڑا اور تذبذب سے بولا۔ "ابھی اپنا نہیں تو اس کا کوئی بات تمھارا دل میں اترتا ہے؟"

بیگم نے کوئی جواب نہیں دیا مگر نواب کی بہن اضطراب سے بولی۔ "ہمارے پاس اظہارِ ندامت کے سوا کچھ نہیں ہے' ہمیں معاف کر دیجیے کہ ہم نے آپ کو....."

"نئیں' نئیں۔" پیرو نے نرمی سے کہا۔ "ابھی آپ کا اس میں کیا دوش ہے' اپن کے لیے یہ ایسا کوئی نوا بات نئیں ہے۔ دیکھے گا' ابھی آگے کیا ہوتا ہے' ابھی آپ گھر واپس جاؤ۔"

"ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم آپ کی کیا مدد کر سکتے ہیں۔" نواب کی بہن بے تابانہ شائستگی سے بولی۔

"ابھی آپ اپنے اور ہمارے لیے بس دعا کرو۔"

"دعا کے علاوہ بھی اگر ہم سے کچھ ہو سکا تو یقین کیجیے کوئی کوتاہی نہیں ہوگی۔" نواب کی بہن نے جھلملاتی آواز میں کہا۔ وہ بولتی تھی تو کمرے میں چھناکا سا ہوتا تھا' جیسے شیشہ ٹوٹ جائے اور کرچیاں بکھر جائیں' کہنے لگی۔ "خانم واقعی خوش قسمت ہیں کہ انھیں آپ جیسے پاسبان ملے ہیں' ہم سے سمجھنے میں چوک ہوئی تھی۔ ہمیں اس قدر تکرار نہیں کرنا چاہیے تھا' ہم تصور کر سکتے ہیں کہ خانم کی نئی زندگی کتنی پُرمسرت ہوگی' بے شک ہمیں بیچ میں نہیں آنا چاہیے۔ شمشی بھائی کو اللہ اپنی امان میں رکھے۔" شمشی بھائی سے مراد نواب عالم تاب ہی ہو سکتا تھا۔

"ابھی سب ٹھیک ہو جائے گا۔" پیرو نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "اپن لڑتا ہے' ابھی زیادہ دیری نہیں لگے گا' ادھر سے چھوٹ کے اپن خانم کے پاس ہی جائے گا۔" پیرو نے اسے پھر دلاسا دیا۔ "اپن آپ لوگ کو بھول نئیں جائے گا۔"

"ہمیں آپ کے ہر قول پر اعتبار ہے۔" وہ یاسیت سے بولی۔ "موقت نے آپ کے ساتھ کوئی سلوک کیا اور ساتھ ہی شمشی بھائی کو کچھ مہلت دے دی تو ضرور ایسا ہوگا۔ خدا کرے یہی ہو۔"

"وقت ملے گا گڑیا رانی! ضرور ملے گا۔" پیرو نے بے قراری سے کہا۔ "ابھی تم دل اتنا چھوٹا مت کرو' پھر تم نے یہ کیسا بات شروع کر دیا ہے' ایسا مت بولو۔"

"سب کچھ وقت کی مہربانی ہی پر منحصر ہے۔" وہ گرفتہ لہجے میں بولی' پھر کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگی۔ "اگر آپ مناسب سمجھیں تو یہاں موجود اپنے ساتھیوں اور عزیزوں کا پتہ دے دیجیے۔ ہم ہر ممکن احتیاط سے' کسی طور بھی انھیں آپ کے بارے میں اطلاع پہنچانے کی کوشش کریں گے۔"

"آپ بہت بھولا ہے بٹیا لوگ! اپن ایسا کیسے کر سکتا ہے' وہ اگر الٹا سیدھا ادھر آ گیا تو اپن کے ساتھ جال میں پھنس جائے گا' سمجھا!"

"ہم انھیں یہاں کا پتہ بتائیں گے ہی نہیں' کوئی رقعہ تحریر کر دیجیے۔"

پیرو ہنس کے بولا۔ "وہ اور پریشان ہو جائے گا بی بی! ابھی اس کو جانے دو۔"

"کاش ہم آپ کی کسی خدمت کے اہل ہوتے' آپ کے کام آ کے ہمیں بہت خوشی ہوتی۔" اس کے لہجے میں وارفتگی تھی۔

"آپ کا اتنا بولنا بہت ہے۔"

"ہم یہاں بڑے ڈرتے ڈرتے آئے تھے۔ لوگ آپ کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کہتے تھے' بہت عجیب باتیں سن سن کے دل ہولتا تھا مگر شمشی بھائی کی حالت ایسی تھی کہ آئے بغیر چین نہ ملتا اور جیسا کہ بابی جان نے کہا تھا' یہی سوچ کے کچھ تقویت ہوتی تھی کہ جو لوگ اتنے عذاب کے باوجود اپنے عزم کے اتنے پختہ ہو سکتے ہیں' وہ ایسے برے نہیں ہو سکتے۔ وہ سب بہتان تراشتے تھے۔"

"ابھی آپ نے کوئی غلط نئیں سنا تھا۔" پیرو نے مسکرا کے کہا۔ "اپن ایسا ہی کچھ عجیب لوگ ہے' کبھی خود اپنے پلے بھی نئیں پڑتا۔"

"کاش ہم کسی اور طرح ملتے۔" وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

پیرو کوئی جواب نہ دے سکا تھا کہ بیگم یکایک اٹھ گئی۔ بیگم کو دیکھ کے نواب کی بہن بھی کھڑی ہوگئی۔ دونوں کے چہروں پر نقاب نہیں تھی' نقاب باندھنے کے بجائے انھوں نے چادر سرکا کے ناک تک چہرے چھپا لیے۔ سیاہ چادر میں صرف ان کی بڑی بڑی آنکھیں نظر آ رہی تھیں' ہم دونوں بھی مونڈھوں سے اٹھ گئے تھے۔ چند لمحوں تک وہ سر جھکائے کن انکھیوں سے ہمیں دیکھتی ہوئی چپ چاپ ہمارے سامنے کھڑی رہیں۔ ابھی وہ جانے کے لیے دروازے کی طرف نہیں پلٹی تھیں کہ پیرو نے اچٹتی نظر سے میری طرف دیکھا' میں یہی سمجھا کہ وہ مجھے کوئی اشارہ کر رہا ہے' ایک لحظے کے لیے میں سراپا لرز کے رہ گیا پھر جیسے ہی پیرو نے اپنی

جگہ سے حرکت کی اور آگے قدم بڑھایا تو میرا ماتھا ٹھنکا، جانے کیوں مجھے شبہ ہوا کہ کہیں پیرو کے دل میں کوئی اور بات نہ آگئی ہو، ہم اُن دونوں پر قابو پا کے اُن کی آڑ لے کے فرار ہو سکتے تھے۔ اُن پر قابو پانا کچھ دشوار نہیں تھا۔ یہ خیال آتے ہی میرا سارا جسم دہل سا گیا تھا مگر عین وقت پر میرے بازو اینٹھ کے رہ گئے، پیرو بیگم کے پاس جا کے ٹھہر گیا اور اُس نے بیگم کا دوپٹا ماتھے سے چھو کے اُس کی طرف بڑھا دیا۔

میں پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ میں نے خود پر لعن طعن کی کہ مجھے ایسا گمان ہی کیوں ہوا، یقیناً یہ ایک بہترین موقع تھا لیکن پیرو کے ذہن میں ایسی کوئی بات آ ہی نہیں سکتی تھی، انھیں یرغمال بنا کے فرار ہونے سے موت بہتر تھی، پھر اُن سے اتنا کچھ کہنے کی کیا ضرورت تھی، میں نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ میرے بھنچتے ہوئے بازو اُٹھے نہیں ورنہ نواب کی بہن اب تک میری گرفت میں ہوتی۔

دوپٹا واپس کرتے ہوئے پیرو نے بیگم کے سر پہ ہاتھ رکھا تو اُس نے اپنی آنکھیں بھینچ لیں اور منہ چھپا کے سُبکنے لگی، پیرو اُس کا شانہ تھپ تھپاتے ہوئے فوراً نواب کی بہن کی طرف متوجہ ہو گیا جو جھلملاتی نگاہوں اور جھپکتی پلکوں سے اپنے پاس کھڑے ہوئے پیرو کو دیکھ رہی تھی، پیرو نے اُس کا شانہ تھام کے سرگوشیانہ لہجے میں کچھ کہا مگر وہ تھا میں نہیں سُن سکا مگر پیرو نے کوئی ایسی ہی بات کہی تھی کہ لڑکی کی آنکھوں کی چمک اور گہری ہو گئی تھی اور اُس کے گالوں پر سُرخی پھوٹ آئی تھی، پیرو نے بے اختیار اُس کی پیشانی چوم لی۔

اُس کے وجود پر یک لخت ایک ہیجان سا طاری ہوا اور وہ کھڑے کھڑے لہرا سی گئی، ایسا محسوس ہوا جیسے ایک پل میں اُس کا سراپا ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ اچھا ہوا کہ پیرو نے اُس کا بازو چھوڑ دیا اور وہ خود سنبھل گئی، پھر وہ وہاں نہیں ٹھیری تیزی سے مُڑ کے دروازے کی طرف لپک پڑی۔

دروازے پہ جا کے اُس نے پلٹ کے ایک نظر مجھے اور پیرو کو دیکھا اور اپنی بھابی کے ساتھ کمرے سے اوجھل ہو گئی۔

کمرے پہ رات کا سناٹا مسلط ہو گیا تھا۔ اُن کے جاتے ہی پہرے دار اندر آ گئے تھے اور دروازے کے پاس انھوں نے اپنی پُرانی جگہیں سنبھال لی تھیں، میں اور پیرو وہیں مونڈھوں پر خاموش بیٹھے رہے پھر کچھ دیر بعد اندر کے کمرے میں چلے آئے۔ یہاں دو چار پائیوں، میز، جگ اور گلاس کے سوا کوئی چیز نہیں تھی، پھر بھی یہ کمرہ اصطبل کی کوٹھری اور تہ خانے سے بدرجہا بہتر تھا۔ کمرے کی کھڑکی مقفل کر دی گئی تھی لیکن ہم ہوا کے لیے دروازہ کھلا رکھتے تھے، اوپر چھت سے ملحق سلاخوں کا روشن دان تھا، دروازہ کھلا ہونے کی وجہ سے ہوا کمرے میں گردش کرتی رہتی تھی۔ پانی پی کر پیرو پاؤں پھیلا کے چار پائی پر ڈھیر ہو گیا اور لمبی لمبی سانس کھینچنے لگا۔ میں نے روشنی بجھا کے آنکھیں موندنے کی کوشش کی، اُن کی آوازیں ابھی تک کانوں میں گونج رہی تھیں، آنکھوں میں اُن کے چہرے کھبے ہوئے تھے۔ پیرو بھی اُنھی کے بارے میں سوچ رہا، اُسے بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔

رات کا آخری پہر ہو گا۔ پیرو کسمساتا ہوا اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ "کیا ہے دادا؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"کچھ نئیں جانی!" وہ غنودہ آواز میں بولا۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے، کیا سوچ رہے ہو؟"

"کیا بولے راجا!"

"اب سو جاؤ، دماغ پر کوئی زور مت ڈالو۔"

"یہی اپن ابھی تجھ سے بھی بولنا چاہتا تھا۔" وہ ہنس کے بولا۔

"میں کیا کروں دادا! مجھے بالکل نیند نہیں آ رہی ہے۔"

"نیند کیسے آئے گا سالا۔"

"مگر آ ہی جائے گی۔ نیند تو پھانسی پر بھی آ جاتی ہے۔ پھر کون سا پل جوتنے جانا ہے، اب نہیں تو صبح آ جائے گی۔"

وہ سر ہلانے لگا اور اپنے گال کھجاتا رہا۔ وہ بہت سرگرم آتا تھا۔ میں نے جان بوجھ کے اُسے نہیں کریدا، اس سے حاصل ہی کیا، وہ خود گھٹے ہوئے لہجے میں مجھے ٹوکنے لگا۔ "چپ کیوں ہو گیا؟ باتیں کر راجا!"

"کیا بات کروں۔"

"ابھی اُودر تو کیسا طوطے کا مافق بولتا تھا، ایک دم پٹ کے کا مافق۔ اپن کو یاد نئیں پڑتا، ابھی تو کبھی اپنے سامنے اتنا بات کرتا لگتا تھا، کسی نے چابی بھر دیا ہے۔"

"میں نے وہی سب کچھ کہا تھا جو تم کہہ چکے تھے، کوئی نئی بات تو نہیں کہی تھی۔ وہ کچھ سمجھتی ہی نہیں تھیں۔"

"اپن تو کبھی تجھ کو دیکھتا تھا، کبھی اُن لوگ کو۔ وہ ایک دم حیران ہو گیا تھا کہ ابھی یہ کون شہزادہ اندر آ گیا ہے۔"

"شہزادہ!" میں نے تنک کے کہا۔

"قسم سے اپن مخول نئیں کر رہا ہے، اپن اُن لوگ کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اُن کا دیدہ کھلا ہوا تھا، اپن سوچ رہا تھا کہیں تجھ کو نظر نہ لگ جائے، اپنا بھی، اُن کا بھی۔ نظر کا کاٹ چاقو سے تیز ہوتا ہے۔"

"معلوم نہیں، قیدی کو نظر لگ جانے سے کیا اثر ہوتا ہے۔" میں نے زہرخند سے کہا۔

"تُو تو کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔"

"تم... تم یہ کیسی باتیں کر رہے ہو؟" میں نے تلخی سے کہا۔

وہ میرے بال پکڑ کے سر کو جھٹکے دینے لگا، پھر اُس نے مجھے اپنے بازوؤں میں بھر لیا اور تھپکتی آواز میں کہنے لگا۔ "راجا! ذرا دھیان ہی رکھو، ابھی اتنا ٹیم کے اپن کو پتہ چلا کہ تیرے اندر کیسا کھل بل ہو رہا ہے، اندر زیادہ شور ہو تو باہر کا کھٹکا سنائی نئیں دیتا ہے۔ ایسا سچ بچ ابھی ہوتا رہتا ہے، آگے بھی ہوتا رہے گا، اپن باہر تھا تو بھی سالا اُن سالا فرق پڑتا تھا۔ اُودر راستے میں وہ سونیا سامنے آ گیا، پتھر مارنے کے لیے زندہ تھا، مار کے چھو ہو گیا، اُوپر والا یہ کھیل تماشا کرتا رہتا ہے۔"

وہ مجھے ڈوبتے لہجے میں سمجھا رہا تھا کہ مجھے ہمت رکھنی چاہیے جو ہو گیا ہے، اُس میں ہمارا کیا قصور۔ "اگر کوئی قصور تھا تو اتنا کہ ہم حیدر آباد سے کیوں آئے، تم سیدھے بمبئی کیوں نہ چلے گئے۔"

"تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے میں کچھ جانتا ہی نہیں ہوں، میں پاگل ہو گیا ہوں، کیا میں نے تم سے کبھی کوئی شکایت کی ہے اور تم جو کہہ رہے ہو تو کیا تمھیں یہاں بہت آرام ہے، تمھیں جیسے کوئی دکھ نہیں ہے۔"

"تُو نے کچھ بولا نئیں تو اپن نے کیا سنا بھی نئیں اور اپن کا بات سن، کرتا اپن کبھی کالا گورا رَت اُوپر سے چلا کر دیتا ہے، ابھی اتنا سالا اولاد کے اپنے کرا اور آدھا کرے گا کیا۔"

"تمھارا مطلب کیا ہے؟"

"ابھی جانے دے۔" وہ کسمساتا ہوا بولا۔

"دادا!" میں نے دبی آواز میں کہا۔ "مجھے احساس ہے کہ تم خواہ مخواہ سب کچھ میری وجہ سے......"

"مجبوری!" اُس کی آنکھوں میں آگ سی جلنے لگی۔ "ابھی آگے سنبھل کے بولنا، اپن سیدھا اُلٹے ہاتھ کا دکھائے گا۔" وہ برہمی سے بولا۔

"تم بھی تو ایسی باتیں کر رہے ہو۔ مارنا ہے تو تمھارا ہاتھ کس نے پکڑا ہے، مارو۔ میں خود ہی ایسا کہ مجھے مارا جائے، ہو سکے تو میرا گلا گھونٹ دو۔"

"یہ...... یہ ایک دم کیسا!" وہ بوکھلا کے بولا۔ "جیت بھی میرا، ہار بھی میرا، سالا کبھی روتا، کبھی رُلاتا ہے۔ آدمی کو اُلٹا کر کے رکھ دیتا ہے، کچھ دھیان رکھ کے بولا کر۔"

"سچ سچ بتاؤ، تمھیں میری کسی بات سے دکھ پہنچا ہے؟ میری آواز رُندھ گئی۔ "ایسا ہے تو میں تمھارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔"

"ارے نئیں راجا! نئیں جانی!" اُس نے مجھے دبوچ لیا اور وحشت سے بولا۔ "اپن کا مطلب یہ نئیں تھا، اپن کا مطلب...... جو بولنا ہی تھا۔ پر لگتا ہے ابھی اپن ہی کچھ اُلٹا سیدھا ہو گیا ہے۔" وہ اُلجھے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔

"دادا! میری کسی بات کا بُرا مت لیا کرو۔" اُس کے خفت آمیز لہجے سے مجھے خود خجالت ہونے لگی تھی، میں نے اُسے اور آزردہ کر دیا تھا۔ میں نے اُس کے پیر پکڑتے ہوئے کہا۔ "میرا کچھ یہی ہے۔ معلوم نہیں، اچانک مجھے کیا ہو جاتا ہے، مجھے کچھ خیال ہی نہیں رہتا۔"

"تُو نے کچھ بھی نئیں بولا تھا راجا!" وہ نرمی سے بولا۔

"میں سمجھتا ہوں، میں نے کچھ کہا نہیں تو سب کچھ منہ سے کہنے ہی سے تھوڑی ہوتا ہے۔ تمھیں میرا چہرہ دیکھ دیکھ کے وحشت ہوتی ہو گی، تم سمجھتے ہو گے کہ میں بہت گھبرا رہا ہوں جتنا تم سمجھ رہے ہو، ایسا نہیں ہے، میں نے پورے سات سال جیل میں کاٹے ہیں اور ویسے بھی باہر کون سی جیل نہیں تھی۔ جب سے میں گھر سے نکلا ہوں کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہا ہے۔ میری طرف سے تم اتنے پریشان مت ہوا کرو۔ مجھے کیا معلوم نہیں ہے، میری آنکھیں بند نہیں ہیں۔ بس یہاں مجھے ایک ہی بات رہ رہ کے ستاتی ہے کہ اُدھر ابا جان کا کیا حال ہوا ہو گا۔ وہ بالکل ہی ٹوٹ گئے ہوں گے۔"

"اپنے کو بھی اُن کا بہت خیال ہے پر کیا کرے، وہ سوچ سمجھ کا آدمی ہے، ابھی اتنے دن اپن لوگ کے ساتھ رہ کے سمجھ گیا ہو گا کہ کوئی بڑا آفت ہی پڑ گیا ہے جو نئیں لوٹا۔ وہ دل کا ایسا چھوٹا نئیں ہے راجا!"

"لیکن عین وقت پر جب برسوں کی دوڑ دھوپ کے بعد کہیں اُن کی تمام خواہشیں پوری ہونے کی گھڑی آئی تھی، میں مل گیا، جہاں گیر مل گیا، جس کام کے لیے انھوں نے سارا گھر اُجاڑ دیا تھا، اُس کا ثمر اب انھیں ملنے والا تھا۔ اتنے دنوں بعد وہ اپنے گھر جا رہے تھے، بیٹے بیٹیوں کو دیکھنے اور اُن کے دُکھ درد کرنے کے لیے۔ وہ کیسے بے تاب ہو گے، ایسے وقت میں یہ صدمہ انھوں نے کس طرح سہا ہو گا۔"

"پر جتنا سوچے گا، اتنا ہی خون جلے گا۔ یہی تو اپن بول رہا تھا تو اُکھڑنے لگا۔ ابھی اندر جو اپنے قابو میں ہو سکتا ہے، وہی تو کر سکتا ہے، وہ سالا نواب اپنے کو کسی بھیڑیے کا اولاد معلوم ہوتا ہے۔"

"دادا! میں نے اُن سے اسی لیے اتنی باتیں کی تھیں کہ وہ ہمارے بارے میں بھی کچھ جان سکیں۔ اگر کہیں کوئی گنجائش ہو تو وہ کچھ ہمت کر سکیں لیکن شاید...... شاید کیا، وہ واقعی کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔"

"اپن نے بھی اتنا دیری اسی واسطے لگایا تھا کہ ابھی وہ کچھ سمجھے۔ وہ اندر حویلی کے اندر باہر کے راستے، ایک ایک کونے سے پورا جان کاری رکھتا ہو گا، جب اندر آنے کے لیے پہرے دار کو رام کر سکتا ہے تو اپنے لیے بھی اُن کو کچھ بول سکتا ہے۔"

"وہ ایسی نہیں تھیں، اُن کے امکان میں ہوتا تو وہ پہلے ہمیں یہاں سے نکالنے کی کوئی تدبیر کرتیں، پھر کوئی التجا کرتیں۔ اندر عمارت کی بات اور ہے، عمارت سے باہر بھی پہرے داروں کی ایک قطار ہے۔"

"وہ بہت الگ لوگ تھا راجا!"

"وہ اس گھر کی معلوم ہی نہیں ہوتی تھیں۔"

"ہاں جانی! لگتا تھا، ابھی زمین پہ اُترا ہے، نرا نوا ہی دُنیا میں آیا ہے۔ دُنیا کا راگ گھاٹ ابھی اُس کو ایک دم پتہ نہیں تھا، وہ چھوٹا والا تو بالکل چینی کا مورتی تھا، پھول کے مانک کھِل جاتا، مُرجھا جاتا۔ اُس کو دیکھ کے اپن کو اُودر حویلی کا زری بیٹا بہت یاد آیا تھا۔ ابھی سامنے ہوں تو دونوں جڑواں لگیں۔ بیگم کو بھی بنانے والا جیسے پر لگاتا ہی بھول گیا۔ راجا! اپن سوچتا ہے، ابھی اُن کو ادر کسی چیز کا کمی نہیں ہے۔ یہ قلعے کی طرح پھیلا ہوا حویلی، نوکر چاکر، سونا، چاندی۔ ادر سبھی کچھ ہے پر تُو نے دھیان دیا، اُن لوگ میں ابھی کون سا چیز کا کمی معلوم ہوتا تھا۔ وہ صرف چھوٹے نواب کا بات ہی نہیں تھا اور بھی کچھ تھا۔"

"تمھارا اندازہ درست ہو سکتا ہے لیکن اس وقت تو انھیں چھوٹے نواب کی طرف سے بہت فکر تھی، نواب کی حالت کچھ زیادہ ہی خراب معلوم ہوتی ہے۔"

"پر اپن ابھی کیا کر سکتا ہے۔" وہ پژمردگی سے بولا۔

میں جواب میں کیا کہہ سکتا تھا۔ وہ بھی منہ لٹکا کے رہ گیا اور کچھ توقف کے بعد بوجھل آواز میں بولا۔ "راجا! ابھی اپن کو ادر زیادہ دیری نہیں لگنا چاہیے۔"

"کیا ہونا چاہیے، کیا نہیں، یہ فیصلہ ہمیں کب کرنا ہے۔"

"ابھی تُو اُن سے بات کرتے ہوئے بول رہا تھا، کل نواب کا ماتھا پھر جائے اور وہ سالا کوئی اور پھڈا کھڑا کر دے کوئی اور حکم دے دے تو اپن کیا کرے گا۔ تُو نے کوئی غلط نہیں بولا تھا۔ ادر ابھی کچھ بھی ہو سکتا ہے، اپن گلے گلے پھنسا ہوا ہے، جتنا دیری ہوئے گا، اُتنا ہی اپن اندر دھنستا جائے گا۔ شروع کا بات اور تھا، اب اپنے کو وہ ایسے چھوڑنے میں دس مرتبہ آزو بازو دیکھے گا، اُس حرام کے جنے کو پتہ ہے کہ اپن لوگ کون ہے۔ وقت نکلنے کے ساتھ وہ ڈھیلا پڑنے کے بجائے اور کھنچ بھی سکتا ہے، سالے کو ضد چڑھ گیا تو اپن ادر ہی کتا بنا رہے گا۔ وہ ابھی ایک دم نئے جیسا حالت میں ہے، زیادہ دیری ہو جانے سے بات اور بگڑ سکتا ہے اور اُودر، اُودر چھوٹے نواب کے لیے بھی ابھی یہی ٹھیک ہوگا کہ اپن ادر سے جلدی نکل جائے۔"

"لیکن بڑے نواب کو جا کے یہ کون سمجھائے، ہم اپنے جیسی تمام کوششیں کر کے دیکھ چکے ہیں، بظاہر ایک ہی راستہ کھلا ہے کہ ہم اُسے سب کچھ بتا دیں۔ کیا تم، تم اب اسی نتیجے پہ پہنچے ہو؟"

"نہیں رے۔" وہ جھڑکتی آواز میں بولا۔ "پر اپن کو کچھ اور سوچنا پڑے گا اور جلدی۔"

مجھے ہنسی آگئی۔ "دادا! کون سا لمحہ ایسا گزرا ہے جب ہم نے اس طرف سے غفلت برتی ہو۔ ہاں سُرنگ کھودنے کی ایک کوشش نہیں کی۔" اُس نے ہنکاری بھری اور تھکے تھکے لہجے میں بولا۔ "اپن کو دم اندازہ نہیں تھا کہ ادر اتنا وقت لگ جائے گا۔"

"تم کیا سمجھ رہے تھے؟" میں نے ترشی سے پوچھا۔

"اپن سمجھتا تھا، ابھی دو چار روز کا بات ہے۔ وہ خود فیصلہ دے گا، ایسا نہیں ہوا تو اپن ہی ادر سے نکلنے کا کوئی راستہ کھوج، اگر یہ بھی نہیں بن سکا تو کوئی اپنے کو ڈھونڈتا ہوا ضرور ادر آ نکلے گا۔"

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کے پوچھا۔

"ابھی ادر کسی کو آنا چاہیے تھا۔"

"تمھارا مطلب زورا، مارتی اور ابا جان سے ہے؟"

"ہاں۔" وہ ہچکچاہٹ سے بولا۔ "وہ بھی آ سکتا تھا۔"

"تم اپنے ہوش میں تو ہو۔"

"اپن ٹھیک ہی بول رہا ہے راجا!"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔"

"سمجھنے کا کوشش کرو، کبھی نہ کبھی تو اُن کو ادر آنا ہی تھا، اُن کو جلدی ہی کرنا چاہیے تھا۔"

"تھانے میں ہم نے اپنے نام غلط لکھوائے تھے، یہ حویلی آ شہر کے مضافات میں ہے۔ ابا جان، زورا اور مارتی کہاں کہاں مارے پوچھتے رہے ہوں گے اور کون انھیں بتا سکا ہوگا، اتنے بڑے شہر کون ہماری نشان دہی کر سکتا تھا۔ تینوں اس شہر یہاں کے گلی کوچوں یہاں کے لوگوں سے بالکل ناواقف ہیں، پہلے تو انھیں اپنے آپ کو سنبھالنے ہی میں تامل ہوگا، ہمارے ساتھ پیش آنے والے حادثے سے لاعلم باعث انھیں ہم سے اپنا کوئی تعلق جتاتے ہوئے لازماً جھجک ہوگی، نقدی کے علاوہ ابا جان کے پاس لاکھوں روپے کے پتھر موجود ہیں، کی وجہ سے بھی اُن کا اپنے آپ کو چھپانا اور محدود رکھنا ضروری، پتھر ہیں کہ وہ ہماری خاطر قربان بھی کر سکتے تھے مگر ہمارا کوئی نشان ملتا تبھی تو! ... تم کس بنیاد پہ اتنے وثوق سے کسی کے آنے کی توقع کر رہے تھے دادا؟" میں نے منتشر آواز میں اس سے پوچھا۔

وہ آنکھیں میچ کے رہ گیا۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

مجھے حیرت تھی کہ پیرو جیسے شخص نے سب کچھ جانتے ہوئے ایسی توقع کیوں باندھ رکھی تھی، غالباً وہ یقین کی حد تک پُرامید تھا، جبھی اب اُس کی پیشانی پہ بل آئے ہوئے تھے۔ شروع شروع میں ذہن میں بھی یہ بات آئی تھی۔ اُن تینوں کو کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا، انتظار ہی نہیں کرتے رہے ہوں گے۔ ایک رات، دوسری رات۔ کتنے دن وہ ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھے رہے ہوں گے، پہلے شہر کے تمام گلی کوچوں کی خاک چھانی ہوگی اور ناکامی سے بولا اُن کے پاس تجمل کو اطلاع دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا ہوگا۔ تار پہنچنے میں ایک پہر کی دیر ہو سکتی ہے، تجمل ایک لمحے کے لیے بھی خود کو نہیں روک سکا ہوگا، چاہے اُس کے پیر کے زخم کی کیسی ہی حالت کیوں نہ ہو۔ اطلاع ملنے اور تجمل کے آنے کے لیے گیارہ دن بہت ہیں۔ ریل کے ذریعے فیض آباد سے حیدر آباد آنے میں دو دن سے زیادہ نہیں لگتے۔ لیکن یہاں تک اُس کی حالت اُن تینوں سے کیا مختلف ہو سکتی ہے، تجمل کوئی جادوگر نہیں ہے کہ بس یہاں آنے کی دیر ہوگی اور حویلی کا راستہ خود بہ خود اُس کے سامنے بچھ جائے گا۔ تھانے تک پہنچنے میں وہ کامیاب بھی ہو گیا تو وہاں روزنامچے پہ ہمارے اصل نام کہاں درج تھے اور تھانے دار رکن الدین سے نہیں تو کسی سپاہی سے اُسے پتہ بھی چل گیا کہ کوئی خاں صاحب چند دن پہلے دو آدمیوں کو ازراہِ ہمدردی ضمانت پہ لے گئے تھے اور تجمل نے خاں صاحب تک بھی رسائی حاصل کر لی تو اُسے اُن سے ہمارا کیا سراغ مل سکے گا۔ خاں صاحب صاف مکر جائیں گے کہ ہم لوگ تو اُسی وقت اُن سے جدا ہو گئے تھے، خاں صاحب نے بعد میں تھانے دار رکنی میاں کو بھی یہی تاثر دیا ہوگا۔ ہماری طرح تجمل کے ذہن میں دور دور تک خانم اور نواب عالم تاب کا خیال نہیں آ سکتا تھا کہ ہماری گم شدگی اُس سلسلے کی کوئی کڑی ہو سکتی ہے۔ تجمل آغا کے اڈے تک ضرور پہنچا ہوگا مگر وہاں جانے سے اُسے تبھی کچھ حاصل ہو سکتا ہے جب آغا نے اُسے اصل بات بتائی ہو۔ آغا کہہ سکتا ہے کہ اُس نے ہماری واپسی کے اندیشے کے سبب اپنے آدمیوں کو چھوڑ رکھا تھا۔ اُن لوگوں سے ہر وقت چوکنا رہنا چاہیے تھا جنھوں نے شاہ کبیر جیسے دادا کو پلک جھپکتے میں اَدھ موا کر دیا تھا۔ وہ لوگ کسی وقت بھی حیدر آباد کے اُس کے لیے خطرہ بن سکتے تھے۔ آغا کا یہ عذر ایسا غیر فطری نہیں ہوگا کہ تجمل کی سمجھ میں نہ آئے۔ شاہ کبیر کی بے دخلی کے واقعے کے بعد ہماری طرف سے اُس کی احتیاط دُور اندیشی ہی کہی جا سکتی ہے۔ اڈے تک پہنچنے سے پہلے وہ ہمیں کسی اور معاملے میں اُلجھا کے حیدر آباد سے بھاگنے پر مجبور کر دینا چاہتا تھا۔ اُسے ہمیں دُور رکھنے اور ہماری دسترس سے دُور رہنے کی اپنی جیسی کوشش کرنی ہی چاہیے تھی۔ وہ ہزار بہانے کر سکتا ہے۔ تجمل کو اُن آدمیوں سے بھی کچھ معلوم نہیں ہو سکتا تھا جو ہمارا تعاقب کر رہے تھے اور راستے میں ہم اُن سے جھگڑ پڑے تھے۔ وہ اِس حقیقت سے قطعی لاعلم تھے کہ انھیں ہمارے تعاقب کا حکم آغا نے خاں صاحب یا بڑے نواب کے اشارے پہ دیا تھا، سو وہ تجمل کو کیا بتا سکتے تھے۔ یہ تو صرف آغا ہی جانتا تھا، اس کے علاوہ خود تجمل کو بھی یہاں آ کے کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے پھونک پھونک کو قدم اٹھانا چاہیے تھا۔

میں نے اشارۃً پیرو کو یہی کچھ جتانا چاہا، تھانے میں اچانک خاں صاحب کی آمد، حویلی کا سارا ماحول و ترتیب، بڑے نواب کا اثر و رسوخ، پیرو کو ہر طرف دیکھنے کے بعد ہی اس طرح کی کوئی اُمید باندھنی چاہیے تھی۔ ممکن ہے تجمل حیدر آباد ہی میں ہو مگر حویلی تک اُس کے آنے کا امکان سو میں دس بھی نہیں تھا اور اگر آ کا اُس کی آمد کی بھنک ملتے ہی کہیں فرار ہو گیا تو تجمل کس کس کے گریبان پہ ہاتھ ڈالے گا۔ بہرحال پیرو کو ایسی کوئی خوش فہمی تھی تو اتنا وقت گزرنے کے بعد اُس کے ذہن سے نکل چکی تھی، جبھی وہ یہاں سے جلد سے جلد نکلنے کے سلسلے میں فکرمند تھا۔ میں نے اُس سے زیادہ جرح نہیں کی۔ اُس کی خاموشی کے بعد میرے مزید کچھ کہنے کا محل بھی نہیں تھا۔

اندھیرا ابھی باقی تھا۔ ہم دونوں پھر چارپائی پر لیٹ گئے تھے لیکن نیند ابھی تک آنکھوں سے دُور تھی۔ پیرو کا پھیلا ہوا ہاتھ میری انگلیوں میں پھنسا تھا، بار بار وہ میری انگلیاں جکڑ لیتا تھا۔ صبح ہونے میں کچھ ہی وقت رہ گیا ہوگا، ایک دن اور گزر گیا تھا۔ جیل میں کم از کم آدمی دن تو گن سکتا ہے۔ ہر دن کے بعد ایک دن کم ہو جاتا ہے، میرا سر پھٹا جا رہا تھا۔ پیرو کا بھی یہی حال ہوگا، یہ سوچ سوچ کے میرے حواس اور منتشر ہوئے جاتے تھے۔ مجھے نہیں تو اُسی کو نیند آ جائے۔ میرے لیے یہ بھی کوئی کم سکون نہ ہوتا۔ کم سے کم میں یہی کر سکتا تھا کہ اِدھر اُدھر کا کوئی ذکر چھیڑ کے اُس کا دھیان بٹاؤں یا اُس سے جا بنی بانی جیسا کوئی واقعہ سُنانے کی فرمائش کروں، کسی طور تو یہ وقت کٹے۔ جو ہونا ہے اُسے کون روک سکتا ہے۔ میں اُسے پکارنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ رُک گیا۔ اچانک ایک بات میرے ذہن میں گونجی۔ "دادا!" میں نے بے تابی سے اُسے آواز دی۔

"کیا، کیا ہے راجا!" وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ کے بیٹھ گیا۔

میں نے کچھ کہنے سے پہلے توقف کیا کہ کہیں میں کوئی بے سروپا بات تو نہیں کہہ رہا ہوں لیکن مجھ سے ضبط نہ ہوا، میں نے سرگوشی میں کہا۔ "دادا! ہم ایک بار بڑے نواب کو بُلا کے کیوں نہ دیکھیں؟"

"بڑا نواب کو!" وہ بڑبڑاتا ہوا بولا۔

"ہاں دادا!"

"اب اُس کو اور کیا بولنا ہے رے!"

"کچھ نہیں، لیکن ایک کوشش کر دیکھنے میں کیا حرج ہے۔"

"کیسا کوشش؟" وہ شش و پنج سے بولا۔

"کوئی اور بات نہیں دادا! ہم اُس سے کہیں گے کہ ہم اُس سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں، ضروری بات۔"

"پر کیا بات جانی؟"

میں نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "رات جب تم دوپٹا واپس کرنے کے لیے بیگم کی طرف بڑھے تھے تو پتہ نہیں، مجھے کیوں شبہ ہوا کہ کہیں تم میری طرف کوئی اشارہ تو نہیں کر رہے ہو، تمھارا ارادہ

کچھ اور تو نہیں ہے پھر فوراً یہ خیال میں نے اپنے سر سے جھٹک دیا تھا کہ تم ایسا سوچ بھی نہیں سکتے مگر دادا! جانے کیوں مجھے ایسا شک ہوا تھا کہ تم نے ان کی لوٹ لے کر باہر نکلنے کا ارادہ تو نہیں کر لیا ہے۔"

وہ ہنسنے لگا۔

"میں تمھیں بتاؤں کہ میں بس رُکا رہ گیا۔"

"ابھی ان لوگ سے ایسا کیسے کر سکتا تھا۔"

"ہاں دادا! یہ کسی طور مناسب نہیں تھا مگر دادا! وہ نہیں تو نواب.... نواب میرا مطلب ہے۔" میں نے سنسناتے لہجے میں کہا۔

اُس کی آنکھیں پھیل گئیں، لمحوں تک وہ گم صم مجھے گھورتا رہا، پھر سر ہلا کے بولا۔ "تیرا بات ابھی اپن کا سمجھ میں کچھ کچھ آتا ہے پر....."

مگر اُس نے آگے کچھ نہیں کہا۔

"سمجھ رہے ہو نا!" میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

"ہاں ہاں۔" وہ تذبذب سے بولا۔

میں نے پھر وضاحت کرنی چاہی لیکن اُس کے چہرے پر چھایا ہوا تکدر دیکھ کے میری آواز بجھ کے رہ گئی۔ اُس کے لیے اشارہ ہی کافی تھا۔ اُلٹا میں تذبذب میں پڑ گیا کہ میں نے کوئی مہمل سی بات کہہ دی ہے، واقعی پہرے داروں کی اتنی بڑی تعداد ہوتے ہوئے شاید ایسا ممکن نہ ہو۔

صبح آٹھ بجے کے قریب پہرے والے نے معمول کے مطابق ناشتہ لا کے رکھ دیا تھا۔ پیرو نے بعد میں اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی، میں نے بھی اُسے نہیں کریدا۔ اندر کمرے میں پڑے پڑے جی گھبرانے لگا تھا، صبح ہوتے ہی ہم صحن میں آ گئے تھے۔ یہاں دھوپ دوپہر کو بس چند منٹ کے لیے آتی تھی لیکن دن میں روشنی خوب پھیل جاتی تھی۔ دو کمرے، ایک بڑا دالان اور چھوٹا سا صحن۔ یہی ہماری دُنیا تھی۔ ہم کبھی اُٹھ کے ٹہلنے لگتے، کبھی دالان میں آ کے مونڈھوں پر بیٹھ جاتے۔ یہ کوارٹر نما مکان مہمان خانے سے ملحق تھا اور خدمت گاروں ہی کے لیے بنایا گیا ہوگا کہ وہ مہمان خانے میں ٹھیرے ہوئے مہمانوں سے قریب رہیں لیکن معلوم ہوتا تھا، عرصے سے یہاں کوئی آباد نہیں تھا۔ اندر کمروں اور دالان کی دیواروں پر جا بجا مکڑی کے جالے تنے ہوئے تھے اور چڑیوں نے کونے کھدروں میں گھونسلے بنا رکھے تھے۔ مکان سے ایک راستہ مہمان خانے کی طرف جاتا تھا، دوسرا حویلی کی طرف۔ تین اطراف مہمان خانے اور حویلی کی عمارتوں کی اونچی دیواریں کھنچی ہوئی تھیں، صرف ایک طرف کسی قدر نیچی دیوار تھی۔ صحن اسی مقصد سے مختصر رکھا گیا ہوگا کہ اطراف کی عمارتوں پر واقع بالائی منزل کے کمروں سے یہ حصہ نظر نہ آ سکے۔ ہم نے صحن کی نیچی دیوار کے اُس پار سُن گُن لینے کی کوشش کی تھی اور یہی اندازہ لگایا کہ اُس طرف بھی اسی طرز کا کوئی مکان بنا ہوا ہے۔ کبھی کبھی وہاں سے چلنے پھرنے کی آوازیں آتی تھیں، ظاہر ہے، پہرے داروں کے کون ہو سکتا تھا۔ دیوار پر چڑھ کر جھانکنا بھی ممکن نہیں تھا اگر یہاں بھی شب و روز ہمارے نگہبان بندوقیں لیے کھڑے رہتے۔ اصطبل کی کوٹھری سے فرار کی کوشش کے بعد انھیں ہماری طرف سے اتنا ہی محتاط ہو جانا چاہیے تھا۔ اگر ہم وہاں کچھ تحمل کر لیتے تو شاید ہماری طرف سے اتنے چوکنے نہ ہوتے۔

اُس وقت گیارہ بجے ہوں گے۔ وہ دوپہر کا کھانا ہمیں دو کے قریب پہنچاتے تھے لیکن اُس روز معمول کے خلاف ایک سفید کپڑے میں بندھا توشہ بغل میں دبائے لپکتا ہوا ہمارے پاس آیا۔ کی ساخت سے وہ توشہ ہی دکھائی دیتا تھا۔

"کیا ہے جمعدار؟" پیرو نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"یہ تمھارے لیے ہے۔" وہ رازدارانہ لہجے میں توشہ بڑھاتے ہوئے بولا۔

"دوپہر کا طعام؟ ابھی تو سالا دھوپ چڑھا ہوا ہے۔"

"یہ اندر سے بھیجا گیا ہے۔" وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔

"اندر سے!" پیرو نے متعجب ہو کے پوچھا۔ "ابھی کیا ... نے وقت بدل دیا ہے؟"

"نکو بابا! اُدھر.... اُدھر زنان خانے سے بی بی صاحب نے ... ہے۔" وہ جھجکتے ہوئے بولا۔ "تمھارے لیے۔"

"اپنے لیے؟ کون بی بی صاحب؟" پیرو کھڑا ہو گیا۔

"بی بی صاحب۔" وہ تیزی سے بولا۔ "رات جو اِس طرف تھیں، نواب حضور کی بہن بانو بی بی!"

"بی بی نے بھیجا ہے۔" پیرو نے اشتیاق سے کہا پھر اُس تھامنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ سمیٹ لیا۔ "بی بی کو بولنا پہلوان شکریہ، ابھی اِس کو واپس لے جاؤ۔" وہ آہستگی سے ...

"بی بی نے بولا ہے، واپس مت لانا۔" پہرے دار نے ... لہجے میں کہا۔

پیرو کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر اُس نے توشہ پہرے دار کے ... لے لیا۔ اُدھر پہرے دار گیا، اِدھر ہم نے اندر کمرے میں ... کھولا۔ خوان کی گرہ کھلتے ہی گلاب کے پھول بکھر گئے۔ گلابی ... بیچ میں چینی کا ایک پیالہ رکھا تھا، پیالے پر اوپر نیچے پلیٹیں ... چمچے تھے، کمرے میں ہر سُو خوشبو پھیل گئی۔ پیالہ کسی قدر گرم ... مغزیات اور چاندی کے ورق کی تہہ جمی ہوئی تھی، ترشے ... پستے، بادام اور ناریل۔ پیرو نے دمکتی آنکھوں سے مجھے دیکھا ... کے ساتھ چمچے سے چاندی کے ورق کی تہہ ہٹائی۔ "بی بی نے ... بھیجا ہے دادا؟" اُس کی آواز مہک رہی تھی۔

ہم ناشتہ کر چکے تھے اور کچھ کھانے کو بالکل طبیعت نہیں چاہ رہی تھی لیکن پیرو نے پلیٹ میری طرف بڑھائی تو مجھ سے منع نہیں کیا جا سکا۔ چمچا منہ میں رکھتے ہی محسوس ہوا جیسے منہ میں خوشبو گھل گئی ہو۔ وہ کسی قسم کا حلوہ تھا، شیرینی نہایت کم تھی۔ کئی چمچے کھانے کے بعد بھی ہم پہچان نہیں سکے کہ کون سے مرکبات سے بنایا گیا ہے جو کچھ بھی تھا بے حد نفیس اور لذیذ تھا۔ یقیناً نواب کی بہن نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہوگا۔ مجھے میٹھے چاولوں کے سوا کوئی میٹھا مرغوب نہیں تھا لیکن میں نے ایسے ذائقے کا حلوہ کبھی نہیں چکھا تھا۔ ہم نے اسی وقت سارا پیالہ خالی کر دیا۔ پیرو کی آنکھوں میں بھی میری طرح اُن کے چہرے گھوم رہے ہوں گے۔ اب خیال آ رہا تھا کہ رات ہم اُن دونوں کے نام بھی نہیں پوچھ سکے۔ پہرے دار نے نواب کی بہن کو بانو بی بی کے نام سے پکارا تھا مگر اُس کا صرف اتنا نام نہیں ہوگا۔ بہرحال انھوں نے ہمیں یاد رکھا، ہمارا اتنا خیال کیا۔ اُن کا دل بھی اُن کے چہرے کی طرح صاف و شفاف تھا۔ ممکن ہے اب وہی کوئی تدبیر کریں۔ رات جس طرح وہ آئی تھیں اور جس طرح انھوں نے یہ توشہ بھیجا تھا، اسی طرح وہ ہماری نجات کی جستجو میں بھی لگی ہوئی ہوں گی، کوئی عجب نہیں کہ کسی وقت بھی پہرے دار ہمیں اشارہ کر دیں۔ آج پہلی بار ایسا لگ رہا تھا کہ ہم یہاں لیے نہیں ہیں۔ شاید یہی کچھ یاد دلانے کے لیے انھوں نے ہمیں توشہ بھیجا تھا۔

دوپہر کا کھانا ہم سے نہیں کھایا گیا۔ ہم شام تک اندر کمرے میں سوتے رہے۔ اُٹھے تو دھوپ اُتر چکی تھی۔ باہر آ کے ہم نے منہ دھویا اور کچھ دیر چہل قدمی کی، اتنے میں اندھیرا چھانے لگا۔ آج بھی دن بھر حویلی سے نواب کے کسی فرستادے نے ہم سے کوئی سلسلہ جنبانی نہیں کی تھی، اب انھوں نے سب کچھ ہمی پر چھوڑ دیا تھا۔ رات کا کھانا کھا کے ہم دالان میں بیٹھے رہے، جیل کی طرح وہ ہمیں کچھ کام سونپ دیتے تو وقت اتنا بھاری نہ گزرتا۔

اندھیرا خاصا گہرا ہو گیا تھا، پیرو مونڈھے پر بیٹھا اُونگھ رہا تھا کہ ہڑبڑا کے رہ گیا جیسے کوئی خواب دیکھتے ہوئے بیدار ہو گیا ہو۔ مجھ سے وقت پوچھنے لگا۔ مجھے حیرانی ہوئی کہ یکایک اُسے وقت کی فکر کیوں ہوئی ہے، بدلیں کو وقت سے کیا واسطہ۔ گھڑی میرے پاس نہیں تھی لیکن اندھیرے ... سے پتہ چلتا تھا کہ نو بجے ہوں گے یا اُس سے کچھ کم زیادہ۔

پیرو اُٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ اُس نے تھمے ہوئے لہجے میں دروازے پر تعینات پہرے دار کو آواز دی۔

"کیا بات ہے؟" پہرے دار نے وہیں کھڑے کھڑے درشتی سے پوچھا۔

"اُدھر جا کے بولو، اپن ابھی بڑے نواب کو ملنا مانگتا ہے۔"

بڑے نواب کا نام سُن کے پہرے دار آگے آ گیا۔ "کیا کہتے ہو؟"

"اُونچا سُنتا ہے کیا!" پیرو نے ناگواری سے کہا۔ "اپن بولتا ہے، ابھی جا کے بڑے نواب کو بولو، وہ اپن سے بات کرے۔"

پہرے دار نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر لوٹ گیا اور جا کے اپنے ساتھی پہرے دار سے کانا پھوسی کرنے لگا۔

"دادا!" میں نے سرگوشی میں پوچھا۔ "اُسے کیوں بلا رہے ہو؟" میری آواز کپکپا رہی تھی۔

"ابھی ٹھیک سے رہنا راجا!" وہ منمناتے ہوئے بولا۔

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ دوسرا پہرے دار چند لمحوں کے لیے باہر گیا تھا اور واپس آ گیا، اُس نے ہمیں کوئی جواب نہیں دیا۔ دس منٹ گزر گئے، پندرہ منٹ گزر گئے۔ دروازے پر کوئی آہٹ نہیں اُبھری۔ ممکن ہے نواب حویلی میں موجود ہی نہ ہو یا مصروف ہو، انکار کر دے یا اپنی طرف سے کسی اور کو بھیج دے۔ میرے سر میں طرح طرح کے وسوسے بھنبھنا رہے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ یہاں آنے کے بجائے وہ ہمی کو حویلی میں طلب کرے۔ حویلی میں ہماری طلبی ہمارے لیے اِس سے بہتر جگہ ثابت ہو سکتی تھی مگر وہ چاہے ہمیں بلائے یا خود آ جائے، ہمیں اِس سے اتنا سروکار نہیں تھا جتنا وقت سے تھا۔ وہ کتنا ہی مصروف ہو، ہمارا پیغام سُن کے اُسے ذرا سی بھی دیر نہیں لگانی چاہیے اس لیے کہ وہ ہماری طرف سے ایسے کسی پیغام کا شدت سے منتظر ہوگا۔

کوئی آدھ گھنٹہ گزر گیا پھر چند ثانیوں بعد دروازے سے تیز چاپیں سنائی دیں اور اپنی جگہوں پر جمے ہوئے پہرے دار ست پلک کے کھڑے
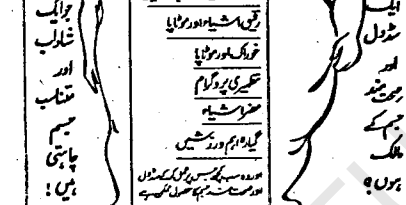
ہو گئے۔ اُس لمحے میری آنکھوں میں دُھند سی اُتر آئی، میں نے دروازے پر نواب کو نمودار ہوتے دیکھا۔ سُرمئی شیروانی میں ملبوس، سَر پر ترکی ٹوپی، بھاری بھرکم جسم، اوسط قد۔ وہ بڑا نواب ہی تھا۔ خاں صاحب کے علاوہ ایک پہرے دار بھی اُس کے ہمراہ تھا۔ بڑے نواب نے ڈگمگاتے قدموں سے صحن عبور کیا۔ پیرو مونڈھے پر بیٹھا رہا، میں بھی نہیں اُٹھا۔ وہ دونوں ہم سے چند قدم کے فاصلے پر ٹھیر گئے۔ اُن کے ساتھ آنے والے پہرے دار کے کندھے سے بندوق لٹک رہی تھی، اُس کا ڈیل ڈول متناسب تھا۔ وہ دالان کے پار کچھ دُور رہ گیا۔ دروازے کے دونوں پہرے دار بھی کچھ آگے آ گئے تھے۔

پیرو نے بیٹھے بیٹھے نواب سے کہا "اپن کو ابھی تم سے کچھ بولنا ہے۔" نواب کو پیرو کا یہ لہجہ پسند نہیں آیا ہوگا، اُس کا چہرہ کچھ اور کھنچ گیا لیکن اُس نے زبان سے کچھ نہیں کہا، خاں صاحب نے اُس سے مونڈھے پر بیٹھنے کی درخواست کی۔

"آ، ہاں۔ بیٹھ جاؤ۔ بات زیادہ لمبا نئیں ہے پر دھیان سے سُننے کا ہے۔" پیرو نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

نواب مجھے اور پیرو کو تند نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا "تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمھاری رہائی اُسی وقت ممکن ہے جب ...."

"اپن جانتا ہے۔" نواب کی بات ادھوری رہ گئی۔ پیرو نے خاں صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "پر اِس سُوّر کا جنے کو تم اِدر کیوں لے آیا، اپن کو ابھی اکیلے میں تم سے کچھ بولنا ہے۔"

"زبان کو لگام دے کے بات کرو۔" نواب گرجتی آواز میں بولا۔ "جو کہنا ہے اِن کے سامنے ہی کہو۔"

"میں، میں ہٹ جاتا ہوں حضور۔" خاں صاحب نے لجاجت سے کہا۔

"نہیں۔" نواب نے اُسے جھڑک دیا۔

"اِس کو اپن سے دُور رکھو نواب!" پیرو نے سرد لہجے میں کہا پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "ابھی تم بھی اِدر سے ہٹ جاؤ راجا!"

میں ابھی تک مونڈھے پر بیٹھا تھا، میری نظریں آمنے سامنے ہر سُو بھٹک رہی تھیں، پیرو کے اِس اشارے کا میں منتظر ہی تھا، میں نے بظاہر کراہ سے اُس کی ہدایت پر عمل کیا اور دالان کے پار چند قدم کی دُوری پر جا کے کھڑا ہو گیا، خاں صاحب ابھی تک وہیں موجود تھے لیکن اُن کے قریب بیٹھنے رہنے سے پیرو پر زیادہ اثر نہیں پڑتا تھا، اُن کے لیے اچھا تھا کہ وہ بھی دُور ہو جائیں۔

"ابھی اِس بیڑی مار کو بیچ میں مت لاؤ۔" مجھے پیرو کی آواز سُنائی دی، اُس نے خاں صاحب کی موجودگی میں کوئی بات کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ میں پہلے ہی اُن کے درمیان سے ہٹ گیا تھا۔ پیرو نے نواب کو کمرے کی خلوت میں چلنے کو نہیں کہا تھا، پیرو کی یہ ضد دانستہ تھی اور جیسا کہ پیرو چاہتا تھا نواب نے اِسے پیرو کی پسپائی، کسی بزدل شخص کی آخری مزاحمت ہی پر محمول کیا ہوگا، نواب کو یہ وقت سمجھنا چاہیے تھا۔ یہ گھڑی کتنے دِنوں کے اذیت ناک انتظار آئی تھی، اِس مدت میں اُسے ہمارے بارے میں بہت کچھ اندازہ اور اُسے یہ بجا اندیشہ لاحق ہوگا کہ کہیں ہم اپنا ارادہ نہ بدل د ہمارا سَر نہ پھر جائے سو اُس نے معاملہ فہمی ہی مناسب سمجھ تکرار نہیں کی۔ اُس نے خاں صاحب کو اشارہ کر دیا۔ خاں ص قدموں سے میری طرف بڑھے لیکن مجھے سامنے دیکھ کے مجھ پر جا کے کھڑے ہو گئے۔ نواب کے ساتھ آنے والے پہرے دار کندھے سے اُتار کے ہاتھ میں تھام لی تھی مگر نشانہ لینے والے نہیں، اُدھر سامنے حویلی کی طرف جانے والے دروازے پر بھ تھے، باہر بھی کمی نہیں تھی۔ احتیاط اپنی جگہ لیکن اِن حالات موقع پر کسی کے بھی دماغ میں ہماری جانب سے کوئی خطرہ رہا ہوگا، انھیں اچھی طرح علم تھا کہ ہمارے پاس ہتھیار نہیں پہلے ہی اپنے پاگل پن کی سزا خوب بھگت چکے ہیں۔

میں نے دیکھا، پیرو نے اپنا مونڈھا کھسکا کے نواب کیا اور سرگوشی میں اُس سے کچھ کہنے لگا۔ جہاں میں کھڑا تھا، اُس کی آواز بالکل نہیں آ رہی تھی۔ میں نے اپنے حواس مجتمع پیرو کی طرف نگاہیں جمائے رکھیں، ساتھ ہی پہرے داروں سے ایک تو میرے قریب ہی تھا۔ مجھے احساس تھا کہ پیرو کو نہیں کرے گا چنانچہ خاں صاحب کو اُن کے درمیان سے ہٹے ہوئے ہوں گے کہ پیرو نے آناً فاناً مونڈھے سے اچھل کے نوا پر ہاتھ ڈال دیا۔ اِدھر میں نے صرف اتنا توقف کیا کہ مجھ دُور کھڑا ہوا پہرے دار نشانہ لینے کے لیے بوکھلائے، نواب کو میں دیکھ کے اُس کی توجہ لازماً میری جانب سے منتشر ہو جا میں میں اُس پر جھپٹ پڑتا۔ نواب کی چیخ سُن کے وہ سخت ہو گیا تھا اِس لیے بندوق تاننے کے بجائے نواب کی مدد کے اُسی کی طرف بھاگا، پھر اُسے اپنے ہاتھ میں لٹکی ہوئی بندوق وہ نشانہ لینے کے لیے بندوق اُوپر کرنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے بائیں طرف سے اُس کی پسلی پر پوری طاقت سے ضرب لگا

مجھے دُور دروازے کے دونوں پہرے داروں کو بھی ز تھا۔ سب کچھ لمحوں میں ہو جانا چاہیے تھا، اِس کے بعد میں کو ملنا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اُن میں سے کوئی گولی چلانے کی غلط گا، پیرو پشت سے نواب کے دونوں ہاتھ جکڑے ہوئے اُس میں تھا۔ اُس نے نواب کے بازو پیچھے سے اِس طرح گرفت کہ دونوں کے جسم گتھے ہوئے نہیں تھے۔ اِس سے زیادہ موثر ط

لاً ایک ہاتھ سے گردن جکڑنے اور دوسرا ہاتھ خالی رکھنے کا طریقہ نس کر دینے اور نرخرے کی چٹکی بھرنے کا طریقہ لیکن نواب اُتھے کا کوئی دی نہیں تھا، نہ اُن میں سے اور کوئی۔ اس طرح پیرو کو رُخ بدلنے، پینترے لنے کی زیادہ آسانی ہو جاتی تھی۔ اِدھر نواب کو ہوش میں رکھنا بھی ضروری ا۔ دروازے کے پہرے داروں نے ایک پل کی چُوک نہیں کی، اُنھوں بے اختیار بندوق تانی مگر سامنے نشانے پر نواب کو دیکھ کے پاگلوں طرح اپنی جگہوں سے دَوڑ پڑے۔ صحن بڑا نہیں تھا، اُسے پھلانگنے ں اُنھیں کچھ وقت نہ لگتا۔ گو پیرو نواب کو دالان میں بالکل اندر کی ف دیوار کے ساتھ قابو میں کیے کھڑا تھا مگر کسی بھی لمحے پہرے دار ں تک پہنچ سکتے تھے، اس سے پہلے مجھے نواب کے ساتھ آنے والے دار کی بندوق پر قبضہ کر لینا تھا۔ پسلی پر میرا ہاتھ پڑتے ہی اُس کا م زمین سے اُکھڑ گیا، پھر مجھ پر دیوانگی سی طاری ہوئی میں نے اُسے ھلانے کی بھی مہلت نہیں دی، بندوق پر جھپٹا مارنے کے ساتھ ساتھ ں کی ریڑھ کی ہڈی پر بھی ضرب لگائی، وہ اَوندھے منہ گر پڑا۔ اب دوق میرے ہاتھ میں تھی۔ اِدھر سے خاں صاحب چیختے ہوئے پیرو کی ف دَوڑ پڑے تھے اور اُدھر سے دروازے کے دونوں پہرے دار۔ ں صاحب کی مجھے اتنی فکر نہیں تھی۔ وہ شور مچانے کے سوا کیا کر سکتے ے مگر پہرے داروں کے پاس ہتھیار بھی تھے اور وہ اسی کام کے لیے نواب نمک کھاتے تھے حالانکہ مجھے اُن کی طرف سے بھی اتنا مضطرب ں ہونا چاہیے تھا، اُن کے سامنے کوئی اور نہیں، پیرو تھا پھر بھی احتیاط ری تھی۔ گولی چلانا ممکن نہیں تھا تو وہ یہی کر سکتے تھے کہ پیچھے پیرو کی طرف جائیں اور بندوق کی بٹ کے ذریعے یا خود اپنی طاقت بل پر نواب کو پیرو کی گرفت سے چھٹکارا دلانے کی کوشش کریں، ں صورت میں بھی پیرو اُن سے خوب نپٹ سکتا تھا۔ وہ نواب کو پکڑے پکڑے متعدد پینترے بدل سکتا تھا، میرے آنے تک وہ آسانی ، انھیں اُلجھائے رکھتا، اُس کے ہاتھ اگر گھرے ہوئے تھے تو پیر آزاد ، اگر پیر بھی گھرے ہوئے ہوتے تو سَر تو کھلا تھا۔ پیرو کہتا تھا کہ سارا جسم جھائے، پر سَر نہیں بندھنا چاہیے۔ پیرو کے قریب جانا پہرے داروں لیے خود موت کو دعوت دینا تھا۔ یہ ساری باتیں پیرو کے ذہن ں بھی ہوں گی۔

مجھے توقع تھی کہ اُن کی تمام تر توجہ نواب ہی پر مرکوز رہنی چاہیے ب کو اِس حال میں دیکھ کے وہ مجھے خاطر میں نہیں لائیں گے لیکن انھیں اپنے حواس برقرار رکھنا دشوار ہوگا کیونکہ یہ اُفتاد اُن کے لیے ہانی تھی، سو عام حالات کی نسبت اُن کا بوکھلا جانا لازم تھا۔ یہی سوچ کے پیرو نے پہلے سے مجھ سے کوئی بات کرنا، کوئی ہدایت دینا ری نہیں سمجھا تھا۔ ویسے ہدایت سے آدمی پر اُلٹا اثر بھی ہو سکتا ہے، اُس کا ذہن پابند ہو جاتا ہے اور ہاتھ پیر اکڑنے بھی لگ سکتے ہیں۔ پیرو کہتا تھا کہ دوسرے کے محض دست و بازو ہی نہیں، اُس کا ارادہ قابو میں کرنا چاہیے۔ کوئی ایسا وار کرو کہ سامنے والے کا ردِ عمل یقینی ہو جائے مگر یہ امکان ذہن سے یکسر نکالنا نہیں چاہیے کہ سامنے دوسرا آدمی ہے، اُس کے سَر میں کچھ بھی سما جائے، وہ اچانک پاگل ہو جائے۔ بعض مرتبہ ہر لمحے ایک نیا فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔

جتنی دیر میں مَیں اپنے قریب کے پہرے دار سے نمٹ کے اُس کی بندوق ہاتھ میں اُٹھائے اُن کی طرف متوجہ ہوا، دروازے کے پہرے دار صحن عبور کر کے دالان میں پہنچ گئے۔ اُسی دم پیرو نے نواب کے بازوؤں پر اپنی گرفت سخت کر دی۔ نواب کی کراہوں اور چیخوں کے درمیان پیرو نے اُنھیں بیچ میں نہ پڑنے اور دُور رہنے کا حکم دیا۔ اُنھوں نے پیرو کا حکم جیسے سُنا ہی نہیں اور نواب کو اُس کی گرفت سے چھڑانے کے لیے پَر تولنے لگے۔ وہ بُری طرح پیرو کے گِرد منڈلا رہے تھے مگر اُن کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ یہ خیال الگ اُنھیں بدحواس کر رہا ہوگا کہ اُن کی کسی غلطی سے نواب کو کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔ نواب کراہ رہا تھا اور پیرو کی کسی جنبش سے وہ اچانک اُچھلنے، چیخنے لگتا تھا لیکن پہرے داروں کو اُسے اِس اذیت سے نجات دلانے اور پیرو کو ہاتھ لگانے کی فرصت نہیں ملی۔ پیچھے سے میں نے ایک کے سَر پہ بندوق کی بٹ ماری، میرے قیاس کے مطابق دوسرا یہ دیکھ کے بندوق کی نال آگے کیے بے تابانہ مجھ پر حملہ آور ہوا، میں نے اُس کے ساتھی کو اُس کے سامنے کر دیا، نال اُس کے ساتھی ہی کے سینے میں پیوست ہوئی۔ پھر وہ اکیلا میرے مقابل رہ گیا، میں اُس کے ساتھی کو وہیں چھوڑ کے سیدھا اُس کی طرف بڑھا مگر بندوق ہاتھ میں ہونے کے باوجود وہ اُلٹے قدموں پیچھے کی جانب بھاگا اور ٹھیر گیا، ٹھیر کے اُس نے بندوق سنبھالی۔ پہلی مرتبہ اُن میں سے کسی نے اتنے ہوش کا ثبوت دیا تھا۔ وہ مجھ سے زیادہ دُور نہیں رہا تھا، اُس کے نشانے سے بچنے کے لیے میرے پاس دو ہی راستے تھے۔ یا تو میں اپنا رُخ بدل دوں یا زمین پر گر جاؤں۔ میں اپنی جھونک ہی میں بڑھتا ہوا عین اُس کے مقابل زمین پر گر گیا۔ گولی سامنے مہمان خانے کی دیوار پہ لگی ہوگی، دوسری گولی چلانے کے لیے اُسے چند لمحوں کا وقت درکار تھا، میرے پاس بھی اُسے اِس اقدام سے باز رکھنے کے لیے اتنا ہی وقت تھا۔ یہ امکان بھی تھا کہ وہ نشانے کے لیے بندوق سنبھالنے کے بجائے مجھ پر کھینچ مارے۔ میں اُس کی ٹانگوں کے پاس تھا۔ میں نے اپنی بندوق چھوڑ دی اور اُس لمحے کچھ یہی میری سمجھ آیا، میں نے ہاتھ بڑھا کے اُس کی ٹانگیں جکڑ لیں اور اُنھیں زور سے اپنی طرف جھٹکا دیا۔ وہ زمین پر چت گرا، میں نے اُسے دوبارہ نہیں اُٹھنے دیا۔

گولی کی آواز برابر کے مکان تک یا باہر حویلی میں کہیں اور بھی

سُنی گئی ہوگی میں نے جلدی سے تینوں پہرے داروں کے کارتوس اور بندوقیں سمیٹیں، اُن کے جسم دالان میں ادھر اُدھر پڑے ہوئے تھے۔ اُن کی تلاشی میں اور وقت صرف ہوتا۔ خاں صاحب ایک کونے میں دبکے ہوئے تھے، اُن کے جسم پر لرزہ طاری تھا، آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ میں نے بندوق کا رُخ پیرو کی طرف کر دیا مگر اس سے پہلے ہی اُس نے ہانپتے ہوئے نواب کو چھوڑ دیا تھا۔ اپنے سامنے مجھے بندوق تانے دیکھ کے نواب ٹھٹک کے رہ گیا۔ پیرو نے بہ عجلت اُس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ شیروانی کی نچلی جیب میں تمنچا موجود تھا۔ پیرو نے اُس کے دونوں ہاتھ شروع ہی سے باندھ رکھے تھے، اُسے تمنچا چھونے کا موقع بھی نہیں مل سکا تھا۔ وہ گُنگ کھڑا تھا کہ پیرو نے اُسے آگے کی طرف دھکیل دیا۔

دروازے میں داخل ہوتے وقت پیرو نے پھر اُس کا گریبان پکڑ لیا۔ "ابھی اپن کا ایک ایک بات دھیان سے سنو۔" پیرو نے درشتی سے کہا۔ "دوبارہ اپن کچھ نہیں بولے گا۔"

اُس نے نواب کو کسی تاخیر کے بغیر گاڑی منگوانے کی ہدایت کی اور کہا کہ اگر اُس نے ذرا بھی حیل و حجت کی تو اُسے دوسرا موقع نہیں دیا جائے گا۔ اسی دوران خاں صاحب نے یکایک پیرو کے پیر پکڑ لیے اور گڑگڑانے لگے۔ پیرو کے چہرے پر آگ برسنے لگی تھی۔ اُس نے انھیں گدی سے پکڑ کے اوپر اُٹھا لیا۔ خاں صاحب کا سارا جسم پھڑپھڑانے لگا تھا۔ میرا خیال تھا کہ پیرو اُن کے مُنہ پر تھوکے گا مزید لیکن دہشت سے خاں صاحب کی آنکھیں ہی پھر گئی تھیں۔ پیرو نے دو تین جھٹکے دے کے انھیں چھوڑ دیا۔ خاں صاحب وہیں لڑکھڑا کے رہ گئے۔

ہم نے دروازہ عبور نہیں کیا تھا کہ دوسری جانب سے بیک وقت کئی آدمیوں کی منڈلاتی چاپیں اور آوازیں سُنائی دیں۔ پیرو نے نواب کو روک لیا۔ "ابھی سنو نواب!" وہ دبی آواز میں بولا۔ "اندر اپن تم کو نچاتا ہوا بھی لے جا سکتا ہے۔ پر ادھر حویلی کے لوگوں میں تمھارا بہت خواری ہوگا۔ جیسا اپن بولتا ہے، ابھی ویسا ہی کرو۔ آگے تم نے کوئی بھی غلطی کیا تو اکیلا تمھی نہیں جائے گا۔ اپن کو پتہ ہے، ایدر زنانیاں بھی رہتا ہے۔ سمجھا۔"

دروازے کے پار گلی جیسی ایک مختصر راہ داری تھی۔ پہرے دار اندر گھس آئے تھے لیکن سامنے نواب کا چہرہ دیکھ کے وہ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے اُلٹے قدموں پیچھے لوٹ پڑے۔ راہ داری فوراً صاف ہو گئی تھی۔ آگے اُونچی چھت اور متعدد ستونوں کا ایک بڑا ہال تھا۔ ہال میں اِردگرد کمرے اور گزرگاہیں بنی ہوئی تھیں۔ حویلی اور مہمان خانے کی عمارتوں کے درمیان یہ جگہ سنگم کا درجہ رکھتی ہوگی۔ جیسے ہی ہم وہاں داخل ہوئے، ہم نے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے چار پانچ پہرے داروں کو اپنا منتظر پایا۔ بندوقیں اُن کے پاس تھیں۔ نواب ہم سے آگے تھا۔ اُس کے پیچھے پیرو، پھر میں۔ "اِن کو بولو، ابھی یہ سارا ہتھیار پھینک دیں اور گاڑی کا

بولو۔" پیرو نے سرگوشی میں نواب کو مخاطب کیا۔ نواب نے سر اُٹھا کے پہرے داروں کی طرف دیکھا اور ایک لمحے تامّل کیا۔ اُسی لمحے پیرو نے اُس کا بازو پکڑ لیا۔ "اپن کے پاس ابھی ٹائم تھوڑا ہے نواب۔"

ہال سے گاڑی کی جگہ تک آنے کا راستہ اتنا طویل نہیں مگر نواب کسی بھی وجہ سے اُسے طول دے سکتا تھا۔ ہمیں کچھ معلوم ہوتی تو ہم کسی خاص راستے کے لیے اُس پر زور دیتے۔ ہال سے وہ طرف مڑ گیا تھا۔ حویلی کی عمارت میں اُس کا اور پیرو کا فاصلہ قدم سے زیادہ نہیں ہوگا۔ پیرو نے اُس کی کمر پر تمنچا تان نہیں رکھا لیکن تمنچا تھا اُس کے ہاتھ ہی میں۔ میری بندوق اُٹھی ہوئی تھی، میں احتیاطاً بار بار مڑ کے پیچھے دیکھ لیتا تھا۔ حویلی میں اندر روشنی تھی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ نواب کسی موڑ پر نظروں سے اوجھل ہو جائے، کسی کھلے دروازے میں بھاگ جائے یا ہمیں کسی ایسی جگہ لے جا کے کھڑا کر دے جہاں سے ہم پھر کسی طرف نہ جا سکیں۔ یہ سب تھا مگر نواب کی کوئی رگ پھڑک جانے کا امکان ہر لحظے موجود تھا۔ پہرے داروں میں کسی کے ہاتھ بہک سکتے تھے۔ ہال کے پانچوں پہرے داروں نے اپنی بندوقیں پھینک دی تھیں اور اُن میں سے ایک نواب کے اشارے پر موٹر تیار رکھنے کے لیے دوڑ گیا تھا۔ وہ ڈرائیور کو کرنے کے ساتھ ساتھ حویلی کے دربانوں، دوسرے پہرے داروں اور کی فوج جمع کرنے کا فریضہ بھی انجام دے سکتا تھا۔ آگے جہاں جہاں ہم گزرے، درمیان میں متعدد ملازموں سے ہمارا سامنا ہوا۔ ہمیں وہ جہاں کھڑے تھے، وہیں سمٹ کے رہ جاتے۔ سارے راستے سر اُٹھائے متوازن رفتار سے چلتا رہا، اُس کے ہاتھ پیر کھلے ہوئے پیرو کا تمنچا بھی کسی کو نظر نہیں آ رہا ہوگا لیکن اُن دونوں کے پیچھے بندوق اُٹھی ہوئی تھی اور میرے سارے حواس میری نگاہ سے بندھے تھے۔ حویلی کے ملازموں میں سے اکثر نے ہمیں پہلی بار دیکھا ہوگا۔ اُن کے علم میں نہ ہوگا کہ اسی چاردیواری میں کئی دن سے ہم ٹھیرے ہوئے ہیں۔ دالانوں اور مختلف راہ داریوں سے گزرتے ہم تین منٹ سے زیادہ نہیں چلے تھے کہ سامنے پورچ تھا۔ حویلی کی عمارت کے پورچ میں موٹر کھڑی تھی۔ وہی سیاہ موٹر خاں صاحب ہمیں تھانے سے یہاں لائے تھے۔ دُور سے صرف ایک آدمی بے تابی کے ساتھ اِدھر سے اُدھر ٹہلتا دکھائی دیا ڈرائیور معلوم نہیں ہوتا تھا بلکہ حویلی کے دربانوں کی مخصوص وردی ہوئے تھا۔ میرا سارا جسم دھڑک رہا تھا۔ کسی اندھے کا روشنی کی کرن نظر آنے پر جو حال ہو سکتا ہے، وہی کچھ میرا تھا۔ پیرو کا بھی اُسے بھی کسی نہ کسی طرح موٹر میں بیٹھ جانے کی جلدی ہوگی موجود معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اُس کے آنے میں کوئی دیر لگتی

خود موٹر چلانے کا فیصلہ کر لیا۔ موٹر تک ہمارے پہنچتے پہنچتے طرف سے ایک دُبلا پتلا لمبا سا شخص پگڑی باندھتا، لپکتا آیا۔ اُس نے بدحواسی سے سر جھکا کے نواب کو تعظیم دی اور کی پچھلی نشست کا دروازہ کھول دیا۔ اِس دوران اطراف میں گئے ہوئے لوگوں کی سرگوشیاں اور چاپیں گونجنے لگیں تھیں۔ دیکھتے کئی آدمیوں نے ایک طرح سے پورچ گھیرے میں لے لیا تھا وہ قریب نہیں آئے، نہ اُنھیں نواب نے کوئی اشارہ کیا۔ نواب آنکھیں اُبلی ہوئی تھیں، ہونٹ آگے نکلے ہوئے تھے اور سارا رہ سُوجا ہوا سا تھا۔

پیرو نے ہاتھ بڑھا کے اُسے گاڑی میں بیٹھنے کی ہدایت وہ جیسے سلگتا رہا۔ اُس کے نتھنے کچھ اور پھول گئے تھے۔ پہلی اُس نے سر گھما کے اطراف میں فاصلے پر کھڑے ہوئے اپنے آدمیوں گھور کے دیکھا مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی اشارہ کرتا، پیرو نے اُسے روک دیا۔ "اپن تم کو اندر سے کپڑے اُتار کے نہیں لایا ہے۔" پیرو نے ہنکارتے لہجے میں سرگوشی کی۔ "ابھی تم کو تھوڑا بہت گننا تو لانا آتا ہوگا، جو اپن بول رہا ہے، اُس کو تھوڑا سمجھو۔ تم ادھر واپس آ جائے گا، پیچھے ادھر کے لوگ باگ کو بول جاؤ کہ وہ تم کو زندہ دیکھنا مانگتا ہے تو جب تک تم ادھر لوٹ کے نہ آ جائے، سالا ہاتھ پیر تھامے بیٹھا رہے۔" کہتے ہی پیرو نے اُس کی کمر پر ہلکی سی تھپکی دی اور قدم آگے بڑھا دیے۔

پورچ میں دربان ہیبت زدہ کھڑا تھا۔ موٹر میں بیٹھ کے پیرو نے اُسے بُلایا اور نواب سے کہا کہ وہ اُس کی کہی ہوئی ہر بات بیش کے بغیر دربان تک منتقل کر دے۔ دربان لڑکھڑاتا ہوا آیا تھا۔ نواب نے بوجھل آواز میں چند ہی لفظ کہے، اتنا کافی تھا۔ پیرو خود بڑھ کے ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گیا چنانچہ مجھے نواب کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھنا پڑا۔ نواب موٹر میں بیٹھا ہوا تھا، اِس کے باوجود ڈرائیور نے اُس کی اجازت چاہی۔ جواب میں نواب کو مہر بہ لب دیکھ کے پیرو نے ڈرائیور کو زور سے کہنی ماری۔ موٹر حرکت میں آ گئی۔ سڑک کے دونوں طرف پیچھے تھے، اُونچے اُونچے درختوں اور پھولوں کے تختوں کا سلسلہ تا حدِ نظر پھیلا ہوا تھا۔ باہر روشنی اتنی نہیں تھی جتنی اندر تھی تاہم موٹر کی تیز روشنی میں سڑک کے ساتھ اور درختوں کے آس پاس کھڑے ہوئے آدمی بھی صاف نظر آ رہے تھے۔ میں ایک طرف نواب پر نظر رکھے ہوئے تھا، دوسری طرف بندوق کی نال کھڑکی سے باہر نکالے ہوئے تھا۔ پیرو کے ہاتھ میں بھی تمنچا اُٹھا ہوا تھا۔ ڈرائیور نے شاید دانستہ موٹر کی رفتار تیز نہیں ہونے دی مگر پیرو نے اُسے ٹوکا بھی نہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں بڑے دروازے پہ آ کے کھڑی ہو گئی۔ دروازہ بند تھا۔ یہاں

پہرے داروں کی کثرت کا اندازہ ہمیں آتے وقت ہی ہو چکا تھا۔ موٹر دیکھتے ہی دروازہ کھل جانا چاہیے تھا۔ تاخیر کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ وہ ہمیں اِس طرح نہیں جانے دینا چاہتے تھے۔ اُنھوں نے جی میں مزید کچھ ٹھان لی تھی مگر وہ ایسی صورت میں کیا کر سکتے ہیں؟ میری سانسیں سینے میں اٹک گئیں۔

بڑا دروازہ اُونچی فصیل نما چاردیواری سے ملحق ایک دو منزلہ عمارت پر مشتمل تھا، اُس کی لمبائی چوڑائی کسی قلعے کے دروازے سے مشابہ تھی۔ نیچے اوپر کھلی محرابوں کے کمرے بنے ہوئے تھے، بارہ دریوں جیسے۔ پہرے دار ہر جگہ ہو سکتے تھے، ایسی جگہوں پر بھی جہاں ہماری نظر نہ پہنچ سکتی ہو۔ موٹر میں پیرو اور میں ایک دوسرے کی مخالف سمت میں بیٹھے تھے۔ پیرو آگے بائیں طرف تھا، میں پیچھے دائیں طرف۔ لبلبی میری انگلی کی گرفت میں تھی۔ چند لمحے سکوت رہا، نہ دروازہ کھلا نہ پہرے داروں نے اپنی جگہ سے حرکت کی حالانکہ ہمیں مہمان خانے کے زنداں سے یہاں تک آنے میں کوئی وقت نہیں لگا تھا مگر اتنی ہی دیر میں اُن تک اطلاع پہنچ گئی تھی۔ جو پہرے دار موٹر تیار رکھنے کا حکم سُن کے ہال سے چلا تھا، اُسی نے کسی طرح انھیں خبردار کیا ہوگا۔

لمحے گزر گئے، دروازہ نہیں کھلا۔ پیرو نے گردن موڑے بغیر دھیمی آواز میں نواب سے کہا۔ "اپن پہلے پاس ہی کا نشانہ لے گا نواب!"

نواب کے جواب کا انتظار کیے بغیر اُس نے ڈرائیور کو ایک طرف دھکیل کے خود ہارن بجایا۔ ہارن کی آواز نے دروازے پر چھایا ہوا سناٹا درہم برہم کر دیا۔ پہرے دار بھی سیدھے نہ کھڑے رہ سکے۔ انھوں نے دروازہ بند رکھ کے موٹر روک لی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی وہ کوئی بھی ارادہ نہیں کر پائے ہیں۔ انھیں اطلاع ملے دیر ہی کتنی ہوئی ہوگی، اس اثنا میں اُن کے لیے کوئی متفقہ فیصلہ کرنا دشوار تھا۔ دروازہ بند رکھ کے انھیں صورتِ حال سمجھنے کی کچھ مہلت درکار تھی۔ اُن کی پُراسرار خاموشی کا یہی سبب ہو سکتا تھا۔ کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے وہ ہماری ہی جانب سے کسی اشارے یا پہل کے منتظر ہوں گے۔ اطلاع دینے والا انھیں ساری بات سے باخبر نہیں کر سکا ہوگا کیونکہ وہ خود بھی زیادہ نہیں جانتا تھا۔ میری رگوں میں خون کبھی جمنے کبھی کھولنے لگتا۔ اگر واقعی انھوں نے دروازہ نہ کھولا اور بندوقیں اُٹھائے یوں ہی ساکت و جامد کھڑے رہے تو کیا ہم بھی یوں ہی موٹر میں بیٹھے انتظار کرتے رہیں گے! لیکن وہ ایسا کیسے کر سکتے ہیں! کیا انھیں معلوم نہیں ہے کہ موٹر میں نواب بھی موجود ہے! کیا وہ واقعی پاگل ہو گئے ہیں یا انھیں اپنے آقا کی کوئی فکر نہیں یا انھوں نے جان لیا ہے کہ ہمیں بھی تو اپنی زندگی اتنی ہی عزیز ہوگی، نواب کو کچھ ہو گیا تو موٹر کبھی باہر نہ جا سکے گی۔ اُن کے پاس بندوقوں اور آدمیوں کی کمی نہیں ہے۔ وہ ہمارے جسم ایک پل میں چھلنی

کرسکتے ہیں مگر وہ یہ کیوں نہیں سمجھ رہے ہیں کہ ہمارے پاس بھی کوئی اور چارہ نہیں ہے۔ ہم نواب کو ساتھ لیے تا دیر موٹر میں بیٹھے رہیں گے۔ اگر ہم نواب سے دست بردار ہو گئے تو ہماری سزائیں بھی کچھ کم نہیں ہوں گی، انھیں اپنے آقا کو ایسی کسی طویل اذیت سے دوچار نہیں کرنا چاہیے جس کا کچھ حاصل نہ ہو اور جس میں ہر لمحے اس کے لیے خطرہ ہی خطرہ ہو۔ کئی پہرے دار میری بندوق کی زد پر تھے مگر مجھے یا پیرو کو ایسی کوئی غلطی نہیں کرنی تھی، دیکھتے ہیں انھیں کب تک دروازہ نہیں کھولنا پڑتا۔ جب تک نواب ہمارے پاس زندہ موجود تھا، ہمارے لیے کچھ تحمل ہی مناسب تھا۔ ہمیں یہاں روک کے وہ باہر سے کوئی مدد طلب کرنے یا پولیس کو بلانے کا ارادہ بھی نہیں رکھتے ہوں گے۔ ہمارے لیے ہر راستہ بند کر دینے کے سنگین نتائج سے وہ خوب آگاہ ہوں گے۔ ہم نواب کو یہاں تک لے آئے تھے تو کوئی عزم ہی کر کے آئے ہوں گے اور نواب یہاں تک آ گیا تھا تو عافیت کا یہی آخری امکان اسے نظر آیا ہو گا۔ یہ امکان اب بھی جوں کا توں تھا۔ اگر وہ یہ سب کچھ نہیں سوچ رہے تھے تو نواب ہی کو کوئی حکم دینا چاہیے تھا لیکن وہ گم صم بیٹھا رہا۔ یا تو اسے اس حالت میں اپنے غلاموں کو بلا کے دروازہ کھولنے کا حکم دیتے ہوئے کوئی سبکی محسوس ہو رہی تھی یا اس کے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا یا پھر اس نے اپنے نمک خواروں سے کسی معجزے کی خوش گمانی میں چپ سادھ رکھی تھی۔

پیرو نے کچھ توقف کیا۔ اس نے دوبارہ ہارن بجانے یا نواب سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ انھیں جلد ہی احساس ہو گیا تھا کہ تاخیر سے مزید پیچیدگی ہی کا احتمال ہے اور تاخیر انھی کی کشمکش کے سبب ہو گی۔ گو موٹر ٹھیرے ہوئے ابھی دیر نہیں ہوئی تھی۔ ایک دو منٹ ہی گزرے ہوں گے مگر ہمارے لیے یہ وقفہ کسی پل صراط کے مانند تھا۔ وہ کسی پل بھی کوئی اندھا فیصلہ کر سکتے تھے اور حویلی میں گولیاں گونج سکتی تھیں، گولیوں کا نتیجہ کبھی اچھا نہیں نکلتا۔ لگتا تھا، شاید ہمی سے کوئی چوک ہو گئی ہے، ہم نے دروازے کے پہرے داروں کی کثیر نفری کو کہیں اہمیت نہیں دی تھی مگر ان کی تعداد کتنی بھی ہوتی، ہمارے لیے نواب کی موجودی سب سے بڑی ضمانت تھی، کسی کے لیے بھی اس سے بڑی ضمانت اور کیا ہوتی۔ ہماری نظریں سامنے کے پہرے داروں پر ٹکی ہوئی تھیں لیکن یکایک دو پہرے دار دائیں طرف کے اندھیرے سے نکل کے ہمارے سامنے آ گئے۔ وہ ہمیں روشنی میں آنے کے بعد ہی نظر آ سکے۔ دونوں کی بندوقیں موٹر کا نشانہ لیے ہوئے تھیں۔ مجھے اپنی بندوق کا اور پیرو کو اپنے تمنچے کا رُخ بے اختیار انھی کی طرف کر دینا پڑا۔ وہ زمین پر ٹھیر ٹھیر کے قدم رکھتے ہوئے آ رہے تھے، موٹر کے پاس آ کے ایک اس جانب دوسرا اس جانب ہو گیا۔ تنے ہوئے تھے۔ انھوں نے بندوق پر نظر جمائے جمائے پھسلتی نگاہ سے اندر دیکھا۔ نشست میں دھنسا دیکھ کے ان کے اکڑے ہوئے جسم ڈگمگا گئے، اسی لمحے انھوں نے ہیجانی انداز میں سر جھکا کے نواب کو بندگی کی۔ نواب نے ایک ثانیے کے تذبذب کے بعد اپنا بھاری سر ہلایا۔ مسلح پہرے دار ٹھٹکے رہے۔ لمحے گزر گئے، نواب کے ہونٹوں کو جنبش نہیں ہوئی۔ آخر پہرے داروں کو وہاں سے ہٹنا پڑا۔

ان کے جاتے ہی دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

موٹر پہرے داروں کے درمیان سے گزرتی حویلی کی حدود سے باہر آ گئی۔

میرے روئیں روئیں سے پسینہ پھوٹ رہا تھا، موٹر شہر جانے والی سڑک پر آ گئی تھی مگر یقین نہیں آ رہا تھا۔ سڑک کے دور تک کھمبوں کی روشنیاں لشکار رہی تھیں۔ پیرو نے ڈرائیور کو چلنے کی ہدایت کی تھی جدھر سے خاں صاحب ہمیں یہاں لائے تھے۔ بلند و بالا محل نما مکانات کا سلسلہ دائیں بائیں پھیلا ہوا تھا۔ چند فرلانگ آگے سڑک کے پہلے چوراہے پر پیرو نے سامنے جانے کے بجائے راستہ بدل دیا اور موٹر آبادی سے نکل کے نسبتاً سنسان سڑک پر دوڑنے لگی۔ میرا سر گھوم رہا تھا، بندوق بغل میں دبائے میں نے آنکھیں موند لی تھیں تاکہ اپنی اکھڑی سانسیں ہموار کر سکوں۔ موٹر چلتی رہی۔ دیر بعد میں نے آنکھ کھولی۔ سڑک پر بجلی کے کھمبوں کی قطار ختم ہو چکی تھیں، ہر سو گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ سڑک صرف موٹر کی بتیوں سے روشن تھی۔ حویلی شہر کے مضافات میں تھی اس لیے ہم جلد ہی غیر آباد علاقے کی طرف آ نکلے تھے۔ دور و نزدیک آبادی کا کوئی نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ معلوم نہیں، پیرو کے دل میں کیا تھا مگر شہر سے دور جانے کی ایسی بے تابی بھی نہیں تھی۔ موٹر نے حویلی سے ڈیڑھ دو میل کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ ایک ویران مقام پر پیرو نے ڈرائیور کو رکنے کے لیے کہا۔ اس کے اشارے پر موٹر پکی سڑک سے ہچکولے کھاتی ہوئی سیدھے ہاتھ کو ایک کچے راستے پر آ گئی۔ یہ چھوٹی پہاڑیوں سے گھرا ہوا کوئی علاقہ تھا، سارا کا سارا سرسبز۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ پیرو خودرو جھاڑیوں کی اوٹ میں موٹر ٹھیرا کے تیزی سے نیچے اترا اور پچھلا دروازہ کھول کے اس نے نواب سے نیچے آنے کے لیے کہا۔ نواب پھیلی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا مگر اس نے پیرو کو دوبارہ کچھ کہنے کی تکلیف نہیں دی، چپ چاپ اٹھ کے باہر آ گیا۔ ڈرائیور بھی باہر آ گیا تھا۔ پیرو نے اسے پھر اس کی نشست پر بٹھا دیا اور موٹر کی چابی اپنے قبضے میں کر کے گرج دار آواز میں بولا: "ادھر ہی بیٹھا رہے گا، ہلے گا بھی نہیں، سمجھا!"

ڈرائیور کے جسم پر رعشہ طاری تھا۔ پیرو اسے وہیں چھوڑ کے آگے چل پڑا۔ زمین نرم اور ناہموار تھی، جگہ جگہ جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ جھینگروں اور مینڈکوں کے شور کے باوجود ہر طرف رات کا سناٹا مسلط تھا۔ موٹر سے کوئی سو قدم دور ایک نشیب میں آ کے پیرو رک گیا۔ نواب ہمارے ساتھ تھا، میرے اور اس کے درمیان۔ اردگرد کسی ذی روح یا کسی آبادی کے آثار نہیں تھے۔ "ابھی تمھارا کیا فیصلہ کرے نواب؟" پیرو نے کسی تمہید کے بغیر تمتماتے لہجے میں نواب کو مخاطب کیا۔

اندھیرے میں نواب کا چہرہ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ کچھ نہیں بولا۔ پیرو کی آواز میں اور تلخی آ گئی: "اچھا ہے، ابھی تم اپنا فیصلہ خود ہی کر دو تم نواب کا جنا ہے، ابھی تم کو اتنا چھوٹ ضرور ملنا چاہیے۔"

"ہم نہ تم سے معذرت خواہ ہیں، نہ کسی رعایت کے طلب گار۔" نواب نے سرسراتی آواز میں کہا: "تم جو چاہتے ہو، اس میں دیر مت کرو۔"

"ابھی تم اور کیا بولے گا۔" پیرو بھڑک کے بولا: "اپن جو چاہتا ہے وہ تو اپن کرے گا ہی۔ تم کو اور کس لیے ادھر لایا ہے، ادھر گڑھا اور کتے کی کمی نہیں ہو گا۔"

نواب نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"ابھی تم بھولا نہیں ہو گا کہ تم نے اپن کے ساتھ کیسا مستی کیا تھا۔ بھلا بھی اپن بھی پر چھوڑتا ہے۔ جو تم کو اچھا لگتا ہے اپن کو بول دو، نادان تمھارا نمک کھایا ہے، ابھی کچھ تو اس کا حق پورا کرے گا۔ بولو اپن کیا کرے، تمھارا کپڑا اتار کے اور منہ کالا کر کے اودر شہر میں چھوڑ دے؟ تم کو پولیس میں لے جائے؟ پولیس پر تمھارا زور اور پیسہ چلتا ہے۔ رسیدھا گنگ کو بھی جا کے گنڈی کھٹ کھٹائے اور نظام کے پاس لے جا کے تم کو کھڑا کر دے؟ ادھر ہر طرف تو اندھیر نئیں چلتا ہو گا یا پھر... پھر تم کو ادھر ہی زندہ دفن کر دے؟" پیرو کی زبان سے چنگاریاں سی لپک رہی تھیں۔

نواب کی طرف سے خاموشی رہی۔

"ابھی تمھارا بولتی کیوں بند ہو گیا، تم اپنا باپ سمجھ کے اودر اپنے کو اندر کیا تھا، اپن پوچھتا ہے تم نم سالا اپن کو کیا سمجھا تھا۔ الو؟ بے پتے کا؟ تمھارا بات نئیں ماننے گا تو تم اندھا بہرا ہو جائے گا؟"

"ہم مجبور تھے، ہمارے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔" نواب نے دھیمی آواز میں کہا۔

"ایک تمھی مجبور ہے دنیا میں، دوسرا کوئی مجبور نئیں ہو سکتا، تم مجبور ہوتا ہے تو آدمی کو جانور سمجھ لیتا ہے۔ اپن تم سے شروع میں کیا بولا تھا، اپن اودر جا کے خانم سے بات کرے گا، اپن بالکل سیدھا بولا تھا، تم الٹا کیوں سنا؟ ابھی تم کون سا بولی سمجھتا ہے؟"

"تم سے ہماری کوئی رنجش نہیں ہے، ہمارا مقصد تم خوب جانتے ہو، ہر طرف سے مایوس ہو کے ہم نے یہ آخری قدم اٹھایا تھا۔"

"اور آخری قدم اٹھا کے لوٹ کے دیکھے گا بھی نہیں۔" پیرو کی آواز تڑخ رہی تھی: "کچھ نہیں سوچے گا کہ دوسرا بھی آدمی ہے۔ آخری قدم میں تم اپنے کو ابھی ٹانگ دیتا۔ بارہ دن کیا، بارہ سال بھی تم اپنے کو نئیں چھوڑتا۔ اپن تم کو کئی بار بولا تھا کہ ابھی بس کرو، تم اپن کا ایک بات نئیں سنا۔"

"ہم تمھارے سامنے کوئی صفائی پیش نہیں کر رہے ہیں، شاید تم ٹھیک کہتے ہو کہ ہم تمھیں یوں کبھی نہیں چھوڑتے۔" نواب نے بکھرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اپن بھی تم کو ایسے نئیں چھوڑے گا، تم ادھر کا نواب لگتا ہے تو اپن بھی تمھارا غلام نئیں ہے، اپن بولتا ہے، تمھارا کسی سے واسطہ نہیں پڑا ہے، برا ہی برا تم نے دیکھا ہے۔ پر اپن تم کو ابھی کچھ اور رنگ بھی ضرور دکھائے گا۔ ابھی تم جانتا تو ہو گا کہ اپن تمھارے ساتھ کیا کر سکتا ہے۔"

"ہم تمھارے سامنے ہیں۔" نواب نے سلگتے لہجے میں کہا: "لیکن کسی مجرم کی حیثیت سے نہیں۔"

"مجرم تو چھوٹا بات ہے، مجرم تو کوئی آدمی ہوتا ہے۔ تم سالا آدمی ہی نئیں ہے، جانور بھی ابھی تم کو بول کے اپن اس کا اوقات گھٹانا نئیں چاہتا۔"

نواب بے حس و حرکت کھڑا رہا۔

اندھیرا کچھ کچھ مانوس ہونے لگا تھا۔ نواب کی آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھیں لیکن پیرو کی باتیں مجھے بالکل اچھی نہیں لگ رہی تھیں، پھپھولے پھوڑنے کا یہ کون سا موقع تھا۔ ہمیں جلد سے جلد یہاں سے دور ہو جانے کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔ میں نے یہی جتلانے کے لیے آہستگی سے پیرو کا بازو تھپتھپایا، وہ اور اکھڑ گیا، اس نے مجھے جھڑک دیا۔ کچھ دیر وہ خاموشی کے ساتھ قہر زدہ نظروں سے نواب کو گھورتا رہا پھر بیزاری سے کہنے لگا: "اپنے کو ابھی دور جانا ہے نواب! ابھی جلدی بولو، تمھارے ساتھ کیا کرے؟ تم اپن کی جگہ ہوتا تو ابھی کیا کرتا۔ اپن کا جی کرتا ہے، ابھی تم کو اٹھا کے سیدھا اپنے ٹھکانے لے جائے اور اودر ایسا ہی کسی پنجرے میں چھوڑے جیسا تم نے اپنے لیے بنایا تھا۔ اودر پھر تم کو ٹھیک پتہ چلے گا کہ تم کون ہے، کتنا بڑا حویلی، سونا چاندی، ہتھیار، غلاموں کا فوج رکھتا ہے، کتنا بڑا فتنی ہے۔ اپن سمجھتا ہے تمھارا نشہ ابھی اتنا جلدی نئیں اترے گا۔ تمھارا گاڑی اپن لوگ کو رات میں شہر سے بہت دور لے جا سکتا ہے۔ ابھی تمھارا آدمی لوگ رات ضرور ڈھونڈے گا، ماس کو ابھی ایسا کوئی غلطی نئیں کرنا چاہیے کہ دوبارہ

تمھارا صورت بھی نہ دیکھ سکے۔ تم بھی اُس کو ٹرک کے کابل کے آیا ہے۔ پولیس میں جاتے ہوئے وہ آگے پیچھے دس مرتبہ ضرور سوچے گا اور پولیس جب اپنی کھوج میں نکلے گا اپن اُس سے دُور جا چکا ہوگا۔ تھانے میں اپنا نام پتہ سب غلط لکھا ہے۔ پولیس ادھر ہی سر پھوڑتا رہے گا اور اگر راستے میں پہنچ گیا تو تم کو اپن کے ہاتھ سے زندہ کبھی مل نہیں کرے گا۔ ابھی تم کو یہ پسند نہیں تو دفعہ کا بات کرے؟ اور سیدھا حاکم کے پاس چلے؟"

نواب نے اُس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا، اچھا ہی کیا۔ پیرو کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بڑھ کے اُس کی گردن دبوچ لے۔ نواب سکتے میں اُس کے سامنے کھڑا رہا، اُس کا پلکنا ہی پیرو کی آگ کو ہوا دینے کے مترادف ہوتا۔ اُسے گنگ دیکھ کے پیرو ہی کو چپ ہو جانا پڑا۔ چاند شاید بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا تھا، ہر طرف چاندنا ہو گیا تھا۔ نواب کا چہرہ مجھے اچھی طرح نظر آ رہا تھا، شکنوں سے بھرا، غبار آلود، دھواں دھواں سا۔ دیر تک ہمارے درمیان دہشت ناک سکوت چھایا رہا۔ سرد ہوا چل رہی تھی اور میری رگوں میں کھولن سی ہو رہی تھی۔ پیرو کی زبان سے اگلے لمحے کوئی بھی بات نکل سکتی تھی، اُس کے ہاتھ میں تمنچا بھی تھا۔ میری دخل اندازی کا کوئی محل نہیں تھا۔ میں پیرو سے کیا کہتا۔ کوئی بات ہی دماغ میں نہیں آ رہی تھی۔ اگر کوئی بات تھی تو یہی کہ جو ہونا ہے جلد سے جلد ہو جائے۔ پیرو تیز تیز سانسیں کھینچتا رہا، پھر اُس کی جھنجھناتی آواز نے خاموشی توڑی۔ وہ نواب سے کہنے لگا: "اپن کا سمجھ میں نہیں آتا، ابھی تمھارا کیا بنائے۔" اُس کا لہجہ کسی حد تک دھیما تھا۔ "تم نے اپن سے جو مخول کیا ہے، جیل میں اپنے کو بہت برا تھوڑا لگتا ہے۔ اپن ابھی تمھیں ٹھکانے لگا سکتا ہے۔ سویرے تمھارا لاش نہیں ملے گا۔ اپن تم کو بولے، ایسا دلا ابھی اپنا خون اپنے کو بہت کاٹتا ہے۔ اپن تمھارے ساتھ ابھی بہت کچھ کر سکتا ہے پر..... پر....." پیرو ہونٹ چبا کے رہ گیا۔ کچھ توقف کے بعد اُس نے نواب کو حکم دیا: "چلو، ابھی گاڑی میں بیٹھو۔"

میرے کانوں میں چھناکا سا ہوا مگر پیرو نے یہی کہا تھا۔ نواب کا بت بھی اپنی جگہ جما نہیں رہ سکا۔ اُس کا جسم ایک لمحے کے لیے بل کھا گیا۔ اُس کے ہونٹ پھڑپھڑائے تھے لیکن آواز اُس کے حلق ہی میں پھنس کے رہ گئی۔ پیرو فوراً واپسی کے لیے پلٹ گیا۔ نواب بھی کسی معمول کی طرح اُس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ پیرو چند قدم ہی آگے بڑھا ہوگا کہ پھر ٹھہر گیا اور نواب سے بولا: "اپن کو یہی ٹھیک لگتا ہے کہ تم کو حویلی واپس بھیج دے۔ سڑ سڑ کے تم ابھی تماشہ دیکھتے رہنا اور زندگی کو اپنا ادھار سمجھنا۔"

مجھے ایسا لگا جیسے میرے شانوں سے کوئی بوجھ اُتر گیا ہے۔ نواب کا سر جھک گیا تھا۔ پیرو نے پھر اُس کی طرف نہیں دیکھا۔ تیزی سے موٹر کی طرف بڑھ گیا۔ ڈرائیور اپنی نشست پر موجود تھا۔ پچھلی نشست پر میرے اور نواب کے بیٹھتے ہی موٹر چل پڑی۔

راستے میں خاموشی رہی۔

موٹر کی رفتار تیز تھی اور وہ واپس حویلی کی طرف جا رہی... حویلی ابھی دُور تھی کہ پیرو نے ڈرائیور کو چار مینار کی طرف چلنے کا... موٹر ابھی حویلی کے سامنے سے نہیں گزری تھی۔ پندرہ بیس... کی مسافت کے بعد ہم شہر میں داخل ہو گئے۔ چائے خانوں اور اکا دکا دکانوں کے سوا ساری دکانیں بند ہو چکی تھیں مگر سڑکوں... ابھی خوب چہل پہل تھی۔ ہر طرف قمقمے روشن تھے۔ چار مینار کی... میں دس بج کے چالیس منٹ ہو رہے تھے۔ پیرو نے مکہ مسجد کے... ایک جگہ موٹر رکوا دی اور ڈرائیور کو اُتر کے دُور کھڑے ہو جانے... دیا۔ ڈرائیور جیسے ہی اُترا، پیرو نے سرد لہجے میں نواب سے کہا: "تمھارا یہ سارا تھیلا ادھر چھوڑ کے جا رہا ہے۔ تمنچا ابھی اپن پا(س) ہی رکھے گا، تمھارا یاد کے واسطے۔ ایک آخری بات تم سے ابھی... دینا ہے۔ حویلی جا کے پھر کوئی مسخری مت کرنا۔ اپن اب باہر ہے۔ تمھارا آدمی حویلی میں لگا ہے، اُس کا کئی گنا اپن کے پاس ہے۔ ایک دس کے برابر ہے۔ اپن کا دل ابھی اتنا بڑا نہیں کر رہا... دے گا۔ دبارہ حویلی کا جگہ راکھ نظر آئے گا۔ تم کو اپن کیا بولے، کچھ نہیں سمجھے گا کہ اپن کن لوگوں کے دھیان میں تم کو حویلی واپس... ہے۔ اُن لوگ نے بیچ میں آ کے سالا اپن کا ہاتھ روک دیا ہے۔ نواب کا حالات اپن کو خوب پتہ ہے۔ جیسا... نے پہلے تم... ابھی خاموش جا کے بات کرے گا پر کوئی وعدہ نہیں کرتا۔ سب مرضی پر منحصر ہے۔ اتنا سا بات اگر تم سمجھ لیتا تو اپنا دشمن بھی کبھو... اور ابھی تم کو ایسا وقت بھی نہیں دیکھنا پڑتا۔" یہ کہتے ہی پیرو... اُتر پڑا۔

میں نے بھی پھر جلدی کی اور اپنے ہاتھ میں دبی ہوئی... میں چھوڑ کے باہر آ گیا۔ نواب موٹر میں رہ گیا تھا۔

✱ ہم چار مینار کے قریب تھے۔ زمین پہ پیر نہیں ٹکتے... ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پنکھ لگ گئے ہوں، جیسے ہوا ہمیں کہیں لیے جا رہی ہو اور جیسے آنکھوں میں اچانک روشنی بڑھ گئی... مینار کے چبوترے پر بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ سامنے ہی... تھا۔ میں اس راستے سے کئی بار گزر چکا تھا لیکن آج سب... لگ رہا تھا۔ پیل کمان کے پاس بہت سے رکشے خالی کھڑے... اُسی کی طرف بڑھا لیکن رکشا والے سے بات کرنے سے پہلے اُس... کی چائے کی دکان سے ایک گلاس پانی پیا۔ انگیٹھی پہ کھولتی...

...ہو رہی تھی اور رکشا والے دکان کے گرد تپائیوں پر گپ شپ... بیٹھے تھے۔ وہاں بڑی بڑی پگڑی باندھے ہوئے ایک ادھیڑ پان والا... خوانچا لگائے پان بنا رہا تھا۔ اُس کے گلے میں موتیا کے پھولوں کا... تھا۔ اُس نے از خود چاندی کے ورق میں لپٹا ہوا بیڑا پیرو کی طرف... پیرو منع نہیں کر سکا۔ ایک بیڑا میں نے بھی کھایا۔ کیوڑے... بسا ہوا پان تھا، سارا منہ معطر ہو گیا۔ پیرو کی جیب میں روپے... تھے۔ انھوں نے حویلی میں ہماری جامہ تلاشی لی تھی لیکن اُن کا مقصد... تھیلا وغیرہ کی طرف سے اطمینان کرنا تھا۔ ایسی کوئی چیز ہمارے... تھی ہی نہیں جو وہ ہم سے دُور کر دیتے۔ تلاشی لینے والے پہرے دار... ہاتھ میری گردن میں پڑی ہوئی مالا پر بھی آئے تھے لیکن مالا اُلٹ پلٹ... دیکھنے اور بے ضرر ہونے کا یقین کر کے اُنھوں نے مجھے واپس کر دی... پیرو نے پانچ روپے کا پورا نوٹ پان والے کو دینا چاہا لیکن اُس... سلام کر کے کھلے نوٹ اور ریزگاری واپس کر دی۔ پیرو نے بھی... نہیں کہا، پان چباتا ہوا رکشوں کی طرف چلا آیا۔ "چلے گا؟" اُس... ایک نوجوان رکشا والے سے پوچھا، وہ اندر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ جواب... نے کے بجائے سرتاپا ہمارا جائزہ لینے لگا۔ اُس کے دیکھنے ہوئے منہ سے... اپنے کپڑوں کی بوسیدگی کا احساس ہوا۔ ہم دونوں کے کپڑے میلے... ہو چکے تھے۔ سلوٹوں سے کچھ سکڑ بھی گئے تھے۔ بکھرے بال... صورت شکل سے، ہم جیل سے بھاگے ہوئے قیدی نظر آ رہے ہوں گے۔ "...کیا دیدے پھاڑتا ہے؟" پیرو نے ڈپٹ کے کہا۔ "اپن کیا بولتا... سالا!"

رکشا والا کسی طرح چونک گیا، پلکیں پٹ پٹاتا ہوا بولا: "کہاں... نے کا ہے؟"

"بازار کو!" پیرو نے دھمکتی آواز میں کہا۔

"بازار کو! کون سا بازار؟"

بازار کے نام پر میرے کان کھڑے ہوئے۔ میں پیرو سے پوچھنے والا تھا مگر اُس نے رکشا والے سے کہا: "اپن کو گانا سننے کو لے چلو۔"

"محبوب کی مہندی!" رکشا والے نے آنکھ مار کے کہا۔ "ایسا... بیٹھو بیٹھو سیٹھ۔" وہ اُچھل کے ایک دم نیچے اُتر آیا۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں دادا؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"ابھی پہلے بازار کو دیکھ لے راجا!" وہ سر ہلاتا ہوا بولا۔

"مگر کیوں؟ بس سیدھے" رکشا والا سن رہا تھا، میں نے لفظ چبا... کہا: "دادا پہلے ہمیں ادھر ملنا چاہیے، ادھر ہوٹل میں۔"

"بیٹھ جا راجا!" وہ مجھے دھکیلتا ہوا بے پروائی سے بولا۔ "ابھی... بیٹھ جا۔"

"دادا! مگر..... مگر تم....." میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "پہلے ہمیں ہوٹل چل کے پوچھنا چاہیے۔"

"وہ ابھی اُدھر نہیں ہوگا۔"

"مگر ہو سکتا ہے وہ کوئی پیغام چھوڑ گئے ہوں یا اُن میں سے کوئی احتیاطاً وہیں رُکا ہوا ہو۔"

"بعد کو اُدھر بھی دیکھ لے گا۔"

"لیکن ہمیں بازار میں ایسے نہیں جانا چاہیے۔"

"بازار جانے کا یہی وقت ہے راجا!" وہ مسکرا کے بولا۔

"میں تم سے کہہ رہا ہوں مت جاؤ۔" میں نے ناگواری سے کہا۔ "خواہ مخواہ پھر کوئی....."

"ابھی پہلے سے شگون خراب کیوں کرتا ہے۔" وہ تیکھے لہجے میں بولا۔ "اُدھر جا کے ابھی اپن آکا کو دیکھے گا۔ دیکھتا ہے ابھی اُس میں کتنا دانت ہے، ابھی جھنجھوڑتا ہے یا گھاس کھاتا ہے۔"

"مگر آکا ہی کی بات ہے تو وہاں ہم پھر بھی جا سکتے ہیں۔ وہ بھاگ کے کہاں جائے گا۔"

"ایسے چلا گیا تو آکا کو شکایت ہوگا۔ پھر وقت ملے نہ ملے۔ اُس کا حساب چکتا کر کے آگے جائے تو نیند ٹھیک سے آئے گا۔"

میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی: "دادا! اِس وقت ہمارا وہاں جانا کسی طرح مناسب نہیں۔ ہوٹل میں ہمیں مزید کچھ معلوم ہو جائے گا۔"

"پہلے اپن اُدھر ہی چلے گا راجا۔" وہ حتمی لہجے میں بولا۔

"دادا! سمجھا کرو، ضد مت کرو، تمھیں کیا ہو گیا ہے۔"

"آکا نئیں تو اپن ابھی اُدھر گانا شانا سنتا ہے۔ اتنا دن ہو گیا ہے ابھی چین سے چلے گا۔"

"دادا! ضرور تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو۔" میں نے عاجزی سے کہا۔ "اب تمھیں گانا سننے کی سوجھ گئی، ابھی تم آکا کو دیکھنے کا کہہ رہے تھے۔ تمھارے دماغ میں یقیناً کچھ اور ہے۔ مجھے بتاتے کیوں نہیں؟"

"چل کے ذرا بازار کا رنگ بھی تو پوچھنا ہے، کیا پتہ اُدھر ہی اُن لوگ کا پتہ لگ جائے۔" وہ ہنس کے بولا۔ رکشا والے سے اُس نے کہا کہ وہ کچھ دُگنی چال چلے۔ رکشا والا پہلے ہی رکشا تیز بھگا رہا تھا، اُس کی رفتار اور تیز ہو گئی۔

"کیا تمھارا مطلب ہے....." ہم آدھے راستے پر آئے ہوں گے کہ میں نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا تمھارا مطلب ہے کہ وہ وہاں تمھارے.....؟"

"ہاں ہاں ابھی سمجھا کر راجا!" وہ میری بات کاٹ کے بولا اور میرے گلے میں بانہیں ڈال کے مجھے دبوچنے لگا۔

میرا سر چل رہا تھا۔ یا تو میں ہی پاگل ہو گیا تھا یا وہ اپنے حواس

کھو چکا تھا۔ اُس کی کوئی بات میری عقل میں نہیں آتی تھی۔ اگر اُسے اپنے کسی مفروضے پر اتنا ہی یقین تھا تو بھی ہمیں ہوٹل جا کے صورتِ حال سمجھنے میں آسانی ہوتی۔ اُس کا اندازہ درست ہونے کا امکان کم نہیں تھا لیکن ایک امکان اندازہ غلط ہونے کا بھی تھا۔ ہوٹل کے بعد بھی ہم یہاں آ سکتے تھے مگر پیرو سے اِس وقت کچھ کہنا سننا بے نتیجہ تھا اِس لیے میں نے اپنی زبان بند کر لی تاہم میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے منڈلاتے رہے۔ جی چاہ رہا تھا کہ رکشے سے چھلانگ لگا دوں، شاید اسی طرح پیرو اپنے ارادے سے باز آ جائے مگر اُس کی ناراضی کے خیال سے میں یہ بھی نہ کر سکا، اُس کے بازو کے حصار میں سمٹا ہوا بیٹھا رہا۔ رکشا والا تیز رفتاری کی وجہ سے ہانپنے لگا تھا، نتیجۃً اُس کی رفتار بھی سست ہو گئی تھی۔ محبوب کی مہندی کا علاقہ اب قریب ہی تھا، یہاں سے میں اور جہاں گیر روز صبح سیر کے لیے جایا کرتے تھے۔ چند لمحوں بعد ہی ہم بازار کے سرے پر تھے۔ رکشا والا اندر گلی میں جانے کا ارادہ رکھتا تھا مگر پیرو گلی کے دہانے ہی پر اُتر گیا۔ اُس نے جیب میں ہاتھ ڈال کے ریان والے سے بچی ہوئی ساری ریزگاری اور کھلے نوٹ رکشا والے کے ہاتھ پر رکھ دیے اور اُسے متحیر چھوڑ کے گلی میں داخل ہو گیا۔ رکشا والا ہمارے پیچھے بھاگتا ہوا آیا اور اکھڑی سانسوں سے پوچھنے لگا کہ کیا وہ ہماری واپسی تک کھڑا رہے؟ پیرو نے منع کر دیا۔

بازار میں جیسے دن ابھی نکلا ہی تھا۔ دکانیں کھلی ہوئی تھیں، تماش بین مختلف ٹکڑیوں میں ہر جانب بکھرے ہوئے تھے۔ بالاخانوں کے دریچوں، دروازوں سے روشنیاں پھوٹ رہی تھیں۔ دور تک جہاں جہاں نظر جاتی تھی، ایک میلا سا نظر آتا تھا۔ چھجوں، کھڑکیوں اور نچلی منزل پر کمروں میں لڑکیاں اور عورتیں طرح طرح کے سنگھار کیے، قسم قسم کے رنگ برنگے کپڑے پہنے اپنے مخصوص انداز میں بیٹھی تھیں۔ وہ بنی ٹھنی، ہر ایک کی سجاوٹ دیکھنے کے لائق تھی، ایک سے بڑھ کے ایک۔ کوئی خاموش سر جھکائے، کسی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ، کسی کی نگاہیں بھٹکتی ہوئی، کوئی اپنے آپ میں گم اور کوئی ناراض ناراض سی۔ سب کے الگ الگ انداز تھے۔ دکانوں پر جنس ایک ہی قسم کی تھی مگر بیچنے والے جیسے مختلف تھے۔ میں خانم کے گھر قیام کے دوران ان گلی کوچوں سے بڑی حد تک واقف ہو چکا تھا۔ کچھ ہی دُور خانم کا مکان تھا اور اُس سے ایک دو گلی آگے وہ بالاخانہ تھا جہاں سے میں نے نیساں کو مانگا تھا۔ جہاں گیر نے تو یہاں خاصا وقت گزارا تھا۔ یہاں آ کے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دُنیا بس رات ہو، جگمگاتی، ناچتی، گاتی رات۔ جیسے کسی کو کسی کا ہوش نہ ہو اور سب کسی نہ کسی دھن میں کھوئے ہوئے ہوں۔ ہر طرف شور اُٹھا ہوا تھا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا ہم چھوڑ کے گئے تھے۔ وہی جگہ جگہ بکھری ہوئی پھولوں کی پتیاں، تیز روشنیوں میں چمکتے دمکتے چہرے، سازوں کی گونج، گھنگروؤں کی جھنکار، گانے کی تانوں اور راہ گیروں کے نعروں نے فضا کو بوجھل اور منتشر کر رکھی تھی۔ پیرو اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ مجھ سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ یہاں آ کے ہمیشہ میرا دم گھٹنے لگتا۔ سامنے آ کے کوٹھری ہو جاتی تھی۔ چلتے چلتے ہم خاصے اندر نکل آئے۔ خانم کے مکان جانے والی گلی بھی نکل گئی تھی۔ سدا کے معمول بالاخانے کے آدمیوں نے ہمیں متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ پیرو سنی اَن سنی کرتا، سر اُٹھائے چلتا ہی رہا۔ گلی میں داخل ہوتے ہر لمحے اپنے پہچانے جانے کا خدشہ تھا۔ اُس دن سارا محلہ اکٹھا ہو گیا تھا جب شاہ کبیر اور میں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ میرا چہرہ وہ اتنی آسانی سے نہیں بھول سکتے تھے۔ [illegible] کے آدمیوں نے مجھے اتنی جلدی پہچان لیا تھا تو یہاں اور بھی گے۔ خانم کے ملازم، ہوٹل والے، جہاں گیر سے اَڑنے والا مو... دادا کے آدمیوں نے تو مجھے بارہا دیکھا تھا۔ ہم اُس ہوٹل کے ... گئے جہاں تجمل نے شاہ کبیرا اور اُس کے ساتھیوں کے سامنے ... کر دیا تھا۔ اُس سے کچھ آگے کی گلی اڈّے کی طرف نکلتی تھی۔ گزرتے وقت مجھے کئی آدمیوں پر بازار کے اڈّے سے وابستہ ہونے کا شبہ ہوا تھا۔ میرا حلیہ خاصا بدلا ہوا تھا۔ داڑھی بھی بڑھی ہوئی ہو گی کہ اُن کی نگاہ مجھ پر نہ آ سکی مگر جیسے ہی ہم ہوٹل کے ... تپائیوں پر بیٹھے ہوئے دو آدمیوں نے چونک کے ایک دو... کیا پھر وہ دونوں چائے چھوڑ کے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ دونوں تیس سال کی عمروں کے ہوں گے۔ اُن کی آنکھوں میں حیرت بھر گئی۔ انھیں بالکل نہیں پہچانتا تھا۔ پیرو نے بھی انھیں اُٹھتے ہو... ہو گا لیکن ہم آگے چلے آئے۔ ہم نے مُڑ کے نہیں دیکھا کہ وہ ہما... رہے ہیں یا نہیں۔ گلی کا وہ ٹکڑا بھی آ گیا جہاں سے اڈّے کے لیے مُڑنا پڑتا تھا۔ علاقے میں سپاہیوں کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی۔ ... کی ایک ٹولی کھڑی تھی۔ کسی سبب کے بغیر وہ ہمیں پوچھ ... روک سکتے تھے۔ علاقے کا کوئی بھی آدمی ہماری طرف اُن کی ... کرا سکتا تھا۔ ہمارے کپڑوں اور وضع قطع سے انھیں یوں بھی ... ہو سکتا تھا۔ نواب کی جانب سے بظاہر کسی اقدام کا امکا... مگر یہ علاقہ دوسرا تھا، کوئی عام علاقہ نہیں تھا۔ اب بھی ہم ... پر جانے کے بجائے علاقے سے باہر نکل سکتے تھے، اب ... گیا تھا۔ گلی کے نکڑ پہ پیرو نے گردن موڑ کے سوالیہ نظروں سے ... دیکھا مگر میں نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے روک نہیں سکا۔ میں ... نگاہوں میں بائیں ہاتھ کی نسبتاً چوڑی گلی کی طرف اشارہ ک... قدم بہک رہے تھے، سارے جسم میں کانٹے سے چبھے ہوئے ... نے خود کو سمجھایا، آگے جو کچھ بھی ہو، اڈّا اب زیادہ دور نہیں

...حل کے اندر ہر جانب سے چوکنا رہ کے چلنا چاہیے۔ میرے پاس ...تو نہیں تھا، چاقو کی بڑی کمی محسوس ہو رہی تھی۔

اڈّے کی گلی اتنی روشن نہیں تھی لیکن اندھیرا بھی نہیں تھا۔ ...ر اُدھر بیشتر بالاخانوں کے دروازے بند تھے اور اندر سے ناچنے ...نے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہاں تمام بالاخانے خانم کے مکان کی ...ح بلند و بالا تھے۔ یہاں عورتیں اور لڑکیاں چھجوں، کھڑکیوں اور کھلے ...یں میں بیٹھی نمائش نہیں کرتی تھیں اس لیے عام تماش بینوں کی بھیڑ ... یہاں زیادہ نہیں ہوتی تھی تاہم گلی سنسان نہیں تھی۔ ہم نے کوئی ...ڑھ دو سو قدم کا فاصلہ عبور کیا ہو گا کہ پیچھے سے بہت سی آہٹیں ...ائی دیں۔ میں نے پیرو کو بتانا چاہا، اُسی لمحے اُس نے خود مُڑ کے پیچھے ...۔ وہ اڈّے ہی کے آدمی تھے جو چند گز کے فاصلے پر لپکتے ہوئے ...ے پیچھے آ رہے تھے۔ ہمیں مُڑتے دیکھ کے وہ تذبذب سے ہو گئے، ...ٹھہر گئے۔ وہ چھ سات آدمی تھے۔ اُن میں وہ دو بھی تھے جنھیں ...نے ہوٹل کے باہر پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھے دیکھا تھا۔ پیرو نے پلٹ ...اُن پر صرف ایک نگاہ ڈالی اور چل پڑا۔ اُس کے پاس تمنچا تھا۔ انھوں ...ہماری طرف کوئی پتھر نہیں پھینکا تھا تو ہمیں بھی اپنی جانب سے ...ئی گرہ ڈالنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ بات طے تھی کہ مجھے انھوں نے ...پہچان لیا ہے۔ پہچاننے کے بعد ہوٹل میں بیٹھے رہنا اُن کے لیے ممکن ...ں رہا ہو گا۔ ہمارا رُخ اڈّے کی طرف تھا۔ ہمیں اڈّے کی گلی میں ...تے دیکھ کے انھیں اور تشویش ہوئی ہو گی۔ وہ کسی طرح ہمارے پہنچنے ...پہلے خود اڈّے پہنچ جانے کی تگ و دو میں ہوں گے۔ اُن میں سے ...کو یہ کوشش کرنی چاہیے تھی مگر کوئی ہم سے آگے نہیں نکلا۔ اڈّے ...ی ایک راستہ نہیں ہوتا، کوئی دوسرا راستہ کسی اور گلی سے نکلتا ہو گا۔ ...ہے اُن کے کچھ اور ساتھی بھاگتے ہوئے ہم سے پہلے اڈّے پر پہنچنے ...کامیاب ہو گئے ہوں یا پہنچنے والے ہوں مگر ایسی صورت میں ہمیں ...تے میں اُلجھانے کے لیے پیچھے آنے والوں کو کوئی نہ کوئی پہل ضرور کرنی ...ہیے تھی۔ عموماً یہی ہوتا ہے۔ ہمیں بوجھنے کے بعد اُن کا تعاقب قرینِ ...تھا۔ پہل میں جھجک کا سبب یہی ہو سکتا تھا کہ وہ مجھے شاہ کبیر کے سامنے دیکھ چکے تھے اور انھوں نے آکا کے آدمیوں، اپنے ساتھیوں ...بھی سُن لیا ہو گا کہ ہم اُن سب سے کس طرح نمٹے تھے۔

وہ ہم سے دس دس قدم دور ہی رہے۔ انھوں نے ہمارے راستے میں رکاوٹ ...ی کوشش نہیں کی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ ہم سے اچھی طرح واقف ... اڈّے کے آدمی عام آدمیوں کی طرح یوں ہی نہیں جھگڑنے لگتے، ...ستی کرتے رہتے ہیں، کوئی چارۂ کار نہ دیکھ کے ہی ہاتھ اُٹھاتے ...یا پھر انھوں نے کچھ ٹھان ہی نہ لی ہو۔ اُن کی خاموشی سے یقیناً ...جا سکتا تھا کہ اڈّے پر کوئی تبدیلی ضرور ہوئی ہے یا وہ کسی موقع کے منتظر تھے اور ہماری نیت کے بارے میں کوئی تعین کر لینا چاہتے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا آکا ہی نے انھیں حکم دیا ہو کہ ہمیں اڈّے تک آنے دیا جائے اور ہماری واپسی کے تمام راستے مسدود کر دیے جائیں۔ بہرحال واضح طور پر کچھ بھی نہیں سمجھا جا سکتا تھا، جب تک ہم اڈّے نہ پہنچ جاتے۔ درمیان میں وہ کہیں بھی رخنہ ڈال سکتے تھے۔ میں اُن کی چاپیں سونگھتا ہوا چل رہا تھا۔ اُن کی تعداد پہلے سے کچھ بڑھی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ پیرو بھی اُن کی طرف سے ہوشیار ہو گا۔ اُس نے تمنچا اب تک نہیں نکالا تھا۔ آگے گلی کچھ تنگ ہو گئی تھی۔ اڈّا بس کچھ ہی دُور رہ گیا تھا بلکہ اڈّے کی عمارت ہمارے سامنے تھی۔

عمارت پُرانے طرز کی تھی، دو منزلہ۔ باہر دیوار اور دروازے کے ساتھ چوکی پر چند آدمی بیٹھے تاش کھیل رہے تھے مگر انھوں نے دُور ہی سے ہماری آہٹیں سُن لی تھیں۔ ہمیں اور ہمارے پیچھے اڈّے کے آدمیوں کو بڑھتے دیکھ کے وہ بوکھلا کے کھڑے ہو گئے جیسے انھیں سانپ نے کاٹ لیا ہو۔ ایک سیدھا اندر دروازے کی طرف بھاگا۔ باقی چار دروازے کے سامنے دیوار بن کے کھڑے ہو گئے۔ میری رگیں چیخ سی رہی تھیں اور میں نے اپنی سانس روک رکھی تھی۔ پیرو خاموش کھڑا رہا۔ ہمارے سامنے ہی ایک آدمی اندر گیا تھا، سو اب ہمارا چھپنا لاحاصل تھا۔ ہمارے پیچھے اور سامنے اڈّے کے سارے آدمی تکے کھڑے تھے، ہم بھی اُن سے غافل نہیں تھے۔ چند لمحے بھی نہ گزرے ہوں گے کہ اندر سے شور سنائی دیا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا، مجھے اُس کی آواز صاف سنائی دی تھی اور دوسرے ہی لمحے وہ ہمارے سامنے تھا، میری آنکھیں چندھیا گئیں،

وہ تجمل ہی تھا۔

وہ کسی پاگل کی طرح میری جانب بڑھا تھا، سمندر کی کسی وحشی لہر کے مانند۔ اُسے اپنے سامنے دیکھ کے میری نس نس میں درد بلبلانے لگا تھا۔ سینے میں ایسی گرج اُٹھی کہ میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ وہ کبھی مجھے جھنجھوڑتا، کبھی میرے گالوں، میرے ہاتھوں کو چومتا۔ میرے شانے اُس کے شانوں پر ڈھلک گئے تھے اور مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے سارا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کے بکھر جائے گا۔ میں بلک بلک کے روتا رہا اور مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ کب اندر آئے۔ میرے حواس کچھ دیکھنے اور سُننے کے قابل ہوئے تو میں نے دیکھا کہ وہاں بھیڑ لگی ہے، وہ سب میرے گرد جمع ہیں اور میں نے سُنا کہ تجمل مضطرب لہجے میں مجھے آوازیں دے رہا ہے "لاڈلے! لاڈلے! اپنا نہیں تو کچھ دوسروں ہی کا دھیان کر جانی!"

مجھے یہ سب کچھ اپنی نظروں کا فریب لگ رہا تھا اور مجھ پر کوئی خوف سا طاری تھا کہ کہیں یہ سب کچھ دوبارہ اوجھل نہ ہو جائے۔ اُسی

لمحے میری نظر کانتے پر پڑی۔ ہاں وہاں کانتے بھی موجود تھا۔ اُس کے ہونٹ پھڑ پھڑا رہے تھے اور بے قرار نظریں مجھ پر منڈلا رہی تھیں۔ بجّل مجھے اپنے پہلو میں جکڑے ہوئے تھا۔ کانتے کو دیکھ کے میرا جسم پھڑکنے لگا۔ وہ اکیلا نہیں تھا، دوسرے ہی لمحے اُس کے ساتھ کھڑا ہوا جابر کا بھائی جمرو بھی مجھے دکھائی دیا اور میں نے زورا کو بھی دیکھا، شامو بھی وہیں تھا۔ وہ چاروں بس میری توجہ کے منتظر تھے، جھپٹتے ہوئے میرے پاس آئے اور اُنھوں نے مجھے بجّل کے بازوؤں سے چھین لیا۔ بار بار مجھے کسی سراب کا گماں ہوتا تھا، اپنی آنکھوں اور کانوں کے خواب مگر اب میں حویلی میں نہیں تھا، یہ کالے دادا کا اڈا ہی تھا۔ جہاں گیر اور خانم کو حیدرآباد سے لے جاتے وقت میں یہاں آچکا تھا۔ وہی پانچ محرابوں والا دالان اور دونوں طرف سرائے کی طرح بنے ہوئے کمرے۔ بجّل کے سامنے وہی حقّہ تھا جو کالے دادا نے پچھلی دفعہ بطورِ خاص اُس کے لیے منگوایا تھا۔ کانتے، زورا، شامو اور جمرو مجھے کھسوٹ رہے تھے، گدگدا رہے تھے اور جیسے مجھے یاد کرا رہے تھے کہ میں اُنھی کے درمیان ہوں۔ پھر کالے دادا اُمڈتا ہوا میرے سامنے آگیا۔ اُس نے زورا اور جمرو کو سر مار کے ہٹا دیا اور وارفتگی سے میرے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ "قسم سے اُستاد ایک پل کو بھی آنکھ نہیں لگا پایا۔" بجّل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ بے چینی سے بولا۔

وہ سب اڈے ہی کے آدمی ہوں گے جو صحن میں اِدھر اُدھر منتشر کھڑے تھے، کالے دادا کو میرے پاس بیٹھا دیکھ کے وہ سب چوکی پر چلے آئے اور اُنھوں نے میرے اطراف گھیرا ڈال لیا۔ چوکی پر تل دھرنے کی جگہ نہیں رہی تھی۔ کانتے مجھے دبوچے ہوئے تھا، اُس کا بس نہیں چلتا تھا کہ مجھے اپنے اندر سمو لے۔ اُسی نے مجھے اُن کے بیچ سے اُٹھایا اور چوکی سے اُتار کے زمین پر کھڑا کر دیا۔ صحن میں شور مچنے لگا تھا۔ کالے دادا نے ہاتھ اُٹھا اُٹھا کے اور چلا چلا کے اُنھیں خاموش کرنا چاہا۔ چیخ پکار کسی قدر کم ہوئی تو وہ مچلتی آواز میں بجّل سے بولا۔ "استاد! ابھی میٹھا آئے گا۔" اُس کے کہنے کی دیر تھی، سبھی تندہی سے اُس کی تائید کرنے لگے۔

"آئے گا رے، ضرور آئے گا۔ فیل کیوں مچاتے ہو۔" بجّل نے کھنکتے لہجے میں کہا۔ "آدمی بھیجو کالے! جتنا ملے سب اِدھر ہی کھینچ لاؤ۔"

بجّل کی آواز اُن کے شور میں دب گئی۔ پیرو بجّل کے کولہے سے کولہا ملائے، گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا چندھی آنکھوں سے اُن سب کو دیکھ رہا تھا۔ مٹھائی کا ذکر سن کے اُس نے کالے دادا کو مخاطب کر کے ہانک لگائی۔ "او رے کالا بھائی! اپنے لیے تو ابھی چلنے کا بولو باپ!"

"... ایک دم دادا! ابھی چٹکیوں میں تیار ہوتا ہے۔" کالے دادا چھاتی پر ہاتھ مار کے بولا۔ "اور کچھ بولو بادشاہ!"

"کھانا کھا لیا ہے تم نے دادا؟" بجّل نے چونک کے پ

"کھانا تو اور ڈال کے ہی چلا تھا۔ وہاں سے نکلے زیادہ دیری نہیں ہوا ہے، چار مینار سے ابھی سیدھا اِدھر پہنچا

"پہلے ذرا نہا دھو لو۔" بجّل نے بھاری آواز میں کہا طرف سر اُٹھا کے کانتے سے بولا۔ "اس کو ایسے ہی پچھلا ما کے ذرا اِسے شیشہ تو دکھا۔"

کالے دادا اڈے کے آدمیوں کو چیخ چیخ کر اور اپنی کے مطابق مختلف حکم دے رہا تھا۔ عمارت اُن کی چاپوں اور آوازوں سے دھمکنے لگے تھے۔ اُنھوں نے بھی تیز کر دی تھیں۔ چوکی سے اُتر کے میں کانتے اور جمرو فرش پر کھڑا تھا۔ بجّل کا اشارہ ملتے ہی کانتے نے میری کمر ڈال کے مجھے جکڑ لیا اور میرے جسم کو زور سے جھٹکا دیا۔ وہ لوگوں کی بھیڑ سے اندر لے جانا چاہتا تھا۔ اُسی پل بے اختیار نگاہ بجّل کے پیرو پر گئی، میرے قدم زمین پر جم کے رہ گئے، پلٹتے پھر گیا۔ بجّل کے پیرو ابھی تک پٹی بندھی تھی مگر پہلے نظر نہیں آ رہی تھی۔ "تمھارا پیر اب کیسا ہے؟" میں ہوئی آواز میں اُس سے پوچھا۔

جواب دینے کے بجائے وہ مجھے گھور کے دیکھتا رہا اور جھک کے پیرو سے بولا۔ "ابھی کچھ بولنا مانگتا ہے دادا!"

"مایا!" پیرو پہلے تو چونک پڑا پھر قہقہہ لگاتے ہوئے ایک دم طوطے کے مانک رٹا لگاتا تھا۔ پنجرے کے پنچھی کے مانک "اُس کے پاس ایک آواز ہی تو اپنی رہ جاتی ہے دادا

"ہاں بجّل بھائی!" پیرو کی آواز بوجھل ہو گئی۔ "اپن! اپن نے ایسا پنجرا سالا کبھی نہیں دیکھا۔"

بجّل نے اُس کے زانو پہ آہستہ سے تھپکی دی اور کچھ نہیں کہنے دیا پھر حقّہ گڑگڑاتے اور بڑبڑاتے ہوئے وہ لگا۔ "سب ٹھیک ہے رے! اپنا ماس تو مٹی بھی مشکل سے

"تم یہاں کب کب ... ؟"

"پہلے دنیاں تو کچھ ڈھیلی کر لے، آگے ساری رات پڑی لگتا ہے، اُدھر بس دیواریں چاٹتا رہا ہے۔"

"ابھی اپن نے بہت باندھ کے رکھا تھا۔" پیرو بیچ میں سے بولا۔ "کبھی ایک دم رسّی تڑانے لگتا تھا پر سنبھالا ہی رہا، اب ہی ابھی کچھ ڈھیر ہوا ہے۔"

"تھکا نے پر آ کے شیر بھی ڈھیر ہو جاتا ہے۔"

"ابھی تم ٹھیک ہی بولتا ہے بجّل بھائی!" پیرو نے

یں کہا۔ "ابی سالا شیر تو اپنے کو نہیں بولتا۔ پر ایدھر آ کے اپن کا جوڑ جوڑ ابھی کچھ لوٹ پلٹ ہو گیا ہے۔"

"تم بھی تھوڑا آرام کر لو دادا!"

"تم کو ابھی پورا کید دیکھا ہے۔" پیرو نے بے تابانہ اُس کا ہاتھ سینے میں کھینچ لیا۔ "اپنا آرام تو ابھی تم کو دیکھنے سے ہو جائے گا۔"

کانتے مجھے کھینچتا، دھکیلتا ہوا اندر دالان میں لے آیا۔ مجھے کے درمیان ابھی تک اباجان اور مادی نظر نہیں آئے تھے۔ میری آنکھیں اُنھی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ کانتے سے کچھ پوچھتے ہوئے میری جھجک اُٹھنے لگتی تھی، جانے وہ کیا بتائے لیکن مجھ سے ضبط نہیں ہوا۔ کانتے اندر کمرے میں آ کے مجھے اپنا جوڑا پہننے کو دیا تو میں نے سب سے پہلے اُنھی کے بارے میں اُس سے پوچھا۔

"تھوڑا چھری تلے دم لے۔" وہ آنکھیں میچ کے بولا۔ "سب ٹھیک ٹھاک ہی ہے۔"

"مگر وہ ہیں کہاں؟"

"اِدھری ہیں لاڈلے!"

"یہیں!" میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

"یہاں کیسے ہوتے، اِدھر اڈے پر رکھتے ان کو؟" وہ تنک کے بولا۔ "بالکل بولا ہو کے آیا ہے۔"

"پھر کیا وہ ابھی ہوٹل ہی میں ہیں؟"

"نہیں، ہوٹل میں بھی نہیں، اِدھر شہر میں ہیں۔" اُس نے مجھے اُس وقت تک کچھ بتانے سے انکار کر دیا جب تک میں نہا دھو کے لباس تبدیل کر کے اپنا حلیہ ٹھیک نہ کر لوں۔ نہانے کو میرا جی بالکل نہیں چاہتا تھا، نہانے کا یہ کوئی وقت بھی نہیں تھا مگر ناچار مجھے اُس کی بات ماننی پڑی۔ دالان ہی میں غسل خانہ تھا، نل کھلا ہوا تھا، کانتے نے مجھے دھکا دے کے باہر سے دروازہ بند کر دیا۔

کانتے کے چہرے اور لب و لہجے سے کوئی اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ اباجان شہر میں ہیں مگر ہوٹل میں نہیں ہیں۔ پھر وہ کہاں ہو سکتے تھے؟ مادی بھی یہاں نہیں تھا۔ وہ یقیناً اُنھی کے ساتھ ہوگا۔ پہلے میں نے اپنے طور پر یہی سمجھا تھا کہ اُنھوں نے اباجان کو بمبئی چلے جانے پر آمادہ کر لیا ہوگا مگر میرے بارے میں کوئی خبر سنے بغیر اباجان یہاں سے کیسے جا سکتے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بجّل کی یہاں موجودی سے اباجان کی وحشت کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ اُنھوں نے ہر طرف سے مایوس ہو کے ہی اُسے طلب کیا ہوگا۔ پانی خاصا ٹھنڈا تھا، مجھے جھرجھری سی آگئی لیکن ایک دو ڈونگوں کے بعد زیادہ محسوس نہیں ہوا۔ میں نے جیسے تیسے جلدی جلدی نہا لیا اور تولیے سے جسم خشک کر کے کانتے کے کپڑے پہن لیے۔

اُس کے اور میرے کپڑوں کی پیمائش میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ بمبئی اور کلکتے میں اکثر ہم ایک دوسرے کے کپڑے پہن لیتے تھے۔ لباس کی تراش خراش بتا رہی تھی کہ یہ کپڑے سلائیں کے بنائے ہوئے ہیں۔ گریبان سے ایسا ہی کڑھا ہوا کرتا اُس نے مجھے ترپ کے دیا تھا، پاجامے کی مہری بھی اتنی ہی چوڑی تھی جتنی میرے پاجامے کی تھی۔ زرّیں کو گلاب کا عطر پسند تھا۔ اُسی کی ہلکی ہلکی خوشبو کرتے میں بسی ہوئی تھی۔ نہانے سے میری رگوں میں جیسے ٹھنڈک سی گھل گئی۔ کانتے دروازے کے ساتھ کھڑا تھا۔ جمرو اور زورا بھی باہر موجود تھے۔ میرے نکلتے ہی کانتے نے بازو پھیلا کے مجھے گلے سے لگا لیا۔ کنگھی دی۔ میرے کرتے کی آستینیں درست کیں اور میری آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" میں نے تندی سے کہا۔

"تجھی کو دیکھتا ہوں۔" اُس کی آواز ڈول رہی تھی۔ "معلوم پڑتا ہے، جگ بیت گئے ہیں، کدھر کھو گیا تھا لاڈلے؟"

"کانتے بھائی! سمجھو دوبارہ زندگی ملی ہے۔"

"اپنے دن بھی بجھ کر لگ جائیں۔" وہ بے قراری سے بولا۔ "تجھ کو کیا بتاؤں، یہ پانچ چھ دن کا وقت کتنے جوکھم سے کٹا ہے۔"

"اُدھر ہم بھی بالکل جکڑے ہوئے تھے۔"

"وہ تو تم دونوں کو دیکھتے ہی پتہ مل گیا تھا، ویسے بھی اپنے کو کوئی اچھے کی اُمید نہیں تھی۔"

"تمھیں معلوم تھا کہ ہم کہاں تھے؟"

"معلوم تھا بھی اور نہیں بھی۔" وہ بھڑکتے لہجے میں بولا۔ "اُستاد نے بیڑی ڈال رکھی تھی سالی! ہاں مسم اُستاد آڑے نہیں ہوتا تو تیرا بھائی دس بیس کو ٹھکانے لگا کے ہی لَوٹتا پر اُستاد!" وہ جز بز ہو کے بولا۔ "اُستاد کو تو تُو جانتا ہے کبھی بالکل مٹّی کا بن جاتا ہے۔"

"گویا تم جان گئے تھے کہ ہم کہاں....؟"

میری بات منہ میں ہی رہ گئی۔ کالے دادا اڈّے کے چند آدمیوں کے ساتھ دوڑتا ہوا میرے پاس آ گیا تھا۔ کانتے بھی ہونٹ چبا کے رہ گیا۔ اس دوران صحن میں اور بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ہم کالے دادا کی معیت میں اندر دالان سے ابھی باہر آئے تھے کہ دروازے سے کچھ اور لوگ مٹھائی کے ٹوکرے اُٹھائے، شور مچاتے اندر داخل ہوئے۔ وہ ہار پھول بھی ساتھ لائے تھے۔ جیسے ہی میں چوکی کے پاس پہنچا، مجھے دیکھ کے پیرو اچھل گیا اور پٹر پٹر پلکیں جھپکانے لگا۔ "اُستاد! ابھی کچھ دیکھتا ہے۔" اُس نے بتّھل کو ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔

بتّھل کی آنکھیں بھی چمکنے لگی تھیں۔ "ہاں دادا!" وہ سر ہلاتا ہوا بولا۔ "ابھی کچھ وہی لگتا ہے۔"

پیرو نے لمبی سانس کھینچی اور دونوں ہاتھ سے کان پکڑ کے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "اپن کو آخری ٹیم ابھی ضرور کچھ آسانی ہو جائے گا۔"

"ہم کو معلوم تھا دادا، یہ کس کے ساتھ ہے۔" بتّھل نے نسبتہً اونچی آواز میں کہا۔

"پَر اپن کا مغز بھی اُودر جا کے ایک دم پھر گیا تھا بتّھل بھائی! آنکھ کھلا تو اپن قید خانے میں پڑا تھا۔ شروع میں تو اپن سب مخول جانا پَر جلدی اُلٹا سیدھا سمجھ میں آ گیا۔ اُودر کا کچھ ٹھیک نئیں تھا۔ پل میں رُت بدل جاتا تھا۔ اپن ماتھا تھامے سوچتا تھا، ابھی بتّھل بھائی کے سامنے آنے کا سے گا بھی کہ نہیں۔ وہ اُودر سالا نواب کا اولاد...."

"جانے دو دادا!" بتّھل نے پیرو کا شانہ دبا کے بھن بھناتے لہجے میں اُسے روک دیا۔ کالے دادا نے مٹھائی اور ہار پھولوں کے ٹوکرے بتّھل کے آگے رکھ دیے تھے۔ میں، کانتے، جمرو، شامو اور زورا بھی چوکی پر بتّھل اور پیرو کے پاس آ کے بیٹھ گئے تھے۔ کالے دادا نے بتّھل کے گلے میں ہار ڈال کے مٹھائی کا پہلا دانہ اُس کے منہ میں رکھا۔ ہر طرف نعروں جیسی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ وہ سب بتّھل کو مبارک باد دے رہے تھے۔ عمارت میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ ابھی کالے دادا ہمارے سامنے سے نہیں ہٹا تھا کہ ایک دراز قد، تنومند، عمر رسیدہ شخص تیزی سے چوکی کی طرف بڑھا اور بتّھل کے مقابل آ کے بیٹھ گیا۔ اُس نے سر جھکا کے پہلے بتّھل کے گلے میں گوٹے کا ہار ڈالا اور اُس کے پیر پکڑ کے زیرِ لب کچھ کہنے لگا۔ بتّھل نے اُس کا جھکا ہوا سر اپنے سینے میں بھینچ لیا اور اُس کے لمبے کھچڑی بالوں میں انگلیاں پھیر[...] بولا۔ "اپنے لیے تو تمھارے یہ پھول ہی بہت ہیں سردار! تم کو [...] بالکل ضرورت نہیں ہے۔" بتّھل کا اشارہ اُس تھیلی کی طرف تھا [...] والے شخص نے چپکے سے اُس کے قدموں میں رکھ دی تھی۔

وہ شخص ہاتھ جوڑے بتّھل کے سامنے بیٹھا رہا۔ "منو[...] مائی باپ!" اُس نے لجاجت سے کہا۔ "اپن پھر کیا جانے کر[...] اپنے کو کسی قابل نہیں سمجھا، اُستاد اپن سے خفا ہے۔"

"نہیں نہیں۔" بتّھل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پھر انکار کاہے کو ہے اُستاد؟" وہ آزردگی سے بولا۔ "[...] اُس کو خوشی سے لایا ہے اور یہ تمھارا، تمھارا....؟"

"جانتے ہیں سردار! اپنا حق ہم خوب جانتے ہیں پر [...] تم پاس ہی رکھو، ضرورت پڑی تو آدمی بھیج دیں گے۔"

کانتے نے مجھے ٹہوکا دیا اور سرگوشی میں بتایا۔ "یہ دل[...] اِدھر سارے بازار کا ٹھیکے دار ہے سالا، بازار کا سارا بھتّا پہلے جاتا ہے پھر اڈّے پر آتا ہے۔"

شکل و صورت سے وہ کسی اڈّے کا اُستاد نظر آتا تھا [...] طرح چوڑا سر، بڑی بڑی پھٹی پھٹی آنکھیں، اُبھرا ہوا سا نرا[...] بادلِ ناخواستہ اُس نے تھیلی اُٹھائی اور اُلٹے قدموں چوکی سے [...] وہ اُترا ہی تھا کہ اڈّے کا ایک اور آدمی لپک کے چوکی پر [...] بتّھل کے پیروں پر سر رگڑنے لگا۔ "نمبر ایک کا نقشے باز ہے [...]" کانتے نے بدبداتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "آگے بہت پچھاڑی تھا سالا!"

میں نے اِسے پہلے بھی دیکھا تھا، شاہ کبیر کے ساتھ [...] بالاخانے پر آنے والے آدمیوں میں یہ بھی شامل تھا اور اُس وقت [...] شاہ کبیر کے پہلو میں کھڑا تھا جب میں اور وہ بازار کے چوک [...] ایک دوسرے کے سامنے ہوئے تھے۔ بعد میں اس شخص نے اڈّے پر [...] رہنے کے لیے بتّھل سے درخواست کی تھی اور بتّھل نے اِسے کال[...] کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ مجھے یاد ہے، اِس کا چہرہ کچھ بجھ گیا [...] اِس نے بتّھل سے تکرار نہیں کی۔ اُس زمانے میں یہ چاقو ہمیشہ [...] جیب میں رکھتا تھا اِس طرح کہ صاف نظر آئے۔ یہیں اڈّے [...] نے اِس کا چاقو اُوپر کی جیب سے نکال کے نیچے بغلی جیب میں ڈ[...] تھا۔ پھر جب تک ہم حیدر آباد میں رہے، ہم نے دوبارہ اسے اُو[...] جیب میں چاقو رکھتے نہیں دیکھا اب بھی نہیں تھا۔ چلتے وقت [...] نواب عالم تاب اسٹیشن پر آیا تھا تو بھی یہ ہمیں رخصت کرنے [...] وہاں موجود تھا۔ میں کانتے سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اِس نے [...]

راستے میں آخر کون سی رکاوٹ کھڑی کی تھی لیکن مجھے کانتے سے بات کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ بتّھل اور پیرو کے پاس سے ہٹ کے وہ شخص سیدھا میرے پاس آیا، میرے پیر پکڑ کے اُس نے میرے گالوں کو بوسہ دیا اور پھولی ہوئی سانسوں سے بولا۔ "تمھارے بنا استاد بالکل آدھا لگتا تھا۔" پھر خود چونک پڑا اور سنبھل کے بولا۔ "اپن کا مطلب ہے، ایسے اُستاد سو، ہزار سے بڑا ہے پر تمھارے بنا کوئی کمتائی لگتا تھا اس میں، صرف اپنے کو نہیں، یہاں سبھی کو۔ اپن بول نہیں سکتا کہ تم کو یہاں دوبارہ دیکھ کے کتنی خوشی ہوئی ہے۔ ناتھو کو اپنا نوکر سمجھو دادا اور اپنے کو حکم کرو۔"

میں نے اپنے پیروں سے اُس کے ہاتھ ہٹائے اور اُس سے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن کہہ نہ سکا۔ اچھا ہوا کہ کانتے نے اُسے اپنی جانب گھسیٹ لیا اور یوں میری مشکل حل کر دی۔

.. دل برا اور ناتھو کے نیچے اُترنے کی دیر تھی، لوگ ہر طرف سے چوکی کی طرف اُمڈ پڑے، بظاہر اُن کا ارادہ یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ سب ایک دم اُوپر آ جائیں گے مگر کالے دادا اور اڈّے کے دوسرے آدمیوں نے انھیں روک لیا اور سختی سے تاکید کی کہ وہ تحمل سے کام لیں، اُس وقت میری سمجھ میں آیا کہ اُن کا کیا مقصد ہے۔ وہ بتّھل کو ناتھو اور دلبرا کی طرح بالمشافہ مبارک باد دینے کے لیے بے قرار نظر آتے تھے۔ اچھا خاصا ہجوم تھا اور لوگ مسلسل اندر آ رہے تھے۔ گویا اگر یہی سلسلہ چلا تو ساری رات گزر جائے گی اور ہم یوں ہی بیٹھے رہیں گے۔ میں نے وحشت سے بتّھل کی طرف دیکھا لیکن وہ پیرو سے باتوں میں مصروف تھا۔ وہ چاہتا تو انھیں روک دیتا لیکن اُسے جیسے کچھ خبر نہیں تھی۔ مٹھائی اور پھولوں کے ٹوکرے بتّھل کے سامنے سے ہٹا کے ایک طرف رکھ دیے گئے تھے۔ اُن میں سے ہر شخص چوکی پر پہلے آنے کی جستجو میں لگا ہوا تھا۔ بہرحال دیکھتے دیکھتے اُن کی ایک قطار سی بندھ گئی، ایک جاتا نہیں تھا کہ دوسرا اُچک کے چوکی پر چڑھ جاتا۔ اُوپر آ کے پہلے وہ بتّھل کے گلے میں ہار ڈالتا، کوئی چیز ساتھ ہوتی تو پیش کرتا، اُس کے پیر چھوتا اور مبارک باد دیتا ہوا یا تو پیرو کی طرف جاتا یا پہلے میرا رُخ کرتا۔

میرا اندازہ کسی قدر غلط تھا۔ اُن کا مقصد میری اور پیرو کی اچانک آمد کے سلسلے میں اپنی مسرت کا اظہار کرنا ہی نہیں تھا، اڈّے کے نئے اُستاد کو سلامی پیش کرنا بھی تھا۔ گویا بتّھل کے اڈّا سنبھالنے کے بعد انھیں یہ رسم ادا کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ حیدر آباد میں نئے اُستاد کی تبدیلی پر یہ رسم باقاعدہ انجام پاتی تھی۔ پہلے بھی یہی ہوا تھا جب بتّھل نے کالے دادا کو یہاں کا اُستاد مقرر کیا تھا۔ ممبئی اور کلکتے میں بھی اڈّے سے باہر کسی نئے اُستاد کے آنے پر یہ رسم ادا کی جاتی ہے مگر کوئی لازم نہیں ہے اور اتنی باقاعدگی کے ساتھ نہیں ہوتی۔ وہ اپنے چاقو بتّھل کے پیروں میں رکھ رہے تھے۔ اُن میں صرف اڈّے سے وابستہ لوگ نہیں تھے، بازار کے لوگ بھی تھے۔ جن کے پاس چاقو نہیں تھے۔ وہ اپنی توفیق کے مطابق مختلف نذریں پیش کر رہے تھے۔ بعض کے پاس مٹھائی کے دونوں اور ہار پھولوں کے سوا کچھ نہیں تھا، بعض کے پاس صرف پھول تھے۔ سلامی کے لیے نذر ضروری نہیں تھی، استاد کے سامنے ایک مرتبہ آ کے سلام کرنا کافی سمجھا جاتا تھا۔ وہ لپکتے ہوئے قدموں سے بتّھل کے پاس آتے اور آ کے بے اختیار سے ہو جاتے۔ یوں کہنا چاہیے کہ سٹ پٹا جاتے۔ میرے سامنے آ کے بھی اُن کا یہی حال ہوتا، کسی کے مُنہ سے کچھ نکلتا اور کسی کے ہونٹ لرز کے رہ جاتے، آنکھیں جل بجھ کے رہ جاتیں۔ میری حالت بھی اُن سے مختلف نہیں تھی۔ مجھ سے کوئی جواب نہ دیا جاتا، میں گنگ لفظوں سے انھیں دیکھتا رہتا، پھر یکایک ایک ایسا آدمی میرے سامنے آیا کہ میں سیدھا نہ بیٹھا رہ سکا۔ اُسے پہچاننے میں مجھے ایک لمحہ لگا ہوگا، وہ مَولا تھا۔ وہی مَولا جو جہاں گیر کو ستایا کرتا تھا اور کئی بار کی درگزری کے بعد بھی باز نہیں آیا تھا چنانچہ مجھے مجبوراً اُس سے اور اُس کے دو ساتھیوں سے نمٹنا پڑا تھا۔ اُنھی کے سبب سے شاہ کبیرا میری طرف متوجہ ہوا تھا۔ مَولا بھی مجھے زندگی بھر نہیں بھول سکتا تھا۔ اُس کے چہرے پر چاقو کی کئی لکیریں کھنچی ہوئی تھیں۔ بھُوری بھُوری مونچھیں بھی خاصی اُبھری ہوئی تھیں، پہلے سے بڑا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اچانک میرے سامنے آ کے ہاتھ جوڑ کے بیٹھ گیا۔ میں نے اُسے پہچانا تو میری رگوں میں چمک سی اُٹھنے لگی۔ ایک بار تو میرے جی میں آیا کہ اُسے یہیں طمانچے مارنا شروع کر دوں۔ میرا ہاتھ اُٹھ جاتا لیکن یک لخت مَولا نے سر اُٹھا کے مجھے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا، اُس کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں، وہ میرے پیر تھام کے گڑگڑانے لگا۔ "مَولا کو معاف کر دو دادا! تم کو خدا رسول کا واسطہ، اپن آپ کو بالکل نہیں پہچانتے تھے۔ اپن کا دماغ یک دم خراب ہو گیا تھا۔" میں سُنتا رہا۔ "مَولا بالکل بدل گیا ہے۔ اِدھر پوچھ لو کسی سے، اپن اب کسی کو...." اُس کی آواز لرز رہی تھی۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔ وہ ہمکتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "رتجو بھائی کیسا ہے؟" رتجو سے اُس کی مراد جہاں گیر تھا۔ خانم یہاں اُسے اِسی نام سے پکارتی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

اُسے باتیں بنانا بھی خوب آ گیا تھا۔ زبان اب کسی قدر صاف تھی، بچپن اُس کا خانم کے بالاخانے ہی پر گزرا تھا۔ لمحوں تک وہ میرے سامنے بیٹھا میری زبان سے کچھ سننے کا منتظر رہا پھر میرے ہاتھ چوم کے جھجکتا ہوا اُٹھ گیا۔

طرح طرح کے لوگ تھے۔ ہر عمر اور ہر چہرے کے لوگ، اڈّے کے نئے اور پرانے آدمی، بڑے بالاخانوں کے نگراں اور بازار کے بڑے دکان دار۔ بہت کم لوگ میرے دیکھے ہوئے تھے۔ مَولا

کے بعد اُن پانچ آدمیوں میں سے وہ دو بھی میرے سامنے آئے جنھوں نے میرا اور پیرو کا پیچھا کیا تھا اور موسیٰ ندی کے قریب ہمیں اُن سے بات کرنے کے لیے ٹھیر جانا پڑا تھا۔ دونوں یکے بعد دیگرے میرے سامنے آ کے بیٹھ گئے۔ اُن کے کپکپاتے ہوئے جسموں پر کپکپی طاری تھی جیسے پکڑ کے لائے گئے ہوں۔ بجھل اور پیرو سے انھوں نے کچھ کہا ہو تو کہا ہو میرے پاس آ کے یوں ہی ٹھٹکے بیٹھے رہے۔ میری، پیرو اور بجھل کی گردنیں پھولوں سے چھپ گئی تھیں اِدھر بجھل کے پہلو میں سلامی کے طور پر آنے والی چیزوں کا ڈھیر لگ گیا تھا جب کہ چاقو اُنھیں اُسی وقت واپس کیے جاتے رہے تھے۔

یہ سلسلہ سویرے تک جاری رہتا اگر کالے دادا نئے آنے والوں پر پابندی نہ لگا دیتا۔ عمارت میں جو لوگ پہلے سے موجود تھے، وہی اُوپر آ سکے ساتھی کی تعداد کم نہیں تھی پھر بھی جتنا میرا خیال تھا، اُتنی دیر نہیں لگی۔ ایک تو بجھل نے چند لوگوں کے سوا کسی سے بات نہیں کی، سر ہلاتا اور ہُوں ہاں کرتا رہا۔ دوسرے کالے دادا نے الگ شور مچا رکھا تھا۔ میں نے سکون کی سانس لی۔ کالے دادا نے نئے آنے والوں کو منت سماجت کے باوجود قطعی انکار کر دیا تھا۔ اس سے پیشتر کہ کوئی اُوپر آنے کی کوشش کرتا، وہ چوکی پر چلا آیا لیکن اُس کے اُوپر آتے ہی عمارت میں ایک لمحے کے لیے سکوت چھا گیا۔ کالے دادا نے پلٹ کے دیکھا اور مضطرب سا ہو گیا۔ ہمارے مقابل لوگوں کے بیچ میں ایک بوڑھا شخص دونوں ہاتھ اُٹھائے کھڑا تھا۔ بھولا لنگ، بڑھی ہوئی داڑھی، چوڑا ماتھا، جھکے ہوئے کندھے، درمیانہ قد اور دھنسی ہوئی آنکھیں، چہرے کی ہڈیاں نمایاں تھیں اور ٹھوڑی کا گوشت لٹک رہا تھا۔ قلموں کے سفید بال دُور سے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ڈھیلا ڈھالا لباس پہنے ہوئے تھا، کسی زمانے میں چوڑا چکلا آدمی ہو گا۔ اُس کی عمر ستر سے کم نہیں تھی۔ کالے دادا نے ایک نظر بجھل کی طرف دیکھا پھر تیزی سے چوکی سے اُتر گیا۔ کورنش کے انداز میں اُس نے بوڑھے آدمی کا دامن پکڑا اور سلام کیا اور اُسے ہاتھ پکڑے ہوئے چوکی پر لے آیا۔ اِدھر اُدھر کھڑے ہوئے لوگوں نے اُس کے لیے راستہ چھوڑ دیا تھا۔ چوکی پر آ کے بوڑھا دوسرے آدمیوں کی طرح بجھل کے پیر چھونا چاہتا تھا مگر بجھل نے کھڑے ہو کے اُسے گلے سے لگا لیا۔ بوڑھا آدمی دیر تک اُس سے لپٹا رہا، جدا ہوا تو اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں، پیرو بھی کھڑا ہو گیا تھا۔ اُن دونوں سے گلے مل کے وہ میری طرف پلٹا اور میرا سینہ دھڑکنے لگا پھر میرے گال تھپتھپاتے ہوئے اُس نے مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ اُس کے بازوؤں میں ابھی تک زور تھا۔ "اپن سب سنا ہے۔" وہ بھرّائی آواز میں بولا۔ "اپن ایک ایک بات سُنا ہے۔ دو تین گھماؤں میں وہ کہتے کا پتا شاہ

کبیراں بول دیا تھا۔ اُن دِنوں میں اپن اِدھر شہر میں نئیں، گیسو والے پیر کے پاس گلبرگے گئے تھے ورنہ شہزادوں کو کیسے نہ آتے۔"

اُس کی آواز میں ایک گونج تھی۔ میں نے تذبذب کا اظہار کر کے، بیٹھانے کا اشارہ کیا۔ اس اثنا میں بجھل نے شانہ تھام کے اُسے اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ میں نے اُسے پہلے دیکھا تھا، وہ خود بھی یہی کہہ رہا تھا لیکن وہ اڈّے ہی سے تعلق ہو سکتا تھا۔ اب نہیں تو کبھی کسی وقت اڈّے سے واسطہ ضرور رہا ہو گا۔ چہرے چہرے سے بھی یہی ظاہر تھا سبھی اُس کے واقف معلوم ہوتے تھے، ایسے واقف کہ اُس پر بے چین ہو گئے تھے اور اب اُس کے چوکی پر بیٹھ جانے سے وہ بہت خوش اور جوشیلے نظر آ رہے تھے۔ بجھل سے بھی اُس کی نئی نہیں لگ رہی تھی، مجھے جستجو تھی کہ وہ کون ہو سکتا ہے جس سے اِس قدر قریب تھا کہ اُس کے بارے میں کالنتے یا زور سے پوچھنا مناسب نہیں تھا۔ اُس کے بیٹھتے ہی کالے دادا کا ٹوکرا اُس کے آگے رکھ دیا۔ بوڑھا ہنسنے لگا، بھیگی ہوئی کی آنکھیں رو رہی تھیں، عمارت میں خاموشی چھانے لگی پیاسی سی ہوئی پھر قبرستان جیسی کیفیت طاری ہو گئی، آخر یہ خاموشی وقت ٹوٹی جب بجھل نے اپنا چاقو جیب سے نکالا اور اُٹھ کے بوڑھے کے قدموں میں ڈال دیا۔ ایک کہرام سا مچ گیا بے تاب صداؤں سے عمارت کے در و بام لرزنے سے لگے۔ ساتھ بھولے دادا کے نام کا نعرہ بھی لگا رہے تھے۔ بھولے کا نام ہو گا۔ وہ منہ چھپائے بری طرح پھڑک رہا تھا۔ میری طرح جمرو اور رزولا کی آنکھیں بھی حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ کالا بھی بجھل کے ساتھ تھا مگر ایسا منظر اُس نے زندگی میں پہلی بار دیکھا ہو گا، پیرو بھی دم بخود بیٹھا تھا۔ بجھل کا چاقو بھولے دادا کے قدموں میں پڑا تھا اور بجھل کے چہرے پر سکوت چھایا ہوا تھا۔ بھولے دادا کی حالت اضطراری ہو گئی تھی، دیکھتے دیکھتے وہ فرش پر رگڑنے لگا۔ بجھل نے اُس کے شانے پکڑ کے اُسے اُٹھایا اور ٹوکرے سے مٹھائی کا ایک ٹکڑا اُس کی طرف بڑھایا۔ بھولے دادا کا چہرہ آنسوؤں سے تر اور بتر ہو گیا۔ اس نے ڈبڈبائی نظروں سے بجھل کی جانب دیکھا اور اُس کے ہاتھ تھام کے مٹھائی اُسی کی طرف کر دی۔ بجھل نے ٹکڑا اپنے منہ سے لگایا، بھولے دادا نے ایک دم ہاتھ دوبارہ اپنی طرف کھینچ کے بچی ہوئی مٹھائی منہ میں رکھ لی۔ معاً اُسے اپنے پیروں میں پڑے ہوئے چاقو کا خیال آیا۔ اُسے ہیجانی انداز میں اُٹھا کے سینے اور آنکھوں سے لگایا۔

آسمان کی طرف منہ کیے کچھ سوچتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ چاقو بجھل کو واپس کر دے گا لیکن اُس نے اُسے بوسہ دے کے جیب میں رکھ لیا۔ لوگ پاگل سے ہو گئے۔ اُن کی بے ہنگم آوازوں نے ہذیانی انداز اختیار کر لیا۔ گرد و نواح میں دُور دُور تک شور گونج رہا ہو گا۔

کالے دادا اور اُس کے ساتھ اڈّے کے دوسرے آدمیوں نے ہاتھ اُٹھا اُٹھا کے لوگوں کو خاموش ہو جانے کی تلقین کی۔ یقیناً اُنھیں کسی حد تک کامیابی ہوئی لیکن اڈّے کا رنگ ہی بدل گیا تھا۔ پیرو نے کالے دادا کو اشارہ کیا کہ وہ ہجوم میں مٹھائی تقسیم کرنا شروع کر دے، اُسی کی ہدایت پر ٹوکرے کھلے رکھے گئے تھے۔ لوگ اُن پر بے تحاشا ٹوٹ پڑے حالانکہ اُنھیں معلوم تھا کہ مٹھائی افراط سے موجود ہے مگر چھینا جھپٹی میں جو لُطف تھا، وہ اطمینان سے کھانے میں نہیں تھا۔ پیرو نے دانستہ کالے دادا کو یہ مشورہ دیا ہو گا۔ لوگوں کا دھیان بٹانے اور فضا بدلنے کی خاطر۔ کالے دادا چوکی کے اِس سرے سے اُس سرے تک ٹوکرا کندھے پر رکھے جھومتا مٹکتا گھوم رہا تھا کسی پھیری والے کی طرح۔ کسی کے منہ میں وہ گلاب جامن رکھتا کسی کے منہ میں برفی۔ پیرو کے پاس پہنچا تو جانے پیرو کے جی میں کیا آئی کہ اُس نے اپنے سارے ہار اُتار کے کالے دادا کی گردن میں لٹ دیے۔ سبھی کو جیسے ایک شوشہ مل گیا، سب نے بڑھ بڑھ کے پیرو کی تقلید کی۔ چند لمحوں میں کالے دادا کا چہرہ اور سینہ پھولوں میں گُم ہو گیا اور وہی سب کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اِدھر اُدھر سے اڈّے کے آدمیوں نے آوازے کسنے شروع کر دیے۔ کسی نے کالے دادا پر ریزگاری نچھاور کی تو ہر طرف سے سکوں کی بارش ہونے لگی۔ اڈّے کا ایک معمر شخص آ کے کالے دادا کی باقاعدہ نظر اُتارنے لگا۔ سب نے اُسی کو نشانہ بنا لیا، کہنے لگے کہ دادا بس ایک سہلے کی کسر رہ گئی ہے، کوئی شخص کسی چنبیلی بائی کا نام لے کے چھاتی کوٹنے اور آہیں بھرنے لگا۔ کسی نے کہا کہ آج وہ دادا کی ایک جھلک دیکھ لے تو خنجر اُٹھا لے۔ کالے دادا پھولوں کے ڈھیر میں لپٹ کے عجیب لگ رہا تھا۔ ویسے بھی اُس کا رنگ روپ سب سے جدا تھا۔ سیاہ کوئلے جیسے تھوبڑے پر تِلوں کی بھرمار اور چاقو کے نشانات، پیچھے لوٹے ہوئے لمبے لمبے بال، کان میں دُریا، آنکھوں میں سُرمہ تھپا ہوا، گینڈے کے مانند کاٹھی۔ عمر چالیس سے زیادہ نہیں ہو گی لیکن پہلے کے مقابلے میں اُس نے ڈیل بہت پھیلا لیا تھا۔ لگتا تھا، درمیان کے عرصے میں اُسے چاقو چلانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی بس بیٹھا انڈے توڑتا رہا۔ یہی وجہ ہو گی کہ آقا آکا کے پاس چلا گیا یا پھر اڈّے نکل جانے کی اصل وجہ چنبیلی بائی ہو گی اسی لیے اُس کا نام ہر ایک کے ورد زبان تھا۔ اُن کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ کالے دادا نے چنبیلی بائی کی خاطر کوئی قسم کھا رکھی ہے، وہ اُسے قسم توڑ دینے پر اُکسا رہے تھے۔ کالے دادا کا خاص آدمی چاند و پیش پیش تھا، کہہ رہا تھا: "ایمان سے ذرا باہر نکل کے دیکھو دادا! سارا بازار لُٹ جائے گا۔"

کالے دادا نے جیسے کچھ سُنا ہی نہیں، ہنستا رہا۔ لوگوں کی بدمستی میں کچھ کالے دادا کی ایما کا دخل بھی تھا۔ وہ اُن کی پھبتیوں، نعرے بازیوں سے اُلٹا لُطف لیتا رہا، اُس کے تیوروں سے لوگوں کو شہ ملتی رہی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہی کالے دادا اِس اڈّے کا کرتا دھرتا رہ چکا ہے، اب بھی بجھل کے بعد سب سے نمایاں آدمی وہی دکھائی دے رہا تھا مگر آج رات جیسے وہ خود کو بھول گیا تھا یا دانستہ بھلا دینا چاہتا تھا۔ وہ سبھی جیسے خود کو یاد نہیں رہے تھے، بھول گئے تھے کہ کہاں ہیں، بجھل نے بھی کچھ نہیں کہا۔ ذرا دیر میں رت جگے کا سماں ہو گیا جیسے کل عید ہو یا شادی کی کوئی تقریب، جیسے بہت دِنوں بعد اُن کی زندگی میں ایسی رات آئی ہو اور جیسے بہت دِنوں بعد کالے دادا اور وہ سب ایک بار پھر مل بیٹھے ہوں۔ یہاں تک بھی ٹھیک تھا مگر پھر تو کوئی ٹھکانا نہ رہا، عمارت میں کوئی بجلی سی چمکی، نہ جانے کس جانب سے چشم زدن میں ایک نوجوان نمودار ہوا، عمارت چیخوں سے گونج اُٹھی، لوگ ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے، درمیان میں ایک کشادہ دائرہ بن گیا۔ نوجوان دائرے میں تتلی کے مانند پھڑکنے، تھرکنے اور ہاتھ پیر نچانے لگا۔ اُس کے جسم میں پارا بھرا تھا۔ کمر پتلی تھی اور ہاتھ پیروں میں غیر معمولی لچک سی تھی، لوگ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ میرا دھیان کسی اور طرف تھا لیکن بعد میں مَیں نے غور سے دیکھا۔ مجھے بھی بہت ہنسی آئی، نوجوان کالے دادا کی نقل اُتار رہا تھا، ایسی صفائی اور مشاقی سے کہ یقین نہیں آتا تھا۔ کالے دادا کا دونوں ہاتھ پیچھے باندھ کے اور سینہ پھیلا کے بازار میں چلنا، پُتلیاں چڑھا کے دیکھنا، نچلا ہونٹ دبا کے غصہ کرنا اور بار بار کندھا جھٹکنا، بڑبڑاتے ہوئے گالیاں بکنا اور گنڈیری کے مانند گلوری چبانا، پھدک پھدک کے چاقو چلانا اور مجرے میں منہ پھُلا کے بیٹھنا۔ خود کالے دادا کا ہنسی کے مارے بُرا حال تھا۔ اُس کے مقابل گویا آئینہ رکھا ہوا تھا۔ آئینے میں بھی اُس نے اپنے اتنے پہلو نہ دیکھے ہوں گے۔ تعجب یہ تھا کہ نوجوان کو بالکل ہنسی نہیں آ رہی تھی۔ اُس نے مجنوں کے انداز میں ہائے چنبیلی، ہائے چنبیلی کی فلک شگاف صدا لگائی، لوگ اُچھل اُچھل پڑے۔ ضرور اُن کے پیٹ میں بل پڑ گئے ہوں گے۔ کالے دادا ابھی پاگل ہو گیا۔ وہ گلے میں پڑے ہوئے ہار نوچ نوچ کے نوجوان پر دیوانہ وار نچھاور کرنے لگا۔

کالے دادا کے علاوہ اُس نے دوسروں کے بہروپ بھی بھرے میں کسی کو جانتا نہیں تھا لیکن نوجوان کا انداز ایسا چٹکی بھرنے والا تھا کہ آدمی بے اختیار ہو جائے۔ بِجّھل بھی مسکرا رہا تھا۔ پیرو تو بے حال ہوا جا رہا تھا۔ نوجوان ہی کیا کم تھا کہ لوگوں نے اصرار کر کے ایک اور شخص کو درمیان میں دھکیل دیا۔ وہ بہت کترا رہا تھا، لوگ اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے سامنے لے آئے۔ پہلے والے کی نسبت اِس کا جسم کچھ بھدا تھا، عمر بھی زیادہ تھی۔ ایک اور ایک گیارہ کے مصداق دونوں نے مل کے حشر بَرپا کر دیا۔ دونوں یقیناً کسی نوٹنکی سے متعلق ہوں گے۔ انھیں ناچنا بھی آتا تھا، مختلف بولیوں اور لہجوں میں بولنا بھی۔ انھوں نے شاہ کبیرا کا بہروپ بھی بھرا۔ ایک اور بہروپ آکا کا ہوگا، آکا کو میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن بہروپ سے اُس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔ تماشا کرتے کرتے وہ دونوں دفعتہً میرے سامنے آکے ہاتھ جوڑ کے کھڑے ہو گئے۔ میں کچھ نہیں سمجھا لیکن وہ مجھ سے کسی بات کے طلب گار تھے۔ میں نے بدحواسی سے کالنتے کی طرف دیکھا۔ میرے بجائے اُس نے اُنھیں کوئی اشارہ کر دیا۔ انھوں نے درمیان میں لوٹ کے چاقو ہاتھوں میں اُٹھائے اور ایک دوسرے کے خلاف معرکہ آرا ہو گئے۔ میری رگیں سنسنانے لگیں کیوں کہ کسی اور کا نہیں، اِس مرتبہ وہ میرا سوانگ لچائے ہوئے تھے۔ میں اپنے سامنے خود تھا۔ ایک طرف میں تھا، دوسری طرف چاقو تولے ہوئے شخص کو پہچاننا بھی میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ وہ شاہ کبیرا تھا۔ دوسرے نوجوان میں جیسے شاہ کبیرا کی روح حلول کر گئی تھی۔ وہ بالکل اُسی کی طرح چاقو ہاتھ میں لہراتا بل کھاتا اُبلی اُبلی آنکھوں کے ساتھ جھپٹ رہا تھا۔ سب کچھ وہی تھا۔ بازار کے نکڑ کی طرح یہاں بھی کم و بیش وہی لوگ تھے، اِس وقت بھی سب کے ہونٹوں پر مہر لگی ہوئی تھی جیسے ابھی شاہ کبیرا کا فیصلہ ہونا باقی ہو۔ کئی بار خود مجھے دھوکا ہوا کہ میں کہاں ہوں۔ پہلے تو میں درمیانی جگہ کے کنارے کنارے گھومتا رہا اور اُس کے حملوں سے بچنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ اِدھر آتا تو میں اُدھر چلا جاتا، اتنے دن گزر جانے کے بعد بھی اُنھیں ایک ایک بات یاد تھی۔ کس طرح میں دیر تک شاہ کبیرے کو بے سر و پا نچاتا رہا تھا۔ وہ کبھی دائیں طرف ہاتھ مارتا، کبھی بائیں طرف۔ اُس کا غصے میں آگ بگولا ہو جانا، منہ سے کف نکلنا اور ڈکرانا، دونوں نوجوانوں سے لوگوں کے اصرار کا مطلب یہی تھا کہ وہ آج پہلی مرتبہ نہیں، یہ ناٹک پہلے بھی کئی بار دیکھ چکے ہیں۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ نقالی میں اتنے ماہر، اتنے چابک دست ہیں، اپنے جسم پر اُنھیں کس قدر قدرت ہے، جدھر چاہیں مُڑ سکتے ہیں اور پل بھر میں بہتیرا بدل سکتے ہیں۔ نقل میں یہ عالم ہے تو اصل میں دونوں کمال حاصل کر سکتے ہیں۔ انھوں نے اصل کی طرف کوشش کیوں نہیں کی؟ سب کچھ کسی تصویر کے مانند تھا، وقت کی گردش جیسے پلٹنے لگی ہو، آخر وہ لمحہ بھی آگیا جب شاہ کبیرا بالکل کنارے پر چلا گیا اور میں نے اپنا چاقو اڑا دیا۔ وہ کچھ بدحواس ہو گیا اور چنگھاڑنے لگا۔ میں نے آناً فاناً چند بدلے ہوں گے کہ اُس کا چاقو میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے ایسے کھنچے اور رُستے ہوئے انداز میں اُس کی طرف بڑھایا کہ زمین جانے کے سوا اُس کے پاس کوئی چارہ نہیں رہا۔ اُس کے بیٹھتے عمارت کی دیواروں اور دروں سے شور کا سوتا پھوٹ پڑا۔ انھوں شاہ کبیرا والے نوجوان کو اُوپر اُٹھا لیا۔ اُس کا نچلا حصہ برہنہ تو وہ اپنے کُرتے سے ستر پوشی کی کوشش کر رہا تھا، لوگ اُس حواس باختگی پر بُری طرح قہقہے لگا رہے تھے۔ اُسے چاقو لگے سوال ہی نہیں تھا، بیٹھنے کے بعد ہی اُس نے ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے خود کو اس بے شرمی پر تیار کیا ہوگا یا دو نے اُسے مجبور کر دیا ہوگا۔

پورے صحن میں اگربتیوں اور پھولوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی، طرف کونے میں رکھے سماوار میں چائے کھول رہی تھی۔ لوگ ابھی آ رہے تھے۔ صحن میں پہلے سے بہت بڑا ہجوم ہو گیا تھا۔ یہ کلکتے اور ممبئی میں پیرو کے اڈے کے آدمی نہیں تھے مگر اُن کی آنکھ اور چہروں سے اُبلتی خوشی دیکھ کے محسوس ہوتا تھا جیسے ہم اُن اڈے سے وابستہ ہیں اور بِجّھل عرصۂ دراز سے یہاں بیٹھا ہوا ہے۔ مرتبہ شاہ کبیرے کو بے دخل کر کے بِجّھل صرف چند دن یہاں رہا تھا۔ ایک مدت گزار کے اُس کا حیدرآباد آنا ہوا تھا۔ اِس مرتبہ بھی یہاں آئے کتنے دن ہوئے ہوں گے، زیادہ سے زیادہ چھ سات لیکن وہ چوکی پر کلکتے کے اڈے کی طرح جما بیٹھا تھا۔ اڈے کے آدمی اُس کے تنا سا معلوم ہوتے تھے۔ اس مختصر عرصے میں یہی ہوا تھا کہ اُنھیں بِجّھل کو جاننے اور بِجّھل کو اُنھیں اچھی طرح خود سے قریب کرا دینے کا کوئی غیر رسمی، غیر معمولی موقع مل گیا ہو۔ اُن میں سے کسی نے وہاں آکا کا نام نہیں لیا۔ یہ آکا کو اڈے سے نکالنے ہی کا کوئی ہوگا جب اُنھوں نے بِجّھل کو قریب سے دیکھا اور جانا بوجھا اور یہ ان کے لیے نہایت مسرت انگیز واقعہ ہوگا۔ مسرت کا وہ اس سے پہلے کھُل کے نہیں کر سکے تھے، ہماری آمد کے بعد ممکن تھا، سو اب اُنھیں کوئی روک ٹوک نہ رہی۔ جانے وہ کب سے اُس تبدیلی کے منتظر ہوں، اُن کے شور شرابے کی بے ساختگی سے اس کا تصور کیا جا سکتا تھا۔ آکا کوئی ایسا شخص تھا جس کے جانے پر کسی آدمی کی آنکھ بجھی ہوئی نظر نہیں آتی تھی۔ وہ آدمی جنھوں نے حیدرآباد آنے پر ہمارا تعاقب کیا تھا، اُن کے انداز و اطوار سے بھی معلوم ہوتا تھا کہ آکا کی ہیبت اُن کے دلوں پر بیٹھی ہوئی ہے۔ اڈے کے اُستاد کا خوف ضروری چیز ہے لیکن ساتھ ہی اُس کی چھاؤں کا بھی کوئی احساس لازم ہے، منصفی اور دادرسی کا تقاضا۔

بِجّھل کو اکثر میں نے کالنتے سے کہتے سُنا تھا کہ اُستاد کو ہاتھ کا سخت، آنکھ کا نرم اور سینے کا کھلا ہونا چاہیے۔ آکا کو شاید ایک ہی زبان آتی تھی جو اڈے کے اُستاد کے لیے کبھی اچھی نہیں ہوتی۔

میری نگاہیں اُن کے کھیل تماشوں پر مرکوز تھیں اور کچھ دیر کے لیے سب کچھ مجھ سے اوجھل ہو گیا تھا لیکن یہ بس چند لمحوں کا پردہ تھا۔ ابا جان کا چہرہ میری آنکھوں میں منڈلانے لگا۔ کالنتے، زورا، جمرو یا شامو سے کچھ پوچھنے کا محل نہیں تھا۔ میں نے کسی کو نہیں ٹوکا۔ کچھ دیر بعد یہ ہنگامہ ختم ہو جاتا تھا۔ رات آگے ہی بڑھ رہی تھی۔

لیکن اُنھیں گزرتے ہوئے وقت کا احساس نہیں تھا۔ وہ دونوں نوجوان ابھی گئے تھے، اور چائے تقسیم کی جا رہی تھی کہ نوجوانوں کی جگہ ایک شعبدے باز نے لے لی۔ پہلے اُس نے سکوں سے بھرا ہوا ہاتھ سب کو دکھایا اور مٹھی بند کر کے اُچھالنے کے انداز میں کلائی کو جھٹکا دیا، پھر مٹھی کھول دی۔ سکے گرنے کی آواز نہیں آئی، ہاتھ بھی خالی تھا۔ اُس نے اِدھر اُدھر چکر لگانا شروع کیا اور کسی کے کان مروڑ کے، کسی کی بغل، کولھے اور سینے میں چٹکی بھر بھر کے سکے برآمد کرنے لگا۔ ایک آدمی کا سر جھٹک کے اُس نے کئی بار اُس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا، آدمی کے سر سے سکے بیروں کی طرح ٹپاٹپ گرنے لگے۔ اُس نے اِس قسم کے اور کرتب بھی دکھائے۔

شعبدے باز کے بعد ایک سلسلہ بندھ گیا، ایک جاتا نہیں تھا کہ دوسرا آ جاتا تھا۔ شولی کی طرح ساز بجانے اور تان اُٹھانے والے۔ کوئی سامنے آتے ہوئے ہچکچاتا تو وہ اُس کے اوپر پیچھے پڑ جاتے۔ کوئی اُنھیں بے لطف کر دیتا یا زیادہ بھیڑ کے اکتاہٹ کا سبب بننے لگتا تو وہ فقرے کستے۔ وہ شخص اگر پھر بھی رُکا رہتا تو اُسے باقاعدہ گھسیٹ کے اپنی نگاہوں سے دُور کر دیتے۔

میں کن انکھیوں سے بار بار بِجّھل کی جانب دیکھتا تھا کہ شاید اُس کے چہرے پر کچھ نظر آ جائے، مجھے یقین تھا کہ کسی وقت بھی بِجّھل کالے دادا کو یہیں تک اکتفا کرنے اور باقی کسی دوسرے وقت پر اُٹھا رکھنے کا اشارہ کر دے گا۔ میری اور پیرو کی تھکن کے علاوہ اُسے یہ احساس بھی ہوگا کہ یہاں آنے کے بعد مجھے کتنی باتیں جاننے کی بے تابی ہوگی، خود اُسے بھی ہم سے باتیں کرنے اور حویلی میں پیش آنے والے شب و روز جاننے کی کچھ کم بے چینی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ سب کچھ تو پھر کسی وقت بھی ہو سکتا ہے۔ بِجّھل نے کل ہی صبح حیدرآباد سے نکل جانے کا ارادہ نہیں کر رکھا ہوگا۔ ایسا ہوتا تو اس بزم آرائی کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ اُس نے کسی سے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ بِجّھل آنکھوں سے سب کچھ دیکھتا رہا، مسکراتا رہا، بھولے دادا اور پیرو سے باتیں کرتا رہا۔ اُس کی دل جمعی دیکھ کے اُن کے حوصلے اور بڑھ گئے ورنہ اُس کے ماتھے کی ایک شکن ہی اُن کے لیے کافی ہوتی۔ کالنتے، جمرو، زورا اور شامو بھی آنے جانے والے بازی گروں کی بازیوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ کسی دلچسپ منظر پر وہ مجھے کہنیاں ملنے اور گدگدانے لگتے۔ پیرو نے غسل کیا تھا، نہ کپڑے بدلے تھے، اُنھی گندے کپڑوں میں بیٹھا ٹھٹھے مار رہا تھا۔ آٹھ دس آدمی اپنے جوہر آزما چکے تھے اور ابھی کچھ طے نہیں تھا کہ وہاں کتنے ہنرمند چھپے ہوئے ہیں۔ یہ سلسلہ صبح تک ختم ہونے والا نظر نہیں آتا تھا۔ بے شک یہ سب کچھ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ جبھی تو اتنے لوگ اتنے چلبلے لوگ ٹس سے مس نہیں ہو رہے تھے۔ کبھی کبھی تو بازی گر آنکھیں خیرہ کر دیتے تھے، میرے لیے تو بہت کچھ نیا تھا۔ اِس سے پہلے میں نے ایسے کرتب کبھی نہیں دیکھے تھے۔ بمبئی میں ایک مرتبہ کرشنا بی مجھے سرکس دکھانے لے گئے تھے، ایک دو مرتبہ نوٹنکی میں بھی۔ اِس کے سوا مجھے کبھی موقع نہیں ملا۔ ہاں جیل میں کبھی کبھار ایسے شعبدے باز آ جاتے تھے۔ میں نے بھی ہر طرف سے دھیان ہٹا کے اُنھی پر نگاہیں مرکوز رکھنے کی کوشش کی لیکن مجھے بیٹھے بیٹھے جانے کیا ہو جاتا تھا، میرا سارا جسم دھڑکنے لگتا تھا۔ ایک بار تو میں نے اُٹھنے کا پکّا ارادہ کر لیا۔ میں نے سوچا، کوئی بھی بہانہ کر دوں۔ کہہ دوں کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ یقیناً کالنتے بھی میری وجہ سے اُٹھ جائے گا لیکن میں یہ سوچ کے چپ بیٹھا رہا کہ میرے اس طرح چلے جانے سے کہیں سب کچھ درہم برہم نہ ہو جائے۔ ایک میری وجہ سے اتنے بہت سے آدمی کیوں متاثر ہوں۔ حویلی میں بھی تو اتنے دن گزارے ہیں مگر حویلی کی بات اور تھی۔ وہاں کسی طرح صبر آ جاتا تھا، یہاں تو سبھی پاس بیٹھے تھے۔ مجھے بِجّھل اور کالنتے کے چہروں پر چھایا ہوا سکون سراب سا محسوس ہو رہا تھا۔ دیر ہو گئی۔ آخر مجھ سے ضبط نہ ہوا۔ کالنتے کھسکتا ہوا مجھ سے اور قریب ہو گیا تھا۔ میں اُس سے کچھ کہنے کے لیے لفظ ڈھونڈ رہا تھا کہ وہ ٹٹولتی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا: "کیا ہے لاڈلے! کیا بات ہے؟"

"کالنتے بھائی!" میں نے ڈوبتی آواز میں کہا: "یہ... یہ لوگ کب جائیں گے؟"

"کیوں جانی؟" وہ پلکیں پٹ پٹاتے ہوئے بولا: "کیا نیند آ رہی ہے؟"

"نہیں۔"

"دیکھ نہیں رہا ہے، سالے ایک دم جنگلی ہو گئے ہیں۔ ایسی باتیں کب آتی ہیں۔ اُس کن کٹے کو دیکھا، اپنے شولی سے کچھ نیچی تان نہیں اُٹھاتا۔"

میں سر ہلا کے رہ گیا۔

"تجھ کو اچھا نہیں لگ رہا ہے کیا؟" وہ بے چینی سے بولا۔ "اچھا تو معلوم ہوتا ہے، سب سے زیادہ بِجّھل بھائی کو لگ رہا ہے۔"

"ہاں!" بجّھل کی طرف نظریں گھماتے ہوئے وہ تیزی سے بولا اور چونک پڑا۔ میرے لہجے کا احساس اُسے بعد میں ہوا۔ "پر اُستاد کی بات جانے دے۔" وہ جھک کے کہنے لگا۔ "اس کو کیا اُلٹا سیدھا، نیچے اُوپر لگتا ہے کسی کو کچھ پتہ نہیں چلتا۔"

"لیکن بیٹھے تو وہ ایسے جم کے ہیں جیسے..." میں تذبذب سے اُس کا چہرہ دیکھا کیا۔

"ہاں"۔ وہ آنکھ مار کے بولا۔ "ابھی آگا پیچھا بھی کچھ کانٹے پر رکھنا پڑتا ہے، اِدھر سالا آمنے سامنے سب آن جانا ہے۔ سمجھا کر جانی!" وہ رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "اُستاد کی آنکھوں سے دیکھ۔"

"تم، تم کیا......"

اُس نے زور سے میرا پیر دبایا اور سامنے کھڑے ہوئے آدمی کی طرف توجہ دلانی چاہی۔ اُس آدمی نے اپنے کندھے، سر اور بازوؤں پر پورے پانچ آدمی بٹھا رکھے تھے اور اُن کا بوجھ اُٹھائے اُٹھائے دائرے میں گھوم رہا تھا۔ پانچوں آدمی ایک دوسرے سے چھیڑ خانیاں کر رہے تھے۔ کانتے کی باتوں نے مجھے اور مضطرب کر دیا تھا۔ "تم مجھے صاف صاف کیوں نہیں بتاتے؟" میں نے اُسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ "کوئی ایسی ویسی بات تو...."

"نہیں رے"۔ وہ سر جھٹک کے بولا۔ "کوئی نہیں۔"

"پھر تم اس طرح کی باتیں کیوں کر رہے ہو؟"

"ٹھیک ہی بول رہا ہوں لاڈلے!" اس نے نرمی سے کہا۔ "ہر جگہ کا رُت موسم ایک سا نہیں ہوتا۔"

"تمھاری کوئی بات میرے پلّے نہیں پڑ رہی ہے، معلوم ہوتا ہے تُم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔"

"کانتے تجھ سے کچھ چھپائے گا بُلبل!" وہ ہنس کے بولا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے جس کا جاننا تیرے لیے ایسا جلدی ہو۔ میں سمجھ رہا ہوں، تیرے کو بابا کی دھڑکن لگی ہوئی ہے، میں تجھ کو شروع میں بول دیا تھا، وہ ایک دم ٹھیک ہیں اور اِدھری شہر میں ہیں۔"

"مگر وہ ہیں کہاں؟"

"اپنے گھر میں۔" وہ تیکھے لہجے میں بولا۔

"اپنے گھر میں!"

"بابا نے اِدھر محل برابر اُونچی حویلی خریدی ہے۔" وہ ہاتھ پھیلا کے بولا۔ "ماڈی ماسٹر اور ٹنگو اُدھری اُن کے ساتھ ہیں۔"

"حویلی خرید لی ہے؟"

"ہاں، لمبی کہانی ہے، تجھ کو ایک ایک بات بول دوں گا پر ذرا نچلا ہو کے بیٹھا رہ۔ پتہ نہیں، یہ چھلیا پھر کب دیکھنے کو ملیں، کچھ دیر کی بات اور ہے۔"

"ان کا کوئی بھروسا نہیں، ساری رات لگا دیں،

لگا دیں سالے۔" وہ مچل کے بولا۔

"کیا تم تھوڑی دیر کے لیے اٹھ نہیں سکتے؟"

"ایسا کیسے؟" وہ تنک کے بولا اور مجھے سمجھانے لگا۔ "تیرے آنے پہ تو سو نیٹے ہوئے ہیں لَلوا! نوشہ ہی بیچ سے اٹھ گا تو براتی کدھر جائیں گے، کیا بولیں گے، اُستاد الگ منہ بنا[...] اُس نے اوّل دن ہی اِن لوگ کو بول دیا تھا کہ پہلے لاڈلے کو [...] دو۔" کانتے وہی کچھ کہنے لگا جو میں نے خود سے کہا تھا۔ میری [...] دھپ مارتے ہوئے بولا۔ "چلنے دے جانی! اب اکٹھا ہی اُٹھ[...] تھوڑی دیر ان حرام خوروں کو اور ستانے دے۔ دیکھ نہیں رہا۔ اُستاد بھی آج کیسا بندھا بیٹھا ہے۔"

"سب دیکھ رہا ہوں۔" میں نے ترشی سے کہا۔

"پر آنکھوں سے ہی دیکھ رہا ہے نا؟"

اِس لیے کہ صرف انھی سے نظر آ رہا ہے۔"

اُس نے مجھے چمٹا لیا۔ "رُوٹھ گیا سجناں!"

"روٹھنے کی اس میں کیا بات ہے کانتے بھائی!"

"تو بولتا ہے تو میں اُٹھ جاتا ہوں۔"

"نہیں، بیٹھے رہو۔ شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ [...] بھائی کو بُرا لگ سکتا ہے۔ وہ چاہتے تو انھیں روک سکتے تھے کہ [...] پہ رکھیں، اُن کا اشارہ ہی کافی ہوتا مگر مگر...."

"مگر اُستاد ایسا نہیں چاہتا۔"

"کیوں؟" میں نے تندی سے پوچھا۔ "آخر ایسی کیا با[...]

"تو اُدھر بارہ دن حویلی میں لٹکا رہ کے بھی یہ پوچھتا [...] ہم کو آئے چھ دن ہو گئے۔ باہر تھے پر اِدھر ہم بھی جکڑے ہی رہے ہیں، کوئی اور جگہ ہوتی تو سالی کیا اتنی دیر لگتی؟ گِھس کرنا پڑتا؟ ابھی ہم لوگ اِدھری ہیں اور جب تک دانہ پانی زور کرتا ہے، تب تک...." وہ بھناتی آواز میں "سارا گودا نکال کے آیا ہے کیا، اتنی دیر سے کیا بول رہا[...]"

میں نے پھر اُس سے کوئی حجت نہیں کی۔

"اور ایک بات دھیان میں رکھ، اڈّے کا مالک اب [...] نہیں، بھولے دادا ہے۔ تیرے سامنے ہی اُستاد نے ہتھیار اُس [...] ڈالا ہے، ساری رات کیا، ساری عمر گزر جائے گی، جب تک بھو[...] اِدھر بیٹھا ہے، اُستاد منہ سے کچھ نہیں پھوٹے گا، تو اُس کی رگ رگ [...] واقف ہے پھر ایسا کیوں بولتا ہے۔"

میں اُس سے پوچھنا چاہتا تھا، یہ بھولے دادا کون [...] میں نے اپنی زبان بند رکھی۔

درمیان سے بیک وقت پانچ آدمیوں کا بوجھ سہارنے وا[...] ہٹ چکا تھا اور اُس کی جگہ کمر میں رنگین ٹکے باندھے ہوئے تین [...]

[...]نے لے لی تھی مگر ابھی وہ سامنے ہی آئے تھے، اُنھوں نے اپنا [...]ماشا شروع نہیں کیا تھا کہ عمارت پر ایک لحظے کے لیے سکتہ سا طاری [...]ہو گیا۔ عمارت کے باہر سے یکایک متعدد دھماکے سُنائی دیے تھے۔ [...]سب پلٹ کے دروازے کی طرف دیکھنے لگے اور اُسی دم وہاں کوئی [...]جھماکا سا ہوا۔ زرق برق لباس میں ملبوس تین عورتیں دروازے پر [...]نمودار ہوئیں، اُن کے پیچھے سازندے اور ایک ساتھ بہت سے آدمی [...]اندر داخل ہوئے۔ ساری عمارت میں سیٹیاں گونجنے لگی تھیں، اُس پہ [...]تالیوں کی آوازوں نے ایک تلاطم سا اُٹھا دیا تھا۔ لوگوں نے عورتوں [...]کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ دروازے سے چوکی تک کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا [...]تاہم انھیں ہم تک پہنچنے میں دیر لگی۔ اُن میں ایک ادھیڑ عمر عورت [...]آگے تھی، دو لڑکیاں اُس کے عقب میں۔ تینوں کے رخساروں پر سُرخ و [...]سفید رنگ دمک رہا تھا، پلکوں پر تارے اور کانوں میں آویزے جگمگا [...]رہے تھے۔ دونوں کے قد نہ زیادہ چھوٹے تھے نہ بڑے۔ بس درمیانے [...]تھے۔ عورت بڑے قد کی تھی۔ تینوں نیچے تُلے قدموں سے سر اُٹھائے [...]نگاہیں جھکائے آئی تھیں۔ چوکی کے پاس آ کے وہ ٹھہر گئیں، اُنھوں نے [...]شائستگی سے بجّھل کو تسلیمات کی۔ بجّھل نے کسمساتے ہوئے بھولے دادا [...]کی طرف اشارہ کیا۔ وہ کچھ ٹھٹک سی گئیں مگر دوسرے ہی پل اُنھوں نے [...]سی انداز سے بیچ میں بیٹھے ہوئے بھولے دادا کو آداب کیا۔ اُن کے [...]ساتھ سازندے بھی تھے۔ بجّھل نے متردّد نگاہوں سے کالے دادا کی طرف [...]دیکھا۔ اُسی وقت آگے کھڑی ہوئی عورت نے شرمیلے سے لہجے میں [...]سے مخاطب کیا۔ "بندی کو تارا کہتے ہیں، شاید اُستاد نے نام سُنا ہو، [...]ی بازار میں غریب خانہ ہے۔"

اُس کی آواز بکھر رہی تھی اور نہایت شستہ تھی۔ "بندی پہلے [...]ہی دن خدمت میں حاضری دیتی لیکن بتایا گیا کہ سرِدست رسائی [...]ممکن نہیں۔ پھر جانے کیوں یہ خوش فہمی رہی کہ شاید اُستاد ہی کسی دن [...]راستہ بھول جائیں۔ یہاں بازار میں سب آپ کو دعائیں دیتے ہیں، [...]مشکل وقت گزارا ہے یہاں سبھی نے، کوئی آزمائش سمجھ کے۔ بندی کیا [...]کیا عرض کرے، یہ اِس کا موقع محل نہیں ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے خدا [...]کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ بُرے دن آخر ٹل گئے، ایسے دن جو [...]یہاں کبھی کسی نے دیکھے نہیں تھے، سُنے نہیں تھے۔ بازار کا ہر گھر اُستاد [...]کے پاس آنے اور اپنی خوشی کا اظہار کرنے کے لیے بے تاب ہے۔"

بجّھل نے اپنا بھاری سر ہلایا۔ "اِن کو کیوں تکلیف دیا ہے کالے؟" اُس نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کالے دادا سے کہا۔

"بخدا ہم اپنی خوشی سے آئے ہیں۔" وہ جھلملاتی آواز میں بولی۔ [...]ابھی کچھ دیر پہلے معلوم ہوا کہ چھوٹے میاں تشریف لے آئے ہیں اور اب [...]حاضری پر کوئی بندش نہیں ہے، بندی سے پل بھر نہ ٹھہرا گیا۔ ہم اجازت [...]کے بغیر آ گئے، ہر تسلیم قدا [...] آمد کی مبارک باد۔

خوشی کی اس گھڑی میں ہم کیوں کسی سے پیچھے رہتے۔"

"لیکن رات بہت ہو گئی ہے بیگم۔" بجّھل نے بوجھل لہجے میں کہا۔

"رات تو اب شروع ہوئی ہے سرکار!" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "صرف آپ کی اجازت مطلوب ہے، اپنی اِن دو بچیوں کو میں نے کچھ سکھانے کی، جو کچھ بھی بندی کو آتا ہے، اِن کے سپرد کرنے کی کوشش کی ہے مگر یہ فیصلہ تو پرکھنے والی نگاہیں ہی کر سکیں گی کہ اِنھوں نے یہ میراث کتنی قبول کی ہے۔ کچھ کیا بھی ہے یا نہیں، ناچیز کی رائے میں اُستاد کو سُر تال نرت بھاؤ کی خوب پرکھ ہے، بڑا بول ہو تو خدا مجھے معاف کرے۔ بندی کو اُمید ہے، شاید یہ نو آموز اُستاد کو مایوس نہ کریں، کوئی کسر رہ گئی ہو تو ان کی عمروں کا لحاظ کر لیجیے گا۔"

"مگر، مگر۔" بجّھل نے اِدھر اُدھر نگاہیں گھماتے ہوئے کہا۔ "بھولے دادا کے ہوتے ہم کیا بول سکتے ہیں۔"

"اپن، اپن کیا۔" اپنے نام پر بھولے دادا سٹ پٹا سا گیا اور لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔ "رات بہت ہو گیا ہے تارا بائی!"

لوگوں نے بے تحاشا شور مچانا شروع کر دیا۔ بھولے دادا چند لمحوں تک پس و پیش میں پڑا رہا، کبھی بجّھل کو دیکھتا، کبھی تارا بائی کو اور کبھی اُدھم مچانے والوں کو۔ آخر اُس نے اجازت کے لیے ہاتھ اُٹھا دیے۔ تینوں نے سر خم کر کے اُس کا اور بجّھل کا شکریہ ادا کیا پھر اُلٹے قدموں چوکی سے کچھ فاصلے پر چلی گئیں۔ کلکتے، فیض آباد یا بمبئی کا اڈّا ہوتا اور محفل کیسی ہی گرم کیوں نہ ہوتی، بجّھل کی خواہش نہ ہوتی تو انھیں روکنے میں وہ ایک ثانیے کی دیر نہ کرتا، ایک آواز بھی نہ اُٹھتی۔ صرف بھولے دادا کی بات نہیں تھی۔ بجّھل کو اُس کا پاس مانع ہوتا تو وہ کسی طور بھولے دادا پر اپنی ناآمادگی کا اظہار کر سکتا تھا۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے، اُس کے چہرے سے بھی یہی بے دلی نمایاں تھی۔ اندر کچھ اور ہو تو نہیں کہہ سکتا۔ کانتے ٹھیک ہی کہہ رہا تھا، کوئی ایسی ہی بات تھی جو بجّھل یوں اپنے آپ کو سمیٹے بیٹھا تھا۔ وہ لوگ اگر اڈّے کے نئے اُستاد کے سامنے اپنی خوشی جتانے کے لیے بے تاب تھے تو بجّھل کو بھی اُن کی خوشنودی بہت مطلوب معلوم ہوتی تھی، ایسا بھی ہو سکتا ہے جب اڈّے کا نیا اُستاد اڈّا حاصل کرنے کے بعد کسی چیز کی کمی محسوس کرتا ہو۔ اب کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہا تھا۔ وہی جو کانتے بتا رہا تھا اور جو میں نے یہاں آ کے خود دیکھا تھا لیکن جیسے جیسے سِرے ملتے جا رہے تھے، گرہیں اور بڑھتی جا رہی تھیں۔ معلوم نہیں، یہاں آنے کے بعد بجّھل کو کن دیواروں کا سامنا کرنا پڑا ہو گا۔ ایک سامنے کی بات میرے ذہن سے بار بار اوجھل ہو جاتی تھی کہ بجّھل کو حیدرآباد آئے چھ دن ہو گئے تھے پھر بھی وہ نواب عالم تاب کی حویلی تک نہیں آ سکا تھا۔

لوگ اور پیچھے ہٹ گئے۔ درمیان کی جگہ کچھ اور چوڑی ہو گئی۔ اُنھوں نے آناً فاناً کھلی زمین پر دریاں بچھا دیں اور چاندنیاں یہاں

سے وہاں تک پھیلا دیں۔ سازندے چوکی کی طرف پشت کر کے بیٹھ گئے۔ تارا بائی نے دیر نہیں لگائی، لے اُٹھانے لگی... پہلی ہی تان سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اُس کی آواز کتنی اچھی ہو سکتی ہے مضطرب سی آواز تھی۔ شروع میں وہ بس سُر الاپتی رہی اور گم سی ہو گئی۔ مجمع کو بھی جیسے سانپ سونگھ گیا۔ عمارت میں ہر طرف اُسی کی آواز گونج رہی تھی۔ چوکی سے کچھ دُور وہ عین ہمارے مقابل بیٹھی ہوئی تھی۔ دونوں لڑکیاں اُس کے دائیں بائیں تھیں۔ وہ شرمائی شرمائی، کسی قدر حیران حیران اور کچھ سہمی ہوئی بھی نظر آ رہی تھیں۔ ممکن ہے اتنے بڑے ہجوم اور ایسے لوگوں کے سامنے آنے کا پہلا اتفاق ہو، ویسے بھی وہ نئی نئی لگ رہی تھیں جیسے کسی گھر سے اُٹھ کے آ گئی ہوں، ایسے گھر سے جہاں لڑکیاں چار دیواری میں بند رہتی ہوں۔ کوئی بھی انھیں کسی اور جگہ دیکھے تو یہی سمجھے کہ ان کا تعلق کسی اچھے اور بڑے گھرانے سے ہوگا، یہ حقیقت تصور میں بھی نہ آئے کہ ان کا تعلق بازار سے ہو سکتا ہے مگر بازار کے جیسے الگ کب بنائے جاتے ہیں، بھلا فمی کو دیکھ کے کون کہہ سکتا تھا۔ اُس کا تعلق بھی تو بازار سے تھا، شہ پارہ بھی انھی کی طرح تھی، نیساں بھی۔ تارا بائی انھیں اپنی بیٹیاں بتا رہی تھی۔ چمپا بھی فمی سے اپنا یہی رشتہ ظاہر کرتی تھی اور اپنی بیٹی کو کُھلے عام گواتی نچواتی تھی۔ ہو سکتا ہے، تارا بائی بھی اُن کی ایسی ہی ماں ہو۔ ہو سکتا ہے لڑکیاں اُسے یُوں ہی مل گئی ہوں جیسے چمپا بائی کو فمی مل گئی تھی، انھیں بھی کسی نے کسی ایسے گھر سے لے جا کے تارا بائی کے ہاں پہنچا دیا ہو گا جس کے مرد مر گئے ہوں یا اندھے ہو گئے ہوں، جس گھر کا کوئی بھائی سب کو چھوڑ کے چلتا بنا ہو اور کوئی باپ پاگل ہو گیا ہو۔ اُسی گھر کے لوگ مارے مارے پھرتے ہیں جہاں پاسبان ٹھیک نہیں ہوتے۔ میں نے گھر سے چلتے وقت سب کچھ ابا جان پر چھوڑ دیا تھا کہ ابا جان تو موجود ہی ہیں، مجھے اُس وقت یہ خیال کیوں نہ آیا کہ میرے پیچھے ابا جان کو خدا نخواستہ کچھ ہو جائے تو باقی گھر والوں کو کون پوچھے گا۔ بے شک گھر میں میرے رہتے ہوئے بھی مجھے کچھ ہو سکتا تھا، آدمی کسی وقت بھی معذور ہو جاتا ہے، مر جاتا ہے لیکن ایسے میں ایک قرار آ جاتا ہے کہ جو کچھ اپنے بس میں تھا اُس میں تو کوتاہی نہیں کی۔ میرے بس میں اتنا تو تھا کہ گھر میں رہ سکوں مگر یہ بھی کہاں تھا۔ گھر سے چلتے وقت میں اپنے ہوش میں کب تھا۔ میں تو اُسی وقت سب کے لیے مر گیا تھا۔ بے اختیار آدمی اور مُردہ آدمی میں کیا فرق ہے۔ پنجرے میں بند پرندے کے پر دکھاوا ہوتے ہیں، آدمی بھی تو پنجروں میں بند ہوتے ہیں، یہ پنجرے کسی کو نظر نہیں آتے، اپنے آپ کو بھی نہیں مگر ہوتے پنجرے ہی ہیں۔ میں گھر سے اپنا اختیار حاصل کرنے کے لیے نکلا تھا، مجھے کیا معلوم تھا کہ آگے جا کے کیا ہو جائے گا۔

کچھ دیر تک تارا بائی خود گاتی رہی گویا اپنی آواز جگا
پھر لڑکیوں نے اُس کی لے میں لے ملانی شروع کی۔ لوگوں کی
اور آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ وہ تارا بائی کا گانا سننے کے
ہیں۔ میں نے تجمل، پیرو، جامو اور کانتے وغیرہ کو اکثر گا
بارے میں باتیں کرتے سُنا تھا، گانے کی جو خوبیاں وہ گِنات
آواز کا اُتار چڑھاؤ، گداز، رس، نشہ اور گونج وغیرہ تارا بائ
میں اتنا کچھ تو نہیں تھا پھر بھی اُس کی آواز میں کوئی ایسی
ضرور تھی کہ سب ہمہ تن گوش تھے۔ سویرا ہو جانے میں اب
نہیں تھا مگر لوگ تارا بائی کی آواز سے بیدار اور تازہ دم نظر
تھے۔ دیر تک وہ تینوں ایک دوسرے کی آواز میں آواز ملا
رہیں پھر لڑکیاں اُٹھ گئیں۔ گھنگرو انھوں نے پہلے سے با
تھے۔ تارا بائی نے ستار سنبھال لیا اور لڑکیاں اُس کی آواز
ناچنے لگیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے تارا بائی کی آواز اُن کے ہاتھ
گئی ہے، اُن کے بدن میں بجلی ہو گئی ہے۔ وہ کٹھ پتلیا
کی ڈوری تارا بائی کی تحویل میں ہے۔ تارا بائی جدھر چاہتی
گھماتی رہتی ہے۔ تارا بائی گا رہی تھی ؎

بھویں تنی ہیں، خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

ساز بھی اُس کی آواز کے ساتھ رَل مل گئے۔ لوگ بُری طر
پھڑکنے سے لگے۔ لڑکیاں کُھلے دائرے میں ہر طرف ناچ
مگر اُن کی بیشتر توجہ چوکی پر بیٹھے ہوئے لوگوں کی جانب
ہی شعر پر لوگ نوٹ اور چاندی کے روپے لُٹانے لگے
نے ناچنے کے ساتھ تارا بائی کے سُر میں سُر ملا کے گانا ش
ساری عمارت میں آگ سی لگ گئی۔ ہر جانب سے لوگ
طرف متوجہ کرنے کے لیے نوٹوں اور سکّوں کی جھلک دکھ
وہ تھرکتی ہوئی کبھی اِدھر جاتیں کبھی اُدھر۔ لڑکیاں جس کے
پہنچتیں، وہ انگلیوں میں تھما ہوا نوٹ اُوپر نیچے دائیں
رہتا۔ لڑکیاں اُس وقت تک اُس کے سامنے ناچتی ر
تک وہ اپنے روپے سے دست بردار نہ ہو جاتا۔ پھر ابھی
ہٹتی نہیں تھیں کہ پھر وہی شخص یا قریب کا کوئی اور شخص
نکال کے جھٹ اُن کے آگے کر دیتا۔ انھیں دیکھ کے بار با
فمی کا دھیان آ رہا تھا جیسے فمی روپ بدل کے میرے سا
ہو۔ وہ بھی ایسے ہی لہک لہک کے اور ٹھمک ٹھمک کے
سے روپے لیتی ہو گی، اُن کے فقروں اور طرح طرح کی حرکتو
طرح مسکرا کے رہ جاتی ہو گی۔ وہ نواب جو فمی کو مستقل ا
چاہتا تھا، اُس نے مجھے بتایا تھا کہ فمی سب سے الگ تھی۔
حسین اور کھوئی کھوئی سی، اپنے بالاخانے تک محدود رہتی

کوچوں میں ایسے نہ ناچتی گاتی ہو مگر گھر تو اُس کا بالاخانہ
تھا۔ گلی کوچوں کے لوگ جہاں جاتے ہیں، اُسی طرح کی باتیں
تے ہیں۔ اُس کے بارے میں جامو کے کہے ہوئے لفظ بھی مجھے اچھی
ح یاد تھے۔ جامو ہمیں زرین کی حویلی ملنے کا جشن منانے چمپا بائی
بالاخانے لے گیا تھا۔ راستے میں اُس نے فمی کے لیے کیا کچھ کہا
ا، ایک ایک لفظ میرے سینے میں پیوست تھا۔

لوگوں کا بس نہیں چلتا تھا کہ اُنھیں کھا جائیں، وہ ایسی ہی نظروں
سے اُنھیں دیکھ رہے تھے۔ تارا بائی نے دوسری غزل چھیڑی۔ ایک
یک کالے دادا ایک طرف سے اُچھلتا، دہاڑتا میرے پاس آیا۔
ں نے جیب سے مٹھی بھر نوٹ نکال کے میرے سر پہ رکھ دیے۔ مجھے
کل اچھا نہیں لگا، میرے جی میں آئی کہ اُسے اُٹھا کے چوکی سے نیچے
پھینک دوں لیکن اُس کا چہرہ دیکھ کے میرا جسم اندر ہی اندر پھڑپھڑا
کے رہ گیا۔ کالے دادا کِھلا جا رہا تھا۔ دونوں لڑکیاں سیدھی چوکی
پر چلی آئیں۔ لوگ اِدھر اُدھر ہو گئے۔ چوکی پہ خاصی گنجائش نکل آئی۔
دونوں میرے سامنے آ کے بیٹھ گئیں۔ میں سر تا پا پسینے میں نہا گیا۔ وہ
مجھ سے کوئی ایک قدم کے فاصلے پر بیٹھی مسکرا مسکرا کے گانے لگیں۔
اتنے قریب سے میں نے اُنھیں اب دیکھا تھا۔ دونوں کے چہروں پر
سُرخ رنگ دہک رہا تھا، آنکھوں میں چنگاریاں سی لپک رہی تھیں۔ وہ سر سے
پیر خوشبو میں بسی ہوئی تھیں۔ ان کے بدن پارا پارا سے تھے۔ گانے کے
ساتھ وہ بیٹھے بیٹھے ناچ بھی رہی تھیں، اُن کے بازو جیسے ہوا میں بہے
جا رہے تھے اور میری ہی طرف پھیلے ہوئے تھے، میرے حواس منتشر ہو
گئے۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی لیکن ہر لمحے گمان
ہوتا تھا کہ فمی میرے سامنے آ کے بیٹھ گئی ہے، یہ لڑکیاں فمی کی ساری
بات جانتی ہیں اور انھیں میرے پاس دانستہ بھیجا گیا ہے۔ مجھے اپنا چہرہ
اُن کی تیز، شعلہ بار نظروں سے چھپانے کے سوا کچھ سجھائی نہ دیا۔ جلد ہی
مجھے اپنے سر پہ اُن کے ہاتھوں کا لمس محسوس ہوا۔ انھوں نے روپے
اُٹھا لیے تھے لیکن میرے پاس سے اُٹھی نہیں تھیں۔ کالے دادا کے
بعد نہ معلوم کون شخص تھا جس نے اُس کے ہٹتے ہی روپے میرے کان
پر رکھ دیے۔ پھر کیا تھا، کوئی میرے گالوں پہ، کوئی ٹھوڑی پہ، کوئی
ہونٹوں پہ اور کوئی سینے پر روپے رکھنے لگا۔ لڑکیاں پہلے تو اُچکتے ہوئے
انداز میں اُنگلیوں سے روپے کھینچتی رہیں پھر انھوں نے چٹکیاں بھرنی
شروع کر دیں۔ لوگوں نے شور مچایا، وہ باقاعدہ مجھے نوچنے لگیں، جیسے
ہی میرے چہرے سے روپے لینے کے لیے اُن کے ہاتھ دراز ہوتے، عمارت
میں قہقہے گونجنے لگتے۔ گانے کی آواز شور میں دب جاتی۔ میرا سارا جسم
اینٹھ گیا۔ ارادے کے باوجود مجھ میں اتنی سکت نہیں تھی کہ اُنھیں دھکے دے
کے خود سے دُور کر سکوں اور یہاں سے بھاگ نکلوں، اپنا گریبان چاک کر

لوں، اپنے آپ کو نوچنا کھسوٹنا شروع کر دوں۔ میں سر جھکائے ساکت جامد بیٹھا رہا اور میری رگوں میں خون سلگتا رہا۔ پھر اُنھی میں سے کوئی اور شخص آیا، اُس نے میرے سر پر سکّوں سے بھری ہوئی تھیلی لوٹ دی۔ سکّے کھن کھناتے ہوئے میرے چاروں طرف بکھر گئے۔ میں نے وحشت سے تجمل کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے گُنگ بیٹھا تھا البتہ پیرو کی نظریں مجھ پر مرکوز تھیں اور اُس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اُسی نے کالے دادا سے کچھ کہا ہو گا کہ پھر کوئی میرے پاس نہیں آیا۔ جس شخص نے سکّوں کی تھیلی لوٹی تھی وہ بازار کا چودھری تھا جس کی نذر تجمل نے واپس کر دی تھی۔ دونوں لڑکیاں تھوڑی دیر تک بیٹھی گاتی رہیں پھر چوکی سے اُتر کے لوگوں کے درمیان چلی گئیں۔

چوکی پر سکوت چھا گیا لیکن مجمع اُن کی واپسی پر اُچھلنے کودنے لگا۔ دائیں طرف کھڑا ہوا ایک شخص کچھ اور بے کل ہو گیا، وہ دونوں ہاتھ اُٹھا کے مٹکانے لگا۔ اُس کے ہاتھوں میں گڈیاں تھیں۔ کچھ دیر پہلے بھی اُس نے لڑکیوں پر بہت سے روپے نچھاور کیے تھے، اِس طرح لڑکیوں کو دیر دیر تک اپنے پاس روکے رکھا تھا۔ اب بھی اُس کے مضطرب تیوروں میں یہی تڑپ چھپی معلوم ہوتی تھی کہ وہ کسی اور طرف نہ جائیں، اُسی کے سامنے ناچتی گاتی رہیں۔ دو ایک مرتبہ اُس نے لڑکیوں کے بڑھے ہوئے ہاتھ پکڑنے کی کوشش بھی کی تھی اور انھیں طرح طرح کے اشارے کر رہا تھا۔ کبھی سینے پہ ہاتھ مارتا، کبھی ٹھنڈی آہیں بھرتا، کبھی دیوانوں کی طرح سر جھکا لیتا۔ اُس کی آنکھوں کے خمار اور اضطراب سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ وہ کوئی نشہ کیے ہوئے ہے۔ شاید وہ تارا بائی کے پیچھے پیچھے آیا تھا اِس لیے کہ ابتدا میں اُسے میں نے کہیں نہیں دیکھا یا ممکن ہے، میری نظروں سے وہ اوجھل رہا ہو۔ اُس نے اچانک آگے آ کے روپے لُٹانے شروع کیے تھے، تبھی میں نے اُسے دیکھا تھا۔ اُس کے اِرد گرد کے لوگ اُس کا خیال کر رہے تھے۔ ڈیل ڈول میں وہ چوڑا چکلا تھا، ہاتھ پیر کا سجل، چہرہ بڑا اور کھُردرا سا، عمر تیس کے قریب۔ اڈّے سے متعلق معلوم بھی ہوتا تھا نہیں بھی۔ چوکی سے واپس جانے کے بعد لڑکیاں اُس کی طرف جانے کے بجائے کسی اور طرف چلی گئیں۔ وہاں کچھ اور لوگ روپے ہاتھ میں دبائے منتظر تھے۔ یہ بات اُسے ناگوار گزری، اُس نے تلملاتے ہوئے انھیں اپنی طرف آنے کا ایک طرح سے حکم دیا۔ لڑکیاں اُسے دیکھ کے مسکرائیں اور آنکھوں آنکھوں میں تحمل کا اشارہ کیا مگر اُس کی بے چینی کم نہیں ہوئی۔ وہ مچلتا، بڑبڑاتا رہا۔ لڑکیوں کو دوسری طرف روپے بٹورنے سے فرصت نہیں مل رہی تھی۔ وہ شخص انتہائی بے تاب ہو گیا، خود اُن کے پاس جانے کے لیے رسّیاں تڑانے لگا، بہر حال اُس کے قریب کھڑے ہوئے لوگوں نے کسی نہ کسی طور اُسے روکے رکھا۔

کچھ دیر بعد لڑکیاں پھر اُس کے پاس پہنچیں۔ اُس نے مضطرانہ انداز میں ایک کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لڑکی کے بال لمبے تھے، دراز گردن، غلافی آنکھیں اور گلے میں گلابی دوپٹا۔ لباس اور سجاوٹ سے وہ کوئی دلھن لگ رہی تھی جیسے کوئی دلھن ناچ گا رہی ہو۔ وہ بُری طرح گھبرا گئی لیکن اُس نے خود پر قابو رکھا اور مسکراتے ہوئے کلائی چھڑانے کی کوشش جاری رکھی۔ شاید اُس آدمی نے گرفت اور سخت کر دی۔ لڑکی کے رخساروں پر تکلیف کے آثار ہویدا ہونے لگے، گانے کے بول بھی لرزنے لگے۔ اُس کے ساتھیوں نے اُسے سرزنش کی اور دوسرے لوگوں کی موجودگی کا احساس دلایا۔ اُن کے ٹوکنے اور ٹھوکے دینے پر آخر اُس نے لڑکی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور ہاتھوں میں جکڑے ہوئے نوٹ وارفتگی سے دونوں لڑکیوں کے قدموں میں پھینک دیے۔ ممکن ہے میرے علاوہ دوسروں نے بھی محسوس کیا ہو، گلابی دوپٹے والی لڑکی سامنے آتی تو وہ بے اختیار ہو جاتا۔ وہ جدھر مڑتی اُس کی نگاہیں اُسی کے گرد منڈلاتیں۔ لڑکیاں روپے فرش سے سمیٹ کے تیزی کے ساتھ دوسری طرف نکل گئیں۔ اُس شخص نے فوراً جیب سے کچھ اور نوٹ نکال لیے تھے، لڑکیوں کو رقص میں بکھر جانا چاہیے تھا مگر وہ دوسری طرف جا کے ناچنے گانے لگیں، کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انھوں نے عمداً اُس آدمی کی طرف توجہ نہیں دی حالانکہ وہ انھیں مسلسل بُلا رہا تھا۔ کئی بار ناچ کے دوران گھومتے ہوئے انھوں نے اُس کی طرف دیکھا بھی لیکن اُس کے پاس نہیں گئیں، اُس کے قریب کے لوگوں کے پاس جاتی رہیں۔ اُس شخص نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ اُسے نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اُس سے برداشت نہ ہو سکا۔ اُس نے سب کی موجودگی میں دہاڑتے ہوئے انھیں بُلایا۔

لڑکیوں نے سُنی اَن سُنی کر دی۔ ویسے اُن کی بھی کوئی غلطی نہیں تھی، وہ کسی ایک شخص کے لیے یہاں نہیں آئی تھیں۔ مضطرب آدمی کے ساتھیوں نے اُسے سمجھانا چاہا لیکن وہ سخت مشتعل ہو گیا۔ لڑکیاں ایک بار اور اُس کی طرف چلی جاتیں تو شاید کچھ نہ ہوتا۔ وہ نہیں پلٹیں بلکہ گلابی دوپٹے والی لڑکی نے تند و ترش نظروں سے اُسے گھور کے دیکھا، دھتکارنے کے سے انداز میں۔ وہ آدمی اپنے ساتھیوں میں کھڑا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا، لوگ اُس کا بازو پکڑے اُسے تحمل کی تلقین کر رہے تھے لیکن اُس نے ایک جھٹکے سے خود کو آزاد کرا لیا۔ گلابی دوپٹے والی اُس سے دُور نہیں تھی۔ لوگ کچھ نہیں سمجھ پائے۔ انھیں سمجھنے بوجھنے کا موقع بھی نہیں مل سکا تھا۔ وہ جتنی دیر میں دوبارہ اُسے سنبھالتے یا قابو میں کرتے، اتنی دیر میں اُس شخص نے جست لگائی اور دیوانہ وار لڑکی کی طرف جھپٹا اور ایک لمحے میں پیچھے سے بازو پھیلا کے لڑکی کو جکڑ لیا۔ لڑکی ہول ناک آواز میں چیخنے لگی، سازندوں کے ساز ایک دم تھم گئے۔ تارا بائی کی آواز ٹھٹھر گئی، دوسری لڑکی چیختی

ہوئی اُس سے جا چمٹی۔ چوکی پر ہم سب کھڑے ہو گئے۔ لوگ اُس طرف بڑھے مگر ٹھٹک کے رہ گئے۔ اُسے ایک ٹلنیے سے ز... نہیں ملی تھی پھر بھی اُس نے تمنچا نکال لیا۔ جو جہاں تھا، وہیں ... عمارت چند لمحوں کے لیے سناٹے میں ڈوب گئی۔ خامو... اُس شخص کو کوئی داد ملی۔ اُس کی وحشت بڑھ گئی۔ اُس نے ہذیانی ... چلانا شروع کر دیا کہ کوئی اُس کے قریب آنے کی کوشش نہ ... وہ گولی چلا دے گا، یہ کہتے ہی وہ لڑکی کی گردن، بالوں، شانوں، رخساروں کے بوسے لینے لگا۔ اُس نے اُسے بُری طرح دبوچ ر... لڑکی پہلے تڑپتی رہی پھر اُس کے سراپا پر دہشت چھا گئی۔ ... منہ سے گھٹی گھٹی چیخیں نکلنے لگیں۔ یہ سب کچھ اتنا غیر متوقع ... گنگ ہو گئے۔ بچھل، پیرو، کالے نتے، بھولے دادا، جمرو وغیرہ ... پیچھے سے قابو میں کرنے کا کوئی سوال نہیں تھا اور آگے سے ... سکتا تھا، اُس سے کچھ بعید نہیں تھا۔ وہ وحشیانہ انداز میں لڑ... کے جور و ستم یاد دلا رہا تھا اور کسی نواب نظیر کو ننگی ننگی گالیاں ... تھا۔ وہ لڑکی سے کہہ رہا تھا کہ اُس حرام زادے نواب کو اب کیو... پکارتی۔ وہ قطعی اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ اُس نے لڑ... صاف صاف کہہ دیا کہ اب اُسے کوئی اُس سے جُدا نہیں کر سکت... وہ کہہ رہا تھا، اُسے کر گزرنے میں اب کسی کو شک نہیں ہونا ... کسی بھی لمحے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

سب کی نگاہیں کبھی بچھل کی جانب اُٹھ رہی تھیں، ک... شخص کی جانب۔ بچھل چوکی پر بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ کسی ک... کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ایسی محفلوں میں طرح طرح کے لوگ ہوتے ... ایسا کبھی نہیں ہوتا، کون سوچ سکتا تھا کہ وہاں کسی کے پاس تمن... وہ یوں سُدھ بُدھ بھی کھو بیٹھے گا۔ ایک مرتبہ جب میں پہلی دف... کے اڈے پہنچا تھا، بچھل نے علاقے کے سارے آدمیوں کا کھا... اور رات کو گانے کی محفل جمی تھی۔ تلسیا نامی ایک آدمی اسی طر... ہو گیا تھا اور اپنی جگہ سے کچھ آگے بڑھ گیا تھا۔ اُس نے ناچتی ... کا ہاتھ کھینچ کے اُسے چوم لیا اور لڑکی کو گلے بھی لگا نا چاہا۔ بچھ... کے بغیر اپنی جگہ سے لپکتا ہوا اُس کے سر پہ پہنچ گیا۔ اس اثنا میں ... ہاتھ چھڑا چکی تھی اور ناچ رہی تھی۔ بات آئی گئی ہو گئی مگر ... تلسیا کو باہر نکال دیا۔ بعد میں لوگ تین دن تک اڈے کے ... مارتے رہے پھر تلسیا کبھی کلکتے میں نظر نہیں آیا مگر یہاں صورت ... مختلف تھی، سب کچھ اچانک سامنے آیا تھا، اُس شخص سے بچھل کی ... کو کتنے دن ہوئے تھے اور بچھل اُسے کتنا جانتا تھا۔ شاید اب ... احساس ہو رہا ہو کہ اُس نے کچھ زیادہ درگزری، زیادہ چشم پوشی ... تارا بائی کی آواز نہیں نکل رہی تھی، دوسری لڑکی کی آنکھیں ...

سے پھٹی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر تک لوگ گم صُم رہے کہ اس ناگہانی سے کس ... طرح نمٹیں پھر عقب سے کسی کی آواز آئی "تھمے!..." یہ اُسی کا نام ہو گا جو اُس وقت سب کی نگاہوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ کسی نے اُسے ملائم لہجے میں سمجھایا "تھمے! اب ہوش میں آ جا، بس کر۔ پری جان کو کوئی تجھ سے نہیں چھین سکتا۔ وہ تیری تھی اور سدا تیری رہے گی۔" دوسرے لوگوں نے دبے دبے لہجے اور اٹکتی سمٹتی آواز میں تائید کی اور جس طرح کسی بچے کو پچکارتے، تھپکیاں دیتے ہیں، انھوں نے کہا کہ "ہاں ہاں، پری جان کو تھمے سے کون چھین سکتا ہے۔ نواب نظیر کیا بیچتا ہے، کل سے وہ بازار میں آ کے تو دیکھے۔" مگر تھمے بچہ نہیں تھا کہ یہ باتیں اُس کی سمجھ میں آ جاتیں۔ وہ اُلٹا بپھرنے اور دہاڑنے لگا۔ اُس نے لوگوں کو حکم دیا کہ اُس کے راستے سے ہٹ جائیں۔

"جانے دے تھمے!" یکایک ہمارے درمیان کھڑے ہوئے بھولے دادا کی لڑکھڑاتی آواز گونجی "اب زیادہ شور شرابا مت کر۔"

"تھمے پری جان کو نہیں چھوڑے گا دادا!" وہ لڑکی کے بالوں کا بوسہ لیتے ہوئے دیوانگی سے بولا۔

"پری جان تیری ہے تھمے!" بھولے دادا نے نرمی سے کہا "اپن بولتے ہیں، اپن زبان دیتے ہیں۔"

"ہاں زبان دیتا ہے۔" وہ زہر خندے بولا "اپن جانتا ہے ابھی تم کیسے زبان دینے کو بولتا ہے۔ تم سب لوگ پہلے کدھر مر گیا تھا۔" اُس نے وحشیانہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا "سالا اب کھٹ کھٹا دیکھ کے بولتا ہے کہ پری جان تیرا ہے۔"

"پری جان کو چھوڑ دے تھمے!" بھولے دادا نے گرجتی آواز میں دوبارہ حکم دیا۔

تھمے نے بھولے دادا کے جواب میں زمین پر تھوک دیا اور لوگوں سے بولا کہ راستے سے ہٹ جائیں ورنہ وہ خود راستہ بنا لے گا۔ اُس سے کوئی حجت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ دلیل اور درخواست، اصرار اور تکرار کا کوئی خراب نتیجہ بھی نکل سکتا تھا۔ ہر چند کہ اپنی باتوں سے وہ ایسا بے ہوش بھی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اُس کی نگاہ ہر طرف تھی اور اُس نے پری جان کو بالکل بے بس کر رکھا تھا۔ وہاں تقریباً سبھی چاقو چلانا جانتے تھے اور اُن کی تعداد بھی کم نہیں تھی لیکن سب کے ہاتھ پیر جیسے ٹوٹ گئے تھے، سب مفلوج کھڑے تھے۔ بچھل نے تھمے سے کچھ نہیں کہا، مسلسل اُسے گھورتا رہا۔ میری نظریں بھی موقع کی تلاش میں تھیں۔ کالے نتے الگ بے چین تھا۔ چوکی سے اُتر کے تھمے تک پہنچنے کا فاصلہ ان حالات میں خاصا بڑا تھا، یہ تبھی ممکن تھا جب وہ کسی جانب سے ایک لمحے کے لیے غافل ہو جائے۔ مثبت نتیجے کا یقین کیے بغیر کوئی قدم اُٹھانا کسی طور مناسب نہیں تھا اور دیر

کرنا بھی ٹھیک نہیں تھا۔

لوگوں کے بار بار سمجھانے اور بھولے دادا کی تلقین دہانی کے باوجود وہ نہیں مانا۔ بچھل کے جسم میں پہلی بار جنبش ہوئی اور اُس نے آگے قدم بڑھا دیے۔ یہ دیکھ کے ہم سب چوکی پر کھڑے کھڑے اچھل گئے۔ پیرو نے غیر ارادی طور پر بچھل کا شانہ پکڑ کے اُسے روکا لیکن پھر وہ بھی آگے بڑھ گیا، میں، کالے نتے، نورا، جمرو اور شامو بھی۔ ہماری نقل و حرکت سے اُس کے پاگل پن میں اور شدت آ گئی، اُس نے پستول ہماری جانب کر دیا، اُس کی توجہ یک سر ہماری طرف مرکوز ہو گئی۔ اب اُس کے دائیں بائیں کھڑے ہوئے لوگوں میں سے کوئی اُس پر حملہ آور ہو سکتا تھا لیکن یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ تھمے چیخ چیخ کے ہمیں بکھر جانے کا حکم دینے لگا اور بولا کہ اُسے گولی چلانے میں دیر نہیں لگے گی۔ پری جان پر اُس نے اپنی گرفت اور تنگ کر دی مگر وہ نڈھال ہو چکی تھی، سسکتی رہ گئی۔ میرے کپڑے جھنجھنا رہے تھے اور آنکھیں اُس کے تمنچے سے بندھی ہوئی تھیں۔ ہم سب اُس کی زد پر تھے لیکن ابھی ہم نے چوکی سے نیچے فرش پر قدم رکھا ہی تھا کہ ہماری آنکھوں کے سامنے شعلہ سا کوندا۔ معاً تھمے کی دل دوز چیخ سنائی دی اور تمنچا اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گرا۔ ہم نے اُسی لمحے پلٹ کے دیکھا۔ بوڑھا بھولے دادا چوکی پر اپنی جگہ کھڑا ہوا آنکھیں میچے بڑبڑا رہا تھا۔ بچھل اُچھل کے چوکی پر چڑھ گیا، اُس نے جھپٹ کے بھولے دادا کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ یہ ایک ناقابلِ یقین منظر تھا۔ عمارت میں سکوت کے ایک اذیت ناک عرصے کے بعد ہر شور طوفان سا اُٹھ کھڑا ہوا۔ تھمے کا ہاتھ خون میں ڈوبا ہوا تھا۔ اُس کی لرزتی چیخیں کچھ دیر سنائی دیتی رہیں پھر مجمع کا شور اُن پر غالب آ گیا۔

ہم سب بھولے دادا کے گرد جمع ہو گئے۔ بچھل کے ساتھ پیرو نے بھی متعدد بار اُس کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور کتنی ہی بار اُسے گلے لگایا۔ بھولے دادا کی آنکھیں بھر آئیں، وہ اپنا چہرہ چھپائے سسکیاں بھرنے لگا۔ ہر شخص اُس کے قریب آنے، اُسے دیکھنے کے لیے بے تاب تھا اور اُسی کے نام کا نعرہ لگا رہا تھا۔ میں نے بھی بے اختیار اُس کا ہاتھ چوما۔ بھولے دادا نے ایک لمحے کے لیے سب کی آنکھوں میں دُھند بھر دی تھی۔ اتنا صاف اور تیز نشانہ کوئی ایسا ہی شخص لے سکتا تھا جس کا چاقو سے بہت واسطہ رہا ہو۔ نشانہ ایسا باریک نہیں تھا لیکن بچھل کے بہ قول سب سے بڑی باریکی تو وقت اور زاویے کی ہوتی ہے۔ تھمے کو قرار نہیں تھا، وہ لڑکی کو جکڑے ہوئے مسلسل اِدھر سے اُدھر بھٹک رہا تھا اور سامنے وہ نہیں، پری جان تھی۔ تھمے کا جسم اُس کی آڑ میں تھا۔ پری جان کے بدن کی ڈھال سے بچا ہوا تھمے کے بازو اور جسم کا کچھ ہی حصہ نظر آ رہا تھا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کب زاویہ

بدل دے۔

ہم چوکی سے اُترے تھے تو بھولے دادا ہمارے ساتھ نہیں آیا تھا، وہیں کھڑا رہ گیا تھا، ہمیں خیال بھی نہیں تھا کہ کون ہمارے ساتھ آرہا ہے، کون رُک گیا ہے۔ ہمیں بڑھتا دیکھ کے شمّے کی نگاہ لازماً ہم پر مرکوز ہو جانی چاہیے تھی بھولے دادا پر نہیں۔ بھولے دادا نے اسی لمحے کا انتظار کیا ہوگا، ہم نیچے اُتر جائیں اور اُس کے مقابل صرف شمّے رہ جائے۔ جتنی دیر میں ہم نے چوکی سے نیچے قدم رکھا، اتنی دیر میں بھولے دادا نے چاقو نکالا اور نشانہ لے لیا۔ وہ اس سے پہلے چاقو نکالنے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ ہمارے نیچے اُترنے میں اور بھولے دادا کے چاقو نکال کے نشانہ لینے میں لمحوں ہی کا فرق تھا۔ بھولے دادا نے اس اثنا میں اتنی پھرتی اور احتیاط سے کام لیا تھا کہ شمّے کو آہٹ نہ مل سکی۔ اگر اُسے اوپر دیکھنے کی فرصت مل جاتی تو تمنچے کی پہلی گولی بھولے دادا ہی کو لگتی۔ چاقو سامنے سے جاتا تو تمنچے سے ٹکرا سکتا تھا۔ شمّے کی انگلیوں اور ہاتھ کا بڑا حصّہ تمنچے سے لپٹا ہوا گتھا ہوا تھا۔ تمنچا آگے تھا، شمّے کا ہاتھ اُس کی اوٹ میں۔ بھولے دادا نے چاقو اوپر اُٹھا کے اور کسی قدر ترچھا کر کے پھینکا تھا۔ وہ سیدھا شمّے کے ہاتھ پر جا کے گرا تھا، اُس کی رفتار بہت تیز تھی اور ترچھا ہونے کی وجہ سے نشانہ بڑی حد تک قطعی ہو جاتا تھا۔ شمّے گھبراہٹ میں اپنا ہاتھ دائیں طرف کرتا یا بائیں طرف، دونوں صورتوں میں مفر کم تھا۔ البتہ وہ ہاتھ لَٹ بھی سکتا تھا تب چاقو سیدھا پَری جان کے سینے میں جا کے پیوست ہوتا لیکن بھولے دادا کو جیسے یقین تھا کہ چاقو بھی اُسی کے ساتھ رُخ بدل دے گا یا اُسے یقین تھا کہ شمّے کا ہاتھ اُس لمحے نشانے سے نہیں ہٹے گا، جما رہے گا۔ اگر بھولے دادا سے ذرا بھی چوک ہو جاتی تو شمّے کے غضب کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ امکان بظاہر ہر لمحے موجود تھا۔ بھولے دادا کے جسم میں جماؤ نظر نہیں آتا تھا۔ نگاہ بھی عمر کے ساتھ تمام تر ہوئی ہوگی۔ بولتے ہوئے اُس کی آواز بھر بھرانے لگتی تھی مگر جیسا کہ لوگ کہتے ہیں کہ عمر تو ارادے کی ہوتی ہے۔ جب تک ارادہ توانا رہتا ہے آدمی جوان رہتا ہے۔ بھولے دادا نے خاص طور پر شمّے کے تمنچے والے ہاتھ کا نشانہ لیا تھا۔ اُسے اوپر سے اور ترچھا چاقو پھینکنے میں اتنی مہارت تھی تو وہ شمّے کے جسم کے سامنے نظر آنے والے کسی اور حصّے کا نشانہ بھی لے سکتا تھا۔ شمّے کا دوسرا ہاتھ پَری جان کے بدن پر جما ہوا تھا۔ اُس کا نشانہ لینا نسبتاً آسان تھا مگر بات تبھی تھی جب تمنچے والے ہاتھ کا نشانہ لیا جائے۔ یہ ضروری بھی تھا کسی اور جگہ کا نشانہ لینے پر تمنچا شمّے ہی کے قبضے میں رہتا۔ میں سرسری طور پر بس ایک نظر شمّے کو دیکھ سکا اس لیے کہ ہم ذرا اُلٹ کے بھولے دادا کے پاس چلے آئے تھے لیکن میرا اندازہ ہے کہ شمّے کا ہاتھ ہتھیار اُٹھانے کی صلاحیت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو چکا ہوگا، اُس کی چیخیں اور خون کی

چھوٹتی تیلیاں بتا رہی تھیں کہ ترچھا چاقو ہاتھ کا بڑا حصّہ کاٹتا تک گھسا ہے۔

چوکی پر بہت سے لوگ آ گئے تھے، سب نے بھولے دادا کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ بڑی مشکل سے کالے دادا نے انھیں واپس کیا۔ تمنچا اور چاقو بھولے دادا کو پیش کیا۔ چاقو بجھل کا تھا۔ بھولے دادا نے اُسے آنکھوں سے لگا کے بجھل کے آگے کر دیا۔ بجھل نے اُسے اُس سے لپٹ گیا۔ "بس دلوا بس۔" وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولا "یہ ہے اور سدا تمھارے پاس رہے گا، قسم سے اپن کا دل پر لگا ہے کبھی کوئی نہیں چھین سکتا۔"

"یہ تم نے کیسا جادو کرا تھا دادا؟" پیرو نے حیرت اور ... سے پوچھا۔ "اپن نے پہلے کبھی ایسا نہیں دیکھا۔"

"سب گیسو والے کا کیا ہے، اپن نے کچھ نہیں کیا، کچھ بھی ..." بھولے دادا رندھی ہوئی آواز میں بولا "لگتا ہے اُس نے اپنے ... معاف کر دیا ہے۔"

"بیٹھو دادا! ابھی آرام سے بیٹھو۔" پیرو نے اُس کا ہاتھ پکڑ کے والہانہ انداز میں کہا۔ "اپن کا سمجھ میں نہیں آتا، ابھی تم کو کس طرح بولے۔" پیرو کی آواز گلے میں پھنسنے لگی اور اُس سے کچھ نہ کہا جا سکا، اپنا سر بھولے دادا کے سینے سے رگڑنے لگا۔

پَری جان پر سکتہ سا طاری تھا، شمّے اب وہاں موجود ... بجھل نے تارا بائی کو نوٹ کے سکّوں سے بھری ہوئی ایک تھیلی ... آہستگی سے بولا "بالیاں ابھی ادھوری ہیں تارا بائی۔ ان کو ابھی نہیں لانا چاہیے۔"

"بندی کہاں لے جاتی ہے اُستاد!" تارا بائی ابھی تک تھی کپکپاتی آواز میں بولی "آج پہلی بار گھر سے قدم نکالا تھا ... محفل جماتی ہیں یا کبھی کبھی خاص محفلوں میں گئی ہیں۔ بخدا بندی آپ کی وجہ سے ادھر لائی تھی۔ اتنی عمر دُنیا دیکھتے گزر گئی لیکن ..." اُس کی آنکھوں سے آنسو پھوٹنے لگے۔

"اتنا سکھایا ہے تو کچھ آنکھ کی پہچان بھی کرائی ہوتی ... پہلے کی چیز ہے یہ۔ معلوم ہوتا ہے تم نے اپنا دودھ نہیں پلا ..."

تارا بائی نے حیرت سے اُسے دیکھا اور سٹ پٹا گئی۔ "... بندی کی کیا مجال ہے کہ اُستاد کے سامنے لب کشائی کرے۔" ... آواز میں یہی کہہ سکی۔

"پہلی بولی پر کسی کھرے گاہک سے ان کی بات کر لینا ..." بجھل نے بھن بھناتے لہجے میں کہا۔

تارا بائی اُسے دیکھتی رہ گئی۔

صبح ہونے میں اب کچھ ہی دیر رہ گئی ہوگی۔ تارا بائی ...

... پر خاصے لوگ چلے گئے لیکن جو رہ گئے تھے، وہ وہیں جم کے بیٹھے ... جیسے انھیں کسی اور بات کا انتظار ہو۔ سب حیرت زدہ اور گم سے ... اُن میں سے چند مختلف ٹولیوں میں اِدھر اُدھر بکھرے سرگوشیاں ... رہے تھے۔ کچھ دیر بعد عمارت میں سکون چھا گیا، وہ سکون جو بھونچال ... ہوتا ہے، بہت زلزلہ تھمنے کے بعد جو اُداسی ہوتی ہے کسی کی آنکھوں ... نیند نہیں تھی۔ بھولے دادا، پیرو، کانتے اور کالے دادا سبھی بجھل کے ... چوکی پر بیٹھے تھے۔ اڈّے کے آدمیوں نے بجھل کے لیے حقّہ تازہ کر دیا ... چائے دوبارہ تقسیم کی جانے لگی تھی۔ بجھل کے جلد اُٹھنے کا امکان نظر نہیں ... رہا تھا، مجھے بھی وہاں سے اُٹھنے اور کانتے سے مزید کچھ جاننے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ شمّے کا چہرہ ابھی تک میری آنکھوں میں کھبا ہوا تھا۔ معلوم نہیں اب اُس کا کیا حال ہو۔ بھولے دادا نے صرف اُس کے ہاتھ کا نشانہ ... تھا، دل کا نہیں۔ شمّے مر نہیں سکتا تھا لیکن اب وہ واقعی زندہ رہے گا۔ ... مجھے کوئی پاگل معلوم نہیں ہوتا تھا، شاید اپنے بس میں نہ رہا ہو۔ ... ایسی پاگل پن تو نہیں ہوتی مگر پھر پاگل پن کیا ہوتا ہے، اپنے بس میں نہ رہنا۔ بھولے دادا بر وقت چاقو نہ اُٹھاتا تو کون جانے کیا ہو جاتا۔ نہ معلوم ہم میں سے کون شمّے کا نشانہ بنتا، اُسے ایک یا دو بار تمنچا چلانے کا وقت مل سکتا تھا۔ ... دوسری یا تیسری بار گولی چلاتے وقت کسی بھی طرف سے کوئی اُس تک پہنچ جاتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ نہ ہوتا، بجھل چوکی سے اُس کی جانب بڑھا تھا تو اُس کے ذہن میں شمّے کو قابو میں کرنے کی کوئی تدبیر ہوگی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ بجھل کے قریب پہنچ جانے پر شمّے کا جسم ٹھٹھر جاتا۔ کسی ... دوسرے کو ختم کرنے سے اُسے کیا حاصل ہو سکتا تھا۔

نہ جانے کیوں اتنی دیر بعد مجھے اب کوئی بات اوجھل ہو جانے، کوئی کمی رہ جانے کا احساس ہو رہا تھا جیسے شمّے کی بات لوگوں نے غور سے نہیں سُنی۔ سب کی نظریں اُس کے تمنچے سے اُلجھی رہیں۔ اُس کی نظر ... تو لوگ کچھ اور دیکھ پاتے، سُن پاتے مگر سب کچھ تو خود میرے سامنے ہوا تھا، پھر مجھے کون سے نہ دیکھے ہوئے، کون سے نہ سُنے ہوئے کی کمی ... محسوس ہو رہی تھی۔ تقریباً سبھی نے طرح طرح شمّے کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ شاید اُسے خود بھی ٹھیک سے معلوم نہیں تھا۔ بھولے دادا نے ہر ... مشکل سے مایوس ہو کے یہ قدم اُٹھایا تھا۔ خود میں شمّے کی کسی غفلت کا منتظر تھا کیونکہ اُس کی دیوانگی میں کیا کسر رہ گئی تھی۔ یہ پاگل پن نہیں تو ... کیا ہے کہ اتنے لوگوں کو پریشان کیا جائے۔ ایسا کہاں ہوتا ہے۔ اُسے ... پَری جان مطلوب تھی تو پَری جان کو حاصل کرنا اُس کے لیے کیا مشکل تھا ... کہیں کھو تو نہیں گئی تھی۔ اُس کے گھر وہ سب کا اُسے علم تھا، وہ چیزیں ... حاصل کرنا کیا مشکل ہے جن کی کوئی قیمت مقرر ہے۔ قیمت ہی ادا کرنے کے لیے تو تگ و دو کرنی پڑتی ہے مگر یہ کون سا طریقہ تھا۔ بھلا کوئی اس طرح قتل مچاتا ہے۔ شمّے نے پَری جان کا کچھ خیال بھی نہیں کیا جس کا وہ دعوے دار تھا۔ اُس نے اُسے کتنی اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ اتنے

بہت سے لوگوں میں اُس کا تماشا کیوں بنایا تھا اور پَری جان اُس سے اتنی سہمی سہمی، دُور دُور کیوں نظر آتی تھی۔ شمّے نے اُس سے رویّہ ہی کچھ ایسا رکھا ہوگا ورنہ کبھی تو ایک شخص کسی کے لیے دُنیا بھر کے مال و متاع سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔

میرے سر میں یہی بے سروپا باتیں گونج رہی تھیں۔ اِن کی بے سروپائی کی تائید اُن سب کے لب و لہجہ سے بھی ہوتی تھی۔ وہ شمّے کی باتیں نہیں کر رہے تھے، دُنیا جہان کے قصّے دُہرائے جا رہے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔ اڈّے کے آدمی سماوار سے کیتلیاں بھر بھر کے چوکی پر لا رہے تھے۔ مٹھائی کے ٹوکرے بھی کھول دیے گئے۔ چائے پینے سے وہ اور بیدار ہو گئے تھے۔ اڈّے پر چھایا ہوا تکدّر چھٹ چکا تھا۔ وقفے وقفے سے اُن کے قہقہے گونجنے لگتے۔ میں بھی اُنھی کے درمیان بیٹھا اُن سب کو دیکھ رہا تھا، اُن کی باتیں سُن رہا تھا لیکن میرا دماغ بہک بہک جاتا تھا اور اُن کی ہنسی پر میں چونک چونک پڑتا تھا۔ اندھیرا کب تک طاری رہتا، دھیرے دھیرے رنگ بدلنے لگا اور عمارت میں جلنے والی روشنیاں پھیکی پڑنے لگیں۔ بھولے دادا کو احساس ہوا۔ وہ حیرانی سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا "سالی پوری رات نکل گیا جاناں!"

اُس کے اُٹھنے پر سبھی اُٹھ گئے، بجھل بھی۔ گویا اُسے بھولے دادا کے اشارے کا انتظار تھا لیکن بجھل نے اُسے اڈّے سے نہیں جانے دیا بلکہ اُسے اور پیرو کو اپنے ساتھ لے کے نچلی منزل کے ایک کمرے میں چلا گیا۔ کانتے کا ارادہ باہر جانے کا تھا لیکن شامو، جمن اور زورا ہمارے پیچھے پیچھے آئے تو کانتے اُوپری منزل پر آ گیا۔ یہاں سائبان میں کئی چارپائیاں برابر برابر پڑی تھیں اور اُن پر سفید چادریں بچھی ہوئی تھیں۔ سب اُنھی پر بکھر گئے اور چپ چاپ گہری گہری سانسیں کھینچنے لگے۔ اندھیرا تیزی سے دُور ہو رہا تھا۔ کانتے میرے ساتھ ہی چارپائی پر لیٹا ہوا تھا، خاصی دیر بعد کانتے نے زبان کھولی اور غنودہ آواز میں بولا "کچھ دیر پلک لٹکا لے لاڈلے!"

"نیند بالکل نہیں آ رہی ہے کانتے بھائی!"

"نیند سالی کدھر سے آئے گی، اُس کُتیا کے پلّے نے سب اُلٹا کے رکھ دیا، سالا ایک دم کٹ کھنا ہو گیا تھا۔" وہ شمّے کو گالیاں بکنے لگا۔ میں چپ رہا تو وہ مچلتے لہجے میں بولا "تجھ کو تو یہ سب کچھ بہت بدلا ہوا، میرا مطلب ہے بہت انوکھا لگ رہا ہوگا۔ اندھیرا شروع ہونے پر تُو کدھر تھا اور اندھیرا...؟"

"ہاں کانتے بھائی! شروع میں تو سب کچھ مجھے اپنی آنکھوں کا جھوٹ لگ رہا تھا۔"

"پر تم لوگ اُدھر سے نکل کیسے آئے؟" وہ تجسس سے بولا۔

"سمجھو کہ یہی وقت لکھا تھا۔ ایک دم دماغ میں بات آئی، میں نے پیرو دادا سے کہا، وہ چپ ہو گیا۔ میں سمجھا، شاید میں نے کوئی اَن ہونی

بات کہہ دی ہے۔ دن بھر اُس نے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی لیکن رات ہونے پر اچانک دادا نے ہمارے اُوپر کھڑے ہوئے پہرے دار سے کہا کہ وہ نواب سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔ کوئی آدھے گھنٹے سے کم کے عرصے میں نواب اندر آ گیا۔ بس اُس کے آنے کی دیر تھی" میں نے مختصراً اُسے حویلی سے نکلنے کا سارا واقعہ سنایا۔

وہ اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ کانتے بھی تجھ کو کیا بولے"۔ وہ ڈولتی آواز میں کہنے لگا۔ "اِدھر ہم آ کے بالکل چوپٹ ہو گئے تھے۔ تم لوگ کو گئے پُورے چھ دن ہو چکے تھے، پُورے چھ دن۔ سوچتے سوچتے دماغ پھرنے لگتا تھا، سالی ایسی کیا بات ہو سکتی ہے کہ اتنے دن میں تم دونوں پلٹ کے نہیں دیے۔ نہ کوئی نام، نہ نشان۔ تُو جان، کیسی کیسی باتیں دماغ میں آ سکتی ہیں۔ ہر طرف اندھیرا بھرا تھا، کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کدھر کو جائیں، کہاں جا کے سر پھوڑیں، سالا کس کا گریبان پکڑیں۔ پھر کچھ دوڑ بھاگ کے بعد تھوڑی بہت سُن گُن ملی لیکن اُس سے بَل نکلنے کے بجائے اور پڑ گئے، اُستاد کو دیکھ کے اور سالا جی اُلٹا ہوتا تھا، یقین مان اُستاد کو کبھی ہم لوگ نے ایسا، ایسا..... اب تجھ سے کیا بولوں"۔ اُس نے تلخی سے کہا۔ "اُس کو دیکھ کے ہاتھ پیر اولا کر جاتے تھے۔ اِدھر ہم لوگ آپس میں جوڑ توڑ کرتے رہتے تھے، اتنا سمجھ میں آ گیا تھا کہ کوئی بڑا چکر ہے ورنہ پیرو دادا کے ہوتے اتنی دیر نہیں لگنی چاہیے"۔

"پیرو دادا بھی کیا کرتا، وہاں سے نکلنا ممکن ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے تمھیں بتایا نا کہ کئی بار کوشش کی اور ناکام ہو گئے اب کے بھی کچھ ٹھیک نہیں تھا مگر کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔ ہم نے سوچا، زیادہ سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے"۔

"تم لوگ ایک دن اور رُک جاتے تو شاید تمھیں اپنے آپ کو یُوں داؤ پر لگانے کی ضرورت نہ پڑتی"۔

"ایک دن"۔ میں نے حیرت سے کہا۔ "کیا مطلب؟"

"ہو سکتا تھا کہ آج ہم کسی طرح تم تک پہنچ جاتے"۔

"آج!" میں نے تذبذب سے کہا۔ "کیا کہہ رہے ہو؟"

"ہاں لاڈلے! آج دوپہر کی گاڑی سے آپی ادھر پہنچ جائیں گی۔ ہم نے سب کچھ اُن کے آنے پر اُٹھا رکھا تھا"۔

"آپی!" مجھ سے لیٹا نہیں گیا۔ "خانم آ رہی ہیں؟"

"ہاں ہاں، ویسے اُن کو اب تک آ جانا چاہیے تھا مگر اُدھر کوئی بات ہو گئی ہو گی جبھی دیر ہو گئی۔ کل شام اپنے کو تار ملا ہے کہ وہ اُدھر سے چل پڑی ہیں"۔

"آپی! آپی کو کس نے بلایا؟"

"اُستاد نے تار بھیجا تھا"۔

"تو، تو اس کا مطلب ہے کہ تم سب کچھ جان گئے تھے؟" میں نے سٹ پٹاتے ہوئے کہا۔ "تفصیل سے بتاؤ"۔

"کیا بتاؤں، اُستاد کا تجھ کو پتہ ہے، آدھی بات منہ میں آدھی اُگلتا ہے"۔ وہ ترشی سے بولا۔ "اب کے آدھی بھی کھا گ[ئے]، اپنے کو زیادہ نہیں معلوم لیکن ایسے اندھے بہرے ہم بھی نہیں ہ[یں]۔ خانم کے آنے کی خبر سُن کے میرا سر گھومنے لگا تھا۔ [اس کے] کیا معنی ہو سکتے ہیں، یہی کہ تُجھل بڑے نواب سے مل چکا تھا یا یا[س] کے بعد اُس نے بڑے نواب سے کوئی رابطہ قائم کیا تھا۔" میں گنگ سے کانتے کی صورت تکنے لگا۔

"تجھ کو کیا بتاؤں"۔ کانتے خود بولا۔ "اِدھر آ کے کیسی خواری ہے، ہم کو فیض آباد میں تیسرے دن تار ملا تھا۔ دو دن تک باوا جان اور مارتی تم کو اِدھر، پورے شہر میں ڈھونڈتے رہے"۔ زورا شام[کو] تینوں اُٹھ کے ہمارے ساتھ والی چارپائی پر چلے آئے تھے۔ زو[را] بول پڑا اور مجھے بتانے لگا کہ شام تک تو کچھ نہیں ہوا لیکن جب ہونے لگی تو سب کو تشویش شروع ہوئی۔ وہ اور مارتی بار بار ہوٹل جا جا کے دیکھتے تھے۔ دس بج گئے تو ابّا جان بھی نکل کھڑے ہوئے۔ تک سڑکوں پر اور ہوٹلوں میں ہمیں دیکھتے رہے۔ ساری رات [گزر] گئی۔ صبح بڑی مشکل سے زورا اور مارتی نے ابّا جان کو ہوٹل میں [روکا]۔ خود دن بھر گلی کوچوں کے چکر کاٹتے رہے۔ وہ کسی سے کچھ پوچھ [نہیں] سکتے تھے، ایک تو ابّا جان نے انھیں منع کر دیا تھا، دوسرے [تُجھل کے آنے] پر پہنچنے سے پہلے یہ مناسب بھی نہیں تھا مگر یہ کیسی تلاش تھی [کہ] کسی سے پوچھ سکیں، نہ تھانے میں جا کے دو گم شدہ آدمیوں کی [رپورٹ] کر سکیں۔ پورا دن گزر گیا۔ زورا اور مارتی کو سارے شہر کی خاک چھا[نتے اور] درمیان میں بار بار ہوٹل جا کے دیکھتے رہتے تھے اور ہر بار زورا کے [ساتھ] انھیں ابّا جان کی سوالی آنکھوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ زورا کہ[تا] اُن سے نظریں نہیں ملائی جاتی تھیں۔ گو ابّا جان نے اُن سے [کچھ] بھی نہیں کہا تھا بلکہ اُلٹا انھیں صبر و ضبط کی تلقین کرتے رہے۔ [مارتی نے] کو زورا نے انھیں مشورہ دیا کہ تُجھل کو مطلع کر دیا جائے مگر ابّا [جان نے] کچھ اور توقف کر لینا بہتر سمجھا۔ تُجھل کا زخمی پیر وہ خود دیکھ کے [آئے] تھے۔ اِس حالت میں اُسے بُلانا انھیں اچھا نہیں لگتا تھا لیکن [کوئی اور] صورت بھی سامنے نہیں تھی۔ دوسری رات ابھی پوری طرح نہیں [ڈھلی] تھی کہ انھوں نے مارتی سے تار گھر جانے کو کہا اور پھر خود بھی اُ[س کے] ساتھ چل دیے۔ تار انھوں نے اپنے ہاتھ سے لکھا اور صرف اتنا [کہ] کسی تاخیر کے بغیر تُجھل حیدر آباد آ جائے۔

اِس دوران اُن تینوں نے طرح طرح کی تدبیروں پر غو[ر کیا] اور ہر پھر کے ایک ہی فیصلہ کر پاتے تھے کہ ابھی کچھ اور انتظا[ر کیا] جائے۔ تار دینے کے بعد وہ اور پابند ہو گئے تھے، تُجھل کے آ[نے تک کو]

[ک]وئی قدم نہیں اُٹھا سکتے تھے۔ چلتے وقت میں اور پیرو ابّا جان سے [ک]وئی خاص بات کہہ کے نہیں چلے تھے، پیرو نے صرف اتنا کہا تھا کہ [ابّا جان] ہمارا انتظار نہ کریں یعنی ہمیں دیر بھی لگ سکتی ہے۔ زورا [ب]تانے پر وہ بار بار یہ بتا رہا تھا کہ ابّا جان اُس سے اور مارتی سے کُرید کُرید کے پوچھتے تھے کہ ہم انھیں کچھ اور تو بتا کے نہیں گئے؟ زورا اور مارتی کو اُن سے زیادہ [کچھ] معلوم تھا جو ابّا جان کو کسی ایک سمت سوچنے کا موقع ملتا۔ وہ خود [بکھ]ری ہوئی باتوں کے تانے بانے ملاتے رہے ہوں گے۔ نکتہ طرازی [اُ]ن کی عادت ہے، آٹھ سال تک وہ کورا کے لائے ہوئے نقشوں اور [خ]اکوں میں نکتے کُریدتے کھکوڑتے رہے تھے۔ سفر کے دوران اچانک [فیض]آباد میں ہمارا قیام اور بمبئی جانے کے بجائے حیدر آباد کا ارادہ، یہاں [آ]تے ہی فوراً نکل کھڑے ہونا، سوچنے کے لیے اُن کے پاس بہت [کچ]ھ تھا۔ نتیجہ اخذ کرنے کے لیے کچھ نہیں۔ ظاہر ہے پیرو نے انھیں سب [کچ]ھ بتانا ضروری نہیں سمجھا ہو گا کہ کسی مولوی محمد شفیق کی تلاش میں [ا]نھوں نے بمبئی جاتے جاتے حیدر آباد کا ارادہ کر لیا ہے۔ مولوی محمد شفیق [ک]ی تحویل میں وہی لڑکی ہے، وہ کورا جو کبھی اُن کے گھر رہی تھی اور جسے ایک رات اُن کا بیٹا گھر سے لے کے چلا گیا تھا۔ اتنی جزئیات [ش]اید پیرو کے علم میں بھی نہ ہوں اور نہ ابّا جان نے بوجوہ انھیں [بت]انا مناسب سمجھا ہو گا۔ بزرگی کی مروّت وضاحت سے اجتناب [ک]رتی ہے تا ہیں کہ بتانے والا خود وضاحت نہ کرے مگر پیرو نے یکایک حیدر آباد جانے کا کوئی نہ کوئی عذر تو انھیں پیش کیا ہو گا، معلوم نہیں وہ کیا تھا، بہرحال ابّا جان سے اب کچھ اتنا ڈھکا چھپا نہیں رہا تھا۔ [و]ہ خوب جانتے تھے کہ اُن کے بیٹے کے ساتھی کون لوگ ہیں، کون لوگ [ب]نت میں اُن کے ہم سفر تھے۔ فیض آباد میں زرّیں کی حویلی میں انھیں [ا]تنے سے بہت سے لوگ ملے تھے۔ انھوں نے تبت میں مجھے چاقو [چ]لاتے ہوئے بھی دیکھا تھا اور ابھی ناگ پور اسٹیشن پر سونیا کے سانحے واقعے کے وہ شاہد تھے۔ وہاں انھیں یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اُن کا بیٹا [س]ات سال جیل میں رہا ہے اور سونیا کون تھی، کلکتہ جیل کے سابق جیلر کی لڑکی۔

ایسے لوگوں کی گم شدگی کی رپورٹ کرنے میں انھیں اتنی جلدی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ یہ حقیقت بھی اُن کے پیشِ نظر ہو گی کہ اگر واقعی پولیس نے ہمیں کہیں گھیر لیا ہے تو ہم نے پولیس کے سامنے اپنے باقی ساتھیوں کی نشان دہی نہیں کی ہے ورنہ ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے زورا، مارتی اور ابّا جان تک پولیس کے پہنچنے میں کتنا وقت لگتا، پولیس کا نشانہ اُن کے لیے ہماری طرف سے خاموشی کا اشارہ ہی ہو سکتا تھا۔ اس طرح اُن کے پاس ہوٹل میں بیٹھے ایّام گنتے رہنا اور گم گشتگان کے سڑکوں پر تاک جھانک کرتے رہنے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ ایک گلی سے دوسری گلی، ایک علاقے سے دوسرا علاقہ۔ زورا اور مارتی پہلی بار حیدر آباد آئے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ایک لمبا راستہ طے کرنے کے بعد وہ وہیں آ نکلتے جہاں سے چلے تھے۔ مارتی نے سرِراہ ایسے لوگوں سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی جن پر اڈّوں سے متعلق ہونے کا شبہ ہوتا تھا۔ وہ انھیں ایک حد تک ہی ٹٹول سکتا تھا۔ دو ایک پولیس والوں سے بھی اُس نے سُن گُن لینے کی کوشش کی لیکن اس طرح کیسے کوئی انھیں اُن کے مطلب کی بات بتا سکتا تھا۔ تار دینے کے بعد تو اُن کے لیے ایک ایک پل کاٹنا دُوبھر ہو گیا۔ انھوں نے ارجنٹ تار دیا تھا۔ فیض آباد سے حیدر آباد کے سفر میں زیادہ سے زیادہ دو راتیں، دو دن لگتے ہیں۔ اِس میں گاڑی لیٹ ہو جانے کا وقت بھی شامل ہے۔ انھیں یقین تھا کہ تار ملتے ہی تُجھل پہلی گاڑی سے سوار ہو جائے گا۔

دو دن پہلے اُس کا آنا ممکن نہیں تھا لیکن تار گھر سے واپسی پر وہ اُس کی راہ اِس طرح تکنے لگے تھے جیسے تُجھل ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کے آ جائے گا۔ اُمید کی یہ کرن بھی اُن کے دلوں میں ٹمٹماتی تھی کہ تُجھل سے پہلے کہیں ہم بھولے بھٹکے ہوٹل نہ پہنچ جائیں۔ نہ ہم پہنچے، نہ دو دن گزرنے کے بعد تُجھل آ سکا۔ اُن کے حواس منتشر ہونے لگے۔ مارتی اور زورا اسٹیشن جا جا کے مایوس لوٹتے رہے۔ زورا کے کہنے کے مطابق پہلی بار انھوں نے ابّا جان کا چہرہ بدلتا ہوا محسوس کیا۔ تاہم ایک وہی تھے جو اُن کے لیے ڈھارس بنے ہوئے تھے۔ وہ اُن دونوں کو بہ اصرار کھانا کھلاتے تھے۔ دو دن بعد ابّا جان نے دوسرا تار دیا، پھر احتیاطاً تیسرا تار گھر والوں سے اُن کی کسی قدر تلخی بھی ہو گئی۔ وہ تیسرا دن تھا، تار دیے ہوئے تیسرا دن۔ ابّا جان نے زورا کے ساتھ عابد شاپ روڈ کی ایک دکان سے اعلا قسم کا کپڑا خریدا اور قریبی درزی کو بہ عجلت سینے کی ہدایت کی۔ اِس کے علاوہ وہ پوچھتے پوچھتے شہر کی نظامت کے دفتر گئے اور مختلف لوگوں سے وہاں کے اعلا عہدے داروں کے متعلق پوچھ گچھ کرتے رہے۔ کون کیا ہے، کیا کرتا ہے۔ وہ کسی عہدے دار سے نہیں ملے۔ تیسرے روز بھی فیض آباد کی طرف سے آنے والی گاڑی خالی گئی۔ ہمیں ہوٹل سے گئے پانچواں دن ہو گیا تھا۔ ابّا جان نے مارتی کے ساتھ پہلی مرتبہ ہوٹل سے نزدیک عابد شاپ روڈ کے تھانے کا رُخ کیا اور اندر جاتے جاتے لوٹ آئے۔ اِس دوران زورا اور مارتی نے محبوب کی مہندی کے علاقے کا بھی چکر لگایا اور وہ مختلف بالاخانوں پر بھی گئے حالانکہ یہ ایک فضول سی بات تھی۔ کسی سے کچھ پوچھے بغیر ہماری تلاش کا کیا حاصل نکل سکتا تھا لیکن کوئی اور راہ بھی انھیں سجھائی نہیں دیتی تھی۔ ہوٹل میں رہ کے انھیں خفقان سا ہونے لگتا تو وہ سڑکوں پر نکل آتے اور راہ چلتے آدمیوں کے چہرے گھورتے رہتے۔ انھیں اپنا بھی خیال

رکھنا تھا کہ کہیں اُن کی نقل و حرکت سے ہوٹل والے یا ہوٹل کے باہر بازار والے مشکوک نہ ہو جائیں۔ اس کے علاوہ انھیں یہ اندیشہ بھی لاحق تھا کہ جو لوگ ہماری گم شدگی کا سبب بنے ہیں، وہ ہمارے ساتھیوں کی تلاش میں بھی ہو سکتے ہیں سو انھیں خود کو بھی محفوظ رکھنا تھا۔ زورا مجھے وہی کچھ بتا رہا تھا جو میرے لیے نیا نہیں تھا۔ حویلی کی جیل میں انھی باتوں کے تصور سے میرا دل ہولنے لگتا تھا۔ زورا کہنے لگا کہ چوتھے دن جب وہ اسٹیشن پہنچے تو انھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ تجمل گاڑی میں موجود تھا۔

" دولھن کے منہ پر سالی ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔" کانتے بیچ میں بولا۔ "لگتا تھا، ابھی چھوٹ کے آئے ہیں۔ تار میں ان لوگ نے کوئی خاص بات نہیں لکھی تھی، بس اتنی کہ جلدی پہنچو قسم سے سارے راستے کچھو سوئیاں مارتے رہے۔ گاڑی بھی ٹہلتی ہوئی آئی۔ شروع میں ہی کینسٹ ہو گئی تھی، آدھے دن کا تل ڈال دیا۔ پہلے متھرا اسٹیشن پر پہیئے چوں چوں بولنے لگے پھر ناگ پور سے اُدھر گڑبڑ ہو گئی۔ آگے بھی بیل گاڑی کے مانند گھسٹتی رہی۔ اُدھر جب تار پہنچا تو بڑے صاحب (منیر علی) استاد کو زمینوں کی طرف لے گئے تھے۔ تار پورے ایک دن بعد پہنچا تھا۔ رات کو ملازری بہن نے پڑھ کے فوراً آدمی گاؤں دوڑا دیا۔ استاد کو واپس آتے آتے صبح ہو گئی۔ گاڑی کا وقت نکل گیا تھا لیکن گیارہ بجے لکھنؤ کی طرف ایک گاڑی جاتی تھی۔ استاد نے اُسی سے سفر کا ارادہ کر لیا۔ وہاں سے پھر دلی کی پہلی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اپنی طرف سے ہم نے وقت بچا لیا تھا مگر آگے نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ گاڑی بدلنے کا اب کوئی سوال نہیں تھا بس جیسے تیسے اِدھری پہنچے۔" کانتے گہری سانس بھر کے بولا۔

" اور ٹیشن پر استاد اور کانتے بھائی کو دیکھ کے اپن کا نہ پوچھو، جیسے اپن کو اپنا کھویا آنکھ، ہاتھ، پیر مل گیا ہو۔" زورا ممتائی آواز میں بولا۔ "پر اپڈر زبان سالا بالکل اینٹھ کے رہ گیا تھا۔ سوچتا تھا، ابھی اُستاد کے آگے کیا بولے، کیدر سے بات شروع کرے۔"

میرے ذہن میں بے شمار سوال بھٹک رہے تھے لیکن میں چپ رہا۔ کانتے نے بیڑی سلگانے کے لیے چند لمحے توقف کیا۔ مجھے یہ جاننے کی بے چینی تھی کہ تجمل نے ہمارے بارے میں کوئی رائے کس طرح قائم کی۔ پہلے وہ کہاں گیا، کیا سیدھا اڈے؟ مگر سیدھے اڈے چلے جانے سے اُسے اتنی آسانی کے ساتھ کیسے کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔ وہ پانچ آدمی جنھوں نے ہمارا تعاقب کیا تھا، اڈے کے آدمی تھے۔ کیا ضروری ہے کہ تجمل کی نظر پہلے انھی پر گئی ہو۔ تجمل کے استفسار پہ آقا ہمارے بارے میں صاف انکار کر سکتا تھا۔ اُس نے اُن پانچ آدمیوں کو بھی زبان کھولنے میں محتاط کر دیا ہو گا لیکن اُن میں سے ایک شخص زخمی بھی ہو گیا تھا۔ اڈے کے کسی آدمی کے زخمی ہو جانے کے بعد یہ ممکن نہیں جبکہ اصل بات انھی پانچ آدمیوں تک محدود رہی ہو۔ کسی اور کے

علم میں کچھ نہ آیا ہو۔ پھر یہ حقیقت بھی اُن سے روپوش نہیں کہ اُن کے ساتھی کو زخمی کرنے والوں میں سے ایک شخص وہ شاہ کبیرا کو محبوب کی مہندی کے اڈے سے بے دخل کر دیا تھا بھی اُن دو آدمیوں کے بارے میں اُن کا تجسس فزوں جنھوں نے چار چار قوی دست آدمیوں کے سامنے حوصلہ نہیں ہارا خود اُن کے زخمی ہو جانے کی کوئی اطلاع انھیں نہیں ملی تھی۔ اڈے آدمیوں سے شہر میں پیش آنے والے ایسے واقعات چھپے نہ اس واقعے کی تو موسیٰ ندی کے علاقے کی ایک خلقت گواہ تھی روز ہوتے رہتے ہیں لیکن یہ خبر اڈے کے آدمیوں کے سر سے والی نہیں تھی کہ شاہ کبیرا کو اڈا بدر کرنے والا شخص پھر اُن کے دکھائی دیا ہے۔ دوسروں کی نسبت یہ اطلاع کالے دادا کو ملنا چاہیے تھی۔ آقا کی وجہ سے اُس نے زیادہ بے کلی ظاہر نہ کی یہ سُن کے کالے دادا کا قرار چھن گیا ہو گا۔ وہ آدمی دوبارہ آگیا سبب وہ محبوب کی مہندی جیسے اڈے کا مالک بنا تھا۔ کالے کے وہ تمام زخم تازہ ہو گئے ہوں گے جو آقا نے اڈا چھین کے لگائے تھے۔ ہو سکتا ہے کسی ایسے ہی دن کے انتظار میں اُس پر آقا کی بالادستی قبول کی ہو یا کسی اور موقع کے انتظار میں کر لی ہو ورنہ عام طور پر ایسا نہیں ہوتا کہ اڈے پہ نئے اُستاد جمانے کے بعد پرانا استاد موجود رہے۔ بہرحال اِس اندھیرے کو اڈے کی سمت ہی روشنی کی کوئی کرن دکھائی دی ہو گی۔ اُسے کچھ مل سکتا تھا۔

کانتے بتا رہا تھا کہ باقی سب کو ہوٹل سے دُور رکھ صرف اُسے ساتھ لے کے تجمل ہوٹل میں داخل ہوا۔ ابا جان ہی سینے سے لپٹ گئے۔ کانتے کہتا تھا کہ اُن کی آنکھیں تھیں، اُن کی طرف دیکھا نہیں جا رہا تھا کہ کہیں وہ بکھر نہ جائیں۔ تجمل نے بھی انھیں سمیٹے ہی رکھا۔ خاموشی سے اُن سنتا رہا، وہی کچھ جو راستے میں زورا اور مارتی اُسے بتا چکے تھے نے ابا جان سے نہ کوئی تبصرہ کیا، نہ دو لفظ تسلّی کے کہے۔ تسلّی کے لیے اُس کے پاس تھا بھی کیا۔ ابا جان بچے نہیں تھے جو کی سیری ہو جاتی۔ خود تجمل کو بھی تسلّی کی ضرورت ہو گی اور ابا جان متوقع پر اپنا منصب بھولے نہیں ہوں گے۔ کانتے کے مطابق سکون سے سب کچھ بیان کرتے رہے، ان کے ہونٹوں پر کوئی اور اُن کی آنکھوں میں کوئی نمی دکھائی نہیں دی۔

تجمل وہاں سے فوراً نہیں اُٹھا۔ اُس نے چائے منگوا کیا اور لباس تبدیل کرنے کے باوجود وہیں صوفے پر بیٹھا رہا کو اُس کی خاموشی سے بہت اُلجھن ہو رہی تھی لیکن تجمل

...ع اُٹھ سکتا تھا۔ ابا جان کی بیان کی ہوئی رُوداد اِس کے سوا کیا ہو ...تی تھی کہ ہم صبح صبح ہوٹل سے نکلے تھے پھر واپس نہیں آئے۔ تجمل وہ بھی قیاس کر رہا تھا جو ابا جان نے نہیں سُنایا تھا۔ مزید کسی پیچیدگی سے بچنے کے لیے اُسے پہلے وجہ کا تعین کر لینا چاہیے تھا اور وجہیں دو ہو ...تی تھیں کہ ہم کسی خاص سبب، خدشے یا نفرت کے باعث کسی کو مطلوب تھے یا پھر ہمارے ساتھ خود اپنی کسی کوتاہی کے سبب کوئی افتاد پیش آگئی تھی، کوئی ارضی و سماوی قسم کی افتاد جس پر ہمارا بس نہ چلا ہو۔ تجمل نے اِسے یک سر نظر انداز کر دیا ہو گا اور پہلی ہی وجہ پیش نظر رکھی ہو گی اور اُس کی روشنی میں اپنے آیندہ اقدام کے لیے مختلف امکانات پر غور کیا ہو گا۔ پہلا امکان مولوی محمد شفیق کے کسی سلسلے سے متعلق ہو سکتا تھا۔ ابا جان نے سفر کرتے کرتے اچانک ہمارے مراد آباد جانے اور وہاں سے چلنے پر ممبئی جانے کے بجائے حیدرآباد کا ارادہ کرنے کا ذکر لازماً اُس سے کیا ہو گا۔ تجمل کے لیے یہ نتیجہ اخذ کرنا دشوار نہیں تھا کہ مراد آباد کے مسافر خانے سے مولوی صاحب کا کوئی نشان ہمیں ضرور ملا تھا، حیدرآباد آ کے اُس نشان پر ہمیں پہلے دن شام کو ناکامی ہوئی تھی، جبھی ہم دوسری صبح ہوٹل سے پھر نکل گئے تھے۔ ممکن ہے مولوی صاحب کے حوالے سے کئی بدگمانیوں نے تجمل کے ذہن میں سر اُٹھایا ہو۔ دوسرا امکان حیدرآباد کے اڈے سے متعلق ہو سکتا تھا۔ تجمل کی یادداشت سے حیدرآباد میں گزشتہ سفر کے حادثے مٹ نہیں گئے ہوں گے۔ مولا جہاں گیر کا قصہ، شاہ کبیرے اور کالے دادا کا واقعہ۔ کیا شاہ کبیرا اڈے پر واپس آگیا ہے یا اڈے سے دُور رہ کے ابھی تک سینے پہ داغ لیے پھر رہا ہے؟ حالانکہ یہ ایک نہایت حیران کُن بات ہے، وہ کس منہ سے بازار واپس آیا ہو گا۔ بازار میں اُس کی واپسی ممکن معلوم نہیں ہوتی لیکن یہی بات تو اُس کے کینے کو ہوا دے سکتی ہے۔ تجمل نے اپنے پیچھے بازار کے اڈے پر ہونے والی غیر معمولی تبدیلیوں کا امکان رد نہیں کیا ہو گا۔ اس عرصے میں اڈے پر نیا اُستاد آ سکتا ہے۔ نئے اُستاد کو فطری طور پر ان اجنبیوں سے جو کنارہ رہنا چاہیے جو اچانک شہر میں وارد ہو کے شاہ کبیرے کی رُسوائی کا سبب بن گئے تھے۔ وہ دوبارہ بھی کسی وقت آ کے اڈے پر اپنے تعینات کیے ہوئے آدمی کالے دادا کے بجائے کسی اور کو دیکھ کے برہم ہو سکتے ہیں اور نئے اُستاد کے لیے مسئلہ بن سکتے ہیں اور خود کالے دادا، آدمی کی نیت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ کوئی عجب نہیں کہ کالے دادا ہی حیدرآباد میں اُن لوگوں کی واپسی پسند نہ کرتا ہو جو اُسے اڈا بخش گئے تھے۔ کوئی بھی بات ممکن تھی۔

مولوی صاحب اور اڈے سے متعلق ان پہلوؤں کے علاوہ ایک امکان ہماری گرفتاری کا بھی ہو سکتا تھا۔ تجمل نے اس پر بھی غور کیا ہو گا کہ ہم کسی اَن جانے معاملے میں ملوث ہو کے جیل نہ چلے گئے

ہوں۔ جیل میں یا تو ہمیں باہر سے رابطہ رکھنے کا موقع نہیں مل سکا یا ہم نے خود ابا جان، زورا اور مارتی پر زک آنے کے خیال سے پہلوتہی کی۔

حیدرآباد میں گزشتہ مرتبہ کے واقعات اور اُن سے متعلق لوگوں کے چہرے ذہن میں تازہ کرتے ہوئے تجمل کے سامنے نواب عالم تاب کا نام بھی آیا ہو گا۔ وہ شخص جو مسلح لوگوں کا ایک دستہ لے کے عین وقت پر اسٹیشن آ کے ہمارے راستے کی دیوار بن کے آگیا تھا، جب ہم خانم کو مستقل فیض آباد لے جا رہے تھے اور خانم نے ہمارے حق میں بلکہ اپنے حق میں فیصلہ دے دیا تھا، اُس وقت نواب چلا گیا تھا لیکن بعد میں خانم کے اس فیصلے سے کسی پشیمانی، غم اور غصے نے تو نواب پر غلبہ نہیں کر لیا۔ کالے دادا سمیت شہر میں کسی کو ہمارے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا کہ ہم کون تھے، کہاں سے آئے تھے اور خانم کو کہاں لے گئے۔ نواب عالم تاب کے نام پر، ہو سکتا ہے، تجمل نے اپنے خون کی گردش میں فرق محسوس کیا ہو۔ نواب کا چہرہ اُسے اچھی طرح یاد ہو گا۔ خانم کے انکار پر وہ کیسا حواس باختہ نظر آتا تھا۔ اُس کا چہرہ جلنے لگا تھا۔

کانتے کہہ رہا تھا کہ وہ سہ پہر کو ہوٹل میں آئے تھے، تجمل شام تک خاموش بیٹھا رہا۔ اُسے اُٹھ کے ناک کی سیدھ میں نہیں چل دینا تھا۔ تار ملنے کے بعد اُن کے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے بیدار ہوئے تھے لیکن کہیں دُور دُور تک اُن کے سان و گمان میں نہیں تھا کہ یہاں پہنچ کے انھیں ایسی کسی خبر سے واسطہ پڑے گا۔ روشنیاں جل چکی تھیں، جب تجمل اپنی نشست سے اُٹھا، چند لمحے اُس نے ابا جان سے دھیمے لہجے میں کوئی بات کی جسے کانتے نہیں سن سکا، پھر ابا جان کو سلام کر کے وہ ہوٹل سے رخصت ہو گیا۔ ہوٹل سے کچھ دور ایک مقام پہ شامو، جمرو اور ٹھنگو اُن کے منتظر تھے۔ مارتی کو تجمل نے ہوٹل میں چھوڑ دیا اور زورا کو ساتھ لے لیا۔ اُن سب کو اپنا تعاقب کرتے رہنے کی ہدایت دے کے وہ آگے بڑھ گیا۔ اس کا رُخ شہر کے اندرونی علاقے کی طرف تھا۔ کانتے اُس کے ساتھ تھا۔ جلد ہی وہ تھانے کی عمارت کے نزدیک پہنچ گئے۔ تجمل نے اپنے پیچھے آنے والوں کو اشارے سے وہیں روک دیا اور تھانے میں داخل ہو گیا۔

تھانے کے ذکر پر مجھے حیرت ہوئی۔ کانتے کے بہ قول وہ بھی شش و پنج میں پڑ گیا تھا لیکن اُس نے تجمل سے کوئی استفسار نہیں کیا اور چپ چاپ اُس کے ساتھ چلتا رہا۔ تجمل راہ داری میں بیٹھے ہوئے حوالدار محرر کے پاس جا کے ٹھیر گیا اور اُس نے کہا کہ ہم لوگ دُور سے آئے ہیں۔ کوئی بیس دن پہلے ہمارے دو آدمی یہاں شہر میں پہنچے تھے۔ گھر سے نکلنے کے بعد ان کی کوئی خیر خبر ہمیں معلوم نہیں ہو سکی۔ نام پلی اسٹیشن پر پان سگریٹ کی ایک دُکان سے اُن کے یہاں آنے کی

تصدیق ہو چکی ہے۔ اس کے بعد وہ دوبارہ دکھائی نہیں دیے۔ انھیں چھ سات دن میں واپس گھر پہنچ جانا تھا اور اتنے دن گزر جانے کے بعد اب تک وہ نہیں پہنچ سکے ہیں۔ حوالدار نے اُس کی بات توجہ سے سُنی اور کئی ایک سوال کیے۔ بجھل نے گم شدگان کے نام مختلف بتائے۔ عمریں بھی میری اور پیرو کی نہیں تھیں۔ وضع قطع بھی کسی قدر مختلف تھی۔ حوالدار کچھ سوچتا رہا اور اُس نے سرسری طور پر روزنامچہ اُلٹ پلٹ کے دیکھا۔ اِس دوران بجھل نے کہا کہ اُس کے کھو جانے والے عزیز مزاج کے ذرا تیز واقع ہوئے ہیں، یہاں ریاست کے طور طریق سے ایسے واقف نہ تھے اِس لیے اُسے اندیشہ ہے کہ کہیں اُن سے کوئی انیس بیس حرکت تو سرزد نہیں ہو گئی ہے۔ حوالدار ایک دردمند آدمی تھا۔ اُس نے اُس سے ہمدردی ظاہر کی، پوچھا، کہاں ٹھیرے ہو۔ بجھل نے کہا۔ اسٹیشن سے اِدھر اُدھر پوچھتے ہوئے یہاں آ گئے ہیں۔ اب جا کے نام پلی کی کسی سرائے میں ٹھیر جائیں گے۔

وہ عابد شاپ روڈ کے تھانے کا علاقہ تھا۔ وہاں سے نکل کے بجھل اور آگے بڑھ گیا۔

کانتے کی زبانی یہ سب سن کے میری سمجھ میں کچھ آیا۔ میری پٹ پٹاتی نظریں دیکھ کے اُس کے ہونٹوں پہ پہلی بار مسکراہٹ اُبھری مگر تھکی ہوئی، بجھی ہوئی سی مسکراہٹ۔ اُس نے بتایا کہ باقی فاصلہ اُنھوں نے رکشے کے ذریعے طے کیا اور اندھیرا گہرا ہوئے زیادہ وقت نہیں ہوا تھا جب وہ ایک دوسرے تھانے پہنچے۔ مجھے فوراً اُس تھانے کا گمان ہوا جہاں مجھے اور پیرو کو لے جایا گیا تھا لیکن وہ کوئی دوسرا تھانا تھا اور اتنا بڑا نہیں تھا۔ بجھل نے وہاں بھی وہی کہانی دُہرائی اور وہاں سے بھی اُسے وہی جواب ملا۔ اُس وقت اُس کا شبہ کسی حد تک دُور ہو گیا ہوگا کہ ہم شہر میں کسی بڑے حادثے سے دوچار نہیں ہوئے ہیں ورنہ تھانے میں اس کا چرچا ضرور ہوتا لیکن کوئی چھوٹا موٹا واقعہ بھی ہو سکتا ہے جو کسی ایک علاقے کے تھانے تک محدود رہا ہو۔ یقیناً یہی کچھ سوچ کے بجھل نے تیسرے تھانے کی چار دیواری میں قدم رکھا ہوگا۔ پہلے دو تھانوں میں جہاں اُس کی کوئی اُلجھن دُور ہوئی تھی وہیں بہت سی اُلجھنیں بڑھ بھی گئی ہوں گی۔ تیسرے تھانے میں اُس نے اپنی رُوداد میں کسی قدر ترمیم کی اور متعلقہ حوالدار سے کہا کہ وہ اپنے دو آدمیوں کی گم شدگی کی رپورٹ کرانا چاہتا ہے۔ حوالدار نے اُسے چونک کے دیکھا اور پہلی دفعہ کانتے کے بہ قول اُس کے کان کھڑے ہوئے۔

میں نے اپنی بے چینی خود تک محدود رکھی اور کانتے سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ موسیٰ ندی کے پاس والا تھانا تو نہیں تھا۔ میری مداخلت سے وہ اٹک سکتا تھا۔ کہنے لگا، حوالدار نے وضاحت چاہی۔

"کیسے آدمی؟"

بجھل نے کم و بیش ہمارا وہی حلیہ اُسے بتایا جو
تھانوں میں بتا چکا تھا۔ حوالدار نے روزنامچے کی ورق گردانی
بولا۔ ایسے ناموں کا کوئی اندراج گزشتہ بیس دن میں نہ
بجھل نے حجت کی اور کہا کہ ممکن ہے، پولیس کے خوف سے
نے اپنے صحیح نام نہ بتلائے ہوں۔ اُس نے حوالدار سے اپنی پر
اظہار کیا اور کہا کہ صرف اُنھی کی تلاش میں اُس نے اتنی دُو
کیا ہے۔ بجھل نے اُس سے درخواست کی کہ اگر وہ اپنا کچھ و
کر کے گزشتہ دنوں کے روزنامچے پر تفصیل سے نظر ڈال
پردیسی کے ساتھ احسان کرے گا۔ حوالدار جز بز ہوا۔ منہ بنا
بجھل نے کہا کہ وہ دو آدمی اُسے بے حد عزیز تھے، اُن کے لی
کے بڑے سے بڑے حاکم کے پاس فریاد کے لیے جا سکتا
روپے پیسے کے خرچ کی اُسے اتنی پروا نہیں ہے۔ اُسے ا
عزیزوں کا حال جاننے کی فکر ہے اور بس۔ روپے پیسے کا
نے جان بوجھ کے کیا ہوگا۔ اس پر حوالدار نے سر تایا اُن دو
لیا اور کسمسا کے بولا۔ "ہم کو یاد نہیں کہ اس درمیان ایسے آدمی
ہوں جیسا حلیہ تم لوگ بولے۔" تاہم بجھل کے گزارشانہ اصرا
دل پسیجا اور اُس نے ناگوارانہ توجہ سے دوبارہ روزنامچہ دیکھ
کیا، ابھی اُس نے تین چار ہی صفحے پلٹے ہوں گے کہ رک گیا
ہوا بولا۔ "دو آدمی تھے؟"

بجھل نے جلدی سے گردن ہلائی۔ "ہاں ہاں صاحب
اِدھر آئے تھے!"

حوالدار نے تذبذب سے جواب دیا۔ "دو آدمی تو ہم
پڑتے ہیں لیکن ...."

بجھل نے اس کی بات کاٹ کے تیزی سے پوچھا
تھے کس معاملے میں آئے تھے صاحب؟"

"لیکن جو حلیہ تم بولتے ہو، ویسا کوئی آدمی نہیں تھا
کو اتنے دن نہیں گزرے، جتنے تم بولتے ہو۔ یہ کوئی سات آ
پہلے کی بات ہے، دو آدمی تھے، ایک نوجوان، دوسرا بڑی عمر کا
سپاہی پکڑ کے لائے تھے۔" اُس نے بجھل کو بتایا کہ یہ تقریبا
کا واقعہ ہے۔ رات ہو گئی تھی۔ وہ بھی ڈیوٹی پہ تھا اور اُس
لوگوں کو اچھی طرح دیکھا تھا۔ پھر اُس نے فوراً صفحے پلٹے
پہلے کی رپورٹ دیکھنے لگا، دیکھتا رہا اور سر ہلا کے بولا۔
وہ لوگاں جیسا تم بولتا ہے ایسا سرے سے نہیں تھا۔"

"کیا ہم اُن سے مل سکتے ہیں؟" بجھل نے اضطراب
"وہ اب ادھر کہاں ہیں۔" حوالدار نے بیزاری سے بتا
اسی رات چلے گئے تھے۔"

"اُسی رات چلے گئے تھے؟"

قسمت کے اچھے تھے۔" حوالدار نے کہا۔ "جلدی خلاصی ہو گئی
م بازوں کی ہم تم سے بولیں، ہم کو ایسے لوگوں سے کم واسطہ پڑا ہے۔
نبر جان دار آدمی تھے۔ بہت سے اپنی آنکھاں سے دیکھنے والے
ی بولتے ہیں کہ دیکھتے دیکھتے پورے چار آدمیوں کو کھینچ کے رکھ
تھے۔" کانتے نے مجھے اُسی کے لہجے میں بتانے کی کوشش کی
کہنے لگا ہمیں اچنبھے اور شک میں پڑا دیکھ کے حوالدار کی آنکھوں
چمک پیدا ہوئی اور وہ ہمیں یقین دلانے کے انداز میں بولا کہ موسیٰ
ی کے کنارے چار آدمیوں نے انھیں گھیر لیا تھا۔ چاقو تک نکل آئے
ھے۔ انھوں نے اُن چاروں کو قابو میں کر کے ایک کو زخمی بھی کر دیا اور
ہم سے صاف نکل گئے۔ ادھر موسیٰ ندی پر ساری خلقت جمع ہو
ی تھی۔ اُس نے بجھل سے کہا کہ کچھ دیر اور ہو جاتی تو وہ دونوں پولیس
ے ہاتھ کبھی نہیں پڑتے لیکن اطلاع ملنے پہ ہر طرف پولیس چوکنا ہو
ی تھی۔ اُسے زیادہ دوڑ بھاگ نہیں کرنی پڑی۔ یہاں تھانے میں آ کے
بھی وہ زور آزاری دکھاتے رہے مگر اِن گنا ہگار آنکھوں نے سلاخوں
ے پیچھے بڑے بڑے رستم پگھلتے دیکھے ہیں۔ ایک شہری کو چاقو لگا تھا
ں لیے تم انھیں نہیں چھوڑا جا سکتا تھا اور پھر سب انسپکٹر فیروز کو اُن
تک ہو گیا تھا کہ ایسی چاقو بازی اور زور کرنے والوں کا تعلق جیسا
وہ کہہ رہے ہیں تجارت سے نہیں ہونا چاہیے۔ سب انسپکٹر کا شبہ
رست معلوم ہوتا تھا لیکن اُن کی یہ بات بھی سب کے جی کو لگتی تھی کہ
چار آدمیوں نے روپے کی وجہ سے اُن پر حملہ کیا تھا۔ اُن کے بیان کے
مطابق اُن کا سامان بھی وہیں موسیٰ ندی پر رہ گیا تھا۔ کہتے تھے کہ
صندوق میں بہت سے روپے تھے۔ روپے اُن کی جیبوں میں بھی تھے
ور خاصی معقول تعداد میں۔ حوالدار نے کانتے اور بجھل کو وہی بتایا
و ہمارے ساتھ تھانے میں پیش آ چکا تھا۔ بتاتے بتاتے وہ یک
لخت ٹھیر گیا، شاید اُسے احساس ہو گیا تھا کہ اتنی تفصیلات کے
ساتھ اُن سے یہ سب کچھ کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ اُس کے ماتھے پہ
ل پڑ گئے چنانچہ بجھل نے کُریدا کہ پھر آخر وہ لوگ چھوٹ کیسے گئے
تو حوالدار ناراض ہونے لگا۔

"ہم کو شبہ ہے صاحب کہ وہ اپنے ہی آدمی تھے۔" یکایک بجھل نے ڈوبے لہجے میں کہا۔

"کیا؟ کیا بولتے ہو تم لوگاں!" وہ ایک دم اکھڑ گیا اور درشتی سے بولا۔ "ہوگا تو پھر چلا گیا، اب وہ اِدھر نہیں ہے۔"

"ہم یہی پوچھتے ہیں صاحب کہ آخر وہ کیسے چلے گئے؟ آپ بولتے ہو کہ قسمت نے اُن کا ساتھ دیا، اُن کی جلدی خلاصی ہو گئی۔"

"دیکھو ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے جو اب تمھارے ساتھ مغز کھپائے۔ کسی دوسرے تھانے میں جا کے دیکھو اور رپورٹ لکھوانی ہے تو ہم کو بولو۔"

بجھل نے اُس سے گزارش کی کہ وہ پہلے ہی دو تھانے جا کے پوچھ آیا ہے۔ جب اُس نے اتنی مہربانی کی ہے، اب تک اتنی ہمدردی سے پیش آیا ہے تو اب اچانک اُسے کیا ہو گیا ہے۔ کیا اُس کی شان میں اُن سے کوئی گستاخی ہو گئی ہے۔ باقی کچھ بتلانے میں کیا حرج ہے۔ کچھ اور نہیں تو اُن کی تسلی ہو جائے گی۔ ممکن ہے، وہی لوگ ہوں۔ حوالدار اس کٹھ حجتی پر اور بھڑک گیا۔ نہایت تند و تلخ لہجے میں اُس نے دوبارہ میرا اور پیرو کا حلیہ دُہرایا، یہ بجھل کے بتائے ہوئے حلیے سے قطعی مختلف تھا۔ بس سفر کی ایک غرض تجارت مشترک تھی۔ وہ غصے میں بجھل سے پوچھنے لگا۔ "ایسا ہی تھا تمھارا کھویا ہوا آدمی؟"

بجھل نے انکار میں گردن ہلائی۔ وہ کسی قدر نرم پڑ گیا اور بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "اور ہم کیا بولتے ہیں، جب لوگاں ہی وہ نہیں تھے تو آگے جان کے تم کیا کرو گے۔" بجھل خاموش رہا لیکن اُٹھا نہیں۔ حوالدار کا پارا ٹھیر گیا۔ اُس نے از خود بتانا شروع کیا کہ "وہ ایک دم دوسرا لوگاں تھا بابا! اینچی آواز میں اُن سے بات کرنا نہیں آتا تھا۔" بجھل اور کانتے کی خاموشی پر اُس کا لہجہ زیادہ نرم ہو گیا۔ اُس نے کہا، رات کو جب بڑے انسپکٹر رُکنی میاں تھانے آئے تو انھیں اُن کے سامنے پیش کیا گیا۔ اتفاق سے اُس وقت رُکنی میاں کے کوئی معزز دوست بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ حوالدار نے انھیں دوسری یا تیسری ہی بار تھانے میں دیکھا تھا۔ اُن کا اصل نام بھی اُسے اُسی رات معلوم ہوا۔ خاں صاحب فیض علی خاں۔ دونوں ملزموں کا بیان انھوں نے بھی سنا اور بہت متاثر ہوئے۔ بولے، پردیسی ہیں، ان کی کہانی سچی لگتی ہے، ان کو تو بہادری کا کوئی تمغہ ملنا چاہیے، پھر انھوں نے ہچکچاتے ہوئے رُکنی میاں سے کہا، جی چاہتا ہے کہ انھیں چھوڑ دیا جائے۔ رُکنی میاں نے معذرت کر لی تھی لیکن خاں صاحب ضمانت لینے پہ آمادہ ہو گئے۔ رُکنی میاں اپنی مرضی کے آدمی ہیں۔ اپنے معاملات میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتے لیکن خاں صاحب کی بات اور تھی۔ کچھ اُن سے اپنے تعلق کا پاس تھا اور کچھ خاں صاحب بڑے آدمی تھے۔ بڑی سی موٹر میں آئے تھے، لباس، گفتگو، رکھ رکھاؤ سے امارت ٹپکتی تھی۔ رُکنی میاں خاموش ہو گئے۔ "دیکھا تم نے!" حوالدار نے سر اُٹھا کے کہا۔ "بڑے لوگاں کی بڑی باتاں، ابھی ایسا دل والاں بھی دُنیا میں پڑا ہے۔ اجنبی کا ضمانت لے لیا۔" پھر وہ تنک کے کہنے لگا۔ "اب تم بولو گے، ہم کو خاں صاحب کا اتا پتہ بولو۔"

"نہیں صاحب! ہم آپ کو کچھ نہیں بولیں گے۔" بجھل نے ایک ثانیے کے سکوت کے بعد بوجھل لہجے میں کہا۔ "پھر آپ ٹھیک ہی بولتے ہو۔ اپنے آدمی ایسے نہیں تھے۔"

کانتے کا خیال تھا کہ بجھل حوالدار کو انسپکٹر رگنی میاں سے ملنے کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کرے گا لیکن وہ اچانک اٹھ گیا، اس نے حوالدار کا شکریہ ادا کیا اور جیب سے روپے نکال کے مٹھی بند کر کے حوالدار کو دینے چاہے۔ حوالدار نے بس پلک جھپکنے کا تامل کیا پھر صاف انکار کر دیا۔

تھانے سے نکل کے وہ دونوں رکشا میں بیٹھ گئے۔ زورا، شامو، جمرو، ٹنگو دور کھڑے تھانے کے دروازے پر نظر رکھے ہوئے تھے انھیں دیکھتے ہی وہ بھی رکشوں میں بیٹھ گئے۔

بجھل کے لیے مختلف امکانات میں سے کوئی ایک متعین کرنا نہایت دشوار تھا۔ وہ یہی کر سکتا تھا کہ پہلے تمام امکانات الگ الگ کرے پھر سب سے بے ضرر اور سامنے کا امکان ٹٹول کے دیکھے۔ مولوی صاحب کے حوالے سے ہماری گم شدگی کا کوئی امکان اس نے مسترد نہیں کیا ہوگا لیکن اس سمت کوئی قدم اٹھانے کے لیے اسے کوئی ایسا نام و نشان معلوم ہونا ضروری تھا جس کے باعث ہم نے یکایک حیدرآباد آنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ بجھل کو وہ نام و نشان مراد آباد کے مسافر خانے ہی سے مل سکتا تھا۔ مراد آباد بہت دور تھا۔ وہاں جانے اور واپس آنے کا وقت صرف کرنے سے پہلے بجھل کو دوسرے امکانات کے سلسلے میں اپنا تردد دور کر لینا چاہیے تھا اور اس کی یہی صورتیں ہو سکتی تھیں کہ وہ یا تو سیدھا اڈے کا رخ کرے یا جا کے نواب عالم تاب کی حویلی کا دروازہ کھٹکھٹائے۔ تھانے پہنچے یا ادھر ادھر گھوم کے ہمیں پیش آنے والے کسی ناقابلِ قیاس حادثے کی سن گن لینے کی کوشش کرے۔ اباجان سے ساری روداد سننے کے بعد اس کے ذہن سے یہ حقیقت چمٹی رہی ہوگی کہ ہمیں گم کر دینے والے ارادے کے پختہ اور حیثیت کے مضبوط لوگ ہی ہو سکتے ہیں۔ گم ہو جانے والوں کے ساتھیوں کے ردِ عمل سے اچھی طرح باخبر اور اس کا جواب دینے کے لیے ہر طرح مستعد۔ میرے متعلق تو بجھل کو ایسی کوئی خوش فہمی نہیں ہوگی لیکن میرے ساتھ ممبئی کے اڈے کا سب سے بڑا دادا پیرو بھی تھا۔ میرے ساتھ اسے بھی یوں سرِ راہ اوجھل کر دینا کوئی آسان کام نہیں اور پھر اتنے دن گزر جانے کے بعد ہماری طرف سے مسلسل سکوت۔

ہوٹل سے چلتے وقت بجھل کے سر میں بے شمار جالے تنے ہوں گے۔ کچھ شواہد اور نشانیوں کے اعتماد میں اس کے لیے اڈے جانا بہتر ہو سکتا تھا اور یہی احتیاط نواب عالم تاب کی حویلی کے لیے ضروری تھی۔ سوالوں سے کچھ نہ حاصل ہو سکنے کی صورت میں اور گرہیں پڑ سکتی تھیں۔ وہ کانتے کو بھی اڈے بھیج سکتا تھا، اسے یہاں کوئی نہیں جانتا تھا مگر کانتے کو اڈے کے لوگوں سے تنا سا ہونے اور

صحیح صورتِ حال تک پہنچنے میں وقت لگ سکتا تھا۔ وہ ا[...] نظروں میں بھی آ سکتا تھا اور اس کی ذرا سی غلطی کسی اور بڑے [...] کا سبب بن سکتی تھی۔ بجھل نے ادھر ادھر گھومنے اور ہواؤں [...] چلانے کا ارادہ اسی لیے موقوف کیا ہوگا کہ اسے اپنی بھی [...] احتیاط رکھنی تھی۔ جن لوگوں نے مجھے پہچان لیا تھا، ان کی نگا[...] میں بجھل کے خدوخال بھی محفوظ ہوں گے۔ جنھیں اپنے سر کی [...] نہیں ہوتی، اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ اپنا سر بچا کے [...] ہوٹل میں سہ پہر سے شام تک بیٹھے رہنے کا ایک سبب اندھیرے [...] بھی ہو سکتا تھا۔

پھر تھانا ہی ایک راستہ رہ جاتا تھا۔ بازار یا آبادی [...] سے ہمیں کہیں لے جایا گیا ہوگا ورنہ ہم ایسے جانے والے نہیں [...] نے یقیناً کوئی مزاحمت بھی کی ہوگی اور اس کا کسی تھانے م[...] بھی ممکن تھا۔ اباجان نے اسے بتایا ہوگا کہ شہر سے چھپنے وا[...] اخبارات پر وہ مسلسل نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ کوئی ایسا ویسا وا[...] سانحہ پیش آتا تو اخبار میں خبر ضرور آتی لیکن اخبار میں بہت [...] شائع بھی تو نہیں ہو پاتیں، تھانے کی چار دیواری اور روزنا[...] محدود رہتی ہیں۔ بسا اوقات تو روزنامچوں سے بھی دور [...] ہیں۔ بجھل کی طرح اباجان، زورا اور مانِٹی بھی تھانے جا[...] زورا کے کہنے کے مطابق اباجان تو جاتے جاتے لوٹ آ[...] انھوں نے اچھا ہی کیا، اول تو انھیں وہاں جا کے بجھل کے لیے [...] کرنی چاہیے تھی، دوسرے تھانے سے حاصل ہونے والی معلو[...] بعد بھی انھیں بجھل کی ضرورت پڑتی۔

موسیٰ ندی کا پل عبور کرنے کے بعد پتھر گٹی، پھر چار کمان [...] بازار اور اس سے فرلانگ بھر آگے چار مینار کا علاقہ تھا۔ یہا[...] رکشا سے اتر گیا۔ چند قدم پیدل چلنے کے بعد وہ مکہ مسجد کے [...] آ گئے۔ زورا، شامو، جمرو، ٹنگو بھی ان کے پیچھے پیچھے آ رہے [...] مسجد کے عین سامنے ایک ہوٹل میں وہ سب یک جا ہو گئے [...] بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ ہوٹل میں آ کے بیٹھ جائے گا۔ ہوٹل ہی [...] کم تھی لیکن کسی طرح سکڑ سکڑا کے انھوں نے تپائیوں پر نشس[...] تھی۔ بجھل نے ان کے لیے کھانا منگوا لیا۔ ہلکا سا کھانا، دال او[...] حالانکہ ہوٹل والے نے اسے مختلف کھانوں کی ایک بڑی فہرست [...] تھی۔ سویل میں نکلتے اور دن میں ایک پیالی چائے کے سوا انھوں [...] صبح سے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ کھانے پینے کا ہوش کسے تھا [...] بجھل کا منہ تک رہے تھے۔ کانتے نے کئی بار ارادہ کیا کہ کوئی [...] چھیڑے مگر بجھل کا سوچا ہوا منہ دیکھ کے اس کی زبان اٹ[...] تھانے میں سب کچھ اس نے اپنے کانوں سے سنا تھا پھر بھی [...] ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے بہت کچھ سننے سے رہ گیا ہو۔ وہ بجھ[...]

[...]ہی کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ کھانا آ گیا، سب گم سم، گنگ بیٹھے تھے۔ [...]بجھل کے اشارے پر انھوں نے جیسے تیسے کھانا شروع کیا۔ ان کا کھانا لی[...] [...]ب کی خوراک سے بہت کم تھا پھر بھی بچ گیا۔ کھانے کے بعد [...]ل نے چائے منگوائی اور بیڑی سلگا کے ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔ ان [...]ب کو بہت گھٹن ہو رہی تھی۔ شامو درمیان میں کہنے لگا کہ اس وقت [...]نادا کی آنکھوں میں جیسے خون بھرا ہوا تھا۔ اس نے آدھی بیڑی پی ہو[...] [...]کہ پھینک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

سامنے چار مینار کے گھڑیال میں دس بج رہے تھے۔ ہوا خشک [...]ی اور دکانیں بند ہو جانے کے باوجود سڑکوں پر آمد و رفت ایسی کم [...]ہیں ہوئی تھی۔ کانتے کہہ رہا تھا کہ اسے بجھل کی خاموشی زہر لگ [...]ی تھی طرح طرح کے اندیشے اس کے سینے میں چبھ رہے تھے۔ کانتے [...]پنے تابی کا اندازہ میں اچھی طرح کر سکتا تھا۔ کچھ اس کے لہجے سے بھی [...]ں کا اظہار ہوتا تھا۔ خود مجھے یہ سوچ سوچ کے دھڑکا سا لگا ہوا تھا [...]کہ تھانے سے نکل کے بجھل نے آخر کس طرف جانے کا ارادہ کیا ہوگا۔ بجھل چار مینار سے آگے نہیں گیا۔ وہیں رکشے خالی مل گئے تھے۔ کانتے بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا، باقی چاروں دوسرے دو رکشوں پر بیٹھے۔ کانتے نے مجھے بتایا کہ رکشا میں بیٹھتے ہوئے بجھل نے جب منزل بتائی تو اس نے جگہ کا نام صاف طور پر سنا لیکن اسے خیال نہیں تھا کہ وہ بازار کا علاقہ ہوگا۔

"محبوب کی مہندی" میں نے تیزی سے کہا۔

"ہاں! وہ ادھری آیا تھا" وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔

میری رگوں میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ کانتے کہنے لگا، رکشا [...]سے اترنے پر اس کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ پہلے وہ سمجھا تھا کہ کہیں وہ خاں [...]احب یہاں نہ رہتے ہوں جن کا ذکر حوالدار نے بجھل سے کیا تھا۔ [...]ن کے خیال میں شاید اسی لیے بجھل نے ان کا اتا پتا جاننے کی جستجو نہیں کی تھی کہ وہ پہلے سے ان سے واقف ہوگا۔ اگر خاں صاحب [...]ی بات غلط نکلی یا خاں صاحب نے انکار کر دیا یا انھوں نے [...]وئی اور؟.... کانتے کہہ رہا تھا کہ اس کا سر گھوم رہا تھا لیکن رکشا [...]ے اتر کے اس نے جب بازار کا علاقہ دیکھا تو اسے خود بخود کوئی [...]بلاسوئی سی نصیب ہوئی۔ اسے آنے والے لمحوں کی لَو محسوس ہو [...]ی تھی اور اس نے بجھل کا بایاں شانہ بار بار اوپر اٹھتا دیکھ لیا تھا۔ [...]س نے کبھی غور نہیں کیا لیکن کانتے کے کہنے کے مطابق کسی خاص [...]قت میں بجھل کا بایاں شانہ پھڑکنے لگتا تھا۔ گلی میں داخل ہوتے [...]ی بجھل نے پیچھے سے اس کی گردن کی چٹکی بھری اور اس کا سارا جسم [...]نچوڑ دیا۔ کانتے کے لیے یہ بھی بجھل کی طرف سے آنکھیں کھلی رکھنے [...] اشارہ تھا تاہم اس کی آنکھیں بھر آئیں اور اس کا جی چاہا کہ وہ

بجھل سے لپٹ کے رونے لگے مگر بجھل نے اسے آگے دھکیل دیا۔

اس نے باقی چاروں کو ساتھ آنے کی ہدایت نہیں دی تھی

اس لیے وہ اس کے پیچھے ہی چلتے رہے۔ گلیوں میں اس وقت بہت ہجوم تھا۔ سارا علاقہ روشن تھا۔ بازار کی تیزی کا وقت تھا۔ بجھل کہیں ٹھیرے بغیر بڑھتا گیا۔ راستے اسے معلوم ہی تھے۔ بعض گلیوں سے فاصلہ کم ہو جاتا تھا لیکن وہ تنگ گلیوں میں گھومنے کے بجائے سیدھے راستے سے گزرا، اسی طرف سے جہاں سے میں اور پیرو گزرے تھے۔ ایک چوک کی مختلف ہوٹلوں اور چائے خانوں کی تپائیوں پر اڈے کے لوگ اور راہگیر بیٹھے رہتے تھے۔ بجھل ابھی اس چوک سے دور تھا کہ یکایک ایک راہ گیر اسے دیکھ کے چونک پڑا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ایک طرف بھاگ جانا چاہتا تھا۔ بجھل نے فوراً دو قدم آگے بڑھ کے اس کے کندھے پر ترچھا ہاتھ مارا۔ وہ اڈے ہی سے وابستہ کوئی آدمی تھا۔ بلبلاتا ہوا وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ بجھل ہی نے بال پکڑ کے اسے اٹھایا اور کہا۔

"کدھر ہے تیرا دادا؟"

اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں، گھگھیاتے ہوئے بولا "دادا، دادا وہ۔ وہ ادھر....." اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"اس حرام کے جنے کو جا کے بول کہ اب ادھر ہم لوگ آ گئے ہیں سمجھا؟" بجھل نے اسے گردن سے اوپر اچھال کے زمین پر پٹخ دیا۔ وہ اٹھ کے ایسی تیزی سے بھاگا کہ ذرا آگے ٹھوکر کھا کے گر پڑا پھر فی الفور اٹھ کے دوڑنے لگا اور دیکھتے دیکھتے اوجھل ہو گیا۔ کئی راہ گیر متوجہ ہو گئے تھے لیکن انھیں آگے جاتے دیکھ کے خاموش رہے۔ انھوں نے ان کی راہ میں رکاوٹ بننے کی غلطی نہیں کی۔ کچھ آگے چل کے کانتے نے دیکھا کہ دو آدمی لپکتے ہوئے ان کی طرف آ رہے ہیں مگر جیسے ہی بجھل اور کانتے پر ان کی نظر پڑی، وہ سٹ پٹا سے گئے، جہاں تک آ سکے تھے، وہیں کھڑے ہو گئے۔ بجھل اور کانتے لمحوں میں ان تک پہنچ گئے تھے۔ دونوں آدمیوں کے ہاتھ میں بند چاقو چھپے ہوئے تھے۔ انھوں نے چاقو سامنے نہیں کیے، بجھل کو ایک نظر گھور کے دیکھا پھر آنکھیں چرانے لگے۔ ضرور انھوں نے بجھل کو پہچان لیا تھا۔ بجھل ان کے سامنے ایک لمحے بے سدھ کھڑا رہا پھر ایک دم اس نے دونوں کے بال پکڑ کے ان کے سر ٹکرا دیے۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ گلی چیخوں سے گونج اٹھی۔ چاقو بھی ان کے ہاتھوں میں نہ ٹک سکے۔ "جا کے اس زنخے کو بولو ہم آ رہے ہیں۔"

"دادا!" دونوں کانپتے ہوئے بجھل کے پیروں پر گرے اور اس کی ٹانگوں سے چمٹ گئے۔ بجھل کا پیر ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ کانتے نے انھیں الگ کرنا چاہا لیکن بجھل نے ان کی ٹھوڑیوں میں ہاتھ ڈال کے انھیں جھٹکا دے کے اٹھایا اور ادھر ادھر دھکیل دیا۔ "مجلتے ہو کہ نہیں"۔ اس نے پھنکارتی آواز میں انھیں حکم دیا "بولنا کہ

اپنی ماں کا جَنا ہے تو اُدھر ہی بیٹھا رہ، ہم آ رہے ہیں۔"

اُنھوں نے ہڑبڑاتے ہوئے خود کو سنبھال کے بتّھل کا حکم سُنا اور سرپٹ اُسی طرف بھاگ کھڑے ہوئے جدھر کانتے اور بتّھل کا رُخ تھا۔ وہ دونوں گلی میں بہت سے راہ گیروں کی نظروں میں آئے۔ بالاخانوں سے لوگ جھانکنے لگے تھے لیکن کانتے اور بتّھل سب سے بے خبر راستہ طے کرتے رہے۔ اُن کی رفتار نہ زیادہ تیز تھی، نہ اتنی سُست۔ چوک میں اُن کے پہنچنے سے پہلے اُن کی اطلاع پہنچ گئی تھی۔ ہوٹل کے سامنے پڑی ہوئی تپائیاں خالی تھیں، اِردگرد افراتفری سی چھائی ہوئی تھی۔ بتّھل کو دیکھ کے وہاں سناٹا چھا گیا۔ تپائیوں کے پاس اڈّے سے متعلق کئی آدمی مستعد تلے ہوئے سے کھڑے تھے مگر وہ آگے نہیں بڑھے۔ بتّھل خود اُن کے بیچ میں جا کے ٹھیرا اور کسی ایک کو قریب آنے کا اشارہ کیا، آدمی ڈُکا، جھجکا پھر آہستہ سے اُس کے پاس چلا آیا۔ "اِن سب کو بول رے، اپنے دادا کے کنے چلے جائیں۔ ابھی اِن کی اُس اٹھائی گیرے کو ضرورت پڑ سکتی ہے۔" بتّھل کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ رُکا اور تپائی پر بیٹھ کے اُس نے اُسی آدمی کو ایک گلاس پانی لانے کا حکم دیا۔

وہ اپنے ساکت و جامد ساتھیوں کی طرف دیکھتا ہوا ہوٹل والے کی طرف پہنچا۔ ہوٹل والے نے بھی سُن لیا تھا اور شاید بتّھل کو پہچان لیا تھا۔ وہ پانی خود لایا اور بتّھل کو سلام کرنے لگا۔ "چائے دادا؟" اُس نے اٹکتی آواز میں پوچھا۔

"نہیں، ابھی پان کھلواؤ پہلوان؛ چائے پینے بعد میں آئیں گے۔" تپائی پر بیٹھے بیٹھے اُس نے پانی پیا۔ دکان دار دوڑتا ہوا پان کی ملحقہ دکان پر گیا اور دو گلوریاں طشتری میں رکھ کے لے آیا۔ زورا، جمرو، شامو اور ٹنگو قریب ہی ایک دوسری پان کی دکان پر ٹھیرے ہوئے تھے۔ بتّھل نے جیب سے نوٹ نکال کے ہوٹل والے کی طرف بڑھایا، اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ نوٹ واپس جیب میں ڈال کے بتّھل اٹھ گیا اور اِدھر اُدھر نگاہیں گھماتے ہوئے بولا۔ "تم اُدھر ہی کھڑے رہو گے کیا، اپنے دادا کا دیدن کرنے نہیں چلو گے؟"

بتّھل نے پھر مڑ کے اُن کی طرف نہیں دیکھا، چوک سے کچھ آگے ہی اڈّے کی جانب جانے والی گلی تھی۔ وہ اور کانتے اُس میں مڑ گئے۔ کچھ دُور جانے کے بعد کانتے کو احساس ہوا کہ وہ اکیلے نہیں ہیں۔ زورا، جمرو، شامو اور ٹنگو کے علاوہ بھی کچھ آدمی اُن کے پیچھے آ رہے تھے۔ آگے گلی کے نکڑ پہ اُنھیں دو گشتی سپاہی بھی دکھائی دیے۔ کانتے کو ایک خدشہ یہ بھی لاحق تھا کہ اگر کہیں پولیس نے اُن کی راہ میں کسی طور مزاحم ہونے کی کوشش کی تو خواہ مخواہ دیر لگ جائے گی لیکن نہ تو گلی میں ایسا شور و شغب تھا، نہ دنگا فساد۔ ویسے بھی پولیس اڈّے کے لوگوں سے اُسی وقت اُلجھتی ہے جب کوئی چارہ نہ رہے یا نقضِ اَمن کا اندیشہ ہو۔ ایسے موقعوں پر بھی پولیس تب ہاتھ بڑھاتی جب اچھی خاصی نفری ساتھ ہونے کا اعتماد ہو۔ اڈّے والوں کی طرف سے پولیس کو متوجہ کرنے کا امکان بھی نہ ہونے کے اڈّوں کے لوگ پولیس کو اپنے معاملات سے آخر وقت تک ہیں۔ پولیس کو اُلجھانے کا مطلب خود بھی اُلجھنا ہے اور پھر ضرورت ہے۔ پولیس کو بیچ میں ڈال کے آئی بلا ٹالی جا سکے تو عارضی حل ہے۔ آڑ بار بار کام نہیں آتی۔ وہی لوگ جھوٹ تو بڑی بلا بن کے سامنے آتے ہیں۔ زورا نے درمیان میں بتایا دیکھ کے سپاہی چونکے تو ضرور تھے لیکن وہیں سے کسی دوسری گئے، اِس کے علاوہ وہ خود بھی اِس اثنا میں آگے بڑھ کے سے اوجھل ہو گئے۔ زورا کے بیان کے مطابق وہ اور جمرو وغیرہ پڑنے پر پولیس کا دھیان ہٹانے کے لیے پیچھے ہر طرح لیکن کانتے کا خدشہ بھی بے سبب نہیں تھا۔ زورا وغیرہ وہ سب کچھ نہیں جانتے تھے جو کانتے نے تھانے پر اڈّے اور اڈّے کے آدمیوں سے کچھ سوا تھا۔ کانتے کے خیال بھی لمحے، کسی بھی جانب سے رکاوٹ کھڑی ہو سکتی تھی۔

گلی میں کچھ اندر جا کے اڈّا تھا، اُس طرف عام بالاخانے تھے لیکن یہ بازار ہی سے متعلق علاقہ تھا۔ یہاں گلیوں میں بھی نہیں تھی۔ ابھی وہ اڈّے تک نہیں پہنچے تھے کہ اُنھیں جانب سے بھاگتے ہوئے کئی آدمیوں کی چاپیں سنائی دیں۔ بتّھل اور کانتے نے کچھ اور فاصلہ طے کیا، اُتنی وہ بھی سامنے آ گئے۔ دونوں نے اُنھیں دیکھ لیا تھا مگر وہ بڑھتے رہے۔ اُن کی تعداد پانچ تھی۔ پانچوں جسم کے مضبوط تیز دکھائی دیتے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں کھلے چاقو تھے اور بے قابو سے لگ رہے تھے۔ بتّھل اور کانتے کو بڑھتا دیکھ نے دُور ہی سے اُنھیں ٹھیر جانے کا حکم دیا تھا۔ بتّھل نے نہیں مگر آگے اُنھوں نے راستہ روک لیا تھا اس لیے بتّھل پڑا، وہ کانتے سے بولا۔ "دیکھ رہا ہے، ہریالے آ گئے، کیا اُس کو، ہرا ڈلے، اب اڈّوں پہ بھی ہراول ہونے لگے سالے۔" نے اُن سے مخاطب ہو کے پوچھا۔ "کیا بات ہے رے؟"

"بات تو تم سے اپن کو پوچھنا ہے اُستاد!" اُن میں بگڑی ہوئی آواز میں بولا۔

"اپنے کو تیرے دادا سے ملنا ہے۔"

"اڈّے پر اب کالے دادا نہیں ہے اُستاد!"

"تو جو کوئی بھی ہے، اپنے کو اُسی سے ملنا ہے۔"

"تم، تم کیا چاہتے ہو؟"

"اونچا سنتا ہے؟ بولا نا، ہمرے اُستاد کو ملنا چاہتے ہیں۔" بتّھل دھیمے لہجے میں کہا۔

"پہلے اِدھر ہمی سے مل لو اُستاد!" اُن میں ایک کسمساتے ہوئے بولا۔

"تو پھر تیرا دادا اِدھر سے چلا جاوے گا کیا؟"

"یہ دادا جانے۔" اُس نے ترشی سے جواب دیا۔

"ہٹ جا رے۔" بتّھل نے تندی سے کہا۔ "اپنے کو نہیں پہچانتا ہے کیا؟"

"پہچانتے ہیں اُستاد! پر تم بھی اپن کو۔۔۔"

"ہاں، آں۔" کانتے نے اُن کی بات کاٹ کے تیزی سے کہا۔ "دیکھ رہے ہیں، تم کو اُوپر سے نیچے تک اچھی طرح دیکھ رہے ہیں، ہم بولتے ہیں، راستہ چھوڑ دو، اُدھر تمھارے دادا ہی سے کچھ بات کرنا ہے۔ تمھارے من میں کچھ اور ہے تو وہ سب بھی پورا کر دیں گے، قسم سے کوئی شکایت نہیں ہوگی تم کو، لیکن دادا سے پہلے نہیں۔ ابھی وہ سالا نہیں گیا ہے۔ اڈّے کا مالک بنا ہے تو صرف تمھارے ٹھیکے پہ نہیں ہوگا، کچھ اپنا بل بھی رکھتا ہوگا۔ اپنے کو معلوم ہے، اُس نے تم کو نہیں بھیجا ہوگا، کوئی اڈّے دار سالا ایسا اُلّو کا پٹھا نہیں ہوتا۔ اپنے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اور ہم کو زیادہ بولنا بھی نہیں آتا۔"

"یہاں سے واپس چلے جاؤ اُستاد!" جواب میں اُن میں سے کسی نے برہمی سے کہا۔ "آکا، شاہ کبیرا نہیں ہے۔ اُس کے پاس سے بھیکنے والا سالا اُن پانی بھی نہیں مانگتا، اپن بولتے ہیں، تمھارے لیے یہی اچھا ہے کہ جدھر سے آئے ہو، اُدھری لوٹ جاؤ۔"

"آکا نام ہے اُس کا؟" بتّھل کی آواز تھمی ہوئی تھی۔ "ٹھیک ہی بولتے ہو بے پِیدوں کے! اپنے کو وہ شاہ کبیرا نہیں لگتا۔ شاہ کبیرا تھوڑا بہت آدمی کا تخم لگتا تھا۔ اپنے کو تمھارا دادا گیدڑ کا جنا لگتا ہے۔"

کانتے کہتا تھا کہ وہ دونوں بالکل تیار تھے اور اُن پانچوں کو کھلے چاقوؤں کے باوجود آسانی سے سنبھال سکتے تھے۔ بتّھل نے کانتے کو کوئی اشارہ نہیں کیا تھا۔ اِس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اُس کے ساتھ کوئی اور نہیں، کانتے تھا۔ میں نے کانتے سے نہیں پوچھا لیکن پہلی تدبیر اُن کے ذہن میں یہی ہوگی کہ وہ اچانک کنارے کھڑے ہوئے دو آدمیوں پر جھپٹیں گے۔ اِس سے پہلے کہ اُن کے باقی تین ساتھی کچھ سمجھنے کی کوشش کرتے، وہ اُن دونوں کو اُنھی کے سامنے کر کے منتشر کر دیتے۔ ہو سکتا ہے اور بھی کوئی صورت اُن کے ذہن میں ہو۔ زورا، جمرو، شامو اور ٹنگو کی دخل اندازی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اُنھیں اُن سے الگ ہی رہنا تھا لیکن پیچھے وہ چاروں بتّھل کے اشارے کے منتظر تھے۔ بتّھل نے ایک بار پھر اُن پانچوں سے راستہ چھوڑ دینے کے لیے کہا۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ کانتے سے برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ بتّھل کی وجہ سے وہ ہاتھ پیر جکڑے کھڑا رہا۔ گو بتّھل کی طرح اُس کا اندازہ بھی یہی تھا کہ اُن پانچوں کی آمد محض ایک رسمی حجت ہے۔ ظاہر ہے اُنھیں آکا نے نہیں بھیجا ہوگا۔ اڈّے کے آدمی کبھی کبھی اپنے اُستاد کی خوشنودی کے لیے یوں ہی سامنے آ جاتے ہیں۔ اُستاد بھی اِس طرح ایسے ویسے لوگوں سے فضول اُلجھنے اور وقت ضائع کرنے سے بچ جاتا ہے۔ وہ بھی اسی خیال سے اڈّے سے نکلے ہوں گے کہ دیکھیں تو سہی، خبر پہنچانے والے نے کسی مبالغے سے تو کام نہیں لیا ہے۔ کوئی یوں ہی سر اُٹھائے تو نہیں چلا آ رہا ہے۔ عام طور پر اُن کا مقصد آنے والے کا تخمینہ کرنا، اُس کا دعوا پرکھنا ہوتا ہے۔ سامنے میں ہوتا تو شاید وہ اتنی دیر نہ کرتے لیکن میرے بجائے بتّھل کے ہمراہ کانتے تھا۔ کانتے کو وہ بالکل نہیں جانتے تھے اور بتّھل سے وہ اسی حد تک واقف تھے کہ شاہ کبیر والے دن وہ میرے ساتھ تھا۔ اُنھوں نے اُسے شاہ کبیر سے زور کرتے نہیں دیکھا تھا حالانکہ پھر حیدرآباد کے چند روزہ قیام میں اڈّے پر وہی اُن کے سامنے رہا تھا۔ بہرحال بتّھل کے متعلق اُن کی رائے کسی غلط فہمی پر مبنی ہو سکتی تھی۔ کہیں میں نے اُسے اُس کے بڑے پن کی وجہ سے یوں ہی رُتبہ نہ دے رکھا ہو۔ ہو سکتا ہے، مجھے اِس وقت اُس کے ساتھ نہ دیکھ کے اُنھیں گمان گزرا ہو کہ بتّھل کو روکنا اُن کے لیے اتنا مشکل نہیں ہے مگر یہ گمان ہی ہوگا، اسے پرکھنے اور آزمانے کا خطرہ اُنھیں مول نہیں لینا چاہیے تھا اور اب تک اگر جیسا کہ کانتے اور بتّھل کا اُن کے متعلق اندازہ تھا، اُنھیں اُن کے سامنے سے ہٹ جانا چاہیے تھا۔ بتّھل نے بھی اتنی دیر اِسی لیے لگائی تھی کہ اڈّے جانے سے پہلے گلی میں خون خرابہ مناسب نہیں تھا، اُنھیں حجت تمام کرنے کا وقت ضرور دینا چاہیے تھا اور بتّھل کی نظر میں شاید یہ وقت ختم ہو گیا تھا، اُس نے دوبارہ اُن سے راستے سے ہٹ جانے کے لیے نہیں کہا۔ وہ آہستہ روی سے ایک قدم آگے بڑھا اور اُس نے اپنے عین مقابل کھڑے ہوئے آدمی کی طرف ہاتھ اُٹھایا، اُس کے ہاتھ اُٹھانے پر وہ اُچھل گیا۔ نتیجتہً اُس کے باقی چار ساتھیوں کا بوکھلا جانا لازم تھا۔ کانتے کی سانسیں سینے میں رُک گئی تھیں۔ وہ تو پیچھے سے اُن پر بے تحاشا ٹوٹ پڑتا مگر بتّھل نے آگے جاتے ہوئے اُسے خاموش کھڑے رہنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ کانتے بتا رہا تھا کہ اُس لمحے اُس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ اُس نے اتنا دیکھا کہ اُس کے سامنے وہ چاروں کئی جانب سے چاقو بلند کیے بیک وقت بتّھل کی طرف جھپٹے مگر بتّھل کے جسم پر سکوت طاری رہا۔ دوسرے ہی لمحے اُن چاروں کے اُٹھے ہوئے چاقو بتّھل کے جسم میں پیوست ہوتے ہوتے ٹھٹھک گئے۔ بتّھل جیسے اُن سب سے بے خبر اُس آدمی کے مقابل کھڑا رہا جس کی جانب وہ بڑھا تھا۔ اُس نے اُس کے کندھے پر ہاتھ

دکھ کے ہلکی سی تھپکی دی۔ وہ گُم سُم لکڑی کے کسی بُت کے مانند اکڑا ہوا ایک طرف ہوگیا اور اُس کے ہاتھ میں جا تو دبا کا دبا رہ گیا۔ اُس وقت تجمل اُس کے چار ساتھیوں کے نرغے میں تھا۔ سامنے والے کے ہٹ جانے پر راستہ ہوگیا۔ تجمل نے سَر گھما کے کانتے کی طرف دیکھا، دونوں اُن کے درمیان سے گزرتے ہوئے آگے نکل گئے۔

بس لمحے صَرف ہوئے تھے۔ تجمل کے لیے اُن کے تیوروں میں غیر متوقع غضب تھا، کانتے بے اوسان ہوگیا کہ کہیں اِن پانچوں کو پہچاننے، اُن کا مقصد سمجھنے میں تو کوئی چُوک نہیں ہوگئی؟ اگر تجمل کے جسم میں جوابًا غلطی سے کوئی اضطراری ردِ عمل ہوجاتا تو چاروں کے لیے خود کو روکنا مشکل تھا۔ کانتے کا خوف بے وجہ نہیں تھا۔ بے تک ثانیوں میں، لمحوں میں کچھ بھی ہوسکتا تھا مگر صِرف لمحے صَرف نہیں ہوئے تھے۔ اِس سے پہلے وہ اتنی دیر اُن کے سامنے کھڑے کیا کرتے رہے تھے۔ اُنھیں کچھ جتلاتے ہی رہے تھے۔

کوئی ایک سبب نہیں تھا جو اُن کے اُٹھے ہوئے ہاتھ اینڈ گئے تھے۔ تجمل اور کانتے نے ہتھیار نہیں نکالے تھے۔ یہ بات راستہ روکنے والوں کے لیے اگر ایک طرف اطمینان کا باعث تھی تو دوسری طرف اُن کی استقامت بھی متزلزل کرتی تھی۔ تجمل کے ساتھ کانتے بھی ساکت کھڑا رہا۔ وہ سب میرے واسطے سے سہی بہرحال تجمل کے بارے میں کوئی نہ کوئی رائے ضرور رکھتے تھے۔ چاہے وہ ایک مشکوک رائے ہو۔ اپنے ساتھی کی طرف تجمل کے بڑھنے پر اُن کا بوکھلا جانا غیر اختیاری تھا مگر رُک جانا بھی اختیاری نہیں تھا۔ وہ اُس لمحے کچھ بُھول گئے تھے جو دوسرے لمحے اُنھیں یاد آگیا۔ آخر انھوں نے جان لیا کہ آنے والے واپس جانے کے ارادے سے نہیں آئے ہیں اور میرے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر اُن کا ارادہ کچھ اور ہوتا تو وہ بھی یقینًا اتنا وقت نہ لگاتے، کوئی بعید نہ تھا کہ اڈّے سے کچھ اور آدمی بھی شور مچاتے ہوئے اُن کے پیچھے آرہے ہوں۔ اُن کی دیوار راستے سے ہٹانے کی کسی اور تدبیر میں کوئی اور گرہ پڑنے اور وقت لگنے کا احتمال تھا۔ کانتے کو خاطر جمع رکھنی چاہیے تھی کہ تجمل کسی یقین کے بغیر ایسا قدم نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ میں نے اُس سے جرح نہیں کی۔ اُس کی بدحواسی کی وجہ صاف تھی، وہ اپنے دست و بازو جکڑے ہوئے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ جو بات وہ تجمل کے لیے کہہ رہا تھا۔ اگر خود اُس سے وہی لغزش ہوجاتی یعنی کوئی اضطراری ردِ عمل تو تجمل سے شاید اُس کی تلافی بھی ممکن نہ ہوتی مگر اُسے کانتے پر اعتبار تھا جبھی اُس نے اُسے صرف اشارہ کرنا کافی سمجھا۔

اڈّا قریب ہی تھا، ایک فرلانگ سے کم فاصلہ طے کرکے وہ اڈّے کے سامنے تھے۔ دروازے پر چند آدمی مضطربانہ گھومتے نظر آئے۔ عمارت کا دروازہ کھُلا ہوا تھا، اُنھیں اندر جانے میں [illegible] پیش نہیں آئی۔

اندر صحن میں بظاہر خاموشی تھی، نفری بھی زیادہ نہیں [illegible] اِدھر اُدھر دو چار آدمی دیواروں کے ساتھ پہرے داروں کی [illegible] تھے، کچھ لوگ دروازے کے سامنے صحن کے ایک کونے میں [illegible] چوکی پر موجود تھے۔ روشنی باہر کی نسبت اندر تیز تھی۔ عمارت کے داخل ہونے پر ایسی کھلبلی نہیں مچی لیکن جمود اُن کے اضطرا[ب کی] چغلی کھا رہا تھا۔ اُنھیں دیکھ کے جو شخص اپنی جگہ جانا رہ[ا] کالے ولوا تھا۔ اُس کی نظریں دروازے ہی پر لگی ہوئی تھیں [illegible] اُن کے نمودار ہوتے وقت اُس پر کوئی بجلی سی گری تھی۔ ایک [illegible] میں اُس نے کئی پہلو بدلے۔ وہ بڑبڑاتا ہوا چوکی سے اُٹھ[ا] اُترتے اُترتے اُس نے پلٹ کے چوکی کے وسط میں اوندھے ہوئے شخص کی طرف دیکھا اور دوبارہ اُوپر چڑھ گیا۔ تجمل اور کا[نتے] سے کچھ فاصلے پر آکے ٹھیر گئے تھے اسی اثنا میں کانتے کو [illegible] بہت سے آدمیوں کے اندر داخل ہونے کی آوازیں سنائی دیں [illegible] کا سکون اُن کے آنے سے منتشر ہوگیا تھا۔ اُن میں سے کو[ئی] اور کانتے کے آگے نہیں آیا، سب دروازے کے قریب ہی رہے اور اُن کے جسموں کی آہٹیں اور سرگوشیاں عمارت میں بھ[ر] گئیں مگر پھر سناٹا چھا گیا، کانتے نے پیچھے ایک نظر ڈال کے [اندازہ] کرلیا تھا کہ جمرو، شامو، زورا اور ٹنگو بھی اندر آنے والوں میں شا[مل تھے]

اوندھے لیٹے ہوئے شخص نے اُٹھ کے دیکھنے کی ضر[ورت] نہیں سمجھی کہ عمارت میں اچانک یہ کیسی آوازیں گونج اُٹھی ہی[ں کون] آیا ہے۔ دو آدمی اُس کا بدن دبا رہے تھے مگر اُن کی بے[تابی] ہر شُو ٹھنک رہی تھیں۔ وہ آکا کے سِوا کون ہوسکتا تھا۔ اُ[لٹا لیٹنے] کی وجہ سے اُس کا چہرہ اُن کے سامنے نہیں تھا، جسم کا گٹھا[ؤ] کا درمیانہ معلوم ہوتا تھا، ہاتھ پاؤں پھیلائے وہ بے سُدھ تھا۔ تجمل نے چند لمحے توقف کیا اور کالے دادا پر نگاہیں جما[کے] کہا "تُو کالے ہی ہے نا؟" اُس کی آواز تڑخ رہی تھی۔

کالے دادا پر سکتہ طاری تھا۔ اُس نے اپنی آنکھیں [illegible] اور کچھ کہا نہیں۔

"کیا ہوگیا ہے رے تجھے؟" تجمل نے تلخی سے کہا۔

کالے دادا نے سَر جھکا لیا، اُس کا سارا جسم دھڑک [رہا تھا]

"بولتا کیوں نہیں" تجمل نے اُونچی آواز میں کہا "زبا[ن] ساتھ کٹوا دی ہے کیا؟"

کالے دادا سے پھر نہیں رہا گیا۔ اتنی دیر بھی جانے کس [طرح] اُس نے برداشت کیا تھا، دیوانہ وار چوکی سے نیچے اُترا اور [illegible] پیر پٹخ کے سَر رگڑنے لگا۔

"ہم نے کیا سُنا ہے کالے!" تجمل نے اُسے اُٹھا کے کھڑا کیا۔

[کا]لے دادا کی آنکھیں ڈوبی ہوئی تھیں اور لگتا تھا کہ ایک اشارے [سے] بکھر جائے گا۔ وہ تجمل سے نگاہیں نہیں ملا رہا تھا۔ اڈّے پر آکا [کی م]وجودی کے باوجود اُسے دیکھ کے تجمل کو تعجب ضرور ہو رہا ہوگا۔

"[یہ] سب کیا ہے رے؟" اُس نے کالے دادا کو جھنجوڑتے ہوئے [کہا]۔ کالے دادا دم سادھے کھڑا رہا تو وہ برہمی سے بولا "ہوش [میں] آ جا کالے اور جلدی سے اِس بھڑوے کو بول کہ یہ ناٹک ختم کرے [ہم] اِدھر آگئے ہیں۔ یہ وہی کُتّے کی اولاد ہے کیا، آکا؟ نام اِس حرام [ت]خم کا اِدھر کسی نے ہم کو بولا تھا۔"

تجمل کا اتنا کہنا تھا کہ دونوں آدمیوں کو اِدھر اُدھر دھکیل کے [ت]ڑپتا ہوا اُٹھا اور تجمل کو مغلظات سناتے ہوئے گرجنے برسنے لگا۔ [اُس] کی عمر چالیس کے قریب ہوگی، جکڑا ہوا، کھنچا ہوا جسم، لمبوترا چہرہ، [چھو]ٹی چھوٹی آنکھیں، ناک باہر اُٹھی ہوئی، انگریزی بال، چہرہ صاف [ر]نگ گندمی۔ وہ اُٹھ کے چوکی پہ پیر پٹخنے لگا۔ اُس کی آواز [بھا]ری تھی اور عمارت کی خاموشی سے اس میں کچھ گرج اور کھنک ہوگئی تھی۔ اُس نے غراتے لہجے میں تجمل سے کہا کہ وہ کسی اور کے [نہیں] آکا کے اڈّے پہ ہے۔ بہتر ہے اوقات میں رہ کے بات کرے [ورنہ] آکا دوسرا موقع نہیں دیتا۔

"کالے! اِس چرچڑی مار کو بول کر ہم پہلا موقع بھی نہیں دیتے [ا]س سے آخری خواہش ضرور پوچھ لیں گے۔" تجمل کی آواز بڑی حد [تک س]نبھلی ہوئی تھی۔ "اڈّا ہم نے اِس کی ماں کو منہ دکھائی میں [نہیں] دیا تھا۔"

"زبان کو داب کے رکھ حرام زادے!" آکا دھاڑ کے بولا اور بے حِسّ[ی] کے انداز میں چوکی سے اُتر آیا "تُو، تُو آکا کو نہیں جانتا۔" اُس [کے منہ] سے کف نکلنے لگا تھا اور غصّے میں اُس کی بوٹی بوٹی پھڑک رہی [تھی] وہ تجمل کو بُری طرح گالیاں بک رہا تھا۔

"لگتا ہے تُو نے اپنے بارے میں کچھ اِس کو نہیں بولا [کا]لے!"

کالے دادا نے ہذیانی انداز میں سَر کو جھٹکے دیے اور ہونٹ [چب]ا رہ گیا۔

"بولتا تو یہ بے پیٹے کا کچھ سوچ سمجھ کے منہ ملدی کرتا، سالا [آن]کھوں کہیں بندھا ہوا دکھائی نہیں پڑتا ہے۔"

"اِس بھڑوے سے کیا پوچھتا ہے، اِس نے سب بولا تھا، بولا تھا کہ [تی]رے اور تیرے شیر ببر میں مارزماں نے اِدھر شاہ کبیرا کو پچھاڑ دیا اور تو پھر اِس کا ٹھ کے اُلّو کو بانس پہ چڑھا گیا تھا، اڈّے کا سودا بنا کے۔ پہلے شیشے میں اِس کو شکل دکھا دی ہوتی۔"

"شکل تو تُو نے بھی اپنی نہیں دیکھی ہے پر آج تجھ کو ضرور دکھا دیں گے۔" تجمل بگڑے لہجے میں بولا "یہ کالے حرام ڈیل کیا ہم اِدھر پیر کی جوتی رکھ کے جاتے تو بھی تجھ کو اِدھر کا دھیان سے رُخ کرنا چاہیے تھا۔ اڈّا کالے کی جاگیر نہیں ہے جس کو طشتری میں لوٹ کے یہ تجھ کو دے دے، ہم سے کوئی مائی کا لال ہی اِس کو لے سکتا ہے۔ تجھ کو اڈّا گیری کی ایسی ہی کھُجلی ہوئی تھی تو تھوڑا اپنا انتظار کرلیا ہوتا بھُنتیا کے۔"

"ہنہہ۔" وہ زمین پر تھوک کے بولا "اپن کو تو کوئی کانجی ہاؤس سے رسّی تُڑایا لگتا ہے سالا نواب کا..." آکا تیرا انتظار کرتا رہا۔" وہ پھنکارتے ہوئے کہنے لگا "اڈّے کا تجھ کو اتنا ہی خیال تھا تو اِدھر ہتھیلی لگا کے بیٹھا ہوتا، اِس مجنوں کے جھٹکے کو اِدھر کیوں چھوڑ گیا تھا یا اِس کو اپنا کوئی اتا پتہ دے گیا ہوتا کہ تیرے کھونٹے ہی پہ جا کے آکا تجھ کو دیکھتا، تیرے سینگ کتنے آگے کو نکلے ہیں۔ اڈّا آکا نے اپنے بل پہ لیا ہے، اِن تیرے کلوا متا نے سے اپنا آپ ہی نہیں سنبھل رہا تھا، اڈّا کیا سنبھالتا سسرا۔ اِس سے پوچھ، اپن نے آ کے پوچھا تھا، کدھر وہ رستم کا سگا رہتا ہے۔ یہ سر دار آئیں بائیں کرنے لگا۔"

"اور تُو اڈّے پر بیٹھ گیا۔" تجمل نے طنز سے کہا "بس اتنا ہی ٹھیک جانا تُو نے چھنال کے جنے!"

"اڈّا آکا نے اپنے بل پہ لیا ہے اور، اور بل پہ ہی اِدھر بیٹھا ہے۔" وہ بھِنّا کے بولا "ابھی تجھ کو سیدھی طرح دکھائی نہیں دیتا تو اپن کو بول، اپن ابھی تجھ کو آگا پیچھا سارا دکھا دیں گے۔ آکا شاہ کبیرا نہیں ہے جس نے اِدھر منہ کالا کرا لیا تھا۔ سالا بیچ بازار میں کھُلوا بیٹھا۔ اپن کو اب تک یقین نہیں ہے۔ ضرور اِدھر کسی سُور کے بچّے نے حرامی پنا کیا ہوگا، وار اپن بھی خوب پتیلا ہے پر اپن شاہ کبیرا نہیں ہے۔"

کانتے کا خون سُلگ رہا تھا کہ وہ بڑھ کے آکا کی زبان کیوں نہیں کھینچ لیتا۔ اُسے حیرت تھی کہ تجمل آخر اِس قسم کی باتیں کیوں کر رہا ہے۔ آکا کی آواز بگڑتی، بھڑکتی جا رہی تھی، اُس کا سارا جسم پارے کے مانند تلملا رہا تھا اور تجمل کو بھی جانے کیا ہوگیا تھا، آج تک کانتے نے اُسے اتنی دیر کسی سے ایسی باتیں سُنتے نہیں دیکھا تھا۔ اِس دوران عمارت میں لوگوں کی تعداد بڑھ گئی تھی سب دم سادھے کھڑے تھے۔ صرف آکا کی آواز دھمک رہی تھی یا تجمل کی۔

"تُو ٹھیک ہی بولتا ہے۔" تجمل نے تمتماتی آواز میں کہا "شاہ کبیرا تجھ سا نہیں تھا۔ اپنے کو تیرا ناڑا اُس سے بھی کچا لگتا ہے کبیرے

نے کچھ دیر بھی لگائی تھی۔ تجھ کو تو اتنا وقت بھی نہیں ملنے کا اب۔"

"ہا!" آکا ایک دم اکھڑ گیا اور دانت پیس کے بولا۔ "تیری موت تجھ کو ادھر کھینچ لائی ہے۔" اُس کا گلا شدتِ غضب سے پھٹنے لگا تھا۔ وہ مسلسل گالیاں بکے جا رہا تھا۔ ایک لمحے میں اُس نے چاقو نکال لیا اور سانڈ کی طرح سَر نیچے کر کے اُچھلنے، گھومنے لگا۔

"تجھل اپنی جگہ کھڑا رہا۔ "تو بَل دکھائے بغیر نہیں مانے گا پر کچھ ہو گا بھی تو دکھائے گا۔ اپنا خیال تھا کہ اتنی دیر میں ہوا کا کوئی جھونکا چل کے تیرے سَر سے بڑی دھول ہٹا دے گا پر تیرے دن ہی ختم ہو گئے ہیں تو ہم....."

تجھل کی بات منہ ہی میں رہ گئی۔ آکا اچانک چاقو تول کے دیوانہ وار اُس کی طرف بڑھ گیا۔ تجھل کی آنکھیں کھلی تھیں۔ آکا اُس کے بہت قریب آ گیا تھا مگر تجھل بے حس و حرکت رہا۔ آکا کی وحشت دو چند ہو گئی، اپنے بڑھتے ہوئے قدم کھینچنے کے لیے اُسے خود پر بہت جبر کرنا پڑا ہو گا مگر وہ بلبلاتا ہوا پیچھے ہٹ گیا اور ڈکراتی آواز میں بولا۔ "زیادہ ٹر ٹر مت کر گُتے کے بچّے! چاقو نکال لے۔"

"تیرے پاس تو ہے رے۔" تجھل نے سرد لہجے میں کہا۔

کانتے نے تجھل کے لہجے کی سردی اپنے رگ و پے میں محسوس کی۔ آکا اُس کے سامنے چند قدم کے فاصلے پر چاقو تولے تڑپ رہا تھا۔ وہ اپنے آپے میں بالکل نہیں معلوم ہوتا تھا، کسی بھی پل وہ دونوں آپس میں دست بگریباں ہو سکتے تھے۔ اس اثنا میں کانتے اپنی دانست میں آکا کو اچھی طرح پرکھ چکا تھا۔ جسم کے نپے تلے ہونے کے علاوہ اُس کے ہاتھ پیروں میں غیر معمولی چمک تھی۔ کانتے کو اُس وقت وہاں اڈّے کا کوئی اور آدمی اُس کا ہم پلا نظر نہیں آیا تھا۔ کالے دادا کا جسم پھیلا ہوا تھا لیکن اُسے یقین تھا کہ اڈّا سپرد کرتے وقت تجھل نے اس میں کوئی بات ضرور دیکھی ہو گی۔ کالے دادا اڈّے کا مالک ہونے کے بعد وہ بات برقرار نہیں رکھ سکا، کچھ مٹتا گیا، آکا کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ کالے دادا کو اڈّے سے زیادہ کسی اور بات سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ شاید یہی وجہ ہو گی کہ آکا کے آنے کے سبب اُس نے کوئی مزاحمت کرنا مناسب نہیں سمجھا اور خاموشی سے اڈّا آکا کے حوالے کر دیا۔ اڈّے پر آکا کے ساتھ اُس کی موجودی کا بھی یہی سبب معلوم ہوتا تھا۔ ہو سکتا ہے، آکا ہی نے اُسے روک لیا ہو، نئے اڈّے پر اُسے اعتماد کے کسی آدمی کی ضرورت محسوس ہوئی ہو گی۔ آکا حیدر آباد کا نظر نہیں آتا تھا۔ اُس کی زبان، طور طریق اور شکل و صورت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اُنھی کی طرح کسی دوسری جگہ سے آیا ہے اور اپنے بارے میں کچھ زیادہ ہی خوش فہمی میں مبتلا ہے۔ خوش فہمی ایسی بے وجہ بھی نہیں ہو گی۔ اڈّے پر اُس کے آنے کے بعد شاید کوئی شخص اڈّے کا دعوا کرنے نہیں آ...

کے آدمیوں کے سامنے اُس نے اڈّے پر ضرور اپنی موجود... ثبوت پیش کیا ہو گا جبھی سب کے چہروں پر اُس کے... چھا جاتی تھی، عام طور پر کسی شہر میں سب سے بڑا اڈّا بازار... اور اس نسبت سے اس اڈّے سے متعلق آدمی بھی دو... مختلف ہوتے ہیں۔ آکا اپنی کسی خوبی کے بغیر اِن لوگو... قائم نہیں رہ سکتا تھا۔

مگر کانتے کے لیے یہ سب کچھ نیا نہیں تھا۔ ایسے... آدمیوں سے تجھل کا اور اُس کا واسطہ پڑ چکا تھا۔ کا... تذبذب اور اضطراب کا سبب یہ نہیں تھا کہ آکا نا... اُس اڈّے پر موجود ہے جس پر تجھل کبھی اپنا آدمی چھوڑ... اُن کا مقصد اُس آدمی کو ہٹا دینا، اڈّا دوبارہ حاصل کر... دل کو تسلی دینا نہیں تھا۔ کانتے کے انتشار کی وجہ اُم... بے یقینی تھی۔ اُسے شبہ تھا کہ تھانے سے نکل کے تجھل... آیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس تگ و دو کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو... اندازے کی کوئی غلطی مجھے اور پیرو کو اُن سے اور دور نہ... جانتا تھا کہ اب اُس کے سارے وسوسے بعد از وقت... بار اپنے آپ کو ٹوکتا، سمجھاتا اور اپنی نگاہیں ایک طر... جو موجود ہے، اُسی کی طرف مرکوز رکھنے کی کوشش کرتا... میں اُس کے سامنے آ جاتا تھا، کبھی پیرو، کبھی ابا جان۔ ان... کی ویرانی اُس کے سینے میں کھُب گئی تھی اور تجھل، تجھل... کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا مگر کانتے کو معلوم تھا، اُس... سمندر اُمڈ رہا ہے۔

اِدھر اُسے تجھل کے پیر کی فکر تھی۔ بڑی مشکل... شروع ہوا تھا کہ دو دن کے مسلسل سفر سے اُس پیا اور زیا... چاقو تول کے تجھل کے پاس آ کے پلٹ گیا تھا۔ کانـ... جھجکتے تجھل سے کہا تھا۔ "اُستاد! میں دیکھتا ہوں اِس حرا... تجھل نے اُسے جھڑک دیا اور اپنے ہاتھوں کو زو... دیتے ہوئے آکا کی طرف بازو پھیلا دیے مگر آکا چاقو نکا... چیخنے لگا۔ "ہم نے کیا بولا تھا کے، تیرے پاس کافی نہیـ... نے تُرشی سے کہا۔

یہ سُن کے آکا نے اپنا چاقو بھی فرش پر پھینک دیا... تجھل نے چاقو نکال لیا۔ آکا نے چاقو خود اُٹھانے کے بجا... قریب کھڑے ہوئے آدمی کو اشارہ کیا، اُس نے فرش سے... کے اُس کی جانب اُچھال دیا۔ آکا نے مشاقی سے چاقو اُچک... پوری طاقت سے کسی فقیر کا نام لے کے نعرہ لگایا۔ اُس...

...ں گونج اُٹھی۔ تجھل نے پھر اُس سے کچھ نہیں کہا، سب خود بخود ...ٹ گئے، کانتے بھی پیچھے چلا آیا۔ زورا اور جمرو وغیرہ اُس سے ...لے پر تھے، انھوں نے ایک دوسرے کو کَن انکھیوں سے دیکھنے کے سوا ...ت نہیں کی۔

...تجھل کے ہاتھ میں چاقو دیکھ کے آکا کے رگ و پے میں جیسے بجلی ...سے اُچھالنے کے انداز میں اُس نے دو چار مرتبہ چاقو اوپر ...اور کئی مرتبہ آناً فاناً اِس ہاتھ سے اُس ہاتھ میں منتقل کیا۔ ...زی سے کہ نظر ٹھہرتی ہی نہ تھی۔ گرفت میں خاصی لچک تھی اور ...ز سے خوب تنا سا معلوم ہوتے تھے۔ تجھل بھی یہی کہتا تھا کہ دونوں ...ایک دوسرے سے بندھے ہونے چاہئیں جبھی چاقو روانی سے منتقل کیا ...ہے۔ وہ کہتا تھا کہ چاقو اُٹھانے والے کا ہاتھ دایاں بایاں نہیں ...انتے کے مطابق آکا کے ہاتھ ایک دوسرے کا اشارہ سمجھتے تھے۔ چاقو ...چلاتے اُن کی اپنی آنکھیں ہو گئی تھیں، تجھل نے آکا کی ...ز نہیں بدلا اور نگاہوں نگاہوں میں اُسے تولتا ہوا آگے بڑھا۔ ...ون سا طاری تھا، تجھل کی دو ایک جھپکیوں نے مہمیز کا کام کیا۔ ...یں وہ اٹکنے کے بجائے وحشیانہ پن سے سیدھا تجھل کی طرف ...اُس کی جھپٹ میں ایسی لپک جھپک تھی کہ تجھل کو اُچھل کے پیچھے ...یا ایک طرف ہو جانا پڑا مگر آکا پل بھر میں رُخ بدل کے پھر اُسی ...امنے سے چاقو بھونکنے کے لیے آگے بڑھ گیا۔ دوسری بار بھی تجھل کو ...طرح پہلو بچا لینا چاہیے تھا لیکن اُسے دیر ہو گئی۔ آکا اُس کے ...چ گیا اور کانتے نے دیکھا کہ پیچھے ہٹنے یا اُسے روکنے کے بجائے ...یزی سے تجھل کچھ ہکا بکا نظر آیا۔ کانتے کے بہ قول اُس کے دل ...دھڑکنا بند کر دیا تھا جب یک بارگی اُس نے تجھل کے ہاتھ سے ...ہوئے اور گھبراہٹ میں ڈگمگاتے اور ایک جانب گرتے دیکھا۔ پہلے ...ل کے ہاتھ سے چھوٹا تھا۔ فرش پر چاقو گرنے کی آواز کانتے کے ...یں دھماکے کی طرح گونجی۔

...اپنے زور میں آکا چند قدم آگے چلا گیا تھا، یک بیک وہ پلٹا، ...اُس لمحے گرا ہوا تھا اور دائیں ہاتھ کے بَل اُٹھنے کی کوشش ...ں حد تک کامیاب ہو گیا تھا لیکن ابھی پوری طرح کھڑا نہیں ہوا تھا کہ ...اُس کے سَر پر پہنچ گیا۔ کانتے کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ اُس نے ...تجھل پر جھکتے اور چاقو والا ہاتھ دراز کرتے اور ساتھ میں تجھل کا ...اتھ بلند ہوتے دیکھا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے تجھل اس صورت ...سا اوسان کھو بیٹھا ہے اور اُس کا اُٹھا ہوا ہاتھ آکا کو روکنے کے لیے ...ہے مگر کانتے کو پلک جھپکنے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی، جیسے ہی آکا ...ایک جانب جھکتے ہوئے چاقو والا ہاتھ دراز کیا، آدھے گرے اور آدھے اُٹھے ہوئے تجھل کے جسم میں یکایک کوئی لہر سی اُمڈی پھر سب کچھ کانتے کی آنکھوں کی خیرگی میں منتشر ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں کی چندھیاہٹ دُور ہوئی تو اُس نے دیکھا کہ تجھل کا اُٹھا ہوا وہی ملتجی سا ہاتھ آکا کا پنجہ گرفت میں لیے ہوئے ہے۔

پنجا پکڑتے ہی تجھل نے کسی تاخیر کے بغیر آکا کا ہاتھ پیچھے کر کے اور ڈھیل دے کے کچھ اِس زور سے جھٹکے کے کھینچا کہ آکا کے پاؤں زمین پر جمے نہیں رہ سکتے تھے، چاقو چھوٹنے کے ساتھ ساتھ وہ فرش پر گرا اور اس سے پہلے کہ دوبارہ سنبھلنے کی کوشش کرتا، تجھل نے جھٹ اپنا پیر اُس کی ٹھوڑی کا نشانہ لے کے مارا اور بڑی تیزی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کا اپنا چاقو اُس سے زیادہ نزدیک تھا۔ اُٹھتے ہوئے وہ اُسے فرش سے اُٹھانا نہیں بھولا تھا۔

صحن میں چاروں طرف کھڑے دم بخود لوگ اُس وقت اپنی سسکاریاں نہ روک سکے جب تجھل نے دوبارہ کھڑے ہو کے اپنا چاقو فرش سے اُٹھایا۔ اُن دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل ہوئے ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا۔ کسی کے سان گمان میں نہ ہو گا کہ اُن کی آنکھوں کے سامنے یہ سب اتنی جلد گزر سکتا ہے۔ کانتے کی طرح اوروں کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہا ہو گا کہ تجھل کے چاقو چھوٹنے اور فرش پر گرنے کا عمل ارادی تھا۔ سبھی نے تجھل کے پیر پر پٹی بندھی دیکھی تھی چنانچہ وہ یہی نتیجہ اخذ کر سکتے تھے کہ اُس کا پیر آکا کی تیزی کی ہڑبڑاہٹ میں رپٹ گیا ہے۔ ممکن ہے، وہ ابھی تک یہی سمجھ رہے ہوں لیکن کانتے کے لیے یہ باور کرنا مشکل تھا کہ تجھل کا چاقو اُس کی انگلیوں سے یوں چھوٹ سکتا ہے۔ تجھل کی انگلیوں میں آ کے چاقو کا اپنا کوئی زور نہیں رہتا تھا۔ اُسے یاد آ رہا تھا کہ پہلے چاقو گرا تھا، تجھل کے پیر بعد میں ڈگمگائے تھے۔ سب کچھ کسی ایک پل میں بکھرا ہوا تھا، ایک پل میں کانتے کیا کیا دیکھتا۔

اُس کی سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں اور سارا جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ جیسے جیسے اُس کے حواس یک جا ہو رہے تھے، گزرا ہوا سب کچھ ترتیب سے اُس کے ذہن میں اُجاگر ہو رہا تھا۔ سب کچھ نپا تُلا تھا۔ تجھل کے اچانک گرنے پر وحشت زدہ آکا کا موقع غنیمت جاننا اور اُس پر جھپٹنا لازم تھا۔ نیز دوسرے ہی لمحے فیصلے کی قوت کھو دینا بھی لازم تھا کیونکہ اُس کے مقابل کا چاقو اُس کے ہاتھ میں نہیں رہا تھا۔ یہ حِلن کے شاید وہ پیچھے ہٹ جاتا اور اڈّے کے کسی معقول دادا کی طرح تجھل کو سنبھلنے کا ایک موقع اور دیتا۔ بہت سے لوگوں کی موجودی میں اس فراخ دلی کا اظہار خود بہ خود ہو جاتا ہے۔ آکا ضرور پیچھے ہٹ جاتا لیکن تجھل کے بلند کیے ہوئے ہاتھ سے ایک قسم کی مزاحمت کا تاثر ملتا تھا۔ مزاحمت کرتے ہوئے مقابل کے سامنے رُکنا مشکل ہو جاتا ہے۔ آکا پھر بھی رُک جاتا مگر اُسے کچھ وقت نہیں ملا تھا۔ وہ اتنا مشتعل تھا کہ اپنے

آپ پر قابو پانے، اپنی نگاہیں کھینچنے کے لیے اُسے کچھ وقت درکار تھا۔ دوسرے
تجمل نے اپنا بلند کیا ہوا ہاتھ اچانک سمیٹ لیا تھا۔ اِس سے مراد یہی
تھی کہ آکا کو اضطراری طور پر اپنا ہاتھ اور دراز کرنا پڑے۔ آکا نے
یہی کیا، اُسے خیال نہیں رہا کہ تجمل کا پنجہ آکا کے مزید جھکنے اور اُس
کا ہاتھ اور قریب آجانے کا منتظر ہے۔

کانتے نے بتایا مگر اِدھر تجمل کھڑا ہوا، اُدھر چند لمحوں کے تذبذب
کے بعد فرش پر لوٹتا ہوا آکا کچھ دُور جا کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ تجمل نے اِس
فرصت میں دو قدم گھوم کے آکا کا چاقو بھی فرش سے اُٹھا لیا تھا لیکن
چاقو کے بغیر آکا پھر دیوانوں کی طرح بازو پھیلائے تُلا کھڑا تھا اور بس
کسی موقع کی تلاش میں تھا۔ اُس کی انگارا آنکھوں میں غضب کے ساتھ
حیرانی بھی شامل ہو گئی تھی۔ تجمل نے اُس کا چاقو اُس کی طرف اُچھال
دیا۔ آکا نے چاقو اُچکنے میں تساہل نہیں کیا۔ اُس کے جسم کے ہیجان سے
یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ اُس نے یہ سب کچھ اتفاق پر محمول کیا ہے۔ دوبارہ
اُس میں پہلے سے زیادہ آگ بھری ہوئی تھی۔ اُس نے کوئی لمحہ ضائع
نہیں کیا، پہلے کی طرح آندھی کے مانند تجمل کی جانب اُمڈا۔ تجمل طرح دے
کے اور گھوم کے دوسری جانب ہو گیا۔ آکا نے فوراً اپنا چاقو دوسرے
ہاتھ میں جدھر تجمل کا رُخ ہو گیا تھا، منتقل کر لیا اور جیسے جیسے تجمل
اُس سے پہلو بچاتا رہا، چاقو اُس کے رُخ پر رکھنے کے لیے ایک ہاتھ
سے دوسرے ہاتھ میں پھرتی سے تبدیل کرتا رہا۔ ایک لمحے اُس کا چاقو
اِس ہاتھ میں ہوتا، دوسرے لمحے اُس ہاتھ میں۔ یہ اپنی مہارت
کی نمائش کا وقت نہیں تھا۔ اُس کی منشا یہی ہو سکتی تھی کہ شاید تجمل
کسی ایک جگہ گڑبڑا جانے کی کوئی چوک کر بیٹھے۔ تجمل نے اُس کے
اور اپنے درمیان گھومتے رہنے کے باوجود ایک فاصلہ برقرار رکھا تھا
اور کانتے کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ جلد جلد رُخ بدل کے آکا کو بار
بار چاقو بدلنے پر دانستہ اُکسا رہا ہے۔ آکا کچھ اپنی مشاقی کے زعم میں
آگیا تھا۔ پھر صحن میں یہاں سے وہاں، اِس جگہ سے اُس جگہ تھرکتے،
پینترے بدلتے ہوئے تجمل ایک جگہ یکایک رُک گیا۔ آکا نے اپنی روش
کے مطابق اُسی کے رُخ چاقو بدلنے کے لیے اپنے دوسرے ہاتھ کی طرف
اُسے اُچھالا لیکن ابھی اُس نے چاقو پھینکنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ تجمل
نے اُچھل کے اُس کے چاقو والے ہاتھ پر جھپٹا مارا۔ تجمل کا پنجہ پڑنے
کی مدت میں آکا چاقو اُچھال چکا تھا۔ اُس کی روانی اور چابک دستی
دیکھتے ہوئے اُس کے دوسرے ہاتھ میں چاقو آجانا چاہیے تھا مگر
درمیان میں یہ ناگہاں رخنہ پڑ جانے سے آکا کے دونوں ہاتھوں میں توازن
قائم نہیں رہ سکا۔ چاقو پھینکنے والا ہاتھ درہم ہو جانے اور کھنچ جانے
پر چاقو تھامنے والا ہاتھ لازماً متاثر ہو جانا چاہیے تھا۔ وہ ایک دوسرے
سے بندھے نہ رہ سکے اور چاقو چھناکے کے ساتھ فرش پر گر
کانتے بتا رہا تھا کہ بس کوئی جھماکا سا ہوا تھا۔ لوگوں
پر سکتہ سا طاری تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ وہ اُستاد کو یوں بار بار
دیکھ کے پہلے ہی کھٹک گیا تھا کہ اُستاد کے ذہن میں کچھ نہ کچھ
وہ جستجو میں تھا کہ آخر وہ کون سی بات ہو سکتی ہے کہ محض ایک
میں سب کچھ بدلا ہوا تھا۔ ساری بات وقت کے تعین کی تھی
یہ تھی کہ تجمل اُسی وقت اپنا ہاتھ بڑھائے جب آکا چاقو اُچھ
ہو۔ اس سے پہلے تجمل نے خود کو یہ یقین دلایا ہوگا کہ اس بار بھی
پینترا بدلنے پر آکا ایک سے دوسرے ہاتھ میں چاقو بدلنے کا
رکھے گا۔ وہ سیمابی حالت میں تھا اور تجمل کے لیے یہ تعین کرنا
نہیں تھا۔ وہ اُس کے اُس ہاتھ پر بھی پنجہ مار سکتا تھا جس
آنے والا تھا لیکن محفوظ طریقہ یہی تھا کہ چاقو چھوڑنے والے
نشانہ بنایا جائے کیونکہ چاقو چھوڑ دینے کے بعد اُس کی تن دہی
میں یقیناً فرق آجاتا ہے، وہ ایک طرح سے بری الذمہ ہو جا
اُس کے مقابلے میں دوسرا چاقو پکڑنے والا ہاتھ زیادہ فعال ہو
ہو جاتا ہے۔ ذرا بھی دیر ہو جاتی تو چاقو آکا کے دوسرے ہاتھ
اور صورتِ حال یکسر مختلف ہوتی۔ تجمل کو پھر اپنی مدافعت
اور تدبیر سوچنی پڑتی جو ضرور اُس کے ذہن میں ہو گی۔

تجمل کے ہاتھ میں اپنا چاقو تھا اور وہ آکا کے جسم کے
حصے میں اُسے اُتار سکتا تھا۔ چاقو گرنے پر آکا نے بدحواسی میں
غلطی کی، اُس نے چاقو زمین سے اُٹھانے کے لیے جھکنا چاہا۔ تجمل
اِس کی مہلت نہیں دی اور اُس کے کولھے کے قریب گھٹنا مار
لڑکھڑا کے سنبھل گیا تھا لیکن تجمل نے اس جانب اپنا
ہاتھ لہرا کے اُسے متذبذب کیا تو دوسری طرف اپنے خالی ہاتھ
اُس کی گردن پر ضرب رسید کی اور کوئی وقفہ دیے بغیر پے بہ
ضربیں لگا کے آکا کو پیروں پر نہیں کھڑے ہونے دیا مگر تجمل
ہاتھ رُکنے کی دیر تھی، آکا تیزی سے فرش پر کروٹیں بدلتا ہوا
اُس کا چاقو تجمل کے پیروں کے پاس پڑا تھا۔ اُسے دوبارہ اپنے
میں لیتے ہوئے تجمل کے سامنے کوئی رُکاوٹ نہیں تھی۔ کسی کو
ہوگی کہ آکا دُور جا کے پھر اُٹھ کھڑا ہوگا، تجمل ہاتھ نہ روکتا تو
موقع کبھی نہ ملتا لیکن تجمل نے جیسے اُسے خود یہ موقع فراہم کیا
سبھی دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے جب تجمل نے آکا کا چاقو اُس کے
ہو جانے پر دوبارہ اُس کی طرف اُچھال دیا، اِس بار آکا کی گرفت
بے شک وہ پھرتی نہیں تھی لیکن چاقو ہاتھ میں آنے کے بعد
جنونی ہو گیا۔ اُس نے دائیں بائیں کچھ نہیں دیکھا، پھر سامنے کی
جست لگا تا تجمل پر وار کرنے کے لیے لپکا۔ اُس کی رفتار میں بجلی

تھی تجمل کے لیے بھی شاید اُس کی یہ تیزی حیران کُن ہو۔
کسی کے یوں منہ اُٹھائے آنے کی صورت میں مقابل کو فوراً
فیصلہ کرنا پڑتا ہے ورنہ ذرا سے تذبذب سے درمیانی فاصلہ
تنگ ہو جاتا ہے۔ سیدھے عموماً اسی وقت آیا جاتا ہے جب پیچھے
لینے کے لیے مقابل کے پاس جگہ تنگ ہو اور وہی شخص سیدھا آتا ہے
اپنی رفتار تیز کرنے کے ساتھ ساتھ وقت پر اُسے قابو میں کر لینے
اعتماد بھی ہو چونکہ مقابل کے پاس پہنچ کے اُسے بہرحال اپنی رفتار
توڑنی پڑتی ہے، مقابل کسی بھی حالت میں کسی کو اپنی جانب اس
طرح بڑھتا دیکھ کے ساکت کھڑا نہیں رہ سکتا، فاصلہ پینترا بدلنے
ایک طرف ہو جانے کی اجازت نہ دیتا ہو تو عام طور پر چاقو سیدھ
کر دیا جاتا ہے، حملہ آور پھر خود ہی دوسری طرف ہو جاتا ہے ہر چند
تجمل کے پاس وقت تھا اور وہ آکا کی سیدھ سے ہٹ کے اِدھر اُدھر
سکتا تھا۔ جس وقت آکا صحن کے دوسرے سرے سے چلا تھا، اُس کے
اور تجمل کے درمیان فاصلہ کم نہیں تھا، تقریباً پورے صحن کا فاصلہ تھا
مگر تجمل نے نہ تو اپنا رُخ بدلنے کی کوشش کی، نہ اپنا چاقو آکا کی
سمت باندھ کے رکھا، اِس کے برعکس وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اِس
طرح اُس کے لیے پیچھے رُخ بدلنے کی گنجائش اور کم ہو گئی۔ اُس کا یہ اقدام
آکا کے جنون کے لیے نہایت حوصلہ خیز ثابت ہونا چاہیے تھا، کوئی
بھی مقابل اِسے اپنے لیے ایک خوش آئند علامت تصور کرتا۔ تجمل کا
مقصد بھی اپنے مقابل کے عزم کو اور تقویت دینا ہی تھا۔ اُسے آکا کو
اب خاص دوری تک اُسی تیزی سے آنے دینا تھا۔ آکا جب صحن
کے درمیان تک آگیا، یکایک تجمل نے آکا کی سمت اُسی کی سیدھ میں
بے تحاشا جست لگائی۔ تجمل کے بڑھتے وقت آکا درمیان میں تھا،
دیکھ کے وہ خود کو یک لخت نہیں روک سکتا تھا۔ کوئی بھی نہیں روک
سکتا تھا، رُکتے رُکتے بھی چند قدم اُسے اپنی جھونک میں آگے بڑھ
جانا تھا اور اس صورت میں تجمل سے اُس کا ٹکرا جانا لازم تھا۔ اُس
کے لیے یہی چارہ کار رہ گیا تھا کہ اب جو بھی نتیجہ ہو، وہ تجمل سے پنجہ آزما
ہو جائے اور اپنی رفتار قابو میں کرنے کی کوئی لغزش نہ کرے۔ اس موقع
پر رُخ بدلنے کی کوئی کوشش بہت مہلک ہو سکتی تھی۔ تجمل نے اُسے
اس کوشش کی مہلت نہیں دی تھی۔ کانتے کی طرح سبھی کی آنکھیں پھٹی
ہوئی تھیں۔ دوسرے لمحے دونوں کے متصادم ہو جانے کے بارے میں
کسی کو کوئی شک نہیں رہا تھا اور تصادم کے نتیجے میں کچھ بھی ممکن تھا۔
یہ امکان دُور دُور تک کسی کے تصور میں نہ ہوگا کہ تجمل اس تیز رفتاری
سے آنے کے باوجود ایک دم بیٹھ جائے گا۔
بس ایک آن کی کسر رہ گئی تھی، تجمل اچانک بیٹھ گیا۔ آکا واقعی
اُس کے جسم سے ٹکرایا تھا مگر کچھ مختلف طور سے۔ تجمل نے بیٹھتے بیٹھتے
اپنا چاقو چھوڑ دیا تھا اور دونوں ہاتھ تیار رکھے تھے۔ اُس کے بڑھنے
سے پیچھے جگہ ویسے ہی کشادہ ہو گئی تھی۔ آکا اُس کے سر سے گزر کے دوسری
جانب کمر کے بل گرا۔ تجمل نے اُس کی دونوں ٹانگیں جھٹکے؛ انھیں
فرش سے اُکھاڑ کے اپنے پیچھے پھینک دیا تھا، یوں خود اُس کے لیے
آگے راستہ بن گیا تھا۔ وہ جھکتا ہوا اُٹھا اور کچھ دُور جا کے پلٹ کر
کھڑا ہو گیا۔

آکا کا سر فرش سے ٹکرایا تھا اور بھی کئی جگہ چوٹ آئی ہوگی۔
چند لمحوں تک سکوت چھایا رہا مگر دیکھتے دیکھتے وہ سر جھٹکتا، پھڑپھڑاتا
ہوا کھڑا ہو گیا اور بے محابا سامنے کی طرف دوڑا، سامنے اڈے کے
آدمی کھڑے تھے، عجب نہ تھا کہ وہ اُن میں سے کسی کے سینے میں چاقو
اُتار دیتا۔ لوگوں کو کچھ یہی خوف محسوس ہوا تھا اسی لیے وہ ہڑبڑاتے
ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔ اسی دوران آکا کو بھی کچھ ہوش آگیا تھا۔ اُس نے
مُڑ کے تجمل کو دیکھا اور چند ھیائی ہوئی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ جتنی دیر
میں وہ اُٹھ کے دوبارہ سامنے آیا، تجمل اُس کے قریب پہنچ سکتا تھا
لیکن اپنی جگہ جما رہا۔ سب کا یہی خیال تھا کہ شاید اب آکا اپنا
چاقو پھینک دے گا۔ اُسے پھینک ہی دینا چاہیے تھا، پسینے سے
اُس کا چہرہ شرابور تھا اور دائیں کنپٹی سے خون چھلک رہا تھا، سانس
پھولی ہوئی تھی مگر وہ کسی اور مٹی کا بنا ہوا تھا، پہلے کی طرح چنگھاڑتا
وہ پھر تجمل کی جانب بڑھا۔ اِس بار اُس کا چاقو اُس کے ہاتھ ہی
میں رہا۔ لگتا تھا کہ اُس نے ساری توجہ چاقو گرفت میں رکھنے پر دی ہے۔
وہ دائیں بائیں، اُوپر نیچے تلوار کے مانند چاقو چلا رہا تھا جیسے
ہواؤں کو کاٹ رہا ہو۔ تجمل اُس کے آڑے نہیں آیا، بچتا ہی رہا۔
اب بہت کچھ کانتے کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ تجمل کے اجتناب اور
تاخیر کا کیا سبب ہو سکتا ہے۔ وہ آکا کی بچی کھچی چنگاریاں بھی ٹھنڈی کر دینا
اور اُسے زندہ ہی رکھنا چاہتا تھا۔ کئی مرتبہ کی ناکامی سے آکا کے ہاتھ
پیر بہکنے لگے تھے۔ کانتے کو تجمل کی دیر طلبی سے اُلجھن ہو رہی تھی۔
جتنی دیر تک آکا سامنے تھا، تجمل کے پیر پر دباؤ پڑ رہا تھا لیکن
تجمل کو اپنے پیر کا خیال یقیناً کانتے سے زیادہ ہوگا۔
تجمل کے سامنے صرف آکا نہیں تھا۔ اڈے کے آدمی بھی تھے
جن سے جلد ہی کسی وقت اُس کا واسطہ پڑنے والا تھا، تجمل نے
تھانے میں کانتے سے زیادہ نہیں سُنا تھا، یہاں حیدر آباد میں اپنے
پیچھے گزرنے والے صبح و شام سے وہ بھی اتنا ہی لاعلم تھا، جتنا کانتے۔
وہ اڈے پر خاموشی سے بھی آسکتا تھا لیکن گلی کے لوگوں کو ساتھ لے
چلنے اور اڈے پر آکے اُن کی نفری بڑھ جانے کا انتظار کرنے سے اُس
کی مراد اڈے کے آدمیوں کو اُن کے موجودہ دادا کا رتبہ بتانا اور
زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو گواہ بنانا ہی نہیں تھا بلکہ آکا کو اُس کی حیثیت

کا احساس دلانا بھی مقصود تھا۔ اڈے کے آدمیوں کی موجودی میں اُستاد، دادا ہی کی طرح اپنے مقابل کو برتتا ہے کیونکہ اگر آکا کی ہزیمت سے اڈے کے آدمی کوئی لذّت محسوس کر رہے تھے تو انھیں یہ سامان دیر تک مہیا کرتے رہنا چاہیے تھا اور جن کی تحویل میں بیں اور پیڑو تھے، تجّل کو اُن لوگوں تک بھی کچھ منتقل کرنا تھا کہ یہ سب کچھ کسی حادثے، آکا کی کسی چُوک یا اتفاق پر مبنی نہیں ہے۔ شاہ کبیرے کے واقعے سے اُن پر کوئی تاثر قائم تھا تو ان حالات میں تجّل کو وہ تاثر سوا ہی کرنا تھا۔

آکا کی کنپٹی سے بہتا ہوا خون اُس کے چہرے پر آگیا تھا۔ اُسے اندھا دھند ہاتھ چلاتے اور تجّل کو اپنا جسم اُس کی پہنچ سے دُور رکھتے، صحن میں اِدھر سے اُدھر گھومتے، اُچھلتے دیر ہوگئی تو اُس نے پہلی مرتبہ رُک کے سامنے سے آکا کی کلائی پر ہاتھ ڈالا اور نیچے کی جانب زور سے جھٹکا دیا، آکا کی کرب ناک چیخ عمارت کے باہر تک گونجی ہوگی۔ چاقو تو اُس کے ہاتھ سے چھوٹا ہی تھا، وہ خود بھی اپنے بس میں نہیں رہا اور لڑکھڑاتا ہوا فرش پر گر پڑا۔ وہ وحشت میں بار بار اپنا ہاتھ جھٹکتا تھا اور اُس کی کراہیں عمارت کے در و بام میں سسک رہی تھیں۔ کانتے نے پہلی بار تجّل کے ہاتھوں میں لرزش دیکھی، اُس کا چہرہ بھی سُلگ رہا تھا تاہم وہ لمحوں منجمد کھڑا آکا کو گھورتا رہا۔ آکا کے پنجے کی ہڈی یا تو ٹوٹ گئی تھی یا اپنی جگہ نہیں رہی تھی جبھی وہ اپنی کراہیں روکنے پر قادر نہیں تھا۔ وہ دوبارہ خود نہیں اُٹھا، تجّل نے اُسے گدّی سے پکڑ کے کھڑا کیا اور اُس کے شانے پر ترچھا ہاتھ مارا۔ آکا تڑپتا ہوا گِر گیا تھا، تجّل نے اُسے پھر اُٹھا لیا اور اُس کے پیٹ میں گھٹنے سے ضرب لگائی۔ وہ دُہرا ہو کے فرش پر تڑپنے لگا، تجّل نے آگے بڑھ کے اُس کے بال پکڑ لیے اور سر جھنجوڑتے ہوئے بولا "شاہ کبیرے کے وقت تو اِدھر نہیں تھا نا؟"

آکا کو جواب کا یارا نہیں تھا۔ تجّل نے انتظار بھی نہیں کیا، چاقو ڈال کے اُس کا گریبان چاک کر دیا۔ "لگتا ہے اُس وقت جو ادھورا رہ گیا تھا، وہ تیرے سے پورا کرنے کو لکھا تھا۔"

آکا کی پیشانی خون سے لال ہوگئی۔ خون اُتر کے اُس کی بھویں اور آنکھوں میں بھی بھر گیا۔ اُس کے ایک ہاتھ کو پہلے ہی قرار نہیں تھا، دوسرے سے وہ پیٹ پکڑے ہوئے تھا، تکلیف کی شدت ہی ہوگی کہ اُس کی آواز گھٹ کے رہ گئی لیکن اُس نے سُن لیا ہوگا کہ تجّل نے کیا کہا ہے، اُس کا مطلب بھی شاید اُس کی سمجھ میں آگیا تھا چنانچہ اُس کا پھڑپھڑاتا جسم سمٹنے اور اکڑنے لگا۔ "وہ کنجر کا جنا شاہ کبیرا وقت پہ اینڈ گیا تھا، سالے کو لگا آ گئی تھی پر تیری کھال اُس سے موٹی ہے، اچّل کو دیکھ تجھ کو اُس سے اچھی آتی ہے، ذرا اُتار کے نرت جمائے گا تو یہ تیرے ماں کے یار کچھ دیر تک یاد رکھیں گے کہ آیا تھا ایک

دادا، اُنھوں نے تیرا بہروپ دیکھا ہے۔ اب ذرا اصلی رو[...]
اِن کو ٹھمکا لگا کے بتا۔"

تجّل کی سرد آواز اور اُس کے جلتے ہوئے لہجے سے [...]
ہو چلا تھا کہیں اُس کے دماغ میں آکا کو برہنہ کرنے کا [...]
سما گیا ہے، پھٹے ہوئے گریبان سے آکا کا سینہ جھلک رہا تھا۔ [...]
لمحوں کی بات تھی کہ تجّل اُس کے لباس میں دوبارہ چاقو [...]
کھینچتا چلا جائے مگر تجّل نے چاقو پیچھے اُچھال دیا۔ اُس [...]
کا خیال کر کے چاقو پیچھے اُچھالا تھا، چاقو کانتے ہی کے پاس [...]
تھا، کانتے نے اُسے زمین پر نہیں گرنے نہیں دیا۔ آکا کے [...]
جھٹکے دے کے تجّل نے اُس کے بال چھوڑ دیے اور آہستہ [...]
چوکی کے سرے پر پاؤں لٹکا کے بیٹھ گیا۔

چند لمحوں تک اڈے پر موت طاری رہی، پھر اُن [...]
میں اُس وقت حرکت سی نظر آئی جب تجّل نے کالے دادا [...]
پاس آنے کا اشارہ کیا، کالے دادا بُری طرح سٹ پٹا گیا [...]
پیروں سے وہ اُس کے پاس پہنچا اور سر جھکا کے کھڑا ہو گیا [...]
بدبداتے ہوئے اُسے کوئی ہدایت کی۔ کالے دادا کے سوا کوئی [...]
سکا۔ اُسی لمحے اڈے کے تمام آدمی اپنی جگہوں سے آ کر اُن [...]
کے گرد جمع ہو گئے۔ انھوں نے اُس کے قدموں میں چاقو ڈا[...]
مگر تجّل نے اُنھیں منع کر دیا۔ "ابھی اپنا اور اُس کا تھوڑا حساب [...]
ہے، چکتا کر کے ہی تم سے بات کریں گے۔" اُس نے گھن گھناتی [...]
کہا۔ "ابھی کالے ہی اِدھر سب دیکھے گا۔"

کانتے بتا رہا تھا کہ کالے دادا اور اڈے کے دوسرے [...]
کر اُٹھا کے اندر ایک کمرے میں لے گئے۔ کچھ دیر بعد تجّل بھی [...]
چھپکا مار کے وہیں چلا گیا۔ کانتے سے اُس نے ساتھ آنے کو [...]
تھا اِس لیے وہ باہر ہی ٹھہرا رہا۔ تجّل کے اندر جانے پر کالے [...]
اور اُس کے ساتھی فوراً واپس آگئے۔ صرف تجّل اور آکا ک[...]
رہ گئے تھے۔ بند دروازے سے صرف ایک مرتبہ آکا کی گھٹی ہو[...]
سُنائی دی پھر خاموشی چھا گئی۔ کانتے پر ایک ایک لمحہ بھاری [...]
تھا۔ گو تجّل کو باہر واپس آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی اور اُ[...]
چہرے پر کوئی ایسی علامت نہیں تھی جو کانتے کی مضطرب نگا[...]
کے لیے کسی سکون کا سبب بنتی۔ باہر آ کے تجّل نے کالے دادا [...]
وقت پوچھا۔ رات کے گیارہ بجے تھے۔ اُس نے کالے دادا کو [...]
کی کہ اُس کی واپسی تک تمام لوگ اڈے پر موجود رہیں پھر [...]
نظریں دوڑاتے ہوئے اُس نے ایک آدمی کی جانب اُنگلی اُٹھا[...]
چھریرے جسم کا نوجوان تھا۔ اُس کا نام مولا تھا۔ مولا سر تا پا لرزتے [...]
تجّل کے پیر پکڑ کے فرش پر بیٹھ گیا۔ زورا، جمرو، شامو اور لنگو[...]

[...]د گئے۔ زورا ممبئی میں جھنگا استاد کے بے دخل ہو جانے کے بعد
[...]ڈا دیکھتا رہا تھا اور لوگوں کو اچھی طرح قابو میں رکھ سکتا تھا۔ تجّل نے
اُس سے ہی کہا ہوگا لہٰذا وہ فوراً چوکی پر جا کے بیٹھ گیا۔ اندر کمرے
سے آ کے تجّل نے تین چار منٹ سے زیادہ نہیں لگائے ہوں گے کہ
کانتے اور مولا کو ساتھ لے کے عمارت سے چلا آیا۔

وہ چوک کے عام راستے کے بجائے گلیوں میں گھومتے ہوئے جلد
ہی سڑک پر آ گئے۔ مولا نے بھاگم بھاگ آگے جا کے ایک رکشا والے
سے بات کی اور تینوں ایک ہی رکشا میں بیٹھ گئے۔ وہ ٹھُسے ہوئے
بیٹھے تھے۔ رکشا چلانے والا ابھی اُن کے وزن سے ہانپ رہا تھا۔
چار مینار کے قریب اُنھیں جھٹکا سواری بھی نظر آئی، تانگا بھی تانگے
کا گھوڑا انسبتہً تگڑا تھا اِس لیے وہ رکشا سے اُتر کے تانگے میں سوار
ہو گئے۔ تانگے والے نے کچھ تکرار کی مگر مولا کا چاقو دیکھ کے ٹھنڈا پڑ
گیا۔ تجّل نے بیٹھتے ہی پانچ روپے کا نوٹ اُس کے حوالے کر دیا، پھر
تو اُس کی رفتار ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ راستہ بھی صاف تھا، اِکا دُکا
سواریاں چل رہی تھیں۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد وہ اپنی منزل کے سامنے
تھے۔ اُس وقت پونے بارہ بجے ہوں گے۔ کانتے کو کچھ معلوم نہیں تھا
کہ وہ کہاں آئے ہیں، راستے میں مولا کی وجہ سے اُس نے کچھ پوچھنے
کی کوشش نہیں کی تھی۔ ویسے بھی شاید وہ خاموش ہی رہتا کیونکہ تجّل
کی مرضی کے بغیر اُس سے کچھ جاننا ممکن نہیں تھا۔ کانتے کا دل جیسے
کسی نے مٹھی میں بند کر رکھا تھا۔ تانگا جس جگہ جا کے ٹھہرا، وہ کسی حویلی
کا دروازہ ہی ہو سکتا تھا۔

"حویلی کا دروازہ! تم، تم ....." میں نے تھرتھراتی آواز میں اُس
سے پوچھا۔ اتنی دیر تک میں اپنے آپ کو جکڑے بیٹھا رہا تھا کہ میری
مداخلت سے کانتے کے تسلسل میں کوئی لکنت نہ آ جائے مگر کانتے
کی زبان پر حویلی پہنچنے کا ذکر میرے کانوں کے لیے عجوبہ تھا، میں چپ
نہ رہ سکا۔

"ہاں لاڈلے!" وہ تھکی تھکی آواز میں بولا۔ "وہ حویلی کا دروازہ
ہی تھا۔ نواب کی حویلی کا۔"

"یعنی تم، تم وہاں تک گئے تھے؟" میری زبان اٹک رہی تھی۔

"یہی تو بول رہا ہوں، رات سالی بہت اُوپر ہو گئی تھی، میں نے
اُستاد کو ٹوکنا چاہا کہ ایک رات اور کاٹے دیتے ہیں، سویرا ہوتے ملیں
گے لیکن ہم وہاں پہنچ ہی گئے تھے تو میرا کچھ بولنا بالکل بے کار جاتا
سالا اُستاد مان کے نہیں دیتا۔" کانتے کا گلا خشک ہو گیا تھا۔ شامو
نے اُٹھ کے چارپائی کے پاس رکھی ہوئی صُراحی سے ایک کٹورا پانی لا
کے اُسے دیا۔ کانتے نے ایک ہی سانس میں پورا کٹورا اُتار لیا۔

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا مگر کانتے مذاق نہیں کر رہا تھا۔ اُس
کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ وہ جس رات کی بات کر رہا تھا، اُس دن
ہمیں تہ خانے سے ملازموں کے حصے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ گویا پیرو کا
اندازہ بالکل صحیح تھا، کسی یقین ہی کی بنیاد پر وہ اتنا پُرامید نظر آتا
تھا۔ کانتے کے وقفے سے مجھے بے چینی ہو رہی تھی، دل بُری طرح
دھڑک رہا تھا۔ مجھے گنگ دیکھ کے اُس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ
نمودار ہوئی، کہنے لگا کہ حویلی خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ دروازے کے
چوکی دار بندوقیں لیے ہوئے تھے۔ وہ اُنھیں دیکھ کے بہت حیران ہوئے۔
تجّل نے اُن سے کہا کہ وہ پردیسی ہیں اور بڑے نواب سے اِسی وقت
ملنا چاہتے ہیں۔ چوکی داروں نے ہیجر مجر کی تو تجّل کو سختی اختیار کرنی
پڑی۔ اُس نے اُن سے کہا کہ نواب کی بھلائی اِسی میں ہے کہ جو کچھ
ہم کہہ رہے ہیں، تم اُتنا ہی اُس سے جا کے کہہ دو اور کہو کہ ہم چھوٹے
نواب کے متعلق کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔ اگر وہ سویا ہوا ہو
تو اُسے جگا دیا جائے۔

چوکی دار نے دوسرے چوکی دار سے چپکے چپکے مشورہ کیا اور
اُنھیں وہیں ٹھہرا کے اندر چلا گیا۔ اُس کے چلتے وقت تجّل نے اُسے
تاکید کی تھی کہ وہ زیادہ دیر انتظار نہیں کریں گے اور جیسا کہ تجّل نے
کہا تھا، اُنھیں اُتنا ہی انتظار کرنا پڑا جتنی دیر میں دروازے سے عمارت
کی طویل گزرگاہ عبور کر کے کوئی اندر جا کے واپس آ سکتا ہے۔ اُنھیں
اندر طلب کر لیا گیا تھا۔ دونوں جانب مسلح چوکی دار اُن کے ساتھ تھے۔
اُنھیں عمارت کے چبوترے پر سامنے کے ایک وسیع و عریض کمرے
میں بٹھا دیا گیا۔ تجّل نے مولا کو باہر راہ داری میں چھوڑ دیا تھا۔ کانتے
کہہ رہا تھا، اُسے توقع نہیں تھی کہ نواب دو اجنبیوں سے اِس وقت
ملاقات پر آمادہ ہو جائے گا۔ حویلی کی شان و شوکت سے ظاہر ہو رہا
تھا کہ وہ کوئی بڑا نواب ہے۔ کانتے کو اصل بات کا کچھ اندازہ نہیں
تھا، طرح طرح کے وسوسوں سے اُس کا دماغ گھرا ہوا تھا۔ اُنھیں کمرے
میں بیٹھے چند منٹ سے زیادہ نہیں ہوئے ہوں گے کہ اندرونی دروازے
سے آگے پیچھے دو بھاری بھرکم شخص آگے پیچھے برآمد ہوئے۔ وہ بظاہر
آہستہ آہستہ اندر آئے لیکن اُن کے چہروں سے اضطراب صاف ظاہر
تھا۔ تجّل کھڑا ہو گیا اور کسی تعارف و تمہید کے بغیر آگے آنے والے
شخص سے بولا۔ "کیا آپ ہی بڑے نواب ہو؟" اُس نے اضطراری
انداز میں سر ہلا کے اقرار کیا اور تجّل سے بیٹھ جانے کے لیے کہا۔ وہ خود
بھی قریب کے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

"ہم کو آپ سے اکیلے میں بات کرنی ہے۔ اِن کو بولو کہ ابھی کچھ دیر
کے لیے اِدھر سے چلے جائیں۔" تجّل نے اُس کے پیچھے آنے والے کی طرف
اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ اپنے ہی آدمی ہیں۔" نواب گرنجیلی آواز میں بولا۔

"پر ہم کو صرف آپ سے بات کرنا ہے۔"
نواب نے کچھ توقف کیا اور متجسس نگاہوں سے تجمل کو گھورتا رہا پھر اُس نے اپنے ساتھ آنے والے شخص کو اشارہ کر دیا۔ اُس کے جاتے ہی تجمل نے کہا: "دیکھو نواب صاحب! ہم کو کئی زبان میں بات کرنا آتا ہے لیکن ہم سیدھی اور صاف زبان میں بات کر رہے ہیں، اس بھروسے پر کہ آپ بھی اُس کا ویسا ہی جواب دو گے۔"
"کیا بات ہے؟" نواب نے متفکر لہجے میں کہا۔
"بات آپ کے لیے اتنی بڑی نہیں جتنی اپنے لیے ہے لیکن آپ کے لیے بھی کسی وقت بہت بڑی ہو سکتی ہے۔ ہم اپنے دو آدمیوں کے لیے آپ کے پاس آئے ہیں۔"
"کیسے آدمی؟" نواب نے تلخی سے کہا۔
"ہم کو معلوم تھا، آپ یہی جواب دو گے لیکن ہم یہ سننے کے لیے اِدھر نہیں آئے ہیں۔"
"آپ، آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"
"ہم جو بول رہے ہیں، سوچ سمجھ کے بول رہے ہیں۔ اتنا بہت سمجھو کہ ہم حویلی میں سیدھے راستے سے آئے ہیں اور آپ سے اپنے دو آدمیوں کے سوا کچھ نہیں مانگ رہے۔ اُن آدمیوں کو چھوڑنے کا حکم کر دو نواب صاحب! آپ سمجھتے ہو کہ وہ خانم تک پہنچنے کا کوئی رستہ بن سکتے ہیں تو یہ آپ کی بھول ہے، وہ مر جائیں گے اور ایسے آپ کو خانم کے بارے میں کچھ نہیں بولیں گے۔ آپ نے اُن دو کو ادھر ڈال کے چھتے میں ہاتھ ڈالا ہے۔ وہ ایک دو نہیں ہیں، آپ گنتی کرتے کرتے تھک جاؤ گے اور وہ سب ایسے ہیں کہ اُن کو لوٹ کے پیچھے دیکھنا نہیں آتا۔"
"آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔" نواب نے تمتماتی آواز میں کہا۔
"غلط فہمی آپ کو ہوئی ہے۔" تجمل نے تندی سے کہا۔ "دیکھو نواب! فضول کی بات مت کرو۔ چھوٹے نواب کے حال کا تھوڑا بہت پتہ اپنے کو چلا ہے پر اِس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ کاٹ کھانے کو دوڑ چلو، اپنے آدمی کو آزاد کر دو نواب صاحب! خانم کے بارے میں آپ کو کوئی بات کرنی ہے تو ہم سے بولو۔"
"جہاں تک آپ کے آدمیوں کا تعلق ہے، ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ آپ کو دھوکا ہوا ہے۔" نواب نے سخت لہجے میں کہا پھر پہلو بدل کے بولا: "لیکن دوسری بات بے شک صحیح ہے، ہمیں خانم کی ضرورت ہے، کسی بھی قیمت پر۔"
"قیمت پر؟" تجمل بھڑک کے بولا: "آپ کیا قیمت چکا سکتے ہو نواب؟ ذرا زبان سنبھال کے بولو خانم کا نام لیتے ہوئے تم کو دھیان

رکھنا چاہیے کہ اُس کے رکھوالے تمہارے سامنے بیٹھے ہیں۔ وہ مال نہیں ہے، وہ کسی گھر کی عزت ہے، ہمارے گھر کی۔ آپ کے ہاں لگتی ہو گی، اپنے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔"
"ٹھیریے ٹھیریے، ہماری گزارش ذرا تحمل سے ..." لہجہ یکایک بدل گیا: "اگر آپ واقعی خانم سے تعلق رکھ... کیجیے، ہمیں آپ کا شدت سے انتظار تھا۔ ہو سکے تو ... قیمت سے کچھ اور نہیں، محض اپنی طلب کا اظہار مقصو... سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم اور کس طرح آپ کو اپنی مجبوری ... سے تفصیل مت پوچھیے، بہتر ہے کہ ہمارے ساتھ چل کے ... کو دیکھ لیجیے اور خود کوئی فیصلہ کر لیجیے۔" وہ بے چینی سے ... آواز بھرا رہی تھی: "ہمیں بہرصورت خانم مطلوب ہیں ... چھوٹے نواب کا مداوا بن سکتی ہیں۔"
"آپ کو اتنا بولنے کی ضرورت نہیں ہے، کچھ اپنے ... دیتا ہے، اپنے آدمیوں کو گروی رکھنے کے پیچھے کوئی ایسی ... ہو سکتی ہے، رشتے داری تو چھوٹے نواب سے نہیں نکلتی کو... نواب کو ہم نے خانم کو اِدھر سے لے جاتے وقت دیکھا ... وقت واپس چلے گئے تھے پر ہم اُسی وقت کھٹک گئے ... آدھے ہو کے واپس گئے ہیں۔ ہم نے سب کچھ خانم کی مرضی ... دیا تھا، اُس کو پورا اختیار تھا کہ اپنے ساتھ جانے کا فیصلہ ... نواب کے ساتھ۔ اُدھر تبھی ساری بات طے ہو گئی تھی۔"
"ہمیں معلوم ہے کہ کچھ ایسا ہی ہوا تھا لیکن یہاں ک... نواب گرفتہ لہجے میں بولا: "ہم آپ کو کیا بتائیں۔"
"نواب لوگ کی بات ہے، اپنی گدی اوپر ہی چڑ... آتا ہے اُن کو، موچھ کچھ نیچے کھسک گئی تھی چھوٹے۔ ... ہی سالی بہت منہ چڑاتی ہو گی۔ لگتا ہے تنکا کھٹکنے کے بجا... چھوڑتا گیا۔ خانم کے جانے کے بعد بازار چوپٹ نہیں ہو گیا۔ ... لوگ سلامت رہیں، روز ایک سے ایک نئی نویلی پری جان اُ... چڑھائی جاتی ہے۔"
"ایسا نہیں ہے جس طرح آپ سوچ رہے ہیں، بخدا ... ہے۔" نواب نے احتجاجی لہجے میں کہا: "خانم کی دوری کے ... گزرتے گئے، چھوٹے نواب اُن کے اور قریب ہوتے گئے ... حالت روز بہ روز ناقابلِ برداشت ہوتی گئی۔"
"پھر اتنے دِنوں کی رگڑ گھس کے بعد آپ کو لاٹری ... خانم کے دو بھیدی آپ کو دکھائی دے گئے۔ بیچ میں ایک ... کا معاملہ تھا، سیدھی طرح کام نہیں بنا تو آپ نے اُن کو اٹھوا لیا۔"
"ہم اس قسم کے طرزِ کلام کے عادی نہیں ہیں۔" نواب ...

... ٹھنک کے بولا: "مناسب ہو گا کہ آپ احتیاط سے گفتگو کریں۔"
"ہم کو بھی عادت نہیں ہے نواب صاحب! اپنی بات کا یقین ... آپ کے سر کی قسم، ہم بہت لگام دے کے ہی بول رہے ہیں۔ اِس ... نہیں کہ آپ پوتڑوں کے نواب ہو، یہاں کے بادشاہ لگتے ہو۔ اِس ... کہ آپ کا سر ٹھیک طرح کام نہیں کر رہا ہے۔ کچھ دیر کے لیے اِس ... ٹھکانے پر لے آؤ اور جو ہم بولتے ہیں، دھیان سے سن لو۔ ہم کو اپنے ... چاہئیں۔ سیدھے اِس لیے آپ کے پاس آ گئے ہیں کہ آپ ... سمجھا سمجھا دیں ورنہ پھر اپنے کو کھلا سمجھنا۔"
"بخدا ہم نے آپ سے بہت مروت برتی ہے، محض اس وجہ سے ... اپنے چھوٹے بھائی کی زندگی ہمیں خود سے زیادہ عزیز ہے، زبان درازی ... ہمارے ہاں ایک ہی ہوتی ہے، شاید آپ نہیں جانتے کہ آپ ... میں بیٹھے ہیں۔"
"جانتے ہیں، اچھی طرح جانتے ہیں پر جتنا ہم آپ کو جانتے ہیں، ... آپ بھی ہم کو جان لیں تو کالا اُجلا آپ کی سمجھ میں جلدی آ ... گا۔" تجمل نے تلخی سے کہا: "بات زیادہ لمبی کیوں کرتے ہو نواب! ... نے کچھ جان کے ہی اِدھر آپ کے دروازے پہ دستک دی ہے، ... ہیں اور بھی جا سکتے تھے، اسے آپ دھمکی سمجھو یا کچھ اور، ہمارے ... واپس نہ کیے گئے تو آپ کے اور آپ کی حویلی کے لیے دن بھاری ... جائیں گے۔ ہم سے دوبارہ مت کہنا کہ وہ تمہارے پاس نہیں ہیں۔ ... کوئی اور بات ہو تو بولو۔"
نواب نے سر جھکا کے کچھ تحمل کیا اور کانپتے کی توقع کے خلاف ... ہوئے لہجے میں بولا: "ہم سمجھ رہے ہیں کہ اپنے اُن دو عزیزوں کی ... زندگی سے آپ کس ذہنی کشمکش سے دوچار ہو سکتے ہیں لیکن ... پاس افسوس اور ہمدردی کے سوا کچھ نہیں ہے، بے شک ہم کب ... اُن لوگوں کی جستجو میں ہیں جو خانم کا کوئی اتا پتہ جانتے ہوں اور ... ہمارے بھائی کے دکھ کا مداوا بن سکیں۔ ہم نے یہاں کسی طرح آپ تک ... اور آپ سے درخواست کرنے کے لیے مختلف لوگوں سے پوچھ گچھ ... تھی مگر اس سلسلے میں نہایت احتیاط کی گئی تھی مگر معلوم ہوتا ہے، ... بات چھپی نہ رہی۔ ضرور ایسے ہی کسی واقف نے آپ کو اِس حویلی ... جانب اشارہ کر دیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں، اِس میں ہمارے لیے بہتری ... کی کوئی صورت مضمر ہے۔ آپ تسلی رکھیں، ہم آپ کے عزیزوں ... تلاش میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں گے، ساتھ ہی ہماری گزارش ... کہ ہماری زندگی، ہمارے بھائی کے سلسلے میں آپ کوئی نرمی ضرور ... اختیار کیجیے۔ خانم کے بغیر جو ممکن تھا، ہم کر چکے ہیں، کچھ اور ہمارے ... امکان میں ہوتا تو ہم آپ سے کبھی اصرار نہ کرتے۔"
"کیا یہ کوئی خیرات ہے نواب صاحب؟"

"نہیں، قطعی نہیں، ہمیں یقین ہے، اگر آپ کے آدمیوں کو کوئی اور حادثہ پیش نہ آ گیا اور وہ اِسی ریاست میں موجود ہیں تو ہم سے اتنی دُور نہیں ہیں۔ ہم اُن کی بازیافت کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ یہ آپ کی اُس عنایت کا نہایت حقیر اجر ہو گا جو آپ ہمارے بھائی کی سلامتی اور خوشی کے لیے ہمارے ساتھ روا رکھیں گے۔ ہماری درخواست ہے کہ آپ ہمارے ساتھ چل کے، ایک نظر ہمارے بھائی کو دیکھ لیں، شاید اِسی طرح ہماری بات آپ تک کچھ رسا ہو سکے۔"
"آپ کی ہر بات اپنی سمجھ میں آ رہی ہے۔" تجمل نے اونچی آواز میں کہا: "پر آپ شاید کچھ نہیں سمجھ رہے ہو۔"
"ہماری التجا ہے کہ آپ ہمارے بدنصیب بھائی کو دیکھیں تو۔" نواب کے لہجے میں عاجزی شامل تھی، اس نے جیسے تجمل کی بات سُنی ہی نہیں۔
"اُس کو کیا دیکھنا۔" تجمل نے کسمساتے ہوئے کہا: "لگتا ہے، آپ سب ٹھیک ہی بول رہے ہو۔"
"نہیں، ہم پر اعتبار کریں اور جو ہم کہہ نہیں پا رہے ہیں، بہتر ہو گا کہ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں، ہم خانم کی قلبِ ماہیت سے انکاری نہیں ہیں۔ بے شک وہ بالاخانے کی زندگی ترک کر کے کسی نہایت شریف خاندان سے وابستہ ہو سکتی ہیں۔ ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ وہ پرانی زندگی میں مراجعت کریں، ہم تو کچھ اور کہہ رہے ہیں۔ یوں کہیے کہ ہم خانم سے ایک اور نیکی، ایک اور ایثار کے لیے درخواست گزار ہیں۔ اُن کی ذرا سی توجہ کسی آشفتہ سر کی راحت و مسرت کا سبب بن سکتی ہے تو نیک نفس خانم کو ایسی بخیلی نہیں کرنی چاہیے نہ اُس خاندان کو جس کے قلب کی کشادگی خانم کی قبولیت سے ظاہر ہے۔ ہم عرض کریں کہ چھوٹے نواب کے متعلق شروع میں ہم بھی اُسی بدگمانی کے مرتکب ہوئے تھے جس کا شبہ آپ کر رہے ہیں، کوئی بھی یہ سب کچھ جان کے یہی تصور کرے گا مگر ایسا نہیں ہے۔ بات کچھ اور ہے اور ہمیں اعتراف ہے کہ اس احساس سے ہم پہلی بار آشنا ہوئے ہیں۔ شاید ہم نے خانم کو کبھی دیکھا ہو لیکن ہمیں اپنے بھائی کی نگاہ پر پورا اعتماد ہے۔ خانم کچھ ایسے ہی اوصاف کی حامل ہوں گی کہ اُن کے نقش اتنے گہرے ہیں اور کوئی خاندان اُن سے ایسی شدید وابستگی کا مدعی ہے۔ خود خانم کا سب کچھ ترک کر دینا اُن کی طہارتِ قلب کا آئینہ دار ہے۔ ہمیں احساس ہے کہ نئی زندگی میں شامل ہونے کے بعد خانم کے متعلق اب کوئی گفتگو کرنا اور یوں اُن کا نام لینا بھی نازیبا ہے، ہمیں اس نازکی کا پورا احساس ہے مگر ہم، ہم..."
اُس کی آواز رُندھنے لگی، بات منہ میں رہ گئی، وہ بہت مضطرب سا ہو گیا تھا، یکایک اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا۔ تجمل کو اُس نے

کچھ کہنے نہیں دیا اور بے تابانہ آگے بڑھ کے اُس کا شانہ پکڑ لیا۔ بنجل نہ چاہتے ہوئے بھی اُٹھ گیا تھا، کانتے بھی اُس کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ نواب نے اندر سے کسی شخص کو طلب کرنے اور ہدایت دینے کے لیے آواز بلند نہیں کی۔ جیسے ہی وہ کمرے سے نکلے، انھیں دروازے کے پاس کئی آدمی کھڑے نظر آئے۔ اُن میں مسلح چوکی دار بھی تھے اور وہ شخص بھی جو ابتدا میں نواب کے ساتھ آیا تھا۔ بنجل اور کانتے کو نواب کے ساتھ دیکھ کے وہ حواس باختہ سا ہو گیا تھا۔ نواب نے اُن کی جانب دیکھا بھی نہیں، وہ سب خود ہی سراسیمگی سے ایک طرف سمٹتے گئے۔ نواب بنجل کا شانہ تھامے تھامے تیز قدموں سے اندر بڑھتا رہا، کانتے کہہ رہا تھا کہ حویلی کسی راجا کے محل سے کم نہیں تھی۔ ہر طرف جھاڑ، فانوس، قالین اور آراستہ دیواریں، محرابیں۔ انھیں حویلی کے اندرونی حصّے میں زیادہ دُور نہیں جانا پڑا۔ جہاں وہ بیٹھے تھے، وہاں سے سو قدم ہی چلے ہوں گے کہ نواب کوئی دستک دیے بغیر تیزی سے ایک دروازے میں داخل ہو گیا۔ دوسرے لمحے ڈیوڑھی نما ایک مختصر راستے سے گزر کے وہ ایک وسیع کمرے میں موجود تھے۔ دو باندیاں ہوں یا نواب عالم تاب کی بیگم یا کوئی اور، نواب کو اور انھیں اس طرح سر اُٹھائے آتے دیکھ کے وہ پریشان ہو گئیں اور ابتری کی حالت میں اِدھر اُدھر کمرے کے تاریک گوشوں کی طرف لپکیں۔

بنجل آگے جاتے جاتے ٹھٹک کے رُک گیا۔ چند قدم کے فاصلے پر کمرے کے وسط میں دیوار کے ساتھ لگی ہوئی مسہری پر ایک شخص لیٹا تھا۔ نحیف و نزار، بے سُدھ سا۔ کمرے میں ہلکی روشنی تھی لیکن اُس کے خط و خال انھیں اچھی طرح نظر آ رہے تھے۔ زرد چہرہ، آنکھوں کے گرد حلقے، ٹوٹا اور بکھرا ہوا سا کوئی وجود۔ اُن تینوں کی آمد کی آہٹیں اُس کے کانوں تک ضرور پہنچی ہوں گی، اُس کی پلکوں پر ہلکا سا ارتعاش نمودار ہوا اور اُس کے سینے کا تموج کسی قدر زیر و زبر ہوا مگر اُس کی آنکھیں بند رہیں۔ کانتے اُسے پہلی بار دیکھ رہا تھا پھر بھی اُس کے لیے یہ قیاس کرنا مشکل نہیں تھا کہ اُس کے سامنے کوئی بدلا ہوا، اُجڑا ہوا آدمی ہے۔ بس کوئی ڈوری چل رہی تھی۔ بنجل لمحوں اُسے دیکھتا رہا اور لرزتی آواز میں بولا۔

"یہ، یہ کیا کر لیا ہے انھوں نے؟"

"یہی ہے۔" نواب نے بھنچے ہوئے ہونٹوں سے جواب دیا۔

بنجل کی آنکھیں مسلسل چھوٹے نواب پر جمی ہوئی تھیں۔ کانتے کا خیال تھا کہ شاید وہ نواب کی مسہری پر جا کے اُسے قریب سے دیکھے گا مگر جلد ہی پلٹ کے وہ دروازے کی طرف چل پڑا۔ باہر آ کے اُس نے بڑے نواب کو آگے آنے کے لیے راستہ دیا اور تینوں واپس اُسی نشست گاہ میں آ کے بیٹھ گئے۔ "ایسا کب سے ہے؟" اُس نے بوجھل آواز میں نواب سے پوچھا۔

"تبھی سے، شروع میں البتہ سنبھلے سنبھلے رہے، پھر اِدھر کچھ دنوں سے ..." نواب کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

بنجل دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا اور آہستگی سے بولا ... کوشش کریں گے نواب صاحب! اپنے جیسی کوشش۔"

"ہو سکے تو ہمیں خانم کا پتہ بتا دیجیے، ہم خود جا کے اُن ..."

"نہیں۔" بنجل نے صاف انکار کر دیا۔ "آپ کے اُدھر جا... کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہم خود جا کے خانم سے بات کرتے ہیں... ہونا نہ ہونا اُس پر ہے۔ ہم کو بھروسا ہے کہ وہ اپنی بات لے... ٹلنے کی۔ اِس وقت ہم آپ کو اتنا ہی بول سکتے ہیں۔ اِس... آپ بھی کچھ مت سمجھنا۔ آپ کی آنکھوں نے ایک ہی طرح... سیکھا ہے۔ بولی بڑھانے کے خیال میں مت رہنا۔ اِس کا تھوڑا... اندازہ آپ کو ہمارے آدمیوں سے بھی ہو گیا ہو گا۔ اپنے کو پتہ... اِدھر آپ کے پاس حویلی میں ڈھیر لگے پڑے ہیں، اُن کی اپنی... ضرورت نہیں ہے جتنی آپ کو ہے، اِس کو سنبھال کے رکھوا... طرف سے اپنے آگے آنے والوں کے لیے سوغات سمجھو۔" بنجل نے... روک لی اور سپاٹ لہجے میں بولا۔ "اپنا مطلب ہے نواب صاحب... خانم کے پاس آدمی بھیجتے ہیں، آگے اچھے کی ہی آس رکھو اور ہمارا... آدمی ہم کو واپس کر دو، اُن سے آپ کو کچھ نہیں مل سکے گا۔"

نواب نے اضطراری انداز میں پھر وہی وضاحت کرنا... میرا اور پیرو کے بارے میں پھر لاعلمی ظاہر کی۔ کانتے کو حیرت تھی... نے اُس سے کوئی حجت نہیں کی۔ وہ اُسی لمحے اُٹھ کھڑا ہوا۔ چلتے... اُس نے نواب سے کہا۔ "ابھی نہیں تو سوچتے میں دھیان کر... ہم کو اپنے آدمی لوٹنے کا انتظار رہے گا۔ وہ لوٹ... اپنے پاس آ گئے تو بھی جو ہم نے بولا ہے، اپنی جگہ ہے اور آپ جا... ہو، یہ بات آپ کے لیے اپنے من میں کوئی گھر ہی بنائے گی۔"

نواب اُسے روکتا اور اُس سے کچھ کہتا رہ گیا۔ بنجل چل پڑ... تاہم دروازے سے نکلتے نکلتے وہ ٹھیر گیا۔ "ایک بات اور سُن لو..." اُس نے تند لہجے میں کہا۔ "اُن کے ساتھ کوئی اینس بیس ہوا تو... حویلی اپنی جگہ دکھائی نہیں دے گی۔ بہت بڑا گھاٹا ہو جائے گا... کے لیے کسی اور کے پاس نہیں جائیں گے، لوٹ کے اِدھر ہی آئیں گے... آپ کے پاس نادر خانم پر کچھ نہیں ہے، ہم نہیں سمجھتے کہ خانم کے... تک وہ آپ کے پاس بدلے میں رکھے ہوئے ہیں۔ ہو سکے تو ہوشیار... رہنا۔ ہم نے پہلے ہی بول دیا ہے کہ آپ گنتے گنتے تھک جاؤ..."

راہ داری میں مولا موجود تھا اور حویلی کے باہر تانگا بھی... تینوں تانگے میں بیٹھ کے اڈے آ گئے۔

کانتے نے رُک کے ایک گہری سانس کھینچی اور پلکیں جھپکائیں... "لگا، سالا پتہ ہی نہیں چلا۔" وہ انگڑائی لیتا ہوا بولا۔

واقعی کسی کو احساس نہیں ہوا تھا، دھوپ ابھی دیواروں سے دُور دُور تھی لیکن ہر طرف اُجالا پھیلا ہوا تھا۔ شامو، جمرو، زورا اور شنگو سب اس طرح کانتے کے گرد ہمہ تن گوش بیٹھے تھے گویا میری طرح وہ بھی پہلی بار سب کچھ سن رہے ہوں۔ بار بار اُن کی نگاہیں مجھ پر اُٹھتی رہی تھیں جیسے مجھ سے کہہ رہی ہوں، سُنا تم نے؟ میں نے کانتے سے خود اصرار کیا تھا اور مجھی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کانتے جان جان کے مجھے یہ سب بتا رہا ہے، مجھے کوئی فردِ جرم سُنا رہا ہے۔ مجھ میں اُس سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں تھی مگر وہ خود ہی کہنے لگا۔ وہ اڈے واپس آئے تو رات بہت ہو گئی تھی اور آکا کے سوا بھی موجود تھے۔ بنجل کی ہدایت پر زورا اُسی وقت خاموشی کے ساتھ اڈے سے نکل گیا۔ اِتنے دِنوں میں وہ شہر کے گلی کوچوں سے کسی حد تک واقف ہو گیا تھا۔ آبا جان کے پاس سے بنجل اندھیرا ہونے پر چلا تھا۔ وہ اُس کی واپسی کے بے چینی سے منتظر ہوں گے۔ رات گزرنے پر اُس کے نہ آنے سے اُن کے دل میں ہول اُٹھ رہے ہوں گے۔ زورا نے راستے میں بہت احتیاط کی کہ وہ کسی کی نظروں میں آئے بغیر منزل پر پہنچ جائے۔ جس وقت وہ ہوٹل میں داخل ہوا، تقریباً ڈھائی بج رہے تھے۔ کئی دن سے آبا جان کے ساتھ وہ اُسی ہوٹل میں مقیم تھا اس لیے یہاں کسی غلط انداز نگاہ کی اُسے پروا نہیں تھی۔ آبا جان اور مارٹی آہٹیں گن رہے تھے۔ اُسے اکیلا دیکھ کے اُن کے چہرے زرد پڑ گئے اور زورا کو انھیں یہ یقین دلانے میں بہت مشکل پیش آئی کہ بنجل ہی نے اُسے بھیجا ہے، زورا انھیں زیادہ بتا بھی کیا سکتا، اُسے خود ہی کتنا معلوم تھا۔ وہ نہ کانتے کی طرح بنجل کے ساتھ تھانوں میں گیا، نہ بڑے نواب کی حویلی میں۔ درمیان میں اُسے کانتے سے سُن گُن لینے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ بنجل نے جو کہا تھا، اُس نے وہی آبا جان کے سامنے دہرا دیا۔ بنجل نے آبا جان کو پیغام بھیجا تھا کہ میرا اور پیرو کا سراغ بڑی حد تک مِل گیا ہے اور اُمید ہے کہ بنجل جلد اُن کے پاس پہنچ بھی جائے گا۔ اُس کے نہ آنے سے آبا جان گھبرائیں نہیں، وہ کسی سبب سے رُک گیا ہے اور آیندہ بھی ممکن ہے وہ اُن سے بار بار نہ مِل سکے، بہرحال کسی نہ کسی طرح آبا جان سے رابطہ ضرور رکھا جائے گا۔ اُس کی کوشش ہو گی کہ کل کسی وقت آبا جان کے پاس پہنچ کے انھیں تفصیل بتا سکے۔ وہ اطمینان سے ہوٹل میں ٹھیرے رہیں اور اپنی جانب سے کوئی قدم نہ اُٹھائیں۔

بنجل کو احساس ہو گا کہ صرف اتنی بات آبا جان کو کبھی مطمئن نہیں کر سکے گی اِس لیے اُس نے زورا سے کہہ دیا تھا، اگر آبا جان نہ مانیں تو وہ انھیں بتا دے کہ بیچ میں ایک بڑے نواب کا معاملہ ہے مگر آبا جان کی یوں بھی کہاں سیری ہوتی۔ وہ اور بدحواس ہو گئے۔ زورا نے سب ٹھیک ہے، سب خیریت ہے، بار بار کہہ کے انھیں دلاسا دینے کی اپنے طور پر بہت کوشش کی لیکن وہ کرید کرید کے پوچھتے رہے۔ بتاؤ، تم کیا چھپا رہے ہو؟ صاف صاف کیوں نہیں بتاتے؟ یہاں سے تم لوگ کہاں کہاں گئے؟ کون کون راستے میں ملا اور کیا بات ہوئی؟ زورا کی عجیب مشکل تھی، ایک طرف اُسے بنجل کا خیال تھا کہ جو اُس نے کہا ہے اُس سے زیادہ اُسے زبان نہیں کھولنی چاہیے تھی۔ دوسری طرف وہ آبا جان کی تشفی کے لیے کوئی بڑا جھوٹ بھی نہیں بول سکتا تھا کہ بعد میں اُن کے سامنے آنے سے بھی جائے مگر وہ اُس کے پیچھے پڑ گئے تھے سو اُسے بتانا پڑا کہ ہوٹل سے نکل کے بنجل مختلف تھانوں میں گیا تھا، تیسرے تھانے میں وہ دیر تک رُکا رہا اور وہی آخری تھانا تھا جہاں سے چل کے چار مینار کے قریب واقع ایک ہوٹل میں انھوں نے کھانا کھایا تھا۔ اُس کے بعد وہ سیدھے بازار کے اڈے چلے گئے۔ آکا کا سارا واقعہ زورا نے آبا جان کو بتانا ضروری نہیں سمجھا۔ بس اِتنا کہا کہ اڈے کے والوں سے الگ کمرے میں بنجل گھنٹے بھر کے قریب باتیں کرتا رہا، یہاں سے نکلتے ہی باقی چاروں کو روک کے وہ کانتے کے ساتھ کہیں چلا گیا۔ تھوڑی دیر پہلے ہی وہ اڈے واپس آیا تھا۔

زورا مزید کچھ بتانے سے مسلسل انکار کرتا رہا تو آبا جان کو بھی خاموش ہو جانا پڑا۔ زورا کو صاف محسوس ہو گیا تھا کہ وہ اُس سے کچھ ناراض ہو گئے ہیں۔ بعد میں انھیں چُپ سی لگ گئی تھی۔ آبا جان نے اب تک خود کو باندھے رکھا تھا۔ جب تک کوئی دوسرا نہیں ہوتا، آدمی اپنا آسرا خود ہوتا ہے، سہارا ملنے پر آدمی سنبھلنے کے بجائے کبھی ٹوٹنے بکھرنے بھی لگتا ہے۔ بنجل اُن کے لیے اور دوسرا پیغام بھیج بھی کیا سکتا تھا۔ ہر صورت میں کم و بیش اُن کا یہی حال ہوتا۔ بنجل اگر یہ بھی کہلوا کے بھیج دیتا کہ ہم دونوں اُسے مل گئے ہیں تو بھی اُس وقت تک اُن کی بے کلی دُور نہ ہوتی جب تک وہ اپنی آنکھوں سے ہمیں دیکھ نہ لیتے۔ بنجل کے آنے کے بعد آبا جان کو شاید یہی توقع ہو گی کہ بس اُس کے آنے کی دیر ہے۔ آتے ہی وہ کوئی سحر پھونکے گا اور ہمیں اپنے ساتھ لے کر ہی لوٹے گا۔ زورا کہہ رہا تھا کہ مارٹی بھی اُس سے کھنچا کھنچا تھا۔ اُس کے خیال میں آبا جان کو نہیں تو کم از کم اُسے زورا کو اصل بات بتا دینی چاہیے تھی حالانکہ زورا نے اڈے پر پیش آنے والے واقعے کی روداد کنایتہً اُسے سُنا دی تھی۔ وہ تینوں باقی رات جاگتے ہی رہے۔

مارٹی اور زورا کے کہنے پر آبا جان بستر پر لیٹ گئے تھے مگر پانچ منٹ بھی نہ بیتے ہوں گے کہ اُٹھ کے صبح سورج نکلنے تک مصلّے پر بیٹھے رہے۔

بنجل نے زورا سے واپسی کے لیے کچھ نہیں کہا تھا اِس لیے

صبح ہونے کے باوجود وہ ہوٹل سے نہیں نکلا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

پھر کوئی نو بجے ہوں گے کہ کسی نے دروازہ کھٹ کھٹایا۔ زورا ہی نے بڑھ کے دروازہ کھولا۔ شامو اُن کے سامنے موجود تھا۔ تینوں نے اُسے گھیر لیا لیکن شامو نے عجلت ظاہر کی اور ابا جان سے کہا کہ وہ کسی تاخیر کے بغیر فیض آباد میں بڑے صاحب منیر علی کے نام ارجنٹ تار بھیج دیں کہ خانم پہلی گاڑی سے حیدر آباد پہنچ جائے۔ بِجّھل نے ایک تار کے بعد دوسرا تار بھیجنے کی ہدایت کی تھی۔ ابا جان یہ سُن کے اور ناتواں ہو گئے ہوں گے۔ انھوں نے شامو سے اس کی وجہ پوچھنی چاہی۔ وہ بھی انھیں زورا سے زیادہ کچھ نہ بتا سکا اور چائے کی ایک پیالی پی کے فوراً روانہ ہو گیا۔ صبح صبح کا وقت تھا، ابھی بازار سنسان پڑے تھے۔ کسی کو اُس کا کہیں آنا جانا محسوس نہیں ہوا۔ شامو ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد اڈّے واپس پہنچ چکا تھا۔

بِجّھل رات ہی کو یہ پیغام زورا کے ذریعے بھیج سکتا تھا مگر یا تو اُس کا ارادہ سویرے کسی وقت خود تار دینے کا تھا جس کا اُسے موقع نہ مل سکا یا پھر ابا جان کو حقیقتِ حال سے بتدریج آگاہ کرنا اُس نے مناسب جانا تھا۔ اس نوعیت کی کوئی ہدایت اُن کے لیے مزید تکدر کا سبب بن سکتی تھی۔ وہ تو اُسی وقت تار گھر کے لیے نکل کھڑے ہوتے اور یہی ہوا، اِدھر شامو واپس گیا، اُدھر ابا جان نے شیروانی پہنی، مارٹی کو ساتھ لیا۔ تار گھر ہوٹل سے نزدیک تھا، پیدل کا راستہ، مارٹی اور ابا جان چند منٹ میں وہاں پہنچ گئے۔ لوٹتے وقت وہ ایک اور فارم بھی ساتھ لیتے آئے تاکہ تھوڑے وقفے بعد دوسرا تار بھیجا جا سکے۔

اِدھر رات گئے، بِجّھل کانتے اور مولا حویلی سے واپس آئے تو اڈّے پر سارے لوگ موجود تھے۔ وہ رات بھر بِجّھل کے گرد بیٹھے رہے۔ شروع شروع میں وہ زبان کھولتے ہوئے جھجک رہے تھے مگر بِجّھل کی توجہ دیکھ کے ساری رات آکا کے واقعات سُناتے رہے۔ تب کانتے کو معلوم ہوا کہ بازار کی ایک عورت کانتی بائی سے کالے دادا کچھ ایسا قریب ہوا کہ اڈّے سے دُور ہوتا گیا، پھر بھی اڈّے پر کسی بات کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی، سب کچھ معمول کے مطابق جاری تھا اور کالے دادا سے چند ایک شکایتوں کے سوا سبھی خوش تھے۔ اِسی دوران آکا نمودار ہوا، کالے دادا نے بھوپال سے آئے ہوئے ایک مہمان دادا کے طور پہ اُسے اڈّے ہی پر ٹھیرایا۔ اُس نے کالے دادا کی غفلت سے فائدہ اُٹھا کے اڈّے کے معاملات میں دلچسپی لینا شروع کیا اور کئی بار اڈّے کے آدمیوں کے سامنے اپنے زور کی نمائش بھی کی۔ پھر چند دن بعد اُس نے انکشاف کیا کہ وہ اور شاہ کبیرا ایک

ہی اُستاد کے شاگرد ہیں، اُستاد بھومی کے۔ اُس کا یہ دعوا درست ہی سمجھا گیا کیونکہ شاہ کبیرا اڈّے کے آدمیں [illegible] اُستاد بھومی کے بَل کا ذکر کیا کرتا تھا۔ شاہ کبیرا نو عمر [illegible] کوئی جرم کر کے حیدر آباد سے فرار ہو گیا تھا، برسوں بعد [illegible] جوان ہو چکا تھا اور مرکھنا بیل اُس وقت بازار کے اڈّ[illegible] دادا بنتا تھا۔ وہ اگرچہ بوڑھا ہو چکا تھا لیکن سبھی اُس [illegible] کرتے تھے اور مرا ہوا ہاتھی سوا لاکھ کے مصداق اُس وقت [illegible] سب میں اُس کا کوئی بدل نہیں تھا۔ حیدر آباد آ کے شاہ [illegible] پاس بیٹھنے لگا۔ اپنے کَس بَل، پھُرتی اور سوجھ بوجھ کی وجہ [illegible] ہی بھولے دادا کے قریب ہو گیا تھا، ابتدا میں ان دونوں [illegible] بڑے چھوٹے ہی کا تھا مگر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ اُس [illegible] نے بھولے دادا کو اڈّے سے بے دخل کر دیا۔ پھر کوئی اٹھا او[illegible] جو بھی شاہ کبیرے کے آڑے آیا، اُسے ذلت ہی اُٹھانی پڑی [illegible]

آکا کو اڈّے پر مہمان ٹھیرے چند دن ہوئے تھے کہ [illegible] کالے دادا سے اڈّا حاصل کرنے کا باقاعدہ مطالبہ کر دیا۔ کا[illegible] عالم ہی دوسرا تھا۔ کانتی نے اُسے پہلے ہی بہت نڈھا[illegible] مہمان آکا کی اس حیرت انگیز خواہش نے اُس کے رہے سہ[illegible] بھی منتشر کر دیے، اُس نے اُس وقت آکا سے کوئی حجت [illegible] بجائے خاموشی ہی مناسب سمجھی، اب نہیں تو پھر کسی وقت [illegible] نمٹا جا سکتا تھا، آکا کے مقابل آنے کے نتیجے میں دوسر[illegible] بھی ممکن تھی، سب سے زیادہ اُسے کانتی بائی کا خیال تھا، اگر [illegible] واقعی اُسے اڈّے سے بے دخل کر دیا تو کانتی بائی بھی اُس [illegible] جائے گی، اُس کے بقول جانے کیوں اُسے یہ آس بھی بندھ[illegible] اُس کے وہ اجنبی محسن ہی بھولے بھٹکے واپس نہ آ جا[illegible] جھولی میں بازار کا اڈّا ڈال کے چلے گئے تھے، اُسے اُن [illegible] معلوم ہوتا تو وہ انھیں باخبر بھی کر دیتا، بِجّھل نے اپنے با[illegible] کے اڈّے کے لوگوں کو کچھ بھی نہیں بتایا تھا، نام بھی کوئی [illegible] بتایا تھا۔ کالے دادا نے آکا کو آگاہ کر دیا تھا کہ اڈّے کا [illegible] کون ہے مگر آکا نے کوئی دھیان نہیں دیا۔ وہ بتدریج اڈ[illegible] حاوی آتا گیا اور اُس نے وہاں وہ کچھ شروع کیا جو اڈّ[illegible] ہوا تھا، اُس کے حکم کی سرتابی، مزاج کے خلاف چھوٹی [illegible] کی سزا میں کوئی رُو رعایت نہیں کی جاتی تھی، گھنٹوں اُ[illegible] چاقو کی نوک سے کھال پر سدا قائم رہنے والے نشانات [illegible] دنوں تک بھوکا پیاسا رکھنا، سر مُنڈ وا دینا، برہنہ کر کے اڈّ[illegible] سے مسلسل پٹائی کرانا، اڈّے کے دالان اور صحن کے درمیا[illegible] دیے بغیر دوڑیں لگوانا، دونوں یا ایک ہاتھ اُٹھانے اور [illegible]

[illegible] دینے کا حکم، اگر کوئی ذرا سی جنبش کرتا تو بید ہی سے اُس کی [illegible] اُدھیڑ دی جاتی، کچھ ہی دِنوں میں شہر اور نواح کے دُور دُور تک [illegible] کا نام پہنچ چکا تھا، اُس کے مزاج کا کچھ ٹھیک نہیں تھا کہ اُسے کب [illegible] سی بات گراں گزر جائے، جب سے اُس نے اڈّا پوری طرح قابو میں [illegible] بننا تو شاید وہ بھول ہی گیا تھا۔ اڈّے کی پُرانی روش کے [illegible] علاقے کی ساری آمدنی کسی ایک شخص کے سپرد کرنے کے بجائے [illegible] نے مختلف علاقوں کے لیے مختلف آدمی متعین کیے تھے، بیشتر وہ انھی [illegible] راہ و رسم رکھتا تھا، انھی کی سفارش اور شکایت پہ وہ اڈّے کے [illegible] کے بارے میں فیصلے صادر کرتا تھا، کوئی شخص ان چند مخصوص [illegible] کی دیوار عبور کیے بغیر براہِ راست آکا کے پاس نہیں جا سکتا [illegible] بشرطیکہ آکا اُسے خود طلب کرے اور کسی اہم معاملے میں اُس نے [illegible] باریابی کا مجاز نہ ٹھیرایا ہو۔ اڈّے پر اُس کے متعین کیے ہوئے [illegible] ہمیشہ ایک دوسرے پہ شک کرتے تھے کہ کہیں دوسرا آکا کے [illegible] قریب تو نہیں ہے اور اُسے میرے خلاف بھڑکا تو نہیں رہا ہے [illegible] صورت میں اُسے اڈّے سے ہٹانے کے لیے کسی منظم سرکشی کا امکان [illegible] کم ہو گیا تھا، کالے دادا کو اُس نے کوئی کام تفویض نہیں کیا تھا [illegible] کالے دادا کو وہ رکھتا اپنے پاس ہی تھا اور ایک وہی شخص تھا [illegible] کا اُسے تھوڑا بہت خیال تھا۔

ساری رات وہ بِجّھل سے آکا کا چرچا کرتے رہے اور دن [illegible] بھی یہی حال رہا۔ جانے کہاں سے لوگ کھنچے کھنچے آ رہے تھے اور [illegible] جم کے بیٹھ جاتے تھے۔ کسی کو جیسے اس خبر پہ یقین نہیں تھا کہ [illegible] پہ اب آکا نہیں رہا ہے۔ بازار کے کئی ہوٹل والوں نے [illegible] طرف سے تینوں وقت کے کھانے کا اہتمام کرنے کی درخواست [illegible] سے کی تھی۔ اُس روز اڈّے پر لوگوں کی تعداد زیادہ تھی لیکن [illegible] وقت انھوں نے اس قدر کھانا فراہم کیا تھا کہ بچ گیا۔ دن بھر [illegible] سا لگا رہا اور سماوار میں چائے کھولتی رہی۔ رات کو کئی بالاخانوں [illegible] طرف سے اڈّے پر مجرا کرنے کی پیش کش بھی کی گئی لیکن بِجّھل [illegible] نے منع کر دیا۔ اِس طرح بِجّھل کا وہاں سے اُٹھنے کا کوئی سوال ہی [illegible] پیدا نہیں ہوتا تھا اور اُس نے خود ایسی کوئی کوشش بھی نہیں کی۔ [illegible] سفر، کئی راتوں کی جگائی نے کانتے، شامو، جمرا اور ٹنگو کو ویسے [illegible] بوجھل کر رکھا تھا، اِس پر اجنبی چہروں کے سامنے بندھے بیٹھے رہنے [illegible] اور جیسا کہ کہا جاتا ہے سب سے بڑا بوجھ تو دماغ کی دھندکا [illegible] آنے والے لمحوں کی بے اعتباری کا، آدھا دیکھنے اور آدھا [illegible] سننے کا اور ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کا، جب تک بِجّھل اُن [illegible] کے بیچ گھِرا ہوا تھا، انھیں بھی وہیں موجود رہنا چاہیے تھا [illegible] بِجّھل کی نشست کے انداز سے اُس کے جلد اُٹھنے اور اُن سب

کے منتشر ہونے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ بِجّھل کو جیسے کوئی اور بات یاد ہی نہیں رہی تھی۔

رات کو کوئی بارہ بجے ہوں گے، بازار کا وقت کب کا شروع ہو چکا تھا کہ معاً زورا دکھائی دیا۔ سب کی بجھی بجھی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی، بِجّھل بھی چونک گیا تھا، اُس نے اشارے سے اُسے اپنے پاس چوکی ہی پر بُلا لیا۔ زورا کو کل رات تک اڈّے کے لوگوں نے خوب دیکھا تھا، ممکن ہے کسی نے اُس کی دن بھر کی رُوپوشی محسوس کی ہو لیکن اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ زورا کو جیسے ہی موقع ملا، اُس نے بِجّھل کو ابا جان کی اضطرابی کیفیت سے آگاہ کیا اور بتایا کہ صبح تار دے کے وہ ہوٹل واپس آ گئے تھے۔ آئے ہوئے دیر نہیں گزری تھی کہ مارٹی کو ساتھ لے کے وہ پھر نکل کھڑے ہوئے، سہ پہر کو لوٹے، بہت گرے گرے نظر آتے تھے۔ مارٹی نے اُسے بتایا کہ بِجّھل کے آنے سے پہلے وہ جن دفتروں کا چکر کاٹتے رہے تھے، وہیں ریاست کے کسی بڑے عہدے دار سے انھوں نے ملاقات کا وقت طلب کیا تھا، عہدے دار اپنے پہلے سے طے شدہ سرکاری کاموں میں مصروف تھا، اُس نے معذوری ظاہر کی مگر ابا جان کے اصرار پہ اُس کے اہل کاروں نے عصر کے بعد گھر پہ ملنے کا وقت دے دیا تھا۔ اس دوران ابا جان نے دوسرا تار اور احتیاطاً ایک خط بھی منیر علی کے نام فیض آباد ارسال کر دیا تھا۔ عصر کے قریب مارٹی کے ساتھ وہ پھر ہوٹل سے چلے گئے۔ ہوٹل میں قیام کے دوران انھوں نے وہاں کے خصوصی رسم و رواج کے لحاظ سے زورا اور مارٹی کے لیے چند جوڑے کپڑے جلد از جلد تیار کروا دیے تھے چنانچہ مارٹی عمدہ لباس پہنے ہوئے تھا۔ ہوٹل سے نکل کے انھوں نے کرائے کی موٹر پکڑی اور دیے ہوئے پتے پر پہنچ کے موٹر ٹھیرا لی۔ وہ بڑی بڑی حویلیوں اور محلات کا علاقہ تھا۔ مارٹی نے ابا جان اور سرکاری اہل کاروں کی گفتگو سے اندازہ لگایا تھا کہ نواب حشمت جنگ کو ریاستی حکومت میں کوئی بڑا مقام حاصل ہے، دربار میں براہِ راست اُن کا عمل دخل ہے۔ نواب کر رہا تھا، انھوں نے دروازے پر اپنی آمد کی اطلاع دی تو انھیں فوراً اندر بُلا لیا گیا۔ اندر نواب کے معتمد نے انھیں ہدایت کی کہ وہ مختصر گفتگو کریں کیونکہ نواب صاحب کے پاس وقت کم ہے، کچھ دیر بعد انھیں کِنگ کوٹھی کی ایک دعوت میں شرکت کرنی ہے۔ پھر معتمد انھیں ایک دوسرے کمرے میں لے گیا، وہاں ایک چوڑا چکلا، بھاری بھرکم شخص اُن کا منتظر تھا۔ ابا جان نے تعظیم دینے کے بعد کہا کہ اُن کے آنے کی کوئی خاص غرض نہیں ہے۔ انھوں نے ریاست اور بیرونِ ریاست میں شرفا سے نواب حشمت جنگ کی بہت تعریف سُنی ہے چنانچہ صرف نیاز حاصل کرنا اُن کی آمد کا مقصد ہے۔ نواب عجلت میں تھا،

کسی قدر چیں بہ جبیں ہوا مگر رسماً اُس نے اباجان کا شکریہ ادا کیا۔ اُس کے استفسار پر اباجان نے بتایا کہ سردست وہ یوپی سے آ رہے ہیں لیکن سارے ہندوستان ہی کو انھیں اپنا گھر کہنا چاہیے' اُن کی زندگی کا بڑا حصہ جہاں نوردی میں گزرا ہے۔ یہ اتفاق ہے کہ حیدرآباد پہلی بار آنا ہوا ہے اور جیسا انھوں نے سُنا تھا، ریاست کی وہی شان و شوکت انھوں نے دیکھی۔ اُن کا جی چاہتا ہے کہ وہ اپنی باقی زندگی یہیں گزار دیں۔ اباجان کی شائستگی سے نواب کچھ متاثر ہوا اور کہنے لگا، ضرور' ریاست حیدرآباد نے ہمیشہ باہر سے آنے والے شرفا کے لیے اپنا سینہ کشادہ رکھا ہے' یقیناً یہاں حسبِ دل خواہ آپ کی پزیرائی ہوگی۔ اباجان نے کہا بے شک' انھیں یہی توقع ہے اور بولے کہ ویسے بھی حیدرآباد اُن کے نوادر جمع کرنے کے شوق کے لیے نہایت موزوں جگہ ہے' یہاں ہر طرف انھیں صاحبِ ذوق لوگ نظر آتے ہیں۔ نوادر کے ذکر پر نواب نے پہلی مرتبہ دلچسپی ظاہر کی اور تجسس سے پوچھا، کس قسم کے نوادر؟ اباجان نے شیروانی کی جیب سے ایک ڈبیا نکالی اور نواب کے سامنے پیش کر دی۔ نواب نے جھجکتے ہوئے اُسے کھولا، اُس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ ڈبیا کی سُرخ مخمل میں ایک نہایت خوب صورت ہیرا دمک رہا تھا۔ نواب نے لپکتی انگلیوں سے اُسے اُٹھایا اور بے چین نظروں سے اُلٹ پلٹ کے دیکھتا رہا۔ ہیرے کی چمک دمک دیکھنے کے لائق تھی، مارتی کے بیان کے بموجب نواب حشمت جنگ پر حیرت کا عالم طاری تھا۔ وہ کبھی اباجان کو دیکھتا کبھی ہیرے کو۔ سن سناتی آواز میں بولا "یہ واقعتہً ایک نادر چیز ہے کیا آپ ؟..." مگر اباجان نے تیزی سے کہا "آپ کو پسند آیا؟"

"یقیناً"۔ نواب نے بے ساختگی سے کہا "بلاشبہ ہم نے اپنی زندگی میں ایسے عمدہ پتھر کم دیکھے ہیں"۔

"آپ صاحبِ نظر ہیں"۔ اباجان نے کہا "مجھے خوشی ہے کہ آپ نے اِسے پرکھ لیا"۔

نواب ہیرا بار بار ہتھیلی پر تولتا اور مچلتی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا "ہم اس کی قیمت جاننا پسند کریں گے"۔

اباجان نے مسکرا کے کہا "آپ کو پسند آ گیا، یہی اس کی قیمت ہے۔ کسی نایاب چیز کی اس سے بڑی عزت کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اچھے ہاتھوں میں پہنچ جائے ورنہ ہے تو پتھر ہی"۔ انھوں نے نواب سے کہا کہ یہ اُس کی نذر ہے۔

نواب کو یقین نہیں آیا، حیرانی سے بولا "یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟"

اباجان نے متانت سے کہا کہ وہ ہیرا اسی ارادے سے یہاں لائے ہیں' ایک نیاز مند کی جانب سے اِسے قبول کیا جائے۔

نواب کے لیے یہ سب کچھ نہایت عجیب تھا۔ وہ وحشت سے اباجان کو تکنے لگا، ایک ایسا شخص جس سے پہلی بار ملاقات ہوئی آخر یہ سخاوت کرنے پر کیوں مُصر ہے؟ اُس کے دل میں ہزار رہے ہوں گے' بہروپیوں سے متعلق مشہور روایتیں مگر دوسری اباجان کی وضع قطع' اُن کے سلجھے ہوئے طرزِ گفتگو' اُن کی نشست برخاست بھی اُس کے پیشِ نظر ہوگی۔ اباجان بھی اُس کے بھن بھنانے والے فطری خدشات سے بے خبر نہیں تھے۔ انھوں نے صاف گوئی سے کہا، بے شک یہ ذرا کچھ قبل از وقت ہے، غیر متناسب سا معلوم ہوتا ہے' انھیں اندازہ ہے کہ کسی اجنبی پیش کش پر نواب بھی دل میں بہت کچھ سوچ سکتا ہے' تاہم ہوگا کسی بدگمانی سے پہلے نواب اُن کی عمر کا خیال ضرور کرے اور ایک علامت ہی تصور کیا جائے اور علامت سے اُن کی غرض اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ نواب حشمت جنگ جیسے شرفا کے طالب ہیں' ایک ذی وقار دوست سے حیدرآباد میں اپنے کی ابتدا کرنا چاہتے ہیں۔

اباجان نے اپنے خزانے سے کوئی ایسا ہی ہیرا منتخب جس کی ندرت اور وقعت میں کوئی کلام نہ ہو' میرے گھر سے بعد انھیں ہیروں کی خوب پہچان ہو گئی ہوگی۔ کورا کی لائی ہوئی جواہر کی تھیلی وہ آٹھ سال تک بیچ بیچ کے تبت میں کے کاغذات کریدتے رہے تھے۔ اس دوران ہیرے جواہرات رکھنے والے قسم قسم کے لوگوں کا بھی تجربہ ہوا ہوگا، انھیں کوئی ہیرا ساتھ لانا چاہیے تھا کہ نواب حشمت جنگ بے کل ہو جائے نواب کی بے کلی اپنی جگہ تھی۔ وہ ایسے کس طرح اُن کے عندیے ہیرا قبول کر سکتا تھا، اُس نے معذرت کی کہ وہ قیمتہً ہی اُسے کرنا چاہتا ہے' اباجان کی یہ کرم فرمائی اُسے ہمیشہ یاد رہے گی نہیں کہ اُن سے رفاقت کے لیے یہی ایک معیار مستند سمجھا جائے کے بتائیں کہ وہ اُن کی کیا خدمت کر سکتا ہے۔

مارتی نے زورا کو بتایا تھا کہ نواب کی نظریں ہیرے پر رہی تھیں' اباجان نے اُسے میز سے نہیں اُٹھایا اور نہ قیمت انھوں نے کہا کہ نواب قیمت کا ذکر کر کے وہ لطافت مجروح نہ کرے دو دوستوں کے درمیان لازم ہے' اِس میں نواب کی سُبکی کا بھی کوئی مضمر نہیں ہے' انھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ خدا نے نواب کو حیثیت سے نوازا ہے اس کے باوجود نواب کو قیمت کی ادائیگی پر اصرار ہے تو اس کے لیے آئندہ بہت وقت پڑا ہے۔ انھوں نے کیا کہ حسابِ دوستاں بھی صاحب دلوں کا ایک شیوہ سلوک ہے کے پیمانہ نہیں ہوتے' ایسا ہی ہے تو وہ کسی اور طرح نواب قیمت وصول کر لیں گے۔ فی الحال تو اُن کی یہی خواہش ہے

زین کے کسی علاقے میں بلکہ بہتر ہے کہ نواب کے قریب کہیں چھوٹی موٹی حویلی میں آباد ہو جائیں' اُن کے پاس خدا کا دیا بہت ہے، سو وہ اپنا باقی وقت عزت و سکون سے بسر کرنا چاہتے ہیں' اِس سلسلے میں اُن سے کوئی اعانت کر سکتا ہے تو وہ یقیناً سے درخواست گزار ہیں۔

نواب نے بے اختیار کہا "ضرور ضرور۔ ہم کوشش کریں گے کہ جلد آپ کی یہ خواہش پوری کر دی جائے"۔

چائے آ چکی تھی لیکن نواب نے ناظم کو طلب کر کے ہدایت کی کہ دوسرے کمرے میں اپنے معزز مہمانوں کے ساتھ چائے نوش کرے گا۔

دوران اُس نے اباجان سے اُن کے قیام کے بارے میں پوچھا۔ اباجان نے نہیں چھپایا کہ وہ کئی دن سے دیکاجی ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے انھوں نے نواب کو بتایا کہ اُن کا خاندان تین لڑکوں اور تین وں پر مشتمل ہے لڑکی یا فہمیدہ کو انھوں نے مرا ہوا سمجھ لیا تھا) جزئیات اباجان نے دانستہ نواب کے گوش گزار کی ہوں گی تاکہ کے بارے میں نواب کے ذہن پر چھائے ہوئے اندیشے زیادہ سے زیادہ چھٹ سکیں۔ حیدرآباد کے سب سے بڑے ہوٹل دیکاجی میں قیام اُن کی گفتگو اور لہجے کے اعتماد سے مطابقت رکھتا تھا۔

دوسرے کمرے میں جہاں نواب کی منشا پر انھیں لے جایا گیا وہاں انگریزی طرز کے کھانے کی لمبی میز لگی تھی اور اس پر انواع کی چیزیں سجی ہوئی تھیں پھل' مشروبات' بھنے گوشت کے پارچے' وغیرہ۔ درمیان میں ہیرے کی کوئی بات نہیں ہوئی۔ وہ دُنیا کی باتیں کرتے رہے' بیشتر اباجان ہی بولتے رہے۔ انھوں حیدرآباد اور مختلف ریاستوں اور علاقوں کے بارے میں اپنے مشاہدات تجربات کا محتاط انداز میں اظہار کیا۔ اباجان کا مقصد اس غیر ضروری گفتگو سے اپنے بارے میں کوئی رائے قائم کرانا ہی ہوگا، کوئی خبث لائے۔ سال تک وہ سفر ہی کرتے رہے تھے، انھوں نے تبت کا ذکر کیا، نواب اشتیاق و انہماک سے سب کچھ سنتا رہا۔ اباجان نے کی جانب سے اپنے لیے کوئی اطمینان ہی محسوس کیا ہوگا جبھی رخصت اجازت چاہی۔ نواب نے اُن سے کچھ دیر اور بیٹھنے کی گزارش اباجان نے کہا، یہ اُن کی عزت افزائی ہے مگر انھیں احساس کہ نواب کو کنگ کوٹھی کی دعوت میں شرکت کرنی ہے' جواب نواب بولا کہ وہ ایک معزز مہمان کے لیے وہاں تاخیر سے بھی جا سکتا کہنے لگا، کیا ہی مناسب ہو کہ اباجان رات کا کھانا کھا کے رخصت سورج غروب ہوا چاہتا ہے اور رات کے کھانے میں اب دیر کتنی رہ جاتی ہے' وہ کنگ کوٹھی کی دعوت میں اپنی شرکت سے رت کے لیے قاصد بھیج سکتا ہے مگر اباجان نے اُس سے معذرت کر لی اور کہا کہ اُن کی وجہ سے وہ یہ اہم دعوت منسوخ نہ کرے' وہ حیدرآباد ہی میں ہیں' کسی وقت بھی طلبی پر حاضر ہو جائیں گے۔

وہ اُٹھ کے پہلے والے کمرے میں آ گئے تھے اور ناشتے کی میز پر نہیں تو بعد میں کسی لمحے پھر اُن کے درمیان ہیرے کا ذکر آنا چاہیے تھا اور اباجان کے جانے سے پہلے نواب کو اُس کی قبولیت کے سلسلے میں تامل کا بھی اعادہ کرنا چاہیے تھا، سو اباجان نے کہا کہ وہ نواب کی طمانیت کے لیے رسید لکھ دیتے ہیں' کسی بھی ادائی کی لیکن وہ اس ارادے سے نہیں آئے تھے' اس ضمن میں نواب کا اصرار اُن کے لیے رنج کا باعث ہو رہا ہے۔

نواب نے خاموشی اختیار کر لی مگر اُس کی آنکھوں میں حیرت موج زن تھی' ایک سوال جو وہ بہت دیر سے کرنے کے لیے بے تاب ہوگا، اباجان کے اُٹھنے سے پہلے آخر اُس نے کر ہی لیا کہ اُس کے مربی نے یہ ہیرا کہیں سے تو حاصل کیا ہوگا؟ اُس کی مُراد اُس رقم سے تھی جو اباجان نے ہیرے کے عوض صَرف کی ہوگی۔

اباجان کچھ سوچنے لگے' سوچتے ہوں گے کہ کیا بتائیں کس طرح حساب جوڑیں۔ وہ گھر تو انھیں بہت یاد آتا ہوگا جس کی دیواریں اور چھتیں انھوں نے اور اُن کے آبا نے اپنے ہاتھوں سے اٹھائی تھیں' وہ ایسا بڑا نہیں تھا مگر اُس کا سایہ بہت بڑا تھا۔ سوچتے ہوں گے کہ امّی کی کیا قیمت لگائیں اور اپنی نوجوان بیٹی کی جو کسی سے کچھ کہے بغیر گھر سے چلی گئی تھی اور اُس نوعمر بیٹے کی جو راستے میں بچھڑ گیا تھا۔ انھیں معلوم نہیں تھا کہ فمّی کے پیروں میں گھنگرو بندھے تھے اور اُن کا بیٹا جہاں گیر بازار میں پلتا رہا تھا۔ اباجان کو یہ سب کچھ معلوم نہیں تھا مگر دونوں کے اس طرح جدا ہونے کے بعد وہ اُن کے متعلق کسی خوش گمانی میں بھی نہیں رہے ہوں گے۔ نواب نے انھیں ٹوکا تو وہ کچھ چونک سے گئے اور کھوئے ہوئے لہجے میں بولے کہ یہ ہیرا انھوں نے خود تلاش کیا ہے اور انھیں یقین ہے کہ دنیا کی نظروں سے یہ صدیوں روپوش رہا ہے ورنہ وہ کبھی کہیں نہ کہیں اس کا تذکرہ ضرور سنتے۔ اس کی نازک تراش خراش' دمک اور بے داغی کی نمایاں خوبیوں کے علاوہ جس محتاط اور محفوظ حالت میں یہ انھیں دست یاب ہوا، اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گئے وقت میں لوگوں کو اس کی قدر و مالیت کا خوب احساس تھا، کوئی عجب نہیں کہ یہ کسی بادشاہ کے تاج میں جڑا ہو یا کسی ملکہ کے ہار میں۔ وہ اتنا ہی بتا سکتے ہیں کہ کسی حکومت کے زوال کے وقت اِسے چھپا دیا گیا تھا اور اب انھوں نے دریافت کیا ہے اور اتفاقاً نہیں' انھوں نے نواب کے شوق کا پارا تیز کرنے کے لیے اِس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مناسب سمجھا کہ اُن کے پاس ایسے اور بھی نوادر ہیں۔ وہ اشارہ ہی کر سکتے

تھے۔ نہ نواب کو یقین آ تا تھا، نہ اُسے یقین دلانا کسی طور بہتر تھا کہ
ن کے پاس تو صندوق بھرے ہوئے ہیں۔ انھوں نے نواب سے کہا، اُن
ی خواہش ہے اگر باریابی کا کوئی وسیلہ پیدا ہو جائے تو وہ چند نوادر
حضور نظام کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کریں۔ انھیں
فوراً کچھ خیال آیا ہو گا، احتیاط کا خیال، اس لیے دوسرے ہی لمحے
انھوں نے نواب سے کہا، باریابی کا امکان نظر آتے ہی وہ جلد از جلد
یہ نوادر یہاں لے آئیں گے۔ یوں حیدرآباد میں مستقل قیام کی صورت
میں کبھی نہ کبھی تو انھیں یہاں لانا ہی ہے۔

رخصت ہوتے وقت مارٹی کے بموجب نواب کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور وہ بہت بے قرار سا نظر آتا تھا، اباجان کو حویلی کے خاص دروازے تک چھوڑنے آیا اور اُن سے بغل گیر ہو کے بولا کہ وہ انھیں جلد ہی زحمت دے گا۔

اباجان کوئی آٹھ بجے کے قریب ہوٹل واپس پہنچے تھے اور رات کے تقریباً ساڑھے دس بجے ہوں گے، ہوٹل کے ایک ملازم نے آ کے اطلاع دی کہ نواب حشمت جنگ ہوٹل میں موجود ہے اور اباجان سے ملنے کا خواہش مند ہے۔ مارٹی اور زہرا اباجان کا منہ دیکھنے لگے مگر اباجان کا چہرہ پُرسکون رہا، یہ سنتے ہی وہ کمرے سے چلے گئے اور نواب کو لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرہ پانچ آدمیوں کے لیے لیا گیا تھا، پورا ایک گھر سا تھا۔ نشست گاہ کے علیحدہ حصّے میں اباجان نے اُسے بٹھایا اور اُس کی بے تکلفانہ آمد پر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ نواب نے اس بے وقت کی زحمت پر معذرت چاہی اور کہنے لگا کہ وہ کنگ کوٹھی کی دعوت سے واپس آ رہا تھا، سوچا، یہ ہوٹل نہایت نزدیک ہے، اپنے محسن سے ملاقات کرتا چلوں۔

اباجان نے کہا، اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ وہ اپنے معزز مہمان کا کس طرح شکریہ ادا کریں۔

نواب نے خوش اطواری سے جواب دیا کہ مہمان تو اباجان ہیں، اُن کے جانے کے بعد اُسے احساس ہوا کہ اُس نے ہوٹل سے اپنے غریب خانے پر منتقل ہونے کی درخواست بھی اُن سے نہیں کی۔ اصل میں یہی پشیمانی اُسے یہاں کھینچ لائی ہے۔ وہ اباجان سے التماس کرنے آیا ہے کہ اُسے اپنی مہمانی کے شرف سے نوازیں، ازراہِ کرم انکار نہ کریں۔

اباجان نے کہا کہ وہ نواب کی اس نوازش کے بے حد ممنون ہیں، جس خوش نظری و خوش دلی کا انھوں نے اظہار کیا تھا، نواب کی یہ خواہش اُس کے عین مطابق ہے اور اُن کے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ انکار کی کسے مجال، وہ ابھی چلے چلتے ہیں مگر انھیں اجازت دی جائے تو وہ لب کشائی کی جرأت کریں کہ ابھی بہ وجوہ اُن کا یہاں

ٹھہرنا ضروری ہے، انھیں یہاں کوئی بے آرامی نہیں ہے
امور سے فراغت پاتے ہی وہ کسی دن خود آ جائیں گے۔ بہتر
نواب اصرار کر کے انھیں آزمائش میں نہ ڈالے۔

نواب نے بھی اُن کا عذر تحمل سے سنا اور کہنے لگا، ہمارے
اپنے والا مرتبت بزرگ کی خوشنودی بہر صورت مقدم
جانیے وہ خاطر جمع رکھیں، ہم نے محض درخواست کی
سوچیے، یہ کیسی عجیب بات ہے کوئی شخص ہم پر ایسی عنایت
کرے، ہماری رفاقت کا ایسا بڑا مدعی ہو اور اس شہر میں
ہوتے وہ ہوٹل میں قیام کرے، پھر خود ہی بولا، اگر یہاں قیام
مقصود مشاغل اور ارادے کی آزادی ہے تو وہ یقین دلاتا
حویلی میں بھی انھیں کوئی شکایت نہیں ہو گی۔ وہ چاہیں تو
اقامت گاہ کے نزدیک پہاڑی کے اُس طرف دوسری حویلی
کریں، جہاں اُس نے زندگی کے بیس سال گزارے ہیں، اور
بتایا کہ نئی حویلی میں وہ کوئی تین سال ہوئے منتقل ہوا ہے،
حویلی میں اب اُس کے وہی مہمان قیام کرتے ہیں جو گھر کے
رکھ رکھاؤ سے گھبراتے ہیں۔ اُس نے پیش کش کی کہ اگر اباجان
کریں تو مستقل وہیں قیام کریں، جیسا کہ وہ اباجان کی گفتگو
ہے، حویلی میں وہ تمام لوازم مہیا ہیں، جن کی اباجان کو کسی مکان
تلاش ہو سکتی ہے۔ گزشتہ دنوں یہاں کے ایک نواب نے
سلسلے میں بات کی تھی مگر اُس کا جی آمادہ نہ ہوا کہ وہ اپنے
باپ کی نشانی فروخت کر دے، بہت توجہ سے اسے والدِ مرحوم
تعمیر کرایا تھا البتہ اباجان کی بات دوسری ہے، فروخت کرنے کے
بجائے وہ حویلی اپنے کسی شخص کے حوالے کرنا پسند کرے گا جو
ذوق مستند ہو اور وہ اُس کی نگہبانی اسی طرح کر سکے جس طرح
مکیں کرتے رہے ہیں۔ کوئی جگہ ترک کرنے کے بعد اس
کی یہ خواہش بھی عجیب ہے لیکن ہے ایسا ہی، شاید وہ ذہنی طور پر
ابھی تک پُرانی حویلی میں مقیم ہے۔

اباجان نے قطعِ کلام کی معذرت چاہتے ہوئے کہا کہ
کو اپنا مستقل مسکن بنانا پسند نہیں کریں گے کیونکہ نواب اُن
اُس کی قیمت لینا پسند نہیں کرے گا اور یہ ایک طرح اُن کے
ایک ناخوش گوار صورت ہو گی، کیا وہاں اُن کے سینے میں
خلش گردش نہیں کرتی رہے گی کہ انھوں نے اسے کسی بدلے میں
چیز کے تبادلے میں حاصل کیا ہے۔ نواب کے لیے یہ صورت حال
ہے، کسی آسودگی کا سبب بن سکے، اُن کے لیے نہیں لہٰذا
ذکر ہی چھوڑ دیا جائے اور کسی ایسے مکان کی بات کی جائے جس کا
نواب سے کوئی تعلق نہ ہو۔

نواب نے کہا، اُسے معلوم تھا کہ اباجان سے اُسے یہی کچھ سننے
کو ملے گا۔ اُن کی یہ صاف گوئی اُسے اچھی لگی ہے لیکن عارضی طور
پر وہاں منتقل ہو جانے میں کیا حرج ہے؟ اُس نے دوبارہ اباجان کو
یقین دلایا کہ وہاں اُن کے مشاغل میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئے
گی۔ اُس نے مسکرا کے کہا، وہ ضمانت دے سکتا ہے کہ انھیں یہاں
سے زیادہ سکون میسر ہوگا۔ انکار کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی
تاہم اباجان نے جواب میں وہی عذر کیا جو پہلے کر چکے تھے۔ انھوں
نے کہا، نواب حشمت جنگ کا مہمان ہونا اُن کے لیے سعادت ہے۔
وہ تو نہایت کم حیثیت آدمی ہیں اور یہ کسی صاحبِ حیثیت کے لیے
بھی ایک بڑا اعزاز ہے۔ وہ ضرور حویلی میں آ کے ٹھیریں گے لیکن
چند دن بعد۔ چند دنوں کے لیے انھیں معذور سمجھا جائے۔

نواب نے پھر کچھ نہیں کہا۔ اباجان نے جانے کے لیے کہا تھا لیکن
اُس نے لیموں کا شربت نوش کیا اور تھوڑی دیر تک بیٹھا رہا۔ باتوں
باتوں میں بولا، اباجان کے جانے کے بعد اُس نے اپنے معتمد کو ہدایت
دی تھی کہ وہ اُن کے لیے کوئی حویلی نظر میں رکھے۔ "ہمارے ذہن سے اُتر
گیا تھا، معتمد کی نشان دہی پر ہمیں یاد آیا، چند مہینے ہوئے ہمارے حضور کے
ایک عزیز کی حویلی کی بات چل رہی تھی، صاحبِ خانہ کو بڑھاپے میں
پے در پے حادثات پیش آئے۔ بھرا پُرا گھر اُجڑ گیا۔ نتیجتہً وہ دماغی طور
پر ایسے متاثر ہوئے کہ ترکِ دنیا کی ٹھان لی۔ سب کچھ بیچ باچ کے مولویوں
مسکینوں میں تقسیم کر دیا، کچھ جائداد رہ گئی تھی، اُس کا معاملہ نمٹا کے مستقلاً
بیت اللہ جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ کہا نہیں جا سکتا کہ اُس جائداد میں وہ حویلی
ابھی تک باقی ہے یا نہیں جس میں وہ خود رہتے تھے، ہمیں خریدنے کی
پیش کش کی گئی تھی مگر ہم اُن دنوں ریاستی امور میں بے پناہ مصروف
تھے، کسی اور جانب توجہ نہ دے سکے۔ وہ حویلی غریب خانے سے کچھ دُور
ہے، گو اتنی بڑی نہیں مگر نہایت نفاست اور شوق سے تعمیر کی گئی ہے
...کاری کے لیے کاری گر دلی سے بلوائے گئے تھے۔ تین چار بار ہمارا
وہاں جانا ہوا ہے۔ اگر واقعی اب تک اُس کا سودا نہیں ہوا ہے اور
ہمارے عزیز کا ارادہ اُس کی فروخت کے سلسلے میں مُصمّم ہے تو رہنے
کے لیے جگہ عمدہ ہے۔ بیش قیمت سامان سے بھی مزین ہے جہاں تک
ہمیں یاد پڑتا ہے ساز و سامان سمیت ہی اُن کا ارادہ ہے۔
آئندہ دو ایک دن میں" اُس نے اباجان سے کہا۔ "اُس کے متعلق ہم کوئی
صحیح بات بتا سکنے کے موقف میں ہوں گے۔"

وہ کوئی پون گھنٹے تک رہا۔ اباجان، زولا اور مارٹی اُسے نیچے
موٹر تک رخصت کرنے آئے، ہوٹل کا منیجر اور عملے کے کئی لوگ اُن
کے پیچھے پیچھے تھے۔

اُس کے جاتے ہی زولا کو اباجان نے تجمل کی خیریت معلوم کرنے
بھیج دیا تھا۔ زولا اُن سے کہہ کے آیا تھا، اگر اُسے دیر ہو گئی اور رات
کو آنا مناسب نہ ہوا تو وہ صبح اوّل وقت واپس آ جائے گا۔

کالے، شامو، جبرو اور منگو کی نگاہیں تجمل کے چہرے پر لگی
ہوئی تھیں۔ درمیان میں اُس کی پیشانی پر چند لمحوں کے لیے شکنیں بھی
ہوئی تھیں مگر زولا کے خاموش ہو جانے پر وہ اِرد گرد اونگھتے ہوئے
بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ زولا کو اُس نے روک لیا تھا۔
اُسے آئے ہوئے وقت گزر گیا تھا۔ رات کے دو بجے ہوں گے، کچھ لوگ
چلے گئے تھے مگر بڑی تعداد باہر موجود تھی، صحن اور دالان میں وہ اِدھر اُدھر
ہر جانب اونگھے سیدھے پڑے تھے۔ تجمل چوکی سے اُٹھ گیا، پھر تو سبھی
بیدار ہو گئے۔ تجمل نے کالے دادا سے کہا وہ اُن سب سے کہے کہ کچھ
دیر کمر سیدھی کر لیں۔ کالے دادا خود کئی بار تجمل کو ٹوک چکا تھا اور تجمل
کے اشارے ہی کا منتظر تھا۔ صحن میں دریاں بچھی تھیں، اکثر لوگ وہیں دراز
ہو گئے۔ صرف چند باہر گئے ہوں گے جن کے ٹھکانے قریب ہی رہے
تھے۔ زولا، کالے، شامو، جبرو اور منگو بھی تجمل کے ساتھ اوپر چھت پر
چلے آئے تھے۔ سب کے جسم ٹوٹ رہے تھے، شامو اور منگو تو بستر پر
لیٹتے ہی غافل ہو گئے لیکن باقی سب جاگتے رہے۔ صبح کے وقت
کالے کی آنکھ لگی ہی تھی کہ تجمل نے اُسے اُٹھا لیا۔ زولا جاگ ہی رہا
تھا۔ اڈّے پر مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے
والا اندھیرا ابھی تک ہر سو طاری تھا۔ تینوں نے جلدی جلدی غسل کیا
اور لباس تبدیل کر کے عمارت سے نکل آئے۔ اُن کی آہٹ پر دو تین
آدمی ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھے جنھیں کالے دادا نے چوکسی پر لگایا تھا،
تجمل اُن سے یہ کہہ کے آگے چل پڑا کہ وہ ہوا خوری کے لیے جا رہا
ہے، کچھ دیر میں آ جائے گا۔ اُن کے سڑک پر آنے تک اندھیرے کا گہرا
پن پھیکا پڑنے لگا تھا۔ دُور دُور تک کوئی سواری نہیں تھی، وہ پیدل
ہی چلتے رہے، کوئی میل بھر بعد انھیں ایک تانگا نظر آ گیا۔

ہوٹل میں کمرے کے دروازے پر انھیں صرف ایک بار دستک دینی
پڑی۔ دروازہ کھل گیا۔ نشست گاہ میں مصلا بچھا ہوا تھا، قبلہ ابا
جان نماز پڑھ رہے تھے، تجمل کو دیکھتے ہی گلے سے لپٹ گئے۔ تجمل بھی
دیر تک انھیں سینے سے چمٹائے بے سُدھ کھڑا رہا، پھر اُسی نے انھیں
صوفے پر بٹھایا اور بولا، وہ انھیں اپنی صورت دکھلانے اور اتنا کہنے
آیا ہے کہ ابھی شاید کچھ دن اور لگیں، اُسے اچھی طرح احساس ہے کہ ابا
جان کے ذہن میں کیسے کیسے سوال اُمڈ رہے ہوں گے لیکن اُس کے پاس
وقت کم ہے، اچھا ہوگا کہ وہ سویرے سویرے چلا جائے۔ آتے ہی
واپسی کی جلدی پر اباجان کچھ کبیدہ سے ہو گئے، کہنے لگے "اگر یہی مناسب
ہے تو وہ کیا کہہ سکتے ہیں" وہ اپنی زبان سے ایک لفظ ادا نہیں کریں گے۔
تجمل نے انھیں سمجھایا "ابھی آپ سے کیا بولیں بابا! ابھی تو
وہ گھڑی نہیں آئی ہے، اپنے کو خانم کا انتظار ہے۔"

"یقین کیجیے، اِس اندھیرے سے مجھے اور گھٹن ہوتی ہے۔ میری عقل
حیران ہے۔ مجھ سے سب کچھ مخفی رکھا جا رہا ہے۔ خدا کے لیے مجھے کچھ
بتائیے" اباجان نے فریادی لہجے میں کہا۔ "مجھ پر بھروسا کیا جائے۔ میں
جاننا چاہتا ہوں کہ خانم کا اِس میں کیا دخل ہے؟"

"ابھی ٹھیک سے ایک دم کچھ نہیں بولا جا سکتا پر لگتا ہے خانم
کا اِس میں کوئی سرا ملتا ہے، اُس کے آنے پر ہی کوئی صاف بات سامنے
آ سکتی ہے" تجمل نے آہستگی سے کہا۔

"مجھے کھُل کے بتائیے، باہمی مشورے سے بھی کبھی کوئی اچھی راہ
نکل آتی ہے" اباجان نے سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں اتنا سمجھ سکتا
ہوں کوئی ایسی بات ہو سکتی ہے جس کا جاننا میرے لیے ضروری نہ ہو یا
مناسب معلوم نہ ہوتا ہو، اِس طرح مجھے کسی مزید اُلجھن سے دُور رکھنا
مقصود ہو، کوئی بھی وجہ ہو سکتی ہے مگر یہ صورت میرے لیے بڑی ناقابلِ
برداشت ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں مشورے کے بغیر کوئی قدم نہیں
اٹھاؤں گا۔ نواب حشمت جنگ کی بات زولا نے آپ کو بتائی ہوگی،
میں نے اُسے کچھ نہیں بتایا ہے اور میں اُسے بتاتا بھی کیا۔"

"آپ نے ٹھیک کیا۔ وہ حویلی میں جانے کو بولے تو آپ چلے جانا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے مگر مجھے بار بار گمان ہوتا ہے کہ مجھ سے
کوئی غلطی تو سرزد نہیں ہو گئی ہے" وہ بے چینی سے بولے۔ "آپ سمجھ
رہے ہیں کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟"

"غلطی کے بعد اُس پہ دھیان دینا بے کار ہے بابا! آگے کی بات
بولو اور ایسے آپ نے کوئی غلطی بھی نہیں کی ہے پر آگے آپ اُس
کو ابھی کچھ نہ بولیں، اُدھر بھی ایک اصیل نواب ہے، گوٹی اُس کی ناؤ پہ
کو چڑھی ہوئی ہے۔"

"زولا نے مجھے بتایا ہے کہ بیچ میں کسی نواب کا معاملہ ہے۔" ابا
جان نے اضطراری انداز میں پوچھا۔ "کون ہے وہ؟"

"ہے ایک نواب کی اولاد نواب!" تجمل نے تلخی سے کہا۔

"مگر وہ چاہتا کیا ہے؟"

"کیا بولیں آپ کو بابا!"

"نواب حشمت جنگ سے آئندہ روابط کے لیے کیا یہ ضروری
نہیں ہے کہ میرا دماغ اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بجائے کسی ایک طرف مرکوز رہے۔"
تجمل کا چہرہ دیکھ کے رُک گئے اور جھجکتے ہوئے بولے۔ "ویسے آپ
بہتر سمجھ سکتے ہیں۔"

تجمل نے کوئی جواب نہیں دیا، سر جھکائے سوچتا رہا۔ اباجان
کوئی غلط بات نہیں کہہ رہے تھے۔ حیدرآباد میں میرا اور پیرو کا اچانک
اُتالدین روپوش ہو جانا، یہاں آ کے تجمل کا اُن سے دُور رہنا، کسی
نواب کا ذکر اور خانم کا نام۔ اباجان پتھر کے بنے ہوئے تو نہیں تھے،
شاید تجمل کا خیال تھا کہ دو ایک دن کی بات ہے، جب تک خانم آ
ہی جائے گی۔ سو اباجان پر وہ سب آشکار کیوں کیا جائے جس سے تشویش
میں اضافہ ہی ہوگا مگر آج نہیں تو کل، پھر کسی وقت اباجان کو یہ سب
معلوم ہونا ہی تھا۔ اُسے چُپ دیکھ کے اباجان نرمی سے بولے۔ "کیا
سوچنے لگے، بخدا میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا۔ مجھے کچھ مت بتائیے۔"

"نہیں بابا! مجبوری کی بات نہیں ہے" تجمل نے سر اُٹھا کے
کہا۔ "آپ سب ٹھیک بولتے ہو، اب کون سا پردہ رہ گیا ہے جو
آپ سے کچھ چھپایا جائے" کسی تمہید کے بغیر وہ کہنے لگا۔ "پچھلی مرتبہ جب
لاڈلے کے ساتھ اِدھر آنا ہوا تھا تو راستے میں ایک جگہ جہاں گیر دکھائی
دے گیا۔ بیچ میں آٹھ سال کا چکر تھا، پر لاڈلا چھوٹے کو جلدی پہچان گیا۔
اُسی کا پیچھا کرتے کرتے ہم دونوں خانم کے گھر تک پہنچ گئے جو بازار
میں رہتی تھی۔"

بازار کے نام پر اباجان کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ کالے نے مجھے
نہیں بتایا لیکن یہ دیکھ کے تجمل کے ہونٹوں پر زہر بھری مسکراہٹ
اُبھر آئی ہوگی۔ ایک بار ضرور جی میں آیا ہوگا کہ ساتھ ہی فتی کی کہانی
بھی دُہرا دے۔ وہ ہونٹ کاٹ کے رہ گیا اور اُس نے اباجان سے
کہا کہ جہاں گیر میرٹھ میں اُن سے بچھڑ کے جگہ جگہ کی ٹھوکریں کھاتا ہوا
بھوپال چلا آیا تھا اور وہاں ایک گھریلو ملازم کی حیثیت سے اُسے
سر چھپانے کی جگہ مل گئی تھی۔ خانم اُس زمانے میں نواب کے ہاں مجرا
کرنے گئی تھی۔ وہیں اُس نے کس مپرسی کے عالم میں جہاں گیر کو دیکھا
اور نواب سے اُس کو مانگ لیا۔ خانم نے بے شمار پیاموں کے باوجود شادی
نہیں کی تھی۔ تجمل نے کہا، اُسے یقین ہے کہ خانم نے بازار کی زندگی
کی ابتدا سے خود کو گانے تک پابند کر رکھا تھا، بازار میں رہتے ہوئے بھی
وہ بازار سے بیگانہ تھی۔ اُسے قدرت نے صورت و حُسن کے ساتھ بہت
اچھی آواز سے بھی نوازا تھا، آواز ہی اُس کی زندگی تھی، اُسی کو جِلا دینے
کے لیے وہ شب و روز مستغرق رہتی تھی، بہت عرصے سے اُس نے خود
کو چند مخصوص لوگوں اور خاص مجروں تک محدود کر لیا تھا، جہاں گیر کے
آنے کے بعد گانے کی طرف سے اُس کی توجہ کم ہو گئی، صرف نواب
عالم تاب کے لیے وہ مجرا کرتی تھی اور نواب کی تمام مہربانیوں کے باوجود
کسی اور زندگی کی آرزو مند تھی، نجات کے کسی ایک موقع کی تلاش
میں۔ سب سے زیادہ اُسے جہاں گیر کا خیال تھا۔ وہ اُسے اعلا تعلیم دلانا چاہتی
تھی جو اُس ماحول میں کسی طور ممکن نہیں تھا۔ بازار میں آنا آسان، بازار
سے نکلنا مشکل ہوتا ہے، بے شمار لوگ اُسے خانہ نشیں بنانے کے لیے
آگے بڑھے لیکن کسی ایسے ہی سہارے پر بھروسا کیا جا سکتا تھا جس
کی پائداری میں کوئی شبہ نہ ہو۔ بازار سے جانے والی بیشتر عورتوں کے لیے

واپسی پر بازار کی پناہ بھی تنگ ہو جاتی ہے۔ ..... یہی کچھ تھا کہ اُس کے دروازے پر وہ دونوں نمودار ہوئے۔ جہاں گیر کے لیے اپنا گم شدہ بھائی مل جانا کسی معجزے سے کم نہیں تھا اور خانم تو اُسے ہر حال میں خوش دیکھنے کی خواہش مند تھی مگر اس حقیقت کا دوسرا پہلو خانم کے لیے بڑا سانحہ تھا کہ اُس کا رشتہ اُس سے بچھڑ جائے گا۔ اب بجّھل کے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ وہ خانم سے بھی ساتھ چلنے کو کہے، جہاں گیر کے بغیر اُس کی زندگی خالی خالی ہو جاتی۔ کوئی اور عورت سامنے ہوتی تو بجّھل کبھی ایسی پیش کش نہ کرتا، کوئی اور عورت بھی اس طرح اجنبیوں کے ساتھ جانے پر آمادہ نہ ہوتی۔ بجّھل نے اُسے سمجھایا تھا کہ وہ جائداد وغیرہ چھوڑ کے یوں ہی چپکے سے نکل جائے لیکن جائداد معقول تھی، اُسے ایسے لٹانا بھی نہیں چاہیے تھا۔ خانم نے راز داری کی پوری کوشش کی تھی مگر یہ خانم کی بات تھی، بازار کی سب سے ممتاز عورت کی لئد لچھی کیسے رہ سکتی تھی، نواب عالم تاب کو بھی علم ہو گیا، اُس نے قاصد بھیج کے خانم کو حویلی میں طلب کیا مگر خانم بھی کوئی فیصلہ کر چکی تھی، نہ گئی۔ قاصد دوبارہ بھی آیا، زر و جواہر اور ملبوسات سے بھرے ہوئے خوان کے ساتھ۔ نواب کا اشارہ واضح تھا، خانم نے اُسے پھر واپس کر دیا۔

بجّھل نے شاہ کبیر کا واقعہ ابّا جان کو نہیں سنایا اور کہا، تمام تر احتیاط کے باوجود آخری لمحوں میں جب وہ اسٹیشن پہنچے، نواب عالم تاب اپنے ساتھ مسلح آدمیوں کا قافلہ لیے سامنے آ گیا، اُس نے خانم سے اصرار کیا کہ وہ واپس چلی چلے۔ بجّھل کو درمیان میں بولنا پڑا۔ اُس نے دُور کھڑے ہوئے نواب کے ساتھ آنے والے آدمی اور اُن کے تیور دیکھ لیے تھے۔ نواب کو شبہ تھا کہ خانم کے ارادے میں اُس کی مرضی کو اتنا دخل نہیں ہے جتنا مجبوری کو۔ اسٹیشن پر کسی ہنگامہ آرائی سے بچنے اور نواب کا وہم دُور کرنے کے لیے بجّھل نے تجویز پیش کی کہ وہ اُن کے درمیان سے ہٹا جاتا ہے، خانم اپنی زبانی اپنے فیصلے سے نواب کو مطلع کر دے یعنی اب بھی موقع ہے، وہ چاہے تو نواب عالم تاب کے ساتھ واپس جا سکتی ہے۔ خانم سے اپنے دیرینہ مراسم کی وجہ سے نواب کو آس بندھی ہوئی تھی کہ خانم اُس کے حق میں فیصلہ دے گی مگر خانم نے معذرت کر لی۔ پھر نواب نے بھی کوئی حجت نہیں کی، وہ بہت آزردہ ہو گیا تھا، خانم کی زبان سے انکار سن کے گنگ کھڑا رہا اور واپس چلا گیا۔ اس کے بعد خانم سے نواب کا رابطہ ممکن نہ رہا۔ یہاں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں گئی ہے۔ خانم کے ہاں چار پانچ روزہ قیام میں بازار کے لوگوں نے بجّھل اور بابر کے چہرے اچھی طرح دیکھے تھے لیکن وہ اور کچھ نہیں جانتے تھے۔

ماروی نے چائے منگوالی تھی اور پیالیاں بنا کے اُن کے سامنے رکھ دی تھیں، بجّھل رک رک کے چائے پینے لگا۔ ابّا جان کا منہ کھلا ہوا تھا، جتنی دیر تک بجّھل چائے پیتا رہا، وہ گم بیٹھے اُسے گھ[...] بڑی سلگاتے ہوئے بجّھل نے یک بارگی اپنی بوجھل پلکیں [...] اُن کی جانب دیکھا۔ وہ سٹ پٹاتے ہوئے بولے: "اور یہ [...]"

بجّھل نے اُن کی بات کاٹ کے کہا: "پرسوں رات [...] نواب کی حویلی کی طرف گئے تھے۔"

"آپ وہاں گئے تھے؟"

"ہاں، ایک بار جا کے اُس کو دیکھنا تو تھا ہی۔"

"تو کیا اُس نے قبول کر لیا؟"

"آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہو؟" بجّھل نے ترشی [...]

"پھر کیا اُس نے خانم کی شرط عائد کی ہے مگر اس [...] کو چارہ بنانا کیسے..... کیسے کم از کم ہیں....."

"آپ جو سمجھ رہے ہو ویسا نہیں ہے۔" بجّھل نے [...] آواز میں کہا۔ "مجھ کو پتہ تھا، آپ ایسا ہی بولو گے۔ آپ کا [...] بڑا ہے بابا! خانم کی شرط وہ تب رکھتا جب اُس نے اپنے [...] ذمے داری لی ہوتی۔"

"پھر آپ، آپ نے کیوں خانم کو؟....." ابّا جان خاموش ہو گئے۔

"اُدھر نواب کا بڑا بھائی سامنے آیا تھا، بڑا نواب [...] اونچی حویلی ہے اُس کی، ہم اپنی طرف سے جتنا بول سکتے [...] تھا پر وہ کچھ اور بولتا رہا۔"

"کیا، کیا؟" ابّا جان ہذیانی انداز میں بولے۔

"وہ اپنے کو اندر لے گیا تھا، اندر چھوٹا نواب تھا [...] وہ جب ہم نے پہلے دیکھا تھا، اُس سے آدھا بھی نہیں [...]"

ابّا جان کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں، بجّھل نے جس [...] نواب عالم تاب کو دیکھا تھا، اُنھیں بتایا اور چپ ہو گیا [...] ابّا جان کے ہونٹوں کو بھی مہر لگ گئی تھی، دیر تک [...] کی طرح بیٹھے رہے پھر بدحواسی سے بولے: "آپ کے خیال [...] خانم کے آنے کے بعد وہ اُن دونوں کو آزاد کر دے گا؟ [...] ہمارے پاس اِس کی کیا ضمانت ہے، اُنھیں رہا کرتے ہوئے [...] اندیشے اُس کے پیشِ نظر نہ ہوں گے۔"

"کوئی ضمانت نہیں پر ایسا ہونا تو نہیں چاہیے، اُس [...] سے اور کیا بیر ہو سکتا ہے، جو لوگ راستہ چلتے لوگوں کو اس طرح [...] ہیں، اُن کو آزاد کر دینے کے بعد اُنھیں کون سی پروا ہو گی۔"

"لیکن نواب لوگوں کا دماغ اُنھی کی طرح سوچتا ہے۔" ا[...] متوحش لہجے میں بولے۔ "بعد میں بھی وہ اپنے منہ سے نکلا ہ[...] ثابت کرنے کے لیے انکار کر سکتا ہے۔ نوابوں کی ضد اُن [...]

[...]بھی مشہور ہے۔"

[...]بعد میں بات دوسری ہے، تھوڑی بہت اُس کو بھی اپنے [...] میں جانکاری ہے۔ معلوم ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو اُس نے چھپا [...]رکھے ہیں، کون اُن کے لیے اُس کے پاس آئے تھے، کچھ اُن دونوں نے [...]بھی اُس کو بولا ہو گا، کچھ ہم بھی بول کے آئے ہیں۔ جو باقی رہ گیا ہے [...]وہ اُس کو دوسرے سمجھا دیں گے۔ ہم ہتھیار ساتھ رکھ کے ہی حویلی [...] گئے تھے، اُن کا وقت نہیں آیا لیکن وقت تو کبھی بعد میں بھی آ [...]سکتا ہے۔"

"مگر یہ کوئی اچھی صورت تو نہ ہو گی۔"

"یہ تو اُس کے سوچنے کا کام ہے۔"

"اگر اُسے کسی طرح خانم کی آمد کا یقین دلایا جائے تو شاید....."

بجّھل کو ہنسی آ گئی۔ "نواب حشمت جنگ کو بول کے؟"

"نہیں، میرا مطلب ہے۔" ابّا جان گھبرا کے بولے۔ "مگر ذریعہ اُس [...]کا بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔"

"اُس کو ابھی سنبھال کے رکھو، وقت پر شاید کام آ جائے۔ آپ [...]نے دھیان نہیں دیا۔ زیادہ اُس بڑے نواب کو چھیڑنے سے اُس کا مغز [...]اور پھر سکتا ہے۔ اپنے آدمی اُس کے پاس ہیں اور حویلی اُس کی [...]تنی اونچی اور بڑی ہے کہ دو آدمی اُس کے لیے کوئی بات نہیں رکھتے۔ [...]دھر قانون بھی اپنا ولایتی والا نہیں ہے۔"

"مگر یہ تو بہت ظلم ہے، یہاں ایسا اندھیر بھی نہیں ہوتا ہو گا۔ [...]مجھے یہ بات بالکل اچھی نہیں لگ رہی ہے کہ خانم پہلے وہاں جائے، یہ [...]تو کوئی بات نہ ہوئی، اس سے پہلے ہمارے آدمیوں کو اُسے چھوڑنا چاہیے۔"

"پھر آپ ہم کو بولو، ہم کدھر جائیں؟"

بجّھل کے اس سوال پر ابّا جان اُس کی صورت دیکھتے رہ گئے۔ بجّھل نے بھی اُن کے جواب کا انتظار نہیں کیا، صوفے سے اٹھ گیا۔ [...]جانا خوب ہو چکا تھا، ابّا جان بے حس و حرکت بیٹھے تھے۔ بجّھل نے [...]اُن کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ حواس باختگی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بجّھل نے اُنھیں گلے سے لگا لیا اور آہستگی سے بولا: "مستی میں آدمی [...]لٹے سیدھے ہی ہاتھ چلاتا ہے اور نواب تو اِن دنوں ویسے بھی دیوانہ [...]ہوا ہے، دیوانوں کے ساتھ بات کرنے میں چوکسی کی ضرورت زیادہ پڑتی ہے۔"

سڑکوں پر دن کی چہل پہل ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ تمام [...]دکانیں بند تھیں، سواری سامنے موجود تھی لیکن وہ کچھ دُور تک پیدل چلتے رہے اور ہوٹل سے کئی فرلانگ آگے آ کے اُنھوں نے تانگے کو [...]اشارہ کیا۔ زوراور ہوٹل میں رہ گیا تھا، صرف کانتے اُس کے ساتھ تھا۔ بازار پہنچتے پہنچتے دھوپ اور پھیل گئی تھی، جس وقت وہ اڈّے کی عمارت میں داخل ہوئے، کالے دادا اور چند آدمیوں کے سوا باقی سب سو رہے تھے مگر اُن کے آتے ہی سب کو بیدار کر دیا گیا۔

اُس روز ناشتے کا انتظام بازار کے ایک ہوٹل والے نے کیا تھا۔ دوپہر اور رات کے لیے بجّھل نے کالے دادا کو ہدایت کی تھی کہ کسی اور جگہ سے انتظام نہ ہونے کی صورت میں وہ دیگیں چڑھوا دے۔ دوپہر کے کھانے سے پہلے وہ کالے دادا اور اڈّے کے دس پندرہ آدمیوں کے ساتھ اڈّے سے نکلا۔ سب بازار کے علاقے سے دُور ایک جگہ جا کے ٹھہرے۔ تنگ و تاریک گلی میں ایک شکستہ سا مکان تھا۔ کالے دادا کو مکان کے باہر کھڑے ہوئے ایک شخص نے پہچان لیا۔ وہی بھاگا بھاگا اندر گیا اور واپس آیا تو اُس کے ساتھ ایک بوڑھا آدمی تھا، بھولے دادا۔

اُسے یقین نہیں آیا کہ آکا کو اڈّے سے نکالنے والا دادا اُس کے دروازے پر آیا ہے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ اُس کے گھر کی حالت نہایت خستہ تھی اور وہ بجّھل کو اندر لے جانے سے کترا رہا تھا مگر بجّھل خود پیش قدمی کر کے اندر داخل ہو گیا۔ مکان مختصر تھا اور باہر کی نسبت اندر کچھ بہتر حالت میں تھا۔ شکستہ دیواروں اور دروازوں کے باوجود ایک سلیقہ ٹپکتا تھا۔ دالان میں پڑی ہوئی چوکی ننگی نہیں تھی، اُس پر گاؤ تکیے کے ساتھ میلی سی سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں زور کرنے والی چیزیں اوپر تلے رکھی تھیں۔ اندر پسینے میں شرابور، جانگیے اور بنیان میں ملبوس دو نوعمر لڑکے بھی تھے۔ بھولے دادا شاید انھی کو زور کرا رہا تھا۔ وہاں جا کے کانتے کو معلوم ہوا کہ بھولے دادا نے اڈّے سے نکلنے کے بعد کیسے دن گزارے ہیں۔ گزشتہ دن وہ اڈّے کے کئی آدمیوں کی زبانی بھولے دادا کا نام سن چکا تھا۔ کانتے نے جی میں طے کیا تھا، اگر وقت ملا تو وہ ایک بار بھولے دادا کو دیکھنے ضرور جائے گا۔ کانتے نے یہ بتا کے مجھے حیران کر دیا کہ بھولے دادا کے سیدھے ہاتھ کی دو انگلیاں کٹی ہوئی ہیں۔ میں نے غور نہیں کیا تھا مگر اس کا مطلب یہ ہے کہ رات جو چاقو اُس نے ناچنے والی لڑکی پر قبضہ کرنے والے پر پھینکا تھا، وہ ان کٹی ہوئی انگلیوں کا کرشمہ تھا۔ بھولے دادا کی لڑکپن ہی میں شادی ہو گئی تھی مگر شادی کے پہلے سال اُس کی بیوی اچانک اُس سے جدا ہو گئی۔ کہتے ہیں رات کو سوتے وقت وہ بالکل ٹھیک تھی، صبح بستر پر مُردہ پائی گئی۔ پھر برس گزر گئے، دادا نے دوسری شادی نہیں کی اور نہ کسی عورت کی طرف نگاہ اُٹھا کے دیکھا مگر پھر بازار کی ایک عورت اُس قدر پسند آئی کہ اُسے دوبارہ شادی نہ کرنے کا عہد توڑ دینا پڑا۔

اُس زمانے میں دُور دُور تک بھولے دادا کا طوطی بولتا تھا۔ اُس کے بازوؤں میں ڈھلتی عمر کے باوجود ایسی لپک تھی کہ کوئی سامنے نہیں ٹکتا تھا۔ وہ عورت بھولے دادا سے شادی کرنے پر آمادہ نہیں

تھی، بلانے کرتی رہی۔ بھولے دادا چاہتا تو اُسے کسی اور طرح بھی حاصل کر سکتا تھا مگر وہ اُسے کسی پھول کی طرح سمجھتا تھا۔ کہتے ہیں پھول تھی بھی وہ۔ نام اُس کا الماس تھا۔ بھولے دادا کا تقاضا شدید ہو گیا تو الماس نے اُس سے ایک بڑی رقم کا مطالبہ کیا۔ بھولے دادا کے لیے اتنی بڑی رقم کی فراہمی مشکل تھی مگر اُس نے کسی نہ کسی طرح رقم حاصل کر کے اُس کے قدموں پر لے جا کے رکھ دی۔ پھر الماس نے اڈّا چھوڑنے کو کہا۔ بھولے دادا اس پر بھی تیار ہو گیا، تب بھی وہ طرح طرح کے حیلے تراشتی رہی۔ اصل میں اڈّے کے کسی آدمی پر اُسے اعتبار نہیں آتا تھا یا وہ اڈّے کے آدمیوں سے بہت خوف زدہ تھی۔ بھولے دادا تو بازار بلکہ شہر کا سب سے بڑا دادا تھا۔ پھر ایک دن الماس نے عجب مطالبہ کیا۔ اُس نے کہا، میں یقین کرنا چاہتی ہوں کہ تم کبھی چاقو کو ہاتھ نہیں لگاؤ گے اس لیے اپنے ہاتھ کی دو اُنگلیاں کاٹ کے میرے حوالے کر دو۔ نہ جانے الماس نے بھولے دادا سے کوئی مذاق کیا تھا یا واقعی سنجیدہ تھی مگر بھولے دادا نے دیر نہیں کی، اُسی وقت چاقو نکالا اور پوچھا، کون سی اُنگلیاں؟ الماس سکتے میں رہ گئی۔ بھولے دادا نے سیدھے ہاتھ کے انگوٹھے کے برابر والی دونوں اُنگلیاں اُسی وقت کاٹ دیں۔ لوگ بتاتے ہیں کہ الماس یہ دیکھ کے بے ہوش ہو گئی تھی، اب کوئی عذر اُس کے پاس نہیں رہا تھا۔ بھولے دادا اُسے ساتھ لے آیا اور اڈّے سے نزدیک ایک گھر میں ایک بوڑھی عورت کے حوالے کر دیا۔ پھر اُس نے اعلان کیا کہ آئندہ جمعرات کو اُس کی الماس سے باقاعدہ شادی ہو گی۔ جمعرات میں تین دن باقی تھے مگر اس کا موقع نہیں آیا۔ بدھ کی رات جب بھولے دادا کی طرف سے عورتیں مہندی لگانے پہنچیں تو الماس وہاں نہیں تھی۔ بوڑھی عورت فرش پر بے سُدھ پڑی تھی۔

اڈّے کے آدمیوں نے سارا بازار چھان مارا، الماس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ بازار میں اُس کا گانا سننے والے کسی شخص کے ہاں اُس نے خود کو چھپایا ہو گا اور اُسی شخص کی مدد سے وہ حیدرآباد سے نکل گئی ہو گی۔ بھولے دادا نے کسی کو اُس کی تلاش کے لیے متعین نہیں کیا تھا، اڈّے کے آدمی خود ہی اپنے دادا کو خوش دیکھنے کے لیے جگہ جگہ مارے مارے پھرتے رہے۔ حیدرآباد سے نزدیک کئی شہروں میں گئے، یہاں تک کہ بمبئی بھی پہنچے۔ الماس کسی بازار میں نظر نہیں آئی۔ بھولے دادا نے لوگوں کی توقع کے خلاف خاموشی سے یہ صدمہ سہا تھا مگر اُس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ بجھ چکی تھی گو وہ ہمیشہ کی طرح جم کے اڈّے پر بیٹھتا تھا اور ہمیشہ ہی کی طرح اڈّے کے آدمیوں کا خیال رکھتا تھا، یہ لوگ بھی اُسے پہلے

سے زیادہ عزت دیتے تھے۔ اس دوران شاہ کبیر آ... نے اچھی طرح اندازہ لگا لیا تھا کہ اُنگلیاں کٹ جانے سے ... کے چاقو کی گرفت ختم ہو گئی ہے اور اُس کے جسم کی بجلی بھی کچھ ... تاہم لوگ بھولے دادا کو ایک زمانے سے دیکھ رہے تھے، کسی کو کوئی شکایت نہیں تھی۔ اڈّے کا کام ٹھیک طرح چل رہا تھا ... روز بھولے دادا اڈّے کے آدمیوں کو زور کراتا اور اُنھیں چا... سکھاتا تھا۔ شہر اور اطراف کا کوئی دادا بھولے دادا کے ... کے لیے آگے نہیں آیا۔ کسی کے گمان میں بھی نہ ہو گا کہ بازار ... پر بھولے دادا کی جگہ کوئی دوسرا شخص بھی ہو سکتا ہے۔ صرف ... تھا جو شروع میں اُس کے شاگرد کی حیثیت سے رہا، بعد میں ... چاقو تان کے اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ جواب میں بھولے د... نہیں اُٹھایا، خاموشی کے ساتھ اڈّے سے نکل گیا۔ اُسے اڈ... کر دینے کے بعد بھی شاہ کبیر کو چین نہیں آیا۔ اُس نے اع... کیا، اڈّے کے ہر آدمی پر اُس سے ملنے کی پابندی عائد کی ... جن آدمیوں نے احتجاج کیا یا جن کے بارے میں معلوم ہوا کہ ... بھولے دادا سے رابطہ رکھے ہوئے ہیں، اُنھیں شاہ کبیر اڈ... پڑا۔ بھولے دادا تنہا رہ گیا تھا۔ وہ کچھ ہی دنوں تک شہر ... پھر لوگوں سے خبر ملی کہ وہ گلبرگے میں خواجہ گیسو دراز کے مز... گیا ہے۔ اُس کے غیاب میں اڈّے کے اکثر آدمیوں کو جانے کیا ... فہمی رہی کہ وہ ایک دن پھر لوٹ کے آئے گا اور شاہ کبیر ... سے نکال پھینکے گا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن کا یہ ... دھندلاتا گیا اور اڈّے پر شاہ کبیر کی گرفت روز بروز ...

بہت عرصے بعد جب لوگوں کی یادوں پر گرد پڑ... اچانک بھولے دادا پھر حیدرآباد میں دکھائی دیا۔ لوگوں کو ت... اب شاہ کبیر کے دل میں اُس کے لیے پہلے جیسا عناد نہیں ر... دادا اور بوڑھا ہو کے آیا ہے مگر شاہ کبیر کے ہاں کوئی ... تھی حالانکہ از خود بھولے دادا نے اڈّے کے کسی آدمی ... کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ قصہ مختصر اُسے دوبارہ واپس ج... وہ پھر اُسی وقت حیدرآباد آیا جب اڈّے پر شاہ کبیر نہ ر... کالے دادا بھی نہیں رہا تھا۔ اُس وقت اڈّے پر آکا بیٹھ... لوگ اس اُمید پر جوق در جوق بھولے دادا سے ملنے گئے ... کو اُس سے کیا پرخاش ہو سکتی ہے لیکن آکا بھول... کے معاملے میں شاہ کبیر سے زیادہ حسّاس ثابت ہوا۔ جو لوگ اُس سے ملنے کا گناہ کر چکے تھے، اُنھیں آکا کے سامنے جلب... اُٹھانی پڑی۔

...بھولے دادا کو بازار کے علاقے سے دُور ایک ٹھکانا مل گیا ...گزر اوقات کے لیے وہ کوئی چھوٹا موٹا کام کرنا چاہتا تھا مگر کام ...کے لیے پیسے درکار تھے۔ تن دہی کے کسی کام کے وہ لائق بھی نہیں رہا ...اڈّے کے پرانے آدمیوں نے ڈھکے چھپے طور پر اُس کی مدد کرنی ...چاہی مگر اُس کے انکار پر خاموش ہو گئے۔ پھر اُنھوں نے ایک اور ...نکالی۔ علاقے سے دُور دُور کے چند نوعمر لڑکوں کو بھولے دادا ...کے پاس بھیج دیا کہ وہ اُنھیں زور کرائے۔ لڑکوں کی تعداد نہایت محدود ...تھی اور اُن کا تعلق کسی اڈّے سے نہیں تھا۔ بات پھیلی نہیں۔ لڑکے ...بھولے دادا کی خدمت کرتے تھے اور اُس کے لیے روزی کا وسیلہ بن ...گئے تھے۔ بھولے دادا کی بھی دلی خواہش یہی ہو گی کہ وہ اپنی زندگی میں ...ایسے لوگ تیار کر جائے جو کسی وقت آکا اور شاہ کبیر جیسے آدمیوں کا ...سامنا کر سکیں۔

...اندر بھولے دادا نے تجمّل کو چوکی کے بیچ میں بٹھایا۔ اُس پر ...اضطراری عالم طاری تھا، وہ تجمّل کے ہاتھ سینے سے لگائے آنکھیں ...موندے بیٹھا رہا۔ اُس نے سب کو مغزیات ملا ہوا دودھ پلایا۔ وہ ...تجمّل کو بازار کے دادا کی حیثیت سے مخاطب کر رہا تھا لیکن تجمّل نے ...اصرار کیا کہ بازار کا دادا سرِدست کالے دادا ہی ہے، اس پر کالے ...دادا اُس کے سامنے ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو گیا اور عاجزی سے بولا کہ ...تجمّل کی موجودگی میں وہ اڈّے کی نگرانی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ بھولے ...دادا نے بھی دبے لہجے میں خواہش ظاہر کی کہ اڈّے کی ذمّے داری ...قبول کرنا تجمّل ہی کو زیب دیتا ہے۔ وہ دوبارہ اڈّے کے آدمیوں کی ...بات کا سبب بنا ہے۔ تجمّل نے نرمی سے جواب دیا کہ بھولے دادا ...کا حکم سر آنکھوں پر مگر اپنی چند مجبوریوں کے سبب وہ اڈّے پر نئے ...دادا کی رسم ادائی سے معذور ہے۔ تجمّل کوئی ایک ڈیڑھ گھنٹے وہاں ...بیٹھا اور اُس نے وعدہ کیا کہ جلد ہی بھولے دادا کے پاس پھر آئے گا۔ ...لوگوں کا خیال تھا کہ تجمّل اُسے اپنے ساتھ اڈّے لے جائے گا۔ اڈّے ...سے جانے کے بعد بھولے دادا نے بازار کے علاقے میں قدم نہیں رکھا ...تھا اور اس واقعے کو زمانہ گزر چکا تھا۔ تجمّل کو اس کا احساس تھا چنانچہ ...چلتے وقت اُس نے بھولے دادا سے کہا، وہ اس وقت کچھ اُلجھنوں ...میں گھرا ہوا ہے ورنہ اُسے بھولے دادا کو ساتھ لے جانے میں خوشی ہوتی۔ ...اس عالم میں وہ اڈّے پر اُس کی پذیرائی نہیں کر سکے گا۔ یہ سُن کے ...قریب کھڑے ہوئے لوگوں نے بے ساختہ کہا کہ وہ اُنھیں کوئی حکم دے، ...اُن کا حکم دے۔ تجمّل مسکرانے لگا اور بولا "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے"۔

دوپہر کے کھانے کے وقت اور بعد میں گزشتہ دن کی طرح ...پر بھیڑ لگی رہی۔ سو اجنبیت جو کانتے، شامو، جمرو اور ٹنگو کو ...محسوس ہو رہی تھی، اب اتنی نہیں رہی تھی۔ اُسی رات تجمّل کی ہدایت

کے بموجب علاقے کے تمام گشتی پولیس والوں کو بھی مدعو کیا گیا۔ بازار سے بھی مختلف عورتیں آتی رہیں۔ شام کو تجمّل نام پلّی کے دادا ساجن کے پاس گیا۔ یہ ایک چھوٹا مگر شہر کے دوسرے اڈّوں سے بڑا اڈّا تھا۔ ساجن کے آکا سے اچھے مراسم تھے یا یوں کہا جائے کہ اُسے آکا سے اچھے مراسم رکھنے پڑتے تھے۔ تجمّل کو دیکھ کے وہ بوکھلا سا گیا تھا مگر تجمّل کی آمد کا مقصد جان کے اُس کے حواس کچھ درست ہوئے۔ اُس نے ندامت کا اظہار کیا کہ اپنی طبیعت خراب ہونے کے سبب وہ آکا کے جانے کے بعد تجمّل سے ملنے نہیں آ سکا لیکن اُسے تجمّل کو دیکھنے کی بڑی تمنا تھی۔ اُس کے آدمی تجمّل اور اُس کے ساتھ آنے والوں کے لیے آناً فاناً اتنی چیزیں سمیٹ لائے تھے کہ رات کے کھانے کی گنجائش ختم ہو جاتی تھی۔ آکا کے لیے ساجن کے سینے میں بہت کینہ بھرا ہوا تھا۔ تجمّل کے تیور دیکھ کے وہ پھٹ پڑا۔ اُس نے انکشاف کیا کہ نام پلّی سے ہونے والی آمدنی کا دسواں حصہ آکا کو جاتا رہا ہے۔ یہ روایت چند مہینے پہلے آکا ہی نے ڈالی تھی، شکایت پر اُس نے ساجن کو دھمکی دی تھی کہ وہ نام پلّی پر اپنا آدمی بٹھا دے گا۔ ساجن کہہ رہا تھا کہ وہ کسی مناسب موقع کی تاک میں تھا۔ کچھ نوابوں کی امداد پر اوپر کے لوگوں سے آکا نے بنا رکھی تھی چنانچہ سوچ سمجھ کر ہی کوئی قدم اُٹھایا جا سکتا تھا۔

یہ جان کے تجمّل کو جو کہنا چاہیے تھا، وہی اُس نے کہا۔ اُس نے کالے دادا کی طرف دیکھتے ہوئے اعلان کیا کہ آج سے اڈّے کی ساری آمدنی اِسی علاقے کے آدمیوں میں تقسیم کر دی جائے۔

ساجن ساتھ ہی اڈّے پر آیا، اُس کے علاوہ نام پلّی کے اور بہت سے آدمی۔ رات کے کھانے کے بعد بھی وہ کہیں رات گئے واپس گئے۔

اڈّے کے بعض لوگ کانتے سے کسی قدر قریب ہو گئے تھے۔ اُن کی زبانی کانتے کو خانم کا نام سُن کر بڑی حیرت ہوئی۔ وہ لوگ کانتے سے تصدیق چاہتے تھے کہ آیا خانم واقعی حیدرآباد واپس آ رہی ہے؟ پہلے تو کانتے کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔ خانم کی آمد کی خبر اُس سمیت تجمّل اور زورا کے سوا کسی کو نہیں تھی، زورا موجود نہیں تھا اور وہ ایسی غیر ذمّے داری کر بھی نہیں سکتا تھا۔ پھر اُنھیں کہاں سے سُن گُن ملی؟ ایک تجمّل ہی رہ جاتا تھا، غور کرنے پر اس کا جواب ایسا مشکل نہیں تھا۔ کانتے کے دماغ میں پڑی ہوئی بہت سی گرہیں خود بخود کھلتی گئیں۔ تجمّل نے ضروری سمجھا ہو گا کہ یہ خبر اڈّے کے لوگوں سے نہ چھپائی جائے گویا اُسے یقین ہے کہ اڈّے کے آدمیوں میں یا باہر اُن سے متعلق لوگوں میں کچھ ایسے لوگ ضرور ہوں گے جو یہ اطلاع دُور تک منتقل کر سکیں گے۔ بڑے نواب کے لیے جہاں یہ اطلاع تشویش کا سبب ہو گی کہ اُس کے محبوسوں کے پُرسانِ حال شہر

میں آ گئے ہیں وہاں اُن کی آمد اُس کے لیے سکون کا باعث بھی ہوگی کہ اِن لوگوں کا تعلق خانم کے کوائف جاننے والوں سے ہے۔ اب دو نہیں کئی آدمی سامنے ہیں اور لازم نہیں کہ سبھی بابر اور پیرو کی طرح موٹی کھال کے ہوں، اور کچھ نہیں تو پولیس کی توجہ ہی ان سب کی جانب مبذول کرائی جا سکتی ہے۔ پولیس کے لیے ایک اشارے کا جواز بہت ہوتا ہے اور وہ لوگ جن کا تعلق اڈے سے ہو، اُن کے لیے جواز تراشنے میں پولیس کو کتنی دیر لگتی ہے۔ سب سے بڑا جواز تو اُن کا اس شہر میں اجنبی ہونا تھا۔ شاید اجنبیت کا یہی احساس مٹانے کے لیے تجمل نے اپنے گرد مجمع لگا رکھا تھا، اُس کی آ سے اپنے لیے اتنی ضرورت نہیں تھی جتنی دوسروں کے لیے تھی۔ دوسروں کو یہ جتانا لازم تھا کہ یہ اجنبی کسی ایسے احساس کے شکار نہیں ہیں، اس سے پہلے کہ بڑے نواب کے دماغ میں کچھ اور سما جائے، اُسے خانم کی آمد کے سلسلے میں مطمئن کر دینا مناسب تھا۔ گو اور بھی بہت سی باتیں اور اڈے سے ملنے والی خبریں نواب کو کسی ہیجانی اقدام سے باز رکھنے کے لیے کافی ہونی چاہیے تھیں۔

تجمل اور کانتے کے لیے نواب کی راسیں تھامنا ایسا دشوار نہیں تھا۔ وہ حویلی میں پہرے داروں کا بڑا ہجوم دیکھ کے آئے تھے جو بعد میں اور بڑھا دیا گیا ہوگا مگر تجمل اور کانتے طے کر لیتے تو حویلی میں داخل ہو کر ہی دم لیتے۔ اس طرح کوئی مثبت نتیجہ برآمد ہونے کا امکان ہوتا تو وہ ایک پل کی تاخیر نہ کرتے ورنہ اُن کی ذرا سی چوک اُنھیں بہت پیچھے دھکیل سکتی تھی۔ وقت کی طوالت اُنھیں کبھی راس نہ آتی۔ تجمل نے دبے لفظوں میں اباجان سے کہنا چاہا تھا کہ اُن کے دو آدمی اُن کے پاس نہیں ہیں اور وہ اُن سے مزید دوَر کیے جا سکتے ہیں، دُوری کی وُسعت سے اباجان خوب آشنا ہوں گے۔ بڑے نواب کو بھی یقیناً حویلی سے چلتے وقت تجمل کے کہے ہوئے لفظ یاد ہوں گے۔ مزید کسی پیچیدگی کا خیال تجمل سے زیادہ اُسے ہونا چاہیے تھا۔ جگ ہنسائی کا خیال بھی تو ہوگا لیکن آدمی کا کچھ ٹھیک نہیں ہے پل بھر میں بکھر جاتا ہے، کسی بھی وقت کوئی ایسا لمحہ آ جاتا ہے کہ آدمی اپنا ہی آشیانہ پھونک دے، اپنے آپ کو بھنبھوڑ ڈالے۔ نواب خود نہیں تو اُس کے مصاحب اُسے ایسے کسی سرکش، دشمن لمحے سے دوچار کر سکتے تھے۔

کانتے کی آنکھوں میں جیسے اُس کی بینائی واپس آ رہی تھی لیکن جتنا اُس کے سامنے واضح ہوتا جا رہا تھا، اُتنا ہی اُس کی رگوں میں اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ بار بار اُسے ایسا لگتا تھا جیسے کوئی پیچھے سے اُس کی جانب بڑھ رہا ہو۔ وہ اپنی ہی آہٹ پر چونکنے لگا تھا۔ بار بار اُس کے دماغ میں سب کچھ گڈمڈ ہو جاتا تھا۔ پولیس کسی وقت بھی دستک دے سکتی ہے، کسی وقت بھی کسی بھی طرف سے ہمیں گھیرے میں لیا جا سکتا ہے۔ خانم کی آمد سے کوئی نتیجہ نہ نکلا تو؟ اِس کے باوجود نواب انکاری رہا؟ اگر خانم ہی نہیں آئی یا اُس کے آنے میں دیر ہو گئی اور اس درمیان چھوٹے نواب کو کہیں کچھ ہو گیا تو اُس کا بھائی نواب تو... اور وہ دونوں لاڈلے اور پیرو دادا معلوم نہیں حال میں ہوں گے۔ کانتے جتنا سوچتا تھا، اُس کے جسم میں جمنے لگتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وقت ہاتھ سے نکلا جا

رات کو کھانے کے بعد ابھی سا جن نہیں گیا تھا گنتی والے چلے گئے تھے کہ کالے دادا نے تجمل سے کہا، آکا کے آدمی آیا تھا، وہ اُستاد سے ملنے کے لیے ضد کر رہا ہے۔ کالے دادا بلند آواز میں تجمل کو بتایا تھا، سبھی نے سُنا تھا۔ تجمل کا جواب کے لیے عمارت میں یک دم سناٹا چھا گیا۔ تجمل نے فوراً جواب نہیں کچھ توقف کے بعد تنک کے بولا: "اُس کو ایسی کیا تکلیف ہے"

"آدمی بولتا ہے، اُدھر دوپہرے ہی رہتاں لگے ہوئے۔" کالے دادا نے تمتمائی آواز میں کہا۔

"بول دو کہ لے آئے" ایک ثانیے کے تذبذب کے بعد تجمل نے آ سے بولا۔ پھر عمارت میں سکوت ہی طاری رہا جیسے سب چلے گئے سب سہمے ہوئے بیٹھ گئے تھے۔ کانتے کو معلوم تھا کہ آکا کو سے قریب کسی مکان میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ اس سے زیادہ اُ جاننے کی بے چینی بھی نہیں تھی۔ جس حال میں کانتے نے آخر آکا کو دیکھا تھا، اُس کے لحاظ سے اُسے سنبھلنے کے لیے بہت دن درکار تھا اور اُس کے بعد اُس کا شہر میں دکھائی دینے یا لوٹنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ کانتے کو گزشتہ رات آکا کے بارے میں معلوم ہوا تھا اور یہ جان کے تردد ہوا تھا کہ وہ ابھی تک شہر میں پھر کانتے خود کو یہ تسلی دے کے چپ ہو رہا کہ تجمل نے اس حال آکا کا باہر نکلنا بہتر نہ سمجھا ہوگا۔ ہو سکتا ہے، آکا کی موجودی میں مجبوری سے زیادہ تجمل ہی کی مرضی کو دخل ہو۔ تجمل نے بعض وجوہ سے بھی اُسے روکے رکھا ہوگا۔ کسی ثبوت وبوت کے لیے ضرورت پڑ سکتی تھی۔ اڈے کا وہ واحد آدمی ہوگا جس سے بڑے یا اُس کے اہل کار خاں صاحب نے رابطہ قائم کر رکھا تھا۔ اُن پانچ نے بھی اُسی کی ہدایت پر میرا اور پیرو کا تعاقب کیا تھا۔ اڈے آدمیوں کا خون گرم رکھنے کے لیے بھی اُس کی موجودی ضروری تھی کے عتاب کی خبریں کے اُن کی آگ ایسی فروزاں نہ رہتی جیسی کے ہونے پر تھی۔ نواب کے سلسلے میں مزید معلومات کے لیے بھی قریب ہی رہنا چاہیے تھا۔

مگر اب آکا تجمل سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟ کانتے کی سبھی یہ جاننے کے لیے بے تاب تھے۔ تجمل اور کالے دادا

کے آدمی کی واپسی کے بعد عمارت میں چھائی ہوئی اضطراب آمیز خاموشی ٹوٹنے کی کوشش کی لیکن اب سب بہت بے کل ہوگئے تھے۔ نام لی کا دادا ساجن بھی گم سم سا تھا اور بجھل کے سوالات کے جواب کھوئے کھوئے انداز میں دے رہا تھا۔ سب کی نگاہیں بار بار دروازے کی طرف جا رہی تھیں۔ دس منٹ گزرے ہوں گے کہ دروازے سے آہٹیں گونجیں اور ایک ساتھ کئی آدمی اندر داخل ہوئے۔ اُن کے بیچ میں آکا تھا۔ موٹی چادر میں لپٹا ہوا، سر پہ پٹی بندھی ہوئی، ناک اور کنپٹی اور ٹھوڑی پر پھاہے جمے ہوئے۔ وہ عمارت میں سب کی موجودی سے گویا بے خبر سیدھا چوکی کی طرف بڑھا۔ اُس کا سر جھکا ہوا تھا۔ لوگ اُسے راستہ دینے کے لیے اِدھر اُدھر سمٹ گئے تھے۔ بجھل اُسے آتے دیکھتا رہا۔ چوکی کے پاس آکے آکا رُک گیا۔ پھر ایک دم سامنے بیٹھے ہوئے بہت سے لوگ اچھل گئے جب آکا نے چوکی پر چڑھنے کے لیے قدم بڑھائے۔ جانے انھوں نے کیا سمجھا ہو، ایک لمحے کے تذبذب کے بعد آکا نے اوپر چڑھ کے تیزی سے بجھل کے پیر پکڑ لیے۔ کانتے چوکی پر بجھل کے نزدیک ہی بیٹھا تھا۔ آکا بجھل کے پیر پکڑ کے ڈولتی آواز میں گڑگڑا رہا تھا کہ اُسے معاف کر دیا جائے۔ زندگی میں کبھی اُس سے اتنا بڑا دھوکا نہیں ہوا تھا۔ اب اُسے اُس وقت تک چین نہیں آئے گا جب تک بجھل اُسے معاف نہ کر دے۔

"اپنے کو تجھ سے کوئی بیر نہیں ہے رے!" بجھل نے دھیمی آواز میں کہا اور پہلو بدلنے لگا۔

عمارت میں سوئی بھی گرتی تو آواز آتی، سب بے حس و حرکت بیٹھے تھے، اُن کی نظریں بجھل اور آکا پر جمی ہوئی تھیں۔ آکا کہنے لگا کہ وہ ایک بنتی کرنے آیا ہے جس کا اُسے کوئی حق نہیں پہنچتا مگر بجھل نے جہاں اُس کا اتنا خیال کیا ہے، ایک احسان اور کر دے۔ اُسے جُدا نہ کیا جائے۔

"کیا بولتا ہے تو؟" بجھل نے ترشی سے کہا۔

"اپن کو اپنے سے الگ مت کرو۔" وہ دبکتی آواز میں بولا۔ اُس نے کہا کہ وہ اب کہیں نہیں جائے گا، زندگی بھر بجھل کی خدمت میں رہنا چاہتا ہے۔

"دھیان کر کے پھر کبھی اپنے سے بات کرنا۔" بجھل نے نرمی سے کہا۔ "کیا اتنا ہی بولنے کو آیا تھا؟"

"اور اپنے پاس بولنے کو کیا رہ گیا ہے دادا!" وہ تڑپتے ہوئے لہجے میں بولا۔ کہنے لگا، اُسے یقین دلایا جائے کہ بجھل نے اُس کی درخواست قبول کر لی ہے۔ یہ دوسری زندگی اُسے بجھل کی وجہ سے ملی ہے اور اسے وہ اُسی کی چھاؤں میں گزار دینا چاہتا ہے۔ اب اُسے محسوس ہو رہا ہے کہ وہ کیسے سراب میں دن گزار رہا تھا۔

آکا کا لہجہ عاجزانہ تھا، اُس میں کوئی کھوٹ نظر نہیں آ[...] کانتے کو اپنا سینہ پگھلتا محسوس ہوا، اُس نے کبھی کسی دادا کو اپ[...] کے درمیان لوٹ کے اس طرح آتے نہیں دیکھا تھا۔ "جانے دو، جس طرح ہونا تھا، ہو گیا سالا۔" بجھل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"اپنے کو سچ پوچھو تو دادا! کوئی دُکھ نہیں ہے۔ قسم سے، خوشی ہے کہ اپنے کو ایک آدمی مل گیا۔" وہ بلکتی آواز میں بولا[...] کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ "تم کو پتہ نہیں دادا، تمھاری تلاش میں کدھر کدھر گھوم گھام کے اِدھر آ کے ٹکا تھا پر تم ملا تھا۔"

"جا کے آرام کر، زیادہ مت بول۔"

"تم جب تک کچھ بول نہیں دو گے، آرام اپنے کو نہیں [...]"

"اپنے ساتھ تو نہیں چلنے کا رے!"

"تم کوئی حکم کر کے دیکھو دادا! سمجھو کہ پہلا آکا مر چکا ہے۔ سؤر کی اولاد بہت جھوٹا تھا، وہ کتا تھا دادا! اُس کو ایک[...] ہی جانا تھا، اُس کو بھول جاؤ۔ یہ سب کچھ تم سے نیا آکا بول[...]" اُس نے ملتجی نظروں سے کانتے کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو بجھل سے سفارش کر دے۔

"کیا چاہتا ہے تو؟" بجھل نے تلخی سے کہا۔

"تمھارا پٹا مانگتا ہے۔ گلے میں اپنا پٹا ڈال دو۔ جب تک سانس رہے گی، قسم سے تمھاری چوکھٹ سے ہل کے دے جا[...] اپنی ماں کا جنا نہیں۔ اپن اور کچھ نہیں مانگتا۔"

"دیکھیں گے پھر۔" بجھل نے سر ہلا کے کہا۔

"نہیں دادا! اپن ایسے بالکل نہیں جائے گا۔ قسم سے اپن[...] کر کے آیا ہے۔ جب تک تم ہاں نہیں کرو گے، اِدھری تمھارے پیر پڑا رہے گا۔ کچھ اور تمھارے پاس اپنے لیے نہیں ہے تو اپن[...] بات تم ضرور پوری کر سکتے ہو۔ اپن کو اپنے ہاتھوں سے ختم کر[...] تمھاری دی ہوئی موت کے بنا اپن کو آدھر بھی...."

"جا، جا کے آرام کر۔" بجھل نے بیزاری سے کہا مگر وہ [...] پیروں سے لپٹ گیا۔ بجھل نے اُس کی گردن پکڑ کے اُس کا چہرہ اٹھایا اور پہلے اُسے خشمگیں نظروں سے گھورتا رہا، پھر کہیں اُس کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی، وہ بڑبڑاتی آواز میں بولا۔ "ابھی جا کے حال تو تھوڑا ٹھیک کر۔"

آکا کو بجھل کی آنکھوں میں کچھ نظر ہی آ گیا تھا، وہ بے تحا[...] سسکنے لگا۔ بجھل نے اُس کا سر اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔

اُس کے جانے کے بعد عمارت پر سوگ سا طاری رہا۔ سب کہیں [...]م ہو گئے تھے۔ ساجن بھی دیر تک بے سُدھ بیٹھا رہا۔

بارہ بجے کے قریب جب ساجن اور اُس کے ساتھی چلے گئے تھے، شاموں نے زورا سے کانتے کی جھنکی بھری۔ اُسے دروازے پہ زورا کا چہرہ دکھائی دیا تھا۔ کل بھی زورا تقریباً اسی وقت آیا تھا۔ ممکن ہے [...]سے کسی آدمی نے اُس کا رات کو آنا اور دن بھر غائب رہنا محسوس کیا ہو مگر زورا کو جیسے اِس اَمر کی فکر نہیں تھی۔ وہ کسی تذبذب کے بغیر اُن کے درمیان آ کے بیٹھ گیا۔ کانتے کو تجسس تھا کہ وہ خانم کے جوابی پیغام سے مطلع کرنے آیا ہو گا مگر زورا کے پاس خانم کی آمد کے متعلق کوئی خبر نہیں تھی۔ وہ بجھل کو یہ بتلانے آیا تھا کہ نواب حشمت جنگ کا معتمد دوپہر کے وقت ابا جان سے ملا تھا، اُس نے اُن سے کہا کہ نواب کے حکم کے مطابق وہ انھیں ایک حویلی دکھانا چاہتا ہے، وہی حویلی جس کا تذکرہ کل رات نواب نے اُن سے کیا تھا۔ ابا جان نے اُسے شام کا وقت دیا۔ شام کو مقررہ وقت پر ٹھیک ۴ بجے وہ آ گیا، اُس کے پاس نواب کی موٹر تھی۔ مارتی، زورا اور ابا جان تینوں اُس میں بیٹھ کے حویلی گئے۔ زورا کے بیان کے بموجب وہ صاف ستھرے پُرفضا علاقے میں واقع ایک خاصی بڑی حویلی تھی، دو منزلوں پر مشتمل۔ تیسری منزل پر بھی چند کمرے بنے ہوئے تھے اور باغیچہ لگا ہوا تھا۔ باہر سے اُس کا رنگ روپ گو اُڑا اُڑا تھا لیکن اندر ہر کمرے کی سجاوٹ دیکھنے کے لائق تھی۔ ایک نواب اور چند ملازموں کے سوا وہاں کوئی مقیم نہیں تھا۔

ابھی وہ پہنچے ہی تھے کہ نواب حشمت جنگ کی سواری بھی آ گئی۔ ابا جان باہر ہی سے حویلی دیکھ کے پسندیدگی کا اظہار کر چکے تھے۔ اندر جا کے وہ اور متاثر ہوئے۔ انھوں نے نواب حشمت جنگ سے کہا کہ یہ بہت نفیس عمارت ہے مگر اُن کی ضرورت سے بہت بڑی ہے۔ نواب نے اِسے ابا جان کے انکسار پر محمول کیا اور اس سے پہلے کہ ابا جان کوئی رائے دیتے یا ردوقدح کرتے، اُس نے حویلی کے مالک اپنے عزیز کہن رسیدہ نواب سے معاملے کی بات شروع کر دی۔ زورا کو حویلی کی قیمت سُن کے حیرت ہوئی تھی۔ حویلی کے مالک نے صرف اسّی ہزار روپے طلب کیے تھے۔ فرنیچر اور دیگر ساز و سامان کے پانچ ہزار الگ۔ نواب حشمت جنگ کو کہنا نہیں چاہیے تھا مگر اُس نے ابا جان کی خاطر حویلی کے مالک سے قیمت پر نظرِ ثانی کی درخواست کی مگر ابا جان نے بیچ میں دخل دے کے ساری بات ہی ختم کر دی۔ انھوں نے کہا جس ذوق و شوق سے یہ عمارت تعمیر کی گئی ہے، اُس کے مقابلے میں مطلوبہ رقم کچھ بھی نہیں ہے۔ دوسرے انھیں یوں بھی کوئی اعتراض نہیں کہ حویلی کے مالک محترم نواب یہ رقم کارِ خیر میں صرف کرنا چاہتے ہیں۔ مستحقین کے حق میں کوئی کمی نہیں کرنی چاہیے۔

ابا جان نے لکھنؤ میں ہیروں کی فروخت سے ڈھائی لاکھ روپے کے قریب حاصل کیے تھے۔ اُس میں سے بچی ہوئی بڑی رقم اُن کے پاس محفوظ ہو گی۔ کوئی اور ہیرا فروخت کرنے کی ضرورت نہیں پڑی ہو گی۔ اُس وقت اُن کی جیب میں چند ہزار روپے تھے۔ کچھ زورا اور مارتی کی تحویل میں تھے۔ دس ہزار روپے بیعانے کے طور پر انھوں نے حویلی کے مالک بوڑھے نواب کے سامنے رکھ دیے۔ نواب نے کہا، اِس کی ضرورت نہیں، شرفا کی زبان ہی بیعانہ ہوتی ہے مگر ابا جان نے نوٹ واپس نہیں اُٹھائے۔ بعد میں نواب نے انھیں بتایا، معاملے سے پہلے وہ مناسب نہیں سمجھتا تھا کہ حویلی کے بارے میں کوئی بات کرے۔ اصل میں اُسے یہ حویلی کسی صاحبِ ذوق کے حوالے کرنے کی خواہش تھی، اسی لیے اتنے دن بھی لگ گئے۔ حال ہی میں ریزیڈنسی سے متعلق ایک بڑے انگریز عہدے دار نے دلچسپی ظاہر کی تھی مگر بڑے ہال میں حافظ و سعدی کے اشعار کندہ ہیں اور آیاتِ کلام اللہ کی نقاشی کی گئی ہے لہٰذا گریز رہا۔ انگریز نے مختلف ذرائع سے سفارش کروائی مگر حویلی کسی غیر مسلم کے حوالے کرتے ہوئے نواب کا دل نہ مانا۔ ویسے اُس انگریز کے اعلا ذوق میں کلام نہیں تھا۔

اُس نے ابا جان سے کہا کہ وہ کسی بھی وقت منتقل ہو سکتے ہیں۔ ابھی چاہیں تو ابھی، رسمی کارروائی بعد میں ہوتی رہے گی کیونکہ نواب حشمت جنگ درمیان میں ہے۔ حویلی کا مالک یہاں سے چند جوڑی کپڑے اور بعض خاندانی یادگاروں کے سوا کچھ لے کے نہیں جائے گا۔ حویلی میں آنے والے کسی بھی خاندان کو لباس کے سوا غالباً کسی چیز کی ضرورت محسوس نہ ہو۔ ابا جان نے پیش کش کی کہ حویلی کا مالک جب تک چاہے وہاں قیام کرے۔ نواب نے اُن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جواب دیا کہ وہ تو کب سے پا بہ رکاب ہے۔ اب جلد از جلد یہاں سے جانا چاہتا ہے۔ ابا جان اگر آج آنا پسند کریں تو آج ہی آ جائیں۔ دو ایک روز کے لیے وہ اپنے ایک دوست کے ہاں منتقل ہو جائے گا۔ پھر اُس نے کہا، حویلی میں باغ، باورچی خانے، صفائی اور دیکھ بھال کے لیے گیارہ ملازم ہیں، اُن کے ساتھ اُن کے مختصر کنبے بھی ہیں۔ یہ لوگ برسوں سے اُس کے خاندان کی خدمت کر رہے ہیں۔ ابا جان چاہیں تو انھیں برقرار رکھ سکتے ہیں۔ اُن کی شرافت، مستعدی اور دیانت کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔ ابا جان نے کہا، وہ انھیں جوں کا توں رکھیں گے۔ ہر چند کہ انھیں اتنے ملازموں کی ضرورت شاید نہ پڑے۔ پھر نواب حشمت جنگ اُن تینوں کو اپنی حویلی لے گیا۔ رات کا

کھانا کھلائے بغیر اُس نے انھیں نہیں آنے دیا۔

ابّا جان نے تجّل سے رائے پوچھی تھی۔ جواب میں تجّل نے زورا سے کہا، مزید پیش و پس کیے بغیر وہ کل ہی ہوٹل چھوڑ کے حویلی منتقل ہو جائیں۔ خانم کہیں گئی تو اُسی حویلی سے جائے گی۔ رات بہت ہو گئی تھی اس لیے زورا اڈّے ہی پر ٹھہر گیا۔ وہ کانتے، جمرو، شامو اور ٹنگو کے ساتھ اوپری منزل پر چلا آیا۔ پھر باتیں کرتے کرتے اُن سب کی آنکھیں جھپک گئیں۔ صبح انھیں معلوم نہ ہو سکا کہ زورا منہ اندھیرے کس وقت نکل گیا۔

گزشتہ راتوں کی طرح بہت سے لوگ وہیں سو گئے مگر جو چلے گئے تھے، صبح ہوتے ہی اُن کی آمد پھر شروع ہو گئی۔ اُن کا آنا لازمی تھا، تجّل ہی نے گزشتہ شام اُن سے کہا تھا کہ کل صبح وہ اڈّے پر روزانہ کی باقاعدہ مشقیں جاری رکھنے کے لیے کچھ آدمیوں کی پرکھ کرے گا۔ یہ تکلف تو محض بہرِ ملاقات تھا، تجّل کی منشا یہی معلوم ہوتی تھی کہ ان دنوں اڈّے کے آدمی شہر میں بھٹکنے کے بجائے بیشتر وقت اڈّے ہی پر رہیں۔ بہتر ہے کہ اِس دوران شہر کے کسی تھانے میں اُن کی کوئی رپورٹ درج نہ ہو اور پولیس بازار کے علاقے سے دُور ہی دُور رہے۔ زیادہ سے زیادہ آدمیوں کی موجودی میں زیادہ سے زیادہ آشنائی کے علاوہ ایک اور بھی رمز تھا۔ ممکن ہے، تجّل کے ذہن میں یہ ہو کہ زورا ابّا جان کے ہمراہ آزادی سے شہر میں گھوم پھر سکے اور ہوٹل سے اُس کے کسی رابطے کا لوگوں کو علم نہ ہونے پائے۔ زورا کو انھوں نے اتنی بار یہاں دیکھا تھا کہ اب اُس کا چہرہ سب کی نظروں میں کھُب چکا ہو گا۔

اڈّے پر آئے انھیں چوتھا دن تھا۔ خانم کو تار دیے پورے دو دن گزر چکے تھے، تیسرا دن شروع ہو گیا تھا۔ کانتے کے خیال میں اب تک خانم کا جواب آ جانا چاہیے تھا، اگر کسی وجہ سے اُس کی آمد میں تاخیر ہو رہی ہے تو بھی اطلاع اُسے فوراً دینی چاہیے تھی۔ اُس نے صبح ہی سے انتظار شروع کر دیا تھا۔ اُسے اُمید تھی کہ زورا آج دن میں کسی وقت تجّل کو خانم کے متعلق کوئی خبر سنانے ضرور آئے گا مگر صبح سے دوپہر ہو گئی، دھوپ اُترنے کا وقت آ گیا، زورا نہیں آیا۔

شام کو چار بجے چائے تقسیم کی جا رہی تھی۔ عمارت میں آدمیوں کی بڑی تعداد موجود تھی۔ صدر دروازے سے ایک شخص لپکتا جھپکتا سیدھا تجّل کے پاس پہنچا، اُس نے سرگوشیانہ اُسے بتایا "دادا! باہر علاقے کا انچارج آیا ہے۔" کانتے کا ماتھا ٹھنکا۔ تجّل بھی چند لمحوں کے لیے چپ ہوا پھر اُس نے اطلاع دینے والے سے پوچھا "کیا کہتا ہے؟"

"بولتا ہے نئے دادا سے ملنا ہے۔"

"لے آ پھر اُس کو ادھری!" تجّل کی آواز اُبھری ہوئی تھی۔ ابھی دروازے تک نہیں پہنچا تھا کہ تجّل نے اُسے روک دیا اور سے اُٹھ کے دروازے کی طرف جانے لگا۔ کالے دادا، کانتے، شامو بھی بیٹھے نہ رہ سکے۔ تھانے کے آدمی اڈّے میں داخل ہونے سے عموماً اُس وقت تک اجتناب کرتے ہیں جب تک کسی خاص معاملے میں اُن کا آنا ضروری نہ ہو جائے یا پھر انھیں اڈّے پر باقاعدہ مدعو نہ کیا جائے۔ اُن کی اچانک آمد کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اڈّے کے آدمی پچھلے دروازے سے فرار نہ ہو سکے۔ انچارج اندر نہیں آیا مگر باہر بھی اُس کی موجودی کسی سبب ہی سے ہو سکتی تھی۔

وہ درمیانے قد، بھرے بھرے جسم، چوڑی آنکھوں اور جیسے رنگ کا کوئی پچاس سالہ آدمی تھا، ریاستی پولیس کی وردی میں ملبوس۔ اُس کے ساتھ دو سپاہی بھی تھے۔ دونوں کے کاندھوں پہ بندوقیں لٹک رہی تھیں۔ کالے دادا نے جلدی سے آگے بڑھ کر سیلوٹ کے انداز میں انچارج کو سلام کیا۔ جواب میں اُس نے سر کو خفیف سی جنبش دی اور چمکتی آنکھوں سے کالے دادا کے پاس کھڑے ہوئے تجّل کو گھورتا رہا۔

"کیسے آنا ہوا سرکار!" کالے دادا نے کسی قدر بے چینی سے کہا۔ انچارج کی نظریں تجّل پر جمی ہوئی تھیں، اُسی کو دیکھتے ہوئے وہ بولا "سنا ہے کسی نئے چڑیمار کو گھیر کے لائے ہو کالے! اُسی کو دیکھنے آئے ہیں، کتنے دانت کا ہے۔"

اِس سے پہلے کہ کالے دادا کوئی جواب دیتا، تجّل سامنے آ گیا اور دھیمی آواز میں بولا "لگتا ہے نام آپ کچھ بھول رہے ہو، اِدھر کوئی پالتو نہیں ہے۔ اِدھر ہم ہیں اور ہم کو آپ دیکھنے آئے، دانت کیا، جو آپ بولو، دکھانے کو تیار ہیں۔"

انچارج کے جسم میں کوئی لہر سی اُٹھی۔ وہ ہنکاری بھر کے لہجے میں کہنے لگا "تو، تو وہ تمھی ہو۔ معلوم ہوتا ہے سب ٹھیک سُنا ہے۔ بڑے چرچے ہو رہے ہیں شہر بھر میں۔"

"کاہے کے چرچے صاحب! ضرور کسی نے صاحب کے کان بھرے ہوں گے۔" تجّل نے مسکرا کے کہا۔

"آدمی پرانے معلوم ہوتے ہو۔"

"آپ بھی اپنے کو نئے نہیں لگتے۔"

"کہاں سے آئے ہو؟"

تجّل ہنس پڑا۔ "پرانے آدمی ہو کے آپ ایسا پوچھتے ہو! باتوں کا جواب ہم گھر پر نہیں دیتے اور بعد میں بھی آدمی دیکھ کے بولتے

ہیں۔ تم ہم ایک پولیس افسر سے مخاطب ہو۔" اُس نے نخوت سے کہا۔ "آپ بھی کسی سے بات کر رہے ہو، اپنے کو خوب جانکاری ہے اپنی کوئی رشتے داری نہیں نکلتی۔"

"کالے!" وہ برہمی سے بولا "اپنے دادا کو بولو، شاید تم نے ہمارے بارے میں کچھ نہیں بتایا کہ ہمیں کون سی زبان پسند ہے، کون سی...."

کالے دادا بدحواس سا ہو گیا۔ تجّل نے اونچی آواز میں کہا "کالے سے کیا بولتے ہو صاحب! اپنے سے بات کرو، ہم کو اچھی طرح پتہ ہے، آپ کون سا سُر پسند کرتے ہو پر اپنے کو بھی ایک ہی سُر آتا ہے۔"

"لیکن یہ سُر اپنا ہمیں بالکل اچھا نہیں لگتا۔"

"تسلی رکھو صاحب! اپنی کوشش یہی ہوتی ہے کہ آپ لوگ کو کوئی شکایت نہ ہو، کبھی ہو جاتی ہے تو اپنے کو تو تکار کی عادت بالکل نہیں ہے۔"

"کالے جانتا ہے کہ ہم ایک ہی بار رعایت دیتے ہیں۔"

"دوسری بار میں اپنے کو بھی شرم آتی ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے، تم سے واسطہ کچھ زیادہ ہی پڑے گا۔"

"اگر یہ حسرت ہے تو بات دوسری ہے، ابھی صاحب کے ساتھ چلتے ہیں، ویسے ہم شگون لے کے ہی گھر سے نکلتے ہیں۔"

کانتے کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا کہ تجّل اُس سے کس قسم کی بات کر رہا ہے۔ آخر اتنی طول کلامی کی کیا ضرورت ہے۔ اگر پولیس افسر کا مقصد محض نئے دادا کو دیکھنا اور اڈّے کی تبدیلی کے بارے میں اندازہ لگانا ہے تو تجّل کو اسی حد تک بات کرنی چاہیے تھی مگر وہ تو الٹ کر رہا تھا۔ کانتے کو شبہ تھا کہ اُستاد اِس وقت ہوش میں بھی ہے یا نہیں۔ کالے دادا کا بھی بس نہیں چل رہا تھا کہ تجّل کے منہ پر ہاتھ رکھ دے یا اُس کا ہاتھ پکڑ کے روک دے۔ انچارج کے چہرے کا رنگ کچھ اور گہرا ہو گیا تھا، تجّل سے کہنے لگا "ضرور کالے نے تمھیں چنے کے جھاڑ پر چڑھا رکھا ہے۔"

"ابھی آپ سامنے موجود ہو، جو اِس نے نہیں بولا وہ اپنے کو کیا معلوم۔" تجّل نے سانس لے کے کہا "اپنے کو آپ اُوپر سے نیچے تک اچھے آدمی دکھائی دے رہے ہو۔"

"دکھائی دے رہے ہیں تو اچھا ہے ورنہ...."

"آگے کیوں بولتے ہو صاحب!" تجّل نے تیزی سے کہا "اپنی تو ایک ہی بات ہے، پہلی اور آخری۔ اِس کو کچھ اور مت سمجھنا، اپنی طرف ہاتھ بڑھانے سے پہلے چھان پھٹک کر نا مت بھولنا۔ اِس میں سب کا بھلا ہے، اپنا بھی۔ پہلے کچھ دوسروں کو بہت وقت خراب کرنا پڑا ہے اس لیے ایسا بول رہے ہیں۔ یوں آپ حاکم ہو اور ہم کو پتہ ہے کہ بازار کے اڈّے پر آپ کو کچھ جان کے ہی جانا گیا ہے۔"

پولیس افسر کی آنکھیں چمکنے لگیں "ہمیں یہاں دکن میں خاص طور پہ بلایا گیا ہے۔" وہ سر اُٹھا کے بولا۔

"وہ تو ہم کو پہلے دکھائی دے گیا تھا، آپ ادھر کھٹائی گھاٹ کے ایک دم نہیں ہو۔"

"تم نے کیسے جانا؟" وہ بے تابی سے بولا۔

"بہت دن دنیا چھانتے ہو گئے صاحب! اور ساری آپ ہی لوگوں میں گزری ہے پر معاف کرنا آپ ادھر پولیس میں کیسے آ گئے؟"

"کیوں، کیوں؟ تمھارا کیا مطلب ہے؟" اُس نے چونک کے کہا۔

"آپ کو تو صاحب کچھ اور ہونا چاہیے تھا، اپنے کو تو آپ کوئی شکاری جان پڑتے ہو۔ اُدھر جاگیر سے کیوں چلے آئے؟"

انچارج پلکیں پٹ پٹانے لگا "نگاہ تمھاری خاصی بہتر ہے۔"

"دل بھی ایسا کھوٹا نہیں ہے صاحب!"

"ہوں!" وہ سر ہلانے لگا "پر یہ، یہ سب...."

وہ کہتے کہتے رہ گیا۔ تجّل بیچ میں بولا "یہ سب کھیل تماشا ہے صاحب۔"

وہ جز بز سا ہو کے کہنے لگا "مگر تم نے ہمیں ٹھیک پہچانا۔ اِس شکار نے ہمیں بہت رُسوا کیا ہے۔ معلوم نہیں، تم نے کبھی شکار کھیلا ہے یا نہیں۔" تجّل کے کچھ کہنے سے پہلے وہ خود بولا "پولیس میں تو ہم اتفاقاً بلکہ حادثتاً آ گئے۔ اُس طرف ترائی میں شکار کھوجتے کھوجتے ایک سینگا گینڈا نظر آ گیا، نام شاید تم نے سُنا ہو، گلّا باکا۔ اُدھر رام نگر کے سارے علاقے میں آگ لگا رکھی تھی، دیکھتے ہی ہم کو شک ہو گیا تھا کہ بن میں اکیلا ایک اسی کا خون نہیں ہے۔ گھیر کے سُسرے کو شہر تک لے آئے اور جب تک پولیس کے ہاتھ میں نہ تھما دیا، سانس لینے کو بھی کہیں نہ ٹھہرے۔ بہت پھڑ پھڑاتا رہا تھا۔ اِس کے بعد کمشنر نے بیڑی میں بڑی ڈال دی۔ پہلے خاص خاص موقعوں پر بلاتے تھے پھر ایک دن ساری بریلی کمشنری کی فہرست رکھ دی۔ کام البتہ ہمارا وہی ہے جو تم نے ابھی بتایا ہے۔ اُدھر دُور دُور تک کوئی پولیس کے قریب نہیں پھٹکتا تھا۔ ویسے پولیس میں بھی اپنا ریکارڈ بڑے بڑے پشتینیوں سے لمبا ہے۔" وہ زبان پر جو آیا، کہتا رہا۔ اُس نے تجّل کو یہ جتانا بھی ضروری سمجھا کہ کوئی دس جگہ کے گورے کمشنروں نے اُسے اپنے ہاتھ سے سرٹیفکیٹ لکھ کے عطا کیے ہیں۔ یہاں بھی ریزیڈنٹ بہادر کی سفارش پر اُسے بھیجا گیا ہے۔ پھر اُسے خود خیال آیا، اُس کا لہجہ بدل گیا "تم بھی ہمیں اس

جنگل کے نہیں معلوم ہوتے نگاہ ہماری بھی ایسی اُتری ہوئی نہیں ہے اور کو تو کچھ اور بھی تمھارے متعلق....."

"اندر ہی رہنے دیں صاحب!" تجمل نے جلدی سے کہا "کیوں جگ ہنسائی کراتے ہو۔ آپ بولو اپنے لیے کیا حکم ہے؟ ادھر صرف ہم کو دیکھنے آئے ہو تو اندر آ کے بیٹھو۔"

"نہیں نہیں۔" وہ جھجک کے بولا "ہم یہاں ٹھیک ہیں۔"

"کچھ اور نہیں ہے تو صاحب اندر ہی چلو۔"

"تم سے کچھ باتیں کرنا تھیں، بہرحال پھر سہی۔"

"وہ تو صاحب ہوتی رہیں گی لیکن اس وقت تو آپ تھوڑی دیر....." تجمل نے دھیمے لہجے میں کہا "ایسے دروازے سے لوٹ جانے کو اپنے ہاں اچھا نہیں سمجھا جاتا۔"

وہ کچھ مذبذب میں پڑ گیا۔ تجمل نے بڑھ کے اُس کی کمر پہ ہاتھ رکھ دیا۔ انچارج کا چہرہ ایک لمحے کے لیے تمتما اُٹھا پھر دوسرے ہی لمحے کانتے، شامو، جمرو اور کالے دادا دیکھتے رہ گئے۔ انچارج نے اندر جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔

کالے دادا اُس سے پہلے بھاگ کے اندر چلا گیا تھا۔ دروازے کے قریب بیٹھک نما کمرہ کھول دیا گیا۔ اڈے کے کئی آدمیوں نے جلدی جلدی وہاں چوکی پہ چاندنی ڈال دی اور گاؤ تکیہ لگا دیا اور ساری کھڑکیاں کھول دیں۔ جتنی دیر میں اُنھوں نے یہ انتظام کیا، انچارج باہر کھڑا صحن اور دالان میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھتا رہا "جگہ تو بڑی ہے۔" وہ اندر تخت پر بیٹھتے ہوئے تیکھے لہجے میں بولا۔

"بس وقت گزر رہا ہے۔"

"سُنا ہے تین دروازے ہیں؟"

"چوتھا بھی ہے ایک، پر اُسے ہم نے بھی ابھی نہیں دیکھا اور شاید دیکھنے کی ضرورت بھی نہ پڑے۔"

"مگر تم نے ایک مقولہ سُنا ہوگا، تمام راستے روم کی طرف جاتے ہیں۔ ہمارا بھی کچھ یہی ہے، جب تک ہم علاقے میں ہیں یہاں سے نکلنے والے تمام راستے ہم تک پہنچتے ہیں۔"

تجمل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کالے دادا اور اڈے کے دوسرے آدمیوں نے بہ عجلت مٹھائی اور چائے وغیرہ کا اہتمام شروع کر دیا تھا۔ منٹوں میں اُنھوں نے چوکی کے وسط میں چینی کی پلیٹوں کا انبار لگا دیا۔

گو انچارج اندر آ کے بیٹھ گیا تھا اور پہلے کی نسبت کچھ تھما اور ٹھیرا ہوا نظر آتا تھا لیکن اُس کی آنکھوں کی چمک اور گہری ہو گئی تھی کانتے کو وہ پہلے سے زیادہ پُراسرار لگ رہا تھا۔ چوکی پر وہ اس طرح جسم پھیلا کے بیٹھا تھا جیسے یہاں پہلے بھی کئی بار آ چکا ہو اور جیسے یہ اڈا اُس کی ملکیت ہو اور اڈے کے سب لوگ رعیت۔ لہجے اور رویے سے کوئی بناوٹ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اُس کے ساتھ دونوں سپاہی دروازے کے پاس مستعد کھڑے تھے۔ باہر سے اڈے کے آدمیوں کی بلبلاتی سرگوشیوں کی گونج آ رہی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ انچارج کی آمد اُن کے لیے کتنی بنی ہوئی ہے اور علاقے پر اُس کا غلبہ کس قدر ہے۔ انچارج نے چائے پہ اکتفا کی۔ کالے دادا کے اصرار پر نمک پاروں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے وہ کہنے لگا "کالے! نمک بخش دینا۔"

کالے دادا نے بے اختیار تجمل کی طرف دیکھا۔ تجمل نے کچھ نہیں کہنے دیا، خود بولا "آپ کے اِدھر آنے کو ہم بڑا ہی سمجھتے ہیں صاحب! دوسری کے بارے میں ہم پہلے آپ

یہ سُن کے انچارج کے نتھنے پھول گئے، وہ چمکتی

"ایک سال ہمیں یہاں آئے ہو رہا ہے لیکن اب تک کچھ سے واسطہ پڑتا رہا۔ البتہ پہلی بار کوئی....." پھر وہ خود ہی کے بولا "معلوم ہوتا ہے، اب کے ملنے میں شاید ہمارے ہمیں اتنی دُعا ملوانے کا مقصد پورا ہو جائے۔"

"ہم کیا بول سکتے ہیں صاحب! دعا کریں تو اپنا گ ویسے آپ آدمی اپنے کو کھرے لگتے ہو۔ ایک کا غذ ادھر بھی آپ کے پلّے ہونا چاہیے۔"

کانتے کے خیال میں ہر بات کا جواب دینے سے رہنا ہی بہتر تھا۔ زیادہ سے زیادہ دو تین دن کی بات یہاں کون سا مستقل رہنا تھا بس خانم کے آنے تک کسی طرح خود سے دُور رکھنا تھا۔ درمیان میں تجمل کے سے کانتے کو کچھ سکون ہوا تھا مگر اندر آ کے تجمل پھر اس کر رہا تھا جیسے انچارج کی مُرکیاں لے رہا ہو۔ انچارج کا سُرخ ہو جاتا تھا سب کچھ تجمل کے سامنے تھا کہ اُن کے آدمیوں سے انچارج کے روابط کیسے رہے ہوں گے کیسی باتیں سُننے کا عادی رہا ہے۔ انچارج کو بھی قرار نہیں کی پیالی ختم کر کے اُس نے تجسس اور طنز کے ملے جلے سے کہا "یہاں تمھارے نشانے اور بل کی بڑی دھوم مچی ہے

"کھل کے بات کرو صاحب!" تجمل نے کچھ توقف کہا "اپنے کو تنگ ہے، آپ اپنی تعریف کر رہے ہو یا برا لگا ہے۔"

"نہیں نہیں" انچارج کا لہجہ مدافعانہ ہو گیا "ہم اچھے کی دل سے قدر کرتے ہیں کیا۔ کیا بندوق میں بھی تمھارا نشانہ

"نشانہ تو صاحب دیدے کا ہوتا ہے۔"

"تم نے بڑی مناسب بات کہی۔" وہ بے اختیار بولا۔

"ہم اپنے جانے میں سب ٹھیک ہی بول رہے ہیں پر سمجھنے کو کوئی آپ جیسا ہو۔" تجمل نے ہنس کے کہا۔

مگر انچارج نے یہ جملہ خوش دلی سے نہیں سُنا تھا، اُس کی پیشانی پر بل پڑ گئیں۔ جواب میں وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر رُک گیا اور سر ہلاتے ہوئے معنی خیز انداز میں بولا "ہم خوب سمجھ رہے ہیں اور تمھیں کہ نشانہ اپنا بھی کم ہی چوکتا ہے۔"

"کانٹے میں بل پڑ جانے پر چوکتا ہوگا، تولنے میں تیزی سے بھی لوٹ کے بھی آ جاتا ہے صاحب!"

"ہاں ہاں۔" وہ اٹکتے ہوئے بولا "ہمیں اندازہ ہے۔" اُس کی آواز میں لرزش تھی مگر اُس نے جلد ہی خود پر قابو پا لیا اور کہنے لگا "ہمیں یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ تم ہمارے لیے ایک ہو۔"

"ہم زبان کھولیں گے تو آپ کہو گے آپ کا بولا لوٹا دیا۔ پر صاحب! اپنے کو بھی آپ جیسا نہیں مِلا۔"

"یہ، یہ تم بڑی حد تک درست کہہ رہے ہو۔" اُس نے تحمل سے "بہتر ہے تم سے ایک بات کی وضاحت کر دیں۔ ہمارے اختیارات وردی اور عہدے سے مت جانچنا، وہ اس سے کہیں سوا ہیں۔ چاہیں تو تمھیں کوئی وجہ بتائے بغیر اسی لمحے یہاں سے لے جا سکتے ہیں۔"

"آپ ایسا کر سکتے ہو پر آپ کرو گے نہیں۔"

"کیوں؟"

"یہ آپ اپنے آپ سے پوچھو۔"

"نہیں، ہم تم سے پوچھنا چاہیں گے؟"

"اپنے کو پتہ ہے، آپ دھوپ دکھا کے سر کا زنگ نہیں ہٹا رہے ہو۔" تجمل نے کہا "آپ کو صرف ہم ہی کو اپنا تماشا نہیں دکھانا بلکہ بھرم رکھنا ہے، دوسروں سے کچھ زیادہ ہی۔"

"ہونہہ۔" اُس نے لمبی سانس کھینچی اور جیسے کہیں کھو گیا۔ پھر یکایک تمتماتی آواز میں بولا "آقا کہاں ہے؟" تجمل کو جواب دینے میں دیر لگی۔ انچارج پہلے سے زیادہ اُونچی آواز میں بولا "تم نے سُنا نہیں، ہم کیا پوچھتے ہیں؟"

"سُن لیا صاحب! سوچتے ہیں کیا جواب دیں، ادھر ہم کو سامنے رکھ کے آپ بولتے ہو کہ آقا کدھر ہے۔"

"یہ ہمارے سوال کا جواب نہیں ہے۔"

"تو ہم کیا کریں صاحب!" تجمل کی آواز جھنجلانے لگی تھی۔

"تم، تم نہیں جانتے!"

"ایسا وہ آپ کا سگا لگتا ہے تو تھانے میں رپٹ کرو صاحب!"

"تم نہیں جانتے۔" انچارج نے دوبارہ بھینچی ہوئی آواز میں کہا۔

"جانتے بھی ہیں تو سمجھو ابھی بتانا ضروری نہیں سمجھتے۔"

"تمھارا یہ طور تمھارے لیے بہت مہلک ہو سکتا ہے۔"

"بہت دِنوں سے اڈے پر بیٹھتے ہیں صاحب! آپ کی شاید پولیس کی عمر بھی اتنی نہ ہو۔"

"تم کیا جتانا چاہتے ہو؟" وہ تلخی سے بولا۔

"آئے تو اِدھر آپ ہو، اپنے کو کیا جتانا۔"

"تمھاری آواز تمھارے قد سے بہت اُونچی ہے، اس میں ہمیں دھمکی کی آمیزش محسوس ہو رہی ہے یا تم ہمارے اعصاب کی کوئی آزمائش کر رہے ہو مگر یہ اچھا نہیں ہے۔"

"سیدھی بولی آپ کو کڑوی لگتی ہے تو یہی ہو سکتا ہے، ہم زبان بند کر لیں۔ اپنا اچھا بُرا ہم آپ سے زیادہ سمجھتے ہوں گے صاحب! آپ کی اپنی کوئی خاندانی دشمنی نہیں ہے جس کو فلیتہ دکھا کے ہم چھاتی ٹھنڈی کریں، آپ کو کچھ بُرا لگا ہے تو سر سے جھٹک دو۔ ہم نے آگے والوں سے یہی سُنا ہے کہ حاکم کو پولیس کی اُونچ نیچ پر نہیں، بولے ہوئے پر دھیان دینا چاہیے، کالے اُجلے، کھرے کھوٹے کو کھوجنا چاہیے، حاکم تو ترازو ہوتا ہے صاحب! اُس کو دکان دار اور گاہک کی تو تکار سے فرق نہیں پڑتا، چیز اُنیس بیس ہونے سے ہی پڑتا ہے۔ آپ اِدھر صرف علاقے کے انچارج کے روپ میں آتے تو ہم آپ کو باہر سے سلام کر کے لوٹا دیتے۔ آپ کو کچھ جان کے ہی ہم نے زبان کھولی تھی۔ قاعدے قانون کا چکر آپ لوگوں کے ساتھ رہتے رہتے بُرا بھلا اپنی سمجھ میں آ گیا ہے اور آپ اختیار کی بات کرتے ہو تو ہم کو یقین ہے آٹھواں خون آپ کو معاف نہیں ہوگا۔"

کانتے سر جھکائے ہونٹ کاٹ رہا تھا، درمیان میں وہ تجمل کے پاس جاتے جاتے اُسے روکتے روکتے رہ گیا تھا۔ اُس کی توقع کے خلاف انچارج اُٹھ جانے اور سپاہیوں کو کوئی اشارہ کرنے کے بجائے سکڑی ہوئی آنکھوں سے تجمل کو گھورتا رہا۔ بہت دیر بعد کانتے نے سر اُٹھایا تو انچارج کا مضطرب اور منتشر چہرہ اُس کے سامنے تھا۔ اُسی لمحے کانتے کے اندھیرے دل و دماغ میں روشنی سی پھوٹ پڑی۔ اتنی دیر میں پہلی بار اُس کی سمجھ میں آیا کہ یہ سب کچھ بے وجہ نہیں ہے۔ تجمل کی لگام اُس کے ہاتھ ہی میں ہے۔ کانتے کے جی میں آیا کہ وہ بڑھ کے اُستاد

کا منہ چوم لے، اُسے سینے میں بھینچ لے۔ پھر اس سے پہلے کہ انچارج کچھ کہتا، تجّھل نے اٹکتے لہجے میں کہا: "چکنی بولی ہم کو اتنی اچھی نہیں آتی پر جانتے ضرور ہیں۔ بولیں تو آپ کا گھاٹا زیادہ، اپنا کم ہے۔ آپ سوچو، ایسے آپ کو آگے کی راڑ، رگڑ گھِس کی کتنی بچت ہے۔ پردہ کرنے پر آئیں تو قسم سے صاحب! اپنے رنگ بھاؤ کی جانکاری میں یہ آدھا بھی سفید ہو جائے گا پر اپنا مطلب بھی یہی ہے کہ آپ اڈّے پر بیٹھنے والے پہلے لوگوں کے چوکھٹے میں اپنے کو مت رکھو اور۔۔۔" تجّھل نے منہ بنا کے کہا: "اور اُس حرام کے جنے آکا کو بھول جاؤ، اب وہ اِدھر سے چلا گیا ہے۔ اڈّے سے جانے والا پلٹ کے نہیں آتا، آتا ہے تو بچا کھچا داؤ پر لگانے کے خیال سے ہی آتا ہے اور اُس کو یہ سمیٹنے میں ابھی بہت دیر لگے گی۔ اڈّوں کی یہی ریت ہے، کوئی اُس کا رونے والا آپ کے پاس آئے تو تھانے کے کھاتے میں درج کروا دینا اور زیادہ فیل مچائے تو ہم کو بُلا کے تسلّی کر لینا پر جیسا ہم نے بولا ہے، کوئی حکم کرنے سے پہلے اچھی طرح تجّھل ملا کے دیکھ لینا۔" تجّھل خاموش ہو گیا۔

خاصی دیر بعد انچارج کے بھاری جسم میں جنبش ہوئی، وہ بوجھل آواز میں بولا: "چپ کیوں ہو گئے؟"

"اپنے کو اتنا ہی بولنا تھا۔ آپ بتاؤ، آتے وقت آپ کہہ رہے تھے، ہم سے کچھ بات کرنا ہے؟"

"اب شاید اس کی ضرورت نہیں رہی۔"

"آپ کی مرضی صاحب!" تجّھل نے کسمساتے ہوئے کہا۔

"نہ جانے کیوں کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے تمھیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔" انچارج متجسّس لہجے میں بولا۔

"اپنے کو بھی کچھ لگتا ہے پر شاید ایسا نہیں ہے، اِدھر سپنے دیکھے بھی اپنے کو دن ہو گئے۔"

"ہونہہ۔" اُس نے ہنکاری بھری۔ "بہرحال تم سے مل کے خوشی ہوئی۔" اُس کی آواز میں طنز صاف نمایاں تھا۔ "ہم نے سب کچھ ایک تجربے کے طور پر سُنا ہے اور ہم اسے اسی طرح برتنے کی کوشش کریں گے۔ ہر تجربے سے ہمیں کسی مہم کی لذّت ملتی ہے۔ یقیناً تم نے ہمیں اپنے آپ سے شناسا کرانے میں فراخ دلی کا مظاہرہ کیا ہے جس کا شکریہ ہم پر واجب ہے، اتنا کچھ سمجھنے بوجھنے میں بے شک ہمیں دیر لگتی۔ آیندہ ہمیں اِس سے بہت مدد ملے گی۔ تمھاری خواہش کے بموجب ہماری کوشش ہو گی کہ تم سے تمھارے مراتب کے تناسب سے تعلق قائم رہے۔ اُمید ہے تمھیں اس سلسلے میں ہم سے کوئی شکایت نہ ہو گی۔"

"آپ کا شکریہ صاحب!" تجّھل نے جیسے اُس کا طنز محسوس ہی نہیں کیا۔

انچارج اچانک چوکی سے اُٹھ گیا۔ کالے داوانے ... ہوئے انداز میں اُس سے کچھ دیر اور بیٹھنے کی درخواست کر... مگر تجّھل کی جانب دیکھ کے ٹھٹھر گیا۔ انچارج کا چہرہ تمتما... تجّھل اُس کے ساتھ دروازے تک گیا۔ ابھی انچارج نے ... عبور نہیں کیا تھا کہ رُک گیا اور تجّھل کی طرف رُخ کر کے بو... جلد ملاقات ہو۔"

"سب آپ پر ہے۔" تجّھل نے کہا۔ "پر شاید جلدی ..."

"ہاں صرف ہمی پر نہیں، یہ تم پر بھی منحصر ہے۔"

"آپ نے مناسب سمجھا تو ویسے سلام کرنے اُدھر ضرور ... صاحب! آتے رہا کریں گے۔"

"بشرطیکہ ارادہ بھی اسی خیر کا ہو۔"

"ایسا ہی ہو گا صاحب!"

"ہمیں خوشی ہو گی۔" وہ تجّھل کے عین مقابل کھڑا تھا ... کے درمیان ایک فٹ سے زیادہ کی دوری نہیں ہو گی۔ "کم صورتِ حال سے ہمیں یقیناً زیادہ خوشی ہو گی اور روادار ... ہمیں بھی پیچھے نہیں پاؤ گے مگر فاصلوں کا بُعد ہے۔ کبھی ... نہیں ہے اور جس طرح ہوتا رہا ہے یا ہوتا ہے، اُس کے ... نہیں ہیں۔"

"اتنا اندازہ ہم بھی کر سکتے ہیں۔"

"بہرحال۔" وہ ٹھنڈی سانس بھر کے بولا۔ "خود کو ... میں رکھنا۔ اور یہ تلقین ہماری طرف سے اپنے لیے مثبت ... کی پہل سمجھنا۔ پہلی رعایت یوں بھی ہمارا اصول ہے۔ ہم ... اور اپنے ارادے کا اظہار کیے بغیر کبھی ہتھیار نہیں اُٹھاتے ... ایک مرتبہ ہم سے ایک بے خبر جانور پر گولی چل گئی تھی، بے خبر ... بھی کیا تھی، بس نگاہ چوک گئی مگر کیا بتائیں، ندامت میں ... راتیں نیند نہیں آئی۔ خیر وہ قصّہ دوسرا ہے۔" وہ جیسے خود کو ... ہوئے بولا۔ "تم سے کہنا ہے کہ یہاں اڈّے کی تبدیلی کی خبر ... علاقے تک محدود نہیں رہی ہے۔ حیدر آباد آنے کے بعد ... انچارج نادر علی کو پہلی بار اُوپر سے بازار کے اڈّے کی نگرانی ... کی گئی ہے۔ نادر علی کے لیے ایسی کوئی ہدایت زرّین کے منزل ... حکّامِ بالا کو غور کرنا چاہیے تھا کہ اُنھوں نے کس مقصد ... ریاست میں ہمیں بُلایا ہے اور کس غرض سے بطورِ خاص ... میں تعینات کیا ہے۔ ہم سے علاقے کی صورتِ حال پوچھی ...

... گفتگو کیے بغیر یہ ہدایت بھیجنے سے مراد یہی ہو سکتی ہے کہ کہیں ہم ... کے مرتکب تو نہیں ہو رہے ہیں، ہماری بینائی اور سماعت ... پر چربی تو نہیں چڑھ گئی ہے۔ حکّامِ بالا کا یہ رویّہ ہمارے لیے نہایت ... کا سبب ہے، ہم پر اُن کے اعتماد کی کمی کا مظہر ہے مگر ڈسپلن ... جگہ ہے۔ حکّامِ بالا کو کوئی بھی ہدایت بھیجنے کا اختیار ہے۔ شکر ... ہے کہ یہ ہدایت ہے، حکم نہیں۔ تجویز ہے، فیصلہ نہیں ورنہ ہمارے لیے یہاں ریاست میں ٹھہرنا مشکل ہو جاتا۔ اس کے علاوہ ہم سمجھتے ہیں کہ حکّام کی تشویش و اضطراب کا کوئی اور محرّک بھی ہو سکتا ہے، کچھ لوگوں نے جو بازار کے علاقے میں آکا کو برقرار دیکھنے کے خواہش مند تھے، اُنھوں نے اُن کی توجہ اس جانب مبذول کرائی ہو گی۔ بہر صورت اس سے تمھیں حالات کی سنگینی کا اندازہ ہو جانا چاہیے۔ ہماری اطلاعات کے مطابق ریاست کے کئی با اثر اور مقتدر لوگوں سے آکا کے مراسم تھے۔" انچارج کی آواز میں تنبیہ کے ساتھ ساتھ سنجیدگی اور متانت بھی تھی۔ "سمجھ رہے ہو؟" اُس نے تجّھل کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔

"ہاں صاحب!" تجّھل چونک کے بولا۔ "سمجھ رہے ہیں پر آپ نے اتنا بولا ہے تو ہم بھی کچھ۔۔۔۔"

اُس نے تجّھل کی بات پوری ہونے سے پہلے کہا: "ہم نے اپنے متعلق تمھیں سب کچھ بتا دیا ہے اور تمھاری طرف سے ہمیں مزید کسی وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ چاروں طرف دیکھ کے کوئی قدم اُٹھانا اور خیال رکھنا کہ علاقے کا انچارج نادر علی خاں ہے، نادر علی اپنے لیے کوئی۔۔۔۔"

"آپ چین سے اُدھر جا کے بیٹھو۔" تجّھل نے تیزی سے کہا: "کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو آکا کو اِدھر دیکھنا نہیں چاہتے، کرسی اور ... میں وہ آکا کے رکھوالوں سے اُونچے بھی ہو سکتے ہیں پر ہم بھی کسی ... پر یہاں آ کے بیٹھے ہوں گے۔ اپنے کو پتہ ہے یہ جگہ کون سی ہے۔ رہی ہدایت کی بات، تو کل آپ کو اس کے اُلٹ بھی آ سکتی ہے۔"

انچارج کا جسم ایک تانیے کے لیے بل کھا گیا۔

کانتے بتا رہا تھا کہ چلتے وقت انچارج کا چہرہ دھواں دھواں ... اُس کی نگاہوں کی کاٹ کانتے نے اپنے رگ و پے میں محسوس ... کی مگر اس اذیت میں کیسا سُکھ چھپا تھا، یہ کانتے ہی جانتا ... اطمینان ہو چلا تھا کہ دو تین دن ہی کی نہیں، کوئی اور حادثہ ... نہ ہوا تو آیندہ کئی دن کی مہلت بھی اُنھیں مل سکتی ہے۔ سرِ دست یہی ایک بہتر صورت تھی کہ انچارج کے سر میں گرہیں ڈال دی جائیں تاکہ کوئی فیصلہ کرتے ہوئے امکانات و نتائج اُس کے پیشِ نظر رہیں۔ نتائج کے کسی تعیّن کے لیے اُسے کشمکش و تردّد کے ایک مرحلے سے نمٹنا لازم تھا اور اُنھیں بہت زیادہ وقت درکار نہیں تھا، صرف اتنا کہ خانم شہر میں آ جائے۔ اُس کی آمد کی اطلاع آ ہی جانا تھی۔ نادر علی کے بجائے کوئی اور شخص ہوتا تو شاید تجّھل کو خود پر اتنا جبر نہ کرنا پڑتا۔

کانتے، شامو، جمّو اور ننگو کے لیے وہ ایک سبک اور نرم شام تھی، سبھی کو ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی بوجھ سر سے اُتر گیا ہو، جیسے اچانک ہوا بدل گئی ہو۔ انچارج کے جاتے ہی اڈّے کے آدمی تجّھل کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ اُنھوں نے نہ تجّھل سے کچھ پوچھا، نہ تجّھل نے اُن سے کچھ کہا مگر تجّھل کا کھُلا کھُلا جسم دیکھ کے اُن کے اضطرار کو خود قرار آ گیا۔

رات کا کھانا کھاتے کھاتے گیارہ بج گئے۔ زورا نہیں آیا۔ وقت کی طرف سے کچھ رعایت مِل جانے کی یقین دہانی کے باوجود کانتے کی بے کلی بڑھتی جا رہی تھی۔ زورا کے انتظار میں بار بار اُس کی نگاہیں دروازے کی طرف اُٹھتی تھیں، رہ رہ کے ایک اندیشہ اُسے ستا رہا تھا اور وہ یہ کہ اگر خانم حیدر آباد آنے پر آمادہ نہ ہوئی تو کیا ہو گا، اُسے انکار تو نہیں کرنا چاہیے کیونکہ تار تجّھل کے نام سے گیا ہے مگر وہ تو حیدر آباد کا نام ہی سُن کے لرز گئی ہو گی، اس شہر میں واپسی پر آمادہ ہو جانا اُس کے لیے ایسا آسان نہیں ہے۔ تار دیکھ کے اُس کے دل میں کیسے کیسے ہول اُٹھے ہوں گے۔ زرّیں کی حویلی اُس کے لیے کسی جنّت سے کم نہیں تھی۔ کانتے نے جب اُسے پہلی بار دیکھا تھا، یہی سمجھا تھا کہ وہ زرّیں کی کوئی عزیزہ ہے۔ وہ زرّیں کی بڑی بہن ہی معلوم ہوتی تھی۔ کانتے نے اُسے کسی ملکہ کے مانند حویلی میں راج کرتے دیکھا تھا۔ اُس کے آنے کے بعد کانتے کو محسوس ہوا تھا کہ حویلی میں اُس کی کتنی کمی تھی۔ کانتے کے لیے یہ انکشاف بہت حیران کُن تھا کہ اُس ملکہ کا تعلق بازار سے تھا۔

خانم کو اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا بھی تو کوئی حق ہے۔ وہ یہاں واپسی پر خودکشی کو ترجیح دے گی۔ تار میں اُسے پوری تفصیل نہیں لکھی جا سکتی تھی کہ اُس کا آنا کس قدر ضروری ہے۔ کانتے کو یہی دھڑکا لگا ہوا تھا مگر رات کے بارہ بجے زورا اڈّے پر نمودار ہو گیا۔ کانتے نے اُسے تجّھل کے قریب جانے سے پہلے بیچ میں روک لیا۔ زورا کے پاس خانم کی کوئی اطلاع نہیں تھی البتہ اُس نے بتایا کہ آج وہ ہوٹل کے بجائے حویلی سے آ رہا ہے، دوپہر کو نواب حشمت

جنگ کی موٹر انھیں لینے آئی تھی۔ اُن کے حویلی پہنچ جانے کے تھوڑی دیر بعد نواب حشمت جنگ بھی آگیا۔ اُس کے ساتھ کوئی عہدے دار بھی تھا، دونوں کی موجودگی میں اباجان اور حویلی کے بوڑھے مالک نے کاغذات پر دستخط کیے۔ اباجان نے ساری رقم اُسی وقت ادا کردی۔ انھوں نے بوڑھے نواب کو کچھ دن وہیں ٹھیرے رہنے کی پیش کش کی لیکن وہ نہ مانا، حویلی کی تمام چابیاں اُن کی تحویل میں دے کے رخصت ہوگیا۔ نواب حشمت جنگ کے ہاں سے اُن تینوں کے لیے رات کا کھانا آیا تھا۔

شام سے اب تک زورا اور مادی حویلی کے مختلف کمروں کا بلکہ وہاں کی ایک ایک چیز کا جائزہ لیتے رہے، حویلی کے ملازمین اشارے کے منتظر، اُن کے آگے پیچھے گھومتے رہے۔ زورا کے کہنے کے مطابق اباجان نے حویلی کے لیے ایک خطیر رقم ادا کی تھی مگر حویلی کی شان و شوکت اور اُس کی آرائش و زیبائش کے مقابلے میں یہ رقم کچھ بھی نہیں تھی۔ اباجان کو احساس تھا کہ نواب کی گاڑی کسی وقت بھی انھیں لینے آسکتی ہے، اُن سب کے پاس نہایت مختصر سامان تھا، اباجان نے صبح بازار کھلنے پر سوٹ کیس اور دوسری چیزیں خرید لی تھیں تاکہ نواب کے ذہن میں اُن کی متعین حیثیت قائم رہے۔ وہ ہوٹل میں کہہ کے آئے تھے کہ اُن کا کوئی خط یا تار آنے کی صورت میں محفوظ کرلیا جائے یا ہوسکے تو حویلی کے پتے پر پہنچا دیا جائے۔ نواب حشمت جنگ کی آمد و رفت کی وجہ سے ہوٹل کا مینجر اور عملہ اُن کے ساتھ نہایت حسن سلوک سے پیش آنے لگا تھا۔ مینجر نے وعدہ کیا کہ وہ فی الفور اباجان کو مطلع کردے گا۔ اس کے باوجود زورا رات کو اوّل وقت ہوٹل جا کے خود تصدیق کر آیا تھا، خانم کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔

بجھل کو بھی کانتے کی طرح یہی اُمید تھی کہ زورا اب کے کوئی خبر لے کے ہی لوٹے گا۔ زورا کے لٹکے ہوئے ہونٹ دیکھ کے بجھل کے چہرے پر لکیریں پڑگئی تھیں تاہم اُس نے زورا کو ہدایت کی کہ وہ صبح منہ اندھیرے ننگو کے ساتھ حویلی چلا جائے اور اب اُسی وقت وہاں سے لوٹے جب اُس کے پاس خانم کے سلسلے میں کوئی خبر ہو یا کوئی اور ضروری بات ہو۔ بجھل نے اباجان کو کہلوایا کہ وہ ابھی نواب حشمت جنگ سے کوئی تذکرہ نہ کریں، خانم کا انتظار کرتے رہیں۔

زورا سورج نکلنے سے پہلے ننگو کو ساتھ لے کے اڈّے سے چلا گیا تھا۔

پھر وہ دن بھر نہیں آیا، رات کو بھی نہیں۔ پانچواں دن تھا۔ روز کی طرح دن بھر اڈّے پر بھیڑ جمی رہی۔ یہ اجتماع اگر ایک طرف بجھل کے ایما کے مطابق تھا تو دوسری طرف اُن کی اپنی بے چینی بھی تھی۔ بہت سوں کو معلوم ہوگیا تھا کہ نئے دادا کو اپنے دو آدمیوں کا انتظار ہے اور جب تک وہ نہیں آجائیں گے، نیا دادا اڈّا سنبھالنے کی رسم انجام نہیں دے گا۔ مگر وہ لوگ کب آئیں گے؟ وہ کہاں ہیں؟ سنبھالنے کے بعد بھی تو اُن کا انتظار کیا جاسکتا ہے؟ کیوں موجود ہے؟ اڈّے پر اُس کے دوبارہ نمودار ہونے کا سوال بھی اُن کے ذہن میں جاگزیں ہوا ہوگا کہ کہیں وہی پھر بے نگاہ نہیں تھے کہ بجھل کے جسم کا تناؤ محسوس نہ کرسکیں۔ انھوں نے زورا کی رات کو اڈّے پر آمد اور سارے دن گم محسوس کی ہو۔ انچارج سے بجھل کی گفتگو کے دوران اڈّے پر موجود تھے۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں سے بجھل اور انچارج ہونے والی باتوں کی جانے کس کس طور سے تشریح کی ہو۔ چوکی پر گو بجھل ہی جا بیٹھا تھا مگر وہ موجودہ صورتِ حال طرح مطمئن معلوم نہیں ہوتے تھے۔ اِس عرصے میں کانتے سے کئی آدمی اچھی طرح گھل مل چکے تھے، ہرچند کہ انھوں نے تشویش ظاہر نہیں کی تھی لیکن کانتے، جمرو اور شامو اُن کی سرگوشیوں سے بے خبر نہیں تھے۔

دیر کسی طرح نہیں ہونی چاہیے تھی۔ وہ دن جیسا کہ انھوں نے کانٹوں پر لوٹ کے گزارا تھا۔ رات کو وہ تینوں پر بھی نہیں گئے تاکہ زورا آئے تو سامنے ہی آئے۔ رات کو آنے کی توقع زیادہ تھی مگر وہ نہیں آیا۔ تینوں کی نظریں بار کی جانب لپکتی تھیں۔ وہ ایک دوسرے سے کچھ کہہ سن کے دل ہلکا کرلیتے تھے۔ استاد تو نہ کسی سے اِس سلسلے میں بات کرتا اُٹھ کے ایک پہر کمر ٹکانے اڈّے کے کسی کمرے میں جاتا۔

رات اڈّے کے چند آدمیوں کے اصرار پر وہ تینوں بازار کی گئے۔ گلیوں میں جہاں جہاں سے وہ گزرے، ہلچل سی مچ گئی۔ کے لوگ انھیں اپنے ہاں بلانے آئے مگر وہ بس گلیوں میں رہے اور علاقے کا ایک چکر بھی پورا نہیں کیا تھا کہ واپس آگئے۔ بجھل کا خیال تھا کہ وہ اڈّے پر اکیلا رہ گیا ہوگا۔ بجھل کو دیکھ اُن کا دل اُمڈنے لگتا تھا لو بجھل ہی تھا جسے دیکھ کے اُن میں دوبارہ کونپلیں پھوٹنے لگتی تھیں۔

چھٹے دن دوپہر کو کھانے کے بعد کانتے نے ہمت کی بجھل کے گرد وہ تینوں تھے۔ کانتے نے جھجکتے ہوئے اُس سے زورا نہیں آیا؟"

"ہاں رے نہیں آیا۔" بجھل نے بھاری آواز میں جواب

"اُس کو آنا چاہیے تھا استاد!" وہ بے تابی سے بولا۔

"آجائے گا رے۔"

اور نا دا اگر تا گر اُس کے آنے میں اور دیری ہوگئی؟ اگر وہ۔"

نے بکتی زبان میں کہا۔ "اُدھر آپی خانم بیمار بھی ہوسکتی ہیں۔ اُس نے کہا کہ حیدرآباد کا نام سُن کے خانم تو بہت گھبرا گئی ہوگی۔"

"ابھی دیکھتے ہیں رے!" بجھل نے تنک کے کہا۔

کانتے سے یہ بات نہ پوچھی گئی کہ دوسری صورت میں بجھل نے کون سی تدبیر ہے۔ وہ اُس سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اور پریشان نہ کرنے کے خیال سے ٹھٹک کے رہ گیا۔

انچارج کے جانے کے بعد سے اب تک علاقے کے تھانے کی کوئی ہرکارہ نہیں آیا تھا مگر پولیس کی جانب سے وقت کی بہت چھوٹ کا کانتے کو ایسا اعتبار نہیں رہا تھا۔ یہ رعایت کا اپنا گمان تھی۔ پولیس کسی بھی لمحے اڈّے کا رُخ کرسکتی تھی۔ آنے لیے اسے اجازت کی ضرورت نہیں ہے، اُس پر تو دروازہ کھٹ نے کی رسم کی بھی قید نہیں ہے۔

کل سہ پہر کا وقت تھا۔ انھوں نے زورا کو دروازے میں مڑتے دیکھا۔ عمارت میں لوگ تھے، اِس کے باوجود زورا کو دیکھ کے بے اختیار اُٹھ گئے۔ انھوں نے دُور سے زورا کے چہرے کی سرخی آنکھوں کی دمکتی روشنی بھانپ لی تھی۔ قریب آکے زورا نے انھیں لرزتی آواز میں بتایا کہ خانم کل حیدرآباد پہنچ رہی ہے۔ انھیں ایسا لگا زورا اُن سے مذاق کر رہا ہو۔ زورا کے بیان کے مطابق دوپہر وہ پہنچا تھا، وہاں فیض آباد سے آیا ہوا تار ملا۔ ہوٹل کا مینجر تار پہنچانے کا انتظام کر رہا تھا۔ زورا تار لے کے سیدھا حویلی گیا۔ پڑھتے ہی اباجان نے اُسے فوراً یہاں کے لیے روانہ کردیا۔ بجھل نے اور واپس نہیں بھیجا۔

❀

دھوپ ہر سو پھیل چکی تھی۔

کانتے نے ایک جھرجھری لی اور بازو جھٹکتے ہوئے بولا۔ "ایک کال رہ گیا تھا لاڈلے! اپنے کو اُمید تھی کہ آج کے دن تیرا اور زورا کا درشن ضرور ہو جائے گا پر اُوپر والے کو اپنا پہلے خیال آگیا۔"

میں گُنگ بیٹھا اُسے دیکھتا رہا۔

"کیا ہوگیا تجھ کو؟" وہ مجھے چٹکی بھرتے ہوئے بولا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے گھُٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"بولتا کیوں نہیں ہے؟"

"کیا بولوں کانتے بھائی؟"

"اُر بتا، تو نے اُدھر کیسے کاٹی؟"

"میں کانتے بھائی!" میں نے بے تابانہ اُس کا ہاتھ سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "اب اُسے دہرانے سے کیا حاصل۔" میری آواز بھرّانے لگی تھی۔

"جانے دے۔" اُس نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور مجھے دبوچ لیا۔ پھر میں نے خود کو بہت روکنا چاہا مگر مجھے بھی نہ جانے کیا ہوا، میری سسکیاں نکل پڑیں۔ "ہائیں لاڈلے! لاڈلے!" وہ بے قراری سے بولا۔ "یہ کیا، یہ کیا، اب تو سب لوٹ گیا ہے جانی! کوئی نیا تھوڑی تھا اُدھر سپاہیوں سے زیادہ تو نہیں تھا اور بمبئی میں کرشنا جی... وہ سب بھول گیا کیا؟ اپنے کو پتہ ہے اُدھر نواب نے تم لوگوں کے ساتھ کوئی آدمی پتا نہیں کیا ہوگا۔ قسم سے اُستاد سامنے پڑھتا تھا۔ میں نے اُس کو دیکھا ہے، جان پڑتا ہے، وہ وہی حرام کا جناخان تھا جو اُدھر حویلی میں چوہے کی طرح دبکا کھڑا تھا، دن باقی تھے سالے کے۔ تجھ کو کیسے بولوں، ماں قسم اِدھر ایک پل بھی کسی کو چین نہیں تھا۔ تجھ کو پتہ ہے اپنے کو زیادہ ہیرا پھیری نہیں آتی۔ اُستاد نے سالی بہت خواری کر رکھی تھی ورنہ تیرا بھائی حویلی کی دیوار اُتر کے ہی دم لیتا۔ اِدھر ایک ہی بات کا دھڑکا لگا تھا، خانم کے آنے کے بعد نواب پھر کہیں ڈھیٹ پنا نہ کرے۔ اپنے کو اُسی کا انتظار تھا۔ کل یا تو تو ملتا یا پھر کوئی کسی کو نہ ملتا۔ اِس سے زیادہ اپنے بس کا نہیں تھا، پھر شاید اپنے کو ہی اُستاد کے آگے آنا پڑتا۔"

کانتے جانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔ وہ بتا رہا تھا کہ انھیں نہ نیند آتی تھی، نہ کچھ کھایا جاتا تھا۔ اُن کے جسموں پر ہر لمحے جیسے چیونٹیاں رینگتی رہتی تھیں۔ زورا، جمرو اور شامو نے مجھے گھیر لیا۔ وہ سب میرے ہاتھ، میرے گال چوم رہے تھے۔ جتنا وہ مجھے بہلاتے تھے، اُتنی ہی میرے سینے میں جلن بڑھتی جاتی تھی۔

"چھوڑ دو اس کو۔" کانتے انھیں میرے پاس سے دھکیلتے ہوئے بولا اور مجھ سے کہنے لگا۔ "رولے پھر، جی بھر کے رولے۔" اُس کی آواز ڈھل رہی تھی۔ "مجھ کو یہ سب کچھ تجھ سے نہیں بولنا چاہیے تھا پر تو نے ہی تو....."

"کانتے بھائی!" میں نے سسکتے ہوئے کہا۔ "مجھے معاف کردو۔"

"کیا! کیا بول رہا ہے تو؟" وہ وحشت سے بولا۔

"میں نے بہت، میں نے تم سب کو....."

اُس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "آگے سنبھل کے بولنا۔" اُس نے بلکتی آواز میں کہا اور میرے سینے سے اپنا چہرہ رگڑنے لگا۔ "بولے تو ابھی چھاتی کاٹ کے دکھائیں تجھ کو؟"

زورا نے مجھے اُس سے چھین لیا اور چارپائی سے کھڑا ہوگیا۔ میری آنکھوں سے کوئی سوتا پھوٹ پڑا تھا۔ زورا مجھے گلے لگائے

لمحوں خاموش کھڑا رہا۔ "ابھی نیچے چلو راجا اُستاد! دن سالا اوپر چڑھ آیلا ہے، اپن لوگ کو ابھی نیچے جانے کا ہے۔ اُودر سب لوگ کب سے جاگا پڑا ہے۔"

جہاں ہم چاروں بیٹھے تھے، وہاں ہر طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ زورا غلط نہیں کہہ رہا تھا، کب سے نیچے سے آوازیں آ رہی تھیں۔ جمرُو نے اپنے دامن سے میرا چہرہ پونچھا۔ خود اُن سب کے چہرے بھیگے ہُوئے تھے۔ میں نے قدم آگے بڑھایا تو مجھے چکر سا آنے لگا۔

نیچے چوکی پر بجھل اور پیرو کے ساتھ بھورے دادا موجود تھا۔ تینوں صاف کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ پیرو خاص طور سے بہت اُجلا اُجلا نظر آ رہا تھا، بال پیچھے کی طرف کاڑھے ہوئے، بیچ میں مانگ نکلی ہوئی۔ مجھے دیکھ کے وہ اُچھل پڑا۔ میری ڈوبتی نظریں بجھل کی طرف اُٹھیں تو اُس کے ہونٹوں پر لرزش سی طاری ہوئی اور اُس نے مجھے چوکی پر اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ مجھے پیروں پر اپنا جسم بوجھ لگ رہا تھا۔ وہیں چوکی پر ہم چاروں کے لیے ناشتہ لگا دیا گیا۔ زورا کے کہنے کے مطابق گاڑی گیارہ بجے آنی تھی۔ اُس وقت دس سے کم نہیں ہوں گے۔ کانتے نے سرگوشی میں بجھل کو وقت کا احساس دلانا چاہا تو اُس نے کانتے کو جھڑک دیا۔ "بیٹھا رہ۔"

میں یہاں آ تو گیا تھا لیکن مجھ سے ایک لمحے کے لیے بھی یہاں بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔ کانتے اور زورا دھیمے لہجے میں سب کچھ بتلاتے رہے تھے لیکن شاید آوازوں کا اصل شور تو اُن کی بازگشت میں ہوتا ہے، لفظ لفظ جیسے میرے جسم میں پیوست ہو گیا تھا۔ میری رگ رگ میں گونج رہا تھا۔ میرے جی میں آتا تھا کہ یہاں سے بھاگ کے کہیں چھپ جاؤں، کسی کمرے میں بند ہو جاؤں اور کسی کو اپنی شکل نہ دکھاؤں۔ کانتے کہہ رہا تھا کہ صرف ایک دن کا بل رہ گیا تھا بلکہ ایک رات کا۔ ایک رات کے لیے میں اور پیرو تحمل کر لیتے تو ہمیں آج مل ہی جانا تھا مگر اچھا ہوا کہ ہم نے وہاں سے نکلنے کا ارادہ کر لیا۔ کانتے کا اندیشہ اگر سچ نکلتا تو جانے پھر کیا ہوتا، خانم کے آنے کے بعد اگر واقعی نواب انکار کر دیتا تو؟ اُسے ہم سے کوئی غرض نہیں تھی لیکن ہمارے بارے میں ایک مرتبہ لاعلمی کا اظہار کرنے کے بعد اگر اُس کے دل میں اپنے قول پر جمے رہنے کی کوئی ٹیڑھ آ جاتی تو؟ ہم سے اُس نے کوئی رعایت نہیں برتی تھی سو ہمیں آزاد کر دینے کا فیصلہ کرنا اُس کے لیے اتنا آسان نہیں تھا۔ بہت سے دُور دراز کے خدشے اُس کے ذہن میں گھر کر سکتے تھے چاہے وہ کتنے ہی بے سر و پا ہوتے۔ اگر نواب کے سر میں سما جاتا کہ ہماری رہائی سے زیادہ ہماری قید یا ہمیں ہمیشہ کے لیے خاموش کر دینے میں بہتری ہے تو وہ کوئی پیش و پس نہ کرتا۔

کہتے ہیں، نوابوں کو اپنے فیصلوں پر نظرِ ثانی کرنے کی عادت نہیں... بجھل بھی ان امکانات سے بے خبر نہیں ہوگا لیکن خانم کے آنے... اُسے ہماری رہائی کی اتنی ہی توقع تھی جو اُس نے کسی اور طرف... ضروری نہیں سمجھا۔ کسی اور طرف دیکھا کہاں جا سکتا تھا۔

اور کون سا نشیب تھا۔ وہی دو راستے، پولیس یا ہر... نواب کی حویلی کی فصیلیں۔ پولیس میں جا کے نواب کا نام... پہلے بجھل کو اپنی صحیح الدماغی کا ثبوت پیش کرنا ہوتا اور حو... فصیلیں عبور کرنے سے مُراد ہم تک پہنچنا نہیں تھا۔ جتنی دیر... کو اپنے منصب کی غیرت آتی اور جتنی دیر میں بجھل اور کانتے... سے ہمارے زنداں تک کا فاصلہ طے کرنے میں کامیاب ہوتے... میں ہمارا نام و نشان ہمیشہ کے لیے مٹا دیا جاتا۔ ایک راستہ اُلجھا... بھی تلاش کیا تھا گو وہ ایسا نامعتبر نہیں تھا مگر ہم دونوں کے... کے اندیشے سے مستثنیٰ نہیں تھا، ان سب کو بعد میں ٹٹولنا ہی... تھا۔ بعد میں معلوم نہیں، بجھل نے ہم دونوں کے خوں بہا کا کیا... تھا۔ جو کچھ بھی ہوگا، وہ نواب کے وہم و گماں سے کہیں سوا ہوگا۔ نواب کو اشارہ کر آیا تھا کہ بصورتِ دیگر کیا کچھ ممکن ہو سکتا... اُس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کچھ کہتا مگر اُس سے ملنے کے بعد... نے اِن لفظوں کے وہی معنی لیے ہوں گے جو بجھل نے کہنا چاہا... اِس میں کوئی شبہ تھا تو بعد میں تصدیق کے لیے بازار کے اڈے... بجھل کی موجودگی کافی تھی اور جو بجھل اُس سے کہہ نہیں پایا تھا... سے ملنے والی اطلاعات سے نواب کو سُننے کو مل گیا ہوگا۔ بجھل... پیرو کے گویا اُسے مسلسل یہی کچھ کہتا رہا تھا۔ اُس نے نواب سے... اسی لیے عجلت کی تھی کہ وہ اُس کے حیدر آباد میں آنے کی خبر سُن... ہیجان میں مبتلا نہ ہو جائے۔ بہتر ہے کہ اس سے پہلے اُسے اپنی شکل... دی جائے مگر بجھل بھی وہاں حویلی میں کچھ جان کے اور دیکھ کے پہنچا... حویلی کی فصیلیں، خشتوں کی دیواریں، مسلح دربانوں اور خدمت گاروں... کی ایک فوج، ممکن ہے، اُس نے وہاں اصطبل کے گھوڑوں اور فیل... کے ہاتھیوں کی چنگھاڑ بھی سُنی ہو جنھیں سال میں کبھی کبھار ہی اپنے آقا... خدمت نصیب ہوتی ہو گی اور یہ سب بجھل کو نظر نہیں آتا یا یہ لاؤ لشکر... اُس کی آنکھوں کے لیے نیا نہیں تھا تو بھی اُس کے سامنے ایک شخص... جس نے راہ چلتے دو آدمیوں کو باقی ساری دنیا کی نگاہوں سے او... دیا تھا اور اُسے اُن کے پوچھنے والوں کی کوئی فکر نہیں تھی کہ وہ کون... اور کس دروازے پر جا کے شور مچا سکتے ہیں۔ اُن کے اشاروں کی... اُس کی حویلی بھی آ سکتی ہے۔ کانتے نے محسوس نہ کیا ہو مگر بجھل نے... اخذ کیا تھا، یہی کہ بڑے نواب کو میرے اور پیرو کے بارے میں...

...ے کسی سنگ دل لمحے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔ ان لمحوں کی ...کے پاس کوئی کمی نہیں ہے۔

مگر اب میرے دماغ پر سناٹا سا طاری تھا، اگر وہ سب ہم دونوں ...ن برتوانے کے لیے تھا نواب تو ہم آ گئے تھے۔ کانتے کے بقول خانم ...آنے کے بعد اُسے نواب کی طرف سے کوئی خدشہ تھا اور اُس کے ...کے مطابق بجھل بھی اُس کے اِس سوال کا کوئی معقول جواب نہ دے ...تھا نواب کسی سوال کا جواب باقی نہیں رہ گیا تھا۔ ساری گرہیں ہمارے ...پر کُھل گئی تھیں، وہ سب ہماری وجہ سے تھا، ہمارے کھو نہ جانے ...خیال سے تو وہ سب ختم ہو چکا تھا، ایک رات پہلے ہی۔ بجھل کو ...رات ہی اڈے سے اٹھ جانا چاہیے تھا۔ اُسے اس طرح یہاں بیٹھنے ...اڈے اور نئے دادا کی رسم کی ادائی کی اجازت دینے کی کیا ضرورت ...بیا کہ کانتے نے ہمارے آنے سے پہلے کے دِنوں کے متعلق بتایا تھا ...کچھ اب بھی تھا، ہمارے آنے کے بعد اس میں کوئی تبدیلی نظر نہیں ...تھی۔ رات ہی کو ہم حیدر آباد سے بہت دُور ہو سکتے تھے، کہیں اور ...ن نوابا جان کی حویلی میں منتقل ہو کے کسی وقت بھی وہاں سے نکل سکتے ...خانم کی آمد کی اطلاع آ گئی تھی تو اُس کا انتظار حویلی میں رہ کے بھی ...جا سکتا تھا یا ابا جان کو اطلاع پہنچائی جا سکتی تھی کہ وہ خانم کو اسٹیشن ...کے فلاں جگہ آ جائیں یا سیدھے بمبئی کی گاڑی میں بیٹھ جائیں۔ ...بی بہرحال اڈے سے زیادہ محفوظ اور پُرسکون جگہ تھی۔ اڈے پر ہم ...ب ہر لمحے پولیس کے نرغے میں تھے۔ رات کو ہمارے آتے ہی اڈے ...ہمارا نکلنا مشکل تھا یا مناسب نہیں تھا تو صبح منہ اندھیرے یہاں ...رخصت ہوا جا سکتا تھا۔ آنے والوں کی پذیرائی نہ کی جاتی تو کوئی بھی ...ان نہ ٹھیرتا۔ بجھل شاید ابا جان کو بھی بھول گیا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی ...ملا کر اُن کے پاس بھیج دینا چاہیے تھا تاکہ ایک رات تو انھیں سکون ...کی نیند آ جاتی۔ ہو سکتا ہے، اُن کے لیے یہ خبر خزانے کی بازیابی سے ...بڑی ہو کہ ہم صحیح سلامت بجھل کے پاس پہنچ گئے ہیں۔ اب بھی بجھل ...کے اُٹھنے کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ رات میں باہر نکلنا اُس کی ...نسبت میں اگر نامعقول تھا تو دن میں اور بھی غیر محفوظ تھا یا تو بجھل کو ...بڑے نواب کی جانب سے کسی جوابی اقدام کا کوئی تردد نہیں تھا کہ اب ...رات کے اندھیرے اور دن کی روشنی سے کوئی فرق نہیں پڑتا، کسی ...وقت بھی ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں یا پھر اُسے اتنا تردد تھا، جیسے نواب ...کے آدمی حویلی سے ہمارے نکلتے ہی ہمارے تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے ...ہوں گے۔ جتنی دیر ہم حیدر آباد سے دُور ہونے کی کوشش کریں گے، ...اتنی دیر میں شہر سے جانے والی تمام سڑکوں پر پولیس پہرا لگا چکی ہوگی ...کہیں زیادہ محفوظ جگہ تھی۔ نواب کو مطمئن رکھنا چاہیے تھا کہ اس

کے ہاں سے بھاگے ہوئے دونوں آدمی مفرور نہیں ہیں، نہ انھوں نے پولیس کا رُخ کیا ہے۔ یہی ہو سکتا تھا کہ بجھل کو کسی اور وقت کا انتظار ہو مگر ایسے تو جتنا وقت گزر رہا تھا، بڑے نواب کے آدمیوں کو اڈے کے گِرد حصار ڈالنے اور سنبھلنے کا موقع فراہم ہو رہا تھا۔ پیرو نے اُسے ہمارے حویلی سے نکلنے کی ساری تفصیل بتائی ہو گی، یہ بھی کہ چلتے چلتے نواب کو ہم نے کس حالت میں چھوڑا ہے اور شاید اُس نے اپنا یہ قیاس بھی ظاہر کیا ہو کہ نواب کی طرف سے مزید کسی حیل و حجت کا امکان نہیں ہے۔ پہلے کی بات اور تھی، مجھے اور پیرو کو دُور دُور سان گمان نہیں تھا کہ یہاں شہر میں بس ہمارے آنے کی دیر ہو گی۔ ضروری نہیں کہ بجھل نے پیرو سے اتفاق کیا ہو، بے شک ہم نواب کی تحویل میں نہیں رہے تھے اور نواب کو خوب احساس ہو گا کہ دوبارہ ہماری جانب ہاتھ بڑھانے سے پہلے اپنے سر اور گریبان کا خیال رکھنا چاہیے مگر کیا خانم کا پتہ جاننے والوں سے ایسے دست بردار ہو جانا چاہیے جو اتنے عرصے کی تگ و دو کے بعد دکھائی دیے تھے؟ کچھ اور نہیں تو شہر سے باہر جانے والے راستے ہمارے لیے ممنوع قرار دیے جا سکتے ہیں۔ ریاست کی تعزیری دفعات بھی کم نہیں ہوں گی۔ ریاست میں نوابوں کی عمل داری اُن کی حویلیوں کی چار دیواریوں تک محدود نہیں ہوتی۔ ہم بڑے نواب کی حویلی کے زنداں سے نکل آئے تھے لیکن زنداں تو ریاست کی سرحدوں تک پھیلا ہوا تھا۔ کوئی بعید نہیں کہ نواب کے آدمی اس وقت بھی یہاں اڈے پر موجود ہوں اور نواب کے نمک کا قرض ادا کرنے کے لیے کسی بہانے کے منتظر۔ وہ ہمارے سائے سونگھتے سونگھتے بمبئی تک جا سکتے ہیں، ہمارے ٹھکانے جاننا ہی اُن کے لیے بہت ہو گا، اس طرح یہ سلسلہ کہیں تو خانم کی دہلیز پر جا کے تمام ہو گا۔ رات اڈے پر نئے دادا کی رسم کی ادائی سے بجھل کی مُراد بڑے نواب کو یہی باور کرانا ہو گا کہ اب اُس کا مستقلاً اڈے پر رہنے کا ارادہ ہے۔

جیسے کوئی میرے اندر چھپا میرا سینہ نوچ رہا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ بڑے نواب کی جانب سے بجھل کو کچھ یقین نہیں ہے مگر پھر وہ کون سے اعتبار پر یہاں بیٹھا ہے۔ گیارہ بجے گاڑی آنی تھی۔ اب ایک گھنٹے سے اُوپر ہو چکا ہو گا۔ کانتے اور زورا پہلو بدلتے بار بار بجھل کی طرف دیکھتے تھے۔ گاڑی کبھی گھنٹوں کی تاخیر سے بھی آتی تھی لیکن ہم سامنے ہی بیٹھے تھے، کسی کے علم میں نہیں تھا کہ بجھل نے کسی سے گاڑی کے وقت کے متعلق کچھ جاننے کی کوشش کی ہو۔ میں نے سوچا کہ میں ہی اُسے ٹوکوں، شاید میری بات کا اثر ہو مگر میری زبان اٹک کے رہ گئی۔ دوپہر کا کھانا ہم سب نے بس ٹونگ ٹونگ کے،

دوسروں کو دکھانے کے لیے کھایا حالانکہ کھانا نہایت لذیذ تھا۔ بریانی، قورمہ اور ماش کی دال۔ بازار کے کسی ہوٹل والے نے ماش کی چھریری دال بطورِ خاص پکوائی تھی، واقعی ایک ایک دانہ الگ تھا۔ پیرو کے بقول ماش کی دال وہی ہے جسے مٹھی بھر کے دیوار پر پھینکو تو ایک دانہ بھی دیوار پر نہ ٹکے۔ ساتھ میں ناریل کی چٹنی تھی۔ کھانے کے وقت لوگوں کی تعداد اور بڑھ گئی تھی۔ اس دوران کالنتے نے کئی بار زورا سے پوچھا کہ خانم کے متعلق تجمل نے اباجان کو کچھ اور تو نہیں کہلوایا تھا۔ تجمل نے ایسی کوئی ہدایت اُسے نہیں دی تھی اور اباجان سے رابطے کا ایک ذریعہ زورا ہی تھا۔ اب سب کچھ بعد از وقت تھا، گاڑی اگر وقت پر آئی تھی تو آگے بھی پرانی ہو گئی ہوگی۔ شاید تجمل نے اپنے طور پر سمجھ لیا تھا کہ اباجان اور ماسی اسٹیشن سے خانم کو لے ہی آئیں گے۔ ہم میں کسی کا اسٹیشن جانا ویسے بھی نامناسب تھا لیکن اگر اباجان نے بھی احتیاط کی تو؟ وہ بھی کہیں ہمارے بھروسے پر رہے تو؟

تقریباً تین بج چکے تھے۔ اُس وقت صحن اور دالان میں لوگ کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ نام پلّی کا دادا ساجن بھی آ گیا تھا۔ سکندرآباد کا دادا اڈونیا بھی موجود تھا، اڈونیا شہر اڈونی کا رہنے والا تھا اس لیے اُس کا نام اڈونیا پڑ گیا تھا، آدھی ہندوستانی، آدھی تلنگانہ بولتا تھا۔ تجمل نے کالے دادا سے چائے کی فرمائش کی۔ چائے تیار ہو رہی تھی، تھوڑی ہی دیر میں آ گئی۔ چائے پینے کی دیر تھی کہ تجمل اُٹھ کھڑا ہوا، پیرو بھی اُس کے ساتھ اُٹھ گیا۔ اُن دونوں کے پاس بیٹھے ہوئے بڑھے بھورے دادا نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔ "کدھر! کدھر دادا؟" وہ بے چینی سے بولا۔

"بس دادا! ابھی اپنے کو اجازت دو۔"

"ایک دم! ایک دم کیسے اُٹھ گئے؟"

"بس دادا! کبھی نہ کبھی اُٹھنا ہی تھا۔"

"ایسا کیسے؟" بھورے دادا نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ابھی بیٹھو، کچھ دیر ادھر اور بیٹھو۔"

"کیا فرق پڑے گا دادا!" تجمل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "جانے سے پہلے اِدھر کو آئیں گے، پر پکا نہیں ہے۔"

"کیسا لگتا ہے، اپن سے کوئی غلطی ہو گیا۔" بھورے دادا مضطرب انداز میں کھڑا ہو گیا اور تجمل کا بازو تھام کے اُس نے اُسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

"ابھی ایسا مت بولو دادا!" پیرو نے بیچ میں کہا۔ "ماں قسم، اپن کے پاس وقت ہوتا تو ایدر تمھارے پیروں میں ہی بیٹھا رہتا۔"

بھورے دادا سر جھٹکنے لگا اور اُس نے والہانہ انداز میں پیرو کا ہاتھ اپنے سینے سے لگا لیا۔ میں، کالنتے، جمرو اور شامو بھی اُٹھ کھڑے ہوئے تھے، صحن اور دالان میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی اپنی جگہ پر بیٹھے نہ رہ سکے۔ ہر سُو ایک ہلچل سی مچ گئی تھی۔ "اپنے کو بھول مت جانا۔" بھورے دادا نے بھری ہوئی آواز میں تجمل سے کہا اور اُس کے گلے سے لپٹ گیا۔

"جلدی، جلدی ہی ملیں گے۔" تجمل بُدبُداتے ہوئے بولا۔

"اِن کے پاس ابھی زیادہ ٹیم نکو دکھائی پڑتا۔" بھورے دادا کی آواز دھندلا گئی تھی۔ "تھوڑا اپنی بات مان لیتے تو۔۔۔"

"اپنا جی بولتا ہے، ابھی پورا جگ پڑا ہے تمھارے پاس۔" تجمل نے اڈّے پر موجود لوگوں کی طرف نظریں گھماتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ "ابھی ان سب کو دیکھنا ہے تم کو، وہ کبیرے اور آکا، اُن اچھلوں نے ان کو بے دھار ابنا دیا ہے، تم کو نئے سرے سے ان کی اٹھک بیٹھک کرانا ہے۔"

"جیسا تم بولتے ہو، اپن سب ویسا ہی بھگتانے کی مِتّن کریں گے۔ پر تم، تم۔۔۔"

تجمل نے سر کے اشارے سے تسلی دی اور اُسے بازو میں بھینچتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ ابھی وہ چوکی سے نہیں اُترا تھا کہ گیلری میں سب لوگ کھڑے اُسے گھور رہے تھے۔ تجمل چند لمحے گم صُم سا کھڑا رہا۔ عمارت پر سکوت چھا گیا تھا۔ تجمل نے نسبتاً بلند آواز میں کہا۔ "ہم کو جانا ہے، ابھی کچھ پتہ نہیں کہ کب اپنی واپسی ہو، پر جب بھی آئیں، ہماری منتی پر بھورے دادا مان گیا ہے کہ وہ اسی جگہ پر رہے گا۔ بیچ میں اپنے پیچھے کسی کو چل اُٹھے تو تم کو جو بولنا ہے وہ ہم کو بتانے کی ضرورت نہیں۔ ادھر ابھی سب بھورے دادا کے حکم پہ چلیں گا۔ کالے بھی ساتھ میں اِتّا دیکھے گا پر کالے چوپٹ چلے گا تو بھورے دادا کسی کو اُس کی جگہ بدل دے گا۔ ہم نے یہ سب خوب جان کے کیا ہے۔ اب آگے تمھارا کام ہے۔ یہ تم پر ہے کہ تم دادا سے کتنا مانگتا اور سمجھتے ہو۔ ہم نے اس سے بولا ہے کہ ادھر اڈّے کے ہی آدمی تیار کرنا کا اور کبیرے لوٹ لوٹ کے آتے رہیں گے۔" تجمل نے ایک ٹک اُن کی طرف دیکھا اور دھیمے لہجے میں بولا۔ "اِدھر ہم کچھ لوگ کو اپنا پتہ بول کے جا رہے ہیں۔ دادا کو کوئی تکلیف نہ ہو، اس پہ دو بلا کھو دو گے تو اپنا کچھ نہیں بگڑے گا، سب تمھارا ہی گھاٹا ہے۔ دھیان رکھنا، تم کو ہم بھورے دادا کے ہاتھ سونپ کے جا رہے ہیں تو اس کو تمھارے۔۔۔۔"

عمارت پر سکوت طاری ہو گیا تھا۔ بھورے دادا تجمل کے پہلو سے چپکا سر جھکائے کھڑا تھا۔ کالے کی آنکھیں بھی برس رہی تھیں۔ تجمل نے پھر کچھ نہیں کہا، چوکی سے اُتر گیا۔ سامنے کھڑے ہوئے آدمی خود پیچھے ہٹ گئے تھے اور دروازے تک اُن کے درمیان گلی نما راستہ بن گیا تھا۔ سب دم بخود سے تھے اور جیسے اُن کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ہمارا حال بھی کچھ یہی تھا۔ دروازے کے قریب ادھیڑ عمر فتوے سے صبر نہیں ہوا، تجمل اُس کے پاس سے گزرا تو وہ سسکیاں بھرنے لگا۔ جب سے تجمل اڈّے پر آیا تھا، فتوا اُس کے پاس ہی چپکتا رہتا تھا، کبھی اُس کے پیر دباتا، کبھی حقہ تازہ کرتا۔ تجمل نے رُک کے اُس کے سر پہ ہاتھ رکھا اور اُس کے بال جھنجوڑے تو وہ اپنے حواس اور کھو بیٹھا۔ دروازے تک ہمارا پہنچنا مشکل ہو جاتا، سب ہمیں گھیر لیتے مگر تجمل نے ہاتھ بلند کر کے انہیں خود سے دُور رکھنے کی کوشش کی۔ کالے اور بھورے دادا بھی انہیں ہمارے پاس سے ہٹ جانے کی تاکید کر رہے تھے پھر بھی کئی آدمی تجمل کے پیروں سے لپٹ گئے اور اُسے اڈّے پر رُک جانے کی دہائیاں دینے لگے۔ "آئیں گے سجنا، جلدی آئیں گے۔" تجمل اُن سے یہی کہتا رہا۔ کالے دادا کی مداخلت پر بمشکل تمام وہ تجمل سے دُور ہوئے۔

باہر گلی میں بھی اُن کا ہجوم ہمارے پیچھے آنا چاہتا تھا مگر تجمل نے بلند آواز میں انہیں روک دیا۔ "تماشا مت کرو۔" اُس نے کسی قدر تندی سے کہا اور بھورے دادا سے بغل گیر ہو کے تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔ بھورے دادا پیرو اور ہم سب سے ملنا چاہتا تھا لیکن تجمل کے بڑھ جانے کی وجہ سے اُس کے بازو اُٹھے رہ گئے۔ چند منٹ بعد ہی مختلف گلیوں میں گھومتے ہوئے ہم بازار کی خاص گلی کے نکڑ پر آ گئے تھے۔ چار بجے ہوں گے، سورج غروب ہونے میں دیر تھی اور اسی نسبت سے بازار کا سورج طلوع ہونے میں دیر تھی پھر بھی خاصی چہل پہل تھی۔ کچھ دُور تک تو کسی کو احساس نہیں ہوا لیکن نکڑ پر ہوٹل کی تپائیوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کی جیسے ہی ہم پر نظر پڑی، وہ بدحواس ہو گئے۔ پھر آگے نہ جانے کس طرح سارے راستے کے بالاخانوں، دکانوں اور راہ گیروں کو جیسے ہمارے آنے کی خبر ہو گئی تھی۔ ہم کُل سات تھے، تجمل، پیرو، کالنتے، زورا، جمرو، شامو اور میں۔ ویسے بھی گلی میں اتنے آدمیوں کا ساتھ گزرنا گلی کے لوگوں سے کیسے اوجھل رہ سکتا تھا خصوصاً جب اُن کا تعلق اڈّے سے ہو اور اڈّے پر بھی وہ نو وارد ہوں۔ آگے تمام راستے پر بالاخانوں کے دروازے اور کھڑکیاں کھلتی گئیں اور راہ گیر یا تو سمٹ کے ایک طرف ہوتے گئے یا جہاں موجود تھے، وہیں ٹھٹک کے رہ گئے۔ دکانوں پر بیٹھے کئی آدمیوں اور راہ گیروں نے تجمل کو سلام بھی کیا لیکن تجمل نے جیسے اُن کی جانب دیکھا ہی نہیں۔ ہم اُس جگہ سے بھی آگے آ گئے جہاں خانم کا مکان تھا اور جہاں نیساں

رہتی تھی مگر گلی کے خاتمے سے کچھ پہلے پان کے ایک دکان دار نے ہمیں روک لیا، وہ تیزی سے نیچے اُتر کے تجمل کے مقابل کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ کولھے مٹکاتا اور ہاتھ لہراتا آیا تھا اور اُس کی آواز میں بھی کچھ ایسی لٹک تھی کہ تجمل کو ہنسی آ گئی۔ "بندی کا پان کھائے بغیر ادھر سے گزر جائیے گا سرکار؟" تجمل اُس کی دکان پر مڑ گیا۔ دکان دار اچھل کے دکان پر چڑھا۔ اُس کے پان لگانے کا انداز بھی دیسی تھا، پہلے مٹکتا تھا، سر کو نرت کرتے ہوئے چھالیا اور مسالے ڈالتا تھا۔ نفاست اور تیزی سے اُس نے ہم سب کے لیے بیڑے بنائے اور انہیں چاندی کے ورق میں لپیٹ کے اپنے ہاتھوں سے ہمیں کھلائے۔ تجمل نے اُسے پیسے دینے چاہے تو وہ مچل گیا، تجمل نے بھی زیادہ تکرار نہیں کی۔ اُس سے کچھ آگے مٹھائی کی دکان پر دو پولیس والے موجود تھے۔ ہم نے انہیں دُور سے دیکھ لیا تھا اور دیکھا تھا کہ حلوائی نے اشارے سے انہیں ہماری جانب متوجہ کیا ہے۔ ہم پر نظر پڑتے ہی اُن کے جسم تن گئے تھے لیکن انھوں نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی، وہیں کھڑے ہمیں گھورا کیے۔ اڈّے کا کوئی آدمی اب تک ہمارے پیچھے نہیں آیا تھا مگر گلی کے کنارے پر وہ اڈّے سے متعلق ہی آدمی تھے جو ادھر گلی میں داخل ہوئے، اُدھر ہم اُن کے سامنے تھے۔ وہ کچھ بوکھلا گئے تھے تاہم اُن میں سے ایک نے جھینپتے ہوئے انداز میں درمیان کا مختصر فاصلہ طے کیا اور قریب آ کے اُس کا جسم دُہرا ہو گیا اور اُس کی زبان سے ایک لفظ نہیں نکلا۔ اس اثنا میں ہم گلی سے نکل چکے تھے۔

باہر چند گز کی دُوری پر تانگے موجود تھے، تجمل اور پیرو پوچھے بغیر اُس میں بیٹھ گئے۔ تانگے والے نے منہ بنایا مگر دوسرے لمحے وہ سیدھا ہو گیا۔ پیچھے دوسرے تانگے میں ہم چاروں سوار ہو گئے تھے۔ زورا، تجمل اور پیرو کے ساتھ اگلے تانگے پر چلا گیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم چار مینار تک آ گئے تھے اور درمیان میں نہ کسی پولیس والے نے ہمارا تعاقب کیا تھا نہ اڈّے کے کسی آدمی نے۔ کوئی ہوتا تو ہماری نظروں سے چوک نہیں سکتا تھا۔ تانگے کے اگلے حصّے پر شامو اور جمرو بیٹھے تھے، پچھلے پر کالنتے اور میں۔ اڈّے سے نکل کے کسی نے کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ ہم کس طرف جا رہے ہیں۔ چار مینار سے ہم اسٹیشن کی طرف بھی جا سکتے تھے اور اباجان کی حویلی تک بھی۔ حویلی کا فاصلہ مجھے معلوم نہیں تھا لیکن چار مینار سے دونوں اسٹیشنوں کا فاصلہ خاصا طویل تھا۔ وہ کتنا ہی ہمارا وہم و گمان ہو لیکن کسی محفوظ جگہ پہنچے بغیر کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ آگے کون سی رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑ جائے۔ سب کی خاموشی کا سبب شاید یہی دھڑکا تھا۔ آگے کے تانگے پر تجمل، پیرو اور زورا بھی خاموش

نظر آرہے تھے۔ چار مینار کے چوک پر کانتے نے میری طرف متوحش نگاہوں سے دیکھا۔ میں اُس کی نگاہوں کا مفہوم سمجھ گیا تھا مگر میں اُس سے کیا کہتا۔ بجّل کا شہر سے باہر جانے کا ارادہ ہوتا تو وہ پہلے زوراکو اباجان کے پاس ضرور بھیج دیتا، اُنھوں نے اڈّے پر موجود اپنا مختصر سامان بھی ساتھ نہیں لیا تھا۔ بہرحال چند لمحوں بعد تانگا جب چارکمان کی طرف جانے والے راستے کے بجائے دائیں طرف مُڑ گیا تو بات واضح ہوگئی۔ کسی اور طرف جانے کا بظاہر کوئی امکان نہیں تھا، بجّل اباجان کے پاس ہی جا رہا تھا۔ گویا اُس کا ارادہ سب کو ساتھ لے کے ہی حیدرآباد سے رخصت ہونے کا تھا۔

چار مینار سے خاصی دُور آگے گنجان آبادیوں کی بستیاں ختم ہوجاتی تھیں اور بڑے مکانات کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ یہی راستہ بڑے نواب کی حویلی کو جاتا تھا۔ موٹروں، ٹم ٹموں اور بڑی سواریوں کے لیے الگ سے ایک راستہ موجود تھا۔ جیسے جیسے فاصلہ کم ہو رہا تھا، اباجان کے ملنے کے خیال سے میری رگوں میں آگ سی جلنے لگی تھی، انھیں کچھ خبر نہیں ہے۔ بجّل کے ساتھ مجھے اور پیرو کو دیکھ کے اُن کا کیا حال ہوگا، انھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آئے گا۔ رات زورا واپس نہیں گیا تھا، اُس کے انتظار میں وہ یوں بھی لمحے گن رہے ہوں گے۔ خانم کو اگر اُنھوں نے سب کچھ بتا دیا ہے تو اُس کے لیے بھی یہ کسی کرشمے سے کم نہیں ہوگا۔ ممکن ہے، اباجان نے اُسے ابھی کچھ نہ بتایا ہو۔ اباجان اُس سے کیسے کہہ سکے ہوں گے کہ اُن کا بیٹا ایک نواب کی قید میں ہے اور خانم کی سفارش کے بغیر اُس کی رہائی ممکن نہیں ہے۔ اباجان کو خانم سے یہ کہنے کے لیے بڑی جُرأت کی ضرورت ہے۔ خانم سے اُن کا واسطہ ہی کتنے دن رہا ہے، صرف اتنے دن جب تک وہ فیض آباد میں زرّیں کی حویلی میں بیٹھے رہے۔ خانم کے اصرار کے باوجود اُنھوں نے اُس سے کچھ نہیں کہا ہوگا اور بجّل پر ہی سب کچھ چھوڑ دینا مناسب سمجھا ہوگا۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد ہم ایک سرسبز علاقے میں آگئے تھے جہاں ہر طرف قلعہ نما حویلیاں بنی ہوئی تھیں۔ تانگے والے کو زورا کے راستہ بتلانے کے انداز سے ظاہر تھا کہ اب اباجان کی خریدی ہوئی حویلی زیادہ دُور نہیں ہے۔ حویلی پہنچنے کے بعد اب شاید اتنی دیر نہ لگے، کاش کہ ایسا ہی ہو۔ رات کا وقت سفر کے لیے زیادہ بہتر ہوگا۔ رات کو بمبئی کے لیے ایک گاڑی روانہ ہوتی ہے۔ نہیں ہوتی تو بھی ہمیں یہاں سے کسی اور سمت نکل جانا چاہیے، جتنی جلدی اس شہر سے چھٹکارا مل جائے، اتنا ہی اچھا ہے۔ بجّل کو بھی اِن سب باتوں کا احساس ہوگا کہ یہاں مزید ایک لمحہ بھی نہیں گنوانا چاہیے۔ اباجان کی اتنی طویل غیر حاضری سے فرخ، فریال، فارحہ اور اکبر تو بالکل ہی مایوس

ہوگئے ہوں گے۔ مولوی اکرم بہت نیک آدمی ہیں لیکن کوئی کب تک دوسروں کا اتنا خیال رکھ سکتا ہے۔ بمبئی جیسے شہر میں لڑکیوں کی ذمے داری۔ مولوی اکرم انھیں زمانے کی نگاہوں سے بچا رکھنے میں خود بہت نڈھال ہوگئے ہوں گے۔ تبّت سے خط جانے کا ہی پتا نہیں ہوتا تھا۔ ہوسکتا ہے، اباجان نے کلکتے یا فیض آباد سے اپنی جلد واپسی کے بارے میں انھیں کچھ لکھا ہو اور لکھا ہو کہ اُن کا بڑا بیٹا بھی اُن کے ساتھ آرہا ہے یا اباجان نے یہ سوچ کر کہ اتنے دن گزر گئے ہیں، وہاں چند دن اور سہی، انھیں کچھ بھی نہ لکھا ہو۔ بہرحال زیادہ سے زیادہ اب ایک ہی دن کا بل رہ گیا ہے کہ سارے دُوریاں ختم ہوجائیں گی۔ اُن کے سامنے جانے کے تصور سے میرا دل بند ہونے لگتا تھا۔ معلوم نہیں، وہ اپنے بھائی کو پہچانیں بھی کہ نہیں۔ اُس شخص کا چہرہ نہیں دیکھنا چاہیے جس کی وجہ سے اُن کا گھر اُجڑ گیا اور اُن کی ماں۔ انھیں امّی سے بہت شکوہ ہوگا کہ اُنھوں نے اُن کا خیال نہیں کیا۔ ایک میں ہی تو اُن کا بیٹا نہیں تھا مگر میں اُن کے پاس ضرور جاؤں گا اور اُن سے کہوں گا کہ وہ جتنی چاہیں مجھے سزا دے لیں، اپنے بھائی کو سنگسار کریں اگر اس طرح کوئی تلافی ہوسکتی ہے۔

تانگا چوراہے سے مڑکے ایک بڑی حویلی کے دروازے پر رُک گیا۔ پتھر کی اُونچی چار دیواری اور اونچے اُونچے درختوں کے درمیان سے جھانکتی ہوئی لال عمارت کا بالائی حصّہ باہر سے نظر آرہا تھا۔ دربان موجود تھا۔ زورا کو دیکھتے ہی اُس نے جھک کے سلام کیا اور دروازہ کھول دیا۔ میرے مساموں سے پسینہ پھوٹ رہا تھا اور سارا جسم پتھر کا ہوگیا تھا۔ تانگے سے اُترکے کانتے نے میرا ہاتھ زور سے پکڑا، اُس کی سانسیں بھی تیز تیز چل رہی تھیں۔ دربان نے چھوٹا دروازہ کھولا تھا، کانتے اور میں سب کے بعد اندر داخل ہوئے۔ دونوں جانب لگی ہوئی پھلواری کے بیچ سرخ رنگ کی ایک چوڑی گزرگاہ سامنے تھی۔ میرے پیر ڈگمگا رہے تھے۔ پیرو، جمرو اور شامو کی نظریں اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔ کیاریوں میں گلاب کے بڑے بڑے پھول کھلے تھے اور دُور چار دیواری تک پیڑوں کا قطار در قطار سلسلہ تھا۔ گزرگاہ کا گھماؤ عبور کرتے ہی عمارت ہمارے مقابل تھی۔ لال لال پتھروں سے بنی ہوئی دو منزلہ حویلی طول و عرض میں اتنی بڑی نہیں مگر سارا نقشہ کسی محل سے مشابہ تھا۔ اس وقت دھوپ اُدھر چلی گئی اور ہر جانب سانولی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ہم عمارت سے چند قدم کے فاصلے پر تھے کہ ہمیں مارتی دکھائی دیا۔ وہ مارتی ہی تھا، وہ کہتا تھا کہ اُس نے ہماری آہٹیں سنیں، یکایک اُس کے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی، بے تحاشا چبوترے کی سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے آگیا۔ پیرو نے

بڑھ کے اُسے پکڑ لیا۔ "ماسٹر، ماسٹر!" وہ اُسے جھنجوڑتے ہوئے بولا۔ "سالا تم تو ابھی ایک دم فنتوش کی مافک بدل گیا ہے۔"

مارتی کی آنکھیں خیرہ ہوگئی تھیں۔ وہ بدحواسی میں سب کے چہرے دیکھ رہا تھا، مجھ پر اُس کی نظر پڑی تو بوکھلا سا گیا۔ "راجا، راجا اُستاد!" پیرو کے بازوؤں سے خود کو چھڑا کے وہ تڑپتا ہوا میری طرف بڑھا اور مجھے دبوچ دبوچ کے دیکھنے لگا۔ وہ بالکل پاگل ہوگیا تھا۔ معًا اُسے کچھ خیال آیا اور وہ وحشت کے عالم میں سیڑھیاں طے کرتا ہوا اندر کی جانب بھاگ پڑا۔ ہم چبوترے پر چڑھے ہی تھے کہ اندر سے تیز تیز قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور مارتی کی بھڑکتی آواز بھی۔

وہ ایک وسیع و عریض گول کمرہ تھا۔ اُوپر گنبدی چھت پر جا بجا رنگ برنگے شیشے جڑے تھے۔ بیچ میں ایک بڑا فانوس تھا۔ دیواروں پر ہر طرف بیل بوٹے کھدے ہوئے تھے اور فرش پر نیلا قالین تھا۔ دیواروں کے ساتھ تین جانب گدیلے رکھے ہوئے تھے اور درمیان میں ایک جانب چوکی کی نشست تھی۔ اُن سب کی آوازوں سے کمرہ گونج رہا تھا۔ سبھی موجود تھے۔ اباجان، مارتی، زورا، ٹنگو، کانتے، جمرو، شامو، پیرو، بجّل اور میں۔ منیر علی بھی۔ منیر علی کو وہاں دیکھنے کے بعد خانم کی آمد کے بارے میں کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی تھی مگر یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ وہ خانم کے بجائے کوئی عذر لے کے آئے ہوں۔ تار کے ذریعے اباجان کا بجّل کو بلوانا اور بجّل کے بعد خانم کی طلبی، خانم تو اس افراتفری اور سراسیمگی میں نیم جاں ہوگئی ہوگی۔ شاید اِس لیے منیر علی کو آنا پڑا ہو مگر مجھے تصدیق کی کوئی ایسی اُلجھن نہیں تھی۔ وہاں تو سب کچھ بدلا ہوا تھا، کسی کو کچھ اور سوچنے کی فرصت نہیں تھی۔ اباجان کے ایک جانب بجّل بیٹھا تھا اور دوسری جانب پیرو۔ میں اُن کے بالکل سامنے تھا۔ وہ مجھے گلے سے لگا کے، خوب ٹٹول ٹٹول کے دیکھ چکے تھے لیکن شاید ابھی تک انھیں کسی فریبِ نظر کا گمان تھا۔ بار بار اُن کی متوحش نگاہیں میری اور پیرو کی طرف اُٹھ جاتی تھیں۔

حویلی پر چھائی ہوئی خاموشی صرف چند لمحوں میں بدلیوں کی طرح چھٹ گئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے سب کے سب ایک دوسرے سے برسوں بعد ملے ہوں اور سب دُنیا سے دُور کسی جزیرے میں آبسے ہوں، کسی گم شدہ جنّت میں۔ ؎

مجھے دیکھا ہے آج برسوں بعد + آج کا دن گزر نہ جائے کہیں

کچھ دیر تک کسی کو ہوش ہی نہیں رہا پھر اباجان کو احساس ہوا۔ اُنھوں نے مارتی کو اشارہ کیا کہ وہ ہم تھکے ہوؤں کے لیے چائے وغیرہ کا بندوبست کرے۔ تھکن تو یہاں آتے ہی دُور ہوگئی تھی۔ مارتی

بڑبڑاتا اُٹھ کھڑا ہوا۔ چائے آنے سے پہلے اباجان نے حکم دیا کہ پہلے سب اپنا حلیہ درست کرلیں، لباس تیار ہے اور غسل کے لیے گرم پانی بھی۔ اِن دنوں میں اباجان نے اندازے سے سب کے کپڑے تیار کرالیے تھے، ایک کے بجائے دو دو جوڑے۔ نواب حشمت جنگ سے تعلق کے باعث انھیں اس اہتمام کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی کہ نواب کا سامنا ہونے پر مکینوں کا لباس بھی مکان کے شایاں ہو۔ کسی کا جی وہاں سے اُٹھنے کو نہیں چاہ رہا تھا لیکن سب مختلف کمروں میں چلے گئے۔ گول گنبدی نشست گاہ کے تینوں دروازے ایک گول راہ داری میں کھلتے تھے، وہیں سے کمروں کے لیے مختلف راستے نکلتے تھے۔ ساری کی ساری حویلی بیش قیمت سامان سے مرصّع تھی، کہیں بھی کسی ویرانی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ آئینے، پردے، کھڑکیوں کے شیشے، منظروں کی تصاویر اور دیگر آرائشی چیزیں، پر کہیں گرد کا نشان تک نہیں تھا۔ میں راہ داری میں آیا ہی تھا کہ منیر علی نے میرا بازو تھام لیا اور آنکھ کے اشارے سے مجھے اپنے ساتھ آنے کی ہدایت کی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے خانم کے متعلق کوئی بات کرنا چاہتے ہیں۔ میرا دل گھبرانے لگا کہ کہیں وہ کوئی ایسی ویسی بات نہ بتائیں۔ راہ داری ہی سے اوپر کی منزل کو سیڑھیاں جاتی تھیں۔ "اپنی آپی سے نہیں ملو گے؟" وہ سرگوشیانہ مجھ سے بولے۔ "وہ تمھیں دیکھنے کے لیے بہت بے تاب ہے۔"

"آپی آئی ہیں؟" میں نے دھڑکتی آواز میں کہا۔

"انھیں بہرحال آنا تھا۔" وہ تمتماتے لہجے میں بولے۔

"اور کون کون ہے؟"

"آنے کو تو سبھی تیار تھے، میں نے روک دیا۔ جہان گیر مچلا جا رہا تھا۔" منیر علی نے افسردگی سے کہا۔

"کیا!" میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "کیا آپی کو سب کچھ معلوم ہے؟"

"نہیں۔" وہ متانت سے بولے۔ "بھائی صاحب نے صرف مجھی کو کچھ بتایا ہے۔ میں نے خانم کو تسلّی دینے کی اپنی سی کوشش کی ہے لیکن وہ ماشا اللہ سوجھ بوجھ کے لحاظ سے ہزاروں میں ایک ہے۔ طرح طرح کے سوال کر رہی تھی۔ تمھیں یہاں نہ دیکھ کے بہت پریشان تھی، نہ پوچھو، سارے راستے ہم نے وقت کس طرح کاٹا ہے، کیسے کیسے وہم ستا رہے تھے۔ خانم میں پھر بھی بہت تحمل ہے لیکن سفید ہوگئی ہے۔ پہلے تم اُس سے جا کے مل لو۔"

میرے قدم رُکنے لگے تھے مگر پھر میں نے جلدی جلدی سیڑھیاں طے کیں۔ بالائی منزل کے پہلے کمرے کے باہر جھروکے کے پاس ہی خانم کھڑی تھی، سرتاپا نیل گوں لباس میں۔ تنگ مہری کا پاجامہ اور کڑھا ہوا کرتا، دوپٹا بھی اُسی رنگ کا تھا۔ ہاتھوں میں طلائی

پچوڑیاں۔ اُس نے سیڑھیوں پر ہماری چاپیں سن لی تھیں۔ اُس کا رُخ ہماری ہی طرف تھا۔ منیر علی نے غلط نہیں کہا تھا، خانم پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ بڑی بڑی چھٹی چھٹی آنکھیں، چہرے کی ساری سُرخی چھپکی۔ مجھے دیکھ کے اُس کے سراپا میں لہریں سی اٹھیں اور اُس کے ہونٹ کپکپانے لگے۔ وہ بے تابانہ میری طرف بڑھی، میرے ہاتھ بھی بے اختیار پھیل گئے۔ میں اُسے تسلی دینے آیا تھا لیکن مجھے اپنی ہی سُدھ بُدھ نہ رہی۔ خانم نے مجھے بازوؤں میں چھپالیا، اُن میں بہت نرمی اور ٹھنڈک تھی۔ میرا بند بند ٹوٹنے لگا۔ ایسا محسوس ہوا کہ میں چکرا کے گر جاؤں گا، جیسے میرے جسم کی ساری قوت ڈھیر ہوگئی ہو اور خانم کا قد بہت بڑا ہے اور اُس کا سینہ کوئی سمندر ہے اور جیسے میں اُسے پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میں اُس کے اتنے قریب رہ کے بھی اُس سے کتنا دُور رہا تھا۔ اُس نے میرے سر پہ ہاتھ رکھا اور اُس کی بے قرار انگلیاں میرے بالوں، میری گردن اور کمر پہ لرزاں ہوئیں، میری آنکھوں سے زار و قطار آنسو جاری ہوگئے۔ مجھے نہیں معلوم، کتنا عرصہ گزر گیا، منیر علی نے میری کمر پہ تھپکی دی اور میرا شانہ پکڑ کے جھنجوڑا تو میں بوکھلا سا گیا۔ "بابر میاں! یہ کیا! ایں! میں نے تم سے اس لیے تو یہاں آنے کو نہیں کہا تھا۔" منیر علی کی بھرّائی ہوئی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ انھوں نے مجھے اُس سے جُدا کر دیا اور میرا ہاتھ پکڑ کے وہیں کمرے کے باہر پڑی ہوئی چوکی پر لے آئے۔ خانم بھی آ کے میرے برابر بیٹھ گئی۔ میری نظر اُس کے چہرے پر گئی، میری آنکھیں اور دھندلانے لگیں۔ خانم کا چہرہ بھیگا ہوا تھا۔ ہم دونوں دیر تک سر جھکائے بیٹھے رہے۔ منیر علی بھی کچھ نہیں بولے، پھر آخر وہی کہنے لگے۔ "میرا خیال ہے، بابر میاں! اب نیچے چلو۔ خانم بیٹی! تم بھی اپنا حال کچھ ٹھیک کرو۔ سب لوگ نیچے بیٹھے ہیں، تجمل اور پیرو بھی ہیں۔ اُن لوگوں کے لیے تمھیں کچھ انتظام وغیرہ بھی کرنا ہے۔"

"تھوڑی دیر انھیں یہیں رہنے دیجیے۔" خانم نے بہ مشکل زبان کھولی اور ڈوبتی ہوئی آواز میں منیر علی سے کہا۔

"یہ اب یہیں ہیں اور اب تو سب یہیں ہیں۔" منیر علی گہری سانس بھر کے بولے۔ "میں انھیں یہاں عمداً نہیں چھوڑنا چاہتا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم دونوں اتنے لبالب ہو اور تم بیٹی! تم تو بہت حوصلے والی ہو۔ میں تو ابھی بابر میاں سے یہی کہہ رہا تھا، دھوپ چھاؤں ہی زندگی ہے۔ میں نے تم سے راستے میں کیا کہا تھا کہ اللہ نے چاہا تو سب خیریت ہوگی۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔" منیر علی نرم آواز میں بولے۔ "بابر میاں سے پوچھو، اب ایسی کوئی اُلجھن درپیش نہیں ہے۔"

"ہاں آپی!" میں نے اٹکتے لہجے میں کہا۔ "اب سب ٹھیک ہی ہے۔"

"مگر، مگر۔" خانم دبی زبان میں بولی۔

میں نے اُس کی بات پوری ہونے سے پہلے کہا۔ "تو بہت کچھ جاننے کے لیے بے تاب ہوں گی مگر اب سب ٹھیک ہے۔ اب اُسے دہرانے سے کچھ حاصل نہیں۔ آپ اطمینان رکھیے۔"

"اطمینان تو تمھیں دیکھ کے ہی ہوگیا مگر مجھے کچھ بتاؤ تو سہی، کون سی بات ہے جو آپ لوگ مجھ سے چھپا رہے ہیں؟"

"سمجھو کہ ایک معاملے میں تمھاری ضرورت پڑ گئی تھی۔" [منیر علی] بیچ میں بولے۔ "لیکن اب سب درست ہو چکا ہے۔"

"کیا معاملہ تھا؟" خانم اضطراب سے بولی۔

"کچھ میری بات تھی آپی! میری وجہ سے آپ کی ضرورت پڑ [گئی]۔" خانم حیرت سے میرا چہرہ دیکھنے لگی، اُس کے ہونٹ کچھ کہنے [کو] پھڑک کے رہ گئے۔ میں نے پھر بھرّاتی آواز میں کہا۔ "آپ کا آنا [بہت] ضروری ہوگیا تھا۔ بہتر ہے، مجھ سے کچھ مت پوچھیے۔ تجمل بھائی [آپ کو] سب کچھ بتا دیں گے۔ سب کو احساس تھا کہ آپ کس قدر پریشان [ہو] جائیں گی لیکن لیکن... اب کچھ بھی نہیں ہے۔ اچھا ہوا کہ آپ آگئیں اور یقین کیجیے، میں نے نہیں، تجمل بھائی نے آپ کو بلایا، مجھے تو کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔"

"تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟" وہ آزردگی سے بولی۔

"میں آپ سے بالکل سچ کہہ رہا ہوں، مجھ سے مشورہ کیا جاتا تو میں شاید منع کر دیتا۔ میرے ذہن میں تو دُور دُور تک نہیں تھا کہ [آپ] کو تار دے دیا جائے گا مگر سمجھیے کہ تجمل بھائی کے پاس اور کوئی [چارہ] بھی نہیں رہا تھا۔ چارہ تو دوسرا بھی تھا لیکن نتائج کا یقین نہیں تھا۔ ایسا ہی تھا۔"

"مجھے صاف صاف کیوں نہیں بتلاتے۔" وہ التجائی لہجے میں [بولی]۔

"یقین کرو، سوچ سوچ کے میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔"

"میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ کچھ مت سوچیے۔ آپ کی اذیت کا مجھے خوب اندازہ ہے لیکن میرے بس میں کچھ نہیں تھا بلکہ کسی کے بس میں بھی...."

"کوئی ایسی بات ہے تو تجمل بھائی نے بالکل ٹھیک کیا۔ اذیت تو میرے لیے عین راحت ہے۔" اُس کی آواز رُندھنے لگی۔ "بھلا اس سے بڑی خوش نصیبی کیا ہو سکتی ہے کہ میں تمھارے یا تجمل بھائی کے کسی کام آؤں۔ میں سمجھوں گی کہ میری زندگی کا بھی کوئی مقصد ہے۔"

"یہ تو آپ دوسروں سے پوچھیے۔ آپ کی ذات ہی آپ کا ... ہے، مقصد صرف اپنے لیے تو نہیں ہوتا۔" میں نے عاجزی سے کہا۔

"جو بہتر سمجھا، وہی کیا مگر مجھے یہ سب کچھ اس طرح اچھا نہیں لگتا تھا۔"

"کیا اچھا نہیں لگتا تھا؟"

"یہی کہ... یہی کہ آپ کو دوبارہ، دوبارہ کسی، میرا مطلب ہے اس شہر میں..." لفظ میرے حلق میں منتشر ہوگئے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اُس سے کیا کہنا چاہتا ہوں۔ میں نے اُسے اور ہیجان میں مبتلا کر دیا تھا۔

"تم رُک کیوں گئے؟" وہ اضطراری انداز میں بولی۔ "میں نے زندگی میں بہت صدمے سہے ہیں لیکن شاید یہ صدمہ نہ سہا جاسکے کہ تم اپنی آپی کو کسی آزمائش کے لیے مشتبہ سمجھو۔ یہ سارا رُتبہ تم نے اور تجمل بھائی نے دیا ہے۔ میرے نگہبان موجود ہیں، پھر مجھے کاہے کی فکر ہو سکتی ہے، ہاں اگر، اگر تمھاری نظروں میں.... مجھ سے کوئی لغزش...."

اُس نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

"معلوم نہیں آپی! آپ کیا سمجھ رہی ہیں، ایسی باتیں مت کیجیے۔ رُتبہ کون کسی کو ایسے ہی دیتا ہے، رُتبہ تو رُتبے کے لائق لوگوں ہی کو ملتا ہے۔ میرا یقین ہے کہ آپ سے لغزش کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔ ایسی ویسی ہر بات دل سے نکال دیجیے۔" میرے لہجے میں تُندی آگئی تھی۔ میں نے اُس سے کہا۔ "کسی مان پر ہی تو آپ کو اطلاع دی گئی تھی، وہ وقت اب ٹل گیا ہے، کوئی ایسی بات ہی نہیں ہے۔ تھی بھی تو اب بالکل نہیں رہی ہے۔"

مجھے معلوم تھا کہ میری کوئی بات اُسے مطمئن نہیں کر سکے گی۔ ایک بار جی میں آئی کہ اُسے سب کچھ بتا دوں۔ اُس کی جگہ کوئی بھی ہوتا، اسی طرح مضطرب ہوتا۔ اُسے بلانے کے لیے دو ارجنٹ تار دیے گئے تھے اور خط لکھا گیا تھا نیز کسی اور جگہ نہیں، حیدر آباد آنے کو لکھا گیا تھا جہاں اُس نے ایک عرصہ گزارا تھا۔ یہاں آنے کے بعد ہمارا یہ رویہ اُس کے لیے بہت ناقابلِ فہم ہوگا، جانے کیسے کیسے شبہے اُس کے دل میں پنپ رہے ہوں گے مگر میں اُسے کیا بتاتا۔ میری زبان سے شاید کچھ بھی نہ نکلتا۔ میں نے اُس کی منت کی۔ "مجھ سے کچھ مت پوچھیے آپی! شاید میرے لیے آپ کو بتانا مناسب نہ ہو۔"

اُس کا چہرہ سُلگ رہا تھا، آنکھیں انگارے جیسی ہو رہی تھیں، ہونٹوں کے گوشے لرز لرز اٹھتے تھے مگر اُس نے پھر مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ منیر علی کرسی سے اُٹھ کے چوکی پر آگئے اور کہنے لگے۔ "تم اتنی ہراساں کیوں ہو رہی ہو بیٹی! بابر میاں واقعی ٹھیک کہہ رہے ہیں، اب اُسے دہرانا بے نتیجہ ہے۔ میرا خیال ہے، ہم جلد ہی یہاں سے چلے جائیں گے۔ ممکن ہے آج ہی رات۔" خانم کچھ نہیں بولی۔ انھوں نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کے آہستگی سے کہا۔ "میں تمھارے باپ کی جگہ ہوں اور بخدا تم مجھے زہرہ سے زیادہ عزیز ہو، کوئی تکدر نہ کرو۔ میرا کہا تو مانو گی؟" خانم نے ڈبڈبائی نظروں سے بے تابانہ اُن کی طرف دیکھا۔ منیر علی نے اُسے سینے سے لگا لیا اور اُس کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ خانم سسکنے لگی۔ اچھا ہوا کہ معاً زینے پر کسی کی آہٹ ہوئی۔ وہ ابا جان تھے۔ خانم نے دوپٹے سے چہرہ چھپا لیا اور کمرے میں چلی گئی۔ ابا جان ہمیں آوازیں دیتے ہوئے آئے تھے مگر ہم دونوں کے چہرے دیکھ کے ٹھٹک گئے۔ پہلے انھوں نے منیر علی کو غور سے دیکھا، پھر مجھے۔ زبان سے کچھ نہیں کہا۔

"ہم نیچے آ ہی رہے تھے بھائی صاحب!" منیر علی نے زیرِ لبی سے کہا اور ابا جان کا ہاتھ پکڑ کے آہستہ آہستہ سیڑھیاں اُترنے لگے۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ گول کمرے کا بڑا فانوس روشن کر دیا گیا تھا اور ساری فضا بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ وہاں کانتے اور جمرو دھلے دُھلائے بیٹھے تھے۔ گریبان کڑھا سفید کُرتا، چھوٹی مہری کا سفید پاجامہ اور واسکٹ۔ دونوں کی واسکٹوں کے رنگ مختلف تھے۔ بال سلیقے سے کڑھے ہوئے۔ میں بھی ایک ثانیے کو چونک پڑا تھا۔ دونوں شہزادے لگ رہے تھے۔ کمرے کا ماحول بھی ایسا ہی تھا۔ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کانتے اور جمرو ہیں۔ مجھے دیکھ کے دونوں مسکرانے لگے۔ کانتے نے اِترلاتے ہوئے اپنی واسکٹ کی گرد انگلی سے صاف کی، مجھے بھی ہنسی آگئی۔ اتنی دیر میں شامو اور زہرا بھی آگئے، پھر پیرو اور تجمل۔ سب کے سب تر و تازہ، شگفتہ شگفتہ نظر آرہے تھے۔ سب آچکے تو ایک معمر ملازم نے چپکے سے ابا جان کے کان میں آ کے کچھ کہا، ابا جان اُٹھ گئے اور انھوں نے سب کو اُٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ ہم انھی کی پیروی میں گول کمرے سے نکل کے راہ داری کا چند قدمی فاصلہ طے کرتے ہوئے ایک دوسرے کمرے میں آگئے۔ یہاں ایک لمبی چوڑی میز لگی تھی۔ میز پر قسم قسم کی چیزیں چنی ہوئی تھیں، چائے، دوسرے مشروبات، پھل میوے، مٹھائیاں اور کئی طرح کی نمکین چیزیں۔ کھانے کا اہتمام بھی اس سے بڑھ کے کیا ہوگا۔ میں نے نہ غسل کیا تھا، نہ لباس بدلا تھا۔ نیچے آ کے منیر علی نے مجھے روک لیا تھا کہ چائے تیار ہے۔ اب ناشتے وغیرہ سے نمٹ کے ہی لباس تبدیل کرنا۔ رات کے کھانے میں بھی اب کتنا وقت رہ گیا تھا لیکن تجمل کے سوا سب نے خوب سیر ہو کے کھایا۔ اُس نے صرف ایک پیالی چائے اور تھوڑی سی آلو کی چاٹ کے سوا کچھ نہیں لیا۔ تجمل ویسے بھی اُن سب سے الگ دکھائی دے رہا تھا جیسے وہ وہاں موجود ہی نہ ہو۔ شاید اور کسی نے خیال نہ کیا ہو لیکن مجھے تجمل کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں بھاری بھاری تھیں، چہرہ سُوجا ہوا تھا اور ماتھے پر شکنوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ اتنے دنوں تک وہ تقریباً جاگتا ہی رہا تھا، ممکن ہے یہ حال تھکن کی وجہ سے ہو۔ اُسے گہری نیند کی ضرورت تھی۔ ہجوم سے آنے کے بعد شروع شروع میں تو یہاں کی خاموشی

بہت عجیب معلوم ہوئی لیکن جلد ہی یہاں کے در و دیوار سے سب مانوس ہوگئے۔ مارٹی سب کا میزبان بنا ہوا تھا اور بس یہ کسر رہ گئی تھی کہ وہ پلیٹیں ہمارے منہ میں ٹھونس دے۔ اِدھر سے اُدھر دوڑا دوڑا پھر رہا تھا، ہر ایک کے منہ میں مٹھائی کا پورا دانہ رکھ دیتا پھر خود ہی بُری طرح کِھل کِھلانے لگتا۔ میرا خیال تھا کہ چائے کے دوران وہ بمبئی روانگی کے بارے میں کوئی فیصلہ ضرور کرلیں گے، آج رات یا کل صبح کی گاڑی سے لیکن کسی نے سفر کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ ابھی وقت تھا۔ دیواری گھڑی میں ساڑھے سات بجنے والے تھے، گاڑی نو بجے سے پہلے نہیں جاتی تھی۔ اسٹیشن تک پہنچنے کے لیے بڑا وقت پڑا تھا لیکن جانے والوں کے انداز ہی اور ہوتے ہیں، کوئی اور وقت ہوتا تو ایک رات آرام کرکے چلنے کا مشورہ مناسب رہتا حالانکہ صحیح آرام تو منزل ہی پر پہنچ کر ملتا ہے۔ ہم حویلی میں آگئے تھے لیکن حویلی تھی تو اسی شہر حیدرآباد میں۔ چائے پینے کے بعد سب پھر نشست گاہ میں آکے بیٹھ گئے۔ ایک ملازم نے بِجّھل کے آگے پرانی طرز کا بڑا سا حقہ رکھ دیا۔ سیاہ قلم کی فرشی، نیچے پر زری جیسا کام، تانبے کی جالی کٹی ہوئی چلم، سرپوش کے ساتھ۔ تمباکو کی بھینی بھینی خوشبو کمرے بھر میں پھیل گئی تھی۔ یہ حقہ ابا جان ہی بِجّھل کے لیے لائے ہوں گے کیونکہ بالکل نیا معلوم ہوتا تھا مگر بِجّھل نے چند ہی کش لیے ہوں گے کہ تخت سے اُٹھ گیا اور ابا جان کو ساتھ لے کے کمرے سے نکل گیا۔ یقیناً وہ کچھ طے ہی کرنے گئے ہوں گے مگر یہ بات یہاں سب کے سامنے کرنے میں کیا مضائقہ تھا؟

میری دھڑکن تیز ہوگئی تھی۔ کہیں کسی موزوں موقع، شبھ گھڑی کے لیے بِجّھل کے ذہن میں یہاں کچھ اور وقت گزارنے کا خیال تو نہیں ہے جو راستے مخدوش ہونے کا کوئی اندیشہ؟ مگر وقت گزرنے پر تو راستے اور مخدوش ہوسکتے ہیں۔ بِجّھل کو واپسی میں دیر ہوگئی۔

میں مارٹی کے ساتھ باہر نکل آیا۔ شامو بھی ہمارے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ کانتے اور زورا پہلے ہی کسی طرف نکل گئے تھے۔ مارٹی حویلی دکھانے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ میرا جی نہیں چاہ رہا تھا مگر میں اُس کی خاطر انکار نہ کرسکا، ویسے بھی مجھے یہاں کون سا کام تھا۔ میں نے اچھی طرح محسوس کرلیا تھا کہ اُن میں سے کسی کو اس شہر سے جانے کی جلدی نہیں ہے۔ شاید میرے ہی حواس کام نہیں کررہے تھے۔ اُن سب کی دانست میں اب کچھ کرنا باقی نہیں رہا تھا اور دیر سویر سے کوئی فرق نہیں پڑنا تھا۔

حویلی کا کوئی ایک حصہ نہیں تھا۔ مردان خانہ، زنان خانہ، مہمانوں کے لیے خاص حصہ اور مختلف نوعیت کے کمرے۔ نچلی منزل پر تقریبات اور خصوصی محفلوں کے لیے ہال جیسا ایک بڑا کمرہ۔ اوپری منزل جانے کے بھی کئی راستے تھے۔ نیچے کی طرح اوپر بھی مختلف اقامتی ایک دوسرے سے ملے ہوئے بھی اور ایک دوسرے سے الگ بھی کے علاوہ تہہ خانہ، زمیں دوز ٹھنڈے اور گرم کمرے۔ ہر جگہ بھی موجود تھا۔ میزیں، کرسیاں، پلنگ، آئینے اور تصویریں۔ دیوار الماریوں کی گنجائش رکھی گئی تھی۔ کئی کمروں میں ہوٹلوں کی طرح وغیرہ ملحق بھی تھے۔ دیواریں اور چھت منقش اور کھڑکیوں پر رنگ کے پردے آراستہ۔ اندر ساری کی ساری عمارت بھول جیسی تھی، جدھر سے نکلو، گھوم کے اُدھر ہی آجاؤ۔ عمارت کے میں نوکروں کے مکانات بنے ہوئے تھے۔ زنان خانے کا با تھا، عام باغ الگ۔ گھر کی ضرورت کے لیے ترکاریاں اُگانے کو ایک مختصر قطعہ بھی مخصوص کیا گیا تھا۔ ٹینس کھیلنے کے لیے کو تھا اور باغ میں ایک تالاب بھی۔ تالاب میں مارٹی کے کہنے مطابق رنگ برنگی مچھلیاں تیرتی رہتی تھیں۔ حویلی کے مکین نے سے غلط نہیں کہا ہوگا کہ کسی انگریز افسر کی عمارت پر نظر تھی۔ نے اس کے عوض بڑی رقم ادا کی تھی مگر دیکھنے کے بعد اندازہ کہ حویلی کی عمارت ادا کی جانے والی رقم سے گراں بہا ہے۔ ہو نواب حشمت جنگ نے حویلی کے مکیں سے اپنے خصوصی مرا میرا ابا جان کے لیے کوئی رعایت کرائی ہو اور اُس رعایت کا بار خود برداشت کیا ہو۔ حویلی کی سج دھج برقرار رکھنے کے لیے ملازم بڑی تعداد لازم تھی۔ مارٹی مجھے ایک ایک چپا اس طرح دکھا جیسے یہ سب کچھ اُسی نے تعمیر کیا ہو اور ہمارا مستقل یہیں رہنے ہوسا کسی کا اشتیاق مجھے روک لیتا تھا، میں باقی پھر پر اُٹھا رکھ واپس اندر چلنے کے لیے کہتے کہتے رہ جاتا تھا۔ پچھلے حصے میں ہمیں ننگول گیا۔ وہ ہمیں کو ڈھونڈتا ہوا اِدھر آنکلا تھا۔ میرے پر اُس نے بتایا کہ ابا جان اور منیر علی سے الگ کمرے میں کچھ دیر کرکے بِجّھل اوپر خانم کے پاس چلا گیا ہے اور ابھی تک وہیں۔ باغ میں تھوڑی دور جا کے ہم اندر واپس آئے۔ کانتے موجود نہیں تھے۔ میں سمجھا کہ وہ کسی کمرے میں آرام کے لیے چلے ہوں گے لیکن اپنے اطمینان کے لیے میں نے جمرو سے اُن کے با میں معلوم کیا۔ جمرو نے میرے سر میں اور ریت بھر دی۔ اُس کہ وہ دونوں بِجّھل کی ہدایت پر کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔

"حویلی سے باہر؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں لاڈلے بھائی!" اُس نے سکون سے جواب دیا۔

"کہاں؟"

جمرو ہونٹ لٹکا کے رہ گیا۔ اِس وقت حویلی سے باہر وہ کہاں سکتے ہیں؟ واپس اڈے پر؟ یا سواری لینے؟ مگر سواری کے انتظام لیے نوکروں کی کیا کمی ہے۔ میری رگوں میں برف سی جمنے لگی۔ بِجّھل نشست گاہ میں واپس آچکا تھا اور حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ پیرو بھی وہیں میں نے سوچا، پیرو سے کچھ معلوم کرنے کی کوشش کروں لیکن ایک بِجّھل کے بہت قریب بیٹھا اُس سے باتوں میں منہمک تھا، دوسرے خود اچھا نہیں لگا۔ مبادا میری وحشت اُسے گراں گزرے یا وہ مذاق نے لگے۔ میں وہیں خاموش بیٹھا کانتے اور زورا کا انتظار کرتا رہا وہ نہیں آئے۔ گھڑی میں نو بجنے والے تھے۔ گھڑی دیکھ کے مجھے قدر سکون ہوا۔ روانگی کا امکان اب خارج از بحث تھا۔ بہتر یہی میں کسی کمرے میں جا کے آنکھیں بند کرلیتا لیکن میں خود پر بوجھ وہیں بیٹھا رہا۔ مجھے اپنے آپ سے چڑ ہونے لگی تھی، خود کو بہت تا تھا کہ ایک مجھی کو ایسی تلا بیلی کیا پڑی ہے۔ سب ایک ہی کشتی میں ار ہیں مگر دوسرے ہی لمحے میری آنکھیں بھٹکنے لگتی تھیں۔ پھر میں وہاں سے اُٹھنے کا ارادہ کرلیا۔ اُٹھ کے میں ابھی دروازے سے ہی رہا تھا کہ بِجّھل کی گونجتی آواز نے میرے قدم روک لیے۔ "تو نے نہیں بدلے رے۔"

"نہیں!" میں نے مُڑ کے ترشی سے کہا۔

"کھینچ لے۔"

"اب سویرے ہی بدل لوں گا۔"

"کہیں چلنا پڑے رے۔"

"کہاں؟" میں نے تذبذب سے پوچھا۔

"چلنا ہے لاڈلے!" بِجّھل نے تنک کے کہا۔ میں نے اُس سے بارہ پوچھنا چاہا لیکن میرے زبان کھولنے سے پہلے ہی اُس نے آنکھ اشارے سے مجھے تحمل کی تلقین کردی۔ میں اُسے دیکھتا رہ گیا اور لمحے وہیں دروازے پر منجمد کھڑا رہا۔ یہ کیا ضروری ہے کہ گاڑی ت گزر جانے کے باوجود ہم یہاں سے نہ نکل سکیں۔ ہم کسی بھی سواری راتوں رات شہر سے دور ہوسکتے ہیں، کم سے کم سکندرآباد تک تو سکتے ہیں، وہاں ایک بڑا ریلوے جنکشن ہے۔ ممکن ہے کانتے اور حفظِ ماتقدم کے لیے حویلی کے آس پاس علاقے کا جائزہ لینے نکلے ہوں ملوں اسٹیشنوں پر کوئی کان لگائے تو نہیں کھڑا ہے۔ وہ سیر و تفریح کو میں گئے ہوں گے۔ اڈے پر واپس جانے کا بھی کوئی جواز نہیں تھا۔ لباس بدلنے کے لیے بِجّھل کی ہدایت بے سبب تو نہیں ہوسکتی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس دوران نواب حشمت جنگ آجائے یا ابا جان ہمیں لے اُن کے پاس جانا چاہتے ہوں۔ میں باہر نکل آیا۔ مجھے معلوم تھا کہ ابا جان کے سلوائے ہوئے کپڑے کون سے کمرے میں رکھے ہیں، وہیں سے سب نے اپنے ناپ کے کپڑے منتخب کیے تھے۔ ابھی وہاں کئی جوڑے رکھے تھے۔ میں نے خانے سے اپنے لیے ایک کرتا ناپ کے دیکھا، اسی اثنا میں مارٹی ہانپتا ہوا آگیا اور ایک چھوٹا سوٹ کیس میرے حوالے کرتے ہوئے کہنے لگا: "راجا اُستاد! اپن سالا ابھی ایک دم بھول گیا، خانم بہن اپن کو بولا تھا، ایدر تمھارے لیے زری بہن کا ایک چیز اُس کے پاس پڑا ہے۔"

"یہ یہ کیا ہے؟" میں نے تعجب سے کہا۔

"ابھی کھول کے دیکھتا ہے راجا!" مارٹی جھل ملاتی آواز میں بولا۔ میں دم بخود سا کھڑا تھا، مارٹی نے اپنے ہاتھ میں دبی ہوئی چابی لہرائی: "ابھی بولے تو کھول کے دیکھے؟"

"زریں نے بھیجا ہے؟" میری آواز لرز رہی تھی۔

"ہاں ہاں راجا! اپنی زری سسٹر نے، ہاؤ ونڈرفل شی اِز، اپن بولتا ہے قسم سے ٹاپ ٹو باٹم ایک دم گاڈیس ہے۔" اُس نے چابی قفل میں گھمادی تھی مگر رُک گیا۔

"کھولتے کیوں نہیں؟" میں نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نئیں راجا اُستاد! اپن ایک دم اُلو کا پٹھا ہے، ابھی تمھی اِس کو کھولو۔" وہ کسمساتے ہوئے بولا۔ "اور جلدی سے ریڈی ہو کے آجاؤ۔"

وہ کمرے سے جانے لگا۔ میں نے اُس کا بازو پکڑ لیا۔ "تمھیں کیا ہوگیا ہے؟" میں نے ناراضی سے کہا، مارٹی کا جسم چور سا بن گیا تھا، معذرت خواہانہ سا۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ اُس کی جھجک کا کیا سبب ہے۔ مجھے اس پر غصہ بھی آیا اور پیار بھی۔ اچانک اُسے خیال آگیا تھا کہ میرے لیے بھیجی گئی چیز مجھی کو کھولنی چاہیے۔ میں نے حکمی لہجے میں پھر اُس سے کہا کہ سوٹ کیس وہی کھولے۔ مارٹی نے بہ جبر تعمیل کی اور اچھلنے لگا: "دیکھا، دیکھا راجا! ابھی کیا کیا زری سسٹر نے بھیجا ہے۔" سوٹ کیس میں ضرورت کا سارا سامان موجود تھا۔ دو جوڑی کپڑے، سیاہ شیروانی، واسکٹ، بنیان، جرابیں اور سلیم شاہی جوتے، آئینہ، کنگھی، تولیا، منجن کا ڈبا، رومال اور عطر کی شیشی۔ سب چیزیں سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں، میری نظروں میں زریں کی تصویر گھومنے لگی۔ چلتے وقت اُس نے مجھ سے کہا تھا، ابھی سلے کپڑے تو تیار نہیں ہوئے، میں منیر علی بتا رہے تھے کہ ہمارا تار ملنے کے وقت وہ گھر پر نہیں تھے، انھیں زمینوں پر اطلاع دی گئی۔ اس دوران دوسرا تار پہنچ گیا مگر کوئی دوسرا شخص بھی تو بِجّھل کے نام سے تار دے سکتا تھا، اسی تذبذب میں دو دن لگ گئے اور جب تک خط نہیں ملا، انھوں نے سفر کا ارادہ نہیں کیا۔ خانم کے آنے میں اسی وجہ سے دیر ہوگئی تھی، دیر شاید اسی لیے ہونی بھی تھی کہ ہمیں حیدرآباد میں اُس کے آنے سے پہلے نواب عالم تاب کی حویلی سے نکل کے آنا تھا، درمیان کے

ان دو دنوں میں زرّیں کو یہ چیزیں اکٹھی کرنے کا موقع مل گیا ہوگا لنڈی ایک ایک چیز احتیاط سے نکال کے مجھے دکھا رہا تھا، نیساں کے ہاتھ کا کڑھا ہوا رومال بھی تھا جب میں چلا تھا، نیساں نے یہ ادھورا رومال مجھے دکھایا تھا اور مجھ سے پوچھا تھا کہ پھول اُس نے کیسا بنایا ہے یہ سارا کام زرّیں ہی نے اُسے سکھایا تھا۔ اُسی نے نیساں کو مشورہ دیا ہوگا کہ سفید رومال کے کونے پر سفید تارکشی سے پھول بنایا جائے تو رومال زیادہ نفیس اور دیدہ زیب ہو جائے گا۔ یہ نفاست اُسی کو آتی تھی کچھ دیر کے لیے میں خود کو بھول گیا، زرّیں جیسے میرے سامنے سر جھکائے کھڑی تھی، سفید لباس میں ملبوس کسی مجرم کی طرح، میری پتھرائی آنکھیں اُسی کو دیکھ رہی تھیں۔ مارٹی نے مجھے چونکایا اور ہنسنے لگا: "ابھی کدھر چلا گیا راجا؟"

مجھے اُس کے سامنے خفت سی ہوئی۔ میں نے جلدی سے ایک جوڑا نکال کے الگ رکھا۔ مارٹی نے شیروانی بھی نکال لی تھی، اُس کی خواہش تھی کہ میں آج یہی لباس پہنوں۔ حیدرآباد میں شیروانی کا عام رواج تھا مگر میں نے شیروانی سوٹ کیس میں واپس رکھ دی اور واسکٹ نکال کے سیدھا غسل خانے میں آگیا۔ مجھ سے ٹھیک طرح غسل بھی نہیں کیا گیا۔ گرم پانی موجود تھا مگر وہ اتنا گرم تھا کہ ٹھنڈا پانی ملا کے معتدل کرنے میں دیر لگتی۔ میں نے ٹھنڈے ہی پانی پر اکتفا کیا۔ پاجامے میں کمر بند پڑا ہوا تھا، کمر بند نیفے میں اندر سرک جانے کے خیال سے گرہ بھی لگا دی گئی تھی۔ باہر مارٹی میرا منتظر تھا۔ میں اندر سے تیار ہو کے نکلا تو مارٹی ایسی سیٹی بجانے لگا جیسی نوٹنکی میں کوئی بازی گر آنے پر تماشائی بجاتے ہیں۔ وہ جسم نچا نچا کے مجھے مختلف زاویوں سے دیکھتا رہا پھر اُس نے میرے پیروں کے آگے سلیم شاہی جوتی رکھ دی۔ جوتی میرے پیر میں بالکل فٹ آئی۔ زرّیں کو میرے کپڑوں اور جوتوں کی پیمائش کا کیسا اندازہ تھا۔ میں نے سوچا کتنی بار باہر گیا ہوں، بہنوں کے لیے لیکن مجھے کبھی خیال تک نہیں آیا کہ اُس کے لیے کوئی چیز لیتا چلوں۔ اُس نے کبھی کوئی شکوہ نہیں کیا مگر شاید شکوہ کرنا اُسے آتا ہی نہیں تھا۔

کمرے میں نصب قدِ آدم آئینے میں خود کو دیکھ کے مجھے اجنبیت سی محسوس ہوئی۔ بالوں کی ترتیب بھی آدمی کو کتنا بدل دیتی ہے۔ مجھے اچھے نہیں لگ رہے تھے لیکن مارٹی نے کاڑھے تھے اس لیے میں نے انھیں جوں کا توں رہنے دیا۔ ہم کمرے سے نکلنے ہی والے تھے کہ شنگو دوڑتا ہوا آیا: "لاڈلے بھائی! اُستاد تم کو بلاتے ہیں۔"

"مجھے؟" میں نے بے چینی سے کہا: "کیا کالنتے اور زورا واپس آگئے ہیں؟"

"ہاں ہاں۔" وہ پھولی ہوئی سانسوں سے بولا۔

میں کسی تاخیر کے بغیر دروازے کی طرف جھپٹا۔ تیز تیز قدم اٹھاتے میں نے راہ داری عبور کی۔ وہ سب مجھے نشست گاہ سے باہر ہی کھڑے نظر آگئے۔ تجمل کے کندھے پر شال پڑی تھی، پیرو کے کندھے پر بھی۔ تجمل شیروانی میں تھے۔ انھیں جیسے میرا ہی انتظار تھا۔ میرے پہنچتے ہی وہ آگے بڑھے اور چبوترے پر چلے آئے۔ باہر موٹر گاڑی کے سائبان میں دو ٹم ٹم موجود تھیں۔ اُن سب کے چہرے بوجھل تھے، سب گم صم سے تھے جیسے موت ہوگئی ہو۔ میں اُن کے قریب جا کے ٹھٹک سا گیا تو تجمل نے مجھے پاس آنے کا اشارہ کیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ جتنی دیر میں ہم ٹم ٹم کے قریب پہنچے، چبوترے کے دوسری جانب سے مجھے منیر علی اور خانم آتے دکھائی دیے۔ خانم برقع پہنے ہوئے تھی۔ چبوترے پر روشنی اتنی تیز نہیں تھی مگر کالے نقاب کے بیچ میں خانم کا چہرہ چاند کے مانند دمک رہا تھا۔ برقع میں اُس کا قد کچھ اور بڑا ہو گیا تھا۔ پہلے ایک لمحے کو مجھے شبہ ہوا تھا کہ وہ کہیں اور نہ جا رہے ہوں مثلاً نواب حشمت جنگ کے ہاں لیکن خانم کو آتے دیکھ کے اس شبہے کا کوئی جواز نہیں رہا تھا۔ ظاہر ہے وہ نواب حشمت جنگ کے ہاں خانم کو ساتھ لے جانا مناسب نہیں سمجھ سکتے تھے۔ آخر انھوں نے فیصلہ کر لیا تھا۔ میرے سینے میں بھرا ہوا اندھیرا چھٹ گیا۔ ٹم ٹم پر چڑھتے وقت کسی نے مجھے ٹوکا دیا کہ انھوں نے کوئی سامان ساتھ نہیں لیا ہے لیکن اس کا جواب دوسرے ہی پل مل گیا۔ ملنگی، شامو، جبرو اور شنگو ہمارے ساتھ ٹم ٹم میں نہیں بیٹھے تھے۔ وہ ہمارے پیچھے پیچھے چبوترے تک آئے تھے لیکن ابا جان نے انھیں وہیں روک دیا تھا۔ تجمل نے یہی طے کیا ہوگا کہ وہ سامان لے کے بعد میں آئیں مگر مارٹی اتنی دیر سے میرے ساتھ تھا، ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ مجھے ضرور بتاتا۔ ممکن ہے ملنگی کے موجود نہ ہونے پر جبرو کو سمجھا دیا گیا ہو۔ پہلی والی ٹم ٹم میں خانم، ابا جان، منیر علی اور تجمل بیٹھ گئے۔ دوسری پر پیرو، زورا، کالنتے اور میں۔ جلد ہی دونوں گاڑیاں عمارت سے نکل کے بڑی سڑک پر آگئیں۔ میں نے پیرو اور کالنتے سے کچھ پوچھنا چاہا لیکن مناسب نہیں سمجھا کیونکہ وہ تینوں اپنے آپ میں گم بیٹھے تھے۔ میں بھی چپ رہا۔ اب تھکن اُن پر اچھی طرح غالب آرہی ہوگی۔

سڑک کے دو رویہ کھمبوں پر روشنی کی قطاریں حدِ نظر تک پھیلی ہوئی تھیں۔ آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ دونوں ٹم ٹموں کی چاپیں دور دور تک سنائی دے رہی ہوں گی۔ ہوا نرم اور خنک تھی، کبھی کبھی کوئی تیز جھونکا جسم میں کھب سا جاتا تھا۔ ٹم ٹم میانہ رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ کسی کے تعاقب کا بظاہر کوئی امکان نہیں تھا۔ کالنتے اور زورا سے یہ یقین کر لینے کے بعد ہی تجمل نے باہر نکلنے کا ارادہ کیا ہوگا تاہم میری نظریں سڑک پر بکھری ہوئی تھیں۔ دونوں اطراف حویلیوں کے برجوں، شہ نشینوں اور جھروکوں میں روشنیاں جھل ملا رہی تھیں۔ ہر سُو سکون چھایا ہوا تھا۔ ٹم ٹم خاصی دور آنے کے بعد بھی شہر کے گنجان علاقے میں داخل نہیں ہوئی تو مجھے بے کلی ہونے لگی۔ میں نے کچھ دیر اور انتظار کیا پھر سر نکال کے باہر جھانکا۔ دور تک آقامتی علاقہ ہی نظر آرہا تھا اور اُن تینوں کو سمت کی کوئی فکر نہیں معلوم ہوتی تھی۔ مجھ سے ضبط نہیں ہوا۔ میں نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے پیرو سے جھک کے پوچھا: "دادا! یہ یہ کہاں جا رہا ہے؟"

پیرو نے سر اُٹھا کے میری طرف دیکھا اور کسی قدر حیرت آمیز لہجے میں بولا: "تجھ کو نہیں پتہ جانی؟"

"ہم ہم بمبئی جا رہے ہیں نا؟" میں نے اٹکتی زبان سے کہا۔

اُس نے اپنے پنجے سے میری گردن دبوچ لی اور میرے سر کو جھٹکے دیتے ہوئے بولا: "ابھی کیدر رے!"

"پھر، پھر تم کہاں جا رہے ہو؟"

"بڑے نواب کے ہاں۔" وہ آہستگی سے بولا۔

مجھے یک لخت جھٹکا سا لگا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھا کیا۔

"ہاں جانی! اپن اُودر ہی جا رہا ہے۔" پیرو بھنچی ہوئی آواز میں بولا۔ میرا جسم سن ہوگیا تھا، مجھ سے کچھ نہیں کہا گیا۔ "ابھی تجمل بھائی یہی مانگتا ہے کہ اپن لوگ کو اُودر چلنا چاہیے، بولتا ہے کہ اُودر خانم کا ضرورت ہے۔"

"مگر، مگر دادا!....." میں نے بہ مشکل کہا۔ میری آواز بھرّانے لگی تھی۔

وہ میری پیٹھ تھپکتے ہوئے بولا: "کبھی ایسا بھی چلتا ہے راجا!"

میرے جی میں آئی کہ ٹم ٹم سے کود پڑوں۔ پیرو کی آواز میرے کانوں میں چیخ رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا: "تجمل بھائی بولتا ہے، اُودر چھوٹا نواب ایک دم رُوٹھ گیا ہے۔"

"تم نے اُن سے یہ نہیں کہا، تم نے یہ نہیں کہا کہ خانم کوئی؟...."

"وہ اپن سے زیادہ جانتا ہے۔"

"روکو دادا! گاڑی روک دو۔" میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔ "خانم کو ایسے وہاں نہیں جانا چاہیے۔ یہ کیا بات ہوئی بھلا، تم سب کچھ بھول گئے ابھی تک تمھارے جسم پر نشانات ہوں گے، کل ہی رات کی تو بات ہے۔ کتنی کسر رہ گئی تھی، تم نے نہیں بتایا دادا کہ ہم سے؟...."

"پر وہ بولتا ہے کہ چھوٹا نواب کا حال ٹھیک نہیں ہے۔"

"لیکن خانم کوئی کھلونا نہیں ہے۔" میں نے چیختے ہوئے کہا: "وہ بازار میں نہیں بیٹھی ہے۔"

"پر کیا وہ کسی گھر سے نہیں جا سکتی؟"

"تم تم کیا کہہ رہے ہو دادا؟"

"اپن ٹھیک ہی بول رہا ہے۔"

"دادا! مجھے تجمل بھائی سے بات کرنے دو۔" میں نے فریاد کی۔ "گاڑی رُکوا دو۔"

"کالنتے اور زورا بڑے نواب کو بول کے آیا ہے کہ ہم لوگ ابھی خانم کے ساتھ اُودر آتا ہے۔"

"نہیں نہیں یہ ٹھیک نہیں ہے دادا! ضروری نہیں کہ تجمل بھائی کا ہر فیصلہ درست ہو۔ مجھے اُن سے بات کرنے دو، ایسا کوئی قدم اُٹھانے سے پہلے ہر پہلو پر سوچ سمجھ لینا چاہیے۔ وہ نواب لوگ ہیں، تم نے انھیں خوب دیکھ لیا ہے، اُن کے دل پتھر کے ہیں، اپنی غرض کے سوا انھیں کچھ نظر نہیں آتا، وہ دو آدمیوں کو جانوروں کی طرح قید رکھ سکتے ہیں، انسانوں کو اصطبل میں گھوڑوں کے ساتھ باندھ دیتے ہیں، ایسا ہی ہے تو اُن سے کوئی باقاعدہ بات کیے بغیر..... اور یہ سب کچھ تو بعد میں بھی ہو سکتا ہے، فی الحال ہمیں یہاں سے نکلنے پر توجہ دینی چاہیے۔" میں نے عاجزی سے کہا: "اور خانم، دادا! وہ اب تمھاری بیٹی ہے اور وہ میرے لیے بھی نمی سے کسی طرح کم نہیں ہے۔"

"پر وہ اُستاد کا بھی تو کچھ بنتا ہے۔" پیرو نے جواب میں تلخی سے کہا: "اُس نے خانم سے بات کر لیا ہے۔"

"خانم اُن کے سامنے کیا بول سکتی ہے۔ یہ تو ہمارے سوچنے کا کام ہے۔ چھوٹے نواب کا حال ٹھیک نہیں ہے تو کیا خانم کو اُس پر قربان کر دینا چاہیے؟ خانم دل سے اس پر تیار نہیں ہوگی۔ مجھے یقین ہے، وہ کبھی وہاں جانا نہیں چاہے گی۔ میں جانتا ہوں، اُسے اپنی موجودہ زندگی عقیدت کی حد تک عزیز ہے۔"

"اپن کو پتہ ہے پرجانی..." وہ کسمسا کے رہ گیا۔

"پر کیا، کیا؟" میں نے وحشت سے کہا۔ "تم سمجھ کیوں نہیں رہے ہو؟ اُس وقت کی بات دوسری تھی جب ہم نواب کے قبضے میں تھے اور وہ تھی تھے جس نے خانم کا پتہ بتانے سے انکار کردیا تھا اور بدلے میں سلاخوں سے بدتر قید قبول کرلی تھی۔ بجھل بھائی کو کوئی اور راستہ نہ دیکھ کے اُسے بلانا پڑ گیا، ٹھیک ہے مگر اب تو ایسی کوئی مجبوری نہیں ہے۔ اب کیا بات ہے؟ یہاں رہنے سے کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ پہلے ہی کیا کم ہوا ہے۔ سوچو دادا! میری بات ذرا دھیان سے سن لو۔ ہم کون ہیں، نواب کون ہے، خانم کون ہے۔ آدمی کے حوالے مشکل سے ملتے ہیں۔ نواب خوب جانتا ہے ہمارا تعلق اڈے سے ہے۔ وہ ہمیں کبھی اس طرح کی حیثیت..." میری آواز ہانپ رہی تھی۔ "نہ خانم کو... اگر تمھارے اور بجھل بھائی کے اندازے غلط ہوگئے، غلط تو ہوسکتے ہیں نا، تو پھر؟ ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے، اِس کام کے لیے یہ وقت کسی طور موزوں نہیں۔" پیرو کی بے حسی دیکھ کے میرے جسم میں کھولن سی ہونے لگی۔ گاڑی اپنی رفتار سے چل رہی تھی۔ کانتے اور زورا بھی مجھے بجھل کا واسطہ دے کے خاموش رہنے کی تلقین کرنے لگے۔ وہ نہ میری بات سننے کی کوشش کر رہے تھے، نہ سمجھنے کی۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں پیرو سے بازو چھڑا کے نیچے اترنے کے لیے لپکا۔ ٹم ٹم کی رفتار اتنی تیز نہیں تھی کہ میں اتر نہ سکتا۔ آگے کچھ ہی فاصلے پر دوسری ٹم ٹم چل رہی تھی۔ میں تیز رفتاری سے درمیانی فاصلہ عبور کرکے اُسے آسانی سے پکڑ سکتا تھا۔ مجھے بہرحال بجھل سے بات کرنی چاہیے تھی۔ میں اُس سے کہنا چاہتا تھا کہ اگر اُس کی یہی منشا ہے تو نواب کے پاس جانے کا یہ طریقہ مناسب نہیں ہے۔ گو ٹم ٹم میں ابا جان اور منیر علی بھی بیٹھے تھے، خانم بھی تھیں۔ مجھ پر ہیجان سا طاری تھا۔ اِس کے سوا کوئی یارا ہی نہیں رہا تھا۔ مجھے نواب کی حویلی آجانے سے پہلے اُسے روک لینا چاہیے۔ اگر ابا جان اور منیر علی کے سامنے کچھ کہنا مناسب نہیں تھا تو میں بجھل سے چند لمحے نیچے اترنے کی درخواست کرسکتا تھا۔ یقیناً اُس نے فیصلہ کرنے میں عجلت کی ہے، مجھے اُس سے اتنا ہی کہنا تھا۔ اِس کے بعد اُس کی جو مرضی لیکن میں نے پائدان پر قدم ہی رکھا تھا کہ کانتے نے جھپٹ کے میری کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ ٹم ٹم زیر و زبر ہوگئی تھی۔ پیرو نے میرا بازو کھینچ کے مجھے پھر نشست پر دھکا دے دیا۔ "دادا! میری بات سنو۔" میں نے ٹوٹی ہوئی سانسوں سے کہا۔ "جو ختم ہوگیا ہے، اُسے دوبارہ کریدنا اور چھیڑنا کون سی ہوش مندی ہے، پھر کوئی الجھاؤ ہوسکتا ہے اور یہاں کوئی ایک آدمی نہیں ہے، سبھی کسی نہ کسی طرح ملوث ہوجاتے ہیں، وہ دوسرے لوگ ہیں دادا! تم تو انھیں بہت قریب سے دیکھ چکے ہو۔ بجھل بھائی جانے کیا سمجھ رہے ہیں۔ نواب عالم تاب کا یہ وقت تو کسی نہ کسی طرح گزر جائے گا مگر اُس کے لیے..."

"اُستاد اس کو دیکھ کے آیا ہے جانی! اور تو بھولتا ہے، اُودر نواب کا بیگم اور بہن آ کے کیا بولتا تھا۔"

"مجھے یاد ہے لیکن وہ جلد ہی یا دیر میں ٹھیک ہوجائے گا، اب تک بھی وہ زندہ ہی ہے۔"

"اُس کو ایسے ٹھیک ہونا ہوتا تو کبھی کا ہو جاتا راجا!" پیرو زہر خند سے بولا۔ اُس کی آنکھوں میں گہری چمک آگئی تھی۔ "تمن میں ... اپن اُودر کوئی جاگیر لینے نئیں جا رہا ہے سالا۔ بعد کو ہم بھی ادھر ہی ہے، کبھی آدمی ایسے ٹھیک نئیں ہوتا، اور تو، تو بھی ایسا بولتا ہے۔ ابھی نیبش دیکھ کے نئیں آیا ہے۔ وقت کی کیا بات کرتا ہے سالا! کبھی بھر ہے تو اتنا ہی اُبھر کے آجاتا ہے۔ ابھی نیچے جھانک کے اپنے سے بولا وقت تو تو نے بھی کم نہیں لیا ہے۔" اُس کی نگاہیں مجھے اپنے جسم پر چبھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ میں گنگ بیٹھا اُسے دیکھ رہا تھا۔ پیرو نے پھر سر جھکا لیا اور تھکی ہوئی آواز میں بولا۔ "اپنی زبان بھی نئیں سمجھا کیا؟"

پیرو کا ایک ایک لفظ میرے سینے میں کسی خنجر ہی کی طرح اُتر رہا تھا۔ "بول رے۔" وہ مجھے جھنجوڑ کے بولا۔ "چپ کیوں ہوگیا؟"

میں نے اُسے کوئی جواب نہیں دیا۔ جواب کا مجھے یارا ہی نہیں تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں اُس کے سامنے ننگا ہوگیا ہوں۔ پیرو نے میرا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور مجھ سے جانے کیا کیا کہتا رہا۔ میں نے شاید کچھ بھی نہیں سنا۔ میں اُس کے آگے ہاتھ جوڑنا چاہتا تھا لیکن سے یہ بھی نہ ہوسکا۔ میرا سارا جسم پسینے میں ڈوب گیا تھا۔

مجھے نہیں معلوم، ٹم ٹم کتنی دیر تک چلتی رہی۔ جب رکی تو کانتے نے میرے گھٹنے پر تھپکی دے کے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ ٹم ٹم چند لمحے رک کے پھر چل پڑی۔ وہ بڑے نواب کی حویلی کا دروازہ تھا، ہم نے کل رات ہی اُسے عبور کیا تھا۔ دروازے کے اطراف روشنیاں جلی ہوئی تھیں، کل کے مقابلے میں بہت زیادہ۔ بڑا دروازہ فوراً کھول دیا گیا تھا۔ باہر کئی آدمی ہمارے انتظار ہی میں کھڑے تھے اور ان کی آوازوں سے باہر چھایا ہوا سکوت تھوڑی دیر کے لیے درہم برہم ہوگیا تھا۔ دروازے سے عمارت تک روشوں کے درمیان گزرگاہ میں فاصلے فاصلے پر مجھے کئی آدمی مستعد کھڑے نظر آئے۔ ٹم ٹم خاص کا ریڈور میں جا کے ٹھیری اور میں نے عمارت کی سیڑھیوں پر بڑے نواب کی جھلک دیکھی۔ وہ ٹم ٹم ٹھیرتے ہی ہماری جانب لپکا۔ پیرو نے میرا ہاتھ بڑے زور سے تھام رکھا تھا۔ اُس نے مجھے کھینچ کے اٹھایا۔ میں ہڑبڑا کے نیچے اترا یا تھا اور میں نے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی لیکن دل اندر ہی اندر جیسے کٹ رہا تھا۔ زمین پر آ کے پیرو نے ایک بار پھر

جانب چھلکتی آنکھوں سے دیکھا تو میرا سارا وجود لرزنے لگا۔ اُس کی نگاہوں میں خفت اور یاسیت کی آمیزش تھی جیسے اُس نے سب غلط کہا تھا اور میں نے غلط سُنا تھا میرے جی میں آئی کہ میں وہیں سر پھوڑ لوں یا اُس کے پاؤں پکڑ کے التجا کروں۔ داجا! بس کرو، مجھے جو چاہے سزا دے دو مگر میں کسی بخشش اور درگزر کا اہل نہیں ہوں میں اپنے سوا واقعی کسی کو نہیں پہچانتا، اپنے سوا میں سب کے لیے لوزان اور چلانے رکھتا ہوں میں بہت وحشی ہوں مجھ سے میری اوقات ہی کے مطابق سلوک کرو مگر شاید اِس سے بڑی ذلت کوئی نہیں ہوتی کہ آدمی اپنی ہی نظروں میں ارزاں ہو جائے۔ پیرو مجھے کھینچتا ہوا چند قدم آگے بڑھ گیا۔ وہاں آگے والی تم تم کھڑی تھی، پیرو کو مجھے کھینچنے گھسیٹنے کی ضرورت نہیں تھی؛ اب میرے لیے اگر تلافی کا کوئی گوشہ بچا تھا تو یہی کہ میں خانم کا ہاتھ تھام کے اُسے خود اندر لے جاؤں۔ ہر چند اب اس سے بھی کیا فرق پڑتا تھا۔ پیرو کو مجھ پر بہت رحم آتا یا بہت ہنسی آتی۔

تجمل کے اُترتے ہی بڑے نواب نے اُس کے ہاتھ جکڑ لیے اُس کی آنکھیں جل سی رہی تھیں، لمحوں تک وہ تجمل کے سامنے اُس کے ہاتھوں میں ہاتھ پیوست کیے گُم کھڑا رہا، پتھر کی مورتی کی طرح اور اُس کے ہونٹ مسلسل سسکتے، پھڑکتے رہے معًا اباجان درمیان میں آ گئے۔ اُسے کچھ احساس ہوا اور اُس نے حواس باختہ انداز میں چبوترے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ خانم بھی منیر علی کے پیچھے پیچھے نیچے اُتر گئی تھی۔ برقع پوش خانم کو دیکھ کے اُس کی حالت اور اضطراری ہو گئی۔ تجمل نے چبوترے کی سیڑھیاں آہستہ آہستہ طے کیں اور اُس کے ساتھ ہم سب نے، نواب سب سے پہلے تیزی سے اُوپر چلا گیا تھا۔ چبوترے کے سائبان میں سامنے پہلا کمرہ روشن تھا، نواب کی پیروی میں ہم بھی اندر داخل ہو گئے۔ منیر علی خانم کا سایہ بنے ہوئے تھے۔ کمرے میں آ کے نواب کے اوسان کچھ درست معلوم ہوتے تھے، اُس نے چھلکتی نظروں سے باری باری ہمیں دیکھا جیسے ہی اُس کی نظر پیرو پر گئی، اُس کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ کسی توقف کے بغیر جھپکتی پلکوں اور رست پٹاتے قدموں سے پیرو کے پاس آیا اور اس سے پہلے کہ اُس کے لرزیدہ ہونٹ کچھ کہتے، پیرو نے اُس کے شانے پکڑ لیے۔ ”ابھی کچھ نہیں بولنا نواب صاحب!“ وہ دہکتی آواز میں بولا۔

”ہم ہم آپ سے...“ نواب کا گلا رُندھنے لگا۔

”بعد میں بہت وقت پڑا ہے۔“

کل رات ہم اُس کی بندوق کی باڑھ پر تھے اور گولی چلنے میں بس کسی اندھے لمحے کی کسر رہ گئی تھی۔ ہمیں نہیں کل رات تو وہ بھی ہماری زد پر تھا اور ہم نے اُس کی گردن پر دباؤ ڈال کے اُسے بے بس کر رکھا تھا۔ پیرو نے آنکھیں میچ لیں اور گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔ ”ابھی اپن اِدھر ہی ہے۔“

نواب نے بے تابانہ اُس کے ہاتھ پکڑ لیے اور اُنھیں چومنے لگا۔ میں پیرو کے پاس ہی کھڑا تھا، وہ میرے مقابل آ[illegible] آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا، میں نے اُسے نہیں دیکھا [illegible] کیونکہ اُس کے چہرے سے دھواں سا اُٹھ رہا تھا، چند لمحوں تک سامنے بے حس و حرکت کھڑا رہا، اُس کی تیز تیز سانسیں میرے کان [illegible] دھمکتی رہیں، اچھا ہی ہوا کہ لمحے بھر میں وہ میرے سامنے سے [illegible] اور میرے جسم سے کوئی پہاڑ سا بوجھ اُتر گیا۔ وہ مجھ سے کچھ کہتا [illegible] نہیں جواب میں میرے منہ سے کیا نکل جاتا۔

کمرے میں وہ اکیلا تھا، حویلی کا کوئی ملازم یہاں تک کہ [illegible] بھی موجود نہیں تھے۔ وہاں ہر جانب دیواروں کے ساتھ مسہ[illegible] ہوئے تھے لیکن ہم سب کھڑے رہے۔ نواب نے ہم سے مسند پر [illegible] کہا۔ تجمل کے قریب جا کے وہ پھر کہیں کھو گیا تھا۔ اُس کی نگاہیں کبھی خانم کی جانب اُٹھتی تھیں، کبھی میری اور پیرو کی جانب ثانیوں کے لیے کمرے پر سناٹا چھایا رہا۔ آخر تجمل کی آواز پر کم[illegible] انگیز خاموشی ٹوٹی۔ ”ابھی اپنی بات تھوڑا دھیان سے سُن لو نواب [illegible] اُس کے اچانک تخاطب پر نواب اُچھل سا گیا تھا۔ ”ہم آ گئے [illegible] نے بظاہر بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ نواب تر دختی آنکھوں کی طرف دیکھنے لگا۔ ”ادھر سے اپنے جانے کے بعد آپ کا کر[illegible] اور اُس کا کوئی سایہ بھی اپنے کو دکھائی پڑ جاتا تو اپنا دوبارہ آنا [illegible] جاتا۔“ نواب نے کچھ کہنا چاہا مگر تجمل نے اُسے کچھ نہیں [illegible] ”خانم کسی اور جگہ سے نہیں اپنے گھر سے آئی ہے۔ وہ گھر آپ [illegible] جیسا بڑا نہیں ہے لیکن کسی طرح کم بھی نہیں ہے۔ آپ نے اگر [illegible] جان لیا ہو گا کہ گھر اُونچی دیواروں سے بڑا نہیں ہوتا، اُس کے [illegible] ہوتے ہیں۔“

”ہم نے بہت کچھ جان لیا ہے ہم نے...“ نواب [illegible] میں بولا۔ ”ازراہِ کرم اب ہم سے کچھ نہ کہیے۔“

”ہم کو زیادہ نہیں بولنا، بس اتنا ہی کہ ابھی آپ کچھ [illegible] سمجھنا، بولی ہر جگہ نہیں لگتی۔“

”یہ تو آپ اُس سے کہیں جس کے پاس بولی لگانے کے [illegible] ہمارے پاس تو شاید یہی آنسو...“ نواب نے منہ چھپا لیا۔ ”ہم بہت بہت...“ اُس کی آواز بھرانے لگی۔

”خانم اپنی امانت ہے نواب صاحب!“

”یہ ہمارے سر کا تاج ہیں۔“ نواب تیزی سے بولا۔ ”ہم ا[illegible] کی قسم کھاتے ہیں، بشرطیکہ آپ کی نظروں میں اِس کی کوئی گنجا[illegible] رہی ہو۔ ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہم نے زندگی محض ضائع کی [illegible] کچھ جاتا ہے تو یقین کیجیے آج ہی جاتا ہے۔“

”ابھی اتنا مت بولو نواب صاحب!“ تجمل نے بکھرے لہجے میں کہا۔ [illegible] خانم کو اندر لے جاؤ۔“

نواب ایک لمحے کے لیے سُن سا ہو گیا لیکن جیسے اُسے دیر میں آواز [illegible] ہوا اُس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں آگے بڑھ کے خانم کے سر پر [illegible] رکھا۔ ”آپ نے ہم پر بڑا کرم کیا، اس گھر پر آپ نے بہت احسان [illegible]“ اُس نے بمشکل تمام سر جھکا کے بے اختیار خانم کے برقع کے پلو کو [illegible] دیا۔

تجمل نے مضطرب نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”لاڈلے! آپی کو اندر لے جا۔“

میں نے سُن لیا تھا لیکن میرے پیر منجمد ہو گئے تھے میں وہیں [illegible] رہا۔ پیچھے سے پیرو نے مجھے آگے دھکیل دیا۔ خانم کے قریب آ کے [illegible] دل کی دھڑکن جیسے بند ہو گئی تھی۔ اُسی لمحے نواب خانم کی کمر پہ ہاتھ [illegible] کے اندر کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا میں نے سراسیمگی [illegible] تجمل کی طرف نگاہیں اُٹھائیں، اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ نواب اور خانم چند قدم آگے بڑھ گئے تھے۔ میں نے دھڑکتے قدموں سے اُن کا [illegible] فاصلہ طے کیا۔ دروازے پر یہ جان کے مجھے کچھ تقویت ہوئی کہ منیر علی [illegible] میرے ساتھ ہیں۔ اندر تیز روشنی تھی۔ یہ ایک کشادہ، لمبی چوڑی ہال جیسی [illegible] تھی۔ یہاں سے گلیوں جیسے متعدد راستے نکلتے تھے اور فاصلے فاصلے سے [illegible] دروازے بنے ہوئے تھے۔ یہ وہ جگہ نہیں تھی جہاں سے ہم کل رات گزرے [illegible] تھے۔ اندر داخل ہوتے ہی ہمیں وہاں کئی ملازم نظر آئے اور سیدھے [illegible] ہاتھ کے انتہائی جانب دروازے کے پاس بکھری کھڑی ہوئی کئی عورتیں۔ [illegible] ہمیں دیکھ کے وہ سٹ پٹاتی ہوئی کمرے میں چلی گئیں۔ ملازم جہاں جہاں [illegible] کھڑے تھے اُلٹے قدموں چل کے دیواروں کے ساتھ جم گئے۔ میں خانم کے پہلو بہ پہلو تھا اور میرا سارا جسم سن سنا رہا تھا، برقع میں ہونے کے باوجود میں نے محسوس کر لیا تھا کہ خانم پر ارتعاش طاری ہے۔ میں نے اُس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا، خانم کا ہاتھ برف کے مانند سرد تھا۔

نواب کی رفتار تیز تھی۔ ہم ابھی ہال کے وسط میں تھے جدھر عورتیں اندر گئی تھیں، وہاں سے چوڑیوں کی کھن کھناہٹ اور لپکتے قدموں کی سرگوشیاں سُنائی دیں، دروازہ کھلا ہوا تھا، نواب سیدھا اُسی دروازے کی طرف بڑھا۔ منیر علی اور میں وہیں رُک گئے تھے، ہمیں اندر داخل ہونے میں جھجک سی ہوئی مگر خانم کی انگلیوں کا دباؤ میرے ہاتھ پر بڑھ گیا تھا، اُدھر نواب نے منتشر لہجے میں ہم سے اندر چلنے کی درخواست کی۔

وہاں کئی عورتیں دروازے کے پاس ہی کھڑی تھیں، باندیاں اور [illegible] کئی عورتیں ہمیں آتے دیکھ کے وہ ایک طرف بھاگنے لگیں لیکن نواب کی آواز پر ٹھٹک کے رہ گئیں۔ ”گیتی گیتی! خانم آ گئی ہیں، خانم آ گئی ہیں۔“ کمرے میں نواب کی بھڑکتی آواز گونجی تو ایک شور بپا ہو گیا۔

جو عورت ایک جانب سے دوپٹا سنبھالے دیوانہ وار لپکتی جھپکتی ہوئی آئی تھی، وہ چھوٹے نواب عالم تاب کی بیگم تھی، میں اُسے پہلی جھلک میں پہچان گیا۔ اُس کے ساتھ نواب کی بہن بھی تھی، سفید پاجامے اور نیلے کُرتے میں ملبوس، دونوں کی آنکھوں میں بجلیاں سی کوندرہی تھیں اور چہروں پر آگ سی دہک رہی تھی۔ میں نے خانم کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ نواب کی بیگم اور بہن نے بے تابانہ خانم کو سینے سے لگا لیا، خانم اُن کے ساتھ آگے چلی گئی تھی اور نواب بھی۔ میں اور منیر علی وہیں خاموش کھڑے سب کچھ دیکھتے رہے، وہ جیسے ہماری موجودی بھول گئے تھے، میں نے واپسی کے لیے منیر علی کی طرف دیکھا ہی تھا کہ ایکدم سامنے کوئی جھماکا سا ہوا۔ وہ نواب کی بہن تھی، اُس نے اچانک پیچھے مُڑ کے مجھے جلدی سے آداب کیا، اُس کے ہونٹ لرز رہے تھے اور رُخساروں پر شفق پھوٹ رہی تھی۔

میں اُسے دیکھتا رہ گیا، اس سے پہلے کہ میں اُسے جواب دیتا۔ وہ باندیوں کے جھرمٹ میں اوجھل ہو گئی۔

دوسرے لمحے کمرے میں ہم تنہا رہ گئے۔

منیر علی نے جھپکتی پلکوں سے میری جانب دیکھا۔ اُنھوں نے مجھ سے کچھ پوچھا نہیں تھا۔ میں نے از خود اُنھیں بتایا کہ وہ نواب کی بہن تھی۔

”میں سمجھ گیا تھا،“ وہ تذبذب سے بولے۔ ”وہ نواب کی بہن یا بیٹی ہی ہو سکتی ہے۔ ماشا اللہ بالکل کسی شہزادی کے مانند ہے۔“

منیر علی غلط نہیں کہہ رہے تھے۔ اُس رات حویلی کے قید خانے میں جب وہ اور چھوٹے نواب کی بیگم چھپتی چھپاتی مجھ سے اور پیرو سے ملنے آئی تھیں تو صرف اُن کے چہرے کھلے تھے، بدن چادروں میں لپٹے ہوئے تھے۔ رات کا وقت تھا اور وہاں روشنی بھی کم تھی لیکن اُن کے رنگ، نقش و نگار، قد و قامت، لب و لہجہ سے اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ سراپا حوروں جیسی ہوں گی۔ میں نے ابھی چند لمحے پہلے چھوٹے نواب کی بیگم کو بھی دیکھا تھا جسے بڑے نواب گیتی کے نام سے پکار رہے تھے اور جو خانم کو دیکھ کے بے قرار ہو گئی تھی۔ اُس کے سراپا کی یہ تصویر میرے تصور سے اتنی مختلف نہیں تھی اور اگر تصویر کچھ دھندلی بھی تھی تو اب روشن ہو گئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کا عکس نظر آتی تھیں۔ عمروں میں بھی بس اُنیس بیس کا فرق ہو گا۔ لباس بھی اُنھوں نے ایک جیسا پہنا ہوا تھا۔ چوڑی دار پاجامے، لمبے گھیر دار منقش کُرتے، ہرے دوپٹے، کانوں میں ہلکے بُندے اور کلائیوں میں طلائی چوڑیاں۔ البتہ اُس رات وہ بہت سا زیور پہنے ہوئے تھیں

غالباً اس لیے کہ کہیں ہم کوئی مطالبہ نہ کر بیٹھیں۔

سب اندر چلے گئے تھے۔ اندر سے سٹ پٹاتے قدموں اور ہڑبڑاتی سرگوشیوں کا شور کچھ دیر سنائی دیتا رہا پھر خاموشی چھا گئی۔ وہ ہم سے اور دُور چلے گئے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ اندر سے کوئی آکے ہمیں پوچھے گا لیکن لمحے گزر گئے اور کوئی نہیں آیا تو منیر علی نے واپسی کا ارادہ کیا۔ کمرے کا دروازہ عبور کر کے ہم اُسی کشادہ ہال جیسے دالان میں آ گئے جہاں سے گلی جیسے متعدد راستے نکلتے تھے۔ دالان میں داخل ہوتے ہی میری نظر سب سے پہلے خاں صاحب پر پڑی، وہی شخص جو تھانے میں ہمارا نجات دہندہ بن کر آیا تھا اور جس نے ہمیں ایک زنداں سے نکال کر دوسرے زنداں میں ڈال دیا تھا۔ یہاں حویلی میں قدم رکھتے ہی اُس کا رنگ گرگٹ کی طرح بدل گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر پہلے تو خاں صاحب کا جسم اکڑ سا گیا مگر دوسرے ہی پل وہ بے تابی سے میری طرف بڑھے "میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔" وہ بدحواسی سے بولے۔

صرف اتنی سی بات تھی۔ بِٹھل کے بقول کتنی آسانی سے اُسے کہہ دیا گیا تھا۔ میرے جی میں آئی کہ اُلٹے ہاتھ کا طمانچہ رسید کر دوں، کم از کم بتیسی تو باہر آ جائے۔ اس کی عاجزی پہ میرے سینے میں آگ سی بھڑک اُٹھی تھی۔ میرے اور پیرو کے جسم پر ابھی تک اُن بیدوں کے نشانات ہوں گے جو یہاں حویلی میں ہم پر برسائے گئے تھے۔ ہمیں اصطبل کی غلیظ کوٹھری میں رکھا گیا تھا۔ منیر علی پاس کھڑے تھے، میں نے بہت ضبط کیا اور ہونٹ بھینچے چپ کھڑا رہا۔

"میں۔ میں آپ سے کیا کہوں۔" خاں صاحب اضطراری لہجے میں بولے "یوں سمجھیے کہ ایک غلام نے محض اپنے آقا کے حکم کی تعمیل کی تھی۔ اس میں غلام کی کوئی غرض شامل نہ تھی اور آقا بھی اپنی جگہ بہت بے بس تھے۔"

میں نے اُس سے نہیں کہا کہ وہ آدمی سے اچانک کیسا وحشی بن گیا تھا۔ اُس نے ہماری کوئی بات سننی گوارا نہیں کی تھی۔ ہم نے اُسے کتنے واسطے دیے تھے، کیسی فریاد کی تھی۔

"جانے بھی دیجیے۔" منیر علی نے اضطراب سے کہا۔ "یقیناً آپ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ قصور شاید کسی کا بھی نہیں تھا۔ جو وقت اللہ نے اچھا بُرا مقدر میں لکھ دیا ہے، اُس سے نمٹنا تو بہرحال لازم ہے۔"

خاں صاحب کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں، ہونٹ پھڑپھڑا رہے تھے۔ یکایک وہ میرے سامنے ہاتھ باندھ کے کھڑے ہو گئے "یقین کیجیے میں نے آپ سے دُگنی عمر گزاری ہے مگر خود کو کبھی اتنا پست محسوس نہیں

کیا۔ سب کچھ صحیح ہے لیکن . . . لیکن سب کچھ بہت غلط شرم ناک حد تک نارو! تھا۔ میری درخواست ہے کہ آپ ... کے لیے ضرور کوئی سزا تجویز فرمائیے تاکہ اس کی نجات کی کوئی ... بن سکے۔"

"جانے اب آپ، اب آپ . . ." لفظ میرے حلق ... گھُٹ گئے۔

"چھوڑیے بھی، رات گئی بات گئی، بُری گھڑیاں یاد رکھنے سے اذیّت اور سوا ہوتی ہے۔" منیر علی نے اُن کی کمر تھپکتے ہوئے کہا۔ "آئیے اندر بیٹھتے ہیں، میں وضو کرنا چاہتا ہوں۔"

"ضرور، ضرور۔" خاں صاحب مستعدی سے بولے۔ "میرے ساتھ تشریف لائیے۔" مُڑتے مُڑتے اُنھوں نے مجھے گلے لگانے کی کوشش کی، میں بے اختیار پیچھے ہٹ گیا۔ خاں صاحب نے میرے ہاتھ پکڑ لیے اور اُنھیں سینے پر رکھتے ہوئے بولے۔ "ہو سکے تو اپنے گناہ گار کو بخش دیجیے۔" اُن کی آواز بھرّا رہی تھی۔ میں سر جھکا کے گیا اور منیر علی کو وہیں چھوڑ کے آگے بڑھ گیا۔

سارا دالان روشن تھا۔ خانم کو لے کے ابھی ابھی میں یہاں سے گزرا تھا لیکن اب مجھے اپنا کچھ ہوش نہیں تھا۔ اندازے سے کھُلے دروازے کے ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ ابّا جان، بِٹھل، زدرا اور پیرو وہیں موجود تھے۔ سب کھوئے کھوئے، ایک دوسرے سے بے گانہ مخملیں صوفوں میں دھنسے ہوئے تھے۔ میرے آنے پر سبھی نے چونک کر مجھے دیکھا۔ بِٹھل نے ہاتھ بڑھا کے مجھے اپنے پاس بلا لیا "دھواں کیوں دے رہا ہے رے؟" اُس نے بوجھل ... میں مجھ سے پوچھا۔

"کچھ نہیں، بس وہ اُدھر، اُدھر . . ." مجھے بروقت احساس ہو گیا۔ اُسے پریشان نہ کرنے کے خیال سے میں نے خاں صاحب کا نام نہیں لیا۔

"اُدھر کوئی بھوت تھا رے؟"

"نہیں" میرے مُنہ سے نکل گیا۔ "اُس طرف ایک جنگلی ..."

وہ سیدھا ہو گیا اور اُس کی گھورتی نظریں مجھ پہ مرکوز ہو ...

"کیا ہے لاڈلے!"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے ترشی سے کہا۔

اُس نے مجھ سے حجّت نہیں کی اور صوفے کی پشت سے سر ٹکائے گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔ کمرے میں ملازمین ... آ جا رہے تھے۔ اُنھوں نے اگر بتّی جیسی کوئی چیز سلگا دی تھی

... طرف بھینی بھینی خوشبو رچ گئی تھی جیسے ہوا میں گلاب گھول ... گئے ہوں۔ ساری کھڑکیاں کھول دی گئی تھیں اور اُن پر پڑے پردے ہوا کے جھونکوں سے سرسرا رہے تھے۔ ملازموں نے کمرے ... فانوس روشن کر دیا تھا اور درمیانی میز پر مختلف قسم کے مشروبات، میووں کی طشتریاں اور پھلوں کے طشت کے علاوہ ایک بڑا ... دان بھی لا کے سجا دیا تھا۔ پیرو نے خاص دان کھول کے دیکھا، ... کے اوراق میں لپٹی ہوئی گلوریوں سے بھرا تھا۔ پیرو نے ... گلوری اٹھا کے مُنہ میں رکھ لی اور اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں "بِٹھل ...!" وہ خاص دان اٹھائے لپکتا ہوا بِٹھل کے پاس آیا۔ "ابھی ذرا ... تلے دبا کے دیکھو، قسم سے ایک دم سالا پھول مافک مُنہ میں ... گیا ہے۔"

بِٹھل نے بھی گلوری مُنہ میں رکھ لی۔ پیرو اس طرح خاص دان ... لیے ہوئے تھا جیسے کوئی عجوبہ ہاتھ آ گیا ہو۔ وہ زدرا، کانتے ... ابّا جان کو گلوریاں کھلاتا میرے پاس بھی آ گیا۔ میرا جی اُڑا اُڑا ... تھا۔ میں بِٹھل کے کہنے پر خانم کو اندر پہنچا آیا تھا لیکن میری سمجھ ... کچھ نہیں آ رہا تھا۔ طرح طرح کے سوال میرے ذہن میں بھٹک ... رہے تھے۔ یہاں سے واپسی کے بارے میں، خانم کے بارے میں، ابّا جان ... بکھری ہوئی حویلی کے بارے میں۔ بے شک اب پولیس کی گرفت ... کے کسی آدمی کے سبب راہ میں رکاوٹ پڑنے کا امکان نہیں ... تھا۔ جس شخص کی وجہ سے پولیس کے حرکت میں آ جانے کا اندیشہ ... کے آدمیوں کے بہک جانے کا احتمال تھا، ہم اُسی کے گھر میں ... تھے۔ اب بظاہر کوئی گرہ باقی نہیں رہی تھی لیکن راستے صاف ... سے مُراد اس شہر سے رہائی تو نہیں تھی۔ ممکن ہے، بِٹھل نے ... کے بارے میں اپنے طور پر کچھ نہ کچھ طے کر رکھا ہو۔ میں نے ... کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی مگر اُس پر کھنچی ہوئی آڑی ترچھی لکیروں ... مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ اُس کی نیم وا آنکھیں سُوجی ہوئی تھیں، کتنی راتوں ... سے جاگ رہا تھا اور شب و روز لوگوں کے درمیان بندھا بیٹھا تھا۔ ... بیٹھی کتاب صوفے پر اُس کا جسم گرا گرا، بکھرا بکھرا لگتا تھا۔ شاید ... کا کوئی اندازہ نہیں تھا اور نہ اُن میں سے کسی اور کو۔ اُن ... چہروں پر اضطراب آمیز سکون چھایا ہوا تھا۔ وہی سکون جو کوئی ... تمام کر لینے کے بعد ممکن ہوتا ہے اور وہی اضطراب جو کوئی منزل ... لینے کی بے یقینی سے ہوتا ہے۔ وہ چونکنے کے انداز میں بار بار ایک ... دوسرے کے چہرے دیکھتے تھے اور اپنے آپ میں کھو جاتے تھے تاہم ... کسی کو کوئی جلدی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ نہ پیرو کو اپنی

بیوی اور بیٹی سے ملنے کی کوئی جلدی تھی، نہ ابّا جان کو فرّخ، فریال، فارہہ اور اکبر کو دیکھنے کی جو بمبئی میں ایک اجنبی کے گھر نہ جانے کب سے اُن کی راہ تک رہے ہوں گے۔ پھر مجھے ایسی جلدی کیا ہے؟ وہ بھی اسی کشتی میں سوار ہیں۔ ایک مجھی پر یہ وحشت کیوں طاری ہے۔ کیا میں اُن سے زیادہ دیکھتا اور سُنتا ہوں یا مجھے اُن سے کم دیکھنا اور سُننا آتا ہے۔ اُنھوں نے تو مجھے نہیں ٹوکا تھا لیکن میں خود اپنے سامنے تو موجود تھا۔ بے شک کبھی ایسے لمحے بھی آتے ہیں جب آدمی اپنی ہی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ یقیناً اُن سب کا یہ سکوت اطمینان کی کوئی کیفیت تھی کہ اب اُنھیں بہرحال گھر ہی جانا ہے سو دیر سویر سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مجھے فرّخ، فریال، فارہہ اور اکبر سے دُور ہوئے نو برس سے اُوپر ہو چکے ہیں تو اب چند دن، چند ہفتوں میں کیا رکھا ہے۔ وہ کون سے میرے منتظر ہوں گے۔ اُنھوں نے تو اپنی دانست میں کب کی اپنے بھائی پر مٹّی ڈال دی ہوگی۔ مُردوں کا انتظار کون کرتا ہے اور ابھی خانم کو اس گھر میں آئے دیر ہی کتنی ہوئی ہے جو مجھے روانگی کی بے کلی شروع ہو گئی۔ اچھا ہی ہوا جو میرا ہذیان مجھی تک محدود رہا ورنہ بِٹھل مجھ پر بہت ناراض ہوتا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ خانم کو یہاں چھوڑ دینے کے بعد ہم اپنے راستے پہ چل پڑیں۔ خدا کرے، نواب عالم تاب جلد ٹھیک ہو جائے۔ خانم کے آنے کا کوئی نتیجہ نکلے۔ کوئی کسی کا اتنا ہی طلب گار ہو سکتا ہے، کسی کے لیے اتنا ہی ویران۔ میں بھول گیا، ابھی راستے میں پیرو نے مجھے کیا طعنہ دیا تھا کہ میری آنکھیں اپنے سوا کسی کو کیوں نہیں دیکھتیں۔ ابھی راستے میں اُس نے میرے مُنہ پہ طمانچہ مارا تھا۔

پیرو نے خاص دان میری طرف بڑھایا تو ایک گلوری میں نے بھی اٹھا لی۔ اُس نے بالکل سچ کہا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے مُنہ میں پھول کھِل اُٹھے ہوں، گلاب کے پھول۔ میں نے زندگی بھر ایسا پان نہیں کھایا تھا۔ زرّیں نے گھر میں پان دان کا خاص اہتمام کیا تھا۔ پان کا شوقین وہاں کوئی نہیں تھا لیکن زرّیں کا کہنا تھا کہ پان دان کے بغیر گھر سُونا سُونا محسوس ہوتا ہے۔ وہ بھی بہت نفیس پان بناتی تھی مگر اِس پان کی لذت ہی کچھ اور تھی۔ نہ ایسی تیز خوشبو کہ جی لوٹ جائے، نہ ایسی کم کہ محسوس ہی نہ ہو۔ معلوم ہوتا تھا کہ سب چیزیں ناپ تول کے ڈالی گئی ہیں۔ ذائقوں کی بھی اپنی تاثیر ہوتی ہے۔ مجھے اپنا سینہ کھُلتا سا محسوس ہوا۔ اگر واپسی میں سیدھے فیض آباد جانا ہوتا تو میں یہاں کی ایک گلوری زرّیں کے لیے ضرور لے جاتا۔ وہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہتی ہے۔

ایک ملازم ہمارے صوفوں کے آگے اسٹول جیسی گول چھوٹی میز بس رکھ رہا تھا کہ خاں صاحب کے ساتھ بڑا نواب تیز قدموں سے اندر داخل ہوا اُس کی چال سے بے چینی عیاں تھی۔ آتے ہی اُس نے گھبرائے ہوئے انداز میں معذرت کی اور بتھل سے مخاطب ہو کے بولا "یقیناً آپ حضرات نے رات کا کھانا نہیں کھایا ہو گا۔"

"تکلف کی ضرورت نہیں۔" بتھل کے بجائے ابّا جان نے جواب دیا "ہم نے ابھی کوئی سات بجے سیر ہو کے ناشتہ کیا ہے۔ میرا خیال ہے، کسی کو بھی بھوک محسوس نہیں ہو رہی ہو گی۔"

بتھل نے بھی ابّا جان کی تائید کی لیکن بڑے نواب نے کسی کی نہ سُنی، "کوئی مضائقہ نہیں، توشے کا اہتمام کچھ دیر میں ہو جائے گا۔" ملازموں کو اشارہ کر کے وہ بتھل کے سامنے والی نشست پر بیٹھ گیا۔ گلے تک شیروانی میں بند اُس کا سینہ زیر و زبر ہو رہا تھا اور خنکی کے باوجود پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلملا رہے تھے۔ خاں صاحب بھی اُس کے دائیں جانب کونے میں سمٹے سمٹائے بیٹھ گئے تھے۔ کمرے میں لمحوں تک سنّاٹا سا رہا۔ سب جیسے گونگے ہو گئے تھے۔ نواب کچھ کہنے کے لیے مضطرب نظر آتا تھا لیکن شاید اُسے لفظ نہیں مل رہے تھے۔ اُس کی آنکھیں جلتی بجھتی رہیں۔ ابّا جان کو یہ خاموشی سب سے گراں گزر رہی تھی، اُنھوں نے نواب سے حویلی کے بارے میں رائے ظاہر کی، کسمساتے لہجے میں بولے "یہ عمارت تو خاصی نئی معلوم ہوتی ہے۔"

"جی، جی ہاں۔" نواب نے چونک کے سر اٹھایا۔ پانچ سال کے قریب اس کی تکمیل کو ہوئے ہیں۔"

"نہایت شاندار عمارت ہے۔"

"جی ہاں۔" نواب نے شائستگی سے کہا "بس بن گئی۔"

"برس لگے ہوں گے؟"

"جی، برس۔ کوئی چار سال۔" نواب نے مختصراً کہا۔

"ہر گوشے سے نفاست ٹپکتی ہے۔"

نواب پہلو بدل کے رہ گیا۔ ابّا جان کو جلد اندازہ ہو گیا کہ یہ ایک بے محل گفتگو ہے۔ اُنھوں نے عمارت کے بارے میں پھر کوئی رائے زنی نہیں کی۔ وہی اجنبی سکوت پھر کمرے پہ چھا گیا۔ نواب نے مضطربانہ خاں صاحب کو دیکھا پھر اچٹتی بھٹکتی نظروں سے ہم سب کو۔ نواب کی جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو اُس کا یہی عالم ہوتا۔ وہ اُن لوگوں کے درمیان تھا جو اُس سے پہلی یا دوسری بار مل رہے تھے۔ اُسے اچھی طرح کسی کا نام بھی نہیں معلوم تھا۔ صرف ایک مرتبہ بتھل اور کانتے اُس سے مل کے گئے تھے اور پیرو اور میں بارہ دن تک اُس کی [illegible] رہے تھے مگر اُس کی یہ کیفیت صرف اجنبیت کے سبب سے ہی نہیں [illegible] بہت کچھ ہو گا۔ وہ ہمارے بارے میں کچھ جانتا تھا تو اڈّے کے حوالے سے اور اڈّے کی طرف سے اس دوران اُسے عجیب خبریں سننے کو ملی ہوں گی۔ ہمارے حیدرآباد آنے کے بعد اڈّے پر پیش آنے والے ایک ایک واقعے کا اُسے علم ہو [illegible] آکا کی بے دخلی، بھورے دادا کی آمد، موسیٰ ندی کا واقعہ، ہا[illegible] ہے، مخبروں نے اپنی طرف سے اور حاشیہ آرائی کی ہو۔ پھر پیرو تو اُس کے سامنے ہی تھے۔ کل رات ہی کی بات تھی، ہم کس طرح اُسے بندوق کی زد پر رکھ کے حویلی سے فرار ہو[illegible] اور بارہ دن طرح طرح کے ستم برداشت کرنے کے باوجود خانم کے متعلق ایک حرف بھی نہیں اگلا تھا۔ انھی لوگوں [illegible] اب وہ بیٹھا ہوا تھا۔ گو ہمارا لباس اڈّے سے ہماری وابستگی کی چغلی [illegible] تھا اور ادھر ہمارے ساتھ منیر علی اور ابّا جان ایسے بزرگ تھے لیکن یہ تضاد تو اُس کے لیے اور کشمکش کا باعث ہو[illegible] چند ثانیوں تک سب جیسے کسی اَن ہونی کے منتظر گم بیٹھے [illegible] نواب ہی نے خاموشی توڑی "ہم، ہم کچھ عرض کرنا چاہتے [illegible]" رُک رُک کے بولا۔

"اب کچھ مت بولو نواب صاحب!" بتھل نے [illegible] ہوئے کہا۔

"ہم پر بہت بوجھ ہے۔" اُس نے تیزی سے کہا [illegible] کہنے دیجیے، گو ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ ہم کیا کہیں [illegible] آپ کے سامنے زبان کھولیں۔"

"ہم لوگ کو تھوڑا آنکھوں سے بھی سننا آتا ہے [illegible] آہستگی سے کہا "اچھا ہے، آپ زبان بند ہی رکھو۔ سمجھو [illegible] سب سُن لیا ہے۔"

"آپ کی نوازش، بخدا ہم اپنے قلبی اظہار سے قا[illegible] پر اتنا بڑا احسان کبھی نہیں کیا گیا۔ ہمیں بار بار احساس ہ[illegible] نے آپ جیسے بلند۔ ۔ ۔" اُس کی آواز بھرّا گئی۔

"بس نواب صاحب ابھی بس کرو۔" پیرو نے درمیا[illegible] دیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "قسم سے نواب صاحب! اپن [illegible] کیا بولا تھا، اپن نے جیسا بولا تھا، آپ اپن لوگ کا خلا[illegible] ہم راستہ بدل کے سیدھا خانم بی بی کے پاس جاتا اور اُس آ کے ہی دم لیتا۔"

"اب اس کو مت کولٹو دادا!" بتھل نے ناگواری سے کہا۔

"مُنہ پر آ گیا بتھل بھائی!" پیرو نے لجاجت سے کہا۔

"انھیں کہنے دیجیے، ہم چاہتے ہیں کہ سب کچھ ہمارے مُنہ پر [illegible] جائے۔ یہ کچھ کم ہی کہیں گے، حقیقت اُس سے بہت زیادہ ہے۔ [illegible]ت یہ ہے کہ ہم کسی طور قابلِ معافی نہیں۔ ہماری وجہ سے انھیں [illegible]ت سے دُکھ اٹھانے پڑے ہیں۔ ہمیں ناز تھا کہ اس گھر سے ہمیشہ [illegible] کو سُکھ دینے کی خواہش کی گئی ہے۔ اس مرتبہ یہاں کے مکین [illegible] آبا کی روش بھول گئے، محض ندامت کا اظہار کافی نہیں ہے۔"

"ازراہِ کرم۔" ابّا جان نے بے تابی سے کہا "ازراہِ کرم نواب [صا]حب! اب یہ باتیں نہ کیجیے، ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ آدمی اپنی [illegible]یرں کرتا ہے۔ غلط فہمیاں، غلط تخمینے زندگی کا حصّہ ہیں، کہیں [illegible] آدمی کو اس سے مفر نہیں۔"

"نہیں، صرف اتنا نہیں ہے۔" نواب کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ [ہم]یں معلوم ہے کہ آپ کا قلب کتنا کشادہ ہے۔ آپ ہمیں دو لفظوں [کی] بھیک دے کر معاف کر دیں گے لیکن کیا اس طرح ہمیں سُرخ روئی [نص]یب ہو جائے گی؟ ہمارے سینے کا تلاطم کم ہو جائے گا؟ ہم آپ [س]ے معذرت نہیں چاہیں گے۔ یہ مت سوچیے کہ ہم صورتِ حال کی [تب]دیلی سے معذرت خواہی پہ مجبور ہیں کیوں کہ اب یہی تیور ہمارے [لی]ے مناسب ہے بلکہ ہم آپ سے عرض کریں کہ ہمیں ان دونوں [ع]زیزوں سے کوئی عناد نہیں تھا۔ ہماری کوشش یہی تھی کہ دونوں پر [ک]وئی آنچ نہ آئے لیکن سب کچھ ہمارے ہاتھ سے نکلتا گیا۔ سب ارادہ [تھ]ا، ہم اپنی غرض میں اتنے اندھے ہو گئے تھے کہ کچھ اور سجھائی سنائی [ن]ہیں دیا۔ یقیناً یہ ہمارے اجداد کی دی ہوئی اور ہمارے اندر چھپی [ہو]ئی کوئی سرکشی تھی جس نے ہمارے حواس سلب کر لیے تھے۔ انھوں نے ابتدا میں ہمیں سب کچھ جتا دیا تھا مگر ہم سننے کے اہل نہیں تھے۔ [ہ]مکو یہ بھی خیال نہ رہا کہ جن لوگوں سے ہمیں خانم بی بی کا سُراغ [م]طلوب ہے، اُن سے خانم بی بی کا کوئی واسطہ بھی ہو سکتا ہے اور [و]ہ ایسے معزز بھی ہو سکتے ہیں۔ ہم اپنے ہوش ہی میں نہیں تھے۔ جگہ [جگ]ہ کی خاک چھاننے کے بعد کہیں ہمیں ان دو معززین کی صورت میں [ا]مید کی کرن نظر آئی تھی۔ موسیٰ ندی پر انھوں نے ہمارا ارادہ پسپا کر دیا تھا تو ہمارے پاس پہلے سے متبادل راستہ موجود تھا۔ ہم جانتے تھے، ہم کہاں اُن پر دست رس حاصل کر سکتے تھے۔ یہاں گھر آ کے انھوں نے صاف انکار کر دیا تھا۔ ہمیں ہر دم وقت نکلتا محسوس ہوتا تھا۔ ہر گزرنے والی رات ہمارے بھائی کو ہم سے اور ناراض کر دیتی تھی۔ ہم پر ایک وحشت طاری تھی لیکن اس کی وجہ صرف ہمارے بھائی کی زار و زبوں حالت ہی نہیں تھی، ہم جانتے ہیں، اس کی وجہ دوسری بھی تھی۔ یہ حویلی تھی۔ یہ حویلی آئینے میں ہمیں صرف ہمارا چہرہ دکھاتی تھی۔"

"ابھی جانے دو نواب صاحب! اپن آپ سے بنتی کرتا ہے، ابھی کچھ مت بولو۔" پیرو نے تندی آمیز نرمی سے کہا "اپن آپ سے بولا تھا کہ ایسا لوٹ پلٹ ہوتا رہتا ہے، کوئی نوابات نئیں ہے۔"

"مگر ہم اس افتاد سے پہلی بار دوچار ہوئے ہیں۔" نواب نے جلتی ہوئی آواز میں کہا "ہمیں قطعی خیال نہیں تھا کہ اس طرح کبھی آپ لوگوں کا سامنا بھی ہو سکتا ہے، آپ ہمیں یوں آئینہ دکھانے آ جائیں گے۔ ہمیں بس اپنے شیش محل کا گمان تھا اور کچھ خبر نہیں تھی کہ لوگ ایسے شیشوں کے بھی ہوتے ہیں، اتنے دریا دل بھی ہوتے ہیں۔"

"نواب صاحب!" بتھل نے نسبتاً اونچے لہجے میں کہا "ہم آپ کو بولیں، ہماری صورت کبھی آپ لوٹ کے نہ دیکھتے اگر ہم کو اِدھر دیکھنے کے بعد آپ سے کچھ اور اُلٹا سیدھا ہو جاتا۔ آپ نے ٹھیک کیا جو ہم کو بازار کے اڈّے پر نہیں چھیڑا اور اِدھر ان لوگ کے حویلی سے نکلنے کے بعد لگام کھینچے رکھی۔"

"آپ درست فرما رہے ہیں، آپ ہم سے سب کچھ کہہ کر گئے

تھے مگر ہم آپ سے عرض کریں۔ ہم آپ کی طرف سے غافل نہیں تھے۔ ہمیں اپنی اس کوتاہی کا اعتراف ہے کہ ہم نے آپ کی باتیں درخورِ اعتنا نہیں سمجھی تھیں۔ ہم نے آپ سے اپنی مجبوری کا اظہار کر دیا تھا لیکن اس کا سبب اگر ایک طرف آپ کے دل میں کسی نرم گوشے کی توقع تھی تو دوسری جانب اس طرح ہمیں اپنی دانست میں یہ جتانا بھی مقصود تھا کہ آپ کے دونوں آدمی اُس وقت تک ہماری تحویل میں رہیں گے جب تک . . . ."

"ہم نے ایسا ہی جانا تھا۔" بتّھل نے سرد لہجے میں کہا۔

"اور، اور بازار کے علاقے میں آپ کے ہر اقدام سے باخبر ہونے کے باوجود ہمیں اعتماد تھا کہ آخر ہمی اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے۔ ہمیں مطلق اس کی پروا نہیں تھی کہ آپ کسی اور طرف دادرسی کے لیے جا سکتے ہیں اور ریاستی نگہ داروں کا رُخ ہماری حویلی کی جانب ہو سکتا ہے۔ ہمیں اپنے ذرائع اور وسائل پر یقین تھا۔ ایوانِ اقتدار تک رسائی کا شرف ہمیں اور بہت سے اعزاز و امتیاز کے ساتھ ورثے میں ملا ہے۔ ہمارے عم زاد نواب حشمت جنگ تو ان دنوں ریاستی انتظامیہ میں اعلاتر منصب پر فائز ہیں۔"

نواب حشمت جنگ کے نام پر ابّا جان سیدھے نہ بیٹھے رہ سکے۔ اُنھوں نے اضطراری انداز میں بتّھل کی طرف دیکھا۔ بتّھل نے آنکھیں میچ لیں اور ابّا جان کی زبان پر کچھ آتے آتے رہ گیا۔

نواب نے اپنی بات جاری رکھی "ہمیں علم ہو گیا تھا کہ آپ نے اُس طرف بازار کے علاقے میں آکا نامی مشہور سرغنہ کو کیسا رُسوا کیا ہے۔ اُس طرف سے آنے والی اطّلاعات ہمارے لیے بہت حیران کُن اور کسی حد تک تشویش انگیز تھیں۔ ہم یہاں دور بیٹھے بیٹھے آپ کے ایک ایک لمحے کے شاہد تھے اور ہمیں کوئی شبہ نہیں تھا کہ آپ کو مآلِ کار پلٹ کے ہماری طرف آنا ہے، ہمیں اطمینان رکھنا چاہیے کہ آپ کو اپنے دو آدمی ہم سے زیادہ مطلوب ہوں گے اور اگر، اگر آپ نے کسی دوسرے ارادے سے اس چار دیواری میں قدم رکھا تو . . ." نواب پلکیں پٹ پٹانے لگا اور گہری سانس لے کے بولا۔ "ہم نے محافظوں کو چوکنا کر دیا تھا اور کہا تھا کہ ممکن ہے، اب نمک آزمانے کا وقت آ جائے۔ ہم نے احتیاطاً نفری بڑھا دی تھی۔ ہر چند کہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم آپ سے سچ کہتے ہیں، ہمارے عزم میں کوئی لچک نہیں تھی۔ ناامیدی کی صورت میں ہم ان دو شریف النفس صاحبان کے لیے کسی دم کوئی بھی فیصلہ کر سکتے تھے، کوئی بھی آخری فیصلہ۔ اور یہاں تک کہ کسی کی نگاہ دراز ہوتے ہوتے ہم ہر شہادت مٹا دینے پر قادر تھے۔"

ہم سب ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھ رہے تھے۔ بتّھل ...
ابّا جان سب خاموشی سے سنتے رہے۔ "فیصلے میں ہر بار لیں ...
لمحے کی دیر ہو جاتی تھی۔" نواب نے جھرجھری لے کے کہا۔ "...
طور پر آتنا ہی صبر و ضبط بہت کیا تھا۔ آپ نے ہمیں نتائج ...
کرنے اور کسی مذموم فیصلے سے باز رکھنے کے لیے ایک بر ...
کوشش کی تھی۔ ہم نے سُن لیا تھا اور بعد میں بازار کے علا ...
ملنے والی اطّلاعات ہمیں کبھی آپ کا مشورہ آزمانے پر راغب ...
تھیں لیکن ہمارے بزرگ غالباً ہمیں ایک درس دینا بھول ...
یا وہ خود اس کا درک نہیں رکھتے تھے۔ ہم سوچتے ہیں، جب ...
آئے تھے، کاش ہم اُسی وقت آپ کی بات مان لیتے اور ان ...
کو آپ کے ساتھ ہی کر دیتے۔ اُس وقت نہیں تو ایک پہ ...
دیتے مگر اس اقدام میں ہمیں سُبکی محسوس ہوتی تھی یا پھر ...
ہمیں آپ کی جانب سے کسی بھی گداز کی توقع نہیں تھی۔ ہ ...
کے بارے میں شاید بتا بہت کچھ دیا گیا تھا۔"

"آپ کو کم بولا گیا ہوگا نواب صاحب!" بتّھل کی آواز کمرے میں گونجی۔

"یقیناً، یقیناً۔" نواب نے شائستگی سے کہا۔ "ہمار ...
اطّلاعات سے ہے۔ ہمیں یقیناً ایسی اطّلاعات پہنچائی گئی ...
تصویر کا ایک ہی رُخ پیش کرتی تھیں اور یہ ہماری گرا ...
تھی کہ ہم نے اُنھیں جوں کا توں قبول کر لیا۔ رات، صرف ...
ہمارے بزرگ۔" اُس نے پیرو کی طرف سر اُٹھا کے کہا۔ ...
ہمارے بزرگ نے ہمیں زندگی کا وہ مشاہدہ کرایا تھا جس ...
کبھی آشنا نہیں ہوئے تھے۔ کل رات ہم نے اپنے آپ کو ...
ہم پر اپنی پیمائش منکشف ہوئی تھی، اور کل رات ہم با ...
ہو گئے تھے۔ ہم نے اپنے بھائی کو خدا کے حوالے کر دیا تھا ...
چارہ گروں سے کہہ دیا تھا کہ اب ہمیں بازار کے علاقے کی ...
کوئی خبر نہ پہنچائی جائے۔ حالانکہ ہمیں مشورہ دیا گیا تھا۔ ...
ہمارے خیر اندیشوں نے ہمیں مشورہ دیا تھا کہ ہمارے ...
بازار کے علاقے میں موجود ہیں۔ ہم ایک آخری تدبیر ...
کیوں نہ اپنے وسائل حرکت میں لائیں۔ ہم ریاست ...
پر پہرا بٹھا سکتے ہیں، دربار سے ہمارے آبا کی رفاقت ...
اُس کے عظمت و جلال اور جاہ و حشم میں کچھ ہمارے آبا ...
شامل ہے۔ ہم بجا طور پر اُمید کر سکتے تھے کہ ایک رعایت ...

... سے اپنی قدیم وفاداری کے صلے میں ضرور دی جائے گی۔ ہم یہ رکاوٹیں ... مری کر سکتے تھے اور ہمیں خوب اندازہ تھا کہ اس کے نتائج کتنے ... سنگین ہو سکتے ہیں۔ ان چند دنوں میں کم از کم ہمیں یہ احساس ہو چلا ... تھا کہ ہم کن لوگوں کی طرف انگلی اٹھائیں گے۔ وہ لوگ جنھوں نے ... ہمیں محتاط رہنے کی طرح طرح تلقین کی ہے۔ انھوں نے بازار ... کے علاقے کا رُخ جان بوجھ کے کیا ہوگا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے اُنھوں نے ... ہمیں کچھ باور کرانے ہی کی کوشش کی ہے۔ بلاشبہ ایک خدشہ ہمیں ... اپنی رسوائی کا بھی تھا لیکن جہاں اس نوع کی کوئی صورتِ حال پیدا ... ہو گئی ہو، وہاں رسوائی کیا اہمیت رکھتی ہے۔ ہمیں خوش گمانی تھی کہ ... اس شہر کے لوگ بازار کے علاقے سے وابستہ لوگوں کے مقابلے میں ... ہماری بات پر یقین کرنا چاہیں گے کیونکہ ہم یہاں ایک زمانے سے ... شرافت اور اعتبار کا کاروبار کر رہے ہیں۔ کوئی عجب نہیں کہ کسی ... دن ہم اپنے مشیروں کے فرمودے پر آمادہ ہو جاتے مگر رات ہم نے اپنے بزرگ کو دیکھ لیا تھا۔" نواب کا اشارہ پیرو کی طرف تھا۔ کہنے لگا۔ "ہم ایک شکست خوردہ کی حیثیت سے کوئی مجنونانہ قدم اٹھا لیتے لیکن ایک حقیقت ہم پر عیاں ہو چکی تھی کہ ہمارے مطلوب ہم سے بڑا ارادہ رکھتے ہیں۔ اُن کی ضد ہم سے قوی ہے اور جو بے سبب نہیں ہوگی۔ اس توانائی کے عقب میں کوئی بڑا یقین مضمر ہے۔ کسی بڑے سچ، کسی بڑے اصول کا یقین، اور چاہے، ہم کچھ بھی کر لیں، اُن کی مرضی کے بغیر اُن سے کچھ نہیں جان سکتے۔ ہمیں خوشی ہے کہ وہ بدبخت لمحہ نہیں آیا، ہم نے سرے سے اس پر غور ہی نہیں کیا۔"

"آپ نے اچھا کیا نواب صاحب۔" بتّھل نے کہا۔

"مگر فردِ عمل بڑی طویل ہے۔ بہر حال، ہم نے بے کم و کاست سب کچھ بیان کر دیا ہے۔" نواب شکستہ آواز میں بولا "اس رُوداد سے ہماری غرض و غایت اپنی تنگ دلی و کوتاہ نظری کا اظہار ہے۔ ہم سے کچھ بھی بعید نہ تھا اور ہم نے کل رات کے سوا بہت سا کینہ اپنے سینے میں بھر رکھا تھا۔ ہم نے یہ اقبال محض اس لیے کیا ہے کہ آپ ہمارے لیے کسی بہتر سزا کا تعیّن کر سکیں اور ہم سے کوئی رعایت روا نہ رکھیں۔"

"آپ، آپ یہ کیا فرما رہے ہیں۔" ابّا جان نے بے چینی سے کہا۔

"اپن لوگ کیا ابھی ایدر سے اٹھ جائے نواب صاحب؟" پیرو تند لہجے میں بولا۔

"نہیں، نہیں۔" بڑے نواب نے ہیجانی انداز میں کہا۔ "آپ ہمارے سر آنکھوں پر۔ مگر ہم آپ کو کیا بتائیں، ہمارا سینہ جیسے کوئی دھنک رہا ہے۔ یہ عجز نہیں، نہ یہ ہذیان ہے۔ ہم کچھ نہیں کہنا چاہتے تھے لیکن یہ سب بے اختیار زبان پر آ گیا، آپ کو ضرور گراں گزر رہا ہوگا۔ خدا کے لیے ہماری یہ عرضِ حال کسی اندازِ بیاں یا سخن آرائی پر محمول نہ کیجیے، معذرت اور معافی کی کچھ حدود ہوتی ہیں۔ وہ خنجر خوش قسمتی سے آپ کو نہیں لگے جو ہم نے جانے کتنی بار آزمائے تھے۔ ہماری درخواست ہے کہ ہمیں سزا سے مستثنا کرنے کا رحم نہ کیا جائے۔ ہمارے لیے کوئی سزا تجویز کیجیے، کوئی عبرت ناک . . . ."

"ابھی آپ، آپ کیسا بولتے ہو نواب صاحب!" پیرو نے اُمڈتی آواز میں کہا۔

"ہمیں احساس ہے کہ ہم کن لوگوں سے کس قسم کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اُن لوگوں سے جن کے دل سمندر ہیں۔ آپ نے ہم سے بہت سلوک کیے ہیں، اب ایک سلوک اور کر دیجیے۔ ہمیں کوئی حکم دیجیے۔ بخدا ہم نظرِ ثانی کے لیے نہیں کہیں گے۔ بہتر ہے، ہم سے یہ اقبال ہی چھین لیجیے جو ہمیں صرف اپنا جلوہ دکھاتا ہے، جس نے اپنے سوا ہمیں سب سے دور کر رکھا تھا۔"

معلوم نہیں وہ کیا کہہ رہا تھا، شاید اُسے خود بھی معلوم نہیں تھا مگر اُس کی آواز فریادی تھی۔ التجا میں کھوٹ ہو تو صاف نظر آ جاتی ہے۔ مجھے وہ نواب یاد آ رہا تھا جو پہلی بار ہم سے یہاں حویلی کے کمرے میں ملا تھا، پھر جو ہمارے زنداں میں ہمیں حکم دینے آیا تھا۔ وہ کوئی اور شخص تھا، اِس شخص کا کوئی بہروپ۔ مگر اس وقت بھی اُس میں کوئی آویزش نہیں تھی۔ سب بار بار کبھی بتّھل کی طرف دیکھتے تھے، کبھی اُس کی طرف۔ بتّھل دم بخود سا بیٹھا نواب کو گھور رہا تھا۔ کمرے میں جلتے فانوس کی روشنیاں جیسے دھیمی پڑ گئی تھیں، ہوا بھی بند بند سی معلوم ہوتی تھی۔ نواب کے عقب میں خاں صاحب سر جھکائے بے حس و حرکت بیٹھے تھے۔

"ہمیں اپنا سارا جسم بندھا ہوا، جکڑا ہوا . . ." چند ثانیوں کے توقّف کے بعد نواب کی بھڑکتی ہوئی آواز دوبارہ کمرے میں گونجی۔ بتّھل یک لخت صوفے سے اُٹھ گیا۔ "ہم لوگ کا بھی تھوڑا دھیان کرو نواب! اتنا ہی بولو جتنا سُنا جا سکے۔" بتّھل کو اُٹھتا دیکھ کر نواب بھی بے قراری سے کھڑا ہو گیا۔ چند قدم کا فاصلہ تھا۔ بتّھل اُس کے سامنے جا کے ٹھیر گیا اور اُس نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیے۔ نواب کا جسم بل کھا گیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ بتّھل کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ "آپ کیا بولتے ہو۔" بتّھل نے بکھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ہم کو جان کاری تھی۔ ادھر ہم آپ سے جو جان کے گئے

تھے، ویسا آپ نے اپنے سے نہیں سمجھا۔ ہم کو سب پتہ تھا کہ ادھر آپ کتنے ہتھیار رکھتے ہو اور خون آپ کا کتنا گرم ہے۔ دادا نے ابھی ٹھیک بولا تھا، ہم آپ کے لیے ضرور نئے ہیں، آپ ہمارے لیے نہیں ہو۔ ہم کو ایسے اصیلوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ آپ نہیں جانتے تھے تو کیا ہوا، خنجر اپنے نشانے کو بھی کچھ پہچانتا ہے۔"

سبھی اپنی نشستوں سے اُٹھ کے اُن کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ نواب کا قد بٹھل سے خاصا کم تھا تاہم بٹھل کے شانے سے اُوپر اُس کا چہرہ میرے سامنے تھا۔ کہتے ہیں کہ چہرہ اندرونی کیفیات کا غماز ہوتا ہے۔ نواب کی بھنچی ہوئی آنکھیں، لرزتے پھڑپھڑاتے ہونٹ اور چہرے پر ہر آن بدلنے والی لکیریں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں گی۔ بٹھل نے اپنا حلقہ اور تنگ کر لیا اور نرم آواز میں بولا "ہم لوگ تو سزا پانے کے لیے ہیں، سزا دینے والے دوسرے ہیں۔ پر آپ کا ایسا بولنا ہی اپنے لیے بہت ہے۔ ہم اِدھر لوٹ کے یوں ہی نہیں آ گئے ہیں۔ آپ کو اور چھوٹے صاحب کو دیکھ کے گئے تھے اس لیے آئے ہیں۔ پتہ تھا کہ کدھر واپس جا رہے ہیں۔ ذرا بھی آپ کے ہاں دھبا اپنے کو دکھائی پڑتا تو پھر دوسری طرح ہی آتے۔" بٹھل نے اُسے تھپ تھپاتے ہوئے کہا "اب کچھ اور مت بولنا نواب! پھر ہم اِدھر نہیں ٹھہریں گے۔ سمجھیں گے تم اپنا ہی پلّا بھاری رکھنا چاہتے ہو۔"

جواب میں نواب نے زور سے بٹھل کو بھینچ لیا اور اپنے سسکتے ہونٹوں پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔

بٹھل نے کچھ دیر بعد نواب سے جانے کی اجازت کے لیے کہا تھا۔ کہا تھا کہ رات بہت ہو گئی ہے، سب کل صبح پھر آ جائیں گے۔ اُس نے خانم کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ خانم نہیں رہے گی مگر بٹھل کی زبان سے جانے کا ذکر سن کے نواب او مضطرب ہو گیا۔ "اتنی عزت دے کر آپ ایسے چلے جائیں گے؟" اُس نے کچھ سننے سے انکار کر دیا اور شکایتی لہجے میں بولا "جیسا کہ ہمارا قیاس ہے، آپ سب حضرات اس شہر میں مسافر ہیں۔ یقیناً کسی جگہ ٹھہرے ہوں گے مگر اب کہیں اور جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ گھر ہوتے ہوئے ہمارے عزیز، ہمارے محسن کہیں اور قیام فرمائیں۔" اُس نے حتمی انداز میں فیصلہ صادر کیا کہ اب ہم جب تک اس شہر میں رہیں گے، یہیں قیام کریں گے۔

ابا جان نے اُس سے نہیں چھپایا کہ وہ کسی ہوٹل میں مقیم نہیں ہیں، اس علاقے میں کچھ فاصلے پر اُنھوں نے حال ہی میں ایک حویلی خریدی ہے، سب اُسی میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہاں کچھ اور لوگ بھی ہماری واپسی کے منتظر ہوں گے مگر نواب پہلے سے ہر بات کا جواب موجود تھا۔ کہنے لگا کہ سب کو یہ جائے گا ورنہ انھیں اطلاع پہنچا دی جائے گی۔ کانتے اور زو تک خاموش بیٹھے رہے تھے، انھوں نے بھی دبے لہجے میں سے منت کی کہ سر دست انھیں جانے ہی دیا جائے مگر نواب جیسے سُنا ہی نہیں۔ اُس کے التجا آمیز اصرار کے آگے انکار کر نہیں تھا۔ بٹھل کے پس و پیش پر وہ اداسی سے کہنے لگا "آ یہ سمجھیں کہ ہم اپنے محسنوں کے دل میں اعتبار قائم کرنے میں رہے ہیں؟"

اسی اثنا میں خاں صاحب لپکتے ہوئے باہر گئے تھے واپس آ گئے اور آ کے انھوں نے توشہ تیار ہو جانے کی اطلاع کسی کو بھی بھوک نہیں لگ رہی ہو گی لیکن جب نواب نے دوسرے کمرے میں چلنے کی درخواست کی تو اُس نے کوئی رد بھی نہیں کی۔ دوسرے کمرے میں روشنی بکھری ہوئی تھی۔ ہر رنگ برنگے شیشے جڑی دیواروں سے روشنی جیسے پھوٹی پڑ قالین کے فرش پر وسط میں وسیع دسترخوان بچھا تھا اور ہر کی خوشبوئیں بسی ہوئی تھیں۔ بڑے نواب اور خاں صاحب ہم کُل دس افراد تھے لیکن دسترخوان اور اُس پر سجے ہوئے ظ کے کھانے دیکھ کے کسی برات کے کھانے کا گمان ہوتا تھا۔ بے آواز قدموں سے اِدھر اُدھر دوڑے پھر رہے تھے طرف آفتابے ہاتھوں میں اُٹھائے دو خادمائیں بھی موجود وہیں سلپچیاں رکھی تھیں۔ اُدھر خاں صاحب سرگوشیوں میں دینے میں مصروف تھے۔ دسترخوان پر نواب کی نگاہیں ہم پر تھیں۔ کچھ تو اُس کی ترغیب اور نگہ داری اور کچھ کھانوں کی خواہش نہ ہونے کے باوجود سبھی نے کچھ نہ کچھ کھایا۔ شیرینی کی قاب کے جانے کیوں میری نظریں وہ حلوہ ڈھونڈنے لگی تھیں جو نواب کی بیگم اور بہن نے چپکے سے ہمیں زنداں میں بھجوایا تھا بھی اُس کا ذائقہ نہیں بھولا ہو گا۔ میں نے کن انکھیوں سے اِد نظر دوڑائی لیکن وہاں حلوے کی قاب نہیں تھی۔

کھانے کے بعد ہم دیوار سے لگی ہوئی آرام کرسیوں پر گئے تھے۔ تین نوجوان لڑکیاں ایک جیسے لباس میں نمودار ہوئیں ہاتھوں میں پھل، فنجان اور چائے دانیوں کے طشت تھے۔ تینوں سر ڈھکے ہوئے تھے اور چھوٹا سا گھونگٹ نکلا ہوا تھا۔ لمبے چھوٹی مُہری کے پاجامے اور چادر نما دوپٹوں میں اُن کا سارا

چھپا ہوا تھا۔ تینوں کی رنگت بھی تقریباً ایک جیسی تھی۔ جیسے سانولے میں چمپئی رنگ کی آمیزش ہو گئی ہو۔ اُن کا رنگ رُوپ دیکھ کے بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ خادمائیں ہوں گی۔ ڈری ڈری سہمی سہمی نگاہیں جھکی جھکی۔ اُنھوں نے نفاست سے طشت ہمارے سامنے میزوں پر رکھ دیے اور جب تک نواب نے اُنھیں جانے کا اشارہ نہیں کر دیا، ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑی رہیں۔ نواب نے اپنے ہاتھوں سے فنجانوں میں قہوہ انڈیلا۔ یہ شکر کے بغیر پیا جانے والا عربی قہوہ تھا۔ میں نے ایک بار بمبئی میں کرشنا جی کے ساتھ پیا تھا۔ پچھلے کی نسبت یہاں کی فضا یکسر بدلی ہوئی تھی۔ نواب بھی اب نسبتہً ٹھہرا ٹھہرا الگ رہا تھا۔ اُس کے لب و لہجہ میں بھی شگفتگی لوٹ آئی تھی۔ سبھی کا کچھ یہی حال تھا، میرا بھی۔ مجھے بھی اپنے دست و بازو کھلے کھلے محسوس ہو رہے تھے۔ نواب نے اب تک ہمارے بارے میں کچھ جاننے کی جستجو نہیں کی تھی۔ یہ کیسی عجیب بات تھی کہ اُسے اپنے ان مہمانوں کے نام بھی ٹھیک طرح معلوم نہیں تھے جن کی خوشنودی و خاطرداری کے لیے وہ بہت مستعد اور بے تاب نظر آتا تھا۔ ظاہر ہے یہ درگزری دانستہ ہو گی اور مقصد ہماری دل داری کے سوا کیا ہو سکتا تھا۔ ایسے ہر سوال و جواب سے اجتناب ہی مناسب تھا جس میں مہمانوں کے لیے سرگرانی کا کوئی پہلو نکلتا ہو۔ یہ رسم اُس نے ہمی پر چھوڑ دی تھی مگر ایسا کوئی موقع آتا تو جانے ہم سب کیسے ایک دوسرے کا تعارف کراتے۔ ابا جان اور منیر علی کی بات دوسری تھی لیکن بٹھل، بیرو، کانتے، زورا اور خود میرے بارے میں کیا اُسے سب کچھ بتا دینا چاہیے تھا کہ ہمارا تعلق باقاعدہ اڈوں سے ہے اور اب اڈوں پر پہچانے جانے والے نام ہی ہمارے نام ہیں۔ تاہم نواب کی گفتگو میں مغائرت کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ ہمارے ساتھ ہی بیٹھا رہا حالانکہ خانم کی آمد کے بعد اُسے اپنے چھوٹے بھائی کا حال جاننے کی بے چینی ہونی چاہیے تھی۔

بارہ سے اُوپر ہو گئے ہوں گے۔ نواب حویلی کی نقاشی کے بارے میں ابا جان کے کسی سوال کا جواب دے رہا تھا کہ اُسے خیال آیا اور وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولا "اتنی رات ہو گئی ہے، ہمیں آپ کی خلوت کا دھیان ہی نہیں رہا۔" بیرو نے مسکرا کے کہا بھی کہ اپنے لیے دن رات کی بندش نہیں ہے۔ وہ اپنی بات جاری رکھے لیکن نواب اسے بیرو کا تکلف سمجھا اور متانت سے بولا "ہم ایک گزارش کرنا چاہتے ہیں۔" سب اُس کی جانب ہمہ تن گوش ہو گئے۔ نواب نے شائستگی سے کہا "حویلی میں مہمانوں کے لیے مہمان خانہ الگ موجود ہے لیکن ہماری خواہش ہے آپ حضرات حویلی کی عمارت میں ہمارے ساتھ قیام فرمائیں۔" اُس نے خود ہی جھجکتے ہوئے وضاحت کی کہ اُس کی نظر میں ہماری حیثیت دیگر مہمانوں سے مختلف ہے۔ اُسے خوشی ہو گی اگر ہم حویلی میں اُس کے عزیزوں کے مانند ٹھہریں، یہ جان کے کہ یہ ہمارا ہی گھر ہے، اس گھر کی ہر چیز پر ہمیں تصرف حاصل ہے۔ وہ ڈبڈبائی آواز میں کہنے لگا کہ جن لوگوں نے اس گھر کے سکھ کا اس قدر خیال کیا ہے، اُن کی قدر و منزلت کے لیے نہ ہمارے پاس لفظ ہیں، نہ اُن کی خدمت و خاطر کے لیے جرأت و ہمت۔ "ہم آج خود کو بہت بے وسیلہ محسوس کر رہے ہیں۔ ہماری درخواست ہے کہ یہ ساری حویلی کھلی ہے، جہاں آپ چاہیں، جب تک چاہیں، رہیں۔ ملازمین سے کہہ دیا گیا ہے کہ پہلی بار ایسے مہمان آئے ہیں جن کا مرتبہ اُن کے آقا سے بلند ہے۔ وہ لوگ آئے ہیں جنھوں نے اس گھر کی شادمانی کے لیے بہت ایثار کیے ہیں جنھیں دوسروں کے دکھ درد کا ایسا احساس ہے،" نواب کی آواز بھرّانے لگی۔ نزدیک دُور موجود خادماؤں اور ملازموں کا بھی اُسے لحاظ نہیں رہا تھا، کہنے لگا "ہم نے اس گھر کی خواتین سے کہہ دیا ہے کہ نووارد مہمانوں کے لیے زنان خانے کی کوئی بندش نہیں ہونی چاہیے۔ جن لوگوں نے اس گھر کو زندگی کی نوید دی ہے، جو اپنے گھر کی آبرو، خانم بی بی کو یہاں لا سکتے ہیں، کسی بڑی قدر کے لیے اُسے ایسی نازک صورتِ حال سے دوچار ہونے پر آمادہ کر سکتے ہیں جنھوں نے ایک روٹھے ہوئے اجنبی کو منانے اور ایک برگشتہ شخص کی نشاطِ خاطر کے لیے اتنا بڑا حوصلہ کیا ہے۔ وہ اس گھر کے ہر فرد کے لیے واجب الاحترام ہیں۔ اُن کے سامنے کسی چلمن سے مغائرت کا گمان ہو سکتا ہے۔ ہمیں اندازہ ہے کہ خانم بی بی نے کن لوگوں کے ہاں جا کے پناہ لی ہے۔ وہ گھر کیسا عزت مند، احترام کے لائق ہو گا جس کے پاسبان ایسے ہوں جنھیں رشتوں کی یہ پاس داری آتی ہو اور جو اپنے عہد کے، کسی شخص سے کیے گئے عہد کے لیے اتنی دور تک جا سکتے ہوں۔ ہمیں اندازہ ہے کہ خانم بی بی کسی بڑے گھر سے آئی ہیں۔"

کسی نے اُسے نہیں ٹوکا اس لیے کہ ٹوکنے پر اُس کے بکھرنے، بپھر جانے کا خدشہ تھا۔ اُسے خود ہی احساس ہوا اور اُس نے بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے خاموشی اختیار کر لی لیکن جیسے اُسے پھر کچھ یاد آ گیا، ایک تامّل کے تذبذب کے بعد وہ تھکی ہوئی آواز میں بولا "مال و زر آپ نے ٹھکرا دیا ہے، جو زندگی بھر ہمیں فریب دیتا رہا۔ ہم سوچتے ہیں، ہمارے پاس باقی کیا رہ جاتا ہے۔"

"بہت ہے، بہت ہے نواب صاحب!" بیرونے تیزی سے کہا اور ہٹھل کی جانب دیکھتے ہوئے بولا "آپ ایسا سمجھتے ہو، اتنا ہی اپن کے لیے زیادہ ہے۔"

ابھی نواب اور بھیڑنا گرخاں صاحب نے بروقت مداخلت کی اور مودّبانہ کہا "بالائی منزل پر مہمانوں کی خلوت کا اہتمام کر دیا گیا ہے۔"

"ہاں، ہاں، بے شک۔" نواب نے ندامت سے کہا "ہم تو بھول ہی گئے، اس دوران رات اور نکل گئی۔ بالائی منزل نسبتہً ہوا دار اور پُرسکون ہے۔ ہم سے پوچھا جاتا تو ہم بھی وہی جگہ تجویز کرتے۔ شاید آپ حضرات کو بھی پسند آئے۔ بصورتِ دیگر کوئی تکلف نہ کیجیے گا۔"

وہ اُٹھ گیا۔ اُس کی معیّت میں ہم بھی کمرے سے نکل آئے۔ پاس ہی خم دار زینہ تھا۔ چھوٹی چھوٹی سیڑھیوں کا روشن زینہ۔ دونوں طرف دیواروں پر نقاشی کی گئی تھی اور اُوپر تک سُرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ نواب نپے تُلے قدموں سے سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ کانتے میرے پہلو بہ پہلو تھا۔ میں جانے کس خیال میں تھا، اُوپر پہنچ کے اُس نے زور سے میرا ہاتھ دبایا، میں ہڑبڑا گیا۔ اُوپر آ کے واقعی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہم کسی اور عمارت میں آ گئے ہوں۔ بالائی منزل کا نقشہ ہی کچھ اور تھا۔ ہمارے سامنے صحن کے بیچ میں فرش سے ایک بالشت بلند وسیع و عریض بیضوی چبوترے پر سبزہ زار کھلا ہوا تھا اور پھولوں کے تختے تھے۔ سبزہ زار کے وسط میں ایک حوض تھا، اُس میں ایک بڑا مجسمہ نصب تھا۔ چار سمتوں سے چار نوجوان لڑکیاں لہراتی ہوئی باریک قبائیں پہنے بے نیازانہ، صراحیوں سے پانی انڈیل رہی تھیں اور نیچے اُن کے گھٹنوں تک آتے دو زانو بیٹھے ہوئے متعدد مرد پانی کے لیے ترساں تھے۔ چبوترے سے پرے سنگِ مرمر کے بھاری بھاری ستونوں کا بڑا دلان تھا اور دُور دالان میں فاصلے فاصلے سے بنے ہوئے جھروکوں کی دیواروں کے پیچھے کمرے نظر آ رہے تھے۔ دالان کے سارے فرش پر اس طرح نقاشی کی گئی تھی جیسے پھول بکھرے ہوئے ہوں۔ سب مجسمہ دیکھنے کے لیے رُک گئے، مجسمہ دودھیا روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ لڑکیوں کے پانی انڈیلنے کا انداز ایسا دل نشیں تھا کہ بے ساختہ آدمی کا جی چاہے کہ ان کے گرد بیٹھے ہوئے پیاسے مردوں میں شامل ہو جانا چاہیے۔ مجسّمے کا شبہ تو اُس کے سفید رنگ سے ہوتا تھا ورنہ ایسا لگتا تھا جیسے بس ابھی ابھی انھیں پتھر کر دیا گیا ہے اور ایک پل میں یہ متحرک ہو جائیں گے۔ ابّا جان حیرت زا نظروں سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ وہ نواب سے ضرور کچھ پوچھنا چاہتے تھے لیکن نواب آگے بڑھ چکا تھا۔ دالان عبور کر کے ہم جھروکوں کے پیچھے آ گئے اور نواب سامنے

کے ایک بڑے دروازے میں داخل ہو گیا جو مخملی پردوں اور ساز و سامان سے مرصّع تھا۔ کسی راجا کی خلوت گاہ کا منظر بھی زیادہ کیا ہو سکتا تھا۔

"مکینوں کے حسین ذوق کے بغیر یہ نفاست ناممکن ہے" منیر علی چُپ نہ رہ سکے اور تمتماتے لہجے میں بولے "اچھی چیزیں کے دل کتنا خوش ہوتا ہے۔ سب کسی مصوّر، کسی شاعر کا خواب ہوتا ہے۔"

"آپ نے درست فرمایا۔" نواب یاسیت سے بولا "یہ ہمارے اُسی حرماں نصیب بھائی کی کارستانی ہے۔ تعمیر کی ابتدا اختتام تک ہماری حیثیت تو محض ایک تماشائی کی رہی۔ یوں کہ گوشہ گوشہ اُس نے اپنے ہاتھ سے تراشا ہے۔ نقشے بنانا، اُن میں رنگ بھرنا پھر انھیں مسترد کر دینا اور نئے زاویے سے پھر ترتیب یورپ میں تعلیم کے دوران اُسے شاہی محلات غور سے دیکھنے کا مل گیا تھا لیکن وہ تو عموماً یورپ جانے والے دیکھ کے آتے ہی ہیں اصل چیز تو مشاہدے کی ہے، کون کتنا اخذ کرتا ہے۔ کوئی برسوں آنکھیں کھلی رکھنے پر کچھ حاصل نہیں کر پاتا، کسی کے لیے ایک جھلک بہت ہوتی ہے۔ بچپن ہی سے اُس کی حسّیات کا عالم دگر تھا۔ ہمیں خوب یاد ہے، اُس وقت اس کی عمر بارہ سال ہو گی، اسکول میں زیرِ تعلیم ایک روز ہمیں اُس کے ذوقِ شعر گوئی کا علم ہوا۔ موسمِ بہار پر اُس ایک مرصّع نظم سُن کے ہم سب حیران رہ گئے تھے۔ اچھے شعر کہنے لیکن سب کچھ اپنے آپ تک محدود رکھا۔ اُسی زمانے میں مصوّری شوق ہوا اور صرف مصوّری کے مطالعے اور تصویریں دیکھ دیکھ کر پختہ تصویریں بنانی شروع کیں کہ لوگ یقین نہیں کرتے تھے۔ یو میں تصویروں کی نمائش گاہیں دیکھ کے یہ شوق اور فزوں ہوا۔ آ کو شاید تعجب ہو کہ یہاں نقاشی کا جتنا کام نظر آ رہا ہے، سب اُ کے بنائے ہوئے خاکوں کا کرشمہ ہے، حتّاکہ خطاطی بھی۔ موسیقی باب میں بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ ہمارے خاندان کو موسیقی سے ایک خا شغف رہا ہے۔ والدِ مرحوم کی حیات تک یہاں نامی گرامی استادانِ جمع ہوتے تھے۔ اُن کے بعد اُسی نے یہ روایت زندہ رکھی اُس نے اتنی جلد جانے کہاں سے ایسا درک حاصل کر لیا تھا کہ بیا پھر وہی جگمگھٹ ہونے لگا۔ ہم آپ سے کیا عرض کریں کہ ہمارا بھا کن گوناگوں صفات کا حامل ہے۔ ہم پانچ بھائی تھے، بہن صرف ایک تھی۔ اب ہم صرف دو رہ گئے ہیں اور چھوٹی بہن سلامت ہے۔ عالم تاب ہمارا بھائی ہے لیکن یقین کیجیے، ہم نے اُسے اولاد کی طرح پرورش کیا ہے۔"

نواب ابھی تک رُکا ہوا تھا، چھوٹے نواب کے ذکر میں وہ ایسا کھو گیا تھا کہ اُسے اپنے اردگرد ہمارے کھڑے رہنے کا احساس بھی نہ رہا۔ بھائی کے نام پر اُس کی آواز ڈگمگانے لگتی تھی۔ سب گُم صُم کھڑے تھے۔ نواب کی آنکھیں بھیگنے لگیں تو ابّا جان نے اُس سے بیٹھ جانے کی درخواست کی۔ ابّا جان کی دخل اندازی پر اُس کے جھکے ہوئے شانے سیدھے ہو گئے اور وہ پشیمانی سے بولا "ہمیں وقت کا پھر خیال نہیں رہا۔ آیئے ہم آپ کو آپ کے کمروں تک پہنچا آئیں۔ باقی باتیں ان شا اللہ صبح ہوں گی۔"

وہ مُڑ کے کمرے کے وسط میں ایک کھلے دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا کہ معاً ابّا جان نے اُس کا شانہ تھام لیا "نواب صاحب! آپ زحمت نہ فرمایئے۔ ہم خود کمرے تلاش کر لیں گے اور یہ، یہ خاں صاحب قبلہ تو راہ بری کے لیے موجود ہیں ہی۔ قطع کلامی سے مراد یہی تھی کہ آپ تشریف رکھیں۔ ہماری فکر نہ کیجیے۔ ہم میں سے کسی کو بھی نیند نہیں آ رہی ہے۔ البتہ آپ کی بے آرامی کا ---"

"اب کیسا آرام۔" نواب شکستگی سے بولا "ہم تو اب عادی ہو گئے ہیں۔ ہمیں اپنی نیند لیے تو دن گزر گئے لیکن، لیکن آج ضرور سکون سے سو سکیں گے۔"

ابّا جان اُس کا بازو تھامے تھامے اُسے کمرے میں ایک جانب پڑی ہوئی بڑی بڑی کرسیوں کی طرف لے آئے۔ جب تک ہم سب بیٹھ نہیں گئے، نواب کھڑا رہا۔ اسی اثنا میں خاں صاحب نے ہم سے مشروبات وغیرہ کے لیے پوچھا لیکن سب نے شدّ و مد سے منع کر دیا۔ کرسی پہ بیٹھے بیٹھے نواب صاحب کا سینہ ہانپ رہا تھا۔

"تو یہ سب چھوٹے نواب صاحب کی فسوں طرازی ہے۔" منیر علی نے اشتیاق سے کہا۔

"جی۔" نواب اکھڑی ہوئی سانسوں سے بولا "سب اُسی کی خلاقی و خیال پردازی ہے۔ اُس کے بغیر یہ ممکن نہیں تھا اور ہم سے تو یہ قطعی ممکن نہ تھا۔ یورپ میں چار سال گزارنے کا موقع ہمیں بھی ملا ہے اور سیر و سیاحت ہم نے بھی خوب کی ہے مگر ہم وہ امتیازی نقوش اپنے ذہن پر ثبت نہیں کر سکے جو عالم تاب نے محفوظ کیے تھے۔ یہاں واپس آ کے ہمارے مشاغل بھی مختلف رہے، شکار، مطالعہ اور جاگیر وغیرہ کے انتظامات۔ عالم تاب کو جاگیر کے بکھیڑوں سے کبھی سروکار نہیں رہا لیکن اپنے خاندان کی انفرادیت قائم رکھنے اور نام روشن کرنے میں جو کچھ عالم تاب نے کیا ہے، ہم سے اس کا عشرِ عشیر بھی نہ ہو سکا۔ اُس کے بغیر عمارت کی کوئی بھی حیثیت ہو سکتی تھی مگر یہ نہیں جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ جب مکمل ہوئی تو دُور دُور تک شہرہ ہوا۔ کئی نوابوں نے عالم تاب سے اپنی عمارتوں کی تعمیر کے لیے مشوروں کی درخواست کی۔ ہمارے عم زاد نواب حشمت جنگ تو گویا عالم تاب کو باقاعدہ گرفتار کر کے لے گئے۔ اُن کی حویلی بھی خوب ہے، کبھی آپ کو دکھائیں گے۔" سب نے ابّا جان کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش ہی رہے، اُنھوں نے نواب سے نہیں کہا کہ وہ مذکورہ حویلی دیکھ چکے ہیں۔ "پھر سلسلہ دربارِ سرکار تک جا پہنچا۔" نواب نے بات جاری رکھی "نئے محلات کے لیے عالم تاب کے پاس سواریاں آنے لگیں۔"

"اس عمارت کو بھی محل ہی کہنا چاہیے۔" ابّا جان نے قدرے اُونچی آواز میں کہا "کوئی محل بھی اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔"

"ہاں! مگر اب تو کچھ بھی نہیں۔" نواب بجھے ہوئے لہجے میں بولا "اب تو یہ سب ہمیں کھنڈر نظر آتا ہے، جیسے ان در و بام کی روح کوئی کھینچ کے لے گیا ہو۔ عرصے سے کوئی محفل آرائی نہ ہو سکی۔ ایک وقت تھا کہ یہاں آئے دن کوئی نہ کوئی تقریب برپا ہوتی رہتی تھی۔ ہر وقت ایک جشن سا رہتا تھا۔ عالم تاب کی حالت جب سے بگڑی ہے، حویلی کے مکین گوشہ نشیں سے ہو گئے ہیں۔ لوگوں کی آمد و رفت بھی کم ہو گئی ہے۔ اب یہاں حکیم ڈاکٹر آتے ہیں، چند عیادت کرنے والے یا یہاں کے ملازمین ہیں۔ معلوم ہوتا ہے حویلی کو کسی کی نظر لگ گئی ہے۔ عمارت کا ہر گوشہ اپنے خالق کو پہچانتا تھا اور اب اُس کی کبیدہ خاطری پر سوگ وار ہے۔ ہمیں تو بہت بعد میں علم ہو سکا۔ ہم سے چھپایا گیا تھا۔ ہماری بہن نے ہم سے چھپایا تھا، امّی جان نے بھی ہمیں خبر نہ ہونے دی پھر جب ہمیں علم ہوا تو وقت بہت نکل چکا تھا اور ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ عالم تاب جو سخن سر تھا وہ کسی سخن کا اسیر کیسے ہو گیا۔ بہت دنوں سے ہمیں اُس کا رنگ متغیّر معلوم ہو رہا تھا۔ بہت دنوں سے ہم محسوس کر رہے تھے کہ عالم تاب بزم آرائیوں سے کچھ اُکتانے لگا ہے لیکن ہم نے جانا کہ یہ ایک عارضی امر ہے۔ اب وہ عمر کی اُس منزل میں ہے جہاں ایک ٹھیراؤ آ جانا چاہیے۔ ہمارے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ ہم سے زیادہ بھی کوئی اُسے عزیز ہو سکتا ہے۔ خاں صاحب نے جب ہمیں بتایا اُس وقت ہمارے اختیار میں کچھ نہ رہا تھا ورنہ ہم خود خانم بی بی کے ہاں جا کے عاجزی کر لیتے تاہم ہم نے اپنی جیسی ہر کوشش کر لی۔ عاملوں اور غیب دانوں پر ہمیں کبھی اعتبار نہیں تھا لیکن ہم نے اُنھیں بھی آزما کے دیکھا۔ جس جس مسیحا نفس کی نشان دہی

کی گئی، ہم نے اُس کی خدمت میں حاضری دی لیکن ہوا وہی جو ہمارے لیے طے کر دیا گیا تھا۔ ہر دوا بے اثر ٹھیری، ہر تدبیر بے سود قرار پائی۔ عالم تاب اپنے آپ میں گُم، اپنے ہم نفسوں سے بے نیاز ہوتا گیا۔ طبیبوں نے مشورہ دیا کہ اب عیادت کرنے والوں سے معذرت کر لینی چاہیے کیونکہ اُن کی آمد عالم تاب کے لیے اور سرگرانی کا سبب بن سکتی ہے۔ ہمارے لیے یہ انکار مشکل تھا لیکن ہم نے اپنے احباب اور اعزّا سے معافیاں مانگ لیں۔ ہم اُس کے لیے ایک چاند سی دُلھن لائے تھے۔ پہلے تو وہ سرے سے شادی پر آمادہ نہیں ہوتا تھا لیکن امّی جان اور ہماری ضد پر بہرحال اُس نے سپر ڈال دی۔ دُور و نزدیک ہماری نظر ایک ہی لڑکی پر پڑتی جو رشتے میں ہماری عم زاد ہوتی ہے، ہمارے بھائی حشمت جنگ کی ہمشیرہ۔ ہم نے حشمت بھائی سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو شش و پنج میں پڑ گئے۔ گیتی کے لیے خاندان کے ایک بزرگ پہلے سے کسی ذی قدر صاحب زادے کے لیے تجویز پیش کر چکے تھے۔ گیتی کو دربار ہی میں کسی شہزادے کے محل کی زینت بننا چاہیے تھا مگر حشمت جنگ ہماری بات کیسے مسترد کر سکتے تھے۔ خود عالم تاب کو وہ عشق کی حد تک چاہتے ہیں۔ مان گئے اور ہم بہت دُھوم دھام سے گیتی کو دُلھن بنا کے لائے۔ گیتی کو سُکھ کے چند سال، دو ڈھائی سال ہی دیکھنا نصیب ہوئے تھے کہ عالم تاب پر بے گانگی چھا گئی۔ اُسے اپنی ضعیف ماں کا بھی خیال نہ رہا، اپنے بڑے بھائی کا بھی نہیں، جس نے پہلے ہی کم صدمے نہیں سہے۔ اُسے معلوم ہے کہ اُسے دیکھے ہوئے دیر ہو جاتی ہے تو ہمارا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ اُسے سب کچھ معلوم تھا پھر اُس نے ہمیں اتنی بڑی آزمائش میں کیوں ڈالا۔ ہمارا بھائی ہم سے۔۔۔۔“ نواب اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا، اُس کی آواز حلق میں ڈوب گئی۔

ابّا جان نے تسلّی کے دو لفظ کہنے چاہے تو اُس کی سسکیاں نکل پڑیں۔ سب پریشان ہو گئے۔ نواب کی طرف نگاہ نہیں اُٹھائی جا رہی تھی، اُس کا وجود ریت کا ڈھیر معلوم ہوتا تھا۔ میری آنکھیں بھی جلنے لگی تھیں۔ نواب نے اپنا چہرہ رومال سے چھپا لیا تھا اور بچّے کی طرح ہڑک ہڑک کے رو رہا تھا۔ شاید بہت دنوں سے اُس کے آنسو رُکے ہوئے تھے۔ میرا جی چاہا کہ میں جھپٹ کے اُسے گلے لگا لوں۔

”ایسا، کبھی ایسا ہی پھیر ہو جاتا ہے نواب صاحب!“ پیرو نے اٹکتی زبان سے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ ”آدمی دوسرے کو کیا، اپنے آپ کو بھی دکھائی نہیں دیتا پر تسلّی رکھو، ابھی سب دُور ہو جائے گا۔ سب ابھی ایک دم ختم سمجھو نواب صاحب!“

”ہاں نواب صاحب!“ ابّا جان اُمڈتی آواز میں بولے ”حوصلہ رکھیے، آپ نے تو خود ابھی فرمایا ہے کہ سب کچھ لکھا ہوا، اپنا لکھا ہوا مٹانے کی قدرت بھی اُسی کو ہے۔ آدمی اپنی سی کرتا ہے لیکن وقت کی گردش کس نے روکی ہے۔ کبھی کوئی شخص کسی کو۔۔۔“ جانے کیوں ابّا جان کی آواز کپکپانے لگی اور اُنھوں نے اپنے ہونٹ سی لیے۔ میری طرف اُنھوں نے نہیں دیکھا تھا لیکن میرا سارا جسم لرز کے رہ گیا۔ ضرور اُن کا اشارہ میری طرف تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہوں گے کہ کبھی کوئی شخص سارے رشتے ناتے توڑ کے ایسے ہی کسی پر چھا جاتا ہے، کبھی کوئی شخص کسی کے اتنا قریب آجاتا ہے کہ اُس کی اوٹ میں ساری دنیا اوجھل ہو جاتی ہے۔ گویا ابّا جان کو احساس ہو چلا تھا۔ اتنے عرصے زمانے کی نیرنگیاں دیکھ کے، دربدر کی خاک چھان کے اُن کی سمجھ میں یہ بات آگئی تھی۔ کاش وہ اُسی رات کچھ جان لیتے جب کورا اُن کے گھر میں پناہ حاصل کرنے آئی تھی۔ میں نے اُن سے اصرار نہیں کیا تھا۔ میں اُن کے سامنے یہ بات کس طرح کہہ سکتا تھا کہ کورا مجھے بہت اچھی لگتی ہے مگر اُنھیں خود بھی تو کچھ جاننا چاہیے تھا۔ بڑا نواب کہہ رہا تھا کہ اگر اُسے وقت پر خبر ہو جاتی تو وہ خود خانم کے در پہ حاضری دیتا۔ ابّا جان نے تو کورا کو گھر سے نکال دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اُن کے فیصلے میں ذرا بھی لچک نظر آتی تو میں گھر سے نکلنے پر کیوں مجبور ہوتا۔ پھر کچھ نہ ہوتا۔ نہ مجھے سات سال جیل کاٹنی پڑتی، نہ بھرا گھر اجڑتا، نہ امّی کو بے وقت موت آتی اور نہ فمّی۔۔۔ ابّا جان کو کبھی اپنی بیوی، بیٹی، اپنے گھر کی یاد آتی ہو گی مگر اب اس سے کیا حاصل۔ امّی اور فمّی تو لوٹ کے نہیں آسکتی تھیں۔

کمرے میں نواب کی گھٹی گھٹی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ پیرو اور ابّا جان کی تسلّیاں مہمیز ثابت ہوئیں۔ اگر وہ بٹھل کی طرح بے حس و حرکت بیٹھے رہتے تو شاید نواب کا یہ حال نہ ہوتا۔ اُسے تو بس اشارے کی دیر تھی۔

ہم بھرے بیٹھے ہیں یوں راگ میں جیسے باجا
اِک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے!

پیرو واقعی بھول چکا تھا کہ کل رات تک ہم اسی حویلی میں قید تھے مگر خود میرا جی بھی نواب کو تھامنے، کسی طرح اُس کے آنسوؤں کا سیلاب روکنے کے لیے اُمڈ رہا تھا۔ نواب کی آواز میں سوز ہی ایسا تھا کہ وہ آدمی کی رگوں میں اُتر جائے۔ میں تو ابّا جان اور منیر علی کی وجہ سے سمٹا بیٹھا رہا۔

بہت دیر بعد نواب کو ہوش آیا مگر پیرو، منیر علی اور ابّا جان کی تشفیوں سے کم اور خاں صاحب کی دخل اندازی سے زیادہ۔ خاں صاحب دیر تک نواب کی کرسی کے عقب میں بیٹھے رہے۔ پہلے انھوں نے جان کے نواب کو نہیں ٹوکا ہو گا کہ آنسو تو جسم میں سلگتی آگ کی طرح ہوتے ہیں، اُن کا بہہ جانا ہی ٹھیک ہوتا ہے، اور ایسے لوگ روتے کب ہیں۔ سُنا ہے، وہ ہر وقت بندھے ہوئے، جکڑے ہوئے رہتے ہیں اور ملازمین کے سامنے تو بالکل پتھر بن جاتے ہیں۔

معلوم نہیں، وہ سب کب تک وہاں بیٹھے رہے۔ ہم تینوں اُٹھ کے چلے آئے تھے اس لیے کہ بٹھل نے ہمیں اُٹھ جانے کا اشارہ کر دیا تھا۔ خاں صاحب نے ہمیں بالائی منزل کے دوسرے حصّے میں پہنچا دیا۔ یہ حصّہ پہلے والے حصّے سے ملحق تھا مگر بالکل مختلف۔ یہاں کا منظر ہی اور تھا۔ خاں صاحب نے میرے، کانتے اور زورا کے لیے الگ الگ کمرے تفویض کیے تھے۔ یہاں سے وہاں تک پھیلے ہوئے کمرے لیکن اُن کے جاتے ہی ہم تینوں ایک کمرے میں چلے آئے۔ جس وقت ہم اُٹھ رہے تھے، ہمیں دیکھ کے نواب بھی کھڑا ہو گیا تھا مگر بٹھل اور ابّا جان نے اُسے روک لیا۔ کہا نہیں جا سکتا کہ ہمیں اشارہ کرنے میں بٹھل کی کون سی مصلحت تھی، وہ ہم تینوں کے پیچھے نواب سے کون سی بات کرنا چاہتا تھا یا اُس نے محض ہمارے آرام کی خاطر اپنے طور پر ہمیں آزاد کر دیا تھا۔ نواب کے سامنے سے اُٹھنے کو ہمارا جی نہیں کرتا تھا۔ ہر چند اُس وقت جب وہ نواب عالم تاب کی کیفیت کا ذکر کر رہا تھا اور خانم کا نام اُس کی زبان پر آیا تھا، مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اُسے ہمارے مابین رشتوں کا علم نہیں ہے، کہیں اُس کے مُنہ سے کوئی ایسی ویسی بات نہ نکل جائے جو میری اور ابّا جان کی موجودگی میں مناسب نہ ہو مگر نواب نے بہت احتیاط کی۔ کہیں بھی شائستگی کا دامن اُس کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا تھا۔

کمرے میں نیند نہیں آئی۔ ہم باہر نکل آئے۔ رات کا سنّاٹا ہر سُو چھایا ہوا تھا۔ اُس حصّے کے صحن میں بھی بڑا سا باغیچہ لگایا گیا تھا۔ طرز بدلی ہوئی تھی اور درمیان میں مجسّمے کی طرح کئی سمتوں میں پانی برسانے والا فوّارہ نصب کیا گیا تھا۔ سبزہ بھیگا بھیگا سا تھا اور فضا میں خنکی گھلی ہوئی تھی۔ زورا اور کانتے بھی میرے ساتھ سبزے ہی پر پھیل گئے۔ دونوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی، بس آسمان تکتے رہے۔ میرا جی بات کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ میں نے آنکھیں موندنے کی کوشش کی لیکن مجھے کسی غفلت کا احساس ہوا جیسے آنکھیں بند کرنے سے کوئی منظر نکل جائے گا۔ میرا دل بار بار دھڑ دھڑانے لگتا تھا، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب یہ کاہے کی دھڑکن ہے۔ اب مجھے راستہ بدل جانے اور بمبئی پہنچنے میں دیر ہو جانے، بارہ دن نواب کی قید میں گزارنے کا پچھتاوا نہیں تھا۔ بے شک ان سب کے بدلے میں ایک شخص کی خوشی، ایک شخص کی زندگی بڑی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر ہم اچانک راستہ بدل کے حیدرآباد آنے کا ارادہ نہ کر لیتے تو خانم عالم تاب کو نہ ملتی اور جانے اُس پہ کیا گزر جاتی۔ مراد آباد میں مولوی صاحب کا پتہ ملنا تو ایک بہانہ تھا۔ اصل میں اس طرح نواب عالم تاب کی مراد بر آنی تھی۔ کہتے ہیں، طلب کا سچّا ہونا لازم ہے، اسباب خود بہ خود پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو میری طلب میں کوئی کھوٹ ہی ہو گی اور وہی کورا کو مجھ سے دُور کیے ہوئے ہے مگر یہ کس طرح ممکن ہے۔ میں تو جب سے، اُس رات سے جب کورا مجھ سے جدا ہوئی ہے۔۔۔۔ یہ تو میں جانتا ہوں، کم از کم میرے دل کا حال تو مجھ پہ عیاں ہے۔ میرا تو ہر لمحہ اُسی کے لیے دعا کرتا رہا ہے۔ اُس کی ایک ایک بات میرے دل پر نقش ہے۔ اُس رات کا ایک ایک واقعہ اور اُس سے پہلے اُس کے ساتھ گزرا ہوا ہر لمحہ، اُس کی باتیں، اُس کی صورت، اُس کی خوشبو، جب اُس نے ہوٹل کے کمرے میں میرے چہرے پر اپنے ریشم ایسے بال بکھیر دیے تھے۔ یہ سب کچھ میری آنکھوں میں کھُبا ہوا ہے۔ میں تو اُسے، اُس کی خوشبو سے پہچان سکتا ہوں۔ شب و روز میں کتنی بار مجھے اُس کی آہٹوں کا گمان ہوتا ہے۔ اگر کبھی کسی لمحے اُس کے اور میرے درمیان پردہ بھی حائل ہو گیا ہے تو پردے کے پیچھے وہی رہی ہے۔ بس یہ اتّفاق کی بات ہے یا قسمت کی۔ اگر ہم دلّی سے حیدرآباد کے لیے راستہ نہ بدلتے تو خانم عالم تاب کو نہ ملتی مگر سونیا تو بچ جاتی۔ سونیا کی موت اُسے کھینچ کے لائی تھی یا یہ نواب عالم تاب کی طلب کا اثر تھا۔

اوس نے سارے کپڑے بھگو دیے تھے لیکن نمی اچھّی لگ رہی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ کانتے اور زورا بھی سبزے پر کروٹیں بدلتے ہوئے میرے قریب آگئے۔ کانتے نے اپنا بازو پھیلا کے میرے لیے تکیہ بنا دیا۔ میں نے بھی اُس کا سر اپنے بازو پر رکھ لیا۔ رات کا آخری پہر ہو گا۔ دونوں ابھی تک جاگ رہے تھے۔ میں نے اُن سے نہیں پوچھا کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں۔ سوچ رہے ہوں گے دیکھیے آب و دانہ اب کہاں کھینچ کے لے جاتا ہے مگر آب و دانہ کیا، سب کچھ تو مجھ پہ منحصر ہے۔ سوچتے ہوں گے کہ دیکھیں، اب کون

سا تماشا دکھانے کا سودا میرے سر میں سماتا ہے۔ بہر حال، چند دن کی گرہ اور رہ گئی تھی۔ کل پرسوں، قریب ہی کسی دن ہمیں بمبئی کے لیے روانہ ہو جانا ہے۔ انھیں جتلانے کی ضرورت نہیں تھی، میں نے پہلے ہی دل میں طے کر لیا تھا کہ اب گھر کے سوا کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں اُن سے لاکھ منّت کروں کہ وہ میرے پیچھے کیوں آتے ہیں، نہ آیا کریں مگر وہ کبھی نہیں مانیں گے۔ میں نے اُن سے الگ جا کے بھی دیکھ لیا ہے۔ وہ میرے ساتھ نہیں تھے لیکن سب میرے لیے کیسے بے چین تھے۔ چمپا بیگم کی ایک اطلاع پر بتھل بمبئی دوڑا آیا تھا۔ بتھل کو مجھ پر اعتبار ہی نہیں ہے کہ میں تنہا اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکتا ہوں۔ میں انھیں کیسے روک سکتا ہوں کہ وہ میری پروا نہ کریں، میری وجہ سے کیوں اپنے دن اجیرن کرتے ہیں، میرا کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے میرے حال پہ چھوڑ دیں۔ بس یہی اُن کے قرار کے لیے مناسب ہے کہ میں اُن کے سامنے رہوں۔ میں اُن کے سامنے ہی رہوں گا۔ ابّا جان نے اب کہیں نہ کہیں تو مستقل بسنے کا ارادہ کیا ہو گا۔ اگر اُنھوں نے مجھ سے مشورہ کرنا مناسب سمجھا تو میں فیض آباد کی رائے دوں گا۔ زرّیں کی حویلی بہت بڑی ہے، کئی خاندان سما سکتے ہیں ورنہ جہاں وہ رہیں گے، میں بھی اُنھی کے ساتھ رہوں گا پھر زرّیں اور نیلساں بھی لازماً ہمارے ساتھ رہیں گی۔ ممکن ہے، ابّا جان نے یہیں حیدر آباد میں رہنے کا ارادہ کر لیا ہو۔ ممکن ہے، نواب حشمت جنگ سے راہ و رسم بڑھانے کے علاوہ یہاں حویلی خریدنے میں اُن کی اس خواہش کو بھی دخل رہا ہو۔ ویسے ایک حویلی کی خریداری سے اُن کے لیے فرق ہی کیا پڑتا ہے۔ زرّیں کی حویلی کے تہہ خانے میں پتھروں سے اٹے کئی صندوق پڑے ہیں۔ ابھی تو اُنھوں نے صرف چند پتھر نکالے ہیں، سو ایک حویلی اس شہر میں بھی سہی۔ امیر لوگ ہر جگہ گھر بنا لیتے ہیں۔ بہر حال وہ کہیں بھی رہیں، میں اب کہیں نہیں جاؤں گا۔ کیا عجب کسی دن وہ یوں ہی اچانک مجھے مل جائے، کوئی ایسا حادثہ ہو جائے جیسے نواب عالم تاب کو خانم مل گئی۔ ہو سکتا ہے، کبھی مولوی صاحب اُس کی نگہ بانی کرتے کرتے تھک جائیں اور اُنھیں میری یاد آ جائے، اُنھیں خیال آ جائے کہ وہ کسی کی امانت ہے، مجھ تک پہنچنا اُن کے لیے کچھ مشکل نہیں۔ اُنھیں کلکتہ جیل سے بتھل کے اڈّے کا اور بتھل کے اڈّے سے فیض آباد کا پتہ معلوم ہو سکتا ہے لیکن انھیں میری جستجو ہو بھی تو۔

میں رات بھر اپنے آپ سے سرگوشیاں کرتا رہا۔ وہی کچھ دہراتا رہا جو اشارے کنایوں میں دوسرے مجھے جتانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کوئی نہیں سمجھتا کہ آدمی اپنے آپ سے بھی بہت کچھ کہتا ... آپ کو بہت کچھ سناتا ہے۔ سب کچھ میری سمجھ میں آتا تھا لیکن ... کسی بھی لمحے میرے ذہن میں منتشر ہو جاتا تھا۔ میں نے پہلے کئی بار اپنے آپ سے عہد کیے تھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہر ارادے کو ایک ... لازم ہے۔ اب مجھے اپنے آپ کو باندھ کے ہی رکھنا پڑے گا۔ ... کی زندگی صرف اپنی نہیں ہوتی، دوسرے بھی اُس میں شامل ہو ... ہیں۔ پہلے کی بات اور تھی۔ ابّا جان نہیں ملے تھے اور محض خوش ... سے نہیں مل گئے ہیں، ہم نے اُن کی تلاش میں کہاں کہاں خاک ... چھانی۔ جہاں جہاں ہم مولوی صاحب کو پوچھتے تھے، ابّا جان کو ... معلوم کرتے تھے۔ وہ مل گئے، جہاں گیر مل گیا۔ فرخ، فریال ... اور اکبر بھی اب دُور نہیں ہیں۔ صرف چند دلوں کی دیوار حائل ... مگر۔ ۔ ۔ مگر جو سمیٹا ہے، وہ کہیں پھر نہ بکھر جائے۔ ابّا جان کو ... اب تبّت کے قدیم تہہ خانے میں چھپے ہوئے باقی پتھر لانے ... بے چینی نہیں ہو گی۔

رات بھر میں وہ لمحہ درگزر کر دینے کی ہمّت استوار کرتا ... جب میرے قدم بہکنے لگتے ہیں اور سب کچھ ریت کے محل کی ... منہدم ہو جاتا ہے۔ جتنا میں اپنے سینے میں اپنا عزم توانا محسو... کر رہا تھا، اتنا ہی میرا جسم ٹوٹتا، ڈھیر ہوتا جا رہا تھا۔ میری رگوں ... سردی سی بیٹھنے لگی تھی جیسے میں اپنے آپ سے دُور ہو رہا ہوں۔

فجر کی اذان کے وقت ہمیں وقت کا اندازہ ہوا۔ اذان کی آ... سُن کے کانتے ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا۔ ابھی اندھیرا بہت گہرا تھا۔ کا... اور زورا اپنے اکڑے ہوئے ہاتھ پاؤں کھولنے کے لیے بیٹھکیں ... لگے۔ اندھیرا پھیکا پڑنے پر ہم نے اپنے اپنے کمروں کا رُخ کیا۔ ہر ک... میں الگ ایک غسل خانہ تھا اور خاں صاحب نے ہمیں بتایا تھا ... کسی چیز کی ضرورت ہو تو دیوار کے ساتھ لٹکی ہوئی نقرئی زنجیریں کھینچ... جائیں ملازمین فوراً حاضر ہو جائیں گے کیونکہ وہ اُنھی کمروں ... پیوستہ عقبی حصّے میں ہمہ وقت موجود رہتے ہیں۔ آمد و رفت ... لیے اُن کے راستے بھی مختلف ہیں اور شب و روز میں مقررہ اوقا... کے علاوہ وہ طلبی ہی پر حویلی کے ان حصّوں میں نمودار ہوتے ... میرا سارا جسم چپ چپا رہا تھا۔ کل شام ہی ابّا جان کی حویلی میں ... تبدیل کیے تھے جو اوس کی وجہ سے گیلے اور مسکے ہوئے ہو گئے ... لیکن دوسرے کپڑے موجود ہی نہیں تھے۔ میں نے اُنھیں کھینچ ک... کے شکنیں درست کیں اور غسل خانے میں تولیوں کے اسٹینڈ ... دیا۔ گرم اور ٹھنڈے پانیوں کے نل الگ الگ تھے اور سارا غسل

...مر کا بنا ہوا تھا، تین اطراف دیواروں میں قدِ آدم شیشے جڑے ... چینی کا ایک بڑا ٹب بھی موجود تھا۔ میں دیر تک نہاتا رہا، ... تازگی سی محسوس ہوئی۔ کپڑے اتنے سُوکھے نہیں تھے۔ میں ... انھیں یوں ہی پہن لیا، جسم پر کپڑے ویسے بھی جلد خشک ہو ... ہیں۔ باہر سویرے کی دُھند چھٹ رہی تھی۔ باغیچے میں مالی آ ... تھے اور کئی خدمت گار فرش کی صفائی کر رہے تھے۔ میں نے جالیوں ... دیوار سے باہر جھانک کے دیکھا۔ نچلی منزل کا ایک حصّہ اور حویلی ... اطراف میں دُور تک پھیلا ہوا باغ یہاں سے صاف نظر آ رہا تھا۔ ... ول نے شور و غوغا مچا رکھا تھا۔ نیچے ملازموں کی چلت پھرت ... بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی اور روشنی بھی چپکے چپکے نکھرتی جا رہی تھی۔ ... یہاں بارہ دن رہے تھے اور ہمیں کچھ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ ... لی میں صُبح کے وقت اتنی چہل پہل ہوتی ہے اور حویلی کا باغ ... وسیع اور سر سبز ہے۔ جا بجا پھولوں کے کنج تھے، فوّارے، نہریں ... مصنوعی پہاڑیاں۔ زنداں میں تو ہر موسم ایک جیسا ہوتا ہے۔ ... اں ہم رات کو بھی آئے تھے، رات ہی کو یہاں سے رہائی نصیب ... ئی تھی۔ میرے جی میں آیا کہ نیچے جا کے باغ میں گھوموں مگر کانتے ... اور زورا ابھی تک اپنے کمروں میں تھے۔ میں وہیں کھڑا آتے جاتے ... زمین کو دیکھتا رہا۔ ان سب کو کوئی جلدی معلوم ہوتی تھی۔ ہو سکتا ... ہے، روز ہی اُن کا یہ معمول رہتا ہو یا آج کوئی خاص بات ہے، ... آج حویلی میں بڑے نواب کے بقول نہایت معزز مہمان آئے ہیں۔ اُن ... سے چھپا نہیں رہا ہو گا کہ ہمارے ساتھ آنے والی خاتون کون ہے ... اور اُس کی آمد پہ ساری حویلی کیوں زیر و زبر ہو گئی ہے۔ اُن کے لیے ... بھی کچھ کم حیرت کی بات نہ ہو گی کہ ایک دن پہلے اُنھوں نے ... جن لوگوں کو قیدی کی حیثیت سے دیکھا تھا آج اُنھیں مہمانی کا ... شرف حاصل ہے۔ اُن میں سے کتنوں کے سامنے میں اور پیر و ... بندوق کی زد پر بڑے نواب کو حویلی سے لے گئے تھے۔ اُس رات ... چھوٹے نواب کی بیگم نے ہمیں بتایا تھا کہ حویلی کے ملازم اپنے چھوٹے ... مالک سے اس قدر وابستہ تھے کہ اب سبھی ویران ویران معلوم ہوتے ... ہیں۔ میں نے اُن کے چہرے پڑھنے کی کوشش کی لیکن ایسے کیا ... معلوم ہو سکتا تھا۔ مجھے یہ جاننے کی بے تابی تھی کہ خانم کو دیکھنے ... کے بعد نواب عالم تاب پر کیا گزری ہو گی۔ رات سے کتنی مرتبہ میری ... آنکھوں نے اُس منظر کا تصوّر کیا تھا جب خانم نواب عالم تاب کے ... سامنے پہنچی ہو گی چھوٹے نواب پر تو سکتہ طاری ہو گیا ہو گا۔ اُسے ... پہلے تو اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا ہو گا۔ اتنے انتظار کے بعد کوئی یوں اچانک سامنے آ جائے تو آدمی پاگل بھی ہو سکتا ہے، کاش میں بھی وہاں ہوتا مگر وہاں تو شاید خانم کے سوا کوئی موجود نہ ہو۔ وہ منظر تصوّر ہی کیا جا سکتا تھا اور اس کے تصوّر سے میرا سارا جسم دھڑکنے لگتا تھا۔ رات خانم کو زنان خانے پہنچانے کے بعد سے اب تک اُس کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ خبر ملتی بھی کیسے۔ ایک ہی رات درمیان میں گزری تھی اور آدھی رات تک بڑا نواب ہمارے ساتھ رہا تھا۔

میں وہیں جھروکے کے پاس کھڑا رہا اور مجھے کچھ احساس ہی نہیں ہوا کہ صُبح کی روشنی کتنی پھیل چکی ہے۔ کانتے اور زورا ابھی تک باہر نہیں نکلے تھے۔ میں اُنھیں دیکھنے کے لیے وہاں سے ہٹنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ میں نے اپنے کمرے کی جانب سے ایک لڑکی کو لپکتے جھجکتے انداز میں اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ میری ہی طرف آ رہی تھی۔ میں سیدھا کھڑا ہو گیا۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر آ کے ٹھیر گئی۔ اُس نے لجائے ہوئے لہجے میں مجھے آداب کیا۔ میں نے بھی جواب میں جلدی سے اُسے آداب کیا۔ وہ پیازی کرتا پاجامہ پہنے ہوئے تھی۔ ہرے دوپٹّے کے آدھے گھونگٹ میں اُس کا چمپئی چہرہ چمک رہا تھا۔ اُس کی عمر اٹھارہ بیس برس سے زیادہ نہیں ہو گی۔ وہ خادماؤں کے لباس میں نہ ہوتی تو کوئی بھی اُسے حویلی کے خاندان کا فرد سمجھتا۔ اُس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں اور ہونٹ لرز رہے تھے۔ چہرے پہ ایک رنگ آ رہا تھا، ایک جا رہا تھا۔ اُس کے بائیں ہاتھ میں تازہ گل دستہ تھا۔ آداب کے بعد وہ کچھ کہنے کے لیے ہمّت مجتمع کرتی رہی۔ میرے حواس بھی منتشر ہو گئے تھے "یہ باندی زنان خانے سے آئی ہے۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"جی، جی!" میں نے چونک کے کہا۔ "کہیے؟"

"چھوٹی بیگم اور بی بی صاحب نے آپ کو یہ گل دستہ بھیجا ہے۔" وہ گل دستہ میری طرف بڑھاتے ہوئے جھجکتے جھجکتے بولی۔

"میرے لیے؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"جی! اُنھوں نے کہا ہے، یہ اِن کی طرف سے قبول کیا جائے۔" اُس کی آواز کسی قدر سنبھل گئی تھی۔

میں نے گل دستہ اس کے ہاتھ سے لے لیا تھا مگر کوئی جواب نہ دے سکا۔ اُس نے انتظار بھی نہیں کیا اور اُس کی مچلتی آواز میرے کانوں میں گونجی: "اور اُنھوں نے پیغام بھیجا ہے، اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو۔" اُس کا بدن چر سرا رہا تھا۔ سانس لے کے بولی۔ "وہ آپ

کی خدمت میں آنے کی خواہش مند ہیں، یا آپ مناسب خیال فرمائیں تو زنان خانے میں تشریف لے آیئے۔"
"اُنھوں نے مجھے، مجھے یاد فرمایا ہے؟"
"جی۔" وہ سر جھکائے جھکائے بولی۔
"کہاں ہیں وہ؟" میں نے بدحواسی سے پوچھا۔
"وہ نیچے زنان خانے کی طرف ہیں۔"
اُس کے جواب سے مجھے احساس ہوا کہ بھلا یہ پوچھنے کی بات تھی۔ مجھے خاموش دیکھ کے وہ شائستگی سے بولی۔ "اور اُنھوں نے کہا ہے کہ وہ آپ کی منتظر رہیں گی۔"

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دوں۔ اب وہ دونوں مجھ سے کون سی بات کرنا چاہتی ہیں۔ ایک بات کے سوا کیا بات ہوسکتی ہے۔ ممکن ہے کچھ اور بات ہو۔ انکار بھی مناسب نہیں تھا اور یقیناً میرے دل کے کسی گوشے میں اُنھیں دیکھنے کا اشتیاق بھی تھا۔ رات ان کی بس ایک جھلک دیکھی تھی۔ اب تو وہ بہت خوش ہوں گی۔ انھی سے مجھے نواب عالم تاب کے بارے میں کچھ معلوم ہوسکتا ہے۔ میں نے کہا "مگر وہ کیوں زحمت فرمائیں، میں خود حاضر ہوجاؤں گا۔"

وہ کھڑی اپنے دوپٹے کا پلّو نوچتی رہی اور دبی آواز میں بولی۔
"ابھی چلیے گا۔"
"ابھی۔" میں نے تذبذب سے کہا۔ "کیا اُنھوں نے ابھی کے لیے کہا ہے؟"
"جی نہیں۔" وہ تیزی سے بولی۔ "مگر وہ بہت مشتاق ہیں۔"
"بہتر ہے۔" میں نے غیر اختیاری طور پر کہہ دیا۔ اُس نے پہلی بار سر اُٹھا کے مجھے جھل مل کرتی آنکھوں سے دیکھا۔ اُس کا چہرہ بھی جیسے کچھ اور روشن ہوگیا تھا۔ میں نے سوچا، اُسی سے چھوٹے نواب کے بارے میں کچھ پوچھوں لیکن میں چپ ہی رہا۔ اُس نے مجھے ایک جانب چلنے کا اشارہ کیا تھا۔ گل دستہ میرے ہاتھ میں تھا۔ گلاب کے پھولوں کی خوشبو نے میرے گرد ایک ہالہ سا بنایا ہوا تھا۔ دالان میں آکے مجھے اپنے لباس کا خیال آیا۔ جھروکے کی تیز ہوا نے کپڑے خشک کردیے تھے البتہ شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس حُلیے میں اُن کے سامنے جاتے ہوئے اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن اُنھوں نے پہلی بار زنداں میں مجھے کون سے اچھے حال میں دیکھا تھا۔ کل تک تو میں ان کی حویلی کا قیدی ہی تھا۔ دالان سے گزر کر وہ چند قدم دُور گلی جیسی ایک راہداری میں آگئی۔ آگے جا کے جانے کیوں میرا جی گھبرانے لگا۔ میرا یوں زنان خانے میں جانا بے محل تو نہیں ہے؟ بڑے نواب نے رات ہمیں کھلی اجازت دے دی تھی اور رات وہ مجھے اپنے ساتھ زنان خانے میں لے بھی گیا تھا لیکن اُس وقت کی بات اور تھی اور یہ اجازت محض حسنِ ظن بھی ہو سکتی ہے۔ سوچا، خادمہ کو منع کردوں، پھر کسی وقت آجاؤں گا مگر وہ چلی ہوئی وہیں راہ داری کے وسط میں بنے ہوئے ایک زینے میں اُتر گئی۔ میں نے جھجکتے قدموں سے اُس کی پیروی کی۔ وہ بار بار مُڑ کے پیچھے دیکھتی تھی کہ میں کہیں راستے میں اُس سے بچھڑ نہ جاؤں۔ اُس کی رفتار سے اضطراب صاف نمایاں تھا۔ چند سیڑھیوں کا زینہ طے کرکے ہم نچلی منزل پر پہنچے، یہ زنان خانے ہی کا حصہ تھا۔ زینے کے بعد وہ ایک کمرے میں چلی گئی۔ یہ ایک روشن اور مختصر نشست گاہ تھی۔ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک جانب تخت پر گاؤ تکیے اور بیٹھنے کے لیے اِدھر اُدھر دیواروں کے ساتھ گدّے رکھے تھے۔ خادمہ نے مؤدبانہ لہجے میں وہاں بیٹھنے کی درخواست کی اور بولی کہ وہ اطلاع کرکے ابھی آتی ہے۔ اُس کے چہرے پر کسی لمحے ایسی حیران حیران سادگی عود کر آتی تھی کہ بس دیکھتے رہیے۔ پٹ بجنے کی طرح لمحے لمحے اُس کی آنکھیں جلتی بجھتی تھیں۔ میں یہاں آ تو گیا تھا لیکن سیرا جی لوٹ جانے کو کرتا رہا۔ ابھی خادمہ کو گئے ہوئے چند منٹ سے زیادہ نہ ہوئے ہوں گے کہ دروازے سے اُن کی آہٹیں سنائی دیں۔ میری سانس بند ہونے لگی۔ اُن کے آنے سے پہلے میں اپنی نشست سے کھڑا ہوگیا۔ وہ دونوں ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئیں۔ میری آنکھوں میں ایک ثانیے کے لیے دُھند چھا گئی۔ میں دن کی روشنی میں اُنھیں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ دن کی روشنی میں رنگ ایسے نمایاں ہوجاتے ہیں، مجھے اس کا اندازہ شاید پہلے کبھی اتنا نہیں ہوا تھا۔ سُرخ اور سفید رنگ اُن کے چہروں سے اُبل سا رہا تھا، شہابی رنگ کی جیسے شعاعیں پھوٹی پڑتی ہوں۔ اُن کے نقش و نگار بھی میری آنکھوں پر پہلے اتنے روشن نہیں تھے۔ دونوں سادہ لباس پہنے ہوئے تھیں۔ دودھیا آڑا پاجامہ، بند گلوں کے ہلکے نیل گوں جمپر۔ دوپٹے بھی اُن کے اُسی رنگ کے تھے۔ اُس رات بھی دونوں ایک ہی طرز کا لباس پہنے ہوئے تھیں۔ وہ کوئی پہلی مرتبہ میرے سامنے نہیں آئی تھیں لیکن مجھے لگ ایسا ہی رہا تھا۔ دونوں کو سانچے میں ڈھالا گیا تھا۔ اُن کی متناسب اندامی اور تر و تازگی دیکھ کے معلوم ہوتا تھا کہ آج ہی بلکہ ابھی آسمان سے زمین پر اُتری ہیں۔ اُن کے آداب کے جواب میں، میں نے بھی جلدی سے اُنھیں سلام کیا۔ وہ میرے سامنے کی دیوار کے ساتھ رکھے ہوئے گدّوں پر خاص انداز سے بیٹھ گئیں۔ اُن کے لباس کی بھینی بھینی خوشبو کمرے میں پھیل گئی تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے اُنھیں دیکھنے کی

[کو]شش کی لیکن اُن کی طرف نظر بھر کے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ "ہم آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے یہاں آنے کی زحمت کی۔" چھوٹے نواب [کی] بیگم نے جھن جھناتی آواز میں کہنے کی کوشش کی۔
مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا، میں ہونٹ کاٹتا رہ گیا۔
"ہمیں یقین نہیں تھا کہ ہم دوبارہ کبھی آپ سے مل سکیں گے۔" وہ ہکتے لہجے میں بولی۔ "لیکن ہماری تمنا تھی کہ ہم، ہم۔" وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔
"آپ کیسی ہیں؟" میں نے بہ مشکل تمام کہا۔
"ہم کیا بتائیں۔" وہ اضطراری انداز سے بولی۔ "ہم نے زندگی میں کبھی ایسا سکون، ایسا سُکھ نہیں دیکھا تھا۔ سب آپ کا دیا ہوا ہے۔ ہم آپ کا کس طرح، کن لفظوں میں۔۔۔"
"نہیں، نہیں۔" میں نے حواس باختگی سے کہا۔ "آپ کچھ نہ کہیے۔ ازراہِ نوازش اب آپ کچھ نہ کہیے۔ رات بڑے نواب صاحب ہی بہت کچھ کہہ چکے ہیں۔"
"ہمیں اندازہ ہے، اُنھوں نے کس طرح اپنے آپ کو سنبھالا ہوگا۔ ہمیں بھی آپ کے سامنے آنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی لیکن پھر شاید ہم اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کرسکتے تھے۔"

"ہم نے آپ سے پہلے کہا تھا۔" میں نے زیرِ لب کہا۔ "ہم یہاں سے نکل کر سیدھے خانم آپی ہی کے پاس جائیں گے اور کوشش کریں گے کہ اُنھیں یہاں آنے پر آمادہ کرسکیں مگر۔۔۔"
"ہمیں یقین آگیا تھا۔" وہ بے قراری سے بولی۔ "یقین کیجیے، ہمارے اختیار میں ہوتا تو ہم ایک لمحے کی تاخیر نہ کرتے اور ہمارے اختیار میں ہوتا تو ہم کبھی ایسا سوچتے بھی نہیں۔ یہاں شہر میں آپ کی موجودی کا علم ہونے پر ہم آپ کی خدمت میں یوں ہی درخواست لے کے حاضر ہوجاتے۔ آپ کے پاس سے آنے کے بعد ہم دونوں مسلسل اپنی جیسی کوششیں کرتے رہے۔ ہم نے آپ کی نگرانی کرنے والے خادموں سے رابطہ قائم کیا اور اُنھیں ایک لمحے کی غفلت کے لیے انعام و اکرام یا یوں کہیے کہ رشوت کی پیش کش بھی کی لیکن ہماری کوئی تدبیر کارگر نہ ہوسکی۔ آخر ہم نے زندگی میں پہلی مرتبہ ایک جرأت کی، ہم دونوں نے جہانی بھائی کے پاس جا کے آپ کا تذکرہ کیا۔"
"آپ نے بڑے نواب صاحب کو بتا دیا تھا کہ آپ ہمارے پاس آئی تھیں؟" میں نے حیرت سے کہا۔
"نہیں، ہم اُن سے یہ اعتراف کس طرح کرسکتے تھے۔ یہاں گھر کے مردوں کے معاملات میں زنان خانے کی کسی خاتون کے دخل

دینے کی رسم نہیں ہے لیکن ہم نے یہ رسم توڑ ڈالی۔ ہمیں ڈر تھا کہ جہانی بھائی ہماری اس گستاخی پر بہت برہم ہوں گے۔ ہم اشارۃً ہی اُن سے آپ کا تذکرہ کر سکتے تھے۔ وہ ہماری زبان پر آپ کا ذکر سُن کر بہت حیران ہوئے۔ یقیناً اُنھیں غصّہ بھی آیا ہوگا۔ ہماری توقع کے خلاف اُنھوں نے بہت برداشت کا ثبوت دیا۔ اُنھوں نے ہم سے یہ نہیں پوچھا کہ آپ دونوں کے متعلق کس نے ہم سے مخبری کی ہے۔ غالباً اس لیے کہ اتنے ملازموں کی موجودی میں کوئی بھی، اُن کے خیال میں کوئی بھی ہمارے کان بھر سکتا تھا۔ وہ یہ تصوّر بھی نہیں کر سکتے تھے کہ ہم آپ سے کوئی رابطہ قائم کر سکتے ہیں اور اگر خدانخواستہ اُنھیں اس کا علم ہو جاتا تو ہم اب تک اس دنیا میں نہ ہوتے۔"

"آپ کو نہیں آنا چاہیے تھا۔" میری آواز دھڑک رہی تھی۔ وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ یہ سُن کر نواب کوئی بھی انتہا پسندانہ فیصلہ کر سکتا تھا۔ اُس وقت اُس کا کچھ یہی عالم تھا۔

"آپ سمجھتے ہیں، ہم نے غور نہیں کیا ہوگا؟" وہ سیمابی لہجے میں بولی۔ "ہمارے لیے یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں تھا مگر ہم ایک آخری جتن کے طور پر آپ کے پاس آئے تھے۔ ہمارے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ جہانی بھائی آپ تک جو کچھ منتقل کرنے میں ناکام ہو گئے تھے۔ ہم نے سوچا کہ ایک بار ہم بھی اپنا دامن پھیلا کر دیکھیں۔ شاید ہماری بات کا زیادہ اثر ہو۔ شاید ہماری التجا رائگاں نہ جائے۔ ہم نے بہت غور کیا تھا اور آخر ہم اور برجیس اسی نتیجے پر پہنچے کہ ہمیں یہ کوشش بھی کر کے دیکھ لینا چاہیے۔"

"آپ نے بڑا حوصلہ کیا تھا لیکن آپ کے آنے کی ضرورت نہیں تھی۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "ہم پہلے ہی اچھی طرح صورتِ حال سمجھ چکے تھے۔ بڑے نواب کی بات ہم تک منتقل ہونے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی اور اُنھوں نے پہلے ہم سے نرم رویّہ ہی اختیار کیا تھا۔ ہم نے اُن سے صاف کہہ دیا تھا کہ اُس وقت تک ہم کوئی وعدہ نہیں کر سکتے جب تک خانم آپی سے مل نہ لیں۔ کاش آپ کو بھی کسی طرح معلوم ہو جاتا کہ ہمارے پاس جواب میں کہنے کے لیے صرف یہی ہے، کچھ اور نہیں ہے۔ پھر آپ کو ہم تک پہنچنے کی اذیت نہ اٹھانی پڑتی۔ آپ کے سامنے ہمیں بھی اپنے انکار سے بہت دُکھ ہوا تھا۔ ہمیں اپنی بے بسی کا احساس اور سوا ہو گیا تھا۔ اِدھر واقعی اگر بڑے نواب صاحب کو علم ہو جاتا تو۔۔۔"

"ہمیں اسی پر حیرت ہے کہ اُنھوں نے ہماری لب کشائی درگزر کیسے کر دی، ہمیں سزا کیوں نہیں سُنائی۔ اُنھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہماری درخواست سُن کر سر ہلا کے رہ گئے۔ ہمیں محسوس ہو گیا تھا کہ وہ زیادہ آزردہ اور شکستہ ہو گئے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں، اُن کے لیے یہ کوئی خوش گوار بات ہرگز نہ ہوگی کہ دو بے قصور آدمی اُن کے زنداں میں اسیر ہیں۔ ایک بار غلط فیصلہ کرنے کے بعد آپ کی رہائی ہی سے کچھ ازالہ ہو سکتا تھا۔ وہ اُلٹا اصرار کرتے رہے۔ اس طرح اُنھوں نے صرف آپ ہی پر ستم نہیں کیا، اپنے آپ پر بھی کیا۔ ہماری دخل اندازی پر اُن کی آزردگی پشیمانی کے اسی احساس کے سبب سے ہوگی یا وہ آپ سے قطعی مایوس نہیں ہوئے تھے۔ یقیناً اُن کے ذہن میں اُمید کی کوئی رمق موجود تھی کہ آخر کبھی تو، کسی طور تو آپ کا لوہا پگھلے گا۔ ہم اُن سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہم آپ سے مل کے، آپ کو دیکھ کے آئے ہیں۔ اُنھیں اپنی جان سے زیادہ اپنی وضع عزیز ہے۔ وہ لوگ دوسرے ہیں۔ کاش ہم اُنھیں یہ باور کرا سکتے۔"

یہ کہتے ہوئے چھوٹے نواب کی بیگم گیتی آرا کی آواز تمتمانے لگی تھی، اُس کا چہرہ کچھ اور سُرخ ہو گیا تھا۔ اُس کے لہجے میں پہلے کوئی جھجک اور لکنت تھی تو اب بڑی حد تک ٹھہراؤ آ گیا تھا اور اتنی دیر میں مجھے بھی اپنے حواس یک جا کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ اُس نے ایک لمحے ٹھہر کے جھل ملاتی آنکھوں سے پہلے میری جانب دیکھا پھر اپنے قریب بیٹھی ہوئی نند کی جانب جس کا نام مجھے ابھی چند لمحے پہلے معلوم ہوا تھا۔ برجیس بظاہر کسی مورتی کی طرح خاموش بیٹھی تھی لیکن اُس کی آنکھیں خاموش نہیں تھیں۔ اُس کے چہرے پر آتے جاتے رنگ بول رہے تھے۔ کتنی بار بے اختیار میری اُس کی نگاہیں چار ہوئی تھیں اور ہر بار اُس کی پلکیں تھرتھرا اُٹھی تھیں۔ اُس نے درمیان میں کوئی دخل نہیں دیا تھا لیکن اُس کا اضطراب آمیز انداز، اُس کا متلاطم سا انہماک بتا رہا تھا کہ گیتی کی آواز میں اُس کی آواز بھی شامل ہے اور کہیں گیتی سے کوئی کوتاہی ہوگی تو وہ فوراً ٹوک دے گی۔ کئی اعتبار سے دونوں ایک دوسرے کا عکس معلوم ہوتی تھیں۔ عمروں میں بھی بس چند برس کا فرق ہوگا۔ اُن کے لباس اور نشست و برخاست کی یکسانی ایک دوسرے سے گہری رفاقت کی شاہد تھی۔ یوں بھی نند بھاوج کے علاوہ رشتے میں وہ ایک دوسرے کی بہنیں بھی تھیں۔

"ہم کچھ بھی نہ کر سکے۔" ایک لحظے کے تحمّل کے بعد چھوٹے نواب کی بیگم مایوسی سے بولی۔ "اور پہلی مرتبہ ہمیں یہاں اِس حویلی میں اپنی بے چارگی، اپنی کم حیثیتی کا اندازہ ہوا۔ برجیس بار بار ہمیں ٹوکتی تھیں کہ گیتی خدا کے لیے کوئی تدبیر کرو۔ اُن لوگوں پر بہت ظلم ہو رہا ہے مگر ہم کیا کر سکتے تھے۔ ایک ہی صورت تھی کہ ہم اپنے بھائی حشمت جنگ کو سب کچھ بتا دیں، جہانی بھائی کے لیے اُن کی بات رد کرنا مشکل ہو جاتی

یکن برجیس نے ہمیں منع کر دیا۔ واقعی جہانی بھائی پھر ہمیں کبھی
ف نہ کرتے۔ ہمیں یہ بھی خدشہ تھا کہ اس غم اور غصّے میں وہ آپ کے
لق کوئی جنونی فیصلہ نہ کر لیں۔ بس ہم آپ کے لیے دعائیں ہی کرتے
ہے۔ گو ان پر سے ہمارا یقین اُٹھ گیا تھا لیکن ایک یہی چارہ ہمارے
ں تھا۔ برجیس ابتدا ہی سے بہت حسّاس اور نازک طبع ہیں۔ برجیس
ل پھول کی طرح مرجھا جاتا ہے، پھول کی طرح کھل اُٹھتا ہے ہمیں
وم ہے، اُس رات کے بعد اُنھیں کسی پل نیند نہیں آئی۔" میں نے
پنی سے برجیس کی جانب دیکھا تو اُس کا چہرہ گلنار ہو گیا اور اس
شے جیسی آنکھیں چھلک چھلک پڑیں۔ میری آنکھیں بھی اُمڈنے
ں اور ایک ثانیے کے لیے میرا سارا جسم سُن سا ہو گیا۔

"یہ ہم سے کچھ کہہ سکتی ہیں۔" چھوٹے نواب کی بیگم بولی۔ "بچپن
ہم دونوں تقریباً ساتھ ہی رہے ہیں۔ یہ سامنے بیٹھی ہیں۔ آپ
ں کے لیے یہ مجھے اس طرح تلقین کرتی تھیں جیسے آپ کے پاس
ن یہی گئی تھیں۔ جیسے ہم نے آپ کو نہیں دیکھا تھا اور آپ کا دُکھ
وس نہیں کیا تھا۔ یہ ہم سے کہتی تھیں، گیتی! خدانخواستہ اُن لوگوں
ساتھ کچھ ہو گیا تو ہمیں کبھی سکون نہیں ملے گا۔ یہ ہمیں جتاتی تھیں کہ
ن لوگوں سے مل کر آئے ہیں۔ جو حویلی اُن کے لیے قید خانہ بنی ہوئی
، اُسی حویلی کی دو نوجوان خواتین کا اُنھوں نے کیسا احترام کیا تھا۔
آپ کہہ رہے تھے کہ ہمیں آپ کے پاس نہیں آنا چاہیے تھا۔ ہم بھی
نتے ہیں کہ ہمارے لیے یہ فیصلہ کرنا پُل صراط پر گزرنے سے کم نہیں
آپ کے متعلق ہم سے بہت ڈراؤنی باتیں کہی گئی تھیں۔ آپ
رکشی اور شوریدہ سری کی ایسی تصویر ہمارے سامنے پیش کی گئی
کہ کبھی ایسا ارادہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ہمیں اِس کے سنگین نتائج کا
طرح احساس تھا لیکن ہمارا تو گھر جل رہا تھا اور ہمیں ایک طرف
آپ پر اعتماد تھا، اپنے صدق پر یقین تو دوسری طرف ایک یہ
بھی ہمیں طمانیت دیتا تھا کہ بہر حال آپ آدمی ہی ہیں۔ آدمی کی
آدمی ہی سُنتا ہے۔ گوشت پوست سے مختلف تو آپ نہیں
ہوں گے۔ گھر تو آپ کا بھی ہوگا اور ہم ایسے متعلقین بھی۔ ہم آپ
ائیں کہ ہم اپنے ساتھ خنجر لے کے گئے تھے۔ آپ کے لیے نہیں،
لیے، کہ بصورتِ دیگر ہمیں اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنے میں دیر
جائے۔ ہم اپنا سب کچھ ترک کر کے، اپنی ساری کشتیاں جلا
آپ کے پاس پہنچے تھے۔ ہمیں یاد ہے ہم نے آپ سے کیا کہا تھا، ہم نے
تھا، ہم بہر حال، ہر قیمت میں خانم سے رابطہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔
جواہر کے علاوہ بے شک وہ قیمت ہم بھی ہو سکتے تھے۔ ہم اپنے

شوہر کے لیے اور برجیس اپنے بھائی کے لیے یہ قیمت ادا کرنے پر آمادہ تھے۔ کیا ہم اتنا نہیں جانتے تھے کہ وہ اجنبی زندانی اپنی ناکردنی پر کتنے مشتعل ہو سکتے ہیں۔ ہمیں سامنے دیکھ کے اُن کے غضب کا کیا عالم ہو سکتا ہے۔"

میں بے حس و حرکت بیٹھا اُسے تک رہا تھا۔ اُسے جھرجھری سی آ گئی اور وہ گہری سانس بھر کے بولی۔ "ہم ناکام واپس آئے تھے لیکن ہمیں ایک قلبی اطمینان حاصل تھا کہ ہم اپنی جیسی تمام کر کے آئے ہیں اور ہمارے دامن، ہمارے آنچل پر کسی آلودہ نگاہ کا کوئی نشان نہیں ہے۔ برجیس بار بار ہمیں یہی سب یاد دلاتی تھیں۔ آپ کی نجابت اور نکوکاری کے یہی حوالے دیتی تھیں۔ برجیس کو معلوم تھا کہ ہماری حالت اُن سے مختلف نہیں ہے، اگر کوئی فرق ہے تو اتنا کہ ہمارا سینہ اپنے زخم چھپانے پر کسی قدر قادر ہو گیا ہے۔ برجیس میں شاید ابھی یہ حوصلہ نہیں۔"

اُس نے اپنے سر سے ڈھلکتا ہوا دوپٹّا ٹھیک کیا۔ میں نے اُسے نہیں ٹوکا کہ اب بیتا ہوا دُہرانے سے کیا حاصل ہے۔ بہتر ہے، اسے کوئی بُرا خواب سمجھ کے بھلا دیا جائے۔ اس ذکر سے بہت گھٹن ہوتی ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ مجھے اُس کی زبانی یہ سب سُن کے کچھ اچھا ہی لگ رہا تھا۔ بیچ میں کتنی مرتبہ میں نے اُسے روکنا چاہا لیکن یہ سوچ کے خاموش رہا کہ پھر اس کے پاس کہنے کو رہ بھی کیا جاتا ہے۔ نہ میں نے اُس سے کہا کہ اُنھیں ہم سے ایسا خوف کھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اتنا تو ہم بھی جان سکتے تھے کہ حویلی کی معزّز خواتین نے کسی بڑی مجبوری کے عالم میں ہمارے پاس آنے کا قصد کیا ہوگا۔ مجھے ڈر تھا کہ میرے دخل دینے سے اُس کے اُمڈتے ہوئے اظہار میں کوئی رخنہ نہ پڑ جائے۔ بعض لوگ باتیں کرتے ہوئے اور دل کش ہو جاتے ہیں۔ اُس کی آواز کے اضطراب میں بھی ایک شگفتگی قائم تھی۔ آدمی سنتا ہے تو کھو جائے۔ مُنہ سے پھول جھڑنے کی تشبیہ لوگوں نے یوں ہی نہیں تراشی ہوگی۔ مجھے اُن کے سامنے بیٹھے ہوئے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی تھوڑی دیر پہلے میں جھروکے کے پاس سے پھیلا ہوا باغ دیکھ رہا تھا۔ آدمی بھی تو پھولوں اور پتّھروں کی طرح ہوتے ہیں، اور کچھ وقت کی دھوپ چھاؤں کی بات بھی ہوتی ہے۔ اُس رات بھی زنداں میں وہی آئی تھیں مگر اُس رات مجھے اُن کی شائستگی اور دل آویزی کا اتنا احساس نہیں ہوا تھا۔ چھوٹے نواب کی بیگم نے سارا وقت حویلی کی جنّت میں عیش و آرام سے نہیں گزارا ہوگا۔ وہ تعلیم یافتہ بھی خوب نظر آتی تھی، اور علم تو جبر سے آتا ہے۔ تحمّل سے آتا ہے اور عالم و فاضل اُستادوں

سے زیادہ اپنی طلب ہے۔ جیل میں کتابوں کے سوا میرا ابھی کوئی اُستاد نہیں تھا۔ تاہم کتابیں لہجہ نہیں سکھاتیں۔ مجھے شبہ تھا کہ مجھے بات کہنے کا سلیقہ آتا ہے، گیتی کو آتا تھا۔ اُس کی آواز بجائے خود ایک ساز تھی جیسے دریا بہتا ہو۔ اُس کے لہجے میں کوئی بناوٹ نہیں تھی۔ بناوٹ میں شاید ایسی روانی نہ ہوتی۔ ہر دم میرا تجسّس بڑھتا جاتا تھا کہ آگے اُس کے بول سے کیا کیا ادا ہوتا ہے، کیسی کیسی حیرانیاں' سنانے والے ایسے ہوں تو آدمی کو خود پر بیتا ہوا بھی کتنا عجیب معلوم ہوتا ہے۔

"اور جب خادموں کی زبانی ہمیں اطلاع ملی کہ آپ جہانی بھائی کو بندوق کی زد پر حویلی سے لے گئے ہیں تو ہم سناٹے میں آگئے لیکن دوسرے ہی لمحے ہم نے اپنے سر سے کوئی بوجھ اُترا ہوا محسوس کیا۔ یہاں خادموں میں افراتفری مچی ہوئی تھی۔ ہر شخص کی نگاہیں ہمی پہ مرکوز ہو گئی تھیں۔ ہمیں طرح طرح کے مشورے دیے جا رہے تھے۔ ہم سے کہا گیا کہ ہم فوراً اپنے بھائی حشمت جنگ سے رابطہ قائم کریں اور کہا گیا کہ مسلح خادموں کو تعاقب کا حکم دیا جائے۔ گو آپ نے انھیں تنبیہہ کر دی تھی کہ کسی نے کوئی غلطی کی تو آپ جہانی بھائی۔ ۔ ۔" اُس کی زبان اٹکنے لگی اور بولی "اگر حویلی سے جاتے وقت نہیں تو حویلی سے آپ کے نکل جانے کے بعد ہم حشمت بھائی کو فون کر سکتے تھے یا کسی کو بھی مگر ہم نے نہیں کیا۔ برجیس نے بھی منع کیا۔ ہمیں معلوم تھا کہ جہانی بھائی کن ہاتھوں میں ہیں اس لیے یقین تھا کہ جلد واپس آجائیں گے۔"

"آپ کو یقین تھا؟" میں نے جھینپتی آواز میں کہا۔

"ہاں، ہمیں اچھی طرح معلوم تھا۔ شاید عورتیں مردوں سے زیادہ نگاہ شناس ہوتی ہیں۔ ہم نے آپ کو دیکھا تھا اور ہم خود جو اپنے گواہ تھے۔ اُن کے جانے کے بعد ہمیں شدّت سے احساس ہوا کہ آپ نے ہم سے کیسا خسروانہ سلوک کیا تھا۔ ہمیں بھی تو آپ یرغمال بنا سکتے تھے۔ جہانی بھائی کے مقابلے میں یہ نسبتہً آسان تھا۔ ہمیں شاید اپنا خنجر نکالنے کی بھی مہلت نہ ملتی۔ اس طرح آپ کو کچھ اور پہلے یہاں سے نجات مل سکتی تھی۔ یقین کیجیے، ہمیں ذرا بھی تشویش نہیں تھی البتہ ہم اور برجیس جہانی بھائی کی جلد از جلد واپسی کے منتظر تھے اور ہمیں یہاں حویلی کے حواس باختہ مکینوں کو قابو میں رکھنے میں بہت دشواری ہو رہی تھی۔ وہ ہمیں مسلسل ٹوک رہے تھے۔ ہم اُنھیں اپنے اطمینان کا کوئی جواز پیش نہیں کر پا رہے تھے۔ بہرحال زیادہ دیر نہیں لگی کہ ہمیں جہانی بھائی کی واپسی کی خوش خبری سُنائی گئی اور بتایا گیا کہ انھیں کوئی گزند نہیں پہنچا۔ یہ سُن کے ہمیں ایسا محسوس ہوا جیسے ہم حویلی کے پریشاں حال مکینوں کے سامنے سُرخ رو ہو گئے ہیں، جیسے جہانی بھائی ہماری سفارش پر واپس آئے ہوں اور آپ نے ہمارا مرتبہ بڑھایا ہو۔ اُس وقت جہانی بھائی کے سامنے ہمارا جانا مناسب نہیں تھا لیکن ہم مسلسل ٹوہ میں لگے رہے کہ واپسی کے بعد وہ آپ کے خلاف کیا قدم اٹھاتے ہیں۔ ہمارے بعض خادموں نے اُس موقع پر ہم سے مہربانی کی کہ ہماری ہدایت پر ٹیلی فون کا سلسلہ ناکارہ کر دیا۔ ہم نے یہ ہدایت اُنھیں بوجوہ دی تھی۔ حویلی میں تیز رفتار سواریاں ہمہ وقت موجود رہتی ہیں لیکن اُن میں اور ٹیلی فون کے رابطے میں بڑا فرق ہے۔ ہماری آرزو تھی کہ آپ یہاں سے جتنی دُور ہو سکتے ہیں، ہو جائیں اور ہم نے طے کر لیا تھا کہ اگر جہانی بھائی نے حشمت بھائی سے آپ کے سلسلے میں کوئی بات کی تو ہمیں آخر زبان کھولنی پڑے گی۔ گو جہانی بھائی کے مقابلے میں ہماری التجا کی پذیرائی کا کم ہی امکان تھا لیکن ہم نے طے کر لیا تھا کہ ہم حشمت بھائی کو منع کر دیں گے۔ چاہے ہماری اس جسارت پر وہ کتنے ہی برافروختہ ہوں۔ شکر ہے، ہمیں یہ سب کچھ نہیں کرنا پڑا۔ واپس آکے جہانی بھائی بہت دل گرفتہ تھے۔ اُس رات ہمیں اُن کی ایک ہی جھلک دیکھنے کو ملی تھی لیکن ہم مطمئن ہو گئے تھے کہ اُن کے چہرے پر چھایا ہوا غبار بغض و عناد کا نہیں ہے، پشیمانی اور شکستگی کا ہے۔"

میری مبہوت نظریں اُسی پر جمی ہوئی تھیں۔ اتنے میں دو خادمائیں شانوں پر طشت اٹھائے بے آواز قدموں سے اندر داخل ہوئیں۔ میرے ساتھ وہ دونوں بھی چونک سی گئیں۔ خادماؤں نے دو زانو بیٹھ کے طشت چھوٹی میزوں پر رکھ دیے۔ ڈھکی ہوئی ریشمی جالیوں میں چاندی کے برتن چمک رہے تھے۔ برجیس نے خادمہ کے کان میں چپکے سے کچھ کہا تو وہ خفیف سی ہو گئی، بھاگی ہوئی باہر چلی گئی اور کسی تاخیر کے بغیر سلفچی اور ہاتھ دھونے کا آفتابہ لیے ہوئے پھولی سانسوں سے کمرے میں واپس آئی۔ گیتی نے خوان پوش ہٹا دیا تھا۔ طشت میں چائے کے علاوہ قابوں اور طشتریوں میں مختلف چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ وہی خادمہ جو مجھے یہاں لائی تھی، برجیس کے اشارے پر آفتابہ ہاتھوں میں اُٹھائے میری طرف بڑھی، میں گھبرا سا گیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے اُس کی طرف ہاتھ بڑھا دیے۔ میں اُن سے کہنا چاہتا تھا کہ اس وقت کسی چیز کی خواہش نہیں ہے لیکن میری زبان گنگ ہو گئی تھی۔ دوسری خادمہ نے تولیا میری طرف بڑھا دی اور جیسے ہی میں نے ہاتھ خشک کیے۔ اُنھوں نے سلفچی تبسّر سامنے سے ہٹالی۔ "یہ میرے لیے صرف چائے" میں نے دبے لہجے میں بہ مشکل کہا۔

"مگر آپ نے تو ابھی ناشتہ بھی نہیں کیا ہے۔" برجیس کھنکتی آواز ... پہلی بار مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"جی ہاں" میں نے سٹ پٹاتے ہوئے کہا "وہ میں اُوپر سب ...ن کے ساتھ کر لوں گا۔ آپ نے بہت زحمت کی۔" شکریے کا لفظ ...ی زبان سے ادا نہ ہو سکا۔

اُس نے گیتی کی طرف پریشان نظروں سے دیکھا، گیتی ...بت سے کہنے لگی "زحمت کیسی، ہم آپ سے کس طرح کہیں کہ ہمیں ... میزبانی سے کیسی مسرت ہو رہی ہے۔ ہماری التجا ہے کہ آپ ... تکلف نہ کریں۔"

میں سوچتا رہ گیا کہ کیا کہوں۔ گیتی نے مجھ سے کچھ اور ...یب ہو جانے کو کہا۔ خود اُنھوں نے بھی میرے اور اپنے درمیان ...صلہ کم کر لیا تھا۔ خادماؤں نے ہمارے بیچ میں میزیں رکھ دیں۔ ...دں سے اشتہا انگیز بھاپ اُٹھ رہی تھی لیکن مجھے اُن کے ساتھ ... طرح آمنے سامنے بیٹھ کے کھاتے ہوئے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ ...ن کے اتنے قریب ہو جانے پر اُن کے لباسوں میں بسی ہوئی خوشبو ...ی اور قریب ہو گئی تھی۔ برجیس کی مرمریں کلائیوں میں طلائی چوڑیاں ...مگا رہی تھیں۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اُس کی کلائیاں زیادہ دیدہ زیب ...یا سونے کی چوڑیاں۔ سونا ہی اُس کے شہابی رنگ سے کچھ پھیکا پڑ ...تھا۔ میں اپنا جسم سکیڑے سوچ رہا تھا کہ ایسے وقت کون سے لفظ ...سب ہوتے ہیں۔ لفظوں کی کتنی ترکیبیں میرے ذہن میں بنتی تھیں ...ر منتشر ہو جاتی تھیں۔ برجیس نے طشتریاں میرے اور اپنے سامنے ...انے میں کوئی وقت نہیں لیا۔ "اب آپ کوئی تکلف نہیں کریں گے۔" ...ی نے مجھ سے کہا۔ اُس کے لہجے میں عاجزی بھی تھی، حکم بھی تھا۔

"یہ تو، یہ تو بہت سا سامان ہے۔" میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"لیجیے نا، کچھ بھی نہیں ہے۔" گیتی نے ملتجی لہجے میں کہا "ہم نے پہلے ...احتیاط کی ہے کہ تکلف کا شائبہ تک نہ ہو۔"

میں نے قیمے کی پلیٹ سے تھوڑا سا قیمہ اپنی طشتری میں ڈال ...میرے منع کرنے کے باوجود گیتی نے اپنے ہاتھ سے اُسے دُگنا کر ...میری انگلیاں ٹھٹھر رہی تھیں۔ پراٹھے کا ایک ٹکڑا توڑ کے میں ...پہلا لقمہ لیا تو وہ حلق میں اٹک گیا۔ گیتی کو شاید کچھ احساس ہو گیا ...تھا۔ وہ میری توجہ ہٹانے کے لیے ہمکتی آواز میں بولی "ہمیں یہ ...سب کچھ خواب سا معلوم ہو رہا ہے۔ ہم آپ کو کیسے بتائیں کہ ہم اِس ...ساعت کے کتنی بے چینی سے منتظر تھے۔ کبھی آپ ہمیں زنداں سے ...ر بھی ملیں۔ خدا جانتا ہے، ہم کتنے آرزو مند تھے کہ کبھی آپ سے ملاقات ہو جائے تو ہم آپ کی خدمت میں اپنے جذبات سپاس پیش کر سکیں، اپنی ندامتوں کا اظہار کر سکیں۔ برجیس ہم سے کہتی تھیں، گیتی ہمارا دل کہتا ہے، اُن لوگوں سے ضرور ملاقات ہو گی۔ ہمیں بھی ایسی خوش گمانی ہوتی تھی۔"

"آپ کو کچھ ایسی اُمید تھی کہ ہم، ہم ۔ ۔ ۔"

"سب کچھ تو ہمارے سامنے تھا۔" اُس نے رومال اپنے ہونٹوں سے مَس کیا اور کھنکتے لہجے میں بولی "آپ نے ہم سے کوئی حتمی وعدہ نہیں کیا تھا اور اُس وقت ہم بہت مایوس ہی واپس آئے تھے لیکن بعد میں جیسے جیسے ہماری آنکھوں سے دُھند چھٹتی گئی اور گزرے ہوئے لمحے ہم پر اجاگر ہوتے گئے، ہماری مایوسی بھی اُسی نسبت سے کم ہوتی گئی اور آپ کا حتمی وعدہ نہ کرنا ہی کچھ ہماری اُمید کا باعث بنا۔ اُس قید و بند کے عالم میں آپ ہم سے کچھ بھی کہہ سکتے تھے۔ ہمیں یاد تھا کہ آپ کے ساتھ جو بزرگ تھے، اُنھوں نے ہم سے کیسی شفقت کا برتاؤ کیا تھا۔ اُنھوں نے ہمارا دوپٹا اپنی آنکھوں سے لگا لیا تھا اور ہمارے سر پر ہاتھ رکھ کے ہمیں رخصت کیا تھا۔ اُنھوں نے ہم سے کہا تھا کہ وہ خانم کو آمادہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ لوگ جنھوں نے بے شمار خادموں کی موجودگی میں اپنی نجات کا عزم کیا تھا، قید و بند کی شدید اذیتوں اور داد و فریاد کا ہر دروازہ بند ہونے کے باوجود جن کا حوصلہ اتنا توانا تھا، جنھوں نے بہ عزّت ہمیں واپس کر دیا تھا اور جہانی بھائی کو اُن کی ستم کاری کے جواب میں کشادہ قلبی سے نوازا تھا۔ اُنھوں نے یہاں حویلی میں کسی کا خون بہانے سے اجتناب کیا تھا حالانکہ وہ ایسا کر سکتے تھے۔ اُن کے ہاتھ میں بھری ہوئی بندوق تھی اور سامنے کوئی اُن کا دوست نہیں تھا۔ انھی ملازموں میں سے کسی نے اُن کے جسم بیدوں سے داغ دار کیے تھے۔ ہم نے کہیں سُنا تھا کہ بہادری کی پہلی شرط عزم کا صدق ہے، نیّت کی سچائی ہے۔ ایسے لوگوں کے سامنے ہم نے دامن پھیلایا تھا اور ایسے لوگ ہم سے کچھ کہہ گئے تھے۔ اُن کے قول و قرار پہ ہمیں اعتبار کرنا چاہیے تھا۔"

میرے جسم پر سناٹا چھایا ہوا تھا، وہ کیسی باتیں کر رہی تھی۔

"تو آپ کو، آپ کو خانم آپا کی آمد کی بھی اُمید تھی؟" میں نے بے ربط آواز میں پوچھا۔

"ہاں، بڑی حد تک بلکہ کسی حد تک۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی "کوئی شبہ نہیں تھا کہ آپ خانم کے پاس جا کے ہماری عرض بہ تمام و کمال منتقل کر دیں گے مگر آپ کا اُن سے کچھ کہنا اور خانم کا آمادہ ہونا دو مختلف باتیں تھیں۔ آپ نے کہا تھا کہ فیصلہ خانم پر منحصر ہے۔

ہمیں یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ خانم کہیں انکار نہ کردیں، وہ جانے کیا سمجھیں، اُنھیں کتنے زمانے کی تمناؤں کے بعد یہ جنت ملی ہے، وہ اب کوئی رخنہ اندازی کیوں کر پسند کریں گی۔ خانم کی جگہ ہم ہوتے تو ہمیں بھی یہ فیصلہ کرنے میں دشواری پیش آتی۔ آپ نے ہمیں اُن کے متعلق زیادہ تفصیلات بھی نہیں بتائی تھیں۔ ہمیں کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ اپنی نئی زندگی کی کن زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہیں۔ زنجیریں شاید ہم غلط کہہ گئے ہیں۔" وہ پشیمانی سے بولی۔ "ہماری مراد سلسلوں سے ہے، کہ وہ اپنی نئی زندگی میں کس حد تک شامل ہو چکی ہیں۔

ہمارا دل یہ سوچ سوچ کر لرزنے لگتا تھا کہ اگر خانم نے انکار کردیا تو ہم کہاں جائیں گے۔ کسی لمحے آس بندھتی تھی، دوسرے لمحے ٹوٹ جاتی تھی۔ ہم سوچتے تھے کہ اگر دیر ہو گئی تو ؟ دیر پہلے ہی بہت ہو گئی تھی۔ جب تک آپ زنداں میں تھے، ہم آپ کی رہائی کے لیے حویلی کے خادموں سے التجائیں کر رہے تھے کیوں کہ آپ کی رہائی سے خانم کی آمد کی توقع مشروط تھی۔ آپ کے جانے کے بعد ہمارے سر سے کوئی بوجھ اُترا تھا تو دوسری طرف ہم پر یہ وحشت طاری رہی کہ اگر خانم نے . . . !" اُس کی آواز ڈولنے لگی لیکن اُس نے جلد ہی خود پر قابو پالیا۔ "مگر ایسا اندھیرا ابھی نہیں رہا تھا جو آپ کے یہاں قید ہونے پر چھایا ہوا تھا۔ اب کوئی چراغ تو ٹمٹما رہا تھا۔ آپ کے جانے کے بعد ہمیں ایک عذاب ناک انتظار سے دوچار ہونا تھا، کب ہمارا نصیبہ کھلتا ہے۔ ہمارے سان دگمان میں بھی نہیں تھا کہ آپ کے جانے کی دیر ہو گی اور خانم کی صورت ہمیں اتنی جلدی دیکھنے کو مل جائے گی، یوں کوئی کرشمہ سا ہو جائے گا۔ وقت ہی کتنا گزرا تھا۔ پرسوں رات تو آپ یہاں سے گئے تھے اور ہم آپ کے لیے دعائیں کر رہے تھے کہ آپ بہ عافیت جلد سے جلد ریاست سے دُور ہو جائیں اور کسی طور خانم کے پاس پہنچ جائیں اور اللہ پاک خانم کے دل میں کچھ ڈال دے۔ ہم تصوّر بھی نہیں کر سکتے تھے کہ خدا ہم پر ایسے مہرباں ہو جائے گا، ایک ہی دن درمیان میں گزرے گا کہ خانم آجائیں گی۔ کل رات ہماری مرادیں بر آنے کی رات تھی۔ ہم کچھ اور بھی مانگتے تو . . . . کچھ مگر، مگر ہم اس سے زیادہ مانگ بھی کیا سکتے تھے۔"

دو تین لقمے لے کے میرا ہاتھ رُک گیا تھا اور میں دم بخود بیٹھا تھا۔ وہ خاموش ہوئی تو ایسا لگا جیسے کمرے میں اچانک کسی چیز کی کمی ہو گئی ہو اور سب کچھ منجمد ہو گیا ہو، ستار کا تار ٹوٹ گیا ہو۔ چند لمحے یہ سکوت مسلط رہا اور برجیس نے مترنم آواز میں مجھے ٹوکا کہ میں نے تو کچھ لیا ہی نہیں ہے۔ گیتی کو بھی احساس ہوا اور وہ خجل آواز میں بولی۔ "ہم تو بھول ہی گئے۔ آپ نے ہاتھ کیوں روک لیا ہے۔ اب ہم اُس وقت تک اپنی زبان بند رکھیں گے جب تک آپ دل جمعی سے ناشتہ نہ کرلیں۔"

"یقین کیجیے، میرا جی نہیں چاہ رہا ہے۔"

"شاید ہم نے بہت زیادہ باتیں کی ہیں مگر آپ کو سامنے دیکھ کے ہمیں احساس ہی نہیں رہا۔" وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولی۔ "آپ کیا سوچتے ہوں گے۔"

"نہیں، ایسا نہیں ہے۔" میں نے بے چینی سے کہا۔ "کاش یہ سب اس طرح نہ ہوتا۔"

"شاید خدا کو یہی منظور تھا۔ اس بہانے ہمیں کچھ دکھانا، کچھ لوگوں کا جلوہ دکھانا مقصود تھا جس سے ہم اب تک نا آشنا تھے۔"

"آپ اتنا کچھ مت کہیے، شرمندگی ہوتی ہے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "کوئی ایسی بڑی بات نہیں۔ میرے خیال سے اتنا کچھ جان کے ہر شخص یہی کرتا۔"

"یہ آپ کی اعلا ظرفی ہے، آپ کو ایسا ہی کہنا چاہیے لیکن جو ہم پر گزری ہے، وہ ہمی جانتے ہیں۔" وہ کرب آمیز لہجے میں بولی۔ "کوئی بھی ایسا نہیں کرتا۔ ہماری تو جان پر بنی ہوئی تھی۔ وہ کیا (نواب عالم تاب) روٹھے تھے کہ زندگی ہم سے روٹھ گئی تھی۔ ہم نے آپ کو بتایا تھا کہ ہم نے ہر دروازے پر جا کے دستک دی اور کہیں سے ہمیں کچھ نہ مل سکا۔ کتنے مسیحا یہاں آئے اور تماشا دکھا کے چلے گئے۔ ہم آپ کو کیا کیا بتائیں، ہم پر کیسی کیسی راتیں، کیسے کیسے دن گزرے ہیں۔ جتنا ہم اُنھیں منانے کی کوشش کرتے تھے اُتنی ہی اُن کی ضد بڑھ جاتی تھی، اور اب تو اُنھوں نے کسی سے بات کرنا بھی بند کر دیا تھا، اپنوں کو پہچاننا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنی ماں، بہن، اپنے بھائی، ہمیں اور اپنے جاں سپار خادموں کو بھول گئے تھے۔ کتنے دنوں سے وہ بستر نشیں ہیں، آنکھیں کھولتے تھے تو صرف اپنے آپ کو دیکھتے تھے۔ اُنھیں اپنے سوا اِرد گرد بیٹھے یا کھڑے ہوئے اپنے شیدائی نظر نہیں آتے تھے۔ ایسے میں خانم کا آجانا ہمارے لیے کتنی بڑی دولت اور نعمت کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارے پاس ممنونیت کے لیے لفظ نہیں۔" اُس کی آواز رُندھنے لگی۔ "خدا آپ کو دُنیا بھر کی خوشیاں نصیب کرے۔ ہم تو کچھ دے نہیں سکتے لیکن خدا آپ کو اس کا اجر ضرور دے گا۔"

"ازراہِ کرم اب آپ کچھ مت کہیے۔" میں نے پھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ اجر کے لیے کہہ رہی تھی۔ اجر میں تو مجھے عذاب ہی ملنا

[illegible] تھا۔ میں اُس سے کہہ دینا چاہتا تھا کہ یہ سب کچھ تو اُسے بِتھل [illegible] سامنے کہنا چاہیے۔ اس داد داستان کا سب سے زیادہ مستحق تو وہی [illegible] خانم کو ہم نے نہیں، اُس نے بُلایا ہے اور ہماری زنداں کی مجبوری [illegible] زیادہ نواب عالم تاب کی حالت دیکھ کے ورنہ ہماری رہائی [illegible] بعد خانم کو یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی۔ میں تو پرسوں رات [illegible] سے جانے کے بعد مسلسل اِسی جستجو میں لگا ہوا تھا کہ اب ہمیں [illegible] یہاں سے بمبئی کے لیے روانہ ہو جانا چاہیے۔ میں نے بہت چاہا، [illegible] صاف صاف بتا دوں کہ سزاوارِ احسان میں نہیں ہوں، بِتھل [illegible] اور پیرو ہے اور خود خانم ہے۔ کانتے سے خانم کی آمد کا ذکر سُن [illegible] میں نے یہی جانا تھا کہ بِتھل کو ہماری نجات کا ایک ہی راستہ نظر [illegible] آیا ہو گا۔ بے شک نواب عالم تاب کی جاں کنی نے بھی بِتھل کو کچھ [illegible] کیا ہو گا مگر اُس کی نگاہوں کا مرکز تو ہمی ہوں گے۔ حویلی سے [illegible] کے اڈّے پہنچنے کے بعد بِتھل کے وہیں اڈّے پر چھپے رہنے کا [illegible] بھی میں نے یہی سمجھا تھا کہ اب چونکہ خانم کو دورانِ سفر روکا [illegible] جا سکتا اس لیے بِتھل کو صرف اُس کا انتظار ہے اور دوسری [illegible] جگہ کی نسبت ہمارے لیے اس وقت اڈّا ہی زیادہ محفوظ جگہ [illegible] میں نے تو گزشتہ رات یہاں آتے ہوئے پیرو سے باقاعدہ حجت [illegible] کی تھی۔ میں ٹم ٹم سے اُتر کے آگے بِتھل کی گاڑی روک دینا چاہتا [illegible] میں نے خانم کو یہاں آنے سے روکنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی۔ ہاں، [illegible] ضرور ہے کہ بمبئی پہنچ کے جلد از جلد فیض آباد واپس جانے اور [illegible] کو سب کچھ بتا دینے کا خیال کئی بار میرے دل میں آیا تھا۔ ممکن [illegible] میں ایسا ہی کرتا لیکن خانم کے انکار پر میں اُس سے کوئی اصرار [illegible] نہ کرتا۔ گیتی جتنا کچھ مجھ سے کہہ رہی تھی، مجھے اپنا وجود اُتنا ہی [illegible] لگ رہا تھا۔ میں اُس سے یہ اعتراف کرنے کی ہمت اپنے اندر [illegible] کرتا رہا کہ وہ میں نہیں ہوں۔ میں تو کل رات سے پیرو کی [illegible] بار نگاہوں کی زد پر ہوں۔ گو اُس نے اپنی تلخ نوائی پر پشیمانی [illegible] ظہار کیا تھا لیکن یہ تو میں جانتا ہوں کہ ابھی تک مجھ میں اُس کے [illegible] سامنے جانے اور اُس سے آنکھیں ملانے کی جرأت نہیں ہو رہی ہے۔ [illegible] کسی نے بر وقت کسی کو چونکا دیا ہو اور وہ ایک بڑے گناہ، ایک [illegible] جرم سے بچ گیا ہو، میری حالت اُس شخص جیسی ہے۔ لیکن اپنے [illegible] میں اتنا کچھ سُننے کے بعد اب مجھ میں گیتی سے یہ کہنے کا حوصلہ [illegible] نہیں تھا کہ ایک غلط آدمی اُن کے سامنے ہے اور اُن کی یہ اضطراب [illegible] سرخوشی، اُن کی آنکھوں میں حیرت بھرے تشکّر کی یہ دمک [illegible] میں بِتھل کا حق ہے۔ دوسرے کا حق حاصل کر کے آدمی پھر آئینے کے سامنے کس طرح جا سکتا ہے، اور یہ آئینہ تو آدمی کے ساتھ ہی رہتا ہے، اُس کے سینے میں چھپا ہوا۔ اس کے لیے بینائی کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ مجھ سے کچھ نہیں کہا جا سکا۔ اس سے حاصل بھی کیا تھا۔ میں زبان کھولتا تو وہ اِسے میرے انکسار پر محمول کرتیں۔ شاید مجھے اُن کی نظروں میں اپنا رتبہ کم کرنے کا یارا بھی نہیں تھا۔ اس طرح اپنی بڑائی کا کوئی تاثر بھی قائم ہو سکتا تھا جو اچھی بات نہیں تھی۔ میں جلتے ہوئے کانوں اور بھٹکی ہوئی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتا اور سُنتا رہا۔ اگر یہ سب کچھ بِتھل کے لیے تھا تو کسی اور کا تو نہیں تھا۔ بِتھل کا انعام بھی تو میرا ہی تھا۔ میرے سر میں اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔ اس دوران گیتی نے مجھ سے کیا کہا تھا جو میں نہیں سُن سکا۔ اس کا اندازہ مجھے برجیس کی آواز کی دستک سے ہوا۔ "آپ کیا سوچ رہے ہیں ؟" وہ مضطربانہ مجھ سے پوچھ رہی تھی، اُس کے چہرے کی سُرخی اور گہری ہو گئی تھی۔

"کچھ نہیں۔" میں نے منتشر لہجے میں کہا۔

"آپ سے ایک گزارش ہے۔" گیتی شائستگی سے بولی۔ "ہماری عرض ہے کہ آپ جب تک حویلی میں قیام فرما ہیں، کوئی غیریت نہیں برتیں گے ورنہ ہمیں بہت دُکھ ہو گا۔"

"جی۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "نہیں، نہیں۔"

"رات جہانی بھائی ہمیں اور گھر کے تمام مکینوں کو ہدایتیں دے رہے تھے۔ اچھا ہوا جو ہمیں زبان نہیں کھولنی پڑی، بصورتِ دیگر ہم نے اور برجیس نے طے کر لیا تھا کہ اگر وہ ظرف اور حوصلے کا کوئی درس بھول رہے ہیں تو ہم اس جانب اُنھیں توجہ دلانے کی جسارت ضرور کریں گے۔ ہم اُن سے کہیں گے کہ ایک صاحب دل کا شیوہ کیا ہونا چاہیے اور ہمارے آبا کی رُوحیں اُن کے کس طرزِ عمل سے خوش ہوں گی لیکن اُن کے سامنے کسی ناروا صورتِ حال سے دوچار ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ رات جہانی بھائی اُلٹی ہمیں تلقین کر رہے تھے کہ آنے والوں کی پذیرائی میں حویلی کا ہر دروازہ، دریچہ کھُلا ہونا چاہیے۔ پہلی مرتبہ ہمارے یہاں اتنے بڑے مہمان آئے ہیں۔ اُنھوں نے ہمارے مُنہ کی بات چھین لی۔ بہت عرصے بعد ہم نے جہانی بھائی کے چہرے پر ایسا سکون دیکھا ہے، اُنھوں نے ہم سے اور بھی بہت کچھ کہا تھا، شاید آپ سے بھی کہا ہو تاہم ممکن ہے، وہ کھُل کے کہہ نہ پائے ہوں تو ہم اُن کی جانب سے آپ کے آگے ہاتھ جوڑتے ہیں۔ آپ ہمیں، ہمیں . . ."

"آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں ؟"

"ہم اپنے دل کی بات کر رہے ہیں۔" وہ جلتی آواز میں بولی۔ "آپ

یہاں کوئی اجنبیت برتیں گے تو ہم سمجھیں گے، آپ نے ہمارے گناہ معاف نہیں کیے۔ جہانی بھائی کی غلط اندیشی اور ذہنی انتشار کے سبب آپ کو یہ ستم برداشت کرنے پڑے ہیں لیکن اس حویلی کے ایک فرد کی حیثیت سے ہم خود کو بھی کم مجرم نہیں سمجھتے۔ خاموشی اور پردہ پوشی بھی جرم میں اعانت کے مترادف ہے۔"

"خدا کے لیے اب اُسے بھول جائیے۔"

"ہم بھی یہی کہہ رہے ہیں۔" وہ تیزی سے بولی۔ "اسی لیے ہماری درخواست ہے کہ آپ اس حویلی کو اپنا گھر ہی تصور کریں اور اس کے مکینوں کو اپنے دوست، اپنے عزیز۔ بخدا ہم یہ کوئی رسم ادا نہیں کر رہے ہیں، بہ صمیمِ قلب منت گزار ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے بہکی ہوئی آواز میں کہا۔

"کتنا عجیب ہے کہ اس بار بھی ہم کچھ طلب کر رہے ہیں لیکن شاید قرار یہی پایا ہے کہ ہمی ستم توڑیں، ہمی داد رسی چاہیں۔ ہم نے آپ کو اس لیے یہاں بلایا تھا بلکہ ہم خود حاضر ہونا چاہتے تھے کہ آپ سے ایک اور سلوک کی التجا کریں۔ آپ نے خانم کو یہاں لا کے اس ساری حویلی کو زندگی کی نوید دی مگر آپ کی آمد بھی ہمارے لیے اسی نوید کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ کو دوبارہ دیکھنے کی ہمیں بہت آرزو تھی۔ رات سے ہم آپ کے پاس آنے کے لیے بے چین تھے۔ ہمیں خوف تھا کہیں آپ باہر نہ چلے جائیں اور ہم اپنے احساسات کے اظہار سے قاصر نہ رہ جائیں کچھ ایسا ہی تھا، رات ہی آپ واپس جانا چاہتے تھے کیونکہ خانم کو یہاں پہنچا دینے کے بعد آپ کا کام ختم ہو گیا ہے۔ آپ یوں چلے جاتے تو جانے پھر کب آتے۔ ہم جانتے ہیں کہ درمیان کا یہ عرصہ ہم پر کسی پہاڑ کی طرح گزرتا۔ وقت کا بھی کچھ طے نہیں ہے کہ کب کیسی کیسی گرہیں ڈال دے۔ سو ہمارا بس چلتا تو ہم رات ہی کو آپ کے پاس آتے۔ ہم بار بار خادماؤں سے پوچھتے رہے مگر آپ رات گئے تک جہانی بھائی کے ساتھ رہے اور ہمیں آنے کا موقع نہ مل سکا۔"

"میرا بھی جی چاہتا تھا کہ آپ سے کبھی دوبارہ ملاقات ہو۔" اُس سے اتنا کچھ سُننے کے بعد میری زبان سے بھی کچھ تو نکلنا ہی ہے۔ میں نے نرمی سے کہا۔ "اُس رات زنداں میں آپ کے جانے کے بعد دیر تک خیال رہا کہ آپ کتنی دیواریں عبور کر کے، کس اُمید سے آئی تھیں اور ہم آپ کو کچھ بھی نہ دے سکے ہم تو ٹھیک طرح بات بھی نہ کر سکے۔"

"آپ نے کچھ نہ دے کے بھی ہمیں بہت کچھ عطا کیا تھا۔ اُمید، حوصلہ، آپ نے ہمیں صبر دیا تھا اور۔۔۔ اور بھی بہت کچھ، جو ہمیں پہلے کبھی نہیں ملا تھا، جو ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہمارے لیے وہ سب نیا تھا۔" اُس کی آواز ترخ رہی تھی۔ "بہرحال، اب تو سب ہو گیا ہے۔" میں نے شگفتگی سے کہنے کی کوشش کی لیکن میری آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

"ہاں، ایک باب ختم ہو گیا، دوسرا شروع ہوا ہے۔" اُس نے نرم لہجے میں کہا۔ "ہم یہی کہنا چاہتے ہیں کہ خانم کی آمد سے جو نئی ڈوری بندھی ہے، اُسے ٹوٹنا نہیں چاہیے۔ خانم تو یہاں آ گئی ہیں لیکن اُن کو لانے والے بھی ہمیں اُنھی کی طرح محترم، اُنھی کی طرح عزیز ہیں۔ آپ نے اب تک بہت کچھ کہا ہے لیکن، ہمیں ہر لفظ حقیر معلوم ہوتا ہے۔ ہر لمحے یہ احساس فزوں ہوتا ہے کہ ہماری زبان ہمارا ساتھ نہیں دے رہی۔ ہمیں کہنے دیجیے کہ صرف خانم ہی ہمیں نہیں ملیں، اُن کے ساتھ ہم نے اور بھی بہت کچھ پایا ہے اور ہم اُسے کھونا نہیں چاہتے۔"

"جی، جی ہاں، کھونے کا کیا، یہ سلسلہ تو قائم رہے گا۔" میں نے اٹکتی زبان سے کہا۔ "آپ کی نوازش ہے جو آپ ایسا سمجھتی ہیں، میرے لیے یہ اعزاز ہے۔ کم از کم میری طرف سے، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری طرف سے آپ کو کوئی شکایت نہ ہو گی۔"

"نہیں نہیں، شکایت نہیں۔" وہ تڑپتی آواز میں بولی۔ "صرف شکایت ہی نہیں، ہماری مراد ہے۔۔۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم اس سے سوا کے خواست گار ہیں۔ ہم کس طرح کہیں۔ شاید ہماری آواز اسی سبب سے گھُٹ رہی ہے کہ یہ سب کچھ قبل از وقت ہے، بہت بے محل ہے لیکن موسموں کا کیا اعتبار پھر وقت ملے نہ ملے، اس لیے ہم سب آج ہی کہہ دینا چاہتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہمیں کسی مطالبے کا کوئی اختیار نہیں مگر ہم تو محض اپنی خواہش کا اظہار کر رہے ہیں۔ ہمارا جی چاہتا ہے۔" وہ ڈوبے ہوئے لہجے میں بولی۔ "کہ اس حویلی سے آپ کی نسبت کسی طور قائم رہے۔ ہم آپ کو، آپ کو اس حویلی ہی کے ایک فرد کے طور پر پہچانیں۔ جیسے ہم ہیں، ان درودیوار کا ایک حصہ جیسے جیسے۔" اُس کی آواز ٹوٹ گئی۔ مجھے اپنے سُنے ہوئے پر بار بار شبہ ہوتا تھا۔ وہ کہنے لگی۔ "آپ جانتے کیا کہیں لیکن کچھ یہی ہے۔ ہمارے لیے یہ دوسرا ہی موقع ہے کہ ہم حویلی کی ہزار روایتیں توڑ کے یوں آپ کے سامنے بیٹھے ہیں۔ صرف اس لیے نہیں کہ خانم کی آمد کی خوشی میں جہانی بھائی پر ایک بے خودی سی طاری ہے اور آپ سے تپاک کے لیے اُن کی جانب سے ہمیں خاص ہدایتیں ملی ہیں۔ یہ رعایت اپنی جگہ لیکن ہم تو آپ کے پاس اپنے ارادے سے حاضر ہونا چاہتے تھے اور خدا جانتا ہے، اب ہم میں جہانی بھائی کا سامنا کرنے کی استقامت بھی موجود تھی۔ ہم باور کر لیں گے کہ یہ محض ہمارے اندر چھپی ہوئی ندامتیں ہیں۔ جو آپ کے سامنے بے اختیار کیے ہوئے ہیں۔ کیا کوئی ازالہ کوئی کفارہ ممکن ہے۔ یہ صلہ نہیں ہے اور ہم صلہ دے بھی کیا سکتے ہیں۔ دولت آپ نے پہلے ہی ٹھکرا دی ہے۔ اس کے سوا ہمارے پاس اور ہے بھی کیا۔ ہم تو اُلٹا آپ سے کچھ مانگ رہے ہیں۔ اِسے سوءِ ظن بھی نہ سمجھا جائے۔ پشیمانی کا احساس اپنے اظہار پر تمام ہو جاتا ہے اور صلہ اگر ممکن ہوتا یا آپ طے کر دیتے تو ہم مقدور بھر کوشش کرتے۔ اگر اتنا ہوتا تو کیا ہماری سیری ہو جاتی۔ ہماری طلب تو پھر بھی اپنی جگہ قائم رہتی۔ ہم اپنے ایک محسن سے ضرور مخاطب ہیں لیکن یقین کیجیے، ہماری نظروں میں آپ کا درجہ اسی قدر نہیں ہے۔ ہمیں کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا کوئی کھویا ہوا مل گیا ہے۔" اُس کی آواز لرزنے لگی تھی۔ "ہم اُس شخص سے مخاطب ہیں جسے ہم نے اُس رات زنداں میں دیکھا تھا، جس کی آواز ہمیں بہت شناسا معلوم ہوئی تھی۔ سو ہم تو اپنے دل کی بات کر رہے ہیں جس میں آپ کے لیے کوئی دریا سا موج زن ہے۔ ہمارا دل چاہتا ہے کہ ہم آپ کے کسی کام آئیں۔ ہمارا اِس طرح بے محابا آپ کے پاس آنا کیا صرف اظہارِ ممنونیت کی بے کلی کے سبب سے ہے؟ ہم سارے حجابات ترک کر کے آئے ہیں کہ آپ کو کچھ باور کرا سکیں۔ آپ کے قدم حویلی کے در و بام کی طرف بڑھتے ہوئے رکاوٹ محسوس نہ کریں، درمیان کوئی بھید بھاؤ نہ رہے۔ آپ جان لیں کہ یہاں آپ کے کیسے کیسے طلب گار موجود ہیں۔ یہ حویلی آپ کا زنداں ہو سکتی ہے تو آپ کا گھر بھی۔ اس کے مکین آپ کے صیاد ہو سکتے ہیں تو آپ کے صید بھی۔ آپ سے کسی رفاقت کا احساس ہمارا اعزاز ہے اور یہ تو ہماری طلب کی بات ہے۔ آپ کے قرینہ عطا سے مشروط نہیں۔ اگر ہماری طلب میں کوئی نقص ہے تو یقیناً یہ بار آور نہیں ہو گی۔"

میرے کان سنسنا رہے تھے اور سارا جسم جیسے پتھر ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے کوئی بھی جواب دینے کا یارا نہیں تھا۔ گیتی چُپ ہو گئی تھی لیکن اُس کی آواز کی بازگشت میرے سینے میں دھمک رہی تھی۔ ہر لمحے مجھے یہی گمان ہوتا تھا کہ یہ سب میرے حواس کی بے توازنی کا فشار ہے۔ میرے حواس میرا ساتھ نہیں دے رہے یا میں کسی بہت عجیب خواب سے دوچار ہوں۔ مجھے نہیں معلوم، کتنی دیر کمرے میں خاموشی مسلط رہی پھر گیتی کی آواز پر ایک دم میرا وجود جھن جھنا اُٹھا۔ "رات ہمیں خانم سے بات کرنے کا موقع مل گیا تھا۔"

"کیسی بات؟" میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"یہی کچھ۔" وہ ٹھیرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "گو رات کوئی محل تو نہ تھا لیکن اُن کا رسمی شکریہ ادا کرتے ہوئے ہمیں اُن سے چند غیر رسمی باتیں کرنے کا موقع بھی مل گیا۔ وہ ایک نہایت شائستہ خاتون ہیں۔ ہمیں اپنے شوہر کی پسند و ناپسند کا اچھی طرح علم ہے۔ وہ ہمیشہ سے گوہر شناس رہے ہیں۔ سو ہم خانم کو دیکھنے، اُن سے بات کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ بے شک وہ کسی ملکہ ہی کے مانند ہیں۔ یہی تو ہم سوچتے تھے، وہ شخص کیسا ہو گا جو اُنھیں اس قدر مطلوب ہے۔ خانم کو صورت و سیرت میں خدا نے بہترین صفات سے نوازا ہے لیکن یہ خوبیاں تو مستزاد ہیں۔ وہ کیسی بھی ہوتیں، ہمارے لیے ہر حال میں معزز و محترم تھیں۔ باتوں باتوں میں بر جستہ نے آپ کا ذکر چھیڑ دیا اور ہمیں اپنے اندازوں کی سند مل گئی۔"

"انھوں نے آپ سے کچھ کہا ہے؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"وہی سب جو ہم نے آپ کو دیکھ کے اخذ کیا تھا، جو ہمارے لیے نیا نہیں تھا لیکن خانم کی زبانی سُن کے ہمارا اشتیاق و اضطراب اور بڑھ گیا۔"

"آپی نے آپ کو کیا بتایا؟" میں نے ہانپتے لہجے میں پوچھا۔

"انھوں نے نہایت فخر اور مسرت سے آپ کا ذکر کیا تھا۔ وہ کیفیت جو کسی کی شدید وابستگی کے اعتماد ہی میں ممکن ہے۔" گیتی کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ لرزنے لگی۔ "یقین کیجیے، ہمیں بہت رشک آیا۔ آپ کے نام پر اُن کی آنکھوں سے روشنی پھوٹنے لگی تھی۔"

"مگر آپی! وہ کیا کہہ رہی تھیں؟"

"زیادہ وقت کہاں مل سکا۔ پہلی ہی ملاقات تو تھی۔ ہم تو اُن کی اجنبیت کا احساس دُور کرنے اُن کے پاس گئے تھے۔ صورتِ حال ہی کچھ ایسی تھی، ہم اُن سے کتنی باتیں کر سکتے تھے۔ بس اشارے کنائے تھے، اور ہم نے آپ کو بتایا نا کہ وہ بھی بس ہمارے جانے ہوئے کی تصدیق کی حیثیت رکھتے تھے۔ ہم نے خود بھی تو کچھ جانا بوجھا تھا۔ اُس رات زنداں میں ہم نے آپ کو قریب سے دیکھا تھا اور ہمیں اجازت دیجیے، اگر ہم کہیں کہ ہم نے قریب سے محسوس کیا تھا۔ آپ کے ساتھی بزرگ کے بارے میں ہم ایک اچھی رائے کے سوا کوئی واضح تصور اپنے ذہن میں قائم نہیں کر سکتے تھے لیکن آپ کی بات دوسری تھی۔ آپ ہماری توقع سے بالکل مختلف تھے اور ہم بتائیں کہ آپ کو دیکھ کے ہمارے جسم و جاں پر چھائے ہوئے طرح طرح کے اندیشے یکسر نہیں تو ایک حد تک چھٹ گئے تھے اور ہمیں کم از کم یہ گداز مل گیا تھا کہ ہمارا واسطہ اہلِ دل لوگوں سے ہے۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ آپ بہت خطرناک لوگ ہیں، کم از کم آپ کی حد تک یہ بہتان ہی معلوم

ہوتا تھا۔ ابتدا میں ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ ہمارا مخاطب کون ہو سکتا ہے۔ لب و لہجہ بتا رہا تھا کہ حسب نسب کے امتیاز کے علاوہ وہ تعلیمی مناصب سے بھی آراستہ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی نے شاید اُس سے اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ اُس کی آواز کی یہ تپیدگی بے سبب نہیں ہوگی، اور یہ تو کلام کی بات ہے۔ ممکن ہے، جیسے آپ ابتدا میں خاموش تھے، خاموش ہی رہتے تو بھی آپ کی آنکھیں، آپ کا چہرہ تو ہمارے سامنے تھا۔ ہم جان گئے تھے کہ ہمارا مخاطب نوجوان ایک اسی زنداں میں نہیں، زندگی بھی اس کے لیے زنداں بنی رہی ہے۔ اُس کے چہرے پر یہ دھواں سا کیوں چھا جاتا ہے اور اُس کی آنکھوں میں یکایک یہ ویرانیاں کہاں سے سمٹ آتی ہیں۔ اُس کی نگاہیں اچانک بھٹکنے، منڈلانے لگتی تھیں جیسے کسی کو کچھ یاد آجائے اور اُس میں جو استقامت نظر آتی ہے، وہ امید ہی کی علامت ہوگی۔ اُس کی اُمید نہیں ٹوٹی ہے۔ اُمید ٹوٹ جائے تو بہت سے دُکھ راکھ ہو جاتے ہیں لیکن یہ اُمید بڑا عذاب ہے۔ یہ استقامت، یہ اوسان بجا رکھنے کی کوشش، تو دوسرا ستم ہے۔ آدمی ذرا سی ٹھیس لگنے پر رنگ بدل لیتا ہے۔ سامنے راستے میں کانٹے بچھے ہوں تو دوسرا راستہ اختیار کر لیتا ہے مگر یہ بے حوصلہ لوگوں کا شیوہ ہے۔ جانے کیوں ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ آپ کی حالت ہم سے مختلف نہیں ہے بلکہ ہم سے کچھ سوا ہی ہے۔ ہم نے کبھی کوئی شعر پڑھا تھا، یاد تو نہیں آرہا، مفہوم کچھ ایسا تھا کہ جن کے پاس ہم چارہ گری کی آس میں گئے، وہ ہم سے بھی زیادہ طلب گارِ نگاہ تھے۔ وہاں سے آکے برجیس بہت روئیں۔ ہم سے کہنے لگیں، گیتی! تم نے انھیں دیکھا! ہم کیا کہتے، چپ ہو گئے۔ ہم نے اِن سے نہیں کہا کہ ہماری آنکھوں پر شاید تم سے کچھ زیادہ ہی عذاب گزرا ہے۔"

میرے ہاتھ اپنا چہرہ چھپانے کے لیے اُٹھتے تھے اور جم کے رہ جاتے تھے۔ ضرور خانم نے اُس سے کچھ کہا ہوگا۔ جانے کیا کیا کہا ہوگا۔ میرے دل کی بات جیسے گیتی تک منتقل ہو گئی، گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی "خانم کے کسی حوالے سے نہیں، ہم نے سب اپنے طور پر قیاس کیا تھا۔ اس پہلی اور سرسری ملاقات میں خانم ہمیں بتا بھی کتنا سکتی تھیں۔ ہمیں اُن کی تائید کی ضرورت نہیں تھی۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے لہجے میں پھر ایسا تیقن، ایسا وثوق نہ ہوتا۔ ہماری آپ سے یہ دوسری ملاقات ہے لیکن یہ بھی جانتے ہیں کہ ہم آپ کو کتنی بار دیکھ چکے، آپ سے کتنی بار مل چکے ہیں۔ خانم کی آمد سے پہلے بھی آپ سے ہماری شناسائی میں کوئی کمی نہیں تھی۔ جب آپ یہاں تھے تو آپ کے زندانی ہونے کا دُکھ تھا اور اپنی بے چارگی کا، آپ یہاں سے چھوٹ تو خوشی کے ساتھ ساتھ یہ خلش بھی ڈستی رہی کہ آپ ہم سے دُور ہو گئے ہیں۔ ہم کچھ بھی نہ کر سکے، کچھ بھی نہ کہہ سکے۔"

میرا سینہ اندر سے جیسے کوئی دھنک رہا تھا تاہم میں نے آنسو اپنی آنکھوں سے چھپائے رکھنے کی کوشش کی۔ نہ مجھ میں وہاں سے اُٹھ کے بھاگنے کی طاقت تھی، نہ اُس سے یہ کہنے کی کہ خدا کے لیے وہ خاموش ہو جائے، اتنا ہی بہت ہے۔ میں نے نہیں دیکھا، برجیس نے یا تو کوئی اشارہ کیا تھا یا گیتی کو خود ہی احساس ہو گیا تھا، وہ چپ ہو گئی تھی۔ اتنے میں ایک خادمہ طشت اُٹھائے نپے تلے قدموں سے اندر داخل ہوئی۔ اُن دونوں کی نگاہیں اُس کی جانب مبذول ہوئیں، مجھے اپنی سانسیں استوار کرنے کی فرصت مل گئی۔ خادمہ نے چائے کا پہلا طشت اُٹھا کے اُس کی جگہ دوسرا رکھ دیا۔

"آپ نے کچھ بھی نہیں لیا، چائے بھی رکھے رکھے ٹھنڈی ہو گئی۔" برجیس کی آواز نسبتاً کھلی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، اُس نے شرمگیں لہجے میں مجھ سے شکر کے لیے پوچھا۔ اُس کی بڑی بڑی سوالیہ آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ میں نے سٹ پٹائے ہوئے انداز میں اُسے بتایا کہ دو چمچوں کے بہ قدر۔ برجیس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ جب وہ شکر گھول رہی تھی تو پیالی کی کھنک میں اُس کی چوڑیوں کی کھنک بھی شامل ہو گئی۔ چائے بنا کے اُس نے پیالی میری طرف بڑھائی، ایک ثانیے کے لیے میرے سارے جسم میں اندھیرا سا چھا گیا۔ اُس کے ہاتھ سے پیالی تھامتے ہوئے میرے ہاتھ ڈگمگا رہے تھے۔ میں نے جلدی سے پیالی ہونٹوں سے لگالی، میرا مُنہ جل گیا۔ پیالی ہاتھ سے گرتے گرتے رہ گئی۔

"وقت کا کچھ احساس ہی نہیں ہُوا۔" گیتی آہستگی سے بولی۔ "دن خاصا روشن ہو گیا ہے۔" میں نے بے چینی سے اثبات میں سر ہلایا تو وہ کہنے لگی "آپ نے تو کوئی بات ہی نہیں کی، اور ہم نے اس کا موقع بھی کب دیا لیکن اب ہمارے پاس کہنے کو شاید کچھ نہیں ہے۔ یقین کیجیے کہ اب ہمیں پہلے جیسی گراں باری محسوس نہیں ہو رہی، البتہ آپ کی خاموشی سے یہ خیال آتا ہے کہ کہیں۔ ۔ ۔ کہیں ہمارا غبار آپ کی سرگرانی کا سبب نہ بن گیا ہو۔ بخدا ہمارا یہ مقصد نہیں تھا۔ ہم نے آپ سے پہلے کہہ دیا ہے کہ ہماری عرضِ حال کے لیے آپ کی تائید و تردید لازم نہیں۔ آپ اطمینان رکھیں۔ ہمیں بہر طور آپ کی خوشی عزیز ہے۔"

"نہیں، نہیں۔" میں نے ہکلاتے لہجے میں کہا "سرگرانی کی

نے بارے میں ایسی باتیں سُن کے کسے خوشی نہیں ہوگی۔ کون ایسا گا جو یہ سب جان کے خود پر ناز نہیں کرے گا لیکن۔ ۔ ۔" مجھے ہوا کہ میری زبان سے کوئی اُلٹی سیدھی بات نہ نکل جائے اس میں نے اسی پر اکتفا کیا۔

"آپ چُپ کیوں ہو گئے؟" برجیس بے تابانہ بولی۔

"کچھ نہیں۔" میں نے بے ترتیبی سے کہا "میں کہنا چاہتا تھا ں کسی طرح اِس عزت اور احترام کے لائق نہیں۔ میں تو ایک ت معمولی بلکہ ایک ناکارہ آدمی ہوں، اور یہ میں کسی انکسار میں ں کہہ رہا ہوں، حقیقت یہی ہے۔ بہر حال یہ سب کچھ میرے ، ایک شرف ہے۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں۔ ۔ ۔ جہاں رے ایسے تپاک کرنے والے، مجھے اتنی عزت دینے والے موجود ں، وہ گھر میرا کیوں نہ ہوگا۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ اب ھے یہاں کسی قسم کی اجنبیت کا احساس نہیں ہو رہا ہے۔" میں نے ک بارگی سر اُٹھا کے دیکھا۔ اُن کی آنکھیں دمک رہی تھیں اور یس کے رخساروں پر تو بجلیاں سی چمک رہی تھیں۔ میرا دل ی اُمڈنے لگا تھا۔ اُن کے چہروں پر وہی شفق پھوٹ رہی تھی جو ی اُمید بر آنے پر ہوتی ہے یا کسی بچھڑے ہوئے کے اچانک مل انے پر۔ اُن کا یہ عالم دیکھ کے میرا جی چاہا کہ میں اُن سے مزید کچھ دں تاکہ وہ اور گلنار ہو جائیں۔ وہ منظر اتنا دل نشیں تھا کہ چند لمحوں ے لیے مجھے اپنی سدھ بدھ نہ رہی۔ برجیس تو بالکل دُلھنوں کے ند شرما رہی تھی اور ایسا لگتا تھا جیسے اُس کے سارے بدن سے مڈ کے آنسو آنکھوں میں سمٹ آئے ہوں۔ میرے لیے یہ سب ھ دیدنی تھا۔ ان جیسی نازک اندام، حورِ شمائل کی نظر میں، میں ایسا عتبر ہوں کہ میری ایک جنبشِ لب سے ان کے رنگ دُھندلے پڑ جاتے ہیں، ان کے رنگ کھل اُٹھتے ہیں یہ جان کے مجھے بہت آرام ل رہا تھا اور ایک توانائی، برتری سی محسوس ہو رہی تھی اور میں ہیں کھو سا گیا تھا۔

"ہمیں آپ کے ظرف کا اتنا ہی یقین تھا۔ یقیناً اب ہمارے بُرے دن ہم سے دُور ہو گئے ہیں۔ یہ قبولیت کی گھڑیاں ہیں سوچتے یں ہم اپنے خدا سے اور کیا مانگیں۔ خانم کے قدم واقعی بڑے مبارک یں۔" گیتی کی آواز کمرے میں منڈلا رہی تھی "خدا کرے، یہ حویلی بھی نم کو راس آئے۔"

خانم کے نام پر مجھے اچانک خیال آیا کہ مجھے اُس سے نواب الم تاب کے بارے میں پوچھنا چاہیے۔ خانم کب اور کس طرح اُس کے سامنے گئی۔ خانم کو دیکھ کے تو اُس پر قیامت گزر گئی ہوگی۔ اچھا ہوا کہ مجھے وقت پر نامناسبت کا احساس ہو گیا اور لفظ میری زبان پر تلملا کے رہ گئے۔ یہ اس سے پوچھنے کی بات نہیں تھی۔ مجھے بالکل خیال نہیں رہا تھا کہ وہ نواب عالم تاب کی بیگم بھی ہے، وہ کیا کہہ سکتی ہے وہ تو وہاں موجود بھی نہیں ہوگی، اس کا اندازہ تو اُس کے چہرے سے بھی ہو سکتا ہے۔ نواب عالم تاب کی طرف سے مطمئن ہو کے ہی وہ دونوں میری طرف آئی ہوں گی۔ یہ فراغت اطمینان کے بغیر ممکن نہیں تھی۔ نواب کو اُس کا مسیحا مل گیا تھا۔ میں یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ برجیس کی آواز نے مجھے منتشر کر دیا "آپ کے بابا جان بھی تو آپ کے ساتھ ہیں۔" اُس کے لہجے میں پہلے سے زیادہ اعتماد تھا۔

"جی ہاں۔" میں نے پہلو بدل کے کہا "اُن کا یہاں ہونا بھی ایک اتفاق ہے اور ہم سب کا حیدرآباد میں ہونا بھی۔ ہم کہیں اور جا رہے تھے کہ راستے میں ہم نے حیدرآباد کا ارادہ کر لیا۔ ابا جان کی فکر ہی سب سے زیادہ تھی۔ کسی کو خبر نہیں تھی کہ ہم یہاں ایک حویلی میں قید ہیں۔"

"بے شک۔ ہم سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کتنے پریشان ہوں گے۔ کیسا صبر آزما وقت کاٹا ہوگا انھوں نے۔" گیتی اداس لہجے میں بولی "ہم تسلیمات اور معافی کے لیے اُن کی خدمت میں ضرور حاضری دیں گے۔ کاش آپ اُس وقت ہماری گزارش توجہ سے سُن لیتے۔ یاد ہے، ہم نے عرض کیا تھا کہ ہم آپ کے پُرسانِ حال کو آپ کی خیریت کی اطلاع پہنچانے کی ایک کوشش کر سکتے ہیں۔"

"یاد ہے، اور ہمیں آپ پر پورا بھروسا بھی تھا لیکن یہ خبر سُن کے کہ ہم ریاست کے ایک بڑے نواب کے ہاں قید ہیں، وہ دہشت میں کوئی بھی ایسا قدم اٹھا سکتے تھے جو صورتِ حال مزید پیچیدہ کر سکتا تھا۔"

"آہ! آپ نے خود پر کتنا جبر کیا تھا۔" گیتی خجالت سے بولی۔ "ایسی حالت میں یہ تحمل اُنھی سے ممکن ہے جن میں خدا نے صبر و ضبط اور عقل و ہوش کی اعلا خوبیاں ودیعت کی ہوں۔"

میں نے چائے کی پیالی ختم کر لی تھی۔ برجیس نے مجھ سے مزید چائے کے لیے پوچھا۔ اُس کے انداز و اطوار میں تمکنت اور ناز کے علاوہ ایک لپک سی تھی۔ ایک ایک لفظ ترازو میں تُلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اُس کی آواز میں ایسی لپک اور کھنک تھی کہ منع کرنا مشکل ہو جاتا تھا لیکن میں نے انکار کر دیا۔ اُس نے بھی اصرار نہیں کیا اور خاص دان میری جانب بڑھا دیا۔ خادمہ ابھی ابھی خاص دان رکھ کے

گئی تھی۔ رات کے پان کا ذائقہ مجھے ابھی تک یاد تھا۔ میں نے چاندی کے ورق میں لپٹی ہوئی ایک گلوری مُنہ میں رکھ لی۔ "سُنا ہے آپ جلد از جلد یہاں سے روانہ ہو جانا چاہتے ہیں۔" گیتی نے مختصر سکوت کے بعد مجھ سے پوچھا اور حسرت آمیز لہجے میں کہنے لگی۔ "کیا ہی اچھا ہو کہ آپ چند دن یہیں قیام فرمائیں۔"

میں نے دھیمی آواز میں کہا کہ مجھے ابّا جان اور دوسروں کی بابت کچھ علم نہیں کہ اُنھوں نے روانگی کے لیے کیا طے کیا ہے البتّہ اتنا میں ضرور جانتا ہوں کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے، ہمیں یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے۔ میرے جی میں آئی، اُنھیں بتا دوں کہ بمبئی میں ہم کن لوگوں کے پاس جا رہے ہیں۔ اُن کے پاس، جن سے بچھڑے ہوئے مجھے ایک زمانہ گزر گیا ہے۔ میں اُنھیں اگر یہ بتا دیتا تو اور بہت سی باتیں نکل آتیں۔ ویسے بھی ہر لمحے مجھے یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں وہ اِدھر اُدھر کے سوال نہ کرنے لگیں۔ نہ معلوم خانم نے اُنھیں کیا کیا اور کس طرح بتایا ہے مگر اُنھوں نے مجھ سے ایسا کوئی سوال نہیں کیا۔ یقیناً وہ مجھ سے متعلق اپنے ذہن میں بھٹکنے والے بے شمار سوالوں سے دانستہ اجتناب کر رہی ہوں گی۔ اُن کے اطمینان میں ایک خوف بھی نمایاں تھا کہ کہیں اُن سے کوئی بھُول نہ ہو جائے اور میری دل شکنی میرے لیے اُلجھن کا سبب نہ بن جائے۔

"خانم کے سکون کے لیے چند دن آپ کا یہاں قیام کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس عرصے میں وہ حویلی کے ماحول سے مانوس ہو جائیں گی۔" گیتی رُک رُک کے بولی۔ "اور ہمارا، ہمارا ابھی یہی جی چاہتا ہے۔"

"میں ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا، اگر ابّا جان نے اِرادہ کر لیا تو اُن کے ساتھ جانا پڑے گا۔ رات بڑے نواب صاحب بھی اسی خواہش کا اظہار کر رہے تھے۔ میں پھر آ جاؤں گا اور جلد ہی آؤں گا۔"

"ہم ابّا جان سے خود درخواست کریں گے۔" برجیس نے چہکتی آواز میں کہا۔ "ہمیں یقین ہے، وہ ہماری بات مسترد نہیں کریں گے۔"

"لیکن وہ بٹے ہوئے رہیں گے۔ جب تک اُنھیں جہاں جانا ہے، ہو نہیں آئیں گے، اُن کا دل بے چین رہے گا۔"

"ایسی کوئی بات ہے تو ہم اُن سے اصرار نہیں کریں گے، یُوں بھی آپ کی بات مناسب معلوم ہوتی ہے۔" گیتی مایوسی سے بولی۔ "آپ کو منزلِ مقصود پہ پہنچنے میں پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔"

دھوپ کچھ اور بڑھ گئی تھی، کمرہ خوب روشن ہو گیا تھا۔ میرا ایک دل وہاں سے اُٹھنے کو کہتا تھا تو دوسرا یوں ہی اُن کے پاس بیٹھے رہنے کو، لیکن اتنی دیر سے وہ حویلی کے دوسرے مکینوں کی نظروں سے دُور تھیں۔ یہ خیال آتے ہی میں نے دبے لہجے میں اُن سے اِجازت چاہی۔ اُنھوں نے مجھ سے تھوڑی دیر اور ٹھہرنے کے لیے اصرار کیا۔ میں بیٹھا رہا۔ وہ کن انکھیوں سے مجھے دیکھا کیں اور اُنھیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھیں لیکن کہہ نہ سکیں۔ میں بھی اُن سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کیا، یہ ذہن میں کہیں گُم ہو گیا تھا۔ دریچوں سے نرم نرم ہوا اندر آ رہی تھی۔ کبھی کوئی تیز جھونکا آتا تو کمرے میں بسی گلاب کی خوشبو منتشر ہو جاتی۔ دُور دروازے کے قریب ایک خادمہ بُت کی طرح ساکت کھڑی تھی۔ برجیس کی تیز سانسیں اُس کے چہرے سے صاف نمایاں تھیں۔ اچانک اُس کے نتھنے اور ہونٹ پھڑکنے لگے تو میری سمجھ میں کچھ اور نہیں آیا تو میں نے کہا۔ "آپ کو دیر ہو رہی گی۔ میں پھر کسی وقت آ جاؤں گا۔"

"ہم بھی یہی کہنے والے تھے۔" گیتی ہمکتی آواز میں بولی۔ "اور ہمیں ابھی تک یہ شُبہ ستا رہا ہے کہ ہمیں ازسرِ نو، سب کچھ دہرانا چاہیے"

"نہیں، نہیں۔" مجھے اپنی زبان پر اختیار نہیں رہا تھا۔ "سب کچھ میرے دل پہ نقش ہے۔" میں نے بکھری ہوئی آواز میں کہا اور میں اُسی وقت اُٹھ گیا۔

"ہم منتظر رہیں گے۔" برجیس مضطرب لہجے میں بولی۔

"اب آپ کو یہ راستے یاد رہیں گے نا!" گیتی نے اشتیاق سے کہا۔ "ورنہ کسی بھی خادمہ سے کہہ دیجیے گا، ہم خود حاضر ہو جائیں گے۔"

وہ دونوں بھی میرے ساتھ اُٹھ گئی تھیں۔ برجیس نے سر سے ڈھلکتا ہوا دوپٹّا ٹھیک کیا اور پیکتے لہجے میں بولی۔ "آپ گل دستہ بھولے جا رہے ہیں۔"

"اوہ۔" میں نے تیزی سے مُڑ کے دیکھا۔ جو گل دستہ خاد بالائی منزل پر میرے لیے لائی تھی، وہ میں یہاں ساتھ لے آیا تھا اب اُسے چھوڑے جا رہا تھا۔ مجھے بڑی خفّت ہوئی۔ میں نے گل دستہ قالین سے اُٹھا لیا۔ وہ دونوں میرے پہلو بہ پہلو چلتی کمرے سے باہر آئیں۔ میرے قدم بہک رہے تھے۔ باہر راہ دا میں وہ اُس مختصر فاصلے تک میرے ساتھ رہیں جہاں سے بالا منزل کے لیے زینہ جاتا تھا۔ وہ زینے پر بھی میرے ساتھ آنا چا تھیں۔ میں نے اُنھیں روک دیا۔ زینے پر قدم رکھنے سے پہلے نے اُنھیں آداب کیا اور شکریہ ادا کرنا چاہا لیکن شکریے کا لفظ زبان پر آ کے رہ گیا۔ گیتی سر اُٹھائے میرے با مقابل کھڑی تھی اور برجیس اُس سے ایک قدم پیچھے، دونو کی آنکھیں جگمگا رہی تھیں، اور رخساروں پر سُرخی چٹک ر

برجیس کے سراپا کا ارتعاش میری نگاہوں سے چھپا نہ رہ سکا۔ میں اُن سے بہت دنوں کے لیے رُخصت ہو رہا ہوں، اُن ہروں پر کچھ ایسا ہی ہیجان چھایا ہوا تھا۔ میری رگوں میں بھی ی گردش جیسے رُک گئی تھی۔ اِس موقع پہ کون سا روّیہ مناسب ہے۔ یقیناً مجھ سے کوئی چوک ہو رہی ہے، مسلسل یہی گمان ے ہاتھ پیر جکڑے لے رہا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ میں جلد سے جلد کے سامنے سے ہٹ جاؤں۔

میں نے ابھی زینے پر قدم رکھا تھا کہ گیتی کی گونجتی آواز نے روک لیا۔ "ہم حویلی سے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں۔" وہ جھجکتے ئے بولی۔ "یہ حویلی خاصی پیچیدہ ہے لیکن یہاں ایسے کئی مقامات اور ر ہیں جو شاید آپ کی دل بستگی کا باعث ہو سکیں۔ گو خادموں کو ت کر دی گئی ہے لیکن آپ جب ضرورت سمجھیں، اُنھیں طلب نے میں کوئی تکلّف نہ کیجیے گا۔ وہ آپ کے قریب ہی رہیں گے۔ ں میں نہانے کا تالاب، مختلف کھیلوں کے انتظامات، اُن کے مخصوص کمرے اور سیر کے لیے دوسرے کئی مقامات ہیں۔ ایک ضرورت کی رعایت دی جائے تو خادم موسیقی کا اہتمام بھی کر سکتے ں۔ حویلی سے بیس میل کی دُوری پر گول کنڈے کی جانب شکارگاہ ، چاروں طرف پہاڑوں سے گھرا یہ سبزہ زار اب کسی قدرتی جنگل شکل اختیار کر گیا ہے۔ موٹریں آپ کو ایک گھنٹے سے کم مدّت وہاں تک پہنچا سکتی ہیں۔ وہاں فیل خانہ بھی ہے اور گھڑسواری انتظام بھی۔ مصنوعی جھیل میں کشتی چلتی ہے۔ غرضیکہ وہاں شکار ے علاوہ دل کش مناظر بھی کثرت سے موجود ہیں۔ ہر چند کہ تفصیل کی ضرورت نہیں تھی لیکن ہم نے سوچا، آپ کے گوش گزار دیں تو بہتر ہے۔"

میں سُنتا رہا۔ گیتی چُپ ہوئی ہی تھی کہ برجیس مُسکراتے ہوئے لی۔ "اور یہاں ایک زنداں بھی ہے۔"

"جی، جی ہاں۔" میں نے بے خیالی میں سر ہلا دیا تھا لیکن سرے لمحے بے ساختہ مجھے ہنسی آ گئی۔ اُن کے موتیوں جیسے دانت ی دمکنے لگے۔ میں نے اُنھیں اس عالم میں پہلی بار دیکھا تھا۔ ایسا لا جیسے ہر جانب پھُل جھڑیاں سی چھُوٹ پڑی ہوں۔ کسی نے غلط یں کہا ہوگا۔ اُس لمحے خود مجھے ایسا لگا جیسے فضا میں جل ترنگ ج اُٹھے ہوں، ہر سو پھول کھِل اُٹھے ہوں مگر جلد ہی وہ میری کھوں سے اوجھل ہو گئیں۔

بالائی منزل پر اُن میں سے کوئی نہیں تھا۔ خادم سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ناشتے کے بعد ابھی ابھی سب بڑے نواب کے ساتھ باغ کی طرف نکل گئے ہیں۔ میں بھی نیچے اُتر آیا۔ عمارت سے کچھ فاصلے پر باغ کے اِبتدائی حصّے میں بنی ہوئی سُرخ پتھروں کی بارہ دری میں وہ مجھے نظر آ گئے۔ بارہ دری کے فرش پر چاندنی بچھی ہوئی تھی اور گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ اُن کے سامنے جاتے ہوئے میرے پیر اٹک رہے تھے۔ اُنھوں نے ضرور میری تلاش کی ہو گی۔ میں اُنھیں اپنی غیر حاضری کی وجہ کیا بتاؤں گا۔ درمیان میں بڑا نواب بیٹھا تھا۔ اُس کے پاس دائیں طرف ابّا جان اور بِٹھل، اِدھر بائیں طرف منیر علی اور پیرو۔ خاں صاحب بھی وہیں بیٹھے ہوئے تھے اور تین چار دوسرے آدمی، شیروانی میں ملبوس۔ میں نے اُنھیں پہلے نہیں دیکھا تھا۔ زورا اور کانتے وہاں نہیں تھے۔ چلتے چلتے میں اُن کے اتنے قریب پہنچ چکا تھا کہ کسی اور طرف نکل بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اُنھوں نے اگر کچھ پوچھا تو صاف صاف بتا دوں گا۔ مجھے دیکھ کے وہ سب شگفتہ انداز میں چونک پڑے اور بڑے نواب نے بے اختیارانہ میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے اُسے آداب کیا اور اُس کے پاس ہی جا بیٹھا۔ نواب نے اپنے اُٹھے ہوئے ہاتھ سے مجھے دبوچ لیا اور میری پیشانی چوم لی۔ میری سانس پھُول رہی تھی لیکن کسی نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ میرا خیال تھا، نواب ناشتے کے بارے میں ضرور پوچھے گا مگر میرے بیٹھتے ہی وہ باتوں میں مصروف ہو گیا۔ ظاہر ہے، اُسے معلوم ہو گیا ہو گا کہ میں نے اتنا وقت زنان خانے میں گزارا ہے اور وہاں سے ناشتے کے بغیر نہیں آیا ہوں گا۔ میں نے دزدیدہ نظروں سے دیکھا اُس کی پیشانی پر کوئی شکن نہیں تھی۔ سبھی ہشاش بشاش نظر آ رہے تھے۔ بِٹھل کے سامنے طشت میں بڑی فرشی، اُونچے منقش نیچے کا حقّہ رکھا ہوا تھا اور مشک کی نقرئی منال اُس کے لبوں سے لگی ہوئی تھی۔ وہ اطمینان اور توجّہ سے نواب کی باتیں سُن رہے تھے۔ جو ریاست کی سرکاری عمارتوں میں انفرادیت قائم رکھنے کے بارے میں کچھ بتا رہا تھا۔ اُنھیں دیکھ کے کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ نواب سے اُن کی شناسائی کا دوسرا دن ہے۔ میں نے بھی نواب کی باتیں توجّہ سے سُننے کی کوشش کی لیکن کچھ دیر بعد ہی میرا جی گھبرانے لگا۔ آتے ہی اُن کے درمیان سے اُٹھ جانا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ میں اپنے آپ کو باندھے بیٹھا رہا۔ بارہ دری کے مقابل فوّارہ چل رہا تھا اور سامنے دُور تک نظر آنے والی نہر میں شفّاف پانی رواں تھا۔ اگر ہمارا رُخ مغرب

کی طرف تھا تو یہ نہر مشرق سے چلتی اور بارہ دری کی چوکی کے نیچے سے گزرتی ہمارے سامنے مغرب میں کہیں دُور جا کے مڑ گئی تھی۔ نہر کے دونوں اطراف کوئی دس دس قدم بعد اُونچے درخت لگے ہوئے تھے اور جگہ جگہ پھولوں کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے سے بنے ہوئے تھے۔ بڑا نواب اُنھیں حویلی کے نہایت خوب صورت مقام پر لایا تھا۔ بارہ دری کے نیچے متعدد خادم سر جھکائے کھڑے تھے۔ میں وہاں سے کسی بہانے اُٹھنے کے لیے پَر تولتا رہا۔ میری آنکھوں کے سامنے بار بار گیتی اور برجیس کے چہرے آجاتے تھے۔ دیر ہو گئی تو مجھے وحشت سی ہونے لگی۔ اب ایک ہی صورت تھی اور میں ایسے کسی موزوں وقت کا منتظر ہی تھا۔ کسی خادم کو ہدایت دینے کے لیے نواب کی توجہ چند لمحوں کے لیے اُس طرف مبذول ہوئی تھی کہ میں نے پیرو سے کانتے اور زورا کے متعلق پوچھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ اِدھر ہی کہیں باغ میں ٹہل رہے ہوں گے۔ میں فوراً اُٹھ گیا اور اُن کی طرف دیکھے بغیر نیچے اُتر آیا۔ اُنھوں نے مجھے روکا بھی نہیں۔ باغ طول و عرض میں پھیلا ہوا تھا۔ کانتے اور زورا مجھے بہت دُور جا کے ایک جگہ پرندخانوں کی طرف ملے۔ وہ بڑی بڑی جالیوں میں اُچھلتی کودتی رنگ برنگی چڑیوں کو اتنے انہماک سے دیکھ رہے تھے کہ میری آہٹ کا احساس بھی نہیں ہوا لیکن جیسے ہی مجھ پر اُن کی نظر پڑی، وہ بے قابو سے ہو گئے۔ "کدھر چلا گیا تھا رے؟" کانتے شکایتی لہجے میں بولا۔ "کم از کم اپنے کو تو بول کے جانا چاہیے تھا۔"

میں نے اُسے بتایا کہ اس کا وقت ہی نہیں ملا اور مجھے یہ خیال نہیں تھا کہ اتنی دیر لگ جائے گی۔ "کیا تمھیں نہیں معلوم تھا کہ میں کس طرف گیا ہوں؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"اپن کو نوکر لوگ نے بولا تھا کہ تم اُودر نیچے کو گیا ہے اور ابھی اُدھر ہی بیٹھا ہے۔" زورا نے مجھے بتایا۔

"اور اُس نے کیا کہا تھا؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"اور وہ کچھ نہیں بولا۔" زورا نے تردّد سے کہا۔ "کیا بات ہے، راجا! ابھی سب ٹھیک تو ہے؟"

"ہاں، ہاں۔" میں نے جلدی سے سر ہلا کے کہا۔

"اپن سمجھ گیا تھا، اُودر خانم آپی نے تم کو مانگا ہوگا، ایسا ہی تھا نا! کیسا ہے وہ؟"

"نہیں۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "میں اُن کے پاس نہیں گیا تھا۔"

"پھر کدھر کو گیا تھا؟" کانتے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ میں نے توقف کیا اور سوچتا رہا کہ اُسے کیا بتاؤں۔ میری خاموشی پر کانتے کی جستجو بڑھ گئی۔ "کیا بات ہے لاڈلے؟"

"ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے منمناتے لہجے میں کہا۔ "چھوٹے نواب کی بیگم نے شکریہ ادا کرنے بلایا تھا۔"

"اتنی سی بات ہے سالی تو پھر تیرا رنگ کیوں اُڑ رہا ہے۔ لگتا ہے، ابھی چوری کر کے اُدھر سے آیا ہے۔"

"کیسی بات کر رہے ہو۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"کانتے بھائی ابھی ایک دم ٹھیک بولتا ہے راجا!" زورا دانت نکالتے ہوئے بولا۔ "قسم سے اپن کو بھی ایسا ہی کچھ جان پڑتا ہے۔"

مجھے اُن کا یہ مذاق بُرا لگ رہا تھا۔ "تم دونوں پاگل ہو گئے ہو۔" میں نے تنک کے کہا۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ آخر اس تندی و برہمی کی کیا ضرورت تھی۔ "بس دیر لگ گئی۔" میں نے اُنھیں سمجھانے کی کوشش کی کہ وہاں چھوٹے نواب کی بیگم نے ناشتے وغیرہ کا اہتمام بھی کر دیا تھا۔

"مگر تجھی کو کیوں بلایا تھا؟" کانتے معنی خیز لہجے میں بولا۔

"مجھی کو؟" میری آواز سٹپٹانے لگی۔ "میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" میں نے ترشی سے کہا۔

"باپ، ابھی اپن سچ بولتا ہے۔" زورا دیدے مٹکاتے ہوئے بولا۔ "اپن کو لگتا ہے، تم کچھ چھپا رہا ہے۔"

"کیا چھپا رہا ہوں۔"

"اپنے کو یہ جان کاری ہوتی تو تجھ سے کیوں پوچھتے۔"

"تم نہ جانے کیا سمجھ رہے ہو۔"

"جانے دے جانی!" کانتے مجھے دھکیلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ میں وضاحت کرنا چاہتا تھا مگر کس بات کی وضاحت؟ میں اُسے بتاتا بھی کیا۔ سو میں نے حجت کے بجائے خاموشی مناسب سمجھی اور اُن کے ساتھ باغ میں گھومتا رہا۔ جیسا کہ گیتی نے بتایا تھا، حویلی کے عقب میں ذرا فاصلے فاصلے پر سُرخ پتھر سے کٹی ہوئی جالیوں کے اندر نہانے کا تالاب بنا ہوا تھا، بالکل انگلش طرز کا۔ جالیوں پر لمبے لمبے پردے پڑے تھے جو ضرورت پڑنے پر کھینچ دیے جاتے ہوں گے۔ وہاں کے چوکیدار نے ہم سے نہانے کے لیے پوچھا بھی۔ پانی بھی ایسا نکھرا ستھرا، آئینے کے مانند تھا کہ خود بخود نہانے کے لیے آدمی کا جی مچلے لیکن ہم اور آگے بڑھ گئے۔ باغ میں درختوں کے بیچ چھوٹی چھوٹی کئی عمارتیں بنی ہوئی تھیں۔ سب کی طرز منفرد تھی۔ جہاں جہاں سے ہم گزرتے، خادم سر جھکا کے اور ہاتھ باندھ کے ہمیں تعظیم دیتے۔ حویلی کے سارے ملازموں کو نئے مہمانوں کے متعلق ہدایات دی گئی تھیں۔ ٹینس کورٹ کی طرف

گزرتے ہوئے زورا حیرتی لہجے میں بولا۔ "راجا! ابھی تم دیکھتا ہے، بادشاہ بھی ایسا ہی مافک محل دو محلے میں رہتا ہوگا۔"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "یہ تو بادشاہ بادشاہ پر منحصر ہے۔ شاید بہت بادشاہوں کو بھی ایسی جگہ نصیب نہ ہو۔"

"ایدر رہی زمین کا لوگ نے اُوپر جیسا جگہ بنا لیا ہے، اُوپر پھر ہوگا۔ اس سے جاستی کیا ہوئے گا۔"

"ابے، ابھی تو نے دیکھا ہی کیا ہے۔" کانتے مُنہ بنا کے بولا۔ "ادھر ولایت میں گورے لوگ کے آگے، لوگ بولتے ہیں، سب سالے بھرتے ہیں۔ اُدھر اندر باہر سب جگہ جنّت ہے۔"

وہ یہی فضول باتیں کر رہے تھے کہ ایک جگہ زورا نے اشارہ کیا۔ دائیں جانب کچھ دُوری پر لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ یہ حویلی کا دوسرا دروازہ تھا جو ملازموں کی آمد و رفت کے لیے مخصوص ہوگا کیونکہ اطراف میں بنے ہوئے مکانات ملازموں ہی کے ہو سکتے تھے۔ قریب پہنچے تو اُن کی تعداد، وضع قطع اور موجودی کے سبب کا اندازہ ہوا۔ ایک جانب میدان میں دری بچھی ہوئی تھی اور بہت سے بچے بڑے قرآنِ پاک کی تلاوت میں مصروف تھے۔ ایک طرف دیگیں چڑھی ہوئی تھیں اور دروازے کے قریب چوکیوں پر رکھے ہوئے ملبوسات کے سامنے قطار در قطار لوگ بیٹھے تھے۔ کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ خانم کی آمد ہی کے سلسلے میں غربا اور مساکین کو لباس اور کھانا تقسیم کرنے کا اہتمام کیا گیا ہوگا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور باہر سے باری باری بہت سے لوگ اندر آ رہے تھے اور ملازمین اُنھیں نظم و ضبط کی تلقین کر رہے تھے تاہم شور مچا ہوا تھا اور لوگ اپنی باری جلد آنے کے لیے ایک دوسرے کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہماری آمد سے ملازمین میں کسی قدر افراتفری سی ہو گئی۔ ہم پر توجہ دینے کے لیے وہ اپنے کام سے غافل ہو گئے تھے اس لیے ہم وہاں نہیں ٹھیرے۔ چلتے چلتے پیر دُکھنے لگ گئے تھے۔ میں تو بس یوں ہی اُن کا ساتھ دے رہا تھا۔ بارہ دری سے اُٹھ کے مجھے کانتے اور زورا کی تلاش میں جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ میں اپنے کمرے میں جا کے سارے دروازے بند کر کے لیٹ جانا چاہتا تھا۔ برجیس اور گیتی کی باتیں میرے دماغ میں گونج رہی تھیں جیسے سب از سرِ نو سُن رہا ہوں اور جیسے اب کچھ اُن کے معانی منکشف ہو رہے ہوں۔ اُس وقت تو میں نے کچھ سُنا ہی نہیں تھا، سُنا تھا تو اُس کا مفہوم میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ میں بار بار مفاہیم ترتیب دے دیتا اور سب کچھ جیسے کسی جھونکے سے منتشر ہو جاتا۔ کانتے ابھی اور آگے جانا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں دخل دیتا، زورا نے میری مدد کر دی۔ اُس نے تھوڑی دیر سستانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ کانتے نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ وہ بھی تھکا تھکا سا معلوم ہوتا تھا۔ میں اپنی طرف سے کچھ کہتا تو وہ اُلٹی سیدھی باتیں شروع کر دیتا۔

مجھے اندیشہ تھا کہ دونوں دوبارہ بارہ دری کی طرف جانے کا ارادہ نہ کر لیں لیکن وہ بالائی منزل پر آگئے۔ یہاں ہماری شب بسری کا بندوبست کیا گیا تھا۔ یہ بھی مناسب نہیں تھا کہ اُنھیں چھوڑ کے میں سیدھا اپنے کمرے کا رُخ کر لیتا چنانچہ مجھے اُن کے ساتھ کانتے کے کمرے میں جانا پڑا۔ خادم وہاں موجود تھا۔ اُس کے پوچھنے پر زورا نے اُسے چائے لانے کی ہدایت کی۔ دوپہر ہو رہی تھی، کھانے کا وقت ہوا ہی چاہتا تھا لیکن زورا کو بار بار چائے کی طلب ہونے لگتی تھی۔ پلنگ کے قریب ایک آبنوسی ڈبے میں سگریٹ رکھے تھے۔ ولایتی لائٹر بھی اُس سے پیوستہ تھا۔ کانتے نے بستر پر پھیل کے اور نوابوں کی طرح ٹانگ پر ٹانگ رکھ کے سگریٹ سلگائی اور گہرے گہرے کش لینے لگا پھر صرف دو تین کشوں میں اُس نے سگریٹ بجھا دیا اور جیب سے بیڑی کا بنڈل نکال کر بیڑی پینے لگا۔ مجھے اُن سے بہت سی باتیں پوچھنی تھیں۔ اُنھیں شاید معلوم ہو کہ ابّا جان اور بتھل نے روانگی کے لیے کیا طے کیا ہے۔ نواب خانم کے بارے میں اُن کی کوئی گفتگو ضرور ہوئی ہوگی۔ اُدھر ابّا جان کی حویلی میں ہمارے منتظر مارٹی، شامو، جبرو اور ٹنگو کو اطلاع دے دی گئی ہے کہ ہم ابھی یہیں رہیں گے یا اُنھیں بھی یہیں بلا لیا گیا ہے؟ ہو سکتا ہے، کانتے اور زورا کو بڑے نواب سے نواب عالم تاب کے بارے میں کوئی سُن گُن ملی ہو؟ میں نے اُن سے کچھ نہیں پوچھا۔ جانے کیوں مجھے اندیشہ تھا کہ کانتے تلخ ہو جائے گا۔ اُن کے چہروں سے بظاہر بے دلی یا بے آرامی ظاہر نہیں ہو رہی تھی لیکن اندر کا کیا معلوم، نہ جانے اندر کتنا دُھواں بھرا ہو۔ میرے ٹوکنے پر اُنھیں کوئی بھی تاثر مل سکتا تھا کہ شاید میں پہلے کی طرح یہاں سے جانے کے لیے بہت مضطرب ہوں۔ یا میں یہ رائے ظاہر کرتا کہ کیا حرج ہے، اگر وہ چند دن اور ٹھیر جائیں۔ دونوں صورتوں میں طرح طرح کی باتیں اُن کے ذہن میں گھر کر سکتی تھیں۔ نہ مجھ میں وہ سب کچھ دہرانے کی ہمت تھی، نہ مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ میں اُنھیں کہاں تک بتاتا کہ گیتی اور برجیس نے کیسی کیسی التجائیں کی ہیں، ایسی التجائیں کہ اب نہ رُکنا بد دماغی ہوگی۔ اُنھوں نے اُن دونوں کو نہیں دیکھا تھا کہ وہ کیسی پھولوں کی طرح نرم و نازک ہیں، بالکل پریوں کے مانند۔ وہ تو شیشے کی بنی ہوئی لگتی ہیں، ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹنے کا ڈر لگے۔ وہ خود گیتی اور برجیس کے سامنے ہوتے تو یہی کہتے۔ غرض میں نے اپنی زبان بند ہی رکھی۔ گیتی

اور برجیس نے وہ سب کچھ میرے اعتماد میں کہا تھا، صرف مجھ سے۔ مجھے وہ خود تک ہی محدود رکھنا چاہیے تھا۔

تھوڑی دیر میں خادم چائے لے آیا تھا۔ میں نے بھی پی۔ وہ خاموش نہیں بیٹھ سکتے تھے، زورا اڈے کی باتیں کہنے لگا کہ اِدھر حیدرآباد میں اڈا گیری ایسی مشکل بات نہیں ہے ورنہ آکا جیسا آدمی اُوپر نہ آتا۔

"آکا میں بل کتی نہیں تھا، بس سالا کھوپڑی کا اُلٹا تھا۔" کانتے بولا "نظر کا بھی تھوڑا گرا ہوا تھا۔ ایک دو پھیروں میں ہی سونگھ لینا چاہیے تھا کہ سامنے کون ہے، اُستاد تو جان کے سالے کو گھمائی دیتا رہا۔ اُدھر لوگ بھی کم نہیں تھے۔ اُستاد کو، اُن کو بھی تو کچھ بولتا تھا۔"

زورا نے بے اختیار سینے پر ہاتھ رکھ لیے اور بلکتے لہجے میں بولا "قسم سے کانتے بھائی، ابھی اپن کا جی کرتا ہے۔ پوری عمر بس اُستاد کے چرن میں کاٹ دے۔" وہ کانتے سے التجا کرنے لگا کہ اگر وہ سفارش کر دے تو شاید جھل اُسے اپنے ساتھ رکھنے پر تیار ہو جائے۔ کانتے نے وعدہ کیا کہ وہ موقع دیکھ کے جھل سے بات کرے گا۔ اڈے کی باتیں کرتے کرتے بھورے دادا کا ذکر آ گیا۔ زورا کہنے لگا "اپن کو شک لگتا ہے کہ بھورے دادا سے اس عمر میں اڈا اُٹھایا جا سکے گا۔" مگر کانتے کا خیال زیادہ درست معلوم ہوتا تھا کہ اب بہت دنوں تک اڈے پر تبدیلی نہیں آئے گی، کوئی آکا نمودار نہیں ہوگا اور اس عرصے میں بھورے دادا اڈے کے لیے مناسب آدمی تیار کر لے گا۔ کالے دادا کے ذکر پر دونوں ہنسنے لگے۔ زورا نے اُس کے حیدرآبادی لہجے اور کولھے مٹکانے کی نقل اُتارنے کی ناکام کوشش کی۔ میں نے بھی اس خیال سے درمیان میں کئی مرتبہ دخل دیا کہ کہیں میری خاموشی اُنھیں مکدر نہ کر دے اور وہ دوبارہ مجھ سے کوئی تکرار نہ کرنے لگیں۔ ہمیں آئے زیادہ وقت نہ گزرا ہوگا کہ دوپہر کے کھانے پر ہماری طلبی ہو گئی۔ وہیں بالائی منزل کے ایک لمبے چوڑے کمرے میں کھانے کا فرشی اہتمام کیا گیا تھا۔ یہاں سے وہاں تک بچھے ہوئے دسترخوان پر اتنی اقسام کے کھانے چُنے تھے کہ انتخاب تو درکنار، سب کا ایک ایک لقمہ چکھنا بھی ممکن نہیں تھا۔ کئی ملازم دو دیگچے اِدھر سے اُدھر منتقل کرنے کی خدمت پر مامور تھے۔ مجھے پہلے ہی بھوک نہیں لگ رہی تھی، چائے نے اور کم کر دی تھی لیکن میں نے کسی کو احساس نہیں ہونے دیا کہ صرف ٹھکے ٹونگ رہا ہوں۔ کھانے کے دوران میری نگاہیں بیشتر اُن کے چہروں پر بھٹکتی رہیں۔ اُن پر کوئی بوجھل پن طاری نہیں تھا بلکہ وہ بڑے نواب سے کچھ اور مانوس معلوم ہو رہے تھے اور بڑے نواب بھی۔ مجھے سب سے زیادہ ابّا جان کی طرف سے بے چینی تھی۔ لیکن ابّا جان اور منیر علی تو سب سے زیادہ خوش و خرم نظر آ رہے تھے۔ پیرو نواب کے پہلو میں بیٹھا کھانوں کی تعریف کر رہا تھا۔ کہنے لگا کہ اگر زنداں میں ہمیں ایسے کھانے کھلائے جاتے تو ہم کبھی فرار کا ارادہ نہ کرتے۔ اس جملے پر نواب کی آنکھیں بجھ گئیں، ہر چند کہ دوسرے ہی لمحے وہ کھِل کھلا پڑا تھا لیکن اُس کی ہنسی بے ساختہ نہیں تھی۔ پیرو کو ایسی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اُسے خود بھی احساس ہو گیا۔ اُس نے فوراً موضوع بدل دیا اور بڑے نواب سے پوچھنے لگا کہ کیا اُس نے کبھی جلتی ریت میں بھُنی ہوئی مچھلی کھائی ہے؟ نواب نے بتایا کہ ہمیں اتفاق نہیں ہوا لیکن سُنا ہے کہ نہایت لذیذ ہوتی ہے۔"

وہ دسترخوان سے اُٹھ کے منتشر ہوئے ہی تھے کہ میں آہستگی سے نکل آیا۔ میں نے اپنے کمرے ہی میں آ کے دم لیا۔ کمرے میں داخل ہو کے میرے قدم ٹھٹک پڑے، کہیں میں کسی دوسرے کمرے میں تو نہیں آ گیا؟ تمام ساز و سامان اپنی جگہ موجود تھا لیکن سب کچھ بدلا بدلا معلوم ہو رہا تھا۔ پلنگ پر نئی چادریں، نئے تکیے، غلاف، میز پوش سبھی کچھ بدلا ہوا تھا۔ سرہانے کی چھوٹی میز پر ٹائم پیس، پھلوں کی قاب، پانی ٹھنڈا رکھنے والا تھرماس، پلنگ کی دوسری جانب ایک گول میز پر ریڈیو گرامو فون کا ڈبا، خاص دان میں گلوریاں، عطر دان اور کئی تہہ کیے ہوئے سفید رومال رکھے تھے۔ سگریٹ کیس بھی تھا۔ گل دستوں میں تازہ تازہ پھول سجے ہوئے تھے اور سارے کمرے میں موتیا کی بھینی بھینی خوشبو بسی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ ابھی ابھی کوئی یہاں سے گیا ہے۔ ہر چیز اپنی جگہ نفاست اور سلیقے سے رکھی گئی تھی۔ میں سمٹی ہوئی نظروں سے سب کچھ دیکھتا رہا۔ کہیں نگاہ جمتی ہی نہیں تھی۔ یہ آرائش تو تمام کمروں میں کی گئی ہو گی لیکن ابھی کچھ دیر ہوئی، کھانے سے پہلے میں کانتے کے کمرے میں بیٹھا تھا، وہاں تو یہ سب چیزیں نہیں تھیں۔ میں نے ایک بار سارے کمرے کا چکر لگا کے دیکھا۔ یک بارگی مجھے محسوس ہوا کہ کمرے میں کوئی اور بھی موجود ہے مگر یہ محض میرا وہم تھا۔ سارا کمرہ روشن تھا۔ مجھے اپنے آپ سے گھٹن ہونے لگی۔ کوئی ہوتا تو اُسے چھپنے کی کیا ضرورت تھی۔ سامنے کی بڑی میز پر لکڑی کے ریک میں چند کتابیں چُنی ہوئی تھیں اور انگریزی، اُردو کے نئے پرانے رسالے۔ پلنگ پر آ کے میں اُن کی ورق گردانی کرتا اور تصویریں دیکھتا رہا۔ چند تصویریں دیکھ کے میرا جی اُکتا گیا، میں نے آنکھیں موندنے کی کوشش کی۔ میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ پلنگ پر پڑے پڑے میں ہانپتا رہا۔ دروازہ بند کرنے کے لیے مجھے دوبارہ اُٹھنا پڑا۔ کھلے دروازے سے کوئی بھی اندر

آ سکتا تھا۔ کچھ دیر کے لیے میں اپنے پاس ہی رہنا چاہتا تھا۔ کمرے میں سکوت چھایا ہوا تھا۔ ہوا بھی بند بند سی تھی۔ ابھی مجھے بستر پر لیٹے چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ میں ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا۔ پہلے تو میں اسے اپنے دماغ کا خلل سمجھا تھا لیکن دستک کی آواز پھر میرے کانوں میں گونجی۔ میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر لگی کہ دستک اُس دروازے پر ہوئی ہے جو خادموں کی آمد و رفت کے لیے مخصوص ہے۔ میں اُٹھ کے تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا لیکن اسی لمحے مجھے یاد آیا کہ ملازموں کی دستک پر اُٹھ کے دروازہ کھولنے کے بجائے پلنگ کے قریب لٹکی ہوئی ریشمی ڈور کھینچنی چاہیے۔ بشرطیکہ اُن کی طلبی مقصود ہو۔ یہ بات رات خاں صاحب نے مجھے یہاں کمرے میں پہنچاتے وقت بتائی تھی۔ میں کمرے کے درمیان شش و پنج میں کھڑا رہا کہ کیوں نہ خاموش رہوں مگر کوئی اور بھی تو ہو سکتا ہے۔ اس خیال سے میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ معاً دستک ایک بار پھر ہوئی۔ میں نے ڈوریوں کی طرف واپس جاتے جاتے بڑھ کے دروازہ کھول ہی دیا۔

ایک ثانیے کے لیے میری آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ سر تا پا سفید لباس پہنے ایک نوجوان لڑکی کھڑی تھی۔ گندمی رنگ، کشیدہ قامت، ہاتھوں میں گجرے، گلے میں موتیوں کا ہار، آڑا پاجامہ اور لمبا کرتا۔ چادر کی طرح چکن کا دوپٹا اُس کا بدن ڈھانپے ہوئے تھا۔ مجھے یوں اچانک سامنے دیکھ کے وہ اچھل سی گئی اور اُس نے بہ عجلت مجھے تسلیم کی۔ حویلی کی ہر چیز کی طرح خادمائیں بھی منتخب کر کے رکھی گئی ہوں گی۔ پہلی دو خادماؤں کو میں قریب سے دیکھ چکا تھا چنانچہ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی کہ یہ خادمہ ہی ہو سکتی ہے۔ میری سوالیہ نظریں اُس پر مرکوز تھیں، معاً وہ ہچکچاتے ہوئے بولی "بندی کو نفیس کہتے ہیں۔"

"جی!" میں نے سر ہلا کے کہا۔

"آپ کو زحمت ہوئی۔" وہ کسی قدر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "بندی صرف یہ عرض کرنے حاضر ہوئی ہے کہ آپ کو اپنی موجودگی کی اطلاع دے دے۔"

"اطلاع!" میں نے تذبذب سے کہا۔

"بندی کو آپ کی خدمت کے لیے مامور کیا گیا ہے۔" وہ آہستگی سے بولی "بندی یہیں آپ کے کمرے سے ملحق گوشے میں موجود رہے گی۔"

"مگر۔ ۔ ۔ مگر مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے ہکلاتے ہوئے کہا "یہاں سبھی کچھ تو موجود ہے۔ آپ کو کس نے یہ ہدایت دی ہے؟"

"چھوٹی سرکار نے۔" وہ سر جھکائے جھکائے بولی۔

"چھوٹی سرکار؟ چھوٹی بیگم صاحب نے؟"

"برجیس بی بی نے۔" وہ جھجکتی آواز میں بولی "مگر چھوٹی بیگم صاحب کی خواہش بھی یہی ہے۔"

میں نے ایک گہری سانس لی "اُن سے میرا آداب کہیے گا اور بہت بہت شکریہ، اور اُن سے کہیے گا کہ کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو میں خود بھی آ سکتا ہوں۔ ویسے بھی یہاں ملازموں کی کمی نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ آپ۔ ۔ ۔ آپ نیچے زنان خانے میں واپس چلی جائیں۔"

اُس نے نگاہیں اُٹھا کے بے چارگی سے میری طرف دیکھا اور کھڑی رہی۔ اُس کا چہرہ تمتمانے لگا تھا۔ مجھے بھی اُس کے سامنے سے اس طرح ہٹ جانا ٹھیک معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ میں بھی کھڑا رہا۔ وہ لاکھ خادمہ سہی، آدمی کی اپنی حیثیت بھی تو ہوتی ہے۔ اُس کے سراپا میں بڑا وقار تھا۔ "بندی کو جناب کی خدمت سے بہت خوشی ہو گی۔ بندی کے لیے یہ عزت ہے۔" اتنی دیر تک کھڑی ہوئی وہ شاید یہی لفظ سوچ رہی تھی۔

"مگر، مگر کس لیے؟ کس لیے؟" میں نے بدحواسی سے کہا "خواہ مخواہ آپ کا وقت ضائع ہوگا۔" اُسے تم کہہ کر مخاطب کرنے کو میرا جی نہیں چاہا۔

چند لمحے وہ گم سُم رہی، پھر اُس نے چونکنے کے انداز میں مجھے آداب کیا اور اُلٹے قدموں واپس ہونے لگی۔ مجھے اچھا نہیں لگا۔ وہ بہت مایوس دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے دروازہ بند نہیں کیا۔ وہ چند ہی قدم گئی ہو گی کہ میں نے ٹھہرنے کے لیے کہا۔ اُس کا بدن لہرا سا گیا "اندر آ جائیے۔" میری آواز چھر چھرا رہی تھی۔ وہ جھجکتی ہوئی اندر آ گئی۔ میں نے اُسے بیٹھ جانے کو کہا لیکن وہ کھڑی رہی۔ میں نے دوبارہ کہا تب بھی اُس کے سراپا میں جنبش نہیں ہوئی تاہم وہ لرزتی ہوئی سی آواز میں بولی "بندی حکم کی منتظر ہے۔"

"بیٹھ جائیے۔" میرے لہجے میں غالباً کسی حد تک حکم شامل تھا۔ اُس نے گھبرا کے اِدھر اُدھر دیکھا اور قریب رکھی ہوئی کرسی کے کنارے بیٹھ گئی۔ اُس کا گندمی رنگ سفید ہو گیا تھا۔ یہ حالت دیکھ کے میں بھول گیا کہ میں نے اُسے اندر آنے کے لیے کیوں کہا تھا۔ برجیس اور گیتی کے بارے میں کچھ معلوم کرنے کے لیے یا نواب عالم تاب کے متعلق کچھ جاننے کے لیے۔ مگر میں اس سے کس طرح پوچھوں۔ زبان سے کہیں کوئی نامناسب لفظ نہ نکل جائے۔ برجیس اور گیتی کی خادمہ سے اُن کے سلسلے میں کچھ معلوم کرنا تازیبا تھا اور وہ چھوٹے نواب اور خانم کے بارے میں بھی کتنا بتا سکتی تھی۔ لیکن میں نے اُسے روکا تھا تو اب کوئی نہ کوئی بات کرنی ہی تھی۔ میں نے دبے لہجے میں اُس سے نواب عالم تاب

کے بارے میں پوچھا۔

"سُنا ہے، خدائے پاک کا شکر ہے مگر بندی کو۔ ۔ ۔" وہ کہتے کہتے رُک گئی۔

"آپ کو زیادہ علم نہیں ہے؟"

"جی" وہ دھیمی آواز میں بولی "ہر کسی کو اُس طرف جانے کی اجازت نہیں ہے۔"

"سب خیریت تو ہے نا؟"

"جی ہاں" وہ چُرمُراتے ہوئے بولی "خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہی ہو گا"

"آپ برجیس بی بی کی، میرا مطلب ہے بقول آپ کے، آپ دونوں میں سے کس کی خدمت پر مامور ہیں؟"

"دونوں کی"

ایک دم میرے جی میں آئی، پوچھوں کہ اُسے دونوں میں سے کون زیادہ پسند ہے مگر میری زبان ہکتے ہکتے رہ گئی۔ بہتر یہی تھا کہ میں اسے واپس چلی جانے دوں۔ آخر وہ گیتی اور برجیس کی خادمہ ہے۔ میرا ایک ایک لفظ اُنھیں منتقل کر دے گی اور نہ جانے کس انداز میں بیان کرے لیکن اندر بُلا کے کچھ کہے بغیر اُسے واپس کر دینا اور یوں خاموش بیٹھے رہنا دونوں باتیں عجیب تھیں۔ اُس کے جھکے ہوئے سر کے باعث مجھے کم سے کم اُس کا چہرہ ٹٹولنے کی آسانی تھی۔ مجھ پر ایک ایک لمحہ بھاری گزر رہا تھا، اُس کا بھی یہی حال معلوم ہوتا تھا "آپ یہاں حویلی میں کب سے ہیں؟" کچھ اور سمجھ میں نہیں آیا تو میں نے پوچھا۔

وہ اُڑی اُڑی آواز میں بولی "بندی نے دوسرا گھر نہیں دیکھا"

"یعنی آپ نے بس یہی دنیا دیکھی ہے؟"

"بندی کی یہی دُنیا جنّت ہے"

"واقعی، یہ جگہ بہت خوب صورت ہے، جنّت نظیر ہے"

"بندی کا خیال ہے کہ مناظر اور عمارتوں سے زیادہ جنّت کی دل کشی کا باعث اُس کے نیک مکیں ہوں گے" وہ زیر لبی سے بولی۔

"بے شک، یقیناً" میں نے تعجب سے کہا مگر تعجب کی کیا بات تھی، گیتی اور برجیس کی خادمہ کا لب ولہجہ بھی کم و بیش اُنھی جیسا ہونا چاہیے تھا۔ کبھی میں نے سُنا تھا کہ ملازم اپنے آقاؤں سے پہچانے جاتے ہیں، گو یہی بات آقاؤں پہ بھی تو صادق آتی ہو گی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ گیتی اور برجیس کی کچھ زیادہ ہی مقرب تھی۔ اُنھوں نے اپنی خاص ہی خادمہ کو بھیجا بھی ہو گا۔ اُس کا جواب سُن کے میری جستجو بڑھ گئی۔ لیکن مجھے اُس کے سامنے بے سوچے سمجھے زبان نہیں کھولنی چاہیے تھی۔

میں سوچتا ہی رہ گیا۔ ذہن میں نہ جانے کتنے سوال گردش کر رہے تھے لیکن کوئی موزوں نہیں لگتا تھا۔ شاید میں اُسے ایسے ہی جانے کی اجازت دے دیتا کیونکہ خاموشی نہایت ناروا تھی لیکن معاً میرے ذہن میں آیا کہ اُسے کمرے میں بلانے کے جواز کے طور پر کیوں نہ اُس سے کوئی فرمائش کروں۔ فرمائش کتابوں سے بہتر نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے اُس سے کہا کہ کیا حیدر آباد کی تاریخ پہ کچھ کتابیں فراہم کی جا سکتی ہیں؟

اُس کے لبوں پہ پہلی بار مُسکراہٹ کِھلی اور وہ سر اُٹھا کے مستعد آواز میں بولی "بندی کا علم محدود ہے لیکن اسے کتب خانے کی کچھ شُدبُد ہے۔ وہاں کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ اِس موضوع پر بھی ضرور کتابیں ہوں گی بلکہ اِس موضوع پہ تو وافر ہوں گی کیوں نہ جناب زحمت فرما کے ایک بار کتب خانہ ملاحظہ فرما لیں" مجھے خیال آیا، اُس سے کہوں کہ وہ اس انداز میں مجھے مخاطب نہ کرے لیکن میں نے بیچ میں دخل نہیں دیا۔ اُس کے لہجے میں سنجیدگی کے باوجود ایک ہیجان بھی تھا، سبھی کچھ ایک سانس میں کہہ دینے کی بے تابی۔ وہ روانی سے کتب خانے کے متعلق مجھے بتاتی رہی کہ وہاں مطالعے کے لیے سکون کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ پرندوں کا شور غل کم سے کم کرنے کی غرض سے اطراف میں اُونچے درختوں اور بیلوں سے پرہیز کیا گیا ہے۔ کتابوں کے سلسلے میں اُس کی معلومات میرے لیے حیران کن تھیں۔ وہ تو بہت کچھ جانتی تھی۔ مثلاً فلاں کتاب بڑے نواب نے کس طرح حاصل کی۔ اورنگ زیب کے زمانے کا لکھا ہوا قرآن شریف کا ایک مخطوطہ حاصل کرنے کے لیے اُس نے کیسی تگ و دو کی تھی۔ باتیں کرتے وقت اُس کے چہرے کے رنگ بدلتے رہتے تھے۔ پل میں دھوپ پل میں چھاؤں۔ میں نے کُتب خانے کے بارے میں اس سے کرید کرید کے پوچھا تاکہ وہ بولتی رہے۔ وہ اپنے آپ سے بے خبر سی ہو جاتی میں اُسے سُنتا کم، دیکھتا زیادہ رہا۔ وہ لائبریری کی خصوصیات کا ذکر بڑے اشتیاق سے کر رہی تھی۔ میں نے درمیان میں پوچھا "آپ کو کس موضوع سے دل چسپی ہے؟"

وہ خفیف سی ہو گئی "بندی کو داستانیں زیادہ پسند ہیں"

"اور، اور شاعری؟"

"جی ہاں، کچھ وہ بھی" وہ شرم گیں لہجے میں بولی "مگر جناب کو کس نے بتایا؟"

"کسی نے نہیں" میں نے کسمساتے ہوئے کہا "خود ہی اندازہ لگایا" اُس کی آنکھیں جھلملانے لگیں اور اُس کا بدن اِس طرح سمٹنے لگا

یے اُس کی کوئی چوری پکڑی گئی ہو "کیا آپ شعر کہتی ہیں؟" اُس کی وشی پر میں نے دوبارہ پوچھا۔

اُس نے سر جھکا لیا "بندی کیا عرض کرے، یوں ہی کوشش نی ہے" وہ رُک رُک کے بولی۔

"چھوٹی بیگم صاحب اور بی بی کو بھی تو شاعری سے خاص دلچسپی ئی ہے؟" میں نے چپکے سے پوچھا۔

"بہت بہت زیادہ، چھوٹی سرکار تو بہت عمدہ شعر موزوں نی ہیں۔ کاش بندی کو اس کا عشرِ عشیر بھی مل جاتا" وہ حسرت آمیز ہیں بولی۔

"کیا وہ بہت اچھے شعر کہتی ہیں"

"بندی کس منہ سے تعریف کرے کہ خدا نے اُنھیں کیسا نوازا ہے ن یہ سب حویلی تک محدود رہتا ہے، چند قریبی لوگوں تک۔ خصوصاً ِبی سرکار کے سوا وہ کسی کو بھی نہیں سُناتیں"

"اور بی بی؟" میں نے آہستگی سے پوچھا۔

"بی بی سرکار شعر نہیں کہتیں لیکن بلا کی سخن فہم ہیں۔ ایسی کہ ھی کبھی تو شک گزرتا ہے، ضرور کچھ چھپاتی ہیں لیکن یہ تو سب بیتی ہوئی باتیں ہیں" اچانک اُس کی آواز پر غبار چھا گیا، کہنے لگی کہ "ایک زمانہ تھا کہ ہر وقت یہی چرچے، یہی مشاغل رہتے تھے"

"اب کیا بات ہے؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"اب تو سب کچھ اُجڑ گیا ہے، جب سے چھوٹے سرکار نے۔۔"

اُس کی آواز بھرا گئی۔

اس سے پہلے کہ اُس کی آنکھوں میں اُمڈتے ہوئے آنسو چھلک پڑتے، میں نے بات کاٹ کے کہا "ہاں، ہاں، مجھے معلوم ہے"

"بہت دنوں کے بعد جناب کے آنے سے حویلی میں کہیں پُرانے دنوں کی جھلک نظر آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب ہوا کا رُخ بدل گیا ہے۔ جناب کے قدم بڑے مبارک ہیں"

"اب سب ٹھیک ہو جائے گا" میں نے اُسے تسلی دی۔

"بندی کو یقین ہے" وہ یاس بھرے لہجے میں بولی۔

"آپ کو اس حویلی سے بہت محبت ہے؟"

"یہ حویلی بہت سے لوگوں کا سایہ ہے"

"بے شک، یہاں آ کے یہی معلوم ہوتا ہے" میں نے بدبداتے ہوئے کہا۔

وہ پھر کہیں کھو گئی۔ چھوٹے نواب کے ذکر ہی نے اُسے منتشر کیا تھا ورنہ وہ کتنی دل چسپ اور دل نشیں باتیں کر رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کسی طرح اُس کی دل جوئی کروں اور موضوع بدل دُوں۔ مجھے گُم دیکھ کے چند لمحوں بعد وہ خود ہی بولی "کیا جناب کچھ نوش فرمانا پسند کریں گے؟"

"نہیں" میں نے بے خیالی میں کہا "میں آرام کرنا چاہتا ہوں"

"اوہ" وہ ندامت سے بولی "بندی یقیناً مخل ہوئی"

"نہیں، بلکہ آپ کے آنے سے آرام ہی ملا، سر میں کچھ درد محسوس ہو رہا تھا، نیند بھی نہیں آ رہی تھی" میں نے اُس کا دل رکھنے کے لیے یُوں ہی کہہ دیا۔

"اب کچھ اِفاقہ ہے؟" وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"بڑی حد تک"

"اجازت ہو تو بندی مالش کر دے؟"

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ میں نے اضطرابی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا مگر اُس کے چہرے پر اطمینان چھایا ہوا تھا "جناب کی خدمت بندی کے لیے عزت ہے" وہ دھیمی آواز میں بولی۔

"مگر آپ، آپ۔ ۔ ۔"

"بندی کو جناب کے آرام کے لیے بھیجا گیا ہے"

"جی، جی ہاں" میری آواز گھُٹ رہی تھی۔

"جناب کو ضرور سکون ملے گا"

"جی" میں نے بدحواسی سے کہا "مگر مجھے عادت نہیں ہے"

اُس نے دوبارہ نہیں کہا لیکن میرے جواب سے اُسے مایوسی ضرور ہوئی تھی اسی لیے اُس نے اجازت طلب کی اور اپنی نشست سے اُٹھ کھڑی ہوئی، اُس کی اجازت طلبی پر میں نے جلدی سے سر ہلا دیا تھا۔ پھر میں اُسے دیکھتا اور پکارتا ہی رہ گیا۔ ایک لحظے میں اُس نے سر جھکا کے مجھے آداب کیا، دوسرے لمحے وہ کمرے میں نہیں تھی۔

اُس کے جانے سے کمرہ خالی خالی ہو گیا تھا۔ میں دیر تک مسہری کے پائنتی بے حس و حرکت بیٹھا دروازہ تکتا رہا، وہ جاتے جاتے دروازہ آہستگی سے بند کر گئی تھی۔ دیواری گھڑی کی ٹِک ٹِک نے کمرے میں اور سناٹا کر رکھا تھا۔ اُس سے تو میں نے سر درد کا بہانہ کیا تھا لیکن اب واقعی میرا سر چکرا رہا تھا۔ گھڑی نے چار بجائے تو مجھے وقت کا اندازہ ہوا۔ جانے کتنی بار مجھے دروازے پر دستک کا شبہ ہوا تھا لیکن وہ دوبارہ نہیں آئی۔ اب شاید وہ کبھی نہ آئے۔ وہ میرے بارے میں کوئی اچھا تاثر لے کے نہیں گئی ہو گی۔ مجھے بات کرنا ہی کہاں آتا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر مجھے یہ کیا ہو جاتا ہے۔ آخر مجھے اُس کی بات ماننے میں تامل کیوں تھا۔ اُس نے خود ہی تو پیش کش کی تھی۔ چند لمحوں کے لیے

سہی، مجھے اجازت دے دینی چاہیے تھی۔ کیسے دل کش اور دل نشیں انداز سے باتیں کر رہی تھی۔ آتنا ہی اُس کے سر دبانے کے انداز میں نفاست اور دل کشی ہوگی۔ اُس کے نرم ریشم جیسے ہاتھ میں نے اچھی طرح دیکھے تھے۔ لمبی لمبی انگلیاں، ہتھیلی اور پوروں پر مہندی لگی ہوئی اس طرح، اتنی دیر میں وہ مجھ سے اور مانوس ہو سکتی تھی اور مجھے بہت سی باتیں بتا سکتی تھی جنھیں جاننے کی جستجو مجھ میں کم نہیں تھی اور پھر اُسے تو انھوں نے ہی بھیجا تھا جن کا کوئی لحاظ مجھے مانع ہو سکتا تھا۔ میں نے کتنی مرتبہ ارادہ کیا، خادموں کو بلانے کی ڈوری کھینچ کے دیکھوں کہ وہ پھر آتی ہے یا نہیں، اگر وہ اب کے آگئی تو میں اپنے آپ کو مجتمع رکھوں گا لیکن میں نے ڈوری نہیں کھینچی، بس بستر پر پڑا اپنے آپ کو نوچتا کھسوٹتا رہا۔

کیا عجب کہ اس مرتبہ وہ خود آجائیں یا اُن میں سے کوئی ایک میں نے اُن کی بھیجی ہوئی خادمہ کی پذیرائی نہیں کی ہے لہٰذا وہ خود آ سکتی ہیں۔ اُن کی آمد کے تصور ہی سے میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں نے بستر سے اُٹھ کے کمرے کا عام دروازہ دیکھا کہ کہیں ایسا نہ ہو ایک طرف وہ اندرونی دروازے سے داخل ہوں دوسری طرف کانتے اور زورا وغیرہ میں سے کوئی آجائے۔ عام دروازہ بند ہی تھا۔ سورج غروب ہونے کی وجہ سے کمرے میں روشنی بتدریج کم ہو رہی تھی۔ میں نے ایک بار یوں ہی سارے کمرے کا چکر لگایا اور کھڑکی سے باہر جھانک کے دیکھا۔ اطراف میں سکوت چھایا ہوا تھا، پھر میں بستر ہی پر آگیا۔ کوئی نہیں آیا۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی کہ آخر یہ سب کیا ہے۔ مجھے کاہے کی بے کلی ہے، جانے کب تک میں خود سے باتیں کرتا رہا اور جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔

دوبارہ دستک کی آواز پر میری آنکھ کھلی اور میں لیٹے لیٹے اُچھل گیا۔ کمرے میں گہرا اندھیرا طاری تھا۔ میری نظریں سیدھی اندرونی دروازے پر گئیں۔ اندھیرے کی وجہ سے دروازہ بالکل نظر نہیں آرہا تھا لیکن کان بھی تو سمتیں دیکھتے ہیں، اس طرف کے بجائے کوئی شخص عام دروازہ کھٹ کھٹا رہا تھا۔ جی میں آئی کہ جوں کا توں پڑا رہوں، زورا اور کانتے میں سے کوئی ہوگا۔ خود ہی واپس چلے جائیں گے مگر پھر میں نے اُٹھ کے دروازے کی چٹخنی گرادی۔ کانتے تھا۔ "سو رہا تھا کیا؟" وہ دروازے پر کھڑے کھڑے بولا۔

"ہاں۔" میں نے آنکھیں مسلتے ہوئے کہا۔ "نیند آگئی تھی۔"

"تو پھر سو ہی جا۔ میں چلتا ہوں۔" وہ جانے لگا۔

میں نے اُس کا بازو پکڑ کے روک لیا۔ "بیٹھو نا، کوئی خاص بات ہے کیا؟"

"کچھ نہیں لاڈلے! دوپہر کھانے کے بعد سے دکھائی نہیں پڑا تھا، سو چا جا کے پوچھتا کر لوں۔"

"کیا وقت ہوا ہے اب؟"

"آٹھ بج رہے ہوں گے رے۔"

"آٹھ!" میں نے حیرت سے کہا۔

"نیند آرہی ہے تو تھوڑی سی اور کھینچ لے، سالی کب کی رُکی ہوئی ہوگی۔"

میں نے اُسے اندر کھینچ لیا اور دیوار ٹٹول کے روشنی کی۔ [روشنی] ہوتے ہی وہ سیٹیاں بجانے لگا۔ "لاڈلے! لاڈلے!" وہ سرسراتی آواز میں بولا۔ "یہ تیرا ہی ٹھکانا ہے کیا؟"

"ہاں! کیوں؟"

"اِدھر تو نقشہ ہی دوسرا لگتا ہے۔"

"کیسا نقشہ؟"

"ریڈیو، باجا اور، اور۔ ۔ ۔" وہ دیدے نکال کے بولا۔

"ادھر تو سالی دنیا ہی بدلی پڑی ہے۔"

"ہاں۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "تمھارے کمرے میں اُدھر نہیں ہے؟"

"تو نے دیکھا نہیں کیا؟"

"میں اُدھر کب گیا ہوں۔"

دوپہر کھانے سے پہلے تو کدھر بیٹھا تھا۔"

"ہاں، میں تو بھول ہی گیا۔" میں نے خجالت سے کہا۔

"کیا ہو گیا ہے رے تجھ کو؟"

"کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ مجھے یہ کمرہ [مل] گیا۔ کسی نے انتخاب تو نہیں کیا تھا۔"

"پر سویرے اِدھر یہ سارا مال پانی نہیں تھا، تجھ کو پتہ نہیں کہ سویرے ہم لوگ اِدھر جھانک کے گئے تھے جب تو نیچے گیا تھا۔"

"مگر، مگر میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" میں نے تندی سے کہا۔

"چکر کیا ہے لاڈلے؟"

"کاہے کا چکر؟"

"کاٹ کھانے کو کیوں دوڑتا ہے، قسم سے اپنے کو تیرا رنگ ہی بدلا لگتا ہے۔" وہ تیکھے لہجے میں بولا اور میری ٹھوڑی اُٹھا کے آنکھ میں جھانکنے لگا۔ میں نے اُس سے نگاہیں ملانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ وہ ہنکاری بھرتا ہوا بولا۔ "ایک بات بولیں لاڈلے؟"

"کیا ہے؟"

"اچھے لوگ جان پڑتے ہیں۔"

"کون لوگ؟" میں نے تنک کے کہا۔

"یہی حویلی کے لوگ باگ۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"اپنے کو کچھ نہیں بولنا، پر لاڈلے۔ ۔ ۔" وہ کچھ کہتے کہتے رُک [گیا]۔ اُس کا چہرہ بھاری ہو گیا تھا۔

"کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں جانی! جا، جا کے مُنہ ہاتھ دھولے۔"

"نہیں بتاؤ۔ تم کیا کہہ رہے تھے؟"

وہ آنا کانی کرنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ میری ضد سے وہ اُڑ [جا]ئے گا لیکن مجھے بے چینی رہی۔ اُس کے کہنے پر میں نے غسل خانے [میں جا] کے جلدی جلدی مُنہ ہاتھ دھویا اور کنگھی کی۔ کانتے نے خاص دان [سے]، پان نکال کے ایک بیڑا مجھے کھلایا، ایک خود کھایا اور مسہری کے [سا]منے نصب شیشے میں اپنا چہرہ دیکھتا ہوا باہر آگیا۔ باہر ہلکی ہلکی [ہوا] چل رہی تھی اور حویلی میں دُور و نزدیک روشنیاں جل رہی تھیں۔ [کان]تے نے بتایا کہ شام تک سبھی اپنے اپنے کمروں میں آرام کر رہے تھے، [ک]چھ دیر پہلے نیچے آئے ہیں۔ وہ سب نچلی منزل کی اُس نشست گاہ [میں م]وجود تھے جہاں ہم کل رات بیٹھے تھے۔ اُن کے علاوہ کمرے میں [کوئی] نہیں تھا۔ تمام دروازے اور کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور درمیان [میں] بڑے فانوس نے سارا کمرہ بقعۂ نور بنایا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی [ا]پنے پاس بلا لیا اور میری گردن پکڑ کے کئی جھٹکے دیے۔ میری چیخ نکلتے رہ گئی۔ "کیسے ہو سجنا؟" وہ مُسکراتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہوں۔" میں نے آہستگی سے جواب دیا اور بے ارادہ [میر]ے مُنہ سے روانگی کے بارے میں نکل گیا، شاید اُس کے چہرے [پر نا]گواری دیکھ کے۔

"چلیں گے رے، جلدی چلیں گے۔" وہ میرا ہاتھ تھپکتے ہوئے [بولا۔ "]جیا نہیں ٹِک رہا ہے کیا؟"

"نہیں، نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "میں تو یوں ہی پوچھ رہا [تھا۔" م]یں نے یہ جتانا ضروری سمجھا کہ میں اُسے ٹوک نہیں رہا ہوں۔

"ہاں، ہاں، اپنے کو پتہ ہے۔ متھا تیرا کچھ صاف دکھائی دے [رہا] ہے۔ اچھا ہے، ذرا کمر ایک دو دن سیدھی کر لے۔"

وہ مجھ سے یہ کہہ ہی رہا تھا کہ بڑا نواب کمرے میں داخل ہوا۔ [اُس] نے کچھ دیر ضرور آرام کیا ہوگا، تازہ دم نظر آرہا تھا۔ سب اُٹھ گئے تھے لیکن نواب تیزی سے اباجان اور منیر علی کے پاس چوکی پر بیٹھ گیا اور باری باری ہم سب کا حال پوچھنے لگا۔ اُسے آئے ابھی چند لمحے ہوئے تھے کہ ایک خادم لپکتا ہوا اندر آیا۔ اُس نے نواب کے پاس جا کے سرگوشی میں کچھ کہا۔ "کہاں ہیں؟" نواب اُونچی آواز میں بولا۔

"باہر تشریف فرما ہیں۔" خادم نے مؤدبانہ جواب دیا۔

نواب نے اضطراب سے اباجان کی طرف دیکھا پھر بٹھل کی جانب اور شائستگی سے بولا۔ "ہمارے عم زاد نواب حشمت جنگ آئے ہوئے ہیں۔"

اباجان کوئی جواب نہ دے سکے، اُن کی متذبذب نظر فوراً بٹھل کی جانب اُٹھی۔ بٹھل نے بوجھل آواز میں کہا۔ "اُن کو ادھر ہی بلا لیا جائے۔"

"ہمارا بھی یہی خیال ہے۔ آپ حضرات اُن سے مل کے یقیناً خوش ہوں گے۔" نواب تمتماتے لہجے میں بولا۔ "وہ ایک نفیس آدمی ہیں۔ انھوں نے فون پر آپ صاحبان سے ملنے کی خواہش بھی ظاہر کی تھی۔"

"ہم بھی اُن کو دیکھنا چاہتے تھے۔" اگر نواب کے لہجے میں کوئی معنی خیزی نہیں تھی تو بٹھل کی آواز بھی آلودگی سے صاف تھی۔

"آپ انھیں جانتے ہیں؟"

"تھوڑا بہت۔" بٹھل نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "رات آپ بھی اُن کے بارے میں کچھ بول رہے تھے۔"

"جی ہاں، وہی۔" نواب خوش دلی سے بولا اور چوکی سے اُٹھ گیا۔ "اُن سے ہمارے کئی رشتے ہیں بلکہ یہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ اسی گھر کے ایک فرد ہیں۔"

نواب کے منع کرنے کے باوجود اباجان اور منیر علی بھی اُس کے ساتھ اُٹھ گئے۔ میں، پیرو، بٹھل، زورا اور کانتے بھی کھڑے ہوگئے۔ اباجان اور زورا کو یہاں دیکھ کے نواب حشمت جنگ کا کیا حال ہو سکتا ہے۔ آنے والے لمحوں کا تصور میری طرح سبھی کے لیے ہیجان انگیز ہوگا۔ میں نے اباجان اور زورا کے چہرے دیکھنے چاہے، لیکن وہ دونوں آگے بڑھ چکے تھے۔ خادم پہلے ہی باہر چلا گیا تھا۔ بڑا نواب ابھی اندر ہی تھا، معاً دروازے پر درمیانے قد، گہرے سُرخ رنگ کا، ترکی ٹوپی اور سلیٹی شیروانی پہنے ایک بھاری بھرکم شخص اندر داخل ہوا۔ وہ نواب حشمت جنگ ہی ہوگا، اتنا بھاری بھی نہیں تھا کہ اُسے موٹا کہا جائے۔ دروازے ہی سے اُس نے سب کو آداب کیا۔ بڑے نواب نے ہمارے بارے میں کچھ کہنا چاہا مگر دوسرے ہی لمحے جیسے سب کچھ غت ربود ہو گیا۔ نواب حشمت جنگ صرف چند قدم بعد ٹھٹک کے رُک گیا۔ اُس کی آنکھیں اچانک پھیل گئیں۔ اباجان

اور زورا پہ اُس کی نظر پڑگئی تھی مگر ابّا جان نے اُسے حیرانی کی اتنی مہلت نہیں دی، لرزتے اور مُسکراتے لبوں سے اُسے سلام کیا اور دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ نواب حشمت جنگ استعجاب کے عالم میں اُن سے بغل گیر ہوا۔ "آپ؟ ـ ـ ـ"

"شاید صدقِ طلب کا کرشمہ ہے۔" ابّا جان کی آواز بھرٹک رہی تھی۔

نواب کو پھر بھی یقین نہیں آیا۔ اُس نے سر گھما کے متوحش نظروں سے ہم سب کو دیکھا پھر اُس کی نظریں ابّا جان کے چہرے پہ آ کے جم گئیں۔ "ہمیں شبہ ہے کہ ہم کسی خواب سے دوچار ہیں۔"

"ایک اچھے خواب سے۔" ابّا جان نے ٹھیرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بے شک، بے شک۔" نواب حشمت جنگ سٹ پٹاتے انداز میں بولا۔ "ہمیں آپ کو یہاں دیکھ کے مسرت ہوئی۔ یہ بھی ہمارا ہی گھر ہے مگر بخدا، ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔"

"آپ تشریف تو رکھیے۔ سلسلے ملانے پر آئے تو قسمت عجب تماشے دکھاتی ہے۔" ابّا جان نے سکون سے کہا۔ "ہمارے لیے بھی اس حویلی سے آپ کے تعلق کی خبر بہت حیران کُن تھی۔ رات ہی نواب صاحب قبلہ نے آپ کی نسبت کچھ فرمایا تھا۔"

"آپ ہمارے بھائی سے واقف ہیں؟" بڑے نواب نے بے کلی سے کہا۔ "مگر آپ نے، آپ نے ہمیں نہیں بتایا تھا؟"

"ہم اس ملاقات کا لُطف کھونا نہیں چاہتے تھے۔" ابّا جان نے اعتماد سے کہا۔ "اور کوئی معتبر حوالہ دینے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی اور پھر نواب صاحب قبلہ سے ہماری شناسائی کو دن بھی کتنے ہوئے ہیں۔"

"چند دن، محض چند دن۔" نواب حشمت جنگ تیزی سے بولا۔ "جہانی میاں! ہم نے آپ کو بزرگِ محترم کے متعلق بتایا نہیں تھا؟ یاد نہیں آپ کو؟ اوہ، یہ سب کتنا عجیب ہے۔ جہانی میاں! یہ ہمارے وہی کرم فرما ہیں جنھوں نے بہ کمال عنایت ہمیں وہ نادر، بیش بہا پتھر عطا فرمایا تھا۔"

بڑے نواب کی پیشانی سکڑ گئی؛ سنسناتے لہجے میں بولا۔

"آپ سچ کہہ رہے ہیں حشمت بھائی؟"

"ہاں ہاں، اور ہم نے آپ سے کہا نہیں تھا کہ ہم کسی مناسب وقت پر اپنے اجنبی بزرگ، اپنے حاتم صفت محسن سے آپ کو ملوائیں گے۔ آپ ادھر اپنی پریشانیوں میں گھرے ہوئے تھے اس لیے ہم ٹھیرے رہے مگر یہ کیسے؟ یہ سب کیسے؟" وہ متلاطم آواز میں بولا۔ "جہانی میاں! براہِ کرم ہمیں بتایئے۔"

"کیا عرض کریں، ایک طویل رُوداد ہے۔" بڑے نواب نے بکھرے لہجے میں کہا۔ "یوں سمجھیے حشمت بھائی! ہماری باری آگئی تھی۔ اس بار ہمارے مہربان بزرگ کے جود و سخا کے لیے ہمارے خانوادے کی باری آگئی تھی۔ قبلۂ محترم نے اگر آپ کو ایک بے نظیر ہیرے سے نوازا ہے تو ہمارے لیے سب سے بے بہا سوغات لائے ہیں۔ یقین کیجیے، ہمیں آپ سے زیادہ ملا ہے، اُس کا کوئی مول نہیں ہے۔"

"کہیں قبلۂ عالم کا تعلق بھی اُنھی حضرات سے تو نہیں جو عالم تا... عالم تاب ـ ـ" نواب حشمت جنگ کی حیرت زدہ آواز حلق میں اٹک گئی۔

بڑے نواب نے سر جھکا لیا۔ "آپ کو اگر اپنے گرامی قدر نوشناساؤں کی دید سے ہمیں مشرف کرانے کا اشتیاق تھا تو ہم بھی ادھر اپنے مسیحا نفس، اپنے والا مرتبت مہمانوں سے آپ کو ملوانے کے لیے بے تاب تھے۔"

نواب حشمت جنگ کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ جلتی بجھتی آنکھیں، وہ شش و پنج کی کیفیت میں دو چار لمحوں تک ساکت کھڑا رہا۔ بھل، پیرو اور ہم سب بھی خاموش کھڑے کبھی ابّا جان کو دیکھ رہے تھے، کبھی بڑے نواب کو اور کبھی اُسے۔ پھر ابّا جان ہی نے پہل کی۔ انھوں نے ایک قدم آگے بڑھ کے نواب حشمت جنگ کے شانے پہ ہاتھ رکھا تو اُس نے دیوانہ وار اُنھیں گلے لگا لیا۔ بڑے نواب اور ابّا جان کے ساتھ وہ تخت پر آگیا تھا۔ اُس کا سارا وجود کھِلا ہوا تھا۔ ابّا جان نے اُس کی خیریت پوچھی تو اُس نے شکایت آمیز شائستگی سے جواب دیا کہ وہ کل رات ابّا جان کی نئی حویلی گیا تھا، پھر صُبح دفتر جاتے ہوئے گیا تھا۔ رات اُسے بتایا گیا تھا کہ ابّا جان کسی ضروری کام سے دُور گئے ہیں۔ صبح اُسے بتایا گیا کہ شہر سے دُور گئے ہیں۔ اُسے حیرت تھی کہ ابّا جان نے اچانک کہاں کا قصد کر لیا، اُس سے ذکر بھی نہیں کیا۔ کہنے لگا کہ یہ تو اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ ابّا جان اُس کے اتنے قریب ہیں، اُس کے اپنے گھر میں ہیں پھر ابھی وہ ابّا جان کے پہلو سے لگا شیفتہ و وارفتہ انداز میں یہ باتیں کر رہا تھا کہ خاں صاحب نے آ کے کھانا چُنے جانے کی اطلاع دی۔ نواب حشمت جنگ بھی ابّا جان کا ہاتھ تھامے تھامے کھانے کے کمرے میں آیا اور اُس نے میزبان ہی کی طرح ہم سب کو بٹھایا۔ مجھے اندازہ تھا کہ جلد یا بدیر اُس پر نئی نئی حیرتیں مسلّط ہونی چاہئیں۔ اُس کی یہ بے ساختگی غیر اختیاری تھی۔ ابّا جان کو یہاں دیکھ کے پہلا فطری ردِ عمل، لیکن رفتہ رفتہ اُس کے ذہن میں طرح طرح کے سوال گو
بھی لازم تھے، اور یہی ہوا، کھانے کے دوران وہ کھویا کھویا نظ

نے لگا۔ اُس کا لمحہ بہ لمحہ بڑھتا ہوا اضطراب اُس کے چہرے سے یاں تھا۔ یہ مجلسی آداب کے خلاف تھا کہ اتنے لوگوں میں وہ کوئی ا سوال کرے جس کا جواب ماحول کی شگفتگی مُرجھا دے، کچھ نہیں جا سکتا تھا کہ بڑے نواب نے اس دوران اُسے کیا کیا بتایا لہ خانم کو ساتھ لانے والے لوگ کون ہیں۔ یہ تو اُسے معلوم ہی گا کہ خانم بازار سے کن لوگوں کے ساتھ گئی تھی، جنھوں نے اُس ت شاہ کبیر جیسے آدمی سے بازار کا اڈّا چھین لیا تھا اور جنھوں نے رے اسٹیشن پر نواب عالم تاب کی گردن پر چاقو رکھ دیا تھا۔ بازار ایک عورت ابّا جان اور اُن کے ساتھ آنے والوں سے وابستہ تھی۔ سب کچھ نواب حشمت جنگ کو بہت پُراسرار نظر آرہا ہوگا۔ ابّا جان یدر آباد کے سب سے بڑے ہوٹل میں قیام، اُس کے گھر کسی تعارف ے بغیر آمد اور کسی جائز و ناجائز کام کی گزارش و سفارش کے بغیر ایک معمولی ہیرے کا نذرانہ۔ ایک بڑی حویلی کی نقد خریداری اور یہاں ن کے ساتھ موجود نئے لوگوں کے چہرے۔ ابّا جان اور زورا کے وا ہم میں سے کسی کو اُس نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ خود بڑے نواب دا ابّا جان اور حشمت جنگ کے تعلق، ہیرے کی سخاوت وغیرہ کی یرت کم نہیں ہوگی لیکن اُس کی بات دوسری تھی۔ درمیان میں ایک مل دن گزر چُکا تھا۔ اڈّے پر آنے والے لوگوں اور وہاں گزرنے لے واقعات سے وہ پہلے ہی واقف تھا۔ اتنی انوکھی باتیں جاننے کے بعد اُس کے خیال میں اب سب کچھ ممکن ہوگا۔ اُس کی مطلوبہ ستی خانم بہرحال حویلی میں موجود تھی اس لیے باقی سب جُوں کا توں ی قبول کر لینا چاہیے تھا۔ خانم کی آمد کے بعد سارے سوال غیر ضروری تھے۔

"ہمیں بھی وہ نادرِ روزگار ہیرا دیکھنے کا موقع ملا ہے، یقیناً ہی مثال آپ ہے۔ ایک عرصے بعد ہم نے ایسا نفیس پتھر دیکھا ہے۔" کھانے کے دوران بڑے نواب نے کہا۔ اُسے نواب حشمت نگ کی مضطربانہ کیفیت کا کچھ احساس ہو چلا تھا۔ حشمت جنگ چند لمحے پہلے گُم سُم سا ہو گیا تھا۔ یہ بات اُسے ٹوکنے کے مترادف تھی۔

نواب حشمت جنگ سنبھل گیا اور مچلتے لہجے میں بولا۔ "روز بہ روز ہم پر اُس کی قدر و قیمت منکشف ہو رہی ہے۔ ہم سے رہا نہ گیا تھا، و سب سے پہلے اُسے لے کے ہم اپنے بھائی جہانی میاں ہی کے اس آئے تھے۔ یہ اُسے دیکھ کے دنگ رہ گئے تھے۔ پوچھنے لگے، شمت بھائی! سچ بتایئے، کہاں سے دستیاب ہوا۔ ہم نے کہا، بس یک سخی دے گیا، سمجھو، آسمان سے بھیجا گیا ہے۔ دروازے پر سائل ی آتے رہے ہیں، اب کے ایک سخی آیا تھا۔ اِنھیں یقین نہیں آیا۔ کسی کو بھی نہیں آتا۔ اِدھر ہم نے ریاست کے ایک جوہر شناس کو دکھایا تھا۔ دیر تک زاویے بدل بدل کے نظّارہ کرتے رہے۔ پوچھا، کس سے ملا؟ ہم نے وہی بات بتائی جو جہانی میاں کو بتائی تھی۔ اُنھیں بھی کیوں یقین آتا چنانچہ اُن کی تسلّی کے لیے ہمیں بات بنانی پڑی کہ ہمارے خاندان کے ایک قدیم مربّی، ایک بزرگ زمانے بعد ریاست تشریف لائے تھے، اُنھوں نے ہمارے جد سے اپنی کسی وابستگی کے اظہار میں ازراہِ لُطف و عنایت ہمیں عطا فرمایا ہے۔ اُن کے خیال میں ہمارے سوا اب اور کوئی اِس کا مستحق نہیں تھا۔" نواب حشمت جنگ نے پشیمانی کے انداز میں ابّا جان سے کہا۔ "ہم یہی کچھ کہہ سکتے تھے، مگر اُنھیں دکھانا ہی غلط ہوا۔ پھر جانے ریاست کے کِس کِس صاحبِ ذوق نے ہم سے فرمائش کی۔ بات رنگ کوٹھی تک بھی پہنچ گئی۔ اتّفاق سے اِن دنوں مہاراجا بنسی دھر بھی میسور سے آئے ہوئے ہیں۔ اُن کے بارے میں مشہور ہے کہ والیانِ ریاست کو چھوڑ کے اگر کسی کے پاس نادر ترین ہیروں کا ذخیرہ ہے تو مہاراجا بنسی دھر کے پاس۔ کیوں جہانی میاں؟"

"جی ہاں، ہیروں سے مہاراجا کے شوق کی تو عجب عجب داستانیں مشہور ہیں۔" بڑے نواب نے متجسّس لہجے میں حشمت جنگ کی تائید کی اور ابّا جان کو بتایا کہ بس اُسے کسی اچھے ہیرے کی بھنک ملنی چاہیے۔ مہاراجا کو اُس وقت تک چین نہیں آتا جب تک اُسے دیکھ نہ لے۔ اور دیکھنے کے بعد اگر کہیں پسند آجائے تو سمجھیے مہاراجا کی نیندیں حرام ہوگئیں۔

"اس مرتبہ بھی کچھ یہی ہوا۔" نواب حشمت جنگ دمکتی آواز میں بولا۔ "مہاراجا نہایت ذوق و شوق کے عالم میں آئے تھے۔ ہم نے ہیرا سامنے رکھ دیا، نہ پوچھیے، کیا حال ہوا اور سچ پوچھیے تو اُس وقت ہمیں اُس کی اصلی قدر و قیمت کا اندازہ ہوا، مہاراجا کی خیرہ آنکھیں اور اُن کے چہرے پر آتے جاتے رنگ دیکھ کے۔ ہیروں کی تھوڑی بہت پہچان ہمیں بھی ہے لیکن مہاراجا کا تو مشغلہ یہی ہے۔ اس معاملے میں اُن کی نگاہ مستند ہے۔ مہاراجا نے بے تابانہ وہی سوال کیا۔ ہمارے جواب سے مطمئن نہیں ہوئے، جھجکتے ہوئے کہنے لگے، آپ کا کچھ اور خیال تو نہیں ہے۔ ہم نے عرض کیا، جنابِ والا یہ ایک تحفہ ہے۔ وہ خاموش ہو گئے، کچھ توقف کے بعد بولے۔ "کون ایسا دھنی تھا جس نے آپ کو یہ انمول چیز بھینٹ کی ہے۔ ہمیں بتایئے، شاید ہم بھی جانتے ہوں۔ آپ کے والدِ گرامی کے بیشتر اعزّا و احباب سے ہمیں نیاز حاصل ہے۔" ہم نے جواب دیا۔ ایک زمانے بعد وہ ریاست تشریف لائے

ہیں۔ والدِ محترم کے حوالے کے بغیر ہمارے لیے بھی وہ اجنبی ہی تھے۔ اُن کا تعلق ریاست سے نہیں، شمالی ہندوستان سے ہے۔ مہاراجا سے اور لُطف لینے کے لیے ہم نے کہا، گمان ہے کہ اُن کے پاس اور بھی نادر پتھر ہوں گے۔ سر ہلانے لگے اور فرمایا، کیا اُن سے ہماری ملاقات ممکن ہے؟ جواب میں ہمارے تامّل و تذبذب پہ وہ اور بے قرار ہو گئے۔ بولے، برِصغیر اور کسی حد تک یورپ میں بھی شاید ہی ہیروں کا کوئی بڑا پارکھ رہ گیا ہو جس سے ہم واقف نہ ہوں، مہاراجا غلط نہیں کہہ رہے تھے۔ ہم نے عرض کیا، ہم اپنے بزرگ کو ملاقات کی خواہش ضرور منتقل کر دیں گے، ہر چند کہ وہ ایک گوشہ نشیں شخص ہیں۔ اُنھیں حیدرآباد سے جانے کی بھی جلدی ہے۔ اگر قیام طویل ہوا تو اب ورنہ دوبارہ واپسی پر انشا اللہ۔ فرمایا، ہم اسے عزت افزائی سمجھیں گے۔"

"گویا آپ نے مہاراجا کی آتشِ شوق اور بھڑکا دی ہے؟" بڑے نواب نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"اُن کی حالت دیدنی تھی۔ بعد میں احساس بھی ہوا کہ ہمیں صاف منع کر دینا چاہیے تھا۔ ہم کوئی بھی عذر کر دیتے۔ مہاراجا کی حالت بے چارگی کی سی تھی، اور بخدا، حویلی کی کسی اور چیز میں وہ ایسی رغبت ظاہر کرتے تو ہم اُن کی نذر کر دیتے۔ ہم تو گھبرانے لگے تھے کہ مہاراجا ہم سے زیادہ تفصیلات نہ پوچھنے لگیں، ہم اُنھیں کیا بتا پائیں گے۔ کیوں کہ اس سے زیادہ ہم خود کتنا جانتے ہیں۔ ہم اُن سے کیا عرض کریں کہ ابھی تو خود ہم پر ایک طلسمِ حیرت طاری ہے۔ ہم اپنے اس بزرگ کی اس نوازش کی ہزار تشریحیں کرتے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ ضرور ہماری کوئی آزمائش ہے۔ ہم اس بے کراں، بے پناہ شفقت و محبت کے متحمل بھی ہو سکیں گے کہ نہیں۔" نواب حشمت جنگ کے لہجے میں معذرت اور تشکر کے علاوہ تشویش بھی شامل تھی۔ وہ بڑے نواب سے پوچھنے لگا۔ "جہانی میاں! آپ ہی بتائیے، اگر مہاراجا واقعی اِدھر اُدھر کے سوال کرنے لگتے! قبلۂ عالم سے۔" اُس کا اشارہ ابّا جان کی طرف تھا۔ "کوئی بات کیے بغیر، کچھ جانے بغیر ہم واضح طور پر کیا کہہ سکتے تھے۔ مہاراجا، ہمارے گھر تشریف لائے تھے۔ اُن سے قدیم روابط کا تقاضا تھا کہ ہم اسی طرح کچھ عرض کریں اور کم و بیش یہی کچھ تھا۔"

"آیندہ کبھی ضرور مہاراجا سے نیاز حاصل کریں گے۔" ابّا جان نے تیزی سے کہا۔ اُن کے ہونٹوں پر پھیکی پھیکی مُسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ "ہمیں جلد ہی واپس جانا چاہیے۔ قبلہ نواب صاحب کا اصرار تھا۔ انکار مشکل ہو گیا۔ انشا اللہ جلد واپسی ہو گی۔"

"ہمیں یقین ہے کہ کل صبح مہاراجا کا کوئی قاصد آئے گا یا ٹیلی فون وہ خود بھی تشریف لا سکتے ہیں۔" نواب حشمت جنگ نے کسی قدر اُلجھے ہوئے انداز میں کہا۔

"سرِ دست تو ہماری طرف سے معذرت ہی چاہ لیجیے۔" ابّا جان اُکتائی آواز میں بولے۔

"ہماری بھی یہی منشا ہے مگر اندیشہ یہ ہے کہ مہاراجا کچھ اور نہ خیال فرمائیں۔ جہانی میاں کے بہ قول یہ عذر کہیں مہمیز کا کام نہ دے۔ بہرحال ہم اُن سے کسی طرح نمٹ لیں گے۔ اپنے محترم بزرگ کے لیے کسی طرح بھی بارِ خاطر ہونا ہمیں گوارا نہیں۔ یہ ذکر تو یوں ہی آ گیا تھا۔ یہاں ملاقات کا یہ خوش گوار حادثہ پیش نہیں آ جاتا تو شاید ہم تذکرہ بھی نہ کرتے۔ اصل میں بات اتنی بھی اس باعث بڑھی کہ ہمیں کچھ ایسا گمان ہوتا ہے، ہمارے محترم نے فرمایا تھا کہ آپ کے پاس کچھ اور بھی نوادر ہیں۔ یہ بات ہمارے ذہن میں کہیں محفوظ تھی چنانچہ ہماری یہ خواہش غیر ارادی سہی مگر غیر شعوری نہیں تھی کہ مہاراجا سے بہتر کون ان کا قدر داں ہو سکتا ہے۔"

میں نے دیکھا کہ بٹھل کے ماتھے پر سلوٹیں پڑی ہوئی ہیں مگر اُسے درمیان میں نہیں بولنا چاہیے تھا، وہ نہیں بولا۔ قہوہ پیتے ہی سب کھانے کے کمرے سے اُٹھ گئے اور موضوع خود بہ خود بدل گیا۔ نشست گاہ کی طرف آتے ہوئے راستے میں بڑے نواب نے میری طرف اشارہ کر کے نواب حشمت جنگ کو میری اور ابّا جان کی نسبت بتائی۔ حشمت جنگ چلتے چلتے رُک گیا۔ اُس کی آنکھوں میں تیز چمک ہویدا ہوئی۔ میرے قریب آ کے اُس نے مجھے گلے لگا لیا۔ "ماشا اللہ، ماشا اللہ۔ ہم یہی سوچ رہے تھے کہ عزیزِ مَن کے خال و خط میں قبلۂ محترم سے کون سی مشابہت موجود ہے۔" وہ میرے شانے پکڑ کر زور زور سے ہلانے لگا۔ "کیا خوب! آپ سے مل کے عجب شادمانی محسوس ہو رہی ہے۔" میں نے بدبدلتے ہونٹوں سے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ اُس کی آنکھیں سرتاپا میرے گرد منڈلا رہی تھیں۔ "یہی صحت اور تناسب رکھیے گا۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "ہماری طرح نہیں۔ کسی زمانے میں ہم بھی آپ کے مانند دل کش اور چاق و چوبند نظر آتے تھے۔"

"اب بھی آپ لاکھوں میں منفرد ہیں۔" بڑے نواب نے کھل کھلا کے لقمہ دیا۔

"کہاں جہانی میاں! اب تو آئینہ دیکھتے ہوئے شبہ ہوتا ہے جب سے ٹینس چھوٹی ہے، سارا جسم ناراض ہو گیا ہے۔" معاً وہ مجھ سے مخاطب ہو کے بولا۔ "آپ بھی کچھ کھیلتے ہیں؟"

"جی، جی ہاں۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"یقیناً کسی میں کمال بھی حاصل ہو گا۔"

"کسی میں بھی نہیں۔"

"دل چسپی کس میں ہے؟" وہ اشتیاق سے بولا۔

میں اُسے کیا بتاتا۔ چاقو بازی، لاٹھی، بلّم، پٹّا، بل اور اڑاگیری۔ میں نے یہی کھیل کھیلے ہیں۔ میں کون کون سے کرتب کا نام لیتا۔ اسکول کے زمانے میں فٹ بال، بیڈمنٹن اور کبڈی تھوڑی بہت کھیلی تھی۔ اُس کے بعد موقع ہی نہیں ملا۔ دونوں کی سوالیہ نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے کچھ نہ کچھ تو بتانا تھا۔ اگر میں یوں ہی کسی کھیل کے بارے میں کہہ دیتا تو وہ مجھ سے اور تفصیلات پوچھنے لگتا۔ میرے مُنہ سے نکل گیا "نشانے بازی۔"

"اچھا۔" اُس کی آنکھیں کھُل گئیں۔ بڑے نواب کی نگاہیں بھی مجھ سے چار ہوئی تھیں مگر دوسرے لمحے اُس نے اپنا سر جُھکا لیا تھا۔ "کون سا نشانہ؟" نواب حشمت جنگ نے تعجب سے پوچھا۔ "ہماری مراد ہے کس ہتھیار کی نشانے بازی سے آپ کو شغف ہے؟"

"سبھی سے تھوڑا بہت۔" میں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"پھر تو ہماری آپ سے خوب نبھے گی۔" وہ جوشیلی آواز میں بولا۔ "جواں مردوں کو یہی شوق ہونا چاہیے لیکن کوئی خاص ہتھیار، ہمارا خیال ہے بندوق؟"

"ہتھیار کوئی بھی ہو، نشانہ تو نگاہ کا ہوتا ہے۔" مجھے بٹھل کی بات یاد آ گئی، میں نے دُہرا دی۔

"کیا خوب!" وہ اچھل کے بولا۔ "بے شک، بے شک۔"

بڑے نواب نے اُس سے دوسرے لوگوں کا تعارف نہیں کرایا تھا۔ حشمت جنگ نے بھی جستجو ظاہر نہیں کی۔ وہ ایک معاملہ فہم اور مجلسی آدمی معلوم ہوتا تھا۔ بڑے نواب نے باقاعدہ تعارفی رسم انجام نہیں دی تھی لہٰذا اُسے بھی کرید نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اس حویلی سے اُس کا تعلق بڑے نواب جتنا نہیں تو کم بھی نہیں تھا۔ خانم کے آنے کی خبر نواب حشمت جنگ نے کسی بھی طرح سُنی ہو، خانم کی موجودگی اُس کے لیے کوئی معمولی واقعہ نہیں ہو گی۔ اُس کی بہن گیتی نواب عالم تاب کی بیگم کی حیثیت سے حویلی میں موجود تھی مگر گیتی کے مانند اُس کے چہرے پر کوئی تردّد دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض لوگ چہرہ چھپانے میں بہت طاق ہوتے ہیں، ایسے تو یہ ہنر کسی نہ کسی حد تک سبھی کو آتا ہے اور ہمیشہ لوگ ایک دوسرے سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔

نشست گاہ میں وہ کچھ ہی دیر بیٹھے۔ پھر خادم کی اطلاع پر حویلی کے ایک اور حصّے میں چلے آئے۔ یہاں قالین بچھے ہوئے اور گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ بٹھل کے لیے حقّہ بھی تیار تھا۔ فرش کے وسط میں گلابوں کے ڈھیر میں اگر دان رکھا تھا۔ اگر بتیاں سلگ رہی تھیں اور ہر طرف خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ یہ ایک ہال کمرہ تھا، حویلی کے دوسرے مرصّع کمروں کے مانند۔ یہاں آ کے معلوم ہوا کہ موسیقی کا اہتمام ہے۔ ہمارے لیے مخصوص نشستوں کے عین مقابل کچھ فاصلے پر سیاہ شیروانیوں میں ملبوس قوّال بیٹھے تھے۔ یہ منظر دیکھ کے کانتے اور زورا مجھ سے چمٹ گئے۔ "قسم سے راجا! ابھی تھوڑا جان بنے گا۔" زورا بے تابی سے بولا۔ کانتے نے چُپکے سے میرے کان میں کہا۔ "نواب تو تا تھیا کا ڈول ڈال رہا تھا، دونوں بابوں کی وجہ سے دبارہ گیا۔"

"اُس نے ابّا جان اور منیر علی سے پوچھا تھا کیا؟"

"اشارہ کیا تھا۔" وہ سرگوشی میں بولا۔ "دونوں گردن ڈالے بیٹھے رہے، پھر قوّالی پہ ہی اُترنا تھا اُس کو۔ اِدھر کا مُجرا بھی سالا ایک ہوتا لاڈلے! سوچا، استاد کو ٹھیکا لگاؤں کہ الگ الگ بٹھوا دو، پر سالی زبان آگے کو نہیں چلی۔"

"کانتے بھائی!" میں نے اُس کا شانہ تھام کے کہا۔ "میں چلتا ہوں۔"

"کیوں لاڈلے؟" وہ ترشی سے بولا۔

"میں کمرے میں جا کے آرام کروں گا۔"

"آرام تُو نے ابھی تھوڑا کیا ہے۔"

"مگر مجھے نیند آ رہی ہے، ابھی موقع ہے، میں جا سکتا ہوں۔"

"ایسی کیا جلدی ہے تجھ کو!"

"کیا ضروری ہے کہ میں بھی شریک ہوں۔"

"چھوٹے موٹے لوگ نہیں آئے ہوں گے لاڈلے! اصیلوں کو ہی بلایا گیا ہو گا۔ اِدھر اُتیس مال نہیں چلتا۔ تھوڑی دیر ٹھیر جا، رنگ دیکھ کے فیصلہ کرنا۔ اُدھر کمرے میں اکیلا بھاڑ جھونکے گا کیا؟"

"بس مجھے جانے ہی دو کانتے بھائی!"

مجھی سے غلطی ہو گئی تھی۔ کاش دوپہر کی طرح کھانے کے کمرے سے، میں چُپکے سے نکل پڑتا۔ کانتے نے مجھے آگے کی طرف دھکیل دیا اور اس سے پہلے کہ میں لوٹ کے دروازے کا رُخ کرتا، نواب حشمت جنگ میرے پاس آ گیا اور رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "آپ نے نشانے بازی کا کہہ کے بے قرار کر دیا ہے۔ دل یہی کہتا ہے کہ ابھی ریوالور نکال کے باہر چلیں اور آپ کا کمال دیکھیں۔"

"میں نے آپ سے پہلے کہا تھا کہ مجھے کوئی کمال حاصل نہیں ہے۔"

"مگر ہم نے اس طرح نہیں سنا جس طرح آپ نے کہا ہے۔"

وہ کانا پھوسی کے انداز میں بولا "ہم بھی کچھ اسی طرح کہتے ہیں۔"

"آپ اچھے نشانے باز معلوم ہوتے ہیں۔"

"اگر یوں کہیے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ ہمیں اچھی نشانے بازی بہت مرغوب ہے۔ نہ پوچھیے، کتنے دنوں بعد کوئی ہم شوق نصیب ہوا ہے۔"

"لیکن مجھے آپ میری عمر کا مارجن تو دیں گے؟"

"اور ہمیں آپ ہماری جاتی عمر کا؟" وہ قہقہہ لگا کر بولا۔

چلتے چلتے ہم اُس جگہ آگئے تھے جو ہمارے لیے مخصوص تھی۔ اب واپسی کا کوئی موقع نہیں تھا۔ ہمارے اندر داخل ہوتے ہی قوال اُٹھ کھڑے ہوئے، آدھا جھک کے اُنھوں نے ہمیں سلام کیا اور اُس وقت تک کھڑے رہے جب تک ہم سب بیٹھ نہیں گئے اور نواب حشمت جنگ نے اُنھیں باقاعدہ اجازت نہیں دے دی۔ اب کچھ وہی ہمارا میزبان معلوم ہوتا تھا۔ اُسی نے قوالوں کے بارے میں مختصراً بتایا کہ عرصہ ہوا، دلّی سے آئے تھے، پھر لوٹ کے نہیں گئے۔ دربار تک باریاب ہوئے ہیں اور کئی خطابات پاچکے ہیں۔ کم گاتے ہیں اور اپنی خاص طرز بنانے میں کوشاں ہیں۔ نواب حشمت جنگ اباجان کے پہلو میں بیٹھا تھا، بڑا نواب اُس کے پہلو میں۔ میں، کانتے اور زدرا پیچھے ایک کونے میں سمٹ گئے تھے، اس طرح کہ اُن کی آڑ بھی ہو گئی تھی۔ کانتے نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ حویلی میں آئے ہیں تو نامی گرامی لوگ ہی ہوں گے۔ نواب حشمت جنگ نے اُن کے بارے میں بتاتے ہوئے احتیاط سے کام لیا تھا۔ ابتدا میں تو وہ تانیں ملاتے رہے مگر پھر اُنھوں نے سب کو سحر زدہ سا کر دیا۔ اباجان گنگ ہو گئے تھے۔ منیر علی باقاعدہ جھوم رہے تھے اور سبحان اللہ، سبحان اللہ کا ورد کر رہے تھے۔ پیرو پر اضطراری کیفیت طاری تھی۔ بجھل کی آنکھیں بھی بھاری بھاری ہو گئی تھیں۔ میں شروع ہی سے اُٹھنے کی تدبیریں سوچ رہا تھا مگر کوئی معقول عُذر سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ نیند آنے کا عُذر بد ذوقی کی بات تھی۔ طبیعت کی خرابی کا بہانہ اُن کے رنگ میں بھنگ ڈالنے کے مترادف تھا۔ رفتہ رفتہ قوالوں کی آواز کھل رہی تھی۔ درمیان درمیان میں وہ فارسی کلام کی آمیزش کر دیتے تھے۔ اُن کی صدائیں سازوں میں رَل مِل کے تھوڑی دیر میں کیا سے کیا ہو گئی تھیں۔ میں نے اُن کی طرف سے اپنے کان اور آنکھیں بند رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن یہ ممکن نہیں رہا۔ اُن کی آوازیں کبھی کبھی تو سارا جسم جھن جھنا دیتی تھیں۔ میں بھی جانے کہاں بھٹک گیا تھا۔ مجھے تو اُس وقت کچھ ہوش آیا جب اُن کے سُر خاموش ہوئے۔ جیسے ہی وہ سانس لینے ٹھیرے، مجھے پھر وقت گزرنے اور دیر ہو جانے کی اُلجھن ہونے لگی۔ ابھی اُٹھا جا سکتا تھا ورنہ دوسرے کلام کے خاتمے تک بیٹھنا پڑتا۔ میں اُسی لمحے اُٹھ گیا لیکن کھڑے ہو جانے کے بعد مجھے اپنی وحشت کا احساس ہوا۔ میں اِن سے کیا کہوں گا۔ سب کی نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں "میں اجازت چاہوں گا۔" بہ دقّت تمام یہ لفظ میری زبان سے ادا ہوئے۔ وجہ معلوم کرنا بھی شاید آداب کے خلاف تھا۔ کسی نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ البتہ سبھی کے چہروں پر لکیریں کھنچ گئیں۔ کانتے نے اُسی وقت میرا ہاتھ پکڑ لیا لیکن جب میں نے آگے قدم بڑھایا تو اُس نے فوراً ہاتھ ہٹا لیا۔ میں نے پھر کسی سے نگاہیں نہیں ملائیں، نہ پیچھے مڑ کے دیکھا اور لپکتا ہوا کمرے سے آگیا۔ آتے وقت مجھے بجھل کی آواز سُنائی دی تھی، وہ اُن سے کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ وہاں موجود ہی تھا، اُس نے ضرور میری طرف سے کوئی مناسب عُذر کر دیا ہوگا۔

ابھی ایسا زیادہ وقت نہیں ہوا تھا۔ تقریباً ساری روشنیاں جل رہی تھیں۔ راہ داریوں میں چہل پہل بھی نظر آرہی تھی۔ میں تیز قدموں سے چند منٹوں میں بالائی منزل پر آگیا اور کمرے میں جانے سے پہلے کچھ دیر باہر ٹہلتا رہا۔ قوارہ بند ہو چکا تھا لیکن وہاں اِکا دُکا خادم تعینات تھے۔ اُنھوں نے مجھے دیکھ لیا ہوگا۔ کمرے میں داخل ہوتے وقت میرے پیر ڈگمگا رہے تھے۔ اندر ہر چیز روشن تھی۔ وہاں کوئی نہیں تھا لیکن کوئی آیا ضرور تھا۔ بستر کی چادر بے شکن تھی اور تکیے ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ مسہری کے سرہانے میز پر مجھے کئی کتابیں نظر آئیں۔ میں نے اُنھیں اُلٹ پلٹ کے دیکھا۔ سب حیدر آباد کی تاریخ سے متعلق تھیں۔ میں نے کتابیں رکھ دیں اور پہلے اپنی اکھڑی ہوئی سانسیں بحال کرنے کی کوشش کی، ٹھنڈے پانی کی بوتل سے پانی نکال کر پیا اور خاص دان کھول کے دیکھا، تازہ گلوریاں رکھی تھیں، گویا کسی کو گئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ نہ معلوم کون آیا ہوگا۔ میں نے گراموفون ریکارڈ ٹٹول کے دیکھا اور خراب ہو جانے کے خیال سے یوں ہی چھوڑ دیا۔ میں کچھ دیر کبھی اِدھر، کبھی اُدھر کمرے میں گھومتا رہا، کبھی یہ اور کبھی وہ چیز کھکھوڑتا رہا پھر کتاب لے کے آرام کرسی میں بیٹھ گیا لیکن مجھ سے ایک صفحہ بھی نہ پڑھا جا سکا۔ تھوڑی ہی دیر میں احساس ہونے لگا کہ میں یہاں بے کار آگیا۔ جانے مجھ پر وہاں کیا آفت ٹوٹ رہی تھی۔ کیا مجھے یہاں کسی کے منتظر ہونے کی توقع تھی؟ مجھے یہاں کس نے وقت دیا تھا؟ وہ لوگ کیا سمجھ رہے ہوں گے، اُنھوں نے صرف ہماری خاطر یہ بزم آرائی کی تھی۔ یہاں کمرے میں تو وحشت ناک تنہائی چھائی ہوئی تھی۔ اب میرا لوٹنا بھی مناسب نہیں تھا۔ پھر میں کیا کروں۔ بیٹھے بیٹھے مجھے خفقان سا ہونے لگا۔ میں یہاں کیوں آیا تھا؟ میں نے کتنی ہی بار خود سے یہ سوال کیا۔ یقیناً مجھے توقع تھی کہ کمرے میں دوسرا منظر ہوگا، کوئی کمرے میں موجود ہوگا۔ نہیں ہوگا تو میرے پہنچتے ہی آجائے گا حالانکہ دوپہر کو میں نے خود آنے والی خادمہ کو منع کر دیا تھا۔ ویسے بھی اب گیارہ بج رہے ہیں۔ میرے جی میں آئی، کیوں نہ ایک بار ڈوری کھینچ کے دیکھوں۔ وہ تو میں نے کہا تھا اور اُس نے سُن لیا تھا، لیکن اگر وہ آگئی تو میں اُس سے کیا بات کروں گا۔ دوپہر کون سی بات ادھوری رہ گئی تھی۔ اب بھی اگر مجھ سے کوئی بات نہ ہو سکی تو؟ بہتر یہ ہے کہ ایک مرتبہ مجھے باہر جا کے خادموں کو دکھا دینا چاہیے کہ میں آگیا ہوں، سماع کی محفل میں شریک نہیں ہوں۔ ممکن ہے، ابھی اُنھوں نے مجھے نہ دیکھا ہو مگر اس سے پہلے ایک مرتبہ ڈوری کھینچ لینے میں کیا حرج ہے۔ میں نے کسی تاخیر کے بغیر ڈوری کھینچ دی۔ لمحے گزر گئے۔ دروازے پر کوئی آہٹ نہیں ہوئی۔ میری آنکھیں دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ اُسے بلانے کا یہ کوئی وقت نہیں تھا۔ اچھا ہی ہوا کہ کوئی نہیں آیا۔ میرا ہذیان خود بہ خود بڑی حد تک کم ہو گیا تھا لیکن ابھی ڈوری کھینچے پانچ منٹ سے زیادہ نہ گزرے ہوں گے کہ دروازے پر چاپ اُبھری اور چوڑیوں کی کھن کھناہٹ ہوئی۔ میرا دل دھڑ دھڑانے لگا۔ جس وقت دروازہ کھلا، میری آنکھوں میں اندھیرا سا اُتر آیا تھا۔ وہی سامنے تھی۔ دوپہر والی خادمہ، جس کا نام نفیس تھا۔ اُس کی آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔ اُس کا سارا چہرہ ہی جگمگا رہا تھا۔ وہ دوسرا لباس پہنے ہوئے تھی۔ گہرے نیلے رنگ کا لمبا کُرتا، سفید پاجامہ، کُرتے پر بڑے بڑے پھول کڑھے ہوئے تھے۔ دوپٹا بھی نیلا تھا، روشنی میں اُس پر ٹکے ہوئے ستارے دمک رہے تھے۔ اُس کی "تسلیم" پر چند لمحوں تک میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے گھورتا رہا۔ "بندی اُمید کرتی ہے، جناب کے مزاج بخیر ہوں گے۔" اُس کی آواز میں پہلے سے زیادہ کھنک تھی۔

"جی ہاں۔" میں نے جلدی سے کہا "آپ کی کتابوں کا شکریہ۔"

"سرِدست یہی دستیاب ہو سکیں۔ مہتمم کتب خانہ کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ کل وہ جناب کے لیے اس موضوع پر مستند کتابوں کی ایک فہرست مرتب کر دے۔"

"میں نے ابھی انھیں سرسری طور پر دیکھا ہے۔"

"بندی کو علم ہے، جناب کو مہلت ہی کتنی ملی تھی۔" وہ شرماتے ہوئے بولی "مہتمم کا کہنا ہے کہ اگر جناب کو ضرورت پیش آئی تو وہ ریاست کے کتب خانے سے بھی بعض نادر نسخے فراہم کر سکتا ہے۔"

"آپ بیٹھیے گا نہیں؟" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ جھجکتی ہوئی میرے مقابل کرسی پر ترچھی ہو کے بیٹھ گئی۔ میں نے اُس سے کہا "میں نے آپ کو ناوقت زحمت دی۔"

"بندی کب سے منتظر تھی۔" وہ برجستہ بولی۔

"آپ یہیں موجود تھیں؟"

"جب تک جناب آرام فرما رہے تھے۔"

"آپ کے جانے کے بعد مجھے گہری نیند آگئی تھی۔"

"بندی نے اسی لیے زحمت نہیں دی۔"

"آپ کو معلوم تھا کہ میں۔ ۔ ۔ میں؟"

"کمرے میں رات تک روشنی نہیں تھی۔" وہ چہکتی آواز میں بولی۔ "دروازے بھی بند تھے۔"

"ہاں!" میں نے سانس لے کے کہا "دنوں بعد مجھ پر ایسی غفلت طاری ہوئی تھی۔"

"گہری نیند تو نعمت ہوتی ہے۔" وہ شستگی سے بولی "چھوٹی سرکار اور بی بی آنا چاہتی تھیں۔ اُنھوں نے آداب کہا ہے اور مزاج پرسی کی ہدایت کی ہے۔"

"میری طرف سے اُنھیں بہت بہت سلام عرض کر دیجیے گا۔ میں خود آتا لیکن وقت ہی نہیں ملا۔ کیا وہ ابھی تک جاگ رہی ہیں؟"

"اب تو عرصے سے کوئی وقت طے نہیں ہے۔"

"جی، جی۔" میں نے سر ہلا کے کہا "میں سمجھتا ہوں، لیکن سب خیریت تو ہے؟"

"پروردگار کا شکر ہے۔"

اُس سے پوچھنے کے لیے مجھے کوئی اور بات سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ اُسے شاید میری اس خالی الذہنی کا احساس ہو گیا تھا، گنگناتی سی آواز میں بولی "جناب کچھ نوش فرمانا پسند فرمائیں گے؟" میں نے انکار کر دیا تھا لیکن پھر میں نے جلدی سے کہا "آپ کو زحمت ہوگی۔"

"بندی جناب کی خادمہ ہے۔"

"مگر میرے لیے تو آپ خادمہ نہیں ہیں۔"

"جناب کی نوازش ہے کہ بندی کو مرتبہ دے رہے ہیں لیکن اسے یہی منصب سونپا گیا ہے۔" اُس کی مستعد آواز میں کسی قدر لرزش آگئی تھی۔

"آپ بہت اچھی باتیں کرتی ہیں۔"

اُس کے رُخسار لال ہو گئے۔ "آپ کا حُسنِ سماعت ہے۔"

اُسے یہی جواب دینا چاہیے تھا لیکن مجھے پھر کیا کہنا چاہیے۔ دوپہر کی طرح میرے ذہن میں ایک ساتھ بہت سی باتیں آئی تھیں، میں ایک ایک کر کے ہر بات رد کرتا رہا۔ یہ اندیشہ میری زبان جکڑ لیتا تھا کہ میرے منہ سے نکلی ہوئی کوئی ایسی ویسی بات گیتی اور برجیس کے لیے سرگرانی کا سبب نہ بن جائے۔ سو میں خاموش بیٹھا اُسے دیکھتا رہا۔ کمرے کی روشنی میں اُس کا گندمی رنگ اور گہرا ہو گیا تھا۔ وہ بار بار اپنا دوپٹا درست کرتی تھی اور لمحے لمحے اُس کے بدن میں کوئی لرسی اُٹھتی تھی۔ یکایک میرے ہاتھ میں جیسے کوئی سرا آ گیا۔ میں نے اشتیاق آمیز لہجے میں پوچھا۔ "آپ کی چھوٹی سرکار اور بی بی اس وقت کیا کر رہی تھیں؟"

اُس کے لبوں پر مُسکراہٹ بکھر گئی، شگفتگی سے بولی۔ "کچھ دیر پہلے تک چھوٹی سرکار خادماؤں کو ہدایات دے رہی تھیں۔ اس کے بعد بندی سے ملاقات نہیں ہوئی۔"

"اور برجیس بی بی؟"

"بندی اُن کے ساتھ تھی۔" اُس کی آواز ٹمٹمانے لگی۔

"وہ کیا کر رہی تھیں؟" میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "مناسب ہو تو بتائیں۔"

"نہیں نہیں۔" وہ گھبرا کے بولی۔ "بی بی سرکار اپنے کمروں میں موجود ہیں۔"

"آرام کر رہی ہیں؟"

"بندی کیا عرض کرے۔" وہ پریشانی سے بولی۔ "سچ پوچھیے تو بی بی اپنے کمرے میں اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہیں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"بی بی سرکار پر کبھی کبھی ایسی خاموشی چھا جاتی ہے۔"

"اچ چھا! مگر ایسا کیوں؟"

"بندی کچھ نہیں کہہ سکتی۔ کب سے اپنے کمرے میں خاموش بیٹھی ہیں۔" وہ اداسی سے بولی۔

"اُن کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"بظاہر خدانخواستہ ایسی کوئی علامت نظر نہیں آئی۔ ابھی شام تک تو سب سے باتیں کر رہی تھیں، اچانک اُنھیں نہ جانے کیا ہو جاتا ہے۔"

"آپ کی بی بی بہت، بہت اچھی لڑکی ہیں۔"

"بے شک۔" وہ وارفتگی سے بولی۔ "خدا اُنھیں ہمیشہ خوش رکھے۔ بی بی سرکار تو پھولوں کی طرح ہیں، آئینے کے مانند ہیں۔"

"ایک بات پوچھوں، بتائیں گی؟" میں نے سرگوشیانہ

"بندی تعمیلِ حُکم کے لیے بھیجی گئی ہے تاہم اس کی درخوا ہے کہ اس کی بساط ملحوظِ خاطر رہے۔"

"نہیں نہیں۔" یوں ہی ایک بات ذہن میں آ گئی، آپ کہ دونوں میں آپ کو کون زیادہ پسند ہے؟" میں نے جان بوجھ ایک فضول بات کہی۔

"بندی نے کبھی اُنھیں جُدا جُدا تصوّر نہیں کیا۔"

"مجھے یقین تھا کہ آپ یہی جواب دیں گی۔"

"بندی نے احوالِ واقعی عرض کیا ہے۔" وہ مُسکراتے ہوئے

"اور، اور یہ چھوٹی بیگم صاحب اور برجیس بی بی کے مشا رہتے ہیں؟" میں نے بظاہر سرسری انداز میں پوچھا۔

"مشاغل کی بات تو پہلے کبھی تھی۔" وہ ڈوبے ہوئے لہ بولی۔ "اب تو عرصے سے ایک ہی مشغلہ رہ گیا تھا۔ دعاؤں کا اہتما کا اور عیادت کے لیے آنے والوں کی پرسش کا۔ پہلے کبھی چھوٹ صاحب کو ایک پل کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ حویلی میں اُن کے آ کے بعد بڑی سرکار نے سارا انتظام اُن کے سپرد کر دیا تھا۔ سا حویلی کی دیکھ بھال، ایک ایک گوشے پر اُن کی نگاہ رہتی تھی۔ ملاز کا خیال، اُن کی غمی خوشی میں شرکت، تقریبات کا اہتمام۔ آنے والے اعزا اور مہمانوں کی پزیرائی۔ اُنھوں نے اپنے ذمّے کتنے لیے ہوئے تھے۔ حویلی کے مصارف کی بھی وہی نگرانی کرتی تھیں تمام مصروفیات کے علاوہ مطالعے کے لیے بھی وقت نکال لیتی کبھی شطرنج سے بھی شوق فرما لیتی تھیں۔ شادی سے پہلے سا بیڈمنٹن خوب کھیلا کرتی تھیں۔ شادی کے بعد ترک کر دیا لیکو سرکار کی خواہش پر دوبارہ مشق شروع کر دی تھی۔"

"اور برجیس بی بی؟"

"دونوں کو ایک دوسرے کا سایہ سمجھیے۔"

"واقعی، یہی محسوس ہوتا ہے۔"

میری نظروں میں برجیس اور گیتی کے سراپا گھوم رہے اُن کا ذکر کرتے ہوئے خادمہ نفیس کی آواز بہکنے مچلنے لگتی تھی جیسے اپنا ہی ذکر کر رہی ہو۔ میں نے طے کیا کہ صبح ہوتے ہی زنان خا کی طرف جاؤں گا لیکن یہ میں نے اُسے نہیں بتایا۔ وہ میرے سا بیٹھی اپنے دوپٹے کے تار سے کرید رہی تھی۔ جیسے ہی اُسے احسا ہوتا کہ میری نگاہیں اُس کے چہرے پر مرکوز ہیں، اُس کا بدن لگتا اور اس کی لمبی لمبی پلکوں پر ارتعاش طاری ہو جاتا۔ وہ منتظ

اُس سے کچھ اور پوچھوں گا، اُسے کوئی حُکم دوں گا یا اُسے جانے کی اجازت ہی دے دوں گا۔ میری خاموشی اُسے بہت گراں گزری ہوگی میرے سر میں پھر سب کچھ منتشر ہو گیا۔ کیا میں اُس سے یہی جاننا چاہتا تھا؟ مگر اتنا کم و بیش میں بھی جانتا تھا۔ پھر میں نے رات گئے اُسے زحمت کیوں دی اور اُسے بے جواز اتنی دیر روکنا ٹھیک نہیں ہے۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ وہ بُت کی طرح بیٹھی ہے اور میں اُس کی صورت دیکھتا رہوں۔ جو لمحہ گزر رہا تھا، میرے کا سناٹا بڑھتا جاتا تھا اور رفتہ رفتہ میرے ہاتھ پیر ٹوٹنے سے تھے۔ میں ایک غبی، ایک فضول آدمی ہوں۔ میری زبان بار بار بہکنے لگتی ہے۔ جب تک یہ موجود رہے گی، میرے رگ و پے میں یہ سی سلگتی رہے گی۔ بہتر یہی ہے کہ وہ چلی جائے۔ میرا اندازہ درست۔ وہ اِس سکوت سے اُکتا گئی تھی، کتراتے ہوئے لہجے میں کہنے لگی۔ ری لب کشائی پر معذرت خواہ ہے۔ ناچیز کا گمان ہے کہ آپ بھول رہے ہیں۔ جناب نے بندی کو یاد فرمایا تھا۔"

"ہاں ہاں۔" میں نے بدحواسی سے کہا۔ "آپ کو جلدی ہے؟"

"بندی کی یہ مراد نہیں۔" وہ سراسیمگی سے بولی۔ "اُس نے محض ہانی کے لیے یہ جسارت کی ہے۔"

"میں آپ کو سچ بتاؤں۔" میں نے بکھری ہوئی آواز میں کہا۔ مجھے یہاں آ کے بہت تنہائی محسوس ہو رہی تھی جب کہ میں اس تنہائی کے لیے سماع کی ایک بہت اچھی محفل چھوڑ کے آیا تھا مگر اب ٹھیک ہے۔ اب کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ آپ چاہیں تو جا سکتی ہیں۔"

"بندی نہایت شرمندہ ہے لیکن خدا گواہ، اس کا کوئی اور مقصد نہیں تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بندی خود کو گناہ گار سمجھ رہی ہے۔"

"نہیں، ایسا نہیں ہے، ایسا مت سمجھیے، میں آپ سے کسی ملال میں نہیں، صاف دلی سے کہہ رہا ہوں۔" میں نے اُس کی خاطر یہ کہنا ضروری سمجھا کہ ضرورت پڑنے پر اُسے پھر بُلا لوں گا۔

"جی، جی۔" وہ لرزتے ہونٹوں سے بولی۔

یوں اِس صورت میں اُس کے لیے خود کو کمرے سے چلے جانے پر آمادہ کر لینا آسان نہیں تھا۔ نہ مجھے اُس سے دوبارہ کہنا چاہیے تھا۔ میرے ذہن میں یہی بات آئی۔ میں نے اُس کی دل دہی کے لیے کہا اس وقت دست یابی ممکن ہو تو مجھے نزلے کی کوئی دوا فراہم کر دی جائے۔"

"نصیبِ دشمناں، بندی کو پہلے ہی شبہ تھا کہ جناب کے مزاج ناساز ہیں۔"

"کوئی خاص بات نہیں لیکن احتیاط بہتر ہے۔"

"بندی ابھی لے کے حاضر ہوتی ہے۔ حویلی میں ہر وقت ایسی ادویات موجود رہتی ہیں۔ طبیب آنے میں بھی کوئی دیر نہیں لگے گی۔ فون پر ڈاکٹر کو بھی بلایا جا سکتا ہے۔ جناب کے لیے انگریزی دوائیں زیادہ مناسب ہوتی ہیں یا یونانی؟"

"کوئی بھی جو آسانی سے فراہم ہو سکے مگر کسی حکیم ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہے۔"

"یقیناً سر درد کی بھی شکایت ہوگی۔"

میں نے سر ہلا کے اقرار کیا۔ وہ دوبارہ جلد واپسی کا کہہ کے کمرے سے فوراً چلی گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کمرے سے اچانک شور کم ہو گیا ہو اور میں کسی چھاؤں میں آ گیا ہوں جیسے میں اپنے آپ سے دُور چلا گیا تھا اور اب اپنے آپ تک واپس آ گیا ہوں لیکن کشادگی و طمانیت کا یہ وہم سب عارضی تھا۔ چند لمحوں بعد ہی جیسے مجھے سب کچھ یاد آنے لگا اور میرے جسم سے پسینہ پھوٹتا رہا۔ وہ کیا سوچتی ہوگی، وہ میرے حواس کی درستی پر ضرور شبہ کرتی ہوگی۔ یہ رویّہ اُس کے لیے ناقابلِ فہم ہوگا۔ وہ تو بہت نرم و نازک، بہت خوب صورت لڑکی ہے۔ اتنے دل نشیں انداز میں باتیں کرتی ہے۔ میرا کیسا خیال رکھ رہی تھی۔ میں اُس سے دُنیا جہان کی باتیں کر سکتا تھا۔ شہر کے متعلق، حویلی کے متعلق، موسموں کے بارے میں مگر میرا دم گھٹنے لگتا ہے، میرا دماغ جو خراب ہونے لگتا ہے۔

اُسے جلد ہی واپس آ جانا چاہیے تھا لیکن دیر ہو گئی اور وہ نہیں لوٹی۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے اُبھرنے لگے۔ اچھا ہے کہ وہ واپس نہیں آئے۔ میں اس دوران خود کو طمانچے ہی مارتا رہا۔ اب کے وہ آ گئی تو میں اس طرح نہیں کروں گا۔ میں نے ایک بار پھر عزم کیا اور آرام کرسی سے اُٹھ کے ایک گلاس پانی پیا۔ بیٹھے بیٹھے میرا جسم اکڑ سا گیا تھا۔ سامنے ہی آئینہ نصب تھا۔ میں نے ایک نظر اپنا چہرہ دیکھا۔ سُوجا چہرہ، بکھرے بال، گریبان کے اُوپر کا بٹن بھی کھلا ہوا۔ غسل خانے جا کے میں نے منہ پر تین چار چھینٹے مارے۔ بالوں میں کنگھی پھیر کے میں جلد سے جلد کمرے میں واپس آ گیا۔ وہ نہیں آئی تھی لیکن میرے آرام کرسی پر بیٹھنے کی دیر تھی کہ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ وہی تھی۔ وہ ہانپتی ہوئی اندر آئی، ہاتھ میں ایک چھوٹی ٹرے تھی جس پر ریشمی کپڑے سے ڈھکا ہوا مگ رکھا تھا۔ آتے ہی اُس نے پھولی

سانسوں سے مجھے بتایا کہ وہ میرے لیے جوشاندہ تیار کر کے لائی ہے اور کڑواہٹ کے خیال سے اُس نے ذرا سی شکر بھی ملا دی ہے۔ ابھی گرم ہے۔ جوشاندہ ذرا ٹھنڈا ہو جائے تو پینے کے لائق ہو جائے گا۔ میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور بیٹھ جانے کو کہا۔ وہ کھڑی رہی۔

"جناب سے ایک گزارش کرنی ہے۔" وہ رُکی رُکی آواز میں بولی۔

میں نے چونک کر پوچھا "کیا بات ہے؟"

"بی بی سرکار یہاں آنے کی خواہش مند ہیں۔"

"بی بی سرکار! برجیس بی بی؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"وہ جناب کی مزاج پرسی کے لیے آنا چاہتی ہیں۔"

"مگر میں تو بالکل ٹھیک ہوں، مجھے کوئی ایسی خاص۔۔۔"

میں نے اپنی ہی بات کاٹ کے کہا "لیکن اگر اُن کی یہی خواہش ہے، وہ تشریف ہی لانا چاہتی ہیں تو بسروچشم لیکن رات خاصی ہو گئی ہے، اُنھیں خواہ مخواہ زحمت ہو گی۔ آپ نے اُن سے کچھ زیادہ تو نہیں کہہ دیا؟"

"بندی نے اپنی جانب سے احتیاط کی تھی لیکن بی بی سرکار پریشان ہو گئیں۔ اُنھوں نے ہی یہ جوشاندہ تجویز کیا ہے۔ وہ تو طبیب کو بلانے کے لیے اصرار کر رہی تھیں۔ بندی نے اُن سے عرض کیا کہ جناب نے منع کیا ہے۔"

"ارے!" میں نے خجالت سے کہا "وہ کیوں تکلیف کرتی ہیں" میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اور کیا کہوں۔

"اُنھیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی، بس جناب کا خیال ہے، اجازت ہو تو بندی اُن سے جا کے کہہ دے۔"

میں نے تذبذب سے کہا "بہرحال اگر اُن کی یہی مرضی ہے تو۔۔۔"

اس نے میری بات پوری بھی نہیں ہونے دی، اتنا سنتے ہی تیزی کے ساتھ کمرے سے اوجھل ہو گئی۔ میری رگوں میں خون منجمد ہونے لگا تھا۔ کچھ دیر تک تو میں کرسی پر گم سُم بیٹھا رہا، یک بہ یک میری نظریں گھڑی پر گئیں۔ اُس وقت پونے بارہ بج رہے تھے۔ میں فوراً کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور سیدھا آمد و رفت کے عام دروازے کی طرف لپکا۔ وہ بند ہی تھا۔ پھر میں نے کمرے پر ایک نظر ڈالی۔ فرش پر میرے پیر بہک رہے تھے۔ مجھے اپنے آپ کو مجتمع کرنے کی بھی مہلت نہ ملی۔ اِدھر خادمہ نفیس گئی، اُدھر اُس کی آہٹ گونجی۔ گویا برجیس پہلے ہی اُدھر آ گئی تھی۔ اُسی لمحے میرا سارا جسم جھن جھنانے لگا تھا جب میں نے خادمہ کے پیچھے برجیس کا چہرہ دیکھا۔ وہ برجیس ہی تھی۔ جیسے بدلیوں سے اچانک چاند نکل آئے۔ عنابی رنگ کا جوڑا پہنے، اسی رنگ کے دوپٹے سے اُس کا سر ڈھکا ہوا تھا جس کی وجہ سے چہرے کا شہابی رنگ اور کھل اُٹھا تھا۔ وہ نپے تُلے قدموں سے اندر داخل ہوئی تھی۔ میں دزدیدہ نگاہوں سے اُسے آتے دیکھتا رہا۔ اُس کی تسلیم کا جواب بھی میں نے جانے کس طرح دیا۔ "نفیس کی زبانی معلوم ہوا کہ آپ اس وقت کچھ بہتر محسوس نہیں کر رہے ہیں۔" ایسا لگا جیسے کمرے میں اُس کی آواز کی کرچیاں بکھر گئی ہوں۔

"جی! مگر کوئی پریشانی کی بات نہیں تھی۔" میں نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں کہا "آپ نے اتنی، اتنی۔۔۔"

"نہیں نہیں، ہم جاگ ہی رہے تھے۔" وہ سیمابی لہجے میں بولی۔ "اب کیسے ہیں آپ؟"

میں نے مُسکرانے کی کوشش کی "بس یوں ہی ذرا سر بھاری سا تھا۔"

"موسم بھی کچھ تبدیل ہو رہا ہے۔ آج خنکی نسبتاً زیادہ ہے۔" وہ لپکتی آواز میں بولی "ہم تو سمجھ رہے تھے کہ آپ محفلِ سماع میں شامل ہوں گے۔"

"وہاں کچھ دیر ہی بیٹھا جا سکا۔"

"کیا اچھے قوال نہیں تھے؟"

"وہ تو اپنے فن میں یکتا تھے، بس جی نہیں لگا۔"

"اچھا ہوا، آپ اس طرف چلے آئے۔"

مجھے خیال نہیں رہا تھا، وہ ابھی تک کھڑی تھی۔ میں نے معذرت کرتے ہوئے اُس سے بیٹھنے کی درخواست کی۔ وہ تمکنت سے کہنے لگی کہ بس اب ہم چلیں گے۔ آپ کو آرام کرنا چاہیے، رات بہت ہو گئی ہے۔

"مگر کچھ دیر تو بیٹھیے۔ میں دن میں خاصا سو چکا ہوں۔ شام کو اُدھر آنے کا ارادہ تھا لیکن کھانے کے بعد ایسی نیند آئی کہ ہوش ہی نہیں رہا۔"

"ہم بھی یہی توقع کر رہے تھے کہ شاید آپ آ جائیں۔" اُس کی آواز اُمڈ رہی تھی۔ "خود ہم بھی شام کو آنے کی سوچ رہے تھے لیکن یہی اطلاع ملتی رہی کہ آپ آرام کر رہے ہیں۔"

"بیٹھیے نا۔" میں نے التجائی لہجے میں کہا۔ اُس نے نگاہیں اُٹھا کے میری جانب دیکھا، اُس کی آنکھوں میں بجلیاں سی کوند رہی تھیں۔ اُس نے پھر انکار نہیں کیا، اپنا بدن سمیٹے سامنے کے صوفے پر بیٹھ گئی۔ چند ثانیوں تک میں خاموش رہا پھر میں نے تھمے ہوئے لہجے میں کہا "چھوٹی بیگم صاحب کیسی ہیں؟"

"اُنھیں بھی آپ کا انتظار تھا۔" وہ بے تابی سے بولی۔ "وہ عالم بھائی کی طرف گئی ہوئی ہیں ورنہ ہمارے ساتھ ضرور آتیں۔"

"چھوٹے نواب صاحب کا کیا حال ہے؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔ اُس کے چہرے پر یکایک دھواں سا چھا گیا۔ مجھے فوراً اپنے سوال کی نامناسبی کا احساس ہو گیا تھا لیکن میں کیا کرتا۔ منہ سے نکلی ہوئی بات لوٹائی نہیں جا سکتی۔

"ہمیں اُن کی جانب سے اب ایسی فکر نہیں ہے۔" وہ ڈوبے لہجے میں بولی "اس کے بعد سب کچھ خدا پر چھوڑ دینا بہتر ہو گا اور اُس نے اپنے کرم کے دروازے ہم پر کھول ہی دیے ہیں۔"

میں نے اس بابت پھر کچھ نہیں پوچھا۔ خادمہ نفیس دروازے کے پاس ہاتھ باندھے کھڑی تھی مجھے اُس سے بھی بیٹھ جانے کو کہنا چاہیے تھا لیکن برجیس کے خیال سے چُپ رہا۔ دوبارہ جب میری نظر اُس طرف گئی تو وہ کمرے میں نہیں تھی۔ اندرونی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ نیچے تو نہیں گئی ہو گی، یہیں کمرے سے ملحق ملازموں کے گوشے میں موجود ہو گی۔ میں اور برجیس کمرے میں اکیلے رہ گئے تھے۔ نفیس نہ جاتی تو اچھا تھا۔ اُس کے جاتے ہی میرا جسم سُن سا ہونے لگا اور میری زبان اینٹھنے لگی۔ اس سے کہنے کے لیے میں کوئی برمحل اور خوش اثر بات سوچ رہا تھا کہ اُس کی سُریلی آواز کمرے میں گونجی "یہاں آپ کو کسی چیز کی شکایت تو نہیں ہے؟"

"کاہے کی شکایت؟" میں نے تعجب سے کہا اور مجھے ہنسی آ گئی "کیا شکایت ہو سکتی ہے۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ اتنے تکلفات سے ہمیں کبھی سابقہ نہیں پڑا۔"

"تکلفات کہاں ہیں؟" وہ شائستگی سے بولی "یقین کیجیے، ہمیں ہر لحظے یہ احساس کھٹکتا ہے کہ ہم سے۔۔۔ ہم سے۔"

"کہ آپ سے کوئی کوتاہی تو نہیں ہو رہی ہے؟" میں نے اُس کی بات مکمل کر دی "ہم سے پوچھیے تو اب ہمیں شرمندگی ہونے لگی ہے۔"

"نہیں، نہیں۔" وہ بے تابانہ بولی "ایسا مت سوچیے۔ ہم سے تو کچھ بھی نہیں ہو رہا ہے۔ ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔"

"اِس سے زیادہ کیا ممکن ہے۔"

"یقیناً ہمارے پاس اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔"

"میں آپ سے التجا کرتا ہوں، اب اِسے نہ دُہرایئے۔" میں نے اُس کی منت کی "ہمارے لیے یہی کیا کم ہے کہ اس بہانے اتنے اچھے لوگوں سے مل لیے اور، اور کسی کے کام آ جانے کی خوشی کچھ کم ہوتی ہے کیا؟"

"یہ آپ کا حوصلہ ہے۔ ہم سے آپ کے سامنے سر نہیں اُٹھایا جاتا۔ اچھے ہونے کا ثبوت ہم نے پہلے بہت دے دیا ہے۔"

"دیکھیے پھر وہی۔" میں نے شکایتی لہجے میں کہا "آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ یہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔ میں آپ کو کیا بتاؤں، زندگی ہم سے کیسا سلوک کرتی رہی ہے۔ میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ یہ ہمارے لیے کوئی نیا نہیں تھا بلکہ پہلے سے کچھ کم ہی تھا۔"

"یہ بھی خوب ستم ہے کہ آپ ہمی کو یہ باور کرا رہے ہیں۔"

"آپ سے غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔" میں نے شکستہ آواز میں کہا "اس مشقت اور آپ کے دیے ہوئے اُس عذاب کے بعد اگر ایسا ثمر ملتا ہے تو آدمی بہت سے عذابوں سے گزر سکتا ہے۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ عذاب، وہ قہر ہمارے لیے نیا نہیں تھا، یہ ثمر البتہ بالکل نیا ہے۔"

اُس کی آنکھیں جھلملانے لگیں۔ کپکپاتے ہونٹوں سے بولی "آپ بہت مہربان ہیں۔" پھر خود ہی کہنے لگی "آپ درست کہتے ہیں، ہمیں اس ذکر سے اجتناب ہی کرنا چاہیے۔"

"جی ہاں، بہتر یہی ہے۔" میں نے تیزی سے کہا "میں آپ کو بتاؤں کہ اگر بڑے نواب صاحب کی جگہ ہم ہوتے تو ہم بھی اس صورتِ حال میں شاید یہی کچھ کرتے۔"

"شاید کبھی نہ کرتے۔" وہ مچلتی آواز میں بولی "آپ پہلے بھی ہمیں یہ دلاسا دے چکے ہیں لیکن ہم جانتے ہیں، آپ ایسا کبھی نہ کرتے۔"

"بہرحال۔" میں نے پہلو بدل کے کہا "اور بھی بہت سی باتیں، بہت سے موضوعات ہیں۔ کیا یہ ضروری ہے کہ ہم جب بھی ملیں اُسی اندھیرے کو تازہ کریں۔"

"ہم بہت کوشش کرتے ہیں لیکن ہماری آنکھوں سے وہ رات اوجھل نہیں ہوتی جو ہم زنداں میں دیکھ کر آئے تھے۔"

"وہ رات اگر جہنم تھی تو یہ رات جنت بھی تو۔۔۔" لفظ میرے حلق میں گڈمڈ ہو گئے اور ایک ثانیے کے لیے میرا سر گھوم کے رہ گیا۔ اُس کی چمکتی آنکھیں میرے سارے جسم کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ شرارے سے لپک رہے تھے۔ میں سمجھ نہیں پایا کہ یہ کون سی کیفیت ہے، سو میرا وجود اندر ہی اندر لرزتا رہا۔ اُس کے رُخساروں پر بھی آگ سی روشن تھی اور ناک کے گوشے پھڑک رہے تھے۔ اُس کے نیم وا ہونٹوں میں جنبش ہوئی تو میرے دل کی دھڑکن بند ہونے لگی "ہمارے لیے اس سے بڑی مسرت اور عزت کیا ہو سکتی ہے کہ آپ ایسا محسوس کرتے ہیں۔" اُس کی آواز دھڑک رہی تھی "لیکن یہ کانٹا ہماری رگِ جاں میں شاید ہمیشہ پیوست رہے کہ وہ جہنم بھی تو ہماری طرف سے تھا۔"

میں نے ایک گہری سانس بھری "وہ آپ کی طرف سے کب تھا۔"

میری آواز بھر بھرا رہی تھی۔ "دیکھیے، اب آپ اپنے دل سے یہ غبار نکال دیجیے۔"

وہ خاموش رہی۔ اس اثنا میں مَیں اپنے آپ سے نبرد آزما رہا۔ اِس لمحاتی عرصے میں مجھے جیسے اپنی بکھری ہوئی بینائی سمیٹنے کی فرصت مل گئی تھی۔ میں نے شگفتگی سے کہا۔ "سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ کی کیا خاطر کی جائے۔ اس وقت تو میزبان میں ہوں۔"

اُس کا چہرہ پھول کی طرح کِھل اُٹھا۔ "شکر ہے کہ آپ ایسا سمجھ رہے ہیں۔"

"کیا آپ اس وقت میری مہمان نہیں ہیں؟"

"مگر بن بلائے۔" وہ چہکتی آواز میں بولی۔

"بظاہر تو یہی ہے مگر بہ باطن شاید ایسا نہیں۔"

"کیوں؟ کیا آپ، آپ۔" وہ اضطراب سے بولی۔ "کیا آپ ہمارے بارے میں سوچ رہے تھے؟"

"کچھ یہی سمجھیے۔" میں نے اٹکتی زبان سے کہا۔

"تو پھر آپ نے خادمہ سے کہہ کیوں نہیں دیا؟"

"بس کہتے کہتے رہ گیا۔" میں نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یاد ہے، آپ نے کیا وعدہ کیا تھا؟"

"کون سا وعدہ؟" میں نے تذبذب سے کہا۔

"کہ آپ کوئی تکلف نہیں کریں گے۔" وہ تمتماتی آواز میں بولی۔

ع "اے ذوق! تکلف میں ہے تکلیف سراسر"

"مجھے یاد ہے مگر دیکھیے نا، وقت ہی کہاں ملا۔ شام ہی کو ممکن تھا اور شام سونے میں غارت ہوگئی۔ پھر رات کو کھانے پر بلا لیا گیا، وہاں سے واپسی میں دیر ہی اتنی ہوگئی تھی۔"

"اب آپ کا یہاں دل لگ رہا ہے نا؟" وہ سرسراتے لہجے میں بولی۔

"یہ جگہ تو ایسی ہے کہ یہاں ساری زندگی گزار دی جائے۔"

"اس سے بہتر بات کیا ہوگی۔" اُس کی آواز دمک رہی تھی۔ "آپ چاہیں تو ساری زندگی رہیے۔ یہ تو ہمارے لیے سب سے بڑی راحت ہوگی۔"

"میں نے طے کیا ہے کہ جلد ہی یہاں آؤں گا۔"

"ابھی جلد جانے کا ارادہ تو نہیں ہے؟"

"میرا ارادہ دوسروں سے مشروط ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ہمیں جلد جانا چاہیے، پہلے ہی دیر ہوگئی ہے۔ کچھ ایسی ہی بات ہے۔ آپ کو کیا بتاؤں۔"

"ایسا ہے تو ہم اصرار نہیں کریں گے مگر جلد واپس آئیے گا، اور اپنا گھر سمجھ کے۔"

"لیکن ایک بات کا خیال رکھیے گا، تکلف سے میرا جی بہت گھبراتا ہے۔ میرا خیال ہے، ابھی کا گھبرانا ہوگا۔ میں اِسے اپنا گھر ہی سمجھ کے آؤں گا۔"

ہم نے خود آپ سے یہ سبھی آداب و قواعد ترک کر دینے کی گزارش کی ہے اور ایک بات، ہم اور کہنا چاہتے ہیں۔" وہ بولتے بولتے ٹھہر گئی۔

"کیوں؟ آپ رُک کیوں گئیں؟"

"ہم مناسب لفظ ڈھونڈ رہے تھے۔" وہ بے کلی سے بولی۔ "ہم چاہتے ہیں، وہی جو گیتی آپ سے کہہ چکی ہیں کہ ان حوالوں سے الگ بھی کچھ ہے۔ اِن سے الگ بھی آپ کی ذات ہے، ہماری ذات ہے۔ نہ جانے کیوں بار بار ہمیں اس صراحت کی خلش ستاتی ہے۔"

"آپ یہی کہنا چاہتی ہیں نا کہ اگر یہ سب اس طرح نہ پیش آتا تو بھی۔ ۔ ۔ تو بھی۔ ۔ ۔ لازم نہیں کہ لوگ ایک دوسرے کو ایسے حادثوں ہی کے سبب جانیں پہچانیں۔"

"ہاں ہاں، یہی کچھ۔"

"وہ بات جو آپ کے دل میں کھٹکتی ہے، میرے سینے میں بھی کبھی کبھی چبھتی ہے۔ کسی بدل یا اجر کا احساس آپ کے لیے شاید اتنا تکلیف دہ نہ ہو جتنا میرے لیے ہے مگر یقین کیجیے کہ میں کسی ایسے کرب سے دوچار نہیں ہوں۔ کوئی اچھا بُرا حادثہ آدمی کو آدمی کے قریب کرنے کا جواز ضرور بنتا ہے لیکن یہ محض بہانہ ہے۔ آدمی، آدمی کے متعلق تمام فیصلے ایک ہی مرحلے پر تو نہیں کرلیتا اور کبھی کرلیتا ہے تو اُس سے حادثے کے منفی اور مثبت پہلو کا آپس میں کوئی تعلق ضروری نہیں کیونکہ ایک ہی پیمانہ تو نہیں ہوتا۔" میں نے کسمساتے ہوئے کہا۔ "شاید میں وضاحت نہیں کر پا رہا ہوں۔"

"نہیں نہیں، ہم سمجھ رہے ہیں۔" وہ جھپکتی پلکوں سے بولی۔

"میری مراد ہے کہ کسی صراحت کی ضرورت نہیں۔ صراحت کے لیے کیا لفظ ہی ضروری ہیں۔ آپ میرے سامنے ہیں، میں آپ کے سامنے۔"

اُس کی آنکھوں میں یکایک آنسو منڈلانے لگے۔ "آپ نے ہماری مشکل حل کر دی۔" وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔ "ہماری ایک گزارش ہے، جس طرح آپ کی ذات کے سوا ہمارے لیے آپ کا کوئی حوالہ مستند نہیں ہے، نہ ہمیں اسے جاننے کی جستجو ہے، اسی طرح ہماری بھی یہ التجا ہے کہ آپ ہمیں اس حویلی کی نسبت سے نہ جانیے۔ اب ہم اپنے لیے اس حویلی کا حوالہ معتبر نہیں سمجھتے۔ یہ ہمارے لیے کسی امتیاز کا سبب

ں ہے۔ پہلے ہمیں اس نسبت پر ضرور فخر تھا لیکن یہ تب کی بات ہے
ب ہم آپ سے نہیں ملے تھے۔ آپ ہی نے ہمیں یہ عزم دیا ہے۔ اب
اپنے اندر ایک عجب توانائی محسوس کرتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری
ں تو ایک حیثیت ہے۔ یہ حویلی ہمارے قد سے بڑی نہیں ہے۔ ہمارے
یہ داحساس سے سوا نہیں ہے۔ ہمیں اس کی عزت بہت عزیز ہے
ں یہ ہماری قیمت پر نہیں، اُن اقدار کی قیمت پر نہیں جو ہم پر پہلی
نکشف ہوئی ہیں۔" اُس کی آواز میں تمکنت کے ساتھ ساتھ تندی و
ی کی آمیزش بھی تھی۔ لوگوں نے غلط نہیں کہا ہے، اُس کے منہ
، پھول جھڑ رہے تھے، ایسا لگتا تھا جیسے پھُل جھڑیاں چھوٹ رہی ہوں
، کے گلابی چہرے میں سفید دانت جگ مگ جگ مگ کرتے
،۔ میں حیران نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔ میں نے کوئی جواب نہیں
، وہ آزردگی سے بولی۔ "آپ چُپ کیوں ہوگئے؟ کیا سوچ رہے
، کیا ہم غلط کہہ رہے ہیں؟"

"نہیں۔" میں نے ہڑبڑا کے کہا۔ "سوچ رہا ہوں کہ کیا کہوں۔
ن سی بات جواب طلب ہے۔ سب کچھ تو آپ نے خود کہہ دیا ہے۔
ریوں ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے منہ کی بات چھین رہے
، بلکہ ہم تینوں۔ صبح چھوٹی بیگم صاحبہ بھی تو یہی کچھ کہہ رہی تھیں۔ شاید
رتِ حال کی نیرنگی اور نزاکت اِس تکرار کا سبب ہے تاہم میں
ے ایک بات کہوں کہ جو حوالے عزت و مرتبت کا سبب ہوں، اُن
ے دست برداری کیوں کی جائے۔ یہ حویلی بے شک آپ سے بڑی نہیں
ہے لیکن یہ کوئی کم تر حوالہ بھی نہیں ہے۔ اچھی نسبتوں کو یوں مسترد
ہیں کیا جانا چاہیے۔ رہی اقدار کی بات، تو آپ کے بقول اُن کے انکشاف
ے تو اب ایک اور بہتر تناسب قائم ہو سکتا ہے۔ کیا حویلی اِن اقدار
ے منحرف ہے، اِن کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ کیا حویلی کے حوالے
ے اِن اقدار کا خیال نہیں رکھا جا سکتا۔ آپ کوئی توانائی سی محسوس
تی ہیں تو کیا حویلی کی نسبت سے اس میں کوئی فرق پڑنے کا امکان
ہے۔ کوئی اچھا حوالہ ہو تو اُسے رَد کیوں کیا جائے۔" نہیں معلوم میں نے
سب کس طرح کہہ دیا لیکن اچانک میری زبان بہکنے لگی اور میں نے متوحش
ہو میں کہا۔ "کہیں آپ کو میرے گداز کا تو خیال نہیں کہ میرا کوئی حوالہ چونکہ
پ کے سامنے نہیں ہے اور جو ہے وہ نہایت اذیت ناک ہے؟"

"بخدا ایسا نہیں ہے۔" وہ بے ساختہ بولی۔ "اور اگر، اور اگر یہ
ی ہے تو کیا مناسب نہیں ہے۔ ہم اس طرح آپ کے تئیں کچھ
ظہار کرنا چاہتے ہیں۔"

"یقیناً۔" میں نے خجالت سے کہا۔ "بس یوں ہی یکایک ایک خیال آگیا اور میں نے آپ سے کہہ دیا۔ میرا مقصد کچھ اور نہیں تھا۔ اُسے درگزر کر دیجیے۔ نہ جانے میں کیا کہہ رہا تھا؟"

"آپ نسبتوں کے بارے میں کہہ رہے تھے۔" وہ اشتیاق سے بولی۔

"ہاں! میں کہہ رہا تھا کہ وقت، مقام، حادثے اور آدمی کا تناسب بھی کوئی چیز ہوتا ہے۔ کبھی کوئی ایسی اکویشن، میری مراد ہے صورت وجود میں آجاتی ہے جس سے کوئی نسبت الگ نہیں کی جا سکتی۔"

"لیکن اصل تو فرد ہوتا ہے، باقی سب کچھ ضمنی ہے۔"

"بے شک اصل تو فرد ہے، اس سے برتر کچھ نہیں۔"

"ہم حویلی سے اپنی نسبت ترک کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ ہم تو دوسری بات کہہ رہے ہیں کہ حویلی کو اپنی ناموس سے زیادہ اپنے مکینوں کے جذبوں کا احترام کرنا چاہیے۔"

وہ یہی کہہ رہی تھی کہ خادمہ نفیس کمرے میں نمودار ہوئی۔ اُس کی آمد سے پہلے چاہیں کمرے میں آچکی تھیں۔ نفیس اپنے ہاتھوں میں خوان پوش سے ڈھکا ہوا طشت اٹھائے ہوئے تھی۔ "یہ کیا ہے؟" میں نے تردد سے پوچھا۔ "آپ کیا لے آئیں؟"

"ہم آپ کے لیے لونگ کی چائے کہہ کے آئے تھے۔ نزلے میں مفید ہوتی ہے۔" نفیس کے بجائے برجیس نے جواب دیا۔ "یہ ہماری امّی جان کا نسخہ ہے۔ زعفران کے علاوہ وہ اس میں جانے کیا کیا آمیزش کرتی ہیں کہ سکون ہو جاتی ہے اور نیند میں حارج نہیں ہوتی۔"

"آپ نے اُنھیں اس وقت زحمت دی تھی؟"

"نہیں، یہ تو خادماؤں نے اُن کے نسخے پر بنائی ہوگی۔"

"آپ اُنھیں امّی جان ہی کہتی ہیں۔"

"ہمیں یہی اچھا لگتا ہے۔" وہ لجائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "خود وہ بھی اسے پسند کرتی ہیں۔"

"میں بھی اپنی ماں کو امّی کہا کرتا تھا۔"

"کہا کرتے تھے؟" وہ چونک کے بولی۔ "کیا وہ، وہ خدانخواستہ۔ ۔ ۔" وہ کہتے کہتے رُک گئی۔

"ہاں وہ چلی گئیں۔ اب تو زمانہ ہوگیا۔"

"ارے! ہمیں یہ سُن کے دُکھ ہوا۔" وہ اداسی سے بولی۔ "کب اُن کا انتقال ہوا؟"

"کئی سال ہوگئے۔" میری آواز بھرّانے لگی۔ اُس نے پھر مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ میری آنکھوں کے سامنے امّی جان کا چہرہ گھومنے لگا اور بے اختیار آنسو اُمڈ آئے۔

"معلوم ہوتا ہے آپ کو اُن سے بہت محبت تھی۔" وہ نرم اور

شفیق آواز میں بولی۔

"نہیں!" میں نے تُندی سے کہا۔ "مجھے اُن کا کوئی خیال نہیں تھا۔"

"جی!" وہ پلکیں پٹ پٹانے لگی۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں!" "مجھے اُن سے محبت ہوتی تو، تو میں۔ ۔ ۔"

میں نے اپنی آواز حلق میں گھونٹ لی۔ مجھے اُس سے یہ سب کچھ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی تجسّس ظاہر کرتی، میں نے اُس سے کہا کہ کل صبح جب میں نیچے آؤں تو وہ مجھے اپنی امّی جان سے ضرور ملائے، میں اُن کی خدمت میں سلام کے لیے حاضر ہونا چاہتا ہوں۔

"ضرور، ضرور" وہ شادمانی سے بولی۔ "وہ آپ کو دیکھ کے بہت خوش ہوں گی۔ ہم بتا نہیں سکتے کہ خانم آپی کے آنے سے وہ کس قدر پُرسکون ہو گئی ہیں!"

خادمہ نفیس چائے رکھ کے واپس چلی گئی تھی۔ پروین نے اپنے ہاتھ سے فنجانوں میں چائے انڈیلی اور راب کے مجھ سے شکر کے لیے نہیں پوچھا۔ وہ دُودھ کے بغیر نہایت خوش ذائقہ چائے تھی۔ میں نے ایک کے بجائے دو فنجان پیے۔ "اور راب جو شاندے کا کیا ہوگا؟" میں نے مسکراتے ہوئے اُسے ٹوکا۔

"ارے ہاں، ہم تو بھول ہی گئے!" وہ پریشان سی ہو گئی اور معصومیت سے بولی۔ "اب تو ٹھنڈا بھی ہو گیا ہوگا۔ ویسے سوتے وقت ہی پینا مناسب ہوتا ہے۔ بہتر ہے ہم دوسرا پیالہ بھیج دیتے ہیں!"

"میرا خیال ہے اس چائے والے نسخے پر اکتفا کرنا چاہیے!"

"آزمودہ ہے، انشا اللہ اسی سے افاقہ ہو جائے گا لیکن بہتر ہے کہ اُسے بھی پی لیجیے!"

"آپ رہنے دیجیے، رات کو بے آرامی رہی تو کسی کو بلا کے کہہ دُوں گا!"

اُسے آئے ہوئے دیر ہو گئی تھی۔ میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ وہ چلی جائے۔ اُس کے چہرے سے بھی یہی ظاہر ہوتا تھا مگر رات بہت ہو گئی تھی۔ چائے پیتے ہی وہ اُٹھ گئی۔ "ہمیں اُمید ہے، صبح تک آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے!"

"میں تو ابھی سے بہت بہتر محسوس کر رہا ہوں!"

"ہم اور بیٹھتے لیکن اب ہمیں جانا چاہیے!"

"مجھے بھی اس کا خیال ہے ورنہ میں آپ سے درخواست کرتا!"

"ہم پھر آ جائیں گے۔ ہو سکا تو کل ہی۔ ویسے کل صبح تو آپ آئیں گے ہی؟"

"ہاں، ہاں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کل اس طرف نہ آئیں!"

"ہم ضرور آئیں گے، کل اسی وقت، بلکہ کچھ پہلے!"

"میں انتظار کروں گا!"

"ہم بھی رات آنے کے منتظر رہیں گے!" وہ سر جھکا کے آہستگی سے بولی۔ لرزتے ہونٹوں سے اُس نے شب بخیر کہا۔ اُس کے رخساروں پر شفق سی پھوٹ رہی تھی۔ جاتے ہوئے اُس نے ایک اچٹتی نگاہ سے مجھے دیکھا اور معاً اندرونی دروازے میں چھپ گئی۔

اُس کے جاتے ہی میں نے بستر پر اپنا جسم پھیلا دیا تھا۔ میں نے نہ کھڑکیوں کے پردے ہٹائے، نہ روشنی گل کی، نہ آمد و رفت کے عام دروازے کی چٹخنی گرائی اور نہ چپل اُتارے۔ میں یُوں ہی بے سُدھ سا بستر پر لیٹا رہا۔ آدمی کی اپنی بھی ایک خوشبو ہوتی ہے۔ وہ کمرے میں اپنی خوشبو چھوڑ گئی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کرنی چاہیں لیکن نیند نہیں آئی۔ بار بار اُس کا چہرہ، اُس کا سراپا سامنے آ جاتا تھا۔ شاید میں خود سونا نہیں چاہتا تھا کیونکہ نیند سے وہ سب کچھ معدوم ہو جانے کا خدشہ تھا جو اُس کے جانے کے بعد بھی موجود تھا۔ اُس کی آوازیں، اُس کی آہٹیں اور اُس کی خوشبو۔ بھینی بھینی، لطیف سی، عجیب سی جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ وہ خوشبو چمپا کی تھی، نہ جوہی کی، نہ گلاب کی۔ وہ تو کچھ اور ہی تھی۔ وہ خوشبو میری سانسوں میں بسی ہوئی تھی۔ جب تک وہ بیٹھی رہی، میرا جسم بندھا ہوا سا، کھنچا ہوا سا رہا۔ میری نگاہ اُس پر جمتی ہی نہیں تھی۔ ایک نظر اُسے دیکھتا اور آنکھیں خیرہ ہونے لگتیں۔ وہ سامنے نہیں تھی تو اب جیسے میں اُسے اطمینان سے دیکھ سکتا تھا۔ یہ اتفاق بھی خوب ہوا، میرا یہاں آنا اور نفیس سے یوں ہی نزلے کی شکایت کر دینا۔ اگر میں نہ آتا اور نفیس سے یہ نہ کہتا تو وہ کم از کم اس وقت کبھی اُوپر نہ آتی۔ یہی تو میرا دل کہہ رہا تھا کہ مجھے اپنے کمرے میں جانا چاہیے، شاید وہاں کوئی میرا منتظر ہو۔ اچھا ہی ہوا جو میں قوّالی چھوڑ کے اِدھر آ گیا۔ قوّالی سے لاکھ درجے دل کش اُس کی بزم تھی۔ قوّال تو باقاعدہ کوشش کرتے ہیں۔ ساز اور آواز کے ساتھ ساتھ کلام بھی پُراثر ہونا ضروری ہے، تبھی بات بنتی ہے۔ اُس کی تو آواز ہی ساز ہے، سَر بہ سَر نغمہ۔ اُس کے لہجے میں ترنّم کوٹ کوٹ کے بھرا ہے۔ صنّاعِ فطرت نے اُس کے سلسلے میں ہر اعتبار سے فیّاضی برتی ہے۔ کرنیں سی اُس کے گلابی، شہابی رنگ سے پھوٹتی تھیں۔ پھول توڑتے وقت آدمی کے ہاتھ نرم پڑ جاتے ہیں۔ پھول کیا، کسی بھی نازک چیز کے سامنے آدمی میں احتیاط خود بہ خود آ جاتی ہے کہ کہیں چھُونے سے میلی نہ ہو جائے، اُس پر شکن نہ آ جائے، کہیں وہ ٹوٹ نہ جائے۔ میں بستر پر پڑا پڑا اُس کی اور اپنی ایک ایک بات دُہراتا

ہا کہ کہیں میں نے اُس سے کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں کہہ دی ہے جس سے اُس کی دل شکنی کا پہلو نکلتا ہو۔ اُس کے سامنے تو اُونچی آواز میں ت بھی نہیں کی جا سکتی۔ میں نے اپنے طور پر پوری احتیاط کی تھی تاہم ب مجھے بہت سی باتوں کا خیال آ رہا تھا۔ میں اُس سے اور نرم اور شگفتہ لہجے ں بات کر سکتا تھا۔

کمرے میں سکوت چھایا ہوا تھا۔ اندرونی دروازے کے اُس طرف ازموں کے گوشے میں خادمہ نفیس ضرور موجود ہوگی۔ میں اُسے بلا سکتا تھا۔ ں مرتبہ اُس کے سامنے زبان کھولتے ہوئے شاید مجھے اتنی دشواری نہ ہو۔ میرے جی میں ایک بار آئی تھی لیکن میں نے ارادہ ترک کر دیا۔ اس ناٹے میں بہت سکون چھپا ہوا تھا۔ گھڑی نے دو بجائے، پھر ڈھائی گھنٹا بجا اور پھر تین کا۔ میں مسہری سے اُٹھ کے کھڑکی پر آ گیا۔ کھڑکی کے ردے اور پٹ کھولنے پر ٹھنڈی ہوا در آئی، باہر تا حدِ نظر فرش، دیواریں ور درخت کے چاندنی میں نہا رہے تھے اور جھینگروں، مینڈکوں کی صداؤں سے فضا گونج رہی تھی۔ کتنا عجیب ہے کہ یہ صدائیں رات کی خاموشی اور بڑھا دیتی ہیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں باہر نکل پڑتا مگر میرے باہر نکلنے سے جگہ جگہ تعینات حویلی کے خادم خواہ مخواہ پریشان ہوتے، سو میں یں کھڑکی سے لگا کھڑا انگڑائیاں لیتا، ہاتھ پیر کھولتا اور تازہ تازہ ہوا سینے یں بھرتا رہا۔ میرا بند بند جیسے کھل رہا تھا۔ پھر کھڑکی سے ہٹ کے یں نے دو ایک روشنیاں گل کر دیں، لیکن کمرے کی مدّھم روشنی سے مجھے اُلجھن ہونے لگی تو میں نے سارے قمقمے دوبارہ روشن کر دیے اور کتابوں کے ورق پلٹنے لگا۔ کسی کتاب کا ایک پیرا بھی دھیان سے نہ پڑھ سکا۔ بمبئی میں کرشنا جی کے گھر بھی ریڈیو موجود تھا۔ میں نے اُس کا بٹن گھما پھرا کے دیکھا تو ہر جگہ سے انگریزی اور غیر ملکی پروگرام آ رہے تھے۔ گڑگڑاہٹ بھی بہت تھی، میں نے ریڈیو بھی بند کر دیا۔ سکوت ہی زیادہ بھلا تھا۔ نیند اور بیداری کے درمیان جو کیفیت ہوتی ہے، جس میں آدمی سوتا بھی ہے، جاگتا بھی ہے۔ نہ جاگتا ہے اور نہ سوتا ہے۔ میری بھی کچھ یہی حالت تھی۔ دل و دماغ پر غنودگی سی چھائی ہوئی تھی مگر مجھے اپنے ہوش و حواس کا بھی پورا یقین تھا۔ دن میں، میں نے کئی پان کھائے تھے۔ دانت مانجھ کے میں نے پھر آنکھیں موندنے کی کوشش کی اور پھر ابھی چار نہیں بج پائے تھے کیونکہ میں نے چار بجنے کی آواز نہیں سُنی تھی، جانے کس وقت مجھے نیند آ گئی۔

کمرے میں قمقموں کی تیز روشنی میں صبح کی روشنی بھی شامل ہو گئی تھی۔ میں نے ہڑبڑا کے آنکھیں کھول دیں۔ کانتے بُری طرح مجھے جھنجوڑ رہا تھا۔ اُس کے چہرے اور آواز پر وحشت چھائی ہوئی تھی۔ "لاڈلے! لاڈلے! اُٹھ جا، جلدی سے اُٹھ جا۔"

میں نے تُرش نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ "کچھ دیر اور سونے دو کانتے بھائی! رات کو بہت دیر سے آنکھ لگی تھی!" میں نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

"پر جانی! اِس ٹائم اُٹھ جانا ہی ٹھیک ہے!"

"کیوں؟ کیا بات ہے؟" میں نے چونک کے پوچھا۔

"بس جلدی سے منہ ہاتھ دھو لے!"

اُس کی آواز مجھے ٹھیک نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ "بتاؤ نا، کیا بات ہے؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"پہلے منہ ہاتھ دھو لے، پھر نیچے کو چلنا ہے!"

"نیچے کیا ہے؟ بتاتے کیوں نہیں؟"

"ضد مت کر لاڈلے! جو بولتا ہوں، پہلے وہ!" کانتے نے تلخی سے کہا۔ "ہر بات پر تو ایسا کیوں کرنے لگتا ہے؟"

"جب تک تم بتاؤ گے نہیں، مجھ سے کچھ نہیں ہوگا!"

"تجھ کو بولنے ہی آیا ہوں!"

میں نے جھپٹ کے اُس کے شانے پکڑ لیے۔ کانتے کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور وہ مجھ سے نظریں چُرا رہا تھا۔ "کانتے بھائی!" میں نے لرزتی آواز میں اُس سے پوچھنا چاہا۔

"کیا بولوں لاڈلے!" وہ بھنچے ہوئے ہونٹوں سے بولا۔ "چھوٹا نواب چلا گیا!"

"کیا؟ ۔ ۔ ۔"

"ہاں لاڈلے! وہ چلا گیا!"

"کانتے نے جیسے میرے سینے میں خنجر اُتار دیا ہو۔ میں پھٹی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھتا رہا۔

"ابھی نیچے اندر سے خبر آئی ہے!" کانتے جیسے بہت دُور سے بول رہا تھا۔ مجھے سکتہ سا ہو گیا۔ کانتے میرے گلے سے لپٹ کے ہڑکنے لگا۔ "اپنے کو پتہ تھا لاڈلے، سُن کے تیرا بھی یہی حال ہوگا!"

"نہیں نہیں کانتے بھائی! یہ غلط ہے!"

"تیرا بھائی بھی یہی جان رہا تھا، پر اُوپر نیچے ساری حویلی میں کہرام پڑا ہے!"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے!"

"ہو گیا لاڈلے! ہو گیا!" کانتے رو رہا تھا۔ "چل، اُٹھ کھڑا ہو۔ نیچے بڑا نواب بیٹھا ہے!"

میں فوراً بستر سے اُٹھ گیا لیکن مجھ سے اپنے قدموں پر کھڑا نہ ہوا جاسکا۔ میرا سارا جسم پتھر ہو گیا تھا۔ کانتے نے مجھے سنبھال لیا۔ مجھے بستر پر بٹھا کے لوٹا، پانی، تولیا اور سلفچی لے آیا، میرے ہاتھ کام نہیں کر رہے تھے۔ کانتے بھیگی تولیا سے میرا مُنہ خشک کرنے لگا۔ میں اُسے ایک طرف ہٹا کے اندرونی دروازے کی جانب بھاگا۔ کانتے نے مجھے دروازے کے پاس پکڑ لیا۔ "کدھر کو جا رہا ہے؟"

"تم ٹھیرو کانتے بھائی! میں ابھی آتا ہوں۔ میں نیچے زنان خانے میں جا رہا ہوں۔" میں نے دروازہ عبور کر لیا اور نیچے آخری سیڑھیوں تک چلا گیا لیکن میرے قدم وہیں جم کے رہ گئے۔ لمحوں تک میں زینے میں بیٹھا ہانپتا رہا۔ اندر سے بھاگ دوڑ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ مجھے وہاں کوئی دیکھ لیتا، میں کمرے میں واپس آ گیا۔ کانتے دروازے کے پاس ہی کھڑا تھا۔ اُس کے کہنے پر میں نے مُنہ پر پانی کے دو چھپکے مار لیے تھے اور بالوں میں کنگھی بھی کر لی تھی۔ باہر صحن اور دالان ویران پڑے تھے۔ کانتے کا ہاتھ پکڑے پکڑے میں نے سیڑھیاں طے کیں۔ نیچے چند قدم کے فاصلے پر نشست گاہ کے باہر بنے ہوئے چبوترے پر وہ سب موجود تھے۔ سب سے پہلے میری نگاہ بڑے نواب ہی پر پڑی تھی۔ منیر علی، ابا جان، بٹھل اور پیرو اُس کے اِردگرد دم بخود بیٹھے تھے۔ بڑا نواب سر جھکائے جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوبا نظر آتا تھا۔ ہماری آہٹ پر اُس نے ایک بار سر اُٹھا کے مجھے دیکھا۔ میرا جسم لرز کے رہ گیا۔ اُس نے ہاتھ اُٹھا کے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اُس کی آنکھیں بھاری بھاری تھیں اور اُن میں آنسوؤں کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔ شیروانی کے سارے بٹن بند تھے اور مانگ بھی سلیقے سے کڑھی ہوئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے ایسا لگا جیسے کانتے نے مجھ سے بہت بڑا مذاق کیا ہو، جیسے سبھی مجھے دھوکا دے رہے ہوں اور جیسے سب نے جان بُوجھ کے مجھے ستانے کے لیے یہ خاموشی اختیار کی ہو۔ یا جیسے یہ سب میرے دماغ کا خلل ہو۔ جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ کاش ایسا ہی ہوتا۔ بڑے نواب کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے لیکن اُس کا سارا وجود ریت کا ڈھیر معلوم ہوتا تھا۔ میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ میں نے بٹھل کی طرف دیکھا۔ وہ بھی بُت کی طرح ساکت بیٹھا تھا۔ چبوترے کے باہر حویلی کے خادم اِدھر اُدھر لپک رہے تھے۔ کانتے مجھے یہاں کیوں لے آیا تھا۔ مجھ سے ایک پل کے لیے بھی نہیں ٹھیرا جا رہا تھا۔ بار بار میری نگاہ بڑے نواب کی طرف اُٹھتی تھی۔ اُس کے جسم میں کوئی جنبش نہیں تھی۔ پلکیں بھی بے حرکت تھیں۔ میں وہاں سے اُٹھ جاتا مگر اتنے میں چبوترے کے سامنے ایک موٹر آ کے رُکی اور نواب حشمت جنگ تیزی سے

باہر نکلا۔ وہ تقریباً بھاگتا ہوا چبوترے پر چڑھا، بڑے نواب نے چونک کے اُس کی طرف دیکھا اور کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ ہم سب کھڑے ہو گئے تھے۔ نواب حشمت جنگ پر دیوانگی طاری تھی۔ ہماری جانب اضطراری نظروں سے دیکھتا ہوا بڑے نواب سے لپٹ گیا اور چیخیں مارنے لگا۔ "یہ کیا ہو گیا جہانی میاں! یہ کیا ہو گیا؟" بڑے نواب کے نتھنے پھولے ہوئے تھے اور ہونٹ کپکپا رہے تھے لیکن اُس کی زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہیں ہوا۔ نواب حشمت جنگ اُس کے شانوں سے سر رگڑنے اور سینے پر سر مارنے لگا۔ اُسے اس حالت میں دیکھ کے میری سسکیاں نکل پڑیں۔ کانتے بھی رونے لگا۔ زورا نے کمر سے میرا کرتا پکڑ لیا تھا مگر وہ خود سسک رہا تھا۔ ابا جان نے نواب حشمت جنگ کو بڑے نواب سے الگ کیا تو وہ اُن کے سینے سے لپٹ گیا۔ ابا جان اُسے تھپکیاں دیتے اور بُدبُداتے ہوئے جانے کیا کیا تلقین کرتے رہے۔ منیر علی نے بھی اُسے کرسی پر بٹھانا چاہا لیکن وہ اُن سے اپنا بازو چھڑا کے دفعتہً اندر نشست گاہ کی طرف بھاگ پڑا۔ بڑا نواب وہیں بیٹھا رہا۔ ابھی حشمت جنگ کو آئے دیر نہیں ہوئی تھی کہ ایک دوسری موٹر آ کے رُکی، پھر تیسری، چوتھی۔ بٹھل پیرو اور منیر علی بڑے نواب کے پاس سے ہٹ گئے۔ دیکھتے دیکھتے آنے والوں سے چبوترا ابھر گیا تھا۔

وہاں سے اُٹھنا اب کوئی مشکل نہیں تھا۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔ میں چبوترے سے اُتر آیا۔ میں اُتر تو آیا تھا لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں، کہاں جاؤں، مجھے کیا کرنا چاہیے؟ بڑے دروازے سے لوگ مسلسل چبوترے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں حویلی کے عقب میں ایک طرف نکل گیا۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد میری سانس پھولنے لگی، میں قریبی پتھر کی ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ یہ باغ کا ایک حصہ تھا اور یہاں بہت سناٹا تھا۔ مجھے کسی ایسی ہی جگہ کی ضرورت تھی جہاں ذرا دیر ٹھیر کے خود کو یکسُو کر سکوں اور سمجھ سکوں کہ یہ سب کیا ہے لیکن اچانک میرے جسم میں کوئی جھٹکا سا لگتا تھا اور میرا سر دھمکنے لگتا تھا۔ مجھے یہاں آئے چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ یک لخت میں بنچ سے اُٹھ گیا اور میں نے چبوترے کی جانب واپس جانے کا ارادہ کیا۔ وہاں لوگ اکٹھے ہو رہے ہوں گے اور میں یہاں آ گیا ہوں۔ کسی نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو کیا ہو گا اور اُس طرف کوئی مجھے ڈھونڈ نہ رہا ہو۔ میں نے صرف ایک دو قدم طے کیے تھے کہ مجھے چکر سا آنے لگا اور میں دوبارہ بنچ پر ڈھیر ہو گیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں زمین میں دھنستا جا رہا ہوں، اندھیرے میں ڈوب رہا ہوں۔ جیسے سب کچھ ختم ہونے کو ہے۔ یہ باغ، یہ پھول، یہ پتے، سب آن کی آن میں ختم ہو جائیں گے

میری آنکھیں جیسے میری آنکھیں نہیں رہی تھیں۔ مجھے سب کچھ اجنبی اور مصنوعی لگ رہا تھا۔ پھولوں کے رنگ، پرندوں کی آوازیں، اپنا وجود۔ یہ سب ایک فریبِ نظر ہے۔ سب اکارت۔ ابھی کوئی آندھی چلے گی یا آگ بھڑکے گی اور سارا کچھ اپنی اصل شکل میں آ جائے گا۔

کوئی اندازہ نہیں تھا کہ مجھے یہاں آئے کتنا وقت گزر چکا ہے۔ کانتے اور زورا نہ آ جاتے تو شاید میرا جسم وہیں بیٹھے بیٹھے اکڑ جاتا۔ کانتے نے آتے ہی مجھے دبوچ لیا تھا۔ "کدھر چھپا بیٹھا ہے تُو؟" وہ برہمی سے بولا۔ "سارے میں چھان مارا۔" میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھ میں جواب دینے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ زورا نے میرے ہاتھ پکڑ لیے اور اپنے سینے سے لگا کے بولا۔ "قسم سے راجا! اپن نے اس کو ایک دم نئیں دیکھا تھا۔ پر ابھی اپن کو ایسا لگتا ہے کہ اپنا کوئی بھائی چلا گیا، اپنا ماں باپ مر گیا ہے۔" زورا رُندھی ہوئی آواز میں بولا۔

"اُدھر لوگ باگ بہت آ گئے ہیں لاڈلے!" کانتے نے ترش لہجے میں مجھے ٹوکا۔

"ہاں راجا! اور اُدھر استاد نے بولا ہے کہ ابھی ترت اس کو اِدھر لے کے آؤ۔ اُس کو اِدھر رہی ہونا چاہیے۔ ابھی کچھ دیر میں میت اُٹھنے والا ہے۔"

میں نے منڈلاتی نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ کانتے نے میری کمر میں ہاتھ ڈال کے ایک جھٹکے سے مجھے کھڑا کر دیا۔ اُن دونوں نے دونوں جانب سے میرے ہاتھ جکڑ رکھے تھے لیکن میں اپنے ہی پیروں سے واپس آیا۔ ہر طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور چبوترے کے پاس ایک اژدہام نظر آ رہا تھا۔ اُس طرف جانے کے بجائے کانتے اور زورا پہلے ہی ایک سیڑھی پر چڑھ گئے اور راہداری سے ایک کمرے میں آ گئے۔ بٹھل اور پیرو کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔ دونوں آرام کرسیوں پر ایک دوسرے کے قریب خاموش بیٹھے تھے۔ میرے داخل ہوتے ہی بٹھل نے بوجھل آواز میں مجھ سے پوچھا۔ "کدھر چلا گیا تھا رے؟"

"یہیں، میں یہیں تھا۔" میں نے منمناتے ہوئے کہا۔

"بیٹھ جا، برات اُٹھنے ہی والی ہے۔"

میرے سینے میں ایک ہوک سی اُٹھی۔ میں نے بے تابانہ اُس کی طرف دیکھا۔ بٹھل کی آنکھوں میں خون بھرا ہوا تھا۔

"اور جانی! اندر جا کے کپڑے ذرا بدل لے۔" پیرو نے تھکے ہوئے لہجے میں مجھ سے کہا۔ وہ سبھی اُجلے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔

"یہی ٹھیک ہیں دادا!" میں نے آہستگی سے کہا۔

"بدل لے رے۔" بٹھل تنک کر بولا۔ "بابا نے اُدھر حویلی سے خاص کر منگوائے ہیں۔"

"دادا! ابھی تمی اس کو بولو۔" زورا نے مچلتی آواز میں بٹھل سے کہا۔ "ابھی کوئی کیا کر سکتا ہے۔"

بٹھل ہنکاری بھر کے رہ گیا۔

"اپن کو یاد ہے۔" پیرو کہنے لگا۔ "اپن کا جامنی بائی کبھی ایک گانا سناتا تھا جس کا بول تھا کہ مرنے کا ایک دن لکھا ہے۔ اُس کا مطلب تھا کہ آدمی اپنا وقت لے کر آتا ہے۔"

"کدھر کو دادا؟" کانتے کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ عود کر آئی۔ "ہر دن سالا موت کا دن ہے۔ کوئی بھی طے نہیں لگتا دادا! بس آگے کو ٹلتا، کھسکتا رہتا ہے۔ لکھا ہوا کسی کو سُوجھتا نہیں تو سب برابر ہے۔"

پیرو سر ہلانے لگا۔ زورا نے میرے کپڑے لا کے سامنے رکھ دیے تھے اور کہنے لگا کہ میں یہ عجلت پہن لوں کیونکہ کسی وقت بھی جنازہ اُٹھنے کی اطلاع آ سکتی ہے۔ میں نے ضد نہیں کی۔ وہیں کمرے سے ملحق غسل خانہ بنا ہوا تھا۔ زورا میرا ہاتھ تھام کے مجھے وہاں لے آیا جیسے میں کوئی بچہ ہوں، جیسے میں اندھا ہو گیا ہوں۔ میں نے اندر جا کے لباس تبدیل کر لیا۔ وہ میرے ہی کپڑے تھے۔ کرتا، پاجامہ اور واسکٹ۔ میرے باہر نکلتے ہی وہ چاروں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میری آنکھیں جل رہی تھیں۔ بٹھل نے دروازہ عبور کرتے ہوئے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ "سنبھل کے رے۔" وہ جھنجھلاتے لہجے میں مجھ سے کہنے لگا۔

چبوترا دُور نہیں تھا۔ وہاں بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے، سرگوشیوں، دھیمی دھیمی آوازوں اور سسکیوں کا ملا جُلا شور گونج رہا تھا۔ بیچ میں جنازہ رکھا تھا۔ سب اُس کے اطراف گھومتے ہوئے چھوٹے نواب کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ کانتے نے مجھے بھی اس حلقے کی طرف دھکیلنا چاہا لیکن مجھ سے آگے نہ جایا جا سکا۔ مجھے چھوڑ کے وہ سب ہجوم میں شامل ہو گئے تھے۔ میں ایک ستون سے کمر ٹکائے وہیں پیچھے کھڑا رہا۔ اس دوران خاں صاحب میرے سامنے سے گزرے۔ اُن پر گریہ طاری تھا۔ کئی آدمی اُنھیں کھینچتے گھسیٹتے ہوئے ایک جانب لے گئے۔ جنازہ جس وقت اُٹھا، ایسا لگا جیسے ساری حویلی بین کر رہی ہو، در و دیوار بلک رہے ہوں۔ حویلی کے کتنے خادم خود کو نوچ کھسوٹ رہے تھے، پھوٹ پھوٹ کے رو رہے تھے۔ میں کسی تماشائی کی طرح نظارہ کرتا رہا۔ جب وہ آگے بڑھے تو میں بھی اُن کے ساتھ چلنے لگا۔ بڑے دروازے تک جانے والے راستے پر آدمی ہی آدمی نظر آ رہے تھے۔ بڑا دروازہ پورا کھلا ہوا تھا۔ وہاں سے گزر کے وہ حویلی کی فصیلوں کے باہر میدان میں آئے پھر سڑک پر آ گئے۔ آگے کسی جگہ کانتے اور زورا نے مجھے ڈھونڈ لیا۔ "تُو نے دیکھا

لاڈلے!" کانتے سنلتے لہجے میں بولا۔"لگتا تھا، کوئی سپنا دیکھ رہا ہے، کوئی بہت اچھا سپنا۔ سپنا دیکھتے دیکھتے جیسے کسی بات پر کھل اُٹھا ہو۔ کیوں زورا؟"

"ہاں راجا! اپن نے بہت لوگوں کو کندھا دیا ہے پر ایسا کبھی نہیں دیکھا۔ مُنہ پھول کے مافک کھلا ہوا تھا۔"

"پر وہ مَرا ہوا ہی تھا نا؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

"ہاں لاڈلے!" کانتے مرجھائے لہجے میں بولا۔"پر اپن کو یقین ہے، وہ بہت آرام سے گیا ہے۔ اُس کو اِدھر دیکھے ہوئے اپنے کو دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ جب میں اِدھر اُستاد کے ساتھ آیا تھا اور بڑا نواب ہم کو اُسے دِکھلانے لے گیا تھا۔ لاڈلے! اُس وقت وہ مرا ہوا لگتا تھا، اب تو وہ زندہ معلوم ہوتا تھا۔ اُدھر جو دیکھتا تھا یہی بولتا تھا۔ اُس کا تو رنگ ہی ایک دم بدلا ہوا تھا۔ مُندی ہوئی انکھیاں، جیسے آدمی جاگ رہا ہو اور جاگتے میں کچھ سوچ رہا ہو، کوئی بہت اچھی بات سوچ رہا ہو۔ ابھی قبر کے پاس شاید دوبارہ منہ دکھائیں تو خود دیکھ لینا۔"

قبرستان حویلی سے میل بھر کے فاصلے پر تھا۔ وسیع و عریض احاطے کے اندر صرف چند قبریں بنی ہوئی تھیں اور باغ کا سا منظر تھا۔ ایک طرف بنی ہوئی چھوٹی سی لال مسجد کے صحن میں پہلے سے کلامِ پاک کی تلاوت ہو رہی تھی۔ احاطے میں آ کے سب بکھر گئے تھے۔ طرح طرح کے لوگ وہاں موجود تھے۔ کہتے ہیں اتنا بڑا مجمع کسی خوش بخت، کسی جنتی کی موت پر ہوتا ہے۔ دھوتی اور بند گلے کے کوٹ میں ملبوس سو ڈیڑھ سو آدمیوں کے سوا تقریباً سبھی شیروانیوں اور ترکی ٹوپی میں ملبوس تھے۔ ابا جان اور منیر علی بھی شیروانی پہنے ہوئے تھے۔ صرف ہمی چند سب سے مختلف نظر آ رہے ہوں گے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ لوگوں کی نظریں بار بار ہماری جانب اُٹھتی تھیں۔ نواب عالم تاب کا گہوارہ مسجد کے صحن میں رکھ دیا گیا۔ بہت سے لوگ راستے بھر سسکتے رہے تھے، یہاں بھی اُن کا یہی حال تھا۔ میرا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ اس لیے میں مسجد سے کچھ دُور ایک اونچی جگہ بیٹھ گیا تھا۔ کانتے کسی طرف نکل گیا تھا مگر تھوڑی ہی دیر میں لپکتا ہوا میرے پاس آیا اور سرگوشی کے انداز میں مجھ سے کہنے لگا۔

"لاڈلے! وہ پولیس افسر اِدھر بھی موجود ہے۔"

"کون پولیس افسر؟" میں نے اُچھل کے پوچھا۔

"وہی جو اڈّے پر اُستاد کے پاس آیا تھا۔" کانتے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔"وہی اکڑی باز۔ اپنے آپ کو بڑا اشکاری بولتا تھا، بولتا تھا کہ اُس رستم کے جینے کو ریاست میں خاص کر کے بلایا گیا ہے۔ وہی جو اُستاد سے اُلٹی سیدھی ہانک رہا تھا اور اُستاد نے اُس کو آگا پیچھا دیکھ کے ہاتھ ڈالنے کو بولا تھا۔ میں نے تجھ کو سارا بتایا تھا نا؟"

"ہاں، ہاں۔" میں نے تذبذب سے سر ہلایا۔

"وہ اِدھر بھی ہے، وردی میں نہیں ہے۔ پتہ نہیں، اُس نے اُستاد کو ابھی دیکھا ہے کہ نہیں۔ میں تو اُدھر سے کنی کاٹ کے آگیا ہوں۔" کانتے مضطرب آواز میں بولا۔

"تو کیا ہوا؟" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"کھوپڑی کا سیدھا نہیں ہے لاڈلے!" وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا۔

"یہاں تو ایسے اور بھی لوگ ہوں گے۔ اڈّے اور بازار کا کوئی آدمی یہاں نہیں ہو سکتا کیا؟ اور پولیس کا کوئی اور شخص؟ اتنے دن اُس پر تم پردے میں تو نہیں بیٹھے رہے تھے۔"

"پر اس کی بات دوسری ہے۔" کانتے جز بز ہو کے بولا۔

"کیا کرلے گا؟"

"خار لے کے گیا تھا لاڈلے! اُستاد کو اِدھر دیکھ کے بدک سکتا ہے۔ مجھ پر تو اُس نے ایسا دھیان نہیں دیا تھا پر اُستاد کا نقشہ کبھی نہیں بھول سکتا۔ اچھی تُو تُو تکار ہوئی تھی۔ کم کٹ کھنا نہیں ہے۔ متھے میں کوئی بھی بات اٹک گئی تو ...... "

"تو کیا ہو جائے گا؟" میں نے ترشی سے کہا۔

"خواہ مخواہ کا اڑنگا لگا سکتا ہے۔"

"اس سے زیادہ تو کچھ نہیں ہو سکتا کانتے بھائی!" میں نے چھوٹے نواب کی میت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں لاڈلے۔" اُس کی آواز بجھ گئی۔

"یہ بات تو یہاں آنے سے پہلے سوچنی چاہیے تھی۔"

"میرے جی میں آیا تھا کہ اُستاد کو منع کر دوں۔"

"یہ کیسے ممکن تھا، گھر میں ٹھیرے ہوئے مہمان، گھر کے آدمی کے مرنے پر چھپے بیٹھے آرام کرتے رہیں۔"

مجھے معلوم تھا کہ کانتے کے پاس کوئی جواب نہیں ہوگا۔ وہ چُپ ہو گیا لیکن مطمئن نہیں تھا۔ میرے پاس سے اُٹھ کے چلا گیا۔ صرف ایک پولیس افسر کا کیا ذکر، کانتے نے بے دردی لوگوں کے متعلق غور نہیں کیا جن کی صُبح سے حویلی میں قطار بندھی ہوئی تھی۔ ابا جان اور منیر علی تو مستقلاً بڑے نواب کے اِرد گرد موجود رہے تھے اور اُنھیں رہنا بھی چاہیے تھا لیکن تعزیت داروں کے لیے بڑے نواب کے قریب اِن اجنبیوں کی موجودگی تجسّس کا باعث نہ رہی ہو گی کیا۔ نواب حشمت جنگ کے علاوہ بڑے نواب کے کتنے اعزّا اور قرابت دار وہاں آئے ہوں گے اور یہاں موجود ہوں گے۔ ہمارے بارے میں اُن کے اشارے پر بڑے نواب نے نہیں حویلی کے خادموں نے تو کچھ نہ کچھ ضرور بتایا ہو گا کہ یہی سبز قدم دو دن پہلے حویلی میں وارد ہوئے تھے۔ آدمی کی زبان سب سے بے قابو چیز ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں کسی کو کتنا احساس ہو سکتا ہے کہ کون سی بات مناسب ہے، کون سی نہیں۔ ابا جان، منیر علی، ببّھل اور پیرو بھی کیا یہ سب کچھ نہیں جان رہے ہوں گے۔

کانتے کو یہ اندیشے ڈسنے لگے تھے۔ سامنے مسجد کے صحن میں ایک لنارے چھوٹے نواب کی میت رکھی ہوئی تھی۔ کانتے نہیں جانتا تھا کہ جو نظر آتا ہے، وہی ایک مرنے والا نہیں ہوتا۔ مرنے والے کو ایک بار مر کے چین پڑ جاتا ہے لیکن اُس کے رونے والے بار بار مرتے ہیں اور اُنھیں کبھی چین نہیں ملتا۔ کانتے نے اتنا کہاں دیکھا اور سُنا تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ ایک آدمی کے چلے جانے سے کبھی کتنا اندھیرا ہو جاتا ہے۔ میں اُس سے کیا کہتا کہ ذرا ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں سے دیکھنے، میرے کانوں سے سُننے کی کوشش کرے۔ کیسی کیسی صدائیں، کیسے کیسے چہرے اُس کا سینہ جلاتے ہیں۔ اُن سوالی چہروں کے سامنے یہ پولیس افسر کیا حیثیت رکھتا ہے۔

ظہر کی نماز کے فوراً بعد لوگ جنازے کی نماز کے لیے صفیں باندھنے لگے۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ صبح مجھے غسل کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی لیکن اور بھی بے شمار لوگ مسجد سے دُور الگ کھڑے تھے۔ ان میں غیر مسلم بھی ہوں گے اور وہ بھی جو میری طرح نماز میں شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ نماز ختم ہوتے ہی چھوٹے نواب کی سواری صحن سے اُٹھا کے سنگِ مرمر کے سائبان میں رکھ دی گئی تھی۔ ایک ہی موقع تو آتا ہے۔ نہ گھوڑا، نہ ہاتھی، جب اتنے بہت سے آدمی کسی کی سواری اُٹھاتے ہیں۔ شاید دوبارہ رونمائی ہو رہی تھی جو سائبان کے اطراف ہجوم جمع ہو گیا تھا اور قبرستان کی فضا سسکیوں اور چیخوں سے گونجنے لگی تھی۔ ہر جانب سے لوگ سمٹ سمٹ کر اُس طرف بڑھ رہے تھے۔ مجھے بھی اُٹھنا چاہیے تھا ورنہ میں اکیلا سب کی نظروں میں آجاتا۔ میرے دل میں بھی اُس کا چہرہ دیکھنے کی ہمک اُٹھی تھی مگر وہاں بہت بھیڑ تھی۔ میں سائبان کے قریب ایک درخت کے نیچے کھڑا لوگوں کے ہٹ جانے کا انتظار کر رہا تھا کہ منیر علی نے مجھے دیکھ لیا۔"بابر میاں!" وہ گلوگیر آواز میں بولے۔"دیکھا تم نے! بس یہی آدمی کا مآل ہے۔ ہر شخص کی زندگی اُس پر قرض ہے جو ایک دن اُسے چکانا لازم ہے۔" میں خاموشی سے سُنتا رہا، مجھ سے پوچھنے لگے۔"چہرہ دیکھا؟" میں نے انکار میں سر ہلایا تو بولے۔"دیکھو، کیسا نور برس رہا ہے۔ خدا جانتا ہے کہ اس عاجز نے کبھی ایسا شگفتہ اور پُرسکون چہرہ نہیں دیکھا۔"

میری کمر تھپکتے ہوئے اُنھوں نے مجھے آگے کر دیا۔ میں لوگوں سے ٹکراتا ہوا جنازے کے قریب پہنچ چکا تھا لیکن یک بارگی مجھے بڑے نواب کا چہرہ نظر آ گیا۔ اُس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے بڑا نواب جھپٹ کر میرا گریبان پکڑ لے گا اور بھرے مجمع میں مجھے طمانچے مارنے لگے گا۔ اُس کی آنکھوں میں آگ بھڑک رہی تھی۔ میرا دل بُری طرح ہولنے لگا تھا۔ پیچھے آ کے ہی مجھے کچھ سکون ملا۔ پھر میں نے دوبارہ اُس طرف رُخ نہیں کیا۔ منیر علی بھی کہیں گم ہو گئے تھے۔ میں اور پیچھے چلا آیا۔

نیچے حویلی میں کچھ دیر ٹھیر کے منیر علی اور ابّا جان کے سوا ہم چاروں بالائی منزل پر چلے آئے تھے۔ دوپہر کے کھانے کے لیے بڑے ہال میں انتظام کیا گیا تھا۔ بہت سے لوگ اس میں شریک تھے۔ نہایت سادہ کھانا تھا۔ کئی قطاروں میں فرشی نشست کا اہتمام تھا۔ موت کا کھانا مجھ سے ویسے بھی نہیں کھایا جاتا۔ ایک لقمہ بھی میرے حلق سے نہیں اُترا۔ میں نے منیر علی کو منع کیا تھا لیکن اُنھوں نے اصرار کیا کہ شریک ہونا ہی مناسب ہے چنانچہ میں بھی ایک قطار کے آخری سرے پر بیٹھ گیا تھا بلکہ ہم سبھی کسی سے بھی کچھ نہیں کھایا گیا۔ سب دکھاوا کرتے رہے تھے اور اُوپر اپنے اپنے کمروں میں جانے کے بجائے بِٹھل کے کمرے میں آگئے تھے۔ کمرے میں گنجائش ہی گنجائش تھی۔ پیرو کا کمرہ بھی بازو ہی میں تھا۔ اندر سے ایک دروازہ دونوں کمرے ملا دیتا تھا لیکن پیرو بِٹھل کے ساتھ ہی بستر پر لیٹ گیا۔ ہم تینوں صوفوں اور آرام کرسیوں پر دراز ہو گئے۔ ہمیں آئے دس پندرہ منٹ ہوئے تھے کہ ایک خادم نے آکے بِٹھل کے سامنے تازہ حقّہ رکھ دیا اور چائے کے لیے پوچھا۔ بِٹھل نے انکار کر دیا۔ خادم کے آنے پر کانتے اور زورا کو بہت حیرت ہوئی، وہ مستقل اُس کی شکل دیکھتے رہے تاہم اُنھوں نے ایک دوسرے سے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور کسی نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ کمرے میں سانسوں اور کروٹوں کی آہٹیں، گھڑی کی ٹِک ٹِک اور گاہے گاہے بِٹھل کے حقّے کی گڑگڑاہٹ گونجتی رہی۔ زورا نے کانتے سے قبرستان میں آنے والے اُن دو آدمیوں کے بارے میں تجسّس ظاہر کیا تھا جو مسلح سپاہیوں کی نگرانی میں عین دفن کے وقت پہنچے تھے اور جن کی آمد پر باہر سے سیٹیوں کی گونج سنائی دی تھی۔ اُنھوں نے چھوٹے نواب کی قبر پر پھولوں کی چادر چڑھائی تھی اور اُن کے ساتھ آنے والے سپاہیوں نے سیلوٹ کیا تھا۔ کانتے مُنہ بنا کے رہ گیا تو زورا بھی چُپ ہو گیا۔ سب جیسے گونگے ہو گئے تھے۔ کسی کی بھی آنکھ ایک پل کے لیے نہیں لگی تھی۔ شام ہو جانے کا اندازہ بھی ایک خادم کی مداخلت پر ہوا۔ اس مرتبہ ہم سے پوچھنے کے بجائے وہ چائے لانے کی اطلاع دینے آیا تھا۔ بِٹھل نے بھی پھر اُسے نہیں روکا۔ چائے کے ساتھ دیگر لوازم بھی تھے لیکن مُنہ ہاتھ دھو کے اور ایک ایک پیالی انڈیل کے ہم نیچے اُتر آئے۔

چبوترے کے باہر اب بھی موٹروں کی قطار لگی تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ بڑا نواب نشست گاہ میں موجود ہے۔ ابّا جان اور منیر علی بھی وہیں ہیں۔ یہ سُنتے ہی میرے پاؤں اٹکنے لگے۔ ایک ہی صورت تھی کہ میں اُن سے کچھ پیچھے ہو جاؤں۔ نشست گاہ میں جاتے وقت کسی کو خیال نہیں رہا کہ میں اُن کے ساتھ نہیں ہوں۔ دروازے تک جا کے میں آہستہ قدموں سے لوٹ آیا اور کوئی مجھے بلانے بھی نہیں آیا۔ کچھ ہی دُور جا کے مجھے احساس ہونے لگا کہ مجھ سے غلطی ہو گئی ہے۔ اُن سے الگ ہو کے میں اپنے آپ کو بہت اکیلا اور غیر محفوظ محسوس کر رہا تھا۔ میری کوئی حس کہہ رہی تھی کہ میرے گرد نشانے تنے ہوئے ہیں۔ راستے میں کئی خادم مجھ سے ٹکرائے۔ مجھے دیکھ کے گو اُنھوں نے نظریں نیچی کر لی تھیں اور سلام کرتے ہوئے گزر گئے تھے لیکن ہر قدم پر مجھے شبہ ہوتا تھا کہ وہ کسی جگہ بھی میرا راستہ روک سکتے ہیں۔ کچھ ہی آگے آکے کوئی سمت طے کرنے کے لیے میں رُک گیا اور دیر تک ٹھٹکا کھڑا رہا۔ مجھے کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آرہی تھی جہاں میں خود کو چھپا سکوں۔ اپنے کمرے ہی میں واپس جایا جا سکتا تھا لیکن وہاں جانے کے خیال سے میرا جسم اینٹھنے لگتا تھا پھر بھی اِس طرح کب تک میں بیچ راستے میں کھڑا رہتا۔ میرے سر میں یہی سمایا کہ واپس ہو جاؤں اور نشست گاہ کے کسی کونے میں بیٹھ جاؤں لیکن اندر جاتے جاتے باہر چبوترے پر مجھے کُرسیاں نظر آگئی تھیں۔ وہاں میں اکیلا نہیں تھا۔ چند بوڑھے اور ادھیڑ لوگ بیٹھے چھوٹے نواب کی عادات و خصائل کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ میرے کان اُس وقت کھڑے ہوئے جب اُنھی میں سے کسی کی زبانی میں نے گیتی کا نام سُنا۔ کوئی سرگوشی میں گیتی کی حالتِ زار پر افسوس کا اظہار کر رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ اُس کی عمر یہ "قیامت" ٹوٹنے کی نہیں تھی، خدا اس پر رحم کرے۔ اُسے سُکھ کا وقت ہی کتنا ملا تھا۔ کسی نے کہا کہ حشمت جنگ سے زندگی میں ایک ہی غلطی ہوئی تھی لیکن وہ کر بھی کیا سکتے تھے، وہ انکار کیسے کر دیتے۔ یہ تو گیتی کے نصیب کی بات تھی۔ اس کے رشتے تو دُور دُور سے آئے تھے۔ کاش وہ نصیب بھی اپنی صورت جیسا لاتی۔ اُن کی کانا پھوسیوں سے میرا دل اور ڈوبنے لگا تھا۔ میں نے طے کیا کہ بِٹھل اور ابّا جان سے کہہ کے آج ہی بلکہ ابھی یہاں سے چلا جاؤں گا۔ وہ میری طرف سے کوئی بھی عذر کر سکتے ہیں۔ ایک آدمی کے نہ ہونے سے کیا فرق پڑے گا لیکن یہ تو سبھی کا حال ہوگا۔ کیا وہ سب پتّھر کے بنے ہوئے ہیں۔ میری کُرسی کا رُخ عام دروازے کی طرف نہیں تھا۔ اس عرصے میں موٹروں کی تعداد کم ہو گئی تھی اور چبوترے پر بھی متعدد کُرسیاں خالی ہو گئی تھیں۔ حویلی میں کل کی طرح اتنی ہی روشنیاں جل رہی تھیں لیکن روشنی اور رنگ کا تعلق تو بینائی سے بھی ہے۔

چبوترے پر صرف میں بیٹھا رہ گیا تھا۔ اتفاق سے نواب حشمت جنگ اُدھر سے گزرا۔ وہ کسی کو چھوڑ کے واپس جا رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑ گئی، وہ سیدھا میرے پاس آگیا اور حیرانی سے بولا۔ "ارے آپ

یہاں تنہا بیٹھے ہیں؟"

میں کھڑا ہو گیا۔ میں نے سٹ پٹاتے ہوئے اُسے سلام کیا اور کہا "جی ہاں، بس یہیں بیٹھ گیا۔"

"آیئے، اندر آیئے۔ ہم تو آپ کو پوچھ ہی رہے تھے۔ ابھی جہانی میاں بھی آپ کے والد سے معلوم کر رہے تھے۔" اُس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا تو میں کسی ردّ و قدح کے بغیر اُس کے ساتھ چل پڑا۔ نواب حشمت کی آواز کی شکستگی صاف نمایاں تھی۔ نشست گاہ میں داخل ہوتے وقت میری رگوں میں برف جمنے لگی۔ بڑا نواب کسی شخص کو رُخصت کرنے کے لیے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ وہی خون بھری اُس کی آنکھیں تھیں، اُبلی اُبلی شعلہ بار سی۔ میں دروازے کے قریب ہی بیٹھ جانا چاہتا تھا مگر بڑے نواب نے براہِ راست مجھ سے مخاطب ہو کے قریب آنے کو کہا۔ میرا سارا جسم سُن ہو گیا۔ نواب حشمت جنگ رُخصت ہونے والے شخص کی طرف متوجّہ ہو گیا تھا لیکن بڑے نواب کی آنکھیں مجھی پر مرکوز تھیں۔ میں ڈگمگاتے پیروں سے اُس کے پاس پہنچا تو اُس نے میرے دونوں بازو تھام لیے اور بے اختیار مجھے گلے لگا لیا۔ مجھے جانے کیا ہوا، اُس کے سینے سے لگتے ہی میری آنکھیں کھولنے لگیں، میں نے خود کو روکنے کی کوشش کی لیکن میری سسکیاں نکل پڑیں۔ اُس نے مجھے اور زور سے بھینچ لیا۔ "ہمیں اندازہ ہے، ہمیں اندازہ ہے کہ آپ۔ ۔ ۔" خود اُس کی آواز رندھنے لگی، جیسے کوئی سوتا کھُل گیا ہو۔ اُس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ اُس کے سینے سے لگ کے مجھے ایسا لگا جیسے اُس میں کوئی بھٹی سُلگ رہی ہو، جیسے اندر ایک سمندر متلاطم ہو۔ میری طرح ان چند لمحوں میں شاید اُسے بھی یاد نہیں رہا تھا کہ وہ کون ہے، کہاں ہے، کس کے سامنے ہے۔ اُس کی گردن میرے شانے پر ڈھلک گئی تھی اور بازوؤں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ خود بہ خود میرے ہاتھوں میں سختی آگئی۔ میں اگر اُسے تھام نہ لیتا تو شاید وہ نڈھال ہو کے گر جاتا۔ نواب حشمت جنگ اور بِٹھل نے درمیان میں آکے اُسے مجھ سے الگ کیا۔ حشمت جنگ نے مجھے تھاما، بِٹھل نے اُسے۔ بڑے نواب کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیل جاری تھا۔ ابّا جان نے اُس کی کمر تھپکی تو بِٹھل نے اُنھیں روک دیا۔ "بہہ جانے دو بابا! ان کا رُکنا ٹھیک نہیں ہوتا۔"

بہت دیر تک بڑا نواب بِٹھل کے بازوؤں میں سمٹا سِسکتا بلکتا رہا۔ پھر نواب حشمت جنگ کی دخل اندازی پر اُسے کچھ ہوش آیا۔ خود نواب حشمت جنگ کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ "مشیّتِ ایزدی میں کسی کو کیا دخل ہے۔" منیر علی کہنے لگے "باری باری کی بات ہے۔ کسی کی پہلے، کسی کی بعد میں۔ ٹھیرنے والا یہاں کوئی نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ ہم مغفرت کی دُعا کریں۔" منیر علی یہی کچھ بڑبڑاتے رہے۔ بڑا نواب گردن ڈالے سُنتا رہا اور رومال سے آنسو خشک کرتا رہا۔ اچھا ہوا کہ اُس وقت خادم نے ایک شخص کے آنے کی اطلاع دی۔ نواب حشمت جنگ نے تُند نظروں سے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ساڑھے نو بج رہے تھے۔ آنے والا ریاست کا کوئی بڑا آدمی ہی ہوگا، وہ دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُن کی پیروی میں ہم سب بھی۔ نو وارد آتے ہی دوپہر کو اپنی غیر حاضری کا عذر پیش کرنے لگا اور وہی سب دُہراتا رہا جو ایسے موقعوں پر کہا جاتا ہے۔ ایک ہی دلیل، ایک ہی انداز۔ معلوم نہیں تعزیت کرنے والے کیا کہنے، کیا جتانے آتے ہیں۔ حکیم ڈاکٹر کی طرح موت کی وجہ پوچھتے ہیں جیسے ابھی کوئی مداوا، کوئی تدارک باقی ہے۔ موت کے بعد پوچھنے کو کیا رہ جاتا ہے۔ تعزیت کرنے والے بار بار یہ احساس دلانے آتے ہیں کہ کوئی مر گیا ہے۔ وہ شخص بھی بڑے نواب کو چھیڑنے، اُسے تنکے چبھونے آیا تھا۔ لوگ کہتے ہیں تعزیت کا مقصد دُکھ بٹانا ہوتا ہے، یہ باور کرانا کہ صرف تم ہی اکیلے نہیں مگر اس سے کیا حاصل؟ کیا دُکھ تقسیم ہو جاتا ہے۔ ہزار آدمی شامل ہو جائیں مگر ایک آدمی کے چلے جانے کی کمی تو اپنی جگہ رہتی ہے۔ آنے والا جلد ہی واپس چلا گیا اور خاں صاحب کے اشارے پر نواب حشمت جنگ نے بڑے نواب کو فوراً وہاں سے اُٹھا دیا۔ سب ملحقہ کھانے کے کمرے میں آگئے جہاں ہمارے ساتھ آنے والے لوگوں کے علاوہ پہلے سے لوگ موجود تھے۔ دسترخوان پر سب رسمی طور پر بیٹھے تھے۔ ویسے بھی آدمی کو صرف خوشی کے لیے توانائی کی ضرورت نہیں پڑتی، کھانے کے بعد بہت کم لوگ رہ گئے تھے۔ حویلی کے خاص ملازم، بڑے نواب کے چند اعزّا، نواب حشمت جنگ، خاں صاحب اور ہم سب۔ بڑا نواب جیسے بھیڑ چھٹنے کا منتظر تھا، جھجکتے جھجکتے ابّا جان سے مخاطب ہو کے بولا "اس وقت آپ سبھی یہاں موجود ہیں، ہم آپ سے ایک گزارش کرنا چاہتے ہیں" اُس کی آواز پر نقاہت طاری تھی۔ ابّا جان پلکیں جھپکانے لگے تھے۔ ابھی وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا کہ بِٹھل نے بھاری آواز میں کہا "ہم کو پتہ ہے نواب صاحب! آپ کو بولنے کی ضرورت نہیں ہے"

"اپن ابھی ادھر ہی ہے" پیرو نے تیزی سے کہا "آپ ایسا ہی بولنا چاہتے ہو نا؟"

"ہاں، جی ہاں" وہ کھوئی ہوئی آواز میں بولا "ہم کہنا چاہتے ہیں کہ اُس کے جانے سے ۔ ۔ ۔"

"ہم کو معلوم ہے" بِٹھل نے پھر بیچ میں دخل دیا۔ نواب حشمت جنگ نے بھی بِٹھل کی تائید کی کہ ابھی سب یہیں حویلی میں موجود ہیں۔ بڑے نواب کی وحشت زدہ نگاہیں ہم پر منڈلا

رہی تھیں۔ اُس کا مدعا کچھ اور بھی معلوم ہوتا تھا لیکن وہ چُپ ہوگیا۔ کاش آدمی کا دُکھ سمیٹنے کی صلاحیت آدمی میں ہوا کرتی۔ کاش آدمی کا بدل آدمی ہوا کرتا۔ آدمی کو آدمی کی عُمر لگ جایا کرتی۔ میں اپنی ساری عُمر چھوٹے نواب کو دے دیتا۔ میں اسی لیے بڑے نواب کے سامنے آنا نہیں چاہتا تھا۔ اُس کے چہرے سے جیسے دُھواں اُٹھ رہا تھا۔

ہم لوگ جلد ہی اُٹھ گئے۔ وہ دن بھر لوگوں کے درمیان گِھرا رہا اور لب بہت گِرا گِرا نظر آ رہا تھا۔ نواب حشمت جنگ اُسے اندر لے گیا، گو وہ ہمارے ساتھ ہی بیٹھا رہنا چاہتا تھا۔

اُس رات میں اپنے کمرے میں نہیں گیا۔ کاشتے کے ساتھ اُس کے کمرے میں چلا آیا۔ زورا بھی وہیں آگیا تھا۔ رات بھر میں صُبح ہو جانے کا انتظار کرتا رہا اور علی الصباح تیّار ہو کے کمرے سے نکل گیا لیکن بالائی منزل کے فوّارے تک چکّر کاٹ کے واپس آگیا۔ نیچے جانے والے راستے کی طرف بڑھتے ہوئے میری آنکھوں میں دُھند اُترنے لگتی تھی۔ نیچے بڑے نواب کے سامنے کچھ دیر بیٹھے رہنے کے سوا سارا دن میں کاشتے ہی کے کمرے میں پڑا رہا۔ دوسرے دن بھی حویلی میں لوگوں کا تانتا بندھا رہا۔ ایک رات اور گزر گئی۔ دن میں کتنی ہی بار میں نے ارادے باندھے کہ ایک بار اپنے کمرے میں جا کے دیکھنا تو چاہیے کہ خادمہ نفیس وہاں موجود ہے یا نہیں جب اِدھر سارے ملازم جوں کے تُوں موجود ہیں تو وہ بھی وہیں ملازموں کے گوشے میں موجود ہو گی۔ نہ ہو گی تو میرے آنے کی اطلاع سُن کے آجائے گی۔ نیچے زنان خانے میں گیتی اور برجیس کے سامنے جانے کے تصوّر سے میرے ہاتھ پیر ٹوٹنے لگتے ہیں تو کیا ہوا، میں نفیس کو بُلا کے کچھ کہہ سکتا ہوں مگر مجھے اُس سے کیا پوچھنا ہے، کیا کہنا ہے۔ تیسرے دن حویلی میں قرآن خوانی کا اہتمام تھا۔ اُس روز بڑے ہال میں اور باہر چبوترے پر تِل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ دوپہر کو کھانے پر بھی بہت سے لوگ موجود تھے۔ اُوپر بالائی منزل پر چلے جانے اور نیچے لوگوں کے درمیان آجانے کے سوا ہمیں کوئی کام نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ رات تخلیے کے وقت جب سب لوگ چلے جائیں گے تو ابّا جان یا تجمل زبان کھولنے کی کوشش کریں گے۔ رات گئے تک وہ بڑے نواب کے ساتھ رہے اور کچھ نہیں بولے لیکن اب وہ کسی وقت بھی وہ بات اُس کے سامنے کہہ سکتے تھے جو اُن کی زبان پر آ آ کے رہ جاتی ہو گی۔ پہلے کی بات اور تھی، میری طرح اُن سب کو حویلی کے در و دیوار اجنبی سے لگتے ہوں گے۔ سوئم سے پہلے تو ویسے بھی کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا تھا لیکن سوئم کے بعد روانگی کی اجازت کے لیے اُنھیں بڑے نواب کو اشارہ کرنا ہی چاہیے۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، اپنی کوتاہی کا احساس میرے سینے پر بوجھ بنتا جا رہا تھا۔ میں خود بھی عذر تراشتا رہا۔ مردانے کی طرح زنان خانے میں بھی یہی ہجوم ہوگا۔ پہلے کی بات اور تھی جب اُنھوں نے مجھے زنان خانے میں آنے کے لیے اطلاع و اجازت کی رسم سے مستثنا قرار دیا تھا اور اِس کے سوا بھی بہت کچھ کہا تھا۔ اب تو اُنھیں کسی طرف دیکھنے کا ہوش ہی کہاں ہوگا اور میں اُنھیں کیا تسلّی دے سکوں گا۔ کیا مجھے اُن کے پاس جا کے وہی لفظ دُہرا دینے چاہئیں جو میں یہاں آنے والوں سے سُنتا رہا ہوں؟ وہ مجھ سے اتنی ہی توقّع کرتی ہوں گی مگر میں اور کیا کر سکتا ہوں۔ میری کوئی بات اُن کے بھوبھل کو ہوا دینے کا سبب بھی تو بن سکتی ہے۔ وہاں جا کے میری زبان ٹھٹھری رہی تو یہ اور بھی نامناسب ہوگا۔ اُنھوں نے کس کس طرح مجھ سے منّت کی تھی کہ میں اسے اپنا ہی گھر سمجھوں۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ اُنھوں نے از رہِ وضع ہی نہیں کہہ دیا تھا۔ وہ لہجہ دوسرا ہوتا ہے۔ میں ایک لمحے اپنا عزم استوار کرتا تھا مگر دوسرے ہی لمحے وہ پارا پارا ہو جاتا تھا اور جیسے کوئی میری جان کھینچنے لگتا تھا۔ میرے نہ جانے سے کوئی بدگمانی اُن کے دلوں میں نہ بیٹھ جائے۔ کبھی مجھے خیال آتا تھا کہ رسم بھی تو کوئی چیز ہے۔ کہیں وہ میرا انتظار نہ کر رہی ہوں۔ اُنھیں اِس عالم میں میرا خیال تو آیا ہوگا۔ خانم تو اُن کے سامنے ہی تھی۔ اُسے دیکھ کے میں اُن کی نظر میں مزید اُجاگر ہوتا ہوں گا۔ ممکن ہے، میرے دو ایک ہی لفظ اُن کے لیے سہارا ثابت ہوں۔ وقت کا کچھ اعتبار نہیں پھر ملے نہ ملے۔ اگر میں یوں ہی چلا گیا تو شاید پھر کبھی اس کی تلافی نہ ہو سکے۔ جانے پھر کب یہاں آنا ہو، آنا ہو بھی یا نہیں۔ کون اُنھیں جا کے بتائے کہ میں اُن کے سامنے نہیں گیا ہوں لیکن وہ مسلسل میرے سامنے رہی ہیں۔ میں اُن کے لیے آرزو ہی کرتا رہا ہوں۔ آرزو بھی تو دُعاؤں کا درجہ رکھتی ہے۔ خدا اُنھیں صبر دے۔ وہ خود بہت ہوش مند ہیں، بہت تحمّل ہے اُن میں۔ سمجھتی ہوں گی کہ کون سا احساس میرے قدم روک لیتا ہے۔ میرے پاس اُنھیں قائل کرنے کے لیے کوئی دلیل نہ ہو گی۔

وہی ہوا، چوتھے دن سویرے ناشتے کے وقت بڑا نواب کسی قدر ٹھہرا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ابّا جان نے اشارۃً اُس سے ذکر کیا۔ اُنھوں نے ہر ممکن احتیاط کی تھی لیکن بڑے نواب کا چہرہ بھاری ہو گیا۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سوچتا رہا پھر بولا "ہم کیا کہیں، ہم خود کو بہت بے جواز محسوس کرتے ہیں۔"

"نہیں، نہیں۔" ابّا جان نے بے تابی سے کہا۔ "آپ کیا فرماتے ہیں۔ آپ کے پاس تمام جواز ہیں، آپ خود سب سے بڑا جواز ہیں۔"

"ہم، ہم بہت اکیلے ہو جائیں گے۔" وہ پژمردگی سے بولا۔ "بخدا، ایسے عالم میں یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔ کیا

عرض کریں۔ جانا بھی ضروری ہے لیکن ہم جلد ہی واپس آئیں گے۔"

"ہمیں احساس ہے، ہم نے پہلے ہی آپ کا راستہ کم کھوٹا نہیں کیا ہے۔"

"نئیں نواب صاحب! ابھی ایسا مت بولو۔" پیرو نے اضطراب سے کہا۔ "اپن نے اِدھر آکے بہت کچھ پایا ہے پر اپن کو دُکھ ہے کہ اپن . . ." پیرو کی آواز بھرّا گئی۔

نواب نے ڈوبی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھا اور ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گیا۔

"خدا آپ کو حوصلہ دے۔" منیر علی لجاجت سے بولے۔ "ہماری یہی دُعا ہے۔ یقین کیجیے، ہمارا دل یہیں اٹکا رہے گا۔"

"ہم بھی آپ سے یہی کہنا چاہتے تھے کہ اُس کے جانے کے بعد ہمیں ...ب کی ضرورت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ کاش آپ کچھ دن اور قیام کرتے۔"

"ہم نے عرض کیا کہ ہم جلد واپس آنے کی کوشش کریں گے، یوں بھی ...ی دن تو جانا ہی ہے نواب صاحب!"

"ضروری نہیں ہے، یہ حویلی بھی تو آپ کا گھر ہے۔"

"یہ آپ کی کرم گستری ہے۔ بے شک یہ ہمارا ہی گھر ہے۔ ہم بھی ...بھ کے یہاں آتے رہیں گے۔"

"اُس کے جانے سے یہ مراد نہیں ہے کہ ہماری سزا ختم ہو گئی ہے ...اپ کے سلوک و نوازش کا وزن کم ہو گیا ہے۔ وہ کبھی اتنے سکون سے ...جاتا۔ ہم آپ سے سچ عرض کریں کہ اُسے دیکھ کے ہمیں ایک اطمینان بھی ...یب ہوا تھا کہ وہ اپنی مراد پا کے گیا ہے۔ اِس کے بعد اُس کے لیے ...اہ گیا تھا۔" بڑے نواب کی آواز حلق میں پھنس گئی۔

کمرے میں سکوت چھایا ہوا تھا۔ کسی نے کچھ نہ کہا تو بڑا نواب ...بھرّاتے لہجے میں بولا۔ "آپ کو معلوم ہے، اُس نے خانم کے ...انوؤں پر آنکھیں بند کی ہیں۔ یقیناً اُسے اندیشہ تھا کہ کہیں یہ سحر ...ٹ نہ جائے، کہیں یہ حقیقت پھر کسی عذاب سے دوچار نہ ہو جائے۔ ...ں نے بے شمار شب و روزِ انتظار کی جاں کنی میں گزارے تھے۔ اب ...ں میں مزید سکت نہیں تھی۔ کب سے وہ اپنے آپ پر بوجھ بنا ہوا تھا۔ ...ے جیسے ہی یقین آیا کہ اُس کی آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہی ہیں، اُس ...ا منزل آسان ہو گئی۔" بڑے نواب کی آواز کپکپا رہی تھی، کہنے لگا "ہم ...ے کچھ اور نہیں تو اُس کی موت آسان کر دی تھی۔"

"بس کرو جہانی میاں!" نواب حشمت جنگ عاجزی سے ...لا۔ "کوئی نہ کوئی بہانہ ہی بنتا ہے۔ آدمی نہ اپنے وقت سے پہلے جاتا ہے، ...بعد میں۔" پھر ابّا جان سے مخاطب ہو کے بولا۔ "قبلۂ عالم! کیا یہ

مناسب نہ ہوگا کہ آپ دو ایک دن اور قیام فرمائیں؟"

"ضرور، ضرور۔" ابّا جان نے تیزی سے کہا۔ "یوں بھی ہم یہاں سے جاتے ہی روانہ نہیں ہو جائیں گے۔ اُدھر گھر میں بھی کچھ دیکھنا بھالنا ہے۔ دو ایک دن، جب تک شہر میں ہی ٹھہرے ہیں، یہاں آمد و رفت رہے گی۔"

"ہماری گزارش ہے کہ آپ کل تک ضرور ٹھہریں۔" نواب حشمت جنگ شائستگی سے بولا۔ "کل صُبح ختم شریف ہو رہا ہے۔ اتفاق ہے کہ کل ہی آجی (عالم تاب) کی سال گرہ کا دن بھی ہے۔"

گلبرگہ اور نظام آباد شہروں کے چند لوگ بڑے نواب سے ملنے آگئے تھے اس لیے موضوع بدل گیا۔ میں فوراً وہاں سے اُٹھ گیا۔ صرف ایک دن باقی رہ گیا تھا۔ یہ ایک دن بھی یوں ہی گزر جائے گا۔ مجھے اپنے کمرے میں جا کے خادمہ نفیس کو ٹٹول کے دیکھنا چاہیے اسی طرح زنان خانے اور اُن کے حال کے بارے میں کوئی صحیح اندازہ ہو سکے گا مگر وہ جو کچھ بتائے گی، کیا میں نہیں جانتا ہوں۔ اُس کی کوئی ایسی ویسی بات میرا رہا سہا ارادہ بھی نہ چھین لے۔ اِس طرح مجھے اُن کے پاس جانے کا ایک اور عذر مل جائے گا۔

اچانک مجھے خیال آیا۔ کیوں نہ خانم سے ملنے کے لیے زنان خانے کا رُخ کروں۔ یہ عذر نسبتاً معقول ہے۔ جب سے وہ آئی ہے، میں اُس سے ملا بھی نہیں ہوں۔ وہیں کوئی صورت نکل آئے گی۔ پھر میں نے یہ خیال بھی مسترد کر دیا۔ خانم کا حال بھی اُن سے کچھ مختلف نہ ہوگا۔ کچھ دیر میں اُنھیں علم ہو جائے گا کہ ہم لوگ کب یہاں سے جا رہے ہیں۔ گیتی کو شاید ہوش نہ ہو۔ ممکن ہے، برجیس خود مجھ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرے اور اس کے لیے ایک خادمہ نفیس ہی لازم نہیں ہے۔

میرے قدم خود بہ خود مجھے بالائی منزل کی طرف لے گئے۔ اپنے کمرے میں داخل ہو کے مجھے احساس ہوا کہ کہاں آگیا ہوں۔ کمرے میں

آ کے میرا دل دھڑ دھڑانے لگا۔ ہر چیز سلیقے سے رکھی تھی، کسی جگہ گرد کی ذرا سی بھی تہہ نہیں تھی، نہ بستر پر کوئی شکن۔ میں نے ٹھنڈے پانی کی بوتل دیکھی۔ اُس میں ٹھنڈا پانی موجود تھا۔ دوسری بوتل میں گرم چائے بھری ہوئی تھی۔ خاص دان میں گلوریاں بھی تازہ تھیں۔ ابھی نہیں تو کچھ دیر پہلے ہی یہاں سے کوئی گیا تھا۔ گویا نفیس ابھی تک ملازموں کے گوشے میں تعینات ہے۔ میرے ہاتھ اُسے بلانے کی ڈوری کھینچنے کے لیے بڑھتے بڑھتے رہ گئے۔ پہلے مجھے اپنے اوسان درست کر لینے چاہئیں۔ میں یہاں آ گیا ہوں تو کسی وقت بھی اُسے بلا سکتا ہوں۔ پہلے مجھے اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ اُس سے کیا کہنا ہے، کیا پوچھنا ہے۔ کیا میں اُس سے صرف بر جبیں سے ملنے کی خواہش کا اظہار کروں۔ کیوں نہ میں بر جبیں کو ایک رقعہ ہی لکھ دوں۔ یہ طریقہ سب سے مناسب رہے گا۔ میں جو کچھ اُس کے سامنے نہیں کہہ سکوں گا، وہ خط میں لکھ سکتا ہوں۔ میں اُسے لکھوں گا کہ اُس کی ایک ایک بات میرے دل پہ نقش ہے، اسی اعتماد میں یہ عریضہ لکھنے کی بھی جسارت کر رہا ہوں اور سرِ دست اُس سے تخاطب کے لیے اس سے بہتر کوئی صورت سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ مجھے شبہ ہوا کہ کہیں یہ سب کچھ میرے ذہن سے نکل نہ جائے۔ میں نے پنسل اور کاغذ تلاش کیا۔ مسہری کے ساتھ رکھی ہوئی میز کی دراز میں دوات قلم موجود تھا۔ میرے دماغ میں جو بھی اُس وقت آتا گیا، میں نے کاغذ پر اُتارنا شروع کر دیا۔ میں نے لکھا، مجھے اندازہ ہے کہ آپ کس قلبی و ذہنی کیفیت سے دوچار ہوں گی۔ میں آپ کو کیا بتاؤں، یہی سوچتا رہا کہ اس عالم میں میرا جانا مناسب بھی ہے یا نہیں۔ ہر لمحے اِس مناسبت نامناسبت کا خیال آڑے آتا رہا اور یہ بھی کہ کہیں میری آمد آپ کے دُکھ اور نہ بڑھا دے، آپ کو اور نہ منتشر کر دے۔ زنان خانے میں عزادار خواتین کے ہجوم نے بھی مجھے روکے رکھا اور میں یہ بھی سوچتا رہا کہ وہاں جا کے کروں گا کیا۔ اگر محض بر بنائے رسم میرا جانا ضروری ہے تو بہتر ہے کہ نہ جاؤں۔ کبھی کبھی یہ رسم و وضع بھی بہت اذیت پہنچاتی ہے۔ کم از کم آپ مجھ سے اِس کی توقع نہ کرتی ہوں گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو بھی میری کیفیت کا بہ خوبی احساس ہوگا اور مجھے ایسی وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

میں نے قلم روک دیا کہ الجھاؤ کے بجائے مجھے سیدھے سادے لفظوں میں لکھنا چاہیے۔ سو چند لمحے توقف کے بعد میں نے لکھا، ہم کل کسی وقت یہاں سے چلے جائیں گے۔ میں دوسرے لوگوں کے ساتھ نہ ہوتا تو یقیناً رُک جاتا لیکن جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا تھا میرا جانا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ مجھے ہر دم یہاں کا خیال رہے گا۔ اُمید ہے کہ مجھے وہاں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ بہر حال میری کوشش یہی ہوگی کہ جلد از جلد آ جاؤں۔ اُس وقت تک حویلی میں آنے والوں کی بھیڑ بھی ختم ہو جائے گی اور اس عرصے میں آپ کو بھی کچھ استقامت ضرور نصیب ہوگی۔ خدا آپ کو صبر و سکون دے۔ آپ کا اور چھوٹی بیگم کا خیال آتا ہے تو دل بہت گھبراتا ہے۔ دُکھ میں آدمی خود کو بہت تنہا اور کمزور محسوس کرتا ہے۔ شاید یہی احساس مٹانے کے لیے لوگ اُس کے گرد اکٹھے ہو جاتے ہیں مگر وقت تو اپنی گردش ضرور پوری کرتا ہے۔ کاش آدمی کے بس میں اس سے سوا ہوا کرتا۔ میں آپ کے لیے دُعا کرتا رہوں گا۔ میری طرف سے چھوٹی بیگم صاحبہ کو بہت بہت پوچھ لیجیے گا۔ اُس وقت تو آپ نے سب کچھ کہا تھا، میں سُنتا رہا تھا۔ اب میری درخواست ہے کہ آپ میرا انتظار ضرور کیجیے گا۔

میری اُنگلیاں کانپ رہی تھیں۔ اتنا لکھ کے میں نے سانس لینے کے لیے قلم روک دیا اور لکھے ہوئے کاغذ پر ایک نظر ڈالی۔ وہ مجھے اپنا خط ہی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ ایک لفظ اِدھر، ایک اُدھر۔ میں نے بہت جلدی جلدی لکھا تھا۔ قلم دماغ کا ساتھ ہی نہیں دے رہا تھا۔ دماغ میں ایک ساتھ اتنی بہت سی باتیں آ رہی تھیں کہ قلم تک پہنچتے پہنچتے گم ہو جاتی تھیں۔ میں نے شروع سے آخر تک اسے دوبارہ پڑھا۔ مجھے سب بکھرا بکھرا، بے ربط معلوم ہوتا تھا۔ اس طرح کا خط میں نے پہلے کبھی کسی کو نہیں لکھا تھا۔ میں دیر تک لفظ اور جملے بدلتا رہا۔ بعد میں میں نے اُسے پڑھا تو وہ کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ اَڑا، اَڑا بے ہنگم۔ میں جو کہنا چاہتا تھا، وہ لکھ ہی نہیں سکا تھا۔ شاید میں لکھنا ہی بھول گیا ہوں۔ جیل سے آنے کے بعد مجھے لکھنے پڑھنے کی مہلت ہی کتنی ملی ہے۔ اتنے طول طویل متن کے بجائے مجھے چند سطری تحریر پر اکتفا کرنا چاہیے۔ میں نے وہ کاغذ پھاڑ دیا اور دوبارہ لکھنے کا ارادہ کیا۔ میرا قلم اٹک رہا تھا تاہم میں نے لکھا کہ کتنی ہی بار آنے کا ارادہ کیا مگر نہ آ سکا۔ اب میں جا رہا ہوں۔ مجھے اپنا وعدہ یاد ہے کم از کم ایک بار یہاں ضرور آؤں گا اور جلد ہی، اِس یقین کے ساتھ کہ آپ میری منتظر ہوں گی۔

اختصار ہی مناسب ہے۔ میں نے تحریر صاف کرنے کے لیے نیا ورق لیا اور ابھی ایک لفظ بھی نہ لکھ پایا تھا کہ لقب کا خیال آیا۔ مجھے کسی نہ کسی لقب سے تو اُسے مخاطب کرنا ہے۔ کوئی موزوں لقب ہی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ زیادہ ادب و احترام سے تخاطب اُسے گراں گزر سکتا ہے۔ صرف اُس کا نام لکھنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے کچھ لکھنے کے بجائے صرف تسلیم لکھ دیا۔ میں نے ایک ایک لفظ ٹھہر ٹھہر کے لکھا تھا کیونکہ میری اُنگلیاں ٹھٹھری جا رہی تھیں۔ آخر میں میں نے اپنا نام بھی نہیں لکھا۔ خط لکھنے کے بعد مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا، کوئی اَن ہونی سی بات۔ اس خیال سے کہ کہیں میں نے کوئی نازیبا بات تو نہیں لکھ دی ہے، میں نے اپنی تحریر متعدد بار پڑھی۔ ہر بار اپنی تحریر مجھے پہلے سے زیادہ اُکھڑی ہوئی اور بے جان نظر آتی تھی۔ اس کے مقابلے میں تو پہلے والا خط زیادہ مؤثر تھا۔ اتنا زیادہ اختصار بھی اچھا نہیں ہوتا۔ یہ بہت رسمی سی تحریر ہے۔ اُس میں کچھ محسوس تو ہو رہا تھا اور ایک اور بات میرے سینے میں کھٹکنے لگی تھی کہ اِس مراسلت میں آداب سے متجاوز ہونے کا کوئی پہلو تو نہیں نکلتا ہے۔ میں نے رقعہ چاک کر دیا اور میرے جی میں آئی کہ ساتھ ہی اپنا گریبان بھی چاک کر لوں۔ کمرے کی ساری چیزیں توڑ پھوڑ ڈالوں۔ مجھے اپنے آپ سے بہت چِڑ ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ کمرے میں میری موجودی کی سُن گُن خادمہ نفیس کو مل جائے اور وہ میری اِس ابتری کے دوران اندر داخل ہو، مجھے باہر نکل جانا چاہیے۔ ابھی کچھ وقت ہے کسی اور تدبیر کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔

صبح سے شام ہو گئی اور شام سے رات۔ ایک ہی رات درمیان میں باقی تھی۔ میں اُس رات بھی اپنے کمرے میں نہیں گیا۔ جیسے جیسے روانگی کا وقت قریب آ رہا تھا، میری ہمت جواب دیتی جا رہی تھی۔ وقت کھو جانے کا احساس ہو رہا تھا۔ اپنے آپ سے نگاہیں نہیں ملائی جا رہی تھیں۔ کانتے اور زورا کے ساتھ رہنے سے میں اپنے ساتھ کم رہتا تھا اس لیے ایک لمحے کو بھی اُن سے دُور نہیں ہوا تھا۔ ساری رات کانتے کے بستر پر آنکھیں کھولے پڑا رہا۔ صبح دس بجے سے ختم شریف شروع ہو گیا تھا۔ آیۂ کریمہ کا ورد تھا۔ اُس دن بھی بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے لیکن میں وہاں کچھ ہی دیر بیٹھا۔ ظاہر ہے، ختم کے بعد کھانے کا اہتمام ہوگا اور کھانے کے بعد ہی ہماری روانگی ممکن ہو سکتی ہے۔ پھر میں نے یہی طے کیا کہ اپنے کمرے میں جا کے خادمہ نفیس کو بلاؤں اور کوئی عریضہ سپرد کرنے کے بجائے سب کچھ اُسی سے کہہ دوں۔ میں اُس سے بہانہ کروں گا کہ اس دوران میری طبیعت ہی ٹھیک نہیں رہی تھی اور میں یہ بتا کے کسی کو پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں تیز قدموں سے اُوپر کی طرف جا رہا تھا کہ کھانے کے بعد شاید موقع نہ مل پائے مگر ابھی میں نے آدھا زینہ ہی عبور کیا ہوگا کہ پیچھے سے کانتے کی آواز پہ مجھے ٹھہرنا پڑا۔ وہ سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اُوپر ہی چلا آیا۔ ”کدھر کو جا رہا ہے؟“

”بس یُوں ہی اُوپر کی طرف۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔

”اپنے کو بھی تھوڑی پان کی طلب ہو رہی تھی۔“

”تم ایسے تو پان نہیں کھاتے۔“

”اِدھر کی گلوریوں کی بات ہی اور ہے لاڈلے! نہ جانے پھر کب کھانے کو ملیں۔ سو چا چلتے وقت دو چار اور ڈال لوں۔“

”یہاں سے ہم کب چل رہے ہیں؟“

”اُستاد کھانے کے بعد کو بول رہے تھے۔“ اُس نے سرسری لہجے میں کہا اور اچانک میرا ہاتھ دبا کے کہنے لگا۔ ”تُو نے کچھ اور بھی سُنا؟“

”کیا! . . .“ میرے پیر وہیں جم گئے۔

”خانم آپی اپنے ساتھ نہیں جا رہی ہیں؟“

”کیا، آپی نہیں جا رہی ہیں؟“

”ہاں لاڈلے! اپنے کو ابھی پتہ چلا۔ آپی نے انکار بول دیا ہے۔ بولا ہے کہ ابھی وہ اِدھری رہیں گی۔“

میں اُسے حیرت بھری نظروں سے دیکھا کیا۔

”اُستاد اور پیر دادا ابھی ابھی اُدھر اندر کو گئے تھے۔ لوٹ کے اُن لوگ نے ابا جان اور بڑے صاحب کو ایسا ہی بولا ہے۔“

تم نے کچھ غلط تو نہیں سُنا ہے؟“

”اپنے کو خود بھی بہت اچنبھا ہوا تھا۔“

”یہ کیسے ممکن ہے! آپی یہاں اکیلی رہیں گی؟“

”آپی نے بولا ہے، جب اُن کو آنا ہوگا، وہ چٹھی بھیج دیں گی۔ اُنھوں نے ہم سب کے لیے بولا ہے کہ ہم لوگ چلے جائیں۔“

”نہیں کانتے بھائی!“ میں نے تذبذب سے کہا۔ ”ادّا اور منجھل بھائی کیا کہہ رہے تھے؟“

”اور کچھ نہیں، ابا جان اور بڑے صاحب بھی سُن کے چُپ ہو گئے۔ اُدھر اندر اُستاد نے آپی کو کچھ بولا ضرور ہوگا۔ ایسے لَوٹ کے آ گیا ہے تو کوئی بات ہی ہوگی۔“

میں اُس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ خانم نے یہ فیصلہ کیوں کیا ہے۔ وہ تو یہاں آنے پر آمادہ ہی نہیں تھی۔ کانتے کچھ اور نہیں جانتا تھا۔ کمرے میں آ کے اُس نے مُنہ ہاتھ دھویا، بال سنوارے اور چائے پی کے پان چبانے لگا۔ میں گم سُم بیٹھا رہا۔ مجھے خانم سے ملنا چاہیے۔ مجھے خود جا کے دیکھنا چاہیے کہ آخر اُس نے یہاں ٹھہرنے کا ارادہ کیوں کر لیا ہے۔ اب وہ یہاں کے مطلوب ہے۔ ہو سکتا ہے گیتی آرا نے اصرار کیا ہو مگر وہ زیادہ دنوں تک جہاں گیر کے بغیر کیسے رہ سکتی ہے، اور زرّیں کے بغیر بھی۔ دونوں ایک دوسری کی بہنیں لگتی ہیں۔ اُن میں بہنوں سے زیادہ یگانگت ہے۔ کچھ دیر کے لیے کوئی ایک نظروں سے اوجھل رہے تو دوسری پریشان ہو جاتی ہے۔ زرّیں کی حویلی تو اُس کا گھر ہے، اُس کی پناہ گاہ۔ زرّیں نے حویلی کی ساری چابیاں اُس کے حوالے کر دی تھیں۔ یہاں کسی کے مجبور کرنے کا بھی اب سوال پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے اپنے کمرے میں جا کے خادمہ نفیس کو بلانے کا ارادہ ترک کیا۔ اگر مجھے زنان خانے کی طرف جانا ہی ہے تو پہلے وہاں

صورتِ حال کا جائزہ لے لوں۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ ایک بجنے والا تھا۔ کانتے کسی رسالے کی تصویریں دیکھ رہا تھا۔ میں اُس سے کچھ کہے بغیر باہر نکل آیا۔ نیچے اب بھی بھیڑ تھی۔ میں عمارت کی پُشت میں خاص زنان خانے جانے والے راستے کی طرف مُڑ گیا۔ قریب پہنچ کے میں نے ایک خادم سے کہا کہ وہ اندر جا کے خانم کو مطلع کر دے۔ خادم کی واپسی میں دیر لگ گئی لیکن میں وہیں کھڑا اُس کا انتظار کرتا رہا۔ واپس آنے پر وہ کچھ دُور تک میرے ساتھ چلا۔ اُس کے اشارے پر جیسے ہی میں ایک دروازے میں داخل ہوا، ایک خادمہ نے مجھے آداب کیا اور بتایا کہ اندر خانم میری منتظر ہے۔ میرے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ دوسرے کمرے میں خانم موجود تھی۔ اُسے دیکھ کے مجھے جھٹکا سا لگا۔ صرف چند دنوں میں وہ پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ بکھرے بکھرے بال، زرد رنگت، لباس صاف مگر جا بجا شکنیں پڑی ہوئی۔ میں دروازے کے قریب ٹھٹک کے رُک گیا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ مضطربانہ میری طرف بڑھی اور اُس نے میری پیشانی کو بوسہ دیا، میرے ہاتھ چومے۔ میں نے اُس کے ہاتھ زور سے تھام لیے۔ "آپی! آپ کیسی ہیں؟" میں نے گھُٹی ہوئی آواز میں پوچھا۔

وہ بے اختیار میرے سینے سے لگ کے سسکنے لگی۔ میرے حواس گُنگ ہو گئے تھے۔ "آپ نہیں جا رہی ہیں آپی؟"

"مجھے ابھی یہیں رہنا ہے۔" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی اور ہڑک ہڑک کے رونے لگی۔

اُس سے کچھ اور پوچھنا لاحاصل تھا۔ سب کچھ میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ تمام سوالوں کا جواب مجھے مل گیا تھا۔ یہ جان کے میرا سینہ بھی دُکھنے لگا۔ اُسے تسلّی دینے کے بجائے مجھے اپنے آپ کو ضبط کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ "آپ کہیں تو ہم اور رُک جائیں، میں رُک جاتا ہوں۔" میں نے بہ دقت تمام کہا۔ "آپ یہاں اکیلی رہیں گی۔"

"نہیں بابر میاں! یہ بھی میرا ہی گھر ہے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میرا کوئی ایسا گھر بھی ہے۔" اُس کی آواز بَین کر رہی تھی۔ "تم جاؤ۔ تمھارا جانا بہت ضروری ہے۔ خدا تمھیں اپنے بچھڑے ہوؤں سے ملائے۔ خدا کرے، وہ سب خیریت سے ہوں۔ اُنھیں لے کے فیض آباد ہی چلے جانا۔ اور رجّو (جہاں گیر) کا خیال رکھنا۔ اُس سے کہنا کہ تمھاری آپی تمھارے لیے بے چین رہے گی اور جلد ہی تمھارے پاس پہنچے گی۔ زریں سے بھی یہی کہہ دینا۔ گھر میں اور سب سے۔ زہرہ اور زینساں سے بھی۔"

"میں بمبئی سے واپس فیض آباد نہیں جاؤں گا۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "یہیں آ جاؤں گا۔"

"اگر میری خاطر یہاں آنا چاہتے ہو تو مت آنا۔ تمھیں وہیں جانا چاہیے۔ اتنے زمانے کے بعد بھائی بہنوں سے ملنا ہو گا۔ کچھ عرصے بھی اُن کے ساتھ نہیں رہو گے؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس نے اپنے دوپٹے سے آنسو پونچھے اور بھنچے ہوئے ہونٹوں سے بولی۔ "میری فکر مت کرو۔ میں یہاں ٹھیک رہوں گی۔" اُس نے میرے گریبان کا بٹن بند کیا، میرے بال درست کیے۔ وہ اپنی قابو یافتگی کے اظہار کی ناکام کوشش کر رہی تھی اور اُس کے سارے بدن پر ارتعاش طاری تھا۔ مجھ سے کہنے لگی۔ "اپنا بھی خیال رکھنا اور اب، ہو سکے تو اب کہیں اور مت جانا۔"

میں سُنتا رہا۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میں جتنی دیر تک اُس کے سامنے موجود رہوں گا، اُس پر یہی اضطرابی کیفیت طاری رہے گی۔ پھر میں وہاں ایک لمحے بھی نہیں ٹھہرا۔ اُس نے بھی مجھے نہیں روکا۔ وہ میرے ساتھ دروازے کے باہر دوسرے کمرے میں آ گئی۔ باہر نکلتے ہی میری نگاہ اچانک دائیں جانب ستون کی آڑ میں کھڑی ہوئی برجیس پر گئی، مجھ پہ کوئی بجلی سی گری، میری آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔ وہ برجیس ہی تھی، سادہ لباس میں ملبوس، پھٹی پھٹی بھری بھری آنکھیں، چہرے پر گھٹا سی چھائی ہوئی۔ اُس نے آہستگی سے ہاتھ اُٹھا کے مجھے تسلیمات کی۔ میرا سارا جسم سَن سَنا رہا تھا۔ جانے کس طرح میں نے اُس کے سلام کا جواب دیا۔ میں بے تحاشا اُس کی جانب بڑھ جانا چاہتا تھا لیکن پیروں نے ساتھ نہیں دیا، معاً مجھے خانم کی موجودگی کا خیال آیا اور میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ دوسرے لمحے جب میں نے نگاہ اُٹھا کے دیکھا تو وہ وہاں نہیں تھی، شاید ستون کی آڑ میں ہو گئی تھی۔ چند لمحوں تک میں بُت بنا کھڑا رہا۔ "میں یہیں واپس آؤں گا آپی! چند روز بعد ہی آنے کی کوشش کروں گا۔" میں نے سٹ پٹائی آواز میں کہا۔ وہ موجود ہو گی تو اُس نے بھی میری آواز سُن لی ہو گی۔ اِس سے پہلے کہ خانم مجھ سے کچھ کہتی، میں تیز قدموں سے وہاں سے چلا آیا۔

دُھوپ ابھی اُتری نہیں تھی کہ نواب حشمت جنگ اور بڑے نواب کی موٹروں نے ہمیں ابّا جان کی حویلی میں پہنچا دیا۔ ہارن کی آوازیں سُن کے ماٹی، شامو، جمرو اور ٹنگو فوراً باہر نکل آئے۔ اُچھلتے کودتے، شور مچاتے ہوئے اُنھوں نے چبوترے کی سیڑھیاں پھلانگیں اور دیوانہ وار ہم سے لپٹ گئے جیسے ہم طویل مسافت کے بعد کہیں سے آئے ہوں، کوئی بڑی مہم سر کر کے۔ خود مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے میں ایک عرصے بعد اُنھیں دیکھ رہا ہوں حالانکہ اُن سے رخصت ہوئے ابھی ایک ہفتے سے زیادہ نہیں ہوا تھا۔ موٹریں ہمیں چھوڑ کے واپس چلی گئیں۔ اندر

جا کے سب اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ سب پر کسی لمبے سفر کی تھکن سوار تھی۔ گھر آ کے یہی ہوتا ہے، آدمی چور چور ہونے لگتا ہے۔ ابا جان اور منیر علی نے شیروانیاں اُتار دیں، بتھل اور پیرو نے واسکٹیں، اور اندر داخل ہوتے ہی بتھل نے مارٹی کو حقہ تیار کروانے کا حکم دیا۔ عمارت کے سامنے وسیع سبزہ زار پر بید کی کرسیاں رکھی تھیں۔ اس اثنا میں دھوپ کچھ اُوپر چلی گئی تھی اور باہر کا منظر خوشگوار ہو گیا تھا۔ سب سبزے پر آ گئے۔ ٹنگو بتھل کے پیر دبانے لگا۔ ملازم چائے لے آئے اور ساتھ میں بہت سا سامان۔ مارٹی، جمرو، شامو اور ٹنگو اس طرح ہماری پذیرائی کر رہے تھے جیسے ہم اُن کے مہمان ہوں۔ مارٹی تو پاگل سا ہو گیا تھا، ناچا ناچا پھر رہا تھا۔ کبھی میرے پاس آتا تھا اور کبھی زورا اور کانتے کے پاس جاتا تھا، کبھی بتھل اور پیرو کے سامنے جا کے کھڑا ہو جاتا۔

پہلے یہ سبزہ زار ایسا ہرا بھرا نہیں تھا۔ سب کچھ دھلا دھلا، رنگا رنگا نظر آ رہا تھا۔ چبوترے کی سیڑھیوں پر گملوں کی تعداد بھی بڑھا دی گئی تھی۔ گملوں پر تازہ تازہ سُرخ رنگ کیا گیا تھا۔ وہ چاروں ان دنوں شاید پھول پودوں ہی کا کام کرتے رہے تھے۔ حویلی کے ملازم بھی اُن سے بہت مانوس معلوم ہوتے تھے، اشاروں پر دوڑے دوڑے پھر رہے تھے۔ بید کی بڑی گول میز پر انھوں نے کھانے پینے کے سامان کا انبار لگا دیا تھا۔ سب کھانے پینے میں مصروف تھے کہ مارٹی میرے پاس چلا آیا اور سبزے پر میرے قدموں کے قریب بیٹھ گیا۔ میں نے اُس کے تپاک کے جواب میں ہر بار مُسکرانے کی کوشش کی تھی اور اُسے اپنے بازوؤں میں زور سے بھینچا بھی تھا لیکن مارٹی مطمئن نہیں ہوا تھا۔ چپکے سے کہنے لگا "کیوں راجا اُستاد! ابھی تم ٹھیک تو ہے؟"

"ہاں مارٹی! بالکل ٹھیک" میں نے مستعدی سے جواب دیا۔

"ابھی تم اپن کو سب سے الگ لگتا ہے۔ جب سے آیا ہے اپن نوٹ کر رہا ہے۔ لگتا ہے، تم ابھی ایدر کو واپس نہیں آیا۔"

"نہیں مارٹی!" میں نے ہنستے ہوئے کہا "تھکن کی وجہ سے شاید تمھیں ایسا محسوس ہو رہا ہو۔"

"لگتا ہے، کئی رات سے سویا بھی نئیں ہے۔"

"ہاں" میں نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا "وہاں نیند ہی بہت کم آتی تھی۔"

"تم ابھی کچھ بھی نئیں لے رہا ہے؟"

"یہ چائے پی جو رہا ہوں۔"

"بولے تو کچھ اور لا دے۔ ایدر لگ ایک دم فنٹاسٹک حیدر آبادو کا ڈشیز بناتا ہے۔ ابھی میٹھا ملا ہوا پوری بنایا ہے۔ کیا بولتا ہے اس کو؟"

وہ جوشیلے انداز میں بولا "ہاں لقمی۔"

"میں نے وہاں کھائی ہیں۔"

"کھایا ہے! پھر کیسا لگا تم کو؟" وہ اشتیاق سے بولا۔

"بہت مزے کی بناتے ہیں۔"

"ایک چیز کیا، سالا روز نیا آئٹم بناتا ہے۔ اپنا باڈی نیں ہے، ماں قسم، اپن سوچتا ہے، اگر کچھ دن اور ایدر رہ گیا تو ایکدم گا" وہ عجیب انداز سے منہ پھلا کر بولا "گول گپا مافک۔"

مجھے ہنسی آ گئی۔ مارٹی کچھ بھی جتن کر رہا تھا۔ میں اُس سے کہتا کہ وہ مجھ سے ایسی باتیں نہ کرے۔ مارٹی نے وہ آنکھیں نہیں دیکھی تھیں۔ میں اُسے کیا بتاتا کہ وہ آنکھیں راستے بھر میرا تعاقب کرتی رہی ہیں۔ برجیس کی بڑی بڑی ڈوبی ڈوبی آنکھیں، میں نے یہاں آ کے سب بھلا دینے کی کوشش کی تھی لیکن وہ آنکھیں یہاں بھی مجھ سے دُور نہیں ہوئی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ بس چھلکا ہی چاہتی ہیں، میں ان کی طرف دیکھتا ہوں تو مجھے لرزہ سا ہونے لگتا ہے۔ مجھے یہ کیا ہو گیا تھا۔ وہ خود بھا آئی تھی اور میں وہاں سے بھاگ آیا۔ مجھے کچھ دیر تو رُکنا چاہیے تھا۔ سوچتی ہو گی۔ میرے جی میں آتا تھا کہ فوراً یہاں سے واپس چلا جاؤں جا کے ایک بار، صرف ایک بار اُس سے ملنے کی کوشش کروں نے مارٹی سے معذرت کرنی چاہی تو وہ اور میرے پیچھے پڑ گیا۔

اندھیرا نہیں ہوا تھا لیکن سبزہ زار کے تمام قمقمے روشن کر دیے گئے تھے۔ اُس وقت وہاں سبھی موجود تھے۔ چائے کے بعد کانتے نے چاندی کی منقش ڈبیا اور چمکتا ہوا رنگین بٹوا نکالا تو سب حیران رہ ڈبیا میں پان بھرے ہوئے تھے۔ وہ یقیناً اُنھیں حویلی سے لایا ہو گا۔ سے پہلے کہ بتھل اور پیرو کی آنکھوں میں سُرخی آتی، کانتے نے خود وضاحت کر دی کہ چلتے وقت اُس نے کسی خادم سے پان کی فرمائش کی تھی۔ خادم اندر سے واپس آیا اور اُس نے یہ ڈبیا اور بٹوا اُس کے حوالے کر دیا۔ کانتے نے لوٹانا چاہا لیکن خادم نے انکار کر دیا کہ راستے میں پانوں کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ کانتے نے سب کو چاندی کے ورق میں لپٹا ہوا ایک ایک پان کھلایا۔ ابا جان اور منیر علی نے بھی منع نہیں

مارٹی منتظر ہی بیٹھا تھا کہ سب ذرا فراغت سے بیٹھیں گے وہ زبان کھولے گا۔ سب ٹانگیں پھیلائے سستا رہے تھے۔ ٹنگو ابھی تک بتھل کے پیر دبا رہا تھا اور بتھل حقے کی نے مُنہ میں لگائے جانے خیال میں گم تھا کہ مارٹی کی آواز پر سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔ مارٹی نے چباتے ہوئے ابا جان کو بتایا کہ اس دوران کئی آدمی اُن سے ملنے آ

"کیا بولتا ہے رے!" بتھل نے دھمکتی آواز میں پوچھا۔

مارٹی سٹ پٹا گیا "تم لوگ کے جانے کے اگلے دن ہی وہ ایدر آیا۔ ایک بڑی کا، دوسرا بیچ کا۔ دونوں اپن کو ٹھیک ٹھاک ہی لگتا تھا دادا! بولتا تھا بابا سے ملنے کا ہے۔"

"کھل کے بول رے" بتھل نے درشتی سے کہا۔

"میرا نام لے رہے تھے؟" ابا جان نے بے چینی سے پوچھا۔

"وہی نام جو آپ نے اُدر ہوٹل میں لکھایا تھا۔"

"اکبر علی خاں! کیا وہ ہوٹل کے آدمی تھے؟"

"اپن نے پوچھا تھا" مارٹی سہمی ہوئی آواز میں بولا "پر وہ لوگ بولا کہ بابا سے خاص کام ہے۔ اپن نے پوچھا کون سا کام؟ بولا اُنھی کو بولنے اپن بولا، وہ ایدر شہر میں نئیں ہے۔ آئے گا تو ایک دم بولے گا۔ ے دن شام کو پھر آیا۔ تیسرے دن پھر اور لوگ آیا۔"

"اور لوگ!" بتھل نے تندی سے پوچھا "اور لوگ کون؟"

"وہ دوسرا تھا دادا! وہ بھی ایسا ہی بولتا تھا، پھر دونوں کا آنا یا۔ ابھی تین دن پہلے پھر ایدر کو آیا تھا، پہلے والا" مارٹی نے کسمساتے ں بتایا کہ اُس نے اُن کی ٹوہ لینے کی بہت کوشش کی لیکن وہ لتے رہے کہ اُنھیں صرف ابا جان سے کام ہے اور کوئی ایسی بات ہے، وہ پھر آ جائیں گے۔ پہلے دن اُس نے چائے وغیرہ سے اُن ع کی تھی، اُنھوں نے اِدھر اُدھر کی باتوں کے دوران مارٹی سے کی سکونت وغیرہ کے بارے میں پوچھا۔ مارٹی کے بقول اُس نے ضح بات نہیں بتائی۔ دیکاجی ہوٹل کے رجسٹر میں ابا جان نے اپنے کوائف درج کرائے تھے، اُسے اُن کا خیال تھا۔ مارٹی نے اُن کے سامنے ن کے اظہار میں ممکنہ طور پر اجتناب ہی کیا تھا جس طرح وہ نرمی و شگفتگی سے رتے رہے تھے، مارٹی نے بھی اُن سے یہی کچھ سلوک کیا تھا۔ پیرو چھنے پر اُس نے بتایا کہ دونوں کے حُلیے عام حیدر آبادی لوگوں جیسے رہ کم از کم اڈے سے وابستہ لوگ معلوم نہیں ہوتے تھے لیکن ت پھرت کے آدمی نظر آتے تھے، تیز طرار، مفاہمت پسند اور رباتوں میں اُڑانے والے۔ مارٹی کہنے لگا۔ اُسے سادہ لباس ا شک بھی ہوا تھا لیکن اُن کی وضع قطع پولیس والوں سے بہت تھی۔

سب کو چُپ لگ گئی تھی۔ بات اتنی سادہ نہیں تھی جتنی سادگی ارٹی نے کہہ دی تھی۔ کوشش کے باوجود وہ لہجے کا اضطراب چھپانے م رہا تھا۔ ہمارے آنے کے اتنی دیر بعد اُس کا زبان کھولنا ہی ے اضطراب کی غمازی کرتا تھا۔ مارٹی سب کی نگاہوں کا ہدف بنا ہوا رکسی مجرم کی طرح پلکیں پٹ پٹا رہا تھا۔ پیرو نے شامو، جمرو اور ٹنگو سے پوچھا تو اُنھوں نے مارٹی کے بیان کی تائید کے سوا کوئی نئی بات نہیں بتائی۔ دیکاجی ہوٹل میں ابا جان نے جو نام درج کرایا تھا، اُس کا علم ہوٹل والوں اور نواب حشمت کے سوا کسی کو نہیں تھا۔ بعد میں بڑے نواب کی حویلی میں جانے کے بعد بھی ابا جان نے اس نام میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ بڑے نواب اور نواب حشمت جنگ ہی کے پاس سے وہ آ رہے تھے۔ اتنی بات سب کی سمجھ میں آ رہی ہو گی کہ ابا جان کے اس بدلے ہوئے نام کا علم ابھی تین جگہوں سے ہو سکتا ہے۔ ہوٹل والوں کا کوئی معاملہ ہوتا تو وہ مارٹی سے بھی سلسلہ جنبانی کر سکتے تھے کیونکہ وہ بھی ابا جان کے ساتھ وہیں مقیم رہا تھا۔ مارٹی کے بقول ابا جان تمام ادائی کر کے چلے تھے اور اُن کے پاس نواب حشمت جنگ کی آمد و رفت کی وجہ سے یوں بھی ہوٹل میں اُنھیں محترم مہمانوں کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ ہوٹل کے منتظمین کے لیے شاید یہ بات بھی اہمیت رکھتی ہو کہ رخصت کے وقت نواب حشمت جنگ کی گاڑی ابا جان کو وہاں سے لینے آئی تھی۔ کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو حویلی میں اُن کی واپسی تک ہوٹل والے کچھ تحمل کر سکتے تھے، اور بات بھی کیا ہو سکتی تھی۔

مارٹی نگاہ کا بھی اتنا کمزور نہیں ہے۔ اُسے کوئی ایسا گمان نہیں تھا کہ اُس نے ہوٹل میں آتے جاتے ہوئے اُن لوگوں کو بھی دیکھا ہو جو ابا جان کو پوچھتے ہوئے آئے تھے۔ ہمارے جانے کے دوسرے دن اُن کے آنے سے ظاہر تھا کہ اُنھیں بڑے نواب کے ہاں ہماری منتقلی کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ گویا نواب حشمت جنگ اور بڑے نواب تک اُن کی رسائی نہیں تھی لیکن ایک اور جگہ بھی تھی جہاں ابا جان نے اپنا ہوٹل والا نام دہرایا تھا۔ نواب حشمت جنگ کے توسط سے یہ حویلی خریدتے وقت اُنھیں حویلی کے مالک کو بھی یہی نام بتانا چاہیے تھا۔ گو منتقلی کے کاغذات کی تکمیل ابھی نہیں ہو پائی تھی کیونکہ درمیان میں نواب حشمت جنگ جیسا صاحبِ حیثیت آدمی تھا لیکن تکمیل کا مرحلہ آ جاتا تو بھی ابا جان کو اُسی نام سے منتقلی کے کاغذات تیار کروانے پڑتے جس سے وہ خود کو متعارف کرا چکے تھے۔ حویلی کے سابق مالک نے حویلی کی فروخت کے لیے کئی معقول پیش کشیں ناپسندیدہ خریداروں کی وجہ سے مسترد کر دی تھیں۔ ابا جان اُسے پسند آ گئے تھے۔ اس میں ابا جان کی ذات کو کم، نواب حشمت جنگ کی سفارش کو زیادہ دخل تھا۔ ہو سکتا ہے کہ آنے والوں کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہو جو حویلی کی خریداری میں پہلے ناکام ہو چکے تھے اور اب حویلی ابا جان کی تحویل میں آ جانے کے بعد وہ اُنھیں بڑی پیش کش کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ کاش ایسا ہی ہو لیکن دوسری بات، میری طرح بتھل، پیرو اور ابا جان کے ذہن میں بھی کلبلا رہی ہو گی کہ آنے والوں کا مقصد اس کے سوا بھی کچھ ہو سکتا ہے۔

یہاں آتے ہوئے راستے میں بٹھل نے ابا جان سے کہا تھا کہ ہم دو ایک دن قیام کے بجائے اگر فوراً روانگی کا ارادہ کر لیں تو کیا حرج ہے۔ ابا جان نے جواب میں کئی پہلوؤں پر بٹھل کو توجہ دلائی تو وہ بھی چُپ ہو گیا۔ ابا جان نے اُس سے کہا تھا کہ اُنھوں نے بوجوہ یہ عجلت مناسب نہیں سمجھی۔ اُن کے خیال میں روانگی کے لیے کسی جلد بازی کا اظہار اُس خوش اسلوبی کے منافی تھا جس کا وہ بڑے نواب کی حویلی میں ہر مرحلے پر خیال رکھتے رہے تھے۔ وہاں سے آجانے کے باوجود انھیں کسی بھاگ دوڑ کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے تھا جیسے بس پا بہ رکاب بیٹھے تھے، جیسے بس زنداں سے چھوٹنے کی دیر تھی۔ جو حویلی اُنھوں نے خریدی تھی، اُس کے جواز اور بھرم کے طور پر بھی انھیں ایک دو دن وہاں ٹھیرنا چاہیے تھا۔ ابا جان کو خانم کا خیال بھی تھا جو ابھی تک بڑے نواب کی حویلی میں موجود تھی۔ جب تک وہ وہاں موجود ہے، دونوں نوابوں سے ربط و تعلق کی اُستواری ضروری ہے۔ اُن پر اب تک ہمارا جو تاثر مرتب ہوا ہے بہتر ہے کہ وہی قائم رہے۔ یہ تاثر ہمارے اطمینان اور تحمل کے سبب سے تھا۔ ہمارے بارے میں اُبھرنے والے تمام سوالوں کا جواب ہمارا اطمینان تھا۔ ابا جان نے بٹھل سے تھکن کا عذر بھی کیا تھا۔ کہا تھا کہ ویسے بھی دو ایک دن آرام کے بعد ہی سفر کرنا ٹھیک رہے گا۔ وہ نواب حشمت جنگ سے آنے والی کل کے لیے ملاقات کا وقت بھی طے کر چکے تھے۔ نواب نے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ ابا جان کے گھر والوں کے لیے چند تحائف پیش کرنا چاہتا ہے۔ ابا جان نے منع کیا تھا کہ یہ ان رسوم کا موقع نہیں ہے لیکن نواب حشمت جنگ نے انھیں قائل کر دیا تھا کہ زندوں کے لیے تو یہ زندگی رواں ہی ہے۔ کہنے لگے، اگر بٹھل پہلے انھیں کوئی مشورہ دے دیتا تو وہ اسی نسبت سے بڑے نواب کی حویلی میں حیدر آباد سے اپنی بہ عجلت روانگی کا تاثر دے دیتے۔

دیر تک سب خاموش بیٹھے رہے۔ بٹھل مسلسل حُقّہ گڑگڑاتا رہا تھا۔ یک بارگی سٹک مُنہ سے ہٹا کے وہ بڑبڑاتی آواز میں ابا جان سے بولا۔ "اُدھر بڑے نواب کے پاس مہاراجا سے تو آپ کی بھینٹ نہیں ہوئی؟"

ابا جان کُرسی سے اُچھل سے گئے۔ وہ بات جو مجھے کھٹک رہی تھی، بٹھل کے سر میں بھی چُبھ رہی تھی۔ ابا جان نواب حشمت جنگ کی وہ باتیں شاید بھول گئے تھے جو اُس نے میسور کے ایک دولت مند کے متعلق بتائی تھیں۔ بڑے نواب کی حویلی میں جانے کے دوسرے دن کی بات ہے جب وہاں پہلی بار نواب حشمت جنگ سے ابا جان کا آمنا سامنا ہوا تھا اور وہ انھیں وہاں دیکھ کے ششدر رہ گیا تھا پھر اُس نے فخریہ انداز میں بڑے نواب کو بتایا تھا کہ وہ نادر ہیرا ابا جان ہی کا عطیہ تھا۔ ہیرے کی قدر و قیمت کی سند کے طور پر اُس نے مہاراجا دھرم دیر کا ذکر کیا تھا۔ مہاراجا کو کسی طرح یہ سُن گُن مل گئی تھی کہ نواب حشمت جنگ کی تحویل میں ایک بیش بہا ہیرا آیا ہے۔ مشہور ہے کہ مہاراجا دھرم دیر ہیروں کی خوشبو سونگھ لیتا ہے۔ بہر حال نواب حشمت جنگ کو اندازہ تھا کہ کس ذریعے سے مہاراجا کو ہیرے کی خبر پہنچی ہوگی۔ نواب حشمت جنگ سے ضبط نہیں ہوا تھا۔ اُس نے اپنے ایک ہم رُتبہ نواب کو کہیں یہ ہیرا دکھا دیا تھا، نواب پتھروں کی پرکھ میں ایک حیثیت رکھتا تھا، اُسی جوہر شناس نے مہاراجا کے ذوق و شوق کی آگ بھڑکائی تھی، سُن کے مہاراجا ایسا بے چین ہوا کہ نواب حشمت جنگ کے پاس آ کے ہیرے کی دید کے لیے اصرار کرنے لگا۔ نواب حشمت کے بقول، وہ اُسے دیکھ کے گُنگ رہ گیا تھا۔ اُس کا عالم دیدنی تھا۔ اُس کی آنکھوں کی خیرگی اور جلتا ہوا چہرہ دیکھ کے نواب کو بہت لُطف آیا تھا۔ مہاراجا نے اُسی وقت ابا جان سے متعارف کرانے کے لیے اُس سے درخواست کی تھی جسے نواب ٹال گیا تھا۔ اُس کے بیان کے مطابق یہیں تک بات ٹھیک تھی اور وہ اپنے مربی ابا جان کا پتہ بتا کے انھیں کسی اُلجھن میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ ہیروں کے شوق کے معاملے میں مہاراجا کی دیوانگی کا اُسے خوب علم تھا۔

بٹھل کی زبانی مہاراجا کا نام سُن کے ابا جان کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ اُنھوں نے اقرار کیا کہ دفن کے روز تو نہیں لیکن پرسوں کے روز مہاراجا دھرم دیر سے اُن کی ملاقات ہوئی تھی۔ "مگر مگر، وہ ایک نہایت رسمی ملاقات تھی۔" ابا جان نے بہکی بہکی آواز میں کہا۔ "مہاراجا کو خاں صاحب نے مجھ سے متعارف کرایا تھا۔ مہاراجا نے مجھ سے ملنے پر خوشی کا رسمی اظہار کیا اور بس، اُس نے کوئی اور بات نہیں کی۔"

بٹھل سر ہلانے لگا۔

"آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ کیا آپ کے خیال میں آنے والے آدمیوں کا تعلق مہاراجا دھرم دیر سے تھا مگر انھیں یہاں ہماری حویلی کے متعلق؟" ابا جان تذبذب سے بولے۔ "مہاراجا نے جیسا کہ نواب حشمت جنگ بتا رہے تھے، کسی قسم کے اشتیاق کا اظہار نہیں کیا بلکہ اُسی دن نواب حشمت جنگ کی زبانی مہاراجا کے ذکر سے اگر کوئی تکدر ذہن پر چھایا تھا تو مہاراجا سے ملاقات کے بعد وہ چھٹ گیا تھا۔ اُنھوں نے اشارۃً بھی اس بابت ایک لفظ نہیں کہا۔"

"وقت سیدھا نہیں تھا بابا!" بٹھل نے سرد مہری سے کہا۔ "اور پتہ کھوجنا کون سا جوکھم کا کام ہے۔ نواب نہیں بول رہا تھا تو اُس کا موٹر چلانے والا پورب پچھم جانتا تھا۔ اُدھر کوئی اور بھی ہو سکتا ہے۔"

"ہاں، ہاں۔" ابا جان نے بے یقینی کے انداز میں کہا۔ "مگر ٹھیک ہے،

...ن آنے دیجیے۔ اگر یہی صورت ہے تو ہم اُن سے معذرت کر لیں گے۔ ...تک میرا قیاس ہے، مہاراجا ایک معقول اور بردبار آدمی معلوم ہوتا ہے۔"

بٹھل کو اب یہ باور کرانے سے کیا حاصل تھا کہ یہاں حویلی میں ...یوں کی مسلسل آمد ہی مہاراجا کی بے چینی کی مظہر ہے اور آنے والوں ...دارانہ انداز ہی مہاراجا کی شدتِ شوق کی علامت ہے۔

"مگر مارٹی کا کہنا ہے کہ تیسری مرتبہ آنے والے آدمی دوسرے تھے۔" ...ن کچھ توقف کے بعد بے تابی سے بولے۔

"آدمیوں کی کمی ہے اُن کے پاس!" بٹھل نے سپاٹ لہجے میں ...ور ہو سکتا ہے کہ اُن کی ڈوری کسی دوسری طرف سے کھینچی گئی ہو۔" "دیکھ لے گا اُستاد! ابھی دیکھتا ہے۔ اپن کے ہوتے میں کون آتا ...ور کیا بولتا ہے سالا!" پیرو نے بہ ظاہر بے پروائی سے کہا۔

"ایسا کیا مسئلہ ہے۔" منیر علی نرمی سے بولے۔ "کوئی ملنا چاہتا ہے ...ا جائے۔ بخدا میری عقل سمجھنے سے قاصر ہے کہ اس قدر وہم و تردّد ...ضرورت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ حساسیت اعصاب شکنی کے سبب ...ہے۔ ہم سب کو ایک رات مکمل آرام کرنا چاہیے۔ اُن کی دوبارہ آمد سے ...ی قسم کی قیاس آرائی مجھے تو فضول معلوم ہوتی ہے۔"

کسی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تو منیر علی نے بھی چُپ سادھ لی۔ سبزہ زار ...ل بڑھ گئی تھی۔ ابھی اندھیرا اتنا گہرا نہیں ہوا تھا مگر اوس پڑنے لگی ...ٹھ بھی نہیں بجے ہوں گے۔ پیرو کے مشورے پر سب اندر چلے آئے۔ ...زدرا، شامو، جمرو، کانتے اور ٹنگو وہاں بیٹھے ایک دوسرے کی صورت ...ہے، پھر یکے بعد دیگرے اُٹھ اُٹھ کے باہر جانے لگے۔ میں بھی اُٹھنے ...ہ کر رہا تھا کہ مارٹی بھاگتا ہوا آیا اور اُس نے تیز سانسوں سے ابا جان ...ر وہی دونوں آدمی پھر آئے ہوئے ہیں۔ ابا جان نے کوئی جواب دینے ...پہلے اضطراری نگاہوں سے بٹھل کی طرف دیکھا۔ بٹھل نے مارٹی کو ...کر دیا۔ ابا جان کرسی پر پہلو بدل رہے تھے۔ میں بھی سیدھا ہو کے بیٹھ ...ا۔ انھیں اندر آنے میں کوئی دیر نہیں لگی۔ اِدھر مارٹی باہر گیا، اُدھر ...شیروانیوں میں ملبوس، پکی عمر اور پکی سانولی رنگت کے دو آدمی نیچے ...سامنے اندر داخل ہوئے۔ ایک لمبا چھریرے جسم کا، دوسرا اوسط قد ...ٹھے ہوئے جسم کا تھا۔ دونوں ترکی ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ شکل و صورت ...معتبر لوگ ہی نظر آ رہے تھے۔ وہ ابا جان کو نہیں پہچانتے تھے اس ...لام کے بعد اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اُنھوں نے شائستگی سے ابا جان ...لق پوچھا۔ اس سے پہلے کہ ابا جان کوئی جواب دیتے، بٹھل نے ...آواز میں اُن سے کہا۔ "کام بولو صاحب!"

چھریرے جسم کے آدمی نے مضطرب انداز میں اپنے ساتھی کی جانب نظر کی پھر متانت سے بولا۔ "ہمیں جناب اکبر علی خاں سے کچھ کام ہے۔"

"فرمایئے۔" ابا جان نے بہ عجلت کہا، بٹھل کو نہیں بولنے دیا۔

"کیا ہم اپنے معزز مطلوب ہی سے مخاطب ہیں؟"

"کہیے، کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" ابا جان نے اُکھڑی ہوئی آواز میں کہا۔ "جناب سے ایک درخواست کرنی ہے۔" اُس شخص نے روانی سے کہا۔

"کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

"یہیں شہر سے۔" وہ معذرت کرتے ہوئے بولا۔ "ہم اپنا تعارف کرانا تو بھول ہی گئے۔ ہم دونوں دوست بھی ہیں اور کاروباری شریک بھی۔ خادم کو محمود علی کہتے ہیں۔ میرے رفیق کا نام قطب الدین ہے۔"

"جی، جی۔" ابا جان نے اٹکتے لہجے میں کہا۔ "مگر اس فقیر سے جناب کو کیا کام ہے۔ ہمیں آج رات کچھ اور مصروفیات بھی ہیں، ہو سکے تو اپنا مدعا جلد بیان کر دیجیے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے آپ کو پہلے کبھی دیکھا ہو۔"

"بلاشبہ، جناب نے ہمیں پہلے نہیں دیکھا۔" وہ شُستگی سے بولا۔ "ہمیں افسوس ہے کہ ہم نامناسب وقت پر آئے۔ اگر ایسی کوئی مصروفیت ہے تو ہم کل کسی وقت آجائیں گے۔"

"کل کا کچھ ٹھیک نہیں ہے۔" ابا جان نے سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "بہر حال ابھی اتنا وقت ہے کہ میں آپ سے بات کر سکوں، آپ فرمایئے۔"

"جی،" وہ جھجکتے ہوئے بولا "کیا ہی اچھا ہو کہ ہمیں چند لمحوں کے لیے خلوت میسر آ جائے۔" یہ کہتے ہی وہ ہماری جانب دیکھتے ہوئے ندامت سے بولا۔ "آپ حضرات کو یقیناً زحمت ہو گی لیکن ہمارا خیال ہے، ہم خلوت میں قبلہ سے اپنا مدعا مناسب طور پر گوش گزار کر سکتے ہیں۔"

"نہیں۔" ابا جان نے کوئی توقف کیے بغیر جواب دیا۔ "اس کی ضرورت نہیں۔ ان سب کو میرا رفیقِ کار سمجھیے۔"

مارٹی دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ کاتے بھی آ گیا تھا۔ بٹھل نے ہم تینوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ دونوں خاموشی سے چلے گئے۔ منیر علی خود بہ خود اٹھ گئے۔ کسی نے انھیں روکا بھی نہیں۔ بٹھل نے مجھے بھی اشارہ کیا تھا لیکن میں اپنی کرسی پر جما رہا۔ کمرے میں ہم چاروں ہی رہ گئے تھے۔ اباجان، پیرو، بٹھل اور میں۔

"کچھ ایسی ہی بات ہے۔" گٹھے ہوئے جسم کے شخص قطب الدین نے پہلی مرتبہ زبان کھولی اور مودب لہجے میں بولا "جناب بجا فرماتے ہیں لیکن ہماری گزارشات کے بعد ہی سب کو شریک کیا جائے تو بہتر ہے۔"

"آپ بولو صاحب!" بٹھل نے بھن بھناتی آواز میں کہا "ہم لوگ الگ کوئی بات نہیں کرتے۔ بعد کو دوبارہ اِن کے لوٹانے سے اچھا ہے کہ آپ ہی کی زبان سے ہم سُن لیں۔ گھبراؤ نہیں صاحب! بولو۔"

"نہیں، نہیں۔ گھبرانے کی ایسی کیا بات ہے۔" لمبے آدمی محمود علی نے قدرے ترشی آمیز شائستگی سے کہا "ظاہر ہے، یہ تو جناب پر منحصر ہے کہ وہ آپ حضرات سے بعد میں مشورہ کرتے ہیں یا نہیں۔ ہماری تو عرض اتنی ہے کہ یوں ہمیں اپنا مدعا بیان کرنے میں کسی حد تک سہولت ہو جائے گی۔"

"اپنے کو ساتھ سُننے میں آسانی ہو گی۔" بٹھل نے نسبتۃً اونچی آواز میں کہا "جو بولنا ہے صاحب! صاف بولو۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" قطب الدین کی پیشانی شکن آلود ہو گئی لیکن فوراً وہ معاہمانہ انداز میں بولا "جیسا کہ ہم نے آپ کو بتایا، ہم کاروباری آدمی ہیں اور اپنی طرف سے کاروبار کے آداب واصول کی پابندی کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ بات کچھ آگے بڑھے گی تو جناب کو خود اندازہ ہو جائے گا۔"

"بولو صاحب! کام کی بات بولو۔" بٹھل نے تند لہجے میں کہا۔

"جی ہاں۔" قطب الدین سنبھل کے بولا اور اپنے ساتھی محمود علی سے کہنے لگا "کیوں محمود بھائی! آپ ہی بات شروع کیجیے۔"

"بہتر ہے۔" محمود علی نے سانس لے کے کہا "اصل میں اپنے اجنبی ہونے کی رُکاوٹ آڑے آتی ہے۔ ہمیں احساس ہے کہ ہمارا کوئی ریفرنس، حوالہ آپ کے سامنے نہیں ہے۔ ایسے میں ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ کسی معاملت سے پہلے آپ ہمارے بارے میں اچھی طرح چھان بین کر لیجیے۔"

"اپن لوگ ایک دم سیدھا بات مانگتا ہے۔" پیرو نے تلخ...

"ہماری بھی یہی خواہش ہے کہ ہم دو ٹوک انداز میں بات... محمود علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پر آپ تو ابھی ایک ٹوک بھی پورا نہیں بول رہا۔"

میرے کان انھی کی طرف لگے ہوئے تھے۔ اباجان کی آنکھ... جل بجھ رہی تھیں۔ ابھی تک کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ معاملت سے... دونوں کی کیا مراد ہے۔ کاش وہ اس حویلی کی خریداری کے سلسلے میں... ہوں لیکن پھر انھیں اِدھر اُدھر کی اتنی باتیں کرنے کی کیا ضرورت... پیرو کی بات سُن کر دونوں ہنس پڑے۔ "کیا خوب کہا ہے!" محمود علی نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "معلوم ہوتا ہے جناب... تعلق بمبئی شہر سے ہے۔"

"اپن بمبئی کا دادا ہے، نمبر ایک دادا۔ ابھی کچھ اور بتائے..."

"نہیں جناب!" محمود نے سنجیدگی سے کہا "معاف کیجیے، آپ تو..." اپنے ساتھی کے ٹوکنے پر وہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔ قطب... نے فوراً نرم لہجے میں کہا "میرا خیال ہے، ہمیں اصل مقصد پر آ جا... میں ہی بیان کرتا ہوں۔ براہِ کرم میری طرف توجہ دیجیے اور میر... ہے کہ پہلے میری بات پورے طور پر سُن لیجیے۔ صورت یہ ہے ج..." وہ ایک لمحے ٹھیر کے بولا "ہم نوادر کا کاروبار کرتے ہیں۔"

میری نگاہیں بے اختیار اباجان پر منڈلانے لگیں۔ ان کا... تمتما رہا تھا اور انھوں نے اپنے ہونٹ بھینچ رکھے تھے۔

قطب الدین کے لہجے میں پہلے جیسی لچک نہیں تھی، ...

"ہمیں اپنے ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ جناب کے پاس اعلا قسم... موجود ہیں، خصوصاً نادر پتھروں کی شکل میں۔ ابھی سے کچھ کہنا... لیکن ایک بار ہماری خدمات حاصل کر کے دیکھیے، انشا اللہ آپ کو... کوئی شکایت نہ ہو گی۔ یہاں ریاست میں ہمارا کام یہی ہے کہ اِدھر اُ... سے نوادر اکٹھے کر کے صاحبِ ذوق حضرات کی خدمت میں پیش... ہم اپنی اس خدمت کا معاوضہ دو صورتوں میں وصول کرتے ہیں۔ باقاعدہ خریداری کی صورت میں، اگر معاملہ ہماری بساط کے مطابق... ہم خود سودا طے کر لیتے ہیں۔ دوسری شکل، موصولہ قیمت پر... اور مقررہ کمیشن کی ہے۔ یعنی ہماری کوشش سے نوادر کی جو رقم... ہو گی، اُس میں ہمارا حصّہ جو بھی خوش اسلوبی سے ہمارے آپ کے... طے پا جائے۔ نوادر کا معاملہ ایسا نہیں ہوتا کہ ہر کسی آنے والے... پر اعتبار کر لیا جائے۔ ہمارا تجربہ ہے کہ لوگ بہت ٹھوک بجا کے... معتبر آدمی ہی سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔ یہاں شہزادگان، نوابین اور ...صاحبِ ثروت حضرات کی ایک بڑی فہرست ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا ...ذکر آدمی رہ جاتا ہو جو ہم سے اور ہمارے کام سے واقف نہ ہو۔ یہ ایک ...ف اور سیدھا کام ہے۔ ہماری حیثیت درمیان کے آدمی کی بھی ہے ...باقاعدہ اہلِ معاملہ کی بھی۔ غالباً ہم نے اپنے منشا کی وضاحت ...ی ہے۔"

"ابھی اپن کچھ بولے؟" جیسے ہی وہ چُپ ہوا، پیرو نے کہا۔

"جی ہاں، لیکن، لیکن۔" وہ ہچکچاتے ہوئے بولا "ایک بات رہی ...ہے۔ آپ کا شکریہ کہ آپ نے اتنی توجہ اور تحمل سے ہماری گزارش... نوادر کے سلسلے میں ہمیں اکثر ایسے حضرات کے پاس جانا پڑتا ہے ...سے پہلے کوئی واقفیت نہیں ہوتی۔ اُن میں قسم قسم کے لوگ ہوتے... ایسے لوگ جنھوں نے بڑی دوڑ دھوپ کے بعد کوئی کام کی چیز کھوج ...، ایسے لوگ جنھیں اتفاقاً یا قسمتہً کچھ مل گیا ہو اور، اور برسبیلِ تذکرہ ...ہے۔" اُس نے کسمساتے اور مُسکراتے ہوئے کہا "ہمیں ایسے لوگوں ...بھی واسطہ پڑتا ہے، کسی اور طرح بعض نوادر جن کے ہاتھ آ گئے..." قطب الدین نے فوراً معذرت چاہی اور تیزی سے بولا "عرض یہ ...ہ چیز چاہے کسی بھی ذریعے سے آئی ہو، رازداری کا خیال فطری ہے ...بھی کبھی یہ احتیاط حد سے گزر جاتی ہے، غیر ضروری ہو جاتی ہے ...چھی چیز اچھے ہاتھوں تک نہیں پہنچ پاتی۔ مثلاً کوئی چیز دیکھ کے ...تر آدمی کی نشان دہی کر سکتے ہیں کہ کہاں اُس کی صحیح قیمت وصول... یقین کی کوئی جرأت تو بہرحال کرنی پڑتی ہے۔ ہم اپنی جانب سے ...ہہ سکتے ہیں کہ رازداری پر ہمارے کاروبار کا دار و مدار ہے اور ...ایک گھسی پٹی بات کہ آزمائش شرط ہے، آپ ہمیں صرف ایک بار ...ضرور دیں۔"

"آپ اپنے کو کون سے لوگ میں جانتے ہو؟" بٹھل نے آہستگی ...کہا۔

"جناب! جناب! خدا کے لیے دل پر کوئی میل نہ لائیے۔ ہم نے ...تذکرۃً ایک حقیقت عرض کی تھی کہ کیسے کیسے لوگوں سے ملنے کا ...ہوتا ہے اور اُن کے دل میں اپنا اعتماد قائم کرنے کے لیے ہمیں کیا ...ہار کرنے پڑتے ہوں گے۔ کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں ذریعہ جاننے ...ئی دل چسپی نہیں ہوتی۔ ہمارے لیے چیز کی اہمیت ہوتی ہے اور اُس ...کی جس کی تحویل میں ہے، لوگوں کو دیکھتے دیکھتے اور یہ کام کرتے کرتے ...بھی عمریں گزر گئی ہیں۔ تھوڑی بہت آدمی کی پہچان ہو گئی ہے۔ ...دہ بات نظر آتی تو ہم دوسری طرح بات کرتے۔"

"پھر کس طرح کا بات کرتا؟" پیرو نے تنک کے کہا۔

"وہ تو صاحب دوسرے ہی لوگ ہوتے ہیں۔ آدمی دیکھ کے بات کی جاتی ہے۔" قطب الدین کے بجائے محمود علی نے کتراتے ہوئے کہا۔

"اگر اپن بولے کہ اپن وہی دوسرا لوگ ہے۔"

"جی، جی! آپ ضرور بُرا مان گئے۔"

"نئیں نئیں، ابھی بولو، پھر آپ کیسا بات کرے گا۔"

"بات پہلے سے طے نہیں ہوتی جنابِ والا!" قطب الدین نے کہا۔

"آپ یقیناً مذاق کر رہے ہیں۔" محمود علی بولا۔

"اپن ایک دم ٹھیک بولتا ہے۔"

"لگتا ہے، گلی کوئی بھٹک گئی ہے۔ رستے میں کوئی ایک دیدے والا ٹکرا گیا تھا کیا؟" بٹھل نے سرد لہجے میں کہا "اِدھر چلتے اپنے سوا کچھ بھی نئیں ہے، اور اس میں بھی اپنے کو تھوڑا شک ہے۔"

"ہم دیکھ بھال کے آئے ہیں جناب!"

"آپ اِس قدر وثوق سے کیوں کہہ رہے ہیں؟" اباجان نے برہمی سے کہا۔

"جناب! عرصہ ہو گیا ہے اس دشت کی سیاحی میں۔"

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"دیکھیے۔" وہ لجاجت سے بولا "ہمیں ایک بار کچھ ثابت کرنے کا موقع ضرور دیجیے۔"

"ہم ابھی کیا بولا۔ آپ ایک گلی بیچ میں چھوڑ کے آ گیا ہے۔ ایدر کس نے بھیجا ہے آپ کو؟"

"ہمارے اپنے ذرائع ہیں۔ شہر میں نوادر کی نقل و حرکت ہو، کوئی نئی چیز آئے اور ہمیں خبر نہ ہو۔"

"آپ تو اپن کو پولیس کا آدمی لگتا ہے۔"

"لعنت بھیجیے پولیس پہ حضرت۔" محمود علی نے بے ساختہ کہا۔

"پولیس میں ہی ایسا کھوجی لوگ ہوتا ہے۔"

"اسی کھوج سے ہمیں آج ریاست کے سب سے بڑے نوادر فروش کی حیثیت حاصل ہوئی ہے۔ پولیس کھوج لگا کے ہتھ کڑیاں ڈال دیتی ہے۔ ہم اس کے برعکس کرتے ہیں، ہاں ہم سونے کی ہتھ کڑی پہنا دیتے ہیں۔"

"ابھی آپ کیا پیے گا، شربت، چائے یا کھانا منگوائے؟"

"شکریہ، بہت مہربانی آپ کی۔"

"نئیں نئیں، ابھی آپ بولو، آپ کی کیا خاطر کرے۔ ابھی کچھ اور نہیں آیا ہے تو ایدر سے کچھ کھا پی کے جائے۔"

"اس کے لیے تو وقت پڑا ہے جناب! کھائیں گے، پئیں گے

بھی بلکہ جناب سے غریب خانے کو عزت بخشنے کی درخواست بھی کریں گے۔"

ابھی وہ یہ کہہ رہا تھا کہ ملازم کو اندر داخل ہوتا دیکھ کے چُپ ہو گیا۔ دونوں ملازموں نے چائے اور [illegible] کا دیگر سامان وغیرہ اُن کے سامنے کی میز پر سجا دیا۔ "یہ آپنے کیا زحمت کی۔" قطب الدّین نے خوش اطواری سے کہا۔ "یوں بھی آپ کو دیر ہو رہی ہو گی۔"

"اپن نے سوچا، ابھی آپ کو تھوڑا نمک کھلا دے۔"

"اوہ، اوہ" قطب الدّین کِھل کھلانے لگا۔ "بے شک بے شک، انشا اللہ حق ہی ادا کیا جائے گا۔ ایک ضروری بات شاید ہم کہہ نہ سکے۔ آپ کے اطمینان کے لیے عرض ہے، آپ چاہیں گے تو بڑی سے بڑی ضمانت بھی پیش کی جا سکتی ہے۔"

"نمک سے بڑا ضمانت ابھی اور کیا ہوئے گا۔"

"اہا ہا" قطب الدّین اُچھل گیا۔ "آپنے کیا خوب کہا ہے۔"

"ایک بات پوچھے؟" پیرو نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اپن لوگ شکل سے ابھی کیا لگتا ہے؟"

"جی!" دونوں گھبرا گئے۔ "کیا فرما رہے ہیں آپ؟"

میری رگوں میں خون جل رہا تھا۔ پیرو یہ کیسی باتیں کر رہا ہے، بیٹھل بھی اُسے نہیں ٹوکتا، صاف صاف بات کرتے ہوئے مُنہ کیوں پھوٹ رہا ہے۔ ممکن تھا، پیرو کی زبان سے کوئی اور بات نکل جاتی کہ میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہمیں اب معذرت کر لینی چاہیے۔"

"ہاں ہاں۔" بیٹھل بس سر ہلا کے رہ گیا۔

میری دخل اندازی پر پہلی بار اُنھوں نے مجھے غور سے دیکھا۔ "ہمیں احساس ہے۔" محمود علی نے جیبی گھڑی ٹٹولتے ہوئے کہا۔ "ہم پھر آجائیں گے۔ اجازت ہو تو کل آجائیں؟"

"کل سے کیا فرق پڑے گا۔" ابّا جان تُرش روئی سے بولے۔ "اگر یہی کام ہے تو آپ کا آنا لاحاصل ہے۔"

"اِدھر وقت اکارت کرنے سے اچھا ہے کہ آپ کوئی اور گھر جا کے دیکھو۔" بیٹھل نے جمی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہم آپ کو کس طرح یقین دلائیں کہ آپ۔ ۔ ۔"

"اپنے کو سارا یقین ہے، پر ہم کیا بولیں۔"

"ابھی لوٹ کے آئے گا نا۔" پیرو پچکارتے لہجے میں بولا۔ "تو ایسا کوئی چیز کھوج کے آپ لوگ کے لیے ضرور لائے گا۔ آدمی اپن کو آپ کام کا لگتا ہے۔"

"جناب! ہم تو اس وقت کی بات کر رہے ہیں۔"

"اپن کے پاس ایک پُرانا چاقو ہے، بولے تو دکھائے؟"

"براہِ خدا جناب کچھ توجّہ دیجیے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہم یہاں یوں ہی مُنہ اُٹھائے چلے آئے ہیں، ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں ہے؛ ہمیں معلوم ہے کہ آپنے حال ہی میں کیسا نادر پتّھر ریاست کے ایک بڑے آدمی کو دیا ہے۔"

"ایسا!" پیرو حیرت سے بولا۔ "پر آپ کو کیسے پتہ لگا؟"

"اسی ہنر کی روزی کھاتے ہیں جناب!" محمود علی کی آواز کسی قدر اُٹھ گئی تھی۔ "بتائیے کیا ایسا نہیں ہے؟"

"ہے، ایک دم ہے، اپن جھوٹ نہیں بولے گا پر ایسا کس نے آپ کو بولا؟"

"بس یہی ہم سے نہ پوچھیے۔ رازداری ہی پر ہمارے کام، ہماری کامیابی کا انحصار ہے۔ ازراہِ کرم یہ ہم سے نہ پوچھیے۔"

"نئیں، آپ بولو، قسم سے اپن کسی سے نئیں بولے گا۔"

"نہیں جناب! ہمیں مجبور سمجھیے۔"

"ٹھیک ہے اپن بھی مجبور ہے۔"

"ویسے تو ہم کسی کا بھی نام لے سکتے ہیں مگر اس سے نہ آپ کو کچھ حاصل ہوگا، نہ ہمیں۔"

"اپن سوچتا ہے، ابھی اپن نے کسی کو کچھ دیا تو سالا کوئی بیچ میں ٹانگ اُڑانے والا کون ہوتا ہے۔" پیرو کی آواز بھرنے لگی۔

"قطعاً نہیں۔" محمود علی نے عاجزانہ انداز میں کہا۔ "یہ تو آپ کا اختیار ہے، آپ لکھ لٹا دیں اور بقول شخصے لُٹا ہی دیا۔ ہماری پیش کش کا تعلق آپ کے معاملات میں دخل دینا نہیں ہے۔ ہم تو ایک مختلف بات کہہ رہے ہیں۔ شاید جناب نے غور نہیں کیا۔"

"اور ایدر اپن نے کیا بولا! ایدر آپ بے کار آیا ہے۔ سمجھا، ایک دم بے کار، مخول کرنے۔"

"ہمارا خیال ہے، آپ کو سوچنے کے لیے کچھ وقت کی ضرورت ہے۔ کوئی بات نہیں۔" محمود علی یاسیت سے بولا۔

"آپ کیا بولتا ہے۔" پیرو نے بھڑکتے لہجے میں کہا۔ "ایک آدمی کچھ دینے کا مطلب ہے کہ اپن دُکان لگائے بیٹھا ہے۔ اپن ایدر مُٹھی میں [illegible] بیٹھا ہے کہ اُس کو دیا ہے تو آپ کو بھی دے گا یا اپن سے آپ یہ بولتا مانگتا ہے کہ واپس لے کے آپ کے آگے ڈال دے۔ ایسا؟"

دونوں مضطرب نظروں سے پیرو کو دیکھتے رہے پھر اچانک اُٹھ گئے۔ اُن کے اُٹھنے کے انداز میں جتنی تیزی تھی، آواز میں اتنی ہی تھی۔ قطب الدّین نے زیرِ لبی سے زحمت کی معذرت چاہی۔ اُنھوں نے نمک پاروں کے دانوں اور چائے پر اکتفا کیا تھا۔ جانے سے پہلے اُنھوں نے سب سے ہاتھ ملایا، محمود علی ٹمٹماتی آواز میں بولا۔ "ہم ایک بار پھر آئیں گے۔"

"اپن کیا بولے۔" پیرو نے مُنہ بنا کے کہا۔ "آؤ، ضرور آؤ، بار بار آؤ، اپن ایدر ہی ہے پر ایک بات دھیان سے سُن لو۔ لوٹ کے یہی [illegible] لے گا تو ایسا ہی اُلٹا جائے گا۔"

دونوں کے ہونٹ پھڑک کے رہ گئے۔ اُن کے ساتھ دروازے سے سبھی باہر نکل آئے تھے۔ چبوترے تک خاموشی رہی۔ سیڑھیاں اُترتے ہوئے قطب الدّین ٹھہر گیا اور دبے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔ "ایک بات زبان پر آ کے رہ جاتی ہے۔ بہرحال ہمارا فرض ہے کہ گوش گزار کر دیں۔ یہ ریاست ہے، یہاں کے رنگ ڈھنگ ذرا مختلف ہیں۔ اگر واقعی کوئی ایسی چیز آپ کے پاس ہے تو احتیاط رکھیے گا۔"

پیرو اُس کے سامنے آ گیا۔ "اپن نئیں سمجھا؟"

"مراد یہ کہ جناب ایک سے ایک بڑا ٹھگ یہاں پڑا ہے۔" قطب الدّین [illegible] بل کھاتی آواز میں کہا۔ "اور ایک سے ایک شوقین، ٹھرک باز۔ گرگے اُن کے اِدھر اُدھر بھٹکتے ہی رہتے ہیں۔ آپ یہاں نووارد ہیں۔ برنبائے احتیاط عرض ہے کہ فیصلہ کرنا ہو تو زیادہ دیر نہ لگائیں۔ چرچا کچھ کم نہیں ہے۔"

"ابھی ایدر آپ کو کس نے بھیجا ہے؟" پیرو نے تڑختی آواز میں پوچھا۔

"نہیں جناب!" وہ جلدی سے بولا۔ "یہ بدگمانی نہ کیجیے۔"

"پھر آپ ایسا زور کیوں لگا رہا ہے؟"

"شاید اس لیے کہ ہماری اُمید نہیں ٹوٹی ہے۔"

"ایک دم کُتّے کا دُم مافک ہے۔"

دونوں کی آنکھوں میں ایک ثانیے کے لیے آگ سی بھڑکی لیکن دوسرے ہی لمحے محمود علی نے سنبھل کے کہا۔ "جو آپ مناسب سمجھیں، جائیں، ہم آپ کے گھر میں ہیں۔"

"ماں قسم ایدر بھی ایسا ہی ہے۔ آپ لوگ گھر میں آیا ہے، اپن بار بار یہی دھیان سالا اٹکتا رہا ہے۔"

"ہماری حیثیت طلب گار کی سی ہے اس لیے ہم آپ سے کوئی [illegible] نہیں کریں گے لیکن یقین کیجیے کہ جرح کے لیے ہمارے پاس [illegible] دتوں کی کمی نہیں ہے۔"

"نئیں نئیں، ابھی آپ سب بول کے جاؤ۔"

محمود علی نے پیرو کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے تھپکی دی اور [illegible] رلتے، لجاتے لہجے میں بولا۔ "اس کا یہ وقت نہیں ہے۔ آپ تو ناراض ہونے لگے۔ میں آپ سے اپنی اور اپنے ساتھی کی کسی بھی تلخ نوائی کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ ہمیں معاف فرما دیجیے۔"

"آپ کیسا آدمی ہے؟" پیرو نے برہمی سے کہا۔

"کسی وقت بھی آپ کو ہماری ضرورت پڑ سکتی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ خوش گوار فضا قائم رہے۔" محمود علی عاجزی سے بولا۔ "اتنی دیر آپنے وقت دیا، ہماری گزارش سُنی۔ اس کا بہت بہت شکریہ۔ انشا اللہ پھر ملاقات ہو گی۔" یہ کہتے ہی وہ قطب الدّین کا ہاتھ تھام کے نیچے اُتر گیا۔ پیرو آگے بڑھ کے کچھ کہنا چاہتا تھا کہ بیٹھل کے اشارے پر ٹھہر گیا۔

"شاید اب نئیں آئے بیٹھل بھائی!" کمرے میں واپس آ کے پیرو تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ہاں دادا! ہو سکتا ہے۔" بیٹھل کی آواز میں یقین نہیں تھا۔

"اپن نے تو بہت کوشش کیا بیٹھل بھائی!"

"اور کیا بول سکتے تھے دادا!"

"میں آپ سے متفق ہوں۔" ابّا جان نے پیرو سے کہا۔ "گمان یہی ہے کہ اب اُنھیں نہیں آنا چاہیے۔ آپنے اُنھیں کوئی رائے قائم کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اگر وہ کوئی رائے لے کے گئے ہیں تو وہ اُن کی دانست میں مایوس کُن ہی ہو سکتی ہے۔ میں نے اِسی لیے درمیان میں اتنا دخل نہیں دیا تھا۔"

"پر کچھ ٹھیک نہیں ہے بابا!"

اُن کی باتیں سُن کے مجھے احساس ہوا کہ میں نے اچھا ہی کیا جو خاموش بیٹھا رہا۔ مجھے یہی حیرت تھی کہ بیٹھل پیرو کی یہ طول بیانی، فضول گوئی کیوں برداشت کر رہا ہے۔ ابّا جان ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ وہ لوگ بہت منتشر رائے لے کے گئے ہوں گے۔ ابّا جان اور بیٹھل فوراً سمجھ گئے، وہ صاف اور سیدھی بات جانے کیوں میرے دماغ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں تو کئی بار پیرو کو ٹوکتے ٹوکتے رہ گیا تھا۔

"ابھی یہ کیدر سے آ سکتا ہے؟" پیرو نے تردّد سے پوچھا۔

"کوئی نواب راجا ہی ہو گا۔" بیٹھل نے حُقّہ گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"اُسی مہاراجا کی طرف ابھی تمھارا دھیان جاتا ہے؟"

"اور بھی ہو سکتا ہے دادا!"

"ہاں اپن بھی کچھ یہی سوچتا ہے بیٹھل بھائی!" پیرو منمناتے ہوئے بولا۔ "کبھی اپن کے سر میں ایک دم اندھیرا بھر جاتا ہے۔ اپن کے من میں ایک اور بات آتا ہے۔ سوچتا ہے تو اپن کا سر گھوم جاتا ہے۔"

"کیا دادا؟" بیٹھل نے سر اُٹھا کے پوچھا۔

"کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟" ابّا جان نے تجسّس سے کہا۔

"کچھ نئیں، اپن ابھی کچھ نئیں بولے گا۔"

"بتائیے نا؟"

"کیا بولے بابا!" پیرو نگاہیں چرانے لگا۔

"کیا بات ہے دادا؟" بھّل نے چونک کے پوچھا۔

پیرو چپ رہا۔ جب ابّا جان نے بہت اصرار کیا تو اُس نے سر جھکا کے بہ مشکل تمام اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ ابّا جان گنگ ہو گئے۔ بھّل بھی اُسے گھورنے لگا۔ مجھے بھی پیرو کی صحیح الدماغی پر شبہ ہونے لگا تھا۔ پیرو نے ہکلتی اٹکتی زبان سے نواب حشمت جنگ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اُس کا قیاس تھا کہ کہیں یہ آدمی نواب حشمت جنگ کی طرف سے نہ بھیجے گئے ہوں۔ ابّا جان نے شدّ و مد سے تردید کی تو پیرو شرم سار سا ہونے لگا، ندامت زدہ لہجے میں بولا کہ اُسے خود بھی یقین نہیں ہے، کاش یہ اُس کا وہم ہی ہو لیکن اُس نے آدمی کے اتنے چہرے، اتنے رُوپ دیکھے ہیں کہ معدودے چند لوگوں کے سوا اب اُسے مشکل سے کسی شخص پر اعتبار آتا ہے۔ ابّا جان کسی حد تک برافروختہ ہو گئے تھے۔ کہنے لگے کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ اُنھوں نے پیرو کو نواب حشمت جنگ کی ایک ایک بات یاد دلائی۔ اُس کی عزت و تکریم، اُس کی سپاس گزاریاں اور رُخصت کے وقت اُس کی آنکھوں میں نمی وغیرہ وغیرہ، کہنے لگے کہ پھر ہماری عدم موجودی میں یہاں ہمارے متلاشیوں کی آمد کا کیا جواز ہے۔ یہاں سے ہمارے جانے کے پہلے دن نہیں تو دوسرے دن نواب حشمت جنگ کو علم ہو گیا تھا کہ ہم بڑے نواب کی حویلی میں ہیں، اُسے اپنے مربیوں کے ساتھ اِس ہیر پھیر کی کیا ضرورت ہے۔ کہیں تو کسی موقع پر اُس کے رویّے سے اس تکدّر کی جھلک نظر آتی۔ ابّا جان نے پیرو سے کہا کہ اُنھوں نے نواب حشمت جنگ کے ساتھ اُس سے زیادہ وقت گزارا ہے۔ بھّل اور پیرو کی عدم موجودی میں بھی تو وہ گھنٹوں اُس کے ساتھ رہے ہیں۔ وہ پیرو کو اُس کی ایک ایک بات بتاتے رہے۔ پیرو نے اُن سے کوئی تکرار نہیں کی بلکہ اُس نے اُن سے معافی مانگی کہ یہ محض اُس کا گمان تھا اور کچھ نہیں۔ یوں ہی اُس کے دماغ میں ایک بات آئی اور اُس کے مُنہ سے نکل گئی ورنہ وہ خود جھجک رہا تھا۔ جو سوال میں اُس سے کرنے والا تھا وہی بات ابّا جان نے اُس سے پوچھی کہ آخر کوئی تو شہادت اس وہم کی بنیاد بنی ہو گی؟ پیرو کوئی جواب نہ دے سکا۔ مجھے پیرو پہ حیرت ہو رہی تھی۔ گویا منیر علی نے غلط اندازہ نہیں لگایا تھا کہ اب ہم پر اعصاب شکنی طاری ہے۔ پیرو کو شاید ہم سب سے زیادہ آرام کی ضرورت تھی۔ اُسے اپنے گھر سے نکلے عرصہ ہو گیا تھا۔ اب گھر اتنا دور بھی نہیں رہا تھا۔ ایک رات کی مسافت اُس کی بیٹی، بیوی اور اُس کے درمیان حائل تھی۔ مگر یہ رات نہیں گزرتی تھی۔

پیرو اپنے وہم کی وجہ کا جواب نہیں دے سکتا تھا یا وہ ا... کی خاطر جواب دینا نہیں چاہتا تھا۔ ابّا جان کی دلیلوں کے سا... اُسے گھٹا گھٹا دیکھ کے یہ خیال اچانک میرے ذہن میں گونجا تھا... میرے سینے میں جلن ہونے لگی تھی۔ میں نے بھّل کی جانب دیکھا... نے پیرو سے ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ پیرو واقعی کوئی ایسی اَن ہونی... نہیں کہہ رہا تھا۔ کوئی بعید نہ تھا کہ اس طرح نواب حشمت جنگ ہ... بارے میں وہ کچھ جاننا چاہتا ہو جو ہم سے ربط و تعلق کی اس فضا... جاننا ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ انکسار اور تپاک، وہ لحاظ اور مروّت... جگہ۔ نواب حشمت جنگ کی جگہ کوئی بھی ہوتا، یہی کرتا مگر اُس کی حیثیت... ریاست کے ایک حاکم کی بھی تو ہے اور ایک باہوش آدمی کی بھی... تمام وقت تو اُس کے سامنے نہیں رہے تھے، ہم سے الگ ہو کے تو اُس... سارا وقت اپنے سامنے گزارا ہے۔ مجھ اندھے کو جیسے روشنی کے ر... مل رہے تھے۔ ریاست کے ایک اہم منصب دار کی یہ جستجو غیر متو... نہیں تھی۔ یہ نو وارد جو اُس کے اتنے قریب آ گئے ہیں، کون ہیں ا... کیا مقصد رکھتے ہیں؟ دیکا جی ہوٹل میں ابّا جان کا قیام، اُس کے پا... کسی غرض کے بغیر اُن کی آمد اور ایک بیش بہا ہیرے کا عطیہ، جو... کی بہ عجلت خریداری، ابّا جان کا اپنے بارے میں کچھ بتانے کے سل... میں محتاط رویّہ، پھر اپنے عم زاد بھائی بڑے نواب کی حویلی میں ہما... موجودی اور خانم سے تعلّق۔ خانم کی بازار سے وابستگی کے بارے... اُسے پہلے سے علم ہو گا اور شاید بڑے نواب سے اُسے یہ بھی معلوم ہو گ... کہ ابّا جان اور منیر علی کے ساتھ کے لوگ بازار کے اڈّے پر باقاعدہ ا... گیری کرتے رہے ہیں، سرِ عام اُن کی چاقو بازی کا تماشا دیکھا گیا۔... منیر علی اور ابّا جان سے بھّل، پیرو اور کلنتے وغیرہ کی گہری رفاقت... نواب حشمت جنگ کے لیے کئی لحاظ سے حیرت و تجسّس کا باعث... گی۔ وہ نادر ہیرا اُس نے قبول تو کر لیا تھا کیونکہ ابّا جان نے انکار کی... گنجائش نہیں رہنے دی تھی لیکن اس شرفِ قبولیت کا یہ مطلب نہ... تھا کہ اُس کا ذہن ابّا جان کی اس خسروانہ مرحمت کی غرض و غایت... سلسلے میں اُلجھتا نہ ہو۔ کہیں یہ عطیہ آئندہ اُس کے رتبے کے لیے ک... زیاں، کسی رُسوائی کا سبب نہ بن جائے؟ کہیں اس داد و دہش کے... میں ابّا جان کا کوئی اور ارادہ نہ چھپا ہو؟

ابّا جان نے اُس کی وکالت کرتے ہوئے پیرو سے کہا تھا کہ جب... نواب حشمت اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا کہ ہم بڑی حویلی میں ہیں... دوسرے دن اور گزشتہ کل یہاں میری تلاش میں آنے والے آدمیو...

...کا اُس کی طرف سے آنے کا کیا جواز ہے، دوسرے دن اُسے اُن آدمیوں کو روک لینا چاہیے تھا۔ پیرو ابّا جان کو جواب نہیں دے سکا تھا حالانکہ جواب صاف تھا کہ پھر اُن کی آمد اور ضروری ہو گئی تھی۔ اسی طرح تو نواب حشمت جنگ اپنی بابت ہمارے دلوں میں ابھرنے والے ہر شبہے کا امکان ختم کر سکتا تھا۔ ایک طرف اُسے ہمارے بارے میں کوئی نتیجہ اخذ کرنے یا ایک اطمینان حاصل کرنے کی بے چینی ہو گی، دوسری طرف اُسے ابّا جان سے ہونے والے تعلّق کی پاس داری کا خیال بھی ہونا چاہیے۔ اُس نے بڑے نواب کی حویلی میں ہمیں دیکھنے کے بعد اور اس سے پہلے ابّا جان کے ساتھ جس وارفتگی اور تعلّقِ خاطر کا اظہار کیا تھا وہ محض ظاہر داری نہیں تھی، ظاہر داری ہمیں ضرور محسوس ہو جاتی۔ یہی تو ابّا جان پیرو کو باور کرا رہے تھے۔ ہمارے لیے اُس کے یہی احساسات ہوں گے جن کا وہ برملا اظہار کرتا رہا تھا لیکن ان احساسات کے لیے کسی تائید، کسی یقین کی ضرورت اُسے ہر لمحے محسوس ہوتی ہو گی۔ بڑے نواب کی حویلی میں اُس نے نازکی کا اتنا خیال رکھا تھا کہ ہمارے مابین رشتے جاننے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ صرف میرے اور ابّا جان کے رشتے کا اُسے علم ہوا تھا۔ ابّا جان نے باقی سب کو اپنے رفقائے کار کے طور پر متعارف کرایا ہو گا۔ یہ ایک نہایت تشنہ تعارف تھا۔ اپنی تشنگی کا احساس گو اُس نے ہمیں نہیں ہونے دیا تھا لیکن تشنگی تو اپنی جگہ تھی۔ اُس کے عم زاد بھائی نواب عالم تاب کے لیے ہماری طرف سے دوسرا بڑا عطیہ خانم تھی۔ حویلی میں خانم کی آمد اتنا بڑا حادثہ تھی کہ پھر ہم سے کہنے سُننے، جاننے، پوچھنے کے لیے ایک جرأت لازم تھی، ایک رنگ دلانہ جرأت۔ پیرو نے ابّا جان کو یہی اشارہ کرنا چاہا تھا کہ بہ صورتِ دیگر نواب حشمت جنگ کے پاس ہمارے سلسلے میں اپنے سر کی دُھند دُور کرنے کا یہی چارہ رہ گیا تھا کہ ہمیں شائبہ تک نہ ہو۔ اُسے کسی نتیجے پر پہنچنے تک اس نزاکت کا بہ طور خیال رکھنا چاہیے تھا۔ یقیناً اُس کی خواہش ہو گی کہ سارا تاثر یوں ہی قائم رہے۔ یہ تو ابّا جان بھی اچھی طرح سمجھتے ہوں گے۔ اُس کی مہربانی بجائے خود اضطراب کی علامت ہے۔ گویا اُسے اندیشہ تھا کہ مبادا ہمارے پاس معقول جواب نہ ہوں اور اُسے ہمارے سامنے اور ہمیں اُس کے سامنے کسی اذیت ناک مرحلے سے دوچار نہ ہونا پڑے۔

•

بڑے نواب کی حویلی میں خانم کی آمد نے نواب حشمت جنگ کے ذہن میں رینگنے والے اَن گنت سوالوں کے آگے دیوار سی کھڑی کر دی تھی۔ ظاہر ہے، سوالات ختم نہیں ہو گئے تھے بلکہ اور گہرے ہو گئے ہوں گے۔ شاید اسی لیے نواب نے ہمارے سامنے بہ طورِ خاص مہاراجا دھرم ویر کا ذکر کیا تھا۔ ہو سکتا ہے، اِن پتھروں سے خود اُس کی رغبت مہاراجا سے کم نہ ہو اور وہ اپنے آدمی بھیج کے ابّا جان کے دوسرے ہیروں کی ٹوہ لینا چاہتا ہو۔ ایک ہیرا قبول کر لینے کے بعد اس سلسلے میں مزید گفتگو بھی تو ممکن نہیں رہی تھی۔ ابّا جان خود بتا رہے تھے کہ مہاراجا دھرم ویر نے ان سے ملنے کے بعد کوئی خاص اشتیاق ظاہر نہیں کیا تھا۔ اُن کے خیال میں وہ ایک رسمی ملاقات تھی۔

پیرو نے کچھ نہیں کہا۔ ابّا جان نے بھّل سے پوچھا کہ کیا اس قدر رسم و راہ کے بعد نواب حشمت جنگ کی طرف سے اس قسم کی بدگمانی کا امکان ہے؟ بھّل ہنکاری بھر کے رہ گیا۔ ابّا جان بھی چُپ ہو گئے۔ نو بج چکے تھے۔ کلنتے، شامو، جمرو وغیرہ میں سے کوئی نہیں لوٹا تھا۔ کمرے میں حبس زدہ سی خاموشی طاری تھی۔ ملازم نے آ کے رات کے کھانے کے لیے پوچھا۔ سبھی نے انکار کر دیا تاہم ابّا جان نے اُسے لیموں کا شربت لانے کا حکم دیا۔ چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ ملازم آ گیا۔ لیموں کے شربت میں عرقِ گلاب کی آمیزش کی گئی تھی۔ نہایت خوش ذائقہ شربت تھا۔ میں نے بھی ایک گلاس پیا۔ شربت پینے کے دوران بھی وہ ایک دوسرے سے بے خبر خاموش بیٹھے رہے۔ میں باہر جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ دفعتہً کلنتے اور ماروٹی نے اندر داخل ہو کے اطلاع دی کہ ایک بڑی موٹر میں کوئی آدمی ابّا جان سے ملنے آیا ہے۔

ابّا جان کو جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا۔ وہ کرسی پہ پہلو بدلنے لگے۔ "کون ہے؟" اُنھوں نے ہذیانی انداز میں پوچھا۔

"اپنے کو کوئی مہاراجا بولتا ہے۔" کلنتے نے جواب دیا۔

"مہاراجا! مہاراجا دھرم ویر؟"

"ہاں، ایسا ہی نام بولا ہے اُس نے۔"

"مہاراجا اِس وقت آئے ہیں؟ تم نے کیا کہا؟"

کلنتے نے بتایا کہ اُس نے اپنے طور پر کہہ دیا ہے کہ ابّا جان شاید سو گئے ہیں لیکن جواب میں مہاراجا نے کہا کہ بہتر ہے، ایک بار اندر جا کے دیکھ لیجیے۔

ابّا جان کھڑے ہو گئے اور پیرو کی طرف دیکھ کے پوچھنے لگے۔ "کیا جواب دیں؟"

"ابھی بُلا کے دیکھتا ہے بابا! کیوں بھّل بھائی؟" پیرو نے کسمساتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے، اس وقت منع ہی کر دیں۔" ابّا جان نیم ہذیانی انداز میں بولے۔ "کلنتے سونے کا کہہ ہی چکا ہے۔"

"اب نمٹا ہی دو بابا!" بھّل کی آواز بدلی ہوئی تھی۔

"جیسی آپ کی مرضی۔" ابّا جان نے تذبذب سے کہا "یہ بھی مناسب ہی ہے۔" دوسرے لمحے اُنھوں نے کانتے سے کہا کہ مہاراجا کو عزت سے اندر لے آئے۔

"ابھی سب لوگ چلتا ہے۔" پیرو کے ٹوکنے پر ابّا جان کو خیال آیا۔ اُنھوں نے کانتے کو آواز دے کے ٹھیر جانے کی ہدایت کی۔ پتّھل بھی اُٹھ گیا تھا۔ ہم چاروں تیز قدموں سے باہر آئے تھے۔ ابّا جان پر سراسیمگی سی چھائی ہوئی تھی مگر دروازے سے گزرتے وقت وہ پیرو کو جتانا نہیں بھولے کہ "دیکھا آپ نے! میں نے کیا کہا تھا۔"

چبوترے کے باہر سیاہ موٹر کھڑی تھی۔ جو شخص کمرے کے باہر سائبان میں کرسی پر بیٹھا تھا، وہی مہاراجا دھرم دیو ہوگا۔ وہ تن و توش ہی سے مہاراجا لگتا تھا۔ چوڑی دار پاجامے اور شیروانی میں ملبوس۔ شیروانی پر شانوں سے گزرتی ہوئی سلکی شال پڑی تھی۔ سر پر پگڑی اور سامنے پگڑی کے عین وسط میں ہیروں سے جڑا ہوا ایک تمغہ نما طلائی زیور آویزاں تھا۔ پچپن ۵۵ کے قریب عمر، درمیانہ قد، بھاری بھرکم جسم، بھرا ہوا چہرہ اور ہلکی ہلکی مونچھیں گلے میں موتیوں کا ہار پڑا ہوا تھا۔ سانولی رنگت کے باوجود چہرہ دمک رہا تھا۔ ابّا جان لپکتے ہوئے اُس کے پاس پہنچے۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں ہیرے کی مانند دمکنے لگیں "ہمیں احساس ہے کہ ہم ناوقت آئے ہیں، ہمیں اطلاع دے کے آنا چاہیے تھا لیکن بس اچانک ارادہ ہوگیا۔"

"یقین نہیں آتا کہ مہاراجا غریب خانے پر قدم رنجہ ہیں۔ جنابِ والا طلب فرما لیتے۔" ابّا جان نے اپنے لہجے کی لرزیدگی دُور کرنے کی پوری کوشش کی۔

"ہم نے سوچا، اس تکلّف کی کیا ضرورت ہے۔ اِدھر دکن میں آپ کی حیثیت مہمان کی ہے۔ ہمی کو پہلے آنا چاہیے تھا۔" مہاراجا نے تمکنت سے کہا "یوں کہیے کہ ہمارا اشتیاق ہمیں کھینچ لایا۔"

"زہے نصیب۔" ابّا جان خوش خلقی سے بولے "مگر اب ہم مہمان کہاں، آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہم نے یہاں گھر بنا لیا ہے۔"

"ہمیں معلوم ہوگیا تھا۔" مہاراجا نے کھل کھلا کے کہا "ہمارے لیے یہ خوشی کی بات ہے کہ شمال سے ایک اور عزت مند گھرانا دکن آ کے بس گیا ہے۔ غالباً آپ کا میسور کی طرف کبھی جانا نہیں ہوا۔ پھر آپ وہیں رہنے کا ارادہ کرتے۔ ریاست حیدرآباد کے دوست ہم سے خفا ہو جاتے ہیں جب ہم اُن سے کہتے ہیں کہ یہ تو میسور کے آگے بیابان ہے۔"

"ایک مرتبہ اتفاق ہوا ہے مگر سرسری۔" ابّا جان نے کہا۔

"جنوبی ہند سارا کا سارا مرغزار ہے لیکن میسور اور بنگلور کی تو بات ہی اور ہے۔"

"آپ نے دیکھا ہے؟" مہاراجا جوشیلے لہجے میں بولا۔

"دیکھنے کی طرح نہیں دیکھا۔ ایک ضروری کام سے جانا ہوا تھا۔ چند روز قیام رہا لیکن ایک اندازہ تو ہو ہی جاتا ہے۔"

"اس بار آپ ہمارے مہمان بن کے آئیں تو ہم آپ کو دکھائیں کہ اُس دیس پر قدرت کتنی مہربان ہے۔"

"ناچیز کے لیے اس سے بڑی عزت کیا ہوگی۔" ابّا جان نے مستعدی سے جواب دیا۔ پیرو کے اشارے پر اُنھوں نے معذرت خواہانہ لہجے میں مہاراجا سے اندر چلنے کی درخواست کی۔ مہاراجا پہلے ہی اِس توجّہ کا منتظر تھا۔ ابّا جان نے ہاتھ آگے بڑھایا تو وہ پھرتی سے آگے بڑھ گیا۔ حویلی کا خاص کمرہ کھول دیا گیا تھا۔ یہ آرائش و زیبائش کے اعتبار سے حویلی کے دوسرے تمام کمروں سے مختلف تھا۔ ہمارے داخل ہونے سے پہلے ملازموں نے روشنیاں جلا دی تھیں۔ دیواروں پر بیلوں اور پھول پتّوں کی شکل میں نصب شیشوں کی وجہ سے کمرے کا منظر کسی شیش محل جیسا ہو گیا تھا۔ ساری چھت رنگ برنگی روشنیوں سے جھل ملا رہی تھی۔ مہاراجا سامنے کے صوفے پر آ کے بیٹھ گیا۔ پتّھل، پیرو، ابّا جان اور میرے سوا کوئی اور اندر نہیں آیا تھا۔

"کیا خوب صورت حویلی ہے۔ ہمیں یاد پڑتا ہے، ہم پہلے بھی یہاں آ چکے ہیں۔" مہاراجا نے ستائشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا "آپ نے اچھی جگہ منتخب کی ہے۔"

"قسمت سے مل گئی۔" ابّا جان انکسار سے بولے "لیکن آپ کو یہاں کا پتہ کس طرح معلوم ہوا؟"

"ہاں!" مہاراجا نے ہنستے ہوئے کہا "وہ جو ایک شاعر نے کہا ہے، کیا حسبِ حال کہا ہے۔ بس ایک صدقِ طلب شرط ہے چنانچہ ہم نے منزل کھوج ہی لی۔"

"ضرور قبلہ نواب حشمت جنگ صاحب نے بتایا ہوگا۔" ابّا جان نے چہکتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہمارے اُن کے قدیم خاندانی مراسم ہیں۔" مہاراجا شگفتگی سے بولا "وہ ہمارا بہت خیال رکھتے ہیں لیکن اُنھوں نے ہمیں نہیں بتایا۔ ہم جانتے تھے کہ وہ ہمیں اتنی جلدی نہیں بتائیں گے، ہمارے صبر کا امتحان لیں گے۔ ہمیں صبر نہیں تھا، سو ہم نے اُنھی کے ذرائع آزمائے اور آخر کامیاب ہوگئے۔"

"یہ کوئی ایسا راز بھی نہیں تھا۔" ابّا جان کے لہجے میں کسی قدر ترشی کی آمیزش ہو گئی تھی "آپ سے اُس روز تو نواب عالم تاب مرحوم کے سوم میں نیاز حاصل ہوا ہی تھا۔ جنابِ والا اشارہ فرما دیتے۔"

"ہم نے وہ موقع مناسب نہیں سمجھا۔" مہاراجا نے مچلتی آواز میں کہا "لیکن آپ یقین کیجیے، ہم نے اُس دن بہت ضبط کیا۔"

"نیاز مند کو حیرت ہو رہی ہے۔" ابّا جان اضطراب آمیز وضاحت سے بولے "اس کے لیے مہاراجا کا اشتیاق باعثِ عزّت و مسرّت ہے لیکن ساتھ ہی کسی حد تک باعثِ تشویش بھی ہے۔ تشویش اس امر کی کہ [illegible] والا مرتبت نے فقیر کے متعلق اس کی بساط سے زیادہ نہ سُن [illegible] یا ہو۔ بہرحال، کھانے کا وقت ہے، جنابِ والا سے درخواست ہے [illegible] پہلے دعوتِ شیراز تناول فرمائیں۔"

"ہمیں افسوس ہے۔" مہاراجا پشیمانی سے بولا "ہم کھانے کے [illegible]بعد ہی نکلے تھے لیکن کیا، کیا آپ حضرات نے! ۔ ۔ ۔ ؟"

"یوں سمجھیے کہ آپ کا انتظار تھا۔" ابّا جان نے مسکرا کے کہا۔

"اوہ!" مہاراجا مسرّت سے بولا "ہمیں اندازہ تھا کہ ہم کن [illegible]ل دل صاحبان کے پاس جا رہے ہیں۔ شاید اسی اعتماد میں ہم نے [illegible]لاع اور وقت کا ایسا خیال نہیں کیا، ارادہ کیا اور آ گئے۔"

ابّا جان نے پھر اُس کا شکریہ ادا کیا اور کہنے لگے "ہمیں مہاراجا کے ذوق و شوق کا علم ہو گیا تھا۔ اگر ہم یہ کہیں تو شاید غلط نہ ہوگا کہ [illegible]ہاراجا کے اوصاف سُن سُن کے ہمیں خود باریابی کی بے تابی تھی۔"

"یقیناً یقیناً نواب حشمت جنگ کی کارستانی ہوگی۔" مہاراجا کی [illegible]ل آنکھوں میں روشنی بھر گئی "مگر اُنھوں نے کتنا کہا ہوگا۔ یہ اُن کی [illegible]رش ہے کہ اُنھوں نے ہمیں اس غیر معمولی ہیرے کے دیدار سے [illegible]رف کیا۔ وہ دنیا کے نادر ہیروں میں سے ایک ہے، ایسے ہیرے [illegible] نے زندگی میں بہت کم دیکھے ہیں۔ اُس کا نظارہ کر کے ہم سے [illegible]اشت کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ ہم نے اُن سے بہت سے سوال کیے [illegible]لنے کے باوجود کہ وہ ایسی آسانی سے ہمیں سب کچھ نہیں بتا دیں [illegible]۔ ہوا بھی یہی۔ نواب صاحب کو ہماری کمزوری کا اچھی طرح علم [illegible]، وہ ٹال مٹول کر کے گویا ہمیں ستاتے رہے، ہم سے لُطف لیتے [illegible]۔ اُن کی بے نیازی نے ہمیں اور مشتاق کر دیا۔"

"نواب صاحب قبلہ نے کیا فرمایا آپ سے؟"

"کچھ بتایا ہو تو کہیں۔ ہم نے پوچھا، کون ایسا سخی ہے؟ اُس قلندر کا کہاں قیام ہے؟ ہمیں دیدار نہ کرائیے گا؟ بولے کہ ہمارے محترم کے ایک دوست ہیں طبعاً گوشہ نشیں ہیں۔ زمانے بعد ریاست [illegible]وا ہے، ہمارے لیے یہ تحفہ لائے ہیں۔ یہ بتا کے فرمایا کہ سرِدست ملاقات مُشکل ہے کیونکہ اُنھیں واپسی کی جلدی ہے۔ البتہ دوبارہ آنے کو کہہ رہے تھے، پھر ہم آپ سے ضرور ملوائیں گے اور اب بھی اُن سے ذکر کر کے دیکھیں گے۔ ممکن ہے، اِسی مرتبہ کوئی صورت نکل آئے۔ مگر اس دوران اُن کے خاندان میں یہ الم ناک سانحہ ہو گیا اور ہم اُن سے کچھ نہیں کہہ سکے۔"

"اُنھوں نے سب درست ہی فرمایا۔" ابّا جان نے آہستگی سے کہا۔ وہ مخاطب مہاراجا سے تھے لیکن اُن کی نگاہیں پیرو کے چہرے پر منڈلا رہی تھیں۔

"اُن کا فرمانا اپنی جگہ درست ہے مگر اس طرف ہم اپنے اختیار کا کیا کرتے۔" مہاراجا تمتماتی آواز میں بولا "آخر ہم نے یہی فیصلہ کیا کہ ہم خود ایک کوشش کر کے دیکھتے ہیں۔"

"ایسا بھی کیا جنابِ والا!" ابّا جان خفیف سے ہو گئے "ہم مہاراجا کی دل چسپی سے ناآشنا نہیں تھے لیکن ہمیں دل چسپی کی اِس شدّت کا ذرا بھی گمان ہوتا تو ہم خود حاضر ہو جاتے۔"

"ہم کیا عرض کریں۔ زندگی انھی پتھروں کو پرکھتے تولتے گزری ہے۔ نواب حشمت جنگ نے چیز ہی ایسی دکھائی تھی کہ ہماری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ کیا سجل، ترشا ہوا پتھر ہے۔ کیا آب و تاب، رنگ روپ ہے۔ ہمیں اُس دن حسد کی حد تک نواب حشمت جنگ پر رشک آیا۔ وہ ہم سے چھوٹے ہیں اور ایک چھوٹے کی حیثیت سے ہماری تعظیم

کرتے ہیں۔ ہمیں اپنا پاس بھی لازم تھا ورنہ جی چاہتا تھا کہ اُن سے چھین لیں۔"

اباجان نے افسوس کا اظہار کیا۔ وہ یہی کہہ سکتے تھے کہ اگر اُن کی ملاقات مہاراجا دھرم دیر سے پہلے ہو جاتی تو وہ یہ ہیرا اُس کی نذر کر دیتے۔

"ہمیں یقین ہے، ایسا ہی ہوتا لیکن ایسا ہوا جو نہیں۔" مہاراجا نے بے قراری سے کہا۔ "ہم اسی لیے آپ کے پاس آئے ہیں کہ آپ سے اُس ہیرے کی بابت کچھ جان سکیں اور اگر اب بھی کوئی گنجائش ہو تو آپ سے درخواست کر سکیں۔"

"کیسی گنجائش؟" اباجان تعجب سے بولے۔

"یہی کہ وہ ہیرا کسی طور ہمیں دست یاب ہو جائے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے! وہ نذر کیا جا چکا ہے۔"

"ہم اس حقیقت سے واقف ہیں لیکن نواب حشمت جنگ سے زیادہ ہم خود کو اُس کا مستحق سمجھتے ہیں۔ آپ ہی کوئی صورت نکالیے۔ سمجھیے کہ ہم یہاں آپ کے در پر سوالی بن کے آئے ہیں۔"

"آپ کیا فرما رہے ہیں؟"

"ہم کسی ریاست کے والی نہیں لیکن اس کے سوا جو کچھ بھی ہمارے پاس ہے، ہم اُسے آپ کے اختیار پر چھوڑ دیتے ہیں کہ آپ جو چاہیں گے، ہم اُسے ترک کر دیں گے۔ پلٹ کے اُس جانب نہیں دیکھیں گے۔"

"جناب والا کے علم میں ہے کہ ہم نے یہ ہیرا تحفتاً نواب صاحب کی خدمت میں پیش کیا ہے۔" اباجان کی آواز اُونچی ہوتی گئی۔

"اپنی طلب کا جنون ظاہر کرنے کے لیے ہمارے پاس مال و دولت کی اس پیش کش کے سوا کیا رہ جاتا ہے، کوئی اور نقش قائم کرنے کا ہمیں وقت ہی کہاں ملا ہے۔ ہم کہنا چاہتے ہیں کہ اپنی طلب کی بنیاد پر حق ہمارا بنتا ہے۔"

"مگر مہاراجا! یہ سب بعد از وقت ہے۔" اباجان نے شکستہ لہجے میں کہا۔ "اب چیز ہمارے پاس نہیں ہے۔"

"آپ اُسے واپس بھی لے سکتے ہیں۔"

"یہ جرأت کرنے سے پہلے ہم اپنی زبان قلم کر لیں گے۔"

"ہمیں اسی جواب کی توقع تھی۔" مہاراجا نے ہٹیلی آواز میں کہا۔ "لیکن پھر ہمارے لیے کیا حکم ہے؟"

اباجان اس بات کا کیا جواب دے سکتے تھے۔ چند لمحوں تک سشش و پنج میں پڑے رہے پھر بولے "بہتر ہوگا کہ آپ اس سلسلے میں نواب صاحب ہی سے بات کریں۔ اب یہ اُنھی کی ملک ہے۔ ہمارا کوئی حق نہیں بنتا۔ ہم اُسی دن بالکلیہ دست بردار ہو گئے تھے جب ہم نے اُسے بہ صد خوشی نواب صاحب قبلہ کے ہاتھوں میں منتقل کیا تھا۔ آپ کا حق ہمیں دل سے تسلیم مگر آپ ہی فرمائیے، اب کس طرح ہم اُن کے سامنے اس سلسلے میں لب کشائی کر سکتے ہیں؟"

"آپ نہیں کر سکتے۔ ہم جانتے ہیں، یہ آپ کے لیے کتنا مشکل ہے لیکن کیا آپ ہمیں اس گھر سے خالی ہاتھ واپس کر دیں گے؟"

"جی، جی!" اباجان کے ہونٹ پھڑپھڑا کے رہ گئے۔ اُنھوں نے پہلے بٹھل کی پھر پیرو کی جانب دیکھا۔ دونوں بُت کی طرح ساکت بیٹھے رہے۔

"کیا ہم بھی نواب حشمت جنگ کی طرح آپ سے تعلقِ خاطر کے مدعی نہیں ہو سکتے؟" مہاراجا نے بے اختیارانہ لہجے میں کہا۔

"کیوں نہیں، کیوں نہیں!" اباجان تیزی سے بولے۔ "یہ تو ہمارے لیے سعادت ہے، مگر، مگر کہیں آپ کا یہ خیال تو نہیں کہ ہمارے پاس اس نوع کے دوسرے نوادر ۔ ۔ ۔"

"ازراہِ نوازش پہلے ہماری بنتی سُن لیجیے۔" مہاراجا نے اباجان کی بات کاٹ کے جلدی سے کہا۔ "یہ ہمارا خیال نہیں، یقین ہے۔ ہمیں اپنا یہی یقین آپ کے دروازے پر کھینچ لایا ہے۔ یہی تو ہم کہنا چاہتے ہیں۔ جو شخص ایک بھولے بسرے نواب کو محض ایک پرانی، ایک زمانے کی گرد پڑی ہوئی شناسائی کی تجدید کے لیے ایسی بیش قیمت سوغات نذر کر سکتا ہے، اُس کے اقبال و حشم کا کوئی کیا تصوّر کر سکتا ہے!"

اباجان نے درمیان میں دخل دینا چاہا لیکن مہاراجا نے اُن سے معذرت کر لی اور کہنے لگا۔ "ہم نے آپ سے عرض کیا ہے کہ نواب حشمت جنگ کے خاندان سے ہمارے مراسم کی نوعیت کیا ہے۔ اُن کے والدِ مرحوم کے ساتھ ایک عمر کی رفاقت رہی ہے اور رہی سے نہیں، قرابت کا یہ سلسلہ ہمارے دادا جی کے زمانے سے جاری ہے۔ ہمارا تعلق ریاست میسور سے ہے لیکن یہ ریاست ہمارا دوسرا گھر ہے۔ نواب حشمت کی والدہ ہم سے پردہ نہیں کرتیں اور ہمیں اپنے ہی گھر کے ایک فرد کا درجہ دیتی ہیں۔ دونوں خاندان ہمیشہ ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں شریک رہے ہیں۔ ہمیں حیرت ہے کہ نواب صاحب کے خاندان سے آپ کے قدیم روابط کا ہمیں کوئی علم کیوں نہیں ہے۔ شمالی ہندوستان میں جہاں جہاں اُن کے سلسلے پھیلے ہوئے ہیں، ہم سب کی نشان دہی کر سکتے ہیں اور اپنے یہ نواب حشمت جنگ، کیا آپ سمجھتے ہیں، ہم اُن کا لہجہ، اُن کی آنکھیں، اُن کا چہرہ نہیں پہچانتے۔ آپ کو نہیں معلوم، وہ ہمارے سامنے آپ سے اپنے قدیم تعلق کا ذکر کرتے ہوئے کیسے متذبذب نظر آ رہے تھے۔"

"یہ امر فطری ہے کیونکہ ہمارا تعلق اُن کے والدِ مرحوم سے تھا۔" اباجان کی آواز میں لرزش آ گئی تھی۔

"ایک مرحوم دوست کے فرزندِ دل بند کو ایک غیر معمولی ہیرے کی نذر گزاری جاتی ہے۔ یہ بخشش کوئی ایسا ہی شخص کر سکتا ہے جو اپنے آپ سے بیزار ہو گیا ہو اور غنا کے درجے پر فائز ہو۔ یا کوئی ایسا شخص جس کے انبار میں ایک پتھر کے کم ہو جانے سے کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔ یا جسے ان پتھروں کی قدر و قیمت کا کوئی احساس نہ ہو اور اس کا امکان نہیں ہے کیوں کہ نواب حشمت جنگ جیسے صاحبِ حیثیت اور جوہر شناس کو وہی پتھر پیش کیا جا سکتا ہے جس کی قدر و قیمت کا اچھی طرح تعین کر لیا گیا ہو۔ ان پتھروں کی پہچان نہ ہر کس و ناکس کو ہو سکتی ہے، نہ ہر کس و ناکس اس کی حفاظت کر سکتا ہے۔ اِن کے لیے تو کوئی اہلِ نظر ہی چاہیے۔"

اباجان کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ اُنھوں نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا، مہاراجا کو گھورتے رہے اور میری توقع کے خلاف ٹھہری ہوئی آواز میں بولے۔ "پھر جناب والا کس نتیجے پر پہنچے؟"

"ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ ہمیں آپ کے پاس چلنا چاہیے۔"

"ایسی صورت میں، آپ کو کم و بیش یہی اندازے قائم کرنے چاہیے تھے تاہم غالباً یہ ضروری نہیں کہ ہم آپ کے سامنے وضاحت پیش کریں۔"

"مطلق نہیں۔" مہاراجا نے بے ساختہ کہا۔ "ہم تو محض اپنی اُلجھنیں بیان کر رہے تھے۔ کیسے کیسے سوال اس دوران ہمارے دماغ میں منڈلاتے رہے ہیں۔"

"معاف کیجیے، اس کی وجہ آپ کی لاعلمی ہو سکتی ہے، لاعلمی کی اُلجھن۔ کوئی شبہ نہیں کہ نواب صاحب قبلہ سے آپ کے مراسم قدیم ہیں لیکن ہمارا گمان ہے، ابھی آپ اُس خانوادے سے متعلق بہت سے حقائق سے ناآشنا ہیں۔ بہر حال ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہم نواب صاحب سے اپنے ربط و تعلق کی سند آپ کی خدمت میں پیش کریں مگر کیا واقعی ایسی کوئی جواب دہی یا ثبوت و شواہد ہم پر قرض ہیں؟"

"نہیں نہیں، آپ نے بہت آگے کی بات کہہ دی۔" مہاراجا کے تحمل میں سرِ مو فرق نہ آیا، نہ اُس کے لہجے کی فصاحت میں کمی ہوئی۔ یہ شائبہ تک نہ ہو رہا تھا کہ اس کا تعلق ریاست میسور سے ہے اور اُس کی مادری زبان کوئی اور ہو سکتی ہے۔ مہاراجا نے ہم تینوں کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا تھا جیسے ہم وہاں موجود ہی نہ ہوں۔ اُس نے اباجان سے تخلیے یا خلوت کی خواہش بھی ظاہر نہیں کی تھی۔ ہنستے ہوئے بولا۔ "ہم ثبوت و شواہد کے لیے نہیں آئے، نہ ہمارا یہ کام ہے۔ ہماری بے چینی ایک تو ان پتھروں سے ازلی دوستی کے سبب تھی، دوسرے نواب حشمت جنگ سے ہمارے تعلق کا تقاضا تھا کہ ہم اُن کی حیثیت کے تحفظ کا خیال رکھیں۔ آپ درست فرماتے ہیں۔ اِس اضطراب کی وجہ ہماری لاعلمی ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے پہلوؤں پر بھی احباب نے ہماری توجہ مبذول کرائی تھی۔ دیگر امور پر ہمیں خود بھی نگاہ رکھنی چاہیے تھی۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ جناب نے براہِ راست نواب حشمت جنگ کے پاس جانے کے بجائے ہوٹل میں قیام کیا تھا۔ دیلکا جی ہوٹل میں اور نواب صاحب سے اُن کے دفتر میں ملنے کی کوشش کی تھی جہاں اپنی مصروفیت کے سبب نواب صاحب نے انکار کر دیا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ نواب صاحب نے گھر پر ملاقات کا وقت بہ اکراہ دیا تھا۔ گھر پر ہی ملاقات ہوئی۔ بعد ازاں ہوٹل ہی میں جناب کا قیام رہا۔"

مہاراجا کو یہ ساری باتیں نواب کے معتمدِ خاص یا ڈرائیور وغیرہ سے معلوم ہو سکتی تھیں۔ اباجان کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ "پھر اطلاع دینے والے نے یہ بھی آپ کے گوش گزار کیا ہوگا کہ نواب صاحب قبلہ نے ہم سے گھر پر قیام کے لیے بے پناہ اصرار کیا تھا، ہمی نے انکار کر دیا کیوں کہ ہمارے ساتھ اور لوگ بھی تھے جن کا نواب صاحب کے ساتھ کوئی علاقہ نہیں تھا۔" اباجان کی آواز تڑخ رہی تھی۔ اُنھیں اس صراحت کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے جھپٹتی نگاہوں سے بٹھل کی جانب دیکھا کہ وہ اباجان کو روکے۔ جواب میں بٹھل نے پلکیں موند لیں اور اشاروں میں مجھے تحمل کی تلقین کی مگر میری رگوں میں خون جل رہا تھا۔ اباجان کہنے لگے۔ "ظاہر ہے، ایک زمانے بعد ہمارا ریاست کی طرف آنا ہوا تھا۔ ہمارا واسطہ نواب صاحب کے والدِ مرحوم سے تھا اور ہمیں کوئی اندازہ نہیں تھا کہ اُنھیں والدِ مرحوم کی رواداری کس حد تک ورثے میں ملی ہے۔"

"اور جنابِ من ہمیں تو یہاں تک بتایا گیا کہ آپ نے ہوٹل میں قیام کے کئی دن بعد نواب حشمت جنگ کے دفتر کا رُخ کیا تھا۔"

"ہم اُن کی طرف سے مطمئن ہوئے بغیر کس طرح اُن کے دروازے کا رُخ کر سکتے تھے، اور بھی بہت سی ناگفتنی مانع ہو سکتی ہے۔" اباجان کے لہجے میں تلخی نمایاں تھی، اکھڑی ہوئی آواز میں بولے۔ "مگر جناب! ان باتوں سے کیا حاصل۔ جنابِ والا کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"کچھ نہیں۔" مہاراجا نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔ "ہم نے تو سب کچھ اپنی فکر مندی کے اسباب کے طور پر عرض کیا ہے۔ اِس حالت

میں ہماری جانب سے یہ تردّد و تشویش غیر حقیقی نہیں تھی۔ ہم آپ سے کیا عرض کریں۔ اس کے سوا بھی جانے کتنی باتیں ہمارے علم میں آئی تھیں مگر اُن کی تفصیل فضول ہے؟"

"اور کیا؟" اباّجان سے ضبط نہیں ہوا۔ اُنھوں نے بھڑکتی آواز میں مہاراجا سے پُوچھا۔

"چھوڑیے بھی۔" مہاراجا نے بے نیازی سے کہا۔ "اصل میں ہم آپ کو بتائیں کہ ہماری توجّہ کا مرکز و محور نواب حشمت جنگ کو آپ کا دیا ہوا عطیہ ہی رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ دوسرے امور ذیلی ہیں۔ پتھروں سے شغل کرتے کرتے سر میں دُھوپ اُتر آئی ہے۔ اُن کے تعاقب میں ہمیں کیسے کیسے عجیب تجربوں سے دوچار ہونا پڑا ہے، یہ ہمی جانتے ہیں۔ داستانیں سُنانے پر آئیں تو برس بیت جائیں۔ اچھّی چیز کے لیے ہم نے کہاں کہاں دشت پیمائی نہیں کی۔ اب کچھ ایسا ہوگیا ہے کہ پتھر ہمیں اپنی طرف بُلاتے ہیں۔ وہ دیواروں کے پار ہوں تو ہماری رگ پھڑکنے لگتی ہے، لیکن یہاں آنے کا ارادہ ہم نے چھٹی حس کی خواہش ہی میں نہیں کیا ہے۔ مناسب تھا کہ ہم پہلے گرد و پیش کے مختلف زاویوں کا بھی تجزیہ کرلیں۔ تجزیے سے گویا شگون مل گیا۔ دیگر باتیں بعد کی ہیں۔ ہم آپ سے درخواست گزار ہیں۔ ہمارے اطمینانِ قلب کے لیے بتائیے کہ یہ ناقابلِ فراموش ہیرا آپ تک کس طرح منتقل ہوا؟ ہوسکے تو ہماری یہ وحشت دُور کردیجیے۔"

"بخدا ہمیں حیرت ہورہی ہے۔" اباّجان نے نسبتۃً پُرسکون آواز میں کہا۔ "آپ کا تجسّس دیکھ کے ہمیں کچھ کھونے کا احساس ہو رہا ہے۔ اُس ہیرے کی نُدرت و عظمت کا تھوڑا بہت اندازہ ہمیں بھی تھا لیکن اتنا نہیں جتنا آپ کے اشتیاق سے ہوا ہے۔ بے شک اس ضمن میں آپ کی نگاہ مستند ہے۔ ہم اس بارے میں اتنا کچھ جانتے تو ممکن ہے کوئی دوسرا فیصلہ کرتے اور اسے زیادہ مطلوب و مشتاق ہاتھوں کی نذر کرتے۔ یقین جانیے، ہم وہ ہیرا آپ کی خدمت میں پیش کردیتے مگر اب یہ ذکر ہی بے معنی ہے۔ دی ہوئی چیز کا ملال ہمارے مسلک میں نازیبا ہے جب کہ اس میں صدفی صد ہماری خوشی کو دخل تھا۔ نواب صاحب نے ہم پر کوئی جبر نہیں کیا تھا۔ رہی آپ کے تجزیے کی بات اور دیگر امور پر نگاہ کی تو ہمیں نہیں معلوم، ان سے آپ کی کیا مراد ہے۔ بہرحال آپ سے اتنا عرض ہے کہ باقی امور کا تعلق کسی طور بھی اس پیش کش سے نہیں ہے۔ بہتر ہوگا کہ ان پر توجّہ نہ دی جائے۔ بین السطور میں بھی آپ نے بہت کچھ فرمایا ہے۔ اِن سب کا ایک ہی جواب ہوسکتا تھا کہ ہم اپنی مرضی و منشا میں آزاد ہیں، مختارِ کُل ہیں لیکن ہر لمحے آپ کی ذاتِ گرامی پیشِ نظر رہی، اس کا احترام ملحوظ ہے۔ اسی لیے ہم خود کو بہت بے بس اور مجبور محسوس کرتے ہیں۔"

اباّجان کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔ پہلی مرتبہ اُن کے لہجے میں یہ قطعیت نظر آئی تھی۔ اتنی دیر میں جیسے اُنھوں نے کوئی فیصلہ کر لیا ہو، جیسے کسی نتیجے پر پہنچ گئے ہوں یا اُنھیں اب کوئی اور صورت نظر نہ آرہی ہو۔ یہ شکست خوردگی کی بھی علامت ہوسکتی تھی۔ دوادمی پہلے اُچکے تھے۔ اب مہاراجا آگیا تھا۔ ابھی تک کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ آدمی مہاراجا کے کارندے تھے یا کسی اور کے۔ بٹھل اور بیرو کی خاموشی اباّجان کے دوٹوک انداز کی تائید ہی ہوسکتی تھی۔ اب نتائج کچھ بھی برآمد ہوں۔ آدمی پہلو تہی ایک حد تک ہی کرسکتا ہے۔ اس اثنا میں ملازم نے چائے اور کھانے پینے کا سامان لاکے رکھ دیا تھا۔ مہاراجا نے چائے پر قناعت کی اور خاموش بیٹھا رہا۔ اباّجان نے اُس سے نرم لہجے میں کہا۔ "مہاراجا کے سکونِ قلب کی خاطر عرض ہے کہ ہمیں یہ ہیرا ورثے میں ملا تھا۔ والدِ گرامی کے پاس کہاں سے آیا تھا؟ اس کے متعلق ہم یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن اغلب ہے کہ اُنھیں اپنے آبا و اجداد سے ورثے میں ملا ہوگا۔ یہاں ریاست میں زندگی کے آخری دن گزارنے کا ارادہ ہے۔ والدِ گرامی کا ارشاد تھا کہ نواب صاحب حشمت جنگ کے خانوادے سے تجدیدِ مراسم کی صورت میں یہاں زندگی ہمارے لیے آسان ہوجائے گی۔ نئی جگہ گھر بنانے اور معزّزینِ شہر سے تعارف حاصل کرنے سے کئی عبوری مسائل آڑے نہیں آئیں گے۔"

اباّجان نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ وہ یہی کچھ کہہ سکتے تھے۔ مہاراجا کچھ پرسیدہ ہوگیا تھا اور توجّہ سے سُن رہا تھا۔ اباّجان نے اُس سے کہا۔ "آپ نے غور فرمایا؟ ہیرا نواب صاحب سے اپنی رفاقت کی نشانی کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ یہاں آنے کے بعد ہمیں ایک مضبوط و مستحکم اور اقبال مند گھرانے کا تحفّظ حاصل رہے۔ ہمارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے، ایک پتھر کیا حیثیت رکھتا ہے۔ پتھر تو پتھر ہی ہوتا ہے۔ ہمارے پاس نہ ہوا، ہمارے کسی مربّی، کسی عزیز کے پاس ہوا۔ آپ نے جن دیگر امور کی طرف اشارہ کیا ہے، اُن کے جواب میں یہ حویلی کافی ہے۔ ہم نے یہاں یہ حویلی خریدی ہے، اور ایک دن، دو دن کی بات نہیں۔ ہم یہاں مستقل سکونت کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہم یہاں موجود ہیں اور آپ بھی یہیں ہیں۔ بلاشبہ نواب صاحب قبلہ کے مانند ہمیں آپ کے سلوک کی بھی قدم قدم پر ضرورت پڑے گی۔ اس کے سوا۔" اباّجان تھکی ہوئی آواز میں بولے۔ "مزید ہم آپ سے اور کیا عرض کریں۔"

"ہم نے سُنا ہوا سب محفوظ کرلیا ہے۔" مہاراجا نے کسی قدر دشت زدہ لہجے میں کہا۔ پہلی بار اُس کے چہرے پر لکیریں اُبھری تھیں۔ "ہمارے لیے یہ بات اتنی اہم نہیں کہ آپ نے ایک دُور افتادہ شناسا کو ایک بیش قیمت پتھر سے نواز دیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ہم اُس سے کیوں محروم رہے اور اس سے زیادہ یہ کہ ہم اُس کے متعلق اتنا کچھ کیوں نہیں جان پارہے ہیں۔ اُس کا وجود ہیروں سے متعلق ہمارے علم کے لیے ایک آزمائش، ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارے لیے یہ ایک علمی اور تحقیقی مسئلہ ہے۔ ہم زندگی بھر پتھروں کے طالبِ علم رہے ہیں۔ ہم مجرا پتھروں کے لیے کسی پولیس والے یا کسی عدالت کا درجہ رکھتے ہیں۔ پتھروں سے دوستی کم ہی لوگوں کو راس آتی ہے لیکن ہمارا ان کا معاملہ اب دوستی کی حد سے گزر گیا ہے۔ یہ عشق کی منزل ہے۔ ہم نے ان کی نسلوں اور شاخوں کی درجہ بندی کی ہے۔ اُن کے باقاعدہ خاندان ہوتے ہیں، شجرے، تاریخ اور ان کے اپنے کردار ہوتے ہیں۔ یہ کچھ غلط نہیں کہ پتھروں میں سیاروں کی سی خصوصیات ہوتی ہیں۔ عجب نہیں کہ وہ سیاروں ہی کی زمینوں کی سوغات ہوں۔ ازراہِ کرم ہمیں تفصیل سے بتائیے کہ آپ اُس بے بہا پتھر کے بارے میں اور کیا کیا جانتے ہیں؟ ہماری علمی پیاس کے لیے، ہماری سیری کے لیے ذہن پر زور دے کر یاد کیجیے۔ شاید اسی طرح ہمیں کچھ قرار آجائے۔"

"ہمیں اس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم۔" اباّجان نے جھجکتے لہجے میں کہا۔ "والدِ مرحوم نے اسے سُپرد کرتے وقت ہدایت کی تھی کہ اگر تم اس کی مناسب حفاظت نہ کرسکو تو کسی صاحبِ نظر، کسی صاحبِ دل کو پیش کردینا اور کچھ یہ بھی یاد پڑتا ہے، اُنھوں نے ہمیں اس کی قیمت لینے سے منع کیا تھا۔"

"قیمت لینے سے منع کیا تھا؟" مہاراجا اُچھل کے بولا۔ دوسرے ہی لمحے وہ بُجھ کر رہ گیا۔ "اور کیا فرمایا تھا اُنھوں نے؟"

"اور کچھ نہیں۔" اباّجان نے بظاہر سادگی سے کہا۔ "مگر جنابِ والا! کیا آپ ہمیں نہیں بتائیں گے کہ آخر وہ پتھر کون سی خصوصیت سے ممیز و مشرّف تھا جو مہاراجا جیسے جوہر شناس اتنے بے چین ہیں۔ ہماری اطلاع کے مطابق ریاست کے بعض دوسرے نوابین بھی فکرمند ہوگئے ہیں۔"

"یہاں کوئی بھی اتنا نہیں جانتا۔ اُن کی بے چینی نمائشی ہے، حرص و ہوس، حسد کی ہے۔" مہاراجا تند لہجے میں بولا۔ "یہ صرف ہمیں معلوم ہے کہ آپ نے کیسا نادر پتھر نواب حشمت جنگ کو عطا کیا ہے۔ اُس کی اپنی ایک تاریخ ہے اور اگر ہمارا قیاس درست ہے تو اس کی ایک طویل اور شان دار تاریخ ہے۔"

"مناسب ہو تو کچھ ہمیں بھی بتائیے ہرچند کہ اب یہ غیر ضروری ہے۔" اباّجان نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

"کیا بتائیں۔" مہاراجا اضطراری انداز میں بولا۔ "ابھی ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ یہ صدیوں سے گم شدہ ایک پتھر ہے۔ صدیوں نے اس کی تلاش جاری ہے اور یہ صدیوں کی گردشوں کے بعد نمودار ہوا ہے۔ اشوکا کے زمانے سے بھی اس کا تعلق ہوسکتا ہے۔ آپ نے اُس کی ساخت پر غور نہیں کیا۔ اُس کا ایک حصّہ پچکا ہوا ہے جیسے کوئی بڑا پتھر دولخت کردیا گیا ہو یا کسی حادثے کے سبب ایسا ہوگیا ہو۔ پچکا ہوا حصّہ تراشا نہیں گیا ہے حالانکہ ایسا ہوسکتا تھا۔ اس کی آب و تاب بالکل تر و تازہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے امینوں کو اُس کی حفاظت کا پورا احساس تھا۔ ہمیں اُس کا دوسرا حصّہ بھی دیکھنے کا اعزاز حاصل ہوا ہے۔"

"دوسرا حصّہ!" اباّجان نے حیرت سے کہا۔ "وہ کہاں ہے؟"

"وہ برطانیہ میں ہے۔"

اباّجان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اُنھوں نے پھر کچھ نہیں پوچھا۔ گھُٹی ہوئی آواز میں بولے۔ "کاش ہم آپ کو کچھ اور بتا سکتے۔"

"بہرحال، ہماری درخواست ہے کہ اپنی یادیں کریدنے کی کوشش کیجیے۔ ہم نواب حشمت جنگ سے کہیں گے کہ وہ کم از کم ہمیں اُس کا نظارہ کرتے رہنے کی خاص اجازت عطا فرمادیں۔ ممکن ہے، اسی طرح ہم کوئی کڑی ڈھونڈنے میں کامیاب ہوجائیں۔"

"ہمیں یہاں سے کچھ عرصے کے لیے جانا ہے۔ کوشش کریں گے کہ اس کی بابت کوئی اور سراغ مل سکے۔ آپ سے یہ سب کچھ جان کے ہمیں بھی بے کلی سی ہوگئی ہے۔"

"یہ ایک نہایت عمدہ بات ہوگی۔" مہاراجا نے سرد آہ بھر کے کہا۔ "ورنہ ہم اپنے طور پر تو جستجو کرتے ہی رہیں گے۔ آپ کو دیگر امور والی بات ناگوار گزری تھی۔ ہمارا تجربہ ہے کہ اِدھر اُدھر کی اُنھی جزئیات اِنھی تانوں بانوں سے گوہرِ مقصود تک رسائی سہل ہوتی ہے۔ پتھروالوں کی مالک شخصیات کا بھی ہمیں خوب تجربہ ہے۔ بڑے نو بہ نو لوگ ہوتے ہیں اور متضاد رویّوں کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ایک صورتِ حال میں ہر ایک کا ردِّ عمل جُدا جُدا ہوتا ہے۔ ہمارا کام پہلے اُن کے رویّوں اور ردِّ عمل کا تعین ہوتا ہے پھر اسی نسبت سے ہم اپنا طرزِ عمل طے کرتے ہیں۔ ان میں ایک خصوصیت مشترک بھی ملتی ہے کہ وہ آسانی سے پردے نہیں ہٹاتے۔ بعض تو کسی کیمیاگر کی طرح دوسرے کی شرکت گناہ سمجھتے ہیں۔ سو ہمیں کبھی کبھی ایک شکاری کی طرح اُن کا تعاقب کرنا پڑتا ہے۔"

"ہمارے لیے آپ نے کون سا طرزِ عمل طے کیا ہے؟" اباّجان نے

ہنس کے کہا۔ اُن کی ہنسی سے مصنوعی پن صاف عیاں تھا۔

"ہم آپ سے سچ کہیں۔ آپ کی ہر دلیل ہمیں تسلیم ہے لیکن وہ جو ایک مصرع ہے پر طبیعت اِدھر نہیں آتی۔ ہمارا یقین ابھی تک متزلزل نہیں ہوا کہ ہم ایک غلط جگہ آ گئے ہیں لیکن یہ شاید ہماری ہی کوئی کوتاہی ہے کہ اپنا اعتماد قائم نہ کر سکے۔ ہمیں شبہ ہے کہ آپ ہم پر اعتبار نہیں کر رہے ہیں۔ ہم اپنے بارے میں صرف اتنا کہیں گے کہ ہمارا خون آمیزش سے پاک ہے، ہمیں اس کے خالص ہونے پر فخر ہے۔ جہاں تک سوداگری کی بات ہے، ہم ایک بہترین سوداگر بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ ہمارا سینہ بے شمار رازوں اور امانتوں کا امین ہے۔ اسے خودستائی پر محمول نہ کیجیے لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہم میں رفاقت کا حق ادا کرنے کی اعلا ترین صلاحیت ہے، اور جہاں تک آزمائش اور چیلنج کا تعلق ہے، ہم خندہ پیشانی سے ہمہ وقت اِس کے لیے تیار رہتے ہیں، چیلنج قبول کرنا ہمارا مشغلہ ہے۔ اپنے تمام اوصاف کے باوجود ہم بہر حال ایک انسان ہیں اور انسان کی کچھ حدود ہوتی ہیں۔"

ابا جان اُس کی صورت دیکھا کیے پھر جھرجھراتی آواز میں بولے "اِن کلمات کے جواب میں ہمارے پاس آپ کے لیے احترام اور عزت کا اظہار ہے۔ ہمیں اپنی رفاقت کے طلب گاروں ہی میں سمجھیے۔ اجازت ہو تو ہم آپ سے عرض کریں کہ ہم بہت بے وصف لوگ ہیں۔ آپ آئے تو صحیح جگہ ہیں مگر غلط تصور ہیں۔ آدمی بھی بہت اَن مول ہوتے ہیں۔"

مہاراجا چند لمحے بے سدھ سا بیٹھا رہا، پھر دفعتہً کرسی سے اُٹھ گیا۔

"کیوں، کیوں جنابِ والا! آپ اُٹھ کیوں گئے؟" ابا جان نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا "کیا ہماری زبان سے کوئی ناگوارِ خاطر؟.."

"نہیں، نہیں، آپ کا بے حد شکریہ، آپ نے اتنا وقت دیا۔ ہم کھانے اور آرام کے وقت حارج ہوئے تھے۔" مہاراجا سنجیدگی سے بولا "آپ سے دوبارہ مل کے خوشی ہوئی۔ امید ہے جلد ہی پھر ملاقات ہوگی۔"

"ہم حاضر ہوں گے۔" ابا جان نے بے تابی سے کہا۔

"کب تک یہاں سے جانے کا ارادہ ہے؟"

"ابھی کچھ طے نہیں ہے لیکن جلد ہی۔" ابا جان نے ہچکچاہٹ سے کہا۔

"ابھی شاید دیر لگے۔" بٹھل نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔ مہاراجا نے گھوم کے اُس کی طرف غور سے دیکھا اور مسکرا کے رہ گیا۔

"واپسی ہیں۔ آپ ہمیں مہمانی کے لیے کچھ وقت دیں گے۔" دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے وہ بولا۔

"ضرور، ضرور، یہ تو ہمارے لیے عزت ہے۔" ابا جان نے کہا۔

مہاراجا کمرے سے نکل کے چبوترے پر آ گیا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا سامنے کھڑی ہوئی موٹر میں بیٹھ گیا۔

کانتے اور مارٹی کمرے کے باہر ہی منڈلاتے رہے۔ وہ مہاراجا کے جاتے ہی لپکتے ہوئے ہمارے پاس آ گئے۔ کانتے بہت بے قرار نظر آ رہا تھا۔ اُس سے ایک لمحے بھی چپ نہ رہا گیا، آتے ہی بٹھل سے پوچھنے لگا "سب ٹھیک تو ہے اُستاد؟"

"ہاں رے!" بٹھل نے جھڑکتے لہجے میں جواب دیا۔

"کون تھا یہ؟"

"کوئی بے تاج کا تھا۔"

کانتے ہنسنے لگا۔ بٹھل نے اُسے گھور کے دیکھا تو اُس کا سارا جسم بَل کھا گیا۔ اچھا ہوا، کانتے اُس وقت بٹھل کے سامنے سے ہٹ گیا۔ اسی دوران پیرو بٹھل کی کمر پہ ہاتھ رکھ کے آگے بڑھ گیا۔

میرا خیال تھا، کمرے میں واپس آ کے ابا جان پیرو سے ضرور پوچھیں گے کہ اب اُس کی کیا رائے ہے لیکن وہ کرسی پر سر جھکائے بیٹھے رہے۔ اُنھوں نے کسی سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ ممکن ہے مہاراجا کی باتیں سن کے اب اُنھیں ملال ہو رہا ہو کہ اُنھوں نے نواب حشمت جنگ کو ہیرا پیش کرنے میں ایسی عجلت کیوں کی۔ اُن کے پاس تھیلی میں اور بھی ہیرے تھے۔ ہو سکتا ہے، سوچ رہے ہوں کہ اُنھوں نے کوئی دوسرا، دوسرا کم تر درجے کا پتھر کیوں نہ منتخب کر لیا۔ مارٹی اور کانتے بھی ہمارے پیچھے پیچھے اندر آ گئے تھے۔ تھوڑی دیر میں شامو اور جبرو بھی چپکے سے آ کے بیٹھ گئے۔ اُن کے اضافے کے باوجود کمرے پر چھائے ہوئے سناٹے میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ بہت دیر بعد پیرو کی آواز نے یہ خاموشی توڑی۔ جو سوال ابا جان کو پیرو سے کرنا چاہیے تھا، وہ پیرو نے بٹھل سے کیا "ابھی کیا بولتا ہے بٹھل بھائی؟"

"کیا بولیں دادا!" بٹھل نے حقے کا کش لیتے ہوئے کہا۔

"ابھی ٹھیک سے گیا ہے نا وہ راجا کا جنا!"

"دکھائی تو ایسا ہی پڑتا تھا دادا!"

"ماں قسم، اپن تم کو دیکھ کے رہ جاتا تھا!" پیرو مچل کے بولا۔ "لگتا ہے، اید کچھ دن اور رہ گیا تو سب بھول جائے گا۔ یہ زبان، ہاتھ پیر ابھی سب اکڑ کے رہ جائے گا بٹھل بھائی! اپن ادھر ٹوٹ کے آدھا بھی نئیں رہے گا!"

"اپنا بھی کچھ یہی ہے دادا!"

"اُستاد!" کانتے دبی دبی آواز سے بیچ میں بولا "ابھی تم کو ایک بات بولنا تھی!"

"لگتا ہے کمر تیری پھر مچیا گئی ہے۔"

"قسم سے اُستاد منہ کی بات چھین لی۔ کمر کیدر سے سیدھی ہوگی۔ بھتا ملے دن بھی کتے ہو گئے۔" کانتے تیز لہجے میں بولا "بعد کو جو من میں آئے کر لینا، پر پہلے اپنی بات ذرا دھیان سے سن لو۔"

"کیا ہے دادا؟" پیرو نے نرمی سے پوچھا۔

"دادا!" کانتے نے لپکتی آواز میں کہا "ابھی ہم لوگ باہر تھوڑی ہوا کھانے کو نکلے تھے، اُدھر اپنے کو شبہ ہے کہ آدمی لگے ہوئے ہیں۔"

بٹھل کی تند نظریں اُس پہ مرکوز ہو گئیں "کیا بولتا ہے؟"

"ہاں اُستاد!" کانتے نگاہیں چرا کے بولا "مارٹی سے پوچھو، اِدھر یہ کئی دن سے اُن کو چکر کھاتے دیکھ رہا ہے۔"

ابا جان بھی چونک پڑے "کیا کہہ رہے ہو کانتے؟"

"ہاں بابا! اپنے کو ایک نہیں، اِدھر کئی آدمی پر شبہ ہے۔"

"تم نے اپن کو پہلے کیوں نئیں بولا ماسٹر؟" پیرو نے پھنکارتے لہجے میں مارٹی سے پوچھا۔

"اپن بولنے ہی کو تھا۔" مارٹی نے سراسیمگی سے کہا "اپن سوچا، ابھی تم تھوڑا ایسٹ ہو جاؤ۔ ایک دم سب تھکا ہوا لگتا تھا۔"

"ماسٹر! تم ایک دم اُلو کا پٹھا ہے۔" پیرو کو ابا جان کا بھی خیال نہ رہا۔ وہ مارٹی کو گالیاں دینے لگا۔

"ذرا صبر سے۔" ابا جان نے دھڑکتی آواز میں کہا اور مارٹی سے پوچھا کہ اُسے کیسے شبہ ہوا؟ کتنے آدمی ہیں؟ کب سے وہ اُنھیں دیکھ رہا ہے؟ مارٹی نے جھجکتی زبان میں اُنھیں بتایا کہ وہ کوئی چار روز سے اُنھیں دیکھ رہا ہے۔ ابھی وہ ٹھیک طرح تین آدمیوں کی نشان دہی کر پایا ہے۔ اُن کی ڈیوٹیاں بدلتی رہتی ہیں۔ ایک تو دن بھر نکڑ پہ واقع پان اور پرچون کی واحد دُکان کے اِردگرد ٹہلتا رہتا ہے۔ اُس نے بتایا کہ اُنھوں نے چوں کہ کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی اس لیے وہ بھی چپ رہا۔ اُسے ہم لوگوں کی واپسی کا انتظار تھا۔

مارٹی کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ پیرو اُٹھ گیا "اپن کے ساتھ چل ماسٹر! اپن بھی اُس کو دیکھنا مانگتا ہے۔"

بٹھل بھی اُٹھ گیا۔ ابا جان بھی ہمارے ساتھ باہر آنا چاہتے تھے لیکن پیرو نے اُنھیں روک دیا۔ مارٹی اور شامو بھی اُن کی وجہ سے ٹھیر گئے۔ صرف میں، بٹھل پیرو اور کانتے باہر نکلے۔

رات کے گیارہ بجے ہوں گے۔ دوسری حویلیوں کی روش کے مطابق اُونچے فیل قامت دروازے کے ایک پٹ میں کھڑکی دروازہ بھی بنا ہوا تھا — چوکی دار نے وہی کھول دیا۔ باہر نکلتے ہی کانتے نے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔ ہم نے بھی دیکھ لیا تھا کہ سڑک کے اُس پار سامنے والی حویلی کے میدان میں ایک ٹھیلے والا موجود ہے۔ آگے بڑھنے کے بجائے ہم اردگرد کا جائزہ لینے کے لیے کچھ دیر تک وہیں کھڑے رہے۔ حویلی سے آگے گزرنے والی سڑک دروازے سے کچھ فاصلے پر تھی۔ یہ سڑک دونوں اطراف سے کھلے ہوئے ایک میدان کے بیچ سے گزرتی تھی۔ میدان میں کہیں کہیں درخت اور جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں اور ہر جانب خاموشی طاری تھی۔ آگے نکڑ پر پان اور پرچون کی دُکان بھی بند ہو گئی تھی۔ یہ سارا علاقہ بڑے بڑے مکانات، کوٹھیوں اور حویلیوں پر مشتمل تھا۔ رات کو ویسے بھی یہاں سکوت چھا جاتا ہو گا۔ سڑک پر نصب کھمبوں کی قطار کے علاوہ مکانات کے جلتے قمقموں نے یہاں سے وہاں تک سڑک روشن کر رکھی تھی لیکن درختوں کی وجہ سے سڑک پر روشنی دھبوں کی شکل میں پڑ رہی تھی۔

اتنی رات کو اس جگہ ٹھیلے والے کی موجودگی بے سبب نہیں ہو سکتی تھی۔ اس پر کاربوریٹ کا مشعل نما چراغ روشن تھا اور مونگ پھلی کا ڈھیر، گزک ریوڑیاں وغیرہ دور سے صاف نظر آ رہی تھیں۔ دو آدمی ٹھیلے والے کے پاس کھڑے تھے، اُن کا رُخ ہماری طرف نہیں تھا۔ پھر ٹھیلے والے ہی نے اشارہ کیا ہو گا، جبھی وہ دونوں تیزی سے پلٹ پڑے، عین اُسی لمحے ٹھیلے والے نے ہانک لگائی۔ اِدھر سے سائکل کی گھنٹی کی آواز آئی۔ ٹھیلے پر کھڑے ہوئے آدمیوں میں سے ایک آگے بڑھ گیا اور سائکل سوار ہماری جانب سرسری انداز میں دیکھتا ہوا ٹھیلے والے کے پاس جا کے ٹھیر گیا۔ پیرو کی ہدایت کے مطابق میں اور کانتے دائیں طرف نکڑ کے راستے پر چل دیے تھے۔ وہ اور بٹھل ہماری مخالف سمت نکل گئے۔ کچھ دُور جانے کے بعد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ کانتے ٹھیک کہہ رہا تھا، سڑک پر سائکلوں کی گھنٹیوں کی آواز بڑھ گئی تھی اور ٹھیلے والے کی ہانکیں بھی۔ نکڑ تک ہمارے پہنچتے پہنچتے دو سائکل سوار اِدھر سے اُدھر تیزی سے گزر گئے تھے۔ رات میں ان کی پہچان مشکل تھی۔ سردی بس خنکی کی حد تک تھی لیکن ایک سائکل سوار نے جسم پر چادر لپیٹ رکھی تھی، دوسرا اُوور کوٹ جیسے کسی لباس میں ملبوس تھا۔ نکڑ اصل میں ایک چوراہا تھا۔ اس کے بائیں طرف کی سڑک پر کچھ آگے جا کے ایک چھوٹا سا بازار تھا۔ وہاں ہوٹل، مٹھائی اور پان کی دکانیں شاید کھلی ہوئی تھیں، اب تک تیز روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ ہم اُس طرف نہیں گئے بلکہ نکڑ سے دائیں طرف اپنی حویلی کی چار دیواری کی طرف مڑ گئے۔ ہماری حویلی کی چار دیواری اور پڑوس کی دوسری حویلی کی چار دیواری کے درمیان ایک کشادہ اور غیر آباد گلی تھی، جہاں بے تحاشا جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں اور اندھیرا غالب تھا۔ اُس جگہ آسانی سے کئی آدمی چھپ سکتے تھے لیکن ہم اُدھر اُن کی تلاش میں نہیں گئے کیونکہ وہاں اُن کے چھپنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اتنی دیر میں تین

تانگے، دو موٹریں، ایک سائکل رکشا، کئی سائکل سوار اور چند پیدل آدمی ہمیں سڑک پر گزرتے ہوئے نظر آئے تھے۔ اُن میں سے ہر ایک پر شبہ کیا جاسکتا تھا۔ حویلی کے خاص دروازے کے سامنے والی سڑک نکڑ کے دونوں جانب دُور تک چلی گئی تھی۔ اِدھر اُدھر دوسری بستیوں تک جانے کے لیے بھی ایک عام راستہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں ابھی تک آمد و رفت جاری تھی۔ ہم بھی اُس سڑک سے گزرتے ہوئے بڑے نواب کی حویلی سے واپس آئے تھے۔

جہاں ہماری حویلی کی چار دیواری ختم ہوتی تھی، وہاں سے چند گز آگے جا کے کانتے لوٹ گیا اور مجھ سے سرگوشی میں پوچھنے لگا "دیکھا لاڈلے؟"

"دیکھ رہا ہوں" میں نے آہستگی سے جواب دیا۔

"تو کیا سمجھتا ہے، اِن لوگ کا کیا مطلب ہے؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں"

"کوئی تو مطلب ہوگا لاڈلے!"

"ابھی تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ حویلی آنے جانے والوں پر اور ہماری نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ اُن کا کوئی اور مقصد ہوتا تو وہ راستے میں روکنے ٹوکنے کی ضرور کوشش کرتے"

کانتے مجھ سے ایسے پوچھ رہا تھا جیسے ساری باتوں کے جواب مجھے معلوم ہوں۔ ہم دوبارہ نکڑ پر آگئے۔ ہم دونوں ہر طرح چوکنّا تھے۔ چلتے وقت مارٹی نے چپکے سے چاقو میرے حوالے کر دیا تھا اور میں نے واسکٹ کی اندرونی جیب میں ڈال لیا تھا۔ نکڑ سے واپسی کے راستے میں کانتے نے مجھ سے پوچھا کہ اگر میری مرضی ہو تو وہ کسی کو روک کے دیکھے۔ میری کچھ عقل میں نہیں آرہا تھا۔ اتنے میں ایک سائکل سوار سگریٹ پھونکتا ہمارے قریب سے گزرا۔ میں کانتے سے کہنے والا تھا کہ کسی کو روکنے ٹوکنے سے پہلے بہتر ہے، پیرو اور بُھل سے مشورہ کر لیا جائے۔ مگر کانتے نے سائکل سوار کو آواز دے دی۔ آواز سُننے کے باوجود وہ فوراً نہیں رُکا۔ اِس کا فیصلہ اُس نے کچھ دُور جا کے کیا، سائکل ٹھیرا کے اُس نے ہماری طرف دیکھا اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولا "کیا بات ہے؟"

کانتے نے اُس سے جلتا ہوا سگریٹ مانگا اور اپنی جیب سے بیڑی کا بنڈل نکال لیا۔ سائکل سوار نے سگریٹ کے بجائے جیبیں ٹٹول کے ماچس کانتے کے آگے کر دی۔ میں نے اچھی طرح اُس کا چہرہ دیکھ لیا تھا۔ اُس کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان ہوگی۔ رنگت سیاہ تھی اور آنکھیں گہری گہری۔ نہ وہ اڈّے کا آدمی معلوم ہوتا تھا، نہ پولیس سے اُس کا تعلق ہو سکتا تھا۔ ماچس دیتے ہوئے بھی اُس کے انداز میں گھبراہٹ تھی۔ کانتے نے ایک تیلی جلا کے دانستہ بجھا دی تھی۔ دوسری تیلی سے بھی اُس نے یہی سلوک کیا اور منہ بناتے ہوئے کہنے لگا "سردی پڑنے لگی ہے" سائکل سوار چُپ رہا۔ کانتے نے تیسری تیلی جلا کے بیڑی سُلگائی اور اُس کا شکریہ ادا کیے بغیر ماچس واپس کر دی "اِدھر قریب کوئی پان بیڑی کی دکان ہوگی اُستاد؟" کانتے نے اُس سے پوچھا۔ سائکل سوار نے چند لمحوں کی جھجک کے بعد جواب دیا کہ کچھ فاصلے پر ہوٹل کے برابر والی دکان کُھلی ہے۔

"آپ کیا داڑھی لگا کے آرہے ہو؟"

سائکل سوار کانتے کے غیر متوقع سوال پر ہکلا کر بولا "ہاں، ہاں" پھر فوراً اُس نے ترمیم کی اور خالص حیدر آبادی لہجے میں بولا "نئیں بادا! اپن ایسے ہی اپنے کاماں کو جاتے ہیں"

مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں کانتے کے من میں کچھ اور نہ سما جائے اور وہ اُس پر ہاتھ نہ چھوڑ بیٹھے "کوئی ضروری ہی کام دکھائی پڑتا ہے" کانتے طنزیہ انداز میں اُس سے بولا "جو ایسے سمے باہر نکلے ہو راجا!"

روشنی اتنی زیادہ نہیں تھی لیکن اُس کے چہرے کے نقش و نگار آسانی سے دیکھے جاسکتے تھے۔ کوئی اور ہوتا تو کانتے کے اس اندازِ بیان پر اُس سے اُلجھ پڑتا۔ اُس شخص کی آنکھوں سے بے چینی ہویدا ہونے لگی تھی جیسے وہ رسّی تڑا کے بھاگ جانے کی فکر میں ہو۔ کانتے نے ایک لحظے کے لیے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا، وہ میرے اشارے کا منتظر تھا۔ میں نے آنکھوں آنکھوں میں اُسے منع کرنا چاہا۔ کانتے کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اُس کے گریبان پر ہاتھ ڈال کے اُسے سائکل سے نیچے کھینچ لے "کوئی ایسی ویسی بات ہو تو ایمان سے اپنے کو بولو" کانتے آنکھ مار کے بولا۔

"آپ کیا، کیا بول رہے ہو حضت" اُس شخص نے عاجزی سے کہا۔

"سچّی بولیں، اپنے کو کچھ کالا لگ رہا ہے پہلوان!"

"کیسا کالا حضت!"

اُس شخص نے بڑبڑاتے ہوئے پیڈل پر پاؤں مار کے بھاگنا چاہا لیکن کانتے نے پہلے ہی سائکل کا مڈگارڈ تھام رکھا تھا۔ سائکل لہرا کے رہ گئی "ایسی جلدی بھی کیا ہے"

"ہم کو جانا ہے حضت" وہ احتجاج کرتے ہوئے بولا۔

"کس کو اِدھر رُکنا ہے" کانتے نے ڈھٹائی سے کہا۔

"ہم کو معاف کرو صاحب!" سائکل سوار نے منّت کی۔

"کاہے کی معافی؟"

"ہم کو دیر ہو رہی ہے"

"کدھر جانے کا ہے؟"

"ہم بولے حضت، ہم کو کام ہے"

"یہی تو پوچھ رہے ہیں اُستاد، کوئی مال وال کا چکّر ہے یا کچھ اور؟"

"نئیں حضت" وہ بری طرح سٹ پٹا گیا "آپ کیا سمجھ رہے ہو؟"

"پھر کوئی پری چھم رہتی ہے اِدھر کیا؟"

"آپ کیسا بولتے ہو حضت" وہ بدحواسی سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا جیسے کسی طرف سے اُسے مدد کی توقع ہو۔

"کدھر رہتا ہے تم؟"

"اِدھر، ہم یہیں قریب رہتے ہیں"

"قریب کدھر؟"

"اُس طرف پیچھے گلی میں"

"پھر اِدھر تمھاری ماں کے یار رہتے ہیں کیا؟" کانتے نے جان بوجھ کے یہ کہا تھا۔ سائکل سوار کی آنکھوں میں چنگاریاں سی بھڑک اٹھی تھیں لیکن دوسرے ہی لمحے بجھ گئیں "کیوں، بولتی کیوں بند ہوگئی؟ ایسا ہی ہے کیا؟"

"آپ کو ضرور کوئی دھوکا ہوگیا ہے حضت:"

"پھر تم اپنے کو دیکھ کے اتنا کیوں اُٹام ہوگیا ہے؟"

"نئیں بادا صاحب! اپنی کوئی غلطی دیکھی ہے آپ نے! ہم سیدھے سادے آدمی ہیں، غریب آدمی ہیں" وہ گھگھیا کے بولا۔ اُس سے صحیح طرح بات بھی نہیں ہو رہی تھی۔

"وہ تو ہم بھی دیکھ رہے ہیں۔ تم کتنا نیچے اُوپر ہے۔ دھوکا تم کو ہو رہا ہے سوّر کی اولاد!" میں نے کانتے کا ہاتھ دبا کے اُسے روکا۔ کانتے بہکتا جا رہا تھا۔ ہمیں اپنی جانب سے کوئی پیش قدمی نہیں کرنی چاہیے تھی حالانکہ کانتے کی طرح میرا بھی جی یہی چاہتا تھا کہ اُسے سائکل سے نیچے گھسیٹ لوں۔ کانتے نے جھٹکا دے کے سائکل کا مڈگارڈ چھوڑ دیا "تم اپنے کو تھوڑا قسمت کا تیز لگتا ہے پر اپنے کو دوبارہ ادھر دکھائی دیا تو زبان سے بات نہیں کریں گے۔ جتنا تم زمین سے اُوپر ہے نا، اتنا ہی نیچے ہو جائے گا"

اُس نے کانتے سے کچھ نہیں کہا۔ پیڈل پر پاؤں مارا اور آناً فاناً ہماری نظروں سے دُور ہونے لگا۔ اُدھر سامنے سے ایک پیدل شخص بھی تیزی سے اُس کی طرف آرہا تھا۔ دونوں کا آمنا سامنا ہوا لیکن پیدل شخص کے ٹھیر جانے اور آواز دینے کے باوجود سائکل سوار کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ گھنٹی بجاتا اُس کے پاس سے گزر گیا۔ اس موقع پر گھنٹی کوئی اشارہ ہی ہو سکتی تھی۔ کانتے مجھ سے رائے پوچھنے لگا۔ میرا دماغ خود کام نہیں کر رہا تھا، میں اُس سے کیا کہتا۔ بہرحال اب اس میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ کانتے نے ٹھیک آدمی پر ہاتھ ڈالا تھا۔ اُسے دیکھ کے یہ نتیجہ اخذ کرنا بھی دشوار نہیں تھا کہ اُس کے دوسرے ساتھی بھی اُسی جیسے ہوں گے اور اُن کی حیثیت تعمیل کرنے والوں کی ہے، حکم دینے والے دوسرے ہیں۔ حکم دینے والوں نے سرِدست انھیں صرف حویلی کی نگرانی کے لیے کہا ہے۔ مگر اس نگرانی سے حاصل کیا ہے؟ اس طرح وہ کون سا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ میں یہ مقصد اپنے ذہن میں جتنا واضح کرنے کی کوشش کرتا تھا وہ اتنا ہی دُھندلا جاتا تھا۔ اس سے تو بہتر تھا کہ ہم بڑے نواب کی حویلی میں ٹھیرے رہتے اور وہیں سے اپنے سفر پر روانہ ہو جاتے۔ ہماری نقل و حرکت اور حویلی میں ہمارے پاس آنے جانے والوں کو نظر میں رکھنے کے لیے یہ چند لوگ تعینات کیے گئے ہیں تو آگے جلد از جلد اطلاع پہنچانے کا بھی معقول انتظام کیا گیا ہوگا اور حویلی تک ہی کیوں، وہ حویلی کے باہر بھی ہمارے تعاقب کا ارادہ رکھتے ہوں گے۔ لازماً پھر اُن کی تعداد بھی زیادہ ہونی چاہیے۔ اطلاع پہنچانے اور تعاقب کرنے کے لیے اُن کے پاس تیز رفتار سواریوں کا بھی انتظام ہونا چاہیے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ قریب ہی کسی مکان سے اُن کا رابطہ ہو جہاں سے دوسرا حکم فوراً جاری کیا جاسکے۔ یہاں سب بڑے بڑے مکانات ہیں۔ بعض گھروں میں ٹیلی فون بھی ہوں گے۔ سائکلیں تو ان کے پاس موجود ہی ہیں۔ حویلی سے ہمارے پیدل نکلنے کی صورت میں انھیں سائکل کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ میرے سر میں طرح طرح کے اندیشے بِھن بِھنا رہے تھے۔

پیدل شخص بھی ہمارے قریب آگیا تھا۔ کانتے کے ہاتھوں میں سختی آگئی۔ میرا ہاتھ دبا کے سرگوشی میں بولا "کیا بولتا ہے لاڈلے! ابھی اس کو بھی دیکھیں، کتّے دانت کا ہے؟"

وہ شخص چلتے چلتے دوسری جانب ہمارے مقابل سڑک کے کنارے ہو گیا تھا۔ قد کا لمبا، چادر کندھے پر ڈالے ہوئے۔ چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ کانتے کی بازپرس کے بعد سائکل سوار کا حویلی کے گرد دوبارہ دکھائی دینے کا امکان نہیں رہا تھا۔ اس دوسرے شخص کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جاسکتا تھا۔ میرا بھی یہی جی چاہ رہا تھا لیکن میں نے کانتے کو روک دیا۔ یوں ہم بہ آسانی اُن سے اُن کے آقا کا نام معلوم کر سکتے تھے۔ آسانی سے نہیں تو ایک کوشش ضرور کی جاسکتی تھی۔ میرے پاس بھی چاقو تھا، کانتے کے پاس بھی ہوگا اور اس کی نوبت بھی شاید نہ آتی۔ کانتے میرے انکار پر جز بز ہونے لگا۔ بُھل اور پیرو بھی یہی کچھ جاننے کے لیے باہر نکلے تھے، اُن کی منشا کے بغیر ہمیں خود کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ آس پاس کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔ ہم واپس حویلی کی طرف بڑھتے رہے۔ اسی اثنا میں پیدل شخص آگے نکل گیا۔ ہم نے مڑ کے دو ایک بار اُسے دیکھا بھی۔ وہ سیدھا ہی چلتا رہا مگر نکڑ پر جا کے اُس نے پلٹ کے ہماری جانب ایک اُچٹتی نگاہ ڈالنا ضروری سمجھا اور بازار جانے والے راستے کی طرف مڑ گیا "لاڈلے!" کانتے بے قراری سے بولا "ادھر اپنے ہاتھوں میں بہت کھُجلی ہو رہی ہے اپنے کو اُن کی گنتی زیادہ نہیں لگتی"

"ذرا صبر کرو، بُھل بھائی کو واپس آنے دو"

"ماں قسم اِدھر جگر کی کمتائی نہیں ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"ٹھکانے لگانے کے لیے ابھی رات بھی پوری پڑی ہے۔" کلنتے سرد آواز میں بولا۔

"تمہارا مطلب ہے، تمہارا مطلب ہے کہ؟"

"ہاں لاڈلے! جھٹکا۔" کلنتے کی آواز جل رہی تھی۔ "جس گیدڑ کی اولاد نے ان کو اِدھر بھیجا ہے، سالا زندگی بھر کتّے کی طرح گھور گھورسے سونگھتا پھرے گا۔"

"تم اپنے ہوش میں تو ہو؟"

"کیوں لاڈلے! تیری سمجھ میں نہیں آرہا؟"

"آرہا ہے لیکن کلنتے! کلنتے بھائی ــــــ معلوم ہوتا ہے، تم اپنے اوسان میں نہیں ہو۔ تم واقعی بہت تھک گئے ہو۔"

"شاید تو ٹھیک ہی بولتا ہے پر لاڈلے! اپنے کو آگے اچھا دکھائی نہیں دے رہا۔"

"میں تم سے خود بھی کہنے والا تھا مگر کلنتے بھائی! ابھی کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ پہلے ہمیں کسی نتیجے پر پہنچنا ضروری ہے۔"

"کیا تو سمجھتا ہے، ان کو اِدھر اپنے سُسرالیوں نے رکھوالی کے لیے بھیجا ہے؟ ہاتھ لگنے پر یہ اپنے کو چھوڑ دیں گے؟ قسم سے رتّی بھر بھی دیری نہیں کریں گے۔ اس سے پہلے ہی ان کو کچھ بول دینا ٹھیک ہوگا۔"

"تم اتنا آگے کیوں سوچ رہے ہو؟"

کلنتے اپنے ہونٹ کاٹنے لگا اور بکھری ہوئی آواز میں بولا۔ "میں تجھ کو کیا بولوں۔ اپنے کو لگ رہا ہے، دیر ہوجانے سے سالا بہت اُلٹ بھی ہوسکتا ہے۔"

ہم حویلی کے صدر دروازے سے ابھی دُور تھے کہ سامنے سے بٹّھل اور پیرو آتے دکھائی دیے۔ ٹھیلے والا اپنی جگہ سے چند قدم آگے چلا گیا تھا۔ اب اُس کے پاس کوئی خریدار نہیں تھا۔ بٹّھل اور پیرو کے نزدیک آجانے پر وہ رُک گیا اور ہانک لگانے لگا لیکن اُس کی آواز میں جھرجھراہٹ آگئی تھی۔ بٹّھل اور پیرو نے اُس سے گزک اور ریوڑیاں طلب کی ہوں گی، اُس نے ترازو اُٹھالی تھی۔ ہم دُور سے اس کے ہاتھوں کا اضطراب دیکھ سکتے تھے۔ جتنی دیر میں اُس نے سوکھے پتّوں کے دَونے میں گزک اور ریوڑیاں تولیں۔ ہم دونوں بھی وہاں پہنچ گئے۔ ہمیں دیکھ کے اُس کے ہاتھوں پیروں کا ہیجان دوچند ہوگیا تھا۔ اردگرد نزدیک دُور بظاہر کوئی نظر نہیں آرہا تھا، تو پھر پھونک مار کے دوسرے ہی لمحے اُس سے نمٹا جاسکتا تھا اور نہ بُجھانے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ اُلجھنے کے لیے ارادہ ہی کافی تھا لیکن پیرو اور بٹّھل ٹھیلے پر کھڑے اُس کی صورت دیکھ رہے۔ سیاہی مائل، تنومند جسم، تلوار کی طرح چھوٹی چھوٹی مونچھیں ... صاف، دھوتی پر بوسیدہ کوٹ پہنے ہوئے، ٹھیلے والا نگاہیں اوپر نہ اُٹھا رہا تھا۔ دونا پیرو کے حوالے کرتے وقت بھی اُس کی آنکھیں جھکی ... ہم بھی وہاں جاکے خاموش کھڑے ہوگئے۔ بٹّھل اور پیرو سے نمٹ ... اُسے ہماری طرف متوجہ ہونا چاہیے تھا لیکن اُس نے ہمیں پیرو اور بٹّھل ساتھی ہی سمجھا تھا۔ جب کریں نے اور کلنتے نے وہاں پہنچ کے ... سے کسی قسم کی وابستگی ظاہر نہیں کی تھی، نہ بٹّھل اور پیرو نے ہمیں دیکھ ... ہم سے اپنے کسی ربط و تعلق کا اظہار کیا تھا۔ گویا ٹھیلے والے کی نظریں ... ہی پر ٹکی رہی تھیں۔ اُس نے ہمیں سامنے حویلی کے صدر دروازے سے نک... کے جُدا ہوتے اور مخالف سمتوں میں جاتے ہوئے اچھی طرح دیکھا تھا ... بدحواسی میں اُسے اس احتیاط کا خیال نہیں رہا کہ اُسے اپنی جانب سے ... ہم دونوں کو الگ الگ سمجھنے ہی کا تاثر دینا چاہیے تھا۔ دونا لے کے ... نے آنکھ دبائی اور رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "اپن کو ابھی نوا نوا دکھائی ... ہے سیٹھ!"

اُس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ دانت نکال کے جلدی جلدی ... ہلانے لگا۔ "ابھی رات کو کب تک یہ میلا لگتا ہے مائی باپ!" پیرو نے ... ہنستے ہوئے اُس سے پوچھا۔

اُس کی زبان سے بہ مشکل تمام ادا ہوسکا کہ بس بس، تھوڑی دیر تک ... اور۔" پیرو کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ بٹّھل کی طرف دیکھ کے ٹھہر گیا۔ چند لمحے وہ اُس کے سامنے کھڑے ریوڑیاں ٹونگتے اُسے گھورتے رہے۔ انھوں نے پیسے بھی ادا نہیں کیے تھے، نہ ٹھیلے والے نے اُن سے طلب کیے۔ ہم اُن میں سے ایک ایک کو چُن کے کم از کم اتنا ضرور کرسکتے تھے کہ دو... دوبارہ اس طرف کبھی نظر نہ آئیں۔ اس طرح اُن میں سے کسی ایک کی زبا... ہمیں اُن کے بھیجنے والے کی نشان دہی بھی ہوسکتی تھی۔ ابتدا اُسی ٹھیلے والے سے ہونی چاہیے تھی مگر ابھی سے اُس کا یہ حال تھا تو چاقو کی ایک جھلک دیکھ کے کیا ہوتا۔ میں اور کلنتے دونوں مستعد تھے لیکن بٹّھل نے ایسا کوئی اشارہ ہی نہیں کیا کہ ہم آگے بڑھ کے اُس کی گردن دبوچ سکتے۔ اسی دوران سڑک پر گزرتی موٹر کی تیز روشنی میں ہم چاروں نہا گئے، پھر ایک تانگا گزرا۔ بٹّھل وہاں سے ہٹ گیا اور درمیانی فاصلہ عبور کر کے صدر دروازے کے پاس آگیا۔ دربان باہر ہی کھڑا تھا۔ ہم دوبارہ حویلی میں داخل ہوگئے۔

ابا جان دالان میں ہمارے منتظر تھے۔ بٹّھل اُن کے شانے پر ہاتھ رکھ کے اندر لے آیا۔ ابا جان نے ہم سے کچھ پوچھا نہیں تھا۔ کمرے میں آ کے بھی وہ خاموش رہے لیکن وہ سراپا سوال بنے ہوئے تھے۔ بٹّھل نے کرسی پر بیٹھ کے حُقّے کے تین چار لمبے لمبے کش لیے اور بھاری آواز میں بولا۔ "بابا! اپنی بات ذرا ٹھنڈے دل سے سنو۔ آپ جلد سے جلد اِدھر سے نکل جاؤ۔"

"جی!" ابا جان نے حیرت سے کہا۔ "آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"ہم ٹھیک ہی بول رہے ہیں۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"مطلب صاف ہے بابا! اپنی سمجھ میں ابھی ایک یہی بات آتی ہے۔" بٹّھل نے سکون سے کہا۔

"اور آپ، آپ؟ ــــــ" ابا جان بے چینی سے بولے۔

"ہم لوگ ابھی اِدھر ہی ٹھہریں گے۔ اپنی بات سمجھنے کی کوشش کرو بابا!" بٹّھل نے آہستگی سے کہا۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔" ابا جان کے لہجے میں ترشی آگئی تھی۔

"اِدھر وہ حویلی کے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں پر ہم باہر جاکے ابھی اُن کو آسانی سے اُلجھا سکتے ہیں۔ بیچ میں آپ نکل کے کوئی بھی گاڑی پکڑ سکتے ہو۔ بعد کو کچھ ہوگا تو ہم دیکھ لیں گے۔ آپ کے جانے کے بعد پھر اُن کو اپنی اتنی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔"

"یعنی آپ کا مقصد ہے کہ مجھے آپ کو چھوڑ کے یہاں سے چلا جانا چاہیے؟" ابا جان نے تکرار کی۔

"ہاں! یہی بولا ہے آپ سے۔ سویرے اِدھر نواب حشمت جنگ آئے گا تو ہم اُس کو کچھ بھی بول دیں گے کہ آپ کا جانا ضروری ہوگیا تھا، آپ کا تار آگیا تھا۔ دو تین دن کی بات ہے، پھر اُدھر بمبئی میں ہم آپ سے آکے مل ہی لیں گے۔"

"گویا آپ صورتِ حال کو اس حد تک ــــــ اس حد تک؟ ــــــ" ابا جان کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

"احتیاط میں کیا جاتا ہے بابا!"

"ایسا ہی ہے تو سب ساتھ ساتھ کیوں نہ چلیں؟ کیا اس وقت یہ ممکن نہیں ہوسکتا کہ اِدھر ہم نکلیں، اُدھر پیچھے پیچھے آپ آجائیں؟"

"کوشش کریں تو شاید ایسا بھی ہوجائے پر ایک ساتھ سب کا نکل جانا ٹھیک نہیں ہوگا۔ شام آپ ہی بولتے تھے کہ خانم ابھی بڑے نواب کی حویلی میں ہے۔ باری باری جانے میں بھاگنے کا مطلب نہیں لیا جائے گا۔"

"میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ میں آپ کو چھوڑ کے خود چلا جاؤں۔" ابا جان نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "کیوں نہ ہم کسی دوسری صورت پر غور کریں۔"

"دوسری کوئی صورت ہو تو آپ بولو۔"

"میرا خیال ہے، ہمیں ایسی عجلت نہیں کرنی چاہیے، تحمّل سے سوچنا چاہیے، عجلت سے نتائج دیگر بھی نکل سکتے ہیں۔"

"اپن نے سوچ سمجھ کے بولا ہے بابا!" پیرو نے درمیان میں کہا۔ "بٹّھل بھائی ایک دم ٹھیک بولتے ہیں۔ آپ کو ابھی یاید سے چلا جانا چاہیے۔ اپن کا کوئی ایسا دھیان مت کرو، اپن دیکھ لیں گے۔ اپنے ساتھ مارٹی اور زورا کو بھی لیتے جاؤ۔"

میرے جی میں آئی کہ میں اُن سے کہہ دوں، ابا جان کے ساتھ جانے والے لوگوں کی فہرست سے وہ مجھے خارج سمجھیں۔ میں بٹّھل اور پیرو کے ساتھ یہیں رہوں گا لیکن ابا جان کی وجہ سے میری زبان اینٹھ کے رہ گئی۔ ابا جان نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ پیرو نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی۔ وہی کچھ جو بٹّھل نے ابا جان سے کہا تھا۔ پیرو نے اُن سے کہا کہ یہ ایک ریاست ہے، یہاں کے قاعدے قانون دوسری جگہوں جیسے نہیں ہیں۔ کسی بھی لمحے کوئی گرہ پڑسکتی ہے یا ڈالی جاسکتی ہے۔ سو وقت اب اگر کچھ رعایت دے رہا ہے تو اُسے گنوانا نہیں چاہیے۔ مزید کسی پیچیدگی سے دوچار ہونے سے پہلے ہی کوئی قدم اُٹھا لینا بہتر ہوگا۔ پیرو نے اشارۃً ابا جان سے یہ بھی کہا کہ اُن کی موجودگی سے وہ اپنے ہاتھ بندھے ہوئے محسوس کرتے ہیں۔

"میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے۔" ابا جان لپکتی آواز میں بولے۔ "کیوں نہ ہم سویرے نواب حشمت جنگ سے رابطہ قائم کر کے اُنھی سے درخواست کریں کہ وہ ہمیں اپنی نگرانی میں شہر سے رخصت کریں، اُن کی طرف سے ممکن ہے ابھی آپ کا دل صاف نہ ہو۔ ہرچند کہ میری رائے ابھی تک بے داغ ہے تاہم فرض کرلیا جائے کہ درپردہ سب اُنھی کی کرشمہ سازی ہے تو بھی ہم اُنھی سے یہ مطالبہ کیوں نہ کریں۔ مروّت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ یوں بھی ایسی صورت میں کسی ایک شخص کو تو ہمیں اعتماد میں لینا ہی چاہیے۔ ہم اُنھی کو سپر کیوں نہ بنائیں۔ نواب حشمت جنگ ریاست کے ایک باحیثیت شخص ہونے کے علاوہ ایک ذمّے دار عہدے دار بھی ہیں۔ آپ نے غور فرمایا! اس طرح ہم ــــــ" ابا جان نے رُک کے سوالیہ نظروں سے بٹّھل کا چہرہ دیکھنے لگے۔

"پر بیچ میں وقت کم نہیں پڑا ہے۔" بٹّھل نے سپاٹ لہجے میں کہا

"کیا مطلب!" ابا جان بے چینی سے بولے۔ "صرف ایک رات تو درمیان میں باقی ہے۔ ہم کل سویرے پہلا کام یہی کریں گے اور صبح ہی کسی وقت یہاں سے روانہ ہوجائیں گے۔"

"پر اپن کو کوئی دیر بھی کیوں کرنی چاہیے۔" پیرو بڑبڑاتے ہوئے

بولا" آپ ایک دم سب ٹھیک بول رہے ہو۔ ابھی کچھ ایسا ہی کرنا ہو گا پر ایدر ایک اکیلا نواب حشمت نواب کا اولاد نئیں ہے۔ ایدر گلی گلی آگے پیچھے ایک سے ایک مستی باز راجا نواب لوگ پڑا ہے۔ اپن کو لگتا ہے، بات ابھی دُور دُور تک پہنچ گیا ہے۔"

"لیکن صاف بات ہے، میرا جی نہیں چاہتا کہ اس طرح یہاں سے چلا جاؤں۔" آبا جان نے حتمی لہجے میں کہا۔

"اس میں جی چاہنے نہ چاہنے کا بات نئیں ہے۔"

"کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں یہاں سے جا کے سکون سے رہوں گا اور اس کی کیا ضمانت ہے کہ میرے جانے کے بعد وہ لوگ آپ سے بازپُرس نہیں کریں گے۔ انھیں معلوم ہے کہ مجھ تک پہنچنے کا واحد ذریعہ آپ ہی لوگ ہو سکتے ہیں وہ آپ کے لیے قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی کر سکتے ہیں۔"

"اپن کا بات چھوڑو۔ اپن کے لیے کچھ نوا نئیں ہوگا۔ وہ لیے اپن سے کچھ نئیں جان سکتا اور جاننے کے لیے زور دے گا تو اپن اُن کو ریاست سے باہر لے جائے گا اور اس کے بعد دیکھ لے گا۔ اکیلے میں اپن ان کو اچھی طرح بھگت سکتا ہے۔ سامنے آپ نئیں رہو گے تو وہ لوگ بھی ابھی جم کے اپنے آڑے نہیں آئے گا۔ ایدر اپن کا پہلا کام یہی ہوگا کہ کسی طرح ریاست سے باہر نکل جائے۔ ابھی کچھ سمجھ میں آیا بابا!" پیرو نے نسبتہً اونچی آواز میں آبا جان سے کہا اور کہنے لگا "اپن کو پتہ ہے، ابھی آپ وہی کچھ بولو گے پر اپن بھی آپ سے کچھ جان کے بول رہا ہے، ماں قسم، اپن کو ٹائم ابھی بہت اینٹھا ہوا لگتا ہے۔"

آبا جان چُپ بیٹھے رہے اُن کی پیشانی پر بے شمار شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ کمرے میں ٹنگو اور منیر علی کے سوا سبھی موجود تھے۔ خاصی دیر بعد آبا جان نے زبان کھولی اور شکستہ آواز میں بولے "ہمیں اُمید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ رات گزرنے میں اب دیر ہی کتنی رہ گئی ہے۔ ایسا ہی ہے تو پھر کل صُبح نواب حشمت جنگ یا بڑے نواب کے ہاں دوبارہ منتقل ہو سکتے ہیں۔ وہاں یقیناً یہاں جیسی صُورتِ حال نہیں ہو گی۔ بہتر ہے کہ اب ہم وہیں سے روانہ ہوں۔ اپنی دوبارہ آمد کا عذر پیش کرنا ہمارے لیے ایسا دُشوار نہیں ہوگا۔"

بتّھل اور پیرو نے پھر اُن سے کچھ نہیں کہا۔ ملازم نے بتّھل کے لیے تازہ حُقّہ لا کے رکھ دیا تھا۔ کمرے میں سلگتے ہوئے خمیرے کی کڑوی میٹھی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ ایک بجنے کے قریب تھا۔ سب جاگ رہے تھے اور اس طرح مستعد بیٹھے تھے جیسے انھیں ابھی ابھی کہیں جانا ہو۔ کسی کی آنکھوں میں نیند کی رمق تک نہیں تھی۔ زورا کی کسی جماہی پر آبا جان نے اُس سے آرام کے لیے بستر پر جانے کو کہا بھی تھا لیکن وہ وہاں سے نہیں اُٹھا۔ پیرو کی ہدایت پر ملازم کسی تاخیر کے بغیر چائے لے آیا تھا۔ اس وقت سب نسبتہً پُرسکون بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ بتّھل کی آواز پر سبھی چونک پڑے۔ بتّھل نے آبا جان سے پوچھا تھا کہ پتھروں کی پوٹلی انھوں نے کہاں محفوظ کی ہے۔

"وہ، وہ میرے پاس ہے۔" آبا جان نے بدحواسی سے جواب دیا۔

"اِدھر اندر ہی ہے کیا؟"

"ہاں، ہاں۔" آبا جان نے گھبرائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

بتّھل نے اُن سے کہا کہ پوٹلی اُس کے حوالے کر دی جائے۔ آبا جان سمیت سبھی حیرانی سے اُس کا منہ تکنے لگے۔ چند لمحوں کے تذبذب کے بعد آبا جان اپنی کرسی سے اُٹھ گئے اور ایک لفظ کہے بغیر کمرے سے نکل گئے۔ دوسرے منٹ میں وہ واپس آئے تو اُن کے ہاتھ میں ایک مخملی تھیلی تھی، اس میں سے پتھر ٹکرانے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ آبا جان نے ہیروں پر پڑنے والی رگڑ اور ٹھیس کے اندیشے سے تھیلی کے اندر انھیں دوسرے کپڑوں میں محفوظ کر دیا ہوگا۔ یہ پُرانی طرز کی کوئی زیادہ بڑی تھیلی نہیں تھی۔ بتّھل نے ایک لمحے کے لیے ہاتھ میں لے کے اُسے تولا۔ اُس کا وزن بھی زیادہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ آبا جان نے فیض آباد سے چلتے ہوئے چند منتخب ہیرے ہی ساتھ لیے تھے۔ بتّھل نے تھیلی کھول کے نہیں دیکھی اور پیرو کو اشارہ کرتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ دونوں کمرے سے چلے گئے۔ ہم سب خاموش بیٹھے اُن کا انتظار کرتے رہے۔ بتّھل اور پیرو کو واپس آنے میں دیر ہو گئی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ دونوں تھیلی باہر سبزہ زار میں کسی ایسی جگہ محفوظ کرنے گئے ہیں جہاں آسانی سے کسی کی نگاہ نہ پڑ سکے۔

اسے احتیاط ہی کہنا چاہیے تھا لیکن یہ بے سبب تو نہ ہو گی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ بتّھل کے ذہن میں کیسے کیسے خدشے سر ابھار رہے ہیں۔ بتّھل اور پیرو واپس آ کے دوبارہ اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ کسی نے اُن سے کوئی سوال نہیں کیا، نہ یہ اعتراض کیا کہ بظاہر یہ احتیاط حد سے سوا نظر آتی ہے۔ لیکن جو وہ کہہ نہیں پا رہے تھے، وہ اُن کے چہروں پر لکھا تھا۔ میری طرح اُن سب کے جسم بھی بندھے ہوئے، جکڑے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ سب بُتوں کے مانند بے سدھ بیٹھے تھے۔ وقت رینگ رینگ کے گزُر رہا تھا۔ جیسے یہ رات کبھی ختم نہ ہو گی۔ میرا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ مجھ سے وہاں زیادہ دیر نہ بیٹھا گیا۔ گھڑی نے ڈیڑھ کا گھنٹہ بجایا تھا کہ میں آہستگی سے اُٹھ کر باہر آ گیا۔ میرے اٹھنے کی دیر تھی کہ کانتے بھی میرے پیچھے آ گیا، مارٹی اور زورا بھی پھر شاسو اور جمرو بھی۔ ہم راہ داری سے گزرتے ہوئے دالان میں آ گئے۔ سامنے حویلی کا سبزہ زار اور اطراف میں چھوٹا سا باغ پھیلا ہوا تھا۔ حویلی کی بیشتر روشنیاں بُجھ چکی تھیں۔ سامنے والا صدر

دروازہ بھی درختوں اور درمیان کے اندھیرے کی وجہ سے چھُپ گیا تھا ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ اردگرد ہر سُو رات چھائی ہوئی تھی اور خنکی پہلے سے بہت بڑھی ہوئی تھی یا اس لیے زیادہ محسوس ہو رہی تھی کہ ہم گرم کمرے سے اُٹھ کے آئے تھے۔ آسمان بادلوں سے گھِرا ہوا تھا۔ ہم باہر کھڑے تازہ ہوا سینوں میں بھرتے رہے، تھوڑی ہی دیر میں ہمیں سردی سی محسوس ہونے لگی۔ پھر مارٹی کے کہنے پر ہم نچلی منزل کے ایک کشادہ کمرے میں چلے آئے۔ دروازے کے مقابل وسط میں برابر برابر دو بڑی مسہریاں بچھی تھیں مارٹی بتانے لگا کہ اتنی بڑی حویلی اور اتنے بڑے کمروں میں رہتے رہتے وہ کتنا اُکتا گیا تھا۔ مارٹی اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے ہمیں بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ سب ہوں ہاں کرتے رہے۔ کسی کا جی دوسرے سے بات کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا یا کسی کے پاس کہنے کے لیے شاید کچھ نہیں رہ گیا تھا۔

جمرو مارٹی اور کانتے نیچے قالین ہی پر پڑ گئے۔ زورا میرے ساتھ مسہری پر آ گیا تھا۔ اور گہری گہری سانسیں بھر رہا تھا۔ آبا جان کا یہ مشورہ غالباً بے محل نہیں ہے کہ ہم کل صُبح بڑے نواب کی حویلی میں چلے جائیں اور اب وہیں سے روانہ ہوں، کل یا پرسوں جیسا بھی مناسب ہو۔ خانم کی موجودی کی وجہ سے ہم کسی وقت بھی وہاں جا سکتے ہیں۔ ہماری دوبارہ آمد کچھ ایسی محسوس نہیں کی جائے گی بلکہ بڑا نواب تو اور خوش ہو گا۔ وہاں جانے سے معاملے کی نوعیت بڑی حد تک بدل جائے گی۔ یہ جبیں بھی بہت حیران ہو گی اور یقیناً بہت خوش بھی۔ چلتے وقت اُس کی ڈوبی ہوئی آنکھیں یہی کچھ تو کہہ رہی تھیں۔ اُسے دیکھے ہوئے پورا ایک دن بھی نہیں گزرا مگر معلوم ہوتا ہے جیسے زمانہ بیت گیا ہو۔ اس طرح مجھے بھی ایک موقع مل جائے گا اپنا بوجھ دُور کرنے کا، وہ سب کچھ کہنے کا جو میں اُس سے کہہ نہیں سکا تھا اور جو مجھے کہنا چاہیے تھا۔ یوں آدمی کسی کا دُکھ کیا بانٹ سکتا ہے مگر کبھی تسلی تشفی کے دو بول بھی بہت ہوتے ہیں۔ آدمی انھیں سُننے کا منتظر رہتا ہے۔ وہ مجھ سے نہ جانے کیا کچھ سُننے کی توقع کر رہی ہو گی۔ جو لوگ ویسے ہی ریشم اور پھولوں کے مانند ہیں اُن کا احساس بھی تو پھولوں جیسا ہو گا، شیشے جیسا میری خاموشی سے اُسے کوئی ٹھیس نہ پہنچی ہو؟ اب کے شاید پہلے جیسا نہ ہو۔ میں اپنے آپ کو سنبھالے رکھوں گا اور حویلی میں جاتے ہی اُس سے ملنے کی کوشش کروں گا۔ آبا جان جانے کس وقت روانگی کا ارادہ کریں۔ ممکن ہے اس بار چھوٹی بیگم سے بھی ملنے کی کوئی صُورت نکل آئے۔ اس مرتبہ مجھے موقع مل گیا تو اُن سے کہوں گا کہ ہم تو اپنے دُکھ کا اظہار بھی نہیں کر سکتے، ہمیں اُن سے کچھ کم دُکھ نہیں ہے لیکن کوئی کیا کر سکتا ہے۔ ایک کی زندگی دوسرے کو مِل جایا کرتی تو ہم میں سے کوئی اس میں بھی بُخل نہ کرتا۔ موت کا قرض آدمی خود ادا کرتا ہے۔ منیر علی کے بقول یہ تو باری باری کا معاملہ ہے، اور وہ جو کسی بُزرگ نے کہا ہے کہ کون سا گھر ایسا ہے جہاں موت نہ آئی ہو، جہاں موت نہ آتی ہو کسی کو کیا اندازہ تھا کہ نوخستہ تو یہ تماشا ہے۔ میں اُس سے کہوں گا کہ ذرا ہماری طرف بھی غور کرو۔ ہم کس کے پاس جائیں، کسے جا کے بتائیں کہ ہم نے کیسا وقت گزُارا ہے۔ ہم تو اب تک سزا کاٹ رہے ہیں۔ سب اسی سلسلے کی تو کڑیاں ہیں۔ ہم کیا کیا دہرائیں۔

مارٹی نے روشنی دھیمی کر دی تھی اور کمرے کی فضا خواب ناک ہو گئی تھی۔ سب اِدھر اُدھر لیٹ گئے تھے۔ کمرے میں اُن کی سانسوں کی آہٹیں گونجتی رہیں۔ میں نے بھی آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔ کھُلی آنکھیں کسی حد تک آدمی کی تابع رہتی ہیں۔ جیسے ہی میں انھیں بند کرتا تھا وہ نہ جانے کہاں کہاں بھٹکنے لگتی تھیں۔ وہ رات کا آخری پہر ہو گا۔ میں نے گھڑی نہیں دیکھی تھی لیکن میرا اندازہ یہی تھا۔ یکایک مجھے اپنے کانوں پر وہم ہوا۔ مجھے شبہ ہوا تھا کہ کسی نے دروازہ کھٹ کھٹایا ہے۔ دوسرے لمحے میں بستر پر اچھل کے بیٹھ گیا۔ کمرے کے باہر سے تیز تیز چاپیں مجھے صاف سُنائی دی تھیں۔ میں نے زورا کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اُٹھ کے بیٹھ گیا تھا اور ایک ثانیے میں وہ سبھی اُٹھے ہوئے تھے۔ گویا میری طرح سبھی کروٹیں بدلتے رہے تھے۔ میں اور زورا فوراً مسہری سے اُتر گئے۔ زورا دروازے کی جانب بڑھ گیا تھا کہ کانتے نے اُسے روک لیا۔ "ٹھیر کے دادا!" کانتے نے سرگوشی میں کہا۔ "باہر کوئی ایک آدمی نہیں ہے۔" ابھی ہم اِن چاپوں کی نوعیت سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ ایک جھٹکے سے دروازہ کھُلا اور ڈھاٹے باندھے ہوئے دو آدمی آناً فاناً اندر داخل ہوئے۔ اس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی آگے بڑھ کے اُن پر جھپٹتا، انھوں نے بندوقیں ہمارے آگے کر دیں۔ اُن دونوں کے پیچھے بھی اور آدمی تھے جو تمنچے تانے ہوئے تھے۔ انھوں نے اندر آتے ہی ہمیں ایک طرف کھڑے ہو جانے اور کوئی حرکت نہ کرنے کا حکم دیا۔ سات آدمیوں کے بعد کوئی اور اندر داخل نہیں ہوا۔ دو دروازے پر کھڑے رہے، باقی پانچ اندر کمرے میں پھیل گئے۔ اُن کی تعمیل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کیوں کہ انھوں نے ایک پل کی مہلت بھی نہیں دی تھی۔ ہم سب بائیں جانب کی خالی دیوار کے ساتھ برابر برابر کھڑے ہو گئے۔ کم روشنی کے باوجود اُن کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ سر تا پا کپڑوں میں لپٹے ہوئے تھے، صرف آنکھیں کھُلی تھیں یا پیشانی کا کچھ حصہ۔ کاٹھی کے اعتبار سے وہ تندرست و توانا ہی معلوم ہوتے تھے۔ قد بھی اُن کے تقریباً اوسط تھے۔ یہ چیزیں پہلے ہی نظر میں رکھ لینا ضروری ہے لیکن سرِدست اس سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ کسی جانب کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اُن کی بندوقیں اور تمنچے ہر طرف سے ہمیں نشانہ بنائے ہوئے تھے اور اُن کے تیوروں سے ظاہر تھا کہ ہماری کسی حرکت پر وہ گولی چلانے سے دریغ نہیں کریں گے، یوں

بھی ہم چھ تھے، وہ سات۔ صرف ایک تمنچا بردار شخص بھی ہوتا تو ہمیں یہی کرنا پڑتا۔ ہم سب دم بخود کھڑے اُن کے اگلے حکم کے منتظر تھے۔ ہمارے ایک طرف ہوتے ہی کسی تاخیر کے بغیر ایک آدمی اپنی اُبلی ہوئی آنکھوں کے ساتھ تمنچا اُٹھائے ہماری طرف بڑھا۔ دوسرا بندوق تانے اُسے اپنی جلو میں لیے ہوئے تھا۔

سب سے پہلے اُس نے شامو کا جسم ٹٹولا کیونکہ اِس جانب مَیں آخر میں تو دوسری جانب شامو پہلے کھڑا ہوا تھا۔ شامو کے ہاتھ بے ارادہ ہی مزاحمت کے لیے اُٹھے ہوں گے کہ بندوق والے نے اُس کے شانے پر کُندا مارا۔ شامو کراہ کے رہ گیا۔ اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔ اُس نے شعلہ بار نگاہوں سے ہماری طرف دیکھا لیکن ہم سب ساکت کھڑے رہے۔ شامو کی سمجھ میں جلد ہی آگیا کہ غلطی اُسی کی تھی۔ پہلے ہمیں اُن کے متعلق اچھی طرح کوئی رائے قائم کرنی چاہیے۔ جلدبازی کا نتیجہ کبھی اچھا نہیں ہوتا۔ تمنچے والے آدمی نے شامو کی جیب سے چھ انچی کھٹکے دار چاقو برآمد کر لیا تھا۔ اُس کی آنکھوں کی چمک اور گہری ہوگئی۔ اُسے اپنے ساتھی کی ے وہ مارٹی کی طرف آیا۔ مارٹی رات کو اپنا چاقو مجھے دے چکا تھا جب میں پیرو، ٹھل اور کانتے کے ساتھ حویلی سے باہر نکلا تھا۔ سو اُس کی جیب سے چند نوٹوں اور ریزگاری کے سوا کچھ برآمد نہیں ہوا۔ جمرو اور کانتے کے نیفوں میں چاقو اُڑسے ہوئے تھے۔ زورا نے اور میں نے مسہری کے تکیے کے نیچے رکھ دیے تھے اور ہمیں اتنا وقت نہیں مل پایا تھا کہ انھیں اُٹھا کے دوبارہ جیب میں ڈال لیں۔ میری بنڈی کے نیچے کورا کی مالا پڑی تھی۔ مجھے یہی خدشہ تھا کہ کہیں اُس کا ہاتھ گلے میں مالا کے دانے نہ ٹٹول لے لیکن اُسے بے حد عُجلت تھی۔ اُس نے میرے جسم پر سرسری انداز میں ہاتھ پھیرا، گردن تک اُس کا ہاتھ آیا ہی تھا کہ میں نے اپنا جسم اُس کے ہاتھ بڑھنے کے ردِعمل کے طور پر اضطراری انداز میں کسی قدر پیچھے کر لیا۔ اُسے محسوس بھی نہیں ہوا کہ یہ ایک دانستہ حرکت تھی۔ اُس کا ہاتھ گریبان چھوتا ہوا گزر گیا۔ چاقو یا کسی دوسرے ہتھیار کا گردن اور سینے پر محفوظ کرنے کا ویسے بھی کوئی امکان نہیں تھا تاہم میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ مالا پر ہاتھ پڑنے کے بعد وہ کیا کرتا اور مجھے کیا کرنا چاہیے تھا۔ شاید میں اُس سے اُلجھ پڑتا۔ اُس کے تمنچے والے ہاتھ پر جھپٹا مارنا اور تمنچے کا رُخ موڑ دینا ایسا مشکل نہیں تھا۔ پیچھے بندوق والے کو قابو میں کرنے کے لیے مارٹی، زورا اور کانتے وغیرہ موجود ہی تھے لیکن یہ تبھی ممکن تھا جب کمرے میں صرف وہ دو ہوتے۔ باقی پانچ اپنے ہتھیاروں کے ساتھ ہم پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ انھوں نے برق رفتاری سے ہماری تلاشی لے لی تھی۔ مارٹی اور جمرو کی جیب سے نکلے ہوئے نوٹ انھوں نے واپس رکھ دیے تھے حالانکہ مارٹی کی جیب سے تو اچھی خاصی موٹی گڈی برآمد ہوئی تھی۔ اس کے معنی یہی تھے کہ وہ اچکے اور لٹیرے نہیں بلکہ کسی خاص مقصد سے آئے ہیں۔ اور وہ خاص مقصد ایک ہی ہو سکتا تھا۔ تمنچے والا آخر میں میری تلاشی لے کے میرے پاس سے ہٹا ہی تھا کہ زورا نے دبے ہوئے لہجے میں زبان کھولی ”تم لوگ ابھی کیا مانگتے ہو، اپنے کو تھوڑا بول کے دونا؟“ زورا کی آواز حیرت انگیز حد تک تھمی ہوئی تھی۔

زورا کی آواز پر تمنچے والا ایک لمحے کے لیے گڑبڑا گیا۔ اُس نے پیچھے مُڑ کے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ بندوق والا زورا کے قریب ہی کھڑا تھا اُس نے کوئی جواب دینے کے بجائے ایک قدم بڑھ کے زورا کے گال پر اُلٹے ہاتھ کا طمانچہ رسید کیا۔ اُس نے پوری قوت صرف کی تھی، طمانچے کی چٹاخ سے کمرہ گونج اُٹھا۔ زورا سرتاپا لہرا گیا۔ وہ طمانچہ سبھی نے اپنے گالوں پر محسوس کیا تھا اور اُس لمحے سب کے جسم بل کھا گئے تھے۔ کانتے نے زورا کا شانہ تھام لیا ورنہ زورا کا جسم بپھر گیا تھا۔ اِدھر دروازے پر کھڑے ہوئے آدمی نے سنسناتی آواز میں اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ ہم سب کو کمرے سے باہر لے آئیں۔ اُس کا یہ حکم ہمارے لیے ناقابلِ فہم تھا۔ بندوق والے نے حکم دُہرانے کی ضرورت نہیں سمجھی اور بندوق کی نال مارٹی کے بازو میں گڑو کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ دو آدمی اِس طرف، دو اُس طرف اور ایک ہمارے پیچھے ہو گیا۔ دروازے پر کھڑے ہوئے آدمیوں میں سے ایک باہر نکل گیا، دُوسرا دروازے سے ہٹ کے پاس ہی کھڑا رہا تاکہ ہم لوگوں کو راستہ مل جائے۔ کچھ اور سوچنے کا محل ہی نہیں تھا۔ صرف ایک آدمی کے باہر جانے کا مطلب تھا کہ باہر اُن کے اور آدمی بھی موجود ہیں۔ کوئی چون و چرا کیے بغیر اُن کے کہنے پر ہم کمرے سے نکل آئے۔

وہاں ایک نہیں کئی آدمی تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی اُن کے جسم پھڑکنے لگے۔ کمرے سے باہر دالان جیسی ایک چوڑی گزرگاہ تھی۔ دوسرے رہائشی کمرے، بیٹھنے کے عام اور خاص کمرے، اوپر کے زینے اور اِدھر حویلی کی پُشت، اُدھر سامنے والے حصّے کے دالان میں جانے کے لیے راستے اس گزرگاہ سے نکلتے تھے، الگ سے بھی تھے۔ بیٹھنے کے عام اور خاص کمروں کے بجائے باہر کھڑے ہوئے آدمیوں نے عمارت کے اندرونی حصّے کی جانب چلنے کے لیے کانتے کو دھکّا دیا۔ کانتے خاموشی سے آگے بڑھ گیا، ساتھ میں ہم سبھی جس کمرے سے وہ ہمیں لائے تھے، وہاں سے اُن کے سارے آدمی باہر نہیں نکلے تھے۔ دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ اندر اُن کے رُک جانے کا مقصد کمرے کی تلاشی لینے کے سوا کیا ہو سکتا تھا۔ ہم سب کے جسم ڈھیلے، ڈھلکے ہوئے اور ہاتھ پیر لٹکے ہوئے سے تھے۔ اس طرح ان پر یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ ہم اُن کے

ناردں کی تعمیل کے سوا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ اوروں کا نہیں معلوم بن میری رگوں میں خون جل رہا تھا۔ اُن کا حال بھی کچھ مختلف نہیں گا۔ سب کسی ایک موقع کے منتظر تھے جو اس صورت میں کسی طور پر بن نظر نہیں آتا تھا۔ چند قدم کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہمیں ایک ے کے کھلے دروازے پر اُن کا ایک اور آدمی کھڑا ہوا دکھائی دیا، ایک رہائشی کمرہ تھا۔ ابھی تک کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ ہمیں اں لے جا رہے ہیں لیکن جلد ہی یہ دُھند چھٹ گئی۔ سامنے جس دروازے پر اُن کا آدمی بندوق لیے کھڑا تھا، اُسی کی طرف وہ مُڑ ے۔ اُن میں سے کسی نے ہم سے پہلے یا ہمارے ساتھ اندر جانے کی یاط نہیں کی۔ اندر داخل ہوتے ہی کوئی نیا منظر ہمارے سامنے نہیں ا۔ وسیع و عریض کمرے میں فاصلے فاصلے سے اُن کے کئی آدمی بکھرے ئے تھے اور اُن کی جلو میں ٹھل، پیرو اور ابّا جان ایک طرف دیوار ساتھ چپکے کھڑے تھے۔ ابّا جان بُری طرح ہانپ رہے تھے، اُن آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ انھیں کسی سری جگہ سے شاید ابھی ابھی یہاں لایا گیا تھا۔ منیر علی اور ٹنگو موجود ں تھے۔ دونوں چونکہ اوپری منزل پر تھے اس لیے ممکن تھا کہ اُن رسائی نہ ہو پائی ہو یا انھیں وہیں روک لیا گیا ہو۔ اندر کمرے میں بُردہ آدمیوں نے ہم سب کو پیرو، ٹھل اور ابّا جان کے ساتھ کھڑے نے کا حکم دیا، زبان سے نہیں بندوق کے اشارے سے۔ جس وقت داخل ہوئے، پیرو اُن سے کچھ کہہ رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کے وہ ں پٹ پٹانے لگا اور زہرخند سے بولا ”ابھی دو اُوپر اور تمھارا باپ لیلہے۔“

اس سے پہلے کہ اُن میں سے کوئی جواب دیتا، دروازے سے یں سُنائی دیں۔ منیر علی کی آواز پہچاننا مشکل نہیں تھا۔ باہر سے کسی انھیں اندر کی طرف دھکیلا تھا، وہ فرش پر گرتے گرتے بچے۔ اُنھوں نے ں کی عمر کا بھی خیال نہیں کیا تھا۔ اس طرح اگر وہ ہمیں کچھ باور کرانا ہتے تھے تو اُس کی ایسی ضرورت نہیں تھی۔ اُن کی وضع قطع، تعداد اور کے ہتھیار ہی کچھ جتانے کے لیے بہت تھے۔ منیر علی گھگھیا رہے ے۔ اندر آ کے اُن کی نظر ہم پر پڑی تو اُن کی آنکھیں اور پھیل گئیں۔ نی انداز میں بولے ”یہ کیا، یہ کیا ہو رہا ہے؟“

ٹھل نے اُن کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ بے تحاشا اُس کی ب اُمڈ پڑے وہ ٹھل سے لپٹ جانا چاہتے تھے لیکن ٹھل نے اُن ناز تھام کے اپنے پاس ایک طرف کھڑا کر دیا اور آہستگی سے کچھ نک کچھ نہ سُن سکا۔ منیر علی تیزی سے سر ہلانے لگے، اُن کے ہونٹ پھڑپھڑا رہے تھے۔ وہ یقیناً دعائیں پڑھ رہے تھے۔ منیر علی کے پیچھے کمرے تک چند اور آدمی آ گئے تھے۔ دروازے کے دو آدمیوں کو چھوڑ کے اُن کی تعداد آٹھ تھی، ہم نو تھے لیکن اُن کی صحیح تعداد کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ کچھ لوگ ملازموں کے حصّے کی طرف گئے ہوں گے، کچھ نے صدر دروازے کے دربانوں کو قابو میں کیا ہوگا، کچھ حویلی سے باہر فصیل کے اردگرد بھی ہو سکتے تھے اور عمارت کے اندر دوسرے حصّوں میں بھی انھیں لازماً ہونا چاہیے تھا۔ گزرگاہ سے اُن کی لپکتی چاپوں کی آواز ابھی تک اندر آ رہی تھی۔ اتنی بڑی تعداد سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ وہ کچھ طے کر کے آئے ہیں اور انھیں ہمارے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں ہے ہو سکتا ہے، انھیں ہمارے اڈے سے متعلق ہونے کا بھی علم ہو۔

منیر علی کے ساتھ ٹنگو بھی تھا، وہ بہت سنبھلا ہوا تھا۔ خاموشی سے چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا کمرے میں داخل ہوا اور پیرو کے پاس جا کے کھڑا ہو گیا۔ منیر علی اور ٹنگو کے آنے کے چند ہی لمحوں بعد تین ملازم بھی ہماری طرح اندر لائے گئے۔ اُن میں سے ایک کی حالت نہایت شکستہ تھی۔ اُس کا سارا جسم پارے کے مانند تھرتھرا رہا تھا اور مُنہ سے خون کی دھار جاری تھی۔ اُن تینوں کو بھی ہمارے ساتھ کھڑا کر دیا گیا۔ پھر باہر سے ایک آدمی نے آ کے سر کا اشارہ کیا۔ اشارہ واضح تھا کہ اب عمارت میں کوئی ذی نفس موجود نہیں ہے۔ آنے والے آدمی کو کمرے کے وسط میں کھڑے ایک بھاری بھرکم، میانہ قد آدمی نے ہاتھ جھٹک کے واپس کر دیا۔ اُس کے جاتے ہی وہ اپنی جگہ سے دو قدم آگے آ گیا اور اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑاتے ہوئے بولا ”تمھاری جاناں تمھارے ہاتھاں میں ہیں۔“ اُس کی آواز میں گرج کے ساتھ لرزش بھی تھی۔ تمنچا اُس کے ہاتھ میں تنا تھا اور کھٹکے پر انگلی رکھی ہوئی تھی۔

”اپنے کو سامنے کا ٹھیک دکھائی سُنائی دیتا ہے۔ اس ناٹک کی ضرورت نہیں ہے۔ جو بولنا ہے، کھُل کے بولو۔“ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا، ٹھل نے اُس سے کہا۔

ٹھل کی آواز پر اُس کی پلکیں جھپکنے لگیں۔ اُس نے قدرے توقف کیا اور درشتی سے بولا ”ہم کو مال چاہیے۔ جان کے بدلے مال۔ تمنا تمھاری جاناں پیاری ہیں تو مال ہمارے آگے کر دو۔“

”جان اپنے کو بہت پیاری ہے، تم سے زیادہ۔“ ٹھل کی آواز ٹھیری ہوئی تھی ”ہم کو بولو تم کو کون سا مال چاہیے؟“

”پھتر! ہم کو پھتر چاہئیں۔“ وہ سرد لہجے میں بولا ”ہم کو بھی زیادہ گھما پھیری پسند نئیں ہے۔ پھتّرے نکال کے اِدھر دے دو۔ سوچنے کو ہم تم کو تھوڑا ٹیم ضرور دیں گے، پر دس منٹ سے زیادہ نئیں۔ آتنا ٹیم تمھارے

پاس اپنی جان کا فیصلہ کرنے کا ہے۔ بھتیرے ہم کو مل گئے تو چلے جائیں گے ورنہ اِدھر ایک آدمی بھی زندہ نئیں رہنے کا۔ اپنی بات زیادہ لمبی چوڑی نئیں ہے۔ سمجھ میں نئیں آیا ہو تو ایک بار دوبارہ بول دیں۔" اُس کی آواز لحظہ بہ لحظہ تیز و تُند ہوتی گئی۔

"اچھی طرح سمجھ آرہی ہے۔" بٹھل نے تحمل سے کہا۔ "اِدھر تمھارا کھٹکا سُن کے ہی جان گئے تھے کہ پھر کسی کو دھوکا ہوا ہے، پھر کوئی شوقین آگیا ہے۔ شام سے جب اِدھر کو آئے ہیں، ایک سے ایک ٹھرکی، مستی باز منہ اُٹھائے چلا آرہا ہے۔ بڑے بڑے نواب راجا لوگ، اُونچی اُونچی بولی لگانے کو بولتے تھے۔ دھن دولت بھی ساتھ لائے تھے۔ اُن کو ہم کچھ نہیں دے سکے، تو تم کو کیا دے سکیں گے۔"

"وہ لوگاں دھن دولت کا بولتے تھے، ہم جان کی بات کرتے ہیں۔"

"پر سودا کاہے کا کریں بابو!"

"لگتا ہے، پھر تمھارا ٹیم ہی آگیا ہے۔"

"آگیا ہے تو اس کو کون روک سکتا ہے رے۔"

"ابھی تم ہم کو پورا نئیں پہچانتے۔" وہ پھنکارتی آواز میں بولا۔

"پورا پہچان رہے ہیں مائی باپ! اوپر سے نیچے تک دیکھ رہے ہیں کہ تم کون سے وقت آئے ہو منہ پہ پردہ ڈال کے، اِدھر تم کتنے آدمی لے کے آئے ہو۔ سب کے ہاتھ میں ہتھیار ہے، کھٹکا جس کا دبانے سے آدمی کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی ہے نا!"

"تم اپنے آپ کے ساتھ مسخری کر رہے ہو۔"

"یہی لوٹ کے ہم تمھارے لیے بولیں گے تو تم کچھ اور خفا ہو جاؤ گے۔" بٹھل نے دبے لہجے میں کہا۔ "رستہ پوچھ ہی کے آئے تھے سردار! اِدھر اپنے پلّے تو صرف ہمی ہیں۔"

"ہم کبھی غلط جگہ ہاتھ نئیں رکھتے۔" وہ نخوت سے بولا۔ "اور ہم تم جیسے لوگاں کو خوب دیکھے ہیں۔" اُس کی آواز بھڑکنے لگی تھی، غصے سے کہنے لگا۔ "تم ایسے نئیں مانو گے تو ہم کو دس رستے اور بھی آتے ہیں۔ ابھی ٹھیک ہے کہ سیدھی طرح مال نکال دو، اپنے پاس زیادہ ٹیم نئیں ہے۔"

"تم تو وقت خود کھوٹا کر رہے ہو۔ اپنی بات دھیان سے نہیں سُنی کیا! اِدھر برابر میں اس سے اُونچی اور بڑی حویلیاں کوٹھیاں ہیں، ایک رات میں اگلی پچھلی ساری کسر نکل جائے گی۔ اُدھر اتنے پنڈروں کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ہم مسافر لوگ کے پاس کیا دھرا ہے لوٹ کے کبھی آئیں تو ہاں، پھر ایک جتن اور کر لینا۔ شاید پھر خالی ہاتھ نہ لوٹائیں۔" بٹھل کے لہجے میں ترشی آگئی تھی۔ ایک ثانیے رُک کے وہ نسبتاً دھیمی آواز میں بولا۔ "ابھی کچھ چائے پانی پینا ہو تو بولو۔"

"مال کاں ہے؟" اُس نے جیسے کچھ سُنا ہی نہیں تھا، دہاڑتا ہوا بولا۔ "ہم دوسری بات سننے کو نئیں آئے۔"

"مال کے بارے ہم نے بول دیا ہے۔ دوسری سُننی نہیں پسند ہے تو دیر کاہے کی ہے، گولی چلاؤ یا پھر اِدھر سے چلے جاؤ۔ کون سی بولی سمجھتے ہو؟"

"گولی کبھی چکھی نئیں ہے تم نے! یہ حسرتاں بھی ابھی پوری کر دیں گے۔ پر ہم کو شبہ ہے کہ یہ تمھارا آخری جواب ہے۔"

"پھر تمھارے سر کی قسم کھائیں کیا!"

مجھے ڈر تھا کہ پیرو، ابا جان یا منیر علی میں سے کوئی درمیان میں نہ بول پڑے لیکن شاید وہ سمجھ گئے تھے کہ اِس طرح کی باتوں سے بٹھل کی کیا مراد ہے، اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ بندوقوں اور تمنچوں سے زیادہ ہم اُن کی نگاہوں کے حصار میں تھے۔ ہتھیار کے ساتھ نگاہ کی مستعدی شرط ہے۔ یقیناً وہ گولی چلانے اور ہم سب کو ختم کرنے کے شوق میں نہیں آئے تھے لیکن کسی بھی لمحے اُن کا کوئی ساتھی اپنے ہوش گم کر سکتا تھا۔ خون سب کا ایک جیسا نہیں ہوتا۔

پہلی بار بٹھل سے مخاطب شخص کسی قدر متذبذب نظر آیا۔ اپنے ساتھیوں پر ایک نظر ڈالتا ہوا وہ دو قدم اور آگے بڑھ آیا تاہم اُس کا ہمارا درمیانی فاصلہ کم نہیں تھا۔ اُس نے اپنے پیچھے کھڑے ہوئے آدمیوں کو آگے آنے کے لیے ہاتھ ہلایا۔ وہ حکم سُننے کے لیے بے تاب تھے۔ اتنی تیزی سے اُس کے قریب آئے جیسے ذرا بھی دیر ہو گئی تو قیامت آجائے گی۔ اُن کے سرغنہ نے دوسرا حکم دینے میں اُتنی ہی تاخیر کی۔ اُس کی نگاہیں باری باری ہم سب پر منڈلاتی رہیں اور ابا جان پر آکے ٹِک گئیں۔ اُس نے اُنگلی اُٹھا کے اُنھی کو اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ ابا جان کا چہرہ سفید ہو گیا تھا۔ میں نے معاً بٹھل کی جانب دیکھا مگر وہ بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ ابا جان نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی، سرغنہ نے اپنے دو ساتھیوں کو ہدایت کی کہ وہ انھیں اُس کے پاس کھینچ لائیں۔ دو آدمی اِدھر اُدھر سے بندوق تانے ہوئے اُن کی جانب دوڑ پڑے۔ میرے جسم میں خون جم گیا۔ وہ شخص بالکل وحشی معلوم ہوتا تھا۔ میرے جی میں آتا تھا کہ میں جھپٹ کے اُس کی گردن دبوچ لوں لیکن میں اپنا جسم جکڑے کھڑا رہا۔ اِدھر پیرو نے سختی سے میرا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ ہمیں آخری لمحے تک اپنی جانب سے محتاط ہی رہنا چاہیے تھا۔ جانے کہاں سے ابا جان میں استقامت آگئی تھی۔ کوئی بعید نہ تھا کہ وہ ابا جان کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیتے مگر وہ خود

بڑھے اور کسی مجرم کی طرح اُس شخص کے سامنے جا کے کھڑے ہو گئے۔ پہلے وہ انھیں سر تا پا گھورتا رہا پھر بھنچی ہوئی آواز میں بولا۔ "کیوں بڑے میاں! ہم کو تم کچھ سمجھ دار آدمی لگتے ہو۔ ہم کو بولو کہ پتھر کاں ہیں؟"

"میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ آپ لوگوں کو کوئی بہت بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔" مجھے حیرت ہوئی ابا جان کی آواز میں لرزیدگی نہیں تھی۔

"تو تم بھی ایسا ہی بولتے ہو۔" وہ مضحکہ خیزی سے بولا۔ "پر ہم کو مال چاہیے۔ مال اِدھر ہی ہے۔ تمھارا وقت ویسے بھی زیادہ دُور نہیں ہے۔ لگتا ہے، تم نے ابھی جانے کا سوچ لیا ہے۔"

"ضرور آپ کو کسی نے بہکایا ہے۔" ابا جان نے رُکی رُکی آواز میں کہا۔ "زندگی سے بڑی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ یہ سودا ہمارے لیے زیادہ مہنگا نہیں ہے لیکن ہمارے پاس کوئی چیز ہو تو جواب دیں۔ فیصلہ ہمیں نہیں، آپ کو کرنا ہے۔ رہا موت کا خوف، تو یہ اُن لوگوں کو ہوتا ہے جو زندگی کو قائم و دائم سمجھتے ہیں۔ اگر یوں ہی لکھی ہے تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔"

"تم، تم سب ہم کو ایک نمبر حرامی لگتے ہو۔" وہ ایک دم آپے سے باہر ہو گیا اور اُس نے ابا جان کا گریبان پکڑ لیا۔

میری آنکھوں میں اندھیرا اُتر آیا تھا۔ میں نے اُس پر جست لگانی چاہی تھی لیکن پیرو نے اپنے دونوں ہاتھ میری کمر میں ڈال کے مجھے جکڑ لیا۔ "ابھی تھوڑا صبر کر راجا! تجھ کو اپنا قسم، تھوڑا ٹھہر جا اپن بھی دیکھ رہا ہے۔" اُس نے سرگوشی میں مجھ سے التجا کی۔

میری آنکھوں کے سامنے اُس شخص نے ابا جان کا گریبان پکڑ کے انھیں جھنجوڑنا شروع کر دیا۔ اُن کا کُرتا پھٹ گیا تھا۔ اندر بنڈی کے بٹن بھی ٹوٹ گئے تھے۔ کہنے لگا۔ "ہم تم کو بتائیں گے کہ موت کیا ہوتی ہے اور تمھارے لیے کیسی لکھی ہے۔ تمھاری عمر دیکھ کے سالا ہاتھاں رکتے ہیں۔ ابھی تمھارے کپڑے اُتروا کے ہنٹراں برسائیں گے تو تم کو آگے پیچھے کا سب یاد آجائے گا، ہم ابھی بولے تھے نا کہ ہم کو دس رستاں اور آتے ہیں۔ تم سمجھتا ہے کہ ہم تم کو گولی کی سیدھی موت دیں گے تمھارے ساتھ ——"

یہ دیکھ کے کانتے بڑھ گیا مگر مارٹی اور جمرو نے اُسے روک لیا۔ وہ اُسے زور زور سے گالیاں بکنے لگا۔ ابا جان سے ہٹ کے اُس شخص کی توجہ یکایک کانتے کی طرف مبذول ہو گئی۔ اُس پر وحشت طاری ہو گئی تھی۔ بھنائے ہوئے لہجے میں ابا جان سے پوچھنے لگا کہ یہ کُتّے کی اولاد تمھارا کیا لگتا ہے۔ ابا جان نے جواب نہیں دیا، اُس نے طیش میں آکے ایک جھٹکے سے اُن کا سینہ ننگا کر دیا۔ ابا جان کا کرتا دامن تک پھٹ گیا۔ بٹن ٹوٹ جانے سے بنڈی بھی کھل گئی۔

"بوڑھے آدمی پر ہاتھ اُٹھاتا ہے سالا زنخا، اُلو کا پٹھا۔" کانتے کے جو منہ میں آرہا تھا، وہ بکے جا رہا تھا۔ سارے آدمیوں نے بے اختیار اپنی بندوقوں اور تمنچوں کا رُخ اُس کی طرف کر دیا تھا۔ کانتے کے بجائے کوئی اور شخص ہوتا تو یہ لمحہ اُن پر ٹوٹ پڑنے کا تھا۔ کانتے نے اپنا سینہ خود چاک کر دیا۔ اور چلّا چلّا کے سرغنہ سے بولا "لے چلا گولی!" ساتھ ہی وہ بُری طرح گالیاں بھی بکتا جاتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا وہ اپنے اوسان کھو چکا ہے۔ جمرو اور مارٹی مسلسل اُسے روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شامو نے اُس کی کمر پکڑ رکھی تھی۔ کانتے اُن تینوں کے قبضے سے نکلنے کے لیے زور کر رہا تھا۔ سرغنہ نے ابا جان کے گریبان سے ہاتھ ہٹا لیا اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ کانتے کو پکڑ کے اُس کے پاس لے آئیں۔ یہ سُنتے ہی دو کے بجائے چار آدمی کانتے کی طرف لپک پڑے۔ انھیں اپنی جانب بڑھتا دیکھ کے مارٹی، جمرو اور شامو بوکھلا گئے تھے۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آرہا ہو گا کہ وہ کانتے کو اپنے بازوؤں میں جکڑے رکھیں یا آزاد کر دیں لیکن پھر اُن کی گرفت ڈھیلی پڑتی گئی کیونکہ دوسری صورت میں کانتے کو زیادہ زک پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ اُن کے ہاتھوں سے چھوٹ کر کانتے کسی اور طرف جانے کے بجائے اپنی جگہ سینہ تانے کھڑا رہا جیسے اُسے حملہ آور آدمیوں کا انتظار ہو۔ اتنی دیر میں وہ چاروں اُس تک پہنچ چکے تھے۔ کانتے کو یوں غیر متوقع طور پر آمادہ دیکھ کے وہ کچھ گڑبڑا سے گئے۔ اور اُن کے جھپٹنے کی شدت میں بھی کمی آگئی تاہم اُنھوں نے دونوں جانب سے کانتے کے شانے اس طرح پکڑے جیسے وہ بہت مشکل سے اُن کے قبضے میں آیا ہو یا اگر گرفت ذرا سی کمزور رہی تو وہ کسی طرف بھاگ کھڑا ہو گا۔ کانتے نے فرش پر تھوک کے سرغنہ کو ایک اور گالی دی، ماں کی گالی۔ جانے اُس کے دماغ میں کیا سمایا تھا۔ ہم سب اپنی اپنی جگہوں پر سُن کھڑے تھے۔ کسی اور کے دخل دینے کا کچھ حاصل نہ تھا۔ کانتے کو کوئی احساس نہیں تھا کہ وہ گولی بھی چلا سکتے ہیں۔ اُن کے پاس ہتھیاروں کی کمی ہے، نہ آدمیوں کی۔ بٹھل اور پیرو نے اپنے ہونٹوں پر مہر لگا لی تھی۔ زبانی طور پر اور کہا بھی کیا جا سکتا تھا۔ دلیل تو دلیل کے جواب میں دی جاتی ہے۔ وہ لوگ ایک بات چاہتے تھے کہ کسی طرح ہم ہیروں کی موجودگی کا اقرار کر لیں۔ اگر صورتِ حال دوسری ہوتی؟ واقعی ہمارے پاس ہیرے نہ ہوتے تو بھی ہم انھیں کچھ اسی طرح تو یقین دلاتے اور وہ اگر اپنی اس روش پر قائم رہتے؟ کانتے کو چاروں آدمی پکڑ کے سردار کے پاس لے گئے اور قریب پہنچ کے انھوں نے اُس کی گردن، کمر اور بازو اس طرح ہاتھوں کے شکنجے میں کس لیے کہ

کانتے کے لیے جنبش کرنا بھی آسان نہیں رہا۔ سرغنہ اباجان کی طرف سے منہ موڑ کے کانتے کے سامنے ہوگیا۔ اُس وقت اباجان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید ایک موقع نکل آتا۔ اباجان تو گنگ کھڑے تھے۔ پھٹے ہوئے کرتے میں اُن کا حُلیہ دیکھا نہیں جاتا تھا۔

سرغنہ کی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکل رہی تھیں۔ اُس نے کانتے کی گردن پر تمنچا رکھ دیا اور نیچے کی جانب سے اُس کی ٹھوڑی پر پوری طاقت سے مُکّا مارا۔ کانتے کا سر جھن جھنا گیا ہوگا، اُس نے بھی ایک پل کی دیر نہیں کی۔ جواب میں اپنے جسم کو جھٹکا دے کے جُھک گیا۔ پھر پورے زور سے اوپر اُچھلا، چاروں آدمی اُس کی جھونک میں گرتے گرتے بچے۔ کانتے نے اچھل کے سرغنہ کے پیٹ میں لات ماری۔ وہ پیٹ پکڑے ہوئے دُہرا ہوگیا۔ اُس کے پیر ڈگمگا گئے تھے۔ وہ پیٹھ کے بل فرش پر گرتا مگر سنبھل گیا۔ پیچھے کے ایک آدمی نے اُسی وقت کانتے کے اردگرد کھڑے ہوئے لوگوں کو نعرہ لگانے کے انداز میں تنبیہہ کی کہ اپنی حفاظت کا خیال رکھیں۔ وہ بندوق کا نشانہ لیے تیار کھڑا تھا۔ کانتے کی طرح اُس کا خون بھی کچھ زیادہ ہی گرم معلوم ہوتا تھا۔ وہ گولی چلا سکتا تھا کیونکہ اُس کے تیور ایسے ہی تھے لیکن عین وقت پر سرغنہ نے جلدی سے ہاتھ اوپر اُٹھا کے اُسے روک دیا۔ "ابھی نئیں۔ ہم کو پتہ ہے، یہ سب سے پہلے جانا چاہتا ہے پر ہم اس کو سب سے آخر میں بھیجیں گے۔ ابھی ہم اِس کے کل پرزاں ٹھیک کریں گے۔ ہم کو یہ سب سے چھٹا ہوا لگتا ہے۔" وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا اور کانتے کے پاس آکے اُس نے دوبارہ اُس کی کنپٹی پر مکّے کی بھرپور ضرب لگائی۔ اس مرتبہ کانتے کو اُچھل کے اُس کے پیٹ پر لات مارنے کا موقع نہیں مل سکا۔ اُسے جکڑنے والے چاروں آدمی پہلے سے زیادہ مستعد تھے۔ دو اُس کے شانے پکڑے ہوئے تھے، ایک نے اُس کی گردن اور ایک نے کمر قابو میں کر رکھی تھی۔

کانتے کو یوں بے بس دیکھ کے اُس کی دہشت کم نہیں ہوئی بلکہ کچھ اور فزوں ہوگئی۔ اُس نے اپنا تمنچا پیٹی میں اڑس لیا اور پے در پے کانتے کے منہ اور سینے پر ضربیں لگائیں۔ کانتے اُسے اور اشتعال دلا رہا تھا۔ اُسے جانے کتنی گالیاں ازبر تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ دونوں اپنے ہوش و حواس کھو چکے ہیں۔ مسلسل ضربوں سے کانتے کے ہونٹ پھٹ گئے تھے۔ کانتے کے لیے یہ چوٹیں بے شک کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھیں، بچپن سے وہ ان کا عادی تھا۔ اتنا تو بار ہا نجّل نے بھی اُسے مارا تھا لیکن کانتے کو موقع محل کا بھی کچھ خیال رکھنا چاہیے تھا۔ ایک دو آدمی نہیں، اُس کے سامنے پورا جتھا تھا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اب اُس آدمی کی توجہ اباجان کی طرف سے یک سر ہٹ گئی تھی۔ گو اباجان ابھی تک اُس کے پاس ہی کھڑے تھے اور اُس نے انھیں اپنی جگہ واپس جانے کا کوئی حکم نہیں دیا تھا۔ ممکن ہے، کانتے یہی سب کچھ دیکھ کے آگے بڑھا ہو۔ پھر تو وہ یقیناً اب بھی اسی کوشش میں ہے۔ اتنی دیر تک یہ بات میری عقل میں کیوں نہیں آئی تھی۔ ظاہر ہے، کانتے نے اچانک بے وجہ تو شور مچانا شروع نہیں کر دیا تھا۔ وہ ہم سب کی طرح خاموش کھڑا رہتا تو ان ضربوں سے محفوظ رہتا۔ اُس کی جگہ تو مجھے ہونا چاہیے تھا۔ مجھے اپنا وجود اپنی نظروں میں بہت حقیر لگ رہا تھا۔ کانتے نے جیسے مجھے کوئی گالی دی ہو مگر اب پچھتاوے سے کیا ہوتا۔ میں نے ارادہ بھی کیا کہ کانتے کی طرح شور مچانا شروع کر دوں۔ اس طرح سرغنہ کی توجہ اُس کی طرف سے ہٹ کے مجھ پر مبذول ہو جائے گی۔ مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا لیکن میں ارادہ باندھتا اور دزدیدہ نظروں سے سب کچھ دیکھتا رہا۔ مجھ سے ایک قدم بھی نہ بڑھایا جا سکا۔ یہ بعد از وقت تھا۔

سرغنہ ہر ضرب کے بعد کانتے سے ہیروں کے بارے میں پوچھتا تھا۔ کانتے ہر بار گالی میں اُسے جواب دیتا تھا۔ کمرے میں خنکی کے باوجود دونوں پسینے پسینے ہو گئے تھے اور کانتے کے پسینے میں تو خون بھی شامل تھا۔ یہاں تک کہ سرغنہ تھکا تھکا دکھائی دینے لگا۔ کانتے اگر چُپ ہو جاتا تو وہ بھی رُک جاتا لیکن کانتے کو ضد سی ہو گئی تھی۔ وہ اُس سے کہہ رہا تھا "گیدڑ کی اولاد! اپنے ان کھلونوں اور چڑی ماروں کو ہٹا کے دیکھ، پھر تجھ کو بتائیں، کس کو پہلے جانا ہے۔"

اباجان سے ضبط نہیں ہوا۔ انھوں نے کانتے سے التجا کی کہ وہ اپنی زبان قابو میں رکھے، اُدھر انھوں نے عاجزانہ لہجے میں سرغنہ کو مخاطب کیا "جناب! میری بات سُنیے، خدا کے لیے یہ فساد ختم کیجیے۔ اِس سے کچھ حاصل نہیں، آپ یقین کیجیے کہ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ ہوتا تو اتنی اذیت اور ذلّت کون برداشت کرتا۔ میں آپ سے منّت کرتا ہوں کہ ہماری بات مان لیں۔ جو کچھ یہاں ہمارے پاس ہے، سب آپ لے جایئے۔ ہمیں کسی چیز سے سروکار نہیں۔ ہمارے پاس کچھ نقدی ہے اور، اور اتنی کم نہیں ہے۔ ہم وہ آپ کے حوالے کرتے ہیں۔"

اُس کا ہاتھ یکایک رُک گیا۔ اباجان کی مداخلت سے اُسے سانس لینے کی کچھ مہلت مل گئی تھی اور کانتے کے ساتھ مزید حجّت سے بچنے کا ایک جواز بھی فراہم ہو گیا تھا۔ اب تک اُس پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو چکی ہو گی کہ کانتے کی زبان اُس کی ضربوں سے رُکنے والی نہیں ہے اور اس طرح اُسے اپنے ساتھیوں کے سامنے پشیمانی

ے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ وہ اباجان کی طرف پلٹ پڑا اور یوں ظاہر یا کہ اباجان کو فراموش کر کے اُس سے کوئی چوک ہو گئی ہو "ہاں بڑھے!" وہ کسی قدر اُکھڑی ہوئی سانسوں سے کانتے کو ماں کی گالی دیتے ہوئے بولا "ہم تو اس کے چکراں میں تجھ کو بھول ہی گئے تھے۔ اس کو ہم بعد میں دیکھیں گے، تو ابھی کیا بولتا ہے؟"

اُس کا لہجہ ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ اباجان نے تحمّل سے کام لیا اور التجائی لہجے میں وہی تکرار کی۔

"تو پھر ہم یاں سے چلے جائیں؟" وہ چھچھلے پن سے بولا۔

"آپ کا یہ فیصلہ ہم دونوں کے حق میں بہتر ہوگا" اباجان نے ی سے کہا "ہمارے آپ کے درمیان کوئی پرانی عداوت یا مخاصمت یں ہے۔ ہم نے آپ کا کبھی کچھ نہیں بگاڑا۔"

اباجان کی داد و فریاد کا یہ اثر ہوا کہ اُس نے اُن کی داڑھی پکڑ ا اور رعونت سے کہنے لگا "تو تم ایسے ہی رٹّاں لگاتا رہے گا۔"

اباجان نے اُس سے کہا کہ پھر وہ اُس کا مطالبہ کہاں سے را کریں۔ یہ سُن کے اُس نے انھیں ایک بے ہودہ گالی دی اور اُن کی ڑھی پکڑ کے جسم کو جھٹکے دینے لگا "ہم کو صرف نقدی پہ ٹہلائے؟ وہ بھی لے کے جائیں گے پر پھتروں کے ساتھ، سمجھا۔"

یں ہیرو کو پیچھے کی جانب دھکّا دے کے اُس وحشی کی ف جھپٹا لیکن ہیرو کو پہلے سے اندازہ تھا۔ میں اس کے بازو سے وٹ کے اور ایک قدم آگے نکل آیا۔ ہیرو نے اپنی ٹانگ اڑا کے ے گرا دیا پھر جتنی دیر میں، میں فرش سے اٹھا، زورا اور ہیرو نے ھے پیچھے سے پکڑ لیا۔ ہیرو مجھے سمجھانے لگا۔ اُس کی باتیں مجھے رنگ رہی تھیں۔ میرے سارے جسم میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ سب میرے سامنے ہو رہا تھا اور میں کھڑا دیکھ رہا تھا۔ صرف اس لیے صورتِ دیگر میری زندگی کو خطرہ لاحق تھا۔ اس آزار سے تو موت ہی تھی۔ میں نے ایک مرتبہ پھر ہیرو اور زورا کے تسلّط سے نکلنے کی ش کی مگر ناکام رہا۔ سرغنہ نے مجھے اپنی طرف جھپٹتے دیکھ لیا تھا۔ اُس بھڑکتی ہوئی آنکھیں مجھ پر مرکوز ہو گئی تھیں، وہ پچکارتے لہجے میں بولا "آنے آنے دو، اس کتے کے پلّے کو بھی آنے دو۔ اب ہم تجھی کو دیکھیں کیا؟ کتنے دانت نکلے ہیں تو نے؟"

یں اُسے ضرور کوئی جواب دیتا مگر اباجان کی طرف دیکھ کے زبان ٹھٹھر کے رہ گئی۔ انھوں نے اشاروں اشاروں میں مجھے سکون کی تلقین کرنی چاہی۔ اُدھر کانتے نے پھر شور مچانا شروع کر تھا۔ سارا کمرہ اُس کی چیخ پکار سے گونج رہا تھا۔ سرغنہ مجھ پر زیادہ توجہ نہ دے سکا۔ کانتے کے شور سے وہ پھر برہم سا ہو گیا۔ کانتے کی گالیاں اُس کے کانوں میں نشتر بن کے چُبھ رہی ہوں گی۔ وہ ہیجانی انداز میں کانتے کو خاموش کرنے کے لیے اُس کی جانب چلا گیا لیکن اس کے مقابل جا کے ٹھہر گیا۔ چند لمحے سوچتا رہا پھر اس نے اپنے چاروں ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ کانتے کو برابر کے کمرے میں لے جائیں اور جب تک اُس کی زبان نہ تھمے، اُسے مارتے رہیں۔ بعد میں وہ ہم سے نمٹ کے خود اُسے دیکھے گا۔

"حرام زادے! اِدھر تیری میّا مرتی ہے کیا!" کانتے زہریلی ہنسی ہنستے ہوئے بولا "اپنے کو یہ تیرے جمائی ھتوڑے پڑیں گے۔" کانتے اُن کے بازوؤں سے نکلنے کے لیے پورا زور صرف کر رہا تھا۔ وہ پچھاڑیں کھا رہا تھا جیسے کسی پاگل پر قابو پانے میں دُشواری پیش آتی ہے۔ اُن چاروں نے اپنی بندوقیں کندھوں سے لٹکا لی تھیں اور تمنچے پیٹیوں میں رکھ لیے تھے۔ اپنے دونوں کُھلے ہاتھوں سے وہ پوری طرح اُسے دبوچے ہوئے تھے اور کانتے کی پچھاڑوں کی جھونک میں اِدھر سے اُدھر ہو جاتے تھے لیکن وہ کانتے سے لپٹے رہے۔ کانتے فضول میں اُن سے اٹک رہا تھا۔ آخر وہی کامیاب ہوئے۔ اور اُسے کھینچتے، گھسیٹتے ہوئے کمرے سے لے گئے۔ اُن چاروں کے جانے سے سرغنہ سمیت چار آدمی کمرے میں رہ گئے۔ دو دروازے پر موجود تھے۔ اُن میں سے ایک اندر آ گیا۔ دروازے پر رہ جانے والے دوسرے آدمی کا رُخ بھی ہماری جانب تھا۔ کمرے میں سکوت ہو گیا۔ کانتے کے جاتے ہی سرغنہ واپس اباجان کی طرف آیا اور جھڑکتے لہجے میں اُن سے بولا "ہاں بڈّھے!" اُس نے اباجان کے سر کے بال پکڑ لیے اور سر جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا "کچھ ٹھکانے آیا یا ابھی اور ٹھیک کریں؟"

اباجان کے ہونٹوں پر لفظ سسک کے رہ گئے۔ اُن کی حالت دیکھ کے یک بارگی مجھے شبہ ہوا کہ بس کچھ دیر باقی ہے، اباجان اقرار کر لیں گے۔ یہی بہتر تھا۔ اِس ذلّت کے سامنے ہیرے کوئی حیثیت نہیں رکھتے، اباجان کے پاس ہیروں کی کمی نہیں ہے۔ چند پتھر نکل جانے سے اُن کے خزانے پر کیا فرق پڑے گا۔ سمجھ لیں کہ تبت کے زیرِ زمین معبد کا ایک اور ستون نہ کھودا جا سکا اور اگر وہاں سے اتنا کچھ برآمد نہ ہوتا تو وہ کیا کر لیتے۔ کوئی دولت آدمی سے بڑی نہیں ہوتی اور آدمی عزّت کے بغیر کچھ نہیں ہے۔ اباجان کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ اُن کے نتھنوں اور ہونٹوں پر لرزہ سا طاری تھا وہ یقیناً کوئی فیصلہ کر رہے تھے، کبھی میری جانب اُن کی بے چین

نگاہیں اٹھتی تھیں، کبھی بجھل کی جانب اور کبھی وہ سرغنہ کی طرف دیکھتے تھے۔ اُس نے اُن کے سر کو متعدد جھٹکے دیے۔ گو ابّا جان نے اُف تک نہیں کی تھی لیکن اُن کے چہرے سے اندرونی اضطراب صاف چغلی کھا رہا تھا۔ میں نے ایک لمحے میں کتنی بار ارادہ کیا کہ ابّا جان اگر اقبال کرتے ہوئے جھجک رہے ہیں تو میں خود سرغنہ سے کہہ دوں کہ ہیرے یہیں ہیں، اِسی حویلی میں موجود ہیں مگر میں نے خود کو بہ مشکل روکا۔ مجھے توقع تھی کہ چند لمحوں میں ابّا جان خود اس نتیجے پر پہنچ جائیں گے ورنہ بجھل اور ہیرو میں سے کوئی بول اُٹھے گا۔ وہ تینوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ معلوم نہیں اُن کے ذہن میں کیا تھا۔ کیا ابھی تک وہ یہ آس لگائے ہوئے تھے کہ جلد یا بدیر سرغنہ مایوس ہو کے واپس چلا جائے گا، یہ محض اِس کی گیدڑ بھبکیاں ہیں، اسے ہیروں کے سوا کسی اور بات سے سروکار نہیں۔ رات ختم ہونے میں بھی اب اتنا وقت نہیں رہ گیا ہے۔ اگر یہی بات ہیرو، بجھل یا ابّا جان کے ذہن میں تھی تو یہ اُن کی خوش فہمی تھی۔ اتنی دیر میں انھیں اُس کے متعلق کوئی اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ وہ کتنا اُجڈ اور جنگلی ہے۔ لگتا ہے کہیں بھی بندھا نہیں ہے۔ اُسے تو بات کرنا بھی نہیں آتا۔ اُس سے اب کچھ بھی بعید نہ تھا۔ جانے کس وقت اُس کے من میں کیا سما جائے۔

بہر حال میں نے طے کر لیا تھا کہ وہ تینوں مزید خاموش رہے تو میں اُسے بتا دوں گا۔ چاہے بعد میں ہیرو اور بجھل مجھ سے کتنے ہی ناراض ہو جائیں مگر بر وقت مجھے ہوش آ گیا۔ میری زبان بہکتے بہکتے رہ گئی۔ یکایک مجھے خیال آیا کہ میں اُسے کیا بتا سکوں گا۔ صرف یہی کہ ہیرے حویلی میں ہیں۔ سرغنہ کے اس سوال کا جواب میرے پاس کیا ہے کہ وہ حویلی کے کون سے گوشے میں چھپائے گئے ہیں۔ یہ تو ابّا جان بھی نہیں جانتے۔ رات کو ابّا جان سے تھیلی لے کے صرف ہیرو اور بجھل باہر گئے تھے۔ یہ دہی جانتے ہیں کہ انھوں نے تھیلی کہاں محفوظ کی ہے۔ اُن کے سوا کوئی کچھ نہیں جانتا۔ کمرے میں واپس آ کے انھوں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا، نہ کسی نے اُن سے یہ پوچھنا ضروری سمجھا تھا۔ میرا گمان ہے کہ وہ سبزہ زار کی طرف گئے تھے اور اُنھوں نے تھیلی کسی درخت، گملے، جھنڈ یا جھاڑی میں کسی ایسی جگہ چھپائی ہو گی جہاں کسی کو شک نہ ہو سکے مگر یہ میرا گمان ہی تھا۔ میں اُن کے پیچھے پیچھے نہیں گیا تھا۔ پورے یقین سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے، انھیں عمارت ہی میں کوئی زیادہ محفوظ جگہ مل گئی ہو۔ سو میرے اس انکشاف سے کون سی مشکل دور ہو سکتی تھی۔ باقی تو سب اُنھی پر منحصر تھا۔ شاید ابّا جان کی خاموشی کی بھی یہی وجہ تھی کہ بجھل اور ہیرو کے تائیدی اشارے کے بغیر یہ اعتراف بے معنی تھا۔ وہ بھی اتنا ہی بتا پاتے جتنا میں۔

مگر بجھل اور ہیرو کیوں یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ انھیں تو ایسی چیزوں سے کبھی رغبت نہیں رہی۔ تبت سے واپسی پر فیض آباد میں ابّا جان نے اشارۃً انھیں پیش کش کی تھی کہ اگر وہ پسند کریں تو تبت سے لائے ہوئے نوادر تقسیم کر لیں۔ بجھل چاہتا تو اُن سے سبھی کچھ لے سکتا تھا۔ ابّا جان کچھ نہ بولتے لیکن صرف بجھل ہی نے نہیں، اُن سب نے ابّا جان کی پیش کش ہنسی میں ٹال دی تھی۔ پھر بجھل کو یہ کیا ہو گیا تھا۔ اب اُسے کون سی توقع تھی، کس موقع کی اُمّید۔ اس انتظار میں تو کوئی بھی ناقابلِ تلافی نقصان ہو سکتا تھا۔ اُسے کانتے کا بھی احساس نہیں تھا کہ وہ اب کس حال میں لوٹے گا۔ جتنی دیر ہو رہی ہے، کانتے کے لیے اتنا ہی بُرا ہو رہا ہے۔ میرے دست و بازو اینٹھے جا رہے تھے۔ سرغنہ نے ابّا جان کو ہدف بنا رکھا تھا۔ ابّا جان کا حُلیہ خاص طور پر اُس کے ذہن نشیں کرایا گیا ہو گا کیونکہ اُس نے ہم میں سے اُنھی کو منتخب کیا تھا، یا وہ اس گمان میں تھا کہ ہم زیادہ دیر تک ایک بوڑھے آدمی پر ستم برداشت نہیں کر پائیں گے۔ یہی ہوا، منیر علی چپ نہ رہ سکے۔ سرغنہ نے ابّا جان کے سینے پر مکّے کی ضرب لگائی تو منیر علی چیخنے لگے "ارے ظالمو! کچھ تو خدا کا خوف کرو، اتنے بزرگ آدمی پہ ہاتھ اُٹھاتے ہو۔ خدا کے لیے رحم کرو۔ خدا تمھیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔" منیر علی کی فریادی آواز پر وہ شخص اور برہم ہو گیا اور اُس نے لہجہ انداز میں اُنھیں متنبہ کیا کہ اپنی زبان کو لگام دیئے دیوار سے لگے کھڑے رہیں ورنہ وہ ابّا جان کی جگہ انھیں بلا لے گا۔ اُس نے اُن سے اور بھی بہت کچھ کہا جو منیر علی نے پہلے کبھی نہیں سُنا ہو گا۔ انھوں نے اپنا منہ چھپا لیا تھا اور بچّوں کے مانند ہچکیوں سے رونے لگے تھے۔ ہیرو اور بجھل تک دیکھا کیے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب انھیں اور کون سا نظّارہ مقصود ہے۔ میرے سینے میں یکایک آگ سی بھڑکنے لگتی تھی اور میرا دماغ بالکل ماؤف ہو جاتا تھا۔ کسی لمحے تو مجھے کچھ بھی دکھائی، سنائی نہیں دیتا تھا۔ ہیرو اور زورا مجھے ابھی تک جکڑے ہوئے تھے، ہر چند اُن کی گرفت میں پہلے جیسی سختی نہیں تھی۔ سرغنہ ابّا جان کے پیٹ میں مکّے مار رہا تھا۔ ابّا جان کو شدید تکلیف محسوس ہو رہی ہو گی۔ وہ اپنا پیٹ پکڑے دُہرے ہوئے جا رہے تھے۔ میں نے شعلہ بار نظروں سے بجھل کی جانب دیکھا، وہ گہری سانس بھر کے رہ گیا۔ اُس کے سُوجے ہوئے چہرے پر بے شمار لکیریں اُبھری ہوئی تھیں، اور اُس وقت مجھے احساس ہُوا کہ بجھل کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہیں۔ وہ بھی اُسے کیا اور کتنا بتا سکتا ہے۔ ہیروں کی موجودگی کے اعتراف کا مطلب تو یہ ہے کہ ابّا جان

کی حویلی کی طرف اُٹھی ہوئی نگاہوں کو اُن کے شک کی سند مل جائے۔ سردست وہ ہیروں کی تھیلی لے کے لوٹ جائیں گے لیکن بعد کی کیا ضمانت ہے کہ انھیں بھیجنے والوں کو قرار آجائے گا، وہ اسی پر اکتفا کرلیں گے اور اس کے بعد شہر کے دروازوں پر کھڑے ہوئے نگراں ہماری جانب سے آنکھیں بند کرلیں گے۔ ہیروں کے حصول کے بعد تو اُن کا تجسس اور بڑھ سکتا ہے اور وہ ہمارے لیے طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کرسکتے ہیں۔ نہ معلوم، تھیلی میں اور کون سے ایسے نادر ہیرے ہیں جو ہیروں کی پرکھ رکھنے والوں کو اضطراب میں مبتلا کردیں۔ ہمارا اقبال، اقبالِ جُرم کے مترادف بھی تو ہوسکتا ہے۔ کیا یہ نہ سوچا جاتا کہ جن لوگوں کی ریاست میں آمد اور موجودی پہلے ہی مشتبہ ہے، اُن لوگوں کی طرف سے یہ اقبال کیا گیا ہے۔ سلسلے ملانے والے تو دُور تک سلسلے ملائیں گے۔ سب سے پہلے تو انھیں بازار کے اڈّے سے ہماری وابستگی کا علم ہوگا جو ہوسکتا ہے، پہلے سے ہو۔ ہمارا سارا شجرہ جانے بغیر، ہمارے بارے میں ہر طرح سے مطمئن ہوئے بغیر وہ ہمیں یہاں سے کیوں جانے دیں گے۔ یہ اعتراف تو اپنی طرف مزید توجّہ دلانے کے مصداق ہوگا۔ اُسی زمین پر مزاحمت زیادہ کامیاب ہوتی ہے جہاں آدمی کی جڑیں ہوں۔ یہاں ہر سُو راجوں، نوابوں کی عمل داری ہے، وہ اتنے آدمی بھیج سکتے ہیں، صرف شک پر اتنا بڑا قدم اُٹھا سکتے ہیں، ایک ہیرے کے لیے اُن کی بے چینی کا یہ عالم ہے تو اب ہماری تحویل سے دست یاب ہونے والے ہیرے دیکھ کے تو اُن کی نیندیں حرام ہوجائیں گی۔ شاد کام ہونے کے بعد تو اُن کی سرکشی کو اور توانائی ملے گی۔ اُن میں اتنی استطاعت اور ایسی دحشت ہے کہ ہم جہاں جہاں جائیں، اُن کے آدمی ہمارا سایہ بنے پھرتے رہیں۔ بچّھل کی خاموشی کا سبب یہی اندیشے ہوں گے۔ ہمیں ایک ہی وقت نہیں ٹالنا، آنے والے وقت کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ آنے والے دنوں کے تحفّظ کے لیے، ہمیں آخری لمحے تک انکار ہی کرتے رہنا تھا۔ یوں اپنی پسپائی کا اعتراف تو آخری لمحے میں بھی کیا جاسکتا تھا۔

میرے سر میں جیسے بہت سی گرہیں کُھل گئی تھیں۔ اس کے سوا اور کیا صُورت ہے کہ ہم سَرغنہ کو یقین دلانے کے لیے یہ منظر دیکھتے رہیں۔ چاہے ابّا جان کا لباس تار تار ہوجائے اور سرغنہ کی ضربوں سے وہ نیم جاں ہوجائیں۔ ابّا جان بھی اچھی طرح یہی کچھ سمجھ رہے تھے اسی لیے اس قدر استقامت سے یہ افتاد جھیل رہے تھے۔ اب یہی تھا کہ کانتے کے مانند ہم میں سے کوئی غُل مچا کے سَرغنہ کی توجّہ ابّا جان کی طرف سے دوبارہ ہٹا دے اور تھوڑی دیر کے لیے انھیں سکون مل جائے۔ ابّا جان پہلے تو جیسے تیسے اُس کے سوالوں کا جواب دیتے رہے۔ وہی سوال وہی جواب، لیکن پھر ابّا جان نے خاموشی اختیار کرلی۔ اُن کے سکوت اور ان کے عزم سے اتنا ضرور ہوا کہ سَرغنہ کا ہاتھ رُکنے لگا اور اُس پر کسی حد تک جھنجلاہٹ طاری ہو گئی تاہم جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آجائے یا اپنے منصب کا خیال آجائے، چند لمحوں کے تذبذب و تردّد کے بعد وہ چونک پڑا اور اُس نے فیصلہ کُن لہجے میں ابّا جان سے وہی تکرار کی۔ ابّا جان کی خاموشی پر وہ اور گرجنے لگا۔ "سالا گونگا ہوگیا ہے، بڈّھے!"

"ہم آپ سے کس طرح کہیں۔" ابّا جان نے بے چارگی سے کہا۔ "یہاں ہمارے پاس کوئی چیز نہیں ہے۔ ہم آپ کو اور کس طرح اطمینان دلائیں۔"

"وہ تو اب ہم خود کریں گے۔ اِدھر کا کونا کونا چھنوائیں گے پھر تم سے پوچھیں گے، اور دیکھو، ہم بولے دیتے ہیں، سالا مال یاں نکل آیا تو تم میں سے ایک کو بھی نئیں چھوڑیں گے۔"

"اِدھر کچھ نہیں ہے۔" بہت دیر بعد بچّھل نے زبان کھولی۔ اُس کی زبان اٹک رہی تھی۔ "اپنی بات کا یقین کرو، اتنی بڑی حویلی میں کدھر کدھر کھوجو گے۔ ہم قسم کھاکے بولتے ہیں، تلاشی سے کچھ نہیں نکلے گا۔ بے کار اپنا وقت کھوٹا کرو گے۔ اِدھر کچھ ہوتا تو ہم تم کو اتنی دیر کبھی نہ روکتے۔"

"ادھر کچھ نئیں ہے؟" سرغنہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

"نہیں ہے سردار۔" بچّھل نے دبی زبان سے کہا۔ "کتنی بار بولیں۔"

"مال ادھر ہی ہے۔" وہ پیر پٹخ کے بولا۔ "پہلے اگر تم ہماری بات سالا سیدھے سبھا مان لیتے تو ہم تمھاری جاناں معاف کردیتے پر اب تم کو سیدھا جہنّم میں بھیج کے جائیں گے، ہم یاں دیواراں، زمیناں ایک دم سب کھود کے ڈال دیں گے۔"

"ہم نے بول دیا ہے، آگے تمھاری مرضی۔" بچّھل نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "اور اگر اِدھر سے کچھ نہ نکلا تو تم ہم کو کیا دو گے؟"

وہ سٹ پٹا سا گیا۔ جواب میں اُس نے بچّھل کو گالی دی۔ بچّھل نے اُسے پھر تلاش سے باز رکھنا اور یقین دلانا چاہا کہ اس تگ و دو سے کوئی فائدہ نہیں لیکن وہ نہ مانا۔ بچّھل کے اصرار سے اُسے مشکوک ہو جانا چاہیے تھا۔ اِدھر ہیرو نے بھی بڑبڑاتے لفظوں میں اُسے یہی باور کرانے کی کوشش کی۔ یا تو وہ جان بُوجھ کے اُس کے تجسس کو ہوا دے رہے تھے یا بچّھل اور ہیرو، ہیروں کی تھیلی کسی غیر محفوظ جگہ رکھ آئے تھے مگر اُن سے اِس چوک کا امکان نہیں تھا۔ ہیرو کی دخل اندازی نے مہمیز کا کام کیا۔ سرغنہ نے اُسے جِھڑک دیا۔ ہیرو تلملا کے رہ گیا۔

"ٹھیک ہے سردار!" بچّھل نے شکست خوردہ سے لہجے میں کہا۔ "ایسا ہی ہے تو جاکے اوپر نیچے سارے کونے کچالے اچھی طرح ٹٹول لو۔ چھُپانے کو اِدھر نہ جگہ کی کمی ہے، نہ چیز کی۔ دیوار طاق، چولھا ہنڈیا، بکسے الماری، مسہری کرسی۔" بچّھل نے متعدد چیزوں کے نام لیے اور بولا۔ "جہاں جی کرے، جاکے دیکھ لو۔"

"اصلی جگہ کا نام بھی بولو۔"

"اصلی جگہ!" بچّھل نے ترشی سے کہا۔ "کون سی اصلی جگہ؟"

"وہی، جاں تم نے سالا مال دباکے رکھا ہے۔"

"تمھارے من میں شک جم گیا ہے، اپنے کو پتہ نہیں، وہ ابھی ہم کیسے نکالیں۔ بعد میں جو من میں آئے کرلینا پر پہلے تھوڑی اپنی بات ذرا تسلی سے سُن لو۔ ہم نے تم کو سب صاف صاف بول دیا ہے، لگتا ہے، تم نے کچھ بھی دھیان نہیں دیا۔ ہم کو خوب نظر آرہا ہے کہ تمھارے پاس بندوق بھی ہے، تمنچا بھی، آدمی کی بھی کمتائی نہیں ہے۔ اتنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک بندوق دس کو جام کرلیتی ہے اور تمنچا تو سالا پُورا جادو ہے۔ کھٹکا دبتے ہی آدمی اِدھر سے اُدھر ہوجاتا ہے۔ اپنے بابا نے پہلے ہی تم کو بولا تھا کہ ہیرے سالے جان سے بڑے نہیں ہوتے۔ ہم کو معلوم ہے، تمھارا ایک اشارہ اپنی جان کا فیصلہ کرسکتا ہے۔ تم سمجھتے ہو، اپنے کو کچھ بھی سُجھائی نہیں دے رہا ایسے میں تو آنکھیں اندھیرے میں بھی دیکھ لیتی ہیں، اس کے بعد بھی تم تلاشی لینا چاہتے ہو تو شوق سے لو۔"

بچّھل نے ایک ایک لفظ سنبھل سنبھل کے بولا تھا۔ سرغنہ نے غور سے سنا بھی تھا لیکن تلاشی کے ذکر پر وہ برافروختہ ہوا اور تلخی سے بولا۔ "تلاشی ہم ضرور لیں گے۔"

"کیا کرے گا سردار! ایک دم بے کار ہوئے گا۔" ہیرو نے تیزی سے کہا۔ "اپن کا بات ابھی مان لو۔"

سرغنہ نے دروازے پر کھڑے ہوئے آدمی کو فوراً اشارہ کیا۔ وہ دوڑتا ہوا اندر آیا تو سرغنہ نے کڑکتی آواز میں حکم دیا کہ عمارت کی ایک ایک جگہ کی تلاشی لی جائے اور کسی چیز کا خیال نہ کیا جائے، چاہے کچھ بھی توڑنا پڑے۔ ہمیں سُنانے کے لئے توڑنے پھوڑنے کے لفظ پر اُس نے خاص زور دیا تھا۔ ہم میں سے کسی نے احتجاج نہیں کیا پھر اُس نے کمرے میں موجود چار آدمیوں میں سے ایک کی جانب انگلی اُٹھاکے ہدایت کی کہ وہ بھی باہر چلا جائے۔ وہ دونوں دروازے پر پہنچ گئے تھے، اُس کی آواز پر رُک گئے۔ اُس نے انھیں جلد سے جلد اپنا کام نمٹانے اور اُس کے لیے دو دو تین تین آدمیوں کے گروہ بنانے کی تاکید کی۔ ابھی اُس کی ہدایتیں جاری تھیں کہ ہیرو نے جھجکتے ہوئے اُسے ٹوکا۔ "بولے تو اپن بھی ساتھ چلا جائے سردار؟ اِن کو تھوڑا آسانی ہوجائے گا۔ کام میں اِتّا دیری نئیں ہوئیں گا۔"

سرغنہ نے گھورتی نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ دروازے سے نکلتے ہوئے آدمی ہیرو کی آواز سُن کے ٹھیر گئے تھے۔ سرغنہ نے چیختے ہوئے انھیں سرزنش کی۔ اُن کے جانے کے بعد کمرے میں اُس سمیت چار آدمی رہ گئے۔ چند لمحوں تک وہ بہت مضطرب نظر آیا اور کمرے میں چاروں طرف نظر ڈالتے ہوئے اُس نے ایک اور آدمی کو تلاشی کے لیے باہر جانے کو کہا۔ اُسے احساس تھا کہ رات زوال پر ہے۔ جتنے زیادہ آدمی باہر ہوں گے، اتنی ہی جلد کام مکمل کرلیں گے۔ اُسے شامل کرکے اب کمرے میں اُن کی تعداد تین رہ گئی تھی۔ نفری کم ہوجانے پر وہ کچھ زیادہ ہی چوکنّا اور تیّار ہوگیا تھا۔ اُس کے باقی دونوں ساتھیوں کی بھی یہی کیفیت تھی۔ ایک دروازے کی طرف جاکے، دُوسرا اُس کے بالکل مخالف، دونوں مورچا سا بناکے کھڑے ہوگئے تھے۔ اُن دونوں کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں، سرغنہ کے ہاتھ میں تمنچا تھا۔ اُس نے ابّا جان کو شانے سے پکڑ کے گھسیٹ لیا۔ اُس وقت اُس کی حالت ایسی اضطراری تھی کہ ایک ذرا سی بدگمان آہٹ پر گولی چلا دے گا۔ اُس کی نگاہیں مُسلسل ہم پر منڈلا رہی تھیں بچّھل اور ہیرو شانے لٹکائے سمٹے کھڑے تھے۔ یقیناً وہ اُسے اپنی طرف سے اطمینان دلانا چاہتے تھے۔ میری رگیں اُس وقت پھڑک رہی تھیں۔

دیر تک خاموشی طاری رہی۔ سرغنہ نے اِس دوران ابّا جان سے بھی کوئی سوال نہیں کیا تھا نہ اُس نے انھیں ہمارے درمیان واپس بھیجا۔ انھیں اپنے قریب رکھنے میں اُس کی مصلحت سمجھ میں آتی تھی۔

"سردار! سردار!" کمرے میں یکایک ہیرو کی گھُٹی گھُٹی آواز گونجی۔ سرغنہ ہڑبڑا سا گیا۔ اُس نے جھٹ اپنا تمنچا ہیرو پر تان لیا۔ "اپن ابھی ایک بات بولے؟" ہیرو نے ہچکچاتے ہچکچاتے کہا۔

سَرغنہ کا مُنہ بگڑ گیا۔ ابھی اُس نے اجازت نہیں دی تھی کہ ہیرو اُلٹے لہجے میں بولا۔ "ابھی تھوڑا بیٹھنے کی اجازت دو، سالا کھڑے کھڑے ٹانگ کھوتا پڑا ہے۔"

"سیدھی طرح کھڑے رہو۔" سرغنہ نے گرج کے کہا۔

کرانے کے لیے اُن دونوں کی نگاہیں بالکلیہ اُسی کی طرف منڈلانے لگی تھیں کہ اِدھر سے میں نے درمیان میں پڑے ہوئے تمنچے پر جست لگائی۔ انھیں بھی تمنچے کا خیال آگیا تھا تاہم مجھ پر بندوق اٹھانے یا تمنچے پر قبضہ کرنے کے فیصلے میں انھیں ایک لمحاتی تامّل لازم تھا۔ اُدھر بٹھل کے شکنجے کی گرفت سے سرغنہ بلبلانے لگا۔ اُن کی توجّہ اس طرف بھی منتشر ہوئی۔ انھوں نے مجھ پر بندوق اُٹھالی تھی مگر اس جانب سے شامو اور جمرد کے بڑھنے کی آہٹ بھی اُن کے کانوں میں پہنچی ہوگی۔ تمنچا کسی طور ہماری تحویل میں نہیں جانا چاہیے تھا۔ وہ دونوں پھر اُسی کی طرف لپک پڑے، پھر وہ اُسے فرش سے اٹھانے کے لیے جھکے ہی تھے کہ مارٹی، زورا، جمرد اور شامو نے انھیں مہلت نہیں دی۔ میرے جست لگاتے ہی وہ پیچھے سے اور اطراف سے اتنی تیزی کے ساتھ آئے کہ اُن دونوں کو سنبھلنے کا لمحہ نہ مل سکا۔ میں نے اس اثنا میں تمنچا فرش سے اُچک لیا۔ شامو تیزی سے جھکتا ہوا آیا اور سامنے آکے ایک آدمی کی بندوق کی نال پکڑے پکڑے سیدھا اُوپر ہوگیا۔ یہ شامو کی غلطی تھی، اُس نے زیادہ پھرتی دکھائی، بندوق چل گئی۔ کمرے میں زور کا دھماکا ہوا اور گولی چھت میں ترچھی ہو کے لگی۔ اُس کی آواز عمارت میں دوسری جگہوں پر بھی گئی ہوگی۔

بٹھل نے فوراً سرغنہ کے جسم سے اپنے بازو ہٹالیے، اُس نے اُسے جھٹکنے کے انداز میں ایک طرف کر دیا۔ سرغنہ بے تحاشا دروازے کی جانب بھاگا مگر وہاں بیرد موجود تھا۔ یہ دیکھ کے اُس نے کمرے کی دُوسری جانب رُخ کیا۔ میں اُس پر تمنچا چلا دیتا لیکن بٹھل نے تیزی سے میرے پاس آکے تمنچے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ میرے جی میں آئی بھی کہ گولی چلا کے ہی تمنچا اُس کے حوالے کروں لیکن میرے سامنے زورا نے سرغنہ کو پکڑ لیا تھا۔ زورا نے اُس کی پسلیوں پر پے در پے شدید ضربیں لگائیں۔ میں نے تمنچا بٹھل کو دے دیا۔

دونوں آدمیوں کو ایک کونے میں کھڑا کر دیا گیا۔ اُن کی بندوقیں مارٹی اور شامو کے پاس تھیں۔ شامو نے اپنی بندوق بیرد کے حوالے کر دی۔ جمرد، مارٹی، ٹنگو اور شامو اُن تینوں سے نمٹنے کے لیے بے قرار ہو رہے تھے۔ بیرد نے انھیں روکا۔ کسی وقت بھی اُن کے باقی ساتھی کمرے کی طرف لوٹ سکتے تھے اور اُن کی تعداد کم نہیں تھی۔ میں نے بٹھل سے باہر جانے اور کانتے کو دیکھنے کے لیے کہا لیکن وہ سر ہلا کے رہ گیا۔ ہمیں صحیح طرح سانس لینے کی بھی فرصت نہیں ملی تھی کہ باہر راہ داری میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں آئیں۔ بیرد کے اشارے پر کسی تاخیر کے بغیر مارٹی اور شامو دروازے کے اس طرف آڑ میں ہو گئے، دوسری طرف جمرد اور زورا کھڑے ہو گئے۔ اس مہلت میں یہی ہو سکتا تھا کہ دروازے کے سامنے سے ہٹ کر ہم سب جلد از جلد اِدھر اُدھر کی دیواروں سے چپک جائیں۔ گو ضروری نہیں تھا کہ آنے والے اُسی تیزی اور وحشت سے اندر داخل ہوں جو ہماری خواہش تھی۔ گولی چلنے کی آواز اگر اُن تک پہنچ گئی تھی تو انھیں پھونک پھونک کر ہی اندر قدم رکھنا چاہیے تھا۔ چاپوں سے آنے والوں کی تعداد زیادہ نہیں معلوم ہوتی تھی۔ زورا نے اشارہ کیا کہ کیوں نہ ہم دروازے سے نکل کے راہ داری میں اچانک اُن کے سامنے پہنچ جائیں، اس طرح وہ یقیناً متزلزل ہو جائیں گے۔ بے شک، یہ بھی ایک صورت تھی لیکن ہماری توقّع کے خلاف اگر وہ حوصلہ برقرار رکھتے تو ناچار ہمیں بے دریغ گولیاں چلانی پڑتیں، رات کے سناٹے میں دُور دُور تک آوازیں جاتیں اور حویلی کے مختلف کمروں میں اُن کے تلاشی لینے والے ساتھیوں تک بھی ضرور پہنچتیں۔ ذرا سا وقت مل جاتا تو اور کئی تدبیریں بھی نکل آتیں۔ باہر راہ داری میں ستونوں کے علاوہ بھی بہت سی ایسی جگہیں تھیں جن کی آڑ میں ہم اُن کا انتظار کر سکتے تھے۔ اُن کے کچھ آگے نکل جانے پر ہم عقب سے برآمد ہوتے تو انھیں کوئی حکم دینے ہی کی پوزیشن میں ہوتے۔ وقت ملتا تو ہم میں سے کوئی ایک اُن کا حُلیہ بنا کے کمرے کے دروازے پر کھڑا ہو جاتا تاکہ وہ اطمینان سے اندر آتے رہیں۔ اُن کی وضع قطع اختیار کرنا ایسا مشکل نہیں تھا۔ آنکھوں اور پیشانی کے سوا اُن سب کے چہرے ڈھکے ہوئے تھے۔ وہ اتنی آسانی سے شناخت نہیں کر سکتے تھے مگر اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ہم اندر کمرے ہی میں اُن کا انتظار کریں۔ گولی کی آواز سننے کے باوجود اُن کے ایک ساتھ آنے کا امکان نہیں تھا کیونکہ وہ حویلی میں مختلف دُوریوں پر تھے۔ یہ اطمینان بھی کم نہیں تھا کہ وہ ٹولیوں میں آئیں گے۔ ہم نے خیال رکھا تھا کہ باہر سے دیکھنے پر کمرے میں انھیں سامنے کچھ نظر نہ آسکے۔ اِس صُورت میں وہ کمرے کے اطراف کا جائزہ لینے کے لیے اندر ضرور جھانکیں گے۔ اُن کے ہاتھوں میں اُٹھی ہوئی بندوقوں یا تمنچوں کی نالیں بھی اُن کے جھانکتے ہوئے سروں کے ساتھ یا پہلے اندر آسکتی تھیں۔

مارٹی نے اپنی بندوق ٹنگو کی طرف اُچھال دی تھی تاکہ اُس کے دونوں ہاتھ آزاد رہیں اور بندوق کسی اُلجھن کا سبب نہ بن سکے۔ وہ اور زورا دروازے کے دونوں اطراف سب سے

ٓگے تھے۔ اُن کے برابر شامو اور جمرد۔ ابّا جان، منیر علی اور ٭ون ملازم، دروازے کے ساتھ والی دیوار کے دائیں جانب ٭ونے میں کھڑے تھے۔ بائیں جانب کے دوسرے کونے میں ٭ن تینوں آدمیوں کو ٹنگو بندوق کی زد پر لیے ہوئے تھا۔ اُس کے ٭یب بٹھل دیوار سے کچھ ہٹ کے تمنچا تانے کھڑا تھا اور اُس ٭ے مقابل، دوسری طرف بیرد بندوق لیے کھڑا تھا۔ میں بیرد کے ٭دیک تھا۔ اتنی دیر میں یہی کچھ ہو سکتا ہے۔

دروازہ کھُلا ہوا تھا۔ روشنی بھی انھیں باہر سے نظر آ رہی ہو ٭ لیکن ایسی خاموشی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ یہ سناٹا انھیں مشتبہ کر ٭تا تھا۔ یہی ہوا۔ دروازے کے قریب اُن کی لپکتی چاپیں یک ٭نت ٹھٹھر گئیں۔ ہم سانس روک کے کھڑے تھے۔ ہماری ذرا سی ٭ک سے سب کچھ حُباب کی طرح بکھر سکتا تھا۔ تین آدمیوں کے ٭دا اُن کے سارے آدمی باہر تھے اور سب کے سب مسلّح۔ بہرحال ٭وازے پر مارٹی، زورا پَر تولے کھڑے تھے۔ اُن کی آمد اس طرح شروع ٭ی کہ پہلے اُن کی بندوقوں کی نالیں اندر آئیں۔ مارٹی اور زورا نے ٭قف کیا۔ ہو سکتا ہے، اس توقّف کے لیے بیرد نے انھیں کوئی ٭ارہ کیا ہو۔ بندوقوں کے ساتھ آنے والوں کے سروں کا اندر آنا ٭ لازم تھا۔ مارٹی اور زورا کے لمحاتی تامّل سے نالیں اور اندر ہو ٭یں۔ انھیں بطورِ خاص یہ خیال بھی رکھنا تھا کہ نالوں کا رُخ عین ٭منے کی جانب رہے جہاں کوئی نہیں تھا یا نیچے فرش یا اوپر چھت ٭ جانب۔

٭ وہ دروازے پر تھے۔ یہ سوچ کر میرا ماتھا ٹھنکا کہ اگر اُن ٭ سے ایک اندر آیا یا اگر اُن کی تعداد تین ہوئی اور ایک باہر رہ گیا ؟ وہ چار بھی ہو سکتے تھے۔ دروازے سے بیک وقت دو ٭ی اندر آسکتے تھے۔ شاید بٹھل کے ذہن میں بھی یہی خدشہ اُبھرا ٭، وہ دوڑ کے مارٹی کے پاس دروازے کے قریب چپک گیا، ٭سے زیادہ سوچنے کے لیے اُسے وقت ہی کتنا ملا تھا۔ میرا دماغ ٭نے کہاں کہاں بھٹک رہا تھا۔ میں بھُول گیا کہ یہ بات بٹھل اور ٭د تو کیا، سبھی کے ذہنوں میں ہوگی کہ آنے والوں کی تعداد دو سے ٭دہ ہو سکتی ہے۔ اُن کی تعداد کتنی بھی ہو، کمرے میں رہتے ہوئے ٭ے پاس اور طریقہ بھی کونسا تھا۔ بٹھل عین وقت پر اس لیے نہیں ٭ا کہ اُس کے ذہن میں اُن کی کمی بیشی کا کوئی اندیشہ اچانک جاگ ٭تھا اور اس طرح وہ دروازے کے قریب رہ کے باہر رہ جانے ٭ن کا فوراً تعاقب کر سکتا تھا، وہ اپنی چاپوں کی گونج سے انھیں اندر آنے کے لیے اکسانا چاہتا تھا اور چونکہ وہ اُن کی نظروں سے اوجھل اندر ہی اندر مارٹی کے پاس آیا تھا اس لیے دروازے پر آنے والوں کا اندر کمرے کے متعلق تجسّس و تردّد فطری امر تھا لہٰذا دوسرے ہی لمحے اُن کے سر اندر تھے اور قدم بھی۔ مارٹی اور زورا تاک میں تھے۔ دونوں اتنی پھرتی سے اُن پر جھپٹے کہ وہ اپنے بڑھتے ہوئے قدم واپس نہ لے جا سکے۔ مارٹی اور زورا نے جست لگائی اور پوری طاقت سے اُن کے سر نیچے جھُکا کے انھیں گھسیٹتے ہوئے دُور لے گئے۔ اُن کی بندوقیں اُن کے جسموں تلے دب گئیں۔ اس عالم میں حواس قائم رکھنا مشکل تھا۔ مارٹی اور زورا کے بعد ایک ثانیے کے وقفے سے جمرد اور شامو بڑھ گئے تھے مگر باہر ایک تیسرا آدمی بھی تھا۔

مارٹی اور زورا دروازے سے ہٹے تو بٹھل نے اُن کی طرف ایک نگاہ دیکھنے کا وقت بھی صرف نہیں کیا، فوراً باہر کی طرف بھاگا۔ بیرد نے اُس کی پیروی کی۔ میں بھی لمحوں میں باہر آگیا۔ بٹھل نے چند قدم بعد ہی اُسے جا لیا۔ تیسرا آدمی اپنے دو ساتھیوں کو اس صورتِ حال سے دوچار دیکھ کے یا تو اُن کی مدد کے لیے اندر آسکتا تھا یا اُلٹے قدموں بھاگ جاتا۔ اُس نے دونوں کام کیے۔ پہلے وہ اندر آنا چاہتا تھا پھر بٹھل کو آتا دیکھ کے بھاگ کھڑا ہوا۔ اگر وہ سیدھا بھاگتا چلا جاتا تو اُس کے بچاؤ کی کوئی صُورت نکل آتی لیکن بھاگتے بھاگتے اُس نے پیچھے مڑ کے دیکھا، بٹھل اُس سے گنتی کے قدموں کی دُوری پر تھا۔ بٹھل کے ہاتھ میں تمنچا بھی اُس نے دیکھ لیا ہوگا۔ ہرچند وہ خود بندوق اٹھائے ہوئے تھا لیکن ہتھیار کے ساتھ حواس و اعصاب کی یک جائی اور درستی شرط ہے۔ بٹھل کے پیچھے اُس نے مجھے اور بیرد کو بھی دیکھ لیا تھا اور جس نے دفاع کی ٹھان لی ہو اُسے حملے پر آمادہ ہونے میں ایک ہی پل کا وقفہ تو چاہیے۔ بٹھل اُس کے سر پہ پہنچ چکا تھا۔ وہ بندوق کے ساتھ اپنی جگہ جم کے رہ گیا۔ بٹھل نے اُس سے کچھ کہا نہیں لیکن بٹھل کا یہ ارادہ شاید اُس نے بھانپ لیا تھا کہ دوسری صُورت میں وہ تمنچا ہی چلائے گا، اُسے فرار نہیں ہونے دے گا۔ اُس میں کم از کم اتنا ہوش باقی تھا۔

اُس کی بندوق میں نے لے لی۔ ہم ابھی کمرے میں نہیں جا سکے تھے کہ سیڑھیوں سے مزید آدمیوں کی آہٹیں سنائی دیں۔ بیرد دروازے کے قریب تھا۔ میری سمجھ میں یہی آیا کہ اُسے بیرد کی طرف دھکیل دوں۔ میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کے زور سے جھٹکا دے کے اُسے دھکیلا، بیرد نے دو قدم آگے آکے اُس کے کولھے پر

لات ماری۔ وہ دروازے کے اندر جا کے گرا۔ پیرو سامنے نہ ہوتا تو بھی وہ دروازے ہی سے ٹکراتا۔ اندر سے کسی نے جھٹ اُسے کھینچ لیا۔ پیرو بھی اندر چلا گیا۔ ہمارے پاس اندر جانے کا وقت نہیں رہا تھا چنانچہ ٹھل دروازے کے مقابل کھمبے کی اوٹ میں ہو گیا۔ میں نے نزدیک کے دوسرے کھمبے کا سہارا لے لیا۔ ٹھل کی نسبت یہ جگہ زیادہ محفوظ تھی۔ پیرو کی ٹھوکر اور دروازے کے فرش سے ٹکرانے کی وجہ سے اُس شخص نے ڈکرانا شروع کر دیا تھا اسی لیے سیڑھیوں سے آنے والوں کی رفتار میں تیزی آگئی تھی۔ انھوں نے سیڑھیاں اُتر کے احتیاطاً راہ داری میں اِدھر اُدھر ضرور دیکھا ہوگا۔ جب انھیں کوئی نظر نہیں آیا تو وہ سیدھے کھلے دروازے کی طرف لپکے۔ وہ بھی تین تھے۔ وہ دروازے میں داخل ہونا ہی چاہتے تھے کہ ٹھل نے دھیمی آواز میں انھیں ٹھیرنے کا حکم دیا۔ وہ اندر جاتے جاتے ٹھٹک گئے۔ پھر انھوں نے پلٹ کے دیکھا، ٹھل اور میں تمنچا اور بندوق تانے اُن کے سامنے کھڑے تھے۔ حیرانی کی ایک لہر کے بعد وہ سنبھلے تو کمرے کے اندر پیچھے سے جمرو اور شامو نے اُن کی گردنوں میں اپنے بازوؤں کا پھندا ڈال دیا اور اسی حالت میں اُلٹے قدموں انھیں اندر کھینچ لیا مگر تیسرا آدمی اُن کی زد پر نہیں آسکا تھا۔ وہ اُن دونوں کے پیچھے تھا۔ اپنے دو ساتھیوں کی چیخوں اور کراہوں پر اُس نے ہمارے سامنے سے مڑ کے دروازے کی طرف نگاہ کی، میں نے فوراً اُس پر بندوق کھینچ ماری۔ میں اتنی جلدی اُس تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہی ہو سکتا تھا کہ بندوق کی بٹ سے اُس کے سر کا نشانہ لوں۔ اتنی دیر میں وہ پلٹ پڑا۔ بندوق اُس کی کنپٹی پر جا کے لگی اور ٹھیک ہی لگی، وہ چکرا گیا۔ میں بندوق پھینک کے اُس کی طرف لپکا لیکن میرے پہنچنے تک وہ اپنی سُدھ بُدھ تقریباً کھو بیٹھا تھا۔

پھر میں اور ٹھل باہر ہی کھڑے رہے۔ پیرو بھی وہیں آگیا تھا۔ بار بار مجھے کانتے کا خیال آتا اور میرا دل ڈوبنے لگتا۔ کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ اُسے کون سے کمرے میں لے گئے ہیں۔ میں ٹھل کو دوبارہ ٹوکنا چاہتا تھا لیکن یہ سوچ کے چُپ رہا کہ ٹھل کو اُس کی فکر مجھ سے زیادہ ہوگی۔ ویسے بھی ہمیں ابھی یہاں سے نہیں ہٹنا چاہیے تھا۔ یہی تدبیر مناسب تھی جو ابھی اندر بھیجے جانے والے تین آدمیوں پر آزمائی گئی تھی۔ ہم تینوں مختلف کھمبوں کی آڑ میں کھڑے تھے اور ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ٹھل نے اس دوران اشارۃً مجھ سے کہا کہ میں بندوق کے کھٹکے پر انگلیاں ڈھیلی رکھوں۔ ٹھل کو اس تلقین کی ضرورت نہیں تھی۔ اتنی بات تو کسی حد تک میں جانتا تھا۔

آخری تین آدمیوں کے کمرے میں جانے کے بعد ایک [illegible] اٹھا تھا مگر اچھا ہوا، جلد ختم ہو گیا۔ ہم کھمبوں کی اوٹ میں [illegible] انتظار کرتے رہے۔ لمحے گزر گئے۔ راہ داری میں کسی جانب سے کوئی آہٹ نہیں اُبھری۔ ایک ایک پل ہمارے لیے پہاڑ تھا [illegible] چار پانچ منٹ ہمیں ساکت کھڑے ہوئے گزرے ہوں گے کہ راہ دا[ری] میں دائیں طرف سے پھر آہٹیں گونجیں، پیرو اور ٹھل نے بھی سُنی ہوں گی۔ اگر یہ کوئی ایک آدمی ہو سکتا تھا۔ اُس کی دبی ہوئی چاپیں بھی دوسروں سے مختلف تھیں، ایک مرتبہ اُٹھ کے معدوم ہو گئیں۔ چند ثانیے بعد چاپیں دوبارہ اُبھریں تو پہلے سے زیادہ واضح اور قریب تھیں۔ ضرور کوئی چھُپ کے اِس طرف آرہا تھا۔ یکایک پیرو کی مضطربانہ سرگوشی راہ داری کے در و بام میں سرا[سیمہ]

”دادا! یہ تم ہے!“

میں نے کھمبے کی اوٹ سے سر نکال کے دیکھا تو میری آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔ وہ کانتے تھا۔ پھر میں اپنی جگہ نہ ٹھیر سکا۔ چن[د] قدموں کا فاصلہ بجلی کی طرح طے ہوا۔ میں نے جب تک اُسے ہاتھوں سے ٹٹول کے اچھی طرح دیکھ نہ لیا، مجھے یقین نہیں آیا مجھے جانے کیسے کیسے وہم آرہے تھے۔ وہ کانتے ہی تھا۔ اُس کے چہرے، شانے اور ہاتھوں سے خون بہہ رہا تھا۔ کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ بکھرے بال، سارا چہرہ سوجا ہوا، خون میں لتھڑا ہوا لیکن اُس کی آنکھوں میں خون کے بجائے روشنی سی بھری ہوئی تھی۔ وہ اپنے پیروں سے چلتا ہوا آیا تھا اور اپنے پیروں ہی پر قائم تھا۔ اُس کے کندھوں سے دو بندوقیں لٹک رہی تھیں اور ہاتھوں میں دو تمنچے دبے تھے۔ میں نے اُسے بازوؤں [میں] بھینچ لیا۔

”وہ لوگ کدھر ہے؟“ پیرو نے بے تابانہ اُس سے پوچھا

”کمرے میں بند کر کے آیا ہوں حرام کے جنوں کو۔“

”ابھی کون سے کمرے میں ہے؟“

کانتے نے اُس کمرے کی طرف اشارہ کیا جہاں سے وہ لوگ مجھے، کانتے، زورا، جمرو، شامو اور مارٹی کو یہاں لائے تھے۔

”وہ سالا اُودر زیادہ شور تو نئیں کریں گا؟“

”دیر لگے گی دادا!“ کانتے نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔

کانتے سے مزید کچھ پوچھنے کا محل نہیں تھا۔ پیرو نے مجھ سے کہا کہ اُسے اندر کے کمرے میں لے جاؤں۔

”ہم کو اِدھر ہی رکھو دادا!“ کانتے نے منمناتے ہوئے کہا۔

”تم کو جیسا بولا ہے، ویسا کرو۔“

کانتے ٹھیرنا چاہتا تھا۔ اُسے کوئی جواب دینے کے بجائے پیرو نے حکیمہ لہجے میں مجھ سے کہا کہ اُسے جلد از جلد اندر دروازے تک پہنچا دوں۔ پیرو ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ راہ داری میں تا دیر ہمارا یوں کھڑا رہنا مناسب نہیں تھا۔ کانتے کو بھی اپنے پیروں پر اپنے دریدہ جسم کا اتنا بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے تھا۔ میں اُسے اندر لے آیا۔ کانتے کو دیکھ کے سبھی اُچھل پڑے اور چیخنے لگے۔ جامو، شامو، مارٹی اور مُنیر علی اُس کے گرد جمع ہو گئے۔ کانتے ہی نے انھیں ٹوکا۔ میں خود اُسے وہاں سے ہٹا کے بہ عُجلت اُس کونے میں لے آیا جہاں ابّا جان اور تینوں ملازم تھے۔ میں نے اُس کے کندھے سے بندوقیں اُتاریں اور ایک تمنچا اپنے پاس رکھ لیا۔ آستین سے میں نے اُس کا منہ صاف کرنے کی کوشش کی۔ خون ابھی تک چھلک رہا تھا۔ انھوں نے ضرور اُس کا چہرہ نوچا کھسوٹا ہوگا۔ یہ ناخنوں ہی کے کھرونچے ہو سکتے تھے۔ کانتے کو بہت تکلیف ہو رہی ہوگی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اُس کے لیے کیا کروں، کون سا مرہم لاؤں کہ اُس کے زخم فی الفور مندمل ہو جائیں۔ جی چاہتا تھا کہ اُسے اپنے سینے میں بھینچے رکھوں، اُس کی پیشانی، اُس کے گالوں کو خوب پیار کروں۔ ٹنگو اور زورا، سرغنہ اور اُس کے ساتھیوں کو سنبھالے ہوئے تھے۔ کانتے کو دیکھ کے اُن لوگوں کی آنکھیں بھی پھیل گئیں۔ میں نے باہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ پیرو اور ٹھل وہاں موجود ہی تھے۔ اِدھر جمرو، شامو اور مارٹی دوبارہ دروازے کے برابر دیوار کے ساتھ چپک کے کھڑے ہو گئے تھے۔ کانتے کا خون روکنے کے لیے مُنیر علی نے اپنا کُرتا پھاڑ دیا اور اپنے حاجیوں والے سر کے رومال سے اُس کے زخم صاف کرنے لگے۔ کانتے مسلسل اُٹھنے کی ضد کر رہا تھا۔ مان ہی نہیں رہا تھا، آخر ابّا جان کو اُٹھنا پڑا تب کہیں وہ چُپ ہوا۔ کانتے کی آمد پر ابّا جان جیسے بیدار ہو گئے تھے ورنہ وہ ننگے فرش پر کونے میں دیوار سے ٹیک لگائے گُم سُم بیٹھے تھے۔ کانتے اُٹھنے کی اتنی ضد کر رہا تھا مگر بیٹھتے ہی کراہنے اور بے سُدھ سا ہونے لگا۔ مُنیر علی نے اُسے فرش پر لٹا دیا اور اُس کا سر اپنے زانوؤں پر رکھ لیا۔ وہ کبھی اُس کا سر دباتے، کبھی بالوں میں انگلیاں پھیرتے۔ اُن کی تھپکیوں سے کانتے پر غشی طاری ہو جانی چاہیے تھی لیکن اُس نے آنکھیں بند نہیں کیں۔ وہ ابھی تک اپنے آپ سے لڑ رہا تھا۔ اتنے میں راہ داری سے پھر چاپوں کی گونج سُنائی دی۔ سب نے ایک دوسرے کو مستعد رہنے کے لیے اشارے کیے۔ میں بھی تمنچے کا رُخ دروازے کی سمت کیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ باہر ٹھل اور پیرو کو انھیں روکنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ دو تھے، دونوں سیدھے اندر آئے۔ جمرو اور شامو تیار کھڑے تھے۔ انھوں نے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ وہ اُن پر ٹوٹ پڑے۔

❀

کمرے میں اُن لوگوں کی تعداد گیارہ ہو گئی۔ چار آدمی کانتے بند کر کے آیا تھا۔ اب چند ہی آدمی باہر رہ گئے ہوں گے اور اگر وہ عمارت کے باہر نگرانی پر ہوئے تو انھیں قابو میں کرنا ایسا آسان نہیں تھا۔ آخری دو آدمیوں کے بعد ٹھل اور پیرو اندر آگئے اور انھوں نے اپنی جگہوں پر زورا اور جمرو کو باہر بھیج دیا۔ اندر آتے ہی ٹھل نے شامو کو ہدایت کی کہ وہ اُن لوگوں کے چہروں سے ڈھاٹے نوچ لے۔ شامو کے پیچھے ٹنگو بندوق لیے کھڑا تھا میرے اور ٹھل کے تمنچے کا رُخ بھی اُنھی کی طرف تھا۔ پہلے شخص نے کسی قدر مزاحمت کی، شامو نے اُچھل کے اتنی طاقت سے اُس کے پیٹ پر ہاتھ کی ضرب لگائی کہ اُس کی آواز بھی نہ نکل سکی۔ شامو نے اُس کے گلے میں اُنگلیاں گڑو دیں، وہ بُری طرح ہاتھ پیر پٹخنے لگا۔ باقی دوسرے آدمیوں کے لیے شامو کو یہ زحمت نہیں کرنی پڑی۔ کنارے پر کھڑا ہوا سرغنہ آخری آدمی تھا جس نے خود ڈھاٹا اُتارا، اُس کی شکل و صورت میرے تصوّر سے اتنی مختلف نہیں تھی اور تقریباً سبھی کی۔ اُن میں سے بیشتر کے رنگ سانولے تھے۔ کھرے اور پختہ رنگ۔ سب تیس سے چالیس کے لگ بھگ ہوں گے۔ ایک شخص کی چھوٹی سی داڑھی بھی تھی۔ باقی سب کی چھوٹی بڑی مونچھیں تھیں۔ اڈّوں سے اُن کا دور کا بھی تعلق نہیں ہوگا، نہ وہ شہر کے رہنے والے معلوم ہوتے تھے۔ اُن کے چہرے کھُردرے اور سخت تھے، بدن گٹھے ہوئے، قد اوسط یا پست۔ اپنی مخصوص وضع قطع اور طور طریق سے سب کسی ایک قبیلے یا کُنبے کے افراد لگتے تھے، شورہ پُشتی جن کا پیشہ ہو۔ عجب نہ تھا کہ وہ کسی رئیس کی جاگیر میں اسی کام پر ملازم ہوں یا باقاعدہ ڈکیت ہوں جن کی خدمات کسی راجا یا نواب نے حاصل کر لیں۔

ٹھل اور پیرو لمحوں تک اُن کے چہرے دیکھا کیے۔ پیرو بار بار پہلو بدلتا اور ٹھل کی طرف دیکھتا۔ کمرے میں بھن بھناتا سا سکوت چھایا ہوا تھا۔ سب منتظر تھے کہ ٹھل اُن کے متعلق کیا فیصلہ کرتا ہے۔

زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔"ابھی اور کتنے رہتے ہیں؟" معاً بٹھل کی آواز کمرے میں گونجی۔ اُس نے سرغنہ کی طرف مڑ کر کے پوچھا تھا۔ سرغنہ نے سُنی ان سُنی کر دی۔ کسی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ "ہم نے بولا ہے کہ ابھی باہر اور کتنے رہ گئے ہیں؟" بٹھل نے اونچی آواز میں دُہرایا۔

سرغنہ کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں۔ جواب دینے کے لیے اُس کے ہونٹ پھڑپھڑائے تھے لیکن پھر اُس نے خاموشی ہی مناسب سمجھی۔

"ابھی یہ جانگلی لوگ ایسا کیسے بولے گا بٹھل بھائی!" پیرو نے تلخی سے کہا اور لپک کے سرغنہ کے رُوبرو جا کے کھڑا ہو گیا۔ اُس نے اپنی بندوق اُتار کے میری طرف پھینک دی تھی۔

پیرو شاید سوچ رہا تھا کہ سرغنہ پر کون سی ضرب لگائے کہ بٹھل نے اُس سے کہا "ٹھیک ہے دادا! ابھی اس کو تھوڑا سانس لینے دو۔ اِدھر دوسرے لوگ کم نہیں ہیں۔ اِس کو اکٹھا ہی دیکھیں گے"

کسی قدر تذبذب کے بعد بٹھل کی بات جیسے پیرو کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ سرغنہ کے سامنے سے ہٹ کے اُس کے برابر کھڑے ہوئے آدمی کے مقابل ہو گیا اور وہی سوال دُہرایا۔ وہ شخص بے قراری سے سرغنہ کی طرف دیکھنے لگا۔ پیرو نے اُس کے بال پکڑ کے اُسے آگے کی طرف کھینچ لیا۔ میری نگاہ اُس وقت جانے کس طرف بھٹک گئی تھی۔ میں نے بس اُس شخص کو چیخ مارتے سُنا اور اُس کے قدم زمین سے اکھڑتے دیکھے۔ وہ فرش پر گر گیا۔ پھر وہ اُٹھ کے بھاگنا چاہتا ہی تھا کہ پیرو نے اُس کے سر پہ ٹھوکر ماری۔ اُس کے منہ سے عجیب بے ہنگم آوازیں نکلنے لگیں اور اُس کا سارا جسم فرش پر پھڑکنے لگا۔ پیرو کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اُسے ٹھوکریں مارتا رہے۔ پیرو کے چہرے پر خون جیسے دہک رہا تھا، ہاتھ پیر اکڑے ہوئے سے تھے۔ اُس نے بال پکڑ کے اُسے فرش سے اُٹھایا اور سرغنہ کی طرف دھکیل دیا۔ سرغنہ اور اُس کے ساتھیوں نے اُسے سنبھالا۔

جیسے ہی پیرو دوسرے آدمیوں کی طرف بڑھا، سرغنہ جلتی آواز میں بولا "ہم بتاتے ہیں، ہم بتاتے ہیں"۔ اُس نے مزید ردّ و قدح کے بغیر بتایا کہ اُس کے ساتھ چوبیس آدمی تھے۔ پیرو نے استفسار کیا کہ باقی آدمی کہاں کہاں تعینات کیے گئے ہیں؟ سرغنہ نے کسی قدر تامّل کیا، پیرو نے اُس کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا اور اس سے پہلے کہ اُس پر ہاتھ اُٹھاتا، وہ بول پڑا کہ دو آدمی ابھی عمارت ہی میں موجود ہیں۔ باقی پانچ عمارت کی چوکسی پر ہیں اور فصیلوں کے باہر ہیں۔

پیرو اُس سے کہنا چاہتا تھا کہ اگر اُس نے ذرا بھی غ[illegible] بیانی کی تو۔۔۔۔ مگر اُس کی بات ادھوری رہ گئی۔ بٹھل نے شا[illegible] کو تاکید کی کہ وہ ان سب کی تلاشی لے۔

"تلاشی کیسا بٹھل بھائی!" پیرو نے بھڑک کے کہا۔ "ابھی ان کا کپڑا ہی اُتار لیتا ہے نا۔ دیکھتا ہے، سالا کتنا چربی چڑ[illegible] کے آیا ہے۔"

شامو نے پہلے آدمی کی کمر سے بندھی ہوئی کارتوسوں کی پیٹی اُتا[illegible] لی، اُس کی جیبوں سے بھی چند کارتوس برآمد ہوئے۔ پیرو بھی شا[illegible] کا ساتھ دیتا رہا۔ تیسرے آدمی نے کچھ ہچر مچر کی، شامو نے پیچھے سے اپنی بندوق کی بٹ اُس کی ٹھوڑی پر ماری۔ اُس کے کئی دان[illegible] ٹوٹ گئے ہوں گے، آنکھیں تو ویسے ہی اُبل پڑی تھیں۔ اُس [illegible] کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک تمنچا بھی نکلا۔ دونوں نے چند منٹوں میں اُن کے کوٹوں سے چھپی ہوئی کارتوسوں کی پیٹیاں، مختلف جیبوں میں پڑے ہوئے کارتوس، دو تمنچے اور ہم سے ہتھیائے ہوئے چاقوؤں کے علاوہ اُن کے تین چاقو بھی برآمد کر لیے تھے۔ اگر سرغنہ کے بیان کے مطابق اُس کے دو ساتھی واقعی عمارت میں موجود تھے تو وہ دو وجوہ سے یہاں نہیں آ سکے تھے۔ یا تو وہ ابھی تک تلاش میں ہوں گے یا اُنھیں شروع ہی سے عمارت کے کسی حصے میں پاسبانی کے لیے تعینات کیا گیا ہو گا چنانچہ اُن کے یہاں آنے کا امکان نہیں تھا۔ ان کے سروں پر کسی کھٹکے کے بغیر ہمارا پہنچ جانا آسان تھا۔ بہرحال ہمارے لیے کم از کم اُن دو تک رسائی حاصل کرنا ضروری تھا۔ کسی طور بھی انھیں یہاں اپنے ساتھیوں کے ساتھ شامل ہونا چاہیے تھا۔

بٹھل نے کچھ دیر انتظار کیا۔ اس دوران وہ سرگوشیوں میں پیرو سے کچھ کہتا سنتا رہا، کوئی مشورہ کر رہا ہو گا۔ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اس وقت وہ کیسی کش مکش سے دوچار ہو گا۔ اُن سے کوئی رعایت نہیں کی جا سکتی تھی۔ خود اُنھوں نے اپنے لیے کوئی گوشہ نہیں چھوڑا تھا۔ اُن کے بارے میں بٹھل نے ہم میں سے کسی سے کچھ نہیں پوچھا۔ شاید اس لیے کہ اُسے ہمارا جواب معلوم تھا۔ سب کا ایک ہی جواب ہوتا اور وہ ہماری آنکھوں میں، ہمارے چہروں پر لکھا ہوا تھا۔ صبح ابھی دُور تھی لیکن لمحہ بہ لمحہ قریب آ رہی تھی۔ بٹھل اور پیرو کو اُن کے متعلق جلد کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ بٹھل نے اتنی دیر عمارت میں موجود دو آدمیوں کی ممکنہ واپسی کا انتظار کیا تھا یا اُسے اپنے خون کی حدّت کم کرنے کے لیے اس وقفے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہو گی۔ وہ پانچ آدمی بھی

اُس کی آنکھوں میں کھٹک رہے ہوں گے جن کے متعلق بتایا گیا تھا کہ عمارت کے اطراف لیکن فصیلوں کے اندر نگرانی کے لیے متعیّن ہیں۔ وہ سب کے سب مسلّح ہوں گے، اور اپنے ساتھیوں کی جلد واپسی کے منتظر۔ بٹھل نے شامو سے کہا کہ وہ سرغنہ کو اُس کے ساتھیوں کے درمیان سے آگے [illegible] آئے۔ اُس نے مزید دو آدمیوں پر انگلی اُٹھائی۔ شامو نے اُنھیں بھی سرغنہ کے ساتھ باہر کھینچ لیا۔ کسی تاخیر کے بغیر وہ اُن تینوں کو لے کے دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ بٹھل اور پیرو نے مجھے کوئی اشارہ نہیں کیا۔ اُنھوں نے میری طر[illegible] دیکھا ہی نہیں تھا لیکن جیسے ہی وہ سرغنہ اور اُس کے ساتھ[illegible] تمنچوں کی زد میں لیے دروازے سے باہر نکلے، میں بھی [illegible] پیچھے پیچھے ہو لیا۔ راہ داری میں آ کے پیرو ٹھیر گیا اور اُس نے سرغنہ کا شانہ تھام کے کہا "سنو، گیدڑ کا اولاد! اپن کا بات ابھی پورا دھیان سے سنو"

پیرو نے اُس سے کہا کہ ہمیں وہ دونوں آدمی فوراً درکار ہیں جو سرغنہ کی اطلاع کے مطابق اندر عمارت میں کہیں ہیں۔ سرغنہ جواب میں کہہ سکتا تھا کہ وہ تلاشی کے لیے گئے ہیں مگر اُس نے زبان سے کچھ نہیں کہا بلکہ اپنے تیوروں سے لاعلمی ظاہر کی۔ پیرو نے اُس سے دوبارہ نہیں پوچھا۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کے اُس کے جبڑوں پر پوری شدت سے ہتھیلیاں ماریں۔ سرغنہ کی آنکھوں میں اندھیرا اُبھر گیا ہو گا۔ پیرو نے اُس کی گدّی پکڑ لی۔ سرغنہ اپنا منہ پکڑے ہوئے تھا اور بات کرنا بھی اُس کے لیے مشکل ہو گیا تھا۔ اُس نے ہذیانی انداز میں راہ داری سے باہر دالان جانے والے راستے کی طرف ہاتھ اُٹھایا۔ گویا میرا قیاس درست تھا۔ وہ دونوں عمارت کے اندرونی حصّے میں مامور کیے گئے تھے اور تلاشی کے لیے نہیں نکلے تھے ورنہ وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کے مانند اب تک کمرے میں آ جاتے۔ اب ہم راہ داری میں کُھل کے نقل و حرکت کر سکتے تھے۔ بٹھل اور پیرو نے پھر بھی احتیاط کی، اُن کی نگاہیں ہر طرف منڈلا رہی تھیں۔ وہ چال میں بھی محتاط تھے۔ سرغنہ کے بارے میں ابھی شبہ کیا جا سکتا تھا کہ اُس نے کوئی فریب تو نہیں کیا، گو وہ اس کے نتائج سے بھی اچھی طرح آگاہ ہو گا۔ راہ داری کے اختتام پر دالان کی طرف جانے والا راستہ آگے جا کے مُڑ جاتا تھا۔ فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا۔ پیرو سرغنہ کی گدّی پکڑے پکڑے اُس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ سرغنہ کے ساتھیوں پر کسی دیوانے لمحے کے غلبے کے آثار ظاہر نظر نہیں آتے تھے تاہم میں اور بٹھل اُن پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔

دالان میں داخل ہونے کے لیے محراب نما راستہ کُھلا ہوا تھا۔ یہ دروازہ اُنھوں نے کسی اور طرف سے اندر آ کے کھولا ہو گا یا ملازم ہی بند کرنا بھول گئے تھے۔ ممکن ہے، بند ہی نہ کیا جاتا ہو۔ بہرحال عمارت میں داخلے کے لیے ایک ہی راستہ نہیں تھا، پیچھے سے بھی راستے تھے اور [illegible] ہوئے مختلف کمروں کے دروازے بھی دالان میں [illegible] ات کو بیٹھک کے دروازے ہی سے دالان [illegible] نے [illegible] ڈاکوؤں کے متعلق لوگ کہتے ہیں کہ عمارت میں گھسنے کے بعد پہلے [illegible] واپسی کے لیے مختلف راستوں کی طرف سے اطمینان کر لیتے ہیں۔ راہ داری کا ہر راستہ سیدھا اور آسان تھا۔ اُنھوں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر اسے کھلا رکھا ہو گا۔ حویلی کے مختلف راستوں سے آگہی کے لیے، ہو سکتا ہے، اُنھوں نے کسی ملازم سے بھی مدد لی ہو سب سے پہلے ملازم ہی اُنھیں ٹکرائے ہوں گے یا اُنھوں نے سب سے پہلے انھی تک پہنچنے کی جستجو کی ہو گی۔ اندر کمرے میں اباجان کے قریب موجود ایک ملازم کا شکستہ حال بتا رہا تھا کہ سب سے زیادہ وہی اُن کے جبر کا ہدف رہا ہے۔ اب تک اُس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔

پیرو محرابی دروازے سے باہر نہیں نکلا، اندر ہی ایک قدم پیچھے رُک گیا۔ اُس طرف روشنی بھی چھپلی چھپلی پڑ رہی تھی لیکن باہر دالان میں روشنی کم نہیں تھی۔ پیرو نے بُدبُداتے ہونٹوں سے سرغنہ کو کوئی حکم دیا تھا۔ یقیناً اُن لوگوں نے واپسی کے وقت ایک دوسرے کو جمع کرنے یا کسی ہنگامی ضرورت کے وقت اُنھیں انتباہ کرنے کے لیے کچھ اشارے ضرور تجویز کیے ہوں گے۔ پیرو نے یہی کہا ہو گا۔ سرغنہ نے پھر تذبذب کیا، پیرو نے اُس کی گدّی پر چٹکی کی گرفت اور سخت کر دی۔ سرغنہ کھڑے کھڑے پیر پٹخنے لگا۔ دالان کے سکوت میں اُس کی کراہوں سے ارتعاش سا ہو گیا تھا۔ باہر سے کسی کے اِدھر اُدھر لپکنے کی آہٹیں سنائی دیں۔ یہ کراہیں سن کے ارد گرد موجود آدمیوں کو بے چین ہو جانا چاہیے تھا۔ گمان تھا کہ تجسّس میں وہ اچانک سامنے بھی آ سکتے ہیں مگر وہ نہیں آئے۔ پیرو دوبارہ سرغنہ کو اذیّت میں مبتلا کر سکتا تھا۔ پیرو یہی کچھ سوچ رہا ہو گا کہ دفعتہً سرغنہ کے دو ساتھیوں میں سے ایک نے سنسناتی ہوئی آواز میں پکارا "خیری خیری جے!" جواب میں چاپیں ہم سے کچھ اور قریب ہو گئیں۔ وہ کوئی ایک ہی آدمی ہو سکتا تھا۔ آواز کی سمت کے تعیّن میں اُسے کوئی اُلجھن پیش نہیں آنی چاہیے تھی اور اب یقیناً اُسے راہ داری کے محرابی دروازے کا جائزہ ضرور لینا چاہیے تھا۔ یہی ہوا۔ میں اور بٹھل پیرو سے چند قدم کے

فاصلے پر پہلے ہی اندھیرے کی اوٹ میں ہوگئے تھے، دونوں ایک ساتھ کیونکہ اندھیرا ایک ہی طرف تھا اور دوسری طرف کوئی آڑ نہیں تھی۔ وہ ایک ہی آدمی تھا۔ سب سے پہلے اُس کی نظر اپنے تینوں ساتھیوں پر پڑی جن کے چہرے کھُلے ہوئے تھے اور بندوقیں ہاتھ میں نہیں تھیں۔ "اِس سے بولو کہ یہ بندوق پھینک دے۔" پیرو نے سرد لہجے میں اُنھیں حکم دیا۔

آنے والے شخص نے بھی سُن لیا، اُس نے دہشت زدہ انداز میں اپنے ساتھیوں کو دیکھا۔ سرغنہ سر جھکا کے رہ گیا۔ اُس کے دونوں ساتھیوں نے بھی یہی کیا لیکن نووارد کے لیے اتنی جلد بندوق چھوڑ دینے کا فیصلہ دشوار تھا۔ وہ کچھ پیچھے ہٹ گیا۔ "اس کو بولو کہ بس ایک کھٹکے کی دیری ہے۔" پیرو نے درشتی سے کہا۔ وہ شخص بندوق تاننے پیرو کا نشانہ لینے کے لیے پھڑکنے لگا۔ اُس کی یہ بوکھلاہٹ توقع کے مطابق تھی، فوری ردِّعمل کا یہ لمحہ گزرنے کے بعد اُس کی سمجھ میں آجانا چاہیے تھا کہ وہ نشانہ صرف اپنے ساتھیوں کا لے سکتا ہے اور یہ بھی کہ اُس کے ساتھی کس مشکل میں گرفتار ہیں مگر وہ کچھ دیر فہم معلوم ہوتا تھا یا اُس کی قوتِ ارادی مضبوط تھی۔ اُس نے پیرو کے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ میں اور ٹھّل پیچھے ہونے کی وجہ سے اُس پر جھپٹ نہیں سکتے تھے۔ میں نے کمرے میں اُس کے ساتھیوں کی جیب سے برآمد ہونے والا چاقو پاس رکھ لیا تھا۔ میں اُس جگہ سے اُس کے پیروں یا ہاتھ کا نشانہ لے سکتا تھا مگر احتیاط لازم تھی ایسا نہ ہو کہ بدحواسی میں اُس سے بندوق چل جائے۔ ترچھے کھڑے ہونے کی وجہ سے نشانہ بھی بہت سنبھل کے لینا پڑتا۔ نشانہ چُوک بھی سکتا تھا کیونکہ اُسے قرار نہیں تھا۔ ہم کسی چُوک کے متحمل نہیں ہوسکتے تھے۔ ہاں ایک اور تدبیر بھی تھی کہ میں اپنی جگہ کے بجائے پیرو اور اُن تینوں کی عین پشت پر تیزی سے آکے نشانہ لوں لیکن میں ٹھہرا رہا۔ کسی قسم کا شور نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ باہر کی جانب تھا۔ شور سے عمارت کے اطراف بکھرے ہوئے اُن کے دوسرے مسلح ساتھیوں کے کان کھڑے ہوجاتے ورنہ پھر تمنچا چلانے میں کیا قباحت تھی۔ پیرو کسی لمحے بھی اُس پر تمنچے سے نشانہ لے سکتا تھا۔

پیرو نے ایک بار پھر اُسے حکم دیا، وہ اور پیچھے ہٹ گیا۔ اُس سے کچھ بعید نہ تھا کہ سامنے ہی سے ہٹ جائے یا اپنے باہر والے ساتھیوں کو مطلع کرنے کی نادانی کر بیٹھے یا کسی جانب بھاگ جانے کا سودا اُس کے دماغ میں سما جائے۔ اُس کا ایک ساتھی نہیں، تین ساتھی ہتھیار کے بغیر بے بسی کی حالت میں سامنے کھڑے تھے اور وہ دیر کر رہا تھا۔ پیرو کو اُس کی مخبوط الحواسی کا احساس ہوگیا تھا۔ اُس نے سرغنہ کے ٹخنے پر ایڑی ماری، اُدھر اُس نے اُس کی گدّی پر پہلے ہی چٹکی جما رکھی تھی۔ سرغنہ بلبلا پڑا۔ پیرو کو جلد ہی کچھ کرنا تھا۔ سرغنہ کو مزید شور مچانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی تھی۔ سامنے کھڑے ہوئے شخص کی آنکھیں پھٹی اور باہر نکل آئی تھیں۔ گویا اُسے اتنی دیر بعد صورتِ حال کا اندازہ ہوا تھا۔ سرغنہ اور اُس کے دونوں ساتھیوں کے چہرے ہمارے سامنے نہیں تھے۔ ہم نہیں دیکھ سکے کہ اُنھوں نے اُسے کیا اشارہ کیا تھا۔ اُن کی نگاہوں نے التجا ہی کی ہوگی جبھی اُس نے جھجکتے ہوئے بندوق اُن کے آگے پھینک دی۔ میں اور ٹھّل اسی موقع کے منتظر تھے۔ دونوں ساتھ ہی تیزی کے ساتھ اندھیرے کی اوٹ سے نکلے۔ میں نے جست لگا کے اُس کی بندوق اُٹھائی، ٹھّل نے اُس کا بازو دبوچ لیا۔ ہمیں نکلتا دیکھ کے وہ بے اختیار بھاگ کھڑا ہوا تھا لیکن دالان کی روشنی میں اُسے ہمارے ہاتھوں میں دبا ہوا تمنچا نظر آگیا ہوگا۔ وہ خود ٹھٹک گیا۔

"دوسرا کیدر ہے؟" پیرو نے ایک لحظے بھی توقف نہیں کیا۔ سرغنہ نے بھی تامل نہیں کیا۔ اُس نے حویلی کی پشت کی جانب اشارہ کردیا۔ اُدھر زنان خانے کا حصہ تھا۔ ہمیں اندر راہ داری کا سارا راستہ عبور کرنا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ واپس ہوتے ہوئے راہ داری کا دروازہ بند کرتا جاؤں، ٹھّل نے توجہ نہیں دی۔ ہم تیز قدموں سے اُنھیں ساتھ لیے راہ داری طے کرنے لگے۔ درمیان میں وہ کمرہ بھی پڑتا تھا۔ جہاں شامو، مارٹی، ابّا جان وغیرہ اور اُن کے باقی آدمی موجود تھے۔ کمرے کے کھمبوں کی آڑ میں جمرو اور زدرا مستعد کھڑے تھے، ٹھّل نے اُن سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ شخص بھی ہمارے ساتھ ساتھ آرہا تھا جس پر ابھی قابو پایا گیا تھا۔ اس مرتبہ ٹھّل اور میں، پیرو اور اُن چاروں سے کچھ آگے نکل آئے۔ پیرو تنہا اُن کے پیچھے رہ گیا تھا۔ یہ کوئی مناسب بات نہیں تھی لیکن کوئی غلطی کرنے سے پہلے وہ اپنے آگے چند گز کی دوری پر ہماری موجودگی نظر انداز نہیں کرسکتے تھے۔

اس طرف بھی زنان خانے میں ویسا ہی دروازہ بنا ہوا تھا جیسا مردانے کے دالان میں کھلتا تھا۔ یہاں روشنی زیادہ نہیں تھی۔ اندر اندھیرے کی اوٹ بھی دروازے سے کچھ دور تھی۔ ہم یہاں خود کو چھپاتے تو پیرو کو دروازے سے اور پیچھے ٹھہرنا پڑتا۔ پیرو نے پھر دروازے سے قریب ہونے کے لیے ہم سے آگے جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ وہی کیفیت تھی جو دالان کے دوسرے سرے کے مردانے دروازے پر تھی۔ اس بار بھی سرغنہ کے ساتھیوں میں سے ایک نے اُسے پکارا۔ اب کے اُس نے صرف ایک آدمی کا نام

لیا تھا، جمے کا۔ جما کہیں قریب ہی کھڑا تھا۔ وہ فوراً نمودار ہوگیا ابھی وہ دروازے کے سامنے نہیں آیا تھا، اُسے پکارتے وقت ہی ٹھّل نے ارادہ بدل دیا تھا۔ آخری لمحے میں ہم اندھیرے سے نکل کر اُن چاروں کے پیچھے آگئے تھے۔ جما پر پہلے تو وہی حیرانی طاری ہوئی۔ اُس کے نظر آتے ہی پیرو نے سرغنہ سے کہا۔ "اس کو بولو کہ سارے پٹاخے، پالتو اپن کے پاس ہیں، ایدر اندر اب کچھ بھی نہیں رہا ہے۔" پیرو کو اپنا حکم دہرانے کی ضرورت نہیں پڑی، جما زیادہ زُود حس، معاملہ فہم اور نظر کا تیز ثابت ہوا۔ ایک ہی نگاہ میں سارا معاملہ بھانپ گیا۔ آدمی آدمی میں فرق ہوتا ہے۔ کچھ یوں بھی اُسے فیصلہ کرنے میں آسانی ہوئی ہوگی کہ اُدھر دوسرے دالان میں تعینات اُس کا ساتھی خیری نامی شخص بھی اُن میں شامل تھا۔ اپنے ساتھیوں کے شانہ بشانہ اُس نے ہمارے چہرے بھی خوب دیکھ لیے تھے۔ ہم نے اپنے چہرے اُس سے چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ کھٹکا دبانے کی آہٹ پر ہم اُس کے ساتھیوں کی دیواروں میں اوجھل ہوجائیں گے۔

صبح اور قریب ہوگئی تھی لیکن اندھیرا گہرا تھا۔ وہ سترہ کے سترہ وہاں موجود تھے۔ جمرو اور زدرا اُن چاروں کو بھی یہاں لے آئے تھے جنھیں کانتے کمرے میں بند کرکے آیا تھا۔ اُن میں سے دو کی حالت نہایت ابتر تھی۔ بھویں خون میں ڈوبی ہوئی، کٹے پھٹے چہرے، کبھی شانے دباتے، کبھی پیٹ پکڑتے تھے۔ کانتے نے اُن کے سروں کو بھی زخمی کیا تھا۔ کانتے کو اُس وقت ہوش ہی کہاں ہوگا کہ وہ اُن پر ضربیں لگانے میں احتیاط برتتا۔ اُسے جیسے ہی موقع ملا ہوگا، اُس نے اندھا دُھند اُن پر بندوق گھمائی ہوگی یہی ایک لاٹھی اُس کے پاس تھی۔

ٹھّل، پیرو، شامو، مارٹی اُن کے مقابل چند قدموں کے فاصلے پر کھڑے تھے۔ جمرو اور زدرا کو ٹھّل نے راہ داری میں واپس بھیج دیا تھا۔ اُس طرف سے بھی چوکنا ہی رہنا چاہیے تھا۔ اندر کمرے میں سب کی نظریں ٹھّل اور پیرو پر جمی ہوئی تھیں۔ دونوں خاموش کھڑے رہے، ہمارے پیچھے بیٹھے ہوئے ابّا جان اور بیز علی بھی اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ کانتے بھی اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کمرے میں موت کا سا سکوت چھا گیا تھا۔ اُنھوں نے بھی اپنی کراہیں سینوں میں گھونٹ لی تھیں۔ سب بتوں کے مانند منجمد کھڑے تھے۔ دیر ہوگئی تو پیرو نے سنجیدہ آواز میں ٹھّل کو ٹوکا۔ "ابھی اِن کا کیا بنائے گا ٹھّل بھائی؟"

ٹھّل نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ "ہاں دادا!" ٹھّل کی آواز بھی جل رہی تھی۔ "ابھی اِنھی سے پوچھو، یہ حرام کے تخم کیا بولتے ہیں؟"

"یہ سالا ابھی کیا بولے گا ٹھّل بھائی! اِدھر باہر مٹی زیادہ سخت نہیں ہے۔ بولے تو اپن ابھی ان کا ایک ساتھ قبر بنا دے۔ سویرا ہونے سے پہلے اپن سب کو ایدر علاقے کے گھورے پہ بھی پھینک کے آسکتا ہے۔"

"اُستاد ٹھیک بولتے ہیں دادا!" شامو سے خاموش نہ رہا گیا۔ وہ غصّے سے لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ "ابھی اِنھی سے پوچھو دادا! بعد میں اِن سور کے بچّوں کو کوئی شکایت نہ ہو۔"

"شکایت بولنے کو ابھی یہ رہے گا کیدر۔"

"اِس نے بابا پر ہاتھ اُٹھایا تھا دادا! اپن کو حکم کرو تو ابھی اس کا دونوں ہاتھ کاٹ دے؟" مارٹی تلملاتے لہجے میں بولا۔ ٹھّل سنتا رہا اور اُس نے سرغنہ کو مخاطب کرکے پوچھا۔ "کیا نام ہے رے تیرا؟" سرغنہ پلکیں پٹ پٹا کے رہ گیا۔ ٹھّل نے اُس کے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا، بوجھل آواز میں بولا۔ "جانے دے، نام تو تُو نے خود نہیں رکھا ہوگا۔"

"معاف کردو نواب صاحب!" اُن میں سے کنارے پہ کھڑا ہوا ایک آدمی گڑگڑایا۔ "ہم کو معافی دے دو، بڑی غلطی ہوگئی ہے حضور نواب!"

"اپن کو ابھی نواب بولتا ہے ٹھّل بھائی!" پیرو زہرخند سے بولا۔ "سالا کیسا مداری ہے، ابھی معافی کو بولتا ہے۔"

"آپ لوگاں کو خدا کا واسطہ۔" ایک دوسرا آدمی عاجزی سے بولا۔

"اب خدا کو بیچ میں لاتا ہے۔" پیرو نے پھنکارتی آواز میں کہا۔ "معاف کرکے تم کو جانے دے، یہی بولتا ہے نا تم؟"

وہ شخص ہیجانی انداز میں سر ہلانے لگا۔

"تلاشی لے لیا ہے پورا تم نے؟"

"ہم کو معلوم ہوگیا ہے، یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔" وہ التجا آمیز لہجے میں بولا۔ "اب ہم کو کچھ نہیں چاہیے سرکار!"

"ابھی کیدر سے آیا تھا تم؟" پیرو نے اُس سے پوچھا۔

"کہیں سے بھی نہیں، ہم خود آئے تھے سرکار!" وہ ہاتھ جوڑ کے گھگھیایا۔ "ہم بالکل اندھے ہوگئے تھے۔"

"اور ابھی تم کیا سمجھتا ہے، اپن کو ابھی بھی تم اندھا ہی لگتا ہے۔ ابھی تمھارا آنکھ نکال کے باہر کرے گا تو سالا تم کو ایک

دم پورا دکھائی دے گا۔"

"ہم قسم کھاتے ہیں، ہم کو کسی نے نہیں بھیجا تھا۔"

"پھر بھترے کا جان کاری سیدھا اوپر سے ہوا تھا تم کو۔۔۔! ایسا ہی نا ہے" پیرو نے دہاڑتے ہوئے پوچھا" اُلو کا پٹھا، سالا، گرگٹ کا۔۔۔۔" پیرو سے خود کو روکا نہیں گیا۔ وہ مغلظات سنانے لگا۔ اُس کی آنکھوں سے چنگاریاں ٹپک رہی تھیں۔ بجّل کو کسی طرح اُس کے ہاتھ سے تمنچا لے لینا چاہیے تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اگر اُن میں سے کسی نے پھر کوئی چبلا پن کیا تو پیرو کو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔

"اپنے کو ایسی جلدی نہیں ہے دادا!" بجّل کے چہرے پر بھی آگ بھڑک رہی تھی۔ پیشانی سکڑی ہوئی، نتھنے پھولے ہوئے تاہم اُس نے ہاتھ اٹھا کے پیرو کو روکا اور دھیمے لہجے میں اُس سے کہنے کی کوشش کی۔" یہ بے سینگے نام تو کوئی بھی بول سکتے ہیں پر اپنے کو جان کے کیا کرنا ہے۔ ابھی سامنے اپنے یہی جھٹکے کرنے آئے ہیں کسی راجے نواب کے تھوکے۔ اپنے کو پہلے انھی کو دیکھنا ہے۔ پیچھے والے اپنے پالتوؤں کو کھوجنے ادھر ضرور ملیں گے۔ گندا خون ویسے زور نہیں مارتا۔ پر بھترے بھی تو اُن کے پاس نہیں پہنچے۔ اُس کے لیے اُن کو اس طرف آنا چاہیے۔ اُن لوگوں سے تب بات کریں گے۔ ابھی پہلے ان کا بولو دادا!"

"کیا بولے بجّل بھائی!" پیرو ذرا اکھڑ گیا۔ بھنچی ہوئی آواز میں بولا۔" ابھی ہو سکے تو انھیں ایدر کمرے سے نکل جانے کا حکم کرو، اپن ان کو زیادہ دیری۔۔۔۔" پیرو کے حلق میں جیسے کوئی چیز اٹک گئی تھی۔ بجّل کی طرف ایک نظر دیکھ کے وہ تلخی سے بولا" اپن ابھی زیادہ دیری نہیں ٹھیر سکتا۔"

"ہاں استاد! میرے دائیں طرف کھڑا ہوا شامو بھی بھرے لہجے میں بولا۔" اپنے کو بس تھوڑی دیر کھلا چھوڑ دو پھر جو من میں آئے کرنا۔"

"ہم۔۔۔۔ ہم آپ لوگاں کو مارنے کا ارادہ نہیں کیے تھے۔" وہی شخص یکایک بلبلاتی آواز میں بولا جس نے سب سے پہلے زبان کھولی تھی۔" ہم صرف بھترے کے لیے آئے تھے۔ یہ ہتھیار، بندوقاں خالی دکھاوے کے لیے لائے تھے۔ ہم کسی کو مارنا نہیں چاہتے تھے ہم کبھی کسی کا جان نہیں لیے نواب حضور! ہم خونی لوگاں نہیں ہیں، ہماری بات کا یقین کرو، جھوٹ بولیں تو اولاد سے جائیں۔"

"ان میں یہ سب سے بڑا کتا ہے استاد!" شامو بھنا کے بولا۔ "سنتے ہو تم، یہ حرامی اب کیا بولتا ہے۔ اپنے کو مار دیتے تو سالا کچھ چین آجاتا۔ سامنے بابا کی خواری دیکھنے کو تو نہ رہتے۔ یہ سور کا بچہ، اولاد کے لیے بولتا ہے۔ بابا پر ہاتھ اُٹھاتے ہوئے ان رنڈی کے جنوں میں سے کسی کو یہ دھیان نہیں آیا کہ وہ بھی ہم لوگ کے کوئی ہو سکتے ہیں۔" شامو کی آواز بھرانے لگی۔

بجّل نے پیرو کو نہ کوئی جواب دیا، نہ شامو کی دخل اندازی پر اُسے خاموشی کی تلقین کی۔ وہ ٹک ٹک کھڑا سب کچھ دیکھتا اور سنتا رہا۔ شامو کی مداخلت اُسے اور اُلجھانے کے مترادف تھی۔ شامو اُس کی جگہ ہوتا تب اُسے کچھ اندازہ ہوتا کہ اُن کے متعلق کوئی فیصلہ کرنا ایسا آسان نہیں ہے۔ صبح میں اب کچھ ہی دیر رہ گئی تھی۔ بجّل کو اُن کے بارے میں فوراً کوئی حکم سنانا تھا مگر کیسا حکم! وہی جو شامو کہہ رہا تھا یا جس کا اشارہ پیرو نے کیا تھا؟ خود اُس کا جی بھی انھی کی ہم نوائی کر رہا ہو گا مگر اس طرح کوئی فیصلہ کیسے کیا جا سکتا تھا۔ انھیں سخت سے سخت جسمانی اذیت بھی دی جا سکتی تھی۔ اُن سب کو انھی کے ہتھیاروں سے نیست و نابود بھی کیا جا سکتا تھا مگر کلیجے کی ٹھنڈک اور آبا جان پر کی گئی دست درازی کی تلافی یوں ممکن ہوتی تو بجّل کو اتنی دیر نہ لگتی۔ آنے والی گھڑیوں کی ضمانت بھی کسی فیصلے سے مشروط ہونی چاہیے تھی۔ پیرو اور شامو کو اُسے یاد دلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ بجّل بھی اس کمرے میں موجود تھا اور اُس کی یادداشت اُن سے کمزور نہیں تھی۔ سرغنہ کے ہاتھ سے کھایا ہوا طمانچہ اُس کے گال میں اب تک کسک رہا ہو گا۔ اُن کے اس طرح بے بس ہو جانے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ سامنے بس وہی ہیں۔ بجّل کو دیوار کے پیچھے بھی نگاہ رکھنی تھی۔ کوئی ایسا فیصلہ ہونا چاہیے تھا جو اُن کی واپسی کی جستجو میں دیوار کے پیچھے کھڑے ہوئے لوگوں کو بھی قابلِ قبول ہو اور دیوار کے پیچھے سبزہ زار میں پھیلے ہوئے پانچ اور فصیل کے باہر تعینات اُن کے دو آدمی ہی نہیں تھے۔ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ اُن ساتوں کے سامنے تو دو ہی راستے رہ جاتے۔ یا تو وہ اُلٹے قدموں بھاگ کھڑے ہوتے یا اپنے ساتھیوں کی تلاش میں عمارت کے اندر داخل ہونے کا ارادہ کرتے۔ وہاں راہ داری میں جبر دلور زورا اُن کا انتظار کر رہے تھے۔ بجّل کی نگاہ اُنھی سات پر نہیں ہو گی بلکہ اُن دوسروں پر بھی ہو گی جو نہ جانے کتنی دیواروں اور دریچوں کے پیچھے تھے۔

سرغنہ اور اُس کے ساتھی جیسے کسی عدالت میں فیصلہ سننے کے لیے مضطرب کھڑے تھے۔ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں لیکن اُن دو کے سوا کسی اور نے بجّل سے عاجزی [illegible]

ہو چکے تھے یا اُن کے خیال میں اُن کی خاموشی بجائے خود ندامت کا اظہار تھی۔ سرغنہ بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ کم از کم اُسے اپنے متعلق کوئی خوش فہمی نہیں ہونی چاہیے تھی لیکن اُس کی حالت قطعاً اُس شخص جیسی نہیں تھی جو اپنا نوشتہ پڑھ چکا ہو اور کوئی دلیل، کوئی جواز اور سوچنے کے لیے کچھ بھی نہ رہ گیا۔ ایسا نہیں معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اور چارہ نہ ہونے کی صورت میں اُس کے اندر غیرت، خودداری بے نیازی اور استغنا کا کوئی احساس بیدار ہو گیا ہے۔ اُس کی کیفیت اُس شخص سے مشابہ تھی جس پر کسی اچانک حادثے کے سبب سکتہ سا طاری ہو گیا ہو۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے صورتِ حال سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر یہ سب میرے قیاس تھے، اُس کے دل و دماغ پر کسی بھی کیفیت کا غلبہ ہو سکتا ہے۔ وہ نہ اتنا پُرسکون تھا، نہ اپنے ساتھیوں کی نسبت اُس کے چہرے پر غیر معمولی ہیجان نظر آتا تھا۔ وہ مزید پتھر ہوتا جا رہا تھا۔

کافی دیر بعد بجّل کے جسم میں جنبش ہوئی۔ اُس نے بھاری آواز میں پیرو کو مخاطب کیا۔" دادا! اپنا خیال ہے کہ پولیس کو بلا لیا جائے۔"

مجھے اپنے کانوں پر دھوکا ہوا۔" پولیس کو؟" پیرو نے چونک کے کہا۔

"ہاں پولیس کو!" بجّل سپاٹ لہجے میں بولا۔" ابھی وہی ان سے ٹھیک طرح بات کرے گی۔"

"تم کیا بول رہا ہے بجّل بھائی؟"

"دوسرے کے گھر میں ہے، ہتھیار، اوزار کے ساتھ، گنتی بھی اتنی ہے کہ دیکھ کے وردی والوں کے دیدے اُلٹ جائیں گے۔"

"پولیس بھی کس کا ہے بجّل بھائی! انھی کوٹھی، حویلیوں والوں کا ہے سالا۔ اور اُن کے ہاتھ میں دے کے ابھی کون سا۔۔۔۔" پیرو نے برہمی سے کہا اور عجیب نظروں سے بجّل کا چہرہ دیکھنے لگا جیسے بجّل نے کوئی بہت انوکھی بات کہہ دی ہو۔

"ابھی اتنا چوپٹ بھی نہیں ہو گا دادا! اپنے کو بھی شہر کے رستے تھوڑے بہت آتے ہیں۔ کون سا کدھر کو جاتا ہے۔ تھانا، کچہری، عدالت کی اِدھر بھی کمائی نہیں ہے۔ دروازوں پر اُن کے نام ایسے ہی کالے نہیں کیے گئے ہوں گے اور اِدھر نہیں تو اُدھر ٹیشن کے رستے میں بادشاہ سلامت کی جو کھٹ بھی پڑتی ہے" پیرو کو حیران و پریشان دیکھ کے اُس نے آہستگی سے کہا۔" ذرا دھیان سے اپنی بات سنو دادا!"

"بہت بہت دھیان سے سُن رہا ہے بجّل بھائی!" پیرو نے طنزیہ لہجے میں کہا اور تنک کے بولا۔" پر لگتا ہے، تم ابھی ایک دم دھیان سے نہیں بول رہا ہے۔"

بجّل کے لہجے میں بھی تندی آگئی۔" بعد کو پولیس کو شکایت بھی ہو سکتی ہے دادا! اپنا کام یہیں ختم ہو جاتا ہے، آگے اب اُن کا شروع ہو رہا ہے۔ اپنے کو اُدھر زیادہ بولنے کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی اور ہم ایسے ہاتھ میں نہیں تھما دیں گے۔ رسید کرا کے دیں گے، پکی، ٹھپا لگی۔ اپنا خیال ہے، اُدھر ہی یہ زیادہ ٹھیک رہیں گے۔ ابھی وہی سب آگا پیچھا اِن سے پوچھ لیں گے۔ کون سے کھونٹے پر بندھے ہیں اور ڈوری کدھر تک جاتی ہے، کس کا رات اِن میں زور کرتا ہے، شہر کے لوگوں میں بھی تو تھوڑا چرچا ہو کہ اِدھر بھترے والے کدھر کو بستے ہیں اور کون ان کا سب سے بڑا گراہک ہے۔ اودھر حویلی تک بات اٹکی رہی تو کہانی سالی پوری نہیں ہو گی، سمجھ رہے ہو دادا؟"

"برابر سمجھ رہا ہے بجّل بھائی!" پیرو نے بھن بھناتے ہوئے کہا کہ" ابھی اپن کیا بولے، یہی تمھارا حکم ہے تو ٹھیک ہے۔ لگتا ہے تم پولیس کو ایک دم بھول گیا ہے۔ ابھی اپن سے کچھ پوچھتا ہے تو" پیرو نے نہایت درشت لہجے میں اُس سے کہا کہ یہ ہمارے مجرم ہیں، ان سے ہمی کو نمٹنا چاہیے۔ پولیس تو اپنی اکھاڑ پچھاڑ میں لگی رہے گی تھوڑی دیر چرچا ہو گا پھر سب بھول جائیں گے۔ پولیس برسوں لگا دے گی پیرو نے انھیں پولیس کی تحویل میں دینے سے صاف انکار کر دیا۔

بجّل نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر پولیس کے لیے یہ چشم دید شہادت بھی کم ہے اور پیرو کے خیال میں اس کے باوجود پولیس حیل و حجت سے کام لے گی اور اِدھر اُدھر کے دباؤ میں آ جائے گی تو کیوں نہ وہ انھیں یہاں روک کے ابھی اسی وقت سیدھے کنگ کوٹھی کا رُخ کریں جہاں ریاست کا والی نظام سرکار رہتا ہے؟ وہیں جا کے زنجیر ہلائیں، پھر پولیس اپنا کام مستعدی سے انجام دے گی۔

"تم ضرور اپن سے ٹھٹول کرتا ہے بجّل بھائی!" پیرو نے جھنجھلاہٹ سے کہا" تم کیسا بولتا ہے؟"

"اپنے کو ابھی یہی سمجھائی دیتا ہے دادا!"

"تو ایسا بولو، بولو کہ تمھارا یہی حکم ہے۔"

"ہاں دادا!" بجّل نے زیرِ لب کہا" اپنی یہی رائے ہے۔"

"پر اپن کا ایک دم نہیں ہے، اب بھی۔۔۔۔ اب بھی بجّل بھائی! اپن بولتا ہے۔" پیرو نے بھڑکتی آواز میں کہا کہ بہتر ہے بجّل دوسرے کمرے میں جا کے کچھ دیر آرام کر لے۔ پھر شاید اُس کی سمجھ

میں آجائے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ مجھے حیرت ہوئی، اُس نے کسی
جھجک کے بغیر ٹھل کی دماغی حالت پر شبہے کا اظہار کیا اور کہنے لگا
"اپن کے پاس ابھی ایسا فالتو ٹیم نہیں ہے کہ روز تھانے کچہری جا
کے سالا حاضری بھرے گا۔" پیرو تیکھے لہجے میں بولا۔ "اپن اِن کو اِدھر
ہی دیکھے گا۔"

مجھے اندیشہ ہونے لگا کہ کہیں اُن کے درمیان اِس تکرار
سے کوئی گرہ نہ پڑ جائے۔ ہر چند کہ اِس کا امکان نہ ہونے کے برابر
تھا تاہم وہ دونوں ایک دوسرے کی بات نہیں سمجھ رہے تھے پیرو
کے لہجے میں ٹھل کے لیے ذرا بھی مروّت نہیں رہی تھی۔ میں نے
دخل دینے کا ارادہ کیا تھا مگر میں اُن سے کیا کہتا۔ دونوں ہی اپنی
جگہ کسی حد تک ٹھیک تھے۔

"ہم ہاتھاں جوڑ کے بولتے ہیں حضت! دوبارہ کبھی ایسا نہیں
ہوگا۔ ہم کو معاف کر دو سرکار!" ایک تیسرا آدمی گڑگڑا کے بولا۔
وہ سرغنہ کے برابر کھڑا تھا۔ سرغنہ نے اُسے پھیلی ہوئی آنکھوں سے دیکھا
مگر چپ رہا۔ گویا بولنے والے کو اُس کی تائید حاصل تھی۔ وہ شخص
بکھرے ہوئے لہجے میں ماں باپ، خدا رسول کی قسمیں کھانے اور
اپنے بال بچّوں کا واسطہ دینے لگا اور بولا کہ وہ ہمیشہ کے لیے ہماری
غلامی میں آنے کو تیار ہیں۔ یہ اور اسی قسم کی کئی بے سروپا باتیں۔
اُسے خود بھی احساس نہیں تھا کہ وہ کیا بک رہا ہے اور اُس کا
ہذیان کس حد تک ہم پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ بہرحال اِس سے یہ
ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ پولیس کے چکّر میں پھنسنا اپنے لیے زیادہ مہلک
سمجھتے ہیں۔

ابھی وہ یہ واویلا کر ہی رہا تھا کہ پیرو نے جھپٹ کے اُس
کا گریبان پکڑ لیا۔ "حرام زادے! تم ابھی معافی کا رونا لگاتا ہے۔ اپن
تم کو معاف کرے گا؟ اپن کو تم نے کیا سمجھا ہے؟ ایک دم اُلّو کا
پٹھا؟" پیرو نے پھنکارتے ہوئے اُسے آگے کھینچ کے بے تحاشا
مارنا شروع کر دیا۔ چند لمحوں میں پیرو نے اُس پر اتنی ضربیں
لگائیں کہ اُس کی چیخ پکار تک بند ہو گئی۔ کسی نے پیرو کو نہیں
روکا۔ ٹھل بھی خاموش کھڑا رہا۔ غصّے میں پیرو کے منہ سے کف
جاری ہو گیا تھا۔ معلوم نہیں اُس کے ذہن میں کیا تھا۔ سویرا ہونے
ہی والا تھا اور صرف ایک نہیں، سترہ آدمی سامنے تھے۔ پیرو ایک
ہی سے اُلجھا ہوا تھا۔ "اپن ان سب کو ابھی اِدھر ہی نمٹے گا اور
اُکھا دفن نہیں کریں گا۔" مارتے مارتے وہ ہانپنے لگا تھا۔

"دادا! دادا!" پیرو کا ہاتھ نہیں رُکا تھا۔ شامو نے سراسیمہ
آواز میں اُسے ٹوکا۔ "ٹھہر جاؤ دادا! اپنے کو استاد کا بات بھی
ٹھیک لگتا ہے۔ پولیس میں اِن کا تختہ ہو جائے گا۔ اوپر سے
رسّی کھنچے گی تو پولیس سالی ـــ"

پیرو پر دیوانگی طاری تھی۔ وہ شامو پر بگڑنے لگا۔ اُس
نے شامو کو بھی گالی دی اور بولا کہ اگر اُس نے اپنی زبان بند نہ
کی تو وہ اُسے بھی اُن لوگوں کے ساتھ کھڑا کر دے گا۔ "اِدھر بابا
بھی موجود ہیں۔" شامو نے اٹکتی زبان سے کہنے کی کوشش کی
"استاد کی بات تم کو نہیں جچتی تو ابھی بابا سے ہی پوچھ لو۔"

پیرو کا ہاتھ رک گیا۔ اُس نے پلٹ کے مضطرب نظروں
سے ابّا جان کو دیکھا اور بوکھلائے ہوئے لہجے میں پوچھنے لگا
"ہاں بابا! ابھی تمھی بولو، اصلی مجرم یہ تمھارے کا ہی ہے۔"

ابّا جان گُنگ کھڑے رہے۔ پیرو نے پھر تپتی آواز میں
پوچھا "کیا ان کٹ کھنوں کو پولیس کے حوالے کر دے؟ تم ان کو
ایسا جانے دے گا!" ابّا جان کے تذبذب پر اُس نے تیز و تند لہجے
میں اُنھیں اطمینان دلایا کہ اگر اُن کی مرضی بھی یہی ہے تو وہ سامنے
سے ہٹ جائے گا

ابّا جان کی دہشت زدہ نظریں ٹھل پر منڈلانے لگیں۔ ٹھل
نے جواب میں انھیں کوئی اشارہ نہیں کیا تھا۔ ابّا جان کے ہونٹ پھڑک
رہے، وہ کچھ کہہ نہ سکے۔ منیر علی اُن سے کچھ فاصلے پر کھڑے تھے انھوں
نے ابّا جان کے پاس آ کے اور اُن کی کمر پر ہاتھ رکھ کے سرگوشی
کے انداز میں کوئی آیت پڑھی۔ ابّا جان کے شکستہ جسم میں ایک
ثانیے کے لیے لہر سی اُٹھی، مگر دوسرے ہی لمحے وہ اور نڈھال اور
شکست خوردہ نظر آنے لگے۔ ٹھل کے سوا سب کی نگاہیں اُنھی پر
جمی ہوئی تھیں۔ یکایک منیر علی دبی آواز میں بولے۔ "ممکن ہو تو
انھیں معاف کر دو پیرو بھائی!"

پیرو اُن کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ "تم ....تم کیا بولتا ہے بڑے
صاحب!" وہ ہکلایا پھر بگڑے ہوئے منہ سے کہنے لگا۔ "اپن ابھی
بابا سے پوچھتا ہے۔" ابّا جان بے سدھ کھڑے رہے۔ پیرو نے چلّاتی
آواز میں اُن سے دوبارہ پوچھا۔ ابّا جان پر کئی رنگ آ کے گزر گئے
اُنھوں نے سر جھکا کے بمشکل اتنا کہا۔ "ہاں بھائی! شاید یہی مناسب
ہے۔" اُن کی آواز جیسے کہیں دور سے آ رہی تھی۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات
چوتھے حصے میں ملاحظہ فرمائیے

سب رنگ ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ

بازی گر

چوتھا حصّہ

بازگشت

پیرو اُن سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ منیر علی تیزی سے بولے۔ "خدا ہمیں اِس کا اجر ضرور دے گا۔ یہ خدا اور رسول کا واسطہ دے رہے ہیں۔ شاید ہمارا یہی سلوک اِن کے قلوب بدلنے کا سبب بن جائے۔" منیر علی جانے کیا کیا کہتے رہے۔

پیرو کے شانے جھک گئے۔ اُس کی شعلہ بار آنکھیں بھی جیسے بجھ گئیں۔ چند لمحے وہ ساکت کھڑا رہا، پھر اُلٹے قدموں پیچھے ہٹ گیا اور کمرے سے نکل گیا۔

❦

باہر راہ داری میں روشنیاں دھندلانے لگی تھیں۔ صبحِ کاذب کا وقت ہوگا۔ وہ اتنی تیزی کے ساتھ کمرے سے نکلے تھے جیسے صدیوں سے ہماری قید میں ہوں۔ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے وہ راہ داری میں اندھا دھند بھاگے تھے۔ دروازے سے بھی وہ ایک ہی وقت میں ایک ساتھ نکل جانا چاہتے تھے۔ اُن کی بندوقیں خالی کر کے اُنھیں لوٹا دی گئی تھیں۔ چار تمنچے چھوڑ کے باقی تمنچے بھی اُنھیں واپس کر دیے گئے تھے۔ راہ داری سے وہ چبوترے پر آئے تو اُن کی رفتار اور تیز ہوگئی۔ اندر عمارت کی نسبت باہر سبزہ زار میں اندھیرا اور گھٹا ہوا تھا۔ اُن کی بھگدڑ کی آوازیں اِدھر اُدھر چھپے ہوئے اُن کے پانچ منتظر ساتھیوں تک بھی پہنچ گئی ہوں گی۔ شاید اسی لیے اُنھوں نے نہ کوئی اشارہ کیا تھا، نہ صدائیں بلند کی تھیں۔ یقیناً وہ اُنھیں بھول تو نہیں گئے ہوں گے۔ اُن کا رُخ سیدھا صدر دروازے کی طرف تھا۔ ہم بھی اُن کے پیچھے تمنچے تانے لپکتے رہے تھے لیکن ہم دالان کے چبوترے سے آگے نہیں گئے۔ مَیں نے اِسی اثنا میں دو بندوق بردار آدمیوں کو صدر دروازے کے بائیں طرف پھیلے ہوئے سبزہ زار میں درختوں کی اوٹ سے نکلتے دیکھا تھا مگر روشنی اتنی نہیں تھی کہ وہ ہمیں صاف نظر آسکتے۔ عمارت سے بھاگنے والوں نے چبوترے سے صدر دروازے کا فاصلہ آناً فاناً طے کیا تھا اور آخر میں صرف ایک بار ہمیں مڑ کے دیکھا تھا۔ اتنی دیر بھی اُنھیں اپنے زخمی ساتھیوں کی وجہ سے لگی۔ اُن میں سے دو سہارے کے بغیر نہیں چل سکتے تھے۔ کچھ دیر پہلے پیرو نے

جس شخص پر ضربیں لگائی تھیں، اُس کی حالت بھی بہت ابتر تھی۔ صدر دروازے کے قریب پہنچ کے وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے اور سناٹے میں لمحوں تک اُن کے بھاگتی چاپوں کی گونج سنائی دیتی رہی۔ شامو نے کمرے میں اُن کے نکلنے سے پہلے ابّا جان سے اجازت مانگی تھی کہ اُنھیں کسی نشانی کے بغیر نہیں جانے دینا چاہیے جمر وادر مارٹی نے بھی اشارۃً ابّا جان سے یہی اصرار کیا تھا۔ اُن کی مراد تھی کہ کم از کم اُن سب کی ناک چاقو سے کاٹ دی جائے۔ یہ سن کے ابّا جان خاموش رہے، اُن کے چاقو جیبوں سے نہ نکلے۔ البتّہ کمرے سے سرغنہ اور اُس کے ساتھیوں کے باہر آتے وقت جو بھی مارٹی اور شامو کے سامنے آیا، اُسے اُنھوں نے ٹھوکروں اور لاتوں سے بے دریغ ہنکایا۔ بندوقیں اُنھیں واپس کی جا چکی تھیں۔ کمرے میں پڑی ہوئی چھوٹی تکونی میز ٹنگو کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ اُس نے اُچھل اُچھل کے اُسی سے اُن کی کمر اور کولھوں کو نشانہ بنایا۔ زورا نے اتنی تیزی سے ایک آدمی کے سر سے اپنا سر ٹکرایا تھا کہ خود اُس کے سر میں بھی گومڑا پڑ گیا ہو گا۔ کسی نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ کمرے سے نکل کے وہ بس بے تحاشا بھاگتے رہے۔ اُن کی اس حواس باختگی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ صبح ہونے والی تھی۔ ہمارے لیے بھی یہی بہتر تھا کہ وہ اندھیرے ہی میں یہاں سے نکل جائیں اور جتنی دور جا سکتے ہوں، چلے جائیں۔

✿

کچھ دیر پہلے ہلکی ہلکی پھوار پڑی تھی، جھلّا سا۔ درختوں کے پتے اور سبزہ بھگوتی ہوئی بادل کی ٹکڑیاں پلک جھپکتے میں غائب ہو گئی تھیں اُن کے جاتے ہی چبوترے اور سبزے پر دھوپ اتر آئی تھی، گہری چمکیلی دھوپ لیکن ایسی تیز نہیں تھی۔ حیدر آباد کی دھوپ ویسے بھی نرم ہوتی ہے۔ اُس وقت دس بجے ہوں گے۔ سبھی سبزہ زار پر آ کے بیٹھ گئے تھے۔ ابّا جان کے آ جانے سے اُن کی کمی بھی پوری ہو گئی۔ کانتے بھی وہاں موجود تھا۔ اُس کے ماتھے اور ہاتھ پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں ابّا جان کے چہرے پر بھی جگہ جگہ ہلدی کے دھبّے پڑے تھے۔ اُن کا سارا ہی چہرہ سوجا ہوا تھا۔ ادھڑے ادھڑے سے ہونٹ، کٹے پھٹے گال، کسی تکلیف کے آثار بظاہر نظر نہیں آ رہے تھے لیکن انھیں اپنی تکلیفیں چھپانے کا خوب ملکہ تھا۔ ٹھّل آرام کرسی پر پاؤں پھیلائے بیٹھا حقے کی منال چوس رہا تھا۔ سب دُھلے دھلائے اُجلے اُجلے لگ رہے تھے۔ گو سبھی کی آنکھیں بوجھل تھیں اور جسم بھاری بھاری، اُن لوگوں کے جانے کے بعد کوئی بھی ایک لمحے نہیں سویا تھا۔ ٹھّل کے کہنے پر اُس وقت سبھی اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے لیکن نیند کسی کو بھی نہیں آئی۔ صبح ہونے میں وقت بھی کتنا رہ گیا تھا۔ جیسے ہی دن نکلا، سب نہا دھو کے باہر آ گئے۔ ٹھّل اور پیرو دالان میں کرسی بچھائے وہاں پہلے سے موجود تھے، انھیں یوں قریب بیٹھے دیکھ کے اب شاید کسی کو کوئی حیرت نہ ہوئی ہو۔ علی الصباح اُن لوگوں کو صدر دروازے سے جاتا دیکھ کے ہم اندر آئے تھے تو پیرو اندر داخل ہوتے ہی ٹھّل کے گلے سے لگ گیا تھا اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اُس وقت مجھے شائبہ تک نہیں ہوا تھا۔ غالباً کسی کو بھی گمان نہ ہو گا کہ یہ سب کچھ عمداً تھا اور ٹھّل کے اشارے پر تھا۔ اسی طرح اُن پر یہ تاثر قائم کیا جا سکتا تھا کہ اُنھیں چھوڑ دینے کا فیصلہ کسی سوچے سمجھے ارادے سے نہیں بلکہ حادثاتی ہے۔ اُن کی قسمت اچھی تھی کہ ہمارے درمیان دو بزرگ موجود تھے اُنھیں اچھی طرح جتا دیا گیا تھا کہ اُن کی سزائیں کتنی سنگین اور شدید ہو سکتی ہیں ہمارے مابین اختلاف کے بعد ہی اُن پر ایسا کوئی تاثر قائم ہو سکتا تھا ابّا جان اور منیر علی کا فیصلہ سُن کے اُنھیں خوف تھا کہیں دوسرے ہی لمحے ہم میں سے کسی کے سر میں کچھ سما نہ جائے۔ کوئی بھی سرکشی پر آمادہ ہو سکتا ہے، بزرگوں کی پاس داری بھی ایک حد تک ہوتی ہے۔ اسی لیے واپسی کے وقت اُنھیں ایسی وحشت تھی۔ انھیں یہ خیال نہ ہوا ہو گا کہ ہمارے پاس انھیں یوں چھوڑ دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ہم نے تو ایک طرح سے اُن کی حفاظت کی تھی کہ وہ اپنے پیروں پر واپس جائیں اور اُن کے جسم ضربوں کے نشانات سے محفوظ رہیں۔ یہ نشانات ہمارے راستے میں نہ جانے اور کیسی کیسی دیواریں حائل کر سکتے تھے۔

جن تین ملازموں کو رات اُنھوں نے سب سے پہلے اپنے حصار میں لیا تھا، اُن میں سے دو سبزہ زار میں مصروف تھے۔ ایک کے سر پہ پٹّی بندھی ہوئی تھی، دوسرا کسی قدر بہتر تھا۔ تیسرے کی حالت کچھ زیادہ ہی ابتر ہو گی، وہ وہاں نہیں تھا۔ اُن کی آنکھوں میں ابھی تک دہشت بیٹھی ہوئی تھی، آہٹ پر چونک پڑتے تھے۔ تاہم ہماری کرسیوں کے آگے رکھی ہوئی گول میزوں پر انھوں نے چائے لا کے رکھ دی تھی اور ناشتے کی قابیں سجا دی تھیں۔ خاص دان میں پان بھی رکھے ہوئے تھے۔ سب نے بس رسمی سا ناشتہ کیا اور مسلسل چائے پیتے رہے۔ منیر علی وہیں کچھ دُور درخت کے سائے میں جانماز پر سر جھکائے آہستہ آہستہ کلام پاک کی تلاوت کر رہے تھے۔ باقی سب چُپ بیٹھے تھے، جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہے ہوں۔ سب بار بار ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے اور نگاہیں جھکا لیتے۔ پیرو نے درمیان میں کئی مرتبہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کی کوشش کی مگر سب ہوں ہاں کر کے خاموش ہو جاتے۔ وقت گزرنے کے بعد اب اندازہ ہو رہا تھا کہ گزری ہوئی رات کتنی کالی تھی۔ کسی نے اتنی طویل رات کبھی نہ کاٹی ہو گی، معلوم ہوتا تھا جیسے سورج اپنی سمت بھول گیا ہے۔ کسی سے ذرا بھی لغزش ہو جاتی تو ہم اِس وقت یہاں اِس طرح نہ بیٹھے ہوتے۔ یقیناً وہ ہم میں سے کسی کو ختم کرنے کے ارادے سے نہیں آئے تھے لیکن اُن کے پاس ہتھیار بھرے ہوئے تھے، اُن سے نہیں تو ہتھیاروں سے چوک ہو سکتی تھی۔ اُن کے لیے ہم میں سے کسی ایک کو کم کر دینے یا سب کو ختم کر دینے سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ وہ جس طرح آئے تھے، اُسی طرح دندناتے ہوئے چلے جاتے۔

صبح کی گاڑی کا وقت نکل چکا تھا۔ اب رات ہی کو ہمیں بمبئی کے لیے گاڑی مل سکتی تھی۔ یہ پورا دن ہمیں اسی حویلی اور اسی شہر میں کاٹنا تھا۔ رات تک اتنی جلد دوبارہ کسی کے آنے یا راستے میں مزاحم ہونے کا امکان بظاہر نہیں تھا۔ انھیں اب صبر آ جانا چاہیے تھا۔ حویلی کی تلاشی کے لیے رات آنے والے آدمیوں کو ٹھّل نے خود اُکسایا تھا اور اُنھوں نے اچھی طرح تلاشی لی ہو گی۔ سارے کمرے اُجڑے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے کمرے کی ہر چیز اُلٹ پلٹ کے رکھ دی تھی۔ بستر الٹے ہوئے تھے اور آرائشی گل دان ٹوٹے ہوئے۔ اوپر کی منزل پر جس کمرے میں منیر علی ٹھیرے ہوئے تھے، اُس کی مقفل الماری انھوں نے توڑ دی تھی۔ الماری میں رکھے ہوئے شیشے اور چینی کے قدیم برتن کھکھوڑنے میں انھوں نے کوئی احتیاط نہیں کی تھی۔ یہ برتن حویلی کے پرانے مالک کے تھے اور ابّا جان کے پاس امانۃً رکھے ہوئے تھے۔ انھوں نے ہر کونے کھدرے کی تلاشی لی تھی۔ یہاں تک کہ دیواروں پر نصب تصویروں اور قدِ آدم آئینوں کے پیچھے کسی ممکنہ روزن یا طاقچے کے متعلق بھی تسلّی کر لی تھی۔ آرائشی چیزوں، فرنیچر اور برتنوں کے سوا گھر میں دوسری قسم کی چیزیں تھیں بھی نہیں۔ ملبوسات اور ضروریات کی دیگر اشیا ہمارے پاس نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اُن لوگوں نے اپنے آقا کے پاس جا کے تلاشی کے بارے میں بڑھ چڑھ کے بیانات دیے ہوں گے کہ بس حویلی کے در و دیوار کھودنے کی کسر رہ گئی تھی۔ دوبارہ یہاں آنے کا خیال اُن کے لیے کچھ کم دہشت ناک نہ ہو گا اس لیے انھیں اپنے آقا کو ہر طرح مطمئن کرنا چاہیے۔ اُن کے آقا کو بھی اتنا اندازہ ضرور ہو گیا ہو گا کہ ہم سے مطلوبہ پتھر حاصل کرنا ایسا آسان نہیں۔ ہماری تحویل میں ہیروں کی موجودگی کے متعلق اگر اُسے اتنا ہی یقین تھا کہ اُس نے اتنے آدمی بھیجے تھے تو اب اس یقین میں دراڑیں ضرور پڑ گئی ہوں گی کہ دوسرا کوئی فیصلہ کرتے ہوئے ہر پہلو پر غور کر لینا لازم ہے۔ اپنے آدمیوں کی بہ سلامت واپسی ہی کو اُسے غنیمت سمجھنا چاہیے اگر وہ واپس نہ آتے یا ٹھّل کے کہنے کے مطابق پولیس بلا لی جاتی تو صورتِ حال بہت کچھ مختلف ہو سکتی تھی۔ وہ یقیناً کوئی صاحبِ حیثیت شخص ہی ہو گا جس نے اتنا بڑا قدم اُٹھانے میں کوئی عار محسوس نہ کی مگر وہ کیسا بھی شخص ہو، ریاست میں اپنے نام اور عزّت کے سلسلے میں ایسا بے پروا نہ ہو گا۔ اتنے بہت سے ہتھیار بند بھیجنے کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ وہ ناکامی اور رسوائی کا کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ اُسے ہماری تعداد کا اچھی طرح علم ہو گا۔ کئی دن سے اُس کے آدمی حویلی کے باہر ہماری نگرانی کر رہے تھے۔ جیسا کہ میرا خیال تھا، حویلی کے کسی ملازم کو ضرور اعتماد میں لیا گیا ہو گا اور ہمارے پاس جوابی ہتھیاروں کے بارے میں بھی اطمینان کر لیا گیا ہو گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حویلی کے کسی ملازم ہی نے اُنھیں اندر آنے کا اشارہ کیا ہو کہ یہ وقت سب سے مناسب ہے، سب اپنے اپنے کمروں میں جا کے سو گئے ہیں۔ ان تمام باتوں سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ حملہ آور بھیجنے والے کو اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا۔ کوئی بعید نہیں کہ مقصد حاصل کرنے کے بعد یا کسی غیر متوقع صورتِ حال سے دوچار ہونے پر اُس نے اپنے آدمیوں کو ہمیں یکسر ختم کر دینے کا حکم دیا ہو۔ وہ چشم دید گواہی مٹا دینے کے تمام انتظامات سے لیس تھے۔ بہر صورت ہم نے اپنے طور پر اُن کے آقا کو کسی انتقامی ردِ عمل سے روکنے کے لیے ہر ممکن حجت کی تھی۔ تلاشی کی حسرت پوری کر دینے کے علاوہ ٹھّل نے اُن لوگوں سے اُن کے آقا کا نام پوچھنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔ ہم نے اپنی طرف سے سارے جتن کر لیے تھے لیکن کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ریاست میں وہ صرف ایک شخص تو نہیں تھا، پتھروں کے لیے جس کی طلب اتنی شدید تھی اور بھی نواب راجا لوگ یہاں کم نہیں ہیں جو آدمیوں پر پتھروں کو فوقیت دیتے ہوں گے۔ نہ جانے اور کس کس کو ریاست میں ہماری موجودگی کی خبر اور نواب حشمت جنگ کو دیے جانے والے پتھر

کی وجہ سے بے قراری ہو۔ کل رات مہاراجا کے علاوہ اور دو آدمی آئے تھے۔ کسی اور کی آمد آج بھی ممکن ہے۔ بہتر یہی تھا، جو ابّا جان نے رات کہا تھا کہ صبح ہوتے ہی کیوں نہ ہم بڑے نواب کی حویلی میں منتقل ہو جائیں۔ وہاں سے ہم زیادہ محفوظ طور پر بمبئی کے لیے روانہ ہو سکتے ہیں لیکن شاید وہ ابّا جان کا مشورہ بھول گئے تھے۔ ابّا جان کو بھی یاد نہیں رہا تھا اسی لیے وہ یوں فراغت سے بیٹھے تھے۔

میرے سر میں طرح طرح کے وہم اُمڈ رہے تھے۔ پیرو کی تیز آواز پر میں چونک پڑا۔ وہ نواب حشمت جنگ کے بارے میں تحمّل سے کہہ رہا تھا کہ نواب کو اب تک آجانا چاہیے تھا، اُس نے ابّا جان سے صبح آنے کے لیے کہا تھا، اب گیارہ بج رہے ہوں گے۔ معاً مجھے احساس ہوا کہ پیرو کا مطلب کچھ اور تو نہیں ہے؟ ممکن ہے، وہ نواب حشمت جنگ کے متعلق ابّا جان کو پھر کوئی اشارہ کر رہا ہو کہ اُس کی آمد میں یہ تاخیر معنی خیز بھی ہو سکتی ہے۔ میں نے پیرو کا لہجہ ٹٹولنے کی کوشش کی مگر اُس کے لہجے میں ایسی کوئی رمزیت نہیں تھی۔ کسی اور وجہ سے بھی نواب کو دیر ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات تھی تو نواب کو وقت کا خاص رکھنا چاہیے۔ مجھے بھی اُس کی آمد کا انتظار تھا۔ میں اُس کی آنکھیں؛ اُس کا چہرہ قریب سے دیکھنا چاہتا تھا۔ اگر پیرو کا گمان صحیح نکلا تو؟ اِس خیال ہی سے میرا جسم کھنچنے لگتا تھا، مجھ سے پھر اُس کے سامنے اپنا چہرہ نہ چھپایا جائے گا۔

کانتے کے شانے جھکے جا رہے تھے۔ اُس کے زخم ٹیس دے رہے ہوں گے۔ وہ بار بار کرسی پر کلبلانے لگتا۔ منع کرنے کے باوجود وہ وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ دھوپ ہر طرف پھیل چکی تھی۔ مارتی اور شامو کے اُٹھ جانے پر ٹنگو بھی اُٹھ گیا۔ میں اور زورا کانتے کی وجہ سے رُکے رہے۔ پیرو کو نواب حشمت جنگ کا ذکر کیے ہوئے ابھی چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ صدر دروازے سے گاڑی کا شور سنائی دیا اور روشوں کے درمیان گزرتی ایک سیاہ گاڑی ہماری طرف بڑھتی دکھائی دی۔ سب اپنی اپنی کرسیوں پر سیدھے ہو گئے۔ وہ نواب حشمت جنگ ہی کی گاڑی ہو سکتی تھی۔ ہاں، وہ نواب ہی تھا۔ میری رگوں میں خون دھڑکنے لگا۔ گاڑی سبزہ زار کے قریب ٹھیر گئی۔ ڈرائیور کے دروازہ کھولنے سے پہلے نواب جلدی سے نیچے اُترا، اُس کے چہرے پر تازگی اور شگفتگی تھی جو دوسرے ہی لمحے معدوم ہو گئی۔ نیچے اُتر کے وہ تیزی سے آگے بڑھا اور ابّا جان کے پاس آکے ٹھٹک گیا۔

"قبلہ گاہی! یہ کیا، یہ کیا؟" اُس کی زبان اٹکنے لگی اور اُس کی مندلاتی نظریں کانتے پر مرکوز ہو گئیں جس کی کلائی پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور سارا منہ سوجا ہوا، ادھڑا ہوا سا تھا۔ زورا کے چہرے پر بھی ہلدی کے دھبّے پڑے تھے۔ شامو کی باچھوں کی خراش اور جمرو کی پھٹی ہوئی بھویں بھی اُسے نظر آگئی تھیں۔ "ہم یہ کیا دیکھ رہے ہیں والا جناب؟" وہ متوحّش لہجے میں بولا۔

ابّا جان کے زرد چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ نواب کا بازو پکڑ کے وہ جھرجھراتی آواز میں بولے "کوئی خاص بات نہیں ہے۔"

"نہیں، نہیں۔" نواب نے بے چینی سے کہا۔ "ہماری عقل حیران ہے کہ ہم یہ کیسا منظر دیکھ رہے ہیں۔"

"آپ تشریف رکھیے۔" ابّا جان پُرسکون آواز میں بولے۔

"ذرا سی چوٹ لگ گئی ہے۔"

"یہ ذرا سی چوٹ نہیں معلوم ہوتی جنابِ والا! اور، اور" وہ کانتے، زورا، شامو اور جمرو کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ہمیں بتائیے کہ یہ سب کیا ہے؟"

"پہلے آپ بیٹھیے تو سہی۔" ابّا جان نے کرسیوں کی طرف ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔ اُس کے آنے پر سبھی کھڑے ہو گئے تھے۔ ابّا جان کو خیال آیا اور اُنھوں نے اُسے اندر نشست گاہ میں چلنے کے لیے کہا مگر وہ وہیں بیٹھ گیا۔ اُس کے ماتھے پر شکنوں کا جال پڑ گیا تھا اور وہ بہت مضطرب نظر آ رہا تھا۔

"ہمیں کچھ دیر ہو گئی۔ چلتے ہوئے ایک نہایت ضروری سرکاری کام پیش آگیا۔ وہ نمٹا کے ہم سیدھے یہاں پہنچے ہیں مگر یہاں..... یہاں تو" وہ بے ترتیب لہجے میں بولا۔ "ازراہِ کرم ہماری تشفّی کیجیے۔ یہ، یہ کس قسم کا حادثہ تھا؟"

مجھے جستجو تھی کہ ابّا جان حادثے کی نوعیت کیا بتلاتے ہیں۔ نواب کی طرف سر اُٹھا کے اُنھوں نے گہری سانس لی اور کہنے لگے۔ "رات کو یہاں کچھ لوگ آگئے تھے۔"

"کچھ لوگ! کون لوگ؟"

"چور! رات کو اور کون آسکتا ہے۔"

"چور آگئے تھے۔" نواب اُلجھی ہوئی آواز میں بولا۔ "کیا واقعی؟"

"جی ہاں۔" ابّا جان نے پھیکی ہنسی سے کہا اور تحمّل اور پیرو کی طرف بے اختیار اُن کی نگاہیں اُٹھ گئیں۔ وہ دونوں ساکت بیٹھے رہے۔ ابّا جان ہی کسماتے لہجے میں بولے۔ "چھوٹا موٹا سا واقعہ ہے۔ یقین کیجیے، ہم سب خیریت سے ہیں۔"

"ہمیں تفصیل سے بتائیے۔" وہ بے تابی سے بولا۔

ابّا جان کے ہونٹ لرزنے لگے۔ سوچ رہے ہوں گے کہ وہ کیا

اور کس طرح بتائیں، اُنھیں کتنا حذف کرنا چاہیے۔ پیرو کی بات بھی انھیں اچھی طرح یاد ہو گی، گو وہ شدّت سے اُسے مسترد کر چکے تھے لیکن شبہے کی ایک کھٹک تو اُن کے دل میں ضرور ہو گی۔ اُن کی جھجک سے نواب کچھ اور بے چین ہو گیا۔ "اتفاق سے ہم لوگوں کی آنکھ کھل گئی۔" ابّا جان نے شگفتگی سے کہنے کی کوشش کی۔ "اور چوروں کو مکینوں کی بیداری سے پرانا بیر ہے۔"

"حویلی کی اونچی فصیل، چوکی داروں کی نفری عبور کر کے چور کیسے آگئے تھے؟ ہمارے علم میں نہیں کہ اس حویلی میں پہلے ایسا کوئی واقعہ پیش آیا ہو۔"

"پہلے حویلی میں ایسے مکین بھی نہیں تھے۔"

نواب نے کرب سے آنکھیں بھینچ لیں۔ "اوہ!" وہ تمتماتی آواز میں بولا۔ "ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔ کیسے..... کیسے چور تھے؟"

"چور تو چور ہی ہوتے ہیں جنابِ والا! سر پہ سینگ نہیں تھے۔"

ابّا جان کے لہجے میں کسی قدر تندی آگئی تھی، فوراً سنبھل گئے اور مسکرا کے کہنے لگے۔ "آدمی ہی کے بچّے تھے۔"

نواب نے ابّا جان کی تندی پر توجہ نہیں دی۔ "ہماری مراد ہے کیا چاہتے تھے؟"

"زر و مال۔"

نواب حشمت جنگ ابّا جان کے جواب پر خفیف سا ہو گیا۔ پہلو بدل کے بولا۔ "یہ ایک نہایت سنگین واقعہ ہے۔ آپ سے ربطِ خاطر کے علاوہ ہم اِس ریاست کے منصب دار بھی ہیں۔ ازراہِ کرم ہمیں ساری بات بتائیے۔" اُس کی آواز میں غم و غصّہ کی لرزش نمایاں تھی

"کیا عرض کریں نواب صاحب!"

"جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں، اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے ایک تکلیف دہ رات گزاری ہے۔"

"مگر ہم اپنے محترم نواب صاحب کو اِس واقعے کے ناگوار بیان سے کیوں مکدّر کریں۔ رات گئی، بات گئی۔ میں نے عرض کیا نا کہ زر و مال کے لالچ میں کچھ چور چکار حویلی میں گھس آئے تھے۔ مسلّح تھے اور زرہ پشت بھی۔ سوچا ہو گا، نئے نئے لوگ ہیں، ابھی گھر میں مکینوں کا سا جماؤ نہیں ہوا ہو گا۔ حویلی کے چوکیداروں کو اُنھوں نے پہلے ہی قابو میں کر لیا تھا۔ ہم لوگ جاگ گئے، یا یوں کہیے کہ اُنھوں نے ہمیں جگا دیا۔ اُن کا خیال تھا جیسے ہم کوئی خزانہ اُن سے چھپا رہے ہیں۔ مطلب براری کے لیے اُنھوں نے دست درازی بھی کی۔"

"اور اِس جارحیت کی حد تک!" نواب اداسی سے بولا۔ "یہ کس وقت کا واقعہ ہے؟ پھر اُن لوگوں سے نجات کیسے ملی؟"

"رات خاصی ڈھل چکی تھی جب اُن کی آمد کا کھٹکا ہوا۔" ابّا جان نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "یہاں کچھ ہوتا تو اُنھیں ملتا اور ہمارے پاس کچھ ہوتا تو اُنھیں بتا بھی پاتے۔ انھیں ہماری بے سر و سامانی کا مشکل سے یقین آیا۔ انھوں نے ساری حویلی کی تلاشی لی اور چلے گئے۔"

نواب سوچ میں پڑ گیا۔ میری نظریں مسلسل اُس پر جمی ہوئی تھیں۔ اُس کے چہرے پہ پریشانی اور دکھ کے آثار تھے اور بظاہر مصنوعی معلوم نہیں ہوتے تھے لیکن بعض لوگوں کو اپنی شکلیں بدلنے کا ہنر خوب آتا ہے۔ ابھی ہم اُسے جانتے ہی کتنا تھے۔ آدمی کو جاننے میں کبھی ایک عمر صرف ہو جاتی ہے۔ ابّا جان نے نہایت آسانی سے سب کہہ دیا تھا مگر نواب مطمئن نہیں تھا، چونک کے بولا۔ "کس قسم کے لوگ تھے؟"

"ڈھاٹے باندھے ہوئے تھے۔ بعد میں اُن کے چہرے بھی ہمیں دیکھنے کو مل گئے۔ شکل و صورت سے اُجڈ، غیر شہری اور جنگجو معلوم ہوتے تھے۔ مگر جانے دیجیے، زندگی میں طرح طرح کے تجربوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کوئی ایسی نئی بات تو نہیں۔ ہوتا ہی رہتا ہے۔ آپ بتائیے آپ کیسے ہیں۔ ایک رات درمیان میں گزری ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانہ بیت گیا۔ جہانی میاں کا کیا حال ہے؟ اُس طرف جانا ہوا؟"

"ہاں، جی ہاں، رات کو جانا ہوا تھا۔ جہانی میاں آپ کے جانے سے بہت دل گیر نظر آتے تھے۔ اُن کے لیے اب ہمی کو زیادہ وقت دینا ہو گا۔ عالم تاب سے اُن کا رشتہ بھائی کا کم، دوست کا زیادہ تھا۔ کچھ عاشقی کی سی کیفیت تھی۔ برس لگیں گے اِس سانحے سے سنبھلنے میں۔" نواب نے ڈوبتی آواز میں کہا اور لمحاتی توقّف کے بعد کہنے لگا۔ "کاش آپ وہیں سے روانہ ہوتے تو یہ سب اِس طرح پیش نہ آتا۔"

"مگر یوں ہی کچھ ہونا طے تھا تو کون روک سکتا تھا۔"

"معاف کیجیے، ہمیں کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ہماری دل داری مزاحم ہو رہی ہے مگر اِس طرح تو ہم پر اور بوجھ رہے گا۔ بہتر ہو گا، اگر آپ ہمیں اُن مجرموں کے متعلق کچھ اور بتائیں، مثلاً اُن کی زبان، لب و لہجہ، طور اطوار۔ ہمارے ہاتھ اتنے کوتاہ نہیں کہ اُن کی گردنوں تک نہ پہنچ سکیں۔ یقیناً وہ اپنی بعض نشانیاں یہاں چھوڑ گئے ہوں گے۔ ریاست میں ایسے واقعات کی ہم قطعاً اجازت نہیں دے سکتے۔ یہاں ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ برسوں میں اکّا دکّا واقعات پیش آتے ہیں۔

ریاست کے قوانین رہ زنوں اور ڈاکوؤں کے لیے کسی قسم کی لچک نہیں رکھتے۔ اگر ہم نے انھیں اُن کی سزاؤں تک نہ پہنچایا تو یہ نہ صرف ہماری سُبکی ہوگی بلکہ ساری ریاست کی توہین۔ ہمیں حیرت ہے کہ وہ کون لوگ ہوسکتے ہیں۔ کیا وہ یہاں سے کچھ لے گئے ؟"

"جی نہیں ؟ انھیں خالی ہاتھ ہی واپس جانا پڑا۔"

"آپ کے پاس نقدی وغیرہ تو وافر ہوگی ؟"

"تھوڑی بہت ہے، یہی کوئی لاکھ سوا لاکھ کے بہ قدر۔"

"ہونہہ !" نواب سر ہلانے لگا اور بولا "کتنی دیر وہ یہاں رہے ؟"

"خاصی دیر۔" ابا جان نے تذبذب سے جواب دیا "حویلی کے ہر کمرے کی تلاشی میں کچھ نہ کچھ وقت تو لگتا ہے۔"

"پھر نقدی اُن کی نگاہوں سے کیسے اوجھل رہی ؟" نواب نے تیکھے لہجے میں کہا۔ اُس کے تیکھے پن میں طنز نہیں تھا۔

"شاید اس لیے کہ نقدی چھپا کے نہیں رکھی گئی تھی۔ بدحواسی میں انھیں سامنے رکھی ہوئی چیز کا خیال نہیں آیا حالانکہ اُسی کمرے میں تھی جہاں میں تھا۔"

نواب نے تعداد پوچھی تو ابا جان بے اختیار مُغل اور پیرو کی صورت دیکھنے لگے اور بولے "باقاعدہ شمار تو نہیں کیا لیکن پندرہ سولہ کی نفری تو ضرور تھی۔"

"پندرہ سولہ کی اور مسلح !" نواب اچھل سا گیا۔

نواب حشمت جنگ ایک باراں دیدہ شخص تھا۔ ابا جان کی آواز میں کوئی لکنت نہیں تھی مگر اُن کے لہجے میں گرہیں پڑی ہوئی تھیں، اور نواب کے سامنے اُن کا چہرہ بھی تو تھا جس پر اُن کے سینے کی تمام گھٹن سمٹ آئی تھی۔ نواب نے واضح طور پر اُن کے بیان میں ابہام کا شکوہ کیا لیکن اس سے پہلے کہ ابا جان اپنے موہوم جوابوں کے بارے میں کوئی صفائی پیش کرتے، نواب کسی پولیس والے کی طرح اُن سے پے در پے سوال کرنے لگا۔ ابا جان ہر بات صاف صاف بتا سکتے تھے لیکن اگر یہی تھا تو پھر رات اُن آدمیوں کو یوں جانے دینے کا کیا جواز رہ جاتا۔ جس وجہ سے انھیں جانے دیا گیا تھا، وہ نواب بھی موجود تھی اگر وہ خفیہ ہاتھ نواب حشمت جنگ کا نہیں تھا تو یہ ساری رُوداد نہ صرف اُس کا سکون غارت کرتی، ہمارے پیروں کی بھی زنجیر بن جاتی۔ یہ سب کچھ سُن کے اُس کے عالمِ غضب کا ایک تصور ہی کیا جاسکتا تھا۔ یہ حقیقت اُسے چین نہ لینے دیتی کہ سب اُسی ہیرے کا کرشمہ ہے جسے ابا جان نے بہ کمالِ قلندری اُس کی نذر کر دیا تھا اور یہ تمام محض اس ایک لغزش کا شاخسانہ ہے کہ اُس نے ریاست کے بعض امرا کو خود

نمائی کے کسی مغلوب وقت میں اُس ہیرے کی جلوہ نمائی کرائی

یہ سب جان کے اُس کی نگاہوں میں جن لوگوں کی تص

اُبھر سکتی تھیں، اُن میں سب سے پہلا شخص غالباً مہاراجا ہی ہوتا اُ

بعد ریاست کے ایسے تمام نوابین جن کی پتھروں سے رغبت جنو

حد تک ہے۔ نواب کی اُن لوگوں سے خوب آشنائی ہوگی

تک پہنچنا اُس کے لیے کوئی مشکل نہ تھا۔ ابا جان کی ایک ذرا سی ا

ریاست کے نوابوں، راجاؤں میں کسی بھی فتنے کا [illegible] شاید

تھی۔ ابا جان کو اُن کے مابین [illegible] فساد سے اتفا[illegible] تھی

حیدر آباد سے بہ عافیت نکل جانے کی بے چینی تھی۔ نواب انھیں

روک لیتا اور اُس وقت تک نہ جانے [illegible] جب تک ابا جان کی نظ

میں مجرموں کو کیفرِ کردار کو پہنچا دینے کی سُرخ روئی اُسے حا

ہو جاتی۔ ابا جان کی کم آمیزی اُس کے تجسس کو اور ہوا دے ا

اُس کا بار بار بدلتا رنگ اندرونی بے سکونی کی غمازی کر رہا تھا ا

کے پاس کہنے کے لیے اس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ مزید ایک

اِس شہر میں ٹھیرنا نہیں چاہتے ہوں گے۔ ہیروں سے وابستگی، اُ

لوگوں سے وابستگی، شہر میں اجنبیت اور خانم کی آمد کا واقعہ بھی نوا

رو پوش نہیں رہا ہوگا۔ ایک پہر جانے کتنے روزن کھول دیتا۔

آنے والے آدمیوں کے اصل مقصد کی بھنک نواب کو بے لگام کر

ابا جان کو اپنی روانگی تک اُسے اسی تذبذب و کش مکش کی حالہ

دوچار رکھنا تھا اور بہتر یہی تھا کہ وہ کسی طرح اُس وقت تک ا

ساتھ ہی رہیں۔ سبزہ زار میں زخمی ملازمین بھی نواب کی نظر وا

سامنے تھے لیکن ہماری موجودگی میں اُن سے کچھ پوچھنا وضع ـ

تھا۔ اس میں ہماری بھی توہین تھی، نواب کی بھی۔ ابا جان کو ا

احساس ہو رہا ہوگا کہ رات انھوں نے مُغل کی بات نہ مان کے

بڑی غلطی کی تھی، رات اگر وہ مُغل اور پیرو کو چھوڑ کے

سے بمبئی کے لیے نکل کھڑے ہوتے تو انھیں اِس بے بسی و بے چا

نہ گزرنا پڑتا لیکن شاید انھوں نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ انھیں مُغ

پیرو کو چھوڑ کے کہیں نہیں جانا چاہیے تھا ورنہ وہ شوو سے ہمیشہ شر

نواب کی حیران و مضطرب کیفیت سے اُس کی ناآسودگی

ہو رہی تھی مگر ابا جان نے احتیاطاً وہ کانٹا اپنے سینے میں محفوظ رکھ

جو رات پیرو نے انھیں چبھویا تھا۔ بے شک نواب کی تکرار عمداً

سکتی تھی، اپنی آلودگی کے احساس سے۔ کہیں ابا جان کی پہلو تہ

درگزری نے اُسے کچھ مشتبہ نہ کر دیا ہو اور اُسے ابا جان کی آنکھوں

آئینے میں اپنے لیے کوئی بال نہ نظر آ گیا ہو۔ یہ بال پراگندہ آنکھ

کو نظر آسکتا ہے۔ اس صورت میں نواب کے لیے یہی لازم تھا کہ وہ شد و مد سے اس الزام کی تردید کرتا رہے۔ اپنے دامن کے دھبے دھونے کے لیے اُسے رات کے واقعے کی جزئیات و تفصیلات جاننے کے سلسلے میں اتنی ہی وحشت اور بے تابی کا اظہار کرنا چاہیے تھا۔ اُسے زندہ واپس جانے والے آدمیوں سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ اُن کی سمت کے بارے میں ہمیں کچھ جاننے کا موقع نہیں ملا تھا۔ یوں نواب کو دلیلیں دینے کا گداز حاصل تھا۔ نواب کو کیا معلوم کہ یہ گداز بھی ہمی نے فراہم کیا تھا۔ جان بوجھ کے، بہت جبر کر کے۔

"اتنی بڑی تعداد !" اُس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا "جنابِ والا! ہمارا تجربہ ہے کہ چور اور ڈاکو کوئی گھر منتخب کرنے سے پہلے اُس کے مکینوں کی دولت و ثروت کے متعلق اچھی طرح معلومات حاصل کر لیتے ہیں۔ یہاں انھیں اس کا موقع نہیں ملا ہوگا۔"

"شاید وہ راستہ بھول گئے تھے یا انھیں اِس گھر کے بارے میں کوئی بڑی خوش فہمی ہو گئی ہوگی۔" ابا جان اٹکتے ہوئے بولے۔

"ہم اِسی نکتے پر غور کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے یہاں ریاست میں خدانخواستہ آپ کی کسی سے دشمنی نہیں ہے۔ ہمارے دماغ میں طرح طرح کی باتیں آ رہی ہیں لیکن یہ ہمارے انتشارِ ذہنی کے سبب بھی ہو سکتی ہیں۔"

"آپ کس نہج پر سوچ رہے ہیں ؟" ابا جان نے بے ترتیبی سے کہا۔

"کیا عرض کریں، سوچ رہے ہیں کہ کون ایسا ..." وہ زیرِ لب بولتے بولتے رکا۔ سب اُس کی طرف متوجہ تھے۔ نواب ایک لمبی سانس کھینچ کے رہ گیا۔

"جانے بھی دیجیے۔" ابا جان نے خوش دلی سے کہنے کی کوشش کی۔

"کیسے جانے دیں، یقین کیجیے، ہمیں بہت صدمہ ہے۔ یہ ہمارے منصب کے لیے تازیانہ ہے۔ ہمیں آپ کے سامنے ندامت محسوس ہو رہی ہے۔" نواب کی آواز ڈوبی ہوئی تھی۔

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں قبلۂ عالم ! اس میں آپ کی ندامت کا بھلا کون سا پہلو نکلتا ہے ؟"

"ہمارے محسن، ہمارے مربّی پر انھوں نے ہاتھ اُٹھایا۔ وہ کیسے شقی القلب لوگ تھے۔ جنھوں نے ایک بزرگ کا لحاظ نہیں کیا۔"

"انھیں مراتب کا خیال ہوا کرے تو وہ یہ مذموم کام ہی کیوں کریں۔ اُن سے اور کیا توقع کی جاسکتی ہے۔" اُسے بہلانے کے لیے ابا جان کی سمجھ میں جیسے لفظ نہیں آ رہے تھے "آپ نے دل پر بہت لے لیا ہے حالانکہ یہ تو ایک عام سا ..."

"ہمیں کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب ہماری کسی کوتاہی کا خمیازہ ہے۔"

"آپ کی کوتاہی !" ابا جان سراسیمگی سے بولے۔

نواب نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور آنکھیں سکڑ سی گئیں۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ کہنے لگا۔ "ریاست میں رہنے والے ہر شخص کے جان و مال کے تحفظ کی ذمہ داری ہماری ہے اور آپ تو ہمارے مہمان، ہمارے ......" وہ یقیناً کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہ سکا اور بولا "ہماری حاکمی کس کام کی۔ یہ گھر ہمارا ہی تو ہے۔ انھوں نے ہمارے گھر میں داخل ہونے کی جرأت کیسے کی۔ انھوں نے آپ سے ہماری نسبت کا بھی کچھ خیال نہیں کیا۔"

"انھیں اِس نسبت کا علم ہوتا تبھی تو ...." ابا جان شائستہ لہجے میں بولے۔

"ہم انھیں کبھی معاف نہیں کریں گے، اگر ہمارے بس میں ہوا تو اُن کے ہاتھ قلم کرا دیں گے۔"

"نواب صاحب ! ازراہِ کرم اب یہ ذکر درگزر کیجیے۔" ابا جان نے عاجزی سے کہا "آپ بھول رہے ہیں کہ آپ نے کل ہم سے کیا کہا تھا اور آپ یہاں کس غرض سے تشریف لائے ہیں۔"

"یاد ہے لیکن ہمیں کیا خبر تھی کہ یہاں آ کے یہ کچھ دیکھنے کو ملے گا۔ کاش آپ ہمیں صبح ہی اطلاع دے دیتے۔"

"صبح آپ نے خود آنے کو فرمایا تھا اِس لیے ہم نے مناسب نہیں سمجھا، اگر ہم اپنے یہ نشان مٹانے پر قادر ہوتے تو ویسے بھی کبھی یہ ذکر نہ کرتے۔ آخر آپ کو اِس قدر کبیدہ خاطر کیوں کیا جائے ؟"

"اِن نشانوں کی اذیت ہم اپنے جسم و جاں میں محسوس کر رہے ہیں۔" نواب نے آزردگی سے کہا۔

"آپ کی عنایت ہے کہ آپ ہمیں ایسا عزیز رکھتے ہیں۔ آپ کی یہ کرم گستری ہم سب کے لیے مرہم کے مترادف ہے۔ اِس کے بعد کیا چاہیے۔ یہی ہمارے لیے سب سے بڑا مداوا ہے۔"

نواب سر جھکائے لمحوں تک خاموش رہا۔

"ہمیں یاد ہی نہیں رہا۔" ابا جان نے پھر اُس کی توجہ مبذول کرانا چاہا اور ندامت آمیز لہجے میں بولے "آپ کو آئے اتنی دیر ہو گئی ہے۔ ہم نے کچھ پوچھا بھی نہیں۔ آپ کیا پئیں گے بلکہ کھانے کا وقت ہوا چاہتا ہے۔"

"ہمارا کچھ جی نہیں چاہ رہا۔" نواب نے بھاری آواز میں کہا "صبح سے یوں بھی طبیعت میں کچھ گراوٹ سی ہے۔"

"خیریت تو ہے ؟"

"ہاں، ہاں، الحمدللہ، کوئی ایسی بات نہیں۔" وہ سنبھل کے بولا مگر دوسرے لمحے اُس کی آنکھیں بجھ سی گئیں اور وہ دل گیر آواز میں کہنے لگا۔ "رحی میاں کے جانے کے بعد سے جیسے کسی چیز کی کمی ہوگئی ہے۔ جسم جیسے کسی نے شکنجے میں کس دیا ہے۔ ہم تو کھل کے رو بھی نہ سکے۔ دوسروں کو سنبھالا دیتے، اُن کے آنسو سمیٹتے رہے۔ رحی میاں کی موت کے بعد سے ہم نے ٹھیک طرح آئینہ بھی نہیں دیکھا ہے۔"

"سانحہ ہی ایسا تھا۔ آپ کے لیے تو دُہرا صدمہ تھا۔ ہمشیرہ عزیزہ کی اس عمر میں بیوگی ...." ابّا جان کے ہونٹ پھڑپھڑانے لگے، دل گرفتہ آواز میں بولے۔ "مگر والا جناب تو ایک حوصلہ مند آدمی ہیں۔ یہاں کون رُکنے کے لیے ہے۔ سب قطار میں ہیں اور کسی کو اپنی باری کا علم نہیں۔"

"ہاں، اور کیا کہا جا سکتا ہے۔"

ابّا جان اُس کا دھیان بٹانے کی کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہوگئے تھے۔ دیر تک خاموشی چھائی رہی پھر ابّا جان نے دبے لہجے میں کہا۔ "چائے کی ایک پیالی تو پیجیے گا۔"

"ضرور، ضرور۔" نواب لجاجت آمیز مستعدی سے بولا۔

ابّا جان نے شامو کو چائے کے لیے اشارہ کیا ہی تھا کہ نواب کو جیسے کچھ یاد آگیا، فکرمندانہ انداز میں بولا۔ "آپ کو کوئی گہری چوٹ تو نہیں آئی ہے؟"

"نہیں، معمولی خراشیں ہیں۔"

"کسی طبیب کو بھی دکھایا؟"

"ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔"

ابّا جان کے چہرے پر چھائی ہوئی لکیریں کچھ دیر کے لیے نرم پڑ گئی تھیں۔ وہ پھر گہری ہونے لگیں۔ نواب کے ذہن میں ابھی تک وہی سب کچھ گردش کر رہا تھا۔ "ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اُن وحشیوں نے سب سے زیادہ آپ ہی کو اپنا ہدف بنایا۔"

"نہیں۔" ابّا جان نے بہ عجلت کہا اور کانتے کی طرف اُنگلی اُٹھا کے بولے۔ "آپ اُسے نہیں دیکھ رہے ہیں۔"

"یقیناً۔ انھوں نے دخل اندازی کی ہوگی۔ آپ کی طرف ان کے اُٹھتے ہوئے ہاتھ ان سے برداشت نہیں ہوئے ہوں گے۔"

"ہاں، شاید کچھ یہی تھا۔" ابّا جان شکستہ لہجے میں بولے۔

"کیا انھوں نے ساری حویلی کی تلاشی لی؟" نواب کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"میں جنابِ والا سے عرض کر چکا ہوں۔"

"ہوں۔" نواب کے ہونٹ پھیل گئے۔ "آپ نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے کہ وہ کچھ اور تو نہیں، ہمارا مقصد ہے، کوئی نادر قسم کی چیز لے جانے میں کامیاب تو نہیں ہوگئے؟"

"یہاں تھا ہی کیا، نقدی کے متعلق عرض کیا جا چکا ہے۔ گھر میں کوئی خاتون موجود نہیں تھی اس لیے زیورات کی طرف خود انھوں نے توجہ نہیں دی ہوگی۔"

ملازم نواب حشمت جنگ کے منصب و ثروت سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔ وہ منتظر ہی تھے۔ شامو کو گئے چند لمحے ہوئے تھے کہ خوان پوشوں سے ڈھکے، چائے، پھل اور مٹھائی کے طشت اُٹھائے ملازم بازار میں داخل ہوئے۔ اُن میں ایک زخمی ملازم بھی تھا۔ نواب کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ٹھیر گیا اور ترکی ٹوپی اُتار کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ وہ اپنا اضطراب متوازن رکھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ یہ ابّا جان اور ہم سب کی خوش گمانی تھی۔ نواب نے کچھ دیر کے لیے از خود موضوع بدلنا مناسب سمجھا ہوگا۔ ابّا جان کے اور اپنے مراسم کی لطافت کے خیال سے یا اس طرح ابّا جان کو اپنے تعلقِ خاطر کا اعتماد دلانا چاہتا ہوگا۔ اس تجدیدِ اعتماد کی اُسے بار بار ضرورت محسوس ہوتی ہوگی۔ اُسے کون سمجھاتا کہ ابّا جان اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا پائیں گے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ کانتے اور ملازم وغیرہ نواب کے سامنے آتے ہی نہیں۔ اکیلے ابّا جان اپنی خراشوں کا کوئی بھی عذر پیش کر سکتے تھے۔ نواب کی آمد صبح سے متوقع تھی مگر اس طرف کسی کا دھیان ہی نہیں گیا۔ ملازم طشت رکھ کے چلے گئے۔ ابّا جان نے اپنے ہاتھ سے نواب کے لیے چائے بنائی۔ "کل شام یہاں آنے کے بعد آپ کی کیا مصروفیت رہی؟" ایک دم نواب نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

"مصروفیت!" ابّا جان سٹ پٹا سے گئے۔ "ہم یہیں رہے، یہیں آرام کرتے رہے۔" کل شام آنے والے دونوں آدمیوں اور مہاراج کے بارے میں ابّا جان اُسے کیسے بتا سکتے تھے۔ "مگر.... مگر آپ نے یہ سوال کیوں کیا؟" انھوں نے سیمابی آواز میں پوچھا۔

"کچھ نہیں، بس یوں ہی ہمارے ذہن میں آگیا۔" نواب بے ربطی سے بولا۔ "آپ نے پولیس وغیرہ میں تو رپورٹ درج نہیں کرائی؟"

"جی نہیں۔" ابّا جان نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"درج کرا دینی چاہیے تھی۔"

"مگر، مگر اس سے کیا حاصل تھا؟"

"احتیاطاً۔" نواب کے ہونٹ باہر نکل آئے۔

"میں، میں سمجھتا ہوں، کوئی ضروری نہیں ہے۔"

"ضروری ہے۔" نواب حتمی لہجے میں بولا

"شاید اب تو وقت بھی گزر گیا ہے۔"

"کیا آپ کسی نتیجے پر پہنچنا نہیں چاہتے؟"

"بے شک، بے شک۔" ابّا جان نے منتشر آواز میں کہا۔ "مگر اس میں ضیاعِ وقت کا بھی اندیشہ ہے۔ آپ صبح تشریف لانے والے تھے، خیال تھا کہ مشورے کے بعد ہی کوئی قدم اُٹھایا جائے۔ پولیس کے طریقۂ کار، تحقیق و تفتیش کے طولانی عمل سے ایک دو بار واسطہ پڑ چکا ہے۔ اصل میں آج ہی روانگی کا قصد تھا۔ یہاں پہلے ہی خاصی دیر ہو چکی ہے۔ ورنہ بڑے نواب صاحب کے ہاں ٹھیرے رہنے میں کیا حرج تھا۔ وہ تو ہمیں روک رہے تھے اور ایسے وقت میں ہمیں اُن کی بات نہیں ٹالنی چاہیے تھی۔ انھیں بھی ہم نے آزردہ کیا۔ صورتِ حال ہی کچھ ایسی ہے کہ روانگی ازبس ضروری ہے۔ ہم تو کل ہی روانہ ہو جاتے لیکن اِدھر آپ نے......"

"ہاں، ہاں۔" نواب اُن کی بات کاٹ کے معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔ "ہمیں احساس ہے۔ کاش ہم آپ کو نہ روکتے مگر یہاں آپ اتنی دیر ٹھیرے ہیں، وہاں چند دن، ہماری درخواست ہے کہ چند دن اور سہی۔"

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔" ابّا جان نے بے چینی سے کہا۔ "لیکن بہتر یہی ہوگا کہ آپ مزید رُکنے کے لیے نہ فرمائیں۔"

"ہم کبھی اصرار نہ کرتے۔ ہم تو یہاں آپ کو وداع کرنے ہی کی غرض سے آئے تھے۔" نواب ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "آپ نے غور نہیں فرمایا کہ آپ کا ٹھیرنا کس قدر ضروری ہے۔ [illegible]ہر سے کچھ نہیں گیا، کوئی نقصان نہیں ہوا مگر کسی بڑے نقصان ہی کے ارادے سے وہ گھر میں داخل ہوئے تھے۔ اللہ کا بڑا کرم ہوا، [illegible] بھی ہو سکتا تھا۔ ایسے لوگوں کو کس طرح معاف کیا جا سکتا ہے۔ [illegible]ح وہ یہاں آئے تھے، کل کسی اور شریف زادے کے گریبان پر [illegible]ن کا ہاتھ دراز ہو سکتا ہے۔ آپ کی مجبوریاں اپنی جگہ مگر یہ تو ایک [illegible]یاست کے نظم و نسق کا معاملہ ہے اور دوسری طرف ہمارے اطمینانِ قلب کا بھی۔ ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ پولیس کو بے جا کارروائیوں [illegible]ا اجازت نہیں دیں گے۔ آپ دیکھیے تو سہی، ہم کیا کرتے ہیں۔ [illegible]کچھ کر سکتے ہیں۔"

"جنابِ من!" ابّا جان کی آواز اُڑی اُڑی سی تھی۔ "ہم آپ [illegible]ے کیا عرض کریں کہ اُدھر بھی وقت پر نہ پہنچنے میں کسی بڑے نقصان [illegible] احتمال ہے۔ آپ سب کچھ درست فرما رہے ہیں۔ ایسا ہی ہونا چاہیے [illegible]ن کیا عرض کریں، کچھ ایسی ہی صورت ہے اور آپ تو یہاں موجود ہی ہیں۔ پھر ہماری موجودگی کی کیا ضرورت۔ اور یہی ہے تو ہم جلد واپس آجائیں گے۔ ہفتے عشرے کے اندر اندر۔"

"مگر آپ کا یہاں ہونا بھی ضروری ہے۔"

ابّا جان نے شش و پنج کی حالت میں بھتل کو دیکھا، پیرو کو دیکھا، پھر مجھے مگر انھیں کوئی کیا اشارہ کرتا۔ انھیں ہر طرف اپنے ہی جیسے چہرے نظر آئے ہوں گے۔ انکار کر دینا ایسا مشکل نہیں تھا مگر ابّا جان کے سامنے ریاست کا ایک اقبال مند نواب ہی نہیں، ریاست کا حاکم بھی بیٹھا ہوا تھا۔ اب تک اُس نے ہم سے بظاہر ایک ہم نشیں ایک دردمند کی حیثیت سے بات کی تھی لیکن کسی بھی لمحے اُس کی آنکھوں کا رنگ بدل سکتا تھا۔ اُس پر اپنے عہدہ و منصب کا کوئی رنگ غالب آسکتا تھا۔ اُس کے شائستہ طور طریق میں کبھی تندی و برہمی کی آمیزش صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ یہ آلودگی واقعے کی سنگینی، نزاکتِ احساس اور ہم سے اپنے تعلق کی پاس داری کے سبب سے بھی ہو سکتی تھی یا اپنی دولت و ثروت، اپنے عزّ و وقار کی کوئی لہر یوں ہی اُمڈ آتی ہوگی مگر ہمارے لیے یہی بہتر تھا کہ ہم اسے اُس کی حاکمیت کے فخر و زور پر محمول کریں۔ ابّا جان کا لب و لہجہ چغلی کھا رہا تھا کہ اُن پر نواب کی اس دوسری ہی حیثیت کا غلبہ ہے۔ انھوں نے اُسے ایک حاکم سے کم یا زیادہ رتبہ نہیں دیا ہے اور نواب کی جنبشِ ابرو کی فتنہ گری

اور اپنی زبان سے نکلے ہوئے کسی مجہول لفظ کی ستم انگیزی کا انھیں خوب احساس ہے۔ وہ اب تک ایک ہوش مند آدمی کی طرح محتاط تھے۔

ممکن ہے، اب نواب کی وہ حیثیت بھی اُن کے وہم و گمان میں دوبارہ رینگنے لگی ہو، جس کی نشان دہی پیرو نے کی تھی۔ نواب کے اصرار کی وجہ کہیں خود اُس کی پسپائی تو نہیں؟ ضروری نہیں کہ صبح اپنے آدمی خالی ہاتھ واپس آجانے پر اُس کی خلش دور ہو گئی ہو۔ ہو سکتا ہے چنگاری باقی ہو اور نواب اسی امید پر اندھیرے میں تیر چلا رہا ہو اور پولیس کے ذکر اور چند دن مزید قیام کی درخواست سے وہ کوئی حجّت پوری کرنا چاہتا ہو۔ ابّا جان کا یہ اجتناب اور گریز جسے استغنا بھی کہا جا سکتا تھا، اُس کی جستجو کا پارا اور مضطرب کر رہا ہوگا اور فرض کیا کہ اگر پہلے نہیں تو اب، رات وہ آدمی اُس کے بھیجے ہوئے نہیں تھے، حویلی میں گزرنے والی رات سے اُس کا کوئی تعلق نہیں تھا مگر اب یہ سب کچھ سُن کے مبادا اُس کے اندھیرے سینے میں ہوس کی کوئی چنگاری بھڑکی ہو۔ جیسے کسی کی آنکھیں کھُل جائیں، جیسے کوئی ٹھینگا دکھا دے! اُسے ملال ہوگا کہ رات ہتھیار بند آدمی بھیجنے والے کے پیمانے پر، ہمیں پرکھنے کا خیال اُسے کیوں نہیں آیا۔ اُسے بہت سُبکی محسوس ہو رہی ہوگی مگر ابّا جان کو نہ ہیروں کے لیے اُس کی حرص و ہوس سے کوئی غرض تھی نہ اُس کے بیلے پیرو کے الزام کی تائید و تردید سے کچھ سروکار تھا۔ رات اگر وہ انھیں بہتان لگتا تھا اور اب وہ خود نواب کے دل میں ایسا کوئی تلاطم برپا ہوتا دیکھ رہے تھے تو اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ وہ اسے کیسے روک سکتے تھے۔ نجات اگر اسی طرح ممکن تھی تو ابّا جان کسی پیش و پس کے بغیر ہیروں سے بھری تھیلی نواب کی نذر کر دیتے مگر نہ ہیرے نذر کیے جا سکتے تھے، نہ نواب کی خواہش کے مطابق یہاں مزید قیام مناسب تھا۔ نواب اُن سے کوئی عجیب اور بے جواز بات نہیں کہہ رہا تھا۔ ایک حساس اور مروّت مند شخص اور ایک مستعد منصب دار کی حیثیت سے اُس نے جو کچھ کہا تھا، وہ ابّا جان کیا، کوئی بھی رد نہیں کر سکتا تھا! ابّا جان کے پاس روانگی میں عجلت کے سوا کون سا بڑا جواز تھا۔ روانگی ایک بڑے مقصد کے لیے ملتوی کی جا سکتی تھی، پہلے بھی کی جا چکی تھی۔ ابّا جان کھوئی کھوئی نظروں سے اِردگرد دیکھتے رہے۔ اپنی مجبوری کا احساس بڑھانے کے لیے اب یہی اضطراب آمیز خاموشی باقی رہ گئی تھی، بے زبانی کی زبان۔ اِس میں اُس کے ادب اور احترام کا پہلو مضمر تھا تو اپنی ناپسندیدگی کے اظہار کی گنجائش بھی نکل آتی تھی تاہم ابّا جان کو منہ سے بھی تو کچھ نہ کچھ کہنا تھا۔ انھوں نے خوش اطواری سے کہنے کی کوشش کی لیکن اُن کی آواز کی پژمردگی چھپائے نہ چھپی۔ انھوں نے کہا "بجا درست ہے، جیسا آپ کا حکم ہے، ہم . . . ."

"حکم نہیں، قبلہ گاہی! ہماری درخواست ہے۔"

"درخواست ہے تو اجازت ہی دے دیجیے۔"

"ہماری کوشش ہوگی کہ وقت کم سے کم صرف ہو۔" نواب تیزی سے بولا "انشا اللہ ایسا ہی ہوگا۔"

ابّا جان نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں موند لیں۔ ہو سکتا انھوں نے واقعی خواب کی نگاہوں میں اپنے لیے کوئی گرہ پڑتی دیکھ لی ہو۔ پھر ہوا کہ نواب کی طرف سے کوئی فیصلہ صادر ہونے کے بجائے انھوں اپنا فیصلہ خود سنا دیا "مناسب ہے، پھر میں ان لوگوں کو رخصت کر دیتا ہوں۔" ابّا جان نے ٹھیرے ہوئے لہجے میں کہا "میں رک جاتا ہوں۔"

انھوں نے جیسے کوئی ناقابلِ فہم بات کہہ دی ہو، نواب چونک سا گیا۔ ابّا جان کے چہرے پر اُس کی نگاہیں منڈلانے لگیں۔ ابّا جان کے چہرے پر ایسا بوجھل سکون تھا جو عدالت میں کھڑے ہوئے ملزم پر اپنے مقدّر کا لکھا سُن کے ہوتا ہے۔

"آپ پہلے جاؤ گے۔" یکایک سبزہ زار میں مُغل کی آواز گونجی۔ سب کرسیوں پر سیدھے ہو گئے۔ "آپ کا ادھر جانا ضروری ہے۔" مُغل نے حقے کا کش لیتے ہوئے کہا "ہم اسی طرف رہیں گے۔ نواب صاحب سب ٹھیک ہی بول رہے ہیں۔"

نواب نے اب تک ہم میں سے کسی کی طرف توجہ نہیں دی تھی حالانکہ ہم اُس کے لیے نئے نہیں تھے۔ بڑے نواب کی حویلی میں کئی دن تک وہ تقریباً ہمارے ساتھ رہا تھا، ہم سے باتیں کرتا رہا تھا، مُغل سے تو بطورِ خاص۔ غالباً ابّا جان کی موجودگی میں ہم سے کوئی بازپرس آداب کے منافی تھی۔ ابّا جان نے بھی ہمیں اس کا موقع نہیں دیا تھا۔ مُغل کی دخل اندازی پر نواب کی آنکھوں کی چمک عود کر آئی "آپ سمجھ رہے ہیں کہ ہم یہ اصرار کس لیے کر رہے ہیں۔" وہ جوشیلے لہجے میں بولا "وہ کہیں سے بھی آئے ہوں، ہماری دسترس سے دُور نہیں! ہمیں یقین ہے، ہم جلد ہی اُن تک پہنچ جائیں گے۔" پھر وہ بے تابی سے مُغل سے پوچھنے لگا "آپ نے انھیں دیکھا تھا؟"

"اچھی طرح دیکھا تھا۔" مُغل نے گونجیلی آواز میں کہا۔

"ہماری مراد ہے، آپ کا اُن لوگوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟" نواب کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

"اپنے کو اوپر سے نیچے تک بالکل اُٹھائی گیرے لگتے تھے۔" مُغل نے سرد آواز میں جواب دیا "بالکل جنگلی لوگ . . . ."

مُغل کی بات پوری ہونے سے پہلے پیرو نے تیزی سے کہا "اپن آپ کو بولے نواب صاحب! اپن کو شبہ ہے، جیسا بابا بولا ہے، کتے کا اولاد رستہ بھول کے آیا تھا یا کسی نے ایدر کے لیے اُن کے ساتھ مخول کیا تھا۔"

"مخول! آپ کا مطلب ہے مذاق!" نواب نے تاسف آمیز درشتی سے کہا۔

"کتنا ہول ناک مذاق! اگر ہم اُن سے کوئی مذاق نہیں کریں گے۔"

"اپن کو پتہ ہے، آپ بہت کچھ کر سکتا ہے نواب صاحب اور آپ کو کرنا بھی چاہیے۔ آپ اتنی باتیں نئیں کرتا تو اپن کو شکایت ہوتا" پیرو نے مودبانہ لہجے میں کہا "اپن بھی ایسا ہی چاہتا ہے، پر اپن ابھی آپ سے کیا بولے۔"

"نہیں، نہیں آپ فرمائیں۔"

"اپن ابھی آپ سے ایک بات پوچھنا مانگتا ہے۔" مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں پیرو کی زبان نہ بہکنے لگے مگر اُسے خود بھی احساس ہوگا۔ وہ نسبتاً دھیمی آواز میں بولا "آپ بولتے ہو تو اپن ٹھیرے جاتا ہے۔ پر اپن کی سمجھ میں نئیں آتا کہ ایدر رہ کے کیا کرے گا جب آپ ایدر ہے۔ سب جانتا ہے۔ اپن کو نکلے ہوئے بہت دن ہو گیا ہے۔ ایدر کا سیدھا کرنے سے ابھی اُدھر کا اُلٹا ہو گیا تو . . . ."

"تم لوگ چلے جاؤ۔" ابّا جان نے کسی قدر تنبیہی لہجے میں پیرو سے کہا "میں ایک دو دن بعد آجاؤں گا۔ وہاں تم میری تاخیر کا کوئی بھی معقول عذر کر دینا۔ ویسے بھی تو کسی اور وجہ سے دیر ہو سکتی تھی۔"

"ابھی آپ کیسا بولتا ہے بابا!" پیرو نے احتجاجی آواز میں کہا "آپ کو اپن سے زیادہ اُودر ہونا چاہیے۔ اپن کیا منہ لے کے جائے گا۔ کس کو کیا جواب دے گا۔ ابھی سب چوپٹ ہو سکتا ہے۔ آپ نئیں جائے گا تو اپن کے جانے سے کیا ہوئے گا۔"

"یہاں نوکر چاکر لوگ بھی تو ہیں۔" مُغل نے آہستگی سے نواب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اُس کا انداز ٹوکنے کا سا تھا "رات تین تو اپنے ساتھ گھرے ہوئے تھے۔ سب اِن کا جانا بوجھا، دیکھا سنا ہے۔"

نواب حشمت جنگ جز بز سا ہونے لگا، وہ ابّا جان، مُغل اور پیرو کے چہرے دیکھا کیا "کوئی ایسی مجبوری ہے تو ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ ہم نے کم و بیش سبھی کچھ عرض کر دیا ہے۔ ہم آپ کو بتائیں، ہمیں سکون نصیب نہیں ہوگا۔ ہم اپنی سی کوشش تو بہرحال کریں گے ہی لیکن آپ لوگوں کی موجودگی میں صورتِ حال مختلف ہوگی۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ مدعی خود موجود نہ ہوں۔ عجب نہیں کہ ہمیں آپ کو ساتھ لے کے حضور نظام کے دربار میں فریاد کے لیے جانا پڑے ویسے ہمیں یقین ہے، اس کی نوبت شاید ہی آئے تاہم طرح طرح کے شکوک و شبہات ہمارا ذہن منتشر کر رہے ہیں۔"

"میں، میں تو یہاں رک ہی رہا ہوں قبلۂ من!" ابّا جان نے بہ عجلت کہا "میں اپنے معزز و محترم دوست کی تجویز کیسے رد کر سکتا ہوں۔"

"پھر ابھی اپن میں سے کوئی نئیں جائے گا۔" پیرو نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "اپن ایسا اکیلا اُودر نہیں جائے گا۔"

"ٹھیک ہے، یہ بھی ٹھیک ہے بابا!" ہم سب پھر اِدھر ہی رہیں گے۔" مُغل نے زیرِ لبی سے کہا "اور جب اِدھر ہی ٹکنا ہے تو بڑے نواب صاحب کی حویلی میں کیوں نہ چلیں۔ وہ ہم کو بہت روک رہے تھے، دیکھ کے خوش ہو جائیں گے۔" مُغل نے ضرور کسی مقصد سے یہ بات کہی ہوگی۔ نواب حشمت جنگ نے جواب نہیں دیا، مُغل نے انتظار بھی نہیں کیا اور نواب کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولا "اور اگر سیدھے اپنے نواب صاحب کے محل میں جا کے ہی ڈیرا لگائیں تو کیسا رہے۔"

نواب نے ایک لمحے کے تذبذب کے بعد اچھل کے کہا "کیا کہنے! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں، یہ تو آپ نے ہمارے دل کی بات کہہ دی۔ ہم تو پہلے ہی گزارش کر رہے تھے۔ ہمیں موقع ہی کہاں دیا گیا۔"

"ابھی موقع ہی موقع ہے نواب صاحب!" پیرو چہلتی آواز میں بولا "اپن ایک دم اکھا شکایت نکال کے جائے گا۔ جب تک آپ بولے گا، آپ کے پاس ہی رہے گا۔"

"زہے نصیب! زندگی بھر۔" پیرو کا یہ اندازِ تخاطب نواب پر گراں گزرنا چاہیے تھا۔ نواب نے اُس کے طنز کا شائستگی سے جواب دیا، شاید اس لیے کہ پیرو کے لہجے میں طنز کم، مضحکہ زیادہ تھا۔ پیرو نے شگفتگی کی احتیاط کی تھی "ہمارے لیے اِس سے بڑی خوشی، اس سے بڑی عزت کیا ہو سکتی ہے۔" نواب انکسار سے بولا۔

"جتنا بڑا آپ ہے، دل بھی آپ کا اتنا ہی بڑا ہے۔ ایسا کیدر ہوتا ہے نواب صاحب! یہ آپ کا نہیں، اپن کا عزت ہے۔" پیرو نے سر جھکا کے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا "اپن آپ لوگ کے لیے نوا نوا آدمی ہے۔ آپ اپن کے بارے میں ابھی کتنا جانتا ہے، قسم سے کچھ بھی نہیں جانتا۔ ایسا کیدر ہوتا ہے نواب صاحب!"

"معلوم نہیں، جاننے سے آپ کی کیا مراد ہے۔" نواب تمتماتے لہجے میں بولا "اگر شناسائی اور یک دلی کسی معیّن مدّت سے مشروط ہے تو بخدا ہم اس کے قائل نہیں۔ اس مختصر مدّت میں آپ حضرات نے جو نقش ثبت کیے ہیں، اُن سے ہم آشنا نہیں تھے۔ سچ تو یہ ہے، ہم کچھ اور جاننا بھی

نہیں چاہتے۔ یقیناً اِس سے کہیں بیش ہو گا مگر ہمارے لیے آپ سے اتنی آگہی کی سرشاری کیا کم ہے۔"

"اپن کو آپ جیسا بات کرنا نہیں آتا۔" پیرو نے لجاجت سے کہا۔ "پَر اپن آپ سے کچھ بول رہا تھا۔ ابھی ہو سکے تو ذرا دھیان سے سن لو نواب صاحب!"

"جی، جی، فرمائیے۔" نواب سنبھل کے بولا۔

"اپن بول رہا تھا کہ سدا کے لیے تو کوئی اپن ایدر سے نہیں جا رہا ہے۔ ایدر یہ حویلی خریدا ہے۔ ایدر اپنا خانم موجود ہے اور آپ لوگ ہے ایدر ابھی اپنا تین تین گھر ہے۔ بابا کا یہ نوا حویلی، بڑے نواب صاحب کا اور آپ کا۔ بابا بہت دن سے ایدر شہر حیدر آباد میں آنے کا بولتا تھا۔ ایدر آکے اپن کو پتہ چلا کہ بابا ٹھیک ہی بولتا تھا۔ یہ شہر، ایدر کا لوگ، ایدر کا موسم، آدھا نرم، آدھا گرم۔ ایدر آپ جیسا لوگ ہے جو اپن کے ذرا سے دُکھ پر اتنا گھبرا جاتا ہے۔ ایدر آکے اپنا من ابھی لوٹنے کو ایک دم نہیں کرتا پَر اپن آپ کو کیا بولے۔ یہ ایک نہیں، اپن کے ساتھ اکھا زندگی، ایسا نوٹنکی ہوتا رہا تھا۔ کبھی وقت ملا تو اپنا کہانی سنائے گا۔ آپ کو نوٹنکی کا ہی مزا آئے گا۔ یہ رات اپن نے جیسا کاٹا ہے، ابھی اپن ہی جانتا ہے۔ معاف کرنا، اپن کا آپ سے کوئی میل نہیں بنتا ہے، اپن بہت کمتی آدمی ہے۔ کیدر بھی آپ کا آگے کھڑا نہیں ہو سکتا۔ پر اپن ایک بات میں ایک دم کمتی نہیں ہے۔ اپن کا خون آپ سے تھوڑا کم گرم نہیں ہے۔" پیرو کی آواز میں لکنت آنے لگی۔ "پَر ابھی کیا کرے۔ اُودر دیکھتا ہے تو اپنے کو نوچ کے رہ جاتا ہے۔ اُودر اپن کا لوگ آس لگائے کھڑا ہو گا۔ اِتنے دن کا بول کے نہیں آیا تھا اور ادھورے میں نکل پڑا تھا۔ اُودر سب بکھرا پڑا ہو گا۔ وقت پر ابھی نہیں پہنچا تو بہت کچھ خراب ہو جائے گا، خلاص ہو جائے گا۔"

نواب جھپکتی پلکوں سے سنتا رہا۔ ابّا جان نے کئی مرتبہ دخل دینا اور اشاروں اشاروں میں پیرو کو ٹوکنا چاہا مگر پیرو غالباً دانستہ اُن کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ تحمّل بھی چپ بیٹھا رہا۔ سب دم بخود سے تھے اور نواب کے پیشانی پر اُبھرتی مٹتی لکیریں اور اُس کے چہرے پر بدلتے ہوئے رنگ دیکھ رہے تھے۔ پیرو چپ ہوا تو ابّا جان نے اپنی زبان بند ہی رکھی۔ تحمّل بھی نہیں بولا۔ نواب کے نتھنے بار بار پھڑکنے لگتے تھے۔ چند ثانیے یوں ہی گزر گئے۔ نواب گم صم سا بیٹھا رہا پھر جھرجھری کے سے انداز میں چونک کے بولا۔ "ہمیں اپنی عرض سے شرمندگی ہو رہی ہے۔ اصل میں ہم نے ..... ہماری نظر محض عواقب کی طرف تھی۔ غالباً اِس لیے کہ ہم پر ریاست کے بعض اہم فرائض منصبی عائد ہوتے ہیں لیکن یقیناً ہم پر اپنے محسنوں، دوستوں کے حقوق بھی لازم ہیں۔"

معلوم نہیں، یہ سُن کے ابّا جان کے دل کا کیا حال ہوا ہو گا، دل تو بُری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ میری طرح ابّا جان کو بھی اپنے کانوں یقین نہیں آیا ہو گا۔ نواب رُکی رُکی آواز میں بولا۔ "ہم عرض کریں ہمارے معروضات محض گزارشات تھیں۔ ہمیں خدشہ ہے کہ وقت گزر نہ جائے "وقت ہی کی تو بات ہے۔ ہمارے خیال میں اُن شورہ پشتوں کی جلد سرکوبی نہ کی گئی تو اُن کے حوصلے اور بلند ہوں گے۔ کل کسی گھر سے کسی الم ناک سانحے کی خبر آئے گی۔"

"آئے گا، ضرور آئے گا۔ کل کسی گھر سے اور، پرسوں کسی اور گھر سے خبر آسکتا ہے۔ پر اپن لوگ کیا کر سکتا ہے؟" پیرو نے اپنی آواز قابو میں رکھی تھی۔ اُس نے منکسر لہجے میں نواب سے پوچھا کہ کیا ہماری میں موجودی اُن لوگوں کے عزائم میں حارج ہونے کی ضمانت ہے؟ ہم یہاں رہیں گے تو وہ کسی اور گھر کا رُخ نہیں کریں گے؟ پیرو نے اُس سے کہا کہ وہ یہاں اپنی کوئی نشانی یا اتا پتہ چھوڑ کے نہیں گئے ہیں جو لوگوں کو سمتیں ٹٹولنے میں مدد دے سکے۔ جہاں تک ان کی تلاش کا تعلق ہے یہ کام کسی طور ہمارا نہیں، سر بہ سر پولیس کا ہے اور پولیس کی کامیابی کے لیے اُس کے ارادے کی سچائی نیز ساری تگ و دو میں اخفا شرط ہے۔ نے نواب کی توجہ اُن تین ملازموں کی طرف دلائی جن کا ذکر کچھ دیر پہلے نے کیا تھا کہ وہ گزشتہ رات کے ایک ایک لمحے کے شاہد ہیں اگر صرف شہادت و شناخت کا معاملہ ہے تو وہ بھی یہ کام بہ حسن و خوبی انجام دے سکتے ہیں کیونکہ اب وہ زندگی بھر اُن کی صورتیں بھول نہیں سکیں گے۔ اگر نواب کا مقصد ہماری موجودی سے پولیس اور متعلقہ حکام کی فعالیت، اُن کا خون گرم رکھنا ہے تو نواب خود کوئی چھوٹا حاکم نہیں ہے۔ دربارِ سرکار میں اُس کا اثر و رسوخ مسلّم ہے۔ ریاست کی پولیس اُس کے مرتبے سے خوب آگاہ ہے، اُس کے اشارے اچھی طرح پہچانتی ہے۔ پیرو نے اُس سے کہا کہ رات حویلی میں اُن لوگوں کی اچانک یلغار ہمارے تئیں نواب کی کسی کوتاہی کا خمیازہ نہیں ہے جو نواب کی محجوبی کا سبب بنے۔ اگر ہماری آنکھوں کے سامنے اُنھیں عبرت ناک انجام سے دوچار کر دینے کی کوئی آرزو نواب کے دل میں تڑپتی ہے اور یوں اپنے دوستوں کی خوشنودی، اُن کی نگاہوں میں سُرخ روئی مقصود ہے تو وہ خاطر جمع رکھے۔ نواب کے دوستوں کو اپنی عدم موجودی میں اُس سے اِسی حسنِ سلوک اور شدتِ احساس کی توقع ہے۔

نواب انہماک اور خاموشی سے پیرو کی باتیں سنتا، اُس کی صورت تکتا رہا۔ درمیان میں وہ ضرور کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اُس کے ہونٹ پھڑک کے رہ گئے۔ پیرو نے رات آنے والے آدمیوں کے سلسلے میں نواب کی طرف اشارہ کیا تھا مگر خود پیرو کے ذہن میں نواب کے جملہ مراتب پوری طرح محفوظ تھے۔ نواب کی ہر حیثیت، ایک دوست جسے رات کا حادثہ سُن کے بے حد صدمہ ہوا ہے۔ ایک حاکم جس کے اثر و اقتدار کے لیے یہ واقعہ ایک تازیانہ ہے۔ ایک حاکم دوست جو کبھی دوست اور کبھی حاکم کے طور پر نتائج اخذ کرنے کے سلسلے میں متوحش ہے۔ کبھی رنج و ملال اُس پر غالب آتا ہے، کبھی اشتعال و غضب۔ ایک ایسا منافق جو بزدل ہے، جس نے رات ہیروں کی طلب میں مسلح آدمی بھیجے تھے۔ ایک حریص جس کے دل میں یہ رُوداد سُن کے ہیروں کی ہوس جاگی ہے۔ ایک ایسا شخص جو رات آنے والے آدمیوں کا مقصد بخوبی سمجھ چکا ہے اور ہم پر ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔ اپنے ہم رتبہ نواب یار اجا کو اُس کی جرأت و جسارت کا معقول جواب دینے کے لیے جس کا خون کھول رہا ہے۔ نواب کی کوئی ایک حیثیت پیرو کے ذہن میں واضح ہوتی تو اُسے اتنی مشکل پیش نہ آتی۔ خانم اور حویلی کا ذکر اُس نے دانستہ کیا تھا، ضمانت کے طور پر کہ شہر میں ہماری دوبارہ آمد کیسی یقینی ہے۔ نواب کو ہم سے اپنی نسبت کی مروّت کا واسطہ دینے ہی سے گلو خلاصی کی کوئی صورت پیدا ہو سکتی تھی۔ دو یقین دہانیوں کا اعادہ ازبس لازم تھا کہ ہماری روانگی کے التوا سے کسی بڑے نقصان کا احتمال ہے اور ہم جلد واپس آرہے ہیں۔ ابّا جان بھی نواب کو یہی باور کرانے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ لیکن غالباً یہاں قیام کی آمادگی کے بعد ہی پیرو کی یہ تکرار کچھ اثر پذیر ہو سکتی تھی۔ ابّا جان ٹھہرنے کی آمادگی ظاہر کر چکے تھے مگر انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ اپنے پیروں پر کلھاڑی مارنے کے برابر ہے۔ ایک دن کی تاخیر کتنے بڑے عرصے پر محیط ہو سکتی ہے۔ پولیس کی چھان بین کا سلسلہ کہاں تک دراز ہو سکتا ہے۔ پولیس کو اڈّوں سے وابستہ لوگوں کو پہچاننے میں ایک گھڑی کی بھی دیر نہیں لگتی۔ اگر کوئی گنجائش باقی تھی، کوئی بھی نرم گوشہ تو پیرو کو ذرا بھی چوک نہیں کرنی چاہیے تھی۔ پیرو جیسے عدالت میں کھڑا دلیلیں دے رہا تھا۔ وہ نواب کو کس طرح یقین دلا سکتا تھا کہ وہ لوگ اب کسی اور گھر کا رُخ نہیں کریں گے۔ وہ صرف ہمارے پاس آئے تھے۔

نواب کی پیشانی پر پسینے کے قطرے اُبھر رہے تھے۔ ہر چند ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور اطراف میں پھیلی ہوئی دھوپ بھی ایسی تیز نہیں تھی۔ نواب کی آنکھوں سے مترشح تھا کہ پیرو کی کوئی دلیل اُسے قائل کر گئی ہے یا اُس نے جان لیا ہے کہ اپنے دوستوں کے راستے میں مزاحم ہونے سے انھیں مزید اذیت ہو گی یا اُسے یقین آ گیا تھا کہ ہمارے پاس وہ شے ہی نہیں ہے جس کی آرزو میں رات لوگ آئے تھے۔ ہمیں روک کے گویا آئندہ کے امکانات بھی ختم کرنا ہے۔ ہو سکتا ہے اُسے کچھ اور اندیشوں نے بھی گھیر لیا ہو کہ کہیں یہ وضع و مروّت پھٹے میں پاؤں اَڑانے کے مصداق نہ ہو۔ پیرو نے اُس سے کہا کہ بہتر ہے، وہ حاکم کے بجائے ایک دوست کی حیثیت سے ہماری عرض پر غور کرے۔ اگر مدّعی خود درگزری اور معافی پر آمادہ ہے تو منصف کو بھی خاموش ہو جانا چاہیے۔

نواب نے کچھ نہیں کہا تاہم جب تک وہ موجود تھا، کسی بھی لمحے کوئی حکم صادر کر سکتا تھا، کسی بھی لمحے اُس کا دماغ کروٹ بدل سکتا تھا۔ اِس کے بعد پیرو یا کسی اور کو زبان کھولنے کی توفیق نہیں ہونی چاہیے تھی۔ پیرو نے اُس کے سینے میں بچا کھچا دھواں تحلیل کرنے کے خیال سے ایک اور کوشش کی۔ نواب نے نظام سرکار کی بات کی تھی کہ اگر ضرورت پڑی تو وہ ابّا جان کو ساتھ لے کر دربار تک فریادی ہونے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ "اور آپ نظام سرکار کی بات بولا ہے نواب صاحب!" پیرو نے کسی قدر رازدارانہ انداز میں اُس سے کہا۔ "اپن پہلی بار اُس کے پاس شکایت لے کے جائے گا اور ایسا خالی ہاتھ جائے گا؟ کچھ ساتھ ہو گا تبھی اُودر جانا تھوڑا ٹھیک لگے گا۔ بار بار ابھی واں جانے کا موقع تو اپن لوگ کو نہیں ملے گا نا! بابا کے پاس ابھی اودر دو ایک چیز ایسا کھرا ہے کہ نظام سرکار نے بھی کبھی۔" پیرو نے اپنی بہکتی ہوئی زبان تھام لی اور جھجکتی ہوئی آواز میں بولا۔ "ابھی شاید اُس کو بھی کچھ پسند آئے۔" پیرو کے لہجے میں بہت سادگی تھی بلکہ کسی حد تک حمق بھی۔ کہیں بھی نواب کو یہ تاثر نہیں ملا ہو گا کہ پیرو نے دانستہ یہ ذکر کیا ہے اور مقصود کچھ اور ہے۔

نواب حشمت جنگ نے بظاہر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ وہ ساکت بیٹھا جیسے اپنے آپ کو گھورتا رہا۔ کسی اور نے بھی لب کشائی نہیں کی۔ لمحوں تک سبزہ زار پر سناٹا چھایا رہا۔ پھر نواب ہی کے جسم میں جنبش ہوئی کیونکہ یہ خاموشی نہایت ناروا محسوس ہو رہی تھی۔ اُس نے رُمال سے اپنا چہرہ خشک کیا، آنکھوں کے گوشے صاف کیے اور سامنے رکھی ہوئی پیالی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پیالی میں بچی ہوئی چائے رکھے رکھے برف ہو گئی ہو گی۔ "مَیں دوسری بناتا ہوں۔" ابّا جان لجاتے لہجے میں بولے۔

"ہمیں ٹھنڈی چائے زیادہ مرغوب ہے۔" اُس نے کھوئی ہوئی آواز میں کہا۔

"اب تو واقعی کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔"

نواب نے شیروانی کے بٹن سے پیوستہ نقرئی زنجیر کھینچ کے

جیبی گھڑی نکالی "ڈیڑھ بجنے کو ہے۔" وہ تعجب سے بولا۔ "اور آپ، آپ کس وقت جانا چاہتے ہیں؟"

سب کو جیسے کسی نے چٹکی بھر لی ہو۔ سب نے بے اختیار ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ "رات نو بجے کے قریب گاڑی جاتی ہے۔" ابّا جان کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

"پھر تو وقت کم رہ گیا ہے۔ ہماری خواہش تھی کہ دوپہر کا کھانا آپ غریب خانے پر تناول فرماتے لیکن اب اس میں اور وقت صرف ہو جائے گا۔ ہمیں بازار بھی جانا ہے۔"

"میری درخواست ہے کہ یہ تکلف اگر مناسب ہو....." ابّا جان کی آواز اُن کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

"تکلف کیسا؟ ہم تو کچھ بھی نہ کر سکے۔"

"آپ نے کیا کچھ نہیں کیا۔" ابّا جان نے دفورِ مسرت سے کہا۔ "سب سے بڑا ثبوت تو یہ حویلی ہے۔ بناتے بناتے ایک عمر لگ جاتی ہے۔ اور، اور آپ کا اتنا وقت دینا، اتنی پرسش کرنا کچھ کم ہے کیا، یہی ہمارے لیے سب سے بڑی سوغات ہے۔ اس سے بڑی کیا چیز ہو سکتی ہے۔ میری عرض ہے، اب ہمیں جلد واپس آنا ہی ہے، پھر ہزار مواقع آئیں گے۔"

"تاہم یہ موقع کیوں جانے دیا جائے۔" بہت دیر بعد نواب کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ بجھی بجھی سی مسکراہٹ۔ "دیکھیے قبلہ گاہی! کل بات طے ہو چکی ہے۔ بس اب ہمارے ساتھ چلیے۔ یہی ہماری خوشی ہے۔"

"بہتر ہے۔" ابّا جان نے سر جھکا کر کہا۔ "گزارش صرف یہ تھی کہ جب سب کو یہاں آنا ہی ہے تو آکے..... مگر۔" ابّا جان کو خیال آگیا کہ اُنھیں اتنی ردّ وقدح نہیں کرنی چاہیے۔ وہ جلدی سے بولے۔ "میں تیار ہوں لیکن اب کھانے کے بعد ہی چلا جائے تو مناسب ہوگا۔"

"ہمیں قطعاً بھوک محسوس نہیں ہو رہی ہے۔"

"یہاں بھی کچھ یہی کیفیت ہے لیکن وقت تو کھانے ہی کا ہے۔"

"جی ہاں۔" نواب ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"وقت تو بھوک پر بنتا ہے بابا!" تجمّل نے حقّے کی منال ہونٹوں سے ہٹاتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

"آپ درست فرماتے ہیں۔" نواب خوش گواری سے بولا۔

"وقت تو خود بھوک طے کرتی ہے۔"

ابّا جان تجمّل کا اشارہ سمجھ گئے تھے۔ ایک جھٹکے سے کرسی سے اُٹھ گئے لیکن ابھی آدھے بھی نہ اُٹھ پائے ہوں گے کہ اُنھیں کرسی کا دستہ پکڑنا پڑا۔ ایک ثانیے کے لیے اُن کی آنکھیں پتھرا سی گئی تھیں۔ نواب کی نگاہیں اُنھی کی طرف مرکوز تھیں۔ کرسی سے اُٹھنے کے دوران اُس نے اُن کی کراہ بھی سن لی ہوگی مگر ابّا جان فوراً سنبھل گئے۔ پھر اُنھوں نے مضبوطی سے پیر زمین پر جمائے ہوں گے۔ نواب نے اُنھیں آرام کا مشورہ دیا اور معذرت چاہی کہ اُسے اُن کی تکلیف کا احساس ہی نہیں رہا۔ ایسی حالت میں کہیں جانے سے تکان اور سوا ہوگی، رات بھی وہ مسلسل جاگتے رہے تھے۔ ابّا جان اُس ایک شکستہ لمحے کی زد سے نکل آئے۔ اُنھوں نے ہاتھ پھیلا کے شگفتگی سے کہا کہ وہ کسی قسم کی تکلیف محسوس نہیں کر رہے ہیں۔ باہر نکلنے سے یہ تھوڑی بہت کسل مندی بھی دُور ہو جائے گی۔ نواب نے خوش دلانہ لہجے میں ایک مرتبہ پھر اُنھیں آرام کرنے کی ہدایت کی اور بولا کہ اُن کا ہمراہ جانا ایسا ضروری نہیں ہے، صرف اس خیال سے وہ اُنھیں لے جا رہا تھا کہ انتخاب میں ابّا جان کی پسند شامل رہے۔ ابّا جان نے مارٹی کو شیروانی لانے کا اشارہ کر دیا تھا وہ آرام ہی کرتے تو زیادہ ٹھیک تھا لیکن رات گاڑی میں بیٹھنے تک اُنھیں نواب کو زیادہ سے زیادہ وقت تک مصروف بھی رکھنا چاہیے تھا، مبادا نواب کا سر پھر کسی اور طرف بھٹکنے لگے۔ مارٹی اندر سے مکلّف شیروانی لے آیا۔ ابّا جان نے صبح ہی نئے کپڑے پہنے تھے اس لیے اُنھیں اندر جانے کی زحمت نہیں کرنی پڑی۔ موٹر میں دو آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش اور تھی۔ نواب نے رسماً سہی، تجمّل اور پیرو سے بھی کہا، پھر میری طرف مڑ کے بولا۔ "آپ ہمارے ساتھ نہیں چلیے گا؟"

جواب میں میری نگاہیں غیر ارادی طور پر منیر علی کی جانب اُٹھ گئیں۔ منیر علی نے پس و پیش بھی نہیں کیا۔ تینوں پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ میں ڈرائیور کے ساتھ آگے والی نشست پر بیٹھ سکتا تھا لیکن سب کو چھوڑ کے اُن کے ساتھ جانا مجھے اچھا نہیں لگا۔ ڈرائیور نے موٹر پہلے ہی موڑ لی تھی۔ ابّا جان اور منیر علی کے بعد نواب بیٹھنا ہی چاہتا تھا کہ پیرو کی آواز پر رُک گیا۔ پیرو نے اچانک اُسے آواز دی تھی۔ نواب دو قدم پیچھے ہٹ کے اُس کے پاس آگیا۔ اِدھر سے پیرو بھی تیزی سے آگے بڑھا، اُس نے سرگوشیانہ لہجے میں مختصراً نواب سے کچھ کہا، نواب سر ہلانے لگا۔ میں اُن سے دُور تھا۔ کچھ موٹر کے انجن کے شور میں پیرو کی آواز دب گئی تھی۔ پیرو کے اندازِ تخاطب سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ اُس نے نواب سے کوئی درخواست کی ہے جسے کشادہ دلی سے نواب نے قبول کیا ہے۔ اُس نے پیرو کے شانے پر تھپکی دی اور موٹر میں بیٹھ گیا۔ ممکن ہے، پیرو نے اپنے لب و لہجہ کی معذرت کی ہو، بہر حال کوئی ایسی بات ضرور کہی تھی جس نے نواب پر اچھا اثر مرتب کیا تھا۔ دیکھتے دیکھتے موٹر ہماری آنکھوں سے دُور ہو گئی مگر سب دیر تک کھڑے صدر دروازے کی طرف دیکھتے رہے۔

او صدر دروازے کے پار سڑک سے موٹر کی پوں پوں کی آواز آئی

تبھی جیسے سب بیدار ہوئے۔ پیرو جسم ڈھیلا چھوڑ کے اتنی زور سے کرسی پر بیٹھا کہ کرسی ٹوٹتے ٹوٹتے رہ گئی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا منہ ڈھانپ لیا۔ بائیں طرف سے زورا آکے مجھ سے لپٹ گیا اور میری گردن سے سر رگڑنے لگا۔ پیچھے سے مارٹی نے آکے میری کمر جکڑ لی اور شامو نے آکے مجھے بھینچ لیا۔ اُن سب کی سانسیں اکھڑی ہوئی سی تھیں جیسے وہ دُور سے چل کے آرہے ہوں اور جیسے بہت دنوں بعد ایک دوسرے سے مل رہے ہوں۔ زورا، شامو، جمرو میری طرف سے ہٹ کے پیرو کی کرسی کی طرف جھپٹے اور اُس کے ہاتھ پیر چومنے، دبوچنے لگے۔ پیرو نے انھیں جھڑکا لیکن اُن میں سے کوئی اُس کے پاس سے نہیں ہٹا۔ پیرو اُنھیں گالیاں بکنے لگا۔ میں سیدھا کانتے کے پاس چلا آیا۔ جانے کتنی بار مجھے اُس کا دھیان آیا تھا۔ میں اُس کی طرف دیکھ کے رہ جاتا تھا۔ نواب کی موجودی میں وہ اپنے آپ پر جبر کیے ہوئے تھا، اُس کے جاتے ہی اب وہ کرسی سے سر ٹکائے آنکھیں موندے بے حال نظر آرہا تھا، بکھرا ہوا سا۔ میں نے اُس کا بازو چھوا تو وہ اُچھل گیا، اُس نے میرا ہاتھ اپنے سینے سے لگا لیا۔ میں اُسے وہاں سے اٹھا کے اندر لے آیا۔ اُسے اب چلنے میں دقت ہو رہی تھی۔ میری منتوں سے وہ بستر پر لیٹ گیا اور چند لمحوں میں بے سُدھ ہو گیا۔

٭

سب اندر چلے آئے تھے۔ جمرو اور شامو نے ملازمین سے کہہ کے کھانا لگوا دیا تھا۔ کسی نے منع نہیں کیا۔ کانتے وہاں نہیں تھا۔ باقی سب نے پیٹ بھر کے کھایا۔ ملازمین نے نواب حشمت جنگ کے خیال سے اچھا خاصا اہتمام کر لیا تھا۔ یہاں سے وہاں تک دسترخوان سجا ہوا تھا۔

میں کانتے کے پاس کچھ دیر بیٹھنے کے بعد عمارت میں یوں ہی گھومتا رہا۔ کبھی اِس کمرے میں، کبھی اُس کمرے میں، اندر حویلی میں کسی جگہ میرا جی نہیں لگا۔ میں نے اُن سب کی طرح سیر ہو کے کھانا کھایا تھا لیکن بہت جلدی جلدی میں۔ سب سے پہلے میں نمٹ گیا تھا پھر بھی اُن کے ساتھ آخر تک دسترخوان پر بیٹھا رہا۔ کھانے کے دوران بھی میرا جی اُڑا اُڑا سا تھا۔ کچھ ایسا گمان ہوتا تھا کہ کہیں کچھ ہو رہا ہے اور ہم سب یہاں بے خبر بیٹھے ہیں، ہم سے کوئی چُوک ہو رہی ہے۔ میری نگاہیں بار بار اُن سب کی طرف اٹھتی تھیں اور اُن کے چہروں پر چھایا ہوا اقرار بھی مجھے جھوٹ معلوم ہوتا تھا۔

ابّا جان کو گئے ہوئے ایک گھنٹے سے اوپر ہو رہا تھا۔ تُھجل کے کہنے پر آرام کرنے کے لیے سب اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ کانتے کو ایک نظر دیکھ کے میں نشست گاہ میں واپس آگیا، یہاں پیرو اور

تُھجل کے سوا کوئی نہیں تھا۔ تُھجل وہیں دیوان پر آنکھیں بند کر لیٹ گیا۔ پیرو بھی اُس کے قریب صوفے پر نیم دراز تھا۔ اُن کی با[تیں] سننے اور کچھ اخذ کرنے کی غرض سے میں بھی چپ چاپ ایک صو[فے پر] لیٹ گیا مگر وہ دونوں خاموش تھے اور سونے کی کوشش کر [رہے] تھے۔ سامنے رات کا سفر تھا اور خاصا طویل سفر۔ اچھا یہی تھا [کہ] تھوڑی دیر کے لیے آرام کر لیں اور تازہ دم ہو کے یہاں سے [نکلیں]۔ میں نے بھی آنکھیں موند لیں۔ لیٹتے ہی میرا سارا جسم اکڑنے لگا [مگر] نیند ایک پل کے لیے بھی نہیں آئی۔ سامنے دیواری گھڑی ٹِک ٹِ[ک] کر رہی تھی۔ ساڑھے تین بج رہے تھے۔ گاڑی رات کو ۹ بجے کر[اچی] روانہ ہوتی تھی۔ کم از کم آدھ گھنٹے پہلے ہمیں اسٹیشن پہنچنا او[ر] گھنٹے پہلے حویلی سے روانہ ہو جانا چاہیے تھا۔ گویا ابھی پورے چا[ر] اور یہیں رہنا ہے۔ ابّا جان بھی واپس آتے ہوں گے۔ بازار میں [ا]ور کتنی دیر لگ سکتی ہے۔ سارا بازار تو اٹھا کے لائیں گے نہیں [اور] نواب حشمت جنگ بھی آخر کتنی دیر اُن کے ساتھ رہے گا۔ میری نظ[ریں] گھڑی پر لگی ہوئی تھیں۔ لگتا تھا کہ وقت بوڑھا ہو گیا ہے یا جیسے [وہ] تھک گئی ہے۔ میں کوئی آدھ گھنٹے تک اپنے آپ کو سمیٹے، باندھے رہا لیکن آرام کے بجائے میری رگیں اور کھنچنے لگیں۔ میں اُٹھ کے [بیٹھ] گیا۔ میری نظر سامنے کے صوفے پر دراز پیرو کی طرف گئی۔ اُس کی آ[نکھیں] کھلی ہوئی تھیں یا میری آہٹ سے کھل گئی تھیں۔ میں دبے قد[موں] کمرے سے نکل جانا چاہتا تھا، معاً پیرو کی آواز آئی "کیدر کو جا[تا ہے]"
وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

"کانتے کو دیکھنے۔ اُس کی طبیعت مجھے ٹھیک نہیں لگ [رہی]
ہے دادا!"

وہ بھی اُٹھ گیا۔ "ابھی لوٹ پوٹ کے ٹھیک ہو جائے گا۔"

"میرا خیال ہے، اُسے کسی حکیم ڈاکٹر کو دکھا دینا چاہیے۔"

"سُور کا کھال کا بنا ہے راجا!" پیرو نے مسکراتے ہوئے کہا۔
ضرورت پڑا تو اودر جا کے اکٹھا دکھا دے گا۔"

"بمبئی ہی چل رہے ہیں ہم لوگ؟" میں نے زیرِ لبی سے پو[چھا]۔

"ہاں راجا! اور کیدر؟ وہ سانس بھر کے بولا۔ "ابھی ب[ہت]
دن ہو گیا۔"

"تمھیں گیتا وغیرہ کی تو بہت یاد آتی ہوگی؟"

"ہاں!" اُس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "اپن اتنی دیر کبھی گیا[ں]
دور نہیں رہا۔ اُودر کبھی لمبا چھٹی کو گیا بھی تو پندرہ بیس دن بعد [آ]
جا کے دیکھ آتا تھا۔ لوٹ کے اپن سیدھا تیم پہ واپس پہنچ جاتا تھا تو [سب]

لوگ بھی اپن کا دھیان رکھتا تھا۔"

"مگر اب کے تو یہ بھی ممکن نہیں ہوا، اب کے تو بہت دن ہو گئے۔"

"پر اپن بول کے آیا تھا، ابھی آئے گا کہ نہیں بھی آئے گا۔ اپن سب خلاص کر کے چلا تھا۔ کیا اپن کے لیے یہ تھوڑا ہے کہ ابھی پھر لوٹ کے اُودر جا رہا ہے۔"

میں جانتا تھا کہ وہ میری خاطر ایسا کہہ رہا ہے۔ اپنی بیوی اور بیٹی سے ملنے کے لیے وہ گِن گِن کے دن کاٹ رہا ہوگا۔ اُن دونوں سے اُس کی وابستگی کا حال مجھے اچھی طرح معلوم تھا۔ "تم نے فیض آباد کلکتے وغیرہ سے خط تو لکھ دیا ہوگا؟"

"نہیں، اپن سوچا، ابھی لبھی ایک دم سامنے جائے گا۔" پیرو کی آواز تپنے لگی۔ "اور راجا! اپن ابھی تیرے بارے میں سوچتا ہے۔ اُودر بمبئی میں اتنے دن بعد بھائی بہن لوگ سے ملے گا تو کیا ہوئے گا۔"

"وہ اب کیا پہچانیں گے دادا!" میں نے آہستگی سے کہا۔ "مجھے تو اُن کے سامنے جانے کے خیال ہی سے خوف آتا ہے۔"

"ٹیم بھی تو بیچ میں بہت بڑا ہے۔"

"ہاں دادا! اور وقت کا تو یہ ہے کہ کس پر کیسا گزرتا ہے، اسی حساب سے اِس کی پیمائش ہونی چاہیے۔ کبھی ایک پل بھی برسوں کے برابر ہوتا ہے۔ ہر ایک کے لیے تو اِس کا حساب الگ ہے۔ یوں تو دس سال ہوئے ہیں۔ لیکن کیا یہ ٹھیک ہے؟"

پیرو پلکیں پٹ پٹانے لگا اور مچلتی آواز میں بولا۔ "اپن بھی اُودر تیرے ساتھ چلے گا راجا!"

"تماشا دیکھنے دادا؟"

"کیسا بولتا ہے۔" وہ تنک کے بولا۔

"تماشا ہی ہوگا دادا! میں کس منہ سے اُن کے سامنے جاؤں گا۔ انھیں تو اپنے بھائی کی حیثیت سے مجھے پہچاننے سے انکار کر دینا چاہیے۔"

"کیوں راجا؟"

"سب کچھ میری ہی وجہ سے تو ہوا ہے۔ میری وجہ سے وہ بے گھر ہوئے، در بدر مارے مارے پھرتے رہے۔ مجھے کسی کا کوئی خیال نہیں آیا۔ میں اُنھیں چھوڑ کے چلا آیا تھا۔ میں نے اُن سے اُن کی ماں چھین لی۔" میری زبان اینٹھنے لگی۔

"ابھی بار بار کیوں دُہراتا ہے اس کو۔"

"دُہراؤں بھی نہیں دادا؟ اپنی خطائیں خود سے چھپاؤں، اپنے آپ کو دھوکا دوں، یہ تو اب ہمیشہ کا عذاب ہے، سوچتا ہوں تو سینہ پھٹنے لگتا ہے۔ میں کوئی غلط کہتا ہوں۔ امی کی عمر بھلا ابھی جانے

کی تھی؟ میں اُنھیں اچھی بھلی چھوڑ کے نکلا تھا۔ میری وجہ سے وہ زندہ نہ رہ سکیں۔ وہ ایک میری ہی ماں تو نہیں تھیں، اُن سب کی بھی تھیں۔ میں نے اُن سے اُن کی ماں چھین لی۔ باپ بھی اُن کا اپنا نہیں رہا۔ ابّا جان کا دماغ میں نے بھٹکایا تھا۔ نہ انھیں تبت کے وہ منحوس کاغذات ملتے، نہ وہ اپنا گھر برباد کرتے اور منّی! منّی بھی تو میری وجہ سے بے پردہ ہوئی تھی اور جہاں گیر...... "میری آواز میرے حلق میں پھنس گئی۔

"ہو جاتا ہے جانی! ایسا ہی ہو جاتا ہے۔ آدمی سالا ابھی دیکھتا رہ جاتا ہے۔ سارا کچھ آدمی کا بس میں تو نہیں ہوتا، آنکھ ہونے کا مطلب سدا دیکھتے رہنے کا اور کان کا مطلب سدا سننے کا نہیں ہے، ٹھیک دیکھنے، ٹھیک سننے کا۔ ابھی ایسا کوئی ایدر کو ہے تو اپن کو بولو۔"

"دادا! میرا جی چاہتا ہے، مجھے دیکھتے ہی وہ مجھ پر ٹوٹ پڑیں، وہ خنجروں سے میرا جسم چھلنی کر دیں۔ میں کسی طرح اُن کا بھائی کہلانے کا مستحق نہیں ہوں۔"

"کیسا!" اُس نے بڑھ کے مجھے دبوچ لیا۔ "راجا! تو نے سب جان کے کیا ہے کیا؟ اُودر خون کا بات ہے۔ وہ ایسا کرے گا؟ ابھی دیکھنا وہ تو تجھ کو دیکھتے ہی پاگل ہوا پڑے گا۔" میں نے اپنے آنسو اپنی آنکھوں تک گھونٹنے کی بہت کوشش کی۔

پیرو مجھے اپنے بازو میں سمیٹے ہوئے باہر لے آیا۔ باہر راہداری

میں ملازم موجود تھے۔ پیرو نے مجھے کہنی مار کے اُن کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اُنھیں دیکھ لیا تھا اور اُن سے اپنا چہرہ چھپانے کے لیے سر جھکا لیا تھا مگر میرا سینہ جیسے کوئی کھرچ رہا تھا۔ آگے ملازموں کی طرف جانے کے بجائے پیرو مجھے دالان میں لے آیا اور وہاں سے چبوترے کی سیڑھیاں اتر کے باغ کی جانب نکل آیا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح میرا دھیان بٹائے۔ باغ میں کون سا پھول، کون سی چڑیا دکھائے۔ وہ اِس طرح تسلیاں دے رہا تھا جیسے میں کوئی بچہ ہوں، جیسے میں خود کچھ نہیں سمجھتا۔ شاید میں سمجھتا ہی نہیں ہوں۔ وہ آرام سے نشست گاہ میں لیٹا ہوا تھا۔ میں نے اُسے بھی تنگ کیا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا کہ وہ سب دہرانے سے کیا حاصل جس کا کوئی مداوا نہیں ہے۔

میں خود بھی دُہرانا نہیں چاہتا تھا مگر کیا کروں، میری آنکھیں خود بخود اڈنے لگتی تھیں۔ پیرو باغ کی منڈیر پر بٹھا کے مجھے تھپکیاں دیتا رہا پھر میں نے ہی اُسے کانتے کے پاس چلنے کا مشورہ دیا۔ پیرو کو بھی تو میری دل داری کی ضرورت تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ سب دہرا کے مجھے اعتراف کا کوئی سکون ملتا تھا یا میں اس خود آزاری سے اپنی سزا کا قرض ادا کرتا تھا۔ کبھی کبھی اذیت بھی تو آدمی کو آرام پہنچاتی ہے۔ مگر قرض کم کب ہوتا ہے، وہ تو اپنی جگہ رہتا ہے۔ بعض قرضے کبھی ادا نہیں کیے جا سکتے۔

کانتے پر غفلت طاری تھی۔ پیرو نے اُس کے سرہانے بیٹھ کے کئی آوازیں دیں۔ کانتے نے نہیں سُنا۔ اُس کا سارا منہ سُوجا ہوا تھا۔ پیرو نے اُس کی کلائی ٹٹول کے دیکھی۔ ہتھیلیاں گرم تھیں لیکن بخار نہیں تھا۔ ایک ملازم کو ہدایتیں دے کے پیرو باہر آگیا۔ میرا اندازہ صحیح تھا۔ پیرو بھی اُس کی حالت سے مطمئن معلوم نہیں ہوتا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ کسی حکیم ڈاکٹر کو بلا کے اُسے دکھایا جائے ورنہ سفر اُس کے لیے اور بھاری ہو سکتا تھا۔ پیرو اور ٹھّل اپنے طور پر ان ضربوں کا علاج کسی نہ کسی حد تک کر لیتے تھے لیکن وہ باقاعدہ حکیم ڈاکٹر تو نہیں تھے۔ میں نے پیرو سے کہا کہ ملازم کے ساتھ جا کے میں کسی طبیب کو بلا لاتا ہوں، طبیب کے یہاں آجانے میں بظاہر کوئی حرج نہیں ہے مگر مجھے اجازت دینے کے بجائے پیرو نے نشست گاہ میں آکے ٹھّل کو جگا دیا۔ ٹھّل ایسا سویا ہوا بھی نہیں تھا۔ وہ پیرو کی ایک دھیمی آواز پر اُٹھ بیٹھا اور ہم دونوں کے ساتھ کانتے کے کمرے میں آگیا۔ اُس کا کانتے کے پاس بیٹھنا اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کے آواز دینا تھا کہ کانتے نے آنکھیں کھول دیں۔ "چربی ختم ہو رہی ہے رے۔" ٹھّل نے اُس کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

کانتے کی بجھی ہوئی آنکھوں میں کوندا سا لپکا۔ ٹھّل کے پرے اپنا چہرہ ٹکاتے ہوئے وہ ہانپتی آواز میں بولا: "ابھی بہت ہے استاد!"

"کھینچ کے ہی رکھ۔"

کانتے کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی اور وہ سر ہلا کے رہ

"تھوڑی چائے پی لے۔"

"کچھ جی نہیں چاہ رہا سالا۔"

"پی لے رے۔ ابھی رات میں دیر پڑی ہے۔"

کانتے نے اٹھنا چاہا تو ٹھّل نے اُس کے سینے پر دباؤ اُسے روک دیا اور کمر کے نیچے ہاتھ ڈال کے اُسے اُٹھا دیا۔ اپنی کراہیں نہ روک سکا۔ مسہری کے تکیے سے کمر ٹکا کے وہ کچھ نظر آیا۔ پیرو کے اشارے پر ملازم سادہ چائے لے آیا تھا۔ ٹھّل اپنے ہاتھ سے پیالی اُس کے ہونٹوں سے لگا دی۔ کانتے منہ بنا ایک گھونٹوں میں پی گیا۔ اُس کی خواہش پر ملازم نے اُسے پان کھلایا۔ ٹھّل نے بیڑی سلگا کے اُس کے منہ سے لگا دی۔ کا دو ایک ہی کش لگائے ہوں گے کہ ٹھّل نے بیڑی اُس کے سے کھینچ لی۔ ٹھّل اُس کے پاس چند منٹ سے زیادہ نہیں اپنے آپ تکیے سے کھسکتا ہوا مسہری پر لیٹ گیا۔ کمرے سے نکلتے میں نے پلٹ کے دیکھا، اُس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔

نشست گاہ میں واپس آکے میں نے گھڑی دیکھی بج کے پانچ منٹ ہو رہے تھے۔ ابا جان ابھی تک واپس نہ تھے۔ جتنی دیر ہو رہی تھی، میرے دماغ میں طرح طرح کے اُٹھا رہے تھے۔ نواب حشمت جنگ انھیں کہیں اور تو نہیں گیا؟ مگر وہ کہاں جا سکتا ہے۔ راستے میں اُس کے دل میں نہ سما گیا ہو؟ ابا جان کے ساتھ منیر علی کے سوا کوئی نہیں منیر علی کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ اب وہ کھُل کے اُن سے با ہے جو یہاں اتنے لوگوں کی موجودی میں ممکن نہ تھا۔ کہیں تھانے نہ لے گیا ہو، رپورٹ درج کرانے پر اُسی نے زور دیا تھا تھا اور خود اپنے وہم ذہن سے جھٹک دیتا تھا۔ دوپہر کا وقت تھ کا کھانا کھلائے بغیر اُسے ابا جان کو گھمانے لیے پھرنا اچھا نہیں ل وہ اُنھیں اپنے گھر لے گیا ہو گا یا کسی کلب وغیرہ میں۔ بمبئی کی ط بھی صاحب حیثیت لوگوں کے لیے کلب اور اعلا درجے کے طعا ضرور ہوں گے۔ یقیناً یہی بات ہو گی۔ ابا جان آیا ہی چاہتے کسی بھی لمحے موٹر کی آواز آسکتی ہے۔"

ٹھّل نے وہیں چائے منگا لی تھی۔ ملازموں نے تازہ حقہ لا کے اُس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ تمباکو کی میٹھی میٹھی کڑوی کڑوی خوشبو سارے کمرے میں پھیل گئی تھی۔ میں اندر نشست گاہ میں ہونے کے باوجود وہاں نہیں تھا۔ میری نگاہیں صدر دروازے کے ارد گرد بھٹک رہی تھیں اور میرے کان ابا جان کی آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔ معاً مجھے بڑے نواب کی حویلی کا خیال آیا اور میری نگاہ سیدھی گھڑی پر گئی۔ ابھی سوا چار بجے ہیں۔ ہم یہاں سے ساڑھے سات بجے سے پہلے روانہ نہیں ہوں گے۔ درمیان میں ابھی پورے تین گھنٹے ہیں۔ اِس عرصے میں بڑے نواب کی حویلی جا کے واپس آیا جا سکتا ہے۔ اگر میں جا کے آدھا گھنٹہ بھی وہاں گزاروں تو اطمینان سے واپس آسکتا ہوں۔ ابھی وقت ہے۔ برجیس کا سراپا میری آنکھوں میں گھوم رہا تھا جیسے کل سہ پہر کی طرح اب بھی وہ میرے سامنے تھم کی آڑ میں کھڑی ہو، اُس کی وہ ڈوبی ڈوبی آنکھیں، اُن میں سمندر سا موج زن تھا اور اُس کے چہرے پر چھائی ہوئی گھٹا۔ اُس کے سارے وجود پر سوگ طاری تھا۔ آئینے پر جیسے نمی جم جائے یا پھول تیز دھوپ میں کھلا ہو۔ کوئی بھی تشبیہ موزوں نہیں لگتی۔

مجھ سے صوفے پر نہ بیٹھا گیا اور میں یک لخت اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اتنی دیر وہاں میرے سامنے موجود رہی اور مجھ سے کچھ بھی نہ کہا جا سکا۔ مجھے دوبارہ دیکھ کے وہ خوش ہو جائے گی۔ وہ بھی کیا کہتی ہو گی کہ لوگ اِس طرح چلے جاتے ہیں۔ کیا ایسی ہی اجنبیت تھی جو میں اجنبیوں کی طرح چلا گیا۔ میں اُس سے کہوں گا کہ ایک تو خانم درمیاں موجود تھی۔ دوسرے میں اُس سے صاف صاف کہہ دوں گا کہ میرے حواس ہی مجتمع نہیں تھے۔ اُسے اِس یاس و حرماں کے عالم میں دیکھ کے مجھ پر بجلی سی گری تھی اور لفظ میرے سر میں منتشر ہو گئے تھے۔ تعریف کرنا مجھے ویسے بھی نہیں آتا مگر خانم تو اب بھی موجود ہو گی۔ زنان خانے میں اب میں خانم کے نام ہی سے جا سکوں گا، بالائی منزل کے مہمان خانے میں نفیس کی طرح کوئی کنیز اب میری منتظر نہ ہو گی، مجھے یقین ہے کہ اُسے جیسے ہی میرے آنے کی اطلاع ملے گی، حویلی میں وہ جہاں بھی ہوئی، مجھ تک آنے کی کوشش کرے گی۔ یہ وقت بھی نامناسب نہیں ہے۔ اگر وہ نہ آسکی تو میں خانم سے کہہ کے اُسے بلا لوں گا چاہے خانم کچھ بھی کہے۔ ایسی کون سی بات ہے جو میں اُسے نہیں بلا سکتا۔ اَب کے اُس خانم کی موجودی کی ذرا بھی پروا نہیں کروں گا، یہ موقع دوبارہ نصیب نہ ہو گا۔ میں اُس سے کہوں گا کہ اُس کی اور چھوٹی بیگم گیتی آرا کی ایک ایک بات میرے سینے میں محفوظ ہے اور یہ محض اُس کی خواہش نہیں، خود میرا بھی یہی جی چاہتا ہے کہ دوبارہ یہاں آؤں، جب حویلی ان میرے لیے کوئی زنداں نہ ہو، نہ وقت کی یہ کبیدگی، نہ یہ ماتمی فضا ہو، جب وقت کی ہوا حویلی کے مکینوں کے زخم بھر چکی ہو۔ وقت تو بہت سے زخم مندمل کر دیتا ہے۔ مجھے کچھ ایسا گمان ہے کہ میری آمد شاید کسی درماں کا سبب بن جائے۔ نواب عالم تاب تو اب واپس نہیں آ سکتا، نہ کوئی اور اُس کی جگہ لے سکتا ہے۔ ہر آدمی کی اپنی پرچھائیں، اپنا سایہ ہوتا ہے، اپنی صورت مگر آدمی کا مداوا بھی تو آدمی ہی ہے، مجھے یاد ہے، گیتی آرا نے اُس دن کیا اشارہ کیا تھا کہ اس نامہربان، بے اماں وقت میں کسی کو دریافت کرنے کی سرخوشی ہے۔ اُس کا مخاطب کوئی اور نہیں تھا۔ بڑا نواب بھی شدّ و مد سے ہمیں یہی باور کرانے کی کوشش کرتا رہا تھا کہ ہم خود کو اسی حویلی کا فرد سمجھیں۔ کون اِس طرح عزیز رکھتا ہے، کون ایسا احترام دیتا ہے کہ اجنبیوں کے لیے اپنے زنان خانے کے دروازوں سے پہرے اٹھا دے۔ اس سے بڑھ کر عزت کیا ہو سکتی ہے۔

مجھے وہاں ضرور جانا چاہیے۔ وہ نہ ملی تو بعد میں اُسے میری آمد کی اطلاع تو مل ہی جائے گی، یہ بھی بہت ہو گا۔ کل میرے یوں چلے آنے سے اُس کے دل پر کوئی غبار ہے تو کچھ اسی طرح وہ چھٹ سکے گا۔ غبار ضرور ہو گا کیونکہ وہ تو یوں بھی ریشم کے مانند ہے، شیشے کے مانند۔ ذرا نظر بھر کے دیکھو تو شیشہ ٹوٹ جانے کا ڈر لگے۔ اُس کی آنکھیں میں نے اچھی طرح دیکھی تھیں۔ وہ آنکھیں حویلی سے واپسی پر تمام راستے میرا تعاقب کرتی رہی تھیں۔ یہ کانٹا میری رگِ جاں میں چبھتا رہے گا کہ میں اُس سے منہ چھپا کے چلا آیا۔ منہ چھپانا اور کسے کہتے ہیں۔

مجھے اُٹھتا دیکھ کے پیرو بھی کھڑا ہو گیا۔ "کیا ہے راجا؟" اُس نے اچکتی آواز میں مجھ سے پوچھا۔

"دادا!" مجھے ٹھّل کی موجودی کا خیال آیا۔ "دادا! ذرا باہر چلو۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔

ٹھّل نے شاید سنا نہیں، پیرو اُسی لمحے میرا ہاتھ پکڑے ہوئے باہر آگیا۔ "دادا! ابھی خاصا وقت ہے۔ کیوں نہ ہم کچھ دیر کے لیے بڑے نواب کی حویلی چلیں اور خانم، خانم آپی کو دیکھ آئیں۔" اُس سے میں خانم ہی کا نام لے سکتا تھا۔

"ہاں راجا! چلے گا، ضرور چلے گا۔"

مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی تیار ہو جائے گا۔ "تو پھر دیر کاہے کی ہے۔ اِس وقت ہمیں آسانی سے سواری بھی مل سکتی ہے۔"

"ابھی کچھ دیر ٹھیر جا۔" پیرو اطراف میں دیکھتے ہوئے اُلجھی اُلجھی آواز میں بولا۔

"کیا تمھیں ابا جان کا انتظار ہے؟"

"وہ آجائے گا راجا!"

"پھر چلو دادا! جتنی جلدی ہم چلیں گے، اتنی جلدی واپس آجائیں گے۔" میں نے بے تابی سے کہا۔

"یہ تجھ کو ابھی ایک دم آپی کا دھیان کیسا آگیا؟"

"بس، کل اُن سے کوئی بات ہی کہاں ہونے پائی تھی۔ اِدھر بھی وقت کاٹے نہیں کٹ رہا ہے۔ میں نے سوچا، ابھی یہاں ہیں اور وقت بھی ہے تو کیوں نہ آپی کو دیکھ آؤں۔" میری وضاحت پر وہ عجیب نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میرے لہجے میں ویسے بھی بڑی بے ترتیبی تھی۔

"کیا سوچ رہے ہو؟ میں نے تندی سے اُسے ٹوکا۔" تم نہیں جانا چاہتے تو میں کسی اور کو ساتھ لے جاتا ہوں، اکیلا بھی جا سکتا ہوں، راستہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔"

"چلے گا راجا! اپن ساتھ ہی چلے گا۔ ابھی تیرے کو ایک دم..... تھوڑا سانس لے کے بول۔ اپن کو اودر دیری بھی لگ سکتا ہے، اُودر بڑا نواب بھی ہے۔ بس خانم کے پاس جا کے لوٹ آئے گا کیا؟"

بڑے نواب کے بارے میں تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا حویلی جانے کے بعد کچھ دیر اُس کے پاس بیٹھنا بھی تو ضروری ہے۔" اُس سے کہہ دیں گے کہ بس ہم تو سلام کرنے آئے تھے، ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ چلو دادا!" میں نے منت سے کہا۔" سواری ملنے میں وقت بھی لگ سکتا ہے۔"

"تھوڑا ٹھیر جا جانی!" وہ کسی قدر ترشی سے بولا۔" ابھی ٹیم کتنا ہوا ہے؟"

"اندر گھڑی میں سوا چار بج رہے تھے، پانچ چھ منٹ اور اوپر ہو گئے ہوں گے۔"

"ابھی ٹیم ہے، اپن جا سکتا ہے۔"

"تو پھر چلو دادا!" میں نے بے کلی سے کہا۔" کیا تم ٹھُلّل بھائی سے پوچھنا چاہتے ہو؟"

"نئیں! پر ابھی بول کے چلے تو اچھا ہے۔"

"اگر اُنھوں نے منع کر دیا؟"

"منع بول دیا تو اپن نہیں جانے کا۔"

"اُنھیں بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ کوئی ایسی اہم بات تو نہیں ہے۔ ہم وقت پر واپس آجائیں گے۔ آ کے بھی بتا سکتے ہیں، کسی غلط جگہ تو جا نہیں رہے ہیں۔ وہ خواہ مخواہ کوئی بھی اُڑنگا ڈال دیں گے۔"

"تجھ کو ابھی کیا ہو گیا ہے راجا؟"

"مجھے کیا ہوتا!" میں نے تلخی سے کہا۔" ٹھیک ہے، پھر جانے دو، تم اندر جا کے آرام سے بیٹھو۔"

"اپن کو تیرا کھوپڑی ابھی کچھ گھومتا پڑا لگتا ہے۔"

میں نے اُس سے جرح نہیں کی۔ وقت اور نکل گیا تھا۔ وہاں چھوڑ کے اندر کی طرف جانا چاہتا تھا کہ صدر دروازے کی آواز سنائی دی۔ ابا جان واپس آرہے تھے۔ اگر پیرو کو اُن کی سے کوئی فکر بھی اور وہ میری خاطر چھپا رہا تھا تو اب وہ آ ہی گئے اُن کی آمد کے بعد فوراً نکلنا ممکن نہیں تھا۔ نواب بھی اُن کے ر گا، تھوڑی دیر تو اخلاقاً اُس کے سامنے بھی ٹھیرنا پڑے گا اور تب اندازہ بھی ہو سکے گا کہ اس دوران نواب رپورٹ درج کرانے لیے ابا جان کو تھانے وغیرہ تو نہیں لے گیا۔ چند لمحوں میں مو سامنے آگئی لیکن یہ وہ موٹر نہیں تھی جس میں نواب ابا جان کو لے گیا تھا۔ اس کا رنگ گہرا سبز تھا اور طرز بھی دوسری نواب کی موٹر جیسی نئی بھی نہیں تھی۔ کیا کل شام کی طرح ہیرو میں کوئی اور شخص ابا جان کے پاس آرہا ہے؟ مگر یہ مہاراجا کی نہیں تھی۔ قریب آنے پر اُس میں مٹیالی وردی پہنے، سفید پگڑی ایک شخص بیٹھا نظر آیا۔ وہ ڈرائیور ہی ہو سکتا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی ہاتھ تھامے تیزی سے آگے بڑھا۔ موٹر پورچ میں آ کے ٹھیر گئی تاخیر کے بغیر ڈرائیور نیچے اُتر آیا۔

"ابھی نواب صاحب نے اِس کو ایدر بھیجا ہے؟" پیرو آواز میں اُس سے پوچھا۔

ڈرائیور نے متانت سے سر جھکایا اور دھیمے لہجے میں معذرت کی اور عُذر کرنے لگا کہ موٹر میں ذرا سا کام تھا۔ اُس مناسب سمجھا کہ درست کرا کے ہی چلے تاکہ بعد میں کوئی پریشانی

پیرو ٹھُلّل کو مطلع کرنے کے لیے اندر بھی نہیں گیا۔ ہم د نشست پر بیٹھ گئے۔ صدر دروازہ عبور کر کے موٹر حویلی کی چار د کے آگے پھیلی ہوئی سڑک پر آگئی کچھ ہی فاصلے پر چوراہا تھا اور د بائیں طرف مڑ کے نواب کی حویلی کے لیے راستہ جاتا تھا۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ گویا اُسے مجھ سے پہلے بڑے نواب کی حویلی خیال آیا تھا۔ دوپہر نواب حشمت جنگ کے چلتے وقت اُس نے کے متعلق نواب سے بات کی ہو گی۔ کاش موٹر کچھ پہلے آجاتی، اب بھی کچھ نہیں گیا تھا۔ اب ہم وہاں آدھ گھنٹے سے زیادہ ٹھیر موٹر کی رفتار بھی تیز معلوم ہوتی تھی۔ صدر دروازے سے باہر سڑ چہل پہل تھی۔ چہل پہل سے مراد ہے، ایسا سناٹا نہیں تھا جو بڑے مکانات کی وجہ سے یہاں عموماً رہتا تھا۔ سواریاں آ جا رہی تھ

سائکل سوار بھی گزرتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ پیدل چلنے والے بھی سڑک پر موجود تھے۔ باہر آ کے میری طرح پیرو نے بھی اِدھر اُدھر نظر دوڑانا ضروری سمجھا ہو گا کہ گرد و پیش میں نگرانی کے لیے آدمی تو تعینات نہیں ہیں۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ موٹر تیز رفتاری سے چوراہے پر آگئی اور ڈرائیور نے پیرو سے سمت معلوم کی۔ میرے جی میں آئی کہ موٹر سے کود پڑوں کیونکہ پیرو نے جواب میں ڈرائیور کو بڑے نواب کی حویلی جانے والے راستے کے بجائے مخالف سمت میں چلنے کی ہدایت کی تھی۔

"یہ راستہ نہیں ہے دادا!" میں نے بے چینی سے کہا۔

"اپن کو پتہ ہے۔" پیرو نے تحمل سے جواب دیا۔" اپن بعد کو اُودر بھی چلے گا۔"

"اب تم کہاں چل رہے ہو؟"

"ایدر تھوڑا کام ہے۔"

"کام ہے؟" میں نے بکھرے ہوئے لہجے میں کہا۔" پھر وقت بالکل نہیں رہے گا دادا!"

"اپن کے پاس یہ اکھا چار ٹانگ کا گھوڑا ہے، وہ کیا بولتا ہے اُس کو؟" وہ مجھ سے پوچھنے لگا، پھر خود اُچک کے بولا۔" ہاں سالا ہوا سے باتیں کرتا ہے۔ اُودر سے اپن بھی سیدھا اسٹیشن بھی جا سکتا ہے۔"

"اور یہاں جو سب انتظار کریں گے۔"

"وہ سمجھ جائے گا، ابھی اپن سیدھا اسٹیشن کو ہی پہنچے گا۔"

"اور اگر وہ انتظار کرتے رہے؟"

"ٹھُلّل بھائی کو پتہ ہے کہ موٹر آنے پر اپن کو تھوڑا باہر جانے کا تھا۔"

مجھے اُس کا اطمینان زہر لگ رہا تھا مگر میں اُس سے اور کس طرح کہہ سکتا تھا کہ کہیں اور جانے کے بجائے پہلے وہ بڑے نواب کی حویلی ہی کی طرف چلے۔ میرے اصرار کا خانم کے سوا کوئی اور جواز بھی تو ہونا چاہیے تھا۔ چوراہے سے گزر کے موٹر دائیں طرف والی سڑک پر آگئی اور شہر رفتہ رفتہ گنجان ہونے لگا۔ دھوپ ہلکی پڑ گئی تھی مگر ابھی پوری طرح شام نہیں ہوئی تھی۔ میں پھر چُپ بیٹھا رہا۔ مجھے اگر ذرا بھی شائبہ ہوتا کہ اُس کا ارادہ کسی اور طرف جانے کا ہے تو میں کبھی موٹر میں نہ بیٹھتا۔ موٹر چار مینار، چار کمان سے ہوتی ہوئی پتھر گٹی کے پل سے بھی گزر گئی۔ حویلی سے نکلنے کے بعد بہت دور تک پیرو کی نگاہیں اِدھر اُدھر منڈلاتی رہی تھیں مگر اب شاید اُسے یقین ہو چلا تھا کہ ہمارا تعاقب نہیں کیا جا رہا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ اس وقت کہاں جا سکتا ہے۔ کیا وہ عابد شاپ روڈ کی بڑی بڑی دکانوں سے اپنی بیوی اور بیٹی کے لیے کچھ خریدنا چاہتا ہے، اتنے دنوں بعد اُن کے لیے کچھ نہ کچھ تو لے جانا چاہیے تھا۔ پتھر گٹی کے پل کے پار دھوپ اور ٹھنڈی ہو گئی تھی اور ہلکی ہلکی شام اطراف میں چھانے لگی تھی۔ لائبریری کے قریب ڈرائیور کے استفسار پر پیرو نے نام پلی اسٹیشن کا نام لیا۔ میں سمجھا کہ وہ عین وقت کی زحمت سے بچنے کے لیے ٹکٹ خریدنے اور نشستوں کا انتظام کرنے جا رہا ہے۔ سب کا ایک ہی ڈبے میں انتظام ہو جائے تو بہت اچھا ہو۔ موٹر عابد شاپ روڈ کے قریب آگئی تھی۔ پیرو نے اچانک ڈرائیور سے بائیں ہاتھ کی سڑک پر مڑنے کو کہا۔ گویا اُس نے پھر ارادہ بدل دیا تھا اور نام پلی جانے سے پہلے وہ کہیں اور جانا چاہتا تھا۔ مجھ سے خاموش نہ رہا گیا۔ میں نے دوبارہ اُسے ٹوکا۔

"ابھی رات کے آٹھ بجے بھی اپن اُودر سے نکلے تو گاڑی پکڑ لے گا۔" وہ بھن بھناتے لہجے میں بولا۔" اپن نے پتہ کر لیا ہے، ایدر سے گاڑی ایک دم پچیس منٹ اوپر نو بجے چلنے کا ہے، سامان وامان تو اپن کے پاس ایسا نئیں ہے جو سالا دیری لگے۔"

"کیا تم پہلے بڑے نواب کی طرف نہیں چل سکتے تھے؟" نہ چاہتے ہوئے بھی میری زبان سے نکل گیا۔

"اُودر جانا ابھی ایدر سے زیادہ ضروری نئیں ہے۔"

بے شک اسے بھی کوئی اہم کام ہو سکتا ہے۔ میں نے خود کو سرزنش کی، یہ تو کوئی بات نہ ہوئی، مجھے اپنے سوا کسی کا خیال ہی نہیں آتا۔ میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔" مگر تم جا کہاں رہے ہو دادا؟"

اُس نے ڈرائیور کی طرف اشارہ کیا اور سرگوشی میں بولا۔" اپن ابھی ایدر قریب ہی اتر جائے گا۔"

مجھے اور دحشت ہونے لگی تھی لیکن پھر میں نے اُس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ موٹر کچھ اور آگے چلی آئی تھی۔ کنگ کوٹھی سے کچھ آگے پیرو نے ڈرائیور کے شانے پر ہاتھ رکھ کے اُسے رک جانے کو کہا اور موٹر رکتے ہی ڈرائیور کو وہیں انتظار کرتے رہنے کی ہدایت کر کے اُتر گیا۔ میں بھی اُس کے ساتھ اُترا۔ میں نے گھوم کے اطراف میں نظر ڈالی۔ یہ علاقہ میرا دیکھا ہوا تھا۔ جہاں موٹر ٹھیری تھی، وہیں قریب کی ایک گلی میں پیرو مڑ گیا۔ اُس کی رفتار نہ اتنی تیز تھی، نہ کم۔ گلی کے اندر آگے جانے کے بجائے وہ دوسری گلی میں مڑ کے پھر عام سڑک پر آگیا۔ اسی سڑک پر موٹر کھڑی تھی لیکن ہم ڈرائیور کی نظروں سے دور آگئے تھے۔ ڈرائیور کو اپنی منزل کا نشان نہ بتانے ہی کے لیے پیرو نے یہ پھیر کیا ہو گا۔ میں خاموشی سے اُس کے ساتھ چلتا رہا۔ کوئی دو ڈھائی فرلانگ چلنے کے بعد پیرو ایک گلی میں مُڑا، میرا ماتھا ٹھنکا اور ایک لمحے کے لیے میرا سارا جسم سُن ہو کے رہ گیا۔

یہ حمایت نگر کا علاقہ تھا، وہی جگہ جہاں مَیں اور پیرو حیدر آباد آتے ہی مولوی محمد شفیق کی تلاش میں آئے تھے۔ پیرو کا رخ بھی اُسی مکان کی طرف تھا، خرم منزل کی طرف جس کا پتہ اپنی منزلِ مقصود کے طور پر مولوی صاحب نے مراد آباد کے مسافر خانے کے روزنامچے میں درج کرایا تھا۔ اگر یہ پتہ نہ ملتا تو سب کچھ اِس طرح نہ ہوتا جس طرح ہوا۔ نہ ہم راستہ بدل کے حیدر آباد آنے کا فیصلہ کرتے، نہ سونیا کو موت آتی۔ حیدر آباد ہی کی گاڑی میں بیٹھنے کی وجہ سے سونیا سے میرا آمنا سامنا ہوا تھا۔ پھر شاید نواب عالم تاب کو بھی کچھ دن کی مہلت اور مل جاتی، نہ خانم اتنی منتشر ہوتی۔ اُس نے یہاں ٹھیرنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر زرّیں اور جہاں گیر کے بغیر وہ کتنے دن تک خود پر جبر کر سکے گی اور اِدھر اُس کے یوں چلے آنے سے اُن کا قرار بھی چھن گیا ہوگا۔ ابّا جان ہی جانتے ہوں گے کہ میری اور پیرو کی گم شدگی کے دوران اُنھوں نے وقت کس طرح کاٹا ہوگا۔ حویلی کے قید خانے کے گیارہ بارہ دن ہمارے لیے گیارہ بارہ برسوں سے کم نہ تھے۔ لنگے زخمی پاؤں پر بھَلّو کا یہاں آنا، ہم نے تو زنداں میں جیسے تیسے وقت گزار دیا تھا، باہر کی کھلی فضا بھَلّو کے لیے ہمارے محبوس قید خانے سے کہیں زیادہ عذاب ناک ہوگی اور گزشتہ رات کی ذلت، اُنھوں نے میری آنکھوں کے سامنے ابّا جان کا گریبان چاک کیا تھا اور اُن کی داڑھی نوچی تھی اور میں تماشائی بنا دیکھتا رہا تھا۔ ابّا جان، منیر علی، بھَلّو، پیرو، زورا، کلنتے، شامو، جمرو ٹنگو، مارتی اور خانم حیدر آباد آنے کے لیے میری ایک ضد سے متاثر ہوئے تھے۔

نواب کی کوٹھی نزدیک آ رہی تھی۔ ہر قدم پر فاصلہ اور کم ہو جاتا تھا۔ میرے پیر ڈگمگا رہے تھے۔ پیرو اب یہاں کیوں آیا ہے؟ کیا اُسے مولوی صاحب کے بارے میں کچھ معلوم ہوا ہے مگر کس طرح؟ ہوٹل سے نکلنے کے بعد تھانے، تھانے سے حویلی کے زنداں اور اڈّے تک، اڈّے سے پھر بڑے نواب کی حویلی تک ہم دونوں مستقلاً ایک دوسرے کے ساتھ رہے تھے۔ نواب عالم تاب کے عزاداروں میں مجھے نواب ثروت یار کا چہرہ کبھی دکھائی نہیں دیا جس کے مکان کی طرف ہم بڑھ رہے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، ثروت یار ہی اُس کا نام تھا۔ ممکن ہے، وہ کسی ایسے وقت وہاں آیا ہو جب میں نیچے نہ ہوں، کئی مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ مَیں بھَلّو، پیرو اور ابّا جان کو چھوڑ کے بالائی منزل کے مہمان خانے میں آ گیا تھا۔ اِس دوران نواب ثروت یار اگر آیا ہوگا تو اُس نے پیرو کو اور پیرو نے اُسے ایک نگاہ میں پہچان لیا ہوگا۔ شاید اُسی سے پیرو کو کچھ معلوم ہوا ہو لیکن اگر مولوی صاحب کے بارے میں ذرا بھی سن گن پیرو کو ملی ہوتی تو وہ اتنی دیر تک خاموش نہ رہتا، کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو مجھے ضرور بتاتا۔ یہ بات وہ مجھ سے کیسے چھپا سکتا تھا۔ میرا سر چکرانے لگا۔ "دادا!" مَیں نے دھڑکتی آواز میں پوچھا "تم پھر اِس طرف کیوں جا رہے ہو؟"

"ابھی ایک بار اور جا کے دیکھ لے تو اپن کا کیا جاتا پڑا ہے۔" وہ اُلجھے ہوئے سے لہجے میں بولا۔

"کیا تمھیں کچھ معلوم ہوا ہے؟"

"نئیں، پر اپن ابھی ایک تسلّی کر لے تو ٹھیک ہے۔"

"بیکار ہے، بالکل فضول۔ تم وقت ضائع کرو گے۔۔"

"ابھی دیکھ لینے میں اپن کا کیا بگڑتا ہے۔"

"نئیں دادا! کچھ حاصل نہیں ہوگا۔"

"دیکھتا ہے راجا!"

"وہ نواب بھی خواہ مخواہ مشکوک ہوگا۔"

"اپن اُس سے بیٹی تو مانگنے نئیں جا رہا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے دادا! کچھ نہیں ہوگا۔"

"تو ابھی ایسا ہی سمجھ راجا!"

"دادا! شاید اُن کا ملنا میری قسمت میں نہیں ہے۔ مَیں انھیں اب کبھی تلاش نہیں کروں گا۔ کبھی نہیں۔"

"کیا بولتا ہے؟"

"بہت خاک چھان لی ہے دادا میں نے، دوسروں کو الگ پریشان کیا ہے۔"

"دوسرا کون؟" وہ ترشی سے بولا۔

"سبھی لوگ دادا!" میری زبان لڑکھڑانے لگی۔ "بھَلّو بھائی، تم، ابّا جان، کس کس کا نام لوں۔"

"اپن دوسرا لوگ ہے راجا؟"

"تم تو بات پکڑ رہے۔ میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے، کیا ایک میرے لیے سبھی بے گھر اور خوار نہیں ہوئے!"

"تو اپن کا لاڈلا جو ہے راجا!"

"دادا! خدا کے لیے بس کرو، یہ تلاش ہمیں راس نہیں آتی۔ جیسلمیر میں کیا ہوا تھا، بمبئی میں اور یہاں کیا ہوا۔ مَیں نے طے کر لیا ہے، اب کہیں نہیں جاؤں گا، کسی کو پریشان نہیں کروں گا، دادا! یقین کرو، مَیں نے اپنے آپ بہت کچھ طے کیا ہے۔ تم دیکھنا۔"

"یہ تو ایک دم اچھا بات ہے۔"

"تو پھر لوٹ چلو دادا!" مَیں نے عاجزی سے کہا۔

کوٹھی ہماری نظروں کے سامنے تھی۔ پیرو میری کمر پر دھپ مارتے ہوئے بولا "ابھی اپن ادھر آ ہی گیا ہے راجا!"

"پھر تم جا کے تسلّی کر لو" مَیں نے زچ ہو کر کہا "مَیں یہیں کھڑا رہتا ہوں۔"

اُس نے مجھے آگے کی طرف دھکیل دیا اور کہنے لگا کہ میرے بقول جہاں اتنا وقت برباد ہوا ہے، وہاں کچھ اور سہی، جانے میں کیا حرج ہے۔ ہم کوٹھی کے دروازے تک پہنچ گئے تھے۔ وہی سیاہ فام دربان وہاں موجود تھا جس سے پہلی مرتبہ ہماری مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ پیرو نے نواب کے بارے میں پوچھا تو دربان اوپر سے نیچے تک ہمیں دیکھنے لگا۔ پیرو نے اُسے کسمسانے کا زیادہ موقع نہیں دیا اور بولا کہ نواب صاحب سے ہمیں چند لمحوں کا کام ہے، بہتر ہے کہ اندر جا کے بتا دیا جائے۔ پیرو نے مزید تاکید کی کہ وہ نواب پر واضح کر دے کہ وہی لوگ آئے ہیں جو سترہ اٹھارہ دن پہلے اُس سے ملنے آئے تھے، دربان بھی ہمیں پہچان گیا تھا، کہنے لگا کہ نواب کہیں جانے کی تیاری کر رہا ہے، شاید مشکل سے ملاقات ہو، ہم کسی اور وقت آ جائیں تو مناسب ہے مگر پیرو کے اصرار پر وہ بادلِ ناخواستہ آمادہ ہو گیا۔ ہم موٹر میں یہاں آتے تو دربان کبھی اتنی حجّت نہ کرتا، اُس نے ہمیں پیدل آتے جو دیکھا تھا۔ ہم باہر کھڑے انتظار کرتے رہے۔ دربان نے واپسی میں پانچ منٹ اور لگا دیے۔ واپس آ کے اُس نے ہمیں اندر جانے کی اجازت دے دی۔ احاطے میں قدم رکھتے ہی میرا سارا جسم دھڑکنے لگا۔ ہمیں اُس کمرے میں بٹھا دیا گیا جہاں ہم پہلے بیٹھے تھے۔ کمرے میں روشنیاں جلا دی گئی تھیں حالانکہ ابھی اندھیرا گہرا نہیں ہوا تھا۔ میری نظر گھڑی پر گئی، ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔

یہاں آنے کے بعد اب مجھے بھی کچھ کچھ شبہ ہونے لگا تھا کہ کہیں پیرو کا قیاس درست نہ ہو اور مولوی صاحب واقعی موجود نہ ہوں۔ اُنھوں نے ثروت یار سے کہا تھا کہ مراد آباد سے واپسی پر وہ سیدھے اُس کے گھر آئیں گے۔ ہو سکتا ہے، راستے میں اُنھیں کوئی مجبوری پیش آ گئی ہو جو وہ اپنے پروگرام کے مطابق یہاں نہ پہنچ سکے لیکن وہ بعد میں بھی تو آ سکتے ہیں، نواب ثروت یار سے ہمارے ملنے کے بعد، گزشتہ سترہ اٹھارہ روز میں کسی دن بھی۔ نواب کے والد سے اُن کے دیرینہ مراسم تھے اور اُس کے بقول جب مولوی صاحب نے حیدر آباد میں سکونت کا ارادہ ظاہر کیا تھا تو اُس نے اُنھیں اپنی کوٹھی میں رہنے کی پیش کش کی تھی۔ ممکن ہے مولوی صاحب نے یہ پیش کش قبول کر لی ہو۔ نواب کی اِس جدید طرز کی کوٹھی میں جگہ کی تنگی نہیں ہے۔ کیا معلوم اندر دروازے سے نواب ثروت یار کے بجائے مولوی صاحب ہی برآمد ہوں۔ میرے مساموں سے پسینہ پھوٹنے لگا۔ اُسی لمحے دروازے پر آہٹ ہوئی، میں کرسی سے اُچھل پڑا۔ وہ خادمہ تھی۔ اُس نے پہلے کی طرح ہمارے سامنے چائے لا کے رکھ دی اور پھلوں کا طشت۔ پیرو میرے پاس ہی بیٹھا تھا اور اُس نے زور سے میرا بازو پکڑ رکھا تھا۔ اُس کی گرفت بتا رہی تھی کہ اُس کا حال بھی مجھ سے مختلف نہیں ہے۔

اگر مولوی صاحب آ گئے ہیں تو کیا نواب نے اُنھیں بتا دیا ہے کہ ہم دونوں چند دن پہلے اُن کی تلاش میں آئے تھے۔ نہ معلوم مولوی صاحب نے کیا ردِ عمل ظاہر کیا ہو۔ ہو سکتا ہے جیسا کہ نواب نے ساری روداد سن کے ہم سے وعدہ کیا تھا۔ اُس نے ہماری آمد کے متعلق انھیں کچھ نہ بتایا ہو۔ پیرو نے نواب ثروت یار سے کہا تھا کہ مولوی صاحب کی ایک امانت لوٹانے کے لیے ہمیں ایک مدّت سے اُن کی تلاش ہے۔ نواب کی تشویش دور کرنے کے لیے پیرو کو کچھ نہ کچھ تو بتانا چاہیے تھا۔ پیرو نے مجھے مولوی صاحب کا رشتہ دار بتایا تھا اور کہا تھا کہ میری ماں مولوی صاحب کی بہن نے اُن کی جائداد ہتھیا لی تھی اور مولوی صاحب دل برداشتہ ہو کر عرصے سے مراد آباد کی سکونت ترک کر چکے تھے۔ یہ سُن کے نواب نے ہم سے ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ اور مولوی صاحب کو ہماری آمد کے متعلق کچھ نہ بتانے کا وعدہ کیا تھا۔ اُس نے ہمیں یقین دلایا تھا کہ مولوی صاحب کے آنے پر وہ خط کے ذریعے ہمیں مطلع کر دے گا تاکہ ہم یہاں آ جائیں اور بچھڑے ہوئے گلے مل لیں۔ اُس نے کہا تھا کہ اُسے میرے اور مولوی صاحب کے درمیان ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑنے، رفاقت کا وسیلہ بننے میں خوشی ہوگی۔ مَیں نے خط کے لیے اُسے بمبئی میں جولین کا پتہ دیا تھا۔ کچھ بعید نہیں کہ مولوی صاحب کے آنے پر اُس نے اپنے وعدے کے مطابق ہمیں بمبئی کوئی خط لکھا ہو اور اُس کے لیے ہماری آمد کی اطلاع ایسی غیر متوقع نہ ہو۔ مولوی صاحب کو اُس نے کچھ بتایا تو نہیں ہوگا۔ خدا کرے ایسا ہی ہو مگر ابھی تو یہ سب مفروضے ہیں۔ اصل میں مولوی صاحب کی آمد شرط ہے تبھی یہ سب کچھ ممکن ہے۔ مولوی صاحب اگر نہ آئے ہوتے تو نواب کو ہمیں اندر بلانے کی کیا ضرورت تھی، وہ دربان سے کہہ سکتا تھا کہ اگر ہم صرف اِس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں تو دونوں کا وقت ضائع ہوگا۔ کوئی بات ہی ہوگی جبھی اُس نے ہمیں اندر بلایا ہے۔

اُس کے آنے میں جتنی دیر ہو رہی تھی، میرے دل کی دھڑکن معدوم ہوتی جاتی تھی۔ خادمہ کے جانے کے بعد کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ ہمیں یہاں بیٹھے ہوئے اتنی دیر نہیں ہوئی تھی مگر لگتا تھا جیسے پہر گزر گیا ہو۔ پیرو بھی بُت کی طرح ساکت بیٹھا تھا۔ سامنے دروازے پر پردے کی سرسراہٹ پر اُس کی انگلیاں میرے بازو میں کھبنے لگیں۔

چند منٹ اور گزرے ہوں گے کہ دروازے پر آہٹ گونجی، مردانہ جوتوں کی چاپ تھی۔ دروازے کی طرف دیکھتے دیکھتے میری آنکھوں میں دھند سی اُتر آئی تھی۔ دوسرے لمحے جو شخص اندر داخل ہوا، وہ نواب ثروت یار تھا۔ مَیں نے آنکھیں بند کرلیں۔ میری سانسیں ایک لمحے کے لیے رک گئی تھیں۔ اس کے نظر آنے پر مجھے سکون سا ملا۔ مولوی صاحب اگر سامنے ہوتے تو شاید میرا دم نکل جاتا۔ پیرو نے مجھے کہنی ماری تو میں ہڑبڑاتا ہوا صوفے سے اُٹھ کھڑا ہوا اور نہ جانے کس طرح نواب کو سلام کیا۔ اُس کے بیٹھ جانے پر ہم دونوں بھی جلدی سے بیٹھ گئے۔ اُس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی، مسکراتے ہونٹوں سے اُس نے ہمارا مزاج پوچھا۔ اُس کے دیکھنے کے انداز میں تجسس بھرا ہوا تھا اور وہ پہلے سے کچھ زیادہ جوان اور تر و تازہ لگ رہا تھا۔ اِس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، پیرو نے بے وقت آنے کی معذرت چاہی اور بولا، اُسے دربان سے معلوم ہوگیا تھا کہ نواب کہیں جانے کی تیاری کر رہا ہے۔ نواب نے شائستگی سے کہا کہ اُسے کوئی ایسی جلدی نہیں ہے۔ یہ وہ تکلفاً ہی کہہ رہا تھا۔ مکلف شیروانی، پاجامے اور جوتیوں سے ظاہر تھا کہ ہم اگر ذرا دیر سے آتے تو وہ گھر سے نکل گیا ہوتا۔ اُس کے سر پر صرف ٹوپی نہیں تھی۔ سیاہ بال سلیقے سے کڑھے ہوئے تھے۔

"اپن آپ کو یاد ہے نا؟" پیرو نے جھجکتی زبان میں پوچھا۔

"خوب!" نواب مستعدی سے بولا۔ "ہمیں خوب یاد ہے، دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ یہ عمر بھول جانے کی تو نہیں ہے، سچ تو یہ ہے کہ ہم آپ کے منتظر تھے۔" میرے کان دھکنے لگے۔

"اپن کا انتظار میں تھا آپ؟" پیرو نے سٹپٹاتی آواز میں پوچھا۔

"ہاں۔" نواب نے ہچکچاہٹ سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"کیا اپن کو آپ نے کوئی خط پتر لکھا تھا؟"

نواب نے تامل کے بعد جواب دیا۔ "نہیں۔"

پیرو حیرانی سے اُس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"ہم آپ کو خط لکھنا ہی چاہتے تھے۔"

"کیا مولوی صاحب آگئے ہیں؟" پیرو کے بولنے سے پہلے مَیں نے پھٹی ہوئی آواز میں پوچھا۔

نواب کی سُرخ آنکھیں مجھ پر مرکوز ہوگئیں، اُن میں چنگاریاں سی چمک رہی تھیں، وہ گہری سانس بھر کے بولا۔ "ہم آپ سے کیا کہیں۔"

"اپن کو بولو نواب صاحب! کیا، کیا وہ ایدر آگیا ہے؟" پیرو نے بے چینی سے کہا۔

"ہم آپ سے شرمندہ ہیں کہ اپنے وعدے کے مطابق آپ کو خط نہ لکھ سکے۔" نواب کی آواز تپتی ہوئی سی تھی۔

"کوئی بات نہیں، پر وہ آگیا ہے نا؟" پیرو نے تیزی سے پوچھا۔ "اپن کو ابھی صاف صاف بولو۔"

"آپ کی اس بے تابی سے ہمیں اور خجالت ہو رہی ہے۔" نظریں جھکاتے ہوئے بولا۔ "بے شک وہ آگئے تھے۔"

"آگیا تھا؟" پیرو نے بھڑکتی آواز میں کہا۔ "آپ کیا بول رہا ہے نواب صاحب!"

"وہ آگئے تھے لیکن چلے گئے۔"

"چلا گیا! کدھر؟"

"ہم آپ کو ساری بات بتاتے ہیں، یقین کیجیے، آپ کو دوبارہ یہاں دیکھ کے ہمیں اپنی کوتاہی کا شدت سے احساس ہو رہا ہے لیکن، لیکن ہم نے.....!"

"اِس کو ابھی چھوڑو نواب صاحب!" پیرو اُس کی بات کاٹ کے تُرشی سے بولا۔ "اپن بھی ابھی اُودر بمبئی نہیں گیا تھا، ایدر ہی تھا۔"

"آپ یہیں تھے؟" نواب نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے پوچھا

"اپن نہیں جا سکا تھا۔"

"تو پھر آپ نے درمیان میں یہاں زحمت کیوں نہیں کی؟"

"اپن نئیں آسکتا تھا۔" پیرو نے تندی سے کہا۔ "آپ بولو۔ ابھی بات کیا ہے؟"

"آپ کے جانے کے بعد مولوی صاحب تشریف لائے تھے۔" نواب نے تاسف سے کہا۔ "اُس کے کوئی چار پانچ روز بعد ہی وہ آگئے تھے مگر چلے گئے۔"

"کہاں چلے گئے؟" مَیں نے اُس سے پوچھا، میری آواز کپکپا رہی تھی۔

"خدا ہی بہتر جانتا ہے۔"

"آپ کو کچھ بول کے نئیں گیا؟"

"ہم سے رخصت ہونا بھی ضروری نہیں سمجھا اُنھوں نے۔"

"آپ کیا بول رہا ہے؟"

"کچھ یہی ہے جنابِ من!" نواب سُر لہجے میں بولا۔ "وہ اچانک چلے گئے۔ ہم سکندر آباد میں اپنے ایک ہندو دوست کی شادی میں گئے تھے، اُن سے کہہ کے گئے تھے۔ واپس آئے تو وہ یہاں نہیں تھے، اُن کے پاس مختصر سا سامان تھا۔ ملازمین سے بھی اُنھوں نے کچھ نہیں کہا۔"

پیرو نے بے اختیار میری طرف دیکھا۔ میرا سارا جسم ڈھیا جا رہا تھا۔ "کیا وہ اکیلا تھا؟" پیرو نے منتشر لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔" نواب نے ایک لمحے کے توقف کے بعد کہا۔ "اُن کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔"

"لڑکی تھا!" پیرو تیزی سے بولا۔ "پھر ایسا کیا بات ہوا جو وہ چلا گیا۔"

"ہم کیا کہہ سکتے ہیں، صبح دس بجے کے قریب اُن سے مل کے گئے تھے اور یہ کہہ کے کہ شام کو واپسی میں دیر ہو سکتی ہے، وہ رات کے کھانے پر ہمارا انتظار نہ کریں۔ ہم شام ہی کو واپس آگئے تھے لیکن وہ جا چکے تھے۔"

"ایسا کیسا؟" پیرو نے مایوسی سے کہا۔ "ابھی آپ نے اپن لوگ کے بارے اُن سے کچھ بولا تھا؟"

جواب میں نواب ہمارے چہرے دیکھا کیا۔ اُس کی تذبذب آمیز خاموشی پر پیرو نے دوبارہ اُس سے پوچھا۔ "اپن لوگ کا آپ کوئی بات کیا تھا؟"

"پہلے آپ یہ فرمائیں کہ آپ نے ہمیں جو روداد سنائی تھی، کیا اُس میں کوئی.....؟" وہ پہلو بدل کے بولا۔ "ہماری مراد ہے، شاید ہمی سے کوئی فروگذاشت ہوگئی۔"

"آپ کیا بولا تھا اُن کو؟"

"ہم نے آپ سے کہا تھا کہ ہم آپ کی آمد کی بابت اُنھیں کچھ نہیں بتائیں گے۔ ہم اِس پر کاربند بھی رہے تھے۔ جس روز وہ تشریف لائے، اُنھوں نے اصرار کیا کہ شرفا کے علاقے میں ہم اُن کے لیے کسی چھوٹے سے کم قیمت مکان کا بندوبست کر دیں تو نہایت مناسب ہو۔ ہم نے اُن سے گزارش کی، حضرت اتنی بڑی کوٹھی ہے یہاں آپ جس جگہ چاہیں قیام فرمائیں۔ یہاں افرادِ خانہ ہی کتنے ہیں۔ ایک بھائی، ایک بہن، ایک ماں۔ باقی سب ملازم ہیں۔ ایک بھائی یورپ تعلیم حاصل کرنے گیا ہے۔ باقی بہنیں اپنے گھر کی ہو چکی ہیں۔ آپ کے آنے سے کوئی تنگی نہیں ہو جائے گی۔ خیر، اِس یقین دہانی پر وہ یہاں ٹھیرنے کے لیے آمادہ ہو گئے کہ ہم جلد ہی اُن کے لیے الگ مکان کا بندوبست کر دیں گے یا اگر وہ خود اپنی ضرورت کے مطابق مکان کی تلاش میں کامیاب ہوگئے تو چلے جائیں گے۔ اُنھوں نے عمارت کے پچھلے والے حصّے میں رہنا پسند کیا۔ یہ جگہ اُن کے لیے موزوں بھی تھی، عمارت سے ملحق ہونے کے باوجود عمارت سے بڑی الگ تھلگ۔ ہمیں کچھ اندازہ تھا کہ وہ ایک گوشہ نشیں کم گو شخص ہیں، ہجوم سے گھبراتے ہیں۔ اس حصّے سے ملحق لائبریری

بھی ہے چناں چہ لائبریری بھی اُن سے قریب رہے گی۔ پہلا دن تو یوں ہی گزر گیا، دوسرے دن ہمیں آپ کا خیال آیا۔ ہم نے سوچا، آپ کو خط لکھ دیں لیکن پھر سوچتے ہی رہ گئے۔ کچھ یہ اطمینان بھی اپنی جگہ تھا کہ مولوی صاحب تو اب یہیں قیام فرما ہیں۔ ہم کسی وقت بھی آپ کو اطلاع دے سکتے ہیں۔ اصل میں ہمارا ذہن ایک اور بات سے منتشر ہو گیا تھا کہ آپ کی اچانک آمد مولوی صاحب کو گراں نہ گزر جائے۔ اچھا ہو گا کہ پہلے اس نئی جگہ سے اُن کی ذہنی مطابقت ہو جائے اور بہتر ہے کہ پہلے ہم اس سلسلے میں اُن کا عندیہ لے لیں۔ وہ بہت پریشان نظر آتے تھے۔ کسی نئی جگہ بسنے میں غالباً یہ اضطراب و تردّد ہونا بھی چاہیے۔ انھیں یہاں وسیلۂ معاش کا بھی کچھ انتظام کرنا تھا۔ حالانکہ اس معاملے میں انھیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی، یہاں اللہ نے بہت کچھ دیا ہے مگر یہ بات اُن جیسے غیور اور حساس شخص سے ہم کیسے کہہ سکتے تھے۔ وہ یہاں قیام ہی بہ مشکل سے راضی ہوئے تھے، معاف کیجیے، اس بدگمانی نے بھی ہمارے دل میں جگہ لی کہ آپ کی رُوداد میں کوئی پہلو ادھورا ہو سکتا ہے، مولوی صاحب اگر کسی سے ملنا یا تعلق رکھنا نہیں چاہتے تو ہم درمیان میں پڑنے والے کون، بہتر ہے کسی موقع پر ہم اُن سے کنایتاً ذکر کر کے دیکھیں، پھر آپ سے کوئی سلسلہ جنبانی کریں۔ یوں آپ کے اچانک آجانے سے وہ مکدّر نہ ہو جائیں، ہماری طرف سے اُن کے دل میں کوئی گرہ نہ پڑ جائے۔ جانے کیسی کیسی تلخی سینے میں بھری ہو، والدِ محترم کی نسبت اُن کے اور ہمارے درمیان ادب و لحاظ کی ایک حد تو بہر حال قائم کرتی تھی۔"

خادمہ کے کمرے میں آنے پر نواب کی بات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ وہ دبے قدموں کمرے میں داخل ہوئی اور خاص دان میز پر رکھ کے فوراً چلی گئی۔ اُس کے آجانے سے نواب کو سامنے میز پر رکھی ہوئی چائے نظر آگئی اور وہ خفیف لہجے میں بولا۔ "آپ نے چائے کو تو ہاتھ ہی نہیں لگایا، ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

"ٹھنڈی ہو جائے گا تو دوسرا آجائے گا۔" پیرو نے لجاجت سے کہا۔ "ابھی آپ کیا بول رہا تھا نواب صاحب؟"

نواب نے چائے پوش اُٹھا کے چائے دانی چھو کے دیکھی۔ "ابھی گرم ہے، ہمارا خیال ہے، ایک پیالی پی لیجیے۔"

"اپن ابھی بعد کو پی لے گا۔"

نواب نے چائے دانی ڈھک دی اور سمٹی ہوئی آواز میں بولا۔ "بس کچھ احتیاط و آداب نے ہمیں روکے رکھا لیکن جب بھی اُن کا سامنا ہوتا تھا، آپ دونوں حضرات کے چہرے ہماری آنکھوں میں گھومنے لگتے تھے۔ دوسرا دن گزرا، تیسرا دن بھی۔ ہم نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ اُنھیں کسی قسم کی زحمت نہ ہو، ملازمین کو خاص طور پر اُن کا خیال رکھنے کی ہدایت کر دی گئی تھی۔ خود والدۂ محترمہ نے جا کے اُن کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ اب وہ اِسے اپنا ہی گھر سمجھیں، کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف فرما دیں، اُن کے آنے سے گھر کی رونق بڑھ گئی ہے، گھر میں اب ایک بڑا موجود ہے وغیرہ وغیرہ۔ ہمیں توقع تھی کہ مولوی صاحب کو یہاں تھوڑی بہت یک سُوئی ضرور نصیب ہو گی۔ اُن کے چہرے سے عیاں تھا کہ یا تو اُنھیں بہت صدمے پہنچے ہیں یا انھیں آیندہ کی فکر کچھ زیادہ لاحق ہے۔ گھبرائے گھبرائے، کھوئے کھوئے، سفر کی تکان بھی اس کی وجہ ہو سکتی تھی یا جیسے کہ ہم نے عرض کیا، نئی جگہ کی اجنبیت بھی سبب ہو سکتا ہے۔ بہر حال ایک بات ضرور تھی۔ ان تمام شکستگیوں کے باوجود اُن کا چہرہ عزم سے عاری نہیں تھا۔ غالباً یہی عزم اُنھیں متحرک اور مستعد رکھے ہوئے تھا۔ سفر، نئے گھر کی تلاش، خودداری اور محتاط روی کو اسی عزم کی علامتیں کہا جا سکتا ہے۔ ہمارے دل میں، یقین کیجیے، اُن کے لیے بڑی عزت تھی، تھی کیا، بلکہ ہے، اُن کے آنے سے ہمیں بہت خوشی ہوئی تھی مگر انھوں نے اپنے مخلصین کو موقع ہی نہیں دیا۔ شاید ہم اُن کے کسی کام آسکتے۔ چوتھے دن شام کے وقت ہم اُن کے ساتھ چائے پی رہے تھے۔ والدِ مرحوم کا تذکرہ تھا۔ ہم نے پہلے کی نسبت اُنھیں کسی قدر مجتمع اور مطمئن دیکھا تو وقت مناسب سمجھا۔ آپ کی بات ہمیں یاد تھی کہ آپ اُن کی کوئی امانت بھی لوٹانا چاہتے تھے، جائداد وغیرہ۔ ہم نے سوچا، مولوی صاحب ہم سے کبھی اپنا حال بیان نہیں کریں گے، ان کی مالی الجھنوں کے تدارک کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اُن کی جائداد واپس مل جائے۔ شاید اسی طرح زخموں کا کچھ اندمال ہو سکے اور برسوں کا حبس دُور ہو جائے۔ ہم نے جھجکتے جھجکتے اُن سے آپ کا نام لیا۔"

"آپ اُن کو اِس کا نام بول دیا تھا؟" نواب سانس لینے کے لیے رُکا تھا کہ پیرو نے ہذیانی انداز میں پوچھا۔

"جی ہاں، ہم نے سرسری طور پر اُن کے خاندانی معاملات کا ذکر چھیڑا۔ اُنھوں نے بُرا نہیں مانا، ہمیں اور جرأت ہوئی، ہم نے کسی ہیر پھیر کے بجائے سیدھے سادے انداز میں بابر زماں صاحب کا نام لیا۔ یہی نام بتایا تھا آپ نے؟"

"جی، جی، یہی بولا تھا، ایک دم یہی۔" پیرو نے بے تابانہ کہا۔

میرے ہاتھ پیر شل ہوئے جا رہے تھے۔ نواب کی نظریں بار بار مجھ پر آکے ٹک جاتیں۔ میں سر جھکاتا تو میرا دم اور گھٹنے لگتا۔

"ہم کیا کہہ سکتے ہیں کہ کیا ہوا۔" نواب شرمندہ سا بولا۔ "مولوی صاحب کی اِس کیفیت کا حال بیان کرنا مشکل ہے۔ وہ بے ساختہ اچھل پڑے، پھر اُن پر جمود سا طاری ہو گیا۔ وہ مبہوت ہو کے ہمیں دیکھنے لگے۔ آپ نے ہمیں بتایا تھا کہ آٹھ نو سال سے اُن سے کوئی ربط ضبط نہیں ہے چنانچہ اُن کا استعجاب ہمارے لیے اتنا غیر متوقع نہیں تھا لیکن ہم کچھ سمجھنے سے قاصر تھے۔ ہم آگے زبان کھولنے کے لیے اُن کے مثبت، منفی ردِّعمل کا ایک اندازہ کرنا چاہتے تھے۔ شاید وہ بھی یہی چاہتے تھے اسی لیے چُپ رہے۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا؟"

"اپن ایک دم سمجھ رہا ہے نواب صاحب!" پیرو نے تیزی سے کہا۔

نواب ٹھیر گیا، جیسے کچھ بھول گیا ہو۔ اُس کی آنکھوں کی سُرخی گہری ہو گئی تھی۔ چہرے پر بھی دھواں سا چھایا ہوا تھا۔ پیرو نے دخل نہیں دیا، چند لمحے بعد وہ خود ہی بوجھل آواز میں بولا۔ "ہم نے اُن سے کہا تھا کہ آپ اس نام کے کسی شخص سے واقف ہیں؟ وہ فوراً کوئی جواب نہ دے سکے، ہم نے اُنھیں ٹوکا کہ آپ چپ کیوں ہو گئے۔ چونکہ ہم نے ذکر چھیڑ دیا تھا لہٰذا اب ہمیں کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا۔ ہمارے ٹوکنے پر وہ چونک پڑے اور عالمِ اضطراب کے باوجود اُنھوں نے بہ کمال تحمل ہم سے وہی سوال کیا جس کا ہمیں علم تھا لیکن جس کا جواب ہمارے لیے آسان نہیں تھا۔ انھوں نے ہم سے پوچھا کہ ہم یہ نام کس طرح جانتے ہیں؟ ہم کہہ سکتے تھے کہ ہمارے پاس کوئی خط آیا تھا یا کسی واقف کار نے ہم سے مراد آباد کے اِن صاحب کا تذکرہ کیا تھا یا ہمیں خود کہیں یہ مراد آبادی صاحب ملے تھے۔ مراد آباد ویسے بھی اتنا بڑا شہر نہیں ہے، چھوٹے شہروں میں ایک دوسرے کے واقف کار نکل ہی آتے ہیں مگر ہم نے یہی بہتر سمجھا کہ اُنھیں صاف صاف بتا دیا جائے تاکہ بعد میں اُن کے سامنے کوئی خفت نہ ہو۔ ہم نے کہا، یہ صاحب یہاں آئے تھے۔ یہ سُن کے، ہمیں کہنا چاہیے کہ اُن پر سناٹا سا طاری ہو گیا مگر اُن کی یہ کیفیت زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی۔ اُنھوں نے ہم سے پوچھا، یہاں آئے تھے؟ اُن کی آواز سے کبیدگی اور حیرت چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ ہم نے کہا، جی ہاں، یہیں آئے تھے اور آپ کے بارے میں معلوم کر رہے تھے۔ اور آپ نے کیا فرمایا؟ اُنھوں نے ہم سے پوچھا۔ ہم نے عرض کیا، ہم نے اُنھیں بتا دیا تھا کہ مولوی صاحب قبلہ یہاں تشریف لائے تھے، مدت دراز کے بعد، اُنھیں کسی ضروری کام سے مراد آباد جانا تھا، یہیں واپس آنے کے لیے فرما گئے تھے لیکن اب کوئی ڈیڑھ ماہ کے قریب ہو رہا ہے، وہ نہیں آئے ہیں۔ ہم سے پوچھا کہ ہم نے اور کیا کہا۔ ہم نے اُن سے عرض کیا کہ اس کے سوا بھلا ہم اور کیا کہہ سکتے تھے۔ اُنھوں نے سوال کیا کہ آپ کی آمد کا آخر کیا مقصد تھا؟ ہم نے کچھ تو اس بابت معلوم کیا ہو گا۔ ہم نے کہا، جی ہاں یہ تو ہمیں پوچھنا ہی چاہیے تھا۔ اُنھوں نے بتایا تھا کہ مولوی صاحب اُن کے قریبی عزیز ہیں، جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے، ماموں کا رشتہ بتایا تھا اور کہا تھا کہ ہماری والدہ نے مدت ہوئی، اپنے بھائی کے مکان پر قبضہ کر لیا تھا۔ مولوی صاحب کو اپنی بہن سے یہ توقع ہرگز نہیں تھی۔ وہ کچھ اور تو نہ کر سکے، مراد آباد کو خیر باد کہہ گئے۔ اُس کے بعد اُن کی کوئی خیر خبر معلوم نہ ہو سکی۔ بابر زماں صاحب بھی اب مراد آباد میں نہیں رہتے، بمبئی میں قیام ہے تاہم عرصے سے وہ آپ کی تلاش میں تھے۔ بڑی تگ و دو کے بعد آخر مراد آباد ہی سے انھیں آپ کا پتہ ملا اور وہ یہاں تک آن پہنچے۔ ہم نے مولوی صاحب سے حقیقتِ حال بیان کی کہ بابر زماں آپ سے ملنے کے لیے بڑے بے تاب تھے کیونکہ وہ آپ کی امانت آپ کو لوٹانا چاہتے ہیں۔"

"مولوی صاحب نے کامل انہماک سے ہماری باتیں سنیں اور کسی قسم کا تبصرہ نہیں کیا۔ ہم اسی جستجو میں رہے کہ پہلے اُن سے کچھ جان سکیں تو اچھا ہو لیکن بہر حال وہ ہمارے بزرگ تھے۔ اُنھوں نے ہمیں اس کا موقع ہی نہیں دیا۔ وہ سوال کرتے رہے، ہم جواب دیتے رہے۔ ہم نے زندگی اُن کے مقابلے میں ظاہر ہے، نہایت کم گزاری ہے، نصف کے لگ بھگ۔ مولوی صاحب کی عمر کے لوگوں میں تحمل، برداشت اور بُردباری لازماً آجاتی ہے مگر ہم اُن سے بہت ناپختہ کار ہونے کے باوجود اتنا تو اندازہ لگا سکتے تھے کہ اس ذکر سے وہ مضطرب اور منتشر ہو گئے تھے، متزلزل کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ آدمی ایک حد تک ہی اپنے احساسات چھپا سکتا ہے اور کم ہی لوگوں کو یہ قدرت ہوتی ہے۔ ہمیں اُن سے ایک طرح کی ندامت ہو رہی تھی کہ ہم نے اچھا نہیں کیا، اُن کے زخم کرید دیے۔ ہر چند مولوی صاحب نے کسی طرح کا اعتراض نہیں کیا تھا، خاصی دیر بعد انھوں نے پوچھا کہ کس قماش کے لوگ تھے۔ ہم نے عرض کیا کہ دو صاحبان آئے تھے، ایک بزرگ کا تعلق بمبئی سے تھا اور معلوم بھی یہی ہوتا تھا۔ دوسرے نوجوان تھے، اُنھی کا نام ہمیں بابر زماں بتایا گیا تھا۔ نہایت مہذب، وجیہ، کھلتے ہوئے گندمیں رنگ اور اٹھی ہوئی قامت کے آدمی تھے۔ سادہ لباس مگر طبیعت میں قرار نہیں تھا۔ ہمیں وہ اچھے لگے۔ وہ ایسے لوگوں میں تھے جن سے ایک ملاقات میں سیری نہیں ہوتی اور جو اپنے نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ معاف کیجیے۔" وہ شائستگی سے بولا۔ "کم از کم ہمارا یہی تاثر تھا۔"

مجھ سے اُس کا شکریہ ادا نہیں کیا جا سکا، میں بس گنگ نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔ میرے اِس رویّے پر شاید اُس نے اپنی رائے میں ترمیم

کرلی ہوگی۔ اپنے اندازوں کے بارے میں اُسے بہت خوش فہمی تھی۔ میرے لیے اُس کے اندازے بس یہیں تک تھے، پھر اور قدو قامت تک کوئی نہیں جانتا کہ اُن کے پیچھے کیسے کیسے رنگ اور کیسی کیسی قامتیں ہوتی ہیں۔ میرے جی میں آئی کہ اُس سے اپنا پورا تعارف ہی کرا دوں، جیل، چاقو بازی، 'اڈا گیری' میں اُسے کیا کیا بتاتا۔ اِن اجالوں کے پیچھے کیسے کیسے اندھیرے چھپے ہیں۔ یہ بھی تو میرا ہی حصّہ ہیں۔ انھیں جانے بغیر اُسے کوئی رائے قائم نہیں کرنی چاہیے۔

"مولوی صاحب کو ہم سے ایک سوال کرنا چاہیے تھا۔" وہ ٹوٹی ہوئی سی آواز میں بولا۔ "کہ کیا وہ لوگ دوبارہ آنے کو کہہ گئے ہیں، وہ اب کہاں ہیں۔ چند لمحوں کے سکوت کے بعد انھوں نے ہم سے یہی پوچھا۔ ہم نے اُن سے کہا کہ اب تو وہ کبھی کے بمبئی واپس چلے گئے ہوں گے۔ اپنا بمبئی کا پتہ دے گئے تھے جو ہمارے پاس محفوظ ہے۔ ہم سے کہہ گئے ہیں کہ اگر اِس دوران آپ تشریف لے آئیں تو براہِ کرم اُنھیں مطلع کر دیا جائے۔ ہم اُنھیں خط لکھ دیتے لیکن آپ سے مشورہ کیے بغیر اُن سے کوئی رابطہ ضبط غالباً مناسب نہیں تھا۔ مُن کے دیر تک چپ رہے، پھر بے نیازانہ انداز میں بولے کہ وہ پتہ ہمیں دے دیجیے گا۔ ہم نے جسارت کی کہ آخر یہ کون صاحب ہیں۔ کیا آپ اُن سے تجدیدِ تعلق پسند کریں گے اور ہم نے اُن سے یہ بھی کہا کہ اب بھول بھی جائیے، وہ صاحب بہت نادم تھے۔ خطائیں آدمیوں سے ہوتی ہیں، معاف کر دیں تو احسن ہوگا۔ ہمیں بھی خوشی ہوگی۔ بس سنتے رہے۔ ہم نے اُن سے دوبارہ پوچھا تو صرف اتنا کہا کہ آپ ہمیں پتہ دے دیجیے۔ مناسب ہوا تو کسی وقت اُن سے رابطہ قائم کر لیا جائے گا۔ ابھی دماغ کچھ حاضر نہیں ہے۔ اس کے بعد مزید کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہیں رہ جاتی تھی۔ باقی ہمیں دخل در معقولات والی بات معلوم ہوئی۔ میزبانی کے بھی آداب ہوتے ہیں، ہم نے زبان بند رکھی رات کے کھانے پر ہماری اُن سے ملاقات ہوئی۔ اُنھوں نے ہم سے پتہ طلب نہیں کیا، ہم نے بھی اس سلسلے میں اُن سے کوئی بات نہیں کی۔ رات کو وہ مطالعے کا عذر کر کے جلد ہی ہم سے رخصت ہو گئے۔ اُس کے بعد کا حال ہم آپ کو بتا چکے ہیں۔ دوسرے دن ہم سکندر آباد چلے گئے۔ واپس آئے تو وہ موجود نہیں تھے۔"

نواب چپ ہو گیا۔ پیرو اُس سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن پھر شاید اُسے خیال آ گیا کہ اب اور کیا پوچھنا باقی رہ گیا ہے۔ اُس نے میرے ہاتھ پر تھپکی دی، میرے جی میں آئی کہ یہاں سے بھاگ جاؤں۔ نواب کی سُرخ آنکھیں مجھی پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ میرا سینہ پھٹا جا رہا تھا۔ "ایدر کسی سے بول کے بھی نہیں گیا؟" پیرو نے نواب سے پوچھا۔ پیرو کا دماغ بھی چل گیا تھا۔ اتنی دیر سے نواب اور کیا کہہ رہا تھا۔

"یہاں صرف والدہ محترمہ تھیں۔" نواب نے بجھی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہمشیرہ بھی ہمارے ہمراہ سکندر آباد گئی تھیں۔ جانا تو امّی جان کو بھی تھا، مگر اُس دن اُن کا مزاج کسی قدر ناساز تھا۔ ملازم کہتے ہیں کہ مولوی صاحب نے والدہ کے بارے میں اُن سے پوچھا، کھانے کے بعد اُنھیں قیلولے کی عادت ہے۔ ملازموں نے بتایا کہ سو رہی ہیں۔ مولوی صاحب نے کہا، پھر بہتر ہے، اُنھیں جگایا نہ جائے۔ ملازم سے انھوں نے تانگہ منگایا۔ ملازم اُن سے کیا کہہ سکتے تھے۔"

"ابھی ابھی آپ کیا سمجھتا ہے۔ اپن کا مطلب ہے، وہ ایسا ایدر سے کیوں چلا گیا؟" اتنا کچھ سننے کے بعد پیرو نے پھر ایک فضول بات کہی۔

نواب کے چہرے کا رنگ لال ہو گیا۔ "ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ کیا کہہ سکتے ہیں۔" وہ بکھرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ہم نے آپ کو بتایا تھا کہ سبھی نے اُن کی دل جوئی کی کوشش کی تھی، اُن کے آنے سے ہمیں بڑی مسرت ہوئی تھی مگر جانے کیوں، کون سی کوتاہی ہم سے سرزد ہوئی۔ اگر صرف یہی وجہ تھی کہ ہم نے اُنھیں آپ کے بارے میں بتا دیا تھا تو کیا یہ ہم نے اچھا نہیں کیا تھا۔ سب کچھ اُنھی کی آمادگی پر منحصر تھا۔ وہ آمادہ نہ ہوتے تو بخدا ہم کبھی آپ کو نہ لکھتے۔ اس میں ایسی کیا بات تھی جو وہ اتنے دل برداشتہ ہو گئے یا یوں کہیے کہ برہم ہو گئے۔ ہمارے آنے کے بعد وہ جا سکتے تھے۔ وہ اپنی مرضی کے مالک و مختار تھے کسی وقت بھی جانے کا فیصلہ کر سکتے تھے۔ یوں سامان اُٹھا کے گھر کے مکینوں سے کہے بغیر چلے جانا، کوئی رسمی سا معذرتی پرزہ بھی لکھنا گوارا نہیں کیا، اسے کیا کہا جا سکتا ہے۔ ہمیں اپنی خطا سمجھ میں نہیں آتی۔ آپ ہی کچھ بتائیے۔"

"اپن کیا بولے نواب صاحب!"

"ہم آپ سے سچ کہیں۔ ہماری عقل میں کچھ نہیں آتا۔ یہ تو ایک بہت سیدھی سادی بات تھی۔ کچھ لوگ اُن کی عدم موجودگی میں اُن سے ملنے آئے تھے۔ ہم نے اُن کے آنے پر تذکرہ کر دیا۔ یقیناً کوئی اور ہی بات ہوگی۔"

"ابھی اور کیا ہو سکتا ہے نواب صاحب!"

"دیکھیے، آپ خود ہی سوچیے، جو کچھ ہم نے آپ کے گوش گزار کیا۔ یقین کیجیے، من و عن یہی پیش آیا ہے۔ اس میں آپ کو ہماری کون سی لغزش نظر آتی ہے۔ یہ ہماری زندگی کا پہلا تجربہ ہے۔ امّی جان کو جتنا رنج ہوا ہے، ہم بتا نہیں سکتے۔ ہم سے پوچھتی ہیں لیکن ہم کوئی جواب نہیں دے پاتے، ہمارے آنے سے پہلے امّی جان کو ملازموں سے اُن کے جانے کی اطلاع مل چکی تھی لہٰذا سکندر آباد سے آنے پر ہم مولوی صاحب

کی اچانک روانگی کے بارے میں اُن سے کوئی بہانہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہم تو آپ کے خود ششدر رہ گئے تھے۔ ہم نے پوری طرح تصدیق کر لی ہے کہ ہمارے سکندر آباد جانے کے بعد کوئی شخص اُن سے ملنے نہیں آیا۔ کسی خط یا تار وغیرہ کی موصولی کا معاملہ بھی خارج از بحث ہے۔ فرض کیجیے اُنھیں کوئی بھولا ہوا کام یاد آگیا تھا اور اُن کا جانا اتنا ہی ضروری ہو گیا تھا اور والدہ سو رہی تھیں تو یہاں ملازم موجود تھے۔ وہ دو لفظی رقعہ تو لکھ سکتے تھے۔ ہم سمجھتے ہیں، ہم نے اس پہلو پر بھی غور کیا کہ آپ کا ذکر اُن کے لیے ایسا ہی ناقابلِ برداشت تھا یا اُنھیں آپ سے کوئی خوف لاحق تھا اور آپ نے ہمیں جو رودادسنائی تھی، معاف کیجیے، ہم تسلیم کیے لیتے ہیں کہ وہ رُوداد حقائق پر مبنی نہیں تھی تو کیا..... نہیں نہیں، وہ ہمیں اعتماد میں لے سکتے تھے۔ اُنھوں نے سب کچھ سن کے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ ہم اُن کی نظروں میں اتنے نامعتبر تھے؟ اشارہ کر دیتے تو یہاں پرندہ بھی پَر نہیں مار سکتا تھا۔"

"اپن سمجھتا ہے کہ آپ کو کیسا دکھ ہوگا۔" پیرو نے افسردگی سے کہا اور یکایک نواب سے پوچھنے لگا۔ "اور وہ، وہ لڑکی! آپ نے اُس کو دیکھا تھا نواب صاحب؟"

"دیکھنے سے کیا مراد ہے آپ کی؟" وہ تیزی سے بولا۔

"اپن کا مطلب ہے، وہ کیسا تھا، ابھی تو بہت بڑا ہو گیا ہوگا؟" پیرو نے جھجکتے ہوئے کہا۔

نواب کے ہونٹ پھڑکنے لگے۔ وہ کھوئی کھوئی نظروں سے پیرو کو تکتا رہا، پھر دبے لہجے میں بولا۔ "ہاں، جی ہاں، اسے اتفاق کہیے، اُس روز حسبِ عادت، دستک کی ضرورت سمجھے بغیر ہم اندر گھر میں داخل ہوئے تو وہ والدہ اور ہمشیرہ کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہمیں بڑی ندامت ہوئی اور ہم فوراً واپس ہو گئے۔ یوں ہمارا اُن کا آمنا سامنا ہوا تھا، بس چند لمحوں کے لیے۔" یہ کہہ کے وہ جیسے کہیں گم ہو گیا۔

"ابھی کیسا تھا وہ؟" پیرو نے اٹکتی زبان سے اُسے ٹوکا۔

پیرو کے سوال پر وہ جز بز سا ہو گیا مگر دوسرے ہی لمحے اُس کے ماتھے کی شکنیں دُور ہو گئیں اور وہ معذرتی لہجے میں بولا۔ "ہاں، آپ نے تو انھیں عرصے سے نہیں دیکھا ہوگا۔"

پیرو نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔

"ماشا اللہ! خدا نظرِ بد سے بچائے۔ اب تو وہ ایک، ایک مکمل دوشیزہ نظر آتی تھیں، ایک، ایک فلکی گردن اپ خاتون....." لفظ نواب کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ وہ بات بدلنے کے انداز میں پیرو سے پوچھنے لگا۔ "کیا وہ مولوی صاحب کی دختر تھیں؟"

"ابھی مولوی صاحب نے کیا بولا آپ کو؟"

"انھوں نے یہی فرمایا تھا۔"

"پھر آپ ایسا کیوں پوچھ رہا ہے؟"

"نہیں، یوں ہی۔" نواب سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ ایک لمحے کے لیے اُس کا سارا جسم بل کھا گیا۔ "یوں ہی ہمیں خیال آگیا۔" وہ سنبھل کے بولا۔ "یعنی کہ وہ متبنّٰے پالک بھی ہو سکتی ہیں۔"

"وہ اُسی کا بیٹا ہے۔" اچھا ہوا جو پیرو نے یہ کہہ کے نواب کے غیر ضروری سوالوں سے نجات حاصل کر لی۔ نواب اُس کے جواب سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔ پیرو نے اُسے مزید تذبذب و کشمکش کی مہلت نہیں دی، عاجزانہ لہجے میں پوچھنے لگا۔ "ابھی آپ کا ماں، بہن تو اُس کو زیادہ بھالا، بات کیا ہوگا۔ وہ اُس کے لیے کیا بولتا ہے۔"

"اُن کی زبانیں تو مدح سرائی کرتے نہیں تھکتیں۔" نواب نے تمتماتی آواز میں کہا۔ "اُنھیں تو گویا اپنا کوئی کھویا ہوا مل گیا تھا، امی کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ اُنھیں مسلسل اپنی نظروں کے سامنے رکھیں، دن میں وہ اُن سے اس قدر مانوس ہو گئی تھیں جیسے برسوں کی شناسا ہو۔ ہمشیرہ کا بھی یہی عالم تھا، نرجس بانو....." نرجس بانو سے نواب کی مراد کورا ہی ہوگی، مولوی صاحب کا رکھا ہوا یہ نام مجھے زہرہ نے بتایا تھا۔ نواب بھی یہی نام لے رہا تھا۔ کہنے لگا۔ "نہایت متین، کم گو لڑکی ہیں۔ امی جان کا خیال تھا کہ ماں بہن نہ ہونے سے اُ

پر گہرا اثر ہے۔ امی جان نے اُن کی یہ خلش دُور کرنے کی کوشش کی۔ وہ عموماً خاموش خاموش رہتی تھیں، ڈوبی ہوئی، ہمہ وقت کسی سوچ میں گم۔ اگر ہم یہ کہیں کہ چند دنوں میں وہ امی جان اور ہمشیرہ کی آنکھ کا تارا بن گئی تھیں تو غلط نہ ہوگا۔ ہمارا یہ گمان بھی شاید غلط نہیں کہ اس توجہ کا نرجس بانو پر اچھا اثر مرتب ہو رہا تھا۔ ہمشیرہ کا کہنا کہ اُن کا جی یہاں لگنے لگا تھا۔ اُن کے لیے اُن دونوں کی محبت کا احوال ہم کیا بیان کریں۔ امی تو بہت جذباتی ہو گئی تھیں۔ اُنھوں مولوی صاحب سے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ہمارا جی چاہتا ہے نرجس بانو کو مستقل اپنی بیٹی بنا لیں۔ امی جان نے اپنے جذبات اظہار میں خاصی جلدی کی تھی لیکن وہ بھی اپنی جگہ درست تھیں۔ خیال تھا کہ نرجس بانو کی طرف سے مولوی صاحب کے دل و دماغ پر بوجھ ہے تو شاید اس طرح کم ہو سکے۔ اس سے پہلے متعدد بار ایسے مواقع آئے، اُنھوں نے ہماری رائے جاننی چاہی، یہ جانتے ہوئے کہ اُن کے حکم سے سرتابی کی مجال ہم میں نہیں ہے۔ اُس بار انھوں نے

سے کوئی ذکر نہیں کیا، شاید اس لیے، اِس لیے کہ ہم بھی کوئی اعتراض نہ کرتے۔" نواب کی آواز بھرّانے لگی تھی۔ "کتنی بار امی جان نے ہم پر زور دیا تھا اور جانے کہاں کہاں وہ دوڑ دھوپ کرتی رہی تھیں اور خود ہی مسترد کر دیتی تھیں۔ خاندانی نجابت اور شرافت اُن کے ہاں پہلی شرط ہے لیکن اِس مرتبہ تو اُن پر جیسے جادو ہو گیا تھا۔" نواب لفظ چباتے ہوئے بولا۔ "ہم آپ کو یہ سب یوں بتا رہے ہیں کہ آپ مولوی صاحب کے لیے اِس گھر کے عزت و احترام کا اندازہ کر سکیں۔ بے شک امی جان نے عجلت کی تھی لیکن یہ عجلت مولوی صاحب ہی کی طمانیتِ قلب کی خاطر تھی۔ وہ سُن کے چپ رہے اور منکسرانہ کہنے لگے کہ نرجس بانو تو آپ ہی کی بیٹی ہیں۔ وہ اُس لمحے کوئی بھی عُذر کر سکتے تھے۔ یہی کچھ ہوتا ہے۔ امی جان نے تو ایک اشارہ کیا تھا، اپنی خواہش کا اظہار، محض عرض گزاری تھی۔ مولوی صاحب کی نگاہیں دیکھے بغیر وہ دوبارہ ایسی بات کبھی زبان سے نہ نکالتیں۔ مولوی صاحب کو تحمل کرنا چاہیے تھا۔ وہ شرفا میں آئے تھے۔ سمجھ رہے ہیں آپ؟"

"ہاں، ہاں۔" پیرو اُچھل کے بولا۔ "اپن ابھی سب سمجھ رہا ہے۔"

"بس یہی کچھ احوال تھا۔" نواب تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ابھی دیکھو، شاید وہ لَوٹ کے آجائے۔"

نواب کے ہونٹ لٹک گئے، تندی سے بولا۔ "نہیں، نہیں، اب شاید وہ کبھی نہ آئیں۔ واپس آنے والے اِس طرح نہیں جایا کرتے۔"

"ابھی آپ ٹھیک ہی بولتا ہے پر آ بھی سکتا ہے۔ بھولا بھٹکا کبھی ایدر کو آجائے تو اپن کا بنتی ہے، ابھی آپ اپنے کو اُس کو بولے بنا چٹھی لکھ دے گا۔ اپن پر بڑا احسان ہوگا۔"

"پہلے وہ آ تو جائیں۔" نواب نے پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔

پیرو کی متوحش نظریں میری طرف اُٹھ گئیں۔ اُس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ میں اُس کا مطلب سمجھ گیا، وہ میری طرف سے تسلی کر لینا چاہتا تھا کہ کوئی اور سوال جواب تو باقی نہیں رہ گیا ہے۔ میرے دماغ میں اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔ میں نواب سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا، وہ کہہ رہا تھا، کورا جتنے دن یہاں رہی، زیادہ تر اُس کی ماں اور بہن کے ساتھ رہی۔ اُن دونوں نے اُس سے جانے کتنی باتیں کی ہوں گی۔ کورا مسلسل تو خاموش نہیں رہی ہوگی۔ جیسلمیر سے نکلنے کے بعد مولوی صاحب جانے اُسے کہاں کہاں لیے پھرتے رہے، کتنے گھر، کتنے شہر بدل چکے ہیں۔ وہ کب تک اپنے آپ کو باندھے، سمیٹے ہوئے رکھ سکے گی مگر میں جیسے ہی نواب سے کچھ پوچھنے کا ارادہ کرتا، میری آنکھوں میں دُھند سی اُتر آتی۔

جب پیرو نے نواب سے اجازت چاہی، اُس وقت مجھے کچھ ہوش آیا۔ دوبارہ یہاں آنا ممکن نہیں ہوگا۔ میں نے اپنے اوسان مجتمع کرنے کی کوشش کی۔ میں نواب سے ایک التجا کرنا چاہتا تھا کہ کیا وہ کچھ دیر کے لیے مجھے اپنی ماں اور بہن سے ملا سکتا ہے، یہ ممکن نہ ہو تو کم سے کم وہ مجھے اُن جگہوں ہی پر لے چلے جہاں جہاں کورا رہی تھی، وہ مجھے اُس کمرے میں لے چلے جہاں وہ ٹھیری تھی۔ میں بس وہاں جا کے فوراً واپس آجاؤں گا۔ نواب نے اچھی طرح دیکھ بھی لیا ہے، ہو سکتا ہے وہ اپنی کوئی چیز بھول گئی ہو، مگر میں سوچتا ہی رہ گیا، میری زبان پتھرا گئی تھی۔ میرا سارا وجود پتھر ہو گیا تھا۔ نواب کے حکم پر تازہ چائے آگئی تھی۔ نواب نے پیالی میری طرف بڑھائی، وہ میرے لرزتے ہاتھوں سے گرتے گرتے بچی۔ میں بہ مشکل ایک دو گھونٹ حلق سے اُتار سکا۔ نواب ہمیں روکنا چاہتا تھا لیکن پیرو اُٹھ گیا، اُس نے نواب کو بتا دیا تھا کہ ہمیں رات ۹ بجے بمبئی کی گاڑی پکڑنی ہے، اب وقت کم رہ گیا ہے، دوسرے کچھ کام بھی نمٹانے ہیں۔ نواب عمارت کے باہر تک ہمیں چھوڑنے آیا، اُس نے پیرو سے وعدہ لیا کہ جب بھی ہمارا حیدر آباد آنا ہوگا، ہم اُس سے ملنے ضرور آئیں گے۔

مجھے کچھ نہیں معلوم تھا کہ نواب ثروت یار کے گھر سے موٹر تک ہم کتنی دیر میں پہنچے۔ پیرو راستے بھر خاموش رہا۔ سورج ڈوب چکا تھا، دکانیں اور کھمبے روشن ہو چکے تھے۔ میں اپنے ہی پیروں پر موٹر تک آیا تھا لیکن بیٹھتے ہی میرا جسم ڈھے گیا تھا۔ میرے گلے میں پڑا ہوا پیرو کا ہاتھ بھی مجھ پر بوجھ بنا ہوا تھا۔ اُس نے مجھے دبوچ رکھا تھا۔ موٹر تیز رفتاری سے سڑکوں پر گزرتی رہی۔ پھر وہ چار مینار کا علاقہ تھا جہاں پیرو نے ڈرائیور کو بڑے نواب کی حویلی چلنے کی ہدایت کی، میرے کان جلنے لگے۔ اُس نے ڈرائیور کو بڑے نواب ہی کی حویلی چلنے کے لیے کہا تھا۔ "نہیں دادا!" میں نے عاجزی سے کہا۔ "سیدھے گھر چلو۔" میری آواز پھٹی ہوئی تھی۔

"کیا راجا!" وہ چہکتے لہجے میں مجھ سے بولا۔ "ابھی تم نے اپن نے چار مینار کا گھڑیال دیکھا ہے۔ ابھی لوٹ کے اپن سیدھا گھر پہنچ سکتا ہے۔"

"گھر ہی چلو دادا!"

"ابھی بس جا کے ایک دم لَوٹ پڑے گا۔ اُدھر خانم دیکھ کے تھوڑا خوش ہو جائے گا۔ اُدھر سے اپنا ٹھکانے کا رستہ اتنا دُور نہیں ہے۔"

"میرا جی بالکل نہیں چاہ رہا ہے۔"

"اپن جانتا ہے، پر اپن اسی لیے تو اُدھر جانے کا بولتا ہے۔ اُدھر جا کے ابھی جی بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔"

"نہیں دادا! میں تمھارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ اب کہیں اور مت چلو۔"

پیرو نے مجھ سے اصرار نہیں کیا، ڈرائیور کو گھر کی طرف چلنے کا اشارہ کر دیا۔ موٹر زیادہ دُور نہیں آئی تھی، ڈرائیور نے وہیں سے موڑ لی۔ "ابھی

سنبھل کے راجا!" پیرو نے سرگوشی میں کہا۔ "ابھی اپن سوچتا ہے، اُو در نئیں جاتا تو ٹھیک تھا۔ سمجھ لے کہ نئیں گیا تھا۔ تُو تو پہلے ہی نا بول رہا تھا۔"

میں نے کچھ نہیں کہا۔ پیرو بھی چُپ ہو گیا۔ دس پندرہ منٹ بعد موٹر ابا جان کی حویلی کے علاقے میں داخل ہو گئی۔ حویلی میں دو موٹریں اور کھڑی تھیں۔ ہم اندر پہنچے تو نواب حشمت جنگ بھی موجود تھا۔ شامو، زورا اور مارٹی وغیرہ نشست گاہ کے درمیان رکھے ہوئے چمڑے کے سوٹ کیسوں میں سامان رکھ رہے تھے۔ ہر طرف مختلف چیزوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ ساڑیاں، دوسرے کپڑے، چینی اور چاندی کے برتن، انگریزی بسکٹوں اور ٹافیوں کے ڈبے، بلوری گل دان، سنگھار دان اور زیورات کے بکس، جانے کیا کیا بکھرا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ابا جان کو آئے زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے۔ ہم دونوں کو دیکھتے ہی نواب صوفے سے اُٹھ کے لپکتا ہوا ہماری جانب بڑھا اور دونوں بازو پھیلائے، وہ مجھے اور پیرو کو لیے ہوئے سامنے کی نشست پر بیٹھ گیا۔ "ابھی آپ تو پورا بازار اُٹھا لایا نواب صاحب!" پیرو نے حیرت سے کہا۔

"کچھ بھی نہیں ہے، ہمیں وقت ہی کتنا ملا، جو سامنے نظر آیا، جلدی جلدی اُٹھا لائے۔" نواب حشمت جنگ نے انکسار سے کہا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ہم نے آپ کے لیے بہت سوچا، کیا چیز لائیں۔ آپ کی پسند کا ہمیں کوئی اندازہ نہیں تھا۔ بہرحال کچھ لائے ہیں، شاید آپ کو پسند آئے۔"

میں نے سر جھکا لیا۔ اُس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میری زبان پر لفظ منڈلا کے رہ گئے۔ میں وہاں سے اُٹھ جانا چاہتا تھا لیکن ایسے کس طرح اُٹھ سکتا تھا۔ نواب نے اُسی وقت جیب سے ایک مخمل پوش ڈبیا نکالی۔ اُس میں ایک سنہری دستی گھڑی چمک رہی تھی۔ میرا ہاتھ تھام کے اُس نے کلائی پر گھڑی باندھ دی۔ "کیسی ہے؟" وہ شگفتگی سے بولا۔

"بہت، بہت اچھی ہے۔" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

اچھا ہوا جو پیرو نے اُسے اپنی طرف متوجہ کر لیا اور چینی کے برتنوں کے متعلق پوچھ گچھ کرنے لگا۔ میں فوراً وہاں سے اُٹھ آیا اور باہر سبزہ زار کے سامنے چبوترے کی کرسی پر آ کے بیٹھ گیا۔ میرا سارا جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ باہر کی ٹھنڈی ہوا سے مجھ پر کپکپی سی طاری ہونے لگی۔ کچھ دیر میں وہاں بیٹھا اپنی سانسیں درست کرتا رہا۔ ملازم آ جا رہے تھے اور ہر کوئی ٹھٹک کے مجھے گھور کے دیکھتا تھا۔ میں وہاں سے اُٹھ کر اندر کمرے میں آ کے بستر پر لیٹ گیا۔ بستر پر آ کے میرا سینہ اور دُھنکنے لگا۔ کورا کی مالا کے دانے جیسے میرے سینے میں پیوست ہوئے جاتے تھے اور جیسے مالا زنجیر بن کے میرے گلے کے گرد اپنا حلقہ تنگ کر رہی تھی۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی، جیسا کہ پیرو کہہ رہا تھا اگر ہم وہاں جانے کا ارادہ ہی نہ کرتے! مجھے سمجھ لینا چاہیے میں وہاں گیا ہی نہیں۔ کوئی فرق تو نہیں پڑا۔ میں تو خود کو وہاں جانے سے روک رہا تھا اس لیے کہ مجھے اُن کے بارے میں کسی حُسنِ گمان کی توقع ہی نہیں تھی۔ میں دیر تک خود کو تسلیاں دیتا رہا لیکن میرے بس میں کچھ نہیں تھا۔ میرے سر میں اچانک شور مچنے لگتا اور بار بار بس یہی سودا سماتا کہ کسی طرح نواب ثروت یار کی کوٹھی پر پہنچ جاؤں اور جا کے اُس سے التجا کروں کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے مجھے اپنی ماں اور بہن سے بات کرنے کی اجازت دے دے، میں اُس سے کہہ دوں گا کہ جب تک وہ مجھے یہ اجازت نہیں دے گا، اُس کے دروازے پڑا رہوں گا۔ وہ نوجوان ہونے کے باوجود ایک سنجیدہ اور معقول آدمی ہے، میری بات نہیں ٹالے گا۔ میں اُس سے کچھ چھین تو نہیں رہا۔ ضرور نہیں کہ اُس کی ماں اور بہن نے کورا کی ساری باتیں اُسے بتا دی ہوں۔ نواب ضرور مان جائے گا۔ بہ صورتِ دیگر دوسرے طریقے بھی ہیں۔ میں رات کو کسی وقت کوٹھی کی دیوار پھلانگ کے اندر داخل ہو سکتا ہوں۔ پھر زنان خانے کا راستہ تلاش کر لینا ایسا مشکل نہیں، جا کے اور مجھے کے سامنے وہ کچھ نہیں چھپا سکیں گی۔ میرا مقصد اُنھیں کوئی نقصان پہنچانا تو نہیں۔

بے اختیار میں بستر سے اُٹھ گیا، پھر اس سے پہلے کہ دروازے سے نکلتا، میرے پیروں کو جیسے کسی نے جکڑ لیا۔ اب میں کہاں جا سکتا ہوں۔ صبح یہاں حیدر آباد سے نکلنے کے لیے نواب حشمت جنگ کو آمادہ کرنے میں سب کس عذاب سے دوچار ہوئے تھے۔ میرے رُک جانے سے کیا وہ ٹھیر جائیں گے؟ وہ اب یہاں ایک پہر بھی مزید ٹھیرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ نواب کے راضی ہو جانے پر سب نے سکون کی سانس لی ہے جیسے انھیں قید سے نجات مل گئی ہو۔ پہلے بھی یہی ہوا تھا۔ سیدھے بمبئی جاتے جاتے میں نے ہی ایک ساعت کے لیے مراد آباد رک جانے کا شوشہ چھوڑا تھا اور وہاں مسافر خانے کے رجسٹر سے مولوی صاحب کا پتہ ملنے کے بعد حیدر آباد آنے کے لیے ضد کی تھی اور اُن کا راستہ کھوٹا کیا تھا۔ ورنہ یہ سب کچھ یوں پیش نہ آتا۔ میں بمبئی جانے کے بعد بھی حیدر آباد آ سکتا تھا۔ اب میں کس منہ سے اُن سے کہوں گا۔ اُن سے کہے بغیر جاؤں گا تو اُنھیں اور آزمائش میں ڈالوں گا۔ اتنی مشکلوں کے بعد کہیں یہاں سے نکلنا ہو رہا ہے۔ میں وہیں بستر پر پڑا اپنے آپ کو کھسوٹتا رہا۔ نواب ثروت یار کی کوٹھی، حرم منزل کا نقشہ میری آنکھوں میں کھنچنے لگتا تھا۔ ابھی عمارت کے در و بام میں وہ گھومتی ٹہلتی رہی ہے۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ میں اُس

...ے اس قدر قریب ہوں، ایک گھنٹے سے کم کی مسافت میں اُس کے پاس پہنچ سکتا ہوں۔ وہ اُنھی دنوں اس شہر میں تھی جب میں اور پیرو بڑے نواب کی حویلی کے زنداں سے فرار ہونے کے لیے دیواروں سے سر پھوڑ رہے تھے۔ اگر ہم اور چند دن پہلے وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے تو پیرو اسی طرح روانہ ہونے سے پہلے ایک بار نواب ثروت یار کی کوٹھی کا رُخ ضرور کرتا اور، اور...... یہ سوچ کے میرا جسم لرزنے لگتا۔ وہ بھی تو اُدھر زنداں ہی میں تھی، کھلے دروازوں کے زنداں میں۔ وہ دن اُس کی دعاؤں کی قبولیت کا بھی ہوتا مگر قبولیت کی گھڑی تو طے ہوتی ہے۔ وہ گھڑی آئی ہوتی تبھی تو ایسا ہوتا۔

مارٹی کی آواز سُن کے میں ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا۔ وہ مجھے بتا رہا تھا کہ سب روانگی کے لیے تیار ہیں۔ میں کچھ کہے بغیر اُس کے ساتھ چل پڑا۔ چبوترے پر سبھی میرے منتظر تھے۔ میرے آنے کی دیر تھی کہ سب سامنے کھڑی ہوئی دو موٹروں میں بیٹھ گئے۔ حویلی کے کئی ملازم صدر دروازے پر موجود تھے۔ موٹریں چند ثانیوں کے لیے اُن کے دوامی سلام کا جواب دینے کے لیے ٹھیریں اور سڑک پر آ گئیں۔ میں، مارٹی، زورا اور شامو ٹھُسے ہوئے بیٹھے تھے۔ اگلی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ جمرو اور ٹنگو تھے۔ موٹر میں خاموشی تھی۔ سب مضطربانہ، اِدھر اُدھر سڑکوں پر جلتی روشنیوں اور گزرتے لوگوں کو دیکھتے رہے۔ اُنھیں اپنی روانگی کا یقین نہیں آ رہا ہو گا اور اُن کی وحشت زدہ خاموشی کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اُنھیں ابھی تک اپنے تعاقب کا اندیشہ لاحق ہو۔ وہ راستے میں پیش آنے والی کسی رکاوٹ کی طرف سے شاید ابھی تک مطمئن نہیں تھے۔ کبھی کبھی آدمی اپنے سائے پر بھی شک کرنے لگتا ہے۔ موٹر جیسے جیسے آگے بڑھتی گئی، اُن کی بے چینی فزوں ہوتی گئی۔ سڑکوں پر آمد و رفت کم ہو گئی تھی۔ دکانیں یا تو بند ہو گئی تھیں یا بند ہو رہی تھیں۔ پھر جب دُور سے اسٹیشن کی روشنیاں نظر آئیں تب اُنھیں کچھ قرار آیا۔ مارٹی مجھے کہنیاں مارنے لگا اور اگلی نشست پر ٹنگو کے مٹکتے دیدے دیکھ کے سب ہنس پڑے، میں نے بھی اُن کا ساتھ دینے کی کوشش کی لیکن بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُنھیں دیکھا کیا۔ میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اسٹیشن پر موٹریں ٹھیرا ہی چاہتی تھیں کہ شیروانیوں میں ملبوس دو ادھیڑ عمر آدمی تیزی سے ہماری طرف بڑھے۔ اُنھوں نے ہی دروازہ کھولا اور ابا جان کو جھک کے سلام کیا۔ اُن کے اشارے پر کسی تاخیر کے بغیر ایک جانب انتظار میں کھڑے قلیوں نے سامان اُٹھا لیا۔ پلیٹ فارم پر گاڑی لگی ہوئی تھی اور ہر طرف شور اُمڈا ہوا تھا۔ پلیٹ فارم کے دروازے سے ریلوے کا ایک افسر بھی اُن دو آدمیوں کے ساتھ ہو گیا اور کچھ دیر میں فرسٹ کلاس کے ایک ڈبے کے سامنے رُک گیا۔ یہاں ہجوم نسبتاً کم تھا۔ برابر برابر دو ڈبے ہمارے لیے مخصوص کیے گئے تھے، اُن کے درمیان بس ایک دیوار حائل تھی۔ جھَل کی ہدایت پر مارٹی نے کانتے کا بازو پکڑ کے سب سے پہلے اُسے ڈبے پر چڑھانا چاہا۔ مجھے کانتے کا دھیان ہی نہیں رہا تھا، اب جو اُس پر نظر پڑی تو میں ٹھٹک کے رہ گیا۔ اُس کی حالت پہلے سے زیادہ خراب معلوم ہوتی تھی۔ سفید شال سے اُس کا سارا جسم چھپا ہوا تھا، اُس کے چہرے کی سوجن اور تمتماہٹ بتا رہی تھی کہ اُسے تیز بخار ہے۔ مارٹی نے اُس کا بازو پکڑا تو اُس نے اُسے جھٹک دیا اور اپنے ہاتھ سے ڈنڈا پکڑ کے اوپر چڑھا۔ وہ اپنے سہارے سے ڈبے میں چلا تو گیا لیکن اُسے پوری قوت مجتمع کرنی پڑی ہو گی۔ اُس کے قدم ڈگمگا رہے تھے اور لگتا تھا کہ جسم پیروں پر بوجھ بنا ہوا ہے۔ اندر جا کے وہ نشست پر لیٹ گیا۔ مارٹی نے ڈبے سے اُتر کے سرگوشیانہ انداز میں جھَل کو بتایا کہ کانتے کا بدن بُری طرح جل رہا تھا۔ جھَل سُن کے رہ گیا۔

ہم ڈبے کے باہر کھڑے تھے، ہمیں یہاں آئے چند منٹ سے زیادہ نہ ہوئے ہوں گے کہ دو آدمی بڑے بڑے ناشتے دان اور سفید کپڑے میں لپٹی ہوئی ٹوکریاں اُٹھائے تیز تیز قدموں سے ہماری طرف بڑھتے دکھائی دیے۔ جن آدمیوں کی رہ نمائی میں ہم ڈبے تک آئے تھے، اُنھوں نے بہ عجلت دونوں چیزیں اپنی تحویل میں لے کے ہمارے ڈبوں میں رکھ دیں۔ کسی وضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔ نواب حشمت جنگ نے زادِ راہ کے طور پر کھانے پینے کا سامان بھیجا تھا۔ چند قدم کے فاصلے پر وہ خود بھی موجود تھا اور کشاں کشاں ہماری طرف چلا آ رہا تھا۔ وہ عین وقت پر آیا۔ اِدھر وہ آیا، اُدھر گاڑی کی روانگی کے لیے پلیٹ فارم کی گھنٹی بجنے لگی۔ نواب حشمت جنگ باری باری سب سے بغل گیر ہوا، سب سے آخر میں میرے پاس آیا کیونکہ میں سب سے پیچھے کھڑا تھا، وہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔ میں نے کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ نواب کو زیادہ وقت بھی نہیں ملا۔ سب جلدی جلدی ڈبوں میں چڑھ گئے۔ گارڈ نے سیٹی بجا دی تھی۔ جب تک نواب حشمت جنگ نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا، پیرو اور شامو دروازے پر کھڑے رہے۔

میں کانتے کے پاس اُس کے ڈبے میں جانا چاہتا تھا لیکن اُس طرف ابا جان، جھَل اور منیر علی کو بڑھتا دیکھ کے میں نے ارادہ بدل دیا اور دوسرے ڈبے میں آ گیا، یہاں پیرو کے علاوہ شامو، جمرو، مارٹی اور ٹنگو موجود تھے۔ اسٹیشن پر کئی مرتبہ میرے جی میں آئی تھی کہ ہجوم میں کہیں گم ہو جاؤں، وہ گاڑی میں بیٹھ جائیں گے اور دو

ڈبوں کی وجہ سے یہی سمجھیں گے کہ مَیں دوسرے ڈبے میں ہُوں۔ اگلے اسٹیشن پر جب کسی کو میرا خیال آئے گا، گاڑی دُور جا چکی ہوگی اور تب تھّل سفر ملتوی نہیں کر سکے گا۔ مارٹی بعد میں اُن کی نظروں میں کتنا ہی بُرا بنے مگر میری خاطر وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ مَیں اُسے اعتماد میں لے سکتا تھا کہ اگلے اسٹیشن پر وہ اُنھیں بتا دے، میری اتنی فکر نہ کریں، مَیں عمداً حیدرآباد میں ٹھیر گیا ہوں اور تین چار دن بعد بمبئی پہنچ جاؤں گا۔ ممکن ہے، دوسرے ہی دن پہنچ جاؤں۔ مَیں نے لمحے بھر میں جانے کتنے ارادے باندھے تھے لیکن سب مجھے نارَوا، نازیبا معلوم ہوتے تھے۔ وہ چلے تو جائیں گے لیکن پھر شاید کوئی مجھ سے کلام کرنا بھی پسند نہ کرے۔ تھّل، ابا جان کو میرے رُکنے کا کیا جواز دے سکے گا۔ وہ تو پریشان ہو جائیں گے۔ کیا کہیں گے کہ اتنے زمانے بعد بھائی بہنوں سے ملنے کی صورت پیدا ہوئی تھی اور مَیں نے پروا نہیں کی۔ مَیں کیسا آدمی ہوں، کیا بھائی۔ اُنھیں کون بتاتا کہ اُن کا خیال مجھے ابا جان سے کم نہیں ہے۔ مَیں ایسے کیا جاؤں گا۔ مَیں کُھلی آنکھوں اور کُھلے سینے کے ساتھ ہی اُن کے سامنے جانا چاہتا ہُوں۔ میری رگوں میں کانٹے چبھے ہوئے ہیں، مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا۔ مَیں اپنے آپ ہی کو بُرا لگ رہا ہوں۔ ایک ابا جان کیا، سبھی مجھ سے برگشتہ ہو جاتے۔ مَیں ایسے وقت اُس شہر میں رُک گیا ہوں جہاں سے نکلنا اُن کے لیے پہاڑ بنا ہوا تھا۔ یہی ٹھیک تھا کہ دو تین روز بمبئی میں ٹھیر کے مَیں پھر یہاں واپس آ جاؤں تب کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔ مَیں نے اپنے دل میں یہی طے کیا تھا لیکن ڈبے میں آ کے پھر مجھے طرح طرح کے وہم ستانے لگے۔ میرے ہاتھ پیروں میں اینٹھن سی ہونے لگی تھی اور یہی کچھ گمان ہوتا تھا کہ مَیں کچھ بھول رہا ہوں، مجھ سے کوئی چوک ہو رہی ہے۔ مَیں آپ ہی آپ چونک پڑتا تھا۔

گاڑی چلتے ہی ٹنگو نے فرش پر اُچھلنا کودنا شروع کر دیا تھا۔ سب کِھلے جا رہے تھے، جیسے کوئی شہر فتح کر کے لوٹ رہے ہوں۔ مجھے وہ سب اجنبی اجنبی سے لگ رہے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ ٹنگو کو اُٹھا کے دروازے سے باہر پھینک دُوں یا خود ہی کُود پڑوں۔ میری طرف آ کے ٹنگو مضحکہ خیز انداز میں دیدے مٹکانے اور مسخرا پن کرنے لگا مگر دوسرے ہی لمحے اُس کے جسم کا پارا ٹھٹھر کے رہ گیا۔ میری نظروں میں جانے کیسی تندی تھی۔ پھر ڈبے میں سبھی کو چُپ لگ گئی، وہ مجھ سے دُور نشستوں پر جا بیٹھے۔ بہتر یہی تھا کہ مَیں خود اُن کے سامنے سے ہٹ جاؤں، سو مَیں اوپر کی برتھ پر چلا آیا۔ مارٹی نے خاموشی سے چادر میری طرف بڑھا دی۔ کچھ دیر بعد انھوں نے کھانے کے لیے مجھ سے پوچھا، مَیں نے منع کر دیا۔ گاڑی مختصر مختصر وقفوں سے اسٹیشنوں پر ٹھیرتی رہی۔ [illegible] جاگ رہا تھا۔ نیند اُن میں سے بھی کسی کو نہیں آئی تھی۔ ہر اسٹیشن [illegible] دوسرے ڈبے کی خیر خبر لینے کے لیے کوئی نہ کوئی نیچے اتر جاتا تھا۔ دو تین گھنٹے گزرے ہوں گے، کوئی تیسرا یا چوتھا اسٹیشن تھا، گاڑی ٹھیری ہوئی [illegible] اچانک مارٹی کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ وہ سن ستاتے لہجے [illegible] پیرو سے کہہ رہا تھا۔ "دادا! اپن کا ساتھ ادھر آدمی لوگ لگا ہوا ہے۔"

"کیا بولتا ہے ماسٹر!" پیرو نے بگڑی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں دادا! اپن نے دو آدمی ایسا دیکھا ہے، پہلے بھی اُترنے پر شک پڑا تھا پر اپن چپ رہا کہ ابھی دوبارہ دیکھنے پر ہی زبان کھولے گا۔ وہ سا[illegible] ڈبے میں ہے، اور لوگ بھی ہو سکتا ہے پر اپن ابھی دو....."

"تونے تھّل بھائی کو بولا؟"

"اپن ابھی اُس کو بول کے ہی ادھر آیا ہے۔"

"پھر وہ کیا بولا؟"

"وہ اپن کے ساتھ دیکھنے کو نیچے اُترا اور پلیٹ فارم پر [illegible] اور گھوم کے بولا، ٹھیک ہے ماسٹر! ابھی سالا آدھا آنکھ بچا کے ہ[illegible] اور چرخی کھول کے، اپن کا طرف سے کوئی تڑی پڑی مت کرنا، [illegible] کو بمبئی تک ڈھیل دینے کا ہے۔ سیدھا چلتا رہا تو اپن اُدھر ہی جا[illegible] اُن کو اکھا دیکھے گا۔"

"اپن ابھی چل کے دیکھتا ہے۔" پیرو اپنی نشست سے اُٹھ[illegible] مَیں بھی فوراً نیچے کود پڑا۔

"استاد نے بولا ہے۔" مارٹی اضطراری لہجے میں بولا۔ [illegible] بار نیچے اترے گا تو ابھی سمجھ جائے گا، اپن اُن لوگ کو پہچان لیا [illegible] استاد بولتا ہے، ابھی اُن کو ایسا پتہ نہ چلے تو ٹھیک ہے۔"

پیرو نے مارٹی کے شانے پر ہاتھ مار کے اُسے سامنے سے [illegible]

"اپن ابھی تھوڑا اُتر کے دیکھتا ہے۔" وہ بھڑکتی آواز میں بولا۔ "ا[illegible] اصیل ہے کہ....."

پیرو کے جھپٹتے ہوئے قدم دروازے ہی پر جم کے رہ گئے۔ گا[ڑی] نے سیٹی بجا دی تھی اور لمحوں میں روشنیوں سے اندھیروں میں آ[گئی]۔ اُس کی رفتار تیز تر ہوتی گئی۔ مَیں نے غیر ارادی طور پر اپنی جیب ٹٹول کے دیکھی۔ مارٹی کا چاقو میری جیب میں محفوظ تھا۔

پیرو دیر تک ڈبے کے دروازے پر گم صم کھڑا رہا۔ گاڑی تیز رفتاری [سے] بھاگ رہی تھی۔ اندر ڈبے میں خاصی روشنی تھی مگر باہر گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ [پیرو] نشست پر آ کے بیٹھا، سبھی اُس کے گرد بیٹھ گئے اور پٹ پٹاتی پلکوں سے اُ[س کا] منہ تکنے لگے۔ "ابھی کون لوگ ہو سکتے ہیں دادا؟" لمحوں تک سناٹا رہا۔ پھر شامو جھجکتے ہوئے زبان کھولی۔

جواب میں پیرو نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

"ہو سکتا ہے۔" جمرو تذبذب سے بولا۔ "ابھی تیرے کو تھوڑا دھوکا لگا ہو ماسٹر؟"

"کیسا بولتا ہے جمرو بھائی!" مارٹی نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

"نہیں نہیں، اپنا مطلب ہے، کہ اُن لوگ کو....."

"اپن نے اُن کو اِن دو آنکھ سے دیکھا ہے۔" مارٹی ترشی سے بولا۔ "اپن آنکھ کا ایک دم پرفیکٹ ہے، ہاتھ کے بارے میں ابھی ٹھیک سے نئیں بول سکتا۔ اپن ابھی کیا بولا، اپن نے جا کر سیدھا دادا استاد کو بولا تھا۔ وہ بھی نیچے اُتر کے اُس لوگ کو دیکھ کے آیا ہے۔"

"کس ٹائپ کے آدمی تھے؟"

"بالکل سالا شہری بابو، ایک شیروانی میں تھا تو دوسرا واسکٹ میں۔ دونوں کا کلر ہاف بلیک، ہائٹ اپن کیا بولے۔ دونوں کا فانیوا ہیڈ ہاف سے اوپر کو نکلا تھا۔"

"ٹھیک ہے ماسٹر! ابھی جو تھّل بھائی نے بولا وہی ٹھیک ہے۔" پیرو نے بھاری آواز میں کہا۔ "اپن ابھی بمبئی جا کے اُن لوگ کو دیکھنے کا ہے۔ اپن کو ابھی ڈھیل دینے کا ہی ہے۔"

"تونے صرف دو ہی دیکھے ہیں؟" شامو نے بے چینی سے پوچھا۔

"ابھی اور ہوئیں گا تو اپن کیا بول سکتا ہے۔"

"گاڑی ابھی کون سے ٹیم پہ دوسرا اسٹیشن پکڑنے کا ہے؟" ٹنگو نے مارٹی سے پوچھا۔

"اپن سالا کوئی ریلوے بابو لگتا ہے ادھر؟" مارٹی تنک کے بولا۔ سبھی ہنس پڑے۔ اُن کی ہنسی بے ساختہ نہیں تھی، خوش دلی کے اظہار کی ایک مصنوعی کوشش تھی۔ دوسرے ہی لمحے اُنھیں احساس ہو گیا کہ یہ بے وقت کی راگنی ہے۔ اُن کی سوالی نگاہیں پھر پیرو پر مرکوز ہو گئیں۔ پیرو کے چہرے پر خود اَن گنت سوال بکھرے ہوئے تھے، وہ اُنھیں کیا جواب دیتا۔ اُس نے اُن سب کو برتھوں پر لیٹنے اور سو جانے کی ہدایت کی اور نرمی سے کہنے لگا کہ اگلا اسٹیشن آنے پر وہ خود نیچے اُتر کے اُنھیں ایک نظر دیکھ کے آئے گا۔ پیرو اپنی آواز کے سکون میں لپٹا ہوا اضطراب اُن سے نہ چھپا سکا۔

"نیند سالی ابھی کیدر آئے گا دادا۔ نیند تو اِس ماسٹر تو کے....." جمرو شکستہ لہجے میں بولا اور مارٹی کا تمتماتا چہرہ دیکھ کے چپ ہو گیا۔

"اپن کو لوٹ کے نئیں بولنے کا تھا کیا؟" مارٹی نے تلخی سے کہا۔ "ابھی اُن باسٹرڈ کو اپن نے بلایا ہے؟"

"منہ کیوں بناتا ہے ماسٹر!" پیرو نے اُس کے سینے پر ہاتھ مارا۔ مارٹی فرش پر اُلٹ گیا۔ پیرو کو اندازہ نہیں تھا کہ اُس کا ہاتھ غیر اختیاری طور پر اتنی زور سے پڑے گا۔ سب خاموش ہو گئے اور یکے بعد دیگرے پیرو کے پاس سے ہٹ گئے۔ پھر کسی نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ بیس پچیس منٹ گزرے ہوں گے کہ گاڑی کی رفتار کم ہونے کے آثار پیدا ہوئے۔ کوئی اسٹیشن آ رہا تھا۔ رفتار ٹوٹتے ٹوٹتے معدوم ہونے لگی۔ گاڑی ابھی ٹھیری نہیں تھی کہ سبھی بے تابانہ کھڑے ہو گئے۔ وہ ایک چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ اِس طرف سے میں نے، اُس طرف سے پیرو نے کھڑکی سے جھانک کے دیکھا۔ اسٹیشن پر بجلی نہیں تھی۔ اِکا دُکا لالٹینوں کے سوا سارا اسٹیشن خاموشی اور اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ جمرو اور مارٹی میری طرف، دائیں کھڑکیوں کے پاس آ گئے۔ اسٹیشن کی تین کمروں پر مشتمل عمارت اِسی طرف بنی ہوئی تھی۔ آگے کہنی تک مختصر پلیٹ فارم اُٹھا ہوا تھا۔ یہاں گاڑی زیادہ ٹھیرنے کا امکان نہیں تھا اِس لیے پیرو نے اُترنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ البتہ وہ دروازہ کھولے اور ڈنڈا پکڑے باہر نظریں جمائے رہا۔ میں بھی اُس کے پیچھے تھا۔ ایک دو منٹ بعد ہی گاڑی نے کھسکنا شروع کر دیا۔ خاصا وقت گزر جانے کے باوجود گاڑی کسی جگہ نہیں ٹھیری تو وہ سب آڑے ترچھے ہو کے ایک دوسرے کے ساتھ برتھوں پر لیٹ گئے۔ اوپر کی برتھ پر کوئی نہیں گیا۔ ٹنگو نے پیرو کے پیر دبانا چاہا مگر پیرو نے اُسے جھڑک دیا۔ ناچار ٹنگو جمرو کی برتھ پر آ گیا اور اُس کے پیروں کی طرف دبک کے پڑ گیا۔ آگے بھی گاڑی کسی اسٹیشن پر ایک دو منٹ سے زیادہ نہیں ٹھیری۔ سب نے ہر بار باہر جھانک کے تسلی کی۔ گاڑی چلنے کے بعد سب برتھوں پر آ کے لیٹ جاتے تھے۔ گزشتہ روز بھی وہ رات بھر جاگتے رہے تھے، دن کو بھی کوئی ایک پل نہیں سویا تھا۔ دیوار کے پار دوسرے ڈبے میں بھی شاید کوئی نہ سویا ہو۔ ہو سکتا ہے، تھّل نے ابا جان، منیر علی، زورا اور کانتے کے آرام کی خاطر اُنھیں بتایا ہی نہ ہو کہ مارٹی نے آ کے اُس سے کیا کہا ہے اور وہ اکیلا ہی چوکسی سے رہا ہو لیکن اُس نے احتیاطاً زورا کو ضرور اشارہ کیا ہوگا۔

کُھلی کھڑکیوں سے تیز ہوا اندر آ رہی تھی اور میرے جسم سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ مجھ سے ایک بڑی لغزش ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اگر میں جیسا کہ میرے جی میں آئی تھی، واقعی حیدرآباد اسٹیشن کے ہجوم میں [illegible] ہو جاتا؟ نواب ثروت یار کے ہاں سے آنے کے بعد مجھے تو ہوش ہی اُس وقت آیا تھا جب مارٹی نے اُن دو آدمیوں کے تعاقب کی خبر سے کانوں میں چنگاریاں بھری تھیں۔ اتنی دیر تک، ابا جان کی حویلی سے اسٹیشن تک ویسے تو میں سب کے ساتھ آیا تھا۔ مَیں اُن کے ساتھ ہونے اور سب کچھ دیکھنے سننے کے باوجود مجھے اپنی سُدھ بُدھ نہیں تھی۔ میری آنکھیں تو مسلسل نواب ثروت یار کے مکان میں بھٹک رہی تھیں۔ مَیں ایک لاش کے مانند اُن کے ساتھ گھسٹتا ہوا اسٹیشن تک آیا تھا۔ گاڑی میں بیٹھ جانے اور گاڑی چلنے کے باوجود مَیں کسی بھی اسٹیشن کی بھیڑ میں گم ہو جانے کے ارادے باندھتا رہا تھا کہ حیدرآباد ابھی دُور ہی کتنا ہوا ہے، واپس جانے والی کسی گاڑی سے وہاں پہنچ سکتا ہوں، صرف ایک پہر کے لیے، اب وہاں ایک پہر سے زیادہ وقت صرف نہیں ہوگا۔ مجھے کام ہی کتنا ہے، نواب کے ہاں جا کے اُس

کی ماں اور بہن تک رسائی حاصل کرنا اور اُن سے اُس بدبخت کی خیریت معلوم کرنا۔ وہ کیسی ہے؟ ابھی تک وہی حال ہے یا کچھ بدل گئی ہے؟ اب بھی اُس کے چہرے پر کیا وہی گھٹا، وہی سوگواری چھائی رہتی ہے، وہی ڈوبی ڈوبی آنکھیں، وہی بات بات پر لرزتے کپکپاتے ہونٹ جن کا حال مجھے زہرہ نے بتایا تھا؟ نواب ثروت یار اُس کے متعلق اتنا کچھ نہیں جانتا ہوگا جتنا اُس کی ماں اور بہن جانتی تھیں، وہ زیادہ وقت اُن ہی کے ساتھ رہی تھی۔ وہ باتیں جو نواب مجھے نہیں بتا سکا تھا، مجھے اُس کی ماں اور بہن سے معلوم ہوسکتی تھیں۔ اِس طرح اُس کا سراغ ملنے کی کوئی توقع نہیں تھی، مجھے تو صرف اُس کا احوال جاننے کی فکر تھی۔ اتنے دنوں بعد جیسلمیر کے سفر میں زہرہ، منیر علی اور اُن کے گھر والوں کے بعد اب کہیں کوئی ملا تھا جن کے ساتھ وہ پورے چار پانچ دن رہی تھی۔ میں اُن سے ملے بغیر چلا آیا۔ وہاں سے آنے کے بعد میرے سارے جسم میں سوئیاں سی چبھتی رہی تھیں۔

جس وقت میں اور بیرو نواب ثروت یار کے ہاں بیٹھے تھے، اور نواب ہمیں مولوی صاحب اور کورا کے آنے کی رُوداد سُنا رہا تھا، میں اُسی وقت نواب سے منّت کرتے کرتے رہ گیا تھا کہ وہ کچھ دیر کے لیے مجھے اپنی ماں اور بہن کے پاس لے چلے، میری زبان ہی ٹھٹھر کے رہ گئی۔ ایک اجنبی کو جس سے صرف دوسری ملاقات ہو، وہ کس طرح اپنی پردہ نشین خانہ دار ماں اور بہن کے سامنے پیش کر دیتا۔ اِس کی تو یہی صورت تھی کہ میں نواب کی عدم موجودگی میں کسی وقت اُس کے مکان میں داخل ہونے کی کوشش کرتا، کسی طرح بھی۔ اِس کے لیے مجھے دیوار پھاندنی پڑتی یا مقصد برآری کے لیے اُن عورتوں کو چاقو دکھانا پڑتا یا اُن کے پیروں پڑنا پڑتا۔ میں نے سوچا تھا کہ دو ڈبوں میں تقسیم ہو جانے کی وجہ سے سب سمجھیں گے کہ میں دوسرے ڈبے میں ہوں اور تجمل گاڑی میں بیٹھنے کے بعد سفر ملتوی نہیں کر سکے گا۔ مارٹی جانے بعد میں کتنا ہی بُرا منے مگر میری خوشنودی اُسے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے، میرے لیے وہ اُن کی ہر سزا برداشت کر لیتا۔ مجھے یقین تھا کہ میں اُسے اعتماد میں لے سکتا ہوں، میرے اوجھل ہونے کے بعد وہ انھیں بتا دے گا کہ صرف ایک دن کی بات ہے، میں دوسرے ہی دن بمبئی پہنچ جاؤں گا، پہلی گاڑی سے نہیں تو دوسری گاڑی سے، مگر مجھے اپنا یہ اقدام اُسی وقت بہت نازیبا لگا تھا اس لیے میں خود کو باندھے ہوئے اُن کے ساتھ چلتا رہا۔ وہ آگے تو لے شک چلے جاتے لیکن پھر شاید کوئی بھی مجھ سے کلام کرنا گوارا نہ کرتا۔ مجھے خیال آیا تھا کہ تجمل ابا جان کو میرے حیدرآباد رُک جانے کا کیا جواز پیش کر سکے گا۔ وہ تو میرے یوں اچانک غائب ہو جانے سے پریشان ہو جائیں گے، کیا کہیں گے کہ اتنے زمانے بعد بھائی بہنوں سے ملنے کا وقت آیا تھا مگر میں نے کوئی پروا نہیں کی، میں کیسا بھائی ہوں۔ کون اُنھیں بتاتا کہ میرے سینے میں کیسا اندھیرا بھرا ہوا ہے، میں اپنی دھندلی آنکھیں لیے اُن کے سامنے کیا جا سکوں گا۔ میں نے خود پر جبر کیے رکھا، مارٹی سے اپنے ارادے کا اظہار نہیں کیا۔ جو شہر اُن کے لیے زنداں بنا ہوا تھا، جہاں سے بہ عافیت نکل آنا کوئی پہاڑ سر کرنے سے کم نہیں تھا، وہاں میں پھر ٹھیر جاتا تو وہ میرے بارے میں کیا فیصلہ کرتے۔ پاگل تو وہ مجھے سمجھتے ہی ہو گئے، اب یہ جان کے معاف بھی نہ کرتے۔ آدمی خدا نہیں ہوتا کہ کسی کو اتنا معاف کرتا رہے، اتنی رعایتیں دیتا رہے۔

ایک نہیں، بہت سی پشیمانیوں، بہت سے عواقب و نتائج کے خیال نے مجھے روکے رکھا تھا لیکن یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ حیدرآباد سے گاڑی نکلنے کی دیر ہوگی اور مارٹی یہ مذاق کرے گا۔ میں بھول گیا کہ زنداں کا تعین تو افراد سے ہوتا ہے، جگہ سے نہیں، آدمی آدمی کی زنجیر ہے۔ اگر پہلے اتنا نہیں تو اب مجھے اپنی ناکردہ لغزش کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ ایسے وقت اگر میں ان کے ساتھ موجود نہ ہوتا تو؟ اِس عالم میں تو مجھے ہر وقت ان کے ساتھ رہنا چاہیے تھا۔ ایک میرے چلے جانے سے بے شک وہ اکیلے نہ ہو جاتے مگر میں اپنے آپ کو کیا جواب دیتا۔ میں تو ہمیشہ خود کو نوچتا کھسوٹتا رہتا۔ دو آدمیوں کے تعاقب سے ظاہر تھا کہ وہ طالع آزما ابھی ہم سے مطمئن نہیں ہوئے جنھوں نے کل رات ابا جان کی حویلی میں حملہ آوروں کو بھیجا تھا۔ اگر حیدرآباد میں اُن میں سے کسی کی نظر مجھ پر جا پڑتی تو مجھ اکیلے کو اپنی منزل کا سرا سمجھ کر گرفت میں لینے سے ہرگز نہ چوکتے۔ وہ مجھے کبھی واپس نہ آنے دیتے۔ اسٹیشن پر ہمارے ہر آدمی کی نقل و حرکت پر اُن کی نظر ہوگی، میں اُن کی نگاہوں سے کیسے بچ سکتا تھا۔ میں تو اُن کے لیے خوش بختی کا شگون بن جاتا۔ میرے ارادے اور عمل کے درمیان بس ایک لمحے کی دیوار رہ گئی تھی۔ خطاکاری ہی پشیمانی کا سبب نہیں ہوتی، اس کی نیت بھی کبھی کبھی آدمی کو اپنی نظروں میں بہت گراتی ہے۔ میں حیدرآباد میں رک جانے یا دورانِ سفر اُن سے دُور ہو جانے کے نتائج کا تصور ہی کر سکتا تھا اور اِس تصور ہی سے میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا اور شاید کسی کو بھی نہیں تھا کہ حیدرآباد سے بہ سلامت واپسی ہم پر نگاہ رکھنے سے دست بردار نہیں ہے، اُن کے حوصلے کی پستی نہیں ہے۔

✽

دیر سے کوئی اسٹیشن نہیں آیا تھا۔ گاڑی کی رفتار بہت تیز تھی کہ یکایک انجن نے سیٹیاں بجانی شروع کر دیں۔ سب ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھے حالانکہ اُن میں سے کسی کی بھی آنکھ نہیں لگی تھی۔ میں نے جلدی سے اُٹھ کے باہر جھانکا۔ دُور دُور تک آبادی کا نشان نہیں تھا، نہ آگے کسی اسٹیشن کے آثار دکھائی دیتے تھے۔ آگے کوئی ہالٹ قسم کا اسٹیشن ہی ہو سکتا تھا جہاں سے سگنل نہیں ملا تھا۔ انجن مسلسل سیٹیاں دے رہا تھا۔ پھر رینگتے رینگتے گاڑی ایک ویران جگہ ٹھیر گئی۔ سب یک لخت کھڑے ہو گئے۔ دونوں طرف کے دروازے کھول دیے گئے۔ ڈبوں کے باہر اور اندر کی روشنیوں سے اردگرد کسی قدر اُجالا ہو گیا۔ آس پاس جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں اور اُن کے پار گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے دروازے سے سر نکال کے دیکھا تو برابر کے ڈبے کے دروازے پر مجھے تجمل کھڑا نظر آیا۔ مدھم روشنی کے باوجود میں اُسے خوب پہچان سکتا تھا۔ خود اُس نے ہاتھ کے اشارے سے اپنی موجودگی کی تصدیق کر دی۔ کسی نے اُن سے کچھ نہیں کہا تھا مگر سب جیسے اپنی اپنی جگہ پوری طرح چوکنا کھڑے تھے۔ ڈبے کے دوسرے دروازے پر بیرو اور جمرو چلے گئے تھے۔ اُنھوں نے اگلے ڈبے کے دروازے پر نذر اکو کھڑے دیکھ لیا تھا۔ بیرو نے ہانک لگائی "جاگ رہے ہو سجنا!" بیرو کی آواز اتنی بلند نہیں تھی مگر سناٹے کی وجہ سے دُور دُور تک پہنچی ہوگی۔

اُدھر سے نذر اکو نے کوئی جواب دیا مگر میں اُس کی آواز صاف نہیں سُن سکا۔ اُسی لمحے شامو نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"لاڈلے!" اُس نے پوچھا۔ "چاقو ہے نا تیرے کنے؟"

"ہاں ہاں۔" میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔

"اُس نے تین چار مرتبہ ناک سُڑ سُڑ کی۔ "ہوا بہت گیلی ہے بھیّا۔ اپنے کو کوئی جنگل جان پڑتا ہے۔ بولو تو اُتر کے دیکھیں؟"

"نہیں۔" میں نے اُسے کہنی ماری۔ "ابھی ٹھیرے رہو۔"

"سالی بار بار ہانپنے لگتی ہے۔" شامو اُلجھی ہوئی آواز میں بولا۔

"ضرور کسی نے چین کھینچا ہوگا۔" میرے برابر کھڑے ہوئے مارٹی نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

میں نے اُس سے نہیں کہا کہ زنجیر کھینچے جانے پر نہ تو انجن اتنی سیٹیاں بجاتا ہے، نہ گاڑی ایسے رینگتے ہوئے ٹھیرتی ہے۔ یہ تو کوئی اور بات ہے۔ دروازے پر میرے کھڑے ہو جانے کی وجہ سے راستہ بند ہو گیا تھا۔ مارٹی، شامو اور ڈنگو میری جگہ آنے کے لیے بے قرار تھے، اُن میں سے کسی کو قرار نہیں تھا۔ کبھی وہ اِس کھڑکی سے سر نکال کے دیکھتے، کبھی اُس کھڑکی سے۔ یقیناً وہ کسی ایسی بات کا اعادہ نہیں چاہتے تھے جس کا تجربہ اُنھیں گزشتہ رات ہوا تھا۔ گزری ہوئی رات کا ایک ایک لمحہ اُنھیں زندگی بھر یاد رہے گا، زندگی تو دور کی بات ہے، ابھی تو صرف ایک دن گزرا تھا۔ ایک دن میں کلنتے کے جسم کی خراشیں اور اُبھر آئی تھیں۔ سرغنہ کے ہاتھوں کھائے ہوئے طمانچوں سے ابا جان کا چہرہ کچھ اور سوج گیا تھا۔ بیرو، شامو، جمرو اور تجمل جنھوں نے ضربیں کھائی تھیں اور باقی جو کھڑے دیکھتے رہے تھے، سب کی آنکھوں میں بیتی ہوئی رات کے مناظر اپنے پیچھے دو آدمیوں کی نگرانی کی نوید سُن کے کچھ اور اجاگر ہو جانے چاہئیں تھے۔ مارٹی نے صرف دو آدمیوں کی نشان دہی کی تھی۔ ضروری نہیں تھا کہ صرف دو ہوں۔ جن لوگوں نے اتنی بڑی نفری ابا جان کی حویلی میں بھیجی تھی اُن کے پاس نہ مزید آدمیوں کی کمی ہوگی، نہ ہتھیاروں کی اور جب کہ چند ایک کو چھوڑ کے اُن کے سبھی آدمی صحیح و سلامت ہتھیاروں سمیت واپس پہنچ گئے تھے۔

کل رات اُنھیں حویلی سے کچھ نہیں مل سکا تھا، اب ایک اور کوشش کر دیکھنے میں اُن کا کیا جاتا تھا۔ اِس کے لیے یہ نہایت معتبر جگہ تھی۔ اُن کے خیال میں اگر واقعی ابا جان کی تحویل میں نادر پتھروں کا کوئی ذخیرہ ہے تو وہ اُسے حویلی میں نہیں چھوڑ گئے ہوں گے اور ابا جان شک تو اپنے ساتھ لے کے چل رہے تھے۔ اتنے ہمراہیوں کی موجودگی ہی اُن کے پاس زر و جواہر ہونے کی سب سے بڑی شہادت ہے، کوئی بھی بے سبب اتنا لاؤ لشکر لے کے نہیں چلتا۔ انھیں خوب آگہی تھی کہ ہتھیاروں پر ہماری دسترس کس درجے کی ہے۔ ممکن ہے اُنھیں اُدوں سے ہماری وابستگی کا بھی کوئی علم ہو۔ چنانچہ اُنھیں اب کے نفری زیادہ بھیجنی چاہیے اور ہتھیار بھی زیادہ۔ ہر چند تلاشی کے لیے اب اُن کے سامنے ایک بڑی حویلی کے در و بام اور بے اندازہ ساز و سامان کے بجائے ریل کے دو مختصر ڈبے تھے اور مختصر سا زادِ راہ۔ یہاں تو تلاشی بہت آسان تھی۔ ہیروں کی پوٹلی ابا جان کے پاس محفوظ ہی ہوگی کہیں دل سے لگی۔ اُسے برآمد کر لینا اب اُن کے لیے لمحوں کا کام تھا۔ اِس بار وہ محتاط بھی پہلے سے زیادہ ہوں گے۔ حویلی جانے سے پہلے اُنھیں ہدایت کی گئی تھی کہ وہ خون خرابے سے حتی الوسع اجتناب کریں اور اپنی کوئی نشانی چھوڑ کر نہ آئیں جیسا کہ تجمل کا قیاس تھا اور اُنھوں نے خود بھی کہا تھا، وہ ہمیں مارنے کے ارادے سے نہیں آئے تھے لیکن بھرے ہوئے ہتھیاروں سے چُوک بھی ہو سکتی تھی۔ ہتھیار اسی لیے ساتھ لائے گئے تھے کہ ہم صورتِ حال سمجھنے میں دیر نہ کریں اور ضرورت پڑے تو وہ اُنھیں کام میں بھی لا سکیں۔ ترازو میں تول کے آدمی نہیں بھیجے گئے ہوں گے۔ کسی ایک میں آگ زیادہ بھری ہو سکتی تھی تاہم ریل میں ایسی احتیاطوں کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ شامو اور مارٹی مضطرب انداز میں میرے پاس کھڑے تھے۔ جو باتیں میرے دماغ میں گردش کر رہی تھیں، وہی اُن کے ذہنوں میں بھی چکرا رہی ہوں گی۔

گاڑی رُکے ہوئے کئی منٹ گزر گئے۔ یہاں سے وہاں تک کوئی مسافر بھی نیچے نہیں اُترا۔ شامو سے تحمل نہ ہو سکا۔ میرا بازو پکڑ کے اُس نے مجھے دروازے سے کھینچ لیا اور مجھ سے پوچھے بغیر نیچے اُتر گیا۔ "آگے تھوڑا موڑ ہے لاڈلے!" اُس نے اپنی آواز دبی رکھنے کی پوری کوشش کی۔ "سگنل اِدھر کہیں کو بھی دکھائی نہیں دے رہا۔"

آگے موڑ تھا تو سگنل کیسے دکھائی دے سکتا تھا۔ میں نے اُس سے اوپر آنے کو کہا مگر اُس نے سنی اَن سنی کر دی۔ اردگرد جھاڑیوں میں سانپ اور زہریلے کیڑے مکوڑے بھی ہو سکتے تھے۔ اُس کی دیکھا دیکھی مارٹی بھی جھٹ نیچے اُتر گیا۔ اُن کے اُترنے کی دیر تھی کہ تجمل سے آگے والے ڈبے میں سے بھی ایک شخص نیچے اُتر آیا۔ مارٹی نے میرے پیر میں چٹکی بھر کے اشارہ کیا۔ میں نے بھی اُسے دیکھ لیا تھا۔ مارٹی اور شامو کے کندھے سیدھے ہو گئے۔ اتنی دُور سے اُس شخص کی پہچان مشکل تھی۔ ڈبے سے اُترنے کے بعد ایک ثانیے کے لیے اُس کا جسم لہراتا، بل کھاتا نظر آیا، پھر پُرسکون ہو گیا اور وہ اپنی جگہ جما کھڑا رہا۔

"راجا استاد! ابھی بڑھے آگے کو؟" معاً مارٹی رینگتی آواز میں بولا۔

"ابھی بولے تو بڑھ کے دیکھے؟"

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اُس سے کیا کہوں۔

"اپن ابھی دادا استاد کے پاس جانے کا بولتا ہے۔" مارٹی نے دوسرے دروازے پر کھڑے ہوئے تھجل کی طرف اشارہ کیا۔

اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔ مجھے خاموش دیکھ کے دونوں آہستہ روی سے چہل قدمی کے انداز میں آگے بڑھ گئے۔ چند قدم بعد ہی وہ تھجل کے سامنے کھڑے تھے۔ "کیا ہے ماسٹر؟" تھجل کی نسبتہً تھمی ہوئی آواز مجھے سنائی دی۔

"ایک دم فرسٹ کلاس دادا!" مارٹی نے مستعدی سے جواب دیا۔ "اپن ایک دم......"

"آگے سالی لین میٹھی لگتی ہے۔" شامو نے مارٹی کی بات پوری نہ ہونے دی۔ "اِدھر ساری مٹی گیلی ہے لگتا ہے، پورے دن پانی پیتی رہی ہے۔"

تھجل نے سر ہلایا، کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

"مٹی بہت نرم ہے اُستاد!" شامو منِ مناتی آواز میں بولا۔

"ہاں رے!" تھجل نے سانس بھر کے کہا۔

"من کرتا ہے اِدھر ہی ٹھکانا بناوے۔"

تھجل ہنکاری بھر کے رہ گیا۔

"گاڑی ابھی جلدی نہیں چلنے والی اُستاد!" شامو نے ٹوکتی آواز میں کہا۔

"لگتا ہے تجھ کو اِدھر ہی چھوڑ کے جانا پڑے گا لالے!" تھجل کے لہجے میں تندی آگئی۔ شامو یہ کیسی باتیں کر رہا تھا۔ اُس کی آواز بھی اتنی دھیمی نہیں تھی جب مجھ تک پہنچ رہی تھی تو اُس شخص کے کانوں میں بھی جا رہی ہوگی۔ اِس سے پہلے کہ شامو اور بے لگام ہوتا، میں اُسے قابو میں کرنے کے ارادے سے نیچے کود گیا لیکن اُتر کے میں اپنے دروازے سے آگے نہیں گیا۔

اسی اثنا میں اُس شخص نے اپنی جگہ سے پہلی مرتبہ حرکت کی اور ہماری طرف آنے کے بجائے مخالف سمت میں جانے لگا۔ وہ چند قدم آگے گیا ہوگا کہ شامو جھینپتی آواز میں کہنے لگا۔ "حکم کرو اُستاد! قسم سے اپنے کو بس جھاڑی تک کھینچنا پڑے گا، بولو تو ابھی دو ایک کو......"

"اِس کو ابھی اِدھر سے لے جا ماسٹر!" تھجل نے تیپیدہ لہجے میں مارٹی سے کہا، میں لپک کے اُن کے پاس پہنچ گیا، میں نے شامو کا بازو دبا کے خاموش ہو جانے کی تاکید کی۔ وہ آدمی چند قدم آگے جا کے پھر پلٹ پڑا۔ میرا گمان تھا کہ وہ چلتا چلا تا ہماری طرف بھی آئے گا لیکن وہ پہلے کی طرح اپنے ڈبّے کے دروازے پر آ کے ٹھیر گیا۔ ہم سے لاتعلقی ظاہر کرنے کے لیے اُسے اپنی جگہ سے حرکت کرنا ہی چاہیے تھا۔ شامو کے چُپ ہو جانے سے سکوت چھا گیا۔ ہم تینوں پہلو بدلتے یوں ہی تھجل کے سامنے کھڑے رہے۔ "کلنتے بھائی ابھی کیسا ہے دادا؟" مارٹی نے شامو کی طرف سے تھجل کا دھیان ہٹانے کے لیے پوچھا۔

"ٹھیک ہے رے۔" تھجل نے بوجھل آواز میں کہا۔

"ابھی ٹمپریچر تو نئیں ہے؟"

"بھُن رہا ہے سُور کا جنا۔"

مارٹی نے زبان بند کر لی۔ اچھا ہوا، وہ جلد ہی سمجھ گیا کہ تھجل اس وقت بات کرنا نہیں چاہتا۔ اتنے دن ساتھ رہتے رہتے اتنا کچھ تو جانا چاہیے تھا۔ مارٹی تو ویسے بھی اُس کے سامنے کم ہی زبان کھولتا تھا۔ ہم کی نظریں بار بار اُس آدمی پر منڈلا رہی تھیں جو ہم سے زیادہ دور نہیں اُسے نہیں جانتا تھا، ہو سکتا تھا کہ وہ کوئی دوسرا ہی مسافر ہو۔ تھجل اور مار سوا اُن دو آدمیوں کو کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ بہرحال مارٹی کے انداز سے یہ ہوتا تھا کہ اُس نے اُسے پہچان لیا ہے۔ وہ آدمی وہیں ٹھیرا رہا۔ اتنی دیر میں ڈبّوں سے بھی چند مسافر اتر آئے تھے۔ گاڑی ٹھیرے دس پندرہ منٹ ہو گئے تھے۔ اندھیرا اب کچھ کچھ نگاہوں کو مانوس لگنے لگا تھا، متعدد لوگ آگئے تھے اور گاڑی رُکنے کا سبب جاننے کے لیے ایک دوسرے سے پوچھ کر رہے تھے، مختلف آوازوں نے فضا کی ویرانی بڑی حد تک دُور کر دی تھی۔ طرف کوئی نہیں آیا اور نہ شاید اب کسی کے آنے کا امکان تھا۔ اگر گاڑی ٹھیرائی گئی تھی تو اب وقت بہت گزر چکا تھا۔ مسافر جاگے ہوئے تھے۔ ہم آدمی نیچے تھے اور ابا جان، منیر علی اور کانتے کو جمع کا [illegible] پر مستعد کھڑے تھے۔ جیسے ہی گاڑی ٹھیری تھی اور آس پاس گھنی جھا نظر آئی تھیں، جانے کیوں میرے ذہن [illegible] یہ شبہ اُبھر آیا تھا کہ کہیں وہ اُنھی میں نہ چھپے ہوئے ہوں اور اچانک ہمارے ڈبّوں پر یلغار نہ کر دیں۔ ایسے اندیشے، کتنے بے سر و پا وہم میرے سر میں اُمڈ رہے تھے۔ کتنے ہی کبھی اپنی آہٹ، اپنے سائے پر بھی شک ہونے لگتا ہے، میرا بھی یہی حال تھا۔ گاڑی ٹھیر جانے سے جیسے رات ٹھیر گئی تھی۔ رات ہی کا وقت اُن کے لیے سب تھا۔ یہاں نہ سہی تو کسی اور جگہ، اور ابھی اُس جگہ کے بارے میں یقین سے جا سکتا تھا۔ رات کا بڑا حصّہ ابھی باقی تھا اور ہم کچھ بھی نہ جان پانے کچھ بھی طے نہیں کر سکتے تھے۔

ہم تینوں تھجل کے سامنے سے ہٹ آئے اور اپنے ڈبّے سے گز بڑھتے گئے۔ تھجل کے پاس بھی کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا، اِس لیے اُس روکنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ ہم دو ڈبّوں سے آگے چلے گئے تھے کہ مارٹی لہجے میں بولا۔ "راجا استاد! حکم کرے تو ابھی اپن اور شامو اُسی کے میں جانے کا ٹرائی کرے؟ ادھر گاڑی اسٹارٹ ہوگا، اُدھر اپن ڈبّا پکڑے گا، شک بھی کوئی نئیں پڑے گا۔"

"کیا وہ وہی آدمی ہے؟"

"ایک دم راجا، سینٹ پرسینٹ۔"

"پر تم وہاں جا کے کیا کرو گے؟"

"اپن، اپن دیکھتا ہے ابھی اُودر وہی ہے یا اور، اور......"

"باقی دوسرے ڈبّوں میں بھی تو ہو سکتے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے پر......" مارٹی سے جواب نہ بن پڑا، وہ کسمسا کے رہ گیا۔

ہم زیادہ دُور نہیں گئے، تیس چالیس قدم تک جا کے پھر اپنے ڈبّے کی طرف لوٹ پڑے۔ واپسی میں ہم نے دیکھا کہ وہ آدمی ابھی تک اُسی جگہ کھڑا ہے اور سگریٹ پھونک رہا ہے۔ ہماری رفتار رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کی رفتار سے کوئی نسبت نہیں رکھتی تھی۔ اُس پر یہ جبری سست گامی اور خون کھولانے لگی تھی۔ ہم نے ابھی تیسرا پھیرا لگایا تھا اور اپنے ڈبّے سے دُور تھے کہ ناگہاں انجن نے سیٹی بجا دی۔ ہم تینوں اچھل سے پڑے۔ میری طرح اُن دونوں کو بھی اپنے کانوں پر شبہ ہوا ہوگا اور اُن کے دل زور سے دھڑکے ہوں گے۔ گاڑی نے سیٹی بجاتے ہی گڑگڑاہٹ سے کھسکنا شروع کر دیا۔ نتیجتہً ہم نے تیز قدموں سے چل کے اپنا ڈبّا پکڑا۔ وہ آدمی پہلے ہی اندر جا چکا تھا تاہم گاڑی کی رفتار تیز نہیں ہوئی تھی، گاڑی چوں چوں کرتی، لڑکھڑاتی ہوئی سی بڑھتی رہی۔ کچھ دُور بعد وہ موڑ بھی آگیا جس کا ذکر شامو نے کیا تھا۔ موڑ سے خاصے فاصلے پر ریلوے لائن کی مرمت ہو رہی تھی اور ارد گرد لالٹین تھامے بہت سے مزدور کھڑے تھے۔ گاڑی مخدوش حصّے سے چیونٹی کی چال سے گزرتی رہی، رفتار اتنی سُست تھی کہ آدمی نیچے جا کے بہ آسانی اوپر آ سکتا تھا۔ دوسرے ڈبّے کے دروازے پر تھجل بھی کھڑا رہا۔ ہم دروازے سے اُس وقت تک نہیں ہٹے جب تک گاڑی نے رفتار نہ پکڑ لی۔ اب وہاں کھڑے رہنے یا دروازے کھُلے رکھنے سے کیا حاصل تھا۔

اندر برتھوں پر سب یوں ہاتھ پاؤں بکھیر کے بیٹھ گئے جیسے بھاگتے بھاگتے تھک کے چُور ہو گئے ہوں۔ بہت دیر میں جا کے اُن کی سانسیں استوار ہوئیں اور میں یہ دیکھ کے چونک پڑا کہ سامنے کی برتھ پر پیرو کے ہاتھ میں تمنچا موجود ہے۔ اُس نے اُس کا چیمبر کھول کے گولیاں نکالیں اور اندر باہر پھونکیں مار کے گرد صاف کی، کُرتے کے دامن سے اُسے چمکایا اور کھٹکا دبا کے دیکھا۔ مجھے یاد نہیں رہا تھا کہ رات حویلی میں آنے والے آدمیوں کو اُن کے سارے ہتھیار خالی کر کے واپس کر دیے گئے تھے البتہ چار تمنچے روک لیے گئے تھے تاکہ واپسی میں بھاگتے وقت کسی کا دماغ نہ پھر جائے، وہ نشانے ہی پر رہیں۔ ایک تمنچا جمرو کے پاس بھی تھا، پیرو نے اپنا تمنچا صاف کرنے کے بعد اُسے بھی قبضے میں لے لیا۔ باقی دو تمنچے دوسرے ڈبّے میں تھجل اور ننورا کے پاس بھی ہونے چاہئیں، یہ دو بھی اُنھوں نے ہی پیرو کے حوالے کیے ہوں گے۔ پیرو کے پاس پہلے سے ہوتے تو ضرور نظر آجاتے۔ دوسری طرف کے دروازے پر پیرو اور جمرو ہی کھڑے تھے، ننورا بھی اُسی طرف تھا۔ ہمارے نیچے جانے کے دوران یہ تبادلہ عمل میں آیا ہوگا۔ اُنھیں دیکھ کے بہرحال مجھے سکون سا ملا لیکن پھر میری رگیں اور کھنچنے لگیں۔ تمنچے نکل آنا کوئی اچھی علامت نہیں تھی۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ پیرو کو اِن کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ دوسرا تمنچا صاف کر کے پیرو نے میری طرف اُچھال دیا۔ میں نے سٹ پٹاتے ہاتھوں سے تمنچا اُچک لیا، فرش پر نہیں گرنے دیا لیکن تمنچا ہاتھ میں آتے ہی میرا سارا جسم ایک لمحے کے لیے سُن ہو گیا۔ میری آنکھوں میں اندھیرا اُتر آیا۔

گاڑی نے رفتار کچھ اور تیز کر لی تھی۔

پیرو اپنی برتھ پر لیٹ گیا تو جمرو اُٹھ کے ہماری برتھ پر آگیا۔ سب کے منع کرنے کے باوجود ٹنگو اور مارٹی بھی ہمارے سامنے رہنے کی خاطر فرش پر بیٹھ گئے۔ مارٹی نے مشورہ دیا کہ نواب حشمت جنگ نے زادِ راہ کے لیے جو ٹوکرے ساتھ کیے تھے، اُن میں سے ایک ہمارے ڈبّے میں بھی ہے، کیوں نہ اُسے کھول کے دیکھا جائے۔ مارٹی کا مطلب محض وقت گزاری تھا، کیوں کہ وقت کٹ نہیں رہا تھا مگر جمرو کو شوشہ مل گیا، آنکھ مار کے بولا۔ "کیوں ماسٹر! بہت لگ رہی ہے سالی؟"

"کیسا، کیسا؟" مارٹی گھبرا کے بولا۔ "اپن تو تم، تمھارے لیے......"

"میں بولتا تھا، یہ ماسٹر کا منہ سالا کیوں تھوبڑا پڑا ہوا ہے۔ ابھی پتہ چلا کہ سالی پانی کی سوجن ہے۔ ماسٹر کے منہ میں پانی بھرا ہوا ہے۔" جمرو چلبلے پن سے بولا۔

"اپن، اپن کا مطلب ایسا ایک دم......"

"نئیں نئیں کھول لے ماسٹر! کھول لے۔" شامو نے پچکارتے ہوئے لقمہ دیا۔ "قسم سے جب سے ٹوکرا اِدھر کو آیا ہے، سالا پورے ڈبّے کو لپٹ مار رہا ہے۔"

"پہلے سے بول دیتا، اپنے کو۔" جمرو مبش کے بولا۔ "جا مار لے منہ، نواب کا مال ہے گھی ہی گھی ہوگا۔"

"تم لوگ کیسا، کیسا بولتا ہے؟" مارٹی نے احتجاج کیا۔

"ارے دیکھ رہے ہو جمرو بھائی!" شامو دیدے نچاتے ہوئے بولا۔ "اپنے ماسٹر کا مکھڑا کیسا گلابی ہو رہا ہے۔ ماسٹر شرما رہا ہے، ہائے ہائے پٹ بجا، لیو ذرا میرا دوپٹا......"

مارٹی دُہرا ہو گیا۔ جتنا وہ نادم ہو رہا تھا، اُتنا ہی زیادہ وہ اُسے چھیڑ رہے تھے۔ مارٹی بڑی بڑی باتیں ہنس کے سُن لیتا تھا پر اِس وقت جانے اُسے کیا ہوا، وہ روہانسا ہو گیا۔ ٹنگو نے ستم یہ کیا کہ جھٹ اُٹھ کے ٹوکرے میں سے مٹھائی کے چند دانے لے آیا اور پلیٹ مارٹی کے سامنے کر دی۔ مارٹی جھنجلا گیا اور اتنی زور کا ہاتھ مارا کہ پلیٹ چکنا چُور ہو گئی، مٹھائی کے ٹکڑے ہر طرف بکھر گئے، ریزے ہم پر آ کے گرے۔ سب کھِل کھلا رہے تھے مگر پھر سب کو چُپ لگ گئی۔ پلیٹ کا چھناکا سُن کے پیرو بھی اُٹھ بیٹھا مگر ایک نگاہ ہم پر ڈال کے پھر آنکھیں موند کے لیٹ گیا۔ میں نے اِدھر جمرو اور شامو کو ٹھوکا دیا، ٹنگو پہلے ہی مارٹی کے عتاب سے بچنے کے لیے میرے پیچھے آگیا تھا۔ اُدھر میں نے مارٹی سے عاجزی کی کہ یہ سب تو مذاق تھا، وہ اِس قدر سنجیدہ کیوں ہو گیا۔ جمرو اور شامو نے کوئی ایسی بات تو نہیں کی تھی جس کا اتنا بُرا مانا جائے۔ میری بات سُن کے مارٹی ہونٹ کاٹنے لگا۔ میں اگر درمیان میں نہ پڑتا تو کوئی بعید نہ تھا کہ وہ آپس میں اُلجھ جاتے۔ مارٹی کے تیور اچھے نہیں تھے۔ جمرو اور شامو کے چہرے بھی بگڑنے لگے تھے۔ بہرحال میرے اشارے پر اُنھوں نے مارٹی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ پہلے تو مارٹی ضد کرنے، مچلنے لگا پھر اُس نے سر جھکا لیا۔ میں جانتا تھا کہ مارٹی نے سر کیوں جھکا لیا ہے۔ وہ اُن سے اپنی

بھری ہوئی آنکھیں چھپا رہا تھا۔ اتنی سی بات پر مارٹی کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔
سب کا کم و بیش یہی حال تھا۔ پیرو نے اپنے پیر دبانے پر ٹنگو کو جھڑک دیا تھا، ڈبے سے اُتر کے اُس آدمی کو دیکھنے کے بعد شامو اپنے حواس کھو بیٹھا تھا، جھل اُس کی مہمل باتوں پر کیسا برافروختہ ہوگیا تھا اور اب مارٹی کا پیمانہ چھلک پڑا تھا۔ میں اُن کی تندی و تنک مزاجی کا سبب خوب سمجھتا تھا لیکن کیا کرسکتا تھا، دعا کے سوا میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ بس کسی طور وہ خیریت سے بمبئی پہنچ جائیں، سب اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں۔ بس یہ آخری بار ہے۔ اس کے بعد یا تو میں ان کے سامنے ہی کم آیا کروں گا یا ان سے کہیں دُور بہت دُور چلا جاؤں گا۔ وہ زبان سے کچھ نہیں کہتے تھے لیکن صرف زبان سے کہنا ہی تو کچھ نہیں ہوتا۔ اُن کے چہروں پر چھائی ہوئی وحشتیں سب کچھ کہتی تھیں۔ جنت میں ہم نے اُنھیں موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔ چار راستے میں ختم ہوگئے۔ کلکتے میں پولیس والے سنگینیں اور زنجیریں لیے کھڑے تھے۔ نہ جھل اڈے سے ہٹتا نہ رتنا کلکتے میں کتھن میاں سمیت گیارہ آدمی ختم کرنے کی سرکشی کرتا۔ یہاں حیدرآباد میں آ کا موجود تھا۔ کتنے دنوں تک وہ دم سادھے خانم کی آمد کا انتظار کرتے رہے۔ اُس غیر اڈے پر پورے چند دن تک زغے میں بیٹھے رہے، ہاتھ پاؤں توڑے ہوئے۔ صرف اس لیے کہ مجھے اور پیرو کو نواب کے زنداں میں کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔ نہ صبح نہ شام، ایک دن کا اجالا، پھر وہی اندھیرا۔ بڑے نواب کی حویلی میں چند دن کا سکھ ملا تھا۔ اگر چھوٹے نواب کی موت کے بعد اُسے سکھ کہا جائے۔ وہاں سے آتے ہی ایک پہر ہی گزرا تھا کہ ہتھیار بردار اُن کے سروں پر موجود تھے۔ آدمی اپنی مرضی اتنی دیر تک ترک نہیں کرتا۔ اُن کا اپنا نہ کوئی ارادہ رہا تھا، نہ اختیار۔ وہ اتنی تعمیل کے عادی نہیں ہیں۔ اُنھوں نے آخر کیا قصور کیا ہے۔ اِس سے زیادہ ان کا حوصلہ نہیں آزمانا چاہیے۔ کسی کے لیے کوئی اِس سے بڑھ کے کیا کرسکتا ہے۔ آدمی اپنی بساط سے زیادہ کیا کرسکتا ہے۔

کوئی چھوٹا اسٹیشن آ کے گزر گیا تھا۔ سب پہلے کی طرح ہتھیاروں کے علاوہ اپنے حواس اور اعصاب مجتمع کرکے کھڑے ہوگئے لیکن گاڑی اُس غیر آباد اسٹیشن پر ایک دو منٹ ٹھہر کے پھر اپنے سفر پر روانہ ہوگئی۔ ٹنگو نے جگہ جگہ بکھرے ہوئے ریزے فرش سے چن لیے تھے۔ ایک دوسرے کے قریب اور آمنے سامنے رہنے کے لیے سب چادر بچھا کے فرش ہی پر بیٹھ گئے۔ جمرو میرے پہلو سے چمٹا ہوا تھا، معاً اُسے جیسے کوئی بات یاد آگئی، چونک کے مارٹی سے پوچھنے لگا۔
"ماسٹر! تو نے اُن سُور کے جنوں کو نزدیک سے دیکھا تھا، کینڈا کیا تھا اُن کا؟"
"کینڈا؟" مارٹی پلکیں جھپکانے لگا۔
"اپنا مطلب ہے کھانچا، اوپر سے نیچے تک کا نقشہ۔"
"اِپن پہلے نہیں بولا۔" مارٹی منتشر آواز میں بولا۔ "ایک بند گلے کا واسکٹ میں تو دوسرا شیروانی ڈالے پڑا تھا۔ دونوں کا کلر سالا ہاف بلیک، ایج فورٹی کے اندر اور تھرٹی سے اوپر کا ہے۔ اِپن کو ابھی شہر ہی کا لوگ لگتا ہے، حیدرآبادی۔"
"آدھا گورا، آدھا کالا سالا کیا بولتا ہے؟" جمرو منہ بنا کے بولا۔ "سیدھی زبان میں بات کیا کر ماسٹر!"
"ساری جمرو بھائی! اِپن ساری بولتا ہے۔" مارٹی معذرت خواہانہ بولا۔ "اِپن ابھی کیا کرے، سالا منہ سے نکل جاتا ہے۔"
"ہم نے پوربیا شروع کردی تو سالا بھاگ جائے گا۔"
"یہ عمر کے بارے میں کہہ رہا تھا۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "مارٹی کے خیال میں دونوں کی عمریں تیس سے چالیس کے درمیان ہوں گی۔"
"اتنی گٹ پٹ اپنے کو بھی آتی ہے۔" جمرو نے ناگواری سے کہا۔ "اِدھر فیض آباد میں رہتی تھی، رہتی تھی کیا اب بھی وہیں رہتی ہے۔ نواب اصغر دادا پڑھ کے ولایت سے پلٹا تو ساتھ میں اُس پری کو بھی لایا۔ کیا بولیں کہ اوپر والا اُس کو کاہے سے بنایا ہے۔ لگتا ہے، سارا مکھن اور شہد اُس میں گھول دیا۔ گلبانار، ہاتھ لگاؤ تو لالی چھوٹے۔ پان کھائے تو گردن سے جھلکے۔ نواب کے پاس پہلی کو مال پانی کے لیے جانا ہوتا تو اُس سے ضرور مٹھیا ہوتا تھا۔ بولتی تھی، ہائے جمرو! ہاؤ آر یو؟ تم کیسا ہے۔ اصغر ہم کو بولتا ہے، تم ایک فسٹ کلاس بہادر آدمی ہے۔ چاقو چلانا جانتا ہے، ہم بھی [illegible]۔"
"ہر بار ایسا ہی بولتی تھی جمرو بھائی!" شامو چپکے سے بولا۔
"ہاں رے ہر بار۔" جمرو نے تیزی سے کہہ تو دیا پھر فوراً شامو کے کا تیکھا پن اُس کی سمجھ میں آگیا، بپھر کے بولا۔ "تو کیا سمجھ رہا ہے، ہم جھوٹ بولتے ہیں کیا؟"
"ایمان سے جمرو بھائی!" شامو نے مچل کے کہا۔ "تم کدھر کو لے گئے۔ مطلب ہے کہ ہر بار جاتے ہوگے تو نئی بات بولتی ہوگی۔"
"بار بار ایسا نہیں بول سکتی کیا؟" جمرو غصے سے بولا۔
"نہیں تو مذاق سمجھ رہا ہے۔ سمجھ رہا ہے کہ ہم جھوٹ بولتے ہیں، ہم میں رعب مار رہے ہیں۔ اب کے فیض آباد آنا تو ہم تجھ کو لے چلیں گے۔ سالا نہیں اُٹھ سکے گا، ایک جھلک میں ٹیں ہوجائے گا۔"
"تم آگے کی بات کرو۔" میں نے آہستگی سے کہا۔
"آگے اب کیا بولیں، سالے نے بات کو کھاد کر دیا۔"
"نہیں نہیں جمرو بھائی! قسم سے، اب منہ سے کچھ بھی پھوٹے تو جوا کر لینا۔" شامو لجاجت سے بولا۔
میں نے بھی ایک بار دبے لہجے میں کہا مگر جمرو آمادہ نہیں ہوا۔ شاید اُسے ٹوک کے بُرا کیا۔ اُس نے غور نہیں کیا، جمرو کی آواز جھلملانے لگی تھی۔ وہ کبھی اپنے بارے میں کم کسی سے بات کرتا تھا۔ آج کیا بات تھی جو وہ کچھ کہہ رہا تھا۔ اِس طرح وقت بھی کچھ ٹل جاتا۔ جمرو ایک ضدی تھا، زیادہ اصرار بھی مناسب تھا۔ میں نے اُن کا تکدر دُور کرنے کے لیے مارٹی سے پوچھا۔ "کاٹھی کے کیسے ہیں وہ؟"
"بس ٹھیک ہے راجا استاد!" مارٹی نے تندہی سے جواب دیا۔
"اندھیرے میں دُور سے ایک کو دیکھا تھا، بیچ کا بدن لگتا ہے۔" شامو ٹھیک ہی کہہ رہا تھا، اُسے دیکھ کے میں نے بھی یہی اندازہ لگایا تھا۔ "استاد نے دھیان نہیں دیا لاڈلے!" شامو اُداسی سے کہنے لگا۔ "ایک کا جھٹکا تو اُسی وقت ہوجاتا۔"
"کیسے، کیسے ہوسکتا تھا؟" میں نے تلخی سے کہا۔
"ہوسکتا تھا، میں نے ہر طرف دیکھ لیا تھا۔ تبھی استاد سے بولا تھا۔ جیسے ہی وہ حرام زادہ نیچے اُترا تھا اور تھوڑی دیر کے لیے دوسری طرف گیا تھا، ویسے ہی میں کسی بہانے سے اُسے اپنے ڈبے کی طرف بلاتا۔ اُس کا باپ آتا۔ بس اُس کے اُنے کی بات تھی۔ گردن پر صرف ایک اُلٹا ہاتھ پڑتا تو بولتی بند ہوجاتی۔ پھر ڈبے کے نیچے لاش پر ڈال اپنے لیے ذرا بھی جوکھم کا کام نہیں تھا۔ تم اور مارٹی بھی ساتھ لگے ہوئے تھے۔ ایک منٹ میں معاملہ تلپٹ ہوجاتا۔ آڑ کی ضرورت نہیں تھی۔ پرتم اور مارٹی آڑ کا کام کرتے۔ اُس وقت ہر طرف اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ بھی مشکل سے سجھائی دیتا تھا۔ ڈبے سے ہم لوگ کے سوا اُس وقت تک کوئی اترا بھی نہیں تھا۔ اگر وہ خالی دو ہی ہیں تو اُن میں سے ایک رہ جاتا۔"
"اور اگر وہ دوسرا کھڑکی سے اپنے ساتھی کی نگرانی کر رہا ہوتا؟"
"اندھیرا بہت تھا لاڈلے!" شامو بے چینی سے بولا۔ "اپنے ساتھی کے اَتے پتے کی جان کاری کے لیے اُس کو نیچے آنا پڑتا۔ یہ تو اور بھی اچھا ہوتا، پھر اُسے جانے کون سالا دیتا، اور اِدھر اُدھر ڈبے کے نیچے پٹری پر جھانک کے کون دیکھتا کہ اندر آدمی پڑا ہے۔"
شامو کا دماغ چل گیا تھا۔ میں نے اُس سے بحث نہیں کی۔ اوّل تو اِس کے لیے ضروری تھا کہ وہ صرف دو ہوتے، دوسرے گاڑی ٹھیرنے کے وقت کا تعین ضروری تھا۔ شامو کو دونوں باتیں معلوم نہیں تھیں۔ ویسے بھی یہ ایک نہایت بے محل اور عاجلانہ اقدام ہوتا۔ شامو ضربوں کا ماہر تھا لیکن ایسے موقع پر اتنا اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ ضرب ذرا سی ترچھی یا اوچھی بھی پڑسکتی تھی۔ وہ شخص شامو کے اشارے پر بے سوچے سمجھے چلا بھی نہ آتا۔ اندھیرا جس طرح شامو کے لیے مفید تھا، اُسی طرح اُس کے مقابل کے لیے بھی سود مند ہوتا۔ کل رات کے تجربے کے بعد آج اُنھیں ہتھیار کے بغیر نہیں بھیجا گیا ہوگا۔
کچھ توقف کے بعد شامو بولا کہ اگر میری اجازت ہو تو وہ ایک اور کام کرلے۔ وہ چلتی گاڑی میں چھت چھت ایک سرے سے دوسرے سرے تک آسانی سے جاسکتا ہے جہاں وہ آدمی ملا تھا، وہ ڈبا تو بہت قریب ہے۔ درمیان میں صرف جھل کا ڈبا ہے۔ بوگی تو ایک ہی ہے، بیچ میں دیواریں ڈبے تقسیم کرتی ہیں۔ [illegible]

نہیں اُٹھانا پڑے گی۔ وہ چھت سے اُتر کے جب دروازے پر بُری طرح دستک دے گا تو ڈبّے کا کوئی شخص دروازہ ضرور کھولے گا۔ وہ اُن سے کہہ کے دوسرے اسٹیشن تک وہاں بیٹھنے کی اجازت حاصل کرلے گا۔ دروازے پر دستک دینے کا مناسب وقت کسی اسٹیشن سے گاڑی روانہ ہوجانے کے فوراً بعد ہی کا ہوسکتا ہے۔ ڈبّے کے لوگوں کو اسی طرح یہ تاثر دیا جاسکتا ہے کہ رفتار تیز ہوجانے کے سبب وہ اپنے ڈبّے تک نہیں پہنچ پایا۔ وہ احتیاطاً تمنچا ساتھ لے جائے گا، اگر ڈبّے میں دو ہی دو آدمی ہوئے تو انھیں وہیں ڈھیر کیا جاسکتا ہے ورنہ اس دوران میں اُسے اُن لوگوں کو قریب سے دیکھنے اور اُن کے ارادے بھانپنے کا موقع تو مل ہی جائے گا۔"

"نہیں رے"، مجھے کوئی تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ جمرو دھتکارتے لہجے میں بولا۔ "ابھی سے یہ ٹھیک نہیں ہے۔"

"ابھی سے تو یہ ٹھیک ہے، پھر چڑیاں کھیت نہ چگ جائیں۔" شامو بربھی سے کہنے لگا۔ "اپنے کو پہلے ہی سے کانٹا ڈال دینا چاہیے۔"

"ابھی اپن کچھ بولے؟" مارٹی نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"کیا ہے ماسٹر! ماسٹر کو ضرور دُور کی سُوجھی ہے۔"

"ابھی اپن کے مغز میں ایک بات آتا ہے۔" مارٹی سب کی طرف پُرامید نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اپن کے پاس زیادہ لگیج تو نہیں ہے۔ یہ ٹوکرا بھی اپن ادری چھوڑ جائے گا۔ ابھی کوئی بڑا اسٹیشن آئے تو اپن بالکل لاسٹ ٹائم پہ گاڑی سے اُتر جائے۔ دیکھتا ہے پھر وہ کتنے کا بچّہ اپنے ساتھ اُترتا ہے کہ نہیں۔ اپن دوسرا کسی ٹرین سے ممبئی کے لیے روانگی کرے گا۔" کسی نے کچھ نہیں کہا، سب مارٹی کی طرف غور سے دیکھنے لگے۔ مارٹی کی آنکھوں میں چمک عود کر آئی۔ "اپن کا بات دھیان سے سنا جمرو بھائی! اپن پہلے ایک ایک کرکے ڈبّے سے کھسکے گا، پھر جب چلنے کو ریڈی ہوگا، اپن کا باقی لوگ بھی ڈبّے سے اُتر آئے گا، سمجھا کہ نہیں۔"

"ماسٹر کوڑی تو دُور کی لایا ہے۔"

"لیکن کانتے بھائی کا کیا ہوگا۔ اُس کو بخار چڑھا ہوا ہے، وہ نہ تیز اُتر سکتا ہے، نہ تیز چل سکتا ہے۔" ٹنگو نے کہا۔

"پہلے آہستہ چلے، دھیرے سے اُترے۔ ابھی کون اُس سے تیز چلنے کو بولتا ہے۔ اپن کا بات سمجھو، اپن ایک دم مانٹا جینج کرے گا تو سالا کھوجی لوگ ایک بار کو تو گھوم جائے گا۔"

"اور اگر وہ بھی اپنا سامان چھوڑ ساتھ اُتر گیا؟"

"اُترتا ہے تو اُتر جائے۔"

"پر بات تو وہی ہوئی مسٹر راجا۔"

"پر سامنے تو سب آجائے گا جمرو بھائی! کیا بولتا ہے اُس کو، دودھ کا دودھ پانی کا پانی۔"

"اگر دیکھنے اور جاننے کی ٹھرکی ہے تو اس کے اور بھی رستے ہیں۔" شامو تمتماتے لہجے میں بولا۔ "اپنے میں سے کوئی بھی کسی بڑے اسٹیشن پر ایک کے آگے گھٹالا کر دے۔ بس ایک ٹنگیا اڑانے سے بھڑکا ہو جائے گا۔ ہاتھ پیر کے ساتھ ذرا اُٹھانا پڑے گا کہ سارا اسٹیشن اپنی طرف ہوگا۔ دیکھتے ہیں پھر کون راون کا منہ چھپاتا ہے، ایک ایک کرکے سالا سب سامنے آجائے گا۔"

جمرو نے شامو کی نقل اتاری اور زہر خند سے بولا۔ "لاڈلے! ادھر بریلی قریب پڑتا ہے کہ آگرہ شہر؟"

"دونوں دُور ہیں۔"

"کیوں بہت یاد آرہی ہے جمرو بھائی گھر کی؟" شامو ٹھنک کے بولا۔

جمرو کے زبان کھولنے سے پہلے ہی میں نے مفاہمانہ لہجے میں اُن سے کہا۔ "ہمیں مغل بھائی ہی کے مشورے پر اکتفا کرنا چاہیے۔ لازماً جلد ہی گاڑی اسٹیشن پر ٹھیرے گی اور دیر کے لیے ٹھیرے گی، وہیں دیکھیں گے کہ کون مناسب ہے۔"

"راجا استاد ایک دم ٹھیک بولتا ہے استاد نے چُپ رہنے کا بولا کچھ سوچ کے ہی بولا ہوگا۔" ٹنگو نے بھڑکتی آواز میں میری تائید کی۔ "اُن بنا اپن کو......"

"ہاں ہاں نٹ راج استاد کی دُم۔" جمرو نے پڑائی سے بولا "پتہ ہم کو تجھ سے زیادہ ہے۔"

"اپن کا من کرتا ہے۔ ابھی اپن کو اجازت ملے تو۔" مارٹی نے حسرت آواز میں کہا۔ "اور کچھ نہیں تو ابھی اپن اپنے ہاتھ کا تھوڑا اڑائی کرلے۔ دن ہوگیا سالا زنگ نہ مار گیا ہو۔ بولے تو ابھی کوئی بڑا اسٹیشن آئے صفائی دکھادے۔"

"پاکٹ!" جمرو بیٹھے بیٹھے اُچھل گیا اور بے اختیار ہنسنے لگا۔ "ہاتھ صاف کرنے کو بولتا ہے ماسٹر!"

"ایک دم! اپن ابھی منہ سے کیا بولے، اودر ممبئی میں اپن کا بس ہی بہت ہوتا تھا۔ ایدر گیا تو اودر ساتھ ہی کچھ لایا۔ اپن کم ہی خالی آتا تھا۔"

"شامو کے سامنے اتنا بڑھ کے مت بول۔"

"بڑھ کے نہیں بولتا جمرو بھائی! اودر اپن کا دُور دُور فیم تھا، سے لوگ اپن کا پاس پاکٹ آرٹ سیکھنے کو آتا تھا، پر سیکھنا اور بات کا دوسرا۔ آدھا آرٹ سونگھنے کا ہوتا ہے۔ اپن ٹین فیٹ ایدر سے سونگھ دیتا تھا کہ آدمی خالی چلتا ہے کہ مال پانی ساتھ۔ بائی گاڈ، اپن ایسا واپس نہیں آنے کا۔ اپن اُن لوگ کو دیکھ کے آیا ہے۔"

"اور اگر ہاتھ اُلٹ پڑ گیا بابو؟"

"ایسا نہیں سوچو جمرو بھائی! اپن ہاتھ کاٹ ڈالے گا۔ ہاتھ بعد میں کٹے گا، ادھر پھندا پہلے گلے میں پڑ جائے گا سسرے!"

"اپن کچھ جان کے ہی بول رہا ہے۔ ایدر سے اپن جائے، اودر سے سیکنڈ کل پرٹ کے پاس شامو بھائی۔ دونوں کا پاکٹ ابھی ایک ساتھ خلاص ہوجائے گا تو۔" مارٹی مچل کے بولا۔ "تھوڑا مستی رہے گا جمرو بھائی!"

جمرو نے ہونٹ سکوڑ لیے اور درشتی سے بولا۔ "ماسٹر کو ایسے میں مستی کی سُوجھ رہی ہے لاڈلے! اپنے کو یہ سب گھومے ہوئے لگتے ہیں۔ تُو نے دیکھا اُس نے نکٹ جائے گا یہ ممبئی کا اُستاد جو اس پہ پہلے ہی نظر ڈالے ہوئے ہے۔" جمرو بالکل درست کہہ رہا تھا۔

مارٹی بچوں کی طرح اُڑنے لگا۔ "اپن جانتا ہے پر اپن اِس میں ہی کام دیکھ کے آئے تو بولو، کیا دے گا؟"

"کہاں میں رہ ماسٹر!" جمرو نے بیزاری سے کہا۔

"تم کو یقین نہیں آتا، کیسا آئے گا، ابھی ممبئی کو ہی جانا ہے، جا کے اودر کسی کو پوچھنا، مارٹی پاکٹ اسٹار کون تھا اور پوچھنے کا کیا ہے۔ اپن کا راجا اُستاد ٹنیس کے لیے ایدر ہی بیٹھا ہے۔ مارٹی نے اُس دن سے اپنا پاکٹ کے سوا کسی کو ہاتھ نہیں لگایا جب سے اپن کو راجا ملا۔ وہ پاکٹ مار اُسی دن ڈیڈ ہو گیا تھا، جب راجا استاد مارٹی کی لائف میں انٹر ہوا تھا، اِس کو دیکھنے سے اپن کو ایسا لگا جیسا اپن پاکٹ مار نہیں، چار ہے سالا۔"

"کتنا سچ بولتا ہے ماسٹر!" شامو درمیان میں بولا۔

"ہاں ہاں، اپن کو سچ بولنا اُسی ٹائم سے آیا۔ اپن کو اُس دن سے معلوم ہوا کہ اپن تو سالا ایک دم تھرڈ کلاس آدمی ہے، آدمی کیا، اُلّو کا پٹھا ہے۔ ابھی اپن کیا جانتا ہے اپن کائے پہ بوم مارتا ہے، پاکٹ ماری پہ؟ اُسی دن اپن نے ڈسائڈ کرلیا تھا، قسم ہے ہولی فادر کی کہ اب راجا استاد سے کچھ جان کے ہی فیلڈ میں آئے گا۔ راجا مل کے کھو گیا تھا۔ اپن بہت خوار ہوا۔ اکھا ممبئی میں گلی گلی راجا کو کھوجتا رہا، چرچ جا کے دعا کیا۔ ایک ایک آدمی سے پوچھتا تھا، تم نے اپنے راجا کو دیکھا ہے؟ لوگ اپن کو پاگل بولنے لگا تھا، پھر ایک دن اپنا لاٹری نکل آیا، راجا اپنے کو مل گیا۔ راجا کیا ملا، اپن کو بس اپن مل گیا۔ اُس دن مارٹی نے نیو جنم لیا۔ اپن راجا کے پیر پڑ گیا کہ ابھی ایدر سے نہیں جانے کا، کبھی نہیں جانے کا۔ یہ راجا دل کا راجا ہے، مان گیا۔ اِس کے پاس آ کے اپن کو پتہ چلا کہ ایک مارٹی ہی اکیلا نہیں ہے، اپن جیسا ابھی ایدر بہت سے جو راجا کا سیلو ہے۔" مارٹی کی آواز بھرّانے لگی۔ شامو، جمرو، ٹنگو تینوں بے ٹنگ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ مارٹی کہنے لگا۔ "قسم سے ابھی اپن کچھ نہیں مانگتا۔ اپن کو سب مل گیا ہے۔ اپن بس ایک دعا مانگتا ہے، اپن راجا کے کس طرح کام آئے۔ کیا کرے کیسا اس کو خوشی دے سکے۔ پر اپن! اپن تو خود بہت چھوٹا ہے سالا، اپن تو خود ہی بگڑ بھکاری ہے۔ اپن کا ہاتھ تو خود اس کے آگے پھیلا ہے۔ اِس کو ابھی لا دے گا، اور کسی کو ابھی کیا......"

"بس کرو مارٹی!" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"تُو تو بالکل ہی سٹا گیا ماسٹر! کدھر سے کدھر کو نکل گیا۔" شامو اضطراب سے بولا۔

"ایں جمرو بھائی! یہ تو بالکل بچّے کی طرح مُنّے کی طرح رو رہا ہے۔" مارٹی نے منہ چھپالیا۔

"نہیں نہیں لاڈلے! یہ تو سالا ایک مُنّا ہے بالکل۔" جمرو نے بڑھ کے اُسے پہلو میں دبوچ لیا۔ مارٹی اور سسک پڑا۔ دیر تک جمرو اور شامو اُسے تھپکیاں، تسلیاں دیتے رہے، تب کہیں مارٹی کو قرار آیا۔

گاڑی کی پُرشور آواز سے رفتار کا اندازہ ہوتا تھا۔ بہت دیر سے کوئی اسٹیشن نہیں آیا تھا۔ ٹنگو نے درمیان میں کئی بار اُٹھ کے کھڑکی سے جھانکا تھا۔ مارٹی نے سبھی کو چُپ لگا دی تھی یا اُن کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا تھا تاہم سب کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، اُن کے ہاتھ پیر بھی جاگ رہے تھے۔ صرف آنکھیں کھلی ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ بدن بھی آنکھوں کا تابع ہونا چاہیے۔ یکایک ٹنگو کے جسم میں بے چینی کی ایک لہر نمودار ہوئی۔ اُسے پہلو بدلتے دیکھ کے جمرو نے پوچھا۔ "کیا ہے چھنکے؟"

"کچھ نہیں جمرو بھائی!" ٹنگو جھجک کے بولا۔

"تو بے کل کیوں ہو رہا ہے، چین سے کیوں نہیں بیٹھتا؟"

"اپن، ابھی اپن کے مَن میں ایک بات آتا ہے۔"

"ہم سمجھ گئے تھے، ابھی تیرے پیٹ میں بھی درد ہو رہا ہے۔"

"چھٹکا اپنے سے ڈبل بات ہی بولے گا۔"

"کیا بولے شامو بھائی! سوچتا ہے، ابھی چُپ رہے کہ زبان کھولے۔"

"جی بھر کے کھول دے، تیری کچی ٹکیا تو نہیں ہے۔"

"اپنے کو پتہ ہے، تو جتنا اوپر ہے، اُس سے دس کے پہاڑ میں نیچے ہے۔"

ٹنگو متذبذب بیٹھا رہا۔ جمرو نے اصرار کیا تو دھڑکتی سی آواز میں بولا۔ "اپن سوچتا ہے، ابھی ہاروں کے بدلے اپن کوئی ایک اسٹیشن پر اُتر جائے، بابا کے پاس جتنا مال پانی ہے، ساتھ لے کے ایک آدمی اُن لوگوں سے چھپ کے اُتر سکتا ہے۔ ایدر گاڑی چلے، اودر اُتر سکتا ہے۔ وہ بعد کو دوسرا گاڑی سے ممبئی چلا جائے گا، سمجھا! ابھی آگے کوئی لفڑا شفڑا ہوتا ہے تو اپن میں سے کسی کے پاس مال تو نہیں نکلے گا نی، سمجھا!" وہ جھپکتی پلکوں سے بولا۔

سب نسبتہً سیدھے ہو کے بیٹھ گئے۔ ٹنگو نے صرف ایک لمحے کے لیے تامل کیا، کسی کے کچھ بولنے سے پہلے ہی چہکتی آواز میں کہنے لگا۔ "اور اگر ابھی نہیں تو ابھی اس کا ایک دم اُلٹا کرے۔ آگے کسی اسٹیشن پر ایک آدمی کو ٹرین میں چھوڑ کے سب نیچے اُتر جائے۔ اپن کے اُترنے کے بعد اُن لوگوں کو اتنا ٹائم ملے کہ وہ بھی نیچے اُتر سکے۔ بس اپن میں سے ایک ٹرین میں رہ جائے گا، اُسی کے پاس مال ہوگا۔ سالا ایدر اُن کتا لوگ کے دھیان میں بھی نہیں آئے گا کہ ایک آدمی کمتی ہے۔ کچھ سمجھا جمرو بھائی! اپنا آدمی سب کے ساتھ اُتر کے بعد میں گاڑی چلنے پر بھی چپکے سے ٹرین پہ چڑھ سکتا

ہے۔ اپن کا باقی لوگ ایڈ اڑی کر کے اُن لوگ کو اُلجھائے، اُدھر اپنا آدمی بیچ سے کھسک لے۔" ٹنگو اتنی تیزی سے بول رہا تھا کہ ہانپنے لگا۔ "بولو جمرو بھائی! شامو بھائی!" وہ ہیجانی لہجے میں بولا۔ "ابھی کیسا ہے؟"

سب گم صُم سے ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ ابھی کسی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ سامنے کی برتھ پر پیرو یکایک اُٹھ بیٹھا۔ "ٹنگوسے!" اُس نے بھاری آواز میں ٹنگو سے کہا۔ "اپن کو ابھی تیرا ہی مغز تھوڑا ٹھکانے پر لگتا ہے۔"

"دادا! تم سن رہے تھے کیا؟" ٹنگو تیزی سے بولا۔

"اسٹیشن آنے پر اپن ابھی تھل بھائی سے بولتا۔" پیرو کے لہجے میں تابیدی نرمی تھی، کہنے لگا۔ "اپن کے دماغ میں ابھی کچھ اور بھی آتا ہے۔"

"کیا دادا؟ بولو دادا!" ٹنگو نے بے تابی سے پوچھا۔

"ابھی تھل بھائی سے بات کیے بنا کیا بولے۔" پیرو نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا اور ترشی سے بولا۔ "پر تم لوگ ایسا کیوں بیٹھا ہے، ابھی جب تک گاڑی چلتا ہے، کمر سیدھا کر لے تو اچھا ہے۔"

"نیند ابھی تمھارے پاس تھوڑی سی ہو تو ادھر دے دو سالی!" جمرو نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"نیند کو کون بولتا ہے، ابھی لیٹنا بھی آدھا نیند کے برابر ہے۔ بیٹھا رہے گا اور ایسا گھوڑا چلاتا رہے گا تو اور ڈھیلا ہو جائے گا۔"

"اب اکٹھا ہی لیٹیں گے دادا!" شامو نے کہا۔

پیرو نے ایک ایک کا نام پکار کے برتھوں پر لیٹ جانے کی ہدایت کی۔ اُس کا لہجہ حکمیہ تھا، پھر کسی نے ردّ و قدح بھی نہیں کی۔

ڈبے میں گاڑی کے شور کے سوا سکوت طاری تھا۔

پیرو انھیں خاموش کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن خاموشی صرف لبوں کی نہیں ہوتی، شور تو آنکھیں بھی کرتی ہیں، آنکھیں بھی سنتی ہیں، شور تو آدمی کے اندر ہوتا ہے۔ بے صدا، بے نوا، پیرو کے مشورے پر وہ مختلف برتھوں پر پھیل گئے تھے مگر پیرو بھی جانتا تھا کہ اُن کے حواس کیسے کیسے وہم و گمان سے دوچار ہیں، نشست بدل لینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ پیرو انھیں کوئی تسلی بھی نہیں دے سکتا تھا کہ بے جواز تسلی کی بے اثری کا اُسے خوب علم ہوگا۔ پیرو یہی کر سکتا تھا کہ اُن کے اعصاب کی کشیدگی کم کرنے کے لیے خود کو نسبتاً آسودہ ثابت کرے مگر اُسے خود پر ہی قابو نہیں تھا، سب کا کم و بیش ایک ہی حال تھا۔ یہ کوئی خوف نہیں تھا، بے شمار مرتبہ موت اُن کے قریب سے گزر گئی تھی۔ اُن کے انتشار کی اصل وجہ اُن کی لاعلمی تھی۔ یہ تجویزیں اُن کے اندرونی غبار کی مظہر تھیں، ایسی صورت میں وہ یہی کر سکتے تھے کہ اپنی اپنی بساط کے مطابق مختلف سمتوں کی نشان دہی کریں۔ کسی کو بھی اپنی تجویز صائب ہونے کا یقین نہیں تھا کیونکہ کسی کو بھی تعاقب کرنے والوں کی تعداد معلوم نہیں تھی۔ تعداد ہی سے اُن کا ارادہ مشروط ہوگا۔ گزشتہ [illegible] کے تجربے کے مطابق تعداد زیادہ سے زیادہ ہونی چاہیے۔ شلو نے وقت ہاتھ سے نکل نہ جانے کا خدشہ ظاہر کیا تھا، وقت واقعی آہستہ آہستہ گزر رہا تھا مگر آنے والے [illegible] کے انتظار کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ شاید کسی کو بھی اس قسم کی صورت حال سے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ انھیں اندازہ نہیں تھا کہ چلتی ریل میں مطلوبہ مسافروں کو کس طرح قابو میں کیا جاتا ہے۔ ہماری طرف سے کسی بھی پیش قدمی میں اتنے ہی اندیشے تھے جتنے ہماری خاموشی میں تھے۔ بہرحال پیرو نے اچھا کیا کہ اُن سب کو الگ کر دیا ورنہ وہ طرح طرح کی باتوں سے اپنا تلاطم اور بڑھاتے رہتے۔ اور [illegible] برتھ پر جسم ڈھیر کر کے مجھے کسی قدر یکسوئی نصیب ہوئی۔ میرا ذہن سب [illegible] کے بعد تاک میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے طریقِ کار کے تعین اور ادھیڑبن میں لگا ہوا تھا، میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا، اگر واقعی اُن کی تعداد زیادہ ہے تو وہ کس طرح ہم تک پہنچیں گے، انھوں نے کون سی جگہ، کون سا وقت منتخب کیا [illegible] انھوں نے کوئی تو طریقِ کار اپنے لیے متعین کیا ہوگا۔

میری کلائی پر نواب حشمت جنگ کی دی ہوئی گھڑی بندھی تھی [illegible] بج رہے تھے۔ حیدر آباد سے گاڑی روانہ ہوئے پانچ گھنٹے کے قریب ہو رہے جگہ جگہ رکنے کی وجہ سے گاڑی یقیناً کچھ لیٹ بھی ہو گئی ہوگی۔ رات کا بڑا گزر چکا تھا مگر ابھی اندھیرے کے دو تین گھنٹے باقی تھے، صبح کاذب تک [illegible] ممکن تھا۔ ایسی حالتوں میں اندھیرا اجالے سے زیادہ مفید ہوتا ہے مگر وہ کس آئیں گے؟ کسی ویران جگہ زنجیر کھینچ کے گاڑی رکوا کر، یا کسی چھوٹے سے اسٹیشن پر اچانک وہ ہمارے ڈبے کا رخ کریں گے؟ انھیں پہلے اباجان کے ڈبے کی طرف بڑھنا چاہیے کیونکہ اُن کی دانست میں اُن کے مطلوبہ تیرا اباجان ہی کی [illegible] میں ہو سکتے ہیں۔ اس دوران میں ہمارا ڈبا بھی پوری طرح اُن کی نگاہوں میں ہوگا۔ گزشتہ رات چھوڑے ہوئے اپنے چار تمنچے اور بڑی تعداد میں گولیاں انھیں خوب یاد ہوں گی۔ وہ شترِ بے مہار کی طرح دندناتے ہوئے تو ہمارے ڈبوں کی طرف نہیں بڑھ سکتے۔ ہر اسٹیشن پر انھوں نے ہمیں دروازوں پر تعینات دیکھ لیا تھا۔ پھر انھوں نے کیا طے کیا ہے؟ ہو سکتا ہے، ابھی تک اُن کی احتیاط کا سبب ہماری بیداری اور چوکسی ہی ہو۔ مبادا وہ کسی موقع کے منتظر ہوں، ہماری غفلت کے ایک لمحے کے منتظر، یا انھوں نے کوئی خاص جگہ سوچی ہوئی ہے؟ ابھی گاڑی ریاست کی حدود میں ہے، ریاست کی آخری سرحدوں تک اُن کی عمل داری ہے۔ پولیس کی ہے، حکم اُن کا چلتا ہے۔ وہ یہاں چلتی گاڑی رکوا سکتے ہیں اور جب تک چاہیں ٹھہرائے رکھ سکتے ہیں۔ وہ ایک ایک ڈبے کی تلاشی کے احکام بھی صادر کر سکتے ہیں۔ ریاستوں میں آدمی کی خریداری عام بات ہے، زر سے نہیں تو زور سے، ریاستیں زور ہی سے چلتی ہیں۔ عجب نہیں کہ انھوں نے بعض اہل کار یا افسر بھی ہماری حرکت کی نگرانی کے لیے ساتھ لیے ہوں مگر جن لوگوں کو اباجان کے نادہندہ [illegible]

کی جستجو ہے' اُنھیں اصولاً پولیس کو بیچ میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ وہ ایسے ہی افسر اور اہل کار ہوسکتے ہیں جن کی وفاداری پر اُنھیں ایمان کی حد تک یقین ہو۔ اُنھیں ہم سے کوئی ذاتی پرخاش تو ہے نہیں کہ پتھر نہ ملنے سے اُن میں کوئی انتقامی ردِّعمل پیدا ہو۔ اُنھیں تو ہماری حفاظت اور سلامتی بھی عزیز ہونی چاہیے اور صورتِ حال زیادہ پیچیدہ بنانے سے ہر ممکن اجتناب کرنا چاہیے۔ وہ اِس معاملے میں غیر ضروری' غیر متعلق اور مشکوک لوگوں کا درمیان میں پڑنا اور پولیس کی شمولیت یا دلچسپی کسی طور پسند نہیں کریں گے بلکہ اُن کی کوشش ہوگی کہ جہاں تک ممکن ہو' پولیس ہم سے دُور ہی رہے۔ میں نے مارٹی اور ٹنگو کی تجویزیں سُن کے کچھ نہیں کہا تھا۔ اُنھیں خود ہی احساس تھا کہ ذرا سی بات اُلجھنے سے اور ہمارے کسی نارَوا اقدام پر پولیس کسی بھی کونے سے نمودار ہو سکتی ہے۔ پولیس ہمیں بھی مطلوب نہیں تھی۔ اباجان کے پاس اَن مول پتھر تھے' ہمارے پاس تمنچے تھے' پولیس ویسے بھی راستہ کھوٹا کرنے کا سبب بنتی۔

گھڑی میں تین بج رہے تھے۔

گاڑی دو مرتبہ چھوٹے اسٹیشنوں پر ٹھیری تھی مگر کسی کو اُترنے کا وقت نہ مل سکا۔ دو چار منٹ سے زیادہ گاڑی کہیں نہیں رکی۔ دونوں اسٹیشنوں پر میں نے ٹھل اور زورا کو دروازوں پہ کھڑے دیکھا۔ اُن کا جاگتے رہنا اور ہر اسٹیشن پر پہرا دینا ہم سب کے لیے احتیاط اور تقلید ہی کا اشارہ ہوسکتا تھا۔ وقت جتنا گزرتا جارہا تھا' رات بھی ختم ہوتی جارہی تھی۔ دونوں مرتبہ اسٹیشنوں پر اُن آدمیوں کے چہرے یکے بعد دیگرے دروازے پر نظر آئے' اور بھی کئی لوگ مختلف ڈبوں سے اُترے لیکن اُن دو آدمیوں سے کسی کا ربط ضبط دکھائی نہیں دیا۔ گاڑی سے اُترنے والے کئی مسافر ہمارے ڈبوں کے سامنے سے بھی گزرے اور کچھ دُور جاکے پان بیڑی وغیرہ خرید کے لَوٹ گئے۔ وہ دونوں نیچے نہیں اُترے' اس لیے ہم نے بھی پہل نہیں کی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد گاڑی بھی روانہ ہوتی رہی۔ اِس دوران ٹھل کو دروازے پر کھڑا دیکھ کے ایک فقیر بھی آیا اور اُوٹ پٹانگ صدائیں بلند کرنے لگا۔ ٹھل نے اُس کی طرف روپے کا نوٹ بڑھادیا' اُس نے ٹھل کو غور سے دیکھا اور دعائیں دیتا رخصت ہوگیا۔ پھر وہی فقیر ہماری طرف بھی آیا' مارٹی نے اُس کی طرف سکہ اُچھال دیا' سکہ پلیٹ فارم پر گرا۔ مارٹی نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا۔ فقیر بے تابانہ پلیٹ فارم پر سکہ ڈھونڈنے لگا' جب تک سکہ اُس کے ہاتھ نہیں آگیا' اُسے چین نہ پڑا۔

گاڑی رُکنے پر دروازوں' کھڑکیوں پر جھپٹنا اور گاڑی چلنے پر برتھیں سنبھال کے پڑجانا' ہر اسٹیشن پر سب کا معمول یہی رہا۔ جتنا وقت گزرتا جارہا تھا' سب کے چہروں پر خون کی تمازت بھی بڑھتی جارہی تھی۔

ابھی چار نہیں بجے تھے' گھڑی میں ٹھیک تین بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے۔ معاً کھڑکیوں سے دُور دُور روشنیاں ٹمٹماتی دکھائی دیں۔ گاڑی کی رفتار بھی سُست ہونے لگی۔ ہم انجن کی سیٹی بجنے سے پہلے ہی کھڑے ہوگئے تھے۔ روشنیاں بتدریج بڑھتی گئیں۔ بار بار پٹریاں بدلنے کی کھڑکھڑاہٹ سے ہمیں اندازہ ہوگیا تھا کہ کوئی بڑا شہر یا بڑا اسٹیشن آرہا ہے۔

وہ واڑی جنکشن تھا۔ گاڑی بہت دُور سے سیٹیاں بجاتی اور آ[...] ہوئی ٹھیر گئی تھی۔ اچانک ایسا لگا جیسے دن نکل آیا ہے۔ پلیٹ فارم پر ہر[...] خوانچہ فروشوں کی صداؤں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ پر گاڑی انتظار کے بعد آئے تو عجیب نفسانفسی ہوتی ہے۔ گاڑی ٹھیرتے ہی ٹوٹ پڑے۔ بہت سے مسافر ڈبوں سے اُترے۔ ہم نے جلدی نہیں کی۔ [...] میں سے صرف ایک نیچے آیا۔ تیز روشنی میں اُس کا چہرہ اچھی طرح [...] تھا۔ تقریباً وہی حلیہ اور ناک نقشہ تھا جو مارٹی نے بتایا تھا۔ البتہ اِس [...] شیروانی پہنے ہوئے نہیں تھا۔ سفید کُرتے پر جگہ جگہ شکنیں پڑی تھیں۔ [...] تھکا' ٹوٹا ٹوٹا معلوم ہوتا تھا مگر تھکن کے باوجود اُس کے چہرے کا [...] ہوا تھا۔ کبھی کبھی اُس کی ایک چھپلتی ہوئی نگاہ ہم پر پڑتی تھی پھر وہ سگ[...] ہوئے کسی اور طرف دیکھنے لگتا تھا۔ ہم سب کی کوشش بھی یہی تھی کہ ا[...] سے اُسے پہچان لینے کا کوئی تاثر قائم نہ ہونے دیں۔ بے شمار مسافر اُس [...] گزرے لیکن نہ کسی شخص نے اُس کی طرف توجہ دی' نہ اُس نے کسی کی طرف [...] بعد پیرو ڈبے سے اُتر گیا' شامو' مارٹی اور ٹنگو بھی اُتر گئے۔ میں بھی نیچے جا[...] لیکن اُن تینوں کے جانے کے بعد جبرو اور میں ڈبے میں اکیلے رہ گئے تھے [...] نے ارادہ ملتوی کردیا۔ مجھے اِس احتیاط کی وجہ خود معلوم نہیں تھی۔ ڈبے [...] حشمت جنگ کے خوان اور ایک چرمی بیگ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ چائے [...] آنے پر مارٹی نے اُسے روک لیا۔ ضرور کسی نے اشارہ کیا ہوگا جو مارٹی نے [...] رکھا۔ وہ ایک ساتھ بھی چائے کے کلھڑ طلب کرسکتا تھا لیکن وہ ایک ایک [...] کے پھر کلھڑ طلب کررہا تھا۔ سموسے اور بسکٹ بھی مارٹی نے اسی طرح [...] تقسیم کیے۔ کچھ وقت اُس نے چائے بسکٹ وغیرہ ہم تک پہنچانے میں اور کچھ [...] سے اور ٹھیلے والے سے حجت کرنے میں صرف کیا۔ ٹھیلا اسی طرح ڈبے کے [...] تک کھڑا رکھا جاسکتا تھا۔ ٹنگو' شامو' جبرو اور زورا نے ایک کلھڑ پر اکتفا [...] چائے تھی بھی تازہ۔ مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو سے اُس کا ذائقہ [...] ہوگیا تھا۔ دیکھتے دیکھتے ٹھیلے کے گرد اور بھی کئی مسافر اکٹھے ہوگئے۔ اُن میں سے ایک آدمی پلیٹ فارم ہی پر موجود تھا' وہ پہلے تو الگ کھڑا سب [...] پھر اُسے بھی ہمک ہوئی یا یہ ہمارے قریب آنے کا بہانہ تھا۔ اُس نے دو کلھ[ڑ] کلھڑ وہ ڈبے کے دروازے پر کھڑے ہوئے اپنے ساتھی کو دے آیا۔ دونوں [...] سامنے چائے ختم کی اور پان کے خوانچے والے کو روک کے پان کھایا۔ میری ن[گاہ] [...] کا [...] کیے ہوئے تھیں۔ دونوں کے چہروں پر کوئی خاص اضطراب نہیں [...] والے کے اطراف جمع ہونے والے لوگوں میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں [...] اُن کے تعلق کا ذرا شائبہ ہو لیکن اِس عرصے میں کئی مسافروں کی نگا[ہیں] ڈبوں کی طرف منڈلائیں۔ ٹھیلے کے گرد کھڑے ہونے والوں' پلیٹ فا[رم] [...]

[...] جانے والوں میں دونوں طرح کے مسافر تھے۔ کوئی آلودہ نگاہ پرکھنا آسان نہیں تھا [...] تاہم تین مسافر میرے محور سے عام آدمیوں سے مختلف لگتے تھے' اُن پر مجھے ایک [...] لمحے کے لیے شک ہوا تھا لیکن وہ ہماری طرف کسی اور سبب سے بھی تو متوجہ ہوسکتے تھے۔ فرسٹ کلاس کے ڈبے کے مسافروں پر ویسے بھی نگاہیں اُٹھ جاتی ہیں' مارٹی اور شامو ٹھیلے والے سے مسخراپن کرنے لگے تھے۔ وہ آدھا سموسا کھاکے' لڈو کا [...] یک کو ناک کے منہ بناکر لائن پر پھینک دیتے۔ اِس طرح اُنھوں نے سموسوں اور لڈوؤں کا آدھا تھال ختم کردیا۔ ٹھیلے والا بے دلی سے ہنستا اور کسمساکے رہ جاتا۔ وہ تین مسافر جو میری آنکھوں میں کھٹکے تھے' اُن پر میرا شبہ رفع ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ہمارے نشان زدہ دونوں آدمیوں سے قطعاً بے خبر رہے تھے حالانکہ وہ دونوں اُن کے بہت قریب کھڑے تھے۔ اُن کی نظر اُن پر گئی ہی نہیں' اچٹتی ہوئی سی بھی کوئی نظر نہیں گئی۔ ذرا بھی شناسائی ہوتی تو ایسا نہ ہوتا' کسی بھی بے اختیار حرکت سے اِس کی تصدیق ہوجاتی۔

پیرو تھوڑی دیر کے لیے ٹھل کے ڈبے میں گیا تھا' کانٹے کو دیکھنے۔ اُس نے شامو' ٹنگو' مارٹی وغیرہ کی تجویزوں کے متعلق ٹھل سے بات ضرور کی ہوگی لیکن ٹھل نے شاید کوئی توجہ نہیں دی' پیرو جلد ہی نیچے آگیا اور ڈبے سے اُتر کے ٹھل کے سامنے رہا۔ ٹھیلے والے کو مارٹی نے گنے بغیر ایک بڑی رقم دے دی' مارٹی کی اِس فیاضی پر اُس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اب وہ کہیں اور جانا نہیں چاہتا تھا لیکن کسی طرف سے ایک تنومند' تند خو مسافر آکے اُسے للکارنے لگا کہ وہ ایک جگہ کیوں جم گیا' آگے دوسرے ڈبوں میں بھی مسافر ہیں اور اُس کا انتظار کررہے ہیں۔ مارٹی ٹھیلے والے کو مزید روک سکتا تھا لیکن ٹھیلے والے کی معذرت پر اُس نے اُسے جانے دیا۔ تند خو مسافر کے طور طریق کچھ مناسب نہیں لگے' اُس نے ہماری طرف بھی اشارہ کیا تھا کہ ایک ہمی لاٹ صاحب گاڑی میں سوار نہیں ہیں۔ کوئی دوسرا موقع ہوتا تو مارٹی اور شامو اُسے سمجھ لیتے۔ اُس شخص کو دیکھ کے میری رگوں میں بھی چبھن ہوئی تھی' اُس کا حلیہ ذات اباجان کی حویلی میں آنے والے آدمیوں سے خاصا مشابہ تھا' وہی رنگ اور کاٹھی' چہرے پر وہی درشتی اور آنکھوں میں وہی شعلہ باری لیکن وہ اُن میں سے قطعی نہیں تھا' حویلی سے باہر رہ جانے والوں میں ہو تو ہو' اُنھیں ہم نہیں دیکھ پائے تھے۔ اُس کی نظریں کئی بار ہم پر تلملائیں۔ اِس سے میرا شبہ کچھ کم ہوا' دوسرے اُن دو آدمیوں سے اُس کا بھی کوئی تال میل معلوم نہیں ہوتا تھا۔ ایسی کوئی گرہ ہوتی تو اِس کا رویّہ کترایا ہوا ہوتا۔ ٹھیلے والا آگے بڑھ گیا تھا' پلیٹ فارم بھی اب ٹھیراؤ آچکا تھا۔ ڈبوں میں تازہ پانی بھر دیا گیا تھا' ایک خاکروب نے آکے ہمارے ڈبوں کی صفائی بھی کردی تھی۔ اسٹیشن پر اُترنے والے کم' سوار ہونے والے زیادہ تھے۔ کئی مسافر جگہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہمارے ڈبوں کی طرف بھی بھٹکے تھے لیکن [...] ڈبے پر فرسٹ کلاس کا نشان دیکھ کے خود آگے چلے گئے' کچھ کو یاد کرانا پڑا [...] یہ کون سا درجہ ہے۔ انگریزی لباس میں ملبوس ایک افسر قسم کا شخص بھی آیا مگر وہ یہ سُن کے کہ ہمارا ڈبا ریزروڈ ہے' چند لمحوں کے پس و پیش کے بعد آگے بڑھ گیا۔

واڑی جنکشن پر گاڑی ٹھیرے ہوئے بیس منٹ سے اوپر ہوچکے تھے۔ چار بجنے والے تھے۔ پلیٹ فارم کو جیسے قرار آگیا تھا۔ وہ آدمی بھی اب اوپر چلا گیا تھا لیکن دروازے سے نہیں ہٹا۔ ٹنگو' شامو بھی ڈبے میں واپس آگئے۔ اُن کے آنے پر میں نے نیچے اُترنے اور ایک نظر کانٹے کو دیکھ آنے کا ارادہ کیا مگر پلیٹ فارم کے آثار بتلا رہے تھے کہ گاڑی روانہ ہوا چاہتی ہے۔ ابھی سیٹی نہیں بجی تھی تاہم کسی لمحے بھی بج سکتی تھی۔ پیرو اور مارٹی' ٹھل کے ڈبے کے سامنے کھڑے رہے۔ اتنے میں انجن کی طرف سے ایک ادھیڑ عمر شخص' سرمئی واسکٹ اور پاجامہ' رام پوری طرز کی ٹوپی' سلیم شاہی جوتی پہنے اور موسیقاروں کی طرح شانوں پر شال ڈالے لپکتا جھپکتا دُور سے آتا دکھائی دیا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ ایک برقع پوش عورت بھی اُس کے پیچھے تھی' اُس سے چلا نہیں جارہا تھا۔ قلی چرمی سوٹ کیس اور چرمی بیگ اُٹھائے اُس شخص سے ایک قدم پیچھے چل رہا تھا۔ دونوں سٹ پٹاتے قدموں سے ایک ایک ڈبا جھانک رہے تھے' عورت پیچھے رہ جاتی تو وہ شخص نہایت مضطربانہ انداز میں رُک کر اور قلی کو روک کر عورت کا انتظار کرتا۔ گاڑی چلنے والی تھی' اِس لیے اُس کا بے تاب ہونا فطری تھا۔ عورت تیز چلنے کی کوشش کرتی لیکن تین چار قدم بعد ہی سُست پڑجاتی۔ پھر ایک دم گارڈ کی سیٹی یہاں سے وہاں تک پورے پلیٹ فارم پر گونجنے لگی۔ وہ شخص حواس باختگی سے بڑھتے بڑھتے پہلے اُن دو آدمیوں کے ڈبے کی طرف گیا اور بے چینی سے اندر جھانکنے لگا' پھر فوراً وہ ٹھل کے ڈبے کے سامنے آگیا۔ پہلے اُس نے کھڑکیوں سے جھانک کے اندر دیکھا' اُسے اباجان اور منیر علی کے چہرے نظر آئے ہوں گے۔ ٹھل دروازے ہی پر کھڑا تھا' پیرو اُس کے مقابل نیچے پلیٹ فارم پر تھا۔ اُس آدمی کو ٹھیرے ہوئے ایک لمحہ بھی نہ گزرا تھا کہ پیرو نے اُسے بتایا کہ یہ فرسٹ کلاس کا ڈبا ہے۔ جواب میں اُس نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا کہ اُس کے پاس بھی اِسی درجے کا ٹکٹ ہے۔ پیرو نے پھر ملائمت سے اُسے بتایا کہ یہ دو برابر برابر کے ڈبے خاص طور پر ہمارے لیے محفوظ کیے گئے ہیں۔ ادھیڑ عمر شخص شش و پنج میں پڑگیا' نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والی کیفیت تھی۔ اُس نے بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اُس کے ساتھ کی عورت گھسٹتی گھسٹتی افتاں و خیزاں ہماری طرف آرہی تھی۔ "مجھے گلبرگے تک بیٹھنے کی جگہ دیجیے۔" وہ شخص عاجزی سے بولا۔ "گلبرگہ یہاں سے صرف بیس میل دُور ہے۔"

مارٹی نے اشارۃً کہا کہ اُس کے ساتھ ایک پردہ نشین عورت ہے اور ڈبے میں سارے مرد بیٹھے ہیں مگر وہ آدمی کہنے لگا کہ اُس کی بیوی کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ گاڑی روانہ ہونے والی ہے۔ وقت شاید نہ مل پائے۔ شاید وہ اُسے زنانہ ڈبے میں نہ بٹھاسکے' اس لیے مجبوراً اس کی دیکھ بھال کے لیے وہ مردانہ ڈبے کو ہی ترجیح دے گا۔ ڈبے میں اُسے [...] مہ دو بزرگ نظر آگئے ہیں' اس لیے وہ خود کو یہاں زیادہ محفوظ و مطمئن محسوس کرتا ہے' اگلے اسٹیشن تک کی بات ہے' اِس سے آگے وہ کوئی مناسب جگہ تلاش کرلے گا۔ "آپ کو صرف آدھ گھنٹے کی زحمت ہوگی۔" اُس کا انداز عاجزانہ تھا۔ وہ حیدرآبادی لہجے میں

بات کر رہا تھا۔ کہنے لگا کہ اپنی بیوی کے آرام کی خاطر اُس نے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ خریدا ہے۔ اُس کی بیوی ڈبّے کے پاس کچھ فاصلے پر ترچھی کھڑی ہو گئی تھی۔ سر سے پیر تک سفید برقع، بدن کسی قدر فربہی کی طرف مائل، قد نکلتا ہوا! اس دوران میں مَیں بھی نیچے اُتر کے اُن کے قریب پہنچ گیا تھا۔

"آپ کو اِدھر تکلیف ہوگا میاں صاحب!" پیرو نے تحمّل سے کہا۔

"تکلیف تو آپ کو ہوگی۔" وہ لجاجت سے بولا۔

پیرو نے تجمّل کی طرف دیکھا۔ تجمّل کا تذبذب دیکھ کے وہ شخص کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ تجمّل نے ہاتھ اٹھا کے کہا۔ "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے میاں صاحب! پر اگلے اسٹیشن پر آپ ٹھکانا ڈھونڈ لینا۔"

اُس نے ممنونیت کی نگاہ سے تجمّل کو دیکھا اور بے ترتیب لفظوں میں شکریہ ادا کرنا چاہا۔ ساتھ ہی اُس نے قلی کو حکم دیا کہ وہ سامان اندر رکھ دے اور جلدی کرے۔ قلی نے ہینڈ بیگ دروازے میں بڑھا دیا، معاً تجمّل نے اُسے روک دیا۔ "ابھی ایسا کرو میاں صاحب! آپ اپنے برابر کے ڈبّے میں بیٹھ جاؤ، اُدھر آپ زیادہ آرام سے ہوگے۔"

"جی، جی ہاں۔" وہ انتشار زدہ مستعدی سے بولا۔

"اُدھر سے ہم آدمی تھوڑے کم کر لیں گے، اچھی جگہ آپ کو مل جائے گی۔"

"جگہ کیا جناب! آپ کی مہربانی ہے کہ....." اُس نے سیمابی آواز میں کہا۔

"ہم کو بخدا یہاں بھی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ تھوڑی دُور کی تو بات ہے۔"

"اِدھر اپنے ساتھ ایک بیمار بھی ہے۔ عورت کے سامنے اُس کا لیٹے لیٹے پڑے رہنا ٹھیک نہیں ہوگا۔"

"اِس کی ضرورت نہیں۔" وہ کسی توقف کے بغیر بولا۔ "وہ بے شک آرام کرتے رہیں۔"

"پر اپنے کو اچھا نہیں لگتا۔ اگلا ڈبّا بھی اپنا ہی ہے۔ آپ بولو گے تو ہم بھی ساتھ چلیں گے۔"

"جی، جی۔" اُس نے کسی قدر بدحواسی سے کہا۔

"جلدی کرو میاں صاحب! سیٹی بج گئی ہے۔" تجمّل نے تندی سے کہا اور قلی کو ہمارے ڈبّے میں سامان رکھنے کی ہدایت کی اور مجھ سے کہا کہ میں شامو، جمرو اور ٹنگو کو یہاں بھیج دوں۔

"آدھ گھنٹے کی تو بات....." مگر اُس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ تجمّل تیزی سے اُتر گیا۔ قلی کو جھڑکنے کے انداز میں اُس نے عجلت کی تلقین کی۔ عورت قلی اور اپنے شوہر کو بڑھتا دیکھ کے چند قدم اور آگے آگئی۔ اِدھر میں نے لپک کے جمرو، شامو اور ٹنگو کو ڈبّا خالی کرنے کا اشارہ کیا۔ مارٹی پہلے ہی نیچے تھا۔ وہ تینوں بھی دروازے پر کھڑے تھے، فوراً اُتر آئے۔ قلی نے آدمی اور عورت کے ڈبّے میں چڑھنے سے پہلے سامان رکھ دیا تھا۔ پہلے وہ دونوں اوپر گئے پھر تجمّل اور پیرو۔ مجھے پیرو سے یہ کہنے کا موقع نہیں ملا کہ اُسے اباجان کے ڈبّے ہی میں رہنا چاہیے۔ وہاں سے دونوں کا آجانا مناسب نہیں تھا، اُن کی عدم موجودگی میں زورا، جمرو، ممّی وغیرہ کوئی الٹا سیدھا قدم اُٹھا سکتے تھے، اُس وقت کسی کا [illegible] نہیں کر رہا تھا۔ مجھ سے تجمّل نے کچھ نہیں کہا تھا، پہلے تو میں [illegible] ڈبّے میں چلا جاؤں لیکن پھر میں نے ارادہ بدل دیا اور تجمّل سے پوچھے [illegible] گیا۔ تجمّل نے کوئی اعتراض بھی نہیں کیا۔ عورت منہ دوسری طرف کیے ایک [illegible] سمٹ گئی تھی۔ برقع کے باوجود صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت سہمی ہوئی ہے [illegible] مردوں کے درمیان بیٹھنے کا اُسے پہلی بار اتفاق ہوا ہو۔ تجمّل نے اُوپر جا کر [illegible] سے کہا۔ "آپ بولو تو ابھی ہم تینوں بھی اُدھر دوسرے ڈبّے میں چلے جائیں۔"

"نہیں نہیں۔" وہ معذرتی آواز میں بولا۔ "آپ کو ہماری خاطر بہت [illegible] اٹھانا پڑی۔ شاید مجھ سے جلدی ہو گئی۔ ابھی کچھ وقت تھا، میں کوئی معقول [illegible] کر سکتا تھا۔"

"اِدھر بھی کیا جاتا ہے۔" تجمّل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں، پیرو اور تجمّل تینوں مخالف برتھ پر بیٹھ گئے۔ ہم نے کوشش [illegible] کا آمنا سامنا نہ ہو لیکن وہ ایک مختصر ڈبّا تھا۔ تجمّل نے ٹھیک جلدی کی تھی [illegible] جیسے ہمارے ڈبّے میں آنے کا انتظار تھا۔ چند ہی لمحوں بعد انجن نے سیٹی دی [illegible] گاڑی جھٹکے لیتی ہوئی کھسکنے لگی۔ تجمّل نے مجھے دروازہ بند کرنے کا اشارہ [illegible] طرف کے دروازے کھلے ہوئے تھے، میں نے ایک بند کر دیا اور دوسرے پر کھڑا [illegible] اسٹیشن گزرتے دیکھتا رہا۔ دوسرے ڈبّے کے دروازے پر مارٹی اور شامو مجھے دیکھ [illegible] ہلانے لگے۔ اس سے اگلے ڈبّے پر وہ آدمی بھی موجود تھا، وہ اس کے سوا [illegible] سکتا تھا۔ دروازے کے ڈنڈے پر اُس کا ہاتھ جما ہوا تھا لیکن جسم اندر ہی کی جانب [illegible] روشنیاں کم ہونے لگیں اور گاڑی کی رفتار بڑھنے لگی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا [illegible] تھی، میرے بال اُڑے جا رہے تھے۔ گاڑی چھوٹنے پر مجھے اپنا وجود ہلکا [illegible] ہو رہا تھا۔ میں نے پیچھے ہٹ کے دروازہ بند کیا۔ دروازہ بند کر کے میں پلٹا [illegible] یکایک میرے جسم کو جھٹکا سا لگا۔ تجمّل اور پیرو کے ہاتھوں میں تمنچے دبے [illegible]

اُس شخص کا منہ کھلا ہوا تھا، دیدے باہر نکلے ہوئے تھے، وہ [illegible] ہو رہا تھا۔ میرے حواس گُنگ ہو گئے تاہم بے اختیار میں نے بھی اپنا تمنچا [illegible]

"اِس سے بولو کہ مکھڑے سے ذرا بدلی تو ہٹا دے۔" تجمّل نے اونچی آ[illegible] کہا۔ "دیکھتے ہیں اندر سے چندریا کیسی ہے۔" میرے کان سنسنا رہے تھے [illegible] نے اُسی شخص کو مخاطب کیا تھا مگر اُس پر سکتہ طاری تھا۔ اُس کے لب پھڑپھڑا [illegible]

"دادا! اِس کو سنائی نہیں دیا شاید۔" تجمّل نے سرد لہجے میں کہا۔ "[illegible] کو بھی کچھ دینا پڑے گا اپنے کو۔"

"ہاں ہاں تجمّل بھائی! دے گا، ابھی ضرور دے گا۔" پیرو کی آواز [illegible] تھی۔ پھر وہ ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا اور گرج کے بولا۔ "سُنا نہیں تو نے؟ [illegible] کفنا پہن لیا ہے! ابھی تو تھوڑا ٹیم ہے، اُتار دے اِس کو۔"

"کیا، کیا جناب! آپ کیسا..... آپ کیا فرما رہے.....؟" اُس آدمی کی لرزتی آواز حلق میں گھٹ گئی۔

"ہتھیار نکال کے ابھی ایدر کو ڈال دے۔" پیرو نے دبا کے کہا۔ "دیری ایک دم کو نئیں۔"

"آپ لوگ، آپ کیسا بولتے ہیں۔" وہ ہذیانی انداز میں بولا۔ "ہتھیار؟ اپنے پاس ہتھیار بھلا کیسا؟"

"دیر کرے گا تو گھاٹا زیادہ ہو جائے گا رے۔" تجمّل نے کہا۔

اُس شخص کا پورا جسم دھڑک رہا تھا۔ عورت بھی الف ہو کے بیٹھ گئی تھی اور اُس نے برقع کس کے لپیٹ لیا تھا۔ پیرو تمنچا تانے اُس کی طرف بڑھا اور تین چار قدم بعد ہی اُس کے سر پہ جا پہنچا۔ "ابھی ایدر ٹھکانے لگانے میں بھی کوئی وانداں نیں ہے، ابھی خود اتار رہا ہے کہ اپن.....؟" پیرو نے انتظار نہیں کیا، دوسرے ہی لمحے اُس کا جھپٹتا ہوا ہاتھ برقع پوش کے سر پہ پڑا۔ برقع پوش کا جسم اضطراری حالت میں پیچھے کی طرف ہٹا مگر پیچھے ڈبّے کی دیوار تھی، نتیجتاً برقع کی جالی بھی اوپر ہو گئی۔ پیرو نے جالی میں انگلیاں گھسیڑ کے اتنی زور سے جھٹکا دیا کہ نیچے گریبان تک کپڑا اُدھڑ گیا۔ میری آنکھیں حیرت سے اُبل آئیں، برقع کے پیچھے اُس کا چہرہ، ایک مرد کا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ گھنی مونچھیں، پھٹی پھٹی آنکھیں اور پھڑکتے ہوئے ہونٹ۔ اُس کی عمر تیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ رنگ گہرا گندمی تھا۔ پیرو نے دوسرے جھٹکے میں برقع ٹانگوں تک چیر دیا۔ میرے لیے یہ ایک ناقابلِ یقین منظر تھا لیکن میں پوری تندہی سے اُسے تمنچے کی زد پر لیے رہا۔ وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں کھڑا ہو گیا۔ اُس کا تمنچا نہ جانے کہاں دبا ہوا تھا کہ اِسی وحشت میں فرش پر گر پڑا۔ پیرو نے اُس کے گال پر پوری طاقت سے طمانچہ مارا، وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا، کھڑکی کے کونے سے اُس کا سر ٹکرایا۔

تجمّل سامنے کی برتھ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ دوسرے آدمی کے پاس بھی ہتھیار ہونے چاہییں گو یہ ناگہانی دیکھ کے وہ بے حس و حرکت ہو لیا اور اُس کے پاس ہتھیار ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا مگر احتیاط بہتر تھی۔ میں نے جھپٹ کے اُس کی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا، وہ غیر ارادی طور پر ایک طرف ہٹ گیا۔ میرا ہاتھ اُس کے گریبان پر چلا گیا لیکن میں نے فوراً گریبان چھوڑ دیا۔ اِس طرح میرا ہاتھ گھر جاتا، ایک ہاتھ تمنچے کی وجہ سے پہلے ہی گھرا ہوا تھا۔ تمنچا بائیں ہاتھ میں لے کے میں نے اُس کی واسکٹ کی بیرونی جیبیں ٹٹولیں۔ اُن میں کچھ نہیں تھا۔ البتہ اندر کی جیب سے چھ انچ کا کھٹکے والا چاقو برآمد ہوا۔ چاقو فرش پر پھینک کے میں نے اُس کی شال کھینچ لی اور کُرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اُس نے پہلی بار ذرا سی مزاحمت کی لیکن میری ایک ہی ترچھی ضرب سے وہ سنبھل گیا۔ کُرتے کی جیب میں تمنچا پڑا ہوا تھا اور بنیان کے نیچے کمر کے گرد کارتوسوں کی پیٹی بندھی تھی۔

پیرو نے برقع پوش کو بھی خالی کر دیا تھا۔ اب وہ عجب ہیئت کذائی کے عالم میں تھا۔ برقع جگہ جگہ سے پھٹ چکا تھا، اُس کا ایک حصہ شانے پر جھول رہا تھا۔

پیرو اُس پر مسلسل ضربیں لگا رہا تھا۔ میرے سامنے والا شخص بھی بُری طرح گھگھیانے لگا۔ اُس کی باچھیں بجھے اور زہر رنگ رہی تھیں۔ میں نے اُس کے منہ پر اُلٹے ہاتھ کا طمانچہ مارا۔ وہ میرے پیروں پر گر گیا۔ اُسے اپنے پیروں سے دُور کرنے کے لیے میں نے اُس کے سر پر تمنچے کے دستے سے ضرب لگائی۔ وہ چیختا ہوا اُچھلا۔ اُس کے ہاتھ جیسے ہی میرے پیروں سے چھوٹے، میں نے اُس کی ٹھوڑی پر گھٹنے کی ضرب رسید کی۔ وہ فرش پر کر کے بل لوٹ گیا۔ میں اُسے اور ٹھوکریں لگانا چاہتا تھا مگر تجمّل کی آواز نے میرے ہاتھ پیر جکڑ لیے۔ "ابھی تھوڑا وقت دے دے اِس کو۔" اُس نے درشتی سے کہا۔ آدمی کی ٹوپی کب کی گر چکی تھی، میں نے بال پکڑ کے اُسے زمین سے اٹھایا اور برتھ پر دھکیل دیا۔ وہ بلبلاتا ہوا سکڑ کے بیٹھ گیا۔

"اِدھر کو آجا رے۔" تجمّل نے مجھ سے کہا۔ "ابھی اِن سے اِن کی ماں کے یاروں کا پتہ بھی کرنا ہے، کون کون ہیں وہ رنڈی کے جنے۔"

پیرو نے بھی سُن لیا تھا، وہ برقع پوش کے پاس سے ہٹ آیا۔ دونوں آدمی ایک دوسرے سے گز بھر کے فاصلے پر بیٹھے ہانپ رہے تھے۔ برقع پوش کے ہونٹوں سے خون کی لکیر ٹھوڑی تک چلی گئی تھی۔ اُس کی ناک بھی سوجی ہوئی تھی۔

"ابھی کتنا ساتھ میں ہے کتنا آدمی؟" پیرو نے کڑکتی آواز میں پوچھا۔

"کوئی نہیں، کوئی بھی نہیں۔" برقع پوش آدمی گڑگڑا کے بولا۔ "ہم بالکل اکیلے ہیں مائی باپ!" صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔

"اپن پوچھتا ہے، ابھی کتنا آدمی ساتھ ہے؟"

"سات!" برقع پوش کے بجائے شال والے آدمی نے سٹپٹاتی آواز میں کہا۔ "اپنے ساتھ سات آدمی اور ہیں۔"

"یہ تھوڑا اپنے کو سمجھ دار لگتا ہے۔"

"دھوپ زیادہ لگی ہے دادا اِس کو۔"

"کیدر، کیدر بیٹھا ہے؟"

"پانچ اِس طرف والی بوگی میں ہیں، باقی دو پیچھے کی بوگی میں ہیں، سارے انٹر کلاس میں ہیں۔"

"اور اُدھر بازو والا فرسٹ کلاس میں بیٹھا اپنے باپ کو بھول گیا؟"

"بازو والے میں کون؟" وہ بدحواسی سے بولا۔

"یہ بھی ابھی اپن بولے گا؟" پیرو نے غضب آلود لہجے میں کہا۔ "دیکھ سالے! ابھی سیدھا سیدھا بولے گا تو اپنے ساتھ ہی بھلا کرے گا۔ بات تھوڑا کم کر اور سیدھا کر دے۔"

"ہم اُن کو نہیں جانتے جناب!"

"نئیں جانتا؟" پیرو نے بڑھ کے اُس کی دونوں کنپٹیاں پکڑیں اور انگلیوں سے مسلنے لگا۔ "نئیں جانتا تھا نا؟"

"ہم کو نہیں معلوم کہ وہ کون ہیں۔" وہ سسکتی آواز میں بولا۔ "ہم کو اپنی ماں کی قسم، اپنے خدا کی قسم، آپ کو ضرور دھوکا ہوا ہے، ہم قسم کھاتے ہیں۔"

"ابھی سنا تھبل بھائی! رات والا حرام زادہ بھی قسم کھاتا تھا۔ یہ حیدرآباد اسٹیٹ کا لوگ سالا کھانا نہیں کھاتا کیا؟"

"کھاتا بھی کھاتا ہے، پر ہم کو یہ اٹھائی گیرے حیدرآباد کے نہیں لگتے، یہ پاری ہیں حیدرآباد پار کے۔"

"آپ بالکل بالکل درست فرما رہے ہیں، ہمیں حیدرآباد آئے زیادہ دن نہیں ہوئے۔ ہم تو جناب بس یہاں آ کے پھنس گئے۔ بدنصیبی یہاں کھینچ لائی، سب قسمت کی بات....."

"تم سے بولا ہے کہ ابھی زبان تھوڑا کم چلاؤ، جو اپن پوچھتا ہے، اُس کا ایک دم ٹھیک ٹھیک جواب دو۔"

"ہم آپ سے کچھ نہیں چھپائیں گے۔"

"چھپائے گا تو اکھا خود چھپ جائے گا سدا کو۔" پیرو کے لہجے میں کوئی لوچ نہیں تھا۔ "ابھی کس نے ایدر کو بھیجا ہے؟"

گاڑی کو واڑی اسٹیشن سے چلے آٹھ دس منٹ سے زیادہ نہیں ہوئے تھے۔ رفتار بہت تیز تھی۔ میں نے خیال رکھا کہ موقع ملنے پر کہیں اُن میں سے کوئی اُٹھ کے زنجیر نہ کھینچ دے۔ وہ کاٹھی اور بشرے سے زور ہیں ایسے کم معلوم نہیں ہوتے تھے لیکن اِس اچانک افتاد نے اُن کے ہوش و حواس سلب کر لیے تھے۔ ہم نے حواس کی بحالی کے لیے کوئی بھی لمحہ انھیں فراہم نہیں کیا تھا۔ یہ سب کچھ اُن کے لیے ایک خواب کے مانند ہو گا جیسے خواب آدمی کو بے اختیار کر دیتے ہیں۔ پیرو نے برقع پوش کو نیم جاں کر دیا تھا، دوسرے کی حالت بھی اُس سے کچھ مختلف نہیں تھی۔ اُس کے بہ قول آدھے گھنٹے بعد گلبرگہ آنے والا تھا۔ اِس عرصے میں ہمیں اُن سے اُن کے ساتھیوں اور بھیجنے والوں کے بارے میں یقین کر لینا تھا۔ اِس کے علاوہ اُن کا فیصلہ بھی کرنا تھا۔ پیرو کے اِس سوال سے میرے جسم و جاں پر بھی سناٹا چھا گیا کہ رنگا یا جس نواب نے انھیں ہمارے تعاقب میں بھیجا ہے؟ جانے یہ کس کا نام لے دیں! پیرو کے راجا دھرم دیر کا یا جیسا کہ پیرو نے خدشہ ظاہر کیا تھا، نواب حشمت جنگ کا؟ یہ نواب حشمت جنگ کا نام بھی لے سکتے ہیں، کاش پیرو کا وہم، وہم ہی ثابت ہو، یہ نواب حشمت جنگ کا نام نہ لیں۔ میرا دل اپنی آنکھوں کے اتنے بڑے جھوٹ، اپنے اعتبار کے اتنے بڑے فریب پر آمادہ نہیں تھا۔ وہ دونوں زبان پر کسی کا نام لاتے ہوئے خوف زدہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ اُن کے تامل نے پیرو کو اور برافروختہ کر دیا۔ پیرو نے مجھے اشارہ کیا۔ ہماری دو ایک ضربوں نے جلد ہی اُن کی جھجک دور کر دی۔ شال والے شخص نے پیرو کے آگے ہاتھ جوڑ دیے اور ہزیمت خوردہ لہجے میں بولا۔ "ہم کو نواب قطب الدین علی نے بھیجا ہے۔"

"قطب الدین علی؟" پیرو نے حیرت سے کہا۔ "ابھی یہ کون ہے سالا؟"

"یہ ریاست کے ایک بڑے نواب ہیں۔"

"تم اُس کا کون ہے؟"

"ہم اُن کے نوکر ہیں جناب! اُن کے سپاہیوں میں۔"

"وہ دربار میں رہتا ہے؟"

"دربار میں اُن کی بہت پہنچ ہے۔"

"ابھی تم سالا اپن کو کسی کا بھی نام بول سکتا ہے۔"

"ہم حلف اُٹھا سکتے ہیں۔"

"حلف کا بات مت بولو۔ تم سمجھتا ہے، اپن تمھارے حلف پر یقین کرے گا؟"

"پھر ہم آپ کو کس طرح یقین دلائیں؟"

"وہ تو ہم ابھی تم میں سے ایک کو گاڑی سے نیچے پھینک کے کرے گا۔ تم ابھی بالکل نہیں سمجھا، تم ابھی کید ہے۔ یہ گاڑی چل رہا ہے۔ ابھی رات کا ہے۔ ایدر دروازے سے تم کو باہر ڈالے گا تو وہ تمھارا نواب کا جنا سالا مرتے تک نا پتا رہنے کا ہے۔ پر اُس کے پاس تمھارا جیسا نمک کا بھیک مانگنے والوں کا کمی نئیں ہے۔ تم جائے گا تو بدلے میں ابھی دوسرا چار آ جائے گا۔"

"ہم بے قصور ہیں، ہم صرف حکم کے بندے ہیں۔"

"ایدر اپن بھی حکم کا بندہ ہے، پر اپنے حکم کا۔" پیرو نے دہکتی آواز میں کہا۔ "رات کو بھی آدمی اُسی نے بھیجا تھا؟"

"رات کو؟ رات کو کون سے آدمی صاحب؟"

"کل رات ادر حیدرآباد میں، اپن کا حویلی میں؟"

"ہم بخدا اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے جناب!"

"اُودر اور کتنا تمھارے نواب کے تھان پہ بندھتا ہے؟"

"جی جی۔" وہ فوراً نہیں سمجھ پایا، گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "بہت آدمی ہیں جناب! نواب قطب الدین علی بہت بڑے نواب ہیں۔ اُن کی زمینیں، جاگیریں، ملازمین کی گنتی نہیں ہے۔"

"اُودر ابھی کوئی چھوٹا بھی ہے؟" پیرو نے نفرت سے کہا۔ "کیا بول کے بھیجا تھا اُس نے تم کو؟ ایک دم ٹھیک بولے گا اور جلدی۔ سمجھا!" گاڑی کی رفتار سست ہونے لگی۔ پیرو نے بے چینی سے تھبل کی طرف دیکھا۔ ابھی گلبرگہ کا سوال ہی نہیں تھا۔ وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ واڑی اور گلبرگہ کے درمیان بھی گاڑی کسی اسٹیشن پر ٹھیر سکتی تھی اور اسٹیشن کے بعد [illegible] برقع تھا۔ اُن دونوں کی [illegible] ان کے چہروں سے عیاں تھی۔ اگر گاڑی ٹھیرنے میں کچھ وقت لے لیا تو وہ لینے کے لیے اُن کے ساتھیوں کا اِس طرف آنا تھا۔ اِس حالت میں اُن دونوں کو سامنے نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ کسی طرح بھی اُن کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا سکتے تھے۔ ویسے خاموش رہنے سے بھی اِن کے ساتھیوں کے دلوں میں شک کی گرہ پڑ سکتی تھی، اِن دونوں کو یقین ہو گا کہ ٹھیری ہوئی گاڑی میں یہ بالکل محفوظ رہیں گے کیونکہ ہم کوئی ہتھیار استعمال نہیں کر سکیں گے تو دیکھتے رہ جائیں گے۔ گاڑی کی رفتار اور کم ہو گئی۔ میں نے جھک کے کھڑکی سے جھانک کے دیکھا۔ گاڑی کسی آباد علاقے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اب اُن دونوں کو ڈبے کے بیت الخلا میں چھپانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

پیرو نے بھی ایک پل ضائع کیے بغیر مجھ سے یہی کہا کہ میں برقع والے کو لے کے وہاں چلا جاؤں۔ دوسرے کے کندھے پر پیرو نے ہاتھ اوپر اُٹھا کے اتنی زور سے مار کر نشست پر وہ دھنسنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔ پیرو نے اُسے حکم دیا کہ گاڑی جب تک اسٹیشن پر ٹھیرے، وہ چادر اوڑھے برتھ پر لیٹا رہے، ذرا بھی حرکت ہوئی تو تمنچے کی گولی اُس کے جسم کے پار ہو گی، اُسے بلبلانے کا وقت بھی نہیں مل سکے گا۔ میں نے اِدھر برقع پوش کا بازو تھام کے جھٹکا دیا۔ وہ ہڑبڑاتا ہوا اُٹھا، میں نے اُس کے کولھے پر ٹھوکر مار کے اُسے اُس جگہ کے اور قریب کر دیا۔ تھبل نے اُٹھ کے دروازہ کھول دیا، ہم دونوں ڈبے کے اِس مختصر حصے میں آ گئے، جو فرسٹ کلاس میں کچھ مختلف ہوتا ہے، نسبتہً صاف ستھرا، ہاتھ دھونے کے لیے بیسن، آئینہ وغیرہ۔ جگہ بھی اتنی تنگ نہیں تھی۔ تین آدمی آسانی سے آ سکتے تھے، چار کا سمانا مشکل ہو جاتا۔ میرے ہاتھ میں تمنچہ دبا ہوا تھا، حالانکہ اِس کی ایسی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سکڑا سمٹا نظریں جھکائے ایک طرف کھڑا رہا۔ کچھ ہی دیر میں گاڑی ٹھیر گئی۔ اوپر ہوا کے لیے ادھ کھلے روشن دان سے اسٹیشن کی ملی جلی آوازیں اندر آ رہی تھیں۔ یہ کوئی چھوٹا اسٹیشن تھا، واڑی جنکشن کی طرح یہاں بہت زیادہ شور نہیں تھا۔ پلیٹ فارم بھی پرلی طرف معلوم ہوتا تھا۔ میں اپنے سارے حواس سمیٹے مستعد کھڑا اُس پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ بظاہر کوئی کھٹکا نہیں تھا لیکن بہت کچھ گاڑی کے کم یا زیادہ ٹھیرنے پر منحصر تھا۔ کبھی گاڑی چھوٹے اسٹیشن پر بھی دیر تک ٹھیر جاتی ہے، کسی اور سبب سے بھی وقت طول کھینچ سکتا ہے۔ لیکن خیر، گاڑی دو تین منٹ بعد حرکت میں آ گئی۔ میں نے اطمینان کی سانس لی۔ اُن کے ساتھی اِس مختصر وقفے میں غالباً نہیں اُترے ہوں گے، ایک دو اُترے بھی ہوں گے تو انھیں ڈبے کے دروازے پر تھبل کھڑا نظر آیا ہو گا اور اندر برتھ پر بیٹھا پیرو دکھائی دیا ہو گا۔ ظاہر ہے، تھبل کی موجودی میں انھوں نے ڈبے میں جھانکنے کی جرأت نہیں کی ہو گی۔ گاڑی چلتے ہی میں باہر نکل سکتا تھا لیکن میں نے انتظار کیا۔ جب تک دستک نہیں ہوئی، میں نے دروازہ نہیں کھولا۔ شال والا آدمی اب بیٹھا ہوا تھا۔ اُن دونوں کا سامان برتھ کے نیچے رکھا تھا، نواب حشمت جنگ کے نوکرے نے اُسے بالکل چھپا دیا تھا! اندر آ کے میں نے تھبل اور پیرو سے نہیں پوچھا کہ کیا اِس طرف کوئی نہ رہا؟ تھبل اور پیرو کی پیشانیوں پر پہلے کی طرح لکیریں پڑی ہوئی تھیں، کچھ اخذ کرنا آسان نہیں تھا۔ پیرو نے انھیں سانس لینے کی مہلت نہیں دی۔ گاڑی جنبش میں آتے ہی وہ اُن کے سامنے کھڑا ہو گیا، شال والے شخص کے گال پر اُس نے زناٹے کا طمانچہ رسید کیا۔ اُس کی آنکھوں میں اندھیرا اُتر آیا ہو گا۔ پیرو نے پھر اُس سے یہی سوال کیا کہ اُن کے آقا نے انھیں کیا ہدایات دے کے ہمارے تعاقب میں روانہ کیا تھا؟ پیرو کے طمانچے سے اُس کا منہ ٹیڑھا ہو گیا اور ہونٹ پھٹ گئے۔ وہ حلق تر کر کے کچھ بولنا ہی چاہتا تھا کہ برقع والے آدمی نے تیزی سے کہا۔ "میں بتاتا ہوں حضور! ایک ایک بات، میں آپ کو بتاتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ جو تجھ کو اِس سے پہلے یاد آ گیا۔" پیرو نے کاٹ دار لہجے میں ایک بار پھر اُسے تفصیل سے اجتناب کی تنبیہ کی۔

"ہمارا نواب صاحب سے سامنا نہیں ہوا تھا، اُن کے ایک خاص آدمی ہیں منشی مبارک صاحب، اُنھی نے نواب صاحب کا نام لے کے کہا تھا کہ ہمیں کچھ لوگوں کے پیچھے جانا ہے۔ منشی مبارک اسٹیشن تک ہمارے ساتھ آئے تھے، وہیں انھوں نے آپ کی پہچان کرائی۔"

"کب؟ ابھی کب اُس نے تم کو ایسا بولا تھا؟"

"اُنھوں نے شام چار بجے کے قریب ہمیں بتایا تھا کہ رات کو تیار رہنا ہے، آٹھ بجے کے قریب۔ ہم تیار بیٹھے تھے، اُنھوں نے حکم دیا کہ تمھیں بمبئی کی گاڑی میں جانا ہے۔ زیادہ سے زیادہ گلبرگے تک۔"

"گلبرگے تک کیوں؟ بمبئی تک کیوں نہیں؟"

"گلبرگے کے بعد ریاست کا علاقہ تقریباً ختم ہو جاتا ہے۔ وہ بولتے تھے کہ گلبرگے تک چار پانچ گھنٹے کا سفر ہے۔ تمھیں رات رات میں اپنا کام کر دینا ہے۔" برقع پوش بار بار اپنے ساتھی کی طرف دیکھتا تھا مگر اُس نے ایک بار بھی دخل نہیں دیا تھا۔

"کیسا کام کو بولا تھا؟"

"کہا تھا کہ تمھیں کسی طرح بڑے صاحب کے ڈبے میں پہنچنا ہے اور گاڑی چلتے ہی تمنچا نکال لینا ہے۔ ایک پل بھی دیر نہیں لگانا۔ تلاشی میں ہو سکتا ہے تمھیں وہ چیز مل جائے جس کی ہم کو ضرورت ہے۔ بس چیز لے کے تم کو فوراً واپس آ جانا ہے۔"

"صرف اتنا سا بات؟"

"اُنھوں نے کہا تھا، تم کو بہت احتیاط سے کام لینا پڑے گا۔ وہ لوگ نظر کے بہت تیز ہیں، دور سے آدمی کو سونگھ لیتے ہیں۔ ہتھیار پاس رکھتے ہیں اور ہتھیار چلانا بھی انھیں خوب آتا ہے۔ انھیں نہ کوئی شک ہونے دینا، نہ تمنچا نکالنے میں دیر کرنا، ہے سوچ سمجھ کے اندر داخل ہونا۔"

"اور اگر مال اپن کے پاس نہ نکلا تب؟ تب؟"

"پھر اُنھوں نے ہمیں واپس ہو جانے کو کہا تھا۔ کہا تھا کہ پھر گلبرگے سے، یا اگر ہم پہلے ہی کام کر لیں تو وہیں گاڑی سے اُتر جانا ہے۔ اُنھوں نے کہا تھا، وہ لوگ اپنا سفر کھوٹا کرنا نہیں چاہیں گے اور جھگڑا کرنے سے بچیں گے۔ تمھیں بھی اُن سے خواہ مخواہ نہیں اُلجھنا ہے۔"

"پھر تم کو سالا دیر کاہے کو لگ گیا؟"

اُس کی آواز بھرا رہی تھی، کہنے لگا کہ اُنھوں نے ہمارے ڈبے میں داخل ہونے کے لیے طرح طرح کے طریقے سوچے لیکن ہم ہر جگہ انھیں جاگتے نظر آئے۔ اُس نے بتایا کہ فقیر کی شکل میں جو آدمی ہم سے بھیک لے کے گیا تھا، وہ بھی اُنھی کا آدمی تھا۔ اُس نے لوٹ کے انھیں بتایا کہ اندر داخل ہونا ممکن نہیں ہے۔ گاڑی کے خاکروب کو اُنھوں نے کچھ پیسے تھما کے روک لیا تھا اور جو آدمی جھاڑو ڈبا لے کے صفائی کے لیے آیا تھا وہ بھی کوئی اور نہیں تھا، اُنھی کے آدمیوں میں سے ایک تھا۔ اُس نے ڈبے

کا سارا نقشہ کھینچا اور بتایا کہ اُس نے ہم میں سے کسی کے ہاتھ میں تمنچا بھی دبا ہوا دیکھا ہے۔ چائے والے کے ٹھیلے کے گرد بھی اُن کے آدمی گھومتے رہے تھے۔ راستہ ٹھیک ہونے کی وجہ سے گاڑی جہاں ٹھیری تھی، وہاں بھی اُتر کے اُنھوں نے صورتِ حال کا جائزہ لیا تھا۔ اُنھیں ہدایت کی گئی تھی کہ وہ کسی اسٹیشن ہی پر ڈبے میں داخل ہونے کی کوشش کریں، ایسی کسی جگہ قطعاً نہیں جہاں ذرا بھی شک کی گنجائش ہو، ہمیں غافل بالکل نہ سمجھا جائے۔ ہمارے شک کا مطلب اُن کی ناکامی ہے، کامیابی کا یقین کیے بغیر اُن کا اندر جانا بے سُود ہوگا۔ ہمارے پاس مال کا اندازہ اُنھیں ہمارے چوکس رہنے سے ہو جائے گا۔ برقع پوش کے بہ قول منشی مبارک نے کہا تھا کہ اُن کے آدمی دونوں ڈبوں میں بیک وقت داخل ہوں تو بہتر ہے۔ داخل ہوتے ہی اگر موقع نہ ملے تو اُنھیں اُس وقت تک صبر کرنا ہے جب تک ہمیں اُن کی سادہ دلی اور نیک نیتی پر اعتبار نہ آجائے۔ پھر اُنھیں کوئی لمحہ ملے تو معمولی چوک بھی نہیں ہونی چاہیے۔ برقع پوش چُپ ہوگیا۔ جب بھی وہ نگاہ اُٹھا کے پیرو کی طرف دیکھتا، اُس کی زبان لڑکھڑا جاتی۔

"اور کچھ نہیں بولا تھا؟" پیرو نے بھناتی آواز میں کہا۔

"بس بس دادا! اتنا بہت ہے۔" ٹھّل اپنی نشست سے اُٹھ گیا۔ "اس کا کام اب ختم ہوگیا ہے۔"

"آگے ابھی تم بولے گا، اِس سے آگے کا بات؟" پیرو نے شال والے شخص سے مخاطب ہو کے کہا۔

"اس سے بعد میں پوچھنا دادا!" ٹھّل کی آواز جیسے برف میں جمی ہوئی تھی۔ "پہلے اِس ہنڈلیے کا حساب تو چُکتا کر دو۔ اگلا پھر سرپٹ بولے گا۔" یہ کہتے ہی ٹھّل نے دو قدم آگے جا کے اور ہاتھ بڑھا کے پلک جھپکتے میں برقع پوش کی گردن پیچھے سے دبوچ لی۔ گردن پر ٹھّل کے گڑے ہوئے پنجے سے اُس کا سارا جسم پھڑکنے لگا، وہ واویلا کرنے لگا کہ اُس نے کوئی غلط بیانی نہیں کی ہے۔ ٹھّل نے اِسی حالت میں اُسے برتھ سے اُٹھا لیا اور گردن چھوڑ کے، دونوں ہاتھ پھیلا کے اُس کے جبڑوں پر ہتھیلیوں کی ضرب لگائی۔ وہ معاً فرش پر گر پڑا اور ہاتھ پیر پٹخنے لگا۔ ٹھّل نے جھٹ دوبارہ اُس کی گردن پکڑ کے اُسے اٹھا لیا اور گُدّی کے قریب چٹکی بھری۔ پہلے میں کچھ اور سمجھ رہا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے ٹھّل کے ارادے کا اندازہ ہوگیا۔ چٹکی بھرتے ہی برقع پوش کے شانے جھول گئے اور وہ سسکاری بھر کے فرش پر ڈھیر ہوگیا۔

پیرو کے اشارے پر میں نے نواب حشمت جنگ کا ٹوکرا ہٹا کے اُن کا صندوق باہر نکال لیا۔ مجھ سے اُس کا تالا کھلنے میں دیر لگ رہی تھی، پیرو نے صندوق کے تسمے میں چاقو اڑا کے چمڑا کاٹ دیا۔ صندوق میں انگریزی بسکٹوں کے دو ڈبے، دوائی کی شیشی، چپل کی جوڑی، بوٹ، تین چار جوڑی عام قسم کے کپڑے، تہمد، سلکی شیروانی، قراقلی ٹوپی اور پولیس کی کلف دار وردی اور وردی کے دیگر لوازم کے علاوہ کارتوسوں کا ڈبا اور ایک تمنچا بھی رکھا تھا۔ چرمی بیگ کھولنے میں مجھے زحمت نہیں کرنا پڑی۔ اس میں میلے کچیلے کپڑے، تولیا، صابن، تیل کی شیشی، کنگھی، پیتل کا سفری گلاس اور چادریں ٹھنسی تھیں۔ پیرو سارا سامان غور سے دیکھ رہا تھا۔ ٹھّل نے ٹوک کے وقت کی تنگی کا احساس دلایا اور کھدر کی ایک رنگین منقش چادر اُٹھا کے مجھ سے فرش پر پھیلانے کو کہا۔ پیرو نے اپنے ہاتھ سے فرش پر بکھرے ہوئے چند کپڑے بھی اُس میں ڈال دیے۔ ٹھّل کے اگلے اقدام کے تصور سے میری رگوں میں خون جمنے لگا۔ میں نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔ "تھوڑے کپڑے چادر میں اور گیر دے رے۔ کمریا اس کی بڑی لچک... جلدی کر۔" اُس نے مجھے سوچنے اور کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔ اُس کا حکم سُن کر میرے ہاتھ پاؤں اینٹھنے لگے تھے۔ اُن دونوں نے میری مدد کے بغیر بے سُدھ برقع پوش آدمی کو اِدھر پیروں سے، اُدھر بازوؤں سے اُٹھا کے چادر پر ڈال دیا اور مجھے دروازہ کھولنے کو کہا۔ دروازہ کھولتے ہی روشنی باہر جانے لگی۔ ٹھّل نے بٹن دبا کے قمقمہ بجھا دیا۔ ڈبے میں روشنی خاصی کم ہوگئی، خصوصاً دروازے کے سامنے۔ دوسرا قمقمہ بھی بجھایا جا سکتا تھا لیکن شال والے شخص کے لیے کسی قدر روشنی چاہیے تھی۔ ٹھّل اور پیرو نے دونوں طرف چادر کے کونے پکڑ کے برقع پوش کو دروازے کے قریب رکھ دیا۔

اُسی وقت شال والا شخص اپنی نشست سے چیختا ہوا اُٹھا۔ اُس نے ٹھّل کے پیر پکڑ لیے۔ "اِس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ خدا کے لیے معاف کر دو۔ اسے اتنی بڑی سزا نہ دو۔" وہ ٹھّل کے پیروں سے چمٹ کے دہائیاں دینے لگا۔ ٹھّل نے پیر چھڑانے چاہے تو اُس نے اور زور سے پکڑ لیے۔ ٹھّل نے اُس کے بال پکڑ کے اپنے پیر آزاد کرا لیے اور اُس کے پیٹ میں گھٹنا مارا، وہ دُہرا ہوگیا۔ پیرو نے اُسے سامنے کی برتھ پر دھکیلا اور تمنچا تان کے اُسے دوسری طرف منہ پھیر کے کھڑے ہو جانے کا حکم دیا۔ تعمیل ہی اُس کے لیے مناسب تھی۔ اُسی لمحے ٹھّل نے بھن بھناتی آواز میں مجھے اور پیرو کو کسی تاخیر کے بغیر برقع پوش کو نیچے ڈال دینے کی ہدایت کی۔ ٹھّل نے اِس کے سوا کچھ نہیں کہا لیکن سب کچھ واضح تھا۔ پیرو بھی جان گیا تھا کہ ڈال دینے سے ٹھّل کی کیا مراد ہے۔ وہ اُسے ہلاک کرنا نہیں چاہتا تھا ورنہ اِس طوالت کی کیا ضرورت تھی۔ اُسے یوں بھی اُٹھا کے دروازے سے پھینکا جا سکتا تھا۔ گاڑی کی رفتار کی جھونک میں شاید ہی اُس کے جسم کا کوئی حصہ سلامت رہ پاتا۔ اُسے ختم کر دینے میں دوسری پیچیدگیاں بھی پیدا ہو سکتی تھیں۔ ہم ابھی سفر میں تھے۔ آبادی جانے کتنی دُور لعد تھی۔ لاش دریافت ہونے میں ہمارے خلاف بہت کم وقت بھی لگ سکتا تھا۔ زندہ آدمی کا اختیار چاہے وہ زندگی اور جان کیوں نہ ہو، اُسی کے پاس رہتا ہے اور چوپا آدمی ویسے بھی اپنا اختیار اپنے پاس ہی رکھنا چاہتا ہے مگر مرنے کے بعد بعض آدمی بہت اہم ہو جاتے ہیں۔ بہر حال ٹھّل کے فیصلے سے میرے بند بھی جیسے کسی نے کھول دیے۔ میں نے دروازے سے سر نکال کے باہر کا جائزہ لیا۔ ہمیں دونوں طرف سے چادر کے کونے پکڑ کے اُسے زمین پر ڈالنا تھا، اِس طرح اُس کے جسم کو بس ذرا دھچکا لگتا۔ لائن کے ساتھ بچھے ہوئے پتھروں کی ڈھلان اُسے گاڑی سے کچھ دُور کر دیتی۔ اِدھر میں نے ایک ہاتھ سے چادر کے دونوں کونے پکڑے، اُدھر سے پیرو نے چادر پکڑی۔ برقع پوش کا جسم خمیدہ ہو گیا۔ گٹھری جیسی شکل بن گئی بلکہ زنبیل جیسی۔ اُس کے جسم کے نیچے مختلف قسم کے کپڑے ہوئے تھے۔ ہمیں چادر کے کونے پکڑے پکڑے اپنے ہاتھ اتنے نیچے لے جانے تھے کہ گٹھری اور زمین کا فاصلہ کم سے کم رہ جائے اور اُسے چوٹ کم سے کم لگے۔

وہ اچھا خاصا بھاری آدمی تھا۔ ہم نے اُسے اُٹھا کے دروازے کے سرے پر رکھ دیا، پیرو نے میری طرف کے سرے بھی پکڑ لیے۔ میں نے ایک بار پھر دروازے سے سر نکال کے باہر کا جائزہ لیا۔ گاڑی فرّاٹے بھرتی آگے بڑھ رہی تھی۔ ہر طرف سبزے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ تاحدِ نظر اندھیرا تھا۔ اندھیرے میں نظر کی حد ہی کتنی ہوتی ہے۔ آسمان ابھی تک بادلوں کے پرتوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایک تارہ بھی کہیں کسی گوشے میں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بارش کی نمی فضا میں گھلی ہوئی تھی۔ یہاں سے وہاں تک کوئی بھی مجھے کھڑکی یا دروازے سے جھانکتا نظر نہیں آیا۔ باجان کے ڈبے کے دروازے پر بھی کوئی نہیں تھا۔ ہوتا تو شاید اچھا تھا۔ مجھے اور پیرو کو جلد ہی احساس ہوگیا کہ ہم کھڑے ہو کے یا بیٹھ کے گٹھری اور زمین کا فاصلہ اتنا کم نہیں کر سکیں گے۔ ہمارے درمیان کسی لفظ کا تبادلہ نہیں ہوا مگر میں نے اور اُس نے بیک وقت فرش پر بیٹھنے کا ارادہ کیا اور گٹھری نیچے کی طرف کھسکانی شروع کی۔ گٹھری سیڑھیوں سے رگڑ کھاتی کچھ ہی دُور گئی تھی کہ ہم نے فرش پر لیٹ جانے کا فیصلہ کیا اور اپنے جسم شانوں تک باہر نکالنے کی کوشش کی کہ گٹھری سیڑھیوں سے کچھ فاصلے پر رہے۔

ہوا کے تھپیڑے میرے چہرے پر طمانچے سے مار رہے تھے اور بال بار بار آنکھوں پر آجاتے تھے۔ نیچے فرش کی زمین بھی صاف نظر نہیں آرہی تھی۔ تیز ہوا، گاڑی کے شور، اندھیرے اور ڈبے کی دھڑکن جیسی جنبشوں نے برقع پوش کے وزن کا احساس کچھ اور بڑھا دیا۔ ہاتھ آگے بڑھائے بڑھائے بوجھ برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ ہم اتنے آگے بھی نہیں بڑھ سکتے تھے کہ پیچھے سے اپنا توازن کھو بیٹھیں، پھر بھی ہم خاصے آگے جھک آئے۔ گٹھری اور زمین کے فاصلے کا اندازہ کرنے کے بعد ہم دونوں کو ایک ساتھ چادر کے کونے چھوڑنے تھے۔ کسی کو بھی ایک لمحے کی دیر نہیں ہونی چاہیے تھی۔ پیرو کو بھی اِس کا خیال تھا۔ ہم نے گٹھری کچھ اور نیچے کر دی۔ اب پیرو نے میرے ہاتھ میں جکڑے ہوئے کونے بھی اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے مجھے شانے سے ٹہوکا دیا۔ میں نے تامل کیا، اِس طرح کسی ایک کے ہاتھ میں چاروں کونے آجانے سے برقع پوش گٹھری بن جاتا، اُس کا جسم اتنا مڑا بھی نہیں ہونا چاہیے تھا۔ نیچے ڈالنے پر جب اُس کا جسم کھلتا تو سر کے زمین یا زمین پر پڑے ہوئے پتھروں سے ٹکرانے کی ضرب شدید ہوتی کیونکہ زیادہ مڑے ہونے کی صورت میں جسم کے درمیانی حصے سے سر کا اوپر ہونا لازم تھا۔ میں نے پیرو کا مشورہ نہیں مانا۔ اُس نے بھی دوبارہ مجھے نہیں ٹوکا۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ گاڑی کی رفتار ابھی تیز تھی اور کسی وقت بھی سُست پڑ سکتی تھی۔ رفتار کی کمی کسی اسٹیشن کی آمد کی علامت ہوتی ہے، ہمیں اِس سے پہلے اپنا کام یقیناً نمٹا لینا چاہیے تھا۔ اتنی دیر میں برقع پوش کو بھی ہوش آسکتا تھا۔ ہم گٹھری کو اتنی ڈھیل بھی نہیں دے سکتے تھے، کہیں وہ زمین سے نہ لگ جائے۔ جگہ کی موزونی کا تعین کر لینا بھی مناسب تھا، وہ کسی پُلیا یا کھڈ میں نہ جا گرے، کسی چٹان یا پتھر سے نہ ٹکرا جائے۔ کہیں کہیں دوسرے ڈبوں کی کھڑکیوں سے روشنی کے چھینٹے باہر آرہے تھے مگر اُن کی حیثیت جھماکوں کی سی تھی، جھماکے گاڑی کی تیز رفتاری میں سامنے کی کسی چیز کا تعین نہیں ہونے دے رہے تھے۔ متحرک روشنی اور جامد روشنی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ بہرصورت زمین ہموار ہونے کا اندازہ کھڑکیوں سے آنے والی روشنی سے بھی کیا جا سکتا تھا۔ سامنے جھاڑیاں یا چٹان ہونے پر روشنی ترچھی اور زمین پر لیٹی ہوئی ہونی چاہیے تھی۔ وہاں آتی جھاڑیاں نہیں معلوم ہوتی تھیں۔ نہ پانی کا امکان تھا کہ روشنی کے لرزاں جھمکے اس پر منعکس ہوتے نظر آتے۔ گاڑی کے شور سے بھی جگہ کا کچھ تعین ہوتا تھا۔ اردگرد درخت ہوں، سرنگ، پُل، پُلیا یا چٹانیں اور کھلا میدان، سب میں شور مختلف ہو جاتا ہے۔ میدان میں اِس شور کی بازگشت دُور دُور تک گونجتی ہوئی صاف محسوس کی جا سکتی ہے۔ مشکل یہ تھی کہ ہم اپنے عین نیچے یعنی سیڑھیوں کے سامنے کی زمین، ایک تو اندھیرے، دوسرے گٹھری کی دیوار کی وجہ سے دیکھنے پر قادر نہیں تھے۔

پہلے میں گٹھری دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے تھا لیکن پیرو کا بایاں ہاتھ کھلا دیکھ کے میں نے بھی گٹھری کے کونوں سے اپنا ایک ہاتھ کھینچ لیا اور فرش کا کنارہ پکڑ لیا۔ میرا توازن اور مستحکم ہوگیا مگر ایک بازو پر میرے حصے کا سارا زور پڑ گیا۔ صرف لٹکانے کی بات ہوتی تو اتنی دقت پیش نہ آتی۔ سیڑھیوں سے گٹھری دُور رکھنے کے لیے ہاتھ آگے بھی رکھنا پڑ رہا تھا اور نیچا بھی، اسی طرح گٹھری اور زمین کا فاصلہ کچھ اور کم ہو سکتا تھا۔ برقع پوش کی تلاشی میں پیرو کو ایک بیٹری بھی دست یاب ہوئی تھی۔ پیرو کو بیٹری استعمال نہیں کرنا چاہیے تھی لیکن اُس نے اپنا جسم دروازے کی جانب اور کھسکا لیا۔ میں نے بھی اُس کی پیروی کی۔ اِس سے زیادہ بڑھنے پر گٹھری کے ساتھ ہم خود بھی لوٹ سکتے تھے۔ کچھ اور آگے کھسکنے سے گٹھری اور ہمارے سر کے درمیان جھری بن گئی۔ پیرو نے بہت مشکل سے کُرتے کی جیب سے بیٹری برآمد کی ہوگی۔ اُس نے یہ احتیاط کی کہ بیٹری کا رُخ سیدھا زمین کی جانب رہے، اِدھر اُدھر روشنی نہ پھیلے۔ اتفاق سے اگر کوئی دروازے یا کھڑکی سے جھانک رہا ہو تو اُسے کچھ سمجھنے کا موقع نہ ملے۔ ریلوے لائن کے ساتھ پڑے ہوئے پتھروں کے بعد ہمیں جگہ کی سطح دیکھنا تھی لیکن رُخ زمین پر رکھنے کی کوشش میں بیٹری پیرو کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ مجھے اِس سے کچھ اطمینان ہی ہوا۔

اتنی دیر میں ہماری آنکھیں اندھیرے سے کسی حد تک مانوس ہو گئی تھیں۔ میرے ذہن میں ایک اور بات آئی کہ ٹھّل سے کہوں، وہ کھڑکی سے ایک نظر دیکھ کے ہمیں بتائے کہ زمین سے گٹھری کس قدر قریب ہوگئی ہے۔ شاید ترچھا دیکھنے پر اُسے کچھ نظر آئے مگر میں اُسے پکارتے پکارتے رہ گیا۔ اُسی لمحے پیرو نے اور ڈھیل دے کے گٹھری نیچے کی، پھر اور نیچے کی۔ مجھے بھی یہی کرنا تھا۔ پیرو کی بات جلد ہی میرے دماغ میں بھی آ گئی۔ چادر میں برقع پوش کے جسم کے نیچے کپڑے بھی پڑے ہوئے تھے اِس لیے تھوڑی رگڑ کھانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ ہم اُسے آہستہ آہستہ نیچے کرتے کرتے زمین کی سطح

کا اندازہ کرسکتے تھے۔ جہاں گٹھری زمین سے جالگے گی، ہم فوراً اس سے دست بردار ہوجائیں گے۔ پیرو کو بھی اس کا احساس ہوگا کہ چادر کے کنارے چھوٹتے ہوئے ہم دونوں میں ایک پل کا بھی فرق نہیں ہونا چاہیے۔ ہم نے یہی کیا۔ چیونٹی کی رفتار سے ہم گٹھری نیچی کرتے رہے، اچانک میرا وجود متزلزل ہوگیا۔ زمین سے رگڑ کھاتے ہی میں نے غیر ارادی طور پر اپنا ہاتھ اوپر کرلیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرا دماغ بالکل ہی ماؤف ہوچکا تھا۔ ہاتھ اوپر کرنے پر میری طرف کے حصّے سے گٹھری بھی اوپر ہوگئی۔ میں حواس باختگی میں چھوڑ دیتا مگر پیرو نے اسی لمحے میرا شانہ زور سے پکڑ لیا۔ بس گٹھری چھوٹتے چھوٹتے رہ گئی۔ مجھے جھڑکنے کے بجائے اُس نے اوسان بجا رکھنے کی تلقین کی اور پھولی ہوئی سانسوں سے کہا کہ میں جس ہاتھ سے چادر کے کونے پکڑے ہوئے ہوں اُسے ادھر پھیلاؤں۔ اُس نے اپنا بایاں ہاتھ اُسی طرف پھیلا لیا تھا۔ چادر کھینچنے سے برقع پوش کا جسم پھیل گیا۔ گٹھری زمین سے بے شک کچھ اور اوپر ہوگئی لیکن برقع پوش کے دھڑ کی نسبت اُس کا سر ایسا اونچا نہیں رہا۔ ہم نے اسی حالت میں دونوں طرف سے ہاتھ پھیلا پھیلا کے اُسے پھر نیچا کیا۔ میں نے اِس بار اپنے ہوش و حواس مجتمع رکھنے کی پوری کوشش کی تا آں کہ گٹھری زمین چھونے لگی۔ ساتھ ہی پیرو نے صدا بلند کی۔

میں نے آنکھیں بھینچ لی تھیں۔ چند لمحوں تک میں بے حس و حرکت وہیں پڑا رہا۔ پیرو کے جھنجوڑنے پر بھی مجھ سے نہ اُٹھا گیا۔ میرا بازو شل ہوگیا تھا اور سارا جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ پیرو نے مجھے پیروں کی طرف سے اندر ڈبے میں کھینچ لیا۔ لمحوں بعد جیسے میری آنکھوں میں روشنی اور میرے سینے میں سانس واپس آئی۔

پیرو نے دروازہ بند کردیا اور بٹن دبا کے قمقمہ بھی روشن کردیا۔ میں نے دیکھا شال والا شخص ابھی تک منہ موڑے کھڑا تھا۔ اِدھر ٹھل تمنچا ہاتھ میں لیے برتھ پر موجود تھا۔ پیرو نے آگے جاکے اُس آدمی کا بازو پکڑا۔ اُسے جیسے بچھو نے ڈنک ماردیا۔ اُس کی دہشت زدہ آنکھیں سیدھی دروازے پر گئیں۔ دروازے پر اُسے کچھ نظر نہیں آیا۔ اُس کے ہونٹ لرزنے لگے۔ وہ سر تا پا لرز رہا تھا۔ "گلبرگہ آنے کو ابھی کتنا ٹیم رہتا ہے؟" پیرو نے پتھریلی آواز میں پوچھا۔

وہ مبہوت کھڑا رہا جیسے اُس نے کچھ سنا ہی نہ ہو یا اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا ہو۔ پیرو نے اُس کی ٹھوڑی میں اُنگلیاں گڑو دیں۔ وہ ڈکرانے لگا۔ "اپن کے پاس زیادہ ٹیم نئیں ہے۔" پیرو نے غصّے سے کہا۔ "سمجھا؟"

"وہ کہاں ہے؟" شال والا ہذیانی انداز میں بولا۔ "وہ کہاں ہے؟"

"اپن نے اُس کو کچرے پہ پھینک دیا ہے۔ ابھی تیری باری ہے۔ کچھ بولنا ہے تو ابھی....."

"نہیں نہیں۔" وہ ہیجانی آواز میں بولا۔ "نہیں نہیں، مجھے مت مارو، تمھیں خدا کا واسطہ، مجھے مت مارو۔"

"ابھی ٹھیک ٹھیک بولے گا تو اپن سوچے گا۔"

"میں آپ کو سچ بتاتا ہوں، ایک ایک لفظ سچ۔" وہ کپکپاتے لہجے میں بولا۔

"مگر میرے ساتھ ایسا مت کرو، تمھیں خدا کو....."

"ابھی بہت یاد آرہا ہے، ادھر آتے میں اُس کو بھول گیا تھا۔ چاقو پورا ہتھیار بھر کے لایا تھا سالا۔"

"مجھے معاف کردو۔" وہ گڑگڑاتے ہوئے بولا۔ "میرے چھوٹے چھوٹے بچے

"اپن بھی نامرد ائیں ہے۔"

اُس نے سچ ہی بتانا شروع کیا ہوگا۔ ایسے عالم میں شاید آدمی مجبور بولتا۔ اُس کا چہرہ سفید پڑگیا تھا اور آواز پر لرزش طاری تھی۔ اُس نے نواب الدین علی اور اُن کے معتمدِ خاص منشی مبارک کے بجائے کسی اور کا نام نہیں کہنے لگا کہ نواب قطب الدین علی کے ذاتی سپاہیوں کی ایک بڑی نفری اُس میں طرح طرح کے زور آزما، ہتھیار بند، شکاری اور شورہ پشت ہیں۔ نواب قطب الدین ہی نہیں، اُن جیسے تقریباً ہر بڑے نواب کے ہاں قسم کے ملازموں کی چھوٹی بڑی نفری ضرور ہوتی ہے۔ یہ ملازم عموماً جاگیروں پڑے اینڈتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھار کسی خاص موقع پر انھیں طلب کیا جا شکار یا کسی لمبے سفر کے موقع پر۔ ملازموں کا یہ سلسلہ پشتینی ہے۔ ایک کوئی کسی نواب سے وابستہ ہوجاتا ہے تو دوسرے کے ہاں ملازمت معیوب سمجھی جاتی اِس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلتا، خصوصاً نواب کے خاص ملازموں کے ترکِ ملازمت کی میں اُس کے کہنے کے مطابق، وہ ایک پڑھا لکھا آدمی تھا۔ اُس کا تعلق بھوپا سے تھا۔ نواب قطب الدین علی کے ایک قدیم ملازم کے توسط سے کوئی دو سا قبل وہ اِس کی ملازمت میں آیا تھا۔ اُس کے بیوی بچے ابھی تک بھوپال تھے۔ وہ ریاست بھوپال کے سپاہیوں میں شامل تھا اور حیدر آباد کی شان شوکت کے قصّے سن کے یہاں قسمت آزمانے آیا تھا۔ یہاں کے رنگ ڈھنگ کے اُس نے کئی مرتبہ بھاگ جانے کا ارادہ کیا لیکن جس شخص نے نواب سے اُس سفارش کی تھی، اُس پر عتاب آنے کے خیال سے وہ رہ گیا۔ کہنے لگا کہ نواب سب ملازم ایک ساتھ نہیں رہتے۔ انھیں مختلف جاگیروں پر رکھا جاتا ہے اور اکثر ایک کو خبر نہیں ہوتی کہ وہ ایک ہی نواب کے نمک خوار ہیں۔ کبھی کسی ملازم کو سپاہیو کے عملے سے تبدیل کرکے حویلی میں بلا لیا جاتا ہے۔ یہ درجے کی فضیلت ہے۔

پیرو اور ٹھل نے اُسے نہیں ٹوکا۔ پیرو اُس کے پاس سے ہٹ کے ٹھل پہلو میں بیٹھ گیا تھا۔ اُن کے اِس انہماک نے اُس کی آواز پر اثر ڈالا، آواز کسی قدر کھل گئی۔ اُس نے بتایا کہ اُسے بہت جلد نواب کی خاص حویلی میں تعینات کردیا گیا تھا اور وہ ہمارا تعاقب کرنے والوں، اپنے سات ساتھیوں کا نگراں ہے۔ یہ ذمے دا کا احساس تھا کہ کسی اور کو بھیجنے کے بجائے اُس نے خود ہمارے ڈبے میں داخل ہونے کا عزم کیا۔ اُس کا ساتھی، برقع پوش آدمی جسے ہم نے اُس کے بہ قول ڈبے سے باہر پھینک دیا ہے، اعلا درجے کا شہ زور اور چست و چالاک شخص تھا۔ اُسے بھی نواب کی تحویل میں آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ وہ سب کے سب نواب کے آزمودہ اور منتخب آدمی تھے۔ نواب

ی نظروں میں اِس معاملے کی اہمیت کا اندازہ اسی سے لگایا جاسکتا ہے۔ کہنے لگا کہ اُس کے ساتھی نے نواب قطب الدین علی کے متعلق غلط نہیں بتایا تھا۔ وہ ایک موڈی رئیس ہے۔ ضدی، سرکش، حاسد اور فیاض۔ اُسے انکار پسند نہیں۔ اپنے آدمیوں کی ناکامی اور بے ادبی پر اُس کا پارا کبھی اس قدر چڑھ جاتا ہے کہ وہ انھیں ختم کردینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ اُس کی اپنی عدالت، اپنی جیل ہے۔ حکم عدولی، بدعہدی اور بدزبانی پر سخت سزائیں دی جاتی ہیں۔ کوڑے، نشتر زنی، اُلٹا لٹکا دینا، کسی جگہ سے چمڑی کاٹ دینا، ناخن نوچ لینا وغیرہ عام سزائیں ہیں۔ دل کا بھی وہ اتنا ہی کھلا ہے۔ ہر ماہ چاند کی پہلی کو اُس کی حویلی کے باہر محتاجوں اور ناداروں کی قطاریں لگی رہتی ہیں۔ خوش ہو تو انعام و اکرام سے اتنا نوازتا ہے کہ نسلیں آرام سے کھائیں۔ اُس کی ایک بڑی لائبریری، شکار گاہ اور طرح طرح کے نوادر پر مشتمل عجائب خانہ ہے، باغات اور محلات ہیں، نئی نئی عمارتیں بنانے کا اُسے جنون کی حد تک شوق ہے۔ قیمتی پتھروں، قالینوں، زیورات، مجسموں اور کتوں سے اُسے گہرا شغف ہے۔ وہ براہِ راست نہ تو حکم دینا پسند کرتا ہے نہ ملازموں سے بات کرنا۔ اِس کام کے لیے منشی مبارک اور دوسرے معتمد ہیں۔ پہلی مرتبہ تقرری کے وقت کے علاوہ بہت خاص خاص موقعوں ہی پر کسی ملازم کو نواب کے حضور پیش کیا جاتا ہے یا کسی ایسے شخص کو جس سے کوئی گستاخی سرزد ہوگئی ہو، ورنہ نواب کو دیکھے مدت گزر جاتی ہے۔

پیرو نے اُس سے یہ نہیں پوچھا کہ نواب عالم تاب اور نواب حشمت جنگ کے خاندان سے اس کے نواب کی قرابت داری ہے کہ نہیں اور مہاراجا دھرم ویرت سے اُس کے کیسے مراسم ہیں۔ یہ سوال فضول تھا۔ رشتوں میں سب سے بڑی قرابت تو زمین کی ہوتی ہے۔ امارت والوں کا ایک ہی خاندان ہوتا ہے۔ شال والا آدمی بہت سی غیر متعلق باتیں بھی کر رہا تھا۔ پیرو اور ٹھل کے چپ رہنے کے بعد میرے لیے بیچ میں بولنے کا محل نہیں تھا جو کچھ وہ اپنے ہیجان اور اضطراب میں کہہ رہا تھا۔ انھوں نے اُسے کہنے دیا۔ شاید اسی طرح وہ کچھ بوجھنا، کچھ سمجھنا چاہتے تھے، بین السطور میں لکھا ہوا۔ سوال کرنے سے وہ کچھ شعوری ہوجاتا۔ وہ تیز تیز لہجے میں بول رہا تھا۔ آدمی اتنی تیزی اور تسلسل سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، وہ کٹہرے میں کھڑا اپنی صفائی پیش کر رہا ہے، اُس مجرم کی طرح جسے موت کی سزا سنائی جانے والی ہے۔ اس نے بتایا کہ منشی مبارک نے انھیں بڑی امیدیں دلائی تھیں، وہ تصور نہیں کرسکتے کہ سفر سے کامیاب واپسی پر نواب انھیں کس کس طرح نواز سکتا ہے۔ ناکامی کے بارے میں اُس نے کچھ نہیں کہا تھا کیونکہ ایک موہوم سا شبہ اُس کے ذہن میں ہمارے پاس کچھ نہ نکلنے کا بھی تھا لیکن آنے والوں کو معلوم تھا کہ ناکامی نواب کی برگشتگی اور نواب کی نظروں میں اُن کا رتبہ گرا دینے کا سبب ہوگی۔ منشی مبارک نے اُن سے کہا تھا کہ اصل آدمی ایک بوڑھا شخص ہے۔ اُس نے ابا جان کی طرف اشارہ کیا تھا۔ انھیں تلقین کی تھی کہ تلاشی میں اُن کا ہدف سب سے پہلے ابا جان ہی کو ہونا چاہیے۔ اُن سے پتھر برآمد کرنے یا اُن کے پاس کہیں اور چھپے ہوئے ذخیرے کا سراغ اگلوانے کے لیے وہ کوئی لحاظ یا مروت روا نہ رکھیں۔ مطلب براری کے لیے ابا جان کے تمام ساتھیوں کو بھی ختم کرنا پڑے تو انھیں اس کی پوری اجازت ہے۔ ہاں انھیں ابا جان کو باقی رکھنا ہے۔

انھیں پولیس کی وردی اِس لیے دی گئی تھی کہ ڈبے میں داخل ہونے کی صورت پیدا نہ ہو تو آخری حربے کے طور پر وہ اسے استعمال کریں۔ انھوں نے یہ وردی محفوظ رہنے دی کیونکہ اس طرح ہم لوگ شک میں پڑ سکتے تھے۔ چلتے وقت انھیں یہ ہدایت بھی کی گئی تھی کہ اگر گلبرگے تک وہ اپنے مقصد میں ناکام رہیں اور آگے اُن کی دانست میں کامیابی کا کوئی امکان ہو تو اپنا سفر شولا پور تک بڑھائیں۔ شال والے کے بہ قول اُس نے منشی مبارک کو مشورہ دیا تھا، اگر ایسا ہی ہے تو وہ اور زیادہ آدمیوں کی نفری کیوں نہ ساتھ رکھے۔ دور جانے کی کیا ضرورت ہے، ان کے پاس ایک سے ایک طالع آزما، معرکہ جو پڑا ہے۔ حیدر آباد سے جیسے ہی گاڑی آگے جائے، کسی ویران جگہ زنجیر کھینچ کے اُسے روک دیا جائے اور وہ باقاعدہ ڈاکا ڈالنے کے انداز میں گاڑی پر حملہ آور ہوں۔ منشی مبارک نے سختی سے اُس کا مشورہ مسترد کردیا تھا۔ اس طریقے میں اُس کے آدمیوں کی ہلاکت کا اندیشہ تھا۔ اُسے اپنا ایک آدمی بھی کھونا گوارا نہیں تھا۔ انھیں تنبیہہ کی گئی تھی کہ کامیابی یا ناکامی دونوں صورتوں میں انھیں سلامت واپس آنا ہے اور اِس سفر پر صرف اُن لوگوں کو بھیجا جارہا ہے جو بااعتماد اور حوصلہ مند ہونے کے علاوہ ذہین بھی ہیں کیونکہ اِس معاملے میں شجاعت کی اتنی ضرورت نہیں جتنی ذہانت کی ہے۔

اُس کے بیان کے مطابق منشی مبارک نے اُن سے ہمارے بارے میں نہایت سنگین باتیں کہی تھیں۔ اُس نے تقریباً وہی کچھ دہرایا جو اُس کا برقع پوش ساتھی ہمیں بتا چکا تھا۔ کہنے لگا، منشی مبارک نے انھیں خبردار کیا تھا کہ ہم ہر طرح سے مسلح اور محتاط ہوں گے اور شک ہونے پر ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کریں گے لہٰذا ہم سے کسی رعایت کی توقع نہ کی جائے۔ منشی مبارک نے امید ظاہر کی تھی اور ہمت دلائی تھی کہ اگر انھوں نے سوجھ بوجھ اور برداشت سے کام لیا تو وہ کامیاب ہی واپس آئیں گے۔ اُس نے اُن سے وہی بات کہی تھی جو میرے ذہن میں تھی کہ ایک بوڑھے آدمی کے ساتھ اتنے لوگوں کی موجودگی کی کوئی غیر معمولی وجہ ہی ہوسکتی ہے۔ آگے سفر میں ہماری احتیاط اور چوکسی دیکھ کے انھیں خود اس کا اندازہ ہوجائے گا اور شال والے کے مطابق اُس نے یہی دیکھا۔

ابھی وہ یہ سب بتا رہا تھا کہ گاڑی دھیمی ہونے لگی۔ ٹھل اور پیرو کو جیسے خیال ہی نہیں رہا تھا۔ پیرو نے گھڑی دیکھی اور یک بیک برتھ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ہم نے بہت جلدی کی تھی، واڑی سے گاڑی چلے ہوئے پچیس منٹ سے زیادہ کسی طرح نہیں ہوئے تھے۔ اگر گلبرگہ آرہا تھا تو ہم سے دیر ہوگئی تھی۔ ہمیں اِس سے پہلے ہی اُس کا فیصلہ کرنا چاہیے۔ نہیں معلوم، پیرو اور ٹھل نے کیا سوچا تھا جو اتنے سکون سے اُس کا ہذیان سن رہے تھے۔ گلبرگہ بڑی آبادی کا شہر ہے۔ وہاں گاڑی پانچ دس منٹ سے

کم کیا ٹھیرے گی۔ اسٹیشن پر اپنے ساتھیوں کی خبر گیری کے لیے نواب کے آدمی ہمارے ڈبّے کی طرف ضرور منڈلائیں گے۔ میں نے باہر جھانک کے دیکھا، کسی بڑے اسٹیشن کے آثار نہیں تھے۔ اُس نے گلبرگے کے لیے آدھ گھنٹے کا وقت بتایا تھا۔ آدھ گھنٹا رسماً ہی کہا ہوگا، تیس سے پینتیس اور چالیس منٹ کا سفر بھی ہو سکتا ہے۔ گویا تھّل اور پیرو کو علم تھا کہ گلبرگہ آنے میں کتنی دیر لگ سکتی ہے مگر انھیں کیسے معلوم ہوا؟ ضرور اُنھوں نے پچھلے اسٹیشن پر کسی سے معلوم کیا ہوگا جب میں برقع پوش کو لے کے چھپا ہوا تھا۔ پیرو نے پہلے کی طرح شال والے آدمی کو فوراً برتھ پر لیٹ جانے کا حکم دیا، اُس نے کسی توقف کے بغیر تعمیل کی۔ پیرو اُس کے پیروں کے نزدیک بیٹھ گیا۔ فرش پر اُس کا بکھرا ہوا سامان سمیٹ کے برتھ کے نیچے رکھ دیا گیا۔ وہ ایک چھوٹا اسٹیشن تھا، گاڑی وہاں بھی اتنی ہی دیر ٹھیری جتنی دیر گزشتہ اسٹیشن پر۔ پلیٹ فارم پر چار پانچ آدمی اُترے لیکن ہماری بوگی کے بعد والی جس بوگی کی نشان دہی برقع پوش نے کی تھی، وہاں دروازے پر مجھے دو آدمی نظر آئے۔ ایک نیچے بھی اُترا۔ اُس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ غالباً اسی لیے قریب آنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ برابر کے ڈبّے پر جمرو اور شامو بھی بے تاب کھڑے تھے۔ میں نے ہاتھ ہلا کے اُنھیں اطمینان دلانے کی کوشش کی۔ وہ میرے پاس آنا چاہتے تھے مگر میں نے انھیں روک دیا۔ اتنے میں گاڑی نے بھی سیٹی بجا دی۔

گاڑی چلتے ہی پیرو نے بازو پکڑ کے اُسے اُٹھا دیا۔ پیرو کے استفسار پر اُس نے اُن دو آدمیوں سے اپنی شناسائی سے دوبارہ انکار کیا جنھیں سب سے پہلے مارٹی نے شناخت کیا تھا اور جو گزرنے والے اسٹیشن پر بھی اپنے ڈبّے کے دروازے پر ڈٹے ہوئے تھے۔ اُس کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ رات اباجان کی حویلی میں آنے والے لوگوں کا بھی اُسے کوئی علم نہیں ہے۔ پیرو نے کریدنے کی کوشش کی لیکن وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ اگر وہ نواب قطب الدین علی ہی تھا تو اُسے کل رات حویلی سے نامراد جانے والوں کی رُوداد اپنے اِن تازہ دم فرستادوں کو نہیں سنانی چاہیے تھی۔ اِس سے ان کی حوصلہ شکنی ہوتی۔ گاڑی چلے چند منٹ ہوئے ہوں گے کہ پیرو نے تھّل کی طرف دیکھتے ہوئے اُس سے پوچھا۔ "ابھی کچھ اور بولتا ہے تو تھوڑا ٹیم ہے۔"

"میں نے جناب کو سب بتا دیا ہے۔"

"ابھی تمھارا کیا بنانے؟"

"جی جی۔" پیرو کی آواز کی سردی اُس تک منتقل ہونے میں لمحے لگ گئے۔ وہ بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں، میں آپ سے منت کرتا ہوں، میں آپ کا غلام، آپ کے پیر پکڑتا ہوں، خدا کے لیے رحم کیجیے۔ مجھ بدنصیب کے ساتھ کئی جانیں لگی ہوئی ہیں۔"

"اکیلا ابھی ایدر کون ہے۔" پیرو نے زہرخند سے کہا۔ "اپن تم کو چھوڑ دے تو ابھی کیدر کو جائے گا؟"

"جیسا، جیسا آپ لوگ حکم کریں گے۔" وہ جلدی سے بولا۔

"اپن ابھی کیا بولے گا۔"

"نہیں بندہ پرور! آپ جو حکم کریں گے، میں خدا کو حاضر و ناظر جانتا ہوں، حکم سے سرتابی نہیں ہوگی۔"

"اپن بولے کہ ابھی جا کے اُس نوابِ حرام کے جنے کا سر کاٹ کے ایدر لے آئے گا؟" پیرو نے بھڑکتی آواز میں کہا۔

"اگر ممکن ہوا تو یقین کیجیے، غلام......"

"تو اپنے کو اوپر سے نیچے تک اکھا حرامی لگتا ہے۔"

"میں، میں آپ سے زندگی کی بھیک مانگتا ہوں۔" اس نے پیرو کے آگے ہاتھ جوڑ دیے اور بین کرنے لگا۔ "اگر آپ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اپنے ساتھیوں کے پاس جا کے میں آپ کے لیے پھر کوئی پریشانی پیدا کروں گا تو ایسا نہیں ہوگا۔ میں آپ سے قسم کھا کے وعدہ کرتا ہوں کہ ایسا نہیں ہوگا۔ [illegible] تو اب میں اُن کے ساتھ جاؤں گا ہی نہیں۔ میں گلبرگہ اسٹیشن کی بھیڑ میں اُن سے اوجھل ہونے کی کوشش کروں گا۔ میں یہیں سے کہیں اور کسی اور طرف نکل جاؤں گا۔ اگر خدانخواستہ اُن سے مڈبھیڑ ہو بھی گئی تو آگے کسی اور اسٹیشن پر مجھے اُن سے دُور ہو جانے کا موقع مل سکتا ہے۔ نواب کے پاس ناکام واپس جانے کا انجام آپ نہیں جانتے۔ وہ مجھے [illegible] چھوڑے گا، وہ مجھے مار ڈالے گا۔ اُسے جلال آتا ہے تو کچھ نہیں دیکھتا۔ زندہ آدمیوں کو شکاری کتوں کے آگے ڈال دیتا ہے۔ وہ شعلہ ہے، شعلہ ہے۔ اُس کی [illegible] آدمی [illegible] موت کی ساری ذمے داری بھی مجھ پر ڈال دے گا۔ میں یہاں سے سیدھا جا کے اپنے بیوی بچوں کو لے کے کسی طرف بھی نکل جاؤں گا۔" وہ ہذیانی حالت میں جانے کیا کیا کہتا رہا۔

تھّل نے ہنکاری بھری اور سر ہلانے لگا۔

یکایک پیرو برتھ سے اُٹھ کے اُس کے پاس جا پہنچا۔ اُس نے اُسے مدد کو چلانے کی مہلت نہیں دی۔ پیرو کو اپنے سر پر کھڑا دیکھ کے اُس پر سنّاٹا طاری ہو گیا۔ پہلی ضرب سے وہ بے حال ہو گیا۔ تیسری بار پیرو کو ہاتھ اُٹھانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ تھّل کے کچھ کہے بغیر میں بھی اُس کا ارادہ جان گیا تھا۔ ابھی اندھیرا تھا لیکن بھاگتا ہوا [illegible] میں نے چادر بچھا دی۔ میرے بازو کی رگیں ابھی تک چٹخ رہی تھیں، پیرو کا بھی یہی حال ہوگا تاہم ہم دونوں نے اُسے بہ عجلت چادر پر ڈال دیا۔ گاڑی کی رفتار تیز تھی۔ پچھلے اسٹیشن سے چلے ہوئے پانچ چھ منٹ سے زیادہ نہیں ہوئے تھے کہ ہم نے اُس کی چادر کی گٹھری نیچے لڑھکا دی۔ دوبارہ ہمیں دیر نہیں لگی۔ کارتوس اور تمنچے رکھ کے ہم نے اُس کا سامان بھی باہر پھینک دیا۔

سات آٹھ منٹ بعد گاڑی گلبرگہ اسٹیشن میں داخل ہو گئی، جیسے دن نکل آیا ہو۔ یہاں بھی کچھ کم ہجوم نہیں تھا۔ ہم تینوں ہی ڈبّے سے اُتر آئے۔ اُدھر جمرو، شامو اور نذو بھی نیچے آ گئے۔ اُن کی بے قرار نگاہیں سب سے پہلے ہمارے ڈبّے کی طرف اُٹھیں، تھّل کی وجہ سے اُن کے ہونٹ پھڑپھڑا کے رہ گئے۔ ڈبّا خالی دیکھ

کے اُن کی آنکھوں میں وحشت سمٹ آئی۔ برابر کے ڈبّے کے دو آدمیوں میں سے بھی ایک نیچے آ گیا تھا۔ ہماری بوگی سے پرے بھی دو آدمی لپکتے قدموں سے ہماری طرف بڑھتے دکھائی دیے۔ دیکھتے دیکھتے وہ ہمارے ڈبّے کے سامنے پہنچ گئے لیکن اُن میں کوئی رکا یا ٹھٹکا نہیں۔ پیرو نے اُسی دم باقاعدہ ہاتھ اُٹھا کے کسی قدر مجہول انداز میں تھّل کی توجہ اُن کی جانب مبذول کرائی۔ اُنھوں نے بھی یہ اشارہ دیکھ لیا تھا۔ یہ میرا گمان نہیں، ایک ثانیے کے لیے ضرور اُن کے جسموں میں کھنچاؤ سا پیدا ہوا تھا لیکن وہ اپنی رفتار سے بڑھتے گئے۔ اُنھوں نے پیچھے مڑ کے بھی نہیں دیکھا۔ اسٹیشن کے درمیان شیڈ میں چائے کا اسٹال تھا۔ اُن میں سے ایک آگے چلا جانا چاہتا تھا، دوسرے نے اُسے روک لیا اور دونوں اسٹال پر ٹک گئے۔

جیسا کہ شال والے آدمی نے بتایا تھا کہ اُن کے دو ساتھی انجن کے قریب کسی بوگی میں بھی موجود ہیں، وہ انھی کے پاس جانا چاہتے ہوں گے لیکن اسٹال پر کھڑے ہو کے وہ ہماری جانب زیادہ محفوظ طریقے سے دیکھ سکتے تھے۔ درمیان میں مسافروں کی بھیڑ کی وجہ سے جھلکیوں میں سہی۔ پیرو نے تھّل کو اُن کی جانب اشارہ عمداً کیا تھا، انھیں متذبذب کرنے کے لیے۔ میرے جی میں آئی، اگر یہی بات ہے تو ہمیں ایک بار اُن کے ڈبّے کی طرف بھی جانا چاہیے، چند ہی قدموں کا تو فاصلہ ہے مگر میں خاموش رہا۔ اُن کی کشمکش کی کیفیت تادیر جاری رہنا چاہیے تھی۔ فیصلہ تو انھیں کرنا ہی تھا لیکن عجلت میں وہ کوئی ایسا قدم بھی اُٹھا سکتے تھے جو نہ اُن کے لیے بہتر ہوتا نہ ہمارے لیے۔ ڈبّے میں اُن کے ساتھیوں کا نہ ہونا اُن کے لیے یقیناً تشویش انگیز ہوگا۔ واڑی کے بعد دونوں اسٹیشنوں پر وہ پوری طرح ہوشیار رہے ہوں گے۔ اُنھوں نے ہمارے ڈبّے سے کسی کو اُترتے چڑھتے نہیں دیکھا تھا۔ اسٹال پر جیسے ہی اُنھوں نے چائے ختم کی اور فوراً لوٹ پڑے۔ اِس بار وہ ہمارے پاس سے گزرنے کے بجائے دُور دُور رہے۔ واپسی میں اُن کی چال نپی تلی تھی۔ ایک سرسری نظر اُنھوں نے ہم پر اور ڈبّے پر ڈالی اور تجاہلِ عارفانہ سے اپنے ڈبّے تک پہنچ گئے۔ پیرو نے اُن کی جانب انگلی اُٹھا کے پھر کسی کو متوجہ نہیں کیا۔ اپنے ڈبّے کے سامنے کچھ دیر ٹھیر کے اور وہاں اپنے ساتھیوں سے گفتگو کر کے وہ گاڑی کے پچھلے حصّے کی طرف بڑھنے لگے۔ اب اُن کی پشت ہماری جانب تھی۔ گاڑی کے آخری ڈبّے تک جانے کا فیصلہ اُنھوں نے سوچ سمجھ کر کیا ہوگا، کئی وجوہ سے، کسی موہوم امید میں اپنے گم شدہ ساتھیوں کو دوسرے ڈبّوں میں بھی دیکھ لینا، ہم پر خود اعتمادی اور بے نیازی ظاہر کرنا اور دُور سے واپس آنے کے سبب ہم پر دیر تک نظر رکھنا۔

ابھی ہم وہیں کھڑے تھے کہ انجن کی طرف سے دو اور آدمی آتے دکھائی دیے۔ اُن کی پہچان ایسی مشکل نہیں تھی۔ انھی کی طرح چاق و چوبند، تومند اور گٹھے ہوئے جسم کے، چھوٹی چھوٹی مونچھیں، گالوں پر چربی چڑھی ہوئی۔ ہر ڈبّے میں جھانک جھانک کے گھورتے ہوئے آگے آ رہے تھے، جیسے اُنھیں کسی کی تلاش ہو۔ اِس طرح وہ ہمارے ڈبّے میں جھانکنے کا جواز بھی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ پہلے وہ اباجان کے برابر کے ڈبّے سے گزرے۔ اُن دو آدمیوں سے اُن کا آمنا سامنا ہوا مگر کسی علامت سے بھی اُن کا آپس میں کوئی رابطہ ظاہر نہیں ہوا۔ اُن سے پہلے جانے والے بھی اسی بے خبری سے اُن دونوں کے پاس سے گزر گئے تھے۔ اباجان کے ڈبّے میں جھانک کے وہ ہمارے ڈبّے پر آئے تھے۔ یکایک پیرو نے پیچھے سے ایک کا شانہ تھام لیا اور مچلتی آواز میں بولا۔ "ابھی کس کا کھوج ہے بابو صاحب؟"

وہ بڑبڑا گئے اور سنبھل کے بولے کہ اُنھیں ایک صاحب کی تلاش ہے جو یہاں گلبرگے سے بمبئی کے لیے سوار ہونے والے تھے۔ یہ کہہ کے وہ تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ پیرو نے انھیں روکا نہیں۔ اُنھوں نے ہمارا خالی ڈبّا اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ اب لازماً اُنھیں اپنے ساتھیوں کے ڈبّے پر رکنا تھا۔ یہی ہوا تاہم وہاں پہنچ کے بھی اُنھوں نے اُسی تردد سے جھانکنا ضروری سمجھا اور آناً فاناً ڈنڈا پکڑ کے سیڑھیاں طے کر گئے۔ اسٹیشن پر افراتفری کم ہو گئی تھی۔ خوانچہ فروشوں کی صدائیں بھی ہلکی پڑ گئی تھیں۔ گاڑی کے آخری سرے پر مال گاڑی کی ایک بوگی لگی ہوئی تھی چنانچہ وہ دونوں آدمی جو تھوڑی دیر پہلے دُور چلے گئے تھے، مال گاڑی کی بوگی سے لوٹ پڑے۔ ڈبّے کے آس پاس لوگوں کی تعداد کم ہو جانے کے سبب ہم ایک دوسرے کو بہ خوبی دیکھ سکتے تھے۔ اُن کی رفتار متوازن تھی۔ جس قسم کا تاثر وہ ہم پر مرتب کرنا چاہتے تھے اُس کا تقاضا یہی تھا کہ اپنے ڈبّے تک آ کے یا تو وہ باہر کھڑے رہیں یا اندر داخل ہو جائیں۔ وہ اندر چلے گئے۔

اُن کے تمام ساتھی، اگر اُن کی تعداد وہی تھی جو برقع پوش اور شال بردوش شخص نے بتائی تھی، سب کے سب ایک ہی ڈبّے میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ وہ ڈبّا انٹرکلاس کا تھا۔ اُس میں اور بھی مسافر ہوں گے۔ اُنھیں باہم مشورہ کرنے میں دقت پیش آ رہی ہوگی۔ جلد ہی کسی نتیجے پر پہنچنا تھا، سفر کے التوا یا جاری رکھنے کا فیصلہ۔ آگے اُنھیں ایک ہی ارادے سے جانا چاہیے تھا کہ اُن میں سے پھر کوئی ہمارے ڈبّے میں داخل ہونے کی کوشش کرے مگر اب اِس اقدام میں کامیابی کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ اُن کے پیشِ نظر بے شمار الجھنیں ہوں گی، بے شمار اندیشے ہوں گے۔ اُن کے گم شدہ ساتھیوں پر آخر کیا اُفتاد پڑ گئی؟ کہیں اُنھیں......؟ یقیناً اُنھوں نے اُن کی زندگی سے ہاتھ دھونے کا امکان مسترد نہیں کیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے [illegible] چلتی گاڑی سے پھینک دی گئی ہوں۔ پردے کے لیے اندھیرا تھا ہی۔ اُن کی لاشیں برتھوں کے نیچے اور بیت الخلا میں چھپا کے تو ہم سکون سے پلیٹ فارم پر کھڑے [illegible] سکتے تھے۔ انجن کی طرف سے آنے والے آدمیوں نے ہمارے ڈبّے میں جھانک [illegible] لیا تھا، پھر انھیں کیا ہوا؟ اگر وہ اپنی کسی غلطی سے پہچانے گئے تھے تو اُنھوں نے کیا کیا اعتراف کیا؟ وہ اُس بوڑھے آدمی کے ڈبّے میں داخل ہونے میں ناکام ہو گئے تھے اور دوسرے ڈبّے میں [illegible] ملنے کی توقع نہیں تھی۔ ساتھیوں نے نتیجہ نکالنے کی جلدی نہیں کی ہوگی۔ اگر اُنھوں نے جلدی کی بھی تو کیا [illegible] اُسی ڈبّے کے لوگوں کے ساتھ تھے، کہیں وہ سارا مال لے کے گاڑی سے فرار تو نہیں ہو گئے۔ جہاں گاڑی ذرا سی آہستہ ہوئی ہو،

وہاں کو دوڑے ہوں۔ مال و منال کے ساتھ ویسے بھی جرأت عود کر آتی ہے، خون کا رنگ بدل جاتا ہے۔ یا یہ نیت کی کھوٹ نہیں ہے۔ جس وقت مال و زر اُن کے ہاتھ آیا، اُسی لمحے اُنھوں نے وہاں سے بھاگ جانا مناسب سمجھا۔ یہ جان کے کہ اُن کے اچانک غائب ہونے سے کامیابی ہی مراد لیں گے اور واپسی کی راہ اختیار کریں گے۔ کسی ایک نتیجے پر بہرحال وہ پہنچ نہیں پا رہے ہوں گے۔ نوادر آبا جان ہی کے ڈبے میں ہونے چاہییں۔ اِس لیے کہ ہم نے اُن دونوں کو وہاں داخل ہونے سے روک دیا تھا۔ وہ دُور سے سب کچھ دیکھ ہی رہے ہوں گے۔

اُن میں سے پھر کوئی باہر نہیں آیا۔ اُن کے فیصلے پر بہت کچھ دار و مدار تھا۔ وہ ہمیں اور آزمائش میں ڈالتے ہیں یا باقی سفر کے لیے فراغت کا پروانہ دے دیتے ہیں۔ ہم لوگوں میں سے کوئی ایک چہل قدمی کرتا ہوا گاڑی کے پچھلے حصے تک چلا جاتا تو ایک نظر اُن کی طرف دیکھنے کا موقع مل جاتا۔ وہ پلیٹ فارم کے اُس طرف کے دروازے سے بھی تو نکل سکتے ہیں! اِدھر ہمارا ڈبا خالی پڑا ہے۔ یہاں دونوں طرف کے دروازوں پر کوئی موجود نہیں ہے۔ جمرد، شامو اور زورا کے نیچے آجانے کی وجہ سے مارٹی اور ٹنگو آبا جان کے ڈبے میں رہ گئے تھے مگر وہ دونوں پلیٹ فارم کی طرف والے دروازے پر کھڑے تھے۔ اُدھر سے کھلنے والا دروازہ اُنھوں نے بند کر دیا ہوگا کیونکہ ٹھیری گاڑی میں ایسے کسی کے چڑھ آنے کا خدشہ نہیں تھا۔ میں نے سوچا تھا، پیرو سے کہوں کہ میں گاڑی کے آخری سرے تک جاتا ہوں اور دیکھ کے آتا ہوں لیکن میں یہ سوچ کے چپ رہا کہ پیرو کو خود اِس کا احساس ہوگا۔ ممکن ہے، تجمل اور پیرو کے ذہن میں کچھ اور ہو، ہو سکتا ہے، وہ چشم پوشی کر کے اُنھیں نکل جانے کا موقع فراہم کر رہے ہوں۔

دیر ہوگئی تھی۔ جمرد کی زبانی کانتے کا حال سُن کے میں چند لمحے اُسے دیکھنے کے لیے بھی جانا چاہتا تھا لیکن اُن لوگوں کا خیال مجھے روکے لیتا تھا جو ڈبے میں بیٹھے جانے کیا مسکوٹ کر رہے تھے۔ وہ اب وہاں تھے بھی یا نہیں؟ جمرد نے بتایا تھا کہ کانتے کا سارا بدن تپ رہا ہے، وہ بار بار چونک پڑتا ہے، بڑبڑانے لگتا ہے۔ اگر صبح تک اُس کی حالت نہ سُدھری تو ہمیں سفر ملتوی کر کے اُسے پہلے کسی معقول جگہ دکھا دینا چاہیے۔ میں نے رائے زنی نہیں کی۔ جمرد کو کیا معلوم نہیں تھا کہ ہمارے ارادے کی تکمیل ہمارے ہاتھ میں کب ہے۔ ہم نہ یہاں سفر ملتوی کر سکتے ہیں نہ آگے کسی جگہ۔ ہمارا ہر ارادہ اُن کے فیصلے سے مشروط ہے۔

اُن لوگوں کے ڈبے کی طرف خاموشی رہی تو میں آبا جان کے ڈبے میں چلا آیا۔

وہاں صرف ایک بلب جل رہا تھا اِس لیے روشنی بہت دھیمی تھی یا اس کی وجہ یہ تھی کہ میں تیز روشنی سے اندر آیا تھا۔ منیر علی ایک جانب فرش پر مصلّا بچھائے نماز پڑھ رہے تھے۔ آبا جان آنکھیں مُوندے ہوئے برتھ پر نیم دراز تھے۔ میں دبے پاؤں اندر داخل ہوا، میری آہٹ سے اُن کی آنکھ کھُل گئی۔ اُنھوں نے غنودہ آواز میں پوچھا کہ میں سویا نہیں۔ کیا بات ہے، تم بھی جاگ رہے ہو؟ میں نے کہا، بس یوں ہی نیند نہیں آ رہی ہے۔ اُنھیں کچھ خبر نہیں تھی کہ کتنے سرفروش کیسے کیسے ہتھیار بند اُن کے رفیقِ سفر ہیں، وہ کتنے مطلوب آدمی ہیں۔ تجمل بوجوہ اُن دونوں بہروپیوں کو برابر کے ڈبے میں لے گیا تھا، آبا جان اور منیر علی کی خاطر، اُن کی موجودی اُن دونوں سے کھُل کے نمٹنے میں حارج ہوتی۔ ہم اتنے تحمل سے نہ اُن سے کچھ جان پاتے نہ اُن کا مناسب انتظام کر سکتے۔ منیر علی سے تو یہ برداشت ہی نہیں ہوتا حالانکہ گزشتہ رات ہی اُن کی آنکھوں نے اپنی زندگی کا سب سے ہولناک تماشا دیکھا تھا۔ منیر علی اور آبا جان کے سامنے ہمارے ہاتھوں میں زنجیر سی پڑی رہتی۔

کانتے کو ہوش نہیں تھا۔ میں نے اُسے ہلکے سے متعدد آوازیں دیں، اُس نے آنکھیں کھولیں، جھپکتی پلکوں سے مجھے دیکھنے لگا اور ہونٹوں پر خفیف مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی، میں نے اُس کے سینے پر زور ڈال کے اُسے لیٹے رہنے دیا اور اُس کا ہاتھ تھام لیا، وہ بخار میں پھنک رہا تھا۔ اُس سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ وہ کیسا ہے، یہ ایک مذاق ہوتا۔ میں اُس کے پاس بیٹھا اُس کی پیشانی سہلاتا رہا۔ مجھے کچھ دیر تو بیٹھنا چاہیے تھا لیکن میرا دل باہر اٹکا ہوا تھا۔ گاڑی کی سیٹی بجنے پر مجھ سے وہاں نہ بیٹھا گیا۔ میں نے اُسے تھپکی دی اور چند قدموں میں ڈبے کا فرش پھلانگ کے باہر آگیا۔ تجمل اور پیرو وغیرہ سب وہیں کھڑے تھے اور برابر کی بوگی کے دروازے پر بھی ایک آدمی موجود تھا۔ گویا اُنھوں نے سفر جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ پیرو نے اصرار کر کے تجمل کو آبا جان کے ڈبے میں واپس بھیج دیا۔ باقی ہم سب، جب تک گاڑی نے حرکت نہیں کی، پلیٹ فارم پر کھڑے رہے۔ ڈبے میں آ کے جمرد اُنھیں دیکھنے کے لیے فوراً دوسری طرف کے دروازے پر چلا گیا تھا، مبادا آخری لمحوں میں اُنھوں نے سفر ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا ہو مگر شاید اُن میں سے کوئی بھی نہیں اُترا۔ گاڑی کی رفتار تیز ہوگئی تھی۔

دروازہ بند کرنے کے لیے وہاں سے ہٹتے وقت میری نظر اُدھر انجن کی طرف آبا جان کے ساتھ والے ڈبے پر گئی۔ اُن دونوں پہلے والے آدمیوں میں سے ایک دروازے پر جما ہوا تھا۔ اِن دو مرحلوں کے خیال میں، میں اُنھیں یکسر بھول ہی گیا تھا حالانکہ دونوں خاصی دیر تک پلیٹ فارم پر مسلسل نظروں کے سامنے رہے تھے۔ اب اِس میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ اُن کا برقع پوش اور شال والے کے ساتھیوں سے کوئی تعلق نہیں ہے، نہ کسی اور سے۔ ہوتا تو اِس عرصے میں کوئی تو اُن سے ملنے آتا یا وہ کسی کے پاس جاتے۔ اُن کی تعداد بھی صرف دو معلوم ہوتی تھی۔ ہو سکتا ہے، وہ کسی اور طرف سے آئے ہوں لیکن مقصد تو اُن کا بھی کوئی دوسرا نہیں ہوگا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ مقصد کے حصول کے لیے اُنھوں نے کیا عزم کیا ہوا ہے۔ میں ابھی کچھ سوچنا سمجھنا نہیں چاہتا تھا۔ گاڑی چلی تو میرا جوڑ جوڑ دکھنے لگا۔ میں برتھ پر ہاتھ پیر پھیلا کے لیٹ گیا۔ جتنی دیر گاڑی چل رہی تھی اور کوئی اسٹیشن نہیں آتا تھا، اُتنی دیر میں آنکھ بند کر سکتا تھا۔ میں نے اپنا بازو جسم کے بوجھ تلے دبا دیا۔ ایکا ایکی اِس میں آگ سی بھڑک اُٹھتی تھی۔

جب گاڑی آہستہ ہونے پر میری آنکھ کھُلی، کھڑکیوں کے باہر اندھیرا مرجھا چکا تھا۔ دو ایک منٹ رُک کر گاڑی پھر چل پڑی اور میری آنکھ پھر لگ گئی۔ آگے کئی اسٹیشنوں پر جہاں گاڑی ذرا سی سُست ہوتی میری آنکھ خود بہ خود کھُل جاتی اور سب لوگ بھی بیٹھے بیٹھے اُٹھ جاتے۔ وہ سب چھوٹے چھوٹے اسٹیشن تھے۔ آنے والے ہر اسٹیشن پر اُجالا بڑھتا جاتا تھا تا آں کہ دھوپ نکل آئی اور ساڑھے سات بجے گاڑی ہوٹگی اسٹیشن پر آ کے ٹھیر گئی۔ ہوٹگی پر وہ سارے کے سارے موجود تھے۔ نواب قطب الدین علی کے نمک خوار بھی اور آبا جان کے ساتھ والے ڈبے کے آدمی بھی۔ چلتی گاڑی میں اُن کا ڈبے میں داخل ہونا ممکن نہیں تھا اور کسی اسٹیشن پر وہ ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر ہی اندر آ سکتے تھے۔ گزشتہ کئی اسٹیشنوں پر ہمارے ڈبے سے دُور دُور سہی مگر اُن کے آدمی پلیٹ فارم پر بھٹکتے منڈلاتے رہے تھے۔ جگہ وہ پہلے سے زیادہ آشفتہ معلوم ہوتے تھے۔ ویران اسٹیشنوں پر اُن کا بار بار ڈبے سے پلیٹ فارم کا چکر لگانا اضطراب ہی کی غمازی کرتا تھا۔ جب تک وہ ساتھ چل رہے تھے، ہمیں بھی پلک جھپکنے کی غفلت نہیں کرنا تھی۔ تعداد کے علاوہ ہتھیاروں کی موجودگی سب سے زیادہ اُن کی تقویت کا سبب ہوگی۔ ایک تمنچا دس آدمیوں کو بے دست و پا کر دیتا ہے۔ کسی وقت بھی کسی کے دماغ میں کچھ سما سکتا تھا۔ اُجالا ہوتے ہوتے ریاست کا علاقہ ختم ہو چکا تھا۔ گلبرگے سے آگے وہ کسی بھی اسٹیشن پر اُتر سکتے تھے۔ ہوٹگی جنکشن تھا۔ وہ یہاں اُتر سکتے تھے۔ ہمارے ساتھ چلنے کا ارادہ اُنھوں نے بے وجہ ہی نہیں کیا ہوگا۔

ہوٹگی پر ہم سبھی اُترنا چاہتے تھے مگر پیرو نے منع کر دیا۔ شاید بار بار اُن کے سامنے جانے کی ہمیں ایسی ضرورت نہیں تھی۔ صرف مارٹی اور شامو پلیٹ فارم پر اُترے تھے۔ کسی تجربہ کار مسافر نے مارٹی کی معلومات میں اضافہ کیا تھا کہ شولاپور جنکشن نزدیک ہے، ناشتہ وغیرہ وہاں بہتر ملے گا اور گاڑی بھی زیادہ دیر ٹھیرے گی۔ اُس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ہوٹگی پر گاڑی دس منٹ کے قریب ٹھیر کے آگے بڑھ گئی اور آدھ گھنٹے سے کم وقت میں شولاپور آگیا۔

آٹھ بج رہے تھے۔ ہر طرف چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی، تازہ تازہ دھوپ۔ پلیٹ فارم پر تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ ہم سبھی وہاں اُتر گئے۔ آبا جان اور منیر علی بھی باہر آگئے تھے۔ وقفے وقفے سے آنکھ بند کر لینے کے باعث مجھے بھی کچھ تازگی محسوس ہو رہی تھی۔ سب کچھ وہی تھا لیکن اُجالا ویسے بھی بہت سی سرگرانیاں کم کر دیتا ہے۔ سرگرانی بھی ایک قسم کا اندھیرا ہی ہے۔ دو اندھیرے مل کے اور گہرے ہو جاتے ہیں۔ اندھیرے کی نسبت مجھے اب اپنا جسم کچھ تنا ہوا، کھنچا ہوا نہیں لگ رہا تھا یا یہ محض نیند کا اثر تھا۔ نیند بھی آدمی کی غذا ہے۔ شامو ایک پلیٹ میں نواب حشمت جنگ کے خوان سے مٹھائی وغیرہ نکال لایا تھا۔ چائے کے ساتھ ہم کھڑے کھڑے مٹھائی کے دانے بھی ٹونگتے رہے۔ یہ دیکھ کے شامو اندر ٹوکری سے اور چیزیں بھی لے آیا۔ یکایک مارٹی نے اُچھل کے مجھے کہنی ماری، میرے ہاتھ سے چائے کی پیالی گرتے گرتے بچی مگر میری نظر سیدھی پیچھے برابر کی بوگی کے ڈبے پر گئی، وہ ڈبے سے اُتر رہے تھے، اپنے مختصر سامان کے ساتھ۔ قلیوں نے آ کے اُن کا سامان اُٹھانا چاہا تھا مگر اُنھوں نے جھڑک کے اُنھیں دُور رہنے کا حکم دیا۔ اسٹیشن کی جانب جاتے ہوئے وہ ہماری طرف ہی سے گزرے، ہمارے بالکل سامنے سے۔ اُنھوں نے ہمیں اور ہم نے اُنھیں بہت قریب سے دیکھا۔ نہ اُنھوں نے کسی رویّے کا اظہار کیا، نہ ہماری طرف سے اُنھیں کسی قسم کا تاثر ملا ہوگا۔ میں نے اچھی طرح گن لیا تھا، اُن کی تعداد سات ہی تھی۔ وہ تیز قدموں سے آگے بڑھ گئے اور پشت سے ہمیں نظر آتے رہے، پھر ہجوم میں چھُپ گئے۔ تجمل کے اشارے پر مارٹی ہجوم میں رل مل کے چپکے سے آگے چلا گیا۔ اُس نے آ کے بتایا کہ وہ گیٹ سے باہر نکلنے یا آگے کسی ڈبے میں بیٹھنے کی بجائے اندر اسٹیشن کی انتظار گاہ میں داخل ہو گئے ہیں۔ پیرو نے مارٹی کو سرزنش کی کہ اُسے لوٹنے کی ایسی کیا جلدی تھی، وہاں وہ اُن کی نگرانی کے لیے کیوں نہیں ٹھیرا۔ مارٹی کچھ کہے بغیر چلا گیا اور اُس وقت تک وہاں سے نہیں ہٹا جب تک گاڑی چلنے کے آثار پیدا نہیں ہوئے، پھر وہ چلتی گاڑی میں ڈبے میں آیا۔ اُس کی اطلاع کے مطابق وہ لوگ انتظار گاہ میں بیٹھ گئے تھے۔

سب کے چہرے جیسے نکھر آئے تھے۔ ٹنگو ہمارے ڈبے میں واپس آگیا تھا۔ اُس کا بس نہیں چلتا تھا کہ ڈبے میں پھُدکتا پھرے۔ اِتنی دیر بعد اب کہیں جا کے اُن کی پیشانیوں کے بل نکلے تھے۔ میں نے اُنھیں ٹوکا کہ ابھی دو باقی ہیں۔

پہلے والے دو آدمی، اُن کا ارادہ درمیان میں کسی اسٹیشن پر اُترنے کا بھی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ شولاپور سے ڈھائی گھنٹے کے سفر میں گاڑی کئی اسٹیشنوں پر ٹھیری۔ ہر جگہ اُن کا تقریباً ایک ہی معمول تھا کہ بڑے اسٹیشن پر جہاں گاڑی کچھ دیر ٹھیرنے کا امکان ہو، پلیٹ فارم پر اُتر جانا اور چھوٹا اسٹیشن ہو تو دروازے پر ایستادہ رہنا۔ کبھی ایک آدمی، کبھی دوسرا۔ رات سے اب تک شاید ہی کوئی اسٹیشن ایسا آیا ہو جہاں اُنھوں نے کچھ کوتاہی برتی ہو۔ اندھیری رات میں بھی نہیں۔ رات سے اب تک وہ اچٹتی نیند سوئے ہوں گے، وہ بھی صرف اُن وقفوں میں، جب گاڑی چلتی رہی۔ اُن کا طرزِ عمل شولاپور میں اُتر جانے والے آدمیوں سے قطعاً مختلف تھا۔ متحمل اور پُرسکون، تاہم بار بار دروازے پر آجانے سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ کسی اسٹیشن پر اُنھیں ہمارے سفر ترک کر دینے کا اندیشہ ہے یا وہ کسی ایک موقع کی تلاش میں ہیں جو اُنھیں جستجوئے بسیار کے باوجود نہیں مل رہا ہے۔ مجھے حیرت تھی، اُن کے ذہن میں یہ بات کیوں نہیں آئی کہ اُن کا بار بار ہماری نظروں میں آنا، پلیٹ فارم پر اور ڈبے کے دروازوں پر کھڑے رہنا، اُن کا چوکیداروں جیسا رویّہ خود اُن کے لیے کسی طور سُودمند نہیں تھا۔ وہ لوگ تو اپنے گرد و پیش کے معاملے میں بطورِ خاص بہت حساس ہوں گے جو اپنے ساتھ بیش قیمت مال و متاع لیے پھر رہے ہیں۔ اُنھیں تو اپنے سائے پر بھی شک ہوتا ہوگا۔ کیا وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ ہم ابھی تک اُنھیں محسوس نہیں کر سکے ہیں۔ اُنھوں نے اب تک کسی جگہ ہم سے راہ و رسم پیدا کرنے کی

کوشش بھی نہیں کی تھی۔ اتنے طویل سفر میں پردیسی مسافروں کے درمیان یہ قربت عموماً ہو جاتی ہے۔ تجمل نے انھیں چھیڑنے سے منع کر دیا تھا ورنہ ہم اپنے طور پر سلسلہ جنبانی کر سکتے تھے۔ نہ معلوم پھر اُن کا ردِ عمل کیا ہوتا۔ تجمل نے اِس لیے منع کیا تھا کہ شناسائی کی صورت میں اُن کے لیے ہمارے ڈبے میں داخل ہونے کا جواز نکل آتا۔ وہ ہم سے کوئی لاگ نہیں کر رہے تھے تو ہمیں بھی پہل نہیں کرنا چاہیے تھی بلکہ اُن کی مسکراہٹ بھی نہیں قبول کرنا چاہیے تھی مگر سفر گزرا جا رہا تھا۔ گاڑی کرواڑی جنکشن سے بھی گزر گئی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ پھر اُنھوں نے کون سی جگہ متعین کی ہے۔ کرواڑی سے آگے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ تھک گئے ہیں۔ پلیٹ فارم پر ٹھیرے رہنے کی مدت خاصی کم ہو گئی تھی۔

گاڑی ڈھائی بجے دَونڈ اسٹیشن پہنچی۔ ہم نے اس سے پہلے ہی کھانا کھا لیا تھا۔ نواب حشمت نے سبھی کچھ بھر دیا تھا۔ چاندی کے ورق میں لپٹے ہوئے پان کے بیڑے بھی تھے جو کانے کو بہت مرغوب تھے۔ وہ یہ پان بھی نہیں کھا سکتا تھا۔ میں [illegible] ایک بار پھر اُسے دیکھ آیا تھا۔ ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن تک [illegible] اُسی کے سرہانے بیٹھا رہا۔ اُس کے زخم کچھ اور لال ہو گئے تھے۔ [illegible] میں بھی کوئی فرق نہیں تھا۔ منیر علی کئی مرتبہ دم کیا ہوا پانی لے کے پلا چکے تھے۔ وہ [illegible] پڑھ پڑھ کے پھونکتے رہے تھے۔ گاڑی دَونڈ اسٹیشن پر پورے بیس منٹ [illegible]۔ گارڈ نے شامو کو بتایا کہ اب بمبئی کا فاصلہ ڈیڑھ سو میل رہ گیا ہے۔ [illegible] سے تاخیر کا شکار نہ ہوتی اور اپنی رفتار سے چلتی رہتی تو پانچ [illegible] بمبئی پہنچ جاتی۔ معلوم ہوا کہ بارش زدہ علاقہ گو کبھی کا گزر چکا ہے لیکن آٹھ بھی بج سکتے ہیں اور اس سے اوپر بھی ہو سکتے ہیں۔ گارڈ کی زبانی یہ سُن کے شامو اُچھلتا ہوا میرے پاس آیا، اُس نے چہکتی آواز میں کہا "لاڈلے! اب تھوڑے گھنٹوں کی بات ہے۔"

پانچ بجنے میں دس پندرہ منٹ باقی تھے کہ گاڑی پُونا شہر میں داخل ہو گئی۔ پُونا اسٹیشن پر تو جیسے اُن کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ سب سمجھ رہے تھے کہ بس ایک جست کی کسر ہے، گاڑی ہوا کے دوش پر جائے گی، ہوائی جہاز کی طرح، اور بمبئی آ جائے گا۔ مارتی پُونا شہر کی خوب صورتی کا نقشہ کھینچ رہا تھا، جمرو سے کہہ رہا تھا کہ بمبئی والے جب شہرِ بمبئی سے تھک جاتے ہیں تو پُونا کی راہ لیتے ہیں۔ یہاں کی بات ہی اور ہے۔ گورے لوگ پُونا پر جان دیتے ہیں۔ "پُونا کا مطلب ہے کہ اپن آدھا بمبئی میں آ گیا ہے، سمجھو پُونا ابھی بمبئی کا چھوٹا بھائی ہے۔"

ابّا جان کے برابر والے ڈبے کے دونوں آدمی بھی پُونا کے پلیٹ فارم پر اُتر گئے۔ ہماری بوگی چائے بسکٹ کے ایک بڑے اسٹال کے سامنے ٹھیری تھی۔ اسٹال کیا تھا، اچھا خاصا ہوٹل تھا۔ اُس کا تمام ساز و سامان دیکھنے کے لائق تھا۔ سب کا سب انگریزی طرز کا۔ اسٹال کے اطراف اونچے اونچے اسٹول رکھے تھے، لوگ اُن پر بیٹھے چائے اور دوسرے مشروبات پی رہے تھے۔ وہ دونوں بھی اسٹال پر چلے گئے۔ وہ دَونڈ کے بعد کسی پلیٹ فارم پر اب اُترے تھے۔ کچھ دیر تک اُنھوں نے چائے سے شغل کیا، پان کھایا اور سگریٹ کے کش لیتے رہے، پھر کیسری رنگ کی واسکٹ والا آدمی ایک طرف چل دیا۔ کچھ دُور تک وہ نظر آتا رہا، پھر آگے مسافروں کی بھیڑ نے اُسے چھپا لیا۔ یہ دیکھ کے شامو بھی چپکے سے ایک جانب کھسکتا ہوا اس کے پیچھے چل دیا۔ اسٹال پر رہ جانے والا آدمی یقیناً شامو کو نہیں دیکھ سکا تھا۔ [illegible] کے وقفے میں واسکٹ [illegible] واپس آ گیا۔ شامو نہیں لوٹا تھا۔ اُس کی [illegible] میں مارتی کو بھیجنا پڑا۔ شامو آ گئے، پلیٹ فارم پر بھٹک رہا تھا۔ واسکٹ والا اُبھر [illegible] اُس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ وہ کہاں گیا تھا، کتنی دُور تک گیا تھا، [illegible] کو اس کا کوئی علم نہیں ہو سکا۔ واپس آنے پر واسکٹ والا اپنے ساتھی سے [illegible] انداز میں باتیں کرتا رہا۔ اُن کے تیوروں میں ایسی رمزیت یا اشاریت نہیں تھی [illegible] چہرے سے اضطراب ظاہر ہو رہا تھا۔ گاڑی چلنے میں ابھی وقت تھا، وہ دونوں اپنے ڈبے میں جا کے بیٹھ گئے اور کھڑکیوں سے ہمیں دکھائی دیتے رہے۔

انھیں ڈبے میں گئے چند منٹ گزرے ہوں گے۔ اسٹیشن پر بھیڑ چھٹ [illegible] تھی اور گاڑی روانہ ہونے کے قرائن نظر آتے تھے، اچانک دو خوش پوش آدمی [illegible] لباس پہنے ہماری [illegible] اُن کے ساتھ قلی بھی تھا، سامان زیادہ نہیں تھا۔ [illegible] کی عمر چالیس، دوسرے کی پچیس سال سے زیادہ نہیں ہو گی۔ لباس اور وضع قطع [illegible] وہ آسودہ حال لوگ معلوم ہوتے تھے۔ ہمارے ڈبے کے پاس آ کے وہ رک گئے، سر اُٹھا کے اُنھوں نے اوپر ڈبے کے نشانات کی طرف دیکھا اور قلی سے سامان رکھنے کو کہا۔ ابّا جان، منیر علی اور زورا کے سوا سب باہر تھے۔ اُنھوں نے کچھ پوچھے [illegible] قلی کو سامان اندر رکھنے کی ہدایت کی۔ قلی ڈبے میں قدم بڑھا چکا تھا۔ وہ لوگ بھی داخل ہونا چاہتے تھے کہ جمرو نے اُن سے کہا کہ ڈبے میں کوئی جگہ نہیں ہے [illegible] ڈبا محفوظ بھی ہے۔ بہتر ہے، وہ کسی اور جگہ چلے جائیں۔ زیادہ عمر کے آدمی کو جمرو کا لہجہ شاید پسند نہیں آیا۔ کہنے لگا "اب بمبئی دُور ہی کتنا ہے۔ ڈبے میں خاصی جگہ [illegible] محفوظ نشستیں اصل میں رات گزارنے کی حد تک ہوتی ہیں اور پھر ہم آپ [illegible] درخواست تو کر سکتے ہیں نا۔" وہ یہ کہتے ہوئے اندر جانے لگا۔ مارتی نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ "اے بابو صاحب! یو ڈِڈنٹ لسن! ابھی آپ تھوڑا اونچا سنتا ہے؟"

اُس نے نہایت نخوت سے مارتی کا ہاتھ جھٹک دیا اور بولا کہ دُور رہ کر بات کرو، یہ کون سا انداز ہے شرفا سے بات کرنے کا۔ ساتھ ہی اُس نے قلی کو [illegible] دیا کہ وہ سامان برتھ کے نیچے رکھ دے۔ ہم سب پاس کھڑے دیکھ رہے تھے۔ پیر [illegible] اُن کے سامنے ہو گیا اور [illegible] نے نرم لہجے میں اُسے وہی سمجھایا جو جمرو نے کہا تھا اور بتایا کہ ڈبے میں ایک بیمار بھی ہے۔ ہم سب نیچے کھڑے ہیں، اُوپر چلے جائیں گے تو ڈبے میں کوئی نشست نہیں رہے گی۔ بہتر ہے، وہ دوسرا ڈبا تلاش کریں۔

نوجوان اب تک خاموش رہا تھا، وہ ڈھٹائی سے بولا "بمبئی تک تو [illegible] ہے، کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا، ایسا ہی ہے تو ہم کلیان میں اُتر جائیں گے [illegible] اتنے کم وقت میں کون سا ڈبا تلاش کریں۔"

"تو ابھی پہلے سے آ جا راجا صاحب!"

"ٹھیک ہے، دیر سویر ہو ہی جاتی ہے۔" ادھیڑ عمر سپاٹ لہجے میں بولا [illegible] دوسری جگہ ڈھونڈ لیں گے۔"

"ابھی وقت ہے، آگے پھر اکھاڑ پچھاڑ کیوں کرے گا۔"

"آپ لوگ کیسے آدمی ہیں؟"

"کیوں، سینگ لگا ہے اپن کے ابھی۔" پیرو نے تلخی سے کہا۔ "سیدھا بولی سمجھ نہیں آتا کیا؟"

"خوب آتی ہے۔" نوجوان نے تنک کے کہا۔ "دیکھیے ہم نے آپ سے ریکویسٹ کی ہے۔ ڈبا نہ آپ کی پراپرٹی ہے، نہ آپ نے کوئی پٹا کروا لیا ہے کہ دوسرا نہیں بیٹھ سکتا۔"

"حیدرآباد سے بمبئی تک کا پٹا ہی لکھوایا ہے اپن نے۔ تم نے کبھی فرسٹ کلاس میں سفر کیا ہے، یہ جاستی رو کڑا اپن کا ہے کو بھرا ہے۔"

"رو کڑا ہم نے بھی بھرا ہے اور حرام کا بھی نہیں ہے۔" ادھیڑ عمر شخص درشتی سے بولا۔ "بات کیوں بڑھاتے ہیں۔"

"بات تو آپ لوگ بڑھا رہے ہیں۔"

"آپ لوگ نہیں جانتے کہ کس سے بات کر رہے ہیں۔"

"لاٹ صاحب ہے۔" پیرو نے پھنکار کے کہا۔ "اپن دیکھ رہا ہے، صاحب کوئی بڑا تیس مار ہے، افسر بہادر گٹ پٹ بھی کر لیتا ہے۔ پر ابھی سنائی ٹھیک نئیں دیتا۔"

"اور تم کو دکھائی کم دیتا ہے۔"

"ٹھیک ہے، پھر بات برابر ہو گیا۔" پیرو نے ہنس کر کہا اور قلی کو سامان اٹھانے کا اشارہ کیا۔

"سامان نہیں رہے گا۔" ادھیڑ عمر حتمی لہجے میں بولا۔

"دیکھا استاد!" پیرو نے تھل کو مخاطب کیا۔ "ابھی یہ نقلی گورا صاحب کیا بولتا ہے؟"

تھل نے آگے آکے ہلکی آواز میں اُن سے کہا کہ وہ اپنا سامان اٹھالیں۔

اندر منیر علی اور ابا جان بھی اپنی نشستوں سے کھڑے ہو گئے تھے۔ اُنھوں نے ہمیں لہجہ دھیما رکھنے کی تلقین کی اور اُن دونوں سے کہا کہ اِس ڈبے میں اُنھیں بھی تکلیف ہو گی، ہمیں بھی۔ منیر علی نے کانتے کی طرف ہاتھ اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "دیکھیے، یہاں ایک بیمار موجود ہے۔ آپ کو واقعی زحمت ہو گی جناب!"

"آپ کو زحمت نہیں ہونے دی جائے گی بڑے صاحب!" ادھیڑ عمر ناگواری سے بولا۔ "ابھی ہم کو پروا نہیں ہے۔"

سبھی نے اپنے طور پر نرم گرم لہجے میں اُنھیں باز رکھنے کی کوشش کی لیکن اُن دونوں کا خون زیادہ گرم تھا، بلکہ نشے میں معلوم ہوتے تھے۔ نشہ تو بہت سی چیزوں کا ہوتا ہے۔ بہ ظاہر دونوں عام مسافر لگ رہے تھے لیکن ایک فی صد امکان میں بھی ہمیں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہیے تھا۔ اب ایک ہی طریقہ رہ گیا تھا جو ہرگز مناسب نہیں تھا کہ اُنھیں جگہ دے دی جائے۔ پیرو یا تھل کسی نے پہلے والے دو آدمیوں کی طرح اُنھیں برابر کے ڈبے میں بیٹھ جانے کی پیش کش بھی نہیں کی۔ یہ دن کا وقت تھا۔ گو شام کی ابتدا ہو چکی تھی لیکن سورج غروب ہونے میں وقت تھا۔

میرے ذہن میں ایک بات آئی تھی کہ اُنھیں اِسی ڈبے میں جگہ دے دی [...] اور احتیاطاً ابا جان برابر کے ڈبے میں منتقل ہو جائیں لیکن اِس طرح، اگر [...] تھے تو ابا جان کے پاس زر و جواہر کی موجودی کی بابت اُن کا یقین اور پختہ [...] تھل نے ایک بار پھر نرم لہجے میں اُن سے سامان اُٹھا لینے کو کہا مگر وہ اندر [...] اور بپھر ہو چکے تھے۔ تھل کا کہنا بھی حجت پوری کرنے کے لیے تھا [...] نے پھر دخل دیا اور کسی قدر رعونت سے بولا۔ "آپ نہیں جانتے، یہ کون صا[حب] ہیں، یہ ایک بہت بڑے سرکاری افسر ہیں۔"

"تو ہم تالی پیٹیں کیا۔" تھل کی آواز بھی بدل گئی۔ اُس نے زورا [کی] طرف نگاہ اُٹھا کے دیکھا، زورا نے کسی توقف کے بغیر اُن کا سامان اُٹھا کے پھینک دیا۔ دونوں کی آنکھوں سے شعلے نکلے، وہ بُری طرح چیخنے چلانے لگے۔ شور اور واہی تباہی سُن کے بہت سے مسافر متوجہ ہو گئے۔ دیکھتے دیکھتے اژدہام [ہونے] لگا۔ نوجوان نے دروازے کے سامنے سے ہٹانے پر جمرو کا گریبان پکڑ لیا۔ جمرو [نے] اب تک بہت برداشت کیا تھا لہٰذا اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے نوجوان [کو] کمر سے پکڑ کے اوپر اُٹھا لیا۔ نوجوان ہاتھ پیر چلانے لگا۔ جمرو اُسے اوپر اچھال کے [...] ہٹا لیتا تو اُس کی ایک آدھ ہڈی ضرور ٹوٹتی۔ جمرو نے تھل اور پیرو کی طرف دیکھا [...] جھٹکے سے اُسے دوبارہ زمین پر رکھ دیا۔ نوجوان بالکل حواس باختہ ہو گیا تھا۔ ادھیڑ عمر آ[دمی] شور مچا رہا تھا۔ گاڑی کا گارڈ، ٹکٹ چیکر، اسٹیشن کا عملہ، ریلوے واچ اینڈ وارڈ [اور] پولیس والے دوڑتے ہوئے اس طرف آ گئے۔ ادھر مارٹی اور زورا نے شامو کو [پکڑ] لیا۔ وہ ادھیڑ آدمی پر جھپٹنا چاہتا تھا اور مارٹی اور زورا کے بازوؤں کی گر[فت] سے نکلنے کے لیے پچھاڑیں کھا رہا تھا۔ اُس کے منہ سے بے تحاشا گالیاں جاری [تھیں] اور وہ ایسی ایسی باتیں اُن دونوں سے منسوب کر رہا تھا جو اُن کی زبان سے [...] نہیں نکلی تھیں۔ شامو کا یہ زور شور عمداً تھا، مارٹی اور زورا کی روکنے کی کوشش بھی دانستہ تھی۔ شامو اُدھم مچا رہا تھا کہ اُسے چھوڑ دیا جائے، وہ اُن دونوں کا خون [پی] لے گا، اُنھوں نے اُسے ماں کی گالی دی ہے اور اُس کے بزرگ پر ہاتھ اُٹھایا ہے۔ [...] کی چیخ پکار سب پر حاوی آ گئی تھی۔ اِن پے بہ پے الزامات پر ادھیڑ عمر آدمی مدا[فعانہ] انداز اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا۔ ریلوے پولیس کے سپاہی شامو کو خاموش کرنے [کی بجائے] خود چیخنے لگے تھے۔ اِس ہاؤ ہُو میں کسی کی سمجھ میں کچھ آ ہی نہیں سکتا تھا۔ اِس کے [...] کہ پہلے مشتعل لوگوں کو قابو میں کیا جائے۔ سپاہیوں کی مداخلت پر شامو اور کٹ[...] ہو گیا۔ کسی نے ادھیڑ عمر آدمی کو پیچھے ہٹا دیا، وہ ہکلا رہا تھا اور وضاحتیں کر رہا تھا [کہ یہ] سب بہتان ہے، یہ لوگ بہت چالاک اور مکار معلوم ہوتے ہیں۔ وہ دھمکیاں دے رہا تھا کہ میں بھی انھیں دیکھ لوں گا، ایک ایک کو دیکھ لوں گا۔

"ہاں ہاں، مت کر دی بہناوے، تیرے باپ کا دیا کھاتے ہیں۔ سالا سر کا[ری...] کی دھونس جماتا ہے۔ پھندا ڈال دے۔ تھانا کچہری تیرے باپ کے خریدے [ہوئے] ہیں۔ جا کے تو دیکھ ڈبے میں، اب تیری لاش ہی اِدھر سے جائے گی۔" کبھی [وہ] گرجنے لگتا تھا، کبھی پیرو۔ گارڈ، ٹی ٹی، اسٹیشن کا عملہ نظم و ضبط قائم رکھنے کی

ناکام کوشش میں مصروف تھا۔ ابا جان کے برابر ڈبے کے دونوں آدمی پہلے تو دروازے پر کھڑے رہے۔ پھر پلیٹ فارم پر آ گئے لیکن حیران کھڑے فاصلے سے سب کچھ دیکھتے رہے، کوئی قریب نہیں آیا۔ ریلوے پولیس کے سپاہی اصل بات جاننے کی فکر میں تھے۔ اُن کا ایک افسر بھی وہاں آ گیا تھا، وہ کبھی ڈانٹتا، کبھی استدعا کرتا اور کبھی سب کو ریل سے اُتارنے کی دھمکی دیتا۔ ادھیڑ عمر آدمی نے بھی بہتان تراشنے شروع کر دیے تھے۔ اُس نے بڑھا چڑھا کے بیان کرنا چاہا کہ ہم نے ڈبے میں داخل ہونے سے پہلے ہی اُس پر ہاتھ اُٹھایا تھا حالانکہ اُس نے ہم سے صرف اگلے اسٹیشن تک بیٹھنے کی التجا کی تھی۔ شامو اُسے بولنے ہی نہیں دے رہا تھا مگر وہ صرف ایک تھا۔ نوجوان کو تو چُپ لگ گئی تھی۔ شامو، جمرو اور پیرو، ادھیڑ عمر آدمی کے سرکاری افسر ہونے اور رعب داب جمانے کا کچھ ایسے احتجاجی انداز میں چرچا کر رہے تھے کہ لوگوں کا اُس سے برگشتہ ہو جانا لازم تھا۔ لوگ ویسے ہی سرکاری افسروں میں عیب ڈھونڈنے کے منتظر رہتے ہیں۔ چند لوگوں نے دبی زبان میں ہمیں بھی سمجھایا کہ دو شریف آدمیوں کو جگہ دینے میں ایسی برائی تو نہ تھی۔ آدمی میں تھوڑی بہت تو مروت ہونی چاہیے۔ شامو بار بار بھڑک اُٹھتا، وہ کہہ رہا تھا کہ اُسے اور افسر دونوں کو تھانے لے جا کے فیصلہ کیا جائے۔ اب تو وہ تھانے جا کے ہی اِس گھمنڈی کا کس بل دیکھے گا، دیکھتے ہیں کہ اِس کی کرسی کتنی بڑی ہے، وہیں جا کے اِسے بتائیں گے کہ ہم کون ہیں اور اِس نے کس آدمی پر ہاتھ اُٹھایا ہے، سالا کرسی کا زور دکھاتا ہے۔ ٹھوکروں پر رکھتے ہیں ہم کرسیاں۔

شامو کے منہ میں جو آیا، بکتا رہا۔ ایک بزرگ مسافر نے ہاتھ جوڑ کے اُس سے اور ادھیڑ عمر آدمی سے منت کی کہ اُن کی وجہ سے گاڑی کی روانگی میں تاخیر ہو رہی ہے اور سینکڑوں مسافر پریشان ہو رہے ہیں، وہ اپنا نہیں تو دوسروں ہی کا خیال کریں۔ ادھیڑ عمر آدمی کے پسینے چھوٹ رہے تھے، آنکھیں اُبلی پڑ رہی تھیں، وہ بُری طرح متزلزل ہو چکا تھا۔ اتنے میں ابا جان کے برابر والے ڈبے کے دو آدمیوں میں سے ایک آدمی لوگوں کی بھیڑ کاٹتا ہمارے قریب آیا اور ادھیڑ عمر آدمی سے التجا آمیز لہجے میں بولا کہ وہ برابر کے ڈبے کا مسافر ہے، اِسی فرسٹ کلاس کا۔ وہ دونوں اُس کے ڈبے میں آ جائیں۔ ادھیڑ عمر آدمی نے کوئی جواب نہیں دیا، دوسرے لوگ تائید میں آوازیں اُٹھانے لگے۔ انکار کا محل نہیں تھا۔ انکار پر پولیس کی نوبت آ جاتی اور لوگوں کی ناراضی کی بھی۔ ہرچند کہ شروع ہی میں ٹی ٹی نے اُن دونوں کو کسی اور ڈبے میں مناسب جگہ فراہم کرنے کی پیش کش کی تھی لیکن اُس وقت وہ طیش میں تھا۔ ٹی ٹی کی پیش کش اُس نے حقارت سے ٹھکرا دی تھی اور دعوا کیا تھا کہ اب تو وہ اِسی ڈبے میں بیٹھیں گے ورنہ گاڑی اپنی جگہ سے نہیں ہلے گی۔ لوگوں نے اُس کی کمر اور شانوں پر ہاتھ رکھ کے اُسے ہم سے دُور کر دیا۔ وہ بڑبڑاتا رہا کہ بمبئی اُتر کے وہ ہمیں دیکھ لے گا۔ ادھر مارٹی اور زورا نے شامو کو پیچھے گھسیٹ لیا۔

گارڈ نے سیٹی بجانے میں عجلت کی تھی، لوگ بھاگنے دوڑنے لگے۔ گارڈ کو یہ تدبیر اور پہلے اختیار کرنی چاہیے تھی۔ اُس نے لوگوں کو منتشر کرنے کے لیے سیٹی بجائی تھی۔ گاڑی روانہ ہونے میں چند منٹ اور لگ گئے۔ اندر آ کے شامو ہانپنے لگا۔ جمرو نے اُسے پانی پلایا اور گلے سے لگا لیا۔

پونا اسٹیشن سے گاڑی کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ گاڑی چھوٹے چھوٹے بہت سے اسٹیشن چھوڑتی ہوئی اب خاص خاص مقامات پر رُک رہی تھی، وہ بھی تھوڑے تھوڑے وقفے کے لیے۔ کرجت اسٹیشن پر البتہ کچھ دیر کے لیے ٹھیری لیکن کلیان سے پہلے نہ ہم کسی جگہ باہر نکلے، نہ برابر کے ڈبے سے کوئی نکلا۔ کرجت ہی پر اندھیرا ہو گیا تھا۔ اسٹیشن پر قمقمے روشن تھے۔ کلیان پر تو رات پوری طرح غالب آ چکی تھی۔ ٹھیک پونے نو بجے گاڑی وہاں پہنچی۔ ہمارے حیدرآباد سے اب تک کے ہم سایہ، ہم سفر یعنی وہ دونوں پلیٹ فارم پر آ کے اُسی طرح کھڑے ہو گئے جیسے بیشتر اسٹیشنوں پر اُن کا معمول رہا تھا۔ اب اگر اُن کے دماغ میں کچھ تھا تو اس کا وقت غالباً گزر چکا تھا۔ بمبئی شہر شروع ہو رہا تھا۔ مارٹی کے کہنے کے مطابق آگے جگہ جگہ بستیاں آباد تھیں، بستیاں اور کارخانے۔ اِس علاقے کا چپا چپا زورا، ٹنگو، مارٹی اور پیرو کا چھانا ہوا تھا۔ کلیان سے بوری بندر کا فاصلہ صرف تیس میل رہ گیا۔ بوری بندر پر گاڑی ختم ہو جاتی تھی۔ کلیان کے پلیٹ فارم سے ہم نے نوجوان اور ادھیڑ آدمی کو ڈبے میں بیٹھے دیکھا تھا۔ اُن کی آنکھوں میں خشونت صاف نظر آتی تھی لیکن وہ وہیں بیٹھے رہے۔ جانے بھی اُنھوں نے اپنی نشستوں پر پی۔ اُن کی اور ہمارا تعاقب کرنے والوں کی رفاقت کے بارے میں یقین سے ابھی تک کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے، وہ عام مسافر ہی ہوں۔ پولیس وغیرہ کی بات سُن کے ہمارا پیچھا کرنے والوں کو چونک جانا چاہیے تھا۔ اگر وہ اُن کے ساتھی تھے یا نہیں تھے، دونوں صورتوں میں اُنھیں پولیس کی مداخلت گوارا نہیں ہونی چاہیے تھی۔

زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے کا سفر رہ گیا تھا۔ بمبئی پہنچ کے اُن کا کام ختم ہو جائے گا۔ آخر وہ کس جگہ، کون سی جگہ کے منتظر ہیں یا اُن کا مقصد ادھیڑ عمر اور نوجوان آدمی کی ناکامی پر تمام ہو گیا لیکن دونوں کی وابستگی بھی ایک گمان ہی ہے۔ اگر وہ اُن کے ساتھی نہیں ہیں تو ساری تگ و دو اور اِس طویل سفر سے اُنھیں کیا حاصل ہوا؟ میں نے سوچا کہ پیرو سے پوچھوں مگر وہ بھی کیا جواب دیتا۔ اُن کے چہروں سے ایسی بے اطمینانی اور بے چینی ہویدا نہیں تھی، تھکے تھکے وہ ضرور لگتے تھے۔ میں پلیٹ فارم پر جمرو، شامو اور مارٹی کے ساتھ کھڑا ہوا تھا مگر میرا دماغ اُنھی کی طرف مرکوز تھا۔ یکایک مجھے خیال آیا کہ بمبئی تک پہنچ جانے کے بعد اُن کا کام ختم کہاں ہو گیا۔ یہ تو بہت ادھورا ہے۔ یہاں تک اُن کا مقصد محض ہماری نگرانی تھا کہ ہم راستے میں سفر ملتوی نہ کر دیں، کسی اور سمت نہ نکل جائیں، کہیں ہم کھو نہ جائیں۔ اُن کا اصل کام تو بمبئی جا کے شروع ہونا ہے، اُن کے تعاقب کا سلسلہ تو ہمارے ٹھکانے تک دراز ہونا چاہیے، اب اُنھیں ہمارا گھر دیکھ کے بلکہ نشان زد کر کے ہی لوٹنا چاہیے۔ ہمارے شب و روز، ہمارا شجرہ جانے بغیر نہیں جانا چاہیے کیونکہ ہمارے بارے میں اُن کے آقاؤں کو حیدرآباد میں ایسا کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا۔

سب کچھ تسلسل سے تھا۔ اُن کی گوہر شناسی، اُن کے ذوقِ نوادر، اُن

کی اُفتادِ طبع اور مزاجِ خسروی کے مطابق وہ اپنی طلب کی صداقت و سرکشی کے کئی ثبوت دے چکے تھے۔ سب سے بڑا ثبوت تو اُنھوں نے ۲۴ مسلح وحشیوں کا ایک پورا دستہ اباجان کی حویلی کی طرف بھیج کے دیا تھا۔ نواب عالم تاب کے ہاں سے ہماری واپسی کے کئی روز پہلے سے اُن کے آدمی حویلی حصار میں لیے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے اپنے جنونِ شوق کے اظہار کے لیے حرفوں سے بنے ہوئے دو شاطر سوداگر بھی بھیجے تھے۔ سو سب کچھ تسلسل سے تھا۔ مہاراجا دھرم دیر سے تو ایک پہر کا بھی ضبط نہیں ہوا۔ سہ پہر کو ہم حویلی پہنچے تھے اور رات کو وہ اپنا کشکول لیے ہمارے دَر پر موجود تھا۔ دولت مند سے بڑا کوئی سائل نہیں ہوتا۔ اُسی جیسے اُس کے کسی ہم رتبہ نواب و راجا نے یہاں سفر میں ہتھیاروں سے لیس اپنے نو منتخب آسودہ نمک خواروں کا قافلہ روانہ کر دیا تھا۔ حویلی سے نامراد واپس جانے والے ہتھیار بندوں کی طرح اپنے تازہ فرستادوں کی ناکامی کا خدشہ بھی اُس کے پیشِ نظر ہوگا، اِس لیے از رُوئے احتیاط اُس نے دو ایسے آدمیوں کو بھی بھیجنا ضروری سمجھا جن کا کام ہمارے بارے میں ہر قسم کی جزئیات کی چھان بین کرنا ہو، یا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے اگر اس کا نام نواب قطب الدین علی تھا تو وہ اُسی کے آدمی ہوں۔ برقع پوش اور شال والے کے ساتھیوں اور اِن دونوں کا ایک دوسرے سے واقف ہونا مناسب نہیں تھا۔ اُنھیں ایک دوسرے سے بے خبر ہی رہنا چاہیے تھا۔ اُن کا آپسی ربط کہیں ظاہر ہو جاتا تو ہمیں شک میں ڈال سکتا تھا۔ مجھ سے باہر نہیں رہا جا سکا۔ میں فوراً ٹھبل اور پیرو کے پاس جا کے اُنھیں آگاہ کرنا چاہتا تھا کہ اُنھوں نے اِس پہلو پر بھی غور کیا ہے؟ اُن لوگوں کا تعاقب ہمارے گھر تک جاری رہ سکتا ہے اور اِس کے بعد بھی۔ جمرو، شامو اور مارٹی کو وہیں چھوڑ کے میں اباجان کے ڈبے میں داخل ہو گیا اور میں نے ٹھبل کے قریب جا کے سرگوشی میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"ہاں رے!" وہ سر ہلا کے بولا۔ "تو اُن کو ٹھکانے لگا دیں گے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے بے چینی سے کہا۔

"بمبئی تو آنے دے رے!" وہ ہنکاری بھر کے بولا۔ "اُدھر پیرو دادا نے بہت سُور کے بچے پال رکھے ہیں۔"

میں نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔ "مگر کیا...؟" میں کہنا چاہتا تھا کہ ہم اباجان اور منیر علی کو لے کے کیا پہلے پیرو کے علاقے میں چلیں گے؟ پیرو دادا کے باڑے کی طرف؟... لیکن میں خاموش رہا۔ اُس طرف جانے میں حرج بھی کیا ہے، پیرو کا علاقہ تو اب سارے بمبئی پر پھیلا ہوا ہے۔ "گر رتنا کی طرح کوئی سُوما پیدا نہ ہو گیا ہو، جیسے کلکتے میں ہوا تھا، اڈے سے ٹھبل کی ناموجودی کا فائدہ اُٹھا کر رتنا کھال سے باہر ہو گیا تھا۔ پیرو کو اپنے خاص علاقے تک پہنچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ باڑے کے آدمی جگہ جگہ تعینات ہوں گے۔ پیرو کے لیے باقاعدہ کسی باڑے تک پہنچنے سے پہلے ہی ایک اشارہ کافی ہوگا۔

میں اپنے ڈبے میں چلا آیا۔ میرے سینے سے جیسے دُھند چھٹ گئی۔ کلیان سے پچیس منٹ بعد ہی تھانا اسٹیشن آ گیا تھا، جیسے جیسے گاڑی آگے بڑھ رہی تھی، مارٹی کے چہرے کی آگ بھی بڑھتی جاتی تھی۔ ٹنگو کھڑکیوں سے نظر آنے والی سڑکوں، عمارتوں اور کارخانوں کے نام شامو اور جمرو کو بتاتا اور ڈبے میں اُچھلنے لگتا۔ پیرو بظاہر خاموش بیٹھا تھا مگر مسلسل پہلو بدل رہا تھا۔ گاڑی شہر بمبئی سے گزر رہی تھی۔ دونوں اطراف بلند و بالا عمارتیں شروع ہو گئی تھیں۔ ہر طرف روشنیوں کے جھنڈ سے بکھرے تھے۔ ایک عرصے بعد وہ اپنے شہر واپس آ رہے تھے۔ اُدھر اباجان کے ڈبے میں زورا کا بھی کچھ یہی حال ہوگا۔ تبت کے سفر سے سلامت لوٹ آنا، سب کے لیے نئی زندگی ملنے کے برابر تھا۔ وہ اپنے تمام رشتے، تمام سلسلے ختم کر کے ہی تبت کی طرف گئے تھے۔ اتفاق سے سلطان، وزیر، مٹن خاں وغیرہ کا قرعہ نکل آیا تھا، وہ رہ جاتے تو اُن کی جگہ ہم میں سے کوئی کام آ جاتا۔

گاڑی تھانا اسٹیشن سے گزر گئی تو پیرو اپنی نشست سے اُٹھ کے میرے پاس چلا آیا۔ اُس نے میری کمر میں بازو ڈال کے مجھے دبوچ لیا۔ "ابھی کیا حال ہے راجا؟"

میں نے سیدھے ہو کے کہا۔ "ٹھیک ہے۔"

"ابھی ایدر کا حال پوچھتا ہے۔" وہ میرا سینہ ٹٹولتے ہوئے بولا۔ "ایدر تو سب ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں دادا!" میں نے دبی آواز میں کہا۔

"تھام کے ہی رکھنا جانی!" میں نے سر جھکا لیا، اُس نے اور زور سے مجھے دبوچ لیا۔ "اپن سوچتا ہے، وہ دیکھے گا تو ابھی کیا بولے گا۔ اُس کو سب ابھی سپنا مافک ہی دکھائی دے گا، اتنا بڑا خوشی ایک دم ملنے سے تو وہ پاگل ہو جائے گا، اکھا پاگل۔"

"کیا معلوم دادا! مجھے دیکھ کے تو اُنھیں سب کچھ یاد آ جانا چاہیے۔ سارے زخم تازہ ہو جائیں گے۔ امی، فرحی، گھر بار، سب کچھ۔ معلوم نہیں جہاں گیر کے بارے میں بھی اُنھیں کچھ علم ہے یا نہیں۔ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ اُنھیں تو اپنے گھر میں مجھے داخل ہونے کی اجازت بھی نہیں دینا چاہیے، اُنھیں تو میرے منہ پہ تھوک دینا چاہیے۔ میرے گھر سے نکل جانے کے بعد اُن کا باپ بھی اُن کا کب رہا تھا۔" میری آواز بھرّا نے لگی۔

"نئیں راجا! نئیں۔ ابھی سب جگہ سالا ایسا ہی ہے۔ جیدر بھی دیکھے۔ ایک بار کبھی کو سر ہاتھ سے نکل پڑتا ہے تو آگے سب اُلجھتا جاتا ہے۔ تو کیا ابھی جان کے ایسا مانگتا تھا۔ ایسا تو، تو نے ایک دم نئیں سوچا تھا جانی! سب ٹیم سے کا ناٹک ہے۔ اُلٹا چلنے کو آیا تو نیچے کا اوپر، اوپر کا نیچے سالا سب اُلٹا دیتا ہے۔ ابھی دیکھنا، تجھ کو سامنے دیکھ کے وہ اکھا دکھ بھول جائے گا۔ بھائی تو بڑا چیز ہوتا ہے، دو کا ناتا، خون کا ناتا، اور تو تو ویسے بھی بڑا ہے۔ تھوڑا روئے گا پر وہ دکھ کا آنسو نئیں ہوئے گا راجا!"

"مجھے تو اب بھی یقین نہیں آتا دادا!"

"کیسا آئے گا۔ ابھی ٹیم بھی تو بہت اُوپر ہو گیا، دس سال کے برابر دیکھنا راجا! ملنے پہ آیا ہے تو ابھی سب کھویا ہوا مل جائے گا۔"

میں اُس کا چہرہ ایک نظر دیکھ کے رہ گیا۔

"ہاں راجا! اپن کا دل بولتا ہے۔ ایک دن ابھی سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں نے اُس سے کچھ نہیں کہا، وہ بھی چپ ہو گیا۔ شاید اُسے خیال آ گیا تھا کہ بے جواز تسلیاں تو اور بے آرام کر دیتی ہیں۔

گاڑی بیچ شہر سے گزر رہی تھی۔ تھانا اسٹیشن پر اُنھوں نے طے کیا تھا کہ بوری بندر کے بجائے وادر اُتر جائیں گے۔ گاڑی درمیان کے مختلف اسٹیشن چھوڑتی ہوئی کرلا آ گئی تھی۔ مارٹی کے بقول کرلا سے دادر کا فاصلہ چند میل سے زیادہ نہیں تھا۔ میں اپنی نشست پر بیٹھا رہا۔ میری رگوں میں کن سلائیاں سی رینگ رہی تھیں۔ مارٹی فاصلہ کم ہونے کا اعلان کرتا تو میرا سارا جسم سُن ہونے لگتا۔ فرخ زماں، فارعہ اور اکبر کے چہرے آنکھوں میں اُتر آتے۔ وہ تو سب بدل گئے ہوں گے۔ اکبر بھی خوب بڑا ہو گیا ہوگا۔ اب تو فارعہ، فرخ، زماں سب کا رنگ روپ ہی کچھ اور ہوگا مگر وہ کتنی بدل جائیں، میں اُنھیں ایک نگاہ میں پہچان لوں گا۔ میں اتنے عرصے اُن سے دور رہا لیکن اُن کے چہرے تو میرے دل پر نقش تھے۔ میں حیدرآباد میں جہاں گیر کو ایک جھلک میں پہچان گیا تھا۔ پرسوں حیدرآباد سے چلتے وقت بھی پیرو نے اُن کا ذکر کیا تھا، میں نے کہا تھا کہ مجھے تو اُن کے سامنے جانے کے تصور ہی سے ہول آنے لگتا ہے اور اب... فاصلہ ہی کتنا رہ گیا تھا۔ مجھے سب کچھ عجیب عجیب لگ رہا تھا۔ کبھی میرا جی چاہتا کہ گاڑی درمیان میں کہیں رُک جائے، اتنی تاخیر سے پہنچی ہے تو کچھ اور تاخیر ہو جائے... میرا دل تو ابھی سے دھڑک رہا ہے، اُن کے سامنے کیسے جایا جا سکے گا؟ وہ مجھ سے کوئی سوال کریں گی تو میں کیا جواب دوں گا۔ زبان نہیں تو اُن کی نظریں ضرور سوالات کریں گی۔ بس خدا کرے وہ خیریت سے ہوں۔ مولوی اکرم کو میں نے دیکھا تھا، وہ ایک دین دار اور شفیق آدمی ہیں۔ اباجان نے کچھ سوچ سمجھ کے ہی اُنھیں یہ ذمے داری سونپی ہوگی۔ اُنھوں نے اُن کا اپنی اولاد کی طرح خیال رکھا ہوگا۔ میرے سر میں بار بار طرح طرح کے وسوسے اُٹھنے لگتے۔ کہیں وہاں جا کے کچھ اور سننے کو نہ ملے۔ خدا کرے، وہ سب ٹھیک ہوں، ہر بلا اور ہر نظرِ بد سے محفوظ۔

کرلا پر مارٹی، ٹنگو، جمرو، شامو سب نیچے اُترے اور واپس آ کے اُنھوں نے پیرو کو بتایا کہ ادھیڑ اور نوجوان آدمی برابر کے ڈبے میں موجود ہیں اور وہ دونوں بھی۔ اُن میں سے ایک پلیٹ فارم پر کھڑا ہے۔ ٹھبل نے مارٹی کو تاکید کی تھی کہ دادر اسٹیشن پر ہم کوئی دیر نہ کریں۔ جیسے ہی گاڑی ٹھیرے، ڈبے سے باہر نکلیں۔ ٹھبل نے اُن سب کی توقع کے خلاف یہ ہدایت دی تھی۔ وہ اِس کے برعکس ارادے باندھے تھے کہ بالکل آخری لمحوں میں، جب گاڑی دادر سے اپنی اگلی منزل کے لیے روانہ ہونے کو تیار ہو، اُس وقت ہم ڈبے سے باہر نکلیں۔ دیکھتے ہیں پھر وہ دونوں کیا فیصلہ کرتے ہیں۔ یقیناً اتنی جلد اُنھیں ہماری پیروی کرنے میں بڑی دقت ہوگی اور اُنھیں ہماری نظروں میں مشکوک ہو جانے کا خدشہ بھی لاحق ہوگا۔ جمرو نے ایک مشورہ دیا تھا کہ کیوں نہ ہم اُنھیں دادر سے ختم کرنے کا تاثر دے کے ڈبے میں دوبارہ بیٹھ جائیں یا کھڑکیوں میں اُتریں، دادر اسٹیشن پر، تین اُس اسٹیشن پر۔ وہ کس کس کے پیچھے جائیں گے مگر جمرو بھول رہا تھا۔ وہ صرف اباجان پر نظر رکھیں گے۔ سامان اُن کے پاس بھی زیادہ نہیں ہونا چاہیے اور ایسے موقع پر تو وہ کسی چیز کی فکر نہیں کریں گے۔ اتنے طویل تعاقب کے بعد وہ اِس طرح ہمیں اپنے ہاتھ سے نہیں نکلنے دیں گے۔ لازماً اُن کے ذہن میں بھی یہ تمام صورتیں ہوں گی۔ اباجان اور منیر علی کی موجودگی میں ہم زیادہ پھرتی بھی نہیں کر سکتے۔ ورنہ چلتی گاڑی سے بھی اُترا جا سکتا تھا۔ بہر حال ٹھبل نے اُن دونوں کی مشکل آسان کر دی، اُس نے اُنھیں کسی اُلجھن میں نہ ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ ٹھبل کی بات میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ وہ اُنھیں اپنے تعاقب کا ہر موقع فراہم کرنا چاہتا تھا۔ ہم اُن کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے تو دوسری طرف وہ بھی ہمارے ہاتھوں سے نکل جاتے۔ جتنی اُنھیں ہماری ضرورت تھی، اُتنے ہی وہ بھی ہمیں مطلوب تھے۔

کرلا سے ابھی گاڑی چلی ہی تھی کہ مارٹی نے مختصر سا سامان سمیٹ لیا۔ اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ڈبے سے کود پڑے۔ "وہ دیکھو جمرو بھائی!" مارٹی بار بار جمرو کو متوجہ کر رہا تھا۔ "وہ دیکھو جمرو بھائی! وہ سامنے مٹھائی کا بڑا دکان نظر آ رہا ہے تم کو؟ رس گلا میں بنگال کو مار دیا ہے سالے نے۔ ایک دم فنٹاسٹک۔ معلوم ہے اس کو ایدر لوگ باگ کیا بولتا ہے؟"

"کیا بولتا ہے؟"

"حلوا بلوائی۔"

"حلوا بلوائی؟" جمرو نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں یہی تو سالا بات ہے۔ اِس کا نام تھا بلوا حلوائی، بلوا مل حلوائی کا تھوڑا اسارٹ۔ چھوکرا لوگ حرامی نے ایسا گھُٹالا کیا کہ ابھی سب دُور دُور حلوا بلوائی بولتا ہے۔"

"اِدھر اپنے فیض آباد میں بھی بالکل ایسا ہی ہے۔ اُدھر اپنے اڈے کے کنے ایک اندھا رہتا تھا کلن نام کا۔ سب اس کو اندھے کلن پکارتے تھے۔ کسی لونڈے لپاڑے سے ایک دن جلدی میں کلے اندھن منہ سے نکل گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ اب سب کلے اندھن بولتے ہیں۔ بہت چڑتا ہے۔ لاٹھی اُٹھا لیتا ہے پر بے چارہ ہوا میں گھما کے رہ جاتا ہے۔"

"دادر آ رہا ہے۔" ٹنگو نے مضطرب آواز میں مارٹی کو ٹہوکا دیا۔ "ماسٹر! سالا دادر آ رہا ہے۔"

دادر پر گاڑی ٹھیری تو لوگوں کا ایک ہجوم جیسے گاڑی پر جھپٹ پڑا۔ ایک ساتھ کئی قلی ہمارے ڈبے کی جانب لپکے۔ لگتا تھا، دادر ہی پر ساری گاڑی خالی ہو جائے گی۔ سارا اسٹیشن روشنیوں میں ڈوبا ہوا تھا اور ہر طرف سے شور اُمڈ پڑ رہا تھا۔ شور میں روشنی اور تیز ہو جاتی ہے۔ چند لمحوں بعد اباجان کانپتے اور منیر علی بھی اپنے ڈبے سے باہر آ گئے۔ سر سے کمر تک لپٹی ہوئی شال میں صرف اُس کا چہرہ نظر آ رہا تھا، جلتا ہوا چہرہ۔ مارٹی اور جمرو نے اُسے سہارا دینے کی کوشش کی۔ اُس نے

اُنھیں جھڑک دیا۔ وہ آہستہ آہستہ ڈبّے سے باہر آیا۔ چند قدم چلا تھا کہ لڑکھڑانے لگا۔ پیرو اُس کی کمر میں ہاتھ ڈال کے نہ پکڑ لیتا تو وہ یقیناً گر پڑتا۔ پیرو نے آگے لے جا کے اُسے ایک بینچ پر بٹھا دیا۔ برابر کے ڈبّے سے وہ دونوں بھی افراتفری کے عالم میں اُترے، اُن کے پیچھے پیچھے ادھیڑ اور نوجوان آدمی بھی تھے، اُن کی حالت اضطراری تھی لیکن جلد ہی اعتدال پر آ گئی۔ اسٹیشن سے باہر جانے کا راستہ خاصا طویل تھا۔ بھیڑ کسی حد تک چھٹی تو ہم نے آگے بڑھنے کا ارادہ کیا، کانتے کی وجہ سے ہمیں آہستہ آہستہ چلنا پڑا۔ اُن دونوں کی رفتار بھی اسی نسبت سے سُست ہو گئی۔ تھوڑی تھوڑی دُور بعد ہم چند قدم آگے نکل جاتے، پھر رُک کے کانتے کے آنے کا انتظار کرتے، اِس طرح ہمیں اُنھیں دیکھنے کا بھی موقع مل جاتا۔ وہ چاروں ساتھ ساتھ تھے۔ ادھیڑ اور نوجوان آدمی کے تیور ابھی تک ٹھیک معلوم نہیں ہوتے تھے۔ اچھا ہوا کہ اُنھوں نے جھڑکی پر ہی اکتفا کیا ورنہ بمبئی آ کے کسی کے ہاتھ ایسے جکڑے اور بندھے ہوئے نہیں رہے تھے۔

ابھی ہم گیٹ تک نہیں پہنچے تھے کہ ایک باوردی شخص گھبرایا گھبرایا اُن کے پاس گیا، اُس نے اُنھیں مؤدبانہ سلام کیا۔ جواب میں ادھیڑ آدمی نے کبیدگی کا اظہار کیا۔ وردی پوش طور طریق سے ڈرائیور معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے ادھیڑ آدمی کے ہاتھ سے چرمی کیس لے لیا اور اُن کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ ٹھل کی ہدایت پر مارٹی اور ٹنگو ہم سے پہلے باہر چلے گئے تھے۔ جب ہم گیٹ سے نکلے تو دو ٹم ٹمیں تیار کھڑی تھیں۔ ہم نے بیٹھنے میں عجلت نہیں کی، کچھ تو کانتے کے آنے کا انتظار کیا، کچھ ویسے ہی دیر لگائی۔ اِس تاخیر کا مطلب اُنھیں سواری حاصل کرنے کا موقع دینا بھی تھا۔ وہ دونوں گیٹ کے باہر تک ادھیڑ اور نوجوان آدمی کے ساتھ رہے۔ گیٹ کے باہر سائبان میں دونوں فریق ایک دوسرے سے پُرتپاک انداز میں تکرار کرتے رہے۔ ادھیڑ آدمی نے شاید اُنھیں اپنی گاڑی میں چلنے کی پیش کش کی تھی جسے رَد کرنا اُن کے لیے دشوار ہو رہا تھا تاہم وہ کامیاب ہو گئے۔ اُن کے باہمی تعلقات سے واضح ہو رہا تھا کہ یہ تعلق زیادہ دیرینہ نہیں ہے، صرف سفر کا ہے یا یہ خاص طور پر ہمارے لیے ایک دکھاوا ہے۔ بہرحال اُن دونوں کو جلدی تھی کہ کہیں ادھیڑ اور نوجوان آدمی کے شوقِ میزبانی میں ہم اُن کی نظروں سے دُور نہ ہو جائیں۔ ایک نے ادھیڑ آدمی سے معذرت کر لی اور آگے جا کے ٹم ٹم والے سے بات کر لی۔ ہم ابھی سو دو سو گز دُور آئے ہوں گے کہ پیچھے سے اُن کی ٹم ٹم آتی دکھائی دی۔ پھر دیر تک کم و بیش یہی فاصلہ برقرار رہا۔

ٹم ٹموں کا بالائی حصّہ کھلا ہوا تھا، اُن کی ٹم ٹم کا بھی۔ دس سے اوپر ہو چکے تھے۔ سڑکوں پر روشنی نہ اتنی زیادہ تھی، نہ اتنی کم۔ اکادکا دکانیں کھلی تھیں لیکن ایسا سنّاٹا بھی نہیں تھا۔ بمبئی میں سڑکوں پر رات گئے تک چہل پہل رہتی ہے۔ جگہ جگہ فٹ پاتھوں پر لوگوں کی ٹکڑیاں بیٹھی رہتی ہیں، کہیں تاش اور شطرنج کی بازیاں جمی ہیں، کہیں چوسر اور ڈرافٹ پر داؤ لگ رہے ہیں۔ آسمان کھلا ہوا تھا اور ہوا چل رہی تھی۔ نہ زیادہ گرم نہ سرد، حیدرآباد کے مقابلے میں کسی قدر گرم۔ ہماری گاڑیاں ایک سڑک سے دوسری سڑک پر مڑ گئیں۔ آگے والی ٹم ٹم میں پیرو بیٹھا تھا، اُس کے ساتھ شامو، کانتے اور زورا تھے۔ ٹنگو اور کوچوان کے پہلو میں دُبکا ہوا تھا۔ ہم میں سے جو کوچوان کی پشت سے لگی ہوئی تپائی جیسی چھوٹی گدّی پر بیٹھے تھے، اُن کے چہرے گزرنے والے راستوں کے رُخ پر تھے۔ وہ کسی قباحت کے بغیر پیچھے دیکھنے پر قادر تھے۔ میں بھی اسی رُخ بیٹھا تھا مگر دوسری گاڑی میں، ابّا جان، منیر علی، مارٹی اور ٹھل کے ساتھ۔ میں اور مارٹی مسلسل اُن پر نظریں رکھے ہوئے تھے۔ اُن کی گاڑی ہمارے پیچھے پیچھے آتی رہی۔ اُنھیں بہرصورت یہیں تک یا کچھ اور آگے تک آنے پر قناعت کرنی چاہیے تھی۔ ظاہر ہے، وہ اتنے بیوقوف نہیں ہوں گے کہ زیادہ دیر ہمارا تعاقب جاری رکھ کے خود کو ہماری نگاہوں میں طشت از بام ہو جانے کا اندیشہ یقین میں بدلیں۔ ہمارے کوچوان ذرا سی تگ و دو پر اُنھیں دوبارہ مل سکتے تھے اور ذرا سی بخشش پر ہمارے اُترنے کی جگہ کی نشان دہی کر سکتے تھے۔ اُن کی تلاش میں اُن کی ٹم ٹم کا کوچوان بھی اعانت کر سکتا تھا، اِس اثنا میں اُنھوں نے ہماری گاڑیوں کے نمبر اور دوسری نشانیاں بھی ذہن نشین کر لی ہوں گی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ جلد ہی کسی جگہ اُتر کے وہ اپنے کوچوان ہی کو ہم پر نگاہ رکھنے کی ذمّے داری سونپ دیں۔ کوچوان یہ کام بحُسن و خوبی انجام دے سکتا تھا۔

دادر کا پاڑا گزر گیا، اِس کے بعد ایک اور پاڑا بھی۔ پیرو نے ٹم ٹم ان پاڑوں سے دُور دُور رکھی۔ یہ اتفاق تھا کہ پاڑے کا کوئی آدمی ہمیں راستے میں نظر نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے اِس کی وجہ پولیس کی اُن دنوں کی سختی ہو۔ ویسے بھی رات ہو گئی تھی۔ اِس سے پہلے کہ وہ دونوں اپنی ٹم ٹم دوسرے راستے پر لے جائیں، پیرو کو کوئی قدم اُٹھا لینا چاہیے تھا۔ دادر ہی میں مولوی اکرم کا گھر تھا۔ ٹم ٹمیں اُس طرف جانے والے راستے کی طرف سے گزری تھیں لیکن آگے بڑھتی گئیں۔

آخر خاصا طویل چکر کاٹتے ہوئے ہم ماہم کے علاقے میں داخل ہو گئے، پیرو کے خاص علاقے میں۔ پاڑے کی عمارت سے کچھ دُور ماما پان والے کی دکان تھی۔ اپنے پاڑے کی طرف جانے کے بجائے پیرو ماما کی دکان کی طرف آ گیا۔ ٹم ٹم کی چھوٹی نشست پر بیٹھنے کی وجہ سے میں آگے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جب ٹم ٹم سامنے سے گزر کے آگے چلی آئی تب ماما کی جگ مگاتی دکان مجھے نظر آ سکی۔ ماما اپنے مخصوص انداز میں آلتی پالتی مارے چبوترے پر بیٹھا تھا، گیروا صافہ باندھے، گلے میں گیندے اور کوڑیوں کے ہار ڈالے، ململ کے براق کُرتے میں ملبوس۔ دکان پر چند گاہک بھی کھڑے تھے۔ دکان سے سو ڈیڑھ سو قدم دُور ہماری ٹم ٹم کو یکایک جھٹکا سا لگا، گھوڑے کی ہنہناہٹ اور منتشر ٹاپوں کی گونج کے ساتھ ہی ٹم ٹم کی رفتار سُست ہو گئی۔ آگے ضرور پیرو نے گاڑی ٹھہرانے کا حکم دیا ہو گا۔ میں نے اُترنے کا ارادہ کیا مگر پیرو کو اپنی طرف آتا دیکھ کے ٹھہر گیا۔ ٹھل نے بھی مجھے کوئی اشارہ نہیں کیا۔ گاڑی رُکنے پر ماما کی دکان کے گاہک بھی متوجّہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اُن میں سے دو فوراً پلٹ پڑے۔ اُنھیں دیکھ کے میری آنکھیں سٹ پٹا گئیں۔ وہ لچھمی اور گلّیا تھے، پیرو کے پاڑے کے خاص آدمی۔ ٹم ٹم رُکنے کی آہٹ پر اُن کے کان کھڑے [illegible]

دوسرے ہی لمحے اُن کی نظر اپنی طرف بڑھتے ہوئے پیرو پر پڑی، ایک ثانیے کے لیے تو وہ ہیبت زدہ رہ گئے، پھر بولے "دادا، دادا!" اُنھوں نے بے اختیار جست لگائی اور اُچھلتے، چیختے ہوئے اتنی تیزی سے پیرو کی جانب جھپٹے کہ اطراف میں کوئی بھی بے خبر نہ رہ سکا ہو گا۔ دونوں نے پہلے تو ہیجانی انداز میں پیرو کے پیر چھوئے پھر بے تحاشا اُس کے گلے سے لگ گئے۔ ابھی چند ثانیوں میں پیرو نے اُن سے کچھ کہا ہو گا، اُن کے جسم کا پارا بھڑک کے رہ گیا۔ اُن کے شانے تھپ تھپا کے اور گالوں کا بوسہ لے کے پیرو فوراً پلٹا مگر ماما نے اُس کا راستہ روک لیا۔ ماما چبوترے سے اُتر آیا تھا، اُس نے اپنے ہاتھ سے پیرو کے منہ میں پان کا بیڑا رکھا اور ہاتھ جوڑ کے خیریت پوچھنے لگا۔ پیرو نے نہایت رسمی طور پر جواب دیا اور اُسے وہیں چھوڑ کے اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اتنی دیر میں اُن دونوں آدمیوں کی گاڑی آگے نکل گئی، اُسے نکل ہی جانا چاہیے تھا، رُکنے یا پلٹ کے دیکھنے کا محل نہیں تھا۔ آگے چلے جانے پر بھی اُنھوں نے مڑ کے ہماری طرف نہیں دیکھا، اُن کی ٹم ٹم سُست ہوئی۔ قریب آنے پر میں نے اُنھیں غور سے دیکھا تھا، اُن کے چہرے بالکل بے حس تھے لیکن اُن کی نظریں ظاہر ہے کہ ہم پر منڈلا رہی ہوں گی۔ لچھمی اور گلّیا کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر چل پڑے تھے۔ چاقو پر اُن کا ہاتھ رواں تھا اور زور آزمائی خوب کر لیتے تھے۔ دونوں جسم کے پھرتیلے تھے مگر ٹھل کے بہ قول اصل پھرتی تو نگاہ کی ہوتی ہے اور دماغ کی حاضری کی۔ آنکھ سر کے پاس ہی رہنا چاہیے۔ پیرو نے اُن سے صرف چند لفظ کہے ہوں گے، وہ اچھی طرح جانتا ہو گا کہ اُن سے کس قدر بات کرنے کی ضرورت ہے۔ دکانوں کے آگے سائبان میں وہ دونوں ہمیں آگے جاتے نظر آئے پھر نگاہ سے اوجھل ہو گئے۔ ماما کی دکان سے اگلے موڑ پر ہم نے بھی راستہ بدل دیا اور سیدھی سڑک پر جانے کے بجائے بائیں جانب مڑ گئے۔ ٹم ٹمیں باندرے کی طرف بڑھ رہی تھیں کہ ایک ایرانی چائے خانے کے نزدیک پیرو نے اُنھیں چھوڑ دیا پھر چند قدم پیدل چل کے ہم چائے خانے میں داخل ہو گئے۔ اندر بڑے ہال میں صرف چند لوگ بیٹھے تھے۔ نہ شور غل تھا، نہ روشنی ایسی تیز تھی۔ یہ ہر اعتبار سے ایک صاف ستھرا چائے خانہ تھا۔ نیا کھلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ رات کا کھانا کسی نے نہیں کھایا تھا مگر سبھی نے انکار کر دیا، چائے کے ساتھ بسکٹ وغیرہ کے سوا کسی نے کچھ نہیں کھایا۔

سب کرسیوں پر پھیل کے بیٹھ گئے۔ ہوٹل والے نے صاف تولیا فراہم کر دی تھی۔ منیر علی اور کانتے کے سوا سبھی نے منہ پر چھپکے مارے، بالوں میں کنگھی کی اور ہاتھ پیر کھولنے، انگڑائیاں لینے لگے۔ یہ نیند کی نہیں، بیداری کی انگڑائیاں تھیں، جیسے صبح طلوع ہو گئی ہو۔ صبح ایک کیفیت کا بھی تو نام ہے جس کے لیے کسی خاص وقت کی شرط نہیں۔ بھری دوپہریا میں بھی یہ کیفیت طاری ہو سکتی ہے۔ اُن کے چہرے تازہ تازہ لگ رہے تھے اور آنکھیں روشن روشن۔ چائے خانے میں داخل ہوتے وقت میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ پیرو نے گاڑیاں کیوں چھوڑ دی ہیں اور اِس وقت اِس عالم میں اُسے چائے نوشی کا شوق کیوں چرایا ہے۔ جمرو نے بھی منہ بنایا تھا، مارٹی نے بھی شانے اُچکائے تھے مگر پیرو بے سبب یہاں نہیں آیا تھا۔ اِس کا اندازہ کچھ دیر یہاں فراغت سے بیٹھنے کے بعد ہوا۔ پیرو کو بھی اپنی بیوی اور بیٹی کو ایک نظر دیکھ لینے کی بے کلی ہو گی لیکن بہتر یہی تھا کہ ذرا سانس لینے کی مہلت تو مل جائے، کسی چھاؤں میں بیٹھ کے دم لینے کا وقفہ۔ زندگی میں بار بار ایسے وقفوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ انسان ہی کو کیا، مشینوں کو بھی۔ اگر محض سفر کا غبار ہوتا تو کوئی بات نہ تھی۔ یہ تو نشانوں سے بچ آنے کی حیرت تھی۔ یوں تو ہر آنے والا لمحہ موت کا لمحہ ہوتا ہے، ہر لمحے آدمی نئی زندگی پاتا ہے مگر آدمی کو فکر نہیں ہوتی، جانے کیوں اُسے اُنھی لمحوں کی فکر ہوتی ہے جو چھُپ کے نہیں آتے، عیاں ہو کے آتے ہیں، منادی کر کے۔ ابّا جان، منیر علی اور کانتے پر یہ لمحے نہیں گزرے تھے سو اُن کے چہروں پر ایسی شگفتگی بھی نہیں تھی جو کچھ پانے کے بعد ہوتی ہے یا کچھ ٹل جانے کے بعد۔ بہت سا عذاب تو جاننے نہ جاننے کا ہوتا ہے۔

چائے خانے کی گھڑی میں گیارہ بج رہے تھے۔ ٹھل نے ابّا جان کو مشورہ دیا کہ اِس وقت گھر جانے کے بجائے رات کسی ہوٹل میں گزار دی جائے۔ یہ وقت کنڈیاں کھٹکھٹانے کے لیے نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ ابّا جان کسمسانے لگے اور تقریباً سبھی۔ کانتے کو بھی علاج اور آرام کی ضرورت تھی۔ ٹھل نے میری طرف دیکھا، میں بھلا کیا جواب دیتا، جب بھی گھر جانے کا خیال آتا تھا، میری رگوں میں اینٹھن ہونے لگتی تھی۔ سب کے کپڑے میلے اور شکستہ ہو گئے تھے۔ ٹھل کی رائے غلط نہیں تھی مگر پھر اُس نے خود ہی اُٹھنے میں دیر نہیں لگائی۔ سبھی ہوٹل سے باہر آ گئے۔ سڑکوں پر آمد و رفت اور کم ہو گئی تھی۔ ایک گشتی پولیس والا تیز قدموں سے ہمارے قریب آیا مگر ابّا جان اور منیر علی کے علاوہ ہمارے ہمراہ سامان دیکھ کر کچھ پوچھے بغیر آگے بڑھ گیا۔ مارٹی اور شامو سواری ڈھونڈنے گئے ہوئے تھے۔ کانتے کو ایک دکان کے چبوترے پر بٹھا دیا گیا تھا۔ مارٹی اور شامو دیر سے آئے لیکن گاڑیاں لے کے ہی آئے۔ ٹھل نے زورا، مارٹی، شامو، ٹنگو اور کانتے کو ایک ٹم ٹم میں بیٹھ جانے کی ہدایت کی اور کہا کہ وہ کانتے کو جولین کے گھر لے جائیں، مارٹی اُس کے ساتھ رُک جائے، باقی سب پاڑے چلے جائیں۔ کانتے ضد کرنے لگا کہ اُس کی طبیعت نسبتاً بہتر ہے، وہ ہمارے ساتھ ہی چلے گا لیکن ٹھل نے اُسے ٹم ٹم میں دھکیل دیا۔ ابّا جان نے گو دبے لہجے میں ٹھل سے کہا کہ سب کے ساتھ چلنے میں کوئی حرج نہیں، اُن کا مکان اتنا تنگ نہیں ہے اور پھر ایک ہی رات کی تو بات ہے لیکن ٹھل آمادہ نہیں ہوا۔ وہ سب بادلِ ناخواستہ رخصت ہو گئے۔ اِس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ میرا بھی جی نہیں چاہتا تھا مگر اتنی رات کو اتنے بہت سے آدمیوں کا قافلہ مولوی اکرم کے گھر لے جانا مناسب نہیں تھا۔ اب بھی ہم پانچ آدمی تھے۔ اُدھر جولین کا گھر بھی اتنا چھوٹا نہیں تھا، ہاں بہت بڑا بھی نہیں تھا۔ وہاں جمیا بیگم کے علاوہ شہ پارہ بھی تھی، اسی لیے ٹھل نے کانتے اور مارٹی کے سوا باقی سب کو پاڑے جانے کی تاکید کی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ جولین اِس وقت اُنھیں کہیں اور جانے ہی نہ دے۔

ہم دوسری ٹم ٹم میں بیٹھ گئے۔ میں پیرو سے کہنا چاہتا تھا کہ پہلے اُسے اپنی بیوی اور بیٹی کے پاس جانا چاہیے مگر اُس کی ناراضی کے ڈر سے میری ہمت

نہیں پڑی۔ اباجان نے کوچوان کو دادر کا پتہ بتایا اور ہم دوبارہ اُنھی سڑکوں پر آ گئے جہاں سے ہم ابھی تھوڑی دیر پہلے گزر چکے تھے۔ سڑکیں صاف ہونے کی وجہ سے ٹم ٹم کی رفتار بھی تیز تھی۔ ٹاپیں چاروں طرف گونج رہی تھیں۔ پیرُو نے مجھے اپنے بازو میں جکڑ رکھا تھا اور بار بار ترچھی نظروں سے مجھے دیکھنے لگتا تھا۔ وہ ... اباجان اور منیر علی کی بھٹکتی نگاہیں بھی کبھی پر آ کے ٹِک جاتیں۔ ٹم ٹم ... کے ساتھ میرا جسم بھی کسی شکنجے میں کَستا جا رہا تھا۔ میں نے اپنے حواس بیدار رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن کسی بھی لمحے سب کچھ بکھر سا جاتا۔ ٹم ٹم تیز رفتاری سے اُس گھر کی طرف بڑھ رہی تھی جہاں وہ سب تھے، میری فرخ، فریال، فارحہ اور اکبر۔ مجھے یہ سب جھوٹ معلوم ہو رہا تھا جیسے اباجان اور وہ سب مجھ سے کوئی مذاق کر رہے ہوں۔

نہیں معلوم ٹم ٹم کتنی دیر تک چلتی رہی، کن کن راستوں سے گزرتی رہی۔ میری آنکھوں کے سامنے تو کبھی امی کی صورت آ جاتی، کبھی فرخ کی۔ امی باورچی خانے میں بیٹھی چلا رہی ہیں، فمی میرے سر کی مالش کر رہی ہے۔ اُدھر آنگن میں ... فرخ، فریال سے کلامِ پاک سُن رہی ہے۔ سب کو شکایت تھی کہ امی سب سے زیادہ میرا خیال رکھتی ہیں، باقی سب جیسے سوتیلے ہوں۔ امی نے یہ ثابت بھی کر دکھایا۔ اپنے سگے بیٹے کے اِس طرح روپوش ہو جانے کے بعد وہ کیسے زندہ رہتیں۔ اُنھیں تو مر ہی جانا چاہیے تھا۔ میری آنکھوں میں سارا گھر گھوم رہا تھا، گھر کی ایک ایک چیز۔ فمی کو چیزیں سلیقے سے رکھنے، آتش دان کا کارنس، طاقیں اور الماریاں آراستہ کرنے کا بہت شوق تھا۔ گل دان میں پھول سجا رہی ہے۔ گملوں میں نئے پھول کھلے دیکھ کے خوش ہو رہی ہے۔ کسی نے ادھ کھلا پھول توڑ لیا تو ناراض ہونے لگی۔ بیٹھک کی چوکی پر چادر ذرا سی میلی ہوئی اور بدل دی۔ کپڑے بھی وہ ہمیشہ بے داغ پہنتی تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر اُس کا چہرہ کِھل اُٹھتا اور کُمھلا جاتا۔ وہی فمی اتنی بے تھر ہو گئی تھی کہ لوگوں کے سامنے ناچنے گانے لگی۔ اُس کا محفل میں سج بن کے آنا اور مجھے دیکھتے ہی کھڑکی سے چھلانگ لگا دینا..... میری آنکھوں میں جب بھی یہ منظر اُبھرتا، میرے وجود میں اُتر جاتا، سینہ جیسے کوئی کھرچنے لگتا۔ وہ دوسروں کے لیے چاہے کتنی ہی بدل گئی ہو مگر اپنے بھائی کے لیے تو فمی ہی تھی۔ بالاخانے پر جانے کے باوجود وہ شیشے کی رہی، پھولوں کی رہی۔ سب کچھ اُس نے کسی آڑے میں کسی خاص وقت کے لیے چھپایا ہوا تھا۔ گھر میں اب فرخ، فریال، فارحہ اور اکبر کے سامنے کس منہ سے جا رہا ہوں؟ میں نے تو اُن کا سب کچھ چھین لیا ہے۔ میرے جی میں آئی کہ ٹم ٹم سے کود پڑوں اور بس بھاگتا رہوں۔

کسی چوراہے پر اباجان نے کوچوان کو کسی سمت مڑنے کے لیے کہا۔ میں بیٹھے بیٹھے چونک پڑا۔ ٹم ٹم نے چوراہے سے تھوڑا فاصلہ عبور کیا ہوگا کہ اباجان نے گاڑی روک دینے کا حکم دیا۔ میرے دل کی دھڑکن معدوم ہونے لگی۔ میں نے سر اُٹھا کے دیکھا تو ٹم ٹم ایک تین منزلہ عمارت کے سامنے کھڑی تھی۔ عمارت احاطے کے اندر تھی۔ یہ وہ جگہ نہیں تھی جہاں مولوی اکرم کا گھر تھا۔ سب نیچے اُترنے لگے تو پیرُو نے میرا بازو پکڑ کے ایک جھٹکے سے مجھے اُٹھا دیا۔ احاطے کا دروازہ بند تھا۔ آہٹ سُن کے دربان فوراً کسی طرف سے نمودار ہو گیا۔ اباجان نے مضطرب آواز میں اُس سے گیٹ کھولنے کے لیے کہا۔ دربان ہمیں متجسس نظروں سے دیکھنے لگا۔ احاطے میں روشنی کم تھی اور عمارت دروازے سے کچھ فاصلے پر تھی، بنگلے جیسی عمارتوں سے مختلف اطراف میں اونچے اونچے درخت کھڑے تھے۔ دربان کے مذبذب پر اباجان نے مولوی اکرم کا نام لیا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں کہ کہیں دربان جواب میں کچھ اور نہ کہہ دے۔ اُس نے جواب دیا کہ اِس وقت تو سب سو رہے ہیں۔

"اُنھیں جا کے بتاؤ کہ مہمان آئے ہیں۔" اباجان کی آواز میں حکم تھا۔

دربان نے چند لمحے تامل کیا پھر کوئی حجت کیے بغیر احاطے میں گیا اور عمارت کے دائیں جانب مڑ گیا۔ اوپر نیچے، ہر منزل کی کھڑکیوں سے دھیمی دھیمی روشنی جھلک رہی تھی اور ہر طرف سکوت تھا۔ دربان کی واپسی تک ہم خاموش کھڑے رہے۔ دربان اکیلا نہیں آیا تھا۔ آنکھیں ملتا ہوا، کُرتے پاجامے میں ملبوس ایک عمر رسیدہ شخص بھی لپکتے جھپکتے قدموں سے اُس کے ساتھ آیا تھا۔ وہ مولوی اکرم کے سِوا کون ہو سکتا تھا اور وہ مولوی اکرم ہی تھے۔ وہ بہت سراسیمہ نظر آ رہے تھے۔ "کون! کون صاحب ہیں؟" دروازے کے پاس آنے سے پہلے اُنھوں نے بدحواسی سے پوچھا۔

"ہم ہیں اکرم میاں!" اباجان کی آواز بھی لرز رہی تھی۔

"کون، کون؟" وہ اضطراری لہجے میں بولے پھر جیسے ہی اُن کی نظر اباجان پر پڑی، وہ سٹ پٹا سے گئے۔ "آپ؟ آپ ہیں صمد بھائی! آپ ہی ہیں نا؟"

دربان نے دروازہ کھول دیا۔ اِس سے پہلے کہ اباجان اندر داخل ہوتے، مولوی اکرم تیزی سے باہر آئے اور اباجان کے سامنے ہو کے اُنھیں گھورنے لگے۔ اباجان نے بازو پھیلا کے اُنھیں سینے سے لپٹا لیا۔

مولوی اکرم کی حالت ہیجانی تھی۔ وہ کبھی اباجان کو دیکھتے، کبھی ہمیں۔ اُنھوں نے متوحش انداز میں دربان کو ہدایت کی کہ وہ اندر جا کے کمرہ کھلوائے۔ دربان اندر جانے لگا تو اُنھوں نے آواز دے کے سامان اُٹھانے کو کہا اور بولے۔ "چلیے، چلیے، اندر چلیے۔"

مولوی اکرم کا اضطراب دیکھ کے میرے سر میں طرح طرح کے وہم رینگنے لگے۔ اباجان کی آمد جیسے اُن کے لیے عجوبہ ہو۔ تبت سے اباجان کی واپسی کوئی عجوبہ ہی تھی مگر وہ مولوی اکرم کو تو اپنی منزل اور مقصد تک نہیں گئے ہوں گے۔ اُنھیں تو وہ اپنی جلد واپسی کا پورا یقین دلا گئے ہوں گے۔ مولوی اکرم کو تو معلوم نہیں ہوگا کہ کہاں کہاں کی خاک چھان کے، کن کن دشوار گزار گھاٹیوں اور پہاڑوں کو عبور کر کے اباجان واپس آئے ہیں۔ موت اُن کے قریب سے آ آ کر گزر گئی ہے۔ تبت میں اُن کے پیچھے اگر ہم نہ پہنچتے تو تھپڑوں سے بھرے صندوقوں کے ساتھ اُن کی واپسی معجزے سے کم نہ ہوتی۔ ہم احاطے میں داخل ہو گئے۔ میرے قدم بہک رہے تھے۔ پیرُو میری کمر میں ہاتھ ڈالے چل رہا تھا۔ اُس کا ... میرے لیے کسی سُتون کی حیثیت رکھتا تھا۔

... اُس وقت ... میں نے دیکھا کہ اباجان کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہیں ہے، اُن ... کپکپا رہے تھے، ہاتھوں پیروں میں بھی لرزش صاف نظر آ رہی تھی۔ مجھے ... تھی کہ اباجان کو آخر کیا ہو گیا۔ یہ تو کسی اور مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ جو شخص ... تین نوخیز لڑکیوں اور ایک نوعمر لڑکے کو ایک اجنبی شہر میں کسی غیر کے سپرد کر کے ... زر کی تلاش میں نکل جائے، اُس سے بڑا طاقت ور کون ہو سکتا ہے ... کہ اِس دربدری میں اُس کی ایک نوجوان لڑکی گھر سے غائب ہو گئی ہو اور ... جواں سال لڑکا مفقودالخبر ہو چکا ہو۔ لڑکی اور لڑکے کی گم شدگی درگزر ... وہ کاغذوں پر جھکا ہزاروں میل دور زمین دوز دفینے کی پہیلیاں بوجھ رہا ... پے صدموں سے جس کا جوشِ جنوں اور سِوا ہو گیا تھا، اُسی کو اب یہ کیا ... رہا ہے؟ اندر جا کے کوئی بھی خبر سننے کو مل سکتی ہے۔ کیا اباجان کو پہلے اِس کا ... احساس نہیں تھا؟ اب اُن کے چہرے پر کیوں رنگ بدل رہے ہیں۔ مولوی اکرم ... کے سگے رشتے دار تو نہیں ہیں۔ ایک عمر رسیدہ اور بے وسیلہ شخص کس حد ... اِس نگرانی کا بوجھ اُٹھا سکتا ہے۔ اِس عرصے میں مولوی اکرم کو کچھ بھی ہو سکتا ... اگر اُنھیں کوئی سانحہ پیش آ جاتا تو؟ اباجان کو اپنے غیاب میں تمام دنیا جُوں کی تُوں رہنے کا اتنا یقین کیوں تھا۔ معاً جیسے کسی نے میرے سینے پر کہنی ماری، تو ... تو اُسی باپ کا بیٹا ہے۔ کہتے ہیں، خون میں بڑی تاثیر ہوتی ہے۔ تُو نے گھر چھوڑتے ... کسی کا خیال کیا تھا؟ تُو نے تو ایک بار بھی لوٹ کے نہیں پوچھا۔ جیل سے ... اگر تُو اپنی خیریت کے دو لفظ گھر لکھ بھیجتا تو تیری ماں شاید کچھ دن اور ... رہ لیتی۔

نچلی منزل کا دروازہ کھول دیا گیا۔ وہ کوئی ادھیڑ عمر ملازم تھا جس نے آگے ... دربان کے ہاتھوں سے سامان لیا۔ اُس نے بڑے حیران و پریشان انداز میں ... سلام کیا۔

"سب ٹھیک ہے ناجانی؟" پیرُو نے بُدبُداتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"ہاں دادا!" میری آواز حلق میں پھنسی ہوئی تھی۔

"کوئی خط پتر تو آنے کا لکھ دیا ہوتا۔" مولوی اکرم نے منتشر لہجے میں اباجان ... کہا۔ "کیا سیدھے اسٹیشن سے آ رہے ہیں؟"

"ہاں اکرم میاں!" اباجان نے بے ترتیب آواز میں جواب دیا۔ "سوچا اب ... ہی ملیں گے۔ خط سے بچے پریشان ہو جاتے۔"

"ہاں ہاں۔" مولوی اکرم اُلجھے ہوئے لہجے میں بولے۔

"سب خیریت تو ہے؟" اباجان کو کوئی خوف ہی تھا جبھی اُن سے ... اشت نہیں ہوا۔

"سب اللہ کا شکر ہے۔" مولوی اکرم نے گہری سانس بھر کے جواب دیا۔ ... کی آواز شکستہ تھی۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔

احاطہ عبور کر کے ہم ایک کشادہ کمرے میں آ گئے، یہاں آرام کرسیاں اور صوفے پڑے تھے۔ ایک طرف دیوار سے چوکی لگی ہوئی تھی۔ اُس پر مخمل کی چادر بچھی تھی اور گاؤ تکیے رکھے تھے۔ ملازم نے پنکھا چلا دیا۔

"آپ کچھ کمزور معلوم ہو رہے ہیں؟" اباجان نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بے چینی سے کہا۔

"سمجھیے، بس دَم اٹکا ہوا تھا۔"

"کیوں! خدا نہ کرے، کیا بات ہے؟"

"آپ بہت بڑی ذمّے داری سونپ گئے تھے۔" مولوی اکرم نے بُجھی ہوئی آواز میں کہا۔

"کسی اور کو سونپ کے تھوڑی گئے تھے اکرم میاں!"

"بس ہر دَم دعا مانگتا تھا کہ مولا سُرخ رُو ہی رکھے مگر مجھے اتنا اندازہ نہیں تھا۔"

"ہاں اکرم میاں!" اباجان نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ "ہم بہت مجبور تھے۔ بہرحال، بچے کیسے ہیں، کہاں ہیں وہ؟"

میری سانس رُک گئی۔ مولوی اکرم نے شکوہ کُناں انداز میں جواب دیا کہ سو رہے ہیں۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے سارے جسم میں روشنی بھر گئی ہو۔

"اُنھیں اطلاع کر دیجیے۔" اباجان نے مچلتی آواز میں کہا۔

"آپ خود اندر چلے جائیے۔ دیکھ کے حیران رہ جائیں گے۔"

"اباجان نے ایسے ہاتھ اُٹھایا جیسے کہہ رہے ہوں کہ اُنھیں یہیں بلا لیجیے۔

"یہاں؟" مولوی اکرم نے شش و پنج سے کہا پھر ہم سب کی طرف دیکھتے ہوئے کسمساتے لہجے میں بولے۔ "معاف کیجیے، آپ صاحبان سے تو سلام دعا ہوئی ہی نہیں۔"

"سب اپنے ہیں اکرم میاں! سب اپنے ہیں۔" اباجان نے جلدی سے کہا۔ "آپ کو اِن سے مل کے واقعی مسرت ہوگی۔"

"بے شک، بے شک۔" مولوی اکرم نے تذبذب سے کہا۔ وہ ہم سے معذرت کرنا چاہتے تھے مگر اُسی وقت دروازے کی طرف سے بھاگتی چاپیں اور ہلکی ہلکی سرگوشیاں سنائی دی دیں۔ ایک لمحے کے لیے میرا جسم جھنجھنا اُٹھا پھر دروازے کا پردہ ہٹا کے ایک لڑکا بے تابانہ اندر داخل ہوا۔ وہ اکبر تھا۔ اباجان کرسی سے کھڑے ہو گئے۔ وہ اُن کے قریب آ کر ٹھٹک گیا۔ شاید اُسے ہم لوگوں کی موجودی کا احساس ہو گیا ... اباجان نے بڑھ کے اُسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ اکبر اُن کے سینے سے چمٹ کے ہڑکنے لگا۔ اباجان کے منہ سے لفظ نہیں نکل رہے تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے بھی پتنگے سے ناچ رہے تھے۔ وہ کتنا بڑا ہو گیا تھا، دبلا پتلا، چھڑی جیسا۔

پردے کے پیچھے سے بھن بھناتی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ وہ یقیناً وہی ہوں گی۔ "آجاؤ، سب اندر آجاؤ۔ یہاں کوئی غیر نہیں ہے۔" اباجان نے ہذیانی انداز میں کہا۔ "دیکھو، دیکھو تو کون کون آیا ہے۔"

"آجاؤ بیٹا! اندر ہی آجاؤ۔" مولوی اکرم نے اُٹھ کے پردہ کھینچ لیا۔ مجھ پر بس بجلی سی گر نہ رہ گئی، وہ تینوں سامنے کھڑی تھیں۔ چند لمحوں تک تو نہ میں کچھ دیکھ سکا، نہ سُن سکا۔ میرا دل اتنی زور سے دھڑکا کہ میں اُچھل پڑا۔ پھر جب آنکھیں

اور کان کچھ دیکھنے اور سننے کے قابل ہوئے تو میں نے دیکھا کہ وہ ابا جان کے سینے میں سمائی ہوئی ہیں اور بُری طرح سسکیاں بھر رہی ہیں۔ ابا جان نے اُنھیں آغوش میں چھپا لیا۔

پیرو مجھے جکڑے ہوئے تھا۔ "دیکھا جانی، دیکھا!" اُس کی دھڑکتی آواز میرے کانوں میں سن سنا رہی تھی۔ "اپن کیا بولتا تھا۔" میں نے وحشت زدہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں اور ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔

مولوی اکرم نے ابا جان کی کمر پہ ہاتھ رکھ کے اُنھیں چوکی پر بٹھا دیا۔ وہ تینوں بھی ابا جان کے پہلو میں سمٹ گئیں۔ اکبر اُن کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ ابا جان ٹوٹی پھوٹی آواز میں مسلسل اُنھیں باور کرا رہے تھے کہ اب وہ آگئے ہیں، اب اُنھیں کہیں نہیں جانا، بس اب وہ اُنھی کے ساتھ رہیں گے۔

نجھل اور منیر علی ایک طرف خاموش بیٹھے تھے۔ ابا جان کو کچھ دیر کے لیے ہم میں سے کسی کا خیال نہیں آیا۔ وہ کبھی فرخ کی پیشانی کا بوسہ لیتے، کبھی فارہہ کے سر پہ ہاتھ رکھتے۔ اُن کا عالم دیدنی تھا۔ ایک طرف وہ اُنھیں تسلی تشفی دے رہے تھے، دوسری طرف خود اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ یک لخت اُنھیں کچھ خیال آیا، اُنھوں نے ہڑبڑا کے میری جانب دیکھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے مگر پیرو نے ہاتھ کے اشارے سے اُنھیں روک دیا۔ ابا جان کے ہونٹ پھڑپھڑا کے رہ گئے۔ فرخ اور فریال سر جھکائے بیٹھی تھیں لیکن مجھ پر بار بار اُن کی نظریں اُٹھ رہی تھیں، پھر فرخ سر جھکائے بیٹھی نہ رہ سکی۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھیں اور پھیل گئیں، پھٹی ہوئی دہشت زدہ آنکھیں، وہ بت سی بن گئی۔ میرا سینہ اُمڈ رہا تھا۔ پیرو نے مجھے روکے رکھا، ویسے بھی میرے ہاتھ پاؤں سے جان کھنچی جا رہی تھی۔ معاً فرخ بے اختیار اُٹھ کھڑی ہوئی۔ مجھ سے بھی نہ رہا جا سکا۔ مجھے کچھ نہیں معلوم کہ کیا ہوا، دوسرے ہی لمحے وہ مجھ میں پیوست تھی اور میرا سارا جسم پگھل رہا تھا۔ میری آنکھوں سے آگ سی برس رہی تھی۔

کمرے میں دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

مجھے ایسا لگا جیسے کوئی طویل خواب دیکھتے دیکھتے میری آنکھ کھل گئی ہو۔ مولوی اکرم سرہانے کھڑے میرے سر پہ ہاتھ پھیر رہے تھے۔ میں ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھا، ہکلاتی زبان سے میں نے اُنھیں سلام کیا۔

"جیتے رہو۔" وہ مسکرائے۔ "سوچا، اب تمھیں اُٹھا ہی دیا جائے۔ اتنی دیر سو لیے ہو کہ تھوڑی بہت کسل تو دور ہو گئی ہوگی۔ کیسی نیند آئی؟"

"مجھے تو ہوش ہی نہیں رہا۔"

"ہوش کیسے رہتا، برسوں کی نیند تھی۔"

"کیا وقت ہوا ہے؟"

"ایک بج رہا ہے۔"

"ایک بج رہا ہے؟" میں نے تعجب سے کہا۔ "باقی لوگ کہا[ں]"

"سب بیٹھک میں تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔"

"میرا انتظار؟"

"کھانے کا وقت ہو رہا ہے میاں! اسی وجہ سے تو میں نے تمھ[یں]"

"نہیں نہیں! بے آرامی کیسی۔" میں بستر سے اُٹھ کے کھڑا ہو گ[یا]

آتا ہوں۔"

کہنے لگے "اطمینان سے آؤ، ایسی جلدی بھی نہیں ہے، نہا[کے]

طرح تیار ہو کے آؤ۔ صابن تولیا غسل خانے میں موجود ہے اور کپڑے

میز پر رکھے ہیں۔"

"میرے کپڑے؟"

"صبح ہی اُنھوں نے بکسا کھول لیا تھا۔ اُنھوں نے ہی ب[ہ]

بہ مشکل ایک دو گھنٹے بستر پر کمر لگائی ہوگی۔ مجھے تو اس میں بھی شک[ہے]

"کہاں ہیں وہ؟"

"کہاں ہیں! تتلی کی طرح گھر میں تھرک رہی ہیں۔ آج[تو پاؤں]

ہی زمین پر نہیں ٹک رہے۔ سارے گھر کا نقشہ بدل دیا ہے۔ بار بار یہا[ں]

دیکھ جاتی تھیں۔ سب کو سختی سے تاکید تھی کہ ذرا بھی شور نہ ہو، بھا[ئی جاگ]

جائے گی۔ اللہ اللہ۔ پہلی بار آج میں نے اُن کے چہروں پر یہ شادا[بی دیکھی]

ہنسنا تو وہ بھول ہی گئی تھیں۔ کیا بتاؤں، کیسے کیسے جتن کرتا تھا، کیا کیا[...]

لیکن بس ایک دو دن اثر ہوتا تھا، پھر وہی حالت۔"

میں نے اُن کا شکریہ ادا کرنا چاہا لیکن خاموش رہا۔

"مجھے اب سکون سے موت آسکے گی۔"

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔"

"ہاں میاں! سچ جانو، سر پر پہاڑ کا سا بوجھ تھا۔ بمبئی جد[ی]

بالیوں کا ساتھ، آدمی یہاں کم بستے ہیں، دندے اور وحشی زیادہ۔[یہاں رہنا]

ہونا عذاب ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے، میں نے کیا کیا منتیں مانی تھیں[تمھاری]

کی بہ سلامت واپسی کے لیے۔ سمجھو کہ مجھے سب کچھ مل گیا۔ خدا نے م[یری]

رکھ لی۔ اُس کا اس سے بڑا کرم کیا ہو سکتا ہے کہ اُس نے نہ صرف [تم]

کو بہ خیر و عافیت اپنے گھر بھیج دیا بلکہ تمھیں بھی اُن سے ملوا دیا۔ سب[...]

ہے اور اُن سے بھی میں بس یہی کہتا تھا کہ اپنے اللہ سے لو لگا[ئے رکھو، اُس]

کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں۔" مولوی اکرم کی آواز بھرا گئی پھر وہ چو[نکے]

"میں بھی یہ کیا بے وقت کا دکھڑا لے بیٹھا۔ تم تیار ہو جاؤ، تمھارے آنے[...]

لگے گا۔ آج تو باورچی خانے کے بھاگ جاگ گئے ہیں۔ صبح سے گھُسی[ہوئی طرح طرح]

کے پکوان بنا رہی ہیں۔ غریبوں میں مٹھائی بھی بھیجی ہے۔ جانے کیا کیا[...]

کر رہی ہیں۔ کسی کو قرار نہیں ہے، اُن کی بہن ریحانہ بھی اُن کے سا[تھ]

ہے۔ سب جیسے پاگل ہو گئی ہیں۔"

مولوی اکرم کے جاتے ہی میں نے غسل خانے کا رُخ کیا۔ میرا ارادہ ہاتھ منہ دھو کے کپڑے پہن لینے کا تھا لیکن سفر کی دھول سر میں اٹی ہوئی تھی۔ میں نے جلدی جلدی غسل کیا اور کپڑے بدل کے بیٹھک میں آگیا۔ بیٹھک کی ترتیب ہی بدلی ہوئی تھی۔ کرسیاں، صوفے ایک طرف کر دیے گئے تھے اور سارے فرش پر چاندنی بچھی تھی، گاؤ تکیے لگے تھے۔ درمیان میں بڑا سا پیچوان بھی رکھا تھا۔ نجھل گاؤ تکیے سے کمر لگائے حقے کے کش لگا رہا تھا۔ اکبر اُس کے پہلو میں دُبکا بیٹھا تھا۔ منیر علی نہیں تھے، پیرو تھا۔ اُسے وہاں دیکھ کے مجھے حیرت ہوئی۔ وہ ابھی تک اپنے گھر نہیں گیا تھا۔ کمرے میں میرے قدم رکھتے ہی اُس نے اُٹھ کے مجھے گلے لگا لیا اور گدگدانے، قہقہے لگانے لگا۔ اُس نے ابا جان کا خیال بھی نہیں کیا۔ میرے آنے کی دیر تھی، وہ تینوں بھی چلی آئیں۔ سب نئے کپڑے پہنے ہوئے تھیں، ستارے جڑے دوپٹے، لمبا کرتا اور چھوٹی مہری کا پاجامہ۔ صبح کوئی چار بجے مولوی اکرم نے مجھے اُن کے پاس سے اُٹھا دیا تھا۔ نہ اُن کا جی مجھ سے الگ ہونے کو چاہتا تھا، نہ میرا۔ رات بھر وہ تینوں میرے جسم و جاں کا جزو بنی بیٹھی رہیں۔ فارہہ اور اکبر میرے شانوں کو تکیہ بنائے ہوئے تھے۔ اُن کا بس نہیں چلتا تھا کہ مجھ میں سما جائیں۔

کسی نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا، کوئی شکوہ کوئی سوال نہیں کیا۔ نہ یہ پوچھا کہ میں اتنے دنوں تک کہاں مارا مارا پھرتا رہا، میں کون سی کھوہ میں چھپ گیا تھا۔ پوچھتیں تو میں تب بھی کیا بتا پاتا۔ کیا یہ بتاتا کہ قتل کے الزام میں پورے سات سال تو میں نے جیل میں بسر کیے ہیں۔ اُنھیں میری ناراضی کا خوف ہوگا، جبھی اُنھوں نے زبان نہیں کھولی، مبادا میں پھر روٹھ کے چلا جاؤں۔ ایک بار آدمی کا اعتبار اُٹھ جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ دیر تک وہ ایک ٹک مجھے دیکھا کیں، رہ رہ کے اُن کے آنسو چھلک پڑتے تھے۔ میں نے بھی اُنھیں خوب رونے دیا۔ اُنھوں نے بھی مجھے نہیں روکا۔ وہ میرے ہاتھ چومتی اور آنکھوں سے لگاتی تھیں۔ بار بار مجھے چھو کے دیکھتی تھیں جیسے یہ کوئی اور تو نہیں ہے، میں ہی ہوں نا؟ وہ قد و قامت، خال و خد میں بہت بدل گئی تھیں لیکن وہی اُن کا لمس تھا، وہی سانسیں، وہی خوشبو جو میری نس نس میں بسی ہوئی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میرے بہت سے ہاتھ، بہت سے پیر ہو گئے ہیں، میرے بہت سے جسم ہو گئے ہیں اور جیسے وقت سکڑ گیا ہے، میں اپنے گھر میں بیٹھا ہوں، امی کہیں گئی ہوئی ہیں، فمی کی آواز اب آتی ہوگی۔ فرخ بالکل فمی کی شکل پہ گئی تھی۔ وہی آنکھیں، وہی رنگ روپ۔ لمبے لمبے بال، گھنی گھنی پلکیں۔ اُس کی اور فریال کی عمروں میں ویسے بھی اتنا فرق نہیں تھا۔ دونوں اتنی بڑی ہو گئی تھیں کہ اُنھیں دیکھتے دیکھتے گمان ہونے لگتا تھا کہ مجھے دھوکا تو نہیں ہو رہا۔ فارہہ کا بھی یہی حال تھا۔ وہ اکبر کی طرح دبلی پتلی، چھریری سی تھی۔ دیکھنے میں وہ بھی اُن سے کچھ ہی چھوٹی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اُن سے فمی کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں پوچھا، نہ اُنھوں نے کوئی تذکرہ کیا۔ وہ سمجھ رہی ہوں گی کہ مجھے ابا جان نے سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ اُنھوں نے جہاں گیر کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا۔ میں نے بھی اُنھیں نہیں بتایا کہ جہاں گیر مجھے کب کا مل چکا ہے اور فیض آباد میں سب اپنے ہی گھر میں وہ بھی کوئی دوسرا گھر نہیں ہے۔ ابا جان کو اُن سے بات کرنے کا وقت نہیں ملا تھا، وہ جہاں گیر کی بازیابی کی نوید اُنھیں کیسے سناتے یا وہ یہ سوچ کے خاموش رہے ہوں گے کہ ایک دم آتنی مسرتیں پا کے تو وہ مولوی اکرم کے بہ قول بالکل پاگل ہو جائیں گی۔ آدمی خوشیاں بھی ایک حد تک ہی برداشت کر سکتا ہے۔

"اِسے تو اپن اپنے ساتھ لے جائیں گے باوا!" پیرو نے فارہہ کی گردن میں اپنے بازو کی گرہ ڈالتے ہوئے ابا جان سے کہا۔

"سبھی کو لے جاؤ بھائی! سب تمھارے ہیں۔" ابا جان شگفتگی سے بولے۔

"ایسا! ابھی بولے تو اپن سبھی کو لے جائے گا، قسم سے۔" پیرو نے اُڑتی آواز میں کہا۔ "اپن تو بہت مال دار ہو جائے گا۔ ایسا پیارا پیارا بیٹی.... ایک دم پھول کا مافک....." وہ فارہہ سے مخاطب ہو کے بولا۔ "کیوں، چلے گا نا اپن کے ساتھ؟"

فارہہ دُہری ہو گئی۔ پیرو نے اُسے پہلو میں سمیٹ لیا۔ "اپن ابھی پہلے اِس کو لے جائے گا اور گیتا سے بولے گا کہ دودھ دہی مکھن کا خوب مارا ماری کرے۔ گیتا بھی کبھی اِس جیسا چھڑی مافک تھا۔ کچھ کھاتا پیتا ایک دم نہیں تھا۔ ایک دن اپن ڈنڈا لے کے بیٹھ گیا، سامنے دودھ کا گلاس رکھا....."

فارہہ کھل کھلا پڑی۔ وہ سبھی پیرو اور نجھل سے ایسی گھُلی مِلی نظر آ رہی تھیں جیسے برسوں کی شناسائی ہو جیسے پیرو اور نجھل بھی بہت دنوں بعد اُن سے ملے ہوں۔ اکبر تو جہاں گیر کی طرح مستقل نجھل کے پاس بیٹھا تھا، اُس سے چپٹا ہوا۔ جتنی دیر میں منیر علی اندر آئے، اُنھوں نے دسترخوان پر کھانا چن دیا تھا بلکہ سجا دیا تھا۔ مولوی اکرم نے کوئی مبالغہ نہیں کیا تھا۔ یہاں سے وہاں تک کابوں اور ڈونگوں کی قطار لگی تھی اور سارے کمرے میں طرح طرح کی خوشبوئیں پھیل گئی تھیں۔ جب میں گھر سے چلا تھا تو فرخ اتنی بڑی نہیں تھی۔ باورچی خانے میں بس برائے نام امی کا ہاتھ بٹا سکتی تھی۔ میرے آنے کے بعد ہی امی اور فمی نے اُسے سب کچھ سکھایا ہوگا، اُس کے ہاتھ کے کھانوں میں ساری لذت امی کے کھانوں جیسی تھی۔ وہ تینوں اور مولوی اکرم کی بیٹی ریحانہ میرے دائیں بائیں اور آمنے سامنے بیٹھی تھیں۔ کھانے کے بعد فرخ نے میرے آگے میٹھے چاولوں کی قاب رکھ دی۔ میری آنکھیں اُمڈ آئیں۔ میں نے آنسو روک لیے تھے مگر آنکھیں جو چھپاتی ہیں، وہ چہرہ عیاں کر دیتا ہے۔ فرخ کن انکھیوں سے میری صورت دیکھتی رہی کہ دیکھیں، مجھے کچھ یاد بھی ہے یا نہیں۔ میرے چہرے پر کچھ اُسے نظر آہی گیا۔ وہ پگلی ضبط نہ کر سکی، سسکیاں بھرنے لگی۔ سبھی کے ہاتھ رُک گئے۔ پیرو نے اُسے سمجھایا۔ اِدھر نجھل نے اپنے پاس بلا لیا۔ چاول میرے حلق سے اُتر نہیں رہے تھے مگر فرخ کے خیال سے میں کھاتا رہا۔

شام کو کہیں مجھے معلوم ہو سکا کہ تبت جانے سے پہلے تین منزلہ مکان ابا جان نے فرخ، فریال، فارہہ اور اکبر کے نام سے باقاعدہ خریدا تھا اور اوپر کی دو منزلیں کرائے پر اُٹھا دی تھیں تاکہ اگر وہ لوٹ نہ سکے تو مکان کے کرائے سے مولوی اکرم اُن چاروں کا خرچ چلاتے رہیں۔ مولوی اکرم کو اُنھوں نے الگ سے خاصی بڑی

رقم دی تھی اور طے کر دیا تھا کہ تین سال تک اُن کی واپسی نہ ہو سکے تو مولوی اکرم کو مناسب جگہوں پر لڑکیوں کے رشتے کر دینے کا اختیار ہے۔ دستاویز کی رُو سے اکبر کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے تک مولوی اکرم ہر معاملے کے مختار تھے۔ البتہ مکان فروخت کرنے یا اپنے نام منتقل کرانے کا اختیار اُنھیں نہیں تھا۔ یہ ایک کشادہ مکان تھا، باہر چاروں طرف باغیچہ تھا، چار دیواری تھی، اندر بیٹھک اور مہمانوں کے لیے الگ کمرے کے علاوہ کئی اور کمرے تھے، ہر کمرے سے غسل خانہ ملحق تھا۔ اوپر کی دونوں منزلوں سے ساڑھے چھ سو روپلے کا خطیر کرایہ آتا تھا۔ کرائے ہی سے مکان کی وسعت اور حیثیت کا اندازہ ہوتا تھا۔ مولوی اکرم کا کہنا تھا کہ وہ شہر میں تھوڑا بہت کام کر لیا کرتے تھے مگر اس مکان میں آنے اور لڑکیوں کی کل وقتی نگرانی کی وجہ سے اُنھیں یہ شغل ترک کرنا پڑا۔ ابتدا میں اُنھوں نے اپنا کام جاری رکھا تھا لیکن بعد میں محلّے والوں کے تیور دیکھ کے اُنھوں نے بیشتر وقت گھر میں گزارنا شروع کر دیا۔

شام کے پانچ بج چکے تھے۔ کھانے کے بعد منیر علی اور ابّا جان ایک ڈیڑھ گھنٹے تک ہمارے پاس بیٹھے رہے، پھر سونے چلے گئے۔ ابّا جان نے فرخ، فریال وغیرہ کو بھی یہ کہہ کے اُٹھا دیا کہ وہ رات بھر کی جاگی ہوئی ہیں، تھوڑی دیر آرام کر لیں۔ کوئی ایک لمحے کے لیے بھی وہاں سے ٹلنا نہیں چاہتا تھا لیکن ابّا جان کی وجہ سے اُنھیں اُٹھنا پڑا۔ اُن کے جانے کے بعد کمرے میں ہم تینوں رہ گئے۔ شجل، پیرو اور میں۔ مولوی اکرم بار بار آ کے ہمیں پوچھ جاتے۔ دھوپ کم ہونے پر وہ ہمیں باہر باغیچے میں لے آئے۔ سبزے پر بید کی کرسیاں پڑی تھیں۔ ملازم چائے بھی وہیں لے آیا اور شجل کا حقّہ بھی۔ کوئی پان نہیں کھاتا تھا لیکن اندر سے خاص دان بھی آ گیا۔ اندر کی نسبت باہر کا موسم بہت خوش گوار تھا، نرم نرم ہوا چل رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ شام کی چائے کے بعد پیرو اور شجل اُٹھ جائیں گے۔ پیرو کو اپنے گھر بھی جانا تھا۔ دُور کی بات اور تھی لیکن شہر میں آنے کے بعد اُس کا دھیان مسلسل گیتا اور اُس کی ماں کی طرف جاتا ہوگا۔ اُنھیں کانتے کو بھی دیکھنے جانا چاہیے تھا، رات سے اب تک اُس کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ کسی کو یہاں کا پتہ بھی معلوم نہیں تھا جو اطلاع دینے آ جاتا۔ اُدھر سب ہمارے منتظر ہوں گے۔ جولین، چمپا بیگم اور شہ پارہ کی نگاہیں تو رات ہی سے دروازے پر لگی ہوں گی۔ ابّا جان ٹھیک کہہ رہے تھے، اِس مکان میں اتنی گنجائش تھی کہ سبھی یہاں آ سکتے تھے۔

شجل اور پیرو کو کہیں جانے کی جلدی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ وہ کرسیوں پر پیر پھیلائے بڑے اطمینان سے مولوی اکرم کی رُوداد سن رہے تھے۔ اُن کی توجہ دیکھ کے مولوی اکرم کو بھی حوصلہ ہو رہا تھا، اپنا غبار کم کرنے کا۔ کہہ رہے تھے کہ یہاں سے کوئی ایک میل کی دُوری پر مجید نام کے ایک ہوٹل والے نے اُنھیں بہت ہلکان کیا۔ ایک بار جمعہ کی نماز میں مجید سے اُن کی سلام دعا ہو گئی تھی۔ نماز کے ذکر پر اُنھیں عصر کی نماز یاد آ گئی، دھوپ اُتر رہی تھی، وہ ہم سے معذرت کر کے فوراً اندر چلے گئے۔ اُن کے جانے کے بعد

میں نے دبی زبان میں شجل سے کہا۔ "کانتے کو دیکھنے نہیں جاؤ گے؟"

"چلیں گے رے!" وہ کسمساتے ہوئے بولا۔

"جانے اُس کا کیا حال ہو؟"

"سور کا کھال سے بنا ہے۔" پیرو نے بے پروائی سے کہا۔ "ابھی نہیں مرنے کا۔"

"رات اُس کی طبیعت بہت خراب تھی، سارے راستے بھنّاتا رہا۔"

"اُدھر ٹھنڈی جگہ پر چلا گیا ہے۔"

"پھر بھی ہمیں جانا چاہیے۔ دادا بھی اپنے گھر نہیں گئے۔"

"ایک دو دن سے کیا بل پڑے گا رے۔ اِدر بھی اپن گھر میں..." پیرو نے کشادہ آواز میں کہا۔

اِس کے بعد کہنے کو کیا رہ جاتا تھا، میں چُپ ہو گیا مگر میں نے ... اگر وہ نہیں جائیں گے تو رات کو میں خود نکل جاؤں گا۔ مولوی اکرم اند... ہی آ گئے۔ وہ آ کے خاموش بیٹھ گئے تھے۔ پیرو نے متجسس لہجے میں اُن...

"ابھی آپ ہوٹل والا مجید کے بارے کچھ بول رہا تھا؟"

مولوی اکرم کے چہرے پر گھٹا سی چھا گئی۔ "کیا بتاؤں بھائی... بتاؤں۔" وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولے۔ "مجھے مردم شناسی کبھی نہیں آ... میں زندگی میں ایسا دھوکا بھی کبھی نہیں کھایا تھا۔ میں نے آپ کو بتایا تھا... کے بندے سے مسجد میں ملاقات ہوئی تھی۔ مسجد کے ایک حصے کی مرمت کا... درخواست پر چندا دینے کے لیے اُس نے مجھے اپنے ہوٹل آنے کو کہا۔ میں... پہنچا، اُس نے وعدے کے مطابق پورے دو سو روپلے دیے اور خاطر مدارات کی۔ میں اِس علاقے میں نیا نیا ہونے کی وجہ سے اچھے لوگوں سے شناسا... تھا۔ مجید مجھے بھلا آدمی لگا۔ داڑھی والا آدمی ہے اور جمعہ پڑھنے باقا... مسجد میں آتا ہے۔ ہوٹل بھی اُس کا اچھا خاصا چلتا ہے۔ کبھی کبھی اُدھر... ہوتے میں رُک کے اُس کی خیر خیریت پوچھ لیتا تھا۔ ایک روز اُس کے گھر والے... لے آئے۔ میں نے مقدور بھر تواضع کی۔ اُنھیں آئے تین چار روز ہوئے... نے کسی جھجک کے بغیر فرخ بیٹی سے اپنے بیٹے حمید کے رشتے کی خواہش ظا... فرخ کے نام پر میرے کان کھڑے ہو گئے، میں کرسی پر سیدھا... سکا۔ مولوی اکرم نے آزردگی سے بتایا کہ اُنھیں مجید کی اِس جرأت پر تع... لیکن یہ کوئی ایسی اَن ہونی بات نہیں تھی۔ جہاں لڑکیاں ہوتی ہیں... قسم کے معاملات چلتے ہی رہتے ہیں۔ خیر، مولوی اکرم نے معذرت کی... کہا جو ایسے موقعوں پر شریفوں کا دستور ہے۔ اُنھوں نے اُس پاس کسی کو... تھا کہ فرخ، فریال سے اُن کا کوئی خونی رشتہ نہیں ہے۔ مجید کو اُن کا... اپنی سُبکی محسوس ہوئی تاہم اُس نے دوبارہ درخواست کی اور پھر اصرار کیا... اکرم طرح طرح کے عذر کرتے رہے۔ وہ جتنی عاجزی اور پہلو تہی کرتے

...نی ہی بڑھتی جاتی۔ یہاں تک کہ وہ تلخ و تند لہجے پر اُتر آیا۔ مولوی اکرم نے... ...طرف جانا کم کر دیا۔ مجید نے بعض اجنبی لوگوں کو اُن کے پاس بھیجنا شروع... اِس عرصے میں مولوی اکرم ... اُس کے لڑکے کی بابت بہت کچھ علم ہو گیا۔ اُس کا ... کن لوگوں سے ہے اور مشاغل کیا کیا ہیں۔ اُن کے کہنے کے مطابق مالی آسودگی ... کچھ نہیں ہوتی۔ بعض حالتوں میں تو ٹاٹ میں ٹاٹ کا اور مخمل میں مخمل کا ... نہیں جچتا۔ مجید کے گھر والوں سے مل کے وہ تھوڑا بہت اندازہ لگا چکے تھے ... وہاں کتنی گنجائش ہے۔ گنجائش ہوتی بھی تو اُنھیں ایک معیّن مدّت تک ... کی واپسی کا انتظار کرنا تھا۔ مجید کی تندی و برہمی میں اُس کا لڑکا بھی شامل ... دو ایک مرتبہ فرخ، فریال باہر نکلیں تو اُس نے اُن کا پیچھا کیا اور اُن پر آوازے ... مولوی اکرم کی موجودگی کے باوجود وہ دیدہ ... سے باز نہیں آیا۔ اُدھر مجید ... مشہور کر دیا کہ اُس نے مسجد کے لیے مولوی ... دیت ... روپلے کا چندہ دیا تھا ... کے نام سے صرف دو سو روپلے درج کیے گئے ہیں۔ اُس کی بات کا گو کسی کو یقین ... آیا لیکن مولوی اکرم کو مسجد کے ہر شخص کے سامنے وضاحت کرنا پڑی۔ یہ اُن کے ... شرم ناک بات تھی۔ اُن کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اُنھوں نے مسجد کے چند برگزیدہ ... سے مشورہ کیا۔ مجید کے بارے میں اُن لوگوں کی زبانی جو کچھ معلوم ہوا، وہ مولوی ... کے لیے اور حیران و پریشان کن تھا۔ اُنھیں معلوم ہوا کہ مجید اِس علاقے کا نامی ... آدمی ہے اور اُس کا ہوٹل بدقماشوں کا گڑھ ہے، وہ لوگ جیب میں ہر وقت ہتھیار ... ہیں اور سارے علاقے میں دندناتے پھرتے ہیں، جس سے ناراض ہو جائیں، اُس کا جینا ... ہیں۔ تھانے، کچہری، جیل، اُنھیں کسی چیز سے خوف نہیں آتا۔ مسجد کے برگزیدہ لوگوں ... مولوی اکرم کو بتایا کہ اِسی وجہ سے وہ مجید سے دُور دُور رہتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ مجید ... سال سے اپنے بیٹے کی شادی کے لیے دوڑ دھوپ کر رہا ہے۔ ایک جگہ نہیں ... کئی جگہ مجید نے رشتہ بھیجا مگر کوئی بھی ہر کس و ناکس کو اپنی لڑکی کا ہاتھ نہیں ... تھوڑی بہت تحقیقات تو سبھی کرتے ہیں، چنانچہ ہر ایک نے کسی نہ کسی طور اُس ... معذرت کر لی۔ کسی نے کہا کہ ابھی ارادہ نہیں ہے، کسی نے کہہ دیا کہ اُس کی بیٹی کی ... ہو گئی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اِن حالات میں مولوی اکرم یہی کر سکتے تھے کہ اور محتاط ... اُنھوں نے فرخ اور فریال کے باہر نکلنے پر پہلے ہی پابندی لگا دی تھی ... لڑکی ہوٹل کی طرف سے گزرنے کے بجائے دوسرے راستے سے جانے کی تاکید ... اکبر کہیں جاتا تو مولوی اکرم ملازم کو اُس کے ساتھ کر دیتے۔

ایک دن مجید گھر آ گیا۔ اُس نے دو ٹوک انداز میں مولوی اکرم سے کہا کہ ... وہ اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کر لیں ورنہ نتائج کے ذمّے دار وہ خود ہوں گے۔ ... اکرم نے پھر عاجزی کی کہ وہ مجبور ہیں۔ مجید پر مطلق اثر نہ ہوا۔ مولوی اکرم ... کا دامن چھوڑ بیٹھے۔ اُنھوں نے کہا کہ آیندہ مجید اِس گھر میں قدم رکھنے کی ... نہ کرے، اگر اُس کا یہی رویّہ رہا تو وہ مسجد میں جا کے اعلان کر دیں گے کہ اُن ... سینہ زوری ہو رہی ہے۔ ... ... نے ہوا

... ٹہلایا اور کہا کہ ابھی تک اُنھوں نے اپنے ذرائع استعمال نہیں کیے ہیں، مجید ... تنگ کیا تو وہ خاموش نہیں بیٹھے رہیں گے، وہ بھی کوئی آخری قدم اُٹھا سکتے ہیں۔ مجید بھڑکتا، شور مچاتا چلا گیا۔ اِس کے بعد نہ وہ آیا، نہ اُس کا کوئی کارندہ۔ مولوی اکرم کسی قدر مطمئن ہو گئے لیکن مجید کی طرف سے یہ خاموشی نہایت عارضی ثابت ہوئی۔ ایک روز وہ محلّے کے ایک شخص کی تدفین کے بعد واپس گھر آ رہے تھے، رات کا وقت تھا، ایک گلی میں اچانک دو آدمی نمودار ہوئے اور اُن پر چاقو نکال کے کھڑے ہو گئے۔ مولوی اکرم نے شور مچانے کی کوشش کی لیکن طمانچوں اور مکّوں سے اُنھیں فوراً چُپ کر دیا گیا۔ اتفاق سے اُن کے پاس زیادہ رقم نہیں تھی، کچھ روپلے تھے اور ایک قیمتی گھڑی کلائی پر بندھی تھی۔ روپلے اور گھڑی لے کے دونوں آدمی چمپت ہو گئے۔ مولوی اکرم جیسے تیسے گھر پہنچے۔ اُن کی نکسیر پھوٹ گئی تھی اور باچھا کھل گیا تھا۔ دونوں آدمیوں کو وہ پہچان نہیں سکے لیکن اُنھیں یقین تھا کہ وہ مجید کے آدمی ہیں۔

اُنھوں نے نہ گھر میں، نہ باہر کسی سے اِس واقعے کا ذکر کیا، خود ہی تدبیر بھی سوچتے رہے۔ چند دنوں سے وہ بعض مشکوک آدمی بھی گھر کے اطراف گھومتے دیکھ رہے تھے۔ احتیاطاً اُنھوں نے چوکیدار بدل دیا۔ کئی مرتبہ مجید کا لڑکا بھی اُنھیں مکان کے گرد منڈلاتا نظر آیا، ہر مرتبہ دو ایک دوست اُس کے ہمراہ ضرور ہوتے۔ مولوی اکرم کی نیند اُڑ گئی۔ وہ رات رات بھر نمازیں پڑھتے اور گھر کی چوکسی کرتے رہتے۔ پڑوسیوں سے اُنھیں معلوم ہوا کہ باہر طرح طرح کے افسانے اُن کی لڑکیوں سے منسوب کیے جا رہے ہیں۔ ناچار وہ نماز بھی گھر میں پڑھنے لگے۔ کئی بار اُنھوں نے سوچا کہ پولیس کا دروازہ کھٹکھٹائیں مگر گھر کی رسوائی کے خیال سے خاموش رہے۔ لڑکیوں کا معاملہ تھا۔ وہ کہاں کہاں جا کے وضاحتیں کرتے پھرتے۔ پھر ایک دن اُنھیں یہ مژدہ سننے کو ملا کہ مجید کا لڑکا غائب ہو گیا ہے۔ مجید نے مشہور کر دیا تھا کہ شہر سے باہر گیا ہوا ہے لیکن دراصل وہ جیل میں تھا۔ یہ بات ایک نمازی نے اُنھیں بتائی جو مسجد سے اُن کی مسلسل غیر حاضری کا سبب جاننے آیا تھا۔ وہ یہ مکان چھوڑ دیتے۔ دستاویز کی رُو سے وہ اِسے بیچ نہیں سکتے تھے لیکن یہ ممکن تھا کہ وہ نچلی منزل بھی کرائے پر اُٹھا کے کوئی دوسرا مکان تلاش کر لیں۔ وہ اِسی پر غور کر رہے تھے۔

اُن کا اپنا فلیٹ گوکل بلڈنگ دادر میں تھا لیکن یہاں آتے وقت وہ اُسے پگڑی لے کے کرائے پر دے چکے تھے۔ ابھی چند روز ہوئے اُنھیں اطلاع ملی تھی کہ مجید کا لڑکا ضمانت پر چھوٹ کے آ گیا ہے۔ چھوٹنے کے بعد سے اُس نے اِس طرف کا رُخ نہیں کیا تھا مگر اُنھوں نے طے کر لیا تھا کہ جلد ہی کسی دوسرے مکان میں منتقل ہو جائیں گے جہاں اِس قماش کے لوگ آس پاس نہ رہتے ہوں۔ وہ کسی بہتر جگہ کے لیے ادھیڑبن میں تھے کہ ہم لوگ پہنچ گئے۔

مولوی اکرم بھرے بیٹھے تھے۔ بار بار اُن کی زبان لڑکھڑا جاتی، بات بات پر روہانسے ہو جاتے اور غیر ارادی طور پر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتے جیسے

کہیں کوئی کان لگائے اُن کی باتیں سُن رہا ہو۔ کہنے لگے کہ وہ ابا جان سے اس لیے یہ ذکر کرنا نہیں چاہتے کہ اُن کا غصہ تیز ہے، مزاج میں ضد ہے۔ پیرو اور ٹھل نے درمیان میں ایک لفظ بھی نہیں کہا، بس خاموشی سے سنتے رہے۔ ساری رُوداد مولوی اکرم نے اس لیے دہرائی تھی کہ ہم ابا جان کو مکان کی تبدیلی پر اُکسائیں۔

"پر یہ تو بہت پکا اور اچھا بنا ہوا ہے۔" ٹھل نے بھاری آواز میں کہا۔ "جگہ بھی اچھی ہے۔"

"ہے، بے شک ہے۔" مولوی اکرم احتجاجی لہجے میں بولے۔ "پڑوس بھی بہت اچھا ہے۔ سیدھے سادے شریف لوگ رہتے ہیں لیکن اُن ناہنجاروں نے گھر دیکھ لیا ہے۔ شہدوں سے بیر اچھا نہیں ہوتا، شریف آدمی ہی نقصان میں رہتا ہے۔"

مولوی اکرم کو احساس نہیں تھا کہ وہ یہ بات کن لوگوں سے کہہ رہے ہیں۔ وہ بہت سہمے ہوئے انداز میں بتا رہے تھے۔ "آپ کو نہیں معلوم وہ سب چاقو رکھتے ہیں۔ منہ زوری، ہاتھا پائی، خون خرابہ اُن کی خصلت ہے۔"

"ہونہہ۔" پیرو نے ہنکاری بھری اور بے چینی سے ٹھل کی طرف دیکھا۔

"ابھی کیا بولتا ہے ٹھل بھائی اپنا بڑے صاحب۔"

"ٹھیک ہی بولتے ہیں دادا!" ٹھل نے زیرِ لب کہا۔

"اپن نے سنا ہے سب اُنگلی ایک جیسا نئیں ہوتا۔"

"میں نے بھی سُنا ہے۔" مولوی اکرم جھلاتی آواز میں بولے۔ "لیکن یہاں تو بڑے کینہ توز لوگوں سے سابقہ پڑا ہے۔ بتائیے، میری کیا خطا تھی؟ میں نے کون سا قصور کیا تھا؟"

"ابھی کیا بولیں بڑے صاحب!" ٹھل نے آہستگی سے کہا۔

"اپن بولے، ابھی آپ کا دل کا قصور تھا سارا۔" پیرو کسی قدر تندی سے بولا۔

"دل کا! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"تھوڑا دل کا، تھوڑ پن کا۔"

"تھوڑپن؟" مولوی اکرم تلخی سے بولے۔ "تھڑدلی کا؟ یہی مطلب ہے نا آپ کا؟"

"ابھی دروازہ بند کر کے بیٹھ جائے گا تو کیا ہوئے گا۔ باہر والا اور مستی میں آجائے گا۔"

"آپ کا مطلب ہے میں بھی اُن پر خنجر تان کے کھڑا ہو جاتا؟"

"اِس کا ضرورت نئیں پڑتا اور پڑتا بھی تو کیا جاتا تھا۔ دو چار کو ٹھنڈا کر کے مرتا تو اوّر ایک دم چین سے رہنے کا تھا۔"

"اور بچے! بچے کہاں جاتے؟"

"اوپر والا کو آپ اتنا سمجھتا ہے پھر بھی بولتا ہے بچے کہاں جاتے؟

ابھی اگر وہ بیچ میں بلا لیتا تو اُن کا کیا بنتا؟"

"جنابِ من! مجھے نہیں معلوم اللہ نے آپ کو کس قدر نوازا ہے۔ خدا کرے ہے اور سب زندہ سلامت رہیں۔ اولاد کی ذمے داری اولاد وال ہے۔ میں ایک بوڑھا آدمی کیا کرتا جس کے سر پر چار جوان جہان لڑک ہو وہ تو ویسے بھی اور بوڑھا ہو جاتا ہے، اور ناتواں بھی۔ وہ عا (ابا جان) تو مجھے اپنا بنا کے اطمینان سے چلے گئے تھے، اُنھیں ک دکھانا تھا۔ بے شک اللہ سے بڑا نگہبان کوئی نہیں مگر اللہ نے اور سوچنے کی توفیق یوں ہی عطا نہیں کی ہے۔ اُس نے کبھی اور با تلقین بھی کی ہے اور کچھ حقوق و فرائض بھی متعین کیے ہیں۔"

"اپنا اپنا سوچنے کا بات ہے بڑے صاحب!" پیرو نے ز

"اپن زیادہ نئیں جانتا، آپ دروازہ کھول کے اور بھالا لے کے بیٹھتا نئیں آتا۔ وہ سالا لوگ، حرام کا جنا اودر سے ہی نکل جاتا۔ چھوٹا لوگ سا ہے، مچھر مانک۔ اپن پوچھتا ہے آپ دوسری جگہ جانے کا بولتا ہے، ابھی ایسا لوگ سامنے پڑ گیا تو؟"

مولوی اکرم کوئی جواب نہ دے سکے، کچھ تامل کے بعد اُنھوں نے

"اس کے سوا کوئی بہتر صورت ہو تو آپ ہی بتائیے۔"

پیرو نے بھی جواب نہیں دیا۔

مغرب کی نماز کے وقت مولوی اکرم اُٹھ گئے۔ اندھیرا چھا نے قمقمے روشن کر دیے۔ مغرب کے بعد منیر علی اور ابا جان بھی وہیں آ اکبر بھی آگیا۔ میری رگوں میں کھولن ہو رہی تھی، مجھے اُن کے ملنے کا ا اندر جائیں تو میں باہر نکلوں اور مجید کا ہوٹل دیکھ کے آؤں، وہاں کانٹے کی طرف نکل جاؤں گا۔ میں ابھی یہ ارادے باندھ ہی رہا تھا پیرو اُٹھ گئے۔ اُنھوں نے ابا جان سے کہا کہ وہ کانٹے کی طرف جا رہے نے بھی ساتھ چلنے کے لیے کہا مگر ٹھل نے یہ کہہ کے منع کر دیا کہ ہماری وا ہو سکتی ہے۔ بہتر ہے وہ دن کو کسی وقت چلے جائیں۔ میں بھی کھڑا ہو باہر جانے سے پہلے میں فرخ اور فریال وغیرہ کو بتانے اندر چلا گیا۔ دیر کے لیے جانے کا کہا مگر اُن کے چہرے بجھ سے گئے۔ فریال ضد کر اب کھانے کے بعد ہی کہیں جائیے گا۔ دوپہر کو اتنا کچھ کھا لیا تھا کہ بھوک تھی اور بھوک تو ویسے بھی مولوی اکرم کی باتیں سُن کے ختم ہو گئی تھی پر وہ چُپ ہو گئیں۔ میں فوراً چلا آیا۔ پیرو اور ٹھل میرے انتظار میں "آپ بھی ابھی اپن کے ساتھ چلو۔" احاطے سے نکلتے ہوئے مولوی اکرم سے کہا۔

"میں! میں بھلا کہاں چلوں؟" مولوی اکرم اٹکتی زبان

"اِدری، تھوڑا دُور تک۔"

"اُنھیں کہاں لیے جا رہے ہیں؟" ابا جان نے شگفتگی سے پوچھا۔

"تھوڑا رستہ بتانے کے لیے باوا!" پیرو نے کہا۔

"رستہ؟ اور آپ کو؟" ابا جان مسکرا کے بولے۔ "بہرحال ٹھیک ہے، جائیے، لے جائیے۔"

ٹھل اور پیرو کا ارادہ جان کے میرے جسم میں جیسے اور سلوٹیں پڑ گئیں، لوی اکرم بھی کچھ کچھ سمجھ گئے مگر ابا جان کے سامنے اُنھوں نے تردد کا اظہار ں ہونے دیا۔ جیسے ہی ہم باہر آئے، وہ بے چینی سے بولے۔ "آپ کہاں جانا تے ہیں؟"

"مجید کی طرف۔" ٹھل نے کہا۔

"نہیں جناب! نہیں، میں یہ مشورہ نہیں دوں گا آپ کو۔" وہ تیزی ے بولے۔ "اُن لوگوں کو آپ نہیں جانتے، بہت بیڑھے لوگ ہیں۔ میں نے ں لیے آپ سے تھوڑی کہا تھا۔"

"اپن ابھی اُس کو اوپر سے نیچے تک دیکھنا مانگتا ہے۔"

"کیا فائدہ جناب! لعنت بھیجیے، ہمیں اُس طرف سے گزرنا بھی نہیں چاہیے۔ منٹ میں شرفا کی پگڑی اُچھال دیتے ہیں وہ لوگ۔ بہتر ہے آپ یہ خیال وڑ دیں، درگزر کیجیے۔"

"اپن تھوڑا اُس کو دیکھ کے آگے بڑھ جائے گا۔"

"کیا دیکھیں گے اُس کو، جو میں نے بتایا ہے، وہ ناکافی ہے کیا؟ میری ے اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے۔ اُن کا پورا ٹولا ہے، ایک سے ایک چھٹا ہوا۔ ے آوارہ جانے کہاں کہاں سے نکل آتے ہیں۔"

"چلو بڑے صاحب! آگے بڑھو۔" ٹھل نے حتمی لہجے میں کہا۔ "آپ فکر ہو کے اپنے ساتھ چلو۔"

"مگر مجھے ساتھ دیکھ کے وہ ضرور کھٹک جائے گا۔"

"ابھی آپ کا ساتھ چلنا ضروری ہے۔ اُس کو پتہ چلنا چاہیے کہ ادھر آپ ہر دم اکیلا نہیں ہے۔"

"میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ سرِدست یہ ارادہ ملتوی کر دیجیے۔ ایسا ہی ہے تو پھر کسی وقت دیکھیں گے۔"

"ابھی کیا جاتا ہے بڑے صاحب! ابھی اندھیرے کا وقت ہے۔" رو نے تنک کر کہا۔

مولوی اکرم کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا مگر وہ زندگی دیکھے ہوئے تھے، ھ گئے کہ مزید حجت ناگواری کا سبب ہو گی۔ میں نے بھی اُن سے کہا کہ چلیے، ھرے گزرنے میں کوئی قیامت نہیں آجائے گی۔

ہم نسبتاً پُرسکون علاقے سے نکل کے گنجان اور پُرشور علاقے میں داخل گئے۔ کھمبوں اور دکانوں پر قمقمے چمک رہے تھے۔ ہر طرف ٹراموں، بسوں اور دوسری گاڑیوں کا اژدہام تھا اور بھاگ دوڑ سی مچی ہوئی تھی۔ پیرو نے آواز دے کر ایک ٹرام رکوا لی۔ مولوی اکرم نے اُسے بتایا کہ فاصلہ اتنا زیادہ نہیں ہے مگر پیرو ٹرام میں بیٹھ گیا۔ آگے جا کے اونچی اونچی عمارتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، اسی نسبت سے بھیڑ بھی بڑھتی گئی۔ راستے میں اڈے کے کسی آدمی کی ہم پر نظر پڑ سکتی تھی۔ اب مجھے بھی یہاں کم لوگ نہیں جانتے تھے۔ چھنگا اور پیرو کے خاص یاروں کے تو سبھی آدمی مجھ سے واقف تھے۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا لیکن ہم گاڑی میں بڑی حد تک لوگوں کی نظروں سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ پانچ چھ منٹ سے زیادہ نہیں گزرے تھے کہ مولوی اکرم نے کوچوان کو ایک دوسری کشادہ سڑک پر گاڑی موڑنے کا اشارہ کیا۔ پیرو نے اُن سے کہہ دیا تھا کہ وہ ہوٹل سے کچھ دُور گاڑی رکوا لیں۔ مُڑنے کے کوئی ایک فرلانگ بعد مولوی اکرم نے گاڑی رکوا دی اور سرگوشی میں پیرو سے کہا۔ "وہ سامنے دیکھ رہے ہیں آپ، نکڑ پر جو بڑا سا سائن بورڈ نظر آرہا ہے، وہی اُس کا ہوٹل ہے۔ وہیں دروازے کے قریب بیٹھا وہ گاہکوں سے پیسے وصول کرتا اور حکم چلاتا رہتا ہے۔"

پیرو نے جیب سے نوٹ نکال کے کوچوان کی طرف بڑھایا اور ٹرام سے اُتر گیا۔ "وہی ہے نا؟" اُس نے ہاتھ کے اشارے سے تصدیق چاہی۔

"جی، جی وہی۔" مولوی اکرم کی زبان لکنت کرنے لگی۔

سڑک عبور کر کے ہم فٹ پاتھ پر آگئے۔ اب ہوٹل سامنے نظر آرہا تھا، چند قدموں کے فاصلے پر مولوی اکرم نے قریب جاتے ہوئے ایک بار پھر شکستہ آواز میں تُوتکار سے بچنے کی درخواست کی۔ ٹھل نے اُن کی کمر تھپک کے سرہلایا۔ میں نے دیکھا کہ مولوی اکرم کے قدم ڈگمگا رہے ہیں، پھر پیرو نے اُن کا ہاتھ تھام لیا۔

باہر سے ہوٹل کا ایک حصہ صاف نظر آرہا تھا۔ نکڑ پر ہونے کی وجہ سے وہ دو اطراف سے کھُلا ہوا تھا۔ اوپر تین منزلہ عمارت تھی۔ دو ایک دکانوں کے علاوہ فرشی منزل کی ساری جگہ ہوٹل نے گھیر رکھی تھی۔ اندر خاصے لوگ موجود تھے۔ ہم قریب گئے تو دروازے کے پاس بنے ہوئے کاؤنٹر پر ایک شخص دکھائی دیا، وہی مجید ہوگا۔ چھوٹی سی داڑھی، اندر دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھیں، رنگ پختہ تانبے جیسا، ٹھوڑی کا گوشت بڑھا ہوا، کھچڑی بال اور سیدھی مانگ، چکن کے کُرتے میں ملبوس، چہرے سے وہ ڈھلکے ہوئے جسم کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ ٹھل اور میں دروازے پر کھڑے رہے۔ مولوی اکرم کی پھٹی پھٹی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ مجید ہی ہے۔ وہ کسی گاہک اور ہوٹل کے بیرے سے حساب میں اُلجھا ہوا تھا۔ اُن سے فارغ ہو کے وہ ہماری طرف متوجہ ہوا۔ سب سے پہلے اُس کی نگاہ مولوی اکرم پر گئی کیونکہ پیرو کاؤنٹر کے دائیں طرف ہو گیا تھا جہاں کاؤنٹر میں جانے کا مختصر راستہ تھا، اندر ایک خالی کرسی رکھی تھی۔

اُس کی بھویں سکڑ گئیں، وہ مولوی اکرم سے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ دائیں طرف سے پیرو نے ایک قدم کاؤنٹر کے اندر بڑھا کے اُس کی گردن پر

ہاتھ مارا، پھر گردن دبوچ کے اسے جھٹکا دیا اور ایک ثانیے میں کرسی سے گھسیٹ لیا۔ درمیان میں رکھی ہوئی کرسی کئی جگہ سے مجید کے جسم میں پیوست ہوئی ہوگی۔ اِس اچانک افتاد پر کسی کے بھی ہوش و حواس برقرار نہیں رہ سکے، مولوی اکرم کی بھی چیخ نکل گئی۔ وہ پیرو کا ہاتھ روکنے کے لیے اُس کی طرف جھپٹے اور واویلا کرنے لگے۔ شبھل نے بڑھ کے اُن کا بازو پکڑ لیا اور جھڑکتی آواز میں اُنھیں ایک طرف کھڑے ہونے اور خاموش رہنے کی تاکید کی۔ مولوی اکرم پر لرزہ طاری ہوگیا۔ مجید کو کرسی سے گھسیٹ کر پیرو کاؤنٹر کے باہر لے آیا، اُس نے اُسے ایک لمحے کا موقع بھی نہیں دیا، بے دریغ اتنی ضربیں لگائیں کہ اُس کی آواز بھی نہ نکل سکی۔ اُس کا کرتا اور بنیان تار تار ہوگیا۔

ہوٹل میں افراتفری پھیل گئی۔ سب لوگ کرسیاں چھوڑ چھوڑ کے چیختے چلاتے ہوئے کاؤنٹر کی طرف دوڑے۔ ایک ساتھ کئی چاقو کھلنے کی آواز آئی مگر شبھل اور میں تیار کھڑے تھے۔ ہم نے بھی چاقو نکال لیے لیکن کھولنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ مجید سے نمٹ کے پیرو چشم زدن میں پلٹا اور اپنی طرف دوڑتے ہوئے آدمیوں کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ اُس نے غراتے ہوئے کہا۔ "ابھی اکیلا آئے گا یا سب ساتھ میں؟"

یکایک وہ سب ٹھٹک کے رک گئے۔ ایک جانب سے کسی نے چیخ کر کہا۔

"دادا، پیرو دادا!" اُسی لمحے ہوٹل پر سناٹا چھا گیا۔

"آؤ باپ! ابھی تم رک کیوں گیا کتے کا اولاد؟" پیرو دہاڑا لیکن وہ لوگ حیرت بھری نظروں سے کھڑے اُسے دیکھتے رہے۔ اُن میں سے کسی نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی۔ جو شخص سب سے پہلے آگے آیا تھا، اُس کا چہرہ میرے لیے جانا پہچانا تھا مگر اُس کا نام مجھے یاد نہیں آیا۔ وہ سر جھکائے چاقو نیچے کیے آہستہ آہستہ پیرو کے قریب آیا اور جھک کے اُس نے اپنا چاقو پیرو کے قدموں میں ڈال دیا۔ مجید ایک طرف سکڑا سمٹا پڑا تھا، پیرو کے نام پر اُس نے بھی سر اٹھا کے دیکھا اور دوسرے ہی لمحے اُس کے پیروں سے لپٹ گیا۔ وہ بری طرح بلکنے لگا۔ پیرو نے ٹھوکر مار کے اُسے خود سے دور کر دیا۔ مجید نے کاؤنٹر کے پاس سراسیمہ کھڑے ہوئے مولوی اکرم کے پاؤں پکڑ لیے اور دہائیاں دینے لگا۔ مولوی اکرم تو خود تھر تھر لرز رہے تھے۔ اُنھوں نے دہشت سے شبھل کی جانب دیکھا۔ شبھل نے مجید کے بال پکڑ کے اُٹھا لیا اور اُسے اپنے چہرے کے سامنے کر کے غور سے دیکھا۔ میں نے چاہا کہ کاش شبھل اُس کے منہ پر تھوک دے مگر شبھل نے اُسے دوبارہ پیرو کی طرف دھکیل دیا۔

وہ زمین پر اوندھا گیا۔ پیرو نے اُس کے منہ پر پنجہ مار کے انگلیاں گاڑ دیں اور جب اُس نے پنجہ کھینچا تو مجید بھی ساتھ ساتھ اٹھتا گیا۔ "ابھی بول تو یہ سارا بے پتا ہا لتو تیرا اماں بہنی کو اُٹھا کے ادھر لائے؟"

مجید کا چہرہ جگہ جگہ سے کٹ پھٹ گیا، خون چھلکنے لگا۔ وہ ہاتھ جوڑ کے گھگھیایا۔ "اپن کو بالکل نہیں معلوم تھا کہ یہ تمھارا آدمی ہے، پیرو دادا کا آدمی۔"

"جو اپن کا آدمی نہیں ہوئے گا، اُس کا تم پگڑی اتار لے گا؟ اُس کا تم داڑھی نوچ لے گا؟ ایسا ابھی تم کو کس نے بولا ہے؟ کون رنڈی کا جنا کا دادا ہے؟ اپن جانے سے پہلے بلے کو ادھر چھوڑ کے گیا تھا۔"

"ابھی وہی ادھر ہے دادا!" کسی نے دبی زبان میں کہا۔

"وہی ہے تو پھر اُس کا دوسرا ابھی پھوٹ گیا کیا؟ ابھی وہ کدھر گیا؟ کیا اپن اِس واسطے بسوا کا جگہ اُس کو دے کے گیا تھا کہ وہ علاقے کے لوگ پر ہاتھ ڈالے؟" پیرو بلے کو گالیاں بکنے لگا پھر ایکا ایکی مڑ کے بولا۔

"وہ حرام کا جنا، تیرا دادا بنیا ابھی کیدر ہے؟"

"اُس کا کوئی دوش نہیں ہے دادا!" مجید گڑگڑا کے بولا۔ تکلیف کی شدت میں اُس سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔

"ابھی کیدر ہے وہ؟"

"وہ گھر پہ ہوگا مائی باپ!"

"اُس کو ابھی ادھر بلاؤ۔"

"اپن اُس کا منہ کالا کر کے ابھی اکھاڑے میں گھمائے گا۔"

"ابھی رحم کرو دادا! ایک موقع اور دو، اپن دوبارہ ایسا نہیں کرے گا۔" مجید ہذیانی انداز میں بولا۔

پیرو نے بڑھ کے اُس کی ٹھوڑی پکڑ لی اور چہرہ اوپر اُٹھا کے دوسرے ہاتھ سے اُس کے پیٹ پر ضرب لگائی۔ مجید بلبلا اُٹھا اور فرش پر لوٹنے لگا۔ "حساب ابھی لمبا ہے سور کا اولاد۔"

سب ساکت کھڑے تھے، سبھی نے اپنے چاقو جیبوں میں رکھ لیے تھے۔ اچانک باہر سے شور اُٹھا۔ سب ہڑبڑا سے گئے۔ وہ بلے تھا، ایک چشم کھلتے ہوئے گندمی رنگ کا بلے۔ اُس کی ایک آنکھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی، اُسے اچھی طرح جانتا تھا مگر سامنے آنے ہی پر پہچان سکا۔ بلے تیز قدموں اندر داخل ہوا۔ اُس کی نظر سیدھی پیرو پر گئی۔ اپنے ساتھ آنے والوں کو چھوڑ کے وہ بے تابانہ پیرو کی طرف لپکا۔ "دادا! دادا! تم کب آئے؟ خبر بھی نہیں دی؟" اُس کی آواز پر اضطراب طاری تھا۔ آتے ہی وہ پیرو کے پیر چھونے کو جھکا۔ پیرو پیچھے ہٹ گیا۔ "تیرا ٹیم آ گیا ہے بلے!"

"کیا.... کیا ہوا دادا! کیا بول رہے ہو؟" بلے نے جنونی انداز میں پوچھا۔ "ایسا کیا ہو گیا جو تم ادھر آئے ہو؟ پیرو دلوا ادھر آیا ہے؟"

"ہاں ادھر آیا ہے اور اِس واسطے آیا ہے کہ تُو ابھی بادشاہ بن گیا ہے۔"

"اپن کو بولو دادا!" بلے نے سر جھٹک کے کہا۔ "اپن کا سر اُتار لو۔ اپن کو خطا بولو۔"

"خطا!" پیرو بھڑک کے بولا۔ "ابھی خطا پوچھتا ہے؟ مٹی کا اِدھر پیلا کو نئیں جانتا؟" اُس نے مجید کی طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ مجید ہے۔"

"ایدر کا دادا ابھی یہ بھی ہے کیا؟"

"کیا بولتے ہو؟ اِس حرام زادے نے کچھ کیا ہے کیا؟"

"یہ بھی اپن ہی بولے۔" پیرو نے اشتعال سے کہا۔ "پھر تو ایدر جوکی سنبھالے کیوں بیٹھا ہے؟"

"اپن کو کچھ نہیں پتہ، قسم لے لو، قسم لے لو دادا!"

پیرو نے بے اختیار بالے کے گال پر پوری طاقت سے طمانچہ رسید کیا۔ بالے کا پورا جسم بل کھا گیا۔ "جس دادا کو نئیں مالوم کہ پاڑے کا پیچھے کس کو چھینک آیا ہے، اُس کو پاڑے کے بدلے گھوڑے پر بیٹھنے کا ہے۔"

بالے نے جھپٹ کے کاؤنٹر کے قریب گٹھڑی بنے ہوئے مجید کی گردن پکڑ لی۔ مجید تڑپنے لگا۔ بالے غضب ناک انداز میں اُس سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔ اُس نے اُسے بے دریغ مارنا بھی شروع کر دیا۔ مجید کی حالت ہی اِس قابل نہیں تھی کہ وہ ٹھیک سے زبان کھول سکے۔ "ابھی اپن کے سامنے یہ ناٹک کیا کرتا ہے سالا!" پیرو نے زہر خند سے کہا۔ "اُس ٹیم دارو پی کے بیٹھا تھا جب یہ تیرا آدمی، تیرے پاڑے کا آدمی کا ڈوری ہلا رہا تھا۔"

"کیا بولتے ہو تم؟" بالے وحشت میں بولا۔

"ایدر علاقے سے سب چھوکری والا لوگ بھاگ چلا جائے نا۔" پیرو کی آواز لرزنے لگی۔ "اپن نے پاڑا دیتے ٹیم تجھ کو کیا بولا تھا؟ بولا تھا کہ پاڑے کا دادا چار آنکھ، چار کان کا ہوتا ہے اور کچھ لوگ سے ایک دم نئیں لگنے کا، جس کا چال میں فرق نئیں ہے۔ پاڑا علاقے کا سارا لوگ کے لیے نئیں ہے۔ اُلٹا چلنے والا کے لیے ہے، آدھا آدمی کے لیے۔"

"اپن کو سب یاد ہے۔" بالے اپنا منہ نوچتے ہوئے بولا۔ "اپن کو بولو دادا! اپن کے لیے حکم کرو، قسم سے اپن ایک دم پاڑا چھوڑ کے چلا جائے گا۔"

مَیں نے نہیں دیکھا کہ ٹھل نے اشارہ کیا تھا یا مولوی اکرم میں خود حوصلہ ہوا، وہ چند قدم بڑھ کے پیرو کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اُن کے چہرے پر کبھی آگ بھڑکنے لگتی، کبھی دھواں سا چھا جاتا۔ بہ مشکل تمام اُن کے منہ سے نکلا۔ "میں نے انھیں معاف کیا، میرے خدا نے معاف کیا۔ اب یہاں سے چلیے، خدا کے لیے بس کیجیے۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔"

پیرو نے اُن کا شانہ تھام لیا اور چند لمحے بے حس و حرکت کھڑا رہا، گومگو کے عالم میں۔ پھر بالے اور مجید پر ایک نظر ڈالتا ہوا اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ وہ باہر نکلنے کے لیے دروازے تک گیا، پھر ٹھہر گیا اور بالے کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "تو ابھی اپن کا پاڑے میں آنے کا ہے۔"

"مگر تم، تم کہاں جا رہے ہو؟" بالے نے چڑچڑی آواز میں کہا۔

"اپن کیدھر کو بھی جا رہا ہے، تجھ کو جاننے کا نئیں ہے۔" پیرو ترشی سے بولا۔ "تو ابھی لوٹ کے ادر کا پاڑے میں نئیں جانے کا، سیدھا اُدھر آئے اور اِس کو بول دے کہ ابھی بڑے صاحب نے بیڑی ڈال دیا ہے سالا میں۔ پورا آٹھ ہزار روپیہ اُدھر دے کے آئے گا تو ایدر گدی پر آ کے بیٹھے۔ سب نازی لوگ کو بولے گا کہ اِس نے آٹھ سو روپیہ نئیں دیا تھا، آٹھ سو مار گیا تھا۔ اِس نے اپنی ماں ......" مولوی اکرم کو دیکھ کے پیرو کی ... گئی۔ "اِس کا بیٹا بھی ابھی پاڑے میں ساتھ لانے کا ہے۔ اپن اُس کو چور بازار سے ابھی کنجری بلا کے رکھے گا۔"

بالے دوڑتا ہوا دروازے کے پاس آ گیا اور لجاجت سے کہنے لگا "بولے گا، اپن ویسا ہی کرے گا۔ اپن اِس کو ابھی اکھا دیکھ لے گا پر تم پاڑے پر چلو دادا! ابھی پاڑے کا دادا تم سے نہیں بول رہا ہے، تمھارا بالا بول رہا ہے، بالے بھی آدمی ہے۔ آدمی سے اُنیس بیس ہو سکتا ہے۔ وہ نہیں، تمھارا پاڑا رہا ہے۔ اِدھر ٹھل استاد اور راجا دادا آیا ہے۔ اِدھر آ... ایسا لوٹ جائے؟" بالے روہانسا ہو گیا اور منت کرتے ہوئے بولا۔ "تھو... کے لیے ٹھہر کے جاؤ۔"

پیرو نے پہلے ٹھل کو راستہ دیا، پھر مولوی اکرم کو، پھر دروازے... گیا۔ ہوٹل کے باہر کھڑے ہوئے لوگ ہمیں دیکھ کے ایک طرف ہو گئے۔ اُ... بہت سوں نے پیرو کو سلام کیا لیکن پیرو نے اُن کی طرف دیکھا ہی نہیں... قدموں کے ساتھ ہوٹل سے دور ہوتے گئے۔

❁

راستے بھر مولوی اکرم بے سُدھ سے ہمارے ساتھ چلتے ر... میں ہم نے تُم تُم نہیں کی۔ گھر کے قریب چوراہے پر پیرو نے مولوی اکر... پوچھا کہ گھر تک جانے کے لیے انھیں ہماری ہم راہی کی ضرورت تو نہیں ہے... اکرم نے سر ہلا کے انکار کر دیا، وہ کچھ کہنا چاہتے تھے مگر کہہ نہ سکے۔ بس پیرو کو... جھلملاتی آنکھوں سے دیکھتے رہے۔ پیرو مسکرانے لگا اور اُس نے اپنے باز... دیے۔ آدمی کی کیفیتیں عمر سے مشروط نہیں ہوتیں۔ مولوی اکرم ایک بچے... پیرو سے لپٹ گئے پھر نہ جانے کیا ہوا، وہ ہچکیاں لے لے کے رونے لگے۔ بھری... پر چوراہے کے نزدیک۔ پیرو اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھے رکھے گھر کی طرف بڑ... جب تک گھر نہیں آ گیا، ہم نے انھیں نہیں چھوڑا۔ پھر ہم باہر ہی سے چلے آ... اتفاق سے دروازے کے پاس ہی ٹرام مل گئی۔ مولوی اکرم آخر تک دروازے... کھڑے رہے تا آں کہ ٹرام آگے چلی آئی اور باندرے کی طرف جانے والی... پر مڑ گئی۔

سڑکوں پر ابھی تک بھیڑ تھی، اتنی نہیں جتنی مجید کے ہوٹل جاتے وقت... اندھیرا بڑھنے کے ساتھ روشنیاں بھی زیادہ تیز اور چمکیلی ہو گئی تھیں۔ باندرے... علاقے میں داخل ہونے سے پہلے ٹھل نے ایک جگہ ٹرام رکوا کے مجھ سے...

...ٹھل کی یہ فرمائش نادر تھی۔ پان سے اُسے ایسی کوئی رغبت نہیں تھی، ...بھی کھا لیتا تھا۔ اِس وقت پان منگوانے سے پیرو کی توجہ مبذول کرانا ہی مقصود ...تا تھا۔ جانے کیوں پیرو کی پیشانی پر ابھی تک سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں جیسے وہ ...جید کے ہوٹل ہی میں ہو۔ پان کی دکان کے پاس شربت کا ٹھیلا کھڑا تھا۔ ...ن سمیت ہم چاروں نے پستے اور بادام ملا ہوا گنے کا ٹھنڈا ٹھنڈا رس پیا۔ ...ی مٹی کی سوندھ نے اُس کا ذائقہ ہی بدل دیا تھا۔ پانچ چھ منٹ کے اِس ...کا اچھا اثر ہوا۔ پیرو کے چہرے کی بشاشت لوٹنے لگی۔ پان بھی بہت ...ذائقہ اور خوشبودار تھا۔ پیرو کے ہونٹوں پر لالی بکھر گئی۔ وہ جب بھی پان ...لگتا، ہونٹوں پہ مہندی رچائی ہوئی ہے۔ ٹھل نے مسکرا کے کہا بھی کہ دادا! ...کھانے سے پہلے ذرا کلوٹے پر سلائی سے تل ٹانک لیا کرو۔

...جولین کا گھر ابھی دور تھا۔ ٹرام باندرے کی سڑکوں پر چل رہی تھی۔ پیرو ...کے متعلق ٹھل کو بتانے لگا کہ وہ اُسے چودہ پندرہ سال کی عمر میں بمبئی میں ...ا بُرے حالوں پھٹے ہوئے کپڑوں میں گندگی میں لپٹا ہوا، کسی اور شہر سے ...کے آیا تھا۔ بھوک سے تنگ آ کے وہ چوری پر اتر آیا۔ ایک روز ایک ...ی نے موقع پر اُسے پکڑ لیا۔ اتفاق سے پیرو کی نظر پڑ گئی۔ پیرو نے کہہ سن کے ...چھڑوا لیا اور اپنے ساتھ لے آیا، پڑھانے لکھانے کی کوشش کی۔ اسکول میں ...بھی دلایا لیکن وہ اسکول سے بھاگ آتا تھا۔ دو تین سال اُس نے پڑھا ...ن مگر آگے نہ پڑھ سکا۔ روز اسکول سے لڑنے جھگڑنے کی شکایتیں آتیں۔ ایک ...کسی ماسٹر پہ ہاتھ اُٹھا بیٹھا۔ بس اسکول میں وہی اُس کا آخری دن ثابت ...پیرو نے اُسے پاڑے سے دور رکھنے کے لیے بہت جتن کیے مگر بالے کے نصیب ...پاڑے کا آدمی بننا لکھا تھا۔ چاقو بازی اور زور آزمائی اُس نے چوری چھپے ...ے کے آدمیوں سے سیکھ لی تھی۔ یہ دیکھ کے پیرو نے اُسے باقاعدہ بہت کچھ سکھایا۔ ...سے قربت اور اپنی سرکشی کے سبب اُس نے ابتدا ہی میں بہت سے دشمن ...ا کر لیے تھے۔ وہ ایک نمبر کا منہ پھٹ، بے لگام اور بے جگر واقع ہوا تھا۔ ...ابھی اُس کی عمر بیس اکیس سال کے لگ بھگ ہو گی کہ وہ ایک حسین و ...ل طوائف گلابی کے ہاں آنے جانے لگا۔ کھار کے علاقے کا مشہور دادا چیتا ...گلابی پر جی جان سے فریفتہ تھا۔ بالاخانہ چیتے کے علاقے میں نہیں تھا لیکن ...بی چیتے کے علاقے میں رہتی تھی۔ سرِ شام صرف گانے کے لیے بالاخانے آ جاتی، ...وہاں نہیں جاتا تھا بلکہ جب بھی اُس کا جی چاہتا، گلابی کو اپنے ڈیرے بلا ...جا لیتا۔

تیس سال سے زیادہ چیتے کی عمر بھی نہیں تھی، ہاتھ کا بڑا اُجل تھا۔ ...ل نام اجیت تھا، پھر اجیتا ہوا اور پھر اجیتا کے بجائے لوگ اُسے چیتا کے لقب ...پکارنے لگے۔ پھرتی، لپک اور نگاہ میں وہ چیتے ہی جیسا تھا۔ دور دور تک ...کے چاقو کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ لاٹھی بھی کمال کی گھماتا تھا۔

بالے نے گلابی کے بالاخانے پر جانا شروع کیا تو پھر کہیں اور کا نہ رہا۔ لوگوں نے بہت سمجھایا کہ گلابی تو ایک طوائف ہے، اُس کے اِتنے قریب ہونا مناسب نہیں مگر گلابی خود اُس کی جانب مائل تھی۔ بالے کی آمد پر بالاخانے کے دروازے بند کر دیے جاتے۔ بالے کی موجودگی میں وہ صرف اُس کے لیے گاتی، اُس کے لیے ناچتی تھی۔ چیتا بھی اِس تعلق سے واقف ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنے آدمیوں کے ذریعے بالے کو متنبہ کیا کہ گلابی پر صرف اُس کا حق ہے۔ بالے پر مطلق اثر نہ ہوا کیونکہ اُسے گلابی کا التفات، گلابی کا اعتماد حاصل تھا۔ بالے کا اصرار تھا کہ گلابی بالاخانہ چھوڑ کے اُس کا گھر بسانے آ جائے۔ گلابی آمادہ ہو گئی اور دونوں کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا ہی چاہتا تھا کہ ایک دن چیتا عین اُس وقت بالاخانے پہنچا جب بالے وہاں موجود تھا، گلابی اُس کے لیے گا رہی تھی۔ چیتے نے دروازہ توڑ دیا اور اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ گلابی نے دیوار بننے کی کوشش کی لیکن چیتے نے ایک نہ سُنی اور ایک ہی شرط رکھی کہ وہ بالے کو فی الفور نکال دے نیز بالے دوبارہ کبھی یہاں آنے کی جرأت نہ کرے۔ بالے کے پاس چاقو نکالنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ چیتے نے اُس کا غلط تخمینہ لگایا تھا۔ خود سامنے آنے کے بجائے پہلے اُس نے اپنے ایک آدمی کو آگے بڑھایا۔ بالے نے اُسے دو ایک پینتروں میں ٹھنڈا کر دیا۔ چیتے نے اِسے اتفاق سمجھ کے دوبارہ یہی غلطی کی اور اپنے ایک دوسرے ساتھی کو بڑھنے کا اشارہ کیا۔ بالے میں بجلی بھری ہوئی تھی۔ دوسرے آدمی کے لیے اُسے اتنی دیر بھی نہیں لگی جتنی پہلے کے لیے لگی تھی۔ اپنے دو ساتھیوں کا حشر دیکھ کے چیتے کو کچھ ہوش آیا، وہ چاقو تان کے خود سامنے آ گیا۔ پیرو کے بہ قول گلابی اور بالاخانے کے سازندے گواہ ہیں کہ ابتدائی لمحوں میں چیتا بالے پر حاوی آ گیا تھا، اُس نے بالے کے بازو پر اچٹتا ہوا سہی ایک نشان ڈال دیا۔ بالے کا حوصلہ کم نہ ہوا بلکہ وہ کچھ اور سنبھل گیا۔ پھر چیتے کے ہر وار کا ناپ تول کے جواب دیتا رہا۔ اُس نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ سرِدست اُس کے لیے مدافعت کرنا ہی موزوں رہے گا چنانچہ وہ مسلسل چیتے کو موقع دیتا رہا اور طرح دے دے کے اُس کی دست رس سے بچتا رہا۔ چیتے کو لازماً پہلے حملے کی کامیابی سے مطمئن ہو جانا چاہیے تھا تاہم بالے کا یہ حربہ اُس کے لیے جھنجلاہٹ کا باعث بن گیا۔ جھنجلاہٹ نے غیظ و غضب کی صورت اختیار کر لی۔

پیرو کے کہنے کے مطابق چاقو چلاتے وقت جسم کو قابو میں رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے اور غصے میں ایسا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ چیتے کو اپنے ہاتھ پر بڑا گھمنڈ تھا، اپنی پھرتی پر بہت ناز۔ کیوں نہ ہوتا، تجربے اور پے در پے کامیابیوں سے کوئی بھی برتری کے احساس میں مبتلا ہو سکتا ہے مگر اِس احساس سے کچھ حاصل اُسی وقت ہوتا ہے جب مدِمقابل میں حوصلے یا تجربے کی کمی ہو۔ غیظ و غضب کا اظہار بسا اوقات بہت سود مند ہوتا ہے، خصوصاً مبتدیوں اور کم تجربہ کاروں کے سامنے مگر چیتا بھول گیا تھا کہ یہ سب کچھ فریقِ ثانی کی سوجھ بوجھ اور تحمل پر موقوف ہے۔ ہر بار صورتِ حال ایک جیسی نہیں ہوتی۔ اِس میں جگہ، وقت اور مقابل کی

کسی خاص ذہنی حالت کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ ایسا نہیں تھا کہ بالے کو چیتے کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا، چیتے کی شہرت سے وہ خوب واقف تھا مگر چیتا اُسے اچھی طرح نہیں جانتا تھا، اُسے معلوم نہیں تھا کہ بالے نے یہ فن کہاں سے سیکھا ہے۔ بالے کو بتایا گیا تھا کہ وہ ہر بار آخری معرکہ سمجھ کے چاقو اٹھائے۔ نوجوانی کے باوجود بالے استقامت کا ثبوت دیتا رہا۔ وہ پینترے بدل بدل کے چیتے کو پہلے سے زیادہ مشتعل اور منغض کرتا رہا۔ اس دوران چیتا ایک اور کاری وار کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اُس نے بالے کی بائیں بھوں کھول دی۔ چاقو بالے کے ماتھے پر نشان ڈالتا ہوا بھوں کو بیچ سے کاٹ گیا۔ بالے کی بائیں آنکھ میں خون بھر گیا، چہرہ لال ہوگیا، کپڑے بھی تر بتر ہوگئے لیکن بالے کا عزم زخمی نہیں ہوا۔ وہ پتھر بنا رہا۔ اُس نے بھی ایک غلطی کی تھی اور وہ یہ کہ مدافعت کرنے اور چیتے کو مشتعل کرنے میں ضرورت سے زیادہ وقت لگا دیا، اس کا اندازہ اُسے بعد میں ہوا جب پہلی بار مدافعانہ رویہ ترک کرکے اُس نے چیتے پر حملہ کیا۔ اتنی شکستگی اور ابتری کے بعد چیتے کو یقیناً ایسی توقع نہ ہوگی۔ جو شخص مسلسل حاوی رہا ہو اُسے مدافعت پر آجانے میں چند لمحے ضرور لگتے ہیں۔ انھی منتشر لمحوں میں بالے نے اُس پر لگاتار حملے کیے۔ بالے کا چاقو بہت دیر سے پیاسا تھا۔ معدے سے ناف تک چیتے کا پیٹ چاک کرکے ہی اُس کی تشنگی کچھ بجھی۔

چیتا وہیں ڈھیر ہوگیا۔ اُس کے دونوں ساتھی وہاں سے بھاگ لیے۔ بالے بھی زیادہ دیر اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ وہ اگر مدافعت ترک کرنے کا فیصلہ کچھ دیر پہلے کرلیتا تو اتنا خون نہ بہتا اور اُس کی آنکھ بھی بچ جاتی۔ بھوں کا زخم آنکھ تک کُھل گیا تھا، آنکھ میں خون الگ جم گیا تھا۔

بالے گرفتار کرلیا گیا لیکن گلابی اور سازندوں کی شہادتیں اُس کے حق میں تھیں، بالے اکیلا تھا، مخالفوں کی تعداد پانچ تھی اور بالے پہلے سے بالاخانے پر تھا۔ اُس وقت تک خوش قسمتی سے بالے کسی بھی جرم میں جیل نہیں گیا تھا۔ اُس کی عمر بھی کم تھی۔ دوسری طرف چیتا اور اُس کے ساتھیوں کا مکمل ریکارڈ پولیس کے پاس محفوظ تھا۔ مقدمے میں زیادہ دن نہیں لگے تاہم بالے کو پانچ سال کی سزا ہوگئی۔ جیل میں گلابی تواتر سے اُس کے پاس جاتی۔ اُس نے بالاخانہ بھی چھوڑ دیا تھا۔ بالے کو جیل سے جلد ہی چھٹی مل گئی، اپنے اچھے کردار اور سزاؤں میں عام تخفیف ہوجانے کے سبب وہ جیل کے دروازے سے نکلا تو گلابی اُس کی منتظر تھی۔ پھر بالے پاڑے کی طرف نہیں گیا۔ چند دنوں بعد دونوں نے پیرو کی موجودی میں شادی کرلی۔ بالے کو قلابے کے کسی تاجر کے مکان میں ایک مختصر کوارٹر مل گیا۔ یہ ایک مشکل زندگی تھی لیکن اِس نئی زندگی سے دونوں بہت خوش تھے۔ پیرو اُن کے گھر دو تین بار گیا۔ گزر بسر کے لیے پیرو کی اعانت سے بالے نے بھنڈی بازار میں ایک چائے خانہ کھول لیا۔ یہ چائے خانہ ایک دکان سے بڑا نہیں تھا مگر دکان اچھی چل نکلی۔ بالے کو گھر بسائے دو ماہ کے قریب ہوئے تھے کہ ایک رات وہ دن بھر چائے خانے میں کام کرنے کے بعد گھر پہنچا تو گلابی زندہ [illegible] کی برہنہ لاش کمرے میں پڑی تھی۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ گلابی آخر [illegible] کرتی رہی۔ بالے کے پاگل ہونے میں کوئی کسر نہ رہ گئی۔ پیرو اُسے [illegible] اور پھر اُسے وہاں سے نہیں نکلنے دیا۔

بعد میں بالے نے کھار کے علاقے میں چیتے کے ایک ایک [illegible] کے ختم کردیا۔ پیرو کہہ رہا تھا کہ یہ سب کچھ ہوا لیکن اتنے سال گزر جانے [illegible] بالے کو قرار نہیں آیا ہے۔ کبھی کبھی تو وہ ایک دم دیوانہ سا ہو جا[illegible] کو فکر لگی ہوئی تھی کہ اُس نے بالے سے کچھ زیادہ تو نہیں کہہ [illegible] رہا تھا کہ اگر بالے پر پھر جنون طاری ہوگیا تو یہ اچھا نہ ہوگا، جانے [illegible] کا نشانہ بن جائے۔ وہ مجید کے ہوٹل کو کہیں پھونک نہ ڈالے۔

بالے کو میں نے کئی بار دیکھا تھا اور تھوڑی دیر پہلے بھی یوں ہی سرسری۔ اب اُسے قریب سے نہ دیکھنے کا مجھے افسوس ہو رہا ہے۔ بس سرسری گزر جاتے ہیں۔ ہر آدمی سائے کی طرح ایک کہانی لیے پھرتا ہے۔ ؎ سرسری تم جہان سے گزرے ۔ ورنہ ہر جا جہا[illegible]

بالے کو دیکھ کے کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اندر سے اتنا شکستہ ہے، اتنا زخمی ہے۔ تھمل بھی پورے انہماک سے سن رہا تھا، راستہ گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ کوچوان نے ا[illegible] آہستہ کرکے ہم سے اپنی منزل کے لیے پوچھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہ [illegible] علاقہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ میں کرشنا جی کے زمانے میں اور پھر بالا[illegible] کے گھر لینے کے بعد انھی راستوں سے آیا جایا کرتا تھا۔ میں نے غور [illegible] میں دیکھا تو حیران رہ گیا۔ جولین کا گھر پیچھے رہ گیا تھا۔ کوچوان نے [illegible] اُس نے بروقت پوچھ لیا تھا، ابھی ہم اتنے آگے نہیں آئے تھے۔ سا[illegible] چوراہے سے کچھ ہی دُور ہماری منزل تھی۔ ہم نے چوراہے پر ٹم ٹم والے [illegible] دیا اور باقی راستہ پیدل طے کرنے کا فیصلہ کیا۔ پورا علاقہ رہائشی [illegible] سڑکوں پر اتنی روشنی نہیں تھی۔ سات آٹھ منٹ کی چہل قدمی کے [illegible] کی گلی میں داخل ہوگئے۔ پورا ایک دن گزر چکا تھا۔ اُس نے صبح ہی [illegible] شروع کردیا ہوگا اور اب رات ہوجانے کے بعد بھی مایوس نہیں [illegible] کاش کانتے اور مارٹی نے اُسے میرے اور تھمل کے بارے میں [illegible] ہم اچانک پہنچیں گے تو اُس کا عالم دیکھنے کا ہوگا مگر کانتے اور مارٹی [illegible] برداشت کی توقع نہیں تھی۔

گھر قریب آنے پر میرا جی گھبرانے سا لگا۔ جولین کے خیال سے [illegible] کرشنا جی کا چہرہ گھوم جاتا تھا۔ مکان کے باہر خاموشی تھی۔ دروازے [illegible] اُگا ہوا ناریل کا درخت خوب بڑا ہوگیا تھا۔ کرشنا جی کو ناریل کے [illegible] کوئی خاص نسبت تھی۔ جولین نے انھی کی یاد میں یہاں ناریل لگا[illegible]

سے کوئی آواز، کوئی چہکار نہیں آرہی تھی۔ اگر وہ لوگ ہوتے تو دروازہ کھلا ہوتا، بیٹھنے کا کمرہ کھلا ہوتا۔ وہ ایسے خاموش تو نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ ابھی رات بھی اتنی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے مڑ کے تھمل کو دیکھا۔ کہیں جولین نے مکان تو نہیں بدل دیا؟ وہ یہاں ٹھہر نہیں سکے، کہیں اور چلے گئے؟ تھمل نے مجھے دستک دینے کا اشارہ دیا۔ اگر چوکھٹ پر بجلی کی گھنٹی لگی تھی، میں نے اُسے دبانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو سانسیں سینے میں اٹکنے لگیں۔ اندر سے گھنٹی کی آواز آئی۔ دوسری گھنٹی بجانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ دروازہ کھلنے کی کھڑکھڑاہٹ پر میں نے ہاتھ روک لیا۔ دروازہ کھلا تو سامنے جولین کھڑی تھی، اپنے اُسی پسندیدہ لباس میں۔ سفید ساڑی میں لپٹی ہوئی پھول کی طرح کھلی ہوئی۔ ایک لمحے کو تو جیسے اُسے بچھو نے ڈنک مار دیا۔ میری آنکھیں بھی چندھیا گئیں۔ گویا میری آمد کے بارے میں اُسے کچھ نہیں معلوم تھا۔ وہ پہلے تو دروازے پر حیران پریشان، سکتے کی سی کیفیت میں کھڑی رہی پھر جیسے اچانک سمندر میں تلاطم آگیا۔ وہ بے تحاشا میری طرف اُمڈی، میرے بازو بھی اُٹھ گئے لیکن میرے قریب آکے وہ سمٹ سی گئی اور پھیلی پھیلی آنکھوں سے مجھے دیکھا کی۔ معاً تھمل سامنے آگیا اور اُس نے اُسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ ”کیسی ہے میم؟“ تھمل اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ”اتنا گھٹا کیوں لیا ہے رمی؟“

جولین سے ذرا دیر بھی ضبط نہ ہوا، تھمل کا سر پہ ہاتھ رکھنا اور پوچھنا تھا کہ وہ پھٹ پڑی۔ تھمل نے تھپکتی آواز میں کہا۔ ”لوٹ جائیں رمی؟ یہ تیرا اپنے پلے بھی کتنی نہیں ہیں۔“

جولین کا سوتا اور پھوٹ پڑا۔ تھمل اُسے پہلو میں سمیٹے ہوئے اندر داخل ہوگیا۔ کمرے میں کرسیاں رکھی تھیں۔ ابھی ہم بیٹھے نہیں تھے کہ اندر سے چمپا بیگم کی آواز آئی، یہ اُسی کی آواز تھی۔ وہ پوچھ رہی تھی کہ کون آیا ہے؟ کسی نے جواب نہیں دیا تو چمپا بیگم خود وہاں آگئی۔ پہلے اُس کی نظر مجھ پر پڑی، اُس کا حال بھی کچھ مختلف نہیں ہوا۔ بے اختیار اُس نے اپنے سینے پہ ہاتھ مارا۔ ”اللہ! یہ تم ہو پیارے میاں! یا میں خواب دیکھ رہی ہوں؟“ وہ ہانپتی آواز میں بولی۔ میرے پاس آکے اُس نے مجھے اپنے حلقے میں لے لیا، میری پیشانی چومی اور بلائیں لیں۔ ”پوچھو بٹیا سے۔ کل سے میرا دل دھڑک رہا تھا۔ میں کہہ رہی تھی شاید پیارے میاں آجائیں۔ اتنے دن کہاں رہے؟ خط بھی نہیں لکھا۔ کوئی خبر ہم دکھیاروں کی نہ لی۔“ وہ ایک ہی سانس میں بولی۔

چمپا بیگم جب بھی سامنے آتی تھی میرا سینہ کوئی نوچنے، مسوسنے لگتا تھا۔ میں نے اُسے کوئی جواب نہیں دیا، وہ اور بے کل ہوگئی۔ ”ٹھیک تو ہو؟ کیسے دُبلے لگ رہے ہو؟“

”ہاں سب ٹھیک ہے۔“ میں نے بھنچی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تم تو ٹھیک ہو؟“

”اللہ کا شکر ہے، بہت بہت احسان ہے اُس کا۔“

چمپا بیگم کی صورت ہی بدل گئی تھی۔ چہرہ نکھرا ہوا، چمکتی پیشانی، رنگ کچھ اور اُجلا ہوگیا تھا۔ سفید دوپٹے اور سُرمئی کُرتے پاجامے میں وہ یکسر بدلی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ جگہ اور مشاغل آدمی پر یوں اثر انداز ہوتے ہیں کہ آدمی کا چہرہ بدل دیتے ہیں، رنگ بدل دیتے ہیں۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ فلاں کے چہرے پر نور ہے، چمپا کے چہرے پر یہی کیفیت تھی جیسے اُسے کسی نے سرتاپا دھو دیا ہو۔ پاس بیٹھ کے وہ میرے ہاتھ چومنے لگی۔ پھر جولین کی ماں بھی اندر سے آگئی۔ وہ بھی اسکرٹ کے بجائے ساڑی پہنے ہوئے تھی۔

دیکھتے دیکھتے سارے گھر میں ہل چل سی مچ گئی۔ گھر کا پرانا ملازم بکھو، جولین، اُس کی ماں سبھی اِدھر اُدھر بے قراری سے پھر رہے تھے۔ مکین متحرک ہوں تو گھر کے در و دیوار متحرک ہوجاتے ہیں، مکین خاموش رہیں تو در و دیوار بھی گونگے بن جاتے ہیں۔ آدمی صحرا ہو تو گلزار بھی صحرا ہوجاتا ہے۔ تھمل اور پیرو کے منع کرنے کے باوجود اُنھوں نے درمیانی میز پر قسم قسم کی چیزوں کا انبار لگا دیا۔ تھمل نے کھانے کے لیے صاف انکار کردیا تھا، اس پر یہ حالت تھی۔ پیرو حیرت کا اظہار کرنے لگا کہ اتنی جلد اتنی بہت سی چیزیں اُنھوں نے کس طرح اکٹھی کرلی ہیں مگر جولین کو یہ کرتب خوب آتا تھا۔ چٹ پٹ طرح طرح کی چیزیں تیار کرلیتی تھی۔ مجھے یاد تھا، اِدھر وہ مجھ سے کچھ پوچھتی، اُدھر تیار کرکے لے آتی۔ وہ بالکل وہی تھی، وہی شام سی چہرے پر چھائی ہوئی، وہی چمکیلی اور حیران حیران آنکھیں۔ تھمل نے ٹھیک کہا تھا، وہ پہلے سے کچھ گھٹی ہوئی معلوم ہوتی تھی لیکن کبھی کبھی کمی بھی خوبی بن جاتی ہے۔ لگتا تھا جیسے کسی مجسمہ ساز نے اپنے مجسمے پر نظرِ ثانی کی ہو۔ اُس میں وہی تیزی اور چستی نظر آرہی تھی جس پر مجھے بعض اوقات تو بڑی حیرت ہوتی تھی۔ یکے بعد دیگرے وہ ہر کام اِس پھرتی سے نمٹاتی کہ مشین کا گمان ہوتا۔ کتنے ہی لوگ کیوں نہ آجائیں، اُس کی پیشانی پر شکن نہیں پڑتی تھی۔ نرینہ میں بھی یہی خوبی تھی۔ دونوں میں ہزار شباہتیں تھیں پھر بھی کوئی ایک بات دونوں میں بہت مختلف تھی۔

شہ بارہ نظر نہیں آرہی تھی نہ کانتے اور مارٹی وغیرہ دکھائی دیے۔ مجھے پوچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ کوئی بات ہی ہوگی جبھی اُن میں سے کوئی اُن کا ذکر نہیں کر رہا تھا۔ مجھے شبہ ہونے لگا، کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ یہاں آئے ہی نہ ہوں، کانتے پہلے ہی منع کر رہا تھا، ممکن ہے وہ پاڑے کی طرف چلے گئے ہوں۔ چائے لانے کے بعد وہ کسی قدر اطمینان سے ہمارے سامنے بیٹھیں تو پیرو سے نہ رہا گیا۔ اُس نے کانتے کے بارے میں پوچھا۔ ”ابھی وہ کیدھر ہے اپن کا دادا! کانتے مہاراجا؟“

چمپا بیگم نے سر جھکا لیا اور ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ”وہ اسپتال میں ہیں۔“

”اسپتال میں؟“ تھمل نے چونک کے کہا۔ ”کیا بولتی ہو؟“

”انھیں سویرے ہی اسپتال بھیج دیا گیا تھا۔“

"ابھی کیسا ہے وہ ؟" پیرو نے بے چینی سے پوچھا۔

تبھل اور پیرو کے چہرے بھاری ہو گئے۔ وہ اِسی لیے اُس کا ذکر کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ پیرو کے پوچھنے پر چمپا بیگم نے بتایا کہ رات ہی ڈاکٹر گھر پر بلا لیا گیا تھا۔ وہ دیر تک معائنہ کرتا رہا اور ناراض ہونے لگا کہ اتنی دیر کیوں کر دی گئی ہے۔ اُس نے سُوئی لگائی اور کئی قسم کی دُوائیں تجویز کیں، مارتی اُس کے اسپتال سے فوراً دوائیں لے آیا۔ ڈاکٹر نے ہدایت کی تھی کہ اگر رات طبیعت نہ سنبھلے تو صبح کسی تاخیر کے بغیر کانتے کو اسپتال میں داخل کرا دیا جائے۔ رات بھر سب جاگتے رہے۔ کسی دوا نے اثر نہیں کیا، کانتے ساری رات بستر پہ تڑپتا رہا۔ صبح ہوتے ہی جولین اور مارتی اُسے ڈاکٹر شرما کے اسپتال لے گئے، دوپہر تک جولین اُس کے پاس رہی پھر شام تک چمپا بیگم اور ابھی کچھ دیر پہلے مارتی شرپاوہ کو اسپتال لے گیا ہے، وہ رات بھر مارتی کے ساتھ وہاں رہے گی۔ کانتے کے لیے الگ کمرہ لیا گیا ہے، دو تیمارداروں سے زیادہ ٹھہرنے کی اجازت نہیں۔ ڈاکٹر کو اچھی طرح جتا دیا گیا ہے کہ روپے پیسے کی قطعاً فکر نہ کی جائے۔

"ابھی بولتا کیا ہے ڈاکٹر؟" پیرو نے متوحش لہجے میں پوچھا۔

چمپا بیگم نے بتایا کہ ڈاکٹر نے سر میں کسی اندرونی چوٹ کا خدشہ ظاہر کیا ہے۔ کوئی رگ زخمی ہونے اور خون جم جانے کا بھی کہا ہے، ضرورت پڑی تو دو تین روز بعد آپریشن کیا جائے گا۔

"ابھی کون ڈاکٹر ہے وہ؟" پیرو نے بگڑے منہ سے کہا۔

"ڈاکٹر شرما یہاں کے مشہور ڈاکٹر ہیں۔" جولین نے پہلی بار زبان کھولی۔ پیرو کا لہجہ ضرور اُسے گراں گزرا تھا۔

"سُنا ہے اللہ نے اُس کے ہاتھ میں شفا دی ہے۔" چمپا بیگم افسردگی سے کہنے لگی کہ شہر کے کونے کونے سے لوگ اُس کے ہاں آتے ہیں۔ صبح سے شام تک مریضوں کا تانا بندھا رہتا ہے۔ مریضوں کی کثرت نے اُسے تند خو بنا دیا ہے، کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا لیکن لوگ اُس کی ہر تلخی سہہ لیتے ہیں۔ بڑی مشکل سے اُس تک رسائی ہوتی ہے اور اُس کے اسپتال میں جگہ ملتی ہے۔ رات بھی اُسے بُلانے کے لیے جانے کتنی منتیں کی گئیں۔ جولین نے باقاعدہ بُرا بھلا کہا تب کہیں ڈاکٹر شرما کو مریض کی نازک حالت کا کچھ احساس ہوا۔ چمپا بیگم نے بتایا کہ ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ہی زدرا، جمرد، شامو اور ٹنگو یہاں سے چلے گئے تھے حالانکہ اُنھیں روکنے کی بہت کوشش کی گئی تھی۔ چاروں صبح کسی وقت آنے کا کہہ گئے تھے۔ دوپہر کو صرف ٹنگو آیا اور اسپتال میں کئی گھنٹے ٹھہر کے شام کو چلا گیا۔ اُنھوں نے میرے بارے میں کسی کو ایک لفظ بھی نہیں بتایا تھا البتہ تبھل کے لیے صرف اتنا کہا تھا کہ اُس کی آمد کسی وقت بھی متوقع ہے۔

پیرو کچھ دیر اور کانتے کے بارے میں نہ پوچھتا تو ٹھیک تھا۔ ابھی ہمیں آئے وقت ہی کتنا ہوا تھا کہ وہاں بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ میں پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ

اُسے فوراً کسی طبیب کو دکھا دینا چاہیے۔ اب اُس سُور کی اولاد مُوری کے جانور کو کیا ہو گیا جو دونوں اتنے فکر مند ہو رہے ہیں۔ سارا سفر اُس کس عذاب میں کاٹا ہو گا۔ محض ہمارا راستہ کھوٹا نہ کرنے کے لیے وہ جانے طرح خود کو باندھے سمیٹے رہا ہو گا، کسی ٹھکانے پر پہنچ کر ظاہر ہے سر بکھر جانا چاہیے تھا۔ جانور کی برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ پیرو نے وقت اسپتال چلنے کا مشورہ دیا لیکن چمپا بیگم نے بتایا کہ ڈاکٹر نے ملاقاتیوں کی تعداد پر پابندی لگا دی ہے۔ خصوصاً رات کے وقت تو اسپتال میں ممکن ہی نہیں ہے۔ ڈاکٹر شرما نہایت سخت آدمی ہے۔ اتنی حجت کے بعد وہ راضی ہوا ہے، اب اگر اُس کی مرضی کے خلاف کچھ ہوا تو وہ علاج سے اُٹھا لے گا۔ وہ ایسا ہی بدمزاج ہے۔

تبھل کی آنکھیں سکڑ گئی تھیں۔

"ابھی چل کے دیکھتا ہے تبھل بھائی!" پیرو نے بے تابی سے کہا۔

"بہتر ہے، آپ اِس وقت یہ ارادہ ملتوی کر دیں۔ ڈاکٹر صاحب سوچ سمجھ کے ہی یہ پابندی لگائی ہے۔" چمپا بیگم نے دبی زبان سے کہا۔ "تک اور انتظار کر لیجیے۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہاں دوائیں جاری ہیں تو یہاں سبھی کانتے کے لیے دُعائیں کر رہے ہیں۔ مار علاوہ وہاں شپارے بھی موجود ہے اور سچ پوچھیے تو اُس کی موجودگی میں کسی کی ضرورت نہیں۔ اُٹھتے بیٹھتے وہ کانتے کا دم بھرتی ہے جو اُس کے بہ قول اُسے میں لے آیا تھا۔ کانتے کو اِس حالت میں دیکھ کے وہ اپنے حواس کھو بیٹھی۔ بہت اچھی بچی ہے۔ جب سے آئی ہے، سارے گھر میں رونق آ گئی ہے۔ جولی کوئی کام کرنے ہی نہیں دیتی۔ دونوں میں ایسی بنی ہے کہ لوگ دیکھیں تو رشک کریں۔ جولین نے اُسے پڑھانا شروع کیا تو ایسی فرفر گٹ پٹ کرنے لگی کہ پوچھیے۔ دیکھیے گا، وہی کانتے کی مسیحا ثابت ہو گی۔ اُس سے زیادہ کون اُس کا خیال رکھ سکتا ہے۔ اپنے محسن کی خدمت کا ایک تو موقع ملا ہے اُسے۔"

تبھل بت بنا بیٹھا رہا۔

چمپا بیگم اور جولین کے کہنے پر ہم تینوں نے سیب کی چند قاشیں اور انڈے کے حلوے کے دو چار چمچے حلق میں اُتار لیے۔ اُنھوں نے بھی زیادہ نہیں کیا۔ چائے پینے کے کچھ دیر بعد پیرو نے اُٹھنے کا ارادہ ظاہر کیا، وہ سبھی زدہ رہ گئیں۔ "کیا مطلب؟" جولین سٹ پٹا کے بولی۔ "آپ یہاں نہیں ٹھہریں گے؟"

"نہیں بیٹا! ابھی نہیں، پھر آئیں گے۔ آتے رہیں گے۔" تبھل نے رُک کر کہا۔ "ابھی ہم کو جانا ہے۔"

"کہاں؟ اب آپ کہاں جائیں گے؟"

"تھوڑا کام ہے۔" تبھل نے بوجھل لہجے میں کہا۔

"اِس وقت کہاں جائیے گا؟"

"لاڈلے کے گھر۔"

"لاڈلے کے گھر؟" جولین اضطراب سے بولی۔

"ہاں ری! کل تجھ کو بھی اُدھر لے جائیں گے۔ وہ سب لوگ مل گئے۔" تبھل نے آہستگی سے کہا۔

"کیا، کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" جولین کی آواز سنسنانے لگی۔ اُس نے جلتی بجھتی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور مضطربانہ پوچھا۔ "سچ مچ؟"

"ہاں ری۔" تبھل نے سر ہلا کے کہا۔

"کب کب؟"

"کل رات ہی کو کانتے کو ادھر بھیج کے ہم اُدھر چلے گئے تھے۔"

"مگر ہمیں تو کسی نے کچھ نہیں بتایا؟"

"ابھی کیسے بتاتے، اُدھر جا کے اور سب کو دیکھ کے ہی تو بولتے نا۔"

"کہاں ہیں وہ؟"

"اِدھر ہی ہیں۔" تبھل نے کہا۔ "اِدھر ہی شہر میں۔ دادر کے علاقے میں۔"

چمپا بیگم، جولین اور اُس کی ماں کی نظریں مجھ پر مرکوز ہو گئی تھیں۔

"ارے پیارے میاں!" چمپا بیگم منڈلاتی آواز میں بولی۔ "یہ خوش خبری تو تمھیں پہلے ہی سنانی چاہیے تھی۔"

میں نے سر جھکا لیا۔ تبھل نے تندی سے کہا۔ "منہ سے کیوں نہیں پھوٹتا۔"

"ہاں ہاں بتاؤ نا ہمیں۔ یہ سب کیسے ہوا۔ اللہ نے ہماری سُن لی خدا گواہ ہے کوئی وقت ایسا نہیں جاتا تھا جو اُن کا خیال نہ آتا ہو۔ اے میرے رب۔۔۔۔"

چمپا بیگم کی آواز ڈوبتی گئی۔

"اُدھر چلنا تم۔" میں نے اٹکتی زبان سے کہا۔

"سبھی، وہ سبھی ہیں نا؟" جولین کی آواز کپکپا رہی تھی۔

"ہاں سبھی۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"مگر کیسے! یہ سب کیسے ہوا؟"

"بہت لمبا کہانی ہے۔" پیرو نے درمیان میں کہا۔

"ارے!" جولین غیر ارادی طور پر کرسی سے اُٹھ گئی۔ اُس کے چہرے پر سرخی بکھر گئی اور آنکھوں میں قمقمے سے جلنے بجھنے لگے۔ وہ کبھی مجھے دیکھتی، کبھی اُن دونوں کو کہ کہیں ہم مذاق تو نہیں کر رہے ہیں۔ میں بہت دنوں تک اُس کے ساتھ رہا تھا۔ وہ خود پر قابو رکھنا جانتی تھی، اتنا بے اختیار اُسے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ "ہم ابھی جائیں گے۔" وہ حتمی لہجے میں بولی۔

"ابھی!" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ ابھی جانے میں کوئی حرج ہے؟"

"نہیں! وہ گھر دوسرا تو نہیں ہے۔"

"ہاں ہاں! اپن سب ابھی چلیں گے۔" جولین کی ماں اشتیاق سے بولی۔ "اپن سب لوگ دُعائیں کرتا تھا، اوہ گاڈ!"

"ابھی جاتے جاتے دیر بہت ہو جائے گی۔ ہمیں ذرا اور جگہ بھی جانا ہے۔" تبھل نے زیر لبی سے کہا۔ "کل ٹھیک رہے گا۔"

"ہمیں پتہ بتا دیجیے۔" جولین تیزی سے بولی۔ "ہم خود چلے جائیں گے بابا!"

"اب سویرے ہی جانا بیٹیا!" تبھل نے نرمی سے کہا۔

"سویرے تک شاید ہی کسی کو نیند آ سکے۔" جولین کی ماں بولی۔

"صبح میں خود لے جاؤں گا۔"

"کیسے ہیں وہ لوگ؟" جولین کی آواز سنسنا رہی تھی۔

"خود دیکھ لینا ری، تیری طرح کانچ کے بنے ہوئے ہیں۔"

"اوہ، اوہ۔" وہ آنکھیں میچ کے بولی۔ "یہ کتنا عجیب ہے۔"

"شکلا جی آج کل کہاں ہیں؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

"شکلا جی! یہیں بمبئی میں ہیں۔ اُن کی ترقی ہو گئی ہے۔ آتے رہتے ہیں اور جب بھی آتے ہیں، اپنے دوست کو ضرور پوچھتے ہیں۔"

اُس کی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہوئی اضطراری کیفیت سے کچھ لطف آنے لگا تھا۔ تبھل اور پیرو سامنے بیٹھے تھے ورنہ میں اُس کا تجسس اور فزوں کرتا۔ میں نے اُسے بتایا کہ اصل میں یہ سب شکلا جی کی وجہ سے ممکن ہو سکا۔

"اُن کی وجہ سے؟ نہیں۔"

"کرشنا جی کے بعد وہ مسلسل ٹوہ میں لگے رہے۔ شکلا جی کے سوا کوئی ہوتا تو اتنی فکر کیوں کرتا۔ اُنھوں نے فیض آباد لکھا تھا کہ ابا جان کی وضع قطع کے ایک صاحب آسام کی طرف دیکھے گئے ہیں۔ ہم فوراً روانہ ہو گئے۔" میں نے اُسے تبت کا واقعہ نہیں بتایا، مختصراً کہا۔ "بس اُدھر ہی ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک دن ہم اُن تک پہنچ گئے۔"

اُسے عرصہ یاد تھا، کہنے لگی۔ "دس سال کے قریب ہو گئے تھے نا؟"

"ہاں کم و بیش۔"

"یہ سب کسی خواب کے مانند ہے۔" وہ لہراتی آواز میں بولی۔

اِس وقت اُنھیں گھر جانے اور سب کو دیکھنے کے بے پناہ ارادے سے روکنے کے لیے تبھل اور پیرو کو متعدد عذر کرنے پڑے۔ وہ کچھ دیر اور ٹھہرنے کے لیے کہہ رہی تھیں لیکن تبھل اُٹھ گیا۔ چلتے چلتے وہ تینوں صبح جلد آنے کے لیے تکرار کرتی رہیں۔ اُن کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ہمیں رخصت کرنے کے لیے گلی کے کنارے تک آئیں۔ گلی سے نکلتے ہی پیرو نے ایک راہ گیر سے ڈاکٹر شرما کے اسپتال کا پتہ پوچھا۔ زیادہ فاصلہ نہیں تھا، ہم پیدل ہی چلتے رہے، ایک اور جگہ پوچھنے کی ضرورت پڑی۔ آدھ گھنٹے سے پہلے پہلے ہم اسپتال پہنچ گئے۔ جدید طرز کی ایک بڑی اور صاف ستھری عمارت تھی، پُرسکون دھیمی دھیمی روشنیاں۔ عمارت دروازے سے خاصی دُور تھی۔ لوہے کے جالی دار گیٹ پر پختہ عمر کے لاٹھی بردار پہرے دار

کو ہم تینوں نے طرح طرح سے آمادہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ انکار میں سر ہلاتا اور گیٹ پر آویزاں بورڈ کی طرف اشارہ کرتا رہا۔ بورڈ پر اسپتال کے اوقات کے بارے میں صاف لکھا تھا، صبح ۸ سے ۱۱ بجے تک، شام ۵ سے ۸ بجے تک۔ پیرو کی طرف سے پانچ روپے کا نوٹ بڑھانے پر پہرے دار کی آنکھیں کھل گئیں لیکن اُس نے نوٹ بھی واپس کر دیا۔ وہ ایک ہاتھ کا بھی نہیں تھا۔ چار دیواری بھی اتنی اونچی نہیں تھی کسی طرف سے بھی پھاندی جا سکتی تھی مگر یہ اسپتال تھا، کوئی اور جگہ ہوتی تو بات دوسری تھی۔ پیرو نے دس منٹ کے لیے صرف ایک آدمی کے اندر جانے کی اجازت مانگی، پہرے دار اس پر بھی راضی نہیں ہوا اور اپنی نوکری کا واسطہ دینے لگا۔ کوئی صورت نہ دیکھ کے آخر پیرو نے کمرہ نمبر ۴ سے مارٹی کو بلانے کی بات کی۔ نوٹ پیرو کے ہاتھ ہی میں تھا، پہرے دار نے اُسے جیب میں رکھا، دروازہ اندر سے بند کیا اور دو تین منٹ میں واپس آ گیا۔ اُس نے آگے جا کے کسی اور شخص کو اندر بھیج دیا تھا۔ جتنی دیر ہم باہر کھڑے مارٹی کا انتظار کرتے رہے پہرے دار معذرتیں کرتا رہا کہ اگر ہم دس بجے تک بھی آ جاتے تو وہ کوئی راستہ ڈھونڈ لیتا۔ اُس کی زبانی معلوم ہوا کہ حادثے کی صورت میں آنے والے نئے مریضوں کا راستہ پچھلی طرف سے ہے۔ ہمیں پہلے اُسی جانب جا کے کوشش کرنی چاہیے تھی۔

پانچ چھ منٹ کے اندر اندر مارٹی ہمارے سامنے تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ بکھر پڑا اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ اُس سے کچھ جاننے کو اب کیا رہ گیا تھا۔ تجھل اور پیرو ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ "ابھی ایدر ایک بڑا اسپتال بھی ہے۔" پیرو نے مشورہ دیا۔ "بولے تو اُدر جا کے بات کرے۔"

"اِس جگہ بھی کوئی کمائی نہیں ہے دادا۔ . . ." ... روتے ہوئے بولا۔

"ابھی ہر گھنٹا بعد کوئی ڈاکٹر وزٹ کر کے جاتا ہے۔"

"بولتا کیا ہے؟" پیرو نے تنک کے پوچھا۔

"ٹھیک سے کچھ نہیں بولتا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بول کے گیا تھا کہ کل شام تک اور دیکھے گا، آپریشن کرنے کا ہے کہ نہیں۔"

مارٹی کے مزید کچھ کہنے سے پہلے مَیں نے تجھل سے کہا کہ مارٹی کے بجائے آج رات کانتے کے پاس مَیں ٹھہروں گا لیکن تجھل نے منہ بنا کے ایسے مسترد کر دیا جیسے مَیں نے کوئی فضول بات کہہ دی ہو، کوئی احمقانہ بات کہنے لگا کہ مجھے گھر واپس جانا چاہیے۔ ہاں ابا جان اور وہ سب میری راہ تک رہے ہوں گے اور کہنے لگا کہ مارٹی کے بجائے وہ خود اندر جائے گا۔

"اپن جائے گا۔" پیرو نے تیزی سے کہا۔ "اپن کا بات وہ بہت مانتا ہے۔ ابھی اپن اُس کا پورا دھیان رکھے گا۔"

"نہیں دادا! تم کو اب اپنے گھر اور پاڑے کی طرف جانا ہے۔" تجھل نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "اِدھر اُس کو بچپن سے بھگت رہے ہیں۔ کبھی وہ ایسا ہی ہٹی ہو جاتا ہے۔ مجھ کو اُس کی رگیں معلوم ہیں۔"

"ابھی تم پاڑے نہیں گیا دادا؟" مارٹی متردد لہجے میں بولا۔

"چلا جائے گا ماسٹر! اُدر بھی جانے گا۔" پیرو نے ترشی سے کہا۔

"ایدر ٹنگو آ کے بولتا تھا، اُودر سب پاڑے میں مٹھا تھا ہے۔ کبھی اور گلیا اُن دو ریل والا لوگ کو بھی پاڑے میں لے"

"وہ لوگ پاڑے میں ہیں؟" مَیں نے تعجب سے پوچھا۔

"ٹنگو ابھی اپن سے یہی بولا تھا۔" مارٹی نے محتاط لہجے۔ "اُن کو اُودر الگ کمرے میں ڈال دیا گیا ہے اور سب دادا کا انتظار دادا! ....." وہ پیرو سے مخاطب ہو کے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر

"کیا ہے ماسٹر؟" پیرو نے ناگواری سے پوچھا۔

"کیا بولے دادا!" مارٹی کتراتی ہوئی آواز میں بولا۔ "ٹنگو تھا، ایدر دادا کے پیچھے بمبئی میں بہت اُلٹ پلٹ ہو گیا ہے۔ قلا... ایدر بائی کلا کا دادا لوگ نے پاڑے کا بھتا بھیجنا بند کر دیا ہے۔ ... دادا نہیں ہے تو بھتا بھی نہیں ہے، اپن پیرو دادا کو جانتا تھا... کے آئے گا تو دیکھے گا۔ تینوں نے سالا ایکا کر لیا ہے۔ ٹنگو بولتا... اُودر جا تو لے کے جانے کا تھا پر دوسرا لوگ باگ نے ابھی تھوڑا...

"ایسا!" پیرو کی آواز ایک دم بھڑکنے لگی۔ "ایسا! اپن سیدھا ابھی اُن کی طرف جائے گا۔"

"دیکھیں گے دادا! اُن لوگ کو بھی دیکھیں گے۔" تجھل... کہا۔ "ایسی جلدی تو نہیں پڑی ہے۔ ہم بھی ساتھ چلیں گے۔"

"اُن لوگ کو پتہ چل گیا ہو گا کہ اپن ایدر آ گیا ہے۔ ابھی... تو سالا اُلٹا سمجھنے لگے گا۔ ایدر اور پاڑوں کا دادا لوگ بھی ہے... بھی دھیان میں رکھنے کا ہے۔ ابھی سمجھا تجھل بھائی!"

"اور ابھی تم کانتے بھائی کے پاس ٹھہرنے کا جو بول... منہ سے جانے کس طرح نکل گیا۔ اُسے پیرو کے منہ پہ ایسی بات نہیں... اُسے یہ بھی خیال نہیں رہا کہ پیرو نے کانتے کے پاس ٹھہرنے... اظہار پہلے کیا تھا، پاڑوں کے بارے میں مارٹی نے اُسے بعد... پیرو نے اُس کی طرف گھور کے دیکھا۔ مجھے حیرت ہوئی! ... آیا۔ اُسے مارٹی کے منہ پر طمانچہ مار دینا چاہیے تھا۔" وہ بات دو... کے لیے اپن دس دن ٹھہر جائے گا، دس سال ٹھہر جائے گا، پھر اپن... نکلے گا۔ ایدر تجھل بھائی اور اپن کا راجا دادا ہے۔ اُن کو اُودر... دیری ٹھہرنے سے اُن کے پاس جانے کا نئیں ہے۔"

"کانتے کے پاس ابھی ماسٹر ہی رہے گا۔" تجھل نے حکم...

"اپن بھی یہی بولنے کا تھا۔ اپن کا دل ابھی... نہیں لگے گا۔ ایدر ڈاکٹر سسٹر لوگ سب سے اپن کا جان کاری بن گیا... تو سمجھو تم لوگ ایدر ہے۔ اپن سے کو...

"ٹھیک ہے ماسٹر!" تجھل نے مارٹی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "پر ذرا دبی ہی رکھ، ورنہ کترنی پڑ جاتے گی اپنے کو۔" مارٹی کا جسم لہرا گیا، اُس نے جھٹ تجھل کے پیر پکڑ لیے۔

تجھل آگے بڑھ گیا۔ رات اور کالی ہو گئی تھی۔ اسپتال سے کچھ دُور آنے پر تجھل کے دماغ میں نہ جانے کیا آئی، اُس نے پیرو سے واپس اسپتال چلنے کو کہا۔ پیرو نے نہ واپسی کی غرض پوچھی، نہ کوئی اعتراض کیا۔ پہرے دار کی طرف جانے کے بجائے گھومتے ہوئے ہم اسپتال کے پچھلے حصے کی طرف آ گئے۔ یہ حصہ ہنگامی طور پر آنے والے مریضوں کے لیے مخصوص تھا۔ اِس وقت کوئی مریض موجود نہیں تھا۔ غالباً اِسی لیے سکون چھایا ہوا تھا۔ اس طرف روشنی بھی زیادہ تھی۔ نرسیں، ڈاکٹر، اسپتال کا دیگر عملہ اور ابتدائی طبی امداد کے کمرے وغیرہ بھی اِسی طرف تھے۔ ایک نرس نے ہمیں ڈیوٹی پر موجود خوش وضع نوجوان ڈاکٹر کے پاس پہنچا دیا۔ وہ میز پر ٹانگیں پھیلائے انگریزی ناول پڑھ رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اُس نے ٹانگیں میز سے ہٹا لیں اور انگریزی میں پوچھا کہ وہ ہماری کیا خدمت کر سکتا ہے۔ پیرو آگے تھا۔ اُس نے شانے اچکا کے میری طرف دیکھا مگر اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا، ڈاکٹر نے ہندوستانی میں دُہرایا۔ تجھل نے کسی رسمی تعارف کے بغیر کہا کہ ڈاکٹر شرما کہاں ہیں۔ نوجوان ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ کچھ دیر پہلے گھر چلے گئے ہیں لیکن ایسی کیا بات ہے؟ کیا وہ ہمارے کسی کام آ سکتا ہے؟

"اپن کو اُسی سے بات کرنے کا ہے۔" پیرو نے کہا۔

"بات کیا ہے؟" ڈاکٹر نے تجسس سے پوچھا۔

جواب میں تجھل نے کہا کہ وہ کمرہ نمبر ۴ کے مریض کانتے کے مرض کی نوعیت معلوم کرنا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر اِس طرزِ تخاطب کا عادی نہ ہو گا لیکن اُس نے خوش اطواری سے پوچھا کہ ہم مریض کے کون ہیں؟

"ہم اُس کے سگے ہیں۔" تجھل نے کسی قدر بیزاری سے کہا۔

"بھائی؟ آپ اُس کے بھائی ہوں گے؟"

"اگر ہم چچا بولیں تو آپ نہیں بتاؤ گے؟"

"نہیں نہیں۔" ڈاکٹر نے خفت سے کہا اور جلدی سے پوچھنے لگا۔ "اُسے کیا ہو گیا ہے؟"

"اور اپن ابھی کیا پوچھنے کو آیا ہے۔" پیرو نے برجستہ کہا۔

"میرا مطلب ہے، مریض کس بیماری میں اور کب داخل ہوا تھا؟" ڈاکٹر نے تشریح کی کہ یہاں مرض کی نسبت سے الگ الگ شعبے ہیں۔

"اُس کو تھوڑا زکام، تھوڑا بخار ہو گیا تھا، کل داخل ہوا تھا۔ اپن کو نئیں معلوم ابھی آپ نے کیدر اُس کو رکھا ہے۔ کمرہ نمبر ۴ ابھی کیدر ہے؟"

"نزلے بخار میں داخل ہوا تھا اور کمرہ نمبر ۴ میں؟" ڈاکٹر بدبداتے ہوئے بولا۔ "ہمیں ذرا اور سکون سے بیٹھنے کو ... ایت کر کے اُس نے فون اُٹھا لیا۔ فون پر اُس نے انگریزی میں کسی کو بتایا کہ یہاں تین آدمی کمرہ نمبر ۴ کے مریض کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف سے کچھ توقف کے بعد کہا گیا ہو گا، ڈاکٹر خاموش ہو گیا۔ "زخمی ہے، اچھا!" وہ چونک کے بولا۔ "مار پیٹ کے نشانات ہیں، گہرے؟" اُدھر سے کچھ اور کہا گیا ہو گا، ڈاکٹر حیرت سے اچھا اچھا، ہُوں ہُوں کرتا رہا اور اُس کی کریدتی، ٹٹولتی نگاہیں ہم پر مرکوز رہیں۔ "جو لوگ پوچھنے آئے ہیں، وہ بھی مجھے کچھ پُراسرار لگتے ہیں۔ اِس وقت آدھ مرض کی نوعیت کے بارے میں یہ تشویش، مجھے تو کچھ اور ہی نظر آ رہا ہے۔" اُس کی آواز بتدریج دھیمی اور گہری ہوتی گئی۔ "کون لڑکی تھی۔ خوب صورت خوابوں والی لڑکی، خوش لباس۔ آہ بدقسمتی سے کل مَیں چھٹی پر تھا۔" دوسری طرف سے یقیناً اُسے جولین کے بارے میں بتایا جا رہا تھا، اُس کے ذکر سے نوجوان ڈاکٹر کی آنکھوں کی چمک تیز ہو گئی تھی۔ "ایک لڑکی کا داخلہ!" وہ سانس لے کے بولا۔ "ٹھیک ہے، مَیں ان مرکھنے سانڈوں کو دیکھتا ہوں۔ ایک سے ایک بڑھ کے ہے۔ منہ زور اور جنگلی۔" اُس کی پیشانی پر لکیریں مٹتی اور کھنچتی رہیں۔ "میرا خیال ہے، یہ ذرا دلچسپ معاملہ ہے۔ شاید مختلف بھی، بہرحال میں اِن سے نمٹ کے تمھیں فون کرتا ہوں۔ شاید مجھے تمھاری دوبارہ ضرورت پڑے۔"

میری کنپٹیاں جلنے لگی تھیں لیکن مَیں نے زبان بند رکھی۔ ڈاکٹر نے فون رکھ کے معنی خیز نگاہوں سے ہمیں دیکھا اور ٹھہر ٹھہر کے وہی کچھ بتانے لگا جو ہمیں معلوم ہو چکا تھا۔ "مریض کے جسم پر چوٹوں کے گہرے نشانات ہیں۔ ایک چوٹ سر پر بہت گہری ہے۔ کوئی اندرونی چوٹ۔ ڈاکٹر شرما کوشش کر رہے ہیں کہ آپریشن کے بغیر ٹھیک ہو جائے لیکن امکان کم نظر آتا ہے۔" اُس کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔ کرسی پر پہلو بدل کے وہ ہم سے پوچھنے لگا۔ "مگر یہ چوٹیں کیسے آئیں؟

"چوٹ کاہے سے آتا ہے ڈاکٹر صاحب؟"

"لڑائی دنگا؟" ڈاکٹر نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "آپ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ لڑائی دنگے والے کیس ہم نہیں لیتے۔"

"وہ لوگ پھر کیدر جائے گا؟"

"اُن کے لیے اور بہت سے ڈاکٹر ہیں۔" ڈاکٹر رکھائی سے بولا۔ "اور ایسی صورت میں پہلے پولیس کو مطلع کرنا ضروری ہوتا ہے۔"

پیرو کچھ کہنا چاہتا تھا کہ تجھل نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور ڈاکٹر سے کہا۔ "ہم لوگ مریض کو دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"ضرور دیکھیے، صبح آٹھ بجے آ جائیے۔"

"مَیں ابھی کے لیے بولتا ہوں۔"

"ابھی اِس وقت؟ وقت دیکھ رہے ہیں آپ؟"

"وقت دیکھ کے ہی آئے ہیں۔"

"مریض کے پاس کوئی اٹینڈنٹ ....." اُسے خیال آیا، اُس نے

ہندوستانی میں تشریح کی۔ "دیکھ بھال کے لیے کوئی آدمی تو ہوگا۔ میں اُسے بُلا دیتا ہوں۔"

بَتھل کو یہ کہنا نہیں چاہیے تھا کہ ہم ابھی تھوڑی دیر پہلے مارٹی سے مل چکے ہیں۔ "ہم اپنے لیے بولتے ہیں ڈاکٹر صاحب!" بَتھل نے کہا۔

"ہاں اپن ابھی خود دیکھنا مانگتا ہے، اپنی آنکھوں سے۔"

"آپ دیکھ کے کیا کریں گے۔ مریض کے آرام میں مخل ہوں گے، ممکن ہے اُسے نیند کی گولیاں دی گئی ہوں۔"

"وہ کیسا بھی اُلٹا پڑا ہو، اپنی آواز سُن کے آنکھ کھول دے گا۔ اپنے کو دیکھ کے اُسے اور آرام ملے گا۔"

"اُس کے لیے آپ خاصے بے چین نظر آتے ہیں۔ ایسا کیا رشتہ ہے آپ کا اُس سے!"

"آپ نہیں سمجھے گا۔"

"مَیں سمجھنا چاہتا ہوں۔"

"ابھی آپ عمر کا تھوڑا ہے، بڑا ہو جائے گا تو اکھا سمجھ میں آجائے گا۔"

"بہتر ہے، آپ ایک رات اور صبر کر لیں۔"

"صبر ہوتا تو ایدر کیوں آتا، ایک رات اپن کے لیے بہت بڑا ہوگا۔ ابھی اُس کو دیکھنے سے تھوڑا من کو شانتی مل جائے گا۔ من سمجھتا ہے آپ؟ سنا ہے، ڈاکٹر لوگ کے پاس نئیں ہوتا۔"

"صرف من کی بات ہے؟" ڈاکٹر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اور بھی کچھ ہوئے گا۔"

"اور کیا؟"

"ابھی کیا منہ کھولے، اپن اُس کا گلے میں گنڈا ڈالنے کا ہے، ایدر ایک بڑا مہاراج نے اپن کو دیا ہے۔" پیرو نے نسبتہً تیز لہجے میں کہا۔ "ابھی گنڈا ابھی نئیں جاننا ہوگا آپ بابو صاحب!"

نوجوان ڈاکٹر کے چہرے پر تمسخر کے بجائے سنجیدگی چھا گئی، کہنے لگا۔ "گنڈا یہاں دے دیجیے، ہم ڈال دیں گے۔"

"قسم سے ابھی آپ بالکل نوا، ایک دم چھوٹا ہے۔"

"یہ گنڈا اونڈا، سادھو وادھو یہاں نہیں چلتے۔ یہاں اسپتال میں ایک سے ایک بڑا ڈاکٹر اُس کی نگرانی کر رہا ہے، اُن پر بھروسا کیجیے۔"

پیرو اور بَتھل بے سرپا باتیں کر رہے تھے۔ اُنھیں کچھ اندازہ نہیں تھا کہ ڈاکٹر کا دماغ کس طرف کام کر رہا ہے، وہ اُن سے کیا جاننا چاہ رہا ہے۔ اُنھیں فوراً اُٹھ آنا چاہیے تھا۔ دن بھر تو ہم آئے نہیں تھے، ایک رات اور سہی۔ کاٹتے بہرحال اب اسپتال ہی میں تھا۔ میں نے سوچا، میں دخل دوں لیکن پیرو نے ڈاکٹر سے کہا۔ "تو اپن چلا جائے؟ اپن کا کوئی بات آپ نئیں سمجھے گا۔"

"سمجھنے کی پوری کوشش کر رہا ہوں۔" ڈاکٹر نے گہری سانس بھر کے کہا اور بولا۔ "ٹھیک ہے، مَیں اوپر موجود ڈاکٹر سے بات کر کے دیکھتا ہوں، ممکن ہے، وہ تیار ہو جائے۔"

"اُس کو بولو، ابھی ایسا زمین نئیں پھٹ پڑے گا۔ مریض کا فکر اپن سے زیادہ ابھی اُس کو نئیں ہوئے گا۔"

ڈاکٹر نے دوبارہ فون اُٹھا لیا اور نیم سرگوشیانہ، نیم رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "ڈاکٹر رمیش! وہ لوگ ابھی موجود ہیں، ہاں ہاں، وہی جن کے بارے میں مَیں نے تمھیں ابھی بتایا تھا۔ وہی لٹھ باز، بگڑے منہ کے پہاڑی جانور، مجھے وہ پہلی ہی نظر میں پسند نہیں آئے تھے۔ جیسا کہ میرا قیاس تھا، مجھے معاملہ نظر نہیں آتا۔ اب یہ محض شک نہیں۔ مَیں ساری بات تو درست نہیں کہہ سکتا۔ وہ مریض کے پاس جانے کے لیے بضد ہیں۔" دوسری طرف سے کچھ کہا گیا تھا کہ ڈاکٹر نے بے تابی سے کہا۔ "پہلے میری پوری بات سُن لو۔ ظاہر ہے، مَیں نے ابتدا ہی میں اُنھیں وقت کی پابندی، اسپتال کے ضوابط وغیرہ سے آگاہ کر دیا تھا مگر وہ مسلسل اپنی ہٹ پر جمے ہوئے ہیں۔ جس حال میں مریض اسپتال میں داخل ہوا تھا، اُس کے پیشِ نظر اُن کے اصرار کے کچھ بھی معانی لیے جا سکتے ہیں۔ یقیناً تم نے بھی کچھ جاننے ہی کی ٹوہ میں بات کو طول دیا تھا اور ایک گونہ سلسلۂ کلام کا باقی رکھا تھا۔ سوال یہ ہے کہ وہ اِسی وقت اُس کے پاس جانے کے لیے کیوں بے چین ہیں۔ کون سی اہم بات وہ اُس سے کہنا چاہتے ہیں۔ اُن کا ارادہ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔"

ڈاکٹر کے جواب سے اندازہ ہوا کہ دوسری طرف سے پوچھا گیا ہے، اُس کے خیال میں آخر یہ ارادہ کیا ہو سکتا ہے؟ ڈاکٹر نے کہا۔ "مَیں واضح طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ممکن ہے صبح ہونے سے پہلے پہلے وہ مریض کو کوئی اہم بات منتقل کرنا چاہتے ہوں، کوئی تلقین، کوئی تنبیہ، ممکن ہے اُنھیں اُس سے کچھ معلوم کرنا ہو، کوئی ایسی بات جو اِس قدر زدوکوب کرنے کے بعد بھی وہ اُس سے جاننے میں ناکام رہے ہوں۔ ہو سکتا ہے کسی ایسی چیز کی اُنھیں تلاش ہو جو مریض کی تحویل میں ہے۔ یعنی یہ کہ وہ صبح بھی آ سکتے ہیں مگر اِسی وقت کیوں؟..... اِن کی تعداد بھی تین ہے۔ تم نے اِن لوگوں کو نہیں دیکھا۔ میرے سامنے بیٹھے ہیں، میرے بہت قریب۔ مجھے گمان ہے بلکہ ایسی صورت میں یقین کی حد تک گمان کہ اِن کے پاس ہتھیار بھی ہونا چاہیے۔"

میرے سارے حواس اُسی کی طرف مرکوز تھے۔ بَتھل اور پیرو کی سوالیہ نگاہیں بار بار میری جانب اُٹھتی تھیں مگر مَیں نے کسی اشارے سے بھی اجتناب کیا۔ میرے ہمہ تن گوش ہونے کا سبب ضرور اُن کی سمجھ میں آ رہا ہوگا، چنانچہ وہ خاموش بیٹھے رہے۔ ڈاکٹر ایک خلاق ذہن کا نوجوان تھا۔ ڈاکٹری کے بجائے اُسے کوئی اور پیشہ اختیار کرنا چاہیے تھا۔ انگریزی روانی سے بول رہا تھا لب و لہجہ بھی تاثر سے عاری نہ تھا۔ دوسری طرف سے ٹوکنے پر لمحوں کے لیے خاموشی کا وقفہ ہو جاتا تھا۔ مخاطب نے اُس کی ہم نوائی ہی کی ہوگی، ڈاکٹر کی آواز کچھ اور تمتمانے لگی۔ "سمجھ رہے ہو نا! بے شک اُنھوں نے آتے ہی ڈاکٹر شرما کا نام لیا، محض ابتدائے کلام کے لیے اور ڈاکٹر کی موجودی ناموجودی کے بارے میں مزید اطمینان کے لیے۔ حالانکہ اُنھوں نے دانستہ یہ وقت منتخب کیا ہوگا جب ڈاکٹر شرما اسپتال میں موجود ہی نہ ہوں۔ کتنے سلسلے مل رہے ہیں۔ ہاں، تم ٹھیک سمجھ رہے ہو، مَیں سوچتا ہوں۔" اُس کی زبان اٹکنے لگی تھی۔ "مَیں سوچتا ہوں کیوں نہ پڑوس میں فون کر دیا جائے۔"

پڑوس سے اُس کی مراد نزدیک کی پولیس چوکی ہوگی۔ مجھے باندرے کی اِس چوکی کا علم تھا۔ ہمارے سامنے اُسے پولیس کا ذکر زبان پر نہیں لانا چاہیے تھا۔ کہنے لگا۔ "وہ ذرا بہتر طریقے سے اُنھیں ٹٹول سکتے ہیں..... نہیں نہیں..... مَیں اُنھیں تاکید کر دوں گا کہ وہ پہلے اِن کے اسپتال سے باہر نکلنے کا انتظار کریں۔ یہاں نہیں، وہ یہاں نہیں آئیں گے، اُن کی ملاقات سرِراہ ہوگی، اسپتال سے مناسب دُوری پر۔ یہ بات وہ خود اچھی طرح جانتے ہیں کہ ڈاکٹر شرما اپنی حدود میں وردی والوں کی مداخلت پسند نہیں کریں گے، تمھارا کیا خیال ہے؟"

اُدھر سے لازماً کہا گیا تھا کہ اگر اُس کا قیاس سراسر غلط ثابت ہوا؟

نوجوان نے جواب میں تیزی سے کہا۔ "اگر کچھ ثابت نہ ہو سکا تو معذرت، روایت کے مطابق اُن سے معذرت کر لی جائے گی۔ ہر چند کہ وردی والے اِس میں بڑے بخیل ہوتے ہیں۔ رہا یہ کہ پھر اِن لوگوں کا شبہ سیدھا میری طرف جائے گا، یہ بعد کی بات ہے۔ مجھے اِس کی پروا نہیں ہے۔ یہ ایک بے جواز شبہ ہوگا۔ میں اِن سے نمٹ سکتا ہوں۔ تمھی بتاؤ، بظاہر مجھے اِس میں ایسا کوئی حرج نظر نہیں آتا۔ ایک ذرا اپنا کانٹا ہی نکل جائے گا۔ اپنی رگ غلط نہیں پھڑکتی۔"

میرا خیال تھا، اب اُسے فون بند کر دینا چاہیے لیکن وہ مذبذب انداز میں سر ہلاتا اور ہاں ہاں کرتا رہا۔ میں اُس کا چہرہ دیکھ رہا تھا، وہ خون کی تمازت سے سُرخ ہو گیا تھا مگر دوسری جانب سے اُس کی توقع کے خلاف کوئی بات کہی گئی تھی، اِس لیے اُس کی آنکھیں بھنچنے سی لگیں، آواز بھی دب گئی۔ "ہاں، یہ تو ہے....." وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "مَیں نے اِس طرف توجہ نہیں کی کہ ڈاکٹر شرما مریض کو داخل کر چکے ہیں لیکن اِس سے..... کیا اِس سے بہت بڑا فرق پڑتا ہے؟"

دوسری طرف پھر معلوم نہیں کیا کہا گیا۔ نوجوان ڈاکٹر غور سے سنتا رہا اور اُس کے شانے جھکتے گئے۔ "لیکن کچھ بھی ہو، یقین کرو میرے قیافے شاذونادر ہی غلط ثابت ہوتے ہیں، بہرحال کیا کہا جا سکتا ہے۔"

اُس سے کہنا چاہیے تھا کہ اگر اُس کا مفروضہ درست نکلا اور معاملے نے کوئی نہایت پیچیدہ صورت اختیار کر لی تو؟ اُس سے شاید یہی کہا گیا ہو، نتائج کی نشان دہی بھی کی گئی ہوگی کہ کتنے سنگین حقائق سامنے آ سکتے ہیں۔ عواقب و نتائج کا یہ تذکرہ ڈاکٹر کے لیے داد کا درجہ رکھتا تھا۔ اِسی تائید کے لیے تو وہ مضطرب تھا مگر وہ محض داد پر اکتفا کرنے والا نوجوان معلوم نہیں ہوتا تھا جو کسی شاعر کی طرح خوش ہو جاتا۔ وہ ایک عملی آدمی تھا۔ جلی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔ "تمھاری بات سمجھ میں آ رہی ہے۔ یہ اسپتال ہے، مندر کی جگہ ہے، یہاں ڈاکٹر شرما کا بُت نصب ہے بلکہ ڈاکٹر شرما کا بھوت......"

اُس کی بات کاٹ دی گئی، وہ رُک گیا اور کچھ توقف کے بعد بپھر کے بولا۔ "نہیں نہیں، تمھیں ایسا کوئی تجربہ نہیں کرنا چاہیے، چاہے ایک آدمی ہی کیوں نہ ہو، اِس وقت کسی کو بھی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ ہماری یہ فراخ دلی کسی بڑے واقعے، کسی بڑے حادثے کا سبب بن سکتی ہے۔ یہ تو وہی بات ہوئی جس کے لیے تم مجھے منع کر رہے ہو۔ ہاں ہاں، مَیں نے کہا تھا کہ مریض کے کمرے سے اٹینڈینٹ کو بلا دیتا ہوں لیکن اُنھوں نے ٹال دیا اور کہا کہ وہ خود مریض کو دیکھنا چاہتے ہیں۔"

فون بند کر کے اُس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔ چند لمحے وہ یوں ہی بے نیاز سا، کھویا کھویا بیٹھا رہا، اُس وکیل کی طرح جس کی بہترین دلیلوں میں سے کوئی دلیل گم ہو گئی ہو، جیسے کسی ایک دلیل کی کسر رہ گئی ہو۔ بَتھل اور پیرو اُس کی طرف دیکھتے رہے۔ مَیں بھی خاموش بیٹھا سوچتا رہا کہ اُس سے کوئی بات کروں یا اُن دونوں کو اُٹھ جانے کا اشارہ دوں۔ اُس نے ہمیں بہت سے خطاب دیے تھے۔ وہ سب میرے سر میں ڈنک مار رہے تھے لیکن جانے کیوں میرے سینے میں پہلے جیسی گھٹن نہیں تھی۔ اِس کا سبب یہ نہیں تھا کہ وہ اپنے ارادے سے باز آ گیا تھا، اِس کا سبب شاید وہ خود تھا۔ وہ بہت الگ سا نوجوان تھا، ایسے لوگ کم نظر آتے ہیں۔ بَتھل اور پیرو میری خاموشی کی وجہ سے ٹھہرے ہوئے تھے اور منتظر ہی تھے۔ مَیں نے اشارہ کیا تو وہ فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُنھوں نے جان لیا تھا کہ اب وادیلا لاحاصل ہے۔ ہمارے اُٹھنے پر ڈاکٹر چونک پڑا اور کرسی پر سیدھا ہو کے بولا۔ "اُس نے منع کر دیا۔" اُس کی آواز مرجھائی ہوئی تھی۔ "آپ لوگ اب صبح ہی آ کے اُسے دیکھ سکتے ہیں۔"

"کوئی گنجائش رہ گئی ہو تو ابھی ہم ٹھیر جاتے ہیں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی میری زبان سے نکل گیا۔

"کیا مطلب؟" وہ ترش رُوئی سے بولا۔ مَیں نے پہلی مرتبہ اُسے مخاطب کیا تھا۔ میرا لہجہ بھی اُس کے لیے تردد کا سبب بنا تھا حالانکہ میں نے انگریزی سے پہلوتہی کی تھی۔

"مطلب یہ کہ ابھی ہم یہاں موجود ہیں۔ مجھے تمھارا خیال آ رہا ہے۔" مَیں نے جان بوجھ کے 'آپ' نہیں کہا۔ "تم نے اتنی زحمت اُٹھائی اور بے نتیجہ رہی۔"

"مَیں نے اپنے طور پر کوشش کی تھی، پوری کوشش......"

"اور اچھی کوشش! تم نے اپنی طرف سے شاید کوئی پہلو نہیں چھوڑا۔" میرے لفظ اُسے محسوس ہونے چاہیے تھے، وہ بیٹھے بیٹھے تیورا۔

گیا اور بے مقصد اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا: "مجھے افسوس ہے۔" "اچھا ہوا" اُس نے کچھ اور نہیں کہا۔

"تم نے اپنا وقت بھی برباد کیا، ہمارا بھی۔" اُس کی متغیر حالت دیکھ کے مجھ سے نہ رہا گیا۔ "نہایت سامنے کی بات تھی۔ ہمارے منع کرنے کے باوجود تم مریض کے کمرے سے اٹینڈنٹ کو بُلا کے تصدیق کر سکتے تھے۔"

وہ ہکا بکا رہ گیا جیسے کسی کی جان نکل جائے، کھلا ہوا منہ، پھٹی ہوئی آنکھیں۔ اُسے گویائی پر بھی قدرت نہیں رہی، اُس کے لبوں میں جنبش ہوئی مگر سِسک کر رہ گئے۔

ہم پلٹ پڑے۔ چند قدم چل کے ہم نے کمرے کا دروازہ عبور کیا اور مریضوں کے لیے بنے ہوئے سائبان میں آ گئے۔ آگے ہم نے تین چار گز کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ اُس کی وحشت زدہ آواز سنائی دی۔ وہ اندر سے دیوانہ وار چلّا رہا تھا: "ٹھیریے، ٹھیریے۔" تُھل اور پیرو دونوں رُک گئے۔ اندر سے اُس کی بھگتی چاپیں بھی سنائی دیں پھر وہ حواس باختہ انداز میں دروازے پر نمودار ہوا۔ "براہِ مہربانی تھوڑی دیر کے لیے اندر آئیے۔" اُس نے عاجزانہ کہا۔ "میں آپ سے درخواست کرتا ہوں۔" وہ آدھی ہندوستانی، آدھی انگریزی میں بولا۔

مجھے تُھل اور پیرو کو کچھ بتانے کا موقع نہیں ملا تھا لیکن وہ بہت کچھ از خود سمجھ چکے ہوں گے۔ انھیں کسی ردِعمل کا اظہار کرنے کے لیے میری طرف دیکھنا چاہیے تھا۔ میں نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا کہ ڈاکٹر لپکتا ہوا ہمارے قریب آ گیا اور سیمابی لہجے میں ہم سے وہی درخواست کی۔

اندر کمرے میں جب تک ہم کرسیوں پر بیٹھ نہیں گئے، وہ کھڑا رہا۔ اتنی دیر میں اُس کے چہرے پر پسینے کے بے شمار قطرے اُبھر آئے تھے۔ اُس نے ہمیں بلا تو لیا تھا لیکن اب اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ لمحوں تک وہ ہماری صورتیں تکتا اور اپنے ہونٹ کاٹتا رہا۔ میں نے اُس کی مشکل حل کرنا چاہی۔ "کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "میں جانتا ہوں۔"

اُس نے اپنی آنکھیں بھینچ لیں۔ "مجھے، مجھے لفظ نہیں مل رہے۔" اُس کی آواز سے بے چارگی ویسی ہی نمایاں تھی۔ "میں آپ..... آپ سے....."

"جانے دو، بہتر ہے اب کچھ مت دہراؤ۔" میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "ایک تجربہ یہ بھی سہی۔"

"میں آپ سے..... آپ سے۔" اُس کی آواز حلق میں اٹک گئی۔

"جو تم کہنا چاہتے ہو، مجھے معلوم ہے اور جو بات مجھے معلوم ہے، اُسے سننے سے کیا حاصل۔"

وہ سر جھٹکنے لگا اور خفقانی انداز میں بولا: "مجھے بالکل خیال نہیں رہا..... میں کتنا وحشی..... مجھے کچھ بھی ہوش نہیں رہا۔"

"ہمیں اجازت دو، وقت بہت ہو گیا ہے۔"

"نہیں آپ نہیں جائیں گے، آپ ایسے نہیں جائیں گے۔"

"یقین کرو، ہمیں کوئی شکایت نہیں ہے۔"

"آپ بڑے آدمی ہیں۔"

"عمر میں کچھ بڑا ضرور ہوں۔"

"آپ ہر طرح بڑے ہیں۔" وہ ڈُوبتی آواز میں بولا: "عمر ہی نہیں، حوصلے میں، نظر میں....."

"تم پھر عجلت کر رہے ہو۔"

"نہیں نہیں۔" اُس نے بے قراری سے کہا: "اس بار یقیناً مجھ سے کوئی کوتاہی نہیں ہو رہی۔" اُسے ہندوستانی میں لفظ نہیں ملے تو انگریزی میں بولا: "اس بار سب میرا آزمودہ، سب میرا چشم دید ہے۔"

وہ نہیں مانا۔ رہ رہ کے اُس میں تلاطم سا اُٹھتا، وہ کیسا عجیب تھا، اُس کی محجوبی میں ناز طلبی بھی تھی۔ وہ ابھی تک من مانی کر رہا تھا۔ ہم تینوں کو کلنٹن کے کمرے میں لے جانا چاہتا تھا۔ پیرو نے منع کیا کہ ایک آدمی کا جانا بہت ہے۔ تین آدمی نظروں میں آ سکتے ہیں۔ اگر ضابطے کی خلاف ورزی کرنی ہے تو ایک آدمی تک محدود رہے۔ ڈاکٹر کہنے لگا کہ اسپتال کا ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے اُسے بھی کچھ اختیار ہے، بعد میں ڈاکٹر شرما نے باز پرس کی تو وہ اس سے [illegible] کر لے گا، وہ استعفا دے دے گا لیکن پیرو اور تُھل تیار نہیں ہوئے، چنانچہ وہ صرف تُھل کو لے کے دروازے سے نکل گیا۔ جانے سے پہلے اُس نے نرس کو بُلا کے ہدایت کر دی تھی کہ وہ ہمارے لیے کافی تیار کرے۔ اُس نے سنا ہی نہیں، ہم انکار کرتے رہ گئے۔ میں خود کو آمادہ کر رہا تھا کہ خلوت ملتے ہی پیرو مجھ سے سوال کرے گا، مجھے اُسے کتنا بتانا چاہیے لیکن وہ زبان بند کیے بیٹھا رہا، میں نے بھی خاموشی مناسب سمجھی۔

نرس صاف شفاف برتنوں سے بھری ٹرالی خود لے کے آئی تھی۔ کافی کے علاوہ کاجو، بسکٹ اور ناریل کی مٹھائی بھی تھی۔ اُس نے خوش سلیقگی سے ہمارے سامنے پلیٹیں اور پیالیاں سجا دیں۔ ہم سے شکر اور دودھ کے لیے پوچھا۔ میں نے ڈاکٹر کے آنے تک ٹھیر جانے کو کہا، مگر وہ کہنے لگی، اُن کے آنے پر وہ تازہ کافی بنائے گی۔ کافی کی چُسکیاں لیتے ہوئے پیرو یکایک مجھ سے بولا:

"راجا! ابھی چھوکرا کیسا ہے؟"

"اچھا ہے۔" مجھے ہنسی آ گئی۔

نرس کے کمرے میں آ جانے کی وجہ سے وہ چُپ ہو گیا۔ نرس آ کے فوراً چلی گئی مگر پیرو گم صُم بیٹھا رہا۔ میں نے بھی اُسے نہیں کریدا کہ وہ اس کے متعلق کیا تبصرہ کرنا چاہتا تھا۔ نرس کو دوسری کافی بنانے کی زحمت نہیں کرنا پڑی۔ بیس منٹ سے کچھ اوپر ہوئے ہوں گے کہ وہ دونوں واپس آ گئے۔ میں اور پیرو دیکھ کے کھڑے ہو گئے۔ تُھل کے چہرے پر کچھ ٹٹولنا بہت مشکل تھا لیکن اس وقت ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کہیں دُور سے چل کے آ رہا ہو، جیسے اتنی دیر میں وہ بوڑھا ہو گیا ہو۔ ڈاکٹر نے اپنے ہاتھ سے اُس کے لیے کافی بنائی۔ جتنی دیر تھل ایک تھکے ہوئے آدمی کے مانند کافی پیتا رہا، ڈاکٹر اُسے نرمی و شائستگی سے اطمینان دلانے کی کوشش میں لگا رہا کہ وہ اور اُس کے ساتھی ڈاکٹر ہر وقت کانتے پر نظر رکھیں گے حالانکہ تُھل نے ہمارے سامنے اُس سے ایک لفظ نہیں کہا تھا۔

"آپ بولے تو اپن ابھی کسی اور اسپتال کو دیکھے؟" پیرو نے ڈاکٹر سے وہی بات کہی جو وہ پہلے تُھل سے کہہ چکا تھا۔

"میری رائے آپ نے پوچھی ہے تو میں آپ کو مشورہ نہیں دوں گا۔" ڈاکٹر محتاط لہجے میں بولا: "یہ ہر اعتبار سے ایک مکمل اسپتال ہے۔ کہیں آپ آپریشن سے تو نہیں گھبرا رہے؟ اپنے ملک میں لوگ آپریشن سے جانے کیوں اتنا خوف کھاتے ہیں، ضرورت ہوتی ہے تبھی کیا جاتا ہے۔ میں ولایت میں چار سال رہا ہوں۔ وہاں لوگ خوشی خوشی آپریشن کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔"

"اُدور ڈاکٹر لوگ بھی ولایت کا ہے۔"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے مگر ڈاکٹر شرما کسی طرح ولایت کے کسی بڑے ڈاکٹر سے کم نہیں ہیں۔ وہ ایک ایکسپرٹ سرجن ہیں، اُن کے ہاتھ میں جادو ہے۔ شاید ہی اُن سے کبھی کوئی کیس خراب ہوا ہو۔"

کافی پیتے ہی تُھل اُٹھ گیا۔ "پر بڑے ڈاکٹر صاحب کو آپ بول دینا کہ کاٹ چھانٹ کرنے سے پہلے ہم سے پوچھ لیں۔" تُھل نے تندی سے کہا۔ "اور بول دینا، ہم اُس کے لیے اپنے کو بھی بیچ سکتے ہیں۔"

"جی جی۔" ڈاکٹر مستعدی سے بولا: "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔"

وہ ہمیں اسپتال کے بیرونی دروازے تک چھوڑنے آیا۔ رخصت ہونے سے پہلے اُس نے پیرو اور تُھل سے زور زور سے ہاتھ ملایا اور جب میرے سامنے آیا تو ہاتھ پھیلا دیے۔ میں نے بھی بازو کھول دیے۔ "تم سے مل کے خوشی ہوئی۔" میں نے زیرِ لبی سے کہا۔ "اور دوبارہ ملنے کی جستجو ہے۔"

"آپ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" وہ آزردگی سے بولا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

"آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔"

"نہیں، ایسا مت سمجھو، میرے ذہن میں دُور دُور تک ایسا کوئی احساس نہیں ہے۔ تم میں بڑی دل کشی ہے۔ ہر شخص کی کوئی خوبی ہی اُس کی دل کشی کا سبب ہوتی ہے۔ تم میں بہت سی باتوں کے علاوہ دلیل سننے کی ایک جرأت بھی موجود ہے اور میں نہیں، لوگ کہتے ہیں کہ یہ بہت بڑی خوبی ہے۔"

"کہاں! وہ بچوں کی طرح مچل کے بولا: "مجھ میں برداشت نہیں ہے جس کا آج میں نے مظاہرہ کیا، اِس کے بغیر ہر خوبی بے کار ہے۔"

"برداشت تجربے سے آتی ہے اور تجربہ.....!" میں نے مسکرا کے کہا۔

"عمر سے آتا ہے۔" اُس نے میری بات مکمل کرنا چاہی۔

"ضروری نہیں، تجربہ تو زندگی کے سلوک سے آتا ہے کہ وہ کیسا سلوک کرتی ہے اور زندگی برتنے سے آتا ہے کہ آپ کس طرح اُسے برتتے ہیں مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نہ زندگی کے بس میں کچھ ہوتا ہے، نہ آپ کے بس میں۔" جانے کیسے میری زبان یہ لفظ تراشتی رہی۔ مجھے خود بھی حیرت تھی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ تُھل اور پیرو مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑے تھے، سُنتے تو ضرور ہنستے۔ ڈاکٹر سے ہاتھ ملا کے میں آگے چلا آیا۔

وہ میرے پیچھے پیچھے آ گیا۔ "میں آپ سے دوبارہ مل سکتا ہوں؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔"

"مجھے اپنا پتہ دے دیجیے۔"

"مگر، مگر ہم ابھی تو یہاں آتے ہی رہیں گے۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا پھر اِس سے پہلے کہ وہ کوئی اور مطالبہ کرتا، میں تیز قدموں سے تُھل اور پیرو کی جانب چل پڑا۔

[illegible]ت تک ہم پیدل چلتے رہے۔ چوک کی گھڑی میں ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ سڑکوں پر ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں نے ٹرم ٹرم روک لی تھی لیکن وہ باہر کھڑے اُلجھتے رہے۔ وہ مختلف سمتوں میں جانا چاہتے تھے۔ پیرو گھر کی طرف چلنے کو کہہ رہا تھا کہ سب ہماری راہ تک رہے ہوں گے اور اتنی رات تک نہ پہنچنے پر تشویش میں مبتلا ہوں گے۔ خصوصاً مولوی اکرم کے دل میں تو طرح طرح کے وسوسے اُٹھ رہے ہوں گے۔ فرخ، فریال وغیرہ رات بھر سو نہیں پائیں گی۔ پیرو غلط نہیں کہہ رہا تھا مگر اُسے خود بھی تو اپنے گھر جانا تھا اور پاڑے جہاں اس کے انتظار میں ان گنت لوگ بیٹھے ہوں گے۔ بمبئی کے باڑوں کے ان گنت دادا۔ مارٹی کی زبانی تین پاڑوں کے رسّی تڑانے کی خبر سُن کے اُس نے پہلے وہیں جانے کا ارادہ کیا تھا۔ اُسے اُن دو آدمیوں کو بھی دیکھنا تھا جو حیدرآباد سے ہماری نگرانی کر رہے تھے اور مارٹی کے بیان کے مطابق پیرو کے پاڑے پر موجود تھے۔ بالے بھی وہاں پہنچ گیا ہوگا۔ تُھل نے مجھ سے کہا کہ میں اکیلا گھر واپس چلا جاؤں، وہ اور پیرو پاڑے کی طرف چلے جاتے ہیں۔ میں نے یک سر انکار کر دیا۔ ٹرم ٹرم والا منتظر تھا۔ تُھل نے سوار ہوتے ہی اُس سے بائی کلا کی طرف چلنے کو کہا۔ بائی کلا کے اُس اڈّے کی طرف جہاں کبھی بھرپیا مستانہ حکمرانی کرتا تھا اور کرشنا جی کے لیے مجھے اُس کے پاڑے میں نقب لگانی پڑی تھی۔ مستانہ کی ساری مستی اُسی رات ختم ہو گئی تھی جس رات اُس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پڑی تھی۔ اُس کے بعد وہ سنبھل نہیں سکا، بائی کلا کے پاڑے پر کسی اور نے قبضہ جما لیا۔ پیرو نے جب تیواڑی اور اُس کے حاشیہ برداروں کا نام و نشان مٹایا تو بائی کلا کا پاڑا بھی اُس کے پاس آ گیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اب وہاں کون سا دادا قابض تھا۔

وہی عمارت تھی جس کا ایک ایک گوشہ میرا دیکھا ہوا تھا۔ ٹرم ٹرم مین دروازے کے سامنے رکوائی گئی۔ دروازہ بند تھا اور ایک آدمی چبوترے پر بیٹھا

اُونگھ رہا تھا۔ پیرو نے اُس کے بال کھینچے، وہ ہڑبڑا کے ہاتھ پیر پٹخنے لگا۔ اُس نے پہلی نگاہ میں پیرو کو پہچان لیا تھا چناں چہ ہوش و حواس بحال کرنے میں اُسے کچھ وقت لگ گیا۔ جہاں وہ بیٹھا تھا، اُس کی پشت پر چبوترے کے فرش سے چار انچ کے قریب دو بجائی پر دو کنڈے دیوار میں جڑے ہوئے تھے۔ پرانی طرز کے دو گول کنڈے جو بعض گھروں کے دروازوں میں عموماً جڑے ہوتے ہیں۔ بظاہر اُن کا کوئی مقصد نظر نہیں آتا تھا لیکن وہ دونوں اطلاعی گھنٹیوں کا کام کرتے تھے۔ پاڑے کا چوکی دار آنے والا آدمی دیکھ کے اُنھیں استعمال کرتا تھا۔ وہ اپنا ہاتھ کولھے کی طرف لے جا کے چپکے سے پہلے کنڈا گھماتا، گھمانے سے کنڈا کھل جاتا۔ کھلنے پر وہ اُسے کھینچتا، چھوڑتا رہتا تو اندر گھنٹی بجنے لگتی۔ نہ زیادہ دُور تک اُسے کھینچنا پڑتا تھا، نہ زیادہ دیر تک، بس دو تین بار یہ عمل دہرانے سے اندر اطلاع ہو جاتی تھی۔ کنڈا کھینچنے کے بعد اُسے فوراً گھما دیا جاتا تو وہ گرفت پکڑ لیتا اور اپنے اندر کے کھانچے میں اِس مضبوطی سے جکڑ جاتا جیسے تالا لگ جائے۔ پھر کوئی بھی اُسے چھیڑتا رہے اُس پر اثر نہ ہوتا۔ اِس سارے عمل میں لمحے صرف ہوتے تھے اور کسی کو آہٹ بھی نہ ہو پاتی تھی۔ چبوترے پر روشنی بھی ایسی تیز نہیں تھی اور رات کے وقت پاڑے کا دروازہ بند ہو جانے پر اِنہیں استعمال کیا جاتا ہوگا۔ پیرو کے اشارے پر چوکی دار نے وائیں ہاتھ کا کنڈا گھمایا تو یہ سارا انتظام میری سمجھ میں آیا۔ دوسرا بائیں ہاتھ کا کنڈا پولیس کی آمد کی اطلاع کے لیے ہوگا۔ پہلے یہ سارا انتظام نہیں تھا۔ اِس کا مطلب تھا کہ پاڑے کے موجودہ دادا نے مستانے سے کچھ زیادہ بڑے انتظامات کیے ہوئے ہیں۔ گویا اندر دن کا سماں ہونا چاہیے۔

دروازہ کھلنے میں دیر نہیں لگی۔ جو شخص باہر نکل کے آیا، وہ دادو تھا۔ گویا وہ جیل کاٹ کے اپنے پرانے اڈے واپس آ چکا تھا۔ دادو نے پہلے پیرو کو دیکھا، پھر جیسے ہی اُس کی نظر مجھ پر پڑی، وہ اپنی جگہ جم کے رہ گیا۔ پیرو اُسے ایک طرف دھکیل کے اندر داخل ہو گیا۔ اندر ڈیوڑھی کی طرز کا مختصر راستہ طے کر کے ہم آگے پہنچے تو طبلے، ہارمونیم کی آوازیں کانوں میں گونجنے لگیں۔ ڈیوڑھی سے ہم صحن میں آ گئے۔ صحن میں یہ آوازیں اور تیز ہو گئیں۔ سیدھے ہاتھ کی طرف کے دونوں کمروں میں واقعی دن کا منظر تھا۔ اندر بہت سے لوگ بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ چھوٹے بغلی کمرے میں تاش کی بازیاں جمی ہوئی تھیں اور سامنے بڑے کمرے میں ایک لڑکی ناچ رہی تھی، دوسری فرش پر بیٹھی گا رہی تھی۔ دونوں رنگ برنگے مراٹھی کپڑے پہنے، سولہ سنگھار کیے ہوئے تھیں۔ ہم نسبتاً اندھیرے سے گزر کے آئے تھے اس لیے کسی کی نظر نہیں پڑی۔ ویسے بھی کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔ سب گم تھے اور جھوم رہے تھے اور صدائیں بلند کر رہے تھے۔ ہم دروازے پر کھڑے ہو گئے، تب بھی کسی نے توجہ نہیں دی۔ کمرے میں دارو کی بو پھیلی ہوئی تھی اور تمباکو کی۔ یہ تین دروازوں والا بڑا کمرہ تھا۔ آخری سرے پر بیچ میں گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے جو بھاری جسم، اوسط قد، سیاہی مائل بھرے ہوئے،

اُٹھی ہوئی ناک کا چالیس سالہ شخص بیٹھا تھا، وہی پاڑے کا دادا ہوگا۔ مسند کی نشست بھی یہی تھی۔ ناچنے والی سانولی کم عمر لڑکی اُس کے قریب بیٹھے ہوئے ایک تنومند آدمی کے سامنے ناچ رہی تھی۔ نوٹ لڑکی پر اُچھال کے اُس آدمی نے اپنی بانہیں لڑکی کے گلے میں ڈالنا چاہیں۔ لڑکی مسکراتی، شرماتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی، آدمی کے ہاتھ اُٹھے رہ گئے۔ یہیں وہاں کھڑے منٹ بھر کے قریب ہوا ہوگا کہ لڑکی کے ہٹنے اور درمیان میں آ جانے کے سبب سب کی نگاہیں منتشر ہو گئیں۔ وہ آدمی جو اپنی بانہوں میں لڑکی کو سمیٹ لینا چاہتا تھا، کچھ بے تاب سا ہو گیا۔ اُٹھ کے لڑکی کے ساتھ ناچنے لگا۔ وہ کھڑا ہی ہوا تھا کہ کمرے میں قہقہے گونجنے لگے اور وحشیانہ صدائیں اُبھریں مگر دوسرے ہی لمحے مسند نشین دادا کو جیسے کسی نے سوتے میں چٹکی بھر لی۔ ناچنے والی کے گھنگرو پتھر ہو گئے اور گانے والی کی آواز پر برف سی جم گئی۔ "دادا، دادا! پیرو دادا!" پاڑے کا دادا اپنی جگہ سے اُٹھ کے سیدھا پیرو کی طرف جھپٹا۔ "ابھی تم کب آیا دادا؟" اُس نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔ "آؤ، آؤ، اِدھر بیٹھو، اِدھر آ کے بیٹھو۔"

"اپن بیٹھنے کے لیے نئیں آیا ہے۔"

"ایسا کیسا! ابھی ایدر آیا ہے تو تھوڑا بیٹھے گا، تھوڑا کھائے گا، پیئے گا۔ اپن کا بھاگ کھلا ہے جو دادا اِدھر آیا ہے۔"

"دینا! ابھی زیادہ دارو تو نئیں چڑھایا ہے؟" پیرو نے دھمکتی آواز میں کہا۔

"تم کو دیکھ کے ابھی نشہ سالا کدھر کو رہنے کا ہے۔"

"ہاں ابھی ٹھیک ہے اپن کا بات سننے کا ہے، اپن ابھی چلا جائے گا، پورا باٹلی چڑھانا کہ بالٹی۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے دادا! پر پہلے ایدر آ کے بیٹھو۔"

"اپن کو ایک جگہ ابھی اور جانے کا ہے۔ ایدر اپن الٹا ٹیم پہ بھی آیا، تمھارا مستی کا ٹیم ہے۔"

"تمھارے لیے کیا ٹیم دادا! تم تو مالک ہے۔"

"ہا، سالا!" پیرو نے زمین پر تھوک دیا۔ "تم اکھا حرامی ہے۔ ابھی مالک بولتا ہے۔ ابھی پیچھے تم کیا سمجھا تھا، سمجھا تھا کہ دادا مر گیا، دادا خلاص ہو گیا، تم کو ایدر چھوڑ کے دادا اکیلا چلا جائے گا، ہاآں! کیا سمجھا تھا تم؟"

"نئیں نئیں دادا! ابھی کیسا بولتا ہے۔ پہلے اپن کا بات سنو، تھوڑا دھیرج سے بیٹھو تو کوئی بات کرے۔"

"اپن سننے کو نئیں، بولنے کو آیا ہے۔" پیرو نے جھڑکتے لہجے میں کہا۔ "تم کو کل دوپہر ۱۲ بجے تک کا ٹیم دیتا ہے، بارہ بجے کے پیچھے ابھی اُدھر پاڑے پر دو کڑا بھیج دے گا۔ نئیں بھیجنے کا ہے تو اپن ایدر ہی کھڑا ہے۔"

"ضرور کسی کتے کے بچے نے تمھارا کان بھرا ہے۔ پہلے اپن کا بات سُن لو دادا۔"

"دو کڑا ملنے پہ اپن ایک دم سُنے گا۔" پیرو نے چشم زدن میں چاقو نکال لیا اور دینا کی طرف اُچھالتے ہوئے بولا۔ "اپن بمبئی آ گیا ہے دینا! تم کو کوئی شک پڑا ہے تو ابھی دُور کر سکتا ہے۔"

چاقو زمین پر گر جاتا مگر دینا نے جھک کے چابک دستی سے اُچک لیا۔ چاقو بند کر کے اُس نے پیرو کی طرف بڑھا دیا اور بے حس و حرکت اسے دیکھتا رہا۔ کمرے میں موجود ہر شخص ساکت کھڑا تھا۔ "ابھی کوئی اور ہے تو اپن ایدر ہی ہے۔ چلا جائے تو بعد کو بولیاں مت بولنا۔"

کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آئی۔ پیرو نے چاقو جیب میں رکھ لیا اور پلٹ کے کمرے سے نکل آیا۔ چند قدم جانے کے بعد اُسے کچھ خیال آیا، وہ دوبارہ اُن کی طرف گیا، سب جوں کے توں کھڑے تھے۔ پیرو نے چمی کا نام پکارا، پختہ رنگ والی سمٹی سمٹائی سامنے آ گئی۔ اُس کے سلام کرنے سے پہلے پیرو نے جیب میں ہاتھ ڈال کے اُس کے ہاتھ میں کچھ تھما دیا، پیرو کی مٹھی بند تھی۔ چمی نے بھی مٹھی بند ہی رکھی اور جھک کے دوبارہ پیرو کو سلام کیا۔

باہر ٹم ٹم ہمارے انتظار میں کھڑی تھی۔ ہم قلابے پہنچے تو ڈیڑھ بج رہا تھا، قلابے کے پاڑے پر اندھیرا چھایا ہوا تھا لیکن پیرو کو وہیں گودی والا نامی پاڑے کا ایک آدمی نظر آ گیا۔ اُس کی زبانی معلوم ہوا کہ پاڑے کے دادا بارجی نے کچی شراب اور جوئے کا ایک اور ٹھکانا بنا لیا ہے۔ یہاں کا پاڑا خاصا بدنام ہو گیا تھا، پولیس آئے دن بارجی کو پریشان کرتی تھی اس لیے بارجی دوسری جگہ بیٹھنے لگا ہے۔ وہ دوسرا ٹھکانا بھی زیادہ دُور نہیں تھا۔ ٹم ٹم بھی ہم نے نہیں چھوڑی تھی۔ کچھ ہی دیر میں ہم وہاں پہنچ گئے۔ یہ سمندر کے کنارے کنارے جھونپڑیوں اور کچے پکے مکانوں پر مشتمل علاقہ تھا۔ مچھلی کی بُو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ ٹم ٹم پھندو سپلے روکنا پڑی، باقی راستہ ہم نے دو تین اندھیری گلیوں سے گزر کے طے کیا۔ گودی والا ہمارے ساتھ تھا۔ گلی میں اندر آ کے وہ ایک جگہ رُک گیا۔ یہاں گلی ختم ہو جاتی تھی۔ سامنے کی کوٹھری پر گودی والا کی تیسری دستک سے دروازہ کھل گیا۔ یہ کوٹھری بس دیکھنے کی تھی۔ اندر ایک دروازہ تھا، وہاں کے آدمی نے کسی تامل کے بغیر دروازہ کھول دیا۔

دروازے کے پار منظر ہی دوسرا تھا، میری آنکھوں کے لیے ایک تماشا سا۔ بمبئی میں ایسا کوئی ٹھکانا میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ دروازے سے کچھ فاصلے پر ایک کشادہ ہال بنا ہوا تھا، کھلا ہوا بے در ہال۔ اوپر بانسوں اور لکڑیوں پر ٹکی ہوئی ٹین کی چھت، نیچے اینٹوں کا پختہ فرش۔ اندر کرسیاں، میزیں اور بنچیں فاصلے فاصلے سے پڑی ہوئی۔ ایک طرف ایک بڑے کاؤنٹر کے آگے اونچے اونچے اسٹول۔ تمام ساز و سامان رنگین، یہاں تک کہ بانس اور چھت سب مختلف رنگوں میں رنگے ہوئے۔ اُس وقت وہاں زیادہ آدمی نہیں تھے مگر چہل پہل کم بھی نہیں تھی۔ خالی میزوں اور کرسیوں کی تعداد سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ کتنے لوگ وہاں آتے ہوں گے۔ ہال کے چاروں طرف کھلی جگہ تھی اور کھلی جگہ کے ساتھ چھوٹی بڑی کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ کوئی کھلی ہوئی، کوئی بند۔ گیس کی لالٹینوں اور ہنڈوں کی روشنی میں بیٹھے ہوئے گنتی کے آدمیوں کے سامنے بوتلیں اور گلاس رکھے تھے اور تاش پھیلے ہوئے تھے۔ اُن کے گرد نخنے اُچھل کود کر رہے تھے۔ ہال میں دو عورتیں اُن آدمیوں کے بیچ میں گھسی بیٹھی تھیں۔ ایک ادھیڑ عمر عورت کاؤنٹر پر بھی موجود تھی۔ اِدھر اُدھر چند اور آدمی بھی ایک دوسرے سے بے نیاز الگ الگ بیٹھے تھے۔ پیرو ہال کے باہر کھڑا تعجب سے دیکھتا رہا۔

"ابھی کیا دادا! ابھی جاتا ٹیم پہ آیا ہے۔ دن بھر ایدر سالا میلا لگتا پڑا ہے اور سورج ڈوبنے پہ نہ پوچھو کیسا مارا ماری ہوتا ہے، سالا بیٹھنے کا جگہ نئیں ملتا۔" پیرو کا تجسس بھانپ کے گودی والے کا حوصلہ بڑھا۔ اُس نے بتایا کہ جو لوگ ہال میں بیٹھنا نہیں چاہتے، اُن کے لیے وہ اطراف میں بنی ہوئی کوٹھریوں کا انتظام ہے۔ ایک طرف کی کوٹھریوں کے دروازے ساحل کی طرف کھلتے ہیں، جگہ نہ ملنے پر یہاں سے گزر کے لوگ ساحل پر چلے جاتے ہیں۔ وہاں بھی دارو اور جوئے کا شغل رہتا ہے۔ شام کو کچھ عورتیں بھی آ جاتی ہیں۔ کوئی ناچتی ہے، کوئی گاتی ہے، کوئی یوں ہی دارو پینے والوں کا دل بہلاتی ہے، خوش فعلیاں کرتی رہتی ہے۔

گودی والے کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ پیرو نے اُسے روک دیا اور درمیان کی تین گز کے قریب کھلی جگہ کا فاصلہ طے کر کے ہال میں داخل ہوا۔ الگ الگ مختلف میزوں پر بیٹھے ہوئے دو آدمی پہلے تو ہمیں دیکھ کے چوکنا ہوئے اور جب ہم کاؤنٹر کی طرف بڑھے جہاں تیز روشنی تھی تو وہ دفعتاً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی کٹے ہوئے سرمئی بالوں اور تیکھے نقش و نگار والی عورت نے بھی ہمیں دیکھ لیا تھا، اُس کی عمر ۳۰، ۳۵ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ پہلے تو اُس نے منہ بنایا لیکن پھر اُس کی چیخ سے سارا ہال گونج اُٹھا۔ "ہے دادا! اپن کا دادا!" اُس کی والہانہ صدا سے سبھی کی نظریں ہم پر مرکوز ہو گئیں، کوئی بھی بیٹھا نہ رہ سکا۔

"ابھی کیسا ہے ماری تم؟......" پیرو کے لہجے میں اشتیاق شامل تھا۔

"اپن تو ٹھیک ہے پر تم، تم؟......" اُس نے سرخوشی سے تالی پیٹی اور اپنے ہاتھ سینے پر رکھ لیے۔ "اپن کیا دیکھتا پڑا ہے۔" وہ آنکھیں مسلتے ہوئے بولی۔ "کیدر چلا گیا تھا۔ اپنا ماری کو بھی بول کے نئیں گیا۔"

"جلدی میں تھا ماری!"

"اتنے دن کیدر چھپا رہا، لوگ سالا ایدر سیدھا اُلٹا بولتا تھا۔ بائی گاڈ، اپن کتنا پرے (PRAY) کیا۔ فادر جانتا ہے کہ اپن پیرو دادا کے لیے اُس کو کیا بولتا تھا۔"

"اپن جانتا ہے اوجھی تو اپن لوٹ کے آگیا۔" پیڑو نے ہنس کے کہا۔
"بچہ لوگ ابھی کیسا ہے؟"
"ایک دم آل رائٹ۔" ماری چہک کے بولی۔ "ہر فورٹ نائٹ اپن اُس کو پونا دیکھنے کو جاتا ہے۔ دونوں اودر بہت ہیپی ہے۔ پر دادا! اپن سوچتا ہے کیا پتہ، تھوڑا پڑھ لکھ کر اپن کو پہچانے بھی کہ نہیں۔"
"نہ پہچانے سالا پر رہے گا تو ٹھیک۔" پیڑو نے بے پروائی سے کہا اور ماری کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "پر تم ابھی کیسا ہے؟ رنگ تھوڑا کالا کرلیا ہے؟"
"ابھی اور کالا ہو جائے گا دادا!" ماری کی آواز بدل گئی۔ "ابھی کیا دیکھتا ہے۔ اتنا کالا ہو جائے گا کہ ابھی نظر بھی نہیں آئے گا۔"
"ایسا کیا بات ہے ماری؟" پیڑو نے نرمی سے پوچھا۔
"بات کیا ہوئے گا دادا!" ماری نے سر جھکا لیا۔ اُس کی آواز ہی نہیں، چہرہ بھی بگڑنے لگا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی، معاً اُسے احساس ہوا کہ وہ ابھی تک اندر کھڑی ہے، اُس نے گلے میں پڑی ہوئی ڈوری کھینچ کے ایپرن اتاری اور جھٹ کاؤنٹر چھوڑ کے باہر آ گئی۔ وہ لمبے قد اور متوازن بدن کی عورت تھی، اسکرٹ پہنے ہوئے۔ ہال میں سبھی لوگ ابھی تک کھڑے تھے۔ ماری نے گرجتے ہوئے اُن سے بیٹھ جانے کو کہا اور بیروں کو پھٹکارنے لگی۔ "جانتا نہیں، ابھی کوئی تمہارا باپ آیا ہے۔" اُس نے اُن سے سامنے کی میز صاف کرنے اور جو کچھ ہے، سب کا سب اٹھا لانے کو کہا۔ "ابھی ایدر اپن کے پاس لاتی بھی ہے۔" ماری نے اکھڑی اکھڑی سانسوں کے درمیان پیڑو سے پوچھا۔ "جو کر چلے گا کہ کالا کتا؟"
پیڑو نے اُسے منع کیا کہ وہ زیادہ دیر کے لیے نہیں آیا۔
"ایسا کیسا ہوئے گا۔" ماری ناگواری سے بولی۔ "اتنے دن بعد آیا ہے اور ایدر تو پہلا دفعہ۔ تھوڑا کھا پی کے جانے کا ہے۔ اپن کیا بولے، اپن کو تمہارا کیسا انتظار تھا۔ اُودر پاڑے کا لوگ باگ بولا ہوگا، اپن اودر دو دفعہ پاڑے کا طرف بھی گیا تھا۔"
پیڑو نے اُسے بتایا کہ ابھی وہ اپنے پاڑے کی طرف گیا ہی نہیں۔
"پاڑے نہیں گیا، سیدھا ایدر کو آیا ہے۔"
"ہاں، ابھی سمجھو سیدھا ایدر ہی کو آیا ہے۔" پیڑو نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "اپن کو جارجی سے تھوڑا کام ہے۔ کیدر ہے وہ؟"
"کون سا... جی؟" ماری ہونٹ سکوڑ کے بولی۔
"کیا بولتا ہے؟" پیڑو نے ترشی سے کہا۔
"ابھی جس جارجی کو تم پوچھنے آیا ہے، وہ ایدر نہیں ہے۔ ایدر دوسرا جارجی ہے۔"
پیڑو نے ایک لمبی ہنکاری بھری۔
"جس جارجی کو تم نے اپن کا ہاتھ دیا تھا، وہ ابھی کیدر ہے۔ وہ ہوگیا دادا!" ماری کی آواز ٹوٹنے لگی۔
"اپن سمجھتا ہے ماری! اپن خوب سمجھتا ہے اور ابھی اسی لیے..." پیڑو نے بپھری ہوئی آواز میں کہا۔ "ابھی کیدر ہے وہ؟"
"ایدر ہی ہے۔"
"ایدر ہی کیدر؟"
"ایدر کسی ڈربا میں الٹام پڑا ہوگا سالا۔"
"جا کے اُس کو بول دے، اپن اُس کو دیکھنے کا ہے، ابھی سینگ کو نکل آیا ہے۔"
بیروں نے بوتلیں، گلاس، بھنا ہوا گوشت اور مونگ پھلی... کیا میز پر رکھ دیا۔
پیرو کا ہاتھ پکڑ کے ماری کرسی پر بیٹھنے کے لیے اصرار کر...
"اپن کو جلدی ہے ماری! اُس کو جا کے بول دے کہ دادا آیا ہے۔" پ... تند لہجے میں کہا۔
"ابھی کس کو بولے دادا!" ماری کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ پھیـ...
"وہ دو باٹلیاں لے کے اُودر کوٹھری میں بند پڑا ہے۔"
"دو باٹلیاں لے کے؟"
"دوسرا ابھی ابھی باٹلی مانگ ہے دادا! دونوں کا نشہ ہوتا..." ماری روہانسی ہو گئی۔
"اور تو ایدر کائے کو بیٹھا ہے؟"
"اپن تو پرانا ہو گیا۔ دونوں باٹلی میں تھوڑا تھوڑا فرق ہے دا... ہلنے پہ ایک کا نشہ بڑھتا ہے، ایک کا اترتا ہے۔"
"وہ تیرا سامنے چھوکری لوگ کو لے جاتا ہے اور تو دیکھتا پڑا ہے... ابھی گیدڑ کا اولاد کب سے ہوگیا؟"
ماری کے ہونٹ پھر پھڑ پھڑانے لگے۔ "اپن کا ٹائم نکل گیا دادا!... ٹائم کا بات ہوتا ہے۔" وہ ڈوبتے ہوئے لہجے میں کہنے لگی کہ جارجی اتنی تیز... آگے بڑھا کہ وہ دیکھتی رہ گئی۔ اُس نے جارجی کو لوٹانے اور اُس کے سا... کی بہت کوشش کی لیکن وہ ہار گئی۔ "اپن ابھی کیا کرتا۔" وہ گرفتہ آوا... بولی۔ "اپن جارجی دادا کو جانتا تھا، جارجی سیٹھ کو نہیں، بھڑوا جارجی کو جانتا تھا۔"
"ابھی بھڑوا ابھی بن گیا وہ؟" پیڑو چونک کے بولا۔
"ایدر بھی تم کیا دیکھتا پڑا ہے۔" ماری زہرخند سے بولی۔ "ابھی... کنجری لوگ بیٹھا ہے۔ بہت سا کوٹھری میں بند ہے اور بہت سا ایدر... کے ساتھ اُن کے ٹھکانے پر چلا گیا ہے۔ اکھا آدھا پگار کا پارٹنر ہے جار... ابھی فارس روڈ سے کئی کنجری لوگ اُٹھ کے ایدر آ نو بازو آ کے بس گیا..."

...بلیو پٹ چھوکری لوگ الگ ہے۔ جارجی پہلے اُن کا ٹرائی کرتا ہے، پھر ایدر دھندا ...رنے کا لائسنس دیتا ہے۔"
پیڑو کی آنکھوں سے اضطراب جھلک رہا تھا۔ "ابھی جارجی ایسا کتا، ...دا ایسا کتا کیا بن گیا ماری!"
ماری بہ مشکل اپنے آنسو روک سکی۔ ٹوٹی پھوٹی آواز میں بتانے لگی کہ کچھ عرصے پہلے اپنے ایک رشتے دار وکی کی موت پر جارجی گوا گیا تھا، دس پندرہ روز قیام کے بعد واپس آیا تو بالکل بدلا ہوا تھا لیکن ماری نے حوصلہ افزائی نہیں کی۔ چند مہینے بعد وکی خود بمبئی آ گیا۔ پیڑو اس دوران بمبئی میں نہیں تھا۔ ماری نے اُس کے پاڑے کا چکر بھی لگایا لیکن ناکام واپس آئی۔ کوئی پیرو کا پتہ بھی اُسے نہ بتا سکا۔ اُس زمانے میں پیڑو کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں بمبئی میں گشت کر رہی تھیں۔ اُن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ پیڑو کو ختم کر کے ماچھی اُس کے پاڑے پر قابض ہو چکا ہے یا پیرو کہیں مارا گیا ہے اور ماچھی اُس کی موت کو چھپا رہا ہے۔ کسی کو یقین نہیں آتا تھا کہ پیرو بہت سوں سے کہہ سُن کے گیا ہے۔ ماچھی نہ تو یہ افواہیں روکنے میں کامیاب ہو سکا، نہ شہر کے پاڑوں پر اپنی گرفت مضبوط رکھ سکا۔ گو ابھی تک صرف تین پاڑوں نے ہفتا بند کرنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن دوسروں پر بھی ماچھی کا اثر کم ہو رہا تھا۔ اِس کی وجہ خود ماچھی تھا، اُس کی ناتجربہ کاری، مزاج کی تیزی۔ لوگ اُس سے خار بھی کھاتے تھے کہ پیڑو کو اپنے اتنے بڑے پاڑے کی نگرانی کے لیے ماچھی ہی کیوں نظر آیا، وغیرہ وغیرہ۔
جارجی نے وکی کو روک لیا اور اُس کی مدد سے اُس نے سستے داموں یہ جگہ حاصل کی۔ یہاں علاقے میں پہلے سے شراب کی بھٹیاں کام کر رہی تھیں اور یہ جگہ ساحل پر ہونے کی وجہ سے زیادہ دل کش اور محفوظ بھی۔ وکی نے یہ کوٹھریاں خاص طرز سے بنائیں تاکہ ایک تو پولیس کی نظروں سے اوجھل رہیں، دوسرے تخلیہ چاہنے والوں کو دُور نہ جانا پڑے۔ پولیس چھاپے کی صورت میں فرار کے کئی راستے تھے اور پولیس آنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ جارجی نے ہر طرف کا خیال رکھا تھا۔ پانچ مہینے پہلے یہ کام شروع کیا گیا تھا۔ دو مہینے میں سب کچھ تیار ہو گیا اور پیسہ بھی کوئی خاص صرف نہیں ہوا۔ جارجی کو اندازہ نہیں تھا کہ وکی نے اُس کے لیے سونے کا درخت لگا دیا ہے۔ وکی نے ہر چیز کے نرخ بھی خود طے کیے اور وصولی بھی۔ وکی کے مشورے پر جارجی نے شہر کے بعض منتخب دادا خرید کے اِس عشرت کدے میں تعینات کر دیے۔ بائی کلا اور اندھیری کے داداؤں کو بھی اُسی نے ورغلایا اور پیرو کے پاڑے سے وابستگی ختم کرنے میں پہل بھی اُسی نے کی۔ ماچھی نے جانے کیا سوچ کے یہ اہم بات درگزر کر دی۔ اِس سے جارجی اور شیر ہو گیا۔ کئی موقعوں پر ماری نے ایک بیوی کی حیثیت سے اُسے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن جیسے جیسے جارجی بڑھ رہا تھا، ماری چھوٹی ہوتی جا رہی تھی۔ اُس نے اپنے دونوں بچوں کو پونا کے ہوسٹل میں داخل کرا دیا تھا، اُن کے لیے اُسے پیسوں کی ضرورت تھی۔ اِدھر اُدھر خواری کے خوف سے ماری کے بہ قول وہ اپنے شوہر کا پیچھا کرتے کرتے یہاں تک آ گئی اور اب کاؤنٹر پر بیٹھی شرابیوں کے لیے پیمانے بناتی ہے اور کنجریوں کی پگار کا حساب رکھتی ہے۔ جارجی کے متعین کیے ہوئے دادا یہاں آنے والوں کو بے قابو ہونے سے روکے رکھتے ہیں۔ جارجی کی دیکھا دیکھی باندرے کے دادا نے بھی ایسی ایک جگہ کھولنا چاہی تھی لیکن جارجی کے زرخریدوں نے شروع ہی میں سب کچھ تہس نہس کر دیا۔ جارجی اب قلابے کے پاڑے میں دن کے وقت بس چند گھنٹوں کے لیے بیٹھتا ہے اور تیسرے چوتھے دن علاقے کا چکر لگاتا ہے، اُس نے ایک پرانی موٹر خرید لی ہے۔ روز شام کو وہ یہاں آ جاتا ہے اور پیتا رہتا ہے۔ رات گئے کسی بھی کوٹھری میں جا کے ڈوب جاتا ہے اور اکیلا نہیں۔ ماری بتا رہی تھی کہ تقریباً روز کا یہی معمول ہے۔
"پر سب تیرا کھوٹ ہے ماری!" پیرو بھنّائی ہوئی آواز میں بولا۔
"بھول گیا، اپن نے تجھ کو شادی میں ابھی کیا جہیز دیا تھا؟"
"اپن نے سنبھال کے رکھا ہے۔"
"ابھی کائے کو دیا تھا، ایسا دبا کے رکھنے کو؟ زنگ لگانے کو نہیں! تو ابھی اُس حرامی کا آنکھ کیوں نہیں نکال باہر کیا؟"
"پر وہ بچہ ابھی تم نے نہیں دیا تھا۔"
پیرو جزبز ہو کے رہ گیا۔ "کون سا کوٹھری میں ہے ابھی وہ کُتیا کا جنا؟" اُس نے آتشیں آواز میں پوچھا۔
ماری نے دریدہ دُزدیدہ نگاہوں سے ایک کوٹھری کی طرف اشارہ کیا۔
پیرو فوراً کرسی سے اُٹھ گیا اور ماری نے جس کوٹھری کی نشان دہی کی تھی، تیز قدموں سے اُس کی جانب بڑھا۔ ماری چلانے لگی۔ "نہیں دادا نہیں! اپن کا بات سنو۔ ابھی یہ ٹائم نہیں۔ ابھی تم ایدر آ گیا ہے تو اپن کو ابھی کوئی فکر نہیں ہے۔"
پیرو نے توجہ نہیں دی لیکن ماری نے بھاگ کے اُس کا کرتا پکڑ لیا اور گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ کے تڑپتی بلکتی آواز میں بولی۔ "یہ ٹائم ٹھیک نہیں ہے دادا! ابھی بہت ٹائم آئے گا۔"
"ہٹ جا ماری! اپن تیرا نہیں، ابھی اپنا حساب کے لیے آیا ہے، تیرا تو بعد میں چکتا کرے گا۔"
"ابھی تو اُس سے بات بھی نہیں ہوئے گا دادا! وہ شام سے پی رہا ہے۔"
"اپن دیکھ لیتا ہے پر تو ایدر سے ہٹ جا۔" پیرو نے اُس کا بازو پکڑ کے ایک طرف ہٹا دیا، ماری فیل مچانے لگی۔ "ابھی زیادہ لفڑا کیا تو اپن پہلے تجھ کو..." پیڑو نے جھنجلا کے کہا۔
اتنی دیر میں چار آدمی کوٹھری کے گرد پہنچ گئے، اُن کے تیور ٹھیک

نظر نہیں آرہے تھے۔ ماری دم بہ خود سی الگ کھڑی ہوگئی۔ پیرُو نے بھی اُن لوگوں کو دیکھ لیا تھا۔ پیرُو آگے بڑھا تو اُن میں سے چوڑے ڈیل کا ایک آدمی کوٹھری کے دروازے پر ٹانگیں پھیلا کے کھڑا ہوگیا۔ اُس کے ہاتھ میں کھُلا ہوا چاقو تھا۔

"تیرا ایدر ابھی کوئی نئیں ہے کیا؟" پیرُو نے درشتی سے کہا۔ اُس کی آواز حیرت انگیز حد تک تھمی ہوئی تھی۔ قریب جانے کے بجائے اُس نے رُک کے دروازے پر چھائے ہوئے آدمی سے کہا کہ وہ سامنے سے ہٹ جائے۔

"جب تک اپن ایدر ہے، تم ایسا اندر نئیں جا سکتا۔"

"پر تو ہے ابھی کتنا دیر کا۔"

اُن کی تعداد چار تھی۔ باقی تین نے دروازے کے پاس ہی حصار سا بنا لیا تھا۔ پیرُو دروازے والے آدمی کے سر پہ پہنچ گیا۔ جھَل اور میں بھی چند قدم آگے ہوگئے۔ دروازے کے پاس جا کے پیرُو ٹھیر گیا اور ماری کی طرف منہ کرکے بولا "ماری! ابھی اِی لوگ کو پیسہ دے کر جارجی نے خریدا ہے، اِن کو تو چاقو پکڑنا بھی ......" پیرُو نے ابھی بات مکمل نہیں کی تھی کہ دروازے پر کھڑے ہوئے آدمی کی کلائی اُس کے ہاتھ میں تھی۔ پیرُو کے جسم میں یکایک ایک لہر سی اُٹھی تھی، بری بینائی کے لیے وہ پلک جھپکنے کی کوئی غفلت تھی یا کسی جھما کے کی خیرگی۔ عین وقت ماری سے پیرُو کے مخاطب ہونے کے سبب دروازے پر سینہ تانے اور چاقو اُٹھائے ہوئے آدمی کی توجہ بھی ایک لحظے کے لیے سہی مگر منتشر ہونی چاہیے تھی، پیرُو کو اسی لمحے کی ضرورت تھی۔ اُس نے منہ پھیرے پھیرے جھپٹتے ہوئے ہاتھ سے اُس کی کلائی پر پنجہ ڈال کے اتنی زور سے زمین پر جھٹکا دیا تھا کہ کوئی بھی نہ توازن قائم رکھ سکتا تھا، نہ ہوش بجا۔

پیرُو کو شبہ تھا کہ دوسرا قریب کھڑا ہوا آدمی اپنے ساتھی کا حشر دیکھ کے اضطراری حالت میں اُس کی طرف بڑھ سکتا ہے حالانکہ دوسرے آدمی کی طرف سے پیرُو کو اتنی مہلت ضرور ملنی چاہیے تھی کہ وہ اُس کے ساتھی سے عہدہ برآ ہو سکے مگر وہ اُٹھائی گیرے تھے۔ باقاعدہ کسی باڑے سے بندھے ہوئے معلوم نہیں ہوتے تھے۔ کوئی دادا ہوتا تو پیرُو کے نمٹنے کا انتظار کرتا۔ وہ چاقو تانے پیرُو کی طرف جھپٹا، پیرُو نے اپنی گرفت کے آدمی کو چھوڑنے کے بجائے دوسری مرتبہ جھٹکا دے کے اُس کے سامنے ڈال دیا۔

دوسرے آدمی کے جھپٹنے اور پہلے آدمی کو اُس کے آگے ڈالنے میں ایک لمحے کا بھی فرق نہیں ہونا چاہیے تھا، ایک ایک لمحے کا حساب پیرُو کے ذہن میں ہوگا جبھی اُس نے یہ اقدام کیا۔ ہر چند کہ اِس میں اُس کے لیے اتنا خطرہ نہیں تھا جتنا اُس کے پنجے میں کسے ہوئے آدمی کو چاقو لگ جانے کا اندیشہ تھا۔ دوسرے نے پیرُو پہ جھپٹنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ پیرُو نے اِدھر پہلے کو جھٹکا دے دیا۔ دوسرا بڑھنے کا ارادہ کر چکا تھا، اُس کے لیے لوٹنا مشکل تھا۔ بس یہی ہے کہ مقابل کا کوئی ارادہ اپنے لیے بہتر معلوم ہو تو اُسے اور پختہ اور یقینی بنانے کی کوشش کی جائے۔ پیرُو سے ایک لمحے کی جلدی ہو جاتی تو بڑھنے والے کو لوٹنے کے لیے کچھ وقت مل جاتا۔ اُسے یقین تھا کہ پیرُو اُسے بڑھتا دیکھ کے ساتھی کو چھوڑ کے اپنے بچنے کی فکر کرے گا اور اُس سے کہیں چوک ہو گی مگر اُس کے وہم و گمان میں نہ ہوگا کہ پیرُو اُس کے ساتھی کو جوں کا توں رکھے گا اور اُس میں اُس گراں ڈیل کو ہاتھ کے بل اُٹھا کے پٹخنے کا زور ہے۔ اندازے کی غلطیاں ہی آدمی کو پشیمان کرتی ہیں۔ آخری لمحے میں اُ... متزلزل ہو جانا چاہیے تھا۔ بالکل آخری لمحے میں اُس نے خود پہ قابو پانے ... ہاتھ میں دبے ہوئے چاقو کے کسی بے اختیار نشانے سے اپنے ساتھی کو بچانے ... کی، وہ اُس سے ٹکراتے ٹکراتے اور اُس پر گرتے گرتے رہ گیا۔ اُس نے ترچھ... کے کسی اور طرف نکل جانا چاہا، پیرُو نے اُچھل کے اُس کے کولھے پر ضرب لگ... وہ زمین پر لڑھک گیا کیونکہ پہلے ہی اپنا توازن استوار کرنے کی کشمکش ... تھا۔ جتنی دیر میں وہ زمین سے اُٹھتا، پیرُو کی دوسری ضرب نے اُسے بے حواس کر دیا۔ اُس کا چاقو آگے جا کے گرا۔

پیرُو کو باقی دو کا بھی خیال ہوگا جو ایک کرکے یا ایک ساتھ اُس پر ٹوٹ سکتے تھے لیکن وہ پر تولے کھڑے رہے۔ اُن کے تامل کی ایک وجہ نہیں ... یہ اعتماد کہ اُن کے دو ساتھی کم نہیں پڑیں گے، یہ اطمینان کہ میں اور جھَل الگ کھڑے ہیں۔ اِدھر ماری نے پیرُو کو روکنے کے لیے چیخنا شروع کر دیا تھا۔ میری اور جھَل کی خاموشی نے بھی ممکن ہے انھیں کچھ غیرت دلائی ہو۔ اُن کی مالکہ ماری ہمارے سامنے کھڑی تھی، ایک عورت۔ دو اور عورتیں بھی موجود تھیں، کچھ دوسرے لوگ بھی ... اُن کے سامنے ذلت اُٹھانے کا کوئی احساس اُن پر غالب نہ آ گیا ہو۔ انھیں یہ خدشہ بھی ہوگا کہ اُن کی شمولیت پر میں اور جھَل تماشائی نہیں بنے رہیں گے۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ ہمیں اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ہم نے تو چاقو بھی نہیں نکالے تھے۔ پیرُو اکیلا ہی اُن کے لیے کافی تھا۔ دو چار مزید ... تو بھی پیرُو کو کوئی دقت پیش نہ آتی۔ پھر انھیں موقع ہی کتنا ملا تھا۔ دیکھتے دیکھتے دونوں ہراول زمین پر پڑے کراہ رہے تھے۔ پہلے کا بازو شانے سے اکھڑ گیا ہوگا، اپنی گراں جسمی کے سبب اُسے چوٹ اور گہری لگنی چاہیے تھی۔ دوسرے کا جسم اتنا بھاری نہیں تھا لیکن شاید اُس کے سر پہ چوٹ لگی تھی، وہ بے دم سا ہو گیا تھا۔

چار پانچ آدمیوں کے ساتھ زور آزمائی میں زیادہ حیلہ جوئی سے کام لینا پڑتا ہے۔ غلط تاثر دینا اور ایک دوسرے کے فیصلے منتشر کر دینا۔ ایک دوسرے کو اشاروں کا موقع نہ دینا اور پہلے ہی حملے میں دو ایک کو نیم جاں کر دینا۔ پھرتی کی ہر وقت اور ہر مرحلے پر ضرورت ہوتی ہے لیکن زیادہ آدمیوں میں دماغ کی کار... کی زیادہ۔ کوئی اور وقت ہوتا تو پیرُو اِس صورتِ حال کو کچھ اور طول دیتا۔ اچھے اُستاد اور دادا اِسے اپنی مشق سمجھتے ہیں۔ وہ پہلے مرحلے میں اپنا کاری داؤ نہیں آزماتے، آزمائشی پینترے بدلتے رہتے ہیں۔ مشق کا یہ ایک نہایت فطری طریقہ

ہے۔ پیرُو نے انھیں بس لمحوں میں نمٹا دیا، ویسے وہ زیادہ وقت کے تھے بھی نہیں۔ پیرُو کو آگے اُن کے سامنے جانا بھی نہیں چاہیے تھا۔ بہتر تھا کہ وہ مجھے اشارہ کر دیتا۔ بعد میں اُسے غالباً اِس کا احساس ہوا ہو۔

پیرُو نے دوسرے کے کولھے پر دو ضربیں لگا کے تیسری ضرب دروازے پر لگائی۔ دروازہ چوپٹ کھُل گیا۔ اندر بہت دھیمی روشنی تھی۔ پیرُو تیزی سے اندر داخل ہوگیا۔ اندر سے بڑبڑاتی، چونکتی چیخیں سنائی دیں۔ چند لمحوں بعد ہی پیرُو باہر آگیا۔ وہ اپنے پنجے میں جارجی کی گردن دبوچے ہوئے تھا۔ سانولے رنگ اور سجل جسم کا جارجی دیکھنے میں نوجوان لگتا تھا، اُس کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں، زبان باہر نکلی ہوئی تھی اور لمبے لمبے بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ تقریباً عریاں تھا۔ پیرُو نے باہر آکے اُسے زمین پر دھکیل دیا، وہ اوندھا گرا۔ جارجی بُری طرح بوکھلایا ہوا تھا اور جھپکتی پلکوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے اور کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ماری ٹھیک کہہ رہی تھی، وہ شراب میں سر تا پا ڈوبا ہوا تھا۔ پیرُو نے جب اُس کے بال پکڑ کے زمین سے اُٹھایا تو اُسے کچھ ہوش آیا۔ "دادا! پیرُو دادا!" وہ بہکتی اٹکتی زبان میں بولا۔ "تم، تم ایدر؟" اُس کی آنکھیں دہشت سے پھٹ گئی تھیں۔ پیرُو نے اُس کے بال چھوڑ کے بے دریغ طمانچے مارنے شروع کر دیے۔ جارجی پہلے ہی لڑکھڑا رہا تھا، چند طمانچوں میں زمین پر لوٹ گیا۔ پھر اُس نے اُٹھنا چاہا تو پیرُو نے ٹھوکر ماری۔ اِسی اثنا میں چادر لپیٹے، منہ چھپائے ایک عورت ٹھٹکتی ہوئی کوٹھری سے برآمد ہوئی اور بے تحاشا ایک طرف بھاگ گئی۔ وہ بھاگتی چلی گئی۔

پیرُو نے کچھ توقف کیا اور مضطرب نگاہوں سے ہمیں دیکھنے لگا۔ جھَل نے آہستہ سے پاس جا کے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ دیا اور اُسے میری طرف لے آیا۔ جارجی دوبارہ زمین سے اُٹھ گیا اور اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی تگ و دو کرنے لگا، وہ کھڑا بھی ہوگیا۔ اب کسی حد تک اُس کا نشہ ہرن ہو چکا تھا لیکن اُس کی حالت اِس لائق نہیں تھی کہ اُس سے کچھ کہا سُنا جا سکتا۔ اُسے خود ہی سب کچھ سمجھ لینا چاہیے تھا۔ پیرُو نے بھڑکتی آواز میں ماری کو مخاطب کیا اور وہی کچھ کہا جو اُس نے بائی کلا کے دادا دینا سے کہا تھا۔ "اور اُس کو بول دینا کہ کل سے ایدر ایک بھی کنجری لوگ نئیں آئے گا۔ بھڑوا گیری کرنا ہے تو ابھی اِس کو سیدھا فارس روڈ بھیج دے گا۔" پیرُو نے ماری کو تاکید کی۔ "اپنے باڑے پہ آنے سے پہلے جارجی قلابے کا باڑے میں تیں جائے گا، سمجھا؟" ماری ہیجانی انداز میں سر ہلانے لگی۔

جارجی گُنگ کھڑا پیرُو کو گھور رہا تھا۔ پیرُو نے ایک جانب دُبکے ہوئے گاڑی والے کو اشارہ کیا اور اُسی کوٹھری کی طرف چل پڑا جس سے ہم اندر آئے تھے۔ ہم کوٹھری سے نکل آئے تھے، ماری کی صدائیں سُن کے ٹھیر گئے۔ ماری دوڑتی ہوئی گلی میں آگئی۔ پیرُو کے قریب آکے وہ کسی مجرم کی طرح کھڑی ہوگئی۔ اُس کا سارا بدن ہانپ سا رہا تھا۔

"ابھی کیا ہے ماری؟" پیرُو نے برگشتگی سے پوچھا۔

"دادا! ابھی اپن سے کوئی غلطی ہوگیا ہے کیا؟" وہ دھڑکتے ہونٹوں سے بولی۔

پیرُو کا جسم بَل کھا گیا۔ اُس نے بڑھ کے دونوں ہاتھوں سے اُس کا سر پکڑ لیا اور ماتھے کو بوسہ دیا۔ "غلطی اپن سے ہوا ہے۔" وہ اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "جو اِس حرامی کا ہاتھ میں تیرا ہاتھ دیا، پر اپن ابھی آگیا ہے جانی!"

ماری اُس کے شانے پر سر لگائے سسکتی رہی۔

ٹم ٹم ابھی مین روڈ سے باڑے کی چوڑی گلی میں داخل نہیں ہوئی تھی کہ انھوں نے ہمیں آلیا۔ چار بجنے والے تھے۔ سڑکوں پر سناٹا طاری تھا، گھوڑے کی ٹاپیں دُور دُور تک گونج رہی ہوں گی، اِسی لیے وہ بھاگتے ہوئے سڑک پر آگئے تھے۔ انھیں جیسے یقین تھا کہ آنے والی ٹم ٹم میں ہمارے سوا کوئی نہیں ہوگا۔ بس ہم پر نظر پڑنے کی دیر تھی، ہر طرف شور پھوٹ پڑا، ہم وہیں اُتر گئے۔ اُن کی چیخ پکار سُن کے گلی کے اور بہت سے آدمی بھی جیسے گجر سُن کے اپنی کمیں گاہوں سے نکل آئے۔ ماچی گلیا، لِلھی، شامو، جمرو، ٹنگو، چھیدا، شتے، لکھے، زورا اور جانے کون کون۔ اُن سب نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا اور اُچھلنے کودنے لگے۔ طرح طرح کی آوازیں نکالنے لگے۔ اُن کے چہروں پر خون تمتما رہا تھا، چمکتی آنکھیں، دھڑکتے سینے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پیرُو کوئی بہت بڑی مہم سر کرکے لوٹا ہو، جیسے وہ اُس کی آمد سے قطعی مایوس ہو چکے ہوں۔ انھیں کہاں اندازہ تھا کہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ کس قدر درست ہیں۔

باڑے کی عمارت روشنیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ بالکل رت جگے کا منظر تھا۔ عمارت کے ساتھ باہر لمبے چبوترے پر دری بچھی ہوئی تھی۔ رات بھر وہ یہیں بیٹھے ہمارا انتظار کرتے رہے ہوں گے۔ چبوترے کے پاس گلی اور سڑک کے نکڑ پر شرفی دادا کی چائے اور پان کی دکان اب تک کھُلی ہوئی تھی۔ اُن کا زور نہیں چل رہا تھا کہ وہ ہم تینوں کو کندھوں پر سوار کرکے باڑے میں لے جائیں۔ شور غل سے گرد و پیش کے سوئے ہوئے مکان بھی جاگ گئے، دروازوں اور کھڑکیوں سے لوگ جھانکنے لگے۔ اندر باڑے کا دالان، صحن اور برآمدہ بھی تیز روشنیوں سے منور تھا۔ درمیان میں پیرُو کی خالی چوکی چاندنی بچھائے پیرُو کی منتظر تھی۔ جھَل کے لیے حقّہ بھی رکھا ہوا تھا۔ پیرُو نے چوکی پر قدم رکھنے سے پہلے جھَل کے لیے جگہ چھوڑ دی، جھَل نے کوئی تعرض بھی نہیں کیا۔ ہمارے بیٹھتے ہی وہ مٹھائی کے ٹوکرے اور ہار پھول لے آئے۔ پھول اِس قدر تھے کہ چوکی پر جگہ جگہ پتیاں بکھر گئیں۔ ایک ایک شخص آکے جھَل اور پیرُو کے پیر چھونے لگا۔ جھَل اُن کے سلام

کے جواب میں کبھی اُن کے شانے پر ہاتھ رکھ دیتا، کبھی سر پر اور کبھی زانو پر۔ پیرو کسی کے گال کی چٹکی بھر لیتا، کسی سے سر ٹکرا دیتا اور کسی کے سینے پر مکا مار دیتا۔ اُن کے ہاتھ میرے پیروں کی طرف بھی بڑھے تھے اسی لیے میں ماچھی کے ساتھ ایک کونے میں بیٹھ گیا تھا۔ بالے بھی میرے پہلو میں تھا۔ تھوڑی دیر میں صبح کے آثار نمودار ہونے لگے۔

صبح تک سارا دالان لوگوں سے بھر چکا تھا۔ اُن میں پاس پڑوس کے بہت سے لوگ بھی شامل تھے۔ وہ اُمڈتے اور ہمکتے ہوئے آتے، آتے ہی اشتیاق و اضطراب سے پیرو کو سلام کرتے، اُس کا حال پوچھتے۔ اُس کی کمی محسوس ہونے کا ذکر کرتے اور پوچھتے کہ آخر اتنے دن اُس نے کس معرکے، کس مجبوری میں لگا دیے؟ پیرو ہنس ہنس کے ٹالتا رہا، کہتا رہا کہ بہت دُور گیا تھا، ایدر سے بہت دُور۔ کیا بتائے، کبھی بتائے گا۔ اُسے بہت سے محلے داروں کے بلکہ اُن کی عورتوں اور بچوں کے نام بھی یاد تھے۔ وہ ہر ایک سے پوچھتا کہ اُس کے پیچھے کسی نے انھیں پریشان تو نہیں کیا؟ کوئی اُسے اپنی ماں کے مرنے کی خبر سناتا، کوئی اپنے بچے کی بیماری کی، کسی کے ہاں چار بیٹیوں کے بعد بیٹا پیدا ہوا تھا، کسی سے زندگی روٹھ گئی تھی، کسی پر بہت مہربان ہو گئی تھی، وقت نے کہیں کچھ تماشا کیا تھا، کہیں کچھ۔ وہ اُسے اِس طرح سب کچھ سنا رہے تھے جیسے بس آج کا دن ہے، پھر وقت نہیں ملے گا۔ گویا اُنھیں دھڑکا ہو کہ پیرو پھر کہیں نہ چلا جائے۔

اب ہر طرف اُجالا پھیل چکا تھا اور جیسے جیسے اُجالا بڑھ رہا تھا لوگوں کی آمد بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ سلسلہ ختم ہونے والا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ درمیان میں پیرو نے تجمل سے اور مجھ سے کچھ دیر کسی کمرے میں آرام کر لینے کو کہا لیکن ایسے میں نیند کیسے آسکتی تھی اور اب نیند کا کون سا وقت رہ گیا تھا۔ سات بجے کے قریب باڑے کے آدمی ناشتے کا اہتمام کرنے لگے۔ وہ کسی برات کی دعوت کی طرح سرگرم نظر آتے تھے۔ پھر اتنے بہت سے لوگوں کے لیے مٹھائی، حلوہ پوری، ترکاری اور چائے پر مشتمل ناشتے کا اہتمام اُنھوں نے اتنی جلدی نہ جانے کیسے کر لیا۔ ناشتہ ختم ہوتے ہوتے آٹھ بج گئے۔ پیرو کے جلد اُٹھنے کے آثار نہیں تھے۔ میں نے سوچا، تجمل کو یاد دلاؤں کہ اسپتال میں مریضوں سے ملنے کے لیے آٹھ بجے سے گیارہ بجے تک کا وقت مقرر ہے لیکن یہ سوچ کے خاموش رہا کہ تجمل کو خود خیال ہوگا۔ وہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے، پاؤں پھیلائے، حقے کے کش لگا رہا تھا اور آنے والوں کے طرح طرح کے فسانے سن رہا تھا۔ گلیا دیر تک اُس کے پیر دباتا رہا تھا۔ ٹم ٹم کے باڑے کی طرف آتے وقت میرے جی میں آیا تھا کہ درمیان میں کہیں اُتر کے گھر چلا جاؤں۔ اُس وقت تو پھر بھی ٹھیک تھا مگر اب وقت اور نکل چکا تھا۔ وہ ساری رات جاگتی رہی ہوں گی، کسی نے ہمارے انتظار میں کھانا بھی نہیں کھایا ہوگا، بار بار اباجان سے پوچھتی ہوں گی لیکن اباجان کیا بتا پاتے ہوں گے۔ ممکن ہے، مولوی اکرم نے یہ دیکھ کے اُنھیں مجید کے ہوٹل کا سارا قصہ سُنا

دیا ہو اور لوگ ہماری غیر حاضری کو اسی سلسلے کی کوئی کڑی سمجھ رہے ہو[ں]۔ اباجان کو جولین کا گھر نیز ہمارا کوئی اور ٹھکانا بھی معلوم نہ تھا کہ وہ ہمار[ی تلاش] میں نکل کھڑے ہوتے۔ مولوی اکرم، منیر علی اور وہ بار بار بلبر ٹرک پر آ[تے رہے ہوں] گے۔ میں کہیں بیچ میں ٹم ٹم سے اُتر جاتا تو ٹھیک تھا مگر مجھے کچھ اچھا [نہ لگا۔]

پیرو کے خیال کے علاوہ حیدرآباد سے تعاقب میں آنے والے بو[ڑھوں کا خیال بھی میرے] ارادے میں رکاوٹ کا سبب بنے۔ وہ ماچھی کی اطلاع کے مطابق با[ڑے] میں موجود تھے۔ اِس دوران مجھے ماچھی سے بات کرنے کا موقع مل گیا تھا[۔ اُس] نے اُن کی باڑے میں موجودگی کی تصدیق کر دی تھی۔ اُس نے بتایا کہ دو[نوں] کو اوپر ایک خاص کمرے میں رکھا گیا ہے اور اُس کمرے میں دن کے وقت [بھی] اندھیرا چھایا رہتا ہے، کمرے کی آوازیں کمرے ہی میں گھُٹ کے رہ جاتی [ہیں۔] پیرو کے انتظار میں اُن سے کوئی بات نہیں کی گئی ہے۔ تجمل اور پیرو شاید اُن[ھیں] بھول گئے تھے۔ میرا خیال تھا، باڑے پہنچ کے وہ سب سے پہلے اُنھی کے پاس [جائیں] گے کہ دیکھیں، وہ کیا بتاتے ہیں، کس طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مجھے [یہ] جاننے کی لے لگی تھی۔ ہو سکتا ہے، وہ بھی نواب قطب الدین علی کے فر[ستادہ] ہوں۔ خدا کرے، ایسا ہی ہو۔ رہ رہ کے ایک ہی وسوسہ میرے دل میں کو[ندتا] تھا کہ کہیں وہ کسی اور کا نام نہ لے دیں۔ وہ نواب حشمت جنگ کا نام بھی لے [سکتے ہیں] سکتے ہیں، پھر بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔ اِس صورتِ حال میں ہمارا دوبا[رہ] حیدرآباد جانا کس طرح مناسب ہوگا۔ کوئی اور نہ سہی، خانم تو ابھی وہاں [ہے]، اگر وہ ہمارے ساتھ آجاتی تو کوئی بات نہ تھی۔

جب نو بج گئے تو مجھ سے نہ بیٹھا جا سکا۔ اُدھر جولین بھی فرخ [کے] کے پاس جانے کے لیے صبح سے میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ میں بیٹھے بیٹھے کھسک[تا] ہوا تجمل کے پاس چلا گیا لیکن میرے زبان کھولنے سے پہلے ہی اُس نے سر [اُٹھا] کر کہا: ”چلتے ہیں رے۔“

”اسپتال نہیں جاؤ گے؟“ میں نے تنک کے کہا۔

”ابھی ٹائم ہے۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

میں نے سوچا، کہوں کہ ٹائم تو دیکھتے دیکھتے نکل جائے گا مگر میں چپ رہا۔ پیرو نے مجھے تجمل کے پاس آتے دیکھ لیا تھا۔ وہ اِس وقت بمبئی کے بڑے کے کئی داداؤں کے درمیان گھرا ہوا تھا اور اپنے پیچھے پڑنے والے پولیس کے چھاپوں کے تذکرے سن رہا تھا۔ میں نے نہ کوئی لفظ کہا، نہ اشارہ کیا مگر وہ فوراً کھڑا ہو گیا۔ ”ابھی کیدر، کیدر دادا؟“ اُس کے پاس بیٹھے ہوئے آدمی حیرانی سے بولے۔

”اپن ابھی جانے کا ہے۔“ پیرو نے کھردری آواز میں کہا اور چوکی سے نیچے آگیا۔ سب دیکھتے رہ گئے۔ تجمل بھی کسمساتے ہوئے اُٹھا۔ کوئی شخص بیٹھا نہ رہ سکا۔ پیرو کا رُخ بیرونی دروازے کی جانب نہیں تھا۔ اُس نے تجمل کے آنے

کا انتظار کیا اور اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کے عمارت کے اندرونی حصے کی طرف بڑھنے لگا۔ میرے جسم میں کانٹے چبھنے لگے۔ اندر جانے کا مطلب یہی تھا کہ اُس نے اُن دونوں کو دیکھنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اُنھیں زیادہ دیر باڑے میں روکے رکھنا بھی مناسب نہیں تھا۔ یہ صاف صاف حبسِ بے جا تھا۔

باڑے کی عمارت خاصی بڑی تھی، تین منزلوں اور کئی کمروں پر مشتمل کسی سرائے کے مانند۔ عمارت کا عقبی حصہ کھلا ہوا اور کچا تھا، وہاں باڑے کے آدمی زور آزمائی کرتے تھے اور سال میں دو ایک مرتبہ تقریبات منعقد ہوتی تھیں۔ ہمارے گزرنے پر لوگ ایک طرف ہٹتے گئے۔ برآمدے سے ہوتے ہوئے ہم ایک کشادہ اور پُرسکون کمرے میں آگئے، یہ کمرہ مہمانوں کے لیے مخصوص تھا اور پیرو کبھی کبھی یہاں آرام کرتا تھا۔ ماچھی بھی ہمارے ساتھ تھا۔

”ابھی کیسا ہے دکنی جوڑا؟ اُلّو کا پٹھا!“ کسی تمہید کے بغیر پیرو نے ماچھی سے پوچھا۔

”کل اکھّا دن سے وہ ایدر ہی ہے دادا!“ ماچھی نے کسیلی آواز میں جواب دیا اور کہنے لگا کہ ایک دن کی بندش سے وہ بڑی حد تک پگھلے ہوئے لگتے ہیں۔ شروع شروع میں اُنھوں نے بہت چیخ پکار مچائی تھی مگر پھر خود اُن کی آوازیں دم توڑ گئیں۔ وہ اپنا جرم پوچھ رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ ہمیں یقیناً کوئی بڑا دھوکا ہوا ہے، وہ تو تاجر ہیں اور بمبئی میں کاروبار کی غرض سے آئے ہیں۔ ماچھی کے کہنے کے مطابق لچھمی اور گلیا، باڑے کے دو تین آدمیوں کی مدد سے اُنھیں یہاں لانے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ پہلے اُنھیں ورغلا کے علاقے سے قریب کیا، پھر کسی جگہ اُن سے جھگڑ پڑے، جھگڑنے والے دوسرے تھے۔ اُنھیں زد و کوب کر کے نیم جانی اور نیم ہوشی کے عالم میں یہاں لانا ایسا دشوار نہیں تھا۔ ماچھی تفصیل بتانے لگا، پیرو نے دلچسپی نہیں لی اور ہدایت کی کہ وہ اُنھیں اوپر تہ خانے کمرے میں پہنچا دے۔

چند منٹ بعد ہم اوپر پہنچے تو وہ کمرے میں موجود تھے۔ ماچھی اور باڑے کے دو اور آدمی بھی۔ اُنھوں نے اُن دونوں کو دیوار کے ساتھ لگی بینچ پر بٹھا رکھا تھا۔ دونوں پہچانے نہیں جا رہے تھے۔ شیروانی اور واسکٹ کے سوا وہ سفر کے اُنھی کپڑوں میں تھے، جو اَب نہایت خستہ و شکستہ ہو چکے تھے جیسے ہفتوں کے پہنے ہوئے ہوں۔ داڑھی بڑھی ہوئی، بال بکھرے ہوئے، ہونٹ خشک، آنکھیں ویران، چہرے پر جا بجا خراشیں۔ کُرتے پر خون کے دھبے۔ پَر کٹے پرندوں کے مانند۔ ایک دن میں آدمی اِس سے زیادہ کتنا بدل سکتا ہے۔ کہتے ہیں، کبھی کان بھی سونگھنے لگتے ہیں، آہٹوں کی بُو، زینہ چڑھتے ہوئے ہمارے ڈیلے قدموں کی آہٹیں اُنھوں نے سونگھ لی تھیں اسی لیے اُن کی نگاہیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ ہمارے داخل ہونے پر دونوں کو جھٹکا سا لگا جیسے کسی بُرے خواب کی دہشت میں آنکھ کھل جائے۔

ہم کمرے کی بیچوں کی طرف بچھی ہوئی چوکی پر بیٹھ گئے۔ وہ بینچ سے کھڑے ہو گئے تھے۔ ”ابھی پہچان لیا اپن کو؟“ پیرو نے زہرخند سے کہا۔

اُن کے درست ... رہ گئے۔ ایک لمحے دوسرے کی طرف دیکھا۔

اُنھیں اپنی منتشر توانائی سمیٹنے کے لیے کچھ وقت تو چاہیے ہی تھا۔ پیرو نے اُنھیں وقت دیا مگر وہ کوئی جواب نہ دے سکے۔

”ابھی اِن لوگ کو تھوڑا پانی دکھلائے۔“

ماچھی کے پہلو میں کھڑے ہوئے آدمی نے پیرو کے حکم پر فوراً عمل کیا۔ کونے میں رکھی ہوئی صراحی سے پانی لوٹا اور کٹورا اُن کے آگے کر دیا۔ وہ منع کرنا چاہتے تھے لیکن اُن میں انکار کی بھی تاب نہیں تھی۔ دونوں سے چند قطرے ہی پیے جا سکے۔

”اپن کو بات زیادہ نہیں کرنے کا ہے۔“ پیرو نے سرد لہجے میں مختصراً اُن سے کہا کہ وہ سیدھی طرح اپنے آقا کا نام بتا دیں گے تو اُنھیں چھوڑ دیا جائے گا، ورنہ یہ اُن کا آخری فیصلہ ہوگا، اِس کے بعد اُن کے متعلق تمام فیصلے دوسرے کریں گے۔ بہتر ہے کہ وہ ہوش مندی کا ثبوت دیں، وہ یہ حقیقت جتنی جلد تسلیم کر لیں گے کہ تمام راستے اُن پر بند ہو گئے ہیں، اُتنا ہی اپنے لیے بہتر کریں گے۔ جواب میں اُنھوں نے یہ حقیقت شاید تسلیم کر لی ہو لیکن ہوش مندی کا ثبوت نہیں دیا۔ اُنھوں نے وہی کچھ دہرایا جو ماچھی ہمیں بتا چکا تھا کہ وہ حیدرآباد دکن سے اپنے کاروبار کے لیے یہاں آئے ہیں، ریل میں اُن کے کسی طرزِ عمل سے ضرور ہمیں کوئی غلط تاثر مل گیا ہے، وہ تو ایک بے ضرر شہری ہیں۔

پیرو نے اُنھیں دوبارہ کسی قسم کی تنبیہ نہیں کی، اُس کے اشارے پر باڑے کے آدمی نے پلک جھپکتے میں اُن کے گریبانوں پر ہاتھ ڈال دیا اور ایک جھٹکے میں نیچے تک اُن کے دامن چاک کر دیے۔ باڑے کے دوسرے آدمی نے دیوار پر ٹنگا ہوا ہنٹر اُٹھا لیا۔ وہ چیخنے چلانے لگے۔ ماچھی نے باڑے کے آدمیوں کو اُن کے سامنے سے ہٹا دیا اور خود آگے جا کر دونوں کے بال پکڑ کے اِس زور سے اُن کے سر ایک دوسرے سے ٹکرائے کہ دونوں کی آنکھیں اُلٹ گئیں۔ اُنھوں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن توازن قائم نہ رکھ سکے، چکراتے ہوئے فرش پر گر گئے۔ درد کے ابتدائی لمحے نسبتاً آسان ہوتے ہیں۔ وہ غیر ارادی طور پر سر پکڑے ہوئے زمین سے اُٹھ گئے تھے مگر اِس اثنا میں درد اُن کی رگوں میں پھیل گیا تھا۔ درد کی شدت اُن کی گویائی پر بھی غالب آگئی۔ میرے خیال میں ماچھی نے کچھ تیزی دکھا دی تھی۔ پیرو کو اُن کے اوسان کی دُرستی کے لیے کچھ صبر کرنا پڑا۔

”اِپن کیا بولا!“ کچھ دیر کے سکوت کے بعد پیرو نے ٹھیرے ہوئے لہجے میں کہا کہ وہ جتنی دیر کریں گے، اُن کا وقت اتنا ہی قریب ہوتا جائے گا۔

اُن میں سے ایک گھٹی گھٹی آواز میں بولا کہ اُنھیں کچھ معلوم ہو تو وہ بتائیں بھی، آخر وہ کس بات کا اعتراف کریں؟ کس شخص کا نام لیں؟

جس آدمی کے ہاتھ میں ہنٹر تھا، پیرو نے اُسے اشارہ کر دیا۔ اُنھوں نے بھی دیکھ لیا، ایک دم ڈکرانے، گڑگڑانے لگے اور دونوں ایک ساتھ پیرو کے پیر پکڑنے دوڑے۔ اُنھوں نے پیرو کے پیروں پر سر پٹخنا اور گریہ کرنا شروع کر دیا کہ خدا گواہ

ہے، وہ کچھ نہیں جانتے۔

"ابھی آگا پیچھا کا یاد آجائے گا تم کو۔" پیرو نے ٹھوکر مار کے اُنھیں خود سے دُور کر دیا اور دھتکارتے لہجے میں ماچھی سے کہا کہ وہ ٹکر ٹکر کیا دیکھ رہا ہے۔ ماچھی منتظر ہی تھا۔ پیرو کی ٹھوکر سے دونوں فرش پر لوٹ گئے تھے۔ ماچھی نے اُن سے نمٹنے کے لیے اپنی جگہ سے حرکت کی، دونوں کمرے کے بالکل آخری سرے کی تکون میں دُبک گئے۔ بدحواسی میں اُنھیں یہ بھی خیال نہ رہا کہ اِس طرح اُنھوں نے ماچھی کے لیے اور آسانی کر دی ہے۔ ماچھی ایک جست میں دیوار بن کے اُن کے سامنے پہنچ گیا تھا، اُس نے اُن کے اِدھر اُدھر بھاگنے کا امکان یک سر مسدود کر دیا۔ ماچھی نے ایک ہی سانس میں دونوں ہاتھوں سے پے در پے اتنے مُکے اُن کے پیٹ میں مارے کہ کوئی بھی بس اسی قدر برداشت کر سکتا تھا۔ اُنھیں نہ بلبلانے کا یارا رہا، نہ اپنے پیروں پر جمے رہنے کا۔ ماچھی بالوں سے کھینچتا ہوا اُنھیں درمیان میں لے آیا، ایک کو اُس نے کولھے سے پکڑ کے اوپر اُٹھا لیا۔ اُن کے ذہن میں اپنے مقابل لوگوں کے بارے میں کوئی ابہام تھا تو اب دُور ہو جانا چاہیے تھا۔ ماچھی نے اُسے بہت اوپر اُٹھا لیا، اور اوپر ہوا میں اُچھال کے دوبارہ اپنے ہاتھوں پر لے لیا، اگر اُسی لمحے وہ اُس آدمی سے دست کش ہو جاتا تو اُس کے جانے کتنے جوڑ کھل جاتے، ماچھی نے اُسے اپنے ہاتھوں پر لے کے زمین پر پھینک دیا اور پیچھے ہٹ آیا۔ ماچھی نے عمداً ایسا کیا تھا تاکہ وہ اِسے رعایت تصور کریں، رعایت بار بار نہیں دی جا سکتی۔

چند لمحوں کے لیے پھر خاموشی طاری رہی۔ درد و کرب سے اُن کے جسم دُہرے ہو گئے تھے۔ وہ مڑے تڑے، اینڈے اکڑے ہوئے فرش پر کراہتے رہے۔ پیرو نے ایک لمحاتی توقف کے بعد ماچھی سے کہا کہ اب وہ اُن سے پوچھے، اُنھیں اب بھی کچھ یاد آیا کہ نہیں؟

ماچھی کے سوال پر دونوں نے اِس نیم جانی کے باوجود انکار کر دیا۔ گویا ماچھی کے کس بل کے اظہار میں کوئی کسر رہ گئی تھی یا وہ مشاق لوگ تھے۔ دیکھنے میں وہ ایسے پختہ کار نہیں معلوم ہوتے تھے مگر ظاہر ہے کہ آزمودہ لوگوں ہی کو یہ ذمے داری سونپی گئی ہوگی۔ شاید ماچھی کی رعایت اُنھوں نے اُس کی مجبوری سمجھ لی کہ وہ بس اتنا ہی ستم کر سکتا ہے۔ پولیس کے سامنے پختہ کار لوگوں کا یہی شیوہ ہوتا ہے، اُنھیں اطمینان ہوتا ہے کہ پولیس اُنھیں زندہ رکھنے کی ایک رعایت ضرور دیتی ہے۔ پولیس تارِ نفس محض جھن جھناتی ہے، توڑتی نہیں۔ یہ بات بھی برداشت کا بہت کچھ حوصلہ دیتی ہے۔ پولیس کی طرف سے یہ اطمینان حاصل نہ ہو تو بھی وہ کسی بخیل کی طرح اپنے تارِ نفس کی بچی کھچی پونجی بہت دبوچ کے رکھتے ہیں، اُس پر کسی طور آنچ نہیں آنے دیتے اور اپنی دہائیوں سے ستم کو دادِ ستم بھی دیتے رہتے ہیں۔ اُن کی ہر چیخ، ہر کراہ، اذیت کی ہر دردناک صدا اُن کی بے گناہی کے ثبوت کی حیثیت رکھتی ہے، اُن کے حق میں ایک اور دلیل کی حیثیت۔ ہر اخفا کا سلسلہ دُور تک جاتا ہے۔ ہر زباں بندی ایک خوف سے مشروط ہوتی ہے اور بہت کچھ اِس پر بھی منحصر ہوتا ہے کہ یہ خوف اعصاب پر کس قدر مسلط ہے۔ دوسری طرف کون ہے، دوسری طرف کتنی بڑی کھائی ہے۔ کون سا ستم گر پڑا ہے۔ یہاں سے امان مل گئی

تو کیا ہوا، اُدھر جو ایک جہنم موجود ہے۔ اپنے ہی لیے نہیں، پسماندگان کے لیے پیرو بھی یہ سمجھ رہا ہوگا۔ اب اُسے اُنھیں یہی باور کرانا چاہیے تھا کہ سامنے کا یہ زیادہ مہلک، زیادہ ہول ناک ہے۔ سامنے کی آگ اُن کی آہ و بکا سے اور بھڑک ہے۔ پیرو نے ہنٹر بدست آدمی سے کہا کہ جب تک اُنھیں اپنے آقا کا نام و نشان آجائے، وہ اُن پر ہنٹر رساتا رہے۔

پاڑے کا آدمی ہنٹر ہاتھ میں لہراتا اُن کے قریب پہنچ گیا، عین وقت ماچھی نے اُسے روک کے اُن کے جسم پر جھولتے ہوئے کُرتے کھینچ لیے۔ کُرتوں کے کھادی کی بنڈیاں بھی پھاڑ دیں۔ اُن کا بالائی جسم بے لباس ہو گیا۔ ماچھی نے ہٹتے اُن کی ننگی پسلیوں پر ترچھے ہاتھ سے کئی ضربیں لگا دیں جن کی کسک شاید کے تارِ نفس تک پہنچ گئی ہو۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ ماچھی اور پیرو ہنٹر کی ضرب کیوں پس و پیش کر رہے ہیں، وہ اُن کے جسموں پر نشان ڈالنا نہیں چاہتے۔ ماچھی کی ترچھی ضربوں نے دونوں کو اور ناتواں کر دیا، اس کے ہٹنے پر جیسے ہنٹر اُٹھایا گیا، اُن میں سے ایک نے دہشت سے ہاتھ بلند کر کے ٹھیر جانے کی التجا کی اور بہ عجلت تمام ہذیانی انداز میں سر ہلانے لگا۔

پیرو نے ماچھی اور پاڑے کے آدمیوں کو اُن سے دُور ہو جانے کا اشارہ کیا۔ دونوں کی سانسیں چل رہی تھیں۔ ایک نے دوسرے پر اشتعال کی نگاہ ڈالی، گردن ڈال دی۔ جس آدمی نے ٹھیر جانے کی التجا کی تھی، وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، پیرو نے اُسے روک دیا اور کہا کہ جو کچھ اُسے بتانا ہے، خوب سوچ سمجھ کے بتائے، اُس کے پہلے ہی بیان کو آخری بیان سمجھا جائے گا، ترمیم و تبدیلی کی گنجائش نہیں۔ اچھی طرح جان لیں کہ یہاں سے وہ کسی عدالت میں نہیں لے جائے جائیں گے، اُن کی نجات اُن کے بیان کی تصدیق کے بعد ہی ممکن ہے۔

اُس نے سُن لیا تھا اور اچھی طرح ہی سُنا ہوگا۔ ماچھی بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گیا۔ میرے کان جلنے سے لگے، وہ کچھ بھی کہہ سکتے تھے۔ وہ شخص سر جھکائے بیٹھا ہانپ رہا تھا۔ پیرو نے اُسے سانسیں بحال کرنے کی مہلت دی اور عجلت نہیں کی۔ اُس نے خود بھی دیر نہیں کی۔ گھٹی ہوئی آواز میں کہنے لگا کہ اُن کا مقصد ہمیں ضرر پہنچانا نہیں تھا، اُنھیں صرف اِس غرض سے ہمارے تعاقب میں روانہ کیا گیا تھا کہ وہ....."

"اپن کو نام بولو۔" پیرو نے اُسے جھڑک دیا۔

اُس کے ہونٹ کپکپانے لگے اور پھٹی پھٹی انگارا آنکھیں اُدھر ہوئی اپنے ساتھی پر اٹک گئیں۔ دوسرے کی حالت اُس سے مختلف نہیں۔

"اپن کو نام بولو سالا!" پیرو نے دُرشتی سے کہا۔

اُس نے جلدی سے حلق تر کیا اور لڑکھڑاتی سٹ پٹاتی آواز میں

"نسبت شاہ خاں صاحب۔"

"نسبت شاہ خاں صاحب؟" پیرو اُلجھی ہوئی آواز میں بولا۔ "کون نواب بہادر ہے کیدر! کون ہے؟"

"یہ نواب نہیں ہیں حضور!" اُس نے گھگھیا کے کہا۔

"پھر کیا ہے؟ نواب کا....."

"یہ وہاں ایک بڑے سرکاری عہدے دار ہیں، ریاست کی نظامت میں۔"

"مطلب! بڑا سرکاری آفیسر؟" پیرو تذبذب سے بولا۔

"جی، جی ہاں۔"

"کائے کا افسر؟"

"سرکاری انتظامیہ کے دفتر میں ہیں وہ۔"

"ابھی ابھی کیا بولا تھا وہ؟"

اُس نے ہچکچاتے، ہکلاتے ہوئے بتایا کہ نسبت شاہ نے اُن سے ہماری نقل و حرکت کی نگرانی، ہمارے پتے اور ہمارے مشاغل کے بارے میں پوری معلومات حاصل کرنے کو کہا تھا۔ کہنے لگا کہ اِس کے سوا اُن کا کوئی مقصد نہیں تھا۔ وہ ہمیں کسی قسم کا نقصان پہنچانا نہیں چاہتے تھے۔

"یہ نسبت شاہ حرام کا جنا ابھی اپن کو کیسا جانتا تھا؟" پیرو نے اُس سے وہی سوال کیا جو میرے سر میں دھمک رہا تھا۔

"ہم کو، ہم کو نہیں معلوم۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بولا۔ "ہم سے جیسی بھی قسم لے لیجیے حضور! ہم کو اِس بابت کچھ نہیں معلوم۔ ہم اُن سے یہ پوچھ بھی نہیں سکتے تھے۔"

پیرو تُھل کی صورت دیکھنے لگا۔ چند لمحے سناٹا سا چھایا رہا پھر تُھل کی ترخنی آواز کمرے میں گونجی۔ "نسبت شاہ سے کس نواب راجا کا نال جُڑا ہے؟"

اُس شخص کا جواب سننے سے پہلے پیرو نے دوبارہ جتانا ضروری سمجھا کہ ہیر پھیر سے کچھ حاصل نہ ہوگا، وہ اپنے ہی ساتھ زیادتی کریں گے۔ جو کچھ اُنھیں معلوم ہے، صاف صاف بتائیں۔

"اُن کے بہت سے نوابین سے تعلقات ہیں حضور!" وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔ "وہاں ایک نہیں، بہت سے نواب لوگاں ہیں۔"

"قطب الدین علی سے کیسا ہے؟"

"نواب قطب الدین علی؟" وہ چونک سا گیا اور متردد لہجے میں بولا۔ "اُن سے بھی اُن کے بہت اچھے، نیازمندانہ مراسم ہیں۔"

"اتنا تم جانتا ہے؟"

"ہمارا اندازہ ہے حضور!" وہ لرزیدہ ہونٹوں سے بولا۔ "ہم آپ سے کچھ چھپا نہیں رہے۔ اب چھپانے کو کیا رہ گیا ہے۔" اُس کی التجا میں احتجاج بھی شامل تھا۔

"تم کو نئیں بولنا۔" پیرو کی پھنکارتی آواز سے وہ اُچھل پڑا۔ ایک لحظے بعد پیرو نے برہمی سے کہا۔ "تم قطب الدین علی کا آدمی ہے؟"

"نہیں نہیں۔" وہ تیزی سے بولا۔ "نہیں حضور! ہم صرف اُن کے نام سے واقف ہیں۔ وہ بہت بڑے نواب ہیں۔ ہم اپنی ماں کی قسم کھاتے ہیں کہ اُن سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ کسی اور طرف نہ بھٹکیں۔"

"وہ آدمی ریل میں تمھارا ساتھ چل رہا تھا؟"

"کون سا آدمی؟" اُس نے سراسیمگی سے پوچھا۔

"وہ چاقو پٹاخا والا....."

"آپ کون سے آدمی کی بات کر رہے ہیں؟"

اُس کے ساتھی کے چہرے پر بھی پریشانی و حیرانی سمٹ آئی۔ "ہم اپنے سوا کسی کو نہیں جانتے۔" پہلی بار اُس نے جھجکتے ہوئے زبان کھولی۔

"تم نئیں جانتا؟....."

"معاف کیجیے آپ کو ضرور غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم صرف دو ریل گاڑی میں تھے اور آپ کے برابر کے ڈبے میں بیٹھے تھے۔"

"ہا!" پیرو نے گرج کر کہا۔ "تم کو، تم کو ابھی کیسا معلوم تھا کہ اپن اسی ڈبا میں بیٹھنے کا ہے جو تم ابھی ایک دم برابر والا ڈبا کا ٹکٹ کٹایا؟"

"ٹکٹاں ہمیں نسبت شاہ خاں صاحب نے دیے تھے۔"

"نسبت شاہ کو پتہ تھا؟" پیرو نے متجسس لہجے میں کہا۔

"ہم نہیں کہہ سکتے۔"

جس بات کا مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا اور میرے دل کی دھڑکن بار بار معدوم ہونے لگتی تھی، آخر وہ اسی نتیجے پر پہنچ رہے تھے۔ تُھل نے ایک پل کی تاخیر کیے بغیر اُس سے پوچھا۔ "نسبت شاہ نواب حشمت جنگ کا کون ہے؟"

"نواب حشمت جنگ کے؟" اُس کی آنکھیں پھیل گئیں اور آواز حلق میں پھنس گئی۔

"اس کو تم نئیں جانتا!....."

"نہیں صاحب! اُنھیں ریاست میں کون نہیں جانتا۔"

"وہ بھی اُدر ریاست کا بڑا افسر ہے، کیا بولتا ہے اُس کو؟"

"جی جی۔" اُس نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔ "اور، اور نسبت شاہ خاں اُنھی کے ماتحت ہیں، اُن کے معتمد۔"

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میرا جی اب وہاں سے بھاگ جانے کو کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا، لیکن نواب حشمت جنگ سے اُن کا کوئی ربط ضبط نہیں ہے۔ اُس سے ساری زندگی میں دو ایک مرتبہ ہی اُن کی ملاقات ہوئی ہوگی اور وہ بھی رسمی طور پر۔ نواب حشمت جنگ تک عام لوگوں کی رسائی نہیں ہو پاتی۔ نسبت شاہ خاں عرصے سے اُس کا معتمدِ خاص ہے۔ ریاست میں اپنے انتظامی تجربے، معاملہ فہمی کے سبب سے اُس کا بہت نام ہے اور اُس کے متعلق بہت سی روایتیں، جرأت اور ذہانت کی بہت سی روایتیں مشہور ہیں۔

تُھل اور پیرو غور سے اُس کی ایک ایک بات سُن رہے تھے۔ دونوں کے چہروں پر رنگ آ گیا، دونوں پر کسی انکشاف کی سی حیرانی طاری تھی، سانحے کی بھی تو حیرت ہوتی ہے اور سوگ میں بھی تو آدمی کا خون جلتا ہے مگر پیرو کی یہ حالت نہیں ہونی چاہیے تھی۔ اُس نے تو پہلے ہی حیدرآباد میں ابا جان کی نو خرید حویلی میں آنے والے ۲۴ مسلح آدمیوں کے دستے کی بابت نواب حشمت جنگ کی طرف

اشارہ کیا تھا۔ شاید پیرو کو اپنے قیاس پر خود بھی اعتبار نہیں تھا۔ ابا جان نے سرزنش کے انداز میں تردید کی تھی تو اُسے خفت بھی ہوئی تھی، منہ سے بات نکل جانے کا پچھتاوا۔ تھوڑی دیر بعد ہی نواب حشمت جنگ پھول اور شیرینی لے کے آگیا تھا، رویّے بھی تو پھولوں اور کانٹوں کے مانند ہوتے ہیں۔ معلوم ہوتا تھا، پیرو نے اُس رات کی ذہنی ابتری کا مآل سمجھ کے سب کچھ اپنے سینے سے کھرچ دیا تھا۔ نواب حشمت جنگ کی کوئی گرہ اُس کی رگوں میں نہیں پڑی تھی جو اب اُس کا چہرہ جل رہا تھا، اُس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ مجھے اب وحشت سی ہو رہی تھی۔ میں نے خود کو بہت روکنا چاہا لیکن آخر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس میں میرے ارادے کو اتنا دخل نہیں تھا۔

"کیدر! ابھی کیدر کو راجا؟" پیرو چونک کے بولا۔

"کہیں نہیں، بس نیچے۔" میں نے بکھری ہوئی آواز میں کہا۔ "میں نیچے بیٹھا ہوں۔" اُس کے کچھ کہنے سے پہلے میں تیز قدموں سے زینے میں داخل ہو گیا۔ کسی نے پیچھے سے مجھے آواز نہیں دی۔

نیچے صحن اور دالان میں لوگوں کی تعداد اور بڑھ گئی تھی۔ میں نے کسی اور طرف نکل جانا چاہا لیکن کوئی ایسا راستہ نہیں تھا جہاں میں اُن کی نظروں میں نہ آتا۔ میں دروازہ بند کر کے وہیں کمرے میں بیٹھ گیا۔ وہ دونوں نیچے نہیں اُترے۔ جانے اب وہ اُن سے کیا جاننے کے خواہش مند تھے، مزید کون سی پہیلی بوجھنا رہ گیا تھا تاہم میں اُن کے انتظار میں وہیں بیٹھا رہا۔ مجھے تنہائی سے بھی گھٹن ہو رہی تھی۔ آدمی کبھی خود اپنی ذات کے لیے بھی اجنبی ہو جاتا ہے۔ لگتا ہے، یہ اپنا چہرہ اپنا جسم نہیں ہے۔ یہ اپنی آنکھیں نہیں ہیں۔ کبھی سب کچھ پتھر سا لگتا ہے، اپنا آپا بھی۔

مجھے نیچے آئے اور کمرے میں خود کو محبوس کیے دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں ہوئے ہوں گے کہ کمرے کے آس پاس شور سا سنائی دیا۔ میں نے جتنی دیر میں اُٹھ کے دروازہ کھولا، اُدھر کسی نے دستک دی۔ زورا، چھیدا، ٹنگو، جمرو اور شامو کے درمیان میرے سامنے مارٹی کھڑا تھا۔ سوجی آنکھیں، ہونٹوں پر پپڑی جمی ہوئی۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ رات بھر نہیں سو سکا ہے۔ اُس کا یہ حال دیکھ کے میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ "خیریت تو ہے؟" میں اُس کا بازو پکڑ کے اندر لے آیا۔

"ابھی دادا اُستاد کیدر ہے؟" وہ اضطراری لہجے میں بولا۔

"اوپر ہیں مگر بات کیا ہے؟"

"اُس کو بولو راجا ابھی اسپتال چلے کانتے بھائی۔" اُس کی آواز ٹھٹھرنے لگی۔ "ابھی بڑا ڈاکٹر دیکھنے کو آیا تھا۔ بولتا ہے آج ہی آپریشن کرنے کا ہے۔"

"آج ہی؟"

"اپن ابھی سویرے تمھارا انتظار کرتا رہا۔ کوئی بھی نہیں آیا، ٹنگو باسٹرڈ بھی ایدر بیٹھا مستی مارتا رہا۔ کوئین (جولین) بھی نہیں آیا۔ اپن بسٹر شبارے کو بول کے موٹر میں بھاگا ایدر آیا ہے۔ اُستاد کو بولو، ابھی چلنا ہے تو جلدی چلو۔ اپن کو جلدی لَوٹنے کا ہے۔"

میں نے سیدھے زینے کا رُخ کیا۔ وہ ابھی اُن دونوں کو کرید رہے تھے۔ میں نے مارٹی کے آنے کی اطلاع دی تو تجمل مزید کچھ پوچھے بغیر اُٹھ گیا، پیرو ہمارے پیچھے پیچھے آگیا۔ ہم کمرے سے نکل کے جیسے ہی صحن میں آئے، لوگوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ہماری تو کوئی بات نہیں تھی، پیرو کے لیے اُنھیں درگزر کر کے آگے بڑھ جانا خاصا دشوار تھا، وہ اُسی کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ چوکی کے پاس بائی کلّا کا دادا دینا بھی وہاں بیٹھا نظر آیا۔ اس سے پہلے کہ پیرو اُس کے پاس پہنچتا، وہ اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ اُس کا یہاں آنا اور وقت سے پہلے آجانا ہی کی انفعالیت کا ثبوت تھا، اُس کے چہرے پر بھی مجوبی لکھی تھی۔ پیرو نے بس اُس کے سلام کا جواب دیا اور ماچی کو اُس کی جانب اشارہ کر کے آگے بڑھ گیا۔ دروازے سے دُور تھا کہ ایک طرف کونے میں بیٹھا ہوا قلابے کا دادا جارجی اُٹھ کر راستے کی دیوار بن کے کھڑا ہو گیا۔ جارجی کو دیکھ کے میرا جسم بھی اکڑ گیا، وہ رات سے بہت بدلا ہوا تھا۔ "ابھی کھال میں ہے نا؟" پیرو نے ترشی سے کہا۔

جارجی پیرو کے پیروں پر جھکنا چاہتا تھا مگر پیرو نے اُس کے شانے پکڑ کے اور سر تا پا اُس پر ایک نظر ڈالتا ہوا بولا۔ "اپن کو ابھی بھی تھوڑا ابل کھائی دیتا ہے۔"

"نئیں دادا! نئیں۔" جارجی سیدھا ہو گیا۔

"لگتا ہے، دارو ابھی خون میں مل گیا ہے۔" پیرو نے بدبداتے ہوئے کہا۔ "پر ٹھیک ہے، ابھی آگیا ہے تو ٹھیک ہے۔ اپن تجھ سے اکھا بات کرے گا۔" پیرو کی آواز میں غصّے کی لرزش نمایاں تھی۔

جارجی کی نگاہیں جھک گئیں۔ پیرو نے اُسے ہدایت کی کہ جب تک وہ واپس نہ آجائے، جارجی یہیں پاڑے پر حاضر رہے گا، جارجی بت کے مانند سنتا رہا۔ پیرو نے اُس سے مزید بات نہیں کی، دروازے کی طرف چل پڑا۔ باہر آکے تجمل نے اُس سے کہا کہ پاڑے میں اُس کے لیے اتنے لوگ بیٹھے ہیں، وہ اپنے گھر بھی نہیں گیا ہے، کچھ دیر یہاں ٹھیر کے اب وہ گھر چلا جائے اور ممکن ہو تو رات ابا جان کے گھر آجائے ورنہ کل صبح ہم پاڑے آہی جائیں گے لیکن پیرو نے ہمارے ساتھ جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اسپتال کی موٹر دروازے کے پاس ہی کھڑی تھی، وہ ہمارے بیٹھتے ہی چل پڑی۔ سڑکوں پر بہت بھیڑ تھی۔ موٹر کی رفتار کبھی تیز ہو جاتی، کبھی سُست۔

ہم اسپتال پہنچے تو بارہ بج رہے تھے۔ اسپتال کا وقت ختم ہو گیا تھا، موٹر مریضوں کے خصوصی وارڈ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہاں رات والا پہرے دار نہیں ہو گا مگر اب بھی ایک آدمی مارٹی اندر جا سکتا تھا۔ رات کی طرح پہرے دار سے پھر تکرار کرنا پڑتی لہٰذا تجمل نے ڈرائیور سے اسپتال کے پچھلے حصّے کی طرف لے چلنے کو کہا۔ اِس وقت رات والے نوجوان ڈاکٹر کے ملنے کی توقع نہیں تھی، یہی تھا کہ ہم براہِ راست ڈاکٹر شرما سے ملنے کی کوشش کریں۔ موٹر سے

ہم اسپتال کی عمارت میں داخل ہو گئے۔ ہمارا رُخ نوجوان ڈاکٹر کے کمرے کی طرف تھا۔ خلافِ توقع وہ مل گیا۔ اپنے کمرے کے باہر ہی، وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ "آپ آگئے؟" وہ بے تابی سے ہماری طرف لپکا۔ "میں آپ کا منتظر تھا۔"

"مجھے امید نہیں تھی کہ اِس وقت تم سے ملاقات ہو جائے گی۔ تمھاری ڈیوٹی تو رات کو تھی؟" میں نے خجالت سے کہا۔ "ہمیں کچھ دیر ہو گئی۔"

"مجھے یقین تھا کہ آپ صبح ٹھیک آٹھ بجے یہاں پہنچ جائیں گے۔" وہ شائستگی سے بولا۔ "بس میں آپ کے انتظار میں رُک گیا۔"

"تم نے بڑی زحمت کی۔" میں نے دبی زبان سے کہا۔ "لیکن سب ٹھیک تو ہے ڈاکٹر؟"

"ڈاکٹر شرما آپریشن کی تیاری کر رہے ہیں۔"

"رات ہم کیا بولا تھا ڈاکٹر!" تجمل نے یکایک سامنے آکے تلخی سے کہا۔

"میں نے ڈاکٹر شرما کو بتایا تھا، اُنھوں نے آپ کا انتظار کیا۔ مریض کی حالت ایسی نہیں تھی کہ زیادہ وقت برباد کیا جاتا۔" وہ نرمی سے بولا۔ "آپ ہوتے تب بھی یہی فیصلہ کرتے۔"

"کدھر ہے بڑا ڈاکٹر صاحب؟"

"وہ آپریشن تھیٹر میں ہیں۔"

"اُس کو بولو، ہم کو چیرا پھاڑی نہیں کرانی۔"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"جو ہم بول رہے ہیں ابھی اُس کو ایسا ہی جا کے بول دو۔" تجمل نے دو ٹوک آواز میں کہا۔ "ہم نے پہلے ہی منع بولا تھا۔"

"آپریشن کی ضرورت ہے جناب!" وہ شکایتی لہجے میں بولا۔ "آپ سمجھ کیوں نہیں رہے۔ رات سے وہ بے ہوش پڑا ہے۔ میں اُسے مسلسل دیکھتا رہا ہوں، اُس کی حالت دیکھ کے ہی میں گھر نہیں گیا۔ یہاں تمام ڈاکٹروں کی یہی رائے ہے۔"

"ہماری نہیں ہے۔"

"آپ اس قدر کیوں گھبرا رہے ہیں، حوصلہ رکھیے۔"

"اُس کو اُس کے حال پر چھوڑ دو ڈاکٹر!"

"دیکھیے، دیکھیے۔" ڈاکٹر اضطراب سے بولا۔ "ہم لوگ کوئی اور طریقہ نہ دیکھ کے مجبوراً یہ قدم اُٹھاتے ہیں۔ مریض کی بھلائی کے لیے، اُسے جلد اچھا کرنے کے لیے۔"

"زیادہ بات مت کرو۔" تجمل نے ناگواری سے کہا۔ "بڑے ڈاکٹر صاحب کو جا کے بول دو، ہم لوگ کی مرضی نہیں ہے، ہم کاغذ پر دستخط نہیں کریں گے۔"

"کاغذ پر دستخط کیے جا چکے ہیں۔"

"کس نے، کس نے کیے؟" تجمل نے بھڑک کے کہا۔

"مریض کے ساتھ موجود لیڈی اٹینڈنٹ نے۔" اُس کی مراد شہ پارہ سے تھی جو رات مارٹی کے ساتھ وہی کانتے کے کمرے میں رہی تھی۔

"وہ، وہ کون ہے۔ دستخط ہم کریں گے۔"

"لیڈی نے خود کو مریض کا عزیز بتایا تھا۔"

"ابھی وہ سر اعزیز منع بولتا ہے۔"

"ایسا کب ہوتا ہے جناب!" نوجوان ڈاکٹر کے لہجے میں تندی آجانی چاہیے تھی۔ "میں آپ سے بنتی کرتا ہوں۔ آپ ذرا صبر سے کام لیجیے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب وقت گزر گیا ہے۔ مریض کو کمرے سے لے جایا جا چکا ہے۔ ممکن ہے ڈاکٹر شرما نے اپنا کام شروع بھی کر دیا ہو۔"

"نہیں۔" تجمل نے چیختی آواز میں کہا۔ "وہ ایسا نہیں کر سکتا، ہم کو ابھی اُس کے پاس لے چلو، ابھی اسی وقت ....."

"میں نے آپ سے کہا نا کہ وہ آپریشن تھیٹر میں ہیں۔"

"وہ کہیں بھی ہو، اُس کو جا کے روک دو۔"

"ایسی کیا بات ہے؟" ڈاکٹر جھنجلا کے بولا۔ "پھر آپ لوگ مریض کو اسپتال کیوں لائے تھے۔ ہم مریض کے دشمن نہیں ہیں، یہ اسپتال ہے جناب!"

"ابھی آواز دبی رکھو ڈاکٹر!"

ڈاکٹر کے چہرے پر ایک رنگ آ کے گزر گیا، اُس نے ملائمت سے کہنے کی کوشش کی۔ "ضرور آپ کو کبھی کسی آپریشن سے تلخ تجربہ ہوا ہے۔"

"ابھی ایسا ہی سمجھو۔" تجمل بھن بھناتے ہوئے بولا۔

"ضروری نہیں کہ دوبارہ بھی یہی تجربہ ہو۔"

"تم نہیں جانتے۔" تجمل کی جلتی ہوئی آواز میں کوئی دکھ بھی شامل تھا۔ "سمجھو کہ ہم کو تمھاری چیرا پھاڑی راس نہیں آتی۔"

"اوہ، اوہ۔" ڈاکٹر مسکرا کے بولا۔ "مگر یہ آپ کا وہم ہی ہے نا۔ ہم دن میں کئی آپریشن کرتے ہیں۔ کبھی کبھار ایک آدھ کیس میں مایوسی البتہ ہو جاتی ہے۔ آپ اطمینان رکھیں، یہاں آپ کا مریض زیادہ محفوظ ہاتھوں میں ہے۔"

"ہم کیا بول رہے ہیں ڈاکٹر!"

ڈاکٹر کا چہرہ تمتمانے لگا۔ "میں بھی کچھ کہہ رہا ہوں جناب! آپ میری بات کیوں نہیں سُن رہے۔"

"تم بھی اپنی نہیں سُن رہے۔"

"میں ایک ڈاکٹر ہوں۔"

"ہم بھی مریض کے کوئی ہیں۔"

میں نے دخل دینے کا ارادہ کیا لیکن اِس موقع پر تجمل سے کچھ کہنا ہوا دینے کے برابر تھا۔ میں نے پیرو کی طرف دیکھا مگر وہ بھی خاموش کھڑا رہا۔ تجمل اپنی ضد سے باز نہیں آیا۔ آخر ڈاکٹر کو کہنا پڑا کہ بہ صورتِ دیگر ڈاکٹر شرما کانتے کو اسپتال سے خارج کر دے گا۔

"ہم اُس کو ابھی لے جائیں گے۔"

"اِس حالت میں آپ اُسے لے جائیں گے؟" ڈاکٹر چیخ کر بولا۔ "یہ آپ

اُس کے ساتھ ظلم کریں گے۔ کیا.... کیا وہ جانے کے قابل ہے اور آپ کریں گے کیا؟ کیا کریں گے؟ میں سمجھتا ہوں، مجھے افسوس سے کہنا چاہیے کہ آپ اُسے تن درست دیکھنا نہیں چاہتے۔

"ہم اس کے بارے میں تم سے زیادہ سمجھتا ہے۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" ڈاکٹر درشتی سے بولا۔ "جیسی آپ کی مرضی۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ ڈاکٹر شرما سے آپ کی ملاقات ہو جائے مگر وہ بہت پاگل آدمی ہیں۔"

"ہم سے زیادہ نہیں ہوگا۔"

ڈاکٹر کی آنکھوں میں شعلے کوندنے لگے۔ اُس نے غصّے سے زمین پر پیر پٹخے اور سر جھٹک کے تجمل کو چلنے کا اشارہ کیا۔ میں اور پیرو بھی اُس کے ساتھ جانا چاہتے تھے لیکن ہمیں اُس نے روک دیا۔ جاتے جاتے اُسے خیال آیا، پلٹ کے اُس نے ہم سے اپنی واپسی تک کمرے میں انتظار کرنے کو کہا۔

ہم اُس کے کمرے میں داخل ہوئے تو جولین پہلے سے وہاں موجود تھی۔ "تم یہاں کیسے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔ اُس کے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی کو میں نے دوسرے لمحے میں دیکھا، اور بس دیکھتا رہ گیا۔ وہ شہ پارہ تھی۔ پیازی رنگ کی ساڑھی میں ملبوس، کانوں میں بالیاں پڑی ہوئی۔ شرمیلی شرمیلی سمٹی سمٹی۔ اُس کا شہابی رنگ کچھ اور نکھر آیا تھا۔ میں نے اُسے صرف بالاخانے پر دیکھا تھا اور وہ بھی رات کی روشنیوں میں، بالاخانے کے خاص لباس میں، ہونٹوں پر سُرخی جمائے، رُخسارں پر غازہ ملے۔ وہ وہاں نہ جانے سنگھار کیوں کرتی تھی۔ وہ تو خود پھول تھی۔ پھولوں کو سنگھار کیسا عجب لگے۔ پھول مخمل میں رکھ کے پیش کیے جائیں تو اُن کی خوشبو بڑھ نہیں جاتی۔ وہ تو کوئی اور ہی لڑکی نظر آ رہی تھی۔ گوجھا بیگم نے کل رات مجھے اُس کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا اور اُس سے پہلے کانتے نے بھی لیکن مجھے خود اپنی آنکھوں سے اُسے دیکھنے کی بے چینی تھی کہ اُس نے اپنی نئی زندگی کس حد تک قبول کی ہے۔ اُس کے چہرے کی تازگی اور تابندگی دیکھ کے مجھے اپنی رگوں میں ٹھنڈک سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ جولین ہی کی کوئی بہن معلوم ہوتی تھی۔ نقلِ مکانی سے آدمی کے ریشہ رگ اور صورت و رنگ پہ کتنا گہرا اثر پڑتا ہے مگر اسے نقلِ مکانی کیوں کہا جائے، یہ تو نقلِ مکینی تھا، مکان تو مکینوں سے ہوتا ہے۔ آس پاس کے چہرے جو بدل گئے تھے۔ مجھے دیکھ کے اُس کی آنکھیں جھلملانے لگیں اور رخساروں پر خون دمکنے لگا۔ "کیسی ہو تم؟" میں نے مضطربانہ اُس سے پوچھا۔

وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اُس کے نتھنے پھڑکتے رہے۔

"ارے!" میں نے تھرتھراتی آواز میں کہا۔ "تم کس قدر بدل گئی ہو۔ کہیں اور ملی ہوتیں تو شاید مجھے پہچاننے میں بہت دیر لگتی۔" جی میں آئی کہ بڑھ کے اُسے سینے سے لگا لوں، اُس کے سر پہ ہاتھ رکھوں لیکن میرے قدم اُٹھے رہ گئے، وہ سنبھل نہ پائی۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ایک اشارے کی منتظر ہے۔ میں نے مُڑ کے پیرو سے کہا۔ "دادا! تم نے دیکھا! خبر ہے یہ کون ہے، یہ شہ پارہ ہے دادا! سمجھو تمھاری ایک دُرگتیا۔"

"ہا ہا" پیرو نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اِس کے بارے میں تو تُو نے کبھی نہیں رے اجا! یہ تو ایک دم ابھی اِس کا دو پر کیدر کو چلا گیا۔" پیرو نے چند قدم آ کے اُس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور اُس کی کمر تھپکنے لگا۔ "اید سب سمندر ہے۔" اُس نے قریب کھڑی ہوئی جولین کو بھی اپنے پہلو میں سمیٹ لیا۔ "اپنا اتنا بہن بھائی دیکھیے گا تو کیا بولے گا۔ قسم ہے رے اجا! بالکل اُلٹ جائے۔"

ڈاکٹر ہدایت کر گیا ہوگا، کمرے میں تعینات ملازم نے چائے کی ٹرالی سامنے لا کے رکھ دی۔ چائے پینے کو بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن جولین پیرو کے اور میرے آگے پیالیاں بڑھائیں تو کوئی بھی انکار نہ کر سکا۔ کچھ دیر سب بھول گئے کہ وہ کسی اسپتال میں ایک ڈاکٹر کے کمرے میں ہیں اور اپنے آپ سے لڑ رہا ہے۔ اتنی ضد اس نے کبھی نہیں کی تھی۔ وقت آدمی کو یہ فریب نہ دیا کرے تو آدمی گھُٹ کے مر جائے۔ میں جولین سے صبح نہ آنے کی شکایت کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے شکایت نہیں کی ہے تو مجھے خود کہنا چاہیے مگر مجھے یہ معلوم ہوا۔ اُس کے لیے یہ کوئی نئی بات تو نہیں۔ چائے کے دوران پیرو کے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ وہ ڈاکٹر کیلاش کی طلبی پر اسپتال آئی ہے۔ رات تو جس سے اتنی باتیں ہوئیں مگر نہ میں اُس کا نام پوچھ سکا، نہ اُسے بتانا یاد رہا۔ جو کہنے کے مطابق رات کو وہ کئی بار کانتے کو دیکھنے کمرے میں آیا تھا اور اُس نے شہ پارہ سے کہا تھا کہ وہ کسی بھی وقت اُسے طلب کر سکتی ہے کسی بھی ضرورت کے وقت۔ صبح کانتے کی حالت بہت بگڑ گئی اور انتظار کے بعد بھی کوئی نہیں آیا۔ خلافِ توقع جولین بھی تو شہ پارہ بہت پریشان ہو گئی۔ مارٹی بھی ہمیں بلا گیا تھا، اُس نے ڈاکٹر کیلاش کو اپنے گھر کا پتہ سمجھا کے درخواست کی کہ وہ کی بہن جولین کو فوراً بلائے۔ ڈاکٹر کیلاش ہی نے مارٹی کو اسپتال کی موٹر فراہم کی۔ دوسری موٹر میں جولین کو وہ خود گھر سے لے کے آیا۔ وہ آدھ گھنٹے پہلے یہاں آئی۔

"اپن کو تھوڑا دیر ہو گیا۔" میرے بجائے پیرو نے آہستگی سے کہا۔ "ہوتا رہا سالا۔ ابھی تک رے اجا بھی گھر لوٹ کے نہیں گیا ہے۔"

"گھر نہیں گئے؟" وہ حیرانی سے بولی۔ "رات کو بھی؟"

"نہیں، جانا نہیں ہو سکا۔" میں نے جواب دیا۔

"وہاں سے کہہ کے چلے تھے؟"

"اب تک کے لیے نہیں۔"

"وہ سب تو بہت پریشان ہو رہے ہوں گے؟"

میں ہونٹ نکال کے رہ گیا۔

"میرا خیال ہے، ہم لوگ یہاں موجود ہیں، آپ چلے جائیں۔" وہ اِس طرف تائیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "کیوں بابا؟"

"ہاں ہاں۔" پیرو نے بے ترتیبی سے کہا۔ "پر یہ نئیں جانے کا بیٹا! یہ ایسا کیسا جا سکتا ہے، کانتے اِس کا بھائی ہے۔"

"یہ جا کے بھی تو آ سکتے ہیں۔"

پیرو نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میرا جواب شاید میرے چہرے پر لکھا تھا اس لیے اُس نے زبان بند رکھی۔ کمرے میں یکایک خاموشی طاری ہو گئی۔ جانے کتنے لوگ ایک دوسرے سے بےگانہ بیٹھے رہیں تو خاموشی اور عذاب بن جاتی ہے۔ ڈاکٹر اور تجمل میں سے کوئی نہیں آیا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ اُنھیں گئے ہوئے بیس منٹ کے قریب ہو رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ باہر جا کے کسی نرس سے معلوم کروں۔ تجمل کی حالت مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی تھی، اگر ڈاکٹر شرما نے انکار کر دیا اور تجمل اگر.... میرے دماغ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ نرس ایک بار کمرے میں آئی بھی لیکن میں اُس سے کیا پوچھتا۔ اتنی دیر میں دروازے کے باہر اُن کی آہٹ سنائی دی۔ وہ تجمل ہی تھا۔ میں اُس کی چاپ اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اُن کے اندر داخل ہونے سے پہلے ہی ہم سب کھڑے ہو گئے تھے اور اب ہماری متوحش نگاہیں اُنھی پہ منڈلا رہی تھیں۔ پیرو نے اُن کی زبانی کچھ جاننے کے لیے توقف کیا لیکن وہ دونوں گنگ جیسے اپنے آپ کو دیکھتے رہے۔ میری سانسیں رُکنے لگیں۔ "ابھی تم جاؤ دادا!" تجمل کی بوجھل آواز نے سکوت توڑا۔

"کیا، کیا ہے تجمل بھائی؟" پیرو نے بے تابی سے کہا

"ہم کو ابھی اِدھر ہی رہنا ہے دادا!"

"اُدر ابھی وہ، وہ کیسا ہے؟"

تجمل نے سر جھکا لیا۔ "مر رہا ہے حرام ڈیل۔"

"کیا، کیا تجمل بھائی؟" پیرو دست پٹا کے بولا۔

"نہیں نہیں۔" ڈاکٹر کیلاش احتجاجی لہجے میں بولا۔ "ہمیں بھلائی کی توقع کرنی چاہیے۔ آپریشن ہو رہا ہے، ضرور کامیاب ہوگا۔"

گویا تجمل ناکام واپس آیا تھا۔ میں کچھ نہ طے کر سکا کہ یہ اچھا ہوا یا بُرا۔ تجمل کا اصرار مجھے کچھ زیادہ ہی لگ رہا تھا مگر اُس کے اضطراب اور وحشت کی کوئی وجہ ضرور ہوگی۔ وہ برہمی کی حد تک تکرار کرتا رہا تھا اور یہاں آ کے اب بھی سرنگوں ہم سب سے بے نیاز بیٹھا تھا۔ جیسے وہ ہماری موجودگی کے باوجود اکیلا ہو گیا ہو۔ میری طرح پیرو کے ذہن میں بھی طرح طرح کے سوال اُمڈ رہے ہوں گے لیکن کوئی اِس حال میں تجمل سے کیا کہہ سُن سکتا تھا۔ ڈاکٹر کیلاش کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ سرِدست خاموشی ہی مناسب ہے۔ سب بےحس و حرکت ہو گئے تھے۔

کوئی وہاں سے نہیں اُٹھا۔ ہمیں اتنی دیر تک ڈاکٹر کیلاش کا کمرہ نہیں گھیرے رہنا چاہیے تھا لیکن خود ڈاکٹر کیلاش کی یہی خواہش تھی۔ وہ کئی مرتبہ باہر گیا، پھر ایک بار جب واپس آیا تو اُس کے ساتھ ایک پختہ عمر ڈاکٹر بھی تھا۔ ڈاکٹر کیلاش کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اُس نے فرطِ مسرت سے کہا، آپریشن مکمل ہو چکا ہے اور کامیاب آپریشن۔

سب کی نگاہیں تجمل کی جانب مرکوز ہو گئیں مگر اُس کے پتھر جسم میں کوئی جنبش نہیں ہوئی۔ اُسے یوں ڈھیر دیکھ کے ڈاکٹر کیلاش کی چہکتی آواز بھی ماند پڑ گئی۔ "مریض کو اُس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا ہے۔" دوسرے ڈاکٹر نے ہمیں بتایا۔ اُس نے کہا کہ آئندہ اڑتالیس گھنٹوں تک کانتے بے ہوش رہ سکتا ہے، اُس وقت تک اُس کی نگرانی کی سخت ضرورت ہے اور دعا کی بھی۔ وہ کہنے لگا کہ اب صرف دعا ہی باقی رہ گئی ہے۔

اُسے کون بتاتا کہ دعا تو اُس کے لیے ہمارا رواں رواں کر رہا ہے۔ دعا تو بے زبانی کی بھی ہوتی ہے۔

تجمل نے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے اُس کے ساتھ ٹھہرنا چاہا، پیرو نے بھی، سبھی نے مگر وہ مارٹی کو اپنے ساتھ لے کے خصوصی وارڈ کی طرف چل دیا۔ ڈاکٹر کیلاش نے خود جانے کے بجائے اپنے ساتھی ڈاکٹر سے التجا کی کہ وہ تجمل کو کانتے تک پہنچا آئے۔

وہ خود ہماری وجہ سے نہیں گیا، اسپتال کا بیرونی دروازہ عبور کرنے کے بعد بھی وہ ہمارے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور مسلسل ہمیں صبر اور حوصلے کی تلقین کرتا رہا۔ جواب میں کسی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تو وہ دل گرفتہ سا ہو گیا۔ ہمیں وہ اسپتال کی گاڑی میں بھیجنا چاہتا تھا لیکن اُس کی اتنی نوازشیں ہی کیا کم تھیں، بمشکل اُس نے ہماری معذرت قبول کی۔ جب ہم ٹرم کے انتظار میں فٹ پاتھ پر کھڑے تھے، وہ ڈوبی ڈوبی آواز میں بولا۔ "مجھے آپ کے خاندان سے مل کے عجب سا احساس ہو رہا ہے۔"

"کیسا احساس؟" میں نے تجسّس سے کہا۔

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔" وہ اشتیاق آمیز حیرت سے بولا۔ "اسے کیا نام دیا جائے بہرحال۔" وہ انگریزی میں بولا۔ "اِٹ لُکس آل ڈریم، آل مسٹری۔" "سب کچھ خواب

سب کچھ پُراسرار لگتا ہے۔

"مگر بس اتنا ہی رکھنا۔" میں نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ "کوئی اور قیاس کرنے سے پہلے بہتر ہے، ہم سے وضاحت طلب کر لینا۔"

"اوہ، اوہ۔" وہ مچل کے بولا۔ "خدارا اُسے بھول جائیے۔"

ٹم ٹم آگئی۔ ہمارے کہنے کی دیر تھی، وہ مان جاتا لیکن ہم نے اس سے اپنے ساتھ چلنے کو نہیں کہا۔ چلتے وقت اُس نے مودبانہ سب کو سلام کیا اور پیرد کے ہاتھ دیر تک اپنے ہاتھوں میں بھینچے رہا۔ "مجھے آپ لوگوں سے مل کے ایک عجیب سنسنی خیز مسرّت کا احساس ہو رہا ہے۔" اُس کا لہجہ بھی یہی غمّازی کر رہا تھا۔ "کاش ہم کسی اور وقت ملے ہوتے۔" وہ حسرت بھری آواز میں بولا۔

"کاش ہمارے لیے تمھارا یہی تاثر قائم رہے۔" میں نے کہا۔

"مجھے یقین ہے، مجھے یقین ہے۔" وہ تیزی سے بولا۔

"آپ ہمارے گھر تشریف لائیے گا۔" شہ پارہ نے شائستگی سے کہا۔ "اسپتال سے ایسا دُور بھی نہیں ہے۔"

"ضرور ضرور، یہ میرے لیے عزت کا سبب ہوگا۔"

ہر طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور سڑکوں پر جیسے کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔ ہر شخص جلد سے جلد اپنی منزل پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ جن کی کوئی منزل ہوتی ہے، اُن کی رفتار میں یہی لے کی ہونی چاہیے۔ میرا اندازہ تھا کہ اسپتال سے جولین سیدھی فرخ، فریال وغیرہ کو دیکھنے جانے کے لیے اصرار کرے گی لیکن وہ ٹم ٹم میں بُت بنی بیٹھی رہی۔ چوک سے راستے مختلف سمتوں میں جاتے تھے مگر ان دونوں کو اکیلا چھوڑ کے ٹم ٹم سے اُتر جانے کا کوئی محل نہ تھا۔ میرے دل میں آیا، پیرد کو ٹوکوں کہ کم از کم اُسے چلا جانا چاہیے۔ وہ پاڑے میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے جلد ہی آنے کا کہہ کے آیا تھا مگر جیسے اب میرا گھر جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا، اُس کا بھی یہی حال ہوگا۔ مَیں جولین کے گھر رہ کے اسپتال سے قریب رہ سکتا تھا۔ گھر چلا جاؤں گا تو دل کانتے ہی میں اٹکا رہے گا لیکن جتنی دیر ہو رہی تھی، ابا جان اور اُن سب کو ہول آ رہے ہوں گے۔ جیسا جولین نے کہا تھا، یہی مناسب تھا کہ میں ابا جان کو بتا کے واپس آجاؤں۔ کانتے کا حال سُن کے وہ مجھے روکیں گے بھی نہیں، کانتے کا یہ حال بھی تو صرف اُنھی کی وجہ سے ہوا ہے۔ مَیں اُن کا بیٹا تماشائی بنا دیکھتا رہا مگر کانتے اُن کی ڈھال بن کے کھڑا ہو گیا تھا اور وہ سب یہاں بھی تو آسکتے ہیں۔ یہ کوئی دوسرا گھر نہیں ہے۔ یہاں آنے کے بعد ہی انھیں کچھ اندازہ ہوگا کہ یہ گھر بھی اُن کا اپنا ہے۔

نشست گاہ میں آکے پیرد صوفے پر پھیل گیا اور گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔ رات بھر ہم تقریباً چلتے رہے تھے۔ ایک پل کے لیے بھی آنکھ موندنے کا موقع نہیں ملا تھا مگر یہ اعصاب شکنی بے آرامی کی وجہ سے نہیں تھی۔ یہ تو کانتے پریشان کر رہا تھا۔ کبھی کبھی ایسا گمان ہوتا کہ وہ کوئی بہت ہول ناک مذاق کر رہا ہے۔ اپنے پرسانِ حال لوگوں کا حوصلہ دیکھنے، انھیں چھیڑنے یا اُن میں اپنی پیمائش کرنے کا سودا اُس کے سر میں سما گیا ہے۔

کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ ہم نے آتے ہی منع کر دیا تھا کہ وہ کوئی تکلف نہ کریں لیکن اُنھوں نے چائے کے ساتھ اتنا سامان ہمارے سامنے رکھ دیا کہ کیا رہ جاتا تھا۔ اُن کی خاطر ہم بس ٹونگتے رہے۔ جولین کو میرے گھر جلدی جانے کا احساس تھا، اس لیے اُس نے بہت جلدی کی تھی۔ اتنی دیر میں اُس نے لباس تبدیل کر لیا تھا۔ چمپا بیگم پہلے سے تیار تھی۔ ملازم نے آکے بتایا کہ باہر ٹم ٹم موجود ہے۔ جولین نے اُس وقت گھر جانے کی بابت مجھ سے کچھ نہیں پوچھا تھا، اُس نے از خود یہ فیصلہ کر لیا تھا۔ اتنا اختیار تو وہ سمجھتی ہوگی۔ اچھا لگا۔ کبھی اپنے لیے دوسرے فیصلہ کریں تو ایک ہلکا پن سا محسوس ہوتا ہے۔ کوئی یوں اپنا استحقاق جتائے تو عجب سی طمانیت ہوتی ہے، اپنے وجود کا، اپنے ہونے کی آسودگی۔ وہ شخص کبھی کبھی بہت اُداس ہوتا ہوگا جسے اپنے تمام فیصلے خود کرنے پڑتے ہوں۔ مَیں اُٹھنے کے لیے اُن کی اطلاع کا منتظر تھا کہ شہ پارہ آکھڑی ہوئی۔ وہ ہلکی نیلی ساڑھی پہنے ہوئے تھی، کام دانی کی ستارے جس میں لگے ہوئے تھے۔ مجھ سے دبی زبان میں کہنے لگی کہ کیا وہ برقع پہن لے۔

"برقع؟" میں نے چونک کے کہا اور فوراً مجھے خیال آیا کہ وہ یہ کیوں پوچھ رہی ہے۔ جولین کا تو پھر بھی ٹھیک تھا مگر اپنے نام کی نسبت سے اُسے اندیشہ ہوگا کہ کہیں ابا جان کو اُس کی یہ بے پردگی گراں نہ گزر جائے۔ اس کی سادگی پر مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے پوچھا۔ "تم برقع پہنتی ہو کیا؟"

اُس نے زیرِ لب کہا۔ "یہاں آکے نہیں پہنا۔"

"پھر کیا سوال ہے۔ جب تم پہنتی ہی نہیں ہو تو تصنع کی کیا ضرورت۔"

"دوبارہ بھی تو پہنا جا سکتا ہے۔" وہ آہستگی سے بولی۔

مجھ سے جواب نہ دیا جا سکا۔ "نہیں نہیں۔" مَیں نے تذبذب سے کہا۔ "اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمھیں ابا جان کا خیال ہوگا، وہ دوسرے قسم کے آدمی ہیں۔" مَیں اُسے کیا بتاتا کہ وہ تو اپنی جوان لڑکیوں کو ایک اجنبی شخص کی تحویل میں دے کر ایک ایسے سفر پر نکل گئے تھے جہاں سے واپسی بس قسمت پر منحصر تھی۔ اُنھوں نے اپنا خاندان، اپنے رشتے دار، اپنا شہر سبھی کچھ ترک کر دیا تھا۔ اُن کی تو اِس طرف توجہ بھی نہیں جائے گی۔

شہ پارہ لہراتی ہوئی سی کمرے سے نکل گئی۔ ٹم ٹم والا بار بار ٹن ٹن کر رہا تھا۔ مَیں نے سوچا، پیرد کو مشورہ دوں کہ وہ لیٹتا ہے تو یہیں آرام کر تا رہے۔ ... جلدی واپس آجاؤں گا مگر وہ یک لخت اُٹھ گیا۔ مٹھائی کے ٹوکرے اور گل دستے ٹم ٹم میں پہلے سے رکھے تھے۔ گل دستوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ پانی ڈال ڈال کے انھیں تازہ رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔

کوچوان اپنی عمر گزار چکا تھا۔ گھوڑے نے بھی شاید اُس کے ساتھ جوانی ... کیا تھا۔ جو ہانپ ہانپ کے راستہ طے کر رہا تھا۔ میری نظریں جولین کے چہرے پر ... پلٹتیں۔ وہ چمپا بیگم کے پہلو میں دبکی نہ جانے کس سوچ میں گم تھی۔ بات ... کے ملنے کی خبر سُن کے وہ کیسی دیوانی ہو گئی تھی۔ وہ تو اُسی وقت ان کے ... فرخ، فریال کو دیکھنے کے لیے مچلنے لگی تھی۔ اُس کے لیے واقعی یہ خبر اتنی ... کُن ہونی چاہیے تھی۔ کرشنا جی کی زندگی میں اور اُن کے بعد ابا جان ... کی کوششوں کی اُسے خوب سُن گُن تھی۔ ایس پی شکلا اُس کے گھر ... آتا تھا۔ ممکن ہے وہ اُسے ٹوکتی بھی رہی ہو۔ سب شمولیت کی بات ہے، کون ... ہوتا ہے لیکن رات کے برعکس اب اُس میں بڑا ٹھیراؤ تھا۔ کانتے میں بھی ... اتنا ہی شامل تھی۔ کلکتے سے کانتے اُس کے لیے ایک تحفہ لایا تھا۔ شہ پارہ ... سے جولین اور تراش رہی تھی۔ آدمی تراشنے میں آدمی کو بڑی مسرّت ... ہے۔ کانتے ویسے بھی اُس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ شہ پارہ کی آمد سے جولین ... میں اُس کی وقعت اور سوا ہو جانی چاہیے تھی۔ کبھی کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ ... اتنی توانائی نہیں ہوتی کہ دُکھ پہ غلبہ پالے۔ نہ خوشی اتنی دیرپا ہوتی ہے ... عرصہ دراز ہوتا ہے اور مَیں نے سُنا تھا، آدمی خوشی چھپا سکتا ہے دکھ نہیں۔ ... ہے کہ آدمی بڑے سے بڑا دُکھ بھول جاتا ہے مگر دُکھ اپنے وقت پر تو سارا ... کے رکھ دیتا ہے۔ جولین کو اِس وقت کہیں جانے کا ارادہ ملتوی کر دینا ... تھا۔ ابا جان کو اب کوئی اور سفر تو درپیش تھا نہیں۔

... بیچ میں کوئی سڑک بن رہی تھی۔ گاڑی کو لمبا چکر کاٹنا پڑا۔ مولوی صاحب ... کے باہر ہی مل گئے۔ اکبر بھی اُن کے ساتھ تھا۔ ہم پر نظر پڑتے ہی دونوں ... رسے چیخے کہ راہ گیر بھی متوجہ ہو گئے۔ اکبر چلتی ٹم ٹم پر چڑھ گیا۔ مولوی اکرم ... تو گھوڑے کی راسیں پکڑ لیتے۔ ابا جان اِس دوپہر میں احاطے میں ... لے بیٹھے تھے۔ ٹم ٹم رکتی دیکھ کے وہ بے تابانہ دروازے کی طرف دوڑے۔ ... فریال اور فارہہ بھی دروازے پر کھڑی تھیں یا کھڑکی سے جھانک رہی تھیں ... باہر نکل آئیں۔ سب کے چہروں کے رنگ ایک رات میں بدل گئے تھے۔ وہ ... دلر مجھ سے لپٹ گئیں۔ فارہہ تو ہچکیوں سے رونے لگی جیسے میں ایک ... طویل ایک جنگ کی جدائی کے بعد اُن کے پاس آیا ہوں۔ اپنے ہیجان میں ... دھیان بھی نہ رہا کہ میں اکیلا نہیں ہوں۔ جولین، شہ پارہ اور چمپا بیگم کے ... ان کی یہ از خود رفتگی ہر چند کہ فطری تھی مگر مجھے کچھ نامناسب سی لگی۔ ان ... میں جولین، شہ پارہ اور چمپا بیگم نے خود کو کیسا اجنبی محسوس کیا ہوگا۔ ... فرخ کو جلد ہی احساس ہو گیا۔ وہ تعجب اور تپاک کی نظروں سے اُنھیں ... اُسی وقت پیرد نے درمیان میں آکے میری مشکل حل کی۔ "ابھی پتہ ہے یہ ...؟" اُس نے فرخ کا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور اپنے ماتھے سے ... لگا کر بولا۔ "یہ تمھارا راجا کا کمائی ہے۔" کہنے لگا کہ تمھارے لیے یہ لوگ اجنبی ... ہوں گے، اُن کے لیے قطعی اجنبی نہیں ہو، یہ تو تمھارے لیے ہر دم دعا کرتی رہی ہیں۔ ... اُن کی سمجھ میں کچھ آیا کچھ نہیں۔ پیرد کو ایک اور بات اُن سے کہنی چاہیے تھی کہ رشتے صرف خون کے نہیں ہوتے اور خون، رشتوں کی کوئی کڑی نہیں ہے۔ 'خون کے رشتے تو جبر کے بھی ہو سکتے ہیں، اختیار کے نہیں، مگر جو رشتے اپنے اختیار کے ہوتے ہیں، جو خود کشید کیے جاتے ہیں،' اُن کے پیچھے خون سے بڑے اتفاقات، خون سے بڑے سلسلے ہوتے ہیں۔ ابا جان بھی ہمارے پاس آگئے۔ اُن کے بارے میں جولین اور شہ پارہ کو کسی نے کچھ نہیں بتایا، اُنھوں نے خود ہی سمجھ لیا۔ اُن کے جھجکتے ہوئے سلام کے جواب میں ابا جان نے اُنھیں رسمی دعائیں دیں، سر پہ ہاتھ رکھا اور شگفتگی سے بولے۔ "تم نے نام تو بتائے ہی نہیں۔" مَیں نے اُنھیں بتانے کی کوشش کی۔ "یہ جولین ہیں، یہ شہ پارہ اور ان کا نام ..." چمپا بیگم کے نام پر میری زبان لکنت کرنے لگی۔ وہ فرخ کو ٹکر ٹکر گھورے جا رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں کو دھوکا ہو رہا ہوگا کہ فہمیدہ کہیں زندہ تو نہیں ہو گئی۔

میں نے جولین کو اشارہ کیا کہ وہی پیش قدمی کرے۔ جولین کو یہ آداب خوب آتے تھے، اُس کے لبوں پر مسکراہٹ کھلی دیکھ کے مجھے تسلی ہوئی۔ میرے اشارے میں ربطِ خاطر کی اپنائیت تھی۔ اُس کے چہرے کا کھنچاؤ کچھ میرے اس گداز کے سبب بھی کم ہوا ہوگا۔ سب احاطے میں کھڑے تھے، مولوی اکرم نے اُنھیں یاد دلایا کہ اندر ایک گھر بھی ہے۔ سب اندر چلے آئے لیکن بیٹھک میں آکے اُن کا اضطراب کچھ اور فزوں ہو گیا۔ جولین بھی میری مدد نہ کر سکی۔ مجھے علم نہیں تھا کہ یہاں آنے کے بعد ایسی کوئی صورت بھی پیش آئے گی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں سے شروع کروں۔ ایک دوسرے کے متعلق کیا بتاؤں جس سے اُن کے درمیان کوئی حجاب باقی نہ رہے۔ کہاں سے وہ لفظ لاؤں، اتنے موزوں، ایسے پُرتاثیر جو ایک پل میں سارے فاصلے طے کر لیں مگر ایسا کب ہوتا ہے۔ آدمی کی بینائی درونِ خانہ تک رسا ہوتی تو یہ دشواری پیش نہ آیا کرتی۔ پہلی بار بینائی ہمیشہ شک زدہ ہوتی ہے۔ ہزار مرتبہ دیوار کے اُس پار ندامت اُٹھانے کے بعد یہ آلودگی ہو جانی چاہیے۔ سو اُن کا یہ امتناع اتنا بے جواز نہیں تھا۔ یہی بہت تھا کہ اُن کی آنکھوں میں حیرت و تجسّس کے ساتھ ایک دوسرے کے لیے اشتیاق بھی موج زن تھا۔ پیرد اور ابا جان اندر آکے فوراً چلے گئے تھے۔ مجھے بھی اپنی موجودگی دیوار سی لگی۔ ممکن ہے، مردوں کے سامنے عورتیں ایک دوسرے سے مغائرت محسوس کرتی ہوں لہٰذا مَیں اُنھیں چھوڑ کے چلا آیا۔ پیرد کا ساتھ آنا اچھا ہی ہوا، ابا جان سے مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ اُسی وقت کانتے کو دیکھنے جانا چاہتے تھے مگر پیرد نے اُن سے کہا کہ اگر اِس وقت وہاں جانے سے کانتے کی دل بستگی مقصود ہے تو اُس کے اتنی جلد ہوش میں آنے کا امکان نہیں اور اسپتال کا وقت بھی شام سات بجے تک ہے۔ پیرد کے سمجھانے پر وہ چُپ تو ہو گئے لیکن بہت ناتواں اور منتشر نظر آ رہے تھے۔

ہمارے انتظار میں رات سے اب تک کسی نے کچھ بھی نہیں کھایا تھا مگر پیرد نے مولوی اکرم کو صاف منع کر دیا۔ ابا جان کی بھوک بھی کانتے کا ذکر سُن کے مر گئی ہوگی۔ مرزا عمار نے بھی انکار کر دیا۔ کچھ دیر تک تو ہم وہیں چبوترے پر بیٹھے

رہے لیکن بار بار کرسیاں کھسکانی پڑتی تھیں دھوپ بار بار زاویے بدل رہی تھی۔ مولوی اکرم نے فرشی منزل کا کمرہ کھول دیا۔ وہیں باہر سے فرشی منزل کا دروازہ کھلتا تھا۔ کمرے میں آرام کرسیاں رکھی تھیں اور دیگر ساز و سامان کے علاوہ مسہری بھی بچھی ہوئی تھی۔ اباجان کے اصرار پر پیرو مسہری پر دراز ہو گیا۔ غالباً میری وجہ سے اباجان نے کمرے سے چلے جانا مناسب سمجھا۔ سارا جسم چور چور تھا۔ پیرو نے مجھ سے مسہری پر آنے کو کہا بھی لیکن میں آرام کرسی ہی پر پھیلا رہا۔ میری بند آنکھیں گھر کے اندر اُن سب پر منڈلا رہی تھیں اور انھیں کچھ نظر آ گیا تھا کہ مجھے نیند آ گئی۔ بکر نے کسی وقت میرے سرہانے تکیہ رکھ دیا۔ ایک لمحے کے لیے میری آنکھ کھلی، پھر مجھے اپنی خبر نہ رہی۔

پیرو کی دستکی آواز پر میں ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑا ہوا مگر اب چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ منہ پر دو ایک چھپکے مار کے میں نے سیدھے گھر کے اندر کا رُخ کیا۔ اندر آ کے مجھے یقین نہیں آیا۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ یہ بھی میری خواب زدگی کا کوئی کرشمہ ہے۔ اُن میں اگر کوئی بھید تھا تو اُن کے چہروں کا۔ سب ایک دوسرے میں ایسی شامل تھیں جتنا آدمی خود میں شامل ہو سکتا ہے۔ میری نگاہوں کے سامنے پھولوں کا سا کوئی منظر تھا۔ روشنی میں اُن کے چہرے دمک رہے تھے مگر بہت سی چمک اُن کے اندر کی تھی۔ چہرے آئینہ ہوں تبھی روشنی منعکس ہوتی ہے۔ گرد آلود آئینوں پر روشنی ٹھٹھر جاتی ہے۔ فرخ، چمپا بیگم کے پہلو سے لگی بیٹھی تھی اور چمپا بیگم کی آنکھیں ابھی تک سمندر بنی ہوئی تھیں۔ وہ ایک دوسرے کے لیے بے شک اتنی ہی اجنبی تھیں جتنا کوئی ہو سکتا ہے مگر اُن کے مابین ایک حوالہ سب سے بڑی زنجیر تھا۔ رشتے بہت کچھ حوالوں پر منحصر ہوتے ہیں کہ کتنا بڑا حوالہ درمیان میں ہے۔ اُنھوں نے ایک دوسرے سے نہیں، مجھ سے اپنی شناسائی بڑھائی تھی۔

سات بجے تو میں سو کے ہی اُٹھا تھا۔ اباجان نے کھانا کھلائے بغیر کسی کو نہیں جانے دیا۔ وہ تو انھیں رات گزارنے کے لیے روک رہے تھے لیکن کانتے کے عذر پر خاموش ہو گئے۔ جولین نے اُن سے درخواست کی کہ کیوں نہ وہ سب اُس کے گھر چلیں، وہ گھر ایسا چھوٹا نہیں ہے۔ جولین کو یہ بھی کہنا چاہیے تھا کہ گھر کا کیا ہے، مکین چھوٹے نہیں ہونے چاہئیں۔ اباجان نے اُس سے وعدہ کیا کہ کل وہ اُس کے گھر ضرور آئیں گے۔ اتنی دیر میں اباجان اُس سے خوب مانوس ہو گئے تھے۔ اِس میں اُن کے تپاک اور خوش اطواری کا اتنا دخل نہیں تھا جتنا جولین کی نشست و برخاست کی شائستگی اور اُس کے لب و لہجے کے سوز و گداز کا دخل تھا۔ جولین کے لہجے میں فرخ اور فریال جیسی ناز آفرینی تھی، انھی جیسا اعتماد تھا۔ اباجان نے اُسے ایک گھڑی اور طلائی نیکلس دیا، شہ پارہ اور چمپا بیگم کو بھی سب قیمتی چیزیں تھیں۔ اباجان کوئی کم حیثیت چیز کسی کو کیسے پیش کر سکتے تھے۔ مجھے حیرت تھی کہ اُنھوں نے یہ سب کچھ کس وقت خریدا تھا۔ صبح تو اُن کے بازار جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، اُنھوں نے یہ خریداری حیدرآباد میں کی ہوگی، فرخ، فریال وغیرہ کے خیال سے۔ تینوں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اُنھوں نے اباجان کو اپنا بزرگ سمجھ کے اور اپنا حق جان کے ہی اُنھیں قبول کیا۔ حق طلبی میں ممنونیت کیسی۔

رات کے دس بج رہے تھے۔ پاڑے کے بہت سے آدمی ہیر[illegible] میں مل گئے۔ اب بھی وہاں بڑی تعداد میں لوگ بیٹھے تھے۔ گو یہ تعدا[د] نہیں تھی۔ دینا اور جارجی بھی ابھی تک موجود تھے اور اندھیری کا دا[دا] بھی۔ رات ہم اِس تیسرے پاڑے کی طرف دوری کے سبب نہیں جا سکے۔ اُن دونوں سے زیادہ عقل مند معلوم ہوتا تھا۔ پیرو چوکی کے بیچ میں بیٹھ گیا۔ اُس کی نشست کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اب اُس کے پا[س] وقت ہی وقت ہے۔ مجھے بھی اب کوئی جلدی نہیں تھی۔ جولین کو گھر[...] تھوڑی دیر کے لیے ہم اسپتال ہو آئے تھے اور ڈاکٹر کیلاش کو بزا[...] کے بجائے ہم نے گیٹ کے چوکی دار سے کہہ سن کے مارٹی کو باہر بلوا لیا تھا۔ زیادہ دیر وہاں ٹھیرنا ممکن نہیں تھا، نہ اِس کا کچھ حاصل تھا۔ مارٹی کی اطلا[ع کے] مطابق کانتے پتھر بنا پڑا تھا۔ شبل کی بھی کچھ یہی حالت تھی۔ وہ کانتے کے [...] بس اُسی پر نگاہیں جمائے، اُس کی کسی ایک جنبش لب کا منتظر تھا۔ مارٹی نے ہم دونوں کو حیران کیا کہ شام اباجان اور منیر علی بھی اسپتال آ کر [...] بیٹھے رہے۔ دونوں نے طرح طرح سے کانتے کو آوازیں دیں لیکن وہ اب [...] سُن رہا ہے۔ کانتے کا واسطہ خود سے کبھی نہیں پڑا تھا، کوئی دوسرا ہوتا [تو] کبھی کا اُس پر حاوی آ گیا ہوتا مگر اس بار تو وہ خود اپنے مقابل تھا۔ [...] برداشت نہیں ہوا۔ جس وقت ہم لوگ مہمان کمرے میں سو رہے تھے [...] اباجان، منیر علی کو لے کے نکل کھڑے ہوئے ہوں گے۔ اباجان چھپ[...] ڈال کے آئے تھے۔ اُس وقت میں یہی سوچ رہا تھا، سہ پہر کی نسبت [...] بجھے بجھے، تھکے تھکے کیوں ہیں۔ اُنھوں نے چلتے وقت کانتے کے متعلق کیوں کچھ نہیں کہا اور اسپتال چلنے کے لیے اصرار کیوں نہیں کیا۔ وہ اُ[سے] دیکھ کے آئے تھے پھر ہم سے کیا تذکرہ کرتے۔ مارٹی بتا رہا تھا کہ ڈاکٹر [...] پھر گھر نہیں گیا اور اب رات کی ڈیوٹی پر بھی حاضر ہے اور ہر آدھے ایک [...] کمرے کا پھیرا لگاتا ہے۔ جیسے کانتے اُس کا کوئی عزیز ہو۔

یہاں پاڑے پر آتے ہی میں نے منگو کو جولین کے گھر بھیج دیا [تھا]۔ جولین کے گھر اور پاڑے تک دوڑ بھاگ کے لیے کوئی شخص جولین کے پا[س] تھا۔ اباجان سے میں نے کہہ دیا تھا کہ رات کو وہ میرا انتظار نہ کریں۔ [...] ورنہ نہیں۔ جولین سے بھی میں یہی کہہ کے آیا تھا۔ میں جولین کے گھر پہنچ [...] تو پاڑے تک پیرو کے ساتھ رہنے کے خیال سے چلا آیا۔ دوسرے میرا [...] تھا۔ یہاں آ کے بھی وہی کچھ تھا مگر اب میں کہاں جاتا۔ اپنے گھر [...] آدمی کو ایسی بے امانی ہوتی ہے۔ حمرو، شامو اور نورا نے آتے ہی [...] ہر ایک کی زبان پر کانتے کا نام تھا۔ وہ دہشت کے عالم میں بجھے ہو[ئے]

[آ]خر اُسے ہوا کیا ہے۔ میں اُنھیں کیا جواب دیتا۔ لوگ یہ سوال جانے کیوں کرتے [ہ]یں جب جان کے کیا اُن کی کچھ تسلی ہو جاتی ہے

دوسرے داداؤں اور پاڑے میں بیٹھے ہوئے بہت سے آدمیوں سے نمٹ [کر] جب پیرو نے دینا، راجن اور جارجی کی جانب رُخ کیا تو میں نے بھی کہنی مار کے حمرو [او]ر شامو کی توجہ اِس طرف مبذول کرنا چاہی۔ پیرو نے اُن تینوں کو پاس بلا لیا [تھا]۔ وہ خود بیشتر خاموش رہا اور راجن اور دینا سے اُن کے علاقوں کا حال سنتا [ر]ہا۔ ماچھی نے پیرو کو پہلے ہی اشارہ کر دیا تھا کہ تینوں پاڑوں کا بھتا وصول ہو [گ]یا ہے۔ پیرو نے راجن اور دینا کو اُن کی بدعہدی پر دوبارہ نہ کوئی سرزنش کی، نہ [آئ]ندہ کے لیے تنبیہہ۔ وہ ان سے زمانے بھر کی باتیں سُنا کیا جیسے کوئی واقعہ ہی نہ [ہو]ا ہو۔ رفتہ رفتہ پاڑے میں لوگوں کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی۔ راجن اور دینا [بھ]ی چلے گئے مگر جارجی وہیں بیٹھا پہلو بدلتا رہا۔ پاڑے میں گنتی کے آدمی رہ گئے [تھ]ے کہ پیرو نے ماچھی سے قہوے کی فرمائش کی۔ یہ تلخ اور کسی قدر کڑوا عربی قہوا [دو]دھ اور شکر کے بغیر فنجانوں میں پیا جاتا تھا، پیرو کو نہایت مرغوب تھا۔ شروع شروع میں میرے حلق سے نہیں اترتا تھا لیکن اب مجھے بھی اچھا لگنے لگا تھا۔ [میں] نے ایک فنجان پیا، جارجی نے بھی۔ قہوا ختم کرنے کے بعد بھی اُس نے کچھ [دیر] انتظار کیا کہ شاید پیرو اُس کی طرف توجہ کرے لیکن پیرو کو جیسے وہ نظر ہی نہیں آ [رہا] تھا۔ آخر جارجی نے جھجکتے ہوئے زبان کھولنے کی کوشش کی۔ "بیٹھا رہ۔" پیرو [نے] بے پروائی سے کہا۔ "ابھی کیدر کو جائے گا۔"

"گھر کو بھی جانے کا ہے دادا!" جارجی دبے لہجے میں بولا۔ "ابھی دیری بہت [ہو] گیا ہے۔"

"یہ بھی تیرا گھر ہے سالا۔"

"ایک دم ہے دادا!" جارجی تیزی سے بولا۔

"پھر دیری کائے کا ہے۔"

"اپن ابھی اتنا بول کے نئیں آیا تھا۔"

"بول کے!" پیرو نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "ابھی کسی کو، کس کو بول کے آنا [م]انگتا ہے کو؟"

"گھر!" جارجی سٹ پٹاتے ہوئے بولا۔ "اپن گھر بول کے نئیں آیا تھا۔"

"ماری کو! او! اوہو۔" پیرو نے ہنس کے کہا۔ "ابھی تیرے کو ایک دم [اپن]ا کا دھیان کیسے آ گیا؟"

"اپن کو۔" جارجی ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا۔ "اپن کو ابھی تھوڑا معافی دیو۔"

پیرو معنی خیز انداز سے سر ہلانے لگا۔ "ایک دم دے گا، بھڑوے کا اولاد، [پ]چھلے رات اپن سے تھوڑا گستاخی ہو گیا۔"

"اپن نے، جیسا تم نے بولا ہے، ابھی ویسا [ہی کیا] ہے۔ اُدر ابھی ایک [چ]ھوکری لوگ نئیں ہے اور اب کبھی نئیں آنے گا۔"

[ج]ائے گا تو ابھی تو کدر جائے گا۔" [پیرو] نے کہا۔ "پھر اپن ایدر کائے کو بیٹھا ہے۔"

"اپن جانتا ہے۔"

"نئیں جانتا۔" پیرو نے ترشی سے کہا۔ "ابھی تیرا کھال پہ چڑھا چربی اپن تھوڑا کم کرے گا تو اکھا جان لے گا۔"

"ابھی تم ایسا کیوں بول رہا ہے۔" جارجی تنک کے بولا۔ "اپن کو بولو، ابھی اپن اور کیا کرے۔ ابھی اور کیا رہ گیا ہے۔"

"ابھی تو رہ گیا ہے۔" پیرو نے تلخی سے کہا۔ "ابھی تو ایدر پاڑے پر ہی رہنے کا ہے۔"

"پاڑے پر! کیوں، کیوں دادا؟"

"یہ اپنے سے پوچھ حرام کا جنا کہ کیوں؟" پیرو بھڑک کے بولا۔ "اپن تیرے کو اکھا تین دن تین رات ایدر اُلٹا لٹکائے گا اور بولے گا، اپن کون ہے، ایدر کیسا بیٹھا ہے۔ اپن کا پاس کون سا جادو کا چھڑی ہے جو ایدر بیٹھا ہے۔"

"تم، تم کیا بول رہا ہے؟" جارجی کی آواز سن سنا رہی تھی۔ "تم نے راجن اور دینا کو تو کچھ نہیں بولا۔"

"اُس کو بولنے کا ضرورت نئیں تھا، وہ ایدر آنے سے پہلے اکھا تنکا جالا باہر جھاڑ کے آیا تھا۔"

"اور اپن، اپن، تمھارا مطلب ہے، اپن ایدر..." جارجی کو خود معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ وہ بُری طرح گڑبڑا گیا۔

پیرو نے اُسے دوبارہ یاد دلانا ضروری سمجھا کہ وہ چاقو کے بل اڑے

پر آیا تھا اور داداؤں کے درمیان تمام فیصلے چاقو کے ذریعے ہوتے ہیں۔ اگر جارجی کو کوئی ملال ہے تو وہ چاقو نکال لے، چاقو نکالنے کا اہل نہیں ہے تو خاموشی سے ہر بات قبول کرے اور پہلے چاقو پر اپنی استطاعت بڑھائے پھر بات کرے۔ یہ دو اور دو چار کی بات ہے۔ قلابے کا پاڑا اُسے وراثت میں نہیں ملا، کوئی بھی پاڑا کسی دادا کی جاگیر نہیں ہوتا۔ جاگیر کی کنجی چاقو ہے اور دادا کا ایل۔ جارجی نے کیا سوچ کے بھتّا بھیجنا بند کیا تھا، اُس کی دانست میں کیا اُس کے چاقو میں زیادہ زور آگیا تھا جو اُس نے ایسا کیا۔ وہ یہ بھول گیا کہ ابھی پیرو کی موت کی کوئی خبر نہیں آئی ہے اور پیرو کے پاڑے پر ابھی ایسے اور دادا ابھی ہیں جو کسی وقت بھی اُس کا چاقو چھین سکتے ہیں۔ بمبئی میں پیرو کے پاڑے کا ایل ان سب سے مل کے ہی بنتا ہے۔

پیرو نے جارجی کے متعلق شاید ٹھیک ہی اندازہ لگایا تھا۔ اُس کے اندر ضرور کوئی گرہ پڑی ہوئی تھی جیسے کچھ چھپا رہا ہو، کچھ چرائے بیٹھا ہو۔ مجھے پیرو کے مسلسل اکراہ سے اِس کا احساس ہوا۔ جارجی کے پاس اب اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ پیرو کو اپنے باطن کی صفائی کا یقین دلاتا رہے۔ وہ یہی کرتا رہا۔ ماچھی نے بھی اُس کی سفارش کی۔ ”ابھی جانے دو دادا!“ اُس نے ملتجی آواز میں کہا۔ ”لوٹ پیٹ کے سالا ٹھکانے پر آجائے گا۔ اپن کا پرانا آدمی ہے۔ ابھی اس کو ایک اور چانس دیو۔“

ماچھی کی دخل اندازی پر پیرو اور بھڑک اُٹھا۔ ”یہ اب دادا کیدر رہا، یہ تو چور بن گیا۔ بھڑوا ہے سالا۔ اِس کے منہ کو خون لگ گیا ہے۔ جو دادا پیسہ بنانے لگتا ہے، وہ پاڑے کا آدمی نہیں رہتا، وہ بھڑوا بن جاتا ہے۔ ابھی چاقو پہ زنگ لگتا ہے، پر ایسا آدمی کا ہاتھ پہ لگ جاتا ہے۔ اپن کو ابھی یہ بالکل بدلا ہوا دکھائی پڑتا ہے۔ اِس کو بول، ابھی قلابے کا پاڑا چھوڑ دے سالا، مال بنائے۔ ابھی دوسرا چھوکری رنڈی چلاتا ہے، کل اُس کا اپنا لڑکی لوگ بھی بڑا ہو رہا ہے اور ابھی ای بھی ایسا پرانا نہیں ہوا ہے۔ تھوڑا پیسہ دے جائے گا۔“

جارجی کا جسم پھڑکنے لگا۔ اُس نے جھٹ اپنا چاقو نکال کے پیرو کے پیروں پر ڈال دیا اور سر بھی۔ ”قسم سے دادا!“ وہ گڑگڑاتے ہوئے بولا۔ ”اپن ہولی فادر کو بیچ میں ڈال کے بولتا ہے، اپن کا من میں ابھی کچھ بھی نئیں ہے۔ اپن تمھارا غلام ہے۔ تم بولے گا تو اپن ایدر ہی رہے گا، کبھی ایدر سے نئیں جانے کا۔ ایک دم نئیں۔ ابھی غلطی آدمی لوگ سے ہی ہوتا ہے۔“

رات خاصی گزر گئی تھی۔ دو بج رہے تھے۔ پیرو چوکی سے اُٹھ کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ صبح ماچھی نے ایک مرتبہ اشارۃً اُس سے جارجی کی سفارش کی تھی۔ پیرو کے تیوروں سے ظاہر تھا کہ جارجی کی طرف سے اُس کا سینہ ابھی تک آلودہ ہے۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا، ماچھی نے اُسے پیرو کا عندیہ ہی سمجھا۔ چلتے وقت پیرو نے مجھ سے بھی کمرے میں آرام کر لینے کو کہا تھا لیکن میں جمرو، شامو زدرا، بھیدا، ماچھی وغیرہ کے ساتھ باہر چوکی پر بیٹھا رہا۔

چار بجے کے قریب وہ اونگھنے لگے اور وہیں اِدھر اُدھر پڑ گئے۔ میں شامو کے قریب ایک کونے میں لیٹ گیا۔ مجھے نیند نہیں آئی۔ جیسے ہی [illegible] بند کرتا، میرا جسم کھنچنے لگتا اور شور سا اُٹھنے لگتا۔ میں دیر تک کروٹیں بدلتا [illegible] پھر اُٹھ کے ننگے پاؤں ٹہلنے لگا۔ پیرو کے کمرے کی طرف جاکے میں نے جھانک کے دیکھا۔ اُس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ پاڑے کا دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔ میں [illegible] پر آکے پھر لیٹ گیا۔ میرا دل اُڑا اُڑا جا رہا تھا۔ میرے لیے یہ کوئی نئی کیفیت نہیں تھی مگر کیفیت کی تکرار شاید ہر بار نئی ہوتی ہے۔ ہر بار پہلے جیسا [illegible] ہوتا ہے، ہر بار تازہ۔

پیرو صبح سویرے اُٹھ گیا۔ میں تو بیدار ہی تھا۔ ناشتے کے وقت پاڑے پر بھیڑ ہونی شروع ہو گئی۔ جس جس کو پیرو کی آمد کا علم ہو رہا تھا وہ چلا آ [illegible] بلکہ منہ اُٹھائے چلا آ رہا تھا مگر اِس سے پہلے کہ بھیڑ اور بڑھتی، پیرو پاڑے سے نکل گیا۔ ہم سیدھے اسپتال پہنچے۔ کانتے اُسی طرح اکڑا پڑا تھا بس اُس کی [illegible] رہی تھی، سینہ آہستہ آہستہ دھڑک رہا تھا۔ ڈاکٹر کیلاش بھی ہمارے ساتھ تھا۔ [illegible] اُس کی زبان کی قینچی بھی اب کچھ کند ہو گئی تھی۔ بچھل کے ہونٹوں کو تو جیسے [illegible] نے سی دیا تھا۔ ہمارے جانے پر مسکراہٹ کی ایک لہر اُس کے چہرے پر اُبھری [illegible] اُبھر کے کہیں ڈوب گئی۔ ہم نے اُس سے کچھ نہیں پوچھا، پوچھتے بھی کیا۔ پیرو [illegible] التجا آمیز لہجے میں اُسے مشورہ دیا کہ وہ اب کانتے کے پاس اُسے چھوڑ کے چلا جائے۔ شام تک سہی، وہ کچھ دیر آرام تو کر لے گا۔

جواب میں بچھل نے آہستگی سے کہا۔ ”لگتا ہے، اب ادھر بھی اپنے کو [illegible] دیر نہیں لگے گی دادا!“

”کیا، کیسا بولتا ہے تم؟“ پیرو ٹوٹی پھوٹی آواز میں بولا۔

بچھل کے ہونٹ پھیل کے رہ گئے۔ ڈاکٹر کیلاش نے بھی سنا ہوگا [illegible] کے سامنے تو وہ کچھ نہیں بولا لیکن باہر آکے اُس نے ہمیں اطمینان دلانے کی کو[شش] کی کہ دماغ کے نازک آپریشن سے بحالی میں وقت لگ ہی جاتا ہے۔ ابھی تو [illegible] ۲۴ گھنٹے بھی نہیں ہوئے ہیں، ڈاکٹر شرما نے پہلے ہی صراحت کر دی تھی کہ کا[نتے] کو ہوش میں آنے کے لیے ۴۸ گھنٹے بھی لگ سکتے ہیں۔ کہنے لگا کہ کانتے [illegible] بظاہر نارمل ہے اور نبض ٹھیک چل رہی ہے۔ وہ سڑک پر دُور تک [illegible] ساتھ چلتا رہا، ہمیں امید اور حوصلے کا درس دیتا رہا۔ اُس کا ارادہ [illegible] جانے کا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اُسے جولین کے گھر چلنے کی دعوت مجھے دینی چا[ہیے] تھی لیکن یہ سب کچھ بے محل، بے وقت لگ رہا تھا۔ آدمی کو کبھی اپنا وجود [illegible] محل لگتا ہے۔ چوک پر رُک کے میں نے اُس سے درخواست کی کہ وہ کہاں [illegible] ہمارے ساتھ آئے گا، بہتر ہے کہ واپس چلا جائے۔ میرا اندازہ غلط نہیں تھا [illegible] ساتھ ہی آنا چاہتا تھا۔ شاید وہ اپنی تلقین و تعلیم پر خود بھی مطمئن نہیں [illegible] وہ ایک نازک طبع نوجوان تھا، اُس نے اُلٹی معذرت کی اور واپس [illegible] ہو گیا۔ بعد میں مجھے پشیمانی بھی ہوئی مگر وہ دُور جا چکا تھا۔

دروازے پر دستک دیتے وقت میرا سر بیٹھا جا رہا تھا۔ جولین ہی نے دروازہ کھولا۔ وہ لمبا گاؤن پہنے ہوئے تھی۔ سیاہ گاؤن اور سیاہ بالوں میں اُس کا چہرہ بدلیوں میں چاند کے مانند دمک رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو میں ٹھٹک کے رہ گیا، گاؤن میں اُس کی قامت کچھ اور بلند ہو گئی تھی۔ ہمیں دیکھ کے اُس کا چہرہ کھل اُٹھا اور سراپا متلاطم ہو کے رہ گیا۔ اُس کے اور ٹنگو کے سوا گھر میں کوئی نہیں تھا۔ شہ پارہ اور چمپا بیگم ابھی ابھی اسپتال کے لیے نکلی تھیں، جولین کی ماں اور ملازم سودا سلف کے لیے گئے ہوئے تھے۔ گھر میں ٹھنڈک تھی، خاموشی کی ٹھنڈک۔ لوگوں کے کام پر جانے کی وجہ سے دن کے وقت اس علاقے میں ویسے بھی سکون چھا جاتا تھا۔ پیرو نے بیٹھک میں قدم رکھتے ہی جولین سے ٹھنڈے پانی کی فرمائش کی اور وہیں صوفے پر لیٹ گیا۔ میں نے اُسے یاد دلا[نا] ضروری نہیں سمجھا کہ یہاں بمبئی میں اُس کا ایک گھر بھی ہے جہاں اُس کی بیوی اور اکلوتی بیٹی گیتا عرصے سے اُس کی آمد کی منتظر ہوں گی۔ مجھے احساس تھا کہ اِس عالم میں اُسے گھر میں بھی کیا چین مل سکے گا۔ کانتے کو کیا معلوم تھا کہ وہ تو بے سدھ پڑا ہے مگر اُس کے وہ پُرسانِ حال بھی اُس سے کچھ بہتر نہیں ہیں جنھیں اپنی سدھ بدھ ہے۔ جولین نے شاید میرے چہرے سے سب کچھ پہچان لیا۔ وہ میرے پاس آکے بیٹھ گئی اور بے تابانہ پوچھنے لگی کہ کیا بات ہے؟ آنکھیں سُرخ کیوں ہیں؟ میں نے خندہ پیشانی سے تردید کی اور کہا کہ بس ذرا تھکن ہو رہی ہے۔ مجھ سے یہ نہیں کہا جا سکا کہ میرا دل ڈوب سا رہا ہے۔ اُس نے جلدی سے میرا ماتھا چھوا، بخار نہیں تھا، پسینے کے قطروں سے اُس کی انگلیاں گیلی ہو گئی ہوں گی۔ ”اندر جاکے آرام کرلو۔“ وہ مضطرب لہجے میں بولی۔ ”ٹھنڈے پسینے آ رہے ہیں۔“

”ہاں ہاں۔“ پیرو نے اُس کی تائید کی۔ ”رات بھر کا جاگا پڑا ہے۔ اپن ایدر ہی ہے، اجا! ابھی اپن کیدر بھی نئیں جانے کا۔“

میں خود بھی تنہائی چاہتا تھا، ٹنگو پیرو کے پاؤں دبانے لگا۔ اس گھر کا گوشہ گوشہ میرا دیکھا ہوا تھا۔ میرے قدم خود بخود اُس کمرے کی طرف اُٹھے جہاں میں پہلے رہا کرتا تھا۔ کمرے میں پہنچ کے مجھے احساس ہوا کہ اب یہاں جولین رہتی ہے۔ وہی مسہری تھی، ایک کونے میں سنگھار میز بھی وہاں رکھی تھی۔ کمرے میں بہت کم سامان تھا، صاف ستھرا بستر، کھڑکیوں اور دروازے پر نیل گوں پردے، دیواروں پر نیا رنگ و روغن۔ سامان میں اگر کچھ تھا تو کتابیں تھیں۔ دونوں اطراف لکڑی کی بڑی بڑی الماریوں میں سلیقے سے کتابیں سجی ہوئی تھیں۔ چند بستر کے قریب میز پر رکھی تھیں۔ سامنے دیوار پر کرشنا جی کی تصویر سنہرے فریم میں آویزاں تھی۔ مجھے یاد تھا، ایک مرتبہ کرشنا جی نے جولین کو مشورہ دیا تھا کہ وہ کسی طور اپنا مطالعہ جاری رکھے۔ مطالعہ اُسے مصروف بھی رکھے گا اور اُس کی علمی استطاعت بھی بڑھائے گا۔ کرشنا جی نے کہا تھا کہ کتابوں میں ایک دنیا بند ہوتی ہے، کتابیں اسرار و فسوں کی کنجی ہیں۔ سارے جہاں کی سیر اِن کے ذریعے کی جا سکتی ہے۔ مخاطب تو وہ جولین ہی سے تھے لیکن میں جانتا تھا، جولین کے بہانے وہ مجھے مطالعے کی ترغیب دے رہے تھے۔ اُس زمانے میں میں نے اُن کی بعض کتابوں کا مطالعہ بھی کیا تھا لیکن پھر مجھے موقع ہی نہیں ملا، ملتا بھی کیسے۔ لگتا تھا، جولین نے اُن کی ہدایت پر پوری طرح عمل کیا ہے اور مسلسل پڑھتی رہی ہے۔ مجھے حیرت تھی کہ ان کتابوں میں اردو کی بہت سی کتابیں بھی تھیں۔

مجھے کمرے میں آئے ایک گھنٹے کے قریب گزرا ہوگا، جولین نے کمرے میں جھانک کے دیکھا۔ میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، وہ اندر چلی آئی۔

”جاگ رہے ہو؟“ اُس نے سرگوشیانہ پوچھا۔

”ہاں، نیند نہیں آ رہی۔“ میں نے کسمساتے ہوئے کہا۔ ”لیکن یہاں بڑا سکون ہے۔“

اُس نے لباس تبدیل کر لیا تھا۔ سفید ساڑی کے کناروں پر نیلے رنگ کی چوڑی پٹی بنی تھی۔ کانوں میں آویزے، گلے میں نیکلس۔ یہ وہی نیکلس تھا جو کل ابّا جان نے اُسے دیا تھا۔ میرے پاس آکے اُس نے دوبارہ میرا ماتھا چھوا۔ اب اُس کی انگلیاں تر نہیں ہوئی ہوں گی۔ اُس نے اطمینان کی سانس لی اور بولی۔ ”کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟“

”میں یہاں مہمان نہیں ہوں۔“ میں نے مسکرا کے کہا۔

وہ میرے سرہانے کھڑی تھی۔ میں نے اُس سے بیٹھ جانے کو کہا اور خود بھی مسہری کے تکیے سے ٹیک لگا کے نیم دراز ہو گیا۔ ”پیرو بھائی سو رہے ہیں؟“

”وہ بھی جاگ رہے ہیں، ٹنگو اُن کے پاس ہے“

”شہ پارے وغیرہ نہیں آئیں؟“

”آجانا چاہیے، خدا کرے، خیریت ہو۔“

میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ پلنگ کے سامنے رکھی ہوئی کرسی کھینچ کے بیٹھ گئی، اتنے قریب کہ میں اُس کی سانسیں سُن سکتا تھا۔ میں نے اُسے بٹھا تو لیا تھا لیکن اب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا بات کروں۔ میں پوچھنا چاہتا تھا کہ اِس عرصے میں اُسے کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی۔ اور بھی بہت سی باتیں کرنا تھیں۔ لیکن سب ذہن میں خلط ملط ہو گئیں۔ وہ بھی سر جھکائے جانے کیا سوچ رہی تھی، سوچتے سوچتے اچانک بولی۔ ”زرّیں کیسی ہیں؟“

”زرّیں؟“ میں نے چونک کے کہا۔ ”ٹھیک، بالکل ٹھیک ہے۔“

”اُنھیں دیکھنے کو بہت جی چاہتا ہے۔“

”اب کے تم ساتھ چلنا۔“ میں نے تیزی سے کہا۔ ”یقیناً تم اُس سے مل کے بہت خوش ہو گی، وہ بہت اچھی ہے۔“

”میں نے اُن کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔“

”کم سُنا ہو گا مگر تمھیں کس نے بتایا؟ کیا میں نے کچھ بتایا تھا؟“

”شاید.... مگر کانتے بھائی تو بس اُٹھتے بیٹھتے اُنھی کا ذکر کرتے ہیں۔“ وہ اشتیاق سے بولی۔

"ہاں! ایک کانتے کیا، شاید کوئی اُسے ناپسند نہیں کرتا۔ بہت عجیب ہے وہ۔ تبھل بھائی! مجھے یقین ہے کہ تبھل بھائی کا جی بھی اب کہیں اور نہیں لگتا، اُسی کے پاس رہنا چاہتے ہیں اور وہ ایک وہی ہے جو اُن پر حکم چلاتی ہے۔ تبھل بھائی کا بس نہیں چلتا کہ اُس کا حکم سُننے جائیں۔ اب کے میں تمھیں ضرور لے چلوں گا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ میں نے اُس سے بھی تمھارا تذکرہ کیا ہے۔ چلو گی نا؟"

وہ پلکیں پٹ پٹانے لگی۔

"تم دیکھنا، وہ تم سے کیسے ملتی ہے، احساس ہی نہیں ہوگا کہ تم کسی اجنبی سے مل رہی ہو، وہ تو سمندر ہے، اُس کا دل سمندر ہے۔ تمھاری طرح وہ بھی نہایت نفاست پسند اور سلیقہ شعار ہے۔ پھولوں سے بنی، شیشے کے مانند۔ تم میں اور اُس میں جانے کتنی باتیں مشترک ہیں۔"

جولین کے تراشیدہ ہونٹ پھڑکنے لگے۔ وہ خاموش رہی۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔" میں نے نسبتہً اونچی آواز میں کہا۔ "بلکہ میرا خیال تو یہ ہے، میرا جی چاہتا ہے کہ تم بھی وہیں رہو، سب کے ساتھ۔ تم وہاں جاؤ گی تو خود واپس آنا نہیں چاہو گی۔"

"ابّا جان اب کب جائیں گے وہاں؟"

"ابّا جان؟" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "میں کیا کہہ سکتا ہوں کب جائیں گے، اُن کا کیا ارادہ ہے اور وہ کہاں رہنا پسند کریں گے۔ وہ اب بہت بڑے آدمی ہیں۔ نوابوں کے نواب مگر اُنھیں زرّیں سے بہت اُنس ہوگیا تھا، بہت خیال رکھتے تھے اُس کا۔ زرّیں کی حویلی بھی بہت بڑی ہے، خاندان کے خاندان اُس میں سما سکتے ہیں۔ کاش وہ وہیں رہنے کا ارادہ کرلیں لیکن یہ سب اُن کی مرضی پر منحصر ہے۔ چند دن ہوئے، اُنھوں نے حیدر آباد میں بھی ایک بہت بڑی حویلی خریدی ہے، دیکھو وہ کیا فیصلہ کرتے ہیں۔"

"مگر ابّا جان تمھاری رائے جاننا تو ضرور چاہیں گے۔"

"میں کیا رائے دے سکوں گا۔ مجھے کوئی رائے دینے کا حق بھی کہاں پہنچتا ہے۔ میں تو اُنھیں چھوڑ کے چلا آیا تھا۔ میں نے تو ......"

"اب کیوں دُہراتے ہو۔" وہ میری بات کاٹ کے بولی۔ "ہو جاتا ہے۔ خدا نے یہی کچھ کرم کیا ہے کہ سب مل گئے۔ کیسا خواب جیسا واقعہ ہے۔"

"مجھے تو سچ اب بھی کبھی کبھی شبہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی خواب تو نہیں؟"

اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "اگر خواب ہے تو کاش یوں ہی رہے، خواب بھی تو ایک حقیقت ہے۔ اتنے دل کش خواب ہوں تو آنکھ کھُلنے کی آرزو کوئی کیوں کرے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو، خواب میں کبھی کیفیتیں تو حقیقتوں کی طرح محسوس ہوتی ہیں۔" جولین کیسی کیسی باتیں کرنے لگی تھی، میں نے اُس سے پوچھا۔ "تمھیں فرخ وغیرہ کیسی لگیں؟"

اُس نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں موندلیں۔ "کیا بتاؤں۔" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔ "سب کچھ بیان سے باہر لگتا ہے۔"

"تم نے امّی کو نہیں دیکھا۔ یہ تو اُن کی گرد بھی نہیں ہیں، بس اُن کی جھلک جانو......"

"میں اندازہ کرسکتی ہوں۔"

"یہ میں اِس لیے نہیں کہہ رہا کہ وہ میری ماں تھیں، وہ سب پر سایہ تھیں، اپنا کیا، پرایا کیا۔ سارے محلّے، سارے خاندان میں لوگ اُن کی [illegible] کرتے تھے۔ وہ سب کے لیے محبت تھیں۔ کاش، کاش وہ بھی......" آواز ڈگمگانے لگی۔

"ہاں بہرحال یہ خوشی بھی کیا......"

"بے شک یہ بہت بڑی خوشی ہے لیکن اُنھیں دیکھ کے مجھے امّی یاد آرہی ہیں۔" میری آنکھوں میں کرچ سی ہونے لگی۔ "اُن کے پاس تو جیسے امّی میرے سامنے کھڑی ہو جاتی ہیں۔ اُن کی نگاہیں مجھے ہر طرف منڈلاتی معلوم ہوتی ہیں، اُن کی خوشبو مجھے ہر طرف محسوس ہوتی ہے۔" [illegible] نے اپنا منہ چھپا لیا۔ میں خود کو روک نہ سکا، میری سسکیاں نکل گئیں۔

"ارے ارے۔" اُسے پریشان ہو ہی جانا چاہیے تھا، وہ کرسی [illegible] کھڑی ہوگئی اور مسہری پر میرے قریب آکے بیٹھ گئی۔ "یہ کیا، یہ کیا؟" وہ [illegible] لہجے میں بولی۔ اُس نے میرے ہاتھ اپنے ریشم جیسے ہاتھوں میں بھر [illegible] نہ جانے کیا کیا کہتی رہی۔ میرے آنسو اُمڈے آرہے تھے۔ وہ مجھے صبر و ضبط [illegible] کررہی تھی مگر خود اُس کی آنکھیں بھی بھری ہوئی تھیں۔ "اب اتنی دور آکے حوصلہ نہیں کھونا چاہیے۔" وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔

"مجھے لگتا ہے، اب میرے اندر طاقت نہیں رہی۔"

"اب تو تمھیں خود کو زیادہ توانا محسوس کرنا چاہیے۔ امّی کا بدل [illegible] نہیں مگر تم نے کچھ لوگ پائے بھی ہیں جو تمھیں بہت عزیز سمجھتے ہیں۔ کرشنا [illegible] بھول گئے۔ تبھل اور پیر بابا، زرّیں، شیارے، کانتے، ماسٹر، کتنے لوگ ہیں جو تم [illegible] اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں۔ زندگی اسی آنکھ مچولی کو کہتے ہیں۔ [illegible] آدمی کھوتا ہے، کبھی پاتا ہے۔ کھوتا کچھ ہے تو پاتا کچھ ہے مگر اچھا ہے، تم خوب [illegible] جانے کب سے یہ دریا چھپائے ہوئے ہو۔" اُس نے بے اختیار میرے ہاتھوں [illegible] دبا اور اپنی آنکھوں سے لگا لیا اور دیر تک یوں ہی بیٹھی رہی، کچھ نہیں بولی۔ یک بیک اُسے کچھ خیال آیا۔ "میں تمھارے لیے پانی لاتی ہوں۔" وہ مسہری [illegible] اُٹھ کے ایک دم باہر نکل گئی۔

دوسرے ہی لمحے وہ گلاس لے آئی۔ اُس کے کہنے پر میں نے چند گھونٹ حلق سے اُتار لیے۔ گلاس ایک طرف رکھ کے مضطربانہ اپنی ساڑی کے [illegible] سے آنسوؤں سے آلودہ میرا چہرہ، میری آنکھیں خشک کرنے لگی۔ مجھے عجیب لگا۔ وہ مجھے اپنا ہی کوئی حصّہ نظر آرہی تھی۔ میرا جی چاہا کہ اُسے گلے لگا کے [illegible] رودوں لیکن اُس کے جلتے ہوئے چہرے پر جیسے ہی میری نگاہیں گئیں، میر[illegible]

[illegible] بیٹھ کے رہ گئے۔ وہ اُسی لمحے کمرے سے چلی گئی۔ اُس نے یہی مناسب سمجھا [illegible] دیر کے لیے مجھ سے دُور ہو جائے، مبادا اُس کی موجودی میرا سینہ اور نہ کرید [illegible] اچھا ہی ہوا، وہ چلی گئی۔ مجھے اپنے آپ کو ٹٹولنے کا وقت مل گیا۔ آدمی [illegible] ہو۔ [illegible] کو شاید سب سے زیادہ مؤثر تلقین کرسکتا ہے۔

خاصی دیر بعد جب وہ لوٹی تو چائے لے کے آئی۔ کہنے لگی۔ "کھانے کا وقت [illegible] سوچا، تم ابھی کچھ کھا نہیں سکو گے۔" پھر تردّد سے بولی۔ "بھوک تو نہیں [illegible] رہی؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔"

"ادھر پیر بابا نے بھی انکار کردیا ہے۔"

"صبح باڑے سے خوب ناشتہ کرکے چلے تھے۔" میں نے چائے کی پیالی [illegible] خالی کردی۔

وہ اُٹھ کے جانے لگی تو میں نے اُسے روک لیا۔ "بیٹھو، کوئی کام [illegible] نہیں ہے؟"

"نہیں۔" وہ مترنم لہجے میں بولی۔

"شیارے اور چمپا بیگم ابھی تک نہیں آئیں؟"

"اب تو اُنھیں آجانا چاہیے۔ ٹنگو کو بھیج کے دیکھا جائے۔"

"کچھ دیر اور انتظار کرلو، ممکن ہے سواری نہ ملی ہو۔"

"اتنی دیر میں تو پیدل بھی آسکتی تھیں۔"

وہ کرسی پر بیٹھ گئی، نظریں جھکائے ہوئے۔ اب میں اُسے اچھی طرح دیکھ سکتا تھا کہ اِس عرصے میں کتنی بدل گئی ہے۔ اُس کے رخساروں پر شفق سی چمک رہی تھی اور ہونٹ جیسے ہوا کے جھونکے سے بکھر بکھر جاتے۔ آدمی ہی گلستاں، آدمی بھی صحرا ہوتے ہیں۔ اُسے روکنے کے جواز کے طور پر مجھے کچھ کہنا چاہیے تھا لیکن سب کچھ میرے ذہن میں منتشر ہوگیا۔ میں نے سوچا، جواز کی کیا بہت ضرورت ہے، کیا میں اُس سے یوں ہی سامنے بیٹھ جانے کو نہیں کہہ سکتا۔ میں بہت دنوں بعد اُسے دیکھ رہا تھا۔ تبّت میں بھی کتنی بار مجھے اُس کا دھیان آیا تاہم ایک اطمینان تھا کہ چمپا بیگم یہاں موجود ہے۔ کانتے بھی آتا رہتا ہوگا۔ جولین خود بھی بہت ذہین، بہت حوصلہ مند ہے۔

میں خاموش رہا تو چند لمحوں بعد اُس کا بدن بل سے کھانے لگا اور وہ اٹکتی زبان سے بولی۔ "ابّا جان نے بھی آج آنے کو کہا تھا۔"

"ارے! کہیں تم اُن کی خاطر داری کی تیاریوں میں تو نہیں لگی ہو؟"

"خاطر داری کیا، کچھ بھی انتظام نہیں کیا۔"

"یہ کیسے ممکن ہے، تم تو اِس معاملے میں طاق ہو۔" میں نے کہا۔ "ایسا ہے تو پھر تم جاؤ۔ تمھارا دل اُسی میں اٹکا رہے گا۔"

"[illegible] ممّی آگئی ہیں۔ میں یہاں کچھ دیر اور بیٹھ سکتی ہوں۔" وہ شگفتگی سے بولی۔ "کیا تمھاری [illegible]"

"ہاں شاید۔" میری آواز بوجھل ہوگئی۔ "تم سے بات کرنے کا وقت بھی کب ملا؟"

"اب جلدی کہیں جانا تو نہیں ہے؟" وہ زیرِ لب بولی۔

"اب کہاں!" میں نے سانس لے کے کہا۔ "فیض آباد ہی جانا ہوگا۔ تبھل بھائی اور ابّا جان پر منحصر ہے کہ وہ کب ارادہ کرتے ہیں۔ فیض آباد تو تم بھی بہرحال ساتھ چلو گی مگر وہاں، غالباً حیدر آباد کی طرف بھی جانا پڑے۔"

"حیدر آباد کیوں؟"

"آپی جو وہاں ہیں۔" میں نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "مگر کیا، کیا تم خانم آپی کو جانتی ہو؟"

"کسی حد تک۔" وہ مسکرا کے بولی۔ "کانتے بھائی نے اُن کے بارے میں بتایا تھا۔"

"کانتے نے کیا بتایا ہوگا۔ بس کچھ یوں ہے کہ وہ زرّیں ہی کی کوئی بچھڑی ہوئی بہن معلوم ہوتی ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو سمجھتی بھی یہی ہیں۔ خانم تو کسی ملکہ کے مانند ہیں۔ کوئی ملکہ ہی ایسی ہوسکتی ہے۔ تمام شاہانہ القاب و خطابات اُن پر ختم ہیں۔ اُن کی ذات کوئی طلسم خانہ ہے۔ تہ بہ تہ، وہ سر بہ سر سایہ ہیں، پاس جاؤ تو چھاؤں کا احساس ہو۔ ستار سے اُنھیں عشق ہے حالانکہ وہ خود کسی ساز سے کیا کم ہیں۔ آواز سے نغمگی پھوٹتی ہے۔" جانے یہ لفظ کیسے میری زبان سے ادا ہوتے گئے، جب خیال آیا تو زبان لکنت کرنے لگی۔ میں نے بہ عجلت کہا۔ "ایک لمبی داستان ہے۔ ـــ بڑی طویل کہانی ہے پھر کبھی اے دوست!"

چند لمحوں بعد میں نے کہا۔ "خانم کو ظاہر ہے، اپنے گھر فیض آباد ہی آنا ہے۔ اُنھیں لینے کوئی تو جائے گا۔ ضروری نہیں کہ میں ہی جاؤں۔ میں اب کہیں جانا نہیں چاہتا۔"

"کیوں؟" وہ تجسّس سے بولی۔

"بس اب مجھے کہیں نہیں جانا۔"

"کیا کوئی سُن گُن مل گئی ہے؟" وہ ڈھیلے لہجے میں بولی۔

"کاہے کی، کاہے کی سُن گُن؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"جس کی کھوج تھی؟"

"تم...... تم جانتی ہو؟" میں نے اضطراب سے کہا مگر میری یہ حیرت بے وجہ تھی۔ اُسے مجھ سے اگر کوئی نسبت تھی تو سب کچھ جاننا ہی چاہیے تھا۔ میں بھول گیا، یہ تو میں نے بھی اُس سے کہا تھا کہ مجھے کسی کے لیے جانا ہے اور میرا کچھ طے نہیں ہے کہ مجھے کتنی دُور، کہاں تک جانا پڑے۔ میں نے شکستہ آواز میں کہا۔

"کوئی فائدہ نہیں، سب بے کار ہے، یہ دُنیا بہت بڑی ہے۔"

"مگر حوصلے کا کوئی کنارہ نہیں ہوتا۔"

"سب کہنے کی بات ہے۔ حوصلے سے آدمی دُنیا کی پیمائش کرتا ہے اور ہمیشہ دھوکا کھا جاتا ہے۔ دُنیا اور بڑی لگتی ہے۔"

"ہو سکے تو مجھے کچھ بتاؤ۔" وہ بے چینی سے بولی۔

"کیا بتاؤں! بتانے کو کچھ ہو تو بتاؤں۔ کرو گی بھی کیا جان کر۔ کوئی اچھا ذکر نہیں ہے۔ لوگ شاید صحیح کہتے ہیں کہ سب ستاروں کا کھیل ہے۔ اگر یہی ہے تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔"

"لوگ امید کے بارے میں بھی کچھ کہتے ہیں کہ وقت موسم کی طرح نہیں ہوتا۔" وہ جھنجھناتی آواز میں بولی۔ "اچھا وقت بہار کا پابند نہیں ہے۔"

"پھر سب وقت پر ہے نا، جبر تو نہیں، پھر میں کیا کروں؟"

"کوشش اور ہمت تو نہیں چھوڑنا چاہیے۔" وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ "ابا جان کی مثال سامنے ہے۔"

"ہاں! مگر یہ ہمت بہت مہنگی پڑتی ہے۔ اِس کے مجھے تلخ تجربے ہوئے ہیں۔ ایک میرا معاملہ ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی مگر کوئی آدمی اکیلا نہیں آتا۔ اُس کی لپیٹ میں بہت سے آدمی ہوتے ہیں۔ ایک شخص کی وجہ سے بہت سے لوگ بے گھر، بے در ہو سکتے ہیں۔ میں نے کتنے لوگوں کو تنگ کیا ہے۔ کبھی سوچتا ہوں تو میرا رُواں رُواں لرزنے لگتا ہے۔ مجھے ہول سا آتا ہے۔ میں نے طے کیا ہے کہ اب اپنی من مانی ہمیشہ کے لیے چھوڑ دوں گا۔ جب ہم بمبئی آ رہے تھے، راستے میں میرے دماغ میں سمائی، مراد آباد آ رہا ہے، ایک بار جا کے اور دیکھ لوں، چنانچہ میں نے پیر بھائی سے ضد کی کہ کیوں نہ ہم بمبئی کے بجائے ایک پہر کے لیے حیدر آباد چلیں۔ میں نے تنہا جانے کو کہا تھا مگر پیر بھائی مجھے اکیلا کیسے چھوڑ دیتے۔ اُنھوں نے کسی طرح ابا جان کو بھی آمادہ کر لیا۔ کاش ایسا نہ ہوتا، وہ انکار کر دیتے۔ ہم حیدر آباد نہ جاتے تو یوں سب کچھ پیش نہ آتا۔ وہاں جا کے وہی جواب ملا جو اَب تک ملتا رہا ہے۔ ایک پہر کی بات تھی۔ ہم دوسری گاڑی سے یا دوسرے دن کسی وقت روانہ ہو جاتے مگر واپسی کے راستے ہمارے لیے بند کر دیے گئے، ایک ایسا زنداں ہمارا منتظر تھا جہاں صیاد منصف بھی تھا، مدعی بھی۔ ابا جان ہماری تلاش میں گلی کوچوں کی خاک چھانتے پھرے۔ پیر بھائی کو اپنے زخمی پیر سے اتنا لمبا سفر کرنا پڑا۔ خانم دوبارہ منتشر ہوئیں، کسی آس میں نواب عالم تاب کی سانس اٹکی ہوئی تھی مگر وہ زندہ تو تھا، زندہ تھا تو ایک امید زندگی کی درازی کی بھی تھی۔ خانم کا پہنچنا اُس کی نجات کا باعث بنا مگر وہ کتنے لوگوں کو اکیلا کر گیا۔ پھر پولیس، گولیاں، خنجر، میرے سامنے ابا جان کا گریباں چاک کیا گیا، اُنھیں طمانچے مارے گئے۔ یہ جو تم کانتے کو دیکھ رہی ہو، اُس کا یہ حال صرف اِس وجہ سے ہوا کہ وہ ابا جان کی سپر بن کے کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ آگے نہ بڑھتا تو اُس جگہ مجھے جانا پڑتا مگر وہ بازی لے گیا۔ ایک آدمی کو یہ حق حاصل نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اپنے اتنے نگہ داروں کو بے آرام کرے، اتنے لوگوں کا سکون غصب کرے۔ کیا میں اندھا ہوں، مجھے نظر نہیں آتا کہ یہ سب کس وجہ، کس کے سبب سے ہوتا ہے۔ کیا میں نہیں جانتا کہ اتی وقت سے پہلے کیوں چلی گئیں اور قمی ......" میری آواز رُندھنے لگی۔ وہ دم بہ خود بیٹھی تھی۔

"میں تمھیں کیا کیا بتاؤں۔" میں نے اُس سے کہا۔ "سب
جاتا ہے۔ کچھ خبر نہیں ہوتی کہ کتنے گھر ردیں گے۔ کون کون اُجڑ جائے
کے سفر میں بھی لوگ ہمارے تعاقب میں تھے، وہ یہاں تک آئے
سی چوک ہو جاتی تو جانے کس کا وقت آیا تھا اور وہاں، وہاں
ہی سے اس کی ابتدا ہو گئی تھی۔ دلی اسٹیشن سے ہم حیدر آباد جانے والی
ہوئے تو ڈبے میں ایک دُور افتادہ لڑکی موجود تھی۔ میرے سان و گمان میں بھی
کم سخن، شیشہ اندام ایسی سرکش نکلے گی۔ سونیا نے وہیں ڈبے میں دم توڑ دیا۔"

"کیا، کیا؟" جولین پھٹی ہوئی آواز میں بولی۔ "سونیا کون؟"

"سونیا بھی ایک لڑکی تھی، تمھارے جیسی، شبارے جیسی ایک
دیکھنے والی ایک لڑکی......" میری آواز جل رہی تھی۔ "بہتر ہے کچھ اور

"مجھے بتاؤ، کون تھی وہ؟" وہ اضطراری لہجے میں بولی۔

میں نے اپنی زبان کو لگام دی۔ مجھے جولین کے ظرفِ سماعت
مطابق ہی بتانا چاہیے۔ میری زبان پر سونیا کا نام بے اختیار آ گیا تھا
کو کیا بتاتا اور کہاں سے بتاتا کہ سونیا کلکتہ جیل کے جیلر صاحب کی لڑکی
میں نے سات سال گزارے تھے۔ میں اُسے پڑھانے جاتا تھا اور اُس نے
اپنے آپ ہی اتنا گہرا نقش بنا لیا تھا۔ میں نے جولین سے منت کی کہ نہ مجھ
کہنے کا یارا ہے، نہ وہ اُس کی متحمل ہو سکتی ہے۔

"ہو سکے تو مجھے بتاؤ۔" وہ عاجزی سے بولی۔ "کچھ اسی طرح
بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔"

"بہت سے بوجھ جسم میں شامل ہو جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔
اب ایسا کچھ چھپا نہیں رہا ہے، تاہم جو رہ گیا ہے، اُسے جان کے تمھیں
نہیں ہو گی۔"

اچھا ہوا، اُس نے مجھے قائل کرنے کی کوشش نہیں کی۔
چھپا بیگم آ گئیں۔ اُسے مجھ سے اصرار کرنے کا موقع نہیں ملا۔ کانتے کے بارے
کوئی نئی خبر نہیں لائیں۔ دونوں کے چہرے سُتے ہوئے تھے۔ لباس تبدیل
کے لیے وہ فوراً کمرے سے چلی گئیں۔ جولین گم صم بیٹھی رہی۔ شہپارہ اور
کمرے سے گئیں تو وہ آہستگی سے بولی۔ "میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"ہاں، ہاں۔" میں نے چونک کے کہا۔ "کیا بات ہے؟"

"تمھارے بارے میں ہے۔"

"میرے بارے میں؟ ایسی کیا بات ہے؟"

"یہاں اس کا موقع نہیں ہے۔" وہ سمٹی ہوئی آواز میں بولی۔

"پھر کہاں؟"

"کہیں بھی، جہاں کچھ وقت مل سکے۔"

"کہیں چلیں گے۔" میں نے تذبذب سے کہا۔ "مگر، مگر......"

"میں کچھ سمجھنا چاہتی ہوں، یہ جاننے کے لیے کہ میں تمھارے

آسکتی ہوں۔"

مَیں نے ایک گہری سانس لی۔ "غالباً جو تم کہنا چاہتی ہو، مَیں نے پہلے ہی اُس کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"مگر وہ تمھارا فیصلہ ہے۔"

"ہاں، ہاں۔" مَیں نے ہچکچاہٹ سے کہا۔

"مگر تمھارے لیے سوچنے والے دوسرے بھی تمھارے متعلق کوئی فیصلہ کر سکتے ہیں، میرا مطلب ہے، تمھارے لیے کوئی فیصلہ کر سکتے ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ تم اُسے قبول نہ کرو۔"

"نہیں نہیں، مَیں تو یہی کہہ رہا ہوں۔"

"مگر شاید میں کچھ اور کہنا چاہتی ہوں۔"

"تم کیا، کیا؟..." میں نے بے ربطی سے کہا۔ اُس کے چہرے پہ کیسا اعتماد تھا، اتنے عرصے جیسے وہ اِس اعتماد کی افزائش کرتی رہی ہو۔ میں نے جھپکتی پلکوں سے اُسے دیکھا۔ اُس کے لبوں پر مسکراہٹ کی ایک لہر آکے گزر گئی۔ باہر سے کسی کی چاپ سنائی دی اور دوسرے ہی لمحے چمپا بیگم کمرے میں داخل ہوئی، پھر شہ پارہ۔ دونوں اُمڈتی ہوئی آئی تھیں۔

چند لمحوں بعد جولین وہاں سے چلی گئی لیکن جانے کے بعد بھی موجود رہی۔ چمپا بیگم جانے کیا باتیں کر رہی تھی۔ یاد نہیں میں نے کیا سنا، کیا نہیں

دوسرے دن سہ پہر میں پیرو کے ساتھ پاڑے آگیا تھا۔

اباجان، فرخ، فریال، فارہہ اور اکبر کل شام جولین کے گھر آئے تھے اور رات کو بھی واپس نہیں گئے۔ اباجان کو اگر کوئی تردد تھا تو دُور ہو گیا ہو گا کہ وہ کسی اور گھر میں نہیں آئے ہیں مگر صرف اتنی بات نہیں تھی۔ ٹنگو تقریباً گھنٹے گھنٹے بھر بعد اسپتال جاتا تھا اور کانتے کے بارے میں اسپتال سے ایک ہی خبر لاتا تھا۔ ڈاکٹروں کے بہ قول جتنی دیر ہو رہی تھی، اچھا نہیں ہو رہا تھا۔ ٹنگو نے یہ بتا کے سب کو اور آزردہ کر دیا تھا کہ ڈاکٹروں نے ہمارے خیال سے اڑتالیس گھنٹے بتائے تھے حالانکہ خود اُنھیں چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر کانتے کے ہوش میں آنے کی توقع تھی۔ ٹنگو کو یہ بات اسپتال میں اُس کے کسی واقف کار نے بتائی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کانتے کے کمرے میں ڈاکٹروں کی آمدورفت بڑھ گئی تھی۔ وقفے وقفے سے ایک کے بعد دوسرا ڈاکٹر اُسے دیکھنے آتا رہا۔ پھر کوئی بھی رات کو نہیں سویا۔ فرخ، فریال وغیرہ کانتے کو نہیں جانتی تھیں مگر وہ اس طرح بے تعلق بھی کیسے رہ سکتی تھیں۔ اباجان نے آتے ہی ٹنگو اور پیرو کی مدد سے غریبوں میں کھانا تقسیم کرانے کے لیے بہ عجلت انتظام کیا تھا۔ رات بھر چمپا بیگم جانماز پر بیٹھی دعائیں کرتی رہی۔ شام کو مَیں اور پیرو بھی تھوڑی دیر کے لیے اسپتال گئے تھے۔ مَیں باہر ہی کھڑا رہا۔ مجھ میں تھّل کے سامنے جانے کی ہمت نہیں تھی۔

جولین کے گھر کی ساری بتیاں روشن تھیں مگر ہر طرف اندھیرا سا نظر آ رہا تھا۔ روشنی بینائی سے مشروط ہے مگر جتنا اُس کا تعلق بینائی سے ہے اُتنا ... سے بھی ہے۔ دل سب سے بڑی بینائی ہے۔ دل میں تاریکی ہو تو کتنی ہی بجلیا... اندھیرا نہیں جاتا۔ پیرو کے اصرار پر اباجان بیٹھک میں لیٹ گئے تھے لیکن ایک ... کے لیے بھی اُن کی آنکھ نہیں لگی۔ جولین، شہ پارہ رات بھر سب کے لیے چائے بنا... اباجان بار بار ٹنگو کو اسپتال بھیجتے تھے اور اُس کی آمد پر سب بیرونی کمرے ... ہو جاتے تھے اور ایک دوسرے کی صورتیں دیکھتے رہتے تھے۔ جولین اور شہ... رات کے کھانے میں خاصا اہتمام کیا تھا مگر سب نے بس رسم ادا کی تھی۔ صبح ناشتہ ... اٹک اٹک کے کیا۔ اباجان سویرے ہی اسپتال چلے گئے تھے اور کوئی نو بجے ... آئے تو جیسے پھول ساتھ لائے تھے اور روشنی ساتھ لائے تھے۔ سبھی کے چہر... روشنی جیسے واپس آگئی۔ اُنھوں نے آکے مژدہ سنایا کہ آخر کانتے کو ہوش ... اُن کے کہنے کے مطابق صبح کانتے نے چند لمحوں کے لیے آنکھیں کھولی... اور تھّل اور اباجان کو سرھانے دیکھ کے بے چین ہوا تھا۔ تھّل نے اُس ک... کو بوسہ دیا تو اُس کے ہونٹوں میں لرزش سی ہوئی۔ اُس نے کچھ بولنا چاہا مگر ... نے اُس کے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ دی۔ اُسی وقت ڈاکٹر کو بلایا گیا، اُس نے تف... معائنے کے بعد اطمینان کا اظہار کیا۔ گو کانتے پھر غافل ہو گیا تھا مگر ڈاکٹر... تھا کہ یہ لمحاتی بیداری کانتے کے لیے بہت اچھا شگون ہے، طبعی اور نفس... پر نہایت مُفید ہے۔ اِس سے کانتے کے ارادے کی توانائی بحال ہوگی، زندگ... ارادے کی۔ منیر علی چوں کہ ساتھ نہیں آئے تھے، اِس لیے اباجان کو گھر پہنچ... تھی۔ دوپہر کا کھانا کھا کے وہ پھر چلے گئے۔ مجھ سے اُنھوں نے ساتھ چلنے کو نہیں ... تھا، نہ فرخ، فریال نے۔ گویا اُن کی رائے بھی یہی تھی کہ مجھے ابھی یہیں ٹھہر...

میں پیرو کے ساتھ پاڑے چلا آیا۔ پیرو کا اپنے گھر جانے کا کوئی ارادہ ... ہوتا تھا۔ پاڑے پر لوگوں کی تعداد بہت کم تھی۔ ماچھی نے بتایا کہ کل ہال... کے بعد شام تک لوگ انتظار میں بیٹھے رہے، صبح بھی بہت سے آدمی آئے تھے۔ ... نے اُن سے کہہ دیا تھا کہ ابھی چند روز تک دادا پاڑے پر نہیں بیٹھے گا، چا... وہ آنے کی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہوا کہ صبح جارج بھی اپنی بیوی ماری کے ... آیا تھا، وہ پیرو کے لیے مٹھائی اور پھولوں کے ٹوکرے لایا تھا۔ پاڑے میں ... سکون تھا، سکون کچھ کانتے کی وجہ سے بھی تھا۔ لگتا تھا جیسے دریچے کھل... ہوں اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی ہو۔ کچھ دیر وہاں ٹھہر کے مَیں، جمرو او... کے ساتھ باہر نکل گیا۔ سڑکوں پر شام اتنی اداس نہیں ہوتی۔ ہم دُور تک نک... جدھر دیکھو ایک خلقت، ایک شور معلوم ہوتا تھا، لوگوں کے پاس لب... دن ہے، آج کے بعد زندگی کا یہ میلا تمام ہو جائے گا۔ اُن میں شاید ہی ... بے کار تھے۔

ڈھلتے سورج کے وقت ہم پاڑے سے چلے تھے۔ چلتے چلتے اندھ... لگا اور سڑکوں پر روشنیاں جلنے لگیں۔ شامو کی خواہش پر ہم نے ایک ... چائے پی اور رنگیلا چٹنی کے ساتھ کاغذی سموسے کھائے۔ ہوٹل سے ...

... یکایک شامو کو احساس ہوا کہ کچھ لوگ ہماری تاک میں ہیں۔ مَیں نے ... انداز میں نظر دوڑا کے دیکھا۔ شامو کا خیال صحیح تھا۔ وہ اچکے ... ہوٹل ہی سے اُنھوں نے ہمارا تعاقب شروع کیا تھا۔ شامو اور جمرو کی بمبئی ... نووادی کا اندازہ لگا لینا اُن کے لیے مشکل نہیں تھا۔ ہوٹل میں جمرو کا بٹوا ... دیکھ لیا ہوگا۔ جمرو کو کاؤنٹر پہ دیر لگی تھی۔ بڑا نوٹ نکالنے پر ہوٹل والے ... تھوڑی بہت چیں پیں بھی ہوئی تھی۔ شامو کو مستی سوجھی۔ وہ آگے کسی گنجان ... پیچھے آنے والوں کو ایک موقع دینا اور اُس کے بہ قول ذرا اُن کے ہاتھ ... مہارت دیکھنا چاہتا تھا۔ جمرو کی رگ بھی پھڑکنے لگی تھی۔ مَیں نے اُنھیں ... فی الحال وہ دو ہی نظر آرہے تھے مگر اِدھر اُدھر اور بھی ہو سکتے تھے۔ ظاہر ... شانوں میں موقع پر تماشا کرتا۔ بھاگنے کی صورت نہ ہو تو ایسے وقت جواب ... زور ہاتھ چھوڑا جاتا ہے اور یہ دیکھ کے اِدھر اُدھر قریب ہی دُبکے ہوئے ساتھی ... میں سامنے آجاتے ہیں، سامنے کیا، آتے ہی ٹوٹ پڑتے ہیں اور ... رکھنے، داؤ پیچ لانے والے کو اُلٹا نکّو بنا دیتے ہیں۔ شامو اور جمرو کو یہ سب ... سے زیادہ معلوم تھا لیکن وہ صرف اُن سے بھڑنے کا مزا لینا چاہتے ... اُن سب کو بے شک ہم بھگت لیتے اور آیندہ کے لیے کوئی تلقین ضرور ... لیکن ہمیں اُن سے فضول اُلجھنے کی کیا ضرورت تھی۔ اِس پنجہ آزمائی میں ... پولیس والا بھی ہماری طرف متوجہ ہو سکتا تھا۔ تعاقب کرنے والے صاف نو... معلوم ہوتے تھے۔ اُنھیں آدمی آدمی کی کچھ تو پہچان ہونی چاہیے تھی، ہماری ... جسم۔ اُنھیں کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا، صرف جمرو کے بٹوے پر اُن کی نظر گئی ... اور بمبئی میں ہماری اجنبیت پر۔ بہرحال آگے آکے جمرو اور شامو کو احساس ... یا کہ وہ ایک حماقت سے بچ گئے ہیں۔ نتیجہ تو ایک ہی نکلتا۔

ہم پاڑے سے ابھی فاصلے پہ تھے کہ دُور سڑک پہ گلیا مجھے اپنی جانب ... ہوا آتا دکھائی دیا۔ اُس کی نگاہیں مسلسل اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں جیسے ... ہم پر اُس کی نظر پڑی، وہ وہیں سے چیخنے لگا اور دیوانوں کی طرح بھاگتا ... ہمارے پاس آگیا۔ "کیدر ہے تم لوگ؟" وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

"کیوں؟" اس کی حالت دیکھ کے میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"ایدر اکھا علاقے میں تم کو ڈھونڈنا پڑا ہے۔ دادا ابھی ابھی نکلا ہے۔"

"کیا بات ہے؟" میں نے سراسیمگی سے پوچھا۔

"اُدر کانتے بھائی کے لیے ماسٹر، ماسٹر آیا تھا۔"

"کیا، کیا ہوا اُسے؟" میں نے چیختی آواز میں پوچھا۔

"حالت ٹھیک نئیں معلوم پڑتا راجا بھائی، ماسٹر سالا بات نئیں ...تا۔ دادا تم لوگ کے لیے تھوڑا دیر رُکا، پھر ابھی نکل گیا۔ ابھی سیدھا ... جانے کا بول کے گیا ہے۔"

شامو نے سنتے ہی ایک ٹم ٹم رکوالی۔ مجھے چکر سا آنے لگا۔ سڑکوں ... بھیڑ تھی، کوچوان اِس سے زیادہ تیز گاڑی نہیں چلا سکتا تھا۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر اُس نے ہمیں اسپتال پہنچا دیا۔ احاطے میں قدم رکھتے ہوئے میری ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔ اسپتال کا مقررہ وقت ختم ہو چکا تھا۔ مَیں نے ڈاکٹر کیلاش کا حوالہ دیا۔ وہ اِس وقت وہاں نہیں تھا لیکن مزید کسی حوالے کی ضرورت نہیں پڑی۔ کانتے کا نام سُن کے اِنچارج نے سر جھکا لیا اور اُس کے ہونٹ پھڑکنے لگے۔ "مجھے افسوس ہے۔" میں صرف اتنا سُن سکا۔

پیچھے سے جمرو نے مجھے تھام لیا۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ بیٹھک میں جانے کے بجائے مَیں سیدھا گھر میں داخل ہو گیا۔ سارے گھر پر سناٹا چھایا ہوا تھا جیسے سبھی مر گئے ہوں اور مَیں کسی قبرستان میں آگیا ہوں۔ جولین، چمپا بیگم، جولین کی ماں، شہ پارہ مجھے دیکھ میری طرف جھپٹ پڑیں اور بین کرنے لگیں۔ مَیں نے اُن سے کچھ نہیں کہا۔ مَیں اُن سے کچھ کہہ بھی نہ پاتا۔ میرا دماغ سُن ہو گیا تھا۔ مَیں دریدہ آنکھوں سے بس اُنھیں دیکھا کیا۔ شہ پارہ میرے بازو سے چمٹی پھوٹ پھوٹ کے رو رہی تھی۔

اندر بغلی کمرے میں کانتے کی لاش پڑی تھی۔

مارٹی نے مجھے ان سے جدا کیا اور اندر کمرے میں کانتے کے پاس لے جانا چاہا لیکن اُس کے سامنے جانے کے تصور سے میری آنکھوں میں اندھیرا اُتر آیا۔ مارٹی نے ارادہ بدل دیا اور میری کمر تھپکتا ہوا بیٹھک میں لے آیا۔ تھّل، پیرو، ماچھی، گلیا، ٹھبی، زورا، چھیدا اور بالے کے علاوہ ڈاکٹر کیلاش بھی وہاں موجود تھا۔ میری نظریں سیدھی تھّل پر جا کے ٹھہر گئیں۔ وہ پیرو کے ساتھ بیٹھا دیوار پر نگاہیں جمائے بیڑی پھونک رہا تھا۔ میرے آنے پر اُس نے مڑ کے بھی نہیں دیکھا۔ پیرو اُٹھ کے مجھے اپنے پاس لے آیا اور بڑبڑاتی آواز میں بولا۔ "ابھی راجا آگیا ہے تھّل بھائی۔"

"ہاں دادا! دیکھ لیا ہے۔" تھّل کی آواز مجھے دُور سے آتی سنائی دی۔ "بیٹھ جا رے۔"

مَیں اُس کے سامنے نہیں بیٹھا، نہ اُس نے مجھے پاس بلایا۔ میرے آنے پر کمرے میں سسکیاں گونجنے لگی تھیں۔ جتنی دیر میں وہاں رہا، میرا دم گھٹتا رہا۔ سو میں وہاں سے اُٹھ آیا۔ میرے دماغ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کہاں جاؤں اور کیا کروں، جا کے کس کا گریبان پکڑوں۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرا سارا وجود ڈوبتا جا رہا ہو۔ گلی میں خاموشی تھی۔ میں باہر چوکھٹ تھامے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ جانے کب اندر سے شامو بلکتا ہوا آگیا اور میرے شانے پر سر پٹخنے لگا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ مجھ سے نہ اُسے سنبھالا دیا جا سکا، نہ میری آنکھیں اُس کا ساتھ دے سکیں۔ خود شامو نے مجھے سہارا دیا اور ہم دونوں وہیں چوکھٹ کے پاس کیاری کی منڈیر پہ بیٹھ گئے۔ کچھ دیر گزری ہوگی کہ اباجان کی ٹم ٹم آکے رُکی۔ فرخ، فریال، فارہہ، اکبر، ریحانہ، مولوی اکرم اور منیر علی۔ وہ سب ٹم ٹم سے اتر کے دیوانہ وار میری طرف بڑھے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ یہ کیا ہوا؟ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ منیر علی پھڑک پھڑک کے رونے لگے۔ اُن کے اندر چلے جانے کے بعد اکبر بھی وہیں میرے پہلو میں منڈیر پہ آگیا اور

سہمی ہوئی آواز میں کہنے لگا: آپ کے بہت گہرے دوست تھے نا بھائی صاحب! ایک بارگی میرے جی میں آیا کہ اُسے زور سے طمانچہ ماروں، وہ کتنی اجنبیت سے کانتے کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ پھر اکبر کو شاید خود احساس ہو گیا، وہ زیادہ دیر میرے پاس نہیں ٹھیرا اور مجھ سے کچھ کہے بغیر اُٹھ گیا۔

تھوڑے تھوڑے وقفے بعد اندر سے شور اُٹھنے لگتا۔ جانے کون کون آ رہا تھا۔ جو بین کے پڑوسی، پاڑے کے آدمی۔ رات گئے گلی سنسان ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی کُتے بھونکنے لگتے تھے۔ پہلے ہمارے قریب ہی منڈلا رہے تھے، پھر دُور چلے گئے۔ جمرو، ماچھی اور زدرا بھی کسی وقت میرے پاس آ کے بیٹھ گئے۔ وہ کبھی مجھے دبوچتے، کبھی جھنجوڑنے لگتے اور میرے گلے میں بانہیں ڈال دیتے۔ میں اُنھیں خوب اچھی طرح دیکھ اور سُن رہا تھا لیکن دیکھنا اور سُننا اخذ کرنے پر، سمجھنے پر منحصر ہے۔ آنکھیں محض ایک وسیلہ ہیں اور کانوں کا بھی یہی ہے۔ دیکھنے اور سننے کا تعلق تو کسی اور چیز سے ہے۔ میری سمجھ میں اُن کی کوئی بات نہیں آ رہی تھی، میں اُنھیں کیا جواب دیتا، نہ مجھے اپنی اِس نافہمی اور کم خیالی پر کوئی حیرت تھی، نہ وحشت۔ وہ مجھے تجمل کا واسطہ دے رہے تھے کہ مجھے اُس کے پاس بیٹھنا چاہیے اِس وقت اُسے میری ضرورت ہو گی، کہہ رہے تھے کہ اُس کا بیٹا جا رہا ہے۔ ماچھی کہہ رہا تھا کہ ابھی وہ حرام کے جنے دونوں آدمی پاڑے پر ہیں۔ وہ اُنھیں اب واپس نہیں جانے دے گا جب تک اُن سے ابا جان کی حویلی میں بھیجنے والے آدمیوں کے سرغنہ نواب کے اصل نام کی تصدیق نہ کر لے گا اور نواب سمیت حویلی میں آنے والے ایک ایک آدمی کو ختم کر کے نہ آئے گا، اُس وقت تک اُسے قرار نہیں آئے گا، وہ اُن دونوں پر اِس وقت تک زندگی کیا موت بھی حرام رکھے گا۔ جمرو اور شامو نے بھی ماچھی کی ہم نوائی کی۔

زدرا کہنے لگا کہ کانتے کا وقت آ گیا تھا۔ جس کا وقت آ جاتا ہے اُس کا ایسے ہی کوئی بہانہ بن جاتا ہے۔ پھر کوئی بھی اُسے روک نہیں سکتا۔ کہنے لگا، یہاں کسے ٹھیرنا ہے۔ ہم میں سے کون ہے جو ٹھیرا رہے گا۔ میں بیٹھا سُنا کیا۔ پھر رات کے آخری پہر مارٹی نے آ کے اطلاع دی کہ سب اندر آ جائیں، پیر دادا بُلا رہا ہے۔ مارٹی کی آمد کے ساتھ ہی مکان کے در و بام سے چیخیں بلند ہونے لگیں۔ مارٹی نے میرا بازو پکڑ کے مجھے اُٹھا لیا۔ میں نے ذرا بھی مزاحمت نہیں کی، اُس نے مجھے اُٹھایا تو میں اُٹھ گیا۔ وہ برادو مجھے اندر صحن میں لے آیا، یہاں کانتے پھولوں کی سیج پر لیٹا ہوا تھا۔ آنکھیں مندی ہوئی تھیں جیسے خواب دیکھ رہا ہو، لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ لگتا تھا، ابھی بیدار ہو جائے گا۔ صحن میں شور مچا ہوا تھا۔ شہ پارہ اُس کے پائنتی سے لگی اپنا سر پھوڑتی تھی، کبھی اپنا چہرہ نوچتی تھی۔ پیرو نے اُسے اُٹھایا تو وہ اور بے حال ہو گئی۔ اُسے کچھ خبر نہیں تھی کہ دوپٹا کس طرف جا رہا ہے اور لباس کس قدر بے ترتیب ہو گیا ہے۔ پیرو اُسے سب کی نظروں سے دُور لے گیا۔

مگر پیرو کو اُن سبھی کو دُور لے جانا چاہیے تھا، میرے اور تجمل کے سوا اُن سبھی کو، سب کا کم و بیش یہی حال تھا۔ خود پیرو کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیل جاری تھا۔ جو لین اور چمپا بیگم، فرخ، فریاں کے ساتھ کھڑی بلک بلک کے رو رہی تھیں۔

میر علی گلاب پاش چھڑک رہے تھے جس میں ان کے آنسو بھی شامل تھے۔ ابا جان کے سرھانے بیٹھے بچوں کی طرح بے کل ہو جاتے تھے۔ ڈاکٹر کیلاش میرے پاس کھڑا ہو گیا تھا۔ اتنے قریب کہ اُس کی سسکیاں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ میر علی نے تجمل کی طرف دیکھا پھر ابا جان کی طرف اور کانتے کی چارپائی پر جھک کے اُس کا چہرہ چھپا دینے کا ارادہ کیا۔ ابا جان نے اُنھیں روک دیا اور اُٹھ کے بیٹے کانتے کی پیشانی چومنے لگے۔ دیر تک وہ دونوں ہاتھوں سے اُس کا چہرہ تھامے دیکھتے اور سسکتے رہے، پھر اُس کے سینے پر سر رکھ کے بلکنے لگے۔ میر علی نے بمشکل اُنھیں اُس سے جدا کیا اور تجمل کے حوالے کر دیا۔ تجمل نے ایک قدم بڑھ کے اُنھیں بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ میر علی نے کانتے کا چہرہ چھپا دیا۔

کانتے کی سواری اُٹھی تو سبھی شور مچا رہے تھے۔ جمرو، شامو، ماچھی، زدرا، ماچھی، گلبا، پھپھی اور چمپا بیگم، جو لین، اُس کی ماں۔ وہ گلی میں آ گئی تھیں۔ تنگے پیر آگے کئی مکانوں تک کانتے کی برات کے ساتھ چلتی رہیں۔

صبح دھوپ پوری طرح نہیں چڑھی تھی کہ ہم واپس آ گئے۔

⁂

سبھی گھر واپس آئے تھے اور میں بیٹھک میں اُن کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ دیر بعد مارٹی نے مجھے وہاں سے اُٹھا لیا اور اندر جو لین کے کمرے میں لے آیا۔ جو لین موجود تھی۔ اُس نے جلدی سے نئی چادر بچھائی اور مجھے آرام کرنے کی ہدایت کی۔ میں کسی چون و چرا کے بغیر بستر پر لیٹ گیا۔ کمرے کا دروازہ بھیڑ کے وہ دونوں چلے گئے۔ ٹھنڈ لگ رہی تھی لیکن مجھ سے اُٹھا نہیں جا رہا تھا، میں پڑا رہا، گزرتے وقت کا بھی احساس ہی نہیں رہا۔ کہتے ہیں کہ آدمی عناصر کا مرکب ہے اور حواس سے عبارت ہے۔ آدمی صرف احساس ہے، احساس ہی زندگی ہے۔ نیند بھی موت ہے مگر زندگی کی کوئی رمق اُس میں باقی رہتی ہے۔ یہ بے احساس بیداری تو نیند سے بڑی ہے۔ اِس سے تو آدمی زندگی بھر ہلاک ہوتا رہتا ہے۔ پھر آئینہ بھی زندگی ہے، زندگی، چلتی پھرتی زندگی منعکس ہوتی ہے اور آئینہ بے جان رہتا ہے۔ آدمی آئینہ مثال ہو جاتا ہے۔ سب کچھ اُس پر گزرتا ہے پر آئینے کی طرح۔ آئینے کی طرح وہ تماشائی بنا رہتا ہے۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں، وہ کیا تھا۔ نہ بیگانگی کا احساس، نہ یگانگت کا۔ بس کوئی حیرت، بس کوئی فسوں۔

دوبارہ جو لین چائے لے کے کمرے میں آئی تو میری آنکھیں کھلی تھیں، بے پردہ آئینے کی طرح۔ اُس نے مجھ سے چائے پینے کو کہا، میں نے لے لی لیکن پیالی میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور سارا بستر خراب ہو گیا۔ جو لین نے میرے کپڑے صاف کیے اور پوچھنے لگی کہ میں جلا تو نہیں؟ میں نے سر ہلا دیا۔ وہ رونے لگی اور کمرے سے بھاگ گئی۔ پھر وہ فوراً واپس آ گئی۔ پیرو بھی اُس کے ساتھ تھا۔

"کیا ہے ابا؟ ابھی کیا بات ہے؟"

میں اُسے دیکھتا رہا کہ کیا جواب دوں۔

پیڑو کی گھومتی پتلیاں ایک ثانیے تک مجھ پر جمی رہیں پھر میرا بازو پکڑ کے اُس نے مجھے ایک جھٹکے سے کھینچ لیا۔ میں زمین پر لڑھکتے لڑھکتے بچا، اُسی نے مجھے سنبھالا میرے قدم ابھی پوری طرح زمین پر نہیں جمے تھے کہ اُس نے اُلٹے ہاتھ سے میرے گال پر طمانچہ رسید کیا۔ جولین نے بڑھ کے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہذیانی انداز میں چلانے لگی پیڑو نے اُسے ایک طرف ہٹایا اور میرے سامنے آ کے مجھے بے دریغ طمانچے مارنے لگا۔ میں نے اُس کا ہاتھ نہیں روکا، نہ کوئی آہ بلند کی۔ میں بُت کی طرح ساکت اُس کے مقابل کھڑا رہا۔

اُس نے پے در پے میرے سینے، میری پسلیوں پر مکّے مارنے شروع کر دیے اور اپنا پنجہ میرے چہرے میں گاڑ دیا۔ میں نے کچھ نہیں کہا آخر اُس نے خود ہی ہاتھ کھینچ لیے اور اپنے بازو پھیلا کے بے تحاشا مجھے بھینچ لیا۔ اُس کی گرفت ایک شکنجہ تھی۔ مجھے اُس کے سینے سے لگ کے ایسا لگا جیسے میرے جسم میں یکایک آگ سی بھڑک اُٹھی ہے، جیسے میرے مساموں میں کوئی سوئیاں چبھو رہا ہے، جیسے کوئی میری رگیں مروڑ رہا ہے رگ و پے میں ایسی گرج اُٹھی کہ میری چیخیں نکل گئیں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میرے صحرا میں اتنا بڑا سمندر موجود ہے۔ آدمی کے بس میں آنسوؤں کے سوا کیا ہے۔ میرا سر پیڑو کے شانے پر ڈھلک گیا۔ اُس نے مجھے جانے کب تک اپنی آغوش میں چھپائے رکھا۔ مجھے اپنی کوئی سُدھ بُدھ نہ رہی۔

تین دن سبھی جولین کے گھر رہے، مولوی اکرم کے سوا۔ تیسرے دن پیڑو، تھل کو اپنے ساتھ لے گیا۔ میں نے بھی ساتھ جانا چاہا تھا لیکن شہپارہ اور جولین نے روک لیا۔ چوتھے دن اباجان نے جولین کے گھر سے جانے کی رسمی اجازت حاصل کر لی۔ میں بھی اُن کے ساتھ گھر آ گیا۔ اِن چار دنوں میں پہلی بار میں نے باہر قدم نکالا تھا مگر اباجان کے ساتھ آ کے بھی گھر میں بند رہا۔ وہ ہمہ وقت کسی لاچار کی طرح میری نگہداشت کر رہی تھیں، میرے پاس بیٹھنے کے بہانے ڈھونڈتی تھیں۔ کوئی میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتی تھی۔ کوئی میرا جسم دباتی تھی۔ شاید انھیں اب تک کسی دھوکے کا گمان تھا جبھی وہ مجھے چھو چھو کے دیکھتی تھیں۔ رات کو میرا جی بہت گھبرانے لگا لیکن فرخ، فریال کے خیال سے میں نے رات گزار دی اور صبح ہوتے ہی گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

چلتے وقت فرخ کے کہنے پر میں نے کپڑے بدل لیے تھے اور ناشتہ بھی کر لیا تھا۔ گھر سے دُور آ جانے پر مجھے دھیان آیا کہ میری جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ میں جیبیں لوٹنا بھول گیا تھا۔ ممکن ہے، پرانے کپڑوں میں کچھ نقدی پڑی ہو۔ گھر واپس جا کے میں اباجان سے پیسے لے سکتا تھا مگر اب کون واپس جاتا۔ میں آگے بڑھتا رہا۔ میرا ارادہ پہلے جولین کی طرف جانے کا تھا، پھر تھل کو دیکھنے کے لیے پاڑے کی طرف لیکن ایک بڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد مجھے سمت کا خیال ہی نہ رہا۔ بہت دنوں بعد میں اس طرح اکیلا سڑکوں پر گھوم رہا تھا۔ مجھے کچھ عجیب سا لگا، ایک کشادگی سی، جیسے میں اپنے ساتھ چل رہا ہوں کسی شاعر کے بہ قول، دوسرا کوئی ساتھ ہوتا ہے تو میں اپنے ساتھ نہیں رہتا۔ میری رفتار نہ تیز تھی، نہ ایسی سُست۔ چلتے چلتے میں جانے کہاں سے کہاں آ گیا۔

وہ جوہو کا ساحل تھا، وہاں شہر کی بھیڑ کم ہو گئی تھی۔ مکانات بھی سطح مختلف تھے۔ سامنے سمندر دکھائی دیا تو میں جا کے ریت پر لیٹ گیا۔ ساحل پر دھوپ ہوئی تھی، نمی ملی ہوئی دھوپ۔ لوگوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی اور میری طرح میں کوئی نہیں تھا۔ وہاں میں ہی میں تھا۔ سمندر کی کوئی اونچی لہر شور مچاتی ہوئی آتی دُور تک ریت بھگو جاتی۔ چھینٹوں سے میرے کپڑے بھی بھیگ بھیگ جاتے۔ ان میں بڑی ٹھنڈک تھی۔ لہریں اُمڈ اُمڈ کے آ رہی تھیں، زندگی کی طرح۔ زندگی لہروں سے کتنی ملتی ہے۔ دُور سے ایک لہر بنتی ہوئی آتی ہے۔ کسی جگہ آ کے اُس کا قامت بڑھ جاتا ہے، اُس کا شور بڑھ جاتا ہے اور کنارے پر آ کے آخر سب کچھ ڈھیر ہو جاتا ہے۔ یہ لہریں کبھی نہیں تھکتیں، زندگی بھی نہیں تھکتی۔ ہر بار ناکامی سے دوچار ہوتی ہے اور ہر بار اُسی شدومد سے اُبھر آتی ہے۔ سہ پہر تک میں یہیں اپنے دست و بازو کھولے پڑا رہا۔ اس دوران کئی آدمی میری طرف آئے لیکن مجھ سے کچھ کہے سُنے بغیر چلے گئے۔ جیسے جیسے دھوپ پیلی پڑتی جا رہی تھی سمندر بھی جیسے اور گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ میں ابھی وہاں سے نہ اُٹھتا اور اُٹھتی ڈوبتی لہروں کا تماشا دیکھتا رہتا، اگر ایک سپاہی آ کے مجھے نہ ٹوکتا۔ سمندر کے شور میں مجھے اُس کی آہٹ محسوس ہی نہیں ہوئی۔ اُس نے میرے شانے پر ڈنڈا چھویا تو میں ہڑبڑا گیا، تو وہ سر پہ کھڑا تھا۔

"کون ہے تم؟" اُس نے درشتی سے پوچھا۔

اُس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے میں نے اُٹھ جانا مناسب سمجھا۔ یوں ہم بیٹھے بیٹھے جواب دینے میں وہ اپنی سُبکی محسوس کرتا۔ مجھے ان لوگوں کا تھوڑا بہت تجربہ ہو چکا تھا۔ میری خاموشی سے وہ مطمئن نہیں ہوا اور اُس نے پہلے سے زیادہ درشت لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ "بہرا ہے تم؟ ہم کیا پوچھتا ہے۔ کون ہے تم؟"

"تمھیں کیا نظر آتا ہوں؟" میں نے بیزاری سے کہا۔

وہ چوڑے چکلے شانے اور بھاری تن و توش کا آدمی تھا۔ پیٹ باہر نکلا ہوا۔ جز بز ہو کے بولا کہ میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔ میں نے بظاہر نرم لہجے میں کہا کہ یہاں کوئی کیا کر سکتا ہے۔ اُسے میرا جواب قطعاً پسند نہیں آیا، کہنے لگا "تم جانتا نہیں تم سے کون بات کر رہا ہے" میں نے پہلوتہی کی کوشش کی لیکن میرے منہ سے نکل گیا "تم بھی نہیں جانتا۔"

سب لوگوں میں شاید ایک میں ہی اُسے نظر آیا تھا۔ کہنے لگا کہ میں اُسے سیدھا آدمی نہیں لگتا۔ وہ مجھے تھانے لے چلے گا تو وہاں میں اُسے اچھی طرح جان لوں گا اور وہ مجھے۔

اتنی سی بات پر تھانے کا ذکر بے جواز تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہا ہے وہ ٹوہ لے رہا تھا یا کچھ بٹورنا مقصود تھا۔ میری جیب میں کچھ تھا ہی نہیں۔ ہوتا بھی تو میں کبھی نہ دیتا۔ وہ خاصا کٹھ حجت آدمی نظر آتا تھا لیکن بے سبب عاجزی کرنے پر میرا دل آمادہ نہیں ہوا۔ میری تاویلات سے اُسے اور شہہ ملی۔ ویسے بھی جب آدمی کا جی بات کرنے ہی کو نہ چاہے تو حجت تو بعد کی بات ہے۔ میں کسی کا کیا بگاڑ رہا تھا۔ ساحلوں پر ایسے کوئی رکتا ٹوکتا نہیں۔ نہ آسمان، نہ زمین۔ آدمی کا سب سے بڑا دشمن آدمی ہے۔ میں نے ایک نظر ارد گرد دیکھا۔ دُور دُور ہی کہیں کوئی آدمی تھا۔ میں بیٹھے بیٹھے اُس کی ٹانگیں پکڑ کے اُسے لٹا سکتا تھا۔ اُس کی مردم آزاری سے میرے ہاتھ پیروں میں اینٹھن سی ہونے لگی تھی لیکن میں نے تحمل کیا۔ بہرحال وہ وردی میں تھا۔ کسی داد فریاد کے بجائے دفعتہً میں نے کھڑے ہو کے کہا۔ "چلو کس طرف چلنا ہے۔"

اُسے مجھ سے یہ توقع نہ ہوگی۔ چند لمحوں تک وہ ششش و پنج میں کھڑا رہا، پھر معنی خیز انداز میں سر ہلا کے بولا "چلو، تم کوئی اونچا آدمی جان پڑتا ہے۔ ہم تم کو ضرور لے چلے گا اور اب اُدھر جا کے ہی تم کو دیکھے گا۔"

میں نے جواب نہیں دیا اور اُس کے ساتھ ساتھ ساحل پر چلتا رہا۔ کچھ دُور جا کے سڑک آ گئی۔ سڑک کے قریب اُس کی رفتار سُست پڑ گئی، کہنے لگا میرے حق میں یہ اچھا ہوگا کہ کوئی بات ہو تو اُسے پہلے بتا دوں۔

"کیا بتا دوں؟" میں نے تنک کے کہا۔

"کوئی ایسا ویسا بات؟"

"تھانے ہی میں بتائیں گے۔" غیر ارادی طور پر میری آواز میں تلخی آ گئی۔ سڑک کے ساتھ مکانات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دھوپ سمٹتی جا رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اُسے آگے کسی جگہ مجھے چھوڑ دینا چاہیے۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد مجھے جانے کیا کچھ سمجھانے اور باور کرانے لگتا۔ میرے جی میں آئی کہ اُس کا گریبان پکڑ لوں مگر شاید وہ اس کے بھی قابل نہیں تھا۔ تھانے کا فاصلہ رفتہ رفتہ کم ہوتا رہا۔ اب اگر وہ مجھے چھوڑتا بھی تو میں نے طے کر لیا تھا کہ خود اُسے تھانے لے جاؤں گا۔ وہ نہیں جائے گا تو میں خود جا کے اُس کے افسر سے بات کروں گا۔ افسر نے بھی بات نہ سُنی تو مجھے کچھ کرنا پڑے گا۔ چاہے بعد میں کچھ بھی ہو۔ ایک بار انھیں کچھ معلوم، کچھ محسوس تو ہونا چاہیے کہ یہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔ سب ایک جیسے نہیں ہوتے۔ سب کو ایک لاٹھی سے نہیں ہانکنا چاہیے۔ میرا قیاس غلط نکلا۔ سڑک پار کر کے ہم دوسری طرف آئے تھے کہ تھانے کی عمارت نظر آنے لگی۔ وہ مجھے واقعی تھانے لے جا رہا تھا۔ وہاں جا کے جواز کے طور پر اُسے کوئی نہ کوئی الزام تراشی کرنی ہوگی۔ اس کے لیے مجھے خود کو آمادہ کرنا چاہیے۔ میرے پاس کیا ثبوت ہوگا۔ کہیں مجھ سے کوئی غلطی تو نہیں ہو رہی ہے؟ میں نے خود کو ٹوکا۔ تھانے والے میری بات سُنیں گے یا میری دہائی وہ شبہے میں، مجھے حوالات میں ڈال سکتے ہیں۔ ایک دن، دو دن۔ تھل، اباجان، پیڑو وغیرہ سبھی کو پریشانی ہوگی اور اگر پاڑے کے کسی آدمی سے وہاں میری ملاقات ہو گئی تو؟ میں بھول رہا ہوں کہ میرا تعلق باقاعدہ پاڑے سے ہے۔ پلٹ کا آدمی تو پاڑے کا آدمی ہوتا ہے۔ اُسے تھانے سے دُور ہی رہنا چاہیے۔ میری جیب میں اتفاق سے چاقو نہیں تھا۔ گلے میں صرف میری مالا تھی لیکن مجھے شناخت کر لینا اُن کے لیے کیا مشکل ہے۔ بمبئی میں، میں کوئی نیا نہیں ہوں، زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ میں بھنگ کے پاڑے کا باقاعدہ دادا رہ چکا ہوں، بالم خاں کے پاڑے کا بھی۔ وہ پرانی بات ہو گئی تو اب بمبئی کے سب سے بڑے پیڑو کے پاڑے سے تو میری نسبت ایسی ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ پاڑے کے آدمیوں کے علاوہ بہت سے پولیس والے بھی میرے صورت آشنا ہیں۔ پاڑے کے حوالے سے نہیں تو کرشنا جی کے حوالے سے۔ کرشنا جی کی جان بچانے کے سلسلے میں اور اُن کی موت کے وقت اخباروں میں میرا تذکرہ چھپا تھا اور بھی بہت سی باتیں تھیں۔ ایک ذرا سا اشارہ ملنے کی دیر ہوگی۔ اگر وہ بھی مجھ پر کوئی فردِ جرم عائد نہ کر سکے تو میری موجودگی ہی اُن کے لیے کیا کم دلچسپی کا باعث ہوگی لیکن اب یہ سب کچھ بعد از وقت تھا۔ یہ تو مجھے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔ بھاگنے کی بھی کوئی صورت نہیں تھی۔ سڑک پر بھیڑ تھی اور تھانہ قریب تھا۔ مجھے سپاہی کے ساتھ اندر جانا تھا۔ پھر وہی جگہ، وہی لوگ، وہی سب۔ میرا جسم ٹوٹنے لگا۔

مگر اس کا موقع نہیں آیا۔ ہم تھانے کی عمارت سے دو ڈھائی سو قدم دُور ہوں گے کہ معاً پہیّوں کی رگڑ سنائی دی۔ کسی نے تیز رفتاری میں موٹر روکی تھی۔ میں نے اور سپاہی نے بیک وقت مڑ کے دیکھا۔ گاڑی تیزی سے واپس ہوئی اور دوسرے ہی لمحے ایک شخص دروازے سے نمودار ہوا۔ وہ ڈاکٹر کیلاش تھا۔ سوٹ بوٹ میں ملبوس وہ لپکتا ہوا سیدھا میری طرف آیا۔ "آپ؟" اُس نے تجسس و اشتیاق سے پوچھا۔ "آپ یہاں کہاں؟"

"بس یوں ہی۔" میرے ہونٹوں پر کھلی ہوئی ہنسی اُسے پھیکی لگی ہوگی۔ اُس نے اضطراب آمیز نظروں سے مجھے سر سے پیر تک دیکھا۔ میرے کپڑے پانی اور ریت سے خستہ ہو گئے تھے۔ پھر اُس کی نظر سپاہی پر پڑی۔ "کیا بات ہے؟" وہ تشویش سے بولا۔

"کوئی خاص نہیں۔" میں نے سنبھل کے کہا۔

"یہ کون ہیں؟" وہ سپاہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"یہ مجھے ذرا تھانے لے جا رہے ہیں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"آپ کو؟" وہ حیرانی سے بولا۔ "مگر کیوں؟"

"میں وہاں جوہو کے ساحل پر آرام کر رہا تھا۔"

"کیا بات ہے؟" اُس نے تمتماتی آواز میں سپاہی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں، کچھ نہیں صاحب۔" سپاہی کے شانے سیدھے ہو گئے۔

"کچھ نہیں تو پھر یہ کیا ہے۔" ڈاکٹر کیلاش نے برہمی سے کہا۔ "تم انھیں کیوں لے جا رہے ہو؟ کس جرم میں؟"

"تھوڑا شک تھا صاحب پر اب ایک دم نہیں ہے۔"

"کیا شک تھا تمھیں اِن پر؟۔۔۔۔"

"اگر صاحب پہلے ہی بول دیتا۔۔۔۔" وہ کترائی ہوئی ہنسی سے بولا۔ "جانیے صاحب آپ کو ایسا تھانے لے جانے کا نہیں تھا۔ تھانے ایسا کون لے جاتا ہے، ہتھ کڑی بنا۔"

"پھر، پھر یہ کیا ہے؟"

سپاہی آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ وہ کس ڈھٹائی سے کہہ رہا تھا کہ میں تو صاحب کو دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا کہ اُدھر بیچ پر ایک سے ایک لُچا لفنگا ہوتا ہے، وہ صاحب کا جگہ نہیں تھا۔ اُسے میرے سامنے ہونے کا بھی خیال نہ رہا۔ جتنی آسانی سے اُس نے مجھے تھانے چلنے کا حکم دیا تھا، اُتنی ہی آسانی سے دست بردار بھی ہو گیا۔ میں اُسے دیکھتا رہ گیا۔ ڈاکٹر کیلاش سے اُس کی کوئی جان پہچان معلوم نہیں ہوتی تھی۔ لگتا

تھا جیسے ڈاکٹر پولیس کا کوئی افسر ہو مگر افسری صرف عہدے کی نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر کیلاش تو اپنی افسری و برتری کے تمام تمغوں، تمام علامتوں کے ساتھ تھا۔ سپاہی کو اس کا لحاظ کرنا ہی چاہیے تھا۔

"کیا نام ہے تمھارا؟" ڈاکٹر کیلاش نے ترشی سے پوچھا۔

"گپت رائے بولتے ہیں مجھ کو۔"

"اسی جوہو والے تھانے میں ہو تم؟"

"جی، جی ہاں صاحب!"

"اُدھر انچارج راجندر بابو ہیں نا؟"

سپاہی نے اضطراری انداز میں سر ہلایا اور پھر ڈہرانے لگا کہ اُسے محض شک ہوا تھا، اُس کا ارادہ مجھے تھانے لے جانے کا نہیں تھا۔ وہ چیلے پن سے بولا۔ "زیادہ سے زیادہ آگے ملباری کے ہوٹل میں صاحب کے ساتھ ایک پیالی چائے پیتا اور بس۔"

ڈاکٹر بگڑ گیا۔ "ایسے تمھیں کسی پر بھی شک ہو جاتا ہے، تمھاری آنکھیں نہیں ہیں کیا یا سر خالی ہے۔ آدمی دکھائی نہیں دیتا، کیا نظر آتا ہے۔" وہ مشتعل لہجے میں بولا۔ "تمھیں ان کے چہرے پر کیا نظر آتا ہے؟"

بس سپاہی کو معذرت کرنا ہی رہ گیا تھا۔ وہ خاموشی سے سُنتا رہا اور اُس نے یہی بہتر جانا کہ جلد سے جلد ہمارے سامنے سے ہٹ جائے۔ چلتے چلتے وہ ہم دونوں کو سلام کرنا نہیں بھولا۔

"میرا خیال ہے، تھانے چل کے انچارج راجندر بابو سے اس کی شکایت کرنا چاہیے۔" ڈاکٹر بھری ہوئی آواز میں بولا۔ "وہ اپنے واقف کار ہیں اور بھلے آدمی ہیں۔"

"میرے خیال میں اتنا ہی کافی ہے۔" میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"آپ نے اس سے پوچھا نہیں کہ ......"

"میں کیا پوچھتا......" میں نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

"اوہ!" اُس کا چہرہ بجھ سا گیا۔ "میں سمجھتا ہوں۔ آپ نے اُس سے کچھ نہیں کہا ہوگا، جبھی تو...... لیکن آپ گھر سے کیوں آگئے؟ ابھی آپ کو وہیں رہنا چاہیے تھا۔"

"وہاں پڑے پڑے جی گھبرا گیا تھا۔"

"بے شک، بے شک۔" وہ دل گرفتہ لہجے میں بولا۔ "میں صبح مس جولین کے ہاں گیا تھا۔ معلوم ہوا اب آپ وہاں نہیں ہیں، باوا جان کے ساتھ چلے گئے۔"

وہ گزشتہ تین دن تک مسلسل جولین کے گھر آتا رہا تھا۔ اُس رات بھی وہیں رہا تھا اور کانتے کو وداع کر کے ہمارے ساتھ ہی گھر آیا تھا۔ وہ اب کسی کے لیے بھی اجنبی نہیں رہا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا کہ اُس کا گھر یہاں سے بہت نزدیک ہے، کیا ہی اچھا ہو کہ میں تھوڑی دیر کے لیے وہاں چلوں۔

"پھر کبھی سہی اب دیر بہت ہو گئی ہے۔ صبح کا گھر سے نکلا ہوا ہوں اور کہیں بھی نہ جا سکا۔ بس یہاں ساحل پر آیا تو جی چاہا کچھ وقت یہیں گزارا جائے، پھر دیر کا احساس ہی نہیں"

"آپ مجھ سے کہہ دیتے۔ میں آپ کو لے کے آجاتا۔"

"پہلے سے کوئی ارادہ نہیں تھا۔"

"یہاں آگے نہایت پُرسکون جگہیں ہیں، بہت حسین۔ کبھی چلیں گے۔"

"اب آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

میں نے اُسے بتایا کہ جولین کی طرف جانے کا ارادہ ہے۔ وہ مُصر ہوا کہ اپنی موٹر میں پہنچا کے آئے گا۔ میں نے بہت منع کیا لیکن اُس نے موٹر کا در کھول دیا۔ پہلے اُس نے مجھے بٹھایا پھر دروازہ بند کر کے دوسری طرف سے خود بیٹھا۔ وہ اُسی سمت جا رہا تھا جس طرف موٹر کا رُخ تھا۔ میں نے تعرض نہیں کیا۔ کچھ دیر بعد موٹر کوٹھیوں کے علاقے میں داخل ہو گئی اور ایک اچھی خاصی بڑی کوٹھی کے احاطے میں آگے ٹھیر گئی۔ "گھر کے اتنے قریب آکے آپ لوٹ جائیں، یہ مجھے اچھا نہیں لگا۔" وہ مسکرا کے بولا۔ "ہم زیادہ دیر نہیں ٹھیریں گے، چائے پیتے ہی چل پڑیں گے۔" مجھے پھر اپنے کا خیال آیا لیکن اب میں اُس کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔

وہ قدیم و جدید طرز کی دو دھیا عمارت تھی، تعمیر ہوئے بیس سال سے زیادہ نہیں گزرے ہوں گے۔ رنگ و روغن کو بھی زیادہ وقت نہیں ہوا تھا۔ سبزہ ترشا ہوا تھا، پودے ترتیب سے لگے تھے اور رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔ گیٹ سے کار یڈور تک روِشوں کے درمیان بنی ہوئی مختصر گزرگاہ میں ایک بھی خشک پتا نظر نہیں آیا، نہ کوئی تنکا۔ موٹر ٹھیرتے ہی ایک ملازم کسی جانب سے بھاگا ہوا آیا مگر ڈاکٹر کیلاش نے اُس کی طرف توجہ نہیں دی۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گیا۔ اندر جاتے ہوئے میرے قدم جھجک رہے تھے۔ وہ میری کمر پر ہاتھ رکھ کے مجھے تقریباً دھکیلتا ہوا اندر لے آیا۔ ڈیوڑھی کی طرز کے ایک مختصر کمرے سے گزر کے ہم ایک نہایت کشادہ نشست گاہ میں آگئے۔ اونچی چھتیں، بے نقش و در و دیوار، دیواروں پر کہیں کہیں مناظر کی تصویریں آویزاں۔ فرش کے بیچ میں قالین بچھا ہوا، چھت کے وسط میں فانوس لٹک رہا تھا۔ کم سامان کی وجہ سے کشادگی کا احساس زیادہ ہوتا تھا۔ ہر چیز اِس ترتیب سے رکھی تھی جیسے اسی جگہ کے لیے بنائی گئی ہو، وہاں سے ہٹائی گئی تو جگہ خالی ہو جائے گی۔ ایک طرف گھومتا ہوا کھلا زینہ اوپر کی منزل تک جاتا تھا۔ زینے کے آس پاس دروازے بنے ہوئے تھے اور زینے کے ساتھ سنگِ مرمر کا ایک قدِ آدم مجسمہ تھا، ساڑھی میں ملبوس ایک نوجوان لڑکی کا مجسمہ، نیم وا پلکیں، سر جھکا ہوا، ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ، بدن کسی قدر خم کھایا، شرمایا ہوا سا۔ اُسے کسی ماہر بُت تراش نے تراشا تھا۔ سچ مچ کی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ لگتا تھا مصور بس جان ڈالنا بھول گیا ہے۔ نشست گاہ میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اس مجسمے پر نظر پڑتی تھی اور ایک ثانیے کے لیے نگاہیں ٹھٹک جاتی تھیں۔ اندر آ کے ڈاکٹر کیلاش چیخنے لگا۔ "رما، انو، ممی سب کدھر گئے؟" مجھے ایک صوفے پر بٹھا کے وہ بے تابانہ ایک دروازے سے اندر چلا گیا اور سوٹ اور ٹائی اُتار کے تھوڑی دیر میں واپس آگیا۔ وہ بہت پُوکھلایا ہوا سا معلوم ہوتا تھا۔ "کھانے کا وقت نہیں ہے مگر یقین ہے آپ نے بیچ پر کچھ بھی نہیں کھایا ہوگا۔ کیا لیجیے گا۔ بے تکلف بتائیے اور کیا پیجیے گا۔ کافی، جوس، چائے یا کچھ اور...... یہ جتنا میرا گھر ہے اُتنا ہی آپ کا......"

اُس نے ایک سانس میں اتنی باتیں کہہ دی تھیں کہ جواب دینا مشکل تھا۔ میں نے مختصراً کہا۔ "چائے پی لوں گا۔"

"نہیں نہیں، سچ بتائیے آپ نے دوپہر کھانا کھایا؟"

"نہیں کھایا مگر بھوک بالکل نہیں ہے۔"

یکایک وہ اوپر کی طرف دیکھ کے اُچھلنے لگا۔ "ارے رما، رما، اِدھر آؤ دیکھو کون آیا ہے۔" وہ انگریزی میں بولا۔ میری نگاہیں بھی زینے کی طرف اُٹھ گئیں۔ ایک نوجوان لڑکی تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں اُتر رہی تھی۔ وہ عنابی رنگ کا گاؤن پہنے ہوئے تھی جس پر گلاب کے بڑے بڑے پھول کڑھے تھے۔ پختہ چمپئی رنگ، چمکیلی آنکھیں، مسکراتا چہرہ، مناسب قد، متناسب بدن۔ میں یک لخت صوفے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے ایسا گمان ہوا جیسے میں نے پہلے بھی اُسے کہیں دیکھا ہے مگر دوسرے ہی لمحے میں اُسے پہچان گیا کیونکہ بہت دنوں بہت ساعتوں کی بات نہیں تھی، صرف چند لمحے، چند لمحوں میں زینے کے ساتھ نصب مجسمے میں جیسے جان پڑ گئی تھی۔ وہ یقیناً اسی کا مجسمہ تھا۔ اُس نے سر جھکا کے مجھے تعظیم دی۔ "یہ رما ہے، میری چھوٹی بہن۔" ڈاکٹر کیلاش فخر و مسرت میں بولا۔ "مگر یہ محض عمر میں چھوٹی ہے اور رما، پہچانو یہ کون ہیں! دیکھتے ہیں کتنی دیر میں تم انھیں پہچان پاتی ہو؟"

"تمھی بتاؤ نا۔" وہ مچل کے بولی۔

"تم انھیں اچھی طرح جانتی ہو۔"

رما کی پلکیں تھرتھرانے لگیں۔ اُس نے پلک جھپکنے کا توقف کیا ہوگا کہ اُس کی کھنکتی آواز نشست گاہ میں گونجی۔ "ارے کہیں کہیں یہ ظہیر صاحب تو نہیں ہیں۔"

"دیکھا! دیکھا آپ نے!" ڈاکٹر کیلاش پر ہیجان ساطاری تھا۔ "اِس نے آپ کو کیسے پہچان لیا۔"

میں اُسے تعجب سے تک رہا تھا۔ اِس کا مطلب تھا، ڈاکٹر کیلاش اُسے میرے بارے میں سب کچھ بتا چکا تھا۔ میں نے اسپتال میں اپنا یہی نام ڈاکٹر کو بتایا تھا۔ کرشنا جی بھی مجھے اسی نام سے جانتے تھے اور کلکتہ جیل کے حکام اور قیدی سبھی اسی نام سے۔ میں نے امتحانات دیے تھے۔ بابر کی طرح اب یہ نام بھی میری ذات کا جزو بن چکا تھا۔

رما کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ وہ ایک ذہین لڑکی ہے۔ "ہاں یہ ظہیر صاحب ہیں، ظہیر بھائی رما! اتفاق سے راستے میں مل گئے۔ بس قسمت سمجھو۔" ڈاکٹر کیلاش نے کہا اور حکمیہ لہجے میں رما کو ہدایت کی کہ وہ جو کچھ گھر میں تیار ہے، اُٹھا لائے۔ "باقی باتیں میز پر ہوں گی۔" مجھ سے معذرت کر کے رما فوراً چلی گئی۔ ڈاکٹر کیلاش مجھے اُس کے بارے میں بتانے لگا۔ "یہ رما جو ہے، بڑی نٹ کھٹ ہے۔ یہ ڈاکٹر ہے، گزشتہ سال ہی اس نے ڈگری لی ہے۔ اس کا جی ہی نہیں لگتا تھا۔ ڈگری کا مرحلہ آیا تو بھاگ گئی۔ بہ مشکل اِسے کالج واپس بھیجا گیا، اِس شرط پر کہ ڈاکٹری کی ڈگری لے گی مگر ڈاکٹری نہیں کرے گی۔ امتحان دے کے یہ گھر بیٹھ گئی۔ اِس کے شوق بس یہی، مصوری، موسیقی، رقص، ستار تو یہ کمال کا بجاتی ہے۔ یہ مجسمہ جو آپ دیکھ رہے ہیں، اِس کے استاد گھوشی جی نے بنایا ہے۔ یہ بھی اب کچھ کم اچھا نہیں بناتی۔ گھوشی جی کہتے ہیں کہ اب میں سکون سے مر سکوں گا کہ ایک شاگرد میری موجود ہے جو میرے کام کو آگے بڑھائے گی مگر گھوشی جی کو غلط فہمی ہے۔ رما کسی ایک جگہ ٹکتی ہی نہیں۔ وہ تو پارا ہے۔ نہایت ضدی، کسی کام کا بیڑا اُٹھا لے تو تمام کر کے ہی دم لے۔ چیلنج قبول کرنا اس کی عادت ہے۔ بڑی بڑی باتیں کرتی ہے لیکن بے پناہ ڈرپوک ہے۔ اب دیکھیے نا، چیر پھاڑ ہی سے گھبرا گئی۔ ڈاکٹری یوں نہیں کرے گی کہ طرح طرح کے دکھی مریض جو آتے ہیں، مریض تو دکھی ہی ہوتے ہیں۔ بلا کی حاضر جواب۔ زبان منہ پھٹ ہے، کوئی ایسی ویسی بات اِس کے منہ سے نکل جائے تو درگزر کر دیجیے گا۔" وہ تیز تیز لہجے میں بولتا گیا پھر اُسے کچھ خیال آیا، سر جھٹک کے بولا۔ "اوہ، میں تو بالکل ہی بے لگام ہو گیا۔ آپ بتائیں۔ کیا آپ تازہ دم ہونا چاہیں گے۔ میرے خیال میں منہ ہاتھ دھو لیجیے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے ہچکچاہٹ سے کہا۔

"رما سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا، یہاں کوئی بھی آپ سے ناواقف نہیں ہے۔ ممی، انو، سبھی آپ کو جانتے ہیں، سو آپ کسی قسم کا تکلف مت کیجیے۔" میری جلد سمندر کی نمی سے چپک رہی تھی اور مجھے اُلجھن ہو رہی تھی۔ میں اُس کے ساتھ ایک دوسرے کمرے میں آگیا۔ کمرے سے ملحق غسل خانہ بھی تھا۔ میرے بال اور کپڑوں میں ریت بھری ہوئی تھی۔ مجھے نہانا چاہیے تھا لیکن اِسے غسل ہی کہنا چاہیے، مجھے سر بھی دھونا پڑا۔ بال کاڑھ کے میں نے آئینے میں چہرہ دیکھا تو کسی قدر تازگی کا احساس ہوا۔ باہر نشست گاہ میں کیلاش منتظر تھا۔ وہیں سامنے ایک طرف کا پردہ ہٹا ہوا تھا۔ یہ کھانے کا حصہ تھا، یہاں ایک بڑی میز لگی تھی۔ کیلاش مجھے اِسی طرف لے آیا۔ ایک ملازمہ اور ملازم میز پر جلدی جلدی پلیٹیں، چھریاں اور کانٹے سجا رہے تھے۔ اُسی لمحے رما اندر سے پکوڑوں کی قاب اُٹھائے برآمد ہوئی۔ "بس آپ لوگ بیٹھ جائیے۔" وہ چہکتی آواز میں بولی۔

"آپ بھی تو بیٹھیے۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"میں بس ابھی آئی۔ پکوڑے اتنی دیر میں ٹھنڈے ہو جائیں گے۔" وہ بہت مصروف نظر آتی تھی، تقریباً بھاگتی ہوئی اندر چلی گئی۔

"رما بہت کم چیزیں بنانا جانتی ہے لیکن جو بھی بناتی ہے اُس کا مزا ہی کچھ اور ہوتا ہے۔" ڈاکٹر کیلاش نے قاب میرے آگے رکھ دی۔ "اب شروع کیجیے۔ اب برداشت نہیں ہو رہا ہے۔"

مجھے واقعی بھوک نہیں تھی مگر گرم پکوڑوں کے دو ایک ٹکڑے میں نے لیے،

بھوک جاگ سی اُٹھی دیکھتے دیکھتے رما اور ملازمہ نے مختلف قابوں سے میز بھر دی۔ چاٹ، حلوہ، مٹھائی، پھل اور مشروبات وغیرہ۔

"ایک آدمی کے لیے اتنا اہتمام" میرے منہ پر آتے آتے رہ گیا کہ یہ غذا کی توہین ہے یا آدمی کی۔

"ایک آدمی کے لیے کیوں، ہم کیا خالی ہاتھ بیٹھے رہیں گے۔ ایسے موقع ملتے ہی کب ہیں کیلی کے دوست ہی نہیں ہیں" کیلی سے اُس کی مراد کیلاش تھی۔ کہنے لگی۔ "دو چار شریف آدمی سال میں کبھی کبھار ان کے ساتھ آجاتے ہیں اور دوبارہ اُن کی صورت دیکھنے کو نہیں ملتی۔" اُس کی آواز میں چوڑیوں کی سی کھنک تھی۔ چولھے کے پاس کھڑے کھڑے اُس کا چمپئی رنگ کچھ سُرخی مائل ہو گیا تھا۔ چہرہ جل سا رہا تھا۔ اِس اہتمام سے نمٹ کے وہ میرے پہلو کی کرسی پر اطمینان سے بیٹھ گئی اور سرگوشی کے انداز میں پوچھنے لگی۔ "کیسے ہیں؟"

"بہت اچھے، واقعی بہت مزے دار۔"

"مجھے ہمیشہ شک ہوتا ہے۔"

"پرفیکشنسٹ کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔"

"اوہ، اوہ۔" وہ کھِل کھِلا پڑی۔ "میں تو کچھ بھی نہیں جانتی۔ ممی مجھے ڈانٹتی رہتی ہیں۔ آپ اُن کے ہاتھ کا کھانا کھائیں تو اندازہ ہوگا کہ پکانا کسے کہتے ہیں۔ میں تو آدھا بھی نہیں جانتی۔ اچھا ہے وہ اِس وقت موجود نہیں ہیں۔"

"آپ کی ممی تو پھر کمال ہی کرتی ہوں گی۔"

"آپ کو کون سے کھانے زیادہ پسند ہیں؟"

"مجھے!" مجھ سے فوراً کوئی جواب نہ بن پڑا۔ "کچھ بھی جو اچھا پکا ہو اور اچھا نہ پکا ہو تو بھی جس سے پیٹ بھر جائے۔"

"بالکل۔" وہ اُچھل کے بولی۔ "آدمی کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ کھانا تو نہایت ضمنی چیز ہے زندگی میں اس سے زیادہ ضروری اور ذائقہ دار چیزیں ہیں۔ ہمارے ہاں صرف زبان کے ذائقے پر توجہ دی جاتی ہے۔ آنکھ کو، ناک کو، کان کو اور دماغ کو بھی غذا کی اور ذائقوں کی ضرورت پڑتی ہے مگر ہم صرف کھانا جانتے ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔"

"میں عموماً ٹھیک ہی کہتی ہوں۔" وہ مسکرا کے بولی۔ "مگر بشرطیکہ آپ سے۔"

"یہ یہ کنجوسی نہ ہوئی؟" میں نے دھیرے سے کہا۔

"ہاں لیکن کیا کریں۔" اُس کے لہجے میں در شگفتگی آگئی۔ "لوگ اس قباحت کے متحمل نہیں ہوتے۔"

"میں نے آپ سے کہا تھا نا، یہ ایسی ہی حرفوں کی بنی ہوئی ہے۔" ڈاکٹر کیلاش بیچ میں بولا۔

"کیا میں نے کچھ غلط کہا ہے؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"آپ سمجھ رہے ہیں نا؟"

"سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"شکر ہے، یہاں کوئی تو میرا ہم زباں ہے۔" وہ آنکھیں میچ کے بولی ... سے کہتی ہوں کہ پیمانوں اور باٹوں کے علاوہ بھی زندگی بہت کچھ ہے۔ پیمانوں باٹوں سے زندگی بسر کرنا جزوی طور پر زندہ رہنے کے مترادف ہے یعنی تمام تماشا دیکھنے کے مترادف۔ کچھ ایسا ہے کہ آدمی ورثے کی زندگی زیادہ گزارتا ہے اور کھوجی ہوئی زندگی کم۔ وہ مستند اور آزمودہ پیمائشوں کے سوا زندگی چھوڑ ... ہے بلکہ ڈرتا ہے اور یوں زندگی کی مجموعی آشنائی سے ناآسودہ رہتا ہے ... حد و حساب ہے۔ اُسے جتنا کرید لیے، کھوج لیے، شاید اتنے ہی حیرت کے کرشمے نمودار ... مطلب ہے، کتنے ہیں جو پوری زندگی وصول کرتے ہیں۔ ہم جہت زندگی ... ایک حصے پر قناعت کر لیتے ہیں۔"

"مگر کبھی ایک ہی حصے سے مہلت نہیں ملتی۔" وہ چُپ ہوئی تو میں ... کے کہا۔ میری آواز بکھری ہوئی تھی۔ "زندگی بہت مختصر، بہت تنگ ہو ... آدمی ایک ہی جانب سے نہیں نکل پاتا۔ سب کے لیے یکساں نہیں ہے۔ سب ... میں کب ہوتا ہے۔"

وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ کیلاش کے ٹوکنے پر رُک گئی۔ کیلاش ... دانی کی طرف اشارہ کیا جو رکھے رکھے ٹھنڈی ہو رہی ہوگی۔ کیلاش نے ... نہایت اچھی باتیں کر رہی تھی۔ کچھ کچے منہ سے پکی پکی باتیں۔ اُس کے لہجے ... تھا جس سے مخاطب کو شرمندگی ہونے لگے نہ ایسی نخوت جو سماعت پر بار گزرے۔ کچھ ... نرم و لطیف، رواں دواں کھنکتی جھلکتی ہوئی باتیں۔ چائے بناتے ہوئے اُس ... شکر کے لیے پوچھا تو میں نے دو چمچے بتائے۔ وہ اپنے بھائی کی طرف کن انکھیوں ...

"صحت مند آدمی کو اتنی ہی شکر لینی چاہیے۔" ڈاکٹر کیلاش نے ہنستے ...

"پھر مجھے کیوں منع کرتے ہو۔"

"تم موٹی ہو جاؤ گی۔ خوب صورت لڑکی کا موٹا ہو جانا سمجھو کہ اُس ..."

میرے جی میں آیا لطفِ کلام کے لیے سہی یہ کہوں کہ آپ کو شکر ... ہے لیکن میں نے اپنی زبان بند رکھی۔

"کیلی! خدا کے لیے۔" وہ ناراضی سے بولی۔ مصنوعی سی ناراضی ... کئی بار آئینہ دیکھتی ہوں۔"

"ویسی آئینہ ہوگا۔" کیلاش نے شوخی سے کہا۔

"میں بھی تو ویسی ہوں۔"

"آئینوں کا کیا ہے آئینے اگر سچ بولا کرتے تو آدمی کہاں سے کہاں ... کیا سے کیا ہوتی۔" کیلاش میری جانب تائید طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے ...

"یہ آئینوں کی نہیں، خود آدمی کی کجی ہے۔" رما نے مستعدی ... مجھ سے مخاطب ہو کے پوچھنے لگی۔ "کیوں ظہیر صاحب آپ ... آئینے ..."

"نہیں، میں کیا بتاؤں۔" میری آواز جھرانے لگی۔ "شاید کچھ یہی ہے۔ آئینے تو شاید سچ ہی بولتے ہیں مگر ایک بے اثر، بے مزہ سچ۔ یہ تو دیکھنے اور سننے والے پر ہے کہ اُس میں سچ قبول کرنے، اُس کا سامنا کرنے کا کتنا حوصلہ ہے۔" مجھے اپنی بات میں کچھ ابہام محسوس ہوا۔ میں نے کہا۔ "آئینہ تو سچ ہی بولتا ہوگا مگر تشریح غالباً ہم نہیں کر پاتے۔ سچ اثبات میں ہے تو جی خوش ہوتا ہے اور یقین نہیں آتا۔ نفی میں ہے تو جی مانتا نہیں جھوٹ کا گمان ہوتا ہے تو بھی یقین نہیں آتا اور آئینے کا یہ ہے کہ وہ تو محض جلوہ نما ہے۔ اُسے دلیل و حجت نہیں آتی۔ پتھر دل کا آمیزہ جو ہے۔ تاہم آئینے کا کوئی اشارہ اثبات میں ہے تو یہ ایک دل خوش کن بات ہے۔ آپ کو اس میں کیا اعتراض ہے؟"

"مجھے، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" اُس کا چہرہ تمتمانے لگا۔ "لیکن یہ ظاہری خوب صورتی ہے جو میرے نزدیک ایک سراب ہے۔ ہر ایسا کمال جو اپنا حاصل کیا ہوا نہیں ہے۔ اُس پر افتخار محض دل بہلاوا ہے۔ طویل قامت شخص کو خود کو ممتاز سمجھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ آدمی کو انھی خوبیوں پر ناز کرنا چاہیے جو اُس نے خود اختیار کی ہوں، خود جمع کی ہوں اپنے بل بوتے پر۔ جسمانی ریاضتوں کے بعد کوئی اپنے دست و بازو ڈھالتا ہے تو بے شک اُس کے لیے وجہِ افتخار ہے۔ میرے نزدیک خوبی صرف اکتسابی ہوتی ہے اور ظاہری خوبیاں تو بہت ناپائدار ہوتی ہیں۔"

"آپ نے ایک دوسری بات کہہ دی۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "اکتسابی خوبیوں کی پائداری کی کیا ضمانت ہے۔"

"ہاں نہیں ہے۔" وہ شائستگی سے بولی۔ "مگر جب تک بھی رہیں، ظاہری خوبیوں سے افضل ہوتی ہیں وہ اسیٹس ہیں۔"

"میں سمجھتا ہوں خوب صورتی ایک طرح کی امیری ہے۔" ڈاکٹر کیلاش تیزی سے بولا۔ "جیسے کچھ لوگ موروثی طور پر امیر ہوتے ہیں۔"

"مگر اُس دولت کی لذت ہی کچھ اور ہوگی جو خود حاصل کی جائے۔"

"لیکن ضائع تو وہ بھی ہو سکتی ہے۔"

"ہاں۔" وہ اُداس ہو گئی۔ "ہاں اور شاید اُس کے چلے جانے کا دکھ زیادہ ہو ... ہونا چاہیے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اُس پہ اصرار نہ کریں، اُس کے لیے کوشش نہ کریں اور ضائع تو آخر سبھی چیزیں ہو جاتی ہیں۔"

"اور آپ نے غور نہیں کیا۔" میں نے اپنا لہجہ استوار رکھنے کی کوشش کی۔ "ظاہری خوبیاں ہی ودیعت کی ہوئی نہیں ہوتیں، باطنی بھی ہو سکتی ہیں۔ اچھے دماغ، خوش طبعی، آدمی خلقی طور پر بھی تو نرم و نازک اور سخت و درشت ہوتے ہیں۔ ... متعلق آپ کیا کہیں گی؟"

"وہی جو ظاہری خوبیوں کے متعلق۔" اُس نے لپکتی آواز میں ... "وہ بھی ہماری ... نہیں ہیں، میراث اور ترکہ ہیں۔"

"لیکن وہ موجود ہیں۔" میں نے کہا۔ "اُن کا ہونا اُن کے نہ ہونے سے بہتر ہے ... ان کا ہم کیا کریں؟"

"انھیں ہم اور بالیدہ کریں۔"

"مگر اُن کا ہونا کیا ہمارے لیے باعثِ طمانیت نہیں؟ خود اپنی کیا، اپنے کسی عزیز کی برتری و کامیابی ہمیں کیسا سرشار کرتی ہے، ہمارے لیے عزت و افتخار کا باعث ہوتی ہے۔"

"کبھی حسد کا۔" وہ چمک کے بولی۔

"گویا کوئی ردِعمل ضرور ہوتا ہے، منفی ہو یا مثبت۔ ہوتا ہے نا؟" میری سوالیہ نگاہیں اُس کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں، وہاں ایک رنگ آتا تھا، ایک جاتا تھا۔

"ہاں ہاں، ہوتا ہے مگر آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" وہ اُلجھے لہجے میں بولی۔ "فطری خوبیاں چاہے اپنی ہوں یا دوسروں کی اور اُن کے متعلق ہمارا ردِعمل جیسا بھی ہو طمانیت آمیز یا نفرت زدہ۔ اُن پر فخر و مباہات یا نفرین و کراہیت جو ناجائز ہے، بے جا ہے۔ وہ ہماری ذات یا ہمارے کسی عزیز کی ذات کا حصہ ضرور ہیں مگر ہماری وضع کردہ نہیں ہیں۔ میری مراد تو کچھ اور ہے کہ خوبی صرف اکتسابی ہوتی ہے۔"

میں جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر میں نے خود کو روک لیا۔ مجھے خود پر حیرت سی ہوئی کہ یہ آج مجھے کیا ہو گیا ہے۔ مجھے اس نزاکت کا احساس کیوں نہیں رہا کہ میں پہلی بار اس گھر میں آیا ہوں اور ایک ایسی لڑکی کے سامنے بیٹھا ہوں جسے آج سے پہلے میں نے نہیں دیکھا۔ جانے میری زبان سے کیا اول فول نکلتا رہا۔ گو نازک طبعی کے باوجود اُس میں حوصلے کی کمی معلوم نہیں ہوتی تاہم میرا ذرا سا ناہموار لہجہ اُسے مکدر کر سکتا ہے۔ میں اُسے کیا جتانا اور خود کو کیا باور کرانا چاہتا ہوں لیکن یہ میرا قصور نہیں تھا

بات سے بات نکلتی گئی۔ مجھے بھی اختیار نہیں رہا۔ کیمین آشنا ہوں تو گھر اجنبی کب رہتے ہیں۔ کیمین ہی لطف و کرم پر آمادہ تھے۔ اُن کا تپاک سوچا سمجھا نہیں تھا، وہ بھی بے اختیارانہ تھا ورنہ میں اتنی دیر یہاں نہ ٹھیر پاتا، نہ میری زبان ایسی رواں ہوتی۔ مجھے اپنا جی کچھ ہلکا ہلکا لگ رہا تھا جیسے کئی دن کی گھٹاؤں کے بعد بدلیاں چھٹ جائیں یا دھوپ میں چلتے چلتے کسی جگہ چھاؤں میسر آجائے۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے کبھی برسوں کی شناسائی تھوڑی پڑجاتی ہے اور کبھی ایک پل میں برسوں کا فاصلہ مٹ جاتا ہے۔

"آپ چپ کیوں ہوگئے؟" رما کی مضطرب آواز پر میں چونک پڑا۔

"نہیں نہیں۔" میں نے ندامت سے کہا۔

"تمھاری باتیں ہی اتنی بے محل تھیں۔" ڈاکٹر کیلاش نے ناز بردارانہ انداز میں اپنی بہن سے شکایت کی۔

"کیا واقعی؟" وہ معصومیت سے بولی۔

"نہیں، یہ سب تو نہایت دل چسپ اور دل نشیں تھا۔" میں نے کہا "میرے لیے نیا بھی۔"

"نیا کیوں؟ لگتا ہے آپ تو بہت پڑھتے، بہت سوچتے ہیں۔"

"دونوں باتیں شاید ٹھیک نہیں ہیں۔"

"یہ انکسار بھی خوب ہے۔" وہ زیرلبی سے بولی۔ "بہرحال مجھے خوشی ہے کہ کیلی کو مردم شناسی آگئی ہے۔ کیلی نے پہلی مرتبہ ایک مکمل دوست دریافت کیا ہے۔"

"غالباً اسی مرتبہ ان سے سب سے بڑی چوک ہوئی ہے۔"

"اوہ نہیں۔" وہ بچوں کی طرح چیخ پڑی۔

"کبھی آدمی پر اثبات ہی اثبات کا تسلط ہوتا ہے، ہوا کے رُخ والی بات ایسے ہی کسی وقت میرا اِن کا آمنا سامنا ہوگیا تھا۔"

"نہیں ظہیر بھائی!" ڈاکٹر کیلاش کی آواز اُمڈ رہی تھی۔ "اُس وقت تو مجھ پر نفی ہی نفی کا تسلط تھا۔"

"مجھے کیلی نے آپ کے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے۔"

"کیا بتایا ہے، یہ تو کچھ بھی نہیں جانتے۔"

"سب جاننا ضروری بھی نہیں ہوتا۔ کچھ جانے بغیر بھی آدمی کبھی اچھا یا بُرا لگ سکتا ہے۔ کچھ لوگ برائیوں سمیت بھی تو اچھے لگتے ہیں۔"

"پھر تو یہ یک طرفہ عمل ہوتا ہے۔"

"ہوا کرے۔" وہ لہکتی آواز میں بولی۔ "دو آدمیوں کی استواری میں ہمیشہ ایک آدمی کا ترک و ایثار زیادہ ہوتا ہے۔"

میں نے سر اُٹھا کے اُسے دیکھا۔ اُس نے کیسی خیال آفریں بات کہی تھی۔ میں نے اُس سے نہیں کہا کہ مگر کتنے ایسے ہوتے ہیں اور کہاں بستے ہیں۔

"تم کچھ غیر مہذب نہیں ہوتی جا رہی ہو رما؟" ڈاکٹر کیلاش نے متبسم ہو کر مُلائمت سے اپنی بہن کو ٹوکا۔

ایک لحظے کے لیے اُس کا سر اپسل ہوا تھا پھر اُس کی چھنا کا بہ کمرے میں بکھر گئی۔ پٹ پٹاتی پلکوں سے بولی۔ "تم نے ٹھیک کہا مجھے تو خیال رہا۔ ہم کنویں کے پاس بیٹھے ہیں اور کیسے ..." اُس نے پلٹ کے ملازم کو کسی تاخیر کے بغیر چائے تیار کرنے کا حکم دیا۔

اندھیرا پھیل گیا تھا۔ رما نے قمقمے روشن کیے تو شام گزر جانے کا احساس ہوا۔ وہ اپنے بال درست کرنے لگی۔ اُس کے کھُلے ہوئے لمبے سیاہ بال شانوں پر تھے جنھیں وہ بار بار سر جھٹک کے ہٹاتی تھی۔ پھر اُس نے ربن سے اُن میں گرہ لگا کر اشتیاق آمیز لہجے میں مجھ سے پوچھنے لگی۔ "آپ کے مشاغل کیا رہتے ہیں؟"

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے بے ربطی سے کہا۔ "کچھ بھی نہیں۔"

"کچھ بھی نہیں۔" اُس کی مسکراتی آنکھیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں "کچھ تو ہوں گے۔"

"کیا بتاؤں آپ کو۔" میری آواز اٹکنے لگی۔ "کچھ ہوں تو بتاؤں، بس کوچہ گردی سمجھیے۔"

"کوچہ گردی!" وہ کھوسی گئی۔ "کیا خوب، کوچہ گرد تو کسی نہ کسی طرح ... میرا مطلب ہے، آپ کے ......"

"رما!" ڈاکٹر کیلاش نے چلبلے پن سے اُسے ٹوکا۔ "ابھی تم کیا کہہ رہی تھیں کہ سب کچھ جاننا اتنا ضروری نہیں ہوتا۔"

"ہاں، میں نے کہا تھا۔" اُس کا چہرہ لال ہوگیا۔ "مگر ... مگر" وہ کہنا چاہتی ہوگی کہ وہ تو کسی اور سیاق و سباق میں کہا تھا۔ چند لمحوں کے تلاطم کے بعد پُرسکون ہوگئی اور تھمی ہوئی آواز میں بولی۔ "لیکن جاننے کا اضطراب تو ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ ظہیر صاحب کے ساتھ زندگی کچھ زیادہ ہی کھیلتی رہی ہے۔"

میں حیرت بھری نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔

"تمھیں یہ ملحوظ رکھنا چاہیے۔" ڈاکٹر کیلاش نے تنک کے کہا۔ "تمھارے سامنے ایک ذہین اور ہوش مند شخص موجود ہے۔"

"میں نے اپنے ہوش و حواس سمیت یہی سمجھا ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔ "کیوں ظہیر صاحب کا چہرہ دیکھ کے مجھے گمان ہوتا ہے کہ پیچھے کوئی سمندر ہے۔"

"تم ہوا میں تیر چلا رہی ہو۔ ظہیر بھائی!" کیلاش مجھ سے مخاطب ہو کے "اس کی باتوں کا بُرا مت مانیے گا۔ اسے دادی اماں بننے کی بڑی عادت ہے۔"

"کیا کچھ ایسا ہی نہیں ہے ظہیر صاحب؟" اُس نے اپنے بھائی کی بات نظرانداز کرتے ہوئے بے چینی سے کہا۔

"میں، میں کیا کہوں۔" میری زبان لکنت کرنے لگی۔

اچھا ہوا جو ملازم چائے لے کے آگئی اور رما چائے بنانے میں مصروف ہوگئی۔ اس بار اُس نے مجھ سے شکر کے لیے نہیں پوچھا۔ چائے کے دوران اُس نے بتایا کہ اُس کی ماں اور چھوٹی بہن انورادھا مجھ سے ملنے کی بڑی آرزومند تھیں۔

دلوں اُن سے میرے ہی متعلق باتیں کرتا رہا ہے میرے ہی متعلق نہیں ہو لیکن شہپارہ چمپا بیگم، تھل اور پیر دسبھی کے متعلق۔ اُس کی ماں اور چھوٹی بہن کسی عزیز کے ہاں تقریب میں گئی ہوئی تھیں، انھیں اب تک آجانا چاہیے تھا۔ اتنی دیر میں مجھے اس گھرانے کے متعلق بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ کیلاش کا ایک چھوٹا بھائی شملے میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ باپ عرصے سے لندن میں مقیم تھا۔ باپ کے ذکر پر رُما کے لہجے میں ایک مغائرت سی شامل تھی۔ زمینوں اور جاگیروں کی اچھی آمدنی تھی اور ان بہن بھائی کے بقول دولت سے انھیں ایسی رغبت نہیں تھی۔ دونوں از خود یہ سب کچھ بتاتے رہے۔ مجھے بھی جواباً کچھ کہنا چاہیے تھا۔ شاید اُنھوں نے اسی لیے پہل کی تھی لیکن میں نے اپنی زبان بند رکھی اور رات ہو گئی۔ کیلاش کی ایک بار گھڑی پر نظر گئی تو وہ چونک اُٹھا۔ اُسے رات کی ڈیوٹی پر اسپتال جانا تھا۔ "آج چھٹی کر لو۔ بوٹ کلب چلتے ہیں وہیں جاکے ڈنر کریں گے۔" رُما نے مچلتے انداز میں اپنے بھائی سے کہا

"ظہیر بھائی اگر تیار ہوں . . . ."

"آج نہیں۔" میں نے ہچکچاہٹ سے کہا "پھر کسی دن سہی۔"

"آج ہی کیوں نہیں؟" وہ ناز آفریں لہجے میں بولی۔ "کل کا کیا، آپ کو اس قدر یقین ہے؟ جو آج مل رہا ہے اُسے آنے والے مجہول کل کی صوابدید پر کیوں چھوڑا جائے۔ مجھے کل پر ہمیشہ شبہ ہوتا ہے۔ کل محض ایک گمان ہے۔"

"آنے والا ہر لمحہ بھی تو ایک گمان ہے، آنے والے کل کے مانند۔" میں نے کہا۔

وہ چائے کا گھونٹ لیتے لیتے رک گئی اور اُس کی آنکھوں میں ستارے سے چمکتے اور ماند پڑتے رہے۔ "بے شک۔" کچھ توقف کے بعد وہ تمتماتی آواز میں بولی۔ "ہر آنے والا لمحہ کل کے مانند ہے لیکن یہ موجود لمحے جو نوازش پر مائل نظر آتے ہیں، سنتے ہیں یہ کسی خاص صورتِ حال سے بھی مشروط ہوتے ہیں۔ اگر سب کچھ یہی رہے تو شاید ان کا تسلسل نہ ٹوٹے۔ کل تک یہ دُنیا ہم سے جانے کیا کیا برتاؤ کرے۔ سو ہم اِسے اس کا موقع ہی کیوں دیں۔ ہم یہ تسلسل ہی کیوں توڑیں۔ کل کی دُوری آنے والے لمحے کی نسبت بڑی ہے اور گویا زیادہ بڑا اندھیرا ہے۔" میرے کچھ کہنے سے پہلے وہ تیزی سے کہنے لگی "کیا آپ کبھی بوٹ کلب گئے ہیں؟" میں نے انکار میں سر ہلایا۔ اُس کی آواز اور پارا ہو گئی "کیلی سے پوچھیے کیسی خواب ناک جگہ ہے۔ رات کے وقت تو اور فسوں گر۔ سمندر کا کنارہ اور لہروں کا اندھا شور۔ کشتیوں کی مرتعش روشنیوں سے لگتا ہے، پانی میں جگہ جگہ چھینٹے سے پڑے ہوں جیسے پانی میں شعلے بھڑک رہے ہوں۔ جھومتے ناچتے گاتے ہوئے لوگ۔ خوش فکر، خوش نظر۔ سب ہنسنے اور کلفتیں بھلانے کے لیے آتے ہیں۔ کشتی میں بیٹھ کے دُور تک نکل جایئے اور لہروں کا جھولا جھولتے رہیے۔"

"میں تصور کر سکتا ہوں۔" میں نے خوش اطواری سے کہا۔

"آپ پیتے ہیں؟"

"جی!" میں نے حیرانی سے اُس کی طرف دیکھا۔ "جی نہیں بالکل نہیں۔"

"مجھے یقین تھا۔" وہ بے ساختگی سے بولی۔ "پھر آپ کا نشہ بھی خالص ہو گا۔ شراب ایک نقلی نشہ ہے، مصنوعی شراب، رنگین عینک ہے۔ مدہوشی میں کسی نظارے کے حقیقی رنگوں سے کوئی کیا اخذ کر سکتا ہے اور کس درجے غم محسوس کر سکتا ہے؟ یہ تو جھوٹ ہے، اپنے آپ سے جھوٹ بولنے، اپنا چہرہ چھپانے کی کوشش۔ مجھے پیتے ہوئے لوگ کبھی اچھے نہیں لگتے، مجھے اُن پر ترس آتا ہے۔ ہوش زندگی کا بڑا جوہر ہے۔ مدہوشی زندگی مختصر کرنے کے مترادف ہے، جزوی خودکشی۔"

"تم کچھ زیادہ انتہا پسند ہوتی جا رہی ہو۔" کیلاش نے کسی قدر تلملاتے ہوئے کہا۔ "تم نے کبھی شراب پی ہے؟"

"پی ہے، ایک بار نہیں، تین چار بار۔"

"تم نے؟" وہ تعجب سے بولا۔ "میرے علم میں نہیں۔"

"تمھارے علم میں آنا ضروری نہیں تھا۔ تم اتنے سراسیمہ کیوں ہو رہے ہو؟ صرف مردوں کو اس کی اجازت ہے۔ مغرب میں چار سال تک تم کیا مشاہدہ کرتے رہے؟"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟" کیلاش کی آواز کھنچنے لگی۔

"کیا میں نے کچھ نہیں کہا ہے۔" وہ معصومیت سے بولی۔

"ظہیر بھائی کیا سوچیں گے۔"

"نہیں۔" میں نے کسمسا کے کہا۔ "میں بھلا کیا سوچوں گا۔"

"وہ ایک بالغ نظر نوجوان ہیں۔ وہ کیا سوچتے۔ میں نے کچھ ناروا تو نہیں کہا؟"

"قطعاً نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "تو آپ نے بھی شراب پی؟"

"ہاں، تین چار بار۔"

"اور کیا محسوس کیا؟"

"میں نے جاننا چاہا تھا کہ یہ چیز کیا ہے۔ دوسری، تیسری، چوتھی بار میں محض اپنے تجزیے کی توثیق کے لیے پی حالانکہ تجربہ ہر بار یکساں تھا۔ میں نے پیالہ حلق سے اُتارا تو جانا کہ میں بے وزن ہو گئی ہوں۔ میرا وجود زمین کی کشش کا پابند نہیں رہا اور میری آنکھیں، میں نے دیکھا کہ میری بینائی میری گرفت سے نکل گئی یا اس کے دائرے میں آنے والی چیزیں اپنی ساخت اور رنگت بدل چکی ہیں۔ مجھے سا لگا کہ یہ تو تجرید ہے۔ میرا جی چاہا کہ میں سمندر میں کود پڑوں، ناچنا شروع کر دوں، گاؤں اور خوب روؤں۔ مجھے اپنی کسی کیفیت پر اختیار نہیں رہا۔ میرا فیصلہ ہی مجھ سے چھن گیا۔ آدمی کی اس سے بڑی بے بسی کیا ہو سکتی ہے۔ میں شراب کو کوئی برائی نہیں سمجھتی لیکن یہ ایک فضول چیز ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ شراب میں نشہ ہوتا ہے۔ اگر واقعی ہوتا ہے تو زندگی میں اس سے کہیں تیز اور پائدار نشے ہیں۔ یہ تو نیند کی گولی کے مانند ہے، سا نشہ، دوا کے مانند۔"

ڈاکٹر کیلاش اُس کے خاموش ہو جانے کا منتظر تھا، اپنی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھتے ہوئے تیزی سے بولا۔ "تمھارے بیان میں تمھاری خواہش، تمھارے اندر کوئی امتناع، کوئی اکراہ شامل ہے اور ...."

"میں اپنی ہی بات کر رہی ہوں۔

اتنی آسانی سے فیصلے صادر نہیں کیے جاتے۔ ساری خارجی چیزیں تقریباً تمام کی تمام ساختہ ہوتی ہیں، ساختہ آسودگی والی۔ غذا، لباس اور بہت سی چیزیں۔۔ بہرحال وقت کم ہے۔" وہ پہلو بدل کے بولا۔ "تم کلب جانے کو کہہ رہی تھیں؟"

"ہاں ہاں، میں تو بہک ہی گئی۔"

"بن پیے بہک گئیں۔"

"دیکھا تم نے!" میں یہی کہہ رہی تھی۔ بن پیے بھی کچھ کم نشے نہیں ہوتے ظہیر صاحب! اگر آپ ہاں میں جواب دیتے تو مجھے دکھ ہوتا۔ میں نے یوں ہی اپنے اندازے کی تصدیق کے لیے آپ سے پوچھا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ آپ یہی کہیں گے۔ تاہم کلب میں شراب کے علاوہ بھی دل کش مشاغل ہیں، تیراکی، بلیرڈ، برج، رقص اور موسیقی۔۔۔ آپ چل رہے ہیں نا . . . . ؟"

"ضرور چلتا مگر ایسا ہے کہ میں کسی سے کہہ کے نہیں آیا تھا، سب فکر مند ہوں گے اور یہ میرا لباس بھی کلب کے لیے شاید موزوں نہ ہو۔" میری ان تاویلات کے باوجود وہ اصرار کرتی رہی اور کلب کے رنگوں اور روشنیوں کا احوال خوابیدہ لہجے میں بیان کرتی رہی۔ اب میرے پاس ایک ہی جواز باقی رہ گیا تھا۔ میں نے اُس سے کہا "یقیناً یہ ایک دل کش صحبت ہو گی لیکن اس وقت کچھ جی آمادہ نہیں ہے۔"

"جی کو منانے ہی کے لیے تو چل رہے ہیں۔"

کیلاش نے تنبیہی انداز میں اُسے ٹوکا کہ ابھی یہ کس طرح مناسب ہے۔ اُس نے دبے لہجے میں کانتے کی طرف اشارہ کیا، وہ محجوب ہو گئی، خجل خجل سی۔ "مجھے افسوس ہے۔" وہ آزردگی سے بولی۔ "مجھے احساس ہی نہیں رہا کہ یہ سب کتنا بے محل ہے۔ اس سانحے کو گزرے چوتھا دن ہے۔ آپ پر تو بہت بوجھ ہو گا۔ ممی نے کیلی سے کئی بار آپ کے ہاں جانے کے لیے کہا۔ میں نے اور انھوں نے بھی لیکن کیلی نے روک دیا، جانے کیوں۔" وہ تاسف کا اظہار کرتی رہی۔

"آپ کے بہت گہرے دوست تھے نا؟" اکبر نے بھی مجھ سے یہی پوچھا تھا اور جواب میں لفظ میرے حلق میں اٹک کے رہ گئے تھے۔

"کیلی نے بتایا تھا۔" اُس نے میرے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا۔ "کیلی نے بتایا تھا کہ وہ کیسے مضبوط تھے۔ موت کا یہی ہے کہ بڑی اندھی ہوتی ہے۔ کیسی دلچسپ بات ہے، آدمی نے ساری دُنیا پر غلبہ پا لیا ہے، اپنے آپ پر نہ پا سکا۔ کیسے کیسے زندہ لوگ دیکھتے دیکھتے ختم ہو جاتے ہیں۔ کوئی کسی سے کچھ بھی کہے، موت کسی کو رعایت نہیں دیتی۔ میں ہمیشہ موت کے گھر سے بھاگتی ہوں بلکہ موت کے گھر میں بسنے والوں سے۔ اُن کی صورتیں نہیں دیکھی جاتیں۔ اُن کے پاس جاکے گونگے پن کا احساس ہوتا ہے، لفظوں کی کم مائگی کا۔ کیلی اُسی دن سے بہت دل گرفتہ ہے۔ دو روز تک ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھا سکا۔ آج ہی ذرا سنبھلا سنبھلا نظر آ رہا ہے۔ کیلی کے سوا ہم میں سے کسی نے جانے والے کو نہیں دیکھا تھا لیکن سبھی کو بہت رنج ہے۔"

میں سنتا رہا، کیا کہتا۔

کہنے لگی۔ "تمام راستے موت کی طرف جاتے ہیں۔ کبھی کوئی جلدی منزل پر پہنچ جاتا ہے، کبھی کسی کو دیر لگ جاتی ہے لیکن منزل سب کی ایک ہے۔"

"تمام راستے جب موت کی طرف جاتے ہیں تو لوگ طویل راستہ کیوں منتخب کرتے ہیں؟" میں نے ڈوبتی آواز میں کہا۔

"ہاں!" وہ چونک سی پڑی اور لرزیدہ ہونٹوں سے بولی۔ "آپ نے کیسی نکتہ خیز بات کہی ہے، یقیناً، پھر طویل راستہ اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

ڈاکٹر کیلاش کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ اُس نے مجھ سے لباس کی تبدیلی کے لیے چند منٹ کی اجازت مانگی۔ اُس کے جانے کے بعد میں اور رُما اکیلے رہ گئے۔ دیر تک وہ نگاہیں جھکائے جھکائے کھوئی کھوئی بیٹھی رہی۔

"یہاں آکے اچھا لگا، جی کچھ ہلکا ہوا۔" میں نے اُس کے چہرے کی دُھند دُور کرنے کی کوشش کی۔ "اتنی دیر میں سب کچھ بھولا سا رہا۔"

"بھلانے کی کوشش کیجیے۔ زندہ آدمیوں کے پاس اس کے سوا کیا چارہ ہے کہ مرنے والوں کو بھلا دیں۔ اچھا ہوا آپ یہاں آ گئے۔ اس گھر میں شاید آپ کو کچھ سکون ملے۔ تبدیلی بھی بڑی اہم ہوتی ہے۔ یہاں آجایا کیجیے، اپنا ہی گھر جان کے، کیلی کے بغیر بھی۔ یہ ایک رسمی سی بات ہے لیکن میں برہنائے رسم نہیں کہہ رہی۔ میں اپنے اظہار میں بخل نہیں کرتی۔ میں سمجھتی ہوں یہ بھی ایک طرح کی منافقت ہے۔ سچ یہی ہے کہ آپ کو دیکھ کے، آپ سے مل کے ایک طمانیت کا سا احساس ہوا ہے، کچھ حاصل کرنے کی سرخوشی۔ جب بھی آپ کا جی گھبرائے، بے تکلف یہاں چلے آیئے۔ ایسے آئیں گے تو مجھے بہت خوشی ہو گی۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ یہ گھر اور گھروں سے مختلف رہے۔ یہاں کے مکین ایک دوسرے کا بہت لحاظ کرتے ہیں، ہر دم ایک دوسرے کے کام آنے کے لیے بے قرار لیکن اپنی ذات، اپنی آزادی کی قیمت پر نہیں۔ میری گزارش ہے کہ آیندہ کیلی کے حوالے کی ضرورت نہیں۔ مجھے اپنے ہی حوالے اچھے لگتے ہیں۔"

"جی۔" میں نے منتشر آواز میں کہا۔ "آپ کا بہت شکریہ۔"

"اور ضروری نہیں کہ ایک دوسرے کی شناخت میں ایک وقت ہی صرف ہو، مرحلہ وار شناخت کا، وقت کے یہ فاصلے، یہ غیر ضروری فاصلے مٹا کے بھی ایک دوسرے کے متعلق اچھی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔"

"جی، جی ہاں۔" میں نے جلدی سے سر ہلا کے کہا۔

"میں نہیں جانتی کہ آپ کے کس کام آ سکتی ہوں۔"

"آپ کا اتنا کہنا ہی بہت ہے۔"

"بہت بالکل نہیں ہے، میں عمل پر یقین رکھتی ہوں اور مجھے لگتا ہے کہ میں آپ کے کسی کام ضرور آ سکتی ہوں، ایک اچھے دوست کے طور پر۔"

"جی ہاں، یہ میرے لیے باعثِ عزت ہو گا۔"

"میری بات کا شاید آپ کو یقین نہیں آیا؟"

"نہیں، یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا؟"

"یقین آتا تو آپ کی زبان سے یہ روایتی جملے ادا نہ ہوتے۔"

"مگر سچ بھی تو یہی ہے۔"

"خیر۔" وہ مسکرانے لگی اور اُس کی آنکھوں میں روشنی سی بھر گئی، متلاطم روشنی۔ اُس کی ڈوبی ڈوبی آنکھیں ویسے بھی ہر لمحے کسی حیرانی سے دوچار رہتی تھیں اب کچھ اور حیران نظر آ رہی تھیں۔ تمام تر سکون کے باوجود اُس کے سراپا میں کوئی اضطراب سا چھپا ہوا تھا۔ کچھ جاننے کی جستجو، کچھ کھو جانے کا ہیجان۔ وہ مسلسل انگریزی میں بات کر رہی تھی، شائستہ اور رواں انگریزی میں۔ اُس کے لہجے میں انگریزوں جیسی فصاحت تھی۔ میری انگریزی میں اُس جیسی روانی تو نہیں تھی لیکن مجھے لفظ ڈھونڈنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوئی۔ کرشنا جی کے ساتھ اتنے دن رہ کے میری جھجک دور ہو گئی تھی۔ جیل میں بھی سونیا کو پڑھانے کے دوران بیشتر بات انگریزی میں ہوتی تھی۔

کیلاش نے زیادہ دیر نہیں لگائی۔ وہ سرمئی سوٹ میں کچھ اور وجیہہ لگ رہا تھا۔ "میرے پیچھے اِس نے آپ کو ستایا تو نہیں؟" وہ شگفتگی سے بولا۔

"یہ اِن کی خو ہی نہیں معلوم ہوتی۔"

"کبھی یہ بہت بے لگام ہو جاتی ہے۔ میں ممی سے کہتا ہوں کہ اب اس کی شادی کر دو۔"

رما کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "آپ اندازہ کر لیجیے کہ بے لگام کون ہے۔" وہ چہکتی آواز میں بولی۔

ڈاکٹر کیلاش کو جلدی تھی۔ رما ہمیں باہر تک چھوڑنے آئی اور آخر تک افسوس کرتی رہی کہ اُس کی ماں اور بہن کو میری آمد کی اطلاع سن کے بہت ملال ہوگا۔ میں گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔ وہ میرے دروازے پر چلی آئی اور کہنے لگی۔ "دیکھیے، اب آپ آتے رہیں گے۔" اُس کے لہجے میں بہت کچھ شامل تھا ؎

کیا حسین تیور تھے کیا لطیف لہجہ تھا
آرزو تھی، حسرت تھی، حکم تھا، تقاضا تھا

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ایک خوش گوار تجربے کی خاطر۔۔۔" وہ نہ جانے کیا کہنا چاہتی تھی کہ کیلاش نے گاڑی چلا دی۔ دروازے تک اُس کے چیخنے چلانے کی آوازیں آتی رہیں۔ وہ کیلاش کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔ کیلاش زور زور سے ہنستا رہا۔

میں پاڑے کی طرف جانا چاہتا تھا لیکن اگر میں کیلاش سے کہتا تو وہ درمیان میں کہیں مجھے اتارنے کے لیے تیار نہ ہوتا۔ اُسے پاڑے کی عمارت تک لے جانا بھی مناسب نہیں تھا چنانچہ ہم جولین کے گھر آ گئے۔ کیلاش کی ڈیوٹی کا وقت ہو رہا تھا لیکن جولین اور شہپارہ کے اصرار پر وہ اندر چلا آیا اور کوئی آدھ گھنٹے تک بیٹھا رہا۔ ہارڈی بھی موجود تھا۔ کسی نے کبھی مجھ سے کہا تھا کہ اصل موت تو زندوں کو بھگتنی پڑتی ہے۔ مرنے والا مر کے تمام ہو جاتا ہے، تمام احساس و شعور کے ساتھ۔ اُسے کون جا کے بتائے کہ اُس کے پیچھے کس کس کی آنکھوں میں آگ جلی، کس کس کے سینے سے دھواں اٹھتا ہے۔ یہ تو بہت بڑی اذیت ہے۔ وہاں سب اُجڑے اُجڑے سے لگ رہے تھے جیسے موت ابھی تک گھر میں ٹھہری ہو۔ صبح سے وہ میرا انتظار کر رہے تھے۔ پاڑے سے بھی سارے دن کوئی نہیں آیا تھا۔ میرا آنا اچھا ہی ہوا۔ اُن کے کھوئے ہوئے، اُڑے ہوئے رنگ واپس آنے لگے۔ کیلاش کافی پی کے چلا گیا۔ اُن سب کی دل دہی کے لیے میں نے اُن کے ساتھ کھانا کھایا۔ ایک مجھی کو نہیں، انھیں بھی تو میری کسی پرسش کی ضرورت تھی۔ سب بیٹھک میں ایک دوسرے سے نگاہیں چرائے بیٹھے رہے۔ مجھے اُن کے درمیان سے اُٹھنا نہیں چاہیے تھا لیکن اُدھر ابا جان پریشان ہو رہے ہوں گے۔ اُن کے خیال سے مجھے اُٹھنا پڑا۔ انھی کی وجہ سے انھوں نے بھی کچھ نہیں کہا۔ میں انھیں پہلے بتا چکا تھا کہ میں سویرے گھر سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ ہارڈی بھی میرے ساتھ آ گیا۔ پہلی بار وہ ابا جان کے گھر آیا تھا۔ آ کے بہت خوش ہوا۔ صبح ہارڈی، اکبر اور فارحہ کو اوٹ پٹانگ قصے سنا کے انھیں ہنساتا رہا۔ ناشتے کے بعد ہم پاڑے کی طرف نکل لیے۔

وہاں زبیر تھا نہ ٹھبل۔ معلوم ہوا کہ پرسوں شام وہ تھوڑی دیر کے لیے آئے تھے، کچھ دیر بیٹھے اور چلے گئے، پھر اب تک نہیں لوٹے ہیں۔ میں نے اطمینان کی سانس لی۔ آخر پیرو اپنے گھر چلا گیا تھا، اپنی بیٹی اور بیوی کے پاس۔ اُسے دیکھ کے اُن کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا ہوگا۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ پیرو اُن کے لیے دوبارہ زندہ ہو کے آیا ہے۔ پیرو کے گھر کا پتہ مجھے ٹھیک ٹھیک یاد نہیں آ رہا تھا۔ یہاں پاڑے میں ماچھی یا دو ایک کے سوا شاید ہی کسی کو اس بابت کچھ علم ہو۔ ایسی صورت میں کسی سے پوچھنے کا محل نہیں تھا۔ پیرو نے اپنے گھر کو پاڑے سے بالکل دور رکھا تھا، ہر اعتبار سے دور۔ دو ایک آدمیوں کو چھوڑ کے شاید ہی کوئی پوری طرح جانتا ہو کہ پیرو کا ایک گھر بھی ہے۔ گھروں جیسا ایک گھر، اُس کی پھولوں سے بنی ایک لڑکی اور ایک باوقار، وفا شعار بیوی ہے۔ جب میں اُس کے گھر گیا تھا تو گیتا کالج میں پڑھتی تھی، اب تو اور آگے بڑھ گئی ہوگی۔ پیرو شب و روز عموماً پاڑے ہی پر رہتا تھا۔ ہفتے میں دو ایک راتوں کے لیے یا کسی ایک دن کے لیے وہ گھر کا رخ کرتا تھا۔ جیل کے دنوں کے سوا اُس کا یہی معمول تھا۔ اپنے علاقے کے علاوہ بمبئی کے کئی اور دولت مند سیٹھوں سے بھی اُس کے خصوصی مراسم تھے۔ پاڑے کے آدمی پاڑے سے اُس کی غیر حاضری کا یہی تاثر لیتے تھے کہ آج کی رات یا آج کے دن وہ کسی سیٹھ کے ہاں عیش و عشرت میں مصروف ہوگا۔ کسی کو اُس کے اِن معمولات میں رخنہ اندازی کی ضرورت تھی نہ جرات۔ پیرو نے رخنہ اندازی ہی کے خیال سے یہ احتیاط کی تھی۔ اِدھر ماچھی پاڑے پر بیٹھا رہتا تھا۔ پہلی بار جب پیرو مجھے اور ٹھبل کو اپنے گھر لے گیا تھا تو پہلے وہ ایک سیٹھ کے ہاں گیا تھا۔ نیچے اُس کی بڑی دکان تھی، اوپر گھر تھا۔ وہیں پیرو کی موٹر کھڑی تھی۔ ممکن ہے یہ موٹر اُس کے سیٹھ دوست کی ہو۔ موٹر میں بٹھا کے وہ ہمیں کوٹھیوں اور بنگلوں کے علاقے میں ایک بڑے مکان میں لے گیا تھا جہاں ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی تھا اور ملازموں کے لیے الگ کمرے بھی۔ مجھے یہ سب کچھ دیکھ کے بہت تعجب ہوا تھا۔ گھر کی حفاظت کے لیے مسلح ملازم تعینات تھے۔ پیرو نے منتخب آدمی ہی رکھے ہوں گے۔ اُس کی بیوی ایک صاحبِ حیثیت پارسی خاندان کی لڑکی تھی۔

پیرو کے کہنے کے مطابق زندگی میں اُس نے روشنی ہی روشنی دیکھی تھی، روشنی اور پھول۔ پیرو کے لیے وہ سب کچھ چھوڑ کے چلی آئی تھی۔ پیرو نے بھی اُس کے لیے ایک چھوٹا سا تاج محل بنا دیا تھا۔ کسی گھر میں خوشی ہو تو وہ تاج محل سے بھی بڑا ہوتا ہے۔

دوپہر تک میں پاڑے میں بیٹھا اُس کا انتظار کرتا رہا۔ پورے دو دن ہو گئے تھے، اب اُسے پاڑے آ جانا چاہیے تھا۔ یہاں اور بہت سے لوگ بھی اُس کے منتظر تھے۔ پاڑے کے وہی معمولات تھے، وہی لوگ، وہی باتیں۔ دوسرے علاقوں کے داداؤں کے، پولیس کے اور جیل کے چرچے۔ کہاں کہاں واردات ہوئی اور کون چاقو ہار بیٹھا۔ کلکتے کی کون سی ڈیرے دار نے بمبئی کا رخ کیا ہے۔ پاڑے کے عقب میں کھلی جگہ اور ٹین کے سائبان میں جسمانی کرتب جاری تھے۔ قلم بازی، پٹا، لاٹھی، چاقو زنی اور تن سازی کے مشاغل۔ سب کچھ وہی تھا مگر سب لوگ گھروں سے جیسے لڑ کے آئے تھے یا کہیں کچھ لٹا کے آئے تھے۔ شاموا اور جمرو مجھ سے لپٹ گئے۔ کہنے لگے کہ اُن کا دل اس شہر میں بالکل نہیں لگ رہا ہے، استاد سے بولنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ وہ واپس جانا چاہتے ہیں۔ کانتے کے بغیر انھیں سب کچھ سونا سونا لگ رہا ہے۔ وہ تو خیر کانتے کے بہت قریب تھے، ہر وقت کا اُٹھنا بیٹھنا تھا۔ جو اتنے قریب نہیں تھے، ماچھی، گلیا، لچھی، چھیدا، زورا وغیرہ، اُن کے چہروں پر بھی خاک اُڑ رہی تھی۔ انھیں دیکھ دیکھ کے پاڑے کے دوسرے آدمیوں پر بھی وحشت طاری تھی۔ آدمی کو دیکھ کے آدمی کھلتا ہے یا مرجھا جاتا ہے۔ زورا تو بھرا بیٹھا تھا۔ کانتے کا نام آیا تو وہ میرے شانے پر سر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ میں نے اُسے تسلی دینا چاہا لیکن میرے پاس فضول کے چند جملوں کے سوا کیا دھرا تھا۔ وہی جو ازل سے سب ایک دوسرے سے بولتے ہیں۔ زورا رو دھو کے خود ہی چپ ہو گیا۔

بارہ بجے کے قریب جارجی بھی آ گیا تھا۔ وہ میرے قریب آ کے بیٹھ گیا۔ اُس نے میرے پیر چھوئے تو میں نے گھبرا کے سمیٹ لیے۔ مجھے اُس کے اِس طرزِ عمل پر حیرت بھی ہوئی، ندامت بھی۔ ماچھی نے پیرو کی جگہ مجھے بٹھا دیا تھا اور جارجی نے جیسے یہی سمجھ لیا تھا کہ پاڑے پر پیرو کی نیابت اب میں کر رہا ہوں۔ جارجی بالکل بدلا ہوا لگ رہا تھا۔ مجھ سے وہ کانتے کی تعزیت کرنے لگا اور شکایتی لہجے میں بولا کہ یہاں کسی نے اُسے گھر کا پتہ بتایا ہی نہیں ورنہ وہ کانتے کا دیدار کرنے ضرور آتا۔ مجھ سے اُس کا کبھی کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ یہی چند دن پہلے اُسے تھوڑا بہت جانا بوجھا تھا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میرے اُس کے درمیان کوئی دوری ہی نہ ہو۔ وہ اُس بات کی معذرت کرنے لگا جب پیرو، ٹھبل اور میں اُس کے ہوٹل گئے تھے۔ بولا کہ اُسے ہوش ہی نہیں تھا۔ میں اور ٹھبل استاد پہلی بار اُس کے ہاں آئے تھے اور وہ ہماری کوئی خاطر نہ کر سکا۔ اب سوچتا ہے تو احساس ہوتا ہے کہ وہ کتنی دور جا چکا تھا۔ اُس کی آنکھیں اپنوں غیروں کی پہچان، اندھیرے اجالے کی تمیز بھول گئی تھیں۔ کہنے لگا کہ وہ جو کچھ بھی ہے، پیرو دادا کی وجہ سے ہے مگر نہ جانے کیا ہوا کہ اُس کے قدم بہکتے گئے۔ پیرو دادا اگر بروقت نہ آ جاتا تو وہ نہ جانے کتنی دور چلا جاتا۔ میرے پوچھے بغیر وہ بتاتا رہا کہ اب ہوٹل میں عورتوں کا داخلہ بالکل بند کر دیا گیا ہے۔ گو اس سے اُس کا کاروبار آدھا رہ گیا ہے لیکن اُسے کوئی غم نہیں۔ ماچھی نے چپکے سے اس کی تصدیق کی کہ پاڑے کے آدمی جا کے سن گن لیتے رہے ہیں، اُس دن کے بعد سے کوئی عورت ہوٹل میں نہیں آئی ہے، یہاں تک کہ جارجی نے اپنی بیوی ماری کو بھی کاؤنٹر سے ہٹا دیا ہے۔ حالانکہ اب جارجی ایک ہی صورت میں ہوٹل چلا سکتا ہے کہ وہ شراب اور جوئے کی زیادہ سے زیادہ سہولتیں گاہکوں کو فراہم کرے۔

میں نے ہر چند کوئی رائے زنی نہیں کی تھی مگر معلوم نہیں، جارجی میرے سامنے یہ صفائیاں کیوں پیش کر رہا تھا۔ شاید خجالت کچھ زیادہ ہی گہری تھی۔ میں چپ رہا تو وہ عاجزی سے بولا، اُس کی بیوی ماری کی آرزو ہے کہ ٹھبل اور میں کسی دن پیرو دادا کے ساتھ اُس کے گھر آئیں اور ماری کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا کھائیں۔ میں نے کہا، ہاں کیوں نہیں، ضرور آئیں گے۔ میرے بارے میں اُسے بہت سی معلومات تھیں کہ میں نے چھنگا جیسے پرانے استاد کا پاڑا کس طرح حاصل کیا تھا۔ بمبئی کے سب سے بڑے دادا تیواڑی کے خاتمے کا سبب بھی وہ مجھی کو ٹھہرا رہا تھا۔ میں نے تردید کی کہ اُس میں تو سبھی کا ہاتھ تھا۔ کہنے لگا لیکن بنیاد تو میں ہی تھا۔ میں اس بات سے کیسے انکار کر سکتا تھا۔ "اپن کا من کرتا ہے، کبھی اپنے راجا کے چاقو کا بل آنکھ سے دیکھے۔ لوگ باگ بولتا ہے، بجلی ہے کہ جادو ہے۔" ایک لحظے کو تو مجھے ایسا لگا جیسے وہ میرا مذاق اڑا رہا ہو لیکن وہ بہت سنجیدہ تھا۔ اُس کے لہجے میں اشتیاق بھرا ہوا تھا۔ اُس نے مجھے پیش کش کی کہ بمبئی میں کسی قسم کا بھی کام ہو، میں اُسے بے تکلف بتا دوں۔ بس حکم دے کے اور ایک بار اُسے آزما کے تو دیکھوں۔ کہنے لگا کہ بمبئی تو ایک تہہ خانہ ہے، ایک کے بعد دوسرا اور۔ در تو ختم نہیں ہوتے، آدمی ختم ہو جاتا ہے۔ کبھی میں اُس کے ساتھ بمبئی کے اِن تہہ خانوں میں چلوں، شاید میرے لیے اس نظارے میں بہت کچھ نیا اور انوکھا ہو۔ ابھی اُسے ہوٹل کھولے کتنے مہینے ہوئے ہیں لیکن اتنے عرصے میں جو کچھ اُس نے دیکھا ہے، وہ عمر بھر نہیں دیکھ پایا تھا۔ باہر سے یہ جو اجلے مکان نظر آتے ہیں کسی کو نہیں معلوم کہ اِن کے اندر کتنا اندھیرا بھرا ہوا ہے اور یہی حال مکینوں کا ہے۔ وہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ کیسے کیسے تابندہ چہرے، جن کی لوگ پوجا کریں، اتنے ارزاں بکتے ہیں۔ اُسے ہر طرف بازار ہی بازار نظر آتا تھا۔ اُس کا اعتبار ہی ختم ہو گیا تھا۔ کچے قدموں کے آدمی کا تو سر گھوم جائے۔ جارجی میری خاموشی کو میرا تجسس سمجھ رہا تھا۔ مجھے طرح طرح سے خوش کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ آدمی ثروت میں بھی تو خوشامد قبول کرتا ہے۔ اُسے کچھ یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ میں پیرو دادا کے لیے اُس کی موثر سفارش ثابت ہو سکتا ہوں۔ میں نے اشارۃً اُسے باور کرانا چاہا کہ پاڑے پر آدمی اپنی سفارش آپ ہوتا ہے۔ اُس کی حد سے زیادہ خجالت سے مجھے شرمندگی ہونے لگی تھی بلکہ گھٹن بھی۔

ڈھائی بجے دسترخوان بچھایا گیا تب کہیں وہ میرے پاس سے ہٹا۔ کھانے میں اتنی [illegible] کے انتظار میں کی گئی تھی۔ کھانے کے بعد بھی وہ نہیں آیا۔ اب مجھے تشویش ہونے لگی۔ ٹھبل تو خیریت سے ہے؟ کہیں پیرو کے گھر جا کے وہ بکھر نہ گیا ہو۔ پاڑے کا نہیں تو اُن دونوں کو ابا جان اور جولین وغیرہ کا تو خیال ہوگا۔ ہو سکتا ہے، وہ کہیں اُنھی کی طرف نہ نکل گئے ہوں۔ سوا تین بجے میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ ہارڈی، شاموا اور جمرو بھی میرے ساتھ اُٹھ گئے۔ میرا ارادہ پیرو کے گھر جانے کا تھا مگر انھیں میں کیسے ساتھ لے جا سکتا تھا۔ یوں روکنا بھی مناسب نہیں تھا لیکن اِدھر اُدھر کا کوئی عذر کرنے کے بجائے میں نے صاف صاف اُن سے کہہ دیا کہ وہ میرے ساتھ نہ آئیں، ابھی پاڑے پر رہیں، شام کو کسی وقت میں یہیں واپس

آجاؤں گا۔ رات بھی ہو سکتی ہے۔ میں نے احتیاطاً یہ اُن سے کہہ دیا۔ وہ سب بھی اتنے مجہول و ناتواں ہو رہے تھے کہ کسی نے مجھ سے حجت نہیں کی۔

دھوپ اترتی جا رہی تھی۔ میں اندازے سے فاصلہ طے کرتا رہا۔ کوشش کر دیکھنے میں کیا حرج تھا۔ مجھے کام بھی کون سا تھا۔ رات کو گھر ہی پہنچنا تھا۔ اُس وقت تک میرے پاس وقت ہی وقت تھا۔ پیسے میری جیب میں تھے۔ بس تھوڑی بہت نشانیاں مجھے یاد رہ گئی تھیں، وہی ذہن میں رکھ کے میں ایک سڑک سے دوسری سڑک تک پیدل فاصلہ طے کرتا رہا۔ آگے میں نے ٹم ٹم روک لی لیکن مجھے اُلجھن ہونے لگی۔ ہر چوراہے پر راستے کی نشان دہی کرنے میں مجھے دیر لگتی تھی۔ ٹم ٹم والا جلد ہی گھبرا گیا۔ چناں چہ تھوڑی ہی دور جا کے میں اُتر گیا اور اُتر کے مجھے اندازہ ہوا کہ میں تو بے دست و پا ہو گیا تھا۔ میری لگام بھی جیسے کوچوان کے ہاتھ میں تھی۔ پیدل آدمی راستوں میں شامل ہو کے چلتا ہے اور وہی بات تھی کہ پیدل تو میں اپنے ساتھ چل رہا تھا، اپنے آپ سے باتیں کرتا ہوا۔ طرح طرح کے خیال، طرح طرح کے وہم و گمان میرے دماغ میں گردش کر رہے تھے۔ میں نے سوچ لیا تھا، تجمل کی حالت اگر ذرا بھی غیر ہوئی تو میں اُسے فیض آباد جانے کا مشورہ دوں گا۔ وہ یہاں رہا تو کلنتے اُسے ستاتا رہے گا، ستائے گا تو وہاں بھی۔ اُس کا نقش تو تجمل سے مٹائے نہ مٹے گا۔ کلنتے تو اُس کی عادت تھا، اُس کا سایہ۔ کلنتے کو وہ ایسے کس طرح بھول سکتا تھا مگر فیض آباد میں زریں موجود ہے۔ زریں اُسے اچھی طرح سمجھتی ہے۔ کاش وہ اِس وقت یہاں موجود ہوتی۔ اُس کے سامنے تجمل بے بس سا ہو جاتا ہے۔ زریں کے علاوہ وہاں جہاں گیر ہے، نیاں ہے۔ استاد جامو کلکتے سے آ سکتا ہے۔ فیض آباد کے اڈے کے بہت سے لوگ ہیں۔ موت پر عزیز شاید اس لیے اکٹھے ہو جاتے ہیں کہ آدمی کو گداز دیتے رہیں کہ ابھی اور بھی باقی ہیں۔ ایک کے چلے جانے سے سب نہیں مر گئے۔ جگہ کی تبدیلی بھی دوا کا کام کرتی ہے۔ یہاں بمبئی میں بھی کئی گھر ہیں لیکن سفر کا احساس بھی کچھ کم بوجھ نہیں ہوتا۔ آدمی اپنے ٹھکانے ہی پر ٹھیک طرح جسم کھولتا اور پھیلاتا ہے۔

میں خود سے سوال کرتا، خود کو جواب دیتا رہا، لیکن ابھی وہ فیض آباد بھی تو نہیں جا سکتا۔ کوئی بھی اُسے یوں نہیں جانے دے گا، نہ ابا جان، نہ جولین، نہ پیرو۔ اور ابھی تو خانم کا معاملہ بیچ میں ہے۔ کیا ضروری ہے کہ خانم نواب عالم تاب کے چالیسویں کے بعد ہی وہاں سے آئے۔ پہلے بھی تو آ سکتی ہے اور پہلے بھی تو اُس کا دل گھبرا سکتا ہے۔ اس کا مطلب ہے، ہمیں درمیان میں بھی اُس کی خیر خبر رکھنی چاہیے۔ جانے وہ کس حال میں ہو، نواب لوگوں کا کیا بھروسا، ہمارے جانے کے بعد معلوم نہیں اُن کا رویہ کیسا ہو۔ خانم نے وہاں ٹھہر جانے کا فیصلہ کر کے غالباً غلطی ہی کی ہے۔ پتھروں کے دیوانے راجا نواب خانم کو بھی تو اپنا ہدف بنا سکتے ہیں۔ خانم کی شکل میں ہمارا ایک آدمی تو ابھی وہاں موجود ہی ہے۔ ہمارا سراغ لگانے اور ہمارے بارے میں حقائق جاننے کے لیے وہ اُسے مجبور کر سکتے ہیں۔ خانم بہت پختہ کار اور ہوش مند عورت ہے لیکن ایک اکیلی عورت کب تک مزاحمت کرتی رہے گی۔ تجمل، پیرو اور ابا جان نے اس بابت ضرور سوچا ہو گا۔ گو اندر زنان خانے تک باہر کے کسی آدمی کی رسائی ممکن نہیں۔ بڑے نواب کو ہیروں وغیرہ سے ایسی رغبت معلوم نہیں ہوتی۔ ابھی بھائی کا زخم بھی تازہ ہے۔ اُس کی طبیعت ویسے بھی اس حرص و طمع پر مائل نہ ہو گی۔ خانم کے سلسلے میں اتنی مروت تو اُس کے دل میں ہو گی ہی کہ وہ [illegible] کے سرگشتہ سودائی بھائی کی مسیحائی کے لیے اپنا گھر منتشر کر کے آئی ہے۔ اُس کا بھائی نہ رہ سکا مگر اُسے ایک آسودہ موت تو نصیب ہوئی۔ اُس کی روح تو اب ایسی بے چین [illegible] گی۔ خانم پر کسی افتاد کی صورت میں گیتی آرا اور مہ جبیں بھی اُس کی سپر ثابت ہوں گی۔ [illegible] کی موجودگی میں خانم کو محفوظ سمجھنا چاہیے۔ نواب زادی ہونے کے باوجود اُن میں [illegible] ہے، وہ تو خود شیشے کے مانند ہیں، خانم کو تماشا بنتے نہیں دیکھتی رہیں گی۔

ماچھی نے مجھے بتایا تھا کہ حیدرآباد سے ہمارے تعاقب میں سفر کرنے والے [illegible] آدمیوں کو اُس نے پاڑے پر روک کے رکھا ہے۔ وہ پاڑے کی اوپری منزل میں قید ہیں۔ [illegible] چھوڑ دیا جاتا لیکن کلنتے کی موت کے بعد ماچھی نے فیصلہ بدل دیا۔ ماچھی نے کلنتے کی [illegible] پہ عزم کیا تھا کہ اب وہ اُن دونوں کو اُس وقت تک نہیں چھوڑے گا جب تک حیدرآباد [illegible] ابا جان کی حویلی پر حملہ کرنے والوں میں سے ایک ایک کو چن کے ختم نہیں کر دے گا [illegible] کی غضب ناکی کا کلنتے نشانہ بن گیا تھا۔ ماچھی ارادے کا اتنا ہی پکا تھا لیکن ریاست حیدرآباد، شہر جیسلمیر کے رانا مہتاب کی حویلی نہیں ہے جس میں ایک اندھیری رات فصیل پھلانگ کے وہ اور پیرو اندر داخل ہو گئے تھے اور تجمل کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے مہتاب کی آنکھیں نکال لائے تھے۔ حیدرآباد میں قدم قدم پر ایک سے ایک رانا مہتاب [illegible] جیسلمیر سے اُٹھ گئی، دس گنی بڑی سیکڑوں حویلیاں سر اُٹھائے کھڑی ہیں۔ ماچھی کو [illegible] اندازہ تھا کہ حیدرآباد سے ہمارا لوٹ آنا کسی زنداں سے نجات کے برابر ہی نہیں، دوبارہ ملنے کے مترادف بھی ہے۔ پاڑے میں مقید اُن دو آدمیوں نے حجت تمام کرنے کے بعد حشمت جنگ کی طرف اشارہ کیا تھا مگر ابھی تک یہ لازم نہیں ہے کہ ابا جان کی حویلی [illegible] آنے والے مسلح آدمی بھی اُسی کی طرف سے بھیجے گئے ہوں۔ جیسا کہ وہ کہہ رہے تھے، ہے اُن کا مقصد ہمارے تعاقب کے سوا واقعی کچھ اور نہ ہو۔ اُنھیں سرِ دست یہی حکم دیا گیا [illegible] کہ وہ ہمارے بارے میں پورا اطمینان کر کے آ جائیں کہ ہم کون ہیں اور کہاں کے [illegible] رئیس ہیں جو ایک نادر ہیرا کسی جان پہچان، کسی رشتے حوالے کے بغیر ایک نواب کو پیش کر [illegible] ہیں۔ اس جود و سخا کے پیچھے ہمارا کوئی اور مقصد تو نہیں۔ نواب کے معتمدین نے اُسے [illegible] دیا ہو گا کہ از [illegible] بارے میں ضروری معلومات حاصل ہو جائیں تو کسی نازک وقت کام ہی آئیں گی۔ پاڑے میں ہمارے قبضے میں موجود یہ دو آدمی اور ریل میں [illegible] لوش اور اُس کے "خاوند" کا کوئی باہمی ربط ضبط معلوم نہیں ہوتا تھا۔ دونوں نے اپنے آقاؤں کے مختلف نام بتائے تھے۔ اُن بہروپیوں نے نواب قطب الدین کا نام لیا تھا، وہ [illegible] اب بھی ہو سکتا ہے جس نے ابا جان کی حویلی میں نقب زنی کرائی تھی لیکن وہ نواب حشمت جنگ ہی ہے تو بڑے نواب کی حویلی کا زنان خانہ اُس کی دسترس سے دور نہیں۔ پھر تو خانم کا اُس کی زد پر آنا طے ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ خانم ہمارے بارے میں زبان کھولنے کے بجائے موت کو ترجیح دے گی۔

میں نے تمام تنکے، کانٹے اپنے سر سے جھٹک دینے چاہے۔ ہم یہاں بیٹھ کے بھی کیا سکتے ہیں۔ کلنتے کو رخصت ہوئے ابھی پانچواں دن ہے، حیدرآباد سے آئے ہوئے دس دن کے قریب ہو رہے ہیں۔ ان دس دنوں میں فراغت کا کتنا وقت ہمیں ملا ہے۔

شاید وہ خانم کو نہ چھیڑیں، ایک عورت سمجھ کے اُسے معاف کر دیں۔ پہلے نواب حشمت جنگ کو اپنے آدمیوں کی واپسی کا انتظار کرنا چاہیے جو ابھی تک ہماری تحویل میں ہیں۔ اب بہت سوچ سمجھ کے ہی ہمیں حیدرآباد کا رُخ کرنا پڑے گا۔ خانم کے لیے وہاں جانا تو بہر صورت پڑے گا۔ چلتی ریل میں ہم نے جن آدمیوں کو زمین پر اُتار دیا تھا، وہ بھی اب اپنے آقا کے پاس پہنچ چکے ہوں گے۔ اُن کے آقا کو اب پہلے سے زیادہ محتاط ہو جانا چاہیے۔ ہماری طرف سے کسی جوابی اقدام کا خطرہ بھی اپنے سر پر منڈلاتا محسوس کرنا چاہیے۔ گو امکان یہی ہے کہ اُس کے واپس جانے والے نمک خواروں نے اپنی جان کی امان کے لیے اُس پر یہ حقیقت آشکار کرنے سے گریز کیا ہو گا کہ وہ ہمیں اپنے بھیجنے والے کا نام پتہ بتا کے آئے ہیں لیکن اگر اُنھوں نے ریل میں اپنے ساتھ بیتی ہوئی داستان کا ایک حصہ بھی گوش گزار کیا ہے تو باقی سب کچھ جہاں دیدہ نواب قطب الدین کو خود اخذ کر لینا چاہیے کہ ہاتھ میں آ جانے کے بعد ہم نے اُن کے سرغنہ نواب کا پورا نام پتہ، سارا شجرہ جانے بغیر اُنھیں نہیں چھوڑا ہو گا۔ سب کچھ نقش کر لینے کے بعد اُنھیں یوں چھوڑ دینے کی فیاضی سے مراد نواب کے لیے ہماری جانب سے ایک تنبیہ ہی ہونی چاہیے۔ کسی حساس طبع اور نکتہ بین شخص کے لیے ایک جارحانہ تنبیہ۔ سو اگر وہ کوئی قطب الدین علی تھا تو اپنے آدمیوں کی ناکام واپسی اور اُن سے سفر کا ماجرا سُن کے اُس کی نیندیں ضرور اچاٹ ہو گئی ہوں گی۔

میں بہت دور آ چکا تھا۔ نہ وقت کا احساس ہوا، نہ فاصلے کا اور نہ تھکن کا۔ چلتے چلتے شام ہو گئی۔ کئی بار میرے جی میں آئی کہ لوٹ چلوں۔ اندھیرا ہو جانے پر نشانیاں بھی اندھی ہو جائیں گی مگر اتنی دور آ جانے کے بعد واپس جانے کو بھی دل نہیں مانتا تھا۔ شام کے وقت سڑکوں پر بھیڑ بھی بڑھ گئی تھی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ گھوم پھر کے مجھے پھر اُسی جگہ آنا پڑا۔ مغرب کی اذان ہو چکی تھی اور اندھیرا تیزی سے بڑھ رہا تھا لیکن میں اِدھر اُدھر بھٹکتا ہوا کوٹھیوں اور بنگلوں کے ایک علاقے میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اندر گلیوں میں جا کے میری رفتار تیز ہو گئی اور میرا شبہ ہر اگلے قدم پر بڑھتا گیا کہ اب پیرو کا مکان دور نہیں ہے۔ پندرہ منٹ اردگرد کی گلیوں کے چکر کاٹنے کے بعد آخر میں اُس کے مکان کے سامنے پہنچ گیا۔ جانے کیوں مجھے کوئی بڑی منزل سر کر لینے کا سا سکون ملا۔ میں اگر پرسوں ہی پیرو سے پتہ پوچھ لیتا تو یہ دشواری پیش نہ آتی۔ دروازے پر ایک مستعد دربان موجود تھا۔ پچاس سے نیچے کا، گٹھے ہوئے جسم کا ایک پستہ قد آدمی۔ وہ سر سے پیر تک متجسس نظروں سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے دھڑکتی آواز میں اُسے بتایا کہ مجھے پیرو دادا سے ملنا ہے۔

"ابھی کیدر سے آیا ہے صاحب؟" وہ کھردرے لہجے میں بولا۔

"اندر جا کے بولو کہ راجا آیا ہے۔" میں نے اُس کی ترش نگاہی نظر انداز کر دی۔ نئے آدمی کے لیے اُس کا رویہ یہی ہونا چاہیے تھا۔

مجھے ٹھہرا کے وہ اندر چلا گیا لیکن دروازہ جیسے ہی کھلا، کاریڈور کے ساتھ بنے ہوئے چبوترے پر کھڑی ہوئی لڑکی نے مجھے دیکھ لیا۔ "کون ہے؟ کون ہے؟" اُس نے بے تابانہ اپنی طرف بڑھتے ہوئے دربان سے پوچھا۔ دربان نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ اُس کی نظر مجھ پر پڑی۔ پہلے تو اُس کی آنکھیں سمٹتی پھیلتی رہیں، پھر ایک دم وہ چبوترے سے کود پڑی۔ "ارے آپ!" اُس نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ "آپ کب آئے؟"

وہ گیتا تھی۔ اُسے پہچاننے میں مجھے چند لمحوں کا تامل ہوا۔ وہ خاصی بدلی ہوئی تھی۔ پہلے سے بڑی معلوم ہو رہی تھی۔ لمبی اور تیکھی۔ اتنا بڑا عرصہ درمیان میں نہیں گزرا تھا جتنا اُس کے سراپے سے لگ رہا تھا۔ رنگت بھی بدل گئی تھی۔ بادامی رنگ اور گہرا ہو گیا تھا جیسے اُس میں سونا مل گیا ہو۔ لمبی پلکیں، متجسس شربتی آنکھیں، ترشے ہوئے رسیلے ہونٹ۔ لمبی سی چٹیا کمر پہ لٹک رہی تھی۔ پیازی رنگ کی ساڑی اور ساڑی پر عنابی واسکٹ پہنے وہ سراپا ایک اور لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ ایک مضطرب اور اپنے آپ سے بے خبر سی لڑکی۔ تیور میں اضطراب آمیز شائستگی، نفاست آمیز اضطراب۔ مجھے دیکھ کے اُس کا وہی حال ہوا جو کسی بہت قریبی عزیز کی اچانک آمد پر ہو سکتا ہے۔ میرے آنے کا جیسے اُسے یقین نہ آ رہا ہو اور میرے آنے کی خوشی کے اظہار کا طریقہ سمجھ میں نہ آ رہا ہو۔ نظر آ رہا تھا کہ پیرو اُسے مسلسل میرے بارے میں بتاتا رہا ہے۔ وہ باہر ہی سے چلّانے لگی۔ "پاپا! پاپا! دیکھیے کون آیا ہے۔" اور مجھے وہیں چھوڑ کے وہ سرپٹ اندر کی طرف لپکی۔ پھر اُسے کچھ خیال آیا، فوراً پلٹ پڑی۔ "آئیے، آئیے، اندر آئیے۔"

میں نے اندر جانے والے راستے کی طرف قدم بڑھایا تھا کہ اُس نے بے چینی سے پوچھا۔ "اکیلے آئے ہیں؟"

مجھے ایک لحظے کو تعجب ہوا لیکن پھر میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ پیرو نے فرخ، فریال کے بارے میں اُسے بتایا ہو گا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ابھی تو صرف میں ہی....."

اُس نے [illegible] بات پوری نہ ہونے دی۔ "سویرے سے میں سوچ رہی تھی، شاید آج آپ آ جائیں۔" وہ چہکتی آواز میں بولی۔ "آپ ٹھیک تو ہیں؟"

"ہاں ہاں، بالکل ٹھیک۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "کیا میں کچھ بدلا ہوا لگ رہا ہوں؟"

"نہیں، بالکل وہی۔ آپ میں تو کوئی فرق نہیں آیا۔"

"تم کیسی ہو؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ جلدی سے بولی۔

"اور ممی، ممی کیسی ہیں؟"

اُن کی طبیعت اچھی نہیں تھی لیکن اب پہلے سے بہت [illegible]۔" اُس کی آواز چہک رہی تھی۔

"پیرو بھائی کے آنے سے تو تم بہت خوش ہو گی۔"

اُس کی آنکھیں مچ گئیں۔ "پاپا!" وہ سرشاری سے بولی۔ "پاپا جب سے آئے ہیں، لگتا ہے یہ گھر زندہ ہو گیا ہے۔ اب کے اُنھوں نے دن بھی تو بہت لگا دیے تھے۔"

جیل میں پیرو کو کبھی اتنے دن نہیں لگے ہوں گے۔ میں نے سوچا اُس سے کہوں کہ اس سے پہلے پیرو کو تبت اور حیدرآباد جیسی بڑی جیلوں سے واسطہ بھی کب پڑا تھا۔

گیتا کی آواز اندر پہنچ گئی تھی۔ اندر سے تیز قدموں کی آہٹیں سنائی دیں۔ دوسرے ہی لمحے پیرو میرے سامنے تھا۔ "ہائیں راجا!" وہ اچھل کے بولا۔ "تم کیسا! ابھی کیدر سے آ گیا۔" اُس نے پوری طاقت سے مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور زمین سے اُٹھا کے گھومنے لگا۔ گیتا کھل کھلا کے ہنس پڑی۔ "کیسا ہے ابھی، سب ٹھیک تو ہے نا؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "چلو چلو، اندر چلو۔" وہ مضطرب لہجے میں بولا اور وہیں سے آوازیں لگانے لگا۔ "اے تھل بھائی! تھل بھائی! پتہ ہے کون آیا ہے ایدر، اپنا راجا آیا ہے۔"

میری کمر میں ہاتھ ڈال کے تقریباً دھکیلتا ہوا وہ ایک کشادہ اور روشن کمرے میں لے آیا۔ سامنے چوکی پر تھل گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز تھا۔ مجھے دیکھ کے وہ سیدھا ہو کے بیٹھ گیا اور اُس کے چہرے پر روشنی سی بکھر گئی لیکن روشنی میں تو خال و خط اور نمایاں ہو جاتے ہیں۔ صاف لگتا تھا کہ یہ بجھی بجھی روشنی ہے، اندر جسم میں بہت اندھیرا بھرا ہوا ہے۔ کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس وقت کمرے میں اُس کے یوں پڑے رہنے سے سب ظاہر تھا۔ میں اُس کے پاس جا کے خاموشی سے بیٹھ گیا۔ "کیسے آ گیا رے؟" اُس نے ٹھہری ہوئی آواز میں پوچھا۔

"بس آ گیا، راستہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے۔"

"دادا دوپہر جانے کو بولتے تھے، پر سوچا، اب سویرے ہی نکلیں گے۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ میں جو سوچ کے آیا تھا، ارادہ کرتے کرتے رہ گیا۔ یہ گھر بھی زریں کی حویلی سے کیا کم تھا۔ میری طرح گیتا تھل کے بائیں جانب اُس کے پہلو سے لگ کے بیٹھ گئی تھی، کسی بچی کے مانند جو ٹکر ٹکر دیکھتی بڑوں کی باتیں سنتی رہتی ہے۔ تھوڑی دیر میں پیرو کی بیوی رانی بھی آ گئی۔ اپنے گھر میں آدمی کو اس سے زیادہ کون سی کشادگی اور طمانیت مل سکتی ہے جو یہاں انہیں بھی معلوم ہوتا تھا، تھل یہاں عرصے سے مقیم ہے۔ مجھ سے پھر یہ بھی نہ کہا گیا کہ فرخ، فریال نے صبح چلتے وقت اصرار کیا تھا کہ میں تھل کو گھر ہی لے آؤں۔ ابا جان نے بھی یہی خواہش ظاہر کی تھی۔ یہاں گیتا اور اُس کی ماں کسی طور فرخ، فریال اور جولین سے کم اُس کی نگہدار نہیں تھیں۔ پیرو کی بیوی رانی کی نگاہوں میں تھل کے لیے وہی عزت اور پذیرائی تھی جو کسی آنکھ میں ممکن ہے۔ پیرو کو ان دو دنوں میں کتنا وقت ملا ہوگا۔ ظاہر ہے، یہ وابستگی صرف دو دنوں کی تاکید و تلقین کا حاصل نہیں تھی۔ تبت کے سفر کے لیے تھل کی طلبی پر کلکتہ آنے سے پہلے ہی پیرو نے ہمارے بارے میں اُن سے بہت کچھ کہا ہوگا، کہتا رہا ہوگا۔

پیرو کی بیوی رانی، جسے تھل کو بھابی جی کے لقب سے مخاطب کرتے سن کر میں نے بھی یہی کہنا شروع کیا تھا، مجھ سے فرخ، فریال کے متعلق پوچھنے لگی اور وہی سوال کیا جو جولین نے مجھ سے کیا تھا کہ اتنے زمانے بعد اُن سے مل کے مجھے کیسا لگا۔ میں نے اُسے بتایا کہ ابھی میں اُن سے پوری طرح ملا ہی کہاں ہوں۔ کانتے نے مہلت ہی نہیں دی۔ موت تو وہ ساتھ لے کے آیا تھا۔ اس پہلی رات کے سوا اُن سے ٹھکانے سے بات ہی کتنی ہو پائی ہے۔ کانتے کے نام پر وہ افسردہ ہو گئی اور خاموش بھی۔ پیرو اور اُس کی بیوی کے درمیان دوستوں کا سا تعلق تھا۔ لگتا تھا، پیرو اُس سے کچھ چھپاتا نہیں ہے۔ سبھی کچھ شاید اُسے معلوم تھا لیکن گیتا کے چہرے کی سادگی بتا رہی تھی کہ وہ بہت سی باتوں سے بے خبر ہے۔ اُسے نہیں معلوم کہ اُس کا باپ بمبئی کے کتنے پاڑوں کا دادا ہے اور پاڑا کیا، پاڑے کا دادا کون ہوتا ہے۔ اُسے کوئی بتاتا تو پھر وہ ضرور پوچھتی کہ آخر اُس کے باپ کو پاڑے کی ایسی کیا ضرورت ہے۔ یہ حویلی تو نہیں تھی لیکن اس گھر میں سبھی کچھ تھا، کـ اور ہوادار کمرے، باغیچہ، طرح طرح کا ساز و سامان، آرائش کی چیزیں، کھڑکیوں اور درو پر رنگ برنگے پردے، فرشی نشست کا ایک کمرہ، ایک کمرے میں صوفے، کرسیاں اور ر کی میز لگی ہوئی۔ جگہ جگہ گل دان، بے داغ دیواریں، خدمت گار، ایک باوقار، معاملہ فہم پڑھی لکھی بیوی۔ ٹھیر ٹھیر کے بات کرنے والی آواز میں گونج، لہجے میں گداز، چہرے تـ نگار، شہابی رنگ، اُجلی اُجلی سی، اپنے نام کی نسبت سے وہ کسی رانی ہی کی طرح تھی۔ اور ا بیٹی، چینی کی کسی بڑی گڑیا سے مشابہ، چابی کے بغیر تھرکتی، پھرکتی ہوئی گڑیا، پھولوں کی نازک، شیشے کی طرح صاف و شفاف جیسے ریشم سے اور روشنی سے بنی ہو۔ کسی گھر میں ا زیادہ اور کیا ہونا چاہیے۔ ان سب کے ہوتے پیرو کو پاڑے کی کیا ضرورت ہے۔ پاڑے اور ا گھر میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ پیرو کو یہاں آ کے تو بہت مشکل پیش آتی ہوگی یا پھر پا میں جا کے۔ یہاں تو ریشم ہی ریشم ہے۔ پاڑے میں ہر طرف خنجر تنے رہتے ہیں، لا بلم۔ کسی دادا کی زندگی اور موت کے درمیان بس ایک چاقو کا فاصلہ ہوتا ہے۔ میں نے کبھی پیرو سے بات کروں گا، وہ پاڑے کیوں جاتا ہے۔ اگر پاڑے سے مراد گھر چلانے کے کسی معقول آمدنی کا حصول ہے تو پیرو تو بہت کچھ کر سکتا ہے۔ اُس کے بازوؤں میں طا ہے، اُس کی آنکھیں بینائی سے بھری ہوئی ہیں اور اُس کے کان دور افتادہ آوازیں ا کھینچ لینے پر قادر ہیں۔ اگر ایسا ہے تو میرے پاس کرشنا جی کی چھوڑی ہوئی بہت رقم پڑی ہے۔ آٹھ لاکھ روپے کے بہ قدر۔ اب تک تو بینک میں رکھے رکھے اور بڑھ گئی۔ وہ میری رقم ہے۔ اگر پیرو مجھ پر اپنا حق سمجھتا ہے تو اُسے انکار نہیں کرنا چاہیے مگر بات نہیں تھی۔ ایک بار کوئی پاڑے سے وابستہ ہو جاتا ہے تو پاڑا اُسے مشکل سے چھو پاڑا آدمی میں رچ سا جاتا ہے۔ پیرو کی وابستگی تو ابتدا سے ہے اور یہ بات تو کتنی اُس کی بیوی رانی نے بھی کہی ہوگی۔ معلوم نہیں، پیرو اُسے کیا جواب دیتا رہا ہے۔ ایک میں بھی اُس سے پوچھوں گا ضرور۔ ممکن ہے، پیرو کے پاس کوئی بہت بڑا جواز ہو سمجھ سے بالاتر ہے۔

گیتا مجھے اپنی مختصر سی مطالعہ گاہ میں لے گئی۔ جہاں نصاب کی کتابوں علاوہ سو ڈیڑھ سو کے قریب انگریزی ناول الماری میں سجے ہوئے تھے۔ ایک کونے طبلہ رکھا تھا اور ہارمونیم بھی اور میز پر طرح طرح کی بانسریاں۔ میرے پوچھنے پر اُس شرمیلی آنکھوں سے بتایا کہ اُسے رقص اور موسیقی کا شوق ہوا تھا۔ باقاعدہ ایک اُ سکھانے آتے تھے کئی ماہ کی تربیت کے بعد اُستاد کا کہیں تبادلہ ہو گیا۔ دوبارہ اُ کا اُستاد نہ مل سکا۔ پھر اس کا شوق ماند پڑ گیا۔ کبھی کبھی اُس کے بـ وہ خود ہی الٹا سیدھا بجا لیتی ہے۔ اُن تینوں کا بس نہیں چل رہا تھا میرے لیے کیا کریں۔ رات کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ سب نے مل ہی کھانا کھایا اور پیرو مجھے بتاتا رہا کہ گیتا کی ماں نے کیا پکایا ہے اور گیتا نے کیا۔ پیرو کی بیوی مجھ سے پوچھنے لگی کہ مجھے کون سے کھانے سے زیادہ پسند ہیں۔ بے اختیار میں تھل کی طرف دیکھ کے کہا۔ "پتلی دال اور خشکا۔" جیل کے سات سالوں میں بیشتر یہو

ری تھی میرے جواب پر وہ معنی خیزی سے مسکرائی۔ وہ سمجھ گئی ہوگی کہ میری مراد کیا ہے۔ البتہ باتیں پٹ پٹاتی رہی۔ دس بجے کے قریب میں نے اُٹھنے کا ارادہ کیا تو وہ دونوں مجھے ے تھیں۔ میرا تو بھی جی نہیں چاہتا تھا۔ تھل کی حالت پہلے سے کچھ بہتر معلوم ہو رہی تھی۔ میرے آنے کا بھی کچھ اثر ہوگا مگر پیرو نے تاکیداً مجھے اُٹھا دیا کہ میرے نہ جانے سے جان پریشان ہوں گے۔

وہ تینوں مجھے چھوڑنے کے لیے گھر سے نکل آئے۔ گلیاں سنسان پڑی تھیں۔ توں کی وجہ سے کھمبوں کی روشنی چھلتی ہوئی سڑک پر پڑ رہی تھی۔ کچھ آگے جا کے ہمیں ہی لوگ ٹہلتے نظر آئے، خوش پوش لوگ۔ وہ رات کے کھانے کے بعد چہل قدمی کر رہے اس علاقے میں ہر سو سکون ہی سکون تھا۔ سارے کا سارا علاقہ کسی جنگل کے مانند تھا۔ جنگل کے بیچ میں مکانات بنا لیے گئے ہوں اور آنے جانے کے راستے۔ ہم مختلف گلیوں گزر کے خاص سڑک پر آ گئے۔ راستے میں فرخ فریال کے بارے میں گیتا اشتیاق آمیز ے میں بولی۔ "اُن سب کو بھی یہاں لائیے گا۔"

"کیوں نہیں، ضرور، وہ آتی رہیں گی۔"

"ابھی تھی اُس کے پاس کیوں نہ چلا جائے۔"

"مگر جب آپ لے جائیں گے تبھی......"

"تم راجا کے ساتھ جا سکتا ہے۔" پیرو نے کہا اور مجھ سے مخاطب ہو کے بولا۔ "راجا! بھی اس کو اُودر لے جا۔"

"اِس وقت؟" گیتا نے تذبذب سے کہا۔

"اِس وقت میں کیا جاتا ہے۔ ابھی دو تین روز بیٹا لوگ کے ساتھ ہی رہنا وہ سیتر اور برابہن بھائی ہے۔ تم اکیلا ہونے کا بہت بولتا تھا ایدر۔ ابھی تم کبھی بھی اکیلا نہیں وے گا۔ اپن باہر سے نیک کے لیے کیسا کانچ کا مانک، پھول کا مانک لوگ لایا ہے کہ یکھے گا تو بولے گا پاپا! اپن کو اودر ہی اُن لوگ کے پاس رہنے کا ہے۔ دیکھے گا تو دیکھتا جائے گا۔ راجا سیدھا اُودر ہی جا رہا ہے۔ جانا ہے تو ابھی چلے جانے کا ہے۔ کیوں راجا؟"

"ہاں دادا!" میں نے اُس کی ہم نوائی کی کوشش کی۔ "چلو، ضرور چلو۔ یہ تو بت اچھی بات ہوگی، سب خوش ہو جائیں گی۔"

"مگر رات بہت ہو گئی ہے۔" پیرو کی بیوی نرمی سے بولی۔

"رات بہت ہو گئی ہے۔" پیرو کی بیوی نرمی سے بولی۔

"رات بہت ہو گیا ہے۔ ابھی راجا جو ساتھ ہے، راجا اکھا شیر ہے۔" پیرو نے نے کہا۔ "پتہ ہے، راجا کون ہے؟"

"وہ لوگ اب سو گئے ہوں گے۔"

"اُودر اپنا گھر ہے رانی!" پیرو ٹھنک کے بولا۔ "دیکھنا ایدر راجا کا چاپ سنے گا بھاگ پڑے گا۔" مگر پیرو کچھ توقف کے بعد خود ہی ہنس کے کہنے لگا۔ "ٹھیک ہے، ابھی بے اپن لے ساتھ چلنا۔ اپن سمجھ گیا۔ ابھی پہلی بار جا رہا ہے، ایسا تھوڑا چلا جائے گا۔"

پیرو کے پاس شاید موٹر نہیں تھی۔ میں نے بھی نہیں پوچھا، ہوتی تو وہ اُسی میں مجھے پہنچا کے آتا۔ ہمیں گلی کے نکڑ پر کھڑے ہوئے چند منٹ گزرے ہوں گے کہ سواری مل گئی۔ میں پیچھے مڑ کے دیکھتا رہا، جب تک گاڑی نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی، تینوں وہیں کھڑے رہے۔ میں پاڑے پہنچا تو ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ جمروشامو اور مارٹی کو ساتھ لے کے میں گھر آ گیا۔

دوسرے دن اوّل وقت میں تھل اور پیرو کے ساتھ گیتا اور اُس کی ماں گھر آ گئی تھیں۔ وہ آئیں تو مارٹی، جولین، شہ پارہ اور چمپا بیگم کو بھی باندرے سے لے آئیں۔

کانتے کے دسویں پر ابا جان نے مارٹی اور ڈنگو کے توسط سے بہت سی دیگیں پکوا کر غریبوں میں تقسیم کرائیں۔ اس کے ایک دن بعد ابا جان نے ایک بڑی سی سیاہ موٹر خرید لی تھی، تقریباً نئی موٹر۔ انھوں نے کہیں سے ایک کہنہ مشق ڈرائیور بھی ڈھونڈ لیا تھا۔

اُس روز کانتے کو گزرے پندرہ دن ہو گئے تھے۔ تھل اور پیرو ابا جان کے گھر میں تھے۔ تھل تو پہلے ہی سے تھا، پیرو کو بطورِ خاص ابا جان نے بلوایا تھا۔ کمرے میں اُس وقت نہ منیر علی تھے، نہ مولوی اکرم۔ ابا جان نے بوجھل آواز میں تھل اور پیرو کو مخاطب کر کے کہا کہ "میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

دونوں ہمہ تن گوش ہو گئے۔ مجھے بھی بے چینی ہونے لگی کہ ابا جان آخر ایسی کون سی بات کہنا چاہتے ہیں جو اُن کے لب و لہجہ پر اتنی سنجیدگی طاری ہے۔ "دیکھیے، میری بات توجہ سے سنیے۔" ابا جان نے کہا۔ "ممکن ہے، ابھی یہ سب قبل از وقت معلوم ہو اور آپ کو گراں گزرے لیکن زندگی تو رواں دواں رہتی ہے۔ بے شک کانتے کے جانے سے سب کچھ اُجڑا ہوا لگتا ہے۔ دل کا وہ عالم نہیں رہا۔ زندگی بہت بے اعتبار ہے اور اب اور بھی بے اعتبار معلوم ہوتی ہے۔ شاید یہی ٹھیک ہے کہ ہر شخص کے دن طے کر دیے گئے ہیں اور ہمارے پاس صبر و شکر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔" ابا جان نے چند لمحوں کے لیے تامل کیا اور سر جھکائے اٹکتی آواز میں بولے۔ "پھر وقت ملے نہ ملے، یا کب ملے اور کتنا ملے۔ میں جو بات آپ سے کہنا چاہتا ہوں، وہ نئی نہیں ہے۔ فیض آباد میں بھی میں نے آپ سے درخواست کی تھی اور آپ نے صاف جواب دے دیا تھا۔ میری التجا ہے کہ آپ اس پر نظرِ ثانی کریں۔"

"اپن سمجھ گیا بڑے صاحب! اچھا ہے، ابھی آگے نہ بولو۔" پیرو نے بے تابی سے کہا۔ "اپن سے ایسا......"

ابا جان نے ہاتھ اُٹھا کے اُسے روک دیا۔ "دیکھیے یہ سب بہت ہے، بے اندازہ، میرے آپ کے تصور سے زیادہ۔ یہ میری ضروریات اور خواہشوں سے کہیں بڑھ کے ہے۔ اس سے زیادہ آدمی اور کیا ہوس کر سکتا ہے۔ آپ مجھے اپنا بزرگ سمجھتے ہیں اور میری خوشی کو بہرحال مقدم سمجھتے ہیں۔ سمجھ لیجیے، میری خوشی اسی میں ہے کہ آپ بھی اس میں شریک ہوں۔"

پیرو کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ابا جان نے کہا۔ "میری بات پہلے پوری طرح سن لیجیے، تسلی سے۔"

"ہاں سن رہے ہیں بابا!" تجمل بدبداتے ہوئے بولا۔

"لیکن غور بھی کیجیے گا اور فوراً جواب دیجیے گا۔" اباجان نے تجمل کے لہجے پر توجہ نہیں دی اور نرمی سے کہا۔ "میں اکیلا اسے صَرف نہیں کر سکتا۔ روپیہ پیسہ تو کس لیے ہے۔ آدمی کے لیے ہوتا ہے۔ آدمی کو اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ اچھی زندگی گزارنے کے لیے اور اچھی زندگی گزارنے کی تمنا کوئی بُری بات نہیں ہے۔ میرے پاس بظاہر زندگی زیادہ نہیں رہ گئی ہے۔ یہ باقی وقت میں سکون اور آرام سے گزارنا چاہتا ہوں اور سمجھتا ہوں اتنی لمبی مسافت کے بعد میری یہ خواہش بے جا نہیں ہے۔"

"بالکل نئیں ہے۔" پیرو نے کہا۔ "اپن تو آپ کو خود ایسا بولنے کا تھا۔ کیوں تجمل بھائی؟"

"لیکن ایک بزرگ کی حیثیت سے، اُس حیثیت سے جو آپ نے مجھے دی ہے، میرا فرض ہے کہ میرے متعلقین میرے پوچھنے والے بھی اپنی زندگیاں عزت مندانہ طور پر بسر کریں۔ اپنی مرضی کی زندگی۔ یقین کیجیے! ایسی کوئی بات ذہن میں نہیں ہے۔ ایسا کوئی بل کہ یہ آپ کا کوئی اجر ہے۔ اس کے حصول میں چونکہ آپ برابر کے شریک رہے ہیں۔ سچ پوچھیے تو اس کا اجر ہو ہی نہیں سکتا۔ اس بے جگری اور جذبے کے اجر کے لیے یہ سب بھی بہت تھوڑا ہے۔ اسے کوئی بدگمانی مت سمجھیے۔ آپ تو منع ہی کر چکے ہیں اور فرض کیجیے کہ فی الواقعی میرے دماغ کے کسی گوشے میں یہ وہم چھپا ہے کہ دولت جتنی اچھی چیز ہے اُتنی بُری بھی ہے، آدمی کو آدمی سے جُدا کر دیتی ہے سو عقل و فہم کا تقاضا یہی ہے کہ حساب صاف رکھا جائے۔ خدا گواہ ہے، ایسی کوئی کھٹک دل میں نہیں ہے لیکن اگر ہے تو کوئی غلط بھی نہیں ہے۔ اسے نیک نیتی بھی سمجھا جاتا ہے، تیر اندیشی اور میں دلیل کے طور پر یہی کر سکتا ہوں کہ سب آپ کے سامنے پیش کر دوں کہ آپ جو چاہیں اُٹھا لیں اور جو چاہیں مجھے دے دیں۔ اللہ جانتا ہے کہ مجھے کوئی ملال نہ ہوگا، اگر میرے لیے کچھ بھی باقی نہ بچے۔" اباجان کی آواز بھرّانے لگی تھی۔ "سمجھ رہے ہیں آپ؟"

"اپن کا سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا۔" پیرو تمتماتے لہجے میں بولا۔ "اپن کو اس کا کوئی ضرورت نئیں ہے۔ اپن اُودر پہاڑ کا طرف اس لیے نئیں گیا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"اپن آپ کے لیے گیا تھا، اپن کا راجا کے لیے۔"

"یہ بھی میں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"پھر اپن ابھی کیدھر کا ساجھے دار بن گیا۔ اپن نے تو سپن میں بھی ایسا کبھی نئیں سوچا۔"

"میرے ساتھ بھی کچھ یہی ہوا تھا۔"

"آپ کو مل گیا تو سمجھو اپن کو مل گیا۔ اپن کا مارا ماری تھوڑا کام آگیا۔ آپ کا پاس ہے تو اپن کے پاس ہے بابا! اپن کیا پھر ایدر آپ کے ساتھ نئیں رہنے کا؟"

"ہمیشہ کے لیے۔" اباجان نے جلدی سے کہا۔ "لیکن میری بات پر شاید آپ نے توجہ نہیں دی۔"

"ہم لوگ کیا اُٹھ کے چلے جائیں بڑے صاحب؟" بہت دیر بعد تجمل نے زبان کھولی۔ اُس کی آواز تڑخ رہی تھی۔

"نہیں نہیں آپ کوئی غلط، غلط ...."

"خدا کے لیے اب آپ کچھ نہ بولیے۔" میں نے مضطرب لہجے میں کہا۔ بہت ضبط کیا لیکن مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔

اباجان کی بے چین نظریں مجھ پر مرکوز ہو گئیں پھر اُنھوں نے اپنے ہی رکھے۔ دیر تک کمرے میں وحشت انگیز خاموشی طاری رہی مگر اچھا ہوا کہ نے پھر کچھ نہیں کہا اور شاید یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ اباجان اُٹھ کے نہیں گئے بیٹھے رہے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد پیرو واپس جانا چاہتا تھا کہ اباجان نے لیا۔ "آپ کو کہیں لے جانا ہے۔" اُنھوں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "کوئی ضروری تو ابھی ٹھہر جائیے۔"

"حکم کرو بابا! کیدر کو جانا ہے۔" پیرو مستعدی سے بولا۔

"باندرے میں، میں نے ایک مکان دیکھا ہے۔ آپ لوگوں کو دکھا

"ضرور ضرور، کیسا مکان ہے؟"

"شاید پسند آئے۔"

پیرو نے فرخ سے پان کی فرمائش کی تھی۔ اس وجہ سے کچھ دیر کی موٹر باہر موجود تھی۔ ڈرائیور ایک آواز پر کہیں سے نمودار ہو گیا۔ ان چلا سے موٹر آئی تھی، میں پہلی بار اُس میں بیٹھ رہا تھا۔ ڈرائیور نے ہمیں ہمیں اُس مکان کے سامنے پہنچا دیا جو اباجان کے بہ قول اُنھوں نے پسند یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی کائی زدہ چار دیواری کی وجہ سے اندر عمارت کے آثار نظر نہیں آتے تھے لیکن جیسے ہی موٹر باوردی چوکی دار رنگ کا آہنی دروازہ کھولا اور موٹر اندر داخل ہوئی سبھی دیکھتے رہ گئے۔ اندر طرف پھیلے ہوئے سبزہ زار میں جدید طرز کی ایک کوٹھی کھڑی تھی۔ ایک دروپرت عمارت نئے رنگ و روغن سے آراستہ ویسے بھی پرانی معلوم نہیں ہوتی ماہر عمارت ساز نے دس خاکے بنائے بگاڑے ہوں گے تو یہ نقشہ بنا ہوگا۔ پر اندازہ ہوا کہ عمارت کے ایک دوسرے سے پیوست کئی حصے ہیں۔ اندر آنے جا کئی راستے، اندر باہر الگ الگ زینے۔ ایک کمرے کے بعد دوسرا کمرہ اور کمرہ سلسلہ، ہال، مردانہ اور زنانہ حصے۔ عقبی باغیچہ، ایک جانب چھوٹا سا باغ اور حوض میں سنگِ مرمر کا فوارہ، ایک طرف کھنچی ہوئی دیوار کے پیچھے ملازموں کاٹھ کباڑ کے لیے گودام، ٹم ٹم اور موٹر کھڑی ہونے کی جگہ۔ ساری عمارت تھی لیکن بھاری قسم کا فرنیچر موجود تھا۔ کئی کمروں میں بچھے ہوئے قالین بھی گئے تھے۔ ہال میں ایک بڑا فانوس بھی چھت سے لٹک رہا تھا۔ یہ اباجان کی عمارت تو نہیں تھی، نہ اس کا رقبہ اتنا لمبا چوڑا تھا لیکن بمبئی کے مکانات بڑی بھی بمبئی میں ایسے مکانات کی تعداد کم ہی ہوگی۔

"یہ تو کسی نواب راجا لوگ کا ہی ہو سکتا ہے۔" پیرو نے ساری عمارت دیکھنے کے اباجان سے کہا۔

"سارے نواب راجا پیسے کے نواب راجا ہوتے ہیں آسمان سے نہیں اُترتے۔" ان کے لہجے میں ترشی موجود تھی۔ اُنھوں نے تجمل سے پوچھا۔ "کیوں کیسی ہے؟"

"اچھی جگہ ہے بڑے صاحب!" تجمل نے سر ہلا کے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے اور قیمت بھی زیادہ نہیں۔"

کسی نے اُن سے قیمت نہیں پوچھی۔ معلوم ہوتا تھا، اباجان یہاں پہلے بھی بار آ چکے ہیں۔ عمارت میں موجود ملازم انھیں تعظیم دے رہے تھے اور اُن کی ہدایت روانے کھولتے جاتے تھے۔ "یہاں اچھی خاصی گنجائش ہے۔" اباجان نے کہا۔ "گو پوری طرح میرے تصور کے مطابق نہیں ہے لیکن سردست گزارا کیا جا سکتا ہے۔ اور دیکھ لیں گے۔"

"ابھی اور کیا دیکھے گا بابا!" پیرو تذبذب سے بولا۔

"جی چاہتا ہے ایک ایسا گھر ہے جس میں سب آرام و سکون سے سما سکیں۔" اباجان نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔ "خاندان بھی تو چھوٹا نہیں ہے۔ سب مجھے بڑے کا رتبہ دیتے ہیں تو میرا بھی کچھ فرض ہے۔"

"جی جی۔" پیرو اُن کی طرف تعجب سے دیکھنے لگا۔

"اس مکان کی خصوصیت یہ ہے کہ مختلف خاندان ایک چھت کے نیچے ایک ساتھ رہنے کے باوجود اپنی اپنی پردہ داریاں بھی قائم رکھ سکتے ہیں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ سب ایک دوسرے کے قریب آنے کے آرزومند ہیں، ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہونے کے۔ فیض آباد میں زریں بیٹی کے ہاں جا کے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ ممکن ہے۔ یہی کچھ دیکھ کے میں نے ایک ایسے مکان کی تلاش شروع کی تھی جو سب کا گھر ہو۔ گیتا اور اس کی ماں سے مل کے میرے ارادے کو اور تقویت ملی۔ بہرحال یہ سب بعد کی باتیں ہیں، دیکھیے آگے کیا ہوتا ہے۔"

"گیتا تو گھر لوٹنے کو نئیں بولتا تھا۔" پیرو نے ہنس کے کہا۔ "اُس کا ماں بھی اپن اور زانے کو ٹوکتا ہے۔ بولتا ہے ابھی اپن کو کیسا پلا پلایا بیٹا بیٹیاں مل گیا ہے۔ ابھی سب مل گیا ہے۔ اپن بولا، ابھی تم دیکھا کیا ہے، ابھی تم اُودر فیض آباد کیدر گیا ہے۔"

"آپ کہیں تو پھر سودا کر لوں؟"

پیرو اُن کی تائید ہی کر سکتا تھا۔ تردید کے لیے اُس کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی، نہ تجمل کے پاس، نہ میرے پاس۔ جہاں روپے پیسے میں کاوٹ نہ ہو وہاں پھر اور سوچنے سمجھنے کا مشورہ بھی کیسے دیا جا سکتا ہے۔ اباجان کے ہاں ویسے بھی اثبات ہی اثبات تھا۔ کسی کو اس میں کیا کلام ہو سکتا تھا۔ اب میری سمجھ میں آرہا تھا کہ یہاں آنے سے پہلے اُنھوں نے اُن دونوں سے مال و زر کا ذکر کیوں کیا تھا۔ عندیہ لینا مقصود تھا یا جواز پیدا کرنا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اتنے عرصے میں اُنھوں نے بہت کچھ دیکھا اور جانا بوجھا ہے مگر تب سے یہاں تک اتنے دن ساتھ رہ کے اُنھوں نے کتنا دیکھا اور جانا بوجھا تھا جو دوبارہ اُنھوں نے یہ ذکر کرنا ضروری سمجھا۔ بہرحال یہ بھی طے ہو گیا تھا کہ وہ فیض آباد جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے، یہیں بمبئی میں قیام کا ارادہ ہے۔ میں اُن سے اس سلسلے میں بات کرنا چاہتا تھا اور کسی اچھے موقع کا منتظر تھا لیکن اب شاید یہ بعد از وقت تھا۔ ٹھیک ہی ہوا جو میں نے اُن سے کچھ نہیں کہا۔ اپنی کوئی رائے اُن پر نہیں تھوپی۔ زریں کا خیال مجھے خود رکھنا تھا اور تجمل کی موجودگی میں میری بھی کیا ضرورت تھی۔

تجمل کو اُنھوں نے نہیں جانے دیا۔ میں شام کو پیرو کے ساتھ پاڑے آگیا۔ پاڑے میں خلافِ معمول بڑا مجمع لگا ہوا تھا اور پیرو کا شدت سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ اندھیری کے دادا راجن کے پاڑے پر پولیس نے چھاپا مار کے راجن کو گرفتار کر لیا تھا۔ . . فوراً ضمانت کا انتظام کرنے کو کہا تھا لیکن جارجی نے . . . بتایا کہ راجن پر علاقے کی ایک عورت کو قتل کرنے کا الزام ہے۔ جارجی کہہ رہا تھا، اتفاق سے وہ اُس عورت کو جانتا ہے۔ وہ فارس روڈ کی ایک مشہور طوائف کامنی ہے۔ راجن نے اُسے مستقلاً اپنے لیے وقف کر لیا تھا اور اُس کا سارا خرچ وہی چلاتا تھا۔ اُسے ایک گھر بھی لے کے دیا تھا۔ جارجی نے بتایا، اُسے معلوم ہے کامنی صرف اُس کی ہو کے نہیں رہی۔ راجن کو اس کی خبر نہیں تھی، پر جب خبر ہوئی تو اُس سے برداشت نہیں ہوا۔

"پر راجن ایک عورت کو نئیں مار سکتا۔" پیرو نے اُسے جھڑک کے کہا۔ "وہ تیرے مافک نئیں ہے، اکھاڑ لوا ہے اپن کو ضرور کوئی گھٹالا دکھتا ہے۔"

پیرو کسی تاخیر کے بغیر ملہجی اور زورا کو لے کے پاڑے سے نکل گیا۔ میں نے بھی اُس کے ساتھ جانا چاہا تھا لیکن مجھے اُس نے منع کر دیا۔ میں نے رات کو دیر تک اُس کا انتظار کیا۔ وہ نہیں لوٹا۔ تجمل کی وجہ سے مجھے گھر آنا پڑا۔

دوسری صبح ناشتے کے دوران اباجان نے تجمل کو بتایا کہ کل رات اُنھوں نے مکان کا سودا کر لیا ہے لیکن ضروری ساز و سامان کے بعد ہی وہاں منتقل ہوا جا سکتا ہے اور اس اہتمام میں ہفتہ عشرہ تو لگ ہی جائے گا۔ تجمل نے یہ کسی مژدے ہی کے طور پر سنا اور اُنھیں مبارک باد دینا نہیں بھولا۔

ناشتے کے بعد تجمل سے کہہ کے میں پھر پاڑے آگیا تھا لیکن پیرو دن بھر غائب رہا۔ ملہجی اور زورا بھی وہاں نہیں تھے۔ پاڑے میں آنے والے آدمی طرح طرح کی باتیں سنا رہے تھے کہ پولیس نے اندھیری کے علاوہ دوسرے پاڑوں کے داداؤں کو بھی تھانے طلب کیا ہے اور علاقے کے دو بڑے تاجروں کے ہاں بھی چھاپے مارے ہیں۔ جارجی یہ خبریں سننے اور اُنھیں دُہرانے میں پیش پیش تھا۔ وہ اب تقریباً یہیں رہتا تھا۔ پیرو نہ ہوتا تو اُس کے انتظار میں، پیرو آجاتا تو جب تک وہ پاڑے میں رہتا جارجی دھرنا دیے بیٹھا رہتا۔ مجھے اُس سے وحشت ہونے لگی تھی۔ مجھے دیکھ کے وہ میرے ہی پاس آجاتا اور میرے پہلو سے جڑا رہتا۔ کبھی کچھ کہتا کبھی کچھ۔ اُس دن بھی میں

دیر تک پاڑے میں بیٹھا رہا لیکن پیڑ او رماجھی میں سے کوئی پلٹ کے نہیں آیا۔ راجن کے جیل جانے سے اندھیری کے پاڑے پر اُن کی موجودی ضروری تھی۔ آنے والے لوگوں کی اطلاع کے مطابق عدالت نے راجن کو ضمانت پر چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا ہرچند کہ مزید لوگوں کے گرفتار ہو جانے کے بعد اب پولیس کا شبہ محض راجن پر نہیں رہا تھا۔ غالباً پیرو کا اندازہ درست تھا کہ وہ راجن نہیں ہو سکتا۔ شام کو گلّیا اندھیری سے ہو کے آیا تو اُس نے بتایا، پیڑ علاقے میں شہادتیں سمیٹ رہا ہے۔ ظاہر ہے، ان دو دنوں میں وہ گھر بھی نہ جا سکا ہو گا۔ گیتا اور اُس کی ماں پریشان ہو رہی ہوں گی۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ جا کے اُنھیں تسلی دے آؤں لیکن پھر میں نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ میرے جانے سے وہ کھٹک سکتی تھیں اور یوں بھی یہ تو اُن کے لیے معمول کی بات ہو گی۔

اگلے دن صبح میں پاڑے جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ دروازے پر کسی کے کھنکارنے کی آواز آئی۔ وہ ابّا جان تھے۔ دوسرے لمحے وہ اندر چلے آئے۔ پہلی بار اُن کے اس طرح آنے سے میں گڑبڑا گیا۔ کمرے میں میں اکیلا ہی تھا۔ ضرور کوئی اہم بات ہو گی۔ اُنھوں نے کسی تمہید کے بغیر سرسری انداز میں مجھ سے کہا کہ نئے مکان میں اگر مجھے کسی خاص چیز کی ضرورت ہو تو اُنھیں بتا دوں۔ مجھ سے جواب نہیں دیا جا سکا۔ "کچھ بھی نہیں۔" میں نے بہ دقت چرمراتی آواز میں کہا۔

میری بات اُنھوں نے نہیں سُنی۔ یکایک وہ ٹھٹک سے گئے اور جھپٹتے قدموں سے میری طرف بڑھے اور اُنھوں نے میز پر رکھی ہوئی میری مالا اُٹھا لی۔

زرّیں نے فیض آباد میں اس کے موتی از سرِ نو پروئے تھے اور مٹیالے رنگ کا غلاف چڑھا دیا تھا۔ اس سے دانے چھپ جاتے تھے اور محفوظ بھی رہتے تھے۔ باہر سے دیکھنے میں وہ گنڈے قسم کی کوئی چیز نظر آتی تھی لیکن باہر سے کسی کا دیکھنا ممکن ہی نہیں تھا۔ میں ہمیشہ اُسے بنیان کے نیچے پہنتا تھا۔ غلافی نلکی میلی ہو گئی تھی۔ میں نے اُسے دھونے کے لیے مالا باہر نکالی تھی کہ ابّا جان کی نظر پڑ گئی۔ وہ اضطراری انگلیوں سے اُس کے دانے ٹٹولنے لگے۔ "یہ تمھارے پاس.....؟" وہ اضطراب سے بولے۔

میں نے سر جھکا لیا، اُن سے کیا کہتا۔

"یہ تو وہی ہیں۔" اُن کی آواز سن سنا رہی تھی۔ "یہ دُنیا کے نادر ترین موتی ہیں۔" اُن کی حیرت بجا تھی۔ ان جیسے موتی اُن کے پاس بھی تھے۔ کورا کی لائی ہوئی پوٹلی کے دوسرے نوادر میں اس قسم کے موتی بھی شامل تھے۔ ابّا جان نے یہ دانے بمبئی کے ایک جوہری کے ہاتھ فروخت کر دیے تھے۔ جوہری سے مسز روپ پٹیل نامی ایک امیر بیوہ نے اُنھیں خرید لیا تھا۔ کرشنا جی جب مجھے کلب لے گئے تھے تو مسز روپ پٹیل کے گلے کے ہار میں وہ موتی دیکھ کے میرا بھی یہی حال ہوا تھا جو ابّا جان کا اس وقت تھا۔

"یہ تمھارے تمھارے پاس کیسے آئے؟" میں نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن آواز حلق میں گھُٹ گئی۔ اُن کی بے چین نگاہیں میرے چہرے پر منڈلا رہی تھیں۔

اچھا ہوا، اُنھوں نے دوسرا کوئی سوال نہیں کیا ورنہ میرے مُنہ سے کچھ بھی نکل جا[تا۔] میرا جواب میرے چہرے پر لکھا تھا۔ "تو یہ یہ تمھارے پاس بھی تھے۔" وہ ہیر[ت زدہ] انداز میں بولے۔

میں خاموش کھڑا رہا۔

وہ بھی لمحوں تک بے حس و حرکت کھڑے مجھے گھورتے رہے۔ میرا ز[...] تھا لیکن اُن کی آنکھیں مجھے اپنے سارے جسم پر چبھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ [انھوں] نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا تو میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ "حوصلہ رکھو[۔" انھوں] نے دھیمی آواز میں کہا۔ "ذرا حالات قابو میں آ جائیں، پھر دیکھیں گے۔ مالا [...] ہونا چاہیے۔"

مالا میز پر رکھ کے وہ فوراً چلے گئے۔

اُن کے جانے کے بعد بھی اُن کی لرزتی آواز کی بازگشت میرے [...] میں گونجتی رہی۔ میرا جسم سُن سا ہو گیا تھا۔ وہ کیا کہہ رہے تھے۔ پھر آدمی اپنا [...] سے کیوں چھوڑ لے۔ جانے کیوں میرے سینے میں ایسی گرج سی اُٹھی کہ مجھ[ے قرار] نہ رہا۔ میں نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کون [...] میں آیا تھا۔ جس نے تھبل کو خبر کی تھی یا تھبل از خود آ گیا تھا۔ اُس نے مجھے [سینے] سے لگایا تو میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ "کیا ہوا رے؟" وہ جتنا مجھ سے پوچھ[تا] میری آنکھیں اور اُمڈنے لگتی تھیں۔ "بول رے، مجھ کو بھی نہیں بولے گا؟" وہ [میرے] بال کھینچنے اور مجھے جھنجوڑنے لگا۔

"کچھ نہیں ہے۔" میں نے بلکتے ہوئے کہا۔

"کچھ دھیان کر، اُدھر وہ تیری سگی بھی ہیں، کیا بولیں گی کہ بڑا بھائی۔" وہ چلچلاتی آواز میں بولا۔ "کیا ہوا رے.....؟"

"کچھ نہیں ہوا، تم کیوں، کیوں.....!"

"اُدھر ٹھیک سے بیٹھ جا۔" اُس نے مجھے بستر پر دھکیل دیا اور میرا سر اپنے [زانو] پر رکھ لیا۔ "اپنے پاس بھی کِتّی نہیں ہیں لاڈلے!"

"تم کیوں پریشان ہو رہے ہو۔ کوئی بھی بات نہیں ہے، بس یوں [ہی] مجھے ایسے ہی ہو جاتا ہے۔"

"بول رے، اب کس نے نوچ لیا ہے۔"

"کسی نے نہیں، تم سے کہہ دیا نا۔"

"بابا اِدھر سے ہو کے گئے تھے۔"

میں سسکیاں بھرتا رہا۔

"وہ کچھ بول کے گئے تھے؟ پر وہ تو کچھ بھی بول سکتے ہیں۔ وہ تو بابا [ہیں]"

"وہ کتنی آسانی سے کہہ کے چلے گئے۔" میں نے آنسوؤں میں ڈو[بی آواز] میں کہا اور اُسے بتانے کی کوشش کی۔ "تمھیں معلوم ہے، وہ کیا کہہ کے گئے؟ اب اتنی دُور آ کے.....؟"

"ٹھیک ہے رے۔" وہ مجھے تھپکنے لگا۔ "ایسا ہی آگے پیچھے ہو جاتا ہے۔"

"اگر وہ پہلے یہ سب۔"

"آدمی گھڑی دیکھ کے چلتا ہے، آدمی خود گھڑی نہیں ہوتا۔ پہلے بھی اُن نے [...]ہی بولا تھا، اب بھی غلط بول کے نہیں گئے ہیں۔ جیتا تو تو ہی رے۔"

"[...]یہ جیت ہے؟ یہ کیسی جیت ہے؟ تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔"

"کبھی لگتا ہے، تیرا دودھ بھی ابھی نہیں چھوٹا۔ اب سنبھال رے اپنے کو۔" [...] [دھیمی] آواز میں بولا۔ "یہ تجھ کو ایک دم کیا ہو جاتا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر کلٹ[ا] [...]کو دوڑتا ہے، اُبلنے لگتا ہے۔"

"یہ ذرا سی بات ہے؟ امی چلی گئیں، فتی چلی گئی۔ سب دربدر ہو گئے۔ تم کہتے ہو [ذر]اسی بات ہے۔" میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔ "تم نے وہ گھر نہیں دیکھا تھا نا۔"

"پھر بات تو اس سے پہلے سے بھی کرنا!"

"کہاں سے، کہاں پہلے سے؟"

"گھر میں اس کو بابا لائے تھے ڈولی میں بٹھلا کے؟"

"نہیں، مگر مگر....." میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن میرے پھڑپھڑاتے ہونٹ جم [...]وگئے۔ وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ "ہر وقت اپنی طرف ہی مت [دیکھ ی]ار۔ یاد ہے، اپنے نصیب میاں کیا بولتے تھے کہ اُستاد ہر آدمی کے ساتھ کوئی [چکر] لگا ہوتا ہے۔ کبھی اُلٹا گھومنے لگتا ہے کبھی سیدھا۔ میں بولتا تھا، بدھن یہ چکرا [کو]ئی نہیں، یہ سالی کھوپڑی ہی چکرا ہے۔ گھومنے پہ آتی ہے تو دن کو رات، رات [کو د]ن کر دیتی ہے۔ پر لگتا ہے نصیب میاں پتے کی بولتے تھے، اپنے کو بھی ابھی [ابھ]ی جان پڑتا ہے، کچھ اور سمجھ میں نہیں آتا تو کیا بولیں۔ پر اب تو چکرا سیدھا [گھو]منے لگا ہے۔ نہیں ہے کیا؟"

میں اُس سے کیا بحث کرتا کہ چکرا سیدھا گھومنے لگا ہے تو پھر کانٹے کیوں [...]لیا مُسن رے۔" وہ کہنے لگا۔ "ابھی پرسوں دادا بول رہے تھے، جب تو [اُ]ن کے گھر آیا تھا، بولتے تھے، ابھی تھوڑے دن بعد نکلنے کا ہے۔ جس جہاں اپنے [...]ابا کو دیکھا نہیں جاتا۔ تھوڑے دن اور ٹھیر جا، پھر چلیں گے۔ ابکے اوپر سے [...]ہمارے کونے بچا لے ٹٹول کے آئیں گے۔ دادا تو بولتا ہے، اب کے لوٹیں [...]تو ایک ہی بات پر....."

"نہیں، اب کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ کوئی فائدہ نہیں۔ دادا نے پہلے [...]ں پھر کو وقت برباد کیا ہے، کچھ کم سکھ اُٹھایا ہے جو اب اور کی حسرت ہے اور تم، تم [...] بھٹکنے مارے مارے پھرتے رہو گے۔ اڈّے پر تمھیں واپس نہیں جانا تو اُدھر زرّیں [انت]ظار کر رہی ہو گی۔"

"دیکھیں گے رے، ایک بار اور۔"

"میں تمھیں نہیں جانے دوں گا، کسی کو بھی نہیں۔ اب کون سا تماشا دیکھنا رہ [گ]یا ہے۔ جب بھی کہیں جاؤ، کوئی نہ کوئی دیوار، کوئی نہ کوئی زنجیر منتظر ہوتی ہے۔ دادا کا پورا گھر ہے اور کیسا گھر۔ اُنھیں وہیں رہنا چاہیے، اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ۔ میں تو دادا سے کہوں گا، وہ پاڑا ابھی چھوڑ دیں۔ وہ لوگ کچھ کہتے نہیں تو کیا محسوس بھی نہیں کرتے۔ میں نے طے کیا ہے کہ اب میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ سب میری وجہ سے ہوتا ہے۔ اب اور کتنے گھر اُجاڑنے، کس کس کے حوصلے آزمانے رہ گئے ہیں۔ سلطان، وزیر، منّن میاں، کبّن خاں، کانتے، اب اور کون دشمن رہ گیا ہے۔ تم بھول گئے؟"

"یاد ہے رے!" وہ تلخی سے بولا۔ "پر دیوار اور زنجیر ایک جگہ جمے رہنے پہ دُور رہتی ہے کیا۔ رُت نہیں بدلتی، رات نہیں آتی! اور سب ایسے ہو گیا ہے کیا۔ اگر پاؤں نہ نکالتے تو یہ سب دکھائی دیتا؟"

"بس اتنا بہت ہے۔"

"اُدھر شیشے میں تھوڑا اکھڑا تو جا کے دیکھ، اتنا کدھر کو بہت ہے۔ بابا نے ذرا تنکا چھو دیا تو ناچنے لگا، پھیل گیا۔"

"ہاں ہاں۔" میں نے پھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہ بھی کیوں، تم ٹھیک کہتے ہو، یہ بھی کیوں۔ یہی سب تو ہے جو سب کو اجیرن کرتا ہے مگر میں کیا کروں، میں کہاں جاؤں۔ میں بہت کوشش کرتا ہوں، چھپانے کی بہت کوشش لیکن بس اچانک ..... میں تمھیں کیا بتاؤں۔ کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ اپنا گلا گھونٹ لوں، اپنے آپ کو چاقو مار لوں۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ہاں رے، چاقو تو تیرے پاس رہتا ہی ہے اور چلانا بھی بُرا نہیں آتا۔ مار لے پھر۔" وہ شکستہ لہجے میں بولا۔ "اپنی ہی گدّی اونچی رکھنا۔"

میں نے بے اختیار اُس کے ہاتھ پکڑ لیے۔ "پھر میں کیا کروں، بتاؤ میں کیا کروں؟"

"مجھ سے کیا پوچھتا ہے۔" اُس نے میرا سر اپنی آغوش میں چھپا لیا۔ "اتنی دُور آنے کے بعد پوچھتا ہے کہ کیا کروں۔ اتنے دن کی دھوپ میں تو تیری کھال سخت ہو جانی چاہیے۔ تُو نے اِسے اور چھوئی موئی کر لیا۔" اُس نے کٹی پھٹی سی آواز میں کہا۔ "ابھی سے کیوں ہانپنے لگا۔ آگے تو دن پڑے ہیں رے۔"

"لیکن یہ دنیا بہت بڑی ہے۔" میں نے سسکتے ہوئے کہا۔

"جتنی بڑی ہے، اتنی چھوٹی بھی ہے۔ کبھی عمر بیت جاتی ہے، کبھی ایک پل میں لپٹ جاتی ہے۔ کسی اور کا نہیں تو تجھے اُس کا بھی دھیان نہیں رہا۔ اُدھر اُس کا بھی تو یہی حال ہو گا، اُدھر کیا وہ کل سے بیٹھی ہو گی؟"

"کون جانے، اُس کا کیا حال ہے؟"

"رے، بھول گئی ہو گی کیا؟"

"وہ مجھے کبھی نہیں بھول سکتی۔"

"پھر ڈوری توڑ دی ہو گی اُس نے؟"

"نہیں، کبھی نہیں۔ وہ زندگی بھر میری راہ دیکھتی رہے گی۔ اپنی آخری سانس تک۔"

"اور تو اِدھر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے گا؟"

"مگر میں کون سی کھوہ میں اُسے ڈھونڈوں؟"
"کسی طرف تو منہ اُٹھانا پڑے گا رے۔"
"تمھیں معلوم ہے، دادا نے تم سے ضرور کہا ہوگا۔ حیدرآباد میں نواب ثروت نے ہمیں کیا بتایا تھا۔ اُس نے کہا کہ جیسے ہی اُس نے مولوی صاحب سے ہمارا ذکر کیا، مولوی صاحب گم صُم سے ہو گئے اور دوسرے دن اُس کی عدم موجودگی میں گھر سے چلے گئے، کوئی رقعہ، کوئی اطلاع دیے بغیر۔ اِس سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ یہی ناکہ وہ اُسے مجھ سے دُور رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ ایک قاتل، ایک سزایافتہ کو اُس کے قریب نہیں پھٹکنے دینا چاہتے۔"
وہ سر ہلانے لگا۔ "ہاں سنا تھا۔"
"مولوی صاحب اگر چاہتے تو کیا مجھے ڈھونڈ نہیں سکتے تھے؟"
"پر مولوی سے اپنے کو کیا لینا۔"
"لیکن وہ انھی کی تحویل میں ہے۔ وہ میرے بارے میں اُس سے جانے کیا کہتے رہے ہوں، کون کون سے عُذر پیش کرتے رہے ہوں۔ مجھے کچھ ایسا لگتا ہے جیسے وہ اُسے مجھ سے چھپائے چھپائے پھر رہے ہیں۔"
"ابھی ایسا بل نہ ڈال، کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔"
"اور کیا ہو سکتا ہے؟" میں نے ڈوبتی آواز میں پوچھا۔
"ابھی کیا بولیں۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "مولوی نے اُسے سنبھال کے بھی تو رکھا ہے، ہر طرف سے بچا کے۔ بڑے صاحب (منیر علی) کیا بولتے تھے۔ مولوی مراد آبادی اپنے گھر کو بھی تو نہیں لوٹا۔ وہ جبلپور کے چودھری رانا مہتاب، بڑے صاحب کے کلنٹے پر تُلے بھتیجے ارشد اور دکن کے نواب ثروت جیسے رشتے کیوں منع بول دیتا ہے۔"
وہ اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ معاً اُس نے مجھے ٹھوکا دیا۔ باہر سے فرخ فریال کی آوازیں آرہی تھیں۔ "اُٹھ جا رے، ایسے دیکھیں گی تو ٹوٹ جائیں گی۔" اُس نے مجھے ایک جھٹکے سے اٹھا دیا۔
میں نے کوشش کی کہ وہ میرا چہرہ نہ دیکھ پائیں یا انھوں نے ہی نگاہیں چرالیں۔ وہ جولین اور شہ پارہ کی آمد کی اطلاع دینے آئی تھیں۔ میں تجمل سے پوچھنا چاہتا تھا کہ پھر کیا بات ہے۔ آخر مولوی صاحب کب تک اس طرح بھاگتے رہیں گے؟ کب تک؟ ... مگر وہ فرخ فریال کے کندھوں کی بیساکھیوں پر کمرے سے چلا گیا۔ پھر کو اباجان اُسے ساتھ لے گئے۔ اتنے دنوں بعد کہیں اُس نے مجھ سے کچھ پوچھا تھا۔ اس دوران کوئی بات کرتے ہوئے کیا، اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بھی مجھے ڈر لگتا تھا۔
جولین اور شہ پارہ کل کے لیے سب کو اپنے گھر بلانے آئی تھیں۔ کل کانتے کا بیسواں تھا اور چمپا بیگم کی خواہش تھی کہ کل سب اُسی جگہ جمع ہو جائیں جہاں سے کانتے اپنے آخری سفر پر روانہ ہوا تھا۔ سہ پہر کو رانی اور گیتا بھی آگئیں۔ صرف جولین کی ماں اور چمپا بیگم کی کسر رہ گئی تھی۔ جمرو، شامو، مارٹی اور ٹنگو بھی موجود تھے۔ اُس دن کہیں جانے کو میرا جی ہی نہیں چاہا حالانکہ مجھے خیال تھا کہ پاڑے پر جا کے پیرو کی خبر لینی چاہیے۔ یقیناً وہ ابھی تک اندھیری میں پھنسا ہوا ہے ورنہ تجمل کو دیکھنے ضرور آتا۔ دوپہر کھانے کے بعد جمرو اور
شامو نے مجھ سے کہا بھی۔ میں نے صاف انکار نہیں کیا تھا لیکن پھر وہ بھی چُپ ہو گئے۔ مجھے گھر میں بھی کسی جگہ قرار نہیں تھا۔ کبھی کمرے میں آ... کبھی جولین اور شہ پارہ کے کمرے میں چلا جاتا جہاں سبھی موجود تھیں ... اندر سناٹا رہا تھا۔ رگ و پے میں خون جیسے دھڑک رہا ہو۔ تجمل کی شام تو میں اُس سے بات کرنے کا موقع تلاش کرتا رہا۔ میرے ذہن میں ... منڈلا رہی تھیں۔ میں اُس سے کہنا چاہتا تھا کہ ہو سکے تو کسی ... وہ فیض آباد میں مستقل قیام کے لیے اباجان سے بات کرے ... میں بہت سکون ہے۔ جہاں گیر بھی وہیں تعلیم حاصل کر رہا تھا ... منیر علی کا پورا خاندان ہے۔ خانم بھی کسی دن واپس آجائے گی۔ یہاں ... شور ہے، بہت بھیڑ۔ تجمل کی بھی یقیناً یہی خواہش ہوگی۔ میں اُس سے ... میں بھی پوچھنا چاہتا تھا کہ اب حیدرآباد جانا کس طرح ممکن ہے۔ کون خانم ... گا وہاں زیادہ دیر خانم کی موجودی مناسب نہیں ہے لیکن تنہائی ... نہ مل سکا۔
ساری رات مجھے نیند نہیں آئی، جب بھی آنکھیں بند کرتا ... ہوتا جیسے مجھ سے کچھ اوجھل ہو جائے گا، کوئی چیز گم ہو جائے گی۔ صبح کسی وقت ... لیکن کچھ دیر بعد مارٹی کی آہٹ پر ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا اور ناشتے کے ... کولے کے پاڑے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ ہمارے پہنچنے کے کوئی دس ... پاڑے آگیا۔ چہرے پر غبار چھایا ہوا تھا لیکن مجھے دیکھ کے وہ اُچھل ... لگانے لگا۔ "ہاراجا، اپن کا جانی بھی ایدری ہے۔"
میں نے پوچھا۔ "تم کہاں ہو دادا! آخر کیا بات ہے؟" مجھے ... اُس نے زور سے اپنا سر میرے سر سے ٹکرایا اور چہچہاتی آواز ... سب ٹھیک ہے جانی! اپن نئیں جاتا تو راجن کو تو سالا پھندا لپیٹ ہی ...
"راجن نے قتل نہیں کیا نا دادا؟"
"نئیں شہزادے! اپن راجن کو جانتا ہے۔"
"اب تو سب ٹھیک ہے؟"
"ہاں! ایک دم اکھا فٹ فاٹ ہے سالا۔"
"تو اب گھر جاؤ۔"
"ابھی نئیں راجا! اپن کو ابھی اندھیری لوٹنا ہے۔"
"اب بھی وہیں جانا ہے تمھیں، ماچھی کو بھیج دو، میں چلا جاتا ..."
"اوئے نئیں نئیں نئیں راجا! ابھی کل تک کا بات ادھر ... تجمل بھائی کیسا ہے؟"
"بالکل ٹھیک دادا!"
"بولنا کہ اپن ابھی کیدر چلا گیا تھا، کل آئے گا۔"
میں نے اُسے بتایا کہ رات کو جولین کے گھر کانتے کا بیسواں ... آنے کی کوشش کرے گا مگر اندھیری سے فاصلہ زیادہ ہے۔ اُسے ...

ہو اُس کا انتظار نہ کیا جائے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اندھیری کے پاڑے پر اُس کا ٹکے رہنا ایسا ہی ضروری ہوگا۔
وہ کچھ دیر بعد ہی چلا گیا۔ گلبا، ماچھی اور جارجی کے کہنے پر میں دوپہر کے کھانے کے لیے ٹھیر گیا۔ جارجی اپنے علاقے کے کسی خاص باورچی سے بریانی اور انناس کی کھیر پکوا کے لایا تھا۔ دونوں چیزیں نہایت لذیذ تھیں۔ سبھی نے سیر ہو کے کھائیں۔ جارجی بار بار افسوس کرتا رہا کہ کاش پیرو بھی موجود ہوتا۔

شام کو جولین کے گھر بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر کیلاش بھی اپنی بہن رما کے ساتھ آیا تھا۔ رما سیاہ ساڑی میں ملبوس تھی۔ مجھے دیکھتے ہی شکایت کرنے لگی کہ وہ میرا انتظار کرتی رہی، روز ہی کیلاش سے پوچھتی تھی۔ میں نے ندامت سے کہا کیلاش نے کئی بار بتایا اور کئی بار میں نے ارادہ بھی کیا لیکن بس آتے آتے رہ گیا۔ کہنے لگی۔ "ہر چند کہ یہ سوگوار فضا ہے اور میں اپنے گھر سے اپنے دُکھ کا اظہار کرنے آئی ہوں لیکن مجھے ایک خوشی بھی ہے کہ اس بہانے اتنے لطیف، اتنے خوب صورت لوگوں سے شناسائی ہو گئی۔"
چمپا بیگم نے خاصا اہتمام کیا تھا۔ شام ہی سے غریبوں میں کھانا تقسیم کیا جا رہا تھا۔ کانتے کو جولین کے ہاتھ کے کباب بہت پسند تھے۔ جولین نے خاص طور پر بنائے تھے۔ ساڑھے نو بجے کھانا لگ گیا۔ سب پیرو کی آمد سے مایوس ہو چکے تھے مگر وہ دونوں آگئے، پیرو اور ماچھی۔ دونوں عجلت میں تھے۔ کھانا بھی انھوں نے رسماً ہی تھوڑا بہت کھایا۔ کھانے کے بعد پیرو کچھ دیر تجمل اور اباجان کے ساتھ بیٹھا کانا پھوسی کرتا رہا پھر اُٹھ گیا۔ میں نے اُسے بتایا کہ گیتا اور اُس کی ماں بھی آئی ہوئی ہیں۔ کہنے لگا کہ گیتا مچل جائے گی۔ اب کل تو گھر جانا ہی ہے۔ مگر جاتے جاتے دروازے سے پلٹ آیا اور مجھ سے بولا۔ "ٹھیک ہے، تھوڑا بلوا دے اُن کو۔" میں نے کہا۔ "تم خود اندر چلے جاؤ، یہاں کس کا پردہ ہے۔" کہنے لگا کہ نہیں، وہاں سبھی ہوں گے اور کچھ دیر تو بیٹھنا پڑے گا۔ میں اندر جا کے اُن دونوں کو دروازے پر لے آیا اور دانستہ وہاں سے ہٹ گیا۔ پیرو نے اُن سے چند ہی لمحے بات کی ہوگی کہ پلٹ پڑا اور گھر سے نکل گیا۔ اباجان کی گاڑی
کھڑی تھی۔ میں نے کہا، اِسے لے جاؤ۔ کہنے لگا، اِس میں گیتا اور اُس کی ماں کو میں گھر واپس پہنچا دوں۔ میں نے کہا، یہ تو میرا پہلے سے ارادہ تھا۔
میں نے کچھ دُور تک اُس کے ساتھ جانا چاہا لیکن دونوں نے بہ اصرار مجھے لوٹا دیا۔
موٹر ایک تھی اور سب کو گھر واپس جانا تھا۔ میں نے سوچا، مارٹی سے کہہ کے گیتا اور اُس کی ماں کے لیے کوئی دوسری سواری منگوا لیتا ہوں لیکن اباجان نے مجھے روک دیا اور کہا کہ میں خود انھیں موٹر میں گھر چھوڑ کے آؤں۔ ڈاکٹر کیلاش اور رما پیرو کے آنے سے پہلے ہی جا چکے تھے۔ اکبر بھی موٹر میں میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ مارٹی کی بھی خواہش تھی لیکن میں اُسے پیرو کا گھر دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اُسے منع کر دیا کہ اباجان اور تجمل کو یہاں شاید اُس کی ضرورت پڑے۔
اباجان کے گھر جانے کے خیال سے میں گیتا اور اُس کی ماں کو پہنچا کے دروازے ہی سے لوٹ آیا۔ سڑکیں سنسان ہو چکی تھیں۔ بس اکا دکا دکانیں کھلی تھیں۔ ڈرائیور نے مجھ سے اجازت لے کے ایک جگہ کھڑے کھڑے چائے پی۔ ... اکبر کے ساتھ اُتر گیا۔ جتنی دیر میں ڈرائیور نے چائے پی، ہم نے ہوٹل سے ملحق پان کی دکان سے پان کھایا اور موٹر میں آکے بیٹھ گئے۔ جس وقت ہم باندرے کے علاقے میں داخل ہوئے گیارہ بج رہے تھے۔ ایسی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی پھر بھی آمد و رفت میں تقریباً ایک گھنٹہ لگ گیا۔
ڈرائیور موڑ کاٹ کے اندر گلی میں جانا چاہتا تھا۔ میں نے اُس کا بازو پکڑ کے موٹر روک دینے کی ہدایت کی۔ موٹر کی تیز روشنی میں مجھے موڑ پر جمرو اور ٹنگو کھڑے نظر آئے تھے۔ وہ موٹر پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ اِدھر ایک جھٹکے سے موٹر ٹھیری، اُدھر وہ جھپٹتے قدموں سے میری طرف آئے۔ "لاڈلے!" جمرو نے لرزتی آواز میں مجھے پکارا۔ "پیرو دادا اور ماچھی کو آگے گلی میں کسی نے گولی ماری ہے۔ اُدھر مت جاؤ لاڈلے! پولیس نے سارے علاقے کو گھیرے میں لے لیا ہے۔"

میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ "کیا بک رہے ہو؟"

"ہاں لاڈلے! زیادہ بات کرنے کا وقت نہیں ہے۔ پولیس نے اُدھر ساری گلیوں پہ گھیرا ڈال دیا ہے۔" جمرو کی آواز سٹپٹا رہی تھی۔ "تھوڑی دیر کے لیے اپنے کو اُن کے سامنے نہیں جانا ہے۔"

"مگر ہوا کیا؟ کیا ہوا؟"

"کیا بولے کیا ہو گیا راجا بھائی!" ٹنگو بلکتے ہوئے بولا۔ "ابھی تھوڑا دیری میں کھل کے آجائے گا، پھر اُدھر جانے کا ہے۔"

اُن کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ میں دروازہ کھول کے فوراً موٹر سے اُتر گیا اور میں نے جمرو کا بازو پکڑ لیا۔ "کیا بات ہے؟ دادا کیسے ہیں، صاف صاف کیوں نہیں بتاتے؟"

"اپنے کو کچھ نہیں معلوم لاڈلے! کچھ بھی نہیں..." جمرو لرزتے ہونٹوں سے بولا۔ اُس کی آواز حلق میں گھٹ گئی۔

"اپن کچھ بھی نہیں بول سکتا راجا بھائی! ابھی یہ کیا اور کیسا ہو گیا۔" ٹنگو کی آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ کہنے لگا کہ وہ ٹھل کی ہدایت پر اُس کے لیے بیڑیاں لینے نکلا تھا۔ گھر جانے کے لیے چونکہ سب لوگ موٹر میں نہیں آسکتے تھے اس لیے ٹھل نے ایک ٹم ٹم لانے کو بھی کہا تھا۔ ٹم ٹم نہیں ملی تو وہ آگے بڑھ گیا۔ آگے راستہ
گرد گلیوں میں خلافِ معمول پولیس اور لوگوں کی تعداد
بے چینی ہوئی۔ وہیں کسی جگہ بہت بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ وہ
گیا اور دیکھا کہ گلی کے فرش پر پیر دادا اور ماچھی خون میں ڈوب
بے ہوش پڑے ہیں۔ یہ دیکھ کے اُس کے ہوش و حواس جا
اُس کے دماغ میں یہی آیا کہ وہ جا کے ٹھل کو خبر کر
تیز بھاگ سکتا تھا، بھاگ کر جولین کے گھر پہنچا۔ ٹھل، ما
کو لے کر اُسی وقت گھر سے نکل پڑا۔ ٹنگو نے اکھڑی ہوئی سا
بتایا۔ "دادا استاد جاتے جاتے جمرو بھائی اور اپن کو بولا، آگے
کے روک دے۔"

میں لمحوں تک گُنگ کھڑا رہا۔

"جلدی کرو لاڈلے!" جمرو مجھے جھنجوڑتے ہوئے بولا کہ
ابا جان کو گھر چھوڑ آئیں گے۔ میں اکبر کو ساتھ لے کے فوراً
سے نکل جاؤں۔"

"مگر کیوں! کیوں؟"

"اُستاد نے کچھ جان کے ہی بولا ہوگا۔" جمرو نے
زیادہ سوال جواب مت کر۔ ابھی جیسا استاد نے بولا ہے، ویسا
کرنا ہے۔"

"وہ جگہ یہاں سے کتنی دُور ہے؟" میں نے ٹنگو سے پوچھا۔

"اتنا دور نہیں ہے۔" ٹنگو نے بتایا۔

"مگر دادا تو میرے گھر سے نکلنے سے پہلے چلے گئے تھے۔"

"پر ابھی آدھا پونا میل آگے گیا تھا کہ گولی...." ٹنگو نے ہونٹ
بھینچ لیے۔ "ایسا ہی کچھ لگتا ہے اپن کو...."

میری رگوں میں خون جمنے لگا تھا۔ کیا مجھے ٹھل کی ہدایت
عمل کرنا چاہیے؟ ایک لمحے کے لیے میں نے یہی فیصلہ کیا تھا لیکن
میرے اختیار کی بات نہیں تھی۔ میرے جسم و جاں نے اسے مسترد
کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اُن دونوں کو موٹر میں بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ وہ بہ عجلت موٹر میں بیٹھ گئے تھے کہ میں نے ٹنگو سے راستہ بتانے کے لیے کہا۔ وہ چیختے چلاتے رہے، پھر اُن کا لہجہ عاجزانہ ہو گیا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ میرے لیے ابھی دُور ہی رہنا بہتر ہے اور اگر نہیں تو موٹر جولین کے گھر بھیج دینی چاہیے۔ موٹر، منیر علی، مولوی اکرم، ابا جان، فرخ، زیال وغیرہ کو لے کے گھر چلی جائے گی۔ اکبر ہمارے ساتھ ہے کم از کم اُسے وہاں نہیں لے جانا چاہیے۔ آگے جانے کی کیا صورت ہو۔ میرے حواس کام نہیں کر رہے تھے، جتنا میں اُنھیں یک جا کرنے کی کوشش کرتا، وہ اُتنے ہی منتشر ہوتے۔ لگتا تھا، یہ کوئی بھیانک خواب ہے، خواب پر آدمی کو قدرت کہاں ہوتی ہے، کچھ دیر میں آنکھ کھل جائے گی۔ ایسا کس طرح ہو سکتا ہے؟ ابھی ایک گھنٹہ ہی تو ہوا ہے، میں دادا اور ماچھی کو گلی کے آخری سرے تک چھوڑ کے آیا تھا۔ بار بار میری نگاہیں جمرو اور ٹنگو کی طرف اُٹھتیں کہ وہ کہیں مجھ سے صبر آزما مذاق تو نہیں کر رہے؟ میرے صبر و ضبط کا امتحان لے رہے ہوں لیکن دونوں کی پھٹی ہوئی آنکھیں، اُن کے جلتے چہرے دیکھ کے میرا سارا وجود ڈوبنے لگتا۔ موٹر آگے بڑھنے پر وہ خاموش ہو گئے تھے۔ مجھے بھی اُن سے مزید کچھ پوچھتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ موٹر کی رفتار بہت تیز تھی۔ میں نے ڈرائیور کو اور تیز چلانے کی ہدایت کی۔ ابھی ہم نے گلیوں کے دو ہی موڑ کاٹے تھے کہ ایک چوراستے پر جمرو نے موٹر رکوا دی اور ڈرائیور سے کہا کہ وہ اکبر کو لے کے جولین کے گھر چلا جائے۔ شاید یہی مناسب تھا۔ یہاں سے جولین کے گھر سیدھا راستہ جاتا تھا۔ موٹر نہ پہنچنے کی وجہ سے ابا جان پریشان ہو رہے ہوں

گے اور اچھا ہے کہ اِس وقت وہ یہاں سے چلے ہی جائیں۔ یہ اطلاع اُنھیں بعد میں بھی مل سکتی ہے۔ اکبر نے ہمارے ساتھ چلنے کی ضد کی لیکن جمرو نے ڈپٹ کر اُسے منع کر دیا اور تاکید کی کہ وہ گھر جا کے کسی سے کچھ نہ کہے، یہی تاکید اُس نے ڈرائیور کو بھی کی۔

مجھے نہیں معلوم کہ اُس نے اُن سے اور کیا کچھ کہا۔ موٹر ٹھہرتے ہی ٹنگو کے اشارے پر مَیں نے دائیں جانب کی گلی میں بھاگنا شروع کر دیا۔ ٹنگو میرا ساتھ دینے کی کوشش کرتا رہا لیکن چھوٹی ٹانگوں کے سبب وہ اتنا تیز نہیں دوڑ سکتا تھا۔ مجھے اپنی رفتار بار بار کم کرنا پڑتی۔ اتنے میں جمرو بھی پیچھے سے بھاگتا ہوا ہمارے ساتھ آ گیا۔ گلی میں ہلکی ہلکی روشنی تھی اور کچھ زیادہ لوگ نہیں تھے لیکن جیسے جیسے ہم فاصلہ طے کرتے گئے، بھیڑ بڑھتی گئی۔ بیشتر مکانات کے دروازے اور کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں، لوگ ٹکڑیوں میں اِدھر اُدھر کھڑے تھے۔ آگے رت جگے کا سا منظر تھا۔ جہاں تک نظر جاتی، ہجوم نظر آتا۔ آگے پہنچ کے مجھے احساس ہوا کہ لوگ تو واپس آ رہے ہیں۔ مَیں نے رک کے کسی سے پوچھنا چاہا لیکن جمرو اور ٹنگو بڑھتے رہے۔ راستے میں سامنے آ جانے والے لوگوں کی وجہ سے ہمیں ایک طرف ہو جانا پڑتا، کبھی کوئی خود ایک طرف ہو جاتا یا اپنی جگہ ٹھہر جاتا۔ تین آدمیوں کو دُور سے بے تحاشا بھاگتے ہوئے دیکھ کے لوگوں کی توجہ اُن کی طرف منعطف ہونی ہی چاہیے تھی لیکن ہم اُن کے تجسّس اور تردد کی فکر کیے بغیر بھاگتے رہے۔ فکر تھی تو پولیس کی، راستے میں کوئی بھی سپاہی رکاوٹ بن سکتا تھا مگر کسی ایسی رکاوٹ کا سامنا کرنا نہیں پڑا اور ہم نے ایک بڑا فاصلہ طے کر لیا۔

سامنے چند قدم کی دُوری پر ایک بڑا ہجوم نظر آ رہا تھا۔ راستہ بند تھا اور ہر سُو طرح طرح کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ قریب پہنچنے پر معلوم ہوا کہ یہ ایک منتشر مجمع ہے۔ چند سپاہی بھی چیخ چیخ کر لوگوں کو بکھر جانے کی تلقین کر رہے تھے۔ میرا دل بُری طرح ... کر رہا تھا۔ جمرو نے میرا بازو پکڑ کے مجھے وہیں روک لیا۔ اُن دونوں کی سانسیں ٹوٹی ہوئی تھیں اور دونوں پسینے میں شرابور تھے۔ میرا بھی یہی حال تھا۔ جمرو نے سانس استوار کرنے کی بھی مہلت نہیں لی اور ہانپتی آواز میں سامنے کھڑے ہوئے ایک سن رسیدہ شخص سے بھیڑ کا سبب پوچھا۔ وہ شخص بھی ابھی ابھی آیا تھا تاہم اُس نے بتایا کہ دو آدمیوں پر گولی چلی ہے۔ کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر ہم آگے بڑھ گئے۔ وہاں لوگوں کی ایک دیوار سی کھڑی تھی۔ باہر آتے، اندر جاتے، ایک دوسرے کو دھکیلتے شور مچاتے لوگوں کی دیوار کے پار کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا، اُسے

عبور کر کے اندر جانے کے خیال سے میرے پیروں میں پر لگ گئے تھے۔ ... بے قراری اُن کی دیوانہ وار صداؤں سے کہ اندر کیا کچھ ممکن ہے۔ مَیں اُن سے پیچھے رہ گیا۔ جمرو اور ٹنگو ... کو ہٹاتے ہوئے اندر پہنچ گئے تھے۔ میرے جی میں آئی کہ ... لیکن جمرو نے پلٹ کے مجھے اپنے پاس کھینچ لیا۔

اندر قدم رکھتے ہی میرا جسم سُن ہو کے رہ گیا۔ وہاں ... میں سے کوئی نہیں تھا۔ درمیان کی خالی جگہ فرش پر ہر طرف بکھرا ہوا تھا، جمے ہوئے خون کے لوتھڑے۔ ایک پولیس افسر ... ٹارچوں اور گیس کی لالٹین کی روشنی میں جگہیں ناپ رہے ... نشان زدہ دائرے سے لوگوں کو دُور رکھنے کی کوشش کر رہے ... چکر سا آنے لگا اور پھر میری آنکھوں میں بینائی نہیں رہی۔ جانے ... لمحے گزر گئے۔ مجھے اپنی کوئی سُدھ بُدھ نہیں تھی۔ جمرو نے مجھے ... دیا تو مَیں اُچھل پڑا۔ مَیں نے بہت نظریں چرانا چاہا لیکن نگاہیں ... زمین پر پڑے ہوئے خون پر منڈلاتی رہیں۔ خون جیسے میری آنکھوں ... میں بھی بھر آیا تھا۔ مجھے ہر طرف سرخی ہی سرخی دکھائی دے رہی ...

"یہ لوگ کدھر گئے؟" جمرو کی متوحش آواز پر مَیں نے گھوم کے دیکھا، اُس نے کسی سپاہی کو روک لیا تھا۔

"کون لوگ؟" سپاہی نے برگشتگی سے کہا اور وہ سر سے ... جمرو کو گھورتا رہا۔

"یہی لوگ جن کو گولی لگی ہے۔"

"تم اُن کا کون لگتا ہے؟" سپاہی نے تلخی سے پوچھا۔

"ہم کیا لگتا۔" جمرو نے بھی اُسی کے لہجے میں جواب دیا۔

"اُن کو ابھی اسپتال میں لے گیا ہے۔" سپاہی کے ... جمرو کے پہلو میں کھڑے ہوئے ایک آدمی نے کہا۔

مَیں نے بھی سُن لیا تھا۔ "کون سے اسپتال میں؟" مَیں ... جھپٹتی آواز میں پوچھا "کیسے ہیں وہ؟..."

"تھوڑا جان باقی تھا۔" وہ بے رحمی سے بولا۔ "دلو الوگ سالا! ایک دم جان دار، حرام کا اولاد۔"

مجھ سے ضبط نہ ہوا۔ مَیں نے اُس کے گریبان پر ہاتھ ... دیا۔ مَیں اُس کا گلا گھونٹ دیتا۔ وہ ڈکرانے اور ہاتھ پیر پٹخنے لگا ... جمرو، ٹنگو اور سپاہی نے مجھے ہر طرف سے جکڑ لیا۔ سپاہی ... میرے منہ پر مکا بھی رسید کیا۔ ایک جانب کاغذ قلم ہاتھ میں ... ایک پولیس افسر کسی آدمی سے گفتگو میں مصروف تھا۔ سپاہی ... اُسے بھی آوازیں دیں۔ سب کی نظریں مجھ پر مرکوز ہو گئی تھیں۔

... ہوش میں تھا، اُس نے تیزی سے مجھے اندر مجمع کی طرف کھینچ لیا۔ ... ٹنگو یقیناً سپاہی کے آڑے آ گیا ہو گا جبھی میں اُس کی نگاہوں ... اوجھل ہو گیا۔ اِس اثنا میں جمرو اِرد گرد کے لوگوں کو دھکیلتا ہوا ... طاقت سے مجھے کھینچتا، گھسیٹتا باہر لے آیا۔ مجھ پر رعشہ طاری تھا۔ ... دُور آ جانے کے بعد جمرو نے مجھے ایک دکان کے چبوترے پر بٹھا ... اور ہانپنے لگا۔ اُس نے مجھ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا، بس میری ... تھپکتا رہا۔ اُس کے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ سب کچھ زبان ... سے تو نہیں کہا جاتا۔ اب مجھے خود احساس ہو رہا تھا کہ یہ کوئی وقت ... تھا، ہمیں جلد سے جلد اسپتال جانے کی تدبیر کرنی چاہیے۔ ٹنگو ... سے بچھڑ گیا تھا لیکن ہمیں چبوترے پر کچھ ہی دیر ہوئی ہو گی کہ وہ ... ڈھونڈتا ہوا آ نکلا۔ اُسے دیکھتے ہی جمرو اُٹھ گیا۔ ٹنگو کسی سے ... معلوم کر کے آیا تھا کہ اُنھیں ڈاکٹر شیورام کے اسپتال لے جایا گیا ہے ... یہ اسپتال یہاں سے زیادہ دُور نہیں ہے۔ جمرو دکانوں کے ... ہوا ٹے کے ایک گلیارے میں داخل ہو گیا۔ یہ عام گزرگاہ نہیں تھی مگر ... نکلنے کے لیے یہی قریبی راستہ تھا۔ اب جمرو کی احتیاط میری سمجھ ... اچھی طرح آ رہی تھی۔ سرِدست یہاں سے دُور ہو جانا ہی بہتر تھا۔ ... گلی میں سپاہیوں کے تعاقب کا اندیشہ تھا۔ اِس وقت تو وہ ... ملنے پر بھی شک کر رہے ہوں گے۔ مجمع میں افراتفری ہو جانے ... ہمیں رَل مِل جانے کا موقع مل گیا تھا مگر ذرا سکون ہونے پر اُنھیں ... جستجو لازماً ہونی چاہیے۔ سیدھے راستے میں ہمیں دیکھنے والا ... کوئی شخص بھی پہچان سکتا تھا اور راستے کا پتھر بن سکتا تھا۔

گلیارے میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ چند ہی قدم بعد ہمارے ... کیچڑ میں لتھڑ گئے۔ ہر طرف گلی سڑی چیزوں کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔ ... کوڑا کرکٹ کی وجہ سے زمین بھی ناہموار تھی۔ ہم اندھوں کی طرح ... ٹٹولتے ہوئے چلتے رہے۔ مجھ میں اُنھیں مشورہ دینے کی ہمت بھی ... نہیں تھی۔ میری وجہ سے اُنھیں اِس راستے پر آنا پڑا تھا۔ ہمیں راستے ... اتنا نہیں تھا جتنی دیر ہو رہی تھی لیکن دیر تو اور بھی لگ سکتی ... تھی۔ اگر جمرو مجھے وہاں بروقت تھام نہ لیتا تو کیا ہوتا؟ پھر وہاں سے ... اتنی آسانی سے نجات نہ ملتی۔ آگے چل کے جمرو کو بھی اندازہ ہو گیا کہ ... اس طرح دُور تک چلتے رہنا ممکن نہیں ہے۔ جیسے ہی عمارتوں ... کے درمیان ایک تنگ گزرگاہ نظر آئی، جمرو اُسی طرف مڑ گیا۔ وہاں ... سے سامنے پختہ سڑک دکھائی دے رہی تھی لیکن جب تک ٹنگو نے ... آگے جا کے سڑک کا جائزہ نہیں لے لیا، ہم وہیں چھپے ٹھہرے رہے۔ ... یہ وہ گلی نہیں تھی جہاں سے ہم گزر کے آئے تھے مگر یہاں روشنی

بھی تھی اور سڑک بھی صاف تھی۔ ابھی تک بہت سے لوگ موجود تھے۔ سب کا رُخ اپنے گھروں کی طرف تھا۔ کسی نے ہماری طرف توجہ نہیں دی۔ جمرو نے شاید عجلت میں فیصلہ کر لیا تھا، ہم اسی متوازن رفتار سے ایک دوسرے کے آگے پیچھے سیدھے راستے پر چلتے رہتے تو شاید کسی کو گمان بھی نہ ہوتا مگر یہ سب اکیلے جمرو ہی پر موقوف نہیں تھا، کیا وہی پتھر کا بنا ہوا تھا۔ ٹنگو کو اس علاقے کے راستے یاد تھے، مجھے بھی تھوڑے بہت معلوم تھے لیکن اِس وقت سمت نہ وہ پہچان پا رہا تھا، نہ مَیں۔ ہم چلتے رہے، کہیں نہ کہیں تو یہ گلی ختم ہو گی ہی۔ ہمیں زیادہ دُور نہیں چلنا پڑا۔ جلد ہی گلی ایک کشادہ سڑک پر پہنچ کے ختم ہو گئی۔ کچھ فاصلے پر چوک کی تیز روشنیاں جل رہی تھیں اور گھنٹہ گھر کی گھڑی میں ایک بج رہا تھا۔ ٹنگو راستہ پہچان گیا تھا۔ اُس کے اندازے کے مطابق اسپتال تک پیدل کا فاصلہ تھا۔ لیکن چوک پر کھڑی ہوئی ٹم ٹم کے کوچوان نے آوازیں لگا کے ہمیں روک لیا۔ اُس سے کچھ کہے سُنے بغیر ہم ٹم ٹم میں بیٹھ گئے۔ تینوں کے جوتے اور پائنچے کیچڑ میں سیاہ ہو گئے تھے اور بُو اُٹھ رہی تھی۔ ہم پہلے صفائی کر لیتے تو ٹھیک تھا، اب وقت نہیں رہا تھا۔ کوچوان نے ہمارے کہنے پر رفتار تیز رکھی۔ وہ دونوں سر جھکائے بیٹھے رہے۔ میری طرح اُن کے جسم بھی ریت کے، راکھ کے ڈھیر ہو رہے ہوں گے، اُن کی رگوں میں بھی آگ دہک رہی ہو گی۔ پیچھے سے موٹر کا ہارن گونجنے پر وہ دفعتہً سیدھے ہو گئے۔ کوچوان نے بھی ٹم ٹم ایک طرف کر لی، پولیس کی ایک جیپ تیزی سے گزر گئی، اُس میں سپاہی بھرے ہوئے تھے، اُنھیں ہماری طرف دیکھنے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ جمرو اور ٹنگو اُچک اُچک کے اُنھیں دیکھتے رہے۔ مگر جیپ آناً فاناً نگاہوں سے دُور ہو گئی تھی۔ کوچوان گھوڑے کو چابک مارتا ٹم ٹم پھر سڑک پر لے آیا۔ جتنی دیر ٹم ٹم چلتی رہی، مَیں اپنے آپ کو نوچتا کھسوٹتا رہا کہ مجھے ہر حال میں خود کو سمیٹ کے رکھنا چاہیے، اپنا سب کچھ سمیٹ کے، میری طرح دوسروں کی بینائی بھی کسی لمحے اُن سے چھن سکتی ہے۔ اپنے اوسان کی جتنی مجھے ضرورت ہے، اُتنی ہی دوسروں کو بھی ہے۔ اِس وقت مجھے بس ایک ہی دعا کرنی چاہیے، خدا کرے دادا اور ماچھی خیریت سے ہوں۔ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ راستے بھر میں خود کو یہی تاکید میں کرتا رہا مگر مجھے اِس خود فریبی کا زیادہ وقت نہیں ملا۔ دس منٹ سے بھی کم عرصے میں ٹم ٹم ڈاکٹر شیورام کے اسپتال پر جا کے ٹھہر گئی۔

گیٹ کھلا ہوا تھا۔ وہ بنگلے کے طرز کی ایک دو منزلہ عمارت تھی،

پتھروں سے بنی ہوئی ایک قدیم عمارت۔ گیٹ پر دربان پہرا دے رہا تھا۔ اُس نے ہمیں روکنا چاہا لیکن جمرو نے اندر پولیس کے پاس جانے کا عذر کیا، دربان نے زیادہ پس و پیش نہیں کی۔ جمرو کو وہاں پولیس کی موجودگی کا پختہ یقین تھا۔ اسپتال کے احاطے میں قدم رکھتے ہی میرا دل بیٹھنے لگا جیسے کوئی مجھے دھکیلتا، گھسیٹتا لیے جا رہا ہو، مَیں اُن دونوں کے ساتھ قدم بڑھاتا رہا۔ پھلواری اور عمارت کے درمیان گھومتے ہوئے پکے راستے سے گزر کے ہم خاص دروازے تک پہنچ گئے۔ کاریڈور کے آس پاس کھلی جگہ پر پولیس کی کئی موٹریں کھڑی تھیں، اوپر سامنے کے کشادہ اور روشن دالان میں کئی بندوق بردار سپاہی موجود تھے۔ ہم سیڑھیاں طے کیا ہی چاہتے تھے کہ اُنھوں نے ہمیں ٹھیر جانے کا حکم دیا اور ایک سپاہی نے قریب آ کے دھتکارتے لہجے میں ہم سے پوچھا کہ ہم کہاں جانا چاہتے ہیں۔ جمرو نے اُن سے تصدیق چاہی کہ کیا پیر دادا اور ماچھی دادا کو یہیں لایا گیا ہے؟ وہ اُن سے ہمارا تعلق پوچھنے لگا۔ جمرو نے جھجکتے ہوئے خود کو اُن کا عزیز بتایا۔ ہمیں دیکھ کے سپاہی کی آنکھوں میں چمک اُبھر آئی تھی، اُس کی نظریں مسلسل ہمارے پیروں پر بھٹک رہی تھیں۔ اِس سے پہلے کہ وہ کوئی اور سوال کرتا، میں نے اُس سے دادا کا حال پوچھا۔ جواب دینے کے بجائے وہ لپکتا ہوا عمارت کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ چند لمحوں میں وہ نمودار ہوا تو اُس کے ساتھ ایک پولیس افسر بھی تھا۔ دونوں تیز تیز قدموں سے ہماری طرف آئے۔ پولیس افسر وہی سوال دہرانے لگا جو سپاہی پہلے کر چکا تھا، پھر اُلجھی ہوئی آواز میں بولا۔ "وہ ابھی اندر ڈاکٹر کے ساتھ ہے۔"

"کیسے ہیں وہ لوگ.....؟" مَیں نے لڑکھڑاتی زبان سے پوچھا۔

"ابھی کچھ نہیں بول سکتا۔" اُس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"کیا، کیا ہم اندر نہیں جا سکتے؟"

"کیا کرے گا تم جا کے؟....." اُس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں، پھر اُسے کچھ خیال آیا، ناگواری سے کہنے لگا۔ "ٹھیک ہے، تم ابھی بیٹھ کے تھوڑا انتظار کرو۔" اُس نے سپاہی سے کہا کہ وہ ہمیں اندر لے جا کے بٹھا دے۔ یہ کہتے ہی وہ چلا گیا تھا مگر جاتے جاتے لوٹ آیا اور حکمیہ لہجے میں ہم سے بولا کہ اُسے ہم سے ضروری بات کرنا ہے، اطلاع دیے بغیر ہم واپس نہ جائیں۔

سپاہی نے ہمیں دالان سے ملحق ایک کشادہ اور روشن کمرے میں پہنچا دیا۔ جیسا کہ میرا خیال تھا، وہ تینوں وہاں موجود نہیں تھے، تجھل، شامو اور مارٹی۔ ہم ایک طرف کونے میں رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے، سپاہی واپس چلا گیا۔ کئی منٹ گزر گئے، کسی نے ہماری خبر نہیں لی۔ کمرے کے ساتھ ہی شاید کوئی راہ داری تھی جہاں سے ہلکی ہلکی [illegible] مضطربانہ سرگوشیاں سی سنائی دے رہی تھیں۔ کمرے سے [illegible] کھلنے والا دروازہ بھی وا تھا۔ مَیں اُس طرف جا کے راہ داری [illegible] کے بجائے اپنے آپ کو جکڑے بیٹھا رہا مگر میرا دم گھٹ رہا [illegible] پیرو کی بیوی رانی کی صورتیں بار بار آنکھوں کے سامنے [illegible] ابھی دو گھنٹے پہلے ہی تو میں انھیں اُن کے گھر چھوڑ کے آیا تھا [illegible] سے ضد کر رہی تھی کہ وہ اُن کے ساتھ گھر کیوں نہیں چل [illegible] کیسی مطمئن اور خوش خوش گھر لوٹی تھیں۔ اُن کے خیال سے [illegible] ہولنے لگتا۔ خدا دادا کو سلامت رکھے، میری زندگی ویسے بھی کسی کام [illegible] کاش یہ دادا کو لگ جائے۔ مَیں وہاں بیٹھا بس دعائیں کرتا رہا [illegible] مَیں کر بھی کیا سکتا تھا۔ جمرو اور ڈنگو کی آنکھیں دروازے پر لگی تھیں، ذرا سی آہٹ ہوتی تو دونوں چونک پڑتے۔ کوئی بھی اندر نہیں آیا [illegible] افسر اور سپاہی ہمیں یہاں بٹھا کے بھول گئے ہیں۔ دیواری گھڑی [illegible] بج رہا تھا۔ ویسے ہمیں یہاں آئے زیادہ وقت نہیں ہوا تھا لیکن [illegible] تو گھڑی پر نہیں، آدمی پر موقوف ہے، آدمی پر کیسا گزر رہا ہے [illegible] منٹ ہم پر پہاڑ کے مانند گزرے تھے۔

پھر مجھ سے، ایسے بے دست و پا، کسی معذور و مفلوج [illegible] نہ بیٹھا گیا۔ مَیں اُٹھ کے سیدھا راہ داری میں کھلنے والے [illegible] کی طرف بڑھ گیا۔ وہ ایک راہ داری ہی تھی، گلی جیسی۔ [illegible] اُس کے تنگ دونوں جانب کمرے بنے ہوئے تھے۔ وہاں [illegible] لوگ موجود تھے۔ سفید گاؤن میں اسپتال کے متحرک عملے کے [illegible] افسر اور سپاہی۔ پہلے مَیں نے سر نکال کے باہر کا جائزہ لیا۔ تجھل [illegible] مارٹی کے چہرے دور تک دکھائی نہیں دیے۔ یہاں اُنھیں [illegible] چاہیے تھا۔ یقیناً وہ کسی کونے یا کسی اور کمرے میں ہوں گے۔ [illegible] سے باہر آ گیا۔ پھر جیسے ہی پہلو کے کمرے سے مجھے ایک عمر رسیدہ [illegible] نظر آیا، مَیں جھپٹ کے اُس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ جلدی [illegible] اُس نے رک کر کبیدگی سے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

مَیں نے دبی دبی آواز میں اُس سے دادا اور ماچھی کے [illegible] میں معلوم کیا۔

"ہم کوشش کر رہے ہیں لیکن اب دعا کی ضرورت [illegible] میرے بیٹے!" وہ مجھ سے معذرت کرتا ہوا راہ داری میں چلا گیا [illegible] دیکھتا رہ گیا۔ میری سانس سینے میں اٹک گئی تھی۔ درمیان [illegible] سپاہی نے آوازیں دے کے مجھے ٹھیرنے کا حکم دیا تھا مگر [illegible] ڈگمگاتے قدم تیزی سے اُس طرف بڑھتے رہے جدھر ڈاکٹر [illegible] چند گز کے فاصلے پر مجھے ٹھٹک کے رک جانا پڑا۔

راہ داری کے بیچ میں بنے ہوئے بیضوی دائرے کے دائیں حصے میں جمگھٹا سا لگا تھا۔ نرسیں اسپتال کے عملے کے لوگ ایک بند کمرے کے گرد منڈلا رہے تھے۔ وہ پولیس افسر بھی وہاں تھا جس نے مجھے، جمرو اور ڈنگو کو کاریڈور میں روکا تھا۔ کمرے کی چوکھٹ پر سُرخ بتی جل رہی تھی۔ اسی کمرے میں وہ دونوں ہوں گے۔ اُس پر آپریشن تھیٹر کی تختی بھی نصب تھی۔ میرے دل میں بس یہی آئی کہ دروازے کے پہرے دار کو ہٹا کے سیدھا اندر داخل ہو جاؤں۔ بعد میں چاہے مجھے دھکے دے کے باہر نکال دیا جائے۔ دادا کیسا بھی ناراض ہو، کتنے ہی غصے میں ہو، میری آواز سُن کے اُس کا چہرہ ہمیشہ کھل اُٹھتا ہے، وہ مجھے اپنی گیتا کی طرح عزیز رکھتا ہے۔ میں جا کے اُسے گیتا اور رانی کا واسطہ دوں گا۔ شاید میری آواز اُس کا حوصلہ بحال کر سکے، میری صوت اُس کے وجود کے اندھیرے میں کوئی کرن ثابت ہو۔ آدمی بھی تو آدمی کی دوا ہوتا ہے۔ میری صدا پر وہ ایسا غافل نہیں رہ سکے گا۔ وہ کتنی بار میری خاطر اپنی جان داؤ پر لگا چکا ہے، اس بار مَیں اُس سے زندگی مانگوں گا۔ مجھے کسی تاخیر کے بغیر اندر جانا چاہیے۔ مَیں ڈاکٹروں سے عاجزی کر لوں گا کہ صرف چند لمحوں کے لیے اُس کے پاس جانے کی مہلت دے دیں اور روپے پیسے کی کوئی فکر نہ کریں، میرے پاس دھن دولت کی کمی نہیں ہے۔ ابا جان کے پاس بے شمار نادر و نایاب ہیروں کا خزانہ ہے، ڈاکٹر جو چاہیں اُس میں سے لے لیں، بس کسی طرح دادا کا ہوش واپس لے آئیں۔ تجھل بھی نظر نہیں آ رہا، وہ کہاں چلا گیا؟ کہیں وہ اندر تو نہیں ہے؟ اُسے تو دادا کے سرہانے ہی ہونا چاہیے۔ میرے دماغ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

مَیں اندر داخل ہو جاتا مگر دوسرے ہی لمحے وہ تینوں مجھے نظر آ گئے۔ ایک کونے میں کمرے کی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی کرسیوں پر تجھل، شامو اور مارٹی سر جھکائے بیٹھے تھے۔ ایک پولیس افسر بھی اُن کے قریب بیٹھا کاغذوں پر کچھ لکھ رہا تھا۔ اتنی سی دیر میں وہ تینوں پہچانے نہیں جا رہے تھے۔ بکھرے ہوئے بال، سُوجے سُوجے چہرے۔ کپڑوں پر خون کے دھبے۔ اُنھیں اِس حال میں دیکھ کے میری رہی سہی ہمت بھی جواب دینے لگی۔ میں اُنھیں آواز دیتے دیتے، اُن کی طرف جاتے جاتے رہ گیا۔ اُسی وقت مارٹی اور شامو نے مجھے دیکھ لیا، جیسے اُنھیں بس میرا انتظار تھا۔ وہ اُمڈتے ہوئے میری طرف بڑھے اور آ کے مجھ سے چمٹ گئے۔ مارٹی ہڑکنے لگا۔ اُس کی سسکیوں سے میرا سینہ کٹ رہا تھا۔ مَیں اُسے کیا دلاسا دوں؟ اِس کی کمر تھپک کے چپ کراؤں؟ کیا کروں؟ زبان کی طرح میرے ہاتھ بھی اینٹھ گئے تھے۔ ایک نادار دوسرے نادار کے آگے، ایک تہی دست دوسرے تہی دست کے سامنے ہاتھ پھیلائے تو دوسرا کیا کرے۔ شامو کو جانے کیا ہوا۔ وہ مارٹی کو اُسی وقت میرے پاس سے لے گیا اور اُنھی کرسیوں پر جا کے بیٹھ گیا۔ میں وہاں اکیلا رہ گیا۔ مَیں اکیلا ہی کھڑا رہا۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ چوکھٹ کی سُرخ بتی بجھ گئی اور دروازہ کھلنے پر کئی ڈاکٹر ایک دوسرے کے آگے پیچھے برآمد ہوئے۔ اُن کی پیشانیوں سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ اُنھیں دیکھتے ہی سب اُن کی طرف لپک پڑے۔ تجھل کو بھی مَیں نے کرسی سے اُٹھتے دیکھا، پھر وہ سب میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ مَیں نے بھی اُن کی جانب بڑھنا چاہا تھا لیکن مجھ سے ایک قدم بھی نہ چلا گیا۔

ایک لمحے کے لیے شور سا اُٹھا، پھر ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ اِس سنّاٹے کا مطلب میری سمجھ میں بعد میں آیا کہ وہ دادا اور ماچھی کے بارے میں فیصلہ سنا رہے ہیں۔ میرا سارا جسم دھڑکنے لگا تھا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ نہیں نہیں، یا تو یہ لوگ پاگل ہو گئے ہیں یا سب میری آنکھوں کا جھوٹ، میرے دماغ کا فتور ہے۔ ابھی چند گھنٹے پہلے کے جیتے جاگتے آدمی اِس طرح کیسے جا سکتے ہیں؟ میرے جی میں آئی کہ میں زور زور سے چیخوں، اپنا سر دیواروں سے پھوڑ لوں یا پولیس افسر سے تمنچا چھین کے سب کو گولی مار دوں، اِس جگہ ہی کو آگ لگا دوں مگر مجھ سے کچھ بھی نہ ہو سکا۔

اُنھوں نے ڈاکٹروں کے لیے راستہ چھوڑ دیا تھا۔ مَیں بُت کے مانند کھڑا اُنھیں دیکھتا رہا۔ وہ آہستہ آہستہ میرے سامنے سے گزر گئے۔

آدمی عناصر کا مرکب ہے تو حواس سے بھی عبارت ہے۔ بے حواسی بھی ایک قسم کی موت ہے۔ مَیں بھی کچھ دیر کے لیے مر گیا تھا، اندھا ہو گیا تھا کیونکہ میری استطاعت یہی تھی۔ کاش ایسا ہی رہتا، میرے حواس کبھی نہ جاگتے، میری آنکھیں بند ہی رہتیں۔ یہ عارضی موتیں تو آدمی کے لیے اور عذاب ہیں۔

مارٹی میرے سینے سے لپٹ کے بلبلانے لگا تو مجھے احساس ہوا کہ میں کون ہوں۔ یہ جگہ کون سی ہے اور سامنے کے کمرے میں کون بے حس و حرکت..... مارٹی مجھ سے چمٹ چمٹ کے رو رہا تھا اور وہی سوئیاں میرے تن بدن میں پھر چبھنے لگی تھیں۔ کیا وہ دونوں اتنے اکیلے، اتنے بے وقعت ہیں کہ اُن کے لیے یوں آسانی سے حکم صادر کر دیا جائے؟ پہلے بھی کئی بار میرے سینے میں گرج اُٹھی تھی کہ مجھے سیدھے پاٹنے جانا چاہیے۔ اُس کتے کے لیے چاہے مجھے اِس سرے سے اُس سرے

تک بمبئی کے ایک ایک پاڑے جانا پڑے۔ وہ کوئی بھی ہوا اور کتنے بھی ہوں، میں اُنھیں مہلت نہیں دوں گا۔ دادا کا خون ایسا ارزاں نہیں کہ اتنی دیر لگے۔ اُنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ دادا اور ماچھی کے صرف اپنے ہاتھ پیر ہی نہیں ہیں، اُن کے اَن گنت ہاتھ پیر ہیں۔ دادا اور ماچھی ہی کے خیال نے اب تک مجھے روکے رکھا تھا۔ اب تو کچھ بھی نہیں رہا۔ اب کس بات کا انتظار ہے؟ مجھے تو اُسی وقت نکل جانا چاہیے تھا۔ میری رگوں میں خون سَن سَنا رہا تھا۔ اِس سے پہلے کہ تُھل اور سب یہاں سے چل پڑیں اور مجھے بھی اُن کے ساتھ جانا پڑے، مجھے نکل جانا چاہیے ورنہ وہ مجھے نہیں جانے دیں گے اور میرا جسم اِسی طرح جلتا رہے گا۔ اُن کمینوں تک کسی اور کے پہنچنے سے پہلے مجھی کو پہنچ جانا چاہیے۔ میں نے مارتی کو اپنے بازوؤں سے الگ کر دیا۔

وہ سب منتشر ہو چکے تھے۔ میری نظریں بے اختیار تُھل کی طرف گئیں۔ وہ پولیس افسر اور سپاہیوں کے درمیان خاموش کھڑا تھا۔ جمرو اور ٹنگو بھی مجھے اُن کے قریب کھڑے دکھائی دیے۔ دونوں کی آنکھیں برس رہی تھیں۔ میں وہیں ٹھیرا رہا۔ کسی طرف کا رُخ کرنے سے پہلے مجھے اپنے آپ کو طمانچے مارنے کی ضرورت تھی، اپنی بینائی کی درستی اور دل و دماغ کی یک جائی کے بغیر میں اُن تک کبھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ پھر عین اُس وقت جب میں وہاں سے نکلنے کا ارادہ کر رہا تھا، شامو میرے پاس آگیا اور اُکھڑی اُکھڑی آواز میں کہنے لگا کہ مجھے فوراً یہاں سے چلا جانا چاہیے۔

"کیوں؟" میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

"وہ ہم کو تھانے لے جا رہے ہیں۔" وہ سرگوشی میں بولا۔

"تھانے! مگر کس لیے؟"

"تھوڑی پوچھ تاچھ کے لیے۔"

"اب کیا پوچھنا رہ گیا ہے؟"

"بول رہے ہیں تو جانا پڑے گا۔ تو گھر جا کے پہلے بابا کو بول دے اور پاڑے میں بھی بول آ اور، اور سُبھے تو اُدھر دادا کے گھر...." اُس کی آواز ڈوبنے لگی۔

"نہیں نہیں، یہ مجھ سے نہیں ہو گا۔"

"بولنا تو ہو گا لاڈلے!" وہ شکستہ لہجے میں بولا۔

"ہاں ہاں، مگر تُھل بھائی ہی کو بھیجنا۔"

"ہم کو اُدھر دیری بھی لگ سکتی ہے۔"

"کیوں؟"

"سمجھا کر، پولیس کو تو تُو سارا جانتا ہے۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔"

"اپنے کو بھی کچھ دکھائی نہیں دے رہا لاڈلے کہ یہ کیا [illegible] سب کیا ہو گیا۔" وہ سسکتے ہونٹوں سے بولا۔

"میرا دل بہت گھبرا رہا ہے شامو!"

"ہم جلدی آنے کا کریں گے۔" وہ پلکیں جھپکاتے ہو[ئے]

"ٹھیک ہے، ایسا کر، تُو ابھی پاڑے کی طرف مت جا۔"

پولیس افسر کی آواز پر وہ کوئی توقف کیے بغیر میر[ے پاس] سے چلا گیا۔ میں بھی اُسی لمحے راہ داری میں مڑ گیا۔ میں نے [راہ داری] عبور کر لی اور کاریڈور کی سیڑھیاں طے کر کے دروازے ک[ے] دُور تک چلا آیا۔ معاً کسی نے پیچھے سے اونچی آواز میں ٹھی[رنے کا] حکم دیا۔ میرے قدم لڑکھڑا گئے تھے لیکن میں دروازے کی طر[ف بڑھتا] رہا۔ پھر پیچھے سے بھاگتے قدموں کی آواز آئی۔ میں نے سوچا [کہ] دوڑ کر طے کر لوں اور جلد از جلد دروازے سے گزر جاؤں [مگر وہ] میرے سر پر آگیا اور مجھے ٹھیرنا پڑا۔ "کدھر کو جاتا ہے؟" اُس [نے پھولی] سانسوں میں مجھ سے پوچھا، وہ ایک سپاہی تھا۔

میں نے اُسے بتانا چاہا کہ میں گھر جا رہا ہوں۔

"تم کو ابھی کچھ بولا تھا صاحب نے؟" میں چپ رہا [تو وہ پھولی] ہوئی آواز میں بولا۔ "چلو، ابھی ساتھ چلنے کا ہے۔"

"کیوں؟" میں نے تلخی سے پوچھا۔

"یہ اُدھر افسر لوگ سے پتہ کرنا۔"

وہ ایک ہی آدمی تھا اُس کے شانے پہ بندوق لٹکی [تھی۔ میرے] دل میں اُس کی گردن دبوچ لینے اور اُسے قریب کی با[ڑھ پر] لوٹ دینے کا خیال آیا، اُس طرف اتنی روشنی نہیں تھی او[ر] دروازہ بھی دُور نہیں رہا تھا لیکن میں نے خود کو روک لیا۔ [اُس نے] میرے بازو پر ہاتھ مار کے مجھے کاریڈور کی جانب دھکیل [دیا اور جب] تک وہ جانے کیا کیا بڑبڑاتا رہا۔ تُھل، جمرو اور شامو بھی مو[قع پر] پاس آ چکے تھے۔ پولیس افسر میرا منتظر تھا۔ دُور سے مجھے دیکھ [کر وہ اُتاؤلا] ہونے لگا کہ کیا مجھے ٹھیک سنائی نہیں دیتا، میں اُسے ا[طلاع دیے] بغیر کہاں جا رہا تھا؟ میرے خاموش رہنے پر وہ اور جزبز ہو[ا۔ ابھی اُس کے منہ] سے ایک دوسرے پولیس افسر نے آ کے اُسے ٹوکا اور عجلت [سے جیپ کی طرف بڑھا] دیا تب اُس کی زبان قابو میں آئی۔ تُھل اور جمرو پہلے ہی [جیپ میں بیٹھے] تھے۔ میرے بیٹھتے ہی جیپ چل پڑی۔ راستے بھر خاموشی [رہی۔]

تھانے کے ایک وسیع اور روشن کمرے میں اُنھوں [نے ہمیں] بنچوں پر بٹھا دیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں تیز تیز قدموں سے تین پولیس افسر اندر داخل ہوئے، اُن کے ہاتھوں میں کاغذات تھے۔ ایک عمر رسیدہ افسر کی بغل میں ڈنڈا بھی دبا تھا۔ ڈنڈا میز پر رکھ کے اُس نے ہم سے کچھ فاصلے پر درمیان کی کرسی سنبھال لی۔ باقی دونوں افسر اُس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ اُن میں سے دو کو میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اُن کے پیچھے دیوار کے ساتھ دو سپاہی بندوقیں لٹکائے مستعد کھڑے تھے۔ دروازے پر بھی دو مسلح سپاہی تعینات تھے۔ ایک سپاہی میز کے قریب ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ افسر کاغذات الٹ پلٹ رہے تھے کہ میرے برابر بیٹھے ہوئے جمرو نے آہستگی سے میرا ہاتھ دبایا۔ "تھوڑا سنبھل کے۔" اُس کے کہنے پر میں سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔ "اپنے کو سارا دھیان رکھنا ہے۔" وہ سرگوشی میں بولا۔ میں نے اُس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کی۔ کہیں مجھ سے کوئی غلطی تو نہیں ہو رہی ہے جو یہ وقفے وقفے سے مجھے ٹھوکے دے رہا ہے؟ یہی کچھ شامو نے کمرے میں داخل ہوتے وقت مجھ سے کہا تھا۔ "تھوڑی سی بے دھیانی سے دیر لگ سکتی ہے۔" جمرو بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ کیسا دھیان؟ وہ ایسا کیوں کہہ رہا ہے۔ ہمیں کس قسم کا دھیان رکھنا ہے اور ہم یہاں ایسے بے زبانوں کی طرح کیوں بیٹھے ہیں؟ میں جمرو سے پوچھنا چاہتا تھا مگر اُس نے کہنی مار کے مجھے میز کی طرف متوجہ کیا۔ درمیان والے عمر رسیدہ پولیس افسر کی نگاہیں ہم پر منڈلا رہی تھیں۔ اُس نے عینک اُتار کے میز پر رکھ دی اور بھاری آواز میں تُھل کو مخاطب کیا۔ "جیسا تم نے بولا ہے، یہ لوگ تھوڑی دیر پہلے گھر سے نکلا تھا، کوئی دس بجے کے قریب؟"

"ہاں صاحب!" تُھل نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"اور اندھیری جانے کا بول کے گیا تھا؟"

تُھل نے سر ہلا کے ہاں میں جواب دیا۔

"پھر تم کو کبھی اور کیسے معلوم ہوا؟"

"ہم سب پہلے بول چکے ہیں۔" تُھل نے آہستگی سے کہا۔

پولیس افسر نے اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے ساتھیوں پر نظر ڈالی اور کاغذات ٹٹولنے لگا۔ "تم کتنی دیری بعد وہاں پہنچا تھا؟"

"یہ بھی ہم نے بول دیا ہے۔"

بائیں طرف والے ادھیڑ عمر افسر کی پھیلی پھیلی آنکھیں تُھل پر جمی ہوئی تھیں، اُس نے نسبتہً نرم آواز میں کہا۔ "کوئی بات رہ گئی ہو تو یاد کر کے ہم کو بولو۔"

"یاد آنے پر ضرور بول دیں گے۔" تُھل بھن بھناتی آواز میں بولا۔

"کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے پولیس کو تمھاری مدد کی ضرورت پڑے گا، ہم کو کھُل کے بتاؤ، ابھی تمھارے خیال میں کون لوگ اُن کا دشمن ہو سکتا ہے؟"

"اپنے کو پتہ ہوتا تو پہلے اُدھری جاتے۔"

"وہ قانون کا کام ہے، ہمارا کام، اور ہم اُنھیں کھوج لے گا۔ اُنھوں نے کن لوگوں پر ہاتھ ڈالا ہے، ہم بھی جانتا ہے۔ اُدھر سپاہی لوگ نے اُس کو پہچان لیا ہے۔ وہ پیرو دادا ہے۔"

"صرف دادا ہی نہیں بولو۔"

"ہاں۔" اُدھیڑ افسر جلدی سے بولا۔ "سب سے بڑا دادا، ہم کو معلوم ہے، ایک نمبر کا دادا۔"

تُھل سر جھکائے بیٹھا رہا۔

"تم نے بولا کہ تم لوگ اِدھر بمبئی کا نہیں ہے اور پیرو دادا تمھارے کسی آدمی کے بیسویں پر اندھیری سے ماچھی دادا کے ساتھ آیا تھا، کچھ دیر ٹھیرا اور چلا گیا، ایسا ہی بولا تھا تم نے؟"

"ایسا ہی۔" تُھل نے ہنکاری بھری۔

"تم ابھی کدھر سے بمبئی آیا تھا؟"

"اپنی بات چھوڑو، ابھی اُس کی بات کرو۔"

"اُسی کے لیے پوچھتا ہے۔" دائیں طرف کی کرسی والے نوجوان پولیس افسر نے ترشی سے کہا۔

"اُلٹی طرف سے مت چلو۔"

"پھر سیدھی طرف کا تم بولو۔"

"کیا بولیں، اپنے پاس ابھی کیا رہ گیا ہے۔" تُھل نے گہری سانس بھر کے کہا۔ "دادا کو ابھی تم نے کدھر بھیجا ہے؟"

"دونوں کا پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال میں۔"

"اپنے کو کب تک مل جائے گا؟"

"زیادہ دیری نہیں لگے گا۔" درمیان میں بیٹھے ہوئے افسر نے کہا۔ "پر اُن کو ابھی تمھارے حوالے کیوں کرے؟"

"پھر کس کو کرو گے صاحب؟"

"تم اُس کا وارث نہیں ہو۔"

"ہم اُنھی کے پاس لے جائیں گے۔"

"تم، تم اُنھیں جانتے ہو؟" نوجوان افسر نے تیزی سے پوچھا۔

"نہ جانتے تو ٹھیک تھا۔" تُھل نے بوجھل آواز میں کہا۔

"کون ہے وہ؟ کہاں رہتا ہے، ماہم کے پاڑے میں؟"

"وہ اپنے گھر رہتا ہے۔"

"گھر! گھر کدھر ہے؟"

"اِدھر شہر میں ہی ہے۔"
"تم بتانا نہیں چاہتا؟"
"بتا دیں گے پر پہلے ہم کو اُدھر جانا ہوگا۔"
"تم کو کیوں؟"
"اُس کو دیکھ کے وہ مر جائیں گے، ہم کو پہلے جا کے اُن کو سنبھالنا ہوگا۔" تُجھل کی آواز جھرجھرا رہی تھی۔
"کون کون لوگ ہے اُدھر؟"
"بیوی اور بیٹی۔"
"بیوی اور بیٹی!" نوجوان افسر نے دُہرایا۔
"کیوں! نہیں ہوسکتا صاحب؟"
"ہوسکتا ہے۔" پولیس افسر پہلو بدل کے بولا۔
"وہ اُن لوگ کو سب سے دُور رکھتا تھا۔"
"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ بیوی اور بیٹی نہیں جانتا تھا کہ وہ پاڑا چلاتا ہے، پاکٹ میں ہر وقت چاقو رکھتا ہے، کتنی بار جیل جا چکا ہے۔ سارا بمبئی کے دادا لوگ کا وہ راجا ہے؟"
تُجھل نے کچھ نہیں کہا۔
"بولو، چپ کیوں ہو گئے؟"
"آپ کرسی پر بیٹھے ہو۔"
"لگتا ہے، بہت قریب تھا تم اُس کے؟"
"آپ کو بُرا لگتا ہے صاحب؟"
"نہیں۔" پولیس افسر نے سر جھٹکا۔ "لیکن...." وہ کچھ سوچ کے رک گیا اور مضطرب آواز میں بولا۔ "کیا نام بتایا تھا تم نے اپنا؟"
"کاغذ پر لکھا ہے۔"
تینوں افسر کاغذ لوٹنے پلٹنے لگے۔ "تُجھل!" نوجوان افسر نے تندی سے کہا۔ "صرف اتنا ہی نام ہے تمھارا؟"
تُجھل نے کوئی جواب نہیں دیا۔
"کیا کرتے ہو؟"
"دادا کا جان کار کیا کر سکتا ہے۔"
"داداگیری، ہا! تم بھی دادا ہے، کدھر؟"
"ابھی تو اِدھر ہی ہے، کام کی بات کرو صاحب!"
"دیکھو تُجھل دادا!" اَدھیڑ افسر نے تنبیہی انداز میں کہا۔ "اپنے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اچھا ہوگا کہ تم سے جو پوچھا جائے سوچ سمجھ کر ٹھیک ٹھیک جواب دو۔"
"یہ آپ کے ٹھیک ٹھیک بولنے پر ہے۔" تُجھل نے کہا۔ "آپ کی ہر بات کا جواب دینا ضروری نہیں ہے۔"
"تم اپنے ہوش میں نہیں ہے۔" نوجوان افسر برہمی سے ا... میں بیٹھے ہوئے عمر رسیدہ افسر نے میز تھپک کے اُسے تحمل کی تلقـ... اور ٹھیرے ہوئے لہجے میں تُجھل سے کہا۔ "یہ پولیس اسٹیشن... دادا! اور تم پولیس کے سامنے بیٹھا ہے۔"
"نئے نہیں بیٹھے ہیں۔"
"ایسا ہی لگتا ہے پر تم اِدھر ضرور نوا نوا ہے۔ یہ بمبئی کا... ہے۔ اِس کے بارے میں تم نے تھوڑا بہت سنا ہوگا۔"
"اُوپر سے اُتر کے نہیں آیا ہے۔" تُجھل کی آواز تڑخنے... "ہم بولتے ہیں، اپنے آپ کو زیادہ مت اُلجھاؤ۔ دُور چلے جاؤ... اِدھر اُدھر کی منہ ماری سے آپ کو کچھ نہیں ملے گا۔ آپ لوگ... آدمی ہے۔ اِدھر اپنا دو بھائی چلا گیا ہے اور آپ مخول کر رہے...
"یہ مخول ہے؟" نوجوان افسر بھڑک کے بولا۔
"ہم اِدھر پاکٹ مار کے نہیں آئے ہیں یا آپ کے گھر ڈاکا ڈا...
"تم ایک خون، بلکہ دو خون کے گواہ ہو۔" دائیں طرف د... افسر نے کہا۔ "یہ پاکٹ مارنے اور ڈاکا ڈالنے سے بڑا...."
"اپنے دو آدمیوں کا خون ہو گیا ہے۔" تُجھل اُس کی با... کاٹ کے اونچی آواز میں بولا۔ "ایسا بولو صاحب۔"
"ایسا ہی ٹھیک ہے اور تم وہ پہلا آدمی ہے جو اُس کو لو... ہوا آیا تھا۔"
"ہم کو دوسرے تیسرے نمبر پہ آنا چاہیے تھا کیا؟"
"اپنا آواز تھوڑا نیچا رکھو۔ ضرورت سے اوپر اونچا ہے، سمجھا؟"
"اپنے کو بھی آپ سے یہی شکایت ہے۔"
میں نے بے چینی سے جمرو اور شامو کی طرف دیکھا۔ یہ کیا... رہا ہے۔ وہ کیوں گونگے اور بہرے بنے ہوئے ہیں۔ اُن... سے کہتے کیوں نہیں کہ وہ ہم سے ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں جن... کچھ حاصل نہیں۔ یہ لوگ پولیس سے کچھ نہیں کہہ سکتے تو تُجھل ہی... روک لیں۔ کم از کم وہی اپنا لہجہ بدل سکتا ہے۔ جمرو اور شامو جو... ہدایتیں مجھے دے رہے تھے، وہ تُجھل کو دینی چاہیے تھیں۔ تُجھل جا... میں نہیں معلوم ہوتا، ہونا بھی نہیں چاہیے۔ میں جانتا ہوں اُن... کے سینے میں کیسا تلاطم برپا ہوگا۔ میں نے طے کیا کہ میں دخل دوں... اور اُن سے کہوں کہ کچھ تو ہمارا خیال کریں۔ اُنھیں کوئی اندازہ نہیں... کہ ہم پر کیا گزر رہی ہے۔ ہم کس طرح جبر کیے یہاں بیٹھے ہیں۔ اِن... کارروائی کے لیے وہ کوئی اور وقت نہیں رکھ سکتے؟ میں یک لخت... اُٹھ گیا لیکن فی الفور اِدھر سے جمرو نے، اُدھر سے شامو نے میرے بازو کھینچ کے مجھے بٹھا دیا۔
"کیا ہے؟ کیا ہے؟" کمرے میں ایک ساتھ کئی آوازیں گونجیں۔
"کچھ نہیں صاحب! کوئی بات نہیں۔" شامو نے جلدی سے کہا۔
"یہ کون ہے؟" نوجوان افسر نے درشتی سے پوچھا۔
"اپنا بھائی ہے صاحب!"
"ابھی کیا ہو گیا اِس کو؟ کیا بولتا ہے؟"
"کچھ نہیں صاحب، آپ اپنا کام کرو۔" شامو نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا اور کتراتی ہوئی آواز میں مجھے سمجھانے لگا۔ "ابھی اُستاد کو رہنے دے۔"
پیچھے کھڑے ہوئے دونوں سپاہیوں نے بندوقیں سیدھی کر لی تھیں۔ دروازے پر تعینات سپاہی بھی آگے آ گئے تھے۔ تینوں افسروں کی نگاہیں دیر تک مجھ پر مرکوز رہیں، پھر نوجوان افسر نے ناگواری سے کہا۔ "کوئی اور، کچھ بولنا مانگتا ہے؟"
سب خاموش رہے۔ تُجھل نے بھی کچھ نہیں کہا۔
"سنو دادا! ذرا غور کر کے سنو۔" بیچ والے افسر نے ٹھیرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ہم کو تمھاری مدد کی ضرورت ہے۔"
"اپنے کو آپ سے زیادہ ہے۔" تُجھل کی آواز بھی کسی قدر سنبھلی ہوئی تھی۔
"ہم کریں گے، اگر جیسا تم بولتے ہو، ہم کو بھی دُکھ ہے کہ تمھارے دو آدمی مارے گئے ہیں۔ ہمیں بتاؤ کہ اِدھر قریب میں پیرو دادا اور ماچھی دادا سے کسی کا دنگا فساد تو نہیں ہوا تھا؟ اپنا مطلب ہے، تمھیں کسی پر شک ہو تو صاف صاف بولو۔ پولیس اپنا کام کرے گی۔ وہ جدھر بھی ہے، پولیس سے دُور نہیں ہے۔"
"آپ کو سارا بول دیا ہے، ہم دادا کی صورت دیکھنے پیچھے آتے، دادا سے پہلے اُس حرام کے تخم کا کریا کرم کرتے۔"
"تم کو اِس کا اجازت نہیں ہے۔ تم سے ابھی کیا بولا کہ اِس کے لیے ہم موجود ہے۔ ہم کس لیے اِدھر بیٹھا ہے۔"
"آپ کو دیر لگے گی صاحب اور ہم کو یہ راس نہیں آتی۔"
"اِس کا مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ تم خود وہاں پہنچنا چاہتے ہو اور اِسی لیے ہم کو کچھ بتانا نہیں چاہتے؟"
"آپ ٹھیک سمجھے ہو، یہ اپنا حساب ہے۔ پتہ ہونے پہ بھی ہم آپ کو تکلیف نہیں دیں گے۔"
"ہم تمھیں ایسا نہیں کرنے دیں گے۔"
"آپ کا کام بعد میں شروع ہوتا ہے۔ بولو گے تو بعد میں آپ کے پاس آ جائیں گے۔"
"تم غلطی پر ہے، ہمارا کام پہلے بھی شروع ہوتا ہے۔ ہم تمھیں ابھی کو اِدھر روک سکتے ہیں۔"
"آپ کس کس کو روکو گے؟"
"تم سب کو، ہم تم سب کو روک سکتے ہیں۔"
"اور اُدھر جو بے گنتی کے بیٹھے ہیں؟ اُدھر اُس کی بولی لگانے والے تھوڑے نہیں ہیں۔ آپ سمجھتے ہو، دادا ایسا اکیلا، اتنا سستا تھا؟" تُجھل نے سرد لہجے میں کہا۔ "اور اِدھر کون سی دیوار پر لکھا ہے کہ آپ ہم کو ایسے روک سکتے ہو۔"
"روک سکتے ہیں۔" اَدھیڑ افسر کرختی سے بولا۔ "اپنے پاس بہت ادھیکار ہے۔ ایک نہیں کئی چارج لگا کے۔ تم جو ایسا بے لگام بول رہا ہے، یہی چارج لگا کے ہونے والے خون خرابے کی روک تھام کے لیے۔ پولیس تم کو شک میں بھی روک سکتی ہے۔"
"کتنے دنوں تک؟"
"جب تک تمھارا دماغ ٹھکانے پر نہ آ جائے اور ہم کسی ٹھیک جگہ نہ پہنچ جائے۔ جب تک ٹھیک آدمی کا گردن پہ اپنا ہاتھ نہ پہنچ جائے اور، اور جب تک تم پہ اپنا شک دُور نہ ہو جائے۔ تم نہیں جانتا، ابھی تم پہ شک کرنے کو کتنا، کتنا پوائنٹ بنتا ہے۔ تم اِدھر بمبئی کا رہنے والا نہیں ہے۔ بمبئی پولیس تمھارا آگا پیچھا بھی ایک دم نہیں جانتا۔ دادا تمھارے گھر سے لوٹ رہا تھا اور رستے کا ٹائم کا تم کو اچھی طرح پتہ تھا۔ دادا کا جان پہچان والے میں تم سب سے پہلے پہنچا تھا۔ تم کو سب سے پہلے خبر ملا جب کہ تم اُدھر دُوری پر گھر میں بیٹھا تھا۔ اُدھر گولی کا آواز بھی نہیں پہنچ سکتا۔ سمجھا! ہم کو ابھی سارا چھان بین کرنا پڑے گا کہ تم .... تم۔"
تُجھل چپ بیٹھا رہا۔ نوجوان افسر غصے سے بولا۔ "ایسا نہیں ہے؟"
"آپ بادشاہ ہو صاحب! شک کرنے کو اپنے آپ پر بھی کر سکتے ہو۔ اُدھر ہمارے جانے سے پہلے وردی والے لوگ پہلے گئے تھے، بندوق بھی اُن کے پاس تھی، اور دادا سے رٹّا کا بھی ماں کے...." تُجھل کے منہ سے کچھ نکل جاتا، اُس نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور بکھری ہوئی آواز میں بولا۔ "پتہ چلنے پر ہم گھر میں بیٹھے انگلی چٹخاتے رہتے؟ ایسا نہیں ہوتا صاحب! آپ نوے نوے افسر نہیں ہو اور آپ سے اپنی باپ دادا کی دشمنی کا اُدھار نہیں ہے۔ آپ ایسا نہیں کرو گے۔ تھوڑی بہت اپنے کو بھی اونچے نیچے کی جان کاری ہے۔

آپ چار دن میں تسلی کر لوگے، دس دن میں، سال بھر میں۔ سوال کرنا آپ کو ہی نہیں آتا، اپنے کو بھی آتا ہے اور جو اپنے کو نہیں آتا، وہ اُدھر کرانے کے آدمیوں کو آتا ہے، ہر جے خرچے کا پورا حساب۔ ٹکے سیر مل جاتے ہیں۔ اُلٹا پڑ جائے گا۔"

"تم ہم کو دھمکی دیتا ہے؟" نوجوان افسر چیختے ہوئے بولا۔

"آپ ٹھیک بولتے تھے صاحب! یہ بمبئی کی پولیس ہے۔" تھل نے زہر خند سے کہا۔ "ہم لوگ بالکل نہیں جانتے تھے۔"

"آگے ابھی اور جان لے گا۔"

"آپ بھی کچھ جان لوگے۔"

میرے کپڑے پسینے میں بھیگ گئے تھے۔ اب میری سمجھ میں خوب آ رہا تھا کہ جمرو اور شامو بار بار مجھے کیوں ٹوک رہے تھے اور تھل نے جمرو اور ٹنگو کو گلی کے سرے پر مجھے روک دینے کے لیے کیوں بھیجا تھا اور شامو مجھے اسپتال سے نکل جانے کو کیوں کہہ رہا تھا۔ وہ یہی کچھ کہنا، یہی سب باور کرانا چاہتے تھے جس کا مجھے کچھ خیال ہی نہیں تھا۔ میں بھول گیا تھا کہ ہم اُس شخص سے نسبت کے مدعی ہیں جو پاڑے کا آدمی ہے۔ پاڑے کا آدمی تو پاڑے کا آدمی ہوتا ہے، زندہ رہنے پر بھی، مرجانے پر بھی۔ دادا کا سب سے بڑا حوالہ پاڑا ہے۔ اُس کے پرسان حال کو بھی، اسی حوالے سے برتنا چاہیے۔ مجھے بالکل خیال نہیں رہا تھا کہ ہم یہاں دادرسی کے لیے نہیں، جواب طلبی کے لیے لائے گئے ہیں اور ہماری آنکھیں، ہمارے چہرے، ہمارے حال کی شہادت نہیں ہوں گے۔ وہ ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتے۔ اُن کے گھروں میں شاید کبھی موت نہیں آتی۔

اُدھیڑ افسر کچھ کہنا چاہتا تھا کہ درمیان والے افسر نے ہاتھ اُٹھا کے اُسے منع کر دیا۔ وہ تینوں سر جوڑے ایک دوسرے سے آدھی انگریزی، آدھی ہندوستانی میں باتیں کرتے رہے۔ اُن کی سرگوشیوں کا کوئی کوئی لفظ مجھ تک پہنچ رہا تھا۔ تینوں بہت مضطرب اور مشتعل نظر آتے تھے۔ جب تک وہ آپس میں گفتگو کرتے رہے، تھل بھی ساکت بیٹھا رہا۔ خاصی دیر بعد عمر رسیدہ افسر نے سر اُٹھایا اور جھجکتے ہوئے بولا۔ "دادا! اب تک ہم نے تم لوگ کے ساتھ بہت نرمی کیا ہے۔ لگتا ہے، تم یہ زبان نہیں سمجھتا۔ تم مجبور کر رہا ہے کہ ہم ابھی دوسری زبان میں بات کرے۔ ہم ایسا نہیں چاہتا پر ادھر نہ تم اپنی مدد کر رہا ہے نہ ہماری۔ ہم صاف بولے، ایسا کر کے تم ہمارے شک کو گھٹانے کے بدلے اور بڑھا رہا ہے اور اپنے لیے بالکل اچھا نہیں کر رہا۔"

تھل نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ میرے پاس بیٹھا ہوا جمرو یکایک کھڑا ہو گیا اور جلتی ہوئی آواز میں بولا۔ "مائی باپ! کم کے گھر میں آگ لگے، آپ اُلٹا تیل چھڑکتے ہو۔ شک کا مطلب ہم نے اُس کو مارا ہے۔ وہ ہماری جان تھا، ہم اپنے کو مارتے کیا پھر ہم آپ کے سامنے بیٹھے ہوتے؟ بمبئی سے سو میل آگے نہ بڑھ گئے ہوتے۔ ہوا بھی نہ لگتی آپ کو اور آپ کیسی مدد کو بولتے ہو؟ چاہتے کیا ہو آپ؟ ہم آدمی کا نام چھپاتے ہیں کہ اپنے کو چھپاتے ہیں۔ ہم اُلٹا سیدھا کسی طرف انگلی اٹھا دے یا آپ کو بول دے کہ ہم خونی ہے، ہم کتا ہے، ہم نے اپنا خون کیا ہے۔ آپ کیسے پولیس والے ہو جو آدمی کو نہیں پہچانتے۔ لگتا ہے بس چور اچکوں سے پالا پڑا ہے۔ اڈے پاڑے کا آدمی کبھی نہیں دیکھا آپ نے۔ آپ ادھر روک کے کیا کر لوگے ہمارا؟ سولی پر چڑھا دوگے؟ ماں قسم! ابھی آپ دادا کا نام لیو، سولی تو دیر کی بات ہے، اپنے پاس چاقو ہے ہم ابھی اُسے سینے میں نہ اُتار لے تو اپنی ماں کا جنا نہیں۔ ایک بار بول کے دیکھو۔ دو گئے ہیں، ابھی تیسرا چلا جائے گا۔ پھر تسلی ہو جائے گا آپ کا کہ دادا اپنے لیے کون تھا۔ مرنے سے ہم نہیں بھاگتے۔ روز مرتے ہیں، روز زندہ ہوتے ہیں۔ موت تو سالی اپنی جیب میں پڑی رہتی ہے۔ اپنے کو معلوم ہے کسی دن ایسی بیچ رستے میں ہی آئے گی۔ آپ زیادہ سے زیادہ موت کی سزا دوگے۔ موت کی سزا اس سے بڑی نہیں ہے جو آپ ابھی دے رہے ہو۔ وہ ہمارا باپ تھا، اپنا بھائی تھا وہ۔ آپ اپنے پہ کسی بھائی، کسی باپ کو مارنے کا شک کرتے ہو۔ آپ کا کوئی رشتہ ناتا کسی سے نہیں ہے کیا؟ اپنی ایسی خواری کبھی نہیں ہوئی۔" جمرو کی آواز سارے کمرے میں گونج رہی تھی۔

تینوں افسر اُسے گھورتے رہے، کسی نے کچھ نہیں کہا۔ جمرو کا گلا بیٹھ گیا تھا، وہ حلق میں گھٹی ہوئی آواز سے بولا۔ "ہم کو بولو صاحب، ابھی آپ خود کون سی زبان سمجھتے ہو؟ آپ کیسے جانوگے کہ؟..."

"تھوڑا ٹھیر کے۔" درمیان والے افسر کے ہونٹ پھڑک رہے تھے تاہم اُس کی آواز تھمی ہوئی تھی۔ "تھوڑا ٹھیر کے۔ ایسا جوش دکھلانے کی ضرورت نہیں۔ یہ تھانہ ہے، اِدھر ایسا نہیں چلتا۔ ٹھیک ہے، تمھاری یہ بات ہم ایک بار کو مانے لیتا ہے کہ وہ تم نہیں تھا، پھر وہ کون تھا؟ تم پیر دادا کے لیے ایسا بڑھ چڑھ کے بولتا ہے، خود کو اُس کا دوست بتاتا ہے۔ تم کیسا دوست ہے کہ دادا کے ایک دشمن کا نام بھی نہیں جانتا؟"

"آپ پھر وہی رٹ لگا رہے ہو۔" جمرو بیزاری سے بولا۔

"یہ بہت ضروری ہے دادا۔

اپنے لیے آپ سے زیادہ ضروری ہے، آپ کے ساتھ تو اِدھر پوری فوج لگی پڑی ہے۔ اِدھر آپ اپنا جتن کر دو، اُدھر ہم اُس ....."

جمرو کے منہ سے گالی نکل گئی۔ اُس نے حتمی لہجے میں کہا۔ "ہم ایسے بمبئی سے نہیں لوٹیں گے۔"

"دادا پانچ چھ مہینے سے اُدھر اپنے ساتھ تھا بمبئی سے باہر۔" جمرو کے خاموش ہوتے ہی شامو ہچکچاتے ہوئے بولا اور اُنھیں بتانے لگا کہ ہم کوئی پچیس دن پہلے ایک بیمار ساتھی کے ساتھ یہاں آئے تھے، پانچ چھ دن اُس کی تیمار داری میں کسی کو اپنی خبر ہی نہیں تھی۔ اُس کا بہت علاج کیا۔ آپریشن کامیاب ہو گیا تھا لیکن اُسے جلدی بھی۔ ٹھیک بیس دن ہوئے، اچانک وہ بھی دادا کی طرح کسی سے کچھ کہے سنے بغیر چلا گیا۔ اِس تمام عرصے میں ہم اِنھی پریشانیوں میں گھرے رہے۔ ہمیں اپنا ہی ہوش نہیں تھا، کسی اور طرف نگاہ کیا جاتی۔ اُس کے روٹھ جانے کے بعد کہیں نکلنے بلکہ بمبئی میں ٹھیرنے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن دادا کا خیال روکے رہا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ دادا کے پیچھے بمبئی میں کیا کچھ ہوتا رہا اور کسی نے پاڑے پر دادا کی دو بار واپسی اور شہر کے پاڑوں پر اُس کا ہاتھ پسند نہیں کیا۔ وہ کوئی ایک نہیں، بہت سے ہو سکتے ہیں۔ شامو کی آواز رفتہ رفتہ سندھر گئی تھی لیکن شاید تھل نے اس کی طرف منہ اٹھا کے دیکھا تھا یا اسے خود کچھ خیال آگیا تھا، وہ ہکلانے لگا اور آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

"کیا ہوا؟" وہ تینوں چونک پڑے تھے جیسے شامو کوئی انکشاف کرتے کرتے رُک گیا ہو۔ "دادا بمبئی سے کدھر گیا تھا؟"

"وہ اپنے ساتھ تھا۔" شامو کے بجائے تھل نے جواب دیا۔

"کہاں، کیوں؟"

"ایسے ہی گھومنے پھرنے کے لیے، مستی کے لیے۔"

"مستی کے لیے۔" اَدھیڑ افسر بے تابی سے بولا۔ "دادا! تم ابھی چپ بیٹھو، اِس کو بولنے دو۔" اُس نے براہ راست شامو کو مخاطب کیا۔ "ہاں کیا بول رہا تھا تم؟"

شامو نے تھل کی طرف نظر کیے بغیر آہستگی سے کہا۔ "ہاں صاحب گھومنے پھرنے کے لیے، اس کے لیے کوئی نہیں کل سکتا۔"

"ایسا ہی بے وجہ؟"

"بولا نا آپ کو۔" شامو نے تیز لہجے میں کہا۔ "سیر سپاٹے کے لیے آپ کبھی باہر نہیں نکلتے ہو؟ اِدھر اُدھر مت بھٹکو صاحب! اپنا مطلب تھا کہ دادا بمبئی آنے کے بعد پورا انجانے میں تھا۔ یہی بولنا تھا آپ سے۔ اُسے کچھ پتہ ہوتا تو ہم کو بھی ضرور ہوتا۔"

"اور ہم کو ہوتا بھی تو بتانا اپنی مرضی پر ہے۔" تھل نے پھر چیختی آواز میں دخل دیا۔ "اور ہم آپ کو بولیں صاحب! بمبئی شہر اپنے لیے ایسا نیا بھی نہیں ہے۔ پہلے بھی ہم ادھر آچکے ہیں۔ دادا کے ساتھ اچھا دیکھا بھالا ہے۔ ادھر کا بہت سا دادا لوگ ہم کو جانتا ہے۔" مجھے حیرت ہوئی کہ جب اُن کی برف کسی قدر پگھلی ہوئی نظر آ رہی ہے تو تھل کا لہجہ ایسا تند کیوں ہے۔ وہ اُنھیں کیا جتانا چاہ رہا ہے؟ تھل کی حالت ٹھیک نہیں معلوم ہوتی تھی۔

نوجوان افسر کا جسم اُس کے قابو میں نہیں تھا۔ "ہی لکس دی مین کلپرٹ۔" اُس نے تھل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انگریزی میں کہا۔ "ہمیں کچھ دیر کے لیے اسے باہر کر کے باقی سے بات کرنی چاہیے۔"

میں نے سن لیا تھا۔ وہ ہم سب کو باسٹرڈ اور تھل کی کٹھ پتلیاں کہہ رہا تھا اور بھی بہت کچھ۔ میں سنتا رہا لیکن میرے لیے خاموش بیٹھے رہنا دشوار ہو گیا۔ مجھے اٹھ کے اُن سے کہنا چاہیے تھا کہ وہ زبان سنبھال کے بات کریں۔ اِس سے پہلے کہ [illegible] تھل کو باہر نکل جانے کا حکم صادر کریں، مجھے صاف صاف [illegible] بتا دینا چاہیے تھا کہ پھر ہم میں سے کوئی بات نہیں کرے گا۔ میں نے جمرو اور شامو کی طرف دیکھا۔ وہ بہرے بنے بیٹھے تھے۔ تھل، مارٹی اور ٹنگو بھی۔ میں انگریزی نہ سمجھتا تو میری بھی یہی کیفیت ہوتی۔ ہر آدمی اُتنا بہرا ہوتا ہے جتنا وہ نہیں جانتا اور مارٹی کو تو اتنی انگریزی ضرور آتی ہے، اُس نے سُن لیا ہوگا کہ وہ کیسی بدزبانی، دریدہ دہنی کر رہے ہیں۔ اُسے چپ دیکھ کے میں بھی اُٹھتے اُٹھتے رہ گیا۔

درمیان میں بیٹھا ہوا افسر کچھ سوچتا رہا پھر اُس نے اپنے نوجوان ساتھی کی تجویز یہ کہہ کے مسترد کر دی کہ ہم سب ایک جیسے ہیں، تھل کے جانے کے بعد ہم اور بے لگام بھی ہو سکتے ہیں یا زیادہ محتاط بھی۔ اُس نے مذبذب لہجے میں تھل سے کہا۔ "تم اِدھر بمبئی میں کب تک رہنے کا ہے؟"

تھل نے جواب دیا کہ وہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔

"ابھی کوئی ضمانت کرا سکتا ہے؟"

"کاہے کی ضمانت؟"

"کہ تم لوگ اِدھر شہر میں ٹکے گا۔"

"ہم ایسی کوئی ضمانت نہیں دے سکتے۔ آپ زیادہ بات مت کرو، سیدھا پرچی بناؤ۔"

"پرچی بننے میں ابھی کوئی دیر نہیں لگے گا۔"

تھل کے لبوں میں جنبش نہیں ہوئی۔

"ایک بار ابھی تم کو سوچنے کا موقع ہے۔" تھل نے کچھ نہیں کہا تو عمر رسیدہ افسر سرکشی سے کہنے لگا۔" زبان بند کرنے سے تمھارے لیے اچھا نہیں ہے دادا۔"

"کھلا رہنے سے ابھی اپنے کو کیا ملا ہے۔" تھل نے جھنجلا کے کہا۔"آپ اپنے لیے وکیل کا انتظام کرو۔"

"وکیل، کیسا وکیل؟" وہ متوحش انداز میں بولا۔

"ابھی ہم اُس سے بات کر کے ہی کچھ بولیں گے۔"

"تم بہت آگے کا بول رہا ہے۔"

"اپنا سر بہت گھوم رہا ہے صاحب! ابھی آپ کے ساتھ کھپا کے اور اُلٹا ہو جائے گا۔"

"تم پولیس کا پوزیشن نہیں سمجھ رہا ہے دادا!" اُدھیڑ پولیس افسر نے کسی قدر مفاہمت کے لہجے میں کہا۔

"پر آپ تو اپنے کو خوب سمجھ رہے ہو۔"

"نہیں۔" وہ سٹ پٹائے ہوئے لہجے میں بولا۔"ہم، ہم کوشش کر رہا ہے۔ ہم بولا کہ اپنے کو تم سے کوئی بیر نہیں ہے۔" اُدھیڑ افسر وہی کچھ دہرانے لگا جو کم و بیش وہ تینوں پہلے کہہ چکے تھے کہ یہ ایک نہایت سنگین واقعہ ہے، آج دو دادا گئے ہیں، کل دوسرے جا سکتے ہیں، پاڑوں سے متعلق لوگ آپس میں خون خرابہ کر سکتے ہیں، اس امکان کی پیش بندی کے لیے پولیس کو اپنا فرض ادا کرنا چاہیے، اُسے کسی بے گناہ آدمی پر ہاتھ ڈال کے خوشی نہیں ہوتی۔ پولیس بھی کسی کے سامنے جواب دہ ہے لیکن چونکہ پیر دادا اور ماچھی دادا کے لیے سب سے پہلے ہی اُن کے سامنے آئے ہیں اس لیے ہم سے اتنا کچھ کہا جا رہا ہے۔ جہاں تک پولیس کے اختیار کا تعلق ہے، وہ یقیناً بے حد حساب نہیں ہے لیکن ایسا کم بھی نہیں ہے۔ پولیس روکنے پہ آئے تو ہمیں کسی بھی الزام، کسی بھی شبے میں روک سکتی ہے۔ بعد میں ہم ثابت کرتے پھریں گے۔ یہی ہو گا نا۔ وہ بھی کچھ ثابت کریں گے لیکن پس منظر میں اگر کچھ نہیں ہے تو یہ ایک غیر ضروری، غیر نتیجہ خیز بات ہو گی۔ پولیس ہمی پر کیا، ایسی صورت میں کسی پر بھی شک کر سکتی ہے۔ وہ کہنے لگا کہ پولیس کو ایسے معاملات کا خوب تجربہ ہے۔ دادا لوگ عموماً نام نہیں بتاتے، خود جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پولیس ایسے خود سر اور منتقم مزاج لوگوں کو کیسے چھوڑ دے جو اپنی زبان سے کہہ رہے ہیں کہ انھیں معلوم ہوتا تو پہلے وہ اُسی طرف کا رُخ کرتے اور انھیں مجرم کا نشان مل جائے گا تو پولیس کو اطلاع نہیں دیں گے، ہماری خواہش پر وکیل بلایا جا سکتا ہے مگر وکیل کیا کرے گا۔ وہ ہمیں روکنے ہی پر آ گئے تو وکیل بھی دیکھتا رہ جائے گا۔ عدالت بھی اتنا جا[نتی] ہے کہ چالاک مجرم کبھی کبھی علی الاعلان سامنے آ کے بھی جرم پ[ر پردہ ڈالنے] کی کوشش کرتے ہیں۔ جائے واردات پر ہمارا موجود ہونا دو[نوں] باتیں ثابت کرتا ہے۔ خبر ملنے کے بعد ہمیں فطری طور پر وہاں [نہیں جانا] چاہیے تھا یا پھر ہم نے اس طرح اپنی دانست میں خود پر عائد [ہونے] والا ہر شک مٹا دینے کی کوشش کی ہے۔ پولیس افسر نے بے[زاری] سے کہا۔" کچہری عدالت ابھی دُور کا بات ہے۔ پہلے اپنے کو تس[لی ہو جائے] کہ یہ سب ایسا نہیں ہے۔"

"تسلی تو آپ اپنے کو دیو، آپ کا کون چلا گیا ہے جو ایسا ہے۔" تھل نے تپیدہ لہجے میں جواب دیا۔" جو آپ آگے پیچھے کا [سوچ] رہے ہو، اُس کا اپنے کو پورا پتہ ہے۔ پتہ ہے کہ آپ کتنی دُور تک چلو گے، آگے کون ...."

پولیس افسر اُس کی بات کاٹ کے ایک ایک لفظ پر ز[ور] دیتے ہوئے بولا کہ عدالت بھی پولیس کے شبے کی تائید اُس وقت [تک] کرتی رہے گی جب تک پولیس کسی نتیجے پر نہیں پہنچ جاتی، پولیس کا دوسرا رُخ ہے۔"

"ہم نے ساری مٹی نہیں کی ہے۔" تھل نے کھردری آواز [میں] کہا۔" اتنا چوپٹ نہیں ہے اُدھر۔"

"اِدھر بھی نہیں ہے۔" پولیس افسر کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔" کوئی تمھارا دشمن نہیں بیٹھا ہے۔ اپنے پہ بھروسا کرو اور کھل کے بو[لو۔]"

"آپ کا رنگ کالا ہو جاتا ہے۔" تھل نے بے اعتنائی [سے] کہا۔" ہم کو بیان بدلنا نہیں آتا، اُدھر گلی میں جو بول دیا تھا اور آ[پ] کے منشی نے لکھ لیا تھا، اُس کے بعد نیا کچھ نہیں ہے۔ لگتا ہے آ[پ] کے پلّے بھی نہیں ہے جبھی آپ پھرکی گھما رہے ہو۔ جب تک اُد[ھر سے] کام لیتے رہو گے، ایسا ہی رہے گا۔ تھوڑا نیچے کو بھی آؤ اور چھا[تی پہ] ہاتھ دھر کے دیکھو۔"

اُدھیڑ افسر اضطراری انداز میں سر ہلا کے بولا۔" پولیس تم لوگ میں سے ہے دادا!"

تھل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ عمر رسیدہ افسر نے تیکھی آ[واز] میں پوچھا۔" ابھی تم کو چھوڑ دے تو کدھر جائے گا؟"

"آپ بولو، کدھر جانا چاہیے؟"

"ہم تم سے پوچھ رہا ہے۔"

"کدھر جاتا صاحب!"

"پاڑے جائے گا؟"

"پاڑے بھی جائیں گے پر پہلے اُن کو پھونکنا ہے۔" تھل کی آواز تڑخنے لگی تھی۔" پاڑے بھی جائیں گے صاحب!"

"اُدھر دادا کی گدی پر بیٹھنے کا ہے؟"

"پاڑا کوئی راجا کی گدی نہیں ہے۔"

تھل کا مفہوم عمر رسیدہ افسر کی سمجھ میں نہیں آیا، وہ کسی قدر بوکھلا کے بولا۔" پاڑے کی گدی پر کون بیٹھنے کا ہے؟"

"پاڑا مال جائداد نہیں ہوتا، راج پاٹ کی طرح، باپ آنکھ بند کرے تو بیٹے کے متھے پر تاج جما دیا جائے۔ پاڑا بَل سے ملتا ہے اور بَل تک رہتا ہے۔ دادا اُسی ٹائم ختم ہو جاتا ہے جب اُس کے ہاتھ پیر اپنے نہیں رہتے۔"

"تم .... تمھارا مطلب ہے کہ ماہم کے پاڑے کے لیے جو بھی جاتی بَل والا آئے گا وہی گدی پر بیٹھنے کا ہے؟"

"یہ آپ بھی جانتے ہو۔"

"پر ہم نے دیکھا، اِدھر بہت بوڑھا بوڑھا لوگ بھی پاڑے پر ہے۔ اب اُس کا بَل نہیں ہے پھر بھی وہ پاڑا چلاتا ہے اور سب اُس کا آگے پیچھے گھومتا ہے۔"

"پر پاڑا دادا کے جنے کو نہیں ملتا، آپ کی طرح آپ کی کُرسی بھی....."

"ہاں ہاں، ہم سمجھتا ہے۔" درمیان والے افسر نے مضطربانہ کہا۔

"پاڑے کا راجا، دادا جنتا نہیں، پالتا ہے اور بَل کھو کے گدی پر بھی ٹکا رہتا ہے۔ جب اُس کے بنائے ہوئے پاڑے کے دادا لوگ ایسا چاہتے ہوں۔ پرانے دادا کی جان کاری، پرکھ کی اُن کو ضرورت پڑے تب ....." تھل نے انھیں بتانا چاہا، لیکن ایسا کم ہوتا ہے اور دیر تک نہیں چلتا۔ وہی گدی سنبھالتا ہے جس کے بازو زیادہ پھڑکتے ہوں اور جس کی انگلیاں چاقو کے کھیل سے خوب واقف ہوں اور اندر پاڑے میں ایسا کوئی نہیں ہوتا تو باہر سے کوئی آ جاتا ہے۔"

"پیر دادا کا بھی یہی تھا؟" نوجوان افسر بے چینی سے بولا۔

"ابھی تو اُس کا بَل شروع ہوا تھا۔"

"پر وہ تو اُدھر بیس پچیس سال سے پاڑے کا مالک تھا؟"

"شہر کا راجا بننے کو یہ ٹائم بھی تھوڑا ہے۔ ٹھنڈے گرم کی پہچان میں پوری عمر ڈھنک جاتی ہے۔ ابھی اُس کو نزدیک کا، پرے کا دیکھنا آیا تھا۔ بَل اکیلا بازو کا نہیں ہوتا۔ اِدھر اُس جیسا کوئی نہیں تھا۔"

"تم بھی نہیں ....؟"

تھل نے جواب نہیں دیا۔ نوجوان افسر نے ایک لمحے کی مہلت دیے بغیر اُسے ٹوکا۔

"بھٹکو مت صاحب!" تھل نے چلچلاتی آواز میں کہا۔" بولیں گے تو آپ کو مرچ لگ جائے گی۔ آپس میں کانٹا نہیں رکھا جاتا۔"

نوجوان افسر کے کچھ کہنے سے پہلے اُدھیڑ افسر نے بے ربطی سے کہا۔" دادا! جس لوگ نے چاقو کے بدلے گولی سے دادا کو ختم کیا ہے، اُس نے گدی کا لالچ میں ایسا کیا! کیوں؟ پھر وہ ضرور سامنے آئے گا، ابھی نہیں تو تھوڑا دیری میں ....."

"ایسا نہیں آئیں گے، وہ حرام کے .... اتنے دھنی نہیں ہیں جو پاڑے پر سینہ پھلا کے ابھی آ جائیں۔ اِدھر آپ میں روڑا اٹکائیں، اُدھر اپنے کو خوار کریں۔ وہ ایسے آگ کی طرف نہیں بڑھیں گے۔ گولی نہ چلاتے پھر، وہ بھی پیچھے کی طرف سے ...."

"پھر اُن کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟"

"دادا ممبئی کے سارے پاڑوں کا دادا تھا۔"

"ہاں۔" اُدھیڑ افسر جھجکتی آواز میں بولا۔" تم سمجھتا ہے کہ وہ پیر دادا کے دباؤ سے سارے شہر کے پاڑوں کو نکالنے کے لیے بھی ایسا کر سکتا ہے؟"

تھل سر ہلا کے رہ گیا۔

"پر اگر کوئی نیا دادا پھر سے ماہم کے پاڑے کے نیچے آنے کو بولے تو اِدھر بہت سا لوگ سامنے آ سکتا ہے۔"

"آپ غلطی پر ہو، نیا دادا آنے پر کون ایسے ماہم کے پاڑے کے حکم کو مانے گا۔ پاڑے کی چوکی لکڑی کی ہے، دادا لکڑی کا نہیں ہوتا۔ حکم کے لیے زور چاہیے۔"

"تم ابھی ماہم کے پاڑے پر بیٹھنا مانگتا ہے؟"

"اپنے پاس اڈّے پاڑے کی کمتائی نہیں ہے۔ اپنے کو ابھی صرف ایک بات سے مطلب ہے کہ دادا پر ہاتھ اُٹھانے والے کا گردن کب اُتار لیں۔"

"ایسا کیسے اُتارے گا؟" اُدھیڑ افسر طنزیہ انداز میں بولا۔

"اُس کا نہیں تو اپنا اُتار لے گا۔"

"ہم پوچھتا ہے، کدھر ڈھونڈے گا اُسے؟"

"ڈھونڈے گا صاحب!"

"کیسے؟"

"ابھی نکل کے دیکھیں گے۔"

ادھیڑ افسر نے مزید حجت نہیں کی۔ چند لمحوں تک سناٹا رہا پھر اُسی نے کسمسائی آواز میں تبّھل سے پوچھا "داداکے پاس مال تو بہت ہوگا؟"

"داداکے پاس مال ہو تو اُس کا زور آدھا ہو جاتا ہے۔"

"ایسا کیسا؟"

"مال زور کا گھُن ہے۔"

"یعنی داداکے پاس کوئی مال نہیں تھا؟"

"کسی داداکے پاس اِتنا نہیں ہوتا۔ مال کے لیے کوئی پاڑا نہیں چلاتا ہے۔"

"پھر کس لیے چلاتا ہے؟"

"اپنے ساتھ تھوڑے دن پاڑے پر بیٹھو تو آپ کو پتہ چل جائے گا۔"

"داداکا بیٹی کتنا بڑا ہے؟" یکایک عمر رسیدہ افسر نے تیور بگاڑ کر پوچھا، اُس کا لہجہ صاف چبلے پن کا تھا۔

تبّھل پھیلی ہوئی آنکھوں سے اُنھیں دیکھا کیا۔

عمر رسیدہ افسر نے اُس کے جواب کا انتظار نہیں کیا، تیزی سے بولا "جوان ہے؟"

"ہاں" تبّھل نے آہستگی سے کہا۔

"شادی کا لائق؟"

تبّھل چُپ بیٹھا رہا۔

"بس ایک بیٹی!"

"ابھی دو چار ہوتی تو آپ کیا کر لیتا؟"

"جو پوچھتا ہے اُس کا جواب دو۔" نوجوان افسر نے خشونت سے کہا "اب اُن لوگ کو کون دیکھے گا؟"

"وہ اپنی بٹیا ہے۔"

"ہُوں۔" عمر رسیدہ افسر ہونٹ سکوڑ کے بولا "تم دیکھے گا؟"

"آپ دیکھوگے کیا؟" تبّھل کی آواز تمتما رہی تھی۔

"تھوڑا کھینچ کے بولو تو اچھا ہے دادا!" نوجوان افسر نے برانگیختگی سے کہا "ہم پوچھتا ہے اِدھر اور کوئی نہیں ہے اُس کا؟"

"ہوگا۔" تبّھل نے اکھڑی ہوئی آواز میں کہا "ہم نہیں جانتا۔"

"تم نہیں جانتا؟"

"یہی بولا ہے۔"

"گھر نہیں بتائے گا؟"

"بتائیں گے پر ابھی نہیں۔"

"ابھی بولنے میں کیا جاتا ہے؟"

دونوں افسروں نے آنکھیں میچ کے اُسے صبر و ضبط کی تلقین کی اور سرگوشیوں میں دیر تک اُس سے باتیں کرتے، کاغذات اُلٹتے پلٹتے رہے مگر بار بار اُن کی نظریں ہم پر بھٹکنے لگتیں جیسے ہم بیٹھے بیٹھے اُن کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں گے۔ اسی اثنا میں ایک دراز قد سپاہی تیز قدموں سے اندر داخل ہوا، اُس نے اُن کے قریب آکے سیلوٹ کیا اور کونے والے نوجوان افسر کے سامنے میز پر ایک پرچی رکھ دی۔ تینوں افسروں نے باری باری پرچی دیکھی۔ اُسے پڑھ کے اُن کے شانے سیدھے ہو گئے۔ اُنھوں نے رقعہ لانے والے سپاہی سے دھیمے لہجے میں مختصراً کچھ کہا، سپاہی فوراً واپس چلا گیا۔ اُس کے جاتے ہی عمر رسیدہ افسر نے تبّھل سے کہا "تو تم ہم کے پاڑے پہ نہیں جائے گا؟"

"ضرور جائیں گے۔"

"پر تم ابھی کیا بولا؟"

"ضرورت ہونے پہ ہر جگہ جائیں گے۔"

"کیسا ضرورت؟"

"یہ آپ جانتے ہو۔"

"دادا!" ادھیڑ افسر نے دخل دیا "تم نے اب تک ہمارا کوئی مدد نہیں کیا ہے۔" اُس کی آواز میں غصہ بھی شامل تھا، رنج بھی۔

"آپ خود ایسا کرنا نہیں چاہتے۔"

"کیا؟ کیا بولا تم؟"

"ادھر بمبئی میں ایک ہی آپ کو دکھائی دیا ہے، سارا شہر دادا کو جانتا ہے، سارا دادا لوگ۔"

"تم کیا سمجھتا ہے، پولیس آنکھ بند کیے بیٹھی ہے؟"

"پھر ہمی کو کیوں چھوڑ رہے ہو؟"

"کیونکہ تم خود کو اُس کا بھائی، دوست بولتا ہے۔"

"تو ہم اُلٹ بولیں، آپ چین سے بیٹھ جاؤ گے؟"

"ایسا نہیں، ایسا نہیں دادا! اپنے کو کس چیز سے چین آنے کا ہے، تم جانتا ہے، سچ جاننے سے۔"

"جھٹکے سے نہیں ملتا، تھوڑی دیر لگتی ہے۔"

"اتنی دیر ہم تم کو ادھر روکے رکھتا ہے۔" نوجوان افسر نے مشتعل کہا۔

"کیوں؟"

"اپنی چھٹی کرو صاحب!" تبّھل نے برہمی سے کہا۔

"چھٹی کر دے؟" نوجوان افسر بھڑک گیا اور دیوانہ وار انداز میں اپنے ساتھی افسروں سے پوچھنے لگا "یہ کیسا بولتا ہے، حکم چلاتا ہے؟

آپ کی مرضی ہے، پر شاید پھر اور دیر لگ جائے۔"

"اور ابھی ہم تم کو جانے دے تو....؟"

"تو آپ اپنے لیے بھلا کروگے۔"

جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو، نوجوان افسر اپنی نشست پر اُچھل سا گیا۔ دونوں افسروں کے منع کرنے پر وہ ہذیانی انداز میں کہنے لگا۔

"ایک شرط پر ہم تم کو چھوڑنے کا سوچ سکتا ہے کہ تم اپنے آپ کچھ نہیں کرے گا، پہلے ہم کو بولے گا؟" ادھیڑ افسر نے اٹکتی آواز میں کہا۔

"آپ کیسی بات کرتے ہو؟"

"کیوں، تم ہم کو نہیں بولے گا؟"

"ہم کہاں کہاں ہتھیلی لگائیں گے۔ دادا نے پوری ادھری لھوٹی اِدھری کاٹی ہے۔ جو آج پاڑوں پر سینگ نکالے راج کرتے ہیں، اُن میں کتنوں کو دادا نے چاقو نچانا سکھایا ہے، یہ آپ جانتے ہو نہ ہم۔ کس نے دادا کا نمک زیادہ کھایا ہے، کون خون کا اصیل ہے۔ ہم سارے شہر کا ٹھیکا لینے کا آپ کو بول دیویں؟ اِدھر اپنے کو بہت سے جانتے ہیں، اُن کو پتہ ہے، دادا سے اپنا کیا ناتا ہے۔ وہ اپنے پاس سر پیٹتے، چھاتی کوٹتے آئیں گے۔ اُن کو بولنا چاہیے کہ ابھی کدھر اُن کا دھیان جاتا ہے، پر اُنھوں نے نہیں بولا، اپنے تک سینت کے رکھا کہ دادا کا ایک بدلہ چکانے کے لیے...."

"اپنا بات کرو، صرف اپنا بات۔"

"اپنی کیا بات کرے۔" جمرو بہت دیر سے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا، اچانک پھر کھڑا ہو گیا اور پھٹی ہوئی آواز میں ڈکرانے لگا "بہت ہو گیا، بہت ہو گیا صاحب بہادر! اب یہ ٹنٹا ختم کرو، جو فیصلہ کرنا ہے، اپنے کو بول دیو۔" اِس وقت جمرو کو چُپ ہی رہنا چاہیے تھا۔ میں نے اور شامو نے اُسے بٹھانا اور خاموش کرانا چاہا مگر جتنا ہم نے اُسے روکنے کی کوشش کی، وہ اتنا بے قابو ہوتا گیا اور جو منہ میں آیا بکتا رہا۔ کہنے لگا کہ کیا وہ اونچا سنتے ہیں۔ کوئی دوسرا جو ٹھیک طرح دیکھتا اور سُنتا ہو، کوئی آدمی کا بچہ یہاں نہیں ہے؟ نوجوان افسر نے بھی چیخ کر اُسے سیدھی طرح بیٹھے رہنے کا حکم دیا اور تبّھل سے کہا "اِس کے گلے میں پٹا ڈالو دادا!" تبّھل نے جیسے سُنا ہی نہیں۔ جمرو شور مچاتا رہا۔ "کیا کر لوگے ہمارا؟ کیا کر لوگے؟ قسم سے ہم کو نہیں جانتے۔ آگے بہت پچھتاؤگے۔ بہت ستایا ہے اپنے کو....!" نوجوان افسر نے سپاہیوں کو اشارہ کر دیا۔ میں نے تبّھل کی طرف دیکھا تاکہ وہی اُٹھ کے جمرو کو سنبھالے مگر وہ بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ سپاہی ہماری طرف بڑھ گئے تھے۔ شامو نے اُنھیں روکا اور جمرو سے منت کی کہ بس وہ کچھ دیر اور تحمل کر لے۔ ٹنگو اور ماروٹی بھی اُٹھ کے ہمارے پاس آگئے تھے۔ سپاہیوں کی دست درازی سے پہلے ہی ہم نے جمرو کو بٹھا دیا، اِس میں خود جمرو کی انفعالیت بھی شامل تھی۔ شاید اُسے احساس ہو گیا تھا کہ آہ و فریاد سے کچھ حاصل نہیں۔ اتنی دیر میں اُسے یہ اندازہ ہو جانا چاہیے تھا۔

"یہ، یہ پاگل ہو گیا ہے؟" نوجوان افسر نے غصے سے لرزتی آواز میں کہا۔

"پاگل تو آپ بنادوگے صاحب!" تبّھل کی آواز جمی ہوئی سی تھی۔ "ایسے وقت میں اپنے سے آنکھ مچولی کرتے ہو۔ پہلی بار کوئی ملا ہے آپ کو؟"

عمر رسیدہ افسر نے جلدی جلدی کاغذات سمیٹنے شروع کر دیے۔ اُس کا چہرہ سوج سا گیا تھا۔ دونوں افسروں نے اُس کی پیروی کی۔ وہ اٹھا ہی چاہتے تھے کہ ادھیڑ افسر تاسف آمیز ناراضی سے بولا۔

"لگتا ہے، تم یہاں سے جانا نہیں چاہتے۔"

"پتا کرا کے نہیں جائیں گے۔" تبّھل نے کہا "بولنے کو ہم کچھ بھی بول کے اِدھر سے جا سکتے ہیں۔ آپ ایک کیا دس شرط رکھ لو پر آگے سارا اندھیرا ہے، ایسے میں آپ کو کیا بولے۔ اِدھر سے نکل کے اپنے کو کچھ معلوم نہیں، کدھر جانا پڑے۔ اِس ٹائم اپنے کو کچھ دکھائی سُجھائی نہیں دے رہا ہے۔ آپ سمجھتے ہو یہاں سے نکل کے آگے راستے میں سب ہرا ہی ہرا ہے۔ اِدھر آپ کی بندی میں اپنے لیے بہت سکھ ہے۔ اپنے کو کہیں کسی کو دیکھنا، سننا نہیں پڑتا۔ اُس کے گھر میں وہ دونوں روتے روتے مر جائیں گی، دادا نے پھولوں میں رکھا تھا اُن کو۔ اپنے کو اُن کو بھی سنبھالنا ہے۔ اُن سے بولنا ہے کہ دادا اب لوٹ کے کبھی نہیں آنے کا، اب وہ اُس کو ایک دم بھول جائیں۔ اُدھر پاڑے پر سب بکھرا ہوا ہوگا۔ گھر میں اُس کے صرف دو جنے تھے لیکن دادا کا دوسرا گھر پاڑا بھی ہے۔ اُدھر بھی سب اُس کی اولاد کے مانند ہیں۔ اپنے کو اُن کو بھی تھامنا ہے اور وہ، آپ سمجھتے ہیں، وہ خنزیر کے جنے اپنی طرف سے آنکھ بند کیے پڑے ہوں گے، اُن کو پتہ ہے کہ ہم کون ہیں۔ دادا کا کانٹا اُنھوں نے نکال دیا ہے۔ جب تک ہم سامنے ہیں، اپنی ہڈی بھی اُن کے گلے میں پھنسی رہے گی۔ خود آگے نہیں آئیں گے تو اُدھر بمبئی کے سارے دادا لوگ کو تھر ماریں گے کہ دیکھو باہر کا کون، پیر و دادا کے پاڑے پہ جیک کے بیٹھ گیا ہے، ایک دن میں دادا کا سب کچھ بن بیٹھا۔ اِدھر وہ آپ کو تیلی دکھائیں گے۔ اپنے کو اُن کے پاس بھی جلدی پہنچنا ہے، نہیں پہنچے تو ہم اپنے آپ کو منہ دکھانے کے نہیں رہیں گے۔ جتنی

دیر وہ زندہ رہیں گے، ہم کو نیند نہیں آئے گی، سارا جلتا رہے گا۔ ہم کو ایک طرف نہیں دیکھنا۔ ہم نے دادا پر بہت بوجھ ڈالے تھے، پر اتنے نہیں جتنے وہ ڈال کے چلتا بنا ہے۔ آپ، آپ یہ سب نہیں جانو گے۔"

"ہم جانتا ہے۔" وہ تینوں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ تبھل جیسے ہی خاموش ہوا، ادھیڑ افسر نے کہا۔ "پر تم پولیس پر بھروسا کرے گا، ہمارا ساتھ دے گا، ہم سے دور نہیں رہے گا تو اتنا سب نہیں ہوگا۔" اُس کی آواز اُمڈ رہی تھی۔

تبھل نے کچھ نہیں کہا تو پولیس افسر مضطرب ہو کے کہنے لگا۔ "ہم کیا بولتا ہے، ابھی سمجھتا ہے؟"

"سمجھ رہا ہے صاحب! اچھی طرح سمجھ رہا ہے۔" تبھل نے سر ہلا کے کہا۔

"اپنے، تمھارے دونوں کے اچھے کے لیے بولتا ہے بابا! تم کو صرف اتنا کرنا ہے کہ جاننے پہ ہم کو اشارہ کر دو، بعد میں تم کو کوئی شکایت نہیں ہوئے گا۔"

"دیکھے گا صاحب! پر ابھی اپنی بھی ایک بات دھیان سے سُن لو۔ اگر آپ پہلے پہنچ گئے تو ہم سے بات کیے بنا آگے نہیں بڑھو گے؟ پہلے ہم کو دکھاؤ گے؟"

"کیا؟" ادھیڑ افسر حیرت سے بولا لیکن دوسرے ہی لمحے اُس کے چہرے پر چھائی ہوئی لکیریں دور ہو گئیں۔ "ٹھیک ہے۔" اُس نے خفت آمیز مسکراہٹ سے کہا۔ "ہم اِس پر سوچ سکتا ہے۔" یہ کہتے ہی وہ فائلیں سمیٹ کے کرسی سے اُٹھ گیا، اُس کے دونوں ساتھی بھی۔ "باہر بمبئی کا سارا بڑا افسر موجود ہے، ہم کو ابھی تھوڑا اُن سے بات کرنے کا ہے۔" ادھیڑ افسر نے چلتے چلتے کہا۔

"آپ سے بڑا نہیں ہوگا صاحب!"

یہ سُن کے وہ تینوں پلٹ گئے لیکن ایک لمحے کے تامّل کے بعد تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

اُن کے جانے کے بعد کمرے پر سکوت چھا گیا۔ سپاہی ابھی وہیں کھڑے تھے، بتوں کے مانند، ہم پر نظریں جمائے۔ تبھل نے بیڑی سلگا لی۔ مارتی اور ٹنگو کے ہمارے پاس آ جانے کی وجہ سے وہ سب سے الگ ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا، اُس کے پاس چلا جاؤں لیکن میں جا کے کیا کرتا، اُسے اور پریشان ہی کرتا۔ چارہ گری کا حوصلہ نہ سہی آدمی یہ تو کر سکتا ہے کہ خاموش بیٹھا رہے۔ وہ سبھی سر جھکائے چپ بیٹھے تھے، میری طرح سب کا دم گھٹ رہا ہو گا مگر غم کا بھی ایک سلیقہ ہوتا ہے، آدمی کو خود پر یہ جبر بھی کرنا پڑتا ہے۔ چاہے اُسے اپنے وجود سے گھن آ رہی ہو۔ دیدوں میں روشنی نہ ہو تو آدمی بہت کچھ دیکھنے سے محفوظ رہتا ہے۔ ہوش گم کر دینا تو بہت آسان ہے، میری طرح اتنا میرے وہم گمان میں بھی نہیں تھا جتنا تبھل کی اور اُن سب کی رگوں میں کھٹک رہا تھا۔ مجھے اُن کے سامنے بہت کم مائگی کم تری کا احساس ہو رہا تھا۔ انھیں مجھ پر اعتبار نہیں تھا جبھی وہ مجھے یہاں لانے سے اجتناب کر رہے تھے۔ میرا سینہ اتنے بوجھ کا حوصلہ نہیں رکھتا، یہ مجھے، مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔

دیر تک کوئی نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے اُنھوں نے ارادہ بدل دیا ہو یا دوسرے افسروں کو قائل نہ کر پائے ہوں۔ وہ بے حد متذبذب تھے ورنہ فیصلہ کر کے جاتے۔ اگر اُنھوں نے افسروں تک تبھل کا رویہ، اُس کا لہجہ بھی منتقل کر دیا تو وہ بھی برہم ہو سکتے ہیں۔ تبھل کا رویہ ابتدا ہی سے معتدل ہوتا، جیسا وہ کہہ رہے تھے، وہ پہلے ہی ہاں کر دیتا تو اتنی دیر نہ لگتی۔ جمرو اور شامو نے بھی دخل دے کے اُنھیں اور متوحش کیا تھا۔ اتنی باتیں کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ جلد یا بدیر اُنھیں ہمارے حق میں فیصلہ کرنا تھا لیکن یہ ضروری بھی نہیں ہے۔ وہ پہروں اپنا فیصلہ ملتوی کر سکتے ہیں، ہمارے لیے ایک پہر کی تاخیر بھی پہاڑ جیسی ہے۔ تبھل نے شاید اِسی خیال سے اتنی جھنجھلاہٹ دکھائی تھی۔ ہماری نرم روی سے اُن کے وسوسے اور تقویت پا سکتے تھے۔ ممکن ہے، تبھل کے ذہن میں یہی کچھ ہو۔ اتنی ردّ و قدح کا سبب صرف ذہنی انتشار نہیں ہو سکتا۔ بہر حال افسروں کے انتظار میں کوئی بے قرار نہیں تھا، جتنا اُن کے امکان میں تھا، وہ کر چکے تھے۔

بہت دیر بعد دروازے پر اُن کی آہٹیں گونجیں۔ سپاہیوں کے جسم اکڑ گئے۔ آنے والے صرف دو تھے۔ ایک نیا افسر بھی ادھیڑ افسر کے ساتھ تھا۔ "تم جا سکتے ہو دادا!" اُس نے اندر آ کے بلند آواز میں کہا۔ سب کی نگاہیں تبھل پر مرکوز ہو گئیں۔ تبھل بنچ پر بیٹھا رہا۔

"سُنا تم نے! ہم کو تمھارے لیے بہت بات کرنا پڑا۔" ادھیڑ افسر نے کہا۔ "پر یاد رکھنا، ہم نے تم پر بھروسا کیا ہے۔"

تبھل نے اپنا جسم سمیٹا اور کھڑا ہو گیا۔

"کچھ رہ گیا ہو تو ابھی اپنے کو بول دیو؟"

"نہیں صاحب!" تبھل نے زیر لبی سے کہا اور دروازے کی طرف چل پڑا۔ ہم بھی اپنی جگہوں سے اُٹھ گئے تھے۔ دروازے کے باہر سائبان میں افسروں اور سپاہیوں کا ہجوم موجود تھا۔ ہم دروازے سے نکلے تو سب کا رُخ ہماری جانب ہو گیا۔ چند ہی قدم بعد سیڑھیاں تھیں مگر ہمیں تبھل کی وجہ سے ٹھیر جانا پڑا۔ تبھل ہمارے نزدیک ہی ادھیڑ افسر سے جانے کیا باتیں کرنے لگا۔ ایک دو منٹ لگے

ہم اُس کے انتظار میں کھڑے تھے کہ سامنے کھڑے ہوئے پولیس افسروں کے جھنڈ میں انتشار سا ہوا، ایک افسر اپنے قریب کے افسروں کو ہٹاتا ہوا تیزی سے آگے آیا، ابھی اُس نے بے تابانہ چند ہی قدم طے کیے ہوں گے کہ میری آنکھیں دھندلا سی گئیں وہ ایس پی شکلا تھا، کرشنا جی کا معتمد۔ مَیں نے دوسری نگاہ میں پہچان لیا تھا اور میرا جسم ایک لمحے کے لیے ڈگمگا گیا تھا۔ میں اُس کی طرف بڑھنا چاہتا تھا کہ رُک گیا میرے قریب آکے اُس کے پاؤں بھی ٹھٹک گئے تھے۔ "تم؟ ظہیر؟" اُس نے ہیجانی آواز میں کہا۔

مَیں نے سر جھکا لیا۔

اُس نے میرے شانے پکڑ لیے۔ "یہ تمھی ہو؟" وہ منتشر لہجے میں بولا۔ "تم یہاں کیسے؟ کب آئے؟"

"بہت دن ہو گئے۔" مَیں نے نیچی آواز میں جواب دیا۔

"بہت دن ہو گئے اور مجھے نہیں معلوم؟ کسی نے مجھے نہیں بتایا۔" وہ حیرانی سے بولا۔ "مگر یہ سب یہ سب کیا ہے؟"

مجھ سے کچھ نہ کہا گیا۔

"کیا؟ کیا ہوا ظہیر میاں؟ تم بھی؟" میری خاموشی پر وہ اور پریشان ہو گیا۔ "کیا بات ہے؟" وہ سراسیمگی سے شامو اور مارٹی کی طرف دیکھ کے بولا۔ "تمھارا ان سے کیا تعلق ہے؟ بولتے کیوں نہیں؟"

"کیا بتاؤں؟" مَیں نے سسکتے ہونٹوں سے کہا۔ "پیر دادا...."

"پیر و دادا!" وہ دہشت سے بولا۔ "تم بھی اسی سلسلے میں آئے ہو؟ اوہ مائی گاڈ! پیر و دادا سے تمھارا کیا تعلق ہے؟"

مَیں اُسے کون سا رشتہ بتاتا۔

دوسرے پولیس افسر بھی ہمارے نزدیک آ گئے۔ شکلا کی نظریں سر سے پیر تک اِس طرح مجھ پر منڈلا رہی تھیں جیسے اُس کی آنکھیں دھوکا کھا رہی ہوں۔ میرے گندے پیر، سیاہ پائنچے، شکستہ کپڑے، بے ترتیب بال۔ میری یہ حالت دیکھ کے اُسے بے قرار ہو ہی جانا چاہیے تھا۔ اُس نے بے اختیار مجھے سینے سے لگا لیا۔ "مجھے بتاؤ ظہیر میاں! یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"انھی سے پوچھ لیجیے۔" مَیں نے قریب کھڑے ہوئے نوجوان افسر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "انھیں سب معلوم ہے۔"

"کیا آپ اِسے جانتے ہیں؟" نوجوان افسر نے انگریزی میں شکلا سے پوچھا۔

"انھیں یہاں کون نہیں جانتا۔" شکلا نے میرا کندھا تھپ تھپاتے ہوئے کہا۔ "کرشنا جی کو تم بھول گئے، یہ انھی کے ساتھ رہتے تھے۔ مستانہ کیس انھی کی وجہ سے .... اور بگڑ گیا۔ "کیا ظہیر میاں بھی اِن لوگوں میں شامل ہیں؟"

"جی ہاں۔" نوجوان افسر نے ہچکچاہٹ سے کہا۔

"نہیں نہیں، تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"ان لوگوں نے تسلیم کیا ہے کہ یہ پاڑے کے دادا ہیں پیر دادا، ماچھی دادا سے اِن کے گہرے مراسم رہے ہیں۔"

"کیا واقعی؟" شکلا بے یقینی کے عالم میں بولا۔ "کیوں ظہیر! یہ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" مَیں نے آہستگی سے کہا۔ شکلا کی متردّد نگاہیں مجھ پر ٹِکی ہوئی تھیں۔ "یہ کوئی بالکل مختلف معاملہ ہے۔" وہ بے چینی سے انگریزی میں بولا۔ "کیا بات ہے ظہیر! مجھے بتاؤ؟"

"مجھ سے اِس وقت کچھ مت پوچھیے۔" مَیں نے عاجزی سے کہا۔

اُس کے چہرے پر لکیریں پڑ گئیں۔ "مجھے بھی نہیں بتاؤ گے؟ ٹھیک ہے۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "میں دیکھتا ہوں تم کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟ جولی کے ہاں؟"

"جی۔" مَیں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"اور اب کہاں جا رہے ہو؟"

میری نظریں تھجل کی طرف اُٹھ گئیں۔ ایس پی شکلا پٹ پٹاتی پلکوں سے اُسے دیکھنے لگا۔ "آپ ہی کچھ بتائیے؟" اُس نے تند لہجے میں تھجل سے پوچھا۔

"اب کوئی بات نہیں صاحب!" تھجل نے بظاہر نرمی سے کہا۔

مَیں نے تھجل کو بتانا چاہا کہ یہ وہی ایس پی شکلا ہے جس نے فیض آباد میں مجھے تار دیا تھا کہ ابّا جان جیسے حُلیے کا ایک شخص آسام میں دیکھا گیا ہے، اسی اطلاع پر تھجل نے تبت جانے کا ارادہ کیا تھا اور ابّا جان مل گئے تھے۔ یہ زیادہ مدّت کی بات نہیں کرشنا جی کے بعد یہی تھا جو ابّا جان کی ٹوہ میں لگا رہا۔ اِس نے ہندوستان کے تمام تھانوں سے رابطہ قائم کر رکھا تھا مگر شاید تھجل کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں تھی، وہ خود اُسے پہچان چکا تھا۔ اس نے شکلا کو سلام کیا، شکلا نے تپاک سے جواب دیا۔ مجھے یاد نہیں تھا کہ وہ پہلے مل چکے ہیں یا نہیں۔ ہو سکتا ہے جولین کے گھر کبھی اُن دونوں کی ملاقات ہوئی ہو۔ اُن کے انداز سے شناسائی ظاہر ہوتی تھی۔ شکلا کے چہرے پر اضطراب چھایا ہوا تھا۔ "ابھی سب ٹھیک ہے صاحب!" تھجل نے دھیمی آواز میں کہا۔ "اپنے کو جلدی جانا ہے۔"

شکلا کسی سوچ میں گم ہو گیا تھا، تھجل کی آواز پر ہڑبڑا سا گیا۔ "ہاں ہاں، ٹھیک ہے، آپ لوگ جائیں۔" اُس نے بے خیالی میں کہا۔ دوسرے ہی لمحے وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تم بھی جا رہے ہو مگر مجھے تم سے کچھ بات کرنا ہے۔"

"مجھے جانے دیجیے۔" میں نے ڈوبتی آواز میں کہا۔ "میں آپ سے پھر مل لوں گا۔"

"صرف چند منٹ کے لیے نہیں ٹھیر سکتے؟" وہ تکدر سے بولا۔

مجھ سے انکار کرتے نہ بن پڑا۔ "ابھی اِس کو جانے دو شکلا جی!" تھجل نے اُس کا نام لے کے کہا۔ "اِس کا باپ مر گیا ہے۔"

"باپ؟" شکلا حیرت سے بولا۔ "آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"یہ اُس کو ایسا ہی سمجھتا تھا۔"

"پیر و دادا کو؟"

"ہاں صاحب! وہ اِس کے لیے باوا سے بھی زیادہ تھا۔"

"پیر و دادا!" شکلا کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ "کیوں ظہیر؟" اُس نے مجھ سے تصدیق چاہی۔ میری خاموشی پر وہ مجھے جھنجوڑنے لگا پھر اُس نے میرے شانوں سے ہاتھ ہٹا لیے۔ اُسے اپنی حیثیت کا خیال آ گیا تھا یا اطراف میں کھڑے ہوئے افسروں کا۔ اُس نے لمحوں میں خود پر قابو پا لیا اور ہمارے لیے راستہ چھوڑ دیا۔

چبوترے کی سیڑھیاں طے کر کے ابھی ہم تھانے کا احاطہ عبور کر رہے تھے کہ شکلا پھر لپکتا جھپکتا ہمارے پاس آیا اور تھجل سے پوچھنے لگا کہ اُسے کسی مدد کی ضرورت تو نہیں؟

"ہو سکے تو اپنے لیے سواری کا بول دو صاحب! اِتنی رات کو نہیں ملے گی۔" تھجل نے اُس سے کہا۔

"ہاں کیوں نہیں۔" اُس نے پیچھے مڑ کے کسی کو اشارہ کیا۔ نوجوان افسر بھاگا ہوا آیا۔ شکلا کے استفسار پر اُس نے بتایا کہ تھانے کے باہر موٹریں کھڑی ہیں، وہ ہمیں اسپتال تک لے جائیں گی جہاں دادا اور ماچھی موجود ہیں۔ وہاں ہمیں اُن کے وارث کے طور پر دستخط کرنے ہیں۔ شکلا نے اُسے ہدایت کی کہ اسپتال سے گھر تک پہنچنے کے لیے بھی سواری ہماری تحویل میں رہنی چاہیے۔

"نہیں صاحب!" تھجل بوجھل آواز میں بولا۔ "اپنے کو ابھی ماہم کے پاڑے تک جانا ہے، گھر نہیں۔"

"لیکن یہ لوگ بتا رہے تھے کہ دادا کا تو اپنا گھر ہے۔" شکلا نے تجسس سے کہا۔

"ایک دم اُن کے سامنے کیسے لے جائیں۔"

"ہاں۔" شکلا نے تاسف سے تھجل کو مشورہ دیا کہ ایسا ہی ہے تو پیر و دادا کو ابھی اسپتال ہی میں رہنے دیا جائے اور بہتر ہے کہ پہلے ہم گھر ہو آئیں۔

"پاڑے بھی تو اُس کو جانا ہے، وہ بھی اُس کا گھر ہے۔"

"لیکن پاڑے کے لوگ بھڑک سکتے ہیں۔"

"نہیں لے جائیں گے تو اور فیل مچائیں گے صاحب!"

شکلا نے سر ہلا کے تائید کی اور مجھ سے کہنے لگا کہ اُس کی موٹر موجود ہے، ضرورت ہو تو میں لے سکتا ہوں، ڈرائیور بھی ساتھ ہے۔ میں سوچتا رہا کہ کیا جواب دوں، مَیں نے تھجل کی طرف دیکھا، اُس نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ ضرورت ہو گی تو ضرور اُسے زحمت دی جائے گی۔ شکلا اور نوجوان افسر ہمارے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ تھانے کی چار دیواری کے باہر تھجل کچھ فاصلے پر ہو گیا تھا، شکلا نے پہلو سے میرا ہاتھ تھام لیا اور بھن بھناتے لہجے میں بولا۔ "ظہیر! کوئی ایسی ویسی بات ہو تو مجھے پہلے سے بتا دو؟"

"کیسی بات؟" مَیں نے بھر کے کہا۔ "کوئی ایسی بات نہیں۔"

"مجھ پر اعتبار کرتے ہو نا؟"

"آپ بھی اُنھی جیسی باتیں کر رہے ہیں؟"

"پھر یہ سب کیا ہے ظہیر! میں کچھ نہیں سمجھ رہا ہوں۔"

"میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہا، یہ کیا ہو گیا۔"

"پیر و دادا سے تمھارا کیسا تعلق تھا؟"

"وہ میرا...." میری زبان لکنت کرنے لگی۔ "کیا بتاؤں۔ بہت لمبی داستان ہے لیکن کوئی ایسی بات نہیں۔"

"تم کہہ رہے ہو تو یقیناً نہیں ہو گی مگر کسی وقت کسی طرف سے بھی کوئی اندیشہ محسوس کرو تو دیر نہ کرنا۔ اُس نے مجھے متنبہ کیا کہ پیر و دادا بمبئی کا بہت بڑا دادا تھا، پولیس نے اِس واقعے کی سنگینی کا شدت سے نوٹس لیا ہے، ہیڈ کوارٹر کے حکم پر سارے شہر کی پولیس حرکت میں آ گئی ہے اور جگہ جگہ چھاپے مارنے کا ارادہ کر رہی ہے، پیر و دادا سے قربت کی وجہ سے مَیں بھی زد پہ آ سکتا ہوں۔ وہ کہنے لگا کہ پولیس کی کارروائیاں اپنے انداز کی ہوتی ہیں، یہ تو میں جانتا ہی ہوں گا، پولیس کی رائے میں یہ سلسلہ ابھی ختم نہیں ہو گا۔

مَیں سنتا رہا، مَیں نے کچھ نہیں کہا۔

"اتنے دنوں تک تم آئے کیوں نہیں؟ کیا کرتے رہے؟"

"فرصت ہی نہیں ملی، خیال تھا کہ کسی دن شاید آپ ہی آ جائیں۔"

"پچھلے دو مہینے میں کئی بار بمبئی سے باہر جانا ہوا۔" موٹریں قریب آجانے پر اُس کی سرگوشیاں بند ہوگئیں۔ تجمل ابھی باہر کھڑا تھا۔ شکلا نے اپنے ہاتھوں میں اُس کے ہاتھ جکڑ لیے اور معذرتی انداز میں بولا "مجھے علم نہیں تھا کہ ظہیر میاں بھی یہاں ہیں ویسے بھی مجھے پہنچنے میں کچھ دیر ہوگئی ورنہ اتنا وقت نہ لگتا۔"

"اچھا ہوا جو آپ دیر سے آئے۔"

"کیوں؟" شکلا چونک پڑا۔ "یہ کیوں کہہ رہے ہیں آپ؟"

"آپ ادھر اکیلے تو نہیں ہو صاحب!" تجمل نے چبھتی آواز میں کہا۔ "اپنے کو جان کاری میں اتنی دیر تو لگتی۔"

شکلا کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ میری طرح وہ بھی تجمل کا مقصد نہیں سمجھ پایا تھا تاہم اُس نے تشریح نہیں چاہی۔ خوش اطواری سے بولا "پولیس کو کبھی کبھی اپنے آپ سے بھی ضد کرنی پڑتی ہے۔ اپنی مرضی کے خلاف چلنا پڑتا ہے۔ پولیس کی اپنی مجبوریاں ہیں۔ میں ان کی جگہ ہوتا تو شاید مجھے بھی وقت لگتا۔ ہاں ظہیر کا سامنا ہونے پر صورت یقیناً مختلف ہوتی۔ مجھے معلوم ہے کہ ظہیر کم از کم پیچھے سے وار نہیں کرسکتا اور نہ اِس کے ساتھی ایسے ہوسکتے ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ اِن میں کسی نے ظہیر کو نہیں پہچانا۔ یہ ایسا بدل بھی نہیں گئے۔ کرشنا جی کو گزرے بھی اتنا زمانہ نہیں ہوا کہ کوئی اُنھیں بھول جائے اور اُن کے محبوب ظہیر کو بھول جائے۔ یہ اشارہ بھی کر دیتے تو اُن سب کی مشکل بھی حل ہو جاتی، آپ کی بھی۔ بہرحال....."

"ہم پاڑے کے آدمی ہیں شکلا جی! اپنا بوجھ ساتھ لے کے چلتے ہیں۔ آپ اِس کی وجہ سے ہم کو تھوڑا چھوٹ دیتے تو ہم منع بول دیتے۔ یہ کسی کا نام لیتا تو ہم اِس کو باہر کر دیتے۔"

"یہ اچھی بات ہے۔" میری توقع کے خلاف شکلا کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"اپنی بنتی ہے آگے بھی آپ کوئی ٹیکی مت لگانا، کندھے کا اُدھار ہم کو راس نہیں آتا۔"

"اوہ! ویری گڈ۔" شکلا اُچھل کے بولا۔

یہ کچھ کہنے کا کیا محل تھا۔ شکلا تو ہمارے لیے کہہ رہا تھا۔ اِس سے پہلے کہ تجمل کی زبان سے کچھ اور نکلتا۔ میں نے اُسے کھنی لر کے اندر بیٹھ جانے کی التجا کی۔ اندر نشست پر بیٹھتے ہوئے تجمل، شکلا کو سلام کرنا نہیں بھولا۔ وہ سب اندر چلے گئے تو میں نے بھی جانا چاہا۔ شکلا نے میری کلائی پکڑ لی۔ "اپنا خیال رکھنا۔" اُس نے مرتعش آواز میں کہا۔ "میں اِسی شہر میں ہوں۔"

میری رگیں کھنچنے لگی تھیں۔ میں جلدی سے اندر چلا آیا۔

اسپتال کے دروازے پر زدرا، گلیا، لچھمی اور چھیدا ہیں دھاڑیں مارنے لگے۔ اسپتال سے پاڑے تک سارے راستے وہ منہ نوچتے، سینہ پیٹتے رہے۔ پاڑے کے علاقے میں جگہ جگہ گشت کر رہے تھے اور ہر طرف آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ مکانوں کی کھڑکیاں اور دروازے کھلے ہوئے تھے جیسے ہر گھر میں کوئی ہو۔ موٹریں پاڑے کی عمارت کے قریب پہنچیں تو ہر سُو شور تھا۔ جب تک موٹریں پاڑے کے دروازے پر ٹھہر نہیں گئیں لوگ ساتھ بھاگتے رہے۔ موٹر سے اُتار کے وہ اُنھیں اپنے کندھوں پر میں لائے۔ دیکھتے دیکھتے عمارت میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ بھی اندر گھس آئے تھے۔ دونوں کو اُسی تخت پر لٹا دیا گیا تھا جہ ایک پہر پہلے وہ دندنایا کرتے تھے۔ زدرا، چھیدا اور نہ جانے کون کون لوگوں سے بار بار خاموش ہو جانے کی منتیں کر رہے تھے۔ بھر کے لیے سناٹا چھاتا، پھر وہی شور اُمڈنے لگتا۔ میں نے بس ایک اُنھیں ایک دوسرے کے قریب پڑے دیکھا۔ جب وہ اُن کے چہرے سے چادر ہٹانے لگے تو میں وہاں سے ہٹ آیا اور ایک کونے میں کے بیٹھ گیا۔ اُن کی سسکتی بلکتی آوازیں سُن سُن کے میرا جسم سُن ہوگیا تھا۔

جانے کتنا وقت گزر گیا تھا کہ شامو میرے پاس آگیا اور رمناتے ہوئے بولا کہ میں یوں چھپ کے کہاں بیٹھ گیا ہوں۔ سارے میں مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔

"کیوں؟ کیا ہوا؟" میں نے چڑ کے کہا۔ "میں کدھر جاتا۔ میری مت کرو۔"

"استاد بلاتے ہیں لاڈلے!" وہ تلخی سے بولا۔

"مجھے یہیں رہنے دو، کہہ دو کہ نہیں ملا۔"

"کیا بولتا ہے؟" اُس نے میرے بال پکڑ لیے۔

"میں یہاں ٹھیک ہوں شامو بھائی!"

"میں بولتا ہوں اُستاد نے پوچھا ہے۔"

"کیا بات ہے؟"

"اُسی سے جاکے پتہ کرنا، چل اُٹھ۔" اُس نے جھٹکے سے کھینچ کے اُٹھا لیا۔ چوکی کے اطراف لوگوں کا اژدہام تھا۔ ہم کے درمیان سے گزرتے ہوئے اندر کمرے میں چلے آئے۔ تجمل

دادا کے خاص کمرے میں بیٹھا تھا۔ "کیا ہے رے! کدھر کھو گیا تھا؟" وہ ہل کے بولا۔

"کہاں جاتا، یہیں تھا۔"

"چلنا ہے ابھی......"

"کہاں؟" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"چلنا ہے رے۔"

مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ کہاں جانے کو کہہ رہا ہے۔ "میں نہیں جاؤں گا، خدا کے لیے مجھے مت لے جاؤ۔" میں نے بہت التجا کی۔

اُس نے کچھ سُنا ہی نہیں "چل رے! وہ اپنا نہیں تو تیرا ہی تھوڑا خیال کریں گی۔"

"وہ کسی کا خیال نہیں کریں گی۔"

"کوئی نہ جائے پھر؟" وہ غصّے سے بولا اور اُٹھ کے میری کمر تھپکتا ہوا دروازے سے نکل گیا۔ وہاں جانے کے خیال سے میری ٹانگیں لپکپانے لگیں۔ شامو نے مجھے آگے کی جانب دھکیلا، میں چوکھٹ سے ٹھوکر کھاتے کھاتے بچا۔ گلیا نے عقبی دروازہ کھول دیا تھا، ہمیں دوبارہ ہجوم کی طرف نہیں جانا پڑا۔ پچھواڑے ٹم ٹم کھڑی تھی۔ ہم دونوں کے سوا کوئی اور نہیں بیٹھا۔ اِس طرف بھی بہت سے لوگ موجود تھے۔ دُور جاکے ٹم ٹم کی رفتار تیز ہوگئی، سڑکیں بھی سنسان ہوگئی تھیں۔ تجمل گم سم بیٹھا رہا۔ ابھی ہم نے آدھا راستہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ اندھیرا ٹوٹنے لگا لیکن روشنی اُجالا تو آدمی کے اندر ہوتا ہے۔ جیسے جیسے دادا کا گھر قریب آرہا تھا، مجھے ہر شے گھومتی سی نظر آرہی تھی، جیسے کوئی مسلسل میری جان کھینچ رہا ہو۔

مکان پر سکوت طاری تھا۔ میں رات ہی کوئی دس گیارہ بجے کے درمیان یہاں آیا تھا۔ اِس وقت پانچ بج رہے ہوں گے۔ چند گھنٹوں میں کیا سے کیا ہوگیا۔ رات اُن کے چہروں پر کیسی روشنی بکھری ہوئی تھی۔ بات بات پر کھِلی جاتی تھیں۔ کیا معلوم تھا کہ چند گھنٹوں بعد مجھے یہاں پھر آنا پڑے گا اور صبح کے ساتھ میں اُن کے لیے اندھیرا لے کے آؤں گا۔ میرا دل ڈوبا جارہا تھا۔ ٹم ٹم ٹھہرتے ہی تجمل اُتر گیا۔ اُس کی دستکوں پر دیر سے دروازہ کھلا اور بندوق بردار گورکھا چوکیدار اندر سے برآمد ہوا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا آیا تھا۔ ہمیں دیکھ کے اُس کا جسم بل کھانے لگا۔ "اندر جاکے بول، ہم آئے ہیں۔" تجمل نے اُسے پوری طرح آنکھیں کھولنے کی مہلت بھی نہیں دی۔

وہ بوکھلا گیا۔ "کیا ہے مالک! سب ٹھیک تو ہے؟"

"ہاں رے! دیری مت کر۔" تجمل نے اُلجھی ہوئی آواز میں کہا۔

چوکیدار گُنگ کھڑا ہمیں دیکھتا رہا۔ اُس کی پیشانی ایک پل کے لیے سمٹ گئی؟ وہ فوراً دروازے سے ہٹ گیا۔ "ابھی سب سوتا ہے۔" وہ اضطراب سے بولا۔

"اٹھا دے رے اُن کو۔" تجمل نے حکمیہ لہجے میں کہا۔

"مالک کو پوچھتا ہے آپ؟" اندر جاتے جاتے اُس نے رُک کے پوچھا۔

"نہیں رے!" تجمل نے درشتی سے کہا۔ "گھر میں جاکے بول۔"

سامنے کے مختصر سبزہ زار سے ملحق ساری کوٹھی لوہے کی جالیوں میں محصور تھی۔ چوکیدار نے عمارت کے ستون میں نصب گھنٹی بجائی۔ اندر سے پیرو دادا کے خاص آدمی شبتی چاچا کی دھمکتی آواز سنائی دی۔ "کون ہے گورے! کیا ہے؟"

چوکیدار ابھی جواب بھی نہیں دے پایا تھا کہ شبتی چاچا ہمارے سامنے آگیا۔ وہ بنڈی اور لنگی پہنے ہوئے تھا۔ کہنے کو وہ ملازم تھا لیکن اُسے گھر کے نگران کی حیثیت حاصل تھی۔ عمر میں بھی وہ پیرو سے بڑا تھا۔ گٹھا ہوا جسم، گندمی رنگت، درمیانہ قد۔ اپنی وضع قطع سے بھی وہ گھر ہی کا کوئی فرد لگتا تھا۔ پیرو سے اُس کی شناسائی بہت پرانی تھی لیکن گھر میں آمد و رفت گیتا کے ہوش سنبھالنے پر ہوئی۔ گیتا کو سب سے پہلے اُسی نے پڑھانا شروع کیا تھا۔ پیرو کی رائے میں کسی حادثے کے سبب اُس نے اپنے شہر سے بھاگ کے بمبئی کے جنگل میں پناہ لی تھی، اپنے بارے میں اُس نے نہ کبھی کچھ بتایا تھا، نہ پیرو نے جاننے کی کوشش کی تھی۔ پیرو کو شبہ تھا کہ اُس کا اصل نام شبیر خاں ہے بھی کہ نہیں۔ بہت دنوں بعد پیرو کو معلوم ہوسکا کہ اُس کا تعلق ریاست رام پور سے ہے۔ پیرو کے اصرار پر وہ یہیں رہنے لگا اور پھر یہیں کا ہو رہا۔ گھر کی دیکھ بھال کے سوا اُس کی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ گھر سے بھی وہ صرف ضرورت کے وقت نکلتا تھا۔ سارا حساب اُس کے ذمّے تھا اور گھر کے دوسرے ملازم اُس کے سامنے جواب دہ تھے۔ پیرو اُسے بڑے بھائی کا درجہ دیتا تھا۔ رانی اور گیتا بھی اُسے بھائی اور چاچا کہتی تھیں لیکن شبتی چاچا ہر جگہ خود کو پیرو کا ملازم کہتا اور ایک مالک کی طرح پیرو کا احترام کرتا۔ گھر میں اتنا شامل ہونے کے باوجود سب سے الگ تھلگ رہتا، ضرورت پر سامنے آتا۔ وہ کوٹھی کے ایک کونے میں ملازموں کے لیے بنے ہوئے حصّے میں رہتا تھا، البتہ

پیرو کی عدم موجودی میں اندر آجاتا۔ پیرو کے بارے میں اُسے سب کچھ معلوم تھا۔ پیرو کے بہ قول شبّی چاچا پاڑے اور اُس کے گھر کے درمیان ایک پردے اور دیوار کے مانند تھا۔ ہم پر نظر پڑتے ہی وہ بے چین ہو گیا۔ "کون؟ کون؟ تُبھل بھائی آئے ہیں۔ اتنے سویرے سویرے؟ خیر تو ہے؟" اُس نے جالیوں کے درمیان بنے ہوئے دروازے کا تالا بہ عجلت کھول دیا۔ تُبھل وہیں پڑی ہوئی بید کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"خدانخواستہ طبیعت تو ٹھیک ہے۔ اتنے سویرے کیسے آنا ہوا؟" شبّی چاچا نے ٹھنکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"آنا بھی بس کا نہیں ہوتا شبّی میاں!" تُبھل نے ٹوٹی پھوٹی آواز میں کہا۔ "اُن دونوں کو اٹھا دے۔"

"کنھیں؟" شبّی چاچا سٹ پٹا کے بولا۔ "بہو رانی اور بٹیا کو؟"

"اُنھی کو بولتے ہیں۔"

"کیا بات ہے تُبھل بھائی! خدا خیر کرے، سب خیریت ہے نا؟" شبّی کے چہرے پر دہشت سی طاری ہو گئی۔ اتنی عمر میں آواز اور چہرے پہچاننا اُسے خوب آ گیا ہو گا۔ وہ سہمی ہوئی آواز میں پیرو کے بارے میں پوچھنے لگا کہ وہ کہاں ہے؟

"اُن کے سامنے ہی جان لینا، کدھر ہے وہ۔ اُن کو ابھی اٹھا دو شبّی میاں!"

"کیا ہوا، ایسی کیا بات ہے؟" وہ بدحواسی سے بولا۔ "مجھے کیوں نہیں بتاتے آپ؟"

"بتانے کے لیے آئے ہیں۔" تُبھل نے اُسے جھڑک دیا۔ شبّی چاچا دم بخود ہو کے تُبھل کی صورت تکتا رہا، پھر مزید استفسار کیے بغیر اندر کی طرف دوڑ پڑا۔ چند لمحوں بعد اندر سے دروازہ دھڑ دھڑانے کی آواز آئی۔ دروازہ جلد ہی کھُل گیا تھا۔ شبّی چاچا کی چیخ پکار بند ہو گئی۔ پھر کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ اُس نے اُن دونوں کو جانے کیا بتایا تھا مگر شاید کچھ زیادہ نہیں کیونکہ وہ فوراً واپس آ گیا۔ آتے آتے اُس نے بیرونی کمرے کا دروازہ کھول دیا، کمرہ روشن کر دیا اور پردے ہٹا کے کھڑکیاں کھول دیں۔ کانتے کے چلے جانے کے بعد تُبھل نے اس کمرے میں کئی دن گزارے تھے۔

ہمیں وہاں پہنچے چار پانچ منٹ ہی گزرے ہوں کہ رانی اور گیتا جھپٹتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔ ہم دونوں کھڑے ہو گئے۔ گیتا نے آتے ہی دہشت زدہ آواز میں اپنے باپ کے بارے میں پوچھا۔ تُبھل نے ہاتھ پھیلا کے اُسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ میری رگوں میں خون جم گیا تھا۔ تُبھل نے رانی کو بھی اپنے پاس بلا لیا اور اُس کے سر پر ہاتھ رکھے ساکت کھڑا رہا۔ جانے کتنے لمحے گزر گئے، وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ گیتا نے اُسے اتنا موقع نہیں دیا کہ وہ کچھ دیر اپنی سانسیں استوار کر سکے اور الفاظ ڈھونڈ سکے جو کبھی بہت حقیر ہو جاتے ہیں، بالکل بے جان، پتھر جیسے۔ گیتا نے اضطراری لہجے میں تُبھل سے دوبارہ پوچھا۔ "پاپا کدھر ہیں؟"

"اِدھر ہی ہے بٹیا، اِدھر ہی۔" تُبھل کی زبان اکڑ گئی تھی۔

گیتا کو یقین نہیں آیا۔ ایسی بچّی نہیں تھی وہ۔ تُبھل کے بازو سے نکل کے وہ اُس کا چہرہ دیکھنے لگی پھر اُس نے پلٹ کے بے تابانہ مجھے دیکھا۔ تُبھل کی طرح میری نظریں بھی جھک گئیں۔ میرا تو سارا جسم اندر ہی اندر لرز رہا تھا۔ "پھر آپ....." وہ اٹکتی بہکتی آواز میں بولی۔ "یہ شبّی چاچا.....؟"

"یہ بھی ٹھیک بولتے ہیں۔" تُبھل نے پھڑپھڑاتے ہونٹوں سے کہا۔

"کیا! کیا ہوا اُن کو.....؟" رانی کی چیخ نکل گئی۔ تُبھل پتھر ہو گیا تھا۔ گیتا دیوانہ وار اُسے جھنجوڑنے لگی۔ مَیں نے بہت کوشش کی لیکن مجھ سے وہاں نہ ٹھیرا جا سکا۔ اِس سے پہلے کہ وہ میرا گریبان پکڑ لیتیں مَیں کمرے سے بھاگ آیا۔ میرے قدم مجھے مکان کے دروازے تک لے آئے تھے اور مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ کہاں جانا چاہیے، کون سی کھوہ میں۔ دروازہ بند تھا اور چوکی دار موجود تھا۔ مجھے دیکھ کے وہ دروازہ کھولنے کے لیے بڑھا تھا لیکن مجھ سے آگے بھی نہ جایا جا سکا۔ پیچھے سے شبّی چاچا بھاگتا ہوا میرے پاس آ گیا اور مجھے اپنے پہلو میں دبوچے اندر لے آیا۔ میرا اپنا کوئی ارادہ ہی نہیں رہا تھا مگر دوبارہ اندر جانے کے خیال سے میرا دم پھر نکلنے لگا۔ شبّی چاچا کی آنکھیں اُمڈ رہی تھیں۔ وہ اُلٹا مجھے تھپکیاں دینے لگا۔ مَیں نے اپنا منہ چھپا لیا۔ وہ بھی نہیں رکا، مجھے وہاں چھوڑ کے سامنے کے بیرونی کمرے میں چلا گیا۔ وہ بین کر رہی تھیں، اُن کی چیخوں اور کراہوں کی صدائیں برآمدے تک آ رہی تھیں۔ تُبھل کی گھُٹی گھُٹی آوازیں بھی اُن میں شامل تھیں۔ اُسے مَیں نے اکیلا چھوڑ دیا ہے، یہ احساس مجھے اور ہلکان اور ناتواں کر رہا تھا۔ مَیں اندر نہیں گیا۔ اتنی دیر میں باہر سے موٹر کا ہارن بجا۔ چوکی دار نے دروازہ کھولا تو منیر علی اور ابّا جان اندر داخل ہوئے۔ فرخ اور فریال بھی اُن کے ساتھ تھیں۔ سب ہانپتے کانپتے سیدھے میری طرف آئے تھے اور مجھ سے طرح طرح کے سوال کرنے لگے تھے۔ مَیں کیا جواب دیتا۔ برآمدے میں گونجتی ہوئی رانی اور گیتا کی سسکیاں اُنھوں نے بھی سُن لی ہوں گی۔ پھر وہ میرے پاس نہیں ٹھیرے۔ اچھا ہوا جو وہ آ گئے، مجھے ایک دم چھاؤں کا سا احساس ہوا۔ تُبھل اب اکیلا نہیں رہا تھا۔ ابّا جان اور منیر علی کی آمد پر اُن کی آہ و بکا کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ اُنھوں نے ایسا گریہ کیا کہ آدمی تو آدمی، در و دیوار دہل جائیں۔

دھوپ ابھی نہیں نکلی تھی مگر اندھیرا ختم ہو گیا تھا۔ مَیں وہیں بیٹھا رہا۔ شبّی چاچا اور گھر کے ملازم سسکتے بلکتے کئی بار میرے سامنے سے گزرے، کوئی بھی میرے پاس نہیں آیا۔ پھر بیرونی کمرے سے یکایک تُبھل نمودار ہوا۔ اُسے دیکھ کے میں ہڑبڑا کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ میرے مقابل آ کے ٹھیر گیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے بولا۔ "چلا آیا رے!" میرے ہونٹ سسک کے رہ گئے۔ "ابھی پاڑے جا کے اُن کو لانا ہے۔" اُس نے بکھری بکھری آواز میں کہا۔ "اِدھر کا دھیان رکھنا۔"

"مَیں بھی چلتا ہوں۔ یہاں ابّا جان ہیں۔"

"ابھی اِدھر ہی رہ۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اِدھر تیری ضرورت ہے، تجھ پہ مان کرتی ہیں وہ۔"

"مگر مجھ سے، مجھ سے یہ سب....."

"پہلی بار تھوڑی دیکھ رہا ہے۔"

"مگر کوئی کتنی بار دیکھ سکتا ہے۔" مَیں نے ہذیانی انداز میں کہا۔ "تمھاری بات اور ہے۔"

"ہاں رے! ٹھیک بولتا ہے۔"

"تم کہو تو مَیں پاڑے چلا جاتا ہوں۔"

"اُدھر کوئی اور ہیں کیا؟....."

"مگر یہاں مجھ سے اُن کے سامنے نہیں جایا جاتا۔"

اُس نے بے اختیار مجھے سینے سے لگا لیا۔ میرے تن بدن میں ایسا شور اُٹھا کہ پھر کچھ بھی خیال نہ رہا۔ میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ "نا نا، نہیں رے نہیں، ایسا کیسے چلے گا۔ تو بھی ڈھیر ہو جائے گا تو....." باہر سے ہارن کی آواز آنے پر وہ سیدھا ہو گیا۔ "موٹر آ گئی ہے۔ مَیں چلتا ہوں۔ ابھی اندر جا کے بیٹھ تو ٹھیک ہے۔" میرے شانے دباتا وہ میرے پاس سے چلا گیا۔ موٹر جولین، اُس کی ماں، چمپا بیگم اور شہ پارہ کو لے کے آئی تھی۔ اُنھوں نے سیڑھیوں پر تُبھل کو روک لیا لیکن وہ اُن کے پاس نہیں ٹھیرا، آگے بڑھ گیا۔ وہ دوڑتی ہوئی مجھ تک پہنچ گئیں۔ میرا سارا چہرہ بھیگا ہوا تھا۔ وہ یقیناً مجھ سے کچھ پوچھنا، کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ مَیں نے بیرونی کمرے کی طرف اشارہ کر دیا۔ یکایک میرے سینے میں وہی آگ بھڑکی۔ تُبھل دروازے تک چلا گیا تھا۔ اُن چاروں کو وہیں چھوڑ کے مَیں نے تیزی سے برآمدے کی سیڑھیاں طے کیں۔ میری آواز پر تُبھل ٹھیر گیا۔ مَیں نے اُس کے پاس جا کے جھجکتے ہوئے پوچھا کہ اُس کا دھیان کس طرف جاتا ہے؟

"کاہے کا دھیان؟" وہ چونک کے بولا۔

"یہی کہ وہ کون، کون ہو سکتا ہے؟"

"تُو بھی وردی والوں کی طرح بولتا ہے۔"

"تم نے کچھ سوچا تو ہو گا، کسی طرف ضرور تمھارا....."

"بیٹھ جا اندر جا کے۔" وہ اُلجھ کے بولا۔

"تم کو کچھ شبہ ہو تو مجھے بتاؤ؟ دادا کی ارتھی اُس سے پہلے نہیں اُٹھنی چاہیے؟"

"پھر دادا لوٹ آئے گا؟"

"دادا تو کبھی نہیں لوٹے گا۔" مَیں نے تلخی سے کہا۔ "تمھارا کیا مطلب ہے، کیا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہو گے؟ پھر تو کبھی کسی طرف جانے کی ضرورت نہیں، تمھیں اس طرح چین آ جائے گا؟"

"ایک وقت میں ایک ہی طرف کا پورا دکھائی دیتا ہے رے! دیکھیں گے اس کو بھی۔"

"تم اِس طرف دیکھو، میں جاتا ہوں، میں ایسے نہیں لوٹوں گا۔"

"پتہ ہے اپنے کو۔" وہ غصّے سے بولا۔ "اِدھر کوئی تیرا جوڑی دار نہیں ہے۔ بڑا اُستم ہے تُو۔ کلنٹے کا پکّا، تھوڑی دیر کا بھی اُدھار نہیں رکھتا۔"

"تم ٹھیک طرح بات کیوں نہیں کر رہے؟"

"چا تو ہی سیکھا ہے تُو نے بس۔" وہ تمتمائی آواز میں بولا اور منہ پھیر کے سیدھا موٹر میں جا بیٹھا۔ میں دروازے پر کھڑا دیکھتا رہا۔ اُس کے بیٹھتے ہی موٹر روانہ ہو گئی۔ گو مَیں اندر لوٹ آیا تھا، اِس کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ تُبھل میری آنکھیں اور دُھندلا گیا۔ میں اُسی وقت نکل جاتا مگر میں کون سی گلی، کون سے کوچے کا رُخ کرتا۔ میں نے تُبھل کی تائید یا اُس کی اجازت کے لیے اُس سے بات نہیں کی تھی، مجھے اپنے سر میں گونجنے والے مبہم اور مجہول شکوک کی تصدیق مطلوب تھی، یوں شاید مجھے کوئی اشارہ مل جاتا۔ ظاہر ہے تُبھل بھی کسی سمت کا تعین نہیں کر پایا تھا اسی لیے مجھے تحمل کا درس دے رہا تھا ورنہ خود اُسے اتنا وقت گوارا نہ ہوتا یا کوئی اور بات ہے؟ وہ محض مجھے روکنے کے لیے تو ابھی سب کچھ خود تک محدود رکھنا نہیں چاہتا؟ نہیں، میں اُسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ اُس پر تو ایک ایک لمحہ عذاب کے مانند گزر رہا ہو گا۔

دھوپ پھیلنے کے ساتھ ساتھ گھر میں پڑوسیوں کی آمد شروع ہو گئی۔ شبّی چاچا نے سبزے پر شامیانہ لگوا دیا تھا۔ عمارت کے

اندر اور باہر دریاں اور سفید چادریں بچھا دی گئی تھیں۔ ابّا جان اور منیر علی بھی شتی چاچا کے ساتھ مصروف تھے۔ مَیں ایک کونے میں سبزے پر بچھی ہوئی دری پہ آبیٹھا۔ ابّا جان اور منیر علی کئی بار میرے پاس آئے اور گپ چپ بیٹھے رہے۔ نہ کچھ وہ کہہ پاتے تھے، نہ مجھ سے کچھ کہا جاتا تھا۔ اُن کی سمجھ میں کچھ اور نہ آیا تو وہ مجھے کچھ دیر کے لیے کسی کمرے میں جاکے کمر ٹکانے کو کہنے لگے۔ میرے حلیے کی طرف بھی انھوں نے اشارہ کیا۔ پھر جولین مجھے برآمدے کی جالیوں میں دکھائی دی۔ وہ مجھی کو بلا رہی تھی۔ مَیں اُٹھ کے اُس کے پاس پہنچا، وہ میرا ہاتھ پکڑ کے اندر ایک کمرے میں لے گئی۔ یہ گیتا کا کمرہ تھا۔ یہاں فرخ بھی تھی۔ دونوں کی آنکھیں برس رہی تھیں۔ جولین نے بھیگی ہوئی تولیا میرے سامنے رکھ دی۔ میرا کچھ جی نہیں چاہتا تھا لیکن نہ انکار کی ہمت تھی، نہ اِس کا کوئی جواز تھا۔ مجھے یاد ہے، کاتتے کے وقت پیرو دادا نے کہا تھا کہ زندوں سے بھی تیرا کچھ واسطہ ہے۔ جولین کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ میں اگر کوئی تماشا بنا ہوا تھا تو یہ اچھا نہیں تھا۔ جولین اور فرخ کو میری فکر سے زیادہ گیتا اور رانی کی نگہ داشت کرنی چاہیے تھی۔ تولیا ایک طرف رکھ کے میں غسل خانے چلا گیا۔ پاجامے کے پائنچوں پر پانی انڈیلنے سے کیچڑ کے دھبے بڑی حد تک مٹ گئے۔

مَیں باہر آیا تو فرخ چائے کی پیالی لے آئی۔ مَیں نے کوئی پس و پیش نہیں کی اور چند گھونٹوں میں چائے حلق میں لوٹ لی۔ غم کی تازگی کے لیے توانائی بھی ضروری ہے۔ وہ دونوں میرے ساتھ باہر نکلیں۔ مَیں برآمدے کی طرف جانے کے بجائے اُن کے ساتھ بیرونی کمرے میں داخل ہوا۔ شہ پارہ، چمپا بیگم، جولین کی ماں، فریال اور پڑوس کی عورتوں کے درمیان رانی اور گیتا بُتوں کی طرح بے سُدھ بیٹھی تھیں۔ بکھرے ہوئے بال، ویران آنکھیں۔ آدمی ایسے شیشے کے بنے ہوتے ہیں۔ اتنی دیر میں وہ ایسی اُجڑ گئیں کہ پہچانی نہیں جاتی تھیں۔ کسی لمحے گیتا نے بھی دروازے کے قریب مجھے کھڑے دیکھ لیا، اُس کے بدن میں کوئی تلاطم سا اٹھا۔ جس بات کے تصوّر سے میرا دل ڈوبنے لگتا تھا، وہی ہوئی۔ مجھے دیکھتے ہی اُس کے ہونٹ کپکپانے لگے، جیسے کسی بچے سے کوئی چیز چھین لی جائے اور وہ حسرت و بے بسی سے منہ بسورنے لگے۔ یہی اُس کا حال ہوا۔ وہ میرے پاس آنا چاہتی تھی یا مجھے بلانا۔ دوسرے ہی لمحے وہ وہیں ڈھیر ہوگئی اور گھٹنوں میں سر دیے بلکنے لگی، چمپا بیگم نے اُس کا سر اپنی آغوش میں چھپا لیا۔ پھر میں ایک لمحے کے لیے بھی وہاں نہیں ٹھیرا لیکن باہر آکے میری نگاہیں اُسی کو دیکھتی رہیں، اُسی کے گرد منڈلاتی رہیں۔

گیارہ بج رہے تھے جب موٹروں اور ٹمٹموں کا شور بلند ہوا۔ پھر چند منٹوں میں اندر باہر ہر جگہ سارا مکان پاڑے کے آدمیوں سے بھر گیا۔ دادا کی چارپائی بیرونی کمرے میں رکھی گئی۔ تو وہ پاگلوں کی طرح واویلا کرنے لگیں۔ کوئی اُنھیں خاموش بھی کیا کرتا۔ اُن کا حال دیکھ کے سب کے ہوش گم ہوئے جا رہے تھے۔ کسی کو ہنستا دیکھ کے آدمی کو اتنی خوشی نہیں ہوتی، جتنا روتا دیکھ کے دل کٹتا ہے۔ سبھی بے حال تھے۔ زورا، چھیدا، گلیا، جھبی، جمرو، شامو، مارٹی، ٹنگو، دینا دادا اور پاڑے کے آدمیوں میں جانے کون کون مجھے ڈھونڈتے ہوئے میری طرف آنکلے تھے اور میرے ہی گرد اکٹھے ہوگئے تھے۔ وہ گلے مل مل کے روتے، اپنے آپ کو طمانچے مارتے، سر پیٹنے لگتے، کوئی کسی کو سنبھالتا اور خود بکھر جاتا۔ تجھل کے ساتھ آنے والوں کے بعد بھی لوگوں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ مکان کے باہر ساری گلی اُن سے گھِر گئی تھی۔ اُن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ لگتا تھا، ماہم کا سارا علاقہ اُٹھ کے آگیا ہے۔ چند ہی لوگ میرے صورت آشنا تھے۔ پھر یکایک جارجی میرے سامنے آگیا، اُسے دیکھ کے مجھے جھٹکا سا لگا مگر وہ خود بہت کھنڈر معلوم ہو رہا تھا۔ سارا چہرہ آنسوؤں میں ڈوبا ہوا، لال انگارا آنکھیں، ڈھلکے ہوئے شانے، مڑا تڑا جسم۔ وہ میرے سینے سے آکے لگ گیا اور بُری طرح بلکنے لگا۔ مارٹی نے اُسے ہٹایا اور تشفی دلاسے دے کے ایک طرف بٹھا دیا۔ اُس کی بیوی ماری بھی چند لمحوں کے لیے مجھے نظر آئی، سڑک پر بیٹھی ہوئی کسی باؤلی بھکارن کی طرح، کوئی ذرا چھیڑے تو کاٹ کھائے۔ نہ اپنی خبر، نہ دوسرے کی، جیسے کپڑے پہنے ہوئے تھی، معلوم ہوتا تھا، ویسے ہی اُٹھ کے چلی آئی ہے۔

مکان کے اندرونی حصّے کے ایک گوشے میں سُکڑا سمٹا ایس پی شکلا بھی مجھے دکھائی دیا۔ وہ سادہ لباس میں تھا۔ اُس کے ساتھ یقیناً اور پولیس والے بھی ہوں گے۔ شکلا میرے پاس نہیں آیا، دُور دُور کھڑا رہا لیکن اُس کی نظریں مسلسل مجھ پر ٹکی ہوئی تھیں۔

گیارہ بجے وہ دادا کو لائے تھے، تین بجے تک اُنھوں نے بنا سنوار کے اُسے پھولوں میں چھپا دیا۔ اُس کی ارتھی اُٹھی تو

...اور رانی دیوانوں کی طرح چیختی بلبلاتی باہر نکل آئیں۔ جولین، ...پارہ اور چمپا بیگم نے اُنھیں جکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ ...یں کھا رہی تھیں۔ دیوانگی کی طاقت ہی اور ہوتی ہے، گیتا ...ی سے چمٹ گئی۔ تجھل، منیر علی اور شتی چاچا نے جاکے اُسے ...اور بے بس کر دیا۔ تجھل اُسے اپنے بازوؤں میں سمیٹے جانے ...یا کہتا رہا۔ گیتا زار و قطار رو رہی تھی جیسے بس آنسوؤں میں ...ل ہو جائے گی۔ تجھل کے اشارے پر وہ جلد ہی دادا کو گھر سے ...لے گئے۔ گلی کے بیچ میں ایک چوکی پر ارتھی رکھ دی گئی اور ...وں سے منت کی گئی کہ جسے دادا کا دیدن کرنا ہو، قطار میں آ ...ے اور آگے بڑھتا رہے۔ کوئی زور زور سے بار بار اِس قسم کے ...لانات کر رہا تھا مگر سب بہرے ہو گئے تھے۔ کوئی سامنے سے ...نا نہیں چاہتا تھا، کوئی دادا کے لیے پھول لایا تھا، کوئی گلاب ...ٹ سے گلاب چھڑکتا، کوئی پھول بکھیرتا، کوئی بس ٹکٹکی باندھے ...کھا رہتا۔ سیاہ کپڑوں میں ملبوس کچھ عورتیں گھر کے اندر نہیں ...ئی تھیں، وہ فارس روڈ کی عورتیں ہوں گی۔ وہ رنگ برنگی چنریاں، دوپٹے لے کے آئی تھیں۔ دادا کی ارتھی پر وہ اُنھیں پھیلاتی، سجاتی رہیں۔ مَیں نے اب تک اُس کا چہرہ نہیں دیکھا تھا اور نہ مجھے اِس نظارے کی حسرت تھی۔ ایک ہی رات کی تو بات تھی، میرے سینے میں اُس کا مسکراتا چہرہ نقش تھا، آدمی زندہ چہرے ہی سینے میں کیوں محفوظ نہ رکھے۔ مَیں اُس کے قریب نہیں گیا لیکن جمرو، شامو اور مارٹی مجھے گھسیٹتے ہوئے وہاں لے گئے۔ وہ پھولوں کے درمیان جیسے پلکیں موندے کسی سوچ میں گم تھا، جیسے ابھی کسی آہٹ پر آنکھیں کھول دے گا مگر اتنی صداؤں اور دستکوں کے باوجود اُس کی پلکوں میں ذرا بھی جنبش نہیں ہوئی۔ زندگی بھر دادا لوگوں سے اپنا گھر چھپاتا رہا۔ کچھ خبر نہیں تھی، ایک دن ایسا راز فاش ہوگا، اتنے لوگ یوں شور مچاتے ہوئے آجائیں گے۔

دھوپ اُترنے لگی تھی اور ارتھی کے گرد لوگوں کا ہجوم کم نہیں ہو رہا تھا مگر پھر پاڑے کے داداؤں نے زبردستی دادا کی ڈولی کندھوں پر اُٹھالی۔ ابّا جان اور منیر علی کو تجھل نے رانی اور گیتا کے خیال سے گھر روک دیا تھا حالانکہ وہ اِس کے لیے آمادہ

نہیں تھے۔

گھاٹ تک کوئی دو میل کا فاصلہ تھا۔ آگے پولیس نے موٹروں اور دوسری گاڑیوں کے لیے سڑک بند کر دی تھی اِسی لیے لوگ کسی رکاوٹ کے بغیر آہستہ آہستہ بڑھتے رہے۔ دادا کی ارتھی کے آگے آگے پولیس کی موٹریں بھی چل رہی تھیں۔ بہت سے باوردی پولیس والے بھی ہجوم میں بکھرے ہوئے تھے۔ ہم ابھی اقامتی علاقے سے نکل کے بڑی سڑک پر آئے تھے کہ ڈاکٹر کیلاش اکھڑی ہوئی سانسوں اور ڈبڈباتی آنکھوں کے ساتھ میرے سامنے آگیا اور مجھ سے وہی پوچھنے لگا جس کا مجھے خود علم نہیں تھا، وہ مجھ سے معذرت کرنے لگا کہ اُسے دیر سے خبر پہنچی۔ اپنی ماں اور بہنوں کو وہ گھر چھوڑ آیا ہے، گھر کے آس پاس موٹر کھڑی کرنے کی جگہ نہیں ملی تھی، اُسے دُور اُترنا پڑا، اِس طرح کچھ اور دیر ہوگئی۔ وہ میرے پہلو سے لگا لگا چلتا رہا۔ خاصی دُور بعد کسی بوڑھے کی آہ دلکاہ پر میں نے پلٹ کے دیکھا، ایس پی شکلا بھی میرے پیچھے چل رہا تھا، میرے سائے کی طرح جانے کب سے۔ میں اگر مڑ کے نہ دیکھتا تو گمان بھی نہ ہوتا۔

"آپ بھی؟" میں نے ٹھٹکی ہوئی آواز میں کہا۔ "آپ کیسے؟"

اُس نے بڑھ کے میرا ہاتھ تھام لیا اور آہستگی سے بولا۔ "میں ڈیوٹی پر نہیں ہوں۔" میں نے کچھ نہیں کہا۔ وہ کہنے لگا۔ "پولیس اسٹیشن سے کچھ دیر کے لیے گھر گیا تھا، دل نہیں مانا، بے کلی سی رہی۔ تم سویرے وہاں بالکل ٹھیک نہیں تھے۔ کوئی بارہ بجے کے قریب معلوم ہو سکا کہ دادا کا گھر کہاں ہے۔ اب کیسے ہو؟"

"بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے سانس لے کے کہا۔

"کہاں ٹھیک ہو۔" وہ افسردگی سے بولا۔

میری خاموشی پر وہ بھی چپ ہوگیا اور میرے قدموں سے قدم ملا کے بڑھتا رہا۔ کچھ دُور کے سکوت کے بعد وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

"مجھے افسوس ہے ظہیر! میں اتنا نہیں جانتا تھا۔"

"کیا نہیں جانتے تھے؟"

"یہی جو میں دیکھ رہا ہوں۔ یہ سب بہت عجیب ہے۔ میں یہاں نہ آتا تو ایک نئے تجربے سے محروم رہتا۔ یہ میرے اندازے سے کہیں زیادہ بلکہ مختلف ہے۔" میں صرف سُنا کیا۔ "مجھے بتاؤ ظہیر!" وہ دل گرفتہ لہجے میں بولا۔ "یہ کون آدمی تھا؟"

"آپ نے اُسے کبھی نہیں دیکھا؟"

"دیکھا ہے کئی بار مگر اِس طرح نہیں۔ ماہم کا سارا علاقہ بند ہے، کہیں کوئی کاروبار نہیں۔ اِدھر فارس روڈ کی عورتوں نے تین دن کے لیے اپنا کاروبار بند کرنے کا اعلان کیا ہے۔ صرف پولیس کے کسی سپاہی کسی افسر کو اپنے دیکھے ہوئے پر یقین رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں آدمی کی کمائی صرف آدمی ہوتے کتنے اپنے رونے والے سمیٹتا ہے۔ پیر و دادا نے اتنے آدمی تھے، وہ اتنا مال دار تھا! یہ پاڑے کے دادا سے سوا بار

"وہ پاڑے ہی کا دادا تھا۔"

"مگر ایسا نہیں ہوتا۔"

"اور آپ کیا دیکھ رہے ہیں۔"

"ہاں۔" وہ تذبذب سے بولا۔ "مگر یہ کیسے ہے؟"

میں سوچتا رہا، کیا جواب دوں۔ چوک آگیا تھا، پہلر کو راستہ جاتا تھا مگر کچھ دیر کے لیے سب کو ٹھیرنا پڑا۔ کسی بے شمار سکے پھاور کیے تھے۔ اُدھر پاڑے کی جانب سے بہت کی ارتھی اُٹھائے آرہے تھے۔ جب تک وہ شامل نہیں ہو اُن کے انتظار میں کھڑے رہے۔ آگے راستہ کچھ کشادہ ہوگیا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ ماہی کو لانے والوں کی شمولیت سے ہوگئے تھے۔ شکلا اور ڈاکٹر کیلاش، دونوں میرے ہم چلتے رہے۔ ابھی گھاٹ کچھ فاصلے پر تھا کہ شکلا کسمساتے "جولین بھی مجھے وہاں نظر آئی، کیا وہ دادا کو جانتی تھی؟

"پھر وہ کیسے آتی۔"

"مگر اُس نے کبھی ذکر نہیں کیا۔"

"ضروری تھا کیا۔"

"نہیں۔" وہ خفیف سا ہوگیا۔ "میں نے وہاں دا اور بیٹی کو بھی دیکھا، دادا کے گھر کو۔ بہت دُکھ ہوا میر یہ سب کچھ کسی کہانی کے مانند ہے۔ دادا ایسے گھر میں رہتا اچھی بیوی اور بیٹی! اتنا اچھا گھر ہوتے ہوئے وہ پاڑا کیوں

"شاید اِس لیے کہ اتنے لوگ اُسے پاڑے پر دیکھنا

"مگر وہ کون تھا؟" اُس کے پنجے کی گرفت میرے با ہوگئی۔ "وہ کون تھا جو پیر و دادا کو پاڑے پر دیکھنا نہیں جیسے اُس سے ایسا بیر ہو۔ تمھیں کچھ پتہ چلا؟"

"اِس کی مہلت ہی کب ملی۔"

"پولیس بھی بہت ہاتھ پیر مار رہی ہے۔ چند آدمی گئے ہیں مگر شاید خانہ پُری کے لیے۔ کوئی مطمئن نہیں ہے شہر میں بھی چرچا ہے اور خوف پھیلا ہوا ہے۔ پولیس چھاپے مارے ہیں۔ بمبئی سے باہر جانے والے راستوں ی کر دی گئی ہے۔ ہتھیار رکھنے والوں کی چھان بین کی جا رہی ، پولیس کو شبہ ہے کہ وہ بمبئی کے پاڑوں میں سے کوئی ایک ئی آدمی ہیں۔ ہو سکتا ہے، وہ دادا کے خاص پاڑے ہی میں سے ئی ہو اور یہاں موجود ہو۔" شور کی وجہ سے اُس کی آواز صاف سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ بول بھی ایسے رہا تھا جیسے خود سے طب ہو۔ گھاٹ قریب آنے پر وہ خاموش ہوگیا اور مجھ سے ھی ہوگیا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر کیلاش بھی مجھ سے بچھڑ گیا۔ گھاٹ تنگ گزرگاہ میں داخل ہوتے وقت پیچھے سے ہجوم کا ایک لا آیا، سبھی منتشر ہوگئے۔ شکلا کی باتوں سے مجھے اُس وقت بہت شت ہو رہی تھی۔ میں اُس سے کہتے کہتے رہ گیا کہ کیا وہ یہ سب کسی اور وقت کے لیے اُٹھا نہیں رکھ سکتا مگر اُس کے جُدا نے کے بعد اندازہ ہوا کہ اُس کا ساتھ کتنا غنیمت تھا۔ وہ تو ری اشک شوئی، میری دل جوئی کی خاطر میرے ساتھ تھا، میرا ھیان بٹانے، مجھے سہارا دینے کے لیے۔ میں بالکل اکیلا رہ گیا۔ ئی میرے پاس نہیں آیا۔ نہ جمرو، نہ شامو، نہ مارٹی۔ ڈاکٹر کیلاش ی ہجوم میں کہیں کھو گیا تھا۔ جانے کیوں ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ ی لیکن سب کا رخ گھاٹ ہی کی جانب تھا۔ وہ ایک دوسرے ے آگے نکل جانا چاہتے تھے یا پیچھے کوئی حادثہ ہوگیا تھا۔ اِس فراتفری میں، میں بہت پیچھے رہ گیا اور آخری آدمیوں کے ساتھ گھاٹ کے احاطے میں داخل ہوا۔ آگے جانے کے لیے جگہ ہی نہیں تھی۔ اور میں آگے جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔

دونوں کو لکڑیوں کے درمیان چبوترے پر رکھ دیا گیا تھا۔ میں گھاٹ کے سرے پر اُن سب سے پیچھے ایک پتھر پر بیٹھا رہا۔ کبھی سناٹا چھا جاتا، کبھی پنڈتوں کی صدائیں گونجنے لگتیں۔ پھر ایک دم ایک چیخ پکار مچی جیسے سب اُن کے ساتھ جل رہے ہوں۔ مجھے نہیں معلوم، اُنھوں نے کب دونوں کو آگ لگائی اور کب آگ نے اُنھیں خاک کیا اور کس نے گھاٹ کے چبوترے پر اپنا سر پھوڑا، کون دیوانہ ہوا۔ جب سورج ڈوب گیا اور اندھیرا چھانے لگا اور لوگ بہت کم رہ گئے اور گھاٹ کے چبوترے پر رکھی ہوئی چتاؤں کے شعلے تھک چکے تب کہیں کسی گوشے سے ڈاکٹر کیلاش میرے پاس آگیا۔ اُس نے میرا شانہ جھنجوڑ کے مجھے اُٹھایا۔ میرے جسم میں بالکل جان نہیں رہی تھی۔ وہ اپنے بازو کی بیساکھی کے سہارے مجھے چتا کے قریب لے گیا۔ وہاں تجمل، شامو، جمرو، مارٹی سبھی موجود تھے اور چتا کے بجھتے شعلے دیکھ رہے تھے۔ آخر آگ نے سب کچھ راکھ کر دیا۔ دادا اور ماہی دونوں راکھ ہوگئے۔ دیکھتے دیکھتے آگ نے سب کچھ خواب کر دیا۔ آگ نے مٹے ہوؤں کو مٹا دیا مگر وہ آگ جو زندوں کا نصیب ہے؟ جو جلاتی بھی ہے اور راکھ بھی نہیں کرتی۔ وہ آگ جو نظر نہیں آتی، وہ اِس سے کہیں تیز، کہیں زیادہ کاری ہے۔ وہ آگ جانے کب بجھے۔ آگ سے آگ جلتی ہے۔ رات ہوگئی تھی۔ وہ چبوترے کے سامنے دیر تک خاموش کھڑے رہے۔ شاید اِس لیے کہ زیادہ سے زیادہ آگ منتقل کر لیں۔ یہ آگ جتنی آزار تھی، اتنی قرار بھی تو تھی، یہ اعتبار کہ کوئی خالی سینہ لے کر گھر نہیں لوٹ رہا ہے۔

وہ سب ہمارے ساتھ گھر لوٹے لیکن ہم سے پہلے شتّی چاچا کے علاوہ بہت سے لوگ وہاں پہنچ چکے تھے۔ سہ پہر کی طرح کم و بیش اُن کی تعداد اُتنی ہی تھی۔ ساری گلی میں شامیانے تنے تھے اور بجلی کے قمقموں کے ساتھ گیس کے ہنڈے جل رہے تھے۔ ایک طرف بہت سی دیگیں چڑھی تھیں۔ اتنی جلدی یہ اہتمام ابّا جان ہی نے کیا ہوگا۔ وہ یہی کر سکتے تھے۔ جس کی جتنی استطاعت ہو، اُتنا ہی کر سکتا ہے۔ مال ہر چیز کا بدل ہے، کبھی یہ وقت بھی ضرور لیتا ہے مگر آدمی کا بدل نہیں ہے۔ ابّا جان اپنے لعل و جواہر سے آدمی ایک نہیں لا سکتے تھے۔ اُنھیں شاید احساس ہوا ہو کہ آدمی ایسے چٹکیوں میں چلا جاتا ہے۔ کاٹنے کو کچھ دیر بھی لگی تھی۔ دادا اور ماہی جیسے گراں ڈیل ہوا کا ایک جھونکا بھی نہ سہ سکے۔ دونوں طرح کے کھانوں کا انتظام تھا۔ ہندو مسلم کھانے الگ الگ۔ ہمارے پہنچتے ہی کھانا شروع کر دیا گیا۔ میں تجمل کے ساتھ سیدھا اندر چلا آیا۔ برآمدے میں جولین کیلاش کی بہن رما اور چند عورتیں بیٹھی تھیں، گیتا اور رانی کی ملنے والیاں ہوں گی۔ ہمیں دیکھ کے جولین ہماری طرف لپک پڑی۔ تجمل نے اپنے بازو کھول دیے۔ جولین کے چہرے پر گھٹا سی اُمڈ آئی، لمحوں کے لیے اُس کا سراپا متزلزل ہوا جیسے بہت دُور کے کسی تھکے ہارے کو کوئی دیوار نظر آجائے۔ دیوار سایہ بھی دیتی ہے، سہارا بھی مگر وہ فوراً سنبھل گئی۔ جولین کو خود پر اتنا اختیار تھا۔ تجمل نے بھی اُسے وقت نہیں دیا، وہ گیتا اور رانی کے بارے میں پوچھنے لگا۔ جولین کے کہنے کے مطابق گیتا کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ دونوں نے ہزار منتوں کے باوجود نہ کچھ کھایا، نہ پیا۔ شور غل کے سبب اُنھیں بیرونی کمرے سے اندر کے ایک کمرے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ جولین نے رُندھی ہوئی آواز میں تجمل کو بتایا کہ جس وقت سے دادا کی ارتھی گئی ہے، گیتا بیگانہ سی ہوگئی ہے، نہ کسی

سے بولتی ہے، نہ کسی کی سُنتی ہے۔ ابا جان، منیر علی بار بار آ کے اُسے دلاسے دیتے ہیں، سبھی اُس کی دل جوئی میں لگے ہوئے ہیں۔ سنبھل نے ایک پل کی بھی تاخیر نہیں کی، وہ جولین کے کندھے پر ہاتھ ٹکائے اندر چلا گیا۔ میں اور ڈاکٹر کیلاش برآمدے میں کھڑے ایک دوسرے کی صورت دیکھا کیے۔ پھر مجھ سے بھی نہ رہا گیا۔ میں سنبھل کی پیروی میں اندر کی جانب بڑھ گیا لیکن چند قدموں کے بعد مجھے خیال آیا کہ ڈاکٹر کیلاش رہ گیا ہے، اُسے بتا کے آنا چاہیے بلکہ اُسے بھی ساتھ لے چلوں۔ گیتا اُس کے لیے اجنبی ہے۔ کل ہی رات کانتے کے بلیسوئیں پر اُس نے رانی اور گیتا کو دیکھا تھا۔ گیتا کو بھی احساس ہو گا کہ کون کون کتنی دُور سے یہاں آیا ہے۔ لیکن یہ ٹھیک بھی ہے کہ نہیں؛ میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ بس غیر ارادی طور پر میرا ہاتھ اُٹھ گیا، اب اُسے روک دینا کسی طور مناسب نہیں تھا۔ وہ مستعد کھڑا تھا، فوراً میرے ساتھ چل پڑا۔

میں جانتا تھا، وہ اِس وقت کس کیفیت سے دوچار ہو گا۔ وہ ایک عجلت پسند، ہڑ کل مزاج نوجوان تھا، جیسے نوجوان ہوتے ہیں۔ اُس نے مجھ سے کچھ جانتے بوجھنے کی عجلت نہیں کی تھی تو بہت ضبط کیا ہو گا۔ ویسے اُسے اِس کا موقع بھی کہاں ملا تھا۔ اُس کے بہ قول وہ سُنتے ہی چلا آیا تھا لیکن کیسی کیسی حیرانیاں اُس کا گرم خون جھلسا رہی ہوں گی۔ یہ تو اُسے معلوم ہی ہو گیا ہو گا کہ پیرو کون تھا اور پیرو اگر بمبئی کے پاڑوں کا دادا اُڑا جاتا تھا تو ہم کون ہیں، میں کون ہوں۔ اُس نے پہلی مرتبہ ہمارے بارے میں جو فیصلہ کیا تھا کیا وہی درُست تھا جب ہم پہلی بار اسپتال گئے تھے اور ہم نے رات گئے کانتے کو دیکھنے کی خواہش کی تھی۔ اُس نے اُس وقت فون پر اپنے ساتھی ڈاکٹر سے ہمارے لیے کیسے وہم و گمان کا اظہار کیا تھا اور کون کون سے خطاب و لقب سے نوازا تھا۔ گھاٹ پر جاتے وقت وہ میرے بائیں جانب تھا اور شکلا دائیں جانب۔ شکلا کی باتوں پر اُس کے کان لگے ہوئے ہوں گے حالانکہ شور کی وجہ سے یہ آسان نہیں تھا تاہم اُس کی متجسس سماعت سے سبھی کچھ اوجھل نہیں رہا ہو گا اور یہاں ہجوم کے درمیان ہونے والی چہ میگوئیاں، دادا کا چھپا ہوا محل دیکھ کے حیرت زا تبصرے، پاڑے کے اتنے آدمیوں کا ہجوم دیکھ کے پڑوسیوں کے تعجب خیز بیانات۔ یہ سرگوشیاں اچٹتی اچٹتی میرے کانوں تک بھی پہنچی تھیں۔ اِن کی بازگشت ڈاکٹر کیلاش نے بھی سُنی ہو گی۔ ویسے اِس کے سوا صورت بھی کون سی تھی۔ سنبھل کے لیے یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ وہ دادا

کو پاڑے تک محدود رکھتا یا گھر تک۔ پاڑے کے لوگ دادا کو [...] کرنے کے بعد اُسے سنبھل کے حوالے کر دیتے اور سنبھل گھر کے آدمیوں کے سامنے چُپ چُپاتے اُسے آگ دکھا دیتا۔ ہر [...] ساز ہوتا ہے، ہر بند دروازہ باہر کے لوگوں کی بینائی چھین [...] بعد میں جو طرح طرح کی داستانیں تراشی جاتیں، وہ اِن [...] کہیں زیادہ بے رحم ہوتیں۔ اب کسی سے شاید کچھ بھی چھپا ہوا [...] رہا تھا۔ نہ منیر علی سے، نہ مولوی اکرم سے، نہ ایس پی شکلا سے [...] کیلاش سے۔ اور ابا جان کو تو تبت سے اب تک اتنے [...] رہنے کے بعد بہت کچھ اندازہ ہو گیا ہو گا۔ مولوی اکرم پہلے ہی [...] کے ہوٹل میں پیرو کی خوں باری اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے [...] منیر علی جیسلمیر میں میری اور سنبھل کی مشقِ ستم کے شاہد تھے۔ [...] رہ گئی تھی تو اب دادا نے پوری کر دی تھی۔ ڈاکٹر کیلاش کو اب [...] توثیق کے لیے اتنا اضطراب نہیں ہو گا جتنا اپنی آگہی کے انکشاف پر ہو گا۔ جاننے کا آزار اکثر نہ جاننے سے زیادہ ہوتا ہے۔ [...] اندر کبھی توقع سے بہت مختلف اور رسوا بھی نمودار ہوتا ہے۔ کچھ اُس کا حال ہونا چاہیے لیکن مجھے کوئی صفائی نہیں پیش [...] تھی۔ پاڑے کے آدمی کو یہ مجوبیت نہیں آتی۔

ہم کمرے میں داخل ہونے والے تھے کہ جولین دروازے [...] کہنے لگی، ہم اگر ابھی اندر نہ جائیں تو بہتر ہے۔ شام کے بعد اب کہیں سنبھل کو دیکھ کر گیتا کا جمود ٹوٹا ہے۔ اتنے لوگ گئے، اس نے کسی [...] بات نہیں سُنی۔ سنبھل نے جاتے ہی اُسے چوکی سے اُٹھا کے فرش [...] کر دیا اور جانے کیا جادو کیا کہ وہ بھر سی گئی اور اب سنبھل کے [...] میں چھپی بچوں کی طرح پھُوٹ پھُوٹ کے رو رہی ہے۔ رونا [...] کے لیے مفید تھا۔ آنسو بھی کبھی علاج ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر کیلاش [...] جولین کی تائید کی اور کہا کہ اُس کی موٹر میں ایسی دوائیں ہیں جو [...] جو رات کو اُسے گہری نیند سُلا سکیں۔ نیند بھی اُس کے لیے [...] ہے۔ میں نے سوچا، اُس سے کہوں کہ وہ سنبھل کو بھی ایسی کوئی [...] دے دے، کسی چیز میں ملا کے سہی۔ کل رات سے اُس کے منہ [...] کھیل تک نہیں گئی ہے، نہ اُسے کھُل کے ایک گھڑی بیٹھنے کا [...] ملا ہے۔ وہ بس بیڑیوں کا دھواں نگلتا اُگلتا رہا ہے۔ کسی کو اُس [...] طرف بھی دھیان دینا چاہیے۔ چارہ گر بھی آدمی ہوتے ہیں۔ ہم [...] کے قریب کھڑے رہے۔ گو اب اندر جانے کی ایسی ضرورت نہیں [...] لیکن میں سنبھل کے خیال سے وہاں جانا چاہتا تھا۔

کچھ دیر بعد جولین پہلے اندر جھانک کے آئی تب ہم [...]

[...] سامنے سنبھل چوکی کے کنارے اُس کا سر زانوؤں پر رکھے [...] رُخ کیا۔ [...] چپکے اُسے جانے کیا تلقین کر رہا تھا، کیا کچھ باور کرانے کی [...] ش کر رہا تھا، گیتا کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیل [...] ری تھا۔ فرخ، فریال، چمپا بیگم، جولین کی ماں، شہ پارہ اور مولوی [...] رم کی بیٹی ریحانہ چند اجنبی عورتوں کے ساتھ ایک طرف گٹھری بنی [...] اُسے گھیرے بیٹھی تھیں۔ "دیکھ ری! کون آیا ہے۔" میرے پہنچتے ہی [...] سنبھل نے بلند آواز میں کہا جیسے روٹھے ہوئے کسی بچے کو کوئی کھلونا [...] دکھا دیا جائے۔ "جانتی ہے، اِس کو، یہ کون ہے۔" سنبھل اُس کے بال [...] سہلاتے ہوئے بولا۔ گیتا کی بھیگی پلکوں پر ارتعاش سا طاری ہوا اور وہ سیدھی ہو کے بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر کیلاش پر بھی اُس کی نظر گئی ہو [...] "تیرا پاپا اِس کو بیٹا بولتا تھا۔ اِس کو ابھی کون پوچھے۔" سنبھل نے کہا۔ گیتا نے بے اختیار میری طرف دیکھا۔ خنجر اندر کیا ہوتا ہے، اُس کی بھٹکی نظروں میں ایسی ہی کاٹ تھی۔

سنبھل کے اشارے پر میں بھاری قدموں سے چلتا کسی مجرم کی طرح اُن دونوں کے سامنے جا کے کھڑا ہو گیا۔ سنبھل نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے اُس کے پہلو میں بٹھا دیا۔ "سنبھال رے اِس کو۔" دبی دبی سی آواز میں بولا۔ میرا جسم سُن ہو گیا۔ "اِس کو بول کہ ابھی ایک گیا ہے، سالے نہیں۔" میں نے بہت کوشش کی کہ کچھ کہوں۔ کہوں کہ وہ [...] کو اتنا بے آسرا، بے سایہ نہ جانے مگر میری زبان ٹھٹھر کے رہ گئی۔ [...] ہر لفظ ہیچ معلوم ہونے لگا۔ سنبھل ہی کچھ نہ کچھ کہتا رہا۔ چند لفظوں [...] مشکل موت کا آموختہ۔ آدمی کو توتے کی طرح یہ لفظ رٹے ہوتے ہیں لیکن دُہرانا بھی حوصلے کا کام ہے۔ سامنے آنے پر سب کچھ گڈمڈ ہو جاتا ہے۔ آدمی کو اپنے الفاظ کی بے مائگی کا احساس ہو تو اُس کی زبان لکنت کرنے لگتی ہے۔ سنبھل کی زبان بھی اٹک رہی تھی، کہنے لگا۔ [...] اس کو بولتا ہوں کہ تو تو شیر کی بیٹی ہے۔ شیر بھی ایک دن ڈھے جاتا ہے۔ گولی سے نہیں تو اپنے زور سے۔ اِدھر کوئی بھی نہیں ٹکنے [...] گی نہیں، میں بھی نہیں۔ بولتے ہیں، پڑھ لکھ کے آدمی کو اونچا [...] دکھائی پڑتا ہے۔ تو کیسی پڑھی لکھی ہے۔" پھر کہنے لگا۔ "ابھی برس [...] نہیں ہوا، وہ اِدھر سے کیا بول کے گیا تھا کہ ابھی لوٹنے کا بھروسا [...] لوٹ کے آ گیا پر زندگی اُس کو دوبارہ ملی تھی، بس تھوڑے دن کے [...] منہ بولتا تو کیا کر لیتی رہی۔ اُدھر ہم لوگ ساتھ تھے۔ سب ترچھے [...] اپنی جگہ پہ دو کے چلے گئے۔ ماں سے پوچھ، اُس نے [...] بار اُس کو کھویا ہے۔ پہلے دن سے یہ آنکھ مچولی ہوتی رہی ہے [...] وہ ایسا ہی ہتھیلی پہ دھڑ کے پھرتا تھا، پر جو سینت کے رکھتے

ہیں، دھوکا اُن کو بھی ہو جاتا ہے۔ پتا کسی کا نہیں لکھا ہے۔ اپنی ماں کو دیکھ ری۔ اُس کا بھی کوئی گیا ہے۔ وہ کیسے باندھے بیٹھی ہے اپنے کو۔" یہ سُن کے رانی پھٹ پڑی۔ گیتا پھر سسکنے لگی جیسے کوئی زخم اندر کھُب کے لگا تا ہو، اُس کے سینے میں یک بیک ہُوک سی اُٹھی۔ وہ میرے اتنے قریب بیٹھی تھی کہ میں اُس کی سانسیں سُن سکتا تھا۔ درد و کرب میں ڈوبی ہوئی اُس کی اکھڑی اکھڑی سانسیں میرے سینے میں کوئی سمندر سا شور کرتا تھا کہ اُسے کسی طرح اپنے اندر جذب کر لوں۔ اُس کے سارے آنسو، سارے کرب اپنے اندر سمیٹ لوں۔ میں لمحے لمحے خود کو مجتمع کرتا تھا۔ میں نے بہ مشکل اپنا لرزتا ہاتھ اُس کے سر پر رکھنے کی کوشش کی۔ وہ تو ابھی تک بھری بیٹھی تھی اور بلکنے لگی۔ آدمی اتنے آنسو چھپائے پھرتا ہے۔ کوئی سوتا ابھی باقی رہ گیا تھا جو اُس کی آنکھوں سے رواں تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں، یہاں سے بھاگ جاؤں میں یہاں کیوں آ گیا ہوں۔ یکایک مجھ پر دیوانگی سی طاری ہوئی۔ میں نے اُسے کھینچ کے اپنے بازو میں بھینچ لیا۔ میں نے بے تحاشا اُس کے ہاتھ چومے، اپنے دامن سے اُس کے رخسار خشک کیے۔ "نہیں نہیں، مت رو، خدا کے لیے مت رو۔" میں نے پھٹی ہوئی آواز میں اُس سے منت کی۔ "تم اکیلی نہیں ہو، دادا چلا گیا ہے اور کبھی لَوٹ کے نہیں آئے گا مگر یہاں سب... یہاں تمھارا بھائی، میں موجود ہوں۔ میں اور یہ سب... سنبھل بھائی... ابھی تمھارے بہت سے گھر..." میرے سینے نے میری آواز کا ساتھ نہیں دیا۔ میں اُسے تھامنے چلا تھا اور خود مجھے اپنا ہوش نہیں رہا۔ میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ دیر تک وہ میری جُز و جاں بنی رہی۔ مجھ میں سمٹی، مجھ میں چھُپی سہمی سہمی سی۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ اطراف میں کون کون ہماری جانب نگراں ہے اور یوں تو میں اُسے اور ہلکان کر رہا ہوں۔ کوئی ہمارے قریب نہیں آیا۔ سنبھل بھی خاموش بیٹھا رہا۔ پھر جانے کب، کسی لمحے جولین نے میرے پاس آ کے مجھے ٹھوکا دیا۔ اور اُٹھنے کا اشارہ کیا۔ جولین، شہ پارہ، فرخ اور چمپا بیگم نے اُسے مجھ سے جُدا کر دیا اور ڈاکٹر کیلاش نے مجھے چوکی سے اُٹھا دیا۔ میرے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ کیلاش میری کمر جکڑے مجھے برآمدے میں لے آیا۔

رات گئے ہر سو سناٹا چھا گیا اور باہر کا سارا ہجوم رخصت ہو گیا تو جولین نے ایک ایک کو بیرونی کمرے میں اکٹھا کر لیا۔ زین

کی طرح اُسے بھی حکم دینا آگیا تھا۔ بیرونی کمرے کے فرش پر دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ ابا جان، منیر علی، مولوی اکرم، مارتی، شامو جمرو سبھی موجود تھے۔ ڈاکٹر کیلاش بھی تھا۔ رما بھی تھی۔ سب دسترخوان کے اطراف گم سم بیٹھ گئے۔ کسی نے کچھ نہیں لیا۔ نہ گیتا نے، نہ رانی نے۔ کسی کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ کھانے کو ہاتھ لگائے مگر سب کو وہ زہر اپنے حلق سے اُتارنا پڑا۔ موت کے کھانے اور زہر میں کیا فرق ہوتا ہے۔

صبح دس بجے کے قریب پاڑے کی اوپری منزل کے بڑے کمرے میں شہر کے سارے پاڑوں کے دادا موجود تھے۔ نچلی منزل پر دادا کے سوگ میں آنے والوں کی کثرت کے سبب کوئی جگہ نہیں رہی تھی اِس لیے تیجھل نے اُن سب کو اوپر جمع ہو جانے کو کہا۔ رات ہی اُنھیں مطلع کر دیا گیا تھا کہ وہ کل صبح دس بجے تک دادا کے پاڑے پہنچ جائیں۔ اُن سے یہ بھی کہہ دیا گیا تھا کہ چاہیں تو اپنے اپنے پاڑے کے منتخب آدمی بھی ساتھ لا سکتے ہیں۔ دینا، سُندر، شوا، بالے، جارجی، نادرے، جگت، لال خان، سُورت والا بنارسی اور دوسرے جنھیں میں ناموں کے بجائے شکل سے پہچانتا تھا اور وہ جنھیں میں بالکل نہیں جانتا تھا، بارش کے باوجود وہ سبھی وقت پر پاڑے آ گئے۔ سب کے چہرے کھنچے ہوئے تھے اور پیشانیوں پر بل پڑے تھے۔ سارا کمرہ اُن کی قیاس آرائیوں سے گونج رہا تھا۔ ہر کوئی اپنے طور پر تأسف کا، غصب کا اظہار کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد تیجھل کے آنے پر خاموشی چھا گئی۔ اُس نے چوکی پر بیٹھتے ہی کسی تمہید کے بغیر اُن سے کہا۔ ”اپنے کو زیادہ نہیں بولنا، بولنا ہے کہ تم پاڑے پر ابھی کس کو بٹھانا مانگتا ہے؟“

کسی نے جواب نہیں دیا، سب ایک دوسرے کی صورت دیکھتے رہے۔

”چپ رہنے سے کچھ نہیں بنے گا۔“ تیجھل نے اونچی آواز میں کہا۔ ”تم نے کچھ سوچا ہے تو اپنے کو بولو۔“

”کیا! کیا بولے دادا!“ خاصی دیر بعد بالے نے زبان کھولی۔

”ایسا تو نہیں رہے گا۔ اپنا مطلب ہے، تم میں کوئی ماہم کے پاڑے کی گدّی پر بیٹھنے کا ہے تو اُٹھ کے بولے۔ ایک دو تین چار، جتنا بھی ہے۔ تم اُن کو اچھی طرح دیکھ لو اور جس پر سب کا جی ٹھکتا ہو، اُس کو اِدھر بٹھا دو۔“

”ایسا کیسے دادا! تم کیا بولتا ہے؟“ کسی نے پیچھے سے کہا۔

”یہ بات تمھاری سمجھ میں نہیں آتی تو اس کا دوسرا بھی ہے۔ کانٹا رکھ کے الگ کر لو، جیسا اپنے یل پر دادا لو ہوا تھا۔“

”تم بولو، تم نے کیا سوچا ہے؟“

”اپنے کو کیا سوچنے کا ہے۔“ تیجھل نے سپاٹ لہجے

”ابھی اِس کو مت چھیڑو دادا!“ بالے نے التجا کی۔ جلدی مت کرو، ابھی کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو ماہم کے پر پیرو دادا کی جگہ بیٹھنا مانگتا ہے۔ کیوں! اپن ٹھیک بولا نا؟“ اُس نے اُن سب سے پوچھا۔

سب نے متذبذب انداز میں بالے کی تائید کی۔

”پھر اِدھر کون رہے گا؟“

”ابھی پہلے دادا کی بات کرو اُستاد۔“ بنارسی دادا سر اُٹھا کے کہا۔ ”دادا کی گدّی پر تب تک کوئی ٹھیک نہیں جب تک اُس کا حساب صاف نہیں کر لیا جاتا۔ اِس سے پہلے اِدھر نہیں بیٹھنے کا۔“

”حساب کون صاف کرے گا؟“ تیجھل نے اُس سے پوچھا۔

”اپن کرے گا، حساب ضرور ہوئے گا، نہیں ہوئے گا تو ماں کا جنا نہیں۔“ لال خان نے غضب آلود لہجے میں کہا۔

”اُس ٹائم تک اِدھر پاڑے پہ کون بیٹھے گا؟ پاڑے ایسے خالی نہیں رہتی لالے! ایک جاتا ہے، دوسرا آجاتا ہے کا بولو۔“

”اِدھر ایسا کس کو بیٹھتے اچھا لگے گا۔ کوئی اور پاڑا ہو تو چلتا۔ یہ پیرو دادا کا پاڑا ہے۔“ باندرے کے دادا دینا نے کہا۔ مارتی تیجھل کے لیے حقّہ لے آیا تھا۔ تیجھل چند لمحے رہا۔ چلم ابھی پوری طرح دہکی نہیں تھی۔ تیجھل نے منال ہٹا کے اُن سے کہا۔ ”پاڑے پہ اُس ٹائم تک تالا مار دیں؟“

”تم جو اِدھر ہو، تمھی اِدھر بیٹھو۔“ بالے تیزی سے بولا۔

”نہیں رے! ہم کو اِدھر نہیں بیٹھنا۔“

”کیوں؟“ بالے کی آواز بھرا رہی تھی۔ ”اپن اکیلا نہیں سب لوگ تم سے ایسا بولتا ہے۔ ابھی کچھ دن کے لیے تم پیرو دادا کی خاطر، اُس کے پاڑے کی خاطر۔ زیادہ دیری گا۔ اپن کو پتہ ہے، ماں قسم زیادہ دیری نہیں لگے گا۔“

”ہم کو یہاں سے جانا ہے۔“

”تم ابھی تو نہیں جاؤ گے۔ کل دادا گیا ہے، آج تم

بنارسی دادا نے تلخی سے کہا۔

دادا کے بعد اب کون اِدھر ٹکے گا رے!“

ٹھیک ہے، اپن لوگ تمھارا کوئی نہیں، تمھارا نہیں تو دادا کوئی ہے۔ اُسی کے لیے....“ بالے جنونی انداز میں بولا۔

اپن کو دوسرا کام ہے۔ ابھی اُس کو کھوجنا ہے۔“

کس کو؟“ لال خان اچک کے برہمی سے کہنے لگا۔ ”تم اپن کو دیتا ہے۔ ہم اِدھر اکھا بمبئی کا دادا لوگ چوڑی ڈال کے بیٹھا جو اکیلا تم اُس کو ڈھونڈنے نکلے گا۔ وہ صرف تمھارا ہی نہیں، بھی بھائی تھا، باپ تھا وہ۔“

اور اُس کے کسی بیٹے بھائی نے اُس پہ پیچھے سے گولی داغ دی۔“ تیجھل نے زہر خند سے کہا۔

کیا بولتا ہے تم؟“ لال خان کا چہرہ بگڑ گیا۔

”دادا کیا اُلٹا بولتا ہے جو ابھی مرچ لگتا ہے۔“ بالے بکھری دئی آواز میں کہنے لگا۔ ”وہ اپن میں سے ہی کوئی حرام کا....ہے، در نہیں وہ گیدڑ کا اولاد ابھی ہمارے بیچ بھی بیٹھا ہو سکتا ہے۔“

”اپن بھی ابھی یہی سمجھتا ہے۔“ شوا اور سُندر نے بیک زبان کہا۔

”اِدھر ہی کوئی کالا بھیڑ ہے دادا!“ سُندر تمتماتے لہجے میں بولا۔ ”وہ ابھی تم بھی ہو سکتا ہے، اپن بھی۔ اپن اُس کو اِدھر ہی ڈھونڈ کے بھگتا دے تو ٹھیک ہے۔“

”نہیں ڈھونڈے گا تو کل دوسرے کا باری آئے گا۔“ بالے نے کہا۔ ”اب چاقو، بازو کا کام نہیں رہا۔ بندوق تمنچے کا بات ہے۔ اُجالے کا نہیں، اندھیرے کا ہے۔ سامنے کا نہیں، پیٹھ پیچھے کا ہے۔ وہ کوئی دادا نہیں ہے سالا، بھڑوا ہے۔ ایک بار اُس کے منہ کو خون لگا ہے تو ابھی بار بار ایسا ہوتا رہے گا۔“

سب مختلف بولیاں بولنے لگے۔ تیجھل نے انھیں روکا۔ ”پہلے اِدھر پاڑے کی بات کرو۔“

کوئی نہیں بولا۔ سب مضطربانہ ایک دوسرے کی لب کشائی کا انتظار کرتے رہے پھر بالے نے خاموشی توڑی اور جھجکتے ہوئے بولا۔ ”اِدھر کسی کو بھی بٹھا دو دادا! ابھی اپن میں سے کوئی لوٹ کے نہیں پوچھے گا۔“

”اپنے کو پتہ ہے پر اِدھر پھر تم کو بُلانے کی کیا ضرورت تھی۔ اِدھر بھی بیٹھا ہے۔ ایک ایک سے پوچھ لو۔ سوچنے کا ہے تو تھوڑا ٹائم لے لو۔ ایک بات کا دھیان رکھنا۔ اِدھر جو بھی گدّی سنبھالے گا، پہلے کی طرح ہر کوئی اُس کو اپنے اپنے پاڑے کا بھتّا پہنچائے گا۔“

”ابھی اِس کا بات مت کرو دادا!“ دینا نے کسی قدر جھنجلاہٹ سے کہا۔

”ہاں دادا۔“ ابھی اس کو مت چھیڑو۔“ بنارسی نے بھی دینا کی حمایت کی، اوروں کی آوازیں بھی بلند ہوئیں۔

”پھر کاہے کا ٹنٹا ہے، اُس کا کام پورا ہو گیا۔“ تیجھل دھمکی آواز میں بولا۔ ”ہٹانے والے کا کام پورا ہو گیا۔“

”دادا کا بات سمجھو ابھی۔“ شوا نے منتشر لہجے میں کہا۔ ”ہم کو اِس وقت کچھ ایک دم ایسا ہی بنائے رکھنے کا ہے جیسا کل دادا کے وقت تھا۔“

”اور گولی ایک بار پھر چلے گی۔“ تیجھل نے زیر لبی سے کہا۔ لیکن سب نے سُن لیا اور سب چونک پڑے۔

”کیا دادا! ابھی کیسا بولتا ہے تم؟“

تیجھل نے بھتے ہوئے لہجے میں اُنھیں بتایا کہ دادا کے چلے جانے پر ماہم کے پاڑے سے شہر کے تمام پاڑوں کا واسطہ جوں کا توں رہے گا تو بندوق بردار پھر اِس طرف کا رُخ کرے گا اور اندھیرے کا منتظر رہے گا کہ کب نیا دادا اِس طرف آتا ہے۔

”ہاں ہاں، اِسی واسطے ہم بولتا ہے کہ اِس کو ابھی مت چھیڑو۔“ بنارسی نے اضطراری انداز میں کہا۔

”نہیں چھیڑتا، آج سے سارے پاڑے کھُلے ہیں۔ پھر اپنے اپنے گھر کو جاؤ۔“ تیجھل ترشی سے بولا۔ ”اب گولی پر ساری بات ہے تو سب ٹھیک ہے۔“

”ہم ہم سمجھ رہا ہے، تمھارا کیا مطلب ہے؟“

”دادا ہو گا تو ضرور سمجھ لے گا۔“

”پر اپن سمجھے کہ تم بھی اسی واسطے اِدھر بیٹھنے کو نہیں مانگتا۔“ دینا نے اشتعال میں کہا۔

”یہی بات ہم تمھارے لیے بھی بول سکتے ہیں، اِدھر سب کے لیے۔“ تیجھل نے گونجتی آواز میں کہا۔

”ایسا؟“ دینا پھنکارنے لگا۔ ”ایسا ہے تو اپن ہی اِدھر بیٹھے گا۔ اپن دیکھے گا کہ کون شیر کا جنا ہے اور کتنا گولی بٹا خانہ ابھی اُس کے پاس۔“

”سُن لیا تم نے۔“ تیجھل نے بلند آواز میں کہا۔ ”آج سے دینا دادا اِدھر کا دادا ہے۔ تم سب لوگ مانتے ہو؟“

کمرے میں بھن بھناہٹ ہونے لگی۔ لال خان اُٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ بلند کر کے اُس نے سب کو خاموشی کے لیے کہا۔ ”دادا!

وہ ٹھیر ٹھیر کے بولا: ”باہر کے پاڑے سے کوئی آدمی نہیں چلے گا۔ اِدھر ماہم کے پاڑے پر کوئی کمی نہیں ہے۔ اِدھر ہی کا کوئی آدمی ہوئے تو ٹھیک ہے۔ ماچھی دادا ہوتا تو بات ہی نہیں تھا۔ دُور دُور اُس کے بَل کا کوئی نہیں تھا پر اِدھر اور بھی ہے۔ اپن سے پوچھو تو ابھی اِدھر کے پاڑے پہ اِدھر کے آدمی کا حق نکلتا ہے۔“

”حق کی بات مت کرلا رے! پاڑے پہ حق صِرف بَل کا بنتا ہے۔“

یکایک دینا اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنی کھردری آواز میں کہنے لگا کہ سرِدست ٹھِل سب سے موزوں آدمی ہے۔ دادا سے اپنے خصوصی تعلق کے ناتے ٹھِل پر لازم ہے کہ وہ اُس کے پاڑے کا بھرم قائم رکھے، تھوڑے ہی دن کی تو بات ہے۔ ٹھِل کو صرف اُس وقت تک بیٹھنا ہے جب تک دادا کو ختم کرنے والے سامنے نہیں آجاتے۔ ٹھِل کی مرضی ہے کہ پھر جیسا چاہے، کرے۔ اُس کے بعد ہم پھر اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ یہ رِیت نئی بھی ہے اور اچھی بھی کہ اِس طرح بھی ہم اپنے بارے میں کچھ فیصلے کر سکتے ہیں۔

دینا بیٹھا ہی تھا کہ چوکی کے دائیں جانب بھاری تن و توش، کالی رنگت کا ایک عمر رسیدہ دادا کھڑا ہو گیا اور دبے لہجے میں بولا: ”مائی باپ! حکم ہوئے تو اپن بھی کچھ بولے؟“

سب کی نگاہیں اُس پر مرکوز ہو گئیں۔ آنکھیں اُبلی اُبلی ٹھوڑی کا گوشت لٹکا ہوا، انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی اور کان میں دُریا پڑی ہوئی۔ مَیں اُسے نہیں جانتا تھا۔ ٹھِل نے اُسے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا لیکن شاید اُس نے دیکھا نہیں، کھڑا رہا اور کہنے لگا: ”تم اپن کو نہیں جانتا، اپن پانڈے ہے، سورت شہر سے آیا ہے۔“

وہ ابھی اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ بنارسی دادا نے اُٹھ کے اُس کا بازو تھام لیا اور ٹھِل سے مخاطب ہو کے بولا: ”اپن بولتا ہے۔ یہ پورا نہیں بولے گا کہ پانڈے دادا کون ہے۔ اِدھر بمبئی میں کسی پاڑے کا کوئی آدمی ایسا نہیں جس نے اگر پانڈے دادا کو دیکھا نہیں تو اِس کا نام بھی نہ سُنا ہو۔ یہ اِدھری پاڑا چلاتا تھا۔ پانڈے دادا مانگتا تو ایک وقت میں بمبئی کا اکھا پاڑا اِس کا گود میں ہوتا پر یہ اپنے پاڑے سے کبھی باہر نہیں نکلا اور نہ اِس کا طرف کبھی کسی نے آنکھ اُٹھا کے دیکھا۔ ابھی بمبئی میں کتنا دادا لوگ کو چاقو کا بولی پانڈے دادا نے سکھایا ہے۔ جیسا کوئی بولتا ہے، ایک دم ایسا مانک تھا۔ پانڈے دادا کے علاقے میں پنچھی بھی پُوچھ کے اُڑتا تھا۔ چیتے کے مانک جھپٹ تھا اِس میں۔ جدھر بولتا تھا، چاقو اُسی طرف کو جاتا تھا۔ ایک دن مگج پھر یلا تھا کہ بمبئی کا پاڑا اخلاص کیا اور سورت چلا گیا۔ اُدھر شہر میں جو بلا پاڑا ہے، وہ پانڈے دادا کا ہے۔ اِس کے ہوتے دوسرا ابھی کوئی ہوئے گا بھی کیسے۔ اور اِدھر جو سورت والا دادا بیٹھا ہے اِسی کا بنایا ہوا ہے۔ پانڈے دادا اِس کو بمبئی کا پاڑا دے کے گیا تھا، برس ہو گیا پر ابھی تک لوگ پانڈے کا پاڑا ہی بولتا ہے۔ کبھو جب بمبئی کا یاد آتا ہے تو پلٹ کے آتا ہے۔ اپن کو پتہ نہیں کبھی پیرو دادا کو دیکھے بنا لَوٹ کے گیا ہو۔ پیرو دادا سے اِس کا یاری ہے۔ اچھا ہے کہ پانڈے دادا ابھی اِدھر ہے۔ کوئی اِدھر تو ابھی اِس.....“

”بیٹھ جا۔“ پانڈے دادا نے بنارسی کے شانے پر ہاتھ رکھ کے اُسے بٹھا دیا۔ پہلے بھی وہ کئی بار اُسے ٹوک چکا تھا۔ بنارسی خاموش ہوا تو وہ ٹھِل کی طرف ہاتھ جوڑ کے بولا: ”اپن غلام اُس کا، عمر میں وہ اپن سے چھوٹا تھا پر اپن کا باپ تھا۔ کیا بولے اپن کا کیا تھا وہ۔“ اُس نے دل گیر لہجے میں ٹھِل کو بتایا کہ وہ کل ہی رات بمبئی آیا تھا، یہ سُن کے کہ پیرو لمبے سفر سے واپس آگیا ہے۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ یہاں یہ دیکھنے کو ملے گا۔ کل رات سے ایک پَل کے لیے اُس کی آنکھ نہیں لگی ہے۔ رات سے وہ پاڑے پر ہے۔ اُسے بھی اُن لوگوں میں شامل سمجھا جائے جو پیرو اور ماچھی کے قاتلوں تک پہنچنے اور اُنھیں کتوں کے آگے زندہ ڈال دینے کے لیے بے چین ہیں۔ پیرو تو کسی چٹان کی طرح تھا، لوہے کا بنا ہوا۔

پانڈے دادا کی پاٹ دار آواز میں گرہیں سی پڑنے لگی تھیں: ”اپن آج پہلی بار سب کے سامنے زبان کھولتا ہے۔ اپن ایک دم بمبئی سے کیوں چلا گیا تھا۔ ایک دن پیرو پاڑے کے بولا، پانڈے دادا! اپن صاف بولے، جب تک تم ہاتھ نہیں کر لے گا، اپن کو ابھی چین نہیں پڑے گا۔ اپن تمھارے بارے میں سُن سُن کے تھک چکا ہے اور تمھارا چاقو، تمھارا دیکھنے کو اِدھر آیا ہے اور بول دے کر پاڑا لینے کو نہیں، ہاں اگر اپن کے ہاتھ سے چاقو چھوٹ گیا تو اپن ماہم کا پاڑا چھوڑ کے چلا جائے گا۔“ پانڈے کہنے لگا کہ اُس نے پیرو کو ٹالنے کی بہت کوشش کی اور کہا کہ اگر میرے پاڑے سے تمھیں کوئی دلچسپی ہے تو مجھے بھی تمھارے پاڑے سے دلچسپی نہیں۔ پھر کیوں ہم ناگوار صورتِ حال سے دوچار ہوں مگر پیرو نہ مانا، وہ اصرار کرتا رہا اور چاقو نکال کے کھڑا ہو گیا اور دھمکی دینے لگا کہ اب یا تم

پر ہو گے یا میں۔ ناچار پانڈے دادا کو بھی چاقو نکالنا پڑا۔ پیرو کی خواہش پر وہ پاڑے کی ایک کوٹھری میں آ گئے، اُن دونوں کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔ پیرو آیا بھی اکیلا تھا۔ دونوں چاقو آزمائی کرتے رہے اور پانڈے کے کہنے کے مطابق وہ تفصیل کیا بیان کرے۔ بہت دیر لگی۔ دونوں پسینے پسینے ہو گئے اور وہی ہوا جو پیرو دادا طے کر کے آیا تھا اور جس کا پانڈے کو ابتدا ہی میں اندازہ ہو چکا تھا۔ پانڈے کا چاقو اُس کے ہاتھ میں برقرار نہ رہ سکا۔ پیرو اُسے سینے سے لگا کے چلا گیا۔ پھر پانڈے بھی اپنے پاڑے نہیں ٹھیرا۔ دو ایک دن ضرور اُس نے تذبذب میں لگائے لیکن آخر اُس نے اپنے دل کے فیصلے پر عمل کیا۔ پیرو کو پیغام پہنچایا کہ وہ آ کے اُس کے پاڑے پر بیٹھ جائے یا اپنا کوئی آدمی بھیج دے۔ پیرو نے انکار کر دیا تو پانڈے اپنے عزیز شاگرد سورت والے دادا کو پاڑے پر چھوڑ کے خود سورت چلا گیا۔ جاتے جاتے وہ سورت والے کو تاکید کر گیا تھا کہ کبھی پیرو دادا اِس طرف آ نکلے تو وہ پاڑے کی چوکی سے ہٹ جائے مگر پیرو نے اُس کے بعد کبھی پانڈے کے پاڑے کا رُخ نہیں کیا اور ایک دن اچانک سورت پہنچ گیا اور پانڈے سے منت کرنے لگا کہ بمبئی واپس چلے۔ اُس نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اُسے پانڈے کے پاڑے سے کوئی سروکار نہیں ہے مگر پانڈے پھر نہیں لَوٹا لیکن وہ بمبئی برابر آتا رہا، صرف پیرو سے ملنے کے لیے۔ پیرو اُسے اتنی عزت دیتا تھا، اُس کا ایسا خیال کرتا تھا جیسے پانڈے اُس کا باپ، اُس کا اُستاد ہو۔ اُس نے کبھی کسی سے ذکر نہیں کیا کہ پانڈے سے اُس کا کبھی کوئی تصادم ہوا تھا۔ پانڈے کو اگر کبھی بمبئی آنے میں دیر لگ جاتا تو پیرو اُس سے ملنے خود سورت چلا جاتا۔

پانڈے کی آنکھیں بھر آئیں۔ اُس کی آواز بھی جھر جھرا رہی تھی۔ کمرے میں سناٹا سا چھا گیا تھا۔ چند لمحے وہ چپ کھڑا رہا پھر کہنے لگا کہ میرا دماغ کام نہیں کر رہا، وہ کون اندھے عقل سے عاری لوگ ہو سکتے ہیں جنھوں نے ایک اتنے زندہ آدمی کو ختم کر دیا۔ اُنھوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ کون تھا۔ وہ پیرو اور ماچھی دادا کے دشمن نہیں تھے، اپنے دشمن ہیں۔ ایک آدمی کی طاقت، اُس کے سارے دوستوں کی طاقت ہوتی ہے۔ ایک آدمی کے ختم کر دینے سے اُس کے دوست ختم نہیں ہو جاتے۔ اُنھیں دکھائی نہیں دیا کہ پیرو کے کتنے اور کیسے دوست ہیں۔ پہلے اُن سب کو ختم کرنا چاہیے تھا۔

پانڈے نے نسبتاً ٹھیری ہوئی آواز میں ٹھِل سے کہا کہ کوئی ایک دن میں کیسے ماہم کے پاڑے پر نئے دادا کا خیال کر سکتا تھا۔ یہ تو پیرو دادا کا پاڑا ہے۔ اُس کی عدم موجودگی میں ماچھی بیٹھتا تھا تو بھی یہ پیرو کا پاڑا تھا۔ یہ عمارت اُسی نے بنوائی تھی۔ اِس کے در و دیوار پر اُس کے نقش ہیں۔

بنارسی نے اُٹھ کر پھر کچھ کہنا چاہا مگر پانڈے نے ڈپٹ کے اُسے بٹھا دیا اور کہنے لگا کہ یہاں لوگوں کے درمیان بیٹھ کے اُس نے بہت کچھ سُنا اور دیکھا ہے اور اِس نتیجے پر پہنچا ہے کہ ٹھِل ہی کو پاڑے پر رہنا چاہیے۔ حالانکہ وہ ٹھِل سے اتنا واقف نہیں لیکن اُسے یاد ہے، زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ پیرو نے اُس سے ٹھِل کا ذکر بہت اشتیاق اور احترام سے کیا تھا اور کہا تھا، پانڈے! دیکھنا، اب کے بمبئی آیا تو اُس سے ملواؤں گا۔ پانڈے نے کہا کہ پیرو اگر ٹھِل کا ذکر نہ کرتا تو بھی ٹھِل کو دیکھ کے اُس کے بارے میں وہ یہی رائے قائم کرتا۔ پیرو ہاتھ کا صاف، دل کا صاف تھا۔ اُس کا کوئی دوست بھی اُسی جیسا ہو سکتا ہے۔ یہاں سب ماہم کے پاڑے پر بدستور رہتا پہنچانے کے لیے آمادہ ہیں تو اِس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ایک تجربہ کار شخص دادا کی گدی سنبھالے۔ کوئی متنازعہ شخص پاڑے پر بیٹھا تو اِس سے دادا کے نادیدہ دشمنوں کا حوصلہ بڑھے گا۔ آج کی بات اور ہے، آج شہر کے جو دادا یہاں گم سم بیٹھے ایک دوسرے کا منہ تک رہے ہیں، کل اِنھی کے درمیان اِس معاملے پر اختلافات جنم لے سکتے ہیں اور پولیس اِس خلفشار سے فائدہ اُٹھا سکتی ہے۔ جیسا کہ ٹھِل کا خیال ہے، مناسب یہی ہو گا کہ ہم ہر طرف کا دھیان رکھ کے کچھ طے کر لیں۔ کوئی ایسا فیصلہ جو ہم نے اِس طرح کبھی نہیں کیا، مگر جو کیا جا سکتا ہے جس پر سب متفق ہوں اور قائم بھی رہ سکیں۔ بمبئی کے پاڑوں میں سے کوئی دادا لیا گیا تو شاید زیادہ دیر تک ہم اُس کے ساتھ نہ چل سکیں۔ باہر کا آدمی ہونا چاہیے یا اِسی پاڑے کا۔ کسی کو حق تلفی کی شکایت نہیں ہو گی۔ وہ کہنے لگا کہ اُسے اِس اندیشے سے اتفاق نہیں ہے کہ پیرو دادا کے زمانے کی طرح سب جوں کا توں رہا تو دادا کے قاتل پھر اِس طرف کا رُخ کریں گے۔ اِس کا موقع ہی شاید نہ آئے۔ اگر ہم میں سے کوئی ایسی کسی احتیاط کے سبب پاڑے پر بیٹھنے سے کتراتا ہے تو اُسے پاڑے کا کام چھوڑ کے کوئی دوسرا دھندا کرنا چاہیے۔ بار بار ایسا نہیں ہو گا لیکن ہاں، اُن کی بازیابی میں بہت دیر

ہوگئی تو کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

یہ کہہ کے پانڈے بیٹھ گیا۔ کئی دادا کچھ کہنے کے لیے مضطرب تھے لیکن شوا کی آواز اُن پر غالب آئی۔ "ابھی تم بھی تو باہر کا آدمی ہے۔"

بیک وقت کئی اطراف سے شوا کی تائید میں آوازیں اُٹھیں۔ پانڈے سر جھٹکتا ہوا دوبارہ کھڑا ہوا اور ہذیانی سے انداز میں بولا۔ "کیا بولتا ہے تم؟ پاگل ہوگیا ہے ابھی سب۔ تمھارا مطلب ہے، اپن کو باہر کا آدمی سمجھ کے ایسا بولا تم؟" وہ اتنا برانگیختہ ہوگیا تھا جیسے کسی نے اُسے گالی دی ہو۔ کہنے لگا کہ کیا وہ پھر سے دُہرائے جو یہاں بیٹھے لوگوں نے توجہ سے نہیں سُنا۔ اُس نے یہ سب اس لیے نہیں کہا تھا کہ اُس کے منہ پر یوں طمانچہ مارا جائے۔ یہ ماہم کا پاڑا ہے، پیرو دادا کا پاڑا۔ وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کے توبہ کرنے لگا اور دریدہ لہجے میں بولا کہ اُس کے دل میں تو اب ایک ہی حسرت ہے کہ کسی طرح پیرو اور ماچھی دادا کے قاتلوں کے سر اُتار لائے۔ اُسے معلوم ہے کہ اِس طرح پیرو اور ماچھی واپس نہیں آجائیں گے مگر تب تک اُسے قرار بھی نہیں آئے گا۔ اِس وقت تو نہ اُس کا دل قابو میں ہے نہ دماغ۔ ایسی حالت میں وہ پاڑے پر کیا بیٹھے گا اور پاڑے کے لیے کیا کرسکے گا۔ یہاں تو ایک ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو ساری ڈوریاں اپنے ہاتھ میں رکھتا ہو۔ یہاں دادا کا محترم دوست بتھل موجود ہے۔ اُس کے ہوتے کسی دوسرے کا خیال، پانڈے کے مفہوم کے مطابق، عاقبت نااندیشانہ ہی نہیں مجرمانہ بھی ہے۔

کسی طرف سے پھر آواز اٹھی تھی۔ پانڈے دادا نے اُسے جھڑک دیا اور بولا کہ آگے کسی نے ایک لفظ کہا تو وہ اُٹھ کے چلا جائے گا۔ ہر طرف تکدّر آمیز خاموشی طاری ہوگئی۔ بتھل بھی چُپ رہا۔ پھر سب سے پیچھے دیوار کے ساتھ لگا بیٹھا ہوا اندھیری کا موجود نوجوان دادا سکندر ہچکچاتے ہوئے اُٹھا۔ راجن کے جیل جانے کی وجہ سے چند روز پہلے پیرو نے اُسے اندھیری کے پاڑے پر تعینات کیا تھا۔ سکندر کچھ بولنے سے پہلے جیسے لفظ ڈھونڈتا رہا۔ اُس کے چہرے پر متانت تھی۔ اُس نے دھیمی آواز میں کہا کہ کوئی بھی فیصلہ کرتے ہوئے ہمیں پولیس کے طرزِ عمل پر اچھی طرح نظر رکھنی چاہیے۔ پولیس جانتی ہوگی کہ دادا پر کسی ایک پاڑے ہی کے لوگوں نے حملہ کیا ہوگا لیکن پولیس کو اِس بہانے شہر کے تمام پاڑوں سے چھیڑ خانی کا موقع مل گیا ہے۔ آئندہ وہ اور تلخ رویّہ

اختیار کرسکتی ہے اور جیسا کہ پانڈے دادا نے اشارہ کیا ہے پاڑے کے داداؤں کے درمیان نفاق کا بیج بوسکتی ہے۔

سکندر وہی کچھ دُہرانے لگا جو کل شام شکلا نے بتایا تو کہ کل سارے دن پولیس مختلف پاڑوں پر چھاپے مارتی رہی۔ ہر پاڑے سے متعدد آدمی گرفتار کر کے لے گئی۔ پولیس کا رویہ نہایت درشت اور دہشت انگیز تھا۔ سکندر کو حیرت تھی کہ پولیس اب تک ماہم کے پاڑے پر کیوں نہیں آئی۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ پولیس پیرو دادا کے خاص پاڑے کو مشتبہ نہیں سمجھتی۔ اُس کا شبہ دوسرے پاڑوں پر ہے اور بے سبب نہیں ہوگا۔ یہ خاص بات سامنے رکھتے ہوئے ماہم کے پاڑے پر شہر کے کسی اور پاڑے کے دادا کا گدّی سنبھالنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ پولیس کی جا و بے جا دخل اندازی سے نجات پانے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم جلد از جلد دادا کے قاتلوں کو پکڑ کے زندہ یا مردہ اُس کے حوالے کردیں۔ دوسرے یہ کہ ہم اپنے تمام شکوے شکایتیں سر دست یک سر فراموش کردیں اور ایک دوسرے پر اعتماد کریں۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ قاتل پولیس کو ورغلانے اور کسی نتیجے پر نہ پہنچنے دینے کی پوری کوشش کریں گے۔ پولیس کی اُفتاد پڑنے پر ایک پاڑا دوسرے پاڑے کی مدد تبھی کرسکتا ہے جب سب کسی ایک مرکزی پاڑے سے بندھے ہوں اور اُن کے درمیان گہرا رابطہ ہو۔ ماہم کے پاڑے کی مرکزی حیثیت برقرار رہے گی تو کم از کم ایک طرف سے سکون رہے گا، پولیس کو اتنا کھُل کھیلنے کا موقع نہیں مل سکے گا اور یہ تبھی ممکن ہے جب ماہم کے پاڑے پر کوئی ایسا دادا چوکی پر بیٹھا ہو جس کی سُوجھ بوجھ، زور اور غیر جانب داری پر تمام پاڑوں کے دادا یقین رکھتے ہوں، جیسا کہ پیرو دادا نے ثابت کیا تھا۔

سکندر کی آواز بتدریج بلند ہوتی گئی۔ وہ کسی پختہ کار دادا کی طرح بردباری اور تحمل سے ایک ایک کر کے مختلف پہلو کریدتا رہا۔ اُس کی زبان ذرا صاف ہوتی تو کوئی بھی اُسے پاڑے کا دادا نہ کہتا۔ اُس نے اُن سے کہا کہ گزشتہ تین روز سے پیرو دادا کا بیشتر وقت اندھیری کے پاڑے پر گزرا ہے۔ پرسوں رات جب گولی چلی تو وہ باندرے سے اندھیری ہی کی طرف آرہا تھا۔ اِس دوران سکندر کو اُس کے بہت قریب رہنے کا موقع ملا۔ پیرو دادا بار بتھل کو یاد کرتا اور کہتا، راجن کا معاملہ جلدی طے ہو تو وہ اپنے دوست بتھل کے پاس جائے۔ وہ کہتا تھا، اگر کسی دادا

[illegible]کھنا ہے تو اپنے بتھل بھائی کو دیکھو۔

سکندر کی باتیں سب توجہ سے سُنتے رہے تھے۔ وہ بیٹھ گیا [illegible]رے میں بھانت بھانت کی آوازیں گونجنے لگیں۔ شنکرا، سُندر[illegible]ل خان، سورت والا، دنیا، بنارسی مدنا، وہ سبھی شدّ و مد سے بتھل [illegible] اصرار کرنے لگے کہ اُسے اب انکار نہیں کرنا چاہیے۔ اُن کے [illegible]ہوں میں بظاہر کوئی کھوٹ نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اُن میں دل [illegible]وزی بھی تھی اور تشویش و تردد بھی۔

بتھل حقّہ گُڑگُڑاتا رہا۔ جب سب چُپ ہوگئے تو اُس نے [illegible]نال ہونٹوں سے ہٹائی اور بھاری آواز میں کہا۔ "ہم ایسے پاڑے [illegible]نہیں بیٹھتے۔"

"پھر کیسے بیٹھتا ہے؟" دنیا غصّے میں بولا۔

"بل پر بیٹھتے ہیں۔"

"پر ادھر بل دکھانے کو کون بولتا ہے۔ جب سب چُپ ہے تو [illegible]اہے کو نا بولتا ہے۔" لال خان نے ناراضی سے کہا۔

"اپنے کو اِدھر ٹکنا نہیں ہے، پھر اُدھر دادا کے گھر کی طرف [illegible]یکھنا ہے۔ دونوں باؤلی ہوگئی ہیں۔"

"تو پھر اِدھر راجا دادا کو بٹھا دو۔" بالے جھینپتی آواز میں بولا۔ میرے قریب بیٹھے ہوئے جمرو نے مجھے کہنی ماری۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ بتھل اُنھیں منع کردے گا اور کسی توقف کے بغیر بتھل نے یہی کیا۔

"پھر تم جس کو بول دو، کوئی تو بیٹھے گا اِدھر۔ کوئی آدمی تم کو [illegible]پورا نہیں ملتا تو ابھی دادا کی جوتی چوکی پر رکھ دو۔" بالے کے لہجے میں بھی تندی آگئی۔

"تھی بیٹھو دادا! اپن کی بنتی ہے۔" قلابے کے دادا جارجی نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔ اُس کی آواز دھڑک رہی تھی اور آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

"تو بھی یہی بولتا ہے رے!" بتھل نے سر اُٹھا کے کہا۔

"ابھی یہی ٹھیک ہے۔" جارجی اٹکتی زبان سے بولا۔

بتھل نے ہنکاری بھری اور چپ بیٹھا رہا۔ طرح طرح کی آوازیں آتی رہیں پھر پانڈے نے جھٹ اُٹھ کے بتھل کے پیروں پر اپنا چاقو ڈال دیا۔ بالے نے بھی اُس کی تقلید کی۔ جارجی نے بھی، سورت والے نے بھی اور دنیا نے بھی۔ دیکھتے دیکھتے بتھل کے پیروں پر چاقوؤں کا ڈھیر لگ گیا۔ بتھل نے ہاتھ بلند کر کے اُن سے کچھ کہنا چاہا لیکن شور میں اُس کی آواز سنائی نہیں دی۔

✥ بتھل نے سر جھکا لیا۔ شاید اب حجت پوری ہوگئی تھی۔ وہ چاہتا تو ابتدا ہی میں چاقو نکال کے اُن کے سامنے کھڑا ہوجاتا یا مجھے اشارہ کردیتا۔ اوّل تو اُن میں سے کوئی سامنے ہی نہ آتا، آتا بھی تو فیصلے میں زیادہ دیر نہیں لگتی، لیکن یہ چاقو کے زور پر پاڑا حاصل کرنے کا وقت نہیں تھا۔ اُنھیں اِس کے سوا بھی کچھ بتانا اور جتانا مقصود تھا جو اُنھوں نے یقیناً اچھی طرح جان لیا ہوگا۔ دوسری صورت میں اُنھیں اِس سفید و سیاہ سے آگہی کا موقع نہ ملتا اور وہ کوئی بھی اُلٹا سیدھا قدم اُٹھا سکتے تھے۔ شروع شروع میں مجھے بتھل کی مرضی کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ بعد میں اُن کی باتیں سُن سُن کے میری سمجھ میں آتا گیا کہ بتھل نے اُن لوگوں کو کیوں جمع کیا ہے اور اِس تکرار و حجت کا سبب کیا ہوسکتا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ بتھل کو نہ اڈّے پاڑوں سے اب کوئی سروکار ہے اور نہ بمبئی میں اُس کا مستقل رہنے کا ارادہ ہے۔ اُس کا بس چلتا تو وہ ہمیشہ فیض آباد میں اپنی زمین کے پاس ہی رہتا۔ پیرو دادا کے پاڑے پر بیٹھنے کا خیال تک اُس کے ذہن میں نہیں ہوگا۔ اِس کا تصور ہی اذیت ناک تھا لیکن دادا کا پاڑا کسی ایرے غیرے کے حوالے بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ عمارت دادا کی ذاتی ملکیت تھی اور عمارت ہی کیا، پاڑے کے جن آدمیوں سے زندگی بھر قدم قدم پر اُس کا ساتھ رہا جو گیتا کی طرح اُس کی اولاد کے مانند تھے، بتھل کو اُن کا بھی خیال رکھنا تھا۔ پاڑے کو لُوٹ کھسوٹ سے بچانے کے لیے ہماری موجودگی اور فعالیت ضروری تھی، کسی اور طرح نہیں، باقاعدہ پاڑے کے نگراں کی حیثیت سے۔ اس میں ہماری عافیت کا پہلو بھی مضمر تھا۔ پولیس نے پرسوں رات ہمیں تھانے سے آجانے دیا تھا لیکن وہ دوبارہ بھی ہماری طرف متوجہ ہوسکتی تھی۔ چند دنوں کے لیے ہمیں بھی کسی پاڑے کی مضبوط چھت درکار تھی۔ بے پاڑے کا دادا پولیس کی نظروں میں کسی یتیم کے مانند ہوتا ہے۔

پولیس کو اب اس خبر سے اتنی حیرت نہیں ہوگی کہ وہی بتھل پیرو دادا کی گدّی پر موجود ہے جس نے تھانے میں افسروں کے استفسار پر پاڑے کی منصب داری سنبھالنے سے صاف انکار کردیا تھا۔ پولیس سے قُربت رکھنے والے اور اُسے خبریں فراہم کرنے والے بعض دادا یہاں ضرور ہوں گے، اُن کے ذریعے پولیس کے علم میں یہ حقیقت بھی آنی چاہیے کہ بتھل نے کسی

اور اگر، جیسا کہ اُن کا قیاس تھا، قاتل بھی وہاں موجود
تو یہ سب جان کے اُن پر کیا گزری ہوگی۔ اُنھیں تو ایسے ہی ہلاک
ہونا چاہیے۔ ہو سکتا ہے یہ مجمع لگانے سے ببّھل کا مقصد اُن
کے ٹٹولنا بھی ہو اور اُنھیں یہ جتانا بھی کہ دادا کے نام لیوا
سے اُن پر وار نہیں کریں گے۔ نیچے آکے ببّھل نے اُن سے
وہ جب تک پاڑے پر نہیں رہے گا، پانڈے دادا پاڑے کی
بھال کرے گا۔ یہ سن کے پانڈے دادا ہاتھ جوڑ کے انکار
نے لگا مگر ببّھل نے اُسے زیادہ واویلا نہیں کرنے دیا۔ اُس
اپنا چاقو نکال لیا اور وہ غالباً پانڈے کے پیروں پر ڈالنا چاہتا
مگر پانڈے نے ایک دم بڑھ کے اُس کے ہاتھ جکڑ لیے اور
زار زار اُس کے سینے سے لگ کے پھڑکنے لگا۔

علاقے کے کسی سیٹھ کی جانب سے دوپہر کے کھانے کا انتظام
کیا تھا لیکن ببّھل کھانا کھائے بغیر اُٹھ گیا۔ پانڈے اور دوسرے
داداؤں نے اُسے روکنے کی کوشش کی لیکن ببّھل نے دادا
کے گھر جانے کا عذر کیا تو سب چپ ہو گئے۔ پاڑے کے باہر لوگوں
کی بھیڑ لگی تھی اور چبوترے پر رکھی ہوئی دیگوں سے مسلسل کھانا
تقسیم کیا جا رہا تھا۔ پانڈے، سُورت والا، دینا، سکندر، لال خان
...را، چھیدا اور جارجی وغیرہ ہمیں موٹر تک پہنچانے آئے۔ سڑک
کے کنارے ابّا جان کی موٹر کھڑی تھی۔ جمرو، شامو اور مارٹی بھی
ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔ پاڑے کے علاقے میں دُور دُور تک مسلح
سپاہی گشت کر رہے تھے اور دادا کے گھر کے اطراف گلیوں
میں بھی وہ ہمیں دکھائی دیے۔ گزشتہ رات کی طرح گھر کے باہر
محتاجوں اور ناداروں کی قطاریں لگی تھیں۔ شبّی چاچا ہمیں باہر
ہی مل گیا۔ اُس کی زبانی معلوم ہوا کہ ابّا جان کی ہدایت پر غریبوں
میں کپڑا تقسیم کیا جا رہا ہے۔ بازار سے کپڑے کے گٹھ کے گٹھ آتے
تھے لیکن اِدھر آئے، اُدھر ختم ہو گئے۔ اب ابّا جان نے اُن کے لیے
اور کپڑا منگوایا تھا اور محلّے کے چند بزرگوں سے درخواست کی تھی۔
کہ وہ اِس کارِ خیر کی نگرانی کرتے رہیں، کوئی سائل خالی ہاتھ نہ
جائے۔ شبّی چاچا کی روداد ادھوری چھوڑ کے ببّھل تیز قدموں
سے سیدھا اندر چلا گیا۔ کوئی بھی وہاں سے نہیں گیا تھا اور کسی
نے ہمارے انتظار میں دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ برآمدے میں
پاس پڑوس کی عورتوں کے درمیان بیٹھی ہوئی جولین ببّھل کو دیکھتے
ہی کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی کہ صبح سے کئی بار گیتا اُسے پوچھ چکی
ہے اور اُس کے لہجے میں شکایت تھی۔ وہی ہمیں اندرونی کمرے میں

لے گئی۔ وہاں فرخ، فریال، شہ پارہ اور مولوی اکرم کی بیٹی ریحانہ
کے ساتھ گیتا ایک کونے میں خوف زدہ بیٹھی تھی۔ ہونقوں
کی طرح پھیلی ہوئی آنکھیں، جیسے کسی نے سارا خون نچوڑ لیا ہو،
چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ آدمی بھی گلستانوں کی طرح
ہوتے ہیں، مدّتوں میں بہار آتی ہے اور ایک تند جھونکے میں سب
کچھ اُجڑ جاتا ہے۔ اُس کی نظریں دروازے ہی پر لگی تھیں جیسے ہی
ہم اندر داخل ہوئے، وہ بے کل ہو گئی مگر اِس سے پہلے کہ وہ اُٹھ
کے ہمارے پاس آتی، ببّھل لپکتا ہوا اُس کے پاس پہنچ گیا۔ وہ تو دریا
بنی بیٹھی تھی، سر پہ ببّھل کا ہاتھ آتے ہی اُمڈ پڑی۔ ببّھل نے اُسے
وہاں سے اُٹھا لیا اور اُس کا بکھرا بکھرا سراپا اپنے پہلو میں سمیٹے
بیرونی کمرے میں چلا گیا، میں وہاں نہیں گیا۔

جولین کے بلاوے پر کھانے کے لیے جب میں بیرونی کمرے
میں پہنچا تو توقع کے خلاف گیتا بہت سنبھلی ہوئی تھی۔ اتنی دیر
میں ببّھل جانے اُس سے کیا کیا کہتا رہا ہوگا، فرش پر لمبا دستر
خوان بچھا تھا اور گھر کے تقریباً سبھی افراد موجود تھے۔ مارٹی، جمرو
اور شامو بھی۔ غذا کی ضرورت ایک رسم بھی تو ہے، صبح و شام
کی رسم، سب بس کوئی رسم ادا کر رہے تھے۔ سفید ساڑی میں ملبوس
رانی بالکل میرے سامنے بیٹھی تھی۔ صبح کی نسبت اب اُس کے
چہرے پر عزم و اعتماد سا نظر آ رہا تھا۔ یہ دیکھ کے مجھے یک گونہ
سکون ہوا لیکن پھر ایسا لگا جیسے یہ استقامت صبر و شکر کی نہیں،
غصّے اور خود آزاری کی کوئی کیفیت ہے، جیسے رانی نے کچھ طے
کر رکھا ہو اور جیسے وہ کچھ چھپا رہی ہو۔ آدمی غم بھی تو چھپاتا ہے،
غم، غصّہ، خوف، نفرت۔ غم زدہ کو دوسروں کا بھی تو خیال رکھنا
چاہیے۔ یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ زخم خوردہ کو اپنے مسیحا کی نزاکتِ
احساس کا خیال بھی رہے۔ ہر غم شاید یوں ہی زہر بن جاتا ہے۔
ممکن ہے، رانی کے بارے میں یہ میرا گمان ہو۔ بہت سے وہم و گمان
آدمی کی اپنی نظر کا فتور ہوتے ہیں۔ آنکھیں اپنے اندر کے حبس،
اپنے اندر کے فشار سے مشروط ہوتی ہیں۔ ایک عینک آدمی کے
اندر بھی تو ہوتی ہے جس کے شیشے آدمی کے اپنے موسم سے بدلتے رہتے
ہیں، گھڑی گھڑی یہ پیمانے بدلتے رہتے ہیں۔

جولین نے میرے، جمرو، شامو اور مارٹی کے لیے ایک الگ
کمرے کا انتظام کر دیا تھا تاکہ ہم آرام کر سکیں مگر جولین اِس خلوت
کی منتظر تھی۔ کھانے کے بعد ہم چاروں وہیں آ گئے اور ابھی ہم نے
بستر پر کمر ٹکائی ہی تھی کہ جولین کے واپس آ جانے پر ہمیں اُٹھ جانا پڑا۔

قدرِ تامّل و تحذّر کے بعد یہ پیش کش قبول کی ہے۔ وہ چاقو
نکال کے سب کے سامنے کھڑا نہیں ہو گیا تھا۔
پاڑے پر بیٹھنے کی یہی بہترین صورت تھی کہ پیش کش اُن
سب کی جانب سے ہو۔ کسی کو پچھتاوا نہیں ہوگا کہ صرف ایک
اُس نے اِس گراں بار فیصلے کی تائید میں آواز اُٹھائی تھی۔ اتنی
جلد کسی کا دماغ نہیں لوٹے گا کہ کل کوئی یوں بے سوچے سمجھے منہ
اُٹھائے اپنا حق جتانے چلا آئے۔ اتنے آدمیوں کے بیچ میں کیے
گئے عہد سے لوگ اتنی جلدی نہیں پھرا کرتے۔ مروّت بھی کوئی چیز
ہوتی ہے جو پاڑے کے آدمیوں میں بھی دوسروں سے کم نہیں ہوتی۔
چاقو کے زور پر پاڑا حاصل کرنے سے مراد تھی، اُن سب کی پسپائی
جو ماہم کے پاڑے پر کب سے نگاہیں لگائے ہوئے ہوں گے۔ اُسی اقتدار
دروت کی جگہ پر اچانک ایک 'دادا'، وہ بھی باہر کے دادا کے قبضہ
جمانے کا تازیانہ وہ کبھی دل سے قبول نہ کرتے، وہ کھمبے نوچتے اور
شہر کے داداؤں کو تنکے چبھوتے تو دوسری طرف پولیس کو یہ باور
کرانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے کہ ہم تو بس انتظار میں بیٹھے
تھے کہ کب پیرو دادا کا کانٹا نکلے، اور کیا عجب کہ وہ ہی ہوں جنھوں
نے دادا کو اِس طرح راستے سے ہٹا دیا ہے۔ جانے کب سے ہم دادا پر
گھات لگائے ہوئے تھے کہ اُس رات وہ نشانے پر آ گیا۔ اِس
صورتِ حال میں اُن کی شوشے بازی کیسی مضحکہ خیز اور مبالغہ آمیز
لگتی، ہمیں دیکھ کے پولیس نے کچھ کم خیال آفرینی اور ہرزہ سرائی کی تھی۔
میرے سر سے جالے چھٹ رہے تھے۔ ببّھل نے تھانے
میں دیر کیوں لگائی تھی اور وہ اُن تین افسروں سے کیوں اُلجھتا رہا
تھا۔ اگر ہم اُس وقت تھانے جانے سے پہلو بچاتے اور دانستہ
وہاں اتنی دیر نہ لگاتے تو شاید یہ فراغت کبھی نہ ملتی۔ دادا کے گھر
کے راستے میں، دادا کے گھر پر، پاڑے میں کسی بھی وقت وہ ناگہاں ہمارے
سروں پر پہنچ جاتے۔ بمبئی میں ہماری موجودی اور دادا سے تعلق کا ایک
ذرا سا اشارہ ہی اُنھیں مضطرب کر دیتا اور ہمیں اپنے رُو بہ رُو کیے
بغیر اُنھیں چین نہیں آتا۔ ہم نے اُنھیں اپنی تلاش کی زحمت
نہیں دی تھی۔ یہ کام ہم نے خود انجام دے دیا تھا۔ اب اُنھیں
کوئی شکوہ نہیں ہوگا کہ اُس رات اُنھوں نے ہمیں اچھی طرح دیکھا
بھالا نہیں تھا۔ ہم دیر تک اُن کے سامنے رہے تھے۔ شاید کوئی کسر
رہ گئی تھی۔ ببّھل کو دادا کی آخری رسم، گیتا اور رانی کی دل جوئی،
پاڑے کا نظم، سبھی کچھ ذہن میں رکھنا تھا۔ یہ نہ ہوتا تو کون کہہ سکتا
ہے کہ پھر دادا اور ماچھی کی لاشیں کب تک اسپتال کے سرد خانے

میں اینٹھتی رہتیں، سب کچھ اتنے تسلسل اور تواتر سے پیش
دادا کا پہلے پاڑے پر آنا، پھر گھر لے جانا، دادا کی سواری کا
اہتمام اور دھوم دھام سے نہ اُٹھتی جیسے کوئی دولہا
پھر یہ سب کچھ کس طرح رونما ہوتا۔ ببّھل نے تھانے سے
پہلے از خود پولیس افسروں کو شہ دی تھی۔ سکندر کو
پولیس ماہم کے پاڑے پر اب تک کیوں نہیں آئی۔
بتاتا کہ ہم یہ مرحلہ پہلے ہی سَر کر آئے ہیں۔ جمرو اور شامو
میں بار بار مجھے خاموش ہو جانے کی تلقین اسی لیے
تھے کہ کہیں اپنی دیوانگی میں مجھ سے کوئی کوتاہی سرزد
اندھیرے میں آنکھیں کھلی رکھنے کی اذیت، ستم بالائے
اُنھیں دُہری اذیت سہنی پڑتی تھی، مصائب و ابتلا کے
سے اپنے سر محفوظ رکھنے کی اذیت۔ صبر و ضبط تو بجائے خود
آزار ہے۔ آدمی گزرنے والے وقت سے نبرد آزما ہو یا آنے
پر پشتے باندھے۔ آدمی سے اپنا آپ ہی نہیں سنبھلتا کہ وہ
بیساکھی بنے۔ جسم میں آگ لگتی ہو مگر آدمی اپنی صدائیں
رکھے۔ اُنھیں یہ ہنر آتا تھا۔ میں نے اُن سے زور آزمائی
بازی کے تمام حربے سیکھ لیے تھے مگر مجھ سے یہ مشقت نہیں
تھی۔ ہزار کوششوں کے باوجود مجھے اِس جبر کے طریقے نہیں
وہاں نہ شیرینی بٹی، نہ دودھ کا شربت تقسیم ہوا،
پھول۔ نئے دادا کی مسند نشینی پر کسی جانب سے تحسین و آفرین
غلغلہ بلند نہیں ہوا۔ کچھ ہی دیر میں ببّھل نیچے بیٹھے ہوؤں
کے درمیان چلا آیا، اُس کے پیچھے پیچھے وہ سبھی آ گئے۔
چہروں سے کسی ناروا اقدام کی ناگواری مترشح نہیں تھی،
ہی چھلک رہا تھا کہ اُنھوں نے عجلت میں کوئی فیصلہ
کیا ہے بلکہ صمیمِ قلب سے کیا ہے۔ دل تو ممکن ہے، بعضوں کا
شامل نہ ہو جتنا اُنھوں نے دماغ سے کام لیا تھا۔ دماغ کے
فیصلے کسی قدر پائدار ہوتے ہیں۔ ببّھل کو اسی قدر مہلت
تھی، وقت کی ایک ذرا سی امان۔ جن کے دل نے اُن کے
ساتھ نہیں دیا تھا، اُن معدودے چند داداؤں کو یہ
گیا ہوگا کہ ایک آدمی کے راکھ ہو جانے سے، پانڈے کے
اُس کے نقش مٹ نہیں جاتے۔ اُس کا زور اور اثر، اُس
کتنے اُس کے ہم نشینوں، ہم نفسوں میں حلول کر جاتی ہے،
میں دھڑکتی رہتی ہے، کتنے لوگوں میں وہ خاکستر زندہ
اقبال اُسی کو کہتے ہیں، جو آدمی کے جانے کے بعد بھی قائم

وہ تنہا آئی تھی۔ اُس نے معذرت بھی نہیں کی جو بات بات پہ اُس کا خاصہ تھا۔ کہنے لگی، مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے، صبح ایک پولیس انسپکٹر تین سپاہیوں کے ساتھ گھر آیا تھا۔ یہ سُن کے ہم چاروں چونک پڑے لیکن چُپ رہے۔ جولین نے بتایا کہ وہ گیتا اور رانی کے بیانات لینے کے ارادے سے آئے تھے جولین ہی نے اُن سے بات کی اور کہا کہ اس وقت تو یہ ممکن نہیں ہے۔ دونوں کی حالت اِس قابل نہیں کہ کوئی بیان دے سکیں، اِس موقع پر اُن سے کچھ کہلوانا زخم کریدنے بلکہ زخموں پہ نمک چھڑکنے کے برابر ہوگا۔ انسپکٹر نے حاکمانہ انداز میں اصرار کیا کہ یہ قانونی کارروائی ہے۔ چونکہ قتل کا معاملہ ہے، پس ماندگان کے بیانات حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے، یہ اُنھی کے مفاد کے لیے ہے۔ اُسے احساس ہے کہ یہ ایک مشکل وقت ہے تاہم گیتا اور رانی کو زیادہ تکلیف نہیں دی جائے گی۔ اُن سے چند ہی سوالات کرنے ہیں۔ شاید اس طرح پولیس کو تفتیش میں کوئی مدد مل سکے۔ جولین نے اُس سے درخواست کی کہ اگر یہ اتنا ہی ضروری ہے تو وہ دو تین دن بعد آجائے مگر انسپکٹر بہ ضد رہا اور کہنے لگا اگر اُسے اُن دونوں سے نہ ملنے دیا گیا تو اِس کے بہت سے معنی لیے جاسکتے ہیں گویا گھر والے حقائق چھپانا چاہتے ہیں اور پولیس سے بوجوہ تعاون نہیں کر رہے۔ جولین کے کہنے کے مطابق، اُس نے انسپکٹر سے بہت عاجزی کی مگر وہ اپنی ضد پہ اڑا رہا چنانچہ جولین کا لہجہ بھی سخت ہوگیا۔ اُس نے کہا، ٹھیک ہے، پھر آپ یہی سمجھیں۔ تعجب ہے کہ ایک نہایت نازک بات آپ کی سمجھ میں نہیں آرہی۔ اِس وقت وہ کیا بیان دے سکیں گی اور اِس کارروائی سے ہونے والے حادثے پر کیا اثر پڑسکے گا۔

مجھے حیرت ہوئی کہ جولین جیسی نرم بیاں لڑکی میں اتنی جرأت کہاں سے آگئی مگر جرأت تو ساری صداقت کی ہوتی ہے جس کی جولین میں کوئی کمی نہیں تھی، کہنے لگی، اُس نے سوچا کہ شکلا کا حوالہ دے لیکن اُسے یہ بھی نامناسب لگا اور شکلا کا نام اُس کی زبان پر آتے آتے رہ گیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ آخر انسپکٹر ہی کو پسپا ہونا پڑا۔ جولین کا کہنا تھا کہ وہ ناراض ہو کے چلا گیا۔ اُس کے بعد سے اب تک کوئی نہیں آیا ہے لیکن اُسے اندیشہ ہے کہ پولیس کسی بھی وقت پھر آسکتی ہے۔ جمرو کے پوچھنے پر جولین نے بتایا کہ اُس نے ابھی بھل سے اس بابت کوئی بات نہیں کی ہے، اس کا وقت بھی نہیں ملا۔ بھل جب سے آیا ہے، گیتا کے ساتھ ہے اور اُسے آئے ہوئے دیر ہی کتنی ہوئی ہے۔ میں فوراً کوئی رائے نہیں دے سکا۔ وہ لوگ دوبارہ آسکتے ہیں اور اِس بار اُن کا رویّہ پہلے سے تلخ ہوسکتا ہے۔ میں نے جمرو اور شامو کی طرف دیکھا، وہ کچھ نہ کہہ سکے۔ دادا کے گھر میں ہماری مسلسل موجودگی اور گیتا اور رانی کے آگے دیوار بنے رہنے سے پولیس کا سر پھر گھوم سکتا تھا۔

جمرو، شامو اور مارٹی بھی یہی سوچ رہے تھے۔ پولیس کبھی یہی جواب دے سکتی ہے۔ پولیس دوبارہ واپس چلی جائے گی، اِس کے سوا اُس کے پاس چارہ بھی کیا ہے لیکن اِس سے گیتا اور رانی کی اشک شوئی کے لیے اُن کے گھر میں رہنے والے غیر متعلق لوگوں سے کس درجہ بدگمان ہوسکتی ہے، اِس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا ہے۔ اِس وقت تو پولیس کے سارے منصب اہل کاروں کی حسیں بھوکے آدمی کے مانند ہیں لہٰذا کیوں نہ گیتا اور رانی کو سمجھا بجھا کے اُن کے سامنے کر دیا جائے تاکہ وہ یہ کڑوا گھونٹ بھی پی لیں اور صاف صاف کہہ دیں کہ وہ اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں جانتیں لیکن پولیس بھلا اِس جواب سے مطمئن ہونے لگی۔ سوال کرنا پولیس کا مشغلہ بھی ہے، شوق بھی اور سب سے آسان کام ہے۔ وہ تو ڈھونڈ ڈھونڈ کے سوال کریں گے، یہ دیکھے بغیر کہ اُن کے مخاطب پر کیا عالم گزر جائے گا۔ پولیس اُن سے پاڑے کا تذکرہ بھی کرے گی، دادا کے معمولات کے متعلق، شروع سے اب تک دادا کے مشاغل کے بارے میں۔ کسی نے ذرا بھی تیز آواز میں گیتا سے کچھ کہہ دیا اور پاڑے کا ذکر کر دیا کہ اُس کا باپ بمبئی کے سب سے بڑے پاڑے کا دادا تھا تو بے شک گیتا سے اب کچھ بھی چھپا نہیں رہے گا۔ کل سے آس پاس کی عورتیں جو چہ میگوئیاں کرتی رہی ہیں، وہ اُس کے کانوں میں بھی پڑی ہوں گی لیکن ایک ہی وقت میں اتنے سارے انکشافات سے وہ نڈھال اور بے حال ہوجائے گی۔

جولین سامنے کی کرسی پر سر جھکائے بیٹھی رہی۔ میرا ذہن بھٹک رہا تھا۔ اگر گیتا کو نہیں تو رانی کو اُن کی جناب میں پیش کر دیا جائے۔ رانی نے نسبتاً اپنے ہوش و حواس تھام کے رکھے ہیں۔ اُسے پیرو کے پاڑے کے متعلق بھی سب کچھ معلوم ہے، وہ پولیس کے سامنے آسکتی ہے یا گیتا اور رانی کو یہاں سے ہٹا ہی نہ دیا جائے۔ ابا جان انھیں اپنے گھر لے جائیں گے۔ پولیس کی آمد پر شتی چاچا کوئی بھی عذر کر دے گا مگر اس طرح تو پولیس شک میں پڑسکتی ہے۔ مارٹی، جمرو اور شامو بھی اسی کشمکش میں

تھے لیکن میری طرح کچھ کہہ نہیں پا رہے تھے۔ پھر مارٹی نے اٹکتے ہوئے کہا کہ کیوں نہ ڈاکٹر کیلاش کو آگے کر دیا جائے یا کسی ڈاکٹر کو۔ کوئی ڈاکٹر اُنھیں باور کرا سکتا ہے کہ اِس ناچاری کی حالت میں یہ سوال و جواب تو انھیں اور شکستہ کر دیں گے، ڈاکٹر کی بات پولیس نہیں ٹالے گی۔ کسی وکیل کی بھی مدد لی جاسکتی ہے۔ جمرو نے مارٹی کو دھتکار دیا۔ مارٹی کا مشورہ ایسا غلط نہیں تھا لیکن اُس نے غور نہیں کیا کہ رانی اور گیتا کے نگہ دار کون ہیں اور پولیس اُنھیں کن نظروں سے دیکھتی ہے۔ ہر عذر پولیس رد کرسکتی ہے اور ہر عذر پر اُسے حیلے کا گمان ہوسکتا ہے۔ پولیس کوئی ایک شخص نہیں جسے قائل کر دیا جائے۔ پولیس کی نفری کے قرار کی ایک ہی صورت ہے کہ وہ دونوں اُس کے سامنے جا کے غیر معمولی استقامت کا ثبوت دیں، سماعت کے حوصلے کا۔ وہ پولیس کے ہر سوال کا جواب صبر و سکون سے دیں۔ جولین کو اُن کی طرف سے کسی ہوش مندی یا مصلحت کوشی کی ذرا بھی خوش گمانی ہوتی تو وہ پولیس کو منع نہ کرتی۔ اُسے معلوم تھا کہ غم تو نشے کی طرح ہوتا ہے۔ نشے سے کہیں زیادہ اندھا اور بہرا۔ اِس عالم میں وہ ڈھنگ سے کیا بات کرسکیں گی، وہ تو سسکنے بلکنے لگیں گی۔ آنسوؤں کے سوا اب اُن کے پاس کہنے کو کیا رہ گیا ہے۔ جولین کو پولیس کی طرف سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ کسی بلاغت اور نزاکت کا لحاظ رکھے گی۔ پولیس تو انھیں ایک پاڑے کے دادا، شہر کے مشہور دادا کے خاندان کے طور پر برتے گی۔ کون سفارش کرے گا کہ دادا نے انھیں پاڑے سے بہت دور شیش محل میں رکھا تھا۔ شہزادیوں کی طرح اور ساری زندگی ریشم ہی دیا تھا۔ جولین کو معلوم تھا کہ پولیس ہمارے بارے میں بھی کوئی گوشہ رکھ کے اُن سے بات نہیں کرے گی۔ لہجے کی مروت پولیس کو نہیں آتی۔ آتی ہو تو وہ پولیس ہی کیوں ہو۔ شک پولیس کا طرّۂ امتیاز ہے۔ شک یوں بھی اندھیرے میں روشنی کی کرن ہے۔ شک ہی کوئی راستہ دکھاتا ہے۔ شک یقین کا زینہ ہے۔ کوئی ایک تیر تو نشانے پر بیٹھتا ہی ہے۔

مارٹی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ پس منظر میں ہم موجود ہیں۔ کسی بھی تاویل سے پولیس کو ہمارے حوالے کا پس منظر الگ کرنے میں مشکل پیش آئے گی اور بالفرض سب کچھ ممکن بھی ہوجائے، گیتا اور رانی میں اپنے باپ کے ترکے کی کوئی جرأت عود کر آئے تو بھی کیا لازم ہے کہ پولیس اُن کے بیان کی سادگی کو ہمارے نرغے اور حصار پر محمول نہ کرے۔ ہم جو اِدھر دھرنا دیے بیٹھے ہیں، یہی سب جمرو اور شامو کے دماغ میں کھٹک رہا تھا، یہی کچھ جولین نے اپنے طور پر اخذ کیا تھا۔ سارا تردد اُن دونوں کے لیے تھا۔ اُن کے لیے ہمیں اپنی ضرورت تھی۔ ہم درمیان میں نہ ہوتے تو جانے اُن کا کیا حال ہوتا ورنہ ہمارا کیا ہے، پولیس زیادہ سے زیادہ ہمیں ساتھ لے جائے گی اور سلاخوں کے پیچھے ڈال دے گی۔ کچھ بھی ہمارے لیے نیا نہیں ہے، نہ سلاخیں نہ کٹہرا۔ اِس سے زیادہ پولیس اور کیا کرسکتی ہے۔ یہاں بدنامی اور رسوائی سے کون ہراساں ہے۔ یہ دُوں عزمی، دل تنگی، یہ شکستہ خاطری تو اُن دونوں کی خاطر تھی۔ اُن کے لیے ہمیں خود کو محفوظ رکھنا ہے، صرف چند دنوں کے لیے۔ جب تک اُن کا حوصلہ استوار نہ ہوجائے، اتنے دنوں کے لیے۔

بار بار میری نظریں شکلا پہ جاتی تھیں، اُسی سے یہ مہلت مستعار لی جاسکتی ہے۔ شکلا سے کہہ کے اُنھیں روک دیا جائے۔ وہ ایک مختلف پولیس والا ہے، کرشنا جی کی طرح۔ شکلا اپنی آنکھوں سے گیتا اور رانی کا حال دیکھ سکتا ہے مگر جولین کو میں نے شکلا کا نام یاد نہیں دلایا۔ شکلا سے اپنی تمام نسبتوں کے باوجود جانے کیوں یہ مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ اُس سے کچھ کہنے کا مطلب اپنے معاملوں میں اُسے مداخلت کی دعوت دینا ہے۔ گویا ایک سفارش کے لحاظ میں بہت سی ناگفتنیاں آشکارا کی جائیں اور قدم قدم پر اُسے ضروری غیر ضروری ہدایتوں کا استحقاق دیا جائے۔ میرا تو کچھ نہیں مگر بھل کو شاید یہ سب گوارا نہ ہو۔ بھل کا عندیہ لیے بغیر شکلا سے کوئی بات کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ہر چند کہ اب ہم سب کے بارے میں شکلا کو بے خبر نہیں رہنا چاہیے۔ کل شام گھاٹ پر جاتے وقت وہ جس اضطراب کا اظہار کر رہا تھا، اُس نے اُسے ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھنے دیا ہوگا۔ شکلا کے لیے مجھ سے تعلقِ خاطر کا تقاضا بھی تھا اور کچھ اپنے منصب کا بھی کہ وہ ہر طرح باخبر رہے۔ اگر مجھ سے وہ کچھ نہیں جان سکا تھا تو اُس کے پاس وسیلوں کی کمی نہیں تھی۔ کل سے وہ اِسی جستجو میں رہا ہوگا اور اب شاید اُسے اچھی طرح معلوم ہوگیا ہوگا کہ بھل کون ہے اور اصل میں، میں کون ہوں۔ میرے بارے میں اُس کے علم میں کوئی کمی تھی تو اب نہیں رہی ہوگی۔ جھنگا کا پاڑا چاقو کے زور پر حاصل کرنے کا واقعہ، بالم خاں کے پاڑے پر قبضہ اور بھی بہت کچھ...... ماہم کے پاڑے پر بھل کی گدی نشینی کی خبر بھی اُسے پہنچ گئی ہوگی اور خبر کاروں نے سب کچھ اپنے لب و لہجے،

اپنے مشاہدے اور تجزیے کے مطابق بتایا ہوگا ؎

کوائف کہنے والا بے تصرف رہ نہیں سکتا
بڑھانے کا اگر موقع نہ ہوگا تو گھٹائے گا

اس آگاہی کی آسودگی کے باوجود شکلا کا اضطراب کم ہونے کے بجائے فزوں ہونا چاہیے۔ کل کی نسبت اب صورتِ حال بالکل بدل گئی ہے۔ بتھل ماہم کے پاڑے بلکہ شہر کے سب سے بڑے پاڑے کا دادا ہے۔ سو شکلا کے لیے احتیاط لازم ہے۔ کل بھی وہ اسی احتیاط کے سبب سادہ لباس میں یہاں آیا تھا۔ خود مجھے بھی اُس کی حیثیت کا خیال رکھنا چاہیے۔ اُس کی حیثیت پر حرف نہ آنے کی حد تک ہی سفارش کی جا سکتی ہے۔ وہ خود بھی اِس حد سے تجاوز نہیں کرے گا۔ وہ پولیس کا ایک اعلا افسر ہے اور یہ بظاہر اُس کے لیے ایک ادنا بات ہے۔ اِس ادنا بات کی ہمارے لیے کتنی اہمیت ہے، یہ ہمی جانتے ہیں، اُسے بتا نہیں سکتے مگر شکلا جیسا ذہین اور باریک بیں افسر ہر پہلو پر غور کیے بغیر کوئی حکم ایسے ہی جاری نہیں کر دے گا۔ بتھل سے پوچھنے کی بات تو بعد کی ہے۔ شکلا کے سامنے زبان کھولنا خود مجھے کچھ نامناسب سا لگتا تھا۔ جولین نے بھی غالباً یہی کچھ سوچ کے اُس کا نام نہیں دُہرایا۔

کسی نے کچھ نہیں کہا۔ ہزار آدمی ایک سمت، ایک ہی ارادے سے دیکھیں تو سب کو ایک جیسا دکھائی دیتا ہے۔ تعداد سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہزار آدمی بھی یک جان ہو سکتے ہیں اور ہر شخص ایک نیا منظر اخذ کر سکتا ہے۔ یہ تو دیکھنے کی نیت پر، شدت اور شمولیت پر منحصر ہے۔ کون کتنا شامل ہے، کسے کتنی جستجو ہے۔ اُن تینوں کے سروں میں بھی وہی اندیشے گردش کر رہے تھے جن سے میں دوچار تھا۔ جولین کو بہت دیر ہو گئی تھی۔ اُس نے اُٹھنا چاہا تو جمرو نے اُسے روک لیا اور وہی کچھ کہا جو مال کا رہم میں سے کوئی بھی جولین سے کہتا۔ جمرو نے اُسے ہدایت کی، اگر اب وہ لوگ دوبارہ آئیں تو بھی اُنھیں یہی جواب دیا جائے اور بہتر ہے کہ جولین ہی اُن سے بات کرے۔ گویا کوئی مرد نہیں۔ جمرو کا خیال تھا کہ شاید اب وہ آئیں ہی نہیں اور اپنے پہلے ہی تاثر پر اکتفا کریں۔ اُنھیں اندازہ ہو جانا چاہیے کہ دوبارہ بھی اُنھیں یہی جواب دیا جا سکتا ہے۔ بے شک یہ امکان بھی تھا، تو پھر کسی تردد کی ضرورت ہی نہیں، پھر تو سب کچھ بعد از وقت ہے۔ اب جو کچھ بھی ہو، اُس کے لیے سینہ کھلا رکھنا چاہیے۔ اُس نے جولین سے کہا کہ وہ موقع ملتے ہی بتھل کو یہ سب بتا دے، چاہے کچھ دیر کے لیے بتھل کو گیتا کے پاس سے اُٹھانا پڑے۔

جولین کے جانے کے بعد ہم آنکھیں مسلتے ہوئے لاؤنج میں لوٹتے رہے۔ کسی کو نیند نہیں آئی۔ شہ پارہ اور فرخ چائے کا ٹرے لے کے آئیں تو وقت کا اندازہ ہوا۔ شام ہو چکی تھی۔ ہم بعجلت کمرے سے نکل آئے جیسے کوئی چوک ہو گئی ہو، جیسے گاڑی چھوٹنے والی ہو۔ باہر آ کے سب کے شانے ڈھلک گئے۔ سارا مکان خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ عمارت کے باہر فقیروں کی ٹولیاں جا چکی تھیں، اُن کی آوازیں اندر نہیں آ رہی تھیں۔ بشی چاچا نے ہر شام کی طرح ساری روشنیاں جلا دی تھیں تاکہ گھر بھر میں لحظے بھر کے لیے اندھیرے کا احساس نہ ہو۔ آدمی خود کو کیسے کیسے بہلانے کی کوشش کرتا ہے، پھر تو موت پر چراغاں ہونا چاہیے۔ ہمیں سیڑھی پر رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھے دس منٹ گزرے ہوں گے کہ ڈاکٹر کیلاش آ گیا۔ اُس کے ہمراہ ہلکے آسمانی رنگ کی ساڑی میں ملبوس رما بھی تھی۔ میں دونوں کی پذیرائی کے لیے اُٹھا تو کیلاش مجھ سے چمٹ گیا جیسے بہت دنوں کا بچھڑا ہوا ہو۔ مجھے آداب کہہ کے رما اندر چلی گئی، کیلاش میرے برابر کرسی پر بیٹھ گیا، میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبوچے ہوئے دیر تک وہ مجھے ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھتا رہا، وہ کچھ کہنے کے لیے بے تاب تھا۔ میں نے دھیمی آواز میں پوچھا "کیا بات ہے؟"

وہ مچل سا گیا "کیا حال ہے آپ کا؟" وہ بے ترتیبی سے بولا۔

"ٹھیک ہے سب۔" میں نے خوش روی سے کہا۔

"سویرے بھی میں آیا تھا، آپ نہیں تھے۔"

"اچھا۔" میں نے چونک کے کہا "کب؟"

"آپ کے جانے کے چند منٹ بعد ہی۔"

"جولی نے مجھے نہیں بتایا۔"

"میں ٹھہرا ہی کتنی دیر۔" وہ جلدی سے بولا "بس خیر خبر لے کے سیدھا اسپتال چلا گیا۔"

میں نے سوچا، اُس کا شکریہ ادا کروں لیکن اُس کی وارفتگی کے جواب میں یہ شائستگی مجھے مصنوعی لگی، یہ اُسے اُداس کر دیتی۔ میں خاموش رہا تو وہ زیرِ لبی سے بولا "گیتا نے بہت اثر لیا ہے۔" میں کیا کہتا، کوئی آدمی کسی کے لیے ساری دُنیا ہوتا ہے۔ کہنے لگا "رما کا حال بھی کچھ کم غیر نہیں ہے۔ رات گھر جانے کے بعد دیر تک جاگتی رہی اور یہی ..... یہیں کا ذکر کرتی رہی۔ مجھ سے پوچھتی تھی، بھیلی بتاؤ ہم کیا کر سکتے ہیں؟ خوشی اتنی مشکل کیوں ہوتی ہے؟ غم دینا اتنا آسان کیوں ہے؟ رات وہ یہیں رہنا چاہتی تھی، میں اُسے زبردستی ساتھ لے گیا۔"

"کیوں، کیا حرج تھا؟"

"کوئی حرج نہیں تھا، بعد میں مجھے افسوس بھی ہوا مگر کبھی کبھی مجھے اُس سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

"کیسا ڈر! وہ تو ایک نہایت ....."

میری بات اُس نے کاٹ دی۔ "وہ کبھی بہت عجیب باتیں کرنے لگتی ہے، سرکشی کی حد تک۔ اب دیکھیے آپ، یہ لباس پہن کے آئی ہے۔ میں نے منع کیا تو کہنے لگی، گیتا کو احساس ہونا چاہیے کہ زندگی ابھی بہت باقی ہے۔ گیتا میں شگفتگی کا احساس رہنا چاہیے، اِس طرح وہ جلد ہی ... میں نے اُس سے کہا مگر اور لوگ کیا کہیں گے، نہیں مانی، بولی کہ وہ لوگ دوسرے ہیں۔"

"دوسرے کیا؟"

"یہی کہ، اُس کا مطلب تھا کہ وہ مختلف لوگ ہیں۔" وہ گھبرائے ہوئے انداز میں بولا اور اُس نے وضاحت ضروری سمجھی۔ "کوئی اور بات نہیں، اُسی دن گھر پہ صرف ایک بار آپ سے کھل کے بات ہو پائی تھی، بس اُسی دن سے آپ کا چرچا ہے۔ کہتی ہے، تم نے ظہیر صاحب کو غور سے نہیں دیکھا۔ لگتا ہے، ایک نوجوان نے صدیوں کا سفر طے کیا ہے۔ وہ جتنی حقیقت پسند ہے، اتنی ہی تصوراتی بھی ہے۔ سب کو آپ کے پیمانے سے ناپتی ہے۔"

مجھے معلوم تھا کہ کیلاش کے قلب و دماغ میں کیسی ہل چل مچی ہوگی، طرح طرح کے سوال، دادا، پاڑا، چاقو، خون، پولیس۔ اُس نے اِس بابت کوئی سوال نہیں کیا کیونکہ اُسے اپنے مخاطب کے آبگینے کا احساس تھا۔ رما سے ہٹ کے وہ موسم کی باتیں کرنے لگا جو مہذب لوگوں کا شعار ہوتا ہے اور جانے کیا کیا کہتا رہا۔ میری نظریں برآمدے پر لگی تھیں۔ کانوں کے ساتھ آنکھوں کا ارتکاز بھی ضروری ہے۔ بینائی منتشر ہو تو سماعت آدھی رہ جاتی ہے تاہم میں سر ہلا کے ہوں ہاں کرتا رہا۔ بتھل باہر نہیں نکلا۔ میرا خیال تھا کہ سہ پہر کھانے کے بعد نہیں تو شام کو بتھل ضرور کسی طرف کا رُخ کرے گا۔ سارے کانٹوں کا ایک ہی مداوا، سارے سوالوں کا ایک ہی جواب ہے کہ ہم کسی طور اُن لوگوں تک پہنچ جائیں جنھوں نے اتنے بہت سے لوگوں کو درہم برہم کیا ہے۔ سب سے بڑی بندش یہی ہے۔ بتھل نے پولیس سے وقت کی رعایت حاصل کر لی تھی لیکن یہ مہلت لٹکتی ہوئی تلوار کے مانند تھی۔ معلوم ہوتا ہے، بتھل کو کوئی جلدی نہیں ہے جبھی وہ اطمینان سے اندر بیٹھا ہے۔

میں نے کیلاش کے سامنے اشارۃً جولین سے پوچھ لیا تھا کہ اُس نے پولیس کی آمد سے بتھل کو مطلع کر دیا ہے؟ اُس نے اثبات میں جواب دیا اور بتایا کہ جواب میں بتھل نے کم و بیش وہی کہا ہے جو جمرو نے کہا تھا۔ اِس کے باوجود بتھل کے سکوت کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

جمرو، شاموا اور مارٹی کے چہروں پر چھائی ہوئی دُھند بتا رہی تھی کہ وہ بھی بتھل کی اس ردوقدح کا جواز سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ بھی بس منتظر بیٹھے تھے، کبھی سبزے پر ٹہلنے لگتے، کبھی برآمدے میں چلے جاتے اور پھر آ کے وہیں میرے پاس کرسیوں پر ڈھیر ہو جاتے۔ بتھل کی تاخیر بے سبب بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ دونوں باتیں ممکن تھیں، یا تو وہ کسی سمت کی نشان دہی نہیں کر پایا تھا مگر اِس گوشہ نشینی سے تو کوئی الہام ہونے سے رہا۔ کیا وہ اتنی آسانی سے ہاتھ آ جائیں گے، ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر؟ گلی گلی کی خاک چھاننی پڑ سکتی ہے یا پھر یہ تھا کہ بتھل نے اُن لوگوں کو پہچان لیا ہے اِس لیے اُسے کوئی عجلت نہیں اور کوئی ایسا ہی یقین اور اعتماد رکھے ہوئے ہے کہ وہ لوگ اُس کی دسترس سے دُور نہیں ہیں، کسی وقت بھی وہ اُن کے سروں پر پہنچ سکتا ہے۔ اِس وقت تو پولیس ہماری نقل و حرکت پر گہری نظر رکھے ہوئے ہوگی۔ ہم جہاں بھی جائیں گے، وہ سائے کی طرح ہماری نگراں رہے گی۔ ہو سکتا ہے، بتھل کے ذہن میں بھی یہی ہو۔ اُس پر بھی یہ وقت کچھ کم گراں نہیں گزر رہا ہوگا۔ گیتا اور رانی کے چہرے دیکھ دیکھ کے اُس کا خون بہت جلتا ہوگا۔ اُن کے آنسو تو اُس کی رگوں میں سُلگتی ہوئی آگ اور بھڑکا رہے ہوں گے جیسا کہ اُس نے پولیس اسٹیشن پر کہا تھا کہ اُسے اتنی دیر کے قرض کی عادت نہیں ہے۔

مگر وہ سرفروش خود، اپنے دشمن کون ہیں جنھیں بتھل نے کھوج لیا ہے یا جو ابھی تک اُس کی نگاہ کی زد پر نہیں آ سکے ہیں۔ کل سے یہی سوال میرے سارے وجود پر منڈلا رہا تھا، میں کیا، پاڑے کا ہر دادا، علاقے کا ہر آدمی جس نے پیرا اور ماچھی کے ساتھ زندگی گزاری ہے اور جو کل اُن کی ارتھیوں پر، اپنے کسی عزیز کی موت کی طرح گریہ کناں تھے، یہ سوال اُن سب کے سینے بھی کھرچ رہا ہوگا۔ پانڈے اور سکندر نے صبح پاڑے میں کہا تھا کہ وہ لوگ ہمارے درمیان ہی کہیں موجود ہیں۔ مجھے نام یاد نہیں، کسی اور نے بھی اِس شبہے کا اظہار کیا تھا، خود میرا دل بھی یہی کہتا تھا اور میری نگاہیں مسلسل اُن سب پر بھٹکتی رہی تھیں لیکن سب کے چہرے ایک جیسے نظر آ

تھے۔ صبح باڑے پر میں نے زورا اور چھیدا سے بھی سُن گن لینے کی کوشش کی تھی اور میرے کان داداؤں کے درمیان ہونے والی قیاس آرائیوں پر لگے ہوئے تھے۔ کسی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میری طرح وہ سبھی ایک دوسرے کی ٹوہ میں لگے ہوئے تھے اور سبھی کو دادا اور ماچھی پر اُٹھنے والے ہاتھ قلم کر دینے کی بے چینی تھی۔ یہ بھی پر خون سوار معلوم ہوتا تھا، اگر وہ اُنھی میں سے کوئی تھا تو اُس نے کیسا بہروپ بھرا تھا۔

گزشتہ تین چار دن سے پیرو اندھیری کے راجن دادا کے باڑے کی دیکھ بھال کے لیے اندھیری ہی میں مقیم تھا۔ علاقے کی ایک عورت کی جان لینے کے الزام میں راجن کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ عورت سے راجن کا پرانا تعلق تھا لیکن پیرو کو یقین نہیں تھا کہ راجن جیسا دل کا زندہ دادا کسی عورت کو ختم کرنے کا گناہ بھی کر سکتا ہے۔ یہ خبر سُنتے ہی پیرو اندھیری چلا گیا تھا، بعد میں اُسی کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ اُس کا اعتماد دُرست تھا اور خاصی تگ و دو کے بعد وہ پولیس کو راجن کی بے گناہی باور کرانے میں کامیاب ہو گیا ہے اور اب راجن چند دن میں جیل سے چھوٹ کر آجائے گا لیکن ابھی اندھیری کے باڑے کی نگرانی کے لیے پیرو کا وہاں رہنا ضروری ہے۔ اندھیری کے باڑے کا ھبتا بھی ماہم کے باڑے آتا تھا، اِس لیے پیرو کی یہ منصبی ذمّےداری بھی تھی کہ وہ راجن کی مدد کو پہنچے۔ جن لوگوں نے راجن کو قتل کے الزام میں جیل بھجوایا تھا، وہ پیرو کی دخل اندازی سے خوش نہیں ہوں گے۔ پیرو راجن کے لیے ثبوت اور شہادتیں جمع کر رہا تھا اور اُس نے اندھیری کے علاقے میں جا کے باڑا منتشر نہیں ہونے دیا تھا۔ راجن کی زندگی، اُسے ناپسند کرنے والوں کی موت تھی۔ اُسے جیل سے چھڑا کے پیرو کا اُن لوگوں کی طرف پلٹنا لازم تھا۔

راجن کے بدخواہ خود اُس کے باڑے کے دادا بھی ہو سکتے ہیں، دوسرے باڑوں کے دادا بھی لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ دادا ہی ہوں اور اُن کا تعلق باڑے ہی سے ہو۔ وہ کرائے کے آدمی بھی ہو سکتے ہیں۔ ڈاکو قسم کے ورنہ پیرو کو اُنھیں شناخت کرنے یا اُن کی جانب پولیس کو اشارہ کرنے میں اتنی دیر کیوں لگتی۔ جن لوگوں نے اُنھیں کرائے پر حاصل کیا تھا، وہ اندھیری کے بااثر اور صاحبِ حیثیت لوگ ہی ہوں گے۔ سنا ہے، راجن بل کا پکّا اور خون کا کچا ہے۔ اُس کا خون ذرا سی تپش سے بھڑک جاتا ہے! ایسا دادا کبھی نہ کبھی نقصان ضرور اُٹھاتا ہے، اندھیری کا باڑا بھی اُن تین باڑوں میں شامل تھا جس نے پیرو کی عدم موجودی کے دوران ماہم کے باڑے پر ھبتا بھیجنا بند کر دیا تھا لیکن پیرو کو راجن کے پاس جانے کی ضرورت نہیں پڑی جیسا کہ وہ بائی کلا کے دادا دینا اور قلابے کے دادا جارجی کو خبردار کرنے گیا تھا کہ وہ کل صبح تک اُس کے باڑے پر ھبتا پہنچا دیں تو خیر ہے۔ راجن کے پاس بھی پیرو کو جانا تھا مگر دوسری صبح خود راجن ماہم کے باڑے پر ھبتے کی پوٹلی لے کر حاضر ہو گیا۔ میں نے اُسی روز اُسے دیکھا تھا۔ وضع قطع اور لب و لہجے سے وہ پختہ کار اور ارادے کا مضبوط دادا نظر آتا تھا۔ اندھیری کے علاقے میں اُلٹا سیدھا کاروبار کرنے والے بہت سے سیٹھوں کو اُس سے خار کھانا چاہیے۔ پیرو نے واضح طور پر کچھ نہیں بتایا تھا لیکن اُس کی باتوں سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ راجن کا قصہ پاک کرنے کے لیے علاقے کے کسی جوشیلے رُپے پیسے والے نے کرائے کے آدمی خرید کے راجن کی محبوب عورت کو آڑ بنا لیا۔

عجب نہیں، جن لوگوں نے اُس عورت کو ختم کیا ہے، اُنھوں نے ہی دادا کا تعاقب کیا ہو۔ اگر وہ واقعی باڑے کے آدمی نہیں تھے تو اُن تک پہنچنا ایسا آسان نہیں ہے۔ اِس سے پہلے اندھیری کے اُن امیر کبیر لوگوں کو شناخت کرنا چاہیے جو راجن کی حکمرانی سے نالاں تھے اور جو اوپر بیٹھے بس ڈوریاں کھینچتے اور ڈھیل دیتے رہتے تھے۔ پرسوں رات جب پیرو، ماچھی کے ساتھ کانتے کے چالیسویں پر جولین کے گھر آیا تھا تو دیر تک بتھل سے باتیں کرتا رہا تھا۔ ہو سکتا ہے، اُس نے اِس سلسلے میں بتھل کو کچھ بتایا ہو، پھر تو وہ سب کچھ بتھل تک محدود ہوگا اور جب تک بتھل چاہے گا، اُسی تک محدود رہے گا۔ اندھیری کے باڑے کے آدمی راجن سے ناراض اپنے ہر ساتھی اور دوسرے باڑوں کے داداؤں اور اپنے علاقے کے امیر کبیر لوگوں سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔ سب سے زیادہ تو راجن اُنھیں جانتا ہوگا۔ باڑے کے آدمی نفرت و عداوت کی بُو جلد سُونگھ لیتے ہیں۔ راجن نے یا اُس کے ساتھیوں میں سے کسی نے کسی کی جانب شک ظاہر نہیں کیا ہے تو اِس کا یہی مطلب ہے کہ وہ بھی کچھ طے نہیں کر پائے ہیں، وہ بھی تذبذب میں ہیں۔ راجن کا کوئی ایسا نمایاں حریف نہیں تھا جس کی جانب بے دریغ، بے تردد انگلی اُٹھا دی جائے۔

اُدھر اندھیری کی پولیس کو بھی خوب معلوم تھا کہ راجن کی وکالت کے لیے پیرو اندھیری کے باڑے پر آچکا ہے۔ تین چار دن کی اِس مدت کے دوران راجن سے ملنے کے لیے پیرو کا کئی بار اندھیری کے تھانے پر بھی جانا ہوا ہوگا۔ پولیس بھی اِس اندیشے سے بے خبر نہ ہوگی کہ کسی نے راجن کے لیے پیرو کو اُس کی فعالیت کی سزا تو نہیں دی ہے۔ ایک شخص کو راستے سے ہٹا دیا گیا جو راجن کے لیے سپر

بنا ہوا تھا۔ ایک راجن کو ہٹانے سے کیا حاصل ہوا، اب ایک ایسا شخص اندھیری کے باڑے پر موجود ہے جو کئی راجنوں کا حاصل جمع ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پیرو نے اُنھیں پہچان لیا ہو اور دانستہ تامل کر رہا ہو، اُس کے خیال میں پہلا مرحلہ راجن کے دفاع کا ہوگا۔ راجن کو محفوظ کرنے کے بعد وہ دوسرے مرحلے پر عمل کرتا۔ باڑے کے آزمودہ کار دادا کا یہی طور ہونا چاہیے۔ بتھل بھی یہی کچھ کر رہا تھا لیکن کبھی کبھی ذرا سا تامل بہت گراں پڑ جاتا ہے، زندگی کی قیمت پر۔ کوئی آدمی مرتے وقت یا کسی کو مارتے وقت یہ نہیں سوچتا کہ ایک آدمی کی زندگی صرف اُس کی نہیں ہوتی اور بھی کئی زندگیاں اُس میں شامل ہوتی ہیں۔

اور اگر یہ سب میرا قیاس ہے کہ پہلے اندھیری کی طرف قدم اُٹھانا چاہیے، اندھیری ہی سے کوئی سلسلہ نکلتا ہے تو پھر دوسرا کون ہے۔ جارجی کے خیال نے کئی بار میری آنکھیں انگارا کی تھیں اُس کا نام آنے پر کئی بار میرے سارے جسم میں آگ لگی تھی مگر جب بھی اُس کی طرف نظر جاتی، وہ اپنا ہی کوئی چہرہ، اپنا ہی کوئی عکس نظر آتا تھا۔ آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی لال لال آنکھیں، سُتا ہوا زرد چہرہ، ٹوٹا پھوٹا سا کوئی جسم۔ وہ اتنا ہی آزردہ اور شکستہ خاطر تھا جتنا پیرو سے رفاقت کا کوئی بھی مدعی ہو سکتا تھا۔ گلیا اور لچھمی نے مجھے بتایا تھا کہ جس رات دادا اور ماچھی پر گولی چلی تھی، جارجی باڑے پر موجود تھا۔ پہلے ہی کئی دن سے وہ وہاں تھا بلکہ جس رات پیرو نے اُس کے جوئے اور شراب کے اڈّے پر اچانک پہنچ کے اُس کی گوشمالی کی تھی، اُس کے بعد سے جارجی بیشتر ماہم کے باڑے پر دھرنا دیے بیٹھا رہا تھا۔ آخر پیرو نے اُسے معاف کر دیا تھا۔ اُس نے جارجی سے قلابے کا باڑا نہیں چھینا۔ اِس کی وجہ صرف یہ نہیں تھی کہ جارجی نے پیرو کے حکم کی تعمیل میں فی الفور اپنے خفیہ اڈّے کا کاروبار بند کر دیا تھا، اِس کا سبب یہ بھی ہوگا کہ جارجی، ماری کا شوہر تھا اور ماری پیرو کو بہت عزیز تھی، اپنی بیٹی کی طرح۔ دونوں ابتدا ہی سے پیرو کے سامنے رہے تھے۔ دونوں کی شادی بھی اُسی نے کرائی تھی۔ پیرو ہی نے جارجی کے بازو کوٹ کوٹ کے اُسے زور آزما بنایا تھا، اُس کی اُنگلیوں کو چاقو کا مزا آشنا کیا تھا۔ پیرو ہی نے جارجی کو قلابے کے باڑے کی گدی پر بٹھایا تھا۔

بمبئی آنے کی دوسری رات کا واقعہ ہے، ڈیڑھ مہینے پہلے جب پیرو میرے اور بتھل کے ساتھ اُس کے ساحلی اڈّے پہنچا تھا۔ جارجی اُس وقت نشے میں چُور تھا، دوسرے دن وہ باڑے پر ھبتا لے کے آیا تو سرتاپا خجالت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اِس عرصے میں وہ مسلسل پیرو کا تکدر دُور کرنے، اُس کی نظروں میں اپنا کھویا ہوا مرتبہ بحال کرنے کی کوشش میں لگا رہا۔ پیرو سے اپنی سفارش کے لیے اُس نے باڑے کے ہر آدمی کی، یہاں تک کہ میری اور بتھل کی خوشنودی حاصل کرنا چاہی تھی۔ میرا جی نہیں مانتا تھا کہ وہ جارجی ہو سکتا ہے۔ اُس میں اتنی جرأت کہاں سے آتی۔ پیرو نے اُس کے ساتھ ایسا بُرا بھی کیا کیا تھا۔ اُس نے اُسے بس چوری چھپے کا کاروبار بند کرنے کا حکم دیا تھا، بازاری عورتوں کا کاروبار، جو باڑے کے دادا کا شیوہ نہیں ہے۔ پیرو نے اُسے باڑا بدر نہیں کیا تھا اور اُس کی اُنگلیاں نہیں کاٹ لی تھیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے چاقو سے محروم ہو جاتا۔ سب کو معلوم تھا کہ جارجی بل کا کتنا ہی کھرا ہو، پیرو کے بغیر آدھا بھی نہیں ہے۔ پیرو کے دم سے تو شہر میں اُس کا اعتبار فزوں ہوتا تھا۔ ہر جنون کا کوئی جواز ہوتا ہے۔ اتنی بڑی دیوانگی کے لیے کوئی بڑی ضد، کوئی بڑا جواز چاہیے۔ جارجی ایسا دیوانہ نہیں لگتا تھا۔ وہ ہوتا تو بتھل کبھی کا اُس کی گردن دبوچ لیتا اور بتھل کا وقت ہی نہ آتا، باڑے کے آدمی اُس سے پہلے ہی اُس کے ٹکڑے کر ڈالتے۔ جارجی بھی خود سب کے درمیان اِس طرح موجود نہ رہتا۔ باڑے میں کسی ایک کی نظر تو اُس پہ جا کے ٹھیرتی۔

میرے سر میں ریت اُڑ رہی تھی اور یہ میرے دماغ ہی کا فتور تھا کہ حیدرآباد سے ہمارے تعاقب میں آنے والے دو آدمیوں کو بھی میں نے کٹہرے میں کھڑے دیکھا۔ وہ دونوں کئی دن تک ماہم کے باڑے کی ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں بند رہے تھے۔ ہفتے ہوئے، اُنھیں چھوڑ دیا گیا تھا کیوں کہ جو کچھ وہ بتا چکے تھے، اِس سے زیادہ ممکن نہیں تھا۔ بزدلوں کو اِس سے زیادہ اذیت کی استطاعت نہیں ہوتی۔ گلیا اور لچھمی جس پردہ پوشی سے اُنھیں باڑے لائے تھے، اُسی بے خبری کی حالت میں اُنھیں کسی جگہ چھوڑ آئے تھے۔ ہمارے ٹھکانوں کے کسی راستے سے وہ واقف نہیں ہو سکے تھے۔ اُن کی حالت ہی اِس قابل نہ تھی کہ وہ مزید ایک دن بھی بمبئی میں ٹھیر سکیں۔ اُنھوں نے سیدھے حیدرآباد کا رُخ کیا ہوگا اور جلد سے جلد اپنے آقا نواب حشمت جنگ کے خاص معتمد نسبت شاہ خاں کی خدمت میں حاضر ہو کے سارا ماجرا گوش گزار کیا ہوگا۔ اُنھیں مزید کمک کے ساتھ بمبئی جیسے شہر میں از سرِ نو ہماری تلاش، ہماری نقل و حرکت پر نظر رکھنے اور موقع ملتے ہی گولی مار دینے کا حکم دے کے دوبارہ بمبئی بھیج دیے جانے کا امکان نہایت موہوم معلوم ہوتا تھا۔ اُن کا مقصد صرف ایک تھا، اباجان کے پاس لعل و جواہر کے ذخیرے کا سُراغ لگانا۔ اُس کی تکمیل کے لیے ہماری

زندگی شرط تھی۔

سفر کے دوران بھرپور بھرکے دو آدمیوں کو ہم نے ریل سے پھینک دیا تھا اور دوسرے ڈبوں میں تیار بیٹھے اُن کے مسلح ساتھیوں کو ناکام لوٹا دیا تھا۔ انھوں نے کسی اور نواب، نواب قطب الدین علی کا نام بتایا تھا۔ اُن کے بیان کے مطابق اُس کے مطلوب بھی ہیرے جواہر تھے۔ ریل میں بیتی ہوئی ساری رُوداد سُن کے اُس طالع آزما نواب کا پیمانہ بہت لبریز ہوا ہوگا۔ صاحبانِ زر کے پیمانے جلد لبریز ہو جاتے ہیں۔ اِس کی وجہ نازکی کے علاوہ تنگی بھی ہو سکتی ہے ہر چند کہ اِس آتشِ غضب میں ہماری شکر گزاری کا ایک پہلو بھی نواب کے پیشِ نگاہ رہنا چاہیے، ہم نے اُس کے زر خریدوں کو گٹھری میں بند کر کے چلتی ریل سے زمین پر صرف لڑھکا دیا تھا، ختم نہیں کیا تھا مگر آدمی کا کیا ہے۔ دنیا میں سب سے گراں اور سب سے ارزاں چیز آدمی ہے۔ نقد اُدھار ہر بھاؤ پر مل جاتا ہے۔ نہ ملے تو ساری دُنیا کے خزانے بھی تھوڑے ہیں۔ ممکن ہے، واپس جانے والوں نے اپنی ہزیمت کے انتشار میں نواب کے روبرو یہ اعتراف بھی کر لیا ہو کہ انھیں ہمارے سامنے اپنے فرستادے کا نام بھی بتانے پر مجبور ہونا پڑا۔ یہ انکشاف مستزاد تھا، ایک اور تازیانہ۔ یہ جان کے نواب قطب الدین علی کی رگوں میں بھڑکتا ہوا خون ایک لمحے کے لیے ضرور جم گیا ہوگا۔

اگر وہ وہی تھا جس نے حیدرآباد میں اباجان کی حویلی پر شب خوں مارنے کے لیے ۲۴ مسلح زور آوروں کا دستہ بھیجا تھا تو وہ ہم سے خوب واقف تھا۔ اُس وقت رہ جانے والی کوئی کمی ہمارے تعاقب کے سفر سے واپس آنے والوں نے پوری کر دی ہوگی۔ اتنی شناسائی آئندہ کے لیے احتیاط کا سبب ہونی چاہیے تاہم حالتِ اشتعال میں احتیاط کی تلقین کبھی اور زہر گھول دیتی ہے۔ حیدرآباد کے اُن اقبال مندوں کے پاس مال و زر کی کمی ہے نہ زور و اثر کی۔ ایسے میں ارادے خود رو پودوں کی طرح آدمی کے سر میں اُگتے ہیں۔ نواب حشمت جنگ کے تزک و احتشام، لاؤ لشکر کا منظر ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ نواب قطب الدین علی بھی اُس کا کوئی ہم سر ہوگا۔ وہ ایک فوج کی فوج تیار کر کے ہماری سرکوبی کی مہم پر روانہ کر سکتے ہیں کہ ہم میں سے ایک ایک کو چن چن کے ختم کر دیا جائے اور یوں حیدرآباد میں ہمارے پلٹنے کی نوبت ہی کیوں آئے۔ یہ اُن کا آبائی مشغلہ ہے۔ ریاست میں وارد ہو کے ہم اور کچھ نہیں تو اُن کے حواس ضرور منتشر کر سکتے ہیں۔ ریاست سے باہر انھیں اپنی عزت و حرمت پر آنچ آنے کا کھٹکا بھی نہیں ہے۔ اباجان کی حویلی کے نقب زن، سفر میں ہمارا پیچھا کرنے والے، شہر کے تمام اڈوں کے دادا، عالم [illegible] کے محل کے ملازمین، شہر میں کتنی آنکھوں کو ہمارے نقش و نگار ازبر [illegible] گے، سو بمبئی میں ہماری کھوج کچھ ایسی مشکل بھی نہیں ہے۔ اِس [illegible] لیے وہ یہاں کے پارٹوں کے داداؤں سے بھی مدد لے سکتے ہیں اگر [illegible] کے آدمیوں کی خدمات بھی خرید سکتے ہیں۔ وہ آدمی سے زیادہ ن[illegible] ہیں۔ پہلے ہی انھوں نے کون سے کم درجے کے فیصلے کیے تھے۔ ریل [illegible] ہم نے جن دو بہروپیوں کو پکڑا تھا، اُن کے پاس ہتھیار تھے اور [illegible] کے کہنے کے مطابق، انھیں حکم دیا گیا تھا کہ ضرورت پڑنے پر وہ ذر[illegible] بھی تامل نہ کریں۔ ہتھیار کی موجودگی سے اور مراد بھی کیا ہوتی ہے۔

اِن تمام دُور دراز اندیشوں کے باوجود میرا دل انھیں یہ یک جنبشِ لب مسترد کر دیتا تھا۔ یہ سب مجھے اپنے حواس کا فشار، اپنے اعـ[illegible] کا خلفشار لگتا تھا۔ وہ چاہے نواب حشمت جنگ ہو، نواب قطب الدین علی، مہاراجا دھرم ویر، یا کوئی اور نواب راجا۔ وہ آدمیوں سے زیا[دہ] پتھروں کے شائق ہیں۔ مکین سے زیادہ مکان کے مشتاق۔ پہلے انھیں اِس امر کا یقین کرنا چاہیے۔ ہماری تحویل میں نوادر کا کوئی بیش بہا خزینہ ہے بھی یا یہ محض دیوانے کا خواب ہے۔ اِس تعین کے بعد انھیں ہمارے سلسلے میں کسی تشویش و توحش کی ویسے بھی حاجت نہیں۔ ہماری جانب سے کسی ردِ عمل کا خدشہ پیشِ نظر ہوگا تو اُس سے نمٹنے کے لیے ریاست کی حدود ہی زیادہ موزوں ہیں، اپنی حدود، زیادہ یقینی، زیادہ اعتباری، جہاں زمین اُن کی، آسمان اُن کا، حکم اُن کا، محکوم اُن کے، جہاں سب کچھ اُن کی دسترس میں ہے۔ وہ بس اتنے پر اکتفا کریں، وہیں ہماری آمد کا انتظار کیوں نہ کریں۔ نواب حشمت جنگ کو تو ہماری واپسی کا ایک مستقل گداز حاصل ہے کہ خانم وہاں موجود ہے، کسی یرغمال کے طور پر۔ یہ بات دوسروں کے لیے بھی کچھ کم وجہِ قرار نہیں ہے۔

اُن کی دانست میں اُن کے جاہ و حشم کا اندازہ ہمیں خوب ہوگا۔ ہماری مشاقی، مستعدی، عزم اور ارادے کا سچ اپنی جگہ لیکن اُن کی سطوت و شوکت بھی کوئی افسانہ نہیں۔ بڑی حقیقت چھوٹی حقیقت کو مٹا نہیں دیتی تو اوجھل ضرور کر دیتی ہے۔ اُن کے خیال میں ریاست میں گزرے ہوئے شب و روز ہم اتنی جلدی نہیں بھولے ہوں گے، اُن کے نجی قید خانے، مسلح خدمت گار، اُن کی اپنی عدالتیں۔ نواب جہاں تاب کی حویلی کا مجلس بھی ہمیں خوب یاد ہوگا اور بھی بہت کچھ۔ سو ہماری جانب سے کسی عاجلانہ، عاقبت نااندیشانہ ردِ عمل کا امکان قرینِ قیاس نہیں، قرینِ عقل بھی نہیں ہے۔ حیدرآباد آ کے ہماری طرف سے کسی ممکنہ اقدام کا خدشہ انھیں اُسی قدر ہوگا جو ہوش

[ب]ندی کا تقاضا ہے۔ انھیں تو اب ہمیں ایک دوسرا ہی تاثر دینا چاہیے، [ب]ے نیازی کا، تجاہلِ عارفانہ کا، استغنا کا تاکہ ریاست میں کسی طور [ج]لد از جلد ہماری آمد ممکن ہو سکے۔ اپنے آدمیوں کی واپسی پر پتھروں [ک]ے لیے اُن کی بے کلی اور سوا ہونی چاہیے۔ انھیں بتایا گیا ہوگا کہ ہم [ک]تنے بیدار، کیسے اپنے سائے سے بھی محتاط سفر کرتے رہے ہیں۔ ہم نے [بم]بئی اُتر کے اپنے ٹھکانوں کی ہوا تک نہ لگنے دی۔ ہم اُن دونوں [ک]و اندھا کر کے کس طرح اپنی منزل تک لے گئے تھے اور کس طرح اُن کی آنکھ کھلی تو وہ کوڑے کے ڈھیر پر پڑے تھے۔ سارے سفر میں، ہم اباجان کو حصار میں لیے رہے۔ اباجان جیسے ایک مختلف شخص کے ساتھ اتنے لوگوں کی ہمہ وقت موجودی کس طرف اشارہ کرتی ہے۔ یہ نگہ داری، نگہبانی کس متاع کی حفاظت کے لیے ہے۔ کسی قیمتی شخص ہی کو اتنے پاسبانوں کی ضرورت پڑتی ہے اور ایسے پاسبان؟ اُن دونوں نامرادوں نے اپنی بدبختی کا جواز پیدا کرنے کے لیے کچھ اور بھی حاشیہ آرائی کی ہوگی۔ یہ سب اُن کے آقاؤں کی جستجو کو سند دینے، اُن کا عزم تازہ کرنے کے مترادف ہے۔ ہماری ہر مزاحمت پر اُن کی لَو اور بڑھنا چاہیے، ہم انھیں اور زیادہ مطلوب، اور زیادہ مرغوب ہونے چاہییں، کجا یہ کہ وہ ہماری نابودی کے درپے ہوں۔ وہ پارٹے کے آدمی نہیں، نواب لوگ ہیں۔ اُن کے آبا و اجداد نے ورثے میں کوئی نامکمل حکایت بھی نہیں چھوڑی ہے۔ انھیں ہمارا حوصلہ بہ قدرِ ہوش ہی آزمانا چاہیے۔ ہوش سے بے گانہ تو پھر کچھ نہیں دیکھتا۔ وہ کتنے ہی بد دماغ ہوں، بے دماغ نہیں ہیں۔ انھیں ہماری کمی بیشی سے کیا غرض ہو سکتی ہے۔ دہشت مراد ہے تو اِس طرح گویا ہماری واپسی کے راستے بند کرنا، ہمیں کھو دینا اور ہمیں خود سے دُور کر دینا ہے۔ اتنا جان بوجھ کے تو انھیں ہمارا خیال رکھنا چاہیے۔ اُن کیمیا گر راز دانوں اور چشم دید گواہوں کی طرح جن کے مٹ جانے سے سب خاک بُرد ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر کیلاش، جمو، شامو اور مارٹی میرے اردگرد کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ہوا میں خنکی تھی۔ جولین نے کیلاش کے لیے چائے کا اہتمام کیا تھا۔ مَیں نے بھی اُن کا ساتھ دیا۔ جسم و جاں کی موجودی کیسا سراب ہے۔ ہوش و حواس کی یک جائی، ارادہ و خیال کے بغیر کیسی عجیب۔ آدمی کا سامنے رہنا اُس کی موجودی کی شہادت نہیں، آدمی محض جسم نہیں ہوتا، کسی بُت کی طرح۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کوئی کتنا وہاں موجود ہے جہاں نظر آتا ہے۔ کون کس گمان، کس تصور، کس دُنیا میں ہے، یہ خود ہی جانتا ہے۔ شاید ہر آدمی کے ساتھ یہی ہے، موجود ناموجود، حاضر غائب، کبھی پورا، کبھی اُدھورا، بٹا بٹا سا، پھر یہ اصرار کیا معنی رکھتا ہے کہ آدمی نظروں کے سامنے ہی رہے؟ شاید اِس لیے کہ اِس طرح کسی نہ کسی لمحے کلی طور پر اُس کے موجود رہنے کا امکان رہتا ہے ورنہ تو کچھ بھی نہیں۔ مگر سُنا ہے، آدمی کہیں بھی ہو، اُس کی صدا پہنچ جاتی ہے بشرطیکہ صدا میں کوئی کھوٹ نہ ہو اور اُسے کوئی سننے کا بھی منتظر ہو۔ لوگ کہتے ہیں کہ سمندروں پار بھی رشتہ قائم رہتا ہے، نفس کا رشتہ۔ بشرطیکہ دوسری جانب بھی کوئی بہت مشتاق ہو۔ یہ لہروں کا سفر ہے اور بے حد و حساب ہے۔ لوگ اور بھی کیا کچھ کہتے ہیں۔ کون جانے اِس میں کتنی شاعری، کتنا فسانہ ہے یا بعض رحم دل لوگوں نے ستم زدگاں کے لیے کچھ ایسی باتیں عام کر رکھی ہیں پر کبھی کبھی یہ بہت سچ لگتا ہے۔ مَیں خود اِس کا شاہد ہوں۔ کبھی مجھے ایسا لگتا ہے، کورا میرے قریب کہیں موجود ہے، وہ مجھے آواز دے رہی ہے، مجھے یاد کر رہی ہے، میرے لیے رو رہی ہے۔ ایسا ہے تو میری آواز بھی ضرور اُس تک پہنچتی ہوگی۔

ہمیں وہاں بیٹھے بیٹھے خاصی دیر ہو گئی۔ بتھل باہر نہیں آیا۔ جولین اور شہ پارہ کھانا تیار ہونے کی اطلاع دینے آئیں تو کسی نے عذر نہیں کیا۔ بتھل کو مَیں نے وہیں بیرونی کمرے میں دسترخوان پر بیٹھے دیکھا۔ سُوجے ہوئے پپوٹے، بھاری بھاری چہرہ لیکن یہ ایک سکون آمیز خاموشی تھی بلکہ حسرت آمیز۔ بے صدا کھنڈروں اور بے برگ درختوں کا سا سکوت۔ مَیں نے بتھل کو غور سے دیکھا۔ اُس کی پیشانی پر اضطراب کی کوئی علامت نہیں تھی، یہ کوئی اور کیفیت تھی، اِس میں نہ کھنڈروں کی مردم بیزاری تھی نہ ننگے درختوں کی بے حسی۔ و[ہ] اور گیتا دونوں اپنے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں ہی کا جزو معلوم ہو[تے] تھے، اُن سے الگ نہیں۔ مَیں نے بھی گرد جھاڑنے اور بہ ہمہ ہوش و حواس اُن میں شامل ہونے کی کوشش کی مگر ہر بات اختیار میں نہیں ہوتی۔ یہ قدرت آدمی میں پیدا ہو جائے تو کمی کس بات کی۔ میرے سارے جسم سے جیسے بچھو چمٹے ہوئے تھے جو بار بار ڈنک مار کے رگیں کر دیتے تھے۔

کھانے کے بعد ابھی سب وہیں بیٹھے تھے کہ میں چپکے سے اُٹھ کے باہر چلا آیا۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑنی شروع ہو گئی تھی۔ مَیں سبزے پر اِدھر سے اُدھر چکر لگاتا رہا۔ چند ہی لمحوں میں اِس تنہائی سے میرا دل گھبرانے لگا۔ جانے کیا بات تھی جو کوئی باہر نہیں آیا تھا۔ میں دوبا[رہ] اندر جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ یکایک ایک خیال نے میرے قدم منجـ[مد]

کر دیئے۔ مجھے یاد آیا، حیدرآباد میں ہم نواب ثروت یار کو اپنا پتہ بتا کے آئے تھے وہی نواب ثروت یار جس کا پتہ مولوی صاحب نے مراد آباد کے مسافرخانے کے رجسٹر میں اپنی قیام گاہ کے طور پر درج کرایا تھا اور جسے دیکھ کے میں کچھ اور دیکھنا سُننا بھول گیا تھا۔ میں نے پیرو سے صرف ایک ان کے لیے حیدرآباد جانے کی ضد کی تھی اور اُن سب کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنا راستہ بدل دیں۔ میں اُس وقت یہ عجلت نہ کرتا، ایک ذرا تحمل کر لیتا تو سب کچھ اتنے تواتر سے پیش نہ آتا۔ نہ ہم حیدرآباد کا رُخ کرتے، نہ سونیا ملتی۔ آدمی کو خواب کیسے زندہ رکھتے ہیں، میری صورت نے اُس کے خواب چھین لیے۔ میں نے اپنا فسوں ہی توڑ دیا۔ نواب جہاں تاب کا زنداں، ابّا جان کے منہ پر طمانچے، ابّا جان کا گریبان تار تار ہونے کا منظر، آدمی کی بینائی چلی جائے تو بھی بعض منظر اوجھل نہیں ہوتے۔ نواب عالم تاب کی سانس بھی کسی آس میں اٹکی ہوئی تھی، زندگی تو باقی تھی۔ خانم بھی کیسی آزمائش سے دوچار ہوئی۔ نہ ہم وہاں جاتے، نہ ابّا جان کو اپنے لعل و جواہر کی پوٹلی کھولنی پڑتی۔ اُس ادھورے پتھر کی چمک نے کتنے لوگوں کی آنکھیں چندھیا دی تھیں۔ کاتنے بھی اُس کی بھینٹ چڑھ گیا اور وہاں جانے سے حاصل کیا ہوا؟

حیدرآباد پہنچتے ہی ہوٹل میں اپنا بندوبست کر کے میں اور پیرو، نواب ثروت کے مکان کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔ اُسی پہلی ملاقات میں ہم نے نواب کو بمبئی کا پتہ بتایا تھا۔ کسے معلوم تھا کہ دوسری ہی گھڑی حیدرآباد کی زمین ہمارے لیے کتنی تنگ ہو جائے گی۔ درمیان کے سترہ دن برتنے کے بعد ہم نواب ثروت یار کے پاس جاتے تو شاید بمبئی کا پتہ کبھی نہ لکھواتے۔ دوسری ملاقات میں اُس نے بتایا تھا کہ اُسے ہمارا پتہ یاد ہے۔ دوسری بار ہم بمبئی روانہ ہونے سے ایک پہر پہلے اُس کے گھر گئے تھے۔ نواب حشمت جنگ کی موٹر ہماری تحویل میں تھی اور دادا نے احتیاطاً نواب ثروت کے مکان سے خاصی دُور موٹر رکوائی تھی۔ باقی راستہ ہم نے پیدل طے کیا تھا اور اچھی طرح یقین کر لیا تھا کہ کوئی ہمارا تعاقب نہیں کر رہا ہے مگر ہماری آنکھیں دھوکا بھی کھا سکتی ہیں۔ بعد میں نواب حشمت جنگ کے ڈرائیور کی نشان دہی پر ہمارے دیوانے اُس علاقے کے بلکہ اردگرد کے ایک ایک مکان پر جا کے دستک دے سکتے ہیں کہ ایسی شکل و صورت کے دو آدمی فلاں فلاں وقت اُن کے ہاں آئے تھے کہ نہیں۔ نواب ثروت یار نے ہماری آمد کا مقصد انھیں کھُل کے بتایا ہوگا۔ چھُپانے کی اُسے ضرورت بھی کیا تھی، ہم نے اُسے جولین کے گھر کا پتہ بتا دیا تھا۔ جولین کے گھر کے قریب ہی گولی چلی تھی۔ سامنے پیرو اور ماچھی آ گئے، اُن کے ساتھ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی زد پر آ جاتا۔ اگر یہ سب اُسی زنجیر کی ایک کڑی ہے تو یہ سلسلہ دادا ہی پر تمام کیوں ہو گیا۔ ابھی دوسرے کئی باقی ہیں۔ جمرو، شامو، مارٹی، زورا، ٹنگو، ابّا جان، منیر علی، میں اور بتھل۔ سبھی حیدرآباد میں تھے۔ دوسروں کی باری بھی جلد آ سکتی ہے۔ اب نہیں تو چند دن بعد وقت کے کچھ ٹھیر جانے پر، شہر میں پولیس کا جوش ٹھنڈا پڑنے پر۔ جولین کے گھر سے اُنھوں نے ہر شخص کا تعاقب کیا ہوگا اور اُنھیں ہمارے سارے ٹھکانے معلوم ہو گئے ہوں گے۔ پاڑا، ابّا جان کا گھر، پیرو کا گھر.......

میرا سر بھن بھنا رہا تھا۔ بتھل نے بھی اِس پہلو پہ کچھ سوچا یا نہیں؟ میرے جی میں آئی کہ فوراً بتھل کے پاس جا کے اُسے بتاؤں۔ میں نے جھپٹتے قدموں سے برآمدہ طے کر لیا تھا لیکن اندر کمرے میں جاتے جاتے ٹھیر گیا۔ اتنے لوگوں کی موجودی میں بتھل کو اُٹھانا مناسب نہیں، سب منتشر ہو جائیں گے لیکن یہی ایک بات نہیں تھی جس نے میرے قدم جکڑ لیے تھے۔ یہ دلیل اپنی جگہ برقرار تھی کہ اُنھیں اپنے سوال کا حتمی جواب ملنے کے بعد ہی اِس کشت و خون کا فیصلہ کرنا چاہیے۔ کیا اُنھیں اُن کے سوال کا جواب مل گیا یا اُنھیں آدمیوں سے اتنا سروکار نہیں جتنا پتھروں سے ہے۔ ہم کسی خزینے کے راستے کی دیوار بنے ہوئے ہیں تو بے شک یہ دیوار ڈھا دینا چاہیے مگر اِس یقین کے بعد کہ پیچھے کوئی خزینہ واقعی موجود ہے یا یہ محض نظر کا فریب ہے۔ نواب ثروت یار کے ذریعے اُنھیں ہمارا پتہ معلوم ہو گیا تھا تو اپنے آدمیوں کو ایک اجنبی شہر میں بھیجنے اور خطرے میں ڈالنے سے بہتر یہ تھا کہ وہ نواب ثروت یار ہی کی جانب سے ایک خط لکھوا کے ہمیں حیدرآباد بلا لیتے یا کہیں اور، اپنی کسی جاگیر میں، جہاں پرندے بھی اُن کی اجازت سے پرواز کرتے ہیں۔ نواب ثروت کا یہ چند لفظی خط ہی بہت ہوتا کہ مولوی صاحب اور کورا فلاں شہر، فلاں گاؤں میں موجود ہیں۔ ہم کسی تاخیر کے بغیر وہاں پہنچ جاتے۔ نواب ثروت یار کی جانب سے ایسا کوئی خط ہمیں نہیں ملا تو یہی مراد ہے کہ وہ اُس تک پہنچنے میں ناکام رہے ہیں ورنہ اِس سے محفوظ اور یقینی تدبیر کون سی تھی۔

میرا جسم لوٹ رہا تھا۔ میں سبزے پر رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور میں نے آنکھیں موند کے اپنے آپ سے نجات پانے کی کوشش کی۔ پھوار سے کپڑے گیلے ہو گئے تھے۔ اندر سے کوئی بھی نہیں آیا۔ میں وہیں تنہا بیٹھا رہا اور از خود مجھ پر غفلت سی طاری ہو گئی۔ شاید اِس لیے کہ اتنا ہی میرے بس میں تھا۔ سر بھی تو کسی پیمانے کے مانند ہوتا ہے لیکن

[...]نشانیوں کا یہ وقفہ دم لینے کا سا تھا۔ میرے رگ و پے میں پھر وہی [...]لبلی ہونے لگی۔ نواب ثروت یار کی طرف سے اب اگر کوئی خط آئے بھی تو [اُ]ن کی صداقت کا کیا بھروسا؟ کیا کسوٹی ہے؟ وہ یقیناً جھوٹا خط ہوگا۔ [م]ولوی صاحب جس انداز سے اُس کے گھر سے گئے ہیں، اُن کے لوٹنے [کا] سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ ایسی جگہ کیوں آئیں گے جہاں میرے [آ]نے کی امید ہو، جو گھر میں نے دیکھ لیا ہو۔ نواب نے بتایا تھا کہ مولوی صاحب [نے] میرا پتہ معلوم کرنا بھی گوارا نہیں کیا۔ دوسرے ہی دن وہ وہاں سے چلے [گ]ئے جیسے اُنھیں علمِ غیب ہو گیا تھا کہ میں حیدرآباد ہی میں ہوں اور [و]ہ وہاں رہیں گے تو میں کسی وقت اُن کے سامنے پہنچ کے دعوا کر سکتا ہوں۔ مجھ سے تو اُنھیں خوف آتا ہوگا۔ قتل کے جرم میں سات سالہ سزا یافتہ سے خوف آنا ہی چاہیے۔ نواب ثروت یار کی طرف سے مولوی صاحب کی خیر خبر کا خط آنے کی کوئی امید میرے ذہن کے کسی گوشے میں چھُپی ہے تو اُسے یک سر خارج کر دینا چاہیے۔ نواب کی طرف سے ایسا خط کبھی نہیں آئے گا۔ آئے بھی تو اُس پر توجہ نہیں دینی چاہیے۔

میں خود کو یہی کچھ باور کرا رہا تھا کہ ناگہاں ایک خیال نے میرے حواس معطل کر دیے۔ کہیں نواب ثروت یار نے دروغ گوئی نہ کی ہو۔ مولوی صاحب نے میرے بارے میں اُلٹا سیدھا بتا کے اُسے آمادہ کر لیا ہو کہ میرے آنے پر وہ اِسی قسم کا کوئی جواب دے دے تاکہ میں دوبارہ حیدرآباد کا رُخ ہی نہ کروں، اُس کے گھر پہ دوبارہ دستک ہی نہ دوں۔ مجھے کورا سے دُور رکھنے کے لیے قتل ہی کیا، مولوی صاحب اور بھی سنگین الزام لگا سکتے ہیں۔ لہٰذا نواب ثروت یار نے ایک کہانی تراش کے مجھے سُنا دی اور یوں مولوی صاحب سے اپنی خاندانی رفاقت کا حق نبھایا جیسا کہ وہ کہہ رہا تھا، کورا سے اُسے واقعی کوئی دلچسپی تھی تو مولوی صاحب کی ہم نوائی میں اُسے اور شدت اختیار کرنی چاہیے۔ مولوی صاحب نے جیسلمیر میں ارشد کا رشتہ مسترد کر دیا اور رانا مہتاب کا پیام بھی اور اِس دوران جانے کس کس کا۔ ظاہر ہے، وہ اُسے ایسے کب تک ساتھ رکھیں گے۔ کب تک دربدری کی زندگی بسر کریں گے۔ کسی ایک دن تو اُن کے اعصاب جواب دے ہی جائیں گے۔ نواب ثروت یار میں بظاہر کوئی خامی نہیں ہے۔ اُس کا نسب نوابوں کا ہے، وہ وجیہ اور شائستہ ہے اور سب سے بڑی خوبی تو دولت کی ہے۔ دولت آدمی کے دس عیب چھُپا لیتی ہے۔

میرا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ نواب کے چہرے سے بالکل نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ تو مولوی صاحب کے رویّے سے دل برداشتہ تھا۔ دادا کو بھی احساس نہیں ہوا، اُسے آدمیوں کی پرکھ میں بڑی مہارت تھی۔ دادا کی آنکھ بھی دھوکا کھا گئی! آدمی اتنا بہروپ کیسے بھر سکتا ہے۔ ہمیں ایک لحظے کے لیے بھی گمان نہیں ہوا تھا کہ نواب داستان طرازی کر رہا ہے۔ اُس نے تو ہم سے بہت زیادہ ہم دردی ظاہر کی تھی؛ ہمیں روکنا بھی چاہا تھا۔ پھر اُسے یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ اُس کی والدہ نے کورا کو پسند کر لیا تھا اور مولوی صاحب سے رشتے کی بات کی تھی۔ اُسے یہ سب بتانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ صاف صاف کہہ سکتا تھا کہ مولوی صاحب آئے تھے اور اچانک کچھ بتائے بغیر چلے گئے تو ہم کیا کر لیتے۔ مگر یہ سب کچھ تو وہ اپنے بیان کا سچ ظاہر کرنے کے لیے بھی کہہ سکتا ہے۔ اُسے یہی تاثر دینا چاہیے تھا کہ مولوی صاحب کو یہ رشتہ نامنظور تھا اور اُن میں صاف انکار کی جرأت بھی نہیں تھی اِس لیے وہ کچھ کہے سُنے بغیر چلے گئے۔ یعنی وہ دوبارہ نہیں آئیں گے اور میں اِس طرف سے بالکل مایوس ہو جاؤں۔

میرے ہاتھ پاؤں بالکل شل ہو گئے تھے اور پورے جسم سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ اگر یہی سچ ہے تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟ مجھے فوراً حیدرآباد جانا چاہیے۔ میرا وجود یہی کہہ رہا تھا کہ مجھے ابھی اِسی وقت یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ حیدرآباد سے ہمیں چلے ہوئے ڈیڑھ مہینے سے اوپر ہو گیا ہے۔ سامنے دروازے پر چوکی دار موجود تھا، آمد بھی خالی پڑا تھا۔ میری نگاہیں دروازے پر منڈلاتی رہیں۔ کسی کے باہر آنے سے پہلے ہی میرا یہاں سے نکل جانا بہتر ہے ورنہ پھر بہت دیر ہو سکتی ہے۔ مجھ پر خفقان سا طاری تھا۔ میں نکل جاتا مگر مجھے ہوش آ گیا۔ یہ ندامت کا پسینہ تھا جو رُویں رُویں سے اُبل رہا تھا۔ دادا کو گئے ابھی دو دن ہوئے ہیں، میں اُس کے قاتلوں کو فراموش کر کے حیدرآباد چلا جاؤں؟ وہ سب جو اندر بیٹھے گیتا اور رانی کا بوجھ کم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، وہ اُن دونوں کے کون ہوتے ہیں جو میں نہیں ہوتا۔ اُن سب کے لیے یہ کیسا تماشا ہوگا۔ میں اُنھیں بتا کے بھی جاؤں تو بھی وہ کیا سوچیں گے کہ یہ کیسا آدمی ہے، اِسے صرف اپنی طرف دیکھنا آتا ہے۔ میں ہمیشہ یہی کرتا ہوں۔ میں نے مراد آباد میں مولوی صاحب کا پتہ دیکھ کے یہی عجلت کی تھی۔ اُس وقت بھی میں پاگل ہو گیا تھا۔ ڈیڑھ مہینہ گزر گیا ہے تو چند دن اور سہی اور ایسے بھی میں حیدرآباد کس طرح جا سکتا ہوں۔ میں کتنی ہی احتیاط کر دوں، بھیس بدل کے جاؤں یا اندھیروں کی آڑ لے کے۔ کسی نے مجھے دیکھ لیا تو شاید میں کبھی نواب ثروت یار کی دہلیز تک نہ پہنچ سکوں۔ وہ تو تاک لگائے بیٹھے ہوں گے اور ابھی یہ طے ہونا باقی ہے کہ دادا کو ختم کرنے والے حیدرآباد سے آئے تھے یا کوئی اور تھے، وہیں کے تھے تو حیدرآباد میں ایک نواب ثروت

کیا، جانے کس کس نواب راجا کی فصیل پھاندنی پڑے۔

یہ بھی تو محض مفروضہ ہے کہ نواب ثروت یار نے مجھے اور دادا کو مولوی صاحب کے بارے میں غلط بتایا تھا۔ ممکن ہے، وہ ٹھیک کہہ رہا ہو۔ درمیان میں کورا بھی تو ہے۔ اُس کی آمادگی کے بغیر مولوی صاحب اور نواب ثروت یار کی مرضی کیا حیثیت رکھتی ہے۔ وہی نواب تک مولوی صاحب کو روکے ہوئے ہو گی۔ وہی انکار کر دیتی ہو گی اسی لیے مولوی صاحب نے ہر جگہ معذرت کر دی تھی۔ اُس کے چہرے پر غبار آجانے کے خوف سے وہ زیادہ اصرار بھی نہ کر پاتے ہوں گے۔ وہ تو اُسے مسلسل آسرا دلاتے رہے ہوں گے کہ وہ مجھی کو ڈھونڈ رہے ہیں اور ایک دن میں ضرور مل جاؤں گا۔ وہ سمجھتے ہوں گے کہ کسی دن دنیا خود اُس پر غالب آجائے گی۔ کبھی تو اُس کا حوصلہ ماند پڑے گا اور آخر وہ اُن کی بات مان لے گی۔ مولوی صاحب نے ہمیشہ تنہا زندگی گزاری ہے، نہ بیوی نہ بال بچّے۔ پہلی مرتبہ کوئی یوں اُن کے ساتھ رہا ہے۔ اِس عرصے میں وہ اِس کے عادی ہو گئے ہوں گے۔ اُس کی جدائی کے تصور ہی سے اُن کا دل ہَول جاتا ہو گا۔ زہرہ اور منیر علی کہتے تھے کہ مولوی صاحب اُس کے لیے پلکیں بچھائے رکھتے تھے، مستقل سایہ بنے رہتے تھے۔ مولوی صاحب اُس کے لیے ایسے رشتے کی تلاش میں ہوں گے جو اُن کی طرح کورا کے آبگینے کا خیال رکھ سکے۔ اُن سے زیادہ کون کورا سے واقف ہو گا کہ وہ کتنی شیشہ ہے اور اُنھوں نے کس طرح ریشم میں اُسے محفوظ رکھا ہے۔ اُنھیں اندازہ ہو گا، جس دن انھوں نے کسی اور کے بارے میں کورا سے کچھ کہا تو وہ اُسے کھو دیں گے چنانچہ وہ کسی ایسے دن کے شدّت سے منتظر ہوں گے۔ جب کورا کی استقامت میں خود ہی لغزش آجائے مگر جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے، کورا کا ارادہ اُس کی رگوں میں اور رچ بس رہا ہو گا، کسی درخت کی طرح۔

نواب ثروت یار کے پاس کتنی ہی دولت ہو اور مولوی صاحب اُسے کتنا ہی لائق آدمی سمجھتے ہوں، کورا کا اقرار بھی تو ضروری ہے۔ مجھے خاطر جمع رکھنی چاہیے کہ فیصلہ کرنے والے صرف مولوی صاحب نہیں ہیں، اصل فیصلہ کورا کا ہو گا۔ اُس کی آنکھیں تو مجھی کو ڈھونڈتی ہوں گی، میرے خواب دیکھتی ہوں گی، میری طرح اُس کا دل بھی اُس سے کچھ کہتا ہو گا۔ وہ بھی آہٹوں پر چونک پڑتی ہو گی اور مولوی صاحب کا آسرا کیا، خود اُس کی امید اُس کی توانائی ہو گی۔ کیا معلوم کسی دن مولوی صاحب ہی کا پتھر پگھل جائے اور وہ جان لیں کہ کورا کا عزم کتنا توانا ہے۔ وہ اُسے اِس لیے میرے سپرد کرنا نہیں چاہتے کہ میں سزا یافتہ ہوں اور اُس کے لیے موزوں نہیں ہوں لیکن جب اِن کے اعصاب جواب دینے لگیں گے تو مآل کار اُنھیں میری جستجو ہو گی۔ وہ مجھ تک پہنچنا چاہیں گے۔ میں اُن سے کہیں دور نہیں۔ بشرطیکہ وہ اسی نتیجے پر پہنچیں۔

میں سبزے پر بیٹھا اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا، مجھے اردگرد کی کوئی خبر نہ رہی تھی مگر میں یکایک اُٹھ کھڑا ہوا۔ چند لمحوں کے لیے میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ یہ بیداری ہے یا کچھ اور..... میرے سامنے ڈاکٹر کیلاش کی بہن رما کھڑی تھی۔ آسمانی رنگ کی ساڑی میں ملبوس بال کھلے ہوئے۔ تیز روشنی میں اُس کا چمپئی رنگ دمک رہا تھا۔ میں نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھا، وہاں صرف وہی تھی۔ برآمدے سے بشتی چاچا گزر رہے تھے۔ پھوار پڑنی بند ہو گئی تھی تاہم میرے کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔ "آپ یہاں بیٹھے ہیں؟" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"ہاں بس، ایسے ہی۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"کہیں کھوئے ہوئے تھے۔ میں مخل ہوئی۔"

"نہیں۔" میں نے اپنے شانے سیدھے کیے اور مستعدی سے کہا "ایسے ہی اپنے آپ سے مخاطب تھا۔"

"سب سے آسان اور دلچسپ مشغلہ۔" وہ شگفتگی سے بولی "میں نے کہیں پڑھا تھا کہ آدمی کا سب سے بڑا رفیق وہ خود ہوتا ہے اور رقیب بھی۔ وہی خود کو سب سے زیادہ رُلاتا ہے، ہنساتا ہے۔ وہی اپنی سب سے زیادہ سُنتا، اپنی سُناتا ہے۔" میں سر جھکائے خاموش رہا تو بے تابی سے کہنے لگی۔ "کیا سوچ رہے تھے؟"

"کچھ نہیں، کوئی بات نہیں۔ باقی سب کہاں ہیں؟"

"اندر اُسی کمرے میں۔"

"کیا کر رہے ہیں؟"

"گیتا اور رانی سے جھوٹ بولنے کی کوشش۔"

"کیسا جھوٹ؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"جو موت پر سب ایک دوسرے سے بولتے ہیں۔ جھوٹ ہمیشہ بُرا نہیں ہوتا۔ کبھی سچ بہت بے رحم ہوتا ہے، کبھی جھوٹ بہت معصوم۔" وہ تیکھے لہجے میں بولی "ایسے میں سب یہی کرتے ہیں، اور کریں بھی کیا۔"

"جھوٹ کا تعلق نیت سے ہے۔"

"ہاں، اور پھر سچ کا بھی۔" وہ پلکیں جھپکتے ہوئے بولی "نیت اچھی نہیں تو سچ لعنت ہے۔"

میں نے ہاتھ بڑھا کے اُسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد اُس نے میری ہدایت پر عمل کیا

اور گہری سانس بھرنے لگی پھر آہستگی سے بولی "آپ کیسے ہیں؟"

"میں ٹھیک ہوں، بالکل ٹھیک۔"

"کہاں! چہرہ کیسا بجھا ہوا ہے۔ آپ تو ایک پڑھے لکھے جوان اور مضبوط ارادے کے آدمی ہیں۔"

میں پہلو بدل کے رہ گیا۔

"کل بھی میں آپ کو دیکھتی رہی، پہچانے نہیں جاتے تھے۔"

"واقعہ ہی کچھ ایسا ہے۔ پرسوں رات آپ بھی جولین کے گھر تھیں۔ دادا کو آپ نے دیکھا ہو گا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ کچھ دیر بعد...."

میری آواز جھرجھرانے لگی۔

"میں نے انھیں دیکھا تھا اور اچھی طرح، زندگی سے بھرپور۔" وہ تیز تیز لہجے میں بولی "کیلی نے بھی مجھے بتایا ہے کہ وہ کیسے آدمی تھے، کتنے اچھے دوست، بہادر اور.... گیتا اور اُس کی ماں رانی کو بھی اُس رات وہیں دیکھا تھا۔ دونوں پھولوں کی طرح لگیں۔ اُن کے چہروں کی خوشی بتا رہی تھی کہ دادا کیسے شوہر، کتنے اچھے باپ ہیں۔ یہاں سبھی الگ ہیں، بالکل نئے آدمی۔ میرے لیے تو یہ سب حیرت ناک ہے۔ میں آپ کو بتاؤں، کیلی نے مجھے منع کیا تھا کہ آپ سے یا کسی سے گیتا کے باپ کے بارے میں، اِس سانحے کے بارے میں کوئی سوال نہ کروں کہ یہ سب کیا ہے، کیوں ہوا، وہ کون لوگ تھے۔ اُس کا خیال ہے، یہ ذکر تکلیف دہ ہو سکتا ہے۔ مجھے خود احساس ہے کہ نہ اِس کا یہ موقع ہے نہ یہ ضروری ہے لیکن آدمی کا دماغ سوالوں کا جنگل ہے۔ یہ سب دیکھ کے طرح طرح کے سوال سر اُٹھاتے ہیں۔"

"آپ سب کچھ خود جان جائیں گی۔"

"مگر اِس کی ضرورت نہیں۔" اُس نے شدّومد سے کہا "ضروری نہیں کہ جوابوں کے بغیر ہم زندہ نہ رہیں۔ کتنے ایسے سوال ہیں جنھیں جانے بغیر ہم اِس دنیا میں پوری زندگی کے ساتھ موجود ہیں اور شاید زندگی گزارنے کا یہ ایک نہایت آسان نسخہ ہے کہ کم سے کم سوال کیے جائیں یا کم سے کم جواب چاہے جائیں۔" وہ میری جانب مضطربانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"اور توقع کم مت رکھیے، ہر جواب کی کوئی توقع ہوتی ہے۔ ناقابلِ یقین جواب کی توقع کی جائے تو شاید سب ٹھیک رہتا ہے۔"

"جانے دیجیے۔" وہ سر جھٹک کے بولی "میں آپ سے کچھ اور کہہ رہی تھی۔ اتنے دنوں بعد تو آپ یوں ملے ہیں۔ پھر یہ وقت نکل جائے گا۔ اِس سے پہلے کہ یہاں کوئی آ جائے اور آپ سے بات ممکن نہ ہو سکے، میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

"کیا؟" میں نے پٹ پٹاتی نظروں سے پوچھا۔

"کوئی ایسی بات نہیں۔" وہ مُسکرا کے بولی "آپ اُس دن گھر آئے تھے کیلی کے ساتھ تو بہت اچھا لگا تھا۔ پھر آپ کا انتظار رہا۔ میں نے کیلی سے کئی بار کہا بھی لیکن وہ ایک غیر ذمّے دار آدمی ہے۔ بہرحال میں آپ کے کسی کام آ سکتی ہوں تو ضرور بتائیے؟ یہ میں رسمی طور پر نہیں کہہ رہی ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے بہ عجلت کہا۔

"سُنتے ہیں کہ ایسے وقت میں دوستوں کا رُخ کرنا چاہیے۔ اُن کی چھاؤں درختوں کے مانند ہوتی ہے۔ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ کو اِس چھاؤں کی بڑی ضرورت ہے۔"

"چھاؤں کی کسے ضرورت نہیں ہوتی۔"

"اور لوگ کہتے ہیں، درختوں میں چھاؤں اتنی نہیں ہوتی جتنی آدمیوں میں ہوتی ہے۔"

"لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔"

"اور جانے کیوں، ہر درخت کی طرح ہر آدمی کی چھاؤں یکساں نہیں ہوتی۔"

"درختوں کی بھی یکساں نہیں ہوتی، کسی کی کم، کسی کی زیادہ، کسی کی گھنی، کسی کی چھدری اور کسی کی بالکل نہیں ہوتی۔ یہ درخت درخت کی توفیق پر منحصر ہے۔"

"ہاں۔" وہ چمکتی آنکھوں سے بولی "اور لوگ گھنی چھاؤں کے درختوں کا رُخ کرتے ہیں۔ ہر آدمی کے ساتھ ایسا کیوں نہیں ہوتا۔ کسی کی چھاؤں بہت گھنی ہوتی ہے پر لوگ اُدھر نہیں پھٹکتے یا لوگوں کو نظر نہیں آتی؟"

"ہو سکتا ہے۔" میں نے شائستگی سے کہا "اور کبھی دھوکا بھی ہو جاتا ہے۔ قریب جانے پر معلوم ہوتا ہے کہ اتنی سی چھاؤں کے لیے کتنا طویل سفر طے کیا، کتنے درخت پیچھے چھوڑ آئے۔" وہ کھوئے کھوئے انداز میں سر ہلانے لگی۔ میں نے اُس سے کہا "کسی کے اندر ہی بہت آگ جل رہی ہو تو چھایا کیا کرے گی۔"

"ہاں۔" اُس کے ترشے ہوئے ہونٹوں پر لرزش سی طاری ہوئی۔ "بے شک یہ آدمی پر بھی منحصر ہے کہ اُسے کتنی چھاؤں کی ضرورت ہے، اُس کے اندر کتنی دھوپ ہے۔" وہ آدھی ہندوستانی اور آدھی انگریزی میں باتیں کر رہی تھی۔ کچے کچے منہ سے پکی پکی باتیں، نہایت انہماک سے، نفاست اور تپاک کے باوجود اُس کے لہجے میں کوئی تکلف نہیں تھا، بے ساختگی تھی۔ یہ کلام کی بات ہے کہ وہ کتنا دل نشیں ہے۔ شروع میں اُس کی آمد پر مجھے گھبراہٹ سی ہوئی تھی لیکن اب اُس کی جلتی بجھتی آواز پر میرے کان مرکوز تھے اور مجھے ہلکا پن سا محسوس ہو رہا تھا۔ کہنے لگی "پر دو آدمی جب بھی ملتے ہیں، ایک دوسرے کے لیے کسی نہ کسی قدر سایہ ضرور رکھتے ہیں۔ درختوں کا مقصود صرف سایہ کاری ہے، یہ مسافر کی مرضی ہے کہ آگے کتنا بڑا سفر درپیش ہے اور اُسے کتنی دیر ٹھیرنا ہے۔ درختوں کو غرض اپنی چھایا سے ہوتی ہے اور یوں اُنھیں اپنے وجود کا جواز مل جاتا ہے۔ کوئی کسی درخت سے پوچھے کہ اُسے سایہ دے کے کتنا سکون ملتا ہے۔ میرا مطلب ہے، آدمی کے ساتھ بھی تو ایسا ہو سکتا ہے۔ آدمی بھی تو ایسے ہو سکتے ہیں۔" یہ کہتے کہتے وہ چونک سی پڑی اور معذرت خواہانہ لہجے میں بولی "معلوم نہیں، یہ باتیں آپ کو کیسی عجب لگتی ہیں لیکن مجھے آگے پیچھے کی ایسی تمیز نہیں آتی اور میں سمجھتی ہوں، آپ بھی اِس پر زیادہ توجہ نہیں دیتے۔"

"نہیں نہیں، آپ تو بہت دل کش باتیں کرتی ہیں، خیال آفریں۔ آپ چھاؤں کی بات کر رہی تھیں۔ سچ پوچھیے تو مجھے اسی کا احساس ہوا۔"

"مجھے یہ جان کے خوشی ہوئی لیکن باتیں ہی نہیں۔" وہ شکایتی لہجے میں بولی "باتوں سے کیا ہوتا ہے۔ میں ایک عملی آدمی ہوں۔"

"میں جانتا ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"میں نے کئی بار آپ سے ملنے کا ارادہ کیا۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"لیکن بس رہ گئی۔ آپ کا جی نہیں چاہا؟"

"چاہا۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا "پر ادھر مہلت ہی نہیں ملی۔"

"میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا کہ ہم مرحلوں کے محتاج کیوں ہوتے ہیں۔ ہم تمام مرحلے ایک ہی جست میں کیوں طے نہیں کر لیتے۔"

"مجھے یاد آ رہا ہے، یہ بات آپ نے پہلے بھی کہی تھی۔"

"مجھے رسوم و آداب کبھی نہیں بھاتے۔ یہ زندگی مشکل کر دیتے ہیں۔"

"لیکن ہم سب اِن سے مشروط ہیں۔"

"مگر کیوں؟ ہم پہلے مرحلے میں آخری مرحلے کے دوست کیوں نہیں بن سکتے۔"

"کیوں نہیں بن سکتے، لوگ بن جاتے ہیں۔"

وہ کہیں کھو سی گئی، میں بھی اُسے گنگ نظروں سے دیکھتا رہا۔ اُس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ بے چینی سے کہنے لگی "لیکن ہاں، ایک اہم بات میرے ذہن سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ یہ کیا ضروری ہے، دونوں شخص ایک ہی کیفیت سے دوچار ہوں۔ ایک شخص کو جلدی ہے، دوسرے کو نہیں، ایک کا تاثر کچھ اور ہے، دوسرے کا کچھ اور۔ مثلاً میں نے آپ سے جو شدید تاثر لیا ہے، آپ نے، ہو سکتا ہے، اِس طرح مجھے محسوس نہ کیا ہو۔"

"جی، جی ہاں، مگر مگر۔" میری زبان لکنت کرنے لگی۔

اُس نے میرے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ کہنے لگی "بعض اوقات مراحل عذاب بن جاتے ہیں۔ یہ زندگی بوجھل کر دیتے ہیں۔ کتنے ہی لوگ ان کی تاب نہیں لا پاتے اور دُور ہو جاتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آدمی کا ایک دوسرے پر اعتبار اُٹھ گیا ہے۔ آدمی کو آدمی سے بہت تلخیاں ملی ہیں اِس لیے وہ ترازو لیے پھرتا ہے۔ وہ بہت محتاط ہو گیا ہے یا یہ کوئی خوف ہے یا اِس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی کسی انسانی قدر کی پاس داری کر رہا ہے، وضع نبھا رہا ہے اور کسی عہد و پیمان کی گرفت میں ہے۔ ہر پیمان ایک دوسرے کے مفادات کے تحفظ کے لیے ہوتا ہے۔ کسی کے مفاد پر ضرب نہ پڑتی ہو تو پیمان پر کہاں ضرب پڑی۔ پھر ایک ایسا پیمان، ایسا جبر آدمی خود پر کیوں مسلط کرتا ہے جس میں تیسرے آدمی کا داخلہ ممنوع ہو جب کہ تیسرا آدمی بھی ایک حقیقت ہے، اور موجود ہے۔ کیا یہ دُنیا محض دو آدمیوں کے لیے ہے؟ تیسرے کی شمولیت اِس کا نظام بگاڑ دیتی ہے؟ یہ کون سی انسانی قدر کی پاس داری ہے جس میں تیسرا، چوتھا، پانچواں شخص نقصان اُٹھاتا ہے۔ کیا درخت کی چھاؤں صرف ایک شخص کے لیے ہے۔ ایک ہی شخص کے پاس رہتی ہے؟ زندگی تو ایک مستقل مسافرت ہے۔ درمیان میں ہزار منزلیں، ہزار آدمی، ہزار حیرتیں ہیں۔ دو آدمی زیادہ تحفظ اور سکون سے رہ سکتے ہیں۔ دو آدمیوں کی خلوت دنیا کی بہترین راحت ہے، مگر کیا ساری زندگی کے لیے؟ کیا ایک شخص متعدد لوگوں کو مطلوب نہیں ہو سکتا؟"

میں نے جواب دینا چاہا لیکن خاموش رہا تاکہ اُس کا سلسلہ نہ ٹوٹ جائے۔ کوئی بپھری بپھری سی لہر متلاطم تھی۔ وہ تیز تیز انگریزی میں باتیں کر رہی تھی، کھنکتی، چٹختی، چہکتی آواز میں۔ کہتے ہیں حلق تو آواز کا صرف وسیلہ ہے، آواز میں تو سارا بدن شامل ہوتا ہے۔ رَما کا انگ انگ جیسے اُس کی آواز میں شامل تھا۔ میں سُنتا رہا۔ کہنے لگی "کبھی کبھی میں سوچتی ہوں، ایسی کیا بات ہے، یہ کیسا گورکھ دھندا ہے، کیسا تماشا ہے۔ آدمی کی سرشت جستجو ہے مگر یہ کیا ہے کہ وہ تجربے سے بھی گریزاں ہے۔ وہ اتنا دُور دُور کیوں رہتا ہے، لوگوں کے پاس کیوں نہیں آتا۔ اُن کا مشاہدہ، اُن کا جلوہ کیوں نہیں کرتا۔ میں اکثر یہ سوچتی ہوں اور اپنے طور پر طرح طرح کے نتیجے اخذ کرتی رہتی ہوں۔ ہو سکتا ہے، ایک ہی شخص سے کسی کا جی سیر نہ ہوا ہو، ایک شخص کا طلسم بڑا ہے۔ ایک شخص کی دریافت سے کوئی نہ نمٹا ہو یا اسرار کھوج نہ پایا ہو۔ وہ زخم خوردہ ہے یا اپنی اَنا کا اسیر ہے۔ کوئی شخص اَنا بن گیا

ہے۔ وہ اعلا درجے کے ترک و ایثار پر کمربستہ ہے یا پھر وہ مستقل تلاش میں ہے۔ آہ وہ شخص کیسا خوش نصیب ہے جو اتنے لوگوں کے ہجوم میں مرکز و محور قرار پایا۔ جواب تو مل جاتے ہیں یا میں اپنی آسودگی کے لیے انھیں تراش لیتی ہوں، قیاس کر لیتی ہوں لیکن میرا مقصد کچھ اور ہے۔ یہ کیوں طے کر لیا گیا کہ درمیان کے چھوٹے چھوٹے سایوں سے آدمی کنارہ کیے رہے۔ ہوسکتا ہے، یہی راحتیں کبھی اپنا دائرہ بڑھا لیں اور سفر تیز کرنے اور کسی مطلوبہ منزل تک جلد پہنچنے کا سبب بن سکیں اور میں کہنا چاہتی ہوں کہ دوسرے محض غاصب نہیں ہوتے، رہزن یا کم نگاہ۔ بوٹ کلب میں مجھے طرح طرح کے لوگوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ایک مثالیہ پرست لڑکی کسی مکمل شخص کی تلاش میں اپنے خواب ناک دن گنوا رہی تھی۔ وہ پابندی سے کلب آتی اور اپنے آپ میں گم رہتی تھی۔ وہ اپنے خیال و تصور میں اتنی دور جا چکی تھی کہ مثالیے کے سوا کسی کی رفاقت اُس کے لیے چھوت کی بیماری کے مانند تھی۔ میں نے پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ اُس نے بہت دلچسپ جواب دیا، خبر ہے اس نے کیا کہا؟"

"کیا، کہا؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"اُس نے کہا، اُسے درمیان میں ٹھہر جانے اور منتشر ہو جانے کا اندیشہ لاحق ہے۔ تعبیر ادھوری رہ جانے کا ڈر، تصویر نا تمام رہ جانے کا خوف۔ میں نے کہا کہ یہاں کون درجۂ کمال پہ فائز ہے اور تکمیل سے کیا مراد ہے اور انسان تو لمحہ لمحہ بدلنے والے عناصر کا مرکب ہے اور تم خود کس منتہائے کمال کی دعوے دار ہو۔ حسن کوئی کمال نہیں۔ نقش و نگار کا دل آویز تناسب، رنگ روپ سب حسنِ کامل کا ایک رُخ ہے۔ وہیں مجھے ایک اور لڑکی ملی۔ اُس کے ہاں ایک اور نفسی گرہ پڑی ہوئی تھی۔ اُس پر مضحکہ خیزی کی حد تک ایک اندیشہ طاری تھا کہ رفاقت اتنی جاں فزا نہیں جتنی جدائی جاں سوز ہوتی ہے۔ لوگ جدا ہو جاتے ہیں اور پھر عذاب نازل ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کے بدلنے کو بھی جدائی سے تعبیر کرتی تھی۔ لوگوں کا بدل جانا بھی اُس کے خیال میں جدائی کے سانحے سے کم نہیں تھا۔ وہ بے شک لوگوں سے تپاک سے ملتی تھی مگر طنابیں کھینچ کے۔ عقل و ہوش کی بات ہوتی تو ٹھیک تھی، اُس کا معاملہ یک سر مختلف تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ اُس نے شدید قسم کی رفاقت کا کوئی تجربہ نہ کیا ہو یا اس بے پناہ انسانی جذبے سے نا آشنا ہو مگر وہ اپنی وارفتگی و شیفتگی کسی متاع کی طرح اپنے پاس محفوظ رکھتی تھی۔ میں نے اُس سے کہا کہ یہ کیسے ممکن ہے، زندگی کوئی دکان نہیں جس پہ گاہک آیا، چلا گیا۔ جس رفاقت میں آدمی ہمہ جاں شامل نہ ہو، وہ سراب ہے۔ مہرباں لمحے آنے والے کڑے وقت کی مآل اندیشی میں کیوں گنوا دیے جائیں۔ یقیناً ہر شخص اعلا درجے کی رفاقت کا متحمل نہیں ہوتا۔ آدمیوں کے ظرف ایک جیسے نہیں ہوتے، اُسے قریب آنے دیا جائے مگر کوئی ہم زباں کبھی مل جائے جس میں دردآشنائی کا وصف اور چند قدم ساتھ چلنے کی استطاعت ہو تو اُس کے ساتھ رویّے کا بخل جبر کرنے کے مترادف ہے۔ یہ منافقت ہے، خود سے منافقت۔ اور میں نے کہا، کہ کل تو ہمیشہ سے بے اعتبار ہے۔ آدمی کی وسعت سمٹتی پھیلتی رہتی ہے۔ آدمی جدا ہوتے رہتے ہیں اور مثالیے آسمان سے نہیں اُترتے، اُترتے ہیں تو زمین پر بہت گرد و غبار ہے۔"

وہ کہتی رہی اور میں ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھتا رہا۔ یہ اُس کے بیان ہی کا لطف نہیں تھا، کچھ اور بھی تھا جو مجھے مبہوت کیے ہوئے تھا۔ کہنے لگی، "کلب میں ایک نوجوان سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ تعلیم یافتہ، وجیہ اور ایک اچھے خاندان کا حوالہ رکھتا تھا۔ اُس سے کوئی بچھڑ گیا تھا اور اُس کے انتظار میں اُس نے گویا جوگ لے لیا تھا۔ وہ شائستگی سے لوگوں سے ملتا تھا مگر اُس شائستگی میں ایک عجب نخوت اور اجنبیت تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ ایسا کیوں ہے۔ اُس نے زندگی کے حاشیے پر چلنا کیوں شروع کر دیا ہے۔ اِس گریز میں کیا رمز ہے؟ اُس نے جو جواب دیا، وہ تصوری تھا، اُس کی بات میری سمجھ میں آئی اور مجھے اچھی بھی لگی۔ سنسنی خیز سی۔ اُس نے کہا، میں جس شخص سے مخاطب ہوں، وہ محض ایک جسم، ایک خول ہے، اُس کی روح اُس سے جدا ہو گئی ہے۔ میں نے پوچھا، کیا اُس کے دوبارہ ملنے کا امکان ہے۔ اُس نے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں کہا کہ کون جانے۔ مجھے اُس سے بہت ہمدردی ہوئی۔ میں نے اُس کی دل داری کی کوشش کی لیکن وہ اپنے سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔ پھر میں نے اُس سے کنارہ کر لیا، میں نے جانا کہ میری موجودی میں اُس کے بادل گرجنے لگتے ہیں، اُس کی آنکھیں اُمڈ آتی ہیں۔ مجھے یاد ہے، میں نے اُس سے کہا تھا کہ یہ کائنات اتنی مختصر نہیں ہے۔ کہنے لگا، تمھیں کوئی ملے تو جانو کہ کتنی بڑی ہے۔ میں نے کہا، میں سمجھنا چاہتی ہوں۔ کہنے لگا، یہ سمجھایا نہیں جا سکتا۔ کوئی کبھی ملے گا تو خود بخود سمجھ میں آجائے گا کہ اِس آگ میں کیسا نشہ ہے۔ میں نے کہا، مگر یہ تو فنا کا راستہ ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ اسی کی تو اُسے آرزو ہے۔ وہ بہت شراب پینے لگا تھا۔ میں نے روکا تو بولا، آگ اور بڑھ جاتی ہے۔ اُس کی صحت خراب ہوتی گئی۔ کلب سے ناغے کرنے لگا، پھر ایک دن کسی طرف نکل گیا، کہاں، کیا خبر۔ میں نے اِس سلسلے میں اُس کے ایک عزیز سے پوچھا تھا، جواب ملا، دیوانہ کہاں جائے گا۔"

میری رگوں میں خون رکنے لگا تھا۔ وہ مجھے یہ سب کچھ کیوں سُنا رہی ہے؟ ایسا لگا جیسے وہ مجھے آئینہ دکھا رہی ہو۔ اس نے جان بوجھ کے کلب کے ایک نوجوان کا افسانہ تراشا ہے اور اُن دو لڑکیوں کا ذکر بھی دانستہ اِسی سیاق و سباق میں کیا ہے۔ میں نے کہنا چاہا کہ اُس کی داستانیں نہایت نا تمام ہیں۔ دنیا میں اِتنا ہی نہیں ہے جتنا اُس نے جانا ہے۔ اِس سے بہت سوا ہے۔ اُسے کیا معلوم کہ آدمی کتنا بے بس ہو جاتا ہے۔ یہ کوئی نفسی گرہ یا ذہنی کجی نہیں، جانے کیا ہے۔ کون کس موڑ پر مل جائے۔ یہ تو آدمی کے ملنے پر ہے اور زندگی پر ہے کہ وہ کس سے کیسا برتاؤ کرتی ہے۔

میں نے کچھ نہیں کہا، پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے گھورتا رہا۔ وہ سراپا اپنے آپ میں گم تھی۔ اُس کی سیاہ لٹیں شانوں پر جھول رہی تھیں اور پھول جیسے چہرے پر یاسیت اور تاسف کی دھند چھائی ہوئی تھی، جیسے چاندنی ٹھٹکی ہوئی ہو۔ نوجوان کے ذکر پر اُس کی آنکھیں بھاری ہوگئی تھیں، آواز بھی بکھر گئی تھی۔ اُس کا انداز بھی خود کلامی کا سا تھا۔ اِس میں کسی تردد اور پشیمانی کی کیا بات ہے؟ میں نے خود کو ٹوکا۔ میں نے اُس کی صاف بیانی اور بے باکی اپنی سبکی پر کیوں محمول کر لی؟ یہ میری اپنی کدورت ہے، اپنا اکراہ ہے جو میری رگیں کھنچنے لگی ہیں۔ وہ ایسی لڑکی نہیں ہے جسے اشاروں اور کنایوں کی ضرورت پڑے۔ وہ میرے بارے میں اتنا کچھ نہیں جانتی ہوگی، اسے بتائے گا بھی کون؟ وہ ایک ذہین و فطین لڑکی ہے اور اس نے میرے چہرے پر لکھا ہوا کچھ پڑھ لیا ہے۔ اس کے خیال میں میری مستقل سرگرانی و سرگشتگی کا سبب یہی کچھ ہو سکتا ہے۔ سو یہ رویّے کی خیرات نہیں، معذوروں اور مفلوجوں سے خوش خصال لوگ جو سلوک کرتے ہیں، میرے کتنے ہی درد مند مجھے میرے سوال اور کسی کشکول کے بغیر اِسی نرمی اور گداز کی بھیک دیتے ہیں اور مجھے مزید ناتواں اور ہلکان کر دیتے ہیں۔ پہلے مجھے رما کی باتوں پہ اسی خیرات کا گمان ہوا تھا مگر ایسا نہیں تھا۔ وہ تو دلیلیں دے رہی تھی۔ اُس کے اظہار میں تو بہت انکسار اور تپاک تھا۔ وہ ایک حسین و جمیل لڑکی، یہ اس کا التفات، اس کی عنایت ہے کہ اتنے لوگوں کے درمیان سے اُٹھ کے میرے پاس آ کے بیٹھی ہے اور اپنے ریشم اپنی چھاؤں سے میری دھوپ کم کرنے کا جتن کر رہی ہے۔ میری اور اس کی شناسائی کو عرصہ ہی کتنا ہوا ہے لیکن اُس کے بہ قول، شناسائی میں مدت کی شرط کب ہوتی ہے اور مرحلوں کی کیا ضرورت ہے۔ وہ کوئی نقش مٹا دینے کو کب کہہ رہی ہے یا اُس سے انکاری ہے۔ وہ تو کچھ اور کہہ رہی ہے۔ اِس سے زیادہ کوئی کیا کہہ سکتا ہے اور کسی کو کسی سے اتنی غرض کہاں ہوتی ہے۔

میرا جی اُس کے لیے بہت امڈا۔ ایک لحظہ میرے جی میں آئی کہ اُٹھ کے اُسے سینے سے لگا لوں اور بتاؤں کہ کلب کے نوجوان نے جس آگ کا ذکر کیا ہے، وہ اُس نے طنزاً کیا ہوگا۔ لوگوں نے طرح طرح کے نام دے دیے ہیں مگر یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ یہ آگ تو بینائی جھلسا دیتی ہے۔ یہ کوئی نظریہ یا عقیدہ نہیں جس پر اصرار کیا جائے۔ یہ تو اپنی بقا کا اصرار ہے۔ بے شک زندگی ایک فرد سے دوسرے فرد تک نہیں ہوتی مگر ایک فرد ہی راستہ بن جاتا ہے، راستہ بھی وہی، منزل بھی وہی۔ دو آدمی مل کے کبھی ایک بن جاتے ہیں۔ ایک شخص چپکے سے دوسرے کا جزوِ جاں بن جائے تو دوسرا کیا کرے۔ اُس کا اختیار تو چھن جاتا ہے۔ کوئی فنا نہیں چاہتا مگر راستہ دوسرا کوئی دکھائی دے تبھی تو؟ میں اُس سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن میں نے تحمل کیا۔ اُس نے کوئی سوال بھی نہیں کیا تھا، نہ میرے جواب کی منتظر تھی۔ وہ تو خود تائید طلب تھی اور اپنی دانست میں چارہ گری کے طور تجویز کر رہی تھی اور اُس کا لب و لہجہ وہی تھا، نرم و لطیف، مترنم اور دل سوز۔ میری رخنہ اندازی سے اُس میں شکن پڑنے کا احتمال تھا اِس لیے میں بس سنتا رہا۔

پھر کیلاش کی آواز پر سب کچھ درہم برہم ہوگیا۔ رما بھی اچھل پڑی اور خجل خجل سی ہوگئی۔ کیلاش برآمدے سے آوازیں لگاتا یکایک ہمارے سامنے آگیا اور شکایت جیسے انداز میں رما سے کہنے لگا، "وہ یہاں کب سے بیٹھی ہے؟" دوسرے ہی لمحے اُسے میری موجودی کا خیال آگیا، اُس نے پیشانی کے بل صاف کرنے کی کوشش کی اور جھجکتے ہوئے مجھ سے پوچھا کہ یہ فتنہ انگیز کب سے یہاں بیٹھی ہے۔

میری نگاہیں رما کی طرف اُٹھ گئیں۔ میں نے نرمی سے کہا، "دیر سے۔"

"پہلے تمھیں مخل ہونے کی معذرت کرنی چاہیے۔" رما چہکتی آواز میں بولی۔

کیلاش سچ مچ معذرت کرنے لگا۔ میں نے اُسے تسلی سے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا، وہ بیٹھ گیا اور اپنی اُلجھی ہوئی سانسیں استوار کرتا رہا۔ "یقیناً اِس شریر نے غیر متعلق باتیں کی ہوں گی؟" اُس نے مضطرب لہجے میں کہا۔

میں نے اُسے بتایا کہ اُس کی بہن نہایت دل نواز اور فکر انگیز باتیں کر رہی تھی۔ اِس سے زیادہ متعلق باتیں ممکن ہی نہیں تھیں۔

"پھر تو میں واقعی مخل ہوا۔" وہ خوش دلی سے بولا۔ "کیا گفتگو ہو رہی تھی؟"

"تمھارے بارے میں نہیں تھی۔" رما نے چہکتی آواز میں کہا۔ "یہی کچھ آدمیوں کے بارے میں۔"

"شکر ہے، تمھیں آدمیوں کی باتیں کرنا تو آئیں۔"
اُس کی برجستگی پر مجھے ہنسی آگئی۔ وہ دونوں بھی کھل کھلا اُٹھے۔ کیلاش کہنے لگا: "مجھے آپ کے چہرے پر شگفتگی دیکھ کے یقین کیجیے، بہت خوشی ہوئی۔" میں اُسے صرف دیکھ کے رہ گیا۔ اُس کی آنکھیں اسی خوشی کی غماز تھیں۔

"تم پھر احساس دلا رہے ہو۔" رما نے اُسے ٹوکا۔

"نہیں، بالکل نہیں۔" کیلاش نے فوراً تردید کی اور حسرت آمیز لہجے میں بولا: "آپ ایسے ہی رہیے، ایسے ہی خوش خوش۔ میں تو ڈر رہا تھا۔ یہ رما میری باؤلی بہن اکثر اُلٹی سیدھی باتیں کرنے لگتی ہے مگر آج تو مجھے اپنے دیکھے پر یقین نہیں آرہا، آج تو اس نے کمال کر دیا۔"

"اِن میں بہت خوبیاں ہیں، سب سے بڑی خوبی تو دردمندی ہے۔"

"آپ کہتے ہیں تو میں اپنی محفوظ رائے پر نظرِ ثانی کروں گا۔" کیلاش نے چہک کر کہا۔

"نہیں نہیں، تمھیں ملال ہوگا کہ تم نے کتنی دیر بعد یہ فیصلہ کیا بلکہ بعد از وقت۔" رما نے جواب دینے میں ایک لمحے بھی تامّل نہیں کیا۔

کیلاش سے کوئی بات نہ بن پڑی یا اُس نے میرے خیال سے نوک جھونک جاری رکھنا مناسب نہیں سمجھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ان دونوں میں فقرے بازی خوب ہوتی ہے۔ میں نے کیلاش سے کہا کہ اُس کی بہن کئی اعتبار سے ایک منفرد لڑکی ہے۔

"انفرادیت تنہا کر دیتی ہے۔"

"اور ممتاز بھی....." میں نے کہا۔

"ایسا نہ کہیے، یہ اور سرکش ہو جائے گی۔"

میرے منہ پر فقرہ آیا کہ کہوں، پھر تو اور دل کش ہو جائیں گی مگر میرے ہونٹ بس پھڑک کے رہ گئے۔

"لگتا ہے، آج اِسی کی باری تھی، یہی بولتی رہی ہے۔" کیلاش نے تیکھی آواز میں مجھ سے پوچھا: "کیا زہر اُگل رہی تھی؟" پھر اُس کے دمکتی نظروں سے رما کو دیکھتے ہوئے بہ عجلت ترمیم کی: "میرا مطلب ہے کیسی گل افشانی....."

"بہت کچھ....." میں نے گہری سانس لی۔

"یہ آپ سے ملنے کو بہت بے تاب تھی۔ آج اسے موقع مل گیا۔ میں سمجھ رہا تھا، یہ اندر کسی کمرے میں ہے۔ جولین سے پوچھنے پر مجھے یہی تاثر ملا تھا۔ دیر ہوگئی تو مجھے بے چینی ہوئی کہ یہ کہیں آپ کے پاس نہ پہنچ گئی ہو اور ایسے وقت اپنی نکتہ طرازیاں نہ بگھار رہی ہو، حالانکہ اُدھر منیر علی صاحب کچھ اپنے، کچھ پرائے قصّے سنا رہے تھے، گیتا اور رانی کی دل دہی کی خاطر۔ سبھی متوجہ تھے مگر مجھ سے وہاں نہ بیٹھا گیا۔ میں نے اُن سے معذرت کی اور اِسے اندر ڈھونڈتا ہوا سیدھا یہاں آنکلا اور میرا اندیشہ درست ثابت ہوا۔"

"تم نے جولی سے پوچھ لیا ہوتا، اُسے معلوم تھا کہ میں یہاں ہوں بلکہ اُسی نے مجھے یہاں بھیجا تھا۔"

"جولین نے؟....." میں نے تذبذب سے کہا۔

"ہاں، وہ وہاں مصروف تھی۔" رما سادگی سے بولی: "اُسے احساس تھا کہ آپ یہاں تنہا بیٹھے ہیں۔"

"تو کیا وہ محض جولین کی فرستادہ تھی اور ایک مہربان مہذب لڑکی کی طرح کوئی فرض نبھا رہی تھی؟ جولین نے اس سے کچھ اور بھی کہا ہوگا۔ کیا کچھ کہا ہوگا۔ میرا دل گھبرانے لگا۔ ایسا تھا تو جولین خود بھی آسکتی تھی۔ وہ کیوں نہیں آئی؟ رما نے شاید چہرے سے میرے سینے کی گھٹن محسوس کر لی۔ اُس نے وضاحت ضروری سمجھی اور بے تابانہ بولی: "میں آپ ہی کو دیکھنے کے لیے وہاں سے اُٹھی تھی۔ اتفاق سے جولین اندر مل گئی اور اُس نے، جیسا کہ کہتے ہیں، میرے منہ کی بات چھین لی۔"

ابھی کیلاش نے کہا تھا، جولین سے استفسار پر اُسے تاثر ملا تھا کہ رما اندر کسی کمرے میں ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ جولین نے کیلاش کو دخل اندازی کے خیال سے جان بوجھ کر نہیں بتایا ہوگا۔ وہ خود بھی اسی لیے نہیں آئی اور شاید اُسی نے کسی کو اِس طرف نہیں آنے دیا۔ کسی نے کچھ پوچھا ہوگا تو اُس نے کوئی بھی عذر کر دیا ہوگا۔

"کیا سوچنے لگے آپ؟" کیلاش کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ میں اُسے کیا بتاتا، اپنی کیفیت خود میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ مجھے اپنے آپ سے چڑ ہو رہی تھی۔ یہ ندامت کا کوئی احساس تھا یا اپنی بے چارگی کا یا گراں خوابی کا۔

"آپ کہیں کھو سے گئے؟" کیلاش نے اُداسی سے کہا۔

"میں سمجھتی ہوں۔" رما چپکے سے بولی۔

"کیا، کیا بات ہے؟" کیلاش مضطرب ہونے لگا۔

"تمھارے سمجھنے کی نہیں ہے۔" رما شکستہ لہجے میں بولی۔

"غالباً مجھی سے کوئی بھول ہوئی۔" کیلاش کی آنکھیں بجھنے لگیں: "میں مخل ہی ہوا مگر یہ سانحہ تو گزر چکا۔"

رما نے کوئی تکلف نہیں کیا، کہنے لگی: "آہ، کاش تم ابھی نہ آتے۔ رات گزر جاتی اور ہم ایک....."

اُس کے مزید کچھ کہنے سے پہلے میں نے شرمندگی کا اظہار کیا۔ اُس نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا تھا۔ رما، جولین کی سفارش پر آئی تھی یا از خود، یہ شرافت و شائستگی تھی یا از خود رفتگی۔ دونوں صورتوں میں اصل مقصود میری دل بستگی تھی ورنہ نیت میں کیا ابہام ہے۔ مجھے آخر کیا مطلوب تھا جس کی محرومی میرے سینے میں سوزش کا سبب بنی ہوئی ہے۔ یہ دونوں اپنے گھر سے دُور، اپنے مشاغل سے کنارہ کیے میری خاطر یہاں بیٹھے ہیں اور مسلسل میری جستجو میں لگے ہیں۔

مجھے خود کو یک سُو کرنے میں دیر نہیں لگی کیونکہ یہ فیصلہ نہایت آسان تھا کہ مجھے اِن کی نوازش پر بہر صورت شکر گزار ہونا چاہیے اور اپنی کبیدگی، اپنی خلش خود تک محدود رکھنی چاہیے۔ میری آزردہ خاطری سے اُن کی آنکھیں کھلانے لگی تھیں۔ اپنے اس تیور کا کوئی استحقاق مجھے نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے کیلاش سے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں، میرا کچھ یہی ہے۔ مجھے یوں ہی بیٹھے بٹھائے کچھ ہو جاتا ہے۔ میں نے اُس سے کہا، دخل اندازی کیسی؟ ہم تو یہی دُنیا جہاں کی باتیں کر رہے تھے۔ رما اپنے کلب کے مشاہدات سنا رہی تھیں اور جیسا کہ میں نے کہا کہ وہ سب کچھ نہایت دل نشیں تھا۔

"اور میرے آنے سے ختم ہو گیا؟"

"ختم تو کسی وقت ہونا ہی تھا، اب نہیں تو کچھ دیر بعد۔"

"ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔" رما نے اُداسی سے کہا: "کوئی نہ کوئی حارج ہو جاتا ہے، کبھی وقت، کبھی موسم۔ زندگی کبھی یکساں نہیں رہتی۔ شاید زندگی اور موت میں یہی امتیاز ہے۔ ایک مسلسل تغیر ہے، ایک مسلسل سکوت۔ موت شاید سب سے بڑا سکون ہے۔"

"پتھر کا سکون۔" کیلاش نے کہا اور مچلتے لہجے میں بولا: "ایک بات کہوں آپ سے؟"

"کیا بات ہے؟" میں نے مسکرا کے کہا۔

"آپ چند دن ہمارے ساتھ، ہمارے گھر چل کے کیوں نہ رہیں، کیوں رما؟"

"اِس سے زیادہ اچھی بات کیا ہو سکتی ہے۔" رما کی آواز مسرت سے لبریز تھی۔

"یہ، یہ کیسے ممکن ہے۔"

"کیوں ممکن نہیں، یہاں بہت لوگ ہیں گیتا اور رانی جی کو دیکھنے کے لیے، اور پھر ہم کسی دوسرے شہر تھوڑی جا رہے ہیں۔ کسی وقت بھی، جب بھی آپ چاہیں، یہاں آسکتے ہیں۔ دن میں دو بار، تین بار۔ اس تبدیلی سے دیکھیے کتنا اثر پڑے گا۔ رما کی داستانیں کبھی ختم نہیں ہوتیں، ورق پلٹتے جائیے۔ یہ ایک بہترین نگراں اور منتظم بھی ہے۔ ویسے بھی تو ایک ڈاکٹر ہے۔ اِسے چارہ گری ہی کی تعلیم دی گئی ہے۔ مجھے یقین ہے، ہمارے ہاں چل کے آپ خوش ہوں گے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر کیسے؟..... یہ کیسے ممکن ہے۔" میں نے اُسے کچھ اور نہیں کہنے دیا: "میں کیسے کہیں جا سکتا ہوں۔ یہاں رہنا میرے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا دوسروں کے لیے۔ گیتا اور رانی بھابی بہت برداشت کا ثبوت دے رہی ہیں لیکن اپنے دل کا حال وہ خود ہی جانتی ہوں گی۔ اِس وقت تو سبھی کو اُن کے سامنے رہنا چاہیے اور ابھی ابھی تو مجھے کئی کام کرنے ہیں۔ ابھی تو دادا کے خون....." میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

"دادا کا خون!" کیلاش بے قراری سے بولا: "آپ کیا کہہ رہے تھے؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے جکڑی ہوئی آواز میں کہا: "ابھی دادا کے بہت سے معاملات بھی نمٹانے ہیں۔" اُس نے تکرار نہیں کی، کسمسا کر رہ گیا۔

"نہیں کیلی!" رما مایوسی سے کہنے لگی: "یہ ابھی مناسب نہیں ہے۔"

وہ دونوں چُپ ہو گئے۔ دیر تک خاموشی رہی۔ رات ہو گئی تھی۔ میں نے یاد دلایا کہ انھیں گھر بھی جانا ہوگا۔ میری وجہ سے وہ نہ ٹھیریں، گھر میں بھی اُن کا انتظار ہوگا۔

"جانے کو جی ہی نہیں چاہتا۔" کیلاش بے ساختہ بولا: "ممی سے ہم کہہ کے آئے تھے۔ موٹر باہر کھڑی ہے، کسی وقت بھی چلے جائیں گے، ہاں اگر آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔"

"نہیں، نیند کہاں۔" میں نے زہر خند سے کہا۔

"پھر چائے کیوں نہ پی جائے۔" کیلاش بچوں کی طرح ہمک کے بولا۔

"میں اندر دیکھتی ہوں کہ کیا صورت ہے۔" رما فوراً اُٹھ گئی۔ کیلاش میرے پاس بیٹھا زمین تکتا رہا۔ پھر زیر لبی سے بولا: "دادا کے قاتل کا کچھ پتہ چلا؟"

"نہیں، چل جائے گا۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"مناسب ہو تو مجھے کچھ بتائیے۔" اُس کا لہجہ التجائی تھا۔

"چھپانے کے لیے اب رہا بھی کیا ہے۔"

"میں اور بھی جاننا چاہتا ہوں، آپ کے خیال میں وہ کون ہو سکتا ہے؟"

"میں بھی خود سے یہی پوچھتا ہوں مگر جو بھی ہے یا جو بھی ہیں، اُن کے پاس بھی وقت بہت کم رہ گیا ہے۔"

"یقیناً۔" وہ بے چینی سے بولا: "وہ زیادہ دیر تک نہیں چھپ سکیں گے۔ مآلِ کار انھیں عبرت ناک انجام سے دوچار ہونا ہے۔ یہ میں بھی سمجھتا ہوں۔ گیتا اور رانی جی کے چہرے دیکھ کے جی کرتا ہے، جیل کچہری، سزا انصاف تو دُور کی بات ہے، انھیں دیکھتے ہی گولی مار دی جائے۔"

"یہی ہوگا۔" میری آواز اکڑ گئی تھی۔

"میں نے سوچا تھا کہ اِس سلسلے میں آپ کو ذرا بھی پریشان نہیں کروں گا لیکن بس، خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ طبیعت بحال ہو تو مجھے کچھ اور بتایئے؟"

"کیا بتاؤں؟"

"کچھ بھی۔" وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ "ٹھیک ہے، چھوڑیے، کسی اور وقت سہی..."

"پیر دادا بمبئی کا سب سے بڑا دادا کہا جاتا تھا۔"

"میں نے سُن لیا ہے مگر جس دادا کو میں نے دیکھا ہے وہ سراپا محبت تھا۔"

"مگر وہ پاڑے کا مشہور دادا ہے۔ ساری بمبئی اور آس پاس کے شہروں میں سبھی اُس کے نام اور چاقو سے واقف تھے۔"

"یہ بھی مجھے معلوم ہوا ہے۔ ارتھی کے ساتھ امڈتے لوگ میں نے خود دیکھے تھے، وہ بُری طرح رو رہے تھے۔ اُن کے درمیان ہونے والی بہت سی چہ میگوئیاں میرے کانوں میں بھی پڑی تھیں۔ سب مشتعل تھے۔ میں نے ایسے واقعات پر مشتمل جھوٹی سچی بے شمار کہانیاں پڑھی ہیں۔ یورپ میں یہ واقعات عام ہیں اور جتنے عام ہیں، اُتنی ہی پولیس کی گرفت مضبوط ہے۔ اگر سامنے کوئی سُراغ نہیں ملتا تو وہ پہلے محرک پر توجہ دیتے ہیں۔"

"پاڑے کے دادا کا سب سے بڑا محرک خود پاڑا ہے۔"

"تو کیا وہ پاڑے سے متعلق آدمی ہو سکتے ہیں؟"

"دوسرے کیوں نہیں ہو سکتے؟"

"ہاں، دوسرے بھی، پاڑے سے کبھی کوئی گھاٹا اُٹھانے والے، پاڑے کے آداب و قواعد سے زک پانے والے لوگ۔" وہ تیزی سے بولا۔ "میں نہیں جانتا، سنا ہے، پاڑے کے اپنے لگے بندھے اصول و ضوابط ہوتے ہیں۔"

"کہاں نہیں ہوتے۔"

"میں نے پاڑا کبھی نہیں دیکھا سب سُنا سنایا ہے یا کتابوں میں اس بابت کچھ پڑھا ہے۔ میرے ذہن میں، میں آپ سے کیا کہوں، پاڑے اور پاڑے سے متعلق لوگوں کا تصوّر میرے لیے بہت عجیب اور مختلف تھا لیکن یہاں تو..."

اُسے اپنا مدعا بیان کرنے میں مشکل پیش آ رہی تھی، میں نے اُس کی بات کاٹ کے کہا۔ "اچھوت سمجھتے تھے۔"

"ہاں کچھ یہی، میں آپ کو سچ بتاؤں، کوئی اچھا تصور ذہن میں نہیں تھا۔ دھاندلی، زور، ظلم، چاقو یہی کچھ لیکن یہاں یہ سب دیکھ کے کہنا چاہیے کہ سب جھوٹ سا لگتا ہے، اپنی آنکھوں کا دھوکا، یہ بہت ناقابلِ یقین ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔"

شاید یوں ہے کہ ہم ایک ہی حوالے سے آدمی کو شناخت کرنے کے عادی ہیں مگر زندگی تو گوناگوں ہے۔ ہم ایک ساتھ کئی زندگیاں بسر کرتے ہیں۔ تقریباً ہم سبھی، بازار میں کچھ اور، گھر میں کچھ اور سوچ میں کچھ اور، اندر کچھ، باہر کچھ۔ پاڑے کے لوگ بھی آدمی ہوتے ہیں، بگڑے ہوئے، سنبھلے ہوئے، خانوں میں بٹے ہوئے مگر تم جو یہاں دیکھ رہے ہو، تمام ایسا ہی نہیں ہے۔ وہ بھی ہے، جس کا تصور تمھارے ذہن میں ہے۔ ایک ہی آدمی میں بڑے فاصلے ہو سکتے ہیں۔"

"مگر اچھائی اور برائی کا ایک جوہر تمام فاصلوں میں رہنا چاہیے۔ کیا ہر فاصلے پر جوہر بدل جاتا ہے۔ بہرحال میں اب پاڑے کے لوگوں سے سہما ہوا آدمی نہیں ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے آپ مجھے پاڑے لے چلیں۔"

"کیا کرو گے وہاں جا کے۔"

"میں دیکھنا چاہتا ہوں قریب سے دیکھنا، پھر کبھی کسی مناسب وقت۔"

"وہاں یہی لوگ ہوتے ہیں۔ پاڑے سے دُور ہی رہنا ٹھیک ہے۔"

"میں پاڑے میں شامل کب ہو رہا ہوں۔"

"تم شامل بھی نہیں ہو سکو گے، ہر شخص پاڑے کا آدمی نہیں بن سکتا۔"

"آپ سے بہت سی باتیں جاننے کو دل مچلتا ہے، میں سمجھتا ہوں، اس کا یہ موقع نہیں ہے اور سوچتا ہوں کہیں یہ دخل در معقولات تو نہیں؟ میں تجاوز تو نہیں کر رہا ہوں؟"

"تم تو اسی گھر کے فرد معلوم ہوتے ہو۔"

"میرے لیے یہ عزت ہے۔ میں بہت کچھ نہیں جانتا لیکن یہ سب لوگ، کیسے سادہ اور کیسے دل پزیر ہیں۔ گیتا سے تو میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ لگتا ہے، ہم نے کوئی نئی دنیا دریافت کر لی ہے۔" میں نے کچھ نہیں کہا، اُس نے بھی چُپ سادھ لی مگر چند ہی ثانیوں بعد وہ بے کلی سے بولا۔ "پولیس نے اب تک کیا کیا ہے۔ وہ بھی بہت سرگرم ہو گی؟"

"ہونی چاہیے مگر پولیس اپنے طور پر کام کرتی ہے۔"

"آپ لوگوں سے بھی رابطہ قائم کیا ہو گا اُس نے؟"

"کیا تھا۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"سُنا ہے، پولیس پہلے قریبی لوگ ٹٹولتی ہے اور اُس کا انداز سنگ دلانہ ہوتا ہے لیکن میرا کچھ کہنا نہ کہنا کیا، آپ بھی اچھی طرح جانتے ہوں گے۔"

"ہاں مجھے اِس کا اچھا تجربہ ہے۔"

"میرا مطلب ہے۔" وہ مجوبی سے بولا۔ "کسی نتیجے پر نہ پہنچنے کی صورت ...لیس پر وحشت بھی طاری ہو سکتی ہے اور پولیس بہ خیال ...رنی کہ بس پر کیا گزر جائے گی۔ اُنھی پر شک کرتی ہے جن کا نقصان ...یہ کیسی ستم ظریفی ہے۔"

"کیونکہ کبھی مطلوبہ اشخاص اُنھی میں سے نکل آتے ہیں۔"

"جی، جی ہاں۔" وہ بوکھلا سا گیا اور سمجھا کہ میں کہیں قریب کے ...آدمی کی طرف تو اشارہ نہیں کر رہا ہوں۔ ذہانت ہمیشہ زود حِس ...ہے۔ اُس کی نگاہیں بے اختیار برآمدے کی طرف اُٹھیں۔ میں نے ...ت کوئی نہیں کی تاہم ایک لمحاتی تردّد کے بعد اُس نے خود یہ نکتہ ...ر لیا کہ یہ کوئی بلیغ اشارہ نہیں، بس زبان پر آئی ہوئی ایک بات ...۔ پولیس کے ذکر پر اُس کی آواز سن سنانے لگی تھی۔ پولیس سے ...طہ نہ پڑنے والوں کی آواز میں یہی اضطراب ہوا کرتا ہے۔ وہ اشاروں ...وں میں مجھے احتیاط کی تلقین کرنے لگا۔ وہ صاف طور پر جو کہہ نہیں ...ہا تھا، میں اُسے سُن رہا تھا۔ میں تو اُسے کب سے سُن رہا تھا۔ اُس کی مراد ...ی کہ پھر ہم نے کیا سوچا ہے؟ میں کیا جواب دیتا۔ ہمارے سوچنے کے لیے ...ہے۔ تھل سہ پہر سے اندر بیٹھا ہے۔ جمرو، شامو، مارٹی اور ٹنگو بھی ہاتھ ...دُن توڑے اندر پڑے ہیں۔ میں یہاں سبزے پر بیٹھا تازہ ہوا کھا رہا ...دن اب رات ہو گئی ہے۔ پولیس دوبارہ یہاں نہیں آئی ہے لیکن ...ح ہوتے ہی یہ خدائی فوج دار پھر آ جائیں گے۔ تھل نے جولین سے ...ہا تھا کہ پولیس کے دوبارہ آنے پر وہی جواب دیا جائے جو پہلے دیا جا چکا ...ے، پولیس اِس طرح واپس چلی جائے گی لیکن پھر آ جائے گی۔ یہ بات ...تھل کو اچھی طرح معلوم ہو گی کہ گیتا اور رانی کو تا دیر پولیس کے ...سوال جواب سے دُور رکھنا مشکل ہے اور اپنے آپ سے بھی۔

کیلاش یہی کہہ رہا تھا کہ پولیس کی بھٹکتی، منڈلاتی نظریں مآلِ کار ...ہم پر آ کے ٹک جائیں گی اور کیا ہو گا؟ وہ ہمیں لے جائیں گے۔ بمبئی آنے ...سے پہلے دادا ہمارے ساتھ کہاں گیا تھا؟ ہمارا تعلق کن اڈوں اور ...پاڑوں سے ہے؟ ہم بمبئی کیوں آئے تھے؟ جولین کون ہے جس کے گھر ...دادا اُس رات گیا تھا؟ وہاں کون کون تھا؟ وہی سوال جن کے ...جواب اُس رات تھانے میں اَدھورے رہ گئے تھے اور باقی قرض سمجھ ...کر اُنھوں نے ہمیں جانے دیا تھا مگر قرض تو باقی ہے۔ اُنھوں نے ...برملا کہہ دیا تھا کہ معافی کی ایک ہی صورت ہے کہ دادا کے قاتل اُن ...کے ہاتھ لگ جائیں یا اُن کے حوالے کر دیے جائیں یا اِس سلسلے میں ...کم از کم اُنھیں ہماری اعانت کا اعتماد حاصل رہے مگر تھل تو اندر بیٹھا ...ہوا ہے، وہ اور کتنی دیر اُس کا انتظار کریں گے۔ ایک دن، دو دن، ایک ہفتے۔ ممکن ہے، وہ ماہم کے پاڑے پر تھل کی نگرانی کی خبر سُن کے زرا سی چھوٹ اور رعایت دے دیں لیکن جیسے جیسے دن گزرتے جائیں گے، اُن کا پارا چڑھتا رہے گا۔ میں کیلاش کو یہی جواب دے سکتا تھا اور خود کو بھی کہ پھر ہم جیل میں ڈال دیے جائیں گے اور سلاخوں کے پیچھے ثبوت و شواہد کے لیے سر مارتے رہیں گے مگر بس اتنا ہی ہے؟ صرف یہی جواب؛ ہم اتنی آسانی سے خود کو پولیس کے حوالے کر دیں اور وہ بھی دادا کے خون کے الزام میں؟ یہ جواب مجھی کو تسلی نہیں دیتا تھا۔ کیلاش سے میں کیا کہتا۔

وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر برآمدے میں آہٹ سُن کے چُپ ہو گیا۔ رَما خود چائے کی ٹرے لے کے آئی تھی، سر پر ساری کا پلّو ڈالے ہوئے لگتا تھا جیسے وہ اِسی گھر سے متعلق ہو۔ جولین بھی اُس کے ساتھ تھی۔ "اب ایک ہم زبان بھی میرے ساتھ ہے۔" آتے ہی وہ کھنکتی آواز میں بولی۔ "جولی کو میں پکڑ لائی ہوں۔ اِس کے بغیر یہاں کوئی کمی سی لگتی ہے۔"

جولین کا بدن بل کھا گیا۔ وہ سمٹ کے میرے پہلو کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ پھر شہ پارہ بھی وہیں چلی آئی اور فرّخ بھی۔ رَما نے سب کے لیے اپنے ہاتھ سے چائے بنائی۔ اُس نے ابھی اور بیٹھنے کے ارادے سے چائے کا مشورہ دیا تھا اور جولین کو بھی اِسی لیے ساتھ لائی تھی مگر جولین، شہ پارہ اور فرّخ اندر کا حبس سمیٹے آئی تھیں۔ یہ کھلی فضا، سبزے پر کرسیوں کا ماحول اُن کے لیے نیا تھا۔ اِس سے مانوس ہونے میں اُنھیں کچھ نہ کچھ دیر تو لگتی، مجھے بھی لگی تھی۔ وہ چُپ چاپ جیسے ایک دوسرے کے بولنے کی منتظر رہیں۔ میرا دماغ بھی حاضر نہیں تھا۔ کیلاش بھی گُم سُم بیٹھا تھا۔ رَما نے سخن طرازی کی اپنی سی کوشش کی، کیلاش کو مخاطب کر کے تیکھے لہجے میں بولی۔ "لگتا ہے، اب کے میں مخل ہوئی؟" کیلاش نے مضطربانہ میری طرف دیکھا۔ "تم نے محاسبی شروع کر دی ہو گی جو مَردوں کا شیوہ ہے۔ دو مرد جب بھی اکیلے ہوتے ہیں، اُن پر حقیقتیں طاری ہونے لگتی ہیں۔"

کیلاش اُس کی صورت تکنے لگا۔ "اور عورت ساتھ ہو تو حقیقت گریزاں۔" وہ ہنس کے بولا۔

"زندگی حقائق کے سوا بھی ہے۔"

"اور وہ فریب ہے۔"

"فریب بھی حقیقت ہے کیوں کہ زندگی کے لیے لازم ہے جیسے خواب، ہم خواب نہ دیکھیں تو یہ صبر آزما زندگی کیسے عبور کریں۔"

کیلاش نے اُس سے جرح نہیں کی، وہ بچی ہوئی ساری

چائے ایک گھونٹ میں انڈیل کے کرسی سے اُٹھ گیا۔ رما نے بھی کوئی تعرض نہیں کیا اور کلائی کی گھڑی دیکھ کے چونک پڑی۔ جولین، فرخ اور شہ پارہ نے اُس سے رات وہیں ٹھیر جانے کے لیے اصرار بھی کیا مگر رما نے اپنی ماں کا عذر کیا کہ وہ گھر کہہ کے آتی تو ٹھیک تھا۔

دروازے تک ہم اُنھیں رخصت کرنے آئے۔ گلی دور تک سُنسان پڑی تھی اور کتے بھونک رہے تھے۔ موٹر تک جاتے جاتے رما معاً پلٹ پڑی اور میرے سامنے آ کے کھڑی ہو گئی اور متجسس نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی "مجھے شبہ ہے کہ میرا ہذیان بھی ناوقت تھا۔"

"نہیں، بالکل نہیں۔" مَیں نے سیدھے ہو کے کہا۔

"بس یوں ہی جو دل میں آتا گیا....."

"مجھے سب یاد رہے گا۔" مَیں نے آہستگی سے کہا۔

"ہو سکے تو کل آئیے۔"

"کل شاید ممکن نہ ہو مگر میں جلد ہی..... زندگی رہی تو جلد ہی ضرور آؤں گا۔"

"یہ آپ نے کیا کہا۔" وہ بے چینی سے بولی۔ "زندگی کی آرزو کرو تو زندگی راضی رہتی ہے، بہت خوشامد پسند چیز ہے یہ۔"

"مگر وہ دوسرے جو کسی کی نابودی کے لیے اِس سے زیادہ شدید آرزو رکھتے ہیں، زندگی اُنھیں بھی مایوس نہیں کرتی۔"

وہ ٹھٹکی ہوئی سی کھڑی پلکیں جھپکاتی رہی۔ کیلاش نے موٹر میں بیٹھتے ہی ہارن بجانا شروع کر دیا۔ اُسے جانا پڑا۔ موٹر میں بیٹھنے سے پہلے وہ سب کو ہاتھ ہلانا نہیں بھولی۔

بیرونی کمرے سے گزرتے ہوئے میرے جی میں آئی کہ اندر جا کے تِھبل کو دیکھوں۔ دروازہ بند تھا لیکن کھڑکیاں روشن تھیں۔ مَیں آگے بڑھ گیا۔ جولین نے مکان کے عقبی حصے کی جانب ایک اور کمرے میں سونے کا انتظام کیا تھا۔ مارٹی، جمرو، شامو اور ٹِنگو فرش پر بچھی ہوئی چاندنی پر اِدھر اُدھر پڑے تھے۔ چاروں ہڑبڑاتے ہوئے اُٹھ گئے۔ میرے پوچھنے پر اُنھوں نے بتایا کہ ابھی کوئی آدھ پون گھنٹے پہلے ہی وہ یہاں آئے ہیں۔ سب تھکے تھکے لگ رہے تھے۔ میرا جسم بھی ٹوٹ رہا تھا۔ رما شاید ٹھیک کہتی تھی، کوئی چھاؤں ہی تھی جس میں مجھے نیند سی آ گئی تھی اور اتنی دیر تک جیسے سب دماغ سے اوجھل ہو گیا تھا۔ چھاؤں گزر جانے کے بعد اُس کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔ آدمی اور درخت دونوں سایہ رکھتے ہیں لیکن بڑا فرق ہے۔ درخت کا سایہ سب کے لیے یکساں، آدمی کا ہر ایک کے لیے جُدا جُدا۔ کسی کے لیے ہے، کسی کے لیے نہیں۔ ایک لمحے ہے، دوسرے لمحے نہیں۔ آدمی کا [illegible] چھوئی مُوئی کی طرح ہوتا ہے۔ جیسے ہی کیلاش آیا، رما کا سا[یہ] سُکڑتا سمٹتا گیا۔

اُن چاروں کے آرام کی خاطر مَیں نے خاموشی منا[سب] سمجھی اور ایک کونے میں جا کے لیٹ گیا مگر وہ لوٹتے لوٹتے [میرے] پاس چلے آئے اور جمرو کو جانے کیا ہوا، آ کے مجھ سے چمٹ گیا [جیسے] پناہ کی تلاش میں ہو، جیسے بہت گرد و غبار اکٹھا ہو گیا ہو۔ [میں] نے بھی اُس کا سر اپنے بازو میں جکڑ لیا۔ "کیا بات ہے جمرو بھائی" [میں] نے نرمی سے پوچھا۔

وہ سانسیں کھینچتا رہا۔ مَیں نے پھر پوچھا تو ٹوٹی پھوٹی آ[واز] میں بولا "کیا بولے لاڈلے!"

"دم گھٹ رہا ہے نا؟" مَیں نے اُس کے بالوں میں اُنگل[یاں] پھیرتے ہوئے سرگوشی کی۔

"ٹھیک ہے سب....." وہ بُدبُداتے ہوئے بولا۔

"پھر کیا ہے، تم تو بہت، بہت....."

"سینگ نہیں ہیں اپنے کے بس....." وہ میری بات کاٹ [کے بولا]۔

"نہیں نہیں، مَیں تو کہہ رہا تھا کہ تم سے دوسرے سیکھتے ہیں۔ [تم] نے تمھیں بہت حوصلہ دیا ہے۔"

"کیا لاڈلے!" اُس کی آواز ڈوبتی گئی۔ "اپنے سے چھوٹی کو [نہیں] دیکھا جاتا۔"

"گیتا کو؟" مَیں نے تذبذب سے کہا۔

"ہاں جانی! اُسے دیکھ کے خون بدن میں بہت کھولتا [ہے]۔"

"اب تو کچھ ٹھیک ہے وہ۔"

"ٹھیک ہے پر ایسی ٹھیک بھی نہیں۔ استاد بیچ میں نہ ہو[تا] تو ماں قسم اپنے سے ایک پل بھی نہ ٹھیرا جاتا۔"

"تِھبل بھائی سے کوئی بات ہوئی؟"

"کیسی بات؟"

"یہی، کہیں آنے جانے کی؟"

"نہیں لاڈلے! تجھ کو استاد کا پتہ ہے۔ سب ایک دم [پیٹ] میں باندھ کے رکھتا ہے، پوچھیں بھی کیا اُس سے۔ سامنے کا [معاملہ] اُلٹا سیدھا دکھائی دے رہا ہے تب استاد کرے بھی کیا۔ گیتا کو چھو[ڑ] کے کدھر جائے۔ کدھر جانے کو سوچے۔"

"پر اُستاد ایک اِسی مارے نہیں ٹھیرا جمرو بھائی!" شامو بیچ [میں] بولا۔ "باہر نہیں دیکھا، براتیوں کو باجے پٹاخے لیے؟ براتیوں سے [ز]یادہ مراد پولیس تھی۔ پاڑے سے واپس آتے ہوئے ہم نے اُنھیں تمام [ر]ستوں پر تعینات دیکھا تھا۔ جہاں وردی والے نہیں تھے، وہاں سادے [لب]اس والے گشت کر رہے تھے۔ کیلاش اور رما کو دروازے پر رخصت [کر]تے وقت مَیں نے غور نہیں کیا لیکن شامو بتا رہا تھا کہ اُس نے کھانا [کھ]انے سے پہلے مکان کے اطراف بھی کئی سادہ پوش گھومتے دیکھے ہیں۔

"استاد ابھی کچھ جان کے ہی اید رہے۔" مارٹی دبے لہجے میں بولا۔

"استاد کو اگر تھوڑا بہت پتہ ہو تو بھی اُسے اِدھر سے نہیں [جا]نا چاہیے۔ اِدھر گیتا کے پاس اُس کا ٹکنا ضروری ہے۔"

"پر اپن تو نکل سکتا ہے جمرو بھائی؟" مارٹی نے کہا۔ "گھر بیٹھنے سے ابھی کچھ نہیں ملنے کا۔"

شامو نے بھی اُس کی تائید کی، کہنے لگا کہ میرے آنے سے پہلے [و]ہ یہی باتیں کر رہے تھے۔ کوئی مُن گُن مل سکتی ہے تو پاڑے سے یا [کہ]یں بھی باہر جانے پر۔ گھر میں بند پڑے رہنے سے ہوائیں آ کے تو ہمیں [کو]ئی خبر دینے سے رہیں۔ شامو نے مشورہ دیا کہ اگر سرِدست تِھبل کا باہر [جا]نا مناسب نہیں تو ہم تو نکل سکتے ہیں۔

"اپن لوگ چاہے تو ابھی بھی جا سکتا ہے راجا بھائی!" مارٹی تمتماتی [آ]واز میں بولا۔

"ابھی؟" مَیں نے تعجب سے کہا۔

"کیا ہے راجا بھائی! موٹر اِدھری کھڑی ہے۔ ڈرائیور کو اپن جگلے گا۔"

"گھڑی پہ بھی ایک نظر مارے ماسٹر!" جمرو جھنکارتی آواز میں بولا۔

"دیکھ لیا ہے جمرو بھائی، اور ہم دیکھ کے ہی بول رہا ہے۔ ڈیڑھ [ب]ج رہا ہے۔ اپن ابھی چلے تو سویرا ہونے سے پہلے پلٹ آئے گا۔ تھوڑا [چ]ل کے دیکھتا ہے ابھی۔"

"تھوڑا چل کے دیکھتا ہے....." جمرو نے اُسے دھتکار دیا۔ "ماسٹر! [ت]یری کھوپڑی الٹ گئی ہے۔"

"کھوپڑی تمھاری بھی اپنے کو جگہ پر دکھائی نہیں پڑتی۔" شامو نے بگڑے لہجے میں کہا۔ "ماسٹر کیا الٹا بول رہا ہے۔ موٹر میں جائیں گے، [گھنٹے] اُسی میں لوٹ کے آئیں گے۔"

"تو پھر چلا جا، جا جا رے، روکتا کون ہے۔"

"ہاں چلے جائیں گے، تم سے پوچھ کے نہیں۔" شامو وحشت سے بولا اور مجھ سے پوچھنے لگا۔ "کیوں لاڈلے؟"

مَیں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ جمرو جھنکارتی آواز میں بولا۔ "پر لوٹ کے اِدھر آنا ہے تو اپنے باپ اُستاد کو بول کے ضرور جانا۔"

"تم تو گرم ہونے لگے۔ ماسٹر تو ایک بات بول رہا تھا۔ بات پر کاٹنے کو کیوں دوڑ رہے ہو۔" شامو ناراض ہونے لگا۔ "ہم لوگ ابھی بات کر رہے ہیں، دفع نہیں ہو گئے اِدھر سے۔"

مَیں نے اُٹھ کے اُسے دبوچ لیا اور سمجھایا کہ جمرو غلط نہیں کہہ رہا۔ وہ خود بھی یہاں آرام سے نہیں ہے، ہماری طرح باہر نکلنے کے لیے بے کل ہے لیکن نہ یہ کوئی وقت ہے نہ تِھبل کو بتائے بغیر باہر جانا مناسب ہے۔ مَیں نے شامو سے کہا کہ ابھی وہ خود شہر میں پھیلی ہوئی پولیس کا ذکر کر رہا تھا۔ اِس صورت میں باہر نکلنا کسی طور قرینِ عقل نہیں۔

جمرو بڑبڑانے لگا کہ ابھی صرف دو دن ہوئے ہیں۔ تِھبل پورے دو دن ہمارے ساتھ، ہمارے سامنے رہا ہے۔ جتنا ہمیں معلوم ہے اُتنا ہی اُسے، کوئی بات اوپر تلے ہو گئی تو ہم تِھبل کے لیے اور مصیبت کھڑی کر دیں گے۔

"ٹائم کا کیا ہے جمرو بھائی!" مارٹی پژمردگی سے بولا۔ "دو دن ہو گیا، پر جان پڑتا ہے، دو برس ہو گیا، اُس کے بھی اوپر۔ ماں قسم اپن کیا بولے، کیسا اکھا جسم میں....." مارٹی کی آواز بھرّانے لگی۔ "اپن نے اپنے کو ایسا کبھی نہیں دیکھا۔"

مَیں نے مارٹی کو اشارہ کیا کہ اب وہ اور کچھ نہ کہے۔ شامو کا منہ لٹکا ہوا تھا۔ مَیں نے اُس کا سر سینے میں چھپا لیا، وہ سُڑکنے لگا اور ہچکیوں سے رونے لگا۔ جمرو اور شامو کی آنکھیں بھی بھیگی ہوئی تھیں۔ اُنھوں نے شامو کو مجھ سے چھین لیا اور بچّوں کی طرح اُسے چمکارنے لگے۔

وہ دیر تک جاگتے رہے۔ کئی بار میرے دل میں آیا کہ اُنھیں بتاؤں، میرا ذہن کہاں کہاں بھٹکتا رہا ہے لیکن وہ پہلے ہی کیا کم بے آرام تھے، جو مَیں اُنھیں اور پریشان کرتا۔

رات کے آخری پہر کسی وقت اُن کی آنکھ لگ گئی۔

دیواری گھڑی میں سات بج چکے تھے۔ شبتی چاچا کی آواز پر ہماری آنکھ کھلی۔ وہ ہمیں اُٹھانے کے علاوہ کپڑے دینے بھی آیا تھا۔ اور جولین کی یہ ہدایت منتقل کرنے کہ نہا دھو کے اور لباس بدل کے ہم ناشتے کے لیے باہر آ جائیں۔ سب نے جلدی کی مگر کچھ دیر ہو گئی۔ باہر آ کے معلوم ہوا کہ بیرونی کمرے میں سب ناشتہ کر چکے ہیں۔ جولین اور فرخ نے دوسرے کمرے میں ہمارے لیے پھر الگ انتظام کیا۔ جولین نے بتایا کہ وہ ہمیں اور آرام کرنے دیتی مگر تِھبل کے حکم پر اُسے شبتی چاچا کو کمرے میں بھیجنا پڑا۔

"استاد بولے تھے؟" شامو نے بے تابی سے تصدیق چاہی۔

"ہاں شامو بھائی! بابا ہی کا حکم تھا۔" جولین نے مسکرا کے کہا۔ اُس کی مسکراہٹ پر شامو جھینپ سا گیا۔

کسی سے پھر ٹھیک طرح ناشتہ نہیں کیا گیا۔ جولین نے ٹوکا بھی کہ ایسی جلدی نہیں ہے لیکن سب نے جیسے تیسے چائے ختم کی بسکٹ زہر مار کیے اور برآمدے میں آ کے بیٹھ گئے۔ مجھے خیال آیا کہ کچھ دیر کے لیے گیتا اور رانی کو کیوں نہ دیکھ آؤں مگر میں ارادہ ہی کرتا رہ گیا۔

سامنے سے بٹھل کو آتا دیکھ کے ہم سب یکایک اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُسے کپڑے پہنے تیار دیکھ کے میری طرح اُن چاروں نے بھی اطمینان کی سانس لی ہو گی یا اُن کے دل بھی میری طرح دھڑکے ہوں گے۔ دل کا دھڑکنا بھی کبھی اطمینان کا سبب ہوتا ہے۔ منیر علی، ابا جان اور مولوی اکرم بھی بٹھل کے ساتھ تھے۔ بٹھل برآمدے میں نہیں رکا، ہم منتظر تھے۔ اُس کے اشارے پر ہم نے تیز قدموں سے سیڑھیاں طے کیں۔ بٹھل اتنی ہی دیر برآمدے سے پیوستہ سبزے پر ٹھہرا جتنی دیر میں ابا جان نے اُس سے جلد واپس آنے کو کہا۔ منیر علی نے کچھ پڑھ کے ہم سب پر دم کیا۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ میں گیتا اور رانی کی صورت دیکھنے اور اُنھیں اپنی صورت دکھانے اندر جا سکتا۔ دروازے پر موٹر کھڑی تھی۔ بٹھل نے ٹنگو کو روک دیا۔ بٹھل ڈرائیور کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھا، میں، مارٹی، جمرو اور شامو پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ موٹر منٹوں میں بڑی سڑک پر آ گئی۔ اُس کا رُخ پاڑے کی جانب تھا۔

دن خوب روشن ہو چکا تھا اور سڑکوں پر گاڑیوں کا شور گونج رہا تھا۔ چوراہوں پر جا بجا پولیس ڈیوٹی پر تھی۔ جمرو، شامو اور مارٹی کا حال تو نہیں معلوم لیکن مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے بہت دن بعد باہر نکلنا ہوا ہے۔ سڑکوں پر بھیڑ کی وجہ سے موٹر کی رفتار بھی تیز نہیں تھی۔ راستے بھر نہ بٹھل نے ہم سے کوئی بات کی، نہ ہم نے آپس میں کچھ کہا سُنا۔ ڈرائیور بھی خاموشی سے موٹر چلاتا رہا جیسے وہ موٹر ہی کا کوئی حصہ ہو۔ آدھے گھنٹے میں ہم ماہم کے علاقے میں داخل ہو گئے۔ ابھی پاڑے سے دُور تھے اور چوراہے کے کیفے شیراز نامی چائے خانے سے گزر رہے تھے کہ ناگہاں مجید ہوٹل والے کی صورت میری آنکھوں میں گھوم گئی، مجھ سے سیدھا نہ بیٹھا گیا۔ اِس کی طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ وہی مجید جس نے مولوی اکرم سے اپنے لڑکے کے لیے فرخ کا رشتہ مانگا تھا اور انکار پر مغلوب الغضب ہو گیا تھا۔ اُس نے علاقے کی مسجد میں مولوی اکرم کو رسوا کرنے کی کوشش کی تھی اور الزام لگایا تھا کہ مسجد کے چندے کے لیے اُس کی طرف سے دی جانے والی رقم کا ایک بڑا حصہ مولوی اکرم نے خورد برد کر لیا ہے۔ اُس کا لڑکا بھی شہدا تھا۔ اُس نے کسی سُنسان گلی میں مولوی اکرم [illegible] زدوکوب بھی کیا تھا اور بھی بہت کچھ ہوا تھا۔ یہ ہمارے بمبئی آ[illegible] کے دوسرے دن کا واقعہ ہے۔ کلنتے ابھی موجود تھا۔ مولوی اکرم [illegible] زبانی مجید کی ڈھٹائی کا سارا ماجرا سُن کے پیرو مولوی اکرم کو [illegible] کے مجید کے ہوٹل پہنچا تھا۔ میں اور بٹھل بھی ساتھ تھے۔ پیرو نے بھر[illegible] ہوٹل میں مجید کو کاؤنٹر سے اُٹھا کے فرش پر پٹخ دیا تھا۔ مجید نے پیر[illegible] اور مولوی اکرم کے پیر پکڑ لیے تھے۔ اِس دوران دادر کے علاقے [illegible] دادا بالے بھی آ گیا تھا۔ اُس نے بھی بعد میں مجید کے ساتھ کچھ کم ذل[illegible] آمیز سلوک نہیں کیا ہو گا۔ پیرو نے چلتے چلتے مجید کو حکم دیا تھا کہ وہ دوس[illegible] دن مسجد کے چندے میں پورے آٹھ ہزار روپے داخل کرا دے کیونکہ مجید نے مولوی اکرم پر آٹھ سو روپے کی بددیانتی کا الزام لگایا تھا۔ مجید نے کسی چون و چرا کے بغیر یہ حکم قبول کر لیا تھا مگر وہ کینہ پرو[illegible] سفلہ آدمی نظر آتا تھا۔ پیسوں کی بھی اُسے کمی نہیں تھی۔ اُس کا لڑ[illegible] بھی اُٹھائی گیرا تھا اور ہر وقت اُٹھائی گیروں ہی کا جمگھٹ اُس [illegible] ہوٹل میں جمع رہتا تھا اور پیرو کے لیے وہ باہر کے آدمی بھی بُلا [illegible] تھا۔ بظاہر اُس میں اتنی بڑی جرأت معلوم نہیں ہوتی تھی لیکن یہ بات جرأت کی بات نہیں، کینے کی ہے اور کینے کے لیے ناتواں، [illegible] کی شرط نہیں ہوتی۔ آدمی کو کمینہ بنتے دیر نہیں لگتی۔ اُس نے مولوی اک[illegible] کو بھی معاف نہیں کیا تھا حالانکہ اُن کی خطا ہی کیا تھی۔ رشتے آتے ہیں، منع کر دیے جاتے ہیں لیکن وہ مجید تھا۔ کٹ حجت، کٹ کھنا۔ ہو سکتا ہے، اُس کا دماغ پھر گیا ہو۔

میرے برابر ٹھنسے بیٹھے ہوئے شامو نے میرے ہاتھ پیروں کی اینٹھن محسوس کر لی تھی، اُس نے بھن بھناتی آواز میں مجھ سے پوچھا۔ "کیا بات ہے لاڈلے؟"

میں نے اُسے کچھ نہیں بتایا، ویسے بھی ڈرائیور کی موجودگی میں کچھ کہنا مناسب نہیں تھا۔ پاڑا قریب آ رہا تھا۔ میں نے طے کیا کہ مجھے بٹھل سے بات کرنی چاہیے۔ ممکن ہے اُس کے ذہن میں یہ سب کچھ نہ ہو۔ آخر اِس میں حرج بھی کیا ہے۔ بٹھل زیادہ سے زیادہ دھتکار دے گا۔ پھر میں نے سوچا، بٹھل سے بات کرنے سے پہلے کیوں نہ میں بالے کو اشارہ کر دوں۔ وہ دادر کے علاقے میں ہے اور مجید کو طلب کر کے اُسے اُلٹا لٹکا سکتا، اُس کی کھال کھینچ سکتا ہے۔ کم از کم مجید تک تو ہم پہنچ سکتے ہیں اور اندھیری کے علاقے میں جا کے راجن کی محبوب عورت کو ختم کرنے اور اِس کا الزام راجن کے سر تھوپنے والوں کی چھان بین تو کر ہی سکتے ہیں! حیدر آباد کے لوگوں کی بات دُور کی ہے۔ جہاں تک

[illegible]ا تعلق ہے، ہم یکے بعد دیگرے تمام لوگوں کے گریبانوں پر ہاتھ [illegible]کتے ہیں جو دادا سے ناخوش تھے یا جنھیں چھ سات مہینے کے غیاب [illegible] دادا کی بمبئی واپسی اچھی نہیں لگی تھی۔ ہو سکتا ہے، اُنھی میں سے [illegible]ہو، آگے اِدھر اُدھر بھٹکنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔

پاڑے کی گلی کے سرے پر موٹر ٹھہر گئی۔ باہر کئی آدمی موجود تھے، [illegible]یکھتے ہی ہماری طرف دوڑ پڑے اور ہمارے ساتھ ہی عمارت میں [illegible] ہوئے۔ اندر لوگوں کی تعداد کل جتنی تو نہیں تھی مگر اتنی کم بھی [illegible]تھی۔ چوکی کے اطراف دری پر متعدد لوگ بیٹھے تھے۔ ہماری آمد کا [illegible]سُن کے چوکی کے وسط میں بیٹھا ہوا پانڈے دادا اُچھل پڑا اور [illegible]تا چیختا، دونوں ہاتھ پھیلائے بٹھل کے سینے سے آ کے چمٹ [illegible]یا دادا! اپن کو کیدر کو چھوڑ گیا؟" وہ منڈلاتی آواز میں بولا۔

تمام لوگوں نے ہمارے گرد گھیرا ڈال دیا۔ پانڈے دادا بٹھل کی [illegible]ے اُسے چوکی پر لے گیا۔ جب تک بٹھل بیٹھ نہیں گیا، سب کھڑے [illegible] "اپن سے جاستی دیر ایدر رُکا نہیں جائے گا، سمجھا دادا!" پانڈے [illegible] توقف کے بغیر بڑبڑاتا رہا۔ کہنے لگا کہ کل سے یہاں لوگوں کا تانتا بندھا ہوا [illegible] لوگ آتے ہیں اور رونا شروع کر دیتے ہیں اور طرح طرح کے سوالات کرتے [illegible] وہ کس کس سے بات کرے اور کس کس کو سمجھائے۔ لوگ جاتے ہی [illegible] جیسے اُن کے بیٹھے رہنے سے دادا لوٹ آئے گا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ [illegible]نے صبح سویرے ہمارا انتظار شروع کر دیا تھا کہ بٹھل آئے تو اُس کے [illegible]ڑ کے اُسے اِس ذمے داری سے سبک دوش کر دینے کی منت کرے۔ [illegible]نے بھی اِس کی تصدیق کی اور بتایا کہ کل ہمارے جانے کے بعد بھی [illegible] تک بہت سے پاڑوں کے دادا بیٹھے رہے۔ جو ہمارے سامنے چلے [illegible] اُن میں سے کئی پھر شام کو واپس آ گئے۔ آخر پانڈے کو اُن سے کہنا [illegible] بہتر ہے، اب وہ اپنے پاڑے دیکھیں اور اپنے اپنے علاقوں میں [illegible]ے دادا کو ختم کرنے والوں کا کھوج لگائیں۔ جتنی دیر ہو گی، دادا کی [illegible] بے قرار رہے گی اور اِس میں خود اُن کا قرار بھی مضمر ہے۔ یوں وہ دادا [illegible] اپنی وابستگی کا حق ہی ادا نہیں کریں گے بلکہ اپنے ساتھ بھی سلوک [illegible]گے۔ جتنی دیر ہو گی، ثابت ہو گا کہ دادا بہت بے وقار، بہت حقیر اور [illegible] اکیلا تھا۔ پھر تو پاڑے کا ہر دادا ایسا ہی ہے، ایسا ہی بے اماں۔ یہ [illegible]ہل پڑی تو..... گلیا کے کہنے کے مطابق پانڈے دادا نے اُن سے صاف [illegible]ن کہہ دیا تھا کہ یہاں حاضری سے کچھ نہیں ہو گا۔ اِس طرح اگر وہ دادا [illegible] اپنا تعلق جتاتے اور اُس کے پاڑے کے لوگوں پر کچھ تاثر قائم کرنا [illegible]تے ہیں تو اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ نئے دادا کو چھپ کے پہچاننے [illegible] آتے ہیں اور شہر کے پاڑوں سے اُس کے مراسم پہلے کسی حوالے

اور سفارش پر کتنی دیر چلیں گے۔ سب کو نئی کھیتی بونی ہوگی۔ تاہم کے پاڑے پر پیرو دادا کے پسماں دگان اور اُس کی چوکی پر بیٹھنے والے نئے دادا کی نظروں میں سُرخ روئی مقصود ہے۔ تو اُس کا یہی طریقہ نہیں۔ یہاں بیٹھے رہنے سے دادا کے لیے اپنے دکھ کا اظہار ہے تو بے شک جم جم کے بیٹھیں لیکن دادا کا حساب صاف کر کے۔

پانڈے نے اُن سے اور بھی بہت کچھ کہا تھا۔ بالے اور جارجی کے سوا تقریباً وہ سبھی چلے گئے تھے لیکن رات گئے تک دوسرے لوگوں کی آمد و رفت جاری رہی اور پانڈے اُن کے درمیان بیٹھا خود کو نوچتا کھسوٹتا رہا۔ گلیا کہتا تھا کہ پانڈے لوگوں کی باتیں سُن سُن کے اور اُن سے باتیں کرتے کرتے خود رونے اور تلملانے لگتا ہے کہ اُسے کن کانٹوں پر بٹھا دیا گیا ہے۔ یہاں اُس کے ہاتھ پیر جکڑے ہوئے ہیں۔ بار بار پیرو دادا اُس کے سامنے آکے کھڑا ہو جاتا ہے۔ رات کو صرف ایک دو گھنٹے کے لیے پانڈے سو پایا۔ سو بھی پایا یا نہیں۔ زورا اور چھیدا نے اُسے بہ اصرار چوکی سے اُٹھا کے پیرو کے خاص کمرے میں پہنچا دیا۔

ہم پاڑے پہنچے تو بالے موجود تھا۔ دینا بھی کچھ دیر میں آگیا۔ اندھیری سے سکندر بھی۔ جارجی وہاں نہیں تھا۔ میں نے بالے کو الگ لے جا کے بات کرنے کا ارادہ کیا لیکن پھر رُک گیا کہ پہلے مجھے خود بالے کی ٹوہ لینی چاہیے اور پاڑے کے دوسرے لوگوں کا احوال سُننا چاہیے۔ ایک نہیں، جانے کتنے، جن کا دادا اور ماچھی سے عمر بھر کا ساتھ رہا ہے، ایسے بے تعلق نہیں بیٹھے رہے ہوں گے۔ وہ جتنے شکستہ ہیں، اُتنے ہی برگشتہ بھی ہیں۔ اور کچھ نہیں تو وہ افواہیں ساتھ لائے ہوں گے۔ خالی زمین میں خود رَو پودے اُگ آتے ہیں، سبھی بے کار نہیں ہوتے۔ افواہوں کا بھی یہی ہے۔ دس میں سے کسی ایک کی تو کوئی بنیاد ہوگی۔ مجھے خیال آیا، پولیس نے واردات کی جگہ کے آس پاس مکینوں اور راہ گیروں سے اچھی طرح پوچھ گچھ کی ہوگی۔ پولیس کو اُن سے کوئی کارآمد بات معلوم نہیں ہوئی ہوگی۔ ضروری نہیں کہ پولیس ہر آدمی تک پہنچ گئی ہو اور ہر آدمی نے اپنا سینہ کھول رکھا ہو۔ لوگ خوف و دہشت میں نہیں بتا پاتے اور پولیس سے دُور رہنے ہی میں عافیت سمجھتے ہیں۔ میں وہاں جا سکتا ہوں۔ ایک کوشش کر لینے میں کیا جاتا ہے۔

زورا نے تھجل کے سامنے حقّہ رکھ دیا، پانڈے کے حکم پر سماوار بھی لا کے رکھ دیا گیا۔ سکندر آتے ہی تھجل کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ جیسے ہی پانڈے دادا چُپ ہوا، اُس نے تھجل کو اطلاع دی کہ رات گئے اندھیری کے علاقے میں پولیس نے اچانک کئی گھروں پر چھاپے مارے ہیں اور کئی آدمی گرفتار کر کے لے گئی ہے۔ سبکے سب کاروباری ہیں اور اندھیری کے پاڑے سے بالواسطہ یا بلاواسطہ اُن کا رابطہ رہا ہے۔ میں تھجل کے قریب بیٹھا سب کچھ سُن رہا تھا۔ سکندر نے صرف اطلاع دی تھی، تبصرہ نہیں کیا تھا لیکن اُس کا اشارہ واضح تھا کہ پولیس کو اندھیری کے علاقے میں کوئی نشیب نظر آیا ہے یا کوئی اور راستہ نہ دیکھ کے پولیس بھی آخر اسی مفروضے پر تکیہ کر رہی ہے کہ راجن کے سر پہ ایک عورت کے خون کا الزام ڈالنے والے لوگ پیرو کے لیے بھی بہت تنگ دل، بہت بے رحم ہو سکتے ہیں۔ پیرو راجن کی دیوار جو بنا ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے، حوالات میں بند راجن ہی نے اِس طرف پولیس کی توجّہ دلائی ہو۔ سکندر گرفتار ہونے والوں کے نام بتا رہا تھا۔

ہمیں پاڑے آئے پندرہ بیس منٹ سے زیادہ نہیں ہوئے تھے کہ بڑے دروازے سے لچھمی لپکتا جھپکتا اندر داخل ہوا اور درمیان میں بیٹھے لوگوں کو پھلانگتا ہوا چوکی پر سیدھا تھجل کے پاس آیا۔ اُس کی حالت کہہ رہی تھی کہ وہ کوئی اچھی خبر لے کے نہیں آیا ہے۔ "دادا!" تھجل کے پوچھنے پر وہ اُکھڑی اُکھڑی سانسوں سے بولا۔ "اپن قلابے سے آتا ہے، اُودر تھانے میں اپن کو پتہ لگا، ماری اندر ہے۔"

تھجل نے منال ہونٹوں سے ہٹالی۔ "کیا بولتا ہے رے؟"

"ہاں دادا! ماری اُودر تھانے میں پڑا ہے۔"

"ماری!" پانڈے حیرت سے بولا۔ "جارجی کا گھر والی؟"

"ہاں دادا!"

"کیوں؟ سیدھا بول۔"

"اپن نے تھانے میں جانے واسطے بہت ہاتھ پیر مارا پر اُودھر آگے پیچھے اکھا پولیس لگا پڑا ہے اور لوگ اپنا اپنا بولیاں نکالتا۔ اپن بھاگ کے جارجی کا پاڑے طرف گیا، اُودر بھی پولیس تھا۔ پھر گاڑی دیکھنے کو نکلا۔ پولیس اُودر بھی کسی کا اندر جانا نئیں مانگتا۔"

پانڈے نے متوحش لہجے میں پوچھا۔ "جارجی کیدر ہے؟"

"اپن پوچھا تھا، پر اُودر کوئی بھی ٹھیک نئیں بولا۔ آزو باز و پاڑے کا ایک بھی آدمی اپن کو دکھائی نئیں پڑا۔"

پانڈے نے تھجل کی طرف دیکھا۔ تھجل کی پیشانی پر لکیریں گہری ہو گئی تھیں۔ سب کی نگاہیں اُسی پر مرکوز تھیں مگر وہ بُت بنا رہا۔

"اپن کو بہت اُلٹا دکھائی پڑیلا ہے دادا! تھانے پر پولیس کا سامو ٹر گاڑی کھڑا ہے۔" لچھمی نے اضطراری انداز میں بتایا کہ وہ جارجی سے ملنے کے لیے قلابے کی طرف گیا تھا۔ گیٹ وے آف انڈیا کے قریب اُسے ایک شناسا سپاہی نظر آیا لیکن اُسے بھی کچھ علم نہیں تھا کہ ماری تھانے میں کیوں موجود ہے اور پولیس نے جارجی کا پاڑا اور گھر کیوں گھیرے میں لے رکھا ہے۔ سپاہی نے لچھمی کو مشورہ دیا کہ وہ جتنی جلدی ہو سکے علاقے سے نکل جائے یا کہیں چھپ جائے اور جب تک کچھ واضح نہ ہو، باہر نہ نکلے۔ کسی سنگین واقعے ہی پر پولیس کی اتنی بڑی تعداد حرکت میں آ سکتی ہے۔ سپاہی کی اطلاع کے بہ موجب ماری کو تھانے میں آئے گھنٹے بھر سے زیادہ نہیں ہوا تھا۔ لچھمی وہاں نہیں رکا اور گلیوں گلیوں چلتا سواری پکڑ کے سیدھا پاڑے آگیا۔

چوکی پر سکوت چھا گیا تھا۔ تھجل خاموش بیٹھا حقّے کے کش بھرتا رہا۔ لمحوں بعد اُس نے بالے اور زورا کو اشارہ کیا۔ "دیکھ کے آؤ رے! لاڈو کا کیا بولتا ہے؟"

بالے اور زورا فوراً اُٹھ گئے۔ میں بھی اُن کے ساتھ اُٹھا تھا مگر تھجل نے تند لہجے میں مجھے اپنی جگہ بیٹھے رہنے کی ہدایت کی۔ میرا خیال تھا، ہم تینوں راجان کی موٹر میں جائیں جو پاڑے کی گلی کے سرے پر کھڑی ہے۔ میں نے پوچھنا چاہا کہ جب بالے اور زورا جا سکتے ہیں تو تھجل مجھ پر پابندی کیوں لگا رہا ہے لیکن اُدھر سے جمرو نے میرا ہاتھ کھینچ کے مجھے چپ چاپ بیٹھے رہنے کی تلقین کی۔ ناچار میں بیٹھ گیا تاہم میں نے تھجل سے کہا کہ بالے اور زورا موٹر ساتھ لے جائیں تو بہتر ہے۔ میرا مقصد تھا کہ وہ جلد واپس آجائیں گے۔ تھجل نے سُنی اَن سُنی کر دی۔ بالے اور زورا نے بھی تھجل کے ردِعمل کا انتظار نہیں کیا جیسے میں نے کوئی بہت فضول بات کہی ہو۔ وہ دونوں ایک بھی لمحے کی تاخیر کیے بغیر دروازے سے نکل گئے۔

"لوگ باگ اُودر کیا بولتا تھا؟" جیسے ہی زورا اور بالے نگاہوں سے اوجھل ہوئے، پانڈے دادا لچھمی پر ناراض ہونے لگا کہ وہ اصل بات جانے بغیر وہاں سے کیوں چلا آیا؟

"اپن نئیں آنے کا تھا پر...."

تھجل نے ہاتھ اُٹھا کے لچھمی کو روک دیا اور دھیمی آواز میں پانڈے سے کہا کہ فی الحال زورا اور بالے کی واپسی کا انتظار کیا جائے۔

گویا تھجل کی مُراد یہ تھی کہ لچھمی کو اِس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم جتنا وہ بتا چکا ہے اور ابھی کوئی قیاس آرائی قبل از وقت ہوگی یا اِس احتیاط کی وجہ دوسری تھی۔ چوکی کے اطراف فرش پر مختلف پاڑوں کے دادا اور علاقے کے آدمی بیٹھے تھے، اُن کے سامنے کوئی حجّت مناسب نہیں تھی۔ انھیں بس ایک حد تک شامل رکھنا چاہیے تھا مگر یہی بات تھی تو تھجل لچھمی کو لے کے اندر جا سکتا تھا۔ وہ وہیں موجود رہا اور چند ثانیوں بعد لچھمی اُس کے سامنے سے ہٹ گیا۔

مجھ سے وہاں بالکل نہیں بیٹھا جا رہا تھا۔ کم و بیش سبھی کا یہی حال تھا۔ جمرو، شامو، مارتی، چھیدا، دینا، سکندر، گلیا سبھی کا۔ اُن کے چہروں پر رنگ آ رہے تھے اور جا رہے تھے۔ سب بار بار تھجل کو دیکھتے۔ تھجل سر جھکائے حقّہ گڑگڑاتا رہا۔ شاید کسی کو بھی اُس کی خاموشی اچھی نہیں لگ رہی ہوگی۔ لگتا تھا، وقت جیسے نکلا جا رہا ہے اور تھجل یقیناً کسی غفلت کا مرتکب ہو رہا ہے۔

پانڈے دادا سے برداشت نہیں ہوا۔ "ایسا کیسے دادا!" وہ منتشر لہجے میں بولا۔ "ماری ایسا کیا؟...."

تھجل نے اُسے بات پوری نہیں کرنے دی اور ناگواری سے کہا۔ "کیا بولیں دادا!"

"اپن یہی سوچتا ہے، ماری اُودر کیسے چلا گیا؟" پانڈے اُلجھی ہوئی آواز میں بولا۔ "ماری کو اپن چھوکری ٹیم سے جانتا ہے۔ دادا ہی نے اُس کا شادی جارجی سے بنایا تھا۔" تھجل کی خاموشی پر پانڈے پیچ و تاب کھانے لگا اور لچھمی کو گالیاں بکنے لگا۔

"جارجی تو رات ایدر اپن لوگ کے ساتھ تھا دادا!" دینا نے

جھجکتے ہوئے کہا۔ "رات اپن سب ساتھ میں باہر نکلا تھا۔"

"کیدر جاتا تھا۔ ایک دم بھُوت مافک شکل بنا تھا، کپڑا میلا چکٹ، کتنا دن سے ایدری تھا' اپن بولا' ابھی بہت ہوگیا، گھر جاکے تھوڑا آرام کر بابا! نئیں جانا مانگتا تھا۔ اپن گالی دیا کہ سالا، ابھی دادا کا ایسا واندا ہے تو کاہے کو خالی پیلی ایدر چوڑی ڈالے بیٹھا ہے۔ ابھی گلے ماپٹا ڈال کے تین چار کو ایدر لائے تو اپن بولے' ہاں دادا کا سگا' دادا کا جانی ہے' دفع ہوگیا۔ اپن کو بعد میں دھیان بھی آیا کہ تھوڑا جاستی بول گیا۔"

پانڈے جو منہ میں آیا' کہتا رہا۔ تجمل نے دخل نہیں دیا۔ وہ شاید سُن بھی نہیں رہا تھا' معلوم ہوتا تھا جیسے وہاں موجود ہی نہ ہو۔

ماری کا تھانے میں ہونا اِتنی بڑی بات نہیں تھی جتنی اُس کے گھر اور قلابے کے پاڑے کے اطراف پولیس کی ہرگشت۔ لچھمی کی اطلاع بہت اَدھوری تھی۔ کچھ بھی ممکن تھا۔ ہوسکتا ہے' رات اندھیری کی طرح پولیس نے اب قلابے کا رُخ کیا ہوا اور یہ محض معمول کی بات ہو۔ یا رات اندھیری سے گرفتار ہونے والے تاجروں نے قلابے کی طرف اشارہ کیا ہو۔ پولیس کی ہر کارروائی دُور سے اتنی شدید نظر آتی ہے۔ گزشتہ تین دن سے پولیس مختلف جگہوں پر چھاپے مارتی رہی ہے مگر ماری کیوں؟ ماری نے ایسا کیا جرم کیا ہے؟ کہیں ماری لپیٹ میں نہ آ گئی ہو۔ گو لچھمی نے اُسی کے بارے میں بتایا تھا، ممکن ہے' جارجی اور قلابے کے پاڑے کے دوسرے آدمی بھی تھانے میں موجود ہوں۔

زورا اور بابے کو جلد یا بدیر واپس آنا ہی تھا مگر اُن کے آنے سے پہلے مختلف امکانات کا ایک اندازہ لگا لینا بہتر تھا۔ قلابے کے پاڑے پر ہونے والے کسی بھی واقعے سے ملہم کے پاڑے کا ردِ عمل مشروط تھا۔ تجمل کی خاموشی اُس کے اضطراب کی غماز تھی' پیش بینی و پیش بندی کے اضطراب کی۔ میری نظریں بھی جانے کہاں کہاں بھٹک رہی تھیں اور کسی ایک جگہ ٹھیرتی ہی نہ تھیں۔ نگاہ کا تعلق بینائی سے نہیں ہے' نگاہیں بے نور آنکھوں کی بھی ہوتی ہیں اور اُن کے لیے پردے' زاویے اور فاصلے کی شرط نہیں اور ارادے کی بھی۔ پانڈے دادا کچھ دیر کے لیے سکون سے بیٹھا رہا تھا کہ پھر بے چین ہونے لگا اور جھینپتی آواز میں تجمل سے بولا۔ "ابھی اپن ہی خود قلابے طرف کیوں نہ چلے دادا؟"

مَیں نے بھی بے اختیار اُس کی تائید میں آواز اُٹھائی' میرے پیچھے سے کسی اور نے بھی۔ تجمل نے سر اُٹھا کے تند نظروں سے پہلے مجھے دیکھا' پھر پانڈے دادا کو اور سپاٹ لہجے میں بولا۔ "اُدھر ہی کون گئے ہیں دادا! اپنے ہی آدمی ہیں۔"

پانڈے دادا سر ہلاتا رہ گیا۔

تجمل کی کوئی خواہش نہ ہوگی' یقیناً اُس نے پانڈے اور اُس کے گرد بیٹھے ہوئے دادؤں کی رسّیاں ڈھیلی کرنے کے لیے چائے کا ذکر کیا تھا۔ پانڈے ماتھے پر ہاتھ مارنے لگا جیسے اُس سے کوئی بڑی فروگزاشت ہوگئی ہو۔ سماوار سے بھاپ اُٹھ رہی تھی اور بالو نامی پاڑے کا ایک آدمی منتظر بیٹھا تھا۔ پانڈے نے زور سے چیختے ہوئے اُسے چائے کا حکم دیا حالانکہ بالو قریب ہی تھا۔ چھیدا نے چائے کی پہلی پیالی تجمل کے آگے رکھی تھی کہ یک بیک سب کی نظریں دروازے کی طرف اُٹھ گئیں۔ کُرتے' پاجامے اور واسکٹ میں ملبوس ایک ادھیڑ آدمی دروازے پر گلیا سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ درمیانہ قد' درمیانہ تن و توش' سرمئی رنگ' وضع قطع سے وہ اجنبی لگتا تھا۔ اجنبی لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی اور کسی طرح کی روک ٹوک نہیں تھی۔ جانے اُس نے کیا پوچھا تھا کہ گلیا کو حجت کرنی پڑی۔ اُسے وہاں رُک کے گلیا لپکتا ہوا چوکی کی طرف آیا اور تجمل کے پاس پہنچ کے بولا۔ "دادا! وہ ظہیر کا نام لیتا ہے' بولتا ہے' اپن کو اُس سے ضروری کام پڑا ہے۔"

"ظہیر!" مَیں نے چونک کے کہا۔

"اپن بولا' اپن کو بول دیو۔" گلیا نے تیزی سے کہا۔ "پر وہ ....."

میں فوراً اُٹھ گیا لیکن تجمل نے ہاتھ اُٹھا کے مجھے منع کر دیا اور نووارد کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ ہماری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔

"اپن کو اوپر کا دکھائی پڑتا ہے دادا!" گلیا نے دبے لہجے میں کہا۔ اوپر سے اُس کی مراد پولیس تھی۔ مجھے بھی یہی شک گزرا تھا۔

اتنی دیر میں وہ تیز قدموں سے چلتا، فرش پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو عبور کرتا چوکی کے پاس آگیا اور جوتے اُتار کے تجمل کے سامنے بیٹھ گیا۔ اُس کے زبان کھولنے سے پہلے تجمل نے درشتی سے پوچھا کہ "کیا بات ہے؟"

"اپن کو ظہیر صاحب سے ملنا ہے۔" اُس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"کام بولو؟"

"اپن کو اُنھی سے ملنا ہے۔" وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ اُس کے لہجے میں عاجزانہ اصرار تھا۔

مَیں تجمل کے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا۔ اِس سے پہلے کہ تجمل کوئی جواب دیتا، مَیں نے اُسے بتایا کہ میرا نام ظہیر ہے۔

مجھے دیکھ کے اُس کی آنکھوں میں چمک سی اُمڈ آئی' وہ کھسک کے جھٹ میرے قریب آگیا اور سرگوشی میں بولا کہ مجھے اے ڈی آئی جی صاحب نے بُلایا ہے۔

"اے ڈی آئی جی!" میری آواز سٹ پٹا گئی۔

"جی جناب! شکلا صاحب نے۔"

"شکلا جی نے؟" مَیں نے حیرانی سے کہا۔

"جی جناب! آپ کو اور تجمل صاحب کو۔"

مَیں نے تجمل کی طرف دیکھا اور اُسے بتانا چاہا مگر تجمل نے سُن لیا تھا۔ "کدھر ہیں صاحب؟" اُس نے بھاری آواز میں پوچھا۔

"اُدھر ہی تھانے کی طرف۔"

تجمل نے بس ایک لمحے تامّل کیا ہوگا کہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ پانڈے دادا اور چوکی پر موجود سبھی ایک دم ہمارے ساتھ اُٹھ گئے۔ تجمل نے اُنھیں بیٹھے رہنے کی ہدایت کی اور چوکی سے اُتر گیا۔

"ابھی کدھر دادا؟" پانڈے دادا وحشت سے بولا۔

مَیں نے نہیں دیکھا' تجمل نے کیا اشارہ کیا تھا جو پانڈے دادا کا پھڑکتا ہوا جسم ٹھٹک گیا تھا۔ تجمل نے اُسے مزید استفسار کی مہلت نہیں دی اور بہ عجلت دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

ماہم کا تھانا پاڑے سے خاصی دُور تھا۔ باہر منتشر کھڑے ہوئے پاڑے کے کئی آدمی مجھے اور تجمل کو دیکھ کے سیدھے ہوگئے۔ وہ ہمارے پاس آیا ہی چاہتے تھے مگر ہماری بے تپاک آنکھوں سے اُنھوں نے جان لیا کہ سرِدست ہمیں اُن کی توجہ کی ضرورت نہیں ہے یا ہمیں جلدی ہے' اُن کی رخنہ اندازی ناگوارِ خاطر ہوگی۔ وہ بس چند قدم بڑھ کے رہ گئے۔ گلی کے آخر میں دائیں جانب مڑتے ہوئے میری نظر پاڑے کی طرف گئی' مَیں نے وہاں چبوترے پر گلیا' لچھمی' چھیدا' شنکرا' جمرو اور ماریٹ کے علاوہ بہت سے لوگوں کو کھڑے دیکھا۔ سب ہمارے پیچھے آنے کے لیے بے چین تھے۔

سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی ابّا جان کی موٹر میں ڈرائیور اونگھ رہا تھا۔ موٹر سے ہم جلدی پہنچ سکتے تھے۔ مَیں نے تجمل کو مشورہ دینا چاہا لیکن موٹر کے سامنے پہنچنے کے باوجود وہ آگے چلتا رہا' مَیں بھی چپ رہا۔ اِس اجتناب کی تاویل سمجھ میں آتی تھی۔ تجمل کو کسی آمادگی کے لیے شاید کچھ وقت درکار تھا۔ لچھمی کی اطلاع کے چند منٹ بعد شکلا کے ہرکارے کی آمد ایک ہی سلسلے کی کڑی معلوم ہوتی تھی۔ کوئی غیر معمولی بات ہی ہوگی جو شکلا نے اِس طور ہمیں طلب کیا تھا اور تجمل کو بطورِ خاص۔ سادہ پوش سے اِس سلسلے میں کچھ سُن گُن مل سکتی تھی لیکن تجمل نے اُسے کسی مشکل میں نہیں ڈالا۔

پاڑے پر آتے وقت دھوپ اتنی تیز نہیں تھی' نہ سڑک پر ایسا ہجوم تھا جیسے سارا شہر اِسی علاقے میں سمٹ آیا ہو۔ پیدل چلنے والے بہرحال اپنا راستہ نکال لیتے ہیں۔ ہم کسی رکاوٹ کے بغیر تیز قدمی سے فاصلے طے کرتے رہے۔ ابھی ہم پاڑے سے کوئی میل بھر دُور آئے ہوں گے کہ شکلا کا فرستادہ سادہ پوش چلتے چلتے ہڑبڑا سا گیا اور اُس نے دونوں ہاتھ پھیلا کے ہمیں روک لیا۔ اُسی لمحے سامنے سے پولیس کی جیپ ہارن بجاتی ایک جھٹکے سے ہمارے قریب ٹھیر گئی۔ اُس میں پولیس افسر اور سپاہی بیٹھے ہوئے تھے' شکلا نظر نہیں آیا۔ رُکتے رُکتے جیپ کچھ دُور گھسٹتی چلی گئی۔ ابھی ڈرائیور نے انجن بند نہیں کیا تھا کہ ایک نوجوان افسر جست لگانے کے انداز میں اُتر پڑا۔ درمیان کا فاصلہ اتنا نہیں تھا' چند قدم بعد وہ ہمارے سامنے تھا۔ اُسے دیکھ کے سادہ پوش کا جسم تن گیا اور اُس نے سپاہیانہ تن دہی سے افسر کو سلام کیا۔ نوجوان افسر نے سر کی خفیف جنبش سے اُسے جواب دیا' کسی قدر ناگواری سے۔ اُس کی پھیلی پھیلی آنکھیں ہم پر جم گئی تھیں' اُسے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اُس نے ہچکچاتے ہوئے جیپ کی طرف اشارے کے لیے ہاتھ اُٹھایا ہی تھا کہ تجمل اُسی جانب چل پڑا اور اِس سے پہلے کہ اردگرد ٹھٹکتے راہ گیروں کی بھیڑ لگتی' ہم جیپ کی پچھلی نشست پر جا بیٹھے۔ ڈرائیور کو بہت عجلت معلوم ہوتی تھی۔ جیپ مڑنے پر پاڑے کی طرف جانے والا راستہ سامنے آگیا۔ مَیں نے ماریٹ' جمرو' گلیا' لچھمی اور پاڑے کے کئی آدمی اِدھر اُدھر سڑک پر کھڑے دیکھے۔ ہمیں کچھ خبر ہی نہیں ہوئی۔ وہ ہمارے پیچھے آ رہے تھے اور اتنی دور آگئے تھے کہ ہمارے اُن کے مابین گزوں کا فاصلہ رہ گیا تھا مگر جیسے جیسے جیپ کی رفتار تیز ہوتی گئی' فاصلہ بڑھتا گیا تا آں کہ وہ نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

ڈرائیور اور افسر کے علاوہ دو بندوق بردار سپاہی بھی جیپ میں موجود تھے۔ ہم تینوں کے اضافے سے جگہ کی تنگی ہوگئی تھی۔ سڑکوں پر گونجتے شور کی وجہ سے کوئی بات کرنا یوں بھی ممکن نہ تھا۔ ممکن ہوتا بھی تو اب کچھ جاننے سے کیا حاصل تھا۔ ماہم کا تھانا آیا چاہتا تھا۔ سب گونگے بنے بیٹھے رہے۔ راستے میں نوجوان افسر نے کئی بار مڑ کے ہمیں دیکھا جیسے ہم کہیں غائب تو نہیں ہوگئے۔ مَیں نے فٹ پیری پر اُس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی تھی۔ اُن میں خشونت نہیں تھی جتنی وحشت تھی اور حیرانی۔ اُس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور وہ کسی حد تک بدحواس بھی لگتا تھا۔ ہم سے اُس کا برتاؤ عام پولیس والوں جیسا نہیں تھا۔ اِس کی وجہ شکلا سے تعلق کی رعایت تھی یا شہر کے سب سے بڑے دادا کا لحاظ مانع تھا یا کچھ اور؟ کوئی خاص ہدایت؟ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ ہماری حیثیت کیا ہے' ہمیں خود کو کیا سمجھنا چاہیے۔

جیپ کی رفتار کم نہیں تھی۔ ڈرائیور بھی مسلسل ہارن بجا رہا تھا۔ دُور سے لوگ پولیس کی موٹر دیکھ کے ویسے ہی ایک طرف ہوجاتے ہیں۔ دس پندرہ منٹ کے قریب گزر گئے' جیپ نہیں ٹھیری' مجھ سے ضبط کرنا مشکل ہوگیا۔ ہم ماہم کے علاقے سے آگے نکل آئے تھے۔ مَیں نے

سوچا، تبھل سے کہوں یا اپنے پاس بیٹھے ہوئے سپاہی کو ٹوکوں کہ وہ ہمیں کہاں لیے جا رہے ہیں لیکن کہیں بھی کوئی بھی منزل ہو ہمارے لیے اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں نے اپنی زبان بند رکھی۔ تبھل نے بیڑی سلگالی تھی اور لوہے کے ڈنڈے سے ٹیک لگائے دائیں طرف کے بھاگتے منظر دیکھنے میں گم تھا یا اپنے آپ میں۔

وہ قلابے کا تھانا تھا، جیسا کہ تبھی کہہ رہا تھا، چار دیواری کے اطراف بڑی تعداد میں سپاہی گشت کر رہے تھے۔ اندر بھی سپاہیوں کی تعداد کم نہیں تھی۔ اتنے لوگوں کی موجودگی کے باوجود تھانے پر سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ جیپ سامنے کے حصے کے بجائے کونے پر ایک گول کمرے کے سامنے رُک گئی۔ اگلی نشست سے پولیس افسر تیزی سے نیچے اُترا۔ میں بھی اُس کے ساتھ اُٹھ گیا تھا لیکن تبھل کو بے حس و حرکت دیکھ کے ٹھیر گیا۔ پولیس افسر جب تک جیپ کے پیچھے ہماری طرف نہیں آیا اور اُس نے ہم سے اُترنے کے لیے نہیں کہا، ہم بیٹھے رہے۔ کمرے سے ملحق دالان جیسے ایک مختصر حصے میں پولیس افسر نے ہمیں کرسیوں پر بیٹھنے کی ہدایت کی اور وردی درست کرتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔ دونوں بندوق بردار سپاہی باہر رہ گئے، سادہ پوش بھی۔

پولیس افسر کو گئے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ اندر سے یکایک شکلا نمودار ہوا۔ اُس کی آنکھیں جل سی رہی تھیں۔ ہم دونوں کھڑے ہو گئے۔ آدمی کی نگاہ پہلے مانوس چہروں پر جاتی ہے، اُس کی نظر پہلے مجھ پر پڑی۔ وہ بے تحاشا میری طرف بڑھا اور میرا شانہ جکڑ کے بولا "آؤ، آؤ، اندر آجاؤ۔" میری نگاہ بے ارادہ تبھل کی طرف گئی۔ شکلا کو یک دم تبھل کی موجودگی کا احساس ہوا اور اُس نے تبھل کے سلام کا جواب جلدی جلدی سر ہلاتے ہوئے دیا۔ "آؤ دادا تبھل!" تبھل کی کمر پہ ہاتھ رکھ کے اُس نے اُسے بھی اندر چلنے کی تلقین کی۔ اُس کی ہیجانی حالت سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُسے ہمارا شدت سے انتظار تھا۔ اُس کے اضطراب و انتشار کے باوجود مجھے اپنا جسم کھُلتا ہوا محسوس ہوا جیسے کہیں کوئی دریچہ وا ہو گیا ہو۔ شکلا کے رویّے میں معاندت نہیں تھی مگر جو بات بھی تھی، شکلا کے ہاں ہمارے لیے معاندت تو ویسے بھی محال تھی۔ وہ اُداس اور مایوس ہی ہو سکتا تھا۔ ہمارے لیے وہ پولیس والا کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔

کمرے میں کئی اور افسران بھی جمع تھے۔ سب کرسیوں سے اُٹھ گئے۔ اُن کی متجسس نگاہیں ہم دونوں کو حصار میں لیے ہوئے تھیں مگر وہ لوگ زیادہ دیر کمرے میں نہیں ٹھیرے، شکلا نے زبان سے کچھ نہیں کہا مگر کوئی اشارہ کیا ہوگا، سب کمرے سے نکل گئے۔ میرے دل کی حرکت جیسے مدّھم ہو گئی تھی۔ ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ شکلا ہم سے بہت قریب میز کے کنارے پر بیٹھا رہا اور کسی تاخیر کے بغیر اُس نے تبھل سے پوچھا "آپ لوگوں کو کچھ پتہ چلا؟"

"کائے کا صاحب؟" تبھل نے تھمی ہوئی آواز میں کہا۔

"ماری کا؟"

"اپنے کو پتہ لگا ہے، ماری ادھری تھانے میں بیٹھی ہے۔"

"صرف اتنا؟ اتنا ہی؟"

"کیا بات ہے صاحب؟" تبھل نے تندی سے پوچھا۔

شکلا نے ہنکاری بھری اور تبھل کو گھورتے ہوئے بولا "ماری تم کو کب سے نہیں ملی دادا؟"

"دادا کے پُرسے میں پرسوں اُس کی صورت دیکھی تھی، ایک بار کو بس۔" تبھل نے جز بز ہو کے کہا "اپنا اُس سے زیادہ ناتا نئیں ہے صاحب! پیرو دادا کا بہت تھا۔ لوگ بولتے ہیں، دادا نے بس اُسے جنا ہی نہیں تھا۔ کاٹ پیٹ کے باقی کا سارا دادا نے بنایا تھا اُس کو۔ گھورے سے اُٹھا کے گھر میں رانی بنا کے بٹھایا تھا اُس نے۔"

"اور کچھ.....؟" شکلا بے تابی سے بولا۔

"قلابے کے دادا جارجی کے ہاتھ میں دادا نے ہی اُس کا ہاتھ دیا تھا، پر صاف صاف بولو، بات کیا ہے صاب؟"

"تم ماری کو کب سے جانتے ہو؟"

"زیادہ ٹائم سے نہیں۔ بیس پچیس دن سے اوپر نہیں ہوئے" تبھل نے ٹھیرے ہوئے لہجے میں کہا "بعد کو بھی ہم نے دوبارہ سے زیادہ اُس کو نہیں دیکھا۔"

"لیکن، لیکن ماری تو تم کو خوب جانتی ہے۔"

"ہم کو؟" تبھل کی آواز اونچی ہو گئی۔ "اپنے کو نہیں پتہ کیسے۔ دادا نے بولا ہو گا۔ ہر جگہ اپنے لیے ایسا ہی اُلٹا سیدھا بولتا تھا۔"

"تم ظہیر! تم کب سے اُسے جانتے ہو؟"

"یہی، جو تبھل بھائی بتا رہے ہیں۔" میری زبان لکنت کرنے لگی۔ "مگر آپ..... آپ کیا، ماری نے کہیں ہمارا نام لیا ہے؟"

"ہاں!" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ماری یہاں کس جرم میں آئی ہے؟"

"قتل کے۔" شکلا نے سر جھکا کے کہا۔

میری سانس سینے میں اٹک گئی۔ "ماری نے قتل کیا ہے؟ کس کا؟" میں نے تبھل کی طرف دیکھا، وہ بھی ساکت بیٹھا تھا۔

"اُس نے اپنے شوہر کا خون کر دیا ہے۔"

"اپنے شوہر! جارجی کا؟"

شکلا نے ہونٹ بھینچ لیے اور اضطراری انداز میں اپنی [illegible]نی رگڑنے لگا۔

"کب؟" میری آواز ٹھٹھر گئی تھی۔ "جارجی تو رات، سُنا ہے [illegible]ک پاڑے میں تھا، ماہم کے پاڑے میں۔"

"ماری نے اُسے سویرے قتل کر دیا۔"

"کیوں؟ مگر ماری کیوں؟ نہیں نہیں، ہو سکتا ہے کسی اور [illegible]نے اُسے..... ماری تو ایک عورت، ایک اچھی عورت.....؟"

"ماری نے یہاں آ کے خود کہا ہے۔"

"ماری نے اقبال کیا ہے؟"

"ہاں، اُسی نے۔"

میرا جسم سُن ہو گیا، تبھل بھی کچھ نہیں بولا۔ ہم دونوں اُس کا [illegible]ہ تکتے رہے۔

"ماری نے آلۂ قتل بھی پولیس کو پیش کر دیا ہے، ایک خنجر....." [illegible]شکلا نے دھیمی آواز میں کہا۔

"مگر کیوں؟ ماری نے اِس کا کچھ سبب بھی بتایا؟"

"تمھارے خیال میں اِس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟"

"میں، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"تبھل دادا! آپ بولو؟"

تبھل سر اُٹھا کے رہ گیا۔ کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ خاصی دیر بعد تبھل نے زبان کھولی "اُدھر اکیلا جارجی تھا صاب؟"

"یہ تم نے کیوں پوچھا دادا؟" شکلا کی آواز تڑخ رہی تھی۔

"ایسے ہی....." تبھل نے منہ بنا کے کہا۔

"تم دوسرے کو جانتے ہو دادا؟"

"نہیں، پر جارجی اکیلا نہیں ہونا چاہیے۔ اکیلا ہوتا تو تھوڑے دن ابھی اور مل جاتے، ماری اِتنے دن کی بھیک اُس کو اور [illegible]دے دیتی۔"

"تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"اپنا کہنا سننا بعد میں رکھنا، ٹائم پڑا ہے اور ہم اِدھری ہیں۔ آپ اپنی بولو صاحب! اور ایک بات اچھی طرح جان لو، آپ کو ہم وردی والا نہیں سمجھتے، آپ وردی والی بولو گے تو ہم سے ٹھیک....."

"نہیں دادا!" شکلا نے ہاتھ اُٹھا کے تیزی سے کہا۔ "ایسا مت کہو، کچھ ہرگز مت سمجھنا۔ میں کچھ پوچھنا، کچھ جاننا چاہتا ہوں۔ مجھے کھُل کے بتاؤ، کچھ مت چھپاؤ۔"

"چھپانے کا اپنے پاس کچھ نہیں ہے۔" تبھل نے تلخی سے کہا۔ "اور آپ سے کیا چھپائیں گے، پھر ایک حکم پر نہیں آجاتے۔"

"مجھے اندازہ ہے۔"

"ہم کو ابھی سب آپ کی زبان سے پتہ چلا ہے۔"

"وہاں ایک اور بھی تھا" شکلا نے بتایا "جارجی کا رشتے دار دکی نام کا، گوا میں رہنے والا غنڈا..... اُس کی شناخت ہو گئی ہے۔ تم اُسے جانتے ہو؟"

"نہیں صاحب! ماری سے اُس کا نام سُنا تھا، دیکھا نہیں، پر وہی ہو سکتا ہے۔"

"وہی کیوں؟"

"یہ ماری نے آپ کو بول دیا ہو گا" تبھل سرد لہجے میں بولا۔

"وہ جارجی اور دکی....." میں نے سٹ پٹائی آواز میں کہا "جارجی کی طرف بھی میرا دھیان گیا تھا لیکن وہ تو مسلسل دادا کے پاس، اُس کے پاڑے پر، وہ تو بالکل ہی....."

"اُسے اُن دنوں اُدھر ہی رہنا چاہیے تھا۔"

"مگر ماری کو، ماری کو یہ کیسے معلوم ہوا؟"

"وہ بولتی ہے، اُسے پتہ تھا۔"

"پتہ تھا، جانتی تھی وہ؟" میری آواز حلق میں پھنس گئی۔

"نہیں، بولتی ہے، یقین تھا اُسے۔"

"یقین غلط بھی....." میں کہتے کہتے رُک گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں کیسی بچوں جیسی باتیں کر رہا ہوں۔ پولیس نے ماری سے اُس کے یقین کے ثبوت ضرور چاہے ہوں گے۔ کوئی عورت اپنے شوہر کو یوں قتل کر سکتی ہے! میری رگوں میں خون سن سنا رہا تھا اور لگ رہا تھا جیسے یہ سب جھوٹ ہے۔

شکلا میز سے اُٹھ کے ہمارے مقابل کرسی پر بیٹھ گیا اور رومال سے ماتھے کا پسینہ خشک کرتے ہوئے آہستگی سے بولا "دادا! ماری تم سے ملنا چاہتی ہے۔"

"اپنے سے؟" تبھل نے چونک کے کہا۔

"اُس نے تھانے آتے ہی تم کو بلانے کو کہا تھا۔ وہ تم سے کچھ کہنا چاہتی ہے، تم سے بھی اور، اور راجا سے بھی۔" مجھ پر نظریں جماتے ہوئے شکلا تیکھے لہجے میں بولا "وہ ظہیر سے بھی ملنا چاہتی ہے۔"

"اب کیا چاہتی ہے وہ؟" میں نے ترشی سے کہا۔

"پولیس نے جاننے کی کوشش کی تھی مگر ماری نے انکار کر دیا، بولی کہ اُسے کچھ اپنے لیے بات کرنا ہے اور صرف تم سے۔ کسی کو اُس نے نہیں بلایا۔" نہ میں نے کچھ کہا نہ تبھل نے۔ شکلا

کلبلانے لگا۔ "کیا سوچنے لگے دادا؟"

"کدھر ہے وہ شیر کی جنی؟" بٹھل نے بوجھل آواز میں پوچھا۔

"یہیں، یہیں تھانے میں۔"

"اپنے کو لے چلو اُس کے پاس۔"

"ہاں۔" شکلا نے کسمساتے ہوئے کہا۔ "لیکن دادا مجھے بتاؤ یہ سب کیا ہے؟"

"اُس سے پوچھ کے بولیں گے۔"

شکلا نے کچھ کہنا چاہا، پھر گہری سانس لے کے دفعتہً کرسی سے اُٹھ گیا۔ ہم بھی کھڑے ہوگئے اور اُس کے پیچھے پیچھے کمرے سے نکل آئے۔ وہاں سپاہی اور ہمیں لانے والا پولیس افسر موجود تھے۔ اُن کی طرف توجہ دیے بغیر شکلا دالان کے اندر ہی کھلنے والے ایک دروازے میں داخل ہوگیا۔ میری ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں، تاہم اپنا بُت گھسیٹتا ہوا میں بٹھل کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

ماری چوتھے کمرے میں تھی۔ باہر سنگین بردار پولیس والوں کا پہرا تھا۔ یہ حوالات نہیں تھی۔ تھانے کے پچھواڑے کوٹھری جیسا ایک تنگ کمرا حوالات بنا دیا گیا تھا۔ ایک کونے میں بچھی ہوئی چٹائی پر ماری دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ دن کی روشنی کے باوجود کمرے میں اجالا نہیں تھا۔ سپاہی نے بلب جلا دیا۔ ہم جیسے ہی اندر پہنچے، ماری یک لخت اُٹھ کھڑی ہوئی اور پہلے تو چند لمحے گُنگ کھڑی رہی، پھر اُس کے بدن میں جیسے کوئی لہر متلاطم ہوئی، وہ وحشیانہ انداز میں بٹھل کی طرف جھپٹی۔ بٹھل نے اُسے سینے سے لگا لیا۔ ماری بلک بلک کے رونے لگی۔ بٹھل اُسے بازوؤں میں دبوچے خاموش کھڑا رہا۔

سپاہیوں نے جلد از جلد باہر سے تین کرسیاں لا کے رکھ دی تھیں۔ شکلا نے ایک کرسی اور لانے کا حکم دیا۔ ماری ہچکیوں سے رو رہی تھی، زار و قطار۔ جیسے بس کسی نشیب کے لیے اُس کی آنکھوں کا سیلاب رُکا ہوا تھا جیسے اُسے بس بٹھل ہی کا انتظار تھا۔ بٹھل اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرتا، اُس کی کمر سہلاتا رہا۔ ماری کی سسکیاں اور کراہیں سارے کمرے میں گونج رہی تھیں۔ در و دیوار بھی جیسے شامل ہوں۔ ایسی آہ و زاری کہ دیکھنے اور سننے والے کو پاگل کر دے۔ آدمی کو خاک کر دے۔ "کیا کر لیا ری؟" بہت دیر بعد بٹھل نے ٹوٹی پھوٹی آواز میں کہنے کی کوشش کی۔ "مر گئے تھے ہم کیا، اِتی جلدی کائے کو پڑی تھی۔"

ماری اور سسکنے لگی۔

شکلا وہیں کھڑا تھا۔ بٹھل نے بہ مشکل ماری کو بازوؤں سے بٹھا کے کرسی پر بٹھایا۔ "بڑے صاحب اِدھری ہیں، کیا بولیں..."

بٹھل نے اُسے پچکارتے ہوئے کہا۔

"مجھ کو جانا چاہیے دادا؟" شکلا تذبذب سے بولا۔

"بیٹھو صاحب! اِس کے لیے ابھی سب ایک جیسا ہے" ... نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔ کرسی پر بیٹھی ماری گری گری جا... تھی۔ بہت تھکی ہوئی، بہت دن کی تھکی ہوئی لگتی تھی۔ بال بکھرے، چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا۔ دھنسی ہوئی لال لال آنکھ... نیلے رنگ کی چادر پیروں میں پڑی ہوئی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا... ایسی خستہ شکستہ عورت سے خنجر اٹھایا گیا ہوگا۔ "بڑے صاحب کے نہیں ہیں۔" بٹھل نے اُس سے کہا۔ ماری کو جیسے اپنی خبر... تھی۔ منہ چھپائے سسکیاں بھرتی رہی۔ "اب کیوں بلایا ہے" بٹھل کی آواز میں درشتی آگئی۔ "پھوٹتی کیوں نہیں منہ سے... کے مت دیکھ اب...."

ماری کے ہونٹوں پر لرزش طاری ہوئی اور وہ بٹھل... یاس بھری نظر ڈال کے رہ گئی۔

شکلا کے تالی بجانے پر ایک سپاہی اندر آگیا۔ شکلا نے... سے پانی منگایا اور نرم لہجے میں ماری کو متنبہ کیا کہ اُس کی خوا... پر ہم دونوں کو بلایا گیا ہے۔ بہتر ہے کہ وہ اپنے حواس قابو میں ر... جس کا وہ پہلے مظاہرہ کرتی رہی ہے۔ یہ تھانہ ہے، ملاقاتی بہت دیر تک اُس کے سامنے نہیں بیٹھ سکتے۔ سپاہی پانی لے کے آ... شکلا کے اشارے پر اُس نے گلاس ماری کے آگے بڑھایا تو ماری نے منہ پھیر لیا مگر بٹھل کے دخل دینے پر اُس نے چند گھونٹ اپنے حلق میں اُتار لیے۔ شکلا اُسے سمجھانے لگا کہ ماری جتنا سچ بولے گی، اُتنی ہی اُس کے لیے آسانی ہوگی۔ ماری نے اُس تلقین پر توجہ نہیں دی بلکہ اُس نے تو جیسے سنا ہی نہیں۔ شکلا پہلو بدلنے... کہ کہیں اُس کی موجودی تو ماری کی لب کشائی میں حارج نہیں رہی؟ وہ اُٹھنا ہی چاہتا تھا کہ بٹھل نے ماری سے پوچھا۔ "بچے کدھر ہیں؟"

ماری پھر پھوٹ پڑی اور بلکتی آواز میں بولی کہ بچے پو... اسکول میں ہیں اور اُنھی کے لیے اُس نے ہمیں بلایا ہے۔ "اُن... اب کوئی نہیں ہے دادا! کوئی بھی نہیں۔" وہ اپنا چہرہ کھسوٹنے...

"اُن کی ابھی تو خود ہے۔"

"اپن جانتا ہے؟ اپن ابھی کدھری ہے دادا! اور ابھی... رہنا بھی نہیں مانگتا۔" ماری کی آواز کے ساتھ اُس کا سارا بدن...

...ہاتھا، ہاتھ جوڑ کے مجھ سے اور بٹھل سے التجا کرنے لگی کہ اب ہمی... ن کے بچوں کا خیال رکھنا ہے۔ "وہ ایک دم بچہ ہے، بہت چھوٹا... دادا! اُن کا کوئی بھی نہیں۔"

"اُن کا دھیان تھا تو پھر ایسا کیوں کیا ری!" بٹھل نے... ج کے کہا۔

"اپن کو ایسا ہی کرنے کا تھا۔ اپن نے کوئی غلط نہیں کیا۔" ماری... نی انداز میں بولی۔ "اپن اُسی دن، اُن لوگ کو ختم کر دیتا پر وہ..." اپنے شوہر جارجی کو گالیاں بکنے لگی کہ جارجی گھر پہ تھا ہی نہیں۔ ...رات ہی وہ کئی دن بعد گھر لوٹا تھا۔"

"اپنے پاس کیوں نہیں آئی؟ اُدھر دادا کے گھر دیدن... نے آئی تھی تو بولا کیوں نہیں؟"

"کیا بولتا دادا! اپن اُس کا حال دیکھا تھا، گیتا کا اور دادا... رانی کا... اُن لوگ کو تمھارا ضرورت تھا، اُن لوگ کو تمھارا... ورت ہے، پھر اپن تم کو کیا بولتا۔"

"پر یہ تیرا کام نہیں تھا۔"

اپن جانتا ہے، کس کا تھا، تم بھی یہی کرتا۔ نہیں تو اپن اوپر... کے دادا کو کیا منہ دکھاتا اور اپن اکھا زندگی اپنے کو بھی کیا منہ... ماتا۔ دادا نے اپن کو شادی میں خنجر دیا تھا اور جارجی کو بھی..."

"دیا تھا پر..."

"اپن اُسی دن اُن باسٹرڈ کو اوپر بھیج دیتا۔ اتنا دیری کبھی... میں لگاتا۔"

"وکی اِدھری تھا؟"

"اُسی رات سے وہ گھر پہ تھا۔" ماری نے تڑختی آواز میں... بتایا۔ "دوسرا بھی تھا، مامی کُتے کا جنا، پر وہ نکل گیا۔ وکی بھی... کل جاتا۔"

"وکی اُس رات گھر پہ تھا؟ کیا بولتی ہے، اُس کو تو نکل جانا... ہیے تھا۔ ہم سمجھے تھے، وہ اُدھر اپنے ٹھکانے گوا کو چلا گیا ہوگا۔"

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بٹھل کیا کہہ رہا ہے۔ وہ اتنے... یقین سے وکی کا نام کیوں لے رہا ہے۔ گویا بٹھل نے جارجی کو... پہچان لیا تھا۔

"وہ نکل جاتا پر وہ باسٹرڈ زخم کھا کے آیا تھا۔ آگے نہیں جا... سکنے کا تھا۔ اُس رات کو سیدھا گھر آیا اور بولا، اپن کا لفڑا ہو... لیا ہے ماری، اِدھر اندھیری میں۔ اپن اُس کے بولے پر کوئی ڈاؤٹ... نہیں کیا، اُس کا بینڈیج کیا۔ دوسرا صبح جب دادا کا پتہ لگا تو اپن سب جان گیا۔ رات کو وہ رنڈی کا... کدھر گیا تھا اور کدھر سے چاقو لگا کے آیا تھا۔ بندوق وہ پھینک کے آیا تھا کسی گٹر شٹر میں، ریوالور اُس کے پاس تھا۔ مامی اُس ٹائم اپن سے بول کے گیا تھا کہ وکی کے لیے ابھی تھوڑا سگریٹ اور برانڈی لے کے آتا ہے۔ وہ لوٹ کے نہیں آیا، گوا بھاگ گیا یا اِدھری کہیں چھپا پڑا ہوں گا۔ ہو سکتا ہے، پولیس کے ہاتھ پڑ گیا ہو، اپن کو نہیں معلوم...."

شکلا کچھ کہنے کے لیے مضطرب ہو رہا تھا مگر بٹھل نے اُسے روک دیا اور ماری سے پوچھا۔ "تو بولتی ہے، وکی چوٹ کھا کے آیا تھا؟"

"ہاں دادا!" ماری کی آنکھوں میں آگ سی جلنے لگی۔ "وکی کے بازو پر چاقو لگا تھا۔ ذرا سا سائڈ مار گیا، نہیں تو ٹھیک دل پہ لگتا۔ اپن وکی سے کچھ نہیں بولا، سمجھ گیا کہ دادا یا ماچھی نے گولی لگنے پہ گرتے گرتے چاقو مارا ہے۔ اپن کو پتہ ہے، دادا کا نشانہ کبھی آؤٹ نہ جاتا پر گولی اندر اُتر گیا تھا...."

"مگر تم، تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ وکی دادا کو مار کے آیا ہے اور اُس کا زخم دادا یا ماچھی کے چاقو ہی کا ہے؟" شکلا نے تمتاتی آواز میں پوچھا۔

"اپن اُن لوگ کو جانتا ہے۔ وہ ایک نمبر کا بھڑوا لوگ ہے۔ اپنا ماں بہن کو بیچ دے۔ وہ آدمی کا...." ماری کی زبان اُس کے قابو میں نہیں رہی تھی۔ کہنے لگی، اُس رات زخمی حالت میں وکی اُس کے گھر آ گیا تھا۔ وہ نہ آتا تو بھی کوئی فرق نہ پڑتا۔ یہ الگ بات ہے کہ اِس دوران کوئی اور، کوئی دوسرا آگے آ کے دادا کے خون کا اقبال نہ کر لیتا۔ ماری نے بتایا، جارجی نے گو پیرو کی سرزنش پر اپنا جوئے اور شراب کا خفیہ اڈا بند کر دیا تھا اور پیرو سے معافی بھی مانگ لی تھی مگر جارجی بہت دور جا چکا تھا۔ پھر یہ سانحہ سُن کے گوا سے وکی آ گیا اور کئی بار آیا۔ وہ دیکھتی رہی کہ وہ دونوں کمرے میں رات رات بھر بند رہتے تھے اور ہرچند اُنھوں نے ماری کو اپنے راز و نیاز میں کبھی شامل نہیں کیا تھا لیکن ماری کے بہ قول وہ اُن کی رگ رگ سے واقف تھی۔ اُس نے ایک بار جارجی کو تنبیہ بھی کی کہ وہ آئندہ ایسی کوئی غلطی نہ دُہرائے، بہت پشیمانی ہوگی، پیرو دادا کو اب بمبئی سے کہیں نہیں جانا ہے۔ اِس بار وہ معاف نہیں کرے گا کیونکہ وہ ایک مرتبہ رعایت دینے کا قائل ہے۔ اُس نے جارجی کو سمجھایا کہ ہمارے لیے پیرو دادا سے مفاہمت ہی میں عافیت ہے۔ پیرو کے پہاڑ سے ٹکرانے میں اپنا ہی نقصان ہوگا اور ویسے بھی پیرو دادا نے ہم سے بدسلوکی کیا کی ہے۔ اُس نے جارجی کو

قلابے کے پاڑے کا بادشاہ بنایا ہے۔ ماری اپنے شوہر سے یہی کچھ کہہ سکتی تھی۔ جارجی ناراض ہونے لگا کہ ماری کے دل میں ایسا خیال ہی کیوں آیا۔ جارجی نے اُسے اطمینان دلانے کی کوشش کی کہ پیرو دادا کے لیے اُس کے دل میں کوئی عناد نہیں۔ ماری یہ سُن کے خاموش ہوگئی لیکن وہ مطمئن نہیں تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ جب تک وکی جارجی کے ساتھ رہے گا، جارجی کے قدم بھٹکتے رہیں گے۔ پھر جب ایک دن وکی اُسے کسی بڑے عذاب سے دوچار کر دے گا تب شاید جارجی کی آنکھ کھُلے۔ اُس نے کئی بار اپنے شوہر کو وکی سے دُور رکھنا چاہا مگر کامیاب نہ ہوسکی۔ جتنا وہ جارجی کو وکی سے دُور رکھتی، وکی اُتنا ہی اُس سے قریب ہوتا جاتا۔

وکی کے گوا سے بار بار ممبئی آنے کے باوجود اُس کا جارجی کے پاڑے پر نہ جانا، اپنی آمد محض گھر تک محدود رکھنا، اپنی سرگرمیوں میں ماری کو شریک نہ کرنا، جارجی کی مستقلاً پیرو کے پاڑے پر حاضری اور عاجزی۔ یکایک اپنی بیوی سے جارجی کا بدلا ہوا رویّہ، خوش کلامی اور خوش اطواری، وکی کا احترام۔ ماری نے رُندھی آواز میں بتایا کہ یہ سب دیکھ کے اُسے دھڑکا لگا ہوا تھا اور اُس کے خیال میں جارجی اور وکی کی سازباز، پُراسرار قسم کی سرگرمیوں کا یہی مقصد ہو سکتا تھا کہ وہ جوئے اور شراب کا منفعت بخش اڈّا دوبارہ کھولنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ سونے کا یہ درخت پیرو دادا نے ایک ہی ٹھوکر میں اکھاڑ دیا تھا۔ اِسے دوبارہ پیرو دادا کی آندھی سے محفوظ رکھنے کی تدبیر یہی ہو سکتی تھی کہ اب کے اڈّا کسی دوسرے مقام پہ کھولا جائے جہاں پیرو دادا کی رسائی نہ ہو سکے لہٰذا پیرو دادا کو کسی معاملے میں اُلجھانے کی سازش کی جائے۔ پولیس وغیرہ کا کوئی چکر چلایا جائے یا شہر کے داداؤں کو ورغلایا جائے تاکہ پیرو آئندہ اِس قسم کی انفرادی آزادیوں پر اثرانداز نہ ہوسکے۔ ماری کو یقین تھا کہ اِس سے زیادہ اُن کے بس میں نہیں ہے اور وہ دادا کو تو کیا نقصان پہنچائیں گے، اپنی رہی سہی بھی خاک میں ملالیں گے۔ جارجی اور وکی کی تمام کمینگی اور مکّاری کے باوجود ماری کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ دونوں دادا کا پتھر ہمیشہ کے لیے اپنے راستے سے ہٹانے کا ارادہ کیے ہوئے ہیں۔ وہ اتنے اندھے اتنے پاگل ہوگئے ہیں۔

ہفتے ڈیڑھ ہفتے پہلے ماری نے ماہم کے پاڑے جا کے پیرو کو اشارۃً بھی کر دیا تھا کہ جارجی کا دماغ ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ پیرو ہنسنے لگا اور ماری سے بولا کہ ہو جائے گا، وقت گزرنے پر خود ٹھکانے پر آجائے گا۔ منہ کو لگا خون اتنی آسانی سے نہیں چھوٹتا۔ وہ چلی[illegible] تاہم وکی اور جارجی کی ٹوہ میں لگی رہی، اِس سے اُسے اضطراب سوا کچھ نہیں ملا۔ چار دن پہلے وکی پھر گھر آیا اور طبیعت کی ناساز[illegible] کا بہانہ کر کے زیادہ تر گھر میں بند رہا۔ اِس مرتبہ ٹامی بھی اُس کے سا[illegible] تھا۔ ماری نے اُن کے گھر سے باہر چلے جانے کے بعد اُن کے سامان کی تلاشی بھی لی تھی اور سامان میں بندوق دیکھ کے اُس کا ماتھا[illegible] تھا۔ ایک بار اُس کے جی میں آیا کہ وہ وکی کا کام تمام کر دے، ما[illegible] بلبلاتی آواز میں بولی۔ کاش اُس میں یہ حوصلہ آجاتا تو آج سب بدلا ہوا ہوتا۔ ماری کے کہنے کے مطابق اُس نے ایک آدمی[illegible] ذریعے وکی اور ٹامی کی آمد کی اطلاع ماہم کے پاڑے پر بیٹھے[illegible] جارجی کو پہنچا دی تھی۔ جارجی اپنے عزیز دوست وکی کو دیکھ[illegible] نہیں آیا تھا، اُس کی علالت کی خبر سُن کے بھی نہیں آیا۔ وہ ماہم[illegible] پاڑے پر ڈیرا جمائے رہا حالانکہ تین چار دن سے پیرو اپنے پاڑ[illegible] کے بجائے اندھیری کے پاڑے میں مقیم تھا اور اُس کی عدم موجو[illegible] میں ماہم کے پاڑے پر جارجی کے ٹکے رہنے کا کوئی جواز نہیں[illegible] دوسرے دن وہ گھر آیا تو خاصی عجلت میں تھا، تھوڑی دیر رُکا[illegible] چلا گیا۔ ماری کو حیرت ہوئی، اُس نے وکی سے اپنی غیر حاضری کا کوئی عذر کیا، نہ وکی نے اُس سے شکوہ کیا۔

اُس رات سورج غروب ہونے کے بعد وکی اور ٹامی[illegible] جانے کا کہہ کے نکلے تھے، اپنا مختصر سامان ساتھ لے کے جن[illegible] بندوق بھی تھی۔ ماری نے سکون کی سانس لی، وکی کے چلے جا[illegible] پر ہمیشہ اُسے سکون نصیب ہوتا تھا، مگر رات گئے وکی زخمی حال[illegible] میں واپس آگیا اور اُس نے ماری کو بتایا کہ وہ گوا نہیں جا سکا[illegible] میں اُس کا جھگڑا ہو گیا تھا، سامان بھی اُس سے چھِن گیا ہے۔ لیا[illegible] سمجھو کہ جان بچ گئی۔ ماری نے بظاہر ہمدردی کا اظہار کیا[illegible] مرتبہ وکی کی آمد سے اُس کا سینہ ایسا متلاطم نہیں ہوا۔ اُسے ایسا[illegible] جیسے قدرت نے خود وکی کو اُس کے پاس بھیجا ہو۔ وکی اُس کے[illegible] کرم پر تھا۔ اُس نے سوچا کہ وکی کا شگاف اور گہرا کر دے اور پو[illegible] کو خبر کر دے کہ زخم خوردہ وکی اُس کے گھر میں موجود ہے لیکن اُ[illegible] نے یہ سوچ کے تحمّل کیا کہ عجلت میں اُٹھایا ہوا کوئی قدم اُس کے کسی بڑی مصیبت کا سبب نہ بن جائے۔ بہرحال اُس نے طے کر لیا[illegible] کہ وکی سے نجات کی ایک ہی صورت ہے، وکی کی موت۔ یہ بات پہلے بھی کئی بار اُس کے دماغ میں آئی تھی لیکن پہلے اگر یہ کوئی خ[illegible] تھی تو اب اِس نے فیصلے کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اپنے عزم[illegible]

[illegible]اری اور توانائی پر اُسے یک گونہ ڈھارس سی ہوئی۔ ماری کے [illegible]ل بس اُسے مناسب موقع کا انتظار تھا۔

ماری کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ بتھل چپ بیٹھا اُس [illegible]ورت تک رہا تھا۔ شکلا نے چند لمحے توقف کیا کہ ماری دوبارہ [illegible]ن کھولے مگر ماری کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور کہنے کے اِس کے سوا اُس کے پاس شاید کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ "مگر یہ بہت [illegible]نی ہے۔" شکلا متوحش لہجے میں بولا۔ "وکی اور جارجی کو مجرم قرار [illegible]ینے کے لیے یہ ثبوت ناکافی ہیں۔"

ماری نے بے چارگی سے اُسے دیکھا جیسے اُس کی سمجھ میں [illegible]لا کی بات نہ آئی ہو یا کوئی جواب نہ بن پڑ رہا ہو۔

"تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ وہ وکی ہی تھا۔" شکلا نے بے تابی [illegible]کہا۔ "وکی دادا کے چاقو سے زخم لگوا کے آیا تھا، اُس نے تمھیں [illegible]یا؟ کسی اور نے؟ یا محض تم نے پیرو دادا کے قتل کی خبر سُن کے [illegible]مجھ لیا۔ وکی اور جارجی کی کوئی بات، دادا کے خلاف ہونے والی [illegible]بھی سازش کا، کوشش کے باوجود تمھیں پتہ نہیں چل سکا تھا۔ [illegible]ا کہ تم نے کہا، تم سمجھتی تھیں کہ وہ دونوں پیرو دادا سے چھُپ کے [illegible]اکارو بار دوبارہ شروع کرنے کی تدبیریں کر رہے تھے اور اُن میں [illegible]جرأت نہیں ....."

"پر ابھی کون دادا کا ....." ماری چیخ کر بولی۔

"کیا بولتے ہو صاحب!" بتھل نے تلخی سے کہا۔

"دادا!" شکلا تیز آواز میں بولا۔ "پولیس عدالت میں ماری [illegible]سے سوال کرے گی کہ ....."

"کرے صاحب!" بتھل نے کہا۔ "اب آپ ٹھیکا لگاتے رہو، [illegible]ن کے پاس دوسرا جواب کدھر ہے اور پھر کیا آپ اِس کو تھپکی دے [illegible]کے گھر کو لوٹا دو گے۔"

شکلا کے ہونٹ پھڑپھڑا کے رہ گئے۔

کمرے میں سکوت چھا گیا۔ پہرے دار دروازے پہ منڈلا رہے تھے۔ "ٹھیک ہے رِی!" بتھل یکایک اُٹھ گیا۔ "کچھ اور رہ گیا ہو تو بول دے۔" ماری پر خفقان سا طاری ہوا۔ وہ بھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "تم، تم جا [illegible]رہے ہو دادا؟ ....."

"بچوں کا پتہ بول دے۔" بتھل نے بھن بھناتے لہجے میں کہا۔

ماری سرتاپا لرزنے اور گھگھیانے لگی، ہاتھ جوڑ کے بولی۔ "اُن کو کچھ مت بولنے کا ہے، ایک بات بھی نہیں۔ ابھی ہو سکے [illegible]تو اُن کو پونا ہی میں رہ کے رکھنے کا ہے، بول دینا، تمھارا ماں باپ دونوں مر گیا، کچھ بھی بول دینا۔ اپن نے بچہ لوگ سے ابھی تک اُکھا چھپا کے رکھا ہے، اُن کو نہیں بولا کہ اُن کا باپ پاڑا چلاتا ہے اور اپن ..... اُن کو کچھ نہیں پتہ۔ ابھی چھوٹا ہے، وہ لوگ یہ سب دیکھے گا اور سنے گا تو کچھ نہیں پڑھ سکے گا۔ اپن کے پاس اپن کے پاس ....." ماری نے اپنے لباس میں کہیں چھپی ہوئی پوٹلی جیسی کپڑے کی ایک تھیلی نکالی اور بتھل کے قدموں میں ڈالتے ہوئے بولی کہ یہ اُس کی جمع پونجی ہے۔

"یہ کیا ہے؟" بتھل نے تھیلی اُٹھا کے ہلائی۔ وہ زیورات ہی ہوں گے، سکّے اور اشرفیاں وغیرہ، اُن کی جھنکار سے بتھل کی بھویں سکڑ گئیں۔ ماری نے بتھل کے پیر پکڑ لیے اور گڑگڑا کے بولی کہ یہ اتنا زیادہ نہیں ہے مگر یہی کچھ اُس کے پاس تھا۔ یہ مال چند سال ضرور اُس کے بچّوں کی کفالت کر سکے گا۔

"اپنے پاس اِس کی کمائی نہیں ہے رِی!" بتھل نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ وہ تھیلی واپس کر دیتا لیکن اُسے خیال آیا کہ حوالات میں ماری کو اِس سے کیا غرض ہو سکتی ہے۔

ماری کہنے لگی کہ صبح اُن دونوں کو ختم کر دینے کے بعد وہ اپنے سینے میں بھی خنجر بھونک لیتی لیکن عین وقت پر اُس کا ہاتھ رُک گیا کیونکہ بتھل سے بات کرنے کے لیے اُسے کچھ دیر اور زندہ رہنا چاہیے تھا۔ وہ یہ باتیں کر رہی تھی اور اُس کی آواز تڑپ رہی تھی، اُس کا سارا وجود لرزاں تھا۔ کہنے لگی، دادا نے میرے اور بتھل کے بارے میں اُسے بہت کچھ بتایا تھا، ممبئی سے جانے سے پہلے اور آنے کے بعد بھی۔ دادا نے اُسے بتایا تھا کہ بتھل سے مل کے ایسا لگتا ہے جیسے کسی طویل خواب سے آنکھ کھُل گئی ہو۔ اپنے ادھورے پن کا احساس اُسے بتھل سے مل کے ہوا تھا۔ ماری وہی کچھ کہہ رہی تھی جو میرے اور بتھل کے بارے میں، پیرو کی زبانی سُن سُن کے پانڈے، سکندر اور پاڑے کے دوسرے دادا ہم سے کہہ چکے تھے۔ آدمی چلا جائے تو یہ سارا شہد زہر بن جاتا ہے۔ پیرو نے ماری سے کہا تھا کہ اب وہ ایک بڑے کنبے والا آدمی ہے۔ ایک بھائی اور بیٹا ہی نہیں، اُس کنبے میں اس کے اور بھی کئی بزرگ، کئی بیٹے بیٹیاں ہیں اور اُس نے ماری سے کہا تھا کہ اگر سچ پوچھو تو اب اُسے پاڑے سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ پاڑے کا کوئی انتظام کر کے وہ باقی زندگی بتھل کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا، اپنے خاندان کے ساتھ ایک راحت کدے میں۔ ماری نے اُس سے التجا کی تھی کہ پیرو اپنے اُس کنجِ عافیت میں کوئی گوشہ اُس کے لیے بھی محفوظ رکھے۔ اُسے بھی تو وہ اپنی بیٹی کہتا ہے۔ ماری نے اُس سے کہا تھا کہ وہ بھی

بہت تھک چکی ہے' اُس کا بس چلے تو وہ کہیں دُور چلی جائے۔ اُسے جارجی کی بھی ایسی پروا نہیں' وہ صرف اپنے بچّوں کے لیے خود کو وقف کر دینا چاہتی ہے تاکہ اُن پر ماں باپ کی چھوٹ نہ پڑنے پائے۔ پیرو نے ہامی بھری تھی کہ ماری کو بھی وہ قلابے سے اپنے ساتھ لے جائے گا مگر یہ سب کچھ آنے والے وقت پر منحصر ہے کہ وہ کتنی جلد پاڑے سے نجات پاتا ہے۔ یہ کنارہ کشی اتنی آسان نہیں تھی۔ ماری کے اصرار پر پیرو نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے اور تبھل کو لے کے اُس کے گھر آئے گا اور اُس کے ہاتھ کی بھُنی ہوئی مچھلی اور تلے ہوئے جھینگے کھائے گا۔ یہ چیزیں پیرو کو بہت مرغوب تھیں۔ ماری بزعمِ خود گنتی کے اُن چند لوگوں میں تھی جو پیرو کے گھر' اُس کی بیوی اور بیٹی کے بارے میں کچھ جانتے تھے حالانکہ وہ پیرو سے اتنے تعلقِ خاطر کے باوجود اُس کے گھر کبھی نہیں جا سکی تھی۔

ماری مسلسل رو رہی تھی۔ تبھل کمرے سے نکل گیا۔ اُس کے پیچھے پیچھے شکلا اور میں بھی۔ ماری کی سسکیاں ہمیں دُور تک سنائی دیتی رہیں۔

کمرے میں کئی افسران موجود تھے اور شور گونج رہا تھا۔ شکلا کو دیکھ کے سب کھڑے ہو گئے اور سنّاٹا چھا گیا۔ ہیٹ میز پر پٹخ کے شکلا درمیان کی کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ اُس کی ہدایت پر وہ سب کمرے سے چلے گئے تھے لیکن شکلا دیر تک ہماری موجودی سے اور اپنے آپ سے بھی بے خبر سا بیٹھا رہا۔ تبھل نے بھی زبان نہیں کھولی' بیڑی پھونکتا رہا۔ اردلی چائے کی ٹرے لے کے آیا تو شکلا کو کچھ ہوش آیا اور کرسی پر اُس کا بکھرا ہوا جسم سمٹ گیا۔ اردلی نے چائے بنانے کے لیے اُس سے اجازت طلب کی تھی۔ شکلا نے جھڑکنے کے انداز میں اُسے منع کر دیا اور خود اپنے ہاتھ سے پیالیوں میں چائے انڈیلنے لگا۔ میں نے چاہا کہ اُس کے ہاتھ سے چائے دانی لے لوں لیکن میں سوچتا ہی رہ گیا۔ میرے ہاتھ پاؤں اکڑے ہوئے تھے۔ میں انکار بھی نہ کر سکا کہ مجھے چائے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ اُس نے پیالی میرے آگے رکھی تو میں نے کسی معمول کی طرح تعمیل کی۔ شکلا نے چند گھونٹوں میں چائے ختم کر لی تھی۔ کرشنا جی کی طرح اُس کے چہرے سے بھی کسی تاثر کا اندازہ لگانا اتنا آسان نہیں تھا لیکن سر دست جیسے اُس کے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔ آدمی بہت سمندر ہے پر سمندر ہے نہیں۔ سمندر کا پیالہ بھی کبھی تنگ پڑ جاتا ہے۔ شکلا کی آنکھوں میں دُھند سی بھری تھی۔ چہرہ بھی جل سا رہا تھا۔

پھر دفعتہً جیسے اُسے کچھ یاد آ گیا۔ اُس نے گھنٹی بجائی۔ ار... کے آنے پر شکلا نے نام بہ نام کئی افسران کو طلب کیا۔ وہ باہر ... ہی کھڑے تھے۔ اِدھر اردلی گیا' اُدھر وہ کمرے میں داخل ہو... یہ وہی افسران تھے جنھیں کچھ دیر پہلے شکلا نے کمرے سے چلے ... کا حکم دیا تھا۔ اُس نے اُن سے کرسیوں پر بیٹھ جانے کو بھی نہیں ... اور منتشر لہجے میں ماری کے بارے میں پوچھا کہ کوئی تازہ رپور... ہو تو اُسے مطلع کیا جائے۔ ایک پختہ کار افسر نے' جسے شکلا نے پا... کے نام سے مخاطب کیا تھا' ایک قدم آگے آ کے ٹھیری ٹھیری آ... میں بتایا کہ ماری کے گھر سے مزید کوئی قابلِ ذکر چیز برآمد نہیں ہو... مکان کے اردگرد سے پولیس کا پہرا ہٹا لیا گیا ہے تاہم چند سپا... پر مشتمل نفری مکان پر تعینات ہے۔ پاٹل کے پہلو میں کھڑے ... ایک دوسرے افسر نے درمیان میں دخل دیا اور مودّبانہ لہجے میں ... کہ پولیس نے گھر کے اندر تمام کارروائی مکمل کر لی ہے۔ جس کمرے ... خون ہوا تھا' اُس کا سارا فرش لتھڑا ہوا تھا۔ پولیس نے فرش ... کرا دیا ہے۔ گھر کی الماری کا تالا توڑنے پر پرانے طرز کی ایک بند... نکلی ہے' وہ استعمال کے قابل ہے لیکن اُسے استعمال نہیں کیا ... صندوقوں اور مچان پر پڑے کاٹھ کباڑ کی تلاشی کے دوران مخ... قسم کے چند چاقو بھی برآمد ہوئے ہیں اور کارتوسوں کے ڈبے ... اس کے علاوہ ایک تمنچا' ایک بینجو' ہارمونیم اور شراب کی بوتلی... دیسی ولایتی دونوں قسم کی۔ گزشتہ رات واردات والے کمرے ... یقیناً شراب پی گئی تھی اور صرف دو ہی آدمی شریک تھے۔ کمرے ... خالی بوتل کے ساتھ دو گلاس پائے گئے ہیں۔ سارے گھر میں ر... پیسے اور زیورات وغیرہ جیسی کوئی چیز پولیس کو نظر نہیں آئی گ... تمام چیزیں سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ کسی جگہ بے ترتیبی کے آ... نہیں تھے اور گھر میں ضرورت کی تقریباً ہر چیز موجود تھی۔ سامان ... اہلِ خانہ کی نفاست' حسنِ ذوق اور نظم و ضبط کا اندازہ کیا جا سک...

پولیس افسر بیشتر انگریزی میں مخاطب تھا۔ درمیان میں ... کہیں ہندوستانی بھی اُس کی زبان پر آ جاتی۔ جانے کیوں بار بار ... کی نظر مجھ پر اور تبھل پر منڈلاتی تھی اور اُس کی آواز دھیمی پڑ جا... اُس کے بیان کے مطابق ماری از خود پولیس اسٹیشن آئی تھی ... کہہ رہا تھا' واردات کے وقت سے پولیس اسٹیشن آنے تک کی ... کے دوران ماری گھر میں کیا کرتی رہی؟ حتمی طور پر کچھ نہیں کہا ... تاہم ایسا لگتا ہے کہ ماری نے خاصی دیر گھر ہی میں لگائی۔ اُس ... روپے پیسے' زیورات وغیرہ کا کوئی انتظام کیا یا کچھ اور۔ ممکن ہے

اسٹیشن آنے اور اعتراف کرنے کا فیصلہ کرنے میں اُسے کچھ دیر لگی ہو۔ خنجر پر ماری کی انگلیوں کے نشانات ہیں۔ کسی پڑوسی نے شور غل کی آواز نہیں سنی۔ قیاس ہے کہ اوّل صبح جب جارجی اور وکی سو رہے تھے' کمرے بند کر کے ماری نے اُنھیں ختم کیا۔ دونوں گہری نیند اور گہرے نشے میں تھے۔ محلّے کے لوگوں کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ پڑوسی' جارجی کے گھر سے دُور رہنے ہی میں عافیت سمجھتے تھے۔ گنتی کے چند پڑوسیوں کے سوا اُس کے گھر کسی کا آنا جانا نہیں تھا۔ جارجی کی وجہ سے وہ ماری سے بھی کنارہ کیے رہتے تھے حالانکہ اُن کی نظروں میں ماری کو ایک خوش وضع' دردمند اور مظلوم خاتون کا درجہ حاصل ہے۔ ماری کے بچّے بہت سے پڑوسیوں نے نہیں دیکھے۔ کسی کے پوچھنے پر ماری نے بتایا تھا کہ اُس نے دونوں بچّوں کو اپنے ایک عزیز کے ہاں پونا بھیج دیا ہے۔ موجودہ مکان میں ماری اور جارجی کو رہتے ہوئے چند سال سے زیادہ نہیں ہوئے۔ اِس سے پہلے وہ قلابے کے گنجان آباد عیسائی پاڑے میں رہتے تھے۔ وکی کے بارے میں بھی محلّے والوں کو کچھ علم نہیں' بس اتنا ہی کہ وہ کبھی کبھی اُسے جارجی کے گھر آتے جاتے دیکھتے اور گوا میں مقیم جارجی کے ایک رشتے دار کی حیثیت سے جانتے تھے۔ جس وقت محلّے والوں سے پوچھ گچھ کی جا رہی تھی' اُنھیں جارجی کے گھر میں ہونے والے کسی حادثے کا علم نہیں تھا۔ پولیس کو اپنے علاقے میں جارجی کے گھر پہ دیکھ کے وہ پریشان ہوئے تھے لیکن صرف جارجی کا گھر پولیس کا مرکز و محور تھا اِس لیے اُن کی تشویش' دہشت میں نہیں بدلی۔ اُن کے خیال میں جارجی کے ہاں کسی وقت بھی پولیس دستک دے سکتی تھی۔ اُنھوں نے صبح صرف ماری کو دیکھا جب وہ تھانے جانے کے لیے گھر سے نکلی۔ کسی کو اُس کی رفتار سے کوئی شبہ نہیں ہوا۔ اُس نے کئی پڑوسیوں کے سلام کا جواب خندہ پیشانی سے دیا۔ وہ انھیں معمول کے مطابق پُرسکون اور خاموش نظر آئی۔

انسپکٹر کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر شکلا نے اُسے روک دیا اور ایک تیسرے افسر کی جانب انگلی اُٹھائی جو اپنے ساتھی کی خاموشی کا منتظر تھا۔ شکلا کو اُس سے کوئی سوال کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اوسط عمر کے اُس افسر نے بتایا کہ ڈاکٹروں کی ابتدائی رپورٹ کے مطابق وکی کے بائیں بازو پر چاقو کا ایک گہرا زخم لگا ہوا ہے۔ ڈاکٹروں کی رائے میں یہ زخم تازہ نہیں' کئی دن پہلے کا ہے۔ دونوں مقتولین کو ایک ہی خنجر سے ختم کیا گیا ہے' ایک ہی لمحے میں' اور ایک وار پر اکتفا نہیں کیا گیا' پے در پے کئی وار کیے گئے کہ دونوں کو سنبھلنے کا موقع نہیں ملا اور اُنھوں نے کم و بیش ایک ہی وقت آخری سانسیں لیں۔ انسپکٹر نے شکلا کو بتایا کہ ڈاکٹروں کی حتمی رپورٹ کا انتظار ہے اور بظاہر کسی پیچیدگی کا امکان نہیں ہے۔

شکلا کے استفسار پر پختہ کار افسر نے بتایا کہ قلابے کے پاڑے سے جارجی کے کئی ساتھی حراست میں لے لیے گئے ہیں لیکن باقاعدہ تفتیش ابھی شروع نہیں کی گئی ہے۔ شکلا نے اُس سے کہا کہ ٹامی نامی گوا کے ایک نوجوان دادا کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں۔ ہو سکتا ہے' وہ گوا کی طرف نکل گیا ہو اور گزشتہ تین دنوں کے چھاپوں میں گرفتار ہو گیا ہو۔ وہ کہیں بھی نظر آئے' اُسے حراست میں لے لیا جائے۔ اگر وہ پہلے سے پولیس کی تحویل میں ہے تو اُسے قلابے کے تھانے منتقل کر دیا جائے۔

"یہ کون ہے جناب؟" پاٹل نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا یہ بھی؟"

"نہیں۔" شکلا نے تندی سے کہا۔ "احتیاطاً کوئی حرج نہیں ہے۔" پھر شکلا نے خود ہی تردید کی۔ "یہ شخص بھی ایک کڑی ہے پاٹل اور پولیس کو شدت سے مطلوب ہونی چاہیے۔ فی الحال اتنا ہی سمجھو۔"

تینوں افسر دروازہ عبور کیا چاہتے تھے کہ شکلا کی آواز پر ٹھیر گئے۔ شکلا نے پاٹل کو مخاطب کر کے ماری کا خیال رکھنے کی ہدایت کی اور کہا کہ اُسے کسی دوسرے روشن اور ہوادار کمرے میں منتقل کر دیا جائے نیز ماری سے متعلق عدالت میں داخل کیے جانے والے تمام کاغذات پہلے شکلا کے سامنے پیش کیے جائیں۔

تینوں افسروں کے چہرے کھنچ گئے تھے تاہم اُنھوں نے مستعدی سے سر ہلایا اور کمرے سے نکل گئے۔

لمحے گزر گئے۔ اُن کے جانے کے بعد شکلا ساکت بیٹھا رہا۔ میری نظریں اُس پر جمی ہوئی تھیں۔ خاصی دیر ہو گئی تو تبھل نے دھیمی آواز میں کہا۔ "اپنی چھٹی کرو صاحب۔"

"ہاں ہاں۔" شکلا سٹپٹا سا گیا۔ "ٹھیک ہے۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ "آپ لوگ کو اب جانا چاہیے۔"

"بولو گے تو پھر آ جائیں گے' نہیں تو آدمی بھیج دینا۔"

شکلا نے جواب نہیں دیا' کچھ سوچتا رہا۔ تبھل اُٹھنے لگا تو شکلا اضطراری لہجے میں بولا۔ "ایک منٹ ٹھیرو دادا!"

تبھل کرسی پر دوبارہ بیٹھ گیا۔

"دادا! وہ کہتی ہے' اُسے یقین تھا کہ پیرو کو ختم کرنے والے وہی دو تھے۔ یہ خون اُس کے یقین کا ثبوت ہیں لیکن دادا! اُس کا یقین غلط بھی ہو سکتا ہے۔"

"پر آپ کیا کرلوگے؟"

"کچھ نہیں، کچھ نہیں۔" شکلا تیزی سے بولا۔ "لیکن دادا کے قاتل پھر رہ جاتے ہیں اور پولیس کا کام ختم نہیں ہوتا، سمجھے دادا!"

"پولیس کا کام تو کبھی ختم نہیں ہوتا۔" ٹھل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "پھر آپ لوگ کا کیا ہوگا۔"

"ہونہہ! یہ بھی ٹھیک بولتے ہو دادا!"

"تھوڑا دھیان دیں تو ایک بات بولیں صاحب؟" ٹھل نے ایک لمحے کے توقف کے بعد کہا۔

"کیا، کیا بات ہے دادا؟"

"ہو سکے تو آپ اندھیری کے راجن دادا کو چھوڑ دو۔"

مجھے بھی حیرت ہوئی، شکلا بھی چونک پڑا۔ "راجن، کون راجن؟"

"اندھیری میں شیلا نام کی جس عورت کے خون میں اُس کو اندر رکھا گیا ہے۔"

"ہاں ہاں لیکن اُس کا اِس معاملے سے کیا تعلق ہے؟"

"سمجھیں تو بہت نکل سکتا ہے۔"

"کیا مطلب! صاف صاف بولو دادا!"

"سب صاف ہے صاحب! ابھی پولیس نے اُس کا کھوج کب لگایا ہے۔"

"ہاں نہیں لگا سکی ہے لیکن پولیس نے اندھیری کے علاقے سے اور گرفتاریاں کی ہیں۔ وہ کچھ کم اُلجھا ہوا معاملہ نہیں ہے مگر مگر....." شکلا بھری ہوئی آواز میں بولا۔ "تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"ختم ہونے سے پہلے پیرو دادا تین چار دن سے اُدھر اندھیری میں تھا۔ اندھیری کا پاڑا ماہم کے پاڑے سے جُڑا ہوا ہے۔ دادا کو پتہ لگنے پر اُدھر جانا تھا۔ آپ شاید جانتے ہیں، پاڑوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"آگے بولو دادا!"

"دادا نے اُدھر پہنچ کے ساری گھوما پھری چھانا پھٹکی کی تھی اور تھانے جا کے بولا تھا، راجن کبھی ایسا نہیں کر سکتا۔ راجن کوئی زنخا بھنڈیلا نہیں ہے جو ایک عورت پر ہاتھ اُٹھائے۔ جس ٹائم راجن کی رکھیل کا خون ہوا، راجن اُس کے پاس نہیں تھا۔"

"مجھے یہ کیس کسی حد تک معلوم ہے۔ معلوم بھی ابھی، پڑھا بھی کیس کی چھان بین کے دوران ہوا۔ تم ٹھیک کہتے ہو، پیرو دادا تین چار دن سے اندھیری میں تھا اور اُس نے راجن کو بے گناہ قرار دینے کی بہت کوشش کی تھی۔ وہ بار بار پولیس سے یہی کچھ کہتا رہا۔ اُس نے چند ایسے لوگوں کے نام ثبوت کے طور پر بتائے جنھوں نے راجن کو اُس رات اُس کے گھر سے باہر دیکھا تھا۔"

"اُس رات راجن اپنی رکھیل کے ساتھ گھر پہ ہی تھا صاحب!"

شکلا کرسی پر سیدھا ہو گیا۔

"پر کوئی حرام کا..... اُدھر دہائی دیتا ہوا آیا اور راجن کے پرانے اسامی کسی سیٹھ ساہوکار کا نام لے کے بولا، اُس کے ہاں چکر ہو گیا ہے اور پولیس آئی پڑی ہے۔ یہ سُن کے راجن اُلٹا ہو گیا۔ رکھیل سے بول کے باہر کو نکلا۔ اُدھر سیٹھ کے ٹھکانے پہنچا تو کچھ بھی نہیں تھا۔ لوٹ کے رکھیل کے پاس آیا تو وہ ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔"

"راجن یہی کہانی سناتا ہے۔" شکلا نے برہمی سے کہا۔ "سیٹھ کے آدمی بھی یہی کہتے ہیں کہ اُس رات راجن گھبرایا ہوا سیٹھ کے گھر آیا تھا، وہاں سناٹا دیکھ کے گالیاں بکتا لوٹ گیا۔ پولیس کو اِس کہانی پر یقین نہیں ہے۔ اِسی بیچ اُس عورت کا قتل ہوا۔ سیٹھ کے ہاں ہنگامے کی خبر سُن کے گھر سے نکلنے اور گھر واپس آنے کا عرصہ اتنا کم ہے کہ کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ ایک بالکل اجنبی آدمی کے آنے پر راجن کچھ سمجھے سوچے بغیر گھر سے نکل جاتا ہے۔ آدمی سے کچھ پوچھتا پاچھتا اور روک کے ساتھ چلنے کو نہیں کہتا۔ بہر حال پولیس نے عدالت میں یہ کیس پیش کر دیا ہے۔ راجن چھوٹ بھی سکتا ہے، سزا بھی پا سکتا ہے۔"

"پر وہ راجن نہیں تھا۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو، کس بنیاد پر؟"

"راجن کو ہم نہیں جانتے پر وہ پاڑے کا دادا ہے، اندھیری کے پاڑے کی گدّی کا دادا۔ ایسے ہی کوئی پاڑے کی گدّی پر نہیں بیٹھ جاتا۔ پیرو دادا نے ہم کو اُس کے بارے میں سارا بولا تھا۔ دادا ہم سے جھوٹ نہیں بول سکتا اور شاید ہم آپ سے۔ آپ عدالت بھی نہیں ہو جو ہم کو کانٹے پر رکھ کے زبان کھولنی پڑے۔ راجن اپنی رکھیل کو بیوی کی طرح رکھتا تھا۔ اُس کو ختم کرنے کے لیے راجن کے پاس آدمی لوگوں کی کمی نہیں تھی۔ راجن کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو خبر سُن کے گھر میں نہیں رُک سکتا تھا۔ وہ اُس آدمی کو نہیں جانتا تھا پر جاننے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کوئی بھی آدمی اُسے خبر دینے آ سکتا تھا۔ اُس کو روک کے اور آگے پیچھے کا جان کے گھر سے نکلنے والا کوئی اور ہوتا صاحب! پاڑے کا دادا نہیں ہوتا۔ دادا اپنے بل پہ بھروسا کرتا ہے، گھر میں چھپ کے نہیں بیٹھ جاتا۔ زیادہ دوری نہیں تھی اور آدمی نے نام ایسے سیٹھ کا بولا تھا کہ راجن کو گھوم جانا تھا۔ اپنی رکھیل سے بول کے وہ گھر سے نکلا اور جلدی لوٹ آیا۔ آیا تو سارا بگڑا ہوا تھا۔ راجن کو پھر کیا کرنا تھا صاحب؟"

شکلا ٹھل کی صورت دیکھتا رہا اور کسمساتی آواز میں بولا۔

"راجن کو پاس پڑوس کو جگانا چاہیے تھا۔"

ٹھل نے اُس سے کہا کہ شور مچا کے راجن تماشا بناتا اور لوگوں کو شہادت میں شامل کرنے کی کوشش کرتا۔ کیا اِس طرح وہ الزام سے بری ہو جاتا؟ راجن کو سب جوں کا توں رہنے دینا چاہیے تھا، کوئی چیز چھیڑنا نہیں چاہیے تھا۔ وہ محلے میں ہنگامہ نہیں کرتا۔ مشکل دقت میں پاڑے کے دادا کا کوئی دوست نہیں ہوتا۔ راجن کو بہت اہم فیصلہ کرنا تھا۔ ایک دادا کی طرح اُس نے ضبط اور حوصلے کا ثبوت دیا اور یہی مناسب سمجھا کہ اپنے پاڑے جا کے پہلے اپنے آدمیوں کو بتائے پھر پولیس کو خبر کرے۔ راجن نے یہی سوچا تھا کہ پولیس نے پھندا ڈال دیا۔

"مگر پولیس نہیں سمجھتی کہ راجن گھر سے نکلا تھا۔ سیٹھ کے آدمی اُس کے خلاف گواہی نہیں دے سکتے۔ پولیس کا خیال ہے کہ نہ کوئی آدمی آیا، نہ راجن کسی سیٹھ کے ہاں گیا، نہ وہاں سے لوٹ کے گھر آیا۔"

"تو پولیس کو کیسے پتہ چلا صاحب!" ٹھل نے زہر خند سے کہا۔

"پولیس کو!" شکلا پہلو بدلنے لگا۔ "مجھے علم نہیں کہ پولیس کو اِس واردات کا کب اور کیسے علم ہوا۔"

"اپنے کو پتہ ہے۔" ٹھل نے سرد لہجے میں کہا کہ راجن کے جانے کے بعد کسی نے شور مچا کے محلّے والوں کو متوجہ کیا کہ اندر گھر میں کوئی گڑبڑ ہے۔ اُس نے چیخیں سُنی ہیں اور گلی میں ایک شخص کو بھاگتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ راجن کی طرف اشارہ نہ کرتا تو بھی اُس کا شور مچانا ہی کافی تھا۔ حواس باختہ پڑوسی گھروں سے باہر نکلے۔ اُنھوں نے اُس عورت کے گھر پہ دستکیں دیں۔ جواب نہیں ملا تو اُنھوں نے کسی گشتی پولیس والے کو ڈھونڈا، سارا ماجرا اُسے سُنایا اور یوں وہ گھر میں داخل ہوئے جہاں معاملہ کچھ اور تھا۔

"ہاں، شاید یہی کچھ پیش آیا۔" شکلا تذبذب سے بولا۔

"وہ لمبے کان والا..... کا جنا کون تھا جس نے فیل مچا کے پاس پڑوس کی نیند چوپٹ کی۔ کسی کو اتنی جلدی پتہ چل گیا کہ اِدھر اندر سے خون کی بو آتی ہے۔ پڑوسی بولتے ہیں، اُن لوگ نے کوئی شور شرابا نہیں سُنا، سڑک پر چلنے والے نے سُن لیا؟"

شکلا مضطربانہ انداز میں سر ہلانے لگا۔ ٹھل نے اُس سے کہا کہ واویلا کرنے والے راہ گیر نے اپنی چیخ پکار پہ گلی میں اکٹھے ہونے والے پڑوسیوں کو بتایا کہ اُس نے فلاں گھر سے چیخیں سُنی ہیں اور گلی میں ایک آدمی کو بھاگتے ہوئے دیکھا ہے۔ یعنی بیک وقت یا چند لمحوں کی تاخیر سے دونوں کام ہوئے، چیخ سننا اور گلی میں آدمی دیکھنا۔ اُس نے چیخ پہلے سُنی یا آدمی پہلے دیکھا؟ اُس نے پہلے آدمی دیکھا اور چیخ بعد میں سُنی تو گویا عورت اُس وقت زندہ تھی اور راجن ایک عورت کو زخمی کر کے گھر سے بھاگ رہا تھا اور بالفرض راہ گیر نے چیخ پہلے سُنی جب وہ گھر سے کچھ فاصلے پر تھا اور راجن کو گھر سے نکلتے ہوئے بعد میں دیکھا جب راہ گیر گھر سے کچھ قریب ہو چکا تھا تو اُس نے راجن کا نام نہیں لیا۔ وہ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ پڑوسیوں کی نظر میں اُس عورت کے حوالے سے وہ راجن کے سوا کون ہو سکتا ہے مگر وہ راجن ہی کیوں ہو؟ اور اگر فرض کر لیا جائے کہ راہ گیر نے راجن کا نام بھی لے دیا تھا۔ کسی خوف سے اُس نے راجن کے دُور چلے جانے کا انتظار کیا تب شور مچایا مگر وہ خود کہاں چلا گیا؟ کیا وہ پولیس کو دستیاب ہو گیا؟ پڑوسیوں نے اُسے کہاں کھو دیا؟ وہ اُنھیں جگا کے پھر کہاں غائب ہو گیا؟ اُسے کسی نے تلاش کیا؟

ٹھل چپ ہو گیا اور نئی بیڑی سلگا کے کش لینے لگا۔

"تم، تم پھر کیا سمجھتے ہو دادا؟" شکلا بے چینی سے بولا۔

"آپ وردی والے ہو اور بڑے افسر ہو۔ آپ کو ہم سے زیادہ چھلنی کرنا آتا ہے۔ ہم آگے کیا بولیں۔"

"میں نے تمھیں بتایا ہے دادا کہ میں اِس کیس سے اتنا باخبر نہیں ہوں لیکن اگر اِس کا تعلق پیرو دادا سے نکلتا ہے تو میں جاننا چاہوں گا۔ تم بولو دادا!" شکلا کی آواز میں اصرار شامل تھا۔

ٹھل نے اُسے بتایا کہ رات کا وقت تھا، گلی سنسان ہو چکی تھی۔ راجن چپکے سے گھر سے نکل جاتا تو باقی رات بھی گزر جاتی۔ صبح ہو جانے پر کسی کو معلوم ہوتا مگر اُسی وقت کسی نے شور کیوں مچایا؟ اس لیے کہ وہ راجن کو لاش غائب کرنے اور کوئی فیصلہ کرنے کی مہلت دینا نہیں چاہتے تھے۔ راجن کو وقت مل جاتا تو وہ ایک ہی رات میں سارا نقشہ بدل سکتا تھا۔ وہ راجن سے خوب واقف تھے۔ شکلا میز پر کچھ اور جھک آیا۔ ٹھل نے کہا کہ پولیس نے ضرور کسی دوسرے امکان پر غور کیا ہوگا لیکن وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی تو اُس نے راجن ہی کو غنیمت جانا تاہم علاقے میں چھاپے اور دوسری گرفتاریوں سے یہ مراد ہے کہ پولیس کا یقین متزلزل ہوا ہے۔ پولیس کو کوئی آلہ بھی گھر سے دستیاب نہیں ہوا۔ وقت کا تعین بھی مشکل ہے اور کوئی چشم دید گواہ بھی نہیں ہے۔

"تمھارے خیال میں پھر وہ کون تھے؟" شکلا نے بے تابانہ پوچھا۔
"اب بھی آپ پوچھتے ہو، وہ کون تھے صاحب!" تھل نے ناگواری سے کہا۔ "اُن کو پتہ تھا کہ راجن کس ٹائم کو عورت کے پاس جاتا ہے، کب تک اُدھر پڑا رہتا ہے۔ کون سے سیٹھ سے اُس کا لاگ الاپ ہے جس کے وہاں ٹنٹے کی ہوائی سُن کے اُس کی کھوپڑی اُلٹ سکتی ہے اور اُس کا جیل جانا دادا کتنا دل پہ لے سکتا ہے، کیا مرکھنا ہو سکتا ہے۔"

تھل نے شکلا کو بتایا کہ وہ پیرو کے مزاج آشنا تھے، پیرو کی ذمّے داری تھی کہ وہ اپنے زیرِ نگیں اندھیری کے پاڑے پر فوراً جائے اور صورتِ حال سمجھے اور اُسے قابو میں کرنے کی کوشش کرے۔ کسی پاڑے کے بھتّے میں حصّے دار بننے کا مطلب اُس پاڑے پر آنے والی کسی آفت میں شرکت بھی ہے، اُسے ہر ممکن تحفظ کی ضمانت دینا چناں چہ راجن کے دفاع کے لیے پیرو کا اپنے پاڑے سے باہر نکلنا لازم تھا۔ وہ پیرو کو منتشر کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اُسے اپنے پاڑے سے باہر نکلنے اور اُس کے معمولات میں رخنہ ڈالنے میں۔ پیر اندھیری پہنچ کے مسلسل دوڑ بھاگ کرتا رہا۔ اُس کے کام بہت سے تھے، ایک طرف اندھیری کے پاڑے کے دل شکستہ اور برگشتہ لوگوں کی لگام کھینچے رکھنا، علاقے میں اصل واقعے کے شواہد ڈھونڈنا، پولیس سے راجن کی وکالت کرنا وغیرہ وغیرہ۔ اِدھر اُنھوں نے طرح طرح کی افواہیں پھیلا کے اُسے سکون سے نہیں بیٹھنے دیا۔ پیرو کی نظر میں اگر راجن کا جرم ثابت ہو جاتا تو اُس کا اندھیری میں تا دیر ٹھیرے رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اُس کا کام کسی نئے دادا کی تقرری پر ختم ہو جاتا لیکن راجن کی روداد میں اُسے بہت سارا سچ نظر آیا اس لیے پیرو کو زیادہ تگ و دو کرنی پڑی۔ اچھا پھل برآمد ہونے کی امید آدمی کی کوشش بڑھا دیتی ہے۔ یقیناً پیرو نے پہلے اندھیری کے پاڑے پر راجن کے ساتھی ٹٹولے ہوں گے، پھر علاقے کے سیٹھ ساہوکار چھانے ہوں گے جن سے راجن کے خاص مراسم تھے یا جو راجن سے خار کھاتے تھے۔ کسی اور جانب بھی اُس کی نگاہیں بھٹکتی رہی ہوں گی۔ یہ پیرو کے لیے، شہر کے سب سے بڑے دادا کی حیثیت سے وقار کا مسئلہ تھا اور خود اُس کے اپنے دل کے اطمینان کا بھی۔

ایک اور وجہ بھی تھی۔ ممبئی سے پیرو کی عدم موجودی کے دوران تین پاڑے سرکشی اختیار کر چکے تھے۔ اندھیری کا پاڑا بھی اُن میں شامل تھا اور گو سبھی پیرو کی واپسی پر دوبارہ ماہم کے پاڑے سے وابستہ ہو چکے تھے لیکن اُن میں اپنا اعتماد بحال کرنے بلکہ فزوں کرنے اور شہر کے دیگر پاڑوں کو یہ باور کرانے کے لیے کہ پیرو ایک زندہ حقیقت ہے اور اُس سے مفر ممکن نہیں، راجن کے معاملے میں سرگرمی ایک فطری واقعہ ہے مگر اُسے کیا اندازہ تھا کہ وہ خود نرغے میں آ چکا ہے، گلی کے کتّوں نے ایکا کر لیا ہے اور گھات لگائے اُس کا تعاقب کر رہے ہیں۔ جنگل کے شیر کو اُس کے پس خوردہ پلے ہوئے بھیڑیے حیلے ہی سے مار سکتے ہیں۔ وہ بس کسی ایک موقع کی تلاش میں تھے۔ اس کام میں اُنھیں دیر بھی لگ سکتی تھی۔ ہو سکتا ہے اُن کے ذہن میں کچھ اور بھی ہو لیکن اُنھیں ماہم کے پاڑے پر کسی سے معلوم ہو گیا کہ آج رات کانتے کا چالیسواں ہے اور پیرو جولین کے گھر باندرے جا سکتا ہے۔ پیرو نے شرکت کا مشروط وعدہ کیا تھا کہ آ سکا تو آ جائے گا مگر اُس نے کسی طرح وقت نکال لیا کیوں کہ کانتے کی بات تھی۔ اُدھر وہ اندھیرے میں چھپن کاڑھے اُس کی واپسی کی راہ تکتے رہے۔ ماچھی پیرو کے ساتھ تھا۔ اِس سے بہتر صورت اُن کے لیے اور کیا ہو سکتی تھی۔

"تمھارا مطلب ہے جارجی اور دکی؟" شکلا ہکلاتے ہوئے بولا۔
"جارجی تو سُور کا..... ماہم کے پاڑے پہ پڑا اینڈ رہا تھا۔" تھل کی آواز اکڑ گئی۔ اُس نے شکلا کو بتایا کہ دکی اور ٹامی کے علاوہ دوسرے بھی ہو سکتے ہیں جو ممکن ہے، یہاں کے نہ ہوں، گو اسے اُن کے ساتھ آئے ہوں اور ماری بھی اُنھیں نہ جانتی ہو۔ کسی اور کا نہیں، پیرو دادا کا معاملہ تھا، اُن کی تعداد زیادہ بھی ہو سکتی ہے مگر بہت زیادہ نہیں۔ راجن نے جارجی کی دیکھا دیکھی، جارجی کی شہ پر ماہم کے پاڑے کا بھتّا بند کر دیا تھا لیکن جیسے ہی اُسے پیرو کی واپسی کی خبر ملی، وہ رقم لے کے آ گیا اور اُس نے پیرو کے پیر پکڑ لیے۔ راجن کی یہ ہزیمت جارجی کے لیے دل شکنی کا باعث ہو گی کہ ایک ادرُت ٹوٹ گیا۔ راجن کی محبوب عورت کے قتل کا سبب راجن سے عناد نہیں تھا۔ جارجی کو معلوم تھا کہ راجن کے پاس دوسرا راستہ بھی ہے، وہ بدنصیب تو چارہ بن گئی۔ اندھیری کا انتخاب اُنھوں نے خوب سوچ سمجھ کے کیا تھا۔ ماہم سے اندھیری کا فاصلہ خاصا ہے۔ قلابے سے اور زیادہ۔ پولیس اُن سے دُور ہی رہے گی اور اُنھیں راجن کی رکھیل جیسی کسی اجنبی عورت ہی کو منتخب کرنا چاہیے تھا۔ ایک ایسی عورت جس کا تعلق کبھی بازار سے رہا ہو اور متعدد آشناؤں سے ربطِ خاطر۔ اُس عورت سے جارجی اور دکی کا کوئی رابطہ یا واسطہ نہیں ہو گا۔ وہ کبھی راجن کے گھر بھی نہیں گئے ہوں گے۔ عورت سے کہانی ہی کچھ اور سمجھ میں آتی ہے۔ پولیس کرداروں کو کھوجتی رہے، پس منظر کے لیے ماچتی

ہے۔ اندھیری ہی کے علاقے میں راجن کے ساتھیوں، اڑوسیوں پڑوسیوں کو نوچتی رہے اور راجن کے سر پر تلوار لٹکی رہے اور پیرو بھی اندھیری میں گلی گلی بھٹکتا، سر پٹکتا رہا ہے۔ اندھیری میں پیرو کی آمد، راجن کے دفاع کے لیے اُس کی بے تابیوں سے پولیس اچھی طرح واقف تھی۔ وہ اندھیری کے علاقے میں راجن کے حریف ڈھونڈ رہا تھا اور اُس نے راجن کے جرم پر پولیس کا یقین پھیکا کر دیا تھا۔ پولیس جانتی تھی کہ یہ بات راجن کے بدخواہوں، اُس عورت کے قاتلوں کے لیے کتنے تردد کا سبب ہو گی۔ سو اُنھوں نے اپنے گریبان تک پیرو کے ہاتھ پہنچنے سے پہلے ہی اُس کا کام تمام کر دیا۔ ایسی صورتِ حال میں پولیس کو یہی قیاس کرنا چاہیے۔ جارجی اور دکی پر آنچ آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جارجی مستقل ماہم کے پاڑے پر رہا اور دکی کو ممبئی کی پولیس جانتی نہیں تھی۔

تھل خاموش ہو گیا۔ شکلا کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں میرا بھی یہی حال تھا۔ تھل بیڑی پیتا رہا۔ شکلا نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تو تھل نے اجازت مانگی۔

"نہیں دادا! ابھی بیٹھو۔" شکلا ٹھٹھری ہوئی آواز میں بولا۔
"ہو سکے تو ایک چائے اور منگوا دو صاحب!"
"ہاں ہاں ضرور، کیوں نہیں۔" شکلا نے گھنٹی بجائی۔ اردلی کے آنے پر اُس نے تیز تیز لہجے میں چائے لانے کا حکم دیا اور تھل سے پوچھا کہ اُسے کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟ تھل نے انکار کر دیا۔ پھر اُس نے مجھ سے پوچھا، ابھی مَیں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ وہ چونک کے بولا۔ "کھانے کا وقت بھی ہو چکا ہے، بلکہ گزر رہا ہے۔ مجھے دھیان ہی نہیں رہا۔"
"نہیں صاحب! مہربانی۔" تھل نے نرمی سے کہا۔
"گھر اتنا دُور نہیں ہے۔" شکلا جھجکتے ہوئے بولا۔ "ہم موٹر میں جائیں گے۔"
"اپنے کو بھوک نہیں ہے صاحب!"
"سچ پوچھیے تو مجھے بھی نہیں ہے۔"
شکلا نے اصرار نہیں کیا اور کہنے لگا۔ "کچھ اور تو نہیں رہ گیا ہے دادا؟"
"یہ تو آپ بولو صاحب!"
"نہیں دادا! شاید کچھ بھی نہیں۔" شکلا کی آواز پر افسردگی چھا گئی۔ "یہ سب کچھ میرے لیے ایک تجربے کی حیثیت رکھتا ہے۔"
"ابھی تو لمبی پڑی ہے صاحب!" تھل نے تنک کے کہا۔
"پر کبھی جی کرتا ہے کہ بہت مختصر ہو جائے۔" شکلا شکستہ لہجے میں بولا۔ "یہ قلابے کا دادا جارجی تو پیرو دادا کا بنایا ہوا تھا۔"
"بنایا تھا پر شرط نہیں ہے صاحب! اوپر والے کے ساتھ بھی ایسا ہے۔"
شکلا پلکیں جھپکانے لگا۔
"وہ دادا نہیں رہے تھے صاحب!" تھل نے کہا۔ "اڈّے پاڑے کا دادا اور ہوتا ہے۔"
"وہ کیسا ہوتا ہے؟"
تھل نے کہا کہ دادا لوگ کبھی ایک دوسرے کو ایک پل نہیں بھاتے پر بل بُوتا نہ ہو تو اپنے حریف کو ٹھکانے لگانے کے لیے طرح طرح کے حربے اختیار کرتے ہیں۔ تھل کے بہ قول اوپر کی لڑائی لڑتے ہیں، شطرنج کی بازی کھیلتے ہیں لیکن وہ بندوق تان کے پیٹھ پیچھے سے وار نہیں کرتے، جو ایسا کرتے ہیں، وہ دادا کے بھیس میں چور اچکّے اٹھائی گیرے ہوتے ہیں۔ کسی دادا کو اُٹھائی گیرا بننے میں دیر نہیں لگتی، دادا بننے میں عمر لگ جاتی ہے۔ دادا تو بہت کم ملتے ہیں اور اُنھی کے دم سے پاڑا اڈّا چلتا ہے۔ دادا گیری الگ چیز ہے، دادا ہونا الگ۔

شکلا انہماک سے سُنتا رہا اور بے کلی سے بولا۔ "لیکن دادا! ایسی کیا بات تھی جو جارجی اس حد تک، میرا مطلب ہے، اتنی دُور چلا گیا، ایسا مشتعل..... ماری کی اور تمھاری باتوں سے۔ مجھے کچھ کچھ اندازہ ہو چکا ہے لیکن.....؟"
"دھندے میں پڑنے والا دادا، دادا نہیں رہتا صاحب!" تھل نے بھڑکتی ہوئی آواز میں کہا۔ "دادا لوگ بہت اُلٹ پھیر کرتے ہیں پر عورت نہیں چلاتے۔ دھندے میں پڑنے والا اور مال

بنانے والا دادا بچھو بن جاتا ہے۔ جارجی نے پہلی بار دھن دولت دیکھی تھی۔" تجھل نے شکلا سے کہا کہ دھن دولت میں دارو کا سا زور ہے، جتنا پیتے جاؤ، نشہ بڑھتا ہے لیکن پاڑے کے دادا کا نشہ اُس کا بَل ہے۔ دولت اڈّے پاڑے کی ضد ہے اور بَل کے لیے زہر ہے۔ سانپ کی طرح بَل کو جکڑ لیتی ہے۔ پاڑے میں آدمی مال بنانے نہیں آتا ورنہ سارے اڈّے پاڑے جوہری بازار ہوتے اور اُن کی جگہ محل دو محلے کھڑے ہوتے۔

"مگر دولت بھی بڑی طاقت ہے دادا بہت زور ہوتا ہے اُس میں۔" شکلا نے بے ربطی سے کہا۔

"ہوتا ہے صاحب! بہت ہوتا ہے پر اپنا بل نہیں رہتا، مانگے کا، پرائے جیسا۔ آدمی اپنا بھی کھو دیتا ہے۔ ڈوری کہیں بھی نہیں ٹوٹتی۔ آدمی بھاگتا رہتا ہے، ساری سمیٹ لینے کو۔ دولت کا مطلب ہے، آدمی صرف اپنا ہو گیا۔ پاڑے کا آدمی ایک اپنا ہی نہیں ہوتا۔ آپ نہیں سمجھو گے صاحب!" تجھل نے تندی سے کہا۔

"مَیں سمجھ رہا ہوں دادا اور..... اور سمجھنا چاہتا بھی ہوں۔"

تجھل نے کہا کہ وکی نے جارجی کی آنکھوں میں چربی بھر دی تھی۔ جارجی کی عمر اتنی پختہ نہیں تھی اور عمر سے ایسا فرق بھی نہیں پڑتا۔ آدمی خود کچا ہو تو ماہ و سال کی گردش بھی کچھ کر نہیں پاتی۔ تجھل نے شکلا کو بتایا کہ ممبئی سے پیرو کی سات آٹھ ماہ کی عدم موجودی کے باعث جارجی نے اپنے ایک نوجوان رشتے دار وکی کی تحریک اور اعانت سے قلابے کے ساحل پر جوئے، شراب اور عورتوں کا خفیہ اڈّا کھول لیا تھا۔ یہ سمجھ کے کہ پیرو کہیں مرکھپ گیا ہے۔ اُس نے ماہم کے پاڑے سے بھی ناتا توڑ لیا۔ ممبئی واپس آنے پر پیرو کو جیسے ہی خبر ملی، وہ جارجی کے سر پہ پہنچ گیا اور اُس کی خوب گوشمالی کی کہ یہ حرکت کسی دادا کا شیوہ نہیں ہے۔ جارجی کو اڈّا فوراً بند کرنا پڑا اور دوسرے دن اُس نے ماہم کے پاڑے آ کے خود کو میرے سپرد کر دیا اور پیرو کی زندگی تک بیشتر پاڑے پر بیٹھا ہوا عاجزی کرتا رہا۔ بگڑا ہوا دادا کتا بن جاتا ہے پھر اس کے لیے کوئی سمت، کوئی راہ بند نہیں ہوتی۔ پیرو دادا کو اُسی رات اُس کی آنکھیں نکال لینی چاہیے تھیں۔ پیرو نے اُسے چھوڑ دیا، بعد میں وہ پاڑے آیا تو بھی اُس کا خیال آیا۔ ایسا نہیں تھا کہ پیرو اُسے اندر باہر سے جانتا نہ ہو۔ یقیناً پیرو نے ماری کی خاطر اُسے چھوٹ دی تھی اور سمجھا تھا کہ لوٹ پیٹ کے ایک دن ٹھیک ہو جائے گا۔ بیٹھا تو وہ مستقل پاڑے ہی پر رہے۔ داداؤں کو یہ رعایتیں راس نہیں آتیں، لگتا ہے، پیرو ابتدا ہی سے اُسے ماری کی رعایت دیتا رہا تھا جبھی گدی پر بٹھا دیا۔ کچا دادا کچے لوہے کی طرح پگھل جاتا ہے۔ پیرو کے بل وہ چلتا رہا۔ سب کو معلوم تھا کہ پیرو دادا سے اس کا کیا تعلق ہے۔

اردلی نے چائے لا کے رکھ دی۔ تجھل کے منتشر ہونے کے خیال سے شکلا نے ٹرے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ تجھل خاموش ہو گیا تو اُس نے چائے بنائی۔ پیالی خالی کرتے ہی تجھل اُٹھ کھڑا ہوا۔ شکلا بھی گھرائے ہوئے انداز میں کرسی سے اُٹھ گیا۔ وہ ہمیں اور روکنا چاہتا تھا لیکن کچھ سوچ کے رہ گیا اور ہمارے ساتھ ہی دروازے سے باہر نکلا۔ کمرے کے باہر موجود افسران اور سپاہی شکلا کو دیکھ کے اِدھر اُدھر سمٹ گئے۔ شکلا ہمارے ساتھ چلتا رہا۔ "آپ بیٹھو صاحب!" تجھل نے چبوترے کی سیڑھی سے اُتر کے کہا۔ "ہم چلے جائیں گے۔"

"نہیں دادا! آپ جیپ میں بیٹھو۔" وہ قریب کھڑی ہوئی جیپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "یہ آپ کو چھوڑ آئے گی۔"

"اس کی ضرورت نہیں صاحب!"

"بیٹھ جاؤ دادا!" شکلا کا لہجہ گزارشانہ تھا۔ "مَیں نے آپ لوگوں کو بلایا تھا۔"

"آپ کسی ٹائم بھی حکم کر سکتے ہو، آپ کی ڈیوٹی ہے۔"

"نہیں دادا! ایسا مت کہو۔" شکلا کی آواز تمتما رہی تھی۔ "اُس نے تجھل کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے تھے۔ "بہت بوجھ تھا سر پہ دادا!"

"اپنے کو پتہ ہے صاحب!"

"جیسے ہی تھانے میں ماری کے آنے کی خبر ملی، میں سیدھا پیرو دادا کے گھر گیا تھا۔ وہاں جولین سے معلوم ہوا کہ آپ لوگ دس منٹ پہلے نکل گئے ہیں۔ میرا پاڑے آنا شاید ٹھیک نہیں تھا۔"

"وہ آپ کی جگہ نہیں ہے۔"

"پر اب پاڑا دیکھنے، پاڑے پہ آنے کو جی چاہتا ہے۔"

"اُدھر آدمی لوگ ہی ہوتے ہیں صاحب!"

"ہاں ہاں دادا!" شکلا بے قراری سے بولا۔ "اُنھی کو دیکھنے، اُنھی کو دیکھنے۔"

"ضرور آؤ صاحب!" تجھل کے لبوں پر مسکراہٹ سی آ گئی۔ وہ ڈنڈا پکڑ کے جیپ میں بیٹھ گیا۔ مَیں بھی بیٹھنے کو تھا کہ شکلا نے مجھے سینے سے لگا لیا۔ "مجھے افسوس ہے ظہیر!" وہ ڈوبی ڈوبی آواز میں بولا۔ "مَیں تمھیں بتاؤں، مجھے بہت خوف تھا۔ یقین کرو، مَیں ان دنوں سو بھی نہیں پایا ہوں۔"

"کاہے کا خوف؟" میں نے دبی زبان سے کہا۔

"یہی کہ تم..... کہیں تم... میرے دماغ میں جانے کیسے کیسے وہم تھے اور ایک بار تو مَیں نے سوچا، کچھ دنوں کی چھٹی پر دُور چلا جاؤں پھر تمھارے خیال نے مجھے روک لیا۔"

"نیند کسی کو بھی نہیں آئی...."

"تمھیں یوں اچانک اس طرح دیکھ کے نہ پوچھو کیا حال ہوا، اب مجھے تسلی ہو گئی ہے کہ تم محفوظ ہاتھوں میں ہو حالانکہ اب بہت سی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔"

"نہیں آئیں گی شکلا جی!"

اُس نے میری کمر تھپتھپا کے جیپ میں بیٹھنے کی ہدایت میں نے دیکھا، اُس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ جیپ ابھی چلی تھی کہ وہ اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے برابر بیٹھے ہوئے تجھل کے پاس گھر ہی جا رہے ہو دادا؟" تجھل نے اقرار میں سر ہلایا۔ شکلا کہنے لگا میں بھی ساتھ چلتا لیکن یہاں بہت سے کام نمٹانے ہیں۔

"اب کیا رہ گیا ہے صاحب!"

"سارا نئے سرے سے دیکھنا پڑے گا دادا!"

"ہو سکے تو اُس ابھاگن کو جلدی کچہری بھیج دو۔ ٹھکانے سے جائے گی۔"

"اُسی کے بارے میں سوچتا ہوں دادا!"

"سوچنے کو کیا دھرا ہے صاحب!"

"دادا!" شکلا مچلتی آواز میں بولا۔ "مجھے بتاؤ، ہم اُس کی کیا کر سکتے ہیں؟"

"آپ بولو تو اُس کی جگہ بیٹھ جائیں۔"

"اوہ نہیں، نہیں دادا!" شکلا سر جھٹک کے بولا۔ "میرا مطلب نہیں ہے۔ سوچتا ہوں، بچے کس طرح رہیں گے۔ کاش کچھ میرے ہاتھ میں ہوتا۔"

"اُس کو اپنے حال پر چھوڑو صاحب!"

"اُس کے بچوں کا خیال آتا ہے۔"

"روپیٹ کے ٹھیک ہو جائیں گے حرام کے.....، اُن کے پاس آ جائیں گے ابھی۔"

"میں بھی ساتھ چلوں گا دادا! ابھی دیکھو، مَیں کاغذات دوبارہ بنا ہوں اور وکیلوں سے مشورہ کرتا ہوں۔"

تجھل نے کچھ نہیں کہا۔ شکلا جیپ کے پاس سے ہٹ گیا۔

جیپ پاڑے کی عمارت کے سامنے ٹھہری تو گلی میں کھڑے وہ سبھی ہماری طرف ٹوٹ پڑے۔ اُنھیں خبر مل گئی تھی کہ جارجی اور وکی نامی اُس کا کوئی دوست ختم کیا جا چکا ہے۔ باقی تفصیل کا اُنھیں علم نہیں تھا۔ تجھل نے اندر جاتے ہی پانڈے دادا سے کہا کہ وہ آدمی بھیج کے شہر کے تمام پاڑوں کے داداؤں کو بُلا لے۔

اُس وقت ڈھائی بج رہے تھے۔ کسی نے ہمارے انتظار میں کھانا نہیں کھایا تھا لیکن شاید کسی کو بھی خواہش نہیں تھی۔ پہلے وہ ہم سے کچھ جاننے کے لیے بے تاب تھے۔ پانڈے دادا تو بے حال ہو رہا تھا۔ اُس نے تجھل کو چوکی پر بیٹھ کے سانس لینے کی بھی مہلت نہیں دی اور سوالات شروع کر دیے۔ اُنھیں معلوم ہو گیا تھا کہ جیپ ہمیں قلابے کے تھانے لے گئی تھی۔ اِس دوران پاڑے پر آنے والے دادا بھی مختلف افواہیں لاتے رہے تھے۔ تجھل کے تحمل کی تلقین سے اُن کی سیری نہیں ہوئی، آخر تجھل کو صاف طور پر اُن سے کہنا پڑا کہ وہ تمام داداؤں کے جمع ہو جانے ہی پر زبان کھولے گا۔ جلد یا بدیر اُنھیں سب کچھ معلوم ہونا ہی تھا۔ تجھل کے اجتناب کی وجہ بظاہر یہی نظر آتی تھی کہ ایک جواب کے بعد واویلا ہونے لگتا۔ اُس کی خاموشی پر پانڈے دادا آزردہ خاطر سا ہو گیا۔ تاہم وہ جہاں دیدہ آدمی تھا۔ تجھل کی پس و پیش اُس نے اپنے اطراف بیٹھے ہوئے داداؤں کے سبب سے جانی ہو یا کچھ اور۔ بہرحال اُس نے مزید اصرار نہیں کیا اور کبیدہ کبیدہ اپنی جگہ چپ بیٹھا رہا۔ ہمارے تھانے جانے سے پہلے جو دادا چوکی پر بیٹھے تھے، وہ اب بھی موجود تھے بلکہ اُن کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ تجھل نے اُن کی توجہ ہٹانے کے لیے کھانا لگانے کا حکم دیا۔ سب نے بس جیسے کوئی ذمے داری نبھائی۔ کھانا کھاتے ہی تجھل اُٹھ گیا اور پیرو کے خاص کمرے میں چلا گیا۔ اُن کی متوحش نگاہوں سے بچنے کا یہی ایک مناسب طریقہ تھا۔ چند ثانیوں کے توقف کے بعد پانڈے بھی چلا گیا۔

وہ سب میرے گرد اکٹھے ہو گئے۔ پہلے مَیں نے سوچا، اُن سے لاعلمی کا اظہار کر دوں کہ میں تھانے سے باہر بیٹھا رہا تھا اور تجھل نے اندر جا کے افسروں سے بات کی تھی، گو اُنھیں میری بات کا یقین نہ آتا لیکن اِس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ میرے پس و پیش پر وہ پیچ و تاب کھانے لگے۔ مَیں نے جھوٹ بولنے کے بجائے یکسر انکار کر دیا کہ سر دست مَیں اُنھیں کچھ نہیں بتا سکتا، جو کچھ ہے، اُنھیں جلد ہی تجھل کی زبانی معلوم ہو جائے گا۔ وہ زبردستی تو کر نہیں سکتے تھے، گھُٹ کے رہ گئے۔ پھر مَیں نے بھی وہی کیا۔ جمرو، شامو، مارٹی اور زورا کے ساتھ اوپری منزل کے ایک کمرے میں آ گیا۔ اُن چاروں نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا تھا، مَیں نے از خود اُنھیں بتایا کہ ہم تھانے میں کیا سُن کے اور کیا دیکھ

کے آئے ہیں وہ گنگ ہو گئے۔ اُنھیں یقین ہی نہیں آرہا تھا۔

پانچ بجے تک شہر کے تقریباً سارے دادا پاڑے میں جمع ہو چکے تھے۔ ہر طرف شور گونج رہا تھا۔ پانڈے دادا نے تجھل کو مطلع کرنے کے لیے کمرے میں آدمی بھیجا تو تجھل فوراً باہر آگیا۔ اُس نے بس چوکی کے وسط میں آنے کی مہلت لی اور کسی تمہید کے بغیر اُن سے کہا۔ "قلابے کے تھانے میں جارجی کی بیوی ماری نے آکے بولا ہے کہ اُس نے جارجی اور اُس کے رشتے دار دکی کو ختم کر دیا ہے، بولتی ہے، اُن لوگ نے ہی پیرو دادا کو ختم کیا تھا۔"

عمارت میں سناٹا طاری ہو گیا پھر دوسرے ہی لمحے ایسا شور اُٹھا جیسے اُن سب کو بچھو نے ڈنک مار ہو۔ پانڈے دادا نے کھڑے ہو کے اور ہاتھ اُٹھا اُٹھا کے اُنھیں خاموش کرنے کی کوشش کی مگر تجھل ہی کی آواز اُن کے شور پر غالب آئی۔ تجھل نے نسبتہً اونچی آواز میں اُن سے کہا۔ "ہم جو بول رہے ہیں، وہ ذرا دھیان سے سُنو۔ اپنے کو تھوڑا ہی بولنا ہے۔ کوئی پتہ نہیں تھا کہ اتنی جلدی تم کو دوبارہ بُلانا پڑے گا۔ بات آج بھی وہی ہے پر کل تم نے فیصلہ کیا تھا اور تمھارے بولنے پر ہم نے تمھاری بات مان لی تھی۔ پیرو دادا کی خاطر بھی ہم چپ ہو گئے تھے۔ آج صرف اپنے کو بولنا ہے۔ پیرو دادا کا سارا حساب چکتا ہو گیا ہے۔ جیسے بھی ہوا، ٹھیک ہے۔ اپنے کو ایسا نہیں چاہیے تھا۔ پر اس کی مار کھائے ایک بھی نہیں تھے اور تھی نہیں تھے۔ دوسرے کا ہم سے بھی زیادہ ناتا تھا۔" تجھل کی آواز بھاری ہو گئی۔ ایک لحظے کے تامّل کے بعد وہ بولا۔ "قلابے کے تھانے سے ہم سیدھا اپنے گھر کو نکل سکتے تھے۔ پانڈے دادا اِدھر ہی تھا، بیٹھا رہتا پر سوچ کے چلے آئے کہ سامنے سب صاف کر دیں تو اچھا ہے۔ ہم نے تم سے پہلے بول دیا تھا کہ ہم کو اِدھر ہی نہیں ٹکنا، آگے جانا ہے۔ تم کو اِسی واسطے اِدھر بُلایا ہے کہ اب ہماری چھٹی کرو، گدی پر کسی اور کو بٹھا دو۔ ایک سے زیادہ دادا ہونے پر چاقو اُٹھا کے فیصلہ کر لو۔"

راجن کی جگہ اندھیری کے موجودہ دادا سکندر نے بے تابانہ اُٹھ کے کچھ کہنے کی کوشش کی، تجھل نے اُسے ڈپٹ دیا۔ "کسی کو کچھ نہیں بولنا، کوئی سوال جواب نہیں کر۔ بمبئی میں ہم پاڑا گیری کرنے کو نہیں آئے تھے۔ دادا نہیں رہا تو اب ہمارا کوئی کام بھی اِدھر نہیں ہے۔ بمبئی میں پاڑا چلانے کی ہم کو کبھی کھجلی ہوئی تو اپنے پاس چاقو ہے۔"

سب حیرت و اضطراب سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ سکندر کے بعد کوئی نہیں اُٹھا۔ تجھل نے دھیمے لہجے میں وضاحت کی۔ "اپنے کو پتہ ہے، ابھی اِدھر کوئی پیرو دادا نہیں ہے۔ ایسے دادا کا لانا مشکل ہے جو شہر کے سارے پاڑے باندھ کے رکھے، تو نال کاٹ دو۔ آج سے کوئی پاڑا ماہم کے پاڑے سے جُڑا بندھا نہیں ہے۔ سب کو اپنا الگ الگ بھگتنا ہے۔ کسی کو آکے اِدھر کوئی بھتّا نہیں پہنچانا۔ آگے نئے دادا کی مرضی ہے، سب کو ساتھ رکھے یا الگ کر دے اور تمھاری مرضی ہے کہ تم اٹکے رہتے ہو یا کٹ کے۔ ہم ماہم کے کھونٹے سے سب کو باندھ کے جائیں تو بھی یہ زیادہ دیری نہیں چلے گا۔ اپنے کو ہتھیلی لگ کے اِدھر نہیں بیٹھنا اور نہ لوٹ کے بار بار کو بمبئی آنا ہے۔ پنجرے کی ایک تیلی کھوٹی ہو تو ایک ایک کر کے پنچھی اُڑ جاتے ہیں۔"

"ابھی ابھی اپن کو تھوڑا بولنے دو۔" باندرے کے دادا دینا نے چلّا کے کہا۔

"بیٹھ جا رے۔ اپنی بات پوری نہیں ہوئی۔" تجھل درشتی سے بولا۔ "ابھی ہم اِدھر کی گدی کے دادا ہیں اور تم سب نے مل کے ہم کو اِس پہ بٹھایا ہے۔ جو ہم بولتے ہیں، ٹھنڈے ہو کے اُس کو سُنو، ماہم کے پاڑے کی گدی کے دادا کا فیصلہ جان کے، سمجھا!"

دینا بے چین کھڑا تھا۔ اُس کے برابر بیٹھے ہوئے داداؤں نے اُسے کھینچ کے بٹھا دیا۔ تجھل نے پھر اُن سے کہا۔ "پاڑے کی زمین اور در دیوار سب پیرو کی جاگیر ہے۔ وہ نہیں ہے تو اب اُس کی بیوی اور بیٹی اِس کی مالک ہے۔ تم لوگ کو یہ پاڑا چلانا ہے تو کوئی تم کو اِدھر سے نہیں نکالتا۔ بھاڑا چکاتے رہو گے تو سب ٹھیک چلتا رہے گا۔ یہ منظور نہیں ہے تو ابھی پاڑا خالی کر دو اور اپنے لیے اِدھر کوئی دوسری منڈھیا ڈال لو۔" سب جیسے بُت بنے بیٹھے رہے۔

"اپنے کو اور کچھ نہیں بولنا۔" تجھل نے حتمی آواز میں کہا۔ "جو بھی ماہم کی گدی پر بیٹھنا چاہتا ہے، اپنے کو بولے۔"

کسی نے جواب نہیں دیا۔ تجھل نے چند لمحے انتظار کیا۔ کسی طرف سے کوئی آواز نہیں اُٹھی تو تجھل نے اُن سے کہا کہ اُن کے خاموش رہنے کی صورت میں ماہم کے پاڑے کی گدی کے دادا کی حیثیت سے وہ پاڑا بند کرنے کا اعلان کرتا ہے۔ سب اپنے اپنے گھروں کو جائیں۔

"ایسا کیسے دادا!" بنارسی دادا چیخ کے بولا۔ اُس کے ساتھ بھی شور مچانے لگے۔

"ایسا کیسے چلے گا دادا!" دادر کا دادا بالے بھی اُٹھ کھڑا ہوا اور ہیجانی انداز میں بولا۔ "یہ پاڑا بند ہو جائے گا؟ پیرو دادا کا پاڑا؟ یہ اُس کی نشانی ہے۔"

چوکی پر کئی دادا کھڑے ہو گئے اور ہر کوئی اپنی بولی بول رہا تھا۔ وہ ہاتھ چلا چلا کے صدائیں بلند کر رہے تھے۔ پانڈے دادا دوبارہ

ہں خاموش کرنے کے لیے اُٹھا مگر اُس کی آواز پاڑے کے گونجتے ریں گم ہو گئی۔ ایک لمحے کو ایسا لگا جیسے وہ سب تجھل پر پل پڑیں تجھل نے جیسے اُنھیں کوئی گالی دی ہو۔

تجھل ساکت کھڑا رہا۔ وہ دُہائیاں دیتے اور گرجتے برستے رہے ہل کے بُت میں کوئی جنبش نہیں ہوئی۔ آخر اُن کی آوازیں از خود ند پڑنے لگیں۔ پانڈے نے سب کو عاجزانہ لہجے میں صبر و ضبط کی لید کی اور کہا کہ تجھل کی بات سمجھنے کی کوشش کریں۔

"اِن سے پوچھو دادا! یہ کا ہے کا رولا کرتے ہیں۔" تجھل نے ہی سے کہا۔

"تم پاڑا بند کرنے کی بات مت کرو دادا!" بنارسی پھنکارتی داز میں بولا۔

"نہیں کرتا! پھر؟" تجھل نے گرج کے کہا۔

"ایسا کبھی نہیں ہوئے گا۔"

"نہیں ہو گا، کون روکتا ہے تیرا ہاتھ۔"

"پاڑا چلے گا اور ایک دم چلے گا، پیرو دادا کے نام پہ چلے گا۔"

"پھر ٹنٹا کیا ہے؟ نیا دادا بٹھلاؤ۔"

سب ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے، کسی جانب سے کوئی صدا نہیں اُٹھی۔ پھر بالے نے آگے آکے اور ہاتھ جوڑ کے تجھل سے کہا کہ وہ اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرے۔ سب کے لیے وہ اِس وقت پیرو دادا کی جگہ ہے۔ اُس نے پہلے بھی اُن کی بات مان لی تھی، ہمیشہ کے لیے نہیں تو کچھ عرصے کے لیے ابھی وہ پاڑے پر بیٹھا رہے۔ بعد میں کوئی نہ کوئی انتظام ہو جائے گا۔ اُسے یقین ہے، فی الحال کوئی بھی ماہم کے پاڑے کی مرکزی حیثیت ختم کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ جہاں تک پیرو دادا کی بیوی اور بیٹی کا تعلق ہے، وہ ہم سب کی ماں بہن ہے۔ پاڑے کا کرایہ کیا، اُن کے لیے جان بھی حاضر ہے۔ تجھل سُنتا رہا۔ بالے کے بعد شنکرا تجھل کی منت کرنے لگا کوئی دادا بھی ماہم کے پاڑے کی گدی پر بیٹھنے کا خواہش مند نہیں ہے۔ اُس نے پاڑے میں بیٹھے لوگوں سے مخاطب ہو کے پوچھا کہ کوئی ہو تو سامنے آئے۔ کسی نے جواب نہیں دیا۔ شنکرا بار بار لوگوں سے پوچھ رہا تھا کہ نوجوان سورت والے نے اُس کا ہاتھ پکڑ کے اُسے خاموش کر دیا اور تجھل سے بولا کہ اُسے دادا کی بیوی اور بیٹی کا اتنا خیال ہے، ہم بھی تو دادا کی اولاد کے مانند ہیں۔ سب نہیں تو ماہم کے پاڑے سے متعلق سارے دادا پیرو کی نگرانی میں پروان چڑھے ہیں۔ وہ سب اُجڑ جائیں گے۔ تجھل، دادا کے اِن پسماندگان کو کیوں بھولے ہوئے ہے۔ سب سے اتنی بے رُخی، بے تعلقی سے کیوں مخاطب ہے۔

سورت والا جارجی کو مغلظات بکنے لگا اور بولا، مجھے یقین نہیں آرہا کہ جارجی نے ایسا کیا ہے۔ کل تک، کل رات تک وہ ہمارے درمیان بیٹھا آنسو بہا رہا تھا۔ وہ اتنا بڑا کمینہ ہے، کوئی خواب میں بھی تصور نہیں کر سکتا تھا۔ تجھل کی بد دلی کا سبب شاید وہی کتا ہو لیکن ایک نمک حرام کی غداری کی سزا اتنوں کو کیوں دی جا رہی ہے۔ پانچوں اُنگلیاں یکساں نہیں ہوتیں۔ جارجی کے نطفے میں ضرور کوئی فرق تھا جو اُس نے اپنے مربّی، اپنے محسن کے ساتھ ایسا کیا۔ بے شک یہاں بہت سے دادا، پیرو دادا سے خار کھاتے تھے، اُس سے حسد کرتے تھے۔ وہ جنھیں ماہم کے پاڑے کی بالا دستی ناپسند تھی اور جنھیں تیواڑی کے خاتمے کے بعد مجبوراً ماہم کے پاڑے سے وابستہ ہونا پڑا تھا۔ ہمیں معلوم ہے، اُن میں کئی رتّی تڑاتے کے لیے سر پیر مارتے تھے لیکن پیرو کا پہاڑ ہٹانے کے لیے کسی کے دل میں بھی یہ بزدلانہ خیال نہیں آیا ہو گا۔ یہ کسی دادا کا کام نہیں۔ ایسا جھنے لگے تو پھر ہر بات آسان ہے۔ سورت والا بلند آواز میں بولا کہ دادا کی بیوی اور بیٹی کے لیے پاڑے کا کرایہ ہی نہیں، اِس کے علاوہ بھی ماہ بہ ماہ کچھ نہ کچھ بلکہ بہت کچھ پہنچایا جاتا رہے گا، اپنے گھر کی طرح۔ یہ بمبئی شہر ہے اور یہاں کے پاڑے ایسے نادار نہیں ہیں جو اپنے پیرو دادا کا گھر نہ چلا سکیں۔

"بیٹھ جا۔" تجھل نے غرّا کے کہا۔ "زبان کاٹ لیں تیری حرام کے..... چندے کو بولتا ہے؟ ابھی ہم جیتے ہیں سخی کے....."

"نہیں نہیں دادا! ایک دم نہیں۔" سورت والا سٹ پٹا کے بولا۔ "ماں قسم اپن کا....."

پانڈے دادا نے جھڑک کے اُسے بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ شنکرا، دینا، بالے، زدرا اور پانڈے دادا وضاحتیں کرنے لگے کہ سورت والے کا مطلب کچھ اور نہیں تھا۔

"زیادہ باتیں نہ بناؤ رے۔" تجھل نے بھڑکتی آواز میں کہا۔ "ہم نے تم سے بولا تھا، اپنے سے ضد بحثی مت کرنا۔ پورا نہیں سُنتے ہو کیا؟"

"سُن لیا ہے مائی باپ!" پانڈے کی نرم گوئی میں ترشی بھی شامل ہو گئی۔

"پھر آگے کا بولو دادا!" تجھل نے برگشتگی سے کہا۔

"کیا بولے مہاراج!" پانڈے دادا چوکی پر بیٹھے ہوئے داداؤں کو مضطرب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم سُنے تو ابھی کچھ بولے۔"

تجھل نے اُن سے کہا کہ تکرار سے کچھ حاصل نہیں، جو کچھ کہنا تھا وُہ کہہ چکا ہے۔ واضح رہے کہ وہ اُن سے اجازت طلب نہیں کر رہا۔ اُس کا فیصلہ اُن کی تائید یا انکار سے مشروط نہیں ہے۔ انھیں نے صرف اپنا فیصلہ کرنا ہے۔ دو صورتوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا۔ اتنی سیدھی اور آسان بات اُن تک کیوں منتقل نہیں ہو رہی۔

"ایسا سیدھا اور صاف نہیں ہے جیسا تم بولتا ہے دادا!" بالے نے کہا۔

"ایسا کیا بات ہے دادا جو تھانے سے آ کے تم ایک دم لوٹ گیا۔" پانڈے دادا بے چارگی سے بولا کہ ابھی تو کسی کی سمجھ میں یہی نہیں آ رہا کہ یہ سب ہوا کیا ہے، کیسے ہو گیا۔ جارجی نے یہ سفاکانہ قدم کیوں اُٹھایا؟ یہ سب تو تفصیل جاننے کے منتظر ہیں۔ جارجی کے ملوث ہونے کی خبر سُن کے ششدر ہیں۔ تھوڑا سانس لینے دو دادا!" پانڈے بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

"اِس کے جاننے سے اپنی بات پر فرق نہیں پڑتا۔ تم پاڑے کے آدمی ہو۔ آگے پیچھے کا سارا سامنے آ جائے گا۔"

"پر ایسا جلدی کا ہے کو ہے۔" شنکرا بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا۔ "لگتا ہے، اپن لوگ سے کوئی بھول ہوا ہے کہ ابھی اوپر سے دادا کو......"

تجھل نے خشمگیں نظر سے اُسے دیکھا تھا، شنکرا کی آواز حلق میں گھُٹ گئی لیکن اُسی لمحے بنارسی دادا چیخنے لگا اور تجھل کے بجائے اپنے اطراف بیٹھے ہوئے داداؤں سے مخاطب ہو کے بولا کہ کیا اتنے ہی وقت کے لیے اُن سب نے خوشامد کی حد تک تجھل سے منت کی تھی۔ ایک دن کے بَل میں کیا وہ مقصد حاصل ہو گیا۔ تجھل نے اُسے جواب دیا کہ پہلے اگر اُس نے اُن کے اصرار پر بہ اکراہ ہامی بھر لی تھی تو اُس کی وجہ دوسری تھی۔ دادا کے خون کا قرض واجب تھا۔ اب کچھ نہیں رہ گیا اس لیے اب اُسے تادیر پاڑے پر ٹھیرنے کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ کیا اُس نے واضح طور پر نہیں کہا تھا کہ اُسے زیادہ دن نہیں ٹھیرنا۔ بہتر ہے، خوش اطواری سے اُسے جانے دیا جائے۔ جو فیصلہ اُنھیں کل کرنا ہے، وہ آج کیوں نہ کر لیں۔

پانڈے کے پیچھے کھڑا ہوا سکندر آ گیا۔ "اجازت ہو تو اپن ایک بات پوچھے دادا؟" سکندر کا لہجہ ٹھیرا ٹھیرا، ٹھنڈا ٹھنڈا سا تھا۔

"کیا ہے رے؟" تجھل نے ناگواری سے کہا۔

"اپن کو یقین ہے، تم دادا کا پاڑا بند کرنے کو نہیں مانگتے۔"

"پھر اتنا بولنے کی کیا ضرورت تھی لاڈ کے۔"

"ایک دم دادا! اپن بھی یہی سمجھتا ہے۔ پیرو دادا نے اس کو بہت لگن اور چاؤ سے بنایا تھا۔ اکھا ممبئی میں ہیرا پاڑا ہے یہ۔ تم نے دیکھ لیا، اس ہیرا پاڑے کی گدّی سنبھالنے کو کوئی اپنی ماں کا جنا آگے نہیں بڑھا۔ تم نے سب کو الگ کر کے بھی بولا۔ کوئی نہیں اُٹھا۔ کسی نے چھاتی پر ہاتھ مار کے نہیں بولا کہ ابھی وہ دادا کی جگہ بیٹھنا مانگتا ہے۔ تم جانتا ہے، ایسا کس واسطے ہے دادا! تم خود بولا ہے، ابھی اِدھر کوئی بھی پیرو دادا نہیں ہے۔ دادا لوگ کو پتہ ہے، وہ کتنے دن کھینچ پائے گا۔ بیٹھنے کو بیٹھ جائے گا پر اکھا ممبئی میں لوٹ کے منہ دکھلانے کا بھی ہے۔ پچھلی دفعہ ہم سب اِدھر بیٹھا کیا بولتا تھا، بولا تھا، اِدھر اینٹ اینٹ پہ دادا کا رنگ چڑھا ہے۔ پاڑے کے اندر کیا، باہر کیا، بہت پکا رنگ ہے اُس کا۔ پھیکا پڑنے میں تھوڑا ٹائم لگے گا۔ دادا کے تھوڑا دُور ہو جانے پہ۔ دھیرے دھیرے ہی اُس کا نشہ...."

"کام کی بات کر رے!" تجھل نے جھپٹتی آواز میں کہا۔

"وہی بولتا ہوں دادا! ایک دم وہی۔" سکندر تیزی سے بولا "اپن کا مطلب ہے، ابھی ادھر کوئی نہیں ہے جو چاروں طرف کھینچ کے، باندھ کے رکھے۔ کوئی بھی آگے نہیں آئے گا۔ تم بھی چلا جائے گا تالا مار کے۔ پاڑا خلاص ہو جائے گا۔ ابھی دل پہ ہاتھ رکھ کے بولو، تم کو چین پڑ جائے گا اور اُدھر اُدھر دادا کا روح بھی خوش ہو جائے گا؟" سکندر کی آواز پھٹنے لگی تھی۔ ساری عمارت میں خاموشی چھا گئی۔

"کون سی بات کا جواب دیں رے تیری۔" تجھل نے بیزاری سے کہا۔ "ایک ہی رٹا لگائے ہے۔" پہلی مرتبہ اُس کے لہجے میں نمی اور نرمی کی آمیزش تھی۔

"کسی بات کا مت دو دادا! اپن جواب کے لیے نہیں بولا سب۔ اپن کو پتہ ہے، تم کیا بولے گا۔ اب بھی دادا کی خوشی کی بات کرتا ہے حرام زادے۔ پر دادا اِس بات سے خوش نہیں ہوئے گا۔ تو دُکھی بھی نہیں۔ آگے پیچھے سب لوگ ٹھکانے سے ہو جائے گا۔ پاڑا بند ہو جائے گا تو سب لوگ اپنے ٹھکانوں پر چلا جائے گا۔ پانڈے دادا سورت لوٹ جائے گا، دینا باندرے کو، بالے دادر کو، اپن اندھیری میں۔ اِدھر ماہم کا لوگ بھی کدھر سر کھپالے گا۔ دادا کا پاڑا ابھی صرف ماہم علاقے کا پاڑا ہے یا اکھا شہر کا۔ اِس کو رہنا ہے

دادا! یہ خلاص ہو گیا تو پھر ہر پاڑا.... پھر آگے سدا کو ایسا ہی ہوتا رہے گا۔"

"ہم سے کیا بولتا ہے، اِدھر شہر کے سارے شیر امتا بیٹھے ہیں۔ چاقو کے دھنی، اِن سے بول۔ یہ تھوڑے دن کے لیے ایک دوسرے کو کندھا نہیں دے سکتے۔ ایک ہی تجھ کو لے دَرے، بلے گھرے دکھائی پڑتے ہیں۔ پاڑے کا، دادا کا اتنا درد پیٹ میں اُٹھتا ہے تو اِن کو بول۔ ہم اِدھر تیرے مہمان ہیں، آج نہیں، کل اِدھر سے چلے جائیں گے اور دادا کے ساتھ اُس رات ہم بھی نکل پڑتے تو.... تو اپنا نمبر بھی آ جاتا۔ پھر کس کو اِدھر لاتا گدّی سجانے کو؟"

"اپن کو یقین ہے، ساتھ تم ہوتے تو ایسا کبھی نہیں ہوتا۔" سکندر نے بے ساختہ کہا۔ "وہ بات دوسری تھی پر ابھی تم اِدھر ہے اور اپن زیادہ ٹائم کے لیے نہیں بولتا۔ بس تھوڑی دیر کے لیے ابھی اس پہ تمھاری ضرورت ہے۔ تم بھی سمجھتا ہے، کیوں۔ اِس کے بعد تم چلے جانا، جدھر مرضی میں آئے چلے جانا، کون روک سکتا ہے تم کو۔"

"پھر کیا ہو جائے گا، سینگ نکل آئیں گے تم لوگ کے؟"

"نہیں نکلے گا پر یہ ٹائم بھی نہیں رہے گا، یہ جا نگلی ٹائم اور کچھ نہیں ہوئے گا تو تم تالا مار دینا۔"

"اپنے کو آگے بہت کام ہے رے!"

"ابھی دادا ہوتا تو تم کیا نہیں رُکتا؟"

"پر دادا نہیں ہے۔" تجھل نے بھاری آواز میں کہا۔

"دادا نہیں ہے تبھی تو اتنا بولتا ہے۔" سکندر عاجزی سے بولا "ہاں جاؤ دادا! دادا کے ناتے سے اپنا حق نکلتا ہے تم پہ، ابھی اپن لوگ تم کو اُسی کا قسم دیتا ہے۔"

"کیا! کیسا بولتا ہے رے؟"

"تم رہو گے تو اِدھر سب ٹھیک رہے گا۔ ابھی دیکھو، کیسا مل کے بیٹھا ہے۔ اِدھر کبھی ایسا نہیں ہوا، دادا کے ہوتے بھی...."

تجھل گم کھڑا رہا۔ اُس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور چہرے پر گہری لکیریں تھیں۔ عمارت میں سرگوشیاں گونجنے لگیں پھر چوکی پر بیٹھے ہوتے دادا آوازیں اُٹھانے لگے کہ تجھل کو انکار نہیں کرنا چاہیے۔ اتنے لوگوں کی بات نہیں ٹالنی چاہیے۔

"پھر ویسا ہی رہے گا۔" تجھل نے جلتی ہوئی سی آواز میں کہا۔

"کیا، کیا بولا تم؟" سکندر بدحواسی سے بولا۔ پانڈے دادا بے اختیار تجھل کے پہلو سے چمٹ گیا اور اُس کے بازو پر سر مارنے لگا۔

"تم میں سے کوئی نہیں اُٹھتا تو ایک رستہ اور بھی ہے۔"

سب کو جیسے سکتہ سا ہو گیا۔ تجھل نے اُن سے کہا کہ کوئی پاڑا بند کرنا نہیں چاہتا، نہ آگے آ کے گدّی پر بیٹھنا چاہتا ہے اور اُس کے پاس بھی وقت نہیں ہے۔ کوئی یہ سمجھنا نہیں چاہتا کہ اُس کے انکار کی کوئی وجہ ہی ہو سکتی ہے ورنہ اتنے بڑے پاڑے کی گدّی کی کسے خواہش نہ ہو گی، خصوصاً ایسا پاڑا جو اُس کے عزیز دوست، بھائی پیرو کی امانت ہو۔ ایک اجنبی کو شہر کے اتنے دادا یہ مرتبہ دینے پر مُصر ہیں تو انکار ویسے بھی مناسب نہیں۔ اِس صورت حال میں ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے کہ وہ اپنی طرف سے کوئی آدمی گدّی پر بٹھا دے۔ "پاڑا اپنے نام پر چلے گا۔" تجھل نے گونجتی آواز میں کہا۔ "بیٹھے گا یہاں کوئی اور۔ جب تک ہم پاڑے سے باہر رہیں گے، اپنا آدمی، اپنی جگہ بیٹھا رہے گا۔"

چند لمحوں کے سکوت کے بعد عمارت میں وہی شور بلبلانے لگا۔ تجھل نے ہاتھ اُٹھا کے اُنھیں خاموش کیا اور کہا۔ "تم کو منظور نہیں تو منع کر دو، پانڈے اپنی جگہ بیٹھے گا اور اُس کو ٹیکی دینے کے واسطے جس کو ہم بولیں۔"

پانڈے دادا اپنا نام سُن کے اُچھل پڑا اور دہشت زدہ انداز میں بولا۔ "نہیں نہیں دادا! اپن کو معافی دلو، اپن ایک دم نہیں ٹھیرے گا، اپن ابھی بہت بھگت لیا۔"

تجھل نے اُس کی جانب نہیں دیکھا اور اِس سے پہلے کہ کسی طرف سے کوئی صدا بلند ہوتی، اُس نے کہا۔ "بالے، پانڈے کے ساتھ اِدھر رہے گا۔ جب تک ہم پلٹ کے نہ آئیں اور تم لوگ کو بلا کے نہ پوچھیں کہ ابھی تم میں سے کون جوان بلوان نے کھال کتنی موٹی کی ہے۔ کس نے چاقو کی بولی کتنی سیکھی اور اُس کو اپنی کتنی سکھائی ہے۔ اپنے تین پاڑوں کے سوا سارے پاڑے ماہم کے پاڑے سے الگ رہیں گے، بھتا بھی نہیں پہنچائیں گے۔ قلابے، اندھیری اور دادر کے پاڑے کے سوا۔ ہمارے پیچھے کسی کا دماغ اُلٹے گا تو اُس کو اِدھر چھاتی پھُلا کے آنے سے تم سب روکو گے۔ جدھر ہم پانڈے اور بالے کو بول کے جائیں، وہ ہم کو خبر کریں گے۔ ہمارے لوٹنے تک تم اُس تیس مار کو انتظار کرنے کا بولو گے۔ ہمارے آنے سے پہلے کسی نے پانڈے اور بالے کو چھیڑا اور تم ہاتھ تاپتے رہے تو ہم تم کو دوبارہ اِس طرح نہیں بلائیں گے۔ ہم خود اُس کو دیکھ لیں گے اور

پھر آکے ہم بولیں گے بھی نہیں۔"

تجھل نے کسی کو دخل دینے کا موقع نہیں دیا اور کہا کہ یہ سب اُن کی خاطر ہے کیوں کہ نہ وہ پاڑا بند کرنے پر آمادہ ہیں نہ چوکی کے وسط میں آکے پاڑے کی باگ ڈور سنبھالنے پر تیار ہیں مگر یہ ایک مشورہ ہے جسے وہ یک سر مسترد کر سکتے ہیں۔ اُن کی تائید کے بعد یہ فیصلہ بن جائے گا۔ اچھا ہو گا کہ وہ خوب سوچ سمجھ کے جواب دیں اور چاہیں تو باہم مشورت بھی کر لیں۔ اُن پر کوئی جبر نہیں ہے۔

وہ بنارسی دادا تھا جس نے اُٹھ کر کتراتے ہوئے، چباتے ہوئے لفظوں میں پوچھا کہ کوئی دادا پاڑے کی گدی پر بیٹھنے کا دعوے دار ہو تو کیا صورت ہو گی؟ بنارسی نے وضاحت کی، کیا اُسے چاقو نکال کے اپنا مطالبہ پیش کرنا پڑے گا یا کچھ اور؟ تجھل نے کسی تاخیر کے بغیر جواب دیا کہ یقیناً اُسے چاقو سمیت ہی اپنا دعوا پیش کرنا ہو گا۔ چاقو ہی کسی دادا کا سب سے بڑا حوالہ ہے۔ مقابل کوئی نہیں اُٹھا اور یہاں موجود سارے داداؤں کو منظور ہوا تو اُسے پاڑے کی گدی سونپ دی جائے گی۔ تجھل نے بھی صراحت ضروری سمجھی کہ وہ اور اُس کے ساتھیوں میں سے کوئی پاڑے کی گدی کا خواہش مند نہیں ہے۔ سو خاطر جمع۔ نہ وہ چاقو اُٹھائے گا نہ اُس کا کوئی ساتھی۔ ساتھیوں سے تجھل کی مراد شامو، جمرو اور مجھ سے تھی۔ اُس نے بنارسی سے کہا کہ یہاں سارے داداؤں کو اسی لیے طلب کیا گیا ہے کہ وہ آپس میں کوئی فیصلہ کر لیں کیونکہ پہلے بھی اُنھوں نے یہی کیا تھا۔ دادا کے پاڑے کے ترکے میں شہر کے وہ تمام دادا شریک ہیں جو باہم کے پاڑے سے متعلق تھے مگر ظاہر ہے، پاڑا تقسیم نہیں کیا جا سکتا، نہ اِس کے اعتبار اور اِس کی ساکھ کی تقسیم ممکن ہے۔ اِس کا انتظام کسی ایک ہی کے سپرد کیا جا سکتا ہے اور اِس لیے کسی ایک کا انتخاب لازم ہے یا دوسرا طریقہ ہے۔ چاقو کے ذریعے خود کو دادا کے ترکے کا حق دار ثابت کیا جائے۔

بنارسی نے پھر سر نہیں اُٹھایا۔ تجھل نے ایک بار اُن سے اور پوچھا کہ کوئی آرزو مند ہو تو سامنے آئے، بہ صورتِ دیگر وہ سمجھے گا کہ سب اُس کے فیصلے پر متفق ہیں۔ پانڈے دادا کچھ بولنا چاہتا تھا، تجھل نے اُسے روک دیا۔

مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ تھانے سے آنے کے بعد کیا یک تجھل کو کیا ہو گیا ہے۔ شروع شروع میں مجھے سب کچھ عجیب سا لگا تھا۔ جیسے تجھل کسی ذہنی دباؤ کا شکار ہو۔ اتنے تسلسل سے اتنی بے ربطیاں پیش آئیں، ایسی ناگہانیاں ہوں تو آدمی کی یہی حالت ہوتی ہے۔

اُس نے پانڈے دادا اور بالے کے نام تجویز کیے تھے تو بھی مجھے بہت حیرت ہوئی تھی۔ پھر اِتنے لوگوں کی طلبی اور اِس حجت و تکرار سے کیا حاصل تھا مگر یہ میری اپنی خستگی، اپنی بے مائگی تھی۔ تھانے سے آکے تجھل کو پہلا کام یہی کرنا تھا۔ اس تجدید کی اتنی ہی ضرورت تھی جتنی دادا کے جانے کے بعد پاڑے پر موجود رہنے کی۔ پاڑے سے دادا کے قاتلوں کی طرف جانے والے راستے نسبتہً آسان ہو جاتے تھے۔ داداؤں کے درمیان رہنے، اُن سے ہمہ وقت رابطہ رکھنے، اُن میں نظم و ضبط قائم رکھنے، اُن کی اعانت حاصل کرنے اور اِدھر پولیس، اُدھر قاتلوں کو کچھ باور کرانے کے لیے تجھل کو پاڑے کا کھونٹا درکار تھا جو بہ زور بھی حاصل کیا جا سکتا تھا۔ کوئی دیر نہ لگتی لیکن اِس اندھیرے میں یہ اقدام کسی طور قرینِ عقل نہ ہوتا۔ مناسب یہی تھا کہ پیش کش اُن کی جانب سے ہو۔ ایسے غیر یقینی حالات میں اُنھی کی جانب سے پیش کش کا امکان تھا۔ وہ اتنے اندھے نہیں تھے کہ گرد و پیش کی دُھند چھٹنے سے پہلے گدی کی طمع کریں، گویا اُن کی پیش کش میں تجھل کی ترغیب اور خواہش کو جتنا دخل تھا، اُتنا ہی اُن کی نکتہ رسی اور معاملہ فہمی کا تھا، اسی لیے تجھل نے اُنھیں اکٹھا کیا تھا اور بہ ظاہر اکراہ سے پاڑے کا منصب قبول کر لیا تھا، بباطن بھی دادا کے بعد دادا کی جگہ بیٹھنا کوئی خوش گوار فریضہ نہیں تھا۔

ماری نے بہر حال اِس آزار سے جلد نجات دلا دی۔ اُس کے تھانے چلے جانے کے بعد تجھل کے بہ قول کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ ہمیں تھانے سے سیدھے گھر چلا جانا چاہیے تھا۔ پاڑے پر کوئی رہے نہ رہے، چلے نہ چلے، خاک اُڑے یا آگ لگے، ہمیں اب پاڑے سے کیا غرض ہو سکتی ہے۔ غرض ہوتی تو دادا کی موجودی میں بھی پاڑا کسی اور کا نہیں تھا۔ تھانے سے ہم سیدھے گھر جا سکتے تھے، شام تک وہ ہمارا انتظار کرتے۔ دادا کا گھر اُنھوں نے دیکھ لیا تھا۔ شام کو وہ لال آنکھوں اور زرد چہروں کے ساتھ گھر آجاتے۔ تجھل کو اندازہ تھا کہ جارجی کے ملوث ہونے کی خبر اُن کے لیے کیسی ناقابلِ یقین، کتنی دہشت انگیز ہو سکتی ہے۔ اِس سے پیشتر کہ تجھل کے غیاب سے وہ طرح طرح کے وہم و گمان سے دوچار ہوں، آپس میں دست و گریباں ہوں اور نئے نئے شوشے چھوڑتے پھریں، تجھل کو اُن کے پاس جا کے بات صاف کر لینا چاہیے تھا۔ برملا دست برداری کا اعلان۔ تجھل کو احساس تھا کہ خوش وضعی کا یہ مرحلہ کتنا وقت طلب ہو سکتا ہے جیسا کہ سکندر کہہ رہا تھا۔ پاڑا بند کرنے سے تجھل کو واقعی کوئی خوشی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ زورا، چھیدا، گلیا، لچھمی اور جانے کتنے

[؟]ک ماہم کے پاڑے سے وابستہ تھے۔ تجھل کی نظروں سے وہ تمام [؟]دجھل نہیں رہے ہوں گے۔ پاڑا بند کرنے کے اعلان سے مراد تھی، [؟]بتدا وہاں سے کی جائے جہاں بات ختم ہوتی ہے تاکہ وہ جلد کسی نتیجے [؟]پہنچ سکیں۔ پاڑے پر دادا کی ملکیت کے دعوے اور کرائے کا ذکر [؟]اُٹھا تاکہ ماہم کے پاڑے کے لیے شہر کے متعدد داداؤں کی لوٹ کھسوٹ نہ [؟]ہو۔ اور بھی کئی باتیں تھیں جن کی طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ [؟]اپنے سوا کسی دوسری طرف میری نگاہ جاتی ہی کہاں تھی۔ ابھی نہ جانے کتنے [؟]دن، کتنے عرصے ہمیں ممبئی میں رہنا تھا اور آگے بھی کتنی بار یہاں آیا تھا۔ [؟]اُن سے دوبارہ بھی واسطہ پڑ سکتا تھا اور یہ تجھل کے لیے اپنے سکونِ [؟]قلب کا معاملہ بھی تو تھا کہ حساب کتاب میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔ [؟]آئینہ تو پاڑوں کے دادا کے پاس بھی ہوتا ہے۔ شاید تجھل کے گمان [؟]میں نہ ہو کہ مآلِ کار وہ اُسی کو ہدف بنا لیں گے، راستی ہی زنجیر [؟]بن جائے گی۔ تجھل کی بے غرضی ہی اُن کے اصرار کا محرک بن گئی۔ [؟]اتنی حجت کے بعد تجھل کا انکار بلاغت سے بعید اور مروت و اعتبار کے منافی تھا جس کی طرح خود تجھل نے ڈالی تھی۔ تجھل کے پاس کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ اِس دائرے سے اپنی برأت کا کوئی گوشہ، کوئی روزن ڈھونڈے۔ وہاں پانڈے اور بالے کے سوا کوئی نہیں تھا جن سے وہ سب دوسروں سے زیادہ مانوس تھے۔ پانڈے کی طرح بالے نے بھی بہت پس و پیش کیا اور کہا کہ تجھل کی نیابت کے لیے کسی کی کیا ضرورت ہے۔ اُس نے میری طرف اشارہ کیا کہ میں موجود ہوں۔ کئی اطراف سے اُس کی تائید میں آوازیں اُٹھیں۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ تجھل انکار کر دے گا اور اُس نے یہی کیا۔ اُس نے کہا کہ مجھے اِسی کے ساتھ جانا ہے۔

تجھل نے پھر انھیں مختصراً بتایا کہ ماری نے تھانے میں جا کے کیا بیان دیا ہے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سُنتے رہے۔ تجھل نے ماری کے بچوں کا ذکر نہیں کیا اور کہا کہ وکی کا ساتھی نامی غالباً گوا بھاگ گیا ہے۔ قلابے کے پاڑے کے کئی اور آدمی بھی اُن کے معاون ہوں، ممکن ہے، وہ بھی گوا کی طرف نکل گئے ہوں یا یہیں شہر میں ہوں اور جارجی کی طرح ہماری آنکھوں میں دھول جھونکے بیٹھے ہوں۔ تجھل نے اُن سے کہا: "اب تم جانو، کتنے دن اُن کو کھلا رکھتے ہو۔"

سارے پاڑے میں آگ سی بھڑک اُٹھی۔ وہ نعروں کے انداز میں دہاڑنے لگے اور اُن کی وحشیانہ صدائیں عمارت کے در و دیوار سے ٹکرا کے ٹوٹتی، بکھرتی رہیں۔ پھر اُن پر محرومی اور یاس کا عالم طاری ہوا، وہ آنسو بہانے اور گریہ و زاری کرنے لگے۔ تجھل کچھ دیر اُن کے درمیان بیٹھا، پھر چوکی سے اُتر آیا۔ دروازے کی طرف جاتے جاتے اُس نے ٹھہر کے کہا کہ ابھی وہ ممبئی سے نہیں جا رہا لیکن شاید پاڑے پر اُس کا آنا ممکن نہ ہو سکے۔ وہ سمجھ سکتے ہیں کہ ورثے میں دادا اُسے کیسی امانتیں سونپ کے گیا ہے۔ وہ پاڑے سے بڑی آزمائش میں ہے۔ تجھل نے اُنھیں یہ جتانا بھی ضروری سمجھا کہ ممبئی سے جانے کے بعد کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اُس کی واپسی کتنے عرصے بعد ہو لیکن اگر موقع ملا تو جانے سے پہلے پاڑے آنے کی کوشش کرے گا۔ اس دوران اگر کوئی دادا تیار ہو سکا تو یہ ایک نہایت اچھی بات ہو گی۔

چھ بج رہے تھے۔ سورج غروب ہوا چاہتا تھا۔ سب سر جھکائے ہمارے ساتھ پاڑے سے باہر نکلے اور گلی میں ایک ہجوم ہو گیا۔ پھر کسی نے ایک لفظ بھی تجھل سے نہیں کہا۔ پانڈے، بالے، شنکرا، سورت والا، بنارسی، سکندر، زورا، چھیدا اور جانے کون کون۔ گلی کے آخری سرے تک وہ ہمارے ساتھ چلتے رہے۔ موٹر کے پاس تجھل ٹھیرا تو پانڈے اُس کے سینے سے چمٹ گیا۔ دیر تک اُس کا جسم تجھل کے بازوؤں میں پھڑ پھڑاتا رہا۔ سبھی تجھل سے بغل گیر ہونا چاہتے تھے مگر پھر تو رات ہو جاتی۔ تجھل بہ عجلت موٹر میں بیٹھ گیا۔

سڑکوں پر بھیڑ کی وجہ سے موٹر کی رفتار سُست ہوگئی تھی۔

پھر ایک جگہ موٹر رک گئی۔ آگے کسی موڑ پر کوئی حادثہ ہوگیا تھا، موٹر نہ آگے جاسکتی تھی نہ پیچھے۔ ہر طرف شور مچا ہوا تھا۔ ٹم ٹموں کی گھنٹیاں، گاڑیوں کی پوں پوں اور راہ گیروں کی چیخ پکار۔ ڈرائیور نے انجن بند کرکے باہر جاکے دیکھا اور آکے بتایا کہ دور تک راستہ نہیں ہے۔ بتھل نے کچھ نہیں کہا۔ وہ ڈرائیور کے برابر والی نشست پر بے خبر سا بیٹھا تھا۔ پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے ہم چاروں کا بھی کچھ یہی حال تھا۔ ہم میں سے کسی نے موٹر سے اُتر کے حادثے کی نوعیت جاننے کی کوشش نہیں کی۔ باہر جتنا شور تھا، اندر موٹر میں اُتنا ہی سناٹا تھا۔ کبھی کبھی جمرو، شامو اور مارٹی چونک کے میری طرف دیکھتے مگر کچھ کہہ نہ پاتے۔ مجھے اُن کی بے چینی کا تھوڑا بہت اندازہ تھا۔ پاڑے میں انھوں نے بتھل کی زبانی سب کچھ سُن لیا تھا لیکن اس مختصر بیان سے ان کی تسلی نہیں ہوئی ہوگی۔ وہ اور بھی بہت کچھ جاننا چاہتے ہوں گے۔

ہم بہت دیر بعد تھانے سے پاڑے واپس آئے تھے۔ اتنی دیر تک ہم وہاں کیا کرتے رہے؟ ماری کو آخر کیسے معلوم ہوگیا تھا کہ وہ جارجی اور دکی ہی تھے، وہ دونوں کتے جو پاگل ہوگئے تھے ایک عورت نے انھیں کس طرح قابو میں کرلیا؟ کہیں ماری سے کوئی چوک تو نہیں ہوگئی؟ اس نے تھانے جاکے کیا بیان دیا اور ہمیں کیا کیا بتایا؟ جب ماری نے اعتراف کرلیا تھا تو آخر پولیس کو ہماری ضرورت کیوں پڑی تھی، صرف میری اور بتھل کی۔ ایسے جانے کتنے سوال جمرو، شامو اور مارٹی کی رگیں کرید رہے ہوں گے۔ بتھل کی وجہ سے اُن کی زبان اینٹھی ہوئی تھی۔ یقیناً اُن کے اضطراب میں ملال بھی شامل ہوگا۔ میری طرح کا ملال کہ ماری نے آخر اتنی عجلت کیوں کی، ماری سے پہلے تو ہمیں جارجی اور دکی کے سروں پر پہنچنا چاہیے تھا۔ دادا کی موت کے بعد جارجی مسلسل سب کی نظروں کے سامنے رہا تھا۔ وہ آنکھوں میں کیسی دھول جھونکتا رہا۔ ایسا سوانگ کبھی کسی نے نہ دیکھا ہوگا پھر پچھتاوے میں آدمی اپنا منہ نہ نوچ لے۔ یہ تو ہماری ذمے داری تھی۔ ہمارا حق تھا، جو ماری نے ہم سے چھین لیا تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ جو لوگ پاڑے پر دادا کے اشارے کے منتظر رہتے تھے۔ وہ بتھل کی زبانی ماری کا نام سن کے دم بخود رہ گئے تھے اور چند لمحوں تک سکتے کی سی کیفیت کے بعد اُن کے سر جھک گئے تھے۔ جیسے رنج اور ندامت میں کسی کا حال ہوتا ہے۔ وہ بہت کھسیانے کھسیانے سے لگتے تھے۔ وہ جارجی اور دکی کو اتنی آسان موت نہ دیتے۔ ماری کی طرح شراب پلاکے وہ ان پر وار نہ کرتے۔ وہ تو انھیں زیادہ سے زیادہ ہوش میں رکھتے، انھیں ٹکڑوں میں، قسطوں میں ختم کرتے۔ وہ انھیں ایک بار نہیں، بار بار مارتے۔

برسوں سے کئی بار پانڈے دادا دیوانہ ہوا تھا، وہ کبھی اپنا چہرہ کھسوٹتا، کبھی سینہ کوٹتا۔ کہتا کہ دادا اور راچھی کا خون بہانے والوں کے سر اُتارے بغیر اُسے چین نہیں آئے گا۔ بالے بھی یہی کہتا تھا اور بھی بہت سے لوگ یہی ہذیان بکتے ہیں۔ سر اتار کے کیا سکون آجاتا ہے، سکون کیا کسی جنونی کی ہزیمت سے وابستہ ہے؟ دادا اور راچھی کیا اتنے ہی ارزاں تھے؟ اب اطمینان ہوجانا چاہیے کہ دو کمینے اور بزدل آدمی بہر حال اپنے انجام کو پہنچ گئے۔ آدمی کا عوض آدمی ہوتا ہے۔ یہاں یہی دستور ہے۔ چاہے کوئی کسی کو کتنا ہی عزیز، کسی کے لیے کتنا ہی قیمتی ہو، چاہے وہ کئی آدمیوں سے بڑا، کئی جانوں پر بھاری ہو، اپنی ذات میں سمندر ہو یا پہاڑوں کا مثیل، اُسے ایک ہی آدمی گنا جاتا ہے۔ اُسے اُس کے عزیزوں اور طلب گاروں سے جُدا کردینے کی سزا محض ایک حقیر آدمی ہے، ایک بادو، جارجی اور دکی۔ آدمی کی قیمت تو اُس کے طلب گاروں سے طے ہونی چاہیے۔ مجھے اپنے اسکول کے زمانے کا ایک واقعہ اچھی طرح یاد تھا۔ اسکول سے ملحق ڈگری کالج میں ایک مرتبہ کسی طالب علم نے ایک بزرگ اُستاد کو ختم کردیا۔ ہر طرف غل مچ گیا۔ پروفیسر تیس سال سے پڑھا رہا تھا اور بہت محبوب و محترم شخص سمجھا جاتا تھا۔ اُس کی ارتھی اُٹھ رہی تھی تو لگتا تھا، سارا شہر ٹوٹ پڑا ہو۔ میں بھی شریک تھا۔ میں نے کالج کے طلبہ کو دھاڑیں مارتے دیکھا تھا۔ اُن کا بس نہیں چلتا تھا کہ دیواروں سے سر پھوڑ لیں۔ ایک طالب علم نے صرف اس وجہ سے اپنے استاد کو ختم کردیا تھا کہ استاد نے اُسے اپنے مضمون میں نمبر کم دیے تھے۔ شاگرد نے پورے کالج کو ایک مطلوب شخص سے محروم کردیا۔ اُسے سزا مل گئی مگر کیا واقعی تلافی بھی ہوگئی؟

موٹر کو ساکت و جامد کھڑے ہوئے کئی منٹ گزر گئے۔ پھر کہیں دس پندرہ منٹ بعد شور مچاتی گاڑیوں نے رینگنا شروع کیا۔ پولیس والے چیخ چیخ کر ہدایات دے رہے تھے۔ آگے جاکے معلوم ہوا کہ ایک ٹم ٹم کا گھوڑا بدک گیا تھا۔ اس افراتفری میں کئی تیز رفتار گاڑیاں اور موٹریں ٹکرا گئیں۔ سڑک پر کھنچے ہوئے دائرے میں خون بکھرا ہوا تھا۔ نزدیک ہی ٹوٹی پھوٹی گاڑیاں کھڑی تھیں اور لوگوں کا ہجوم تھا۔ راستہ بہت تنگ تھا، کچھ دور جاکے صاف ہوگیا۔ مگر تیز

رفتاری سے موٹر چلانا پھر بھی ممکن نہیں تھا۔ گھر پہنچتے پہنچتے اندھیرا ہو گیا۔

سب دروازے کے قریب بیٹھے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔

ہمیں دیکھ کے سبھی چونک سے پڑے جیسے ہماری بہ سلامت واپسی کوئی اَن ہونی ہو۔ اُن کی آنکھوں کی وحشت اور ویرانی سے یہی ظاہر ہوتا تھا۔ ببّھل سب سے پہلے گیتا کے پاس گیا اور اس سے پہلے کہ گیتا کی پلکیں چھلک پڑتیں، ببّھل نے اُس کے گال تھپ تھپا کے اُس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔ "اب کہیں نہیں جا ناری اپنے کو۔" ببّھل کی آواز ہانپ سی رہی تھی۔ اُس نے گیتا سے کہا کہ اب وہ گھر ہی میں رہے گا، مستقل اُس کے پاس۔ اور کوئی بھی نہیں جائے گا، گیتا کی اجازت کے بغیر کوئی بھی گھر سے باہر نہیں جائے گا۔ گیتا کے ہونٹ پھڑپھڑا کے رہ گئے۔ ببّھل نے زیادہ کچھ نہیں کہا۔ شاید یہی بہتر تھا۔ وہ گیتا کے پہلو میں رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اور لمحوں تک گیتا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبائے بے سدھ سا بیٹھا رہا۔ شبّی چاچا نے حقہ اُس کے آگے لا کے رکھ دیا تھا لیکن منال ببّھل کے زانو پر پڑی رہی۔

آج بھی گھر کی ساری روشنیاں جلی ہوئی تھیں۔ اندھیرا بڑھنے پر روشنیاں اور عیاں ہو گئیں۔ شبّی چاچا کو اچھی طرح معلوم ہوگا کہ روشنیوں میں کیا رکھا ہے، ان سے کیا ہوتا ہے مگر جو کچھ دست رس میں ہے، اس میں کوئی کسر کیوں چھوڑی جائے۔ آدمی کے اندر بھی بہ قمقمے ہوتے تو سب کچھ کتنا آسان ہوتا۔ جب ذرا اندھیرا گہرا ہوا، بٹن دبا دیا۔ دیر ہو گئی۔ سب گونگے بنے بیٹھے رہے۔ بار بار ہر نظر ببّھل پر آ کے مرکوز ہو جاتی۔ اُس کا سوچا سوچا، اُدھڑا اُدھڑا چہرہ انھیں اجنبی لگ رہا تھا تاہم انھیں ببّھل کو بھی کچھ رعایت دینی چاہیے تھی غالباً اسی سبب سے وہ خاموش تھے یا انھیں نئے لفظ نہیں مل رہے تھے۔ کرشنا جی کہتے تھے، تکرار سے لفظ بوسیدہ ہو جاتے ہیں اور دنیا میں جس چیز کی سب سے زیادہ کمی ہے، وہ لفظ ہیں۔ اُن سب کی آنکھوں میں آنسو بھی نہیں رہے تھے۔ کہتے ہیں، آنسو سینہ کچھ ہلکا کر دیتے ہیں مگر آنسو بھی لفظوں کے مانند ہیں، اندر بہت آگ لگ رہی ہو تو جس طرح لفظ ساتھ نہیں دیتے، آنسو بھی کام نہیں کرتے، آنسو بھی جل جاتے ہیں۔

مولوی اکرم نے منیر علی سے وقت پوچھا اور کلمہ پڑھتے ہوئے یک بیک اُٹھ کھڑے ہوئے۔ عشا کی نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ سبزے پر ایک کونے میں جا نماز بچھی تھی۔ شبّی چاچا بھی شامل ہو گئے۔ مولوی اکرم نے تکبیر پڑھی۔ امامت بھی انھوں نے کی۔ میں، جمرو، شامو، مارتی اور ٹنگو اُٹھ کے عمارت کے عقبی حصّے میں چلے آئے۔ میرا سارا جسم دُکھ رہا تھا لیکن یہ اندر کسی کمرے میں جا کے لیٹ جانے کا وقت نہیں تھا۔ وہ سب میری طرف متوجہ ہو جاتے۔ عقبی حصّے کے وسیع دالان میں نواڑ کے پلنگ رکھے تھے۔ جمرو اور شامو اُن پر پھیل گئے۔ میری طرح اُن کے جسم بھی اینٹھ رہے ہوں گے۔ آدمی آدمی کا کتنا پابند ہے۔ اُن کا جی بھی یہاں سے بھاگ جانے کو چاہتا ہوگا لیکن ہر ایک کے پیروں سے کوئی زنجیر لپٹی ہوئی تھی۔ اسیری صرف زنداں کی نہیں ہوتی۔ وہ گم سُم اِدھر اُدھر پڑے کسمساتے، کلبلاتے رہے۔ میری توقع کے خلاف اُنھوں نے مجھ سے کچھ جاننے، کچھ پوچھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ گھر آ کے اور سب کے چہرے دیکھ کے شاید اُن کا حوصلہ زیادہ پست ہو گیا تھا۔ اتنی دیر میں انھیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو میں انھیں خود آگاہ کر دیتا اور اگر میں کچھ چھپا ہی رہا ہوں تو مجھے مجبور کیوں کریں۔ عقبی حصّے میں بہت سکون تھا مگر یہاں آ کے دم اور گھٹنے لگا تھا۔ نماز کے دوران ہمارا وہاں بیٹھے رہنا بھی نامناسب تھا۔ میں ٹنگو کو بھیج کے دکھوانا چاہتا تھا کہ ابّا جان وغیرہ نے نماز ختم کر لی ہو تو اسی طرف چلیں۔ اتنے میں شہ پارہ کی آواز آئی۔ سب ہڑبڑا گئے جیسے سب کسی خواب سے دوچار ہوں۔ شہ پارہ کھانا لگ جانے کی اطلاع دینے آئی تھی۔ کسی کو بھی خواہش نہ ہوگی لیکن کسی نے انکار نہیں کیا۔ ہم گھوم کے عمارت کے سامنے والے حصّے کی طرف آئے تو وہ کھانے کے لیے اُٹھ رہے تھے۔ اُسی لمحے دروازے کی گھنٹی بجی۔ جو جہاں تھا، وہیں ٹھیر گیا۔ ابّا جان نے ٹنگو کو باہر جا کے دیکھنے کا اشارہ کیا۔ اِسی اثنا میں ببّھل خود دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ مَیں بھی لپک کے اُس کے پاس پہنچ گیا۔

مجھے ایک لحظے کے لیے گمان ہوا تھا کہ کہیں شکلا نہ ہو، اس کے باوجود باہر اُسے اپنے سامنے دیکھ کے مجھے جھٹکا سا لگا۔ وہ سادہ لباس میں اپنی موٹر کے پاس کھڑا تھا۔ موٹر بھی پولیس کی نہیں تھی۔ ببّھل نے سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ شکلا نے بڑھ کے اُس کا شانہ پکڑ لیا

"آؤ آؤ صاحب! اندر آؤ۔" ببّھل نے کسی قدر اضطراری آواز میں کہا۔

"سب خیر تو ہے؟"

"ہاں ہاں، بالکل، سب ٹھیک ہے۔" شکلا جھجکتے ہوئے بولا۔

"اِدھر سے گزر رہا تھا، سوچا...۔"

"اچھا کیا صاحب، بہت اچھا کیا۔"

"یہاں آ کے احساس ہو رہا ہے کہ یہ وقت نامناسب ہے۔"

"کیا صاحب! کیسا بولتے ہو۔"

"جی نہیں مانا، بس اِدھر کا رُخ ہو گیا۔"

پنے کو شک تھا، آپ آ سکتے ہو۔"

کلا پلکیں جھپکانے لگا۔ "آپ کو اندازہ تھا؟ کیسے کیسے؟"

ابھی تک آپ آدھے وردی والے ہو۔"

ب لمحاتی توقف کے بعد شکلا مسکرا پڑا۔

یر علی، مولوی اکرم، جمرو، شامو وغیرہ سبھی باہر آ گئے تھے۔

ب تھے۔ مارتی، جمرو اور شامو کے لیے البتہ وہ نیا نہیں تھا۔

ت کی رات وہ اُسے تھانے میں دیکھ چکے تھے۔ شکلا اندر آتے

بچا رہا تھا، شائستگی کی جھجک۔ ببّھل نے اُس کی کمر پہ ہاتھ رکھ

ہ اندر چلنے کو کہا تو اُس نے مزید تامّل نہیں کیا۔ وہ سر جھکائے

ہوا۔ اُسے دیکھ کے یک بارگی میرا ماتھا ٹھنکا تھا کہ اِس وقت

بے سبب نہیں ہو سکتی، ابھی سہ پہر تو ہم اس سے رخصت ہوئے

لوم پھر کیا خبر لایا ہو۔ مگر شکلا کے انداز و اطوار اور لب و لہجے

سی آلودگی نہیں تھی جو میری وحشت سِوا کرتی۔ اندر آ کے روشنی

ہی اُس کی نظر ابّا جان پر پڑی، وہ ٹھٹک کے رُک گیا۔

با با ہیں، اپنے لاڈلے کے بابا۔" ببّھل نے آہستگی سے کہا۔

ہیں، مَیں دیکھ رہا تھا۔" شکلا حیرانی سے بولا۔ ابّا جان سے

نے کے لیے بے ساختہ اُس نے ہاتھ پھیلا دیے۔ "مَیں آپ کو

تھا۔"

مجھے!" ابّا جان نے تذبذب سے کہا۔ "کیسے؟ مجھے یاد نہیں

جناب سے...۔"

اتنی بار آپ کا حُلیہ سُنا اور...۔" وہ کہتے کہتے ٹھیر گیا اور میری

ہیں جما کے بولا۔ "آپ میرے لیے بالکل اجنبی نہیں ہیں،

پوچھیے۔"

ابّا جان کے علم میں تھا کہ بمبئی میں مجھے بہت سے لوگ بلکہ تقریباً

ر کے نام سے جانتے ہیں اس لیے وہ چونکے نہیں تاہم چند ثانیے

وں سے شکلا کو دیکھتے رہے۔ یوں بھی اُس کی وضع قطع میں

ار تھا، لہجے میں بُردباری تھی۔ ببّھل نے ابّا جان کی پریشانی دُور

فر اُنھیں بتایا کہ شکلا ہی کی وجہ سے ہم اُن تک پہنچ سکے تھے

ں نے ابّا جان کی تلاش کے لیے ہندوستان بھر کے تھانوں کو

انہ کیے تھے، اُن کے بعد شکلا ہی اس سلسلے میں پیروی کرتا

ر خط میں میرا بتایا ہوا ابّا جان کا حُلیہ تفصیل سے درج تھا اور

زبر ہو گیا تھا۔ آخر آسام میں ابّا جان نظر آ گئے۔ شکلا کے تار کے

یں یہ اطلاع فیض آباد میں ملی تھی۔ ببّھل نے شکلا کو نہیں بتایا کہ

ہ ابّا جان ہمیں نہیں مل سکے تھے، ہمیں تبّت کا سفر کرنا پڑا اور

ابھی بہت کچھ دیکھنا سننا رہ گیا تھا کہ نشانے چوکتے رہے، ہم زندہ و سلامت واپس آ گئے۔ شکلا ٹوہ میں نہ لگا رہتا تو شاید ابّا جان ہمیں کبھی نہ ملتے۔ ملتے بھی تو جانے کب، کس حال میں۔ تبّت سے لعل و جواہر کے انبار کے ساتھ اُن کی تنہا واپسی کس طرح ممکن ہوتی، اور واپسی کا سوال تو بعد میں آتا، اُنھوں نے صدیوں پہلے کے مدفون خزانے تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ اُس محبس کی سنگلاخ دیواروں، دروں میں چھپے ہوئے نوادر کریدنے میں انھیں ایک عمر لگ جاتی۔ ابّا جان کے چہرے پر حیرت چھائی ہوئی تھی۔ اُن کے ہونٹ شکلا کے احسان کی زیر باری سے سِسکتے رہے۔ ممکن ہے، اُنھیں امّی کی یاد بھی آئی ہو اور فہمی کی بھی، اور بھی بہت کچھ اس ذکر پر سب کچھ تازہ ہو جانا چاہیے۔ وہ شکلا سے کچھ نہ کہہ سکے۔

"مجھے آپ سے ملنے کا اشتیاق تھا، آج دونوں کو، دونوں باپ بیٹے کو ساتھ دیکھ کے یقین کیجیے کیسی کیسی،،" شکلا کی آواز بھی بھرّا گئی۔ "کاش کرشنا جی آج زندہ ہوتے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ سب اُنھی کا...۔"

درمیان میں جولین کے آنے پر شکلا کی آنکھوں کی چمک فزوں ہو گئی۔ جولین نے رسمی سلام کے بعد اُسے کچھ کہنے کی مہلت نہیں دی اور سامنے بچھے ہوئے دسترخوان پہ چلنے کا حکم دیا۔ اس حکم میں تعلق خاطر کا ناز بھی شامل تھا۔ شکلا نے کہنا چاہا کہ وہ بے شک کھانا کھا کے نہیں آیا ہے لیکن اُسے بھوک بھی نہیں ہے۔ جولین نے اُس کا عذر مسترد کر دیا۔ برآمدے میں جانے سے پہلے شکلا نے ببّھل سے خواہش ظاہر کی کہ پہلے وہ پیرو دادا کی بیوی اور بیٹی سے ملنا چاہتا ہے۔ گیتا اور رانی، فرّخ اور فریال کے قریب کچھ فاصلے پر کھڑی تھیں۔ ببّھل کے ساتھ شکلا خود اُن کے پاس گیا، اُنھیں ہاتھ جوڑ کے پرنام کیا اور لمحوں گنگ کھڑا رہا۔ "یہ پولیس کے بہت بڑے افسر ہیں ری، شکلا جی۔" ببّھل نے بھاری آواز میں کہا۔ گیتا اور رانی نے بیک وقت سر اٹھا کے اُسے دیکھا، اُن کے چہروں پر ایک آن کے لیے کوئی تلاطم سا آ کے گزر گیا۔

"مگر میں، مَیں یہاں پولیس افسر کی حیثیت سے نہیں آیا ہوں، مجھے آپ سے ملنا تھا۔" شکلا افسردگی سے بولا۔ "مجھے بھی اُن لوگوں میں سمجھیے جو یہاں آپ کے دکھ درد میں شرکت کے لیے موجود ہیں۔" شکلا کی زبان اٹکتی رہی۔ وہ وہی کچھ کہتا رہا جو آدمی کے مقدور میں ہے۔ لوگ مرتے رہیں گے اور اُن کے پسماں دگان کے سامنے زندہ رہ جانے والے یہی مجہول جملے دُہراتے رہیں گے۔ کوئی نہیں جانتا، سوگوار صرف ایک بات سننا چاہتے ہیں کہ اُن سے بچھڑ کے جانے والا کب تک واپس آ جائے گا، کوئی ترکیب، کوئی تدبیر بتاؤ کہ وہ اُسے دوبارہ حاصل کر سکیں۔ کسی کو یہ دعوا کرنا نہیں آتا، نہیں آتا تو یہ ہم دردیاں کیسی؟ سب بے کار ہے۔

گیتا اور رانی خاموشی سے سنتی رہیں۔ شکلا کے اظہار میں دل سوزی بھی تھی، بے چینی بھی۔ دونوں نے ساڑی کے آنچل سے مُنہ چھپالیا۔ پھر نہ جانے شکلا کو کیا ہوا، اُس نے ہیجانی انداز میں گیتا کو اپنے پہلو میں کھینچ لیا، کہنے لگا۔ "میری چھوٹی بہن کامنی بھی بالکل تمھارے جیسی ہے۔ بہت چھوٹی تھی کہ ماں مرگئی، پتا جی بھی چند دنوں بعد چل بسے۔ مَیں نے ہی اُسے پالا پوسا ہے۔ میرے لیے وہ بیٹی کے مانند ہے۔ تمھیں دیکھ کے ایسا لگتا ہے، سچ مانو، ایسا لگتا ہے کہ اب ایک نہیں، میری دو بیٹیاں، دو بہنیں . . . ."

شکلا کو احساس ہوا تو وہ مضطربانہ گیتا کی پیٹھ سہلانے، اُس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا اور بولا۔ "نہیں، نہیں، رو مت، مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم پڑھی لکھی لڑکی ہو، علم تو حوصلہ دیتا ہے، علم سے تو اندھیرا اجالا زیادہ سمجھ میں آتا ہے۔ جب سے دُنیا بنی ہے، یہی ہوتا رہا ہے، آگے پیچھے لوگ بچھڑ جاتے ہیں۔ یہاں جتنے بھی ہیں، سب ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے۔ سب کی تقدیر ایک جیسی ہے۔ ہر آدمی چھوٹی بڑی مدت کا مسافر ہے۔ تمھارے پتا جی نے تو اتنے لوگ، اتنے اچھے لوگ تمھارے لیے ورثے میں چھوڑے ہیں۔ یہ تو بہت بڑی دولت ہے۔ جانے والے تو کبھی بہت اکیلا، بہت تنہا کر جاتے ہیں، تمھارے پاس تو اتنے . . . ؟"

گیتا اور پھوٹ پڑی۔ بتھل نے شکلا کی مدد کی اور گیتا کو اُس سے جُدا کر دیا۔ وہ روتی سسکتی گیتا کے شانوں پر ہاتھ رکھے برآمدے کی طرف بڑھ گیا۔

دسترخوان پر بتھل نے شکلا کو اپنے پاس ہی بٹھایا۔ میں بھی اُس کے ساتھ تھا، جولین میرے برابر تھی۔ وہ بار بار شکلا کے آگے ڈونگے رکھتی۔ اُس کے اصرار پر شکلا آخر تک ہاتھ چلاتا رہا۔ منیر علی اور مولوی اکرم نے کھانے کے دوران فضا پر چھایا ہوا غبار دُور کرنے کے لیے کئی مرتبہ موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ اتنا ضرور ہوا کہ گیتا اور رانی کے آنسو تھم گئے۔ کھانے کے بعد بھی شکلا دیر تک دسترخوان پر بیٹھا رہا اور مختلف موسموں میں مختلف غذاؤں کے خواص کے بارے میں منیر علی کی باتیں انہماک سے سنتا رہا۔ وہ کُھلی کُھلی آنکھوں سے سب کو دیکھتا تھا، کسی حد تک حیران و پریشان آنکھوں سے۔ جب دوبارہ سارے مردبنے پر آبیٹھے تو بھی اُس کا یہی عالم رہا۔ ابّا جان نے شکلا کے قریب کی کرسی سنبھال لی تھی۔ ایک شخص کے اچھا لگنے کے علاوہ اس قربت کی وجہ اور بھی ہوگی۔ اُن کی نظریں مسلسل شکلا کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ کرسی پر بھی اُنھیں ایک پہلو قرار نہیں تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ شکلا سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں مگر جیسے سرا نہیں مل رہا ہے۔ گھر کے ایک آدمی کو، دادا سے تعلّق رکھنے والے کسی شخص کو جو بے کلی ہونی چاہیے، وہ اُنھیں بھی ہوگی۔

اَب تک سَب کچھ جوں کا توں قبول کر لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں وہ اندھا وقت گزر چکا تھا۔ ابّا جان کو گرد و پیش کا جاننے کی بہت تڑ ہوگی، پولیس کے رویّے اور اندازے جاننے کی بے تابی۔ ہم پر کوئی آنے یا کسی طور ہمارے ملوّث ہو جانے کا خدشہ اُن کے سینے میں دھڑکتا ہوگا۔ جو بات وہ ہم سے نہیں پوچھ پاتے تھے، مناسب سمجھتے تھے یا ہم سے کسی معقول بات کی توقع نہیں تھی، اُسے پو کے لیے یہ موقع غنیمت تھا۔ ایک پولیس افسر اُن کے سامنے موجود بتھل کے بہ قول ایک بڑا پولیس افسر۔ شکلا کی خوش بیانی، وضع و فرو جگہ، اِدھر جولین نے بھی شکلا کے لیے سب کا تکدّر دُور کرنے میں بڑ مدد کی تھی۔ اُس کی بے ساختہ خاطر داری اور غیر ارادی التفات کا بھ دخل تھا جبھی شکلا کسی کو ایسا اجنبی نہیں لگ رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے بہت سے وہ اس گھر میں آرہا ہو۔ جولین کی ماں اور چمپا بیگم تو ویسے بھی اچھی طرح جانتی تھیں۔ اُنھوں نے بھی شکلا کا ایک اچھا تاثر قائم کرنے جولین کی اعانت کی تھی مگر شکلا کا تعلق بہرحال پولیس سے تھا اور ابّا جا ایک سرد و گرم چشیدہ شخص کے خیال میں اُس کی اچانک آمد محض اظہا کے لیے نہیں ہوگی، کوئی دوسرا مقصد بھی ہوگا۔

شکلا کی طرف ابّا جان کی رغبت یک طرفہ نہیں تھی، شکلا بھ اُنھی کی جانب مائل تھا۔ وہ بمبئی کے موسم کی نیرنگی کے بارے میں تجربے سُنا رہا تھا اور کوئی عجب نہیں تھا کہ باتوں باتوں میں کسی لمح اُن سے پوچھ لے کہ آخر کیا مجبوری تھی جو اُنھیں اپنے آبائی گھر اور شہر دور ہونا پڑا، کیوں جلد جلد وہ نئے گھر، نئے شہر بدلتے رہے۔ اُنھو نے اِس کی بھی پروا نہیں کی کہ اُن کا جوان بیٹا ٹھوکریں کھا کے کسی گھر واپس آسکتا ہے، اُس کے لیے کوئی پتہ نشان تو بتا کے جاتے۔ کیا نے اپنی دانست میں اُس پر خاک ڈال دی تھی؟ اُس کی یاد تو اُنھیں آتی ہوگی، کہیں کوئی اُس کے قد، اُس کی کاٹھی کا نظر آتا ہوگا تو آنکھیں بہت جلتی ہوں گی۔ آخر کیا ستم ٹوٹا تھا، کون سی دہشت تھی جو وہ خود بچائے بچائے، چھپائے چھپائے پھرتے رہے؟ شکلا کو بہت کچھ معلو نہیں تھا۔ مَیں نے ساری بات کرشنا جی کو بھی نہیں بتائی تھی کہ ابّا جا گھر چھوڑنے کا اصل سبب کیا تھا۔ مجھے خود بھی اتنا کہاں معلوم تھا۔ کے سان و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ ایک اجنبی لڑکی کے ترک کیے ہوئے کاغذات کے نقش و نگار نے اُن کی بینائی خیرہ کر دی تھی۔ نہ معلوم ابّا جا کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اُس کی کیا حالت ہوتی۔ اس چیستاں میں عزت دو کے راستے چھپے تھے، ابّا جان کو اُنھیں کھوجنا تھا۔ کسی مہم جو اور طالع آز کی طرح۔ سمندر کی گہرائی جتنی قریب آتی ہے، آدمی اتنا ہی ڈوبتا ہے

ون پیچھے رہ گیا، کس نے صدا لگائی، اِس کا ہوش کِسے رہتا ہے۔ ی اِس کمال کی طلب میں ایسے ہی دیوانہ ہو جاتا ہے۔ ہر کمال کے ے ایثار شرط ہے، ایثار، قربانی، صبر و ضبط۔ پر ابّا جان نے کاغذات ے آگے کے علم پر توجہ نہیں دی تھی جو دیوار کا نوشتہ ہے۔ وہ نقش اندھیروں میں بھی روشن رہتا ہے۔ کاغذات میں آبِ حیات کا نقشہ ں تھا جس کے بغیر ہر کمال عارضی ہے، ناپختہ اور ناتمام۔

شکلا نے ابّا جان سے کوئی ایسی بات نہیں کی جس کا جواب نا اُنھیں مشکل ہو جاتا۔ یہی اندیشہ ابّا جان کو بھی روک رہا ہوگا جو پر دا کا تذکرہ اُن کی زبان پر نہیں آرہا تھا، کہیں معزز مہمان کوئی اطمینان ش جواب دینے کے موقف میں نہ ہو۔ جمرو، شامو، مارٹی اور ٹنگو کچھ ر وہاں بیٹھ کے چپکے سے ایک ایک کر کے باہر نکل گئے تھے۔ شکلا نہ تا تو میں بھی اُن کے ساتھ نکل جاتا مگر شکلا نہ ہوتا تو وہ بھی کیوں تے۔ اس اثنا میں جولین نے چائے کی ٹرے لا کے رکھ دی تھی۔ ں نے چائے بنائی اور ابّا جان نے آدھی پیالی بھی ختم نہ کی ہوگی کہ انک اُٹھ گئے۔ شاید اُنھیں احساس ہو گیا تھا کہ بتھل کی موجودگی میں ہ شکلا سے دادا کا کوئی ذکر نہیں چھیڑ سکتے اور خود اُن کی موجودگی بتھل ر شکلا کی کسی ضروری بات چیت میں حارج ہو رہی ہے۔ اُنھوں نے کلا سے واجبی معذرت کی۔ اُن کے ساتھ ہی منیر علی اور مولوی اکرم بھی ٹھ گئے۔

میرے اور بتھل کے سوا کوئی نہ رہا تو شکلا نے بس چند لمحوں کا وقف کیا، سرگوشیانہ انداز میں بتھل سے کہا کہ تھانے سے ہمارے جانے کے بعد وہ پھر ماری کے پاس گیا تھا اور اُس نے ماری سے اُس کے بیان پر نظرِ ثانی کے لیے کہا تھا، ماری نے انکار کر دیا۔ ہمارے جانے کے بعد وہ بالکل نڈھال ہو گئی تھی۔ شکلا نے بتایا کہ کل صبح ماری کو مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر دیا جائے گا، پولیس نے کاغذات تیار کر لیے ہیں۔ ماری کل بھی جیل منتقل ہو سکتی ہے اور اُسے چند دن کے لیے حوالات میں بھی روکا جا سکتا ہے۔ اِس دوران ماری اپنے بیان میں تھوڑی سی ترمیم کر لے تو سزا میں کمی ہو سکتی ہے۔

بتھل سر ہلاتا رہا۔ "وہ نہیں کرے گی صاحب!" اُس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"اُس کے بچّوں کا خیال آتا ہے۔" شکلا بے قراری سے بولا۔ "سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس کی کیا مدد کی جائے؟"

"اب تو تالی بجاؤ صاحب!"

"وہ ایک اچھی عورت لگتی ہے۔ کاش وہ یہ واردات خود کرنے کے بجائے سیدھی پولیس اسٹیشن آجاتی، پھر یہ سَب نہ ہوتا۔"

"آگے کا دیکھو صاحب!"

"ہاں۔" شکلا مایوسی سے بولا۔ "وہ تھانے آچکی ہے، وقت کو پیچھے چلنا نہیں آتا۔"

"آپ بولو تو اُس کو اُٹھوا دیں؟"

"جی، جی۔" شکلا اچھل سا گیا۔ "کیا کہتے ہو دادا؟"

"سوچ لو صاحب!"

شکلا کی پیشانی شکنوں سے بھر گئی۔ "تھانے سے اُسے اُٹھایا جا سکتا ہے؟"

"آپ کی مرضی پر ہے۔" بتھل نے دھیمی آواز میں کہا۔

"اوہ! نو نو۔" شکلا سر جھٹک کے بولا اور ایک ثانیے کے تذبذب آمیز سکوت کے بعد کہنے لگا۔ "پھر، پھر وہ کہاں جائے گی؟"

"دُنیا کوئی چادر نہیں ہے صاحب!"

"اور بچّوں کا . . . ؟؟"

"ساتھ ہی رہیں گے اُس کے۔"

"اور سب چھپے رہیں گے؟" شکلا تلخی سے بولا۔ "کب تک؟ کہاں تک؟ وہ قتل کی ملزمہ ہے دادا۔"

صرف دو ہی تو کیے ہیں صاحب!"

شکلا نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا، تم، تم کیا کہہ رہے ہو دادا!"

"نہیں آتا تو جانے دو۔"

"میری بات دھیان سے سُنو۔" شکلا کی آواز میں ترشی تھی۔ "تم جو کہہ رہے ہو، میرے خیال میں وہ بالکل ممکن نہیں ہے لیکن اگر، اگر ایسا ہو سکتا ہے تو اِس سے اُس کا کوئی بھلا نہیں ہوگا۔ ایسا مت سوچو دادا! ہم اور بھی کئی طریقوں سے اُس ابھاگن کی مدد کر سکتے ہیں۔ صحیح مشورہ تو ایک اچھا وکیل ہی دے سکے گا۔ ادھر پولیس نے بھی اپنی رپورٹ میں ماری کے لیے نرم روّیہ اختیار کیا ہے۔ وہ ایک عورت ہے، عدالت ضرور اس کا خیال رکھے گی۔" بتھل چُپ بیٹھا رہا تو شکلا جیسے اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا۔ "قانون بھی عجیب ہوتا ہے۔ عدالت کو اچھی طرح یقین ہوگا کہ ماری ایک عادی مجرم نہیں ہے اور وہ دوبارہ ایسا سنگین جُرم نہیں کرے گی۔ ایک لمبی کارروائی کے بعد عدالت بھی جس نتیجے پر پہنچتی، ماری نے وہی کیا ہے مگر ماری کو سزا صرف اِس وجہ سے ملے گی کہ اُس نے عدالت کا اختیار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔" شکلا بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "پر شاید یہی ٹھیک بھی ہے۔ ایک مرتبہ یہ حق عام کر دیا جائے

تو...؟" شکلا خود چونک پڑا اور حتمی لہجے میں بولا۔ "میری نظر میں ایک قابل وکیل ہے، بیرسٹر بھارگو۔ ذرا مہنگا ہے مگر ہم ماری کے لیے روپے پیسے کی پروا نہیں کریں گے۔ پیسہ ہوتا ہی کس لیے ہے، جتنا پلّے ہے، پھینکیں گے، کیوں دادا؟"

"آپ زیادہ جانتے ہو صاحب!"

"کیا یہ پیسے کا صحیح استعمال نہیں ہوگا؟"

"ٹھیک بولتے ہو صاحب!"

بٹھل کے لہجے میں کسی تندی کی آمیزش تھی جو شکلا نے محسوس کرلی۔ "میرا مطلب ہے دادا!" اُس نے نسبتہً تیز آواز میں کہا۔ "بے شک روپیہ پیسہ ہر جگہ نہیں چلتا۔ سونے کا سکّہ بھی بعض جگہ کھوٹا ہو جاتا ہے۔ ہم عدالت کو روپے پیسے سے نہیں خرید سکتے، نہ خریدنا چاہیے مگر ایک تجربہ کار وکیل عدالت میں ماری کے لیے مفید ہو سکتا ہے۔ جتن کر لینے میں کیا حرج ہے۔ ہم کم از کم اُس کی سزا تو کم کرا سکتے ہیں۔" بٹھل کے لبوں میں جنبش نہیں ہوئی۔ شکلا منتشر سا ہو گیا۔ "کیا تم نہیں چاہتے کہ وہ... وہ؟"

"کیسا بولتے ہو صاحب!" بٹھل نے سر اُٹھا کے کہا۔ "ہم تو آپ سے بولے تھے، اُس کی جگہ جا کے بیٹھ جائیں۔"

"نہیں دادا! اِس کی ضرورت نہیں۔ تم بس اتنا کرو، ماری سے جا کے کہو کہ اپنی زندگی ہار چکی ہے تو آگے بچّوں کی زندگی پڑی ہے۔ اُسے بولو، جیسا وکیل مشورہ دے، ویسا ہی بیان دے، تھوڑی ہوش میں آجا۔"

"ملیں گے تو ضرور بول دیں گے۔"

"رات ہو گئی ہے۔" شکلا گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں بھارگو جی سے ملنے کی کوشش کرتا ہوں، صبح تم جتنی جلدی ہو سکے تھانے پہنچ کے اُس سے مل لو تو اچھا ہے۔ تمھاری بات وہ ضرور مانے گی دادا! ہمیں اُس میں زندگی دوبارہ جگانی ہوگی، سمجھے دادا! دوپہر جب تم نے اُسے دیکھا تھا، اُس وقت وہ کچھ اور تھی۔ لگتا ہے جیسے تم سے ملنے کے لیے اُس نے طاقت بچا کے رکھی تھی۔ شام کو میں دوبارہ اُس کے پاس گیا تو پہچانی نہیں جاتی تھی۔ اتنی دیر میں وہ ایسی اجڑ گئی تھی کہ مجھ سے ٹھیک طرح بات بھی نہیں کی۔ اُٹھ کے بیٹھی اور بس خالی خالی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ میں انسپکٹر ٹھاکر کو اُس کا خیال رکھنے کا کہہ کے آیا تھا، ضرورت پڑنے پر فوراً ڈاکٹر کو بھی بُلانے کا...۔"

"آگ اپنے آپ کو بھی جلاتی ہے صاحب!"

"بالکل دادا! وہ تو ریت کا، راکھ کا ڈھیر معلوم ہوتی تھی، دیکھا نہیں جاتا تھا۔" شکلا کی آواز اُس کے اضطراب کی غمّاز تھی۔ "میں تمھیں بتاؤں، شام اُسے دیکھ کے مجھے شبہ ہوا کہ شاید ہی وہ عدالت کے فیصلے تک چل سکے۔"

"نہیں چلے گی صاحب وہ۔" بٹھل نے سرد لہجے میں کہا۔

"تم بھی یہی سمجھتے ہو؟" شکلا تیزی سے بولا۔ "پر دادا سچ پوچھو تو اِس میں تمھارا بھی دخل ہے۔"

"اپنا!" بٹھل کرسی پر سیدھا ہو گیا۔ "کیا بولتے ہو آپ صاحب بہادر!"

"تمھیں بچّوں کا وارث بنا کے وہ نچنت ہو گئی ہے، سارے کاموں سے نمٹ چکی ہے، اُسے یقین ہے کہ تم اُس کے بچّوں کے لیے اُس سے بڑا سایہ بنو گے، تم، ظہیر اور... گو اُس نے اپنی کل جمع پونجی تمھارے حوالے کر دی ہے مگر وہ جانتی ہے کہ اس کے بغیر بھی ایک بار ذمّے داری لے کے تم وہی کرتے جو زیادہ سے زیادہ تمھارے بس میں تھا، جان سے زیادہ اُن کی حفاظت۔"

"وہ تو الٹی ہوئی ہے صاحب! آپ نے دیکھا ہی ہے اُس حرام کی جنی کو، ہم نے آپ کے سامنے اُس کو سارا بولا تھا۔" بٹھل نے ترشی سے کہا۔

"میں نے دیکھا تھا۔ تم یہی کرتے، تمھاری جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا لیکن تمھاری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو ماری کو اتنا یقین بھی نہ آتا۔ وہ تو تم تھے دادا، کوئی اور نہیں۔ اُس وقت تمھیں اسی طرح سننا چاہیے تھا جس طرح وہ کہہ رہی تھی مگر اب تم، تم اُسے بتا سکتے ہو، تمھیں اُس سے کہنا چاہیے کہ ایک ماں سے زیادہ کوئی اُس کے بچّوں کے لیے بہتر نگراں نہیں ہوتا، کوئی بھی نہیں۔ تم اُسے اپنی مجبوریاں بتا سکتے ہو، سیدھے اور سچّے عذر... اِس صورت میں وہ... میرے کہنے کا مقصد یہی ہے۔" شکلا کو وضاحت میں مشکل پیش آرہی تھی۔ وضاحت کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ بٹھل ساکت و جامد بیٹھا اُسے گھورتا رہا۔

"مجھے اُٹھنا چاہیے۔ صبح تھانے میں ملاقات ہوگی۔ اُمید ہے تم جلدی آؤ گے۔" شکلا کا لہجہ حکمیہ بھی تھا، التجائی بھی۔ بٹھل نے آنکھیں بند کر کے اثبات کا اظہار کیا۔ "ویسے بھی اَب تمھارے پاس وقت ہی وقت ہوگا۔" شکلا نے کہا۔ "پاڑے تو جانا نہیں۔" میری نظریں یکایک بٹھل کی طرف گئیں، میری طرح اُسے بھی حیرت ہوئی ہوگی۔ پاڑے پر بٹھل کے نہ جانے کے بارے میں شکلا کس وثوق سے کہہ رہا تھا۔ میں نے پوچھنا چاہا لیکن بٹھل کو خاموش دیکھ کے چپ رہا۔

شکلا تیکھے لہجے میں کہنے لگا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ تم نے ابھی پاڑے سے ناتا توڑنا کیوں ضروری سمجھا حالاں کہ تمھارے اور ظہیر کے کسی بھی ہم درد کی یہی خواہش ہوگی کہ تم کبھی پاڑے کا رُخ نہ کرو مگر ابھی، ابھی شاید تمھارا وہاں جاتے رہنا کچھ بہتر ہوتا۔"

"اب اپنا اُدھر کوئی کام نہیں تھا۔"

"دوسروں کا تھا، پولیس تمھیں وہاں دیکھنا چاہتی تھی، پولیس کو اندیشہ ہے کہ تمھارے جیسے دادا کے پاڑے سے ہٹنے کے بعد دادا لوگ بہت دنوں تک آپس میں جُٹے نہیں رہ سکیں گے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آگے کیسی لُوٹ مار مچے، اُن کے درمیان کتنا سر پھٹّول ہو۔ ہمیں فوراً ہی خبر دی گئی تھی۔ شام ہی کو پولیس افسروں کی میٹنگ بلائی گئی۔ میرا خیال ہے، اب تمھیں یہ بتا دینے میں کوئی حرج نہیں کہ کئی پولیس افسروں کا مَن تمھاری طرف سے صاف نہیں تھا۔ صبح ماری کے تھانے آنے سے پہلے، یعنی کل رات تک اُنھیں شک تھا کہ کہیں وہ تمھی نہ ہو۔ تم نے اُس رات، دادا کی موت کی رات تھانے میں بہروپ بھرا تھا اور پولیس کو فریب دینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اُنھیں افسوس تھا کہ تمھیں اُس رات تھانے میں کیوں نہ روک لیا گیا۔ اِس دوران تمھیں تمام نشانات، شہادتیں مٹانے کا موقع مل گیا ہوگا۔ وہ تم پر ابھی ہاتھ تو نہ ڈالتے، تمھیں کچھ اور وقت دیتے کیوں کہ وہ تمھاری طرف سے پوری طرح باخبر تھے۔ اُنھیں معلوم تھا کہ تم نے بہت دیر بعد پاڑے پر پیرو کی جگہ بیٹھنا قبول کیا تھا۔ وہ افسر جو تمھارے جیسے دادا کے ہاتھ آجانے کے بعد اتنی آسانی سے چھوڑ دیے جانے کے فیصلے پر ناراض تھے، اُن کی رائے میں پاڑے پر تمھارے نہ بیٹھنے کی ٹھیک بھی ایک دکھاوا تھی۔ اُن افسروں کی تعداد زیادہ نہیں تھی اِسی بر سے اُن کی بات نہ چل سکی لیکن وہ افسر جنھوں نے تم پر اعتبار کیا ما، کوئی بات واضح نہ ہونے کی وجہ سے ڈگمگانے لگے تھے۔ بے جیسے کوئی سُراغ ملنے میں اُنھیں ناکامی ہو رہی تھی، وہ کم زور ہے تھے۔ لوٹ پھر کے اُن کی نظریں تمھاری ہی طرف آتیں۔ ماری اجاتی تو شاید تمھیں زیادہ وقت نہ ملتا۔"

"اپنے کو بس اتنے ٹائم کی ضرورت تھی۔"

"اتنے ہی ٹائم کی؟" شکلا تعجب سے بولا۔

"دادا کو آگ میں پھونکنا اور تھوڑا ان دونوں کو سنبھالنا تھا۔" ل نے برآمدے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "پھر وہ بھی دیر نہ کرتیں۔"

"اندازہ ہے دادا!" شکلا گہری سانس لے کے بولا۔ "میں سوچتا ل، اُس رات اگر وہ تمھیں تھانے میں روک لیتے اور تمھارے بجائے ی اور ذریعے سے گیتا اور اُس کی ماں کو دادا کی خبر ملتی تو جانے کیا ہوتا... کیا کچھ بدلا ہوا ہوتا...۔"

"نہیں روکتے صاحب وہ اپنے کو۔"

"نہیں روکتے! تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"اپنے کو پتہ تھا، وہ روک سکتے ہیں۔ اسی واسطے ہم نے پورا ٹائم لگایا تھا، اُن کو آگے پیچھے کا سمجھانے کو، اِس کے بعد اپنے کو جانے ہی دینا تھا۔"

"میں، میں جانتا ہوں۔" شکلا ہکلاتے ہوئے بولا۔ "پہلے نہیں تو بعد میں مجھے اِس کا احساس ہوا اور اب یہاں آنے کے بعد کچھ زیادہ معلوم ہوا کہ تم نے وہاں کس لیے اتنی تکرار کی تھی۔ پولیس کے سلسلے میں تمھارا تجربہ کم نہیں ہوگا مگر دادا! میں اُنھی لوگوں کے درمیان رہتا ہوں۔ اُن میں سے کسی کا دماغ پھر سکتا تھا، وہی راستے کا پتھر بن جاتا۔ وہ تینوں افسر تمھیں چھوڑنے کا فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے۔ باہر آ کے اُنھوں نے یہی کہا بھی مگر پولیس نے یہ سوچ کے کہ تم پر کڑی نگرانی رکھی جائے گی، تمھیں تھانے سے جانے کی اجازت دے دی، فرض کرو اگر ایسا...؟"

"پھر اپنا بھی اُلٹ سکتا تھا صاحب!"

شکلا کے چہرے پر لکیریں کھنچ گئیں جیسے بٹھل کی بات اُس کی سمجھ میں نہ آئی ہو یا اُسے ناگوار گزری ہو یا بٹھل کی دماغی حالت پر اُسے شک ہونے لگا ہو۔ تاہم اُس نے نرم لہجے میں کہا۔ "دیر تو ہو جاتی دادا! خیر۔" وہ پہلو بدل کے بولا۔ "جانے دو، اب سب بعد کی باتیں ہیں۔ بات کہاں سے چلی تھی، کہاں نکل گئی، جانے میں کیا کہنا چاہتا تھا۔"

"آپ سویرے آنے کا بول رہے تھے۔"

"ہاں!" شکلا مستعدی سے بولا۔ "اور میں، میں کہہ رہا تھا، شکر کرو کہ ماری آلئی۔ وہ نہ آتی تو وہ تمھیں زیادہ وقت نہ دیتے۔"

"ہم بھی نہیں لیتے صاحب؟"

"مَیں، مَیں سمجھا نہیں تم...؟"

"اپنے کو جان کاری تھی، وہ اِدھر اپنے پاس ہی پلٹیں گے۔"

"پھر تم!" شکلا چیختی آواز میں بولا۔ "کیا تم، تمھیں معلوم تھا کہ وہ جارجی اور وکی ہی...؟"

"نہیں تھا تو ہو جاتا صاحب!" بتھل نے تنک کے کہا۔ "پہلے ہم اسی سور کی اولاد کے پاس جاتے۔"

جولین کے آنے پر شکلا کچھ کہتے کہتے رہ گیا۔ اُس کی نظریں مسلسل بتھل پر جمی ہوئی تھیں۔ اُس نے جولین کی طرف بھی توجہ نہیں دی۔ جولین بھی ٹھیری نہیں، چائے کی ٹرے اُٹھائے خاموشی سے اندر چلی گئی۔ شکلا اپنے آپ میں گم رہا پھر دفعتہً کرسی سے اُٹھ گیا۔ ہم دونوں بھی کھڑے ہو گئے۔ ابھی ہم دروازے سے باہر نہیں نکلے تھے کہ شکلا پھر رک گیا اور بتھل کا بازو پکڑ کے بولا۔ "میں نے تمھارا بڑا وقت لیا دادا۔"

"وقت کی بات تو تالی جیسی ہوتی ہے صاحب!"

"ہاں!" ایک لمحے بعد شکلا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھِل اُٹھی۔ "مگر یہ سب میری طرف سے تھا۔" وہ اُمڈتی آواز میں بولا۔ "یقین کیجیے، آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، تقریباً شام ہی ہو گئی تھی جب آپ لوگ تھانے سے گئے تھے۔ کچھ دیر مجھے وہاں اور لگی۔ مَن پر بہت بوجھ تھا گھر پہنچ کے نہایا، کپڑے بدلے اور ہیڈ آفس کی طرف جانا چاہتا تھا کہ اِس طرف نکل آیا۔ مَیں نے بتایا نا، بس جیسے موٹر کا رُخ خود بہ خود اِدھر ہو گیا۔ یہ بھی خیال نہ رہا کہ آپ لوگوں کو آرام کی ضرورت ہو گی۔ دن بھر تھانے اور باڑے میں لگ گیا تھا۔ وقت مرضی پر نہ چلے تو تھکن بڑی ہوتی ہے اور رغم تو یوں بھی بہت بڑی تھکن ہے۔ پرجی نہیں مانا، سچ پوچھو تو جانے کتنی باتیں دماغ میں اٹک رہی تھیں، کھٹک رہی تھیں۔ یہاں آ کے سب کچھ گڈ مڈ ہو گیا۔ تھانے میں اتنی دیر ملاقات رہی تھی، اتنے آمنے سامنے لیکن کوئی کمی محسوس ہوتی رہی اور اب یہ اور بڑھ گئی ہے۔"

"باتوں میں ایسا ہی ہوتا ہے صاحب! کمی بڑھتی رہتی ہے پوری ہو جاتی ہے تو بولتے ہیں، ناتے میں دم نہیں رہتا۔"

"ہاں دادا" شکلا پلکیں پٹ پٹانے لگا۔ "تم سے ملنا میرے لیے ایک بہت...!" وہ کچھ کہہ نہیں پایا، اُس کا جسم بل کھا گیا۔

"کیا کہا جائے دادا؟"

"کچھ مت بولو صاحب! اپنے کو بھی بہت سُکھ ملا آپ سے مل کے، اور ہم پر تو آپ کا ویسے بھی بہت ادھار ہے، اُوپر سے نیچے تک بندھے ہیں صاحب! آپ کے واسطے سے لاڈلے کو اس کا بابا مل گیا۔"

"میں نے کچھ نہیں کیا، یہ سب تو کرشنا جی...۔"

"آپ کا بھی بہت ہے۔ اِدھر بمبئی آ کے ایسا ہی اُلٹ پلٹ ہوتا رہا۔ آنے کو ٹائم ہی نہیں ملا۔ پر آپ کے پاس آئے بنا اُوٹتے نہ"

"مجھ پر اعتبار ہے دادا؟" یکایک شکلا نے منتشر لہجے میں کہا۔

"کیا بولتے ہو صاحب!"

"تو پھر بتاؤ، یہ سب کیا ہے؟"

"کیا صاحب! کس طرف کا بولتے ہو؟"

"میں اور جاننا چاہتا ہوں۔" اور بہت کچھ۔"

"اپنے کو نہیں پتہ، آپ کیا بولتے ہو۔"

"کاش میں پولیس والا نہ ہوتا۔"

"ہم آپ کو نہیں سمجھتے، ایک دم نہیں۔ آپ بولو صاحب کدھر کا آپ کو ڈھکا ہوا لگتا ہے؟"

"نہیں نہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے۔" شکلا نے بہ عجلت کہا۔ "میں اپنی بات ٹھیک طرح کہہ نہیں پا رہا ہوں۔ بہر حال پھر" شکلا سر جھکائے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اُس کی موٹر تک ہم بھی ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ اُس نے چابی گھما کے دروازہ کھولا مگر موٹر میں بیٹھنے سے پہلے وہ مُڑ کے بتھل سے بولا۔ "دادا! اُس کے بچوں کے پاس کب جانا ہے؟"

"جلدی صاحب، جلدی جائیں گے۔" بتھل نے تحمل سے کہا۔

"جلد ہی جانا چاہیے، ممکن ہے، اُن تک کوئی ایسی ویسی خبر پہنچ جائے۔ بچوں پر بُرا اثر پڑے گا۔ مناسب سمجھو تو میں بھی تمھارے ساتھ چلوں؟"

"ضرور صاحب! ضرور۔"

"اُن سے کیا کہو گے، کیا بتاؤ گے دادا؟"

"ٹائم پر دیکھیں گے۔"

"میں مسلسل سوچتا رہا ہوں، دماغ کام نہیں کرتا، یہ آسان کام نہیں ہے دادا!"

"اپنے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے صاحب!"

"اگر کوئی اچھی صورت نہ بنی تو مَیں، مَیں اُنھیں گھر لے آؤں گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ایک اچھی ماں کے اچھے بچے ہوں گے۔"

"اتنا آگے کا ابھی کیوں دیکھتے ہو صاحب!"

شکلا اضطراب سے سر ہلانے لگا۔ "تم بھی اپنا خیال رکھنا۔ کوئی کانٹا سا بار بار چبھتا ہے۔ پولیس کی نظر اب تم پر بالکل نہیں ہے لیکن باڑے کے لوگ! اُن کے بارے میں تم مجھ سے زیادہ واقف ہو۔ تم سب نمٹا کے وہاں سے چلے آئے ہو اور دوبارہ جانا بھی نہیں چاہتے، نہ وہاں بیٹھنے والوں کو تمھاری جلد واپسی کی اُمید ہو گی۔ مجھے معلوم ہوا ہے، اُنھوں نے تمھیں روکنے کی بہت کوشش کی تھی اُس وقت انھیں یہی کرنا چاہیے تھا پر وقت بہت جلد گزر جاتا ہے آدمی بھولنے پر آئے تو اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہے۔ کل ہمیشہ دوسرا ہوتا ہے۔ وہاں اور بھی بہروپیے ہو سکتے ہیں، اور بھی کئی جارجی۔ اُنھیں زیادہ دیر تمھارا بمبئی میں ٹھیرے رہنا پسند نہیں آئے گا۔ کچھ بھی ہو، وہ تمھیں سدا پیرو دادا کے رشتے سے دیکھیں گے تم نے باڑے الگ الگ کر دیے، یہ تم نے اچھا کیا۔ یہی ٹھیک فیصلہ تھا مگر کوئی اور نہیں تو ابھی ماہم کا باڑا باقی ہے۔ آج وہاں سب ایک زبان سے بولتے ہیں۔ کل یہی لوگ ایک دوسرے کے خلاف اُٹھ سکتے ہیں اور سب اِس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہوں گے کہ جب تک تم بمبئی میں ہو، اُن کا مطلب پورا نہیں ہو سکتا۔ تم کسی وقت بھی اپنا حق جتانے آ سکتے ہو۔ بہت عرصے تک اُنھوں نے پیرو داد کی من مانی قبول کی، اَب پہلی بار اُنھیں چھوٹ ملی ہے۔ وقت کچھ گزر گیا تو شاید وہ ایک دوسرا پیرو برداشت نہ کریں۔ ایک دوسرا پیرو یا اُس کی جگہ کوئی لاڈلا یا راجا...۔" شکلا میری طرف دیکھے بغیر زیرِ لبی سے بولا۔ "سُنا ہے، چاقو پر راجا دادا کا ہاتھ بھی بہت صاف ہے؟"

میرے کانوں میں چنگاریاں سی لپکیں حالاں کہ شکلا کے لفظوں میں زہر تھا نہ طنز و استہزا۔ میں نے کچھ نہیں کہا، سر جھکائے کھڑا رہا۔ بتھل نے دخل دینا چاہا تو شکلا نے اُسے روک دیا۔ "پہلے میری سُن لو دادا!" اُس نے عاجزانہ انداز میں کہا۔ "اب وہ پیرو دادا کے گھر کا راستہ بھی جانتے ہیں۔"

"ہم کو بھی جانتے ہیں صاحب! اچھی طرح سے۔"

مجھے علم ہے، وہ کس طرح تمھیں جانتے ہیں، بہت بڑے دادا کی حیثیت سے۔ یہی کہنا چاہتے ہو تم؟ پر پیرو دادا بھی شہر کا سب سے بڑا دادا تھا۔ کتنی آسانی سے اُنھوں نے... تم کہو گے کہ ماہم کے باڑے پر پیرو کے خاص آدمی ہیں۔ وہ ایک اشارے پر پیرو کے لیے جان قربان کر دینے کو تیار رہتے تھے۔ اُسی کے پالے ہوئے ایک کُتّے نے دادا کو ختم کر دیا۔ میرا مقصد کچھ اور نہیں دادا! بس تھوڑی سی احتیاط مُراد ہے۔ اِس گھر کو تمھاری بہت ضرورت ہے۔ اُس دن جب دادا کی ارتھی اُٹھ رہی تھی، مَیں بھی یہاں لوگوں کے درمیان ایک کونے میں کھڑا تھا۔ اُس دن میں نے گیتا اور اُس کی ماں کو دیکھا تھا۔ آج وہ بہت سنبھلی ہوئی ہیں۔ سمجھ رہے ہو دادا۔"

بتھل ہنکاری بھر کے رہ گیا۔

"کچھ بُرا لگا ہو تو معاف کر دینا۔" بتھل کی خاموشی نے شکلا کو مجوب کر دیا تھا۔ وہ دبی دبی آواز میں کہنے لگا۔ "سارا اونچا نیچا تو خود تمھارے سامنے بھی ہو گا۔ نہ جانے میں اتنا کیوں کہہ رہا ہوں اپنی حد سے زیادہ۔"

"اب آپ جاؤ صاحب!" بتھل نے آہستگی سے کہا۔

شکلا کے چہرے کا رنگ ایک آن کے لیے متغیر ہوا پھر وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ہاں دادا! میں چلتا ہوں، پر ابھی جی نہیں بھرا۔ یہاں اس سوگ میں بھی کیسی ٹھنڈک ہے، ہو سکا تو دو ایک دن میں پھیرا لگاؤں گا، وقت نکال کے۔"

"نہیں صاحب! اپنی بنتی ہے، ابھی آپ اِدھر مت آنا۔"

"کیوں، کیوں دادا؟" شکلا کی زبان حلق میں اٹک گئی تھی۔

"آپ کے لیے ٹھیک نہیں ہے، اڈے کے، باڑے کے لوگ ہیں صاحب! آپ پولیس کے بڑے افسر ہو۔ گھر بھی یہ پیرو دادا کا ہے۔ اِدھر اَب سارے میں گھنٹی...۔"

"مگر مجھے اِس کی، اِس کی پروا نہیں ہے۔"

"اپنے کو ہے صاحب!" بتھل اُس کی بات کاٹ کے بولا۔ "آپ کے لیے بولتے ہیں۔"

شکلا ٹھٹکی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ بتھل نے اُس کی کمر پر ہاتھ رکھ کے موٹر میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ شکلا چند لمحے سکوت میں کھڑا رہا پھر اُس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور موٹر میں بیٹھ گیا۔

اُس کے جاتے ہی مَیں سیدھا کمرے میں چلا آیا۔ تھوڑی دیر میں جمرو، شامو، مارتی اور ٹنگو بھی آ گئے۔ وہ قریب کی جگہیں گھومتے رہے تھے، اُنھوں نے شکلا کی موٹر جاتے ہوئے دیکھ لی تھی۔ چاروں نے جیسے نشہ کیا تھا۔ وہ آتے ہی بستروں پر اوندھے سوندھے پڑ گئے۔ اُنھیں میرے اور اپنے آرام ہی کا خیال ہو گا جو چند رسمی لفظوں کے سوا اُنھوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔

رات گئے تک مجھے نیند نہیں آئی۔ پھر رات کا آخری پہر ہو گا جب کہیں میری آنکھ لگی اور کئی دن بعد مجھے ٹوٹ کے نیند آئی۔

بے حسی میں شاید یہی ہوتا ہے۔

صبح کسی کا ہاتھ مجھے اپنی پیشانی پر محسوس ہوا تو میری آنکھ کھلی۔ مَیں ہڑبڑا کے اُٹھ گیا۔ سفید کُرتے اور پاجامے میں ملبوس جولین آئی تھی، نکھری نکھری، اُجلی اُجلی۔ پہلی نظر میں تو مجھے زرّیں کا گماں ہوا، جولین کو اس لباس میں، مَیں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ میرے ہڑبڑانے پر وہ بھی گھبرا گئی۔ "طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اُس نے متردّد لہجے میں پوچھا۔

"ہاں ہاں، بالکل۔" مَیں نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں کمرہ خوب روشن تھا۔ جولین کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔ "کیا وقت ہوا ہے؟" جولین کے جواب دینے سے پہلے میری نظر گھڑی پر گئی۔ ساڑھے دس بج رہے تھے۔ "اتنی دیر ہو گئی؟" مَیں نے سٹ پٹاتی آواز میں کہا۔

"تو کیا ہوا۔" وہ مُسکراتے ہوئے بولی۔ "دِنوں کی نیند تھی۔"

"یہ لوگ کہاں گئے؟"

"جمرو بھائی تو سویرے سویرے بابا کے ساتھ نکل گئے تھے باقی سب یہیں ہیں۔"

"کہاں! بِتّھل بھائی کہاں گئے ہیں؟"

جولین کو کچھ معلوم نہیں تھا مگر مجھے یاد آ گیا۔ بِتّھل کو تو صُبح ہوتے ہی قلابے کی طرف نکل جانا چاہیے تھا۔ یقیناً اُس نے میرے اُٹھنے کا انتظار کیا ہوگا۔ "مجھے اُٹھا لیا ہوتا۔" مَیں نے تن دہی سے کہا۔

"بابا نے منع کر دیا تھا۔ کئی بار مَیں جھانک کر گئی، فرخ اور فریال بھی، تم بے خبر سو رہے تھے۔" جولین شگفتگی سے بولی۔ "کیا بہت ضروری کام تھا؟"

"نہیں۔" مَیں نے بہ شدّت تردید کی۔ "کوئی ایسا کام نہیں۔"

اتنی دیر میں میری آنکھیں پوری طرح کُھل گئی تھیں۔ آدمی بھی مناظر اور موسموں کی طرح خواص رکھتے ہیں۔ کوئی مُتادیر اُن سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ ابھی تک کھڑی ہوئی ہے۔ "بیٹھ جاؤ۔" مَیں نے اپنے بال درست کرتے ہوئے کہا۔

قریب کوئی کُرسی نہیں تھی۔ وہ میرے پائینتی سکڑ کے بیٹھ گئی۔ میرے جی میں آیا، اُس سے کہوں کہ تم اِن کپڑوں میں کیسی مختلف کتنی اچھی لگ رہی ہو۔ ہو سکے تو یہی لباس پہنا کرو مگر مجھے مناسب لفظ نہیں ملے۔ "اور اندر تو سب خیریت ہے؟" مَیں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، سب ٹھیک ہے۔" اُس کی آنکھیں اور چمک اُٹھیں۔ "رانی بھابی اور گیتا آج اور بہتر لگ رہی ہیں۔ خدا کرے، سب ایسا ہی رہے۔"

"ہاں دیکھو، اتنی جلد تو..." میری آواز گھٹنے لگی۔

"سب اُن کے قریب ہی رہتے ہیں، کسی وقت بھی وہ خود کو تنہا اور بے آسرا نہ سمجھیں۔ انھیں احساس رہے کہ ایک پیرو بابا گئے ہیں، اُن کے پوچھنے والے ابھی بہت سے ہیں۔"

"مگر کبھی بہت سے آدمی بھی ایک آدمی کا بدل نہیں ہوتے!"

"کوئی بھی اُن کے لیے پیرو بابا کی جگہ نہیں لے سکتا۔" جولین یاس سے بولی۔ "رشتے عہدوں کی طرح نہیں ہوتے۔"

اس نے کیسی سچّی بات کس سادگی سے کہی ہے۔ میں اُسے دیکھا کیا۔ "رات شکلاجی دیر تک بیٹھے رہے؟" مجھے خاموش دیکھ کے اُس نے پوچھا، اُس کا لہجہ تجسّس سے عاری نہیں تھا۔

"ایسے ہی۔" مَیں نے کہا اور سوچا کہ ماری کے متعلق اِسے بتا دینے میں کیا حرج ہے لیکن پھر یہ بہت سے سوال کرے گی اور مجھ سے شاید ہر بات کا جواب نہ دیا جا سکے، سو مَیں نے اپنی زبان بند رکھی۔

"رات رما اور کیلاش بھی نہیں آئے۔" وہ فکرمندی سے بولی۔

"مجھے بھی کئی بار اُن کا خیال آیا، کوئی کام ہو گیا ہوگا۔"

"وہ دونوں بہت اچھے ہیں۔"

"بہت، کم لوگ ایسے ہوتے ہیں۔"

"کیلاش کو تو دیکھا ہی تھا، رما تو کچھ اور بھی... وہ ایک ذہین، ہم درد اور..." وہ لفظ ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگی اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو انگریزی میں بولی۔ "ویل مینرڈ اور کری ایٹو..."

"ہاں، اُس میں بہت سی خوبیاں ہیں۔"

"خوب صورت بھی بہت ہے۔" وہ آہستگی سے بولی۔ مَیں نے کہنا چاہا، تم میں بھی یہ خوبیاں کم نہیں ہیں لیکن مَیں سوچتا رہ گیا یا اُس نے مجھے کچھ کہنے کی مہلت ہی نہیں دی، سرگوشیانہ لہجے میں بولی۔ "تمھاری بڑی تعریف کرتی ہے۔"

"ہُنھ۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "تعریف کیا، سب ہم دردی کرتے ہیں۔ میری صورت ہی شاید کچھ ایسی ہے۔"

"صورت کی بات نہیں۔" وہ تیزی سے بولی۔ "تم کیا سمجھتے ہو، تمھاری صورت کیسی ہے؟"

"مجھے کیا معلوم، کوئی بات تو ایسی ہوگی۔ مَیں تو یہی دیکھتا ہوں۔ مَیں کسی سے کچھ نہیں کہتا، لوگ خود بہ خود ہم دردی کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔"

"وہ تم سے خاصی متاثر لگتی ہے۔"

"پہلا تاثر تو صورت ہی کا ہوتا ہے۔"

"مگر پہلا ہی، رما ایسی لڑکی نہیں جو سامنے کی چیزوں پر توجہ دے۔" جولین کی دھیمی آواز میں تیقن بھی تھا، تلقین بھی تھی، کہنے لگی۔ تم کسی سے کچھ کہتے جو نہیں، یہ بھی تو وجہ ہو سکتی ہے۔ رما کی نظریں ویسے بھی خوب گہری ہیں۔ ابھی کل ہی کہہ رہی تھی کہ اِس شخص سے مل کے کسی دریافت کا سا احساس ہوتا ہے۔"

"وہ ایسی ہی دل چسپ باتیں کرتی ہے، خیالی، تصوّری۔"

"ایسا غلط تو نہیں کہتی۔"

"تم بھی یہی سمجھتی ہو؟"

"میرا کیا! مَیں تو اُس کی بات کر رہی ہوں۔" وہ کسی قدر خفگی سے بولی اور چادر کی شکنیں دُرست کرنے لگی۔

مَیں نے محسوس کیا کہ وہ کسی کش مکش سے دوچار ہے اور کچھ کہنا چاہتی ہے مگر لمحے گزر گئے، وہ چُپ رہی۔ مَیں نے کہا۔ "اب گھر کب جاؤ گی؟"

"کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

"جانا چاہتی ہو؟"

اُس نے پلکیں اٹھا کے ایک نظر مجھے دیکھا۔ اُس کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ "میرا مطلب ہے، اُدھر بھی گھر خالی پڑا ہوگا۔ تمھارے اسکول کا بھی حرج ہو رہا ہوگا۔" مَیں نے رُک رُک کے کہا۔

"تو کیا مجھے چلے جانا چاہیے؟"

"نہیں نہیں، یہ بات نہیں، مَیں کہنا چاہتا تھا کہ کب تک ایسے..." میری آواز بھٹکنے لگی۔ "کوئی اور بات دل میں مت لانا۔"

"جانے تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں، شاید میں خود بھی نہیں جانتا۔" مَیں نے شکستہ لہجے میں کہا۔ "بس ایسے ہی خیال آیا کہ سبھی منتشر ہو گئے ہیں۔"

کوئی نئی بات تو نہیں، ایسے وقت میں یہی ہوتا ہے کسی کو بھی یہاں کوئی الجھن یا پریشانی نہیں ہے۔ سب کی یہی کوشش بلکہ آرزو ہے کہ کسی طرح جلد سے جلد دونوں کو قرار آ جائے۔ اِس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔"

"وہ تو ہے مگر، مگر..."

"یہ سب تو کسی کے بھی ساتھ پیش آ سکتا ہے۔"

"ہاں۔" مَیں نے ناتوانی سے کہا۔

"لگتا ہے، تمھیں کچھ زیادہ..." وہ لفظ چبا چبا کے بولی۔ "تم بہت تھکے ہوئے ہو، بہت تھک گئے ہو۔"

"یہ تھکن نہیں ہے۔"

"پر کچھ ہے تو سہی۔"

"کچھ بھی نہیں ہے۔" مَیں نے کبیدگی سے کہا۔

اُس نے حُجّت نہیں کی اور نگاہیں نیچی کیے بیٹھی رہی، پھر نرمی سے بولی۔ "تم سے کئی باتیں کرنی تھیں۔ وقت ہی نہیں مل پاتا۔ خیر پھر کبھی، تم اب تیار ہو جاؤ، مَیں ناشتہ لاتی ہوں۔"

"کیا بات ہے؟ بیٹھو نا!"

"اندر سے آئے دیر ہو گئی ہے۔"

"اندر تو سبھی لوگ ہیں۔"

"تم تو فکرمند ہو گئے۔" اُس کے لرزیدہ ہونٹوں پر مُسکراہٹ بکھر گئی، ایک اختیاری مُسکراہٹ، مہذّب لوگوں کو جو خوب آتی ہے۔ "ذرا اُدھر کا حال دیکھ کے پھر آتی ہوں۔ اتنی دیر میں تم منہ ہاتھ دھو، کپڑے باتھ روم میں رکھے ہیں، تبدیل کر لینا، نہانے کا ارادہ ہو تو گرم پانی کا برتن بھی رکھا ہوا ہے۔" وہ مجھے ہدایات دیتے ہوئے اُٹھنے لگی تو مَیں نے غیر ارادی طور پر اُس کا ہاتھ تھام لیا اور مجھے ایسا لگا جیسے اُس کی کلائی کانچ کی بنی ہو، ایک ذرا تیز گرفت سے ٹوٹ جائے گی مگر دوسرے ہی لمحے میرے جسم کی طاقت جیسے کسی نے کھینچ لی، مَیں نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا یا مجھ سے چھوٹ گیا اور مَیں نے دیکھا، اُس کا سراپا بھی کسی شاخ کی طرح لچک گیا ہے۔ وہ بیٹھ گئی۔ لمحوں تک خاموشی طاری رہی نہ مَیں نے اُس سے کچھ کہا نہ اُس نے۔ "کوئی خاص بات نہیں۔" آخر وہ دبے دبے لہجے میں بولی۔ "جانتے تو تم بھی سبھی کچھ ہو۔ سب تمھارے سامنے ہے۔ مَیں کوئی اضافہ نہیں کروں گی۔ ایسا لگتا ہے جیسے تم کچھ بھول گئے ہو، بار بار بھول جاتے ہو۔ بھول جانا اور یاد آ جانا آدمی کے بس میں نہیں، پر آدمی کے بس میں تو بہت کچھ نہیں ہے۔ زندگی بھر وہ اپنے بس کی چادر کھینچتا، پھیلاتا رہتا ہے۔ شاید زندگی بھی اتنی ہی ہے۔"

جولین رک گئی۔ مجھے اُس کے سلسلے میں گرہ پڑ جانے کا اندیشہ تھا جبھی اپنے تجسّس کے باوجود میں نے بیچ میں ایک لفظ نہیں کہا۔ اُسے بھی ایک لحظے کی مدّت میں میری سماعت کی طرف سے کوئی اطمینان مطلوب تھا کہ اُس کی سمٹی سمٹی آواز نسبتہً کشادہ ہو گئی، کہنے لگی کہ جہاں تک اُس کے مشاہدے میں آیا ہے، آدمی دو طرح کی زندگی گزارتا ہے، ایک اپنے لیے، ایک دوسروں کے لیے۔ دونوں ساتھ ساتھ۔ اپنے لیے کم دوسروں کے لیے زیادہ۔ اپنے لیے تو اُسے زندگی کا دس فی صد حصّہ بھی شاید نہیں مل پاتا۔ یہاں ہر شخص بندھا ہوا ہے، اُس نے یکا یک

مجھ سے پوچھا۔ "تم نے روسو کو تو پڑھا ہوگا؟"

"روسو کو! ہاں ہاں، کبھی پڑھا تھا۔" میری زبان پر جیل کا نام آتے آتے رہ گیا کہ میں نے جیل میں معاہدۂ عمرانی نامی کتاب پڑھی تھی۔ میرا شوق دیکھ کے جیلر صاحب اور سونیا مجھے ہر طرح کی کتابیں فراہم کرتے تھے۔ اُس کے بعد تو مجھے پڑھنے لکھنے کا ایسا موقع ہی نہیں ملا مگر مجھے روسو کا نام اچھی طرح یاد تھا۔

"اُس نے کہا تھا کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے۔ پیدا ہوتا ہے مگر جدھر دیکھو، زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے، جکڑ جاتا ہے۔" جولین کا چہرہ جل بجھ سا رہا تھا، آواز بھی جیسے پگھل رہی ہو، دوپٹے کا کونا انگلیوں پر لپیٹتے ہوئے بولی کہ روسو نے یہ قول کسی اور پس منظر، حوالے سے کہا تھا لیکن یہ تو بہت وسیع ہے۔ طرح طرح سے اِس کی تشریح کی جا سکتی ہے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ جو لوگ صرف اپنی زندگی گزارتے ہیں یا جنھیں اِس کا موقع مل جاتا ہے، وہ خوش قسمت ہیں یا دوسروں میں مصروف رہنے والے، دوسروں کی خاطر خود کو بھول جانے والے، دانستہ یا مجبوراً۔ کوئی بھی صورت ہو مگر یہ اچھی بات کہی جاتی ہے اور شاید یہی ہونا بھی چاہیے پھر بھی معلوم نہیں کہ سچ کیا ہے؟ اپنے لیے زندہ رہنا سچ ہے یا دوسروں کے لیے؟ کون سا سچ بڑا ہے، کس میں زیادہ لطف ہے؟

اُس کی آواز اُلجھنے لگی۔ ہندوستانی میں اُسے مشکل پیش آتی تھی تو وہ انگریزی کا سہارا لیتی تھی۔ میں گونگوں کی طرح بیٹھا رہا۔ "روسو نے کہا تھا کہ آدمی آزاد پیدا ہوتا ہے مگر کیا واقعی ایسا ہے؟" وہ بکھرے بکھرے انداز میں بولی۔ "یوں کہا جائے تو کیا غلط ہوگا کہ آدمی پابند پیدا ہوتا ہے کہ وہ جنگل میں نہیں پیدا ہوتا اور وہ اپنی آزادی کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا رہتا ہے، ہر دم اِس جتن میں رہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ اپنی زندگی گزارے مگر یہ تو اُس کے آگے پیچھے کی دیواروں اور زنجیروں پر منحصر ہے کہ وہ کتنی اُس پر مہربان ہوتی ہیں اور آدمی کامیاب ہو جائے، وہ ساری زنجیریں، سارے ریفنے رین سیز، رشتے ناتے توڑ کے خود کو آزاد کرا لے تو کیا وہ جنگل کی طرف نکل جائے۔ اگر وہاں بھی آدم زاد جا نکلے وہ پھر اُس کے گرد گھیرا ڈال دیں گے۔ زنجیروں سے مراد دوسرے آدمی ہیں۔"

اُس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ مجھ پر کوئی سناٹا سا طاری تھا۔ اُس نے میرے جواب کی ضرورت بھی نہیں سمجھی میرا سکوت میری تائید پر محمول کیا یا لاجوابی پر۔ کسی توقف کے بغیر وہ بولی کہ تنہا آدمی کا شاید کوئی وجود نہیں۔ آدمی آدمی سے عبارت ہے ایک جنگل نشیں کی زندگی کتنی ہی اپنے لیے ہو مگر دوسروں کے لیے اُس کی موت کے مانند ہے۔ آدمی دوسروں کے حوالے سے مرتا ہے کہ اُس کی موت کا احساس کرنے والے اُس کے پسماندگان ہی ہوتے ہیں۔ وہ خود تو ہر قسم کے احساس سے مبرا ہو جاتا ہے۔ کوئی جنگل میں چلا گیا ہے تو صرف اپنے لیے زندہ ہے، دوسروں کے لیے نہیں۔ تنہائی آزادی نہیں ہوتی اور تنہائی کی یہ آزادی تو پھر بھی مشروط ہے۔ آزادی سے کیا مراد ہے؟ ذات کی آزادی! پھر یہ تو اُسی وقت مکمل ہوگی جب آدمی ہر قسم کے بیرونی اثرات اور نقش و نگار سے مستثنا ہو جائے۔ ابتدا ہی سے اُس کی تربیت مختلف ہو اور انسانوں سے اُس کا واسطہ یکسر نہ پڑے لیکن یہ ایک اَن ہونی بات ہے۔ آدمی کی ساخت ہی ایسی ہے کہ اُسے ابتدا سے دوسروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ آزاد کب پیدا ہوتا ہے۔ روسو نے سماجی اقدار، روایات، قانون اور اخلاقی ضابطوں کو زنجیروں اور دیواروں سے موسوم کیا ہے۔ ان سے مفر نہیں تو ملال سے کیا حاصل۔

جولین کے تراشیدہ ہونٹوں پر لفظ جیسے اُمڈ اُمڈ کے آ رہے تھے، کہتے ہیں، نہاں خانے کی تپیدگی کے بغیر لہجے میں یہ سوزش نہیں ہوتی۔ اُس کی آواز دھڑک رہی تھی۔ کہنے لگی، یقیناً آدمی کو کچھ دیر اپنے ساتھ بھی رہنا چاہیے کہ دوسروں پر صَرف ہونے کے لیے یہ توانائی ضروری ہے۔ وقت جس قدر بھی ایسی مہلتیں دے، انھیں غنیمت سمجھنا چاہیے۔ کاش یہ مہلت ملا ہی نہ کرتی اور آدمی عارضی آزادی کے سراب میں نہ رہا کرتا۔ یہ عارضی آزادیاں تو اُسے اور پریشان کرتی ہیں۔ اُسے دوبارہ معمول کی زندگی سے مطابقت کرنے کی دشواری پیش آتی ہے پھر ایک اور پہلو سے دیکھا جائے۔ آدمی کا تعلق اپنی ذات سے بھی کچھ کم نہیں ہوتا۔ اس کے خواب اپنے ہوتے ہیں، خیال اپنے اور خواب بھی ایک حقیقت ہیں کہ آدمی کو آسودہ رکھتے ہیں یا پراگندہ کرتے ہیں۔ تخلیق کا بھی یہی ہے کہ یہ بھی فرد کے خواب کی طرح ہے بلکہ خواب کی تعبیر کا درجہ رکھتی ہے۔ کوئی تخلیق، کسی فکر کے بغیر ممکن نہیں ہوتی اور فکر خلوت کے بغیر۔ اور پھر وہی بات، کیا خلوت آزادی ہے؟ تخلیق کی قدرت کسی نہ کسی حد تک ذہن و فکر کی آزادی کی نشان دہی کرتی ہے مگر خیال ہو یا خواب یا تخلیق، سب پر اُن کے عہد کی چھاپ ہوتی ہے۔ آدمی خواب اپنی زبان میں دیکھتا ہے اور سوچتا بھی اپنے عہد کے واسطوں سے ہے۔

وہ کہتی رہی، چپکے چپکے، دھیمے دھیمے انداز میں تند و تیز باتیں۔ بے شک میری حیرت اور تردد میں اب اشتیاق بھی شامل تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں اُسے پہلی بار دیکھ اور سُن رہا ہوں۔

وہ دن یاد آ رہے تھے۔ شروع میں جب میں نے کرشنا جی کو اپنے ے میں کچھ نہیں بتایا تھا اور اُنھوں نے میری تعلیم کے لیے اُسے مقرر تھا۔ اُس وقت بھی اُس کی جُز بینی اور خیال آفرینی کا یہی حال تھا۔ ناجی اِسی وجہ سے اُسے پسند کرتے تھے۔ اُنھوں نے اُسے مزید ادر مطالعے کا مشورہ دیا تھا۔ بعض اوقات وہ اُسے کتابیں بھی ھنے کو دیتے تھے۔ کرشنا جی کے بعد اُن کا سارا سامان مجھے منتقل تھا تو کتابوں کا ایک انبار بھی ساتھ تھا۔ میں نے وہ سب کچھ جولین والے کر دیا تھا اور میں نے دیکھا تھا، یہ کتابیں جولین نے نہایت قے سے الماریوں میں سجائی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا، ممبئی سے ں عدم موجودی کے دوران وہ بس انھی سے شغل کرتی رہی ہے۔ ، خبر تھی، اُس وقت مجھے پڑھانے کے لیے آنے والی نازک اندام بدہ قامت، ترشے ہوئے خال و خد، کھلتے ہوئے گندمیں رنگ، ن کھناتی، گنگناتی آواز میں بات کرنے والی وہ اُداس اُداس اور م مستعد، اجنبی لڑکی گھر کی ایک فرد بن جائے گی۔ میری آنکھوں میں ر کی دھند کب کی چھٹ چکی تھی مگر نہ جانے دفعتہً اُسے کیا ہوا کہ اُس کی زبان نے لگی۔ "میں جانے کتنی دُور چلی گئی۔ نہ جانے کیا کیا کہتی رہی۔" وہ رت زدہ لہجے میں بولی۔ "پھر بھی شاید یہ سب ایسا نہیں جو مشکل ے سمجھ میں آئے۔"

"میں، میں سمجھ رہا ہوں۔"

"مجھے اتنا کچھ نہیں کہنا تھا، بس...۔"

"اِسی طرح، اِسی طرح کہتی رہو۔"

"کیوں؟" اُس کا چہرہ لال ہو گیا۔

"یہ باتیں کرتے ہوئے تم کیسی نناث ستی ہو۔"

"اچھی نہیں لگ رہی ہوں گی۔" وہ سرسراتے ہوئے بولی۔

"میں نے کب کہا۔ کس نے کہا یہ؟"

اُس کا سر اور جُھک گیا۔

"تم چُپ کیوں ہو گئیں؟" میں نے مضطربانہ کہا۔

"شاید کچھ باقی نہیں رہ گیا ہے۔"

"ضرور تم پر کسی احساس کا غلبہ ہو گیا ہے۔"

"کیسا احساس؟"

"یہی کہ، یہی کہ میری کوئی بات بُری لگ جانے کا احساس مگر تم تو بہت اچھی، بہت سچی باتیں کر رہی ہو۔"

وہ مسکرانے لگی اور جھجکتے ہوئے بولی۔ "صرف اتنا کہنا تھا کہ تم اکیلے نہیں ہو، بہت سے ہیں جو تمھاری طرف دیکھتے ہیں۔ تمھیں دیکھ کے جن کی ہمت بڑھتی ہے اور خوشی ہوتی ہے کہ تم اُن کے پاس ہو، وہ تمھارے پاس ہیں، باوا جان، فرخ فریال، اکبر، فارہہ، جہاں گیر، کس کس کا نام لوں، منجھل باوا، زرّین، نیساں، خانم اور اب رانی بھابی، گیتا... یہ بھی تو تمھاری زندگی میں شامل ہیں۔ آدمی دیکھنے میں ایک نظر آتا ہے مگر اُس میں بہت سے اور بھی ہوتے ہیں۔ ان سب سمیت مل کے ہی کسی آدمی...۔"

میں نے اضطراری انداز میں تائید کرنی چاہی تو معلوم نہیں وہ کیا سمجھی، عاجزی سے بولی کہ بہتر ہے، میں کچھ نہ کہوں، جو جواب مجھے دینا ہے، مناسب ہوگا کہ میں خود کو دُوں اور گھٹی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔ "لگتا ہے، فرخ، فریال تمھیں حاصل کر کے بھی تم سے دُور ہیں۔ اِس حقیقت کے باوجود کہ تمھیں کسی اور طرف دیکھنے کا وقت ہی کب اور کتنا ملا ہے۔" میں نے کچھ کہنا چاہا تو اُس نے پھر روک دیا۔ "مجھے تمھارے حال کا تھوڑا بہت اندازہ ہے۔ تم دوسروں کے لیے خود پر کم جبر نہیں کرتے لیکن وہ اس سے سوا چاہتے ہیں اور سوچو تو تمھارے لیے بھی یہ ضروری ہے۔ وقت بہت گزر گیا ہے۔ پہلے کی بات اور تھی، اب، اب تمھیں اور طرف بھی دیکھنا ہے۔"

"میں اپنی طرف دیکھنا ہی نہیں چاہتا۔"

"نہیں، میرا مطلب یہ نہیں ہے۔" وہ بے تابی سے بولی۔ "دوسرے لوگ جیل خانہ نہیں ہوتے۔ وہ تمھارے کام آنا چاہتے ہیں۔ سب کی یہی آرزو ہے کہ تم کسی طرح خوش رہو۔ دوسرے بھی تو کسی کے کام آتے ہیں۔"

"ہاں ہاں، میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ...۔"

اُس نے میری بات نہیں سُنی اور تیزی سے بولی۔ "آدمی کو کبھی نہ کبھی کسی ایک جگہ ٹھیر کے پیچھے کی طرف دیکھنا، کچھ سوچنا ضرور پڑتا ہے۔ ہوا نے جن کا ساتھ نہیں دیا یا لکیروں نے، جو کچھ بھی ہوا وہ اپنے کام نہیں آ سکے یا اپنے نہیں بن سکے تو وہ خود کو دوسروں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ میں جانتی ہوں، تم اپنے طور پر بہت کوشش کرتے ہو گے مگر کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اب کچھ دوسروں پر چھوڑ دو، کچھ عرصے کے لیے سہی...۔"

"میرا، میرا کیا مطالبہ ہے، اب کوئی بھی نہیں۔" میری آواز ڈوبنے لگی۔ "پہلے بھی کچھ نہیں تھا۔"

"اِسے شکایت مت سمجھنا، میں شاید اپنی بات کہہ نہیں پا رہی۔"

اُس کا بدن بے قرار سا ہو گیا۔ اور وہ مضطرب لہجے میں بولی۔ "نہ جانے میں کیا، کہنا چاہتی ہوں۔"

"گھبرا کیوں رہی ہو، تم نے کچھ غلط تو نہیں کہا۔"
"مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ تمھارے لیے کچھ نیا نہیں ہے۔"
"ضروری نہیں کہ صرف نئی باتیں ہی کی جائیں۔ دوسرا کوئی کہتا ہے تو اپنے سوچے ہوئے کو زبان مل جاتی ہے۔ کوئی تصدیق ہو جاتی ہے۔ یقین کرو۔ میری تو ہر دم یہی کوشش رہتی ہے کہ مجھے کچھ یاد نہ رہے، کچھ بھی۔ لیکن میں، میں کیا کروں۔۔۔" میری آواز بھرّانے لگی۔

"ایسے نہیں، ایسے کوئی کیسے کچھ بھول سکتا ہے۔ اِس کے لیے تو بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں، اور یہ تو گرہوں پہ ہے کہ وہ کتنی پڑی ہوئی ہیں، نقش کتنا گہرا ہے۔ پر آدمی سامنے کی زندگی کیوں کھو دے۔ دھوپ ہی میں کیوں کھڑا رہے۔ رما کے بہ قول آدمی چھوٹی چھوٹی چھاؤں سے کیوں کنارہ کش رہے۔"

مجھے یہی حیرت ہو رہی تھی کہ رما اور جولین کی باتوں میں کیسی مماثلت ہے۔ "لگتا ہے، رما نے سبھی کچھ دُہرا دیا ہے۔" میں نے پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔

"وہ ایک نفیس لڑکی ہے، کہہ رہی تھی کہ مجھے خوشی ہو گی، اگر میں ظہیر صاحب کے کسی کام آسکی اور کہہ رہی تھی، یہاں بمبئی کی بھیڑ بھاڑ میں سکون کی بہت سی جگہیں ہیں، میرا جی چاہتا ہے کہ میں انھیں وہاں لے جاؤں۔ میں نے کہا۔ یہ تو بہت اچھا ہو گا۔"

"وہ بالکل اپنے بھائی کے مانند ہے، دوست، دردمند مگر شاید وہ مجھے مریض سمجھتی ہے کوئی۔"

"مریضوں کی کمی نہیں ہے اس شہر میں۔"

"میں بھی کسی مریض سے کیا کم ہوں۔"

"ایسا مت کہو، میرا خیال ہے، اُسے تمھارے بارے میں اتنا کچھ معلوم نہیں ہے، ویسے بھی تو کوئی کسی سے متاثر ہو سکتا ہے۔"

"ہاں ہاں۔" میرے ہونٹ پھڑپھڑا کے رہ گئے۔

"اُس سے مِل کے اچھا لگتا ہے۔ یہاں سبھی کے دل میں اُس نے گھر بنایا ہے۔ اپنی دل نشین باتوں، بے تکلفی، دوسروں کے کام آنے کے جذبے اور اپنی ذہانت سے۔ اُس کے ساتھ بیٹھ کے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ میں سمجھتی ہوں، تم اُس کے ساتھ چند دن گھوم پھر کے دیکھو، کچھ اور نہیں تو یہ کڑا وقت نکل جائے گا۔ رما ایک ایسی لڑکی ہے جو کبھی کبھی، کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ میں نے اُس سے کہا تھا کہ وہ ایک قیمتی لڑکی ہے۔ میری بات سُن کے وہ کھل کھلا پڑی لیکن یہ سچ نہیں ہے کیا؟ اتنی بہت سی خوبیاں ایک شخص میں

کب اور کہاں۔۔۔۔۔" اُس نے اپنی لمبی پلکیں اُٹھا کے تائیدا نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں چپ رہا۔ وہ بے کلی سے بولی۔ "نہیں کیا ایسا؟"

"نہیں۔" میں نے چونک کے کہا۔ میرا دل بُری طرح دھ لگا تھا۔ مجھ سے کچھ اور نہیں کہا گیا۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ کیا کہنا چاہیے۔

وہ دیر تک گُپ چپ بیٹھی رہی۔ پھر معاً مسہری سے اُٹھ گئی۔ "مجھے اب چلنا چاہیے۔"

"کیوں، کیا بات ہے؟" میں نے بے ترتیبی سے کہا۔

"بس، بہت وقت ہو گیا ہے۔"

"پھر جانا۔"

"آجاؤں گی پھر۔" وہ تذبذب سے بولی۔

اُسی لمحے باہر سے کسی کی چاپ سُنائی دی۔ جولین نے شانے پر دوپٹا درست کیا اور ایک مسکراتی نظر مجھ پر ڈال کے جلدی سے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ میں نے بھی اُسے نہیں روکا مگر ابھی کمرے ہی میں تھی کہ دروازے پر فرخ نمودار ہوئی۔ "ارے، آپ یہاں ہیں جولی۔" فرخ کی چہکتی آواز کمرے میں گونجی۔ مجھ پر اُس کی نگاہ بعد میں پڑی، وہ پریشان سی ہو گئی، خجل بھی ہوئی۔ اُس نے گھبراہٹ کے عالم میں مجھے سلام کیا۔ جولین ٹھیر گئی اور فرخ کا ہاتھ تھامے ہوئے دوبارہ میرے پاس آگئی۔

"کیسی ہو تم، تم فرخ!" مجھے اپنا ہی لہجہ مصنوعی لگا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کے بے اختیار اُسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ کچھ سہم سی گئی تھی۔ میرے سارے جسم میں یکایک ایک لہر سی اٹھی۔ میں اُسے اپنے سینے سے لگانا اور خوب پیار کرنا چاہتا تھا۔ میں اُسے بازوؤں میں سمیٹ لیتا لیکن جولین پاس ہی کھڑی تھی۔ یکایک کسی نے ٹھوکا سا دیا، جولین کیسی اجنبیت محسوس کرے گی۔ چند لمحے پہلے وہ میرے پاس بیٹھی تھی اور میری خاطر اپنا سینہ جلا رہی تھی، کئی بار کے لیے بھی میرے بازو منڈلائے تھے۔ میرا جی چاہا تھا کہ میں اُسے سینے سے لگا کے بہت روؤں، اُس سے کہوں کہ میرے لیے کیوں اتنی آزردہ ہوتی ہو، تمھاری ہر دلیل درست ہے، سب سچ ہے لیکن میں کیا کروں، بس اچانک سب کچھ جیسے میرے ہاتھ سے چھن جاتا ہے۔ میں جتنا بھی سمیٹ کے رکھتا ہوں، کسی لمحے سب بکھر جاتا ہے۔ آدمی اپنے بس کی چادر بھی تو بس سے زیادہ نہیں کھینچ سکتا۔ میں نے خود سے پوچھا، جولین کے وقت میرے بازو کیوں اینٹھ گئے

مجھے اِس سوال کا کوئی جواب نہیں ملا۔ شمار میں کیا فرخ پہلے ہے، جولین بعد میں؟ ایسا بالکل نہیں تھا۔ جولین کے لیے بھی دل میں اتنی ہی ہمک اُٹھتی تھی جتنی فرخ کے لیے۔

وہ دونوں مسہری پر میرے قریب بیٹھ گئیں۔ فرخ میرے سے چمٹ گئی۔ اُس کے انداز میں وارفتگی تھی جیسے وہ اپنے کی جزوِ جاں بن جانے کو بے چین ہو۔ اُس کی آنکھوں میں ستارے چمک رہے تھے، چہرے پر لالی پھوٹی پڑتی تھی۔ اُسے یوں لالہ زار کے جولین کی بازگشت میرے رگ و پے میں گونجتی تھی۔ آدمی کو اپنے لیے نہیں تو دوسروں کے لیے روشنی بن جانا چاہیے۔ اُس ایک اور سوال نے مجھے حیران و ہراساں کیا۔ جولین اس قدر پاس کے مجھ سے اتنی کھنچی کھنچی کیوں بیٹھی ہے؟ اِس میں فرخ جیسی شیفتگی بے ساختگی کیوں نہیں ہے؟ بے شک اُس کی آنکھوں میں فرخ سے چمک اور رخساروں پر فرخ سے گہری سرخی تھی مگر مجھے کوئی جواب نہیں سوجھا اور میں نے جولین کا امتناع اپنی کسی کوتاہی کے عمل پر محمول کیا، میں نے جانا کہ یہ میرے کسی سوال کا جواب ہے مگر کون سے سوال کا جواب؟ اور کون سی کوتاہی کا ردِ عمل؟

جولین کے ٹوکنے پر فرخ اُٹھ گئی۔ دونوں نے حکمیہ انداز میں جلد از جلد تیار ہو جانے کی ہدایت کی تاکہ وہ ناشتہ لا سکیں۔ اب ناشتے کا وقت نہیں رہا تھا اور مجھے کوئی خواہش بھی نہیں تھی لیکن انھوں نے سُنی اَن سُنی کر دی اور کمرے سے چلی گئیں۔ میں تادیر مسہری پر بے ارادہ بیٹھا رہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ اپنی استواری کی کوئی کوشش تھی یا مجھے کسی چیز کی تلاش تھی۔ نہانے کے دوران بھی میری نگاہیں بھٹکتی رہیں، میں اپنے آپ سے وضاحتیں کرتا رہا۔ دو بالٹی پانی سے صرف باہر کی گرد صاف ہوتی ہے، اندر کے گرد و غبار کے لیے تو سمندر بھی ناکافی ہے۔

(۲)

بتھل کے انتظار میں دوپہر کا کھانا دسترخوان پر نہیں لگایا گیا تھا۔ اُس کی واپسی دو بجے کے قریب ہوئی۔ اتنی دیر کسی سبب کے بغیر نہیں ہوئی ہو گی۔ ابا جان کی موٹر بھی اُس کے پاس تھی۔ پھر پوچھنے سے کچھ حاصل نہ تھا، یہ بتھل کی مرضی پر منحصر تھا کہ وہ مجھے بتائے یا نہیں ماری سے ملاقات کے بارے میں کچھ بتائے یا نہیں۔ حال مجھے ایک تسلی تھی کہ جمرو بھی اُس کے ساتھ گیا تھا۔ میں اُس سے پوچھ سکتا تھا۔ میں نے تحمل کیا۔ کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو ان کے چہروں پر ضرور نظر آجاتی۔ بتھل کے چہرے پر نہیں تو جمرو کے چہرے پر۔ وہ مضمحل اور مایوس ضرور دکھائی دیتا تھا، مضطرب اور متوحش نہیں۔

کھانے کے بعد سب بیرونی کمرے میں آبیٹھے، پیرو دادا کے خاص کمرے میں بتّبتی چاچا نے حقہ پہلے سے تیار کر رکھا تھا۔ تین بج رہے تھے۔ ہم مردوں کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔ ابا جان نے منیر علی اور مولوی اکرم کی طرف دیکھ کے بتھل سے کہا کہ اگر اُس کی طبیعت بحال ہو تو وہ کچھ بات کریں۔ بتھل نے حقے کی نے مُنہ سے ہٹالی اور کسی قدر تردد کا اظہار کیا کہ ایسی کیا بات ہے؟ ابا جان نے جواب دینے کے بجائے کسمساتے ہوئے پوچھا کہ آیندہ کے لیے اُس کا کیا ارادہ ہے؟ بتھل نے استفسار کیا کہ اُن کا اشارہ کس طرف ہے، ابا جان نے دبی آواز میں کہا کہ رانی اور گیتا کے بارے میں اُس نے کیا سوچا ہے؟

"کاہے کا سوچنا بادا؟"

ابا جان نے صراحت کی کہ اُن کا مدعا ذرا قبل از وقت ہے لیکن بے حقیقت نہیں ہے۔ جلد یا بہ دیر ہمیں کسی نتیجے پر پہنچنا ہے۔ اِس وقت وہ دونوں سامنے نہیں ہیں۔ ہم سب یہاں موجود ہیں۔ بہتر ہو گا کہ ہم ابھی اس معاملے پر کچھ غور و فکر کر لیں۔ یہ ایک مشکل مرحلہ ضرور ہے لیکن زندگی کی یہی روش ہے حقیقت سے کہیں مفر نہیں ہے۔

"آپ بولو، آپ کے مَن میں کیا ہے۔" بتھل کا لہجہ ناخوش گواری سے عاری نہیں تھا۔

"ہاں۔" ابا جان نے نرمی سے کہا۔ "میں نے جو سوچا ہے یا جو مجھے مناسب لگتا ہے، وہ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ میری رائے میں گیتا اور رانی کو جتنی جلد ہو سکے، یہاں سے منتقل کر دیا جائے۔"

ابا جان نے بتھل کی پیشانی پر ابھرتی سلوٹیں ضرور دیکھ لی ہوں گی مگر اُنھوں نے کسی تامل کے بغیر اپنی بات جاری رکھی اور بتھل سے کہا، یقیناً اِس مکان سے اُن کی وابستگی جذباتی ہے اور اُنھی دِلوں کی کیا، ہم سب کے لیے یہ جگہ پیرو کی یادگار کی حیثیت رکھتی ہے تاہم جب تک وہ دونوں اِس مکان میں رہیں گی، ذہنی اور قلبی طور پر منتشر رہیں گی۔ اِس عمارت کے گوشے گوشے میں پیرو موجود ہے۔ اِس کی پرچھائیاں اُن کا غم تازہ کرتی رہیں گی۔ اتنے لوگوں کی ہمہ وقت موجودگی، نگہداشت اور تسلیتوں سے اتنا ہوا ہے کہ اُن کا حوصلہ بندھا رہا ہے مگر ظاہر ہے، یہ سارے لوگ مستقل یہاں نہیں رہ سکتے۔ آج نہیں تو کل، اپنے اپنے گھر چلے جائیں گے۔ انھیں جانا بھی چاہیے۔ یہ مکان بھی اتنا بڑا نہیں کہ سب یہاں رہ سکیں اور

نہ عملاً یہ ممکن ہے اور بھی... اور بھی کئی باتیں ہیں۔

مجھے خدشہ تھا کہ بٹھل ضرور برہمی کا اظہار کرے گا لیکن اُس نے زبان بند رکھی۔ ابّا جان نے پھر کچھ کہنا چاہا۔ اُسی وقت منیر علی نے دخل دیا۔ "بات یہ ہے بھائی صاحب! دل میں کوئی فرق مت لائیے۔ بخدا یہاں سے جانے کے لیے کسی نے ایک لفظ بھی نہیں کہا ہے۔ کوئی بھی یہاں سے جانا نہیں چاہتا۔ سب کی ایک ہی کوشش ہے کہ کسی طرح اُن دونوں بدنصیبوں کا دکھ بٹا سکیں لیکن اب اِس مکان میں خود گیتا اور رانی کا رہنا زیادہ مناسب نہیں ہے۔ پہلے کی بات اور تھی۔ پیرو بھائی نے اپنی یہ جنت ساری دُنیا سے چھپا کے رکھی تھی۔ اِس علاقے میں کسی کو بھی..." منیر علی نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "زیادہ بہتر تو آپ ہی سمجھتے ہوں گے۔ کسی کی زبان کون روک سکتا ہے۔ طرح طرح کی باتیں پھیل رہی ہیں۔ پولیس کے لوگ یہاں پورے تین دن چکّر لگاتے رہے ہیں۔ اُنھوں نے جانے کیا زہر اگلا ہے۔ خُدا اُس وقت پیرو بھائی بھی ساتھ تھے۔ صفدر بھائی کہتے ہیں، اُنھوں نے پیرو بھائی سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا کہ کیا ہی اچّھا ہو، وہ بھی یہیں منتقل ہو جائیں جیسا کہ توقع تھی، جواب میں پیرو بھائی نے کہا کہ اِس سے بڑی خوشی کی کیا بات ہو سکتی ہے۔ آپ کو کچھ یاد ہے؟" منیر علی نے بٹھل سے پوچھا۔

بٹھل سر ہلا کے رہ گیا۔

"گزشتہ دو دن سے صفدر بھائی وہاں جا رہے ہیں۔ خاصا کام مکمل ہو چکا ہے۔ جو رہ گیا ہے، وہ ہم وہاں جا کے اپنے سامنے پورا کرا لیں گے۔ اُس مکان کی خوبی یہ ہے کہ ایک ساتھ رہنے کے باوجود سب پوری خلوت، اپنے مزاج اور منشا کے مطابق رہ سکتے ہیں۔ گنجائش ہی گنجائش ہے وہاں، اور سب سے بڑی گنجائش تو دل کی ہے۔ سچ تو یہ ہے، اِسی مقصد سے، مِل جُل کے رہنے کی غرض سے اُسے خریدا گیا تھا۔" منیر علی نے ٹھیر کے ہماری جانب نگاہ کی کہ شاید ہم میں سے کوئی اُن کی ہم نوائی کرے مگر جب کوئی کچھ نہ بولا تو اُنھوں نے کسی قدر تیز آواز میں بٹھل سے پوچھا۔ "آپ نے غور کیا بھائی؟"

"ہاں بابا!" بٹھل نے سرد لہجے میں کہا۔

"پھر آپ کا کیا خیال ہے؟"

"کیا، کیا بولنا ہے اپنے کو۔"

"یہ تو صرف ایک مشورہ ہے، آپ کے ذہن میں کچھ اور ہو تو بتائیے۔"

"وہ سب ٹھیک ہی بولتے ہو آپ۔"

"نہیں، میرا کچھ نہیں، مَیں تو..." منیر علی کی زبان لکنت کرنے لگی۔ "آپ فرمائیے۔"

"ابھی پہلے اُن سے بھی پوچھ لو بابا۔"

"بالکل درست مگر وہ بے چاریاں کیا کہیں گی۔ اب اُن کے پاس کہنے سننے کے لیے رہ کیا گیا ہے۔ وہ تو ہر حال میں راضی بہ[illegible] ہیں اور اچھی طرح جانتی ہیں کہ ہم اُن کی بہتری ہی کے لیے کوئی [illegible] کریں گے۔ سُنا ہے کل رانی کے کوئی بھولے بسرے قریبی عزیز [illegible] بعد آئے تھے، اُنھوں نے رانی سے کہا تھا کہ اب وہ چاہیں تو اپ[illegible] خاندان میں واپس آ سکتی ہیں، تمام تلخیاں اُن کے شوہر کے وقت تک تھیں۔ تفصیل تو مجھے نہیں معلوم، لیکن سُنا ہے، رانی نے شدّت سے انکار کر دیا۔ بہر حال صبح جولین کی ماں اور چمپا بیگم نے یہاں سے جا[illegible] کی بابت اُن کا عندیہ لینے کی کوشش کی تھی، دونوں چپ ہو گئیں۔"

"ابھی تو دسواں بھی نہیں ہوا ہے بابا۔"

"اللہ آپ کو خوش رکھے، مَیں نے بھی یہی کہا تھا۔ بے شک ابھی تو کم از کم اُنھیں یہیں رہنا چاہیے۔" منیر علی نے یاس سے ک[illegible] "ہے تو بہت عجیب سی بات۔ بھرا پُرا گھر ہے اور اپنا گھر اپنا ہی ہے۔ اِسے چھوڑنا اُن کے لیے دوسرے بڑے صدمے سے کم نہ ہوگا۔ پیرو بھائی نے یہ مکان اپنے لیے نہیں، اُن کے لیے بنایا تھا لیکن ہر چیز اختیار میں نہیں ہوتی۔ جانے ہی کا مرحلہ مشکل ہے لیکن اللہ نے چاہا، ایک بار وہ یہاں سے چلی گئیں تو اُنھیں اتنا قلق نہیں ہوگا۔ اُنھیں اندازہ ہوگا کہ گھر تو مکینوں سے ہوتا ہے۔ یوں چھوٹی بڑی چار دیواریاں تو ہر جگہ ہوتی ہیں۔ دوسری جگہ بھی اُن کا اپنا گھر ہوگا۔ صفدر بھائی نے اُن کے لیے اور بہت کچھ سوچا ہے، جس کا اظہار سرِ دست مناسب نہیں ہے۔ ایک پیرو بھائی کو تو ہم واپس نہیں لا سکتے۔" منیر علی گلوگیر آواز میں بولے۔ "البتہ جو اِ مکان میں[illegible] انشا اللہ اُس میں کوئی کوتاہی نہیں ہوگی۔ اتنے دنوں میں ہم لوگ[illegible] کے بارے میں گیتا اور رانی نے اتنا تو..." منیر علی نے اپنی آنکھوں سے چھلکتے آنسو چھپانے کی کوشش کی مگر اپنی بلکتی ہوئی آواز نہ چھپا سکے، کہنے لگے۔ "میرا خیال ہے، کسی موزوں وقت آپ اُن سے بات کر لیجیے گا۔" بٹھل حقہ گُڑگُڑاتا رہا۔

منیر علی نے کچھ دیر انتظار کیا تاہم اُنھوں نے ساری تائید[illegible] تردید خود کر دی تھی۔ بٹھل اُن سے اور کیا کہتا۔ منیر علی خاموشی سے اُٹھ گئے۔ اُن کے ساتھ ابّا جان اور مولوی اکرم بھی اُٹھ گئے۔ جمرو[illegible]، مارٹی اور ٹنگو بیٹھے رہے۔ پھر وہ بھی چلے گئے۔ مَیں اکیلا رہ گیا۔ [illegible] بٹھل سے جانے کیا کچھ کہنا اور سُننا چاہتا تھا۔ جبھی باہر چلنے [illegible] لیے جمرو کے اشارے پر مَیں نے انکار کر دیا تھا۔ مَیں لفظ ڈھونڈتا [illegible] لیکن لفظ تو بعد میں آتے ہیں۔ مجھے کوئی سرا ہی نہیں مل رہا تھا۔ [illegible] بہت سی باتیں تھیں کہ اوّل و آخر کی ترتیب نہیں ہو پاتی تھی [illegible] دل کی گراں باری کا احساس ہوگا۔ پھر مَیں نے سوچا، بہتر ہے [illegible] ہی مجھ سے کوئی سلسلہ جنبانی کرے لیکن اُسے تو جیسے میرے موجود ہونے کی خبر ہی نہیں تھی۔ آدمی کی موجودی کا تعلق اُس کے جواز سے ہے۔ اکارت آدمی کا ہونا نہ ہونا یکساں ہے۔ مَیں اُس کی نظر میں کسی بے کار محض کی حیثیت رکھتا تھا۔ مجھے ٹھیک سے بات کرنا ہی کب آتا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ مَیں صرف ہذیان بک سکتا ہوں، صرف [illegible]یشان کر سکتا ہوں۔

آخر مَیں بھی وہاں سے اُٹھ گیا۔ میرا قیاس اتنا غلط نہیں تھا، [illegible] کے بُت میں کوئی جُنبش نہیں ہوئی۔ اُس نے سر اُٹھا کے ایک [illegible]

[illegible]ہیں سمجھے، کیا کچھ فسانے بنا کے، فسانے سُنا کے گئے ہیں۔ تعزیت کا سلسلہ جاری ہے۔ محلّے کی آسودہ حال عورتیں دیکھنے میں تو بڑی سلیقہ مند اور معاملہ فہم معلوم ہوتی ہیں مگر بچیاں بتائیں گی کہ ان میں سے کتنی پُرسا دینے، ہم دردی کا اظہار کرنے آئی تھیں اور کتنی سُن گن لینے اور تماشا دیکھنے۔" منیر علی نے رُک کے بٹھل کی طرف دیکھا اور ہچکچاہٹ سے بولے۔ "سمجھ رہے ہیں آپ؟"

بٹھل کے ہونٹ باہر نکل آئے تھے۔ اُس نے کچھ نہیں کہا۔

"یہ وجہ ہے۔" منیر علی کی آواز جھر جھرانے لگی۔ "یہ مکان سارے علاقے میں مشہور ہو گیا ہے۔ آپ کہیں گے، ان کی فکر کیوں کرتے ہو۔ لوگ تو جو منہ میں آیا، بک دیتے ہیں۔ ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، چارہ کچھ نہیں ہے لیکن اُن دونوں نے کیا قصور کیا ہے۔"

منیر علی کی بات بٹھل کی سمجھ میں آ رہی ہوگی جبھی وہ چپ بیٹھا رہا۔ ابّا جان کی نسبت منیر علی کی زبان بل نہیں کھا رہی تھی لیکن وہ بھی کھُل کے نہیں کہہ پا رہے تھے کہ پیرو نے آخر یہ مکان سب سے چھپا کے کیوں رکھا تھا، اپنے قریب ترین ساتھیوں سے بھی۔ اگر اُس کی کوئی وجہ تھی تو وہ اب بھی موجود ہے۔ اگرچہ پیرو سامنے نہیں ہے لیکن ہم ہیں، وہی پاڑے کے لوگ۔ پیرو دادا کی ارتھی اُٹھتے وقت بمبئی کے سارے دادا یہاں جمع ہو گئے تھے۔ علاقے کے ہر شخص نے یہ اژدحام دیکھا تھا۔ ارتھی کے جلوس میں بٹھل سب سے آگے تھا۔ اُنھیں اچھی طرح معلوم ہو جانا چاہیے کہ بٹھل کون ہے جیسے بمبئی کا سب سے بڑا دادا پیرو سر آنکھوں پہ بٹھاتا تھا، جس نے پیرو کے بعد اُس کے پاڑے کی گدّی سنبھالی تھی اور بھی بہت سی باتیں تھیں۔

جو لوگ پیرو دادا کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں اور اُس جیسی موت مرتے ہیں، اُن کے متعلق طرح طرح کی کہانیاں تراش لی جاتی ہیں۔ منیر علی نے بٹھل سے یہ سب کچھ نہیں کہا تھا لیکن اشارہ ہی کافی تھا۔ بٹھل نے پلٹ کے اُن سے یہ نہیں کہا کہ یہ مکان نہ محلّے والوں کی میراث ہے، نہ گیتا اور رانی کسی کے رحم و کرم کی محتاج ہیں۔ جس کی زبان بہکتی ہے اور جس کی آنکھ میں تنکے زیادہ چبھتے ہیں، اُسے دیکھ لیا جائے گا اور یہاں کسی کو یہ صورتِ حال گراں گزرتی ہے تو وہ چلا جائے۔ ابّا جان، منیر علی، مولوی اکرم، جولین وغیرہ جس کا جی چاہے، اپنے گھر چلا جائے۔ بٹھل اور بھی بہت کچھ کہہ سکتا تھا لیکن وہ سرنگوں بیٹھا رہا۔ شاید اِس لیے کہ منیر علی اور ابّا جان کے مدّعا میں کسی قسم کی آلائش نہیں تھی۔ اُنھیں گرد و پیش کے لوگوں کا اتنا خیال نہیں تھا جتنا گیتا اور رانی کے آب گینے کا پاس تھا۔ اُنھیں پیرو نے پھولوں کی طرح رکھا تھا۔ پیرو کی جیب میں ہر وقت چاقو رہتا تھا اور پاڑے کے آدمی کے لیے چاقو تو ایک علامتی چیز ہے، اُس کے دست و بازو اُس کے ہتھیار ہوتے ہیں۔ اُس کا ارادہ ہی چاقو ہوتا ہے۔ پیرو نے اپنی بیوی اور بیٹی کو اپنا یہ زور نہیں دکھایا تھا کیونکہ گھر اور پاڑے کے راستے شاید ایک نہیں ہوتے۔ پاڑے کے آدمیوں کو پاڑے اور گھر میں مطابقت اور مفاہمت کی یہی مشکل پیش آتی ہوگی۔ پیرو نے اسے یک سر دو حصّوں میں منقسم کر دیا تھا۔ اُس کی زندگی ساتھ دیتی تو یہی کچھ رہتا۔ یقیناً پیرو کے ذہن میں اچھی طرح واضح ہوگا کہ آگے کسی مرحلے پر اُسے کوئی فیصلہ کرنا پڑے گا۔ اُس نے کیا سوچا تھا، یہ تو وہی جانتا تھا لیکن گیتا اور رانی اور اپنے گھر سے اُس کی گہری وابستگی سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ کبھی کسی موقع پر پاڑے سے مکمل انقطاع کی کوئی صورت اُس کے ذہن میں ضرور ہوگی۔ ممکن ہے اُس نے بٹھل سے اس بارے میں کبھی کچھ کہا ہو۔

بٹھل کی خاموشی پر منیر علی نے ٹوکا۔ بٹھل نے بھاری آواز میں منیر علی ہی سے پوچھا کہ پھر ان کی کیا رائے ہے؟ "کیا بتاؤں بھائی! مَیں نے تو اسی لیے آپ سے، آپ کے سامنے ساری..." منیر علی بے چارگی سے ابّا جان کی طرف دیکھنے لگے۔

"فیض آباد چلنے کا کریں بابا؟"

"میرا بھی یہی خیال تھا۔" منیر علی نے بے تابانہ کہا۔ "وہاں

زرّیں بٹیا ہے۔ اُس کا آپ کو معلوم ہے۔ اُس کی چھاؤں سب کے لیے عام ہے، سب کے لیے یکساں ہے۔ تلافی تو ممکن نہیں لیکن زرّیں سے مِل کے دونوں کو خوشی ہوگی۔ وہ سبھی کو راس آتی ہے۔ خدا نے اُس کی نگاہ اور زبان میں بڑی تاثیر دی ہے۔ مَیں آپ کو بتاؤں، میں نہیں کہہ سکتا، اگر زرّیں بیٹا فیض آباد میں نہ ہوتی تو جیسلمیر سے اپنا آبائی گھر چھوڑنے کا صدمہ، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کس طرح برداشت ہو پاتا۔ میری بھی یہی رائے تھی مگر صفدر بھائی بھی درست کہتے ہیں ان کے خیال میں ماحول کی اتنی بڑی تبدیلی گیتا اور رانی کے لیے ناسازگار بھی ہوسکتی ہے جیسلمیر سے میرے فیض آباد منتقل ہونے اور رانی اور گیتا کے وہاں جانے میں بڑا فرق ہے۔ صفدر بھائی کی بات میری سمجھ میں آتی ہے۔ گیتا اور رانی کا ابھی کچھ عرصے یہیں بستی میں رہنا مناسب ہے۔ اتفاق سے صفدر بھائیؒ نے چند دن ہوئے اسی شہر میں ایک ایسا مکان حاصل کرلیا تھا جہاں سب سما سکتے ہیں کسی محل سے کیا کم جگہ ہے وہ۔ آپ نے بھی اُسے خوب دیکھا ہے۔

نظر میری طرف دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی۔ اِس بے خبری کا سبب اُس کی نظر میں میری بے مائگی و بے بضاعتی کے سوا کیا ہوسکتا تھا۔ آدمی اتنا گم تو نہیں ہوسکتا اور بتھل جیسا آدمی؛ جس کی بینائی کے لیے آنکھیں کھلی ہونا ضروری نہیں تھا۔

باہر سبزے پر جمرو، شامو، مارتی اور ٹنگو کوئی نہیں تھا۔ گلی میں بھی وہ نظر نہیں آئے۔ میں اِردگرد کی گلیوں میں گھومتا رہا۔ دھوپ اُوپر لوٹ رہی تھی۔ گلیوں میں راہ گیروں کی تعداد اتنی ہی تھی جتنی عموماً بڑی بڑی کوٹھیوں اور بنگلوں کے علاقے میں ہوتی ہے۔ مَیں آگے نکل گیا۔

یہ میرا گمان نہیں تھا۔ شروع میں، گو مَیں نے اِسے واہمہ ہی سمجھا تھا۔ ایک دو نہیں، یکے بعد دیگرے کئی راہ گیر مجھے دیکھ کے ٹھٹکے، ممکن ہے، اباجان اور منیر علی اُس طرف اشارہ نہیں کرتے تو مجھے کچھ احساس نہ ہو پاتا۔ مَیں اُن میں سے کسی کو نہیں جانتا تھا۔ ظاہر ہے، وہ مجھے پہچانتے ہوں گے، اُن کے جسم کھنچ سے گئے۔ اُن کی آنکھوں میں حیرانی کے ساتھ دہشت کی آمیزش بھی تھی۔ بہت سے خوف کدورت کی طرف جاتے ہیں، عناد کی طرف۔ بتھل جیسے اڈّے پاڑے کے کسی آدمی کے لیے یہ علامتیں کسی تکدّر کا باعث نہیں ہوتیں۔ یہ تو معمول کی بات ہے، تماشے کا حصّہ ہے پھر اڈّے پاڑے کا آدمی ہونے سے کیا حاصل؟ بتھل پیرو کے گھر میں بیٹھا تھا ورنہ اُسے اتنا کچھ سننے کی عادت نہیں تھی۔ کون جانے کہ جسم سے

آزادی کے بعد روح کا اپنے متعلقین سے سروکار بھی ہوتا نہیں، نہ ہونے کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ انسانوں کو یہی چاہیے کہ ایسا ہوتا ہے اور ہوتا ہے تو روحیں اپنے پُرسانِ اثبات سے یقیناً آسودہ ہوتی ہوں گی۔ اور پیرو تو گیتا اور [...] صورت میں ویسے بھی موجود تھا۔ رُوح کی خوشی و ناخوشی کا [...] ایک اَن دیکھی چیز ہے۔

گلیوں سے گزرتا ہُوا مَیں بہت دُور چلا آیا۔ اندھیرا پھیل [...] تھا۔ اندھیرا ہو جانے پر مجھے کچھ سکون سا ملا۔ جیسے میں محفوظ ہو [...] یا میرا کوئی حصار ٹوٹ گیا ہے۔ آگے سڑکوں پر گو تیز روشنی تھی [...] کی روشنی کی طرح تسلسل سے نہیں۔ کتنی ہی روشنیاں کرلی جائیں تو رات ہی رہتی ہے۔ جیسا کہ کسی نے کہا ہے، اندھیرا کرنا آسان [...] کرنا مشکل ہے۔ گھر واپس جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ میں چلتا [...] جتنی دُور ہوتا گیا، مجھے ایسا لگا جیسے میرے جسم و جاں کے روز [...] رہے ہیں۔ آدمی بھی مکان کے مانند ہوتا ہے، دریچے دروازے سب ہوتے ہیں اس میں۔ کبھی یہ ایسے بند ہوتے ہیں کہ کھلتے نہیں۔ بہت دنوں بعد، مجھے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے زمانوں [...] مَیں یوں اکیلا صرف اپنے ساتھ سڑکوں پہ چل رہا ہوں۔ نہ کو [...] نہ مقصد۔ کہتے ہیں، منزلیں اور مقصد کبھی خود بہ خود پیدا ہو [...] ہیں۔ روزن کھلنا بھی ایک مقصد ہے، تازہ ہوا بھی۔ ہوا [...] در آئے۔ منزلیں بھی آدمی کی طرف آتی ہیں۔ گھر سے چلتے [...] میری آنکھوں میں دُھند سی بھری تھی، سارے جسم میں۔ مجھے [...] آیا، اگر مَیں اور دُور ہو جاؤں تو کیا ہوا یوں ہی چلتی رہے [...] پر ایسی ہی مہربان؟ کچھ اور نہیں تو میرا بوجھ صرف میرے [...] ہوگا، دوسروں پر نہیں۔ میرا آزار مجھ تک محدود رہے گا [...] اس سے متاثر نہیں ہوں گے۔ آدمی سب کچھ کتنا ہی خود تک [...] دوسرے کسی نہ کسی طرح زد پر آجاتے ہیں۔ آزار بھی وبائی [...] کی طرح ہوتا ہے متعلقین کو چھوت کی طرح لگ جاتا ہے [...] بھی ہوتا ہے کہ کوئی اپنے آپ کو ہزار چھپائے، اُس سے نسبت [...] کے مدّعیوں سے کچھ چھپا نہیں رہتا۔ وہ خود اس کا آزار جذب [...] لیتے ہیں ورنہ نسبت ہی کیسی! اس کی صرف ایک صورت [...] آدمی ان کے سامنے ہی نہ رہے پر یہ کہاں ممکن ہے، جنگل ہیں [...] نہیں۔ جولین یہی کچھ تو کہہ رہی تھی جنگل میں آدمی دوسروں سے دور ہو جائے گا اور دوسروں کے لیے مزید آزار کا سبب نہیں [...] لیکن وہ خود جو اپنے ساتھ بستیوں کا گرد و غبار، بستیوں کے [...]

ساتھ لے کے جائے گا۔ مَیں اپنے آپ سے جانے کیسی اُلٹی سیدھی، بے سر و پا باتیں کرتا آگے بڑھتا رہا اور میں نے خود سے کہا، آدمی کو اپنے نسبت داروں کے قرار کا ایسا ہی خیال ہے تو جنگل، بیاباں کیا ایک مرتبہ خود ہی کو خاک بُرد کیوں نہ کر دے۔ کسی نہ کسی دن ویسے بھی یہی فیصلہ ہوتا ہے۔ کبھی کبھی لوگ یہ فیصلہ خود کر لیتے ہیں۔ یوں انھیں مستقل قرار آجاتا ہے اور اُن کے ماتم گساروں کی آگ بھی بھڑکتے بھڑکتے ایک دقت ٹھٹھر جاتی ہے۔ پر جو لوگ یہ فیصلہ نہیں کر پاتے، اُن کی ڈوری شاید مضبوط ہے، اُن کے کشکول میں آرزو کچھ باقی ہے۔ آنے والے دنوں سے کسی رحم اور رعایت کی آس میں وہ ایسا نہیں کر پاتے۔ بدلتے موسم، اپنے اِردگرد ہر لحظہ بدلتی چیزیں انھیں آسرے میں رکھتی ہیں یا پھر انھیں اپنے آپ سے ضد ہو جاتی ہے، اذیت سہنے کی سرکشی۔ وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اُن میں کتنا حوصلہ، آسمان کا کتنا زور ہے۔ اُنھیں ہر دم یہ گداز رہتا ہے کہ نجات کا فیصلہ تو ایک آن کی دُوری پہ ہے۔ اس نتیجے پر پہنچنے سے پہلے، کیا عجب کہ پتھر پگھلنے کا موسم شروع ہو جائے۔

جانے کیا ٹھیک ہے، کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ سب کیا ہوتا ہے، کیا ہونا چاہیے۔ غالباً زندگی کا یہی طور سب سے زیادہ موزوں ہے کہ آدمی اپنی سعی کرلے، کچھ موسموں پر چھوڑ دے اور ہوسکے تو سردیوں کے لیے آگ بچائے رکھے، گرمیوں کے لیے پانی۔ آدمی اپنی بساط سے زیادہ کی طلب کیوں کرے۔ طلب کرے اور اصرار بھی لیکن انکار کے لیے بھی آمادہ رہے۔ بھکاریوں کی طرح جو صدا لگاتے ہیں، لگائے جاتے ہیں اور گھڑکیاں کھا کے اپنا رستہ لیتے ہیں۔ وہ ایک دہلیز پر بیٹھ نہیں جاتے اور دروازہ توڑ کے اندر مکینوں کا گلا نہیں گھونٹ دیتے۔ بھکاری کا کام صدا بلند کرنا ہے۔ کوئی ایک دروازہ تو کھلتا ہے پر کوئی بھی نہ کھلے تو؟ مَیں نے خود سے پوچھا، تو آدمی ایسے ہی سو جائے۔ دوسرے دن صدا لگانے کی ہمّت رہی تو ٹھیک، نہ رہی تو انجام کو پہنچ جائے گا۔ جولین کی باتیں میرے دماغ میں گردش کر رہی تھیں۔ صبح وہ ایک اور بات کہہ رہی تھی کہ آدمی خود کیوں نہ دروازہ بن جائے جن دروازوں پر صدا رسا ہوتی ہے، اُن میں بھی تو آدمی رہتے ہیں۔

مجھے سمت کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ مَیں تو بس سر اُٹھائے چلتا رہا۔ کسی چوراہے پر ایک شخص نے اچانک مجھے ایک طرف دھکا دیا تو میری آنکھیں کھلیں۔ وہ ناتواں شخص جھپٹ کے مجھے ایک طرف دھکیل نہ دیتا تو میں سامنے سے آتی ہوئی ٹم ٹم اور اُس کے منہ زور گھوڑے کی لپیٹ میں آجاتا۔ ایک لمحے کے لیے تو میں سُن ہوگیا۔ میرا جسم جھول گیا تھا۔ کسی دوسرے راہ گیر نے بوڑھے آدمی کی مدد کی۔ دوسرے لمحے میں اپنے پیروں پر کھڑا تھا۔ جانے کیوں میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ عود کر آئی، پھیکی پھیکی۔ ایک آن میں فیصلہ ہو جاتا۔ مَیں نے دبے لفظوں میں بوڑھے کا شکریہ ادا کیا تو وہ خفا ہو کے بولا: ”دارو پی ہے کیا؟“ میری خاموشی پر اُس کے لہجے میں کچھ نرمی آگئی اور وہ میری کمر تھپ تھپاتے ہوئے کہنے لگا: ”خدا نے خیر کرلی۔ یہ سڑک ہے میاں! جوان آدمی ہو، ابھی کیا دیکھا ہے زندگی میں۔ آنکھیں کھلی رکھ کے چلا کرو، گھوڑا بدک جاتا تو ایک تمھی نہیں، اور لوگ بھی لپیٹ میں آجاتے۔“ غلطی میری تھی۔ میں سر جھکائے کھڑا رہا۔ وہ ایک ہمدرد آدمی تھا مجھ سے پوچھنے لگا: ”کیا بات ہے، پریشان نظر آتے ہو؟“ میں نے اُسے یقین دلانا چاہا کہ ایسی کوئی بات نہیں، بس چوک ہوگئی۔ میرے جواب سے وہ مطمئن نہیں ہوا۔ میرا نام پتہ اور منزل پوچھنے لگا۔ پھر میں ابھی کچھ بتا نہیں پایا تھا کہ وہ مضطرب ہو کے بولا: ”کیا کام کرتے ہو؟“ میں سوچ رہا تھا کہ اِسے کیا بتاؤں، کیوں کہ میں تو کوئی کام ہی نہیں کرتا۔ میرے شش و پنج سے اُس نے جانے کیا سمجھا۔ میں نے نہیں دیکھا تھا کہ کب اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور باہر نکالا۔ میرا سارا جسم اکڑ گیا تھا۔ جب اُس نے اپنی بند مٹھی میرے ہاتھ میں کھولنی چاہی۔ مَیں گھبراہٹ میں پیچھے ہٹ گیا۔ سکّے فٹ پاتھ پر گر گئے

اور چھناکے کی آواز آئی۔ ایک بار تو میرے جی میں آیا کہ ہاتھ کھینچ کے بوڑھے کے منہ پر طمانچہ رسید کروں لیکن اُس کی سہمی صورت دیکھ کے میرا ہاتھ اُٹھتے اُٹھتے رہ گیا۔ اِس سے پہلے کہ وہ زمین پر پڑے ہوئے سکے اُٹھا کے مجھ سے کچھ کہتا، مَیں تیز قدمی سے آگے بڑھ گیا۔ اُس کی آوازیں میرا تعاقب کرتی رہیں۔ پھر ٹریفک کے شور میں گم ہو گئیں۔ مَیں نے بھی پیچھے مڑ کے نہیں دیکھا۔

سڑکوں پر بہت بھیڑ تھی اور چیخ پکار بھی بہت تھی۔ اب مجھے سب کچھ سنائی اور دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے اتنی دیر میں بند آنکھوں اور بند کانوں سے راستہ طے کرتا رہا تھا۔ صوت و صورت کی موجودی سماعت و بصارت سے مشروط نہیں ہے۔ گرد و پیش میں اُٹھنے والا شور اور سامنے کی چیزوں سے مراد یہ نہیں ہے کہ انھیں دیکھا اور سُنا بھی جا رہا ہے۔ میرے دست و بازو دیر تک سَن سَناتے رہے۔ اُس وقت مجھے اِس کا اِتنا احساس نہیں ہوا تھا۔ چند لمحے پہلے بیتے ہوئے منظر کا ہر نقش اب شکلیں بدل بدل کے میری آنکھیں خیرہ کر رہا تھا۔ زندگی باقی رہتی تو ہاتھ پیر سلامت نہ رہتے۔ میری جیب میں پڑا ہوا چاقو یوں ہی دھرا رہ جاتا۔ فٹ پاتھ سے اُتر کے میں نے سڑک پر ایک دو قدم بڑھائے تھے کہ عین وقت پر بوڑھے کی نظر پڑ گئی اور اُس نے مجھے آلیا۔ وہ مجھے پہلے سے دیکھ رہا تھا۔ غلطی ٹم ٹم والے کی بھی کم نہیں تھی۔ اُسے گھنٹی بجانی چاہیے تھی۔ ممکن ہے، اُس نے بجائی ہو اور میں سُن نہ سکا ہوں یا وہ بھی میری طرح کسی اور شور، کسی اور خیال میں منہمک ہو۔ آدمی کو اپنے پیش منظر سے کبھی اتنا بے خبر نہیں رہنا چاہیے۔ کہتے ہیں، موت کو ایک بہانہ چاہیے، حالاں کہ موت کو کسی بہانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہر لمحہ موت کا لمحہ ہے۔ ٹل جائے تو دوسری بات ہے، ٹل جائے تو زندگی ہے۔ موت کا نظر انداز کیا ہوا لمحہ زندگی ہے یا یوں کہیے کہ زندگی موت کی رعایت ہے، رسّی کی ڈھیل ہے جو پلک جھپکتے میں کھینچ لی جاتی ہے۔ زندگی بھی بس ایک پل ہے۔ پل پل جُڑ کے بنتی ہے اور ایک اشارے میں ساری پونجی لُٹ جاتی ہے۔ بوڑھا ٹھیک کہتا تھا۔ مجھے کچھ ہو جاتا تو ایک میرا ہی کچھ نہ جاتا۔ یہ خبر محل تک پہنچتی، ابا جان، جولین، فرخ، فریال، فارہہ، اکبر تک تو کیسا کہرام مچتا۔ کون اپنا مُنہ نوچتا، کون دیواروں سے سر پھوڑتا۔ مَیں اِس کا تصور ہی کر سکتا تھا۔ زریں، خانم، شہ پارہ، نیساں، جہاں گیر، کون کون، سب اُجاڑ ہو جاتے۔ پیرو کی موت پر کسی نے کہا تھا کہ موت کا اصل عذاب تو زندہ رہ جانے والے پسماں دگان پر ٹوٹتا ہے۔ ایک آدمی کی موت جانے کتنوں کو ویران کر دیتی ہے، ایک آدمی کتنے آدمیوں میں زندہ رہتا ہے۔ اپنے لیے نہیں تو اُسے دوسروں کے لیے زندگی پر اصرار کرنا چاہیے۔ جولین کا یہی مطلب تھا کہ اپنے اختیار کی نہیں، اپنے لیے کارگر نہیں تو ایسی زندگی دوسروں کے اختیار پر چھوڑ دینا چاہیے، دوسروں کی امانت سمجھ کے برتنا چاہیے۔

مَیں جولین سے بہت کچھ نہیں کہہ سکا تھا کہ کسی کی زندگی پہلے ہی گروی رکھی جا چکی ہو، کوئی اپنا اختیار پہلے ہی ترک کر چکا ہو، پہلے ہی سے کسی دوسرے کی زندگی گزار رہا ہو تو وہ کیا کرے؟ ابھی کچھ دیر پہلے اگر مجھے کچھ ہو جاتا تو سبھی پر پہاڑ سا ٹوٹ پڑتا مگر ایک دوسرے کے غم گسار بہت تھے، ایک دوسرے کا دُکھ درد بٹا لیتے۔ کسی دن انھیں صبر آ ہی جاتا۔ یہ کوئی گلہ نہیں، یہی ہوتا ہے اور یہی ہونا بھی چاہیے مگر ایک شخص کا کیا ہوتا! یہ تو مَیں جانتا ہوں، وہ جہاں بھی ہے، میری وجہ سے وہ اِس اجیرن زندگی پر مُصر ہوگی۔ اِس دربدری میں کوئی آرزو ہی کورا کی قوت، اُس کی سپر بنی رہی ہوگی۔ مولوی صاحب اُس سے یہی کہتے ہوں گے کہ مَیں بہ ہمہ ہوش و حواس موجود ہوں اور وہ ایک دن مجھے ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ مولوی صاحب نے اتنے دنوں میں خوب سمجھ لیا ہوگا کہ کوئی تسلّی دلاسا، کوئی عیش آرام اُس کے لیے اِس سے بڑا نہیں ہوگا جتنا میرے نام کا دلاسا اور میرے ذکر کا آرام اور مولوی صاحب بھی اُس سے اتنا نہ کہہ پاتے ہوں گے، جتنا وہ خود سے کہتی ہوگی۔ آدمی کا دِل خود ایک صدا اور روشنی ہے۔ پہلی بار کلکتے کے ہوٹل میں جب ہم چند کمینے لوگوں کی نظر میں آ گئے تھے اور وہ اُسے مجھ سے جُدا کرنے کے درپے تھے تو وہ بہت نڈھال ہو گئی تھی۔ اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں گھبرا گھبرا کے کہتی تھی کہ بس میرے قریب رہو۔ مجھے چھوڑ کے کہیں مت جانا۔ مَیں سائے کی طرح اُس کے ساتھ رہتا تھا، حالاں کہ میری سمجھ میں خود نہیں آتا تھا کہ کہاں جاؤں، کون سے گوشے میں سر چھپاؤں، اُسے دُنیا کی نگاہوں سے کیوں کر محفوظ رکھوں۔ ہم دونوں ہوٹل کے کمرے میں بند باتیں کرتے رہتے تھے۔ مجھے اُس کا ایک ایک لفظ یاد ہے، اُسے بھی سب ازبر ہوگا۔ ہم نے بہت سے عہد کیے تھے۔ یہ عہد ہی اُس وقت ہمارے لیے تقویت کا باعث بنے تھے۔ بعد میں انھی نے مجھے زندہ رکھا، اُس کے لیے بھی یہی زندگی رہے ہوں گے۔ ایک دوسرے پر اعتماد سے بڑی توانائی کوئی نہیں ہوتی۔ اُسے مجھ پر ایسا ہی یقین تھا جو اُس نے اندھیری رات میں بُدھ گیا سے بھاگ کے سیدھے میرے گھر کا رُخ کیا تھا اور ابا جان کا بے اعتنائی کا رویہ دیکھ

کے بے سروساماں میرے ساتھ گھر سے نکلنے پر آمادہ ہو گئی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ مجھ سے زیادہ مضبوط اور محفوظ پناہ اُس کے لیے کوئی نہیں ہے۔ اُس نے میری آنکھیں دیکھی تھیں جو ہر دم اُسی کی جستجو میں رہتی تھیں اور میرا چہرہ، جو اُس کے لیے بے قرار رہتا تھا۔ اُس کا دل گواہی دیتا ہوگا کہ میری نگاہیں اب بھی اُس کے لیے بھٹکتی ہیں۔ مَیں جو کچھ سوچا کرتا تھا، منیر علی کی بیٹی زہرہ نے بالکل وہی مجھے بتایا تھا۔ زہرہ نے اُسے خوب دیکھا تھا۔ وہ کہتی تھی، کورا کے چہرے پر بادل سے منڈلائے رہتے ہیں۔ ہر لمحے آنکھوں میں اُمڈتی ہوئی کوئی گھٹا، ذرا چھیڑو تو برس پڑے۔ وہ آہٹوں پر چونک پڑتی تھی۔ زہرہ نے مجھے اُس کا سارا حال بتایا تھا۔ زہرہ کے بہ قول اُس نے کئی مرتبہ کریدنے کی کوشش کی۔ کورا نے کچھ نہیں بتایا۔ وہ بتاتی بھی کیا۔ اپنا ارادہ توانا رکھنے کے لیے آدمی اپنا حال خود میں چھپائے رکھتا ہے۔ میرا بھی کچھ یہی ہے، جولین کو مَیں کیا بتاتا کہ اُس کی ہر دلیل کسی بھی معیار و اعتبار کی رُو سے درست ہے مگر جواب تو کچھ اور آتا ہے، نتیجہ تو کچھ اور ظاہر ہوتا ہے۔ یہ دلیلیں تو مَیں خود کو بھی دیتا ہوں۔ میرا اِن سارے لوگوں کے درمیان کھُلی آنکھوں اور کھُلے کانوں کے ساتھ رہنا اِس کا ایک ثبوت ہے۔ مجھے تو چلتے رہنا، بڑھتے رہنا چاہیے تھا، زمین کے آخری سرے تک، اپنے حصّے کے وقت کے اختتام تک۔ پھر کہیں رُک کے میرے بیٹھ جانے سے اور کیا مراد ہے۔ جتنا کچھ میرے پاس ہے، مَیں نے اُس میں پس و پیش کب کیا ہے۔ مَیں اپنی سی کوشش بہت کرتا ہوں لیکن وہی ٹھہرے ہوئے پانی میں کنکر ڈال دینے کے مصداق، کوئی کنکر کہیں سے آ جاتا ہے اور سب منتشر ہو جاتا ہے۔ اچانک اُس کا سوالی سراپا میرے سامنے آ جاتا ہے، جیسے وہ مجھے بُلاتی ہو اور مجھے ایسا لگتا ہے جیسے مجھ سے کچھ چھینا جا رہا ہو، جیسے مجھ سے کوئی بھول ہو رہی ہو۔ جانے کتنے لوگ یوں ہاتھ پیروں سے ثابت نظر آتے ہیں۔ بہت سارا وزن اُٹھا لیتے ہیں، ضرورت پڑنے پر دیوار بن جاتے ہیں، کوئی آ و سر کسی جانب اُٹھے، تلوار بن جاتے ہیں، اندھے کی لاٹھی بن کے راستہ پار کرا دیتے ہیں۔ پر کون جانے اِن شہ زوروں میں خود کتنا اندھیرا ہے، کتنی پسپائی، کیسی ٹوٹ پھوٹ ہے۔

آگے سڑک کی مرمت کی وجہ سے راستہ تنگ ہو گیا تھا، تب مجھے خیال آیا کہ میں کہاں جا رہا ہوں اور کتنا وقت ہو گیا ہے۔ مَیں نے راستہ پہچاننے کے لیے اطراف میں نظریں گھمائیں۔ یہ جگہ میری دیکھی بھالی تھی۔ جوہو کا علاقہ تھا۔ مَیں بہت دُور نکل آیا تھا، وقت بھی زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ سڑکوں پر گاڑیوں کی کثرت تھی مگر شام کی طرح افراتفری نہیں تھی۔ جوہو سے مجھے کیلاش اور رما کی یاد آئی۔ اُن کا گھر زیادہ دُور نہیں رہ گیا تھا۔ کوئی بات ہی ہوگی جو وہ دو دن سے نہیں آ سکے تھے۔ مَیں نے سوچا، مجھے جا کے پوچھنا چاہیے۔ مَیں تنگ راستے سے گزر گیا لیکن دیر ہو جانے کے خیال سے میرے پاؤں سُست پڑنے لگے۔ مَیں نے سامنے نکڑ پر بنے ہوئے ہوٹل میں وقت دیکھا۔ ساڑھے نو بج رہے تھے۔ مجھے گھر سے چلے ہوئے کئی گھنٹے ہو چکے تھے۔ واپسی کے سفر میں اور وقت لگتا۔ میں کسی سے کہہ کے بھی نہیں آیا تھا۔ اتنی دیر میری غیر حاضری پر سب پریشان ہو رہے ہوں گے۔ سو میں نے گھر واپس جانے اور جلد پہنچنے کے لیے سواری پکڑنے کا ارادہ کیا۔ سامنے سے آتی ہوئی گھوڑا گاڑی میری آواز پر رُک گئی لیکن اچھا ہوا، گاڑی پر بیٹھنے سے پہلے مَیں نے پیسوں کے بارے میں اطمینان کر لینا مناسب سمجھا۔ مَیں نے ابھی کوچوان سے کچھ نہیں کہا تھا، مجھے جیب ٹٹولتے دیکھ کے اُس نے چابک مار کے گاڑی آگے بڑھا دی۔ مجھے یاد تھا، کئی روز پہلے جولین نے چند روپے میرے کُرتے میں ڈال دیے تھے۔ صبح کپڑے بدلتے ہوئے یا تو میں جیب خالی کرنا بھول گیا یا پیسے کہیں گر گئے، خرچ کرنے کا تو کوئی موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اب اتنا لمبا سفر مجھے پیدل طے کرنا تھا۔ کوئی اور چارہ کار بھی نہ تھا، میں تیز تیز قدموں سے بڑھتا رہا۔ شارعِ عام نہ ہوتی تو شاید مَیں بھاگ کے راستہ طے کرتا۔ جلد ہی مَیں نے ایک بڑا فاصلہ گزار دیا۔ پھر ابھی ایک چوراہے سے نکل کے پان کی کسی دکان کے نزدیک آیا تھا کہ مجھے رُکنا پڑا۔ "راجا دادا!" کسی کی چہچہاتی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ وہ دو آدمی تھے، ایک دُبلے پتلے چھریرے جسم کا بیس اکیس سالہ، بڑی مونچھوں والا، دوسرا اُس سے کچھ بڑا اور کسی قدر فربہ۔ اُس کی مونچھیں تلوار کی طرح کھنچی ہوئی تھیں۔ مَیں نے پلٹ کے اُنھیں غور سے دیکھا۔ اُن کے چہرے شناسا معلوم ہوتے تھے، نام ذہن میں نہیں آ رہے تھے۔ مَیں جیسے ہی ٹھیرا، اُنھوں نے لپک کے میرے پیر پکڑ لیے۔ پاٹے ہی کے آدمی لگتے تھے۔ "اپن کو پہچانا دادا؟" چھریرے آدمی نے کہا۔ "اپن جگنو ہے اور یہ، یہ تمھارا غلام۔" وہ اپنے ساتھی کے کندھے پر ہاتھ مار کے اضطراب سے بولا۔ "یہ دیوا ہے۔"

مَیں نے جلدی سے سر ہلایا۔ اُن کے نام بھی میرے لیے نئے نہیں تھے لیکن کچھ واضح نہیں ہو رہا تھا کہ انھیں کس پاٹے پر دیکھا ہے۔ میرا تذبذب وہ بھانپ گئے۔ "اپن کو بھول گیا دادا؟

اپن چھنگا دادا کے پاڑے پر...."

"ہاں ہاں۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "کیسے ہو تم لوگ؟"

"اپن ٹھیک ہے، ایک دم بالکل ٹھیک۔" جگنو نامی شخص بے تابی سے بولا۔ "تم کو ابھی اُدھر پیرو دادا کی ارتھی پر دیکھا تھا، پھر اکھا تین دن، ہم پاڑے پر بیٹھا رہا، ایک بار کو تم کبھی اپن کی طرف بھی آنکھ گھما کے دیکھے... اپن سلام بھی دیا تھا۔"

"مجھے دھیان نہیں رہا۔" میں نے معذرتی لہجے میں کہا۔

"کدھر کو رہتا، اپن کو سارے کا پتہ تھا، اس واسطے بڑھ کے آگے کو نہیں پہنچا۔" دیوا نے اضطراری انداز میں کہا۔ "قسم سے، اپن تم کو بہت یاد کیا دادا!" اُس کی آواز ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

میں نے مسکرا کے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "میں بمبئی میں نہیں تھا، بہت دنوں بعد آنا ہوا تھا، پھر یہاں آ کے کہیں آنے جانے، کسی اور طرف دیکھنے کا وقت ہی نہیں مل پایا۔"

"اپن کو پتہ پڑا تھا کہ ابھی تم ادھر بمبئی آگیا ہے۔ کئی بار سلام کرنے کو اُدھر ہم پاڑے کا پھیرا لگایا، تم نئیں دکھائی دیا، پھر ملا تو ایسا... اکھا الٹا پلٹی کے بعد...." دیوا سر جھٹکنے لگا اور چونک کے بولا۔ "ابھی تھوڑا ہوٹل میں بیٹھنے کا ہے، چائے پانی...."

"نہیں نہیں، مجھے کچھ جلدی ہے، پھر کبھی سہی۔"

"صرف ایک کوپ چائے۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بولا۔

جتنا میں کہہ سکتا تھا، میں نے اُن سے کہا مگر وہ بہ ضد ہوگئے کہ مجھے ایسے نہیں جانے دیں گے۔ ناچار مجھے آمادہ ہونا پڑا۔ ہم تینوں نزدیک کے ہوٹل میں داخل ہوگئے۔ ہوٹل میں بھیڑ زیادہ تھی لیکن انھوں نے کسی نہ کسی طرح جگہ تلاش کر لی۔ میرے لیے کرسی صاف کی، میں نے نہیں دیکھا کہ کب انھوں نے بیرے کو اشارہ کیا تھا۔ بیرے نے ملائی بھری چائے کے ساتھ مکھن ڈبل روٹی، بسکٹ اور سموسوں کی پلیٹیں بہ عجلت میز پر سجا دیں۔ اُن دونوں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ہوٹل میں دست یاب ساری چیزیں منگوا کے میرے سامنے رکھ دیں۔ مجبوراً مجھے کچھ نہ کچھ ہاتھ چلانا پڑا۔ اس دوران وہ حسرت آمیزی سے چھنگا کے پاڑے کے بارے میں بتانے لگے، گدی پر میرے وہاں بیٹھنے اور جانے کے بعد کے واقعات۔ میں انھیں اب اچھی طرح پہچان گیا تھا۔ پہلے دن جب میرے اور چھنگا استاد کے درمیان دیر تک چاقو آزمائی ہوئی تھی، یہ دونوں موقع پر موجود تھے۔ تیواڑی کی سرکوبی کے لیے جو منتخب آدمی اکٹھے کیے گئے تھے، اُن میں بھی یہ شامل تھے اور سارے واقعے کے شاہد تھے۔ پیرو کے پاڑے پر جب تیواڑی کو پکڑ

کے لایا گیا تھا اور بٹھل حجت بسیار کے بعد اپنی جگہ سے اُٹھا تھا اور دوسرے ہی لمحے تیواڑی کی ناک اُس کی ہتھیلی پر تھی۔ چھنگا کے پاڑے پر قبضہ کرنے کے بعد وہاں کے آدمیوں کو قابو میں رکھنے کے لیے میں نے چند دن چاقو بازی سکھائی تھی، یہ دونوں سیکھنے میں پیش پیش تھے۔ اُنھی دنوں کا یہ ذکر کر رہے تھے، اتنا وقت نہیں گزرا تھا مگر اُن کے لہجے کی آزردگی سے لگتا تھا، ایک زمانہ بیت گیا ہے۔ چند دنوں کی مشق کے بعد میں اور وقت نہیں دے پایا تھا، اِسی کا دونوں افسوس کر رہے تھے۔ کہنے لگے، اس کے بعد انھوں نے کئی پاڑوں کا رُخ کیا اور مختلف داداؤں کی جی جان سے خدمت گزاری کی لیکن کسی جگہ اُن کا دل نہیں لگا اور وہ گویا ایک قدم بھی نہ بڑھ سکے۔ بار بار کھونٹے بدلنا دادا کو راس نہیں آتا، اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے وہ پھر اپنے پُرانے علاقے میں آگئے۔ جہاں چھیدا، اُن کا پُرانا ساتھی، چوکی پر بیٹھا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ میری تلاش میں وہ کلکتے بھی گئے تھے۔ وہاں بٹھل کے اڈے پر میں موجود نہیں تھا۔ بٹھل بھی نہیں تھا۔ وہ سچ کہہ رہے تھے۔ اُن دنوں ہم ابا جان کے تعاقب میں تبت کی گھاٹیوں اور پہاڑوں میں بھٹک رہے تھے۔ کلکتے میں انھیں میرے دوسرے ٹھکانے فیض آباد کی بھی سُن گُن ملی۔ وہ فیض آباد نہیں گئے کیوں کہ انھوں نے وہاں میری ناموجودگی کے بارے میں تسلی کر لی تھی۔ ایک مہینے تک وہ میرا انتظار کرتے رہے اور بمبئی میں کسی ایک دن میری آمد کی اُمید باندھے کلکتے سے لوٹ آئے۔ انھیں معلوم ہوگیا تھا کہ پیرو بھی ہمارے ساتھ گیا ہے۔ چناں چہ میری بمبئی واپسی کے بارے میں وہ اور پُرامید تھے۔ اِس دوران وہ مسلسل پیرو کے پاڑے پر آتے جاتے رہے۔ پھر بمبئی میں جیسے ہی انھیں میری آمد کی خبر ملی اور میں پیرو کے پاڑے پر نہ مل پایا تو انھوں نے میرا پتہ یعنی باندرے میں جولین کا گھر تلاش کرنے کی کوشش کی۔ وہ گھر ڈھونڈنے میں کام یاب ہو گئے تھے تاہم کانتے کی اطلاع سُن کے انھوں نے کسی اور بہتر وقت کے لیے اپنا ارادہ موخر کر دیا۔ کہہ رہے تھے، آج قسمت نے یاوری کی اور میں انھیں یوں اچانک نظر آگیا۔ شاید اُن کے عزم نے مجھے اِس طرف کھینچ لیا تھا، ورنہ میرا تو گھر سے نکلنے کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ مجھے تنہا دیکھ کے وہ اور خوش تھے کہ کھُل کے دل کی بات کر سکتے تھے۔ انھوں نے مجھے دُور سے دیکھ لیا تھا اور انھیں یقین نہیں آیا تھا کہ میں ہی اُن کے سامنے ہوں۔

مجھے بھی اپنے سُنے ہوئے پر یقین نہیں آرہا تھا۔ میں حیرتی آنکھوں سے انھیں دیکھتا رہا۔ "ابھی کیا بولے راجا دادا!" جگنو عاجزی سے کہنے لگا۔ "اپن لوگ کو ابھی تھوڑا ٹیم دیو دادا!"

میں سمجھ رہا تھا کہ وقت دینے سے ان کا کیا مقصود ہے۔ میں نے اُنھیں بتایا کہ میرا تعلق کسی پاڑے سے نہیں ہے اور نہ آیندہ کسی پاڑے پر بیٹھنے کا ارادہ ہے۔

"اپن کو پتہ ہے، کل اپن اُدھر ماہم کے پاڑے پر ہی بیٹھا تھا جب بٹھل دادا تھانے سے پلٹ کے آیا تھا اور آ کے پانڈے دادا کے سر پہ تاج لوٹ دیا تھا۔ اپن اُدھر منہ بند اکھا ناٹک دیکھا تھا۔"

"وہ ناٹک نہیں تھا۔" میں نے ترشی سے کہا۔

"جانتا ہے۔" دیوا نے جلدی سے کہا اور خفت آمیز لہجے میں وضاحت کرنے لگا کہ میں کچھ اور نہ سمجھوں، جگنو کا مطلب یہ ہے کہ بٹھل تھانے سے خوب تیار ہو کے آیا تھا کہ اُسے بات کہاں سے شروع کرنی ہے۔ اُس طرح پانڈے دادا کے پاس کوئی راستہ ہی نہیں رہ جاتا تھا۔ دونوں خاصے معاملہ فہم تھے، ذہین بھی۔ دیوا ٹھیک طرح اپنے ساتھی کے طنز کی وضاحت نہ کر سکا تو اُس نے موضوع بدل دیا، آواز دھیمی کر کے بولا، خیر جو ہونا تھا، ہو چکا ہے۔ پانڈے اب پیرو کی جگہ بیٹھا ہے۔ بالے کو اُس کا نائب یا دستِ راست بنا دیا گیا ہے۔ پانڈے، پیرو کا دوست تھا، بالے پروردہ ہے۔ یہ اشتراک جاری رہے تو بہت اچھا ہے لیکن اِس کا امکان نظر نہیں آتا۔

"ہو سکتا ہے۔" میں نے رُکھائی سے کہا۔

"بٹھل دادا کو اب کائے کو پاڑے پہ بیٹھنے کا تھا۔ ماری نے اُس سور کے بچے جارج کو خلاص کر کے بٹھل دادا کے واسطے کام ہی نہیں چھوڑا تھا۔"

ایک ثانیے کے لیے مجھے شبہ ہوا کہ اِن کا تعلق پولیس سے نہ ہو۔ دونوں باخبر بھی اچھے لگتے تھے مگر یقیناً ایسا نہیں تھا۔ اُن کے انداز و اطوار میں بڑی لپک اور بے قراری تھی۔ آلودگی میں یہ بے ساختگی نہیں ہوتی۔ جگنو نے کہنی مار کے دیوا کو ٹوکا اور تاسف سے بولا کہ ظاہر ہے بٹھل نے ہر طرح سوچ سمجھ کے پاڑا پانڈے کے حوالے کرنے اور خود علیحدہ ہو جانے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ اُسے بھی اندازہ ہوگا کہ پیرو کا اتنا بڑا پاڑا منتشر ہو سکتا ہے، ختم ہو سکتا ہے۔

"پیرو دادا ختم ہوگیا تو اب پاڑے کا کیا...." میں نے زہرخند سے کہا۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے دادا پر اپن کو تھوڑا معاف کرو تو بولے۔" جگنو نے لجاجت سے کہا۔ "تم جیسا بولتا ہے، ایک دم ٹھیک ہے۔ پر تم کو کچھ فرق نہیں پڑتا، تم راجا لوگ ہو، ابھی جو بھی پاس بیٹھا لوگ سے پوچھو۔ ماہم پاڑے پر اور اکھا بمبئی جنگل میں پیرو دادا کا ایک دو پالتو نئیں ہے۔ ابھی ادھر چھوٹا بڑا بہت کتا ہے جس کا گردن میں اُس کا پٹا ڈلا تھا، جو اُس کا مارا کھاتا تھا اور دُم ہلاتا تھا، وہ کیا بولتا ہے سالا، کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے اپنے کو، جاستی دن نئیں جائے گا، تم خود دیکھ لے گا، سب اُلٹا ہو جانے کا ہے۔ ادھر ایک سے ایک حرامی دادا پڑا ہے۔ ابھی سب آگے کو بڑھ کے بولتا ہے۔ اونچا اونچا سُر میں، اپن پاڑا نئیں مانگتا، اپن دادا کا غلام ہے، ماہم پاڑے ساتھ جُڑا رہنے کو مانگتا ہے، ہا، ایک دم سالا حرام کا...." دیوا کی آواز گھٹنے لگی۔ چائے کے گھونٹ سے اُس نے خشک گلا تر کیا اور جیسے وقت نکل جائے گا، ایسے بدحواسی کے عالم میں کہنے لگا کہ کچھ دنوں کی بات ہے، پیرو کی موت کو چند دن ہوئے ہیں کہ کھچڑی پکنی شروع ہوگئی ہے۔ داداؤں کے گروہ بن رہے ہیں، ہاتھی کے دانت کھانے کے اور، دکھانے کے اور ہوتے ہیں۔ ابھی تو دادا لوگ خود حیران و پریشان تھے کہ اچانک یہ کیا ہوگیا۔ جیسے جیسے وقت ٹھیرتا جائے گا اور جس دن انھیں یہ یقین ہو جائے گا کہ بٹھل لوٹ کے نہیں آئے گا یا وہ بمبئی سے چلا جائے گا اور اس دوران چند سرکردہ دادا اپنے گٹھ جوڑ سے کسی خوش گمانی کا شکار ہوگئے تو کچھ کہا نہیں جا سکتا، یہاں شہر میں پھر کیسا خون خرابا ہوگا۔ دیوا کم و بیش وہی کچھ دُہرا رہا تھا، جس کا اندیشہ کل رات شکلا نے ظاہر کیا تھا اور جس کا اظہار پاڑے سے بٹھل کی دست برداری کے وقت داداؤں نے کیا تھا۔ پانڈے نے بٹھل سے کہا تھا کہ اُسے پیرو کی بیوی اور بیٹی کی اتنی فکر ہے لیکن جو لوگ زندگی بھر پیرو کے ساتھ رہے، اُس کا دم بھرتے رہے، اُس کے ایک اشارے پر جو اپنی زندگیاں قربان کرنے کو تیار رہتے تھے، وہ کہاں جائیں۔ کہاں جا کے سر چھپائیں؟ میں نے دیوا سے کہا، یہ محض اتفاق ہے کہ پیرو اور ماچھی کی پیٹھ پر کسی ناہنجار نے گولی پھونک دی مگر دونوں کا ویسے بھی تو وقت آسکتا تھا۔ ہم یہاں نہ ہوتے اور اُس کی زندگی کا چراغ بجھ جاتا تو وہ کیا کرتے؟ دیوا نے کسی جھجک کے بغیر وہی جواب دیا جو بٹھل کو کسی دادا نے دیا تھا کہ پھر اور بات تھی لیکن اب تو ہم موجود ہیں۔ پیرو دادا کی نسبت سے ہم پر اُس کے نمک خواروں کی نگہ بانی کی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ وہ بھی ہر اعتبار سے پیرو کے پسماندگان ہیں۔ دیوا دہائی دینے کے انداز میں نظر ثانی کے لیے کہنے لگا کہ زیادہ عرصے کے لیے نہیں تو کچھ وقت کے لیے ہمیں ماہم کے پاڑے پر رہنا چاہیے۔ اگر پہلے پولیس کی نظروں میں مشکوک ہونے کے

کسی اندیشے میں ہم ماہم کے پاڑے کی گدّی سے اجتناب کر رہے تھے تو ماری کے اعتراف کے بعد یہ صورت بھی نہیں رہی ہے۔

"ماری کے اقرار کے بعد ٹھل بھائی نے پاڑا چھوڑنے کا اعلان کیا تھا۔" میں نے درشتی سے کہا۔

"بالکل دادا! ایک دم، پھر کیا بات ہے، یہی تو اپن بھی بول رہا ہے۔" دیوا کچھ بدحواس ہو گیا اور افسردگی سے بولا کہ پیرو کا اتنا بڑا پاڑا کسی بدترین انجام سے دوچار نہ ہو جائے اسی لیے وہ اتنا کہہ رہا ہے۔ "تھوڑا ٹیم کے لیے دادا!" اُس نے بچّوں کی طرح مچل کے کہا۔

"تھوڑے اور زیادہ وقت سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہمیں اِس شہر میں نہیں رہنا، کچھ اور کام ہیں، اور اس کی کیا ضمانت ہے کہ بعد میں، ہمارے جانے کے بعد وہ کچھ نہیں ہو گا جو اب ہو سکتا ہے۔" میں نے جھڑکتی آواز میں اُس سے پوچھا۔

"نئیں ہوئیں گا ایسا۔" جگنو سینے پر ہاتھ مار کے بولا۔ "اپن جانتا ہے، ابھی اتنا نئیں ہونے کا، ٹھل دادا اتنا دن پھر خالی پیلی تالی بجانے کو پاڑے پر بیٹھنے کا کیا! آدمی بنا کے جائیں گا، تیار کر کے۔"

"آدمی ایسے نہیں بنتا، چاقو کی ہیرا پھیری اور ہاتھ پیر کی زور ازوری سے۔ پاڑے کی گدّی کے لیے اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔"

"ٹھیک ہے راجا دادا!" جگنو بے کلی سے بولا۔ "پر آدمی لوگ سے آدمی نکلتا ہے۔" وہ کٹی پھٹی سی آواز میں کہنے لگا کہ اُنھیں اپنی نوآموز اور ناپختہ کاری کا اچھی طرح علم ہے لیکن ٹھل کے سلسلے میں اُن کی آنکھ نے دھوکا نہیں کھایا ہے۔ ہر چند کہ اُنھیں اُس کی قربت کا موقع کم ملا ہے مگر جتنا بھی میسّر ہوا، اُنھوں نے اُسے ضائع نہیں کیا۔ جگنو کے کہنے کے مطابق، وہ پورے تین دن تک پیرو کی ارتھی کے جلوس اور ماہم کے پاڑے پر ٹھل کے نزدیک تر رہے ہیں۔ اِس سے پہلے بھی وہ ٹھل کا سایہ بنے رہے تھے۔ جب میں نے چھنگا کا پاڑا حاصل کر کے وہاں چوکی پر بیٹھنا شروع کیا تھا اور ایک دن ٹھل کی اچانک آمد پر میں نے اُس کے لیے چوکی خالی کر دی تھی۔ مجھے دیکھ کے اُنھیں ٹھل سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ اُس کا قرب اُن کے لیے کسی خواب کی تعبیر کا درجہ رکھتا تھا۔ جگنو کے بہ قول، اُسے اور دیوا کو ٹھل کا جسم دبانے، حقہ تیار کرنے اور اُس کی جوتیاں اٹھانے کا اعزاز حاصل رہا ہے۔ اُنھیں یقین ہے کہ ٹھل کی آمادگی شرط ہے۔ جگنو آہ بھر کے بولا۔ "اپن کو پتہ ہے، ٹھل دادا کے ہاتھ میں پڑ کے پتھر بھی ہیرا بن جانے کا ہے، ایسا نئیں ہے کیا؟"

میں خاموشی سے سُنتا رہا۔ ٹھل کے ذکر پر دونوں کی آنکھیں دمک رہی تھیں۔ دیوا کچھ کہنا چاہتا تھا کہ جگنو نے اُسے روک دیا اور معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔ "آپ اچھا سمجھتے ہو دادا! ابھی ناراض مت ہونا، اپن کا من میں جو بات تھا، ابھی منہ پر آ گیا۔ اپن نے سالا کسی پاڑے شاڑے کا ٹھیکا نئیں لیا پڑا ہے۔"

میں نے صراحت کرنی چاہی لیکن اِس کی ضرورت نہیں تھی، وہ خود ہی چُپ ہو گئے۔ دیوا نے میرے آگے سموسوں کی پلیٹ بڑھا دی۔ میں نے اُن کی خاطر ہر پلیٹ سے کچھ نہ کچھ لیا۔ پیالی میں بچی ہوئی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ مجھ سے پوچھے بغیر بیرے نے گرم چائے کی ایک اور پیالی میرے سامنے لا کے رکھ دی۔ کچھ کھا پی کے مجھے کسی قدر تازگی کا احساس ہوا۔ معاً میری نظر گھڑی پر گئی اور میں مضطربانہ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بھی ہڑبڑا گئے، پوچھنے لگے کہ کیا بات ہے؟

"بہت دیر ہو گئی ہے۔"

"گھر ہی تو جانے کا ہے دادا!"

"ہاں ہاں پر..." میں تیزی سے ہوٹل سے نکل گیا۔

"اپن کے لیے ابھی کیا حکم ہے؟" دیوا نے بھی عجلت کی اور ہوٹل کے باہر آ کے میرے سامنے ہاتھ باندھ کے کھڑا ہو گیا۔

"کیسا حکم؟" میں نے ناگواری سے کہا۔

"اپن ابھی کدھر کو جائے؟" جگنو کتراتی ہوئی آواز میں بولا۔

"کدھر کیا؟" دوسرے لمحے اُن کا مدّعا میری سمجھ میں آیا۔ "میں نے تمھیں بتایا نہیں کہ اڈّے پاڑے سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"نئیں ہے تو کیا ہوا دادا!" جگنو نے لپک کے میرے پیر پکڑ لیے۔ "تم تو خود اکھا پاڑا ہے۔ اپن کو یاد ہے، ایک بار تم بولا تھا، کوئی پاڑا دادا سے بڑا نئیں ہوتا۔ بولا تھا تم نے ایسا؟"

"ہاں" میں نے اُلجھ کے کہا۔ "ضرور کہا ہو گا۔"

"اپن جانتا ہے، ابھی تم چاہے تو اکھا بمبئی کا پاڑا تمھارا پاڑا ہو۔ تم جدھر جائیں گا، پاڑا تمھارے ساتھ چلیں گا۔"

"تم چاہتے کیا ہو؟"

"کچھ نہیں مائی باپ، بس ایک بار کو اپن کا ہاتھ پکڑ لو۔" دیوا منت سے بولا۔ "اپن تمھارا بہت انتظار کیا ہے۔"

"بے شک کیا ہو گا لیکن شاید اب وقت گزر گیا ہے۔ اڈّے پاڑے سے میرا تعلق نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مجھے اُن سے کوئی دل چسپی نہیں۔ وہ اور بات تھی، اور وقت تھا، مجھے کسی سبب سے چھنگا کے پاڑے کی ضرورت تھی، اِسے تھوڑا بہت تم بھی سمجھتے ہو گے۔ چھنگا کوئی اُنیس دادا نہیں تھا، اُستاد آدمی تھا۔ چاقو پکڑنا اُسے بہت اچھا آتا تھا۔ دم میں البتہ کچھ کم زور پڑ گیا تھا۔ یہ جان کے ہی میں اُس کے پاڑے پر گیا تھا۔ میرے متعلق تمھیں کچھ زیادہ خوش فہمی ہے۔ چھنگا کے پاڑے کے بعد میں دو اور پاڑوں پر گیا تھا، وہ بہت چھوٹے تھے۔ اُنھی دو تین چھوٹے موٹے پاڑوں کے سوا میں نے کبھی پاڑا نہیں چلایا اور وہ بھی کتنے عرصے کے لیے۔ یقین کرو، میں نے بہت دنوں سے چاقو کھولا تک نہیں ہے۔ بہتر ہے، تم کسی اچھے دادا کی تلاش کرو۔ یہاں بمبئی میں ایک سے ایک کھرا اُستاد، دادا پڑا ہے۔"

"ہوئے گا، اپن کے لیے نئیں ہے، اپن کو کدھر بھی نئیں ملا، تم جیسا کدھر بھی نئیں ہے۔ ابھی کچھ بولے دادا! اپن کو پتہ ہے، تم نے چھنگا دادا سے جان کے ویری رگایا تھا۔ تم پہلے ہی اُس کا چاقو گروا سکتا تھا۔ تم نے اُس کو خلاص بھی نئیں کیا، چھوڑ دیا اُس کو۔ اپن نے اکھا تماشا اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔"

وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ یہی کچھ تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ ایسے نہیں جائیں گے۔ اُن سے حجّت میں اور دیر ہو جاتی۔ میں نے نرمی سے کہا کہ اچھا دیکھیں گے۔ ممکن ہے، جلد ہی بمبئی سے جانا پڑ جائے۔ پھر آنا ہوا اور فراغت ہوئی تو جو تھوڑا بہت آتا ہے، میں تمھیں ضرور بتاؤں گا۔

"نئیں دادا! ابھی اپن تم کو نئیں چھوڑنے کا ہے۔"

اُن کے منت گزار لہجے کے باوجود میں نے اُنھیں گھور کے دیکھا۔ دونوں نے سر جھکا لیا۔ "کیا مطلب؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"اپن کا ابھی بہت خواری ہو گیا ہے۔" جگنو بلبلاتی آواز میں بولا۔ "نئیں معلوم، پھر تم کب ملے؟"

"مجھے خود بھی نہیں معلوم۔" میں نے بے ربطی سے کہا۔ "لیکن بمبئی آنا جانا رہے گا۔ تم نے اتنا انتظار کیا ہے تو کچھ اور سہی..."

میری بات جیسے اُنھوں نے سُنی ہی نہیں۔ جگنو گھگھیائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اپن سے ابھی انتظار نئیں ہوئے گا دادا! اپن مر جائیں گا۔"

"پھر تم، تم۔" میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ جتنی دیر ہو رہی تھی، مجھے وحشت ہو رہی تھی۔ میں آگے بڑھ جاتا لیکن یا تو مجھے شبہ تھا کہ یہ اتنا آسان نہیں ہے یا اُن کی انفعالی حالت نے میرے پیر جکڑ لیے تھے۔ میں نے اُن دونوں کے شانے پر ہاتھ رکھ کے مُسکرانے کی کوشش کی اور اُنھیں مطمئن کرنے کی بھی۔ وہ اور بے قرار نظر آنے لگے۔ "تمھیں کوئی پاڑا چاہیے؟" میں نے بہ ظاہر خوش دلی سے پوچھا۔

"نئیں دادا! اپن پاڑا نئیں مانگتا۔" دونوں نے تقریباً ایک ساتھ جواب دیا۔

"پھر کیا ہے؟ کسی دادا کو بھگتنا ہے؟"

دونوں نے سر ہلا کے انکار کیا۔ جگنو کسی قدر تامّل کے بعد دبی ہوئی آواز میں بولا۔ "اپن کو اپنے سے بھگتنے کا ہے۔"

"اپنے سے!" میں نے تعجّب سے کہا۔

جگنو نگاہیں جھکائے ہوئے بولا۔ "اپن، اپن اکھا دادا بننا مانگتا ہے۔"

سُنا ہے، کسی بے پناہ خلش کے بغیر آواز میں یہ سوز نہیں ہوتا۔ میں نے نسبتہً ٹھیرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "دیکھو! پاڑا کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔ ہو سکے تو پاڑے کا خیال چھوڑ دو۔"

"تم بولیں گا تو اپن لوٹ کے پاڑے کا مُنہ نئیں دیکھیں گا۔"

"پھر دادا بننے کی کیا ضرورت ہے؟"

"ہے دادا!" دیوا نے بے تابی سے کہا۔ "اپن پاڑے واسطے نئیں، بس ابھی دادا بننا مانگتا ہے۔"

"میں یہی پوچھ رہا ہوں، جب تمھیں پاڑے پر نہیں بیٹھنا تو دادا بننے سے حاصل؟"

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ جگنو جھجکتے ہوئے بولا۔ "تمھارے جیسا! تم بھی تو سب جانتا ہے اور پاڑے پر نئیں ہے۔"

"ہاں ہاں۔" میں کچھ اور نہ کہہ سکا۔

"بل صرف پاڑے کا لوگ میں نئیں ہوتا دادا۔" دیوا نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں اپنا مافی الضمیر بتانے کی کوشش کی کہ اپنی ذات کے اعتماد کے لیے بھی کوئی کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے، حفظِ ماتقدّم کے لیے، اور اپنے لیے نہیں تو کسی دوسرے یا دوسروں کے لیے۔ پاڑے کے سوا بھی تو زندگی میں ہر قدم، ہر موڑ پر بل کی ضرورت پڑتی ہے۔

میں نے کہا۔ "ہاں کیوں نہیں، ٹھیک ہے۔ تمھاری یہی خواہش ہے تو میں ضرور تمھارا ساتھ دوں گا اور مجھے خوشی ہو گی، اگر تم جیسا کہہ رہے ہو، واقعی اسی لیے کچھ جاننے کی خواہش مند ہو، ویسے تمھاری مرضی۔"

"نئیں دادا!" جگنو اضطراب سے بولا۔ "تم، تم جیسا بولیں گا۔"

دیوا نے شدّت سے اُس کی تائید کی اور کہنے لگا۔ "ایسا ابھی ایک سچ بول دے دادا!"

"کیا بات ہے!" میں نے تجسّس سے پوچھا۔

تم سے بات کرنے سے پہلے اپن کا من میں تھوڑا میلا تھا، ابھی تم سے ایک دم نئیں چھپانے کا، اپن کا من کرتا تھا کہ ابھی ایک بار، صرف ایک بار کو کسی پاڑے کا گدّی پر بیٹھے۔" جانے کیوں یہ کہتے ہوئے دیوا کی آواز پھٹنے لگی۔ اُس نے جلد ہی خود پر قابو پایا اور سینے پر ہاتھ رکھ کے بولا۔ "پر ابھی کبھی پاڑے کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھے تو اپنی ماں کا جنا نئیں۔"

"نہیں، میرا مطلب یہ نہیں ہے۔" میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "یہ کوئی شرط نہیں، میں نے تو صرف ایک مشورہ دیا تھا۔"

اِس سے پہلے کہ اُن میں سے کوئی زبان کھولتا، میں نے اجازت چاہی۔ وہ میری صورت دیکھنے لگے۔ میں نے قدم بڑھائے تو وہ بھی میرے ساتھ چلنے لگے۔ شروع میں تو میں نے یہ سوچ کے احتراز نہیں کیا کہ ممکن ہے، اُن کی منزل بھی اسی سمت ہو لیکن خاصی دُور آنے کے بعد بھی اُنھوں نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا تو میں نے اُن سے پوچھا کہ وہ کہاں جارہے ہیں؟

"تمھارے ساتھ دادا!" دیوا نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میرے ساتھ! مگر میں تو گھر جارہا ہوں۔"

"اپن بھی ساتھ چل رہا ہے۔"

میرا سر گھوم گیا جیسے جسم میں یک بارگی آگ بھڑک اٹھی ہو۔ میں نے وہیں ٹھہر کے خشمگیں نظروں سے اُن کی طرف دیکھا۔ اُن کی وہی کیفیت تھی جو دست و بازو توڑ دے۔ دونوں پر کوئی ندامت سی طاری تھی، سر تا پا تسلیم و اقرار۔ خفگی کے باوجود اُن کے چہروں پر پسینہ چمک رہا تھا۔ میں درشتی سے کچھ کہہ دیتا مگر مجھے خیال آیا کہ کہیں یہ بر بنائے وضع تو میری ہم رکابی پر مُصر نہیں ہیں؟ میں نے دوبارہ اُنھیں تاکید کی کہ وہ اپنے ٹھکانے واپس جائیں، میں چلا جاؤں گا۔ جواب میں وہ خاموش کھڑے رہے۔ میں نے اُنھیں سمجھایا کہ وہ غیر ضروری تکلف نہ کریں، رات ہوگئی ہے اور مجھے دُور ہیرو دادا کے گھر جانا ہے۔ اُن کے لیے واپسی مشکل ہوجائے گی۔

"اپن واپس نئیں آئیں گا۔" دیوا نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیوں! کیا تم بھی اُسی طرف جارہے ہو؟"

"اپن تمھارے، ابھی تمھارے ساتھ..." دیوا لفظ چبانے لگا۔

ظاہر ہے، اب کسی قسم کی رُو رعایت کا جواز نہیں رہا تھا۔ میں نے طے کیا، مجھے صاف طور پر کہہ دینا چاہیے کہ اپنا راستہ لو۔ تاہم میں نے جبر کیا اور کہا۔ "ٹھیک ہے، چلتے رہو پھر۔"

"ابھی راستہ دُور ہے دادا! بولے تو وکٹوریا کر لے۔"

"نہیں۔" میں نے اُنھیں جھڑک دیا۔ "مجھے پیدل ہی جانا ہے۔" میں نے اُنھیں یہ نہیں بتایا کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اُنھوں نے بھی لوٹ کے نہیں پوچھا کہ مجھے تو گھر پہنچنے کی بہت جلدی تھی۔ وہ چلتے رہے اور میری تیز رفتاری کا ساتھ دیتے رہے۔ دیر تک میں نے اُن سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ بھی کچھ نہ بولے۔ شاید میں اُن سے اتنا کبیدہ اور برگشتہ نہیں تھا جتنا خود سے تھا۔ جانے کیوں میں ہوٹل میں اُن کے ساتھ چائے پینے پر آمادہ ہوگیا تھا۔ اب تو یقیناً اُدھر سب پریشان ہو رہے ہوں گے۔ کسی نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا ہوگا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو ایسی بات نہیں تھی۔ دادا کے واقعے کے بعد سب کا اعتبار متزلزل ہو گیا تھا۔ ہو سکتا ہے، جمرو، شامو وغیرہ میری تلاش میں نکل بھی چکے ہوں۔ بہر حال جتنی تیزی سے ممکن تھا، میں فاصلہ کم کرتا رہا۔ ٹانگیں کھنچنے لگی تھیں۔ آگے سارے راستے میں نے اُن دونوں سے لاتعلق رہنے کی کوشش کی لیکن وہ تو ہمہ جاں، ہمہ نفس میرے ہم قدم تھے۔ اُن کا بوجھ بھی جیسے مجھ میں شامل ہوگیا تھا۔ اِس دوران میں بار بار خود کو تلقین کرتا رہا کہ حرج بھی کیا ہے، یہ آخر میرا کیا نقصان کر رہے ہیں اور میں انھیں زبردستی کس طرح روک سکتا ہوں۔

گھر اب اتنی دور نہیں رہ گیا تھا جتنی دُور ہم آچکے تھے۔ ہوٹلوں اور پان کی دکانوں کے سوا تقریباً ساری دکانیں بند ہوچکی تھیں۔ سڑکوں پر لوگوں کی تعداد بھی برائے نام تھی۔ راستے میں کئی جگہ مجھے پولیس والے دکھائی دیے۔ پولیس کا پہلا کام شک ہے۔ تین آدمیوں کو اتنی تیز رفتاری سے بڑھتے دیکھ کے اُنھیں بے کلی ہوسکتی تھی۔ وقت بھی مناسب نہیں تھا۔ دُکانیں بند ہوجانے کی وجہ سے روشنی خاصی کم ہوگئی تھی۔ پولیس کے علاوہ درمیان میں ہم تینوں کے جاننے والے باڑے کے لوگوں سے بھی واسطہ پڑ سکتا تھا۔ ممبئی میں اب میں کوئی ایسا گُم نام دادا بھی نہیں رہا تھا۔ قدم قدم پر مجھے یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کچھ اور نہیں تو وقت اور نکل جائے گا مگر وقت کے نہ کان ہوتے ہیں [illegible] ہیں، وہ کسی ضدی بچّے کی طرح ہے یا کسی خودسر حاکم کی طرح۔ اپنی مرضی سے روپ بدلتا رہتا ہے۔ چلتے چلتے دیوا فٹ پاتھ پر اُبھرے ہوئے کسی پتھر سے چوٹ کھا کے اوندھے مُنہ گر پڑا۔ مجھے پھر رُکنا پڑا۔ وہ جلدی سے کپڑے جھاڑتا ہوا اُٹھ گیا۔ اُس لمحے میرے جی میں آیا کہ میں چلتا رہوں لیکن دیوا کی چھلی ہوئی ٹھوڑی سے خون چھلک رہا تھا۔ میں نے اُس کی چیخ بھی سُنی تھی۔ چھوٹی موٹی چوٹ ہوتی تو دیوا اتنا مرا گرا نہیں تھا، پی جاتا۔ میں نے جگنو کے ساتھ دیوا کے کپڑوں کی گرد جھاڑی۔ پیچھے فرش کا کچھ حصّہ گیلا تھا جس پر پہلے دیوا کا پاؤں رپٹا، پھر سنبھلنے کی کوشش میں اُس کا توازن اور بگڑ گیا۔ میں نے جولین کا رومال جیب سے نکال کے دیوا کا چہرہ صاف کیا۔ اُس کی ٹھوڑی سے خون بہنے لگا تھا۔ چند لمحوں میں اُس کے ہونٹ بھی خون سے بھر گئے۔ پتھر نے دانتوں اور مسوڑھوں کو بھی زک پہنچائی ہوگی۔ گھٹنے بھی محفوظ نہیں رہے ہوں گے۔ دیوا لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا تھا۔

اور ہر چند کہ اُس نے دوسرے ہی لمحے مستعدی کا مظاہرہ کیا لیکن

ں کے انکار کے باوجود اُسے سامنے کی بند دکان کے چبوترے پر ر اُس کی ٹھوڑی کا جائزہ لیا۔ خون نہیں رُک رہا تھا۔ خون سے ں تر ہوگیا۔ جگنو بدحواسی سے کبھی اُسے تسلی دیتا، کبھی مجھے۔ میں ے کسی قریبی حکیم ڈاکٹر وغیرہ کے بارے میں پوچھا۔ تو وہ اِدھر اُدھر دڑا کے رہ گیا۔ گیلے فرش کی کیچڑ خون میں مل گئی تھی۔ کہیں سے ہاتا تو اچھا تھا۔ میرے اشارے پر جگنو بھاگتا ہوا ایک طرف گیا پھر ا اور قریب کی ایک عمارت میں گھُس گیا۔ اچھا گنجان علاقہ تھا۔ اتنی لٹی راہ گیر ہمارے گرد جمع ہوگئے۔ اُنھیں مدد کرنے کے بجائے یل جاننے کی بے چینی تھی۔ وہ بہت مشکل سے میری التجا پر چُپ جگنو فوراً کہیں سے پانی سے بھرا ہوا لوٹا لے آیا۔ لوٹے کا مالک بھی ڈھے اُس کے پیچھے لپکتا ہوا آیا تھا۔ ٹھوڑی صاف کرنے پر زخم رت نظر آئی۔ اتنا گہرا نہیں تھا لیکن بیچ میں گچی سی بن گئی تھی۔ خون ے کے لیے الگ سے کوئی کپڑا نہ میرے پاس تھا، نہ جگنو کے پاس۔ جگنو کا کُرتا پھاڑے بغیر چارہ نہیں تھا۔ لوٹے والا آدمی سب یادہ مشورے دے رہا تھا، اُسی نے اپنی چادر اتاری۔ چادر کے وہ دبلا پتلا شخص بنیان پہنے ہوئے تھا۔ شرافت کا شکل و قامت، حیثیت سے تعلق نہیں ہے۔ اِس سے پہلے کہ اور راہ گیر اکٹھے ہوتے پنی اپنی بولیاں بولتے، لوٹے والے کی ہدایت پر ہم وہاں سے چل ے۔ کوئی ایک فرلانگ کی دُوری پر وہ ایک گلی میں داخل ہوگیا، پھر ، دوسری تنگ گلی میں۔ وہ کسی ڈاکٹر رستوگی کا ٹوٹا پھوٹا سا مطب ۔ لوٹے والے نے بے دریغ دروازہ کھٹ کھٹانا اور آوازیں لگانا روع کر دیا۔ کسی نہ کسی طرح اُس نے نیند خراب ہونے پر ناراض کٹر کو منا بھی لیا۔ دیوا کو ڈاکٹر کے حوالے کر کے میں پیچھے ہٹ گیا، انک مجھے اپنی خالی جیب کا خیال آگیا تھا۔ اگر دیوا اور جگنو کی جیبوں ں بھی مرہم پٹی کے پیسے نہ ہوئے تو؟ میں اس پشیمانی کا اندازہ ہی کر سکتا تھا۔ روپے پیسے کے بغیر آدمی اپاہج سے کم نہیں ہوتا۔ گھر سے چلتے قت یہ لاٹھی ضرور ساتھ رکھنی چاہیے۔ جب تک جگنو نے اپنی جیب سے ڈاکٹر کی فیس ادا نہ کر دی، میں اپنی انگلیاں توڑتا، ہونٹ کاٹتا رہا۔

ڈاکٹر پندرہ بیس منٹ تک اپنے کام میں مصروف رہا تھا۔ دیوا کے چہرے پر جا بہ جا لال دوائی کے دھبّے پڑ گئے تھے۔ اُس کے نیچے کے دو دانت بھی ہل گئے تھے۔ ڈاکٹر نے اُنھیں نکالا نہیں۔ دوا لگا کے خون روک دیا۔ ہم مطب سے باہر آئے تو سڑکیں اور سنسان ہو چکی تھیں۔ کئی منزلہ عمارتوں کے دروازوں اور کھڑکیوں کی روشنیاں بھی بیشتر بجھ چکی تھیں۔ فٹ پاتھ پر ٹکڑیوں میں بیٹھے ہوئے چوسر اور تاش کے شوقین بھی اِکّا دکّا ہی کہیں نظر آرہے تھے۔ دکانوں کے چھجّوں کے نیچے سوئے ہوئے لوگوں کی تعداد بھی اس نسبت سے بڑھ گئی تھی۔ میری رفتار اب اتنی تیز نہیں تھی۔ اب جو کچھ بھی ہو، گھنٹے بھر بعد یا پہلے پہنچنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ایک گھوڑا گاڑی قریب آنے پر جگنو نے میری طرف دیکھا، میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بھی خاموش رہا۔ میرا خیال تھا، اب کسی جگہ اُنھیں ارادہ بدل دینا چاہیے۔ ممکن ہے، یہ میری طرف سے اشارے کے منتظر ہوں۔ دیوا اب لنگڑا کے نہیں چل رہا تھا لیکن لازماً اُسے تکلیف ہو رہی ہوگی۔ میں نے جلدی نہیں کی تاکہ اُنھیں اِس غیر ضروری زحمت کا مزید احساس ہو سکے۔ کچھ دور جا کے پھر میں نے زبان کھولی اور دیوا سے کہا کہ اُسے سرِدست آرام کی ضرورت ہے۔ اِدگرد دُکانوں کے تھڑوں پر جہاں اور بہت سے لوگ سوئے ہوئے ہیں، اُسے بھی کہیں جگہ مل سکتی ہے۔ میری توقع کے خلاف خود کو چاق و چوبند ظاہر کرنے کے لیے دیوا اپنے بازو پھیلانے اور جسم کو جھٹکے دینے لگا۔ پہلے کی بات اور تھی لیکن اس عالم میں اُن کا اصرار وضع و مروّت سے سوا تھا، مرتبت سے بیش رُتبہ کسی محبوب و محترم سے اظہارِ التفات کا یہ قرینہ نہیں ہوتا۔ یہ جس شخص کو کسی منزلت کا سزاوار سمجھ رہے ہیں، اُس کی پیشانی پر بھی اُن کی نظر ہونی چاہیے۔

میری رفتار سست پڑ گئی۔ اور مجھے از سرِ نو اپنے حواس مجتمع کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ کوئی ایسی بات ضرور ہے جسے میں اخذ نہیں کر پایا ہوں یا ٹھیک طرح سُن نہیں سکا ہوں۔ یہ کسی موقع کے منتظر ہیں جو اُنھیں مل نہیں پایا ہے یا میں نے نہیں دیا ہے۔ اِس دیوانہ واری کا سبب محض فشارِ اعصاب ہی نہ ہوگا۔ اپنی گفتگو اور طور طریق سے یہ ایسے سادہ اور بے ارادہ بھی نہیں لگتے۔ جو کچھ یہ کہہ نہیں پا رہے ہیں یا میں سُن نہیں پا رہا ہوں، وہ مجھے اِن سے پوچھنا چاہیے، سو میں نے دیوا کو براہِ راست مخاطب کیا۔ میں نے ہمدردانہ لہجے میں اُس سے پوچھا کہ وہ کہاں رہتے ہیں؟ دیوا کے ہونٹ پھیل گئے اور اُس نے بکھری ہوئی آواز میں جواب دیا کہ اب اُن کا کوئی گھر نہیں ہے۔ آج یہاں، کل وہاں۔ میں نے کہا کہ پھر مجھے گھر تک پہنچانے کے لیے اتنی زحمت کیوں کر رہے ہو؟

دیوا نے دندیدہ نظروں سے پہلے مجھے دیکھا، پھر جگنو کو اور بہ دقت جواب دیا کہ وہ تو میرے ساتھ جا رہے ہیں۔ یہی شبہ میرے رگ و پے میں کھٹک رہا تھا۔ میرا سر پھر گھومنے لگا۔ تاہم میں نے ضبط کیا اور اُن سے پوچھا۔ "میرے ساتھ کہاں؟"

"جدھر ابھی تم کو جانے کا ہے دادا!" جگنو سراسیمہ لہجے میں بولا۔

"میں، میں تو پیرو دادا کے گھر مہمان ہوں۔"

"اپن کو بھی اُدھر ہی لے چلو دادا!"

"تمھیں!" اپنی آواز مجھ سے سنبھل نہیں رہی تھی۔ "میں تمھیں وہاں کیسے لے چل سکتا ہوں۔ تمھارا دماغ ٹھکانے پر نہیں لگتا۔ میں نے تمھیں بتایا نہیں کہ میری حیثیت خود وہاں مہمان کی ہے۔"

"اپن تمھارا نوکر ہے دادا! ابھی اُدھر ہی کہیں کو پڑا رہے گا۔" جگنو گڑگڑایا کہ اُن دونوں کو دروازے پر جگہ مل جائے تو بھی اُن کے لیے بہت ہے۔ وہ وہاں سب کی خدمت کریں گے۔ میری، ہتھل کی، پیرو دادا کی بیوی اور بیٹی کی۔

"تم کیا کہہ رہے ہو؟ ایسا کیسے! ایسا کہاں ہوتا ہے۔" میری زبان سٹ پٹانے لگی۔ میں نے اُنھیں یاد دلایا کہ پیرو دادا کا گھر موت کا گھر ہے۔ وہاں پہلے سے بہت سے لوگ موجود ہیں۔ میں نے اُن سے اور بھی بہت کچھ کہا لیکن اُن پر کوئی اثر نہیں ہوا، اُنھوں نے میرے پیر پکڑ لیے اور وہی رٹ لگاتے رہے۔

دوسروں پر قابو پانے میں کبھی اتنی مشکل پیش نہیں آتی، جتنی خود پہ پانے میں پیش آتی ہے۔ میرے بازو اکڑنے لگے، جی میں آیا، دونوں کو گدّی سے پکڑ کے اِن کے سر ٹکرا دوں۔ تلے ہوئے دو ایک ہاتھوں میں یہ کچھ دیر کے لیے بے سُدھ ہو سکتے تھے۔ گھر اب اتنا دُور نہیں رہ گیا تھا۔ میں آسانی سے باقی راستہ طے کر سکتا تھا اور میں اتنی دیر میں مجھ عقل کے اندھے کو سجھائی دیا کہ میں گھوڑا گاڑی نوبت پہلے کر سکتا تھا۔ گھر اُتر کے بس اندر جا کے پیسے لانے پڑتے۔ دونوں میری ٹانگوں سے چمٹے اپنے سر میرے پیروں پر رگڑ رہے تھے۔ میں نے بے اختیار اُن کے بال پکڑ کے اُنھیں جھٹکے سے اُٹھایا! اُنھوں نے نہ کوئی مزاحمت کی نہ فیل مچایا۔ میں جانے کیا کرتا لیکن دونوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیل جاری تھا۔ میرے ہاتھ پتھر کے ہو گئے۔ چند لمحوں تک میں بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اِن کا کیا کروں۔ میں نے اُن جیسے آدمی کبھی نہیں دیکھے تھے۔ میں نے اُنھیں چھوڑ دیا۔ جہاں ہم تھے، یہ جگہ نہ اتنی اندھیری تھی نہ روشن۔ میں ایک دکان کے چبوترے پر آ کے بیٹھ گیا۔ وہ دونوں بھی آہستہ آہستہ میرے پاس آ گئے اور زمین پر سر جھکائے میرے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔

مجھے اپنے آپ کو سمیٹنے میں وقت لگ گیا۔ "کیا بات ہے؟" میں نے جکڑی ہوئی آواز میں اُن سے پوچھا۔ وہ کچھ نہیں بولے۔ میں نے دوبارہ پوچھا۔

"اپن کو ابھی اپنے سے الگ مت کرو دادا!"

"کیا، کیا چاہتے ہو تم؟" میں نے شکستگی سے کہا۔

"اپن پہلے اکھّا بول دیا ہے۔"

"کیا بولا ہے تم نے؟ اور میں نے، میں نے تم سے کچھ نہیں کہا، کچھ نہیں کہا۔ کاہے کی جلدی ہے تمھیں۔ آخر ایسی کیا بات ہے؟ صاف صاف کیوں نہیں بتاتے ہو؟"

"اپن تمھارا بہت انتظار کیا ہے۔"

"میں نے سُن لیا ہے۔" میں نے پھنکارتی آواز میں کہا۔

"ابھی اپن کو مت چھوڑو دادا! مر جائیں گا اپن۔"

"ہا۔" میں نے پیچ و تاب کھا کے کہا۔ "اِس وقت میں تمھیں نہ مِل پاتا تو تم زندہ رہتے۔"

"کدھر کو دادا! اپن زندہ ابھی کدھر کو ہے۔" جگنو کی آواز کرب میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کہنے لگا کہ دادا کی موت کی وجہ سے وہ رُکے ہُوئے تھے کہ ابھی میرے پاس اُن کا آنا مناسب نہیں ہے، نہ وہ کچھ کہہ پائیں گے نہ میں سُن پاؤں گا۔ وہ قسم کھانے لگا اور وہی سب دُہرانے لگا کہ ایک ایک لمحہ اُنھوں نے گِن گِن کے کاٹا ہے۔ اُن کی قسمت تھی کہ آج میں اُنھیں مل گیا اور تنہا مل گیا۔ جیسا کہ اُن کی آرزو تھی۔ ورنہ مجھ سے ملنے کے بعد بھی جانے کب اُنھیں اس طرح اپنا احوال بیان کرنے کا موقع مل پاتا۔

"مگر کیوں؟ صرف دادا بننے کے لیے؟"

"ہاں دادا!" جگنو نے سانس کھینچ کے کہا۔

"کیوں؟ دادا بننے کی ایسی وحشت کیوں ہے تمھیں؟"

"ایک بار کو۔" دیوا ملتجی لہجے میں بولا۔ اُس کی عاجزی میں تپیدگی نمایاں تھی۔ کہنے لگا کہ وہ صرف ایک مرتبہ کے لیے مکمل دادا بننا چاہتے ہیں۔ پھر چاہے اُن کے ہاتھ پیر توڑ دیے جائیں۔

"مگر کیوں؟"

"اپن پر ابھی بہت اُدھار ہے دادا!"

"کیسا اُدھار؟" میں نے اضطراب سے پوچھا۔

"بنارسی کا۔" جگنو سرد مہری سے بولا۔

"بنارسی کون؟ بنارسی دادا؟"

"دادا نئیں، ابھی کُتّا بولو۔"

"بنارسی سے تمھارا کیا تعلق ہے؟"

"بہت ہے دادا!" جگنو کی آواز تڑخ رہی تھی۔ "بس ایک بار کو اپن کا ہاتھ پکڑ لیو، اپن کو پتہ ہے، اکھّا آگے پیچھے کا ابھی...!"

"کیا بات ہے، کھُل کے بتاؤ۔" اُس کی بات کاٹ کے میں نے بے چینی سے کہا۔

"کیا بولے دادا! ابھی کیا بولے۔" جگنو نے اپنا منہ چھپا لیا۔

وقت کا کچھ احساس ہی نہیں رہا۔ پہلے دونوں کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہتے رہے۔ میرے اصرار اور تسلی تشفی پر جگنو نے زبان کھولی اور جو کچھ اُس نے بتایا، وہ ایسا دل دوز تھا کہ آدمی سنّارہ جائے۔ جگنو کے کہنے کے مطابق وہ بچپن میں سوتے جاگتے ایک خواب دیکھا کرتے تھے، ایک بڑے مکان کا آنگن اور آوازیں اور چہرے۔ وقت کے ساتھ وہ سب دھندلاتا گیا اور اُنھیں صرف اتنا یاد رہا کہ ایک عورت اُن کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ اُس کا نام نولکھی تھا۔ نیلی نیلی بڑی بڑی آنکھیں، لمبے بال اور رنگ سونے جیسا۔ اُس کی آواز بہت میٹھی تھی اور لہجہ بہت نرم تھا۔ وہ اوسط قد اور متناسب بدن کی ایک عورت تھی۔ اُس نے ایک ماں کی طرح جگنو اور دیوا کی پرورش کی اور بہت دنوں تک وہ اُسے اپنی ماں ہی سمجھتے رہے۔ نولکھی کے ساتھ ایک بوڑھی عورت بھی رہتی تھی، برس ہوئے اُس کے مرنے کے بعد نولکھی اکیلی رہ گئی۔ جگنو بتا رہا تھا کہ شروع میں اُس کے گھر کئی مردوں کی آمد و رفت تھی۔ بعد میں ایک شخص رہ گیا تھا۔ اُس وقت وہ بہت چھوٹے تھے۔ جگنو، دیوا سے عمر میں کچھ اور کم تھا۔ نولکھی کے پاس آنے والا شخص جب بھی گھر آتا، گھر کے واحد کمرے میں چلا جاتا۔ جب تک وہ اندر رہتا، نولکھی بھی اُس کے پاس رہتی۔ نولکھی کی کوشش ہوتی کہ دیوا اور جگنو اُس آدمی کی نظروں سے دور رہیں۔ جس دن اُس کے آنے کا وقت ہوتا، نولکھی پہلے ہی جگنو اور دیوا کو کہیں چھپا دیتی یا باہر بھیج دیتی۔ وہ درشت چہرے، کرخت آواز اور بلی جیسی آنکھوں والا شخص بنارسی تھا۔ پاڑے کا دادا، دُور دُور اُس کی پھُرتی، لپک اور چاقو بازی کا شہرہ تھا۔ بعد میں نولکھی کو جگنو اور دیوا سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، بنارسی کی آمد پر وہ خود کسی کونے میں دُبک جاتے یا باہر گلی میں چلے جاتے۔ کبھی اتفاقاً آمنا سامنا ہو جاتا تو اُنھیں ہمیشہ بنارسی کی گالیاں سننی پڑتیں۔ وہ اُنھیں پلّے کہتا تھا، بڑا پلّا، چھوٹا پلّا۔ پلّوں کو دیکھ کے کسی کا منہ اتنا نہ بگڑتا ہوگا جتنی بنارسی کی شکل بگڑ جاتی تھی۔ اُس کی آہٹ پر دونوں کا دل ڈوبنے لگتا۔ نولکھی کا بھی کچھ یہی حال تھا، پہلے وہ بنارسی سے ذرا کھُل کے، اونچی آواز میں بات کر لیتی تھی، ہوتے ہوتے اُس کی زبان بھی لکنت کرنے لگی۔

وہ بستی کسی جیل خانے کے مانند تھی جہاں آدمی کو زندگی کی سزا ملتی تھی۔ وہ خود ہی صید، خود ہی صیّاد تھے۔ جیل سے یہ سزا بس اتنی مختلف تھی کہ آدمی لوٹ کے پھر وہیں آ جاتا تھا۔ بہت بھاگنے کی کوشش کرتا مگر لوٹ کے وہیں آنا پڑتا۔ مرد صبح گھروں سے نکل جاتے، شام ڈھلے واپس آتے، بہت سی عورتیں مزدوری کرتیں اور اپنے بچّوں کو کرائے کی عورتوں کی تحویل میں دے جاتیں۔ چند پیسوں کے عوض یہ بوڑھی عورتیں دن بھر اُن کے بچّوں کی رکھوالی کیا کرتیں۔ یہ بچّوں کی حفاظت کا طریق کار تھا، تربیت کا نہیں۔ غریب بچّوں کو کسی تربیت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اتنی سزاؤں کے بعد آدمی بچّوں کی خواہش کیوں کرتا ہے، پیدا ہو جاتے ہیں تو اُنھیں ختم کیوں نہیں کر دیتا۔ زنداں میں قیدیوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ خود آزاری ہے یا کوئی انتقام، جانے کیا ہے، آدمی اپنی زندگی سے کچھ نہیں سیکھتا۔ بہرحال جگنو اور دیوا کو رکھوالی کرنے والی کرائے کی عورتوں کے پاس نہیں جانا پڑا کیوں کہ نولکھی سارا دن گھر ہی رہتی تھی۔ جگنو اور دیوا کے ساتھی گلی کے بچّے تھے جو صبح و شام گلیوں میں شور مچاتے، چھینا جھپٹی کرتے رہتے۔ جس کے پاس زیادہ طاقت ہوتی، وہ زیادہ مستحق سمجھا جاتا۔ آئے دن گلی کے بچّوں میں سر پھٹوّل ہوتی، اُن کا اُدھورا کام اکثر رات کو اُن کے والدین نمٹاتے۔ نولکھی، جگنو اور دیوا کو گلی کے بچّوں میں شامل ہونے سے منع کرتی تھی مگر یہ تو بڑے مکانوں میں ممکن تھا، بستی کے گھروں اور گلی میں امتیاز ہی کتنا تھا۔ جگنو اور دیوا ایک دوسرے کے لیے ہمہ جان و ہمہ دل تھے۔ دونوں کی یہ یک جائی اُنھیں گلی کے بچّوں میں برتر کر دیتی تھی۔ نولکھی نے شروع شروع میں اُنھیں پڑھانے کے لیے ایک استاد کا بھی انتظام کیا تھا۔ وہ جلد ہی حرف و عدد کا کرتب سیکھ گئے تھے۔ اپنے ہاتھ سے اُنھیں الفاظ و اعداد کی اچھی شکلیں بنانا بھی آ گیا تھا کہ ایک دن یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ایک روز توقع کے خلاف بنارسی اُس وقت آ دھمکا جب استاد موجود تھا، دیوا اور جگنو کتابوں سے سر کھپا رہے تھے۔ معلوم نہیں کیوں، بنارسی کے جسم میں آگ بھڑک اٹھی۔ اُس نے استاد کو دھکّے دے کے باہر نکال دیا اور ساری کتابیں کاپیاں پھاڑ دیں۔

اُن دنوں گھر میں ایک اور فرد کا اضافہ ہوا تھا، ایک لڑکی کا۔ نولکھی پھولی نہیں سماتی تھی، وہ لازماً بنارسی کی بیٹی تھی۔ اُنھیں یاد نہیں کہ بنارسی نے کبھی اپنی بچّی پھول وتی کو نظر بھر کے دیکھا ہو۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ پھول وتی سے اُس کا رویّہ ایسا خار دار نہیں تھا۔ پھول وتی پھولوں کی طرح تھی، بالکل اپنی ماں پر گئی تھی۔ اُس کی آنکھیں بھی ماں کی آنکھوں کی طرح نیلی تھیں۔ جیسے جیسے جگنو اور دیوا پر وقت گزرتا گیا، وہ بہت کچھ سمجھتے گئے کہ نولکھی اُن کی ماں نہیں ہے اور بنارسی اُن کا باپ نہیں ہے اور نولکھی بنارسی کی زوجیت میں بھی نہیں ہے۔

البتہ نولکھی کا سارا خرچ بنارسی کے ذمّے ہے اور خرچ کی کمی بیشی بنارسی کی خوشی و ناخوشی پر ہے۔ بنارسی سے پہلے کوئی اور تھا جو نولکھی کے پاس آتا تھا، بنارسی کا بڑا بھائی، نام اُس کا کچھ اور تھا مگر سب کاشو دادا کہتے تھے، وہی شاید جگنو اور دیوا کو نولکھی کے پاس چھوڑ گیا تھا۔ کاشو بھی پاڑے کا دادا تھا اور کوئی بہت بڑا شہ زور۔ اُنھوں نے سُنا تھا کہ بنارسی اپنے بڑے بھائی کے پاسنگ بھی نہیں ہے۔ جگنو اور دیوا نے کئی بار نولکھی کو کریدنے کی کوشش کی۔ اُنھیں محسوس ہوا کہ یہ ذکر نولکھی کے لیے دُکھ کا باعث بنتا ہے۔ وہ کوئی مُناسب جواب نہ دے پاتی۔ نولکھی ہی دُنیا میں اُن کی ایک پناہ تھی اور اُنھیں وہ کچھ دیتی تھی جو کوئی اور نہیں دیتا تھا، عزّت، پیار اور چھاؤں۔ وہ بھی اُسے یہی سب کچھ دینے کے لیے بے تاب رہتے تھے، سو وہ نولکھی کی اداسی اور ویرانی کے عوض اپنے بارے میں کچھ جاننے سے اجتناب کرتے تھے۔ تاہم نولکھی کی زبانی اتنا معلوم ہوا تھا کہ بنارسی کا بھائی کاشو اُن کا باپ تھا۔ وہ کسی لڑائی میں مارا گیا۔ اُن کی ماں پہلے ہی مر چکی تھی۔ کاشو دادا اُن دونوں کو نولکھی کے پاس چھوڑ گیا۔ اِس سے زیادہ نولکھی کچھ نہیں بتا پاتی تھی یا اُسے واقعتہً کچھ معلوم نہیں تھا۔ بہرحال اُنھیں نولکھی کے بیان پر یقین نہیں تھا۔ خود کو بنارسی جیسے کمینے شخص کا رشتے دار تسلیم کرنا ان کے لیے نہایت روح فرسا بات تھی۔ اُنھیں شبہ تھا کہ نولکھی نے اُن سے بہت کچھ چھپایا ہے اور اُنھیں خوف تھا، اُن کے زیادہ تنگ کرنے پر نولکھی کوئی ایسی بات نہ کہہ ڈالے جسے سننا اُن کے بس میں نہ ہو۔

پھر بنارسی کی آمد میں تواتر نہیں رہا۔ کبھی ہفتے میں دو بار آجاتا، کبھی ایک بار۔ وقت بھی طے نہ رہا۔ جب بھی آتا، شراب میں جھومتا، دندناتا ہوا آتا یا وہیں شراب منگوا کے پیتا۔ جگنو اور دیوا سامنے ہوتے تو اُنھیں حکم پہ حکم دیتا۔ شراب پی کے وہ اور بدمست ہو جاتا۔ جگنو اور دیوا کے لیے وہ طرح طرح کے حقارت آمیز القاب تراشتا، حرامی، حرام خور کے لقب تو مسلسل اُس کی زبان کا درد ہوتے۔ کبھی وہ اُنھیں طیش میں آکے ہمیشہ کے لیے گھر سے نکل جانے کا حکم صادر کرتا۔ جگنو اور دیوا نے منافقت بھی کرنی چاہی لیکن اُن کی خوشامد کا اثر صرف کچھ دیر رہتا، بنارسی پھر اپنی خصلت پر اُتر آتا۔ جگنو کہہ رہا تھا کہ آخر ایک دن اُنھوں نے عاجز آکے گھر چھوڑ دیا۔ نولکھی اُن کی تلاش میں ماری ماری پھرتی رہی۔ بمبئی بڑا شہر تھا۔ وہ چند روز تک اِدھر اُدھر ٹھوکریں کھاتے ہوئے اپنے آپ کو چھپانے میں کامیاب رہے مگر پھر بنارسی کے پاڑے کے آدمیوں نے اُنھیں دیکھ لیا۔ وہ اُنھیں پکڑ کے مارتے پیٹتے گھر لے آئے۔ نولکھی کی آنکھیں سُوجی ہوئی تھیں، وہ دونوں کو سینے سے چمٹائے روتی رہی، اُس نے منّتیں کرکے اُن سے وعدہ لیا کہ وہ آیندہ کبھی اُسے اکیلی چھوڑ کے نہیں جائیں گے، اُنھوں نے اب کے ایسا کیا تو وہ زندہ نہیں رہے گی، پھول وتی بھی مر جائے گی، جسے وہ اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ اس کے بعد بنارسی گھر آیا تو اُنھیں دیکھ کے پاگل ہو گیا۔ اُس نے نولکھی اور پھول وتی کی بھی پروا نہ کی، دونوں کو ننگا کرکے اتنا مارا کہ جگنو بے ہوش ہو گیا۔ دیوا جسم کا توانا تھا، وہ بلکتا، دھاڑیں مارتا سب کچھ برداشت کرتا رہا۔ پھول وتی سُن ہو گئی تھی۔ نولکھی نے مداخلت کی تو بنارسی نے اُس پر بھی ہاتھ اُٹھایا۔ جگنو اور دیوا کو یہ کہنے کی مجال نہیں تھی کہ گھر سے نکل جانے کا حکم بنارسی ہی نے اُنھیں دیا تھا۔ پھر اُنھوں نے طے کیا کہ اب وہ اِس شہر ہی میں نہیں رہیں گے۔ وہ پھر گھر سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہفتے عشرے تک وہ شدید مشقتیں کرکے اپنا پیٹ بھرتے رہے۔ رات ہوتی تو ریلوے اسٹیشن کے ڈھکے کُھلے مسافر خانے میں جا پڑتے۔ وہاں بھی لوگ اُن کے پیچھے پڑ گئے۔ ایک دفعہ تو اسٹیشن سے پانچ چھ شُہدے اُن کی مدد کرنے، اُنھیں پناہ دینے کے بہانے کسی ویرانے میں لے گئے۔ یہ بات بتاتے ہوئے جگنو کی حالت ہذیانی ہو گئی۔ وہ اپنا منہ نوچنے لگا۔ اُن کے لڑکپن اور شکستہ حُلیے کی وجہ سے سب اُن پر شک کرتے اور گھر سے مفرور، کہیں سے کچھ چُرا کے بھاگے ہوئے لڑکے سمجھتے۔ یہ جہنم گھر سے بھی زیادہ سخت تھا۔ جتنے دن وہ سورت میں رہے، نولکھی اور پھول وتی اُن کا تعاقب کرتی رہیں، وہ اُن کی آنکھوں میں بیٹھی آہ و بُکا کرتی رہیں۔ ہر لمحے وہ خود کو ملامت کرتے کہ نولکھی اور پھول وتی کو بے آسرا چھوڑ کے آگئے، اُنھوں نے یہ کچھ ٹھیک نہیں کیا، نولکھی کو کسی کل چین نہ ہوگا۔ سو وہ ایک دن خاموشی سے گھر واپس آگئے۔ اُنھوں نے صحیح فیصلہ کیا تھا، لگتا تھا، وہ کسی اور گھر میں آگئے ہیں۔ نولکھی اور پھول وتی پہچانی نہیں جاتی تھیں۔ اب کے وہ تیار تھے کہ واپسی پر اُنھیں پھر بنارسی کا سامنا کرنا پڑے گا مگر اُن کی قسمت اچھی تھی کہ اپنے علاقے میں ہونے والی قتل کی کسی واردات میں بنارسی پولیس کو مطلوب ہو گیا تھا۔ وہ شدّت سے آرزومند تھے کہ کاش بنارسی کو بھی سزا ہو جائے، اُسے پھانسی کی سزا ہو لیکن کچھ نہیں ہوا۔ بنارسی پورے ایک ہفتے بھی جیل میں نہیں رہا۔ جیل سے چھوٹ کے وہ سیدھا نولکھی کے پاس آیا۔ نولکھی نے اُسے رات بہت شراب پلا دی اور یوں جگنو اور دیوا بنارسی کی نظروں سے اوجھل رہے مگر یہ تو ایک رات کی بات تھی۔ بنارسی تو موجود تھا اور وہ سب

زنجیر میں جکڑے ہوئے تھے۔ زنجیر کا حلقہ کبھی ڈھیلا ہو جاتا، اتنا تنگ کہ بس دم نہ نکل پاتا۔

کسی جواز کے بغیر بنارسی نے اچانک خرچا کم کر دیا تھا۔ نولکھی ہاتھ کھلا ہوا تھا۔ کوئی مانگنے آتا تو جو اُس کے پاس ہوتا، دے سب سے زیادہ پیسے وہ جگنو اور دیوا پر خرچ کرتی تھی تاکہ اُنھیں طور محرومی کا احساس نہ رہے، وہ اچھے کپڑے پہن سکیں اور پاس میں بات بنی رہے۔ یہ محض نولکھی کی خوش گمانی تھی۔ اُس نے داری کو اتنا ارزاں سمجھ لیا تھا۔ گھر سے باہر تو یہ اور مہنگی ہو ہے۔ عام بچّوں کی طرح دیوا اور جگنو نے کبھی اُس سے جیب چ میں اضافے کے لیے ضد نہیں کی، اُنھیں گھر کا حال معلوم تھا کہ بھی خود ہی کتنا بچا کے رکھتی ہے تاہم اُس کی خوشنودی کے لیے وہ پیسے قبول کر لیتے تھے۔ بنارسی کی طرف سے خرچا کم کر دینے پر لکھی کی پریشانی میں اضافہ ہوا تو جگنو اور دیوا کو کچھ سکون ملا۔ وہ بھے کہ اب شاید بنارسی نے اُن کے گھر میں دل چسپی لینا کم کر دیا ہے، رچ کی کمی سے گھر پہ بنارسی کے استحقاق کا جواز بھی کم ہو جاتا ہے۔ اُن لی خواہش تھی کہ کیا ہی اچھا ہو، بنارسی خرچ بالکل ہی بند کر دے۔ وہ وجھا ڈھولیں گے، ایک وقت کا کھا لیں گے، کچھ بھی کر لیں گے۔ بنارسی سے اُنھیں نجات مل جائے گی مگر یہ تو بنارسی کے ستم کا ایک طور تھا۔

وہ اُسی طرح سینہ پُھلائے آتا رہا۔ نولکھی کے لیے گھر چلانا مشکل ہو گیا تھا، کھانے پینے تک کی تنگی۔ ہاں اب بنارسی گھر آنے کے بعد خاص اہتمام کرتا۔ وہ جگنو اور دیوا کو پیسے دے کے کھانے پینے کی چیزیں افراط سے منگانے کی شاہ خرچی کرنے لگا۔ صبح اس کا پس خوردہ اُن کے کھانے کے لیے بہت ہوتا۔ خرچ میں کمی کی بات جگنو اور دیوا کی سمجھ میں کچھ عرصے بعد آئی۔ بنارسی نولکھی سے کچھ اور چاہتا تھا۔ ایک رات اُس نے پہلی بار نولکھی کو اپنے ساتھ باہر چلنے کا حکم دیا۔ نولکھی نے بہت پس و پیش کیا، بچّوں کے تنہا رہ جانے کی تاویل پیش کی مگر اُسے جانا پڑا۔ اُن کا خیال تھا کہ وہ کچھ دیر بعد واپس آجائے گی مگر وہ رات بھر اُس کا انتظار کرتے رہے اور چھوٹی پھول وتی کو سمجھاتے رہے۔ صبح سویرے نولکھی واپس آئی تو اُس کی حالت بہت شکستہ تھی۔ کسی نے اُس سے کچھ نہیں پوچھا، پھول وتی نے بھی نہیں۔ پھر تو مہینے دو مہینے بعد بنارسی نے یہ معمول بنا لیا۔ باہر پاڑے کا کوئی آدمی منتظر کھڑا رہتا۔ بنارسی آکے نولکھی کو تیار ہو جانے کا حکم دیتا۔ وہ کتنی ہی منّتیں کرتی، بچّوں کا واسطہ دیتی، بنارسی پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ ایک مرتبہ نولکھی نے صاف انکار کر دیا۔ بنارسی نے اُس کی چٹیا پکڑ کے اتنے طمانچے مارے کہ وہ دُہری ہو گئی۔ نولکھی کے باہر جانے پر عموماً بنارسی رات گھر میں گزارتا اور دارو پیتا رہتا۔ وہ تینوں دھڑکتے کانپتے ہاتھوں سے بنارسی کے گینڈے جسم کو تیل پلاتے رہتے۔ جب تک بنارسی کے خرّاٹے شروع نہ ہو جاتے، وہ وہاں سے نہ ہٹتے۔ پھر نولکھی نے عذر کرنا ہی چھوڑ دیا۔ وہ خاموشی سے باہر کھڑے پاڑے کے آدمی کے ساتھ چلی جاتی۔ صبح واپسی پر بنارسی اُسے طلب کرتا تو وہ اُس کے پاس چلی جاتی۔ پھر بنارسی نے از خود پیسوں میں دوبارہ اضافہ کر دیا۔ جس رات نولکھی باہر جاتی، واپسی پر اُس کے پاس بھی کچھ نہ کچھ رقم ہوتی۔ پیسوں سے گھر کی حالت کچھ سُدھر گئی مگر نولکھی کے مجسّمے میں خراشیں پڑنے لگی تھیں۔ وہ زیادہ تر خاموش رہنے لگی۔ تینوں اُس کی دل جوئی کی کوشش کرتے، وہ اُنھیں آغوش میں بھینچ کے بس رونے لگتی اور روتی رہتی۔

وہ بارہا سوچا کرتے کہ آخر اُنھوں نے بنارسی کا کیا بگاڑا ہے۔ وہ تو جب بھی موقع ملتا ہے، اُسے خوش رکھنے کی تدبیریں کرتے ہیں۔ کیا جیسا کہ بنارسی کہتا ہے، واقعی وہ آدمی کے تخم سے نہیں ہیں۔ اُن میں دوسرے لوگوں کے مقابلے میں کون سی کجی ہے، کیا کمی ہے۔ کیا اُنھیں ٹھیک طرح دیکھنا، سننا اور بولنا نہیں آتا؟ کیا اُن کا چہرہ وہ نہیں جو آئینہ اُنھیں دکھاتا ہے؟ وہ گھُورے پر پیدا ہوئے تھے؟ پھر یہ سلسلہ کہاں جا کے ختم ہوگا، کیا وہ ہمیشہ ایسے ہی رہیں گے؟ کیا بنارسی کے پاس کوئی جادوئی طاقت ہے؟ کیا اُسے علم ہو جاتا ہے کہ وہ اُس سے کس قدر نفرت کرتے ہیں؟ وہ خود سے بہت سے سوال کرتے تھے۔ تمام سوالوں کا ایک ہی جواب آتا تھا، بنارسی! وہ روز و شب بنارسی کے تسلّط سے نولکھی کو نکالنے کے خواب دیکھا کرتے۔ کئی بار اُنھوں نے اُسے مشورہ دیا کہ زمین بہت بڑی ہے کیوں نہ وہ سب کسی دوسرے شہر میں جا کے بس جائیں، کسی دوسری جگہ جا کے وہ جیسے تیسے محنت مزدوری کر کے گزر بسر کریں گے۔ نولکھی ہامی بھر لیتی مگر پھر جانے اُسے کیا ہو جاتا، وہ عذر کرنے لگتی کہ اور بڑے ہو جاؤ، اچھے دن آتے دیر نہیں لگتی، جہاں اتنا وقت گزارا ہے، کچھ اور ٹھیر جاؤ۔ وہ یہی سنتے رہتے اور اُن کی سمجھ میں نہ آتا کہ نولکھی بنارسی کے آگے اِس قدر بے بس کیوں ہو جاتی ہے۔ ضرور کوئی ایسی بات ہے جو وہ نہیں جانتے۔ نولکھی کی کوئی کمزوری بنارسی کے پاس ہے۔ سب سے بڑی کمزوری تو عورت ہونا ہے مگر عورتیں تو اور بھی ہیں۔ وہ کچھ کر نہ پاتے تو اُنھیں نولکھی پر غصّہ آتا، نفرت کی حد تک۔ دونوں اُس سے بات چیت بند کر دیتے۔ نولکھی اُنھیں مناتی رہتی پھر اُنھیں خود خیال آجاتا کہ نولکھی

تو اُن سے زیادہ مجبور رہے۔ کئی بار جگنو اور دیوا کے دل میں آئی کہ وہ کسی روز بنارسی کا کام تمام کر دیں۔ جس وقت وہ نشے میں چور ہو، وہ اُس کے سینے میں رسوئی کی بڑی چھری گھونپ دیں یا کہیں سے زہر لا کے اُس کی شراب میں ملا دیں۔ جس رات گھر میں نولکھی نہ ہو، اُس رات یہ کام اور آسان ہوگا۔ کوئی الزام آیا تو نولکھی محفوظ رہے گی، صرف اُنھیں سزا ہوگی۔ جیل کی زندگی اس زندگی سے بہتر ہوگی۔ اُنھوں نے سُنا تھا کہ کم عمر قاتلوں سے رعایت برتی جاتی ہے۔ اُنھیں زیادہ سے زیادہ سات آٹھ سال کی سزا ہوگی، ٹھیک ہے، سات سال گزر جائیں گے مگر اِس عرصے میں نولکھی اور پھول وتی کا کیا ہوگا؟ اُن کے بغیر تو وہ ویران ہو جائیں گی۔ نولکھی اور پھول وتی کے خیال سے جگنو اور دیوا کے ہاتھ پیر ٹوٹنے لگتے۔

گلیوں کے لڑکوں سے اُنھوں نے بہت سے ہنر سیکھ لیے تھے۔ تاش، چوسر اور دوسری بازیاں، اٹھائی گیروں اور اچکّوں کے کرتب، تمباکو نوشی۔ بعد میں اُنھوں نے جیب کاٹنے کی بھی مشق کی اور ابھی ہاتھ صاف نہیں ہوا تھا کہ دیوا پکڑا گیا۔ پہلی بار وہ جگنو سے جُدا ہوا۔ دونوں کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر کتنے نامکمل ہیں۔ دونوں تڑپتے رہے، نولکھی الگ دیوانی بنی رہی۔ دیوا کئی ہفتے جیل میں رہا پھر نولکھی کے اصرار پر بنارسی نے ہیر پھیر کر کے اُسے چھڑایا۔ بنارسی اُسے چھڑا کے لایا تھا۔ گھر آ کے اُس نے دیوا کو دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا اور اپنے ہم راہ آنے والے پاڑے کے آدمی کو اشارہ کیا۔ بنارسی کے حکم پر وہ دیوا کے ناخن کھینچتا، کانوں کی لَویں رگڑتا رہا۔ جتنا دیوا چیختا بلکتا، بنارسی کی آنکھوں کی چمک اتنی ہی گہری ہو جاتی۔ دیوا کا حال بہت بگڑنے لگا تو کونے میں دُبکے ہوئے جگنو نے ہمت کر کے بنارسی کے پیر پکڑ لیے کہ خدا کے واسطے اب وہ بس کرے۔ بنارسی کی توجہ ہٹانے کے لیے اُس نے خود پر ذمّہ داری لینی چاہی، کہا کہ دیوا کا کوئی قصور نہیں، مَیں نے اِسے اُکسایا تھا۔ بنارسی نے اُسے بھی دیوا کے ساتھ کھڑا کر دیا۔

جگنو نے مجھے اپنا اور دیوا کا ہاتھ دکھایا۔ مجھے یقین نہیں آیا۔ دونوں کے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلیوں کے پورے کٹے ہوئے تھے۔ بنارسی نے اُنھیں تنبیہ کی تھی کہ جتنی بار وہ جیب تراشی کے جُرم میں پکڑے جائیں گے، یہی ہوتا رہے گا۔ جگنو کے بہ قول بعد میں اُنھوں نے بنارسی کو کوئی ایسا موقع نہیں دیا۔ دوسری بار بھی دیوا ہی جیل گیا مگر اب کے نولکھی نے بنارسی سے سفارش نہیں کی۔ دیوا دو ڈھائی مہینے بعد خود چھوٹ کے آ گیا۔

سڑک پر سناٹا اور گہرا ہو گیا تھا۔ دور و نزدیک بھونکتے کتّوں کا شور سناٹے کا احساس اور دلاتا۔ جگنو ٹھیر گیا۔ اُس کی آواز گھٹنے لگی تھی، اُسے پانی کی ضرورت تھی اور پانی کا امکان نہیں تھا۔ اُس نے بیڑی جلانے کی اجازت چاہی۔ بیڑی کے چند کش لگا کے وہ بولا کہ اُن کے خیال میں اُن کے گھر پر بنارسی کے تسلط کا بہ ظاہر ایک ہی بڑا سبب تھا اور ایک ہی صورت میں وہ یہ غلبہ ختم کر سکتے تھے کہ کسی طرح نولکھی کو بے فکری کا یقین دلا دیں۔ اتنا کما کے لائیں کہ نولکھی کو کوئی اندیشہ یا خدشہ لاحق نہ رہے پھر وہ اُسے کہیں بھی لے جا سکتے ہیں چناں چہ اُنھوں نے ہوٹل میں بیرا گیری کی، سڑکوں پر بوجھ اٹھایا، پھیری لگائی، سامان اِدھر سے اُدھر منتقل کرنے والی گاڑیاں کھینچیں۔ دونوں ساتھ مل کے کھینچتے تو وزن زیادہ اُٹھا لیتے تھے لیکن وہ بہت کم پیسے اکٹھے کر پاتے تھے. پیسوں کی اُنھیں شدید طلب تھی۔ کہیں کوئی درخت مل جائے جس پر پیسے کا پھل آتا ہو، کوئی خزانہ، کوئی نسخۂ کیمیا، زندگی میں پیسے کی کرشمہ سازی کے جلوے، وہ صبح و شام دیکھا کرتے تھے۔ سیٹھ لوگ، صاحب لوگ، ناک بھوں چڑھاتی ہوئی ریشم کی بنی شیشے کی بنی عورتیں، گاڑیاں، عمارتیں۔ پیسے کا مطلب ہے کہ آدمی کے کئی ہاتھ، کئی آنکھیں، کئی جسم ہو گئے دگنا، چار گنا، ہزار گنا آدمی، ایک زندگی میں کئی زندگیوں کا لطف، ایک جنم میں کئی جنم۔ پیسے کا مطلب ہے، رنگ، روشنی، خوشبو، سب کو پیسہ مرغوب ہے۔ پیسہ آدمی کی رفتار تیز کر دیتا ہے، چوری، جیب تراشی اور جوئے وغیرہ میں کسی وقت بھی قسمت یاوری کر سکتی ہے۔ دن بھر کے کمائے ہوئے پیسے رات کو جگنو اور دیوا داؤ پر لگا دیتے۔ کبھی کچھ فائدہ ہوتا، کبھی سارے گنوا دیتے۔ مگر اب اُنھیں اتنا غم نہ ہوتا، بھوک سے بھی اُنھیں ایسی بے کلی نہیں ہوتی تھی۔ وہ میلوں پیدل چلنے اور کئی دن تک فاقہ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے.

وہ دن دن بھر اور رات رات بھر گھر سے غائب رہنے لگے۔ نولکھی بھی اُن سے کچھ نہ پوچھتی۔ اسٹیشن پر وہ مسافروں کی تاک میں رہتے، جہاں بھی موقع ملتا، کوئی چیز اُٹھا کے بھاگ کھڑے ہوتے اور اونے پونے بیچ دیتے۔ پھر اُنھیں اندازہ ہوا کہ کسی باقاعدہ دادا کے سہارے بغیر جیب تراشی اور چوری وغیرہ میں کام یابی ممکن نہیں۔ اُنھوں نے چھوٹے موٹے داداؤں کا رُخ کیا اور بنارسی سے دُور دُور کے پاڑوں کے چکر لگانے شروع کیے۔ اُن کی آنکھوں میں بسی ہوئی دہشت اور اُن کے چہروں پر برستی وحشت، اُن کی نوعمری اور جسمی ناتوانی ہر جگہ رکاوٹ بنی رہی۔ دادا اُن سے زر خرید دل جیسا سلوک کرتے، کبھی بہت گندے اور اوچھے مذاق۔ جگنو اور دیوا اچھی طرح جان گئے تھے کہ پاڑے میں کوئی جگہ حاصل کرنے کے لیے یہ سلوک پہلے زینے کا درجہ رکھتا ہے۔ سو وہ وہاں ہر کام کے لیے تیار رہتے۔ چائے لانا، حقہ تیار کرنا، مالش، پاڑے کی جھاڑو، داداؤں کے دیگر کام۔ وہ ٹک جاتے مگر ابتدا ہی میں دو ایک پاڑوں پر بنارسی کے آدمیوں نے اُنھیں دیکھ لیا۔ وہاں اُن لوگوں نے جانے کیا کچھ کہا سُنا تھا کہ جگنو اور دیوا کا پاڑوں پر مزید ٹکے رہنا دشوار ہو گیا۔ پاڑوں کے دادا بھی کم و بیش اُنھی خطابات سے اُنھیں نوازنے لگے جو بنارسی کا وظیفہ تھے۔ بہت سے دادا نولکھی کے بارے میں اُن سے کرید کرید کر پوچھتے، بنارسی اور نولکھی کے بارے میں ایسی ناروا باتیں کرتے جن کا جواب دینا تو کجا، سننا بھی جگنو اور دیوا کو گوارا نہیں تھا.

جگنو کہہ رہا تھا، وہ ایک دوسرے سے پوچھتے تھے کہ وہ کیوں زندہ ہیں، دُنیا میں تو اُن کا کوئی کام ہی نہیں ہے۔ کبھی اُنھیں اپنا وجود اتنا حقیر لگتا کہ وہ موت ڈھونڈا کرتے۔ موت بھی اُنھیں نہیں آئی تھی جو اُنھوں نے سنا تھا اور جس کی تردید کے لیے وہ ہمہ دم، ہمہ جاں سرگرداں رہے تھے، وہ اُنھیں سارا سچ لگتا تھا، نامرادوں کے لیے ایک جواز کا گداز کہ سب کچھ لکیروں اور ستاروں پر منحصر ہے۔ کچھ لوگ پیدا ہی ٹھکرائے جانے کے لیے ہوتے ہیں۔ نالی کے کیڑوں اور خارش زدہ کتّوں کی طرح۔ زمین ہر کسی کو راس نہیں آتی۔ یہ زمین اُن کے لیے نہیں ہے تو وہ کیوں اصرار کر رہے ہیں۔ کبھی اُنھیں ہر رنگ اور ہر آواز ایک جیسی لگتی۔ اُنھیں معلوم تھا کہ موت کی دُوری بس ایک ارادے کے فاصلے پر ہے لیکن یہ فاصلہ اُن سے عبور نہیں ہو پاتا تھا۔ اِس کے درمیان اُن کا گھر پڑتا تھا، جہاں نولکھی اور پھول وتی رہتی تھیں۔ وہ جب گھر لوٹ کے آتے تو نولکھی کی پھیلی ہوئی بانہیں کچھ دیر کے لیے اُنھیں سب کچھ بُھلا دیتیں۔ پھول وتی اُن کے بازوؤں میں جھول جاتی۔ اُنھیں سب خواب سا لگتا، کوئی طلسم سا، اسی خواب اور طلسم کی تعبیر کی تلاش میں وہ پھر گھر سے نکل کھڑے ہوتے۔ روز اُن سے یہی تماشا سرزد ہونا تھا۔

بعد کے دنوں میں بنارسی کی آمد میں فصل بڑھ گیا۔ پندرہ بیس روز میں ایک بار۔ اسی نسبت سے جگنو اور دیوا کو کسی قدر فراغت نصیب ہوئی۔ پھول وتی چپکے چپکے اتنی بڑی ہو گئی تھی کہ اُنھیں کسی کی نظر لگ جانے کا دھڑکا لگا رہتا۔ وہ اپنی عمر سے بڑی باتیں کرتی تھی، باتیں ہی نہیں، سفید و سیاہ کی پرکھ بھی اُسے خوب ہو گئی تھی۔ جس رات بنارسی گھر آتا، وہ جگنو اور دیوا کو اُس سے دور رکھنے کے لیے گھر کے دروازے پر کسی کیل، کنڈے میں کوئی کپڑا اٹکا دیتی، جگنو اور دیوا دروازے ہی سے لوٹ آتے اور رات کسی فٹ پاتھ پر گزار دیتے۔ اُن کی موجودی میں بنارسی آ جاتا تو بات دُوسری تھی پھر وہ تمام آگ سینے میں دبائے اُس کی خدمت کرتے اور کسی بھی حکم کی تعمیل کے لیے ہر لمحے مستعد رہتے۔ ایک رات بنارسی انگوچھا پہنے چارپائی پر اوندھا پڑا تھا۔ نولکھی اُس وقت کمرے میں نہیں تھی۔ اب جگنو اور دیوا کے ہاتھ مالش میں طاق ہو چکے تھے۔ بمبئی کے پیشہ ور مالشیوں سے اُنھوں نے بہت سی نازک رگیں چھونا، چھیڑنا، یوں کہیے کہ رگوں کے تار ہلانا سیکھ لیا تھا۔ کم سے کم وقت میں مساموں کو زیادہ سے زیادہ تیل پلانا بھی اس فن میں شامل ہے۔ یہ جگنو اور دیوا کی مالش کا نشہ تھا یا دارو کا کرشمہ، بنارسی اُس رات بہت خوش نظر آتا تھا۔ اُن کا جی نہیں چاہتا تھا تاہم اُنھوں نے خوب سوچ سمجھ کے زبان کھولی اور کسی قدر ناز بردارانہ، تمام تر نیاز مندانہ لہجے میں پہلی بار بنارسی سے فرمائش کی کہ وہ اُسے اپنے پاڑے میں جگہ دے دے۔ وہ وہاں دوسرے داداؤں کی طرح اُس کی خدمت کرتے رہیں گے۔ کوئی اُن سا وفادار، خدمت شعار بنارسی کو شاید نہ ملا ہو۔ جگنو اور دیوا کو دوسرے پاڑوں کا اچھا تجربہ ہو چکا تھا۔ دوسرے کسی پاڑے سے وابستہ ہونے سے اُن کا جو مقصد تھا، وہ بنارسی کے پاڑے پر بھی پورا ہو سکتا تھا۔ اتنے گرم و سرد موسم گزارنے کے بعد آدمی میں یہ شاطری و زمانہ سازی آ جاتی ہے۔

جوا کھیلنا اُنھیں آ گیا تھا۔ یہ ایک ایسی بازی تھی جس میں جیت سے بہت فرق پڑتا تھا، ہار سے کچھ نہیں۔ جتنا وہ ہار چکے تھے، اِس سے زیادہ اُن کے پاس کچھ تھا ہی نہیں۔ جگنو کے بہ قول اُنھیں ذرا وقت درکار تھا جو اُنھیں کبھی نہیں ملا، سانس لینے کا وقت۔ ورنہ دوسرے پاڑوں میں وہی ہوتا رہے گا جو اب تک ہوتا رہا ہے۔ تمام ذلتوں کے باوجود، بنارسی کے پاڑے میں بڑی امان تھی۔ وہاں وہ کم از کم نولکھی کے بارے میں رسوا کُن باتیں سننے سے محفوظ ہو جاتے تھے، وہ باتیں جو اُنھیں بہت ڈسا کرتی تھیں۔

اُن کی التجا سن کے بنارسی ہنکاریاں بھرتا رہا۔ اُنھوں نے تکرار نہیں کی تا کہ خرخراتا ہوا کُتا بھڑک نہ جائے، بس کسی طرح چپکے سے راستہ مِل جائے۔ لوچ صرف آواز کا نہیں، نگاہ کا بھی ہوتا ہے، رفتار کا بھی اور ہاتھوں کا بھی۔ دیر تک وہ چپ چاپ اُس شکرے کے جسم پر اپنے ہاتھوں کا لوچ، اپنی انگلیوں کی مہارت آزماتے رہے۔ اُنھوں نے اُس فیلِ بدمست کی خاموشی نشانِ خسروی پر محمول کی۔ آخر وقت بہت گزر گیا تو بنارسی نے انگڑائی لی اور ڈوبی ڈوبی، بہکی بہکی آواز میں پوچھا

کر نولکھی کہاں ہے۔ وہ اُلٹے قدموں کمرے سے چلے آئے۔ چند لمحوں بعد نولکھی کمرے میں چلی گئی۔

بہت عرصے بعد اُنھوں نے ایک نرم و سبک رات گزاری۔ آدھی رات تک وہ اور پھول وتی سرگوشیاں کرتے رہے، دُنیا جہان کی باتیں۔ پھول وتی اپنے جھکتے لہجے میں اُنھیں آس پاس کے قصّے سُناتی رہی۔ پھر اُنھیں نیند آگئی۔ بنارسی علی الصّباح چلا گیا تھا۔ اُس روز اُنھوں نے بہ طورِ خاص غسل کا اہتمام کیا، صاف کپڑے پہنے۔ وہ اپنی طرف سے پوچھنا نہیں چاہتے تھے، بار بار اُن کی نظریں نولکھی کی طرف اُٹھتی تھیں کہ شاید بنارسی نے اُن کے بارے میں اُس سے کوئی بات کی ہو۔ نولکھی بہت تھکی ہوئی تھی، سُوجی سُوجی آنکھیں۔ تاہم اُس نے اُن کے لیے سبزی کا پراٹھا بنایا اور بالائی والا چائے کا پیالہ۔ ناشتہ کر کے وہ گھر سے نکل گئے۔ اُس وقت دس بج رہے تھے۔ کچھ اور وقت گزارنے کے لیے وہ اِدھر اُدھر سڑکوں پر مٹر گشت کرتے رہے۔ اُن کا رُخ بہرحال پاڑے کی طرف تھا۔ دھوپ ہر طرف پھیل چکی تھی جب اُنھوں نے دھڑکتے قدموں سے پاڑے پر قدم رکھا۔

دالان کے وسط میں کئی داداؤں کے درمیان بیٹھا، بنارسی دادا چوسر کھیل رہا تھا۔ دونوں کو دیکھ کے اُس کا ہاتھ رُک گیا۔ جگنو اور دیوا چند قدم آگے جا کے ٹھہر گئے اور نظریں جھکائے کھڑے رہے۔ بنارسی کی شعلہ بار نظروں اور دھمکتی آواز پر وہ پہلے ہی متزلزل ہو گئے، اُن سے کچھ کہا نہیں جا سکا۔ بنارسی کو جیسے کچھ یاد نہیں تھا۔ اُس نے پھنکارتے لہجے میں اُن سے پوچھا کہ کون سی پریشانی اُنھیں یہاں لائی ہے۔ جگنو نے جیسے تیسے ہمّت کی اور سٹ پٹاتے ہوئے رات کی بات یاد دلائی۔ بنارسی کا مُنہ پھیل گیا اور اپنے قریب بیٹھے ہوئے آدمیوں کی طرف مُنہ کر کے وہ یک دم ہنسنے لگا، جیسے جگنو اور دیوا نے کوئی لطیفہ سنایا ہو یا کوئی بہت ہی مضحکہ خیز بات کہی ہو۔ بنارسی کے ساتھیوں نے بھی اُس کی ہم نوائی کی۔ ساری عمارت اُن کے قہقہوں سے گونجنے لگی۔ وہ دونوں ہونقوں کی طرح ایک دوسرے کی صورت دیکھا کیے۔ بنارسی اپنے آدمیوں سے مخاطب ہو کے چٹخنے پن سے بولا، "لو بھئی مُستا، چھٹی ہو گیا سالا۔ ابھی اکھا چاقو چھرا پھینکنے کا ہے راجا لوگ کے آگے...." جگنو نے صرفِ نظر کیا اور عاجزانہ کہا کہ وہ دونوں پاڑے کے لیے مفید ثابت ہوں گے۔ بنارسی برہم ہو گیا اور گالیاں بکتے ہوئے بولا کہ اُنھوں نے کیا سوچ کے اُس کے پاڑے پر قدم رکھنے کی جرأت کی ہے۔ جس ہتھ لکّے، "اٹھائی گیرے کا جی چاہے، مُنہ اُٹھائے چلا آتے؟ ایں؟ یہ اصیلوں کا پاڑا ہے، چوٹّوں چماروں کا نہیں۔ اُنھوں نے آئینے میں اپنی صورت دیکھی ہے، یہاں داخلے کے لیے .... وہ جو مُنہ میں آیا، بکتا رہا۔ جگنو اور دیوا کا بس نہیں چلتا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اُس میں سما جائیں۔ جگنو کہہ رہا تھا کہ ہم دونوں کی جیبوں میں چاقو تھے اور جی ہی کرتا تھا کہ زقند بھر کے بنارسی کے سر پر جا پہنچیں اور اِس سے پہلے کہ وہ اور اُس کے حاشیہ بردار کچھ سنبھلیں، ہم بنارسی کا جسم چیر پھاڑ ڈالیں، پھر جا ہے ہمارے ساتھ جو بھی ہو۔

لیکن اِس سے پہلے کہ بنارسی کے آدمی اُنھیں دھکّے دے کے پاڑے سے نکالتے، وہ وہاں سے چلے آئے۔

بنارسی کے اِس برتاؤ کے بعد جگنو اور دیوا نے کسی پاڑے سے وابستگی کا خیال ہی دل سے نکال دیا۔ جہاں جیسا کام مل جاتا، کر لیتے، جہاں جیسا موقع ہاتھ آتا، ہاتھ کی صفائی دِکھا دیتے۔ بنارسی کی آمد میں بتدریج کمی کے سبب گھر کے خرچ میں بہت تنگی ہونے لگی تھی۔ اب بہت کچھ اُنھی پر منحصر تھا۔ کبھی گھر میں روٹی نہ پک پاتی تو نولکھی اور پھول وتی خود مزدوری کی غرض سے باہر جانے کے لیے اصرار کرتیں۔ گھریلو کاموں اور زیرِ تعمیر عمارتوں میں عورتوں کو روزگار مل جاتا تھا۔ شاید یہ نام کا اثر تھا، پھول وتی کپڑے پر ایسے ایسے گل بُوٹے تراش لیتی تھی کہ نگاہیں دھوکا کھا جائیں۔ جگنو اور دیوا نے دونوں کو گھر سے نہیں نکلنے دیا اور خود شب و روز ایک کرتے رہے۔ بے شمار نامرادوں کی طرح لکشمی کی مسیحائی پر اُن کا یقین تھا۔ لکشمی کا کچھ طے نہیں ہے، کسی آن بھی مہربان ہو جائے۔ وہ جانتے تھے کہ رنگ، ذات، قد کاٹھی، ناتواں، توانا کے امتیازات سے لکشمی کو کوئی علاقہ نہیں ہے۔ اُن کی گلی سے ایک گلی آگے کاٹھ کباڑ کا کام کرنے والا، ہتھّل ہتھّل کرتا موٹا اور کالا سیٹھ نرائن برسوں سے لکشمی کی نگاہِ خاص کا زندہ ثبوت تھا۔ وہ لوگ ابھی موجود تھے جنھوں نے ایک زمانے میں اُسے سڑکوں پر بے حال دیکھا تھا، اِدھر ہوا کے جھونکے سے بل کھا جانے والا سیٹھ فیروز، لکشمی کو جانے اُس کی کون سی ادا بھا گئی تھی کہ ہزار جان سے فریفتہ تھی۔ بنارسی جیسے آدمی سیٹھ فیروز کی دہلیز پر ہڈی کے لیے منڈلایا کرتے تھے۔ جگنو اور دیوا نے جوئے کے علاوہ ٹونے ٹوٹکے بھی بہت کیے کہ کوئی ایک لمبا ہاتھ پڑ جائے، صرف ایک بار۔ اُس کے بعد تو وہ لکشمی کو ایسا روک کے، باندھ کے رکھیں گے، ایسی اطاعت گزاری اور پرستار داری کریں گے کہ دُنیا دیکھے گی۔ مگر وہی بات، لکشمی کی اپنی پسند اور ترجیح ہوتی ہے۔ یہ بھی گمان ہے کہ کوئی اُسے روک کے،

باندھ کے رکھ سکتا ہے۔ ٹھیرنا نہ ٹھیرنا سب اُس کی مرضی پر ہے۔ جگنو اور دیوا جتنا اُس کی جستجو میں رہتے تھے، اُتنا ہی وہ اُن سے بے نیاز تھی، اور اُن کا وہی حال تھا جو اُن جیسے بے شمار لوگوں کا تھا۔ اُنھیں معلوم تھا کہ لکشمی کا ظرف اتنا کشادہ نہیں ہے، وہ معدودے چند، سو میں سے چند ایک ہی پر اپنی نوازشیں ارزاں کرتی ہے۔ باقیوں کی آسرے میں گزر جاتی ہے۔ غالباً یہی رمز ہے کہ کسی آسرے میں زندگی آسانی سے کٹ جاتی ہے۔

نولکھی کے بدن میں کوئی مکڑی چھپ کے بیٹھ گئی تھی اور لگتا تھا، اُس کی بیٹی پھول وتی جیسے مسلسل اپنی ماں کا خون چوستی رہی ہو۔ اپنی ماں کا سارا رنگ روپ اُس نے چُرا لیا تھا۔ نولکھی کے پتّے گرنے شروع ہوئے تو دیکھتے دیکھتے صرف شاخیں رہ گئیں اور شاخیں دیمک کو مرغوب ہوئیں۔ بنارسی کی آمد کبھی کبھار کی رہ گئی، مہینوں مہینوں کے وقفے سے۔ جگنو اور دیوا کی اُس سے مہینوں ملاقات نہیں ہو پاتی تھی۔ ہر چند کہ اب وہ زیادہ وقت گھر ہی گزارتے تھے، بیمار نولکھی کی خاطر اور اپنی پھول وتی کی خاطر، وہ ان کی جڑواں بہن تھی، اندھیروں میں کسی چراغ کے مانند، صحراؤں میں پھول کی طرح۔ وہ اُسے چھپا کے رکھتے تھے کہ کہیں کسی کی نظر نہ لگ جائے، کہیں کوئی دیکھ نہ لے کہ اُن کے گھر میں ایک شہزادی چھپی ہے۔ رات کو وہ ٹوٹے ٹوٹے بکھرے بکھرے گھر آتے تو اُس کا چہرہ دیکھ کے اُن کی ساری کلفتیں کافور ہو جاتیں۔ نولکھی کے علاج کے لیے وہ اپنی بساط سے زیادہ کوششیں کرتے رہے۔ کچھ دن کے لیے وہ بھلی چنگی ہو جاتی، پھر پہلے سے بھی بدتر....

برس بیت گیا، بنارسی نہ پلٹا، پھر کوئی چھ مہینے اور گزر گئے، بنارسی نے لوٹ کے خبر نہیں لی مگر ایک رات وہ راستہ بھول گیا۔ جگنو اور دیوا گھر میں تھے۔ سب اُسے دیکھ کے دم بہ خود رہ گئے۔ نولکھی کے حال سے بنارسی کا رنگ کچھ متغیّر ہوا اور اُس نے جگنو اور دیوا ہی پر الزام دھرا کہ اُنھوں نے نولکھی کی علالت کے بارے میں اُسے مطلع کیوں نہیں کیا۔ جگنو اور دیوا کیا جواب دیتے، بنارسی نے علاج کے لیے اچھی خاصی رقم نولکھی کے حوالے کی۔ یہ مہربانی جگنو اور دیوا کے لیے حیرت انگیز تھی۔ وہ بنارسی سے ایک پیسہ تک لینے کے روادار نہ تھے لیکن رقم واپس کرنے میں بنارسی سے ربط ضبط کا پہلو نکلتا تھا اور اُس کے کاٹ کھانے کا خدشہ الگ تھا۔ وہ چپ رہے۔ اُنھیں اطمینان تھا کہ بنارسی اب بار بار نہیں آئے گا کیوں کہ نولکھی کے بدن میں خون نہیں رہا ہے اور اُس کی آنکھوں کا نیلا رنگ گدلا گیا ہے مگر یہ اُن کا واہمہ تھا۔ بنارسی تو تواتر سے آتا رہا اور توقع کے خلاف اُس نے روپے پیسے کی اعانت بھی جاری رکھی۔ ایک روز وہ کسی وید کو بھی ساتھ لایا۔ گھر میں اُس کی دوبارہ آمد و رفت جگنو اور دیوا کو بہت شاق گزرتی تھی۔ وہ حیران و پریشان سب کچھ دیکھتے رہے، تماشائی کی طرح۔ بنارسی کا یہ رویہ اُس کی خود غرضی اور سخت گیری سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا تھا۔ پشیمانی اور عجز بھی آدمیوں کو ہوتی ہے، یہ آدمیوں کا شیوہ ہے۔ بنارسی میں آدمیوں کی خوبو ہی نہیں ہے، وہ اُن سے بھی بہ ظاہر کوئی پرخاش نہیں رکھتا تھا لیکن اُس کا رویّہ دوستانہ بھی نہیں تھا۔ سڑک پر صدائیں لگاتے ہوئے بھکاریوں کو دیکھے بغیر جس طرح راہ گیر گزر جاتے ہیں، جگنو اور دیوا سے بنارسی کا سلوک بھی کچھ یہی تھا۔ چند دنوں میں وہ اپنے ہی گھر میں اجنبی ہو گئے تھے اور اُن دونوں کا بھی یہی حال تھا، نولکھی اور پھول وتی کا۔ کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔ اتنے عرصے میں بنارسی کا شمار بمبئی کے نامی گرامی داداؤں میں ہونے لگا تھا۔ اُس کا پاڑا شہر کے بڑے بڑے پاڑوں میں گنا جاتا تھا۔ شہر کے سب سے بڑے دادا تیواڑی سے اُس کے خصوصی مراسم تھے۔

تیواڑی کے نام پر میں سیدھا نہ بیٹھا رہ سکا۔ اُسی وحشی نے کرشنا جی کو ختم کیا تھا۔ کرشنا جی کو گئے ہوئے اتنے دن نہیں گزرے تھے کہ تیواڑی اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا۔ اُس کے بہت سے حواری بھی چلے گئے تھے لیکن کرشنا جی اتنے ارزاں نہیں تھے۔ جب بھی تیواڑی کا خیال آتا، میری رگوں میں خون جلنے لگتا۔ اُس وقت بمبئی کے متعدد پاڑے اُس کے حاشیہ بردار تھے، پیرو دادا کے پاڑے کی طرح آپس میں جتنے ہوئے تو نہیں تھے مگر کوئی تیواڑی سے الگ نہیں تھا۔ اختلاف ویسے بھی منصب داروں کو پسند نہیں آتا۔ تیواڑی تو آدھی بمبئی کا راجا تھا۔ میں نے دخل نہیں دیا اور خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔ جگنو نے بتایا کہ بنارسی نے گھر کے خرچ ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ اُس نے اِس مختصر گھر میں رنگ و روغن کرا دیا۔ کئی چیزوں کا اضافہ کیا۔ نئی مسہری، بستر، چادریں، میز کرسی، نئے طرز کے برتن وغیرہ۔ دوائیں، پھل، وید حکیم کا خرچ مستزاد تھا مگر نولکھی اور زیادہ ہمّت کھونے لگی۔ اب اُس کے چہرے پر آنکھیں ہی رہ گئی تھیں۔ پھول وتی کا بھی یہی حال تھا۔ وہ ہر وقت سہمی سہمی رہتی تھی جیسے تیز دھوپ میں گلاب فریادی سا لگتا ہے، اپنے رنگ اور خوشبو کے لیے اصرار کرتا رہتا ہے۔ بنارسی کے آنے پر اُس

کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے۔ بنارسی نے پہلے کبھی ایک باپ کی طرح اُس کے سر پر ہاتھ نہیں رکھا تھا مگر اب اچانک وہ اُس کا بھی خیال رکھنے لگا تھا۔ اُس نے پھول وتی کے لیے نئے کپڑے بنوائے، چاندی کے کئی زیور، طلائی بالیاں اور نتھ۔

پھول وتی بچّی نہیں رہی تھی جو کھلونوں سے بہل جاتی اور جو اپنے جلوہ و منظر میں خود مزیّن و مرصّع ہوں، اُن میں ایک استغنا بھی لازم ہے۔ جگنو کے مفہوم کے مطابق، پھول وتی تو خود سر تا پا ایک ملبوسِ بہار تھی، ترشے ہوئے مجسمے کے مانند۔ لباس و زیور اُس کی چھب کیا بڑھاتے، اور نشاطِ قلب کے بغیر تو یوں بھی سب اکارت ہے۔ آدمی کا وجود بھی اکارت۔ ممکن ہے، نولکھی نے اپنی بیٹی کو بنارسی سے اُس کی نسبت کے بارے میں کچھ باور کرایا ہو۔ پھول وتی کی عزتِ نفس کے لیے کوئی نہ کوئی جواز تو اُس نے دیا ہی ہوگا۔ نولکھی کچھ نہ بتا پائی ہوگی تو ہوش مند پھول وتی نے خود اخذ کرلیا ہوگا، مگر اصل نسبت تو تعلقِ خاطر کی ہوتی ہے، دل داری و دِل ستانی کی، غم گساری اور دردِ مشترک کی۔ پھول وتی نے شیر خواری سے آغازِ شباب تک بنارسی کا ایک ہی روپ دیکھا تھا یا بنارسی نے اپنا ایک ہی رنگ دکھایا تھا، پاڑے کا دادا، جو سینگ نکالے، ڈکراتا ہوا اُس کے گھر آنے کا حق رکھتا ہے، جس کی آمد پر اُس کی ماں بے دست و پا ہوجاتی ہے، بار بار اُس کی نگاہیں آسمان کی طرف اُٹھتی ہیں۔ پھول وتی کے رگ و ریشے میں پیوست اپنے نقش کھرچنے میں بنارسی کے لیے کوئی بھی مدّت بہت کم تھی۔ بعض نقش مٹائے نہیں مٹتے، آدمی کے ساتھ جاتے ہیں۔ سب کچھ اتنا گہرا تھا کہ بنارسی کی ہر مہربانی صاف اُس کے ستم کا پیش خیمہ معلوم ہوتی تھی۔ اُس کے روز افزوں لُطف و کرم سے پھول وتی بہت ہراساں تھی۔ اُس نے جگنو اور دیوا سے التجا کی کہ جتنی جلد ہوسکے، وہ کسی طرف بھاگ نکلیں۔ حکیم ڈاکٹر کو دکھانے کے بہانے نولکھی کو کسی طرح اسٹیشن لے جائیں گے اور کسی بھی گاڑی میں بیٹھ کے جتنی دُور ہوسکے گا، چلے جائیں گے مگر اب دیر ہوگئی تھی۔ اب یہ ایسا آسان نہیں رہا تھا۔ نولکھی طویل سفر کے قابل نہیں تھی۔ جگنو اور دیوا نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ انھوں نے گھر کے آس پاس اکثر بنارسی کا کوئی نہ کوئی آدمی منڈلاتے دیکھا ہے۔ بنارسی نے یہ اہتمام کچھ جان کے ہی کیا ہوگا۔ یہ سُن کے پھول وتی اور پریشان ہوجاتی۔

ایک روز بنارسی شام کو آکے گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد نولکھی کا حال کچھ اور ابتر ہوگیا۔ بنارسی کی موجودگی کے سبب جگنو اور دیوا گھر سے نکلے ہوئے تھے۔ پھول وتی نے پڑوسیوں سے منّت سماجت کرکے اُنھیں تلاش کرایا۔ دونوں قریب ہی مل گئے۔ گھر پہنچے تو پھول وتی کی آنکھوں سے جھڑی لگی ہوئی تھی۔ نولکھی کراہ رہی تھی۔ دونوں کسی ڈاکٹر کے لیے گھر سے نکلنا چاہتے تھے مگر نولکھی نے روک لیا اور کہا کہ وہ اُن سے چند باتیں کرنا چاہتی ہے، پھر وقت نہ ملے۔ اُس نے پھول وتی کو ہدایت کی کہ وہ کچھ دیر کے لیے کمرے سے چلی جائے۔ پھول وتی پاس سے ہٹ گئی تو نولکھی نے جگنو اور دیوا سے کہا کہ وہ کسی طرح پھول وتی کو لے کے یہاں سے دُور چلے جائیں، بمبئی شہر سے بہت دُور۔

یہ نولکھی کیا کہہ رہی ہے؟ دونوں ہکا بکا اُس کی صورت دیکھنے لگے۔ نولکھی نے اُن سے کہا کہ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو اور بہتر ہے کہ کوئی حیل و حجت نہ کرو۔ اب وقت بالکل نہیں رہا۔ اگر پھول وتی کو محفوظ کرنا چاہتے ہو تو میرا خیال کیے بغیر یہاں سے بھاگ نکلو، پھر مجھے زیادہ سکون سے موت آئے گی۔

یہ کیسے ممکن تھا۔ جگنو اور دیوا سناٹے میں آگئے۔ نولکھی نے پھر اُن سے منّت کی اور اُنھیں بتایا کہ بنارسی کے ارادے اُسے اچھے نہیں لگ رہے۔ بنارسی سے کچھ بعید نہیں۔ ابھی موقع ہے۔ اُس کی (نولکھی کی) موجودگی میں وہ آسانی سے پھول وتی کو لے جاسکتے ہیں، پھر جانے کیا ہوجائے۔ اُن سے زیادہ کوئی اور پھول وتی کا محافظ نہیں ہوسکتا اور نہ وہ دونوں پھول وتی کے بغیر چین سے رہ سکیں گے۔ نولکھی نے اُکھڑی سانسوں میں اُن سے کہا کہ اُس نے پھول وتی اور جگنو دیوا میں کبھی کوئی فرق نہیں کیا۔ اُس کی تمنا تھی کہ وہ پھول وتی کا بیاہ اُن میں سے کسی ایک کے ساتھ کرے گی۔ اب تک اُس نے اِس خواہش کا اظہار یوں نہیں کیا تھا کہ ابھی یہ قبل از وقت تھا۔ دوسرے وہ پھول وتی کی مرضی بھی دیکھنا چاہتی تھی اور کوشش کے باوجود آج تک وہ یہ نہ جان سکی کہ جگنو اور دیوا میں سے کون پھول وتی کو زیادہ عزیز ہے۔ وہ دونوں بھی ایک دوسرے کے لیے ہمیشہ ایثار پر آمادہ رہتے ہیں۔ نولکھی کو یقین تھا کہ پھول وتی کے معاملے میں بھی وہ یہی کریں گے، کوئی ایسا فیصلہ جس میں تینوں کے لیے سلامتی اور سکون ہو۔ نولکھی نے کہا، اُسے اندازہ ہے کہ اُن کے لیے یہ فیصلہ کرنا کس قدر دشوار ہوگا لیکن اِسی میں تینوں کی بہتری ہے۔ کسی ایک کے پیچھے ہٹ جانے کا مطلب پھول وتی سے مکمل دست برداری نہیں ہے۔ اچھا ہوگا کہ اُن کے درمیان اس معاملے میں کوئی تلخی نہ ہو، ورنہ پھر یہی مناسب ہے کہ وہ پھول وتی کے لیے کوئی اور بَر ڈھونڈ لیں اور اچھی طرح جان لیں کہ اُن کے مابین رنجش کی صورت میں پھول وتی بھی کسی فیصلے کا حق رکھتی ہے۔ یوں وہ خوش رہیں گے، نہ پھول وتی اور نہ اُس کی ماں کی رُوح کو قرار آئے گا۔

دونوں سب سُن رہے تھے اور حیران تھے کہ نولکھی یہ کیسی باتیں کررہی ہے۔ ابھی سہ پہر تو وہ اُسے بہت بہتر چھوڑ گئے تھے، اتنی دیر میں یہ کیا ہوگیا۔ جگنو اور دیوا یہ سب دیکھنے اور سننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ کیا واقعی، جیسا کہ نولکھی کہہ رہی ہے، وہ اُن سے جُدا ہو رہی ہے۔ اُن کے حواس کام نہیں کررہے تھے کہ وہ کیا کریں، نولکھی کو کیا جواب دیں۔ اُن میں تو یہ کہنے کی ہمت بھی نہیں تھی کہ نولکھی اُن کا بھی کچھ خیال کرے، اُس کے بغیر تو وہ کہیں کے نہ رہیں گے۔ نولکھی نے ان کے لرزتے ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپانا چاہا اور کرب سے بولی، وعدہ کریں کہ جو اس نے کہا ہے، اُسی پر عمل کریں گے۔ جگنو اور دیوا کو رونے کا بھی یارا نہیں تھا، دونوں نے دیوانہ وار اُس کے ہاتھ پکڑ لیے اور بلکتی آواز میں دیوا نے وہی کچھ کہنے کی کوشش کی، جو بسترِ مرگ پر پڑی ہوئی اپنی ماں، بہن یا اپنے کسی جزوِ جاں کے لیے کوئی کہہ سکتا ہے۔ نولکھی کے زرد ہونٹوں پر ایک لمحے کے لیے مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اُس نے اشارے سے دونوں کو قریب ہونے کے لیے کہا اور اُن کی پیشانیاں چوم کے بولی کہ وہ اُسے معاف کردیں، وہ اُن کے لیے کچھ بھی نہ کرسکی۔ بہت آرزوئیں تھیں اُس کے دِل میں۔ کہنے لگی، وقت نے ساتھ ہی نہیں دیا۔ شروع کے دِن اِس خوف میں گزر گئے کہ وہ دونوں کہیں اس سے چھن نہ جائیں۔ نولکھی نے اُن سے کہا کہ وہ سینے پر کوئی بوجھ لیے مرنا نہیں چاہتی۔ پہلی بار اُس نے اُنھیں بتایا کہ کاشو دادا اُن کا باپ نہیں تھا۔ یقیناً وہ کسی بڑے گھر کے کسی دولت مند گھرانے سے تعلق رکھتے ہوں گے جہاں سے کاشو دولت کی لالچ یا دُشمنی میں اُنھیں اُٹھا کے لے آیا تھا۔ اُس نے کاشو سے اصل بات جاننے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکی۔ کاشو کو بہت جلدی تھی۔ وہ کچھ روپیہ پیسہ نولکھی کے حوالے کرکے فوراً چلا گیا تھا۔ اُس نے نولکھی اور اُس کی ماں کو بچّوں کا خاص خیال رکھنے کی تاکید کی تھی اور کہا تھا کہ جب تک وہ واپس نہ آئے، اس کی امانت سمجھ کے دونوں بچّوں کی نگرانی کی جاتی رہے۔ جگنو کو اس وقت تیز بخار تھا۔ ماں بیٹی نے اس کی دیکھ بھال میں دن رات ایک کردیے۔ کاشو کی خصلت سے وہ واقف تھیں۔ جگنو کو اگر کچھ ہوجاتا تو وہ درندہ اُن کی زندگی اجیرن کردیتا۔

کاشو واپس نہیں آیا۔ نولکھی اور اس کی ماں انتظار کرتی رہیں تاآں کہ اُنھیں اُس کی موت کی خبر ملی۔ کسی نے بتایا کہ ناگ پور کے قریب کاشو مارا گیا۔ نولکھی کو یقین نہیں آتا تھا کہ کاشو جیسا گراں ڈیل، چست و چالاک، چاروں طرف آنکھیں کھلی رکھنے والا شخص اتنی آسانی سے کیسے ختم ہوسکتا ہے۔ اس نے انتظار کیا۔ رفتہ رفتہ کاشو کے دیے ہوئے پیسے اور کچھ اپنی جمع پونجی سب کچھ وقت کی بازی گری میں چھو ہوگیا۔ ماں کو بمبئی کی آب و ہوا راس نہیں آئی تھی۔ اُس کے ہاتھ پیروں کو سمندر کی ہوا نے کھوکھلا کردیا تھا۔ بچّوں کی دیکھ بھال وہ ایسی مستعدی سے نہیں کرسکتی تھی۔ تاہم فاقوں سے تنگ آکے نولکھی نے باہر نکلنا شروع کردیا۔ اُس کے پاس ایک ہی ہنر تھا، جو بے چہرہ لوگوں میں نہیں ہوتا۔ آس پاس کے چند لوگوں نے شروع شروع میں اُس کی مدد کی۔ پھر وہ مطالبے کرنے لگے۔ نتیجتاً نولکھی کو چند لوگوں سے رسم و راہ رکھنی پڑی۔ اس طرح ایک روز بنارسی اُن کے گھر آگیا۔ کاشو نے نولکھی سے اپنے چھوٹے بھائی کا بہت تذکرہ کیا تھا۔ دونوں میں کوئی عداوت نہ تھی تو یگانگت بھی نہیں تھی، دونوں اپنے اپنے راستے چلتے تھے۔ حالاں کہ کاشو ہی بنارسی کو بمبئی لایا تھا۔ یہاں آکے کاشو کے بہ قول، وہ وقت سے پہلے پیروں پر کھڑا ہوگیا۔ نولکھی نے جگنو اور دیوا کے بارے میں بنارسی کو کچھ نہیں بتایا تھا مگر بدقسمتی سے ایک روز اُس کی بوڑھی ماں کی زبانی نکل گیا کہ دونوں بچّوں کو کاشو اُن کے پاس چھوڑ گیا ہے۔ ماں نے اپنی دانست میں احتیاط کی تھی کہ بعد

میں کسی وقت بنارسی کو سچ کا علم ہوا تو نہ جانے کیا قیامت برپا کرے۔ یہ سُن کے بنارسی کئی دن غائب رہا، واپس آیا تو بہت کشیدہ و کبیدہ تھا۔ نولکھی نے ٹوہ لینے کی کوشش کی لیکن بنارسی کی مرضی کے بغیر اُس سے کچھ جان لینا کارے دارد تھا۔ ابتدا ہی میں نولکھی کو دونوں بھائیوں کے فرق کا خوب اندازہ ہو گیا تھا۔ گُنتے بھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ مختصر یہ کہ بنارسی کسی طور اپنے بھائی کا ہم سر نہیں تھا۔ کاشو کو بات سننا آتا تھا، بنارسی صرف اپنی بولی سنتا، اپنی بولی سمجھتا تھا۔ نولکھی نے کہا کہ کاشو کی موت اور بنارسی کی آمد کے دوران وہ بمبئی چھوڑ کے کہیں چلی جاتی تو شاید سب بدلا ہوا ہوتا لیکن اِدھر کاشو کی موت کی خبر دیر سے آئی، اُدھر جگنو اور دیوا، دو چھوٹے چھوٹے بچّے ساتھ ہونے کی وجہ سے وہ کہیں اور جا کے قسمت آزمانے کا حوصلہ نہ کر پاتی، اس کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک روز بنارسی آ جائے گا اور اپنا ہی گھر نولکھی کے لیے زنداں بن جائے گا۔

جگنو اور دیوا گُنگ بیٹھے تھے۔ آج پہلی مرتبہ نولکھی نے اُن کے اور اپنے بارے میں اتنا کچھ کہا تھا۔ جگنو اور دیوا پر متضاد کیفیتیں طاری تھیں۔ خوف، رنج، خوشی، غصہ، حیرت۔ طرح طرح کے سوال اُن کا سینہ متلاطم کیے ہوئے تھے مگر اُنھوں نے کچھ نہیں پوچھا۔ غالباً اِس اندیشے سے کہ نولکھی کی زبان میں لکنت نہ آ جائے یا وہ کوئی ایسی بات نہ پوچھ بیٹھیں جس کا جواب دینا، اپنے آپ سے نبرد آزما شکستہ جاں نولکھی کے لیے مشکل ہو یا جو جواب سننا خود اُن کے لیے عذاب۔ وہ بُتوں کی طرح گُم بیٹھے سنتے رہے۔

سب کی نظر شمع پر رہتی ہے۔ خود شمع کتنے اندھیروں سے دوچار ہے، یہ کوئی نہیں جانتا۔ نولکھی نے اُنھیں بتایا کہ بچپن ہی سے اندھیروں نے اُس کا گھر دیکھ لیا تھا۔ وہ چند سال کی تھی کہ باپ کا انتقال ہو گیا، کچھ عرصے بعد اکلوتا بڑا بھائی ملیریا میں چل بسا۔ وہ غازی پور کے ایک چھوٹے سے زمیں دار یا ایک بڑے کسان کی بیٹی تھی جس کے پاس اپنا ایک معقول قطعۂ اراضی تھا۔ باپ گوشہ نشین آدمی تھا، اُدھر قریب میں کوئی غیرت مند عزیز نہیں تھا جو ماں بیٹی کا سہارا بنتا۔ شوہر اور بیٹے کے صدمے سے نیم جاں نولکھی کی ماں نے ناچار کاشت کاری کے کاموں کی نگرانی شروع کی لیکن زمین کو غالباً مردوں سے کوئی خاص رغبت ہے جبھی اس زنِ نادار کے ہاتھ سے نکلتی گئی۔ ایک چھوٹا سا قطعہ گزر اوقات کے لیے رہ گیا۔ وہ بھی نکل جاتا مگر ایک رات کاشو اُن کے گھر آ دھمکا۔ نولکھی جوان ہو چکی تھی اور ماں کو اس کی بہت فکر تھی۔ ایک چینی کہاوت ہے، حسین لڑکی کی منگنی اس کے پالنے میں ہو جاتی ہے، نولکھی کے کئی رشتے آئے۔ جگنو اور دیوا اندازہ کر سکتے تھے کہ اِرد گرد کے کتنے لوگوں نے نولکھی کو گھر لانا چاہا ہو گا۔ ماں ابھی کوئی فیصلہ نہ کر پائی تھی کہ کون سا گھر اور کون سا بر نولکھی کے لیے موزوں رہے گا کہ کاشو آ گیا۔

اُس رات ماں بیٹی اپنی ایک قدیم ملازمہ کے ساتھ گھر میں سو رہی تھیں۔ ملازمہ کا عمر رسیدہ شوہر غازی پور سے باہر کسی میلے میں گیا ہوا تھا۔ وہ موجود ہوتا بھی تو کیا فرق پڑتا۔ بہر حال تینوں عورتیں گھر میں اکیلی تھیں کہ پہلے کھٹکے پر نولکھی کی ماں کی آنکھ کھل گئی۔ جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا، اپنے سامنے ایک خشم ناک، خنجر بدست شخص کو دیکھ کر دھک سے رہ گئی۔ وہ کاشو تھا۔ اس نے بتایا کہ پولیس اس کے پیچھے ہے، جب تک پولیس کا خطرہ ٹل نہیں جاتا، وہ گھر میں چھپا رہے گا۔ کوئی بھی مطلق پریشان نہ ہو۔ اس کے ساتھ اعانت کی گئی تو وہ خاموشی سے چلا جائے گا اور اس خدمت کا صلہ الگ دے گا اس نے ان تینوں کو ایک گوشے میں بیٹھ جانے کا حکم دیا، اسی اثنا میں اس کی نظر نولکھی پر پڑی۔ نولکھی کی ماں اور خود نولکھی نے اپنے آپ کو بہت چھپانا چاہا، حُسن و جمال بھی مال و زر کی طرح ہوتا ہے، ڈھکا چھپا رہے تو بد نگاہی سے محفوظ رہتا ہے۔ کاشو اپنے آپے میں نہ رہا نولکھی کو دیکھ کے وہ سب کچھ بھول بیٹھا کہ کہاں ہے۔ اسے اتنا بھی یاد نہ رہا کہ ابھی لوگوں نے پناہ دی ہے مگر پناہ تو اس نے خود حاصل کی تھی، خنجر کے زور پر، اور خنجر اسی کے پاس تھا۔ وہ خود بھی کسی خنجر سے کیا کم تھا۔ ملازمہ کی گھگھی بندھی ہوئی تھی۔ کاشو کی ایک ضرب سے وہ بے سُدھ ہو گئی۔ نولکھی کی ماں نے مزاحمت کرنی چاہی مگر کاشو جیسے قوی ہیکل کے سامنے وہ کتنی دیر ٹکتی۔ نولکھی ویسے ہی اَدھ موئی ہو چکی تھی۔

نولکھی کے بہ قول، وہ اسی رات مر گئی تھی۔ موت اور کیا ہوتی ہے۔ یہ دوسری نولکھی ہے جس نے اُس سیاہ رات کو ایک اور جنم لیا تھا۔ کاشو نوٹوں کی گڈّی اور سونے کی چوڑیاں اس کے سرھانے ڈال کے کسی وقت چلا گیا۔ نولکھی کو چپ لگ گئی۔ ماں اور ماں جیسی ملازمہ نے بہت منت سماجت کی کہ جو لکھا ہوتا ہے، اُس سے مفر نہیں ہے، کوئی بھی اسے ٹال نہیں سکتا۔ آدمی تو بہت بے بس ہے۔ ماں نے اپنے لیے بیٹی سے زندگی کی بھیک مانگی۔ نولکھی کہہ رہی تھی، اب کیا رہ گیا تھا۔ وہ خود کو ختم کر لیتی۔ یہ اس کی ماں ہی تھی جس نے اُسے مرنے نہیں دیا اور اپنی بیٹی پر اور ستم کیا۔ ایک شورہ پشت اجنبی کے گھر

میں داخل ہونے کے واقعے سے صرف ملازمہ واقف تھی جس کی ایثار پیشگی اور وفا خوئی پر ماں بیٹی کا ایمان تھا۔ اُس کے سوا پھر کون تھا۔ جس نے باہر جا کے نولکھی اور اُس کی ماں کے دیے ہوئے کسی پرانے زخم کا قرض وصول کیا۔ دو تین روز میں پاس پڑوس کا ہر شخص ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتا پھر رہا تھا کہ تم نے کچھ سُنا ہے۔ ماں بیٹی نے خود کو گھر میں محبوس کر لیا۔ ماں کس کس سے جا کے کہتی کہ ان کا کوئی قصور نہیں تھا، انھوں نے کسی کو اپنے گھر نہیں بلایا تھا۔ یہ بجلی تو کسی کے بھی گھر گر سکتی تھی، اُس رات اُن کا آشیانہ زد پر آ گیا۔ ماں بہت متوحش تھی کہ وہ ہر ایک کے پاس جا کے اپنی صفائی کیا پیش کرے۔ لوگ کہنے پہ آئیں تو سننا ہی نہیں چاہتے۔ اپنے پرائے سب بیگانے نظر آتے تھے۔ اپنا آپا بھی بیگانہ، ایسی بے بسی کہ آدمی کو اپنا سایہ بھی پرایا لگے مگر نولکھی کو جیسے کچھ خبر ہی نہ تھی۔ کوئی گلہ نہ شکوہ، دعوا نہ مطالبہ۔ گھر کی دیواروں کے باہر اپنی رسوائیوں سے اُسے کوئی غرض نہیں تھی۔ ماں نے زندگی کی نیرنگیاں افراط سے دیکھی تھیں سو اُس میں تھوڑی بہت استقامت تھی یا استقامت اور اُمید لازم و ملزوم ہیں۔ آنے والے اندھے لمحوں سے روشنی کی اُمید! کہتے ہیں یہ اثبات محض گمان بھی نہیں۔ کبھی بہت سی روشنی مل جاتی ہے۔ آدمی کو اپنے محبس میں کوئی ایک روزن کُھلا رکھنا چاہیے۔ نولکھی کی ماں کو ویسے بھی آسرے اور آس کی عادت تھی۔

کوئی چوتھے دن، آدھی رات کے وقت جب ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا، کاشو پھر آ گیا، ملازمہ اور اس کے شوہر کی رفاقت کا اب کوئی جواز نہیں رہا تھا۔ دونوں ماں بیٹی اکیلی تھیں۔ لٹنے کے لیے اب اُن کے پاس اور تھا بھی کیا۔ کاشو کو دیکھ کے نولکھی کے سراپا میں کوئی جنبش نہیں ہوئی۔ ماں البتہ ٹھٹھر کے رہ گئی۔ کاشو کے ہاتھ میں اس وقت خنجر نہیں تھا۔ خنجر کی بے اثری کا اب شاید اُسے اندازہ تھا۔ آتے ہی اس نے حواس بجا رکھنے کو کہا اور تسلی دی کہ وہ کسی اور ارادے سے نہیں آیا ہے۔ اُس کے لہجے میں حکم بھی تھا، معاملہ فہمی بھی تھی۔ اُس نے کہا کہ دونوں اچھی طرح اُس کی بات سنیں اور سمجھ لیں کہ اُسے زیادہ بات کرنا اور تکرار کرنا نہیں آتا۔ اس نے حتمی آواز میں کہا کہ وہ انھیں لے جانے آیا ہے، یہاں سے دُور۔ جو کچھ اُن کے پاس نقدی زیور ہے، وہ سمیٹ لیں اور باقی سارے گھر بار اور زمین وغیرہ کا خیال چھوڑ کے اُس کے ساتھ چلیں اور خاطر جمع رکھیں، بعد میں سب چیزوں کا ازالہ ہو جائے گا۔ اُس نے اعتراف کیا کہ اُس رات اس سے بڑی چُوک ہو گئی تھی۔ اُسے معلوم ہے کہ اس کے بعد اُن کے لیے زندگی کتنی تنگ ہو گئی ہے۔ وہ اُن کے بارے میں ساری واقفیت حاصل کر کے آیا ہے اور ندامت کا اظہار کرنے نہیں آیا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں۔ یہ زبان اُسے نہیں آتی۔ اس کی دوبارہ آمد محض نولکھی کی وجہ سے ہے کیوں کہ وہ نولکھی سے دست بردار ہونا نہیں چاہتا۔ وہ فقرہ جو ہر سرکش اور کج رَو کے وردِ زباں ہوتا ہے، کاشو نے بھی دُہرایا کہ ایک بار کوئی چیز اُسے پسند آ جائے تو ہر قیمت پہ وہ اُسے حاصل کر لیتا ہے۔ سو وہ نولکھی کو لینے آیا ہے۔ جو ہو چکا، اُسے بھول جانا ہی مناسب ہے۔ گیا وقت لوٹ کے نہیں آتا لیکن آنے والے دن نولکھی کے ہوں گے۔ اُس نے کہا، کاشو جب کچھ کہتا ہے تو اس کے ایک ہی معنی ہوتے ہیں۔ نولکھی خوش رہے گی اور نولکھی کی خاطر، نولکھی کے لحاظ میں وہ اُس کی ماں کو بھی ساتھ لے جانے کو کہہ رہا ہے۔ اچھا ہے کسی چون و چرا کے بغیر وہ اُس پر اعتماد کریں۔ اس کے سوا اُن کے پاس کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔ وہ خوش اسلوبی سے آمادہ ہو جائیں گی تو اُنھی کے حق میں بہتر ہو گا ورنہ اُس کے آدمی اطراف میں پھیلے ہوئے ہیں۔

بمبئی میں نولکھی کے پاس اُس کے گھر جیسا گھر تو نہیں تھا لیکن سر چھپانے کے لیے بہت تھا۔ گھر شاید اسی کو کہتے ہیں جہاں مکینوں کی عمل داری ہو۔ شروع میں در و دیوار سے ماں بیٹی کا رویہ مغائرت کا تھا لیکن جلد ہی اُنھیں احساس ہو گیا کہ یہ گھر اُنھی کا ہے اور اُنھیں کہیں اور نہیں جانا، اور جلد ہی اُنھیں یہ تجربہ بھی ہوا کہ پڑدیسی بولیاں، طور طریقے کتنے ہی مختلف ہوں، آدمی ہر جگہ ایک جیسے ہوتے ہیں۔ نئی زمین اور نئے لوگوں سے اُن کی مفاہمت کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اُن کے پاس کاشو کے بہ قول کوئی راستہ نہیں رہا تھا بلکہ اس کی وجہ خود کاشو تھا جس نے اُن کے لیے سارے دروازے کھلے رکھے تھے اور کوئی سمت اب اُنھیں خود نظر نہیں آتی تھی۔ کاشو کبھی روزانہ، کبھی ناغوں سے وہاں آتا تھا مگر کسی گھر ہی کی طرح۔ اُس نے کبھی اُن کی عمل داری میں دخل نہیں دیا۔ بمبئی آ کے نولکھی اور اُس کی ماں کو کاشو کے بارے میں اور بھی باقی کچھ معلوم ہوا تھا کہ کاشو پاڑے کا آدمی ہے، اس کا ایک علاقہ ہے جہاں کوئی دوسرا کاشو سر اُٹھا کے نہیں چل سکتا۔ نولکھی کی ماں کاشو کے گھر آنے پر کونوں میں سمٹ جاتی تھی اور بیٹی کو اشاروں اشاروں میں احتیاط کی تلقین کرتی تھی کہ یہ شیوۂ محکومیت بھی ناگوارِ خاطر ہو سکتا ہے، گویا مطلق محکومیت یا ساکت و جامد محکومیت میں بھی ضرر کے اندیشے ہیں۔ ماں سمجھ نہیں سکی تھی کہ نولکھی کے کسی شغل و عمل میں اس کی نیت کی تنگی یا ارادے

کی کوتاہی شامل نہیں ہے۔ یہ شیوۂ تسلیم و رضا تو کسی خودکار عمل کی طرح ہے اور کسی خوف کا حاصل نہیں۔ نولکھی کو کاشو سے بالکل خوف نہیں آتا تھا۔ کاشو ہی کیا، نولکھی کو اب کسی چیز سے خوف نہیں آتا تھا، اندھیری رات، بچھو، آسمان کی گرج چمک، پتھروں پر جس طرح سب گزر جاتا ہے معلوم نہیں، ایسی اطاعت جو خوف پر قائم ہو، حاکم کے لیے کیا حیثیت رکھتی ہے۔ کاشو میں سوجھ بوجھ کی کمی نہیں تھی۔ اُسے بھی علم ہوگا کہ نولکھی کی محکومیت، نولکھی کے ارادے کی تابع نہیں ہے بلکہ نولکھی کے پاس اب کوئی ارادہ ہے ہی نہیں۔ یہ صورت کاشو کو کسی اذیت سے دوچار کرتی تھی یا سرخوشی کا باعث تھی۔ یہ کاشو ہی بہتر جانتا تھا۔ بمبئی آنے کے بعد، بہرحال، کاشو نے اونچی آواز میں کبھی نولکھی سے بات نہیں کی۔ اس کی آمد پر نولکھی اُس کے سامنے حاضر ہو جاتی اور خاموش ہی رہا کرتی۔ اُسے کاشو پر غصہ آتا تھا نہ کاشو کے قرب سے اُس کے چہرے پر غم کی گھٹائیں جھلکتی تھیں۔ کاشو اُس کے لیے نئے کپڑے زیور، خوشبو اور پھول لاتا۔ نولکھی انھیں اپنے بدن پر سجا لیا کرتی۔ کاشو کی خوشنودی کے لیے نہیں، کاشو کے جانے کے بعد بھی وہ ایسی سجی بنی رہتی تھی اور اس کے قدم آئینے کی طرف نہیں اُٹھتے تھے۔ کسی شخص کا آئینے سے واسطہ نہ رہے تو یہ زندگی کا کون سا درجہ ہے؟ یہ سوال جگنو نے مجھ سے نہیں کیا تھا، جگنو کی باتوں سے خود بہ خود میرے ذہن میں منڈلایا۔

کئی سال گزر گئے اور نولکھی کو پہلی بار کاشو سے اُس وقت خوف آیا جب وہ جگنو اور دیوا کو اس کے پاس چھوڑ کے گیا۔ کاشو کی ہدایت کے بہ موجب نولکھی نے پہلے پہل انھیں کاشو کی امانت ہی کے طور پر برتا لیکن جگنو اور دیوا کو ہمہ وقت نولکھی اور اس کی ماں کی ضرورت تھی۔ بچّوں کو اپنی طرف توجہ مبذول کرانے کا فن آتا ہے۔ وہ انھیں ہمکتی نگاہوں سے دیکھتے تھے، حسرت بھری، اشتیاق بھری نظروں سے۔ وہ ہر دم جاری و ساری زندگی کی علامت تھے، ایک مسلسل سویرا، ایک مستقل مداوا۔ یہ وہی تھے جو نولکھی کے گم گشتہ ارادے کی بازیابی کا سبب بنے۔ وہ اتنے سادہ و معصوم، ایسے چینی کے گڈّوں کے مانند تھے کہ نولکھی کا بس نہیں چلتا تھا، انھیں اپنی آنکھوں میں بسا لے۔ جگنو اور دیوا کو چند ٹوٹے پھوٹے لفظوں پر مشتمل زبان آتی تھی، جگنو کو تو اور بھی کم، مگر نولکھی اُن کی ہر جنبش لب سے ایک جہانِ معانی اخذ کر لیا کرتی۔ اُن کا بھی یہی حال تھا، کہتے ہیں، بچّے بہت کچھ آنکھوں سے سنتے ہیں جو انھیں نہیں آتا تھا۔ نولکھی کا سارا کہا ہُوا دونوں خوب سنتے، خوب سمجھتے تھے۔ رات دن وہ ایک دوسرے سے کسی راز و نیاز میں محو رہتے۔

جگنو اور دیوا نے نولکھی کو بہت پریشان، بہت ہلکان کیا انھوں نے دوبارہ اُسے خوف آشنا کیا۔ کسی وقت بھی کاشو واپس آسکتا تھا۔ اُس کی آمد کے خوف نے نولکھی کو بہت مضطرب اور منتشر کیا ہوا تھا۔ وہ طرح طرح کے منصوبے بناتی کہ کاشو آئے گا تو وہ اُنھیں واپس نہیں کرے گی، صاف انکار کر دے گی۔ کاشو کسی سوغات کے لیے بہت پوچھا کرتا ہے۔ وہ اُس سے کہہ دے گی کہ کوئی زیور، لباس، کوئی سوغات نہیں چاہیے۔ جانے وہ کیا کیا سوچا کرتی، کاشو آئے تو اُسے زہر کیوں نہ دے دے۔ اس کے آنے سے پہلے وہ سب کہیں بھاگ کیوں نہ جائیں۔ اتنی بڑی دُنیا ہے، کاشو اُسے کہاں کہاں ڈھونڈ سکے گا۔ دو چار دن کی بات ہوتی تو نولکھی کے لیے جگنو اور دیوا کی جدائی کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ دن بہت ہو گئے تھے، اور جتنا وقت بڑھتا جا رہا تھا، کاشو کی آمد کی ہیبت سے نولکھی اتنی ہی ناتواں ہوئی جا رہی تھی۔ تمام خوف زندگی کی طلب سے عبارت ہے۔ نولکھی کو اب زندگی کی شدید طلب تھی

بہت دن گزر گئے۔ کاشو نہیں آیا، اس کی موت کی خبر آئی۔ یہ سُن کے نولکھی پر جانے کیوں سکوت طاری ہوا اور وہ پہروں آنسو بہاتی رہی۔ اِدھر ماں نے اُسے ٹوکا کہ کاشو کا نہ آنا، جگنو اور دیوا کے لیے کسی اور کے نہ آنے کی ضمانت نہیں ہے۔ نولکھی بھی اِس حقیقت سے واقف تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کاشو کی موت کے تیقن کے باوجود دروازے پر بھٹکتی آہٹوں سے اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا، دروازے پر بار بار اُسے اجنبی دستکوں کا گمان ہوتا۔ کچھ دن اور بیت گئے مگر کوئی نہیں آیا۔ نولکھی کو کسی قدر قرار آنے لگا لیکن اُس نے دوسری طرف غور ہی نہیں کیا تھا۔ دیکھتے دیکھتے ماں کی پس انداز پونجی وقت بُرد ہو گئی۔ کچھ عرصے تک زیوروں نے ساتھ دیا لیکن جب وقت ہی ساتھ نہ دے!

نولکھی کو اپنی فکر نہیں تھی، جگنو اور دیوا کے لیے ایک ذرا سی دھوپ بھی اُسے گوارا نہ تھی۔ اُنھیں چھاؤں دینے کے لیے نولکھی کو گھر سے نکلنا پڑا۔ نہ معلوم آگے اُسے اور کہاں تک جانا پڑتا کہ اس اثنا میں بنارسی آگیا۔

زندگی بھر کا ساتھ بھی بسا اوقات فاصلے کم نہیں کرتا اور بعض لوگ بہت دور ہوتے ہوئے، بہت وقت گزرنے کے بعد بھی ہمہ دم ساتھ رہتے ہیں۔ آدمی سے آدمی کے فاصلے کی پیمائش کچھ اور ہوتی ہے۔ اس کا تعلق وقت سے ہے نہ منزلوں سے۔ کاشو، کم سے کم جب تک گھر میں ہوتا، اُن کے ساتھ رہتا تھا مگر وہ اس کے ساتھ نہیں رہتے تھے۔ اتنی گرہوں کے لیے ایک جُگ کی گرد بھی کم ہے۔ بمبئی آنے کے چند دنوں

ھی کی آزمودہ کار ماں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اُس نے اپنی قدیم ملازمہ ِ سلوک کیا۔ ملازمہ نے باہر جا کے افترا پردازی نہیں کی تھی کہ اُس ن کے گھر ایک خنجر بہ دست شخص آیا تھا اور اس نے سب کو بے بس تھا، اُس نے نولکھی سے اُس کی متاع چھین لی۔ یہ کاشو تھا جس ڈا پاس پڑوس میں اپنی ستم رانی کی داستان عام کرائی۔ ملازمہ نے کو بیٹی کی طرح پالا تھا۔ اس نے نمک کا حق ادا کرنے کی ہر طرح ش کی ہوگی مگر سب کو جزئیات کے ساتھ سارا کچھ معلوم تھا۔ ملازمہ کھاتی کہ پڑوسیوں کی زبانی یہ تفصیل جان کے اُسے خود حیرت تھی۔ لوگ اس سے تصدیق چاہتے تھے۔ اس کے بہ قول، اُس نے انکار کر دیا تھا لیکن مبالغے کی تردید نہ کرنا اس کے بس میں نہیں د گا۔ اُس وقت نولکھی کی ماں کے ہوش و حواس یک جا نہیں تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ملازمہ کے سوا گھر میں اور کون دہ تھا؟ بمبئی میں نولکھی کے تئیں کاشو کی وارفتگی دیکھ کے ماں عقل میں آیا کہ اس رات کوئی فوج پولیس کاشو کے پیچھے نہیں تھی؛ ب دکھاوا تھا۔ وہ پورے ارادے سے اس کے گھر میں داخل ہوا کیوں کہ، یقیناً اُس نے پہلے کہیں نولکھی کی جھلک دیکھ لی تھی۔ سکتا ہے، وہ دوبارہ کبھی اُس گھر کا رُخ نہ کرتا لیکن اُس رات نے نولکھی کو بہت قریب سے دیکھا تھا، پھر نولکھی سے دور ہونا ں کے لیے ممکن نہ رہا اور نولکھی کے حصول کے لیے ایک ہی دردناک لریقہ اس بے درد کے دماغ میں آیا کہ وہ ہر طرف کانٹے بچھا دے۔ شوہر اور بیٹے کی جدائی سے شکستہ حال عورت، نولکھی کی ماں، جو کسی کسی طرح تیز ہواؤں کا سامنا کرتی رہی تھی، چند دنوں میں حوصلہ ہار بیٹھی۔ صیاد ایک اور سوانگ بھر کے پھر آیا تھا۔ نولکھی کی ماں کے پاس انکار کے لیے تنکے کا بھی سہارا نہ تھا۔ وہ نظر دوڑاتی تو اردگرد کوئی ایسا نہ تھا جو چند لفظوں کے گداز کی فیاضی کرتا۔ کاشو نے جیسے سب کو اندھا کر دیا تھا۔ نولکھی کی ماں خزاں ختم ہونے کے آسرے ں وہاں ٹھیر جاتی، کچھ عرصے میں، ممکن ہے یہ بے امانی بے سروسامانی نہ رہتی مگر نولکھی کی ماں کب تک وضاحتیں کرتی رہتی، اپنی بیٹی کے لیے وہ کس کس کے آگے درگزری کی بھیک مانگتی۔

نولکھی کہتی تھی کہ مرتے دم تک اس کی ماں کی زبان پر ملازمہ کا ذکر تھا۔ اُسے یہی خلش تھی کہ غازی پور جا کے وہ اپنی ملازمہ سے معافی نہ مانگ سکی۔ نولکھی نے ماں کی دل بستگی کے لیے وعدہ کیا تھا کہ وہ چوری چھپے سہی، کسی طرح، ایک بار غازی پور ضرور جائے گی۔ نولکھی کو ماں سے کیے ہوئے وعدے کی تکمیل کی مہلت نہ مل سکی۔ کاشو ہوتا تو شاید یہ کبھی ممکن ہو جاتا مگر بنارسی کا رنگ ڈھنگ اپنے بھائی سے بالکل الگ تھا۔ نولکھی کہتی تھی، یہ وہی تھا جس کے آنے کے بعد اس کی ماں کی کمر ڈھے گئی۔ وہ زیادہ دنوں تک اپنی بیٹی کا ساتھ نہ دے سکی۔ بعض لوگ اوجھل ہو جانے کے بعد زیادہ نمایاں ہو جاتے ہیں۔ کاشو کے چلے جانے کے بعد ماں بیٹی کو اس کے اندھیرے اُجالے کا اندازہ ہوا۔ بنارسی نے یہ احساس اور سوا کیا۔ کاشو میں جتنا غضب تھا، اتنا تحمل بھی تھا۔ اسے ہر طرح کی زبان آتی تھی، نرمی کی، سختی کی۔ یہی نہیں کہ کاشو نے اپنے ایک دو مقرّب ترین ساتھیوں کے سوا کسی سے بمبئی میں نولکھی اور اپنے اس گھر کا تذکرہ نہیں کیا تھا، بلکہ نولکھی کا کہنا تھا، اُسے یقین ہے، اُسے ایک نئے گھر میں بسانے کے بعد بمبئی میں کاشو کا کوئی دوسرا گھر نہیں تھا۔ ہو بھی تو اس نے کبھی نولکھی سے اس بابت کوئی اشارہ نہیں کیا۔ بنارسی کے آنے پر نولکھی کو بہت کچھ یاد آتا تھا۔ لگتا تھا، بنارسی بھی یہی کچھ جتانے آیا ہے، لگتا تھا جیسے وہ اپنے بڑے بھائی کا کوئی قرض وصول کر رہا ہو مگر ایسا نہیں تھا۔ بنارسی کو کاشو سے ایسا کوئی علاقہ نہیں تھا۔ وہ اُن لوگوں میں سے نہیں تھا جو کبھی اپنے آپ کو بھول جاتے ہوں، جو کبھی اپنے سوا، دوسروں کے بارے میں بھی فکرمند ہوتے ہوں، اپنے بھائی ہی کے لیے سہی۔

نولکھی ہانپنے لگی۔ جگنو اور دیوا اُس کے دائیں بائیں بیٹھے وحشت زدہ آنکھوں سے سب کچھ سُنا کیے۔ نولکھی اور بھی کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن مسلسل بولتے رہنے سے اس کے سینے میں دم نہیں رہا، اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا۔ نولکھی نے بے شک جگنو اور دیوا کو باہر نہیں جانے دیا تھا، خود انھیں بھی اپنے دل و دماغ کے سنّاٹے میں کسی وید حکیم کے پاس جانے کا ہوش نہیں رہا۔ نولکھی کی حالت اس قابل نہیں تھی کہ ذرا بھی دیر کی جائے۔ وہ اندر کمرے سے پھول وتی کو بلانے کے لیے آواز دینا چاہتے تھے مگر پھول وتی تو اُن کے قریب ہی موجود تھی۔ جانے وہ کب سے سامنے، کونے میں کھڑی سب کچھ سن رہی تھی۔ اُسے دیکھ کے دونوں یک لخت اُٹھ گئے۔ وہ دروازے تک نہیں پہنچے تھے کہ نولکھی کی کرب ناک صدا نے ان کے قدم لڑکھڑا دیے۔ "نہیں نہیں، میری بات سُنو، اب کوئی فائدہ نہیں۔" وہ لرزتی ڈوبتی آواز میں بولی کہ کیوں وقت ضائع کرتے ہو، پھول وتی کو لے کے فوراً یہاں سے نکل جاؤ، جب تک تم نہیں جاؤ گے، میں تڑپتی رہوں گی۔ نولکھی نے ان سے کہا کہ وہ اُسے پُرسکون موت دینا کیوں نہیں چاہتے۔

جگنو اور دیوا بچوں کی طرح سسکنے لگے، عاجزی سے بولے کہ وہ ایسی باتیں کیوں کر رہی ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ اُسے نہیں مرنے دیں گے اور یوں چھوڑ کے نہیں جائیں گے۔

جگنو کہہ رہا تھا کہ نولکھی اُن کے آگے ہاتھ جوڑ کے بولی کہ اب اُسے کوئی دوا نہیں چاہیے۔ دوا کا وقت گزر چکا ہے۔ اُس نے اُن سے کہا کہ وہ سمجھتے کیوں نہیں، اُس کے لیے اس سے بڑا دکھ کیا ہوگا کہ آخری وقت میں اس کے جگر گوشے سرہانے نہ ہوں مگر وہ کچھ جان کے ہی اُن سے یہ بنتی کر رہی ہے، بنتی نہیں تو اسے اُس کا حکم سمجھا جائے۔ کہنے لگی کہ وہ پھول وتی کو دوسری نولکھی بنانا نہیں چاہتی۔ وہ بھی یہ نہیں چاہیں گے کہ نولکھی کی کہانی کسی طور دہرائی جائے۔

نولکھی مسلسل اُن سے التجا کرتی رہی۔ جگنو اور دیوا نے اسے سمجھانا چاہا کہ ایسا اندھیر نہیں ہے۔ وہ وقت اور تھا اور یہ غازی پور نہیں، بمبئی ہے۔ وہ آخر دم تک پھول وتی کی حفاظت کریں گے۔

وہ اُسے جانے کیا کیا تسلیاں دلاسے دیتے رہے مگر اُن کی آواز خود اُنھیں مطمئن نہ کرتی تھی، نولکھی پر کیا اثر ہوتا۔ نولکھی کے چہرے پر اور وحشت اُتر آئی، وہ بے کلی سے بولی کہ وہ کچھ سننا نہیں چاہتی، کوئی تاویل، کوئی دلیل۔ سب سے بڑی دلیل بنارسی ہے۔ جگنو اور دیوا بنارسی کو اُس سے زیادہ نہیں جانتے۔ بنارسی کا شو نہیں ہے۔ اُس سے کچھ بھی بعید نہیں۔ بنارسی کا اپنے سوا کسی سے کوئی رشتہ ناتا نہیں ہے۔ بہتر ہے کسی پس و پیش کے بغیر جگنو اور دیوا نولکھی کی خواہش کی تکمیل کریں، یہی سمجھ کے کہ یہ اس کی آخری خواہش ہے یا وہ نولکھی کا کوئی حق ادا کر رہے ہیں، اس پر کوئی احسان کر رہے ہیں۔

جگنو اور دیوا اس طرح کیسے جا سکتے تھے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ بنارسی نے پھول وتی کے لیے کوئی ایسی ویسی بات ضرور کہی ہوگی جو نولکھی اس قدر بے چین ہے۔ اُن کی سمجھ میں اور بھی بہت کچھ آ رہا تھا جو نولکھی کہہ نہیں پا رہی تھی، مگر نولکھی سے آنکھیں پھیر کے گھر سے نکل جانے کی استطاعت اُن میں نہیں تھی۔ پھول وتی بھی سب سُن رہی تھی۔ دونوں بھائیوں نے مضطربانہ اُس کی طرف دیکھا۔ اُن کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ پھول وتی سے اُس کی رائے پوچھیں لیکن کچھ پوچھنے کی ضرورت کیا تھی۔ پھول وتی کوئی اُن سے الگ تو نہیں تھی۔ وہ ماں کے سینے سے لپٹی ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ نولکھی اپنے ناتواں بازوؤں میں کبھی اُسے سمیٹ لیتی، کبھی پرے دھکیلنے کی کوشش کرتی۔ وہ ہذیان بکنے لگی تھی کہ پھول وتی اُسے چھوڑ دے، سب اُسے چھوڑ کے چلے جائیں۔ وہ آرام سے مر جائے گی۔ اب دیر بھی کتنی رہ گئی ہے۔ چند سانسوں کا پھیر ہے۔ کہنے لگی، سب اُسے مرا ہوا دیکھنے ہی پر کیوں مُصر ہیں۔ بعد میں جانے کیا ہو جائے، کیا نہ ہو جائے، نولکھی پر خفقان طاری تھا۔ آخر وہ بے حال ہو گئی۔ پھر دیوا کسی کو بتائے بغیر باہر نکل گیا۔ بھاگتا بھاگتا وہ قریب کے ایک معمّر وید کے پاس پہنچا۔ وید پہلے اُن کے گھر آ چکا تھا۔ وہ نولکھی کو دیکھ کے بڑبڑانے لگا کہ اسے یہ کیا ہو گیا ہے، ابھی کچھ عرصے پہلے تو خاصی بہتر تھی۔ وید طرح طرح کے سوال کرنے لگا کہ یہ کس کے زیرِ علاج ہے، کیا کھاتی پیتی رہی ہے۔ دیر تک وہ نولکھی کی نبض ٹٹولتا رہا۔ اس نے چند دوائیں تجویز کیں اور اپنے چوبی بکسے سے کچھ مشروبات نکال کے بہ مشکل نولکھی کو پلائے۔ وہ ایک تُند مزاج شخص تھا۔ اُس نے کچھ خیال نہیں کیا کہ اُن تینوں پر کیا گزر جائے گی، کہنے لگا کہ دوا اپنی جگہ مگر اب دُعا کی زیادہ ضرورت ہے۔ صبح تک دیکھ لیں ورنہ اب یہی چارہ رہ گیا ہے کہ سرکاری اسپتال میں داخل کرا دیں۔ ممکن ہے، ولایتی علاج میں نولکھی کے لیے شفا لکھی ہو۔ جاتے جاتے وید دروازے سے پلٹ آیا اور انھیں ہدایت کی کہ مریض کی دل جوئی بھی دوا کا کام کرتی ہے۔ وہ نولکھی کو زیادہ سے زیادہ خوش رکھنے، سکھ پہنچانے کی کوشش کریں۔ اُس کے سامنے اونچی آواز میں بات بھی نہ کریں۔ دیوا، وید کے ساتھ جا کے مزید دوائیں لے آیا۔ دونوں وہیں، نولکھی کی چارپائی کے گرد بیٹھے رہے۔ پھول وتی ماں کی پائنتی پر سر رکھے سسکیاں بھرتی رہی۔ نولکھی کی جب بھی آنکھ کھلتی، اُس کا نحیف و نزار، سراپا پھڑکنے لگتا، اُس کی ویران آنکھیں بے قراری سے انھیں دیکھتیں اور لرزیدہ ہونٹوں پر کوئی شکوہ سا اُٹھ آتا اور وہ بے سُدھ ہو جاتی۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات پانچویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں
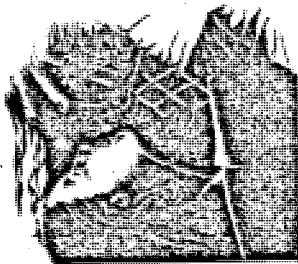
سب رنگ ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ
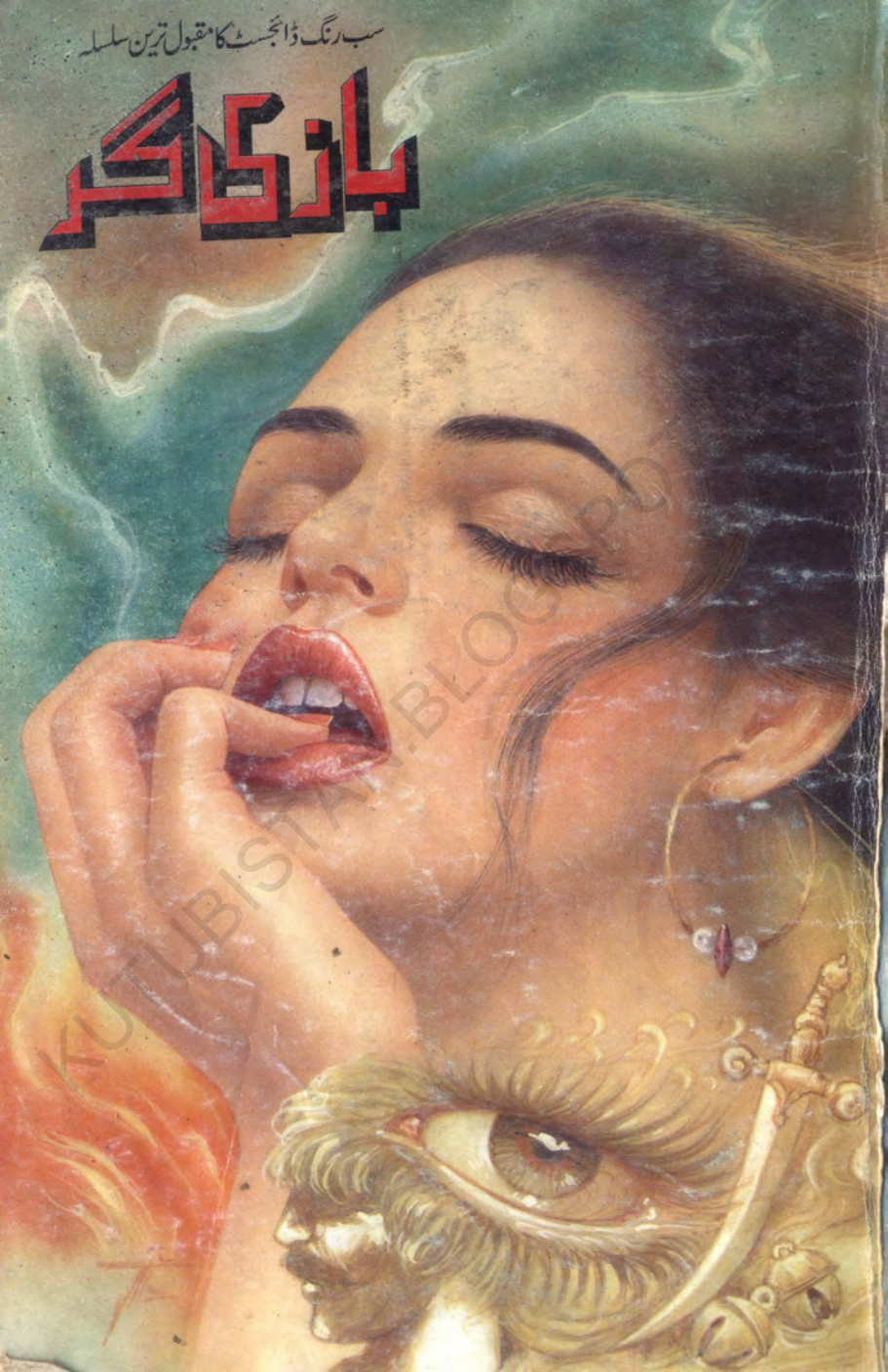
بازی گر

حالات کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ایک نوجوان کی داستان

سب رنگ ڈائجسٹ کا مقبولِ عام سِلسلہ

بازی گر

پانچواں حصہ

راوی : بابر زماں خاں

تحریر : شکیل عادل زادہ

امنگوں حوصلوں آنسوئوں اور آہوں کی داستان

بازیگر

اول شب بنارسی آگیا۔ نولکھی کی ابتر حالت دیکھ کے اس کی پیشانی شکنوں سے بھر گئی تھی۔ جگنو' دیوا اور پھول وتی' کسی نے اس سے کوئی بات نہیں کی' بنارسی نے ان سے نولکھی کی خیریت پوچھی۔ وہ دم سادھے کھڑا رہا پھر آہستگی سے بولا کہ سول اسپتال میں وہ ایک ڈاکٹر سے بات کر کے آیا ہے۔ ڈاکٹر نے کل صبح دیکھنے کو کہا ہے۔ ضرورت سمجھے گا تو ڈاکٹر اسی وقت اسپتال میں داخل کر لے گا۔ بنارسی کے کہنے کے مطابق ڈاکٹر نے اسے اجازت دی تھی کہ اس دوران طبیعت زیادہ خراب ہو تو اسے گھر بلا لیا جائے۔ بنارسی نے کہا' اس کے خیال میں نولکھی اسپتال جانے کے قابل نظر نہیں آتی۔ مناسب یہی ہے کہ ڈاکٹر کو بلا لیا جائے۔ بنارسی کی آواز نسبتاً بدلی ہوئی تھی' قدرے نرم اور اضطراب آمیز۔ تینوں نے اسے ایک نظر دیکھا اور خاموش رہے۔ بنارسی کی تسلی پر کہ گھبرانے سے کچھ نہیں ہوگا' ان سب کو اس وقت سنبھل کر رہنا چاہیے' جگنو کا کہنا تھا۔ میری رگوں میں خون کھولنے لگا تھا' یہی جی کرتا تھا کہ بنارسی پر جھپٹ پڑوں اور چاقو سے اس پر وار کرتا رہوں' اس کا سارا جسم چیر پھاڑ ڈالوں پھر پھول وتی اور دیوا بھی یوں ہی نہیں بیٹھے رہیں گے۔ جگنو نے بہت ضبط کیا اور اپنا ہی خون پیتا رہا۔

"اپن کیا بولتا ہے۔" انہیں چپ دیکھ کے بنارسی نے تلخی سے کہا "سالا خلاص ہو جائیں گا۔ تنک میں ماتا جی تمہارا۔۔۔" اس کے منہ پر گالی آئی تھی جو اس نے روک لی اور بھنچے ہوئے ہونٹوں سے بولا "ابھی ایسا ہی ہاتھ پیر ڈال کے بیٹھا رہیں گا تم لوگ۔۔۔"

"ابھی وید جی گئے ہیں۔" جگنو اور دیوا کے بجائے پھول وتی ہکلاتے ہوئے بولی۔

"کون وید؟" بنارسی چونک کے بولا۔

"ادھر نالا پار کے وید جی' وہ بھی ایسا ہی بولتے تھے۔"

"کیسا؟ کیا بولتا تھا؟" بنارسی نے ترشی سے پوچھا۔

"ایسا!" بنارسی نے سانس بھر کے بولا "اپن کیا بولتا ہے' ابھی وید سے پہلے اپن اسپتال کا پھیرا لگایا تھا' اسی واسطے کو۔ وید کوئی دوا دارو دیا؟"

پھول وتی نے نیچی نظروں سے جواب دیا کہ وید کچھ دوائیں تجویز کر کے گیا ہے۔ پہلی خوراک دے دی گئی ہے۔

"ٹھیک ہے۔ ابھی تھوڑا اس کو دیکھے۔" بنارسی تذبذب سے بولا "یا ابھی' ابھی ڈاکٹر کو بلانے کا ہے؟"

بنارسی کی آمد اور اس کی دخل اندازی پر جگنو اور دیوا کے جسم جل رہے تھے۔ پھول وتی نے اشاروں میں

ن سے تحمل کی التجا کی۔ انہیں تعجب ہوا کہ پھول وتی میں ان سے زیادہ ہوش اور استقامت ہے۔ اس وقت پھول وتی نے جیسے کسی طوفان سے انہیں بچالیا تھا۔ جگنو کہہ رہا تھا' پھول وتی ان سے پارا دھیما رکھنے کی منت نہ کرتی تو نہ جانے کیا ہوجاتا۔ کوئی کتنا ہی ناتواں ہو' ایک آتش غضب تو سب میں پنہاں ہوتا ہے اور ایک لمحہ شرط ہے' ایک اندھا' گونگا اور بہرا لمحہ جب آجائے تو آدمی کو بے کراں کردیتا ہے' آدمی نہیں جانتا کہ اس کی آگ کتنی دور تک جائے گی' کون کون اس کی لپیٹ میں آجائے گا اور آگ خود اپنا تن من بھی راکھ کرلے گی۔ جگنو بہت دنوں سے اس لمحے کی تلاش میں تھا۔ یہ لمحہ کئی بار آکے ٹل چکا تھا' اب کے پھول وتی آڑے آگئی۔

بس ایک لمحے کی شعبدہ کاری ہوتی ہے' دوسرے لمحے زندگی غالب آجاتی ہے' آدمی کی آنکھ کھل جاتی ہے' مقابل پھر وہی آئینہ۔ بے ہنری اور بے مائیگی کے سارے احساس پھر رگ وپے سے چمٹ جاتے ہیں۔ دوسرے لمحے جگنو کو احساس ہوا کہ پھول وتی نے کیسا بروقت اسے روک لیا ہے' ادھر نو لکھی نیم جاں پڑی تھی۔ سردست ساری توجہ اسی کو سزا وار تھی۔ اس آتش غضب کا جو بھی مال نکلتا' نو لکھی کے لیے کسی طور بہتر نہ ہوتا۔ بعد میں جگنو کو یہ لمحہ ٹل جانے کا کچھ ایسا ملال نہیں ہوا۔

بنارسی نو لکھی کے پاس ٹھہرا رہا پھر پڑوس کی چند عورتیں نو لکھی کو دیکھنے آئیں تو وہ وہاں سے ہٹ کے کمرے میں چلا گیا۔ جگنو اور دیوا بھی کچھ دیر بعد اٹھ گئے لیکن گھر ہی میں رہے۔ رات بڑھ رہی تھی۔ پھول وتی نے کمرے میں جاکے بنارسی سے کھانے وغیرہ کے بارے میں پوچھا' بنارسی نے انکار کردیا۔ اس رات اس نے شراب بھی نہیں پی۔

اتنا وقت نہیں گزرا تھا' عورتیں ابھی موجود تھیں اور سرگوشیوں میں پھول وتی کو طرح طرح کے مشورے دے رہی تھیں کہ نو لکھی کی کرب ناک صداؤں نے سب کچھ منتشر کردیا۔ بنارسی بھی فوراً کمرے سے باہر آگیا۔ نو لکھی کی سانس تیزی سے چل رہی تھی اور پھول وتی کے ہاتھ پیر کام نہیں کررہے تھے۔ پڑوس کی ایک عورت نے اس کی مدد کی اور وید کی ہدایت کے مطابق دوا نو لکھی کو چٹائی' پانی پلانے کی کوشش کی مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ نو لکھی بری طرح کراہتی رہی تا ایں کہ اسے اس کا بھی یارا نہ رہا۔ بنارسی نے کسی طبیب کے مانند اس کی نبض دیکھی اور متوحش آواز میں جگنو اور دیوا سے کہا کہ وہ فی الفور ڈاکٹر رستوگی کے پاس جائیں۔ اس نے بہ عجلت پتا بتایا اور جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کے کہا کہ وہ روپے پیسے کی فکر نہ کریں' جو بھی سواری ملے' بس جلدی سے ڈاکٹر کے پاس پہنچیں اور اسے یہاں لے آئیں۔ سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں تھا۔ جگنو اور دیوا نے ایک نگاہ پھول وتی کو دیکھا اور پھر ایک دوسرے کو۔ جگنو نے رکنا چاہا تھا مگر پھر دونوں کچھ سوچ کے گھر سے نکل پڑے۔ اس وقت پڑوس کی کئی عورتیں گھر میں موجود تھیں۔ بنارسی کی موجودگی میں وہ ان سے کچھ کہہ نہیں سکتے تھے' اس لیے باہر نکلتے ہی انہوں نے برابر کے گھر میں جگت موسی سیتا بائی کو آواز دی۔ موسی کا ان کے گھر بہت آنا جانا تھا' کچھ دیر پہلے ہی وہ نو لکھی کو دیکھ کے آئی تھی۔ جگنو نے اس سے گزارش کی کہ جب تک وہ واپس نہ آئیں' موسی ان کے گھر رہے۔

انہیں جلد ہی سواری مل گئی۔ بازار بند ہوچکے تھے۔ البتہ سڑکوں پر چہل پہل تھی۔ اسپتال کی گلیوں میں ڈاکٹر رستوگی کا مکان تھا۔ انہوں نے گھوڑا گاڑی چھوڑ دی اور بنارسی کی تاکید کے مطابق ایک گلی کے نکڑ پر واقع پان کی دکان پر ڈاکٹر کا پتا پوچھا۔ بنارسی نے انہیں بتایا تھا کہ پان کی دکان والے کو گھمٹی کاکا کہتے ہیں' وہ سارے عقبے سے واقف ہے۔ ادھر ادھر بھٹکنے کے بجائے وہ سیدھے اس کے پاس پہنچ جائیں' اس کے ذریعے وہ آسانی سے ڈاکٹر کے مکان پر پہنچ سکتے ہیں۔ دکان پر کئی گاہک تھے۔ رات کے وقت پان کی دکانوں پر یوں بھی یار باشوں کا ریٹھان ہوتا ہے۔ دکان سے ملحق ملباری کے ہوٹل کی وجہ سے بھی نکڑ پہ خاصی رونق تھی۔ گھمٹی کاکا مصروف تھا تاہم مشینی انداز میں ہاتھ اٹھاکے اس نے تیسری گلی کے بائیں طرف ساتواں بنگلا بتایا۔ یہ سن کر دکان پر کھڑا ہوا ایک نوجوان جگنو اور دیوا کی طرف متوجہ ہوا' کہنے لگا کہ وہ بھی اسی طرف جارہا ہے اور ڈاکٹر کے مکان تک ان کی رہبری کرسکتا ہے۔ جگنو اور دیوا نے ممنونیت کا اظہار کیا۔ نوجوان نے کھمبے سے ٹیک لگائے ہوئے اپنے ادھیڑ ساتھی کو چلنے کا اشارہ کیا' اس شخص کے کلے میں پان دبا تھا۔ آنکھیں بھی چڑھی ہوئی تھیں' دیوا کی طرف رخ کرکے اس نے کچھ کہنا چاہا تھا کہ منہ میں بھری ہوئی پیک دیوا کے کرتے پر لوٹ پڑی۔ دیوا کا سارا کرتہ رنگ گیا۔ معذرت کرنے کے بجائے الٹا وہ دیوا اور جگنو کی بدحواسی پر لگانے لگا۔ اس کے نوجوان ساتھی نے اس مردم آزاری اس کا دل جمعی سے ساتھ دیا۔ دیوا نے بہت سبکی محسوس بے اختیار اس کا ہاتھ ادھیڑ آدمی کے گریبان پر چلا گیا۔ نے جیسے بھڑوں کا چھتا چھیڑ دیا تھا۔ پہلے تو ادھیڑ آدمی نے مکوں اور ٹھوکروں پر لیا' جگنو بیچ میں پڑا تو دوسری طرف

جوان نے اسے سنبھال لیا۔ ان کے اور ساتھی بھی ہوٹل ں بیٹھے تھے' وہ کسی تاخیر کے بغیر ہوٹل سے نکل آئے پھر وہی وا جو ایسے معاملوں میں ہوا کرتا ہے۔ کسی نے پیچھے سے جگنو کے بازوؤں میں اس طرح جکڑ بندی کی کہ وہ ضربیں لگانے الے کے اور سامنے ہوجائے۔ ادھر سے کسی نے دیوا کے یٹ پر لات ماری۔ بس ابتدا کے چند لمحوں میں جگنو اور دیوا نے ذرا سی مزاحمت کی تھی' اس کے بعد دونوں کو سنبھلنے کا وقع ہی نہیں ملا۔ منٹوں میں بہت سے لوگ اکٹھے ہوگئے۔ وٹل کے شیشے ٹوٹ جانے اور پان کی دکان کا بعض سامان ٹ پاتھ پر الٹ جانے کا بظاہر کوئی امکان نہیں تھا مگر یہ بھی وا۔ کچھ ہی دیر میں پولیس آگئی۔ بہت سے لوگ بھاگ گئے' کچھ لوگ سپاہیوں کے ہاتھ لگ گئے۔ جگنو اور دیوا نے اپنے واس مجتمع رکھنے کی بہت کوشش کی' وہ مسلسل چیختے چلاتے ہے تاہم ان کی حدود بھی آدمی سے سوا نہیں تھیں۔ ان کی کھال جگہ جگہ سے ادھڑ گئی تھی اور خون بہنے لگا تھا۔ ہڈیوں ں جیسے آگ لگی ہوئی تھی۔

رات کو کسی وقت دیوا کی آنکھ پہلے کھلی اور پہلے اس کی ظر سلاخوں پر پڑی پھر اپنے پہلو میں پڑے ہوئے جگنو پر۔ جگنو کے جسم پر جابجا لال دوا لگی تھی اور پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ہی حال خود اس کا تھا۔ دیوا نے وحشت کے عالم میں اٹھنا چاہا و اس کی آنکھوں میں اندھیرا بھر گیا۔ ہر طرف سکوت چھایا وا تھا۔ سلاخوں کے پار سنتری تپائی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ دیوا کو دفعتاً سب کچھ یاد آگیا اور اس نے بے تحاشا چیخنا شروع کردیا۔ سارے تھانے میں شور مچ گیا۔ ہر طرف سے سنتریوں نے اس کی کوٹھری کا رخ کیا۔ جگنو بین کرتا رہا کہ ہماری ماں مار ہے۔ ہم بے قصور ہیں' ہمارا کوئی قصور نہیں' خدا کے اسطے ہم پر رحم کرو' ہمیں چھوڑ دو۔ سنتریوں نے اندر آکے جبراً اسے چپ کرانا چاہا مگر خود دیوا کی آواز اس کے ڈولتے سفینۂ جاں میں ڈوب گئی۔

سویرے سویرے پھر اس کی آنکھ کھل گئی' جگنو کو بھی وش آگیا۔ دونوں نے تھانا سر پر اٹھالیا۔ وہ بار بار خدا کا اسطہ دیتے کیوں کہ ایک ہی واسطہ دنیا میں مشترک ہے مگر تکرار سے شاید اپنی افادیت کھوچکا ہے۔ وہ دہائیاں دیتے کہ گر گھر نہ پہنچے تو ان کی ماں مرجائے گی۔ لگتا تھا' تھانے کے سی سپاہی اور افسر کی ماں نہیں تھی یا سب کی مائیں مرچکی یں۔ بہرحال ان کی آہ وبکا پر تھانے دار نے انہیں کمرے ں بلالیا۔ دونوں سے چلا نہیں جارہا تھا' خود کو گھسیٹتے' کچھ پاہیوں کا سہارا لیتے وہ تھانے دار کی خدمت میں حاضر ہوئے اور رو رو کے اسے ساری روداد سنائی۔ تھانے دار انہماک سے سنتا رہا۔ اس نے ضمانت کے لیے پوچھا۔ اتنے بڑے شہر میں کوئی ایسا نہیں تھا جسے وہ ضمانتی کے طور پر پیش کرتے۔ ان پر توڑ پھوڑ' خون خرابے' دنگے فساد قسم کے کئی الزام تھے۔ پان والے گھمٹی کاکا نے ان کے خلاف بیان دیا تھا' ہوٹل والے اور بعض تماشائیوں نے بھی۔ پولیس کے لیے بھی جگنو اور دیوا کوئی اجنبی نہیں تھے' دونوں کئی بار سزا پاچکے تھے۔

ضمانتی کے لیے انہوں نے بنارسی کا نام نہیں لیا' اس لیے کہ ذہنی فشار میں' ذرا دیر سے سہی تاہم سارا ماجرا ان کی سمجھ میں آگیا تھا۔ یہ جان کرکے ان پر کیا کچھ گزری ہوگی' جگنو کو بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ جگنو نے مجھے نہیں بتایا' بس اتنا کہا کہ وہ بلک بلک کر روتے اور دیواروں سے سر پھوڑتے تھے۔ انہوں نے تھانے دار سے درخواست کی تھی کہ کم از کم ان کے گھر اطلاع کرادی جائے کہ ان پر کیا افتاد پڑی ہے اور وہ کیوں واپس گھر نہیں پہنچ سکے۔ شام تک وہ بار بار سنتریوں سے پوچھتے رہے۔ ہر بار انہیں خاموش رہنے کا حکم دیا گیا اور ایک ہی جواب دیا جاتا کہ آدمی بھیج دیا گیا ہے۔ سب نے جیسے انہیں پاگل سمجھا ہوا تھا' کسی نے بھی ان سے ہمدردی نہیں کی' ایک سپاہی برج بابو کے سوا۔ برج بابو نے ان سے وعدہ کیا کہ رات ڈیوٹی ختم کرکے وہ ان کے گھر کی طرف جائے گا اور خیریت معلوم کرکے آئے گا۔ رات بھر وہ زخموں کی تکلیف میں فرش پر لوٹتے رہے۔ آدمی کا ظاہر تو اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔ سارا کچھ تو آدمی اپنے اندر سے ہے۔ بیرونی زخم اتنے شدید نہیں تھے جتنے ان کے اندر.... ان کی روحیں ایک عذاب سے دوچار تھیں۔ انہیں رات ہی کو کسی وقت برج بابو کی واپسی کی توقع تھی۔ برج بابو صبح ٹھیک اپنی ڈیوٹی کے وقت آیا اور اس نے انہیں صبر وشکر کی تلقین کی اور کہا کہ سب اوپر والے کی مرضی پر ہے۔ جگنو اور دیوا کے دل بری طرح دھڑک رہے تھے' وہ آگے کچھ سننا نہیں چاہتے تھے مگر برج بابو نے انہیں بتایا کہ پرسوں رات جب وہ گھر سے نکلے تھے' اسی رات کے آخری پہر نو لکھی چل بسی۔ جس وقت برج بابو ان کے گھر پہنچا' دروازے کے باہر گلی میں آٹھ دس آدمی موجود تھے۔ وہ نو لکھی کی آخری رسمیں ادا کرکے آئے تھے۔ اندر سے عورتوں کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ برج بابو وردی میں تھا اس لیے سب اس کی طرف متوجہ ہوگئے لوگوں کے بیچ میں بیٹھا ہوا شخص بنارسی تھا' کسی حد تک پریشان اور برگشتہ سا۔ برج بابو نے اسے فوراً پہچان لیا اور پہلے اسی سے بات کی' اسے جگنو اور دیوا کے بارے

میں بتایا۔ بنارسی نے تلخی سے کہا کہ اسے سب معلوم ہوچکا ہے اور وہ ان دونوں کے متعلق کچھ سننا نہیں چاہتا۔ برج بابو نے شکایت کی کہ ان کی ماں کی موت کی اطلاع تو تھانے پہنچانی چاہیے تھی' یقیناً انہیں ماں کا آخری دیدار کرنے کی اجازت مل جاتی۔ بنارسی بھڑک گیا اور بولا' کیسی اطلاع؟ کس کی ماں؟ وہ ان حرام زادوں کی ماں نہیں تھی' جانے کہاں' کس گھورے پر سے انہیں اٹھالائی تھی۔ وہ اس کے اصل بیٹے ہوتے تو کبھی ایسا نہ کرتے۔ ان کتوں کی وجہ سے نولکھی اپنی جان سے چلی گئی۔ زندگی بھر وہ اس کا جینا حرام کیے رہے' آخر وقت میں بھی اس کے کام نہ آئے' ایسے وقت انہوں نے جھگڑا کرلیا۔ بنارسی نے مشتعل ہو کے برج بابو سے کہا کہ ڈاکٹر وقت پر پہنچ جاتا تو شاید نولکھی بچ جاتی۔ بنارسی نے جگنو اور دیوا کے معاملے میں کسی قسم کی اعانت سے انکار کردیا اور کہا کہ وہ ان کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔

برج بابو اور بھی کچھ بہت بتاتا رہا' یہ سوچے بغیر کہ ہر آدمی کی ایک سکت ہوتی ہے' شور سننے اور تماشا دیکھنے کی۔ جگنو اور دیوا کے اعصاب شل ہوگئے تھے۔ پھٹی پھٹی آنکھیں' بے حس و حرکت جسم۔ سپاہی برج بابو انہیں تسلی تشفی دینے لگا کہ حوصلہ رکھو بھائیو! ہمت سے کام لو۔ تم تو نوجوان ہو' ایسے امتحانات آتے رہیں گے۔ جگنو اور دیوا کا سناٹا نہیں ٹوٹا۔ برج بابو تھک کے ان کے پاس سے ہٹ گیا۔ اسے گئے دیر ہوگئی پھر اچانک دیوا کو جیسے کسی نے جھنجوڑا' کسی نے جیسے اس کے سینے میں خنجر اتارا' اور پھول وتی؟ وہ وحشیانہ انداز میں برج بابو کو پکارنے لگا۔ برج بابو دوڑا دوڑا اس کے پاس آیا۔ دیوا نے گڑگڑا کے اس سے پوچھا "اور پھول وتی؟" آگے اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ برج بابو نے مایوسی سے سرہلایا کہ اسے گھر کے اندر کا حال نہیں معلوم۔

اسی روز انہیں مجسٹریٹ کے سامنے پیش کردیا گیا۔ جگنو اور دیوا نے ہاتھ جوڑ کے اپنی روداد سنانے کی کوشش کی مگر پولیس کی رپورٹ ان کے سچ سے زیادہ مدلل تھی۔ ان کے جسم پر چوٹوں کے نشانات' پٹیاں ان کی وحشت' گزشتہ ریکارڈ' انہیں جیل بھیجنے کا فیصلہ کرنے میں مجسٹریٹ کو کوئی زحمت نہیں ہوئی۔

ساتویں دن' جیل میں آنے کے ٹھیک ہفتے بھر بعد انہیں موسی سیتا بائی کی آمد کی اطلاع دی گئی۔ جب تک انہوں نے موسی کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ لیا' انہیں یقین نہیں آیا۔ بہت سے دکھ آدمی کو خود اپنے خیال و خواب دیتے ہیں۔ ایک لمحے کے لیے جگنو اور دیوا کو گمان ہوا کہ موسی کے ساتھ کہیں پھول وتی نہ ہو۔ موسی اکیلی تھی۔ اس نے دونوں کو سینے سے لگالیا۔ وہ ان کی اشک شوئی کے لیے آئی تھی لیکن خود آنسو بہانے لگی۔ شدید اضطرار کے باوجود انہوں نے موسی سے کچھ نہیں پوچھا۔ انہیں خوب اندازہ تھا کہ موسی کیا جواب دے گی۔ موسی کو بھی جیسے معلوم تھا کہ زنداں کے لوگ سوال نہیں کیا کرتے۔ سو وہ خود ہی بتانے لگی کہ سب دیکھتے رہے "ہمارے پاس پڑوس والے دیکھتے رہے۔ کوئی بھی پھول وتی کا کچھ نہیں ہوتا تھا' کوئی کیا کہتا۔" موسی کے بقول' صرف اسی نے جرات کی اور بنارسی سے التجا کی کہ ابھی کچھ عرصے پھول وتی یہیں رہے تو ٹھیک ہے۔ بنارسی برافروختہ ہوگیا کہ پھول وتی گھر میں اکیلی رہے؟ کہنے لگا "یہاں رہے گی تو یہ بھی مرجائے گی۔"

موسی' نولکھی کی بہت کچھ واقف حال تھی۔ پھول وتی اس کے سامنے بڑی ہوئی تھی اور یہ دونوں بھی۔ غریبی کے رشتے ویسے بھی مضبوط ہوتے ہیں۔ موسی کی آنکھوں سے مسلسل آنسو جاری تھے' گھٹی ہوئی آواز میں اس نے بتایا کہ بنارسی پھول وتی کو لے جارہا تھا اور موسی نے زندگی میں کبھی ایسی بے بسی اور ناداری محسوس نہیں کی تھی۔ پھول وتی کو دیکھا نہیں جاتا تھا' دل کٹا کٹا جاتا تھا۔ ماں کے جانے کے وقت سے اسے چپ لگی ہوئی تھی۔ کوئی تسلی دیتا تو اسے تکتی رہتی۔ اس رات سے بنارسی مستقلاً گھر میں رہا' پھول وتی کا سایہ بنا ہوا۔ موسی کہتی تھی کہ اس کا بس چلتا تو وہ اسی رات پھول وتی کو کہیں چھپا دیتی۔ جب مرد نولکھی کو جلانے گئے تھے' اس وقت وہ پھول وتی کو کہیں لے جاسکتی تھی مگر کہاں؟ اس کے بازو بہت کمزور تھے۔ موسی نے پڑوس کے کریم بھائی سے مشورہ کیا۔ کریم بھائی ہمت کا آدمی تھا اور خدا ترس بھی کہنے لگا' موسی! یہ بڑا کام ہے۔ نولکھی نے سارے میں خو مشہور کر رکھا تھا کہ پھول وتی' بنارسی سے ہے۔ سچ اور جھوٹ خدا بہتر جانتا ہے۔ بعض سچ بہت برے ہوتے ہیں۔ اگر جھوٹ بھی تھا تو اپنی امان کے لیے نولکھی کو کچھ نہ کچھ تو تھا۔ کریم بھائی آہ بھر کے رہ گیا۔ موسی کی عقل میں نہیں تھا کہ کیا کرے۔ کبھی جی میں آتا کہ پھول وتی کی شکل ہی بگ دے۔ کتنے بدنصیب ہیں وہ' جنہیں اپنی خوبیاں راس نہ آئیں۔ نولکھی نے اپنی گل رنگی کی سزا پائی تھی' اب پھ وتی کو بھی یہی سزا مل رہی تھی۔ موسی میں حوصلہ نہیں ہوا وہ پھول وتی کے گلستاں چہرے پر انگارے پھینک دے۔

اس دن سب بار بار جگنو اور دیوا کو پوچھتے اور ج ہوجاتے۔ ایسے وقت میں جگنو اور دیوا کا روپوش ہوجانا۔

کے لیے تعجب انگیز تھا لیکن دیواروں کے خوف میں آدمی جو کچھ دوسروں سے نہیں کہہ پاتا' خود سے تو کہہ سکتا ہے' خود سے کہہ کے جی ہلکا کرلیتا ہے۔ ہر ایک سمجھ رہا تھا کہ کیا کچھ ممکن ہے' بعد میں جگنو اور دیوا کی تھانے میں موجودگی کی اطلاع ملی تو بہت سوں کو قرار آگیا کہ کہیں سے ان کی خبر تو آئی۔ غریب آدمی کو اپنے آپ ہی سے فرصت نہیں ملتی' اپنے آزار سے' دوسرے کے پھڈے میں کیا ٹانگ اڑائے۔ سب نے خود کو ملامت کی اور کام پر نکل گئے کہ مدتوں سے ان کا یہی معمول تھا۔

موسی کے کہنے کے مطابق' آخری رات وہ نولکھی کے سرہانے موجود تھی۔ نولکھی نے وہ رات بہت کرب میں گزاری۔ جب بھی اسے ہوش آتا لگتا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے مگر بے چاری جگنو' دیوا اور پھول وتی کو پکار کے رہ جاتی۔ موسی بتا رہی تھی کہ دم ٹوٹتے وقت نولکھی کی ویران آنکھیں چاروں طرف منڈلا رہی تھیں' پھر دروازے کی طرف جاکے ایسے ٹھہریں۔" موسی ہچکیوں سے رونے لگی۔

وہ اپنی رو میں جانے کیا کچھ کہہ گئی۔ جگنو اور دیوا نے دخل نہیں دیا کیونکہ یہ سب ان کے لیے ایسا نیا نہیں تھا۔ تھانے سے جیل تک شب و روز وہ یہی سنتے اور دیکھتے رہے تھے۔ موسی تو بس دہرا رہی تھی۔ ان کے سکوت سے وہ ٹھٹک سی گئی اور دونوں کی بلائیں لے کے بولی۔ نولکھی مرگئی ہے لیکن اس کی جمن سیتا بائی' تمہاری موسی ابھی زندہ ہے۔ کاش خدا اسے کسی قابل کرتا تو یہ نوبت ہی نہ آتی۔ اس کا دل جتنا بڑا ہے' اتنی ہی یہ بے وست دپا ہے۔ کسی کے کام نہیں آسکتی' اپنے بچوں کے کام نہیں آسکتی۔ کہنے لگی کہ وہ مایوس نہ ہوں۔ خدا نے چاہا تو پھول وتی سکھ سے ہوگی۔ ذرا سوچو کہ بنارسی نہ لے جاتا تو اسے کون لے جاتا۔ کیا عجب' خدا بنارسی ہی کے دل میں نرمی ڈال دے' صبح و شام وہ یہی دعا کرتی ہے۔ آخر پھول وتی سے اس کا کیا تعلق ہے۔ نولکھی کی آنکھیں بند ہوجانے کے بعد پھول وتی سے اس کا رویہ بہت مربیانہ تھا۔ موسی نے کہا کہ جاتے وقت بنارسی گھر کی چابیاں بھی دے گیا ہے کہ چند دنوں تک موسی ہی گھر کی رکھوالی کرے۔ موسی نے دبے لہجے میں اس سے پوچھا کہ اگر وہ پھول وتی سے ملنا چاہے تو کہاں جائے۔ بنارسی نے کہا کہ ابھی وہ کوئی ٹھکانا نہیں بتا سکتا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ ایک دو دن میں وہ خود پھول وتی کو لے کے یہاں آجائے گا۔ موسی نے اس سے زیادہ جرح نہیں کی۔ بنارسی سے اتنی بات بھی موسی نے زندگی میں پہلی بار کی تھی کہنے لگی "آج چوتھا دن ہے' بنارسی نہیں آیا' ممکن ہے آج شام یا کل۔۔۔"

سپاہی آکے موسی کو نہ اٹھاتے تو وہ شام تک بیٹھی رہتی جاتے جاتے موسی نے کہا کہ جب بھی موقع ملا' وہ جگنو اور دیوا کے پاس آتی رہے گی۔ انہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتائیں۔ جگنو اور دیوا کون سی چیز طلب کرتے۔ موسی چلی گئی' یہ التجا کرکے اور حکم دے کر کہ جیل سے چھوٹ کے وہ سیدھے اس کے پاس آئیں گے' کہیں اور نہیں جائیں گے' کسی طرف بھی نہیں' اور کوئی ایسا کام نہیں کریں گے جس سے نولکھی کی روح کو تکلیف پہنچے اور پھول وتی ان سے اور دور ہوجائے۔

موسی دوبارہ نہیں آئی۔ جیل میں جگنو اور دیوا کے پاس اس کے جانے کی خبر چھپی نہ رہ سکی ہوگی۔ موسی کی دوبارہ آمد شاید اسی لیے ممکن نہیں ہوئی۔ تاہم جگنو اور دیوا کی قید و بند میں ڈھائی مہینے سے کچھ اوپر ہوئے تھے کہ ایک وکیل کی کوششوں سے انہیں رہائی مل گئی۔ دونوں کے لیے یہ ناقابل یقین سی بات تھی۔ ان کے اصرار پر بمشکل وکیل نے بتایا کہ اس کے ایک دوست کے ہاں گھریلو کام کرنے والی سیتا بائی نامی عورت اس کے گھر آئی تھی۔ سیتا بائی کے پاس بہت کم روپے تھے' اس نے باقی رقم ادھار کرنے کی درخواست کی اور نہایت دل سوزی سے سارا واقعہ سنایا۔ وکیل نے روپے اسے لوٹا دیے اور اطمینان دلایا کہ وہ ایک کوشش کرکے دیکھتا ہے۔ سیتا بائی بہت خوف زدہ تھی' کسی کو خبر نہ ہوجائے کہ اس نے وکیل سے رابطہ قائم کیا ہے۔ وکیل نے جگنو اور دیوا کو صلاح دی کہ جو کچھ ہوچکا ہے' وہ اسے بھولنے کی کوشش کریں۔ اسی میں ان کی بہتری ہے۔ سمجھ لیں کہ وہ نئے آدمی ہیں' زنداں سے دوسرا جنم لے کے نکل رہے ہیں۔ جگنو اور دیوا نے سر جھکالیا۔ انہوں نے وکیل صاحب سے نہیں کہا کہ نئے آدمی کے لیے دوسرا جنم بھی لازمی ہے۔ وکیل کی ہدایت اپنی جگہ تھی۔ جگنو اور دیوا بھی اپنے آپ سے بہت کچھ کہتے رہے تھے۔ جیل کے دوران وہ گویا طرح طرح کی مشقیں کرتے رہے تھے' لگام تھامنے' آئینہ دیکھنے اور سانس روکنے کی' اپنا چہرہ چھپانے اور سینہ جلائے رکھنے کی مشق۔ سینے کی آگ ان کے زندہ رہنے کے لیے ضروری تھی' باقی اس آگ کو روشن رکھنے کی تدبیریں تھیں۔ وہ ایک دوسرے کے تربیت کار تھے اور مسلسل ایک دوسرے کو نشان دہی کراتے رہتے تھے' نشان دہی اور یاد دہانی۔

انہیں اندازہ تھا کہ بنارسی کو اتنی جلد ان کی رہائی پسند نہیں آئے گی۔ البتہ جیل سے نکلنے کے بعد انہیں اتنا موقع'

اتنی مہلت ضرور مل گئی کہ بنارسی ان کے بارے میں کوئی تخمینہ لگا سکے۔ جیل سے وہ سیدھے موسی کے گھر پہنچے۔ موسی انہیں دیکھ کے بے قابو ہوگئی۔ برابر ہی میں جگنو اور دیوا کا گھر تھا۔ وہ اس طرف نہیں گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ اب اس گھر کے دروازے ان کے لیے نہیں کھلیں گے۔ موسی نے ان کی بڑی خاطر مدارات کی۔ اس نے ان کے لیے نئے کپڑے سلوا کے رکھے تھے۔ کچھ روپے بھی اس نے ان کی جیبوں میں ڈال دیے اور کہا کہ اس کا گھر بہت چھوٹا ہے لیکن جیسے تیسے گزر بسر کرلیں گے۔ وہ اب یہیں رہیں۔ ان کے پوچھے بغیر موسی نے یاسیت سے بتایا کہ پھول وتی کو وہ دوبارہ نہیں دیکھ سکی۔ بنارسی ہفتے بھر بعد آیا تھا۔ اس نے موسی سے چابی لی اور مکان کسی کے حوالے کرکے چلا گیا۔ موسی نے پھر جسارت کی اور پھول وتی کے بارے میں لجاجت سے پوچھا کہ کیسی ہے وہ؟ کیوں نہیں آئی؟ اپنی موسی کو بھول گئی؟ اسے دیکھنے کو دل بہت بے چین ہے۔ بنارسی نے مختصر جواب دیا کہ پھول وتی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے اسے پونا بھیج دیا گیا ہے۔ اب وہ واپسی ہی پر موسی سے مل سکے گی۔ جگنو اور دیوا نے خاموشی سے سن لیا۔ بنارسی کا ذکر موسی نے نرمی اور احتیاط سے کیا تھا۔ انہوں نے بھی اسی طرح سنا جس طرح موسی نے کہا تھا۔

کپڑے تبدیل کرکے شام کو وہ جھجکتے جھجکتے گھر سے نکلے۔ موسی نے ان سے وضاحت نہیں کی تھی کہ وہ جیل میں دوبارہ ان سے ملنے کیوں نہیں آسکی۔ یہ بات انہیں پڑوسیوں کی زبانی معلوم ہوئی۔ موسی کے جیل جانے پر دو اجنبی اسے تنبیہہ کرنے آئے تھے کہ وہ اپنی اوقات میں رہے' زیادہ پر پرزے نکالے گی تو جتنے دن رہ گئے ہیں وہ بھی نہیں رہیں گے۔ پڑوسیوں سے انہیں اور بھی کچھ معلوم ہوا' پھول وتی کے فسانے' آس پاس ہر طرف پھول وتی کے چرچے تھے۔ مثلاً بنارسی نے کسی سیٹھ کے ہاتھ پھول وتی کا سودا کردیا ہے اور بہت دولت سمیٹی ہے' بنارسی نے اسے الگ گھر میں رکھا ہوا ہے اور وہ اسے بیٹی تسلیم کرنے سے انکاری ہے' بنارسی نے پھول وتی کو قلبِ ماہیت کے لیے بمبئی سے باہر بھیج دیا ہے۔ پھول وتی کو بالا خانے کی تربیت دی جارہی ہے' پھول وتی اپنے ہوش وحواس میں نہیں ہے' جانے کیسی کیسی باتیں۔ انہیں سن سن کے جگنو اور دیوا کی ہڈیاں چٹخنے لگی تھیں۔ جیل کا سارا آموختہ ایک پہر میں منتشر ہوا جاتا تھا۔ وہ کسی کے پاس رکنا نہیں چاہتے تھے مگر لوگ ان کا راستہ روک روک کے یہ کانٹے چبھوتے تھے۔ زندان سے باہر آکے انہیں احساس ہوا کہ اس ہجوم میں چہرہ چھپانا کتنا مشکل ہے۔ زنداں میں صرف وہی تھے' صرف ان کا شور۔۔۔ گو انہوں نے کسی بیان پر تبصرہ نہیں کیا تھا لیکن وہ اپنے آپ سے تو خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ بہ عجلت وہاں سے گزر گئے اور جگنو نے دیوا کو مشورہ دیا کہ انہیں سیدھے بنارسی کے پاڑے چلنا چاہیے۔

شام ہورہی تھی۔ ان کی رفتار متوازن تھی جو حواس و اعصاب کے توازن کے بغیر ممکن نہیں۔ پاڑے تک پہنچتے پہنچتے اندھیرا چھا گیا۔ انہوں نے احتیاط کی تھی کہ راستے میں پاڑے کے آدمیوں سے واسطہ نہ پڑے۔ کچھ بڑھتے ہوئے اندھیرے نے ان کا ساتھ دیا۔ وہ ایک بڑا فاصلہ طے کرگئے تھے اور پاڑے کے نزدیک چوراہا عبور کرکے دوسری طرف جانا چاہتے تھے کہ دو آدمی یک بیک ان کے سامنے آگئے۔ انہیں دیکھ کے دونوں داداؤں کو جھٹکا سا لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ حیرانی کا اظہار کرتے یا کوئی بازپرس کرتے' جگنو نے انہیں بتایا کہ وہ بنارسی دادا کے پاڑے جارہے ہیں اور دیوا نے ان سے پوچھا کہ کیا بنارسی دادا پاڑے پر ہے؟ داداؤں نے تذبذب سے اثبات میں سر ہلایا۔ جگنو اور دیوا اپنے لہجے میں اعتماد اور چہروں پر انکسار قائم رکھنے میں کامیاب رہے تھے۔ وہ کسی تاخیر کے بغیر آگے بڑھ گئے۔ انہوں نے مڑ کے نہیں دیکھا مگر انہیں یقین تھا کہ دونوں دادا بھی پلٹ کے ان کے پیچھے آرہے ہوں گے۔

عمارت کے باہر موجود کئی داداؤں کا بھی یہی حال ہوا۔ ان کو جیسے کسی نے چٹکی بھرلی لیکن دوسرے ہی لمحے ان کے ہونٹوں پر استہزائی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ راستے میں مزاحم نہ ہونا بھی حقارت کا اظہار تھا۔ کوئی بھی جگنو اور دیوا کے لیے دیوار نہیں بنا۔ وہ دونوں دروازے میں داخل ہوگئے۔ سامنے دالان کے وسط میں بچھی ہوئی چوکی پر بنارسی بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں اکیلے اندر داخل نہیں ہوئے تھے' ان کے پیچھے وہ سارے دادا تھے جو ابھی عمارت کے باہر ملے تھے اور جن سے چوراہے پر آمنا سامنا ہوا تھا۔ جگنو اور دیوا کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ کے چوکی پر بنارسی کا پھیلا ہوا جسم سمٹ گیا۔ ان لمحوں کی نزاکت کا جگنو اور دیوا کو اچھی طرح احساس تھا۔ وہ زیادہ آگے نہیں گئے۔ صرف ایک لمحے کے لیے بنارسی کی آنکھوں میں خیرگی اتری' اس کی بھویں تن گئیں۔ جگنو اور دیوا نے اسے سلام کرنے میں دیر نہیں لگائی تاہم بنارسی اپنی یکجائی میں کچھ دیر لگی "کیوں؟ ابھی' ابھی ایدر کیسے حرام کا جنا؟" بنارسی کی گرجتی آواز نے عمارت پر چھایا ہوا سکوت توڑا۔

کوئی جواب دینے کے بجائے جگنو اور دیوا سر جھکائے کھڑے رہے۔ اپنے بارے میں مطلوب تاثر قائم کرنے کے لیے انہیں بنارسی کو کچھ اور وقفہ دینا چاہیے تھا۔ ان کی مسلسل خاموشی پر بنارسی جزبز ہوا اور بھڑک کے بولا' اس سے پہلے کہ وہ اپنے آدمیوں کو حکم دے کہ انہیں الٹا لٹکوائے' ان کی کھال کھنچوائے' وہ اس کی نظروں سے دور ہوجائیں۔

"اپن کو معافی دیو دادا!" دیوا نے گھگیا کے کہا "ماں قسم' اپن کا کوئی قصور نئیں تھا۔ اپن سیدھا جارہا تھا۔ ان لوگ سے ڈاکٹر کا پتا پوچھا تھا کہ اپن کے پیچھے پڑگیا۔ سب ایک دم دارو لگائے ہوئے تھے۔ اپن نے کچھ نئیں کیا تھا۔"

"ہو' سالا حرامی۔" بنارسی نے نفرت سے کہا "ابھی ایسا بولنے کو ایدر آیا ہے؟"

"اپن کو جو چاہو سزا دے لو دادا! اپنی نولکھی' ماں کا قسم کھا کے بولتا ہے۔ اپن سے ابھی۔۔۔"

"اس کا نام ایک دم نئیں لینے کا ہے سور کا اولاد! سالا اردیا اس کو! قسم بھی اس کا کھاتا ہے۔"

"نئیں دادا!" جگنو نے دہائی دیتے ہوئے کہا "ایسا مت بولو' اپن ایسا بھی کرسکتا ہے اپنی ماں کے ساتھ۔ اپن ان لوگ سے بالکل منہ ماری نئیں کیا تھا۔ ان لوگ نے اپن کو مت مارا' اکھا زخمی کردیا۔ ابھی تھانے والے سے جاکے پوچھو۔ اپن کے ساتھ اودر ہوٹل' پان کا دکان پہ چل کے پوچھ لیو۔ تمہارے آگے وہ جھوٹ نہیں بولے گا۔"

بنارسی نے انہیں جھڑک دیا اور گالیاں دے کے بولا "سالا مخول کرتا ہے ابھی' اپن ایدر فالتو بیٹھا ہے۔ تیرا باپ کا۔۔۔" بنارسی نے بھنا کے کہا کہ وہ زیادہ بات نہ کریں۔ انہیں یہاں آنے کی جرات ہی کیسے ہوئی۔

"اور ابھی کیدر جاتا! تمہارے سوا اپن کا کون ہے؟"

"اپن' اپن کون ہوتا ہے تیرا۔۔۔" بنارسی گرجنے لگا۔

"ایسا مت بولو دادا! اپن کا مائی باپ ہے تم۔" جگنو نے دبی ہوئی آواز میں کہا کہ انہیں معلوم ہے' بنارسی بہت رانس ہے۔ سبھی ان سے برگشتہ ہیں۔ پھول وتی بھی یہی سمجھتی ہے کہ اس رات وہ جان بوجھ کے ان لوگوں سے الجھے تھے۔ پڑوس میں رہنے والی موسی ایک بار انہیں دیکھنے جیل آئی تھی اور یہی کچھ بتاتی تھی۔

بنارسی نے مشتعل لہجے میں کہا کہ ان کی زبان پر دوبارہ پھول وتی کا نام نہ آئے' اسے تو وہ چھوڑ کے چلے گئے تھے' اب مگرمچھ کے آنسو کیوں بہا رہے ہیں۔

دیوا پھر قسمیں کھانے لگا اور ہاتھ جوڑ کے بولا' وہ اپنی بے گناہی کا یقین کس طرح دلائیں۔ کہنے لگا' انہیں امید تھی کہ جلد یا بدیر بنارسی کو اصل بات کا علم ہوجائے گا۔ بنارسی جیسے دادا سے حقیقت ڈھکی چھپی نہیں رہ سکتی۔ جیل میں بھی انہوں نے کئی آدمیوں سے منت کی تھی کہ کوئی بنارسی دادا کو پیغام پہنچا دے کہ جگنو اور دیوا کی کوئی خطا نہیں ہے۔ وہ ان لوگوں کو بالکل نہیں جانتے تھے جو اس رات۔۔۔

وہ یہی تکرار کرتے رہے۔ انہیں ہر دم یہی سب دہراتے رہنا تھا' تاوقتیکہ بنارسی انہیں دھکے دے کے باہر نہ نکال دے۔ انہیں خوب اندازہ تھا کہ بنارسی کے پتھر پر اپنے لیے کوئی مثبت تاثر نقش کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ بنارسی کے اثبات کا دارومدار محض اس پر ہے کہ وہ کس حد تک اسے اپنی سادگی و سادہ شعاری کا یقین دلانے کے لیے خود پر جبر کرسکتے ہیں۔ انہیں اپنی آگ' اپنا زہر بہت چھپا کے رکھنا تھا۔ ایک ذرا سی تپش' ایک ذرا سی آلودگی ان کے لب و لہجے میں نہ آنے پائے۔ ان کا کام نہایت صبر آزما تھا۔ اس مرحلے کی آمادگی ہی کے لیے وہ کچھ کم اذیت سے دوچار نہیں ہوئے تھے مگر اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ایک زنداں ابھی اور تھا' بنارسی کا زنداں' یا یوں کہا جائے کہ عدالت سے برأت کے باوجود بنارسی کی توثیق لازم تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ دوبارہ انہیں سامنے دیکھنا بنارسی کے لیے کس قدر بیزاری و برہمی کا سبب ہوگا۔ اس کے خیال میں جیل سے چھوٹنے کے بعد ان کے پاس دو ہی راستے ہوں گے' شہر چھوڑ دینا یا دنیا چھوڑ دینا۔ پھول وتی درمیان میں نہ ہوتی تو جگنو اور دیوا شاید یہی فیصلہ کرتے۔ اپنی آگ میں آدمی خود بھی تو جل جاتا ہے۔ انہیں یہ بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ پھول وتی سے نہیں مل سکیں گے تاہم انہوں نے بنارسی سے فریاد کی کہ صرف ایک بار پھول وتی سے ملنے کا موقع دے دیا جائے' وہ اس کے سامنے جاکے صفائی پیش کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے بنارسی سے کہا' انہیں یقین ہے' پھول وتی انہیں معاف کردے گی۔ وہ دل کی بہت اچھی ہے۔ وہ تو انہیں دیکھ کے خوش ہوگی۔ جگنو اور دیوا' نولکھی کا بدل تو نہیں ہوسکتے لیکن پھول وتی کے لیے آرام و سکون کا باعث ہوں گے۔ پھول وتی کی خوشی سے زیادہ ان کے لیے کوئی اور چیز نہیں۔ دیوا نے بنارسی سے کہا کہ آخر ایک دن تو پھول وتی کو ان سے جدا ہو ہی جانا تھا۔ صرف ایک بار بنارسی ان پر رحم کرے' انہیں پھول وتی سے ملوا دے۔

ان کی زبان سے پھول وتی کا ذکر بناری کی شہ رگ پہ ہاتھ رکھنے کے مترادف تھا۔ وہ دہاڑنے لگا کہ پھول وتی ان کتوں کی صورت دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتی۔ جگنو اور دیوا کو اس جواب سے کوئی مایوسی نہیں ہوئی کیونکہ انہیں اس جواب کا پہلے سے علم تھا۔ بناری کا تمام رد عمل ان کی توقع کے مطابق تھا لیکن اتمام حجت تک انہیں یہی التجائیں کرتے رہنا تھا۔ بناری کو انہیں باور کرانا تھا کہ وہ پھول وتی کے ایک نہایت ناقص اور مجہول دعوے دار ہیں' دعوے دار کیا' محض فریادی ہیں۔ دروازے پر صدا لگانے والے بھکاریوں سے زیادہ ان کی حیثیت نہیں۔ بناری بری طرح گالیاں بکتا رہا اور آخر وہ کسی نتیجے پر پہنچ گیا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ دونوں کو پاڑے کے باہر پھینک دیں۔ جگنو اور دیوا نے جھپٹ کے بناری کی چوکی پکڑلی اور اپنے سر رگڑتے ہوئے بولے کہ اب وہ کہاں جائیں' ان کا کوئی گھر ور نہیں ہے۔ وہی سب کچھ انہوں نے دہرایا جو بہت دن ہوئے' ایک بار پہلے بھی کہہ چکے تھے کہ بناری انہیں پاڑے میں جگہ دے دے' وہ اس کی خدمت کریں گے' مالش کریں گے اور دارو پلائیں گے۔ بہت کچھ انہوں نے کہا۔ ان کی باتوں کا بناری کے آدمیوں پر یقیناً کوئی اثر ہوا کہ دونوں ان کے قریب آکے بھی دست کش رہے۔ ممکن ہے' اس گمان میں کہ شاید بناری' جگنو اور دیوا کے بارے میں نظر ثانی کرلے۔ تعمیل میں تاخیر سے بناری کا جسم پھڑکنے لگا۔ اس نے پھنکارتے ہوئے ان سے کہا کہ یوں کھڑے منہ کیا دیکھتے ہو' چیاؤں چیاؤں کرتے ان پلوں کو اٹھا کے گھورے پر پھینک آؤ جو ان کی اصل جگہ ہے۔ پاڑے کے داداؤں کی دست اندازی سے پہلے جگنو اور دیوا نے ان سے ٹھہر جانے کی عاجزی کی اور آخری امید کے طور پر بناری سے کہا کہ اگر اس کے پاڑے پر ان کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے تو وہ اپنے کسی دوست دادا ہی سے ان کی سفارش کردے۔ پاڑے کے سوا اب ان کے لیے کسی جگہ امان نہیں ہے۔ کوئی بھی انہیں کام نہیں دیتا' سب انکار کردیتے ہیں' کوئی انہیں کسی کام ہی کا نہیں سمجھتا۔

بناری کے آدمیوں نے جگنو اور دیوا کو پھر کوئی مہلت نہیں دی۔ انہوں نے دونوں کے بازو پکڑ لیے اور جھٹکے سے کھڑا کردیا لیکن جگنو اور دیوا کو دروازے کی طرف دھکیلنے میں نہ انہوں نے وحشت اختیار کی نہ جگنو اور دیوا نے انہیں اس پر مجبور کیا۔ آدمی میں بہت پتھر ہیں پر سب کے سب پتھر یکساں نہیں ہوتے' اور اپنی اپنی نسبت کی بات ہے۔ جگنو اور دیوا سے بناری کی اور ان کی نسبت مختلف تھی۔ دروازے سے باہر آکے انہوں نے دونوں کو چھوڑ دیا۔ جگنو اور دیوا سر جھکائے وہیں کھڑے رہے۔ کئی لمحے گزر گئے' پھر بناری کے خاص مقربوں میں سے ایک' روبی دادا نے آگے آکے تند نظروں سے انہیں چلے جانے کا اشارہ کیا۔ روبی دادا کی تند آنکھوں میں تاکید بھی تھی' تنبیہہ بھی۔ اس نے ان کی کمر پر ہاتھ رکھ کر تھپکی دی۔ جگنو اور دیوا آہستہ قدمی سے پاڑے کی گلی سے نکل گئے۔

جگنو کی آواز حلق میں پھنسنے لگی تھی' وہ ٹھہر گیا اور مضطرب نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا جیسے کوئی وضاحت نہ کرپایا ہو' کچھ بھول گیا ہو یا اسے یہ سب کچھ سنا کے کوئی پچھتاوا ہو رہا ہو۔ میں نے بے اختیار اس کا ہاتھ اٹھا کے سینے پر رکھ لیا۔ جگنو کی آنکھیں امڈ رہی تھیں۔ میں نے اس کے گلے میں بازو ڈال کے اسے خود سے قریب کیا۔ وہ بری طرح سسکنے لگا۔

کسی وضاحت اور تشریح کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ یہی کرسکتے تھے اور شاید انہیں یہی کرنا چاہیے تھا۔ جگنو نہیں کہہ پا رہا تھا مگر وہ اپنی آگ' اپنا ارادہ لے کر بناری کے پاس گئے تھے۔ یہ ارادہ ہی ان کی سپر تھا' یہی آسرا' یہی امید' حقارتیں سہنے اور نفرتیں جھیلنے کی قوت۔ انہیں بناری کے در سے کچھ ملنے کی توقع نہیں تھی لیکن وہ بہت کچھ لے کے آئے تھے۔ وہ زندگی لے کے آئے تھے جو ارادے کی شرط ہے' جس کے بغیر کوئی آگ فروزاں نہیں ہوتی۔ یوں وہ بناری کے پاس اپنی آگ اپنے ارادے کی تجدید کے لیے گئے تھے پھر کیا ذلتیں اور کیسی رسوائیاں؟ وہ نامراد تو نہیں لوٹے تھے۔

میرے ٹوکنے پر آنسوؤں کے درمیان جگنو نے بتایا کہ وہ واپس موسی کے ہاں نہیں گئے بلکہ پہلے کی طرح مختلف پاڑوں کے چکر لگاتے رہے' چھوٹی موٹی چوریاں کرکے' اسٹیشن پر مزدوری کرکے زندگی نمٹاتے رہے۔ اس دوران کئی بار بناری کے آدمیوں سے ان کا سامنا ہوا بلکہ وہ دانستہ ان کے سامنے آتے رہے۔ بناری کے آدمیوں کا سلوک ان سے کتنا ہی کشیدہ ہو' ایسا معاندانہ نہیں رہا تھا۔ جگنو کے بقول' ان میں سے دو ایک نے تو کئی مرتبہ چوری چھپے پیسوں سے مدد کی۔ جگنو اور دیوا نے ہر بار بسروچشم یہ مدد قبول کی اور اس کے عوض داداؤں کے لیے دعائیں ارزاں کیں کہ دعائیں سخی کا حق ہیں اور لوگ کہتے ہیں کہ بھیک اصل میں دعاؤں کا سودا ہے۔ ابھی بہت دنوں تک جگنو اور دیوا کا وظیفہ وہی رہنا

چاہیے تھا جس کی مشق انہوں نے بنارسی کے پاڑے پر بنارسی کے سامنے کی تھی۔ پاڑے سے انہیں نکال دینے کے بعد، ظاہر ہے، بنارسی نے ان کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کرلی ہوں گی۔ ہرچند اتنے بے حیثیت لوگوں کی بابت پاڑے کے آدمیوں سے باربار اضطراب کا اظہار اس کے لیے سبکی کا باعث ہوگا۔ جگنو اور ردیوا کہ ایسے بے اوقاتوں، بے توفیقوں کے لیے یہ تشویش و تردد بنارسی جیسے اعلا مرتبت دادا کو زیب نہیں دیتا۔ جگنو اور ردیوا کو یقین تھا کہ پاڑے کے کچھ داداؤں نے ضرور ان کی وکالت کی ہوگی۔

بنارسی کے آدمیوں ہی سے پھول وتی کا سراغ مل سکتا تھا مگر کسی کو جیسے کچھ معلوم نہیں تھا یا انہیں کوئی بتا تا ہی نہیں تھا، وہی طرح طرح کی باتیں۔ کبھی کوئی کچھ کہتا، کبھی کچھ۔ جگنو اور ردیوا کسی سے کچھ پوچھ بھی نہیں سکتے تھے لیکن وہ انہی لوگوں کے گرد منڈلاتے رہتے تھے۔ ان کے سامنے کسی نہ کسی طرح وہ پھول وتی کا ذکر لے آتے، پھول وتی کیسی تھی، پھول کی پنی، ریشم کی بنی۔ جگنو اور ردیوا کو کتنا عزیز رکھتی تھی۔ وہ خوابوں اور خیالوں کی طرح اس کی یادیں دہراتے تھے اور اس کے حسن و جمال کا تذکرہ کرکے ان کے شوق کو بھڑکاتے تھے کہ شاید اسی صورت کسی کے منہ سے کچھ نکل جائے اور کوئی ان پر ترس کھا کے کچھ بتا دے، بس ایک اشارہ۔ بمبئی اور گردونواح کے تمام بالا خانے، قحبہ خانے انہوں نے چھان مارے تھے۔ بمبئی کی کوئی گلی، کوئی کوچہ ایسا نہیں تھا جہاں وہ پھول وتی پر نظر پڑنے کے آسرے میں بھٹکا نہ کیے ہوں۔ کسی نے انہیں بتایا تھا کہ بمبئی کے ایک بہت بڑے سیٹھ کے ہاتھ بنارسی نے پھول وتی کو فروخت کردیا ہے۔ انہوں نے اپنی استطاعت کے مطابق ہر سیٹھ کی چھان بین کی جو اپنے نفس کا اسیر تھا۔ بنارسی سے تعلق رکھنے والے سیٹھوں کے علاقوں میں وہ پہروں گھومتے رہتے۔ انہوں نے اپنے طور پر بنارسی کے معمولات کا بھی تعاقب کرنے کی کوشش کی مگر وہ کتنی دیر تک اس کے پیچھے جاسکتے تھے۔ کچھ فاصلہ طے کرتے ہی ان کے پیروں میں زنجیر سی پڑجاتی، بنارسی آگے چلا جاتا پھر انہوں نے بمبئی کے قریبی شہروں کا رخ کیا۔ پیسوں کے بغیر وہ سفر پر نکل کھڑے ہوتے۔ سفر کے دوران انہیں چوریوں کا اچھا موقع ملتا۔ چلتی گاڑی سے اترنے میں انہوں نے خوب مہارت حاصل کرلی تھی اس لیے عموماً رات کو سفر کرتے۔ رات کو مسافروں کا سامان ہتھیانا اور ٹکٹ چیکروں سے بچنا آسان ہوتا تھا۔ انہیں یہ سوچ کر ہر قدم پر اپنا خیال رکھنا پڑتا تھا کہ اگر کہیں وہ پکڑے گئے تو پھول وتی ان سے اور دور ہوجائے گی۔ پھول وتی پھر شاید انہیں کبھی نہ مل سکے۔ لگتا تھا، بنارسی نے پھول وتی کے سلسلے میں اپنے زیادہ آدمیوں کو اعتماد میں نہیں لیا تھا، دو ایک داداؤں کے سوا، اور ان تک جگنو اور ردیوا کی رسائی ممکن نہیں تھی۔ رسائی ہو بھی جاتی تو ان سے کچھ معلوم کرنا کارے دار تھا۔ پھول وتی کی بازیافت وہ اتنی مشکل نہیں سمجھتے تھے جتنا انہیں بعد میں اندازہ ہوا۔ بنارسی نے اسے جانے کون سی کھوہ میں چھپا دیا تھا۔

ان دنوں بمبئی کے سب سے بڑے دادا تیواڑی کے ہاں بنارسی کا بہت آنا جانا تھا۔ جگنو اور ردیوا کو ایک یہ وہم ہلکان کیے دیتا تھا کہ پھول وتی کو بنارسی نے تیواڑی کی خدمت میں نہ پیش کردیا ہو۔ تیواڑی کی خوشنودی کے لیے دادا بڑے بڑے جتن کرتے تھے کیونکہ اس کی قربت کسی دادا کے لیے عزت و مرتبت کی علامت تھی۔ چاقو زنی، زور آوری اور ہیبت و دہشت کے علاوہ تیواڑی کے بارے میں اور بھی بہت کہانیاں مشہور تھیں۔ کہا جاتا تھا کہ شہر میں ہر نئی آنے والی طوائف کو پہلے تیواڑی کے سلام کے لیے ضرور آنا پڑتا ہے اور مشہور تھا کہ بمبئی میں تیواڑی کا ایک گھر نہیں، کئی گھر ہیں، اور ویسے تیواڑی اپنی عمل داری کے علاقوں میں جس گھر کو چاہے، جب تک چاہے، وہ گھر اس کا رہتا ہے۔ جگنو اور ردیوا کو معلوم تھا کہ مہینے کے آخری جمعے کو تیواڑی کے ہاں خاص محفل جمتی ہے۔ پاڑے پر نہیں، کسی اور جگہ، کسی بھی سیٹھ کے ہاں۔ تیواڑی کے خاص آدمیوں، دوسرے پاڑوں کے منتخب داداؤں اور بعض افسروں کے سوا اس ماہانہ جشن میں کسی کو شرکت کی اجازت نہیں ہے۔ جگنو اور ردیوا نے سنا تھا کہ کچھ عرصے سے بنارسی بھی مہینے کے آخری جمعے کو پاڑے پر نہیں رہتا۔ سو اسی بات کا امکان تھا کہ اسے تیواڑی کی محفل میں شرکت کی عزت حاصل ہوگئی ہے۔

جگنو اپنی رو میں تیواڑی کے بارے میں جانے کیا کیا بتاتا رہا۔ وہ بھول گیا اور میں نے بھی نہیں ٹوکا کہ وہ مجھے کیا بتاتا رہا ہے۔ جب بھی تیواڑی کا نام آتا ہے، میرا سینہ دھکنے لگتا ہے۔ اس درندے نے کرشنا جی کو مجھ سے دور کیا تھا۔ ایک مجھے کیا، کرشنا جی تو ایک جہاں کو عزیز تھے۔ بٹھل نے تیواڑی کی ناک اتار لی تھی۔ کہتے ہیں، کسی دادا کے لیے اس سے بڑی سزا کوئی نہیں ہوتی مگر کرشنا جی کے بدل میں تو ہر سزا کم تھی۔ بٹھل بھی اس پر مطمئن نہیں ہوگا۔ جگنو کہہ رہا تھا کہ انہیں یہی وہم ڈسا کرتا تھا کہ اگر پھول وتی تیواڑی کے پار چلی گئی ہے تو پھر خدا ہی اس کی حفاظت کرے۔ وہ تو سات خانوں میں چلی گئی ہے، اور کیا ضروری ہے، تیواڑی نے اسے اپنے پاس ہی رکھا ہو۔ اس نے پھول وتی کو اپنے کسی مربی سیٹھ کی نذر نہ کردیا ہو۔

دن گزرتے گئے اور ان کی آنکھیں ویران ہوتی گئیں۔ وہ نہ پھول وتی کو تلاش کرسکے، نہ کسی پاڑے میں کوئی جگہ حاصل کرسکے اور نہ کوئی ایسی چوری کرسکے جو پھول وتی اور ان کے درمیان فاصلے کم کرنے میں معاون ہوتی۔ کوئی کتنا ہی ناتواں ہو، پیسے سے منزلیں آسان ہوجاتی ہیں۔ پیسہ تو بجائے خود منزل ہے، سب سے بڑی چھت اور سب سے بڑی چھاؤں۔ پیسے سے تو وہ بنارسی کو خرید سکتے تھے، تیواڑی کو خرید سکتے تھے مگر کوئی تقدیر کا کیا کرے۔ کھوٹا سکہ چل جاتا ہے، کھوٹی تقدیر نہیں چلتی۔ کچھ لوگوں کی تقدیر ہی ایسی مٹی ہوتی ہے کہ جتنا پیسے کی ضرورت ہو، جتنا پیسے کی تدبیر کرو، پیسہ اتنا ہی گریزاں رہتا ہے۔ ایک بار ان کے دل میں آیا کہ کیوں نہ پولیس کی مدد لیں، پولیس کے کسی دردمند افسر کے پاس جا کے ساری روداد سنائیں مگر پھر شاید ان کے ہاتھ میں کچھ نہ رہے۔ پولیس کے پاس تو ہر چیز کے لیے پیمانے اور باٹ ہوتے ہیں۔ بہت سی چیزیں ترازو میں نہیں تلتیں، نہ پیمانے انہیں ناپ سکتے ہیں۔ تھانے کی عمارت ابھی دور تھی، وہ بیچ سے لوٹ پڑے۔ بعد میں انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ اتنی بڑی نادانی سے بچ گئے۔

جگنو اور ردیوا کا کہیں جی نہیں لگتا تھا، نہ کپڑوں کا ہوش، نہ کھانے کی فکر، صبح کب ہوئی شام کب۔ شام و سحر بھی ایک گمان ہے۔ زمین کی گردش پوری ہونے پر اجالا ہوجاتا ہے یا اندھیرا مگر فرد کی بھی اپنی گردشیں ہیں۔ دونوں میں کوئی مطابقت لازم نہیں۔ ہر آدمی کے لیے سحر نہیں ہے۔ جس کے وجود پر اندھیرا مسلط ہو، اس کے لیے کیا سحر، کیا شام۔ جتنے دن گزرتے جاتے تھے، جگنو اور ردیوا کا اندھیرا بڑھتا جاتا تھا۔ وہ پھول وتی سے کیا، اپنے آپ سے دور ہوتے جارہے تھے۔ اسی عالم میں ایک دن دادر اسٹیشن پر جیل کے ایک شناسا باٹلی والا بھائی سے ان کی ملاقات ہوگئی۔ باٹلی والا، دادا نہیں تھا لیکن داداؤں سے اس کی بڑی راہ و رسم تھی۔ وہ انہیں چھنگا دادا کے پاڑے پر لے آیا۔ چھنگا علاقے کے اعتبار سے اتنا بڑا دادا نہیں تھا جتنا کس بل اور رکھ رکھاؤ کے اعتبار سے تھا۔ وہ دوسرے داداؤں سے کم ہی سروکار رکھتا تھا، نہ کسی کے علاقے پر نظر رکھتا، نہ اپنے علاقے میں دوسروں کو ایسا کرنے دیتا۔ ایک زمانے سے وہ اپنے پاڑے پر جوں کا توں قائم تھا۔ باٹلی والا کی سفارش پر چھنگا انہیں رکھنے کے لیے آمادہ ہوگیا مگر گویا جگنو اور ردیوا کو کنارہ نظر آگیا۔ ان سے کوئی بڑی غلطی سرزد ہوجاتی تو دوسری بات تھی ورنہ ایک بار اپنے پاڑے پر انہیں قبول کرنے کے بعد چھنگا بہرحال ان کا امین اور نگراں تھا۔ ادھر جگنو اور ردیوا نے جی جان سے چھنگا دادا کی خدمت کی، چھنگا کے علاوہ دوسرے داداؤں کی بھی۔ وہ یہ موقع ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتے تھے لیکن ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ ایک روز میں پاڑے میں داخل ہوا اور میں نے یعنی راجا دادا نے چھنگا کو پاڑے سے بے دخل کردیا۔

جگنو کے کہنے کے مطابق، انہوں نے کبھی ایسا نہیں دیکھا اور سنا تھا۔ ان کے لیے وہ سارا منظر دیدنی تھا۔ بس اسی دن سے انہیں اپنے دن پھرتے محسوس ہوئے۔ انہوں نے طے کرلیا کہ اب کہیں نہیں جانا۔ ذرا وقت گزر جائے تو وہ راجا دادا کو بیتی ہوئی ہر بات بتائیں گے۔ راجا دادا انہیں بالکل دادا نہیں لگتا تھا۔ میری ناوقت آمد سے جتنے وہ آزردہ ہوئے تھے، چھنگا کی ہزیمت سے انہیں اتنی ہی خوشی ہوئی۔ ان کی کوشش یہی رہتی تھی کہ وہ کسی طور میرے سامنے رہیں۔ چھنگا کی طرح اب وہ میری خدمت کے لیے اشاروں کے منتظر رہتے پھر ایک دن انہوں نے بٹھل کو دیکھا اور دیکھا کہ راجا دادا نے اس کے لیے پاڑے کی چوکی خالی کردی ہے۔ بٹھل کی آمد پر وہ خود کو اور محفوظ و توانا محسوس کرنے لگے۔ اس کے لیے وہی حقہ تیار کرتے تھے اور وہی اس کے پیر دباتے تھے مگر انہیں اپنے دل کی بات کہنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ جگنو ٹھیک کہہ رہا تھا۔ تیواڑی کا سرا تارنے کی جستجو میں مجھے کسی اور طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ بمبئی میں اچانک بٹھل کی آمد سے وقت کچھ اور تیز ہوگیا تھا۔ بے شک وہ دونوں تیواڑی کا پاڑا نیست و نابود کرنے والے داداؤں میں شامل تھے اور یقیناً پیش پیش بھی ہوں گے۔ تیواڑی کے خاتمے کے بعد بٹھل نے چھنگا کے پاڑے پر چھیدا کو تعینات کردیا تھا اور ہم سب اپنے محسن پیرو دادا کے پاڑے پر بیٹھنے لگے تھے۔ جگنو کہہ رہا تھا کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کس طرح حرف مدعا زبان پر لائیں۔ میری پیروی میں کبھی وہ اس پاڑے جاتے، کبھی اس پاڑے، اور وہ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے پھر ایک دن انہیں خبر ملی کہ ہم بمبئی سے چلے گئے ہیں۔

جگنو مجھے پہلے ہی بتا چکا تھا کہ پھر میری تلاش میں وہ کہاں کہاں گئے۔ کلکتے اور دوسرے کئی شہروں میں۔ وہ فیض آباد بھی جانے کے لیے تیار تھے لیکن کلکتے میں انہیں تصدیق ہوگئی تھی کہ میں اور بٹھل وہاں بھی نہیں ہیں۔ ہم تبت کی طرف گئے ہوئے تھے۔ جگنو اور دیوا ہماری آس میں بہت دنوں تک کلکتے میں ٹھہرے رہے پھر پھول وتی کے خیال نے

انہیں بد حواس کردیا۔ اس سفر میں انہوں نے ایک اور کام بھی کیا۔ کلکتے تک راستے میں پڑنے والے بیشتر بڑے شہروں میں اتر کے انہوں نے ایک نظر وہاں کے بالا خانوں کو دیکھ لینا مناسب سمجھا۔ لکھنؤ، کان پور، دلی اور آگرے میں تو انہوں نے اس مقصد کے لیے کئی دن صرف کیے۔ کہیں بھی پھول وتی کی سن گن نہ ملی۔ کلکتے میں انہیں کچھ کام مل گیا تھا۔ باقی جگہوں پر انہیں شدید دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پلیٹ فارم اور ریل کے ڈبوں میں چوریوں سے جیسے تیسے انہوں نے سفر جاری رکھا، آخر وہ واپس بمبئی پہنچ گئے اور چھنگا ہی کے پاڑے سے ان کا تعلق رہا لیکن بس رسمی سا۔ پاڑے پر اب ان کا جی ہی نہیں لگتا تھا۔ انہیں میرا انتظار تھا اور چونکہ پیرو دادا ابھی بمبئی میں نہیں تھا اس لیے انہیں میری واپسی کا یقین تھا۔ اس دوران وہ بمبئی کے گلی کوچوں میں پھول وتی کے لیے بھٹکتے، منڈلاتے رہے۔

تیواڑی کے خاتمے کے بعد بمبئی میں بہت کچھ بدل چکا تھا۔ تمام پاڑے اب پیرو دادا کے پاڑے سے جٹے ہوئے تھے، بنارسی کا پاڑا بھی۔ بنارسی کا رخ اب کلیتا ماہم کے پاڑے کی طرف تھا۔ جگنو اور دیوا کو یہ جان کے حیرت بھی ہوئی اور موہوم سی مسرت بھی کہ ماہم کے پاڑے سے الحاق کرنے میں بنارسی آگے آگے تھا۔ بنارسی اور تیواڑی کے ربط ضبط کا علم پیرو اور دوسرے داداؤں کو ضرور ہوگا لیکن سبھی نے اسے نظرانداز کردیا۔ انہیں یہی کرنا چاہیے تھا۔ بنارسی سے براہ راست پرخاش بھی نہیں تھی اور بنارسی کا موجودہ رویہ، اس کا تپاک اور سرخوشی کا اظہار مجوبیت اور معذرت کے مترادف تھا۔

بمبئی میں اب سبھی کچھ الٹ چکا تھا مگر جگنو اور دیوا کے لیے کچھ نہیں بدلا تھا۔ ان کے لیے وہی سحر تھی، وہی شام، وہی اندھیرا، وہی دھوپ اور وہی بنارسی۔ وہ دوبارہ بنارسی کے پاس نہیں گئے اس لیے کہ وہاں سے کچھ حاصل ہونے کا امکان نہیں تھا لیکن وہ اس کے بعض آدمیوں کی خدمت میں پابندی سے حاضری دیتے رہے کیونکہ بنارسی کو اپنی فردتنی اور فرمائیگی کی یقین دہانی انہی آدمیوں کے ذریعے ممکن تھی۔ اس یقین دہانی کی ضرورت ختم نہیں ہوئی تھی۔ دوسرے جگنو اور دیوا کو ابھی تک کوئی امید تھی کہ شاید کبھی کسی آدمی کی زبان بہک جائے۔ پھول وتی کے بارے میں کوئی سراغ مل جائے۔ اسی آسرے میں انہوں نے تیواڑی کے خاتمے کے بعد اس کے پاڑے کے منتشر ہوجانے والے داداؤں سے سلام دعا شروع کی مگر وہ بھی بنارسی کے آدمیوں کی طرح انجان تھے۔

جگنو کی آواز ڈوب ڈوب جاتی تھی۔ وہ چپ ہوگیا۔ اب شاید کہنے کو کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ پہلے کی طرح بکھر گیا اور اپنے چہرے پر چٹکیاں بھرنے لگا۔

"حوصلہ رکھو۔" میں نے بمشکل کہا اور مجھے اپنے ہی لفظ بہت حقیر لگے۔

○☆○

دور دور تک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دیر تک کوئی گاڑی بھی نہیں گزری تھی۔ رات کا آخری پہر ہوگا۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ گھر بھی جانا تھا۔ میرے گھر نہ پہنچنے پر وہ سب کیسے بے حال ہوں گے۔ میری نظریں ان دونوں پر جمی ہوئی تھیں۔ دونوں کے شانے ڈھلکے ہوئے تھے اور وہ اپنا چہرہ مجھ سے چھپائے ہوئے تھے۔ کوئی خیال نہیں کرتا کہ اس کے پاس سے گزرتا ہوا راہ گیر کتنی دور سے چل کر آرہا ہے اور کتنی دور اسے جانا ہے۔ کون کتنا اجیرن ہے اور کتنا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے۔ دیر تک میں گنگ بیٹھا رہا۔ میری رگوں میں چنگاریاں سی لپکتی تھیں۔ مجھے ان سے کیا کہنا چاہیے۔ اتنا سن کے کوئی کسی سے کیا کچھ کہہ سکتا ہے اور کیا کرسکتا ہے۔ اسے آنسو بہا کے گزر جانا چاہیے کہ اپنا راستہ ہی کم نہیں ہوتا۔ لمحوں تک میں اپنے آپ سے دو چار رہا، کسی محبس میں بیٹھا ہاتھ پاؤں مارتا رہا پھر جیسے میرے سینے کی دھند چھٹنے لگی، کوئی گم شدہ چیز مل جانے پر آدمی کو جو سکون نصیب ہوتا ہے۔ ارادہ بھی تو کھو جاتا ہے۔ میں نے جگنو سے پوچھا کہ یہاں سے بنارسی کا پاڑا کتنی دور ہے؟

دونوں اچھل سے گئے اور میری صورت دیکھنے لگے

"جاستی دور نئیں۔" دیوا اضطراری لہجے میں بولا "مگر کیوں، کیوں دادا؟"

"ٹھیک ہے۔" میں نے نسبتاً ٹھہری ہوئی آواز میں کہا "وہیں چلتے ہیں، پہنچتے پہنچتے سویرا ہوجائے گا۔"

میری توقع کے خلاف دونوں نے ہاتھ جوڑ لیے "نئیں دادا نئیں۔"

"ایک بار چل کے دیکھتے ہیں۔"

"نئیں دادا۔" جگنو عاجزی سے بولا "آپ نئیں جاؤ گے۔"

"میں اکیلا جاؤں گا۔"

"یہ بات نئیں دادا۔" جگنو نے میرے پیر پکڑ لیے "ایسی بات نئیں ہے۔"

"پھر، پھر کیا ہے؟" میں نے بے چینی سے کہا "پھر کیسے؟"

"آپ کو اور نئیں جانے کا ہے۔" جگنو نے اٹکتی زبان سے کہا "ابھی ایسا کرنے کا ہوتا تو اپن خود بھی اس کے سامنے اودر پاڑے پر گیا تھا۔ پہلی بار میں نئیں تو اپن دوسری بار کو بھی جاسکتا تھا۔"

میں نے اس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کی اور تذبذب سے سرہلایا۔

"آدمی کو خلاص کرنے کا کیا ہے دادا۔ اپن کبھی بھی اس کا خون پی لیتا۔ ابھی کچھ نئیں تو پیچھے سے چاقو ڈال دیتا، تیزاب مار دیتا اس کتے پر۔ بعد کو اپن کا جو بھی ہونے کا تھا، اس خواری سے جاستی نئیں ہوتا۔ اپن کو پتا تھا، اپن بھی خلاص ہوجاتا پر ایسا بار بار کو تو نئیں مرتا سالا۔"

"اچھا ہوا جو تم نے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا۔" میں نے نرمی سے کہا "میں سمجھ رہا ہوں، تم نے بہت تحمل کیا، غالباً اس وجہ سے کہ ایک یہ فیصلہ تو تم ہر وقت کرسکتے تھے لیکن اب کچھ نہیں، میں جاکے اس سے بات کرتا ہوں۔"

"آپ کیا بات کروگے دادا؟"

"پہلے پھول وتی کے بارے میں پوچھیں گے۔"

"اگر وہ کچھ نئیں بولا؟"

"بول دے گا۔"

"اپنے کو معافی دو دادا۔" جگنو جھجک کے بولا "اگر وہ منع کردیا؟"

"ایسا ممکن نہیں ہے پھر دوسرے طریقے ہیں۔ یہ بات وہ بھی جانتا ہوگا۔"

"اور اگر اس نے آپ کو پھول وتی کے بارے میں بول دیا؟"

"یہی تو ہم چاہتے ہیں۔"

"پھر کیا ہوئے گا دادا؟"

"پھر، پھر؟" میں نے ترشی سے کہا "پھر تم کیا چاہتے ہو؟"

"اپن کو پتا ہے دادا! ابھی پھول وتی اپن سے دور چلی گئی ہے، ایسا لوٹ کے اپن کو نئیں ملنے کا۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔"

"دادا!" جگنو نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا "اپن پہلے بولا تھا، اپن خود بنارسی کے پاس جانے کا ہے۔"

"تم، تم؟" میں نے حیرت سے کہا "تم جاؤ گے؟"

"آپ چاہو گے تو ضرور جائیں گا۔"

"میں چاہوں گا!" میں نے الجھی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں دادا! آپ ساتھ رکھو گے تو ضرور جائیں گے۔"

میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ دونوں کی بھیگی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ تھیں۔ میں نے یہ یقین کرلینے کے لیے توقف کیا کہ جو کچھ میں سمجھ رہا ہوں، کیا وہی ان کے چہروں پر لکھا ہے اور جیسے جیسے ان کے چہرے مجھ پر روشن ہوتے گئے، مجھے ندامت کا احساس ہوتا گیا اور طمانیت کا بھی۔ میں خاموش بیٹھا انہیں دیکھتا گیا۔

"آپ سمجھتے ہو دادا!" دیوا نے لجاجت سے کہا۔

"ہاں ہاں۔" میں سرہلا کے رہ گیا۔

انہوں نے وضاحت کی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ بہت سی باتیں وضاحت کے لیے نہیں ہوتیں، اور وہ تو سب کچھ پہلے ہی کہہ چکے تھے۔ بے شک زنداں سے نکل کے پھول وتی کی تلاش میں وہ رات دن ایک کیے رہے مگر وہ ایک اور بات کہہ رہے تھے۔ پھول وتی کی بازیابی اور بنارسی سے اپنے معاملے کو انہوں نے الگ الگ کردیا تھا کیونکہ پھول وتی بنارسی سے ان کے معاملات کا محض ایک جزو تھی۔ اگر وہ اس پر قناعت کرجاتے تو شاید اب تک زندہ نہ ہوتے۔ پھول وتی کے چھن جانے کے بعد موت ہی میں ان کے لیے امان تھی، ایک اور پرسکون موت کی صورت یہ تھی، جیسا کہ جگنو کہہ رہا تھا کہ وہ زنداں سے نکل کے بنارسی کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیتے۔ نشانے پر چاقو پھینکنے کی انہیں کم از کم اچھی شدبد ہوگئی تھی لیکن یہ فیصلہ کسی بھی لمحے ان سے دور نہیں تھا۔ زنداں میں رہ کے وہ مسلسل ایک دوسرے سے برسرپیکار رہے تھے اور وہاں سے خالی ہاتھ واپس نہیں آئے تھے۔ زنداں میں انہوں نے خود شناسی کی مشق کی تھی۔ کوئی خواب نہیں، وہ اپنا ارادہ ساتھ لے کے نکلے تھے۔ جبر سہنے کی انہیں عادت تھی اور سزاوار تعبیر ہونے تک انہیں اپنے ارادے کا جبر سہنا تھا یا جب تک وہ نامرادی کے آخری نتیجے پر پہنچ نہ جائیں۔

پھول وتی کو دیکھنے کے لیے ان کی آنکھیں ترستی تھیں۔ اس کی تلاش میں انہوں نے کسی لمحے کی کوتاہی نہیں کی تھی لیکن صرف پھول وتی ان کی منزل نہیں تھی، ان کی منزل تو بنارسی پر جاکے ختم ہوتی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ پھول وتی ان سے بہت دور جاچکی ہے۔ وہ ہر دم کسی کرشمے کی آرزو کرتے تھے کہ کبھی کسی دروازے سے پھول وتی کی آواز سنائی دے جائے، کہیں کسی دریچے سے اس کی جھلک دکھائی دے جائے۔ اس دوران پھول وتی انہیں نظر آجاتی تو کیا بات تھی۔ وہ اپنی قسمت پر جتنا بھی ناز کرتے، کم تھا۔ تاہم پھول

وتی کی بازیابی کا بنارسی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ انہیں کسی نہ کسی دن بنارسی کے پاس تو پھر بھی جانا تھا۔

انہیں یقین ہو گا کہ میں بنارسی کے ہاں جا کے پھول وتی کے بارے میں کوئی سرا حاصل کیے بغیر واپس نہ آتا اور میرا نام ان کے لیے ہر قسم کے تحفظ کی ضمانت بھی ثابت ہوتا۔ انہیں یہ تحفظ نہیں چاہیے تھا اس لیے کہ یہ تو انہیں کسی نہ کسی طور اب بھی حاصل تھا۔ یوں مانگے کی زندگی تو وہ کب سے بسر کر رہے تھے۔ ممکن ہے، میرے پہنچنے کے بعد بنارسی پاڑے پر باقی نہ رہتا۔ دادا کا پاڑا کھو بیٹھنا، زندگی ہار جانے کے مترادف ہے۔ ممکن ہے، بنارسی زندگی ہار بیٹھتا۔ جگنو کے بقول یہ کام تو وہ خود کر سکتے تھے۔ بنارسی کے سینے پر میرے چاقو کے یا اس کی پیٹھ پر جگنو اور دیوا کے چاقوؤں کے نشانات ایک ہی حیثیت رکھتے تھے۔

انہوں نے یہ صراحتیں مجھ سے نہیں کی تھیں لیکن پھر انہوں نے اور کیا کہا تھا۔ ان کے ایک ایک لفظ کی بازگشت میرے دل و دماغ میں گونج رہی تھی۔ اندھیرے کا رنگ بدلنے لگا تھا، دونوں نظریں جھکائے بیٹھے رہے۔ میں نے ان سے کہا "ٹھیک ہے، پھر جیسا تم کہتے ہو، ٹھیک ہے مگر دوسری باتوں پر تم نے دھیان نہیں دیا۔ یوں بہت دیر لگ سکتی ہے۔"

"ہو سکتا ہے۔" دیوا بے تابی سے کہنے لگا کہ انہیں یقین ہے، میری توجہ رہی تو کوئی وقت نہیں لگے گا۔

میں ان سے کہنا چاہتا تھا کہ صرف جستجو نہیں، اور بھی چیزیں ہوتی ہیں، بعض لوگوں کی عمریں گزر جاتی ہیں۔ یہ ایسا آسان نہیں جیسا وہ سمجھ رہے ہیں۔ سب پاڑے کے آدمی نہیں ہو سکتے، جیسے پاڑے کا ہر آدمی پاڑے کی چوکی پر نہیں بیٹھ سکتا۔ ہنر کے لیے یک سوئی، صحت، تجربہ اور بھی بہت سی باتیں لازم ہیں مگر میں ان سے کچھ نہ کہہ سکا۔

"ابھی ٹیم کا کیا۔ اپن کو ابھی کیدر جانا کہ آنا مانگتا ہے۔" جگنو نے مایوسی سے کہا، پھر اسے فوراً کچھ خیال آیا، کہنے لگا کہ یہ سب تو مجھ پر منحصر ہے کہ میرے پاس ان کے لیے کتنا وقت ہے، میں ان پر کتنی نوازش کرتا ہوں۔ میں خاطر جمع رکھوں کہ وہ تا وقت مجھے کوئی زحمت نہیں دیں گے۔

"مگر، مگر۔۔۔" میں نے منتشر لہجے میں کہا "میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا ہے کہ ہم سب پیرو دادا کے گھر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ جانے ہمیں وہاں کب تک رہنا پڑے۔ وہاں پہلے سے بہت لوگ موجود ہیں اور گھر کی فضا ہی دوسری ہے۔ ایسے میں میرا تمہیں اپنے ساتھ وہاں لے جانا۔۔۔"

"اپن باہر پڑا رہنے کا ہے دادا!" جگنو بے کلی سے بولا اور ہیجانی انداز میں یہی دہرانے لگا کہ وہ کسی کو کوئی تکلیف نہیں دیں گے، ہر ایک کی خدمت کریں گے اور میں کہوں گا تو کوئی بھی ان پر انگلی نہیں اٹھائے گا، بٹھل بھی نہیں جہاں اتنے لوگ ہیں، وہاں دو نوکر اور سہی۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن سبھی کچھ بکھرا پڑا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تمہیں کیا وقت دے سکوں گا۔ کچھ نہیں معلوم کہ کب کہاں جانا پڑے۔ میں سوچتا ہوں یہ وقت نہایت نامناسب ہے۔"

"اپن بولا دادا۔" دیوا تڑختی آواز میں کہنے لگا "اپن کو کوئی جلدی نئیں ہے۔ ابھی آپ مل گیا تو اپن کو اکھا چیز مل گیا۔ ابھی سب ٹھیک ہو جائیں گا۔"

"میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں۔ میں مل گیا ہوں تو اب سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔ میں اگر آج تمہیں نہ ملتا تو تم کچھ اور انتظار کرتے نا؟"

"ضرور دادا! پر ابھی آپ مل گئے ہو، اپن کیا بولے، ابھی اوپر والا اکھا دیکھتا پڑا ہے، اپن نے ایک ایک پل کیسا کاٹا ہے۔"

میں نے ان سے کہا کہ زندگی ہمیشہ محدود ہوتی ہے۔ پہلے ہی بہت وقت نکل چکا ہے۔ آگے نہ معلوم کیا حالات پیش آئیں۔ میری مانو تو مجھے بنارسی کے پاس جانے دو۔

"دادا!" جگنو گھگیاتے ہوئے بولا کہ میری ہر بات ان کے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ کہنے لگا کہ مجھے بنارسی کے پاس بھیجنا مقصود ہوتا تو اتنا کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ بنارسی کے پاس مجھے بھیجنے کے لیے پیرو دادا کا نام کافی ہوتا۔

"پیرو دادا کا نام؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"آپ سمجھتے ہو، جارجی ابھی اکیلا تھا کیا؟"

"کیا مطلب؟"

"جارجی اکیلا نہیں تھا دادا!" جگنو کی عاجزی میں بڑی تلخی تھی۔

"اور کون تھا؟" میں نے متوحش لہجے میں پوچھا۔

جگنو کے کچھ کہنے سے پہلے دیوا نے اسے روک دیا اور جھجکی آواز میں بولا کہ بمبئی سے پیرو کے جانے کے بعد پاڑوں کے دادا ایک دوسرے کے پاس کثرت سے آنے جانے اور ملنے بیٹھنے لگے تھے۔ خاص طور پر وہ دادا جو تیواڑی کے رفیق تھے۔ انہوں نے ماہم کے پاڑے کی مرکزی حیثیت اس لیے قبول کر لی تھی کہ وقت کا یہی تقاضا تھا۔ پیرو کو گئے ہو گئی تو ان داداؤں کو اور ہوا ملی۔ کچھ یہ تاثر بھی عام ہو گیا کہ پیرو دادا کسی بڑے چکر میں پھنس گیا ہے، اس کی جلد واپسی کی توقع نہیں، ممکن ہے، اب وہ کبھی نہ آئے۔ پیرو کی عدم موجودگی میں اس کی چوکی پر بیٹھنے والے ماچھی کو بہت سی باتوں کی خبر ہونی چاہیے۔ یقیناً وہ بے خبر نہیں ہو گا لیکن اس نے پیرو کے انتظار میں توقف کیا۔ ادھر یکے بعد دیگرے تین داداؤں نے ماہم کے پاڑے پر بھتا بھیجنا بند کر دیا۔ اندھیری کے راجن، بائی کلا کے دینا اور قلابے کے جارجی نے۔ یہ گویا ماہم کے پاڑے سے تعلق ختم کرنے کا صریح اعلان تھا۔ بعد میں دوسرے پاڑے بھی اندھیری، بائی کلا اور قلابے کی پیروی کرتے لیکن وہ کوئی جلدی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ماچھی کی خاموشی سے ایک طرف ان کی حوصلہ افزائی ہوئی تھی تو دوسری طرف ماچھی کا سکوت ان کے لیے تردد و تذبذب کا سبب بھی بن گیا تھا۔ انہیں شبہ ہو گیا تھا کہ پیرو دادا بمبئی واپس آنے والا تو نہیں ہے؟ اور پیرو ایک دن واقعی بمبئی آ گیا۔

دیوا کہہ رہا تھا کہ گزشتہ تین چار دنوں میں ماہم کے پاڑے پر پیرو دادا کے سوگ میں بیٹھے ہوئے ہجوم میں بنارسی بہت واویلا مچا رہا تھا۔ جگنو اور دیوا ایک کونے میں دبکے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ بنارسی بہت مضطرب تھا کہ وہ کسی طرح پیرو دادا سے اپنے دیرینہ مراسم، اپنی گہری وابستگی کا اظہار کرے۔ اس کی آواز بھرا بھرا جاتی۔ اس نے بٹھل سے تلخی بھی کی تھی کہ اگر بٹھل نے اپنے دوست پیرو دادا کی چوکی نہ سنبھالی تو شہر کا اتنا بڑا پاڑا انتشار کی نذر ہو جائے گا۔ جیل سے آنے کے بعد پھول وتی کی تلاش میں جگنو اور دیوا کا ایک ہی کام رہ گیا تھا کہ وہ بنارسی کے سایوں کا تعاقب کریں۔ جارجی اور بنارسی، دینا اور دوسرے کئی دادا اندھیری میں راجن کے اڈے پر عموماً ملتے تھے۔ پاڑے کی عمارت کے بجائے نزدیک کے ایک گھر میں رات کو وہاں محفل جمتی تھی۔ جارجی نے ساحل پر جوئے، شراب اور عورتوں کا اڈا کھولا تو بنارسی وہاں آنے جانے لگا۔ دیوا نے بتایا کہ جس رات پیرو دادا نے میرے اور بٹھل کے ساتھ جارجی کے قحبہ خانے پر چھاپہ مارا تھا، اتفاق سے اس رات بنارسی وہاں نہیں تھا۔ ہوتا بھی تو شاید پیرو دادا کی اس پر نظر نہ پڑتی۔ رات خاصی ہو گئی تھی اور بہت سے لوگ شراب پی کے مختلف کوٹھریوں یا عشرت خانوں میں بند ہو چکے تھے۔ پیرو صرف جارجی کی کوٹھری تک گیا تھا۔ اس رات بنارسی اندھیری کے پاڑے پر راجن کے ساتھ تھا۔ جس نے ایک کم تر درجے کا ایسا ہی اڈا اندھیری میں کھول لیا تھا۔ بنارسی نے ماہم کے پاڑے کا بھتا بند کرنے کا فیصلہ خود کیوں نہیں کیا؟ ظاہر ہے، بنارسی بینائی کا ایسا کم زور نہیں تھا۔ اس نے پیرو کے خاص آدمی جارجی کو آگے بڑھایا اور دیوا کے بقول باقی کتوں کو یہ تاثر دیا کہ اسے پیرو کے پاڑے پر ماچھی کا رد عمل جاننے، ماہم کے پاڑے کی سن گن لینے کے لیے کھلا چھوڑ دینا چاہیے۔ بنارسی کا عذر معقول تھا۔ کسی شک اور اعتراض کی گنجائش نہیں تھی۔ سب کو تیواڑی کی بارگاہ میں بنارسی کی حضوری کا اچھی طرح علم تھا اور تیواڑی کی معزولی کے بعد پیرو کے پاڑے سے اس کے بغض و عناد کا اندازہ تھا۔ ادھر بنارسی نے ماچھی کو بھی کچھ یہی تاثر دیا ہو گا کہ تینوں منحرف داداؤں سے اس کا رابطہ قائم ہے بلکہ وہ ان تینوں پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ ہو سکتا ہے، یہ وہی ہو جس نے ماچھی کو، پیرو کے بمبئی آنے تک جارجی، دینا اور راجن کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے روکے رکھا ہو۔

اور کسی پیشگی اطلاع کے بغیر ایک روز پیرو دادا بمبئی میں وارد ہو گیا، اور اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ بٹھل بھی تھا، میں تھا اور دوسرے کئی اور۔ پیرو کے ساتھ ہماری موجودگی مستزاد تھی۔ بٹھل اور میں بمبئی میں ایسے اجنبی نہیں تھے۔ پیرو کی آمد پر سارے خواب الٹ گئے۔ ایک رات صرف کچھ دیر کے لیے پیرو، جارجی اور دینا کے پاڑوں پر گیا تھا۔ دونوں پر جیسے بجلی گر گئی تھی۔ اندھیری وہاں سے دور تھا۔ اس رات پیرو کو راجن کے پاس اندھیری جانے کی مہلت نہ مل سکی اور اگلی دن راجن نے پیرو کو اپنے پاڑے پر آنے کی زحمت ہی نہیں اٹھانے دی۔ اگلی صبح وہ بھتا لے کے ماہم کے پاڑے پر خود حاضر ہو گیا اور پیرو کے پیروں سے لپٹ گیا۔ جارجی تو اس کے بعد جیسے قلابے کا راستہ ہی بھول گیا تھا۔ جب دیکھو، پیرو کے پاڑے پر بیٹھا نظر آتا۔ دینا اور راجن بھی زیادہ وقت وہیں گزارتے تھے اور بنارسی بھی۔ پیرو کے خلاف کوئی نئی وضع ایجاد کرنے کے لیے پیرو کے پاڑے سے بہتر جگہ کیا ہو سکتی تھی۔ ہر چند کہ بمبئی آنے کے بعد پیرو کو جم کر پاڑے پر بیٹھنے کا وقت ہی کم ملتا تھا۔ بمبئی آتے ہی کانتے چلا گیا تھا۔ اتنے دنوں باہر رہنے کے بعد گھر والوں کو بھی کچھ وقت دینا چاہیے تھا۔ آخری دنوں میں راجن پر افتاد ٹوٹ پڑی۔ وہ اپنی محبوبہ کے قتل کے الزام میں گرفتار ہو گیا تو پیرو کا زیادہ وقت اندھیری کے پاڑے پر گزرنے لگا لیکن بنارسی، جارجی اور دینا باقاعدگی سے پیرو کے پاڑے آتے رہے اور پیرو کے لیے نت نئے بہانے تراشتے رہے۔ دیوا کے کہنے کے مطابق، کوئی بعید نہیں کہ انہی میں سے کسی نے راجن کی محبوبہ کو چارہ بنا لیا ہو تاکہ ادھر راجن جیل جائے، ادھر پیرو کے روز و

ب منتشر ہوں۔ لازماً پیرو کو اپنے دست نگر پاڑے کی خبر گیری کے لیے اندھیری کا رخ کرنا چاہیے تھا۔ صرف پاڑے کی نہیں، اصل واقعے کی چھان بین کے لیے بھی۔ پیرو اندھیری چلا گیا اور وہ اس کے راستوں پر زاویے آزماتے رہے۔ آخر ایک دن پیرو ہدف میں آگیا۔ انہیں توقع ہوگی کہ اس وقت بٹھل یا میں، کوئی بھی پیرو کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ ہمیں ایک اطمینان حاصل تھا کہ پیرو سے ہماری وابستگی اور بمبئی میں ہماری موجودگی کے باعث پہلا شک ہم ہی پر جائے گا۔ ایک بار ہم پولیس کے نرغے میں آگئے تو باہر ہمارے خلاف شوشہ طرازیاں کرنے میں وہ پوری طرح آزاد ہوں گے اور اگر اتفاق سے، پولیس کی نظر چوک گئی اور ہم سامنے کے آدمی، سامنے کی حقیقت کی طرح او جھل رہے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں، دوسرے موجود ہیں۔ پولیس ان نامعلوم لوگوں کی کھوج میں منڈلاتی رہے گی جنہوں نے مبینہ طور پر راجن کی محبوبہ کا خون کرکے پھندا راجن ہی کے گلے کی طرف بڑھا دیا تھا۔ دو تین دن کی دوڑ دھوپ سے پیرو، راجن کی گردن بچانے میں بڑی حد تک کامیاب ہوگیا تھا۔ پولیس کی دانست میں پھر وہی لوگ پیرو دادا کی دیوار ہٹانے میں سب سے زیادہ بے چین ہوں گے جن کے خلاف پیرو اندھیری میں گواہیاں اور ثبوت بٹور رہا تھا۔ گویا سب رل مل جائے گا اور کوئی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے گا۔ جارجی بھی کھلا رہے گا، اس کے ساتھ سرملانے والے بھی۔ سبھی کچھ خانوں کے مطابق تھا، خانے سے باہر کوئی چیز نہیں تھی لیکن وہ بھول گئے کہ بٹھل دادا زندہ رہ گیا ہے اور یہ سچ اپنی جگہ ہے کہ دادا کا بل صرف ہاتھ پیر کی پختگی کا نہیں ہوتا، اس کے اور بھی بل ہوتے ہیں۔

دیوا کو اس رات ہمارے تھانے جانے کی خبر تھی لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ پولیس کی نظروں میں آنے اور تھانے جانے کے لیے ہم نے خود پہل کی تھی۔ اسے یہ علم بھی نہیں تھا کہ ہم تھانے سے اتنی جلدی کیسے واپس آگئے۔ پوری رات بھی ہم نے وہاں نہیں گزاری، بہرحال میں نے درمیان میں کوئی تائید یا تردید نہیں کی۔ دیوا کم و بیش وہی کچھ بتا رہا تھا جو بٹھل نے، شکلانے اور میں نے اخذ کیا تھا۔ دیوا کے لہجے میں بہت وثوق تھا جیسے وہ ہر واقعے کا شاہد رہا ہو۔ اس کے بیان میں کوئی بے ربطی اور ابہام نہیں تھا مگر جیسے کسی دور دراز اندیشے نے یکایک اسے آگھیرا، اس کی آواز ٹھٹک گئی۔ میرے چہرے پر چھائی ہوئی حیرت نے اسے اور مضطرب کیا۔ چند ثانیوں کے سکوت کے بعد وہ اضطراری انداز میں بولا کہ ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں۔ ممکن ہے، یہ سب کچھ ان کے وہم و قیاس پر مبنی ہو اور اس طرح نہ پیش آیا ہو، سوانہیں اس پر ایسا اصرار بھی نہیں ہے۔

میری آنکھیں بہت جل رہی تھیں۔ یقیناً جارجی کے ساتھ گوا سے آئے ہوئے اس کے دوست وکی اور ٹامی ہی نہیں ہوں گے۔ شہر کے مختلف داداؤں کی پشت پناہی کے اعتماد کے بغیر وہ اتنی بڑی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی بیوی ماری نے بنارسی کا نام نہیں لیا تھا مگر ایک خانہ دار عورت کو اپنے شوہر کے بیرون خانہ معاملات و مشاغل کے بارے میں کتنا کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔ بعد میں جب جارجی نے ساحل پر اڈا کھولا تو ماری کو کاؤنٹر پر بٹھا دیا تبھی بہت سی حیران کن حقیقتیں اس پر منکشف ہوئیں۔ ماری کس کس کا نام لیتی۔ ایک بنارسی کی کیا تخصیص تھی، بنارسی کی طرح وہاں بہت سے تماش بین دادا آتے تھے۔ ایسی صورت میں خود بنارسی بھی تو کنارے کنارے رہتا ہوگا۔ ماری نے کسی خاص دادا کا نام لیے بغیر کہا تھا کہ بمبئی سے پیرو کے جانے کے بعد جارجی کا دماغ بالکل پھر گیا تھا۔ وہ دن دن بھر، رات رات بھر گھر سے پاڑے سے غائب رہنے لگا تھا۔ جانے کس کس دادا سے اس کی آشنائی تھی۔ اڈا کھولنے کے بعد تو اس کے پاؤں زمین پر ٹکتے ہی نہیں تھے، دادا سے وہ سیٹھ بن گیا تھا۔

میری خاموشی پر جگنو دیوانہ وار بولا "جارجی ابھی ایک دم پلا تھا سالا، کھوٹا سکہ مافک، پیرو دادا کے نام پر چلتا تھا، اتنا آگے کو کبھی نئیں جاسکتا تھا۔" جگنو کہنے لگا کہ بے شک ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں لیکن بنارسی تو بجائے خود ایک ثبوت ہے۔ ان سے زیادہ اسے کوئی نہیں جانتا۔ تمام آدمی جو آدمی کے قالب میں نظر آتے ہیں، آدمی نہیں ہوتے۔ بعض جانوروں کو بھی آدمی کا قالب مل جاتا ہے، کہنے لگا۔ ابھی ایک دن پیچھے کی بات ہے، شام کو تھانے سے لوٹ کے جب بٹھل ماہم کے پاڑے پر آیا تھا اور آکے اس نے سب کو بتایا کہ جارجی کی بیوی ماری نے پیرو دادا کے خون کے جرم میں اپنے شوہر جارجی کو ختم کردیا ہے تو وہ دونوں وہیں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ سن کے ان کی نظریں سیدھی بنارسی پر گئیں۔ بنارسی پر سکتہ سا طاری ہوگیا تھا۔ اس کا چہرہ لمحہ بہ لمحہ رنگ بدل رہا تھا۔ جگنو نے مضطربانہ مجھ سے پوچھا کہ کیا میں نے اس وقت بنارسی کو دیکھا تھا؟

میں نے اسے دیکھا تھا لیکن بٹھل کی زبانی جارجی کا نام سن کے تو ہر شخص پر سناٹا چھا گیا تھا۔ گزشتہ رات تک جارجی ان کے درمیان بیٹھا پیرو کے سوگ میں ٹسوے بہا رہا تھا۔ جگنو کی نظریں تائید طلب تھیں۔ میں نے غیر ارادی طور پر اثبات میں سرہلا دیا۔ جگنو کے لہجے میں اور تندی آگئی۔ کہنے لگا کہ بنارسی کیسا پاگل بنا ہوا تھا۔ بٹھل کے پاڑا چھوڑنے کے اعلان پر سب سے زیادہ وحشت کا اظہار بھی وہی کر رہا تھا۔ جگنو کی زبان اس کے قابو میں نہیں رہی۔ وہ بنارسی کو مغلظات سنانے لگا پھر دیوا نے اشارہ کیا ہوگا، وہ بوکھلا سا گیا اور اس کی آواز ایک دم ماند پڑ گئی، لجاجت سے بولا "اپن کو اکھا ابھی، ابھی ایسا ہی جان پڑتا ہے دادا!"

انہوں نے یہی کہا تھا کہ اگر انہیں بنارسی کے پاس مجھے بھیجنا مقصود ہوتا تو صرف پیرو دادا کا حوالہ کافی تھا لیکن شدت بیان میں انہیں خیال نہیں رہا کہ وہ کس بات سے مسلسل اجتناب کر رہے تھے، یہ کوتاہی ان سے سرزد ہوگئی تھی۔ اتنا کچھ جان کے تو اب مجھے سیدھے بنارسی کی طرف جانا چاہیے تھا۔ میرا دل یہی کہہ رہا تھا، جسم و جاں میں بار بار تلاطم سا اٹھتا کہ اب دیر کی کیا ضرورت ہے؟ میری آنکھوں میں اترتا ہوا خون جگنو اور دیوا کی بے چین نظروں سے چھپا نہیں رہا ہوگا۔ وہ بہت شکستہ نظر آرہے تھے، لٹے لٹے سے۔ دونوں بدحواسی سے مجھے دیکھتے رہے اور چپ بیٹھے رہے۔ اپنی خاموشی انہیں پہاڑ لگ رہی ہوگی۔ آخر جگنو بے بسی سے بولا "دادا! اپن ابھی کیا بولے، اوپر والا اکھا جانتا ہے، اپن ایک دم سچ بولنے کا ہے، پر ابھی اپن سے کوئی غلطی ہوگیا ہو تو۔۔۔"

اس سے پہلے کہ دونوں اور بے حال ہوتے، میں چبوترے سے اٹھ گیا۔ وہ بھی ہڑبڑا کے کھڑے ہوگئے۔

میرا رخ بنارسی کے پاڑے کی طرف نہیں تھا۔

کچھ ہی دور جا کے میری رفتار معتدل ہوگئی، یہ غالباً اپنے فیصلے کی درستی کا اطمینان تھا۔ پیرو کی موت کے حوالے سے انہوں نے اگر بنارسی کے متعلق کوئی اشارہ کیا تھا تو وہ صرف میری استواری کے لیے۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ میں ان سے ان کی آگ ہی چھین لوں، اس کے بغیر ان کے پاس کیا رہ جاتا۔ مجھے باور کرنا چاہیے تھا کہ انہوں نے اپنے لیے ایک دشوار راستہ منتخب کیا ہے۔ دوسری صورتیں تو ان کے لیے بہت آسان تھیں۔ ان کا ارادہ ہی تو انہیں زندہ رکھے ہوئے تھا۔ اس ارادے کے بہت سے نام ہیں۔ یہ آدمی کو آدمی سے اور آدمی کو جانور سے ممیز کرتا ہے۔

دونوں میرے ساتھ چلتے رہے۔ اب اس تکرار سے بھی کیا حاصل ہوتا کہ میں انہیں سردست اپنے ساتھ پیرو کے گھر نہ چلنے پر زور دوں اور کہوں کہ بس کچھ دن کے لیے اور ٹھہر جاؤ۔ اس صورت حال میں تمہارا میرا ساتھ جانا مناسب نہیں ہے۔ میں نے ان سے کچھ نہیں کہا۔

اندھیرا اور سمٹ گیا تھا۔ ہم بڑی سڑک سے آگے اقامتی علاقے میں داخل ہوا چاہتے تھے کہ جمرو اور شامو نکڑ پر نظر آگئے۔ انہوں نے بھی مجھے اسی لمحے دیکھ لیا۔ دونوں اچھل پڑے اور بے تحاشا میری جانب دوڑے "لاڈلے!" جمرو نے کسی پاگل کی طرح مجھے دبوچ لیا "کہاں، کہاں کو کھو گیا تھا بھیا؟" وہ اکھڑی ہوئی سانسوں سے بولا۔

دونوں نے ایک سانس میں کتنے ہی سوال کر ڈالے۔ میں ابھی کوئی جواب نہیں دے پایا تھا کہ ان کی نظریں میرے پہلو میں کھڑے ہوئے جگنو اور دیوا پر پڑیں۔ دیوا کے چہرے کا زخم دیکھ کے اس کی وحشت اور سوا ہونی چاہیے تھی۔ شامو میرے بازو ٹٹولنے لگا "کیا بات ہے لاڈلے! سب ٹھیک تو ہے؟"

"ہاں، ہاں۔ کوئی ایسی بات نہیں" میں نے بہ عجلت انہیں سمجھانے کی کوشش کی "کوئی جھگڑا وگڑا نہیں ہوا۔ کچھ نہیں ہے۔ یہ دیوا جو ہے، اسے چوٹ لگ گئی تھی۔ ساری رات بس ایسے ہی گزر گئی۔"

"ساری رات لاڈلے؟" وہ حیرت سے بولا۔

گھر زیادہ دور نہیں رہ گیا تھا۔ انہوں نے دائیں بائیں طرف سے میرے بازو جکڑ لیے اور جو میں جانتا تھا، شامو وہی بتانے لگا کہ کوئی بھی رات بھر ایک پل نہیں سو سکا۔ وہ رات گئے تک تو میرا انتظار کرتے رہے پھر گھر سے مختلف سمتوں میں نکل کھڑے ہوئے۔ ابا جان کی موٹر بھی رات بھر سڑکوں پر گھومتی رہی۔ وہ ماہم کے پاڑے پر بھی گئے۔ کیلاش اسپتال میں تھا اور گو کہ انہوں نے وہاں میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا لیکن رما کھٹک گئی۔ رما نے اپنے بھائی کو فون کردیا۔ وہ ڈیوٹی چھوڑ کے اپنی موٹر میں گھر آگیا اور شامو کے کہنے کے مطابق کیلاش اب بھی میری تلاش میں نکلا ہوا تھا۔ چند دنوں کی بات تھی، پیرو بھی اس رات اسی گھر سے نکلا تھا۔ صبح اس کی لاش آئی۔ پیرو کے ساتھ تو ماچھی بھی تھا۔ میں نے تو بالکل اکیلا تھا اور کسی سے کچھ کہہ کے بھی نہیں گیا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ سب کیسے کیسے اندیشوں سے دوچار ہوئے ہوں گے۔ میں جمرو اور شامو سے کیا عذر پیش کرتا، ان کا ہذیان سنتا سر جھکائے بڑھتا رہا۔

دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ دربان باہر ہی ٹہل رہا تھا۔ ابا جان، منیر علی، مولوی اکرم اور بٹھل سب کے سب باہر سبزے پر موجود تھے۔ برآمدے میں لوہے کی جالیوں کے پیچھے جوگین، گیتا، فرخ، فریال، چمپا بیگم اور گیتا کی ماں رانی کے جلتے بجھتے چہرے بھی مجھے نظر آئے۔ میری زندہ سلامت واپسی

ان کے لیے کسی کرشمے کے مانند ہوگی۔ جیسے ہی ان کی نظریں مجھ پر پڑیں' ایک شور سا اٹھا۔ سب بے تابانہ میری طرف لپکیں اور انہوں نے مجھے گھیرے میں لے لیا۔ فرخ' فریال تو بری طرح مجھ سے چمٹ گئی تھیں۔ ان میں گیتا بھی تھی۔ وہ نہ جانے کب سے خود کو روکے بیٹھی تھی کہ میرے پہلو سے لگی ہوئی ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ میرے ہاتھ پیر شل ہوگئے۔ کچھ سجھائی نہیں دیا کہ ان سے کیا کہوں' انہیں کیا بتاؤں کہ میں کہاں تھا۔

منیر علی سجدے میں چلے گئے تھے' مولوی اکرم زور زور سے دعائیں پڑھنے لگے۔ کسی نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا شاید اس لیے کہ پہلے انہیں میری موجودگی کے یقین کے لیے کچھ مہلت درکار تھی۔ میں بت کے مانند ان کے درمیان خاموش کھڑا تھا۔ ابا جان نے یقیناً میری بے بسی محسوس کرلی تھی' جبھی انہوں نے گیتا' فرخ اور فریال کو میرے پاس سے ہٹادیا اور مجھ سے کہا کہ اندر جاکے لباس تبدیل کرلو۔ مجھے اپنے لباس کی شکستگی کا دھیان ہی نہیں رہا تھا۔ ایک رات میں کپڑے کیا سے کیا ہوگئے تھے۔ سوکھی کیچڑ سے پائنچے کالے کالے' گریبان اور آستینوں پر جابہ جا دیوا کے خون کے دھبے پڑے ہوئے تھے' بہتر یہی تھا کہ میں اندر چلا جاؤں۔ اس طرح میں ان کے سوالوں سے بھی بچ سکتا تھا۔ میں نے جلدی سے برآمدے کی طرف قدم بڑھادیے۔ برآمدے کی سیڑھیاں طے کرکے اپنے کمرے میں جاتے جاتے یکایک مجھے جگنو اور دیوا کا خیال آیا۔ میں نے سوچا' پہلے اندر جاکے حلیہ ٹھیک کرلوں لیکن میں پلٹ کے پھر نیچے آگیا۔ وہ ایک کونے میں دبکے کھڑے تھے۔ میرے وہاں سے ہٹنے کے بعد سبھی کی نظریں ان پر مرکوز تھیں "یہ جگنو اور دیوا ہیں" میں نے سیدھے بٹھل کے سامنے جاکے کہا "چھنگا دادا کے باڑے پر یہ۔۔۔ ان کے ساتھ۔۔۔"

بٹھل کی آنکھیں دہک رہی تھیں۔ مجھ سے آگے کچھ نہ کہا جاسکا۔ جگنو اور دیوا جیسے بس اشارے کے منتظر تھے' انہوں نے جھپٹتے ہوئے بٹھل کے پیر پکڑلیے "کیا ہے رے!" یقیناً بٹھل کو ان کی مستعدی ناگوار گزری ہوگی۔ میری طرف سے بھی کچھ کم غبار نہیں بھرا ہوگا۔ اس نے ٹھوکر مار کے انہیں خود سے دور کردیا۔

جگنو اور دیوا وہیں سبزے پر سکڑے سمٹے بیٹھے رہے' کانپتے ہوئے سے۔ انہیں اٹھنے کا بھی یارا نہیں تھا۔ میں نے اپنے اوسان مجتمع کیے اور کہا "یہ اب یہیں رہیں گے" میں نے بہت کوشش کی تھی لیکن اپنے لہجے کی تندی میرے اختیار میں نہیں تھی۔ اور خود مجھے ایسا لگا جیسے میں نے کوئی بہت ناروا اور بے محل بات کہہ دی ہے۔ میں نے بٹھل کا رد عمل دیکھنے کے لیے سر نہیں اٹھایا اور وہیں سے برآمدے کی طرف مڑگیا۔

کمرے میں' میں اکیلا آیا تھا' میرے پیچھے جمرو اور شامو بھی آگئے۔ چند لمحوں بعد مارتی اور ٹنگو بھی۔ وہ ان دونوں کو تنہا چھوڑ آئے تھے۔ "ان کا خیال رکھنا ہے جمرو بھائی!" میں نے جمرو سے کہا۔

"کون ہیں یہ لیچڑ سے؟"

"اپنے ہی آدمی ہیں۔"

"کانجی ہاؤس کی طرف کو نکل گیا تھا کیا؟"

"ایسا مت کہو" میں نے ترشی سے کہا "کسی کے بارے میں کچھ جانے بغیر ایسا نہیں کہتے۔"

"بالکل چڑی مار ہیں' ایمان سے۔"

"بہت لٹے ہوئے ہیں وہ۔"

"یہ تو اندھا بھی ثیپ لے گا' پر تو کدھر سے اٹھالایا ان کو؟"

"راستے میں مل گئے تھے۔"

"پہلے سے جان کاری تھی کیا؟ اپنے کو اسی کھونٹے کے جان پڑتے ہیں۔"

"ہاں' یہیں کے ہیں" میں نے دھیمی آواز میں کہا "بٹھل بھائی بھی انہیں جانتے ہیں' ذرا ذہن پر زور دیں گے تو انہیں یاد آجائے گا۔"

"پر بات کیا ہے؟"

"لمبی بات ہے جمرو بھائی! چھپانے کی نہیں ہے مگر اس وقت کچھ مت کہو۔ بس تمہیں ان کا خیال رکھنا ہے' بھائیوں کی طرح۔ یہ میری تم سے' تم سب سے التجا ہے۔ میں انہیں یہاں لانا نہیں چاہتا تھا لیکن شاید اس کے بغیر کوئی۔۔۔"

جمرو' شامو' مارتی اور ٹنگو متردد نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے کہ فرخ کی آواز پر سب چونک پڑے۔ فرخ اندر نہیں آئی۔ دروازے ہی پر اس نے میرے لیے جمرو کو کپڑے دے دیے "پہلے نہالے لاڈلے! پہچان میں نہیں آرہا اپنے کو' پھر کچھ دیر کو سولینا" جمرو نے کپڑے میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "میں ذرا باہر جاکے ان کو دیکھتا ہوں۔"

جمرو کے ساتھ مارتی' شامو اور ٹنگو بھی باہر نکل گئے۔ سارے جسم میں چپ چپاہٹ سی ہورہی تھی۔ ان کے جاتے ہی میں نے غسل خانے کا رخ کیا۔ پانی بھی کیا چیز ہے' آدمی کو نیا کردیتا ہے۔ کپڑے بدل کے میں باہر آیا تو جسم کا کوئی وزن نہیں لگ رہا تھا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ دیر تک تو میں بستر پر کروٹیں بدلتا رہا' پھر ایسی آنکھ لگی کہ کچھ ہوش ہی نہیں رہا۔

اور کمرے میں کوئی نہیں آیا یا مجھے خبر نہیں ہوئی۔ میری آنکھ کھلی تو میں نے حیرت سے دیوار پر لٹکی ہوئی گھڑی دیکھی۔ ساڑھے تین بج رہے تھے۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا لیکن گھڑی بند نہیں تھی۔ کمرے میں دھیمی دھیمی روشنی تھی۔ دونوں کھڑکیوں کے پردے گرے ہوئے تھے۔ سامنے کا دروازہ بھی بند تھا اور اس کا پردہ بھی گرا ہوا تھا۔ میں نے بستر سے اٹھنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی۔ تین چار چھپکے مار کے میں نے تولیا سے منہ خشک کیا اور باہر نکلنے ہی والا تھا کہ انہیں میرے جاگنے کی خبر ہوگئی۔ فرخ اور شہ پارہ نے پہلے دروازے سے جھانک کے میرے جاگنے کی تصدیق کی پھر جھجکتی ہوئی اندر چلی آئیں۔ ان کے چہرے کھلے ہوئے تھے۔ وہ کھانے کے لیے پوچھنے آئی تھیں اور ان کے کہنے کے مطابق' دوپہر کو سب نے وقت پر کھانا کھالیا تھا لیکن بٹھل کی ہدایت پر مجھے نہیں جگایا گیا۔ اب مجھے واقعی بھوک لگ رہی تھی' ان کی ترغیب سے اور چمک اٹھی۔ میری ہاں پر نہ جانے کیوں وہ بہت خوش ہوئیں اور لپکتی جھپکتی واپس چلی گئیں۔ دوسرے ہی لمحے مجھے جگنو اور دیوا کی طرف سے بے کلی ہوئی اور بے ارادہ میرے قدم باہر کی جانب اٹھ گئے۔ گھر میں ایسی چہل پہل نہیں تھی۔ سہ پہر کے وقت یوں بھی سارے گھر کچھ اداس سے ہوجاتے ہیں۔ جمرو' شامو' مارتی میں سے کوئی بھی مجھے نظر نہیں آیا۔ کونے ہی پر بیٹھک تھی' وہاں بٹھل کی موجودگی کا امکان تھا۔ اندر سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ شاید بٹھل بھی نہیں ہے؟ یہ جاننے کے لیے میں کمرے میں داخل ہوگیا تو میرے پاؤں ٹھٹک کے رک گئے۔ سامنے گدیلے پر بٹھل کروٹ سے لیٹا ہوا تھا اور صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس جگنو اس کے پیر دبا رہا تھا۔ کمرے میں ان دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ مجھے دیکھ کے جگنو منتشر ہوگیا۔ اس سے پہلے کہ بٹھل کروٹ بدل کے دیکھتا' میں نے اشارے سے جگنو کو خاموش رہنے اور اپنا کام جاری رکھنے کی تاکید کی اور دبے قدموں لوٹ آیا۔ ایک پہر میں جگنو کا رنگ ہی بدل گیا تھا۔ مجھے اپنی بینائی پر شبہ ہو رہا تھا۔ لوگ سچ کہتے ہیں' بعض مناظر آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتے ہیں' مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں نے کوئی منزل سر کرلی ہے۔

وہ ابھی کمرے میں واپس نہیں آئی تھیں۔ کوئی دس منٹ گزر گئے۔ پھر۔۔ آئیں تو بھرے ہوئے طشت ان کے

ہاتھوں میں تھے۔ شہ پارہ نے فرش پر چٹائی بچھادی اور دسترخوان بچھادیا "ارے شہ پارہ!" میں نے تعجب سے کہا "ایک آدمی کے لیے اتنا لاؤ لشکر!"

"ایک آدمی کیوں، ہم دو بھی تو ہیں" شہ پارہ شگفتگی سے بولی۔

"کیا مطلب؟ تم لوگوں نے کھانا نہیں کھایا؟"

"اس وقت کچھ جی نہیں چاہ رہا تھا" شہ پارہ کے بجائے فرخ نے ہڑبڑاتے ہوئے جواب دیا۔

وہ نیچی نظریں کیے تن دہی سے پلیٹیں اور قابیں رکھتی رہیں۔ شہ پارہ کھنکتی آواز میں بولی "ناشتا بھی تو بہت دیر سے کیا تھا۔"

"اب بسم اللہ کیجئے بابر بھائی، کھچڑی ویسے ہی ٹھنڈی ہوگئی ہے" فرخ کی آواز امی کی آواز سے بہت ملتی تھی۔ کھانا چن جانے کے بعد وہ ہمیں پکارتی رہتی تھیں، ارے بھئی آجاؤ! کھانا مٹی ہوجائے گا۔ وہی لب ولہجہ، لفظوں کی وہی نشست وبرخاست، جیسے امی کی روح فرخ میں مجسم ہوگئی ہو۔

فرخ کے دوبارہ ٹوکنے پر میں نے جلدی سے ہاتھ بڑھایا۔ کھانا اقسام میں اتنا زیادہ نہیں تھا جتنا مقدار میں تھا۔ مونگ کی دال کی کھچڑی، آلو کا رائتہ، بھنڈی قیمہ اور روٹیاں، سرکے کا اچار بھی تھا۔ سب کچھ بہت لذیذ تھا۔ ہاں اگر کچھ بے ذائقہ تھا تو وہ خاموشی تھی۔ اسے دور کرنے کے لیے میں نے اٹکتی زبان سے کہا "گھر میں کچھ سناٹا سا نہیں ہے کیا؟"

"بہت ہے" شہ پارہ یاسیت سے بولی "گھر میں لوگ بھی کم ہیں، اور جو ہیں وہ آرام کررہے ہیں۔"

میں تو بالکل بھول گیا تھا کہ سب رات بھر کے جاگے ہوئے ہیں۔ فرخ نے مجھے بتایا کہ اباجان، منیر علی اور مولوی اکرم ناشتے کے بعد گھر سے نکل گئے تھے اور کہہ گئے تھے کہ اب شام ہی کو واپسی ہوگی نیز جولین اور چمپا بیگم مارٹی کے ساتھ اپنے گھر کی طرف گئی ہیں۔ وہ بھی شام تک آنے کا کہہ گئی ہیں۔ جمرو، شامو وغیرہ پیچھے والان میں سو رہے ہیں۔ صبح ڈاکٹر کیلاش نے از سرنو دیوا کی مرہم پٹی کردی تھی۔ مجھے ڈھونڈتا ہوا کیلاش کوئی نو بجے واپس آیا تھا اور گیارہ بجے تک میرے جاگنے کا انتظار کرتا رہا۔"

میں نے ندامت کا اظہار کرنا چاہا لیکن ان دونوں کے سامنے جواز پیش کرنے سے حاصل بھی کیا تھا، میں چپ رہا۔

"گیتا کا برا حال تھا، رات بھر روتی رہی" شہ پارہ ڈوبے ہوئے لہجے میں بولی "آپ کو دیکھ کے اس کے چہرے پر کچھ ہلا سی آئی ہے۔"

میں کیا وضاحت کرتا، انہیں بھی احساس ہوگیا کہ رات کا ذکر میرے لیے وحشت اور خجالت کا باعث ہوسکتا ہے۔ شاید اسی لیے انہوں نے کوئی اور لفظ نہیں کہا، جلدی جلدی برتن سمیٹے اور کمرے سے چلی گئیں۔ میں پھر تنہا رہ گیا اور کھلی آنکھوں سے دیواریں تکتا رہا اور اپنے آپ کو بھی۔ آدمی کبھی خود سے بھی اوجھل ہوجاتا ہے اور اپنی تلاش میں بھٹکتا رہتا ہے۔

میں نے اسی شام جمرو اور شامو کو دیوا اور جگنو کے بارے میں بہت کچھ بتادیا۔ میں نے بنارسی کا ذکر نہیں کیا بلکہ ان سے بہانہ بنایا کہ کرشناجی کے جدا ہوجانے کے بعد جب مجھے ایک پاڑے کی ضرورت تھی اور میں نے چنگا داوا کا پاڑا حاصل کرلیا تھا تو جگنو اور دیوا نے میرا بہت ساتھ دیا تھا۔ میں نے اس وقت ان سے وعدہ کیا تھا کہ جو کچھ مجھے آتا ہے، انہیں ضرور سکھاؤں گا۔ لیکن پھر وقت ہی نہیں ملا، ہمیں بمبئی سے جانا پڑا۔ پھر ہم لوگ تبت چلے گئے۔ جگنو اور دیوا اس دوران میں مجھے شہروں شہروں ڈھونڈتے رہے۔ وہ بہت اندھیروں میں گھرے ہوئے تھے اور انہیں میری ضرورت تھی۔ دنیا میں آدمیوں کی کمی نہیں ہے لیکن کبھی ایک آدمی دوسرے آدمی سے ایسا بندھ جاتا ہے، دوسرے پر ایسا تکیہ کرلیتا ہے کہ کسی اور کی طرف نہیں دیکھتا یا کسی اور جانب اسے کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ وہ شدت سے میری بمبئی واپسی کے منتظر تھے۔

مجھے جمرو اور شامو کو کچھ نہ کچھ تو ضرور بتانا تھا۔ گزشتہ رات اپنی گمشدگی اور دیوا اور جگنو کو ساتھ لانے کے بارے میں وضاحت ضروری تھی۔ میں خاموش رہتا تو بے شک وہ میری خاطر کچھ پوچھنے پر اصرار نہ کرتے لیکن پھر جگنو اور دیوا کے لیے ان کے رویے میں مغائرت سی رہتی۔ میں نے انہیں بتایا کہ ہمارے بمبئی آنے کی خبر جگنو اور دیوا کو چوتھے پانچویں روز ہوگئی تھی۔ مگر ساتھ ہی انہیں کانتے کے رخصت ہوجانے کی اطلاع ملی۔ انہیں کانتے سے میرے اور ہم سب کے رشتے کا علم تھا چنانچہ وہ ٹھہرے رہے کہ ذرا کانتے کی افتاد کا صدمہ کم ہو اور مجھے یک سوئی نصیب ہو تو میرے پاس آئیں اور اپنے زخم دکھائیں۔ وہ مسلسل میری ٹوہ میں رہے۔ کانتے کے ٹھیک دس دن بعد پیرو چلا گیا۔ اس لیے انہیں اب کچھ اور انتظار کرنا تھا تاہم کل رات ان کے بہ قول ان کی قسمت نے یاوری کی اور میں انہیں تنہا نظر آگیا۔ ان سے برداشت نہیں ہوا۔ وہ میرے پیروں پڑ گئے۔ پھر اتفاق سے دیوا ٹھوکر کھا کے گر پڑا۔ بس یوں دیر ہوتی چلی گئی۔

میں نے مزید کچھ نہیں کہا اس لیے کہ مجھے اور کچھ نہیں کہنا تھا۔ جمرو اور شامو نے بھی دیوا اور جگنو سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی ہوگی اور مجھے یقین تھا کہ انہوں نے بھی یہی کچھ بتایا ہوگا۔ انہوں نے نولکھی اور پھول وتی کا تذکرہ نہیں کیا ہوگا، بنارسی کا بھی نہیں۔ اگر شامو اور جمرو کی جستجو اتنی عذر خواہی کے بعد بھی کم نہیں ہوئی تو یہ ان کا قصور تھا۔ انہیں سمجھنا چاہیے تھا کہ باقی ناگفتنی ہوگی، باقی پندار کی بات ہوسکتی ہے۔ انہیں خاطر جمع رکھنی چاہیے کہ میں یوں ہی کسی کو سڑک سے اٹھا کے گھر نہیں لے آیا ہوں۔ وہ ضرور اس کے حاجت مند ہوں گے" وہ بہت دکھی ہیں۔ جمرو بھائی!" میں نے جمرو سے کہا۔

"اپنے کو بھی تھوڑا بہت دکھائی دیتا ہے لاڈلے!"

میں نے عاجزی سے کہا "انہیں سنبھالنا تمہی کو ہے۔ میں بھی اپنی سی کوشش کروں گا۔ وہ کچھ سیکھنا چاہتے ہیں۔"

"کیا، کیا سیکھنا۔۔؟"

"یہی جو، جو مجھے اور تمہیں آتا ہے" میں نے جھجک کے کہا۔

"دادا بننے کو بولتے ہیں کیا؟"

"ہاں جمرو بھائی!"

"پر کیوں لاڈلے!" شامو بے رخی سے بولا۔

"کچھ ایسا ہی ہے۔"

"تم نے بولا نہیں، اس میں کیا دھرا ہے سالا۔"

"بہت کچھ کہا" میں نے آہستگی سے جواب دیا "لیکن ان کی یہی خواہش ہے اور ایسی غلط بھی نہیں ہے۔"

"تو بھی یہی بولتا ہے؟" میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

جمرو نے ماتھے پر ہاتھ مارا "اپنے کو کچھ پلے نہیں پڑ رہا۔"

میں نے الجھ کے کہا "دادا بننا چاہتے ہیں اور بس۔۔!"

"ٹھیک ہے، پر لاڈلے!" شامو کچھ کہتے کہتے رہ گیا اور جمرو کی طرف دیدے نچاتے ہوئے بولا "دیکھا جمرو بھائی! ہم کیا بولے تھے! خالی نہیں ہیں، پٹلیا دبائے ہوئے ہیں بھیتر۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم؟" میں نے تندی سے کہا۔

"اس کا مطلب ہے" جمرو بل کھا کے بولا "اندر بہت کچھ چھپائے ہوئے ہیں۔ گانٹھ لگی ہے اندر میں۔"

"ہاں! شاید یہی کچھ ہے۔"

دونوں متوحش نظروں سے مجھے دیکھتے رہے پھر شامو مضطرب ہوکے بولا "ایسا ہے تو اپنے لوگ میں سے کوئی کام نہیں آسکتا؟"

جمرو نے اسے جھڑک دیا "کیا سالا چمار پنے کی بوتا ہے، یہ بات تو لاڈلے نے پہلے ہی ان کو بولی ہوگی، کیوں لاڈلے؟"

"ہاں! میں نے ان سے کہا تھا۔"

دیر تک دونوں گم صم رہے اور جیسا کہ مجھے توقع تھی، انہوں نے میری ناراضگی کے خیال سے مزید کسی تردد اور تکدر کا اظہار نہیں کیا۔ جمرو نے موضوع بدل دیا اور معنی خیز لہجے میں بولا "لگتے اصیلے ہیں لاڈلے!"

"اڈوں پاڑوں سے ان کا کچھ نہ کچھ واسطہ رہا ہے۔"

"سچ، سویرے تو بہت مردار دکھائی پڑتے تھے، ایک دم چونگھٹ۔" جمرو پلکیں پٹپٹاتے ہوئے بولا "پر ایسا نہیں ہے، پورے پکے ہوئے ہیں۔"

"اتنی جلدی کوئی رائے قائم نہیں کرنی چاہیے۔"

"اپنے کو بولو، کیا کرنا ہے لاڈلے!" شامو تیزی سے بولا۔

"کچھ نہیں، بس ان کا خیال رکھنا ہے۔ میں نے کہا نا، میں تو اپنی سی کروں گا ہی، کچھ تمہیں بھی ان پر نظر رکھنی ہے۔ اچھی طرح۔ تھوڑا بہت جانتے ہیں وہ، لیکن سرے سے چلنا ہوگا۔"

"پر دیری بہت ہوسکتی ہے لاڈلے!"

"انہیں اس کی فکر نہیں ہے۔"

"ایسی دیری بھی نہیں لگے گی جمرو بھائی!" شامو مچل کے بولا "استاد بولتا ہے، یہ تو سالا سب اپنے پہ ہے۔ لگی ہوئی کی ساری بات ہے۔"

"ان کے ہاں اس کی کمی نہیں ہے۔"

"پر زیادہ لگی ہوئی بھی ٹھیک نہیں ہوتی" جمرو کے کہا۔ "آدمی خود جھلس جاتا ہے کبھی۔"

جمرو ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں نے تبصرہ نہیں کیا کہ پھر کوئی ملال بھی نہیں ہوتا۔ آدمی کو یہ سکون تو رہتا ہے کہ اس نے اپنے سارے اختیار تمام کیے تھے، ہم اطراف کی گلیوں میں ٹہلتے ہوئے جلد ہی گھر لوٹ آئے۔ مارٹی اور ٹنگو ہمارے ساتھ ہوتے تو اور اچھا تھا لیکن مجھے اطمینان تھا کہ جمرو اور شامو اب دیوا اور جگنو کے لیے ان سے خود ہی کچھ کہہ سن لیں گے اور بٹھل کے سامنے زبان کھولنے کی ابھی ایسی ضرورت نہیں تھی۔ جگنو اور دیوا کی سوختہ جانی اس کی نظروں سے چھپی نہیں رہنی چاہیے۔ جگنو اور دیوا کی بے زبانی بھی تو کچھ کہے گی۔

سبھی لوگ گھر آچکے تھے۔ اباجان، منیر علی، مولوی اکرم، جولین اور چمپا بیگم وغیرہ۔ مارٹی اور ٹنگو بھی موجود تھے۔ جگنو اور دیوا ابھی تھے۔ اب وہ گھر میں ایسے اجنبی نہیں لگ رہے

تھے۔

کھانے سے پہلے کیلاش آگیا۔ اس نے آتے ہی مجھے گلے سے لپٹالیا اور زور زور سے بھینچتا رہا۔ میں نے معذرت کرنی چاہی کہ گزشتہ رات اسے میری وجہ سے خواہ مخواہ اتنی زحمت اٹھانی پڑی۔ وہ مجھ سے خفا ہونے لگا کہ یہ میں کیسی باتیں کررہا ہوں۔ وہ آج بھی اس کے ساتھ نہیں آئی تھی۔ میرے استفسار پر کیلاش نے بتایا کہ رما کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے تشویش ہوئی۔ میں نے بیماری کے بارے میں پوچھا تو وہ شانے اچکا کے بولا "گھبرایئے نہیں، وہ خود بھی ایک اچھی ڈاکٹر ہے، اپنا علاج کرسکتی ہے۔"

مجھے شبہ ہوا کہ کہیں رما میرے کسی رویے سے ناراض تو نہیں ہوگئی؟ یا پھر اس کی طبیعت زیادہ خراب ہے اور کیلاش مجھ سے چھپا رہا ہے ورنہ وہ ضرور آتی۔ آج تو بہ طور خاص، میری صحت یابی کی مبارک باد دینے "کوئی خاص بات تو نہیں؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"اوہ، نہیں" کیلاش مستعدی سے بولا "وہی عام بیماری، نزلہ، زکام، بخار، جسم کی ٹوٹن وغیرہ۔ بمبئی کا تحفہ۔ گھر میں خاموشی اور رما کے کمرے کا بند دروازہ دیکھ کے پہلے مجھے بھی خدشہ ہوا تھا کہ رما پھر اپنی پرانی بیماری کی زد پر ہے لیکن شکر ہے کہ ایسا نہیں تھا۔

"پرانی بیماری؟"

"آپ کو نہیں معلوم، اس پر ایسے ہی کبھی کبھی اپنے آپ میں گم ہوجانے کے دورے پڑتے ہیں۔ ہم ڈاکٹر لوگ اسے خود غرضی کی بیماری کہتے ہیں۔"

"یہ کون سی بیماری ہے؟" میں نے چونک کر کہا۔

"ہاں!" وہ مسکرانے لگا "یہ بہت عجیب بیمار ہے، بہت مشکل اور پریشان کن۔ اب دیکھیے نا، آدمی بس اپنے آپ میں ڈوبا رہے، نہ کسی کی سنے، نہ کسی سے بات کرے۔ ساری دنیا سے کٹ کے رہ جائے تو اسے آپ کیا کہیں گے۔ سال میں رما پر دو ایک بار ایسے دورے پڑتے ہیں کہ وہ سب سے بے گانہ ہوجاتی ہے گو یہ کیفیت زیادہ دیر نہیں رہتی لیکن جب تک رہتی ہے، قریبی لوگوں کے لیے کم از کم بہت تکلیف دہ ہوتی ہے۔ آپ اسے ایک ایسی بیماری بھی کہہ سکتے ہیں جو لگتی کسی کو ہے، اذیت کسی اور کو بلکہ اوروں کو ہوتی ہے۔"

مجھے ایسا لگا جیسے کیلاش کنایوں میں بات کررہا ہے، اس کی گفتگو رمزیت سے عاری نہیں۔ ایک مہذب آدمی کا یہی طور ہوتا ہے مگر کیلاش کی آنکھوں میں وہ چمک نہیں تھی جو استعاروں اور کنایوں کے وقت خود بخود نمودار ہوجاتی ہے۔

میں نے فوراً اپنی بدگمانی کی تردید کی تاہم میرے چہرے پر ایک لمحے کے لیے جو دھند سی چھاگئی تھی، وہ کیلاش کی جزبیں نگاہوں سے مخفی نہ رہ سکی۔ وہ کسی قدر مضطرب ہوگیا اور ہونٹ چبانے لگا۔ میں نے اس کی مشکل حل کی اور شائستگی سے کہا "کل میں اس طرف آؤں گا۔"

"ہماری طرف، کیا خوب!" وہ لپکتی ہوئی آواز میں بولا "کس وقت آیئے گا؟ مجھے یقین ہے کہ رما کی آدھی بیماری تو آپ کے آنے سے دور ہوجائے گی، آپ نہیں جانتے، وہ آپ کا کتنا ذکر کرتی ہے اور اس سارے گھر میں خود کو کیسا شامل سمجھتی ہے۔ وہ اپنی بیماری کو برا بھلا کہہ رہی تھی کہ یہ کیسی ناوقت ہے۔ میں نے کہا "بیماری بھی کیا وقت اور اجازت لے کر آئے گی۔ بہرحال اس وقت اسے یہاں آنا تھا مگر اسپتال میں ایک مریض کی حالت نازک تھی، میری کال آگئی۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ اسپتال سے آکے تمہیں لے جاؤں گا لیکن وقت زیادہ لگ گیا اس لیے سیدھا اسی طرف چلا آیا۔ اب گھر واپسی پر مجھے کیسی کیسی تاویلیں پیش کرنی ہوں گی۔۔۔ آپ کو رات کا قصہ معلوم ہے؟"

مجھے جمرو نے بتایا تھا کہ رات وہ کیلاش کے گھر مجھے ڈھونڈنے گئے تھے تو رما بدحواس ہوگئی تھی۔ یہی بات ہوگی، میں نے کیلاش کو نہیں بتایا اور متجسس لہجے میں پوچھا "کیسا قصہ؟"

"کل رات اسے معلوم ہوا کہ آپ گھر نہیں پہنچے ہیں تو اس نے اسی وقت اسپتال فون ملایا اور ضد کرنے لگی کہ میں اسے بھی ساتھ لیتا چلوں۔ میں نے منع کردیا۔ رات زیادہ ہوگئی تھی اور موٹر بھی گھر میں نہیں تھی، میرے پاس تھی ورنہ وہ چل پڑتی۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ رات بھر نہیں سوپائی۔ باربار اسپتال فون کرتی رہی۔ مجھے بھی خیال نہیں رہا، خیر سے اسے فون کردیتا۔ صبح گھر کے قریب سے گزرتے وقت میں نے سوچا کہ اسے بتاتا چلوں، کپڑے بھی بدل لوں گا۔ میں گیا تو وہ کوریڈور میں کرسی ڈالے میرا انتظار کررہی تھی۔ ٹیلی فون پاس رکھا تھا اور نگاہ دروازے پر لگی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ برسنے لگی کہ کیلی! تم کیسے غیرذمے دار آدمی ہو۔ اس کی بے چینی دیکھ کے میں نے جھوٹ بولا کہ آپ گھر آگئے ہیں۔ پھر تھوڑی دیر بعد میں دوبارہ گھر سے چل دیا۔ میں نے اس سے بہانہ کیا کہ ایک ایمرجنسی کے سبب مجھے پھر اسپتال جانا ہے وہ شک میں پڑگئی اور مجھے ماں جی کی قسم کھانی پڑی تب اسے یقین آیا۔ شاید یہی وقت تھا، عجیب اتفاق ہے، جب میں قسم کھائی تھی، ٹھیک اسی وقت آپ گھر واپس آگئے" وہ ہنس کے بولا "کاش، میں ماں جی کو پہلے ہی داؤ پر لگادیتا۔"

میرے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ پھیل گئی "معلوم نہیں اس آدمی کے لیے یہ امر راحت کا باعث ہے یا کلفت کا جس کے اتنے نگہ دار ہوں۔ وہ آدمی تو بہت مجبور ہونا چاہیے۔ میں سنتا رہا۔ اتنا کچھ کہنے کے باوجود کیلاش نے یہ نہیں پوچھا کہ میں کل رات آخر کہاں کھوگیا تھا۔ اتنے دنوں میں اسے اچھی طرح اندازہ ہوجانا چاہیے تھا کہ اڈے پاڑے کے لوگوں سے ایسی باتیں نہیں کی جاتیں۔ ان سے سوالات کرنے میں احتیاط برتنی چاہیے۔ میں خود بھی کوئی صفائی پیش نہ کرسکا۔

کیلاش رات گئے تک رہا۔ اندر جا کے اس نے گیتا اور رانی کی دل جوئی کی، کچھ دیر ابا جان سے باتیں ہوتی رہیں۔ کھانا بھی اس نے ہمارے ساتھ کھایا۔ چلتے وقت اسے یاد تھا کہ میں نے کل آنے کا وعدہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ شام کو کسی وقت آؤں گا۔

وعدے کے مطابق دوسرے دن میں اس کے ہاں جانے کے لیے تیار تھا مگر عین وقت جب میں گھر سے نکل رہا تھا، کیلاش کے بھیجے ہوئے ایک آدمی نے آکے مجھے روک دیا۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ کیلاش کے والد کے کسی قریبی دوست کے اچانک انتقال کی وجہ سے سب لوگ پونا چلے گئے ہیں۔

میرا خیال تھا کہ پونا اتنی دور نہیں ہے لہٰذا رات کو کسی وقت کیلاش واپس آجائے گا مگر اگلے دن دوپہر تک اس کی کوئی خبر نہیں ملی تو جولین کو بتا کے میں نے کیلاش کے گھر کا رخ کیا۔ جمرو میرے ساتھ تھا، یہی بہتر تھا کہ باہر جانے کی صورت میں گھر کا کوئی نہ کوئی آدمی میرے ساتھ ہو۔

کیلاش کے ہاں اب تک کوئی واپس نہیں آیا تھا۔ ایک ملازم سے صرف اتنا معلوم ہوسکا کہ مرنے والا کوئی جج تھا۔ ملازم کہنے لگا کہ صاحب بہت بڑے آدمی تھے۔ اسے یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ظاہر ہے، کسی ایسے ویسے کا تعلق کیلاش کے خاندان سے اتنا گہرا نہیں ہوسکتا۔ لوگ شعوری غیرشعوری طور پر اپنے ہی سے مشابہ لوگوں کی طرف قدم اٹھاتے ہیں۔ ہمارا معاملہ تو ایک استثنا تھا۔ ہم شام سے پہلے گھر لوٹ آئے۔

جولین نے مجھے بتایا کہ پیرو کے دسویں کے بعد سب لوگ ابا جان کی نئی خریدی کوٹھی میں منتقل ہوجائیں گے۔ گیتا اور رانی نے آمادگی ظاہر کردی ہے۔ آمادگی کا جولین نے خوب کہا، گیتا اور رانی کے پاس انکار کا حوصلہ ہی کہاں تھا۔ معذور تو بیساکھی اور لاٹھی کے سہارے ہی چلتے ہیں۔ تمام عذر اپنی جگہ کہ اس منتقلی سے گیتا اور رانی کچھ بہل جائیں گی، اتنے لوگوں کی موجودگی میں یہ مکان چھوٹا پڑرہا ہے، محلے والے جان گئے ہیں کہ اس مکان کا تعلق ماہم بلکہ بمبئی کے سب سے بڑے دادا سے تھا۔ ہر بات اپنی جگہ درست تھی لیکن جانے کیوں مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا، لگتا تھا کہ ابا جان سے کوئی عجلت ہورہی ہے۔ جولین بھی شاید یہی سمجھتی تھی، یہ اطلاع دیتے ہوئے اس کی آواز مرجھائی ہوئی سی تھی۔ میں نے صرف سن لیا۔ میں نے اپنے کسی موہوم گمان کی تائید جولین سے نہیں چاہی، اس نے اس بابت مجھ سے کچھ کہا۔ اس کے کہنے کے مطابق ابا جان نے صراحت کردی تھی کہ وہ اس یک جائی میں سب کی بہتری سمجھتے ہیں۔ ہوسکتا ہے، وہ غلطی پر ہوں، چنانچہ تینوں مکان جوں کے توں برقرار رہیں گے۔ دل جمعی نہ ہونے کی صورت میں جولین، مولوی اکرم، گیتا اور رانی اپنے اپنے گھر واپس جاسکتے ہیں۔ پھر ابا جان ان سے اصرار نہیں کریں گے اور سب خاطر جمع رکھیں کہ ابا جان کی پیشانی پر کوئی شکن نہیں آئے گی۔ ابا جان کو اپنا گھر بہت یاد آتا ہوگا۔ یوں ایک بڑا گھر بسا کے شاید وہ کوئی مداوا کررہے تھے۔

چند ہی دنوں میں جگنو اور دیوا بہت پرانے ہوگئے جیسے برسوں سے وہاں مقیم ہوں اور ہر ایک سے ان کی شناسائی ہو۔ صبح سویرے سے رات گئے تک وہ سارے گھر میں پھرکی کی طرح گھومتے رہتے تھے، اشاروں کے منتظر، ہر ایک کی خدمت کے لیے ہمہ دم تیار۔ بٹھل کے حقے کی تیاری، اس کے جسم کی مالش، ابا جان، منیر علی کے پیر دبانا، گھر کا سودا سلف لانا، بکھری ہوئی چیزیں، جگہوں پر رکھنا، اندر سے چائے لانا، رکابیاں اٹھا کے رکھنا اور کچھ نہیں تو کھڑکیوں کے شیشے صاف کرنا۔ مجھے حیرت تھی کہ گزشتہ چار دنوں میں ایک مرتبہ بھی انہوں نے مجھ سے اپنے بارے میں لب کشائی نہیں کی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انہوں نے پہلی بار کوئی گھر دیکھا ہے اور یہاں آکے سب کچھ بھول گئے ہیں۔ میں نے انہیں نہیں ٹوکا کہ وہ ان کاموں کے لیے یہاں نہیں آئے ہیں۔ انہیں اپنے ہوش وحواس مجتمع کرنے میں کچھ دنوں کی مہلت ضرور ملنی چاہیے تھی۔ یہی سوچ کے میں رہ گیا اور ایک بار تو انہیں یوں گم دیکھ کے میرے جی میں آیا کہ اچھا ہے، اسی طور انہیں قرار آجائے۔ پھر میں بنارسی کے پاس جاسکوں گا۔ بنارسی کے پاس خود جانے کے لیے میرے سینے میں باربار ہوک سی اٹھتی تھی۔ کبھی سوچتا تھا، جگنو اور دیوا کو قائل کرنے کی ایک اور

کوشش کروں کہ انہیں بہت وقت لگ سکتا ہے۔ نئے ماحول
میں شاید انہیں اپنے ارادوں پر نظرثانی کا موقع ملا ہو۔ میں
انہیں پھول وتی کا واسطہ دوں گا کہ ہر گزرتا لمحہ انہیں پھول
وتی سے دور کر رہا ہے۔ ایسا ہی ہے تو میں بناری کو لا کے ان
کے سامنے کھڑا کردوں گا۔ وہ جس طرح چاہیں اس سے بازپرس
کریں۔ کوئی درمیان میں نہیں بولے گا لیکن یہ سب میرا
قیاس تھا۔ خواہشیں ساون کے اندھے کی طرح ہوتی ہیں۔
اسی رات جمرو نے مجھے بتایا کہ جگنو اور دیوا کو ایسی دیر نہیں
لگے گی، ان کی انگلیوں میں لچک' بازوؤں میں پھرتی ہے۔
نگاہوں میں بھی اچھا جماؤ ہے' سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی
طلب سچی ہے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا' جمرو اور شامو نے مجھے
بتایا کہ جب بھی موقع ملتا ہے' وہ جگنو اور دیوا کو وقت دے
رہے ہیں۔ ابا جان کی کوٹھی میں منتقل ہوجانے کے بعد یہ بے
ترتیبی ختم ہوجائے گی' پھر کچھ زیادہ وقت مل سکے گا۔ مجھے
خیال نہیں رہا کہ گھر کے مشاغل میں جگنو اور دیوا کی شمولیت
بھی ان کے مقصد کا ایک حصہ ہے۔ اسی گھر سے ان کا راستہ
نکلتا ہے۔ یہاں کے لوگوں کی آسودگی سے ان کی آسودگی
مشروط ہے یوں وہ بٹھل کا پتھر بھی موم کر رہے تھے۔ یہ سب
جان کے مجھے کچھ سکون ہوا کہ جگنو اور دیوا کا ارادہ ایسا خام
اور ناتمام نہیں ہے۔

پیرو کے دسویں پر ابا جان نے خاص اہتمام کیا تھا۔ صبح
سے گلی میں شامیانے تن گئے تھے۔ اور دیگیں پکنی شروع
ہوگئی تھیں۔ دھوپ نکلنے کے ساتھ ہی سائلوں کا ہجوم جمع
ہونے لگا۔ پاڑے کے لوگوں کو بھی جانے کیسے خبر ہوگئی تھی۔
گیارہ بجے سے مختلف علاقوں کے دادا لوگ آنے لگے۔
سبزے پر دریاں اور چاندنیاں بچھادی گئی تھیں۔ لوگ آکے
خاموشی سے بیٹھ جاتے۔ کچھ دیر بعد پانڈے اور بالے دادا
کے آنے پر اندر تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ پانڈے دادا کے
ساتھ ماہم کے پاڑے کے بہت سے لوگ تھے۔ گلیا' بچھی'
سکندر' زورا' چھیدا وغیرہ۔ بہت سے لوگ تھے جن کی شکلوں
سے میں واقف تھا' ناموں سے نہیں۔ ان میں کتنوں کی
آنکھیں امڈ رہی تھیں۔ بٹھل نے خیریت پوچھی تو وہ سسکنے
لگے۔ پانڈے دادا تو بہت ہی دل گرفتہ آیا تھا۔ بٹھل سے گلے
مل کے وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا "اپن کو معافی دیو دادا!"
وہ ہاتھ جوڑ کے بولا "کیدر اپن کو چھوڑ کے چلا گیا۔ ماں قسم'
ابھی اپن لوگ سے ایک دم نئیں بیٹھا جاتا اودر۔" ایک
پانڈے دادا نے کیا گلہ کیا سب کو زبان مل گئی۔ بٹھل پہلے تو
خاموشی سے سنتا رہا پھر انہیں تسلیاں دینے لگا کہ وہ پاڑے پر
ضرور آئے گا' اس دوران میں وہ ایک دوبار کے سوا گھر سے
باہر ہی نہیں نکلا' وہ دادا کی ایک چوکی پر نہیں تو دوسری چوکی پر
موجود ہے جہاں اس کی ضرورت زیادہ ہے۔ بٹھل نے بکھری
ہوئی آواز میں ان سے کہا "وہ اب کدھری کو جائیں دادا!"
اس کی مراد گیتا اور رانی سے تھی۔

وہ یہی باتیں کر رہے تھے کہ دروازے پر کھڑے ہوئے
لوگ ایک دوسرے کو پیچھے ہٹانے لگے۔ وہ دینا' لال خان اور
بناری تھے جن کی آمد پر یہ انتشار ہوا تھا۔ بناری ان میں
سب سے آگے تھا۔ اسے دیکھ کے میرے سارے جسم میں
سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں نے ان کے
لیے جگہ بنائی۔ ادھر سے پانڈے دادا نے آواز لگائی "آؤ'
آؤ۔ ایدر آکے بیٹھ جاؤ' ویری کردیا اتنا!"

تینوں ٹھس ٹھسا کے بٹھل اور پانڈے کے پاس بیٹھ
گئے۔ بناری کو میرے سامنے ہی جگہ ملی تھی۔ چند لمحوں بعد
اس کی نظر مجھ پر پڑی اور اس نے ہونٹوں اور پلکوں کی جنبش
سے مجھے سلام کیا۔ میں اضطراری انداز میں سرہلا کے رہ گیا۔
دوسرے لمحے وہ پانڈے دادا کی طرف متوجہ ہوگیا۔ میرا سر
دھمک رہا تھا' کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے'
جھپٹ کے اس کا گلا دبوچ لوں یا گلیا' بچھی' زورا وغیرہ کو
اشارہ کرکے اسے باہر پھنکوادوں یا مجھے خود یہاں سے اٹھ جانا
چاہیے۔ میری نظریں اسی پر ٹکی ہوئی تھیں۔ اسے میں نے
پہلے کتنی بار دیکھا تھا۔ بہت قریب سے بھی لیکن جیسا کہ لوگ
کہتے ہیں' دل اور دماغ کے بغیر آنکھ کا دیکھا ادھورا ہے
ادھورے سے بھی کم۔ آج سے پہلے میں نے جیسے بناری
دیکھا ہی نہیں تھا۔ گٹھا ہوا جسم' اتنا کھنچا ہوا نہیں جتنا پھیلا
ہوا' ابلی ہوئی آنکھیں۔ سامنے سے سر کے بال اڑ جانے
باوجود پیشانی تنگ تھی اور اس پر چاقو کا نشان واضح تھا
گالوں پر بھی ایک دو جگہ کچیاں پڑی تھیں۔ شکل سے چالیس
سے کم کا لگتا تھا۔ نشست میں مستعدی' نگاہوں میں بے
قراری تھی۔ میں نے سنا' وہ پانڈے دادا سے کہہ رہا تھا
پیرو دادا کیا گیا' ساری بمبئی سونی ہوگئی ہے۔ پاڑے پر
جی ہی نہیں لگتا' کسی کو بھی دھندے میں مزہ نہیں آرہا۔
رہا تھا کہ ابھی تک یقین نہیں آتا کہ پیرو دادا ہمیشہ کے
جدا ہوگیا ہے۔ لگتا ہے' ہم سب کو دھوکا ہوا ہے۔ کسی دن
بھی وہ کہیں سے' کسی دروازے سے چلا آئے گا اور سب
حیران کردے گا۔ زبان چلانی بھی اسے اچھی طرح آتی
کوئی صورت نہیں تھی کہ میں بٹھل کو ٹوک سکوں کہ وہ
کتے کی باتوں پر ذرا دھیان نہ دے' یہ بہت بڑا کمینہ

بٹھل کو اگر میں پہلے بناری کے بارے میں کچھ بتادیتا تو ٹھیک
تھا' پھر بناری کی اس غم زدگی پر نہ جانے اس کا کیا تاثر ہوتا مگر
اب بھی کچھ مختلف نہیں تھا۔ وہ بہروں کی طرح سنتا رہا۔ اس
کی اس بے جنبشی پر بناری کو مضطرب ہونا چاہیے تھا۔ اس
نے براہ راست بٹھل کو مخاطب کیا "دادا! اپن لوگ کو کچھ
بول' ابھی پیرو دادا کا بٹی اور بیوی کے لیے اپن کیا کرسکتا
ہے۔ اپن کو بھی تھوڑا شریک کرو۔"

"ٹائم آئے گا تو بول دیں گے رے" مجھے تسلی ہوئی کہ
بٹھل کے لہجے میں کوئی اثرپذیری نہیں تھی۔ نتیجتاً بناری
کو خاموش ہوجانا پڑا۔

کھانے کے وقت تک کچھ اور لوگ بڑھ گئے تھے۔
دسترخوان کی ترتیب کی وجہ سے سب ادھر ادھر ہوگئے اور
اچھا ہوا جو بناری مجھ سے دور ہوگیا۔ بہت دیر سے میری نگاہیں
جگنو اور دیوا کی ٹوہ میں بھٹک رہی تھیں۔ آمنے سامنے وہ مجھے
کہیں نظر نہیں آئے۔ صبح سے وہ کاموں میں لگے ہوئے
تھے۔ پاڑے کے لوگوں کو آتا دیکھ کے یقیناً انہوں نے گھر کے
اندر رہنا یا کسی طرف نکل جانا ہی مناسب جانا ہوگا۔ سہ پہر
تک کھانے کی بیٹھکیں جاری رہیں۔ اندر پاڑے کے لوگ
تھے' باہر سائلوں کا اژدہام تھا۔ یہ بس آخری دن تھا' اس
کے بعد پیرو دادا کے لیے آنا تھا۔ مرا ہوا آدمی جلدی پرانا
ہوجاتا ہے۔ رفتہ رفتہ ساری بھیڑ چھٹ جاتی ہے' صرف چند
لوگ رہ جاتے ہیں اور رسمیں رہ جاتی ہیں' پھر یہ بھی نہیں
رہتا۔ آدمی کا جیسے کبھی کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ اندھیرا
ہوجانے پر گھر صرف گھر والوں تک محدود رہ گیا۔ بناری آخر
تک بیٹھا رہا تھا۔ پانڈے دادا اور ماہم کے پاڑے کے لوگوں
کے ساتھ ہی وہ اٹھا اور چلتے وقت بھی بٹھل سے عاجزی کرنا
نہیں بھولا۔ کہنے لگا' پاڑے پر بھی پیرو دادا کی بہت سی
ولادیں ہیں۔ بٹھل انہیں اس طرح نظرانداز نہ کرے اور
بھی بہت کچھ اس نے کہا تھا۔ بٹھل نے جواب میں اس کی
کمر پر ہاتھ رکھ کے دروازے کی جانب اشارہ کیا۔ میرے
دست و بازو چٹختے رہے۔ بناری نے میرے سامنے سے دروازہ
عبور کیا۔ میں دیکھتا رہ گیا۔ جگنو اور دیوا رات ہی کو پھر مجھے
نظر آئے۔ نہ معلوم انہوں نے دن بھر اپنی روپوشی کا کیا جواز
پیش کیا ہوگا۔ اتنے لوگ تھے' ہوسکتا ہے کسی کو ان کی طرف
دھیان کرنے کی فرصت ہی نہ ملی ہو۔

میرا جسم ٹوٹ رہا تھا اس لیے میں اول وقت ہی اپنے
کمرے میں جاکے لیٹ گیا۔ جولین سے میں نے کہہ دیا کہ میں
رات کا کھانا نہیں کھاؤں گا' ہاں کیلاش کے آنے پر مجھے
ضرور اطلاع دے دی جائے۔ وہ اس روز بھی نہیں آیا۔ صبح
جولین نے مجھے بتایا کہ رات گئے شکلا آیا تھا۔ زیادہ دیر نہیں
ٹھہرا اور بٹھل سے مل کے چلا گیا۔ اس کے منع کرنے پر مجھے
نہیں اٹھایا گیا۔ صبح باہر نکلنے پر مجھے معلوم ہوا کہ بٹھل گھر میں
نہیں ہے' جمرو بھی اس کے ساتھ گیا ہوا ہے۔ رات شکلا کی
آمد بے سبب نہیں ہوگی۔ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ واپس
آنے پر جمرو نے مجھے بتایا کہ وہ ابا جان کی موٹر میں پہلے شکلا کے
گھر گئے تھے۔ وہاں سے تھانے' پھر کچھ دیر کے لیے عدالت
گئے۔ جمرو مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ یہ شکلا کیسا آدمی ہے۔ وہ
ایک اجنبی عورت کے لیے کتنا فکرمند ہے۔ کسی طرح بھی وہ
پولیس کا آدمی نہیں لگتا۔ میں نے کہا کہ تم نے کرشنا جی کو
نہیں دیکھا' وہ شکلا کو کتنا پسند کرتے تھے' اسے انہوں نے ہی
تراشا ہے۔ جمرو کے کہنے کے مطابق وہ صبح ہی گھر سے نکل گئے
تھے۔ شکلا وکیل کے ساتھ بیٹھا بٹھل کا انتظار کر رہا تھا۔ کوئی
گھنٹے بھر وہ ایک دوسرے کو دلیلیں دیتے رہے اور طے پایا کہ
ماری پولیس میں دیے ہوئے بیان سے منحرف ہوجائے۔
انحراف کا مطلب یہ نہ ہو کہ ماری اپنے شوہر جارجی اور اس
کے عزیزوں کی کے قتل سے یکسر انکار کردے بلکہ اس کے پہلے
بیان میں صرف اتنی سی تبدیلی کی جائے گی کہ ماری کے پاس
اس رات اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

شکلا کے گھر سے وہ تھانے پہنچے۔ جمرو کو معلوم نہیں تھا'
وہاں ماری سے بٹھل کی کیا بات چیت ہوئی۔ اس دوران میں
جمرو تھلے کی راہداری میں بینچ پر بیٹھا رہا۔ پھر اس نے ماری کو
عدالت میں دیکھا۔ جمرو بتا رہا تھا کہ وہ بالکل گم صم تھی۔ ایسی
لٹی پٹی کہ دیکھی نہیں جاتی تھی۔ بکھرے ہوئے بال' وحشت
زدہ آنکھیں' گرد آلود چہرہ' تمام وقت وہ گردن ڈالے ہوئے
بیٹھی رہی۔ شکلا نہ تھانے آیا تھا' نہ عدالت میں دکھائی دیا'
وکیل وہاں پہلے سے موجود تھا۔ بٹھل نے اسے ماری کی
حالت سے آگاہ کیا۔ اور کہا کہ ماری سوال و جواب اور بیان
وغیرہ کے قابل نہیں ہے۔ وکیل نے کسی تشویش کا اظہار
نہیں کیا تھا' کہنے لگا' اس کی خاموشی بہتر ہے۔ اس نے ماری
کی طرف سے لکھا ہوا بیان داخل کیا اور عدالت سے
درخواست کی کہ اس کی مؤکلہ شدید ذہنی ابتری میں ہے'
عدالت فوراً اس کے ڈاکٹری معائنے کا حکم دے اور مناسب
علاج کا بندوبست کرے۔ جج نے اس کی درخواست منظور کرلی
اور انہماک سے سارے کاغذات کا مطالعہ کرتا رہا۔

بٹھل اور وکیل کی گفتگو سے جمرو کو تھوڑا بہت اندازہ
لگانے کا موقع مل گیا تھا۔ وکیل نے عدالت سے مطالبہ کیا کہ

ایک منصفانہ فیصلے کے لیے پس منظر کی تحقیق لازم ہے اور پس منظر سارا آئینے کی طرح ہے۔ جمرو کا خیال تھا کہ وکیل نے اپنے طویل بیان میں تقریباً ہر پہلو کا احاطہ کیا ہے۔ وکیل کا کہنا تھا کہ پہلے ہی مرحلے میں تمام ممکنہ گوشے عدالت کے علم میں آجائیں تو مخالف وکیل کو کھل کھیلنے‘ غیر ضروری طور پر معاملہ الجھانے یا سنسنی پھیلانے کا موقع نہیں ملتا اور عدالت کا کام آسان ہوجاتا ہے۔ ماری کی پچھلی زندگی میں قدم قدم پر پیرو کی اعانت‘ پیرو کے ایما پر جارجی سے شادی‘ ایک باپ کی طرح پیرو کے لیے ماری کا احترام‘ شہر کے سب سے بڑے دادا پیرو کی بمبئی سے طویل غیر حاضری اور ان بدخواہوں کی جانب سے اس کے مرنے کی قیاس آرائیاں اور کسی تصدیق کے بغیر جارجی کا ان افواہوں پر یقین کرلینا اور پر پرزے نکالنا اور اپنے گوا سے آئے ہوئے عزیزوں کی شہ پر بمبئی کی ایک ساحلی بستی میں جوئے‘ شراب اور عورتوں کے اڈے کا قیام‘ پھر ایک دن اچانک پیرو دادا کی بمبئی میں آمد اور جارجی کے خفیہ اڈے پر چھاپا۔ وکیل نے تفصیل سے یہ ساری روداد بیان کی تھی۔ اس نے عدالت پر واضح کیا تھا کہ جارجی بھی پیرو کا پروردہ تھا اور اسی کے بل پر قلابے کے اہم پاڑے پر بیٹھا ہوا تھا۔ جوئے اور شراب کے اڈے سے جارجی کے ہاں سونے چاندی کی بارش ہونے لگی تھی۔ زندگی بھر جارجی نے پیسے کی ایسی ریل پیل نہیں دیکھی تھی۔ پیرو نے آکے جارجی کے سارے خواب اجاڑ دیے۔ پیرو کے حکم پر دوسرے دن اسے اڈے کا دھندا بند کرنا پڑا۔ یہ حادثہ جارجی کے لیے ایک بڑے سانحے سے کم نہیں تھا۔

وکیل نے عدالت کو بتایا کہ اس کی موکلہ عرصے سے اپنے شورہ پشت شوہر کا جبر سہ رہی تھی۔ جارجی نے اس کی مرضی کے خلاف اسے اپنے کاروباری اڈے کے کاؤنٹر پر بٹھادیا۔ ماری اس وقت بہت بے دست وپا تھی۔ ایک پیرو دادا ہی اس کی سپر تھا۔ بمبئی سے پیرو کی عدم موجودگی میں وہ بڑی بے امان ہوگئی تھی۔ کسی تماشائی کی طرح وہ جارجی کو فیل بدمست کی طرح سرکشی کرتے دیکھتی رہی۔ پیرو نے بمبئی واپس آنے میں بہت دیر کردی۔ جارجی نے اڈا ضرور بند کردیا تھا لیکن وہ بہت آگے جاچکا تھا۔ ماری کو پہلے سے دھڑکا تھا کہ جارجی کا واپس آنا مشکل ہے مگر اس کے سان گمان میں نہ تھا کہ جارجی اتنا اندھا ہوچکا ہے کہ اسے پیرو کی موت کے سوا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ پیرو دادا کے قتل کی رات جارجی ماہم کے پاڑے پر بیٹھا رہا تاکہ کوئی اس پر انگلی نہ اٹھاسکے۔ اس رات کیا وہ شب و روز کئی دنوں سے پیرو دادا کی خوشنودی کے لیے ماہم کے پاڑے پر جما ہوا تھا۔ گھر اور را پاڑے پر اس کا آنا جانا واجبی سا رہ گیا تھا۔ اس رات وکی ا ٹائی نے‘ ہوسکتا ہے‘ ان کا کوئی اور بھی شریک ہو‘ ایک تاریک گلی میں پیرو دادا اور اس کے دست راست ماچھی د پر پیچھے سے حملہ کردیا۔ پیرو اور ماچھی نے مرتے مر مزاحمت کی اور وکی کو زخمی کردیا۔ وکی زخمی نہ ہوتا تو گوا طرف بھاگ جاتا۔ ادھر جارجی مستقل طور پر ماہم کے پاڑ پر بیٹھا اپنی گواہی بنا ہوا تھا۔ دونوں اس معاملے میں بے رہتے لیکن مکافات عمل بھی کوئی چیز ہے۔ زخمی ہوجانے سبب وکی کو بمبئی میں ٹھہرنا پڑا اور جارجی کے گھر پناہ لینی پڑ ماری نے اس کی مرہم پٹی کی۔ ماری کو اس وقت کچھ علم تھا‘ دوسرے دن جب اسے پیرو دادا کی موت کی خبر ملی تو ا شبہ جڑ پکڑنے لگا۔ پیرو دادا کی موت پر ماری کا بے حال ہ عین فطری تھا۔ پیرو کی ارتھی اٹھتے وقت اپنے مربی کا دیکھنے وہ اس کے گھر گئی تھی۔ وہاں سے وہ اور تنہا اور رو لوٹی۔ آس پاس کوئی بھی اس کے غم میں شریک نہ تھا‘ آکے وہ آنسو بہاتی اور خود کو صبر و ہمت کی تلقین کرتی ر اسے جارجی کا انتظار تھا۔

جارجی دو راتوں بعد گھر آیا۔ وکی پہلے سے وہاں دونوں نے شراب کی بوتل سے پیرو کی موت کا جشن منا بھول گئے کہ گھر میں پیرو دادا کا ایک سوگوار بھی موجو ماری وہاں ہے اور ان پر نگاہ رکھے ہوئے ہے۔

جارجی کے گھر آنے پر اب کوئی حجت باقی نہیں تھی۔ ماری نے اپنی آنکھوں سے ان کی بدمستیاں دیکھیں اپنے کانوں سے ان کی ہرزہ سرائیاں سنی تھیں۔ اس برداشت نہیں ہوا‘ وہ ہذیان بکنے لگی اور اس نے اپنے کو مجبور کیا کہ اچھا ہے‘ وہ پولیس میں جاکے اپنے اقرار کرلے ورنہ۔۔۔

وکیل نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ اندازہ لگایا جا کہ ایسی صورت میں جارجی اور وکی کا رد عمل کیا ہوسک دونوں نشے میں چور تھے‘ دو طرح کا نشہ‘ فتح اور شراب لیے ماری ان پر حاوی آگئی۔ بہ صورت دیگر دونوں چابک دست اور ہنرمند تھے کہ راتوں رات تمام نشا ڈالتے‘ ماری کی خاک بھی نہ ملتی۔

وکیل نے اپیل کی تھی کہ اس کی مؤکلہ کی را اور نیکوکاری کے گواہ کم نہیں ہیں۔ اس کے بچوں سامنے ہے۔ اعلیٰ تعلیم دلانے کے لیے اس نے انہیں ایک اچھے اسکول میں داخل کرایا ہے۔ پاڑے کے

ی ہونے کے باوجود وہ پاڑے سے کنارہ کش رہتی تھی‘ اس ھر صاف ستھرا تھا‘ لباس بھی اجلا اور شریفانہ پہنتی تھی۔ وہ سیوں سے کم واسطہ رکھتی تھی‘ پڑوسی بھی جارجی دادا کی سے گریزاں رہتے تھے۔ تاہم اس کے لہجے کی نرمی اور ں کے اطوار کی شائستگی کے سبھی قائل تھے۔ ضرورت پڑی وہ چند لوگ بھی گواہی دینے آئیں گے جن سے ماری نے مدد موقعوں پر اچھا سلوک کیا ہے اور عدالت کو برابر بطور خاص ظ رکھنا چاہیے کہ ماری خود تھانے آئی تھی۔ یہ اس کی دگی کا ایک اور ثبوت ہے۔ واردات کے بعد وہ اپنے گھر ے بھاگ سکتی تھی یا فیل مچاتی‘ پولیس اسٹیشن وارد ہوتی‘ ئیاں دیتی کہ رات اسے کمرے میں بند کرکے‘ بے دست وپا ر کے اجنبیوں نے اس کے شوہر اور وکی کو ختم کردیا ہے۔ بہ ہر میاں بیوی میں کوئی ایسا اختلاف بھی نہیں تھا جو ماری پر ب کرنے کا عذر بنتا۔ پاڑے کے داداؤں کی ہلاکت پر پولیس نی متوحش بھی نہ ہوتی۔ پیرو دادا دو دن پہلے گزر چکا تھا‘ ے بھی گزشتہ سے پیوستہ واقعہ جان کے پولیس اپنے جتن رتی رہتی۔ ماری کو کچھ ایک عورت ہونے کی رعایت ملتی‘ ھ اس کے واقف حال مدد کو آتے اور وہ صاف بچ جاتی ن ماری نے ایسا نہیں کیا۔ وہ سیدھی تھانے چلی آئی۔ وہ چھی طرح جانتی تھی کہ اس سے ایک بڑا جرم سرزد ہوگیا ہے‘ اپنے لٹ جانے کا احساس مستزاد تھا۔ وہ تو بالکل ٹوٹ ی تھی۔ عدالت سمجھ سکتی ہے کہ ماری کی ذہنی حالت کس ے ناگفتہ بہ ہوگی۔ شکستگی‘ خانماں بربادی کا یہی احساس تھا ر اس نے پولیس میں آکے صاف اپنے جرم کا اقرار کرلیا‘ رے ہوئے جواری کی طرح۔ اس نے پولیس سے کہا کہ میں نے پیرو دادا کے خون کا بدلہ لے لیا ہے۔ ممکن ہے‘ ہتھیار ھاتے وقت یہ جذبہ بھی اس کے لاشعور میں موجزن رہا ہو یا کن ہے‘ بعد میں اسے اس کا احساس ہوا ہو کہ اس نے ایسا چھ غلط بھی نہیں کیا۔ پیرو کے زندگی بھر کے احسانات اسی رح چکائے جاسکتے تھے۔ وہ اپنے بچوں سے غافل نہیں تھی۔ ریے وہ زیورات اور نقدی سے بھری ہوئی ایک پوٹلی ساتھ ئی تھی جو اس نے بٹھل نامی پیرو کے ایک محترم دوست کے الے کردی اور پیرو کو واسطے دیے کہ بٹھل اس کے بچوں و اپنی تحویل میں لے لے‘ اب وہ کس منہ سے اپنے بچوں کا امنا کرے گی‘ اب وہ ان کے لیے کچھ بھی نہیں رہی ہے‘ ں کو بتایا بھی نہ جائے کہ ان کی ماں کا کیا انجام ہوا؟ وہ بہت معصوم ہیں اور اس نے پھولوں کی طرح ان کی نگہداشت کی ہے۔ ان سے کچھ بھی کہہ دیا جائے کہ ان کی ماں اچانک مرگئی۔ عدالت یہ نکتہ بھی پیش نظر رکھے کہ ماری واردات سے پہلے بھی پولیس میں آسکتی تھی۔ اس صورت میں وہ قطعی محفوظ تھی۔ جارجی اور وکی کے ملوث ہونے کی بین شہادتیں اس کے پاس تھیں‘ باقی پولیس کی کوشش سے جارجی اور وکی اقرار کرلیتے اور یوں ماری کو اپنے محسن پیرو کی روح کے سامنے سرفرازی کا موقع مل جاتا مگر ماری کو وقت ہی نہ مل سکا۔ اس سے صرف اتنی نادانی ہوئی‘ اس نے اپنی نفسی افراتفری میں دونوں مجرموں پر یہ ظاہر کردیا کہ وہ ان کے خونیں کارنامے سے واقف ہے۔ اس کے بعد ان دونوں کو لازماً ماری کے راستے بند کردینے چاہیے تھے۔ یہ یقین کرلینے کے بعد کہ وہ جارجی اور وکی اور ان کے ساتھیوں کے سوا کوئی نہیں تھا‘ ماری خود پر کچھ جبر کرلیتی اور چپ چاپ پولیس اسٹیشن چلی آتی تو آج وہ سلاخوں کے پیچھے نہ ہوتی۔ ایک عورت کو اس کی اس نادانی کی سزا بے شک عدالت دے سکتی ہے۔

شکلا نے یقیناً کوئی قابل وکیل ہی منتخب کیا ہوگا۔ بس یہی ایک گوشہ نکلتا تھا۔ وکیل کو کسی حاشیہ آرائی کے بغیر ساری روداد بے کم و کاست یوں ہی بیان کرنی تھی۔ تحقیق و تفتیش کے لیے اب عدالت کے پاس کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ تصدیق کرنے پر سب کچھ سچ ہی نکلتا اور اس سچ کے تسلسل میں وکیل کا یہ عذر بھی تسلیم کرلیا جاتا کہ ماری نے جو کچھ کیا ہے‘ وہ اپنے دفاع میں کیا ہے۔ یہ سب کچھ سنا کے وکیل نے صرف ایک نکتے پر عدالت کی توجہ مرکوز کردی تھی کہ آیا ماری نے عمداً یہ سنگین جرم کیا ہے یا وہ ایسا کرنے پر مجبور تھی؟ گویا پولیس کو دیے جانے والے پہلے بیان پر یقین کیا جائے یا اب عدالت میں اس کا تازہ بیان سچ سمجھا جائے۔ دوسرے بیان کے استرداد کے لیے عدالت کے پاس معقول وجوہات ہونی ضروری تھیں اور یہ وکیل کا کام تھا کہ وہ ان وجوہات کی وضاحت عدالت سے طلب کرے۔

بٹھل اور شکلا نے وکیل کو کسی پہلو سے بے خبر نہیں رکھا تھا۔ اور اتنی جزئیات صرف بٹھل ہی جانتا تھا۔ شکلا سے اب کچھ چھپا نہیں رہا تھا۔ میرے بارے میں بہت سی باتیں اسے کھٹکتی تھیں‘ اب کوئی وحشت باقی نہیں رہ گئی ہوگی۔ جمرو کی زبانی یہ باتیں جان کے مجھ پر حیرت طاری تھی‘ اتنے کم عرصے میں بٹھل اور شکلا کس قدر دوڑ دھوپ کرچکے ہیں۔ مجھے بھی ان کے ساتھ ہونا چاہیے تھا مگر یہ تو انہی پر منحصر تھا‘ وہ میری ضرورت سمجھتے تبھی تو میں ان کے لیے کسی کام کا نہیں ہوں گا اس لیے انہوں نے مجھ سے کوئی

سرو کار نہیں رکھا۔ جمرو کہہ رہا تھا کہ وکیل بہت پر امید ہے مگر جج کا رویہ بے حد سپاٹ تھا۔ "قسم سے لاڈلے!" جمرو بے چینی سے بولا "اپنے سے ماری کو دیکھا نہیں جاتا تھا' جی کرتا تھا' ابھی اس کو ادھر سے اٹھا لے جاؤں۔ استاد اپنے کو اشارہ کرے' تھانے سے اٹھا کے نہ لاؤں تو اپنی ماں کا دودھ پیا۔"

"فضول باتیں کیوں کر رہے ہو؟" میں نے تلخی سے کہا "بٹھل بھائی کیا یہ بات نہیں جانتے تھے' مجھے یاد ہے' انہوں نے شکلا جی سے ایک بار کہا تھا' بولو تو اس کو تھانے سے اٹھوا لیں؟"

"استاد نے بولا تھا ایسا؟" جمرو تعجب سے بولا "پھر شکلا صاحب نے کیا جواب دیا؟"

"شکلا جی ایک پولیس افسر ہیں' وہ کیا جواب دیتے؟"

"لیکن مطلب تو ان کا بھی یہی ہے۔ وہ بھی تو یہی کر رہے ہیں۔ ایسے میں بہت دیر لگے گی' عدالت کا کچھ پتا نہیں' اتنے میں وہ ابھاگن مر جائے گی' اپنے کو ڈر ہے لاڈلے! وہ زندہ نہیں رہنے کی۔"

"زیادہ دیر نہیں لگے گی جمرو بھائی!"

"تیرا مطلب ہے' ماری کا کوئی مخالف نہیں ہے' اور جیسا تم نے بتایا' وکیل نے بہت سوچ سمجھ کے بیان داخل کیا ہے۔"

"پر جج اڑ بھی سکتا ہے' اپنے کو بالکل پتھر لگتا ہے وہ۔"

"لیکن آدمی ہی ہے اور ماری سے اس کی کوئی خاندانی دشمنی نہیں ہے' ماری کے بچوں کا اسے بھی کوئی خیال ہونا چاہیے۔"

"پر اتنے میں ماری نے کوئی الٹا سیدھا بول دیا تو؟"

"وکیل نے اسی لیے اس کے علاج معالجے کا مطالبہ کیا ہے۔ وہ عدالت کو یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ ماری کے حواس درست نہیں ہیں' اودھر بٹھل بھائی بھی ماری کو کچھ سمجھائیں گے۔ بجھائیں گے' کم سے کم ان کی بات وہ ضرور سنے گی۔"

"تو بولتا ہے تو ٹھیک ہے پر اپنے کو آگے بہت چکر دکھائی دیتا ہے۔"

"چکر تو ہوگا' خون کا مقدمہ ہے۔"

"یہی تو بولتا ہوں' عدالت میں برس خرچ ہو جاتے ہیں' الٹا بھی ہو سکتا ہے سب۔"

"پھر! پھر کیا صورت ہے۔ تم ماری کو اٹھا لاؤ گے؟ یہی کہہ رہے ہو نا تم۔ پھر۔ پھر کیا ہوگا؟" اس نے درشتی سے کہا "کہاں لے جاؤ گے اسے؟"

"بہت بڑی دنیا ہے۔"

"چھپاتے پھرو گے سارے میں' بچوں سمیت' یہ بھی کوئی زندگی ہے؟"

"پولیس شروع میں زور کرے گی' پھر سب بھول جائے گی۔"

"کیسی بچوں کی سی باتیں کر رہے ہو' ہر وقت خوف' ہر لمحے دھڑکا۔ وہ عزت سے' سکون سے رہ سکے گی کہیں؟ اس زندگی سے موت بہتر ہے۔ بال بچے خوش رہیں گے کہ ان کی ماں تو ان کے ساتھ ہے مگر آج تو وہ چھوٹے ہیں' بعد میں کیا ہوگا؟ یہی ایک مناسب طریق کار ہے جو شکلا جی اور بٹھل بھائی کر رہے ہیں۔ ورنہ ہم لوگ مر تو نہیں گئے' بچوں کو ان کی ماں تو نہیں دے سکتے لیکن شاید انہیں کوئی کمی بھی نہ ہو' ان کا اللہ مالک ہے۔"

جمرو چپ بیٹھا رہا۔

○☆○

اس روز میرا ارادہ کیلاش کی خیر و عافیت معلوم کرنے اس کے گھر جانے کا تھا۔ پھر خیال آیا' دسواں گزر گیا ہے۔ آج کسی وقت گھر والوں کو ابا جان کی کوٹھی میں منتقل ہو جانا چاہیے۔ شام ہو رہی تھی اور کسی کو کوئی جلدی نہیں معلوم ہوتی تھی' میں دیر تک گیتا کے پاس بیٹھا رہا' وہاں فرخ فریال' جولین اور شہ پارہ بھی تھیں۔ ان سے معلوم ہوا کہ ابھی دو چار روز کی اور دیر ہے۔ نئی جگہ پر کچھ کام باقی رہ گیا ہے۔ ابا جان نہیں چاہتے کہ وہاں جا کے کسی کو پریشانی ہو۔ اندھیرا گہرا ہونے پر ابا جان بھی واپس آ گئے۔ بار بار میرا دھیان کیلاش کی طرف جاتا' موٹر موجود تھی مگر جمرو دن بھر کا تھکا ہوا تھا۔

میں نے مارٹی کو ساتھ لیا۔ ابا جان سے میں نے پوچھ لیا تھا کہ انہیں کوئی کام نہ ہو تو میں کیلاش کے ہاں جانے کے لیے موٹر لے جانا چاہتا ہوں۔ ابا جان اور منیر علی بھی جانا چاہتے تھے لیکن پھر جانے کیا سوچ کے رک گئے۔ ابھی چلی ہی تھی کہ میں نے ڈرائیور سے ٹھہر جانے کو کہا۔ مجھے یاد آیا کہ میری جیب بالکل خالی ہے' احتیاطاً کچھ پیسے پاس ہونے چاہئیں۔ مارٹی سے پوچھنا اچھا نہیں لگا۔ اندر جا کے میں نے جولین سے کچھ پیسے مانگے۔ وہ مسکرانے لگی اور الماری سے اپنا پرس لا کے میرے سامنے کر دیا۔ دس روپے کے دو نوٹ نکال کے میں نے جیب میں رکھ لیے۔ موٹر کی وجہ سے ہم منزل پر پہنچ گئے۔ اس بار بھی ملازموں ہی سے ہمارا استقبال ہوا۔ ابھی تک کوئی پونا سے واپس نہیں آیا تھا۔

ہراساں ہراساں لگتے تھے۔ مجھے بھی تشویش ہوئی۔ کئی دن گزر گئے تھے۔ پونا ایسا دور نہیں تھا۔ اب تک انہیں واپس آجانا چاہیے تھا۔ میں نے ملازموں سے پتا پوچھنے کی کوشش کی مگر کسی کو ٹھیک طرح کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔ ڈاک کا پتا مختلف ہوتا ہے۔ وہ گلیوں کے موڑ اور نشانیاں بتاتے رہے تھے۔ پھر ان سے معلوم ہوا کہ آں جہانی کی ایک کوٹھی باندرے میں بھی ہے۔ باندرا نزدیک ہی تھا۔ منٹوں میں ہم وہاں پہنچ گئے۔ وہاں بھی سناٹا تھا۔ ایک دو ملازموں کے سوا اتنی بڑی کوٹھی میں کوئی نہیں تھا تاہم وہاں سے اصل پتا معلوم ہوگیا۔ اس وقت میری سمجھ میں یہی آیا کہ مجھے تار دینا چاہیے اگر ہوسکے تو پونا بھی جانا چاہیے۔ صبح جاکے میں رات کو واپس آسکتا ہوں۔ گھر جانے کے بجائے میں نے ڈرائیور سے بمبئی سینٹرل کی طرف چلنے کو کہا۔ کبھی کسی نے مجھے بتایا تھا کہ اسٹیشن سے تار جلدی پہنچ جاتا ہے۔ جولین کے دیے ہوئے پیسے اس موقع پر کام آئے۔ میں نے ارجنٹ تار دیا اور جوابی تار کے پیسے بھی ادا کیے۔ گھر آکے میں نے بتایا تو سبھی پریشان ہوگئے۔ کیلاش رکنے والا نہیں تھا۔ اسپتال میں اس کی ضرورت ہوگی۔ وہ نہیں آسکتا تھا تو گھر کے دوسرے افراد آجاتے۔۔۔ مولوی اکرم کی اطلاع کے مطابق رات کو بھی ایک گاڑی پونا جاتی تھی۔ سب کی یہی رائے تھی کہ کسی کو وہاں جاکے خیریت پوچھنی چاہیے۔ ابھی گاڑی کا وقت تھا۔ میں جانے کے لیے تیار تھا لیکن بٹھل نے منع کردیا کہ پہلے تار کے جواب کا انتظار کرلیا جائے۔ میں نے یہ بات تار میں لکھ دی تھی کہ اگر میری یا ہم میں سے کسی کو ضرورت ہو تو کوئی بھی پہلی گاڑی سے آسکتا ہے۔ علی الصباح تار کا جواب آگیا۔ کیلاش نے لکھا تھا کہ اسے رابطہ نہ رکھنے کا افسوس ہے لیکن آں جہانی کی اچانک موت نے سب کو امتحان سے دوچار کردیا ہے باقی باتیں تفصیلی ملاقات پر۔ دو ایک روز میں بکھرے ہوئے معاملات سمٹ جانے کی توقع ہے۔ ابھی حالات قابو میں ہیں، کسی کی ضرورت پڑی تو یقیناً زحمت دوں گا۔ تار سے اطلاع کردوں گا۔ آخری سطر میں کیلاش نے شکریہ ادا کیا تھا اور سب کے لیے دعائیہ کلمات لکھے تھے۔ میں نے بٹھل سے کہا کہ میں کیلاش کے جواب سے مطمئن نہیں ہوں۔ یہ بہت مبہم ہے۔ ہوسکتا ہے، اسے ہماری ضرورت ہو اور وہ تکلف کررہا ہو۔ بٹھل مجھ سے متفق تھا لیکن اس نے مجھے پونا جانے کی اجازت نہیں دی۔ میں نے کہا، ایسا ہے تو تم چلے جاؤ، بٹھل اس پر بھی آمادہ نہیں ہوا۔ دسویں کو چار روز گزر چکے تھے۔ صبح ہی سے گھر منتشر نظر آنے لگا۔ ابا جان نے کہا تھا کہ کپڑوں اور ضروری سامان کے سوا سارا گھر جوں کا توں رہنے دیا جائے۔ شبتی چاچا کو بڑی مشکل سے راضی کرلیا گیا تھا کہ وہ گھر کی نگرانی کرتے رہیں گے۔

ناشتے کے وقت کوئی کسی سے نظر نہیں ملا رہا تھا۔ سب گم صم سے تھے۔ میں تو ناشتے کے بعد ہی گھر سے نکل گیا تھا۔ گھر چھوڑتے وقت گیتا اور رانی کے چہرے دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ اپنا گھر چھوڑنا ویسے بھی آسان کام نہیں ہے۔ در و دیوار سے آدمی آنکھیں چراتا ہے۔ وہ تو پیرو کے گھ سے جارہی تھیں۔ کہتے ہیں، آدمی مرجاتا ہے، اس کی بازگشت باقی رہتی ہے۔ جانے والا کسی نہ کسی طور پر موجود رہتا ہے۔ اس کی آہٹیں، صدائیں، اس کے نقوش زند رہتے ہیں اور اس کے لیے مخصوص اشیا اور مخصوص محل وقوع کی ضرورت نہیں۔ اس کا تعلق تو نہاں خانے ہے۔ گیتا اور رانی پیرو کے گھر سے جارہی تھیں لیکن پیرو تو ا کے ساتھ تھا۔ پیرو سے ان کا تعلق اشیا اور در و دیوار حوالے سے نہیں، براہ راست تھا۔ کسی نے ضرور انہیں با کرایا ہوگا کہ کل کوئی دوسرا اس مکان میں آئے گا تو پیرو کوئی صدا، کوئی آہٹ اسے سنائی نہیں دے گی۔ جولین صبح مجھے بتایا تھا کہ ادھر ایسی دیر نہیں تھی، کچھ کام ہمار جانے کے بعد بھی ہوسکتا تھا لیکن ابا جان نے منتقلی کا ا چند روز کے لیے دانستہ ملتوی کردیا تھا تاکہ گیتا اور رانی ا دوران میں خود کو استوار کرسکیں۔ سب انہیں طرح ط قائل کرتے رہے ہوں گے۔ گیتا اور رانی خاموش ہوگئیں اپنے دل کا حال کچھ وہی جانتی ہوں گی۔ دلیل غم کا علاج ہے، دلیل کوئی تریاق نہیں ہے۔

جمرو میرے ساتھ تھا۔ مارٹی سے میں نے کہہ دیا تھ کوئی پوچھے تو کہہ دینا، میں سیدھا ابا جان کی کوٹھی پر جاؤں گا۔ جمرو اور میں سہ پہر تک سڑکوں پر گھومتے ر کھانا بھی ہم نے ایک ہوٹل میں کھایا۔ کچھ دن کا وقت اور کچھ اتفاق، راستے میں کئی جگہ اڈے پاڑے کے لو سے ہماری مڈبھیڑ ہوئی۔ مجھے علم نہیں تھا کہ بمبئی میں ا چھپانے کی مشکل بھی پیش آئے گی۔ وہ میرے لیے اجنب مگر میں ان کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ مجھے دیکھ کے د ہوئے میرے پاس آتے۔ میں سلام دعا کے سوا ان سے بات نہ کرتا، اس طرح ان سے جلد چھٹکارا مل جاتا۔

شام کو پانچ بجے ہم ابا جان کی وسیع و عریض کو ٹھ داخل ہوئے۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کسی اور جگہ آگیا وہاں سب کچھ بدلا ہوا تھا۔ سفید اور لال اینٹوں کے رنگین امتزاج سے عمارت کسی مغل محل کا حصہ نظر آتی تھی۔ چمکتے ہوئے نیلگوں شیشے، کھڑکیوں پر لہراتے ہوئے ریشمی پردے، اردگرد ترشا ہوا، دھلا ہوا سبزہ، عمارت کے سامنے سبزے کے چوڑے دائرے میں فوارہ ابل رہا تھا۔ لگتا تھا، رات دن لوگ کام کرتے رہے ہیں۔ دولت ہو تو آدمی کو کیا کمی، دولت وقت پر بھی حاوی آجاتی ہے۔ کسی نے کہا ہے، دولت مند آدمی زیادہ وقت گزارتا ہے، دگنی، تگنی، دس گنی زندگی۔ بہت سوں کو ایک جیسا وقت ملتا ہے پر سب ایک جیسا وقت نہیں گزار پاتے۔ زندگی کا طور ہر ایک سے جدا ہے، کسی کو کم وقت ملے اور زندگی اس پر مسلسل مہربان رہے، کسی کو بہت وقت ملے اور زندگی اس سے مستقل روٹھی رہے۔ زندگی کی پیمائش کے لیے وقت کا پیمانہ نہایت فرسودہ اور غیر معیاری ہے۔ ابا جان نے ایک محل حیدر آباد میں خریدا تھا، اب ایک بمبئی میں لے لیا۔ زندگی کا اگلا پچھلا بہت سا حساب انہیں بے باق کرتا تھا اور ابا جان کو بہت کچھ وصول کرنا تھا، ایک ایک لمحے کا حساب، امی کا، فہمیدہ کا، اپنے آبائی گھر کا، اعزا و اقربا کا حساب۔ رات کے مقابلے میں دن کے خواب بہت شدید ہوتے ہیں۔ ابا جان نے اس تعبیر کے لیے اپنی عمر کے کتنے سال ارزاں کردیے تھے مگر جتنا بڑا حوصلہ، اتنا بڑا انعام۔ جتنا بڑا داؤ، اتنی بڑی جیت اور جتنا بڑا خواب، اتنی بڑی تعبیر۔ دولت کی بڑی خوبی اس کی زرخیزی ہے۔ اور جیسے زرخیز زمین کے لیے ہنر لازم ہے، دولت کو بھی ایک سلیقہ چاہیے۔ کہتے ہیں، دولت خود سب سے بڑا ہنر ہے۔ سلیقہ خود بہ خود آجاتا ہے۔ ابا جان تو گزشتہ دس سال سے یہی مشق کررہے ہیں۔

پہلی مرتبہ ہم یہاں آئے تھے تو پیرو بھی موجود تھا اور اس نے ابا جان سے کہا تھا کہ بابا! یہ تو پورا محل ہے۔ اس وقت ابا جان نے خواہش ظاہر کی تھی کہ کیا ہی اچھا ہو، پیرو بھی یہیں رہے۔ پیرو نے کسی رد و قدح کے بغیر جواب دیا تھا کہ اس سے بڑی خوشی اس کے لیے اور کیا ہوسکتی ہے۔ نہ ابا جان کی پیش کش تکلفانہ تھی نہ پیرو کی قبولیت رسمی۔ پیرو زندہ ہوتا تو آج شاید یہیں ہوتا۔ ابا جان کی بات ٹالنا اس کے لیے ویسے بھی ممکن نہیں تھا۔ یہ تو اس کے لیے عین راحت کی ت تھی کہ گیتا اور رانی اتنے بڑے گھر میں سب کے ساتھ ں۔ جہاں بٹھل اور ابا جان ہوں، فرخ، فریال، فارہہ اور ین وغیرہ ہوں اور جہاں میں ہوں، ادھر فیض آباد میں ریں کی حویلی میں جاکے وہ بہت مچلتا تھا۔ بٹھل سے اس ، متعدد بار کہا کہ یہاں سے اب کہیں اور جانے کو دل نہیں چاہتا، جی کرتا ہے کہ گیتا اور رانی کو بھی یہیں بلالوں اور یہ بات تو طے ہی تھی کہ وہ کچھ عرصے کے لیے گیتا اور رانی کو فیض آباد بھیج دے گا۔ کاش پیرو کو ذرا سا وقت اور مل جاتا صرف چند روز گیتا اور رانی کو وہ خود یہاں چھوڑ کے جاتا تو بات اور تھی۔

کوٹھی کا خاص دروازہ ایک کشادہ ہال میں کھلتا تھا۔ وہاں کے اطراف کئی دروازے تھے، عمارت کے مختلف حصوں سے آنے کے راستے۔ اوپر کی منزلوں سے آنے کے لیے روایتی چکر وار زینہ بنا ہوا تھا۔ فرش کے وسط میں قالین بچھا تھا اور گنبد کی شکل میں بنی ہوئی اونچی چھت میں بہت بڑا فانوس لٹک رہا تھا۔ گنبد کی گولائی میں ہر طرف شیشے جڑے ہوئے تھے اور پھول پتیاں بنی تھیں۔ ابا جان نے پہلے سے موجود بہت سارے ساز و سامان سمیت عمارت کا سودا کیا تھا۔ نئے رنگ و روغن سے فرنیچر کی شکل نکل آئی تھی۔ ہر چیز ایسی ترتیب سے رکھی تھی جیسے اسی جگہ کے لیے بنی ہو، اسی جگہ کا حصہ ہو۔ وسطی ہال سے عمارت کے دائیں بائیں جانب ترچھی طرز کے دو حصے تھے۔ دونوں حصوں میں دو منزلیں، فرشی اور پہلی منزل کے علاوہ دوسری منزل پر بھی ہوا خوری کے لیے کشادہ سائبان اور چند کمرے بنے ہوئے تھے۔ مولوی اکرم، ان کی بیٹی ریحانہ، جولین اس کی ماں اور چمپا بیگم، ابا جان، فرخ، فریال، فارہہ اور اکبر، گیتا اور رانی کے علاوہ اور بھی کئی گھر کوٹھی میں آباد ہوسکتے تھے اور جیسا کہ ابا جان نے پہلے کہا تھا، سب ساتھ رہ کے بھی الگ رہ سکتے تھے۔ اپنے اپنے گھروں میں اور سب کے ساتھ پیچھے ایک بڑا مہمان خانہ تھا، ملازموں کے کمرے، باغ، گھوڑا گاڑیاں اور موٹر کھڑی کرنے کی جگہیں۔ یہاں پہلے کوئی بڑا خاندان ہی رہتا ہوگا۔ جس نے بھی یہ عمارت بنائی تھی، اس کے پاس صرف دولت نہیں تھی، خیال آفرینی اور خوش ذوقی کی خوبیاں بھی اس کے پاس خوب تھیں جنہیں دولت کے بغیر زنگ لگ جاتا ہے اور جو دولت سے اور پختہ ہوجاتی ہیں۔ ملازموں کی بھی عمارت میں کمی معلوم نہیں ہوتی تھی، بڑے گھروں کی زینت کا ایک سبب ملازم بھی ہوتے ہیں۔ کٹھ پتلیوں کی طرح اشارے پر دوڑتے، یہاں سے وہاں تک تھرکتے پھرکتے ملازم۔

سب لوگ دوپہر ہی کو وہاں پہنچ گئے تھے۔ نچلی منزل کی بڑی نشست گاہ میں فرخ اور شہ پارہ مجھے دیکھتے ہی شکایت کرنے لگیں کہ میں کہاں رہ گیا تھا؟ اتنی دیر کہاں لگادی؟ میرا جواب سنے بغیر فرخ ہمکتے لہجے میں بولی "بابر بھائی! دیکھا آپ نے یہ سارا۔۔۔؟"

"ہاں!" میں نے گہری سانس لے کے کہا "دیکھ رہا ہوں۔"

"سبھی کو پسند آیا ہے۔"

"بہت اچھا ہے" میں نے چاروں طرف نظریں گھماتے ہوئے کہا "کہاں ہیں سب لوگ؟"

"یہاں تو ڈھونڈنا پڑے گا" فرخ مسکراتے ہوئے بولی "ابھی تو کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔ یہ سارا تو بھول بھلیوں سا ہے۔ کہیں دو ایک روز میں راستوں اور دروازوں کا ٹھیک سے اندازہ ہوسکے گا۔"

وہ دونوں سامنے کھلے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔ میں نے بھی ان کی پیروی کی۔ اندر چمپا بیگم' جولین کی ماں' فریال' فارہہ اور ریحانہ بیٹھی تھیں۔ کمرے کی نشست فرشی تھی اور دیواروں سے گاؤ تکیے لگے تھے۔ مجھے دیکھ کے سب اٹھ گئیں۔ غیر ارادی طور پر میری منڈلاتی ہوئی نظریں گیتا اور رانی کی طرف گئیں اور مجھے اپنے سینے' اپنی آنکھوں میں ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ اتنے دنوں بعد دونوں کے چہرے کچھ نکھرے ہوئے نظر آرہے تھے۔ گیتا کو اپنے پاس لپکتے ہوئے آتے دیکھ کے بے اختیار میرے بازو پھیل گئے' میں نے اسے اپنے پہلو میں سمیٹ لیا "کیسی ہو گیتا تم؟" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ میں اس سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا کہ وہ بس حوصلہ قائم رکھے۔ ایک پیرو' اس کا باپ چلا گیا ہے لیکن ابھی بہت سے ہیں اور بے شک وہ پیرو نہیں ہیں' پھر بھی ان میں باقی کوئی کمی نہیں ہے۔ وہ پیرو ہی طرح ان پر اپنا حق جتا سکتی ہے۔ مجھے خیال آیا کہ یہ سب تو کم و بیش میں اس سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ باربار اعادے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر یہ کچھ بھول رہی ہے تو اسے پھر سے سب یاد آنے لگے گا۔ لفظ ہی اظہار کا ایک ذریعہ نہیں ہیں۔ لفظوں کے بعد جس چیز کی ضرورت پڑتی ہے' لفظ نبھانے کی' اصل تو وہی کچھ ہے۔ گیتا میرے پہلو میں سمٹی کھڑی رہی۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔ میں اس سے یہ بھی نہ پوچھ سکا کہ اسے اپنا یہ نیا گھر پسند آیا؟ یہ سوال بھی مجھے قبل از وقت معلوم ہوتا تھا۔ فرخ نے اس موقع پر میری مدد کی اور تجسس آمیز لہجے میں بولی "بابر بھائی! آپ نے اوپر کی منزل دیکھی؟ پورا باغ ہے۔"

"اچ۔۔۔ چھا" میں نے اشتیاق سے کہا "میں نے اسے نہیں بتایا کہ یہ عمارت میں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔ فرخ ہی نے ہماری رہبری کی۔ اس کے اور گیتا کے علاوہ فریال' فارہہ' ریحانہ اور شہ پارہ بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ فرخ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اوپر کا منظر ہی کچھ اور تھا۔ میں پہلے اس طرف نہیں آیا تھا۔ چھت کے ایک بڑے حصے پر سبزہ بچھا ہوا تھا اور ہر طرف پھولوں کے گملے کثرت سے کھلے تھے۔ درختوں سے جھانکتی ہوئی آس پاس کی بہت سی عمارتیں وہاں سے نظر آتی تھیں اور دور سمندر کے کنارے کی سفید لکیر۔ اوپر آسمان پر بدلیاں چھائی ہوئی تھیں۔ نظارے کی دلکشی پر شام کے وقت کا سحر مستزاد تھا۔ مجھے خیال ہوا ساری عمارت میں اس سے خوب صورت جگہ کوئی نہیں ہوگی۔ سبزے کے پیچھے سائبان میں بیٹھ کے بارش کا لطف لیا جاسکتا تھا۔ سائبان سے ملحق رنگین شیشوں کے روشن دانوں اور محرابوں کی شکل والے دریچوں کے کمرے آگے پیچھے بنے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے سے فاصلے پر اس طرح کہ ہر کمرا جداگانہ حیثیت رکھتا تھا۔ وہ خراماں خراماں ادھر ادھر گھومتی گھامتی' سبزے پر رکھی ہوئی بید کی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ میں ان سے پوچھنے ہی والا تھا کہ اتنے میں جولین آگئی۔ سرتاپا سفید لباس میں' ساڑھی میں وہ ہمیشہ کھنچی ہوئی' تراشی ہوئی سی لگتی تھی۔ سبزے کے رنگ میں اس کے لباس کا سفید رنگ کچھ اور نمایاں ہوگیا۔ جولین بھی نسبتاً ٹھہری ہوئی سی معلوم ہورہی تھی۔ اس کے آجانے سے سب کے چہرے چٹکنے لگے۔ سب نے تپاک سے اس کا خیرمقدم کیا۔ جولین کے اشارے پر ملازم نے چائے کی پیالیاں میز پر سجادیں۔ چائے کے ساتھ پھلوں سے بھرا ہوا طشت بھی تھا۔ فرخ' فارہہ' شہ پارہ مجھے عمارت کے ایک ایک گوشے کی تفصیل بڑی حیرانی سے سناتی رہیں۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ عمارت میں نہانے کا تالاب بھی ہے۔ ٹینس کورٹ بھی ہے' ایک گھوڑا گاڑی بھی پچھواڑے کی طرف کھڑی ہے۔ اتنی جلدی انہیں باغ میں درختوں کی اقسام بھی معلوم ہوچکی تھی۔ ان کی آسودگی کے لیے میں پورے انہماک سے سنتا رہا۔ اندھیرا ہونے پر بڑے بڑے قمقمے روشن ہوگئے۔ نزدیک و دور عمارتوں کی روشنیاں بھی جل گئیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہم ستاروں کے جھرمٹ میں بیٹھے ہوں مگر اول شب ہی اوس پڑنے لگی۔ خنکی بھی زیادہ تھی اس لیے ہم وہاں سے اٹھ آئے۔ جولین کو رات کے کھانے کا انتظام دیکھنے کی بے چینی ہورہی تھی۔ وہ کئی بار اٹھی' ہر بار اسے انہوں نے روک لیا تھا۔

اس رات کیلاش بھی آگیا۔ دو روز سے میں اس کی راہ تک رہا تھا۔ تار کی اطلاع کے مطابق اسے دو روز پہلے آجانا چاہیے تھا۔ رات ہی میں نے پھر بٹھل سے اشارتاً اپنے اندیشے کا اظہار کیا تھا کہ کیلاش ضرور کسی پریشانی میں گھرا ہوا ہے' کہیں تکلف نہ کررہا ہو مگر بٹھل نے سنی ان سنی

کردی تھی۔ دوپہر کو بھی میں اور جمرو احتیاطاً اس کے گھر کی طرف گئے تھے' میں نے طے کرلیا تھا کہ اگر آج رات وہ نہ آیا تو صبح میں کسی کو بتائے بغیر پونا نکل جاؤں گا۔ میں جیسے ہی نیچے آیا' شامو مل گیا۔ وہ کیلاش کی آمد کی اطلاع دینے کے لیے مجھی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ نچلی منزل کا یہاں حصہ مردانے کے لیے مخصوص کردیا گیا ہے۔ شامو مجھے اپنے ساتھ اسی طرف لے گیا۔ پہلے ہی کمرے میں سب موجود تھے' ابا جان' منیر علی' مولوی اکرم' جمرو' مارٹی' جگنو۔ سامنے کے تخت پر کیلاش' بٹھل کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ تخت سے اٹھ کھڑا ہوا اور بے تحاشا گلے لگ گیا۔ اس کے بازوؤں کی گرفت اس کی بے تابی کی مظہر تھی "نیا گھر مبارک ہو" اس نے تمتماتی آواز میں کہا۔

"اتنے دن کہاں لگ گئے؟" میں نے شکایتی لہجے میں پوچھا۔

"کیا بتاؤں" وہ آہ بھر کے بولا "بڑی لمبی کہانی ہے۔ آپ بتائیے' کیسا لگا یہ گھر؟ یہ تو' یہ تو بہت عجیب ہے۔ نہایت شاندار' خواب جیسا۔ سب کو یہاں دیکھ کے مجھے بہت خوشی ہوئی۔"

میں نے آنکھیں میچ کے ممنونیت ظاہر کی اور پوچھا کہ یہاں آنے میں اسے کوئی دشواری تو نہیں ہوئی؟"

"ذرا سی' پہلے میں اسی طرف گیا تھا' وہاں تبھی چاچا نے محل پتا بتایا' پھر میں سیدھا یہیں آکے ٹھہرا۔"

"پونا سے کس وقت آنا ہوا؟"

"ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے' نہانے اور کپڑے تبدیل کرنے میں کچھ دیر لگ گئی" وہ تیز آواز میں کہنے لگا "رما بھی آنے کو تیار تھی' میں نے اسے روک دیا۔ پونا میں دن رات سب برابر ہوگئے تھے۔ سچ پوچھئے تو ایک رات بھی ٹھیک سے نہ سوسکے" پھر انگریزی میں بولا "اٹ واز اے ہاری بل ایکس پی رینئنس۔"

"معلوم ہوا تھا' جج صاحب تمہارے عزیز تھے؟"

"عزیز سے بہت زیادہ' عزیز تو دور کے تھے۔ پتا جی سے ان کی بچپن کی دوستی تھی۔ دونوں گھر ایک جیسے تھے۔ پونا میں ان کے تبادلے کے بعد تھوڑی دوری ہوگئی تھی۔"

"کیا بیمار تھے؟" میں نے دبے لہجے میں پوچھا۔

"بیمار تو ایسے نہیں تھے' یہی کہنا چاہیے کہ وقت آگیا تھا۔ رات بالکل ٹھیک تھے' صبح زندہ نہیں تھے۔"

"ایسی کیا بات' دل کا مرض تھا؟"

کیلاش نے یاسیت سے سر ہلایا' ایک لمحے تذبذب کے بعد کھوئے ہوئے لہجے میں بولا "کچھ ایسا ہی۔"

اس سے پہلے کہ وہ کچھ بتاتا' بٹھل نے اس سے بیٹھ جانے کو کہا۔ ہم دونوں کو احساس ہی نہیں رہا کہ اور لوگ بھی موجود ہیں اور سب کی نظریں ہم پر مرکوز ہیں۔ ہم دونوں بٹھل کے پاس ہی تخت پر بیٹھ گئے لیکن ہمیں فوراً اٹھنا پڑا۔ کھانے کا وقت ہوگیا تھا۔ جولین نے آکے بتایا تو سبھی اٹھ گئے۔ میرا خیال تھا کہ عمارت کی مناسبت سے کھانے کے لیے بھی اب میز کرسی کا اہتمام ہوگا مگر ایسا نہیں تھا۔ قریب کے ایک کمرے میں فرش پر دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ صرف اتنا فرق تھا کہ دو ملازم مضطرب انداز میں تیار کھڑے تھے۔ گو جولین اور شہ پارہ نے انہیں ہاتھ پاؤں ہلانے کا موقع کم ہی دیا۔ کھانے میں بھی کوئی ایسا تکلف نہیں تھا۔ کیلاش بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گیا' میرے بالکل برابر' مجھے کچھ گمان ہوا کہ کیلاش پوری طرح شامل نہیں ہے یا مجتمع نہیں ہے۔ میں نے پہلے اسے سفر کی تھکن پر محمول کیا۔ اس نے کیے بعد دیگرے سب سے سلام دعا کی تھی' گیتا اور رانی سے بطور خاص۔ اس کی نشست و برخاست میں نہ شائستگی کی کمی تھی نہ لب و لہجے میں سرگرمی کی کمی۔ تاہم کوئی بات ضرور تھی۔ ممکن ہے میری طرح اوروں نے بھی یہ محسوس کیا ہو۔ آج اس میں پہلے جیسی بے ساختگی نہیں تھی۔ وہ کسی کوشش میں مصروف نظر آتا تھا' مہذب آدمیوں کا طور ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے خیال سے اپنا سارا غبار و فشار خود تک محدود رکھتے ہیں' دوسرے کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتے۔

کھانے کے بعد جیسے ہی سب دسترخوان سے اٹھ کے منتشر ہوئے' میں نے اسے باہر چلنے کا اشارہ کیا اور اس سے پہلے کہ جمرو اور شامو میں سے کوئی دانستہ نادانستہ ہمارے پیچھے آتا' میں اسے عمارت کے پچھواڑے لے گیا۔ باغ کے نزدیک ہمیں نسبتاً ایک خاموش جگہ مل گئی۔ "لگتا ہے' سب کچھ ٹھیک نہیں ہے" میں نے کسی تمہید کے بغیر اس سے کہا "مناسب ہو تو مجھے کچھ بتاؤ۔" اس نے پھیلی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور بھنچی ہوئی آواز میں بولا "چھپانے کی کوئی بات نہیں ہے اور آپ سے کیا چھپانا۔"

"اتنے دن تمہارے نہ آنے سے طرح طرح کے اندیشے گھیرے رہے۔ میں تو آرہا تھا مگر بٹھل بھائی نے روک دیا۔"

"میں نے بھی کئی بار سوچا کہ آپ کو تار دے دوں لیکن پھر یہ خیال کرکے رہ گیا کہ آپ کی ضرورت یہاں زیادہ ہے۔"

"ایسا بھی کیا' یہاں بہت سے لوگ تھے' بٹھل بھائی نے تو اس وجہ سے منع کر دیا تھا کہ کوئی ایسی ویسی بات ہو گی تو تم کوئی جھجک محسوس نہیں کرو گے" میں نے نرمی سے کہا "بات کیا ہے؟"

"یوں تو لمبی داستان ہے" وہ بوجھل آواز میں بولا "جج صاحب طبعی موت نہیں مرے' انہیں زہر دیا گیا تھا۔"

"زہر!" میں اچھل پڑا "تمہارا مطلب ہے یہ۔۔۔؟"

"ہاں' یہ ایک صاف سا قتل کا واقعہ ہے۔"

"ارے!" میں نے سٹپٹا کے کہا "مگر کس نے اور کیوں؟"

"کچھ نہیں معلوم' رات کو وہ روزانہ کی طرح اسٹڈی کر کے سوئے تھے۔ صبح دیر ہو گئی' وہ نہیں اٹھے تو نوکروں کو پریشانی ہوئی۔ انہوں نے ڈاکٹر کو بلایا مگر کچھ رکھا نہیں تھا۔"

میں خاموش بیٹھا اس کی صورت تکتا رہا۔

"ہم ذرا دیر سے پہنچے تھے۔ پوسٹ مارٹم کیا جا چکا تھا اور ڈاکٹروں نے زہر کی قسم کے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔ دوسرے دن صبح کریا کرم کر دیا گیا۔"

"مگر کس نے؟" میں نے اضطراب سے پوچھا "آخر کون ان کا دشمن تھا؟"

"پولیس کا خیال ہے' تمام مجرم کسی بھی با اصول' انصاف پسند جج کے دشمن ہوتے ہیں۔ ان کی عدالت میں سیاسی قیدیوں کے بھی مقدمات تھے اور قتل و خون کے مجرموں کے بھی۔ گوروں کے خلاف آزادی کی جنگ لڑنے والوں کے بیشتر مقدمات میں ان کا فیصلہ قانون کے مطابق تھا اور سرکار کے حق میں جاتا تھا۔ وہ جج کی کرسی پر بیٹھ کے اپنے آپ کو بالکل بھول جاتے تھے' صرف قانون بن جاتے تھے۔ نجی زندگی میں بھی وہ بہت اصول پسند تھے۔ پتا جی کے سوا کسی سے ان کی دوستی نہیں تھی۔ پتا جی کے جانے کے بعد وہ سب سے بالکل الگ تھلگ ہو گئے تھے۔ صبح و شام لائبریری میں بیٹھے رہتے۔ دو پشتوں سے وہ بڑے رئیس تھے۔ کسی زمانے میں گوروں نے ان کے دادا کے کسی کارنامے سے خوش ہو کے انہیں بڑی جاگیر بخشی تھی' وہ ساری کی ساری ان کے باپ کے حصے میں آئی۔ باپ نے اور اضافہ کر کے یہ ترکہ اپنے دو بیٹوں کو منتقل کر دیا۔ جج صاحب کے چھوٹے بھائی اپنے حصے کی رکھوالی نہ کر سکے اور تقریباً سب کچھ ہاتھ سے نکل گیا۔ جج صاحب نے اپنے بھائی کو سنبھالا دینے کی بہت کوشش کی لیکن جب کسی کی قسمت ہی ساتھ نہ دے تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔ جج صاحب کی اولاد میں ایک بیٹی' دو بیٹے ہیں۔ بڑا بیٹا تعلیم کے لیے لندن گیا تھا۔ وہاں اس نے کسی فرنگن سے شادی کر لی۔ جج صاحب ایسے ناراض ہوئے کہ پھر بیٹے کی شکل بھی دیکھنا گوارا نہیں کیا۔ دوسرا بیٹا ایک دو برس پہلے انگلستان سے پڑھ کے آیا ہے اور دلی میں سول سروس کے امتحان کی تیاری میں مصروف ہے۔ بیٹی سب سے چھوٹی ہے' پہلے بمبئی میں' پھر پونا میں پڑھتی رہی' ان دنوں شملہ میں تھی۔ جج صاحب کی موت کے وقت تینوں میں سے کوئی ان کے پاس نہیں تھا۔ بڑے کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ بعد میں دلی اور شملے سے دونوں بھائی بہن آ گئے۔ جج صاحب کی بیوی شروع ہی میں ان سے جدا ہو گئی تھیں۔ تینوں بچوں کو جج صاحب نے ماں کی طرح پالا پوسا تھا اور ادھر تا جی نے ان کا بوجھ بانٹ رکھا تھا۔ جج صاحب مجھے اور رما کو بھی اپنی اولاد کی طرح سمجھتے تھے۔ رما کو تو وہ بہت پسند کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ رما کو دیکھ کے مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں رہتی' بہرحال۔۔۔" کیلاش رک گیا۔ شاید اسے احساس ہوا تھا کہ کہیں وہ غیر ضروری باتیں تو نہیں کر رہا ہے یا اسے میری توجہ کی کمی کا شک گزرا ہو گا۔ اس نے بس ایک لمحے توقف کیا اور گھٹی ہوئی آواز میں بولا "پولیس کا خیال ہے' دولت مند کے رشتے دار بھی کچھ کم اس کے دشمن نہیں ہوتے۔ سو ان کا شبہ سب پر تھا' خصوصاً بیٹے' بھائی' بھائی کی اولاد اور مجھ پر۔۔۔"

"تم پر!" میں نے حیرت سے کہا "تم پر کیوں؟"

"موت سے چند روز پہلے جج صاحب نے وصیت لکھی تھی۔ انہوں نے اپنی جائداد وغیرہ چار برابر حصوں میں تقسیم کی ہے۔ بڑے بیٹے کا نام وصیت میں نہیں ہے۔ چار حصوں میں سے ایک چھوٹا بیٹا اور بیٹی' دوسرے دو حصے میرے اور رما کے نام ہیں۔"

"خوب! اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تم دونوں سے کس درجے محبت کرتے تھے۔"

"بے شک' انہوں نے دو گھروں کو بھی دو گھر نہیں جانا مگر۔۔۔" وہ ہچکچاتے ہوئے بولا "مگر وصیت میں انہوں نے ایک شرط رکھی ہے۔"

"کیسی شرط؟"

"وصیت کے مطابق ان کے بیٹے کمل سے رما کی اور ان کی بیٹی کوشلی سے میری شادی کی صورت میں ہم ترکے کے حق دار رہوں گے ورنہ نہیں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے الجھ کے کہا "ورنہ؟"

"ورنہ سرکار کے حوالے۔"

"یہ کیسی بات ہے؟"

"انہوں نے وصیت میں لکھا ہے' ان کی خواہش ہے کہ دونوں گھر ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں اور سب ایک گھر میں محفوظ رہیں۔ سوچنے کے لیے انہوں نے اپنی موت کے بعد پورے ایک سال کا وقت دیا ہے۔ سال بھر جائداد جوں کی توں رہے گی اور نقدی منجمد ہو گی۔ بیٹی اور بیٹے کے اخراجات کے لیے انہوں نے ایک لاکھ روپے کی رقم چھوڑی ہے اور ڈیڑھ لاکھ روپے مزید کوشلی کے لیے الگ رکھے ہیں۔ اگر کوشلی کی شادی مجھ سے نہ ہو سکی تو یہ رقم کوشلی کے جہیز اور شادی کے اخراجات میں صرف کی جائے گی۔ اس سارے کام کی نگرانی کے لیے انہوں نے اپنے ایک پارسی دوست جسٹس ڈین شا کو ٹرسٹی مقرر کیا ہے۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ یہ سب کچھ تو عجیب و غریب ہے۔" میں نے بے ربطی سے کہا۔

"جج صاحب کی وصیت کا علم ان کی موت کے بعد ہوا۔ جسٹس ڈین شا نے تیسرے روز ہمیں جمع کیا اور وصیت کے کاغذات دکھائے۔"

"کمل اور کوشلی کیا کہتے ہیں؟"

"کیا کہتے' دونوں چپ تھے۔"

"اور۔۔۔ اور رما؟"

"اس کا بھی یہی حال تھا' بالکل گم صم' ہم کبھی سوچتے ہی نہیں کہ ہمارے عزیز ترین رشتے ناتے کیسے ناپائیدار ہوتے ہیں۔ رما کے لیے تو وہ مثال تھے۔ ہر مہینے' ڈیڑھ مہینے بعد رما ان سے ملنے کے لیے پونا جاتی تھی اور تین چار دن ان کے ساتھ گزار کے آتی تھی۔ پچھلے سال سے جج صاحب کو دل کی شکایت ہو گئی تھی۔ رما کچھ اس لیے بھی باقاعدگی سے انہیں دیکھنے جاتی تھی اور ان پر حکم چلاتی تھی کہ وہ کھانے پینے' چلنے پھرنے' سونے اور مطالعے کے شیڈول پر نہیں چلیں گے تو سزا کے طور پر وہ ان سے ناراض ہو جائے گی۔ جج صاحب نہایت پابندی سے اس کی بات پر عمل کرتے تھے۔ ہر معاملے میں قاعدہ قانون تو ویسے بھی ان کی زندگی میں شامل تھا۔ گورے افسروں سے ان کے اچھے تعلقات تھے اور وہ علاج کے لیے انہیں انگلستان بھیجنا چاہتے تھے۔ جج صاحب کچھ تیار نہیں تھے۔ احتیاط اور علاج سے وہ یہیں خاصے بہتر ہو گئے تھے۔ عدالت کا بھی ناغہ نہیں کیا۔ رما بہت پر امید تھی اور اب وہ انگلستان جانے کے لیے ان پر زور نہیں دیتی تھی مگر اچانک سب کچھ اجڑ گیا۔ رما کا حال پھر آپ جان سکتے ہیں' کمل اور کوشلی تو یوں بھی جج صاحب کا خون ہیں۔ کوئی تصور نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اس طرح سب سے بچھڑ جائیں گے۔ کوئی راون انہیں ہم سے جدا کر دے گا۔ سبھی گنگ تھے کہ یہ کیا ہو گیا۔ کچھ دکھائی سجھائی نہیں دیتا تھا' کون کسے سنبھالے' دوسری طرف دیکھے یا خود پر نظر رکھے۔" کیلاش کی آواز رندھنے لگی۔ میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے صبر کی تلقین کرنی چاہی تو وہ اور اجڑ سا گیا' کہنے لگا "ادھر پولیس نے پریشان کرنا شروع کر دیا' پھر یہ وصیت نامہ۔ جسٹس ڈین شا کو بھی اپنا فرض ادا کرنے کی بہت جلدی تھی۔"

"پولیس کیوں؟ اسے کسی بات پر شبہ تھا؟"

"آپ تو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں پولیس کیسی۔۔۔" معاً وہ سٹپٹا گیا اور ندامت زدہ لہجے میں بولا "معاف کیجئے' میرا مطلب ہے' پولیس کے تو اپنے طور تیور ہوتے ہیں۔"

"تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ میں یقیناً پولیس کو تم سے زیادہ جانتا ہوں' آئے دن ان سے واسطہ پڑتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ انہیں جج صاحب کے اتنے قریب لوگوں پر آخر کیوں شبہ تھا؟"

"ان کے تجربے کی بات ہو گی' ایسا اندھیرا انہوں نے پہلے بھی دیکھا ہو گا جبھی۔۔۔ پولیس افسروں کے بقول انہیں ہر طرف نظر رکھنی پڑتی ہے۔ کہتے تھے 'اگر ہم نے ان کی مدد نہ کی تو وہ اصل مجرم تک شاید نہ پہنچ سکیں۔ سنا تھا' اوپر سے پولیس پر بہت دباؤ ہے۔ تفتیش میں گورے افسروں کی شمولیت کی وجہ سے پولیس خاصی چوکس ہو گئی تھی اور بدحواس بھی۔ ان کے کہنے کے مطابق' جج صاحب کی عدالت میں پیش ہونے والے تمام اگلے پچھلے مقدموں کی چھان بین کی جا رہی ہے اور ایسے تمام مجرموں کی فہرست الگ بنائی گئی ہے' جنہیں جج صاحب کی عدالت سے سخت سزائیں ملی تھیں یا جن کے فیصلے ہونا ابھی باقی ہیں اور انہیں جج صاحب سے کسی رعایت کی توقع نہیں تھی۔ جیسا کہ میں نے آپ کو پہلے بتایا' پولیس کے خیال میں درپردہ تحریکوں کے انقلابی بھی جج صاحب سے ناراض ہو سکتے ہیں۔ جج صاحب بہرحال ان کی راہ میں رکاوٹ کا سبب بنے ہوئے تھے۔ جج صاحب کے بے لچک فیصلوں سے انتہا پسند سیاسی کارکنوں کی حوصلہ شکنی ہوتی تھی اور آزادی کی جدوجہد متاثر ہوتی تھی۔ کچھ افسروں کی رائے میں ذاتی رنجش بھی اس قتل کی وجہ ہو سکتی ہے۔ جج صاحب کی بے اندازہ دولت پولیس کے شبہے کی بنیاد ہے۔ اپنے کسی عزیز کی دولت قریبی رشتے داروں کو زیادہ کھٹکتی ہے۔ جبھی انتقام اور لالچ کے بدترین واقعات رشتے داروں کے مابین کثرت سے ہوتے ہیں۔ لندن میں مقیم جج صاحب کا بڑا بیٹا بھی اپنا حصہ وصول کرنے کے لیے' وہیں بیٹھے بیٹھے

باپ کو ختم کرنے کا انتظام کرسکتا ہے۔ جج صاحب اپنی اولاد کو ہمیشہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا درس دیا کرتے تھے۔ تعلیم اور لگے بندھے ضروری اخراجات کے علاوہ اولاد پر مزید ایک پائی خرچ کرنے کے روادار نہیں تھے۔ بارہا انہوں نے بیٹوں اور بیٹی کو جتایا تھا کہ میرا کام تمہیں اعلیٰ تعلیم دلانے کے بعد ختم ہوجاتا ہے۔ باقی تمہیں خود سب کرنا ہے۔ کئی بار انہوں نے ٹرسٹ بنانے کی خواہش کا اظہار بھی کیا تھا۔ ٹرسٹ بنانے کا مطلب لاکھوں روپے کی جائداد سے اولاد کی محرومی تھی۔ پولیس اس پہلو پر غور کررہی تھی کہ باپ کو اس اقدام سے باز رکھنے کا سودا تو کسی کے سر میں نہیں سماگیا۔ پاگل پنے کے لیے کوئی وقت تو طے نہیں ہے' کسی وقت بھی کسی کا دماغ پھر سکتا ہے۔"

"وہ تو سب ٹھیک ہے۔" میں نے اضطراب سے کہا "مگر تم کہہ رہے تھے کہ پولیس کو تم پر بھی شبہ تھا۔"

"ہاں' وہی میں آپ کو بتا رہا تھا۔" وہ شکستہ لہجے میں بولا "یہ سوال میں نے ایک پولیس افسر سے بھی کیا تھا' اس نے مجھ سے معذرت چاہی اور کہنے لگا کہ بعض اوقات ہمیں بہت سے مفروضے سامنے رکھنے پڑتے ہیں۔ شریف آدمیوں کے گریبان پر ہاتھ ڈالنا پولیس کے لیے کوئی پسندیدہ کام نہیں ہے لیکن کیا کریں' پولیس کو مروت راس نہیں آتی۔ ظاہر ہے' کوئی ایک ضرور مجرم ہے۔ وہ مجھ سے پوچھنے لگا کہ آپ ہی بتائیے پھر ہم کون سا طریقہ اختیار کریں۔ اس نے بتایا کہ میں اور رما پولیس کی نظروں سے محفوظ کیوں نہیں ہیں۔ کوئی بعید نہ تھا کہ ہمیں جج صاحب کی وصیت کا پہلے سے علم ہو۔ جج صاحب کی اس فیاضی کا ہم نے کبھی خواب میں بھی تصور نہیں کیا ہوگا۔ گھر بیٹھے کسی کو اتنی بڑی دولت ملنے کا آسرا ہوجائے تو وہ یہ آسرا اور یقینی بنانے میں کوئی جتن باقی نہ چھوڑے گا۔ پولیس افسر نے مجھ سے کہا۔ فرض کیجیے کہ وہ آپ نہیں ہیں' آپ کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہے اور اسے کسی طرح وصیت کا علم ہوجاتا ہے تو اس کا یہ خدشہ قطعاً بے جا نہیں ہوگا کہ جج صاحب کا..... کسی وقت غیر معمولی حادثہ جج صاحب کے فیصلے میں ردوبدل کا باعث بن سکتا ہے۔ وہ ایک قانونی آدمی تھے۔ وصیت بدلنے کے لیے کوئی قانونی عذر تلاش کرنا ان کے لیے مشکل نہیں تھا اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ وصیت پر جج صاحب کی زندگی کے بعد عمل ہونا تھا۔ چنانچہ میرے اور رما کے دماغ میں جج صاحب کی زندگی کی موت کم کرنے اور وصیت یقینی بنانے کا سنگدلانہ خیال آنا بعید از امکان نہیں تھا۔ پولیس افسر کے کہنے کے مطابق قتل کے لیے آسمان سے کوئی اور مخلوق نہیں اترتی' ہم ہی جیسے لوگ قتل کرتے ہیں اور کوئی شخص ہر وقت قاتل نہیں ہوتا۔"

"تم نے اس سے نہیں کہا کہ تمہیں دولت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے پاس خود....." میں نے تلخی سے کہا اور مجھے فوراً احساس ہوا کہ میں فضول بات کررہا ہوں۔

"میں نے اس سے پہلے بہت کچھ کہا لیکن وہ اپنی جگہ قائم رہا۔ پولیس نے جج صاحب کی موت سے پہلے بمبئی میں ہماری مصروفیات' جج صاحب کے ملازموں سے ہمارے تعلق' ہمارے کردار اور مشاغل کے بارے میں نہایت شرمناک سوالات کیے۔ رما تو بالکل ڈھے گئی' ایک موقع پر وحشت میں اس نے ایک پولیس افسر کو ڈانٹ دیا کہ پولیس کے جو جی میں آئے کرے' اب وہ کسی سوال کا جواب نہیں دے گی۔ ہم سب نے اسے سمجھایا کہ اس کے اس رویے سے پیچیدگی بڑھ جائے گی لہٰذا بہتر یہ ہے کہ وہ خود کو قابو میں رکھے۔ صرف ہم ہی نہیں تھے' کمل اور کوشلی سے بھی پولیس کا یہی سلوک تھا۔ کسی ملازم سے پولیس کو معلوم ہوا تھا کہ جج صاحب نے حال ہی میں اپنے قلاش بھائی کو مزید مدد کرنے سے انکار کردیا تھا اور ان کے دو بیٹوں کو سخت سست کہا تھا۔ سو جج صاحب کے بھائی اور بھتیجوں سے پولیس کا رویہ اور سفاکانہ تھا۔ ہم سب ایک دوسرے کا منہ دیکھا کرتے۔ ورنہ ہمارے سامنے پولیس ایسے ایسے نکتے وضع کرتی تھی کہ کبھی ہمیں خود ایک دوسرے سے بدگمانی ہونے لگتی۔ ملازموں کو انہوں نے الگ ہراساں کر رکھا تھا۔ باہر پولیس والوں کو کوئی سراغ نہ مل سکا' وہ گھوم پھر کے جج صاحب کے گھر آجاتے اور ہم سب کو کریدنے' کھکھوڑنے لگتے۔ میرے اور رما کے ڈاکٹر ہونے اور جج صاحب کو دیے جانے والے زہر میں بھی انہوں نے ایک نسبت ڈھونڈ ماری۔ ان کا کہنا تھا کہ وقوعے کے روز واردات کی جگہ قاتل کا موجود ہونا ضروری نہیں' یہ کام تو اپنے کسی معتمد اہلکار سے بھی انجام دلوا سکتا ہے۔" کیلاش اپنا مافی الضمیر ادا کرنے میں مشکل پیش آتی تو وہ انگریزی سہارا لیتا۔ وہ بظاہر بہت سمٹا ہوا' بندھا ہوا بیٹھا تھا لیکن اس کی آواز بکھر بکھر جاتی۔ کہنے لگا "ہمیں ایسا تجربہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس سے زیادہ اذیت کی بات کیا ہوگی کہ وہ ہم پر شک کررہے تھے۔ جو شخص ہمیں جان سے زیادہ عزیز تھا' وہ ہم اس کی موت کا الزام عائد کرنے کے لیے بے چین نظر آتے تھے' یہ سب کچھ بہت عذاب ناک تھا۔ ستم یہ تھا کہ وہ اس سوہان روح رویے پر بار بار شرمندگی کا اظہار بھی کرتے تھے۔"

"مگر یہ کیسی بات ہے' تم نے اتنی باتیں اس آسانی سے کیسے سن لیں؟" کوشش کے باوجود میں اپنے لہجے کی تلخی دور نہ کرسکا "تم نے مجھے کیوں نہیں بلایا؟ کچھ اور نہیں تو اس مشکل وقت میں' میں تمہارے قریب رہتا' تمہارا بوجھ کسی قدر ہلکا کرنے کا سبب بنتا اور شاید پولیس سے بات کرنے میں تمہاری کچھ مدد کرپاتا۔"

"ہمارے ساتھ آپ بھی پریشان ہوجاتے' آپ آتے تو وہ آپ کو بھی ہم میں شامل کرلیتے۔"

"پھر کیا ہوتا؟" میں نے تندہی سے کہا "مجھ پر کیا اثر پڑتا! مجھے حیرت ہے کہ تمہیں پہلے ہی' جب انہوں نے تم پر شبہ ظاہر کیا تھا' کہنا چاہیے تھا کہ وہ صاف صاف الزام عائد کریں' ہم قانونی چارہ جوئی کا حق محفوظ رکھتے ہیں۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔"

"آپ درست کہہ رہے ہیں لیکن ذرا سوچیے' ان دنوں ہماری کیا حالت ہوگی۔ سب کچھ اچانک ہوا تھا' پولیس کی آمد اور پوچھ گچھ' وصیت کا انکشاف۔ جج صاحب کی موت کا صدمہ کیا کم تھا کہ اس افتاد نے سب کو بدحواس کردیا تھا۔ پولیس کا کیا جاتا ہے۔ سب بڑوں نے یہی مشورہ دیا کہ بہتر ہے' پولیس کی غلط فہمی گھر کے اندر ہی دور ہوجائے' گھر کی بات باہر نہ جائے۔ ہوگا تو کچھ نہیں مگر رسوائی بہت اٹھانی پڑے گی' جج صاحب کے خاندان کی رسوائی۔ جب تک لوگ حقیقت جانیں گے تب تک جانے کیسی کیسی باتیں عام ہوجائیں۔ پولیس تو بعد میں بڑی معصومیت سے معافی مانگ لیتی' معذرت کے دو بول' بول کے الگ ہوجاتی۔ ماتاجی خاص طور پر سب کو روکتی رہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ پولیس سے ہم نے تعاون کیا ہے۔ ان کی ہر بات کا تحمل سے جواب دیا ہے' اس لیے جلد ہی وہ مطمئن ہوجائیں گے یہ وقت گزر جائے گا۔"

"پولیس تحمل کا کبھی کبھی غلط مطلب بھی لینے لگتی ہے۔"

"یہی ہوا' عاجز آکے ہمیں ان سے کہنا پڑا کہ وہ ان بے سروپا تاویلوں' آزار سوالوں سے اجتناب کریں اور یہی کرنا ہے تو ہمیں حوالات بھیج دیں۔ اب جواب ہم وہیں دیں گے۔ آخر ان کے لہجے میں کچھ نرمی آئی یا وہ خود مایوس ہوگئے تھے' انہیں کوئی شکن جو کہیں نظر نہیں آئی تھی۔ یوں سمجھیے کہ اتنے دن تک ایک طرح سے گھر میں نظر بند رہے۔ میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ میں تو پہلے چلا آتا لیکن انہوں نے مجھے اور رما کو روک لیا تھا۔ آخر میں نے ان سے کہا کہ میں ایک اسپتال سے وابستہ ہوں اور آج مجھے بہرحال واپس جانا ہے۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ رما کا برا حال تھا۔ میں رما کو ساتھ لے آیا۔ ماتاجی اور چھوٹی انو وہیں ہیں۔"

اس کے چپ ہوجانے پر میں بے سدھ سا بیٹھا رہا۔ کئی باتیں میرے دماغ میں گردش کررہی تھیں مگر مجھے مباحثے اور نکتہ چینی سے اجتناب کرنا چاہیے تھا۔ اس طرح وہ الجھنے لگتا۔ اس وقت تو مجھے اس کی دل جوئی کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔ مجھے مناسب لفظ نہیں مل رہے تھے۔ ایسے لفظ شاید سب سے مشکل ہوتے ہیں' آدمی کو یاد نہیں رہتے۔ تا دیر خاموشی رہی پھر دماغ مجھے رما کا خیال آیا "رما' اب کیسی ہے؟" میں نے بظاہر ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"یہاں آکے تو ایسا محسوس ہورہا ہے کہ ہم کسی قید خانے سے نکل آئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اتنے دنوں بعد آج رما کچھ سکون سے سوسکے گی۔"

"واقعی تمہارے لیے یہ سب کچھ بہت اذیت ناک ہوگا۔" میں نے زیرِ لبی سے کہا "مگر خیر' جو ہونا تھا' ہوگیا۔ برا وقت گزر گیا' اسے ایک برا خواب سمجھ کے تمہیں سب کچھ بھول جانا چاہیے۔"

"ہاں۔" اس نے ڈوبتی آواز میں کہا "یہی مناسب ہے۔" اس کے لہجے میں بہت بے یقینی اور ناتوانی تھی۔

میں نے پوچھا "کیا تم فکر مند ہو کہ وہ دوبارہ تمہیں پریشان کرسکتے ہیں؟"

"نہیں' ایسی کوئی بات نہیں۔"

"بے شک وہ دوبارہ آسکتے ہیں۔ اتنا کچھ سن کے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا شبہ گہرا تھا۔ کوئی اور جگہ ہوتی تو وہ یہ لحاظ و مروت قطعاً نہ کرتے' اپنے طریقوں سے بات کرتے۔ پولیس مجرم سے بھی آدمی دیکھ کے بات کرتی ہے۔ ان کی تاویلیں جیسا کہ تم نے بتایا ہے' ایسی خام بھی نہیں تھیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ انہیں ان کا معقول جواب مل گیا ہوگا۔ ممکن ہے' وہ پھر آجائیں لیکن ہوا میں وہ کب تک تیر چلاتے رہیں گے۔ کاغذ کی ناؤ تو کاغذ ہی کی ہوتی ہے۔ تھک ہار کے آخر انہیں لوٹ جانا ہے۔ رہا بدنامی وغیرہ کا اندیشہ تو راہ راست پر چلنے والوں کو اس کی ایسی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ تمہیں کم سے کم اپنا اطمینان تو حاصل ہے اور تمہارا ہی اطمینان سب سے بڑی چیز ہے۔"

"ہاں' آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" وہ گہری سانس لے کے بولا "لیکن یہی کچھ تو نہیں۔"

"اور کیا ہے؟"

"وہ وقت تو جیسے تیسے گزر گیا لیکن آگے کچھ کم آزمائش

نہیں ہے۔"

"کیسی آزمائش!" میں نے تنک کر پوچھا۔

"آپ نے غور نہیں کیا۔" وہ جکڑی ہوئی آواز میں بولا "جج صاحب بھی تو بیڑیاں ڈال گئے ہیں۔"

"نہیں! ایسا کیوں کہتے ہو۔ تم دونوں بھائی بہنوں سے وہ اپنی محبت اور شفقت کا اس سے بڑا ثبوت کیا دے سکتے تھے؟"

"لیکن انہوں نے سب کچھ منتشر کردیا۔"

"کیا؟ تمہیں یہ سب کچھ اچھا نہیں لگا؟"

"ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔"

"کیا جج صاحب یہ بات نہیں جانتے تھے۔ وہ ایک دوربین شخص تھے' انہوں نے یقیناً کچھ سوچ سمجھ کے یہ فیصلہ کیا ہوگا' اپنی اور تم سب کی خوشی کے لیے۔"

"صرف اپنی خوشی کے لیے' کاش وہ ایک بار ہم سے بھی پوچھ لیتے۔"

"یوں سمجھو کہ وہ تم پر اپنا حق سمجھتے تھے۔"

"تو وہ ویسے ہی حکم دے سکتے تھے' کسی شرط کے بغیر۔"

"تعمیل تو تمہیں ویسے بھی کرنی پڑتی' شرط تو انہوں نے یوں ہی رکھ دی۔ تم اسے ان کی طرف سے ایک تحفہ بھی سمجھ سکتے ہو۔"

"ایسا نہیں ہے۔" اس کی آواز میں ترشی آگئی "آپ کیوں نہیں سمجھ رہے' ہم یہ نہیں چاہتے تھے۔"

"لیکن اس میں حرج بھی کیا ہے۔"

"کوشلی بہت اچھی لڑکی ہے' صورت تعلیم اور کئی اعتبار سے اچھی لیکن میں نے اس کے لیے کبھی اس طرح نہیں سوچا تھا۔ شاید اس نے بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ ایک بالکل مختلف لڑکی ہے۔ اس کی فکر اور انداز میری افتاد طبع سے مطابقت نہیں رکھتے۔ یہی صورت رما کے ساتھ ہے۔ اس نے بھی کمل کے بارے میں کبھی اس طرح نہیں سوچا تھا۔ عمر' خاندان' تعلیم اور تہذیب کے سوا ان دونوں میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔"

"ایسا ہے تو تم انکار کرسکتے ہو؟"

"کیسے کرسکتے ہیں؟"

"کیوں' کوئی چیز قبول کرنا نہ کرنا تمہارے اختیار میں ہے۔"

"آپ نے شاید توجہ نہیں کی' ہم تو انکار کردیں گے لیکن ان دونوں پر کیا گزرے گی' کمل اور کوشلی پر؟ ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ اپنے باپ کی خواہش پر عمل کریں اور ہمیں بھی اس پر مجبور کریں۔"

"ان سے تمہاری کوئی بات ہوئی؟"

"موقع ہی کہاں ملا۔ سوگ کی فضا تھی۔ عزاداروں آرجار تھی' یہ سلسلہ آج تک جاری تھا۔ موت کی رسمیں اور پولیس کی دخل اندازی۔ ایسے میں ان سے کیا بات ہو اور ہم بات بھی کیا کرتے۔ ہمیں معلوم تھا کہ وہ کیا جواب دیں گے۔ ہمارا کیا ہے' ہم انکار کردیں۔ وہ دونوں یا تو اصرا کریں گے یا چپ رہیں گے۔ یہ سوچنا تو ہمارا کام ہے ہمارے انکار کی صورت میں ان کی کتنی بڑی حق تلفی ہوگ ہم انہیں ان کے باپ کی لمبی چوڑی جائداد سے محروم کرد گے' وہ دولت جو نسلیں کو آسودہ رکھ سکتی ہے۔ اس سے محرو معمولی بات نہیں ہے۔ آپ نے اس پیچیدگی پر دھیان نہ دیا۔"

"واقعی' اس کا تو مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا۔ تمہارے پاس کہنے کے لیے کچھ ہے' نہ اس کے پاس۔ ا لیے نہیں تو تمہیں ان کی خاطر یہ سب کچھ قبول کرنا ہوگا۔"

"اور ساری زندگی۔" وہ بے قراری سے بولا " ساری زندگی کا معاملہ ہے۔ ساری زندگی آپ کو اس کے ساتھ بسر کرنی ہے جس سے آپ کوئی رغبت نہ رکھتے۔"

"ہاں۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا "مگر سنا ہے' ر ہوجاتی ہے' ساتھ رہنے سے خود ہوجاتی ہے۔ تم نے بتایا کہ کوشلی ایک مہذب' تعلیم یافتہ اور شکل صورت کی ا لڑکی ہے' ایسی لڑکیاں صرف اپنے گھر' شوہر اور بچوں ہوجاتی ہیں۔ ممکن ہے' ابتدا میں تمہیں مفاہمت میں مشکل پیش آئے گی مگر ایک تعلیم یافتہ لڑکی سمجھ سکتی۔ اس کے گھر کے لیے کون سی بات بہتر ہے۔ کوشلی بہ ایک ہندوستانی لڑکی ہے۔"

"آپ کیسی باتیں کررہے ہیں۔" وہ بچوں کی ناراضی سے بولا "آپ نے اسے دیکھا نہیں' وہ دو مزاج کی لڑکی ہے۔ مجھے وہ پسند نہیں ہے۔"

"ممکن ہے' اس کی بھی تمہارے لیے یہی رائے ہ"

"بالکل' بالکل۔" اس کی آواز اونچی ہوگئی "یہ ممکن ہے بلکہ یہی ہونا چاہیے۔"

"تو مفاہمت اسے بھی کرنی پڑے گی۔"

"مگر ہم دونوں ہی ایسا کیوں کریں گے۔"

"دیکھو نا' کسی مقصد کے لیے کچھ نہ کچھ تو ترک ہے اور شادی تو تمہاری لڑکی ہی سے ہوگی۔ بعد

تمہاری توقع پر پوری نہ اتری یا تم اس کی امیدوں پر پورے نہ اترے تو؟ آدمی بھی موسموں کی طرح بدلتا ہے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ آج جو آدمی۔۔۔"

اس نے مجھے بات پوری کرنے نہیں دی' وحشت سے بولا "آپ سچ بتایئے' میری جگہ اگر آپ ہوتے تو کیا کرتے؟"

"ہاں۔" مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا' میں نے کسمساتے ہوئے کہا "شاید کوئی کسی کی جگہ نہیں لے سکتا۔ ہر آدمی بس اپنی جگہ ہوتا ہے۔"

"میرا مطلب ہے' آپ اس صورت میں۔۔۔"

"میری بات جانے دو۔" میں نے جھنجھناتی آواز میں کہا "شاید میں بھی اسی خلفشار سے دوچار ہوتا۔"

"یہی تو میں آپ سے کہہ رہا ہوں' میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔"

"شروع میں تو وہ بالکل پتھریلی ہوئی تھی مگر اب اس نے فیصلہ کرلیا ہے' اس لیے وہ کسی عذاب میں نہیں ہے۔"

"کیسا فیصلہ؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"اس نے اپنے طور پر طے کرلیا ہے کہ وہ انکار کردے گی۔"

"انکار کردے گی؟"

"ہاں' سفر کے دوران میری اس سے بات ہوئی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ اس میں اپنی مرضی کے بغیر اتنی دور تک چلنے کی استطاعت نہیں ہے۔ اس نے کمل کو کبھی اس نظر سے نہ دیکھا ہے' نہ دیکھنا چاہتی ہے۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ کمل کے سامنے ایک بہترین مستقبل ہے۔ دولت بجائے خود سب سے بڑی ضمانت ہے جو رما کے مثبت فیصلے سے مشروط ہے لیکن یوں کہئے کہ جس طرح اس نے میرے بارے میں اس حیثیت سے کبھی نہ سوچا۔ اسی طرح کمل کے سلسلے میں بھی اس قسم کا کوئی خیال اس کے دماغ میں کبھی نہیں آیا۔"

"تمہاری بات دوسری ہے' تم ان کے بھائی ہو۔"

"کمل کو بھی وہ بھائی ہی سمجھتی ہے۔"

"لیکن وہ ان کا بھائی ہے نہیں۔" میں نے زور دے کر کہا۔

"رما ایک ہوش مند لڑکی ہے۔ اپنی زندگی کے اہم فیصلے وہ خود کرسکتی ہے۔ وہ پوری طرح اس کی اہل ہے۔"

"میں جانتا ہوں لیکن دوسرے بھی کسی کے لیے بہتر انداز میں سوچ سکتے ہیں۔"

"بے شک لیکن پھر یہ ملال تو نہیں ہوگا کہ ہمیں اپنا حق حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ شریک زندگی کے لیے ہر ایک کے اپنے معیار اور تصورات' اپنے خواب ہوتے ہیں' فرض کیجئے کہ آپ کے ذہن میں پہلے سے کوئی شخص ہے پھر؟ فرد بھی کسی دولت سے کم نہیں ہوتا۔"

"ہاں' ہاں۔" میں نے اضطراری لہجے میں کہا "تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ آدمی کا کوئی معمول نہیں ہوتا۔ کسی کے لئے کوئی آدمی سب سے بڑی جاگیر ہوتا ہے' کہیں تم یہ کہنا تو نہیں چاہتے کہ تم نے اور رما نے اپنی منزلیں یا اپنی تعبیریں ڈھونڈلی ہیں؟"

"رما کا مجھے نہیں معلوم۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا "ممکن ہے ایسا ہو۔ یہ رما کا حق ہے۔"

"اور تم!" میں نے مضطربانہ پوچھا "کہیں تم نے۔۔۔ میری مراد یہ ہے کہ کیا تم نے پہلے سے کچھ سوچ رکھا ہے؟"

"جی!" وہ کسی قدر گھبرا گیا اور بے کلی سے بولا "میں واضح کردوں کہ ایسا کوئی امکان جج صاحب کی خواہش یا حکم کی تعمیل میں حارج نہیں ہے۔"

"گویا امکان ہے۔" میں نے اشتیاق سے پوچھا "کون ہے وہ؟"

جہاں ہم بیٹھے تھے' وہاں اتنی روشنی نہیں تھی تاہم میں اس کا چہرہ بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ اس کی پلکوں کا انتشار' اس کے ہونٹوں کا ارتعاش اور چہرے کا رنگ۔ اس نے کئی پہلو بدلے اور جھجکتے ہوئے بولا "ابھی یہ بہت قبل از وقت ہے۔" پھر کہنے لگا "ہاں' میں نے ایک شخص کے لیے محسوس کیا ہے ا۔۔ نہیں کہہ سکتا کہ وہ بھی' اس نے بھی مجھے۔۔۔ میرا مطلب ہے ابھی تک اس سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ ابھی یہ امر مجھ تک محدود ہے اور جو اختیار اسے حاصل ہے' وہ اسے حاصل ہے۔ میں نہیں جانتا' اس کا جواب اثبات میں ہوگا یا نفی میں۔" اس کی آواز دھڑک رہی تھی۔

"تمہاری اس سے کوئی بات نہیں ہوئی؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"نہیں! وقت ہی کتنا ہوا ہے۔ ابھی تو میں نے اسے تلاش کیا ہے۔" وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگا اور حسرت آمیز لہجے میں بولا "کیا معلوم' اس کے بھی اپنے خواب ہوں۔ اس نے پہلے سے کوئی بت بنا رکھا ہو۔ میں نے کہا نا' ابھی یہ بہت قبل از وقت ہے۔"

جانے کیوں میری رگوں میں خون رکنے لگا۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے؟ لیکن جیسے کسی نے روک دیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے یہ جاننے کے لیے مجھے اپنے دل و دماغ کی یکجائی کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے' یہ میرے لیے

بڑی حیرت کا باعث ہو۔ مجھے یہ معاملہ نہیں جاننا چاہیے' مبادا مجھے اپنا ردعمل ظاہر کرنے میں دشواری پیش آئے۔ جانے کیوں' دوسرے ہی لمحے مجھے یہ گمان ہوا کہ میں جانتا ہوں' اس کا اشارہ کس طرف ہے۔ خنکی کے باوجود میرے مساموں سے پسینہ پھوٹنے لگا۔ میں نے اس سے دوبارہ کچھ نہیں پوچھا۔ ویسے بھی اسے از خود بتانا چاہیے تھا۔ ہوسکتا ہے' جیسا کہ وہ کہہ رہا تھا' سردست وہ یہ بات خود ہی تک محدود رکھنا مناسب سمجھتا ہو اس لیے میرے لیے بھی یہی مناسب ہے۔

مجھے خاموش دیکھ کر وہ تیزی سے بولا "اور میں آپ کو بتاؤں کہ مجھے کسی کے مثبت یا منفی جواب کا انتظار بھی نہیں ہے۔"

"وضاحت کیوں کررہے ہو' میں سمجھتا ہوں۔ آدمی کو اپنا ارادہ سب سے زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ وہ اسے اپنی ہی تحویل میں رکھنا چاہتا ہے۔" میں نے نرمی سے کہا "پھر کیا مشکل ہے۔ رما کی طرح تم بھی کسی وقت اپنے فیصلے سے دور نہیں ہو۔ بس ایک جرأت کی ضرورت ہے۔"

"یہ ایسا آسان نہیں ہے۔" وہ پژمردگی سے بولا "رما کو بھی نہیں معلوم کہ یہ ایسا آسان نہیں ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی یہاں آزاد نہیں ہے۔ ہمارے حوالے ہمیں ہر طرح سے جکڑے رہتے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آگے کون کون ہمارے خیر طلب کس کس روپ میں ہمارے پاس آئیں گے اور ہم سے ہمارا ارادہ چھیننے کی کوشش کریں گے۔ غصہ' انتباہ اور عاجزی' طرح طرح کے واسطے۔ وہ کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے۔ مال و زر کے اتنے بڑے خزانے سے دستبرداری کا حوصلہ کمل اور کوشلی میں نہیں ہے۔ وہ اپنی انا کی پامالی کی حد تک ہماری منت کریں گے اور سب ان کے ساتھ ہوں گے۔ ماتاجی' چھوٹی انو' پتاجی مدت سے اپنے گھر سے بے نیاز بریڈ فورڈ میں مقیم ہیں' وہ بھی ہمیں ہماری نادانی اور ناپختہ کاری سے باز رکھنے کے لیے جلد از جلد ہندوستان واپسی کا پروگرام بنالیں گے۔ رما کو اس کا اندازہ نہیں ہے۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں اسے کیا تسلی دیتا' کیا تائید' کیا تردید۔ ہر آدمی کی زندگی کے اہم فیصلے۔۔۔۔ صرف ایک دیوار کے پار ہوتے ہیں مگر وہ دیوار عبور نہیں ہوپاتی۔ زندگی جتنی گھٹتی جاتی ہی' دیوار اتنی ہی اونچی ہوتی جاتی ہے پھر کوئی تناسب نہیں رہتا اور آدمی دیوار کے دوسری طرف دم توڑ دیتا ہے۔

خاصا وقت گزر گیا۔ ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے پھر جب تک جمرو اور شامو ہمیں ڈھونڈتے ہوئے ادھر نہ آنکلے' ہم وہاں سے نہیں اٹھے۔ انہیں دیکھ کر کیلاش نے اپنے چہرے پر شگفتگی بکھیرنے کی ناکام کوشش کی اور دونوں سے نئی جگہ کے بارے میں ان کا تاثر پوچھتا رہا۔ رات خاصی ہوگئی تھی۔ وہ اندر نہیں گیا' باہر ہی سے روانہ ہوگیا۔ میں نے اسے کچھ دیر اور رکنے کو بھی نہیں کہا۔ ایک بار میرے جی میں آئی تھی کہ اس سے کہوں' میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں لیکن بس سوچ کے رہ گیا۔ میں اس سے یہ پوچھنا بھی بھول گیا کہ اب پھر کب آنا ہوگا۔

ہم تینوں خاص دروازے کے سامنے حوض کی منڈیر پر بیٹھے رہے۔ آسمان پر کالی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ جمرو اور شامو بمبئی کے بے قرار موسم کی باتیں کرنے لگے کہ صبح کچھ ہوتا ہے اور شام کچھ' اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ جمرو کو فیض آباد اور لکھنؤ کی یاد ستا رہی تھی اور شامو کو کلکتے کی۔ میرا دماغ جانے کہاں کہاں بھٹک رہا تھا۔ میں ہوں ہاں کرتا بظاہر ان میں شامل رہا۔

وہ ابھی اور بیٹھتے مگر بوندا باندی ہونے لگی۔ ہمیں اٹھنا پڑا۔ کسی کے جاگنے کا امکان نہیں تھا۔ شامو نے آہستگی سے دروازہ کھولا۔ انہی کو معلوم تھا کہ کس طرف جانا ہے اور ہمیں کون سے کمرا یا کمرے تفویض کیے گئے ہیں۔ وہ پہلے ایک ڈیوڑھی جیسے کمرے سے گزر کے دائیں طرف جانا چاہتے تھے' اچانک جمرو ٹھٹک گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے ٹھٹکنے کی وجہ سمجھ میں آگئی۔ بائیں طرف کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر تیز روشنی میں جولین صوفے پر بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی۔ میرے لیے یہ منظر ایسا تھا جیسے آدمی جو سوچ رہا ہو' وہی ایک دم سامنے آجائے اور گویا اسے بھی خبر تھی کہ میری نظریں اسی کو ڈھونڈ رہی ہیں' اسے مجھ سے اوجھل نہیں رہنا چاہیے۔ وہ ہلکے آسمانی گاؤن میں ملبوس تھی۔ گلے میں ہرا دوپٹا تھا۔ جیسے سبز پتوں کے درمیان گلاب کھلا ہو۔ ہماری آہٹ پر وہ فوراً کھڑی ہوگئی اور لپکتی ہوئی سیدھی ہماری طرف آئی "آپ ابھی تک جاگتی ہو دیدی؟ شامو نے حیرانی سے کہا۔

نیند ہی نہیں آرہی۔" وہ مسکرا کے بولی۔

"نئی جگہ پر کدھر آتی ہے۔"

"کہاں تھے آپ لوگ؟"

"ایسے ہی ادھری گپ مارتے تھے بیٹھ کے۔" شامو سر جھٹک کے بولا "سمجھو کہ ٹیم پاس کررہے تھے۔"

"کیا یہاں جی نہیں لگ رہا ہے؟"

"نہیں' ایسی کوئی بات نہیں۔" شامو مچلتی آواز میں

بولا۔

"یہ گھر بھی دو آدمی لوگ کی طرح ہوتے ہیں' ایک سے دوسرے کو سمجھنے میں تھوڑی دیر لیتے ہیں۔" جمرو نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں جمرو بھائی! اچھی بات کہی آپ نے۔"

جمرو کا جسم اکڑ گیا' آواز بھی تن گئی "اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہو جولی بہن! یہ بال کوئلے سے کالے نہیں کیے ہیں۔"

جولین کے ہونٹوں پر ہنسی بکھر گئی۔ ہنسی سب پر پھبتی ہے مگر کچھ لوگوں پر تو بہت زیادہ بھلی لگتی ہے' ان کا سارا بدن چٹک سا جاتا ہے۔ جولین کو میں نے شاذ شاذ ہی کھل کھلاتے دیکھا تھا۔ میری نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ مجھے بالکل نئی لگ رہی تھی۔

"کیلاش کب گئے؟" اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

وہ مجھ سے مخاطب تھی لیکن میں بس اسے دیکھے گیا۔ میرے بجائے جمرو نے جواب دیا "ابھی تھوڑی دیر پہلے۔"

"باہر ہی سے چلے گئے؟"

"دیر بہت ہوگئی تھی۔" میں نے بدبداتے ہوئے کہا۔

"آج کیلاش بہت پریشان لگ رہے تھے۔" اس کی آواز میں فکر مندی بھی تھی' افسردگی بھی۔

"حادثہ ہی ایسا تھا۔ طبعی موت آدمی جلدی قبول کرلیتا ہے لیکن ایسی موت۔۔۔! پھر پولیس کے چکر۔۔۔"

جمرو اور شامو بھی چونک پڑے۔ میری زبان سے نکل گیا تھا یا خبر سنانے کا کوئی شوق اور اس کا تاثر دیکھنے کی کوئی جستجو اس حقیقت بیانی کی محرک تھی۔ مجھے بتانا پڑا کہ پونا میں کیلاش اور رما نے کیسے مضطرب دن گزارے ہیں۔ البتہ میں نے جج صاحب کی وصیت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ وہ گم کھڑی سنتی رہی پھر بجھے ہوئے لہجے میں بولی "کچھ اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی اور بات بھی ہے۔"

"دونوں بہت بکھرے ہوئے ہیں۔"

"اس وقت انہیں ہماری ضرورت ہوگی۔" وہ بے چینی سے بولی۔

"لازماً۔ میں نے رما کو تو نہیں دیکھا لیکن کیلاش کی حالت سے اس کی کیفیت کا اندازہ بھی کیا جاسکتا ہے۔"

"مجھے معلوم ہوتا تو میں بھی رما کے پاس جاتی۔"

"مجھے بھی ابھی معلوم ہوا۔ میں نے کیلاش کے ساتھ جانے کا ارادہ کیا تھا لیکن پھر رہ گیا۔ خیر سویرے سہی۔"

"یہاں سے تو سبھی کو جانا چاہیے۔"

میں نے کوئی رائے نہیں دی۔ دیر تک بوجھل سی خاموشی رہی پھر میں نے آہستگی سے کہا "جانا چاہیے لیکن انہیں اس وقت آرام کی ضرورت ہوگی اور آرام کے لیے تنہائی کی۔ ویسے بھی ہمارے درمیان رسمی وضع داری وغیرہ کا کوئی تکلف نہیں ہے۔"

"کیا کیلاش نے اس قسم کی کوئی بات کہی ہے؟"

"کیسی بات؟"

"کہ ہمارا وہاں جانا' ہمدردی کرنا' مداخلت کا۔۔۔"

"نہیں بالکل نہیں۔ یہ سوچنا بدگمانی ہوگا۔ بھلا کیلاش ایسی بات کہہ سکتا ہے۔ یہ تو میرا خیال ہے اس لیے کہ میں نے ساری روداد سنی ہے۔ وہ سب تھکے ہوئے ہیں۔"

وہ جانے کیا سمجھی' گھبرا کے بولے "لگتا ہے' کچھ اور بھی ہے۔"

"کچھ اور کیا ہوتا۔"

"وہ مطمئن نہیں ہوئی' متجسس نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی پھر اس نے جمرو اور شامو کی طرف دیکھا "ٹھیک ہے۔" وہ سمٹی ہوئی آواز میں بولی "صبح جانا ہو تو مجھے بھی لیتے چلنا۔"

شامو کئی جماہیاں لے چکا تھا۔ جولین نے مشورہ دیا کہ اب ہمیں اپنے کمرے میں جاکے آرام کرنا چاہیے۔

جمرو اور شامو تو اشارے کے منتظر تھے' فوراً تیار ہوگئے "آپ بھی تھوڑی کمر نکالو جولی بہن!" جمرو نے مشفقانہ لہجے میں کہا "رات بہت اوپر ہوگئی ہے۔"

"آپ لوگ جائیں' مجھے تو بالکل نیند نہیں آرہی۔"

"ایسا کیسے۔" جمرو مچل کے بولا "بولو تو ادھری بیٹھیں' ماں قسم' ساری رات ہم لوگ ابھی پورے تین دن کو جاگ سکتے ہیں۔"

وہ مسکرانے لگی "مجھے معلوم ہے۔"

"مجھے بھی نیند نہیں آرہی ہے۔" میں نے کسمساتے ہوئے کہا۔

"پھر کیا ہے۔" جمرو تیزی سے بولا "پھر تم بیٹھو جولی بہن کی دلراہٹ کے لیے ہم لوگ چلتے ہیں۔"

میں بھی یہی چاہتا تھا۔ جولین سے مجھے بہت سی باتیں کرنی تھیں مگر یہ کچھ اچھا نہیں لگتا تھا کہ میں انہیں چھوڑ کے جولین کے پاس بیٹھا رہوں لہٰذا میں نے ان سے کچھ دیر اور ٹھہر جانے کو کہا۔ انہوں نے کچھ نہیں سنا' ایک دم کمرے سے نکل گئے۔

میں بھی ان کے پیچھے چلا لیکن ابھی میں نے دروازہ عبور بھی نہیں کیا تھا کہ ارادہ بدل لیا اور پلٹ کے جولین کے

سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر تلاطم نمودار ہوا مگر صرف چند لمحوں کے لیے "کیلاش نے مجھے اور بھی کچھ بتایا ہے۔" میں نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔

"مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ تم کچھ چھپا رہے ہو۔" میری توقع کے خلاف وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولی۔

"تمہیں کیسے شبہ تھا؟"

"بس ہوگیا۔" وہ بال درست کرنے لگی "تمہیں بھید چھپانا خوب آتا ہے۔ سمندر کی طرح لیکن آج ایسا نہیں تھا۔"

"آج کیا تھا؟"

"آج تمہاری آنکھیں' تمہارا چہرہ جو کچھ کہہ رہا تھا۔"

"کیا کہہ رہا تھا؟"

"یہی کہ تم پر کوئی بوجھ ہے۔" وہ دبی زبان سے بولی "مگر کوئی بہت اہم بات نہیں ہوگی۔"

میں نے تعجب سے پوچھا "اہم کیوں نہیں؟"

"اوہ۔" میرا منہ بن گیا "یہ بھی خوب ہے' میں کسی سے کیا چھپاتا ہوں۔"

"یہ اپنے آپ سے پوچھو۔" وہ نیچی نظروں سے بولی اور اس سے پہلے کہ میرے لہجے کی تندی گہری ہوتی' معذرت خواہانہ بولی "تم کیا کہہ رہے تھے؟"

"میرا دماغ منتشر ہوگیا تھا۔ اس نے کچھ دیر انتظار کیا۔ میں چپ ہی بیٹھا رہا تو اس نے یاد دلایا کہ میں کیلاش کے بارے میں کچھ بتا رہا تھا۔ مجھے بھی یاد تھا لیکن سرا کہیں کھو گیا تھا۔ اس کی نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں' میں نے بے ترتیبی سے کہا "جج صاحب نے ایک وصیت بھی چھوڑی ہے۔"

"وصیت؟"

اس کے چہرے کی تمازت دیکھ کر میرا حوصلہ فزوں ہوا۔ میں نے مختصراً اسے جج صاحب کے زر و مال اور موت سے چند دن قبل لکھی جانے والی وصیت کے بارے میں بتایا۔ اس کی آنکھیں بتدریج پھیلتی گئیں' تاہم اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا "کیلاش اس صورت حال سے بہت پریشان ہے۔" میں نے کہا "نہ رما جج صاحب کی خواہش کی تکمیل پر آمادہ ہے نہ کیلاش۔"

جولین نے وہی بات کہی جو میں نے کیلاش سے کہی تھی اور کیلاش کا جواب بھی جولین کو بتایا۔ وہ غائب سی ہوگئی۔

"کیلاش کے انکار کی وجہ تو یہ ہے کہ کوشلی سے اس کی کوئی مناسبت نہیں' دوسری وجہ یہ ہے۔" میں نے کن انکھیوں سے اس کی جانب دیکھا کہ "اس کی نگاہ کا مرکز کوئی اور ہے۔"

مجھے حیرت ہوئی۔ جولین نے کسی اضطراب کا اظہار نہیں کیا۔ جس طرح میں نے کیلاش سے نہیں پوچھا تھا' جولین نے بھی جاننا نہیں چاہا کہ وہ کون ہے۔ وہ پتھرئی بیٹھی رہی۔

"میں نے محسوس کیا ہے کہ کیلاش بہت دکھ میں ہے' اس پر شدید مایوسی طاری ہے۔" میں نے دھیرے سے کہا۔

"تم نے کیا رائے دی؟" وہ تیکھے لہجے میں بولی۔

"میں کچھ بھی نہ کہہ سکا' تمہیں بتاؤ' کیا کہتا۔"

"یہ تو کیلاش پر منحصر ہے کہ اس کی ترجیحات کیا ہیں؟" وہ جھجکتے ہوئے آدھی انگریزی میں بولی۔

"ظاہر ہے اس کی ترجیحات میں سب سے مقدم وہ خود ہے۔ یہ مسئلہ ایسا آسان نہیں' ساری زندگی کا معاملہ ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ایک مطلوب شخص مل جائے تو اس سے بڑی دولت کیا ہے اور کہہ رہا تھا کہ اسے ایک شخص کی صورت میں اپنے خوابوں کی تعبیر نظر آتی ہے۔ وہ شخص اس کے لیے کسی منزل کی حیثیت رکھتا ہے۔"

"اتنی باتیں!" وہ جھپکتی پلکوں سے بولی۔

"میں صرف دہرا رہا ہوں۔"

"میں اعتراض نہیں کررہی۔" وہ تیورا کے بولی۔

"کیلاش کے بقول اس کا اس لڑکی سے کبھی تعلق نہیں رہا۔ کوئی رسم و راہ بھی ان کے مابین نہیں' ابھی سب کچھ صرف کیلاش تک ہے۔"

میں نے دیکھا کہ جولین کی آنکھوں کی چمک تیز ہوگئی ہے۔

"اس نے مجھے نہیں بتایا کہ وہ کون ہے' نہ میں نے پوچھنا مناسب سمجھا۔ مجھے یقین ہے کہ کیلاش جیسے خوش وضع نوجوان کی نظر کسی مثالی لڑکی پر ہی گئی ہوگی۔"

جولین کے سراپا میں جنبش نہیں ہوئی۔

"ساتھ ہی کیلاش کو یہ دھڑکا بھی لگا ہوا ہے کہ اس لڑکی کے بھی اپنے ارادے' اپنے معیار ہوسکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں' یہ محض کسرِ نفسی ہے۔ بھلا کون لڑکی کیلاش جیسے باصلاحیت' تعلیم یافتہ اور نفیس شخص کے سلسلے میں انکار کرسکتی ہے' کیوں؟"

"ہاں شاید۔۔۔" وہ چرمراتی آواز میں بولی۔

"میں نے محسوس کیا کہ کیلاش اس لڑکی کے خیال و تصور میں کتنی دور جاچکا ہے۔ جب وہ یہ سب کچھ بتا رہا تھا تو اس کی اندرونی کیفیت کا اندازہ اس کے چہرے سے کیا جاسکتا

تھا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ کسی رابطے اور سلسلے کے بغیر اس نے ایک بت بنالیا ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے نا؟ کوئی کسی کو یک طرفہ طور پر اپنے آپ سے اتنا قریب محسوس کرنے لگے؟"

"ہوں۔" جولین کی آنکھیں جل بجھ رہی تھیں۔

"ایک بات کیلاش نے اور کہی۔ جج صاحب کی وصیت کی قبولیت اور نا قبولیت اس لڑکی کے اقرار و انکار سے مشروط نہیں ہے۔"

"میں سمجھی نہیں۔" وہ الجھ کے بولی۔

میں جو بات کہنا چاہتا تھا' وہ میری زبان سے ادا نہیں ہو رہی تھی "مطلب یہ کہ۔۔۔" میں نے ہچکچاہٹ سے کہا "اگر وہ لڑکی اقرار کرلیتی ہے تو کیلاش کے لیے اس سے بڑی مسرت کوئی نہیں ہوگی۔ بصورت دیگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کوشلی سے مفاہمت کرلے۔ کوشلی کے ساتھ زندگی بھر کی رفاقت' کیلاش کے کہنے کے مطابق' ایک مسلسل جھوٹ ہوگا۔"

"تو الجھن کا ہے کی ہے؟" وہ بے ساختہ بولی "فیصلہ تو کرلیا گیا ہے۔"

"ہاں ہاں۔" میں نے سرہلا کے کہا "کسی حد تک یہ بات درست ہے لیکن فیصلہ تو ابھی صرف کیلاش کی حد تک ہے۔ کوئی شخص اکیلا نہیں ہوتا' بہت سے دوسرے بھی اس میں شامل ہوتے ہیں۔ آدمی کتنا مختار اور کتنا مجبور ہوتا ہے' یہ تو تم اچھی طرح جانتی ہو۔ کوئی کم' کوئی زیادہ مگر سب ہی جکڑے ہوئے ہیں۔"

"پھر' پھر کیا صورت ہے؟" وہ تذبذب سے بولی۔

"ایسے میں اس لڑکی کے اقرار کا گداز کیلاش کے لیے توانائی کا باعث ہوگا۔"

"اور انکار۔۔۔؟" وہ چبھتی ہوئی آواز میں بولی۔

"انکار سے کیلاش پر جانے کیسا عالم طاری ہو۔"

"اس لڑکی سے بات کی جائے؟"

اس کے لہجے میں طنز کی صاف آمیزش تھی میں نے تقریباً بدحواسی سے کہا "ہاں' یہی بات ہے۔"

"اور اگر اس نے انکار کردیا؟"

"کرسکتی ہے لیکن آخر کیوں کرے گی؟ اس کے سامنے کوئی ایرا غیرا نہیں' ایک ایسا نوجوان ہے جس کے آگے ایک یقینی مستقبل ہے۔ اس کا خاندان بڑا ہے اور عادت و اطوار شائستہ ہیں۔ غرض ہر پہلو سے وہ ایک مکمل آدمی ہے۔ دردمندی کی خوبی بھی اس میں کمال کی موجود ہے۔"

"ممکن ہے' وہ لڑکی بھی ان خوبیوں کی معترف ہو۔ اس کے باوجود خود کو آمادہ نہ کرپائے۔ شاید تم ہی نے کبھی کہا تھا کہ ہر جگہ ترازو نہیں چلتا کیوں کہ ترازو میں بہت سی چیزوں کا وزن نہیں ہوپاتا۔"

"شاید میں نے کہا ہو اور یہی اب بھی کہہ رہا ہوں مگر پھر کیلاش کا کیا ہوگا؟ وہ تو بالکل اجڑ جائے گا۔"

"دوسرے لفظوں میں اس لڑکی کو کیلاش کی خاطر اپنے خوابوں کا ایثار کرنا چاہیے یا یوں کہو کہ وصیت سے ملنے والی دولت کی محرومی میں وہ کیلاش کے لیے مداوا ثابت ہوگی۔"

جولین کے لفظوں کی تلخی مجھے کچھ دیر میں محسوس ہوئی' میں بے خیالی میں کہہ چکا تھا کہ ہاں کیلاش کے لیے وہ لڑکی بجائے خود ایک بڑی دولت ہے۔

اور اس طرح ایڈجسٹ منٹ ہوجائے ورنہ ہر صورت میں محرومی رہے گی۔" وہ دہکتی آواز میں بولی۔

"اس طرح کیوں سمجھ رہی ہو۔" میں نے بہت کوشش کی لیکن اپنی آواز کی درشتی میرے بس میں نہیں تھی۔ میں نے کہا "وصیت کا اس سے کیا تعلق' میں نے تمہیں بتایا نہیں کہ وصیت کی تعمیل کا اس معاملے پر دارومدار نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے۔ وصیت کے ذکر سے صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ کیلاش کو ان دنوں کسی آزمائش کا سامنا ہے۔ وصیت تو چند روز پہلے کی بات ہے' جج صاحب کی موت کے بعد اسے یہ علم ہوا تھا کہ اس لڑکی کو تو اس نے وصیت سے کہیں پہلے دیکھا تھا اور خواب دیکھنے شروع کردیے تھے۔ تم نے نجانے کا کیا مطلب لے لیا۔"

جولین کچھ نہیں بولی' بس چمکتی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی۔ میرے ذہن میں سب رُل مل گیا کہ میں کیا کہنا چاہتا اور کیوں جمرو اور شامو کے ساتھ جانے کے بجائے اتنی رات کو اس کے پاس ٹھہر گیا تھا۔ خاموشی کے اس وقفے میں بہرحال مجھے اپنے آپ کو مجتمع کرنے کا موقع مل گیا۔ میں نے نرمی سے کہا "جانے بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ مجھے صرف کیلاش کا حال بتانا تھا۔ کیلاش نے یہ سب کچھ کہا مجھے بہت محسوس ہوا۔ اتفاق ہے کہ تم اس وقت مل گئیں۔ میں یہ باتیں جمرو اور شامو سے نہیں کرسکتا تھا مگر ایسا لگتا کہ تم نے کوئی توجہ نہیں دی؟"

"نہیں۔" وہ سیدھی ہو کے بولی "میں نے پوری توجہ سے سنا ہے۔"

"کیلاش نے کسی مجبور کی طرح مجھ سے بات کی ہے۔"

"سنا ہے' ایسا آدمی مجبور ہی ہوتا ہے۔"

"نامرادی کی صورت میں آدمی کی پوری زندگی اکا۔۔۔ چلی جاتی ہے۔"

"سب ہی کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا۔" وہ مدھم لہجے میں بولی "وقت آدمی کے لیے اگر زخم ہے تو مرہم بھی ہے۔"

"مگر وقت کبھی کسی سے زندگی بھر نامہربان بھی رہتا ہے۔ وقت کا سلوک ہر ایک سے الگ ہے' بہرحال۔" میں نے کہا "کیلاش ایک اچھا آدمی ہے۔ اچھا آدمی بھی ایک دولت ہوتا ہے۔"

"اس سے کون انکار کرسکتا ہے۔"

"پھر یہ دولت اس لڑکی کے نصیب میں ہی تو آئے گی جو کیلاش سے وابستہ ہوگی۔"

"یقیناً' بشرطیکہ وہ حاجت مند ہو' وہ اگر خود مالا مال ہے تو اسے کسی طرف دیکھنے' کسی اور طرف نظر رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"ہاں' تم ٹھیک کہتی ہو۔" میں نے شکستگی سے کہا۔

"ویسے ہمدردی اور ایثار کی بات دوسری ہے۔"

"زندگی بھر کے لیے شاید کوئی اتنا بڑا ایثار نہیں کرپاتا۔"

"کیوں نہیں کرپاتا۔ ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں۔"

"تم جو کہہ رہی ہو وہ بڑی حد تک درست ہے لیکن میں سوچتا ہوں' بقول تمہارے' کوئی پہلے سے اتنا آسودہ' ایسا مشروط یا پابند نہ ہو تب۔۔۔" میں نے منتشر آواز میں کہا "اگر یہ سب نہ ہوا تو کیا کوئی لڑکی کیلاش کو مسترد کرسکتی ہے۔"

"شاید نہیں۔۔۔" وہ جیسے اپنے آپ سے بولی۔

"فرض کرو۔" میری آواز حلق میں پھنسنے لگی لیکن میں نے کہہ دیا "فرض کرو' وہ لڑکی تم ہو۔" اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور ہونٹ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

میں نے بہ عجلت صراحت کرنی چاہی مگر مجھ سے کوئی بات نہ بن سکتی' میں نے معذرت طلب لہجے میں کہا "یہ محض ایک مفروضہ ہے لیکن۔۔۔" جولین کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ کہیں میری زبان سے کوئی ایسی ویسی بات نہ نکل جائے اس لیے میں نے خود کو روک لیا۔ اس پر سکتہ طاری تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کون سی حالت ہے۔ یہ کسی دل خوش کن بات کا فطری ردعمل ہے یا کوئی طلسم خیال ٹوٹ جانے کا صدمہ؟ ہر آدمی اپنے شیش محل میں رہتا ہے۔ چند لمحوں کے جمود میں میرے سینے میں تلاطم سا اٹھا۔ مجھے یہ اخذ کرنے میں دیر نہیں لگی کہ جولین کی حالت تو خانہ بدری کی سی ہے۔ ایک گھر ہر آدمی کے اندر بسا ہوا ہوتا ہے یا کسی گھر میں بسا ہوا جو آدمی ہوتا ہے' وہ اس کے خیالوں اور خوابوں کا گھر ہے۔ اس کے لیے نہ چونے کی ضرورت پڑتی ہے' نہ گارے کی۔ وہ تو شیش محل ہے' وہ تو راج محل ہے۔ کوئی ایک دم' ناگہاں یوں ویران نہیں ہوجاتا۔ ایسا لٹا لٹا اور اجڑا اجڑا جیسے میں نے جولین کو گھر سے بے گھر کردیا ہو۔ کسی نے کہا ہے' کبھی ایک حرف نامہرباں بھی سنگ گراں کا اثر رکھتا ہے۔ اس کی آنکھیں چھلک رہی تھیں۔ میں نے خفت سے کہا "تمہیں بتایا نا کیلاش نے کسی کا نام نہیں لیا ہے لیکن یہ ممکن تو ہے۔"

"خدا کے لیے کچھ مت کہو۔" وہ ہیجانی آواز میں بولی۔

"نہیں نہیں' میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں تم سے کیا کہوں' تمہارے لیے میرے دل میں۔۔۔ مجھے غلط مت سمجھو۔" میں نے عاجزی سے کہا "ضروری نہیں کہ وہ تم ہی ہو اور اگر ایسا ہے بھی تو یہ کوئی الزام نہیں ہے۔ تم ایک پڑھی لکھی' سیاہ و سفید میں تمیز کرنے والی لڑکی ہو اور مختار بھی۔۔۔"

میرے لہجے کی منت رائگاں نہیں گئی۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی گھٹا کسی قدر کم ہوئی "کیا تم اتنی دیر سے یہی جتانے کی کوشش کررہے تھے؟" اس نے بوقت کہا۔ اس کی آواز ڈول رہی تھی۔

"ہاں' یہ غلط بھی نہیں ہے لیکن یہ سب میرا قیاس ہے۔ سیدھے لفظوں میں' میں تو صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ ایسی صورت میں تمہارا کیا جواب ہوگا۔ میری بات سے تمہیں دکھ پہنچا ہے تو میں اپنا کہا سنا واپس لیتا ہوں۔ میرا مقصد کسی طرح تمہیں دکھ پہنچانا نہیں تھا۔"

"تم' تم کیا سمجھتے ہو؟" وہ ناتوانی سے بولی۔

"مجھے کیا سمجھنا ہے۔"

"تمہاری بھی تو کوئی رائے ہوگی؟"

"میری رائے!" میں سٹپٹا گیا "میری رائے کچھ نہیں۔"

"تم بھی تو میرے لیے فیصلہ کرسکتے ہو۔"

"ہاں ہاں' کیوں نہیں۔" میں نے کسی تاخیر کے بغیر کہا۔

"سو اگر تم یہی سمجھتے ہو تو' تو۔۔۔" وہ لرزتے ہوئے ہونٹوں سے بولی۔

"میں تو تم سے پوچھ رہا ہوں۔"

"مجھ سے کچھ مت پوچھو۔" وہ کٹی پھٹی آواز میں بولی "میں' میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

"یقیناً' تمہیں یہ سب کچھ اچھا نہیں لگا' مجھے بھی نہیں لگا۔ میں بھی کیسا پاگل ہوں۔ تم سے اب کچھ پوچھنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں کیلاش کی وکالت کررہا تھا لیکن میں تم سے پھر کہوں گا کہ یہ کوئی برائی نہیں ہے۔ کوئی بھی کسی کی آرزو کرسکتا ہے۔ کیلاش کا حال جان کر

مجھے جانے کیوں بہت وحشت ہوئی تھی اسی لیے تو میں نے تم سے اتنی بات کی۔ کوئی جلدی نہیں ہے۔ غور و خوض اور کسی بہتر فیصلے تک پہنچنے کے لیے بہت وقت پڑا ہے۔"

"میرے پاس کوئی وقت نہیں ہے۔"

"کیا مطلب! کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"کچھ نہیں' میں اپنے حال میں ٹھیک ہوں۔ میرے لیے ہر وقت ایک جیسا ہوگا۔" اس کی آواز جیسے کہیں دور سے آرہی تھی "اور اگر یہی ہے تو سب کچھ تم پر ہے' تم جتنا چاہو وقت لگاؤ اور جو چاہو فیصلہ کردو۔"

"لیکن ظاہر ہے' میں تمہاری مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا۔ میں کیا' کوئی بھی۔"

"میری مرضی کوئی نہیں' میرے پاس سوچنے کے لیے کچھ نہیں۔"

"ایسا کیا' تم یہ کیوں کہہ رہی ہو' تم ایک 'ایک ــــ" میں نے ملائمت سے کہا "دیکھو نا' کبھی نہ کبھی تو ہر ایک کو کسی نتیجے پر پہنچنا پڑتا ہے۔ کوئی فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ تمہیں ایک بھرپور زندگی گزارنی ہے۔ یہ تمہارا حق ہے' یہی ہونا چاہیے اور خدا کرے ایسا ہی ہو۔"

"مجھے اس کی ایسی فکر نہیں ہے۔" وہ آزردگی سے بولی۔

"کیوں نہیں' تمہیں نہیں تو دوسروں کو تو ہے۔"

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ انہیں ہے تو وہ حکم سنادے گا۔"

"تم کیسی باتیں کررہی ہو؟" میں نے مضطربانہ کہا "ٹھیک ہے پھر' مجھے کچھ اور نہیں کہنا۔ میں نے پہلے ہی شاید تم سے سب کچھ کہہ دیا ہے۔ ہوسکے تو دوبارہ غور کرلینا۔"

"میں نے بھی تم سے کچھ کہا ہے۔" اس کی آواز بھری ہوئی تھی۔

میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس کا سلگتا چہرہ' اس کا بکھرا بکھرا سراپا۔ وہ بہت شکستہ و شکست خوردہ نظر آرہی تھی۔ میرا حال بھی اس سے اتنا مختلف نہیں تھا۔ میں نے اس سے کہنا چاہا کہ کسی سے وابستگی سے مراد اپنی دولت چھن جانا نہیں ہے۔ یہ دولت نہ تو چوری ہوتی ہے' نہ اسے کوئی غصب کرسکتا ہے۔ یہ تو زنجیروں میں بھی باقی رہتی ہے مگر میں کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ ایک ذہین لڑکی تھی۔ اسے جواب دینے میں دیر نہ لگتی کہ اس دلیل کا اطلاق تم پر بھی ہوتا ہے۔

میں کرسی سے اٹھ گیا کیونکہ رفتہ رفتہ مجھ پر ہول سا طاری ہونے لگا تھا۔ کچھ اس کے اضطراب انگیز سکون سے' کچھ اپنے آپ سے' اپنے اندر بڑھتے ہوئے اندھیرے سے۔ مجھے لفظ ہی سجھائی نہیں دے رہے تھے جو میں اس سے کچھ کہتا۔ آدمی اندھیرے میں جیسا اندھا ہوجاتا ہے۔ میں اس سے کچھ کہے سنے بغیر دروازے کی طرف بڑھ گیا لیکن باہر جاتے جاتے میں نے غیر ارادی طور پر مڑ کے دیکھا۔ وہ اسی طرح سر جھکائے بیٹھی تھی۔ میرا دل اس کے لیے بری طرح اڈنے لگا۔ اسے کوئی مژدہ سنانے' اس کا چھنا ہوا سکون لوٹانے' اسے کوئی مسرت دینے کے لیے میرا دل بے قرار تھا۔ بے اختیار میں اس کے قریب جا پہنچا۔ وہ چونک پڑی اور اس نے سر اٹھا کر بے تابانہ میری جانب نظر کی۔ اس کی سرخ آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ مجھے کچھ یاد نہیں رہا۔ میرے ہاتھ پاؤں ہی شل ہوگئے۔ ایسا لگا جیسے میں اس کے اور قریب ہوجاؤں گا تو میرے بچے کھچے حواس بھی جاتے رہیں گے۔ مجھے جیسے موت آجائے گی۔ مجھ سے یہ مذاق بھی نہ ہوسکا کہ یہ سب تو اسے چھیڑنے' اس سے لطف لینے کے لیے تھا۔ اس ستم سے تو بے زبانی ہی بہتر تھی۔ میں لمحوں تک اس کے سامنے بے حس و حرکت کھڑا رہا پھر میں وہاں نہیں ٹھہرا اور پلٹ کر تیزی سے کمرے سے باہر آگیا۔ ایک دست نگر کسی کی کیا دستگیری کرسکتا ہے۔ اپنی بے بسی' بے مائیگی کا خیال مجھے اس کے پاس جا کے آیا۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ جمرو اور شامو کس طرف گئے ہیں۔ پہلے کمرے میں داخل ہونے پر مجھے ایک دیوان نظر آگیا۔ میں وہیں پڑا رہا۔ میرے مساموں سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ رات کا آخری پہر ہوگا۔ ایک لمحے کے لیے میری آنکھ نہیں لگی۔ اپنے وجود پر چھائے ہوئے سناٹے کا سبب میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا' کون سی بات میرے وہم و گمان سے سوا تھی۔ میں جولین سے اور کیا جاننا چاہتا تھا؟ اور لمحہ' جولین کا عزم و ارادہ جان کے .... میرے سینے میں طمانیت کی ایک لہر اٹھی تھی' کوئی جھماکا سا ہوا تھا۔ وہ لمحہ کہاں گم ہوگیا؟ ساری رات میں جیسے کسی آئینے کے مقابل کھڑا اپنی شکل دیکھتا رہا۔ اپنے آپ کو پہچاننا بھی کبھی آدمی کے لیے ایسا مشکل ہوجاتا ہے۔

○☆○

صبح فرخ نے مجھے اٹھایا اور اوپری منزل کے ایک کمرے میں لے گئی۔ اس کا انداز حاکمانہ تھا۔ اسے جیسے ... علم تھا میں رات بھر جاگتا رہا ہوں' ممکن ہے' جولین ہی نے اسے بتایا ہو۔ کمرے میں نرم بستر کی مسہری موجود تھی۔ میرا جسم ویسے بھی ٹوٹ رہا تھا' کسی چوں چرا کے بغیر فرخ کی ہدایت پر

وہیں لیٹ گیا۔ اس نے میرے سینے تک چادر پھیلا دی اور سرہانے بیٹھ کے سر دبانے لگی۔ اس کی انگلیوں میں بہت نرمی تھی اور لپک بھی۔ جذب ہونے یا جذب کرلینے کی کو شاید لپک کہتے ہیں۔ میری آنکھیں گھٹنے لگیں' امی بالکل اسی طرح سر دباتی تھیں' میرے کہے بغیر' از خود۔ وہ میری پیشانی پر کوئی شکن دیکھ کر سمجھ جاتی تھیں کہ آج میرا جی ٹھیک نہیں ہے۔ فرخ بھی چپ چاپ آہستہ آہستہ سر دباتی رہی۔ دیر ہوگئی تو اس نے یہ سمجھ کے کہ شاید میری آنکھ لگ گئی ہے' اپنے ہاتھ اٹھالیے اور بے آواز قدموں سے کمرے سے نکل گئی مگر اس کے جانے کے بعد بھی میں دیر تک جاگتا رہا پھر جانے کس وقت مجھے نیند آگئی اور میں دوپہر تک سوتا رہا۔

دوپہر کو سب نے ایک ساتھ کھانا کھایا اور وہیں میں نے جولین کو دیکھا۔ وہ معمول کے مطابق بظاہر پوری تن دہی سے کاموں میں مصروف تھی لیکن اس کا چہرہ صاف چغلی کھا رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ رات اس نے میرے ساتھ رما کے ہاں جانے کو کہا تھا۔ کھانے کے بعد میں نے اس سے پوچھا' نہ اس نے مجھے ٹوکا۔ میں نے بھی پھر ارادہ ملتوی کردیا اور ادھر ادھر گھومتا ہوا' اس کے کمرے کی طرف جا نکلا جہاں جمرو اور شامو نے ڈیرا جمایا ہوا تھا۔ مارٹی بھی وہاں موجود تھا۔ انہی کے ساتھ میں باہر نکل گیا۔ مارٹی کو راستوں کا اچھی طرح علم تھا۔ دو ایک گلیوں بعد ہی ایک پر رونق سڑک تھی۔ جہاں بڑی بڑی آراستہ و پیراستہ دکانیں بنی ہوئی تھیں۔ ہوٹل اور چائے خانے بھی سارے بمبئی سے الگ تھے۔ عام آدمیوں کا گزر اس بازار میں مشکل ہی سے ہوتا ہوگا۔ بازار کے پاس کچھ آگے سمندر کا کنارہ تھا لیکن ہم زیادہ دور نہیں گئے اور اندر ہی اندر چند گلیوں کا چکر کاٹ کر واپس آگئے۔ بڑے دروازے کے سامنے ایک نئی لمبی چوڑی' کالے رنگ کی موٹر گاڑی دیکھ کر ہم چاروں ہی ٹھٹک گئے تھے۔ کون مہمان اس موٹر میں آسکتا ہے۔ ابھی ہم یہ سوچ ہی رہے تھے کہ ٹنگو اچھلتا کودتا ہماری طرف آیا اور اس نے جوش و خروش سے بتایا کہ ابا جان نے ایک نئی موٹر گاڑی خریدی ہے۔

"ہائیں!" جمرو' شامو اور مارٹی دیدے نچاتے اور سیٹیاں بجاتے ہوئے موٹر کی طرف لپک پڑے۔ میں نے بھی قریب جا کے دیکھا' بالکل نئی گاڑی تھی۔ کالا رنگ ایسا چم چما رہا تھا کہ آدمی اپنی شکل دیکھ سکتا تھا۔ جمرو اور شامو دروازے کھول کر نشستوں کے گدوں پر اچھلنے لگے۔ شامو تو باقاعدہ ڈرائیور کی جگہ بیٹھ کے موٹر چلانے والا پہیا گھمانے اور ہارن بجانے لگا۔

شام کو اکبر کی زبانی معلوم ہوا کہ صبح جب میں سو رہا تھا تو بٹھل' ابا جان' منیر علی اور مولوی اکرم' تعزیت کے لیے کیلاش کے ہاں گئے تھے۔ فرخ' شہ پارہ' فریال' چمپا بیگم اور جولین کی ماں بھی ان کے ساتھ تھیں۔ ایک موٹر میں جگہ کم پڑ گئی ہوگی غالباً اسی لیے ابا جان نے دوسری موٹر خرید لی۔ پیسے پاس نہ ہوں تو ارادے کو دیر لگتی ہے اور پیسے پاس ہوں تو ارادہ خود بہ خود پیدا ہوجاتا ہے۔ اکبر نے جولین کا نام نہیں لیا۔ یہ سن کے میں سوچتا رہا' کہیں جولین میری منتظر نہ ہو۔ وہ ایک متحمل مزاج لڑکی ہے۔ تعزیت کی بات الگ ہے اور کم از کم رما کی خیر خبر لینے تو اسے ضرور جانا چاہیے۔ میں خود بھی اس سے پوچھ سکتا تھا لیکن جانے کیوں میں نے فرخ کی مدد لی۔ جولین نے طبیعت کی ناسازی کا عذر کردیا پھر اکیلے جانا مجھے اچھا نہیں لگا۔ جمرو اور شامو عقبی حصے کے ایک کمرے میں جگنو اور دیوا کو مشق کرا رہے تھے۔ میں بھی وہیں چلا گیا۔ جگنو کے ہاتھ میں کھلا چاقو تھا اور وہ بڑھ بڑھ کے' پینترے بدل بدل کر جمرو پر وار کررہا تھا۔ نہتا جمرو' جگنو کے داؤ پر پھرتی سے پہلو بچا جاتا۔ جگنو کے جسم میں بجلی کم نہیں تھی۔ مجھے دیکھ کے اس کے ہاتھ پیر کچھ اٹکنے لگے اور جمرو اس کے پنجے پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب ہوگیا۔ میں نے جگنو کو سمجھایا کہ نگاہ بھٹکنے سے سارا معاملہ ہی چوپٹ ہوجاتا ہے۔ آدمی کو چاقو کی گرفت سے زیادہ نگاہ گرفت میں رکھنی پڑتی ہے اور نگاہ کا ارتکاز' ذہنی ارتکاز کے بغیر ممکن نہیں۔ چاقو آزمائی کے وقت آدمی کو اپنے تمام حواس' سننے اور دیکھنے کی ساری قوت بس مقابل پر مرکوز کردینی چاہیے اور کوشش کرنی چاہیے کہ کسی طور پر اس کی توجہ ہٹ جائے۔ اچانک ادھر ادھر دیکھنے اور خواہ مخواہ چونک پڑنے سے بھی ناپختہ کار مقابل منتشر ہوسکتا ہے۔ میں نے بٹھل کی زبانی سنی ہوئی بہت سی باتیں انہیں بتائیں پھر میں خود ان کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ شروع شروع میں وہ جھجکتے رہے لیکن میں جان بوجھ کر طرح دیتا رہا۔ ان کے جسم کھلتے گئے۔ دونوں میں پھرتی تھی۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ چاقو میرے جسم سے مس ہوتے ہوتے رہ گیا اور اتنے مشاق ہونے کے باوجود جمرو اور شامو اپنی سسکاریاں نہ روک سکے۔ عین موقع پر میں کسی نہ کسی حربے سے جگنو اور دیوا سے دور ہوجاتا یا انہیں گڑبڑا دیتا۔ وہ آپس میں الجھ جاتے پھر ہانپنے لگتے اور ہنسنے لگتے۔ میں نے بہت دنوں بعد چاقو کا سامنا کیا تھا۔ ہم سب پسینے پسینے ہوگئے۔ ان کی آزمائش سے اندازہ ہوا کہ انہیں مسلسل ریاضت کی ضرورت ہے لیکن زیادہ وقت نہیں لگے گا' ان کے دست و

بازو میں اعتماد آجائے گا۔ اعتماد کی ان میں بڑی کمی تھی اور بٹھل کے بقول سب سے بڑی ریاضت تو اعتماد ہی ہے۔ مقصد کی ان کے پاس کثرت تھی جس سے جوش و غضب طے ہوتا ہے۔ بٹھل کا کہنا تھا کہ مقصد پاس ہو تو آدمی کی طاقت سوا ہو جاتی ہے۔ اسی شہر میں جگنو اور دیوا نے عمریں گزاری تھیں لیکن اب آب و ہوا بدلنے کا اتنا فرق نہیں پڑتا جتنا لوگوں کی تبدیلی کا۔ آدمی خزاں' آدمی بہار ہے۔ ان کے چہروں سے برسوں کی جمی ہوئی دھند اتر رہی تھی۔ اتنے کم دنوں میں رنگ نکھر گیا تھا۔ لہجوں میں بھی ٹھہراؤ آگیا تھا۔ میں نے طے کیا کہ اب میں روز انہیں کچھ نہ کچھ وقت ضرور دیا کروں گا۔ بنارسی کے سامنے جانے کا جتنا جنون انہیں تھا' اتنا ہی مجھے بھی تھا۔

رات کے کھانے میں ابھی وقت تھا۔ جمرو اور شامو کے اصرار پر بٹھل کو بتا کے ہم سب گھر کے قریب ساحل کی طرف چلے گئے۔ ہوا میں خنکی تھی' لیکن سکون بہت تھا۔ سمندر کے شور میں بھی کیسا سکوت ہوتا ہے۔ جگنو اور دیوا ہمارے ساتھ نہیں آئے تھے۔ ایک تو انہیں بٹھل کی خدمت گزاری کا خیال تھا کہ اسے کسی چیز کی ضرورت نہ پڑ جائے' دوسرے وہ اپنے آپ کو لوگوں کی نظروں سے زیادہ سے زیادہ دور رکھنا چاہتے تھے۔ مبادا بنارسی تک خبر پہنچ جائے کہ وہ کن لوگوں کے ساتھ ہیں۔ یہی اندیشہ پیرو کے دسویں پر انہیں لاحق تھا۔ شاید ان کے لیے یہی مناسب بھی تھا کہ سردست وہ کسی پیچیدگی سے بچیں۔ ساحل پر اندھیرا گہرا تھا۔ بادلوں نے آسمان ڈھانپ رکھا تھا۔ سمندر کے سامنے آدمی کو آزادی کا احساس ہوتا ہے' آزادی کا بھی اور کم تری کا بھی۔ سمندر دنیا کی ہر چیز سے بڑا ہے۔ ہمیں اڈے پاڑے کا کوئی آدمی دکھائی نہیں دیا۔ اس طرف شہر کے دوسرے ساحلوں جیسی بھیڑ بھاڑ نہیں تھی۔ ہم کنارے کنارے کہیں سے کہیں نکل گئے۔ کانتے کی موت کے بعد سب نے بہت محبوس وقت گزارا تھا۔ پیرو کے جانے کے بعد رات دن اور پہاڑ ہو گئے تھے۔ ابا جان ٹھیک کہتے تھے' گھر بدلنے سے کم از کم اس ہانپتے رینگتے وقت سے کسی قدر نجات کا گمان ہوتا تھا۔ میں نے اسی لیے انہیں نہیں روکا کہ اچھا ہے' کچھ وقت وہ اپنے ساتھ بھی گزار لیں۔ لوٹ کے آخر انہیں پھر گھر ہی جانا ہے۔ بے شک مکان وہ نہیں ہے' مکیں وہی ہیں' وہی حسرت و یاس سے ایک دوسرے کی صورت دیکھتے ہوئے لوگ۔ آدمی کا یہی ہے کہ اسے لوٹ کے اپنے مسکن کی طرف جانا پڑتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا کہ آدمی آگے ہی آگے چلتا رہتا' ایک پڑاؤ کے بعد دوسرا پڑاؤ' ایک منزل کے بعد دوسری منزل۔ اسے پچھلی منزل پر لوٹنا نہ پڑتا تو جانے آدمی کیسا مختلف ہوتا۔

ہم کنارے کی نم زمین پر اپنے نقش چھوڑتے ہوئے بڑھتے رہے اور لہریں ہمیں چھو چھو کر لوٹتی رہیں اور سارے نقش مٹاتی گئیں' وقت کی طرح۔ وقت بھی پچھلے نقش مٹا دیتا ہے۔ آگے لکڑی اور بانس کے بنے ہوئے ایک صاف ستھرے ہوٹل سے اٹھنے والی' تلی ہوئی مچھلی کی خوشبو پر شامو پھیل گیا۔ کھانے میں اور دیر ہو گئی۔

واپسی میں ہوٹل کے نزدیک ایک طرف چیخ و پکار ہو رہی تھی اور لوگ دائرے کی صورت میں اکٹھے تھے۔ یقیناً کوئی حادثہ ہو گیا تھا۔ مارٹی اور شامو وہاں جانے کے لیے پھڑکنے لگے۔ میں نے تلخی سے منع کر دیا۔ ان کی سمجھ میں جلد ہی آگیا کہ کنارہ کشی ہی عافیت کی ایک صورت ہے۔ بھیڑ میں صرف تماشا ہی نہیں ہوتا تماشائی بھی کبھی تماشا بن جاتا ہے۔ بھیڑ تو جنگل کی' دلدل کی طرح ہے۔ جنگل میں راستہ نہیں ملتا' دلدل میں آدمی دھنستا چلا جاتا ہے۔

ہم بوجھل قدموں سے گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ کیلاش اور رما بھی ابھی ابھی آگئے ہیں۔ کھانا بھی انہوں نے یہیں کھایا تھا۔ فرخ نے بتایا کہ شکلا بھی آیا تھا اور ابا جان کے ساتھ سارا مکان دیکھ کے گیتا اور رانی کی سوا فرداً فرداً سب کو مبارک باد دے گیا ہے۔ داد و ستائش امارت کا لازمی جزو ہیں اس کے بغیر امارت کا لطف آدھا رہ جاتا ہے۔ ابا جان نے ایک ایک چیز تفصیل سے دکھائی ہوگی۔ شکلا بہرحال ایک پولیس افسر تھا۔ اتنا کچھ دیکھ کے ضرور اسے بے چینی ہونی چاہیے تھی کہ ابا جان آخر کہاں کے رئیس تھے۔ ممکن ہے' اسے یہ بدگمانی ہوئی ہو کہ کہیں میں نے کرشنا جی کا ترکہ تو ٹھکانے نہیں لگا دیا؟

جولین مجھے آمنے سامنے کہیں نظر نہیں آئی۔ میں نے فرخ سے پوچھنا چاہا لیکن خاموش رہا۔ جمرو اور شامو جس کمرے میں سونے کے لیے گئے تھے' میں بھی وہیں چلا گیا اور کسی وقت مجھے نیند آگئی۔

ہمیں نئی جگہ آئے ہوئے تیسرا دن تھا۔ اس دن سرشام ابا جان نے سب کو جمع کیا پھر گیتا اور رانی کے آگے کاغذات کا ایک پلندا رکھ دیا۔ ابا جان نے محمد علی روڈ کے گنجان آباد علاقے میں گیتا کی ماں رانی کے نام سے ایک پانچ منزلہ عمارت خریدی تھی۔ ہر منزل پر بارہ فلیٹ تھے اور فرشی منزل پر اسی دکانیں تھیں۔ ابا جان کے کہنے کے مطابق عمارت تعمیر ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ پوری عمارت میں کرائے دار بسے ہوئے تھے اور تبدیلی پر ہر مرتبہ رسید بدلوائی کی ایک مخصوص رقم الگ ملتی تھی۔ امکان یہ تھا کہ آئندہ پچاس سال تک عمارت میں کسی بڑی مرمت کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ کرائے کی وصولی اور کرائے داروں سے دیگر معاملات نمٹانے کے لیے ابا جان نے عارضی طور پر ایک ذمے دار آدمی کا تقرر بھی کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے گیتا کے جہیز کے لیے ایک لاکھ روپے بینک میں جمع کرائے تھے۔

دونوں گنگ بیٹھی سنتی رہیں۔ ابا جان نے انہیں کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ کہنے لگے کہ وہ کوئی احسان نہیں کر رہے ہیں' یہ ان کا فرض بھی ہے اور پیرو کا حق بھی۔ پیرو انہیں ایک بزرگ کا مرتبہ دیتا تھا اور وہ اسے چھوٹا سمجھتے تھے۔ گویا یہ چھوٹے بڑے بھائی کا معاملہ ہے۔ ابا جان نے وضاحت کی کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ گیتا اور رانی کے فرض سے سبکدوش ہو گئے ہیں۔ رشتوں میں سبک دوشیاں نہیں ہوتیں۔ گیتا اور رانی ان کے لیے فرخ' فریال اور فارہہ کے مانند ہیں۔ جس طرح فرخ' فریال اور فارہہ اس گھر میں شریک ہیں' گیتا اور رانی کی بھی ان کی نظر میں یہی حیثیت ہے۔ کہنے لگے' اس کاغذی کارروائی کی ایسی ضرورت نہیں تھی لیکن کل کا کیا بھروسا؟ وہ اپنی زندگی کی سرحدوں پر آچکے ہیں لہٰذا انہوں نے خوب سوچ سمجھ کے گیتا اور رانی کے تحفظ اور اپنے اطمینان کے لیے یہ قدم اٹھایا ہے۔ خدا بہتر جانتا ہے' ان کے پاس جو کچھ ہے' اس میں پیرو کی اعانت کا کس قدر حصہ ہے۔ پیرو کی محبت اور اس کے سلوک کی یہ کوئی قیمت نہیں ہے۔ وہ اصل قیمت ادا کر ہی نہیں سکتے۔ ابا جان نے دل سوزی سے کہا کہ کاش وہ پیرو کو واپس لا سکتے۔ یہ ممکن ہوتا تو وہ اپنا سب کچھ نچھاور کر کے اسے لے آتے۔

گیتا اور رانی پتھر کی طرح ساکت بیٹھی رہیں۔ سب کا یہی حال تھا۔ ابا جان نے بتایا کہ وکیل اور دو ایک سرکاری کارندے باہر انتظار کر رہے ہیں۔ کاغذات کی قانونی تکمیل کے لیے وہ گیتا اور رانی سے دستخط لیں گے۔ گیتا اور رانی کے جسموں میں پہلی بار جنبش ہوئی۔ دونوں کی حیران و پریشان نظریں سیدھی بٹھل کی طرف گئیں۔ بٹھل نے آنکھیں میچ کے گویا اپنی طرف سے اقرار کا اظہار کیا۔ یقیناً ابا جان نے اس سے پہلے بات کر لی ہوگی۔ ابا جان کی ہدایت پر جمرو باہر بیٹھے ہوئے آدمیوں کو بلا لایا۔ وہ تعداد میں چار تھے۔ ابا جان نے شیروانی کی جیب سے قلم نکال کر رانی کے سامنے رکھ دیا۔

○☆○

نئے گھر میں سب ہفتے بھر میں پرانے ہوگئے تھے۔ ان کے قدموں میں تیزی آگئی۔ قدموں میں تیزی اور روانی سے مراد ہے کہ قدم فاصلوں سے مانوس ہوگئے ہیں۔ اجنبی در و دیوار میں آدمی سمٹتا ہوا، جھجکتا ہوا چلتا ہے۔ آوازوں کا بھی یہی ہے، ان کی آوازیں بھی اونچی ہونے لگی تھیں۔ ہر ایک نے اپنے لیے کوئی نہ کوئی گوشہ منتخب کرلیا تھا لیکن زیادہ تر شب بسری کے لیے دن بھر وہ نچلی منزل کے چند بڑے کمروں تک محدود رہتے۔ دائیں جانب کا حصہ کسی حد تک مردانے کے لیے مخصوص ہوگیا تھا۔ وہاں کسی کے آنے جانے پر پابندی نہیں تھی مگر سب خود ہی خیال رکھنے لگے تھے۔ کوئی کہاں ہوگا، کسے کہاں آواز دینی چاہیے؟ ابتدائی چند دنوں میں سب ایک طرح سے عمارت میں مقید رہے تھے، اب باہر بھی نکلنے لگے۔ باغ میں خاص طور پر۔ انہوں نے اپنی پسند کے مطابق گھر کی سجاوٹ میں ترمیمیں شروع کردی تھیں۔ رنگ برنگے تازہ پھولوں کے گلدان جابجا میزوں اور دریچوں پر نظر آنے لگے تھے۔ گھر میں رہنا اور گھر میں شامل ہونا الگ الگ بات ہے۔ گھر کی سجاوٹ پر توجہ کا بھی شاید یہی مطلب ہے کہ مکینوں کو گھر سے رغبت ہو رہی ہے۔ اس عرصے میں ملازموں کی تعداد میں کچھ اور اضافہ ہوگیا تھا۔ حکم پر، پندرہ منٹ میں گھوڑا گاڑی تیار ہوجاتی تھی۔ گھوڑا بھی خاص نسل کا اور آزمودہ کار معلوم ہوتا تھا۔ دو ایک مرتبہ چمپا بیگم اور جولین کی ماں، شہ پارہ اور فرخ کے ساتھ گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر بازار گئی تھیں اور لدی پھندی واپس آئی تھیں۔ ادھر گیتا اور رانی بھی اپنی آنکھوں کا دریا خشک کرنے کی کوشش کررہی تھیں۔ دوسروں کی خاطر غمزدگان کو ایک جبر یہ بھی سہنا پڑتا ہے۔ ویسے کوئی بھی ان دونوں کو اکیلا نہیں چھوڑتا تھا۔ تنہائی غم کے لیے اور ستم ہوتی ہے۔ گیتا کا تو وہ خاص خیال رکھتی تھیں۔ فرخ، فریال، فارہہ، ریحانہ، شہ پارہ اور جولین میں سے کوئی نہ کوئی ہر وقت گیتا کے ساتھ رہتا تھا۔

ایک روز جمرو اور شامو شام کے وقت سب کو موٹر میں بٹھا کے سمندر کے کنارے لے گئے۔ جولین کی ماں، چمپا بیگم اور رانی ان کے ساتھ نہیں تھیں۔ وہاں جاکے ان سب کو بہت اچھا لگا۔ وہ کنارے کنارے سیر کرتی رہیں۔ انہیں ہم سے اتنا آگے نہیں جانا چاہیے تھا۔ انہیں اکیلا سمجھ کے چند شہدے ان کے قریب جاکے بے ہودہ گوئی کرنے لگے۔ دور سے یہی لگتا تھا، وہ گھبرا کے پیچھے ہٹ گئیں اور پلٹ کے سب نے ہماری طرف دیکھا۔ ہم خاصے فاصلے پر بیٹھے ہوئے تھے لیکن جمرو اور شامو کی نظریں انہی کی طرف تھیں۔ انہوں نے شہدوں کو تاک لیا اور اٹھ کے بے تحاشا جولین اور فرخ وغیرہ کی طرف بھاگنا شروع کردیا۔ وہ لوگ تعداد میں پانچ تھے، پہلے تو وہ بوکھلائے لیکن پھر یہ دیکھ کے کہ جمرو اور شامو صرف دو آدمی ہیں، وہ ڈھٹائی پر اتر آئے اور ٹھہر گئے۔ مارٹی نے بھی اٹھ کے جمرو اور شامو کے ساتھ بھاگنا چاہا تھا۔ میں نے اسے روک لیا۔ مجھے یقین تھا کہ جمرو اور شامو کافی ہوں گے اور یہی ہوا بھی۔ جمرو اور شامو نے ان سے کوئی سوال جواب نہیں کیا، ایک لمحہ ضائع کیے بغیر انہوں نے دو کو نپی تلی ضربوں سے پلے ہی ہلے میں ریت پر لوٹا دیا۔ گردن پر ترچھے ہاتھ کی ضرب ٹھیک سے پڑ جائے تو آدمی کے قدم جمے نہیں رہ سکتے۔ کسی کو بھی ان سے اس تیزی کی توقع نہیں ہوگی۔ باقی تین کو چونکنے کا موقع ضرور ملا تھا، سنبھلنے کا نہیں۔ جمرو اور شامو ان پر جھپٹ پڑے اور انہوں نے دیوانوں کی طرح بے دریغ ان پر ضربیں لگانا شروع کردیں۔ ان کے ہاتھ بھی چل رہے تھے، پیر بھی۔ ایک کو چھوڑ کر فوراً دوسرے کے سامنے آجاتے۔

میں اور مارٹی دور سے دیکھتے رہے۔ ان میں سے دو تو بھاگ کھڑے ہوئے، تیسرا بھی بھاگ جاتا مگر عین وقت پر شامو نے اس کی گردن پیچھے سے دبوچ لی۔ شامو کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ جگہ بنا کے اس کی کمر پر گھٹنا مارنا چاہتا ہے۔ اگر یہی بات تھی تو شامو کو خود کو پیچھے ہٹانے کے علاوہ جھٹکا دے کے اس کے جسم کو بھی تھوڑا سا خم دینا چاہیے تھا۔ اس طرح کہ اس کے پیر اور سر سیدھ میں ہوجائیں اور جسم کا درمیانی حصہ کچھ آگے نکل جائے اور کمر کی جانب سر اور ٹانگوں کے درمیان خلا پیدا ہوجائے۔ اس صورت میں جسم کچھ اکڑ سا جاتا پھر اوپر گردن پر گرفت، ادھر دو قدم پیچھے ہوکے شامو کے گھٹنے کی ضرب اسے بے حال کردیتی مگر جمرو اور شامو کو اس کارروائی کی مہلت نہیں دی۔ وہ دور بھاگتے ہوئے آدمیوں سے نمٹ کے جیسے ہی شامو کی طرف پلٹا، اس نے آگے سے شامو کی گرفت میں اکڑے ہوئے آدمی کے پیٹ پر ٹھوکر مار دی۔ ناٹے قد کے شہدے کے جسم کا سامنے والا حصہ شامو کی کوشش سے آگے نکلا ہوا تھا۔ شامو کو خود قابو پانا مشکل ہوگیا ہوگا، وہ پوری طرح تیار تھا۔ اگر اس کی ضرب بھی کمر پر لگ جاتی تو آگے پیچھے پے در پے شدید ضربوں سے اس ناہنجار کی سانس واپس نہ آتی۔ شامو نے اس کی گردن چھوڑ دی، جمرو کی ٹھوکر سے وہ پیٹ پکڑے بلبلاتا ہوا ریت پر لوٹنے لگا۔

اس اثنا میں پہلے دو آدمی اٹھ کھڑے ہونے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کھلے چاقو دیکھ کر جولین، گیتا،

فرخ سب ہی کی چیخیں نکل گئیں۔ میرے پاس بیٹھا ہوا مارٹی بھی پھڑکنے لگا تھا۔ میں نے اسے پھر بھی نہیں جانے دیا۔ مارٹی کو جمرو اور شامو کی چابک دستی کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔ جمرو اور شامو پھرکی کی مانند ادھر ادھر گھومنے لگے۔ آناً فاناً وہ رخ بدل لیتے تھے۔ ان کی پھرتی اور چستی سے دونوں چاقو برداروں کا منتشر ہوجانا لازمی تھا۔ جمرو اور شامو اسی طور کسی ایک رخ سے ان کی کلائیوں پر پنجہ ڈال سکتے تھے۔ چاقو نکالنے والے کو اس حقیقت کا احساس ہر دم رہنا چاہیے کہ کوئی اوچھا وار خود اس کے لیے بہت مہلک ہوسکتا ہے اسی لیے کہتے ہیں کہ چاقو نکالنے سے پہلے مقابل کے بارے میں ایک اندازہ کرلینے کی احتیاط بہتر رہتی ہے۔ جمرو اور شامو مسلسل انہیں بھبکیاں دے رہے تھے۔ مقابل کے اس اعتماد سے ماہر چاقو باز بھی ایک وقت کو متزلزل ہوجاتا ہے۔ وہ بری طرح سٹ پٹا گئے پھر جمرو اور شامو کو جلد ہی موقع مل گیا۔ مجھے پہلو بدلنے کی دیر لگی کہ دونوں چاقو برداروں کی کلائیاں جمرو اور شامو کے پنجوں میں جکڑی ہوئی تھیں۔ ایسے وقت میں جولین اور فرخ کو الگ الگ ہی رہنا چاہیے تھا۔ مگر یہ منظر دیکھ کے ان کے اوسان جاتے رہے ہوں گے۔ ان کی دخل اندازی سے جمرو اور شامو کسی قدر متذبذب ہوگئے۔ وہ چاقو بازوں کو اتنی جلدی نہیں چھوڑتے، کچھ دیر کے لیے انہیں ہلکان ضرور کرتے۔ وہ ایسے کم عقلے نہیں تھے کہ ان کے جسموں پر چاقو کی لکیریں ڈال کر اپنے لیے خواہ مخواہ کی الجھنیں پیدا کرتے۔ جولین، فرخ، گیتا کی موجودگی میں خون خرابے کی بات سے انہیں بہر طور اجتناب کرنا تھا لیکن جولین اور فرخ یہ سب کچھ نہیں جانتی تھیں۔ ان کا دہشت زدہ ہوجانا بھی اپنی جگہ بالکل درست تھا۔ انہیں کیا اندازہ ... کہ جمرو اور شامو کا چاقو سے کیا واسطہ رہا ہے۔ بچپن سے ان دونوں نے ایک ہی کام کیا ہے، چاقو سدھانے کا یا یہ کہنا مناسب ہوگا کہ چاقو کے لیے وہ اپنے آپ کو سدھاتے رہے ہیں اور چاقو پر دسترس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آدمی ساری باتوں سے نچنت ہوگیا اور اس کے پاس چاقو ہے اس لیے اسے جوش و غضب کے اظہار کی کھلی چھٹی مل گئی۔ اڈے پاڑے کا آدمی کتنا ہی مشتعل اور برہم ہو، اسے اپنی لگام کھینچ کے رکھنا پڑتی ہے۔ چاقو کے ساتھ آدمی کے لیے خود پر بھی قابو رکھنے کی مہارت ضروری ہے۔ وہ غیر ضروری طور پر چاقو نہیں نکالتا، چاقو پاس رکھتا ضرور ہے۔ جولین اور فرخ، جمرو اور شامو نے بہ عجلت اپنے پنجوں میں دو آدمیوں کی جکڑی ہوئی کلائیوں پر گرفت ڈھیلی کرکے خود کو اوپر اچھالا۔ چند انچ زمین سے اچھل کے وہ اپنے ہاتھوں پر جسم کا سارا زور دینا چاہتے تھے تاکہ کلائی پر جھٹکا زیادہ سے زیادہ موثر ہو۔ پلک جھپکتے میں وہ اچھلے اور دوبارہ دوسرے لمحے ان کے قدم زمین پر ٹکے تو دونوں آدمیوں کی چیخ بھی نہ نکل سکی۔ کلائی کی ہڈیاں ٹوٹی نہیں ہوں گی تو بل یقیناً گئی ہوں گی۔ دونوں کے ہاتھوں سے چاقو چھوٹ گئے۔ وہ بلبلا کے ایک طرف بھاگے پھر انہوں نے پلٹ کے بھی نہیں دیکھا۔

جمرو اور شامو نے ان کے چاقو اٹھا کے جیب میں رکھ لیے۔ جولین، فرخ ایک دوسرے سے پیوست دبکی کھڑی تھیں۔ میں اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ان کی کیفیت کا اندازہ کرسکتا تھا۔ ان سب کی آنکھیں پھٹی ہوئی ہوں گی۔ جولین اپنی گلی میں مارٹی اور اس کے ساتھیوں سے ایک بار مجھے چاقو آزمائی کرتے دیکھ چکی تھی۔ شہ پارہ کے لیے بھی یہ کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن پہلے دیکھے ہوئے کسی منظر کا تجربہ، قلب و نظر کی پختگی کا ثبوت نہیں ہے۔ ان سب پر پُراسرار سراسیمگی طاری ہوگئی۔

جمرو اور شامو کو پلٹ کر ان کا سامنا کرنے میں ندامت سی ہو رہی ہوگی مگر وہ اور کیا کرسکتے تھے۔ انہیں بالکل توقع نہیں تھی کہ بات اتنی بڑھ جائے گی، چاقو کھلنے کی نوبت آجائے گی۔

میں اٹھ گیا۔ میرے ساتھ مارٹی بھی اٹھا۔ ہم دونوں تیز قدموں سے ان کے پاس پہنچ گئے۔ جاتے ہی میں نے جمرو اور شامو کی پیٹھ تھپکی اور دونوں کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ وہ بہت گھبرائے ہوئے تھے، میں اسی طرح ان پر چھائی ہوئی پشیمانی دور کرسکتا تھا۔ اب وہ سب گھر واپس چلنے کو کہہ رہی تھیں لیکن بہتر تھا کہ ابھی کچھ دیر وہ یہیں رہیں اور اپنا تردد اور تکدر دور کرکے گھر جائیں۔ میں نے مسکرا کے ان سے کہا "ارے! کیا صورتیں بنا رکھی ہیں۔ ایسی کیا بات تھی۔ کوئی بھوت تو نہیں تھے وہ، حوصلے سے کام لینا چاہیے تھا۔ ذرا سی جرات دکھاتیں تو وہ بے ہودہ لوگ ویسے ہی بھاگ کھڑے ہوتے۔"

"وہ برے لوگ تھے بابر بھائی! ان کے پاس چاقو تھے۔" فریال سہمی ہوئی آواز میں بولی۔

"ہاں، ہاں۔" مجھ سے کوئی بات نہ بن پڑی۔ چاقو میری جیب میں بھی تھا۔ جمرو، شامو اور مارٹی بھی خالی نہیں ہوں گے۔ ان تینوں کی نظریں بیک وقت مجھ پر منڈلانے لگیں اور ان کے شانے ڈھلک گئے۔ "وہ تم پر کبھی چاقو نہ نکالتے۔" میں نے بوجھل آواز میں کہا "چاقو تو انہوں نے جمرو اور شامو بھائی کو خوف زدہ کرنے کے لیے نکالے تھے۔ میرا خیال ہے،

انہیں مغالطہ ہوا تھا کہ جمرو اور شامو بھی ان کی طرح تمہارے لیے اجنبی ہیں اور تمہاری نظروں میں اپنا مرتبہ بڑھانے، تمہیں احسان مند کرنے کے لیے بیچ میں آگئے ہیں جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔"

فریال کچھ اور کہنا چاہتی تھی مگر جولین نے کہنی مار کے اسے منع کیا۔ میں نے بھی پھر خاموشی مناسب سمجھی۔ ہم ان کے ساتھ کنارے کنارے چلتے رہے۔ وہ سب چپ چپ تھیں۔ چلتے چلتے ہم اس ہوٹل کے پاس پہنچ گئے جہاں چند روز پہلے ہم نے مچھلی کھائی تھی۔ ہوٹل والے نے ہمیں پہچان کے باہر میز اور تپائیاں رکھ دیں۔ وہ بچھا جا رہا تھا۔

"آپ کو کوئی ڈر نہیں لگا جمرو بھائی؟" یکایک فارہہ نے پٹ پٹائی پلکوں سے پوچھا۔

"کیوں بھنو!" شامو جھجکتے ہوئے بولا "ڈر کا ہے کا' اپنے کو پتا ہے' وہ دونوں بس چاقو رعب مارنے کو رکھتے ہیں' ایسے ہی شوبازی ہے۔"

"کوئی پکا آدمی اتنی جلدی چاقو نہیں کھولتا' چاقو تو بہت آگے کی بات ہے۔" جمرو نے اٹکتی زبان میں کہا۔

"ہمارا تو دم نکل گیا تھا۔" فریال نے گہری سانس بھری۔

"ایسے ہی۔" جمرو پھیکی ہنسی سے بولا "آپ لوگ تھوڑی آنکھ دکھاتے تو اپنے کو آنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ ایسے ٹائم آدمی کو اوسان پاس رکھنے چاہئیں۔ ان کو فالتو میں کھونا نہیں چاہیے۔"

"لیکن چاقو کے سامنے؟" فریال ٹھنک کے بولی۔

"چاقو تو ان لوگ نے پہلے نہیں نکالا تھا اور چاقو کوئی چیز نہیں ہے اگر' اگر۔" جمرو کو خیال آگیا کہ یہ موضوع طویل نہیں کرنا چاہیے۔ وہ بھن بھناتی آواز میں بولا "چھوڑو بھنو! مٹی ڈالو' کوئی ایسی بڑی بات نہیں تھی۔ ادھر کی مچھلی کھا کے دیکھو' ایک دم تازی تازی۔"

فارہہ کی وحشت کم نہیں ہوئی تھی۔ "اگر آپ میں سے کسی کو چاقو لگ جاتا تو خدانخواستہ۔"

"نہیں لگتا بیٹا!" جمرو نے تنک کر کہا۔ اس سے برداشت نہیں ہوا' وہ زور دے کر بولا "اپنے کو ایک دم نہیں لگتا۔ ہم کو چاقو کا کھیل آتا ہے' ایسے لوگوں کو ہی بھگتانے کو ہم نے چاقو کا کرتب سیکھا تھا' اپنے پاس بھی۔۔" عجب نہ تھا کہ وہ کچھ اول فول بکنے لگتا' میں نے اس کا ہاتھ دبا کے ٹوکا تو اسے کچھ ہوش آیا۔ اچھا ہوا کہ اسی وقت ہوٹل والا اور اس کے ملازم تازہ گرم پراٹھے اور مچھلی لے کے آگئے' چٹنی بھی ساتھ تھی۔ جمرو اور شامو حکم پہ حکم دینے لگے "اور کیا ہے تمہارے ہوٹل میں؟ یہ لے آؤ' وہ لے آؤ۔ وہ بھی لے آؤ۔" ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ سارا ہوٹل منگوا لیں۔ جتنی اقسام کے کھانے تیار تھے' انہوں نے سب طلب کر لیے تھے۔ ہوٹل کا مالک کشمیر کا رہنے والا تھا۔ اس نے پستے' بادام اور کشمش ملی ہوئی کشمیری چائے بنوائی تھی۔ چائے پیے بغیر اس نے ہمیں نہیں اٹھنے دیا۔ رفتہ رفتہ سب کے چہرے بحال ہونے لگے۔ اس میں جولین کے سلیقے اور تدبیر کا بھی بڑا دخل تھا۔ وہ انہیں بمبئی کے کھانوں' خصوصاً بمبئی میں پکائی جانے والی مچھلی کی بے شمار اقسام کے بارے میں بتاتی رہی۔ کچھ دیر پہلے بیتے ہوئے واقعے کا ذکر ہی نہیں آیا۔ جولین نے انہیں اس کی مہلت ہی نہیں دی۔

ہر سو اندھیرا چھا گیا تھا مگر سمندر کو اندھیرے سے سروکار نہیں ہے۔ سمندر کبھی نہیں سوتا' اندھیرے میں تو وہ اور بیدار اور پرجلال ہو جاتا ہے۔ ہوا میں سردی کی آمیزش تھی۔ اب انہیں ایسی جلدی نہیں تھی۔ موٹریں دور کھڑی تھیں۔ ہم آہستہ آہستہ ان تک پہنچے۔ فارہہ چونک کے بولی "جمرو بھائی! آپ ان کے چاقو پانی میں پھینک دیجیے۔"

"ہاں ہاں' کیوں نہیں۔" جمرو اور شامو نے بڑبڑاتے ہوئے جیب سے چاقو نکال کے فارہہ کے آگے ہاتھ پھیلا دیے۔

فارہہ پیچھے ہٹ گئی جیسے جمرو اور شامو نے چاقو نہیں' بچھو اس کے سامنے کر دیے ہوں۔ جمرو ہنسنے لگا اور اس نے شامو سے کہا کہ وہ فارہہ کو ساتھ لے کر چاقو سمندر برد کر آئے۔

"اور اگر انہیں مچھلیوں نے نگل لیا تو؟" جولین مسکرا کے بولی۔

"بند چاقو مچھلیوں کا کچھ نہیں بگاڑیں گے' مچھلیوں کے پیٹ میں وہ زیادہ محفوظ رہیں گے۔" فریال نے چہکتی آواز میں کہا۔

گھر واپس آ کے وہ خاصی سنبھل چکی تھیں۔ میرے ساتھ وہ پہلی بار کسی ایسی جگہ گئی تھیں۔ وقت ہی کہاں ملا تھا انہیں کہیں لے جانے اور گھمانے پھرانے کا۔ اس وقت یہی کچھ ممکن تھا۔ میں نے طے کیا کہ کل یا پرسوں انہیں پھر کہیں لے جاؤں گا۔ آج کی کسر پوری ہو جائے گی۔ اب تو موٹریں بھی موجود ہیں' ہم دور تک جا سکتے ہیں۔ گھر سے باہر نکل کے یقیناً ان کی گھٹن دور ہوگی اور کچھ حوصلہ بھی بڑھے گا۔ کم از کم گیتا کے لیے تو یہ بہت ضروری ہے۔ اس کے دل میں زندگی کی ہمک پیدا ہوگی۔ گھر آ کے وہ بہت ہلکی پھلکی نظر آ رہی تھیں۔

بعض لوگوں کی طرح زمین کے بعض حصوں پر بھی خدا نے خاص مہربانی کی ہے۔ کرشنا جی مجھے بمبئی کے کئی ایسے مقامات پر لے گئے جہاں مٹی نظر نہیں آتی' زمین پر سبزہ ہی سبزہ بچھا ہے' سبزہ زمین سے پھوٹ رہا ہے۔ ہر طرف جنگل جیسا نظارہ جھیلیں' پہاڑیاں جا بجا پھولوں سے ڈھکے ہوئے کنج' درمیان میں بنے ہوئے لکڑی کے مکانات' اونچی نیچی سڑکیں' چائے خانے اور جانے کیا کیا۔۔۔ ایک جگہ تو اچھی طرح میرے ذہن پر نقش ہے۔ وہاں بمبئی کے بڑے بڑے لوگ موجود تھے۔ ساز گونج رہے تھے اور رنگ برنگی دھیمی روشنیاں جھل مل جھل مل کر رہی تھیں اور فضا میں خوشبو بسی ہوئی تھی۔ میں اس وقت بہت گھبرایا ہوا تھا۔ پہلے میں کسی ایسی جگہ گیا بھی نہیں تھا۔ لگتا تھا' کسی اور دنیا میں آگیا ہوں۔ وہاں کسی شخص کو جیسے کوئی دکھ ہی نہیں تھا۔ کسی کے گھر میں جیسے کوئی بیمار نہیں ہوتا تھا' نہ موت ہوتی تھی۔ وہاں داخلہ بھی خاص خاص آدمیوں کو ملتا تھا مگر خاص آدمی کے سر پر سینگ نہیں ہوتے۔ خاص آدمی بننے میں کیا دیر لگتی ہے۔ روپیہ سب سے بڑا ذریعہ اور سب سے بڑا واسطہ ہے۔ میں نے سوچا' ایک بار تو میں انہیں وہاں ضرور لے جاؤں گا۔ ان کے لیے یہ سب کچھ نیا ہوگا۔ وہاں کے لوگ دیکھ کے ان میں اعتماد پیدا ہوگا۔ ایسی جگہیں اسی لیے بنائی جاتی ہیں کہ آدمی کو زندگی کی ترغیب ملے۔ مجھے اور کام بھی کیا ہے۔ میں کچھ اور نہ سہی' یہ تو کر سکتا ہوں۔ جولین نے مجھ سے یہی تو کہا تھا کہ اگر آدمی اپنے لیے کارآمد نہ ہو تو دوسروں کے لیے سود مند ہو سکتا ہے۔ آدمی جب دوسروں کو بھول سکتا ہے تو اپنے آپ کو کیوں نہیں بھول سکتا۔ آدمی خود کو یکسر فراموش کیوں نہ کر دے اور ہو سکے تو بس دوسروں کو یاد رکھے۔ آدمی کا اپنے آپ سے واسطہ نہ رہے تو کوئی مشکل باقی نہیں رہتی۔ بھلا یہ کوئی ضروری ہے کہ آدمی اپنی ہی زندگی گزارے۔ راستے بھر اور پھر گھر جا کے میں اپنا ارادہ مصمم کرتا رہا مگر میں نے کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا۔

کیلاش اور رما ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ کیلاش افسوس کرنے لگا کہ وہ کچھ پہلے آجاتے تو ہمارے ساتھ ہی چلتے۔ اس کے تاسف پر مجھے بھی ندامت ہوئی اور وضاحت کرنی پڑی کہ بس اچانک جمرو اور شامو کے دل میں سمائی اور دیکھتے ہی دیکھتے سب تیار ہو گئے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ آئندہ سب ساتھ ہی کہیں چلا کریں گے۔ گزشتہ ہفتے کیلاش اور رما نے شاید ہی کسی دن ناغہ کیا ہو۔ رات کا کھانا وہ عموماً یہیں کھاتے تھے۔ ان کی ماں اور بہن ابھی تک پونا ہی میں تھیں۔ رات کو وہ دونوں دیر سے گھر جاتے۔ اس دن کے بعد کیلاش سے پونا کے بارے میں میری کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ نہ اس نے زبان کھولی' نہ میں نے تجسس ظاہر کیا۔ وہ دونوں ہی بجھے بجھے' کھوئے کھوئے سے رہتے تھے اور چھپانے کی کوشش کرتے تھے' دوسروں کے علاوہ شاید اپنے آپ سے بھی۔ اپنے آپ سے بھی تو آدمی بہت کچھ چھپاتا ہے۔ کیلاش کچھ زیادہ دل گرفتہ نظر آتا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے کھو جاتا پھر آپ ہی آپ چونک پڑتا اور زیادہ تن دہی و مستعدی ظاہر کرنے لگتا۔ ارادے کی پختگی اپنی جگہ مگر آدمی کی ناتوانی اپنی جگہ ہے۔ وہی بات جو کیلاش خود مجھ سے کہہ رہا تھا' آدمی دوسروں کا پابند جو رہتا ہے' عزیزوں کا' دوستوں کا' رسم رواج کا۔ دوسروں کی رفاقت سے جہاں توانائی بڑھتی ہے' وہاں توانائی بھی کم نہیں ہوتی۔ رما کو اس ناگفتنی کا احساس تھا تو اس کی وجہ اپنے آپ پر یقین کے علاوہ حقیقتوں سے ناآگہی بھی ہو سکتی ہے۔ سچ ہمیشہ دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک اپنا سچ' ایک دوسروں کا۔ یعنی آدمی کے گرد و پیش کا سچ۔ ایک اپنے حوالے سے' دوسرا دوسروں کے حوالے سے۔ کبھی اپنا سچ غالب آجاتا ہے' کبھی دوسروں کا مگر بیشتر جیت دوسروں کے سچ کی ہوتی ہے۔ ہجوم میں گھرا ہوا آدمی آخر کہاں تک اپنے سچ پر اصرار کرے۔ رما زندگی کی اس نیرنگی سے شاید ناواقف تھی اور وہ بظاہر آسانی سے پسپا ہونے والی لڑکی نہیں تھی لیکن وضع دمروت کی اس میں بھی کمی نہیں تھی جو ذات کی ناتوانی کا اشارہ ہے۔ اتفاق سے اس دوران میں مجھے اس سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ خود میں نے بھی اجتناب کیا کہ اس کا بتایا ہوا کیلاش سے کیا مختلف ہوگا اور میں کیا اس کی دل جوئی یا اشک شوئی کر سکوں گا۔ اسے شاید معلوم نہیں تھا کہ کیلاش نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ ممکن ہے' جولین سے رما نے اپنا حال بیان کیا ہو۔ پونا سے آنے کے بعد زیادہ تر جولین ہی سے اس کا ربط و ضبط رہا تھا اور ہو سکتا ہے یہ رما کی صاف دلی' اس کی زبانی سنے ہوئے احوال کا اثر تھا یا جولین نے از خود اپنے رویے میں نظر ثانی کی تھی' وہ بڑی حد تک متوازن نظر آتی تھی۔ مجھے اس سے مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ کیلاش سے مغائرت کا رویہ کیلاش کے اضطراب کے لیے مہمیز ثابت ہو سکتا ہے' ایک طرح سے یہ کیلاش کی آنکھوں میں امڈتے ہوئے خوابوں کی پذیرائی ہے۔ غالباً یہی سبب تھا کہ وہ رما سے تعزیت کرنے اس کے گھر بھی جا چکی تھی' میرے بغیر حالانکہ طے یہ ہوا تھا کہ وہ میرے ساتھ وہاں جائے گی۔

اس دن رما سادہ لباس میں تھی۔ بجھے ہوئے سے گیروے رنگ کی ساڑی میں ملبوس' کناروں پر بڑے بڑے پھول کڑھے ہوئے تھے۔ اس سادگی میں بھی بہت دیدہ زیبی تھی۔ ہر بار یہی گمان ہوتا تھا کہ یہ لباس اس کے بدن کا حصہ ہے۔ ہر بار اس سے اس کے سراپا میں لباس شامل سا لگتا تھا۔ کانوں میں سفید آویزے لٹک رہے تھے۔ کانوں سے الگ ہوں تو کان سونے ہوجائیں۔ چہرہ دہک رہا تھا جیسے آگ اندر جل رہی ہو۔ میں کیلاش کے پاس بیٹھا تھا کہ وہ میرے پاس چلی آئی اور کھنکتی ہوئی آواز میں بولی "آپ تو آتے ہی نہیں!"

یوں اچانک اس کے سامنے آجانے پر میرا جسم اکڑ سا گیا۔ میں نے منتشر لہجے میں کہا "بس آتے آتے رہ جاتا ہوں۔"

"اب تو بہت کچھ ٹھیک ہوگیا ہے۔" وہ نظریں گھماتے ہوئے شائستگی سے بولی "آپ آسکتے ہیں۔"

"ضرور آؤں گا۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"جانے کیوں مجھے انتظار سا رہتا ہے کہ آپ کسی بھی وقت اچانک چلے آئیں گے۔" وہ چمکتی آنکھوں سے بولی۔ دو دن پہلے بھی وہ کہہ چکی تھی کہ گھر میں سارے دن اکیلے رہتی ہوں' کیلاش اسپتال چلا جاتا ہے' آپ اگر کوئی کام نہ ہو تو چلے آیا کیجئے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا اور مجھے یاد بھی تھا کہ لیکن میں سوچ کے رہ گیا۔

"آپ ہی ادھر آجایا کیجئے۔" میں نے مسکرا کے کہا "صبح کے وقت بھی تو آپ آسکتی ہیں۔ یہاں آپ کا دل بہلا رہے گا اور سب ہی خوش ہوں گے۔"

"میں نے رما سے یہی بات کہی تھی کہ تم کچھ دن کے لیے یہاں آجاؤ۔" کیلاش سر جھٹک کر تیزی سے بولا۔

"صبح میں پینٹنگ کرتی رہتی ہوں یا کتابیں پڑھتی ہوں۔ وقت گزر جاتا ہے لیکن یہ اچھا مشورہ ہے۔" وہ انگریزی میں بولی "کسی دن آجاؤں گی۔"

"کسی دن کیوں' آپ ابھی سے رہ جائیے۔"

وہ مسکرا دی "یہ بھی ٹھیک ہے مگر آپ کیوں نہیں آتے؟ میں شرط لگاتی ہوں کہ آپ کا دل نہیں اکتائے گا۔"

"مجھے یقین ہے۔" میں نے جھجکتی آواز میں کہا۔

"تو آپ ہی آئیے نا' کتنے دن ہوگئے آپ سے باتیں کیے ہوئے۔ گھر میں نہیں تو کہیں اور چلے جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے' میں ضرور آؤں گا۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"کل آئیے گا؟" وہ سرگوشیانہ لہجے میں بولی۔

"دیکھیں شاید' کل ہی مگر انتظار مت کیجئے گا۔ ویسے آپ تو شام کو آئیں گی ہی۔"

"انتظار تو میں نے ابھی سے شروع کردیا ہے۔" وہ لہکتی آواز میں بولی "جانے کتنی باتیں اکٹھی ہوگئی ہیں۔"

"یقیناً نہایت دل کش اور اہم باتیں ہوں گی۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

اس کے چہرے کی سرخی گہری ہوگئی۔ چمپا بیگم نے درمیان میں آکے اسے بھٹکا دیا۔ وہ پان دان لے کر آئی تھی۔ رما کو اس کے ہاتھوں کی گلوریاں بہت پسند تھیں۔ گلاب کے عرق میں بسی ہوئی چاندی کے ورق میں لپٹی ہوئی۔ پان رما پر رچتا بھی خوب تھا۔ گلوری کھا کے اس کے ہونٹ سرخ ہوجاتے تھے' مہندی لگے ہوئے یا خون میں ڈوبے ہوئے۔ وہ پان نہیں کھاتی تھی لیکن جب بھی چمپا بیگم سامنے آتی' رما اس سے گلوری کی فرمائش کرنے لگتی۔ اس نے ایک مرتبہ چمپا بیگم سے کہا تھا' لگتا ہے آپ گلوریاں تراشتی ہیں' فن کار کی طرح۔ رما کو کیا معلوم تھا کہ چمپا بیگم سے زیادہ کون اس فن سے واقف ہوگا۔ ہاں' میں نے یہ ضرور دیکھا تھا کہ رما کی بات سن کر چند لمحوں کے لیے چمپا بیگم کا چہرہ بجھ سا گیا تھا مگر وہ جلد ہی سنبھل گئی کیونکہ رما کی توصیف میں کوئی آلودگی نہیں تھی۔

کیلاش کو اسپتال میں کسی مریضہ کو دیکھتے ہوئے گھر جانا تھا اس لیے وہ دونوں نسبتاً کچھ جلدی چلے گئے۔

○☆○

دوسرے دن ہم ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ زورا آگیا۔ وہ پہلے پرانے گھر گیا تھا۔ وہاں شبی چاچا نے بہت منتوں کے بعد اسے یہاں کا پتا بتایا۔ زورا نے آتے ہی بٹھل اور ابا جان کے پیر پکڑ لیے اور عاجزی سے کہنے لگا "اب و پاڑے واپس نہیں جائے گا' یہیں کونے میں اسے بھی جگ دے دی جائے' وہ سب کی خدمت کرتا رہے گا۔ اس کا وعد ہے' کسی کو بھی اس سے شکایت نہیں ہوگی۔" کہنے لگا کہ اس کا دل پاڑے پر بالکل نہیں لگتا۔

ابا جان نے اسے اٹھا کے گلے لگالیا اور کہا کہ وہ خود اس کی طرف سے فکر مند تھے اور انہوں نے بٹھل سے کہا تھا زورا کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اسے بھی یہیں بلالیا جائے ماہم کے پاڑے سے کنارہ کشی کرتے وقت بٹھل نے زورا پاڑے پر چھوڑ دیا تھا اور ہدایت کی تھی کہ وہ ماہم کے پاڑ پر پانڈے دادا کی اعانت کرتا رہے۔ زورا' پیرو کے دسویں

بھی آیا تھا۔ اس روز وہ بہت اداس اور دل گیر نظر آتا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ اسے روک لوں گا۔ ایک دو دن کے لیے ہی لیکن وہ مجھ سے ملے بغیر چلا گیا۔ اس وقت بناری کو سامنے دیکھ کے میری آنکھوں میں ریت بھری ہوئی تھی۔ زورا ہمارے ساتھ ابا جان کی تلاش میں تبت گیا تھا۔ وہ بھی ہماری طرح اپنے آپ کو داؤ پر لگائے رہا اور زندگی تھی کہ نشانوں سے بچا رہا پھر حیدر آباد میں جب ایک رات مسلح آدمیوں نے ابا جان کی نو خرید حویلی میں نقب لگائی تو زورا ان کے سامنے دیوار بن کے کھڑا ہوگیا تھا' وہ یہ بھول گیا تھا کہ دیوار کی بھی ایک استطاعت ہوتی ہے۔ اس اندھیری رات میں زورا ہمارے ساتھ تھا۔ زورا' چھنگا کے پاڑے کا خاص آدمی تھا۔ پہلی مرتبہ میری اس سے وہیں ملاقات ہوئی تھی۔ چھنگا دادا کا بڑا ہاتھ میں آنے کے بعد میرے قدم پاڑے پر جمانے میں اس کا اور چھیدا کا بڑا دخل تھا۔ وہ دونوں سائے کی طرح میرے ساتھ رہتے۔ زورا کوئی چھوٹا موٹا دادا نہیں تھا۔ جسم کا مضبوط' ارادے کا مضبوط' وہ بولتا کم' سنتا اور سمجھتا زیادہ تھا۔ چاقو پر اسے پہلے ہی اچھی مہارت تھی۔ بعد میں کچھ میری توجہ' کچھ اپنی لگن سے اس کا ہاتھ اور صاف ہوگیا تھا۔ ماہم کے پاڑے پر پیرو دادا سے ہماری شناسائی کے بعد اس کا بیشتر وقت پیرو کے ساتھ گزرتا تھا۔ میرے لیے وہ کسی طور جمرو' شامو اور مارٹی وغیرہ سے کم نہیں تھا۔ تبت سے کلکتے' کلکتے سے فیض آباد اور فیض آباد سے حیدر آباد اور پھر واپس بمبئی تک وہ مسلسل ابا جان کی خدمت کرتا رہا تھا' ابا جان کی اور بٹھل کی۔ اس کے ساتھ نہ رہنے پر مجھے کوئی خلش سی تھی۔ اچھا ہوا کہ وہ خود آگیا۔ ابا جان کی مرضی دیکھ کے بٹھل نے بھی کچھ نہیں کہا۔

زورا کی زبانی معلوم ہوا کہ پاڑے پر سب ہی بکھرے ہوئے ہیں۔ پانڈے دادا چوکی پر بیٹھا ہاتھ پاؤں دبواتا رہتا ہے اور بات بے بات' بکتا جھکتا اور لوگوں کو جھڑکتا رہتا ہے۔ اس کا دل بھی وہاں نہیں لگ رہا ہے۔ صبح و شام لوگ پابندی سے آتے ہیں اور سر جھکائے بیٹھے رہتے ہیں۔ بٹھل نے زورا کی باتوں پر دھیان نہیں دیا۔ آخر زورا بھی چپ ہوگیا۔

اس کی آمد پر جمرو' شامو' مارٹی اور ٹگو تو دیوانے سے ہوگئے تھے جیسے زمانوں کا بچھڑا ہوا کوئی ملا ہو۔ جگنو اور دیوا کے بارے میں' میں نے زورا کو جتا دیا تھا کہ یہ دونوں اپنے ساتھ ہی ہیں۔ انہیں گھر میں دیکھ کر وہ حیران رہ گیا تھا۔ وہ ان کا اچھی طرح واقف تھا۔ جگنو اور دیوا جب پاڑے پاڑے ٹھوکریں کھا رہے تھے تو چھنگا دادا نے انہیں پناہ دی تھی' زورا اور چھیدا چھنگا دادا کے دست راست تھے۔ بناری سے جگنو اور دیوا کی نسبت کے متعلق زورا کو کچھ ایسا علم نہیں تھا۔ میں نے بھی تفصیل نہیں جانی۔ میں نے اس سے کہا کہ ان کا خیال رکھنا اور ان پر اور محنت کرنی ہے' کیوں اور کس لیے سے زورا کو غرض نہیں تھی۔ میرا اتنا کہہ دینا اور اس کا اتنا سن لینا ہی بہت تھا۔

میرا ارادہ رما کی طرف جانے کا تھا لیکن زورا کی وجہ سے میں نے جانا ملتوی کردیا۔ زورا اپنے ساتھ کچھ نہیں لایا تھا۔ میں نے اسے میرے کپڑے دیے۔ سہ پہر کو درزی نے آکے اس کا ناپ لیا۔ ابا جان نے درزی کو تین دن کا وقت دیا تھا۔ ان کا حکم تھا کہ اس عرصے میں درزی کوئی اور کام نہ کرے' زورا کے لیے جتنے بھی جوڑے ممکن ہوں' تیار کرکے لے آئے۔

نہا دھو کے زورا کا رنگ روپ نکل آیا۔ شام کو جمرو اور شامو اسے ساحل کی طرف لے گئے۔

اس روز کیلاش اور رما نہیں آئے۔ رات گئے تک سب ہی ان کا ذکر کرتے رہے پھر غیر متوقع طور پر کیلاش کے ایک ملازم نے آکے مجھے کیلاش کا رقعہ دیا۔ رقعہ انگریزی میں تھا' لکھا تھا کہ پہلی گاڑی سے انہیں پونا جانا پڑ رہا ہے۔ ابھی ٹھیک سے کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن امید ہے کہ چند روز میں واپسی ہوجائے گی۔ کیلاش نے معذرت کی تھی کہ تار ملنے کے بعد اتنا وقت نہیں کہ وہ مجھ سے مل لے۔ میں نے کئی بار کیلاش کی تحریر پڑھی اگرچہ کوئی اور بات اس نے نہیں لکھی تھی۔ سب کو سلام اور سب کے لیے نیک خواہشات کے رسمی جملے کے سوا۔ ظاہر ہے کوئی اہم بات ہوگی جو اسے اتار دے کے بلوایا گیا تھا۔ پولیس نے جج صاحب کے قتل کا سراغ لگالیا ہوگا یا کمل اور کوشلی کا کوئی معاملہ تھا۔ کوئی اور بات بھی ہوسکتی تھی۔ مجھے دیر تک تشویش رہی۔

دن ایسے ہی گزر گیا' کچھ اندر گھر میں' کچھ بٹھل کے پاس' کچھ جگنو اور دیوا کے ساتھ اور کچھ اکبر کے ساتھ۔ اکبر نے باغ سے ملحق ٹینس کورٹ ٹھیک کروالیا تھا۔ یہ کھیل میں نے کبھی اسکول میں کھیلا تھا۔ بس سرسری انداز میں۔ آج اکبر کے اصرار پر میں اس کے مقابل کھڑا ہوگیا پھر جمرو' شامو' مارٹی اور زورا بھی آگئے۔ انہیں ٹینس کھیلنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ میں نے اپنی شدبد کے مطابق انہیں کھیل کا طریقہ سمجھایا۔ نگاہ کے سب تیز تھے۔ جسموں میں پھرتی تھی' بازوؤں میں بل تھا اور ذہن کی فراغت بھی میسر تھی۔ چنانچہ

ذرا سی دیر میں ان کا ہاتھ چلنے لگا۔ اکبر کو بھی دسراہٹ کی کمی نہ رہی پھر میں کرسی پر بیٹھا کھیل دیکھتا رہا۔ کچھ وقت اس طرح گزر گیا اور شام ہونے لگی۔

مجھے بے کلی سی ہو رہی تھی۔ کچھ اور سمجھ میں نہیں آیا تو میں نے جولین اور فرخ سے کہا کہ وہ کہیں چلنا چاہتی ہوں تو چلیں، مجھے شبہ تھا کہ شاید وہ کوئی عذر کردیں گی لیکن وہ تو جیسے اشارے کی منتظر تھیں۔

ہم موٹروں میں بیٹھے شہر کی سڑکوں پر گھومتے رہے۔ یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں۔ سانتا کروز سے قلابے تک راستے میں روشنیاں جل گئی تھیں۔ اردگرد اندھیروں کے بیچ میں روشنیوں کے منظر ہی کچھ اور ہوتے ہیں۔ اندھیرے میں کم سے کم عیب پوشی کی خوبی تو ہے۔ شہر کی کتنی بدنمائیاں اندھیرے میں شامل ہوگئی تھیں۔ اندھیرا بھی سمندر کے مانند ہے، اندر کا کچھ نظر نہیں آتا۔ اس شام موسم بھی اچھا تھا۔ دھیمی دھیمی ہوا چل رہی تھی۔ سڑکوں پر بہت اژدحام تھا جیسے سارے گھر خالی ہوگئے ہوں اور سارا شہر شور مچا رہا ہو، ہر طرف مقامی ریل گاڑیوں، موٹروں، ٹراموں اور گھوڑا گاڑیوں کا غل اٹھ رہا تھا۔

گیٹ وے آف انڈیا پر سب اتر گئے۔ رات کا منظر وہاں بہت دل کش ہوتا ہے۔ مارٹی نے سب کو ناریل کا پانی پلایا اور قلفی، چاٹ مسالا وغیرہ الگ کھلایا۔ بندر اور بھالو والا ایک مداری ہمارے سامنے آکے تماشا دکھانے لگا۔ بندر نے اپنی حرکتوں سے سب کو بے حال کردیا تھا۔ مارٹی اور جمرو نے ان پر بے تحاشا روپے لٹانے شروع کیے تو بندر اور مستانے ہوگئے۔ جانوروں کو بھی روپے کی قدر و قیمت معلوم ہے۔ آدمی کی صحبت کا کچھ تو اثر ہونا چاہیے۔ بندر اور بھالو روپے اٹھا کے سلام کرتے، سیلوٹ مارتے، کھولے مٹکاتے، پتلیاں گھماتے اور دانت دکھاتے تو جمرو اور شامو کے ہاتھ بے اختیار جیبوں میں چلے جاتے۔ مداری کی ڈگڈگی پر بندر اور بھالو کا رقص ناقابل یقین تھا۔ جمرو اور شامو تو جیسے کسی مجرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سب کی جیبیں بھری تھیں۔ لگتا تھا، ابا جان نے انہیں ڈھیروں روپے دیے ہیں۔ سب بادشاہ بنے ہوئے تھے۔ روپیہ بس ان کی جیبوں میں ہونا چاہیے تھا پھر وہ کل کی فکر نہیں کرتے تھے۔ شامو کی خواہش تھی کہ بھنڈی بازار میں وہ سب کو چوڑیاں اور چنریاں پہنائے مگر جولین نے اسے گیتا کی موجودگی کا احساس دلایا تو وہ سر پیٹنے لگا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ گیتا اس وقت پاس نہیں تھی۔ قلابے کے بازار میں ایک جگہ موٹر رکوا کے جولین اتر گئی۔ وہ کتابوں اور رسالوں کے انبار خرید لائی تھی۔ جمرو بھی چپکے سے اس کے پیچھے چلا گیا تھا، یقیناً اس نے جولین کو پیسے نکالنے کا موقع نہیں دیا ہوگا۔

میرے لیے یہ طمانیت کی بات تھی کہ وہ خوش خوش گھر آئیں۔ مقصود بھی یہی تھا کہ وہ ذرا مختلف وقت گزاریں اور دیکھ سکیں کہ ان کے اطراف زندگی کیسی زندہ اور روشن ہے۔ روز لوگ مرتے ہیں پھر بھی بے شمار لوگ اور بستیاں رواں دواں رہتی ہیں۔ زندگی کا دریا کبھی خشک نہیں ہوتا۔ سب ہی نے ان کا خیال رکھنے کی کوشش کی تھی خصوصاً گیتا کا۔ اس سے زیادہ شاید ممکن نہیں تھا۔ میں تو مستقل انہی کی طرف متوجہ رہا، غالباً کسی بھی لمحے انہیں میری شمولیت میں کوتاہی کی شکایت نہ ہوئی ہو۔ جب تک خود انہوں نے گھر چلنے کی خواہش کا اظہار نہ کیا، کسی نے واپسی کے لیے ایک لفظ منہ سے نہیں نکالا۔

گھر آکے مجھے تھکن سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں اوپری حصے کے ایک کمرے میں لیٹ گیا۔ یہاں تنہائی بہت تھی اور کسی کی دخل اندازی کا امکان نہیں تھا۔ میں کچھ دیر اپنے ساتھ بھی رہنا چاہتا تھا۔ لوگوں کے ساتھ اس تن دہی سے رہنے کی مجھے عادت جو نہیں تھی۔ کسی نے آکے مجھے نہیں پوچھا۔ رات میں وہیں رہ گیا اور کسی وقت مجھے نیند آگئی لیکن صبح وہی صورت تھی۔ جسم جیسے ٹوٹ پھوٹ رہا ہو۔ میں نے کسی پر ظاہر نہیں کیا۔ میں نے ان سب کے ساتھ معمول کے مطابق ناشتا کیا اور عمارت کے اندر اور باہر چکر لگاتا رہا، کبھی اس کے پاس، کبھی اُس کے پاس۔ ناشتے کے بعد جولین نے گزشتہ رات لائی ہوئی کتابوں میں سے تین کتابیں مجھے دی تھیں، دو انگریزی ناول تھے، ایک کتاب زندگی کے متعلق تھی۔ یہی اچھا تھا کہ ادھر ادھر گھومنے پھرنے کے بجائے میں کتابیں پڑھتا رہوں۔ میں پھر اوپری منزل کے کمرے میں چلا گیا اور دوپہر کے کھانے تک ورق گردانی کرتا رہا، کہتے ہیں، کتاب سے اچھا دوست نہیں ہوتا مگر دوستی بھی تو بٹھل کے بہ قول تالی کی طرح ہوتی ہے۔ یہ تو آدمی پر منحصر ہے کہ وہ دوستی کے لیے آمادہ ہے یا نہیں۔ میں نے دل جمعی کی کوشش کی۔ جب کچھ صفحات پڑھ چکا... تو پھر میرا دماغ بھٹکنے لگا۔ میں نیچے آگیا۔

کئی دن اسی طرح گزر گئے۔ دس گیارہ بجے کے قریب میں گھر سے نکل کھڑا ہوتا اور آس پاس کا ایک چکر کاٹ کے واپس آجاتا۔ یوں کچھ اور نہیں تو مکان کے اردگرد کی گلیوں سے مجھے واقفیت ہوگئی۔ شام کو جمرو اور شامو میں سے کوئی کسی طرف جاتا تو میں بھی ان کے ساتھ ہولیتا۔ کئی بار میں نے ارادہ کیا، بٹھل سے بات کروں کہ اس نے کیا سوچا ہے،

فیض آباد میں بھی کوئی رہتا ہے۔ زریں کو خط بھیج دیا گیا تھا لیکن وہ تو دن گن رہی ہوگی، ادھر خانم کو بھی حیدر آباد سے واپس آنا ہے۔ وہ کیا سوچتی ہوگی، ہم نے پلٹ کے خبر بھی نہ لی۔ اب تو بہت وقت ہوگیا ہے۔ وہ کب تک وہاں ٹھہری رہے گی۔ جہاں تک مجھے علم تھا، اسے تو کوئی خط بھی نہیں لکھا گیا۔ بٹھل دن بھر اپنے کمرے میں پڑا حقہ گڑگڑاتا رہتا۔ وہ ناشتے دوپہر کے کھانے اور رات کے وقت باہر نکلتا یا شام کو عمارت کے پچھلے حصے کے چبوترے پر جا کے بیٹھ جاتا اور سب اس کے اطراف اکٹھے ہوجاتے۔

دو دن پہلے رات کو شکلا دوسری بار آیا تھا۔ گھنٹوں بیٹھا رہا۔ اس نے ہدایت کی ہوگی جبھی بٹھل کل صبح جمرو کو ساتھ لے کے عدالت گیا تھا۔ جمرو کے کہنے کے مطابق عدالت میں ماری پیش کی گئی تھی۔ اس کی حالت نہایت ابتر تھی۔ عدالت نے ماری کے لیے درپردہ شکلا کی طرف سے کیے گئے وکیل کی درخواست آخر منظور کرلی اور ماری کو جیل سے اسپتال منتقل کرنے کا حکم جاری کردیا۔ گویا شکلا اپنی تگ و دو میں کم سے کم اس حد تک تو کامیاب ہوگیا تھا۔ بٹھل اور شکلا کو ماری کے بچوں کا انتظام کرنے پونا بھی جانا تھا۔ اگر بٹھل ماری کے مقدمے اور اس کے بچوں کی وجہ سے ٹھہرا ہوا تھا تو آخر کیوں؟ پونا جانے اور آنے میں وقت ہی کتنا لگتا ہے۔ جانا ہوتا تو اسے کبھی اب تک آنا ہوچکا ہوتا۔ ماری کی خبر گیری کے لیے ادھر شکلا اور اس کا وکیل کافی تھا اور ایسا ہی تھا تو بٹھل کچھ دنوں بعد پھر بمبئی واپس آسکتا تھا مگر نہ جانے اس کے دل میں کیا تھا۔

ادھر ابا جان بھی مستقل اپنا نیا گھر جما رہے تھے۔ روز نئی نئی چیزیں آرہی تھیں۔ فانوس، قالین، نئی طرز کا فرنیچر۔ ملازموں کے حصے کی مرمت کی جارہی تھی اور ان کے کمرے کشادہ اور روشن کیے جارہے تھے۔ حوض کے لیے نادر قسم کی رنگ برنگی مچھلیاں منگوائی گئی تھیں۔ رات کو سبزہ زار پر بیٹھنے کے لیے تیز روشنیوں والے بڑے بڑے قمقمے نصب کیے جارہے تھے۔ صبح ناشتے کے بعد ابا جان اور منیر علی موٹر میں بیٹھ کے نہ معلوم کہاں جاتے تھے، واپسی کبھی دوپہر کے کھانے کے وقت ہوتی، کبھی شام کو۔ منیر علی کو بھی شاید بمبئی بہت پسند آیا تھا۔ اپنا گھربار چھوڑے ہوئے وہ یہاں باغ میں لگے ہوئے تھے۔ چار دیواری کے بڑے دروازے سے عمارت تک کے راستے میں انہوں نے اشک بار اشوک، درخت کے ان گنت پودے لگوا دیے تھے، سرو کی طرح قطار میں، کسی کو بھی کوئی جلدی معلوم نہیں ہوتی تھی۔

جمرو اور شامو کو بھی نہیں۔ انہیں تو جیسے فرصت ہی نہیں تھی۔ ٹینس کورٹ میں ان کا جی بھی لگ گیا۔ ہاں، صبح و شام وہ جگنو اور دیوا کو وقت ضرور دیتے پھر سیدھے ٹینس کورٹ کا رخ کرتے اور بلا مبالغہ پہروں کھیلتے رہتے۔ کھیلتے کھیلتے پسینے پسینے ہوجاتے۔ زورا، مارٹی اور ٹنگو بھی پورے ذوق و شوق سے ان کے ساتھ جتے رہتے۔

روز صبح کچھ دیر کے لیے میں بٹھل کے پاس جا کے بیٹھ جاتا۔ کچھ اسے پوچھنے، اس کا حال جاننے اور کچھ سن گن لینے کے لیے بھی۔ ایسا نہیں تھا کہ میں بٹھل کو ٹوک نہ سکتا ہوں، اس سے کچھ پوچھ نہ سکتا ہوں مگر جب بھی میں یہ ارادہ کرتا، مجھے اپنی لب کشائی بے محل معلوم ہونے لگتی۔ کہیں میں جلد بازی تو نہیں کر رہا ہوں۔ بٹھل کون سا یہاں اپنی مرضی سے بیٹھا ہوا ہے۔ زریں، اپنی بٹیا تو اسے اچھی طرح یاد آرہی ہوگی۔ زریں ایسی نہیں ہے جسے کوئی آسانی سے بھلا دے۔ خانم کی طرف سے بھی وہ غافل نہیں ہوگا۔ وہ چاروں طرف آنکھیں کھلی رکھتا ہے۔ مجھے شبہ تھا کہ وہ جھڑک دے گا کہ تجھے آخر ایسی کیا بے چینی ہے۔ تیرا کون سا گاؤں زد پر ہے۔ جب دیکھو، منہ بنانے، فیل مچانے لگتا ہے۔ یہی سوچ کے میں خاموش ہوجاتا ہوں۔ واقعی مجھے کاہے کی جلدی تھی؟ کہاں جانا تھا؟ کوئی جلدی مجھ ہی کو کیوں ہو رہی ہے۔ بٹھل مناسب سمجھتا تو مجھ سے کہہ سکتا تھا کہ میں فیض آباد چلا بھی جاتا تو فرق کیا پڑتا۔ میرے لیے تو ہر جگہ ایک جیسی ہے، میں آخر کیوں گھٹا جا رہا ہوں۔ کون سے نقصان کا اندیشہ مجھے ایسا بے کل کیے ہوئے ہے۔

ابا جان کو اپنے ایک اور بیٹے جہاں گیر کی فکر نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ جہاں گیر فیض آباد میں کسی پریشانی سے دوچار ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں، خود دیکھ کر آئے ہیں کہ زریں کی حویلی میں جہاں گیر نہایت آرام سے ہے اور تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ ابا جان خود بھی جہاں گیر کی ایسی نگہداشت نہیں کرسکتے۔

کل رات، کھانے کے دوران میں دسترخوان پر بریانی کی قاب دیکھ کر منیر علی کو زریں یاد آنے لگی، کہنے لگا "ہائے ہائے، زریں کے ہاتھ میں اللہ نے کیا لذت دی ہے۔ آدمی کا دل سیر ہی نہیں ہوتا۔" جولین، فرخ، شہ پارہ اور گیتا کو مخاطب کرکے وہ بولا "میں تو کہتا ہوں، تم سب بچیاں زریں سے یہ ہنر اصرار سے سیکھنا۔" مجھے گمان ہوا کہ کہیں ابا جان زریں وغیرہ کو تو یہاں نہیں بلا رہے ہیں؟ زریں، نیساں، جہانگیر اور منیر علی کے خاندان کو؟ بمبئی سے حیدر آباد بھی

نسبتاً قریب ہے پھر تو خانم بھی یہیں آسکتی ہے لیکن کوئی ایسی بات ہوتی تو ابا جان یا منیر علی کی زبان پر ضرور آتی، کم از کم فرخ، فریال، فارہہ اور اکبر کو وہ ان کے بچھڑے ہوئے بھائی جہانگیر کی آمد کا مژدہ سنانے میں تامل نہ کرتے۔ یوں بھی ابا جان زریں کی حویلی خالی کیسے چھوڑ سکتے تھے، وہاں ان کی کائنات مدفون تھی۔ تبت سے لائے ہوئے لعل و جواہر کے صندوق اور نوادر تو وہ حویلی کے تہ خانے میں چھپا کے آئے ہیں۔ چلتے وقت وہ تہ خانے کے تمام دروازوں اور راستوں کے آگے دیواریں چن کے آئے تھے۔ انہوں نے مزدوروں کا خطرہ مول نہیں لیا تھا، یہ کام ابا جان، منیر علی، پیرو، کانتے اور میں نے راتوں رات انجام دیا تھا۔ تبت میں زخمی ہوجانے کے باعث بٹھل کے پیر میں تکلیف تھی، اس لیے ابا جان نے اسے زحمت نہیں دی تھی۔ ابا جان کا کل اثاثہ تو وہیں محفوظ تھا، ہیروں کی جو پوٹلی اپنے ساتھ لائے تھے، وہ اس کی عشر عشیر بھی نہیں تھی۔

میں نے جولین کی دی ہوئی تینوں کتابیں دو دن میں ختم کردیں۔ گلیاں اور بازار ناپنے اور گھر میں مٹر گشت کرنے سے دل گھبرانے لگتا تو کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کرلیتا۔ میں نے خود کو قائل کرنا شروع کیا کہ مطالعہ سب سے اعلیٰ مشغلہ ہے اور میں نے یہ اقوال تازہ کرنے شروع کیے جو کتاب کی فضیلت کے بارے میں بڑے لوگوں سے منسوب ہیں۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ہر کتاب ایک سفر کے مانند ہے ایک تجربہ، ایک سیرگاہ، گھر بیٹھے دنیا کا نظارہ۔ مطالعہ سے کچھ جاتا نہیں، آتا ہی ہے اور کتاب اور قاری میں جلعت روا رجاحت مند کا تعلق ہے۔ سو کتاب کے سامنے قاری کو ایک سائل ہی ہونا چاہیے، وغیرہ۔ رفتہ رفتہ مطالعے میں میرا جی لگنے لگا تھا یا یوں کہنا چاہیے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا، اس سے بہتر کوئی چیز نہیں تھی۔ کتابوں کے ساتھ تو عمر گزاری جاسکتی ہے۔ ایک دن میں خود بازار جاکے بہت سی کتابیں خرید لایا۔ چند ایک اپنے پاس رکھ کے باقی جولین کے حوالے کردیں۔ اس کے چہرے کی تابانی دیدنی تھی۔ اس نے سب کو منع کردیا کہ کوئی اوپر کے کمرے میں بلاضرورت نہ جایا کرے۔ جولین خود بھی نہیں آتی تھی۔ دوپہر ٹھیک گیارہ بجے اور شام پانچ بجے کسی ملازم کے ذریعے وہ مجھے چائے بھجواتی، کبھی نمک پاروں، پاپڑ، کبھی نمکین کاجوؤں کے ساتھ۔ کبھی سنگترے اور انناس کا رس ملازم لے آتا۔ کئی روز اسی طرح گزر گئے۔

ایک روز دوپہر کے کھانے کے بعد ابا جان نے مجھ سے کہا کہ وہ کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے بڑی حیرت ہوا ان کے پیچھے پیچھے نشست گاہ میں چلا آیا۔ ابا جان تمہید کے بغیر مجھ سے پوچھا کہ آگے میرا کیا ارادہ ہے؟

میں نے اپنے اوسان درست کرنے اور یہ کوشش کی کہ ان کا اشارہ کس طرف ہے، وہ کو ارادے کے بارے میں معلوم کررہے ہیں؟ لمحوں تذبذب میں رہا پھر ابا جان نے خود ہی صراحت کی۔ سے بولے "میرا مقصد ہے، تم نے کچھ سوچا ہے؟" جواب دیتا، سر جھکائے مضطرب بیٹھا رہا۔

وہ کہنے لگے "میرا مشورہ ہے کہ تمہیں کسی مصروف ہوجانا چاہیے۔ گو اللہ کا بڑا کرم ہے۔ ضرورت بھی نہیں ہے لیکن آدمی کچھ نہ کچھ کر مصروف رہے تو اچھا رہتا ہے۔ ان کے لہجے میں تشویش نہیں تھی، حکم بھی نہیں تھا۔ میرے دل کی معمول پر آنے لگی "تم کچھ بھی کرسکتے ہو، کسی با نہیں ہے۔" ابا جان نے کہا "کپڑے کی ایک مل میں میری بات چیت مکمل ہوگئی ہے۔ تم چاہو تو ا بھی دلچسپی لے سکتے ہو۔ کام تو دوسرے لوگ ہی نگرانی البتہ تمہاری رہے گی۔ ذرا توجہ دو گے تو س میں آجائے گا۔ اس میں تمہارا دل نہیں لگتا تو او کام ہیں۔ میں یہاں تجارتی نوعیت کی چند عمارتیں ہوں۔ ان سے ہر مہینے مستقل اور معقول آمدنی ہو اور اصل میں اضافہ الگ ہوتا رہے گا۔ بمبئی شہر رہا ہے۔ ہم خود نئی عمارتیں بنوا سکتے ہیں۔ اس طرف نے تھوڑی بہت جستجو کی تو اندازہ ہوا کہ یہ نہایت منافع بخش کام ہے۔ کوئی خاص دیدہ ریزی بھی سے کچھ دور زرعی زمین کی بھی میں نے بات کی ایکڑ پر ہے۔ اردگرد سرسبز پہاڑیاں ہیں۔ بیچ میں موٹی جھیل بھی ہے، واللہ اعلم۔ میں نے دیکھی تو دلال بہت تعریف کررہا تھا، کہتا تھا سونا اگلتی ہے چل کے دیکھو۔"

انہوں نے چند لمحے توقف کیا اور ٹھنڈی دھیمے لہجے میں بولے "جو وقت گزر گیا، گزر گیا، ا ہی اچھا ہے۔ کبھی آدمی کے بس میں کچھ نہیں نے کوئی جواب نہیں دیا، کہنے لگے "تمہارے پڑی ہے۔ نہیں معلوم میرے پاس کتنا وقت زیادہ تو نہیں رہ گیا ہے۔ اب تم ہی کو سنبھالنا کہتے ان کی آواز جھرجھرانے لگی۔

میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن میری زبان نے ساتھ نہیں دیا۔ "اور اگر تم مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہو تو شوق ہے۔ اس سے اچھی بات تو کوئی نہیں۔ یہاں نہیں تو تم ولایت جاسکتے ہو۔ بیرسٹری کرکے واپس آسکتے ہو۔ بہرحال سب کچھ تمہارے سامنے ہے۔ وہ کٹھن وقت گزر گیا، اللہ اور آزمائشوں سے بچائے...."

دیر تک خاموشی رہی۔ انہیں میرے جواب کا انتظار ہوگا۔ میں گنگ بیٹھا رہا پھر وہ یکایک اٹھ گئے اور تھکی تھکی آواز میں بولے "کوئی عجلت نہیں۔ سوچنے کے لیے وقت ہے۔ ذہن پر بالکل بوجھ مت ڈالو۔ یہ میری منشا تھی کہ جو مناسب سمجھو، مجھے بتادینا۔"

انہوں نے میرے پاس آکے میرے سر پر ہاتھ رکھا تو مجھے ایسے لگا جیسے میرا سارا جسم بکھر جائے گا۔ میں نے دزدیدہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ ابا جان کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

دوسرے لمحے وہ کمرے سے چلے گئے۔

رات ہوگئی۔ میں اوپری حصے کے کمرے میں مسہری پر پڑا رہا۔ مجھ سے کتاب بھی نہیں پڑھی گئی۔ میرا دل ڈوب رہا تھا۔ میرا سارا وجود ہی ڈوب رہا تھا۔ رات کے کھانے کے وقت ملازم اطلاع دینے آیا تو میں نے منع کردیا۔ میں نے غلط نہیں کہا تھا، مجھے واقعی بھوک نہیں تھی لیکن مجھے خیال آیا، یہ سن کے وہ ابھی اوپر آجائیں گے اور طرح طرح کے سوالات کرنے لگیں گے۔ اس لیے میں نیچے آگیا اور ان کے ساتھ بیٹھا لقمے ٹونگتا رہا۔ کھانا ختم ہونے پر میں پھر اوپر چلا گیا۔ ساری رات ایسے ہی گزر گئی۔

اپنی ناتوانی و نیم جانی کا سبب مجھے خود معلوم نہیں تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ابا جان نے آخر ایسی کون سی بات کہی ہے جو مجھ پر یہ سوگ سا طاری ہے۔ پسپائی کا کوئی احساس یا توہین و ذلت کا۔ ابا جان جیسے مجھ سے کچھ پوچھنے کے درپے تھے۔ انہوں نے بیک جنبش لب جیسے سب کچھ منہدم کرنے کا حکم صادر کردیا ہو۔ انہوں نے میرے بارے میں غلط سمجھا یا اب تک میں خود کو غلط سمجھتا رہا۔ میں انہیں کیا جتلانا چاہتا تھا جو نہ جتا سکا اور میں ان سے کیا سننا چاہتا تھا، جو وہ نہ کہہ سکے۔ میں سوچتا تھا کہ صرف اتنا ہی ہے جو ابا جان نے کہا۔ کیا یہی حال ہے جس کے لیے اتنے دن خاک ہوئے۔ جو گزر گیا، وہ محض خواب تھا، محض سراب تھا اور سب کچھ بس یہیں تک تھا۔ گزشتہ شب اکارت گئی۔ اس کے بعد کچھ نہیں، اس سے سوا کچھ نہیں۔ میں ابا جان سے کیوں نہ کہہ

سکا کہ میرے پاس تو کرشنا جی کے ترکے کے لاکھوں روپے پہلے سے موجود ہیں۔ لوٹ پھیر سے توان میں اب تک اور اضافہ ہو چکا ہوتا۔ میں ابا جان سے کبھی کچھ کہتا جب میں خود کو کوئی جواب دے چکا ہوتا۔ پہلے تو آدمی خود کو ہی جواب دیتا ہے۔ مجھے اس کے سوا خود کچھ معلوم نہیں تھا۔ آئینے میں خود مجھے اپنی شکل صاف نظر نہیں آتی ہے۔ میں اس غبار اور فشار کا عادی ہو گیا ہوں تو یہ میری کوتاہی ہے۔ ابا جان نے کچھ بے جا نہیں کہا تھا۔ یہی دنیا کے اصول و قواعد ہیں۔ یہی زندگی کے آداب ہیں۔ آدمی انہی راستوں پر چلتا ہے جو پہلے سے متعین کر دیے گئے ہیں۔ بے شک آدمی اپنے راستے خود ہی بناتا ہے لیکن میں نے کون سا جتن نہیں کیا۔ میری تو ہر کوشش رائگاں گئی۔ پس یہی مناسب ہے کہ مجھے خود کو ترک کر دینا چاہیے۔ ابا جان کو اپنے بیٹے کی پہچان نہیں ہے تو میں خود کو کتنا جانتا' پہچانتا ہوں۔ میرے سامنے پھر کون سی منزل ہے؟

مجھے شاید اسی بات کا ملال تھا کہ میں خود بھی کچھ نہیں جانتا تھا۔ ابا جان سوال نہ کرتے تو سوال تو اپنی جگہ ہیں۔ ان کے جواب تو مجھ پر کب سے قرض ہیں۔ میں ان سے کب تک نظریں بچاتا رہوں گا' کس آسرے پر۔ میرے پاس اپنے اصرار کی کون سی دلیل ہے۔ اپنے آپ کو ترک کرنے کا فیصلہ تو میں نے پہلے بھی کیا تھا۔ جولین کے کہنے پر اور اپنے آپ کے کہنے پر لیکن اس سبک دوشی میں ایسی بے امانی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وجہ شاید صرف اتنی تھی کہ جولین نے مجھے دوسروں پر خود کو ترک کرنے کا مشورہ دیا تھا' ابا جان نے خود پر۔ ابا جان کی بات بھی میری سمجھ میں خوب آتی تھی لیکن ساتھ ہی میرا جسم اکڑنے' اینٹھنے لگتا تھا۔ مجھے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا تھا۔

اس روز کیلاش پونا سے آگیا' پورے دس دن بعد۔ اس کی ماں پر ملیریا کا شدید حملہ ہوا تھا جو بعد میں ٹائیفائڈ میں بدل گیا۔ دونوں ڈاکٹر بھائی بہن اپنی ماں کی پائنتی سے لگے رہے۔ کیلاش کے کہنے کے مطابق اس کی ماں خود سے ناامید ہو گئی تھی اور مصر تھی کہ اس کے سامنے کمل اور کوشلی سے رما اور کیلاش کی رسمیں ادا ہو جائیں۔ جج صاحب کی روح کو قرار آجائے گا' وہ بھی سکون سے مر سکے گی۔ کمل اور کوشلی کی بھی یہی خواہش تھی۔ ایسی صورت میں رما اور کیلاش کے لیے انکار بہت مشکل ہو گیا تھا۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن جیسی صورت حال سے وہ دوچار تھے۔ ان کے پاس ایک ہی مجہول عذر تھا کہ ابھی تو جج صاحب کی موت کو چالیس دن بھی نہیں گزرے ہیں۔ ماں نے یہ عذر مسترد کر دیا تھا کہ جج صاحب کی خواہش کی تکمیل بجائے خود جج صاحب سے محبت و احترام کی مظہر ہے۔ کیلاش کے بقول اس دوران ماں کی حالت سدھرنے لگی اور اسی نسبت سے اس کے اصرار میں بھی شدت نہ رہی۔ رما اور کیلاش پر جاں کنی کا یہ وقت سردست کسی طرح گزر گیا۔

کیلاش اپنے چہرے پر اور غبار منڈھ کے آیا تھا۔ اس کی حالت اضطراری تھی۔ ٹھیک طرح بات بھی نہیں ہو پا رہی تھی۔ تاہم اسے اپنی روداد سنانے کی ایسی بے تابی تھی کہ مجھے سب کے درمیان سے اٹھا کے باہر لایا تھا۔ کہنے لگا کہ رما بہت اپنے عزم میں پرجوش تھی' اپنے تصور و خیال میں مست۔ اسے بھی اب احساس ہو گیا ہے کہ آدمی کے حوالے اسے کتنا نادار کر دیتے ہیں ماں کی بیماری پر یہ آزمائش مستزاد تھی۔ رما تو بالکل ہی نڈھال ہو گئی تھی۔ جتنے دن پونا میں رہی بہت ویران رہی۔ ماں اسے روک رہی تھی' کیلاش ضد کر کے لے آیا اور یہاں آکے ہی رما کے ہوش و حواس کچھ درست ہوئے۔ کیلاش نے بتایا کہ اس کی ماں اور چھوٹی بہن انو' جج صاحب کے چالیسویں تک پونا میں رہیں گی۔ چالیسویں پر رما اور کیلاش کو پھر وہاں جانا پڑے گا۔ چالیسویں میں ابھی کئی دن پڑے تھے' کیلاش ابھی سے ہول رہا تھا۔

"رما نے تو کہہ دیا ہے' وہ اب پونا نہیں جائے گی۔" کیلاش برگشتہ آواز میں بولا "بیماری کا بہانہ کر دے یا کچھ اور.... ٹھیک ہے' نہیں جائے گی مگر اس کے بعد تایا جی تو یہیں آجائیں گی۔ کمل اور کوشلی بھی ضرور ان کے ساتھ ہوں گے' پھر کیا ہوگا۔ میں نے رما سے یہی کہا تھا۔ وہ پھر ضد کرنے لگی کہ وہ صاف منع کر دے گی۔ آپ نے دیکھا! پونا کے تجربے کے باوجود وہ کہتی ہے کہ انکار کر دے گی۔ میں نے اس سے کہا' پونا کی طرح یہاں بھی ایسی کوئی صورت پیش آسکتی ہے تب! آپ کو معلوم ہے' اس نے کیا جواب دیا؟"

"انہوں نے کہا ہوگا کہ دیکھا جائے گا۔" میں نے کسمساتے ہوئے کہا۔

"بالکل!" وہ تیزی سے بولا "آپ نے ٹھیک اندازہ لگایا۔ بعض اوقات تو وہ بالکل بچی بن جاتی ہے۔ کہنے لگی' ٹھیک ہے۔ وہ لگن منڈپ میں بیٹھ جائے گی۔ پھیرے بھی پڑ جائیں گے۔ کمل کو اس طرح اپنے باپ کی دولت مل جائے گی۔ دولت ہی اسے چاہیے نا! جج صاحب کی وصیت میں صرف شادی کے بارے میں لکھا ہے۔ شادی ہو جائے گی چاہے وہ لگن منڈپ اور پھیروں تک ہو۔ شادی کے جاری رہنے کے لیے وصیت میں کچھ نہیں لکھا ہے۔ کہتی ہے کہ وہ اپنا حصہ کمل کو دے دے گی۔ کمل چوتھائی دولت کے لیے شادی کر سکتا ہے تو چوتھائی دولت کے لیے شادی ختم بھی کر سکتا ہے۔ دیکھا آپ نے شادی کو اس نے کوئی کھیل سمجھ رکھا ہے' گڑیا گڈے کا کھیل۔ کتنی آسانی سے اس نے فیصلہ سنا دیا۔ سارا کچھ نمٹا دیا۔"

میں سرہلا کے رہ گیا۔ کیلاش کو بھی معلوم تھا کہ میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ میری خاموشی کو غالباً اس نے اپنے اندیشوں کی توثیق جانا اور یوں اسے کچھ سکون حاصل ہوا۔ اس کی وحشت میں کسی حد تک کمی ہو گئی۔ رما کو بھی کچھ دیر پہلے میں نے دیکھا تھا۔ وہ ایسی آشفتہ حال نظر نہیں آتی تھی۔ گزشتہ مرتبہ نام لیے بغیر کیلاش نے جس لڑکی کا تذکرہ مجھ سے کیا تھا' لگتا تھا' کیلاش اسی کی آرزو کا اسیر ہے۔ رما کے دل میں کوئی گرہ نہیں پڑی ہوئی تھی۔ اس لیے وہ اتنی مضطرب و منتشر معلوم نہیں ہوتی تھی مگر میں یہ بات کیلاش سے نہ کہہ سکا۔

ہم جلد ہی اندر آگئے۔ سب نشست گاہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ رما سب کے درمیان' مجھے حیرت ہوئی' وہ تو چہچہا رہی تھی۔ اس کے بالوں میں گلاب کا تازہ پھول اٹکا ہوا تھا۔ خود بھی وہ کسی پھول کے مانند کھلی ہوئی تھی۔ کچھ دیر میں وہ میرے پاس آکے بیٹھ گئی اور چہکتی آواز میں بولی "آپ کہاں ہیں؟"

"میں' میں کہاں ہوتا۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

"سنا ہے آج کل خوب کتابیں لوٹ رہے ہیں۔"

"خوب کیا' بس ایسے ہی۔"

"کون کون سی کتابیں پڑھ ڈالیں؟" وہ اشتیاق سے بولی۔

"ادھر ادھر کی' جو بھی سامنے آگئی۔"

"میں آپ کو کچھ کتابیں دوں گی۔"

"شکریہ! دیکھیے جی بھی کب تک لگے۔"

وہ پہلو بدل کے سرگوشیانہ لہجے میں بولی "مجھے آپ کو بتانا تھا کہ میں اب آگئی ہوں۔"

"میں دیکھ رہا ہوں۔" میں نے جھجکتی آنکھوں سے کہا۔

وہ کھل کھلا پڑی "پھر کب آرہے ہیں ہماری طرف؟"

"دیکھیے۔" میں نے تذبذب سے کہا "جس دن آنے کا ارادہ تھا' اس دن آپ پونا چلی گئیں۔"

"اب میں کہیں نہیں جا رہی۔" اس کی آواز میں اعتماد تھا "ہو سکے تو کل ہی آئیے۔"

"مناسب ہے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"مجھے آپ کی ضرورت ہے۔" وہ زیر لبی سے بولی۔

"میری!" میں نے تعجب سے کہا "میں کیا کام آسکتا ہوں۔"

"کوئی ایسی بات نہیں' ضرورت کا مطلب کام ہی نہیں ہے۔ اچھا وقت گزارنا بھی آدمی کی ضرورت ہے۔"

"اوہ! میں سمجھا' جانے کیا بات ہے۔"

"یہی کچھ کہنا پڑے گا۔" وہ شگفتگی سے بولی "ویسے تو آپ آتے نہیں۔"

"کل تو آپ گھر پہ ہی رہیں گی۔"

"سارا دن' مجھے کیا کام ہے۔"

"ٹھیک ہے' پھر میں کل کسی وقت آؤں گا۔"

"کچھ سویرے آئیں تو اور اچھا رہے۔ کھانا پھر وہیں کھائیں۔ میں بری ڈشز نہیں بناتی۔"

"مجھے معلوم ہے' خوش سلیقگی یک رخ نہیں ہوتی۔"

اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ ابا جان کی آمد پر خاموش ہو گئی بلکہ منتشر سی ہو گئی۔ اس نے کھڑے ہو کے انہیں آداب کیا۔ ابا جان نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کے دعائیں دیں۔

وہ اسی دن شام کو پونا سے آئے تھے' اس لیے جلدی چلے گئے۔ ان کے آنے سے لگتا تھا جیسے کوئی دریچہ سا کھل گیا ہے اور تازہ ہوا جسم و جاں میں در آئی ہے۔ دس دن کے عرصے میں ان کی کوئی خیر خبر ہی نہیں ملی تھی۔ مجھے فکر ہو رہی تھی۔ مجھے کیا سبھی اور سبھی ان کے آنے سے خوش ہوئے تھے۔ ابا جان نے تو انہیں دیکھ کے برملا کہا کہ گھر میں اداسی ہو رہی تھی۔ دوسرے دن صبح جگنو اور دیوا کو کچھ وقت دے کے میں نشست گاہ میں آکے بیٹھا تھا کہ جولین آگئی اور اس نے مجھے یاد دلایا کہ میں نے رما سے وعدہ کیا ہے۔ مجھے یاد تھا۔ جولین نے مجھ سے لباس تبدیل کرنے کو کہا۔ میں نے صبح ہی کپڑے بدلے تھے۔ جولین سوٹ کے لیے کہنے لگی' کوئی تین دن پہلے درزی سوٹ اور شیروانی کی ٹرائی کرنے آیا تھا۔ ہفتے بھر سے اوپر ہوا وہ سب کے ساتھ میرا ناپ بھی لے گیا تھا۔ مجھے اس وقت کچھ اندازہ نہیں تھا کہ درزی سے میرے لیے کون کون سے کپڑوں کی فرمائش کی گئی ہے۔ وہ ناپ لیتا رہا' میں چپ چاپ کھڑا رہا۔ وہ تو جب ٹرائی کے لیے آیا تو مجھے معلوم ہوا' اس نے میرے لیے دو سوٹ اور دو شیروانیاں تیار کی ہیں۔ یقیناً وہ جولین ہی ہوگی۔ وہ پہلے بھی مجھے ٹوک چکی تھی کہ کرشنا جی کے بنوائے ہوئے میرے کئی سوٹ اس کے پاس محفوظ رکھے ہیں' میں انہیں کیوں نہیں پہنتا۔

"یہ کپڑے بھی ٹھیک ہیں' میں کسی تقریب میں تو نہیں جارہا۔"

"وہ بھی تو پہننے کے لیے ہیں' وہ ان سے اچھے لگیں گے۔"

"اچھا کیا! لباس سے اتنا کچھ تو نہیں ہوتا۔"

"کچھ تو ہوتا ہے۔"

"مجھے اچھا نہیں لگتا کہ وہاں کسی خاص لباس میں جاؤں۔"

"یہی سوچتے رہے تو پھر ان کا نمبر تو کبھی نہیں آئے گا۔"

"پھر کبھی سہی' اس وقت تو جی نہیں چاہ رہا۔"

"رما کہہ رہی تھی کہ شاید وہ کلب کی طرف جائے۔"

"کلب کی طرف!" میں نے تنک کے کہا "مجھ سے تو اس نے کچھ نہیں کہا۔ میں وہاں جا کے کیا کروں گا۔"

"سنا ہے' بہت اچھی جگہ ہے' بوٹنگ' فشنگ' سوئمنگ' ان ڈور گیمز اور جانے کیا کیا۔۔۔۔"

"تم اسی لیے کپڑے بدلنے کو کہہ رہی ہو۔"

"نہیں' صرف اس لیے نہیں۔ کہتے ہیں' آدمی کو اچھا کھانا' اچھا پہننا چاہیے۔"

"اچھا بولنا' اچھا سننا اور اچھا سوچنا بھی۔"

"وہ تو سب موجود ہے۔" وہ مسکرانے لگی اور اس نے مزید بحث نہیں کی۔ مجھے گمان ہوا' کہیں میری حجت اسے گراں نہ گزری ہو۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ ایسا ضروری سمجھتی ہے تو میں جو وہ کہے پہن لیتا ہوں "پھر سہی۔" وہ خوشگواری سے بولی "مگر واسکٹ کے بغیر مت جانا۔"

اس نے اندر سے مجھے نئی واسکٹ لا کے دی اور مجھ سے پوچھا کہ میری جیب میں روپے ہیں یا نہیں۔ میرے ہاتھ فوراً جیبوں کی طرف گئے اور مجھے یاد آیا کہ ابا جان کے دیے ہوئے سارے روپے تو میں نے جولین ہی کے حوالے کردیے تھے۔ وہ روپے بھی ساتھ لائی تھی۔ جانے کتنے نوٹ تھے۔ میں نے گنے بغیر جیب میں رکھ لیے۔

جولین نے مجھ سے موٹر لے جانے کو کہا تھا لیکن میں ایسے ہی گھر سے نکل آیا۔ کچھ دور بعد مجھے گھوڑا گاڑی مل گئی۔

○☆○

رما اپنی کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور بے تابانہ سیڑھیاں اتر کے میری طرف بڑھی۔ وہ گلابی رنگ کے گاؤن میں ملبوس تھی۔ اسی رنگ کی ریشمی ڈوری کمر سے بندھی ہوئی تھی۔ بال کھلے ہوئے تھے اور کسی شعر کے مانند جو میں نے کبھی پڑھا تھا' سیاہ بالوں میں اس کا چہرہ ماہ تاب کی طرح دمک رہا تھا "واقعی آپ آگئے۔" وہ پلکیں پٹ پٹاتے ہوئے بولی۔

"آپ کو شبہ تھا؟"

"نہیں' مجھے یقین تھا کہ آج آپ ضرور آئیں گے۔"

"اور یقین تھا تو اتنا کیسے؟"

"بس تھا' مجھے نہیں معلوم۔" وہ لہک کر بولی "ویسے میں جولی سے کہہ کے آئی تھی کہ صبح آپ کو یاد دلا دے۔"

"اس نے مجھ سے کہا تھا لیکن مجھے خود یاد تھا۔"

"اچھا ہوا' آپ آگئے۔" وہ دمیدہ آواز میں بولی "کیلی اسپتال چلا جاتا ہے میں یہاں دن بھر اکیلی رہتی ہوں' کچھ اور نہیں تو نوکروں سے باتیں کرتی رہتی ہوں۔"

"آدمی' آدمی سے بیزار ہے اور آدمی کو آدمی کے بغیر چین بھی نہیں۔" میں نے یوں ہی کہہ دیا۔

"اور آدمی کہاں ملتا ہے۔" وہ گہری سانس بھر کے بولی "آدمی جتنے زیادہ ہیں اتنے ہی کم بھی۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" میں نے اس کے پہلو بہ پہلو برآمدے کی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے کہا "آپ سے تو سب نے کہا تھا' جب تک ماں جی پونا میں ہیں' آپ ہماری طرف آجائیے۔ وہاں آپ کا دل شاید بالکل نہ گھبرائے۔"

"گھر کو بھی کچھ دیکھنا پڑتا ہے۔ پیچھے نوکروں کی فوج تھی۔ یہاں آکے دیکھا تو سارا اجاڑ پڑا ہوا تھا۔ جدھر دیکھیے' دھول' گرد جمی ہوئی تھی۔ معلوم ہے آپ کو' ان لوگوں نے میری ایک بہت قیمتی' انمول مورتی توڑ دی۔ بہت نازک تھی وہ۔ میں نے ہزار منتوں کے بعد کشمیر میں ایک پنڈت سے حاصل کی تھی۔" یک بارگی اس نے سر جھٹکا۔ جھٹکنے سے اس کے بال ادھر ادھر ہوگئے۔ اس نے بہ عجلت انہیں اپنے چہرے سے ہٹایا اور مضطرب لہجے میں پوچھنے لگی کہ میں کہاں بیٹھنا چاہوں گا' وہیں برآمدے میں یا اندر۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا' اس نے کہا "اندر بہت سکون ہے' وہیں چلتے ہیں' اور ہاں' ایک بات آپ سے کہنی ہے' آپ کوئی تکلف نہیں کریں گے جس وقت بھی جس چیز کی ضرورت ہو' بے جھجک کہہ دیجیے گا۔ شاید مجھے جتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ کوئی دوسرا گھر نہیں ہے۔"

"تکلف تو آپ خود کررہی ہیں۔ آپ کی یہ وضاحت سب سے بڑا تکلف ہے۔"

"تو اسے' اسے میرا آخری تکلف سمجھیے۔" وہ ہنس بولی۔

ہم دروازہ عبور کرکے بائیں جانب کے ایک کمرے میں آگئے۔ وہ ایک آراستہ وپیراستہ کمرا تھا۔ درو دیوار سے شان و شوکت ٹپک رہی تھی۔ سارے فرش پر قالین بچھا تھا اور دیواروں کے ساتھ قدیم طرز کے صوفے لگے تھے۔ ایک طرف صوفوں کے بیچ میں دیوان رکھا ہوا تھا۔ ہر کونے میں سنگ مرمر کے مجسمے استادہ تھے' نیم عریاں ملبوسات میں سوچتی ہوئی' انگڑائی لیتی ہوئی اور نیم پلکوں سے لجاتی' بل کھاتی عورتوں کے مجسمے۔ اوپر دیواروں پر کسی پختہ مصور کی بنائی ہوئی مختلف مناظر کی تصویریں آویزاں تھیں۔ وسط میں نیلگوں پتھر سے تراشی ہوئی میز پر تازہ گل دستہ سجا ہوا تھا۔ کمرے میں روشنی کم تھی۔ رما نے قمقمے روشن کردیے' سارا کمرا جگمگانے لگا۔

"کیا پئیں گے آپ؟" وہ سامنے کے دیوان پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"جو جلد سے جلد میسر ہوجائے۔"

"کیوں؟ کوئی جلدی ہے آپ کو؟" وہ گھبرا کے بولی۔

"بالکل نہیں' آپ کا خیال ہے کہ آپ کو کم سے کم زحمت ہو اور آپ زیادہ سے زیادہ آزاد رہ سکیں۔" مجھے فوراً احساس ہوا کہ آزاد کے بجائے مجھے کوئی دوسرا لفظ کہنا چاہیے تھا۔

"میں ہمیشہ آزاد رہتی ہوں۔" وہ اونچی آواز میں بولی۔

میں نے کہنا چاہا کہ یہاں کوئی آزاد نہیں ہے۔ سب ایک دوسرے کے اسیر ہیں' آزاد تو شاید وہ ہوتا ہے جو محض اپنا اسیر ہو مگر میں چپ رہا۔

"پھلوں کے رس میں دیر لگے گی' چائے' کافی اور۔۔۔" وہ جھجکتے ہوئے بولی "شراب بھی موجود ہے۔ مجھے یقین ہے' آپ نہیں پیتے۔ یہاں بھی کوئی نہیں پیتا لیکن مہمانوں کے لیے انتظام رکھنا پڑتا ہے۔"

"میرا خیال ہے' کسی ملازم سے چائے کے لیے کہہ دیجیے۔"

اسے قرار نہیں تھا۔ مجھ سے معذرت کرکے وہ فوراً کمرے سے چلی گئی۔ میں اٹھ کے اس دوران مجسمے کو دیکھتا رہا اور دیواروں پر لگی ہوئی پینٹنگز۔ چند منٹ ہی میں وہ واپس آگئی اور مجھے بتانے لگی کہ پچاس برس کے قریب ہوئے' اس کے دادا نے بنگال کے ایک مفلس مجسمہ ساز سے یہ مجسمے حاصل کیے تھے' کوئی انگریز بہت پیچھے پڑا رہا' ہزاروں کی پیشکش ہوئی۔ دادا انہیں خود سے جدا کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے اور خود ان سے جدا ہوگئے۔ اتنی دیر میں ایک ملازمہ چائے لے کے آگئی۔ چائے کے ساتھ نمک آلودہ کاجوؤں کی طشتری بھی تھی۔ میں نے پینٹنگز میں دلچسپی ظاہر کی اور اس سے پوچھا کہ اپنی بنائی ہوئی تصویریں اس نے کہاں چھپائی ہوئی ہیں' کہنے لگی' وہ تو شوقیہ ہیں' ایسی دیکھنے کی چیز نہیں تاہم میرے اصرار پر وہ مجھے اوپر ایک کمرے میں لے گئی اور میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ وہ تو پورا نگار خانہ تھا۔

ہر طرف' ہر گوشے میں چھوٹی بڑی تصویریں آویزاں تھیں اور بے شمار فریم اوپر نیچے دیواروں سے ٹکے ہوئے تھے۔ تمام تصویروں میں ایک بات مشترک تھی' پھول' پتے اور شعلے۔ شعلوں میں جلتے ہوئے پھول' شعلوں میں کھلتے ہوئے پھول۔ بقول شخصے تخلیق اپنے خالق کے باطنی رنگ روپ کا آئینہ ہوتی ہے تو رما کی تصویروں میں اس کا نہاں خانہ بہ تمام و مال عیاں تھا۔ ان میں تیزی تھی' تندی' شدت' نفاست' سلیقہ اور خوب صورتی اور ان سب کا ایک توازن۔ اتفاق سے میں نے ابھی دو ایک روز پہلے ایک ناول میں تصویر اور مصور کے بارے میں بہت کچھ پڑھا تھا۔ وہ ایک مصور کی کہانی تھی۔ اس نے اپنے شاگرد سے کہا تھا کہ مصوری محض ہنر نہیں۔ علم' خیال' احساس اور فکر کے بغیر یہ ہنر ممکن نہیں۔ مصور کے لیے مشاہدہ ہی نہیں' تجربہ اور مطالعہ بھی اتنا ہی لازم ہے اور ان سب سے بڑھ کے جستجو ہے۔ جستجو تخلیق کی نشانی ہے۔ ہر تخلیق ایک جرات ہوتی ہے۔ اس نے اپنے شاگرد کو یک سوئی انہماک اور جستجو کی تلقین کی تھی اور کہا تھا کہ یک سوئی ایثار ہے' انہماک ایثار ہے۔ زندگی کی ہشت سمت ترغیبوں کو ٹھکرانے کا ایثار۔ یہ سطریں پڑھ کے میرا دھیان چاتو کی طرف چلا گیا تھا۔ چاتو اور تصویر کی کوئی نسبت نہیں مگر بٹھل بھی کچھ ایسی ہی باتیں کیا کرتا تھا۔ گویا کوئی کسی ہنر میں یکتا و یگانہ ہے۔ تو اپنی خداداد صلاحیتوں کے علاوہ کم و بیش انہی خوبیوں کے سبب سے ہے۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ ساری تصویریں رما نے بنائی ہیں۔ ایک تصویر میں عورتوں کے نیلام کی منظر کشی کی گئی تھی۔ چبوترے پر پابہ زنجیر' سرتاپا عریاں کئی نوجوان لڑکیاں سکڑی سمٹی کھڑی تھیں اور دو مرد فیتوں سے ایک لڑکی کی پیائش کررہے تھے' لڑکی شرم سے پانی پانی ہوئی جارہی تھی۔ چبوترے کے نیچے بے حال ہجوم ہاتھ اٹھا اٹھا کے شور کررہا تھا۔ پہلو میں ایک اور تصویر بھی آویزاں تھی۔ اس پر میری نظریں جم کے رہ گئیں۔ یہ بھی ایک نوجوان لڑکی کی تصویر تھی۔ لڑکی فٹ پاتھ پر نوکیلے' کھردرے پتھروں کی دیوار کے سہارے حسرت و یاس کے انداز میں بیٹھی تھی۔ اس کے بدن پر چیتھڑے جھول

رہے تھے اور کچھ ایسی صورت تھی کہ ناکافی لباس سے وہ بدن کا ایک حصہ چھپانے کی کوشش کرتی تو دوسرا حصہ نمایاں ہوجاتا۔ اس کے پاس ایک کشکول رکھا تھا۔ کشکول میں نہ سکے تھے نہ روٹی۔ ہاں، گلاب کا ایک پھول پڑا تھا۔ میں دیر تک یہ منظر دیکھا کیا۔ بعض چیزوں کا لفظوں میں اظہار ممکن نہیں، انہیں صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔

"کہاں کھوگئے آپ؟" مجھے گم دیکھ کے اس نے ٹوکا۔

"میں، میں یہ تصویر دیکھ رہا تھا۔" میں نے اٹکتی آواز میں کہا "آپ نے تو کمال کیا ہے۔"

"یہ تصویر مجھے بھی پسند ہے، بس بن گئی۔"

"یہ واقعی متاثر کن ہے۔ میں مصوری کے بارے میں کچھ نہیں جانتا لیکن یہ تصویر دیکھ کے عجیب قسم کا احساس ہوتا ہے۔"

"اور لگتا ہے، آپ مصوری کے لیے ہی بنی ہیں۔"

"مجھے تو کچھ بھی نہیں آتا، آپ یورپ جائیں اور وہاں گیلریز دیکھیں تو یہ سب کچھ ہیچ لگے گا۔"

"میرا خیال ہے، یہ بھی کچھ کم نہیں۔ یہ تصویریں دیکھ کے مجھے حیرت بھی ہوئی خوشی بھی۔ آپ تو ڈاکٹر ہیں، آپ نے یہ کیسے بنالیں؟"

"اتفاق کہئے، ڈاکٹر بھی میں اتفاق سے ہوں۔"

"کیسا اچھا اتفاق ہے۔" میں نے ہنس کر کہا "ایک فرسودہ سا جملہ لوگ اکثر بولتے ہیں کہ زندگی اتفاقات کا مجموعہ ہے۔ آدمی بہت کچھ اتفاق سے ہوتا ہے۔ کسی حد تک یہ غلط بھی نہیں تاہم خداداد صلاحیت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ اس کے بغیر آدمی گا تو نہیں سکتا، مصوری تو نہیں کرسکتا اور شاعر تو نہیں بن سکتا۔"

"خداداد صلاحیت بھی خام مال کی طرح ہوتی ہے، بے ترشے ہوئے پتھر کی طرح۔" وہ نہایت شستہ اور رواں انگریزی بول رہی تھی، کہنے لگی "پتھر تراشنے کے لیے مہارت کی ضرورت پڑتی ہے اور مہارت، ریاضت، لگن سے ممکن ہے اور جدت، خیال آفرینی سے۔ شاید ہر شخص میں کوئی نہ کوئی خداداد صلاحیت ہوتی ہے اور اسے اپنے جوہر کا خود علم نہیں ہوتا۔ ہر شخص ابتدا میں گنگناتا ہے بلکہ گانا گانا چاہتا ہے، ہر شخص دیواروں پر نقش و نگار بناتا ہے اور اسے جلد ہی اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ سُر سے محروم ہے اور اس کی انگلیاں شکل کشی کے لیے موزوں نہیں اور جن کے گلے میں سُر چھپا ہے، جن کی انگلیاں دائرے اور زاویے تراشنے کی لچک رکھتی ہیں، انہیں کوئی سازگار وقت یا ماحول مل جائے، رہبری مل جائے یا وسائل میسر آجائیں تو وہ کچھ کر گزرتے ہیں پھر گڑ ڈالنے کی بات ہے، آدمی جتنی گہرائی میں جائے گا، اتنے بیش بہا سیپیاں لائے گا۔"

اسے شاید میری توجہ میں کمی کا شبہ ہوا کہ وہ ٹھہر گئی

"آپ چپ کیوں ہوگئیں؟" میں نے بے تابی سے کہا "کیسی سچی اور اچھی باتیں کررہی ہیں آپ! آپ بالکل ٹھیک کہتی ہیں، خواہش، صلاحیت نہیں، صلاحیت اور چیز ہے خواہش اور چیز۔ آدمی کو خود علم نہیں ہوتا کہ اس میں کیسا جوہر چھپا ہے۔"

"آپ نے سنا ہوگا کہ فلاں شخص بننا کچھ چاہتا تھا، بن کچھ گیا۔ گویا دیر میں اس کی مخصوص صلاحیت کو اپنی منزل نظر آئی اور ضروری نہیں کہ آدمی ایک ہی طرح کی صلاحیت سے متعلق ہو۔ بیک وقت کئی قسم کی صلاحیتیں بھی اس میں چھپی ہوسکتی ہیں۔ یہ اتفاق ہے کہ اسے کس قسم کا ماحول نصیب ہوتا ہے۔ عموماً آدمی کو اپنے حصار سے نکلنے کی فرصت نہیں ملتی، چنانچہ زردوز کا بیٹا کسی غیر معمولی صلاحیت کا ا... ہے تو بے چارہ زردوزی ہی میں کچھ الٹا سیدھا ملتا رہے گا ہاں کبھی اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔ زردوز کا بیٹا ایک ا... شاعر اور مصور بھی بن جاتا ہے اور یہ بھی ہوتا ہے کہ کو... بیک وقت بہترین شاعر، مصور اور گلوکار ہو۔ جیسے خیام، کو... داس، اور بھی بہت سے نامور لوگ لیکن کتنے، بے شمار ا... ہوں گے جنہیں اپنے مصائب و آلام ہی سے مہلت نہ ملی جو زندگی بھر گردشوں کے اسیر رہے۔ خداداد صلاحیت ... ساتھ آمادگی بھی لازم ہے۔ کوئی اپنا جوہر اجاگر کرنے پر آ... ہی نہ ہو۔ کوئی شخص بے حد سُریلا ہو اور گانے کا شوق نہ ر... ہو، اپنی صلاحیت کا عرفان ہونے کے باوجود اس کا برملا اظ... اسے ناپسند ہو یا وہ اپنا جوہر ہی حقیر سمجھتا ہو۔"

میں انہماک سے سن رہا تھا۔ یکایک وہ چونک سی پڑی ا... خفت سے بولی "جانے میں کہاں بھٹک گئی۔ بات کہاں سے تھی، کہاں پہنچ گئی۔"

"بات کہیں بھی نہیں پہنچی، وہیں پر ہے جہاں سے تھی۔" میں نے اشتیاق سے کہا "میں آپ کو سچ بتاؤں، کچھ حاصل کررہا ہوں۔"

"نہیں!" اس کی آواز بل کھاگئی "میں تو یوں ہی۔ اس کے رخساروں کی سرخی گہری ہونے لگی "آپ بھی کہتے ہوں گے۔ چلئے، نیچے چلتے ہیں۔"

"چلئے، لیکن آپ اپنا سلسلہ جاری رکھیے۔ یقین جانیں، مجھے بہت اچھا لگا۔ میں پوچھنا چاہ رہا تھا کہ آپ کیا چاہتی تھیں؟"

"سچ پوچھئے تو مجھے خود نہیں معلوم۔"

"پھر بھی....!"

"یوں کہئے کہ سبھی کچھ....." وہ چہکتی آواز میں بولی۔

"اوہ نہیں۔" اس نے آنکھیں میچ لیں "ان تصویروں پر مت جائیے، یہ مصوری نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے، یہ کتنی ادھوری ہیں۔ میں اسی لیے انہیں بہت کم کسی کو دکھاتی ہوں۔ اب تو بہت دنوں سے میں ادھر آئی بھی نہیں ہوں۔ کبھی جی چاہا تو کچھ بنالیا، بس اتنا ہی ہے۔ اسے کسرِ نفسی مت سمجھئے۔"

میں نے اسے اس ناول کے بارے میں بتایا جو ابھی میں نے ختم کیا تھا۔ میں نے کہا "اس میں لکھا تھا کہ خداداد صلاحیت بھی مستقل نہیں ہوتی۔ ایک تخلیق کار مسلسل تخلیقی حالت میں نہیں رہتا۔ کبھی وہ بنجر ہوجاتا ہے، زمین کی طرح یا موسم خزاں کی طرح اور خزاں کا یہ موسم برسوں پر محیط ہوسکتا ہے۔ اس میں لکھا تھا کہ تخلیق کے دورے پڑتے ہیں۔ تخلیق کار کے پاس سب کچھ ہے، یکسوئی، آمادگی، مہارت اور وقت مگر خیال قابو میں نہیں آرہا۔ خیال کہیں گم ہوگیا ہے۔ تخلیق کار کے لیے یہ وقت بڑے کرب کا ہوتا ہے۔ اس کے جوڑ جوڑ میں ٹیسیں اٹھتی ہیں۔ اس پر ایک دیوانگی سی طاری رہتی ہے، وہ غصے میں کبھی رنگ لوٹ دیتا ہے، برش توڑ دیتا ہے، کینوس پھاڑ دیتا ہے، اور کچھ نہیں ہوتا تو اپنے آپ کو کھسوٹنے لگتا ہے۔"

"کون سی کتاب تھی وہ؟" وہ تجسس سے بولی۔

"میں آپ کو پیش کروں گا لیکن آپ نے اس مصنف سے کچھ کم فکر انگیز باتیں نہیں کیں۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ ناول کے متن اور آپ کے بیان میں کیسی مشابہت ہے، یہ درد مشترک کی بات ہے شاید۔"

"اوہ نہیں! میں، میں کسی زمرے میں نہیں آتی۔" وہ بے بسی کے انداز میں بولی "مجھے اپنی بساط، اپنی حدود اچھی طرح معلوم ہیں۔"

"اس کا فیصلہ دوسرے کرتے ہیں۔" میں نے تیکھے لہجے میں کہا "میں سمجھتا ہوں کہ خداداد صلاحیتوں سے پہلے اور بعد میں سب سے اہم چیز ذہانت ہے، مثال کے طور پر چاقو بازی کے فن میں....." میرے منہ سے نکل گیا۔ میں نے اپنی زبان کو لگام دینا چاہی لیکن یوں تو وہ جانے کیا سمجھتی، میں نے سٹ پٹاتے ہوئے کہا "چاقو بازی یا کوئی بھی "حربی فن" مراد ہے مہارت کتنی بھی ہو، ذہانت کے بغیر سب کچھ ناتمام ہے۔"

"یقیناً، یقیناً۔" اس نے شدت سے میری تائید کی "ذہانت تو پہلی شرط ہے۔ مہارت تو ریاضت، لگن اور کثرت کار سے حاصل ہوجاتی ہے اور صاف، سجل پہلے سے بہتر نمونے بھی تو سامنے آسکتے ہیں۔ مہارت سے رفتار میں اضافہ ہوتا ہے لیکن ذہانت کی بات ہی اور ہے۔ ذہانت تخلیق کار کو بے قرار کیے رہتی ہے اور تجربے کی جرات پیدا کرتی ہے۔ ممکن ہے بعض تخلیقی نمونے کبھی اونچان کے وجود میں آگئے ہوں لیکن ان کا تواتر و تسلسل تو فکر سے ہی ممکن ہے۔"

باتوں میں سڑھیاں اترنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ ہم نیچے ایک کشادہ کمرے میں آگئے۔ وہ سونے کا کمرا تھا اور ایک طرح کی نشست گاہ بھی تھی۔ ہر قسم کا سازوسامان وہاں موجود تھا، مسہری، میز، کرسیاں، سنگھار میز گراموفون ریکارڈ، ریڈیو، کتابیں اور شیشے کی الماری میں چینی کے برتن اور آرائشی چیزیں۔ رما نے بتایا کہ یہ مہمانوں کا کمرا ہے، رشتے داروں اور عزیزوں کے لیے مخصوص۔ ویسے اصل مہمان خانہ کوٹھی سے الگ ایک حصے میں ہے۔

میں آرام کرسی پر بیٹھ گیا، وہ بھی میرے برابر بیٹھ گئی اور کہنے لگی کہ مجھے آرام کی خواہش ہو تو بے تکلفی سے بتادوں۔ میں نے بے ساختہ کہا کہ اس بیداری سے زیادہ کیا آرام ہوسکتا ہے۔ البتہ اسے کچھ کام ہو تو میں اطمینان سے یہاں بیٹھا رہ سکتا ہوں۔

"آپ کہیں تو کہیں اور چلیں۔" وہ مچلتی آواز میں بولی۔

"جہاں آپ کہیں مگر کیا یہاں سکون کم ہے۔"

"یہ تو ہے، میں تو آپ کی وجہ سے کہہ رہی تھی۔" وہ تیزی سے بولی "کچھ منہ چلتا رہے تو اور لطف آئے گا۔ میں آپ کے لیے پکوڑے بنا کے لاتی ہوں، پنیر کے پکوڑے، آپ کو پسند ہیں نا!" کیا خیال ہے۔"

"پکوڑے پسند ہیں لیکن خیال اچھا نہیں، آپ کو یہاں بیٹھے ہوئے برا لگ رہا ہے کیا! براہ مہربانی تسلی سے بیٹھی رہیے۔" میں نے منت کے انداز میں کہا "کھانے کے وقت ہی کچھ کھائیں پیئیں گے۔ کیا پکایا ہے آپ نے؟"

"آپ کو کیا پسند ہے؟"

"تقریباً ہر اچھی بنی ہوئی چیز۔"

"پھر بھی کوئی خاص؟"

"میں کہوں گا تو آپ مذاق سمجھیں گی۔"

"دال کو تو آپ نہیں کہہ رہے؟"

مجھے ہنسی آگئی۔ وہ بھی ہنسنے لگی۔ ہم دونوں دنیا جہاں کی

باتیں کرتے رہے لیکن اس نے پونا کا ذکر کیا' نہ میرے بارے میں کچھ پوچھا۔ گھڑی نے ایک بجایا تو وہ فوراً اٹھ گئی۔ ابھی وہ گئی بھی تھی اور میں آنکھیں موندے آرام کرسی پر دراز تھا کہ کچھ دیر میں کیلاش کی آواز آئی۔ وہ اچھلتا' شور مچاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور میرے گلے سے لگ گیا۔ کہنے لگا "رما سے میری شرط لگی ہوئی تھی کہ آج بھی آپ شاید نہ آئیں۔ رما کو یقین تھا۔ میں پورے سو روپے ہار گیا۔"

"مگر تمہیں شک کیوں تھا؟"

"میرا خیال تھا' آج بھی آپ کہیں گھر نہ جائیں۔ وسیوں کام نکل آتے ہیں۔" وہ میرا... بازو پکڑتے ہوئے بولا "مگر مجھے اپنے ہار جانے کی بہت خوشی ہے۔" اس کی خوشی اس کی آواز سے ظاہر تھی۔ اس کی آنکھوں سے ظاہر تھی "کب آئے آپ؟"

"میں نے اسے بتایا کہ دیر ہو گئی۔"

کیلاش کے آجانے سے گھر میں ایک دم چہل پہل سی ہو گئی۔ اس نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا۔ اتنی دیر رما اور ملازمہ نے کھانے کی میز چن دی۔ کھانے میں زیادہ اہتمام نہیں تھا' ہلکی پھلکی غذائیں تھیں لیکن سب کچھ نہایت لذیذ۔ ٹماٹر کا سوپ تو بہت اچھا تھا۔ میں نے سیر ہو کر کھایا اور طبیعت بھی بوجھل نہیں ہوئی۔ کھانے کے بعد کیلاش نے انگریزی دھنوں کے ریکارڈ لگا دیے۔ وہ دونوں بھائی بہن ایک دوسرے سے نوک جھونک کرتے رہے۔ کیلاش اسپتال آنے والے مریضوں کے بارے میں بتانے لگا کہ بعض دن تو جیسے مریض ڈاکٹروں کی آزمائش کے لیے منتخب کر لیتے ہیں۔ آج دن بھر تانتا بندھا رہا' حادثات کے مریض تو مسلسل آتے رہے اور اتنے شدید حادثوں کے کہ ایک طرف توجہ دیجیے تو دوسرے سے ناانصافی۔ پھر کیلاش نے ایک عورت کے بارے میں بتایا کہ وہ کئی دن سے پولیس کی نگرانی میں زیر علاج ہے۔ اس پر اپنے شوہر اور اس کے دوست کے قتل کا الزام ہے۔ یہ سن کر میرا ماتھا ٹھنکا "کون ہے وہ؟" میں نے متوحش لہجے میں پوچھا۔

"مجھے زیادہ تفصیل نہیں معلوم۔" کیلاش نے افسردگی سے کہا "پونا سے آنے کے بعد میں نے آج ہی اسپتال جوائن کیا ہے۔ میں راؤنڈ پر تھا کہ ایک کمرے میں سپاہی دیکھ کر میں چونکا۔ وارڈ بوائے سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ایک قاتل عورت اندر موجود ہے۔ مجھے بے چینی ہوئی' اس طرف میری ڈیوٹی نہیں تھی۔ ممکن ہے سپاہی مجھے روک دیتے لیکن اس سے پہلے کہ وہ رکاوٹ بنتے' میں سیدھا کمرے میں داخل ہو گیا۔"

"لیکن پولیس کسٹڈی کے مریضوں کے لیے نرسیں اور ڈاکٹر بھی طے ہوتے ہوں گے۔" رما الجھ کے بولی "اس طرح تو کوئی بھی اندر جا سکتا ہے۔"

"میرے گلے میں اسٹیتھسکوپ لٹکا ہوا تھا۔ اپر کوٹ بھی پہنے ہوئے تھا۔ کوئی ڈاکٹر ہی لگ رہا تھا۔"

"مگر یہ حلیہ تو کوئی بھی اختیار کر سکتا ہے۔" رما نے تنک کر کہا۔

"کچھ شخصیت کی بھی بات ہوتی ہے۔" کیلاش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہا!" رما چہک کے بولی اور تالی بجانے لگی "لگتا ہے تمہارے آئینے پر دھول خاصی جمی ہوئی ہے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کے بولی "دیکھا آپ نے! ڈاکٹر صاحب کو کیسی خوش فہمی ہے' سامنے کون بیٹھا ہے' یہ دیکھے بغیر..."

"بابر بھائی کی بات اور ہے۔ اپر کوٹ اور اسٹیتھسکوپ کے بغیر بھی چلے جائیں تو سپاہی دروازے سے ہٹ جائیں گے۔"

"جی ہاں۔ بالکل!" میں نے گہری سانس لی "مجھے آگے جاننے کی تشویش تھی' میں نے کسمساتے ہوئے پوچھا "مگر تم نے یہ بتایا ہی نہیں کہ اندر جا کے تم نے کیا دیکھا؟"

"وہ ایک سیدھی سادی عورت ہے۔" کیلاش کے لہجے میں سنجیدگی آ گئی۔ وہ گم صم بستر پر نیم دراز تھی۔ پھٹی پھٹی سی آنکھیں' سامنے دیوار کی جانب گھورتی ہوئی۔ میری آہٹ پر اس نے دروازے کی طرف مڑ کے دیکھا بھی نہیں۔ دیکھنے سے کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس نے کسی کا خون کیا ہو گا اور ایک کے بجائے دو خون..."

"میں پوچھتے پوچھتے رہ گیا کہ اس کا نام کیا ہے۔ وہ بدنصیب ماری کے سوا اور کون ہو سکتی تھی۔ اب کیسی ہے وہ؟" میں نے پژمردگی سے پوچھا۔

بے ارادہ میرے منہ سے اب نکل گیا تھا۔ کیلاش نے توجہ نہیں دی کہنے لگا "ویسے تو بالکل ٹھیک معلوم ہوتی ہے لیکن صاف لگتا ہے کہ دل و دماغ پر گہرا اثر ہے۔ وہ بہت نڈھال تھی جیسے برسوں کی بیمار ہو اسے دیکھ کر مجھے ترس آیا۔"

"مگر اس نے اپنے شوہر کو آخر کیوں قتل کر دیا؟" رما حیرت سے بولی "کوئی بہت سنگین بات ہی ہو گی کہ اسے یہ قدم اٹھانا پڑا۔"

"کیا کہہ سکتا ہوں' میں نے بتایا نا کہ مجھے تفصیل نہیں

لوم۔ آج شام کچھ دیر کے لیے اسپتال جانا ہے' دیکھو شاید ل بات پتا چلے۔"

"کیا عمر ہو گی۔" رما کے لہجے میں دل سوزی تھی۔

"ایسی زیادہ نہیں۔"

میں خاموش بیٹھا رہا اور یہی بہتر ہوا۔ رما نے خود ضوع بدل دیا۔ اس نے کیلاش سے پوچھا کہ شام کو اس کا ا ارادہ ہے؟

"کلب چلیں گے۔" کیلاش نے کسی تامل کے بغیر کہا۔

"مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ تمہیں اسپتال بھی جانا ہے؟"

"تھوڑی دیر کے لیے بس! کچھ سیریس کیس ہیں۔"

"پہلے اسپتال جائیے۔" میں نے نرم روی سے کہا ب پھر کسی دن چلیں گے۔ میں تو ایسے ہی کپڑے پہن کے آیا۔"

"یہ تو نہایت عمدہ لباس ہے۔ بال روم اور ڈنر میں وص لباس کی قید ہوتی ہے۔ ہم اس طرف جائیں گے ہی ں۔ آپ چل کے دیکھیے' دلچسپ جگہ ہے۔" رما نے کچھ ے منت کش لہجے میں کہا کہ کچھ اور نہ کہہ سکا۔ ویسے بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ میں تو آیا انہی کے خیال سے

شام کو پانچ بجے سے کیلاش نے شور مچانا شروع کر دیا۔ ا دیر میں وہ تیار ہوتے رہے' میں مہمانوں کے کمرے میں ں پھیلائے کرسی پر ستاتا رہا۔ ملازمہ وہیں چائے لے آئی۔ ے سے ملحق غسل خانہ تھا۔ میں ادھر ہاتھ منہ دھو کے باہر ۔ ادھر وہ بھی آ گئے۔ کیلاش عنابی رنگ کے سوٹ میں ں تھا۔ رما نے بھی اسی سے ملتے جلتے رنگ کی ساڑی پہنی ۔ قد اس کا ویسے بھی نکلتا ہوا تھا' ساڑی میں کچھ اور کھنچ ۔ کانوں میں طلائی ٹاپس تھے اور گلے میں سفید موتیوں کا اس سادگی میں بھی بڑی زیبائش تھی۔

دھوپ چھتوں پر جا چکی تھی۔ گھر سے نکلتے نکلتے چھ بج ۔ ہمیں زیادہ دور نہیں جانا پڑا۔ یہی کوئی آدھ گھنٹے کا سفر ۔ کیلاش نے مجھے اور رما کو کلب کے احاطے میں وسیع ن سبزہ زار پر چھوڑ دیا اور ڈیڑھ گھنٹے کی مہلت لے کے ے لوٹ گیا۔

ہر سو سرمئی سا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ سبزہ زار شاید روز ا جاتا ہو گا۔ جیسے سبز مخمل زمین پر بچھا دی گئی ہے۔ مخملی ا میں جس طرح بیل بوٹے بنے ہوتے ہیں' بالکل اسی سبزہ زار میں فاصلے فاصلے سے رنگ برنگے پھول کھلے سامنے ملگجے پتھروں سے بنی ہوئی قدیم طرز کی ایک پرشکوہ عمارت کھڑی تھی۔ وسیع برآمدے کا فرش سرخ تھا اور اس پر سفید کرسیاں اور میزیں سلیقے سے رکھی تھیں۔ تمام کھڑکیوں اور دروازوں کے شیشے بلور کے مانند چمک رہے تھے۔ برآمدے کی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے میرے قدم اگر اٹک نہیں رہے تو جھجک ضرور رہے تھے۔ فرش ایسا چکنا تھا کہ ذرا سی بے احتیاطی سے آدمی توازن کھو بیٹھے۔ کرسیوں پر اکا دکا لوگ بیٹھے تھے' عورتیں اور مرد دونوں۔ انہوں نے ایک نظر ہماری جانب دیکھا' ایک عورت نے ہاتھ کے اشارے سے رما کے لیے خوشی کا اظہار کیا۔ رما نے بھی اسی انداز میں اسے جواب دیا اور درمیانی دروازہ عبور کر کے ایک لمبی چوڑی راہداری میں داخل ہو گئی۔ راہداری کے دونوں طرف ہال تھے۔ میں نے رما کی رفتار کا ساتھ دینے کی کوشش کی۔ اندر منظر ہی کچھ اور تھا۔ سوئمنگ پول' جمنازیم' ٹینس کورٹ اور فٹ بال کا میدان۔ عمارت کے پچھلے حصے میں ناریل کے درختوں کی کثرت تھی اور اونچی نیچی زمین پر دور تک سبزہ زار پھیلا ہوا تھا اور جنگل کا سا نقشہ تھا۔ بیچ بیچ میں کہیں کہیں لال پیلی چھتریاں نصب تھیں اور ان کے سائے میں کرسیاں رکھی تھیں۔ اتفاق سے کوئی وہاں بیٹھا ہوا نہیں تھا۔ رما سبزے کے درمیان پتھروں کے راستے سے گزر کے اونچائی پر آ گئی۔ آگے ایک بڑا چبوترہ تھا اور چبوترے کا فرش پختہ نہیں تھا۔ اس کے ایک طرف سفید جنگلا بنا تھا اور جنگلے کے پار ساحل۔ ہم وہیں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اندھیرا تیزی سے بڑھ رہا تھا اور ساری روشنیاں جل گئی تھیں۔ ہم سے قدرے فاصلے پر کچھ اور لوگ بھی بیٹھے تھے۔ "کیسی جگہ ہے؟" رما نے پُرشوق آواز میں پوچھا۔

"نہایت دلچسپ۔" میں نے ادھر ادھر نظر گھماتے ہوئے کہا۔

"آپ پہلے تو اس طرف نہیں آئے؟"

"میں کہاں!" میرے ہونٹ سکڑ گئے "عرصہ ہو گیا' ایسے ہی ایک کلب میں جانا ہوا تھا۔ وہ بھی بہت بڑی جگہ تھی مگر ایسی نہیں تھی۔ ساحل بھی نہیں تھا۔ یہاں کا تو سماں ہی کچھ اور ہے۔"

"ویسے تو دن بھر یہاں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں لیکن شام کو تو کلب کے کسی ممبر کا جیسے گھر میں جی لگتا ہی نہیں۔ سب ادھر کا رخ کرتے ہیں اور رات گئے واپس جاتے ہیں اور چھٹی کے دن تو میلا سا لگا رہتا ہے۔ کلب چھوٹا پڑ جاتا ہے۔"

"جگہ ہی ایسی ہے۔ یہاں ایسا کوئی تکلف بھی مجھے نظر

نہیں آیا۔ میں نے ساحل کی نم ہوا سینے میں بھرتے ہوئے کہا "لوگ آزادانہ جدھر ان کا جی چاہے، گھوم پھر سکتے ہیں اور واقعی آپ ٹھیک کہتی ہیں، یہاں لباس کی بھی کوئی پابندی نہیں۔"

"کلب اس لیے بنائے جاتے ہیں کہ آدمی کچھ دیر آزاد فضا میں سانس لے سکے۔ یہاں لوگ ایک دوسرے سے بہت کھلے ملے اور ایک دوسرے سے بہت الگ تھلگ رہتے ہیں۔ بہت مشکل سے کلب کی ممبرشپ ملتی ہے۔ بعض اوقات برسوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اونچی اونچی سفارشیں چلتی ہیں۔ اچھی طرح چھان پھٹک کر ممبر بنایا جاتا ہے۔"

"سب سے بڑی سفارش تو خود دولت ہے۔"

"بے شک، پہلی شرط یہی ہے۔" وہ کشادہ آواز میں بولی "یہاں چھوٹے امیر کی بھی گنجائش نہیں۔ راجے، مہاراجے، اعلیٰ حکام اور اعلیٰ تاجر وغیرہ۔ کوئی چیز یہاں اعلیٰ سے کم نہیں ہے۔"

"اگر کوئی امیر سے غریب ہو جائے۔۔؟" میں نے جھجک کر کہا۔

"اس کی ممبرشپ تو قائم رہتی ہے کیونکہ ایک دفعہ کوئی ممبر بن گیا تو بن گیا، چاہے وہ بعد کو غریب ہو جائے۔ وہ کلب کی سالانہ فیس ادا کرتا رہے۔ کلب کے قواعد پر عمل کرتا رہے تو ممبرشپ جاری رہے گی لیکن اس کے علاوہ دیگر اخراجات بھی تو ہوتے ہیں۔ ملنے جلنے میں کچھ خرچ تو ضرور ہوتا ہے۔ شکست خوردہ آدمی تو ویسے بھی کم تری کے احساس کا شکار ہو جاتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے، ایسے لوگوں کا کلب میں آنا جانا خود ہی ختم ہو جاتا ہے۔"

اندھیرے میں ساحل بالکل چھپ گیا تھا اور کلب کی روشنیاں اور نمایاں ہو گئی تھیں۔

رما نے خدمت گار کو جانے کس وقت اشارہ کیا تھا کہ وہ صاف وشفاف گلاسوں میں سنگترے کا رس لے آیا۔ اس کے طور طریق میں عاجزانہ تپاک تھا۔ انکار تو جیسے وہ جانتا ہی نہیں تھا۔ ہر بات میں سر جھکاتا بلکہ دہرا ہو جاتا۔ برف کی قاشیں گلاس میں ڈال کے اس نے رس کی چسکی لی۔ ذرا سا ترش تھا لیکن مزے کا تھا۔ میں آدھا گلاس پی گیا۔ "آپ تو یہاں خوب آتی ہوں گی؟" میں نے آہستگی سے کہا۔

"اب تو کبھی کبھی۔" وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولی "زیادہ دنوں کی بات نہیں، امتحان کے فوراً بعد مجھے ایک عرصے تک کلب کا دورہ پڑا رہا۔ ہر شام یہیں گزرتی تھی لیکن پھر آنا کم ہو گیا۔"

"کیوں؟ پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتی کہ اس کی وجہ کیا تھی۔ یہ مجھے بہت پسند ہے پھر آدمی جائے بھی کہاں۔" وہ تذبذب بولی "اصل میں، شاید بات یہ ہے کہ جگہ کا تعلق منا نہیں، لوگوں سے بھی ہے۔"

"ہاں ہاں۔" میں نے یونہی سرہلا کے تائید کردی میں مجھے احساس ہوا کہ اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ یہاں آپ کو اچھے لوگ ملے؟" میں نے بے ربطی سے پوچھا۔

"نہیں، یہ زیادتی ہوگی۔" اس کے ہونٹوں پر تبسم گیا "ایسا نہیں ہے کہ یہاں برے لوگ آتے ہیں، برے سبھی۔ یہ کلب کب سے قائم ہے۔ اچھے، پڑھے خشک مزاج اور بے تپاک لوگ ہیں یہ، ہنستے بولتے رہنے ہنسنے بولنے کے لیے یہاں آتے ہیں۔"

"پھر، پھر کیا بات ہوئی؟"

"اس کی وضاحت مشکل ہے۔" وہ ہچکچانے لگ خیال ہے، یہ میری ہی کوئی خامی ہوگی کہ میں ان کے قر آسکی، کوشش کے باوجود یوں سمجھیے۔۔"

"مگر انہوں نے تو آپ کی قربت کی خواہش کی" میں نے اس کی بات کاٹ کے جلدی سے کہا اور مجھے ا عجلت پر خفت ہوئی۔

"ہاں شاید، انہوں نے مجھے یہ عزت دینا چاہی میں نے کہا ناکہ میں اس کی متحمل نہیں ہو سکی۔" سے بولی۔ میری خاموشی پر وہ کچھ سنجیدہ ہو گئی اور زیر بولی "وہ سب ایک جیسے ہیں، ایک جیسی باتیں کرتے بڑے محدود لوگ ہیں۔ لوٹ پھر کے ان کی توجہ کا مر ہی رہتی ہے۔"

"تو برا کیا ہے، دولت اتنی حقیر چیز نہیں بڑی ملتی ہے اس سے۔"

"دنیا یہی سمجھتی ہے، اتنے بہت سے لوگ غل سمجھتے ہوں گے۔ دولت آدمی کو طاقت ور تو ضرور جبھی لوگ اس کی طرف بھاگتے ہیں۔"

"لیکن صرف دولت ہی تو سب کچھ نہیں اور بھی زندگی ہے، دولت مند آدمی بظاہر بہت پھیلا ہو ہے لیکن وہ ہوتا بہت محدود ہے۔ اس پر دولت کا طلسم طاری رہتا ہے کہ اسے اس کے سوا کچھ دکھا دیتا۔ اس کی پیش تر توانائیاں اس میں صرف ہو جاتی کہیں رکتا نہیں، بس بھاگتا رہتا ہے، بھاگتا رہتا ہے

وقت یہ خوف لاحق رہتا ہے کہ یہ سرفرازی اس سے چھن نہ جائے۔ چاہے کوئی کتنا ہی بڑا دولت مند ہو' ایک سہما ہوا آدمی ہوتا ہے۔ چاروں طرف چھائی ہوئی بھیانک غربت اسے دولت پکڑنے' جکڑنے پر مجبور کیے رہتی ہے۔ اور وہ جانتا ہے کہ دولت صلاحیت سے زیادہ اتفاق ہے' حادثہ ہے اور جسے ورثے سے نہیں' اپنی جدوجہد سے دولت ملی ہو' وہ تو اور اس سے چمٹا رہتا ہے اور وہ خوف زدہ رہتا ہے۔"

"آپ صحیح کہہ رہی ہیں لیکن آپ نے غریبی کہاں دیکھی ہے۔ غریبی تو بہت بڑی قید ہے۔ یہ تو آدمی کو امیری سے کہیں زیادہ محدود کردیتی ہے۔"

"میں نے غریبی دیکھی نہیں' سنی اور پڑھی ضرور ہے۔ غریبی بری چیز ہے اور امیری بے شک اچھی چیز لیکن میں ایک اور بات کہہ رہی ہوں۔" اس کی آواز تمتمانے لگی "میری مراد روپے سے ہے۔ دولت کی اتنی طلب سے آدمی خود کو کھو دیتا ہے۔ آدمی' آدمی نہیں رہتا' کچھ اور بن جاتا ہے۔"

تیز ہوا سے اس کی ساڑی کا پلو اڑ اڑ جاتا تھا۔ اس کے بال بھی اڑ رہے تھے۔ وہ کبھی پلو درست کرتی تھی' کبھی بال۔ "چھوڑیے بھی۔" اس نے گلاس میں بچا کھچا رس ایک گھونٹ میں ختم کردیا اور بے قراری سے بولی "آپ یہیں بیٹھے رہیں گے؟ کسی اور طرف کیوں نہ چلیں؟ اب کلب جاگنے لگا ہے۔ میں آپ کو گھماتی ہوں۔ ذرا دیکھیے گا' یہاں آ کے لوگ کیسے دیوانے ہوجاتے ہیں۔"

میں نے اسے یاد دلایا کہ کیلاش اب آتا ہی ہوگا' ہم اِدھر اُدھر ہوگئے تو اسے دشواری ہوگی۔

"ڈھونڈ لے گا۔ اسے یہاں کے سب ٹھکانے معلوم ہیں۔" وہ بے نیازی سے بولی۔ اس نے خدمت گار کے لائے ہوئے بل پر دستخط کیے اور کچھ روپے بھی رکھے اور کرسی سے اٹھ گئی۔ ہم جس جگہ بیٹھے تھے' وہ سب سے اونچی تھی' کلب کی عمارت کا عقبی حصہ' سبزہ زار' سوئمنگ پول وغیرہ خاصے نیچے تھے۔ اونچائی پر جا کے چیزیں کتنی چھوٹی نظر آتی ہیں۔ ایک طرف گہرا اندھیرا مسلط تھا' سمندر کی طرف باقی تینوں اطراف شہر کی روشنیاں بکھری ہوئی تھیں جیسے ستارے زمین پر آگئے ہوں۔ راستے میں روشنی زیادہ نہیں تھی۔ وہ آگے آگے تھی' میں ایک قدم پیچھے۔ اونچے نیچے پتھروں سے بنی ہوئی سیڑھیاں اترتے وقت اس نے ساڑی سینڈل سے کچھ اوپر کرلی اور احتیاط سے قدم رکھتی رہی۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ گر نہ جائے۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے بے اختیار اسے تھام لیا۔ کوئی ریشم سا میری مٹھی میں بھر گیا مگر دوسرے ہی لمحے میرا وجود پتھر ہوگیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے قدم زمین پر اکھڑ رہے ہوں' جیسے مجھے خود سہارے کی ضرورت ہو۔ کوئی لمحہ جائے گا کہ میں سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا نیچے چلا جاؤں گا۔ مجھے نہیں معلوم کہ باقی سیڑھیاں میں نے کس طرح طے کیں اور کب اس نے ہاتھ چھوڑا یا اس نے چھڑا لیا۔ چند ثانیوں تک میں اپنے آپ سے بچھڑا رہا لیکن جلد ہی میں خود کو نظر آگیا۔ اپنی بازیابی پر میں نے سکون کی سانس لی۔ نیچے آ کے اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور مجھ سے پوچھنے لگی کہ کیوں نہ سمندر کی سیر کریں۔

یہ گزشتہ لمحوں کی ناتوانی ہی تھی کہ میں کوئی جواب نہ دے سکا اور اضطراری انداز میں سرہلا کے رہ گیا۔ وہ پگڈنڈی جیسے راستے سے نیچے اترتی رہی۔ کچھ دیر میں ہم اس برآمدے میں آگئے جہاں سے کشتیوں میں سوار ہوا جاتا تھا۔ وہاں کئی کشتیاں کھڑی تھیں۔ کئی آدمی ہماری طرف لپکے۔ رما ان پر توجہ دیے بغیر نیچے اتر گئی۔ ملاح تیزی کے ساتھ ہم سے آگے بڑھ گئے۔ انہوں نے مجھے اور رما کو اپنے ہاتھ کے سہارے سے زینے اور کشتی کے درمیان کا فاصلہ عبور کرایا۔ وہ ایک بادبانی کشتی تھی' سفید براق بادبان پر لال لال دھاریاں پڑی تھیں' مسلسل دو ملاحوں نے جاں فشانی سے کشتی گھاٹ کے زینے سے جدا کردی۔ وہ کچھ دور تک چپو چلا کے کشتی بڑھاتے رہے پھر انہوں نے بادبان کھول دیا۔ درمیان میں ساز و سامان کے لیے بنی ہوئی جگہ سے کشتی دو حصوں میں منقسم ہوجاتی تھی۔ ہم جس حصے میں آ کے بیٹھے تھے' وہ غالباً سیر بینوں کے لیے مخصوص تھا۔ وہاں صاف ستھرے پھول دار گدے بچھے تھے' پاؤں پھیلا کے بیٹھیے یا لیٹ جائیے۔ دونوں طرف تختوں کی بنچ جیسی نشست نصب تھی۔ اس پر بھی نرم گدے بچھے تھے۔ کلب کے معززین ہی اس کشتی میں سیر کرتے ہوں گے اسی لیے ایسا اہتمام تھا۔ یہ سمندر ہی کا حصہ تھا مگر کسی بڑی جھیل کے مانند۔ اس طرف پانی میں اتنا زور و شور نہیں تھا مگر جیسے جیسے کشتی آگے بڑھتی گئی' پانی کا بہاؤ تند و تیز ہوتا گیا۔ چھٹکی ہوئی چاندنی ہر سو بکھری ہوئی تھی آسمان پر رواں دواں بدلیاں چاند چھپالیتیں تو اندھیرا ہوجاتا۔ تیز ہوا چل رہی تھی' کشتی کی رفتار بھی تیز تھی۔ رما کے اڑتے ہوئے بال بھی بدلیوں کی طرح بار بار اس کے چہرے پر چھا جاتے' وہ بے خودی کے سے عالم میں تختے پر بیٹھی تھی۔ مجھے بھی یہ سب کچھ عجیب سا لگ رہا تھا' خواب خواب' تصویر تصویر۔ رما تختے سے اٹھ کے گدے پر چلی گئی اور تکیے کے سہارے ترچھی ہو کے نیم دراز ہوگئی۔ اس نے مجھے بھی وہیں آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے کسی معمول کی طرح اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ میں بھی اس کے قریب گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کے اور پاؤں پھیلا کے بیٹھ گیا "آپ خاموش کیوں ہوگئے؟ کیا اچھا نہیں لگ رہا؟" وہ لہرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"بہت' بہت اچھا۔" میں نے ہڑبڑا کے کہا "یہ تو عجیب ہے۔ رات کو تو سمندر اور سحر انگیز ہوجاتا ہے۔"

"مجھے رات ہی کو سمندری سیر کی سوجھتی ہے۔ چاندنی میں تو اور مزہ آتا ہے۔ سمندر بپھرا ہوا ہوتا ہے۔ یہ شاید آٹھویں نویں کا چاند ہے۔ چار پانچ دن بعد اِدھر آ کے دیکھیے گا' کیسا پاگل بنا ہوا ہوگا' پانی۔"

کبھی کبھی کشتی بہت ہچکولے کھانے لگتی' لگتا تھا' کوئی جھولا جھلا رہا ہے۔ ایک گھن گھنا تا سناٹا ہر طرف طاری تھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں۔" وہ لپکتی آواز میں بولی۔

"کچھ نہیں۔" میں نے تن دہی سے کہا "بس ایسے ہی۔ سوچ رہا تھا کہ ہم اتنی دیر وہاں ٹیلے پر کیوں بیٹھے رہے۔ میں نے رات کے وقت اس طرح پہلی بار سمندر کا نظارہ کیا ہے' سمندر کے اندر جا کے۔"

"ایک بات پوچھوں؟"

"ضرور!" میں نے حیرانی سے کہا "کیا بات ہے؟"

"یہ آپ اتنے بند بند سے کیوں رہتے ہیں؟"

"نہیں تو۔" میں نے سٹپٹا کے کہا "آپ کو کیسے اندازہ ہوا؟"

"لگتا ہے' آپ کا کوئی دوست نہیں ہے شاید۔"

"نہیں میرے بہت دوست ہیں۔"

"دوست سے مراد وہ دوست جس سے آپ سب کچھ کہہ سکیں۔ آخر مجھے بھی اتنے دن ہوگئے دیکھتے ہوئے' مجھے شبہ ہے کہ شاید ایسا کوئی نہیں ہے۔"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" میں نے گھٹی آواز میں کہا "مجھے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔"

"ہوسکتا ہے۔" وہ شائستگی سے بولی اور اچانک سسکاری بھری۔ کشتی بری طرح اچھلنے لگی۔ کوئی بڑی کشتی قریب سے گزری تھی اسی لیے لہریں متلاطم ہوگئیں۔ رما بھی لڑھک گئی۔ مجھے بھی تختہ پکڑ کے اپنا توازن قائم رکھنا پڑا۔ اسی اثنا میں کسی تیز لہر کے چھینٹے اندر تک آگئے اور ہم دونوں کو بھگو گئے۔ دوسری کشتی دور چلی گئی تو ہماری کشتی کی رفتار معمول پر آئی "آپ کو کسی پر بھروسا نہیں ہے کیا؟" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

"اپنے آپ پر اعتماد کی کمی سے بھی ایسا ہوتا ہے۔"

"ممکن ہے' ایسا ہی ہو۔" میں نے اضطراب سے کہا "لیکن آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟"

"بہت کچھ۔" وہ ٹھنڈی سانس بھر کے بولی "کہنا بھی اور سننا بھی۔ میں جانتی ہوں' یہ آپ کے لیے بہت مشکل ہے کیونکہ آپ عمداً ایسا نہیں کرتے لیکن شاید آپ کو اندازہ نہیں کہ اس طرح کیسی کیسی گانٹھیں پڑجاتی ہیں۔ آدمی دوسروں سے تو کیا' خود سے بھی دور ہوجاتا ہے۔ آپ کے دلدار' جاں نثار کم نہیں ہوں گے لیکن ان میں سے کوئی بھی شاید آپ کو نہیں جانتا۔ کوئی دوست ہوتا تو آپ میں اتنا غبار نہ ہوتا۔ دوست صرف غم گساری ہی نہیں کرتا' آپ کو اچھے مشورے بھی دیتا ہے' بعض اوقات دوسرے زیادہ بہتر مشورے دے سکتے ہیں۔"

میں گنگ بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔

"میری کوئی بات گراں گزرے تو مجھے معاف کردیجیے۔"

"نہیں نہیں۔" میں نے منتشر لہجے میں کہا "مگر آپ کو' آپ کو اچانک یہ خیال کیسے آیا؟"

"اچانک نہیں' بہت دن سے اور شاید پہلے دن سے جب آپ کیلی کے ساتھ گھر آئے تھے۔ یہ ایک روایتی سا اظہار ہے مگر ایسا ہوتا تو ہے۔ انسانوں کے مابین یہ واقعہ بار بار پیش آتا ہے کہ کسی اجنبی سے مل کے آپ کو یہ گمان ہو' کوئی بچھڑا ہوا مل گیا ہے۔ اس احساس کی منطقی وجہ موجود ہے۔ وہ اجنبی آپ کے ذہن میں بنی کسی تصویر کے مطابق ہو' آپ کو اس کی موہوم سی تلاش ہو' اور وہ اچانک آپ کو کہیں نظر آجائے' وہی یا اس سے ملتا جلتا' ہوتا ہے نا ایسا؟"

"جی' جی ہاں۔"

"یہ بھی ممکن ہے کہ تصور و خیال میں بنی تصویر سے بڑھ کے کوئی مثال سامنے آجائے لیکن المیہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے خیال' اپنے خواب رکھتا ہے۔ دو آدمیوں کے درمیان مطابقت شاذ ہی ہوتی ہے۔ مجھے معلوم کہ مجھے دیکھ کے آپ کے ہاں وہ شوق بیدار نہیں ہوا جو آپ کو دیکھ کر میرے دل میں گونجا تھا۔"

میں نے دھڑکتی آواز میں کہنا چاہا "یہ بات نہیں ہے' آپ سے مل کے میں نے ایک خوش گوار تاثر لیا تھا۔ مجھے خوشی ہوئی تھی کہ میں ایک خوش طبع' فکر اور۔۔۔" حسین کہتے ہوئے میری زبان لکنت کرنے لگی لیکن میں نے کہہ دیا اور

میں نے کہا "یقین کیجئے آپ کو دیکھ کے مجھے بھی کچھ حاصل کرنے کی سرخوشی حاصل ہوئی۔"

"میں جانتی ہوں' آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ زیرلب تبسم میں بولی "لیکن پہلے مجھے کہنے دیجئے اور سمجھ لیجئے کہ میرا کوئی ہے میں صرف آپ کے حوالے سے کہنا چاہتی ہوں' اپنے حوالے سے نہیں۔ بہتر ہوگا کہ میری بات جانے دیں۔ اتنے دنوں میں آپ کو یہ اندازہ تو ہوگیا کہ میرے ہاں اقدار کا اپنا ایک نظام ہے۔ کسی نہ کسی حد تک ہر شخص کے ہاں ہوتا ہے لیکن سماجی دہشت کی وجہ سے وہ اسے خود تک محدود رکھتا ہے۔ میں بھی اس سماجی دباؤ سے بری الذمہ نہیں ہوں کیونکہ میں بھی اسی زنداں کی اسیر ہوں لیکن جیسا کہ قیدی قیدی میں فرق ہوتا ہے۔ میری مثال اس قیدی کی سمجھئے جو کبھی اونچی آواز میں بات کہنے کی جرات کرلیتا ہے۔ چاہے اسے یہ جرات کتنی مہنگی پڑے مگر زنداں زنداں ہے اور قیدی تو قیدی ہے۔ ہم سب قیدی ہیں اور نجات کی ایک ہی صورت ہے کہ خود کو زنداں کے سپرد کردیا جائے' زنداں کے رحم وکرم پر۔ اچھے قیدیوں کی طرح زنداں کے آداب و قواعد پر عمل کیا جائے' کچھ رعایتیں مل جاتی ہیں۔ جانے کب سے یہ رد عمل انسانوں کے درمیان رائج ہے۔ ایک' فرد کا شعور ہے کہ کیا اچھا ہے' کیا برا' کیا ہونا چاہیے' ایک گروہی یا اجتماعی شعور ہے یا ضابطہ حدود کہ کیا لازم ہے۔ دونوں میں ایک کشمکش رہتی ہے اور طاقت ور کی جیت ہوتی ہے۔"

"معاً وہ رک گئی اور چند لمحوں کے تردد آمیز سکوت کے بعد بولی "میں دور چلی گئی' جانے میں کیا کہہ رہی تھی؟"

میں سوچ رہا تھا کہ اسے کہاں سے یاد دلاؤں کہ وہ خود ہی بے تابی سے بولی "ہاں' میں اپنے بارے میں وضاحت کررہی تھی کہ آپ اطمینان رکھیں' میں فرد کے داخلی سچ اور خارجی سچ کے تضاد کا پورا شعور رکھتی ہوں۔ دونوں سچ ہیں کہ دونوں موجود ہیں اور جہاں تک میرا معاملہ ہے' میں فرد کے داخلہ سچ کے سلسلے میں بہت حساس ہوں لیکن ہر زمانے میں انہیں انگلیوں پر گن لیجئے جو محض فرد کو ترجیح دیتے ہیں۔ تقریباً تمام لوگ اپنی ذات کا سچ گروہی یا اجتماعی سچ پر قربان کردیتے ہیں۔ میرے کہنے کا مقصد ہے کہ آپ کے قریب کوئی ایسا ہے جس سے آپ اپنی ذات کا سچ بول سکتے ہیں۔ میں آپ کے پاس ہوں' ہم کیوں نہ ایک دوسرے سے سچ بولیں اور جتنا سکھ ممکن ہے' اسے سمیٹیں' آپ ایک صاحب دل' صاحب فکر نوجوان ہیں' مجھے بتائیے' یہ گھٹا کیسی ہے جو آپ کے چہرے پر امڈی رہتی ہے۔ کون سی کمی ہے جو آپ کو اتنا اجیرن کیے ہوئے ہے؟ کسی نے آپ کو آپ سے چھن رکھا ہے۔ مجھے بتائیے کہ یہ سب کیا ہے' کس لیے ہے؟"

اس کے لہجے کی دل سوزی سے میرا سینہ کٹنے لگا۔ میں نے جھرجھرائی آواز میں کہا کہ کیا بتاؤں کچھ بتانے کو ہو تو بتاؤں بھی۔"

"میں سمجھ سکتی ہوں کہ آدمی کا دکھ ہی کبھی اس کی متاع بن جاتا ہے۔ اس کی انا اس کا سرمایہ پھر آدمی کو گردوپیش کی ترغیبات سے کوئی غرض نہیں رہتی۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ یہ سرمایہ ضائع نہیں ہوگا۔ ہوسکتا ہے' ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکیں' کوئی تدبیر نکل آئے۔ سنا ہے' کسی کی شرکت سے بار کچھ کم ہوجاتا ہے۔ میں پوچھتی ہوں' وہ سرمایہ ہی کیا جس کے چھن جانے اور لٹ جانے کا اتنا ڈر ہو۔ کچھ بعید نہیں کہ یہ احوال خود میرے لیے کسی اذیت کا باعث ہو مگر یہ خلش تو مجھے اور بے کل کیے رہے گی کہ میں ایک شخص سے قلبی اور ذہنی رفاقت کے باوجود اس سے کیسی اجنبی ہوں۔"

"خدا کے لیے زیادہ کچھ مت کہئے۔" میں نے کٹی پھٹی آواز میں کہا "مجھ سے دہرایا نہیں جاتا۔ میری آواز ہی میرا ساتھ نہیں دیتی۔"

"اسی لیے تو میں یہ منت کررہی ہوں' آپ نے سب کچھ خود تک جو چھپا رکھا ہے۔" وہ عاجزی سے بولی "کسی کو شامل کردیکھئے اور باور کیجئے کہ مجھ میں دوستی کی اعلیٰ صلاحیت موجود ہے۔ میں آپ کی بہترین دوست ہوں۔"

"میں' میں آپ کو دشمن کب سمجھتا ہوں۔"

"مگر دوست بھی کہاں سمجھتے ہیں۔ مجھ سے زیادہ تو کیلی آپ کا دوست ہے۔ آپ اس سے یہ تکلف برتتے۔ اسے تم کہہ کے مخاطب کرتے ہو۔"

"وہ اور بات ہے۔" میں نے کسمساتے ہوئے کہا "میں آپ کو بھی تم کہہ سکتا ہوں لیکن ایک خاتون کو۔۔۔"

"کیا ایک خاتون ایک مرد کی طرح کسی مرد کی دوست نہیں ہوسکتی۔" وہ جھنجھلائی آواز میں بولی "میرا مطلب ہے' دو مردوں اور دو عورتوں میں جس طرح کی دوستی ہوتی ہے جس طرح کیلی آپ کا دوست ہے' میں کیوں نہیں ہوسکتی؟"

"جی' جی ہاں بالکل۔" میں نے منتشر لہجے میں کہا۔

"مگر ایسا نہیں ہوتا۔ جانے کیوں ایک مرد' ایک عورت دو مردوں اور دو عورتوں کی طرح نہیں ہوپاتے۔ ان دونوں کا باہمی تعلق ہمیشہ ایک مخصوص تناظر میں دیکھا جاتا ہے لیکن ہو ضرور سکتا ہے' نہ ہوسکنے کی کوئی مضبوط دلیل کم سے کم میری سمجھ میں نہیں آتی' ایسا ہونا چاہیے نا؟"

"جی ہاں۔" میں نے مضطربانہ تائید کی۔

"تو میں آپ سے یہی تو کہہ رہی ہوں۔ مجھے آپ اپنا ایسا ہی دوست سمجھئے جیسے کیلی ہے' کیلی کی طرح مجھے آپ کی ضرورت ہے' آپ کو بھی کیلی کی طرح میری ضرورت ہے۔ کیلی کے پاس مجھ سے زیادہ نہیں ہے۔ میرے پاس اس سے زیادہ چھاؤں' اس سے زیادہ ریشم ہے۔" وہ بہت بے چین نظر آرہی تھی کہنے لگی "اچھا ایک بات بتائیں' میں آپ کو کیسی لگتی ہوں؟"

میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن میرے ہونٹ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

"کوئی مشکل بات نہیں ہے' سچ بولنا اتنا دشوار نہیں ہوتا' جتنا سچ سننا۔"

"آپ' آپ یہ کیوں پوچھ رہی ہیں۔"

"میں آئینہ دیکھنا چاہتی ہوں' اصل آئینہ تو دوسروں ہی کے پاس ہوتا ہے' خود کو کتنا نظر آتا ہے۔"

"مگر' مگر اس میں جاننے کی کیا بات ہے؟" میں نے بے ربطی سے کہا "آپ کو نہیں معلوم۔"

"میری خوش گمانی بھی ہوسکتی ہے۔"

"کیسی باتیں کررہی ہیں آپ پھر ہم یہاں' یہاں کیوں۔" میں نے کٹی پھٹی آواز میں کہا "تائید کی کیوں ضرورت محسوس ہوئی آپ کو؟ میرے دل میں آپ کے لیے بہت عزت ہے' آپ ایک نہایت نفیس' ذہین اور دردمند خاتون ہیں اور کیا کہوں۔"

"میں ایک خوب صورت لڑکی نہیں ہوں کیا؟"

"جی' جی ہاں یقیناً۔" میں نے بدحواسی سے کہا۔

"مجھے دیکھ کر آپ کے دل میں نرم لطیف احساسات نہیں ابھرتے۔"

"کیوں نہیں' کیوں نہیں۔"

"گیتا کے گھر اس دن میں نے آپ سے یہی کہنے کی کوشش کی تھی۔ شاید آپ بھول گئے۔"

"نہیں' مجھے یاد ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔"

"یاد ہے تو آپ نے توجہ نہیں کی۔ میں نے کہا تھا کہ بڑی چھاؤں کی آس میں آدمی راستے کی چھوٹی بڑی چھاؤں سے کیوں کنارہ کیے رہے اور میں نے کہا تھا کہ تیسرے یا چوتھے آدمی کی شمولیت کوئی حق تلفی یا بدعہدی نہیں ہے۔ وفا ایک اعلیٰ ترین قدر ہے مگر یہ کوئی معاہدہ نہیں۔ معاہدے صرف تجارتی' سیاسی اور سماجی ہوتے ہیں۔ وفا کوئی معاہدہ نہیں' معاہدہ مشروط ہوتا ہے۔ وفا دونوں جانب سے اثبات کا ایک عمل ہے' یہ پابند نہیں' بے اختیار ہے۔ ایک جانب سے بھی کبھی یہ ممکن ہے؟ لیکن آدمی دریا نہیں جو ایک طرف بہتا ہے' بہتا چلا جاتا ہے۔ آدمی پر مختلف اوقات میں مختلف کیفیات طاری ہوتی ہیں اور چوں کہ ایک فطری مظہر ہے' اس لیے اپنی بدلتی ہوئی کیفیتوں کے دوران میں آدمی سے وفا کی پاس داری مشکل ہوجاتی ہوگی اور یہ دورانیہ کشمکش میں گزرتا ہوگا۔ میرا خیال ہے' وفا میں جہاں سے جبر شروع ہوا' وہ وضع ہوگئی۔ زندگی بھر آدمی وضع نبھائے جاتا ہے اور اپنے جسم وجاں میں ابلتی امڈتی نوبہ نو تحریکیں تابع کیے رہتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ پاس وضع سے ہونے والی سرخوشی بیش ہوتی ہے یا خود پر عائد کیے جانے والا جبر زیادہ جاں گسل ہوتا ہے۔ یقیناً پاس وضع میں کوئی اطمینان نصیب ہوتا ہوگا کہ آدمی اصرار کیے جاتا ہے یا یہ ضد کی کوئی حالت ہے۔ ضد بھی استقامت دیتی ہے۔ میری رائے میں وضع ایک اچھی چیز ہے۔ آدمی پر آدمی کے اعتبار کی علامت لیکن یہ بھی تو اپنی جگہ طے ہے کہ آدمی پر مختلف موسم طاری ہوتے رہتے ہیں۔ وضع کا پاس احساسات وجذبات کی قیمت پر نہیں ہونا چاہیے۔ تشنہ لبی اور تلاطم کے کسی موسم میں آدمی کو دریا کا رخ کرنے یا ساحل کی جستجو کرنے کی رعایت ملنی چاہیے۔ مخالف سمت میں اپنی ذات کے سفر سے تو آدمی میں دراڑیں پڑجاتی ہوں گی۔" معاً وہ کچھ گھبرا سی گئی اور مسکرا کے بولی "آپ سوچتے ہوں گے کہ میں کتنی دور دور چلی جاتی ہوں۔ مجھے صرف اتنا کہنا تھا کہ زندگی اس قدر نہیں ہے' جتنی آپ نے طے کر رکھی ہے اور دنیا ایک آدمی سے دوسرے آدمی تک ہی نہیں ہوتی۔"

میں سمجھتا ہوں' آپ کو کیا بتاؤں کہ میں خود پر کوئی جبر نہیں کرتا۔" میں نے بکھری ہوئی آواز میں کہا "جو کچھ بھی ہے' وہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔"

"ہوسکتا ہے' ضرور یہی ہوگا لیکن کیا یہ ستم نہیں کہ آپ کے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔ آپ کہیں گے کہ آپ کو کسی ستم یا جبر کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ نہیں ہوتا ہوگا۔ ترک اختیار بھی بعض حوصلہ مندوں کا شیوہ بن جاتا ہے۔ امید ٹوٹ جائے تو بھی لوگ اپنی وضع نہیں بدلتے اور جہاں تک میرا اندازہ ہے' آپ کی امید قائم ہے اس لیے آپ کی آنکھوں میں آگ سی جلنے لگتی ہے جن کی امید ختم ہوجائے' ان کا عالم دوسرا ہوتا ہوگا۔ میں نے وہ لوگ دیکھے نہیں' کہانیوں میں پڑھے ہیں۔ سنا ہے' ان میں کئی اپنے آپ سے ۔۔۔ بردار ہوجاتے ہیں۔ اختیار ترک دنیا نہیں ہے

لیکن پھر اور کیا ہے؟ میں سمجھتی ہوں' یہ آخری درجے کی شکست خوردگی ہے۔ بہرحال میں تو اس شخص کی بات کر رہی ہوں جس کی امید قائم ہے اور جس کے خوابوں کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا ہے جس کی آنکھیں پوری طرح کھلی ہیں اور مناظر کے ساتوں رنگ پوری طرح اخذ کرتی ہیں۔ وہ شخص جو چوراہے پر ایک سمت نظر ٹکائے کھڑا ہے۔ اس کی نظر تو ایک سمت ہے مگر راستے اسے اور بھی نظر آرہے ہیں۔ وہ ان راستوں کا رخ نہیں کرتا مگر راستے اس کی آنکھوں سے مسدود نہیں ہوئے ہیں۔ مجھے تسلیم ہے کہ آپ کو اپنی یک سوئی اور ارتکاز تلاش اور انتظار سے یک گونہ آسودگی ملتی ہے اور یہ محض وضع ومروت نہیں ہے۔ اسے وضع ومروت سے موسوم کرکے ارزاں نہیں کیا جاسکتا۔ یہ مسلسل سوزش کسی گہری ذہنی اور قلبی واردات کے بغیر ممکن نہیں۔ اس کا تعلق جسم سے اتنا نہیں جتنا ماورائے جسم سے یعنی روح سے ہے۔ کوئی شخص جو روح میں اتر گیا ہے' ایک شخص جو ریشہ ورگ میں سما گیا ہے' یہ کوئی فسانہ نہیں' ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے لیکن آپ ایک حساس اور ذی ہوش انسان ہیں' ہر اعتبار سے ایک مکمل آدمی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کبھی کسی لمحے آپ کو اپنے گردوپیش اور اپنی طرف دیکھنے کی فرصت نہ ملتی ہو۔ آپ آئینہ نہ دیکھتے ہوں۔ میں انہی سرکش وسرگرداں لمحوں کی طرف اشارہ کررہی ہوں کہ آخر آپ ان کا کرب کیوں سہتے ہیں۔ ایسے میں ٹھنڈک کا کوئی گوشہ میسر آتا ہے تو اسے غنیمت جانیئے اور اگر' اگر یہ سب کچھ میرا گمان ہے تو پھر یہ گرد کیسی ہے؟" وہ الجھی ہوئی آواز میں بولی "چہرے پہ بادل کیوں چھائے ہوئے ہیں' سمجھ رہے ہیں آپ؟"

"ہاں' ہاں۔" میں نے بے قراری سے کہا۔

وہ رک گئی اور چند لمحوں کے سکوت کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی "سنئے! میں جو اتنا کچھ کہہ رہی ہوں' اسے کوئی شکوہ یا اعتراض مت جانئے۔ آپ مجھے ایک ہوش مند لڑکی سمجھتے ہیں تو میرا بیان توجہ اور اعتنا کا سزاوار ہے۔ میری غرض کیا ہے؟ میری غرض وغایت صرف آپ ہیں۔ یہ میرے لیے اتنا نہیں جتنا آپ کے لیے ہے۔ میرے لیے صرف اتنا ہے کہ میں آپ کو بطور خاص خوش دیکھنے کی آرزو مند ہوں۔ میں آپ سے کیا کہوں اور کس قدر کہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں آپ کے کسی کام آؤں۔ یہ خدا ترسی نہیں۔ نہ آپ نے کوئی سوال کیا ہے۔ نہ مجھے کسی چارہ گری اور جادوگری کا دعوا ہے۔ ہر ایک کا جادو ہر ایک کے لیے کارگر نہیں ہوتا اور اپنی اپنی نسبت کی بات ہے۔ میں بھی ایسی کوئی نسبت اپنی رگوں میں محسوس کرتی ہوں کہ آپ میرے لیے اس تصویر کے مانند ہیں جو میں نہ بنا سکی لیکن آپ سے میری کوئی نسبت سربہ سر میرا معاملہ ہے اور آپ کے اثبات سے مشروط نہیں۔ میرے نزدیک دوستی میں تجارت کی طرح لین دین نہیں ہوتا۔ یہ تو حساب پیمانے سے سوا کوئی چیز ہے' اور پسند اور شوق کی بات ہے۔ میں آپ کو کیا بتاؤں' میں نے خود سے پوچھا تھا کہ میں کون ہوں' میرا کیا جواز ہے۔ میں اس قدر کیوں متوحش ہوں۔ مجھے اطمینان ہوگیا تھا کہ میرا جواز میرا احساس ہے۔ میرا جواز وہ تاثر ہے جو ایک آدمی دوسرے آدمی سے قبول کرتا ہے اور یہ کوئی وحشت نہیں' یہ تو ایک بے کنار جذبہ ہے۔ یوں کہئے کہ ایک شاہکار تصویر کو گردوغبار کی جگہ کے بدلے محفوظ دیوار پر آویزاں دیکھنے کی تمنا نے خود کو باور کرانے کی کوشش کی کہ کہیں یہ جسارت مداخلت بے جا تو نہیں' کنکر پھینکنے کے مترادف' میری انا کی کوئی سازش میرے جسم وجاں کی کوئی شورش' ایک طالع آزما امیر کا شوق معرکہ آرائی شغل کوچہ گردی۔ یہ کیا ہے؟ یہ کوئی نفسی گرہ ہے؟ مجھ میں کوئی سودا سمایا ہے؟ میں نے اچھی طرح مطمئن ہونے کے بعد ہی سلسلۂ جنبانی کی ہے۔ میں نے خود کو یقین دلایا کہ میرا ارادہ نہایت متوازن ہے۔ میرا مقصد ایک عزیز ترین اور نفیس ترین دوست کی دل جوئی اور دلداری ہے اور کوئی نقش رگ وریشہ میں پیوست ہے تو اندیشہ زیاں فضول ہے۔ اس میں کسی کا حرج نہیں۔ نہ میرا نہ آپ کا۔ اس میں دونوں کا بھلا ہے کہ دو آدمی اس جنگل میں اپنے راستے ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور جب تک راستے عیاں نہیں ہوجاتے' ایک دوسرے کا سہارا بنے ہوئے ہیں۔ میں نے اتنی صراحتیں یوں کی ہیں کہ کوئی ابہام نہ رہے۔ آپ کو اعتبار آجائے کہ آپ کا کوئی ضرر نہیں ہے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" میں نے ہیجانی آواز میں کہا۔

"اعتبار کا لفظ غالباً بے محل ہے مگر پھر مجھے اور کیا کہنا چاہیے۔" وہ تیورا کے بولی "بہرحال اسے ایک تجویز سمجھئے۔ معتبر دوست کی طرف سے ایک تجویز۔ ممکن ہے' میں نے کچھ زیادہ ہی اخذ کرلیا ہو اور یہ سب کچھ میری فہم سے متجاوز ہو۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ پھر یہ کیا ہے؟ آپ مجھے شامل کریں گے تو میرے لیے سرخوشی کی بات ہوگی۔ آپ کے لیے اسے دہرانا مشکل ہے تو میں اصرار نہیں کروں گی پھر اس محبت کو

تبادلۂ خیال سے زیادہ وقعت نہ دیجئے۔ میں آپ کے سامنے موجود ہوں اور کسی وقت بھی آپ سے دور نہیں ہوں اور ہمارے پاس مال ودولت کی طرح وقت کی بھی قلت نہیں ہے۔ مجھے اس کے سوا کچھ اور نہیں کہنا ہے کہ آپ کی دانست میں میرے پاس کوئی نرمی' حلاوت وگداز ہے تو آپ کو کیا عار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے پاس آپ کے لیے بہت کچھ ہے۔"

"جی' جی ہاں۔" میری آواز لڑکھڑا رہی تھی "مجھے کوئی' مجھے کوئی عار ہوتا۔ یہ تو میرے لیے....." مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ میں نے بہ مشکل کہا "کون کس کے لیے اتنا سوچتا ہے۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ آپ میرے لیے اس قدر....."

"نہ' نہ خدا کے لیے کسی ممنونیت کا اظہار مت کیجئے۔ یہ میرے لیے کسی صدمے سے کم نہیں ہوگا۔" وہ احتجاجی لہجے میں بولی "کیا میری گزارش کا اتنا ہی خلاصہ ہے۔"

"پھر' پھر میں آپ سے کیا کہوں۔" میں نے گھٹی ہوئی ...از میں کہا۔

"ہوسکے تو مجھے شریک کیجئے' مجھے کچھ بتایئے۔"

"کیا بتاؤں' آپ نے سبھی کچھ تو خود کہہ دیا ہے۔"

"کوئی کھو گیا ہے کیا؟" وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ لمحوں تک مجھ پر کوئی سناٹا ...ری رہا۔ جیسے میرے جسم وجاں میں جان ہی نہ رہی ہو۔ میں ...ت کی طرح اسے گھورتا رہا۔

یکایک اس نے میرے ہاتھ تھام لیے اور اضطراری ...راز میں انہیں دباتے ہوئے بولی "کون تھا ایسا؟ کس نے' ...س کس پہ ستم کیا۔"

میں نے اسے کچھ بتانا چاہا لیکن ایسا لگا جیسے دوسرے ...ے مجھ پر کوئی بجلی گر جائے گی اور معاً میرے جی میں آیا کہ ...ں کشتی سے کود جاؤں۔ میں سمندر کی گہرائیوں میں خود کو ...ق کردوں۔ اس نے میرے ہاتھ زور سے جکڑ رکھے تھے۔ ...ن کی تپش سے میرا سارا جسم ہی پگھلنے لگا تھا۔ میں نے اس ...ے اپنی آنکھیں چھپانی چاہیں' اپنے آپ کو بھی چھپانا چاہا ...لن مجھے اپنا یارا ہی نہیں رہا تھا۔ جانے مجھے کیا ہوا' میری ...نکھوں سے بے تحاشا آنسو بہنے لگے۔

"اوہ' نہیں نہیں۔" وہ ہذیانی انداز میں بولی اور اس ...نے میرے ہاتھ اپنی آنکھوں سے مس کرلیے۔ وہ مضطربانہ ...نہیں چومنے لگی "کچھ مت کہئے' کچھ بھی نہیں۔" وہ بے ...راری سے بولی اور مجھے تسلی وتشفی دینے لگی۔ اس نے رومال سے میرے آنسو خشک کرنے کی کوشش کی لیکن میری آنکھوں سے تو ایک سیل جاری تھا۔ جتنا وہ میری پرسش کرتی' میرا سینہ اور گرجنے اور امڈنے لگتا "ٹھیک ہے پھر.....! جانے کب کا سمندر ہے' مت روکے اسے۔" اس نے تھکتی آواز میں کہا اور میرا سراپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

مجھے چکر سا آنے لگا۔ میں نے اپنے آپ کو مجتمع کرنے کی کوشش کی لیکن میرے پاس تو کچھ بھی نہیں رہا تھا' میرے ہاتھ پیر' میرا جثہ وقامت' سارا بل زور دیکھنے کا تھا' وہ تو کوئی سراب تھا۔ میرے جسم پر تو جابہ جا آبلے پڑے ہوئے تھے۔ نس نس میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ میری حالت اس خاک بسر دشت نورد کی تھی' بے شمار سورج گزرنے کے بعد جیسے کوئی دیوار دکھائی دے اور وہ اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھے۔ چھاؤں میں آکے اس کے دست وبازو اینٹھنے' اکڑنے لگے ہوں' جیسے سارا وجود ریزہ ریزہ ہوجائے۔ رما کے ہاتھوں میں ایسی نرمی اور لپک تھی' ایسی شفقت اور تپاک تھا کہ آدمی کو ڈھیر کردے' آدمی کا دم نکل جائے۔ وہ میرے سارے آنسو' سارا درد جیسے اپنے اندر جذب کرنے کے لیے بے کل تھی۔ میں بچوں کی طرح اس کی بانہوں میں بلکتا رہا۔ مجھے کچھ خبر نہیں کہ اس نے کیا کہا' میں نے کیا سنا اور خود میں کیا ہذیان بکتا رہا' جانے کتنی دیر مجھ پر وحشت کا یہ عالم' یہ خفقان طاری رہا۔ مجھے کچھ نہیں معلوم کہ کب اس نے میرا سر اپنے شانے سے ٹکالیا تھا' تلاطم کے یہ لمحے' یہ سیلاب بلا گزرا تو میں کسی لاچار کے مانند اس کے حصار میں تھا اور جیسے جیسے میری بینائی واپس آتی رہی' میرے رگ وپے میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ وہ مجھے اپنے پروں میں چھپائے ہوئے تھی' ریشم کے پروں میں۔ میں نے نکلنا چاہا تو اس نے اپنی گرفت اور مضبوط کرلی۔ میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی کہ اس شکستہ حالی اور تن دریدگی میں اس کا حلقہ میرے لیے گوشۂ راحت بنا ہوا تھا۔ اس کے لمس' اس کے زیروزبر انفاس میں بہت ٹھنڈک تھی لیکن یہ چند لمحوں کا خواب تھا کہ مجھ پر میرے حواس غالب آگئے۔

میری مضطرب نظریں اس کے چہرے پر منڈلانے لگیں۔ اس کے لبوں کے گوشے پھڑک رہے تھے اور اس کی آنکھیں کچھ زیادہ بڑی' گہری اور چمکیلی لگ رہی تھی۔ ڈوبی ڈوبی آنکھیں' کسی تکدر یا تردد کے بجائے اس کے چہرے پر سکون چھایا ہوا تھا' کھلا کھلا چہرہ مجھے ندامت نے آگھیرا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا تو اس نے میرے ہونٹوں پر انگلیاں رکھ دیں اور سرسراتی آواز میں بولی "میں آپ کی بہترین دوست

ہوں۔"

بے اختیار میرا جی چاہا کہ اسے گلے لگالوں' اسے خوب پیار کروں۔ میرے دل میں اس کے لیے بے پناہ پیار امڈا لیکن میں گم صم بیٹھا رہا۔

"میرے لیے کچھ نیا نہیں تھا" چند لمحوں کے سکوت کے بعد وہ جھلملاتی سی آواز میں بولی "مجھے اس کا اندازہ تھا اسی لیے تو میں آپ سے کہہ رہی تھی مگر آپ رک کیوں گئے؟"

"مجھے جانے کیا؟"

"آپ نے مجھے مان دیا" وہ میری بات کاٹ کے تیزی سے بولی۔

میں نے سر جھکا لیا۔

اس نے میری کمر سے تکیہ ٹکا دیا اور مجھے آرام سے بیٹھ جانے کی ہدایت کی "مجھے کسی رد و قدح کا یارا نہیں تھا۔ وہ دیر تک خاموش رہی پھر پلکیں پٹ پٹاتے ہوئے بولی "کیسے ہیں آپ؟"

"میں' میں ٹھیک ہوں" میں نے خفت سے کہا۔

وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے خوابیدہ لہجے میں بولی "اچھے دوست بھی ہم زاد کی طرح ہوتے ہیں' امانت دار' پاسبان اور۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی پھر چونک کے بولی "سچ بتائیے' کیسا لگ رہا ہے؟"

"بہت' بہت اچھا" میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"پھر اسی طرح رہیے' کوئی مدافعت مت کیجیے۔ جب تک میرے ساتھ ہیں' اپنے آپ کو میری تحویل میں رہنے دیجیے۔" وہ شگفتگی سے بولی "ادھار کی طرح۔"

"میں آپ ہی کے پاس ہوں" میں نے بہ عجلت کہا۔

اس کے بالوں کی گرہ کھل گئی تھی اور ہوا سے بال لہرا رہے تھے۔ وہ سر جھٹک کے انہیں بار بار چہرے سے ہٹاتی تھی۔ پھر اس نے گرہ باندھ لی اور سکون کا سانس لیا "بادل آپ کے برسے ہیں اور جی میرا ہلکان ہوا ہے" وہ لہراتی ہوئی آواز میں بولی۔

کشتی دھیمی رفتار سے چل رہی تھی۔ ہم نہ جانے کتنی دور آگئے تھے۔ تاہم ابھی تک دور ساحل کی روشنیاں ٹمٹماتی نظر آرہی تھیں۔ رما نے مینچوں کے درمیان لٹکی ہوئی کوئی ڈوری کھینچی تھی کہ دوسری طرف سے ایک ملاح نمودار ہوا۔ رما نے اسے کوئی اشارہ کیا تو وہ سر جھکائے لوٹ گیا اور پلک جھپکتے میں غائب ہو گیا۔ رما میرے اور قریب آگئی۔ اس کی مسکراتی نظریں مجھ پر بکھری ہوئی تھیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کے میرے بال درست کرنے چاہے تو میں اچھل سا گیا۔

دوسرے لمحے مجھے اپنے غیر ارادی رویے پر پشیمانی ہوئی۔ رما کو میرے اضطرار کا احساس نہیں ہوا یا اس نے دانستہ درگزر کر دیا۔ وہ میرے الجھے ہوئے بال درست کرتی رہی۔ میری رگوں میں خون جمنے لگا تھا۔ میں دیکھتا رہا' کسی تماشائی کی طرح۔ اس نے میرا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ میرے ہاتھ پاؤں پھر سن ہونے لگے۔ یکبارگی میں نے اٹھنا چاہا لیکن میں نے ارادہ ترک کر دیا۔ وہ میرے بالوں میں آہستہ آہستہ انگلیاں پھیر رہی تھی اور آہستہ آہستہ میرے سارے جسم میں نرم و لطیف لہریں اٹھنے لگی تھیں' یہ سرور آگیں گداز میرے سان و گمان میں بھی نہ تھا۔ وہ سب کچھ میرے لیے بالکل نیا نیا سا تھا۔ جیسے میں بے وزن ہو گیا ہوں' میرا وجود پھیلتا جا رہا ہو اور ہوائیں' مجھے اڑائے لے جا رہی ہوں۔

چند ثانیوں کے لیے جو ایک شور سا میرے سینے میں برپا ہوا تھا اور اس ہاؤ ہو میں میرے اختیار کی ڈوری مجھ سے چھن گئی تھی' میں نے کسی طور اس پر دسترس حاصل کر لی۔ میں نے خود کو ٹہوکے دیے کہ میں تو ایک مہربان شخص کی پناہ میں ہوں۔ آدمی کے لیے آدمی کا اس سے اعلیٰ وظیفہ کیا ہو سکتا ہے۔ اس کا مقصود میری دل بستگی و دلداری ہے اور کیا میں واقعی کسی لطف و انبساط سے ہم کنار نہیں؟ وہ راحت مجھ تک منتقل نہیں ہو رہی جس کے لیے وہ کوشاں ہے؟ تو مجھے کیا عار ہے؟ وہ ایک نرم و نازک لڑکی ہے' ایک حسین' ماہ جبیں لڑکی۔ وہ کسی گوشہ گلستاں سے کم نہیں۔ اس کے قرب کی تو لوگ تمنا کرتے ہوں گے۔ کون سے وسوسے اور اندیشے میرے درپے ہیں؟ مجھے اس لطف و عنایت کا کوئی مول چکانا ہے یا یہ میری عقل و فہم سے بعید کوئی طور ہے؟ یہ کوئی احسان ہے جس کی گراں باری کا اندیشہ مجھے ستائے ہوئے ہے یا یہ سب کچھ کسی ہم درد طبیب کی طرح چارہ گری کا ایک قرینہ ہے' مگر وہ تو ایک آئینہ مثال لڑکی ہے۔ اس کی رفاقت و نفاست میں کوئی کلام نہیں۔ تکلف و تصنع اور چیز ہے جو اس میں دور دور تک بھی نہیں۔ ہوتا تو ڈھکا چھپا نہیں رہتا۔ اس کے اظہار میں بے ساختگی ہے اور سوزش ہے۔ اس کے رخساروں پر تو شفق سی چھا جاتی ہے۔ اور یہ ساری نوازش میری دہائی اور داد خواہی پر کب ہے۔ اسی کے بہ قول میں نے کوئی دست سوال کب دراز کیا ہے۔ وہ خود بھی تو یہی پچھ سے کہہ رہی تھی۔

میں نے اپنا جسم کشتی کے گدے پر بکھیر دیا تھا۔ اس کا دمکتا ہوا چہرہ مجھ پر جھکا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں محبت و مسرت سے لبریز تھیں۔ اس کی نظریں کبھی اتنی تیز ہو جاتیں کہ مجھ سے نگاہ نہیں ملائی جاتی' میں آنکھیں موند لیتا' کبھی وہ خود ہی میری پلکیں بند کر دیتی۔ نشہ کچھ یہی ہوتا ہوگا' نیند کے مانند' نیند آ بھی رہی ہے اور جسم جاگ بھی رہا ہے۔ جسم جاگ بھی رہا ہے اور کوئی بوجھ بھی نہیں۔ بہت دیر بعد اس نے زبان کھولی اور مہکتی آواز میں بولی "وہ کتنا خوش قسمت ہے جس کے لیے کوئی اتنی آگ لیے پھرتا ہے؟"

میرے جی میں آیا کہ کہوں' اور وہ کتنا بد نصیب ہے جو اس کے باوجود نامراد ہو' میں خاموش ہو رہا۔

وہ سرگوشی کے انداز میں بولی "میں نے سب احترام سے دیکھا اور سنا ہے۔"

میں نے کچھ نہیں کہا۔

پھر کہنے لگی "اب کے کسی طرف جانا ہو تو مجھے ساتھ لے چلیں' دونوں مل کے اسے دیکھیں گے۔"

میں گہری سانس بھر کے رہ گیا۔

آسمان پر بدلیاں چھا گئی تھیں اور ہر سو اندھیرا مسلط ہو گیا تھا۔ اندھیرا بھی کبھی کیسا سہانا لگتا ہے۔ جانے کتنی رات ہو گئی تھی۔ مجھے اچانک کیلاش کا خیال آیا' وہ کلب میں ہمیں ڈھونڈ رہا ہوگا' ممکن ہے' گھر لوٹ گیا ہو مگر میں نے رما کو ٹوکا نہیں۔ کشتی ہچکولے کھاتی ہوئی ہولے ہولے چلتی رہی۔

گھنٹی بجنے پر میں چونک پڑا۔ رما نے بھی جھرجھری سی لی۔ میں نے نظریں گھما کے دیکھا تو گھاٹ قریب تھا اور کلب کی روشنیاں سامنے نظر آرہی تھیں۔ ملاحوں نے ہمیں مطلع کرنے کے لیے گھنٹی بجائی۔ رما نے آہستگی سے میرے شانے پر دستک دی۔ میں اس کا مقصد سمجھ گیا تھا لیکن اٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ کچھ دیر میں یہ سارا منظر بکھر جانے کو تھا۔ میں نے چند لمحوں کو بچی کھچی راحت سمیٹنے کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ کشتی کی رفتار اور سست ہو گئی۔ میں اٹھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ رما نے میری پیشانی کو بوسہ دیا اور میری پلکوں کو اور مجھ سے اس وقت تک نہیں اٹھا گیا جب تک کشتی گھاٹ کے زینے سے نہ لگ گئی۔

کلب کے ٹاور میں ڈیڑھ بج رہا تھا۔ کلب ابھی تک جاگ رہا تھا۔ سوئمنگ پول اور اس کے گرد و نواح میں پھیلے ہوئے وسیع سبزہ زاروں کی طرف سناٹا تھا۔ اکا دکا لوگ ہی نظر آئے۔ رما میرے پہلو سے لگی عمارت کی طرف بڑھتی رہی۔ ہماری رفتار نسبتاً تیز تھی۔ درمیان میں ایک بڑا فاصلہ تھا۔

اس نے مضبوطی سے میرا ہاتھ تھام رکھا تھا اور یوں اس کے ساتھ چلتے ہوئے مجھے عجیب سا لگ رہا تھا۔ جیسے میرا قد بڑھ گیا ہے' جیسے میری طاقت دوچند ہو گئی ہے۔ سوئمنگ پول کے قریب ہم نے سبزہ زار کی پگڈنڈی عبور کی تھی کہ نہ جانے کس طرف سے بھاری جسم اور اوسط قد کا ایک ادھیڑ عمر شخص ہمارے سامنے آکے کھڑا ہو گیا۔ وہ سوٹ بوٹ میں ملبوس تھا' چہرے سے امارت ٹپک رہی تھی۔ حلیہ بگڑا ہوا تھا۔ ٹائی کی گرہ کھلی ہوئی' بال بکھرے ہوئے' پٹ پٹاتی پلکوں سے پہلے اس نے رما کو گھورا پھر اس کی نظریں مجھ پر مرکوز ہو گئیں۔ وہ ہمیں پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا اور اچانک اس نے رما کی کلائی پکڑ لی "کدھر پھر رہی ہو تم' اور یہ کون ہے؟" اس نے انگریزی میں کہا۔ اس کی تلخ و ترش آواز جیسے ناک سے نکل رہی تھی۔

مجھے حیرت ہوئی' میں نے پریشان ہو کر رما کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھلی ہوئی تھی "یہ میرے دوست ہیں مسٹر بابر!" رما نے شائستگی سے کہا اور مجھ سے کسی قدر اور قریب ہو کے بولی "ہم سمندر کی طرف نکل گئے تھے۔"

"ہا! سمندر کی طرف" اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ گرجتے دہاڑتے ہوئے بولا "مجھ کو بتائے بغیر!"

"تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں تھی" رما نے شوخی سے کہا "تم ابھی بار میں جا کے ایک پیگ اور پیو' میری طرف سے میرا جام صحت' اتنی دیر میں ان کے ساتھ ہوں۔"

مجھے اندازہ ہوا کہ یہ شخص تو سر بہ سر ڈوبا ہوا ہے' اس سے تو سیدھی طرح کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا' یکایک اس پر وحشت طاری ہوئی' مجھے یہی ڈر تھا' اس نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ میرے جی میں آئی کہ اس کی گردن دبوچ لوں لیکن وہ تو کسی قابل ہی نہیں تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے گریبان سے ہٹانے کے لیے ایک ذرا اس کی کلائی پر پنجہ ڈالا تھا کہ وہ پیر پٹخنے اور فیل مچانے لگا۔ میں نے فوراً چھوڑ دیا۔ اس سے کچھ بعید نہیں تھا' ممکن تھا کہ وہ رما سے بھی دست درازی کرے اور ادھر ادھر سبزہ زاروں میں لوٹتے ہوئے لوگ ہماری طرف متوجہ ہو جائیں۔ اچھا ہوا کہ رما نے اس کی غلط فہمی دور کر دی۔

اسے یقین نہیں آیا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں "پھر وہ کدھر ہے؟ میری بیوی کہاں ہے؟ آپ لوگوں نے اس کو دیکھا ہے؟" وہ احمقوں کی طرح پوچھنے لگا۔

"وہ ادھر پول میں نہا رہی ہے" رما نے اسے بتایا۔ وہ کچھ

سوچے سمجھے بغیر لڑکھڑاتے قدموں سے سوئمنگ پول کی طرف دوڑ پڑا۔ رما بالکل بچی بن گئی' زور زور سے تالی بجانے اور کھل کھلانے لگی۔

"یقیناً وہ بے چارہ چھلانگ لگائے بغیر باز نہیں آئے گا" میں نے کہا۔

"نشہ تو اتر جائے گا۔"

"اور اگر اسے تیرنا نہ آتا ہو تو؟"

"کلب میں تیراکی جاننا پہلی شرط ہے۔"

"مگر وہ اپنے آپے میں کہاں ہے؟"

"زندگی ہاتھ سے جانے لگی تو اچھی طرح ہوش میں آجائے گا" میں سوئمنگ پول کی طرف جاکے اسے دیکھنا چاہتا تھا لیکن رما بے نیازانہ آگے چل پڑی۔ اندر کلب کی عمارت میں لوگوں کی بڑی تعداد موجود تھی' عورتیں اور مرد۔ رما ہال کی طرز کے ایک کمرے میں داخل ہوئی۔ وہاں بہت سرگرمی تھی' اندر روشنی بھی تیز تھی اور رولے کے گرد بھیڑ جمع تھی۔ جوئے کا پہیا گھوم رہا تھا اور لوگوں کی قسمت بھی گھوم رہی تھی۔ ہم پر کسی کی نظر نہیں پڑی کیونکہ سبھی لکشمی کی جستجو میں تھے۔ یہ حقیقت جاننے کے باوجود ہر ایک اس کی آرزو میں تھا کہ لکشمی اپنے سارے آرزو مندوں سے یکساں سلوک نہیں کرتی۔ سگار اور سگریٹوں کے دھوئیں سے کمرے میں کہر سی پھیلی ہوئی تھی۔ رما نے اشارہ کیا کہ مجھے شوق ہو تو میں بھی کچھ داؤ پر لگاؤں۔ میں نے کہا' مجھے جوئے سے کبھی رغبت نہیں رہی۔ میں نے اسے ایک مقولہ سنایا کہ جواری آخر ایک دن خود کو بھی ہار دیتا ہے۔ "وہ کہانی تو پڑھی ہوگی" میں نے کہا "جب ایک شخص کے پاس ہارنے کے لیے کچھ نہ رہا تو اس نے اپنی بیوی کو داؤ پر لگا دیا اور اسے بھی ہار گیا۔"

کہنے لگی "میں نے بھی یہ کہانی پڑھی ہے۔ لیکن کبھی کبھی منہ کا ذائقہ بدلنے میں کوئی حرج نہیں۔"

میں نے کہا "اس کی خواہش ہو تو وہ ضرور کچھ داؤ پر لگائے لیکن رما کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ تو میری خاطر کہہ رہی تھی' کیلاش وہاں نہیں تھا۔ ہم کچھ دیر ٹھہر کے دوسرے دروازے سے نکل گئے۔ رما مجھے ایک اور ہال میں لے آئی۔ یہاں کا منظر ہی اور تھا۔ دھیمے دھیمے سُر ہال میں گونج رہے تھے اور رنگ برنگی' ہلکی ہلکی روشنیوں سے لگتا تھا جیسے قوس قزح کے رنگ گڈمڈ ہوگئے ہوں اور جیسے رنگ بھی وسطی فرش پر ایک دوسرے میں گم جوڑوں کے ساتھ ناچ رہے ہوں۔ اطراف میں لگی ہوئی بیش تر میزیں بھری پڑی تھیں۔ ہم نے کیلاش کو کئی جگہ تلاش کیا' کافی ہاؤس میں' بلیرڈ روم میں' ڈائننگ ہال بند ہوچکا تھا۔ کیلاش ہمیں لابی میں بیٹھا نظر آیا۔ وہ شطرنج کھیل رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کے ایک دم کھڑا ہوگیا او[ر] اس کے چہرے پر کئی رنگ آئے لیکن اس سے پہلے کہ و[ہ] برہمی کا اظہار کرتا' رما نے اسے اور تنگ کیا "آہ کیلی! ہ[م] سمندر میں دور تک نکل گئے تھے۔" وہ دیدے نچاتے ہو[ئے] بولی۔

"معلوم ہے' میں کب کا اسپتال سے آگیا تھا؟" کیلاش نے کاٹ کھانے والے انداز میں کہا۔

"تم نے گھنٹے دو گھنٹے کے لیے کہا تھا" رما سادگی سے بولی۔

"میں ٹھیک گھنٹے بھر بعد آگیا تھا۔"

"مجھے یہی اندیشہ تھا کہ تم جلد واپس نہ آجاؤ۔"

"کیا مطلب؟" کیلاش بدحواسی سے بولا۔

"پھر تم بھی ساتھ چلتے اور لطف آدھا رہ جاتا۔ آد[ھے] میں تم شریک ہوجاتے۔"

کیلاش نے رما پر مکا تان لیا۔ رما جلدی سے میرے پیچ[ھے] ہوگئی "آپ کا خیال ہے ورنہ۔۔۔!" وہ مجھ سے مخاطب ہو[کے] بولی۔ اس کے تیور یہی بتا رہے تھے کہ میری موجودی مانع ہوتی تو وہ رما کی اچھی طرح خبر لیتا مگر یہ میرا گمان تھا۔ دوسر[ے] ہی لمحے وہ مجھے مسکراتا نظر آیا اور مچل کے بولا "دیکھا آ[پ] نے؟"

"دیکھ رہا ہوں۔" میں نے ندامت آمیز شگفتگی سے "واقعی' بہت دیر ہوگئی۔ بس ہم نکل گئے اور وقت کا احسا[س] ہی نہیں ہوا۔"

"جب آپ کہیں نظر نہ آئے تو میں سیدھا گھاٹ پر گ[یا] وہاں مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ ایک دیسی میم صاحب ا[ور] صاحب ابھی ابھی کشتی میں نکلے ہیں۔ میں نے سوچا کہ [انتظار] کروں لیکن پھر میں اس طرف چلا آیا' جب سے اب [تک] مسراجی سے بازیاں جم رہی ہیں اور میں مسلسل ہار رہا ہوں۔"

"لگتا ہے' ابھی ڈاکٹر گیم بھول گیا ہے یا جان بوجھ[کر] ہارتا ہے" کیلاش کے سامنے بیٹھے ہوئے معمر آدمی نے آد[ھی] ہندوستانی' آدھی انگریزی میں کہا "ابھی کیا بات ہے ڈارلنگ! اس کا دل و دماغ اپن کو ٹھکانے پر نہیں لگتا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں" رما نے بے ساختہ کہا "کیا[؟] دماغی حال آج کل ٹھیک نہیں ہے۔ کچھ دنوں کے لیے ا[گر]۔۔۔ اگر۔۔۔!"

مسرا نے قہقہہ لگایا "نہیں نہیں' ابھی اتنا نہیں پر ا[سے] تھوڑا نظر رکھنے کا ہے۔ نوجوان آدمی کھونٹے پہ بھی بد[کتے] ہے۔"

مسرا اٹھ کھڑا ہوا۔ کیلاش نے معذرت کی کہ وہ میرا تعارف کرانا تو بھول ہی گیا۔ اس نے وارفتہ لفظوں میں مسرا کو میرے بارے میں بتایا۔ مسرا نے بھی گرم جوشی کا اظہار کیا اور مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی' کہنے لگا "وہ ہمیشہ نوجوانوں کے ساتھ رہتا ہے۔

رما نے لقمہ دیا "اور نوجوان جب نوجوان نہیں رہتے؟"

"تو دوسرے نوجوان لوگوں کو شکار کرتا ہوں۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی مسراجی! ایک دن آپ ہم سے بھی منہ پھیرلیں گے۔"

مسرا پہلے تو لاجواب سا دکھائی دیا' پھر شانے اچکا کے بولا "یہ تو تم پر ہے ڈارلنگ! ابھی کتنی دیر تم خود کو نوجوان سمجھتی ہو' یاد رکھو۔ جوانی' نوجوانی کا تعلق عمر سے نہیں ہے۔ اپن کی طرح" مجھے یاد آیا' چند دن ہوئے' کسی اور نے بھی کہا تھا کہ عمر کا تعلق تو ارادے سے ہے۔ مسراجی بھی یہی بات کہہ رہا تھا۔ کہنے لگا "ابھی میرے کو دیکھو' اپن تم کو کتنا ہی کھوسٹ دکھائی دے' ایک نمبر نوجوان آدمی ہوں اور تم سے عشق کرنے کو ہر دم تیار ہوں۔"

"واقعی!" رما اچھل پڑی اور کھل کھلا کے بولی "میرے خدا! میری تو آج سے نیند گئی۔"

مسرا ہنستا' قہقہے لگاتا ہوا چلا گیا۔ ہم تینوں نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ جمی ہوئی بازی منتشر کرچکا تھا۔ اسے رقص گاہ جانے کی بھی جلدی تھی حالانکہ رقص کی محفل اب تمام ہوا چاہتی تھی۔ اس کے بہ قول چند منٹ رقص کیے بغیر وہ ٹھیک طرح سو نہیں پاتا۔ مسرا کے جانے کے بعد کیلاش کو جیسے فرصت ملی' وہ مجھے دیکھنے لگا' ہمکتی نگاہوں سے' پھر اس نے میرے بازو پکڑ لیے "آپ نے اچھا کیا" وہ تمتماتی آواز میں بولا "کشتی کی سیر کلب کی سب سے بہترین تفریح ہے۔ کیسے تازہ تازہ لگ رہے ہیں آپ! مجھے تو پہچاننے میں دشواری ہو رہی تھی۔ سچ پوچھئے تو آپ کا چہرہ دیکھ کے ساری کوفت دور ہوگئی۔ اس نے آپ کو زیادہ پریشان تو نہیں کیا؟"

"جی یہ تو نہایت۔۔۔" میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہوں' میں بل کھا کے رہ گیا۔ کیلاش نے مجھے وضاحت بھی نہیں کرنے دی۔ اسے بھوک لگ رہی تھی' بے چینی سے بولا "آپ نے کچھ کھایا پیا بھی؟ یہ رما تو ہوا پہ زندہ ہے۔ یاد نہ دلاؤ تو برسوں تک نہ کھائے۔ مجھے یقین ہے' اس نے آپ

سے پوچھا تک نہیں ہوگا۔ میرا تو برا حال ہے' بتایئے' کیا کھائیں گے آپ؟"

"اب کیا ملے گا یہاں؟" رما چہک کر بولی "اب تو شاید بینگن بھی نہ ملیں' سیدھے گھر کیوں نہ چلیں؟"

"سیدھے گھر کیوں نہ چلیں" کیلاش نے منہ بنا کے کہا "گھر تک پہنچتے پہنچتے تو دیہانت ہوجائے گا" اس نے کسی تاخیر کے بغیر بیرے کو حکم دیا کہ جو کچھ بھی جلد سے جلد لا سکتے ہو' لے آؤ۔"

تھوڑی دیر میں دو بیروں نے پلیٹیں اور ڈشیں میز پر چن دیں۔ زیادہ تر خشک چیزیں تھیں۔ کیلاش سے برداشت نہیں ہورہا تھا۔ میری بھوک بھی کھلی ہوئی تھی۔ تینوں نے سیر ہو کے کھایا۔ کھانا تو خیر جیسا تھا' عمدہ تھا۔ کھانے کے دوران میں ان دونوں کی نوک جھونک کا لطف مستزاد تھا۔

سڑکوں پر خاموشی چھائی ہوئی تھی' گھر پہنچتے پہنچتے تین بج گئے۔ دونوں مصر تھے کہ آج رات میں انہی کے گھر ٹھہر جاؤں' باقی رات باتیں کریں گے۔ صبح سویرے وہ مجھے گھر چھوڑ آئیں گے۔ صبح میں خود بھی جا سکتا تھا لیکن میں جولین کو یا کسی اور کو بتا کے آتا تو ٹھیک تھا۔ میں نے یہی عذر کیا۔

دربان جاگ رہا تھا۔ مجھ سے رخصت ہونے کے لیے دونوں موٹر سے اترے تو مجھے خیال آیا کہ اتنی رات گئے' ویران سڑکوں پر ان کا سفر کرنا مناسب نہ ہوگا۔ بمبئی کا کوئی بھروسا نہیں۔ کوئی ہتھیار وغیرہ بھی ان کے پاس نہیں ہے۔ میں نے جھجکتے ہوئے ان سے کہا کہ وہ بھی تو یہاں ٹھہر سکتے ہیں۔ اب صبح میں وقت ہی کتنا رہ گیا ہے۔ یہ بھی گھر ہے۔ یہاں تک آگئے ہیں تو اب صبح ہی جائیں' ناشتا وغیرہ کرکے۔ کیلاش سے میں نے اپنے کسی دور دراز اندیشے یا احتیاط کی تلقین کا اظہار نہیں کیا تھا مگر وہ سمجھ گیا اور ہنسنے لگا۔ اور اسے شاید اندازہ ہوگیا کہ اس کے اعتماد سے میری تسلی نہیں ہوئی ہے' اس نے کوٹ کے اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کے باہر نکالا تو اس کا ہاتھ خالی نہیں تھا۔ مجھے تعجب ہوا' وہ درمیانے سائز کا ریوالور تھا۔ میں نے کہنا چاہا کہ ہتھیار کے لیے ارادے کی پختگی بھی شرط ہے لیکن میں خاموش رہا۔ یہی بہت تھا کہ کیلاش کے پاس کچھ موجود تو تھا۔

گھنٹی بجانے کے بجائے میں نے عقبی حصے کے ایک کمرے کی کھڑکی پر دستک دی۔ مارٹی کی آنکھ سب سے پہلے کھلی' اس نے دروازہ کھولا۔ میں وہیں مسہری پر دراز ہوگیا۔ رات کا آخری پہر تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی لیکن نیند ہی نہیں آرہی تھی۔ ابھی تک سمندر کا شور کانوں میں گونج رہا تھا اور لگتا تھا جیسے ابھی تک میں ڈوبتی ابھرتی کشتی میں سوار ہوں اور بھینی بھینی سی خوش بو میرے اطراف پھیلی ہوئی ہے۔ بازگشت آواز ہی کی نہیں ہوتی' اور بازگشت بھی ایک حقیقت ہے۔ اور یوں حقیقت بھی ایک سراب ہے اگر آدمی شامل نہیں ہے۔ مجھے نیند نہیں آرہی تھی لیکن بیداری کی کوئی خاص گرانی بھی نہیں تھی۔ شاید کچھ ایسا ہے' رات کتنی ہی سیاہ اور نامہرباں ہو' دن کی نسبت آدمی کو اپنی سی محسوس ہوتی ہے اور دن کتنا ہی شگفتہ اور سایہ دار ہو' آدمی کے لیے پرایا پرایا سا ہوتا ہے۔ دن سبھی کی ملکیت ہوتا ہے' سڑک یا سرکاری باغ کی طرح جن پر سب کا حق ہے اور کسی کا بھی نہیں۔ صبح پرندوں کی چہچہاہٹ پر مجھے گھبراہٹ ہوئی۔ اندھیرا ٹوٹ رہا تھا۔ پھر کسی وقت میری آنکھ لگ گئی۔

کسی نے مجھے نہیں اٹھایا۔ میری آنکھ کھلی تو کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ گیارہ بج چکے تھے۔ منہ ہاتھ دھو کے میں فرخ اور جولین کی طرف جانے کے لیے کمرے سے نکل گیا تھا' راستے میں ایک ملازم مل گیا۔ وہ مجھ ہی کو دیکھنے آرہا تھا کہ میں جاگ گیا ہوں یا ابھی تک سو رہا ہوں۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ چمپا بیگم' جولین کی ماں اور رانی کے سوا گھر میں کوئی نہیں ہے' باقی سب خریداری کے لیے گئی ہوئی ہیں۔ ممکن ہے' بازار سے وہ جولین کے پرانے گھر جائیں یا کہیں اور۔ اب شام تک ہی ان کی واپسی ہوسکے گی۔ یہ سن کے میں نے اس طرف جانے کا ارادہ ملتوی کردیا۔ ملازم کے مطابق جولین میرے لیے ناشتے کا اہتمام کرنے کی تاکید اسے کرگئی تھی۔ اب ناشتے کا وقت کہاں رہ گیا تھا۔ میں نے ملازم سے صرف چائے کے لیے کہا۔ وہ اونچا نہیں سنتا تھا مگر ناشتے کا پورا خوان اٹھا لایا۔ سیب کا مربا' پھل' انڈے' پراٹھے' آلو کی سبزی اور چائے۔ میں نے ہر چیز ذرا ذرا سی ٹونگی' پھر ہاتھ نہیں رکا۔ میں نے تقریباً سارا خوان خالی کردیا۔ شکم سیر ہو۔ مجھے پھر باہر نکلنے کا خیال آیا مگر کس طرف؟ میں سوچتا رہا کہ اب مجھے کس طرف جانا اور کیا کام کرنا ہے۔ میرے پاس کوئی کام ہی نہیں ہے۔ ابا جان اس دن یہی تو کہہ رہے تھے۔ اس دن مجھے ان کی باتیں عجیب سی لگی تھیں۔ مجھے سبکی محسوس ہوئی تھی لیکن انہوں نے وضع کے خلاف کیا کہا تھا۔ یہی ہوتا ہے۔ ہر شخص کوئی نہ کوئی کام کررہا ہے۔ ہر شخص کو کوئی نہ کوئی کام کرنا چاہیے' چاہے اسے کام کی ضرورت نہ ہو۔ لوگ کہتے ہیں کہ سویا مرا برابر ہے اور خالی آدمی سوئے ہوئے آدمی میں کیا فرق ہے؟ لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں گے مگر اس میں میرا کیا قصور ہے؟ مجھے کسی اور طرف نظر کرنے کا وقت ہی کہاں ملا تھا۔ گھر سے نکلنے کے چند ہی دن بعد سزا ہوگئی تھی۔ سات برس کی جیل میں بھی میں نے کتنا وقت گنوایا! زنداں میں رہنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی منجمد ہوگیا۔ زنداں کی نذر ہونے والا' پورا وقت اس کی زندگی سے منہا کردیا جائے مگر میں تو جیل میں دیواریں چاٹنے اور ہاتھ پیر توڑ کے بیٹھنے کے بجائے کچھ کرتا ہی رہا تھا' انٹر بی اے اور ایم اے تو میں نے وہیں سے کیا تھا۔ اس کے بعد مسلسل آج یہاں' کل وہاں لیکن اب کیا ہے؟ اب مجھے کہاں جانا ہے' کون سی سمت کا رخ کرنا ہے۔ دوسروں کی طرح مجھے بھی کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ خود میری عقل کام نہ کرتی ہو تو مجھے کسی سے مشورہ کرنا چاہیے۔ پہلے کی طرح میرے دماغ پر ایسا بوجھ بھی نہیں ہے تاہم اب نہیں تو پھر کسی نہ کسی وقت مجھے کوئی تو فیصلہ کرنا ہی ہے۔ ابا جان نے سب کچھ مجھی پر چھوڑ دیا تھا۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر میں مزید تعلیم حاصل کرنا چاہوں تو ولایت چلا جاؤں ورنہ یہاں بھی ڈاکٹریٹ کرسکتا ہوں۔ یہی کچھ میرا جی بھی کہتا تھا۔ میں نے سوچا بٹھل سے بات کرکے دیکھتا ہوں۔ اسے بھی تو میری فکر ہوگی۔ ممکن ہے' مجھ سے زیادہ ہو۔ کبھی کبھی خود آدمی سے زیادہ دوسروں کو اس کی فکر ہوتی ہے۔

بٹھل کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے جھانک کے دیکھا' اندر بھی کوئی نہیں تھا۔ ابا جان' منیر علی اور مولوی اکرم بھی شاید گھر میں نہیں تھے۔ میں بے ارادہ ادھر ادھر گھومتا ہوا دوبارہ عقبی حصے کی طرف پہنچا۔ شامو' جمرو اور مارٹی وغیرہ مجھے ایک کمرے میں نظر آئے۔ وہاں تو اکھاڑا جما ہوا تھا۔ وسط میں جگنو اور دیوا چاقو لیے شامو کو نشانہ بنائے ہوئے تھے۔ دونوں پسینے پسینے تھے اور طرح طرح سے شامو پر وار کرنے کی کوشش کررہے تھے' شامو ان کے وار بچا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کے ان کے ہاتھ رکنے لگے۔ میں نے انہیں اشارہ کیا کہ وہ اپنا کام جاری رکھیں۔ میں زورا اور مارٹی کے پاس بیٹھا توجہ سے دیکھتا رہا۔ جگنو اور دیوا کے ہاتھ پیر اچھے کھل گئے تھے۔ چاقو پر گرفت مضبوط ہوجائے تو جسم بھی کھلنے لگتا ہے۔ وہ چاقو اچھال کے' چشم زدن میں' جس ہاتھ میں چاہتے' منتقل کرلیتے۔ مقابل پر اپنی مہارت کا سکہ جمانے کے لیے یہ حربے کارگر ہوتے ہیں۔ بٹھل کے بہ قول ہاتھ اور چاقو ایک دوسرے کی آنکھ' ایک دوسرے کی زبان بن جائیں تبھی بات بنتی ہے۔ بٹھل کے گھر میں نہ ہونے کی وجہ سے جگنو اور دیوا بھی خوب فارغ لگ رہے تھے۔ پھر مجھ سے بھی بیٹھا نہ رہا گیا۔ میں بھی ان میں شامل ہوگیا لیکن وہ تھک گئے تھے یا میرے سامنے آنے کی وجہ سے ان کا ارتکاز قائم نہ رہا۔ میں نے جگنو اور دیوا کو بٹھا دیا پھر زورا اور مارٹی سے کہا کہ ان کی جگہ وہ فرش پر آجائیں۔ مارٹی تو ایسے موقع کی تلاش میں رہتا تھا۔ چاقو کھول کے فوراً میرے مقابل آگیا۔ یہ لگن کی بات تھی ورنہ چاقو اب مارٹی کے اشارے پہچاننے لگا تھا۔ مارٹی نے مشق اتنی نہیں کی تھی جتنی توجہ سے وہ دوسروں کو دیکھتا رہا تھا۔ بٹھل یہی کہتا تھا کہ مشق کرنے سے زیادہ دیکھا کرو اور دیکھنے سے زیادہ سوچا کرو۔ ہر کامیاب ہنرمند کی ریاضت ہمہ وقت جاری رہتی ہے۔ عمل ختم ہوجائے تو بھی ذہن مصروف رہتا ہے۔ ذہن میں بساط بچھی رہتی ہے۔ ذہن' پینترے بدلتا رہتا ہے۔ مارٹی میں سنجیدگی بھی بہت آگئی تھی۔ وہ اب عموماً کم بولتا تھا۔ ضروری تو نہیں لیکن میرا قیاس ہے کہ ذلت کے اعتماد اور کم گوئی میں کوئی تعلق ضرور ہونا چاہیے۔

زورا اور مارٹی جانتے تھے کہ وہ مجھ سے کوئی رو رعایت کریں گے تو میں دست بردار ہوجاؤں گا۔ اڈوں باڑوں میں دو طرح کی مشقیں ہوتی ہیں۔ ایک محض سیکھنے سکھانے کے لیے' دوسری دست و بازو کی چستی' حواس اور اعصاب کی یک جائی' چاقو کی روانی و صفائی کے لیے اور نئی سے نئی آزمائش سے دوچار ہونے کے تجربے کے لیے۔ اس دوسری مشق میں بس آخری لمحے ایک دوسرے سے کچھ رعایت کی جاتی ہے ورنہ لحاظ و مروت سے نہ ہاتھ پیر ٹھیک طرح کھل سکتے ہیں' نہ مشق کا کوئی نتیجہ برآمد ہوسکتا ہے۔ بے شک زچ کردینے کے مرحلے پر چاقو پھینک دیے جاتے ہیں یا ہاتھ اٹھا لیے جاتے ہیں لیکن اس سے پہلے کسی کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ زورا اور مارٹی آزمودہ کار تھے۔ زورا بل میں مارٹی سے کچھ بہتر تھا۔ چاقو پر گرفت میں قریب قریب دونوں یکساں تھے۔ انہوں نے متعدد مرتبہ مجھے مشکل میں ڈالا۔ بار بار مجھے زاویے بدلنے پڑے۔ مقابلے پر جب ایک سے زیادہ لوگ ہوں تو ہر ایک کو مختلف تاثر دینے کی کوشش کرنی چاہیے۔ زورا اور مارٹی کو بھی یہ بات اچھی طرح معلوم تھی۔ دونوں نے مجھ پر' میری نقل و حرکت پر نگاہیں جمائے رکھیں۔ دیر تک میں انہیں طرح دیتا رہا۔ وہ بھی مجھے جھکا دینے کی ٹوہ میں رہے۔ بیش تر زور آزمائی ذہنی ہوتی ہے۔ آخر وہ میرے داؤ میں آگئے۔ میں نے تیز رفتاری سے ادھر ادھر گھوم کے پہلے انہیں ایک دوسرے سے خاصی دور کیا اور پیچھے ہٹتے ہٹتے ذرا فاصلے پر آکے میں ایکبارگی بے تحاشا زورا کی طرف جھپٹا۔ یہ

دیکھ کے مارٹی کو مجھ پر وار کرنے کے لیے دیوانہ وار میری طرف بڑھنا چاہیے تھا۔ اس نے یہی کیا لیکن اس سے اندازے کی ذرا سی لغزش ہوگئی۔

مجھے یقین تھا کہ میرے اچانک جھپٹنے پر چاقو سے مسلح ہونے کے اعتماد کے باوجود زورا چند قدم پیچھے ہٹے گا' دائیں بائیں ہوجائے گا اور یوں میرا اس کا فاصلہ چند قدم اور بڑھ جائے گا مگر مجھے اس کی طرف جانا ہی نہیں تھا' درمیان سے پلٹ کے مجھے اپنی طرف بڑھتے ہوئے مارٹی سے بھڑ جانا تھا۔ سب کچھ اسی طرح ہوا۔ زورا اضطراری انداز میں پیچھے ہٹا۔ ادھر سے مارٹی میری طرف لپکا لیکن زورا کی طرف جاتے جاتے ناگہاں میں مارٹی کی جانب پلٹ پڑا۔ مارٹی منتشر ہوگیا۔ اسے فوراً اپنا زاویہ بدلنا چاہیے تھا۔ اس کے پاس پیچھے ہٹنے یا ادھر ادھر ہوجانے کی مہلت زیادہ نہیں تھی' لیکن تھی ضرور۔ حواس اور زور کی یہی تو آزمائش ہوتی ہے۔ دوسرے ہی لمحے میں اس کے اتنے قریب پہنچ گیا کہ وہ کوئی دوسرا فیصلہ نہ کرسکا۔ چاقو اس کے ہاتھ میں تھا۔ ہتھیار بھی کبھی بوجھ بن جاتا ہے۔ میں نے آناً فاناً جھکائی دے کے اس کی کلائی پر ہاتھ ڈال دیا۔ مجھے پوری طاقت سے مارٹی کو ضرب پہنچانی تھی تاکہ چاقو اس کے ہاتھ سے چھوٹ جائے اور وہ اسے چند لمحوں کے لیے اٹھانے کے قابل بھی نہ رہے۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس کے ہاتھ سے گرا ہوا چاقو اٹھانے کا وقت میرے پاس نہیں ہوگا۔ اتنی دیر میں زورا میرے سر پر پہنچ جائے گا۔ زورا نے زیادہ پھرتی دکھائی۔ میں ابھی مارٹی کی کلائی پر پنجہ ڈالنے میں کامیاب ہوا ہی تھا کہ زورا جست لگا کے تیر کی طرح مجھ تک پہنچ گیا۔ نتیجتاً مجھے مارٹی کو آگے کرنا پڑا۔ مجھ سے بھی غلطی ہوئی' زورا سے بھی۔ زورا کسی وحشی کی طرح امڈتا ہوا آیا' بالکل اندھوں کے مانند۔ جیسا کہ اسے توقع تھی' سامنے میں نہیں تھا۔ میں نے مارٹی کو آگے کردیا۔ زورا نے کوشش کی تھی کہ اپنے پیروں میں زنجیر ڈال سکے اور عین موقع پر وہ ترچھا بھی ہوگیا تھا۔ میں نے بھی یہی دیکھ کے مارٹی کو اپنی طرف کھینچا تھا مگر اسی اثنا میں زورا کا کھلا ہوا چاقو مارٹی کی پسلی چیرتا ہوا گزر گیا۔

سب کچھ پلک جھپکتے ہوگیا۔ پہلے مارٹی کا کرتا لال ہوا پھر فرش۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ خون مارٹی کی پسلی سے ابل رہا تھا۔ تسلی دلاسے کا وقت نہیں تھا۔ بائیں طرف سے ہاتھ بھر کے قریب مارٹی کی کھال کھل گئی تھی۔ شامو نے اپنا کرتا اتار کے خون روکنے کی ناکام کوشش کی۔ سبھی کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ لمحوں میں یہ کیا ہوگیا ہے۔ اور اب کیا کرنا چاہیے۔ میں نے چیخ کے شامو سے موٹر لانے کو کہا۔ دونوں موٹریں گھر میں نہیں تھیں۔ ایک جولین لے گئی تھی' دوسری ابا جان کے پاس تھی۔ یہ ایسا زخم تھا جو لیپا پوتی' ٹونے ٹوٹکے سے مندمل نہیں ہوسکتا تھا۔ اس طرح تو کچھ اور خرابی ہوجاتی۔ گھر میں ایک ٹم ٹم بھی تھی۔ اس کی تیاری میں کچھ دیر لگتی۔ چند ثانئے تذبذب میں گزر گئے تاہم پھر میں نے ایک لمحے کی تاخیر نہیں کی۔ یہاں سے دروازے تک اور دروازے کے باہر سڑک تک خونم خون مارٹی پر سبھی کی نگاہیں جاتیں۔ میری ہدایت پر دیوا اندر جا کے جو بھی چادر سامنے پڑی' اٹھا لایا۔ ہم نے نڈھال مارٹی کا جسم چادروں سے ڈھانپ دیا اور میں نے بہ عجلت اسے کندھے پر ڈال کے دروازے کی طرف بھاگنا شروع کردیا۔ کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ جگنو اور دیوا بھاگتے ہوئے آگے چلے گئے۔ زورا اور شامو نے مارٹی کو مجھ سے لینا چاہا لیکن مارٹی ویسے ہی ہلکا پھلکا تھا۔ مجھے اس کے وزن کا کچھ احساس ہی نہ تھا۔ میں تو بس جلد سے جلد باہر نکل جانا چاہتا تھا۔ کئی ملازموں نے ہمیں مارٹی کو اٹھائے بھاگتے ہوئے دیکھا ہو لیکن وہ کیا کرسکتے تھے۔

آگے گلی خالی تھی۔ دور دور تک گھوڑا گاڑی یا موٹر نظر نہیں آرہی تھی۔ بڑی سڑک گلی کے بعد تھی۔ دن کی تیزی کا وقت تھا۔ امید یہی تھی کہ جگنو اور دیوا کو سواری مل جائے گی۔ اگر جگنو اور دیوا کو جلد کوئی سواری نہ ملی تو؟ اس خیال سے میرے پیر لڑکھڑانے لگے۔ میں جیسے تیسے خاص سڑک پر آگیا۔ ہر طرف گھوڑا گاڑیوں' موٹروں اور دیگر سواریوں کا شور گونج رہا تھا۔ قریب سے جگنو اور دیوا مختلف سمتوں میں گھوڑا گاڑیوں کے پیچھے بھاگتے' آوازیں دیتے نظر آئے۔ کوئی بھی نہیں رک رہا تھا۔ ساری گاڑیاں بھری ہوئی تھیں۔ آخر زورا نے ایک ٹم ٹم کے ساتھ ساتھ کچھ دور دوڑ کے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں۔ ساتھ ہی اس نے مجھے اشارہ کیا۔ گاڑی میں ایک عمر رسیدہ پارسی عورت بیٹھی تھی۔ زورا کوچوان اور بوڑھی خاتون سے حجت کر رہا تھا کہ اتنی دیر میں میں پہنچ گیا۔ خاتون نے چیخنا چلانا شروع کردیا تھا مگر شامو نے کچھ کہنے سننے کے بجائے چادر ہٹا کے مارٹی کا حال دکھایا۔ خاتون کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ وہ فوراً گاڑی سے اتر گئی۔ شامو اور زورا نے میری مدد کی۔ ہم نے احتیاط سے مارٹی کو بڑی نشست پر لٹا دیا۔ کیلاش کا اسپتال دور تھا۔ میری نظر چاروں طرف کسی ڈاکٹر کے بورڈ کے لیے منڈلا رہی تھی۔

زورا کو معلوم تھا کہ کچھ فاصلے پر ایک ڈاکٹر کا مطب ہے۔ اس نے پتھروں کی بنی ہوئی ایک سہ منزلہ عمارت کے سامنے ٹم ٹم رکوا دی۔

نچلی منزل پر ڈاکٹر ڈیسائی کا مطب تھا۔ عمارت کا اندرونی حصہ پرانی طرز کے کسی مکان جیسا تھا۔ صحن کے بعد برآمدہ' اس کے بعد بڑا کمرا۔ دونوں طرف گولائی میں دو کمرے اور برآمدے' صحن کے اطراف کئی کمرے۔ ایک کے سوا سارے کمرے بند تھے۔ اندر عمارت میں بھی خوب صفائی ستھرائی تھی۔ ٹائلز کا فرش' دیواروں پر تازہ رنگ روغن' کھڑکیوں کے چمکتے شیشے۔ برآمدے کے کھلے کمرے کے سامنے کرسیوں پر چند مریض دوا کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ ادھیڑ کمپاؤنڈر دوا بنانے میں منہمک تھا کہ زورا کی آواز پر چونک پڑا۔ اس نے مڑ کے ایک نظر زورا کو دیکھا پھر اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ ابھی ٹائم ختم ہوگیا ہے۔ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا "چند منٹ ہوئے ڈاکٹر اوپر اپنے گھر جاچکا ہے۔ اب شام پانچ بجے ملاقات ہوسکتی ہے" زورا کی منت پر نرمی کے بجائے کمپاؤنڈر الٹا ناراض ہونے لگا کہ کیا زورا نے سنا نہیں' اس نے کیا کہا ہے' کیا زورا بہرا ہے۔ وہ آنکھیں نکال کے تلخی سے بولا کہ اس وقت ڈاکٹر کا نیچے آنا ممکن نہیں ہے۔ ڈاکٹر وقت اور ضابطے کے معاملے میں نہایت سخت ہے۔ مقررہ وقت پر چاہے کوئی مریض نہ ہو' وہ مطب آجاتا ہے اور کتنے ہی مریض بیٹھے ہوں' اپنے وقت پر اٹھ جاتا ہے۔ زورا کے ساتھ شامو بھی شامل ہوگیا۔ دونوں نے کمپاؤنڈر کو مارٹی کے حال کی تفصیل بتانی چاہی اور عاجزی کی کہ وہ کسی طرح ڈاکٹر کو اطلاع کردے۔ انہیں یقین ہے' مریض کا حال سن کے ڈاکٹر نیچے آجائے گا۔ بس کچھ دیر کے لیے اسے بلوالیا جائے۔ فیس کی کوئی فکر نہیں ہے۔ دگنی' چوگنی' دس گنی فیس بھی دی جاسکتی ہے۔ فیس کے ذکر سے کمپاؤنڈر بالکل اکھڑ گیا۔ غصے سے بولا "کتنی فیس دے گا ابھی تم؟ تم کوئی ادھر لاٹ صاحب لگا ہے کیا۔ جاؤ کسی اور ڈاکٹر کے پاس جا کے ایسا اونچا بولو۔ یہ ڈاکٹر ڈیسائی کا کلینک ہے۔"

زورا نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔ برآمدے میں شور مچ گیا۔ مریض بھی کمپاؤنڈر کی واویلا میں اس کا ساتھ دینے لگا۔ مگر زورا پر دیوانگی سی طاری تھی۔ ممکن ہے وہ کمپاؤنڈر کو اندر سے گھسیٹ کے برآمدے کے فرش پر پٹخ دیتا لیکن جلد ہی اس کی سمجھ میں آگیا کہ اس طرح وہ اور وقت ضائع کر رہا ہے۔ اس نے کمپاؤنڈر کو چھوڑ دیا اور پلٹ کے سیدھا صحن کے بائیں جانب والے زینے پر چڑھ گیا۔ کمپاؤنڈر بھی کمرے سے نکل کے زورا کے پیچھے پیچھے زینے کی طرف بھاگا۔ شامو نے اس کا راستہ روک لیا اور اس کے مزید فیل مچانے سے پہلے شامو نے اسے جکڑ کر اس کے منہ پر ہتھیلی کس دی۔ کئی مریض کمپاؤنڈر کی مدد کے لیے دوڑے تھے مگر جگنو اور دیوا کی دیوار کے آگے بے بس رہ گئے۔ اوپر جا کے زورا نے جانے کیا کچھ کیا ہو یا یہ نچلی منزل کی چیخ پکار کا اثر ہوگا' دو تین منٹ بعد ہی گنجے سر' سانولی رنگت کا ایک پستہ قامت عمر رسیدہ شخص زورا کے ساتھ بڑبڑاتا ہوا زینے سے برآمد ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک نوجوان لڑکا اور ایک نوجوان لڑکی بھی نیچے آئے۔ تینوں تیزی سے سامنے کے بڑے کمرے میں چلے گئے۔ زورا کی ہدایت پر میں نے مارٹی کو "بستر میز" پر لٹا دیا۔ ڈاکٹر کے تیور ویسے ہی خراب معلوم ہوتے تھے' زخم دیکھ کے اس کی پیشانی پر اور بل پڑ گئے' وہ پوچھنے لگا کہ یہ سب کس طرح ہوا؟ "چاقو لگ گیا صاحب!" زورا نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔

"لڑائی جھگڑا میں؟" ڈاکٹر درشتی سے بولا "ابھی پولیس میں رپورٹ کرایا؟"

"کیا بولتا ہے تم' اپن پہلے پولیس میں جاتا یا ابھی ایدر کو آتا" زورا نے جھلا کے کہا۔

ڈاکٹر نے صاف انکار کردیا کہ جب تک پولیس میں رپورٹ درج نہیں کرائی جاتی' وہ مارٹی کو ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔

"تم' تم کیسا آدمی ہے ڈاکٹر صاحب! تم کو اس کا حال دکھائی نئیں دیتا۔ اندھا ہے کیا تم؟"

ڈاکٹر کا چہرہ بگڑ گیا۔ نوجوان لڑکے اور لڑکی کی آنکھوں میں بھی خون اتر آیا "یہ تو پیشہ ور مجرم معلوم ہوتے ہیں" نوجوان غصے سے انگریزی میں بولا "ہمیں فوراً پولیس کو اطلاع دینی چاہیے۔"

"تم کو بولنے کا نئیں' پولیس کے پاس اپن خود جائے گا۔" زورا نے سینے پر ہاتھ مار کے دہاڑتے ہوئے کہا۔ زورا نے صرف پولیس کے لفظ سے اخذ کرلیا تھا کہ نوجوان نے ڈاکٹر ڈیسائی کو کیا مشورہ دیا ہے۔ میں نے زورا کو روکنا چاہا لیکن اس نے میری نہیں سنی' بھڑکتی آواز میں ڈاکٹر سے بولا کہ وہ کیا سمجھتا ہے' ہم نے جان بوجھ کے مارٹی کو چاقو مارا ہوتا تو اب تک جانے کہاں نکل گئے ہوتے۔ اس نے ڈاکٹر کو باور کرانے کی کوشش کی کہ یہ ایک اتفاقی حادثہ ہے۔

"ہا! اس کو چاقو لگا ہے اور تم بولتا ہے کہ یہ۔۔۔" نوجوان مشتعل لہجے میں بولا۔

"اپن جو بولتا ہے' ایک دم ٹھیک ہے۔ اور ابھی تم ایسا ہی سمجھو۔ اس کو جو کچھ بھی ہوا' اپن نے اس کو مارا یا کسی اور نے۔ اپن تمہارے پاس جس واسطے اس کو بلایا ہے تم وہ کام کرو۔ ہم ایدری بیٹھا ہے۔ بعد کو تم پولیس بلا کے اپن کو پھانسی چڑھا دینا۔ اپن لوگ کا پولیس سے پرانا یاری ہے' سمجھا! تمہاری دیری میں اس کو کچھ ہو گیا تو۔۔۔" زورا نے ڈاکٹر اور نوجوان کو کچھ کہنے نہیں دیا اور جیب سے چاقو نکال کے بولا "تم نئیں دیکھے گا تو ہم ابھی تم کو بھی ایسا بنائے بنا ایدر سے جائے تو اپن باپ کا نئیں' حرامی ہوگا سالا۔"

نوجوان نے شعلہ بار نظروں سے ایک بار ڈاکٹر ڈیسائی کو دیکھا' پھر اپنے ساتھ والی لڑکی کو۔ لڑکی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کے تحمل کی تلقین کی "یہ لوگ تو بالکل دادا گیر ہیں۔" وہ انگریزی میں بولا "یہ کتے ہمیں دھمکی دے رہے ہیں۔"

میں نے دخل دینا چاہا لیکن اسی لمحے ڈاکٹر ڈیسائی نے کمپاؤنڈر کو اشارہ کردیا۔ کمپاؤنڈر نے کسی معمول کے مانند سر کو جنبش دی اور کمرے سے نکل گیا۔ ڈاکٹر ڈیسائی مارٹی پر جھک گیا تھا۔ اس نے ہم سب کو کمرے سے چلے جانے کا حکم دیا۔ زورا وہیں ٹھہرا رہنا چاہتا تھا۔ میں اسے بھی بہ دقت باہر لے آیا۔ ہم سب برآمدے میں رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کمپاؤنڈر اوپر سے ایک اور لڑکی کو بلا لایا تھا۔ اس نے مریضوں سے معذرت کی کہ انہیں کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ دو ایک مرتبہ لڑکی اور کمپاؤنڈر روئی اور دواؤں وغیرہ کی ٹرے اٹھائے لپکتے جھپکتے قدموں سے اندر آتے جاتے دکھائی دیے پھر خاموشی چھا گئی۔ کسی نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔

دیر ہوگئی۔ بار بار ہماری نگاہیں برآمدے کی گھڑی پر جم جاتیں۔ اندر کے کمرے میں جھانکنے کے لیے کوئی جھری اور سوراخ بھی نہیں تھا اور اس سے حاصل بھی کیا تھا۔ ہم سب ہاتھ پاؤں جکڑے بیٹھے رہے' آدھ گھنٹا گزر گیا۔ کوئی پون گھنٹے بعد وہی نوجوان باہر نکلا جو ڈاکٹر ڈیسائی کے ساتھ نیچے آیا تھا۔ کمپاؤنڈر اس کے ساتھ تھا۔ نوجوان ڈاکٹروں والا گاؤن پہنے ہوئے تھا اور ڈاکٹر ہی معلوم ہوتا تھا۔ غصے کے بجائے اس کے چہرے پر فکر و اضطراب کی لکیریں نمایاں تھیں۔ ہم نے جھٹ کے اسے گھیرے میں لے لیا۔ وہ ہمارے ہی پاس آیا تھا' کسی کو اس سے کچھ پوچھنے کا یارا نہیں تھا تاہم شامو نے جرات کی اور ہکلاتی آواز میں مارٹی کا حال پوچھا۔ جواب میں نوجوان آنکھیں میچ کے اور سر ہلا کے رہ گیا۔ اس نے صرف اتنا کہا کہ مریض کو خون کی ضرورت ہے۔ سب نے ایک ساتھ اپنے ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیے۔ خون کا صرف رنگ ایک ہوتا ہے۔ معلوم نہیں' خون کی مختلف قسموں سے آدمی آدمی میں کتنا فرق پڑتا ہے۔ نوجوان نے ہمیں بتایا کہ مارٹی کو خون کے جس گروپ کی ضرور ہے' اس کے مطابق ہم میں سے کسی کا کوئی خون ہو تو ٹھیک ہے ورنہ باہر سے حاصل کرنا پڑے گا۔ یہ بات ہم سبھی کو معلوم تھی لیکن کسی کو اپنے خون کا گروپ معلوم نہیں تھا۔ نوجوان نے کمپاؤنڈر کی مدد سے ہمارے بازوؤں میں سوئیاں گھونپ کے ہمارا خون سرنجوں میں بھرلیا۔ سب اس کے چہرے پر کچھ پڑھنے' اس سے کچھ جاننے کے لیے بے چین تھے۔ تسلی کے صرف دو لفظ۔ نوجوان ڈاکٹر شیشوں میں خون منتقل کرتا اور ہمارے نام لکھتا رہا۔

"اپنا سارا خون لے لو صاحب!" شامو وحشت زدہ لہجے میں بولا "اپنے ماسٹر کو بچالو۔"

ڈاکٹر کو جلدی تھی۔ اس نے کچھ سنا ہی نہیں' تیزی سے اندر چلا گیا۔ زورا نے اپنا سر پکڑ لیا۔ سب دوبارہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میرے جسم میں تو جیسے جان ہی نہیں رہی تھی۔ ایک ایک پل کاٹنا مشکل ہو رہا تھا۔ ان کا بھی یہی حال تھا۔ جگنو اور دیوا کے چہرے تو زرد پڑ گئے تھے۔ کوئی دس منٹ بعد اندرونی کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور دوسرے لمحے ڈاکٹر ڈیسائی کے دکھائی دینے پر سبھی بوکھلا کے اٹھ گئے۔ ڈاکٹر ڈیسائی بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ ہم نے چند قدموں کا فاصلہ تقریباً بھاگ کے طے کیا۔ عرصۂ مرگ کی اذیت یہی کچھ ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر کے سکوت کے چند لمحے ہم پر موت کی طرح گزرے۔ کسی نے کوئی سوال نہیں کیا۔ سب مجرموں کے مانند اس کے سامنے کھڑے رہے۔ ڈاکٹر نے گاؤن اتار کے اپنے ساتھ آنے والی لڑکی کے سپرد کیا۔ اسے ہمارے حال پر ضرور ترس آیا تھا کیونکہ اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ زورا نے اس کے پیر پکڑ لیے "ٹھیک ہے' ابھی ٹھیک ہے بابا!" ڈاکٹر ایک قدم پیچھے ہٹ کے بوجھل آواز میں بولا "ہم لوگ نے اپنا کام کردیا ہے۔ ٹانکا لگا دیا ہے۔"

"ابھی اکھا ٹھیک ہے نا ڈاکٹر صاحب!" زورا کسی بچے کی طرح گھگیا کے بولا۔

"تھوڑا دیری ہو جانے سے سب خراب ہو جانے کا تھا" ڈاکٹر نے تنک کے کہا۔ کسی نے اسے نہیں ٹوکا کیونکہ ہم بھی تو اس سے یہی کہہ رہے تھے "ابھی خون کا اور کڑی دیکھ بھال کی ضرورت ہے" وہ کبیدہ آواز میں کہنے لگا کہ عرصہ ہوا' اس نے کلینک میں مریضوں کے قیام کا سلسلہ بند کردیا ہے۔ دن میں دو بار مختصر وقت میں وہ مریض دیکھتا اور دوائیں تجویز کرویتا ہے۔ بہتر ہوتا کہ مارٹی کو کسی باقاعدہ اسپتال میں منتقل کردیا جاتا لیکن اس کی حالت ایسی نہیں ہے کہ اسے قریب ترین اسپتال میں لے جایا جاسکے۔ کم از کم تین دن تک تو مارٹی پر ہمہ وقت نگاہ رکھنی لازم ہے۔ اس نے کمپاؤنڈر کو حکم دیا کہ کلینک کا کوئی کمرا کھلوا کے اور صفائی کرا کے مارٹی کو عارضی طور پر وہاں منتقل کردیا جائے۔ وہ انگریزی میں کمپاؤنڈر سے مخاطب تھا۔ میں سنتا رہا۔ اس نے کمپاؤنڈر کو گلوکوز کی بوتل لگانے اور مارٹی کی نگرانی کے لیے بملا نامی کسی نرس کو بلوانے کی بھی تاکید کی۔

زورا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ شامو بھی اپنے آپ کو بہت روکے ہوئے تھا۔ وہ بھی سسکنے لگا۔ ڈاکٹر ڈیسائی کے پتھر چہرے پر طمانیت کی ایک جھلک ڈھونڈ کے میرے رگ وپے کی برف بھی پگھلنے لگی۔ اتنی دیر تک میرا دم مسلسل گھٹتا رہا تھا۔ میں نے اپنے ہوش و حواس بہت قائم رکھے تھے۔ اب جیسے سب کچھ میرے اختیار سے باہر ہوا جارہا تھا۔ میں نے ڈاکٹر ڈیسائی سے تشکر کے اظہار کی کوشش کی لیکن مجھے ہر لفظ ادھورا اور بے معنی سا لگا۔ میں بس وحشت زدہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا تاایں کہ وہ آہستہ روی سے زینے کی جانب بڑھ گیا۔ پھر ابھی اس نے چند قدموں کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ ٹھہر گیا اور پلٹ کے بولا "اپنا نام پتا ادھر لکھوا دو' اور جیسا تم لوگ پیچھے بولا تھا' ابھی پولیس کو بھی رپورٹ کردو۔"

"اپن کو یاد ہے صاب!" زورا نے ہاتھ جوڑ کے کہا "آپ کا حکم ہے تو ضرور پولیس میں چلا جائے گا لیکن یہ پولیس کیس نہیں ہے صاب! اپن آپ لوگ سے پہلے بولا تھا' اپن کا پولیس کچہری سے روز کا منہ ماری ہے۔ اپن دادا لوگ ہے صاب' پاڑے کا آدمی ہے۔ روز پاڑے میں کھلا چاقو سے آنکھ مچولی کرتا ہے۔ آج سالا ہاتھ تھوڑا تیزی دکھا گیا' پولیس کا آپ جانتے ہو مائی باپ' اس کو ابھی دن ہو کہ رات' اکھا کالا ہی کالا دکھائی دیتا ہے۔ ایدر سے اپن کا گھر جاستی دور نئیں ہے۔ تھوڑا آپ کو تکلیف ضرور دے گا' اپن کے ساتھ چل کے اپنی آنکھ سے دیکھ لو' آپ نئیں جاسکتا تو اور کسی کو بھیج دو کہ اپن آدمی ہے کہ کتے کا اولاد۔ ابھی ذرا ماسٹر کی آنکھ کھل جائے تو اس سے بھی آپ کچھ پوچھ لینے کا ہے۔ اپن پولیس پاس چلا گیا تو اور کچھ نئیں ہوئے گا' ایسا ٹیم اپن ماسٹر سے دور ہو جائے گا۔ اپن کا ضرورت' آپ سمجھتا ہے کہ ایدر ایک دم نئیں ہے تو اپن ابھی چلا جاتا ہے۔ ماں قسم' ابھی جیسا آپ بولتے ہو۔۔۔ اپن آپ کا غلام ہے۔"

ڈاکٹر ڈیسائی خاموشی سے زورا کا ہذیان سنتا رہا۔ نوجوان اور اس کی ساتھی لڑکی' ڈاکٹر کے پہلو میں کھڑے تھے۔ اس نے ایک نظر ان کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں ساکت کھڑے رہے۔ ڈاکٹر ڈیسائی سر جھکائے زینے کی جانب چل پڑا۔

آدھ گھنٹے کے اندر مارٹی کو ایک کشادہ اور ہوا دار کمرے میں منتقل کردیا گیا۔ کچھ دیر پہلے کا ہنستا کھیلتا مارٹی بے حال' بے حرکت بستر پر پڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ مجھ سے تو اس کی طرف دیکھا بھی نہیں گیا۔ ڈاکٹر ٹھیک کہہ رہا تھا۔ مارٹی کو صرف دواؤں اور دیکھ بھال ہی کی نہیں' دعاؤں کی بھی ضرورت تھی۔ ٹھیک چار بجے بملا نامی نرس آگئی۔ اس نے کمرے میں کسی کو رہنے کی اجازت نہیں دی لیکن زورا ضد کر کے وہیں ٹھہرا رہا۔ میں' شامو' جگنو اور دیوا باہر آ کے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

کلینک کا صدر دروازہ کب کا بند ہو چکا تھا۔ کمپاؤنڈر کچھ دیر کے لیے گیا تھا کہ پھر واپس آگیا۔ اس کے تیور پہلے جیسے نہیں تھے۔ اس نے نرمی سے ہمیں مشورہ دیا کہ ہمارے ٹھہرے رہنے سے کچھ حاصل نہیں مگر وہاں سے اٹھنے کو کسی کا دل نہیں مانتا تھا۔ کمپاؤنڈر نے اصرار نہیں کیا۔ وہ ہمارے پاس ہی بیٹھا رہا۔ اس نے ہمارے لیے چائے منگوائی' چائے کے ساتھ بسکٹ بھی۔ کسی کو بھی بھوک پیاس نہیں لگ رہی تھی۔ شامو نے دبے لہجے میں کمپاؤنڈر کو جتانا چاہا کہ روپے پیسے کی ہمارے پاس کوئی کمی نہیں ہے۔ مزید نرس' دوائیں اور دوسرے کسی بھی خرچ کے لیے ہم تیار ہیں۔ زورا نے چونکہ سب کو پیشہ ور دادا اور اڈوں پاڑوں سے سب کی وابستگی ظاہر کی تھی اس لیے یہ وضاحت اور ضروری تھی۔ کمپاؤنڈر عرصہ دراز سے ڈاکٹر ڈیسائی کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ وہ کہنے لگا کہ اب ڈاکٹر کو روپے پیسے سے ایسی دلچسپی نہیں رہی۔ جب سے اس کی نوجوان بیٹی سمندر میں نہاتے ہوئے ڈوبی ہے' ڈاکٹر بالکل بدل گیا ہے۔ نہ کہیں آتا ہے' نہ جاتا ہے۔ یہ عمارت ہی اس کی دنیا ہے۔ آج سے چند برس پہلے یہ کلینک شہر کا سب سے مہنگا اور اعلیٰ کلینک تھا۔ ڈاکٹر ڈیسائی کا سارے شہر میں طوطی بولتا تھا۔ دور دور سے لوگ اس کے پاس علاج کے لیے آتے تھے' گورے تو خاص طور پر۔ سارے شہر میں مشہور تھا کہ ڈاکٹر ڈیسائی کے ہاتھ میں شفا ہے۔ مزاج کا وہ پہلے ہی تند و ترش تھا' بیٹی کی موت کے بعد اور چڑچڑا ہو گیا' جنونی سا۔ اس نے لوگوں سے ملنا جلنا تقریباً بند کردیا تھا۔ مریض آتے اور مایوس لوٹ جاتے۔ بہرحال چند

برس گزر جانے کے بعد پرانے دوستوں نے اسے کسی طور آمادہ کرلیا کہ دن میں کچھ دیر کے لیے وہ چند ایک مریضوں کی حد تک کلینک کھلا رکھے۔ انہوں نے اس کی بیٹی کا واسطہ دیا جس کے جدا ہوجانے سے ڈاکٹر کا یہ حال ہوگیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ اس طرح اس کی بیٹی کی روح بہت ناخوش رہتی ہوگی۔ وہ ایک قابل ترین ڈاکٹر کی حیثیت سے اپنے باپ پر ناز کرتی تھی اور اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کررہی تھی۔ کمپاؤنڈر نے کہا کہ اب تو ڈاکٹر ڈیسائی بہت سنبھل چکا ہے۔ جیسا کہ میرا اندازہ تھا۔ کمپاؤنڈر نے بتایا کہ جو نوجوان ڈاکٹر ڈیسائی کے ساتھ بھی نظر آیا تھا' وہ اس کا بیٹا شوچندر ڈیسائی ہے۔ اسے گھر میں گیا اور باہر جونیئر ڈیسائی کہتے ہیں۔ کوئی ڈیڑھ برس پہلے شیوا ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم کے بعد ولایت سے واپس آیا ہے اور جو خوش ادا لڑکی اس کے ساتھ نیچے آئی تھی' اور وہ بھی ڈاکٹر ہے۔ شیوا کی بیوی ہے۔ دو مہینے پہلے ان کی شادی ہوئی تھی۔ بیٹے کی ولایت سے واپسی اور گھر میں بہو کی آمد سے ڈاکٹر ڈیسائی اب خاصا پرسکون ہوگیا ہے۔ شیوا اور اس کی بیوی ہی اب کلینک دوبارہ باقاعدگی سے کھولیں گے۔ ابھی تو وہ دونوں ہنی مون منا کے دار جلنگ سے واپس آئے ہیں۔ ہمارے پوچھے بغیر کمپاؤنڈر دیر تک ڈاکٹر ڈیسائی کی باتیں کرتا رہا۔ دل جوئی کے علاوہ ہماری توجہ مبذول کرنا بھی اس کا مقصود ہوگا۔ گو ہماری نگاہیں مسلسل مارٹی کے کمرے کی طرف ٹکی ہوئی تھیں تاہم ڈاکٹر ڈیسائی کے بارے میں اتنا کچھ جان لینا ہمارے لیے بہتر ہی تھا۔ اس دوران میں ڈاکٹر شیوا چند منٹ کے لیے ایک مرتبہ نیچے آکے مارٹی کا معائنہ کرچکا تھا۔

پانچ بجے کے قریب صدر دروازہ کھول دیا گیا۔ مریضوں کی آمد شروع ہوگئی۔ ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ ٹھیک پانچ بجے ڈاکٹر ڈیسائی نیچے آگیا۔ ہمیں وہاں بیٹھا دیکھ کے وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا پھر سیدھا مارٹی کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ ہم بھی اس کے ساتھ اندر جانا چاہتے تھے لیکن کمپاؤنڈر نے روک دیا۔ ڈاکٹر کے باہر آجانے پر ہم اس کے سامنے ہی کھڑے تھے "ابھی تم لوگ ادھر کیوں بیٹھا ہے؟" وہ ترشی سے بولا "اپن لوگ ادھر ہے۔"

"تم' تم کیا کرے گا؟" ڈاکٹر ڈیسائی کی آواز بھرگئی۔

شامو کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ جگنو نے ہمت کی اور لجاجت سے بولا "مائی باپ! ابھی اکھا خیر ہے نا۔"

"اپن پہلے تم کو کیا بولا!" ڈاکٹر نے تلخی سے کہا "اپن نے اپنا کام کردیا ہے' آگے کا سارا ابھی اوپر والے پر ہے۔"

میں بھی ڈاکٹر سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر مجھے خود معلوم نہیں تھا کہ کیا پوچھنا اور کیا جاننا ہے۔ میں سوچتا ہی رہ گیا۔ ڈاکٹر ڈیسائی بڑبڑاتا ہوا اپنے خاص کمرے میں چلا گیا۔ شامو نے پھٹی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ واقعی اتنے لوگوں کا مطب میں مستقل بیٹھے رہنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے جگنو' دیوا اور شامو سے کہا کہ وہ گھر چلے جائیں۔ میں اور زورا یہیں رہیں گے۔ ابھی تو کوئی خاص وقت نہیں گزرا ہے لیکن جتنی دیر ہوگی' گھر میں ہمارے نہ پہنچنے پر سب کی پریشانی بڑھتی جائے گی۔ بٹھل کی آج گھر واپسی کا تو کوئی امکان نہیں تھا۔ صبح بٹھل' جمرو اور ٹنگو گھر میں نہیں تھے۔ میں سمجھا تھا' مارٹی کے سلسلے میں کچہری یا اسپتال گئے ہوں گے' دوپہر تک آجائیں گے لیکن کچھ دیر پہلے شامو نے مجھے بتایا کہ وہ تینوں ماری کے بچوں کی خیر خبر لینے صبح صبح پونا روانہ ہوگئے ہیں۔ شامو کو معلوم نہیں تھا کہ شکلا بھی ان کے ساتھ گیا ہے یا نہیں۔ دو دن سے پہلے بٹھل کی واپسی شاید ممکن نہ ہو لیکن اب شام ہورہی ہے۔ گھر کے دوسرے لوگ اب گھر آچکے ہوں گے۔ ہوسکتا ہے' کسی ملازم نے دوپہر ہمیں مارٹی کو کندھے پر اٹھائے بھاگتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔ کسی نے ابا جان کو کچھ الٹ سلٹ بتادیا تو وہ اور منتشر ہوجائیں گے۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ گھر میں کسی کو کچھ نہ بتایا جائے' مارٹی کے اچانک غائب ہوجانے کے سو بہانے تراشے جاسکتے ہیں لیکن پھر مارٹی کی حالت دیکھ کے میں نے ارادہ بدل دیا۔ اب شاید گھر کے کسی فرد سے ہمارے اور پاڑے کا تعلق ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ یہی ٹھیک تھا کہ کسی سے کچھ نہ چھپایا جائے' سب سے صاف کہہ دیا جائے کہ ہم تو محض مشق کررہے تھے۔ پاڑے کے لوگوں کا یہی معمول ہے۔ چاقو ان کا پیشہ ہے' شوق بھی ہے اور کھیل بھی۔ اور کھیل میں یہی کچھ ہوتا ہے' کبھی جیت کبھی ہار۔ کھلاڑی کو چوٹ بھی لگ سکتی ہے۔ زورا کا ہاتھ ذرا سا چوک جاتا' ترچھا ہونے کے بجائے چاقو سیدھا رہتا تو مارٹی کا اتنا آسرا بھی نہ ہوتا۔ یہ سب جان کے ہر ایک کو دکھ ہوگا لیکن ہمارے مسلسل جھوٹ کی اذیت اس سے سوا ہوگی۔ سو جھوٹ سے ایک سچ کا زہر یقیناً کم ہونا چاہیے۔

شامو' جگنو اور دیوا سر جھکائے کھڑے رہے۔ کوئی بھی جانا نہیں چاہتا تھا "تھوڑی دیر بعد پھر آجانا۔" میں نے بوجھل آواز میں کہا "یہاں سے گھر اتنی دور نہیں ہے۔ پیدل کا راستہ ہے۔"

"اپنے کو ادھری رہنے دے لاڈلے!" شامو ویرانی سے بولا "ویسے بھی گھر جاکے سب کو کیا بولیں گے؟"

میرا سر چکرا رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے بھی وہاں سے ہٹنے کو جی نہیں کرتا تھا لیکن اصرار کا کیا محل تھا۔ میں رہوں یا شامو' بات ایک ہی تھی اور گھر جاکے سب کچھ سنانے کا عذاب شامو ہی کیوں بھگتے۔ میں نے جگنو اور دیوا کو اشارہ کیا۔ کلینک کا دروازہ عبور کرتے ہوئے میرے قدم پھر اٹکنے لگے۔ پلٹ کے میں نے مارٹی کے کمرے میں جاکے ایک نظر اسے دیکھا۔ وہ ویسا ہی بے حس و حرکت پڑا تھا۔ ایک کونے میں ٹکٹکی باندھے زورا دبکا بیٹھا تھا۔ جگنو اور دیوا کو ساتھ لے کے میں کلینک سے نکل آیا۔ مارٹی کے خون نے کئی جگہ سے میری قمیص لال کردی تھی۔ جگنو نے میرے جسم پر چادر لپیٹ دی۔ سورج غروب ہوچکا تھا مگر سڑک پر جیسے دن نکلا ہوا تھا' فٹ پاتھ پر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہم تینوں جلد ہی گھر پہنچ گئے۔ گھر کی ساری روشنیاں جل چکی تھیں۔ میں پچھلے حصے کی طرف چلا آیا۔ اچھا تھا کہ کوئی مجھے اس حال میں نہ دیکھ پائے اور اپنا حلیہ کچھ درست کرکے ہی میں ان کے سامنے آؤں۔ جگنو نے سامنے سے جاکے اپنے کمرے کا عقبی حصے کی طرف کھلنے والا دروازہ میرے لیے کھول دیا۔ وہی جولین سے میرے لیے کپڑے لایا۔ جسم بھگونے کی حد تک میں نے غسل کیا اور نئے کپڑے پہن کر باہر آگیا۔ جگنو نے مجھے بتایا کہ بھی لوگ گھر میں موجود ہیں۔ کچھ دیر ہوئی' ابا جان' منیر علی در مولوی اکرم بھی واپس آچکے ہیں اور بے چینی سے ہمارے منتظر ہیں۔ وہی ہوا جس کا مجھے خدشہ تھا۔ دوپہر کسی ملازم نے ہمیں افراتفری کی حالت میں گھر سے نکلتے دیکھ لیا تھا۔ جگنو کہہ رہا تھا کہ جولین بہت سراسیمہ تھی اور اس سے طرح طرح کے سوال کررہی تھی۔ جگنو اسے کیا بتاتا' پہلے وہ دائیں بائیں شائیں کرتا رہا پھر کوئی جواب بن نہ پڑا تو اس نے سب کچھ مجھ پر ڈال دیا کہ میں بس اندر آیا ہی چاہتا ہوں۔ مناسب ہوگا' جولین مجھ ہی سے کچھ پوچھے۔ جگنو' جولین کو اور پریشان کر آیا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق جولین کو اصل بات کا علم نہیں تھا ورنہ وہ مارٹی کا نام ضرور لیتی۔ اس سے پہلے کہ کوئی مجھے پوچھتا ہوا آجاتا' میں کمرے سے نکل گیا۔ ابا جان اور منیر علی ملاقاتی کمرے میں موجود تھے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے "کیا ہوا؟" انہوں نے میرے سلام کا جواب دینے اور میرے بیٹھنے کا بھی انتظار نہیں کیا "باقی لوگ کہاں ہیں؟" وہ منڈلاتی آواز میں بولے۔

میں نے اپنے حواس بجا رکھنے کے لیے چند لمحے توقف کیا۔ "مارٹی زخمی ہوگیا تھا' اسے اسپتال پہنچادیا ہے" میں نے بظاہر تحمل کی کوشش کی۔

"کیسے! کیا ہوا اسے؟" ابا جان بے قراری سے بولے۔

"اسے چاقو لگ گیا تھا" میں نے آہستگی سے کہا۔

"چاقو لگ گیا تھا؟" ان کی آواز حلق میں پھنس گئی۔

"ہاں' بس یوں ہی' کسی کے سان و گمان میں نہ تھا کہ ایسا ہوجائے گا۔ مارٹی ہی سے کچھ چوک ہوئی' اندازے کی غلطی..."

ابا جان گنگ رہ گئے۔ ہرچند ان ثانیوں کا جبر میرے لیے کسی بڑی سزا سے کم نہیں تھا۔ جیسا کہ مجھے اندازہ تھا' ابا جان کے مزید سوالات سے بچنے کے لیے مجھے اس کے سوا کوئی صورت نظر نہ آئی کہ میں ازخود سب کچھ بے کم و کاست بیان کردوں۔ میں نے ان سے صاف کہہ دیا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہم ایسی مشقیں کرتے رہے ہیں۔ یہ سن کے ابا جان کو تفصیل سے اجتناب کرنا چاہیے تھا لہٰذا انہوں نے پھر ایک لفظ نہیں کہا۔ منیر علی بھی گم صم بیٹھے رہے' میں بھی چپ رہا۔

"اب' اب کیسا ہے وہ؟" خاصی دیر بعد ابا جان ہڑبڑاتے ہوئے بولے۔

"ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ڈاکٹر ڈیسائی ایک تجربہ کار ڈاکٹر ہے۔ ہم یہی کرسکتے تھے کہ مارٹی کو جلد سے جلد اسپتال پہنچادیں۔ گھر میں موٹر نہیں تھی لیکن شاید کوئی ایسی دیر بھی نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اب صرف دعا کی ضرورت ہے۔"

"میرے خدا!" ابا جان صوفے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ "بدنصیب لڑکا' وہ کیسا سعادت مند' سادہ طبیعت بچہ ہے۔" ابا جان کی آواز نہیں نکل رہی تھی "مجھے ابھی اسپتال لے چلو۔" انہوں نے اضطراب سے کہا۔

"ابھی وہ ہوش میں نہیں ہے۔ شامو اور زورا اس کے پاس ہیں۔ آپ ضرور چلیے لیکن ابھی آپ کے جانے سے کچھ حاصل نہیں ہے۔ اسے ذرا ہوش آجائے تو سرہانے آپ کی موجودگی یقیناً اس کے لیے تسلی و تشفی کا باعث ہوگی۔"

"ڈاکٹر نے کچھ اور نہیں بتایا؟" منیر علی نے دھڑکتی آواز میں پوچھا۔

میرے ہونٹ پھڑپھڑا کے رہ گئے۔

"آہ' خدا خیر کرے" ابا جان آہیں بھرنے لگے "خدا اس پر رحم کرے۔ اسے سلامت رکھے' اس نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے؟"

"پروردگار نے چاہا تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔ وہ بڑا کارساز ہے۔ اس سے خیر کی طلب کرنی چاہیے" منیر علی کی

آواز کپکپا رہی تھی "مگر یہ تو۔۔ یہ تو۔۔" وہ جھجکتے ہوئے بولے "یہ تو پولیس کا بھی۔۔"

"ڈاکٹر نے اسی لیے انکار کردیا تھا۔ ہم نے کسی طور اسے راضی کرلیا۔ پولیس تو بعد کی بات ہے" میں نے بمشکل کہا "مارٹی اچھا ہوجائے' پولیس سے بھی نمٹ لیا جائے گا۔"

ابا جان نے اپنا چہرہ چھپالیا۔

"میرا خیال ہے' ہمیں ابھی اسپتال چلنا چاہیے" منیر علی نے ابا جان کی طرف دیکھتے ہوئے تذبذب سے کہا۔

"ہاں ہاں' چلنا چاہیے' ضرور ضرور" ابا جان پر ہیجان سا طاری تھا۔

"بٹھل بھی نہیں ہیں اس وقت" منیر علی نے وحشت سے کہا "خدا جانے کیا ہورہا ہے یہ سب۔ ہم سے کون سی لغزش ہوگئی ہے۔"

"تم نے ڈاکٹر سے کہا کہ وہ روپے پیسے کی کوئی پروا نہ کرے جتنا بھی چاہے' جتنا بھی۔۔" ابا جان کو فوراً احساس ہوگیا کہ یہ دعویٰ تو ہم نے بھی طمطراق سے کیا ہوگا "میرا مطلب ہے" انہوں نے ہچکچاتے ہوئے صراحت کی "ہمیں کسی اور بڑے ڈاکٹر کو بھی تلاش کرنا چاہیے۔ تم نے کیلاش سے مشورہ کیا؟"

"اس کا وقت ہی کہاں ملا" میں نے ناتوانی سے کہا۔ یوں بھی نوجوان ڈاکٹر کیلاش کی دخل اندازی آزمودہ کار ڈاکٹر ڈیسائی کو گراں گزر سکتی تھی" میں نے ابا جان سے نہیں کہا کہ مجھے کئی بار کیلاش کا خیال آیا تھا۔ میں اگر خود نہیں جاسکتا تھا تو پھر اسے کلینک بلا سکتا تھا' پہلے نہیں تو بعد میں لیکن کوئی ایک بات نہیں تھی جس نے مجھے روکے رکھا۔ مجھے وضاحتیں کرنے کا یارا نہیں تھا۔ جس طرح ابا جان نے سب کچھ اخذ کرلیا ہے' ضروری نہیں تھا کہ کیلاش بھی اسی صبروضبط کا متحمل ہوتا۔ بہت کچھ سامنے ہونے کے باوجود کوئی ایک گوشہ تو ابھی باقی ہے یا محفوظ ہے۔ یہ پردہ ابا جان کو مجھ سے زیادہ عزیز ہوگا۔ ڈاکٹر ڈیسائی کے آمادہ ہوجانے کے بعد کیلاش کی اتنی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ہوتی تو کوئی اندیشہ زیاں مارٹی' ایک آدمی کے زیاں سے بڑا نہیں تھا' بڑا نہیں ہے۔

منیر علی نے کچھ دیر کے لیے ابا جان سے اجازت چاہی۔ وہ نفلیں پڑھنے اور منت مانگنے گئے ہوں گے۔ ان کے جانے کے بعد میں اور ابا جان خاموش بیٹھے رہے' پھر معاً ابا جان بھی مجھ سے کچھ کہے بغیر اٹھ کے چلے گئے' میں کمرے میں تنہا رہ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اندر جولین اور وہ سب شدت سے میری منتظر ہوں گی۔ اندر جاکے ان کا سامنا کرنے کے تصور ہی سے میری رگیں کھنچی جاتی تھیں۔ ابا جان کی بات اور تھی۔ جولین' فرخ' فریال وغیرہ کے سامنے مجھے ان کی استطاعت کے مطابق ہی زبان کھولنی تھی۔ جولین کمرے کے اردگرد ہی کہیں منڈلا رہی تھی۔ ابا جان کو گئے چند ثانئے گزارے ہوں گے کہ جانے کس طرف سے اچانک وہ میرے سامنے آکے کھڑی ہوگئی۔ فرخ' فریال کی طرح وہ چوڑی دار پاجامے' کرتے اور دوپٹے میں ملبوس تھی اور بہت نکھری نکھری' اجلی اجلی لگ رہی تھی۔ اسے دیکھ کے ایک لمحے کے لیے جیسے سب کچھ مجھ سے اوجھل ہوگیا' جیسے اندھیرے میں روشنی کی ایک لہر سی گزر جائے مگر وہ بس ایک جھماکے کی چاندنی اور ایک جھونکے کی تازہ ہوا تھی کہ میرے وجود پر پھر اندھیرا چھانے لگا۔ جولین کی آنکھوں میں تابندگی اور چہرے پر شگفتگی تھی۔ میں نے جان لیا کہ یوں وہ مجھے اپنی استقامت کا ثبوت دینا چاہتی ہے اور یہ ارادی خوش گواری میری دل داری' میرے حوصلے کی استواری کے لیے ہے۔ کسی ہم دم و ہم نفس کا یہی شیوہ ہوتا ہے مگر وہ تادیر خود سے مدافعت نہ کرسکی۔ آخر اس کے چہرے پر اس کے اندر کا تلاطم غالب آگیا۔ "کیا بات ہے؟" وہ امڈتی آواز میں بولی۔

"کیا بتاؤں؟" میں نے تقریباً کراہتے ہوئے کہا۔

اس نے کسی قدر تامل کیا اور زیرلبی سے بولی "میں کسی کام نہیں آسکتی۔"

"سردست تو نہیں" میں نے شکستہ لہجے میں کہا اور مختصراً اسے مارٹی کا حال بتایا۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میں نے اس سے گزارش کی کہ وہ مجھ سے اس وقت جزئیات نہ پوچھے۔

اس نے ضد نہیں کی اور کہنے لگی "کیا میں کلینک جاسکتی ہوں؟"

"جاسکتی ہو' مگر کیا کروگی جاکے' اسے تو اپنی کوئی سدھ بدھ ہی نہیں ہے۔"

"اسے میرا بڑا لحاظ ہے" وہ دبی زبان سے بولی "شاید میری موجودگی سے وہ۔۔۔" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

میری نگاہیں یک بارگی اس کے چہرے پر گئیں اور مجھے یاد آیا کہ مارٹی سے میری پہلی مڈبھیڑ جولین ہی کے واسطے سے ہوئی تھی۔ جب وہ کرشنا جی کے گھر مجھے انگریزی پڑھانے آئی تھی اور ایک روز میں اسے اس کے گھر پہنچانے گیا تھا تو گلی میں ماسٹر مارٹی مجھ سے بھڑ گیا تھا۔ جولین کو میرے ساتھ دیکھ کے مارٹی کو بہت طیش آیا تھا۔ وہ گلی کا شہدا تھا' چاقو نکال کے میرے راستے کا پتھر بن گیا' مارٹی کو اس روز بہت ندامت

اٹھانی پڑی۔ پھر اس نے وہ گلی ہی چھوڑ دی۔ وہ دوبارہ اپنے علاقے میں سر اٹھا کے کس طرح جاتا جہاں ایک ہجوم کے سامنے اس کا چاقو گرالیا گیا تھا اور اس نے ضربیں الگ کھائی تھیں' مارٹی پھر میری تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا اور ایک روز میں اسے نظر آگیا۔

اس کے بعد مارٹی گویا دوبارہ پیدا ہوا۔ تمام شہدا پن' اٹھائی گیری چھوڑ کے وہ باقاعدہ دادا بن گیا۔ ایک بار میں نے بالم خاں کے اڈے پر قبضہ کرکے مارٹی کو نگراں بنادیا تھا مگر اسے اڈوں پاڑوں سے طبعاً کوئی مناسبت نہ تھی۔ وہ ان بے شمار تیرہ نصیبوں میں سے تھا جن سے ان کا سایہ' ان کا کنارہ ابتدا ہی میں کہیں کھوجاتا ہے۔ اور کوئی دیوانہ ہوجاتا ہے' کوئی وحشی' جنگلی۔ کوئی اپنے آپ کو ترک کرکے کشکول اٹھالیتا ہے اور کسی کو ایک عرصہ انتظار کی دہشت راستے ہی میں تمام کردیتی ہے۔ مارٹی کو اس کا کچھ کھویا ہوا واپس مل گیا تھا اسی لیے اس نے سر اٹھا کر پھر کسی اور طرف نہیں دیکھا۔ وہ جولین کا کوئی ایسا خطا کار نہیں تھا لیکن اس کے اندر کا شیشہ بہت ثابت و سالم تھا۔ وہ تو جیسے جولین کو عزت و مرتبت دے کے مسلسل کوئی تلافی کررہا تھا۔ جب میں بمبئی میں نہیں تھا اور جولین اپنی ماں اور چمپا بیگم کے ساتھ کرشنا جی کے دیے ہوئے موجودہ مکان میں رہتی تھی تو گھر کی نگرانی اور خدمت گزاری کے لیے صبح و شام حاضری مارٹی کا معمول تھا۔ میں نے کبھی اس جانب ایسی توجہ ہی نہیں کی کہ مارٹی اور جولین میں ایک نسبت تو بہرحال رہی ہے۔ مارٹی نے بھی کسی وقت مجھے اس کا گمان نہیں ہونے دیا۔ جولین کو ضرور کچھ اندازہ تھا جبھی وہ کلینک جانے کو کہہ رہی تھی۔

یہ سن کر مجھ پر حیرت سی طاری رہی اور میں نے خود کو ملامت کی کہ کبھی مارٹی کو سینے سے لگا کے میں نے اس کا سمندر جھانکنے کی کوشش کیوں نہیں کی مگر یہ میری کوئی کوتاہی نہیں تھی۔ کچھ جان کے بھی میں کیا کرلیتا۔ یہ سفارش و گزارش کا معاملہ نہیں ہے۔ یہ تو جولین پر تھا کہ وہ کیلاش کے لیے کتنے دریا اور مارٹی کے لیے کتنے صحراؤں کا فاصلہ مقرر کرتی ہے اور کسی اور کے لیے کیا۔۔۔! آدمی منزل کی طرح نہیں ہوتے کہ ایک متعین فاصلے پر ممکن ہوجاتی ہے اور یہ تو کسی کی طلب و جستجو پر منحصر ہے کہ کسی منزل مراد کے لیے وہ کتنا سفر طے کرنے کے حوصلہ رکھتا ہے اور اس میں منزلیں قریب کرنے کی قوت و قدرت کتنی ہے۔ مجھے کچھ نہیں معلوم تھا کہ جولین نے مارٹی کے لیے کوئی منصب تجویز کیا ہے یا نہیں۔ البتہ مارٹی کے روز و شب سے بظاہر یہی نظر آتا تھا کہ

اس نے ایک بے ہنرو بے مایہ' ایک شکستہ شخص کی طرح خود کو اپنی لکیروں اور گردشوں کے سپرد کردیا ہے۔ اسے اچھی طرح احساس ہوگا کہ اپنی منزل تک اس کی رسائی کتنی مسافت پر ہے اور خود اس کی قامت اور دسترس کیا ہے۔ یہ پسپائی ایک طرح کی عاجزی بھی ہے' ہوش مندی بھی۔ تاہم نسبت کی بات اپنی جگہ ہے۔ مارٹی کی حالت میں نے جولین کو بتادی تھی۔ وہ ایک ذہین اور ایثار پیشہ لڑکی تھی۔ مارٹی کی رگوں میں جمی ہوئی برف پگھلانے کے لیے بے شک یہ حربہ کارگر ثابت ہوسکتا ہے اگر واقعی یہی کچھ ناگفتنی ہے تو اس موقع پر اس حرماں نصیب کے لیے جولین کی معیت' جولین کا قرب' کسی کرشمے کے مانند ہوگا۔ ڈاکٹر ڈیسائی کی مسیحائی پر مستزاد۔ کہتے ہیں' مریض کے خواب دیکھنے کا عمل جاری رہنا چاہیے۔

جولین میرے سامنے بیٹھی تھی اور میرا ذہن طرح طرح سے کسی کنایہ و رمز کی تشریح و تعبیر میں الجھا ہوا تھا۔ میں نے خود کو ٹوکا' مجھے باور کرنا چاہیے کہ کوئی بھی نسبت صرف مارٹی کی طرف سے تھی۔ جولین کو اس سے مطلق سروکار نہیں تھا اور ممکن ہے' اتنا کچھ بھی نہ ہو جتنا میں آڑی ترچھی لکیریں کھینچ کے کوئی شکل وضع کرنے کے لیے سر کھپا رہا ہوں۔ ہوسکتا ہے' جولین کی تشویش' گھر کے ایک فرد مارٹی کے لیے محض وضع و مروت اور نفسی شرافت پر مبنی ہو۔ جولین نے لحاظ کی بات کہی تھی۔ ضروری نہیں کہ لحاظ سے مراد نسبت ہی ہو۔ مارٹی تو سبھی کا لحاظ کرتا ہے۔ فرخ' فریال' گیتا' ابا جان وغیرہ میں سے کوئی بھی اس کے سامنے آجائے' اس کا بس نہیں چلتا کہ وہ کسی طرح کوئی خدمت بجالائے۔ اور جولین نے سوچا ہوگا اگر ایسی کوئی بات ہے تو مارٹی کے نہاں خانے میں سوئی ہوئی راکھ جگانے کی تدبیر سے مثبت نتیجہ ضرور حاصل ہوجائے گا مگر پھر جولین کا کیا طور رہے گا؟ دریچہ کھلا رہے گا کیا؟ بصورت دیگر مارٹی تو بہت عاجز ہوجائے گا۔ آدمی پتھر نہیں ہوتے کہ بار بار موسم کی نیرنگی کا ستم سہتے رہیں' آدمی تو ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔ اچھا ہوا جو مجھے کچھ اور سوچنے' الجھنے اور اپنی اس بے محل خیال کاری پر پراگندہ ذہنی سے نجات مل گئی۔ ابا جان اور منیر علی تیار ہوکے کمرے میں آگئے۔ میں نے گہری سانس بھر کے جولین سے کہا "دیکھو' پھر وہاں جاتے ہیں' شاید کوئی اچھی خبر لے کے آئیں" وہ شامو اور زورا کے لیے کھانا بھیجنے کو پوچھنے لگی۔ میرے ہونٹوں پر پھیکی پھیکی مسکراہٹ پھیل گئی "کیا کھانا پینا! دوپہر بھی کسی نے کچھ نہیں کھایا تھا' ایسے میں کسی کو کیا بھوک پیاس۔۔۔"

میں نے جولین سے کہا "کلینک اتنا دور نہیں ہے۔ شامو زورا چاہیں تو کسی وقت گھر آسکتے ہیں۔ ان کی جگہ میں رہ جاؤں گا۔"

باہر موٹر تیار کھڑی تھی۔ اکبر نے ہمارے ساتھ چلنے کے لیے اصرار کیا۔ مگر ابا جان نے منع کردیا۔ جس وقت دروازے سے نکل رہے تھے' مہر بہ لب وہ سبھی وہاں کھڑی تھیں۔ چمپا بیگم' گیتا کی ماں رانی' فرخ' فارہہ وغیرہ۔ ابا جان نے اندر جا کے انہیں سارا کچھ بتادیا ہوگا۔ منیر علی نے انہیں تسلی دی اور دعا کی تلقین کی' کہنے لگے "کون جانے بارگاہ خداوندی میں کس کی آواز رسا ہوجائے۔"

رات اتنی گہری نہیں ہوئی تھی۔ موٹر نے چند منٹوں میں کلینک کا فاصلہ طے کرلیا۔ بڑا دروازہ بند ہوچکا تھا اور گیٹ پر چوکی دار پہرا دے رہا تھا۔ وہ ہمارے راستے میں مزاحم ہونے کے لیے بڑھا تھا لیکن نہ جانے کیا سوچ کے پیچھے ہٹ گیا۔ ہم موٹر سے اترے تھے۔ ابا جان اور منیر علی مکلف شیروانی پہنے ہوئے تھے' تیور بھی مکلف تھے۔ ابا جان نے تو جیسے دیکھا ہی نہ تھا یا جیسے دروازے پر اس کا وجود ہی نہ تھا۔ قدم رکھتے ہوئے میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ مجھے شامو بھی کہیں نظر نہیں آیا۔ ہم سیدھے مارٹی کے کمرے کی طرف گئے۔ زورا اور شامو کو وہاں دیکھ کے میری جان میں جان آئی۔ نرس بملا بھی کمرے میں موجود تھی۔ مارٹی اسی طرح اکڑا پڑا تھا۔ ابا جان دم بخود سے ہوگئے۔ منیر علی کا بھی یہی حال تھا لیکن انہوں نے کچھ پڑھ کے مارٹی کے اوپر پھونکا۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے اور بال درست کرتے رہے۔ پھر انہوں نے اس کی پیشانی کا بوسہ لیا اور اضطراری انداز میں ابا جان کی طرف دیکھنے لگے۔

میرا خیال تھا ابا جان بملا سے مارٹی کا حال دریافت کریں گے۔ مجھے حیرت ہوئی جب انہوں نے سسٹر کے لقب سے بملا کو مخاطب کرکے ڈاکٹر ڈیسائی کے بارے میں پوچھا۔ بملا بے نیازانہ مارٹی کے دائیں جانب اسٹینڈ سے لٹکی ہوئی خون کی بوتل ٹھیک کررہی تھی' وہ سنبھل گئی اور اس نے کسی قدر متردد لہجے میں بتایا کہ ڈاکٹر ڈیسائی اور ڈاکٹر شیوا ابھی مارٹی کا معائنہ کرکے اوپر گئے ہیں۔ ابا جان کے مطالبے پر کہ وہ ڈاکٹر سے ملنا چاہتے ہیں' بملا نے صاف انکار کردیا کہ اس وقت یہ ممکن نہیں ہے۔ ڈاکٹر کی ہدایت ہے کہ اشد ضرورت کے وقت ہی اسے زحمت دی جائے۔ ابا جان نے خود کو مارٹی کا باپ بتایا اور بملا کی بات سنی ان سنی کرکے بولے "کیا ضروری ہے' اوپر جا کے ڈاکٹر ڈیسائی کو مطلع کردیا جائے۔ اگر اس وقت ان کا نیچے آنا ممکن نہیں ہے تو ہمیں اوپر بلالیں۔ ہم زیادہ وقت نہیں لیں گے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ابا جان یہ کیا کررہے ہیں؟ کون سی کسر رہ گئی ہے' کون سی ایسی التجا تھی جو ہم نے ڈاکٹر ڈیسائی سے نہ کی ہو۔ کلینک آتے ہوئے میں نے ڈاکٹر کے بارے میں اچھی طرح ابا جان کو بتادیا تھا۔

ابا جان کے لہجے میں شائستگی بھی تھی' حکم بھی تھا۔ نرس بملا کی آنکھیں سکڑ گئی تھیں لیکن وہ شانے اچکا کے کمرے سے نکل گئی۔ میری دخل اندازی سے اب کچھ حاصل نہیں تھا۔ بملا جاچکی تھی اور مجھے اندازہ تھا کہ وہ کس قسم کا جواب لے کے آئے گی۔ اسے واپس ہونے میں دیر لگ گئی۔ مجھے تعجب ہوا' آکے اس نے ابا جان سے کہا کہ ہم اوپر جاسکتے ہیں۔

بملا کے پیچھے پیچھے ایک نوجوان لڑکی بھی آئی تھی۔ اسے میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی رہبری میں زینہ عبور کرکے ہم ایک کشادہ اور روشن کمرے میں آگئے۔ قدیم و جدید ساز و سامان سے آراستہ یہ کمرا مکینوں کی خوش ذوقی کا مظہر تھا۔ لڑکی نے ہمیں دس منٹ انتظار کرنے کو کہا۔ مجھے بڑی گھبراہٹ ہورہی تھی۔ میں ابا جان کو ٹوکتے ٹوکتے رہ جاتا تھا کہ ڈاکٹر سے زیادہ نوک جھونک نامناسب ہوگی۔ وہ ایک ترش زباں اور تند خو شخص ہے۔ ابھی ہمیں وہاں بیٹھے ہوئے دس منٹ بھی نہیں ہوئے ہوں گے کہ ڈاکٹر ڈیسائی اندر آگیا۔ کبیدگی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ ابا جان' منیر علی اور میں نے اٹھ کے اسے تعظیم دی' ہاتھ ملایا "ابھی کیا بات ہے؟" ڈاکٹر ڈیسائی صوفے پر بیٹھتے ہوئے بے زاری سے بولا۔ ابا جان نے پہلے بے وقت آمد کی معذرت کی اور شکریہ ادا کیا کہ ڈاکٹر نے ان کے معنوی بیٹے مارٹی پر کمال مہربانی کی' خدا اسے اس کار خیر کی جزا دے گا۔ میرے سینے کا بوجھ کچھ کم ہوا۔ ابا جان کا لب و لہجہ سکون آمیز تھا۔ ان کی معذرت اور ان کے تشکر پہ ڈاکٹر ڈیسائی بت کی طرح ساکت بیٹھا رہا۔ ابا جان نے اس سے کہا کہ وہ اس کے پاس مشورے کے لیے آئے ہیں' صرف چند باتیں کرنے۔ ان کا مقصد صرف اتنا جاننا ہے کہ مارٹی کے لیے اس سے بہتر کوئی صورت ہو تو ڈاکٹر ان کی رہنمائی کرے۔

ڈاکٹر ڈیسائی پلکیں جھپکانے لگا "کیا مطلب ہے آپ لوگ کا؟ ابھی تھوڑا صاف بولو۔"

"ہماری مراد ہے کہ کوئی کسر نہ رہ جائے" ابا جان نے نرمی سے وضاحت کی "ہمیں معلوم ہے کہ آپ ایک تجربہ کار اور لائق ترین ڈاکٹر ہیں۔ آپ کی لیاقت اور مہارت میں کوئی کلام نہیں لیکن مزید کسی تبدیلی اور احتیاط سے اور اچھے نتائج کی توقع ہو تو ہمیں بتایا جائے۔"

"اس کے اوپر کیا!" ڈاکٹر ڈیسائی تنک کے بولا "ابھی لنڈن لے جائے تو ٹھیک ہے۔"

"آپ کا مشورہ ہوا تو ہم اسے لندن بھی لے جاسکتے ہیں" ابا جان نے اطمینان سے کہا۔ ان کی آواز میں غیر معمولی اعتماد تھا "آپ نے توجہ نہیں کی ڈاکٹر صاحب! اکثر ایسا ہوتا ہے' بہت سے معاملات میں بعد کو ہم سوچتے ہیں کہ اگر ایسا ہوجاتا' یہ' یہ چیزیں اور فراہم ہوجاتیں تو کیا اچھا ہوتا۔ میں کہنا چاہتا ہوں' کیا اس کے سوا مارٹی کے لیے اور کچھ نہیں کیا جاسکتا؟"

ڈاکٹر نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"ہم اس کے لیے آخری امکان تک جانا چاہتے ہیں۔"

"آپ اس کے کیا ہوتے ہو؟"

"میرا خیال تھا' نرس نے آپ کو بتادیا ہوگا۔" ابا جان نے نسبتاً اونچی آواز میں کہا "وہ میرا بیٹا نہیں ہے لیکن بیٹے سے زیادہ ہے۔"

ڈاکٹر کے ہونٹ پھیل گئے اور چہرے پر جال سا بن گیا۔ ہم نے اسے بتایا تھا کہ ہمارا تعلق اڈے پاڑے سے ہے۔ زورا نے شروع میں شور بھی بہت مچایا تھا' اس کے سوا چارہ بھی کوئی نہیں تھا۔ یقیناً ڈاکٹر ڈیسائی سوچ رہا ہوگا کہ ہم نے اس سے جھوٹ بولا تھا یا ابا جان غلط بیانی کررہے ہیں۔ وہ ہم میں اور ابا جان میں کوئی مطابقت ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کررہا ہوگا۔ میں یہی بات ابا جان سے کہنا چاہتا تھا کہ ان کی مداخلت اور تشویش کا اظہار ڈاکٹر کے لیے اسرار انگیز ہوسکتا ہے۔ ڈاکٹر معنی خیز اور خشونت آمیز نظروں سے ہمیں گھورتا رہا پھر بھاری آواز میں بولا "ابھی آپ کیا چاہتے ہو؟"

"ہم تو اس کی جلد از جلد صحت یابی چاہتے ہیں اور اس کے لیے جو کچھ ہمارے بس میں ہے' ہمیں بتایئے۔ ہم سے پوچھیے تو ہم اسے اپنے گھر لے جانا چاہتے ہیں۔ اپنے گھر میں ہم وہ تمام انتظامات فی الفور کرسکتے ہیں جو اس جیسے کسی مریض کے لیے ضروری ہیں۔ ڈاکٹر' نرسیں اور ساز و سامان۔ ہم سمجھتے ہیں' وہ اپنے شناسا چہروں کے درمیان رہے گا تو اچھا اثر پڑے گا۔ ہمیں بھی آسانی ہوگی۔ یہ ممکن نہیں تو کوئی دوسری صورت آپ کے ذہن میں ہوگی' کوئی اور بہتر جگہ" ابا جان کا دھیما لہجہ تندہی سے عاری نہیں تھا۔

"ابھی اس کا ادھر سے لے جانا ٹھیک نہیں ہے۔"

"مناسب ہے" ابا جان نے کسی تامل کے بغیر کہا "جب آپ فرمائیں لیکن پھر ہماری درخواست ہے' ہمہ وقت دیکھ بھال کے لیے جتنی نرسوں اور جتنے ڈاکٹروں کی ضرورت پڑے' انہیں کسی بھی معاوضے پر طلب کرلیا جائے۔ ہماری خواہش ہے کہ ہروقت ماہر ڈاکٹر اس کے سامنے رہیں۔ یہ کلینک آپ نے عرصے سے بند کیا ہوا ہے اور اس کی حیثیت اب کلینک کی کم' گھر کی سی زیادہ ہے۔ ہوسکے تو جتنے دن مارٹی یہاں سے رہے' پہلی منزل کو عارضی طور پر باقاعدہ کلینک کا درجہ دے دیا جائے تاکہ کسی روک ٹوک کے بغیر ہم یہاں آجاسکیں۔ آپ ہماری گزارش پر غور کررہے ہیں جناب؟"

ڈاکٹر متذبذب انداز میں سر ہلانے لگا۔

"بات تو اچھی نہیں ہے لیکن معاملے کی ہے۔ معاملے کی ہر بات جتنی ہلکی ہوتی ہے۔ اتنی بوجھل بھی۔ ہم اس نوازش کے لیے کوئی بھی رقم خرچ کرنے کو آمادہ ہیں۔"

"آپ کے پاس بہت روپیہ پیسہ ہے کیا؟" ڈاکٹر کی بھنچی ہوئی آواز میں پورا طنز صاف نمایاں تھا۔

"روپیا پیسا کیا چیز ہے صاحب!" ابا جان جیسے اس سوال کے لیے تیار تھے' کہنے لگے۔ "ہم پھر کس طرح آپ کو یہ باور کرائیں گے کہ وہ ہمیں کتنا عزیز ہے۔ کسی بھی مال و دولت کے مقابلے میں ہمیں اس کی زندگی پیاری ہے۔"

"روپیا پیسا زندگی کا مول نہیں ہے' بڑے صاحب!"

"بے شک نہیں ہے۔" ابا جان نے ایک لمحے کا توقف نہیں کیا' کہنے لگے "دولت سے زندگی نہیں خریدی جاسکتی۔ دولت سے وقت بھی نہیں خریدا جاسکتا۔ آدمی نیلام ہوجاتے ہیں۔ چونکہ بولی آدمی کے مابین لگتی ہے۔ یہ کوئی نیلام نہیں ہے۔ جناب' اس لیے کہ بولی آدمی کی لگتی ہے' زندگی کی نہیں۔ زندگی کی لگام اسی کے ہاتھ ہے جو دنیا جہاں کا مالک ہے۔ یہ بھی سب اسی کی دولت ہے جس کی ملکیت کے میں اور آپ گمان میں رہتے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ آپ ہمارا مقصد نہیں سمجھ رہے ہیں یا میں کہہ نہیں پارہا۔ ہوسکتا ہے' آپ کو خدا نے بہت کچھ دیا ہو۔ سب سے بڑھ کے تو دل ہوتا ہے۔ خدا نے ایک دل کشادہ دے دیا تو سبھی کچھ دے دیا۔ یہ کوئی سودے بازی نہیں ہے ڈاکٹر صاحب! ہمیں معلوم ہے' آپ اتنا ہی کرسکتے ہیں جتنا آپ کے اختیار میں ہے۔ ہم تو ایک اور بات کہہ رہے ہیں۔ دولت کے ذکر سے کوئی ضمانت ہمیں مطلوب نہیں ہے۔ یہ ضمانت آپ دے بھی نہیں سکتے لیکن اتنا تو آپ کو خوب اندازہ ہوگا کہ کبھی ذرا سی غفلت یا ناداری کی وجہ سے کتنے مریض طبیب کے پاس نہیں پہنچ پاتے' اچھے طبیب' بروقت علاج اور دیگر نگہداشت وغیرہ سے فرق تو کوئی پڑتا ہے ورنہ۔۔۔" ابا جان نے ٹھہر کے کہا "ہم اس کے علاج کے تمام امکانات کی ضمانت چاہتے ہیں اور بس۔۔۔ باقی سب خدا کے حوالے۔۔۔"

ڈاکٹر ڈیسائی خاموش بیٹھا رہا۔

ابا جان نے کہا کہ انہیں اور کچھ نہیں کہنا۔ انہوں نے کسی گراں بات کے لیے ڈاکٹر سے معذرت چاہی۔

"نہیں' نہیں" ڈاکٹر کرسی پر سیدھا ہوکے بولا "ایسا نہیں ہے' ایسا بات نہیں ہے' اپن سوچتا ہے کہ ابھی اور کیا کیاجاسکتا ہے" اس نے مضطرب نظروں سے ہم تینوں کو دیکھا اور خود کلامی کے انداز میں کہنے لگا کہ ہر زخم کے اندمال کے لیے ایک وقت لازم ہے۔ کسی ڈاکٹر کے پاس جادوئی چھڑی نہیں ہوتی۔ ابھی ابھی اپن کیا کرے؟" وہ الجھتے ہوئے بولا۔

"یہ آپ کا کام ہے ڈاکٹر صاحب' ہم تو آپ کے منتظر ہیں۔" ابا جان نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے' ابھی تھوڑا وقت دیو اپن کو۔"

ابا جان نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اجازت چاہی۔

ڈاکٹر کو جیسے ابا جان کے اس طرح اٹھ کے جانے کی توقع نہ تھی "ایسا کیسے!" وہ چونک سا پڑا اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کے پشیمانی سے بولا "آپ لوگ سے چائے پانی کو تو پوچھا ہی نہیں۔"

"شکریہ جناب! اس وقت تو کسی چیز کو جی نہیں چا[ہ] رہا۔"

"آپ بولو' ابھی کیا پیئیں گے' چائے' کافی بھی بن سک[تا] ہے۔"

"پھر سہی ڈاکٹر صاحب" منیر علی نے لجاجت سے کہا۔

"آپ لوگ گھر آیا ہے" یہ کہتے ہی اس نے ڈولی کے نا[م] سے کسی کو آواز دی۔ وہ خادمہ تھی اور قریب ہی کہیں تھی' پہلی ہی آواز پر آگئی۔ ابا جان اور منیر علی کے کئی بار منع کر[نے] کے باوجود ڈاکٹر نے ڈولی سے چائے لانے کو کہا اور اپنے [بیٹے] بہو کے بارے میں پوچھا۔ ڈولی کے بتانے پر کہ وہ دونوں ا[پنے] کمرے میں ہیں' ڈاکٹر نے انہیں یہاں آنے کی ہدایت ک[ی۔] خادمہ کے جانے کے بعد وہ گپ چپ بیٹھا رہا۔ ابا جان' چپ رہے۔ ڈاکٹر شیوا اور اس کی بیوی فوراً ہی اندر آگئے۔ شیوا نے گھر کا لباس نہیں بدلا تھا۔ اس کی بیوی نیلے رنگ گاؤن پہنے ہوئے تھی۔ گلے میں سرخ رنگ کا پھول دا[ر] رومال لپٹا ہوا تھا۔ سہ پہر سے وہ بالکل مختلف نظر آرہی تھ[ی]

[تا]زہ تازہ' کھلی کھلی اور بڑی بڑی سی۔ دونوں کسی قدر بدحواس [تھ]ے۔ ڈاکٹر نے ابا جان سے ان کا تعارف کرایا۔ اس سے پہلے [ڈاکٹر] ابا جان کا تعارف کراتے ہوئے وہ کسی کشمکش سے دوچار [تھ]ا۔ ابا جان نے اپنا منیر علی کا اور میرا نام بتایا۔ میرا نام [انہ]وں نے بابر بتایا تھا' پھر انہیں خیال آیا کہ بمبئی میں تو میرا [نا]م کچھ اور ہے "ظہیر' یہ ظہیر ہے" انہوں نے جلد ہی ترمیم [کی۔] انہیں میرا لقب' راجا دادا' یاد نہیں آیا۔ ہمیں نمسکار [کر]نے کے بعد شیوا اور اس کی بیوی صوفے پر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر [نے] اپنی بہو کو پرتی کے نام سے پکارا تھا۔ اس نے بیشتر [انگ]ریزی میں شیوا کو مارٹی اور ابا جان کے تعلق کے بارے [میں] بتایا اور مختصراً ساری بات دہرائی۔ شیوا سعادت مندانہ [انداز] سے سنتا رہا۔ درمیان میں وہ کچھ کہنا چاہتا تھا' اپنے باپ [کی] قطع کلامی کے خیال سے ہکلا۔۔۔ کے رہ گیا۔ شیوا اور پرتی [کی] نگاہیں مسلسل بھٹک رہی تھیں۔ کبھی وہ ایک دوسرے کو [دیک]ھتے تھے' کبھی ہم سب کو اور کبھی ڈاکٹر ڈیسائی کو۔ دوپہر [انہ]وں نے مجھے زورا اور شامو وغیرہ کے ساتھ دیکھا تھا۔ سو [ان] کا وہی حال ہونا چاہیے تھا جو منیر علی اور ابا جان کے ساتھ [انہی]ں دیکھ کے ڈاکٹر ڈیسائی کا ہوا تھا۔ ممکن ہے' ڈاکٹر ڈیسائی کی [شائ]ستگی' بے ساختگی بھی شیوا اور پرتی کے حیرت و تجسس میں [اض]افہ ہو۔ وہ کسی پرانے شناسا کی طرح ابا جان سے محو کلام [تھا]۔ باتوں باتوں میں ابا جان اسے بتا چکے تھے کہ ان کا محل [نم]ا مکان کلینک سے کتنا قریب ہے۔ مکان کے سابق مکینوں [سے] ڈاکٹر کی رسم و راہ تھی۔ وہ اپنے بیٹے اور بہو کو اس مکان [کی] منفرد عمارتی نوعیت اور طول و عرض کے بارے میں بتانے [لگا]۔ شیوا اور پرتی شائستہ لوگوں کی طرح پھیلی ہوئی آنکھوں [سے] یہ تفصیل سنتے رہے۔ اتنی دیر میں پھلوں' بسکٹوں' چائے [او]ر چینی کے برتنوں سے بھری ہوئی ٹرالی آگئی۔ چائے کے [دو]ران میں ابا جان نے براہ راست پرتی کو مخاطب کیا اور کہا' [سن]ا ہے' ان کی شادی کو زیادہ وقت نہیں گزرا۔ کوئی جواب [دی]نے کے بجائے پرتی شرما گئی۔ میں دیکھتا رہ گیا' چائے ختم [ک]رنے کے بعد ابا جان نے پرتی کو اپنے پاس بلایا۔ پہلے تو وہ [قدر]ے حیران و پریشان ہوئی' اس نے اپنے شوہر اور خسر کو [دیک]ھا۔ ابا جان کے مشفقانہ انداز میں تحکم بھی تھا۔ پرتی [اٹھ]ی' جھجکتی ہوئی ان کے سامنے پہنچ گئی۔ ابا جان نے اس [اث]نا میں اپنے دستی چرمی بیگ سے ایک چھوٹی مخملی ڈبیا نکال لی [تھ]ی۔ انہوں نے پرتی کے سر پر ہاتھ رکھا اور ڈبیا اس کے ہاتھ [میں] تھمادی۔

"یہ' یہ کیا ہے؟" پرتی کے جیسے کسی نے چٹکی بھرلی ہو' وہ بری طرح گھبراگئی "یہ تمہارے لیے ہے' سمجھ لینا کہ تمہاری رونمائی کا تحفہ ہے' تمہارے کسی بڑے کی طرف سے" ابا جان نے گونجتی آواز میں کہا۔

پرتی نے اضطراری حالت میں ڈبیا کھول کے دیکھی۔ وہ ہیرا جڑی انگوٹھی تھی۔ کمرے کی روشنی میں اس کا ہیرا دمک رہا تھا۔ پرتی کی بڑی بڑی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ ابا جان نے کوئی منتخب ہیرا ہی انگوٹھی میں جڑوایا ہوگا۔ چند لمحوں کے سکتے جیسے سکوت کے بعد پرتی کو کچھ ہوش آیا۔ اس نے انگوٹھی ابا جان کو لوٹانی چاہی۔ شیوا اور ڈاکٹر ڈیسائی نے بھی شدومد سے اس کی ہم نوائی کی۔ ابا جان نے کچھ سنا ہی نہیں "یہ اس کی خوبصورت انگلیوں میں خوب جچے گی" انہوں نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا "بیٹیاں' باپ کی دی ہوئی چیزیں لوٹایا نہیں کرتیں۔"

پرتی وہیں کھڑی رہ گئی۔

ابا جان اور منیر علی زینے کی جانب بڑھ گئے۔ ہمارے نیچے اترتے ہی ڈاکٹر ڈیسائی اور شیوا بھی پیچھے پیچھے چلے آئے۔ نرس بملا مارٹی کے کمرے کے باہر ہی موجود تھی۔ ڈاکٹر ڈیسائی کو دیکھ کے اس کے ڈھلکے ہوئے شانے سیدھے ہوگئے۔ اس نے ڈاکٹر کو بتایا کہ کچھ دیر پہلے مارٹی نے آنکھ کھولی تھی لیکن پھر اس پر غشی طاری ہوگئی۔ ڈاکٹر ڈیسائی اور شیوا فوراً اندر چلے گئے۔ منیر علی اور ابا جان بھی۔ میں باہر کھڑا رہا۔ شامو اور زورا بھی باہر آگئے۔ ایک پہر میں دونوں کھنڈر ہوگئے تھے' میرے جسم سے چمٹ گئے۔ میں نے انہیں اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا تھا۔ میں تسلی دینا چاہتا تھا لیکن مجھ سے ایک لفظ بھی نہ کہا جاسکا۔ شامو تو سسکنے لگا۔ اچھا ہوا' ابا جان اور ڈاکٹر جلد ہی باہر آگئے اور شامو کو سنبھل جانا پڑا۔ دیر تک کمرے سے باہر ایک کونے میں ابا جان' منیر علی' ڈاکٹر ڈیسائی اور شیوا جانے کیا سرگوشیاں کرتے رہے۔ پھر ڈاکٹر ابا جان کو موٹر تک رخصت کرنے آیا۔ موٹر میں بیٹھنے سے پہلے میں نے ابا جان کو روک کے کہا کہ وہ شامو اور زورا سے گھر جانے کے لیے کہیں۔ دونوں کچھ دیر آرام کرکے اور کپڑے بدل کے پھر واپس آسکتے ہیں۔ میں ان کی جگہ رک جاتا ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے کہنے سے وہ نہیں مانیں گے۔ ان دونوں نے ہاتھ جوڑ کے ابا جان سے التجا کی کہ انہیں وہیں رہنے دیا جائے۔ میں نے بھی ابا جان سے انکار کردیا تھا لیکن انہوں نے ساتھ چلنے کا حکم دیا تو میں نے ضد بھی نہیں کی۔ موٹر ابھی چلی نہیں تھی کہ ڈاکٹر ڈیسائی نے ڈرائیور کو کچھ توقف کرنے کی ہدایت کی۔ میری طرح ابا جان کو بھی توقع نہ

ہوگی' ڈاکٹر نے ان سے پولیس کے متعلق پوچھا۔

"میرا خیال ہے' اس کی ضرورت نہیں" ابا جان نے کسی قدر بے اعتنائی سے کہا۔

"جیسا آپ مناسب سمجھیں" ڈاکٹر انگریزی میں بولا "یوں ہی حفظ ماتقدم کے لیے مجھے خیال آیا" ڈاکٹر کے لہجے میں طنز کی آلودگی نہیں تھی۔

ابا جان نے سرہلانے پر اکتفا کیا اور ڈرائیور کو موٹر چلانے کا اشارہ کیا۔ سڑک پر بھیڑ کچھ کم ہوگئی تھی۔ ہم نے منٹوں میں گھر کا فاصلہ طے کرلیا۔ ملاقاتی کمرے میں سبھی ہمارے منتظر تھے۔ موٹر کی آواز سن کے سبھی باہر آگئے۔ ابا جان اور منیر علی کے پاس چھپانے اور ظاہر کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ تسلی تشفی کے دو ایک رسمی جملے ادا کرتے ہوئے دونوں اندر چلے گئے۔ راستے بھر مجھے رما اور کیلاش کا دھڑکا لگا رہا تھا۔ عموماً یہی وقت ان کے آنے کا ہوتا ہے۔ وہ وہاں نہیں تھے لیکن کسی وقت بھی آسکتے تھے۔ میرا دل اس وقت کسی سے بات کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا' اپنے آپ سے بھی نہیں۔ آدمی سب سے زیادہ تو خود سے مخاطب رہتا ہے۔ ابا جان کے جانے کے بعد ان سب کی نگاہیں مجھ پر مرکوز ہوگئی تھیں۔ وہ مجھ سے کچھ جاننے کے لیے مضطرب تھیں لیکن انہیں سنانے کے لیے ابا جان اور منیر علی سے سوا میرے پاس بھی کیا تھا۔ جولین نے قریب آکے مجھے بتایا کہ زورا اور شامو کے لیے ناشتے دان اور کپڑے لے کے جگنو اور دیوا اسپتال جارہے ہیں' کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو ساتھ کردی جائے؟ میرے ہونٹ لٹک کے رہ گئے۔ یہی ٹھیک تھا کہ جگنو اور دیوا کے ساتھ میں بھی کلینک واپس چلا جاؤں۔ میں نے کئی بار ارادہ باندھا اور ملتوی کردیا۔ جگنو اور دیوا کو چار دیواری تک رخصت کرکے میں پھر لوٹ آیا اور میرے قدم اوپری منزل کے ہوادار کمرے کی طرف اٹھ گئے۔ نسبتاً ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اس کمرے کے درودیوار مجھ سے تھوڑے بہت مانوس ہوگئے تھے۔ یہاں کی خاموشی میں مجھے سکون سا محسوس ہوا لیکن پھر میرا دل ڈوبنے لگا۔ میں جبر کرکے بستر پر پڑا رہا اور یہ جبر بھی میرے اختیار میں نہ رہا۔ نیچے آکے گھر میں کسی طرف جانے کے بجائے میں نے باغ کا رخ کیا۔ ادھر خاصا اندھیرا تھا۔ پیڑوں کی اوٹ میں کوئی بھی مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا مگر میں تو اپنے سامنے موجود تھا۔ آدمی سات تہ خانوں میں بھی اپنے آپ سے نہیں چھپ سکتا۔ کہتے ہیں' ایسی بے بسی یا بے کلی تبھی ہوتی ہے جب دست وپا اور دل ودماغ کی روشنی کے باوجود آدمی کچھ کر نہیں پاتا' اور کہتے ہیں کبھی آدمی سے اپنی پہچان بھی مشکل ہوجاتی ہے۔ آدمی اپنے لیے بھی اجنبی بن جاتا ہے۔ خود کو ڈھونڈتا رہتا ہے کہ وہ کہاں ہے' وہ کون ہے اور اس کا منصب کیا ہے؟ مجھے بھی یہ سب کچھ معلوم تھا مگر اس جاننے نہ جاننے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ علم سے مراد آدمی کا قرار نہیں ہے۔ میں بار بار خود سے پوچھتا تھا کہ مجھے اس وقت کیا کرنا چاہیے۔ میں کیا کرسکتا ہوں۔ یہ احساس ہر لحظے میرے سینے میں کھٹکتا تھا کہ مجھ سے کوئی بھول' کوئی چوک ہورہی ہے۔ باغ میں پتھر کی بینچ پر بیٹھے ہوئے جانے کتنا وقت گزر گیا تھا کہ جگنو کی آمد پر میں چونک پڑا۔ "تم تو ایدر ہے راجا بھائی!" وہ حیرت سے بولا "اپن' اکھا جگہ ڈھونڈتا پھریلا ہے۔"

"کیا بات ہے؟" میں نے ہکلاتے ہوئے پوچھا "تم کب واپس آئے؟"

جگنو نے مجھے بتایا کہ اسے اور دیوا کو آئے ہوئے پندرہ بیس منٹ کے قریب ہورہے ہیں۔ یہ معلوم ہونے پر کہ میں ان کے ساتھ کلینک نہیں گیا ہوں اور گھر میں بھی کہیں نہیں ہوں' ابا جان کو پریشانی ہونے لگی۔ مجھے تلاش کرتا ہوا جگنو آخر اس طرف آنکلا "تم ابھی اکیلا ایدر کیسے بیٹھا ہے راجا بھائی!" جگنو بدحواسی سے بولا۔

"بس' ایسے ہی" میں نے ناتوانی سے کہا "کیسا ہے مارٹی؟"

"ابی تو ویسا ہی ہے" جگنو کی آواز ڈھلک گئی "پر ابھی اور دوسرا ڈاکٹر اور نرس لوگ آیا ہے' بڑا ڈاکٹر بھی ان کا ساتھ تھا۔"

"اور ڈاکٹر بھی آگئے ہیں" میں بینچ سے اٹھ گیا "انہوں نے کچھ بتایا؟"

جگنو کو زیادہ کچھ معلوم نہیں تھا۔ بیرونی کمرے میں ابا جان موجود تھے۔ مجھے دیکھ کے انہوں نے کوئی سوال نہیں کیا۔ بس گہری سانس بھر کے رہ گئے۔ انہیں اپنی صورت دکھا کے میں جگنو کے ساتھ گھر سے نکل آیا۔ دوسری موٹر بھی وہیں کھڑی تھی۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ ڈرائیور کو جگانے میں جتنی دیر لگتی' اتنی دیر میں ہم نے راستہ پیدل ہی طے کرلیا۔ کلینک کا دربان ہمیں دیکھ کے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور کسی ردوقدح کے بغیر اس نے چھوٹا دروازہ کھول دیا۔ اندر داخل ہوکے مجھے یہ گمان ہوا کہ میں کسی دوسری جگہ آگیا ہوں۔ آمنے سامنے کئی کمرے کھلے ہوئے تھے اور دالان' صحن کے سارے قمقمے روشن تھے۔ زورا اور شامو صاف ستھرے کپڑے پہنے دالان میں آرام کرسیوں پر بیٹھے

تھے جیسے انہوں نے بہت دنوں بعد مجھے دیکھا ہو' دونوں بے تحاشا میری جانب لپک پڑے۔ ان سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کی سرخ آنکھیں ہی سب کچھ بتا رہی تھیں۔ میں نے مارٹی کے کمرے کی طرف جانے کا ارادہ کیا اور میں کمرے میں داخل ہوا چاہتا تھا کہ اندر سے کیلاش کو برآمد ہوتا دیکھ کے مجھے جھٹکا سا لگا۔ وہ کیلاش ہی تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے حواس مجتمع کرکے اس سے پوچھتا کہ وہ یہاں کس طرح پہنچ گیا' وہ مجھ سے لپٹ گیا اور دل گیر لہجے میں بولا "مجھے یقین تھا کہ کچھ دیر میں آپ سے ملاقات ہوگی۔"

مجھے خفت ہونے لگی اور میں نے کھسیائی ہوئی آواز میں کہا "مگر تم' تم یہاں کیسے۔۔۔"

"میں تو اور پہلے آجاتا۔" وہ بے تابی سے بولا "شام کو اسپتال سے گھر پہنچا تو رما آپ کی طرف جانے کے لیے تیار تھی۔ اسی وقت پونا سے ٹیلے گرام آگیا۔ وقت کم تھا۔ میں اور رما کو شلی کو لینے اسٹیشن پہنچے۔ ٹرین لیٹ تھی۔ گھر واپسی پر مجھے اسپتال کے انچارج اور اپنے استاد ڈاکٹر بھارگو کا پیغام ملا کہ مجھے فوراً ڈاکٹر ڈیسائی کے کلینک پہنچنا ہے۔ ڈاکٹر ڈیسائی اور بھارگو ایک ساتھ کام کرچکے ہیں۔ یہاں آکے میں ناقابل بیان حیرت سے دوچار ہوا۔ یہ تو اپنا مارٹی۔۔۔" وہ ایک ہی سانس میں کہتا گیا۔ پھر ٹھہر کے دل گرفتہ لہجے میں بولا "یہ کیا ہوگیا بابر بھائی!"

"کیا بتاؤں۔۔۔؟" میری آواز حلق میں ٹوٹ گئی۔

"میں نے سب دیکھ لیا ہے" وہ میری کیفیت سمجھ گیا۔ اور تیزی سے بولا "ڈاکٹر بھارگو اور اسپتال کے ایک بڑے سرجن ڈاکٹر برٹن میرے آنے سے پہلے یہاں آکے جاچکے ہیں۔ ڈاکٹر ڈیسائی خود ایک ماہر ڈاکٹر ہیں اور اس معاملے میں انہوں نے وہی کچھ کیا ہے جو ان حالات میں کوئی بھی ڈاکٹر کرسکتا ہے۔ ڈیسائی صاحب میڈیکل کالج میں پروفیسر بھی رہ چکے ہیں۔ ان کے بعد کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ سن کے کہ مجھے ڈیسائی صاحب کے کلینک جانا ہے' سچ پوچھیے تو بڑی حیرت ہوئی۔ گھر سے نکلنے سے پہلے میں نے احتیاطاً بھارگو جی کو فون کرلیا تھا کہ کہیں مجھے دیر تو نہیں ہوگئی۔ انہوں نے مجھے جلد سے جلد یہاں پہنچنے کا حکم دیا۔ یہ ان کی شفقت ہے کہ وہ مجھ جیسے ناپختہ ڈاکٹر کو بعض پیچیدہ معاملوں میں شامل کرلیتے ہیں۔ بہرحال میرے تعجب پر ڈاکٹر بھارگو نے بتایا کہ مریض کے اعزا محض ڈاکٹر ڈیسائی پر تکیہ کرنا نہیں چاہتے۔ ان کا اصرار ہے کہ دوسرے ڈاکٹر بھی ڈیسائی صاحب کی مدد کے لیے موجود رہیں۔ ڈاکٹر بھارگو کا کہنا تھا کہ ہم لوگ معذرت کرلیتے مگر ہمیں کلینک میں بلانے کی درخواست خود ڈاکٹر ڈیسائی نے کی ہے' راستے بھر میں سوچتا رہا کہ وہ کون سا ایسا مریض ہے جس کے اعزا اتنے بے چین ہیں' کس گھر سے اس کا تعلق ہے۔ یہاں آکے معلوم ہوا کہ یہ تو' یہ تو اپنے گھر' محبت والوں کے گھر کا آدمی ہے۔ میری رائے میں یہ سب کچھ' کچھ زیادہ ہے لیکن ایسا غلط بھی نہیں۔ ڈیسائی صاحب کا کلینک عرصے سے غیر آباد ہے اور خود ڈیسائی صاحب ڈاکٹری کیا' اپنے آپ سے بھی اکتائے ہوئے ہیں۔ میں آپ کو یہ بتاؤں' ایک حادثے نے ان کا۔۔۔"

"مجھے معلوم ہے" میں نے اس کی بات کاٹ کے کہا۔

"آپ کو معلوم ہے" وہ پٹپٹاتی پلکوں سے بولا "تو پھر آپ کو یہ بھی پتا ہوگا کہ ڈاکٹر ڈیسائی نے خود کو کیسا سمیٹ لیا ہے۔ سرجن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنا کام کرتا رہے۔ ڈاکٹر ڈیسائی کی پریکٹس عملاً ختم ہوچکی ہے۔ انہوں نے میرا خیال ہے' ایک مدت بعد رفوگری کی ہے اور کیا ماہرانہ کام کیا ہے" کیلاش میرا بازو تھامے ہوئے مجھے مارٹی کے کمرے سے ملحق ایک دوسرے کمرے میں لے آیا۔ وہاں دو ادھیڑ عمر آدمی اور ڈاکٹر شیوا پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ کیلاش نے انگریزی میں ان سے میرا تعارف کرایا۔ وہ دونوں بھی ڈاکٹر تھے اور کیلاش کے کہنے کے مطابق اپنے ہنر میں یکتا تھے۔ "اور یہ نوجوان ڈاکٹر شیوا!" کیلاش نے شیوا کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے کہا "ڈاکٹر ڈیسائی کے بیٹے ہیں۔ ہم دونوں نے ساتھ ہی تعلیم حاصل کی ہے۔ پھر شیوا لندن چلے گئے۔ وہاں سے بہت بڑے ڈاکٹر بن کے لوٹے ہیں۔ یہ مجھے بہت پیچھے چھوڑ گئے۔"

میں نے دھیمی آواز میں کیلاش کو بتایا کہ میں ڈاکٹر شیوا سے پہلے مل چکا ہوں۔

"اوہ ہاں!" کیلاش سر جھٹک کے بولا "مجھے تو دھیان ہی نہیں رہا کہ آپ لوگ تو پہلے مل چکے ہوں گے۔"

ڈاکٹر شیوا مجھ سے مصافحے کے لیے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور متجسس نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ اس کا چہرہ تمتما گیا تھا۔ شاید مجھے انگریزی بولتا ہوا دیکھ کے۔ "کیلی کے توسط سے اس بار آپ سے مل کے اور خوشی ہوئی" اس نے لپکتی آواز میں کہا۔

"شیوا! یہ میرے دوست ہی نہیں' بھائی بھی ہیں" کیلاش مجھے بازو میں بھینچتے ہوئے بولا "میں سوچتا ہوں' بابر بھائی سے ملنے سے پہلے میں کتنا ادھورا تھا۔"

میں نے سر جھکا لیا۔

"بابر صاحب کے متعلق کچھ اور نہیں بتاؤ گے؟" شیوا

نے اشتیاق آمیز لہجے میں کہا۔
"ہاں ہاں" کیلاش گھبرا سا گیا اور سنبھل کے بولا "اس کے لیے وقت پڑا ہے۔ بس اتنا سمجھو کہ بابر بھائی ایک نہ درتہ نوجوان ہیں۔"
"وہ تو میں بھی کچھ سمجھتا ہوں" شیوا نے اپنے لہجے کا تیکھا پن دور کرنے کی پوری کوشش کی تھی "میری مراد ہے کیا کرتے ہیں آپ؟" اس نے شائستگی سے کہا۔
کیلاش نے جواب دینے کے بجائے میری طرف دیکھا اور مسکرا کے بولا "بہت کچھ' خاندانی آدمی ہیں۔ زمینیں ہیں' بزنس ہے۔"
شیوا تذبذب سے سرہلا کے رہ گیا۔
"میں ایک بے کار آدمی ہوں" میں نے زہرخند سے کہا۔
"میں سمجھ گیا" شیوا ہنس کے بولا "کاش ایسی بے کاری ہم سب کو نصیب ہو۔"
"بابر بھائی ایک شاندار آدمی ہیں" کیلاش نے والہانہ انداز میں کہا اور میرا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیا "سچ پوچھو تو میرے پاس لفظ نہیں کہ میں بابر بھائی کو بیان کرسکوں۔"
"تمہاری آنکھیں بیان کررہی ہیں" شیوا نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا "حیرت ہے' تم تو بہت ناپ تول کے آدمی تھے۔ شکی' وہمی' جزئیات بیں۔ آڈیٹوریم میں تم احتراماً کبھی تالی بجایا کرتے تھے اور وہ بھی بہت آہستہ۔ یاد ہے' لڑکوں نے تمہیں کیا خطاب دیا تھا؟"
"یاد ہے لیکن تب تک مجھے کوئی آدمی نہیں ملا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ آدمی' آدمی کے لیے کتنا اہم ہوسکتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ رشتے کیا ہوتے ہیں اور سب سے بڑا رشتہ کون سا ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ پیمانہ تو صرف آدمی کا قد ناپ سکتا ہے' آدمی کا طول و عرض۔ تب تک میں نے بابر بھائی کو تلاش نہیں کیا تھا۔"
مجھے گھٹن ہونے لگی۔ میں نے بہ مشکل کہا "کیا کوئی اور وقت اس موضوع پر گفتگو کے لیے مناسب نہ ہوگا۔"
جیسے ان سے کوئی بڑی غلطی ہوگئی ہو' دونوں مجھ سے معذرت کرنے لگے اور کیلاش نے مجھ سے کہا کہ دوپہر سے اب تک میں نے ایک پل کے لیے آرام نہیں کیا ہوگا۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں گھر جا کے آرام کروں' وہ اور اس کے ساتھی ڈاکٹرز رات بھر کلینک میں رہیں گے۔ شیوا بھی ہے۔ ان کی موجودگی میں مجھے کسی قسم کا تردد نہیں کرنا چاہیے۔ دونوں ڈاکٹروں نے بھی اس کا ساتھ دیا اور ان میں سے ایک کہنے لگا کہ ہم آج شیوا کے مہمان ہیں۔ شیوا اور بھائی نے یہاں ہمارے قیام کے عمدہ انتظامات کیے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ بھی ہمارے ساتھ رہتے لیکن بہتر ہوگا کہ گھر جا کے آپ ایک لمبی نیند لیں۔ میں کیا کہتا کہ ایسے میں کیسے نیند آسکتی ہے۔ کیلاش نے مجھے کچھ کہنے کی مہلت بھی نہیں دی اور مجھے لیے ہوئے کمرے سے باہر آگیا۔
کیلاش کو کلینک میں دیکھ کے مجھے بے چینی ہوئی تھی اور ایک تسلی بھی۔ میں اس سے ایک بات پوچھنے کے لیے متوحش تھا کہ وہ مجھے مارنی کے بارے میں صحیح صحیح بتادے۔ میں یہ جاننا بھی چاہتا تھا اور مجھ میں کوئی ایسی ویسی بات سننے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ پھر میں نے خود قیاس کیا کہ کیلاش مارنی کی طرف سے مطمئن ہوتا تو از خود مجھے سو طرح کے دلاسے آسرے دیتا اور ان ڈاکٹروں کی موجودگی کا سبب یہ نہیں کہ ڈاکٹر ڈیسائی جیسے صاحب حیثیت ڈاکٹر نے انہیں طلب کیا اور انہیں کسی بڑے معاوضے کی ترغیب دی ہے۔ مارنی کو دیکھ کے انہوں نے یہاں ٹھہرے رہنا ضروری سمجھا ہوگا ورنہ وہ واپس چلے جاتے۔ کیلاش نے جن دو ڈاکٹروں سے میرا تعارف کرایا تھا' انہوں نے بھی مارنی کے لیے ایک تشفی آمیز لفظ نہیں کہا تھا۔ وہ تو ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے' جیسے مجھے بہلا رہے ہوں۔
کیلاش کے اشارے پر میں اس کے ساتھ کسی معمول کی طرح کلینک کے ایک گوشے میں چلا آیا۔ مجھے شبہ ہوا اور میرا دل بیٹھنے لگا کہ شاید وہ مارنی کے متعلق مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتا ہے لیکن وہ سرگوشی میں کہنے لگا کہ کوشلی کی اچانک آمد نے اسے بہت منتشر کیا ہوا ہے۔ میں نے کسی بہرے کی مانند توجہ سے اس کی بات سننے کی کوشش کی۔ اس کے شکستہ لہجے سے ظاہر تھا کہ اسے گداز کی ضرورت ہے اور وہ مجھ سے مشورے کا طالب ہے۔ کہنے لگا' ایسی صورت میں' جب اس کی ماں اور چھوٹی بہن کوشلی کے باپ کے سوگ میں مستقلاً پونا میں مقیم ہیں' کوشلی کا بمبئی آجانا ناقابل فہم ہے۔ اسے تو ابھی اپنے گھر سے نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ میں خاموش کھڑا سوچتا رہا کہ اس سے کیا کہوں۔ ایک اشک بار دوسرے اشک بار کی کیا دل جوئی کرسکتا ہے۔ کیلاش نے یہ ذکر دل گرفتہ انداز میں کیا تھا کہ جیسے کوشلی کی بمبئی میں آمد' کوئی حادثہ یا سانحہ ہے۔ یہ تو اپنے اپنے احساس کی بات ہے۔ اچانک پڑجاتی ہے۔ آدمی کا نفس اس کا زنداں ہے۔ ایک بار آدمی اس زنداں میں آجائے تو نکلنے کے راستے اس کے بس میں نہیں ہوتے۔ مجھے باور کرنا چاہیے کہ اس رات

صاحب کی وصیت کے حوالے سے کیلاش نے اپنا جو احوال بیان کیا تھا' وہ اس پر کتنا طاری ہے۔ دوسرے کا احساس آدمی کو ارزاں کیوں معلوم ہوتا ہے۔ یکایک جولین میری آنکھوں میں سمٹ آئی اور مجھے سامنے کے کمرے میں دراز بے حال مارنی کا خیال آیا۔ میرے دماغ میں الٹے سیدھے دائرے بننے لگے۔ آدمی' بساط کے مہروں کی طرح کیسے ایک دوسرے کے سامنے آجاتے ہیں۔ کیلاش' مارنی کی مسیحائی کے لیے کلینک میں ٹھہرا ہوا ہے۔
میری خاموشی پر کیلاش کہنے لگا کہ رما بھی کوشلی کی غیر متوقع آمد سے بے کل ہوگئی ہے۔ شام سے وہ کئی بار اسپتال فون کرچکی تھی کہ کیلاش جلد آجائے تو دونوں ہمارے ہاں آسکیں۔ پھر کہیں اور نکل جائیں گے۔ بمبئی سے کچھ دور۔ کل رات کلب سے واپسی پر وہ دونوں جاگتے رہے اور میرا ہی ذکر کرتے رہے۔ کیلاش کے بقول اس نے بہت دنوں بعد رما کو اتنا سرشار دیکھا تھا۔ وہ کسی سحر کی سی کیفیت میں تھی' کہتی تھی کہ آج اسے ایسا لگا جیسے اس نے کوئی کھوئی ہوئی چیز حاصل کرلی ہو' کوئی سراغ پالیا ہو' کسی خزانے تک پہنچ گئی ہو۔ اور بھی بہت کچھ۔۔۔ کوشلی کے ٹیلی گرام پر وہ بہت برگشتہ ہوگئی تھی۔ اسٹیشن جانے پر بھی تیار نہ تھی بلکہ اکیلے ہی ہمارے ہاں آنے کی ضد کررہی تھی۔ یہ ایک نہایت ناروا بات تھی۔ کیلاش نے اسے سمجھایا کہ کوئی اجنبی نہیں' کوشلی آرہی ہے جو گھر کے ایک فرد کی حیثیت رکھتی ہے۔ یوں بھی کوشلی سے رما کی اچھی دوستی ہے۔ کیلاش نے بتایا' وہ کوشلی سے اس کا مقصد تو نہیں پوچھ سکتے تھے۔ ایک طرح سے وہ اپنے دوسرے گھر میں آئی تھی اور کسی وقت بھی اطلاع کے بغیر آسکتی ہے۔ ممکن ہے وہ پونا کی سوگوار فضا سے بے زار ہوگئی ہو اور کچھ دن کشادہ ماحول میں رہنے کی ضرورت محسوس کرتی ہو۔ وہ بہت تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ پریشان پریشان سی۔ کیلاش سے وہ پہلے کی طرح پیش آئی۔ اس کے چہرے بشرے سے ایسی کوئی بات واضح نہیں ہورہی تھی۔ کیلاش کی توقع کے خلاف اس میں کوئی مصنوعی یا مبالغہ آمیز تپاک نہیں تھا۔ کیلاش کہہ رہا تھا' اس کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ وہ کوشلی کے لیے کیا رویہ اختیار کرے اور کوشلی کے کسی مثبت رویے کا کیا جواب دے؟ کوشلی اب یہاں موجود رہے۔ آج نہیں تو کل کسی وقت جج صاحب کی وصیت کا ذکر آئے گا۔ پھر کیلاش کو کوشلی پر کیا ظاہر کرنا چاہیے؟
میں اسے کیا بتا سکتا تھا تاہم اس کی خاطر عزیز تھی۔ جو کچھ وہ کہتا رہا' میں سر جھکائے پوری تن دہی سے سنتا رہا اور میں نے چاہا بھی کہ اس کی گراں باری کم کرنے کے لیے جھوٹے سچے لفظ کہوں مگر کون سے لفظ؟ پھر وہ خود ہی خاموش ہوگیا۔ اس کا غبار یوں ہی کم ہوگیا۔ اسے اندازہ ہوگیا کہ میں کیا' کوئی بھی اس نازک معاملے میں سرسری رائے نہیں دے سکتا۔ ہوسکتا ہے' اسے خیال آگیا ہو کہ ایسے وقت مجھ سے کسی رائے کی توقع فضول ہے۔ ہم دونوں زورا' شاموا اور جگنو کے پاس دالان میں رکھی ہوئی آرام کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میرا دماغ بھٹکنے لگا تھا۔ کیلاش کو شاید کوئی شافی جواب مطلوب بھی نہ تھا۔ اسے تو اپنا اظہار مقصود تھا۔ کبھی کبھی سامنے کی بات میری نظروں سے اوجھل ہوجاتی ہے۔ مجھ دیر فہم کو بعد میں احساس ہوا کہ کیلاش تو یوں مجھے ٹوکنا اور ٹٹولنا چاہتا ہے۔ اس رات اس نے مجھ پر اعتبار کرکے' مجھے کوئی واسطہ سمجھ کے اپنی جاں سوزی کا جو حال بتایا تھا اور کوئی عرض گزاری تھی' میں نے اس طرف کچھ توجہ کی یا نہیں؟ میرے جی میں آئی اسے صاف بتادوں کہ کوئی واسطہ کام نہیں آتا۔ آدمی اپنی سفارش آپ ہوتا ہے۔ اسی رات مجھے موقع مل گیا تھا اور میں نے کیلاش کا احوال جولین کو منتقل کرنے میں شاید کوئی کوتاہی نہیں کی تھی۔ میں کیلاش کو بتا سکتا تھا کہ اس رات جولین سے کیا بات ہوئی تھی۔ یہ سب کچھ سن کے تو وہ تمام ہوجاتا۔ اس کی آواز کی تپش میں نے اپنے رگ و ریشے میں محسوس کی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں میں کدورت کا اندھیرا سا اڈا تھا کہ میں نے خود کو ملامت کی۔ میں بھول گیا کہ کیلاش تو ایک مجبور آدمی ہے۔ وہ کوشلی کی آمد پر اپنی وحشت کا اظہار کرکے مجھ سے کسی ہمدردی کا خواہاں ہے تو کیا غیر فطری ہے۔ ایسے عالم میں وقت کی موزونی ناموزونی کا کیسے ہوش رہتا ہے۔ اس تلاطم میں' میں ہی اس کے لیے ایک کنارہ ہوں۔ میرے سوا چارہ گری کے لیے اس کے سامنے پھر اور کون ہے مگر میں اس کے لیے کیا کرسکتا تھا۔ کوئی بھی کچھ نہیں کرسکتا۔ ہرچند جولین نے مجھ سے کہا تھا۔ اگر میری یہی خواہش ہے تو اس کے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ پھر کہنے سننے کو کیا رہ گیا تھا۔ میں جانتا ہوں' وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ میرا اشارہ ہی کافی ہوتا مگر کوئی کسی کو یہ حکم کیسے صادر کردے۔ کسی کو ایسے ایثار کی آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہیے۔
دو سے اوپر ہوچکے تھے۔ ایک دوسرے کمرے میں نرسوں کا انتظام کیا گیا۔ کمپاؤنڈر بھی جاگتا رہا۔ شیوا کچھ دیر کے لیے اوپر' اپنے گھر گیا تھا کہ واپس آگیا۔ دونوں ڈاکٹر اور نرسیں وقفے وقفے سے مارنی کے کمرے میں آتے جاتے رہے

تھے۔ کیلاش دیر سے خاموش تھا۔ ہم دونوں ابھی دالان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یکایک ایک نرس مضطربانہ انداز میں مارٹی کے کمرے سے برآمد ہوئی اور برابر کے کمرے میں چلی گئی۔ کیلاش فوراً اٹھ گیا۔ اس کے ساتھ میں بھی اٹھا۔ زورا' شامو اور جگنو سبھی نے مارٹی کی چیخ سنی تھی۔ ہم سب اس کے کمرے کی طرف دوڑے' برابر کے کمرے سے دونوں ڈاکٹر بھی لپکے۔ ان کی ساتھ ہم بھی اندر جانا چاہتے تھے کہ ایک ڈاکٹر نے ہمیں روک دیا۔ اندر سے مارٹی کے کراہنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ کوئی اجنبی سنتا تو اس کا سینہ بھی پھٹنے لگتا۔ مارٹی شدید تکلیف میں تھا۔ زورا چوکھٹ سے سر پھوڑنے لگتا۔ شامو اور جگنو نے اسے تھاما اور کمرے سے دور لے گئے۔ دروازے پر اب ڈاکٹرز کی دیوار حائل نہیں تھی۔ میں اندر جاسکتا تھا مگر وہیں کھڑا مارٹی کی آہیں سنتا رہا۔ کیلاش اور شیوا' دونوں ڈاکٹر اور نرسیں اندر موجود تھے۔ رفتہ رفتہ مارٹی کی کراہیں کم ہونے لگیں' پھر خاموشی چھاگئی اور کیلاش' شیوا کے ساتھ باہر نکلا۔ میرا گلا خشک ہوگیا تھا۔ میں نے پھٹی ہوئی آنکھوں سے کیلاش کو دیکھا.... میں نے کچھ پوچھنا چاہا مگر میری زبان پتھرا گئی۔ میرا سارا جسم پتھر کا ہوگیا تھا۔

"کوئی ایسی بات نہیں" اس نے میرا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔ "پہلی رات ذرا بھاری ہوتی ہے۔ اس کی بے ہوشی ختم ہوگئی تھی اور درد جاگنے لگا تھا۔ ضروری غذا میں اور دوا میں پلا کے اسے پھر سوئی لگادی گئی ہے۔"

"سب ٹھیک تو ہے نا؟" میں نے جھرجھراتی آواز میں پوچھا۔

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں' خدا سے بہتری کی امید کرنی چاہیے۔" اس نے جلدی سے کہا۔ اس کے لہجے میں زور نہیں تھا۔ میں نے خود کو دلاسا دیا کہ اس کی وجہ تھکن بھی ہوسکتی ہے اور ڈاکٹر تو ویسے ہی محتاط لہجے کے عادی ہوتے ہیں۔ کیلاش نے موضوع بدل کے مشورہ دیا کہ بہتر ہے ہم سب اب گھر چلے جائیں۔ یہاں ہمارے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔

"اپنے کو جانے سے بھی کیا ہے ڈاکٹر صاحب!" شامو تندی سے بولا۔

کیلاش نے نرمی سے اسے سمجھایا کہ کئی ڈاکٹر اور نرسیں یہاں موجود ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ ممکن نہیں ہے۔ ہم لوگ صبح تک آرام کرکے پھر واپس آسکتے ہیں۔ وہ سب میری طرف دیکھنے لگے۔ میں خود بھی جانا نہیں چاہتا تھا لیکن زورا' شامو اور جگنو کے خیال سے میں نے کہا کہ ہاں' جیسا تم کہتے ہو' ٹھیک ہے۔ زورا پھر بھی آمادہ نہیں ہوا۔ اس سے ضد کرنا بے کار تھا۔ میں' شامو اور جگنو کو لے کے کلینک سے نکل آیا۔ کیلاش بھی ہمارے ساتھ باہر آیا۔ ہم نے بہت منع کیا لیکن اس کے اصرار پر ہمیں اس کی موٹر میں بیٹھنا پڑا۔ گھر کے دروازے پر ہمیں پہنچا کے وہ فوراً واپس چلا گیا۔

راستے بھر وہ چپ بیٹھا رہا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ کسی لمحے کہیں وہ مجھ سے پوچھ نہ لے کہ سب سے پہلے اسے اطلاع کیوں نہیں دی گئی۔ اس وقت یہ ممکن نہیں تھا تو رات گئے تک اسپتال یا اس کے گھر ہم کسی قاصد کو بھیج سکتے تھے۔ اگر ڈاکٹر ڈیسائی طلب نہ کرتا تو شاید اسے خبر بھی نہ ہوتی۔ کیلاش نے ایسی کوئی شکایت نہیں کی' نہ اس نے مارٹی کے زخم کا سبب جاننے کی جستجو کی۔ جیسے اسے معلوم ہو کہ سب کچھ کس طرح پیش آیا ہوگا۔ ہوسکتا ہے' ڈاکٹر ڈیسائی' شیوا یا زورا اور شامو میں سے کسی نے اسے کچھ نہ کچھ بتادیا ہو۔ خود اس نے بھی زخم کی نوعیت دیکھی تھی تاہم اس نے مجھے کسی مشکل میں نہیں ڈالا۔ اسے اب جاننا بھی کیا تھا۔ سب کچھ تسلسل سے اس کے سامنے ہی ہورہا تھا۔ کوئی عرصہ نہیں گزارا' کانتے کے دریدہ جسم کا وہ عینی شاہد تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کانتے کس وجہ سے جاں بر نہ ہوسکا اور پیرو کو گولی کیوں لگ گئی۔ پیرو کی ارتھی کے اژدحام میں کون لوگ بین کررہے تھے اور شہر میں کیسے کیسے فسانے عام ہورہے تھے۔ کسی نے کیا اسے نہیں بتایا ہوگا کہ پیرو' ماہم کی چوکی پر بیٹھنے والا' بمبئی کا سب سے بڑا دادا تھا۔ کیلاش تناسب و توازن کا آدمی تھا۔ اسے اچھی طرح شدبد تھی کہ دوستوں سے اتنے ہی سوال کرنے چاہئیں جتنوں کے وہ جواب دے سکیں۔ باقی اس نے اپنے طور پر تشریح کرلی ہوگی۔ ممکن ہے' اسے یہ بھی احساس ہو کہ جو کچھ ہوا' اس میں میری یا کسی اور کی نیت کا دخل نہیں تھا۔ اس نے میرے یا زورا اور شامو وغیرہ کے بارے میں کوئی بدگمانی نہیں کی ہوگی۔

سارے گھر پر سناٹا چھایا ہوا تھا مگر شاید کوئی بھی نہ سویا ہوگا۔ ہم عقبی راستے سے اندر داخل ہوئے۔ دیوا ہماری آہٹ پر کمرے سے باہر نکل آیا۔ میں' جگنو اور شامو کے ساتھ انہی کے کمرے میں لیٹ گیا لیکن وہاں میرا جی نہیں لگا۔ میں اٹھ کے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ صبح کاذب کے وقت شاید چند لمحوں کے لیے میری آنکھ لگی تھی کہ میں ہڑبڑا کے اٹھ گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری ذرا سی غفلت سے کوئی بڑا نقصان ہوجائے گا۔ میرا جاگتے رہنا ہی ٹھیک ہے۔ بیداری میں آدمی امید کا پہرا تو دے سکتا ہے' کچھ

اور نہیں تو آدمی دعا تو کر سکتا ہے۔ میرا سارا جسم دکھ رہا تھا اور سینے میں ہوک سی اٹھتی تھی جیسے موت آرہی ہو۔ موت آجائے تو آدمی کو قرار آجاتا ہے مگر یہ اذیت تو موت سے بھی شدید ہوتی ہے۔ یہ تو بار بار کی موت ہے۔ آدمی کا جسم' قد کا ٹھ' چوڑا چکلا سینہ' مضبوط ہاتھ پیر' علم' منصب' مال و زر' ارادے' خواہشیں' خواب' سارے سراب ہیں۔ یہ طلسم ٹوٹتا ہے تو ساری حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ آدمی تو ریت کے ڈھیر پر کھڑا ہے اور آدمی تو بس ریت کا بنا ہوا ہے۔ اکارت زندگی موت کے برابر ہے' بے بسی' موت سے بڑی اذیت ہے' کہتے ہیں جو شخص دوسروں کے لیے کچھ نہیں کر سکتا' وہ مردہ آدمی کے مترادف ہے اور کہتے ہیں صرف اپنے لیے زندگی کوئی زندگی نہیں ہے مگر آدمی زندگی کا مختار ہی کتنا ہے اور موت پر بھی اسے کس قدر اختیار ہے۔ موت بھی اتنی آسانی سے نہیں آجاتی۔ کاش ایسا ہوا کرتا کہ مال و زر سے اپنے غریب اور نادار عزیزوں اور رفیقوں کی اعانت کی طرح لوگ اپنے اپنے وقت اور اپنی اپنی عمروں کی اعانت پر بھی قادر ہوا کرتے۔ اگر ایسا ہوتا تو ایک میں ہی نہیں' گھر کا ہر فرد اپنے حصے کی کچھ عمر مارٹی کو نذر کرنے میں کوئی تامل نہ کرتا۔ معلوم نہیں' کتنا سچ ہے' کتنا جھوٹ ہے۔ بابر بادشاہ کے متعلق مشہور ہے' اس نے اپنے جواں سال جاں بلب بیٹے ہمایوں کے لیے دعا مانگی تھی کہ خدا اس کی زندگی کے بدلے ہمایوں کو زندگی دے دے۔ خدا نے اس کی دعا قبول کرلی۔ ابا جان اپنی بے اندازہ دولت مارٹی پر نچھاور کرنے کے لیے آمادہ تھے۔ کیلاش کے بہ قول' اس سے زیادہ کچھ ممکن نہیں ہے۔ اس سے زیادہ ایک ہی بات ممکن تھی' بابر اور ہمایوں والی صورت۔ مجھ بے حیثیت اور بے ہنر کے پاس اپنی جان کے سوا کچھ نہیں تھا لیکن خدا کو بھی ایک مجہول اور معطل آدمی سے کیا غرض ہو سکتی ہے۔ وہ تو بادشاہ اور شہزادے کا معاملہ تھا۔ میں تو کسی گنتی میں نہیں آتا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو بہت ٹٹولا' کریدا کہ میری نیت میں کون سا نقص اور میرے ارادے میں کیا کمی ہے؟ آدمی اپنے لاشعور کے فتور سے واقف نہیں ہوتا' خود کو دھوکا دیتا رہتا ہے۔ یقیناً میری خواہش میں کوئی آلودگی ہوگی جو اسے سودا منظور نہیں تھا۔

دھوپ کمرے میں اتر آئی تھی۔ میں آنکھیں کھولے بستر پر پڑا رہا۔ آنکھیں بند کرنے سے مجھے ڈر لگنے لگتا تھا۔ کسی نے دروازے پر دستک نہیں دی۔ کوئی آیا بھی ہوگا تو میرے آرام کی خاطر بند دروازے سے لوٹ گیا ہوگا۔ کئی بار میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا لیکن اس خوف نے مجھے باندھے ا... جکڑے رکھا کہ نیچے کوئی اچھی خبر تو میری منتظر ہوگی نہیں... دیوار پر گھڑی نے نو بجائے تو میرے لیے کمرے میں ٹھ... مشکل ہوگیا۔ میں چوروں کی طرح نیچے آیا۔ سب سے ... مجھے فریال دکھائی دی۔ اس کے چہرے کا ٹھہراؤ دیکھ کے م... سانسیں استوار ہوئیں۔ فرخ بھی وہیں کہیں ستون کی آڑ... تھی' میری آہٹ سن کے وہ سامنے آگئی۔ دونوں میری طر... اٹھ کے آئیں اور میں نے بے اختیار انہیں اپنے پہلو... سمیٹ لیا۔ فرخ کی زبانی معلوم ہوا کہ ابا جان صبح ہی شامو' جگنو اور دیوا کے ساتھ کلینک گئے تھے' ابھی ابھی وا... آئے ہیں۔ جگنو اور شامو تو وہیں رہ گئے ہیں' دیوا آگیا... ان سے کچھ پوچھنا مناسب نہ معلوم ہوا۔ میں نے ان دو... سے کہا کہ ابھی واپس آتا ہوں اور دیوا کے کمرے کا رخ... وہ مجھے راستے ہی میں مل گیا۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی آواز میں... کہ مارٹی نے رات بہت تکلیف میں گزاری ہے۔ ... کی دواؤں کے باوجود وہ وقفے وقفے سے چیختا چلاتا رہا۔ البتہ اسے کچھ سکون آگیا۔ نرسیں' ڈاکٹر کیلاش اور دوسر... ڈاکٹر رات بھر جاگتے رہے۔ ڈاکٹر ڈیسائی بھی نیچے تھا۔ ... ڈاکٹر بھی مارٹی دیکھنے آئے تھے۔ دیر تک وہ اس کے کمر... میں رہے۔

میں وہیں سے کلینک نکل جانا چاہتا تھا کہ فرخ... دروازے پر مجھے روک لیا۔ اس کا لہجہ قطعاً حاکمانہ تھا'... لگی کہ ناشتا کیے اور کپڑے بدلے بغیر میں کہیں نہیں جا... گا۔ میں سنی ان سنی کرکے نکل جاتا لیکن فرخ نے کہا ک... گیتا اور جولین بھی میرے ساتھ کلینک جارہی ہیں۔ میں ... کو سمجھا سکتا تھا کہ سر دست کلینک جانے سے کیا حاصل... مارٹی کو تو اپنی سدھ بدھ ہی نہیں ہے' وہ اسے دیکھ کے پریشان ہوں گی' مگر مجھے ٹھہر جانا پڑا۔ اس کی وجہ یہ نہیں... کہ جواباً فرخ بھی مجھ سے یہی کچھ کہہ سکتی تھی۔ جولین کا... سن کے میرے اندھیرے وجود میں کوئی چراغ سا روشن ہ... ٹوٹکے بھی کبھی کارگر ہو جاتے ہیں۔ جولین کی صورت میں... دور دراز امکان ہے تو کسی پس و پیش کا وقت نہیں ہے۔ فرخ کے ساتھ اندر چلا آیا۔ انہوں نے پہلے سے سارا ا... کر رکھا تھا' ناشتے اور کپڑوں کا۔ فرخ کی ہدایت پر میں... جلدی جلدی غسل کیا اور کپڑے بدلے۔ پراٹھے کے نوا... نہیں نگلے جارہے تھے لیکن فرخ پھر ضد کرنے لگی۔ میں... تھوڑا بہت ناشتا زہر مار کیا۔ چائے بھی پی۔ اتنی دیر... بھورے رنگ کی ساڑھی پہنے جولین اور فرخ کی طرح کر...

تنگ مہری کے پاجامے اور دوپٹے میں ملبوس گیتا بھی اندر آگئیں۔

کلینک کے دروازے پر ہاتھ سے لکھا ہوا گتے کا بورڈ آویزاں تھا۔ انگریزی میں لکھا ہوا تھا کہ تا اطلاع ثانی کلینک بند ہے' صرف زیر علاج مریض کمپاؤنڈر سے رابطہ کرکے دوا بنوا سکتے ہیں۔ جیسے ہی ہماری موٹر رکی اور دربان کی نظر ہم پر پڑی' اس نے چھوٹا دروازہ کھول دیا۔

مارٹی کے کمرے میں جانے کی ممانعت تھی۔ فرخ' گیتا اور جولین کو نرسوں کے لیے مخصوص کیے گئے کمرے میں انتظار کرنا پڑا۔ میں' زورا اور شامو وغیرہ کے ساتھ بیٹھا رہا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہمیں اندر جانے کی اجازت ملی۔ دونوں ڈاکٹر باہر آگئے تھے۔ یہ دونوں وہی تھے جن سے رات کیلاش نے میرا تعارف کرایا تھا۔ مجھے دیکھ کے وہ سیدھے میری طرف بڑھے۔ ان میں سے ایک نسبتاً سن رسیدہ ڈاکٹر نے انگریزی میں مجھ سے کہا "بہتر ہوگا کہ خواتین اندر جاکے ضبط و حوصلہ رکھیں۔ وہ اس وقت ہوش میں ہے لیکن غنودگی کی حالت میں۔"

"اب' اب کیسا ہے؟" میں نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بتائیں آپ کو؟" وہ گہری سانس بھر کے بولا۔

"کیوں' ایسی کیا بات ہے ڈاکٹر صاحب؟" میرا سر گھومنے لگا "مجھے صاف بتائیے۔"

"صرف زخم کا معاملہ نہیں ہے۔"

"پھر! اور... اور کیا ہے؟"

"اور بھی پیچیدگیاں ممکن ہیں۔"

"اور کیا ڈاکٹر صاحب!" میں نے سراسیمگی سے کہا۔

"یہاں ایکس رے کے آلات قریب قریب ناکارہ ہوچکے ہیں۔ کچھ دیر میں بہر حال یہاں تمام انتظامات ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر بھارگو کا خیال ہے' ہمیں کئی ایکس رے لینے پڑیں گے۔"

"کیوں؟ اس کی ضرورت کیوں ہے؟"

"شبہ ہے کہ اس کے دیگر جسمانی نظام بھی متاثر ہیں" ڈاکٹر کسمساتے ہوئے بولا۔

"کیا مطلب؟ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"صورت یہ ہے جناب کہ اس کی آنتوں میں سوزش کا مرض بھی خارج از امکان نہیں۔ اس کے سینے کا بھی ایکس رے لیا جائے گا' ممکن ہے وہ السر زدہ ہو۔"

جولین' گیتا اور فرخ میرے عقب میں سمٹی ہوئی کھڑی تھیں۔ "ہمیں ٹھیک سے بتائیے گا ڈاکٹر صاحب!" یکایک جولین نے آگے آکے مداخلت کی معذرت کی اور شکایتی لہجے میں بولی "اس حادثے سے پہلے اسے کوئی مرض نہیں تھا۔ وہ تو بالکل ایک نارمل آدمی تھا۔"

ڈاکٹر سنبھل سا گیا۔ جولین اس سے انگریزی میں مخاطب تھی۔ "تب تک اس کی قوت مدافعت اچھی تھی" ایک لمحے کے توقف کے بعد ڈاکٹر نے نرمی سے جواب دیا۔

"آپ کچھ چھپا تو نہیں رہے؟" جولین سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔

"نہیں میڈم!" ڈاکٹر نے شائستگی سے کہا "سچ تو یہ ہے' ابھی صاف طور سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ آج سویرے ہم اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہمیں کسی دوسری خرابی کی طرف بھی نظر رکھنی چاہیے۔ زخم بے شک بہت گہرا تھا۔ خون بھی بہت نکل گیا تھا لیکن یہ ایسا پیچیدہ معاملہ نہیں تھا جتنا ہوتا جارہا ہے۔"

"پھر ڈاکٹر صاحب!" میری آواز ڈگمگانے لگی۔

"خدا پر بھروسا رکھیے اور یقین کیجیے' جس قدر ممکن ہے' ہم سب کر رہے ہیں۔"

"مگر ڈاکٹر ڈیسائی نے پہلے اس طرف..." جولین اضطراری نظروں سے میری طرف دیکھ کے کچھ کہتے کہتے چپ ہوگئی۔

"ڈاکٹر ڈیسائی کے پاس چارہ بھی کیا تھا۔ عام حالات میں ڈاکٹر' مریض کے مختلف معائنے کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ڈیسائی کو زخم کی رفوگری فوراً کرنی چاہیے تھی اور انہوں نے مشاقی سے یہ کام انجام دیا۔"

میں گم صم ڈاکٹر کی صورت دیکھتا رہا۔ جولین بھی مبہوت کھڑی تھی۔ ڈاکٹر نے میرا شانہ تھپکا اور جانے کیا کیا رسمی لفظ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

مارٹی کے کمرے میں جاتے ہوئے میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے' دبے قدموں ہم اندر داخل ہوئے۔ خون کی بوتل ابھی تک اسٹینڈ پر لٹک رہی تھی۔ دو نرسیں اندر موجود تھیں اور ایک طرف مارٹی بستر پر دراز تھا۔ ہم چاروں اس کے سامنے چپ کھڑے تھے۔ مارٹی کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ ایک دن میں وہ بالکل ہی بدل گیا تھا۔ نرسیں ہمارے قریب آگئیں اور ایک سرگوشی میں بولی "ابھی کچھ سکون ہے ورنہ رات تو..."

وہ اپنا جملہ مکمل نہ کرسکی تھی کہ مارٹی کی پلکوں میں ارتعاش ہوا اور اس کے چہرے پر شکنیں پڑ گئیں "مارٹی! مارٹی!" میں نے بہت دھیمی آواز میں اسے مخاطب کیا "یہ میں

ہوں، تمہارا۔"

اس کی آنکھیں کھل گئیں اور اس کی بے قرار پتلیاں ادھر ادھر گھومتی ہوئی میرے چہرے پر آ کے ٹھہر گئیں۔ جیسے وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو اور اس نے مجھے پہچان لیا ہو، اس کی آنکھیں ٹمٹمانے لگیں "دیکھو، دیکھو۔ کون آیا ہے، یہ فرخ، گیتا اور۔ اور جولین بھی۔"

مارٹی کے جسم میں اضطراب کی لہر اٹھی۔ اس نے اٹھنا چاہا لیکن دوسرے لمحے وہ پسپا ہو گیا۔ مجھے شبہ ہوا، انہوں نے شاید اس کا جسم باندھ دیا ہے یا اس میں کچھ بھی طاقت نہیں رہی تھی۔ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ وہی مارٹی ہے جو کم و بیش کل اسی وقت چاقو کھولے چوکڑیاں بھر رہا تھا۔ پل میں پینترا بدل لیتا تھا۔ لگتا تھا، سب جھوٹ ہے۔ کوئی موذی خواب دیدوں سے چمٹ کے رہ گیا ہے۔ فرخ اور گیتا نے لرزتے ہونٹوں سے اسے سلام کیا اور مسکرانے کی کوشش کی۔ پشیمان اور پریشان مسکراہٹ۔ مارٹی کی آنکھیں ایک ثانئے کے لیے بند ہوئی تھیں پھر کھل گئیں۔ وہ ممنونیت کا اظہار کرنا چاہتا تھا یا اپنی اذیت کا حال بیان کرنا، مگر اسے گویائی کا یارا ہی نہ تھا۔ اس کے ہونٹ سسک کے رہ گئے۔ کہتے ہیں، اپنوں کو سرہانے دیکھ کے مریض کا دل بڑھتا ہے مگر اپنے ہی ویران ہوں تو مریض تو اور ہلکان ہو جاتا ہو گا۔ مارٹی کو صبر و ہمت کی تلقین کے لیے پہلے مجھے خود کو استوار کرنا چاہیے تھا۔ چارہ گری بھی ایک ہنر ہے۔ ہر چارہ گر کو ہمیشہ اپنے آنسو چھپانے اور شگفتگی اور امید کا تاثر دینے کے دشوار مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے حالانکہ جو تسلی اور دلاسے کے سوا کچھ نہ کر سکتے ہوں، ایسے چارہ گروں کا مریض پر اثر ہی کتنا ہوتا ہو گا۔

بستر کے اس طرف کھڑی ہوئی جولین کی آواز پر میں چونک پڑا۔ وہ جولین ہی تھی۔ اس نے بکھرے ہوئے لہجے میں کہا "ہر کوئی تمہارے لیے دعا کر رہا ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ برا وقت بھی۔۔" جولین نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

مارٹی کو کوئی شبہ تھا کہ جولین اس سے مخاطب ہے۔ وہ پلکیں پٹپٹانے لگا اور اس کی آنکھیں جلنے بجھنے لگیں۔ طمانیت، شوق، امید، حسرت دیا اس کی جانے کیسی کیسی کیفیتیں ایک لمحے میں اس پر طاری ہوئیں۔ پھر گھٹا سی اس کے چہرے پر امڈ آئی۔ یقیناً اپنی ناتوانی اور محرومی کا احساس مارٹی پر غالب آ گیا تھا۔ اس کے نتھنے پھول گئے، وہ بچوں کی طرح منہ بسورنے لگا۔ میرا دل بھی بھر آیا تاہم جولین کے سلسلہ جنبانی سے کچھ میری ہمت بڑھی۔ بستر پر اس کے بازو میں بیٹھ کے میں نے کہا "تم تو لڑتے ہی رہے ہو، یہ مقابلہ بھی تمہیں جیتنا ہے اور۔ اور تم ضرور جیتو گے" میری زبان نے ساتھ نہیں دیا۔ میری آواز جھرجھرا رہی تھی۔ میں نے جھک کے اس کی پیشانی چوم لی اور چادر ہٹا کے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں جکڑ لیا۔

بستر کے دوسری جانب فرخ اور گیتا نے بھی میری تقلید کی اور انہیں بھی معلوم ہو گیا کہ مارٹی کے ہاتھ تو بندھے ہوئے ہیں۔ جولین بے حس و حرکت نظریں نیچی کیے، گم کھڑی تھی۔ مارٹی کی نگاہیں بار بار اس کے چہرے پر بھٹکتی تھیں۔ آنکھیں بند کرتا اور کھولتا تھا، جیسے یقین کر رہا ہو کہ جولین اس کے سامنے ہے اور خواب سے تعبیر جدا نہیں ہے خواب بجائے خود تعبیر ہے اور تعبیر بجائے خود خواب۔ مارٹی کا یہ حال دیکھ کے میرا جسم اکڑنے لگا تھا۔ اپنی کم نگاہی، غصہ، اپنی کج فہمی کی ندامت۔ مارٹی تو بہت کچھ چھپائے ہوئے تھا۔ یہ تو عالم ہی کچھ اور تھا۔ کوئی کتنا ہی کرب و نزع سے دوچار ہو مگر یہ تو تارِ نفس کی بات ہے اور ماورائے جسم معاملہ ہے۔ ہر آدمی کی استقامت بہ قدر ظرف ہوتی ہے۔ ایک طویل اندھیری رات کے بعد اپنے کسی گم گشتہ خواب کی تعبیریوں جلوہ گر ہو، کوئی یوں رگِ جاں چھیڑ دے تو آدمی بکھر ہی جائے گا۔ مارٹی کا پیمانہ چھلک رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں مارٹی کے بستر پر دراز ہوں۔ اس کی آنکھیں، میری آنکھیں اور اس کا چہرہ، میرا چہرہ ہے اور میری رگوں سے چنگاریاں سی لپکتی ہیں اور شگوفے سے پھوٹتے ہیں۔ میں ہواؤں میں اڑ رہا ہوں اور میرا وجود تو تار تار ہے۔

مارٹی کی لرزتی پلکیں بھیگنے لگی تھیں۔ یہ کسی آسودگی کے آنسو تھے یا بے چارگی کے یا دونوں کے۔ اس کی سینے میں رہ رہ کے تموج سا اٹھتا تھا۔ وہ کچھ کہہ نہ سکتا تو کراہنے لگتا اور کراہیں دبانے کی کوشش کرتا تو اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو جاتا۔ نرس نے مجھے اشارہ کیا کہ اس طرح تو ہم اسے پریشان کر رہے ہیں۔ دونوں نرسیں درمیان میں آ گئی تھیں۔ انہوں نے مارٹی کی چادر درست کی اور پیشانی چھو کے دیکھی۔ انہوں نے زبان سے کچھ نہیں کہا لیکن ان کا مدعا ظاہر تھا۔ میں اور بیٹھا رہتا لیکن میں اکیلا نہیں تھا، اور شاید مارٹی اس آزمائش کا متحمل بھی نہیں تھا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ میں یہیں ہوں، زورا، شامو، جگنو اور دیوا بھی۔ ڈاکٹر کیلاش کا۔۔۔ میری نگاہ بے اختیار جولین کی طرف گئی اور میں نے مارٹی سے کہا "گھر میں سبھی تمہارے منتظر ہیں۔ تمہاری دیکھ بھال کے لیے ہر کوئی یہاں آنے کے لیے بے چین ہے" میں اور بھی کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن جیسے کسی نے مجھے روک لیا۔

مارٹی کی پتلیاں اس کی ویران آنکھوں میں بھٹکتی رہیں اور اس کے ہونٹ پھڑکتے رہے۔

○☆○

میں نے مارٹی سے کہا تھا کہ میں کلینک میں موجود ہوں لیکن میرا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ فرخ، گیتا اور جولین کے ساتھ میں گھر واپس آ گیا۔ دوپہر کو جگنو اور دیوا کھانا لینے کے لیے آئے تو ان کے چہرے نسبتاً کھلے ہوئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ مارٹی نے نہایت خاموشی سے وقت گزارا ہے اور ڈاکٹروں نے اس کے متعدد ایکسرے لیے ہیں۔ ناشتے دان لے کے وہ فوراً واپس چلے گئے۔ فرخ اور جولین نے دسترخوان پر کھانا چن دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ کھانا کھا کے میں کلینک ہی کی طرف چلا جاؤں گا اور بیشتر وقت وہیں رہوں گا لیکن کھانا کھانے کے بعد آنکھیں مچنے لگیں۔ کچھ دیر کمر ٹکانے کے ارادے سے میں اوپر کمرے میں آ گیا اور ایسی آنکھ لگی کہ شام تک کچھ ہوش ہی نہ رہا۔ کسی نے مجھے جگایا بھی نہیں۔ چھ بج رہے تھے۔ دھوپ چھتوں پر چلی گئی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر میں جلدی جلدی نیچے آیا تو جیسے اندھیرے سے روشنی میں اور دھوپ سے سائے میں پہنچ گیا۔ فرخ کی زبانی معلوم ہوا کہ ابا جان، منیر علی اور مولوی اکرم کلینک سے خاصے مطمئن واپس آئے ہیں۔ گھر میں جگنو اور دیوا وغیرہ میں سے کوئی نہیں تھا۔ چائے پی کے میں نے ایک لمحے کی تاخیر بھی نہیں کی۔

سڑکوں پر اندھیرا اتر رہا تھا لیکن ابھی روشنیاں نہیں جلی تھیں۔ مجھے ایسی جلدی نہیں تھی۔ میں خود کو بہت ہلکا پھلکا لگ رہا تھا۔ میانہ رفتاری سے میں نے راستہ طے کیا، مجھے امید تھی کہ کلینک جا کے اچھی ہی خبر سننے کو ملے گی۔

یہی ہوا، دروازے سے جگنو، شامو، زورا اور دیوا مجھے دکھائی دیے۔ ان کی چستی اور ترو تازگی دیکھ کے میرا سینہ اور کشادہ ہوا۔ زورا کی آنکھیں بھی خوب چمک رہی تھیں۔ شامو نے مجھے بتایا کہ کیلاش نے ان کے لیے ایک الگ کمرے کا انتظام کر دیا ہے۔ اس کے اصرار پر شامو اور زورا دوپہر کے کھانے کے بعد دو گھنٹے کے قریب سوتے رہے۔ ڈاکٹر کیلاش کا نام ان کے ورد زبان تھا۔ ان کے کہنے کے مطابق کیلاش صرف دو ڈھائی گھنٹے کے لیے صبح گھر گیا تھا۔ اتنی سی دیر میں اس نے کیا آرام کیا ہو گا۔ ساری رات وہ جاگتا رہا ہے۔ وہ بار بار مارٹی کے کمرے میں جاتا ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی دونوں ڈاکٹر اور نرسیں بھی پوری توجہ دے رہے ہیں۔ رات کو ٹھہرنے والے دونوں ڈاکٹر جا چکے ہیں۔ ان کی جگہ دوسرے آ گئے ہیں۔ کیلاش ابھی تک موجود ہے۔ کیلاش اس وقت مارٹی کے کمرے میں تھا۔ میں اندر جا سکتا تھا لیکن ایک تو ڈاکٹروں کی موجودگی میں میری مداخلت نامناسب تھی، دوسرے جانے کیوں مجھے مارٹی کا سامنا کرتے ہوئے خوف آ رہا تھا۔ میں باہر بیٹھا کیلاش کا انتظار کرتا رہا۔ وہ چند منٹ بعد ہی باہر آ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کس طرح اس کا شکریہ ادا کروں۔ ہر ایک سے شکرگزاری کا اظہار نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے میرے بازو جکڑ لیے اور کہنے لگا "کیسے ہیں آپ! معلوم ہوا، آپ لوگ صبح آئے تھے؟"

"صبح تو نہیں" میں نے مسکرا کے کہا "دوپہر اور صبح کے درمیان کہو۔ گیتا، فرخ اور جولین بھی ساتھ تھیں۔"

"میں اس وقت گھر گیا تھا" وہ معذرت کے انداز میں بولا۔

"تمہیں جانا چاہیے تھا۔"

"جانا تو کیا چاہیے تھا" وہ ترشی سے بولا "ادھر اسپتال میں ایک مریض کے سلسلے میں ہدایت دینی تھی۔ اسے ایک دوسرے ڈاکٹر کی نگرانی میں دے کے میں گھر کی طرف نکل گیا اور وہاں کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے ہی ٹھہرا ہوں گا۔"

"کوشلی کیا کہتی ہوں گی۔"

"وہ کیا کہتی، کچھ بھی کہے" اس کے لہجے میں تندی آ گئی۔

"مجھے تو رما کی فکر تھی۔ سچ پوچھئے تو کوشلی کے آ جانے کے بعد وہ اور اکیلی ہو گئی ہے۔ پہلے یہ حال تھا کہ کوشلی کبھی آ جاتی تھی تو گھر میں چہل پہل ہو جاتی تھی۔ رما کے تو شب و روز اسی کے ساتھ گزرتے تھے۔ وہی کوشلی اب ایسی اجنبی لگتی ہے۔ رشتے بھی کیسے مشروط ہوتے ہیں۔ کچھ رما کو مطمئن کرنا تھا اور کپڑے وغیرہ بدلنے تھے، اس لیے گھر جانا پڑا۔"

"رما تو، اس کا مطلب ہے، بہت الجھ رہی ہو گی۔"

"نہیں، بالکل نہیں۔ میں نے اسے ساری بات، ساری صورت حال سمجھائی تو وہ بے چین ہو گئی۔ کہنے لگی کہ مجھے کلینک میں زیادہ سے زیادہ وقت دینا چاہیے۔ کہہ رہی تھی، کوشلی نہ آتی تو وہ بھی کلینک آ کے ہاتھ بٹاتی۔ وہ بھی تو ایک ڈاکٹر ہے۔"

"ہاں ہاں، بالکل" میں نے تذبذب سے تائید کی "میرا خیال ہے، کیوں نہ رما اپنی مہمان کے ساتھ جولی اور فرخ کے پاس چلی جائیں۔ وہاں ان کا دل لگا رہے گا۔"

"کوشلی ساتھ نہ ہوتی تو میں رما سے یہی کہتا" وہ تلخی آمیز ادا سے بولا "مگر اسے ایک طرح کا احساس ملکیت

کہیے یا خود غرضی' رما سے میری بات تو نہیں ہوئی لیکن رما بھی نہیں چاہے گی کہ آپ کے گھر' ہمارے دوسرے گھر کو شلی بھی دخیل ہو۔ آپ سمجھ رہے ہیں؟"

"ہاں ہاں" میں نے بے سوچے سمجھے سہلا دیا۔

"رشتے تو ملکیت ہوتے ہیں۔ کو شلی کو اس اثاثے کا حصے دار بنانا یا اس سے رفاقت کی کوئی نئی فضا قائم کرنا کس حد تک مناسب ہے' یہ آپ سمجھ سکتے ہیں۔ وہ وہاں جائے گی اور سب سے ملے گی تو وہ تو بالکل۔۔۔" وہ رک گیا اور جھجکتے ہوئے بولا "یہ تو حوصلہ افزائی ہے' کوئی اور وقت ہوتا تو ٹھیک تھا لیکن اب۔۔۔ اب یہی بہتر ہے کہ کو شلی جلد از جلد پونا واپس چلی جائے۔"

میں سوچتا رہا کہ کیا رائے زنی کروں۔ چند ثانیوں کے شش و پنج کے بعد میں نے پوچھا "کچھ معلوم ہوا' کو شلی کیوں آئی ہیں؟"

"کہتی ہے' وہاں پونا میں بہت منتشر تھی۔ ہو سکتا ہے' یہی کچھ ہو" وہ تنک کے بولا "مگر مقصد تو واضح ہے' اس کے سوا اور کیا۔۔۔" وہ جھنجلا سا گیا اور خفت زدہ مسکراہٹ سے بولا۔ "جانے دیجیے۔ یہ ذکر ہی تکلیف دہ ہے۔ آپ بتائیں' اس وقت تو آپ خوب ترو تازہ نظر آ رہے ہیں۔"

"ہاں" میں نے ہنس کے کہا "تیمار دار بھی مریض سے بندھے ہوتے ہیں۔ سنا ہے' اب اس کا حال کچھ ٹھیک ہے۔"

"یقیناً! خدا کرے ایسا ہی رہے۔"

کیلاش کی آواز میں بے ساختگی نہیں تھی "ایکس رے رپورٹ آ گئی؟" میں نے بے کلی سے پوچھا۔

"ابھی نہیں لیکن ڈاکٹر بھارگو کا اندازہ ہے کہ اس کا سینہ متاثر ہے۔ السر بھی' شاید وہ۔ ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

"مگر اب تو' اب تو وہ سکون سے ہے۔"

"یہ ایک اچھی علامت ہے۔ یہ ہماری توقع سے زیادہ ہے۔ کاش ہمارے تمام خدشات غلط ہوں۔ مارٹی ایک عمدہ نوجوان ہے۔ بہت پیارا' سادہ اور معصوم۔ مجھے تو وہ پہلے سے پسند ہے۔ اس کی آنکھیں چمکتی رہتی ہیں اور ان میں ہمیشہ ایک تپاک ہوتا ہے گو میری اس سے بات چیت کم ہوئی ہے لیکن جب بھی وہ ملا' جی چاہا اس سے دوبارہ بھی مڈبھیڑ ہو۔ میں نے دیکھا ہے' وہ ہر دم کچھ سوچتا رہتا ہے اور سامنا ہونے پر چونک پڑتا ہے۔ ابھی تو مارٹی کو دنیا دیکھنی ہے۔ اسے زندہ رہنا ہے' زندہ رہنا چاہیے۔"

"اس نے پہلے تو کبھی کسی بات کی شکایت نہیں کی۔ یہ اچانک اتنی بہت سی چیزیں۔۔۔" میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور مجھے یاد آیا' یہی بات صبح جولین نے ایک ڈاکٹر سے کہی تھی۔ اس نے جو جواب دیا تھا' وہی کچھ کیلاش نے کہا کہ اس وقت مارٹی کی قوت مدافعت بہتر تھی۔

میرے چہرے پر اٹھتا ہوا غبار دیکھ کے کیلاش مجھے سمجھانے لگا "میرا مقصد محض آپ کو حقیقت سے آگاہ کرنا ہے' کچھ اور نہیں۔ ہمیں پوری امید ہے کہ ہم اس کے بڑھتے ہوئے ممکنہ خطروں پر قابو پا لیں گے۔ باقی تو وہی ایک آخری بات ہے کہ سب کچھ کسی اور کے ہاتھ میں ہے" میں چپ رہا تو وہ موضوع بدل کے بولا "کو شلی نہ ہوتی تو میں آپ سے کہتا کہ آپ گھر چلے جائیں اور کچھ وقت رما کے ساتھ گزاریں مگر ایسا ہوتا تو رما خود یہاں آ جاتی۔ یقین کیجیے' وہ بار بار آپ کا ذکر کرتی تھی' آپ کا حال پوچھتی تھی۔ اس نے کہا بھی تھا کہ ہو سکے تو انہیں یہاں بھیج دوں۔ میں نے منع کر دیا کہ اس وقت نہ بابر بھائی آ سکیں گے' نہ کو شلی کی موجودگی میں تم ڈھنگ سے ان کا ساتھ دے سکو گی۔"

ہم دونوں چند قدم دور لان میں رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے اور کیلاش نے مجھ سے پوچھا "چائے کیوں نہ پی جائے؟" میں نے انکار کیا نہ اقرار۔ اس نے کمپاؤنڈر کو آواز دے کے چائے لانے کی ہدایت کی۔ میری نگاہیں مسلسل مارٹی کے کمرے کے دروازے پر مرکوز تھیں۔ ہم نے ابھی چائے ختم نہیں کی تھی کہ ایکس رے رپورٹ آ گئی۔ کیلاش مجھ سے معذرت کر کے ڈاکٹروں کے لیے مخصوص کمرے میں چلا گیا۔ میرے پاس شامو اور زورا آ کے بیٹھ گئے۔ مارٹی کے کمرے میں خاموشی تھی۔ نرسیں آتی جاتی رہیں۔ کلینک کی ساری روشنیاں جلا دی گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد کیلاش' ڈاکٹر شیوا کے ساتھ کمرے سے نکلا۔ اس کے ہاتھ میں وہی بڑے بڑے لفافے تھے جو ہرکارہ چند منٹ پہلے لایا تھا۔ میری طرف دیکھے بغیر شیوا اور کیلاش اوپر کی منزل کی طرف چلے گئے اور آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا۔ میرے جسم میں کانٹے اگنے لگے تھے۔ اس دوران میں دو مرتبہ میں مارٹی کے کمرے میں جھانک آیا تھا۔ وہ سکون سے تھا۔ نرسوں نے بھی ہاتھ کے اشارے سے مجھے یہی بتایا۔ کیلاش اور شیوا نیچے نہیں اترے تھے کہ سانولی رنگت کا ایک پستہ قد' بھاری بھر کم' معمر اور مستعد شخص کلینک کے دروازے پر نمودار ہوا اور سیدھا ڈاکٹروں کے کمرے میں چلا گیا۔ اس کی آمد پر شامو اور زورا کھڑے ہو گئے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ یہی ڈاکٹر بھارگو ہے۔ وہ ہماری طرف سے گزرا تو زورا' شامو' جگنو اور دیوا کے ساتھ میں نے بھی اسے سلام کیا۔ اس نے سر کی خفیف جنبش سے جواب دیا اور اوپری منزل جانے والی سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ وہ چاروں سراسیمہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے تاہم ڈاکٹر بھارگو جلد ہی نیچے آ گیا۔ اس کے پیچھے کیلاش بھی تھا۔ اس بار کیلاش میری طرف دیکھنا نہیں بھولا اور آنکھوں آنکھوں میں تحمل کی تلقین کرتا ہوا ڈاکٹر بھارگو کے ساتھ مارٹی کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ پھر ڈاکٹر بھارگو کو کلینک کے دروازے پر رخصت کر کے ہی وہ میرے پاس آیا اور میرے کسی استفسار سے پہلے اس نے پژمردگی سے بتایا "ڈاکٹر بھارگو کا اندازہ درست تھا۔"

میری آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے" وہ جلدی سے بولا "شکر ہے' دونوں امراض درجے کے اعتبار سے ابتدائی مرحلے میں ہیں۔ ان پر قابو پایا جا سکتا ہے" اس کی آواز الجھ گئی' کہنے لگا "ایکس رے کے علاوہ ہم نے رطوبت اور دیگر چیزیں بھی ٹیسٹ کے لیے بھیجی تھیں۔ ان کی رپورٹ ذرا دیر سے آتی ہے لیکن ڈاکٹر بھارگو کی ہدایت پر تمام کام نہایت عجلت سے کیے گئے۔ احتیاطاً ہم نے پہلے جو دوائیں تجویز کی تھیں' وہی جاری رہیں گی۔ ڈاکٹر بھارگو نے البتہ چند دواؤں کا اور اضافہ کیا ہے۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ مارٹی سکون سے ہے حالانکہ ہم نے خواب آور دواؤں کی مقدار کم کر دی تھی' آگے اور کم کر کے دیکھیں گے۔ جیسا کہ میں نے آپ سے کہا تھا' ڈاکٹر بھارگو کی رائے بھی یہی ہے کہ مارٹی کا اعصابی سکون توقع سے کہیں سوا ہے اور بہت خوش آئند ہے۔"

مجھے ایسا لگا جیسے میں کوئی بچہ ہوں جسے کیلاش بہلا رہا ہے۔ میں نے اس سے جرح نہیں کی۔ جرح کا محل بھی کیا تھا۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ رات کے کھانے کا انتظام شیوا کی طرف سے کیا گیا تھا۔ ٹھیک نو بجے جگنو اور دیوا بھی گھر سے کھانا لے آئے' اور اتنا کھانا ہو گیا کہ کیلاش' شیوا' دونوں ڈاکٹرز' نرسیں اور ہم پانچوں کے بعد بھی بچ رہا۔ میرا ارادہ تھا کہ ساری رات کلینک میں رہوں گا۔ کیلاش ہے تو مجھے بھی وہیں ٹھہرنا چاہیے لیکن گزشتہ رات کے طرح گیارہ بجے سے اس نے مجھے ٹوکنا شروع کر دیا۔ اس عرصے میں مارٹی کے کمرے سے کوئی آہ اور کراہ بلند نہیں ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ کیلاش اور شیوا کے چہروں پر طمانیت کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ میں یہ سوچ کے پھر اٹھ گیا کہ کیلاش کا ساتھ میں اتنا نہیں دے سکوں گا جتنا میری موجودگی اس کا دھیان بٹائے رہے گی۔ بہتر ہے کہ اس کی ساری توجہ مارٹی پر مرکوز رہے۔

زورا نے پھر گھر جانے سے انکار کر دیا۔ دیوا کو اس کی دسراہٹ کے لیے چھوڑ کے' ایک بجے کے قریب میں' شامو اور جگنو کے ساتھ گھر چلا آیا۔ ساری رات ایسے ہی کٹ گئی' کبھی آنکھ لگ جاتی' کبھی کھل جاتی۔ جگنو اور شامو کا بھی یہی حال تھا۔ صبح میں جلدی گھر سے نکل جاتا لیکن مجھے بتائے بغیر شامو منہ اندھیرے کلینک ہو آیا تھا۔ پھر صبح ہونے پر ابا جان اور منیر علی بھی وہاں گئے اور تمتماتے چہروں سے واپس آئے۔ جیسے مجھے کوئی شبہ تھا اور تبھی یقین آیا جب میں نے خود کلینک جا کے تصدیق کر لی۔ مارٹی' اس وقت سو رہا تھا۔ اسے جگانے کے بجائے میں دبے قدموں کمرے سے لوٹ آیا۔ کیلاش وہاں نہیں تھا لیکن شیوا موجود تھا۔ اس کے لہجے کے اعتماد اور اطمینان سے میں نے خود کو اور توانا محسوس کیا۔ گھر سے چلتے وقت ابا جان نے ایک ایسا کام میرے سپرد کر دیا تھا جو مجھے بالکل نہیں آتا تھا مگر دوسرے اور کام بھی مجھے کتنے آتے تھے۔ ابا جان کے حکم کی تعمیل میں مجھے آدھے گھنٹے کے اندر گھر واپس آنا پڑا۔ میں جانتا تھا' ابا جان کا مقصد محض مجھے مصروف رکھنا ہے۔ عمارت کے عقبی حصے میں دیگیں چڑھی ہوئی تھیں۔ ابا جان کی ہدایت تھی کہ جیسے ہی کھانا تیار ہو جائے' میں دیگیں یتیم خانوں اور جھونپڑیوں کے علاقے میں پہنچانے کے کام کی نگرانی کرتا رہوں۔ سارے انتظامات موجود تھے۔ مولوی اکرم کے علاوہ وہاں پہلے سے کئی لوگ دیکھ بھال کر رہے تھے۔ میں تو بس کھڑا دیکھتا رہا۔

بٹھل کو گئے دو دن ہو چکے تھے۔ آج یا کل کسی وقت اس کی واپسی کا امکان تھا۔ اچھا یہی تھا کہ وہ جلد از جلد واپس آ جائے۔ بٹھل کو سرہانے دیکھ کے مارٹی کو اور تقویت ہو سکتی تھی۔ میں نے دوپہر کا کھانا سب کے ساتھ گھر ہی میں کھایا۔ کھانے کے بعد چمپا بیگم مصلے پر بیٹھ گئی اور فرخ' فریال' فارہہ' شہ پارہ اور ریحانہ آیت کریمہ کا ورد کرتی رہیں' اکبر بھی ان کے ساتھ تھا۔ اتنے بہت سے لوگ مارٹی کے لیے دعا کر رہے تھے۔ فرخ' فریال' ریحانہ اور اکبر نے تو کبھی کسی کو نقصان پہنچایا بھی ہو گا تو نادانستگی میں پہنچایا ہو گا۔ خدا کو ان کی صدا ضرور سننی چاہیے تھی۔

شام تک میں گھر ہی رہا۔ دوپہر کو جگنو اور دیوا کھانے کے لیے آئے تھے تو مارٹی کا حال بتا گئے تھے اور چراغوں کی لو تیز کر گئے تھے۔ جگنو کی زبان نسبتاً خوب چلتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی تگ و دو میں تھے کہ کون پہلے نوید سنائے۔ جگنو ہی غالب رہا۔ ہانپتی ہوئی آواز

میں اس نے بتایا کہ مارٹی کافی دیر سے ہوش میں ہے اور آرام سے ہے۔ کہنے لگا کہ کوئی گھنٹے بھر پہلے ڈاکٹر بھارگو اسے دیکھ کے گیا ہے۔ ڈاکٹر کے بت جیسے چہرے سے کچھ اندازہ ہی نہیں ہو پاتا تھا کہ مریض کی کیفیت کیا ہے لیکن آج وہ بھی کچھ مختلف دکھائی دے رہا تھا۔ برآمدے میں ڈاکٹر کیلاش، شیوا اور ان کے ساتھی ڈاکٹروں سے دیر تک باتیں کرتا رہا۔ اس نے ان کے ساتھ چائے بھی پی۔

سہ پہر کو پھر میں اوپر کے کمرے میں چلا گیا اور اس مسافر کے مانند مجھے ٹوٹ کے نیند آئی جسے دور کہیں منزل کا نشان نظر آگیا ہو اور وہ تازہ دی کے لیے کسی چھاؤں میں بیٹھ جائے۔ شام کو جب اندھیرا پھیل گیا، تب میری آنکھ کھلی۔ میں اٹھ کے نیچے آیا تو ملاقاتی کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ یہ کمرا عموماً مرد مہمانوں کے لیے مخصوص تھا مگر جب سے مارٹی اسپتال گیا تھا، وہ سب زیادہ تر یہیں بیٹھی رہتی تھیں۔ میں اندر چلا گیا اور تقریباً وہ سبھی مجھے ایک دوسرے کمرے میں مل گئیں۔ باہر سے ان کی چہکتی چٹکتی آوازیں آرہی تھیں۔ میں مارٹی کی خیر خبر کی جستجو میں ادھر آیا تھا لیکن اب کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں وہاں سے لوٹ جاتا لیکن میرے قدم غیر ارادی طور پر دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ انہیں اپنی آمد کی اطلاع دینے کے لیے فرخ کو پکارتا ہوا میں کمرے میں داخل ہوا تو سب نے مجھے گھیر لیا۔ فرخ کہنے لگی کہ میری عمر بہت بڑی ہے۔ وہ میرا ہی ذکر کر رہی تھیں۔ میں نے شگفتگی سے کہا "میری برائیاں کی ہوں گی" وہ کھل کھلا پڑیں اور فرخ ناز بردارانہ لہجے بولی کہ مارٹی کے گھر آجانے پر کیوں نہ سب کہیں دور کسی پہاڑی مقام پر چلیں۔

فرخ کے لہجے میں ناز و اشتیاق بھی تھا، حسرت و یاس بھی اور تکان بھی شامل تھی۔ اپنی سکت سے زیادہ کوئی کتنا دیکھ اور سن سکتا ہے۔ وہ تو مسلسل تماشے دیکھتی رہی تھیں اور خود تماشا بنی رہی تھیں۔ میرے گھر سے اچانک غائب ہوجانے کے صدمے سے وہ کسی قدر سنبھلی ہوں گی کہ امی جدا ہوگئیں۔ آبائی گھر چھوٹا اور ابا جان ایک شہر سے دوسرے شہر، آج یہاں کل وہاں، خانہ بدوشوں کی طرح انہیں گھمائے پھرتے رہے۔ فہمیدہ روٹھ گئی، جہانگیر بچھڑ گیا اور ابا جان ایک اجنبی گھر انہیں چھوڑ کے ایسے سفر پر روانہ ہوگئے جہاں سے واپسی قسمت کی یاوری کے بغیر ممکن نہ تھی۔ جانے کتنی منتوں مرادوں کے بعد انہیں ایک ساتھ کئی خوشیاں نصیب ہوئی تھیں، ابا جان کی واپسی، میری بازیابی اور جہاں گیر کے مل جانے کا مژدہ۔ انہوں نے جانا ہوگا کہ اندھیری رات اب ختم ہوگئی۔ خدا نے ان کی سن لی ہے مگر انہیں کتنے دن فرصت ملی تھی۔ کانتے، پیرو اور اب مارٹی۔۔۔ وہ تو مسلسل جلتی بجھتی رہی تھیں۔ سفر تو وقت سے کم، فاصلوں سے کم، راستوں سے زیادہ عبارت ہے۔ کس کے ساتھ راستے کس طرح پیش آئے۔ ابا جان کے لعل و جواہر سے لدے ہوئے صندوق کیا کیا تلافیاں کرسکتے تھے اور مجھ پر تو ان کے بہت سے قرض تھے۔ ساری عمر چکاؤں تو ادا نہ ہوسکیں۔ سب سے زیادہ خود غرضی تو میں نے کی تھی۔ میں انہیں چھوڑ کے چلا گیا تھا۔ اس رات کسی مجرم کے مانند میں گھر سے یوں فرار نہ ہوتا تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ یہ محل جیسا عظیم الشان گھر، ان کے اپنے گھر کا بدل نہیں تھا۔ اس میں امی نہیں تھیں، فہمیدہ نہیں تھی اور بھی بہت کچھ نہیں تھا۔ انہیں کون بتاتا کہ جب بھی وہ میرے سامنے آتی ہیں، میرے سینے میں کیسی ہوک اٹھنے لگتی ہے۔

جتنا فرخ نے ناز و شوق سے کہا تھا، اتنی شدت سے میں نے تائید کی "ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ ضرور چلیں گے مگر کہاں؟"

"یہ تو آپ طے کریں" وہ مچل کے بولی۔

"کشمیر چلیں؟" میں نے پوچھا۔

"کہیں بھی۔" فرخ جھجکتے ہوئے بولی۔

"لوگ کہتے ہیں۔ کشمیر تو کوئی گوشۂ فردوس ہے۔"

"خدا کرے، مارٹی بھائی جلدی گھر آجائیں۔" فارہہ نے دعائیہ لہجے میں کہا۔ "ہم انہیں بھی لے چلیں گے۔"

"چلیں گے تو سبھی چلیں گے" فرخ تیزی سے حتمی انداز میں بولی۔

"کشمیر کا تو موسم ہوتا ہے" یکایک جولین نے چپکے سے کہا۔

میری نظر کئی بار جولین کے چہرے پر گئی تھی۔ وہ اتنی دیر سے بالکل چپ بیٹھی تھی جیسے کوئی خواب کی باتیں سن کے مسکراتا ہے یا خیالی پلاؤ سن کے۔ جولین کی زیر لب مسکراہٹ سے مجھے کچھ اسی تاثر کا گمان ہوا اور پشیمانی سی ہوئی۔ میں نے کہا "کشمیر تو ہر موسم میں کشمیر ہے۔ برف کا بھی اپنا ایک لطف ہے۔ بہت سے لوگ تو بطور خاص برف باری کے موسم میں جاتے ہیں۔"

جولین کو شاید میرے لہجے کی تندی محسوس ہوگئی تھی جبھی اس نے نظریں جھکالیں۔ فریال کہنے لگی کہ اتنے لوگ ٹھہریں گے کہاں؟ ہوٹل یا سرائے کے بجائے کچھ دن کے لیے کوئی گھر مل جائے تو بہت اچھا ہو۔"

میں نے انہیں بتایا "وہاں کشتیوں میں بھی گھر ہوتے ہیں، بڑے بڑے سجے سجائے گھر۔ انہیں ہاؤس بوٹ کہا جاتا ہے۔"

"سنا ہے، ان کشتی گھروں میں دنیا کی ہر چیز موجود ہوتی ہے۔ بالکل چھوٹے موٹے جہازوں کی طرح ہوتے ہیں" شہ[illegible]رہ چہکتی آواز میں بولی۔

"پھر تو مہنگے بھی زیادہ ہوتے ہوں گے" مولوی اکرم کی [illegible]بی ریحانہ نے دیدے پٹ پٹاتے ہوئے کہا۔

"دیکھنا؟ ابا جان ایسا ہی کوئی گھر لے لیں گے" اکبر وثوق سے بولا۔

میرے جی میں آیا، کہوں کہ ابا جان کی کیا بات ہے، وہ تو [ک]چھ بھی حاصل کرسکتے ہیں۔ کشتی کیا، پورا جہاز خرید لیں۔ وہ تو [س]اری جھیل، سارا دریا خرید سکتے ہیں۔ وہ طرح طرح خیال [آ]رائیاں کرتیں، منصوبے باندھتی رہیں۔ جیسے کل ہی [س]فر درپیش ہو۔ اتنی دیر میں گیتا اندر جاکے چائے کا طشت لے [آئ]ی۔ گیتا اب بہت سنبھلی ہوئی، ٹھہری ہوئی لگتی تھی۔ اسے [اس]ی طرح گھر میں شامل دیکھ کے مجھے بہت اچھا لگا۔ چائے کے [س]اتھ پاپڑ بھی تھے۔ چائے پی کے میں ملاقاتی کمرے میں آگیا۔ [جو]لین نے مجھ سے کہا تھا کہ بہتر ہے، میں کپڑے بدل کے ہی [ک]ہیں باہر جاؤں۔ وہ اس قسم کی ہدایتیں دیتی رہتی تھی۔ [می]رے کپڑے خاصے اجلے تھے مگر سونے کی وجہ سے مل مل [کے] مکلف کرتے پر جا بہ جا شکنیں پڑ گئی تھیں۔ ملاقاتی کمرے [می]ں مجھے آئے چند منٹ ہوئے ہوں گے، جولین نئے کپڑے لے کر آگئی۔ دوسرے ملحق کمرے میں جاکے میں نے لباس [تب]دیل کیا اور کنگھا کرکے دوبارہ ملاقاتی کمرے میں آیا تو وہ [وہ]یں موجود تھی۔ میں ٹھہر گیا "کلینک جارہے ہو؟" اس نے [دھ]یمی آواز میں پوچھا۔

"ہاں" میں نے مختصر جواب دیا۔

"تمہاری کچھ ڈاک آئی ہے۔"

"ڈاک!" میں نے حیرت سے کہا "میری ڈاک؟"

"خط تو تمہارے ہی نام ہیں۔"

"کس کے خط ہیں؟"

"نہیں معلوم، میں نے کھول کے نہیں دیکھے۔"

مجھے بے چینی ہونے لگی "مگر کب، کب آئے یہ؟"

"پرسوں، جب ہم لوگ پرانے گھر گئے تھے۔"

"پرسوں آئے تھے" میں نے الجھ کے کہا "مگر تم نے کوئی [ذک]ر نہیں کیا۔"

"تم گھرے ہوئے اتنے تھے کہ۔۔۔"

میں نے جھپٹتے انداز میں اس کے ہاتھ سے خط لے لیے۔ وہ دو لفافے تھے۔ ایک مٹیالا، دوسرا نیلے رنگ کا۔ دونوں پر میرا نام اور جولین کے گھر کا پتا لکھا تھا۔ جانے کیوں میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے اوپر والا لفافہ جلدی سے چاک کیا۔ اندر نیلے دبیز کاغذ کا رقعہ تھا، دونوں طرف لکھا ہوا۔

"کس کا خط ہے؟" جولین نے تجسس سے پوچھا۔

"فیض آباد سے آیا ہے" میں نے گہری سانس بھر کے کہا۔ "اور بٹھل بھائی کے لیے ہے۔"

"زریں بہن کا خط ہے۔" وہ دمکتی آواز میں بولی "مگر لفافے پر تو تمہارا نام لکھا ہے، کیا لکھا ہے؟"

میری مضطرب نظریں رقعے پر منڈلاتی رہیں اور چند لمحوں میں، میں نے سارا رقعہ پڑھ لیا۔ وہ زریں کی تحریر تھی۔ ایک ایک لفظ ترشا ہوا اور اٹھا ہوا سا۔ زریں کا سراپا میری آنکھوں میں مجسم ہوگیا جیسے وہ کسی شہزادی کے مانند اپنا مخصوص سفید لباس پہنے سامنے کھڑی ہو۔ سفید اور ہلکے رنگوں سے اسے خاص مناسبت ہے۔

اس نے بٹھل کو، اپنے باوا کو مخاطب کیا تھا اور تسلیم و تعظیم کے بعد شکایت کی تھی کہ اتنے دنوں سے کسی کا خط نہیں آیا۔ منیر علی کے خط پابندی سے ملتے رہے تھے لیکن یہ پندرہواں دن ہے۔ انہوں نے بھی خاموشی اختیار کرلی ہے۔ میرے سوا زریں نے نام بہ نام سب کو سلام لکھا تھا اور لکھا تھا، کاش میں بھی بمبئی میں ہوتی تو شاید ان کے کسی کام آسکتی۔ کچھ اور نہیں تو ان کی دل جوئی کی کوشش تو کرسکتی تھی۔ اپنی عادت کے مطابق زریں نے اپنے بارے میں کچھ نہیں لکھا تھا۔ حویلی کا ذکر بھی سرسری طور پر کیا تھا۔ مجھے اندازہ تھا، کوئی ایسی ویسی بات ہوگی بھی تو اس نے سفر میں بٹھل کے پریشان ہوجانے کے خیال سے اپنے آپ تک محدود رکھی ہوگی۔ اپنے حصار میں رہنے میں اسے کمال حاصل ہے۔ جہانگیر کے لیے اس نے لکھا تھا کہ اپنی بہنوں اور بھائی سے ملنے کی بے قراری کے باوجود، شکر ہے، وہ اپنی تعلیم پر پوری توجہ دے رہا ہے۔ نیساں بہت سنجیدہ ہوگئی ہے۔ اسے پڑھانے کے لیے ایک اور استاد کا اضافہ کردیا گیا ہے۔ نیساں اور جہاں گیر میں شوق علم کا جیسے کوئی مقابلہ ہورہا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو زچ کردینے کے درپے ہیں۔ سر جھکائے جس طرح کوئی شکوہ سنجی کرے، زریں نے دبے دبے لہجے میں بٹھل سے مطالبہ کیا تھا کہ گھر میں کسی بڑے کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ بٹھل کے آنے میں کچھ دیر

ہے تو کم از کم منیر علی کو فیض آباد بھیج دیا جائے۔ ان کی بیٹیاں زہرہ اور سلمیٰ' بیٹا مجو اور بھانجا ارشد زبان سے کچھ نہیں کہتے تو کیا ہوا' محسوس تو کیا جا سکتا ہے' انہیں منیر علی کا انتظار ہے' ہونا بھی چاہیے۔ یہ نیا ماحول اور نیا گھر ان کے لیے بالکل اجنبی نہیں رہا ہے۔ بہ ظاہر وہ سب بہت خوش و خرم نظر آتے ہیں لیکن منیر علی کی طویل غیر حاضری انہیں دلگیر کر سکتی ہے۔ اس نے لکھا تھا' میں اپنی طرف سے پوری کوشش کرتی ہوں لیکن ہر دم یہ احساس فکرمند کیے رہتا ہے کہ کوئی چوک نہ ہو جائے۔ انہیں زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ ادھر زمینوں کے کئی کام بھی منیر علی کے نہ ہونے کی وجہ سے ادھورے پڑے ہیں۔ زریں نے خانم کے بارے میں پوچھا تھا کہ آخر خانم کے واپس آنے میں اب اور کتنی مدت رہ گئی ہے۔ یقیناً منیر علی نے ابا جان کے نو خرید محل کا قصیدہ بھی لکھا ہوگا' جبھی زریں نے اسے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا تھا۔ اس نے الگ سے جولین کا ذکر کیا تھا اور بٹھل کو تاکید کی تھی کہ وہ جولین کو فیض آباد ضرور ساتھ لائے۔

آخر میں زریں نے لکھا تھا کہ بٹھل کی فرمائش پر اس نے کان پور سے پیٹے کا اچار اور چوک لکھنؤ سے حقے کا درجہ اول تمباکو منگوایا تھا۔ سنا ہے' بلاقی کا یہ تمباکو دور دور تک مشہور ہے۔ اچار تو اب کسیانے لگا ہے' بارشوں کی وجہ سے۔ اس مرتبہ مسلسل بارشیں ہوتی رہیں۔ پھول پھلواری خوب آئی۔ لکھا تھا کہ صحن کی کیاریوں میں اس نے گلاب کے پودے لگائے تھے' ان میں رنگ برنگے پھول کھل رہے ہیں۔ بعض تو بالشت بھر کے ہیں۔ رات کی رانی بھی خوب کھلی ہوئی ہے' رات بھر ساری حویلی مہکائے رکھتی ہے۔

ایک بار پڑھنے کے بعد میری سیری نہیں ہوئی۔ جس طرح ٹھہر ٹھہر کے اس نے ساری باتیں لکھی تھیں' مجھے بھی اسی طرح پڑھنا چاہیے تھا۔ اس کی تحریر اس کی تصویر تھی۔ نرم و نازک' شستہ و شائستہ۔ یوں تو لفظ سبھی کو آتے ہیں' کسی کو کم' کسی کو زیادہ لیکن یہ کیا ہے کہ کسی کے لفظوں سے رس ٹپکتا ہے' خوش بو پھیل جاتی ہے' روشنی سی بکھر جاتی ہے اور کبھی یہی لفظ رگ و پے میں زہر بھر دیتے ہیں' آگ سی لگا دیتے ہیں۔ کہتے ہیں لفظوں کا ہنر اپنی جگہ' انہیں برتنے کا سلیقہ ہی اصل ہنر ہے مگر یہ تبھی کارگر ہوتا ہے جب اظہار' ظاہر و باطن کی ضد نہ ہو۔ ورنہ لفظ تو پتھر ہیں' چاہے کتنے ہی ترشے ہوئے ہوں' کتنے ہی سجے ہوئے ہوں۔ لفظوں کی ترکیب و ترتیب تو احساس کی پابند ہے۔ دل کا حال رقم کرتے ہوئے ہنر کی اتنی ضرورت نہیں پڑتی۔ لفظ تو خود سانچے وضع کر لیتے ہیں۔ زریں کا خط مختلف کیفیات کا آمیزہ تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے ابھی کچھ پڑھنے اور اخذ کرنے سے رہ گیا ہے' سو میں نے خط دوبارہ پڑھا اور گرد و پیش سے ایسا غافل ہوا کہ کمرے میں مجھے جولین کی موجودگی کا بھی خیال نہ رہا۔ اس نے مجھے ٹوکا تو میں چونک پڑا "کیا بات ہے' خیریت تو ہے نا؟" جولین نے بے تابانہ پوچھا۔

"ہاں ہاں" میں نے کٹی پھٹی آواز میں کہا "سب ٹھیک ہے۔"

"کیا لکھا ہے' زری نے؟"

"تم خود دیکھ لو" میں نے رقعہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"تم تو کچھ کھوئے گئے تھے" وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

"ہاں!" میں نے بوجھل آواز میں کہا "بس ایسے ہی ساری حویلی نظروں میں گھوم گئی' تمہارے بارے میں بھی اس نے کچھ لکھا ہے؟"

"میرے بارے میں؟" وہ مضطرب ہو کے بولی "کیا لکھا ہے؟"

"لکھا ہے کہ تم سے ملنے کی اسے بہت آرزو ہے۔"

"مجھے بھی" جولین نے بے ساختہ کہا "اس کی آواز تمتمانے لگی" میں نے زریں کے بارے میں اتنی باتیں سنی ہیں کہ ایک تصویر سی ذہن میں اس کی بن گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس تصویر سے بھی اچھی ہوگی۔"

"وہ بہت عجیب ہے" میں نے آنکھیں میچ کے کہا "آدمی اپنے وصف سے ممتاز ہوتا ہے۔ آدمی' آدمی کا فرق ہی یہ ہے کہ کون کتنا بڑا درخت' کتنا بڑا سایہ اور کتنا بڑا آشیانہ ہے۔ میں نے کہیں سنا تھا کہ آدمی مظاہر فطرت کی طرح ہوتے ہیں' درخت' ہوا' پانی' بادل وغیرہ کی طرح۔ زریں کسی درخت کی مثال ہے جو اپنی جگہ قائم ہے اور سایہ بخشتا رہتا ہے جو اپنی جگہ سے تبھی ہٹتا ہے جب اسے کاٹ دیا جائے۔ کچھ لوگ بادل ہوتے ہیں' کچھ ہوا کے مانند اور کچھ پانی کی طرح۔۔۔ رواں' ٹھہرے ہوئے' دریا' جھیل' سمندر کی طرح۔۔۔ اور دیکھا جائے تو زریں پانی کے مانند بھی ہے۔"

"تم نے کتنی اچھی بات کہی ہے۔"

"میں نے نہیں' سچ پوچھو تو مجھ سے وضاحت ہی نہیں ہو پائی۔ مجھے یاد آیا' وہ ایک پروفیسر تھا جس سے قتل ہو گیا تھا۔ جیل میں اس نے مجھ سے ایسا کچھ کہا تھا۔ شاید زریں اس کی مناسب مثال ہے اور وضاحت بھی۔"

"یقیناً" جولین نے انگریزی میں کہا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ کہنے لگی "کانتے بھائی بھی زریں کے لیے یہی کچھ کہتے تھے۔ کہتے تھے' جولی! تم نے زریں کو نہیں دیکھا' اس کے سر پہ بس ایک تاج کی کمی ہے۔ کئی بار میں نے ارادہ کیا کہ خود فیض آباد چلی جاؤں لیکن موقع ہی نہیں آیا۔"

"اب سب چلیں گے" میں نے سر جھٹک کے کہا "کیسی بات ہے' ہم ابھی کشمیر جانے کی باتیں کر رہے تھے۔ کسی کو خیال ہی نہیں رہا کہ پہلے تو سب کو فیض آباد چلنا چاہیے۔"

"مجھے یاد تھا لیکن میں چپ بیٹھی رہی۔"

"کیا زریں کے بغیر کشمیر چلیں گے؟" میں نے تنک کے کہا۔

"میں یہی سوچتی تھی کہ تم نے زریں کا نام کیوں نہیں لیا؟"

"بس ایسے ہی" میں نے خجالت سے کہا "کچھ دھیان ہی نہیں رہا۔"

"تمہیں حویلی بہت یاد آتی ہے؟" وہ تجسس آمیز لہجے میں بولی۔

"حویلی کیا!" میں نے بکھری ہوئی آواز میں کہا "اس دن کوئی کہہ رہا تھا کہ مکان تو مکینوں سے ہوتے ہیں۔"

"میری مراد بھی یہی ہے۔"

مجھ سے کچھ نہ کہا جا سکا۔

"زریں نے تمہارے بارے میں کیا لکھا ہے۔"

"کچھ بھی نہیں۔"

"اس سے پہلے کہ میں کوئی جرات کرتا" جولین تیزی سے بولی "اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ تمہارا نام لفافے پر لکھا ہے تو ظاہر ہے' تم ہی اس کے مخاطب ہو۔"

"یہ بھی ایک رعایت ہے' سبھی ایسی رعایتیں مجھے دیتے ہیں۔"

"ایسا کیوں کہتے ہیں" وہ کسی قدر ترشی سے بولی اور معاً اس نے پٹ پٹاتی پلکوں سے میرے ہاتھ میں دبے ہوئے دوسرے لفافے کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں ہاں" میں نے اضطراری انداز میں کہا۔ زریں کے ذکر میں' یہ دوسرا لفافہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔

میں نے دھڑکتے ہاتھوں سے اسے چاک کیا۔ سفید کاغذ پر وہ چند سطری تحریر تھی' شکستہ خط میں لکھی ہوئی۔ میرے دل کی حرکت معدوم ہونے لگی۔ میری نظر پہلے نواب ثروت یار کے نام پر گئی۔ متن پڑھتے ہوئے میری آنکھوں میں دھند اتر آئی۔ رسمی سلام و دعا کے بعد لکھا تھا۔

"جس مقصد کے لیے آپ نے غریب خانے پر آنے کی زحمت فرمائی تھی' اس بارے میں اب اس کی کوئی صورت نکلی ہے۔

مناسب ہوگا' اگر آپ فی الفور حیدر آباد تشریف لائیں' نیاز مند۔"

میرا سارا جسم منجمد ہوگیا اور مساموں سے پسینہ پھوٹنے لگا۔ جولین صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیا بات ہے؟" اس نے بے قراری سے پوچھا۔

میری پھٹی ہوئی آنکھیں رقعے پر جمی ہوئی تھیں اور مجھے چکر سا آرہا تھا۔ جولین نے رقعہ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ اس نے کرشنا جی کی موت کے بعد باقاعدہ اردو پڑھنی شروع کی تھی اور اسے اچھی اردو آگئی تھی لیکن نواب کا خط شکستہ تحریر میں تھا' اسے دشواری ہوئی۔ میں نے لڑکھڑاتی زبان سے خط کا متن اسے بتانے کی کوشش کی۔ وہ بھی گنگ ہوگئی' پھر منتشر لہجے میں بولی "تمہیں جانا چاہیے' تمہیں فوراً جانا چاہیے۔"

"کب' کب ملا تھا تمہیں یہ خط؟" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"پرسوں کی بات ہے' پرسوں ہی تو ہم لوگ گھر گئے تھے۔"

"اور' اور وہاں کب آیا تھا؟"

"اسی روز' میں نے خود پوسٹ مین سے لیا تھا۔ البتہ زری بہن کا خط ایک روز پہلے آیا تھا۔ زری کا خط مجھے نوکرانی نے دیا تھا۔ اگر ہم وہاں اس دن نہ پہنچ پاتے تو دونوں خط وہ دوسرے دن یہاں بھیج دیتی' اسے یہی ہدایت کی گئی ہے۔ میں نے خط اس لیے تمہیں نہیں دیے کہ کوئی بات ہوئی تو تم اور پریشان ہوجاؤ گے' یہی ہوا لیکن مجھے افسوس ہے' مجھے یہ خط اسی روز تمہیں دے دینے چاہیے تھے۔"

میرا دماغ کام نہیں کررہا تھا۔ میں بت کی طرح کھڑا رہا۔

"مگر کیا' کیا تم مارٹی کو اس حالت میں چھوڑ کے کہیں جاسکتے ہو؟" وہ بے ترتیبی سے بولی "شاید نہیں لیکن اب' اب غالباً یہ صحیح وقت ہے۔ اب تم جاسکتے ہو۔"

"میں اب بھی کیسے جاسکتا ہوں" میں نے ناتوانی سے کہا۔

"اب خدا کا شکر ہے' اس کی حالت بہتر ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر۔"

"میرا خیال ہے' تمہیں کلینک جاکے دیکھنا چاہیے اور کیلاش سے مشورہ کرنا چاہیے۔"

"کس بات کا مشورہ؟" میں نے بدحواسی سے کہا۔

"مشورے سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمہیں اس سے کوئی اجازت لینی ہے یا رائے مانگنی ہے۔ تمہیں اس سے کچھ نہیں کہنا۔ صرف مارٹی کی حالت کے بارے میں تسلی کرنا ہے' اور کچھ نہیں۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔"

"میں جانتی ہوں لیکن تمہیں خود کو تھامے رکھنا ہے۔ اپنے حوصلے ہی سے تم کسی بہتر نتیجے تک پہنچ سکتے ہو۔ تم ابھی کلینک جاؤ۔ میں موٹر کے لیے کہتی ہوں۔"

میرے ہونٹ پھڑپھڑا کے رہ گئے۔ میں اس سے اتنا بھی نہ کہہ سکا کہ موٹر کی ضرورت نہیں ہے۔ جولین باہر چلی گئی اور فوراً واپس آگئی "موٹر تو تیار کھڑی ہے" اس نے کہا "تم کہو تو میں بھی ساتھ چلوں۔"

"ٹھیک ہے" میں نے یوں ہی سرہلا دیا۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ یہ اس وقت کلینک جاکے کیا کرے گی۔ سو میں نے اسے منع کردیا۔ مجھ سے چلا بھی نہیں جارہا تھا۔ ملاقاتی کمرے سے راہ داری کا راستہ میں نے جانے کس طرح طے کیا اور جانے کتنی دیر میں موٹر نے مجھے کلینک پہنچا دیا۔ دروازے میں داخل ہونے سے پہلے میں نے اپنے حواس مجتمع کرنے کی کوشش کی۔ مجھے دیکھتے ہی زورا' شامو' جگنو اور دیوا میرے گرد اکٹھے ہوگئے۔ کیلاش بھی ان میں شامل تھا' ان کی چستی اور مستعدی سے مارٹی کے حال کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔ کیلاش بھی بہت ہشاش بشاش نظر آرہا تھا۔ تاہم میں نے خود کمرے میں جاکے مارٹی کو دیکھا۔ وہ آنکھیں موندے پرسکون حالت میں لیٹا ہوا تھا۔ میری آہٹ پر اس کی پلکوں میں جنبش نہیں ہوئی۔ میں نے کئی بار سوچا کہ اسے آواز دوں اور ممکن ہو تو اسے بتاؤں کہ چند دنوں کے لیے میں اس سے دور جارہا ہوں۔ اسے بہت کچھ معلوم ہے۔ سفر کی نوعیت جان کے وہ مجھے اجازت دینے میں ایک لمحے کا توقف نہیں کرے گا مگر میں اس کے بستر کے سرہانے کھڑا سوچتا رہا اور ایسے ہی چلا آیا۔ میرے جسم میں جیسے جان ہی نہیں رہی تھی۔ یکایک زور زور سے میرا دل دھڑکنے لگتا تھا اور ایسا لگتا جیسے کچھ اور وقت نکل گیا تو جانے کیا ہوجائے۔ مارٹی کے کمرے سے نکل کے میں صحن میں رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کیلاش بھی کچھ دیر میں میرے پاس آگیا اور میرے پوچھے بغیر اس نے بتایا "ڈاکٹر بھارگو کا کہنا ہے' یہ رات اور خیریت سے گزر جائے تو اس کے لیے بہت اچھا ہوگا۔"

میں نے کچھ نہیں کہا تو وہ کہنے لگا "ساری چیزیں درست چل رہی ہیں۔ بلڈ پریشر' ہارٹ بیٹ' ٹمپریچر ذرا سا تیز ہے لیکن یہ ایسی تشویش کی بات نہیں۔ سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ وہ آنکھیں کھولتا ہے اور بیشتر ہوش میں رہنے کی کوشش کرتا ہے' اس کی آنکھوں کی چمک گہری ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے اس سے چھیڑ چھاڑ کی تھی۔ میں نے پوچھا' کہو ماسٹر! کیسے جارہے ہو؟ اس نے مسکرانے کی کوشش کی اور اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ میں نے اس کے دل میں امید جگانے کے لیے بہت سی باتیں کیں۔ میں نے کہا "ماسٹر! سچ' تم بہت خوش قسمت ہو۔ خبر ہے' کتنے لوگ تمہاری وجہ سے فکر مند ہیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا کہ وہ تمہارے لیے کیا کریں۔ دھن دولت تو بس ایک دھوکا ہے۔ اصل چیز یہی ہے کہ کون کتنے آدمی سمیٹتا ہے۔ کتنے جاں نثاروں کی دولت اس کے پاس ہے۔ باہر بہت سے لوگ تمہارے منتظر ہیں۔ تم جلد سے جلد گھر پہنچو تو دیکھنا' سب کیسا جشن مناتے ہیں۔ وہ سنتا رہا۔ میں نے اس سے کہا۔ آدھا ڈاکٹر تو خود مریض ہوجاتا ہے کیونکہ آدھی جنگ وہ خود لڑتا ہے۔ ہم نے اس کے ہاتھ کھول دیے ہیں اور بستر کئی بار اوپر نیچے کیا ہے۔"

کیلاش کے احتیاط آمیز جذبہ و جوش پر میں ڈھیر بنا بیٹھا رہا تو وہ بجھ سا گیا اور خاموش ہوگیا۔ یہ سب کچھ تو میں بھی دیکھ رہا تھا اور اخذ کررہا تھا۔ میں تو اس سے کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا مگر میری زبان ہی اکڑ جاتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ میری خاموشی اسے گراں گزر رہی ہوگی' یہ ایک نازیبا' ناروا بات ہے لیکن میرے اختیار میں کچھ نہ تھا۔ کیلاش ایک صلح جو اور معاملہ فہم شخص تھا۔ اس نے یہ سکوت توڑا' کہنے لگا "کیا بات؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں' ہاں" میں نے سٹپٹا کے کہا "بالکل ٹھیک۔"

"نہیں' ضرور کوئی بات ہے' مجھے بتائیے۔"

میں نے ڈوبتی آواز میں کہا "کچھ ہو تو بتاؤں۔"

"آپ حاضر نہیں معلوم ہوتے۔ مجھے شبہ ہے کہ آپ نے میری بات بھی توجہ سے سنی ہے یا نہیں۔"

"میں نے سب کچھ سنا ہے۔"

"آپ کا چہرہ بھی کیسا اترا ہوا ہے" وہ بے کلی سے بولا۔

"ایسے ہی" میں نے بھاری آواز میں کہا "میں سو رہا تھا' اٹھ کے سیدھا ادھر چلا آیا۔"

اسے یقین نہیں آیا۔ اس نے اپنی کرسی میرے مقابل کرلی اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولا "مجھ پر آپ اعتماد کرسکتے ہیں۔"

"تم یہ کیسی باتیں کررہے ہو۔"

"پھر آپ بتاتے کیوں نہیں۔"

"میں نے کہا نا' ایسی کوئی بات نہیں۔"

چند لمحے وہ چپ رہا پھر اضطراب سے بولا "گزشتہ دو دنوں میں' میں نے آپ کو ایسا فکر مند اور نڈھال سا نہیں دیکھا جب کہ اب تو' اب تو بھگوان کا۔" وہ ٹھہر گیا اور کہنے لگا "میں گھر فون کیے دیتا ہوں۔ میرا خیال ہے' آپ کچھ دیر کے لیے کلب چلے جائیے۔ موٹر تو آپ کے پاس ہوگی اور ڈرائیور بھی ساتھ ہوگا۔ جتنی دیر میں آپ گھر پہنچیں گے' رما تیار ہوجائے گی۔ اسے گھر سے لے لیجیے اور وہ کوشلی!" وہ شانے اچکا کے بولا "ٹھیک ہے' وہ ساتھ ہوجائے تو اسے بھی لے جائیے' اچھی خاصی باتیں کرلیتی ہے۔ لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا آتا ہے اسے' کیا خیال ہے؟"

"نہیں' اس وقت نہیں" میں نے کسمساتے ہوئے کہا۔

"وقت اچھا گزر جائے گا۔ ان چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں سے کبھی کبھی اچھا اثر پڑتا ہے۔ رما بھی آج بہت الجھ رہی تھی۔ یہاں ہم سب لوگ موجود ہیں۔ یہاں کی آپ کوئی فکر نہ کیجیے۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا' یوں ہی بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ وہ بھی اپنی جگہ سے نہیں اٹھا۔ میرے مساموں سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ میں آنے کو یہاں آتو گیا تھا لیکن میرا دل اڑ رہا تھا اور بھاگ جانے کو جی کرتا تھا۔ میری خاموشی پر کیلاش نے اضطراری انداز میں میری پیشانی چھو کے دیکھی۔ اس کی انگلیاں بھیگ گئی ہوں گی۔ اس نے میری نبض دیکھی۔ میرے ہاتھ ٹھنڈے پڑے تھے۔ ایسی کیفیت کو طبی اصطلاح میں ڈیپریشن کہتے ہیں۔ خون کا کم دباؤ بھی اس کی وجہ ہوسکتی ہے۔ "آپ کہیں نہ جائیے' بہتر ہے۔ گھر جاکے آرام کیجیے" وہ متردد لہجے میں بولا "آرام ہی اس کا بہترین علاج ہے۔"

"مجھے کچھ نہیں ہوا ہے" میں نے کہا مگر میری آواز جھرجھرا رہی تھی۔

"نہیں' آپ ٹھیک نہیں ہیں۔ کاش میں وجہ جان سکتا! بہرحال میری بنتی ہے' آپ گھر چلے جائیں۔ اعصابی سکون کے لیے میں آپ کو چند گولیاں دیتا ہوں۔"

کیلاش اسی دم میرے پاس سے چلا گیا اور تیز قدموں سے ڈاکٹروں کے کمرے میں جاکے واپس آگیا۔ وہ زرد گولیوں پر مشتمل ایک چھوٹی سی شیشی ساتھ لایا تھا۔ اس نے مجھے ہدایت کی کہ نیند نہ آنے کی صورت میں ایک گولی دودھ یا پانی کے ساتھ کھالوں' دو بھی لے سکتا ہوں لیکن بیک وقت چار نہیں۔ اس کے کہنے پر میں کسی معمول کی طرح اٹھ گیا۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا۔ مجھے کلینک سے باہر جاتا دیکھ کے زورا' جگنو' شامو اور دیوا بھی مضطرب ہوگئے۔ میں اپنی نظروں میں

تماشا بن گیا تھا۔ جیسے تیسے کیلاش نے انہیں مطمئن کیا اور جب تک موٹر حرکت میں نہ آگئی' وہ باہر دروازے کے پاس کھڑا رہا۔

کچھ دور آگے جاکے ڈرائیور نے گھر واپس جانے کے لیے چوک سے موٹر موڑلی۔ چوک کے گھنٹا گھر میں ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ سڑکوں پر ابھی تک بھیڑ تھی اور بیشتر دکانیں کھلی تھیں۔ ڈرائیور نے منٹوں میں مجھے گھر پہنچادیا اور جولین مجھے ملاقاتی کمرے ہی میں مل گئی۔ وہ جیسے میرا انتظار کررہی تھی "کیسا ہے ماسٹر؟" مجھے دیکھتے ہی اس نے پوچھا۔

میں نے گہری سانس لے کے جواب دیا "پہلے سے تو ٹھیک لگتا ہے۔"

"میں نے تمہارا اٹیچی کیس تیار کردیا ہے۔ ضروری سامان اور کپڑوں کے چھ جوڑے رکھ دیے ہیں۔ اس سے زیادہ کی شاید ضرورت نہ پڑے۔ تم نے پوچھا کہ گاڑی کس وقت جاتی ہے؟"

"نہیں' مجھے نہیں معلوم" میں نے بے ربطی سے کہا "لیکن رات کو ضرور کوئی گاڑی دکن کی طرف جاتی ہوگی۔"

"کسے ساتھ لے جاؤ گے؟"

"کسی کو' کسی کو بھی نہیں" میں نے بکھری ہوئی آواز میں کہا۔

"اکیلے جاؤ گے کیا؟"

"کیوں؟ کیا میں اکیلا نہیں جاسکتا؟" میرے لہجے میں تندی آگئی۔

"جاسکتے ہو" وہ نرمی سے بولی "مگر اچھا ہوگا کہ کوئی ساتھ رہے۔"

"کون! تمہارے خیال میں کون۔؟" میں نے چنچناتی آواز میں کہا۔

"کوئی بھی۔" وہ ہونٹ کاٹنے لگی۔

"اس وقت میرا ہی جانا نامناسب ہے' کجا یہ کہ کوئی اور بھی جائے۔"

"یہاں بہت سے لوگ ہیں' ایک شخص کی کمی سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ کوئی ساتھ رہے گا تو سفر اتنا دشوار محسوس نہیں ہوگا۔" وہ حتمی لہجے میں بولی۔

"تمہیں میری طرف سے فکر ہے' یہی بات ہے نا! میں بالکل ٹھیک رہوں گا۔ اب مجھے عادت ہوگئی ہے سب چیزوں کی۔" میری آواز بھرانے لگی۔ میں نے اس سے کہا "ایسا ہی ہے تو میں جگنو اور دیوا میں سے کسی کو ساتھ لے جاتا ہوں۔"

"میں نہیں کہہ سکتی" وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولی "اتنی دیر کرنی چاہیے یا نہیں لیکن اچھا ہوتا کہ صبح تک باوا کا انتظار کرلیا جاتا۔ وہ کل صبح پونا سے ضرور واپس آجائیں گے۔ پھر انہی کے ساتھ جانا۔"

"بٹھل بھائی کے ساتھ! نہیں' نہیں" میں نے شدت سے انکار کردیا "ان کے جانے کی ضرورت نہیں۔ ویسے بھی انہیں ابھی حیدر آباد کی طرف نہیں جانا چاہیے۔ تمہیں معلوم نہیں' ہم وہاں کیسی مشکلوں میں پھنس گئے تھے۔ کئی نواب ہمارے دشمن ہوگئے تھے اور انہوں نے جال پھیلادیا تھا۔ آخر میں انہوں نے اپنے دو آدمیوں کو ہمارے پیچھے لگادیا۔ کانتے انہی کے حملے میں زخمی ہوا تھا۔ ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے۔ بٹھل بھائی کے حیدر آباد جانے سے خواہ مخواہ الجھاؤ پیدا ہوسکتا ہے۔ وہ نواب اور ان کے نمک خوار کتوں کی طرح ابھی تک ہماری جستجو میں ہوں گے" میرے منہ میں جو آیا' کہتا چلا گیا۔

جولین کی حیرت سے کھلی آنکھیں دیکھ کے معاً مجھے احساس ہوا کہ میں یہ کیا ہذیان بک رہا ہوں۔ میں نے اپنی زبان کو لگام دی۔

"جیسا کہ تم بتا رہے ہو' ان حالات میں تو تمہارا بھی اکیلے حیدر آباد جانا کسی طور مناسب نہیں ہے" وہ تشویش سے بولی۔

"میرے اکیلے کی ایسی کوئی بات نہیں لیکن بٹھل بھائی۔۔۔ بٹھل بھائی کی بات اور ہے' یوں بھی ان کے سامنے کوئی یوں بھی بے دست وپا ہوجاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں' پونا سے ان کے واپس آنے سے پہلے ہی مجھے نکل جانا چاہیے ورنہ وہ کبھی مجھے اکیلے نہیں جانے دیں گے۔"

"ٹھیک ہے تم جیسا بہتر سمجھتے ہو" وہ تذبذب سے بولی "میں' میں تمہارے ساتھ چل سکتی ہوں؟" اس نے آہستگی سے پوچھا۔

"تم۔۔۔ تم!" میں نے حیرانی سے کہا "تم کیسے' کیسے جاسکتی ہو؟"

"کیوں؟ جیسے جگنو اور دیوا جاسکتے ہیں۔"

مجھے اپنی سماعت پر شبہ ہوا لیکن اس کے چہرے پر گھٹا چھائی ہوئی تھی "ہاں ہاں" میں نے اٹکتی زبان سے کہا "مگر تم۔۔۔"

وہ میری بات کاٹ کے دل سوزی سے بولی "جی چاہتا ہے' ایسے وقت میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ تم نے اس دن کے لیے بہت انتظار کیا ہے۔ مجھے بھی یہ دن دیکھنے کی بہت آرزو ہے۔ لیکن شاید میں' میرا جانا۔۔۔" اس کی آواز جکڑی گئی۔ چند لمحے سکوت کے بعد وہ کہنے لگی "میں ڈرائیور کو بھیج کے معلوم کراتی ہوں۔ یہاں قریب ہی اسٹیشن ہے۔ جگنو اور دیوا بھی کھانا لینے کے لیے آتے ہوں گے۔ ان میں سے کسی کو روک لینا۔"

"تم نے گھر میں کسی سے ذکر تو نہیں کیا؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"ابھی تک نہیں لیکن انہیں بتانا تو ہوگا۔"

"میرے جانے کے بعد ہی بتانا۔"

"تم چھپا کیوں رہے ہو؟"

"بس یوں ہی" میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دوں۔ "جانے کیوں اچھا نہیں لگتا" میں نے شکستہ لہجے میں کہا "ابا جان جانے کیا کہیں گے اور کس طرح اسے۔۔۔"

"وہ کیا کہیں گے' وہ تو بہت خوش ہوں گے۔ کیا تم سمجھتے ہو' انہیں اس بارے میں کوئی اندازہ نہیں ہے؟"

"ضرور ہوگا' مجھے نہیں معلوم۔"

"یوں اطلاع دیے بغیر چلے جانے سے وہ ناراض ہوں گے' ملال بھی بہت ہوگا انہیں۔"

"یقیناً ہوگا لیکن بعد میں سب ٹھیک ہوجائے گا۔ ابھی ۔۔۔ ابھی شاید میرا تنہا ہی جانا مناسب ہے۔ ابا جان کے سامنے زبان کھولتے ہوئے عجیب سا لگتا ہے۔ یوں سمجھو کہ ہمت نہیں پڑتی اور ابھی کیا معلوم کہ وہاں جاکے۔۔۔" میری آواز میرے سینے میں ڈوب گئی۔

"تمہیں یقین نہیں ہے" وہ اضطراب آمیز سراسیمگی سے بولی۔

"کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ پہلے بھی کئی بار ایسا ہوچکا ہے۔ میں نے سب کو بہت تنگ کیا ہے۔ پچھلی مرتبہ جب ہم فیض آباد سے بمبئی آرہے تھے تو مراد آباد کے اسٹیشن پر جیسے ہی گاڑی ٹھہری' مجھے وحشت ہونے لگی۔ میں نے پیرو بھائی سے منت کی کہ کیوں نہ مسافر خانے جاکے معلوم کیا جائے۔ ممکن ہے' اس دوران میں مولوی صاحب کا مراد آباد آنا ہوا ہو۔ یہی ہوا' مولوی صاحب کا نام مسافر خانے کے رجسٹر میں درج تھا اور سکونت کے خانے میں حیدر آباد کا پتا لکھا ہوا تھا۔ میں نے پیرو بھائی سے ضد کی کہ میں تو حیدر آباد جارہا ہوں۔ آپ سب بمبئی چلے جائیں۔ پیرو بھائی اس طرح کیسے آمادہ ہوجاتے۔ انہوں نے ابا جان کو بھی راضی کرلیا اور دلی اسٹیشن سے سبھی حیدر آباد کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ وہاں حیدر آباد میں سب نے کیسے ستم برداشت کیے' دہراتے ہوئے بھی اذیت ہوتی ہے۔ میں تمہیں کیا کیا بتاؤں' ایک کے بعد ایک آزمائش۔ میری وجہ سے سب ہلکان ہوئے۔ بٹھل بھائی کا پیر زخمی تھا۔ انہیں حیدر آباد آنا پڑا۔ کانتے تو اپنی جان سے گیا اور نتیجہ وہی نکلا۔ وہاں جاکے معلوم ہوا کہ مولوی صاحب حیدر آباد میں نہیں ہیں' آئے تھے اور چلے گئے۔ اب بھی کیا کہا جاسکتا ہے۔ مجھے اس پر کوئی اعتبار نہیں رہا۔ ایسا کوئی دن شاید قسمت میں نہیں ہے۔" میری آواز قابو میں نہیں رہی۔

"ضروری نہیں کہ اس بار بھی یہی ہو" جیسے بچوں کو کوئی پچکارتا ہے' وہ ایسے نرم اور شفیق لہجے میں بولی "بہرحال تمہارا جانا تو لازم ہے۔ اب تک جو کچھ ہوتا رہا' اس میں تمہارا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ تم نے تو ایسا سوچا تھا' نہ چاہا تھا۔ کسے معلوم' وقت کو مہربان ہوتے بھی دیر نہیں لگتی۔ خدا نے چاہا تو اب کے تم سرخ رو واپس آؤ گے۔"

میری آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ میں نے اپنا سر جھکالیا۔

"میں ڈرائیور سے بات کرکے ابھی آتی ہوں۔" یہ کہتی ہوئی جولین کمرے سے چلی گئی اور دیر تک واپس نہیں آئی۔ کوئی اور بھی نہیں آیا۔ ہر طرف سناٹا طاری تھا۔ میں صوفے پر کسی بت کی طرح لیٹا رہا۔ دل بہت گھبرانے لگا تو میں کمرے سے نکل آیا اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ کس طرف جاؤں۔ میں اسی شش وپنج میں تھا کہ بیرونی دروازے سے جولین لپکتی ہوئی داخل ہوئی۔ وہ ساڑی پر عنابی شال باندھے ہوئے تھی۔ لگتا تھا' کہیں باہر سے آرہی ہے۔ شال پر بوندیں پڑی ہوئی تھیں "میں اسٹیشن چلی گئی تھی۔ کچھ دیر ہوگئی" وہ پشیمانی سے بولی۔

"تم اسٹیشن گئی تھیں' اتنی رات کو؟"

"ایسی رات تو نہیں ہوئی۔ ڈرائیور ساتھ تھا اور اسٹیشن یہاں سے دور ہی کتنا ہے" اس نے اپنی بھیگی ہوئی شال اتارتے ہوئے کہا "میں نے سوچا' ڈرائیور جانے کیا معلومات کرکے آئے' خود ہی ہوکے آتی ہوں۔ ایک گاڑی تو ابھی نکل گئی۔ وہ کل سہ پہر تک حیدر آباد پہنچ جائے گی۔ دوسری گاڑی دوپہر دو بجے بمبئی سینٹرل سے جاتی ہے براستہ واڑی۔"

"کل دوپہر دو بجے؟" میں نے کٹی پھٹی آواز میں کہا۔

"ہاں! میں نے کھڑکی پر پوچھا کہ کوئی اور ذریعہ بھی جلد حیدر آباد پہنچنے کا ہے تو معلوم ہوا کہ صبح نو بجے من ماڑ کے لیے چھوٹی لائن جاتی ہے۔ من ماڑ سے وہ اورنگ آباد ہوتی ہوئی حیدر آباد چلی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور صورت

بھی ہے۔ ابھی گیارہ بجے کی دلی ایکس پریس میں بیٹھ کے ناگ پور اتر جائے' وہاں سے حیدر آباد جانے والی گاڑی پکڑلی جائے۔ بات ایک ہی ہے۔ یہ زیادہ لمبا اور تھکا دینے والا سفر ہے۔ میں کل دوپہر دو بجے والی گاڑی کے دو ٹکٹ لے آئی ہوں۔ دونوں فرسٹ کلاس کے۔ تم یہاں سے ایک بجے کے قریب نکل جانا۔"

میں گم صم کھڑا اس کی صورت تکتا رہا۔

"اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ الٹے راستے کے بجائے سیدھی حیدر آباد جانے والی گاڑی بہتر رہے گی لیکن تم جیسا چاہو۔" میری خاموشی سے وہ منتشر سی ہو گئی اور پوچھنے لگی کہ پھر میں نے کیا سوچا ہے۔

"میرا خیال ہے" میں نے پژمردگی سے کہا "یہی گاڑی ٹھیک رہے گی جس کے تم نے ٹکٹ لیے ہیں۔"

"ٹکٹ تو واپس بھی ہو سکتے ہیں۔ کھڑکی پر ایک ہمدرد شخص بیٹھا تھا' اس بے چارے نے بہت سے راستے بتائے اور خود ہی رد کر دیے اور کہنے لگا کہ کل دوپہر تک آپ کو انتظار کرنا ہوگا۔"

میں سرہلا کے رہ گیا۔

"اب تم میرا کہا مانو تو کچھ کہوں؟" وہ ملتجی لہجے میں بولی۔

"کیا بات ہے؟" میں نے ٹھٹک کے کہا۔

"تم یہ وقت سکون سے بھی گزار سکتے ہو اور پریشان رہ کے بھی۔ یہ وقت تو تمہیں بہرحال گزارنا ہے۔ پھر کیوں نہ صبرو تحمل سے گزارا جائے۔ میری رائے میں کھانا کھا کے تم اوپر والے کمرے میں چلے جاؤ اور کوشش کرکے سو جاؤ۔"

"کوشش سے نیند کب آتی ہے؟"

"میں جانتی ہوں' یہ سب کتنا مشکل ہے لیکن میرا مطلب ہے' تم تازہ دم ہو کے سفر کرو۔ کھانا تیار ہے' تم کہو تو میں لے آؤں؟"

"کچھ کھالو تو اچھا ہے' پھر نیند بھی ممکن ہو جاتی ہے۔"

"کسی بات کو جی نہیں چاہ رہا۔"

"جو ہونا ہے' لوگ کہتے ہیں وہ تو ہو کے رہتا ہے۔ اس مرتبہ بھی وہی کچھ لکھا ہے تو تم کیا کر سکتے ہو؟"

"میں تو کچھ بھی نہیں کر سکتا۔"

"کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ ہر ایک کے ساتھ یہی ہے۔ وقت تو کسی پاگل کے مانند ہے۔ خود تو اندھا ہوتا ہی ہے' آدمی کی بینائی بھی چھین لیتا ہے۔"

"میں کلینک چلا جاتا ہوں۔"

"وہاں کیا کرو گے جا کے؟"

"یہاں بھی کیا کروں گا؟"

"رما کی طرف کیوں نہ چلیں۔ وہ کئی دن سے آئی بھی نہیں۔ اس طرح کچھ وقت کٹ جائے گا۔ وہ بھی بہت خوش ہوگی۔"

میں اسے کیا بتاتا کہ میرے سینے میں کیسا شور مچا ہوا ہے۔ میرے تو ہاتھ پیر ہی سن پڑے ہیں' میں کسی کے ہاں کس طرح جاؤں گا۔ وہ خود ہی کہنے لگی "رما کے ہاں نہیں تو ساحل کی طرف چلیں۔ ہلکی ہلکی بارش ہو تو کشتی کی سواری میں بہت سکون ملتا ہے۔" پھر کہنے لگی "کوئی کتاب ہی شروع کرو۔ کتاب سے اچھا ساتھی کوئی نہیں ہوتا۔ تمہارے پاس اس روز کی کچھ کتابیں ابھی باقی ہوں گی۔ ورنہ میرے پاس بہت سی ہیں۔"

"تم اتنی پریشان مت ہو۔" میں نے کسی قدر سنبھلی ہوئی آواز میں کہا "میں اوپر کے کمرے میں جا رہا ہوں۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ میرے لیے یہ سب کچھ نیا نہیں ہے۔ مجھے ان باتوں کی عادت سی ہو گئی ہے۔"

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی' میں اسے راہ داری میں چھوڑ کے اوپر ہوا دار کمرے میں چلا آیا۔ یہاں ہوا خوب آتی تھی۔ باہر بوندا باندی ہو رہی تھی۔ سارے موسم آدمی کی آمادگی سے مشروط ہیں۔ کمرے میں آ کے مجھے ٹھنڈ سی لگنے لگی۔ بتی جلا کے میں مسہری پر لیٹ گیا اور دیر تک اپنی اکھڑی ہوئی سانسیں ہموار کرتا رہا۔ میں نے کتاب اٹھا کے پڑھنے کی کوشش کی۔ یہ کتاب ابھی تین چوتھائی رہ گئی تھی اور میں نے صفحے پر نشانی لگالی تھی کہ دوبارہ مجھے کہاں سے شروع کرنا ہے لیکن میری نظر بار بار دھندلا جاتی تھی۔ صفحے پر لفظ ہی بکھر بکھر جاتے تھے۔ میں نے آنکھیں موند کے سونے کی بھی کوشش کی۔ آدمی ہمیشہ یہی کرتا ہے۔ ضبطِ نفس' صبرو تحمل کی مشق' کون اپنے جسم پر زنجیریں' اپنے وجود میں کانٹے پسند کرتا ہے۔ کسے یہ آگ اچھی لگتی ہے جو رگ وپے میں سلگتی ہے۔ کوئی کتنا ہی دست وبازو کا مضبوط ہو اور پتھر کا' لوہے کا بنا ہو۔ کس کے اختیار میں ہے کہ اپنی یہ زنجیریں کاٹ سکے' اپنے کانٹوں کا رخ موڑ سکے اور اپنی آگ فرو کردے۔ یہ نادیدہ آگ تو خود بخود سلگ اٹھتی ہے۔ اور ہڈیوں تک میں اتر جاتی ہے۔ دریاؤں' سمندروں کا پانی بھی اس کے لیے ناکافی ہے۔ مجھے آئے ہوئے منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ایک ملازمہ کمرے میں کھانا رکھ گئی۔ خوان پوش سے ڈھکا طشت یوں ہی پڑا رہا۔ میری منڈلاتی ہوئی نگاہیں گھڑی پر آ کے جم جاتی تھیں۔ دیوار پر لٹکی ہوئی گھڑی ٹک ٹک کر رہی

تھی۔ اس کی آواز سے مجھے اور وحشت ہو رہی تھی' جیسے مجھے چڑاتی ہو' مجھ سے مذاق کرتی ہو۔ کئی بار میرے جی میں آئی کہ دیوار سے گھڑی اتار دوں یا اس کا رخ ہی بدل دوں۔ کئی بار مجھے وہم ہوا' وقت بہت گزر چکا ہے اور گھڑی غلط چل رہی ہے۔ گیارہ بج رہے تھے۔ پوری رات اور آدھا دن! بٹھل کو صبح کسی وقت پونا سے واپس آجانا چاہیے۔ اس کے آنے کے بعد یہ ممکن نہیں ہوگا کہ میں اس کے بغیر حیدر آباد جا سکوں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ جولین کسی سے کچھ نہ کہے۔ اور میں چپ چپاتے ایک بجے گھر سے نکل جاؤں۔ میری تاکید کے بعد جولین یقیناً زبان بند رکھے گی چاہے اسے ابا جان اور بٹھل کے سامنے کتنا ہی نادم ہونا پڑے لیکن اس کے ذہن میں الٹے سیدھے اندیشوں نے گھر کرلیا تو وہ بٹھل سے ذکر ضرور کرے گی۔

میں مسہری پر اٹھ کے بیٹھ گیا۔ یہی بہتر ہے کہ مجھے صبح نو بجے چھوٹی لائن والی گاڑی سے روانہ ہو جانا چاہیے۔ وہ بھی کم وبیش اسی وقت حیدر آباد پہنچے گی جتنی دیر میں بڑی لائن سے دو بجے چلنے والی گاڑی۔ اس طرح بٹھل سے میرا آمنا سامنا ہی نہ ہو سکے گا۔ صبح نو بجے روانگی کے ارادے سے مجھے کچھ تقویت ہوئی جیسے میری لگام میرے ہاتھ میں آگئی ہو۔ میں نے خود کو تلقین کی کہ جولین کے بہ قول یہ تو ایک جاں فزا مژدہ ہے۔ اس سے بڑی نوید میرے لیے کیا ہو سکتی ہے۔ مجھے تو شکر ادا کرنا چاہیے کہ اتنے عرصے بعد امید کی پھر کوئی صورت نظر آئی ہے۔ مجھ پر تو وقت صدیوں کی طرح بیتا ہے۔ میں تو صرف آہٹیں سنتا اور صرف پرچھائیاں دیکھتا رہا ہوں' میری آنکھیں تو مولوی صاحب کے گمان میں سڑک کے آخری آدمی تک منڈلاتی رہی ہیں۔ میرے لیے تو یہ صبح کی نوید ہے۔ پھر یہ دریدہ تنی اور حواس باختگی کیسی؟ جیسا کہ جولین کہہ رہی تھی اور میں نے تردید بھی کی تھی اور تائید بھی۔ کیا واقعی کوئی بے اعتباری اور بے یقینی میرے قلب ودماغ کے اس فشار وفساد کا سبب ہے؟ مجھے یقین جو نہیں رہا ہے۔ میرے رگ وپے میں یہ وہم سرایت کر گیا ہے کہ ایسی کوئی ساعت میرے نصیب میں نہیں ہے۔ میں نے جان لیا ہے کہ میرے ستاروں کی گردش کے لیے کوئی حصار طے ہو چکا ہے اور میری لکیریں اپنا مقسوم کندہ کر چکی ہیں۔ اب ان میں کسی ترمیم وتبدیلی کی گنجائش نہیں۔ کیا یہ مال کا خوف ہے کہ واپسی میں سینے کی آگ اور نہاں خانے کے اندھیرے میں اور اضافہ ہو جائے گا؟ میں کسی سراب کے پیچھے جا رہا ہوں' یقیناً ایسا نہیں ہے۔ ایسا کچھ ہے تو محض وہم وگمان کی حد تک۔ کوئی امید' کوئی آس ہی تو مجھے قائم رکھے ہوئے ہے ورنہ میں کہاں ہوتا۔ میں تو آئینے سے کب کا اوجھل ہو چکا ہوتا۔ اور کیا یہ بس یہیں تک' ایک نواب ثروت یار کے خط تک موقوف ہے اور حیدر آباد سے نامراد واپس آنے تک کا حصہ ہے؟ پھر کیا سارے چراغ بجھ جائیں گے؟

میں نے خود کو تسلی دی کہ آج نہیں تو کل میں روانہ ہو جاؤں گا۔ اس کے سوا میرے پاس راستہ بھی کون سا ہے۔ میرے پر نہیں ہیں جو میں اڑ کے حیدر آباد پہنچ جاؤں۔ مجھے خاطر جمع رکھنی چاہیے۔ نواب ثروت یار نے حیدر آباد میں مولوی صاحب کے مستقل قیام کے بارے میں مطمئن ہو کے ہی مجھے خط لکھا ہوگا۔ مولوی صاحب دوبارہ اس کے پاس آئے ہیں تو اس کا یہی مطلب ہے کہ وہ مسلسل خانہ بدوشی اور پناہ گیری سے عاجز آچکے ہیں ورنہ وہ لوٹ کے نواب ثروت یار کی حویلی کا رخ نہ کرتے۔ ہو سکتا ہے' انہوں نے تھک ہار کے نواب سے ہامی بھر لی ہو کہ وہ اس کی خواہش کے مطابق کورا کو اس کی تحویل میں دے دیں گے۔ کورا کے لیے نواب سے بہتر امیدوار انہیں نہیں ملا ہوگا۔ نواب اپنے خواب کی اس تعبیر سے بہت سرشار ہوگا لیکن اس کی یہ خوش خیالی کتنی دیر کی ہے۔ ممکن ہے' اب تک اس پر یہ حقیقت آشکار ہو چکی ہو کہ فیصلے کا اختیار صرف مولوی صاحب کو نہیں' کورا کو بھی ہے۔ وہ آخر دم تک مزاحمت کرتی رہے گی۔ میری طرح وہ بھی کسی روز آسمان کا تیور بدل جانے کے آسرے پر قائم ہے۔

نواب ثروت یار نے اب کے مولوی صاحب سے میرا تذکرہ نہیں کیا ہوگا۔ جبھی اس نے مجھے خط لکھا ہے۔ اسے یہ تجربہ ہو چکا تھا جیسا کہ نواب کی حسرت آمیز باتوں سے عیاں تھا' وہ کورا کا ایسا ہی طلب گار ہے تو اسے بہت محتاط رہنا چاہیے۔ مولوی صاحب کے سامنے میری دوبارہ آمد کا ذکر کرنے سے مراد مولوی صاحب سے یا دوسرے لفظوں میں کورا سے دست برداری ہے۔ میرا نام سنتے ہی مولوی صاحب پھر کہیں گم ہو سکتے ہیں اور وہ بار بار حیدر آباد نہیں آئیں گے' وہ تو اس گلی' اس شہر سے بہت دور چلے جائیں گے۔ مولوی صاحب کے دوبارہ کھو جانے کے اندیشے نے نواب کی زبان بند رکھی ہوگی۔ میں نے خود کو مولوی صاحب کا عزیز بتایا تھا۔ کوئی بعید نہیں کہ مولوی صاحب نے کورا کے سلسلے میں نواب سے اپنی معذوری ظاہر کر دی ہو یا کچھ انتظار کرنے کو کہا ہو اور کوئی چارہ نہ دیکھ کے نواب کو میری یاد آئی ہو۔ اسے اتنا تو اندازہ ہو چکا ہوگا کہ کورا اور مولوی صاحب کی

آپس میں وہ نسبت نہیں ہے جو مولوی صاحب نے بتائی ہے۔ نواب کو پھر کورا کے مدعی' اس کے دوسرے عزیزوں کی جستجو کرنی چاہیے۔ پیرو بھائی نے اور میں نے نواب سے بہت عاجزی کی تھی۔ نواب نے وعدہ کیا تھا کہ مولوی صاحب دوبارہ حیدر آباد آگئے تو وہ ہمیں ضرور مطلع کردے گا' وہ ایک خاندانی آدمی ہے۔ آدمی کتنا ہی بڑا نواب' جاگیردار ہو' آدمی ہی ہوتا ہے۔ وہ پیرو بھائی کی التجا سے بہت متاثر نظر آتا تھا۔ کیا عجب کہ اپنا وعدہ نبھانے کی خاطر اور انسانی ہمدردی کے کسی جذبے سے اس نے مجھے خط لکھا ہوا۔ ہم دوبارہ اس کے پاس گئے تھے اور ہم نے بہت تشویش و اضطراب کا اظہار کیا تھا۔ اصل ماجرا جاننے کا تجسس بھی نواب جیسے ایک ہوش مند اور نکتہ بیں شخص کو یہ خط لکھنے پر اکسا سکتا ہے۔ وہ لوگ کون ہیں جو مولوی صاحب اور ان کی مبینہ بیٹی' ایک نوجوان لڑکی کے سلسلے میں متوحش ہیں اور مولوی صاحب آخر ان لوگوں کے قرب سے اس قدر کیوں گریزاں ہیں۔ اگر واقعی مولوی صاحب حیدر آباد میں ہیں اور نواب کسی طور کسی اتفاق کے بہانے ان سے میری رو بہ روئی کا اہتمام کردیتا ہے تو بس سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔

بس ایک بار مولوی صاحب مجھے مل جائیں' پھر میرے بارے میں وہ اپنی رائے ضرور بدل دیں گے۔ پھر وہ کورا کو مجھ سے دور نہیں رکھیں گے۔ انہوں نے میرے بارے میں اپنے طور پر جو مفروضے قائم کرلیے ہیں' میرے سامنے پہنچنے پر وہ سارا تکدر چھٹ جائے گا۔ میں انہیں بتاؤں گا کہ ایک بار زنداں میں جانے سے آدمی زندگی بھر کے لیے زندانی نہیں ہوجاتا۔ اور جیل میں سبھی زندانی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ مولوی صاحب خود گواہ ہیں' کورا کو ان بد نگاہوں کی دست بردسے بچانے کے لیے مجھے چھرا نکالنا پڑا تھا۔ میں ان دونوں کو ختم نہ کرتا تو کورا جانے کہاں ہوتی۔ یہ کوئی جرم نہیں تھا۔ جرم تھا تو میں نے اس کی پوری سزا کاٹ لی ہے مگر یہ کیسی سزا ہے جو مولوی صاحب مجھے دیتے رہے ہیں۔ میں انہیں بتاؤں گا کہ جیل میں' میں نے وقت ضائع ہرگز نہیں کیا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ لوٹ کے مجھے کہاں جانا ہے۔ مجھے اس کے پاس جانا ہے اور اپنے گھر جانا ہے' زنداں کی رسوائی کے بعد میری سرخ روئی کی یہی صورت ہے کہ میں کچھ کام کا آدمی بن کے باہر جاؤں۔ جیل میں' میں کتابیں پڑھتا اور امتحانات دیتا رہا۔ اڈے سے وابستہ لوگ مجھے کاپیاں کتابیں لا کے دیا کرتے تھے۔ شہر کا سب سے بڑا دادا بٹھل اور اس کے آدمی مجھے ہمہ وقت ٹوکتے رہتے تھے۔ بٹھل اوروں کی طرح مجھے اڈے پر دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ جیل میں کوئی اس سے زیادہ کیا کرسکتا ہے۔ میں مولوی صاحب کو باور کراؤں گا کہ چاقو بازی اور اڈے پاڑے سے وابستگی کے باوجود میں اڈے پاڑے کا آدمی نہیں ہوں۔ میں تو اب اپنے باپ' بھائی اور بہنوں کے ساتھ رہتا ہوں۔ پہلے کی طرح کورا دربدر ماری ماری نہیں پھرے گی۔ وہ تو ایک گھر میں جائے گی جہاں ہر فرد اسے پلکوں پر بٹھائے گا۔ ایک بار مولوی صاحب مل جائیں' میں ان سے منت کروں گا کہ کورا تو ان کے پاس میری امانت کی طرح ہے۔ بے شک ان کا بڑا احسان ہے۔ انہوں نے اسے زمانے کی ستم کاریوں سے محفوظ رکھا۔ انہوں نے اپنی بیٹی کی طرح اس پر سایہ کیے رکھا۔ وہ کوئی نواب' جاگیردار آدمی نہیں تھے' منیر علی کی بیٹی زہرہ بتاتی تھی کہ مولوی صاحب کورا کے سکھ کا کیسا خیال رکھتے تھے۔ وہ کورا کی جنبش ابرو کے منتظر رہتے۔ کورا کوئی بھی خواہش' کوئی بھی فرمائش کرے' وہ حکم کی طرح' پلک جھپکتے اسے بجا لاتے۔ انہوں نے اسے ریشم اور مخمل میں رکھا ہے۔ مجھے احساس ہے' ایک نوجوان لڑکی اور کورا جیسی لڑکی کو ہوائے حرص و ہوس' دنیا کے گرد و غبا سے بچائے رکھنا کیسا مشکل ہے۔ ادھر کہیں کسی مقام پر کور کے تعاقب میں جانگ قبیلے کے وحشی سرفروشوں کے اچانک سر پر پہنچ جانے کا دھڑکا انہیں الگ ستائے رہتا ہوگا۔ مولوی صاحب نے اس کے لیے زندگی اجیرن کردی۔ میں تو زندگی بھ ان کا احسان نہیں چکا سکتا تھا۔ ان کا بہت حق ہے۔ میر مقصد کورا کو ان سے چھیننا' ان سے جدا کرنا ہرگز نہیں ہے' تو ہم سب کے ساتھ ہی رہیں گے۔ میرے لیے جیسے ابا جان بٹھل بھائی' ویسے مولوی صاحب۔ یہاں سب لوگ ان ک خدمت ہی کریں گے۔

بس ایک بار مولوی صاحب کا ملنا شرط ہے۔ پھر میں ا کی چوکھٹ سے ہٹوں گا ہی نہیں اور اتنی دلیل' حجت' دا فریاد کی نوبت ہی شاید نہ آئے۔ مجھے یقین ہے' مجھے دیکھ۔ ان کا پتھریوں ہی پگھل جائے گا۔ ان کے مل جانے کے بع مجھے واپس نہیں آنا ہے۔ مولوی صاحب کی منزل کورا منزل ہے۔ مجھے اس کے پاس جانے سے پھر کوئی نہیں روک سکتا اور کورا۔۔۔ اس تصور ہی سے میرے رونگٹے کھڑ ہوگئے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اتنے عرصے بع میں اس کے پاس کیسے جاؤں گا۔ مجھے سکتہ ہوجائے گا۔ میر دم نکل جائے گا۔ اس کا بھی کچھ یہی حال ہوگا۔ پہلے تو ا سب خواب خواب' سراب سراب لگے گا۔ یقین نہیں آ گا کہ قسمت اس طرح بھی مہربان ہوجاتی ہے۔ کیسا سمن

اس نے اپنی آنکھوں میں چھپائے رکھا ہوگا۔ مجھے پہچاننے میں وہ ایک لمحے کا تامل نہیں کرے گی۔ یہ تو اپنی اپنی طلب اور اپنے اپنے مطلوب کی بات ہے۔ کوئی کتنا ہی دور ہوجائے' نقش اتنے ہی گہرے ہوجاتے ہیں۔ میرا چہرہ تو اسے اپنے چہرے کی طرح یاد ہوگا۔ رہا میرا تو میں تو اس کی خوشبو' اس کے سائے' اس کی آہٹ سے اسے پہچان لوں۔ زہرہ نے مجھے اس کا جو حال بتایا تھا' ہو بہ ہو وہی تھا جو میرے خیال و خواب میں بسا ہوا تھا۔ زہرہ بتاتی تھی کہ کورا مستقل گم صم' کھوئی کھوئی سی رہتی تھی' بیٹھے بیٹھے چونک پڑتی۔ اچانک بے چین سی ہوجاتی۔ زہرہ کو کیا معلوم تھا کہ پتا کھڑکنے پر کورا کو کس کی آہٹ کا گمان ہوتا ہوگا۔ اب مجھے یوں بہ ہمہ وجود' بہ تمام و کمال اپنے سامنے دیکھ کے اس کا کیا حال ہوگا۔

اس کے سامنے جانے کے تصور سے میرا جسم سن سنا رہا تھا۔ میرے دل کی حرکت جیسے معدوم ہوگئی ہو۔ جانے کب تک مجھ پر ایک نشاط انگیز' سرور آفریں ہول طاری رہا۔ میری رگوں میں چیونٹیاں سی رینگتی رہیں۔

صرف ایک دن کی دیوار حائل ہے۔ کل یہاں سے روانہ ہوکے پرسوں دوپہر مجھے اپنی منزل پر پہنچ جانا ہے۔ ضروری نہیں کہ جاتے ہی نواب ثروت یار سے میری ملاقات ہوجائے اور وہ مجھے مولوی صاحب کے سامنے جا کھڑا کرے۔ ممکن ہے' دوسرے دن یا اس سے اگلے دن۔ بہرحال حیدر آباد میں کورا مجھ سے بہت قریب ہی کہیں ہوگی۔ اگر واقعی یہ سب کچھ سچ ہے۔ مولوی صاحب حیدر آباد میں نواب کی حویلی میں' اس کے کسی دوسرے مکان میں مقیم ہیں تو ان تک رسائی حاصل کرنے میں کوئی دیر نہیں لگے گی۔ یکایک مجھے خیال آیا۔ نواب کی خوشنودی کے لیے کیوں نہ میں ایک دو ہیرے ساتھ لے جاؤں۔ لعل و جواہر نوابوں کی شہ رگ کے مانند ہوتے ہیں۔ ابا جان کا کوئی نادر ہیرا اس کی آنکھیں خیرہ کردے گا۔ میں جاتے ہی یہ بیش قیمت سوغات نواب کی نذر کردوں گا۔ ابا جان سے یوں کوئی ہیرا مانگنا مناسب نہیں ہے۔ وہ منع تو نہیں کریں گے لیکن طرح طرح کے سوال ان کے ذہن میں منڈلائیں گے۔ یہی صورت ہے' صبح صبح جیسے ہی ابا جان کلینک کی طرف جائیں' میں ان کے کمرے کی تلاشی لوں۔ ایک دو ہیرے مجھے ان کے سامان سے ضرور مل جائیں گے۔ بعد میں ابا جان کو مقصد معلوم ہوگا تو اس چوری پر ناراض نہیں ہوں گے۔ ہیرا نہیں تو میں اپنی مالا بھی نواب کی نذر کرسکتا ہوں۔ اس کے دانے بہت قیمتی ہیں۔ ایک دن ابا جان اسے دیکھ کے دنگ رہ گئے تھے۔ کورا کے بعد مجھے اس کی مالا کی کیا ضرورت رہے گی۔ یہ کورا سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔

میں بستر پر لیٹا ہانپتا رہا اور میری رگوں میں خون دھڑکتا رہا۔ کاش جولین صبح کسی وقت مجھے نواب کا خط دے دیتی تو میں آج دوپہر کی گاڑی سے نکل جاتا اور اس وقت سفر کررہا ہوتا اور کل صبح نو بجے حیدر آباد پہنچ جاتا۔ جتنی جلدی میں وہاں پہنچ سکوں' اتنا ہی اچھا ہے۔ کسے معلوم کہ مولوی صاحب کے دماغ میں کچھ سما جائے اور پہنچوں تو معلوم ہو کہ وہ کل وہاں سے روانہ ہوچکے ہیں۔ یہ موقع تو پھر ہاتھ سے نکل جائے گا۔

بارش تیز ہوگئی۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ایک بج رہا تھا۔ بائیں جانب کی کھلی کھڑکی سے بارش کی پھوار اندر آرہی تھی۔ میں بستر سے اٹھ کے کھڑکی کے پاس کھڑا ہوگیا۔ بہت دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ میں تو بھیگ رہا ہوں۔ کھڑکی بند کرکے میں کمرے کے چکر کاٹتا رہا۔ پھر بستر پر آکے کروٹیں بدلنے لگا۔ مجھے کسی پہلو قرار نہیں تھا۔ وہ کسی خواب کا نشہ تھا جو کچھ دیر کے لیے میرے حواس و اعصاب پر طاری رہا' پھر سب کچھ بکھر گیا۔ رفتہ رفتہ جیسے میری آنکھ کھل گئی اور میرے جسم و جاں میں وہی اندھیرا سرایت کرنے لگا' وہی زنجیریں اور دست و بازو کی شکستگی۔ میں نے گرداب میں مبتلا کسی راندہ زمین کی طرح ہاتھ پیر مارنے شروع کیے۔ میں نے پھر وہی کوشش کی' ترازو کے پلڑے برابر رکھنے کی۔ میں نے بار بار اپنے عزم کی تجدید کی کہ صرف ایک رات کی بات ہے' صبح نو بجے مجھے روانہ ہوجانا ہے۔ دوپہر کے بجائے مجھے صبح ہی بمبئی سے نکل جانا چاہیے لیکن جتنا میں اپنے ارادے کی تکرار کرتا' اتنی ہی وحشت بڑھتی جاتی۔

رات کا آخری پہر ہوگا کہ کسی لمحے میں نے اس ہیجان و خفقان سے نجات حاصل کرلی۔ مجھے نیند نہیں آئی لیکن ایک سکوت سا چھا گیا۔ نہ کوئی درد نہ راحت' نہ تلاطم نہ سکون۔ میں نے اپنے حال پر قناعت کرلی تھی۔ کوئی رمز نہاں مجھ پر عیاں ہوگئی تھی یا میں نے اپنی سودائیت کی تشخیص کرلی تھی۔ کہتے ہیں' مرض کی آگہی جاں بلب کو تحمل و توکل کی تلقین کرتی ہے۔ ترجیح و تقدیم کے میزان میں مجھے کوئی شافی یا حتمی جواب مل گیا تھا۔ میں نے جگ سے پانی لوٹا کے ایک گلاس پیا اور رات کا باقی حصہ کھلی آنکھوں سے گزار دیا۔ بارش کا سلسلہ جاری تھا لیکن صبح کے وقت بادل چھٹنے لگے۔

آٹھ بج رہے تھے کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے اٹھ کے دروازہ کھولا تو ملازمہ تھی۔ وہ ایک شائستہ

اور خوش اطوار لڑکی تھی۔ اس نے مجھے سلام کیا اور معذرت کی کہ بی بی کی ہدایت پر اس نے دستک دینے کی جرات کی ہے۔ بی بی سے اس کی مراد جولین ہی ہوسکتی تھی۔ جولین نے اس سے کہا تھا' مجھ سے پوچھ کے آئے کہ ناشتا اوپر کے کمرے میں پہنچادیا جائے یا میں نیچے آرہا ہوں؟ جولین کا مقصد مجھے بیدار کرنا بھی ہوگا اور میری خیریت دریافت کرنا بھی۔ میں نے ملازمہ سے کہا کہ میں نیچے ہی آرہا ہوں۔ کمرے سے غسل خانہ ملحق تھا۔ منہ ہاتھ دھوکے میں نے کنگھا کیا اور ملاقاتی کمرے میں آگیا۔ کسی ملازم نے اندر جاکے اطلاع دے دی ہوگی کہ چند لمحے بعد جولین تیز قدموں سے اندر داخل ہوئی۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر جم گئی تھیں۔ وہ کچھ پوچھنا یا کہنا چاہتی تھی لیکن متذبذب سی ہوگئی اور گنگ سی کھڑی رہی۔

"میں کلینک جارہا ہوں" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

وہ پلکیں جھپکانے لگی اور شکایتی لہجے میں بولی کہ کیا میں ناشتا بھی نہیں کروں گا۔ رات کا سارا خوان بھی یوں ہی واپس آگیا۔ مجھے لباس بھی تبدیل کرنا چاہیے۔

میں نے کوئی تعرض نہیں کیا۔

اس نے بھی کوئی اور بات نہیں کی' تیزی سے واپس اندر چلی گئی۔ دوسرے منٹ میں وہ کپڑے لے آئی۔ جتنی دیر میں غسل خانے سے لباس تبدیل کرکے میں لوٹا' ناشتا تیار تھا' ناشتے کی پوری ٹرالی تھی۔ میرا ساتھ دینے کے لیے اس نے بھی پلیٹ اٹھالی۔ مجھے بالکل بھوک نہیں تھی لیکن جو کچھ وہ میری پلیٹ میں ڈالتی رہی' میں نے ردوقدح کیے بغیر حلق سے اتارلیا۔ اس نے بھی احتیاط کی تھی۔ کسی میزبان کی طرح اس نے مجھ سے اصرار نہیں کیا۔ میرے لیے چائے بھی اسی نے بنائی "صبح کا اخبار تو نہیں دیکھا ہوگا؟" وہ جھجکتے ہوئے آہستگی سے بولی "لکھا ہے' بمبئی میں تو خیر رات سے سلسلہ شروع ہوا لیکن آس پاس کے علاقوں میں کل دوپہر سے موسلا دھار بارش ہورہی ہے اور سیلاب کی سی حالت ہے۔"

میں ہنکاری بھر کے رہ گیا۔

میرے کچھ پوچھے بغیر وہ بتانے لگی کہ ابا جان اور منیر علی کلینک گئے ہیں۔ شاید اب واپس آتے ہوں۔ جگنو اور شامو بھی ابھی ابھی ناشتا لے کے گئے ہیں۔ بتارہے تھے کہ مارٹی نے خاصی بہتر رات گزاری ہے۔ صرف ایک دوبار بے چین ہوا تھا لیکن ڈاکٹروں نے اسے پھر سلادیا۔ کہنے لگی کہ جگنو اور شامو کیلاش کا بہت ذکر کررہے تھے۔ کہتے تھے کہ آج بھی وہ تقریباً ساری رات جاگتا رہا۔

میں نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ اب تک وہی کچھ بولتی رہی تھی۔ اپنا غبار وفشار مجھے خود تک محدود رکھنا چاہیے تھا۔ میری خاموشی اسے کیا' مجھی کو ناگوار گزررہی تھی۔ میں نے بظاہر ٹھہری ہوئی آواز میں کہا "کیلاش نے کل شام کہا تھا کہ رات اور خیریت سے گزرجائے تو گویا مارٹی نے کوئی معرکہ سرکرلیا۔"

وہ بے ساختہ بولی "خدا نے چاہا تو اب سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔"

میں صوفے سے اٹھ گیا۔ وہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آئی اور کہنے لگی کہ بارش کا امکان ہے۔ کیوں نہ میں موٹر ساتھ لے جاؤں۔ میں ایسے ہی آگے چل پڑا۔ سڑکیں بیشتر گیلی تھیں لیکن کہیں پانی ٹھہرا ہوا نہیں تھا۔ دن کی چہل پہل ابھی شروع ہوئی تھی۔ میں تھوڑی دیر میں کلینک پہنچ گیا۔ ابا جان اور منیر علی وہاں سے جاچکے تھے۔ زورا نے مجھے بتایا کہ کیلاش بھی ابھی ابھی اپنے گھر گیا ہے۔ جولین نے مارٹی کا جو حال مجھے بتایا تھا' وہی شامو اور زورا نے دہرایا۔ میں نے خود بھی مارٹی کے کمرے میں جاکر دیکھا۔ وہ اس وقت غافل تھا۔ میں زورا' شامو' جگنو اور دیوا کے ساتھ والان میں آکے بیٹھ گیا اور دس بج گئے۔

اس دوران میں ڈاکٹر اور نرسیں مارٹی کے کمرے میں آتے جاتے رہے تھے۔ ڈاکٹر بھارگو کی آمد پر ڈاکٹر ڈیسائی بھی نیچے آگیا تھا۔ دونوں دیر تک مارٹی کے کمرے میں رہے اور باہر آکے سرگوشیوں میں گفتگو کرتے رہے۔ زورا کی زبانی معلوم ہوا کہ صبح سے ڈاکٹر بھارگو کا یہ دوسرا دورہ ہے۔ پہلی مرتبہ وہ سات بجے کے قریب آیا تھا پھر ڈاکٹر شیوا اور اس کی بیوی بھی نیچے آگئے۔ مجھے دیکھ کے وہ سیدھے میرے پاس چلے آئے۔ ان کا پرتپاک رویہ میرے لیے حیران کن تھا۔ اوپر اپنے گھر چلنے کی دعوت دے کے انہوں نے مجھے اور شش وپنج سے دوچار کردیا۔ شیوا کے ساتھ اس کی بیوی نے بھی تائید کی اور کہنے لگی "ہم آپ کو بہت نفیس کافی پلائیں گے" کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ ان سے کیا عذر کروں تاہم وقت پر بہانہ سوجھ گیا۔ میں نے ان سے معذرت کی کہ ایک ضروری کام سے کچھ دیر کے لیے باہر جانا ہے' واپس آکے ضرور اوپر آؤں گا۔ ان دونوں کے مارٹی کے کمرے میں جانے کے بعد میں وہاں سے اٹھ گیا اور جگنو' دیوا' زورا اور شامو سے کچھ کہے بغیر کلینک سے باہر آگیا۔ سڑک پر بھیڑ اب زیادہ ہوگئی تھی۔ میں بے ارادہ چوک کی سمت بڑھتا رہا اور ذرا سا چلنے سے مجھے تھکن سی ہونے لگی۔ آگے جانے کے بجائے میں چوک کے

اردگرد باغیچے کی ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ موٹروں اور دوسری گاڑیوں کا شور ہر سو گونج رہا تھا۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔ ب کے پاس جیسے بہت کم وقت تھا۔ ہر شخص وقت سے پہلے پنی منزل پر پہنچ جانے کے لیے بے چین تھا۔ چوک سے گھنٹے کی آواز نے مجھے بوکھلا سا دیا۔ میں نے سر اٹھا کے دیکھا تو گیارہ بج رہے تھے۔ میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا لیکن چند قدم بعد میری رفتار سست ہوگئی۔ دوبارہ میں کلینک میں داخل ہوا تو کیلاش آچکا تھا۔ اسی بچھڑے ہوؤں والے انداز میں وہ مجھ سے لپٹ گیا اور دوسرے ہی لمحے اپنے بازوؤں سے مجھے کچھ دور کرکے متجسس ومتردد نظروں سے میرے چہرے کا جائزہ لینے لگا "نہیں! لگتا ہے' آپ رات بھر جاگتے رہے ہیں۔"

میں نے مسکرانے کی کوشش کی اور کچھ کہہ نہ سکا۔

"آج تو اس کی حالت بہت بہتر ہے" وہ دمکتی ہوئی آواز میں بولا۔ "ابھی میں نے اسے دیکھا۔ وہ آنکھیں کھولے ہوئے ہے۔ میں نے اس سے بات بھی کی۔ آپ نے اسے دیکھا؟"

"میں جب گیا تھا تو وہ سو رہا تھا۔"

"اب جاکے دیکھیے۔" وہ میرا بازو پکڑ کے تقریباً کھینچتا ہوا مجھے مارٹی کے کمرے میں لے گیا۔ مارٹی جاگ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی سی تھیں۔ چہرے پر نسبتاً تازگی تھی۔ مجھے سامنے دیکھ کے اس کے ہونٹوں پر یاس انگیز مسکراہٹ ابھر آئی۔ میں اس کے سرہانے بیٹھ گیا اور بے اختیار جھک کے میں نے اس کی پیشانی چوم لی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں بھینچ لیا۔ مارٹی کی سسکی نکل گئی۔ کیلاش پاس ہی کھڑا تھا۔ "نانا" وہ مارٹی کو پچکارتے اور ڈپٹتے ہوئے بولا "ایسا نہیں' تم تو اتنے ہمت والے نوجوان ہو' یہ بچوں کی طرح کیا! اب کیا بات ہے۔ آدھی سے زیادہ جنگ تو تم نے جیت لی ہے۔ دوچار ہاتھ کی بات ہے بس۔" کیلاش کو میری تائید کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ اسی لیے وہ مڑ کے مجھ سے مخاطب ہوا "آپ ہی اس خوبصورت اور بہادر نوجوان کو بتائیے نا۔۔۔!" وہ ٹھہر گیا۔ میری آنکھیں بھی بھر آئی تھیں "یہ کیا؟" وہ ناراضی سے بولا "آپ بھی۔۔۔ آپ کو تو۔۔۔ نہیں نہیں' یہ تو بہت غلط ہے۔"

میں نے بہ مشکل ضبط کیا۔ کیلاش نے بستر کی دوسری جانب مارٹی کے پاس بیٹھ کے اپنے رومال سے گالوں پر بہتے ہوئے مارٹی کے آنسو پونچھے اور طرح طرح بہلاتا' پھسلاتا رہا۔ موسم کا ذکر کرنے لگا کہ باہر کیسا رنگین اور دل نشین موسم ہے۔ خوب چھما چھم بارش ہورہی ہے۔ پھول پھلواری

توجیسے زمین سے ابل رہی ہے اور بھی بہت سی دل انگیز باتیں، پھر شوخی سے بولا "ماسٹر! بس ذرا جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔ دو چار داؤ آڑے وقت کے لیے ہم کو بھی سیکھنا ہے" کیلاش مکا تان کے ادھر ادھر گھمانے لگا۔

مارٹی کو ہنسی نہیں آئی۔ کیلاش نے بھی پھر اسے زیادہ نہیں چھیڑا۔ یہ میری موجودگی کا اثر تھا یا مارٹی کے اندر کی قوت تھی کہ دوبارہ بحال دکھائی دینے لگا۔ اس کی الجھی ہوئی تیز تیز سانسیں ہموار ہوتی گئیں، وہ نقاہت سے بولا "گھر میں سب ٹھیک ہیں۔"

"ہاں" میں نے جلدی سے کہا "سبھی یہاں تمہارے پاس، تمہیں دیکھنے کے لیے آنا چاہتے ہیں۔ انہیں روک دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر اتنی بھیڑ پسند نہیں کرتے۔"

وہ چپ ہو گیا اور کچھ سوچتا رہا، پھر کہنے لگا "دادا نہیں آئے؟"

"بٹھل بھائی!" میں نے شگفتگی سے کہا "کسی وقت بھی آتے ہوں گے۔ جولی بتا رہی تھی کہ آج صبح انہیں آنا ہے۔"

"وہ کیا بولیں گے؟" وہ سراسیمگی سے بولا۔

"کیا بولیں گے!" میں نے کہا "یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ اس میں تمہاری یا کسی کی کیا خطا تھی۔ دیکھنا، وہ ایک لفظ بھی نہیں کہیں گے۔ ان کے لیے یہ نئی بات تو نہیں ہے۔"

اس نے آنکھیں میچ لیں۔ میرے جی میں آیا، اس وقت وہ خاصا بہتر نظر آ رہا ہے، مجھے نواب ثروت یار کے خط کے سلسلے میں اسے کچھ بتانا چاہیے۔ چند لمحوں کے لیے میرے حواس منتشر ہوئے تھے لیکن پھر میں نے خود کو مجتمع کر لیا۔ کیلاش کے اشارے کی باوجود کچھ دیر میں اور ٹھہر سکتا تھا۔ مارٹی کی بھی شاید یہی خواہش تھی۔ اسی اثنا میں نرس نے آکے اس کے منہ میں تھرمامیٹر لگا دیا۔ کیلاش کے بستر سے ہٹ جانے کے بعد میں بھی کھڑا ہو گیا۔

کلینک سے میں سیدھا گھر آیا۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ جیسے ہی میں دروازے میں داخل ہوا۔ جولین مجھے مل گئی "دیر کر دی!" وہ کوئی توقف کیے بغیر تیزی سے بولی "تمہارا سامان میں نے موٹر میں رکھوا دیا ہے۔ سوٹ کیس میں احتیاطاً تمہاری چیک بک بھی رکھ دی ہے، اور چند کتابیں بھی۔ کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بتا دو۔ یہ بٹوا بھی رکھ لو، اس میں دو ہزار روپے ہیں۔ بادا ابھی پونا سے نہیں آسکے ہیں۔ جانے کیا بات ہے۔ انہیں تو صبح آجانا چاہیے تھا۔ بارش کی وجہ سے ہو سکتا ہے گاڑی لیٹ ہو گئی ہو۔ بہرحال وقت کم رہ گیا ہے۔ میرا خیال ہے، کھانا کھا کے تم فوراً روانہ ہو جاؤ۔ اتفاق سے ابا جان بھی گھر پہ نہیں ہیں" وہ ایک ہی سانس میں بولتی رہی۔

میں خاموش کھڑا اس کی صورت دیکھا کیا۔

"جگنو اور دیوا میں سے کوئی تمہارے ساتھ نہیں آیا؟"

"نہیں" میں نے آہستگی سے کہا۔

"کیا کلینک سے ساتھ لو گے؟"

"نہیں" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا "میں، میں نہیں جا رہا۔"

"کیا!" وہ سراپا سوال بن گئی "تم کیا کہہ رہے ہو؟ ماسٹر کی حالت۔۔۔؟"

"نہیں، اسے خاصا افاقہ ہے۔"

"پھر کیا ہے؟ کیا بات ہے؟"

"کوئی بات نہیں" میری آواز بکھرنے لگی۔ وہ دم بخود ہو گئی تھی۔ میں اسے راہداری میں چھوڑ کے اوپر چلا آیا۔

جوتے اتار کے میں نے پانی پیا تھا کہ وہ جھپٹتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور مضطربانہ بولی "تم کوئی غلطی نہیں کر رہے؟"

"معلوم نہیں" میں نے ہونٹ بھینچ لیے "شاید نہیں۔"

"میرا خیال ہے" وہ اٹکتی زبان سے بولی "ہو سکے نظر ثانی کر لو۔ ابھی وقت ہے۔"

"ہوں" میں سرہلا کے رہ گیا۔

وہ دروازے کے پاس کھڑی رہی اور اس کے چہرے رنگ آتے رہے، جاتے رہے۔ وہ فوراً ہی چلی گئی۔ میں اسے روک بھی نہیں سکا۔

ایک دم تیز دھوپ نکلی تھی پھر جانے کس تیزی سے بادلوں نے آسمان کو گھیر لیا۔ دیکھتے دیکھتے ہر طرف اندھیرا چھا گیا اور گھن گرج سے بارش ہونے لگی۔ میں نے مسہری پر لیٹ کے بہ جبر آنکھیں بند کر لیں۔ جولین جیسے مجھ سے چھیننے آئی تھی اور مجھے کسی شکنجے میں کس گئی تھی۔ میں بے تحاشا آئینے سے دھند صاف کرتا اور اپنا گم گشتہ آموختہ کرتا رہا۔ کچھ دیر کے لیے میں ضرور اپنے آپ سے غافل اور مسہری پر لوٹتا، تڑپتا رہا لیکن پھر سب کچھ میرے اختیار میں آگیا۔

دیواری گھڑی ٹک ٹک کرتی رہی۔ ایک بجا، پھر دو بج گئے۔ مجھے ایسا لگا جیسے زمین ٹھہر سی گئی ہو۔ گھڑی کی آواز رفتہ رفتہ ماند پڑنے لگی تھی۔ مجھ پر غنودگی طاری ہوئے گزرے ہوں گے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میرے جی میں آئی کہ جواب نہ دوں، ایسے ہی پڑا رہوں مگر جانے [illegible] بات ہوئی۔ کسی ان جانے وہم نے مجھے مسہری سے اٹھا دیا۔

ملازمہ مجھے کھانے کے لیے بلانے آئی تھی۔ پہلے میں نے منع کر دیا تھا، پھر میں نے اس سے کہا "ٹھیک ہے، میں ابھی آتا ہوں۔"

نیچے فرشی دسترخوان پر تقریباً سبھی موجود تھے۔ پلیٹیں رکھی ہوئی تھیں۔ میرے پہنچتے ہی ملازمہ، شہ پارہ اور فرخ ڈونگے بھی لے آئیں۔ صبح اتنے ناشتے کے بعد بھوک ویسے بھی نہیں لگ سکتی تھی، لیکن میں نیچے آیا تھا تو مجھے کھانے میں شامل رہنا چاہیے تھا اور شمولیت محض ساتھ بیٹھنے کی نہیں ہوتی۔ میں نے جولین کی ماں اور گیتا کی ماں رانی کو سلام کیا، گیتا سے خیریت پوچھی اور فرخ سے معلوم کیا کہ آج کون کون سے کھانوں پر تجربے کیے ہیں۔ ان پر اپنے ہوش حواس کی یک جائی کے اظہار سے زیادہ خود مجھے اپنے توازن اعتدال کی تصدیق مطلوب تھی۔ سبھی خاموش خاموش تھے، موت کے کھانے پر جو سوگواری ہوتی ہے۔ کھانے کے دوران میں جولین نے مجھے بتایا کہ بٹھل، جمرو اور ٹنگو پونا سے آچکے ہیں اور آتے ہی کلینک چلے گئے ہیں۔ یہ اطلاع میں نے اسی سکون سے سنی جس تحمل سے جولین نے سنائی تھی۔ دسترخوان سے اٹھ کے میں ملاقاتی کمرے میں آگیا۔ فرخ، فریال، شہ پارہ اور گیتا بھی میرے پیچھے پیچھے وہاں چلی آئیں۔

ساڑھے تین بج رہے تھے کہ جگنو وحشت زدہ انداز میں اندر آیا اور اس نے مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ اس کی ابتری دیکھ کے میرا دل دھک سے رہ گیا۔ جگنو کی بے حالی فرخ، فریال وغیرہ سے بھی چھپی نہیں رہ سکی تھی۔ گو جگنو نے ان کے استفسار پر تسلی دلاسے ہی کی بات کی لیکن اسے نہ اپنے لہجے کا کوئی اندازہ تھا نہ حال کا۔ باہر آکے اس نے اکھڑی ہوئی سانسوں سے مجھے بتایا کہ مارٹی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ دوسرے ہی لمحے میں نے دروازے کی طرف بھاگنا شروع کر دیا تھا۔ جگنو نے موٹر لانے کو کہا۔ موٹر زیادہ دور نہیں تھی۔ مجھے خیال آیا، میرے اس طرح چلے جانے سے اندر سبھی پریشان ہوں گے۔ انہیں کچھ بتا کے جانا ہی بہتر ہے۔ میں نے ڈرائیور سے ٹھہرنے کو کہا اور اندر جا کے انہیں بتا دیا کہ جگنو کیسی خبر لایا ہے۔

چند منٹ میں موٹر کلینک پہنچ گئی۔ سامنے دالان کی کرسی پر بٹھل سر جھکائے تنہا بیٹھا تھا۔ زورا، شامو، جمرو، دلوا اور ٹنگو مارٹی کے کمرے کے باہر منڈلا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کے زورا میرے گلے سے لپٹ گیا اور سسک سسک کر رونے لگا۔

جمرو نے اسے میرے پاس سے ہٹایا۔ میں نے اندر جانا چاہا لیکن نرس نے مجھے روک دیا۔ نرس کی زبانی معلوم ہوا کہ ڈاکٹر بھارگو، ڈیسائی، شیوا اور کیلاش اندر مارٹی کے پاس ہیں۔ کمرے سے مارٹی کے کراہنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ پندرہ بیس منٹ بعد ڈاکٹر بھارگو اور ڈاکٹر ڈیسائی باہر نکلے۔ ہم سب نے انہیں گھیر لیا۔ وہ دونوں ہونٹ لٹکائے، سرہلاتے رہے۔

"اپنے کو کچھ بولو صاحب!" زورا نے بلکتے ہوئے کہا۔

دونوں ڈاکٹروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ڈاکٹر ڈیسائی بھاری آواز میں بولا "ابھی کچھ ٹھیک ہے، پر پہلے ہم کیا بولے تھے بابا! سارا اوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔"

یہ کہتا ہوا ڈاکٹر ڈیسائی، ڈاکٹر بھارگو کے ساتھ اوپر اپنے گھر جانے والی سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ جو جہاں تھا۔ وہیں ساکت وصامت کھڑا رہ گیا۔

کیلاش ابھی اندر تھا۔ اس کے انتظار میں میری آنکھیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ شیوا کے ساتھ باہر آیا۔ دونوں کے چہرے سوجے ہوئے، شانے ڈھلکے ہوئے تھے۔ میں سامنے ہی موجود تھا۔ مجھے دیکھ کے کیلاش کے جسم میں ایک لہر سی اٹھی اور ڈوب گئی۔ اس کی چال میں پہلے جیسی لپک نہیں تھی۔ آہستہ قدموں سے وہ سیدھا میرے پاس آیا اور پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔

میں نے زبان کھولنی چاہی مگر مجھے اور کیا جاننا تھا۔ شامو کو قرار نہیں تھا۔ وہ گھگھیائے ہوئے لہجے میں بولا "ابھی کیسا ہے اپنا ماسٹر؟"

کیلاش اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے ڈوبی ہوئی آواز میں بولا "پہلے سے تو اب بہت سنبھل گیا ہے۔"

"ایک دم یہ کیا ہو گیا اس کو؟"

"کیا بتائیں" کیلاش کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ وہ نرم روی سے شامو کو سمجھانے لگا کہ "مارٹی کا سینہ پہلے سے متاثر تھا اور اس کی آنتیں بھی۔۔۔" اسے احساس ہوا کہ وہ انگریزی میں مخاطب ہے۔ یوں بھی یہ طبی زبان شامو کی سمجھ میں کیا خاک آئے گی۔ چند لمحوں کے تامل کے بعد وہ شامو کی زبان میں بولا کہ کئی اور اندرونی پیچیدگیاں بھی تھیں۔ ہم نے ان پر نظر رکھی تھی۔ خیال تھا کہ شگاف ذرا سوکھ جائے تو بعد میں باقاعدہ دوسرا علاج کیا جائے مگر کئی تکلیفیں ایک دوسرے پر اثرانداز ہوتی رہیں اور سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔ مارٹی کی آنتوں کی آگ، ہم نے بجھانے اور زخم سے دور رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن۔۔۔ کیلاش کی آواز حلق میں پھنس گئی۔ کہنے

لگا "ہم سب کو ایک ہی ڈر تھا۔"

"اب' اب کیا حال ہے اس کا؟" شامو نے ہذیانی انداز میں پھر وہی سوال دہرایا۔ شامو کی خواہش ہوگی کہ اس بار جواب میں شاید وہ کچھ اور سن سکے مگر کیلاش کے پاس کچھ اور ہوتا تو وہ اتنا بخل کیوں کرتا۔

زورا نے کیلاش کے پیر پکڑ لیے اور گڑگڑانے لگا۔ جمرو نے بہ مشکل اسے اٹھایا اور دور لے گیا۔ جمرو پھر سبھی کو دالان میں رکھی ہوئی کرسیوں تک لے آیا۔ سب وہیں ڈھیر ہوگئے۔

مارٹی کے کمرے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ دالان میں سناٹا طاری تھا۔ میں بٹھل سے بہت قریب تھا۔ اس نے نہ مجھ سے کچھ پوچھا' نہ سر اٹھا کے دیکھا۔ سبھی گونگے بن گئے تھے یا پتھر ہوگئے تھے۔ آدھ پون گھنٹے بعد ڈاکٹر بھارگو نیچے اترا اور چند لمحے مارٹی کے کمرے میں ٹھہر کے کلینک سے چلا گیا۔ کیلاش اور دوسرے ڈاکٹر اسے باہر تک چھوڑنے گئے تھے۔ واپس آکے کیلاش ہمارے درمیان ہی بیٹھ گیا۔ اس کی ہدایت پر کمپاؤنڈر چائے بنا کے لے آیا۔ بٹھل اور کیلاش کی موجودگی کی وجہ سے کسی نے پس و پیش نہیں کیا' میری طرح سبھی نے چائے زہر مار کی ہوگی۔

"آپ گھر چلے جاؤ بابا! سفر کی تھکن ہوگی" کیلاش نے جھجکتے ہوئے بٹھل کو مشورہ دیا۔

"تھکن تو ادھری آکے دور ہوگئی ساری" بٹھل نے بوجھل آواز میں کہا۔

کیلاش چپ ہوگیا مگر کچھ دیر بعد بٹھل خود اٹھ گیا۔ اس کے ساتھ سبھی کھڑے ہوگئے۔ بٹھل آہستہ آہستہ چلتا ہوا کلینک سے نکل گیا۔ وہ پیدل ہی جا رہا تھا۔ میں نے دبے لہجے میں اسے بتایا کہ موٹر بھی موجود ہے۔ جمرو نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ بھی ساتھ چلے' کوئی جواب دیے بغیر بٹھل موٹر میں بیٹھ گیا۔

دھوپ رینگتی ہوئی اوپر چلی گئی۔ کلینک میں اندھیرا پھیلنے لگا۔ کیلاش میرے پہلو میں بیٹھا تھا کہ ایک نرس مارٹی کے کمرے سے لپکتی ہوئی اس کے پاس آئی۔ اس نے بے ربطی سے انگریزی میں بتایا کہ مارٹی کی آنکھ کھل گئی ہے اور وہ درد و کرب کے عالم میں ہے۔ کیلاش ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ میں بھی اٹھا لیکن کیلاش نے مجھے کمرے میں نہیں جانے دیا۔

مارٹی کی چیخیں عمارت میں گونج رہی تھیں۔ خنجر کی طرح میرے سینے' میرے جسم میں پیوست ہو رہی تھیں۔ درد سہنے والے کو کچھ احساس نہیں ہوتا کہ دوسرے' اس کے جاں پر کیا گزرتی ہوگی۔ زورا' شامو' جمرو' ٹنگو کے چہرے رہے تھے۔ اتنے بہت سے آدمی ایک آدمی کا دکھ نہیں بانٹ سکتے! مارٹی بری طرح ڈکرا رہا تھا۔ ڈاکٹر شیوا بھی نیچے آ دونوں تعینات ڈاکٹر بھی اندر چلے گئے۔ زورا' شامو اور اندر جھانکنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ نرس نے دروازہ بند کردیا۔

کمپاؤنڈر نے کلینک کی ساری روشنیاں جلا دیں جب بینائی میں اندھیرا بیٹھا ہو' آنکھوں میں ریت بھری جانے کتنا وقت گزرنے پر کیلاش کمرے سے نمودار ہوا۔ کے ماتھے پر پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ اس نے مجھے اندر آ اشارہ کیا۔ مجھے اس کا مطلب سمجھنے میں دیر نہیں لگی' چار قدم کا فاصلہ طے کرکے وہ خود میرے پاس آگیا اور ہوئی آواز میں بولا "وہ آپ کو بلا رہا ہے۔"

"مجھے' مجھے بلا رہا ہے؟" میں نے اپنا خشک گلا تر کیا ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ میرا سارا جسم شل ہوگیا تھا۔ ٹانگوں سے میں اندر داخل ہوا۔ دونوں ڈاکٹر' نرسیں شیوا مارٹی کے بستر کے اطراف کھڑے تھے۔ مجھے دیکھ ہٹ گئے۔ ان کے ہٹنے پر مجھے مارٹی کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ رہا تھا۔ میں جھپٹ کے اس کے بستر پر بیٹھ گیا۔ مجھے کچھ معلوم کہ میں نے اس سے کیا کیا کہا' کیسا ہذیان بکتا رہا لمحے لمحے بدل رہا تھا' کبھی اس کی آنکھیں ویران ہو جا کبھی ان میں آگ بھڑکنے لگتی۔ میں نے اس کے ہاتھ پکڑ اور بے تحاشا چومتا رہا۔ میں نے اس کے گال چومے' پیشانی کو بوسہ دیا۔ اپنی بے ہنری اور بے اثری کا اح آدمی کو کیسا اجیرن' کیسا پاگل کردیتا ہے۔ میں نہ اپنے حال اسے بتا سکتا تھا' نہ اس کی دل جوئی کرسکتا تھا۔ نہ کچھ سننے کا یارا تھا۔ نہ میری اتنی استطاعت تھی۔ اس انگلیاں میری انگلیوں میں پیوست ہوگئیں "اپن کو معاف راجا بھائی!" وہ تڑپتی بلکتی آواز میں بولا۔

"کیا! تم کیا کہہ رہے ہو؟ کس بات کی معافی؟" میں اسے جھڑک دیا اور میری سسکی نکل گئی۔ میں نے اس منت کی کہ وہ ایسی باتیں نہ کرے۔

اس کی آنکھیں درد کی شدت سے بار بار بند ہو تھیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کی آواز نہیں نکل تھی۔ اس کے ہونٹ پھڑپھڑا کے رہ جاتے تھے۔ میں نے کان اس کے قریب کرلیے "بولو بولو مارٹی! کیا بات ہے؟" مسلسل اس سے پوچھتا رہا۔ بہت تگ و دو کے بعد اس ہونٹوں کی جنبش سے میری سمجھ میں کچھ آسکا کہ وہ شاید کوئن کہنا چاہتا ہے۔ "کوئن! کوئن! جولی!" میں نے دھڑکتی آواز میں تائید چاہی۔

اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ میری نگاہ فوراً دروازے کی طرف گئی۔ کیلاش دور کھڑا تھا۔ میں نے سوچا' اس سے کہوں لیکن پھر میں لپکتا ہوا باہر نکل آیا۔ میں نے جمرو کو پاس بلایا اور اس سے کہا کہ وہ کوئی تاخیر کیے بغیر جولین کو کلینک لے آئے۔

جمرو اسی لمحے دروازے کی طرف بھاگا۔ مجھے خیال آیا کہ باہر موٹر کھڑی نہیں ہوگی۔ ایک ہی صورت تھی کہ کیلاش اپنی موٹر لے کے جائے۔ جمرو نکل چکا تھا۔ مجھے کمرے سے بھاگتا دیکھ کے کیلاش بھی باہر آگیا تھا۔ میری بات سن کے اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ اپنی بے اوسانی اور منتشر حواس کے باوجود مجھے اتنا ہوش تھا کہ کیلاش کا تکدر یا تردد دور کرنے کے لیے جولین کے ساتھ چند اور نام بھی لوں۔ سو میں نے کہا۔ گیتا' فرخ فریال وغیرہ میں سے جو بھی فوراً آسکے' وہ اسے لے آئے۔ مجھے اندازہ تھا کہ جولین کے لیے اتنا ہی کافی ہوگا۔ وہ سنتے ہی چلی آئے گی۔ کیلاش بھی اسی دم باہر نکل گیا۔ جمرو ابھی اسے راستے میں مل سکتا تھا۔ میں واپس مارٹی کے پاس چلا آیا اور چپ چاپ اس کے سرہانے بیٹھ گیا۔ اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ اسے کیا تلقین' کیا تعلیم کروں۔ کون سے لفظ' کون سی زبان میں اسے امید' زندگی اور گداز کی ترغیب دوں۔ نہ پھول نہ ریشم' نہ رنگ نہ روشنی۔ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ سبھی کچھ ہیچ لگتا ہے۔ سب جھوٹ' سارا وہم و گمان' چند منٹ ہوئے ہوں گے کہ مارٹی کے پاس ٹھہر کے میں پھر باہر چلا آیا اور میں نے شامو سے پوچھا کہ کیلاش تو ابھی واپس نہیں آیا۔ وہ حیرانی سے کہنے لگا کہ وہ تو ابھی گھر تک بھی شاید نہ پہنچا ہو۔ ان سب نے مجھے گھیر لیا تھا۔ سب کچھ جاننے بوجھنے کے باوجود وہ مجھ سے سوال کرتے تھے کہ ایسی کیا بات ہے۔ میں انہیں کیا بتاتا۔ مجھ میں کچھ بتانے کی ہمت ہی کہاں تھی۔ وہ اصرار کرتے تو میری آنکھوں میں آنسو امڈنے لگتے اور جتنا میں ضبط کرنے کی کوشش کرتا' اتنا ہی سینہ گرجنے لگتا۔ ٹنگو پھر اپنا سر پیٹنے لگا۔ میں کبھی مارٹی کے کمرے میں جاتا' کبھی واپس آتا۔ وقفے وقفے سے اس پر غشی طاری ہو جاتی اور یکایک ہوک سی اٹھتی۔ وہ ہڑبڑا کے آنکھیں کھول دیتا اور مضطربانہ دیدے گھمانے لگتا۔

جولین کے کلینک میں آتے وقت مجھے باہر ہی رہنا چاہیے تھا۔ کہیں میں اندر کمرے میں ہوں اور جولین' فرخ' فریال وغیرہ کے ساتھ سیدھی کمرے میں چلی آئے۔ پہلے مجھے جولین سے کچھ کہنا تھا۔ نرسیں ہر لمحہ مارٹی کی نگرانی کر رہی تھیں۔ ایک ڈاکٹر بھی وہاں تھا۔ کمرے میں ویسے بھی میری مستقل موجودگی سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

اس وقت میں کمرے سے باہر ہی تھا کہ موٹر کا ہارن بجنے کی آواز آئی۔ دربان نے چھوٹا دروازہ کھولا تو مجھے جمرو دکھائی دیا۔ مجھ میں ذرا سا تحمل نہیں تھا۔ جولین کو سامنے نہ دیکھ کے مجھے ہول آنے لگا۔ اس بے جواز شبہے نے کہ کہیں کسی وجہ سے جولین نہ آسکی ہو' میرا جسم منجمد کردیا۔ اسے تو ہر حال میں آنا چاہیے۔ میری نظریں دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ جمرو کے بعد شہ پارہ اور فرخ دروازے میں داخل ہوتی نظر آئیں۔ جولین ان کے پیچھے تھی۔ اسے دیکھ کے میرے اوسان کچھ بحال ہوئے۔ وہ نیلی شال لپیٹے ہوئی تھی' سر جھکائے وہ جیسے ہی صحن میں آئی' میں نے بڑھ کے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ اتنا موقع نہیں تھا کہ میں کھل کے کوئی بات کرسکتا۔ جیسے تیسے میں نے ہانپتی سانسوں سے اسے کچھ بتانا چاہا۔ وہ ساکت کھڑی رہی اور میری بات پوری سنے بغیر آگے چل پڑی۔ اس اثنا میں کیلاش بھی موٹر بند کرکے اندر آگیا۔ فرخ' فریال' مارٹی کے کمرے میں داخل ہوا چاہتی تھیں' انہیں یوں روکنا عجیب سا لگ رہا تھا تاہم کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔ مجھے انہیں روکنا ہی تھا۔ بہ مشکل میں نے جرات کی اور ان سے کہا کہ باری باری وہ اندر جائیں تو اچھا ہے۔ جولین نے انہیں پس و پیش کی مہلت نہیں دی اور کمرے میں داخل ہوگئی۔ کیلاش بھی یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ باہر ہی ٹھہرا رہا۔ میں سوچ رہا کہ اس سے کس طرح کہوں کہ کچھ دیر کے لیے وہ کمرے میں موجود دونوں نرسوں اور ڈاکٹر کو بھی باہر بلا لے۔ میں کیلاش سے ابھی کچھ کہہ نہیں پایا تھا اور ارادہ ہی کر رہا تھا کہ اس نے میرے چہرے سے جیسے میرا مدعا جان لیا۔ اس نے دروازے کے پاس کھڑی ہوئی فرخ اور شہ پارہ کو دوسرے کمرے میں بیٹھنے کی ہدایت کی اور خود مارٹی کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ فوراً ہی واپس آگیا اور وہ اکیلا نہیں تھا۔

مجھے دالان میں رکھی ہوئی کرسی پر بٹھا کے وہ ڈاکٹر اور نرسوں کے لیے مخصوص کمرے میں جا چھپا' میں سمجھتا تھا۔ وہ جان بوجھ کے مجھ سے اوجھل ہوا ہے۔ اسے احساس ہوگا کہ اس وقت میرے سامنے اس کی موجودگی مجھے اور گراں بار کرسکتی ہے۔ میں اس کے چہرے پر بلبلاتے ہوئے سوالوں کا

جواب نہیں دے پاؤں گا یا اسے خود اپنا یارا نہیں تھا۔ وہ اپنی آنکھوں میں اٹھتا ہوا غبار مجھ سے نہ چھپا سکے گا اور یہ اس قسم کے کسی تاثر و احساس، رنج و شکایت اور ہیجان و اضطراب کا کوئی محل نہیں ہے۔ سوا اسے میرے قریب نہیں رہنا چاہیے۔ تمام جور و ستم کے لیے آدمی کے پاس اپنا سینہ تو ہوتا ہی ہے، اسی کو آزماتے رہنا چاہیے۔

جولین کے اندر جانے کے بعد مارٹی کے کمرے سے کوئی آہ اور کراہ بلند نہیں ہوئی۔ سب ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ زورا کسی خانماں برباد شخص، کسی پاگل کے مانند فرش پر سر پکڑے بیٹھا تھا۔ اس کے پہلو میں ٹنگو اپنا منہ نوچ کھسوٹ رہا تھا۔ جمرو، شامو، جگنو اور دیوا، دیواروں اور کھموں سے ٹیک لگائے گم کھڑے تھے۔ کلینک پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بس دیوار کے وسط میں نصب گھڑی کی آواز دالان میں گونجتی رہی۔

جولین کو اندر گئے آٹھ دس منٹ سے زیادہ نہیں ہوئے ہوں گے کہ وہ ہانپتی کانپتی دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس کی آنکھوں سے وحشت برس رہی تھی اور چہرہ جیسے آگ میں جل رہا تھا۔ اپنی شال کی بے ترتیبی کا بھی اسے ہوش نہیں تھا۔ دروازے پر اس کی سیمابی نگاہوں نے میری پناہ گاہ دیکھ لی تھی۔ وہ دیوانہ وار میری طرف بڑھی اور میرے پاس آ کے اس کا بدن بل کھا گیا، وہ میرے قریب کی کرسی پر نڈھال ہو کے بیٹھ گئی اور اس نے شال سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے زمین میں دھنسا جا رہا ہوں۔ میں نے اٹھ کے اس سے پوچھنا چاہا، پھر میں نے مارٹی کے کمرے کا رخ کیا اور دروازے میں داخل ہوتے ہوتے پلٹ کے ڈاکٹروں کے کمرے کی طرف بھاگا۔ کیلاش بھی آہٹوں کا منتظر تھا۔ وہ خود کمرے سے باہر آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے دونوں ڈاکٹر، دونوں نرسیں بھی۔۔۔

کیلاش دیر تک مارٹی کے کمرے سے نہیں نکلا۔ ایک نرس اوپر جا کے ڈاکٹر ڈیسائی کو بلا لائی۔ ڈاکٹر شیوا اور اس کی بیوی بھی نیچے آ گئے۔ کچھ دیر میں ڈاکٹر بھارگو بھی کلینک میں آ گیا۔ فرخ اور شہ پارہ ایک خالی کمرے میں اپنی باری کا انتظار کرتی رہیں۔ جولین بھی ان کے پاس پہنچ گئی تھی۔ یہی مناسب تھا کہ وہ گھر واپس چلی جائیں۔ کیلاش کے مصروف ہو جانے کی وجہ سے اس کی موٹر میں واپسی ممکن نہیں تھی۔ دیوا ان کے لیے سواری لے آیا۔ تینوں گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کے گھر کی طرف روانہ ہو گئیں۔

○☆○

اس وقت نو بج رہے تھے۔

رات کو دس بجے کے قریب مارٹی مر گیا۔

گیارہ بجے تک ہم اسے گھر لے آئے تھے۔ رات بھر وہ گھر ہی رہا۔ دوسرے دن صبح نہادھو کے اور نئے کپڑے پہنا کے اسے تیار کر دیا گیا۔ اس کی میت کے جلوس میں گنتی کے آدمی تھے۔ گھر کے سارے مرد، کیلاش کے علاوہ ڈاکٹر شیوا اور وہ دونوں ڈاکٹر جو آخر تک اس کی نگہداری کرتے رہے، چھیدا اور ماہم کے باڑے کے دو چار آدمی، جہاں مارٹی کبھی حکومت کیا کرتا تھا۔ ٹنگو اس گلی میں جا کے خبر کر آیا تھا۔ اس گلی سے تین آدمی قبرستان آئے۔ ان میں ایک عمر رسیدہ عورت بھی تھی۔ ٹنگو کے کہنے کے مطابق وہ مارٹی کے دور کے عزیز تھے۔ مارٹی کا تابوت قبر میں اتارنے سے پہلے کھول دیا گیا۔ اس کے چہرے پر سکون چھایا ہوا تھا۔ ہر اذیت اور غم سے بے نیاز۔ جیسے اسے کچھ ہوا ہی نہ تھا، جیسے ابھی ابھی سویا ہو اور کوئی خواب دیکھ رہا ہو، ذرا سی آہٹ سے اٹھ جائے گا۔ عمر رسیدہ عورت تابوت سے لپٹی سسکیاں بھرتی رہی۔ ٹنگو دھاڑیں مارتا رہا۔ مارٹی سوتا رہا اور اسے جلد ہی مٹی میں دبا دیا گیا اور مٹی پر ابا جان نے بے شمار پھول بکھیر دیے۔ گلاب کے تازہ تازہ، سرخ سرخ پھول۔

سارے کاموں سے نمٹ کے ہم گھر واپس آ گئے۔

اس دن جیسے گھر کے سارے لوگ مر گئے تھے۔ کوئی کسی کی طرف دیکھتا، کسی سے بات نہیں کرتا تھا۔ زورا تو بالکل پاگل ہو گیا۔ رات کو اس نے تھانے جا کے خود کو پیش کر دیا۔ دوسرے دن صبح صبح پولیس آ گئی۔ وہ لوگ دوپہر تک طرح طرح کے سوالات کرتے رہے۔ پھر شامو، دیوا اور جگنو نے بھی اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ کہنے لگے صرف زورا نہیں، وہ بھی اتنے ہی قصوروار ہیں۔ شامل تو میں بھی ان میں تھا، مجھے بھی اپنا نام دے دینا چاہیے تھا لیکن میں بس دیکھتا اور سنتا رہا۔ ابا جان کو ڈاکٹر ڈیسائی کے پاس جانا پڑا۔ ڈاکٹر ڈیسائی، بھارگو، شیوا اور کیلاش کی یقین دہانی اور تسلی تشفی پر پولیس کو کچھ خیال آ گیا۔ ابا جان نے مدد کے لیے احتیاطاً شکلا کو بھی بلوا لیا تھا۔ ممکن ہے ابا جان نے کچھ دولت بھی لٹائی ہو۔ ان کے پاس یہ ایک بڑا ہنر تھا۔ زورا کو وہ اسی شام حوالات سے لے آئے۔ وہ آنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ گھر آ کے بھی فیل مچانے، دیواروں سے سر پھوڑنے لگا۔ بٹھل نے اٹھ کے اسے طمانچے مارے، ٹھوکریں لگائیں تب وہ قابو میں آیا۔

سارا دن پولیس کے سوال و جواب اور زورا کی دیوانگی میں گزر گیا۔ مجھے بھی سب کے ساتھ بیٹھنا پڑا۔ میں تو اپنے

کمرے ہی میں پڑا رہنا چاہتا تھا اور سب کی شاید یہی خواہش تھی۔ سب ایک دوسرے سے منہ چھپائے پھر رہے تھے۔ کبھی کوئی سامنے آ جاتا تو گلے مل کے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگتا۔ ایک غم گسار اور دوسرے غم گسار سے کہہ بھی کیا سکتا ہے، آنسوؤں کے سوا کیا دے سکتا ہے۔ میری آنکھوں میں تو آنسو بھی نہیں رہے تھے۔ میں اندر گھر کی طرف بھی نہیں گیا۔ قبرستان سے واپسی پر ملاقاتی کمرے سے گزرتے ہوئے میں نے رما کی جھلک دیکھی تھی۔ اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی سرخ سپید لڑکی کوشلی ہی ہو سکتی تھی۔ رما نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور صوفے سے اٹھ گئی تھی لیکن میں سیڑھیاں طے کر کے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ وہ دونوں شاید رات کو واپس گئیں۔ کیلاش تو دن بھر وہاں رہا۔ دوسرے دن بھی وہ سویرے سویرے آ گیا تھا۔ پولیس کے آنے پر ابا جان اسی کو لے کے ڈاکٹر ڈیسائی کے پاس گئے تھے۔

"یہ کیسا عالم ہوتا ہے جب نہ کوئی راحت ہوتی ہے نہ اذیت، نہ دکھ سکھ۔ آدمی سانس لیتا، اٹھتا بیٹھتا، چلتا پھرتا ہے پر نہ تازہ ہوا کی کشادہ تنی، نہ حبس کی تنگی، نہ وقت، رفتار اور موسم کا احساس۔ آدمی زندہ ہے، مردہ بھی نہیں۔ مقبرے تو زندہ آدمیوں کے بھی ہوتے ہیں۔ ابا جان کا یہ عظیم الشان مکان بھی کوئی مقبرہ بن گیا تھا۔ کھنڈر صرف عمارتوں کے نہیں ہوتے، آدمی بھی تو کھنڈر ہو جاتے ہیں اور جب آدمی کھنڈر ہو جائیں تو اونچے محل دو محلوں کی کیا حیثیت۔ ان بستیوں کو پھر کیا کہنا چاہیے جہاں کے مکین ہی کھنڈر ہو چکے ہوں۔

آدمی بھی درختوں کے مانند ہوتا ہے، قد و قامت، سائے، ثمر اور شاخوں میں بالکل درخت کے مثل۔ درخت گر جائے تو اندازہ ہوتا ہے، اس کا سایہ کتنا پھیلا ہوا، ثمر کتنے شیریں اور جڑیں کتنی گہری تھیں۔ آدمی کے جانے کے بعد ہی کچھ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتنا محیط ہے، رنگوں اور روشنیوں میں کتنا شامل۔ اس کے جانے سے رنگ مرجھا جاتے ہیں اور روشنیاں کیسی سنسان، ویران ہو جاتی ہیں۔ ایک آدمی کی صرف اپنی آنکھیں نہیں ہوتیں، وہ بہت سی آنکھوں میں رہتا ہے اور بہت سے دلوں میں دھڑکتا ہے پھر ایک آدمی کے جانے سے بینائی تو کم ہو ہی جائے گی، دل تو غریب ہو ہی جائے گا۔ اور جانے والے کو کچھ خیال نہیں ہوتا کہ وہ کیسی خود غرضی کر رہا ہے۔ موت تو ایک طرح کی خود غرضی ہے۔ کتنوں کو دکھ دے کے آدمی سکھ سے چلا جاتا ہے، چپکے سے چلا جاتا ہے۔ پلٹ کے نہیں دیکھتا، کون صدا لگاتا، کس کا سینہ جلتا ہے۔ کس کی آنکھیں خوں بار ہیں۔

تیسرے دن، اول پہر کا وقت ہو گا۔ میں اوپر کے کمرے میں پڑا تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ صبح کسی وقت ملازمہ آ کے چائے وغیرہ رکھ کے چلی گئی تھی۔ میرے تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ باہر سے آنے والی چاپ کیلاش کی ہو گی اور وہ اچانک اوپر چلا آئے گا۔ میں اٹھ کے بیٹھ گیا۔ وہ مجھ سے اس طرح بے اطلاع، بے اجازت چلے آنے کی معذرت کرنے لگا اور کہنے لگا "مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے" میں چپ رہا تو وہ کچھ تامل کے بعد بولا "میں آپ کو نیچے لے چلنے کے لیے آیا ہوں" میں نے گہری سانس بھری اور پوچھا۔

"نیچے کوئی خاص بات ہے؟"

کہنے لگا "کوئی خاص بات نہیں مگر اور بھی لوگ ہیں، جنہیں آپ کی ضرورت ہے۔ جنہیں آپ کی طرح دکھ ہے۔ اس طرح تنہا رہنے سے تو جی اور خراب ہو جائے گا۔"

میں نے حجت نہیں کی "ٹھیک ہے، نیچے چلتے ہیں۔ کوئی فرق پڑتا ہے تو ٹھیک ہے۔"

وہ سر جھٹک کے بولا "ہاں پڑتا ہے۔ یوں سب ایک دوسرے سے بے پروا ہو جائیں تو پھر۔۔۔" اس نے میرا بازو کھینچ کے کہا۔ "بس آپ اٹھ جائیے اور پہلے ذرا منہ ہاتھ دھو لیجیے۔"

میں نے کسی چون و چرا کے بغیر اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ غسل خانے سے منہ پر دو چار چھپکے مار کے میں باہر آیا تو اس نے جیب سے کنگھا نکال کے میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے کنگھا اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ مسہری کے پاس رکھی ہوئی کرسی پر سر جھکائے بیٹھا رہا اور جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو، ایسے کہنے لگا "ہم نے اپنے سارے جتن کیے تھے۔ اتنا زیادہ کسی کے ساتھ نہیں ہوتا۔ میں نے تو خدا سے دعا مانگی تھی کہ وہ میری کچھ زندگی ہی اسے دے دے لیکن۔۔۔"

اس کی آواز بھن بھنانے لگی، پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا "کیا، کیا جا سکتا ہے؟ اس کے سوا کہ اس نے وقت طے کر دیا ہے اور ہم بونے لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم بھی کچھ کر سکتے ہیں۔"

میں نے اس سے کچھ نہیں کہا "مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ کیا کہنا چاہیے۔ وہ از خود بولتا رہا۔ "مگر وہ، وہ بہت سکون سے گیا ہے۔ آخر میں اسے کوئی تکلیف نہیں تھی۔ وہ تو جیسے میٹھی نیند سو رہا تھا۔ ڈاکٹر ڈیسائی اور ڈاکٹر بھارگو جیسے ڈاکٹروں کو حیرت تھی کہ یہ کون سی حالت ہے۔ انہوں نے اس کا درد دوبارہ جگانے کی کوشش کی۔ کبھی اس سے بھی فائدہ ہوتا ہے لیکن وہ تو کچھ اور ہی ٹھان چکا تھا۔ لگتا تھا، وہ تو ہر دکھ، ہر تکلیف سے۔۔۔ آپ نے اس کا چہرہ دیکھا تھا، کوئی کہہ سکتا تھا

کہ اس نے پچھلے دن کیسے بتائے ہیں؟"

کیلاش کرسی سے اٹھ گیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے وہ پھر بڑبڑانے لگا "ڈاکٹر بھارگو کو بہت صدمہ ہے کہ اچانک یہ کیا۔ ان کے لیے تو یہ سب کچھ کسی حادثے کی طرح تھا۔ ڈاکٹر بھارگو کے لیے کہا جاتا ہے کہ خدا ان سے بہت خوش ہے۔ وہ جس مریض پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں' خدا بھی اس سے راضی ہوجاتا ہے" ہم نیچے آگئے تو کیلاش چپ ہوگیا۔

اندر کسی کمرے میں جانے کے بجائے وہ مجھے عقبی حصے کی طرف لے آیا۔ عقبی حصے کے چبوترے پر چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ کچھ بھی مختلف نہیں تھا۔ موت ہوجانے پر ہر گھر میں یہی کچھ منظر ہوتا ہے۔ تقریباً سبھی موجود تھے جو چبوترے پر نہیں تھے' وہ ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ چبوترے کے وسط میں بٹھل گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ ماہم کے پاڑے پر پیرو کا جانشین پانڈے دادا' بانکے اور دوسرے چار پانچ دادا اس کے اطراف بیٹھے تھے۔ چبوترے سے کچھ دور وسیع شامیانے کے نیچے سائلوں کا ہجوم تھا۔ ایک طرف دیگیں چڑھی ہوئی تھیں۔ وہیں بید کی کرسی ڈالے منیر علی کھانے کی نگرانی کررہے تھے۔ مولوی اکرم' جگنو اور دیوا کے ساتھ بے سلے کپڑے لوگوں میں تقسیم کررہے تھے۔ ساتھ میں ایک ایک لفافہ بھی وہ حاجت مندوں کی نذر کرتے جاتے' لفافوں میں نقدی ہوگی۔ چبوترے کے پاس رکھے ہوئے کپڑے کے گٹھ لوگوں کو اچھی طرح دکھائی دے رہے ہوں گے لیکن وہ بہت بے تاب ہورہے تھے۔ بعید نہ تھا کہ وہ چھینا جھپٹی کرنے لگیں یا مولوی اکرم پر ٹوٹ پڑیں۔ مولوی اکرم باربار ڈانٹ ڈپٹ کرتے کہ اطمینان رکھو' ہر ایک کی باری آئے گی' کوئی خالی ہاتھ نہیں جائے گا۔ وہ لوگ سمجھ رہے ہوں گے کہ مرنے والا کوئی بہت مال دار آدمی ہوگا۔ امیر مرتا ہے تو غریبوں کا کچھ بھلا ہوجاتا ہے۔ پھر تو یہ لوگ امیروں کی جلد موت کی آرزو بھی کرتے ہوں گے۔ عقبی حصے میں ملازموں کے مکانات بنے ہوئے تھے۔ ملازموں کی آمدورفت کا راستہ بھی الگ تھا۔ اسی راستے سے سائلوں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ پیرو کے وقت اباجان کو مکان کے باہر شامیانے لگوانے پڑے تھے۔ ساری گلی بھرگئی تھی۔ اباجان کی سوجھ بوجھ کے اب سبھی قائل ہوں گے۔ اتنے بڑے مکان سے کم ازکم یہ فائدہ تو ہورہا تھا۔ ابھی اتنے ہی لوگ یہاں اور آسکتے تھے۔ مکان ایسے ہی گنجائش والے ہونے چاہئیں کہ وقت بے وقت کام آسکیں۔

دوپہر تک لوگوں کی تعداد اور بڑھ گئی۔ پانڈے اور دوسرے داداؤں نے دوپہر کا کھانا سب کے ساتھ کھایا۔ ان کے سوا کوئی مارٹی کے پرسے کے لیے نہیں آیا حالانکہ بچپن ہی سے اڈوں اور پاڑوں سے مارٹی کا تعلق رہا تھا۔ ایک بار تو وہ باقاعدہ ایک پاڑے کی گدی کا راجا بھی بنا تھا۔ میں نے بالم خاں کے پاڑے پر قبضہ کرکے اسے نگراں بنایا تھا۔ وہ زیادہ عرصے وہاں نہیں رہا۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل والی بات ہوتی ہے۔ آدھی موت تو آدمی کے سامنے نہ ہونے سے ہوجاتی ہے۔ اباجان کی تلاش میں ہم سب کے ساتھ تبت جانے سے پہلے ہی وہ اڈوں پاڑوں سے ناتا توڑ چکا تھا۔ وہ تو جانے کب سے کسی سائے کی جستجو میں بھٹک رہا تھا۔ مجھ سے ملنے کے بعد پہلی بار کسی گھر سے اس کا واسطہ پڑا تو اس نے پھر کسی اور طرف دیکھنے' کہیں اور جانے کا خیال ہی نہیں کیا۔ میں بمبئی میں نہیں تھا تو وہ صبح وشام جولین کے گھر حاضری دیا کرتا تھا۔ تبت سے واپسی کے سفر میں وہ اباجان کا بہت لاڈلا ہوگیا تھا۔ ان کی خدمت کا بہانہ ڈھونڈتا رہتا۔ اب تو اباجان اسے اپنا چوتھا بیٹا کہنے لگے تھے۔ بیشتر جگہوں پر وہ اسے ساتھ لے جاتے۔ اباجان اپنے بیٹے کی رسمیں ادا کررہے تھے۔ موت کی رسمیں ادا کیے بغیر موت مکمل کہاں ہوتی ہے اور مال وزر ہو تو رسمیں بھی صحیح طرح ادا ہوتی ہیں۔ اباجان کے خزانے میں ویسے بھی مارٹی کا حصہ بنتا تھا۔ اباجان کے پاس یہ بھی ایک جواز مارٹی کے نام پر زرومال صرف کرنے کا تھا۔ آدمی سب سے پہلے تو خود کو جواب دہ ہوتا ہے۔ زندگی میں نہیں تو موت کے بعد اباجان نے اس کا حق ادا کردیا۔ اباجان کے لیے پتھروں کے حصول میں مارٹی نے بھی زندگی داؤ پر لگائی تھی۔ تبت میں جس طرح سلطان من میاں اور روزیر غارت ہوگئے' وہ بھی ختم ہوسکتا تھا۔ کاش ایسا ہی ہوجاتا۔ میری بات دوسری تھی مگر پھر وہ اوروں کے اتنا سامنے' اس قدر قریب نہ آتا اور سب اتنے ہلکان نہ ہوتے۔ اوپر کے کمرے میں کیلاش جب مجھ سے نیچے چلنے اور دوسروں کا خیال رکھنے کی تاکید کررہا تھا' تو مجھے یہی بات اس سے کہنی چاہیے تھی' آدمی کو دوسروں میں بہت شامل نہیں ہونا چاہیے۔ پھر اس کے کھوجانے سے دوسرے یوں اجیرن نہیں ہوتے۔ اباجان کے چہرے پر تو وہ زردی مل کے گیا تھا۔ کانتے اور پیرو کے موقعوں پر وہ خاصے سنبھلے ہوئے تھے' اب تو بہت لٹے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ دولت کے باوجود ایسے لٹے ہوئے' ایسے برباد۔

کیلاش' جمرو' زورا اور شامو کے ساتھ میں چبوترے کے ایک گوشے میں بیٹھا رہا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد پانڈے' بانکے اور دوسرے دادا بٹھل کے آگے سے اٹھ کے میرے پاس آئے تو مجھے احساس ہوا کہ اتنی دیر ہوگئی۔ مجھے خود ان لوگوں کے پاس جانا چاہیے تھا۔ سب نے باری باری مجھے گلے لگایا اور میری کمر تھپکتے رہے۔ پانڈے دادا نے تو میری پیشانی کو بوسہ دیا اور کہنے لگا "اپن سے کوئی غلطی ہوگیا ہے دادا!" میں نے سٹپٹا کے کہا "نہیں دادا! بالکل نہیں" وہ میرے گال پر آہستہ سے چپت لگاتے ہوئے بولا "پھر ابھی ایسا کیا ہے' اپن کو خبر بھی نئیں کیا!" میں نے ٹوٹی پھوٹی آواز میں کہا "بس دادا! بس ایسے ہی کچھ ــــ" وہ سہلانے لگا اور آزردگی سے بولا "ایسا ہی ہوتا ہے سالا! ابھی اپن کیا بولے' یہ اوپر والا کبھی بہت مسخری کرتا ہے۔ ابھی بار کسی کا ہوتا' اٹھا کسی کو لیتا ہے۔ اس کا مرضی ہے بابا! اپن کو دیکھو' اپن پرانا' ایک دم کھوسٹ لوگ کو چھوڑکے کیسا نوا' نوا ـــ ماں قسم' کندھا دیتے دیتے ابھی اپنے سے شرم آتا ہے اپن کو۔"

پانڈے' بانکے' دوسرے داداؤں کے ساتھ شام کو چلے گئے لیکن عقبی حصے میں مارٹی کے تیجے کا میلا رات تک لگا۔ جمرو' شامو اور ٹنگو بیشتر وقت میرے ساتھ ہی بیٹھے رہے تھے اور اباجان' منیر علی اور مولوی اکرم کا ہاتھ بھی بٹاتے رہے تھے۔ زورا اپنی جگہ سے نہیں اٹھا۔ نہ میری طرح اسے کسی نے کام پر مامور کیا۔ دوسروں کے مقابلے میں دونوں شاید زیادہ معذور تھے۔ عقبی حصے سے فارغ ہوکے رات کو سب ملاقاتی کمرے میں جمع ہوگئے۔ سارے دن کی جاں فشانی ان کے چہروں سے عیاں تھی لیکن اس تھکن میں سکون بھی شامل تھا۔ اپنی ذمے داری سے حسن وخوبی سے فارغ ہوجانے کا سکون۔ آدمی کے جانے کے بعد اس کے پس ماندگان اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔ وہ اس کے ساتھ نہیں جاسکتے تو اتنا تو کرسکتے ہیں۔ تیجا' دسواں' بیسواں' چالیسواں' پہلی برسی' دوسری' تیسری' چوتھی۔ پھر رفتہ رفتہ جانے والے آدمی کے نقش مدھم پڑتے جاتے ہیں۔ کسی کے پہلے' کسی کے بعد میں اور آدمی وقت کے سمندر میں حباب کے مانند گم ہوجاتا ہے۔ جیسے کبھی اس دنیا میں آیا ہی نہیں تھا۔

کیلاش کی زبانی معلوم ہوا کہ رما بھی صبح اس کے ساتھ آئی تھی اور دن بھر یہیں رہی۔ کوشلی کی وجہ سے اسے شام ہی کو جانا پڑا۔ رات گئے پھر کیلاش نے گھر جانے کا ارادہ کیا اور سبھی اٹھ گئے۔ میں بھی اوپر اپنے کمرے میں جانے کے لیے کھڑا ہوگیا تھا کہ جمرو اور شامو نے مجھے روک لیا' کہنے لگے کہ آج میں انہی کے ساتھ رہوں۔ جمرو کہنے لگا "دل بہت لوٹ رہا ہے لاڈلے!" ہم سب ایک ہی کمرے میں آگئے اور چپ بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ کسی کو نیند نہیں آرہی تھی۔ ٹنگو پھر مارٹی کی باتیں سنانے لگا۔ ان دنوں کی باتیں جب وہ مارٹی کا ساتھی تھا اور ٹنڈے کے نام سے مشہور تھا۔ بعد میں بٹھل نے اسے ٹنگو کہنا شروع کیا تو وہ ٹنگو ہوگیا۔ مارٹی کی باتیں سناتے سناتے ٹنگو کی آواز بھکنے اٹکنے لگی۔ مجھے پہلے ہی بہت گھٹن ہورہی تھی مگر میں ٹنگو کو کیسے منع کرسکتا تھا۔ اس نے سبھی کے سوئیاں چبھودیں۔ زورا تو کب کا بھرا بیٹھا تھا۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ کئی بار میرے جی میں آئی' انہیں جھڑک دوں کہ اس طرح رونے پیٹنے کی کیا ضرورت ہے۔ گورکن کی طرح موت کی تو اب سب کو عادت ہوجانی چاہیے لیکن میں چپ رہا۔ یہی ہوتا آیا ہے' یہی ہوتا رہے گا۔ لوگ مرتے رہیں گے' لوگ روتے رہیں گے۔ گنتی کے وہ قول مجھے بھی اچھی طرح یاد تھے جو ایسے وقت کے لیے لوگوں نے ازبر کرلیے ہیں۔ اگر وہ مجھ سے نہیں دہرائے جاتے تھے تو کم ازکم ان کی اشک باری میں تو ساتھ دینا چاہیے تھا لیکن مجھے چڑسی ہورہی تھی۔ رونے کے لیے شاید انہیں فراغت کا یہی وقت ملا تھا۔ وہ روتے رہے اور میں کسی اجنبی کی طرح ان کے درمیان بیٹھا رہا۔

○☆○

مارٹی کو گئے ہوئے ساتواں یا آٹھواں دن تھا۔ مجھے صحیح کچھ یاد نہیں تھا۔ میرے لیے تو ہر دن ایک جیسا تھا۔ انہوں نے صبح مجھے ناشتے کے لیے طلب کیا تھا۔ حسب معمول ناشتا کرکے میں نچلی منزل کے ایک دورافتادہ کمرے میں آکے لیٹ گیا تھا کہ یکایک بٹھل کو سامنے دیکھ کے حیران رہ گیا۔ وہ جانے کس طرح اندر آگیا تھا کہ مجھے اس کی آہٹ کا بھی احساس نہیں ہوا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا "بیٹھ جارے" اس نے بھاری آواز میں کہا "بیٹھ جا۔"

"کیا بات ہے؟ تم' تم یہاں کیسے؟" میں نے سٹپٹا کے پوچھا۔

وہ پلنگ کی پائنتی پر بیٹھتے ہوئے بولا "چلنا نہیں ہے؟"

"کہاں؟" میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا "کہاں جانا ہے؟"

"ادھری' حیدرآباد کی طرف!" وہ آہستگی سے بولا۔

مجھے جھٹکا سا لگا جیسے کوئی خنجر سینے میں پیوست ہوا ہو اور سارے جسم میں آگ بھڑک اٹھی ہو۔ لمحوں تک میرا یہی حال رہا۔

"دوپہر کی گاڑی سے چلتے ہیں" وہ زیرلبی سے بولا۔

"مگر میں" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا "میں تو کہیں نہیں جا رہا۔"

وہ دیر تک خاموش رہا' پھر ہنکاری بھر کے بولا "دوپہر کی گاڑی کے ٹکٹ آگئے ہیں۔"

"مگر مجھے کہیں نہیں جانا۔"

"جانا تو ہے رے۔"

"کوئی ضرورت نہیں' کہیں بھی جانے کی ضرورت نہیں۔" میری آواز بکھر گئی "میرا جی اب کہیں جانے کو نہیں چاہتا۔"

وہ سہلانے لگا "اپنا کون سا چاہتا ہے' پر جانا تو چاہیے۔"

"پھر' پھر کبھی دیکھیں گے' ابھی تو۔۔۔"

"پھر کیا ہو جائے گا' لوٹ کے آجائے گا وہ؟"

اپنے ہونٹ چبانے اور آہ بھرنے کے سوا میرے پاس کیا جواب تھا "تم آرام کرو۔ بھول جاؤ وہ سب۔ تمہیں یہ سب بتایا کس نے ہے' ضرور جولی نے۔۔۔"

"اسی نے بولا ہے" وہ میری بات کاٹ کے چن چناتی آواز میں بولا "نہیں بولنا چاہیے تھا اس کو؟"

"کسی طرف جانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

"کیوں رے؟" اس کی تیوری پر بل پڑ گئے "کیوں نہیں ہے؟"

"بس" میں نے تندی سے کہا "بس نہیں ہے۔"

"تو اپنے کو اکیلا ہی جانا ہے کیا؟"

"تم سے کون کہہ رہا ہے' میں نے تم سے منت نہیں کی۔"

"تو پہلے کیوں جا رہا تھا وہاں؟" وہ درشتی سے بولا۔

"مگر میں نہیں گیا" میں نے چیخ کے کہا۔

"کیسا بولتا ہے رے" وہ منہ بنا کے بولا "تجھ کو کچھ پتا نہیں' اوپر سے وقت کتنا نکل گیا ہے۔ تو تو ابھی تک وہی ہے' ویسا ہی نیم پہ چڑھا ہوا۔"

"ہاں ہاں' میں ابھی تک ویسا ہی ہوں۔ مجھ کو کیا پتا' میں تو پاگل ہوں' جنگلی ہوں' پر کسی کو کاٹ کھانے کو نہیں دوڑتا۔ مجھے اپنی حالت پر چھوڑ دو۔ میں کسی سے کیا کہہ رہا ہوں۔"

وہ خشمگیں نظروں سے مجھے گھورتا رہا اور پلنگ سے اٹھ گیا "ٹھیک ہے رے' اپنے کو زیادہ بات نہیں آتی۔ اپنے کو جانا ہے' ساتھ چلنا ہو تو وقت پر تیار ہو جانا۔"

"تم' تم کیا کرو گے وہاں جا کے!" میں نے زہر خند سے کہا "تمہیں تو ویسے بھی اس طرف جانے کا ارادہ کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ سمجھ لینا چاہیے۔ بھول گئے' وہاں سے کیسے آئے تھے؟"

"چوری کر کے' ڈاکا ڈال کے آئے تھے۔"

"یہ مجھ سے کیوں پوچھتے ہو' اپنے آپ سے پوچھو۔ ڈاکا نہیں ڈالا تھا تو کیا ہوا' کانتے ایسے ہی جان سے چلا گیا۔ اسی رات اباجان کی حویلی میں ہونے والی نوٹنکی تو خوب یاد رہنی چاہیے۔"

میں کمرے کے وسط میں بے حس و حرکت کھڑا رہا اور میرے مساموں سے پسینہ پھوٹتا رہا۔ مجھے یہ سب کچھ عجیب سا لگ رہا تھا' اپنا آپ بھی۔ اتنے دنوں تک مجھے کسی اور طرف دیکھنے کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اتنے دنوں تک میں نے شاید آئینہ ہی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اپنے ہوش و حواس قائم رکھنے کی کوشش کی۔ میں بٹھل سے کیا کہنا چاہتا تھا جو نہیں کہہ سکا یا اس کی سمجھ میں نہ آسکا' میں نے سوچا' مجھے اس کے پیچھے جا کے وضاحت کرنی چاہیے کہ میری بات ذرا تحمل سے سنو' مجھ میں کسی اور طرف دیکھنے کی ہمت ہی نہیں ہے۔ مجھے تو اب ڈر سا لگتا ہے' جانے کس وقت کیا ہو جائے۔ یہ کوئی ضد نہیں ہے' ضد کاہے کی ہوتی۔ نہ یہ کوئی سزا ہے جو میں خود کو دینا چاہتا ہوں۔ میں نے اس سے کچھ غلط نہیں کہا ہے کہ میرا کچھ جی نہیں چاہتا۔ کسی بات کو بھی۔ پہلے کبھی کہیں بھاگ جانے' کسی ویرانے میں جا کے چھپ جانے کو جی کرتا تھا۔ اب یہ بھی دل نہیں کرتا۔ جب میرا ہی کوئی ادعا نہیں ہے تو بٹھل کو بھی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ اسے اس قدر تشویش و تردد کی آخر کیا ضرورت ہے؟ میں کمرے سے نکل کے بٹھل سے بات کرنے کا ارادہ کرتا رہا مگر میرے پیروں میں جیسے جان ہی نہیں رہی تھی۔ بٹھل کو کیا معلوم تھا کہ کتنے عذاب کے بعد میں نے اپنا یہ اختیار حاصل کیا تھا۔

وہ ایک پل میں سارا کچھ بکھیر کے' الٹ کے چلا گیا۔

وہ مجھے کیا باور کرانے آیا تھا۔ جیسے کوئی دیوار تھی جو ہٹ گئی۔ مجھے اسی بات کا انتظار تھا۔ یہ رکاوٹ دور ہو گئی تو مجھے اپنا راستہ پکڑنا چاہیے۔ آدمی سے آدمی کی نسبت بس اسی قدر ہے۔ وہ اوجھل ہو جائے تو لوگ اسے اور اوجھل کر دیتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے' وہ منوں مٹی کے نیچے دب چکا ہے' اب لوٹ کے نہیں آئے گا۔ کوئی بھی پلٹ کے نہیں آتا مگر آنکھوں سے اوجھل ہو جانے اور دسترس سے نکل جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جانے والا کبھی آیا ہی نہیں تھا۔ اس کی خوشبو' اس کی بازگشت' اس کے نقش بھی مٹ گئے۔ وہ تو لمحے لمحے بعد میرے سامنے آ کے کھڑا ہو جاتا

ہے۔ مجھے دیکھ کے مسکراتا ہے' جیسے کوئی سوال کررہا ہو یا شکایت۔ وہ ہمیشہ میرے سامنے سر جھکائے آیا کرتا تھا۔ موت کے بعد اس کا تیور ہی بدل گیا تھا۔ وہ ہمیشہ میرے ہی کام آتا رہا' میں اس کے لیے کچھ بھی نہ کرسکا۔ میں اس کے لیے بہت کچھ کرسکتا تھا مگر مجھے اپنے آپ ہی سے فرصت کہاں تھی۔ ایک وہ بھی تھا۔ کسی سے اس نے کچھ نہیں کہا۔ میری طرح کوئی شور مچایا نہ کسی کو تنگ کیا۔ سب کچھ اپنے آپ میں دفن کیے رکھا۔ یہ بھی تو ایک طور ہے زندگی بسری کا۔ یہی کچھ میں بٹھل سے کہنا چاہتا تھا کہ مارٹی بھی تو ایک خود گزیدہ تھا۔ اس کی مثال بھی تو ہے۔ کوئی دوسرا بھی یوں چراغ جلا سکتا ہے۔ مارٹی کی طلب رائیگاں نہیں گئی۔ بہت دیر میں سہی مگر چند لمحوں کی سرخوشی اسے بہرحال نصیب ہوئی۔ اسی کو اس نے غنیمت جانا اور آنکھیں بند کرلیں کہ اس سے زیادہ اسے اور کیا دیکھنا تھا۔ میری طلب اور جستجو میں کوئی کمی ضرور ہوگی۔ اگر نہیں ہے تو ایک دن ساری دیواریں خود بہ خود ہٹ جائیں گی' سارے دروازے کھل جائیں گے۔

میں نے بٹھل کے پاس جاکے عاجزی کرنے کا ارادہ ترک کردیا کہ نہ مجھ سے اتنی باتیں کی جائیں گی' نہ اس کی سمجھ میں کچھ آسکے گا۔ جو لفظ مجھے خود نہیں معلوم' میں اس کے سامنے جاکے کس طرح ادا کرپاؤں گا۔ الفاظ' ہر احساس کی تشریح و توضیح نہیں کرسکتے۔ جب بٹھل یہاں موجود تھا تبھی میری زبان لکنت کررہی تھی۔ اسے قائل کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس نے کچھ طے کرلیا ہے تو میں کیا' کوئی بھی اسے باز نہیں رکھ سکتا۔

مجھے امید تھی کہ بٹھل کے بعد شاید کوئی میرے پاس آئے' اور جو بٹھل نہیں کرسکا ہے' ممکن ہے' میں اسے بتاسکوں لیکن دیر ہوگئی۔ کوئی بھی نہیں آیا۔ میں تنہا اس محبوس کمرے میں اپنی رسیاں جکڑتا رہا۔ مجھے کسی پہلو چین نہیں تھا۔ گھڑی نے بارہ بجائے تو مجھ سے کمرے میں نہیں ٹھہرا گیا۔ جیسے کسی نے مجھے سرزنش کی کہ میں ایسے ہی پڑا رہا تو وہ نکل جائے گا۔ دو بجنے میں اب دیر ہی کتنی رہ گئی ہے۔ دو بجے حیدر آباد کے لیے گاڑی روانہ ہوجاتی ہے۔ بٹھل باہر سے چلا جائے گا۔ وہ ایسا ہی ہے کہ پلٹ کے مجھ سے پوچھے گا بھی نہیں۔ مجھے ایک کوشش اور کرنی چاہیے۔ چاہے کتنی ہی حجت و تکرار کرنی پڑے۔ میری بات وہ جانے دے لیکن اس نے دوسری جانب توجہ نہیں کی۔ سردست حیدر آباد کا سفر اس کے لیے کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ ابھی بہت دن نہیں ہوئے۔ کانتے' پیرو اور مارٹی کے چلے جانے سے ایسا

لگ رہا ہے کہ مدت ہوگئی ہے۔ وہ نواب لوگ اتنی جلد ہمیں نہیں بھولے ہوں گے۔ وہ ان کی ریاست' ان کا علاقہ ہے۔ وہ جال پھیلائے ہماری راہ تک رہے ہوں گے۔ حیدر آباد میں اباجان کی خریدی ہوئی حویلی سے ان کے متعدد مسلح آدمی نامراد لوٹ گئے تھے۔ یہ زخم ایسا نہیں جو آسانی سے مندمل ہوسکے۔ حیدر آباد سے واپسی کے سفر میں ہمارے تعاقب میں بھیجے جانے والے ان دو آدمیوں نے بھی واپس جاکے کچھ کم حاشیہ آرائی نہیں کی ہوگی۔ ان دونوں کی ناکام واپسی ایک اور تازیانہ ہوگی۔ انہیں نواب حشمت جنگ کے مقرب خاص نے بھیجا تھا۔ نواب کے علم میں ہے کہ خانم ابھی حیدر آباد میں ہے۔ اسے وہاں سے نلے جانے کے لیے ایک نہ ایک دن ہمارا حیدر آباد کی طرف رخ کرنا لازم ہے اور ابا جان اپنی عالی شان حویلی ایسے ہی نہیں چھوڑدیں گے۔ اپنے مسلح سرفروشوں کی ذلت اور دو چار چشم طالع آزماؤں کا حشر دیکھ کے ان نوابوں کو محتاط ہوجانا چاہیے۔ ورنہ وہ دوبارہ بھی آدمی بھیج سکتے تھے۔ ان کے پاس آدمیوں کی کمی نہیں۔ بس سونے کی ہڈی چاہیے' آدمی کتا بن جاتا ہے۔ ایک فن) دولت کی شرپ ہے' جاں باز اور جاں سپار کھنچے چلے آتے ہیں۔ بمبئی میں' ہماری نشاندہی میں دو آدمی ناکافی پڑگئے تھے تو وہ نفری بڑھاسکتے تھے۔ نواب حشمت جنگ کو تو خانم کے ذریعے بھی فیض آباد میں زریں کی حویلی کا سراغ مل سکتا تھا۔ اس نے شاید کوشش بھی کی ہو لیکن خانم ایک جہاں دیدہ عورت ہے۔ اس نے یقیناً پہلوتہی کی ہوگی۔ نواب حشمت کو یہ سب کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ بعد میں اسے ہوش آیا ہوگا کہ ایک دن تو ہماری حیدر آباد واپسی یقینی ہے۔ اس وقت تک صبر و ضبط عین عقل و ہوش ہے۔ تاہم اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس دن کا اسے کس بے صبری سے انتظار ہوگا۔

اور وہ صرف دو آدمی نہیں تھے' جنہیں ہم نے اپنے پیچھے بمبئی تک آنے دیا تھا اور بعد میں ہم انہیں اندھا کرکے پیرو کے باڑے پر لے آئے تھے۔ اس سے پہلے سفر کے دوران میں دو اور آدمی ہم نے چلتی ریل سے نیچے پھینک دیے تھے۔ ان کے بہ قول وہ نواب حشمت جنگ کے بھیجے ہوئے نہیں تھے۔ کوئی عجب نہیں کہ ان چاروں ستم کشوں نے واپس جاکے یہ ناگفتنی اپنے بندگان عالی کے گوش گزار کردی ہو کہ انہیں اذیتوں کی تاب نہیں رہی تھی اور ان کی زبانیں اپنے بھیجنے والے مربیوں کے ناموں کا بھرم نہ رکھ سکیں۔ یہ جان کے نواب حشمت جنگ اور اس کے ہم قبیل نوابوں کا کیا حال ہونا چاہیے۔ ندامت کا غضب بے اندازہ

ہے۔ اس بار وہ کوئی چوک نہیں کریں گے اور دیر بھی ں لگائیں گے کہ ہمیں سنبھلنے اور پینترا بدلنے کی مہلت مل ے میرے اکیلے وہاں جانے کا کچھ ایسا نہیں تھا۔ میں کسی ح چھپ چھپاکے چلا جاتا۔ انہیں تو خاص طور پر ابا جان بٹھل کی جستجو ہوگی۔

میں فوراً ہی کمرے سے نکل گیا۔ صرف میرے لیے' ی خاطر بٹھل کسی زیاں کے درپے ہے تو مجھے اسے روکنا ہیے۔ ایسا کوئی قدم ہی کیوں اٹھایا جائے کہ گزشتہ کے ے کا ذرا بھی اندیشہ ہو۔ مجھ میں اب بالکل سکت نہیں ۔ میں نے یہی کچھ تو بٹھل کو جتانے کی کوشش کی تھی۔ نے کان نہیں دھرے۔ اس نے غور نہیں کیا۔ ر نواب ثروت نے اس سے بات کرنے سے انکار کردیا تو نواب نے مجھے خط لکھا ہے' بٹھل کو نہیں۔ دونوں مرتبہ اور پیرو اس کے ہاں گئے تھے۔ میرے اور پیرو کے بجائے ل کو دیکھ کے کوئی بدگمانی اس کے دل میں جگہ پاسکتی ۔ بٹھل سے کسی لمحے کوئی انیس بیس بات ہوگئی تو نواب دسری قسم کا آدمی ہے۔ نواب لوگ عام لوگ نہیں تے۔ وہ اپنی شکلیں چمکتے آئینوں میں دیکھتے رہنے کے عادی ۔ ان کے مزاج کا کوئی بھروسا نہیں۔ بہرحال میرا کام تو ل کو تمام عواقب و جوانب سے آگاہ کرنا ہے۔ اس کے اس کی مرضی ہے' وہ جو جی چاہے کرے' میں کیا کرسکتا ہے۔

بٹھل اپنے کمرے میں نہیں تھا۔ اس کا حقہ بھی کونے رکھا تھا۔ ایک ملازم نے بتایا کہ وہ ملاقاتی کمرے میں ۔ جاتے جاتے معاً اس خیال سے میرے قدم ٹھٹک رہ گئے کہ کہیں نواب ثروت یار کا خط انہی نوابوں کی فتنہ ی نہ ہو۔ نواب ثروت یار کو ہمارے اور نواب حشمت ۔ کے کسی تعلق کا بہ ظاہر کوئی علم نہیں تھا۔ میں نے اور نے اس کے گھر جاتے ہوئے ہر ممکن احتیاط کی تھی تاکہ کسی کی نظر میں نہ آسکیں۔ ہم بہت دور پہلے موٹر سے گئے تھے اور مختلف جگہوں سے پیدل گزرتے ہوئے ہم نے راستہ طے کیا تھا۔ مجھے خوب یاد ہے' ہم نے اچھی طرح مئن ہوکے ہی نواب ثروت کے دروازے پر دستک دی ۔ اس بات کا کوئی امکان تو نہیں تھا کہ نواب ثروت یار گھر ہماری حاضری کی سن گن نواب حشمت جنگ اور ں کے تمنائی دیگر نوابوں کو مل گئی ہو۔ ڈرائیور نے جہاں ا آمارا تھا' اس مقام سے ہماری بو سونگھتے ہوئے وہ نواب ت کے گھر تک پہنچ گئے ہوں۔ نواب ثروت کی زبانی

ہماری آمد کا ماجرا سن کے انہوں نے ایسا کوئی خط لکھنے پر اسے آمادہ کرلیا ہو۔ غریبوں میں اتنی دوستی نہیں ہوتی جتنی امیروں میں ہوتی ہے۔ نواب حشمت جنگ جیسے ذی وقار' عالی مرتبت کی خوش نودی کا موقع نواب ثروت کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے۔ ان نوابوں سے کچھ بعید نہیں۔

میں نے تیز قدموں سے ملاقاتی کمرے کا فاصلہ طے کیا۔ ابھی میں کمرے میں داخل نہیں ہوا تھا کہ زنان خانے کی طرف سے آتی ہوئی جولین مجھے دکھائی دی۔ فرخ بھی اس کے ساتھ تھی۔ مجھے دیکھ کے دونوں رک گئیں۔ میں بھی ٹھہر گیا اور میری نظریں جولین کے چہرے پر جم گئیں۔ وہ تو کچھ اور ہی نظر آرہی تھی۔ سرتاپا سفید لباس میں ملبوس' چادر سے سر ڈھکا ہوا' گرجا کی کسی راہبہ کے مانند' جس کے چہرے کی تابانی ٹھٹھری ہوئی ہوتی ہے۔ وہ روز ہی صبح و شام مجھے ملتی تھی لیکن اتنے دنوں سے میں نے سر اٹھاکے اسے دیکھا تک نہیں تھا۔ اب یوں اچانک وہ میرے سامنے آئی تو مجھے یقین نہیں آیا۔ بوجھل پلکیں' چھلکتی آنکھیں اور سوکھے سوکھے ہونٹ۔ آدمی اندر سے ٹوٹ رہا ہو تبھی ایسا دھواں اٹھتا ہے۔ میں نے اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا کہ وہ بھی تو اپنے آپ سے دوچار ہوگی' مجھ سے کہیں زیادہ کہ اس کے لیے تو وہ سارا کچھ ایسی تعبیر کی طرح تھا جو آدمی کو ہیبت زدہ کردے۔ جولین ویسے ہی بہت نازک تھی' پھول کے مثل۔ تیز ہوا اور تیز دھوپ میں اس کا رنگ کمھلا گیا تھا۔ اس پر ابھی تک حیرت کا ایک عالم طاری تھا' جاں کنی کا عالم۔ آئینے اتنی حیرتوں کے متحمل نہیں ہوتے۔ مجھے دیکھ کے اس کی دھند اور گہری ہوگئی۔ اس کے سراپا میں تموج سا ہویدا ہوا' جیسے کسی لمحے وہ اڑتی ہوئی میرے سینے میں چھپ جائے گی اور زار زار ہوجائے گی۔ اس کے لبوں کے گوشے دھڑک رہے تھے۔ اسے میری جانب سے بس کسی دل ساز' دل نواز نگاہ کا انتظار تھا۔ میرا دل بھی بھر آیا۔ میں بھول گیا کہ میں کس ارادے سے نکلا تھا اور کہاں جانا چاہتا تھا۔ فرخ بھی میری نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی۔ میں بڑھ کے جولین کے ڈگمگاتے سراپا کو سہارا دیتا اور اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیتا کہ فرخ کی آواز پر مجھے ہوش آیا۔ وہ مجھے بتارہی تھی کہ وہ دونوں میرے ہی پاس آرہی تھیں۔ میں نے ہکلاتے ہوئے بٹھل کے بارے میں پوچھا تو فرخ نے ملاقاتی کمرے کی طرف اشارہ کیا اور دل گیر لہجے میں بولی "آپ جارہے ہیں بھائی؟"

"نہیں' کہیں بھی نہیں۔ میں کہاں۔۔۔!" میں نے منتشر آواز میں کہا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور سوال کرتی یا جولین

زبان کھولتی' میں بہ عجلت کمرے میں داخل ہوگیا اور اندر قدم رکھتے ہی میرے جی میں آئی کہ وہیں سے لوٹ جاؤں۔ وہاں تو محفل جمی ہوئی تھی۔ مولوی اکرم' جگنو اور دیوا کے سوا سبھی موجود تھے۔ کیلاش بھی فراغت سے ان کے درمیان بیٹھا تھا۔

فرش پر دسترخوان بچھا ہوا تھا اور کھانا نہیں لگا تھا۔ میری آمد پر سبھی چونک پڑے جیسے میں کوئی عجوبہ ہوں۔ کیلاش صوفے سے اٹھ کے بے قراری سے میرے پاس آگیا اور اس نے مجھے پہلو میں صوفے پر بٹھالیا۔ اتنے لوگوں کی موجودگی میں بٹھل سے کوئی بات کرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ میرے داخل ہونے پر کچھ دیر کے لیے خاموشی چھائی مگر پھر سب میری طرف سے غافل ہوگئے اور بارشوں کی باتیں کرتے رہے۔ منیر علی بتا رہے تھے کہ دور دراز تک شدید بارشوں کی وجہ سے گاڑیاں شاید بروقت اپنی منزل پر نہ پہنچ سکیں۔ بیشتر وہی بولتے رہے۔ ابا جان گم صم بیٹھے تھے۔ بٹھل بھی سرہلا تا رہا۔ گویا بٹھل کا ارادہ طے تھا۔ اتنی دیر میں کھانا آگیا۔ ابھی دوپہر کے کھانے کا وقت نہیں ہوا تھا لیکن انہیں بٹھل کی روانگی کی وجہ سے جلدی ہوگی۔ کیلاش کے ساتھ میں بھی دسترخوان پر بیٹھ گیا۔ سب کوئی فرض ادا کرتے رہے اور جلد ہی اٹھ گئے۔ اس وقت ایک بج رہا تھا۔ چائے پیتے ہی بٹھل کھڑا ہوگیا اور سب سر جھکائے اس کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ سارا نظام اوقات سب کو یاد تھا۔ ایک جولین کی ماں نہیں تھی' باقی وہ سبھی دروازے پر ان کی منتظر تھیں۔ چمپا بیگم کی درخواست پر بٹھل نے ٹھہر کے اپنا بازو پھیلا دیا۔ فرخ نے بٹھل کو امام ضامن باندھا تو بٹھل نے اس کی پیشانی چوم لی اور اسے اپنے بازو میں سمیٹ لیا۔ انہوں نے جمرو اور زورا کے بازوؤں پر بھی امام ضامن باندھے۔ میں پیچھے کھڑا تھا۔ ان تینوں سے نمٹ کے وہ میری طرف بڑھیں۔ میں انہیں منع کر سکتا تھا لیکن میرے دست و بازو ہی اکڑ گئے تھے۔ میں دیکھتا رہ گیا۔ انہوں نے میرے بازو پر بھی پٹی باندھی اور چمپا بیگم کچھ پڑھ کے میرے چہرے اور سینے پر پھونکتی رہی۔ دروازے کے سامنے کیلاش کی موٹر اور ابا جان کی دونوں موٹریں آگے پیچھے کھڑی تھیں۔ بٹھل نے پیچھے مڑ کے دیکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی اور آگے والی موٹر میں بیٹھ گیا۔ جمرو' شامو اور زورا بھی اسی موٹر میں بیٹھ گئے۔ دوسری موٹر پر جگنو' دیوا اور ننگو نے قبضہ جمالیا۔ جگنو اور دیوا نے مجھے بھی راستہ دیا تھا لیکن میں سیڑھیوں پر کھڑا رہا۔ دونوں موٹریں آگے چلی گئیں تو کیلاش میرا ہاتھ تھام کے اپنی موٹر تک لے آیا۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ مجھے یہ سب کچھ تماشا سا لگ رہا تھا جیسے سب مل کے میرا مذاق اڑا رہے ہوں۔ میری حیثیت کیلاش کے معمول کی سی ہوگئی تھی۔ کوئی رد و کد کے بغیر میں اس کے ساتھ چلتا رہا اور اس کی موٹر میں برابر والی نشست پر بیٹھ گیا۔

اسٹیشن زیادہ دور نہیں تھا۔ سڑکوں پر بھیڑ کی وجہ سے اسٹیشن پہنچنے میں پندرہ بیس منٹ لگ گئے۔ راستے بھر میرے دماغ میں ریت سی اڑتی رہی۔ راستے میں کیلاش نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی اور خود کلامی کے انداز میں راہ گیروں اور سواریوں کی بے قاعدگی پر جھنجلا تا رہا تھا۔ ابھی وقت تھا انہیں اپنا ڈبا تلاش کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ فرسٹ کلاس کے مسافروں کو کوئی دیر نہیں لگتی۔ ہمارے سوا ڈبے میں کوئی اور مسافر نہیں تھا۔ انہوں نے پہلے کی طرح پورا ڈبا محفوظ کرایا ہوگا۔ ان کے ساتھ مختصر سامان بھی تھا۔ اس میں یقیناً میری اٹیچی بھی ہوگی جو جولین نے پہلے سے تیار کر رکھی تھی۔ سب ڈبے میں آکے بیٹھ گئے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرح سلسلہ جنبانی کروں۔ ابا جان اور منیر علی بھی سامنے نہیں تھے۔ بٹھل سے بات کرنی نسبتاً آسان تھی لیکن سب کچھ میرے دماغ میں منتشر ہوگیا تھا۔ یہی صورت تھی کہ میں ڈبے سے واپس ہوجاؤں اور فرض کرلوں کہ انہوں نے میری التجا ٹھکرا دی ہے۔ یہی وہ بعد میں کریں تو میرے پاس کیا چارہ ہے۔ بٹھل کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں معلوم ہوتا تھا تاہم میں اپنے حواس مجتمع کرتا اور مناسب لفظ ڈھونڈتا رہا۔ میں اتر کے کسی وقت بھی بھاگ سکتا تھا۔ وہ شاید مجھے نہ روکتے۔ انہیں میری پروا نہیں تھی۔ کسی کو کوئی بے چینی نہیں تھی جیسے انہیں یقین تھا کہ میں ان کے ساتھ ہی جاؤں گا۔ کیلاش نیچے اتر کے بسکٹوں کے بہت سے ڈبے اور گلوریاں لے آیا۔ بٹھل کے لیے وہ بیڑی کے بنڈل بھی لایا تھا۔ وقت جا رہا تھا۔ وہ یہاں تک آکے واپس جانے والے نہیں لگ رہے تھے۔ میری عرض گزاری کا وقت نکلا جارہا تھا۔ صاف نظر آتا تھا کہ میں نہیں جاؤں گا تو وہ میرے بغیر چلے جائیں گے۔ اگر میرے پاس انہیں روکنے کی وہی دلیلیں ہیں تو کچھ بھی ہو' مجھے بھی ان کا ساتھ دینا چاہیے۔ وہ میرے لیے جارہے ہیں تو وہی کیوں زد پر رہیں۔ انہی کا زیاں کیوں ہو' میری دانست میں آگے کوئی جہنم ہے تو میں اس سے کیوں بچا رہوں۔ میں واپس ہوجاؤں گا تو مجھے ویسے بھی چین نہیں آئے گا۔ یہی کچھ جان کے وہ بھی میری طرف سے مطمئن تھے۔

گارڈ نے سیٹی بجادی اور انجن چیخنے لگا۔ کیلاش سب سے گلے مل کے اتر گیا۔ شامو' جگنو' دیوا اور ننگو بھی اتر گئے۔ جمرو ڈبے کے دروازے پر کھڑا ہاتھ ہلاتا رہا اور گاڑی کی رفتار تیز ہوگئی تو اپنی جگہ پر آکے بیٹھ گیا۔ شام تک میں بے حس و حرکت کھڑکی کے پاس بیٹھا بھاگتی ہوئی زمین' پہاڑیوں اور درختوں کو دیکھتا رہا' پھر میں بھی نشست پر لیٹ گیا۔

○☆○

بارشوں کی وجہ سے کئی گھنٹے کی تاخیر سے دوسرے دن تین بجے کے قریب ریل گاڑی حیدر آباد کے نام پر پلی اسٹیشن پہنچ کے ختم ہوگئی۔ کسی اور ہوٹل میں جانے کے بجائے بٹھل نے اسی عالی شان ہوٹل کا رخ کیا جہاں ابا جان اور ہم بھی ٹھہر چکے تھے۔ دو ایک بیرے ہمیں پہچان گئے۔ انہوں نے درباریوں کے انداز میں تعظیم پیش کی اور ہم چاروں پورے مکان کے مانند' ہوٹل کے ایک گوشے میں ٹھہر گئے۔ بٹھل کے اشارے پر جمرو نے خدمت گاروں کو زرِ نقد کے عطیے پہلے سے ادا کردیے تھے۔ پورے سفر میں' میں نے خود کو بہت تھامے رکھا تھا۔ کسی اجنبی کی طرح میں ان کے ساتھ سفر کرتا رہا لیکن جیسے جیسے حیدر آباد قریب آرہا تھا' مجھے خفقان سا ہو رہا تھا۔ ہوٹل آکے تو میرے رہے سہے اوسان بھی جانے لگے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا اور کبھی ایسا ڈوبتا کہ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا جاتا۔ جمرو اور زورا میری خاطر میرے اردگرد ہی منڈلاتے رہے تھے۔ بٹھل نے پہلے غسل کیا اور اجلا سا لباس پہن کے چائے منگوائی۔ جمرو اور زورا نے بھی نہا دھو کے کپڑے بدل لیے تھے۔ مجھ سے تو کچھ بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔ چائے بھی حلق سے نہیں اتر رہی تھی' جیسے تیسے میں نے ان کی پیروی کی اور انہی کی طرح تیار ہو کے کرسی پر بیٹھ گیا۔

شام کو جب دھوپ عمارتوں سے اوپر چلی گئی' بٹھل نے جمرو سے کہا "اٹھ رے! ذرا باہر کا رنگ بھی دیکھیں۔"

"ٹھیک ہے استاد!" جمرو نے مستعدی سے کہا "قسم سے' میں بھی بولنے کو تھا" بٹھل کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تو جمرو نے ٹوکنے کے انداز میں اس سے کہا "خالی ہی نکلو گے استاد؟"

بٹھل کسی اور دھیان میں تھا' اسے سمجھنے میں دیر لگی۔ کچھ توقف کے بعد وہ سرہلا کے بولا "ہاں ہاں' نکال لے رے۔"

جمرو نے پھرتی سے دروازہ بند کیا اور الماری سے ایک اٹیچی نکال لی۔ میری آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ اٹیچی میں کپڑوں کے نیچے تمنچے چھپے ہوئے تھے۔ پیٹیاں بھی ساتھ رکھی تھیں۔ زین یا اسی قسم کے کسی کپڑے کی دہری تہری تہ والی پیٹیاں الگ تھیں۔ یہ اس طرح دائیں جانب کے شانے سے بائیں جانب کی پسلیوں تک باندھی جاتی تھیں کہ بائیں ہاتھ کی بغل کے نیچے تمنچا چھپ جائے۔ بنڈی' کرتے اور واسکٹ کے پردوں کے بعد باہر سے کسی کو شبہ نہیں ہوتا اور گریبان کھلا نہ ہو تو دامن سے ہاتھ ڈالنے پر ضرورت کے وقت تمنچا نکالنے میں ایسی دیر بھی نہیں لگتی۔ تبت کے سفر میں بھی ہم نے کچھ اسی طرح کی پیٹیاں استعمال کی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ جو خدشے میری رگوں میں رینگ رہے تھے' بٹھل بھی ان سے غافل نہیں تھا۔ جمرو اور زورا نے چاروں تمنچے گولیوں سے بھر دیے۔ اٹیچی میں دو بڑے تمنچے بھی مجھے نظر آئے تھے لیکن انہوں نے چھوٹے تمنچوں پر اکتفا کیا۔ ہولسٹر میں تمنچے جمالینے کے بعد جمرو نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میری جیب میں چاقو ہے؟ مارٹی کے زخمی ہوجانے کے دن سے اب تک مجھے چاقو کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ میری خاموشی پر جمرو نے ایک نیا چاقو میرے حوالے کیا۔ یہ چھ انچ کا کھٹکے والا رام پوری چاقو تھا' وزن میں خاصا ہلکا۔ بٹھل کی ہدایت پر انہوں نے اسپرنگ کے موٹے گدوں کی سلائی چیر کے اور اسپرنگ کے درمیان ناریل کی چھال نکال کے دونوں تمنچے سرہانے کی طرف چھپا دیے۔ یہ وزنی گدے بار بار نہیں اٹھائے جاتے ہوں گے' صرف چادریں بدلی جاتی ہوں گی۔ اب اٹیچی میں کپڑوں کے سوا کچھ نہیں رہ گیا تھا اور کمرے کی تلاشی میں کسی ضرر کا اندیشہ نہیں تھا۔ بیس منٹ کے قریب اس تیاری میں صرف ہوگئے۔ پھر کہیں جمرو نے دروازے کی چٹخنی گرائی۔ اسی اثنا میں اجالا اور کم ہوگیا تھا۔ بٹھل نے ہوٹل سے باہر آکے میرا ہاتھ تھام لیا۔ مجھے ایسا لگا کہ میرے ڈگمگاتے جسم کو کسی دیوار یا ستون کا سہارا مل گیا ہو۔

سڑکوں پر خوب چہل پہل تھی۔ ہم آہستہ آہستہ نام پلی کی طرف بڑھتے رہے۔ آگے جاکے ہمیں سواری مل گئی۔ بٹھل نے مجھے اپنے برابر ہی بٹھایا اور میرا ہاتھ اپنے پنجے میں جکڑے رکھا۔ اپنی اپنی نسبت پر منحصر ہے۔ ایک کا درد دوسرے کا سینہ کاٹتا ہے۔ میرا سارا حال جیسے اس پر آئینہ تھا۔ گھوڑا گاڑی نے کچھ فاصلہ طے کیا تو وہ تھکتی ہوئی آواز میں کہنے لگا "ایسا کیا رے! سارا الٹا سیدھا ابھی سامنے کو آجائے گا" دوسرے لمحے اس کے لہجے میں ترشی آگئی۔ کہنے لگا "زیادہ کیا ہوئے گا' پچھلے جیسا ہی!"

وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں نے بھی اپنے آپ کو یہی

درس دینے کی کوشش کی کہ اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے لیکن چند ثانیوں کے سکوت کے بعد میرے جسم سے پھر وہی بچھو چمٹنے لگے۔ میں نے بٹھل سے نہیں کہا کہ یہی کچھ تو نہیں ہے۔ راستوں میں پہلے اتنے پتھر اور اتنے کتے نہیں تھے۔ پہلے ہم اپنے سائے سے بدگمان نہیں تھے۔ آگے جاکے اب ایک سوال کا ایک ہی جواب طے نہیں ہے۔

نام پلی کے اسٹیشن کے سامنے سڑک پر آکے بٹھل نے مجھے کہنی ماری "آنکھیں کھلی رکھنا ہے رے!" اس نے سرگوشی میں مجھے ہدایت کی۔

اس کے ٹھوکے پر مجھے احساس ہوا کہ بٹھل کو نواب ثروت یار کے گھر کا راستہ معلوم نہیں ہے۔ وہی احتیاط بہتر تھی جو پیرو نے نواب کے گھر جاتے ہوئے کی تھی۔ گھوڑا گاڑی نام پلی سے کچھ آگے آگئی تو میں نے جمرو سے کہہ کے گاڑی رکوادی۔ کھمبوں کے قمقمے روشن ہوگئے تھے لیکن ابھی ایسا اندھیرا نہیں تھا کہ آدمی کو آدمی نہ پہچان سکے۔ گھوڑا گاڑی سے اتر کے ہم سڑک کے کنارے کھڑے ہوگئے اور جمرو کے آنے کا انتظار کرتے رہے۔ کوچوان کے پاس ریزگاری نہیں تھی۔ اس لیے جمرو کو دیر لگی۔ وہ دس روپے کے سالم نوٹ کی فراخ دلی کرکے کوچوان کو چونکانا نہیں چاہتا ہوگا۔ جمرو کے ساتھ ہونے پر ہم مختلف گلیوں سے گزرتے ہوئے اس گلی میں آگئے جہاں کچھ فاصلے پر نواب ثروت یار کی کوٹھی تھی۔ بٹھل کے استفسار پر میں نے ہاتھ کے اشارے سے نشاندہی کی۔ گلی کے دونوں اطراف چھوٹی بڑی کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں اور خاموشی طاری تھی۔ اکادکا راہ گیر ہی دکھائی دے رہے تھے۔ قطار سے قمقمے روشن تھے لیکن درختوں کی وجہ سے سڑک پر جابہ جا روشنی کے چھینٹے سے پڑے ہوئے تھے۔ بٹھل نے ضرور کچھ کہا ہوگا جبھی زورا اور جمرو ہم سے کچھ پیچھے ہوگئے۔ مجھے نہیں معلوم کہ نواب کے مکان تک کا فاصلہ ہم نے کس طرح طے کیا۔ میرا تو سارا جسم سن ہوگیا تھا۔

کوٹھی کے دروازے پر دستک دیتے ہی دربان آگیا۔ مجھ سے کچھ پوچھا ہی نہیں گیا۔ بٹھل نے تڑختی آواز میں اس سے کہا کہ وہ اندر جاکے نواب ثروت یار کو مطلع کردے کہ کوئی اس سے ملنے آیا ہے۔

جمرو اور زورا آگے چلتے گئے تھے' دربان کے سامنے میں اور بٹھل تھے۔ اس نے سر سے پیر تک مغائرانہ نظروں سے ہمیں دیکھتے ہوئے جواب دیا کہ نواب گھر پر نہیں ہے۔

یہ سن کر مجھے سانس لینے کا کوئی موقع مل گیا۔ بٹھل نے پوچھا کہ نواب کی واپسی کی کب تک امید ہے؟ دربان نے تیوری چڑھا کے کہا کہ وہ نواب ہے' اپنی مرضی کا مختار' پھر کہنے لگا کہ آنے کا وقت تو ہوگیا ہے لیکن کیا معلوم' دیر سے آئے۔

بٹھل کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں اور نتھنے پھولنے لگے۔ دربان کو کچھ خیال آیا۔ تجسس سے پوچھنے لگا کہ ہمیں نواب سے کیا کام ہے؟

"اپنے کو کتے نے نہیں کاٹا ہے رے۔" بٹھل نے تنک کے کہا۔

دربان سیدھا ہوگیا اور اس کا لہجہ بدل گیا "آپ لوگاں کا نام۔۔؟" اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"تجھ کو بول کے کیا کریں؟"

"آپ' آپ لوگاں بمبئی سے تو نہیں آئے کیا؟" دربان نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

میری رگوں میں خون جمنے لگا۔ صاف ظاہر تھا کہ نواب ہی نے خط لکھا تھا اور اسے ہمارا انتظار بھی تھا۔ بٹھل کے اقرار پہ دربان ہم سے اندر چل کے بیٹھنے کے لیے ضد کرنے لگا اور اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔

"مگر نواب' نواب صاحب!" بٹھل نے تردد سے کہا "کب آئیں گے وہ؟"

"آجائیں گے صاحب! ابھی بس آنے کا وقت ہوگیا ہے۔" دربان نے مودبانہ کہا "آپ لوگاں ذرا انتظار کرلیں تو اچھا ہے۔ اندر آؤ حضت!"

بٹھل دروازے پر رکا' کچھ سوچتا رہا پھر میرا ہاتھ تھامے ہوئے وہ اندر داخل ہوگیا۔ وہی نشست گاہ تھی جہاں پہلے میں اور پیرو آکے بیٹھے تھے۔ پردے' صوفے اور قالین شاید بدل دیے گئے تھے۔ دربان نے پردے ہٹا کے کھڑکیاں کھول دیں۔ فانوس بھی روشن کردیا۔ ہمیں بٹھا کے وہ فوراً واپس چلا گیا۔ دیر تک سناٹا چھایا رہا۔ میرا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ عمارت سے ملحق ہونے کے باوجود نشست گاہ الگ تھلگ بنی ہوئی تھی۔ گھر کی طرف سے کوئی آواز کوئی چہکار نہیں آرہی تھی جیسے ہمارے سوا وہاں کوئی موجود ہی نہ ہو۔ جانے کتنا وقت گزرنے پر اندر کی جانب سے دھیمی دھیمی چاپیں سنائی دیں۔ میرے دل کی حرکت بند ہونے لگی۔ بار بار مجھے ایسا لگتا تھا کہ سامنے کے دروازے سے مولوی صاحب اندر نہ آجائیں۔ مولوی صاحب اگر یہیں مقیم ہیں۔ تو کسی وقت بھی اندر آسکتے ہیں۔ نہ جانے نواب نے انہیں کیا بتایا ہو۔ مولوی صاحب کی موجودگی کا مطلب ہے کہ کورا بھی یہیں کہیں

ہوگی' چند قدموں کے فاصلے پر' دو چار دیواروں کی دوری پر۔ آنے والے وقت میں کیا دیکھنے اور سننے کو ملے' اس خیال سے مجھ پر رعشہ طاری ہونے لگتا۔

وہ ملازمہ تھی۔ ہمارے لیے بسکٹ' خشک میووں اور چائے کا طشت لائی تھی۔ وہ دبے پاؤں کمرے میں آئی اور طشت پر رکھی ہوئی چیزیں میز پر چن کے چلی گئی۔ بٹھل اس سے پوچھ سکتا تھا کہ گھر میں کوئی اور مہمان ہے یا نہیں لیکن وہ خاموش رہا۔ ملازمہ کے جانے کے بعد بٹھل نے میرے لیے بھی چائے بنائی۔

"تھوڑی تو بھی تو لوٹ لے" وہ بھن بھناتی آواز میں بولا۔

مجھ سے تو پیالی بھی نہیں اٹھائی جاتی۔ میں بے سدھ بیٹھا رہا تو اس نے بھی اصرار نہیں کیا۔ ہمیں وہاں بیٹھے ہوئے گھنٹا بھر ہوگیا ہوگا یا اس سے زیادہ۔ ایک ایک لمحہ رینگ رینگ کے گزر رہا تھا۔ بٹھل نے شاید ایسا وقت کبھی نہ کاٹا ہو۔ وہ پہلو بدلتا' ہنکاریاں بھرتا اور پلیٹ سے کاجو اٹھا کے ٹونگتا رہا۔

پھر موٹر کا ہارن بجنے' لوہے کا دروازہ کھلنے اور موٹر اندر آنے کی آواز سنائی دی اور لمحوں بعد برابر کے کمرے سے تیز چاپوں کی گونج پیدا ہوئی۔ میری آنکھیں پتھرانے لگیں۔ سیاہ شیروانی میں ملبوس وہ نواب ثروت یار ہی تھا۔ وہ تیزی سے اندر داخل ہوا۔ "ارے آپ! آپ کب آئے؟" وہ حیرت آمیز تپاک سے بولا اور معذرت کرنے لگا "مجھے کچھ دیر ہوگئی' آپ حضرات کب تشریف لائے؟"

بٹھل اور میں کھڑے ہوگئے تھے۔ پہلے نواب سیدھا میری طرف آیا' اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ مجھ سے اس نے مصافحہ کیا اور گلے لگایا۔ میرا جسم اکڑا ہوا تھا۔ وہ کہنے لگا "آپ نے بہت دیر کردی۔ مجھے شبہ ہو رہا تھا کہ آپ کو شاید میرا خط نہیں ملا؟" پھر وہ بٹھل کی طرف مڑا۔ اس کی بھویں سکڑ گئیں اور وہ ہچکچاتے ہوئے بولا "وہ کہاں ہیں؟ پہلے آپ تو نہیں آئے تھے؟"

بٹھل نے اسے سلام کیا اور بتایا کہ پیرو کی موت ہوگئی ہے۔

"ارے!" نواب کے چہرے پر غبار چھا گیا "کب؟" وہ بے چینی سے بولا۔

"دن ہوگئے" بٹھل نے گہری سانس لے کے کہا۔ چند ثانئے سکوت رہا پھر بٹھل نے بھاری آواز میں پوچھا "آپ پہلے یہ بولو نواب صاحب! ابھی مولوی صاحب ادھری ہیں؟"

نواب سٹپٹا گیا اور جلد ہی سنبھل کے بولا "جی ہاں' جی ہاں۔ مگر آپ تشریف تو رکھیئے' میں تو آپ کا انتظار کر رہا تھا۔"

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

ایسا لگا جیسے یہ خواب کی کوئی حالت ہے۔ نواب ثروت یار نے کچھ اور کہا ہے' میں نے ٹھیک سے سنا نہیں یا نواب کوئی اذیت پسند ہے۔ اسے میری اور بٹھل کی کیفیت کا اندازہ ہوگیا ہے اور وہ ہم سے لطف لے رہا ہے۔ اس کا کیا جاتا ہے' دوسرے ہی لمحے وہ کوئی بھی عذر کرسکتا ہے۔ بٹھل نے عجلت بھی بہت کی تھی۔ ابھی کچھ دیر اسے تحمل کرنا چاہیے تھا۔ ممکن ہے مولوی صاحب کے بارے میں ہماری امید کے خلاف کوئی ایسی ویسی خبر سنا کے نواب ہمیں صدمہ نہ پہنچانا چاہتا ہو۔ کوئی عجب نہیں کہ چند لمحوں بعد وہ تاسف کا اظہار کرے اور بتدریج وہی کچھ بتائے جس کے لیے ہم تیار ہوکے آئے ہیں اور جو ہمارے لیے کچھ نیا نہیں ہے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس کا انکار ہمارے لیے کوئی بڑا حادثہ نہیں ہے۔ ہم تو یہ سزا کب سے بھگت رہے ہیں۔

بٹھل نے صوفے سے کمر نکالی اور نواب سے پھر کوئی سوال نہیں کیا۔

"آپ حضرات نے کچھ چائے وغیرہ بھی لی؟" نواب فکرمندانہ شائستگی سے بولا "دربان نے بتایا ہے کہ آپ کو آئے خاصی دیر ہوگئی ہے۔ یقیناً آپ نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا ہوگا؟"

"اپنے کو بالکل ضرورت نہیں ہے' چائے ابھی ہم لوگوں نے پی لی ہے۔"

بٹھل نے سمٹی ہوئی آواز میں کہا اور نواب کو مشورہ دیا کہ وہ ابھی گھر آیا ہے' بہتر ہوگا کہ اندر جاکے لباس وغیرہ تبدیل کرلے۔

"نہ نہ' ہماری فکر نہ کیجئے' ہم بہت تازہ دم ہیں۔" نواب شانے اچکاتے ہوئے بولا "کلب سے آرہے ہیں۔ ہماری گزارش ہے کہ کوئی تکلف نہ کیجئے" اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی اور بولا "کھانے کا وقت تو ہوچکا ہے۔"

"اپنا نہیں ہوا صاحب!" بٹھل نے آہستگی سے کہا "آپ کھاؤ' ہم ادھری بیٹھے ہیں۔"

"یہ کیسے' کیسے ہوسکتا ہے" نواب الجھ کے بولا اور اس پر ندامت طاری ہوئی' کہنے لگا "ہم تو بھول ہی گئے۔ سامان وغیرہ کہاں ہے آپ کا؟ آپ کب تشریف لائے؟"

"دوپہر کی گاڑی سے آئے تھے' سامان بھی ٹھکانے سے

ہے۔"

"یہ کیا ہوا جناب!" نواب شکایتی لہجے میں بولا "آپ کو سیدھے غریب خانے پر آنا چاہیے تھا۔ یقین کیجئے، ہمیں یہی توقع تھی۔ یہاں آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔ مہمان خانہ الگ بنا ہوا ہے۔"

"مہربانی آپ کی نواب صاحب!"

"کہاں کہاں قیام ہے جناب کا؟" نواب نے بے چینی سے پوچھا۔

"ادھری چارکمان کے پاس ایک ٹھکانا ہے۔" بٹھل نے نواب کو نہیں بتایا کہ ہم شہر کے سب سے بڑے ہوٹل' ویکاجی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

میں دم بخود بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا اور میری نظریں نواب پر منڈلا رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر بہ ظاہر خوشگواری کی علامات نمایاں تھیں۔ ہمیں سنانے کے لیے کوئی ناگوار بات ہوتی تو وہ ضرور نا آسودہ دکھائی دیتا۔

"کوئی عزیز ہے یہاں؟" اس نے زیرلبی سے پوچھا۔

"اپنا کوئی نہیں ہے ادھری صاحب!"

"پھر کیا کسی ہوٹل' سرائے میں؟" نواب نے جھجک سے کہا۔

"ایسے ہی سر چھپانے کی ایک جگہ ہے۔ پہلے کبھی ایک دفعہ دو ایک دن ادھری کاٹے تھے" بٹھل نے نواب کو کچھ اور نہیں کہنے دیا اور کسمساتے ہوئے بولا "ہم لوگ اپنی جگہ ٹھیک ہیں صاحب! ہوسکے تو آپ پہلے تھوڑی اپنی بات کرو۔"

"کیسی بات جناب والا؟" نواب مضطرب سا ہوگیا۔

"اپنے کو مولوی صاحب کے بارے میں کچھ بولو تو مہربانی ہوگی۔"

"ہا آں" نواب چونک کے بولا۔ اس نے سر اٹھا کے آنکھیں بند کرلیں اور اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

میرا دل بیٹھا جارہا تھا۔ ہم پر گزرنے والی اذیت کا نواب کو جیسے کوئی احساس ہی نہ تھا۔

"میں نے بتایا نا جناب!" چند لمحے سکون آمیز توقف کے بعد نواب نے کہا "مولوی صاحب قبلہ یہیں ہیں اور الحمدللہ خیریت سے ہیں۔"

نواب کی ٹھہری ہوئی آواز کی تپیدگی بٹھل نے بھی محسوس کی ہوگی۔ اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا "ابھی ادھری گھر میں ہیں وہ؟"

"گھر ہی میں سمجھئے" نواب کسی قدر تذبذب سے بولا "لیکن یہاں نہیں۔"

بٹھل نے سر ہلایا اور کوئی تامل کیے بغیر پوچھا "ادھری حیدرآباد شہر میں نہیں ہیں کیا؟"

"نہیں نہیں" نواب ایک ثانیے کے لیے منتشر ہوا تھا کہ سنبھل کے بولا "حیدرآباد ہی کہیے اور نہیں بھی۔ اصل میں یہاں حیدرآباد سے کچھ دور وہ ہمارے دوسرے گھر میں ہیں۔"

میری رگوں میں خون منجمد ہوگیا تھا۔ بٹھل جانے کیسے اپنے آپ کو سمیٹے سنبھالے بیٹھا تھا۔ میں دریدہ آنکھوں سے کبھی اسے دیکھتا، کبھی نواب کو۔ لگتا تھا، نواب میرا اور بٹھل کا امتحان لے رہا ہے۔ وہ ازخود بھی سب کچھ بتا سکتا تھا۔ اس سے زیادہ ہماری آمد کے مقصد سے کون واقف تھا۔ وہ تو جیسے بھول ہی گیا تھا کہ اس نے ہمیں بلایا ہے۔ کچھ دیر کے لیے خاموشی رہی پھر بٹھل نے دبی آواز میں پوچھا "آپ کی زمینوں والے مکان میں ہیں کیا وہ؟"

"آپ نے بالکل صحیح اندازہ لگایا" نواب پلکیں جھپکانے لگا۔ اس کے چہرے پر حیرت اُمڈ آئی "مگر آپ کو کیسے علم ہوا، ہماری زمینوں اور مکانات کے بارے میں؟"

"آپ نواب ہو صاحب!" بٹھل نے نسبتاً اونچی آواز میں کہا "زمین جاگیر کے بنا کوئی نواب کیسے ہوسکتا ہے؟"

"یہ آپ نے خوب کہا" نواب نے محجوبیت سے آنکھیں موندلیں اور پہلو بدل کے بولا "بس تھوڑی بہت بزرگوں کی امانت کے رکھوالے ہیں۔"

"آپ ایسا بولتے ہو تو اچھی بات ہے۔"

"ہم تو سمجھتے ہیں، جو کچھ بھی ہے، خدا کا دیا ہوا ہے اور صرف اسی کا ہے۔" نواب سانس بھر کے بولا۔

"اتنا کون سمجھتا ہے؟"

"ہاں، آپ بجا کہتے ہیں شاید بہت ہی کم۔ مکین تو مکانوں میں مسافروں کی طرح ہوتے ہیں" نواب نے متانت سے کہا پھر یکایک اسے خیال آیا اور وہ معذرت کے انداز میں بولا "کیسی عجیب بات ہے، اتنی دیر ہوگئی۔ ہم ابھی تک اپنے محترم مہمان کے نام نامی کے بارے میں بھی نہ جان سکے؟"

"نام سے کیا بنتا ہے صاحب! نام تو شاید سب کے الٹے رکھے جاتے ہیں" بٹھل نے بھن بھناتے ہوئے کہا "اگر یہ کوئی رسم تھی تو بٹھل کو ادا کرونی چاہیے تھی۔ اس نے کچھ نہیں چھپایا اور نواب سے کہا کہ والدین نے جو نام رکھا تھا، وہ تو کب کا مٹ چکا، اب اسے لوگ صرف بٹھل کے نام سے پکارتے ہیں۔"

"بٹھل!" نواب کے ہونٹ کھنچ گئے اور ماتھے پر لکیریں ابھر آئیں "بٹھل صاحب۔۔۔ بٹھل خاں۔۔۔ بٹھل۔۔۔؟"

"جو بھی آپ کو اچھا لگے، ساتھ ٹانک لو۔"

"خوب!" نواب نے تجسس سے کہا "اور جناب کے مشاغل؟"

"ہم لوگ نواب نہیں ہیں۔"

"نوابوں کے سینگ تو نہیں ہوتے جناب!"

"پھر بھی نواب نواب ہوتے ہیں" بٹھل نے بوجھل آواز میں کہا "سینگ تو ہر ایک کے ہوتے ہیں، پر دکھائی نہیں دیتے۔"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیسی باتیں کرنے لگے ہیں اور بٹھل اس فضول گوئی میں کیوں وقت ضائع کررہا ہے۔ کئی بار مجھے وحشت ہوئی کہ نواب سے پوچھوں، اس نے ہمیں خط لکھ کے بلانے کے بارے میں مولوی صاحب کو کچھ بتایا ہے یا نہیں۔ میں نے دخل دینا چاہا لیکن مجھے اپنے ہوش و حواس کی یک جائی کا یقین نہیں تھا۔ میرے حلق میں کانٹے پڑے ہوئے تھے۔ میرے لیے شاید یہی مناسب تھا کہ بت بنا بیٹھا رہوں۔

"آپ نہایت آزمودہ کار بزرگ معلوم ہوتے ہیں" نواب کے چہرے کے مانند اس کی آواز بھی تمتما رہی تھی۔ "یقین جانیئے، آپ سے مل کے خوشی ہوئی لیکن آپ کچھ فرما رہے تھے، اپنے سلسلے۔۔۔"

"وقت بڑا ہے صاحب!" بٹھل نے نرمی سے کہا "بولنے کو کچھ زیادہ ہو تو منہ کھولتے ہوئے بھی اچھا لگے گا۔ سمجھو، تھوڑی بہت کھیتی باڑی کا آسرا ہے، دیکھ بھال تو کوئی اور کرتا ہے۔ ہم تو بس گنتی کرتے ہیں۔ دو تین، پانچ ہزار۔"

"بمبئی ہی میں زمینیں ہیں؟"

"بمبئی سے کچھ پرے، دور ہیں صاحب!"

"آپ بھی بمبئی کے معلوم نہیں ہوتے۔"

"اب تو دنوں سے ادھری پڑاؤ ہے، اپنا کیا نواب صاحب جدھری کو ہوا چلی، چل پڑے۔"

"آپ نے بتایا کہ آپ کو شکار سے دلچسپی ہے، ہمیں بھی کچھ ہے" نواب نے مچل کے کہا۔

"ہر نواب کو ہوتی ہے۔"

"ضروری نہیں" نواب نے بہ عجلت تردید کی "ہمارے علم میں کئی نواب ہیں جو اپنی حویلی اور محل سے باہر بھی کم ہی نکلتے ہیں۔"

"ان کے جنگل اندر ہی ہوتے ہیں۔" بٹھل نے آہستگی سے کہا۔

نواب نے بٹھل کی بات شاید توجہ سے نہیں سنی۔ تیزی سے بولا "ہمارا مقصد ہے کہ وہ شکار سے بالکل بے بہرہ ہیں۔"

"صرف آدمی کا کھیلتے ہوں گے۔"

اس موقع پر بٹھل کو کوئی ایسی ویسی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ صوفے پر نواب کا جسم بل کھا گیا لیکن نوجوان ہونے کے باوجود وہ خاصا حلیم الطبع شخص تھا۔ اس نے جلد ہی اپنی بے کلی پر قابو پالیا "معلوم ہوتا ہے، آپ کو نوابوں کا کوئی تلخ تجربہ ہے۔"

"اپنا اتنا نہیں، آگے کا دیکھا بولتے ہیں" بٹھل نے نواب سے اجازت لے کر بیڑی جلائی اور ایک گہرا کش لے کے بولا "جانے دو نواب صاحب! ابھی اپنی بات کرو۔"

نواب کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر ٹھہر گیا۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے خوش گواری سے کہا "ویسے انگلیوں کے فرق کے تو آپ قائل ہوں گے۔"

"پر ہوتی ساری انگلیاں ہیں چھوٹی بڑی انگلیاں۔"

نواب نے مفاہمانہ انداز میں سر کو جنبش دی مگر اسے قرار نہیں تھا، کہنے لگا "ہمارے بزرگ کو کون سا شکار زیادہ مرغوب ہے؟"

"ڈور کانٹے کے سوا سارا۔"

"وہ تو بہ خدا ہمیں بھی نہیں" نواب کو بے ساختہ ہنسی آگئی "مچھلی کا شکار تو مذاق سا لگتا ہے، اپنے آپ سے بھی اور شاید مچھلیوں سے بھی۔ بہت سے لوگوں کا معاملہ یہ ہے، ان کا بس چلے تو ساری عمر ڈور ڈالے کنارے پر بیٹھے رہیں۔ سنا ہے یہ لوگ پہلے افیون کھاتے ہیں۔"

"مچھلی کا شکار افیون ہے صاحب!"

"بے شک، پھر افیون کی کیا ضرورت رہ جاتی ہوگی" نواب شگفتگی سے بولا "میرا قیاس ہے، جناب ماہر شکاری ہوں گے۔"

"کیا بولیں صاحب! یہ تو شکار ہونے والے ٹھیک سے بولیں گے۔ وقت ملا تو کسی دن چلیں گے۔ ادھری بھی اچھا شکار ہوگا۔"

"مل جاتا ہے لیکن شکار کا اصل مزہ تو ادھر نیپال کی طرف اور ادھر وندھیاچل کے پہاڑوں میں ہے۔ ایک بار جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ واپس آنے کو جی ہی نہیں کرتا تھا۔ آپ بھی گئے کبھی اس طرف؟"

"دو ایک بار جانا ہوا ہے" بٹھل نے سرسری انداز میں کہا۔

"آپ نے وہاں کیا کھیلا؟"

"جو نشانے پر آگیا صاحب! یا یوں بولو' جس کا وقت آگیا" بٹھل نے سر اٹھا کے دیواری گھڑی پر نظر ڈالی "رہے گی صاحب آپ سے بات" نواب کے کچھ اور کہنے سے پہلے اس نے اسے یاد دلایا کہ رات ہو رہی ہے' نواب کے اپنے معمولات ہوں گے۔ وہ کوئی تکلف نہ کرے اور ہماری وجہ سے اپنے مشاغل منتشر نہ کرے۔ بٹھل کا اشارہ واضح تھا کہ نواب کو ہماری آمد کے مقصد کو اولیت دینی چاہیے لیکن نواب جیسے کچھ نہیں سمجھا' وہی کھانے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ بٹھل نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ کھانے کے معاملے میں ذرا بھی ردوکد نہیں کرتا تاہم نواب نے فوراً تالی بجائی۔ چند ثانیوں میں وہی نوجوان ملازمہ حاضر ہو گئی جو نواب کی عدم موجودگی میں ہمارے لیے چائے لائی تھی۔ نواب نے چند منٹ کے لیے گھر میں جانے کی اجازت چاہی۔ کھانے کے لیے بٹھل کی آمادگی سے اسے خوشی سی ہوئی تھی۔ اس میں کچھ اور چستی و تیزی آگئی۔ کمرے سے اس کے جانے کے بعد سناٹا چھا گیا۔ میں نے مضطربانہ بٹھل کی طرف دیکھا۔ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا' بس پلکیں پٹپٹاتا رہا۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے نواب کی باتوں سے کیا نتیجہ اخذ کیا لیکن میں نے جو سنا اور دیکھا تھا' وہی اس نے بھی کیا تھا۔ نواب کے دوبارہ کمرے میں داخل ہونے تک ہم دونوں گنگ بیٹھے رہے۔ وہ منٹوں میں واپس آگیا مگر لگتا تھا' پہر گزر گئے ہیں۔ وقت کا یہی دستور ہے۔ اسے کوئی غرض نہیں کہ کس پر کس طرح گزرتا ہے۔ نواب نے شیروانی اتار دی تھی اور سلک کے کرتے پر بیل بوٹوں سے کڑھی کشمیری شال سینے سے لپیٹ لی تھی۔ صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے شال شانے پر ٹھیک کی تو اس کے کسرتی جسم کا کچھ اندازہ ہوا۔ اس کے بازو مضبوط تھے اور سینہ آگے نکلا ہوا تھا۔ جسم کا یہ توازن ورزش کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ سفید شال میں اس کا سرمئی رنگ کچھ اور نمایاں ہو گیا تھا۔ بال بھی پہلے سے زیادہ سلیقے سے جمے ہوئے تھے۔ اس کے آنے پر بٹھل سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔ واپس آنے کے بعد بھی نواب نے معذرت چاہی اور کہا "کھانے میں کچھ دیر نہیں۔ البتہ جو حاضر تھا' وہی کچھ ہے۔ تیاری میں اور دیر ہو جاتی۔"

"آپ نے اچھا کیا" بٹھل نے ٹھنڈی آواز میں کہا "اپنے کو ایسی بھوک نہیں تھی۔"

"رات کا کھانا آپ عموماً کس وقت کھا لیتے ہیں؟"

"کوئی ٹھیک نہیں' پر نو سے پہلے بھی نہیں۔"

"تو پھر وقت تو ہو رہا ہے؟"

بٹھل نے کچھ نہیں کہا۔ خاموشی چھا گئی۔ نواب کو یہ سکوت گراں گزر رہا ہو گا۔ اس نے بے قراری سے ادھر ادھر دیکھا اور بٹھل سے مخاطب ہوا "یہ علاقہ آپ کو کیسا لگتا ہے؟"

"یہ سب تو آدمی سے ہوتا ہے صاحب!"

"آپ نے بہت صحیح کہا' یوں کہیے کہ یہاں کے لوگ آپ کو کیسے لگے؟"

"لوگ بھی ساری جگہوں پر ایک جیسے ہوتے ہیں' اچھے برے۔"

"لیکن یہاں آپ کو کچھ مختلف' منفرد تو لگتا ہو گا۔"

"سچ پوچھو تو صاحب! کوئی خاص نہیں' یہاں نواب لوگ کچھ زیادہ ہیں۔"

"کیا حضرت!" نواب کے جیسے کسی نے چٹکی بھرلی "یہ اچھی بات ہے یا بری؟" اس نے بہ ظاہر شوخی سے پوچھا۔

"سارے ہی ہوتے تو اچھا تھا۔ اور صاحب!" بٹھل نے بھاری آواز میں کہا "یہ تو ادھری بسنے والوں سے پوچھو۔"

نواب دیدے گھمانے لگا "یہ فرمایئے' کبھی یہاں مستقل بس جانے کو دل نہیں چاہا؟"

"آپ جیسے دو چار مل جائیں تو ضرور۔"

"اوہ!" نواب پر خجالت کا غلبہ ہوا۔ اس نے ایک جھرجھری لی اور منکسر لہجے میں بولا "یہ محض آپ کا حسن ظن ہے' ہم کیا! ہم تو ہمیشہ اپنے دوستوں' مہمانوں کے سامنے۔۔۔"

"ہم ایسے نہیں بول رہے صاحب!" بٹھل نے اس کی بات کاٹ کے سادگی سے کہا۔

"ہمیں معلوم ہے' ہمیں یقین ہے" نواب نے ہکلاتے اور سرہلاتے ہوئے تائید کی اور کہنے لگا "آپ نے بتایا تھا کہ ایک دوبار ہی جناب کا یہاں آنا ہوا ہے۔ یقیناً سیر و تفریح کی غرض سے۔"

"ہاں صاحب!" بٹھل نے مختصراً کہا۔

"کتنے دن قیام رہا یہاں؟"

"زیادہ دن نہیں' کوئی ہفتے بھر کو۔"

"یہ مدت تو کسی علاقے اور اس کے لوگوں کو جاننے کے لیے بہت کم ہے۔ بھلا آپ نے یہاں کیا دیکھا ہو گا۔"

"پانی پی لیا تھا صاحب!"

"اچھا کیا آپ نے" نواب پہلے کھل کھلایا پھر سنجیدہ ہو کے بولا "بہت کچھ حضرت' ہم سمجھتے ہیں کہ میزبانوں اور

مہمان داری پر منحصر ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہاں آپ کا کوئی نہیں ہے' کوئی دوست' رشتے دار۔۔۔ تو ظاہر ہے' بے لطفی تو۔"

"کانٹے پر رکھے بنا ہم دوست نہیں بناتے صاحب! رشتے داری تو پرے کی بات ہے" بٹھل نے بڑبڑاتے ہوئے کہا "ادھری چار مینارے کے پاس ایک دو سے تھوڑی سلام دعا ہوئی تھی۔"

"اور' اور ابھی ان صاحبان کے پاس بھی کیا جانا ہوا ہو گا" نواب خود کلامی کے انداز میں بولا۔

"ادھری سے نمٹ کے ضرور جاتے۔"

"ہماری مراد ہے' پھر تو نہایت مناسب ہے۔ غریب خانہ حاضر ہے' ان حضرات سے ملاقات ہو جاتی تو جناب کے لیے مشکل ہو سکتی تھی۔ حیدر آباد کے لوگ' مشہور ہے' خاصے مہمان نواز ہوتے ہیں۔"

نواب کے پاس ان بے سروپا باتوں کے سوا کوئی اور موضوع نہیں تھا۔ بٹھل بھی جانے کیوں اس تن دہی سے جواب دے رہا تھا۔ ملازم دبے پاؤں اندر آکے دسترخوان لگ جانے کی اطلاع نہ دیتا تو یہ سلسلہ جاری رہتا۔ نواب پھر فوراً اٹھ گیا اور اس نے بازو پھیلا کے ہمیں اندر چلنے کے لیے اشارہ کیا۔ اندر کی تو دنیا ہی دوسری تھی۔ یہ وسیع و عریض حصہ کسی سائبان یا دالان کے مانند تھا۔ ایک طرف لمبی چوڑی میز لگی تھی' دوسری جانب فرشی نشست کا اہتمام تھا۔ جس حصے میں ہمیں بٹھایا گیا تھا۔ شاید اسی طرح محراب دار ستونوں پر اٹھا ہوا دالان چاروں طرف بنا تھا۔ باقی تین حصوں میں لمبی لمبی چلمنیں پڑی تھیں۔ درمیان میں پھیلے ہوئے سبزہ زار کے وسط میں فوارہ ابل رہا تھا۔ دالان کے پیچھے فرشی اور پہلی منزل پر ذرا ذرا سے فاصلے کے بعد کمرے بنے تھے۔ باہر سے دیکھ کے کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ خرم منزل اندر سے اتنی مختلف اور بڑی ہو گی۔ باہر سے جدید طرز کی کوٹھی' اندر روایتی حویلی۔ نواب سے پہلی مرتبہ جب میں اور پیرو ملے تھے تو نواب کے کہنے کے مطابق اس کے والد کے انتقال کو دو سال ہوئے تھے۔ غالباً باپ کے مرنے کے بعد ہی خوش مذاق نواب ثروت یار نے حویلی کے سامنے کا حصہ نئی طرز پر بنوایا ہو گا۔

میرا سارا جسم ڈھیر ہو رہا تھا۔ صوفے سے اٹھتے ہوئے آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ ملازم نے سلفچی میں ہاتھ دھلانے کے لیے آفتابہ بڑھایا تو مجھ سے اچھی طرح ہاتھ بھی نہ دھوئے جا سکے۔ دسترخوان پر چینی کے ڈونگے' رکابیاں اور

چمچے کانٹے سلیقے سے رکھے تھے۔ ایک لقمہ بھی لینے کو جی نہیں کرتا تھا۔ نواب نے ڈونگوں کے سرپوش اٹھائے اور عجز وانکسار کا آموختہ پڑھنے لگا۔ بٹھل کی یقین دہانی کے باوجود کہ دسترخوان پر بیٹھ کے وہ تکلف نہیں کرتا' نواب اصرار سے باز نہیں آیا' کہنے لگا "حیدر آباد کے بعض کھانے صرف حیدر آباد سے مخصوص ہیں' بریانی تو یہاں آپ نے طرح طرح کی آزمائی ہوگی۔ یہ لقمی تخمی بھی ۔۔۔ لیکن ممکن ہے' اس وضع کا مزعفر آپ نے پہلے نوش جاں نہ فرمایا ہو۔"

ہم نواب عالم تاب کی حویلی میں قیام کے دوران میں ہر قسم کے حیدر آبادی کھانے برت چکے تھے۔ وہاں کے تو رنگ ڈھنگ ہی شاہانہ تھے۔ وہ تو ویسے بھی پورا محل تھا۔ یہ سب کچھ اس کا عشر عشیر بھی نہ تھا "حیدر آباد میں ترشی کا بہت شوق ہے مگر صرف کھانوں کی حد تک" نواب ہنس کے بولا "خاطر جمع رکھیے' لوگ اس کی ضد ہیں" نواب جانے کیا کیا کہتا رہا اور بٹھل کے آگے ڈونگے بڑھاتا رہا۔ اس کی دل دہی کے لیے بٹھل کو یہی ظاہر کرنا چاہیے تھا کہ کھانوں کی یہ خوش رنگی اور خوش ذائقگی اس کے تجربے میں ایک اضافہ ہے۔ وہ اشتیاق کا اظہار کرتا رہا' اس صاحب آداب سامع کی طرح جسے شعر سننے کے بعد داد دینا لازم ہوتا ہے۔ چاہے شعر سماعت پر کتنا ہی بار گزرے۔ چار و ناچار میں بھی سر جھکائے نواب کے حکم کی تعمیل میں ہاتھ چلاتا رہا۔ لقمے میرے حلق' میرے سینے میں اٹک رہے تھے۔ سزائیں تو طرح طرح کی ہوتی ہیں۔

فرشی نشست والا حصہ پوری طرح روشن تھا۔ اطراف میں دھندلی دھندلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ بار بار میری نظریں زنان خانے کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ انہی در و بام سے اس کا بھی گزر ہوا ہوگا۔ ہو سکتا ہے' وہ اب بھی یہیں ہو اور کسی سبب سے نواب ہم سے چھپا رہا ہو۔ جب اتنا بڑا گھر ہے تو مولوی صاحب کو دور ٹھہرانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ ہماری کوئی آزمائش کر رہا ہے۔ عجب نہیں کہ کسی گوشے سے اچانک مولوی صاحب سامنے آجائیں مگر پھر نواب میں یہ اطمینان نہ ہوتا۔ زنان خانہ اتنا دور نہیں تھا کہ کوئی آواز چہکار ہو تو ہم تک نہ پہنچ سکے۔ اس طرف ایسی خاموشی طاری تھی جیسے وہاں کوئی رہتا ہی نہ ہو۔

دونوں ملازم نواب کے اشارے کے منتظر ایک جانب مستعد کھڑے تھے۔ ملازمہ باورچی خانے سے گرم پراٹھے لالا کے دسترخوان پر رکھتی جاتی تھی۔ حاضر کھانے کی ایسی افراط' اتنی اقسام تھیں تو ہمارے لیے اہتمام کرنے پر نہ جانے کیا عالم ہوتا۔ معلوم ہوتا تھا' جیسے نواب کو ہماری آمد کی خبر ہوگئی تھی۔ کوئی کتنا ہی بڑا نواب ابن نواب ہو' شاید کسی کے ہاں بھی اتنی قسموں کے کھانے ہمہ وقت تیار نہ رہتے ہوں۔ یہ اتفاق ہی ہو سکتا تھا' کوئی مہمان نہ آسکا ہوگا یا پھر ہم کسی رسم' والد مرحوم کی برسی وغیرہ کے موقع پر آگئے تھے سب کچھ تازہ تازہ تھا۔

"آپ اتنے خاموش کیوں ہیں؟" نواب دفعتاً مجھ سے مخاطب ہوا۔

میں ہڑبڑا سا گیا "نہیں تو۔۔" میں نے بے ربطی سے کہا "میں تو۔۔۔"

"آپ کو شاید کچھ پسند نہیں آیا۔"

"نہیں' نہیں جناب!"

"آپ تو گزشتہ مرتبہ خاصے دن یہاں رہے تھے۔ ہمیں یاد پڑتا ہے' دو تین ہفتے۔ کوئی اٹھارہ انیس روز کے وقفے سے آپ دوبارہ غریب خانے پر تشریف لائے تھے اور آپ نے بتایا تھا کہ آپ شہر ہی میں رہے ہیں۔"

"جی ہاں' جی ہاں" میں نے بدحواسی سے کہا۔

"تو آپ کے لیے تو حیدر آباد اتنا نیا نہیں ہوگا۔"

"جی ہاں" میں نے لکنت سے کہا "مگر اس وقت تو۔۔" میں کہتے کہتے رک گیا۔

نواب کی مشتاق اور متجسس نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں "آپ نے یہاں کیا کیا دیکھا بھالا؟ کہاں قیام رہا؟"

نواب کی یادداشت بہت تیز تھی۔ اسے دن تک یاد تھے۔ ٹھیک اتنے ہی دن بعد میں اور پیرو' حیدر آباد سے واپس جاتے وقت اس کے ہاں دوبارہ آئے تھے اور اس وقت اس نے بتایا تھا کہ اس دوران میں مولوی صاحب اور کورا نے اس کے گھر قیام کیا تھا۔ اور جب یہ کسی ضروری کام سے سکندر آباد گیا ہوا تھا' مولوی صاحب گھر میں اس کی والدہ یا کسی ملازم کو بتائے بغیر چلے گئے۔ میں نواب سے کیا کہتا کہ سترہ اٹھارہ روز کا یہ وقفہ ہم نے کہاں' کس حال میں بسر کیا تھا۔ ہمیں بمبئی جانے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ ادھر مارلی' زورا' نگو اور اباجان ہوٹل میں ہماری راہ تک رہے تھے۔ نواب کے گھر سے واپسی کے راستے میں اڈے کے آدمیوں نے ہمارا تعاقب شروع کر دیا تھا۔ ہم نے ان سے اوجھل ہو کے ہوٹل پہنچنے کی اپنی سی کوشش کی' کوئی چارہ نہ رہا تو پھر گٹی کے نسبتاً سنسان علاقے میں ہمیں ان کے سامنے آنا پڑا اور خون خرابے کے نتیجے میں حوالات جانا پڑا۔ ہمارے سان وگمان میں نہ تھا کہ نواب جہاں تاب کے ایما پر اڈے کے آدمی سارے شہر میں کتوں کی طرح ہماری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ وہ تو کب سے جال بچھائے بیٹھے تھے۔ پولیس' حوالات' اڈے کے آدمی' سب نواب جہاں تاب نے خرید لیے تھے۔ سب کچھ پہلے سے طے کیا ہوا تھا۔ حوالات کا راستہ نواب کے زنداں تک جاتا تھا۔ بیش تر دن تو ہم نے اس شہر کے رئیس اعظم نواب جہاں تاب کے زنداں میں گزارے تھے۔

"پچھلے کے بارے میں پوچھ رہے ہو نواب صاحب!" بٹھل نے کسی طرح میری مشکل آسان کی "ان دنوں یہ ٹھیک کدھری رہا' یہ تو الٹا پڑ گیا تھا" اس سے پہلے کہ میں ہذیان بکتا' بٹھل نے نواب ثروت یار سے میری بیماری کا ذکر کیا کہ میں تو سارے عرصے ہاتھ پیر توڑے بستر پر پڑا رہا۔ طبیعت کچھ بحال ہوئی اور بمبئی واپسی کی کوئی شکل نظر آئی تو میں نے اور پیرو نے سوچا' ایک بار پھر نواب کے گھر کا رخ کیوں نہ کریں۔ ممکن ہے' اس درمیان اپنے وعدے کے مطابق مولوی صاحب وہاں آئے ہوں۔ ہو سکتا ہے مولوی صاحب کے بارے میں ہمیں نواب سے کچھ مزید معلوم ہو سکے' اور یہی ہوا بھی۔

میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ بٹھل کو یہ عذر کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ کوئی اور بات بھی پیش کی جا سکتی تھی۔ بہرحال نواب کے غیر ضروری سوالوں سے گریز کے لیے یہ فسانہ وضع کرنا بھی ایسا نامناسب نہ تھا۔ اس طرح بٹھل نے مولوی صاحب کے ذکر کا اعادہ کرنے کے لیے سلیقے سے نواب کو ترغیب دلائی تھی۔ دیر ہوگئی تھی' نواب کو ٹوکنا اب ضروری تھا۔ اسے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ ہم حیدر آبادی من و سلوا زہر مار کرنے اور ان کے قصیدے پڑھنے یہاں نہیں آئے ہیں۔ ایک ایک دن' ایک ایک لمحہ گنتے ہوئے اب کہیں برسوں میں یہ دن آیا ہے کہ کورا اور مولوی صاحب کے اتنے قریب پہنچ جانے کی صورت پیدا ہوئی ہے۔ نواب کو ہمارے حال کی کچھ خبر نہ تھی۔ مولوی صاحب کا ذکر جیسے اس نے سنا ہی نہیں۔ وہ ہمدردی کا اظہار کرنے لگا اور شکایتی لہجے میں بولا "ہمیں بتایا بھی نہیں۔ ہم نے ان سے کہا تھا کہ اس اجنبی شہر میں کوئی خدمت ہمارے لائق ہو تو ہم ہر وقت حاضر ہیں۔"

"بیمار آدمی تو اور بوجھ ہوتا ہے" بٹھل نے چڑ مراتی آواز میں کہا "ایسے کوئی کیسے آجاتا صاحب!"

"بہ خدا ہمیں ذرا بھی علم ہو جاتا تو ہم سے کوتاہی نہ ہوتی۔ ہم انہیں یہاں لے آتے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ پہلی ہی ملاقات میں ہمیں بہت پسند آئے تھے۔ ان کے چہرے پر ایک عجب' معصوم سا ہیجان ہے۔ سترہ اٹھارہ دن تو خیر بڑی بات ہے' یہ دیکھتے ہمارے ساتھ صرف چند دن رہ کے کیسے ترو تازہ ہو جاتے۔"

"ایسا ہے صاحب تو ابھی اس کو پاس رکھ لو۔ یہ ابھی بھی کتنا ٹھیک ہے۔"

مجھے حیرت ہوئی کہ بٹھل یہ کیا کہہ رہا ہے۔ نواب کی آنکھوں سے بے چینی ہویدا ہوئی "نصیب دشمناں' کوئی عارضہ ہے انہیں؟ کیا بات ہے؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"برس ہو گئے اسے" بٹھل کی آواز ماند پڑنے لگی "کیا بولیں آپ کو' دیکھنے میں جتنا ٹھیک لگتا ہے' ایسا ہے بالکل نہیں۔"

میں نے جلتی ہوئی نظروں سے بٹھل کو دیکھا۔ میں اسے روکنا چاہتا تھا کہ نواب اضطراب سے بولا "کیا بات ہے' ہمیں بھی بتائیے۔"

"اسی کارن تو آپ کے پاس آئے ہیں" بٹھل نے گہری سانس بھر کے کہا "کتنے گھر' شہر' نگر کھوج لیے تب کہیں آپ کا ٹھکانا دکھائی دیا ہے۔"

نواب کشش و پنج کی کیفیت سے دوچار ہوا اور تردد سے بولا "ہو سکے تو ہمیں بتائیے' ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

"اب تو سارا آپ ہی کے پاس ہے۔" بٹھل نے الجھی ہوئی آواز میں کہا۔

"آپ کیا فرما رہے ہیں؟" نواب چونک کے بولا۔

"مولوی صاحب کے مل جانے پہ دیکھو صاحب! یہ کیسا رنگ بدلتا ہے۔"

"اوہ!" نواب نے ایک گہری سانس کھینچی "اچ۔۔ چھا' خوب! بہ خدا ہم تو پریشان ہو گئے تھے" وہ مسکرا کے بولا "ہم سمجھتے ہیں۔"

"پتا نہیں' آپ کتنا سمجھتے ہو؟"

"گزشتہ مرتبہ جب یہ آئے تھے تو انہوں نے ہمیں کچھ بتایا تھا' شاید سبھی کچھ" وہ جھجکتے ہوئے بولا "اسی لیے' اسی لئے ہم نے انہیں خط لکھا۔"

"آپ بولو' ہم آپ کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟"

نواب کی سمجھ میں دیر سے آیا کہ بٹھل کی مراد شکر گزاری سے ہے' کہنے لگا "نہیں نہیں۔ ہمارے لیے اس سے بڑی خوشی کیا ہو سکتی ہے کہ ہم بچھڑے ہوؤں کو۔۔۔" یہ کہتے ہوئے یکایک اس کے چہرے پر شکنیں بکھر گئیں۔ وہ خاموش ہو گیا پھر مجھ سے مخاطب ہو کے نرمی سے بولا "خاطر

جمع رکھیے۔ ایسی دیر نہیں ہے اب۔"
"ہم کو لگ رہا تھا' اس بار ہم خالی ہاتھ نہیں جائیں گے۔" بٹھل نے ممنونیت کے لہجے میں کہا۔
نواب کسی قدر اضطراری انداز میں سہلانے لگا۔
"آدمی کو بھی تالے لگ جاتے ہیں صاحب! توڑے سے نہ ٹوٹیں' وہ کنجی ڈھونڈتا رہتا ہے اور ادھری مکڑی جالا کاڑھتی رہتی ہے" بٹھل دھندلائی آواز میں بولا۔
"ہاں ہاں' آپ ٹھیک کہتے ہیں جناب!" نواب کی پلکیں سکڑ گئیں "آدمی واقعی بہت عجیب ہوتا ہے۔ گرہ پڑ جائے تو لاکھ سر پیر ماریے' نہیں کھلتی۔ حالانکہ بہت کچھ خود آدمی کے اختیار میں ہے۔ یاد کرنا' بھول جانا' چھین لینا' بخش دینا' نقش بنانا' بگاڑ دینا' قائم رکھنا اور مٹا دینا۔ سارے کل پرزے اس کے پاس ہوتے ہیں۔ دماغ بھی دل بھی۔"
"سارے کل پرزے اوپر نیچے ہو جاتے ہیں۔ باگ جب ہاتھ سے چھوٹ جائے صاحب۔" بٹھل نے تندی سے کہا۔
"اور تقدیر! تقدیر بھی تو کرشمہ۔" نواب جانے کیا کہنا چاہتا تھا کہ ملازمہ کی دخل اندازی پر منتشر ہو گیا۔ ملازمہ کے ہاتھ سے شیرینی کا ڈونگا گرتے گرتے رہ گیا تھا۔ ڈونگا دسترخوان پر گرنے سے بچانے کے لیے وہ بوکھلا گئی اور اس کا سراپا ڈگمگا گیا۔ یہ دیکھ کے ایک ملازم اس کی طرف دوڑا لیکن ملازمہ نے خود کو فوراً سنبھال لیا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو نواب ضرور سرزنش کرتا۔ اس کے چہرے پر سرخی کی ایک لہر اٹھی تھی مگر اسے ہماری موجودگی کا احساس ہو گیا۔ ایک لحظے کی خفت آمیز مسکراہٹ کے بعد وہ شکایت کرنے لگا کہ ہم نے ہاتھ کیوں روک لیا' سب کچھ تو ویسے ہی رکھا ہوا ہے۔
"بس نواب صاحب! مہربانی" بٹھل نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ ہم نے کوئی تکلف نہیں کیا ہے۔
"باتوں میں ہمیں آپ سے پوچھنے کا خیال ہی نہ رہا' بہرحال یہ خوبانی کا میٹھا تو ملاحظہ کیجیے۔ یہ بھی حیدر آباد کی خاص چیز ہے۔"
بٹھل نے ایک کٹوری میری طرف بھی بڑھا دی۔ میں نے جیسے تیسے اسے حلق سے اتارا۔ نواب کو شاید ہماری بے چینی و بے زاری کا اندازہ ہو چلا تھا یا یہ کہنا چاہیے کہ اسے ہماری حالت پر رحم آنے لگا تھا۔ اس نے پھلوں کے لیے اصرار نہیں کیا اور دسترخوان سے اٹھ گیا۔ ہاتھ دھونے اور کلی کرنے کے بعد ہم دوبارہ پہلے والے کمرے میں آ گئے۔ درمیان کی میز پر چائے دانی اور فنجان تیار رکھے تھے۔ ابھی چائے کا مرحلہ باقی تھا اور سہمی ہوئی ملازمہ فنجانوں میں چائے ڈالنے کے لیے کمرے میں داخل ہوئی تھی کہ نواب نے بے اعتنائی سے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ وہ سر جھکائے الٹے قدموں واپس چلی گئی۔ نواب نے اٹھ کے خود چائے بنائی اور اس سے پہلے کہ وہ ہم دونوں کے سامنے فنجان لاتا' بٹھل نے عجلت کی۔ میں نے بھی اس کی پیروی میں فنجان میز سے اٹھا لیا۔
"یہ خالص عربی قہوہ ہے۔ آپ پسند فرمائیں تو شکر کی آمیزش کر لیں۔ عرب تو چینی کے بغیر پیتے ہیں۔"
"جان دار ہے صاحب!" بٹھل نے ایک گھونٹ لے کے کہا "بڑی کاٹ ہے۔"
"یہاں ریاست میں بہت سے عربی رسم و رواج مروج ہیں۔ ریاست سے عربوں کا تعلق بھی گہرا ہے۔ یہ قہوہ انہی کی سوغات ہے۔ آپ کو کبھی چاؤشوں کی بستی میسرم جانے کا بھی اتفاق ہوا؟"
"وہ کدھری ہے؟" بٹھل نے تجسس سے پوچھا۔
"ہاں' آپ کو موقع بھی کہاں ملا ہوگا۔ یہ تو جناب دیکھنے کی چیز ہے" نواب نے چہکتی آواز میں کہا "صورت یہ ہے کہ حضور نظام کے چوب داروں' عصابرداروں میں عرب باشندے بھی کثیر تعداد میں شامل ہیں۔ ان لوگوں کی ایک بستی' کسی جزیرے کے مانند یہاں آباد ہے۔ عمارتی اعتبار سے تو کوئی خاص نہیں لیکن وہاں جا کے بالکل عربستان کا گمان ہوتا ہے۔ زبان' بودوباش اور رسم و رواج سب عربی۔ سرزمین عرب کا خطہ ہو جیسے۔"
"ضرور دیکھیں گے صاحب!" بٹھل نے آنکھیں پھیلا کے کہا۔
"یہاں سے دور زیادہ نہیں ہے' یہی کوئی پانچ چھ میل کے فاصلے پر ہوگی۔ وہاں جا کے ہریس ضرور کھائیے گا۔ ہریس تو شہر میں بھی ملتا ہے' ادھر شاہ گنج کے قریب مسجد چوک کے پاس لیکن چاؤشوں کی بستی میں اس کا لطف ہی کچھ اور ہے۔"
"یہ کیا چیز ہے نواب صاحب؟" بٹھل نے سادگی سے پوچھا۔
"کیا عرض کریں" نواب دیدے گھماتے ہوئے بولا "غذائی لحاظ سے' کہا جاتا ہے کہ بہت مقوی چیز ہے۔ اب ہم کس طرح تشریح کریں۔ یوں سمجھیے کہ آٹے' دودھ اور گوشت کی یخنی کا آمیزہ۔ آسانی کے لیے اسے عربی حلیم کہہ لیجیے مگر اپنے ہاں کے حلیم سے بہت مختلف ہے۔ یہ عموماً بے نمک اور بے مرچ تیار کیا جاتا ہے۔ بعد میں چاہے نمک مرچ سے کھائیے یا چینی سے۔ نہایت لذیذ قسم کا کھانا ہے۔ عربوں

ا مرغوب غذا ہے۔ ریاست کے لوگ بھی کم شوق سے نہیں ماتے۔ دیکھیے' وقت ملا تو ہم آپ کے لیے اہتمام کرتے ہے۔ کسی چاؤش سے رابطہ کرتے ہیں۔ عرب کے ہاتھ سے نے ہوئے ہریس کی لذت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔"
بٹھل کو چاؤشوں اور ان کی بستی کا علم ضرور ہوگا۔ مجھے ر آتا تھا' ایک مرتبہ ہم نے شاہ گنج میں مسجد چوک کے پاس ٹل میں ہریس بھی کھایا تھا اور نواب جہاں تاب کے ہاں ام کے دوران میں بھی یہ تجربہ ہو چکا تھا۔ بٹھل کا لاعلمی کا ظہار نواب کا شوق کلام اور فزوں کر رہا تھا۔ یہ تو طرح دینے ے مترادف تھا۔ پہلے اجنبیت کا کوئی حجاب تھا تو اب نواب کے ہاں یہ بھی نہیں رہا تھا۔ ہمارے کسی استفسار اور جستجو کے نیر اس نے ریاست کے تفریحی اور تاریخی مقامات و آثار' طب شاہی مزارات' عثمان ساگر' گول کنڈے کا قلعہ' فلک ا' نواب سالار جنگ کے نوادر' گلبرگہ میں حضرت گیسو دراز امزار' ناندیڑ میں گرو گوبند سنگھ کا گوردوارہ' اورنگ آباد میں ورنگ زیب کی قبر' اس کی بیٹی کا تعمیر کیا ہوا سرخ پتھروں کا اج محل ثانی' اجنتا' ایلورا کے عجائب' نواب نے جانے کہاں لہاں کا ایران توران کا تذکرہ شروع کر دیا۔ بٹھل کو اب لوئی جلدی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ وہ مودبانہ دل جمعی سے نتا رہا۔ قطع کلامی میں یوں بھی مجلسی ادب مانع تھا۔ میری لرح بٹھل کو بھی شاید یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کوئی بات ناگوار ماطر نہ ہو جائے۔ نواب ہی پر سب کچھ منحصر تھا۔ ہمارے زنداں کی کنجی تو اسی کے پاس تھی۔ وہ کسی بھی لمحے مولوی ماحب کے بارے میں کوئی خبر سنا سکتا ہے' اسی کا کیا جاتا تھا' بھی اس نے مولوی صاحب کی شہر میں موجودی کا اقرار کیا تھا' کچھ دیر میں وہ انکار بھی کر سکتا تھا۔ رہ رہ کے یہ خیال دل کو لرزاتا' دہلاتا تھا کہ نواب کی یہ طول کلامی' یہ شائستگی اور مروت کسی سبب سے نہ ہوں' کسی اتمام حجت کے لیے؟ مبادا کوئی ایسی ویسی خبر سنانے کے لیے وہ ہمیں آمادہ کرنا چاہتا ہو مگر پھر وہ اس طرح کی باتیں نہ کرتا' اور ایسی ویسی خبر ہو بھی کیا سکتی ہے۔ میرا دماغ جانے کہاں کہاں بھٹک رہا تھا۔ کبھی جی کرتا' یہاں سے اٹھ کے چلا جاؤں۔ جو کچھ ہوگا' بٹھل مجھے باہر آ کے بتا دے گا۔ بٹھل کا رویہ میری فہم سے بالا تھا۔ وہ مجھے اور نیم جاں کیے ہوئے تھا اور میں خود کو یہی باور کرانے کی کوشش کرتا تھا کہ بٹھل کو تو مجھ سے زیادہ گراں باری ہوگی۔ اسے اتنا وقت کرنے کی عادت نہیں ہے۔
بٹھل کو کسی موقع کا انتظار تھا۔ نواب نے ریاست کے احوال و آثار کا بیان کرتے ہوئے جیسے ہی وقفہ کیا اور تازہ دم ہونے کے لیے سامنے میز پر رکھے ہوئے قہوے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو بٹھل نے ہنکاری بھری اور دیواری گھڑی دیکھ کے حیرت ظاہر کی "رات بڑھ رہی ہے نواب صاحب! ہم کو اب اجازت دو۔"
نواب نے فنجان میں قہوہ انڈیلتے ہوئے ہاتھ روک لیا اور دستی گھڑی دیکھتے ہوئے بولا "نہیں' ایسی رات بھی کہاں ہوئی ہے۔ ہمارا خیال ہے' قہوے کا ایک دور ہو جائے۔"
"ابھی ایک دم گنجائش نہیں صاحب!"
نواب نے از خود عذر پیش کیا "یقیناً آپ کو سفر کی تکان بھی ہوگی۔ ہم تو ایسے محو ہوئے کہ اس طرف توجہ ہی نہ دے سکے۔"
بٹھل نے بیڑی کا بنڈل واسکٹ میں ڈالا اور اونچی آواز میں بولا "آپ سے بہت کچھ جانا ہم نے۔"
"کیا جناب!" نواب نے لجاجت سے کہا "ہماری تو گزارش ہے کہ رات یہیں قیام فرمائیں۔"
"ابھی جانا ہے اپنے کو" بٹھل کسمساتے ہوئے بولا۔
"وہاں کوئی انتظار تو نہیں کر رہا ناآپ کا؟"
"کون کرے گا صاحب!"
"پھر کیا مضائقہ ہے۔ اطمینان رکھیے' یہاں آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔"
"جانتے ہیں صاحب! پر' پھر بھی۔"
"جیسا آپ مناسب خیال فرمائیں" نواب کی پتلیاں چڑھ گئیں۔ لگتا تھا' بٹھل کا انکار اسے کسی قدر ناگوار گزرا ہے۔
بٹھل صوفے سے اٹھ گیا۔ نواب بھی کھڑا ہو گیا۔ گویا وہ بادل ناخواستہ سہی ہمیں رخصت کرنے کے لیے آمادہ ہو گیا تھا' کچھ کہے سنے بغیر جیسے ہم اس سے ملاقات کرنے اور اس کے ہاں دعوت کھانے کے لیے آئے تھے اور بس۔ مجھے خفقان سا ہونے لگا۔ میں نے دہشت زدہ نظروں سے بٹھل کی طرف دیکھا۔ بٹھل دروازے کی طرف بڑھنے لگا تھا۔ ہمارے ساتھ چلتے ہوئے نواب نے دفعتاً ٹھہر کے کہا "جناب' کس طرح جائیں گے' چار کمان تو خاصی دور ہے؟"
"سواری مل جائے گی صاحب!"
"موٹر حاضر ہے' اگر آپ۔" نواب نے بٹھل کو انکار کی مہلت نہیں دی' تالی بجا کے ملازم کو طلب کیا۔
"چلے جائیں گے صاحب' آرام سے" بٹھل کہتا ہی رہ گیا۔ ملازم لمحوں میں حاضر ہو گیا۔ نواب نے بٹھل کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے ڈرائیور کی طلبی کا حکم صادر کیا اور

باہر نکل گیا۔ ہم دونوں نے اس کے پیچھے دروازہ عبور کیا۔

کمرے کے باہر مختصر سا باغیچہ تھا۔ چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ اور بھن بھناتا سا سناٹا ہر سو چھایا ہوا تھا۔ "باہر کا موسم تو نہایت جاں فزا ہے" نواب نے نیم خنک ہوا سینے میں بھرتے ہوئے کہا۔

"موٹر کی تکلیف مت کرو نواب صاحب!" بٹھل دھیمی آواز میں بولا "تھوڑا پیدل چلنے کو مل جائے گا۔"

ادھر باہر جمرو اور زورا ہمارے انتظار میں بے چین ہوں گے۔ انہیں نواب ثروت یار کے مکان کے اردگرد ہی منڈلاتے رہنا چاہیے۔ ایک ہی علاقے میں رات کے وقت دو اجنبیوں کا ادھر سے ادھر گھومتے رہنا نظروں میں آسکتا ہے۔ میں نے بھی نواب سے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ وہ الٹا شرمندگی کا اظہار کرنے لگا کہ اسے پہلے ہی ہمیں موٹر کی پیش کش کرنا چاہیے تھی۔ چند قدم سبزے کا فاصلہ طے کرکے ہم پرانی طرز کے کاریڈور میں آگئے۔ کالے رنگ کی چمکتی ہوئی موٹر وہیں کھڑی تھی۔ دوسری جانب سے ڈرائیور ٹوپی اوڑھے، سفید کوٹ کے بٹن بند کرتا ہوا، موٹر کے پاس پہنچ گیا۔ ہم نے کچھ نہیں سنا، نواب نے آگے جاکے سرگوشی کے انداز میں اسے کچھ ہدایت کی۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اب نواب کو زبان کھولنی چاہیے تھی۔ یا بٹھل ہی کو اسے ٹوکنا چاہیے تھا۔ ہم موٹر میں بیٹھ گئے، ہماری طرف کا دروازہ بند کرکے ڈرائیور نے بھی اپنی نشست سنبھالی اور چابی گھمادی۔ انجن کا شور گونجنے لگا تو نواب نے اسے روک دیا۔

"کیسی عجیب بات ہے۔ ہم اپنے معزز مہمان سے آئندہ کے لیے پوچھنا ہی بھول گئے" نواب پشیمانی سے بولا "اب ملاقات کب ہو رہی ہے؟"

"سوچا تھا، آپ کو بولیں پھر...." بٹھل نے شاید ڈرائیور کی وجہ سے احتیاط کی اور نواب سے کہا کہ وہ اس کے حکم کا منتظر ہے۔

"حکم کیجئے جناب!" نواب نے متانت سے کہا "ہمارا خیال ہے، کل صبح نو دس بجے کیسا رہے گا؟ آپ کی کوئی اور مصروفیت ہو تو۔"

"کیا بولتے ہو صاحب!" بٹھل نے تنک کے کہا۔

"آپ فرمائیں تو ساڑھے آٹھ بجے موٹر بھیج دیں۔"

"آجائیں گے خود صاحب!"

"موٹر کس لیے ہے۔ یہ وقت پر آپ کو لے لے گی۔ ناشتا ہمارے ساتھ ہی کیجئے گا۔"

"آپ بولتے ہو تو ٹھیک ہے۔ ناشتے کی ہم کو ایسی عادت نہیں ہے۔"

"یہاں دکن میں تو صبح کے وقت باقاعدہ کھانا کھایا جا[تا] ہے" نواب نے ہنس کر کہا "یوں کہئے، دن میں تین وقت [کا] کھانا۔"

بٹھل نے سر ہلا دیا۔

"بہتر ہے، پھر صبح نو بجے انتظار رہے گا۔ منزل دور ہ[ے] لیکن اتنی بھی نہیں۔ دو ڈھائی گھنٹے میں...."

"آپ تکلیف مت کرو نواب صاحب! ہوسکے تو ہم کو [پتا] دو، ہم خود ان کے پاس پہنچ جائیں گے۔"

"نہیں جناب!" نواب مضطرب سا ہو گیا "یہ کیسے ممک[ن] ہے۔ قبلہ مولوی صاحب کیا فرمائیں گے۔"

"آپ نے ان کو ہمارا بول دیا ہے؟"

نواب نے ایک لحظے توقف کیا "سچ پوچھئے تو اس بار [ہم] نے پردہ ہی رکھا۔ بابر میاں نے یہی کچھ ہمیں باور کرایا تھا[۔] کیوں بابر میاں؟"

"جی، جی ہاں" میں نے ہکلاتی زبان میں تائید کی۔

"ایسی صورت میں اندازہ کیجئے، ہمارا آپ کے ساتھ ہونا کس قدر ضروری ہے" نواب نے زور دے کر کہا۔

بٹھل کو کہنا چاہیے تھا کہ ہاں ایسی صورت میں نواب کا ہمارے ساتھ نہ ہونا زیادہ مناسب رہے گا مگر وہ چپ رہا۔

"آپ کا وہاں پہنچنا بھی مشکل ہے" نواب نے خو[د ہی] اضافہ کیا "اور یوں بھی ہم ایک زمانے سے بچھڑے ہوؤ[ں] کے ملاپ کے دل افروز منظر سے کیوں محروم رہیں۔"

نواب کے خدا حافظ اور شب بخیر کہنے پر ڈرائیور نے موٹر چلادی۔ صدر دروازہ کب کا کھلا ہوا تھا۔ دوسرے ہی لمحے موٹر سڑک پر آگئی۔ کوئی فرلانگ بھر بعد بٹھل نے ڈرائیور کو موٹر آہستہ رکھنے کی تاکید کی مگر اس کا کوئی نتیجہ [نہ] نکل سکا۔ دروازے سے نکلتے ہی ہماری نظر زورا اور جمرو [کے] لیے بھٹکنے لگی۔ آمنے سامنے، دور و نزدیک وہ ہمیں کہیں دکھائی نہیں دیے۔ بٹھل نے اس ناگہانی سے نمٹنے کے [لیے] جانے کیا طے کیا تھا۔ نہ ہم آس پاس کی گلیوں میں موٹر گھما سکتے تھے۔ نہ جمرو اور زورا کو ساتھ بٹھا سکتے تھے۔ البتہ کہیں قریب مل جانے پر انہیں اشارہ ضرور کرسکتے تھے۔ چار کمان تک جانے اور دوبارہ اس علاقے میں آکے انہیں تلاش کرنے میں بہت دیر ہوسکتی تھی۔ جب تک ہم نواب کے مکان سے نکلتے ہوئے دکھائی نہیں دیں گے، ظاہر ہے وہ اردگرد، انہی گلیوں میں منڈلاتے رہیں گے اور وقت گزر[نے]

کے ساتھ ساتھ ان کی وحشت بڑھتی رہے گی۔ ہر وقت نواب کا مکان نظروں میں رکھنا ان کے لیے ممکن بھی نہ تھا۔ اس سے تو اچھا تھا کہ ہم انہیں ہوٹل ہی میں چھوڑ دیتے۔ آخر انہیں ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے کچھ نہیں معلوم تھا کہ بٹھل نے صورت دیگر کے لیے کیا ہدایت کی ہے۔ کتنی دیر تک انہیں نواب کے دروازے سے ہمارے برآمد ہونے کا انتظار کرنا تھا۔

وہ دونوں گزشتہ مرتبہ حیدر آباد میں ہمارے ساتھ تھے۔ اڈے کے آدمی انہیں خوب پہچانتے ہیں۔ کسی وقت بھی وہ ان کی نگاہوں کی زد پر آسکتے ہیں۔ اباجان کے ہیروں کی جستجو میں حواس کھو دینے والے نوابوں کے نمک خواروں کی نظر بھی ان پر پڑسکتی ہے۔ حیدر آباد سے واپسی کے سفر میں ہمارے تعاقب میں آنے والے ان کے چار زرخریدوں میں سے دو کو ہم نے چلتی ریل گاڑی سے نیچے پھینک دیا تھا۔ باقی دو کو پیرو کے اڈے کے زنداں میں بے حال کرکے اڈے کے آدمی بمبئی کے کسی گھورے پر پھینک آئے تھے۔ ممکن ہے، وہ چاروں صحیح سلامت اپنے آقاؤں کے پاس پہنچ گئے ہوں۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ اس ہزیمت کے بعد طالع آزما نوابوں نے امید چھوڑ دی ہے یا ابھی تک سینوں میں پھانس چھپائے بیٹھے ہیں۔ حیدر آباد میں قیام کے دوران میں اباجان نے عالی شان حویلی خریدی تھی اور خانم ابھی تک نواب جہاں تاب کے ہاں موجود تھی۔ اسی آس نے انہیں آسودہ رکھا ہوگا کہ حویلی کے لیے نہیں تو خانم کی خاطر ایک نہ ایک دن ہمیں حیدر آباد واپس آنا ہے۔ ان کی حرص و ہوس کی آگ ٹھنڈی ہونے کے لیے ایک موسم کی بارش ناکافی ہے۔ ابھی ایسا وقت نہیں گزرا تھا اور اگر پے درپے مایوسیوں کے بعد انہوں نے ہم پر خاک بھی ڈال دی ہے تو دوبارہ حیدر آباد میں ہماری موجودگی کی اطلاع انہیں پھر سے بے کل کرسکتی ہے۔ بٹھل نے انہی خدشوں کی وجہ سے زورا اور جمرو کو ساتھ رکھا ہوگا۔ ایک سے دو، دو سے چار بھلے ہوتے ہیں۔

موٹر نام پلی کی بڑی سڑک پر آگئی۔ واقعی رات اتنی گہری نہیں ہوئی تھی۔ سڑکوں پر اچھی خاصی چہل پہل تھی۔ بازار بند ہوچکے تھے لیکن چائے خانے اور پان کی دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ نام پلی اسٹیشن کے ہوٹلوں کی طرف ویسے بھی رونق رہتی ہے۔ اس طرف دن کا سماں تھا۔ سڑکوں پر سواریاں کم ہونے کی وجہ سے موٹر کو کوئی رکاوٹ پیش نہیں آرہی تھی۔ نام پلی سے گزر کے ہم عابد شاپ روڈ پر آگئے۔ یہیں ہمارا ہوٹل تھا۔ مجھے شبہ ہوا تھا کہ ڈرائیور سے کوئی بہانہ کرکے شاید بٹھل یہیں اتر جائے لیکن وہ خاموش بیٹھا رہا۔ ڈرائیور کی موجودگی میں ہمیں ایک دوسرے سے بات کرنے میں احتیاط ہی برتنی چاہیے تھی۔ عابد شاپ سے پتھرگٹی کا پل عبور کرتے ہوئے ہم جلد ہی چار کمان پہنچ گئے۔ بٹھل نے عثمانیہ بازار کے سامنے سڑک کے بیچوں بیچ والی مسجد کے قریب موٹر رکوادی "ابھی آپ کو گھر تک چھوڑتا ہوں صاحب!" ڈرائیور مستعدی سے بولا۔

"نہیں رے، ادھری کدھر جائے گا" بٹھل نے منہ بنا کے کہا "اب زیادہ دور نہیں ہے۔"

بٹھل نے جیب میں ہاتھ ڈال کے دس روپے کا نوٹ اس کے حوالے کرنا چاہا اور کہا "تھوڑا پیدل چل کے ہی نیند آئے گی۔"

نوٹ دیکھ کے ڈرائیور زیر و زبر ہوا۔ اس کا جسم لہرا گیا۔ کتراتے ہوئے انداز میں اس نے انکار کیا۔ بٹھل نے نوٹ اس کی جیب میں اڑس دیا۔ ڈرائیور نے بے قراری سے جھک کر سلام کیا اور کہنے لگا "آپ دکن میں پہلی بار کو آئے سرکار؟"

"نہیں" بٹھل کے اختصار سے ڈرائیور کا حوصلہ پست ہوا۔ وہ بھنچی ہوئی آواز میں بولا "خادم صبح کس وقت لینے کو آئے؟"

"جس ٹائم کو نواب صاحب نے بولا ہے۔"

ڈرائیور نے پہلے سر جھکایا پھر ہچکچاتے ہوئے جگہ کے بارے میں پوچھا۔

"ادھری، اسی جگہ پر۔"

"سرکار، پتا بتائیں تو خادم گھر تک آجائے گا۔ اپن حیدر آباد کا کوچہ کوچہ دیکھا ہے۔"

"ادھری مل جائیں گے رے" بٹھل نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

ڈرائیور نے کہا کہ وہ صبح ساڑھے آٹھ بجے سے پانچ دس منٹ پہلے پہنچ جائے گا تاکہ ہمیں اس کے انتظار کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ اس نے کسی اور خدمت کے بارے میں پوچھا۔ بٹھل نے اس کے شانے پر تھپکی دی تو وہ سلام کرکے اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ ہم چار مینار کی سمت چل پڑے۔ دیر تک موٹر چلنے کی آہٹ نہیں ہوئی۔ میں نے گھوم کے دیکھا تو موٹر سے باہر کھڑے ہوئے ڈرائیور سے نظریں چار ہوئیں۔ میں نے بٹھل کو ٹوکا دیا کہ موٹر میں شاید کوئی خرابی ہوگئی ہے۔ ہمیں جاکے دیکھنا چاہیے۔ بٹھل نے مڑکے دیکھے بغیر مجھے آگے چلتے رہنے کا اشارہ کیا۔ سامنے کچھ فاصلے پر پان کی

دکان تھی۔ ہم محراب دار بازار کے کنارے کنارے چلتے ہوئے دکان پر آگئے۔ یہاں سے موٹر صاف نظر آرہی تھی۔ ڈرائیور کے ہاتھ میں ٹارچ تھی اور وہ بونٹ کھولے کل پرزوں سے الجھا ہوا تھا۔ بار بار بے بسی' بے زاری سے وہ ادھر ادھر دیکھتا تھا۔ میرا ہاتھ غیر ارادی طور پر اس کی طرف اٹھ گیا۔ میرا مقصد تھا کہ اسے کسی مدد کی ضرورت ہو تو ہم اس کے پاس آئیں؟ اس نے بھی دیکھ لیا اور ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ فکر و تشویش کی کوئی بات نہیں' وہ خود ہی نمٹ لے گا۔

پان کی دکان پر ہمیں کئی منٹ لگ گئے۔ کچھ تو پان والے کی وجہ سے کہ وہ حرفوں کا بنا ہوا تھا۔ کچھ بٹھل نے غیر ضروری طور پر اس کی لاف و گزاف میں دلچسپی کا اظہار کیا۔ بٹھل نے اس سے ملیٹھی کے پان کی فرمائش کی۔ بٹھل پان والے کے پاس نہیں تھی حالانکہ اس کی سجی ہوئی دکان میں آویزاں مختلف تختیوں پر بڑے بڑے دعوے کیے گئے تھے اور پان کی شان میں شعر تک لکھے ہوئے تھے۔ وہ حیدر آباد میں ہماری نو واردی پہچان گیا اور اس نے بٹھل سے کہا کہ اسے ایک موقع دیا جائے۔ وہ اپنی پسند کی گلوری بنا کے بٹھل کی خدمت میں پیش کرے۔ بٹھل کی آمادگی پر اس نے نہایت اہتمام سے طرح طرح کے مسالوں سے پان کو مزین و مرصع کرنا شروع کیا۔ بٹھل کو کوئی جلدی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ نہ زورا اور جمرو کا کوئی احساس' نہ یہ خیال کہ ایسی دکانوں کے آس پاس اڈے کے آدمیوں کا جماؤ رہتا ہے۔ کوئی بھی کسی طرف سے نکل کے سامنے آکھڑا ہو سکتا ہے۔ اسی اثنا میں میری نظریں تو بیش تر نواب ثروت یار کی موٹر میں اٹکی رہیں۔ ڈرائیور اپنی سی تگ و دو کر رہا تھا۔ اس وقت تو موٹر کو دھکا دینے والے بھی اسے نہیں ملیں گے۔ میں منتظر تھا کہ وہ کسی لمحے مدد کا اشارہ کر سکتا ہے۔ پان والے نے بٹھل کے بعد چاندی کے ورق میں لپٹی ہوئی ایک گلوری میری طرف بھی بڑھادی۔ میرا جی بہت گھبرا رہا تھا لیکن پان والا حجت کرنے لگتا' میں نے جلدی سے گلوری منہ میں رکھ لی۔ پان یقیناً بہت خوش ذائقہ تھا۔ منہ میں رکھتے ہی خوشبو سی گھل گئی۔ بٹھل کی تعریف پر پان والے نے چنبیلی کا ایک بار بھی ہمیں پیش کیا اور ہاتھ جوڑ کے درخواست کی کہ جب تک حیدر آباد میں ہمارا قیام ہے' ہم اس کی دکان پر آنے کی تکلیف کرتے رہیں۔ وہ ہمیں ہر بار ہندوستان کے ایک نئے علاقے کا پان کھلائے گا۔

بٹھل کی نظر بھی کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی نواب ثروت یار کی موٹر اور ڈرائیور پر لگی ہوگی۔ پان کی دکان سے ہٹ وہ چار کمان بازار کی محرابوں والی راہ داری میں بڑھ گیا۔ ہم سے او جھل ہو چکی تھی۔ راہداری سے ایک تنگ را عثمانیہ بازار کے احاطے میں نکلتا تھا۔ ہم وہاں سے احا میں داخل ہوئے اور سامنے کے ایک راستے سے کسی گلی آگئے۔ یہ چار کمان اور عثمانیہ بازار کا پچھواڑا تھا۔ ہ زیادہ اندر گلیوں میں نہیں جانا چاہیے تھا تاکہ ہم خا سڑک سے بہت دور نہ ہو جائیں۔ یہی ہوا' بٹھل سڑک قریب قریب رہنے کے بجائے آگے چلتا رہا۔ نیم تا گلیوں میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہم جانے کہاں سے کہاں گئے۔ آخر ایک سن رسیدہ چوکی دار کو روک کر ہمیں چار کا راستہ پوچھنا پڑا۔ پہلے تو اسے ہم پر شک ہوا' وہ بڑبڑا لگا لیکن اس نے وقت گنوایا نہیں تھا۔ کچھ آدمی کی ہوگئی تھی۔ بٹھل کو کسی تندی و ترشی کی ضرورت پیش آئی۔ چوکیدار خود ہی ہموار ہو گیا۔ وہ کچھ دور ہمارے چلا اور چار مینار تک جانے والی سیدھی گلی کے سرے پر چھوڑ کے واپس ہو گیا۔

چار مینار چوک پر رات پوری طرح مسلط ہو چکی چاروں مینار ہلکی ہلکی دھند میں لپٹے ہوئے تھے۔ نہ کوئی کھلی ہوئی تھی نہ آس پاس کوئی سواری نظر آرہی تھی۔ دیر سواری کا انتظار کر کے ہم اپنے راستے پر پیدل ہی پڑے۔ نام پلی وہاں سے بہت دور تھا۔ سواری نہ ملے صورت میں پیدل چلتے رہنے کے سوا چارہ ہی نہ تھا۔ طرح فاصلہ تو ہر قدم پر بہرحال کم ہو رہا تھا۔ ایک فرلانگ بعد پھر چار کمان کا بازار پڑتا تھا۔ موٹر اب وہاں تھی۔ ہم مدینہ ہوٹل تک آگئے۔ مدینہ ہوٹل بھی بند تھا۔ لیکن بائیں ہاتھ کی سڑک کے کنارے ذرا اندر کی نسبتاً سنسان جگہ ایک گھوڑا گاڑی دکھائی دی۔ کوچوان کی نشست پر سویا ہوا تھا۔ اور اس کا کہیں جانے کا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ بٹھل نے اسے جگایا تو وہ بوکھلا گیا ناراض ہونے لگا اور اس نے کہیں جانے سے صاف کر دیا۔ اسے قائل کرنے کے لیے بٹھل کے پاس پہلی سکوں کی دوسری چاقو کی تھی۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے۔ آد دو بڑی مجبوریاں ہیں۔ حرص اور خوف۔ بٹھل کی جیب دونوں چیزیں تھیں۔ دوسری چیز کی ضرورت پیش نہیں روپیہ شاید چاقو سے زیاد کاٹ رکھتا ہے یا یہ وقت کی تھی۔ بٹھل کے ہاتھ میں دبے ہوئے نوٹ دیکھ کے کوچوا یقین نہیں آیا۔ قریب ہی کھونٹے سے بندھے ہوئے گھو

نے بھی جیسے نوٹوں کی بو سونگھ لی۔ کہتے ہیں جانوروں کے ساتھ رہتے رہتے آدمی پر کچھ نہ کچھ اثر پڑتا ہے۔ جانور بھی تو انسان کے ساتھ رہ کے کچھ متاثر ہوتا ہوگا۔ دونوں لمحوں میں ہشاش بشاش ہوگئے۔ بٹھل نے کوچوان سے معظم جاہی مارکیٹ چلنے کے لیے کہا تھا۔ وہاں سے نام پلی کا فاصلہ کم نہیں تھا۔ گویا اس نے جمرو اور زورا کی تلاش میں' نواب ثروت یار کے علاقے میں جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا یا پھر اس کے ذہن میں کوئی اور بات تھی۔ میں نے چاہا' اس سے پوچھوں مگر میں کیا کیا پوچھتا' اس امید میں بھی میں چپ رہا کہ آئندہ کسی لمحے وہ خود مجھ سے کچھ کہے گا۔ بٹھل خود بھی بہت منتشر معلوم ہوتا تھا اس کی خاموشی مجھے اور ہلکان کر رہی تھی ورنہ میری تسلی کے لیے سہی' دو چار لفظ اس کی زبان سے ضرور پھوٹتے۔

گھوڑے کی ٹاپیں خالی سڑک پر دور دور تک گونج رہی تھیں۔ کبھی کوئی موٹر' گھوڑا گاڑی یا گھنٹی بجاتا سائیکل سوار گزر جاتا تو آوازیں گڈمڈ ہو جاتیں۔ معظم جاہی مارکیٹ سے کچھ آگے بٹھل نے گاڑی رکوادی اور جانے کتنے روپے کوچوان کے ہاتھ میں تھمادیے۔ کوچوان نے ایک ہی سانس میں اسے بہت سی دعائیں دیں اور اپنے رویے کی معذرت چاہی۔ ریاستوں میں خطابات کی بڑی ارزانی ہوتی ہے۔ اس نے بٹھل کو سخی' حاتم' بندہ پرور' سرکار جیسے بے شمار خطابات سے نواز دیا۔ وہ گھوڑے سے مخاطب ہو کے کہنے لگا "لے بھئی سالار! آج تو تیرے بھاگ بھی جاگ گیاں' حضور کو سلاماں پیش کر" اس نے چابک کی لکڑی سے گھوڑے کے کولھے پر ٹھوکا دیا۔ گھوڑے نے کئی مرتبہ سر جھکایا اور فرش پر ٹاپیں مار کے بٹھل کو تعظیم پیش کی۔ بٹھل نے گھوڑے کی پیٹھ تھپکی اور جیب سے ایک اور نوٹ نکال کے کوچوان کی نذر کیا۔ ہم آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے ویکاجی ہوٹل میں داخل ہوگئے۔ ہوٹل پوری طرح روشن تھا۔ دن جیسی گہما گہمی نہیں تو رات کی بیابانی بھی نہیں تھی۔ ہوٹل کے کاؤنٹر سے ہمیں اپنے کمرے کی چابی حاصل کرنی تھی۔ مگر بٹھل کاؤنٹر سے گزرتا ہوا آگے چلا گیا۔ میں نے یہ سمجھ کے کہ شاید وہ چابی کی طرف توجہ دینا بھول گیا ہے' اسے ٹوکا مگر وہ چلتا رہا تا آں کہ ہم کمرے کے سامنے پہنچ گئے۔ بٹھل کی پہلی دستک پر دروازہ کھل گیا۔ میری آنکھیں پھیل گئیں۔ جمرو اور زورا اندر موجود تھے۔ ہمیں دیکھ کے دونوں کے چہرے کھل اٹھے "دیر لگادی استاد!" جمرو نے بے چینی سے پوچھا۔

"ہاں رے! کچھ چائے پانی کا بول پہلے۔"

زورا نے پلٹ کے مسہری کے سرہانے نصب گھنٹی کا بٹن دبادیا۔

"سالی خیر تو ہے استاد!" جمرو نے بٹھل کو واسکٹ اتارنے اور صوفے پر بیٹھنے کی فرصت بھی نہیں دی۔

جواب تو بٹھل کی مرضی پر منحصر تھا۔ وہ سامنے رکھی ہوئی کرسی پر ڈھیر ہو گیا اور اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اسی لمحے گھنٹی بجی۔ زورا کے دروازہ کھولنے پر بیرا باہر کھڑا دکھائی دیا۔ زورا نے دبی ہوئی آواز میں بٹھل سے پوچھا کہ چائے کے ساتھ کچھ اور تو نہیں چاہیے؟ بٹھل نے ہاتھ اٹھا کے منع کر دیا۔ بیرے کے چلے جانے پر زورا اور جمرو نے مجھے اشارہ کرتے ہوئے ملحقہ کمرے میں چلے گئے۔ میں بھی یہی چاہتا تھا۔ کمرے میں میرے داخل ہوتے ہی دونوں مجھ سے لپٹ گئے۔ "کیا بات ہے لاڈلے! استاد تو بہت بھاری لگتا ہے۔"

"ہاں!" میں نے بکھری ہوئی آواز میں کہا "کچھ ایسا ہی ہے۔"

وہ بے تابانہ وجہ پوچھنے لگے۔ میں انہیں کیا بتاتا۔

"پہلے یہ بول' کام نکلا کہ نہیں؟"

"کیا بتاؤں" میں نے گہری سانس بھر کے کہا۔

"بتانے کو کچھ نہیں ہے کیا؟"

"سمجھو کہ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

"کیا مطلب!"

"یہی مطلب ہے' اس سے زیادہ کچھ نہیں۔"

"یہ کیا ہوا لاڈلے!" جمرو ناراضی سے بولا۔

میں نے اسے بتایا کہ نواب نے کل صبح نو بجے پھر بلایا ہے۔

"پھر بلایا ہے' مطلب ہے' کچھ بات تو۔۔۔"

میں نے مختصراً اسے نواب کے ہاں ہونے والی گفتگو بتادی۔ وہ بھی سوچ میں پڑ گیا' پھر کہنے لگا "نواب نے ہامی تو بھرلی ہے نا؟"

"ہاں۔" میں نے شکستہ آواز میں کہا۔

"پھر کیا ہے" وہ مجھے حوصلے اور عزم کا درس دینے لگا اور کہنے لگا کہ اوپر والے پر بھروسا کرنا چاہیے۔ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب کچھ میری منشا کے مطابق ہوگا۔ ایک نہ ایک دن خدا ضرور سن لیتا ہے۔ وہ مجھے سمجھا رہا تھا اور خود اس کی تلقین و تاکید اعتماد سے عاری تھی۔

گھنٹی کی آواز پر ہم تینوں پہلے والے کمرے میں آگئے۔ بیرا چائے پیسٹری وغیرہ لے کے آگیا تھا۔ زورا نے سب کے لیے چائے بنائی۔ بٹھل کے استفسار پر کہ وہ دونوں کب ہوٹل آئے' جمرو نے بتایا کہ انہیں گھنٹے بھر سے زیادہ ہو رہا ہے۔ نواب ثروت یار کے گھر ہمارے داخل ہونے کے کوئی آدھ پون گھنٹے تک تو انہیں ہماری ایسی فکر نہ تھی۔ کچھ دیر بعد انہوں نے ایک موٹر نواب کے گھر میں جاتی دیکھی۔ موٹر گئے وقت گزر گیا تو انہوں نے قیاس کیا کہ موٹر میں آنے والا شخص نواب ہی ہوگا۔ اسی لیے ہمیں دیر ہو گئی اور کچھ اور بھی دیر لگ سکتی ہے۔ انہیں اطمینان تھا کہ نواب کے گھر سے جلد فارغ ہونے پر ہمارے لیے انہیں ڈھونڈ لینا کچھ مشکل نہ ہوگا۔ وہ پوری احتیاط سے قریب قریب ہی رہے۔ جیسا کہ میرا خیال تھا' وہ ہر وقت نواب کی حویلی نظر میں نہیں رکھ سکتے تھے۔ پھر انہوں نے طے کیا کہ ساتھ ساتھ گلیوں میں گھومتے رہنے کے بجائے الگ الگ ہو جائیں۔ اس طرح ایک نواب کے مکان سے دور ہو گیا تو دوسرا قریب آجائے گا۔ مزید وقت گزرنے پر انہیں تشویش ہونے لگی۔ بٹھل نے کسی ممکنہ اندیشے کے سبب انہیں نواب کے مکان کے ارگرد منڈلاتے رہنے کی ہدایت کی تھی اور بٹھل نے جو آخری وقت انہیں دیا تھا' وہ ابھی نہیں بیتا تھا پھر انہیں اس گمان نے آگھیرا کہ کہیں کسی وقت نواب کے مکان سے نکلتے ہوئے ہم ان سے اوجھل نہ ہو گئے ہوں لیکن اگر ایسا ہی ہوا ہے تو ہمیں ان دونوں کی جستجو میں گلیوں کا چکر لگانا چاہیے۔ پھر ان میں سے ایک گلی کے نکڑ پر کھڑا ہو گیا' دوسرا نواب کے مکان کے آس پاس گشت کرتا رہا۔

رات اور سیاہ ہو رہی تھی۔ ان کی سمجھ میں ایک تدبیر آئی کہ کیوں نہ ادھر ادھر بھٹکنے کے بجائے وہ بہ راہ راست نواب ثروت یار کے دربان سے رابطہ قائم کریں۔ قریب جا کے انہیں محل وقوع کا بھی کچھ اندازہ ہو جائے گا۔ بٹھل کی ہدایت کے مطابق درمیانی رات' کوئی دو بجے تک نواب کے گھر سے ہمارے برآمد نہ ہونے کی شکل میں انہیں نواب کے مکان کی چار دیواری پھلانگنی ہی تھی۔ ریوالور ان کی بغل سے بندھے ہوئے تھے' چاقو بھی ساتھ تھے۔ جمرو نے دربان کے پاس جانے کا ارادہ کیا۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ دربان ہر کچھ دیر بعد دروازے سے باہر آتا ہے۔ دوسرے ملازمین بھی گاہے گاہے صدر دروازے سے کچھ فاصلے پر چھوٹے بغلی دروازے سے آتے جاتے ہیں۔ اس وقت دربان اندر ہی تھا کہ جمرو نے صدر دروازے پر پہنچ کے ہلکی سی دستک دی۔

اسے دوبارہ دستک کی زحمت نہیں کرنا پڑی۔ دربان فوراً باہر آگیا اور جمرو کو دیکھ کے حیران ہوا۔ جمرو نے کسی تامل کے بغیر عاجزانہ لہجے میں اس سے کہا کہ وہ دلی سے آیا ہے' نواب کے پاس ایک فریاد لے کے۔ وہ سخت مشکل میں ہے۔ دادرسی کی امید میں اس نے دلی سے یہاں تک کا طویل سفر کیا ہے۔ بڑے نواب صاحب' نواب ثروت کے والد کے پاس اس کا باپ آیا کرتا تھا اور ہمیشہ بڑے نواب صاحب اس کی مدد کرتے تھے۔ ظاہر ہے' دربان محض دربان تھا۔ یہ سن کے کہ جمرو کی حیثیت ایک سائل کی ہے' اس نے اس سے سیدھے منہ بات نہیں کی اور کہا' نواب صاحب سے اس وقت ملنا ممکن نہیں' کسی اور وقت آنا۔ جمرو کی مسلسل آہ و بکا سے وہ کسی قدر پسیج گیا اور اس کے اطوار میں نرمی آگئی۔ اس نے جمرو کو سمجھایا کہ نواب کے پاس باہر سے کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں۔ وہ لوگ کھانے سے ابھی فارغ ہوئے ہیں۔ اس وقت تو ویسے بھی نواب سے ملنا محال ہے۔ بہتر ہے کہ جمرو کل صبح آئے۔ وہ اسے نواب سے ملوانے کی کوشش کرے گا۔ بشرطیکہ نواب کا مزاج بہ خیر ہوا۔ جمرو نے اپنی تسلی کے لیے بظاہر معصومیت سے پوچھا کہ اندر بیٹھے ہوئے مہمان نواب صاحب کے رشتے دار ہیں کیا؟ دربان نے رکھائی سے کہا کہ نہیں' بمبئی سے آئے ہوئے دو مہمان ہیں۔ اس سے زیادہ اسے کچھ نہیں معلوم۔ جمرو نے کہا کہ وہ نواب کے انتظار میں دروازے کے پاس بیٹھ جاتا ہے' مہمانوں کے چلے جانے کے بعد دربان نواب سے اس کی ملاقات کی سبیل نکالے۔ دربان نے اسے جھڑک دیا۔

جمرو کو اب وہاں رکنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ گلی کے نکڑ پر آگیا۔ اتنی دیر میں زورا بھی کوچہ گردی کرتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا۔ دونوں وہیں کھڑے انتظار کرتے رہے۔ کچھ اور وقت بیت جانے پر جمرو کو پھر بے چینی ہونے لگی۔ اس نے دوبارہ نواب صاحب کے دروازے پر جا کے دستک دی۔ اس مرتبہ دربان کو باہر آنے میں وقت لگ گیا۔ اندر عمارت کی روشنیاں بھی کم ہو گئی تھیں۔ دربان نے جمرو کو دوبارہ سامنے دیکھ کے کبیدگی کا اظہار کیا۔ جمرو نے اس سے التجا کی' اگر مہمان چلے گئے ہوں تو دربان اس کے حال پر رحم کرے۔ اندر جا کے نواب کو اس کے بارے میں کچھ بتائے۔ جمرو کی اس حجت پر دربان چراغ پا ہو گیا۔ کہنے لگا "یہ کوئی وقت ہے داد فریاد کا۔ کیا جمرو کا دماغ ٹھکانے نہیں ہے۔ پھر اس نے بتایا کہ دونوں مہمانوں کو ان کی قیام گاہ پہنچانے کے لیے نواب گھر سے نکل چکا ہے۔ جمرو سے نجات حاصل کرنے کے لیے دربان کو یہی عذر کرنا چاہیے تھا۔ ادھ کھلے دروازے کی آڑ سے جمرو نے خود تصدیق کر لی تھی کہ موٹر اب وہاں نہیں ہے جہاں پہلے کھڑی تھی۔ گلی کے نکڑ پر کھڑے ہوئے زورا اور جمرو نے کچھ دیر پہلے ایک موٹر نواب کی گلی کی طرف سے آتی دیکھی تھی۔ موٹر ادھر آئی' ادھر زن سے گزر گئی اور اندر بیٹھے ہوئے لوگ انہیں نظر نہ آسکے۔ اندھیرے میں یہ ممکن بھی نہیں تھا۔ وہ نواب کی موٹر پہچانتے بھی نہیں تھے اور نکڑ سے نواب کی حویلی کا صدر دروازہ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔

جمرو اور زورا نے فیصلہ کیا کہ وہ ہوٹل چلے جائیں۔ میرا اور بٹھل کا دوبارہ اس علاقے میں آنا مشکل ہوگا۔ اگر ہم ڈیڑھ بجے تک ہوٹل نہ پہنچے تو جمرو اور زورا ہوٹل سے نکل کھڑے ہوں گے۔ انہیں وہاں سے نواب کے گھر پہنچنے میں زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹا لگے گا اور وہ کسی لیت و لعل کے بغیر حویلی کی چار دیواری پھاند جائیں گے۔

بٹھل نے انہیں بتایا کہ اس نے گلی کے نکڑ پر ان دونوں کو کھڑے ہوئے دیکھ لیا تھا اور اشارہ بھی کیا تھا تاہم اسے شبہ تھا کہ یہ اشارہ ان تک منتقل ہوا یا نہیں۔ گویا وہ ہمیں ہوٹل میں نہ ملتے تو نواب ثروت کے مکان تک ہمارا جانا لازم تھا۔ دو بجنے میں ابھی آدھ گھنٹے سے کم وقت رہ گیا تھا۔ چار کمان کے پاس گھوڑا گاڑی دستیاب نہ ہوتی اور ہم دیر سے ہوٹل پہنچتے تو جمرو اور زورا گھڑی دیکھ کے ہوٹل سے نکل جاتے اور ہم اگر دو بجے سے پہلے نواب کے علاقے میں ان تک نہ پہنچ پاتے تو وہ حویلی کی فصیل پھلانگ چکے ہوتے۔ پھر جانے کیا ہوتا! وقت کی کچھ گنجائش تھی ورنہ بٹھل چار کمان سے سیدھا نواب کی حویلی ہی کا رخ کرتا۔

اتنی رات کو چائے کا کوئی موقع نہیں تھا۔ کسی کو بھی خواہش نہ ہوگی' بٹھل کو بھی نہیں مگر کبھی کبھی یہ غیر اختیاری شغل بھی' کچھ دیر کے لیے سہی' آدمی کا دھیان بٹا دیتے ہیں۔ جمرو' بٹھل کے پاس رہ گیا۔ میں اور زورا برابر کے کمرے میں چلے آئے۔ زورا مسہری کے سرہانے بیٹھ کے میرے سر میں انگلیاں پھیرنے لگا' مجھے بڑی وحشت ہوئی لیکن میں اسے روک بھی نہیں سکتا تھا۔ میرا سارا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ نواب ثروت یار کے ہاں بیٹھے ہوئے سینے میں ایسی گھٹن نہیں تھی۔ اب جیسے بہت کچھ آنکھوں کے آئینے میں عیاں ہو رہا تھا اور کچھ بھی نمایاں نہیں تھا۔ ایک گمان کے بعد دوسرا گمان۔ جی میں آتا تھا' جا کے بٹھل سے پوچھوں' اب یہ خاموشی اور گراں باری کیوں ہے؟ کچھ توقع سے سوا ہے کیا! وہی بات ہوئی نا۔ بمبئی میں کچھ اتنی دور دراز

اندیشوں کی وجہ سے میں اسے روک رہا تھا۔ وہ تو اسی وقت میرا ماتھا ٹھنکا تھا جب شام کو کمرا بند کرکے جمرو نے اٹیچی سے تمنچے نکالے تھے۔ مجھ اکیلے کا اتنا کچھ نہیں تھا۔ جو کچھ ہوتا' ایک میں ہی ہدف بنتا اور میں کسی نہ کسی طرح بھگت لیتا۔ وہ مجھ اکیلے کا کتنا کچھ بگاڑ سکتے ہیں۔ میرے لیے اب اس کے چھن جانے سے بڑی اور کون سی ضرب ہوگی۔ اور میں نواب کو اس قدر قیل و قال کا موقع ہی کب دیتا۔ میں بھی تمنچے اور چاقو کے بغیر اس کے پاس نہ جاتا۔ کوئی کتنا ہی نواب ہو' ہوتا تو آدمی ہی کا تخم ہے۔ کھلے چاقو اور تمنچے کی ایک جھلک سارا پتھر چشم زدن میں پگھلا دیتی ہے۔ مقابل کو چاقو کی دھار اور خالی یا بھرے تمنچے کی تمیز کا بھی ہوش نہیں رہتا۔ نواب کی زبان کی لکنت ایک ہی ہتھیار سے ختم ہوجاتی۔

زورا اونگھنے لگا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ سر سے ہٹا کے اسے آرام کا مشورہ دیا۔ بستر پر جاتے ہی زورا کے ہلکے ہلکے خراٹے کمرے میں بھن بھنانے لگے۔ میں نے بھی آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی لیکن کبھی کبھی بند آنکھوں سے زیادہ نظر آنے لگتا ہے' آڑی ترچھی شکلیں۔ اپنے آپ پر آدمی کا اختیار سب سے کم ہوتا ہے۔ آدمی کے دروازے' دریچے اپنے آپ کھلتے بند ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں' آدمی کا تہ خانہ سات تہ خانوں سے زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ آدمی کا تہ خانہ تو ہر وقت باہر کی گرد و غبار' بجلیوں کی زد پر رہتا ہے۔ اس کے لیے روشنی' اندھیرے کا کوئی وقت نہیں۔ کوئی نہ کوئی جھری کھلی رہتی ہے۔ میرا سر دھمک رہا تھا۔ بستر سے اٹھ کے میں نے ایک نظر برابر کے کمرے میں جھانک کے دیکھا' وہاں خاموشی تھی۔ نیلا قمقما ٹمٹما رہا تھا۔ بظاہر تو بٹھل سویا ہوا ہی معلوم ہوتا تھا۔ میں کمرے کی کھڑکی پر چلا آیا اور ذرا سا پردہ کھسکایا۔ باہر ہر جانب سکوت طاری تھا۔ شہر کی روشنیوں پر دھند چھائی ہوئی تھی۔ روشنیاں بھی جیسے سو چکی ہوں۔ معًا ایک خیال میرے دل میں آیا۔ کیوں نہ میں آہستہ سے باہر نکل جاؤں اور سیدھے نواب کے گھر کا رخ کروں۔ جس طرح جمرو اور زورا کو دیوار پھلانگنے کے لیے کہا گیا تھا' اس طرح میں بھی یہ کام کرسکتا ہوں۔ ایک بار کسی طور اندر داخل ہوکے نواب کی خلوت گاہ تک پہنچنا مشکل نہ ہوگا۔ میں اس کے سر پر اچانک جا دھمکوں گا تو اسے ادھر ادھر کی باتوں کا موقع نہیں مل سکے گا۔ پھر نواب کو سچ اگلنا ہوگا۔ ممکن ہے' ہم سے ملنے کے بعد اس نے ارادہ بدلا ہو کہ کیوں نہ ایک مرتبہ پھر وہ میرے بارے میں مولوی صاحب کا عندیہ جان لے۔

حویلی سے ہمارے رخصت ہوجانے کے بعد ہی وہ مولوی صاحب سے رابطہ کرسکتا تھا۔ صبح تک مہلت لینے کی وجہ بھی یہی ہوسکتی ہے۔ رات کو بہت دیر ہوگئی تھی۔ رات ممکن نہ ہوا تو علی الصباح وہ مولوی صاحب کے سامنے میرا ذکر چھیڑ کے دیکھے گا۔ وہ انہیں آمادہ کرسکتا ہے کہ ایک بار آمنا سامنا ہوجانے میں کوئی حرج نہیں۔ میری صورت مولوی صاحب کو گوارا نہیں ہے تو روبہ رو اس بے زاری کا برملا اظہار کیوں نہ کردیا جائے۔ یہ باب ہی تمام ہو۔ درمیان میں تو نواب موجود ہے۔ مولوی صاحب کو اطمینان رکھنا چاہیے کہ وہ ایک صاحب حیثیت شخص کی پناہ میں ہیں۔ اس کی موجودگی میں وہ کسی تردد کے بغیر حوصلے اور بے باکی سے میرا سامنا کریں اور اپنی عزیز از جان کورا کے لیے جو بہتر سمجھتے ہیں اس پر قائم رہیں۔ کچھ ایسی بات بھی ہوسکتی ہے۔ پھر تو میرے لیے نواب کے گھر جلد از جلد پہنچنا لازم ہے۔ ہوسکتا ہے' وہی بات ہو' نواب ہم سے چھپا رہا ہو' مولوی صاحب وہیں موجود ہوں۔ اتنے بڑے مکان کے کسی بھی گوشے میں انہیں ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ اس طرح تو ان کا قیام حویلی کے ملازمین کے علم میں بھی ہوگا۔ میں براہ راست مولوی صاحب تک بھی پہنچ سکتا ہوں۔ چاقو کی ایک لکیر سے کسی بھی ملازم کا سارا نمک باہر آجاتا ہے۔ میرا دماغ گھوم رہا تھا۔ سارا وجود جیسے دھڑک رہا ہو۔ کوئی بعید نہیں کہ صبح مولوی صاحب سے گفتگو کے بعد نواب اپنے رویے اور فیصلے پر نظر ثانی کرے۔ صبح وہ یک سر ایک مختلف شخص بھی ہوسکتا ہے۔ سب کچھ اس کے اختیار میں ہے۔ وہ ہم سے کوئی عذر' کوئی بھی بہانہ کرسکتا ہے۔ صبح ابھی دور ہے۔ صبح تک جانے کیا ہوجائے۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ تین بج رہے تھے۔ ایسے وقت میں سواری مل جانا آسان نہیں لیکن کوشش تو ضرور کرنی چاہیے۔ مجھے معلوم تھا' ہوٹل میں کاؤنٹر والے بھی اپنے ہاں مقیم لوگوں کے لیے سواری کا بندوبست کردیتے ہیں۔ باہر جاکے بہرحال کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔ میں نے جیب ٹٹولی۔ جولین نے بمبئی سے روانگی کے وقت میری جیب میں کچھ روپے ڈالے تھے' وہ میں نے نکال کے دیکھے۔ گننے کا وقت نہیں تھا۔ خاصی بڑی رقم معلوم ہوتی تھی۔ جوتے پہن کے پنجوں کے بل میں نے دروازہ عبور کیا مگر مجھے واپس ہونا پڑا۔ تمنچا تو تکیے کے نیچے رکھا تھا۔ اسے پہلے کی طرح بائیں جانب بغل کے نیچے پیٹیوں سے کس کے میں کمرے سے نکل آیا۔ چند لمحے دروازے پر ٹھہر کے میں نے بٹھل اور جمرو کی مسہری کا جائزہ لیا۔ جمرو کروٹ بدلے سو رہا تھا۔ بٹھل سیدھا لیٹا ہوا تھا لیکن

[کچ]ھ کہا نہیں جاسکتا تھا کہ وہ گہری نیند میں ہے یا غنودگی میں۔ [ا]س کی طرف سے اچھی طرح مطمئن ہونے کے بعد مجھے [ک]مرے میں چہل قدمی کرنی چاہیے تھی۔ میں نے دبے [قد]موں اس سرے سے اس سرے تک کا فاصلہ طے کیا۔ [ب]ٹھل کے جسم میں جنبش نہیں ہوئی۔ احتیاطاً ایک بار پھر [مج]ھے یہ عمل دہرانا تھا۔ اس کے بعد دروازے کی چٹخنی کھول [ک]ے اور ہینڈل گھما کے باہر نکل جانا تھا۔ دوسری مرتبہ بھی [ک]مرے کی ایک دیوار سے دوسری دیوار کا فاصلہ طے کرتے [ہ]وئے بٹھل کی آنکھ نہیں کھل پائی۔ دروازے کی طرف [بڑ]ھنے سے پہلے میں نے چند ثانیوں کا وقفہ کیا۔ پھر ابھی میں [ن]ے دروازے کی جانب ایک قدم بھی نہیں بڑھایا تھا کہ بٹھل [ک]ی آواز پر میرا دل جیسے بند ہوگیا "کیا ہوا رے؟"

میرے حواس منتشر ہوگئے تھے۔ میں نے اکھڑی ہوئی سانسوں سے کہا "کچھ نہیں' کچھ بھی نہیں۔"

وہ بستر سے نہیں اٹھا' جماہی لیتے ہوئے اس نے کہا "سوجا رے۔"

"تمہیں نیند کیوں نہیں آرہی؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"آجائے گی رے' بولتے ہیں' سولی پر بھی آجاتی ہے۔" وہ خوابیدہ لہجے میں بولا۔

"کسی دیوانے کو آئی ہوگی۔"

"دیوانوں ہی کو نہیں آتی بالم!"

سب کچھ الٹ پلٹ ہوگیا تھا۔ اس کا مزاج کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا تھا۔ میں نے سوچا' اسے کچھ بتاؤں۔ شاید اس نے توجہ نہیں کی کہ نواب کل صبح ہمیں ایک دوسرے آدمی کے طور پر بھی مل سکتا ہے۔ میں اس سے کہتے کہتے رہ گیا۔ آج رات نہیں تو کل کی رات بھی آئے گی۔ حویلی کی فصیل تو کسی رات بھی پار کی جاسکتی ہے اور کسی بھی وقت ہم نواب کا راستہ روک سکتے ہیں۔ بہتر ہے' نواب کی ہدایت کے مطابق کل صبح اسے دیکھ لیا جائے۔ کہیں ہم ہی نے زیادہ نہ [س]ن لیا اور سمجھ لیا ہو۔ جیسا کہ وہ کہہ رہا تھا' مولوی صاحب کو اس نے اپنی زمینوں والے مکان ہی میں ٹھہرایا ہو اور اس کی طرف سے اکراہ و تامل محض اس کشمکش کے سبب ہو کہ مولوی صاحب کو مطلع کیے بغیر وہ مجھے ان کے سامنے لے جارہا ہے۔ میری آنکھوں کی دھند کچھ کم ہوئی۔ میں نے بٹھل سے بحث نہیں کی۔ وہ تو بس خیر ہوگئی کہ میں دروازے کی جانب نہیں بڑھا تھا ورنہ پھر میں باہر جانے کا کوئی بھی عذر کرتا' سر کی گرانی اور سینے کے حبس کا عذر مگر بٹھل کو بالکل یقین نہ آتا۔ وہ تو بہت برگشتہ ہوجاتا' آزردہ خاطر بھی۔ یہ

تینوں میری وجہ سے اپنا سکھ چین برباد کیے ہوئے ہیں۔ انہیں بھی تو اسی قدر بے کلی ہے۔ میری طرح بٹھل کو بھی نیند نہیں آرہی ہے۔ میں اپنے کمرے میں چلا آیا اور جوتے اتار کے' تمنچا تکیے کے نیچے رکھ کے بستر پر پڑ رہا۔

وقت کچھ اور گزر گیا۔ ساڑھے تین بجے' پھر چار بج گئے۔ جانے یہ گھڑیاں کس نے وضع کی ہیں۔ ان کی یکساں رفتار ایک سراب ہے۔ یہ کبھی تو بہت تیز چلتی ہیں' کبھی ست۔ صبح و شام اور ہندسہ و عدد کی نسبت سے نہیں' وقت تو کیفیت سے عبارت ہونا چاہیے۔ کس پر کیسا گزرتا ہے۔ کچھ دیر میں اذانیں گونجنے لگیں۔ ذرا آنکھ بند کرتا تو جسم ٹوٹنے اور چٹخنے لگتا..... آدمی کے لیے یہ اور عذاب ہے کہ دوسرے بھی اس کے لیے جہنم سے دوچار ہوں۔ ادھر بٹھل کروٹیں بدل رہا تھا۔ میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ عام حالت میں وہ ایسا ڈھیر نہیں ہوتا۔ اس کی یہ شب بیداری اور بے سکونی کسی بڑی بدگمانی کے سبب ہی ہوسکتی تھی۔ مجھے تو شبہ ہو رہا تھا' اسے نواب کے مرسلہ خط کا یقین ہی نہیں ہے۔ وہ میرے ساتھ آنے کو تو آگیا ہے کہ نواب کے خط کے متن اور مندرجات کا وہی مفہوم تھا جو کوئی بھی اخذ کرتا لیکن کہیں اور سے نہیں' یہ خط حیدر آباد سے آیا تھا جہاں چند مہینے پہلے ہم نے بہت اندھے دن گزارے تھے۔ ابھی وہ تمام تاگفتنی آنکھوں میں کھبی ہوئی تھی۔ کوئی بھی اسے اتنی آسانی سے فراموش نہیں کرسکتا تھا۔ خاص کر وہ رات جب نوابوں کے پروردہ مسلح وحشیوں نے اباجان کی نو خرید حویلی میں نقب زنی کی تھی۔ انہوں نے کسی رشتے ناتے کا لحاظ نہیں کیا تھا۔ میرے سامنے' سب کے سامنے اباجان سے سنگدلی کی تھی۔ انہوں نے سبھی کو بے دست و پا کردیا تھا۔ وہ تو کانتے اپنی جان کی نذر نہ گزارتا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ اس رات کے بعد صبح کس کس کو نصیب ہوتی۔

حیدر آباد جانے کے ارادے سے میرے حواس بھی ایک بار متلاطم ہوئے تھے۔ میں نے بھی نواب ثروت کا خط گزشتہ سفر کی بازگشت میں پڑھا تھا مگر خط میں کوئی پہیلی اور کہہ مکرنی نہیں تھی۔ اور تمام احساس گراں اور امکان زیاں کے باوجود مجھے تو خط کے جواب میں نواب کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہی چاہیے تھا۔ اسی لیے میں نے چھپ چھپا کے بمبئی سے نکلنے کا ارادہ کیا تھا۔ جولین کے پرانے پتے پر نواب کا خط آیا تھا۔ سو اس سے تو کچھ چھپانا ممکن نہیں تھا اور اس کا کوئی قصور نہیں تھا کہ اس نے بٹھل پر سب کچھ کیوں افشا کردیا۔ اسے یہی کرنا چاہیے تھا۔ نوادر اور جواہر کے دیوانے نواب

حشمت اور اس کے ہم سر نوابوں سے نواب ثروت یار کی رسم وراہ کا ہمیں اس وقت تک کا کوئی علم نہیں تھا مگر حیدر آباد سے ہمارے جانے کے بعد دیر تک ہمارے چرچے رہے ہوں گے۔ نواب جہاں تاب کے محل میں میری اور پیرو کی اسیری اور رہائی۔ بٹھل کا بازار کے اڈے پر قبضہ اور اڈے کے شورہ پشت آکا دادا کی رسوائی۔ ابا جان کی طرف سے نواب حشمت جنگ کو ایک بے بہا پتھر کے تحفے کی داد و دہش اور چٹکی بجاتے ہوئے ایک عالی شان حویلی کا سودا۔ سنانے کے لیے بے شمار فسانے ہم اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ اڈے کے سارے آدمیوں نے نئے مسند نشین بٹھل کے تیور دیکھے تھے۔ ان کے لیے تو وہ سب کچھ افسانوی تھا۔ اڈے کے آدمی امرا روسا سے نمک کا کوئی سلسلہ رکھتے ہیں۔ دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ اڈے کے آدمیوں نے بیرون دکن سے آنے والے ہم اجنبیوں کے لیے کیا کیا سرگوشیاں اور حاشیہ آرائیاں نہ کی ہوں گی۔

وہاں نواب جہاں تاب کے ہاں بھی ملازموں کی ایک فوج تعینات تھی۔ وہ چھوٹے نواب عالم تاب کی جاں بہ لبی' خانم کی آمد اور ہماری مہمان داری کے اسرار رموز' سارے عبرت انگیز مناظر کے چشم دید شاہد تھے۔ نواب جہاں تاب کی درون خانہ واستانیں سینہ بہ سینہ کہاں سے کہاں تک منتقل ہوئی ہوں گی پھر وہ ہتھیار بند سرکش جو ابا جان کی حویلی میں ہیروں کے سراغ میں بھیجے گئے تھے اور وہ طالع آزما جنہوں نے بمبئی تک ہمارا تعاقب کرانا چاہا تھا۔ وہ ایک دو ہوتے تو جان کے ضرر میں سینوں پر بوجھ لیے پھرتے۔ ان کی تعداد تو انگلیوں سے تجاوز کر گئی تھی۔

عجب نہیں کہ اڑتے اڑتے نواب ثروت تک ہماری روداد پہنچ گئی ہو۔ انہی دنوں اس کے ہاں میں اور پیرو' بمبئی سے دو اجنبی آئے تھے۔ پہلی بار' دوسری بار۔ دونوں مرتبہ کم و بیش اتنا ہی وقفہ تھا' جتنا ہمارا احوال بیان کرنے والوں نے اسے بتایا ہوگا۔ آدمی کا ذہن بے حد و بے کنار ہے۔ نواب ثروت ویسے بھی نکتہ آفرینی کا حامل اور مہم جوئی کا شائق ہے۔ پس اسے تانا بانا ملانے میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ اپنی تشفی کے لئے اس نے داستان سراؤں سے ہماری شکل و شباہت اور وضع قطع کی بھی تصدیق کی ہوگی پھر ایک نسبتاً فروتر نواب کے لئے لازم تھا کہ ازروئے تعظیم ریاست کے مکرم و معظم نواب حشمت یا اس جیسے کسی دوسرے ذی حشمت نواب کی خدمت میں جا کے عرض کرے کہ وہ مطلوب لوگوں کے سلسلے میں کس قدر معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

صبح نمودار ہونے لگی تھی۔ برابر کے کمرے سے جمرو دروازے پر آ کے جھانک کے دیکھا۔ میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ شاید یہ سمجھ کے واپس چلا گیا کہ میں نیند میں ڈوبا ہوا ہوں۔ کچھ دیر بعد بٹھل کے اٹھ جانے کی آواز آئی۔ چھ بجے کے قریب خوب روشنی ہو چکی تھی۔ میں بستر ہی پر پڑا رہا۔ وقت تو جیسے کوئی بدلہ لے رہا تھا۔ وقت سب سے بڑا اذیت پسند ہے۔ خوشی کا موقع ہو تو آناً فاناً گزر جاتا ہے۔ آدمی کسی عذاب سے دوچار ہو تو چیونٹی کی طرح رینگنے لگتا ہے۔ ہمیں آٹھ بجے ہوٹل سے نکل جانا چاہیے تھا۔ پہلے ڈرائیور کو بتائی ہوئی جگہ پر پہنچنا تھا۔ پورے تین گھنٹے کی بات ہے پھر سب ہی کچھ آئینہ ہو جائے گا۔ اگر نواب ثروت کی نیت میں وہی آلائش ہے جو بٹھل کو بے خواب کیے دے رہی ہے تو ٹھیک ہے۔ ہمیں تو پھر اپنی خوش گمانی کی ایک رات اسے دینی چاہیے۔ ہمیں بہرحال وقت پر اس کے پاس پہنچ جانا چاہیے۔ وہاں کوئی مقتل ہی ہمارے لیے کیوں نہ سجا ہو۔

گزشتہ رات ہمیں اپنے گھر میں دیکھنے کے بعد نواب ثروت نے تحمل کیا ہوگا ورنہ کیا مشکل تھا کہ کسی بہانے اندر جا کے وہ اپنے ہم شعار مربیوں کو ہماری آمد کی نوید سنانے کے لیے ہرکارے دوڑا دیتا۔ بٹھل نے اس سے کہا بھی تھا کہ پہلے وہ اندر جا کے لباس تبدیل کر لے۔ وہ نہیں مانا۔ نواب کو عجلت کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کسی اور کی تحویل میں ہمیں دینے سے پہلے اسے خود بھی مطمئن ہونا چاہیے تھا۔ اسے گمان تھا کہ شاید ہم اس کی خواہش کی تکمیل میں اس کے گھر ٹھہر جائیں۔ ہمارے انکار سے وہ افسردہ ہوا تھا لیکن یہ امر بھی تقویت کا باعث تھا کہ صبح تو پھر ہمیں اس کے پاس آ جانا ہے۔ نو بجے کے بعد ہمیں اپنی موٹر میں بٹھا کے جانے کہاں لے جائے۔ کسی زنداں یا عقوبت خانے کی طرف! نواب نے ہر پہلو سے تسلی کر لی تھی کہ ہم دونوں کے سوا کوئی ہمارے ساتھ نہیں ہے۔ زورا اور جمرو کو بٹھل اب بھی شاید ساتھ نہ لے جائے پھر نواب کا گھر تو انہیں معلوم ہی ہے بشرطیکہ اس سے پہلے کسی کی نظر میں نہ آ جائیں۔

وہی ہوا۔ ٹھیک ساڑھے چھ بجے جمرو نے مجھے اور زورا کو اٹھا دیا۔ زورا نے جمرو کی ہدایت پر جلدی سے منہ ہاتھ دھویا اور کپڑے بدلے۔ ناشتا کیے بغیر وہ کمرے سے نکل گیا۔ تمنچے ساتھ رکھنا' وہ نہیں بھولے تھے۔ بٹھل کمرے میں اکیلا رہ گیا تو میں نے اس سے ان کے بارے میں پوچھا۔

"ان کو پہلے سے جانا تھا۔" وہ ترشی سے بولا۔

"مگر کہاں گئے وہ؟"

"پیچھے ہی رہیں گے رے' جانا کدھر ہے۔" وہ سرسری انداز میں بولا۔

اس کے جواب سے میری سیری نہیں ہوئی تھی لیکن میں چپ رہا۔ مجھے اپنے آپ پر یقین نہیں تھا کہ میں ٹھیک طرح دیکھ اور سن بھی رہا ہوں۔ میرے تو ہاتھ پیر ہی ٹوٹے جا رہے تھے۔

مجھے خاموش بیٹھا دیکھ کر بٹھل نے چائے کے لیے بٹن دبانے اور تیار ہو جانے کا حکم دیا۔ میں نے جسم تر کرنے کی حد تک غسل کیا۔ نئے کپڑے پہن کے میں غسل خانے سے باہر آیا تو بیرا چائے لے کر آ گیا تھا۔ چائے کے ساتھ آملیٹ' مکھن' توس' شہد اور پھل وغیرہ بھی تھے۔ بٹھل نے یقیناً میری وجہ سے باقاعدہ ناشتا کیا۔ مجھے بھی اس کا ساتھ دینے کے لیے کچھ نہ کچھ حلق سے اتارنا پڑا۔ بٹھل کے کہنے پر میں نے تمنچے کی پیٹی بغل کی طرف باندھ لی تھی۔ واسکٹ کے سارے بٹن بند کر کے ہم کمرے سے نکل گئے۔ حیدر آباد میں بٹن بند رکھنا شائستگی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ عموماً لوگ شیروانی اور ترکی ٹوپی پہنتے ہیں۔ میرے پاس ترکی ٹوپی تو نہیں تھی۔ جولین نے نئے گھر میں آ کے جو شیروانی سلوائی تھی' وہ سامان میں رکھی تھی۔ اسے پہنتے ہوئے مجھے عجیب سے لگا' حالانکہ شیروانی کے بغیر حیدر آباد میں آدمی ہی عجیب سا لگتا ہے ادھورا ادھورا سا۔ کمرے کی چابی کاؤنٹر پر چھوڑ کر ہم ہوٹل سے باہر آ گئے۔

ابھی آٹھ نہیں بجے تھے۔ سڑکیں سونی سونی اور تمام دکانیں بند تھیں۔ چند قدم بعد ہمیں گھوڑا گاڑی مل گئی اور بٹھل نے کوچوان کو چار کمان کے بجائے مدینہ ہوٹل چلنے کی تاکید کی۔ موسی ندی پار کرتے ہی ہم مدینہ ہوٹل آ گئے۔ بٹھل وہیں اتر گیا۔ اس نے پان کی دکان سے ماچس اور بیڑیاں خریدیں۔ کچھ دور تک ہم پیدل چلتے رہے پھر جیسے ہی چار کمان بازار شروع ہوا' ہم محرابوں والی راہ داری میں آ گئے۔ دھوپ تیزی سے زمین پر اتر رہی تھی۔ کہیں کہیں دکانیں بھی کھلنے لگی تھیں۔ چائے خانے تو پہلے سے کھلے ہوئے تھے اور ریڈیو پر گانے بج رہے تھے۔

مجھے حیرت ہوئی' ڈرائیور موٹر کے ساتھ اس جگہ مستعد کھڑا تھا جہاں گزشتہ رات ہم اس سے رخصت ہوئے تھے۔ ہمیں دیکھ کے اسے کچھ قرار آیا۔ اس نے جھک کے بٹھل کو سلام کیا اور بتایا کہ پندرہ منٹ سے وہ وہاں موجود ہے۔ اچھا ہوا کہ وہ وقت سے پہلے آ گیا ورنہ ہمیں اس کے انتظار میں ادھر ادھر گھوم کے یا مقررہ جگہ کھڑے رہ کے وقت کاٹنا پڑتا۔

اڈے کے آدمیوں کی نگاہوں سے بچنے کے لیے محفوظ طریقہ یہی تھا کہ ہم زیادہ سے زیادہ موٹر یا کسی دوسری سواری میں سفر کریں اور اندھیرا پھیلنے کے بعد۔ اڈے کے آدمیوں کا ویسے تو کوئی وقت نہیں لیکن دن اور رات میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور پڑتا ہے۔ رات گئے سہی' رات کو انہیں تھوڑی بہت نیند کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ اب دن نکل چکا تھا۔ انہوں نے اپنے اپنے علاقوں میں پھیلنا شروع کر دیا ہوگا۔

ڈرائیور نے جلدی کی۔ منٹوں میں عابد شاپ اور نام پلی کی طرف سے گزرتے ہوئے ہم نواب ثروت کے علاقے میں پہنچ گئے۔ نواب کا گھر قریب آنے پر بٹھل نے میرا ہاتھ دبایا تو میرا دل اور ڈوبنے لگا۔ دربان باہر ہی کھڑا تھا جیسے ہماری آمد کا منتظر ہو۔ اس نے بہ عجلت دروازہ کھول دیا۔ جس نشست گاہ میں رات ہم بیٹھے تھے' اس کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا اور درمیان کی گول میز پر خشک میووں اور کھجوروں کی طشتریاں رکھی تھیں۔ کمرے میں اگربتی کی گلابی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ کھڑکیوں کے پردے ہٹے ہوئے تھے اور کمرا خوب روشن تھا۔ بٹھل نے طشتری سے نمکین بادام کے چند دانے اٹھا کے ٹونگے۔ اسی لمحے ملازمہ نے اندر آ کے کسی قدرے گھبرائے اور سہمے ہوئے تیور سے آداب کیا اور چائے کا طشت میز پر رکھ دیا پھر ایک ملازم آیا۔ اس نے نواب کی طرف سے معذرت کی اور بتایا کہ کچھ دیر میں نواب آیا ہی چاہتا ہے' مناسب ہوگا اس دوران میں ہم چائے سے شغل کریں۔ ہم نے چائے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ میں بٹھل کے برابر بیٹھ گیا اور میری حیثیت اس مجرم سے کیا مختلف ہوگی جو عدالت میں فیصلہ سننے کا منتظر ہو' سزائے موت کا یا سرخ روئی کا۔ نواب کے آنے سے پہلے ملازمہ نے دوبارہ آ کے خاص دان رکھ دیا اور سگریٹ کیس بھی۔ بٹھل نے اسے اٹھا کے' الٹ پلٹ کے دیکھا۔ ہاتھی دانت کے کام کا نہایت نفیس اور نازک کیس تھا۔ بٹھل نے سگریٹ سونگھ کے دیکھے اور راکھ دان میں بیڑی بجھا کے سگریٹ جلا لیا۔ یہی بہتر تھا کہ کسی نہ کسی طرح خود کو مصروف رکھا جائے۔ میری نظریں تو دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ کسی بھی لمحے نواب اندر سے برآمد ہو سکتا تھا۔ اس کی زبانی کچھ سننے سے پہلے چہرے سے بھی کچھ اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ کوئی آدمی اپنے اندر کا احوال چھپانے میں ہمہ وقت اتنا مشاق تو نہیں ہو سکتا۔ اندر کی کجی کبھی نہ کبھی چہرے پر ضرور نظر آتی ہے۔

دیوار پر جمی ہوئی گھڑی ٹک ٹک کر رہی تھی۔ رات کی نسبت بٹھل اب کچھ ہلکا لگ رہا تھا۔ اس شخص کے مانند'

ایک عرصہ حیرت کے بعد جس کی آنکھیں کسی بھی نیرنگی کے لیے آمادہ ہوجاتی ہیں۔ میں نے اپنے آپ کو یک جا کرنے کی کوشش کی۔ اپنا سب سے بڑا ناصح، معلم اور دوست، آدمی خود ہوتا ہے لیکن ہر آدمی میں ایک ہی دل ایک ہی سینہ ہوتا ہے۔ اس کی مثال بھی چادر کی طرح ہے۔ کوئی چادر بس ایک حد تک بھرا ہوا ڈھانپ سکتی ہے۔ ہمیں آئے ہوئے بیس منٹ ہوگئے تھے۔ معًا دروازے کی چلمن متلاطم ہوئی۔ اس بار نواب ہی تھا۔ چکن کے سفید کرتے اور پاجامے میں ملبوس، بالکل نوابوں کی طرح اس کے چہرے پر اضطراب آمیز شگفتگی چھائی ہوئی تھی۔ ہم دونوں کھڑے ہوگئے۔ نواب اٹھتا ہوا ہماری طرف بڑھا۔ پہلے اس نے بٹھل سے مصافحہ کیا، آداب و تسلیمات کے بعد تاخیر سے آنے کی معافی چاہی پھر وہ میری طرف متوجہ ہوا اور اس نے گرم جوشی سے میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبالیے اور پوچھا "رات کیسی گزری جناب؟"

میں نے پلکیں پٹ پٹا کے کہا "جی! ٹھیک، بالکل ٹھیک۔"

"دیر تک ہمیں خیال رہا کہ ہم سے کوتاہی ہوگی۔ ہمیں آپ کو روک ہی لینا چاہیے تھا۔ یقینًا آپ کو زحمت ہوئی ہوگی۔"

"کاہے کی صاحب؟" بٹھل نے سادگی سے پوچھا۔

"یہی آنے جانے کی۔"

"کیسی صاحب! ہم آپ کو بولے تھے، ہم نواب لوگ نہیں ہیں۔"

"اوہ ہاں، ہاں۔" نواب کھل کھلا پڑا اور تیکھے لہجے میں بولا "ہم سے بھول ہوئی۔ واقعی آپ نے فرمایا تھا کہ آپ نواب نہیں ہیں۔" اس نے تالی بجا کے ملازمہ کو طلب کیا اور تازہ چائے لانے کا حکم دیا۔ ملازمہ پہلے والا طشت اٹھا کے لے گئی تو نواب نے ہم سے ناشتے کے لیے پوچھا۔ بٹھل کے کہنے پر کہ ہم نمٹ کے آئے ہیں، نواب نے اصرار بھی نہیں کیا۔ وہ کچھ مضطرب سا لگ رہا تھا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ جھجکتے ہوئے بولا "رات تو اچھی خنکی رہی۔"

"ہاں صاحب، تھوڑی سردیلی رات تھی۔"

"یہاں موسم عمومًا شدت گیر نہیں ہوتا۔"

بٹھل سہلانے لگا اور بولا "بولتے ہیں، موسم کا کچھ اثر آدمی پر بھی پڑتا ہے۔"

"ضروری نہیں۔" نواب نے مسکرا کے کہا "آدمی تو یورپ جیسے سرد ترین علاقے کے بھی کچھ کم گرم مزاج نہیں ہوتے۔ گوروں کو دیکھئے، یہ ان کی گرمی ہی ہے کہ آدھی دنیا کے فاتح ہیں۔"

"سردی بھی ہوسکتی ہے۔" بٹھل خود کلامی کے انداز میں بولا "کدھر سنا تھا، زیادہ ٹھنڈک آدمی کو پتھر کر دیتی ہے۔"

"کیا خوب!" بٹھل کی برجستگی پر نواب مچل گیا۔

پھر وہی باتیں۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ بٹھل ہی کو خاموش رہنا چاہیے تھا۔ جواب دینے سے بات بڑھتی رہتی ہے۔ اس طرح تو نواب کی حوصلہ افزائی ہو رہی تھی۔ ابھی چائے بھی آنی تھی اور نواب کو شیروانی پہننے اندر بھی جانا تھا۔ میں نے بٹھل کو نہیں ٹوکا۔ نواب کی موجودگی ہی میں یہ ممکن بھی نہیں تھا۔ بٹھل کو خود ہی احساس ہوا۔ اس نے نرم لہجے میں نواب سے کہا "اگر چائے پھر پہ رکھی جائے تو۔۔۔"

"کوئی مضائقہ نہیں۔" نواب نے تذبذب سے کہا "جیسے آپ کی خواہش ہو۔"

"سچ پوچھیے تو ایک بہانہ ہے خوش وقتی کا۔" ابھی وہ کہہ رہا تھا کہ ملازمہ چائے کا نیا طشت لے کر داخل ہوئی۔ نواب ہنسنے لگا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر ملازمہ کو چائے واپس لے جانے کا اشارہ کیا۔

"اب آگئی ہے تو ضرور پیئیں گے۔" ملازمہ واپس جانے لگی تھی، بٹھل نے اسے روک لیا۔

وہ گھبرا گئی، طشت میں رکھی ہوئی پیالیاں کھڑکھڑا گئیں۔ اس نے نواب کی طرف دیکھا اور جلدی سے چائے میز پر رکھ دی اور ریشمی کپڑا طشت سے ہٹا دیا۔ وہ شاید چائے بنانے کے انتظار میں سکڑی سمٹی کھڑی تھی کہ نواب نے اسے جانے کی ہدایت کی اور خود پیالیوں میں چائے لوٹنے لگا۔ بٹھل نے نواب کو ہمارے پاس آکے چائے پیش کرنے کی زحمت نہیں دی۔ اس نے اٹھ کر اپنی اور میری پیالیاں میز سے اٹھالیں۔ وہ چائے پینے لگے۔ یہ بے وقت، کیسی خوش وقتی ہو رہی تھی۔ میں نے بھی چند گھونٹ لیے۔ زہر کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک موت تک لے جاتا ہے، دوسرا موت کا عذاب دیتا ہے۔ دوسرا پہلے سے زیادہ اذیت ناک ہے۔ ایک بار آدمی ختم ہوجائے تو سارے عتابوں، عذابوں سے نجات مل جائے۔

چائے پیتے ہوئے نواب کھو سا گیا۔ بٹھل نے زیرلب سے کہا "کیا ارادہ ہے نواب صاحب؟"

نواب سنبھل گیا اور سانس بھر کے بولا "جی ہاں! ارادہ مستحکم ہے۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے اضافہ کیا "اور نیک بھی۔"

"اچھا ہے پھر۔" میری طرح نواب نے بھی دوبارہ غور کیا ہوگا مگر بٹھل کے لہجے میں کوئی گرہ نہیں پڑی ہوئی تھی۔ اسے کہنا چاہیے تھا کہ پھر دیر کیا ہے مگر اس نے کچھ نہیں کہا اور چائے ختم کرکے خاص دان سے پان کھایا۔ نواب نے بھی اپنی پیالی میز پر رکھ دی۔ بٹھل نے خاص دان اس کے سامنے بڑھا دیا۔

نواب نے اس کا شکریہ ادا کرکے ایک الائچی پر اکتفا کیا "ایک گزارش ہے۔" نواب پہلو بدل کے چرمراتی آواز میں بولا "شام کو اگر ہم اپنی منزل کے لیے روانہ ہوں؟"

میری آنکھوں میں اندھیرا اتر آیا۔ بٹھل بھی نواب کو دیکھا کیا۔

"کیا عرض کریں۔" نواب کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں اور چہرے پر غبار سا چھا گیا۔

"کیا بات ہے نواب صاحب؟"

"صورت یہ ہے۔" نواب افسردگی سے بولا "ہمارے ایک عزیز کے ہاں کوئی سانحہ ہوگیا ہے۔ صبح سویرے ہی ہمیں اطلاع ملی۔"

"کیا ہوا صاحب؟" بٹھل نے تشویش سے پوچھا۔

"بس ایسا ہی ہے۔" نواب نے بے زاری کا اظہار کیا "جاکے ہی اصل صورت حال کا علم ہوگا۔"

بٹھل سیدھا ہوکے بیٹھ گیا تاہم اس نے تھمی ہوئی آواز میں کہا "آپ کل چلو صاحب۔"

"نہیں نہیں، امید ہے، سہ پہر تک ہمیں فرصت ہوجائے گی۔ سوچتے ہیں، ہمیں وہاں جاکے عیادت کرنی چاہیے۔"

"آپ اچھا جانتے ہو، اپنی فکر مت کرو صاحب! ہم تو ادھری آگئے ہیں۔ ایسا تھا تو آپ ڈرائیور کو بول دیتے۔"

"ہم نے سوچا تھا مگر سچ پوچھئے تو مناسب نہیں معلوم ہوا۔ ہم خود بھی کوئی فیصلہ نہیں کرپائے تھے۔ ادھر آپ کو بھی الجھن ہوتی۔ سوچا، جتنی دیر میں ہم واپس آئیں۔ آپ یہیں آرام فرمائیں۔ ممکن ہے، ہمیں کچھ کم وقت لگے۔"

"جیسا آپ سمجھو، ہم کچھ دیر کو بازار گھوم کے بھی واپس آسکتے ہیں۔ آپ سے پہلے لوٹ آئیں گے۔"

"کچھ خریداری وغیرہ کرنی ہے؟"

"ہاں صاحب، تھوڑی دکن کی سوغات بھی دیکھیں۔"

"بعد میں کیوں نہ رکھیے، ہم بھی ساتھ چلیں گے۔"

"آپ کدھری صاحب۔" بٹھل نے اپنے طور سے پہلوتہی کی پوری کوشش کی۔

"کیوں نہیں، ہمیں اپنی زبان سے نہیں کہنا چاہیے لیکن یوں سمجھئے لوگ کہتے ہیں، ہمیں اچھی پرکھ ہے، اصلی نقلی کی۔"

"آدمی کی یا چیزوں کی؟"

نواب کا سارا جسم لہرا گیا، تنی ہوئی آواز میں بولا "آدمی کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہتے، ہماری مراد چیزوں سے ہے۔"

"نواب ہوناصاحب!"

"نواب کو کیا، آدمی کی پہچان نہیں ہوتی؟"

"ہونی چاہیے۔" بٹھل نے تحمل سے کہا "چیزوں سے وقت ملتا ہوتا تو ضرور ہوتی۔"

نواب، بٹھل کی صورت دیکھنے لگا پھر سر ہلاتے ہوئے بولا "آپ نے درست کہا، انہیں فرصت نہیں ہوتی۔ ہم تو اپنی بات کررہے تھے۔ فرصت تو بے شک ہمیں بھی نہیں ہے لیکن بہ قدر استطاعت ایک جستجو سرشت میں ضرور ہے اور ہمارا خیال ہے، اس کے لیے نواب ہونا شرط نہیں ہے۔"

بیرونی دروازے پر آہستہ سے کھٹکا ہوا۔ جب تک نواب نے حکم نہ دیا، آنے والا سامنے نہیں آیا۔ وہ دربان تھا۔ اس نے ہرچرن نامی کسی شخص کے بارے میں بتایا کہ وہ نواب سے ملاقات کا آرزومند ہے۔ نواب کو ناگواری سی ہوئی۔ کسی قدر تردد کے بعد اس نے دربان سے کہا کہ سردست کسی سے ملنا ممکن نہیں۔ بہتر ہوگا، ہرچرن جی کل یا پرسوں اسی وقت آئیں۔ دربان تین چار قدم گیا ہوگا کہ نواب نے اسے آواز دی اور بٹھل سے مخاطب ہوکے بولا "زیورات کے سلسلے میں ہمی نے ہرچرن جی کو بلوایا تھا۔ ریاست کا مشہور جوہری ہے۔ آپ کو ہیرے جواہرات کا کچھ ذوق ہے؟"

بٹھل کا ماتھا ٹھنکا ہوگا تاہم اسے جواب میں جو کہنا چاہیے تھا، اس نے وہی کہا کہ اسے ایسی چیزوں کا کوئی تجربہ اور تمیز نہیں ہے۔

"ہمیں شبہ ہے، یہ محض کسرِ نفسی ہے۔" نواب نے لہک کے کہا۔

"اب کیا بولیں آپ کو۔" بٹھل کی آواز بل کھا گئی تھی۔ اس نے نواب کو یاد دلایا کہ اسے کہیں جانا بھی ہے۔

"کچھ وقت ہے ابھی ہمارے پاس۔" نواب نے روانی سے کہا "امی قبلہ بھی تو ساتھ جارہی ہیں۔ جیسے ہی تیار ہوں گی، ہمیں اطلاع مل جائے گی۔ اتنی دیر میں ہم ہرچرن جی کو

فارغ کرسکتے ہیں۔ نامی گرامی صراف ہیں۔ جڑاؤ زیورات میں دور دور تک ثانی نہیں۔ ہیروں سے ہمیں بھی اچھا شغف ہے۔ آپ کو کون سا پتھر پسند ہے؟"

"وہ سارے، جو سر سے دور رہیں۔" بٹھل سرد لہجے میں بولا۔

بٹھل نے نواب کو پھر زعفراں زار کردیا مگر خود بٹھل ازراہ وضع بھی اس کا ساتھ نہ دے سکا۔ اب شاید کسی اور شہادت کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ کوئی ابہام تھا تو اس کے آئینہ ہونے میں اب ایسی دیر نہیں تھی۔ بٹھل کو بہرحال مطمئن ہونا چاہیے تھا کہ اس استعارے میں اندھیرا بڑھنے کے بجائے چھٹنے کا اشارہ ہے۔ ہرچرن کی آمد اور ہیروں کا ذکر سب ایک ہی سلسلے سے پیوستہ معلوم ہوتا تھا۔ آنے والا ہمارا چہرہ شناس ہونا چاہیے۔ ممکن ہے، اس نے نواب حشمت اور جہاں تاب کے محلات میں ہمیں دیکھا ہو یا وہ ان زرخریدوں میں سے کوئی ہو جو ابا جان کی حویلی میں شب خوں مارنے آئے تھے۔ وہ کوئی بھی ہوسکتا تھا۔ اب یہ نتیجہ اخذ کرنا بھی بٹھل کے لیے مشکل نہ ہوگا کہ نواب ثروت اپنے کسی محترم نواب کی شرکت کے بجائے سب کچھ اپنے آپ تک محدود رکھنا چاہتا ہے۔ وہ بھی تو ایک جدی نواب ہے۔ ہر نواب کو اپنے رتبے کی فزدنی اور جاہ و حشمت کی فراوانی کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ ہرچرن کی آمد سے ہماری شناخت مطلوب ہے تو اس کے معنی یہ نکلتے ہیں کہ نواب ہمارے سلسلے میں ابھی تک کسی کش مکش سے دوچار ہے اور ہمارے لیے بھی اس کے کوئی معنی ہیں کہ جس تعبیر کے سراب میں ہم نے مارنی کو چالیس دن کی عزت بھی نہیں دی، وہ خواب تو ایک سراب ہی ہے۔

بٹھل کو ہنوز نواب کی ہم نوائی کا جبر سہتے رہنا تھا۔ اس نے کہا کہ مناسب ہے، نواب کی یہی خواہش ہے تو ہرچرن کو بلا لیا جائے۔ زر و جواہرات کی بابت ہم کوئی رائے نہیں دے سکتے تو ان کے نظارے سے کیوں محروم رہیں۔

نواب نے گھڑی دیکھی۔ دربان ہاتھ باندھے دروازے کی آڑ میں کھڑا تھا۔ جانے نواب کے دماغ میں کیا سمائی، اس نے کوئی نیا حکم صادر نہیں کیا۔ میرے نہاں خانے کے جیسے دریچے کھل گئے۔ مجھے اپنے آپ سے پشیمانی بھی ہوئی۔ آنے والا ہماری تگ و دو میں آتا تو نواب اسے یوں نہ جانے دیتا۔ کاسۂ سر بھی عجیب وہم و گماں کی افزائش گاہ ہے۔ شک خود رو پودے کے مانند ہے، ایک بار نمو پا جائے تو جا بے جا پھیلتا رہتا ہے۔ نواب کے کسی عزیز کے ہاں واقعی کوئی حادثہ ہوسکتا ہے اور نواب کے لیے تنگیٔ وقت کا مسئلہ پیدا ہوسکتا ہے۔ ہیروں کا ذکر بھی اتفاقاً ہونا ممکن ہے۔ نواب ثروت ایک نوجوان آدمی ہے۔ یہ عمر چاروں طرف دیکھنے کی ہے۔ یہ نوجوان میری طرح نہیں ہوتا۔ اسے شکار سے بھی رغبت ہوتی ہے، سیر و سیاحت سے بھی۔ زر و جواہر سے بھی اور زیب و زینت سے بھی۔ نواب لوگوں کے تو بہ طور خاص یہی مشاغل ہوسکتے ہیں۔ ادھر دربان گیا، ادھر نواب ثروت بھی اٹھ گیا "آیئے ہم آپ کو مہمان خانے لیے چلتے ہیں۔" اس نے شائستگی سے کہا۔

بٹھل نے کوئی تاویل پیش کرنا چاہا تھا مگر ایک ساعت کے اکراہ کے بعد وہ نواب کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ بیرونی دروازے سے گزر کے ہم باہر کے مختصر باغیچے میں آگئے اور بائیں طرف مڑ گئے۔ نواب کی اقامت دائیں طرف تھی۔ مہمان خانہ عمارت سے ملحق بھی تھا اور اس سے الگ بھی کیا جاسکتا تھا۔ باہر سے آنے کا راستہ بھی الگ تھا۔ نواب نے پہلے سے ہدایت دی ہوئی تھی۔ کشادہ اور روشن نشست گاہ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ سب کچھ تازہ تازہ سا تھا۔ رنگ و روغن، فرنیچر، پردے، غالیچے، گل دانوں میں رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔ نشست گاہ کے دونوں اطراف جانے والی گلیور جیسے راستے میں غالباً کمرے بنے ہوئے تھے۔ یہ کسی نواب ہی کا مہمان خانہ معلوم ہوتا تھا۔ نواب نشست گاہ عبور کرتا ہوا سامنے کی گلی یا راہ داری میں بڑھ گیا اور سجے سجائے کمرے میں داخل ہوگیا۔ یہ خواب گاہ تھی۔ دوپٹے، کرتے اور چھوٹی موری کے پاجامے میں ملبوس بادامی رنگت، تیکھے نقش و نگار کی ایک نازک اندام نوجوان لڑکی کھڑکیوں کے پردے درست کررہی تھی۔ ہماری آمد پر اس نے اپنا کام روک دیا، جھک کر نواب کو آداب کیا اور سمٹی سمٹائی کمرے سے نکل گئی۔ کمرے میں تقریباً ہر چیز کا اہتمام تھا۔ بلوریں جگ اور گلاس، فلاسک، پھل، شیشے کی ریک میں رکھی ہوئی چند کتابیں اور رسالے اور جانے کیا کیا۔ بٹھل وہاں نہیں ٹھہرا اور نواب کے ساتھ نشست گاہ میں آکے صوفے پر بیٹھ گیا "کسی چیز کی ضرورت ہو تو ملازمہ کو آواز دینے کی زحمت ہوگی۔ وہ یہیں کہیں موجود رہے گی۔" نواب نے خوش اطواری سے کہا "تکلف نہ کیجیے گا۔ یہ ہماری درخواست ہے۔ ویسے ملازمہ بھی آپ سے معلوم کرتی رہے گی۔ اس کا نام پری بانو ہے۔"

"ادھر تو پریاں ہی ہوسکتی ہیں۔"

نواب مسکرا دیا اور کہنے لگا کہ اسے اجازت دی جائے وہ اندر جاکے والدہ کو دیکھتا ہے۔ اب ہم سے اس کی ملاقات ایسی پر ہوگی۔

بٹھل نے خدا حافظ کہنے سے پہلے اس سے کسی مرد ازم کے لیے پوچھا اور کہا کہ باغ عامہ یہاں سے بہت نزدیک ہے۔ ہوسکتا ہے، ہم کچھ دیر کے لیے وہاں جانے کا ارادہ کرلیں۔ کسی ملازم کی رہبری مل جائے تو آسانی ہوجائے گی۔ اب جیسے شش و پنج میں پڑ گیا۔ اس نے مشورہ دیا کہ دھوپ تیز ہوا چاہتی ہے۔ ایسے میں باغ عامہ کی سیر کا کیا لطف آئے گا۔ "دھوپ ہی میں تو چھاؤں کا نشہ ہوتا ہے۔" بٹھل نے جت کی اور کہا کہ آرام کے وقت ہی آرام اچھا ہے۔ بستر پہ کروٹیں بدلنے سے بہتر ہے کہ یہ وقت کسی مصرف میں لایا جائے۔ مسافر تو یوں بھی نئی جگہ کو ہر طرح لوٹ لینا چاہتے ہیں۔ کوئی ملازم ہمراہ ہو تو کیا خوب ہے ورنہ کچھ ایسی دوری بھی نہیں کہ ہم اکیلے نہ پہنچ سکیں۔ بٹھل نے کچھ ایسے حتمی اور مطالبہ آمیز انداز میں یہ خواہش کی تھی کہ نواب کو خاموش ہوجانا پڑا۔ اس نے کہا "الحمدللہ، خدمت گاروں کی کمی نہیں ہے، میں اکبر نامی ملازم کو ہدایت کردیتا ہے جس وقت باہر نکلنے کا ارادہ ہو، پری بانو سے کہہ کے اکبر کو طلب کیا جاسکتا ہے۔"

نواب کے جانے کے بعد بٹھل صوفے پر نیم دراز ہوگیا اور اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ میں بھی اپنے آپ میں دھنسا اس کے بازو میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ میرے دماغ میں پھر بھن بھناہٹ ہونے لگی تھی، وہی حبس اور شور سا۔ آدمی کو پاگل کردینے والا سکوت۔ دیر ہوگئی تو مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ میں نے جھجکتے ہوئے بٹھل کو چھیڑا "کیا سوچ رہے ہو؟"

اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں اور تنی ہوئی پلکوں سے مجھے گھورتے ہوئے بولا "تجھ سے زیادہ نہیں۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔"

اس کے ہونٹ پھیل گئے، وہ اچٹتی آواز میں بولا "اب زیادہ دیر نہیں لگنے کی رے۔"

"میرا تو دل بہت گھبرا رہا ہے۔"

"واپس چلنے کو بولتا ہے؟"

"یہ مطلب نہیں ہے۔" میں نے ترشی سے کہا۔

"ٹھکانے سے رکھ رے۔ یہ جھٹ پٹ تو چلتا رہا ہے۔ لگتا ہے اپنے ساتھ آخری تک یہی آنکھ مچولی رہے گی۔"

"میں نے تم سے اسی لیے منع کیا تھا۔"

اس کا چہرہ کشیدہ ہوگیا۔ لوٹ جائیں رے پھر؟"

"اب کیا ہے، یہ تو پہلے سوچنے کی بات تھی۔"

"سوچ ہی کے چلے تھے سجنا۔" وہ زہر خند سے بولا "کبھی تو کیسا کٹ کھنا، مرکھنا ہوجاتا ہے۔"

"صاف کیوں نہیں بولتے، کتا کہو، بیل کہو، سانڈ...! میری حالت ان سے مختلف بھی کیا ہے۔"

غصہ آنے کے بجائے اسے ہنسی آگئی "اور بھی بہت بے پلے ہوتے ہیں۔ اپنے کو کھونٹے سے بندھا رکھ، پٹا ڈال کے۔"

"مجھے بھی کچھ بتاؤ۔ تم نے کیا اندازہ کیا ہے؟"

"بولا نا رے، تجھ سے زیادہ نہیں۔" وہ کھو سا گیا پھر کہنے لگا "دھیان رکھنا، آدھ پون گھنٹے میں اٹھنا ہے۔"

"کہاں جانا ہے؟"

"ادھری باغ کی طرف..."

"جمرو اور زورا کہاں ہیں؟"

"ٹھیک سے ہی ہوں گے حرام کے۔"

"میرے دماغ میں ایک بات آرہی ہے۔" اس نے سر اٹھایا تو میں نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا "یہ جو ملازمہ پری بانو ہے، تم کہو تو اس سے کچھ سن گن لینے کی کوشش کریں؟"

اس نے منہ بنا لیا "کیسی باتیں کرتا ہے رے!"

"کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔"

"ٹھیک سے بیٹھا رہ۔" اس نے مجھے جھڑک دیا۔

اتنی دیر میں دروازے پر آہٹ ہوئی اور دوسرے لمحے دستک "بٹھل کی اجازت پر چور چور سی بنی پری بانو اندر آگئی۔ اندر آتے ہی اس نے سلام کیا "سرکار کے لیے چائے لائی جائے؟" اس کی زبان نہایت شستہ اور دھیمی ہونے کے باوجود آواز میں چوڑوں کی سی کھنک تھی۔

بٹھل اسے دیکھتا رہا۔ وہ پلکیں جھکائے جواب کے لیے منتظر کھڑی تھی۔ اس وقت نواب کے ساتھ، خواب گاہ میں دور سے بس اس کی ایک جھلک نظر آئی تھی۔ اب سامنے آنے پر اندازہ ہوا، وہ کیسی قسمت گزیدہ تھی۔ ان در و بام میں تو اس کی کوئی اور حیثیت ہونی چاہیے تھی۔ پری بانو کا چہرہ گلنار ہورہا تھا، کچھ دوپٹے کی وجہ سے بھی۔ گلابی دوپٹے میں گندم گوں رنگت اس طرح کھلتی ہے۔ "ذرا قریب تو آری۔" بٹھل نے اسے مخاطب کیا "وہ سہم گئی اور آہستہ آہستہ چند قدم آگے آکے ٹھہر گئی۔ کب سے ادھری ہے رانی؟"

اس نے تھرکتے ہونٹوں سے بہ مشکل کہا "چار مہینے ہے۔"

بٹھل نے جیب ٹٹول کر سو روپے کا نوٹ نکالا اور اس

کے حوالے کرنا چاہا۔ وہ اپنی جگہ ساکت کھڑی رہی "رکھ لے بٹیا! اپنے کو یہ خالی ہاتھ اچھے نہیں لگتے۔"

اس کا سر جھک گیا "نہیں سرکار!" اس نے بھنچی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ آگے نہیں آئی۔

"کسی اور جنگل کی ہرنی ہے۔" بٹھل بدبداتے ہوئے بولا اور پری بانو سے پوچھنے لگا "کدھری سے آئے ہیں اماں باوا؟"

پری بانو جیسے کسی مشکل میں گرفتار تھی۔ اس کے رخساروں پر ایک رنگ آتا تھا' ایک جاتا تھا۔ اس نے زیر لبی سے کہا۔

"ریاست رام پور سے۔"

"ہونہہ! رم پریا پٹھانی ہے۔"

پری بانو کے سراپا میں ایک تموج سا اٹھا۔ بٹھل نے نوٹ اس کے سپرد کرنے کے لیے پھر ہاتھ بڑھایا۔

"بندی معافی چاہتی ہے۔" پری بانو کی آواز گھٹی ہوئی تھی۔ لگتا تھا' اتنا کہنے کے لیے اسے اپنے سارے بدن کی توانائی صرف کرنا پڑی ہے۔

"کیوں ری! نواب صاحب کو پتا نہیں ہوگا' ایسے نہیں ہیں ہم لوگ' اتنی اچھی بٹیا ہو کے منع بولتی ہے۔" بٹھل صوفے سے اٹھ کے اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا' اس کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اٹھایا اور پیشانی کو بوسہ دیا اور اس کے ہاتھ میں نوٹ تھما کے مٹھی بند کر دی۔

"مان رکھ لے اپنا' تجھ کو کچھ بولا ہے ری۔" بٹھل نے بوجھل آواز میں کہا اور اس سے پہلے کہ پری بانو کی حالت غیر ہوتی' بٹھل نے اس سے چائے لانے کو کہا۔ پری بانو کو جیسے رہائی مل گئی۔ وہ چھلاوے کی طرح کمرے سے نکل گئی۔

گویا بٹھل نے پری بانو سے کچھ معلوم کرنے کی میری تجویز مان لی تھی اور یہ ابتدا تھی۔ ابتدا میں اتنا ہی مناسب تھا۔ پری بانو نے بتایا تھا کہ وہ نئی نئی آئی ہے۔ ممکن ہے' اس نے کورا کو دیکھا ہو۔ کچھ اور نہیں تو وہ اتنا تو بتا سکتی ہے کہ کورا کا کیا حال تھا' کیسی لگتی تھی وہ۔ منیر علی کی بیوی زہرہ نے جیسلمیر میں مولوی صاحب کے قیام کے دوران میں مجھے اس کی بابت کچھ بتایا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ کورا کے چہرے پر تو ہر وقت کوئی گھٹا سی چھائی رہتی تھی اور اس کی غزالیں آنکھیں ہر وقت چمکتی رہتی تھیں۔ زہرہ نہیں جانتی تھی کہ وہ آسرے کی تابندگی تھی۔ امید تو دیے میں تیل کے مانند ہے' تیل ہو تو دیا جلتا رہتا ہے۔ اس بات کو عرصہ گزر گیا۔ کورا میں ضرور تبدیلیاں آئی ہوں گی مگر ایک تبدیلی یقیناً آئی ہوگی اور وہ یہ ک اس نے اپنی امید ترک نہیں کی ہوگی۔ وہ تو اب بھی اس ک آنکھوں میں فروزاں ہوگی۔ یہی اعتبار تو مجھے قائم رکھے ہوئے ہے۔ ہو سکتا ہے' اسے اسی مہمان خانے میں ٹھہرا گیا ہو۔ پری بانو نے اسے دیکھا ہے تو فراموش نہیں کر سکتی کوئی بھی اسے ایک بار دیکھ کے اس کا نقش نہیں مٹا سکتا۔ مجھے تھوڑا بہت اندازہ ہو گیا تھا کہ پری بانو ایسی سخت اور تنگ دل لڑکی ثابت نہیں ہوگی۔ وہ بظاہر ایک سادہ و معصوم لڑ لگتی تھی۔ بٹھل کا سلوک بھی اس کی نظروں میں ہمیں معتب قرار دینے کے لیے بہت تھا۔ اتنا تو اسے بھروسا ہو گیا ہوگا ک ہم کوئی برے لوگ نہیں ہیں' ہمارا مقصد محض کسی کی خیری دریافت کرنا ہے' اس میں نواب کے لیے ضرر کا کوئی پہل نہیں۔

پری بانو تھوڑی دیر میں چائے لے کر آ گئی۔ چائے ساتھ طشتریوں میں انگریزی بسکٹ بھی رکھے ہوئے تھے۔

"تو ہی بنا دے۔" بٹھل نے بھاری آواز میں کہا۔

میز کے اس پار قالین پر پری بانو گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی برقع کی طرح اس نے دوپٹا چہرے کے اردگرد ڈھانپ بلک لپیٹ رکھا تھا۔ اس نے دھیمی آواز میں دودھ اور چینی ک مقدار کے بارے میں پوچھا۔ اس کی انگلیوں میں پہلی لرزش نہیں تھی۔ چائے بنا کے اس نے پیالیاں ہمار آگے رکھ دیں۔

یہی موقع تھا کہ بٹھل سلسلہ جنبانی کرتا' اس نے پیا ہونٹوں سے لگا لی اور چسکی لیتے ہوئے بولا "ساری چیزیں ا ہی سواد کی بناتی ہے ری؟"

پری بانو دیر میں سمجھی اور اس کے رخسار شفق زا ہو گئے۔ وہ بس چند لمحے ٹھہری اور دروازے کی طرف جا لگی۔ میں نے بے چینی سے بٹھل کو دیکھا۔ پری بانو ا دروازے سے باہر نہیں گئی تھی کہ بٹھل نے اسے پکار سٹ پٹاتے ہوئے مڑی تو بٹھل نے اسے اکبر نامی ملازم بھیجنے کی ہدایت کی۔ میں نے بٹھل کو یاد دلانا چاہا مگر پری ب تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ میں بٹھل سے کیا کہتا' صا ظاہر تھا کہ اس کا پری بانو سے مولوی صاحب کے سلسلے م بات کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ پری بانو کے جانے کے فو بعد نواب کا ملازم اکبر حاضر ہو گیا۔ وہ شیروانی میں ملبو فربہی مائل' سیاہ رنگت کا ایک خوش شعار ادھیڑ شخص تھا یقیناً نواب کا خاص ملازم ہوگا۔

چائے ختم کر کے بٹھل اٹھ گیا۔ اکبر نے بٹھل کو

تھا کہ نواب جا چکا ہے۔ موٹر بھی کاریڈور میں نہیں تھی۔ بٹھل کی رفتار نہایت سست تھی۔ اقامتی علاقے کی گلی سے ہم بڑی سڑک پر آ گئے۔ چلتے چلتے نہ جانے بٹھل کو کیا ہوا' کپڑے کی ایک دکان پر رک گئے وہ شیشے کی الماری میں سجی ہوئی ساڑیاں دیکھنے لگا۔ اس نے ساڑی کی قیمت پوچھی۔ دکان دار نے اس سے اندر آنے کی درخواست کی لیکن بٹھل نے توجہ نہیں دی اور ساڑی کی قیمت معلوم کر کے آگے بڑھ گیا۔ دکان سے ہم زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ سامنے سے جمرو کو آتا دیکھ کر میرے پاؤں ٹھٹک گئے۔ وہ خراماں خراماں ہماری جانب بڑھ رہا تھا۔ بروقت مجھے اکبر کا خیال آگیا اور میں بٹھل کو کہنی مارتے مارتے رہ گیا۔ جمرو نے بھی ہمیں دیکھ لیا تھا لیکن دوسرے راہ گیروں کی طرح وہ بھی بے نیازانہ ہمارے سامنے سے گزر گیا۔

چند قدم بعد ہی بٹھل نے اکبر سے پان کی دکان کی بابت پوچھا۔ دکان کچھ پیچھے رہ گئی تھی۔ اکبر کو کہنا چاہیے تھا کہ بٹھل کو جس چیز کی ضرورت ہے' وہ لے آتا ہے' اس نے یہی نیاز مندی کی۔ بٹھل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اسے اس تکلف سے باز رکھا اور پلٹ کر خود دکان کی طرف چلا گیا۔ بٹھل نے مجھے کوئی اشارہ نہیں کیا تھا مگر میں سمجھ گیا۔ اکبر نے بھی ازروئے اخلاق بٹھل کے پیچھے جانے کے لیے قدم بڑھا دیے تھے۔ مجھے رکا ہوا دیکھ کے وہ متذبذب ہوا۔ مجھے اسے مصروف رکھنا تھا۔ کوئی اور بات میرے ذہن میں نہیں آئی تو میں نے اکبر سے اس کے بارے میں معلوم کیا۔ آدمی اپنے ذکر میں سب سے زیادہ دلچسپی لیتا ہے تاہم جواب دیتے ہوئے اس کی نگاہیں دکان کی جانب منڈلاتی رہیں۔ جہاں ہم کھڑے تھے' وہاں سے دکان خوب نظر آتی تھی۔ جمرو بھی وہاں ٹھہرا ہوا کچھ خرید رہا تھا۔ بٹھل نے بھی دکان پر پہنچ کے بظاہر دکان دار سے سروکار رکھا۔ پان بنوانے اور بیڑی خریدنے کا دورانیہ جمرو سے کچھ کہنے کے لیے کافی تھا پھر جمرو دکان پر ہی ٹھہرا رہا اور بٹھل واپس آگیا۔ اکبر کو کسی قسم کی بدگمانی نہیں ہوئی ہوگی۔

باغ عامہ قریب ہی تھا۔ اس وقت خاصا ہجوم تھا' کسی اسکول کے لڑکے اور لڑکیاں سارا باغ سر پر اٹھائے ہوئے تھے۔ اکبر ہمیں مختلف گوشوں میں لے گیا اور باغ میں بنی ہوئی ایک مسجد کے بارے میں بتایا کہ یہاں حضور نظام اپنے فرزندوں اور سلطنت عمائد کے ساتھ جمعہ پڑھنے آتے ہیں۔ باغ کی سیر تو عذر لنگ تھا۔ بٹھل کو کسی طور نواب کی حویلی سے نکل کے جمرو سے بات کرنی تھی اور یہ مقصد پورا ہو چکا تھا

پھر بھی بٹھل نے ایک سنسان کنج میں کچھ وقت گزارا واپس آتے آتے دوپہر ہو گئی۔ واپسی کے راستے میں زورا میں سے کوئی دکھائی نہیں دیا' نہ بٹھل کو کسی جانے کا شوق ہوا۔ نواب ابھی تک واپس نہیں آیا سے پوچھے بغیر پری بانو اور اس کے ساتھ ایک اور ملا مہمان خانے میں واقع کھانے کے کمرے میں کھانا لگا میں منع کر دیتا لیکن بٹھل اٹھ گیا تھا اور اس دسترخوان پر بیٹھنے کی کوئی تک نہیں تھی۔ دولت مند ہاں عموماً کھانا کھایا کم' سجایا زیادہ جاتا ہے۔ یہاں تک منقش زرنگار برتن آراستہ تھے۔ ایسے نفیس و نا ایک بار تو کھانے کے ساتھ کانچ اور چینی کے بر جزو لقمہ بنا لینے کو جی چاہے' کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا تھا قدر کھانا آدمی کو چڑانے کے لیے سامنے رکھا جاتا تناسب تو ہو آخر۔

پری بانو اور اس کے ساتھ ایک پختہ کار ملازم میں سرگرداں تھی کہ کہیں مہمانوں کی جبیں پر آجائے۔ دوسری ملازمہ موجود نہ ہوتی تو شاید بٹھل سے کچھ دریافت کرنے کی سعی کرتا مگر وہ تو بس خامو کھانے کی رسم ادا کرتا رہا یا خانہ پری کرتا رہا۔ طر کے کھانے تھے۔ شیرنی بھی کئی قسم کی تھی۔ ذائقہ کے لیے ہر کھانے سے ایک لقمہ لیا جاتا تو شکم سیری اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا تھا کہ گزشتہ را خوان کی تکرار نہ ہو۔ بٹھل کو بھی بھوک نہیں میرے ہاتھ اٹھانے پر اس نے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔ دستر سے ہمارے جلد اٹھ جانے سے پری بانو کچھ افسر تھی۔ اس نے جرات کر کے بٹھل کو بابا سرکار کے لق مخاطب کیا' کچھ اور کھانے کی درخواست بھی کی "بس بٹھل نے کسل مندی سے کہا "اتنے پر تو بھوک الٹ جاتی ہے۔" قہوہ پی کے بٹھل خواب گاہ میں بستر ہو گیا۔

میں نشست گاہ میں چلا آیا۔ ابھی صرف ڈھا تھے۔ نواب نے شام تک آنے کو کہا تھا۔ اسے دیر سکتی تھی۔ اندھیرا ہو گیا تو جانا مشکل ہو جائے گا مگر ہم کیا سکتے تھے۔ ایسی صورت میں کوئی بھی کیا کر سکتا تھا کچھ دیر نشست گاہ میں بیٹھا دیواریں تکتا رہا پھر جا مجھے مہمان خانے کا ایک جائزہ لینے کا خیال آیا اور ایک ایک کمرے میں جھانک کے دیکھا پھر ایک کمر داخل ہو گیا۔ میرا قیاس صحیح تھا۔ کمرے کی ایک کھڑکی

کھکانے پر زنان خانے کی عمارت سامنے تھی مگر محرابوں کے درمیان کھنچی ہوئی چلمنوں کے پار دیکھنا ممکن ہی نہ تھا۔ میں لوٹ آیا۔ میرا دل جیسے اڑا جا رہا تھا۔ کسی جگہ پل دو پل کے لیے بھی جی نہیں لگتا تھا۔ پری بانو ایک بار مجھے کھانے کے کمرے سے نکلتی ہوئی نظر آئی۔ اس کے چہرے پر پہلے سے زیادہ اعتماد تھا۔ وہ شرماتی' مسکراتی ہوئی میرے آگے سے گزری۔ اس کے تیور سے عیاں تھا کہ میرے کسی سوال کے جواب میں اس کا رویہ شگفتہ ہی رہے گا' میری کسی خواہش کے لیے وہ سراپا تعمیل ہے۔ میں نے اس سے بات نہیں کی۔ اس خیال سے کہ بٹھل مناسب سمجھتا تو ذرا بھی تامل نہ کرتا۔

گھڑی نے ساڑھے چار بجائے تھے کہ چائے کا طشت ہاتھ میں اٹھائے پری بانو دروازے پر نمودار ہوئی اور اس نے لپکتی جھجکتی آواز میں بتایا کہ نواب واپس آگیا ہے اور اس نے پیغام دیا ہے' چائے پی کہ ہم نشست گاہ میں آجائیں' اتنی دیر میں وہ بھی تیار ہو کے وہاں پہنچتا ہے۔

میں اچھل کے اٹھ کھڑا ہوا۔ پری بانو کی پوری بات میں نے بٹھل کے پاس خواب گاہ میں جاتے ہوئے سنی۔ بٹھل جاگ رہا تھا۔ وہ بھی فوراً بستر سے اٹھ گیا۔ منہ ہاتھ دھونے میں اس نے کچھ وقت صرف کیا۔ پری بانو چائے بنانے کے لیے موجود تھی۔ میں نے اسے واپس کر دیا اور بٹھل کے لیے چائے بنائی۔ بٹھل کی حجت کی وجہ سے میں نے اپنے لیے بھی ایک پیالی بنا لی اور چند گھونٹوں میں ختم کر لی۔ بٹھل کی آہستہ نوشی سے مجھے وحشت ہونے لگی تھی۔ کسی نہ کسی طرح اس کی پیالی بھی تمام ہوئی۔ وہ بس شوقیہ پان کھاتا تھا اس لیے خاص دان کی طرف اس کا ہاتھ بڑھتا ہوا دیکھ کر میرے جی میں آئی کہ اسے روک دوں۔ یہ وقت شوق کرنے کا نہیں؟ اس نے گلوری منہ میں رکھی' کپڑوں کی شکنیں درست کیں اور واسکٹ کے بٹن بند کیے' تب کہیں صوفے سے اٹھا "چل بالم۔" اس نے صدا بلند کی اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

نشست گاہ کی گھڑی میں پانچ بجنے والے تھے۔ تاہم دن ابھی خوب روشن تھا۔ اکبر نے ہماری پذیرائی کی۔ اس نے بتایا کہ نواب کب کا تیار ہے اور ہمارا منتظر ہے۔ میں اسی لیے جلدی کر رہا تھا۔ نواب کو کسی بھی لمحے آجانا تھا مگر دس منٹ گزر گئے تو اکبر بھی متفکر ہوا اور ہم سے اجازت لے کے باہر چلا گیا پھر وہ فوراً ہی واپس آگیا اور اس نے نواب کی طرف سے معذرت چاہی کہ جاگیر سے ایک کارندہ آگیا ہے۔

اسے ضروری ہدایات دے کر نواب آیا ہی چاہتا ہے۔ عین وقت پر زمینوں سے کسی کارندے کی آمد کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ نواب نے ہم سے یہی کہا تھا کہ مولوی صاحب اس کی زمینوں والے مکان میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ہمیں نشست گاہ میں پورا آدھ گھنٹا گزر گیا لیکن نواب اندر نہیں آیا۔ میرا سر پھٹا جا رہا تھا۔ دن کی روشنی لمحہ بہ لمحہ ڈوب رہی تھی۔ کچھ اور دیر ہو گئی تو نواب اندھیرے کا عذر کر کے سفر ملتوی کر سکتا ہے۔ اب بہت ہو گیا۔ بٹھل کو اب اپنے طور پر بات کرنی چاہیے۔

چھ بجنے میں دس منٹ تھے کہ اندرونی دروازے پر آہٹ ہوئی۔ نواب ہی تھا۔ وہ شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے تیزی سے اندر آیا۔ میری سانسیں رکنے لگیں۔ سرمئی شیروانی میں ملبوس' کہیں جانے کے لیے وہ پوری طرح تیار معلوم ہوتا تھا۔ اس نے ہم سے رسماً چائے کے لیے پوچھا۔ بٹھل کی یقین دہانی پر کہ ہم مہمان خانے سے سیر ہو کے آئے ہیں' نواب نے روانگی کا اعلان کر دیا۔

کاریڈور میں موٹر کی ڈکی کھلی ہوئی تھی۔ ڈرائیور زین کے کئی تھیلے اندر رکھ چکا تھا۔ بید کی دو باسکٹیں' لوٹا' ایک چرمی بکس' دو بڑے فلاسک اس نے ہمارے سامنے رکھے' سب سے اوپر دو نالی بندوق۔"

"پوری تیاری ہے صاحب!" بٹھل نے جیسے طرح دی۔

"ہاں جناب۔" نواب اچکتی آواز میں بولا "اسباب سفر' بے شک طوالت سفر سے زیادہ ہے۔ ابی مرحوم فرماتے تھے سفر چاہے کیسا ہو' طویل یا مختصر' زادراہ میں مزید دو چار چیزیں ساتھ رکھ لی جائیں تو ان کا بار سود مند ہوتا ہے اور پھر یہ تو موٹر ہے اس میں ابھی اور گنجائش ہے' یقین کریں امی' قبلہ تو کچھ اور چیزیں بھی ساتھ کر رہی تھیں۔ ہم نے رہنے دیں۔"

ہم موٹر میں بیٹھ گئے۔ پچھلی نشست پر نواب اور بٹھل بیٹھے۔ میں ڈرائیور کے برابر والی جگہ پر بیٹھ گیا۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ میرا تو سارا جسم سن ہو گیا تھا۔ مجھے کچھ احساس نہیں ہوا کہ کب موٹر دروازے سے نکلی اور بڑی سڑک پر آئی۔ میری آنکھیں اس وقت کھلیں جب موٹر پیٹرول بھرنے کے لیے پمپ پر کھڑی تھی۔ دھوپ عمارتوں سے چلی گئی تھی۔ بہرحال' اب شاید کوئی دیوار حائل نہیں رہی تھی' راستے کے پتھروں کے سوا۔ ڈرائیور نے ہوا' پانی' پیٹرول وغیرہ کے انتظام اور معائنے میں خاصا وقت لگا دیا۔ روشنی اور ڈھلک گئی۔

دیر تک موٹر شہر کے اندر چلتی رہی۔ شیشے کھلے ہوئے

تھے۔ سڑکوں کے شور سے بچ بچا کے بسمل اور نواب کی کوئی کوئی بات میرے کانوں میں پڑجاتی تھی۔ نواب، بسمل کو نظر آنے والی عمارتوں اور راستوں کے بارے میں کچھ بتا رہا تھا۔ اس کے لہجے میں کسی قسم کا تکدر نہیں تھا۔ مجھے بار بار یہی خیال آتا تھا کہ نواب کہیں اپنا ارادہ ملتوی نہ کردے اور ہمارے بارے میں اپنی رائے نہ بدل دے۔ اس کے لگے بندھے مشاغل ہیں۔ ہماری خلل اندازی اور ہماری وجہ سے یہ زحمت اسے کسی بھی وقت ہم سے بیزار کرسکتی ہے۔ یہ تو پھڈے میں پاؤں اڑانے کے مترادف تھا حالانکہ اسی نے خط لکھ کے ہمیں طلب کیا تھا، مگر نوابوں کے اپنے مزاج ہوتے ہیں۔ میں نے ان کے لیے جتنا کچھ سنا تھا، اتنا آنکھوں سے بھی دیکھا تھا کہ وہ کیسے نازک مزاج ہوتے ہیں۔

تمہاری سنگ دلی کا نہیں جواب کہ تم
بڑھے ہوئے ہو نزاکت میں آبگینوں سے

نوابوں کا پارا ذرا ذرا سی بات پر بے قرار ہوجاتا ہے۔ نواب ثروت پرانے شناساؤں کی طرح ہم دور افتادگاں کی میزبانی کررہا تھا۔ بسمل سے اس کا انداز تخاطب عزت واحترام کا تھا جب کہ ہم نے خود بھی جتادیا تھا اور اسے بھی اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا کہ ہم کسی پہلو سے اس کے ہم پیشہ وہم سر نہیں ہیں اور ہم میں نوابوں کی کوئی عادت، کوئی خو بو نہیں۔

شہر کے گنجان علاقے سے نکل کر موٹر کم آباد راستوں پر آگئی۔ رفتہ رفتہ پختہ عمارتوں کا سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔ موٹر کی رفتار متوازن تھی، نہ زیادہ تیز اور نہ سست۔ افق کی لالی کب کی مٹ چکی تھی اور فضا میں جیسے سرمہ گھول دیا تھا۔ موٹر کچھ اور آگے پہنچی تو جھٹکے لینے لگی، نواب الجھ گیا "کیا مسئلہ ہے؟" اس نے ناراضگی سے پوچھا۔ ڈرائیور نے اپنی سی کوشش کی لیکن موٹر کے جھٹکے کم نہ ہوئے۔ اس نے موٹر سڑک کے کنارے کرلی اور انجن بند کرکے اتر گیا۔ جگہ بہت سنسان تھی۔ دور چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کا سلسلہ نظر آرہا تھا۔ آس پاس کہیں آبادی کے آثار نہ تھے۔ اندھیرا ابھی گہرا نہیں ہوا تھا۔ ڈرائیور بونٹ کھول کے مختلف پرزے اور آلات ہلاتا جلاتا رہا۔ ہم تینوں موٹر میں بیٹھے رہے۔ میں نے چاہا کہ اتر کر ڈرائیور کی مدد کردوں مگر مجھے موٹر کے بارے میں اتنا معلوم نہیں تھا۔ دوسرے میں یہ سوچ کے رہ گیا کوئی زیادہ خرابی ہوگی تو نواب خود پہل کردے گا۔ ڈرائیور نے پلگ صاف کیے اور کسی نلکی میں پھونکیں ماریں، ہوا بھری، ہوا کھینچی پھر اس نے بونٹ بند کردیا اور اندر بیٹھ کے چابی گھمائی تو موٹر چل پڑی۔

"کیا بات تھی؟" نواب نے درشتی سے پوچھا۔

"تیل میں کچرا لگتا ہے سرکار!" ڈرائیور نے مودبا جواب دیا۔

"پھر کپڑے بغیر تیل بھروایا تم نے؟"

"نکو سرکار! کپڑا رکھا تھا۔"

"پھر کیا ہے؟" نواب برہم ہوگیا۔ وہ بسمل سے بولا موٹر کی کوئی خرابی اسے سخت ناگوار گزرتی ہے۔ وہ اچھ حالت میں موٹر رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور ذرا پرانی ہو۔ پر بدل دیتا ہے۔ اس نے ڈرائیور کو سرزنش کی کہ یقیناً اس کوئی کوتاہی سے یہ نقص پیدا ہوا ہے۔ ڈرائیور نے کو جواب نہیں دیا۔ ایک اچھے محکوم کی یہی وضع ہونی چاہیے میں نے اور بسمل نے نواب کو نہیں بتایا کہ گزشتہ رات ج چارکمان کے علاقے میں ہمیں پہنچانے کے بعد موٹر میں گڑ ہوگئی تھی اور ڈرائیور جانے کب تک الجھا رہا تھا۔

موٹر کی رفتار کچھ ہلکی ہوگئی تھی لیکن پھر کوئی خرابی نہیں ہوئی۔ ہوا میں سردی کی آمیزش تھی۔ میں نے اپنی طرف شیشہ چڑھالیا۔ میرے کان پچھلی نشست پر لگے ہوئے تھے مجھے توقع تھی کہ اگر اب تک مناسب نہ تھا تو اب ضرو نواب، مولوی صاحب کے پاس جاتے ہوئے ان کے بار۔ میں کوئی بات چھیڑے گا۔ پہلی مرتبہ جب میں اور پیرو اس۔ ہاں گئے تھے تو مولوی صاحب وہاں نہیں تھے۔ نواب نے بتا تھا کہ وہ ڈیڑھ دو مہینے پہلے ملاقات کے لیے آئے تھے اور جل دوبارہ آنے کا وعدہ کرکے گئے تھے۔ وہ انہیں اپنے والد مرحو کے ایک معزز شناسا کی حیثیت سے جانتا تھا اور اس نے مولوی صاحب کے بارے میں اپنی بے کلی کے لیے کوئی معقول تاویل پیش کرنی تھی۔ اس نے مولوی صاحب کا بھانج بتایا اور کہا تھا کہ عرصہ گزر گیا، مولوی صاحب گھر سے ناراض ہوکے ایسے گئے کہ کوئی خیر خبر ہی نہ ملی۔ آٹھ نو سال پہلے میری ماں نے مولوی صاحب کی جائداد ہتھیالی تھی۔ اب میں، ان کا قریب ترین رشتے دار اپنی ماں کی زیادتی کی معافی چاہنے اور مولوی صاحب کی امانت انہیں لوٹانے کے لیے مضطرب ہوں۔

نواب نے یہ روداد سن کے ہمدردی کے باوجود اچھی جرح کی تھی۔ پیرو نے اسے کسی طرح مطمئن کردیا تھا اور درخواست کی تھی کہ اپنے ارادے کے مطابق، مولوی صاحب نواب کے ہاں آجائیں تو ان سے ہمارا کوئی تذکرہ کرنے کے بجائے ہمیں خط کے ذریعے مطلع کردے، ہم خود

ن کی خدمت میں حاضر ہوجائیں گے اور برسوں کی رنجش ر ہونے کی شکل نکل آئے گی۔ نواب نے ہامی بھرلی تھی لیکن وہ اپنی بات پر قائم نہ رہ سکا۔ ہمارے آنے کے چوتھے نچویں دن بعد ہی مولوی صاحب اس کی حویلی پہنچ گئے تھے۔ ن کے ساتھ کورا بھی تھی اور اب کے وہ حیدر آباد میں مستقل قیام کے عزم سے آئے تھے اور نواب کے توسط سے ر چھپانے کے لیے بساط بھر کسی مکان کی تلاش میں تھے۔ اب کی حویلی کے کسی حصے میں رہنے کی پیش کش انہوں نے سترد کردی تھی۔ نواب کے بہ قول وہ اس وقت خط لکھ کے جھے بمبئی سے بلا سکتا تھا اور اچانک مولوی صاحب کے سامنے پیش کرسکتا تھا مگر اسے مولوی صاحب کی ناراضگی کا اندیشہ ہوا۔ اس بدگمانی نے اس کے دل میں جگہ بنالی تھی کہ ہماری داستان میں کوئی پہلو ادھورا نہ ہو۔ مولوی صاحب اگر کسی سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتے تو وہ درمیان میں پڑنے والا کون ہے۔ بہتر تھا کہ کسی موقع پر کنایتاً وہ ان سے میرا ذکر کرکے دیکھے۔ اسے یہ بھی احساس تھا کہ مولوی صاحب کی غیرت اور خودداری آڑے آتی رہے گی۔ وہ کبھی کھل کے اس سے اپنا حال بیان نہیں کریں گے۔ ان کی مالی الجھنوں کے تدارک کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ ان کی جائداد انہیں واپس مل جائے۔ شاید اسی طرح زخموں کا کچھ اندمال ہوسکے۔ مولوی صاحب کو حویلی میں ٹھہرے ہوئے چوتھا دن تھا۔ ایک شام نواب کو موقع مل گیا۔ مولوی صاحب کسی حد تک مجتمع دکھائی دیتے تھے کہ نواب نے جھجکتے ہوئے میرا نام لیا۔

نواب کے کہنے کے مطابق میرا ذکر سن کے کہ میں ان کی جستجو میں نواب کے ہاں آیا ہوں، مولوی صاحب سناٹے میں آگئے تھے۔ نواب کا کہا ہوا ایک ایک لفظ میرے ذہن پر نقش تھا۔ اس نے بتایا کہ مولوی صاحب کی اس وقت کی کیفیت بیان کرنا اس کے لیے مشکل ہے۔ ان پر تو جمود طاری ہوگیا تھا۔ نواب کے دوبارہ ٹوکنے پر کہ آخر وہ خاموش کیوں ہیں؟ مولوی صاحب نے کوئی جواب دینے کے بجائے نواب سے پوچھا تھا کہ وہ مجھ سے کیسے واقف ہے؟ نواب نے ساری روداد بے کم وکاست دہرا دی تھی اور بتایا تھا کہ اتفاق کی بات ہے، مراد آباد شہر میں میری اور مولوی صاحب کی ملاقات نہ ہوسکی۔ مراد آباد سے ان کے جانے کے چند ہی دن بعد میں بھی وہاں پہنچا تھا۔ بڑی تگ ودو کے بعد مراد آباد کے مسافر خانے کے روزنامچے سے مجھے مولوی صاحب کا پتا معلوم ہوا۔ مولوی صاحب کے تجسس پر کہ ہم کس قماش کے لوگ ہیں، نواب نے انہیں ہماری طرف سے مطمئن کیا تھا اور ان کے بہ قول اس نے ہماری تعریف ہی کی تھی۔ مولوی صاحب نے اس سے پوچھا تھا کہ کیا وہ لوگ دوبارہ آنے کو کہہ گئے ہیں؟ نواب نے انہیں بتایا تھا کہ اب تک تو ہم بمبئی واپس چلے گئے ہوں گے کیونکہ اب عرصے سے میرا قیام بمبئی میں ہے۔ میرے ساتھ آنے والا شخص تو خاص بمبئی کا رہنے والا معلوم ہوتا تھا۔ نواب نے مولوی صاحب سے کہا تھا کہ ہمارا پتا اس کے پاس محفوظ ہے اور ہم التماس کرگئے ہیں کہ مولوی صاحب حیدر آباد آجائیں تو ازراہ نوازش ہمیں مطلع کردیا جائے۔ مولوی صاحب مبہوت بیٹھے رہے تھے۔ ان کے معنی خیز سکوت نے نواب کو نادیدہ بھی کیا تھا، مضطرب بھی۔ اس نے جسارت کی اور مولوی صاحب سے ہمارے بارے میں پوچھا کہ ہم کون لوگ ہیں اور کیا واقعی ہم سے تجدید تعلق مولوی صاحب کو گوارا نہیں؟ نواب نے ان سے ہماری سفارش بھی کی تھی کہ خطا انسان ہی سے ہوتی ہے۔ معافی کے لیے دل کھلا رکھنا چاہیے۔ نواب کے پند ونصائح کے جواب میں مولوی صاحب نے صرف اتنا کہا تھا کہ ہمارا پتا انہیں دے دیا جائے۔ مناسب ہوا تو کسی وقت ہم سے رابطہ کرلیا جائے گا۔ انہوں نے عذر کیا تھا کہ اس وقت ان کا دماغ کچھ حاضر نہیں ہے، گویا یہ ذکر انہیں ناپسند تھا۔ دماغ تو واقعی ان کا حاضر نہیں رہا ہوگا۔ اس کے بعد نواب کی طرف سے کچھ اور کہنے سننے کی کیا گنجائش رہ جاتی تھی۔ رات کے کھانے پر دونوں کی ملاقات ہوئی تو بھی مولوی صاحب نے ہمارا کوئی ذکر نہیں کیا نہ پتا حاصل کرنے کے لیے بے چینی ظاہر کی۔ کھانے کے بعد وہ کچھ وقت ادھر ادھر کی باتوں میں گزارتے تھے۔ اس رات مولوی صاحب جلد ہی خواب گاہ میں چلے گئے۔ اپنی کسی ادھوری کتاب کی تکمیل کا عذر کرکے دوسرے دن نواب اپنے ایک ہندو دوست کی شادی میں سکندر آباد گیا ہوا تھا، اس کی والدہ گھر ہی میں تھیں اور آرام کررہی تھیں۔ معمول میں رخنہ اندازی سے نواب کی والدہ کو زحمت ہوتی، کسی ملازم کے سامنے یہی دلیل سپر بنائے ہوئے مولوی صاحب کورا کے ساتھ چپ چپاتے خرم منزل سے رخصت ہوگئے تھے۔

سترہ اٹھارہ روز بعد دوسری بار جب میں اور پیرو نواب کے ہاں گئے تو اس نے یہ سارا احوال ہمیں بتایا۔ وہ بہت آرزدہ تھا کہ جانے اس کے کون سے ناروا نازیبا سلوک نے مولوی صاحب کو کبیدہ خاطر کردیا۔ وہ اس طرح گھر چھوڑ کر کیوں چلے گئے۔ دوبارہ مولوی صاحب کی آمد سے وہ قطعاً

ناامید ہوچکا تھا۔ مجھے یاد ہے' اس نے کہا تھا' جو اس طرح جاتے ہیں' وہ لوٹ کے نہیں آتے مگر نواب مولوی صاحب کے یوں اچانک گھر سے چلے جانے کی وجہ کچھ اور سمجھتا تھا۔ اس کے بہ قول اس نے ایک بار زنان خانے میں کورا کی جھلک دیکھ لی تھی۔ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا تھا لیکن اس کے چہرے کے بدلتے رنگ معترف تھے۔ کورا کو دیکھ کے اس کی آنکھیں خیرہ ہوگئی ہوں گی۔ بے شمار پری مثال ماہ جمال لڑکیوں کے بعد اس کی ماں کی نگاہیں بھی کورا پر ٹھہر گئی تھیں اور اس نے اپنے خوش رو' خوب خو فرزند کے لیے مولوی صاحب سے اپنی خواہش کا اظہار کردیا تھا۔ نواب کے لیے اپنے ہم حیثیت خاندانوں کی کیا کمی تھی۔ نوابوں کو خاندان اور خون وغیرہ کا بھی بہت خیال ہوتا ہے۔ ان کی نظروں میں تو صرف جاہ وحشمت والے ہی اصیل ہوتے ہیں' انہی کا خون سب سے اعلیٰ ہوتا ہے۔ نواب اور اس کی ماں سے مولوی صاحب کی حالت بھی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ روایت سے انحراف کی وجہ صرف کورا تھی۔ وہ ہے ہی ایسی۔ اس کا نظارہ تو کسی طلسم کے مانند ہے جو بھی اسے دیکھنے کا اسیر ہوجائے۔ جیسا کہ کہتے ہیں' اس کا مجسمہ بناتے ہوئے خدا کو بہت فرصت ہوگی۔ خدا نے اسے پھولوں سے' ریشم سے' کانچ سے اور شہد سے بنایا تھا۔

نواب اس گمان میں تھا کہ تعلق خاطر اور وضع ومروت کا معاملہ ہے۔ انکار کی جرات مولوی صاحب میں نہیں تھی اس لیے ان کے پاس فرار کے سوا کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔ پیرو نے نواب کے اس تاثر کی تردید نہیں کی تھی۔ اس کی والدہ نے کورا کو اپنی بہو بنانے کے لیے مولوی صاحب سے بات کی تھی تو یہ مراد نہیں تھی کہ ابھی اسی وقت یہ کام انجام پاجائے۔ مولوی صاحب کچھ مہلت لے سکتے تھے۔ ایسے موقعوں پر وسیوں بہانے تراش لیے جاتے ہیں۔ عقل مند کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ یہ میں جانتا تھا اور پیرو بھی جانتا تھا کہ مولوی صاحب کے اس طرح روپوش ہوجانے کا اصل سبب کیا ہے۔ ہم نے وہ گھر دیکھ لیا تھا جہاں مولوی صاحب کی بازیابی کا امکان تھا۔ وہ عینی شاہد تھے کہ میں نے بری نگاہ رکھنے' کورا پر دست درازی کرنے والے دو آدمیوں کا کلکتے میں دریائے ہگلی کے کنارے خون کردیا تھا۔

موٹر اندھیرا چیرتی ہوئی متوازن رفتار سے آگے جارہی تھی۔ تیز روشنیوں میں دور تک کا راستہ صاف ہوجاتا تھا۔ بہت کم تعداد میں مقابل سے آتی ہوئی موٹروں' بیل گاڑیوں اور سائیکل سواروں سے ہمارا سامنا ہوا اور ایک موٹر' دو لاریوں اور دو ٹرکوں کے سوا کسی گاڑی نے ہمیں عبور نہیں کیا۔

بٹھل اور نواب خاموش ہوگئے تھے۔ دونوں اپنے طور پر آنے والی ساعتوں کے خاکے بنا رہے ہوں جیسے جیسے منزل قریب آرہی تھی' میری رگوں میں سرسراتی چیونٹیاں بھی بڑھتی جاتی تھیں۔ کبھی ایسا لگ سب کچھ ایک خواب ہے' اس سے سوا اور اس کے نہیں۔ کبھی دل اتنے زور سے دھڑدھڑانے لگتا کہ سا لرز جاتا۔ نواب نے آگے بھی مولوی صاحب سے متعل بات نہیں کی۔ نواب کو معلوم تھا کہ ہماری آمد کی خبر مولوی صاحب کا کیا حال ہوا تھا' وہ بے دم ہوگئے تھے۔ ہی نے ہمیں بتایا تھا کہ انہوں نے کیسی سرد مہری و سے اسے جواب دیا تھا۔ نہ انہوں نے نواب سے حاصل کرنے میں کوئی دلچسپی ظاہر کی تھی۔ ایسی صور نواب کو مولوی صاحب کے رنج وبرہمی کی فکر کیوں ہے۔ اسے تو ہم سے زیادہ مولوی صاحب کا ہم د چاہیے۔ ممکن ہے' اس کے دماغ میں یہ آیا ہو کہ آمنا سامنا ہوجانے سے مولوی صاحب کے دل کا غبا جائے گا۔ مبادا نواب اس نیکی کا آرزو مند ہو کہ طرح دو عزیزوں کے درمیان برسوں کی تلخی ختم ہوسکت نواب کے کہنے کے مطابق مولوی صاحب نے ہماری سن کے کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ اصل بات تو وہ بھی سکتے تھے۔ میرے لیے کچھ الٹا سیدھا کہنے سے انہیں کے تجسس کی افزونی کا خدشہ ہوگا۔ شاید اسی لیے انہو خاموشی اختیار کی مگر اس خاموشی پر باریک بین نواب قرار آگیا۔ یقیناً اسے کچھ اور جاننے کی بے آرا چاہیے کہ کہیں کوئی اور گرہ تو نہیں؟ مولوی صاحب آ لوگوں کے ساتھ بالمشافہ ملاقات سے کیوں گریزاں میرے نام پر نواب کے بہ قول' مولوی صاحب کے چ رنگ کیوں بدل گیا تھا؟ نواب یہی پہیلی بوجھنے کے لیے مولوی صاحب کے پاس نہ لے جارہا ہو؟ اسے اندازہ مولوی صاحب اس کے سامنے زبان کھولیں گے نہ بتاپائیں گے۔ مولوی صاحب نے کورا کو نرجس بانو سے متعارف کرایا تھا۔ نکتہ سنج نواب کو نرجس با مولوی صاحب کی بیٹی کی نسبت پر بھی شبہ ہونا چاہیے نے ان دونوں میں مماثلتیں ضرور تلاش کی ہوں گی اد میں اس کے ذہن رسا کے انتشار میں اضافہ ہوا ہوگا۔ صاحب نے خرم منزل میں رہنے کے بجائے اتنی دور د

کیوں ترجیح دی ہے۔ اس کی ایک تو وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اتنے عرصے تک بستے اجڑتے' اجڑتے بستے انہیں تھک جاتا ہے۔ اب انہیں سکون کی بہت ضرورت ہوگی۔ دوسرے ایک اندیشہ تھا' کسی بھی وقت اچانک نواب کے گھر ہمارے آدھمکنے خطرہ بھی انہیں لاحق ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ ادھر نواب نے ہمیں لکھا ہو اور ادھر حفظ ماتقدم کے طور پر انہیں زمینوں والے ان پہنچادیا ہو۔ کسی طرح خرم منزل میں ان کی موجودگی کی بھنک یں مل گئی تو نہ جانے ہمارے سر میں کیا سودا سما جائے۔ پہلے میں ر پیرو آئے تھے۔ اب کے میرے حمایتیوں کی تعداد دگنی بھی سکتی ہے' کوئی بعید نہیں کہ ہم کیسا فیل مچائیں۔ ہماری طرف سے ی سوالوں کے مثبت جوابات کے بعد ہی نواب نے ہمیں مولوی صاحب کے پاس لے جانے کا فیصلہ کیا ہے نواب کی گزشتہ رات ر آج صبح کی یاوہ گوئی کا بھی یہی مقصد ہوسکتا ہے۔

ڈرائیور سے چوک ہوگئی۔ سامنے سے آنے والی لاری نے ڈرائیور کو موٹر ایک طرف کرنے پر مجبور کیا۔ سڑک کے کنارے گڑھا تھا۔ ڈرائیور نے کچھ زیادہ ہی احتیاط کی۔ تنے کنارے ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ گڑھے میں موٹر ور سے اچھلی مگر شکر ہے کہ نکل گئی' اس افتاد نے ہم سب کو زیروزبر کردیا۔ نواب' ڈرائیور پر خفا ہونے لگا کہ وہ کس خیال یں گم ہے۔ ایسی تیز روشنی میں اسے گڑھا کیوں دکھائی نہیں یا۔ نواب کی ملامت درست تھی۔ اس تاریک اور سنسان جگہ پر موٹر خراب ہونے سے کیسی پریشان ہوسکتی تھی۔ سب معمول ڈرائیور چپ رہا۔ نواب بھی بڑبڑاتا ہوا خاموش ہوگیا اور موٹر میں وہی جاں سوز سکوت گھن گھنانے لگا۔ بٹھل بھی گونگا بن گیا تھا۔ پہلے نہیں تو اب اسے کچھ تنکے بھونے چاہئیں تھے۔ نواب کی اس بے نیازی میں کیا اسے کوئی رمز محسوس نہیں ہورہی؟ اس کی آنکھیں تو اپنے ان دیکھے سے بھی غافل نہیں رہتیں لیکن اگر وہ کچھ معانی اخذ کررہا تھا تو میں بھلا کس طرح جان سکتا تھا۔ میں ہزار خود کو سمجھاتا کہ میری وحشت بے جواز ہے' اس سے کیا حاصل ہے۔ میرے لیے فی الحال ایک تماشائی کی طرح آنکھیں کھلی رکھنا ٹھیک ہے مگر بس چند لمحوں کی یکسوئی ہوتی تھی کہ سب کچھ گڈمڈ ہوکے رہ جاتا تھا۔ دو باتیں ساتھ تو نہیں ہوسکتیں۔ ایک ہی وقت میں آدمی تماشا ہو' تماشائی بھی۔ نواب کو کم از کم میرے موضوع پر اپنے علم میں اضافے کی طلب ہونی چاہیے تھی۔ میری تعلیم' شوق' معمولات وغیرہ۔ میرا دماغ جانے کہاں کہاں بھٹک رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر میں نے پیچھے مڑ کے ایک نظر نواب کو دیکھا۔ وہ پُرسکون تھا اور کسی سوچ میں گم۔ مجھے دیکھ کے وہ مسکرایا "ہنوز دلی دور است جناب!" وہ شوخی وشائستگی سے بولا۔

میں نے کچھ نہیں کہا۔ موٹر تیزی سے بھاگتی رہی۔ یکایک ایک خیال نے مجھے گنگ کردیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کورا نے' کورا ہی نے کسی ذریعے سے رابطہ کیا ہو کہ وہ کچھ چارہ گری کرے۔ مولوی صاحب ایک زمانے سے اسے آسرے میں رکھے ہوئے تھے۔ وہ اس سے میری گمشدگی' نادست یابی کی کیسی کیسی توجیہیں اور تاویلیں پیش کرتے رہے ہوں گے۔ کیا کیا فسانہ طرازیاں نہ کی ہوں گی۔ انہوں نے اس امید میں کہ وقت سب سے بڑا درماں ہے۔ ایک نہ ایک دن تو کورا کے نہاں خانے میں فروزاں آگ کمہلا ہی جائے گی لیکن انہیں بہت مایوسی ہوئی ہوگی۔ یہ آگ ہی تو اسے قائم رکھے ہوئے ہے۔ جس دن کورا کی ڈوری ٹوٹ گئی' اس دن کچھ بھی نہ رہے گا پھر مولوی صاحب دیواریں نوچا کھسوٹا کریں اور دیواروں کا لکھا ایسے نہیں مٹتا۔ حیدر آباد آنے کے شروع کے چند دن تو مولوی صاحب خرم منزل میں ضرور ٹھہرے رہے ہوں گے۔ اس درمیان نواب کی بہن' ماں اور اس کی معتمد کنیزوں' باندیوں سے مانوس ہونے کا کورا کو موقع ملا ہوگا۔ ان کی زبانی نواب کے ارادہ وعزم کی توانائی صائب دماغی اور صاحب دلی کے چرچے سن کے ہی اسے لب کشائی کا حوصلہ ہوا ہوگا۔ ہوسکتا ہے انہی میں سے کسی کے توسط سے اس نے نواب کو کچھ بتایا ہو۔ مزاجاً نواب اس راہ گیر کے مانند معلوم ہوتا ہے جو عجلت کے باوجود سڑک کی بھیڑ کے اندر جھانکے بغیر اپنی راہ نہیں لیتا۔ آتے ہی مولوی صاحب نے اس سے کسی الگ مکان کے بندوبست کے لیے اصرار کیا ہوگا اور حیدر آباد میں اس مرتبہ ان کی موجودگی یقینی بنانے کے لیے کسی مستقل مکان کا انتظام ہونے تک نواب نے انہیں اپنی زمینوں والے مکان میں منتقل کردیا مگر کورا! زمانے کے سردوگرم نے اسے اتنا شعور ضرور دیا ہوگا کہ وہ اپنے مربی ومحسن مولوی صاحب کے لیے زبان کھولنے سے پہلے عواقب پر اچھی طرح غور کرلے۔ مولوی صاحب ہی اس کی ایک پناہ تھے۔ اسے تو انہوں نے شہزادیوں کی طرح رکھا۔ ان کی حیثیت تو اس کے لیے کیسی ستون اور سائے کی رہی ہے۔ انہوں نے اسے اس کے طلب گار جانگ قبیلے کے سرگشتہ وسرکش عقیدہ زدگاں سے بچائے رکھا ہے۔ اس کی خاطر وہ دربدر پھرتے رہے۔ وہ ایک سیلانی آدمی تھے۔ اپنی چھوٹی سی دنیا میں مست وبے خود انہوں نے دنیا ہی اس کے

لیے ترک کردی۔ مولوی صاحب کو کہیں کورا کی اس نادانی کا علم ہوجائے تو وہ بالکل ٹوٹ جائیں گے۔ اب تک سب کچھ اسی لیے محفوظ رہا تھا کہ کورا نے ہونٹوں پر مہر لگا رکھی تھی ورنہ ایک بار حرفِ شکایت زبان پر لانے کا مطلب اپنا اختیار کھو دینا ہے۔ اس میں مولوی صاحب کے زیاں اور رسوائی کے پہلو تھے۔ کورا کو یہ نہیں کرنا تھا۔ وہ ایسا کر بھی نہیں سکتی تھی۔ کبھی قسمت نے یاوری کی تو مجھ تک پہنچنے کا وسیلہ ایک مولوی صاحب ہی ہوسکتے ہیں۔ چند دن کے اجنبی رفیقوں پر اتنا اعتماد کرلینا کوئی ہوش مندی نہیں۔ کورا نے یقیناً ایسا نہیں کیا ہوگا۔

نواب نے موٹر رکوادی اور ڈرائیور کو ڈکی سے فلاسک نکالنے کا حکم دیا۔ موٹر ایک دو منٹ کو ٹھہری تھی کہ چل پڑی۔ ابھی موٹر نے رفتار نہیں پکڑی تھی کہ پیچھے سے آتی ہوئی کسی موٹر کی وجہ سے ڈرائیور کو پھر کنارے ہونا پڑا۔ گزرنے والی موٹر کی رفتار بہت تیز تھی۔ فلاسک میں قہوہ خوب گرم تھا۔ بٹھل اور نواب چسکیاں لیتے رہے۔ میں نے چند گھونٹوں میں ختم کرلیا۔ نواب کے کہنے پر بٹھل نے دوسرا فنجان بھی لیا۔ "ہم قطب شاہی مزارات سے آگے نکل آئے ہیں۔" نواب نے سرگرمی سے کہا "کچھ دیر پہلے آپ کو دور ٹیلوں کے اردگرد ٹمٹماتی روشنیاں نظر آئی ہوں گی۔ سنا ہے' یہ چھوٹی سی بستی صدیوں سے آباد ہے۔" بٹھل ہوں ہاں کرتا رہا۔ نواب کہنے لگا۔ آگے حسین ساگر ہے اور اس کے بعد ہماری منزل۔ رات کے وقت موٹر کی یہی رفتار مناسب ہے۔ دن ہوتا تو شاید ہم اب تک پہنچ چکے ہوتے۔"

"پہنچ جائیں گے صاحب!" بٹھل نے اچٹتی آواز میں کہا "اپنے کو سویرے کی گاڑی نہیں پکڑنی ہے۔"

"ہاں' یہ بھی بجا ہے' بالکل درست!" نواب نے ہمکتے ہوئے کہا "کیا عرض کریں' چلتے چلتے ایک کے بعد ایک مسئلہ۔ ہمارا خیال تھا' پانچ بجے تک نکل جائیں گے۔ ان دنوں سورج بھی جلد غروب ہوجاتا ہے۔"

"آپ بولتے تو اگلے دن کا رکھ لیتے۔"

"ہم نے سوچا تھا' آپ سے گزارش کریں لیکن پھر یہ سوچ کر رہ گئے کہ آپ کو اپنے مقصد کی تکمیل کی بے چینی ہوگی۔"

"اپنے کو عادت پڑگئی ہے صاحب۔"

نواب کا چہرہ میرے سامنے نہیں تھا کہ کچھ اندازہ ہوسکتا۔ اس نے ایک آہ بلند کی اور جیسے کہیں کھو گیا۔

اچانک سڑک' ٹائروں کی رگڑ سے چیخ اٹھی۔ ڈرائیور نے زور سے بریک لگائے۔ سامنے سے آنے والی گاڑی نہ لالٹین تھی' نہ بیل کی گردن میں گھنٹی۔ ڈرائیور کو وقت پر دکھائی دے گئی ورنہ کوئی بھی حادثہ ہوسکتا تھا۔ نو برہم ہونے لگا پھر شاید ہماری موجودگی کے باعث یا احساس سے کہ ڈرائیور کی اتنی غلطی نہیں ہے' اس کی بتدریج دھیمی پڑگئی۔ گول کنڈے کے قلعے سے آگے ساگر تھا۔ نواب ہی جانتا تھا کہ اب کتنی دیر کا راستہ ہے۔ بہرحال ہر لمحے فاصلہ کم ہی ہو رہا تھا۔ مجھے اب بھی نہیں آرہا تھا کہ ہم اپنی منزل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ تو کے لیے میرے سینے میں دریا سا امڈتا تھا کہ میں اس احسان کا بدلہ کس طرح چکا سکوں گا۔ اس کے لیے تو سے دریافت کیا ہوا ابا جان کا خزانہ بھی ہیچ ہے۔ نواب معلوم کہ اس کا یہ عمل کس کو زندہ کرنے' زندگی بخش د کے مترادف ہے۔ مجھے سامنے دیکھ کے کورا کا کیا حال ہو اسے تو سکتہ ہوجائے گا اور خود میرا حال؟ میرے ہاتھ پاؤ ابھی سے پھولے جارہے تھے۔ میرا دل کہیں بند نہ ہوجا پھر تو کچھ بھی ہوجائے' کاش کچھ دیر کے لیے میرے حو معطل ہوسکتے۔ میں نے پوری کوشش کی کہ اپنے آپ سمیٹے' باندھے رکھوں مگر اپنے اختیار میں مجھ سے سوا نہ تھا۔ آدمی کو اتنی توفیق ہوا کرتی تو ہر آدمی اپنا حاکم' اپنا آپ ہوا کرتا۔ یہ تو رسیوں اور زنجیروں کے بس میں کبھی نہ کہ آدمی کا دل جکڑ سکیں' دماغ جکڑ سکیں۔

معاً جیسے کسی نے میری رگ وجاں میں سوئیاں پیوس کیں۔ یہ سامنے کی بات تو میرے دماغ سے اوجھل ہی ر تھی کہ مولوی صاحب' نواب کے گھر سے فرار ہونے کے! واپس کیوں آگئے؟ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے خود کو دیکھا کی ظاہر ہے انہوں نے کسی کو مطلع کیے بغیر گھر سے چلے جانے کوئی بڑی وجہ بیان کی ہوگی اور نواب نے اسے تسلیم کر ہوگا کہ اب تو وہ واپس آ ہی چکے ہیں۔ رفتہ گزشتہ نواب یہی شیوہ ہے۔ دلیل تو گذشتہ دنوں کے بجائے مولوی صاحب کو آنے والوں دنوں کی دینی تھی۔ جن اسباب نے نواب کی حویلی سے رخصت ہونے پر انہیں مجبور کیا تھا' وہ تو بدستو موجود تھے۔ انہیں یاد ہوگا کہ نواب کی والدہ نے اپنے اقبال مند فرزند کے لیے ایک عزت مندانہ پیش کش کی ہے۔ ادھر حیدر آباد میں دوبارہ نواب کے گھر جانے کی صورت میں کسی وقت میری آمد کا دھڑکا جوں کا توں قائم تھا۔ مولوی صاحب کی واپسی سے مراد پسپائی ہے۔ زوال آمادہ اعصاب شکستہ حالی اور زمانے کی نیرنگی کیسے کیسے سورماؤں سے کتنا بھاگ سکتا

ہے' کتنا زور کرسکتا ہے۔ کوئی توانا شخص اس طرح مراجعت پر آمادہ نہ ہوتا۔ ہر مراجعت ہزیمت نہیں ہوتی لیکن ہر ہزیمت کے لیے کوئی مفاہمت لازم ہے۔ مولوی صاحب نے بہت طویل سفر کیا تھا اور راستے کی طوالت' سفر کی طوالت نہیں ہے۔ سفر کی پیائش تو راستے کے پتھروں' اندھیروں سے ہونی چاہیے۔ انہوں نے جانے کتنی پناہ گاہیں آزمائی ہوں گی۔ لگتا ہے' نواب ہی کے ہاں انہیں کچھ امان نظر آئی۔ وہ نواب کے خاندان کی اصالت ونجابت سے اچھی طرح واقف تھے۔ میرے لیے سارے دروازے بند کردینے کے بعد انہیں کورا کے لیے بھی کچھ سوچنا تھا۔

میرا جسم پتھر کا ہوگیا۔

پھر نواب ثروت ہمیں مولوی صاحب کے پاس کیوں لے جارہا ہے۔ مولوی صاحب کی برہمی کے یقین کے باوجود۔ شاید مولوی صاحب نے ابھی ہامی نہ بھری ہو اور گومگو کی کیفیت سے دوچار نواب کو ہماری صورت میں امید کی کوئی کرن نظر آئی ہو۔ مولوی صاحب کی آمد پر نواب کے گھر والوں نے دوبارہ ان سے کورا کے لیے بات نہیں کی ہوگی۔ یہ آداب کے منافی ہے۔ کہتے ہیں' دشمنی میں بھی نوابوں کو آداب کی فکر رہتی ہے۔ مثبت یا منفی کوئی بھی جواب مولوی صاحب ہی پر واجب تھا اور واجب ہے۔ نواب نے مولوی صاحب کی آمد اور اپنے گھر ان کے قیام کو ان کی ہاں سے مشروط نہیں کیا ہوگا۔ دونوں طرف سے کسی عجلت کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ مولوی صاحب کی آمد بجائے خود ایک اقرار ہے لیکن خاموشی اقرار نہیں ہے۔ ان کی خاموشی پر نواب کے گھر والوں کو تحمل اور بردباری کی روش اختیار کرنی چاہیے کیونکہ مولوی صاحب کو نئے گھر میں بسنے اور نئے ماحول سے موافق ہونے کے لیے بجا طور پر ایک مہلت لازم ہے۔ ازروئے وضع' نواب نے ان کے لیے دیدۂ ودل فراش راہ کیے ہوں گے۔ یکسر معذرت... کی جرأت یقیناً مولوی صاحب میں نہ ہوگی' پھر انہیں نواب کے گھر کا رخ ہی نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ممکن ہے انہوں نے کچھ وقت طلب کیا ہو۔ یہ وقت طلبی رسم کے عین مطابق' مگر یہ پیش وپس کی علامت اور آدھے انکار کے مساوی ہے۔ نواب کے لیے یہ سبکی کی بات ہے' کشمکش ونزاع کی بھی۔ اس نیمے دروں' نیمے بروں رویے سے سینوں میں غبار اتر آتا ہے۔ رگوں میں خون چبھنے لگتا ہے۔ کہیں نواب مولوی صاحب کو آئینہ دکھانے اور ان کے ناگفتنی احوال کی آگہی کے لیے ہمیں چارہ تو نہیں بنا رہا! میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ جتنا میں سرا پکڑنے کی کوشش کرتا' میری آنکھیں اور الجھ جاتیں۔ مولوی صاحب کے اقرار کی صورت میں بھی ان کے روبرو پیش کرنے کی ایک معقول وجہ موجود ہے۔ اس سے مراد ان کی خوشنودی کا حصول ہے۔ یہ امر مولوی صاحب کے معاملات میں شمولیت اور ان کی ذات میں سنجیدگی کا مظہر ہے۔ نواب کی دانست میں مولوی صاحب کی برگشتگی بہت عارضی ہوگی۔ ہماری طرف سے معافی تلافی کے بعد وہ مآل کار نواب کا اقدام تحسین کی نگاہوں ہی سے دیکھیں گے۔ ان کی جائداد انہیں واپس مل جائے گی۔ ان کے بچھڑے ہوئے ان سے آملیں گے۔ یوں عرصے سے جاری ایک مشقِ ستم سے' اس تنگ وتند زندگی سے انہیں نجات مل جائے گی۔

مولوی صاحب کے انکار پر نواب کی دست برداری کے امکان کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ سامنے کورا کی جگہ کوئی اور ہوتا تو بات اور تھی اور مولوی صاحب واپس نہ آتے تو ٹھیک تھا۔ واپس آکے گویا خود انہوں نے مائل بہ اندمال زخم کھرچنے اور شعلہ پژمردہ کو ہوا دینے کا کام کیا ہے۔ نوابوں میں ضد کی خو بھی نہایت درجے کی ہوتی ہے۔ مولوی صاحب جیسے پست حال شخص کو یہ سرکشی زیب نہیں دیتی۔ ایک نواب کیا' کوئی اور سادہ شعار بھی اتنی آسانی سے دست بردار نہ ہوپاتا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے کورا کے ذکر پہ نواب کی دل گیری دیکھی تھی۔ اس کی کبیدہ خاطری کا اصل سبب مولوی صاحب کا اچانک چلا جانا نہیں تھا۔ مولوی صاحب جیسے لوگ بہت ارزاں ہیں' کوئی اور ملال اسے دل گرفتہ کیے ہوئے تھا۔ مولوی صاحب کی طرف سے مسلسل انتظار کا مرحلہ نواب کے لیے بہت اذیت ناک ہوسکتا ہے۔ ویسے یہ تاخیر بہ وجوہ بھی مناسب نہیں تھی۔ ریاست میں ایک سے ایک جید نواب موجود ہے۔ مولوی صاحب کو حیدر آباد میں بس جانے کے بعد اپنا حلقہ اثر اور دیگر نوابوں سے اثر ورسوخ بڑھانے کا موقع نہیں ملنا چاہیے تھا۔

اور مولوی صاحب کا یہ ہے کہ وہ صرف انکار کے مجاز ہیں' اقرار کے نہیں۔ نواب کو کچھ نہیں معلوم کہ مولوی صاحب کا اختیار بہ قدر امکاں ہے۔ یہ تو کلیتہً کورا پر منحصر ہے۔ آدمی کو زندگی کی درازی کی قدرت نہیں مگر خاتمے کی ضرور ہے۔ مولوی صاحب کو اس صداقت کا اچھی طرح عرفان ہوگا کہ انہوں نے کورا کی منشا سے جدا کوئی ایسا قدم اٹھایا تو کورا کو فیصلہ کرنے میں پل دو پل سے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ مولوی صاحب بس وقت طلب کرسکتے ہیں۔ اس توقع میں کہ نواب ہی نظرثانی اور حجت سے باز آجائے اور

اس توقع میں کہ ممکن ہے' خود کورا نواب کے گھر والوں کے شوق و اشتیاق' ان کے حسن سلوک سے متاثر ہو کے کبھی اپنی روش بدل لے۔ آخر کسی دن تو اس کے خوابوں میں دراڑ پڑے گی۔ مولوی صاحب کچھ اسی سراب میں مبتلا ہیں جبھی انہوں نے اسے مجھ سے دور رکھا ہے۔ مجھے تو اب شبہ ہو رہا تھا کہ مولوی صاحب سرے سے حیدر آباد سے گئے ہی نہیں تھے' نواب نے مجھ سے اور پیرو سے محض داستان سرائی کی تھی۔ مولوی صاحب کی طرف سے عائد کیا ہوا انتظار جب حد سے سوا ہو گیا تو اسے ہمارا خیال آیا۔

میں جانے کہاں کہاں سرگرداں تھا' نواب کے اس اعلان پر میں ہڑبڑا گیا کہ ہم نے حسین ساگر عبور کر لیا ہے۔ میں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ موٹر کی روشنی کے سوا باہر ہر سو اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ بینائی کا تعلق صرف آنکھوں سے نہیں' دماغ سے بھی ہے۔ مجھے کچھ نظر نہیں آیا تھا کہ موٹر کب حسین ساگر سے گزری اور اب وہاں سے کتنی دور آچکی ہے۔

"یوں سمجھیے کہ ہم نے منزل کا بڑا حصہ طے کر لیا ہے۔" نواب تمتماتی آواز میں بولا۔

"چھوٹا بھی نکل جائے گا۔" بٹھل نے غم زدہ لہجے میں کہا۔

نواب نے پوچھا کہ کھانے پینے کی خواہش ہو تو کوئی چیز ڈکی سے نکلوائی جائے' بٹھل نے منع کر دیا۔ نواب نے شاید تکلفاً کہا تھا' دوبارہ کچھ نہیں پوچھا۔

موٹر کچھ اور آگے آئی تھی کہ پھر جھٹکے لینے لگی۔ ڈرائیور نے اندر بیٹھے بیٹھے کسی طرح قابو پا لیا لیکن میل ڈیڑھ میل کی دوری پر پھر وہی نقص پیدا ہونے لگا۔ نواب جھنجلا گیا۔ ڈرائیور نے دوبارہ کوشش کی۔ اس بار وہ کامیاب نہیں ہوا۔ نتیجتاً اسے موٹر سڑک کے کنارے کھڑی کرنی پڑی۔ قریب میں ایستادہ درختوں پر آباد پرندے پھڑپھڑانے لگے۔ ڈرائیور بونٹ کھولے جانے کیا کیا آلات چھیڑتا رہا۔ کئی مرتبہ اندر آکے اس نے چابی گھمائی۔ انجن میں گھڑگھڑاہٹ ہوتی اور بند ہو جاتا۔ نواب کی بے موقع تلخی ڈرائیور کے ہاتھ پاؤں اور گڑبڑائے دے رہی تھی۔ سڑک کے آس پاس اونچے اور گھنے درختوں نے اندھیرا گہرا کر دیا تھا۔ دور دور تک کسی بستی کے آثار نہیں تھے۔ جھینگروں اور مینڈکوں کا الاپ کچھ دیر کے لیے ٹھہر گیا تھا پھر انہوں نے اپنا واویلا شروع کر دیا۔

ڈرائیور کو وقت لگ گیا۔ اس دوران میں دو ایک موٹریں تیزی سے گزر گئیں۔ کسی نے رک کے ہم سے استفسار نہیں کیا۔ ڈرائیور اپنے سے جتن کر رہا تھا کہ مخا[لف]
سمت سے آتی ہوئی ایک تیز رفتار موٹر ہم سے کچھ فاص[لے]
جا کے ٹھہر گئی اور ہماری طرف واپس آنے لگی۔ پچ[ھلی]
نشست پر ہندو مارواڑی سیٹھ قسم کا ایک فربہ اندام شخ[ص]
بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی' گھونگ[ھٹ]
کاڑھے' سکڑی سمٹی' کونے سے چپکی ہوئی سیٹھ نے
ہمارے پاس رکوا کے خرابی کا سبب جاننا چاہا۔ نواب نے
مہربانی پر اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا' بظاہر کوئی خاص با[ت]
معلوم نہیں ہوتی' وہ اپنا راستہ کھوٹا نہ کرے۔ پہلے بھی
طرح کا رخنہ پیدا ہو چکا ہے' ڈرائیور موٹر کے کام
شدبد رکھتا ہے' یقیناً درست کر لے گا۔ مارواڑی سیٹھ کی
آگے چلی گئی۔

ڈرائیور پسینے پسینے ہو گیا تھا۔ پہلی مرتبہ نواب
پریشان دکھائی دیا۔ ہم تینوں موٹر سے اتر آئے۔ بیٹھے
جسم اینٹھ گیا تھا۔ باہر آکے ہاتھ پاؤں کچھ کھلے۔ ٹھن[ڈی]
ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی لیکن سردی نہیں تھی۔ نواب
ڈکی سے ٹارچ نکالی اور اردگرد نظریں دوڑانے لگا "حس[ین]
ساگر سے ہم کتنی دور آگئے ہوں گے؟" نواب نے ترشی
پوچھا۔

ڈرائیور نے مسمسی آواز میں اسے بتایا کہ چھ سات
سے زیادہ نہیں ہوئے ہوں گے۔

نواب کی چہل قدمی اور بار بار ٹارچ جلا کے اطراف
درختوں پر روشنی کرنا اس کا ہیجان و اضطراب ظاہر کرتا
"نواب صاحب ماجد علی مجن کا باغ یہاں سے کتنی د[ور]
ہوگا؟" نواب نے ڈرائیور سے پوچھا۔

ڈرائیور نے تذبذب سے بتایا کہ زیادہ دور تو نہیں
چاہیے۔

نواب خاموش ہو گیا۔ ڈرائیور نے ایک بار پھر چ[ابی]
گھمائی۔ انجن بس جھرجھری سی لے کے رہ گیا۔ ڈرائیور
مایوس نہیں ہوا تھا۔ لگتا تھا' نواب ہمارے خیال سے
ٹھہرا ہوا ہے ورنہ ڈرائیور پر بری طرح گرجتا برستا۔ کچھ
وقت گزرنے پر موٹر کی درستی کی کوئی شکل نہ نکلی تو نواب
گیا۔ اس نے ڈرائیور کو جھڑکتے ہوئے کہا "آگ دکھا
اسے۔ مجن میاں کا باغ کہیں قریب ہی ہوگا۔ رات ہم
ویرانے میں تو نہیں بسر کر سکتے۔"

ڈرائیور نے سن لیا تھا لیکن آخری کوشش کے طو[ر پر]
اس نے موٹر کی کچھ اور رگیں ٹٹولیں' کریدیں اور
نشست پر بیٹھ کر پہلے بسم اللہ پڑھی اور چابی کو گردش دی۔

ناکام رہا' بکھرا ہوا سامان سمیٹنے' پیچ کسنے اور ہاتھ صاف کرنے میں اسے مزید دس منٹ لگ گئے ہوں گے۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا جیسے ساری خرابی اسی میں ہو اور وہی موٹر ہو۔ نوکر اور اشیا میں ویسے بھی اتنا فرق نہیں ہوتا۔

نواب بٹھل کے ساتھ موٹر کے اردگرد چکر لگاتا رہا۔ اس کے چہرے پر خجالت تھی۔ اس نے متردد لہجے میں بٹھل سے کہا کہ فاصلہ کچھ کم ہوتا تو حسین ساگر کی طرف لوٹ جانا بہتر ہوتا۔ وہاں شب بسری کا اچھا انتظام ہو سکتا تھا لیکن اتنی دور اندھیری رات میں پیدل سفر کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ ادھر اطراف میں ریاست کے نامی گرامی نواب' نواب مجن میاں کی وسیع عریض جاگیر کا سلسلہ ہے۔ زرعی زمین' سبزہ زار' چراگاہیں اور باغات وغیرہ۔ سڑک کے کنارے واقع باغ میں مجن میاں کی ایک کوٹھی بھی ہے۔ ریاست کے امراو رؤسا کے علاوہ مجن میاں کے خاندان کے افراد اور خاص احباب سیر و تفریح کی غرض سے یہاں قیام کرتے ہیں۔ امکان یہی ہے کہ زیادہ دور نہ جانا پڑے' ممکن ہے' میل سے کچھ کم یا کچھ زیادہ۔ نواب نے بٹھل کو اطمینان دلایا کہ مجن میاں سے اس کے اچھے مراسم ہیں۔ وہاں چند ملازم مستقل طور پر تعینات ہیں۔ کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ کوٹھی میں مہمان ٹھہرے ہوں تو بھی گنجائش کم نہیں۔ رات کسی طرح گزار لیں' صبح منزل تک پہنچنے کا کوئی نہ کوئی بندوبست ہو جائے گا۔ خود اس کی زمین بھی یہاں سے سات آٹھ میل کے فاصلے پر ہوگی۔ بٹھل سنتا رہا۔ وہ کیا رائے دے سکتا تھا۔ سر ہلا کے اس نے نواب کی تائید کی۔

نواب نے ڈرائیور کو ڈکی میں سے ضروری سامان کے دو ایک تھیلے اور بندوق نکالنے کی ہدایت کی۔ ڈرائیور ڈکی کھول کے سامان منتخب کرنے اور تھیلوں میں ڈالنے کے لیے باہر نکال رہا تھا کہ سامنے سے ایک موٹر کی روشنیاں دکھائی دیں۔ ڈرائیور کے ہاتھ رک گئے۔ اس نے استفہامی انداز سے نواب کو دیکھا۔ نواب نے اسے اپنا کام جاری رکھنے کا حکم دیا۔ ہمارے قریب آتے آتے موٹر کی رفتار سست ہو گئی۔ آنے والی موٹر میں سوار لوگوں کو ہم دور سے نظر آ رہے ہوں گے۔ ہم سے چند گز کے فاصلے پر سڑک سے ذرا ہٹ کے موٹر رک گئی اور بڑی روشنیاں بجھ گئیں۔ موٹر ٹھہرتے ہی جو شخص تیزی سے اترا' وہ ڈرائیور ہی ہو سکتا تھا۔ وضع قطع ہی شوفرانہ تھی۔ اس نے فکر مندی سے پوچھا "کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں" نواب کے لہجے سے بے زاری نمایاں تھی۔ "موٹر خراب ہو گئی ہے۔"

"کہاں جانا تھا آپ لوگاں کو؟"

"زیادہ دور نہیں" نواب نے تنک کے کہا "چلے جائیں گے ہم۔"

موٹر اتنی قریب نہیں تھی۔ اندھیرے میں پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے لوگ دکھائی نہیں دے رہی تھے۔ شاید ڈرائیور کے سوا اس میں کوئی نہیں تھا۔

"تمہارے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟" بٹھل نے گونجتی آواز میں پوچھا۔

"اپن کے ساتھ تھوڑا سامان ہے اور ..." ڈرائیور ہچکچا کے بولا اور اپنی بات قطع کر کے اس نے پھر سوال کیا کہ آخر ہمیں کس طرف جانا ہے؟

"ہماری فکر مت کرو" نواب نے دخل دیا "ہم چلے جائیں گے۔"

ایک شخص نے اپنا وقت ضائع کیا' ہماری خاطر موٹر روکی۔ اس کے سلوک کے جواب میں نواب کی یہ ناسپاسی بہت نازیبا تھی۔ یہ کوئی نخوت تھی تو یہاں اس کا کوئی موقع نہ تھا مگر نوابوں کے لیے نخوت کے وقت تھوڑی مقرر ہوتے ہیں۔ بٹھل نے نواب کی کجی پر توجہ نہیں کی اور ڈرائیور سے پوچھا "تم نے ادھری نواب مجن کا باغ دیکھا ہے؟"

ڈرائیور نے انکار میں سرہلایا۔

"کتنی دور ہے پھر ادھری سے؟"

حیدر آباد میں انکار اقرار میں سرہلانے کی علامت بالکل الٹی ہے۔ سارے ہندوستان سے جدا' اس خالص حیدر آبادی طریقے سے بٹھل کو بھی واقفیت تھی لیکن اسے دیر میں یاد آیا۔

"ہم تلاش کرلیں گے' جناب! ہمیں معلوم ہے" نواب نے بہ عجلت کہا "اور اب شاید ہم اس طرف جائیں ہی نہیں' ممکن ہے' ہم حسین ساگر واپس چلیں" نواب نے ڈرائیور کو اپنا سفر جاری رکھنے کی تلقین کی اور بٹھل کا بازو تھام کے شاید کوئی اشارہ کیا' بٹھل بھی چپ ہوگیا۔ ڈرائیور چند لمحے ٹھہرا رہا' پھر اپنی موٹر میں جا بیٹھا۔ اسے اب رکنا نہیں چاہیے تھا تاہم اس نے موٹر فوراً نہیں چلائی۔ نواب کے رویئے سے اسے رنج ہوا ہوگا۔ موٹر کی آواز آئی اور زن سے یہ جا وہ جا والا تیور اس کے غصے کا مظہر تھا۔ کچھ دور تک موٹر کی عقبی سرخ روشنیاں نظر آتی رہیں۔ آگے شاید کوئی موڑ تھا اس لیے روشنیاں جلد اوجھل ہوگئیں۔

نواب نے گہری سانس لی' اطمینان کی سانس اور متانت سے کہنے لگا "آپ سوچ رہے ہوں گے' اس صورت حال میں ہم نے یہ موقع کیوں کھو دیا؟"

"کچھ پلے پڑتا ہے صاحب!" بٹھل نے کہا۔

"اس علاقے میں طرح طرح کی داستانیں مشہور ہیں"

"آپ زیادہ جانتے ہو۔"

"ہاں" نواب سنجیدہ ہوگیا "اصل میں ہم اسے ا منزل کے بارے میں بتانا نہیں چاہتے تھے۔"

"اپنے کو کیا پتا تھا صاحب!"

"بے شک" جیسے کوئی سن نہ لے' نواب ادھر ادھر د ہوئے دھیمی آواز میں بولا "آپ نے تو سادہ دلی میں پوچھا آپ نے غور نہیں کیا" موٹر ہم سے ایک فاصلے پر روکی تھی اور بتدریج آہستہ ہوئی تھی۔ ہمارے پاس اس کا اچا رکنا فطری عمل ہوتا۔ اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کی اجازت سے ڈرائیور باہر آیا ہوگا۔ اندر کوئی موجود تھا تو اس ہمارے پاس آکے یا وہیں بیٹھے بیٹھے ہمارا احوال جاننے کی نہیں کی۔ کسی نے کھڑکی سے سر نکال کے باہر جھانکنے کی زحمت نہیں کی۔ ممکن ہے' یہ سب ہمارا واہمہ ہو' بہرحا ایسے اندھیرے اور سناٹے میں احتیاط ہی بہتر ہے۔ ہمیں ذرا دشواری تو ہوگی۔ امید ہے' گھنٹے بھر سے پہلے ہم نوا مجن میاں کے باغ تک پہنچ جائیں گے۔"

نواب کی دیدہ ریزی و نکتہ آفرینی پر جرح کی گنجائش تھ لیکن بٹھل نے سادگی سے کہا "ٹھیک ہے صاحب!"

اس دوران میں ڈرائیور اپنا کام کرتا رہا۔ اس نے مو مقفل کردی تھی اور سارا سامان اٹھالیا تھا۔ میں نے اس بوجھ ہلکا کرنے کا ارادہ کیا لیکن نواب کے خیال سے ملتو کردیا۔ کسی نواب کی ہم رکابی میں اطوار بھی نوابوں جیسے مناسب ہوتے ہیں۔

شروع میں ہماری رفتار سست تھی' بعد میں تیز ہوگئی۔ نواب ٹارچ جلا کے راستہ روشن کرتا جاتا تھا لیکن اب روشنی کی ایسی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اتنی دیر میں ہماری آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوگئی تھیں۔ آسمان پر ٹکڑوں ٹکڑوں میں بادل بکھرے ہوئے تھے اور دھندلی دھندلی چاندنی چاروں طرف بسی ہوئی تھی۔ سڑک کے دونوں جانب فاصلے فاصلے سے اونچے درختوں کی قطاریں کھڑی تھیں۔ ہوا بھی بہت ہلکی تھی۔

ہم نے فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ راستہ طے کیا ہوگا کہ نواب ٹھہر گیا اور چونک کر گھوم گھوم کے دیکھنے لگا "لیجیے' ہم نے خواہ مخواہ اتنا وقت ضائع کیا" وہ فرط حیرت سے بولا "یہ جو آپ فصیل جیسی دیوار دیکھ رہے ہیں' یہی نواب صاحب مجن میاں کا باغ ہے۔ ہم آپ سے عرض کر رہے تھے' کچھ ایسا دور نہیں ہونا چاہیے۔ یہ راستہ تو ہمارا خوب دیکھا بھالا ہے۔ تاریکی نے ہمیں بھٹکائے رکھا۔"

"اندھیرے اجالے کا کیا صاحب!" بٹھل نے تپی ہوئی آواز میں کہا "اجالا بھی دیدوں سے کم مستی نہیں کرتا۔ تھوڑا زیادہ ہو تو اندھا کردیتا ہے۔"

نواب نے شاید سنا نہیں۔ اسے خاص سڑک کے بائیں جانب والی سڑک پر جانے کی بے کلی تھی۔ باغ کی چار دیواری سی کے ساتھ تھی۔ نواب اسی طرف مڑ گیا۔ اتنی جلدی منزل مل جانے کی خوشی سے اس میں پھرتی آگئی تھی۔

باغ کا وسیع آہنی دروازہ بند تھا۔ نواب نے سلاخوں سے ٹارچ کی روشنی پھینکی تو اندر جاتی ہوئی کشادہ سڑک چمک اٹھی۔ پھلواری کے حاشیوں کے بیچ میں بنی ہوئی سڑک کچھ دور جاکے بل کھا گئی تھی۔ پھلواری کے پیچھے دونوں طرف درختوں کے جھنڈ تھے۔ نواب دروازے کے پاس جاکے کچھ پیچھے ہٹ گیا۔ اندر دروازے سے ملحق کمرا دربان کے لیے مخصوص ہوگا۔ نواب کے اشارے پر ڈرائیور نے بڑھ کے سلاخوں پر کسی چیز سے ضرب لگائی۔ لمحوں تک بازگشت گونجتی رہی۔ ڈرائیور نے پھر ہانک لگائی "کوئی ہے' دروازہ کھولو' دروازہ کھولو۔"

کئی مرتبہ کی تکرار کے بعد اندر سے ایک پختہ اور کھردری آواز آئی "کون ہے؟ آتا ہوں' آتا ہوں۔"

دوسرے منٹ بعد ایک ہاتھ میں لاٹھی' دوسرے میں لالٹین اٹھائے چادر میں لپٹا ایک اوسط قد کا شخص دائیں طرف سے برآمد ہوا۔ اس نے سلاخوں سے جھانک کے دیکھا۔ ڈرائیور نے سرگوشیانہ انداز میں اسے کچھ بتایا۔ دربان نے لالٹین اوپر کرکے جب تک فاصلے پر کھڑے ہوئے نواب کی موجودگی کا یقین نہیں کرلیا' دروازے کے قفل کی طرف ہاتھ دراز نہیں کیا "سرکار ہیں؟" اس نے متجسس آواز میں پوچھا۔

چند قدم بڑھ کے نواب حاکمانہ لہجے میں بولا "ہاں' ہم ہیں نبی خاں! دروازہ کھولو' آج رات ہم یہیں بسر کریں گے۔"

"آیئے' آیئے سرکار!" نواب کی آواز سن کے دربان نے جھک کے سلام کیا اور دروازے میں پڑا ہوا تالا کھول دیا۔

کوٹھی دروازے سے خاصی دور تھی۔ دربان کی لالٹین اور نواب کی ٹارچ کی مدد سے پانچ چھ منٹ میں ہم کوٹھی کے سامنے پہنچ گئے۔ وہ شہروں کی طرح لال اور سفید پتھروں پر مشتمل' قدیم وجدید طرز کی ایک دو منزلہ عمارت تھی۔ نہ اتنی مختصر نہ اتنی بڑی۔ عمارت کے آگے وسیع چبوترے کے پار اس کے نصف حصے کے برابر بارہ دری کی طرز کا متعدد ستونوں پر اٹھا ہوا دالان تھا۔ دالان کے پیچھے اصل عمارت تھی۔ نواب نے ابتدا ہی میں دربان سے معلوم کرلیا تھا کہ کوئی مہمان تو ٹھہرا ہوا نہیں ہے۔ مہمان ہوتا تب بھی ایک رات گزارنے کے لیے وہاں جگہ کی کوئی کمی نہیں تھی۔ چبوترے کے کونوں پر نصب کھمبوں کے چند ٹمٹماتے لیمپ روشن تھے۔ اندر دالان میں بھی لیمپ کی روشنی تھی۔ دروازے سے عمارت تک دربان ہمارے ساتھ ہی آیا اور راہ داری میں جمے ہوئے صوفوں پر ہمیں بٹھا کے چلا گیا۔ ہمیں بس سانس لینے کی مہلت ملی تھی کہ ایک سن رسیدہ اور دوسرا ادھیڑ عمر شخص سٹپٹاتے قدموں سے ہمارے پاس آئے۔ تسلیم و تعظیم کے بعد ایک نے اندر جاکے راہ داری کے کچھ اور لیمپ جلا دیے۔ عمارت میں بجلی نہیں تھی لیکن روشنی کا اچھا انتظام تھا۔ اندر دیوان خانے کی چھت میں شیشے جڑے ہوئے تھے۔ لگتا تھا' آسمان پر کندہ ستارے بہت نیچے آگئے ہوں۔ دیوان خانے کا ساز و سامان شاہانہ تھا۔ پردے' قالین' مجسمے' تصویریں' آئینے وغیرہ۔ یہ اشیا درمیان میں نہ ہوں تو آدمی' آدمی میں تمیز کیسے ہو۔ سن رسیدہ ملازم نے نواب سے پوچھا کہ وہ فرشی منزل میں شب بسری کرے گا یا بالائی منزل پر؟ نواب نے سوچنے میں ایک لمحے کا توقف نہیں کیا اور سر اٹھا کے بالائی منزل کی طرف اشارہ کیا۔ دیوان خانے کی صبح و شام صفائی کی جاتی ہوگی۔ صوفوں اور میزوں پر ذرا بھی گرد نہیں تھی۔ آئینے بھی دمک رہے تھے۔ بوڑھا ملازم ہمیں دیوان خانے میں بٹھا کے روشنیاں کرنے اور ہمارے آگے کی میز پر پانی کا جگ اور گلاس رکھنے میں سرگرم رہا' پھر مودبانہ کھڑا ہوگیا "بہت عرصے بعد آنا ہوا سرکار؟" اس کی جھر جھراتی ہوئی آواز میں حلاوت اور نفاست تھی۔ تخم تاثیر نہیں تو صحبت کا اثر بھی کم نہیں پڑتا۔

نواب نے بے نیازی سے کہا "ہاں قطبی میاں! عرصہ ہوگیا۔ مصروفیت زیادہ رہی۔"

"کھانے میں کیا لیجیے گا سرکار؟"

"کچھ نہیں' ہمارے پاس موجود ہے۔"

"جلدی تیار ہوجائے گا۔ مرغ' چاول یا کوئی اور چیز سرکار کو پسند ہو' سبزی' پراٹھے وغیرہ۔" قطبی میاں لکنت سے بولا۔

نواب نے استغنا سے کہا کہ وہ ڈرائیور سے سامان لے کے جلد از جلد کھانا لگانے کا اہتمام کرے' اچھے خدمت گار کا شعار کم سننا' کم بولنا بھی ہوتا ہے یا مالک کو کم زحمت کلام' کم زحمت سماعت دینا۔ پھر تو گونگے خدمت گار سب سے اعلیٰ ہونے چاہئیں۔ بوڑھا ملازم فوراً دیوان خانے سے نکل گیا۔ نواب کی پیروی میں ہم بالائی منزل پر آگئے۔ عمارت کے مختلف حصوں سے اسے خوب واقفیت تھی۔ ہرچند کہ ادھیڑ ملازم بھی رہ نمائی کے لیے پیش پیش تھا۔ بالائی منزل بھی آراستہ و پیراستہ تھی۔ نواب سیڑھیوں کے پاس پہلے کمرے میں داخل ہوگیا اور کہنے لگا کہ وہ ساتھ والے کمرے میں رہے گا۔ اگر میں اور بٹھل الگ الگ رہنا چاہیں تو تیسرا کمرا بھی کھلوایا جاسکتا ہے۔

بٹھل نے اچٹتی آواز میں کہا "سونا کدھری ہے صاحب!"

"کیوں' کیوں جناب!" نواب تعجب سے بولا "ابھی بہت رات باقی ہے۔"

"نکال دیں گے صاحب!"

"خدا ناخواستہ مزاج تو ناساز نہیں؟" نواب نے تشویش سے پوچھا۔

"پاس ہو تو صاحب سازی ناسازی بھی ہو۔"

نواب کو ہنسی آگئی "ہماری مراد ہے۔۔۔" اس نے خوش طبعی سے کہا "یہ نشیب و فراز' یہ حادثے تو زندگی کا حصہ ہیں۔ ایک رات کی بات ہے۔ کچھ آرام کرلیجیے گا تو صبح تر و تازگی رہے گی۔ یہ جگہ تو بنائی ہی گئی ہے آرام و سکون کے لیے۔ ادھر شہر میں تو زندگی روز بہ روز پیچیدہ ہوتی جارہی ہے۔ نواب صاحب مجن میاں نے یہاں آدمی کو فطرت کے قریب کردیا ہے۔ صبح یہاں کا منظر دیکھیے گا' دنیا ہی الگ ہے یہاں کی۔ پھول ہی پھول' رنگ برنگے اور سارے ہندوستان کے منتخب درخت۔ کسی گوشے میں جنگل کا نظارہ ہے تو کسی جگہ موسمی فصلوں کا سبزہ لہلہا رہا ہے۔ تاروں کی باڑھ کے اندر خاص خاص جنگلی جانور بھی ایک حصے میں رکھے گئے ہیں۔ گو ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ ایک قدرتی جھیل' ایک نہر بنائی گئی ہے جو بل کھاتی ہوئی سارے باغ سے گزرتی ہے۔ مچھلیوں کا تالاب' پیراکی کا تالاب' ٹینس کورٹ' بلیرڈ روم۔ تقریبات کے لیے نیچے کا وسیع ہال' بارہ دری اور صحن۔ چند برس پہلے یہاں ایک محفل سخن کا اہتمام ہوا تھا۔ پھر مجرے کی ایک محفل آراستہ ہوئی تھی۔ نواب صاحب مجن کا شعری ذوق خدا کی پناہ' سریلے بھی بے حد ہیں۔ کمال کا ستار بجاتے ہیں۔ یہ ان کی نوازش ہے کہ ان رت جگوں میں ہمیں یاد رکھتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو جنگل میں منگل کا سماں ہوتا ہے۔"

دیکھنے اور بولنے کی طرح کاش آدمی کو اپنے کان بند کرنے کا اختیار بھی ہوا کرتا۔ سماعت بھی کبھی کیسا جبر ہوتی ہے۔ نواب ذوق و شوق سے باغ کا احوال بتاتا رہا۔ میں اور بٹھل بہ ظاہر اچھے سامع ہونے کا ثبوت دیتے رہے' نواب کہنے لگا "باغ کی حدود میں جو چھوٹی پہاڑیاں اور ٹیلے تھے انہیں جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے۔ ان پر درخت لگا کے اور دل کش بنادیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نواب صاحب مجن میاں کے احباب یہاں آنے کے لیے' یوں کہیے کہ ہمہ وقت ہمہ دم پر تولتے رہتے ہیں۔ اب کوئی دو ایک برس سے حضرت نواب صاحب کی توجہ اس طرف کچھ کم ہوگئی ہے۔ دو برس پہلے بیگم صاحبہ اچھی بھلی تھیں' ایک رات بلاوا آگیا۔ نواب صاحب مجن میاں بجھ سے گئے بہرحال۔۔۔" نواب تاسف سے بولا "اندھیرے کی وجہ سے ممکن ہے' آپ کو احساس نہ ہوا ہو' یہ عمارت سڑک کی سطح سے خاصی اونچائی پر ہے۔ ہم نے اسی لیے بالائی منزل کو ترجیح دی ہے۔ یہاں سے باغ کے سحر انگیز مناظر کی نظارگی کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ اصل میں' صبح ہی آپ کو یہاں کی دل فریبی اور رنگا رنگی کا صحیح اندازہ ہوسکے گا۔"

"اپنے کو نکنا ہی کتنا ہے صاحب!" بٹھل نے بہت دیر بعد زبان کھولی۔

"جی! جی ہاں' یہ تو ہے" نواب کی آواز ڈھلک گئی "ہم سے بھول ہوجاتی ہے۔ بے شک آپ کا دل و دماغ تو کسی اور طرف مرکوز ہے۔ یک سوئی اور ذہنی فراغت ہی میں سب کچھ اچھا لگتا ہے۔ ہم تو اپنی دھن میں بس۔۔۔" وہ شرم ساری سے بولا "صرف ایک رات کی فصیل حائل ہے پھر۔۔۔"

نواب اٹھ گیا۔ اسے خیال آگیا تھا کہ اس نے ملازم قطبی میاں کو کھانا لگانے کا حکم جاری کیا ہے۔ وہ منہ ہاتھ دھونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد لمحوں تک میں اور بٹھل ایک دوسرے کا منہ تکا کیے۔ پھر بٹھل بھی اٹھ گیا۔ غسل خانہ کمرے سے پیوست تھا۔ نواب کے بہ قول کچھ تازہ دم ہوکے ہم کمرے میں واپس آئے تو قطبی میاں منتظر تھا۔ بالائی منزل ہی پر کھانے کا کمرا تھا۔ لیمپوں کی روشنی میں بلوریں میز جگمگا رہی تھی۔ کرسیاں بھی پھر شیشے کی ہونی چاہیے تھیں۔ وسط میں لٹکے ہوئے فانوس نے سارا کمرا منور کردیا تھا۔ کھڑکیوں پر ہلکے نیلے رنگ کے

ریشمی پردے سرسرا رہے تھے۔ ریشم' شیشے اور روشنی سے امارت کو خاص نسبت ہے۔ ادھیڑ ملازم' قطبی میاں کی معاونت کررہا تھا۔ کھانے کی چند ہی اقسام تھیں۔ نواب کو بھی بھوک نہیں معلوم ہوتی تھی' ہماری وجہ سے بیٹھ گیا تھا۔ قطبی میاں نے سارا کھانا بچ جانے پر دبے لفظوں میں حیرت ظاہر کی اور ناشتے کے لیے پوچھا "جو مناسب ہو' تیار کرلینا" نواب نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

نواب نے قہوے کی فرمائش کی تھی۔ قہوہ پی کے ہم کھانے کے کمرے سے باہر آگئے۔ بٹھل کو اس وقت جانے کیا سوجھی تھی۔ اس کے عمارت دیکھنے کے اشتیاق پر نواب کسی قدر جزبز ہوا تاہم ملائمت سے بولا "اس وقت کیا دیکھ پایئے گا۔ دن کی روشنی میں عمارت کے خال و خد کچھ نظر آسکیں گے" بٹھل بھی بچہ بن گیا تھا' کہنے لگا کہ صبح وقت ملے نہ ملے۔ نواب کو زحمت ہوگی۔ بہتر ہے' نواب آرام کرے اور کوئی حرج نہ ہو تو قطبی میاں کو ہدایت کردی جائے۔ قطبی میاں قریب ہی موجود تھا۔ اس نے بھی نواب کی تائید کی۔ بٹھل نے پھر ضد نہیں کی اور کہا جیسی منشا ہو۔ اس کی مراد کھانے کے بعد محض چہل قدمی سے ہے۔ نیچے صحن میں وہ کچھ وقت گزار لے گا۔ ظاہر ہے' نواب اور قطبی میاں کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ بٹھل نے منع بھی کیا لیکن نواب ہمارے ساتھ نیچے آگیا۔ ہم صحن کے چکر لگاتے رہے۔ سارا فرش سنگ مرمر کا بنا ہوا تھا۔ شبنم سے بھیگی ہوئی فضا میں سبزے' مٹی اور پھولوں کی ملی جلی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ رات کی رانی کی مہک سب پر غالب تھی۔ ایک ذرا چھیڑنے کی دیر تھی' نواب' نظام دکن کے خسروانہ مشاغل' محلات اور نوادر کے بارے میں رطب اللسان رہا۔ بٹھل نے دانستہ نواب کا شوق بیاں مہمیز کیا تھا۔ اس طرح کم از کم گھنٹا بھر تو گزر گیا ہوگا۔ گمان یہ ہورہا تھا کہ بہت رات ہوگئی ہے۔ ہم واپس کمرے میں پہنچے تو بارہ بجنے میں ابھی چند منٹ باقی تھے۔ نواب کو بھی نیند نہیں آرہی تھی۔ کمرے میں آکے وہ کچھ پریشان و مضطرب سا دکھائی دے رہا تھا۔ بار بار گھڑی دیکھتا لیکن آدمی کی مرضی پر وقت کہاں گھٹتا' بڑھتا ہے۔ اپنے کمرے میں جانے سے پہلے اس نے بٹھل سے معلوم کیا کہ طبیعت موزوں ہو تو کیوں نہ بازی جمائی جائے۔ بٹھل نے سرد آہ بھر کے کہا کہ اب کہاں' کسی زمانے میں صبح و شام کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ مہرے جب خواب میں نظر آنے لگے تو دل کچھ مضبوط کیا۔ اب تو بساط چھوٹے زمانہ ہوگیا۔ قطبی میاں نے پانی سے بھرا ہوا جگ اور گلاس میز پر رکھ دیے تھے۔ ہم سے رخصت کی اجازت لیتے ہوئے اس نے صبح کی بیداری اور ناشتے کے اہتمام کا وقت پوچھا۔ بٹھل نے سب نواب پر ڈال دیا۔ قطبی میاں دروازے سے نکلتے نکلتے لوٹ آیا۔ وہ یہ بتانا بھول گیا تھا کہ نیچے زینے کے پاس برکت نامی ادھیڑ ملازم ساری رات چوکسی کرتا رہے گا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو مسہری کے سرہانے لٹکی ہوئی ڈوری کھینچ لی جائے ورنہ ایک آواز پر وہ خدمت میں حاضر ہوجائے گا۔

نواب کا کمرا ہمارے کمرے سے جڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ دروازہ کھلا رکھے گا' کسی طرح کی الجھن ہو تو ذرا بھی تکلف نہ کیا جائے۔ بس ایک تھپکی بہت ہوگی۔ سفر میں اس کی نیند ایسی پختہ نہیں ہوتی' آہٹ پر آنکھ کھل جاتی ہے۔

"پکی نہ آتی ہو تو دھیان زیادہ رکھنا چاہیے صاحب!" بٹھل نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

ایک وقفہ استعجاب کے بعد نواب کے جسم میں لہر اٹھی "نہیں' نہیں" وہ کھل کھلاتے ہوئے کہا "آپ ہمارا خیال نہ کیجیے' ہمیں رات میں ویسے بھی کئی بار اٹھنے کی عادت ہے۔"

نواب خدا حافظ کہہ کے رخصت ہوگیا۔ کمرے کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ سبزے کی وجہ سے مچھروں اور کیڑے مکوڑوں کی افراط ہوگی اس لیے باریک تاروں کی جالیاں کھڑکیوں پر نصب کی گئی تھیں۔ بیچ میں سرہانے کے پاس رکھی ہوئی مختصر میز دونوں مسہریاں جدا کرتی تھی۔ لیمپ بھی اسی پر رکھا ہوا تھا۔ بٹھل نے روشنی کم کردی اور آہستگی سے بغل اور بازو کے درمیان لپٹی ہوئی پیٹی سے تمنچا نکال کے تکیے کے نیچے رکھ لیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ بستر پر کمر ٹکاتے ہی تمنچا چبھنے لگا تھا۔ ہمیں پیٹیاں بھی اتار دینی چاہیے تھیں لیکن پھر صبح نواب یا کسی ملازم کی موجودگی میں انہیں دوبارہ کسنا بھی ممکن ہوتا یا نہیں بٹھل نے شاید اسی وجہ سے نہیں چھیڑا۔ لیٹے لیٹے مجھے دروازے کی چٹخنی چڑھانے کا خیال آیا۔ دوبارہ اٹھا ہی نہیں جارہا تھا۔ آدمی چلتا پھرتا رہے تو جسم بندھا ہوا' کھنچا ہوا رہتا ہے۔ بستر پہ آکے تو جیسے سارا کچھ بکھر جاتا ہے مگر میں نے ہمت کی اور اٹھ کے چٹخنی چڑھادی۔

باہر سبزہ زار سے اٹھتا ہوا جھینگروں اور مینڈکوں کا شور کمرے میں گونج رہا تھا۔ یہ شور سناٹا اور گہرا کرتا ہے۔ بٹھل نے چادر تان لی۔ ہلکی ہلکی سردی ہونے لگی تھی۔ ابھی تو بہت رات باقی تھی۔ میں اپنے آپ کو تسلیاں دیتا رہا' اور بہت سی راتوں کی طرح کسی نہ کسی طرح یہ رات بھی گزر جائے گی۔

وقت کے پھیروں کے بغیر شاید کوئی کام مکمل نہیں

ہوتا۔ ہر کام میں کوئی نہ کوئی وقت ضرور لگتا ہے۔ تمنچے سے گولی نکلنے، زخم مندمل ہونے، پھول کھلنے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کا وقت، چاہے فاصلہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو، غاروں سے شہروں تک کا جتنا سفر ہے، دیکھا جائے تو وقت بچانے، وقت بڑھانے کے سوا کچھ نہیں۔ پہیے کی ایجاد سے بے شمار اوزار و آلات تک آدمی کا مقصد کسی نہ کسی طور وقت پر دست رس حاصل کرنا ہی رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہیے، زندگی محفوظ کرنا، زندگی بڑھانا۔ بجلی کے چولھے بن گئے، گیلی لکڑیوں پر پھونکیں مار مار کے کھانا پکانے میں اب وقت برباد نہیں ہوتا۔ بٹن دباتے ہی اندھیرا ہٹ جاتا ہے، بٹن گھماتے ہی دور دراز کی آوازیں سنی جاسکتی ہیں، جو کہا جارہا ہے، ادھر سات سمندر پار اسی دم سنا جارہا ہے۔ پہلے کے مقابلے میں آدمی کے روزمرہ کاموں میں وقت کی کھپت میں بے شک بڑی کمی ہوگئی ہے لیکن یہ محض کمی وبیشی کی بات ہے۔ وقت یکسر ختم نہیں ہوا اور شاید کبھی نہ ہو۔ بٹن دبانے اور گھمانے کے لیے ایک عرصہ حرکت بہرحال لازم ہے۔ موٹر، ریل گاڑی، ہوائی جہاز میں سفر کرنے اور اردگرد نت نئی اشیا کا انبار لگانے کی تدبیر سے وہ جادوئی چراغ اور چھڑی والی بات پھر بھی پیدا نہیں ہوتی جو آدمی کو پلک جھپکتے میں سات دروازوں پار پہنچادے۔ آدمی کو اپنے کسی بچھڑے ہوئے سے ملادے یا اس کا پتا ہی بتادے۔ آدمی روشنیوں کا کیسا ہی ہجوم کرلے، رات رات ہی رہتی ہے اور اپنی گردش کے بعد ہی تمام ہوتی ہے۔ کوئی مشین ایسی نہیں بنی جو انتظار ختم کردے۔ انتظار میں کمی کے اسباب بہت ہوگئے ہیں لیکن انتظار تو موجود ہے۔

اور آدمی کتنا ہی وقت پر قادر ہوجائے، احساس، خواب اور خیال اس کے قابو میں نہیں آئیں گے۔ ان کی رفتار کا وہ ساتھ نہیں دے پائے گا۔ خیال کا کوئی موسم طے نہیں ہے، احساس کا کوئی وقت طے نہیں ہے۔ کاش ایسا ہوا کرتا کہ ادھر خیال آیا، ادھر ارادہ کیا، ادھر کام ہوگیا۔ جب تک آدمی، خیال، یاد اور غم جیسے معاملات پر گرفت حاصل نہیں کرلیتا، سب کچھ بے کار ہے۔ آدمی خود مشین بن جائے تبھی یہ ممکن ہوسکے گا۔

وقت سے آدمی کو کہیں مفر نہیں۔ وقت ہی سب سے بڑا عذاب، سب سے بڑی جاں کنی ہے۔ آدمی کی جانے کتنی زندگی اسی کے ہیر پھیر میں گزر جاتی ہے۔ جانے کب سے آدمی وقت سے نبرد آزما ہے۔ جو زیادہ سے زیادہ وقت پر قدرت رکھتا ہے، وہی سب سے امیر ہے، جسے زخم مندمل ہونے اور نقش مٹانے کے مراحل سے نجات مل جائے بادشاہ ہوجائے۔ اصل میں پیسہ کمانے سے مراد بھی وقت درازی ہے۔ مال وزر تو ظاہری علامتیں ہیں۔ آدمی کا سے بڑا سرمایہ ہی وقت ہے۔ آدمی زیادہ سرمائے سے وقت خریدتا ہے۔ کس طرح محدود وقت میں تیز زندگی گز جائے اور زیادہ سے زیادہ آسودگی حاصل کی جائے۔ آدمی پاس بے حد وحساب وقت ہوتا تو اسے اتنی تگ ودو کی ضرورت تھی۔ آنے والے زمانے میں چیزیں اور بھی جائیں گی۔ آدمی وقت کو اور کھینچ تان لے گا۔ بند گو عددی اعتبار سے یہی رہیں گے، ان کی قدر کچھ اور ف ہوجائے گی۔ بیتے ہوئے دنوں کے مقابلے میں ساٹھ ، معین زندگی میں آدمی کو زیادہ دیکھنے، سننے اور برتنے کا ملے گا، دگنا، تگنا، چوگنا، دس گنا لیکن وقت کے پیمانے بھی یہیں رہیں گے، پیمانے ٹوٹ نہیں جائیں گے۔ را پھر بھی رات رہے گی۔ لوگ تو پھر بھی روٹھتے بچھڑتے گے۔ بجلیاں آشیانوں سے گریزاں نہیں ہوجائیں گی۔ ز جتنی تیز رفتار ہوجائے گی، احساس بھی اتنا شدید ہوجائے زندگی جتنی سہل ہوجائے گی، انتظار اتنا ہی اذیت نا ہوجائے گا۔

"کیا ٹائم ہوا ہے رے؟" میں کہاں کہاں کے تا بانے ملا رہا تھا، خود کو تھپکیاں دینے کے لیے طرح طرح جواز تراش رہا تھا کہ بٹھل کی سرگوشی پر اچھل پڑا۔ اسے نہیں آرہی تھی۔ لیمپ کی روشنی بڑھا کے میں نے گھ دیکھی۔ ڈیڑھ بج رہا تھا۔ صبح ہونے میں ابھی کئی گھنٹے تھے۔ نے بٹھل کو بتایا تو وہ ایک لمبی سانس کھینچ کے رہ گیا۔

میں اس سے معلوم کرنا چاہتا تھا لیکن دماغ میں مربوط ہی نہیں ہو رہے تھے۔ نواب کا کمرا ملحق تھا۔ ہمار پھوسیاں شاید نامناسب ہوتیں اور مجھے جاننا بھی کیا تھا۔ طرح رات کا پہاڑ اسے بھی عبور کرنا تھا۔ ہم دونوں جیسے دوسرے سے کچھ چھپائے ہوئے بستر پر بھٹکتے رہے۔

کوئی گھنٹا بھر کے قریب گھڑی نے فاصلہ اور طے ہوگا۔ یکایک مجھے ایسا لگا کہ کمرے کے باہر راہ داری میں گزرا ہو، ایک ساتھ کئی قدموں کی سرسراہٹ۔ میری سا توانائیاں کانوں میں سمٹ آئیں۔ دروازے کے پار کوئی بھی ہوا تھا۔ کسی نے شسکاری سی بھری ہو، پھر خاموشی گئی۔ ذہن کی ابتری میں کبھی اپنے سائے پر بھی شبہ ہوتا میں نے اپنا واہمہ سمجھ کے درگزر کرنا چاہا۔ مجھے یقین تھا، تصدیق کے لیے میں نے کروٹ بدل کے بٹھل کی طر دیکھا۔ وہ بستر پر بیٹھا ہوا تھا۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے اس نے منہ پر انگلی رکھ کے خاموشی کی تاکید کی۔ بٹھل نے جیب سے چاقو نکال لیا تھا۔ میں یک لخت بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ باہر یقیناً کوئی موجود تھا۔ دوسرے لمحے آہستہ سے کسی نے دستک دی، ہم نے دوسری دستک کا انتظار کیا۔ اسی اثنا میں بٹھل مسہری سے اٹھ کے دبے قدموں چلتا ہوا دروازے کے پاس جا کے ٹھہر گیا۔ دستک دوبارہ گونجی۔

"کون ہے؟" بٹھل نے زیرلبی سے پوچھا۔

"دروازہ کھولیے سرکار!" کسی نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا ہے؟" بٹھل نے تنک کے پوچھا۔

"خطرہ ہے سرکار!" باہر سے وہی سہمی ہوئی آواز گونجی "میں، میں برکت ہوں۔"

"نیچے جو ملازم چوکسی دے رہا تھا، قطبی میاں نے اس کا نام برکت ہی بتایا تھا، بٹھل بے پروائی سے بولا "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، سن لیا ہے۔"

بستر کے بائیں ہاتھ پر جو الماری ہے، اس سے تہ خانے کو رستہ جاتا ہے۔ آپ لوگاں ادھر چلے جائیں تو اچھا ہے، جلدی کریں صاحب! آپ کو مشکل ہو تو خادم اندر آکے بتائے" برکت نے ٹھٹکی ہوئی آواز میں بہ عجلت تمام کہا۔

ابھی وہ تلقین کر رہا تھا کہ دروازے سے کچھ دور کھڑکی پر چرچراہٹ سی ابھری۔ چند ثانیوں بعد میری سمجھ میں آیا کہ انہوں نے تاروں کی جالی کاٹ دی ہے، دوسرے لمحے کھڑکی کے پٹ دھڑ سے کھلے، پردہ لکڑی سمیت زمین پر آرہا۔ جتنی دیر میں، میں لپک کے کھڑکی تک پہنچتا۔ ڈھاٹے باندھے ہوئے دو آدمی آناً فاناً اندر کود چکے تھے۔ ان کے کندھوں پر بندوقیں لٹکی ہوئی تھیں اور پلک جھپکتے میں انہوں نے اپنے ہاتھوں میں دبے چاقو کھول لیے تھے۔ میں ان کے سامنے پہنچ چکا تھا لیکن سنبھل کے مجھے ان پر جھپٹنے کا موقع نہیں ملا۔ کھڑکی سے کودنے کے بعد میری طرف بڑھنے کا وقت ان کے پاس تھا۔ میں نے طرح دے کے ان کی گرفت سے نکل جانے کی کوشش کی مگر فوراً ہی ان کے پیچھے دو اور آدمی کھڑکی سے کود پڑے۔ انہیں دیکھ کے میں کسی قدر متردد ہوا، بدحواس بھی۔ یہ ناگہانی کچھ میری عقل میں نہیں آرہی تھی۔ دونوں نے مجھے بازوؤں سے جکڑ لیا۔ ادھر بٹھل نے میری مدد کرنے کے بجائے دروازے کی چٹخنی کھول دی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی تین آدمی پاگلوں کی طرح گھس آئے۔ بٹھل آڑ میں ہوگیا تھا۔ انہیں اندازہ تھا کہ دروازہ کھولنے والا اسی فطری حرکت کا مرتکب ہوگا چنانچہ انہوں نے تیزی سے پلٹ کے بٹھل پر بندوق تان لی۔ بٹھل نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔

اندر کمرے میں آنے والوں کی تعداد سات ہوگئی تھی۔ وہ سب کے سب مسلح تھے۔ ان کے علاوہ باہر بھی ان کے کچھ اور آدمی ہوں گے۔ ان کے جسم گٹھے ہوئے تھے اور بازوؤں میں پھرتی تھی۔ ڈھاٹوں کی وجہ سے ان کی آنکھیں اور پیشانی کا کچھ ہی حصہ نظر آرہا تھا۔ وضع قطع سے وہ شوریدہ سر ڈاکو اور لٹیرے ہی لگتے تھے۔ کچھ اس طرح کے آدمی، جنہوں نے ابا جان کی حویلی پر یلغار کی تھی، اور کانتے جن کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔

برکت کا دروازے پر آنا شعبدہ کاری تھی۔ وہ برکت ہو بھی نہیں سکتا۔ اس سے تو نچلی منزل پر سب سے پہلے ان کی مڈبھیڑ ہوئی ہوگی۔ اوپری منزل پر دروازے سے کچھ دور ہی کھڑکی تھی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ اسی منزل پر برکت ہمیں متنبہ کر رہا ہو اور وہیں موجود ان وحشیوں کی آنکھوں اور کانوں سے اوجھل رہا ہو۔ انہیں تو پہلے دروازے ہی کا رخ کرنا چاہیے تھا۔ ساتھ ہی انہوں نے محض دروازے پر اکتفا نہیں کیا۔ دروازے پر دستک دینے کا مطلب ہماری توجہ منتشر کرنا تھا کہ ادھر ہم برکت سے الجھے ہوئے ہوں، ادھر انہیں کھڑکی کے ذریعے کمرے میں داخل ہونے کے لیے زور آزمائی کی مہلت مل سکے، اور کیا معلوم ہم برکت کا نام سن کے دروازہ کھول ہی دیں۔ کھڑکی کی چٹخنی پہلے سے کھلی ہوئی تھی یا وہ اتنی کم زور تھی کہ ایک جھٹکے سے اکھڑ گئی۔ جس وقت میں نے دروازے کی چٹخنی چڑھائی تھی، میں کھڑکیاں بھی دیکھ لیتا تو شاید اندر گھس آنے میں وہ اتنی جلد کامیاب نہ ہوتے۔ کھڑکیوں پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ مجھے اس کا خیال ہی نہیں رہا۔ بہرحال اب اس پچھتاوے اور سوچ بچار کا کیا محل تھا۔ وہ اندر آچکے تھے۔ کھڑکی سے ان کے داخل ہونے پر بٹھل کو دروازہ کھول ہی دینا تھا۔ کچھ اسی طرح ان کی وحشت کم ہوسکتی تھی۔

بندوقیں کندھے سے اتار کے انہوں نے بٹھل کے آگے کردی تھیں اور یوں اسے بے دست وپا بنادیا تھا۔ مجھے پہلے ہی دو آدمیوں نے باندھ رکھا تھا۔ میں نے اول اول ذرا سی مزاحمت کی تھی، پھر بٹھل کو دیکھ کے بازو ڈال دیے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے حقارت سے بستر کی جانب دھکا دے کے مجھے چھوڑ دیا۔ میں فرش پر کمر کے بل گرتے گرتے بچا۔ کمر میں دائیں طرف مسہری کا پایہ لگا تھا۔ ذرا ترچھا رہا ورنہ میں بے حال ہوجاتا۔ بٹھل کو بھی انہوں نے اشارے

سے میرے پاس کھڑے ہوجانے کا حکم دیا۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں تمنچا بھی تھا۔ دو آدمیوں کے سوا باقی نے بندوقیں کندھے پر ڈال لیں۔ "اپن جو بولتے ہیں' اس کو کان کھول کے سنو' اپن کو مال چاہیے" ایک بھاری بھرکم اوسط قد آدمی آگے آکے درشتی سے بولا۔

"کیسا مال؟" بٹھل نے ناگواری سے پوچھا۔

"اپن سے زیادہ چکری نہیں چلے گا' سمجھا! جتنا مال ہے' ادھر سیدھی طرح سے آگے کردو۔"

"تم کو دھوکا ہوا ہے" بٹھل نے نرمی سے کہا "ہم مسافر لوگ ہیں۔"

"ادھر سارے مسافر لوگاں ہی حرام خوریاں کو آتے ہیں" وہی آدمی جھڑکتے ہوئے انداز میں بولا "سور کی چربی بہت پسند ہے نا تم لوگاں کو؟"

"پہلے ہماری بات سن لو" بٹھل نے تحمل سے کہا "راستے میں موٹر خراب ہونے سے رات بھر کے لیے ہم کو ادھری ٹھہرنا پڑا ہے۔ اپنے پلے کچھ نہیں ہے بھلے مانسو!"

"ایہہ! اپن کو زیادہ بولنا آتا ہے نہ سننا" وہ ان کا سرغنہ ہی ہوگا جو بٹھل سے مخاطب تھا۔ اس نے چند قدم بڑھ کے بٹھل کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا اور جھٹکے دینے لگا۔ بٹھل سیدھا کھڑا رہا۔ اسے بٹھل کی سردمہری پر اور طیش آیا۔ گریبان سے ہاتھ ہٹا کے اس نے پانچوں انگلیاں پھیلا ئیں اور بٹھل کے منہ پر زور سے پنجہ مارا۔ بٹھل کے پاؤں زمین پر جمے رہنے سے سرغنہ کو ضرور تعجب ہوا ہوگا۔

اپنے سامنے کھڑے ہوئے دو آدمیوں کی پروا نہ کرتے ہوئے میں جست بھر کے سرغنہ کی طرف جھپٹا۔ میری آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ میں اس کا منہ نوچ لیتا کہ پیچھے سے کسی نے میری کمر پر بندوق کی بٹ ماری' ضرب اتنی شدید تھی کہ سارے جسم میں درد ابلنے لگا تھا۔ پھر بھی میں فرش سے اٹھ کھڑا ہوا لیکن انہوں نے فوراً مجھے قابو میں کرکے میرے بازوؤں میں قینچی ڈال دی اور کنپٹیوں پر مکے مارنے لگے۔ انہوں نے اپنے پیروں سے بھی میرے پیر کچلنے کے لیے ضربیں لگائیں۔

"ٹھہر کے رے!" بٹھل نے منہ بنا کے مجھ سے کہا اور سرغنہ سے بولا "تم کو جو چاہیے' آپ تلاشی لے لو' اپنے پاس تو اپنے سوائے کچھ نہیں ہے۔ جو جیب میں دھرا ہے' بولو تو اسی کو الٹ دیں۔"

"اس کو بھی دیکھیں گے' پہلے اصلی مال جدھر کو چھپایا ہے' وہ ہم کو بولو' تھوڑے دن دنیا میں ابھی اور مستی کرنا ہے تو مال اپن کو دے دو۔"

"مال کے بنا مستی کدھری ہوتی ہے سردار!"

"کیا! کیا بولا تم؟" سرغنہ بھن بھنا گیا۔ جیسے ہی اس کی سمجھ میں بٹھل کی بات آئی' اس کے منہ سے مغلظات جاری ہو گئیں۔

"ذرا ٹھنڈے ہو کے سردار!"

سرغنہ کا پارا اور چڑھ گیا۔ اس نے بٹھل کو مزید کچھ کہنے' صبر و سکون کی درخواست کرنے کی اجازت نہیں دی۔ زمین پر پیر پٹخ کے اس نے اپنی ہی ماں کو گالی دی اور کہنے لگا "تم لوگاں سمجھتے ہو' اپن ایسے ہی۔۔۔ ادھر کو آگئے ہیں۔"

"اپنے کو یہی لگتا ہے۔ ضرور تمہارے سے کسی نے مسخری کی ہے۔ ہم کوئی بیوپاری' نواب لوگ نہیں ہیں بادشاہ سلامت۔"

"یہ لوگاں ایسے نکو مانیں گے" سرغنہ کی آواز شدت غضب سے بھرانے لگی۔ اس نے پلٹ کے ایک نظر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ وہ اس کے پیچھے پر تولے' اشارے کے منتظر کھڑے تھے۔ دو نے مجھے تھام رکھا تھا' دو بند دروازے کے دائیں بائیں موجود تھے۔ سرغنہ نے ہاتھ کھینچ کے پوری طاقت سے بٹھل کو طمانچہ مارا۔ وہ مرکھنا سانڈ یقیناً کوئی پاگل شخص معلوم ہوتا تھا' لگتا تھا' جیسے اسے ہم سے کوئی بیر ہو۔ بٹھل کی وجہ سے میں نے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے تھے۔۔۔ اسے پہلے ہی جان لینا چاہیے تھا کہ وہ کس درجے کے لوگ ہیں۔ طمانچہ کھا کے بھی بٹھل نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ اس نے منتشر ہاتھوں سے کرتے اور اندر پہنی ہوئی صدری کی جیبیں ٹٹولیں اور ریزگاری سمیت نوٹوں کی گڈی نکال کے سرغنہ کے پیروں میں ڈال دی۔ "اپنے پاس جو کچھ ہے' تمہارے آگے کردیا ہے۔" بٹھل نے بھنچی ہوئی آواز میں کہا۔

سرغنہ کا پھڑکتا ہوا جسم ایک لحظے کے لیے ساکت ہوا پھر ایک دم اس نے ٹھوکر مار کے گڈی پیروں سے دور پھینک دی اور فرش پر تھوک کے بولا "اپن کو الو کا پٹھا سمجھتا ہے کیا؟"

میری رگوں میں خون کھول رہا تھا۔ بہت ہوگیا تھا' بٹھل کو ان سے کسی شرافت اور گداز کی توقع تھی تو اب دماغ سے جھٹک دینی چاہیے تھی۔ میرا شبہ تو کچھ یقین میں بدلتا جارہا تھا۔ یہ وہی لوگ نہ ہوں جنہیں گزشتہ مرتبہ نوابوں نے ہیروں کے سراغ میں ابا جان کی حویلی سر کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ہم بھی اس وقت گنتی میں کم نہیں تھے۔ نسبت کے مطابق ہی ان کی تعداد تھی۔ اگر یہ وہی لوگ ہیں تو مجھے اور بٹھل کو پہچان گئے ہوں گے۔ اس رات کی ناکامی اور شرمندگی کا صدمہ یہ زندگی بھر نہیں بھول سکتے۔ دوسری بار انہیں اتنا ہی مستعد اور وحشی ہونا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہزار احتیاط کے باوجود ہم ان کی نظروں کی زد پر رہے۔ ہمارا تعاقب کرتے کرتے آخر وہ یہاں تک پہنچ گئے۔ ممکن ہے' اس بار ان کی ڈوریاں نواب ثروت یار ہی کے ہاتھ میں ہوں' وہی اس لالہ زار ویرانے میں ہمیں کھینچ کے لایا ہو۔ شب بخیر کہتے وقت نواب نے کہا تھا کہ سفر میں اسے ٹھیک طرح سے نیند نہیں آتی۔ بار بار وہ اٹھ جاتا ہے' ذرا سی آہٹ پر آنکھ کھل جاتی ہے مگر اتنی دھماچوکڑی کے باوجود اب تک اس کی آنکھ کیوں نہیں کھلی؟ تانے بانے میں کوئی جھول نہیں ہے۔ میرا جسم اینٹھنے لگا تھا۔ سینے میں یہ وہم مسلسل پیوست ہوا جاتا تھا کہ کہیں وہ نواب ثروت یار ہی نہ ہو۔ نواب ذہن کا بڑا خلاق ہے۔ قماربازوں جیسی کچھ اس کی خو ہے۔ بہرحال اگر وہ نواب ثروت ہی ہے تو کیا فرق پڑتا ہے اور اگر وہ نہیں ہے تو اس جیسے کسی دوسرے نواب نے کرائے کے ان جنگلیوں کو ہماری طرف ہنکایا ہوگا۔ ہمیں تو کسی طور اس ناگہانی سے چھٹکارا حاصل کرنا تھا۔ میں نے خود کو باور کرانے کی کوشش کی کہ کسی بدگمانی پر آزردہ و کبیدہ ہونے کا یہ وقت نہیں ہے۔ صورت حال بھانپ کے نواب کہیں چھپ نہ گیا ہو۔ درپردہ وہ نہیں ہے تو سر پر منڈلاتا خطرہ سونگھ کے اس ہوش مند کو ادھر آنا بھی نہیں چاہیے۔ باہر رہ کے وہ ہمارے لیے زیادہ مفید ہوسکتا ہے۔ اس کے پاس بندوق بھی ہے' تمنچا بھی ہوسکتا ہے۔ کسی طرح نیچے جا کے وہ کوٹھی کے ملازمین کو بیدار کرسکتا ہے۔ کچھ اور نہیں تو ملازم شور مچا کے ان لوگوں کو متزلزل کرسکتے ہیں۔

"مال کدھر کو رکھا ہے؟" بٹھل کو طمانچہ رسید کرکے سرغنہ نے وہی رٹ لگائی "صاف بولتا ہے کہ۔۔۔"

"اپنی زبان تمہاری سمجھ میں نہیں آتی شاید۔"

"لگتا ہے' تم لوگاں کا وقت آگیا ہے۔"

"آگیا ہے تو ٹھیک ہے رے' تو اسے روک لے گا کیا؟" بٹھل کے لہجے میں پہلی مرتبہ تندی آئی۔

مجھے حیرت تھی بٹھل کو جانے کس بات کا' کس موقع کا انتظار تھا۔ کمرے میں ان لوگوں کی تعداد ابھی تک سات تھی۔ دیر کرنے سے تعداد بڑھ بھی سکتی تھی۔ یہ حقیقت مستزاد تھی کہ بندوقوں کے علاوہ ان کے پاس خنجر بھی ہیں۔

سرغنہ نے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے یکایک بٹھل کے پیٹ میں مکا مارنا چاہا۔ بٹھل کو کچھ اندازہ تھا' وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ سرغنہ کا غضب لازماً فزوں ہوجانا چاہیے تھا۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلا کے غراتا ہوا بٹھل کی طرف بڑھا۔ بٹھل اور پیچھے ہٹ گیا۔ سرغنہ کے بازوؤں میں کھڑے ہوئے دونوں آدمیوں نے بٹھل کو اپنی گرفت میں لینا چاہا۔ بٹھل پیچھے ہوتے ہوتے مسہری پر جا گرا۔ وہ دانستہ مسہری پر آیا ہوگا۔ اسی طرح تکیے کے نیچے سے تمنچا اور چاقو نکالا جاسکتا تھا مگر ان تینوں نے بہ یک وقت اسے دبوچ لیا' بالکل بچوں کی طرح۔ انہوں نے اسے کچھ سوچنے کا وقت ہی نہیں دیا۔ اس افراتفری میں تکیہ سرہانے سے ہٹ سکتا تھا۔ تمنچا اور چاقو ان کی نظروں میں آسکتے تھے۔ بستر پر آکے بٹھل نے مزاحمت کے بجائے ایک طرح سے سپر ڈال دی یا خود کو ان کے سپرد کردیا۔ اسی طرح ان جانوروں کے شکنجوں کی گرفت کمزور پڑسکتی تھی۔ ان تینوں نے بے تحاشا الٹے سیدھے ہاتھ چلانے شروع کردیے تھے۔ بٹھل کا سارا جسم وہ بری طرح مشق ستم بنائے ہوئے تھے۔ درندگی کا یہ طور ڈاکوؤں اور لٹیروں جیسا قطعاً نہیں تھا۔ ایسا تو بدترین نفرت اور پرلے درجے کی دشمنی میں ہوتا ہے۔ انہیں تو کسی حیلے حوالے سے مال کے بارے میں ہم سے کچھ اگلوانے کی تدبیر کرتے رہنا چاہیے تھا۔ بٹھل ساری ضربیں برداشت کرتا رہا اور مچلتا' تڑپتا ہوا اپنے جسم سے تکیہ ڈھانپنے میں کامیاب ہوگیا۔ مجھے بعد میں اندازہ ہوا کہ پہلے تو اسے کسی طرح تکیے کی جگہ محفوظ کرنی تھی۔ اس کے بعد ہی وہ ان سے نمٹنے کی کوئی سبیل کرسکتا تھا۔ اسی اثنا میں نواب کے کمرے کی جانب سے شور اٹھا' کسی نے زور سے ٹھوکر ماری' دروازہ چوپٹ کھل گیا۔ کنڈی کھلی نہ ہوتی تو چول اکھڑ جاتی۔ وہ نواب ثروت تھا جسے دو آدمی دھکیلتے' دھکے دیتے ہوئے کمرے میں لے آئے تھے۔ نواب کی حالت نہایت شکستہ تھی' سر کے بال بکھرے ہوئے' کرتے کا گریبان پھٹا ہوا' آنکھیں ابلی ہوئی۔ اتنی دیر میں اس کا کیا حال ہوگیا تھا "یہ ایک اور مردار اپن کو ادھر سے ملا ہے' حرام کا چھپا ہوا تھا" نواب کے بال پکڑ کے سر کو جھٹکے دیتے ہوئے ایک آدمی نے کہا۔

سرغنہ سمیت وہ تینوں جو بٹھل کو نشانہ بنائے ہوئے تھے' ٹھہر گئے "یہ' یہ کون ہے؟" سرغنہ نے پھنکارتے ہوئے پوچھا۔

"یہ بھی کوئی نواب کا تخم' نواب کا۔۔۔ لگتا ہے۔"

"ہا!" وہ تینوں بٹھل کو چھوڑ کے نواب کی طرف متوجہ ہوگئے "اور ابھی کتے جنگ بہادر ہیں ادھر؟"

"بس راجا!" نواب کولانے والے آدمی نے کہا۔
"سارا دیکھ لیا ہے؟"
"نیچے اس چڑی مارنے بھی اتنے ہی لوگاں بولے تھے۔"
سرغنہ کے نتھنے پھول گئے "ہاں! نواب صاحب!" وہ نہایت سفلے پن سے نواب ثروت یار سے مخاطب ہوا "کدھر کو چھپ گئے تم؟"
"ہماری بات سنئے" نواب گھگھیانے لگا "خدا گواہ ہے' ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔"
سرغنہ بستر سے اٹھ کے نواب کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس نے نواب کی گدی پکڑ کے چہرہ اوپر کیا "لگتا تو اصلیچ ہے' دربار مارکہ۔"
"ہمیں اپنے اجداد' اپنے ماں باپ کی قسم۔ اگر آپ سمجھتے ہیں' ہماری تحویل میں کوئی خزانہ ہے تو یہ خدا ـــ" نواب نے شدومد سے التجا کی۔
سرغنہ لمحوں تک نواب کے روبہ رو کھڑا اسے گھورا کیا "انوں کون لگتے ہیں تمہارے؟"
"یہ ہمارے مہمان ہیں جناب! ہم انہیں ان کے بچھڑے ہوئے رشتے دار سے ملانے لے جارہے تھے۔ راستے میں موٹر خراب ہوگئی۔ قریب ہی نواب صاحب مجن میاں کا یہ باغ تھا اس لیے ہم یہاں چلے آئے" نواب نے ساری روداد ہکلا ہکلا کے سرغنہ کے گوش گزار کی۔
"وہی رام لیلا!" سرغنہ نے دہاڑ کے کہا "اپن کو مال چاہیے۔"
"ہم آپ کو' آپ کو کس طرح یقین دلائیں" نواب نے فریاد کی "ہمارے پاس جو کچھ ہے' وہ بے شک آپ لے سکتے ہیں' آپ کا ہے۔"
"کیا ہے تمہارے پاس؟" سرغنہ نے حقارت سے پوچھا۔
نواب نے کرتے کی بغلی جیب سے گلے کا ہار نکالا "یہ سچے موتیوں کا ہار ہے اور یہ' یہ انگوٹھیاں۔ اس میں سے ایک تو ہمارے والد محترم کی نشانی ہے" اس نے جلدی جلدی اپنی انگلیوں سے دونوں ہیرے جڑی انگوٹھیاں اتاریں "کچھ نقدی بھی ہے شیروانی کی جیب میں ہماری۔ یہ سب آپ کی نذر ہے' بندوق بھی آپ لے لیں۔ اور یہ سونے کے بٹن بھی ـــ"
سرغنہ نے نواب کے ہاتھ سے ہار اچک لیا۔ انگوٹھیوں پر ایک ہوسناک نگاہ ڈال کے اس نے قریب کھڑے ہوئے ساتھیوں کی طرف اچھال دیا "اصلی مال بولو کدھر ہے؟"
نواب نے ٹوٹی پھوٹی آواز میں اسے یقین دلانے کی کوشش کی اور عاجزی سے بولا "ہر چیز آپ کے سامنے ... آپ خود تلاشی لے سکتے ہیں۔"
"تم میں خلیفہ کون ہے؟"
"خلیفہ! ہم آپ کا مطلب نہیں سمجھے؟" نواب اضطراری لہجے میں بولا "آپ کو یقیناً بڑی غلط فہمی ہوئی جناب!"
"اپن پہلے کیا بولے' بولے کہ زیادہ بات بالکل ... چاہیے۔"
نواب نے یہی بہتر جانا کہ خاموش ہوجائے۔ سرغنہ ... کشمکش سے دوچار سرنگوں نواب کے سامنے کھڑا رہا' جانے اس کے جی میں کیا سمائی' وہ معاً پلٹ کے مجھے اور ... کو شعلہ بار نظروں سے دیکھنے لگا اور اس نے میری اور نو... کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جیلے پن سے کہا "انوں چھو... بڑے سرکار کی خدمت میں بعد کو حاضری دیں گے' وہی ... اپن کو انوں میں پورا حرام زادہ دکھائی دیتا ہے۔"
بٹھل بستر پر تکیے کی جانب کہنی کے سہارے ترچھا ... تھا' نہ پائے رفتن نہ جانے ماندن والی کیفیت' بہ ظاہر ... یا بے چارگی کی حالت میں' بہ باطن پابہ رکاب۔ ا... تعینات دونوں آدمی بھی مسہری سے ایک قدم کے فاص... کسی نئے ستم کے لیے جیسے تازہ دم ہورہے تھے۔ سرغ... اعلان سن کے کہ اسے پہلے بٹھل ہی سے بازپرس کرنی پڑ... گی' انہیں بس اپنے سالار کے پاس آنے کا انتظار ... نواب کی طرف سرغنہ کے متوجہ ہوجانے کی وجہ سے میں ... نہیں سکا کہ اس دوران بٹھل کو تکیے کے نیچے سے تمنچا... چاقو نکالنے کا موقع مل سکا یا نہیں۔ سرغنہ کو اپنی جانب ... دیکھ کے بٹھل نے بستر سے اٹھ جانے کے ارادے سے ... بدلا۔ ابھی وہ پوری طرح نہیں اٹھ پایا تھا کہ دونوں آدمی ... پر ٹوٹ پڑے مگر بٹھل نے طے کرلیا تھا کہ اسے مسہری... بہرصورت اٹھ جانا چاہیے۔ تھوڑی سی مزاحمت اور کسی ... زور کے نتیجے میں اس نے فرش پر پیر جمالیے۔ دونوں آدمی... کو بھی مسہری پر دھینگا مشتی پسند نہیں ہوگی۔ ان کے چہر... سے بھی اطمینان جھلکتا تھا۔ بٹھل نے فرش پر آتے ... مدافعت ترک کردی۔
اسی لمحے سرغنہ بھی اس کے سامنے پہنچ گیا۔ دونو... آدمیوں نے بازو میں بازو ڈال کے اسے اس طرح جکڑ رکھا ... کہ سرغنہ جہاں چاہے' بٹھل کے جسم پر ضربیں لگا...

ادے' یہ گدھ کی اولاد تو بہت پھدکتا ہے" سرغنہ نے بے دریغ اس کے منہ پر مکا مارا۔ بٹھل نے نڈھال ہوکے گویا ... سے داد دی۔ اس کی اس خستہ و شکستہ حالت سے دونوں آدمیوں کی گرفت بھی سست پڑجانی چاہیے تھی۔ سرغنہ نے دوبارہ ہاتھ اٹھایا کہ اچانک بٹھل فرش سے اچھلا۔ مشکیں باندھنے کی مانند دونوں آدمیوں نے اس کے گرد اپنے بازو اور جکڑنے' کسنے چاہے ہوں گے۔ ان کا یہ اضطراری ردعمل ہی کچھ ان کے لیے برا ہوا۔ ان کے سان و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ ناگہاں بٹھل کے فرش سے اچھلنے سے کیا مراد ہے۔ ایک دو پل کی مدت میں' دوبارہ فرش پر پیر ٹکاتے ہی بٹھل نے پوری طاقت سے ان کے بازوؤں کو جھٹکا دیا۔ دونوں کی ہڈیاں اپنی جگہ سے ہٹ گئی ہوں گی۔ ان کے حلق سے اٹھنے والی چیخوں سے یہی ظاہر ہوتا تھا۔ بٹھل کے ہاتھ آزاد ہوگئے تھے۔ سرغنہ پر حیرت کا عالم طاری ہوا۔ اس نے چاقو یا تمنچا نکالنے کے لیے جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ یہ وقت اس کام کا نہیں تھا۔ اتنی دیر میں بٹھل ہاتھ پھیلا چکا تھا۔ واپس سمیٹتے ہوئے دونوں ہاتھوں میں اس نے فاصلہ رکھا تھا' ترچھے بھی رکھے تھے۔ ایک سرغنہ کی پیشانی پر بھوں کے نزدیک دوسرا گردن میں پیوست ہوا۔ سرغنہ کی بینائی ضروری متاثر ہوئی ہوگی۔ اس کے قدم زمین سے اکھڑ گئے۔
دروازے پر کھڑے ہوئے مجھے اور نواب کو اپنی تحویل میں لیے ہوئے سارے آدمی بٹھل کی طرف دوڑ پڑے۔ کمرے میں افراتفری مچ گئی تھی۔ انہیں دوسرے ہی لمحے خیال آیا کہ میں اور نواب تو تنہا رہ گئے ہیں اور دروازہ بھی خالی ہوگیا ہے۔ درمیان میں ایک نے دوسرے کو ٹوکا' کسی حد تک دونوں میں چپقلش رہی کہ کون کہاں جائے۔
میرا کام آسان ہوگیا تھا۔ میں تو پہلے ہی بٹھل کے اشارے کا منتظر تھا۔ ان میں سے ایک آدمی مجھے' دوسرا نواب کو قابو کرنے کے لیے پلٹ آیا' تیسرا دروازے پر گیا' باقی تین بٹھل کی طرف بڑھ گئے۔ مجھے جلد ہی کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ جو آدمی مجھے تھامنے آیا تھا' میں نے اسے آنے دیا۔ اس نے میرے شانے پر پنجہ مارا تو بھی میں نے اسے نہیں روکا۔ اس کی آنکھیں سامنے بٹھل پر جھپٹتے ہوئے اپنے ساتھیوں میں الجھی ہوئی تھیں کہ میں نے نیچے سے یکایک اس کی ٹھوڑی پر ضرب لگائی۔ اس کی زبان دانتوں میں آجانی چاہیے تھی' ممکن ہے دانت بھی ٹوٹے ہوں۔ دونوں ہاتھوں سے منہ پکڑ کے وہ بلبلانے لگا۔ میرا دل چاہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں بھی انگلیاں گڑو دوں۔ آدمی کچھ دیر کے لیے ضرور اندھا

ہوجاتا ہے۔ ہاتھ صحیح پڑجائے تو وقت کا شمار مشکل ہے لیکن میں نے خود کو باز رکھا۔ اسے جلد ہی بے دم کردینا مناسب تھا۔ سو میں نے گردن کے نیچے' اس کی کمر پر ریڑھ کی ہڈی کی طرف وار کیا۔ وہ واویلا کرتا ایک جانب بھاگا مگر درد و کرب کی وجہ سے ابھی دور تک نہ جاسکا تھا کہ میں پھر اس کے سر پر پہنچ گیا اور ابھی وہ زمین پر کھڑے رہنے کی ناکام کوشش کررہا تھا کہ پیٹ میں گھٹنے کی ضرب نے اسے دوہرا کردیا۔

دروازے کی نگرانی کرنے والا شخص زیادہ دیر وہاں ٹھہرا نہیں رہ سکتا تھا۔ میں بھی اس پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ نواب پر قابض آدمی کو ناچار نواب کے پاس ہی ٹھہرے رہنا تھا۔ میری جانب بڑھتا تو نواب کھلا رہ جاتا۔ میں نے دیکھا تھا کہ نواب نے شروع میں اس سے کچھ حجت کی تھی بلکہ اسے اپنی طرف آتا دیکھ کے بھاگنا چاہا تھا لیکن پھر نواب پسپا ہوگیا۔ اس نے اچھا ہی کیا' مشتعل ہوکے اس پر مسلط آدمی کوئی بھی کاری وار کرسکتا تھا۔ نواب نے دیکھا یا نہیں' میں نے بہرحال اسے ضبط و تحمل کا اشارہ کیا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ نواب اڈے پاڑے کا آدمی نہیں ہے۔ شکار اور بندوق کے نشانے پر چابک دستی اور چیز ہے۔ اڈے کا آدمی تو ہر وقت نشانے پر رہتا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق دروازے پر کھڑے ہوئے آدمی سے برداشت نہ ہوسکا۔ اپنے ساتھی کو میری دست برد سے بچانے کے لیے اس نے جست لگائی۔ خنجر بھی اس نے نکال لیا تھا۔ میرے دماغ میں یہی آئی کہ میں اس کے ڈولتے' ڈوبتے ہوئے ساتھی کو اس کے آگے کردوں۔ اس طرح اس کے فیصلے کی قوت بکھر جائے گی اور مجھے اس کا خنجر والا ہاتھ قابو میں کرنے کا موقع مل جائے گا' سینے میں یا شانے میں کسی جگہ۔ وہ عین وقت پر ایک قدم پیچھے ہوگیا۔ سنبھل کے اب اسے مجھ پر حملہ کرنا چاہیے تھا۔ میرے پاس بھی اس خنجر بہ دست سے دو بہ دو ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

ہمارے درمیان فاصلہ بھی ایسا زیادہ نہیں تھا۔ ایسے مرحلے پر ایک آزمودہ حربہ یہی رہ جاتا ہے کہ لمحے لمحے بعد مخالف کو مختلف تاثر دیا جائے۔ اسی میں کوئی موقع نکل آتا ہے۔ میں نے بائیں جانب' جہاں سراسیمہ نواب کھڑا تھا' قدم بڑھائے۔ اس کا رخ بھی اسی طرف ہوا لیکن مجھے ادھر جانا ہی نہیں تھا۔ میں نے پینترا بدل کے بٹھل کی سمت بھاگنے کا تاثر دیا۔ ایک عام خنجر باز کی طرح اس نے یہی اخذ کیا کہ میں باربار اسی طرح تیزی سے رخ بدلنے کا فریب کرسکتا ہوں۔ وہ مجھ پر خنجر بھی نہیں پھینک سکتا تھا کیونکہ میں

اس کے کراہتے ہوئے نیم جاں ساتھی کے آس پاس منڈلا رہا تھا اور اس پار بٹھل سے اس کے ساتھی نبرد [illegible] تھے۔ نشانہ خطا ہونے کی صورت میں اسے پشیمانی کی [illegible] بھی نہ ملتی۔ مجھے توقع تھی کہ وہ فاصلہ کچھ اور کم کرے گا [illegible] خنجر والا ہاتھ ادھر ادھر لہرا کے مجھے بھی متذبذب کرنے کی کوشش کرے گا بلکہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں بدلنے کی مہارت بھی آزمائے گا۔ اس نے تقریباً یہی کیا' خنجر ایک ہی ہاتھ میں رکھا اور وہی گھماتا' لہراتا رہا۔ وہ [illegible] تن دہی سے اس عمل میں مصروف تھا کہ دفعتاً میں بیٹھ [illegible] اسے مجھ سے یہ توقع ہرگز نہ ہوگی۔ ایک خاص رویا دھن [illegible] اس اچانک تبدیلی سے نمٹنے کے لیے بڑی مشاقی درکار [illegible] ہے۔ اس کے لیے اب سنبھلنا مشکل تھا۔ وہ منتشر ہوا [illegible] اس نے گم کردہ راہ' زیر دام خود کھنچے آنے والے شکا[ر کی] طرح مجھ پر خنجر اتارنے کے لیے اپنا ہاتھ دراز کیا' حالا[نکہ] اسے ہاتھ اوپر لے جانے میں وقت نہیں گنوانا چاہیے [تھا۔] اس مختصر وقفے میں مجھے اس کی ٹانگوں تک اپنے [ہاتھ] پھیلانے اور جھٹکا دے کے اس کے پاؤں زمین سے ا[کھاڑ] دینے تھے۔ وہ لوٹ جاتا تو ٹھیک رہتا۔ میں نے اڑی [illegible] نزدیک اس کی ٹانگیں اپنے پنجوں میں جکڑیں تو وہ بری [طرح] بوکھلا گیا اور ہڑبڑاہٹ میں ترچھے ہوتے وقت اسے اپنے [خنجر] والے ہاتھ پر اختیار نہ رہا۔ پسلیوں کے قریب خنجر کی [illegible] اس کی جلد کے پار ہوئی ہوگی۔ وہ تڑپتا ہوا اپنے ساتھ[ی پر] گرا۔ اس خوں گشتہ پر مزید وار کرنا مناسب نہیں تھا لیکن اڈے کا صحن نہیں تھا۔ زخمی شیر کیا' زخمی گیدڑ سے بھی غا[فل] نہیں ہونا چاہیے۔ اس کی دوبارہ بیداری زخم کی نوعیت [سے] مشروط تھی اور مجھے اس کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ مجھے فوراً بٹھ[ل] کی طرف جانا تھا۔ ایک دو ضربوں میں مجھے یقین ہوگیا کہ ا[ب] وہ تادیر بے حواس رہے گا۔ اس کی چیخ و پکار ختم ہونے [illegible] میں اسی میں الجھا رہا۔

نواب ثروت یار پر متعین آدمی بہت مضطرب ہ[و رہا] ہوگا۔ میری دانست میں نواب سے بری الذمہ ہوجانا اس [کے] لیے آسان نہیں تھا۔ نواب کو ترک کردینے کا مطلب ہما[ری] تعداد میں ایک تہائی اضافہ کرنا تھا۔ وہ ایک کام البتہ کر [سکتا] تھا کہ کچھ دیر کے لیے نواب کو بے دست و پا کردے اور [illegible] کمک کے طور پر بٹھل کو نرغے میں لیے ہوئے ا[پنے] ساتھیوں میں شامل ہوجائے۔ شاید اس نے نواب کو اس [لیے] نہیں چھیڑا کہ اپنے ساتھیوں کی تعداد اور ان کے پاس مو[جود] ہتھیاروں سے وہ ابھی تک پرامید تھا۔ نواب کو وہ کسی [illegible]

[ا]سے خاموش کرسکتا تھا' نواب کی حالت تو ویسے ہی بڑی ابتر [تھ]ی۔ تاہم یہ اندیشہ ہر لحظے موجود تھا کہ اپنی جگہ کھڑے [ک]ھڑے وحشت میں وہ آدمی کہیں خنجر نہ اچھال دے یا بندوق [ت]ان لے۔ ابھی تک اس کے محتاط رہنے کی وجہ یہی ہوسکتی [تھ]ی کہ بندوق سے نشانہ لینے یا خنجر سے شست باندھنے میں [چن]د لمحوں کے لیے سہی' اسے نواب سے بے نیاز ہونا پڑتا۔ [illegible]ری اور بٹھل کی فعالی و مستعدی ہی اسے حیرت سے دوچار [کی]ے ہوئے ہوگی۔ ذرا سی رعایت ملنے پر نواب بھی رنگ بدل [سک]تا تھا۔ ادھر سامنے ہر پل زاویہ بدل جاتا تھا۔ نواب کو چھوڑ [کے] نشانہ لینے یا بٹھل کو زیر کرنے کی تگ و دو میں مصروف [اپ]نے ساتھیوں میں شامل ہونے کا فیصلہ کرنا خاصا دشوار تھا مگر [illegible]ہ کے! جلد ہی اسے غلط یا صحیح' کوئی قدم اٹھانا تھا۔

اس سے پہلے اگر میں اس کے سر پر پہنچ جاؤں' اسے [نو]اب کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے میں مشکل پیش آرہی [ہ]ے یا اس سے پہلے کہ وہ نواب کے سلسلے میں کسی وحشیانہ [اق]دام پر آمادہ ہوجائے' مجھی کو نواب کی فکر کرنی چاہیے۔ [نو]اب کی نجات سے مراد ان کے ایک آدمی کی کمی' ہمارے [ای]ک آدمی میں اضافہ ہے۔ سو میں نے دروازے والے آدمی [س]ے نمٹ کے بٹھل کے پاس جانے کے بجائے نواب کی [ط]رف جانے کا ارادہ کیا۔ میرا اندازہ تھا کہ اس پر حاوی آدمی [کا] زیادہ وقت صرف نہیں ہوگا۔ مجھے نزدیک پا کے نواب بھی [کچ]ھ حوصلہ پکڑے گا اور کسی قدر ہاتھ پاؤں چلا کے اس کے [لی]ے انتشار کا باعث بنے گا۔ میں نے نواب کی طرف قدم [بڑ]ھادیے تھے لیکن جیسے کسی نے میرے پیروں میں زنجیر ڈال [دی۔] مجھے تقدیم و ترجیح کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ ادھر بٹھل [ک]ے گرد تو چھ آدمی ہیں' گو تین ابتدا ہی میں ہوش و حواس سے [عا]ری ہوچکے ہیں لیکن کسی کی بھوبھل میں چنگاری بھڑک سکتی ہے۔ فرش پر الٹے سیدھے پڑے ہوئے آدمیوں کے پاس [بن]دوقیں بھی ہیں۔ کوئی بھی ان میں بچی کھچی توانائی سمیٹ کے [ک]ھیل سکتا ہے۔ شکست خوردہ قمار باز کی طرح جو آخر میں [اپ]نے آپ کو بھی داؤ پر لگادیتا ہے۔ میں نے پلٹ کے بٹھل کا [ر]خ کیا مگر جاتے جاتے ٹھہر گیا۔ اندھادھند بڑھ جانے سے [ب]ہتر تھا کہ اچھی طرح ایک نظر سامنے کا احوال آنکھوں [می]ں اتار لیا جائے۔ میں نے دیکھا کہ ایک شخص پیٹ میں [اک]ھ بیوست کیے فرش پر لوٹ رہا ہے۔ یقیناً ابتدا کے تین [آ]دمیوں میں سے کوئی ایک اٹھنے میں کامیاب ہوگیا تھا اسی [لی]ے بٹھل کے گرد بھنکتے' پھڑپھڑاتے آدمیوں کی تعداد اب [بھ]ی تین ہی تھی۔ ان کے ہاتھوں میں کھلے خنجر تھے اور ان کا

بس نہیں چلتا تھا کہ بٹھل کو چیر پھاڑ ڈالیں۔ ایسے وقت بٹھل کو اپنے مقابل میں مطلوبہ احساس جگانے کا ملکہ تھا۔ مجھے معلوم تھا' کسی اچھے داؤ یا پینترے پر وہ مخالف کو واجبی داد و ستائش سے نوازنے کی گنجائش نکال لیتا ہے۔ دو ایک بار کے اس واقعے کا بھی میں شاہد تھا کہ ہاتھ اٹھا کے اس نے مخالف کو ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور اسے اس کی غلطی سے آگاہ کیا۔ اس کے اس طرز عمل سے مقابل میں اصول و آداب کا لحاظ اجاگر ہوتا تھا' اس میں ایک انفعالیت پیدا ہوجاتی تھی یا اس کا غصہ بڑھ جاتا تھا اور وہ دیوانہ ہونے لگتا تھا۔ بٹھل کو کسی ایک موقع کی جستجو رہتی تھی اور وہ اسے جلد ہی مل جاتا تھا۔ اڈے پر وہ اپنے آدمیوں سے یہی کہا کرتا تھا کہ پھرتی' زور اور ہنرمندی پہلی چیز ہے مگر حاضری کے بغیر سب کچھ ادھورا ہے۔ حاضری سے اس کی مراد تھی دماغ کی حاضری' زور آزمائی کے دوران میں جسم کے دیگر اعضا اور دماغ کا توازن۔ وہ اسے تال میل کہتا تھا۔ جیل میں شولی اس کے جسم کی مالش کیا کرتا تھا۔ بٹھل کی فرمائش پر وہ ساز بھی بجاتا تھا۔ گانا بھی اسے خوب آتا تھا۔ استاد کی اتنی خدمت کے باوجود شولی' کانتے اور اڈے کے ایسے ہی دوسرے آدمیوں کا مثیل نہ بن سکا۔ بٹھل اس پر خفا ہوتا تھا۔ "بل کرتے وقت کیوں سر سے اتر جاتا ہے رے۔ اس کی تو ہر وقت ضرورت پڑتی ہے" شولی کی خامی اس کی بے توازنی تھی۔ وہ کبھی بہت جلدی کردیتا' کبھی اس سے دیر ہوجاتی۔ رتنا نے بٹھل کی عدم موجودگی کے دوران میں اڈے پر حملہ کیا تو شولی بھی کام آگیا۔ شولی نے ضرور قبل از وقت یا بعد از وقت کوئی غلطی کی ہوگی۔

بٹھل ان تینوں کو اطراف میں گھمارہا تھا۔ پلک جھپکتے میں وہ رخ بدل لیتا۔ وہ ایک دوسرے سے بھڑ جاتے یا پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوجاتے۔ وہ شدید برہم نظر آتے تھے' بٹھل کو باربار بھپکیاں دیتے۔ وہ بھی بس بٹھل کی کسی ایک کوتاہی کے سراغ میں سرگرداں تھے۔ بڑے بڑے تال میل کے پکے' ہنرمندوں' پختہ کاروں سے چوک ہوجاتی ہے۔ یہ پہلو بٹھل کے ذہن میں غالباً ہر وقت موجود رہتا تھا۔ وہ کہتا تھا' کبھی اپنا کھونٹا' بھی دھوکا دے سکتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ مسہری کے قریب ایک طرف پڑا ہوا سرغنہ بھی کلبلا رہا ہے۔ ہوسکتا ہے' وہ اتنا ناچار نہ ہو جتنا ظاہر ہورہا تھا۔ وہ چپکے چپکے اپنے بند باندھ رہا ہوگا۔ اس کا اچانک اٹھ کھڑا ہونا خارج از امکان نہیں تھا۔

آنکھوں کو بھی شاید سانس لینے کی ایک مہلت چاہیے یا گزشتہ کو فراموش کرنے اور درپیش موجودہ جذب کرنے کے

لیے جنبش ابرو کا ایک مرحلہ لازم ہے۔ میں نے کسی تماشائی کی طرح ایک لمحے توقف کیا ہوگا کہ تیزی میں پیچھے سے ایک کی کمر پر ضرب لگائی۔ ضرب ہلکی رہتی تو بھی وہ سٹپٹا جاتا۔ وہ جیسے ہی مڑا' میں نے اس کی کلائی گرفت میں لے لی۔ جھٹکے کے علاوہ میں نے اس کا ہاتھ بھی پوری قوت سے مروڑ دیا تھا۔ اس کی چیخ سے جیسے در و دیوار بھی چونک پڑے۔ ہرچند خنجر اس کے دوسرے ہاتھ میں تھا لیکن اس افتاد سے خنجر چھٹ جانا یقینی تھا۔ اس کے قریب دو ساتھی بھی میری اس غیر متوقع دخل اندازی سے دگرگوں ہوئے۔ دونوں کی توجہ مجھ پر مرکوز ہوئی تو وہ موقع نسبتاً وقت سے کچھ پہلے بٹھل کے ہاتھ آگیا جس کا وہ متلاشی تھا۔ اس نے جھپٹ کے ایک کے کندھے سے بندوق کھینچ لی اور اسی کو زور سے بٹ ماری۔

میرا بھی یہی خیال تھا کہ بندوق ہاتھ میں آتے ہی بٹھل بٹ گھمائے گا لیکن یہ جان کے میری آنکھیں کھلی رہ گئیں کہ اس نے اپنی جگہ چھوڑ دی ہے اور نواب کی طرف دوڑ چکا ہے۔ بٹھل کو گھیرے میں لیے ہوئے تین آدمیوں میں سے ایک تو میری ضرب اور بازو اکھڑ جانے کی وجہ سے ناکارہ ہوگیا تھا۔ اس پر توجہ دینے کے بجائے بٹھل نے نواب کا رخ کیا۔ تیسرے کے دماغ نے بروقت کام کیا۔ اس نے دروازے کی جانب بھاگنا شروع کردیا۔ دونوں باتیں ممکن تھیں۔ اسے یا تو باہر نکل جانا تھا یا ایک فاصلے پر جاکر بندوق سنبھالنی تھی۔ چند لمحوں کے لیے نواب کو بے بس رکھنے والا آدمی میرے ذہن سے محو ہو چکا تھا۔ بٹھل نے اس کا کوئی ارادہ بھانپ لیا ہوگا جبھی اس نے نواب کی طرف جانے کا فیصلہ کیا۔ ویسے بھی ادھر بٹھل کی جگہ میں آہی چکا تھا اور یہاں صرف ایک شخص اپنے پیروں پر قائم رہ گیا تھا۔ وہ بھی اب دروازے پر چلا گیا تھا۔ نواب پر مسلط آدمی آخر نواب کو تنہا چھوڑنے پر مجبور ہوگیا۔ اس نے یہ ارادہ بٹھل کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ کے کیا یا اس سے پہلے' یہ میں نہیں دیکھ سکا۔ ایک دو لمحوں میں ادھر سے بٹھل' ادھر سے وہ' دونوں ایک دوسرے کی جانب امڈے تھے۔ بیچ میں دونوں کی مڈبھیڑ ہوئی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اس سے الجھے بغیر بٹھل جھکائی دے کے اس کے راستے سے ہٹ گیا اور اس نے نواب کے پاس جاکے بندوق تان لی "ٹھہرو!" اس کی دھمکتی ہوئی آواز کمرے میں گونجی "ایک دم ٹھہر جاؤ" کسی نے ذرا بھی الٹا سیدھا کیا تو نواب ثابت نہیں ملے گا۔"

اس اثنا میں دروازے پر جانے والے آدمی کو قابو میں کرنے کے لیے میں پر تول چکا تھا۔ بٹھل کی آواز نے میرے پاؤں لڑکھڑا دیے' میرا سارا وجود ڈگمگا گیا۔ نواب کے پاس سے جانے والا آدمی بھی اپنی جھونک میں مسہری تک جاکے پلٹ گیا تھا اور اس نے بندوق اٹھالی تھی۔ دروازے پر ٹھہر کے اس کا ساتھی بھی بندوق اٹھا چکا تھا۔ سرغنہ بھی اٹھ کے بیٹھ گیا تھا۔ نواب بٹھل کی زد پر تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور وہ اکڑ سا گیا تھا۔

"ہم نے کیا بولا ہے' سارے اوزار ہتھیار پھینک دو نہیں تو پھر ادھری کوئی بھی نہ رہے گا" بٹھل نے گرجتے ہوئے دوبارہ تنبیہہ کی اور نواب کی کنپٹی پر بندوق کی نال رکھ دی۔

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ ایک زخمی کی کراہ ضرور بلند ہوئی' پھر موت کی خاموشی طاری ہوگئی۔

میری سانسیں سینے میں اٹک گئی تھیں۔ ایک لمحے کو مجھے ایسا لگا جیسے میں اندھا اور بہرا ہوگیا ہوں' میری بینائی اور سماعت ضرور کسی سراب سے دوچار ہے۔ بٹھل کا دماغ پھر گیا ہے یا میرا۔

سرغنہ نے اشارہ کیا یا نواب نے' میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ نواب کے پاس سے مسہری تک جانے والے اور دروازے پر ٹھہر جانے والے نے اپنے ہتھیار پھینک دیے مجھے کچھ ہوش آیا۔ بٹھل کی ہدایت پر میں نے حسب سابق کسی معمول کی طرح اوندھے سیدھے پڑے ہوئے لوگوں کی بندوقیں اور خنجر جمع کرنے شروع کردیے۔ جانے کس طرح میں نے یہ کام انجام دیا۔ ہتھیار اکٹھے کرکے میں نے ایک کونے میں ڈال دیے اور اسی جانب خاموش کھڑا ہوگیا۔

کسی کے لیے بھی ایسے عالم میں اپنے آپ کو منضبط اور مستحکم رکھنا شاید ممکن نہ ہوتا' پھر اس شخص کے لیے بشر ہونے کی شرط ضروری نہیں سمجھنی چاہیے۔ میں نے امکان بھر کوشش کی کہ جو سامنے ہے' وہی حاصل ہے۔ میرے لیے اسی میں بہتری ہے کہ کسی رد و قدح کے بغیر موجود پر اپنے حواس مرکوز رکھوں چاہے یہ دلیل و تاویل سے کتنا ہی زائد ہو۔

"سارے حرام کے جنوں کو اٹھاکے ادھری سے نکل جاؤ" بٹھل نے سرد لہجے میں کہا "ابھی اسی وقت! نہیں تو۔"

ابھی وہ یہ کہہ رہا تھا کہ کمرے میں بجلی سی چمکی۔ یکایک مسہری کے قریب سے کسی نے خنجر پھینکا۔ بٹھل اچھل کے نواب کے پہلو میں ہوگیا۔ دوسرے ہی لمحے نواب کی چیخ بلند ہوئی۔ بٹھل نے عین وقت میں اسے کھینچنا چاہا تھا لیکن سرگرفتہ نواب جانے کیا سمجھا۔ درون خانہ اس کے ہاں ایک

ظلم برپا ہوگا۔ اس نے جانا کہ بٹھل نے اس کے لیے کوئی طے کرلیا ہے۔ یہ مزاحمت نہیں تھی' اپنے آپ کو بٹھل کی کسی ممکنہ عتاب سے بچانے کے لیے اس نے دوسرے کمرے کے قریبی دروازے کی طرف جانا چاہا۔ اتنا وقت نہیں تھا۔ خنجر کو چند گز کا فاصلہ عبور کرنا تھا۔ بٹھل اس کا ہاتھ چھوڑ دیتا تو شاید نشانہ اتنا کاری نہ ہوتا مگر یہ بٹھل کے بس میں نہیں رہا تھا۔ نواب کے دائیں میں بغل کے قریب' ذرا سے اوپر خنجر پیوست ہوا تھا۔ وہ چکرا کے وہیں ڈھیر ہوگیا۔

کمرے میں سبھی کچھ درہم برہم ہوگیا جیسے آگ لگ گئی یا سانپ نکل آیا ہو۔ وہ دونوں جو پوری طرح زمین پر کھڑے ہونے پر قادر تھے' بے محابا نواب کی جانب لپکے۔

"ادھری کوئی نہیں' کوئی نہیں" بٹھل نے دہاڑ کے کہا "سارے ایک طرف کو ہوجاؤ' دیوار کے ساتھ۔"

میں بھی جست لگاکے اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اس نے دھتکارنے کے انداز میں مجھے دور ہوجانے کا حکم دیا۔ میرے اوسان ہی جاتے رہے تھے۔ کمرے میں ان کتوں کی موجودگی سے میں تو بالکل غافل ہوگیا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ ان کے ہتھیار ایک کونے میں پڑے ہیں اور میری ذرا سی چوک سے وہ ان تک پہنچ سکتے ہیں۔ خود میرے پاس بھی کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ میں نے اسی انبار سے ایک بندوق اور احتیاطاً ایک خنجر بھی اٹھالیا۔ دروازے پر جانے والا آدمی بھی مسہری کے پار اپنے ساتھی کے پاس چلا گیا تھا۔ بٹھل کے حکم کے مطابق انہیں دیوار کے ساتھ لگ کے کھڑا ہوجانا چاہیے تھا۔ میں نے ان کے قریب ہوکے یہی اشارہ کیا۔ انہوں نے کچھ تامل کیا تھا کہ میں نے بندوق کی نال ایک کے سینے میں بھونک دی۔ خنجر کی ضرب اتنی شدید نہ ہوتی' وہ سینہ پکڑ کے فرش پر گرا اور گٹھری بن کے لوٹنے لگا۔ دوسرا سٹپٹاتا ہوا دیوار تک چلا گیا۔ میرے تو جی میں آئی تھی کہ ایک ایک کرکے سبھوں کو گولی ماردوں۔

سرغنہ کھڑے ہونے کی کوشش میں کراہنے لگا لیکن جیسے تیسے اس نے خود کو قدموں پر بحال کرلیا۔ ان میں سے کسی اور کے پاس خنجر یا تمنچا ہوسکتا تھا اور پھر کسی کا دماغ الٹ سکتا تھا۔ وہ میری ہی غلطی تھی' ہتھیار سمیٹتے وقت میں ان کی تلاشی بھی لے لیتا تو شاید یہ سب کچھ یوں نہ ہوتا۔ فرداً فرداً ان کے لباس ٹٹولنے کی احتیاط کا اب یہ محل نہیں تھا۔ میں نے ارادہ کیا تھا لیکن پھر میں ٹھہر گیا۔ میں بالکل اکیلا تھا۔ بٹھل ادھر نواب کے جسم سے ابلتا خون روکنے' کم کرنے کے جتن کررہا تھا۔ نواب اپنے ہی خون میں نہا گیا تھا۔ بٹھل کے کپڑے بھی رنگ گئے تھے۔

سرغنہ پر دیوانگی طاری ہوئی۔ اس کے منہ سے مغلظات جاری ہوگئیں۔ جس آدمی نے نواب پر خنجر پھینکا تھا' وہ نزدیک ہی تھا۔ سرغنہ اس کے بال پکڑ کے جھٹکے دینے لگا اور اس نے اسے بری طرح گھونسے اور طمانچے مارنے شروع کردیے۔

"اس کو چپ کرلا ڈلے!" بٹھل نے غضب آلود لہجے میں کہا۔

میری انگلی ٹریگر پر گئی تھی لیکن یہ تو اس کے لیے ایک طرح نجات کی صورت ہوتی۔ میں نے بندوق الٹی کرکے بٹ مارنے کے لیے جیسے ہی اوپر کی' وہ بلبلانے لگا اور بٹھل سے فریاد کرنے لگا "اب کیا رہ گیا ہے سرکار! اپن کو جو چاہے سزا دے لینا' تھوڑا اپن کو وخت دو" اس نے اپنی ماں کی قسم کھاکے بٹھل سے التجا کی کہ اسے نواب کے پاس آنے دیا جائے' وہ بٹھل کا ہاتھ بٹا سکتا ہے۔ اس نے ہاتھ جوڑ کے کہا کہ اس سے یا اس کے کسی ساتھی سے اب کوئی لغزش ہو تو سب کو کتوں کے آگے ڈال دیا جائے۔

بٹھل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگاکے نواب کو بٹھا دیا تھا۔ نواب کا گریبان بھی اس نے پھاڑ دیا تھا اپنے کرتے سے خون صاف کرکے وہ اس کے زخم کی نوعیت جانچنے میں منہمک تھا۔ نواب کی آنکھیں پتھرا پتھرا جاتی تھیں تاہم اس کی بے ترتیب سانسوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ ابھی وہ ہوش میں ہے۔ سرغنہ کے واویلا پر بٹھل کو طیش آگیا "تجھ کو کیا بولا رے!" اس نے بھڑکتی ہوئی آواز میں مجھے مخاطب کیا "ماردے گولی سور کے بچے کو۔"

سرغنہ کو خاموش کرنے کے لیے میں پہلے ہی بندوق اٹھا چکا تھا لیکن وہ اسی دم نیچے بیٹھ گیا اور میرے پیر پکڑ کے آہ و بکا کرنے لگا "اپن کو ایک دم فنا کردینا' بالکل نہیں چھوڑنا' اپن کی یہی سزا ہے' پر تھوڑا وخت کی بھیک دو داتا! تم کو اپنی ماں' اپنے رسول ؐ کی قسم" وہ ہذیان بکنے اور اپنا سر پیٹنے لگا۔

میں نے بہ مشکل اس کے پنجوں سے اپنی ٹانگیں آزاد کرائیں اور ٹھوکر مار کے اسے دور کیا۔ میں نے طے کرلیا تھا' اس نے پھر وہی چیخ پکار کی تو جیسا کہ بٹھل نے کہا ہے' مجھے وہی کرنا پڑے گا۔ سرغنہ نہیں مانا' کھڑے ہوکے وہ پھر میری طرف بڑھنا چاہتا تھا کہ میں نے ٹریگر پر انگلی رکھ دی مگر معین وقت کی بھی کوئی حقیقت ہے۔ اس کی ڈوریاں ٹوٹنے میں بس ایک دو پل کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ جانے کیوں اسے اس نزع

وکرب' نالہ وفریاد کی حالت میں گولی مارنے پر میرا دل آمادہ نہ ہوا۔ شاید اس لیے بھی کچھ دیر لگی' اور اچھا ہوا۔ اس سے پہلے کہ میں دوبارہ اپنا عزم استوار کرتا' بٹھل نے مجھے روک لیا "آنے دے مردار کو ادھری" بٹھل کی زہریلی آواز سرغنہ کے لیے تریاق ثابت ہوئی۔

اس نے بھی سن لیا تھا۔ اس کا جسم مائل بہ پرواز پرندے کی طرح پھڑکنے لگا اور مسہری پھلانگ کے وہ لڑکھڑاتا' ڈگمگاتا ہوا بٹھل کے پاس پہنچ گیا۔ جاتے ہی اس نے سجدے کے انداز میں بٹھل کے پیروں پر سر رکھ دیا۔ کئی اور ساتھیوں کی طرح اس کا ڈھاٹا پہلے ہی کھل چکا تھا۔ چادر بھی اس نے اتار کر ایک طرف پھینک دی۔ چند لمحوں میں وہ اور بٹھل ایک دوسرے کے پرانے شناسا دکھائی دیتے تھے۔ بٹھل کی ہدایت پر وہ مسہری کے پاس رکھا ہوا لیمپ اٹھا لایا۔ بٹھل نے مٹی کے تیل سے نواب کا زخم صاف کیا۔ زخم گیری کے ساتھ اندمال کا ہنر بھی اسے اچھا آتا تھا۔ انہیں کوئی ریشمی کپڑا نہیں مل رہا تھا۔ سرغنہ کے دماغ نے کام کیا۔ اس نے کھڑکی پر لٹکا ہوا ریشمی پردہ کھینچ لیا اور بٹھل کے اشارے پر لیمپ کی لو سے اسے جلا دیا۔ سارے کمرے میں کپڑا جلنے کی بو پھیل گئی۔ ریشم کی یہ راکھ بٹھل نے بہ عجلت نواب کے زخم میں بھر دی۔ مٹی کے تیل ہی سے بڑی حد تک خون رک گیا تھا۔ راکھ نے دو آتشے کا کام کیا ہوگا۔ بٹھل کو خوب احساس ہوگا کہ یہ ایک عارضی چارہ گری ہے۔ خنجر تیر کی طرح آیا تھا۔ نواب کا زخم خاصا گہرا ہونا چاہیے۔ اسے زخم دوزی کی' باقاعدہ علاج کی ضرورت تھی۔ اتنی رات گئے اس دور افتادہ مقام پر بہ ظاہر کسی طبیب کے جلد مل جانے کا امکان نہیں تھا۔ دیوار کے ساتھ کھڑے ہوئے دو آدمیوں کے سرگرم ہو جانے کا اب اتنا خدشہ نہیں رہا تھا۔ میں ان سے نگاہ ہٹا کے بٹھل اور نواب کی جانب بھی دیکھ سکتا تھا۔ اسی دوران میں مسہری پر پڑی ہوئی اوڑھنے کی چادر میں ان کے ہتھیاروں کی گٹھری بنانے کا موقع مجھے میسر آگیا۔ ان کی دست رس میں اب اتنی آسانی سے ہتھیار نہیں آسکتے تھے۔ پیر سے کھسکا کھسکا کے میں نے گٹھری مسہری کے نیچے کر دی۔

فرش پر جابجا سرخ دھبے پڑے ہوئے تھے۔ خون سے میرے پاؤں بھی سن گئے تھے۔ نواب کے علاوہ سرغنہ کے خنجر گشتہ ساتھیوں کا خون بھی اس میں شامل تھا۔ ان کی پرسش کرنے والا کوئی نہ تھا۔ کثرت سے خون نکل جانے کی وجہ سے اب وہ تقریباً بے حس وحرکت ہو گئے تھے۔ ممکن ہے' کسی ایک میں تابِ استقامت ہی نہ رہی ہو۔ میرے جی میں آیا تھا کہ ان کے دو پوری طرح ثابت وسالم آدمیوں سے اپنے بلب ساتھیوں کی دیکھ بھال کے لیے کہوں' ذرا سی توجہ شاید کسی کے دن بڑھ جائیں۔ نواب نہیں تو کیا ہوا' آدمی بھی ہیں۔ میں چپ کھڑا رہا۔ بٹھل سے پوچھے بغیر انہیں کوئی رعایت دینا مناسب نہیں تھا۔ ہرچند سرغنہ بٹھل پاس چلا گیا تھا کہ دریں حالات یہی ایک بہتر طریقہ تھا۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ باقی ساتھیوں کے لیے اپنے سرخیل کی یہ قلب ماہیت کس قدر سزاوار اعتنا ہے۔

نواب کو فرش پر لٹا کے بٹھل نے کہیں سر اٹھایا' گہری سانس لے کے سرغنہ سے پوچھا کہ باہر اس کے کتنے آدمی موجود ہیں۔ سرغنہ کے جواب پر کہ نیچے صرف آدمی چوکسی دے رہے ہیں' بٹھل نے اس سے گرد و نواح میں کسی وید حکیم کے بارے میں استفسار کیا۔ سرغنہ شش و پنج میں پڑ گیا تھا کہ بٹھل نے اسے نواب کا ڈرائیور بلا لانے کے لیے کہا۔ میں نے سرگوشیانہ لہجے میں اسے ٹوکا کہ موٹر باغ سے دور خراب حالت میں کھڑی ہے۔ بٹھل نے بات سنی ان سنی کر دی۔ سرغنہ فوراً باہر نکل گیا۔

باہر جا کے' ظاہر ہے' اپنے ساتھیوں سے اس کا رابطہ لازم ہے۔ سرغنہ کے کہنے کے مطابق' اگر وہ دو سے زیادہ نہیں ہیں تو بھی نہتے نہ ہوں گے۔ انہیں ساتھ لے کے بندوقیں تانے وہ دندناتا ہوا کمرے میں واپس آسکتا تھا۔ اس سے اچھا موقع اسے کیا ملے گا' پھر وہی سب کچھ۔ ۔ ۔ تو جسم شل ہونے لگا تھا۔ ہاتھ پاؤں میں جیسے دم ہی نہ رہا۔ ادھر سرغنہ کو اپنے زخمی ساتھیوں کا بھی کچھ خیال ہوگا! ضروری نہیں کہ ڈرائیور اسے فی الفور مل جائے۔ ہو سکتا ہے' نچلی منزل کے بجائے عمارت سے ایک فاصلے پر واقع ملازموں کے حصے کی طرف ہو۔ باغ کے ملازم اگر سرغنہ کے محرمِ اسرار نہیں ہیں تو اسے وہاں تک جانے میں ویسے بھی پس و پیش ہوگا۔ سرغنہ کو باہر بھیجنے کی کیا تک تھی؟ بٹھل کو مجھ سے کہنا چاہیے تھا۔ میری عدم موجودگی میں وہ میری طرح کمرے میں موجود لوگوں پر نظر رکھتا اور میں ڈرائیور کی بازیابی کے علاوہ ملازموں کے حصے کی طرف جا کے کسی کو کانوں کان خبر کیے بغیر انہیں بیدار کر دیتا۔ بہرحال سرغنہ اب باہر جا چکا تھا اور بٹھل کو ان عواقب کا احساس دلانے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔

وہ نواب کے پاس سے اٹھ گیا۔ تکیے کے نیچے سے تمنچہ نکال کے اس نے کمر کی پیٹی میں اڑسا' چاقو جیب میں ڈالا' واسکٹ پہنی' پھر میرا تمنچہ اور چاقو بھی اس نے میری طرف بڑھا دیا۔ بندوق مسہری پر رکھ کے میں نے بھی اس کی پیروی کی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ کاش بٹھل کو خیال ہوتا کہ کبھی اس کی خاموشی دوسرے کو کیسا شکستہ کر دیتی ہے۔ باہر نکلنے کی تیاری تھی مگر واپس حیدر آباد کے سفر کے لیے موٹر کی مرمت بھی تو شرط تھی۔ اس وقت سڑک پر موٹروں کی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر ہوگی۔ کسی سے مدد لینے کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔ سرغنہ ہی کے ذریعے حیدر آباد پہنچنے کا کوئی امکان بٹھل کے ذہن میں ہوگا۔ یہاں تک یہ لوگ گھوڑوں پر تو نہیں آئے ہوں گے۔ واپسی کے لیے بھی انہوں نے کوئی معقول انتظام رکھا ہوگا۔

میری نگاہیں دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ سرغنہ کسی بھی وقت وارد ہو سکتا تھا۔ نشانے کے لیے گو میں نے بندوق نہیں اٹھائی تھی لیکن انگلی لبلبی پر تھی۔ بس لمحے بھر کی دیر لگتی' دروازے سے سرغنہ کے نمودار ہونے پر اس کے تیور کا اندازہ لگانے اور بندوق اٹھانے کا دورانیہ۔ اسے گئے زیادہ وقت نہیں ہوا تھا کہ کوئی ایک آدمی نہیں ہے۔ وہ دو ہی تھے' ایک سرغنہ دوسرا اس کا ساتھی' کندھے سے بندوق لٹکائے ہوئے۔ دونوں حواس باختہ حالت میں اندر آئے اور سرغنہ نے ہکلاتی آواز میں بتایا کہ ڈرائیور آیا ہی چاہتا ہے۔

"ادھری سے اب دفع ہونے کا کر' فوراً۔" بٹھل نے سرغنہ سے کہا۔

سرغنہ گم صم ہو گیا۔ ہاتھ جوڑ کے وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کے ہونٹ پھڑپھڑا کے رہ گئے۔ دیوار کے ساتھ کھڑے ہوئے دونوں آدمیوں کو اس نے اشارہ کیا۔ وہ منتظر ہی تھے۔ سرغنہ نے بھی ان کا ہاتھ بٹایا۔ انہوں نے لشتم پشتم اپنے زخمی اور بے دم پڑے ہوئے ساتھیوں کو باہر لے جانا شروع کر دیا۔ وہ چار تھے۔ اٹھا کے لے جانے والوں کی تعداد بھی چار رہ گئی۔ ایک مرگا تھے ہوئے تھا۔ اسے اٹھایا گیا تو وہ کسمساتا' کراہتا اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ پہلے وہ دروازے کے باہر لے جا کے انہیں چھوڑتے رہے۔ ابھی وہ اس صبر آزما مرحلے سے دوچار ہی تھے کہ کسی پاگل کے مانند نواب کا ڈرائیور اندر داخل ہوا۔ وہ بہت تیزی میں اندر آیا تھا لیکن چند قدم چل کے رہ گیا۔ اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔ پہلی نظر میں شاید اسے اپنا ولی نعمت نواب ثروت یار دکھائی دے گیا تھا۔ بٹھل کے حکم پر اس کے جسم میں جھرجھری پیدا ہوئی' پھر وہ تن سا گیا اور اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا۔

"کیا بولا تم کو کنجری کے ۔ ۔ ۔" بٹھل نے چنگھاڑتے ہوئے کہا۔

میری آنکھوں میں ریت بھر گئی۔ ڈرائیور نے مزید کوئی لیت و لعل نہیں کیا۔ میں نے دیکھا' جہاں نواب کا قیام تھا' وہ سیدھا اسی کمرے کی جانب لپکا۔ گویا موٹر باغ ہی کے اندر تھی! اور وہ' وہ سب کچھ محض ایک تماشا تھا۔ آدمی کے کتنے رنگ ہوتے ہیں' آدمی کے آگے تو سمندر بھی ہیچ ہے۔ مگر آدمی کے ظاہر و باطن کی بوالعجبی سے زیادہ یہ میری اپنی پراگندگی تھی کہ اتنا کچھ دیکھنے اور سننے کے بعد مجھ پر کیسا پردہ پڑا رہا۔ مجھے اپنے آپ کو طمانچے مارنے چاہیے تھے' پر کوئی خود کو کیا سرزنش کر سکتا ہے' کتنی سزا دے سکتا ہے۔ خود کو کہاں کسی سزا و جزا کا یارا ہے۔ یہ منصب تو دوسرے کو ہی سزاوار ہے۔

نواب کے کمرے سے بھی باہر کا ایک راستہ تھا۔ غالباً اسی لیے ڈرائیور ہمارے کمرے سے ہو کے نہیں گزرا۔ میں نے جلدی جلدی مسہری کی چادر سے پاؤں صاف کیے' واسکٹ پہنی۔ اور کوئی سامان ہمارے پاس تھا ہی نہیں۔ سرغنہ اور اس کے ساتھی اپنے ساتھیوں کو کمرے سے اٹھا کے لے جا چکے تھے۔ بٹھل غسل خانے میں منہ پر پانی ڈال کے آگیا تھا۔ چادر سے میرے پاؤں اچھی طرح صاف نہیں ہو پائے تھے۔ جوتے میں خون کی چپ چپاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ بٹھل کی دیکھا دیکھی میں نے بھی غسل خانے کا رخ کیا۔ جب تک میں نے پیر دھو نہیں لیے مجھے تسلی نہیں ہوئی۔ لمحوں میں ہم تیار ہو گئے تھے۔ کپڑے بدلنے یا دھونے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ مجھے خیال آیا کہ نواب بھی تو گھر سے لدا پھندا چلا تھا۔ اس کے سامان میں دو ایک جوڑے ضرور ہونے چاہئیں لیکن اتنی دیر میں ڈرائیور سامان اٹھا کے نکل چکا تھا۔ نواب کے کمرے میں اس کی مسہری پر رکھی ہوئی چادریں مجھے نظر آگئیں۔ میں وہی اٹھا لایا۔ کچھ اسی طرح ہمارے کپڑوں کے داغ چھپ سکتے تھے۔ ویسے چاندنی کتنی ہی کھلی ہوئی کیوں نہ ہو' رات بھی ہماری پردہ پوشی میں معاون ہوتی۔ میں نے ایک چادر بٹھل کی طرف بڑھا دی۔ وہ کسی اور دھیان میں تھا۔ چادر میرے ہاتھ سے لے کے اس نے بے پروائی بلکہ ناگواری سے مسہری پر ڈال دی اور نواب کے پاس جا کے اس کی نبض ٹٹولی۔ پھر سامنے والی کھڑکی کھول کے نیچے جھانکنے لگا۔ دروازے کے پار سرغنہ اور اس کے ساتھیوں کی آہٹیں معدوم ہو چکی تھیں۔ وہ ایک ایک کر کے اب تک انہیں نیچے بارہ دری یا صحن میں لے جا چکے ہوں گے۔ بٹھل کسی قدر مضطرب لگ رہا تھا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اسے ڈرائیور کا انتظار تھا۔ جیسے ہی ڈرائیور کمرے میں داخل ہوا۔ بٹھل نے مجھے اشارہ کیا اور بندوق اٹھا کے کھڑکی کی جانب بے دریغ فائر کرنے شروع

کردیے۔ ڈرائیور' ہیبت زدہ ہو کے ایک کونے میں چھپ ہوگیا۔ بٹھل جیسے دیوانہ ہوگیا تھا۔ میری عقل بھی خبط ہوگئی تھی لیکن میرے لیے یہی مناسب تھا کہ میں لمحہ موجود کو بعینہ بجنسہ تسلیم کرلوں اور اسباب وعلل پر تردد و تفکر کے بجائے اس ناقابلِ یقین افتاد پر اپنی ساری توانائیاں مرکوز کردوں۔

جلد ہی میری سمجھ میں بٹھل کی دیوانگی کا سبب آگیا۔ میں نے بھی اضطراری انداز میں بندوق داغنی شروع کردی۔ کھڑکیوں کی شیشے ٹوٹ گئے۔ رات کے سناٹے میں گولیوں کی گونج نہایت سنسنی خیز تھی۔ درختوں پر خوابیدہ پرندے جاگ گئے اور ہاہاکار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر میں ہر سو شور مچ گیا تھا' جیسے جنگل میں آگ لگ گئی ہو۔ ادھر ملازموں کے حصے کی جانب سے بیدار اور خبردار ہوجانے کا غلغلہ بلند ہوا۔ ان میں سے کسی کے پاس بندوق تھی' باہر بھی وقفے وقفے سے فائر ہونے لگے تھے۔ کئی باتیں ممکن تھیں۔ بارہ دری سے صدر دروازے تک افتاں وخیزاں جاتے ہوئے سرغنہ کے آدمیوں کو اگر کہیں دیر ہوگئی اور وہ باغ کے ملازموں کو دکھائی دے گئے تو سب کا رخ اسی طرف ہوجائے گا' پھر سرغنہ کو بڑی بھاگ دوڑ کرنی پڑے گی۔ ہرچند کہ ابھی ان کے پاس دو بندوقیں تھیں۔ صدر دروازہ دور تھا۔ درمیان میں عمارت تھی اور عمارت میں مسلسل گولیاں دھمک رہی تھیں۔ اس بات کا بھی امکان تھا کہ باغ کے ملازم درمیان کی قریبی آوازوں ہی کا تعاقب کریں کہ صدر دروازے پر ان کی یلغار' سرغنہ اور اس کے ساتھیوں کی نقل وحرکت نظر آجانے کی پابند تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ان میں سے کچھ سرغنہ کے پیچھے صدر دروازے کا رخ کریں' کچھ عمارت میں داخل ہوجائیں۔ وسیع وعریض اراضی پر پھیلے ہوئے باغ کے ملازموں کی تعداد کم نہیں ہوگی۔ ان سبھوں کو گھر سے نکل آنا چاہیے۔

وہ عمارت کے قریب آچکے تھے کہ بٹھل نے اچانک فائر بند کردیے۔ میں نے بھی بندوق نیچے کرلی۔ گولیوں کی آوازیں ہماری مدد کو آنے اور صورت حال جاننے والوں کی پیش قدمی میں رکاوٹ کا باعث ہوتیں۔ لگتا تھا' ان کے کچھ ساتھی شور مچاتے ہوئے صدر دروازے کی طرف بھی دوڑے ہیں۔ کچھ عمارت میں آگئے تھے۔ آگے زمینی اور پہلی منزل کی سیڑھیوں پر انہیں پھونک پھونک کر قدم اٹھانے چاہئیں تھے مبادا کہیں سے گولی چل پڑے۔ بٹھل کمرے سے نکل گیا اور زینے پر چیخ پکار کرکے اس نے انہیں اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ بٹھل کے اس اقدام سے انہوں نے ہمت

پکڑی اور ان میں خیر طلبی اور سرفروشی کا جذبہ استوار
وہ کئی آدمی تھے۔ قطبی میاں ان میں پیش پیش تھا
میں دہی ہمیں کھانا کھلا کے اور کمروں میں پہنچا کے ر
ہوا تھا۔ مجھے شبہ ہوا تھا کہ سب کو نہیں تو نواب ثرو
نے باغ کے چند ملازموں کو ضرور اپنے ارادے میں ش
ہوگا لیکن قطبی میاں سمیت ان سب کا کمرے میں آ
حال ہوا' وہ میرے شبے کی تردید کے لیے کافی تھا۔
ناقابلِ تصور نادیدنی سے دوچار تھے۔ صاف نظر آرہا
ان کی آنکھوں کے لیے یہ مرحلہ' یہ تجربہ کیسا عبرت
ہے۔ وہ دم بخود ہوگئے اور ان کی سسکاریاں نکل گئیں
کی بینائی نے اس ناگہانی سے آشنائی کا وقفہ تمام کیا تو
نے واویلا شروع کردیا۔ طرح طرح کے سوالات۔
برہمی سے وہ کہیں باز آئے۔ بٹھل نے ان سے کہا کہ
نے مزید وقت ضائع کیا تو نواب کے حق میں اچھا نہ ہوگا
نے انہیں جلد سے جلد نواب کو موٹر تک لے جانے
دیا۔ سراسیمہ ڈرائیور بھی کمرے کے کسی گوشے سے نک
سامنے آگیا تھا۔ مریضوں کا اسٹریچر عمارت میں نہیں
انہوں نے کہیں نہ کہیں سے ایک تختہ فراہم کرلیا او
اور رضائیوں سے تختے کی سختی دور کردی۔ تین چار آ
نے زینے پر مجھے گھیرلیا تھا۔ میں انہیں جیسے تیسے کچھ
میرے بے ربط بیان سے ان کی سیری نہیں ہوئی ہوگی
ملازم لوگ تھے۔ آقاؤں سے حجت ملازمت کے آدا
منافی ہے۔ ان کی دانست میں تو میں اور بٹھل' نواب
یا ریا ان کے مالک نواب صاحب مجن میاں ہی کے ک
پیشہ وہم رتبہ ہوں گے اور ہمارے متعلق انہیں کچھ
نہیں تھا تو بھی یہ کیا کم تھا کہ ہم نواب ثروت یار کے
آئے تھے اور مہمان کے لیے مخصوص بالائی منزل کے
کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ نچلی منزل پر زینے کے
برکت نامی ان کا ساتھی خون میں لت پت بے سدھ پڑ
اوپر کی منزل کو جاتے ہوئے انہوں نے لازماً اسے دیکھ
اور اب دوبارہ ہمارے ساتھ واپس آتے ہوئے بھی
نے بھی اس کی چارہ گری کے سلسلے میں بے صبری کا ا
نہیں کیا۔ وہ برکت کا نمک نہیں کھاتے تھے۔ نمک تو ن
بھی نہیں کھاتے تھے لیکن نسبتوں کی بات اور ہوتی
نواب کو موٹر تک لے جانے میں کوئی وقت نہیں لگا۔
دری سے کچھ فاصلے پر موٹر کھڑی تھی۔ ڈرائیور بھاگتا
اور موٹر قریب لے آیا۔ نواب کو پچھلی نشست پر لٹا دیا
بٹھل اس کا سر گود میں رکھ کے وہیں سمٹ کے بیٹھ گیا۔

موٹر صدر دروازے پر جا کے ٹھہر گئی۔ وہاں شور مچا ہوا
ا لیکن موٹر کے قریب پہنچنے پر سب خاموش ہوگئے۔ بٹھل کے
تفسار پر ایک دست بستہ ادھیڑ شخص نے جھرجھراتی آواز
ں بتایا کہ دروازے پر متعین عمر رسیدہ چوکی دار اور اس کا
واں سال بیٹا کام آچکے ہیں۔ وہ بری طرح بین کرنے لگا تھا۔
ٹھل اسے کیا تسلی دیتا کہ انہیں تو ختم ہی ہوجانا تھا ورنہ
واب ثروت یار کے تراشے ہوئے خاکے میں حقیقت کا رنگ
س طرح بھرتا؟ بے چارہ برکت بھی اسی لیے چارہ بن گیا۔
واب کی طرف سے باغ کے ملازموں کو یہی تاثر دینا چاہیے
تھا کہ سب کچھ کسی ناگہانی بلا کے طور پر پیش آیا۔ نواب کے
ساتھ آنے والے اس کے دو معزز مگر بدبخت مہمان بھی باغ
کے معصوم ومظلوم ملازموں کی طرح لپیٹ میں آگئے۔ نواب
کے نوشتے میں وافر وقت مرقوم تھا اس لیے وہ دستِ قضا سے
محفوظ رہا۔ انجام اب گو مختلف ہوگیا تھا' بٹھل کو بہرحال
نواب کا ترتیب دیا ہوا تاثر قائم رکھنے پر اصرار کرنا چاہیے
تھا۔ ہم چپ چپاتے بھی نکل سکتے تھے لیکن باغ کے ملازموں
کی موجودگی گواہی کی حیثیت رکھتی تھی۔ کسی پیش آئندہ
ناگفتنی کے لیے شہادتیں جمع رہیں تو اچھا ہی رہتا ہے۔ اتنا
وقت تھا ممکن ہے' صدر دروازے کی طرف بڑھنے والے
ملازموں نے بھاگتے ہوئے سرغنہ اور اس کے ساتھیوں کی
کوئی جھلک دیکھ لی ہو۔ ایسی صورت میں تعاقب کرنے والوں
کو دور رکھنے کے لیے سرغنہ نے گولی چلانے کا حکم جاری کیا
ہوگا۔ اور اگر وہ لوگ ملازموں کے پہنچنے سے پہلے صدر
دروازہ عبور کرنے میں کامیاب ہوگئے تو بھی ایسا حرج نہیں
تھا۔ باقی سبھی کچھ باغ کے ملازموں کے سامنے تھا۔ سب سے
زندہ شہادت جاں بہ لب نواب ثروت کی شکل میں موجود
تھی۔ اور کچھ نہیں تو ان کی نیند خراب کرنے اور گھروں سے
نکالنے میں ایک یہ رمز بھی تھی کہ نواب کو بالائی منزل سے بہ
عجلت تمام موٹر تک منتقل کرنے کی آسانی ہوگئی۔ ان کی
اعانت نہ ہوتی تو جانے ہمیں کتنی دیر لگ جاتی۔

ادھیڑ شخص مرنے والوں کا کوئی رشتہ دار معلوم ہوتا تھا۔ وہ بلک بلک کے دہائیاں دے رہا تھا۔ اس کی فریاد میری طرح بٹھل کا دل بھی گداخت کررہی ہوگی۔ بٹھل اس سے کیا کہتا' وہی گنتی کے چند لفظ جو ماتم گساروں کو بھی حفظ ہوتے ہیں۔ بٹھل نے ڈرائیور کو موٹر بڑھانے کی ہدایت کی۔ باغ کے لیے مخصوص راستے سے گزر کر بڑی سڑک کا نکڑ تھا۔ ڈرائیور نے صدر دروازے سے نکلتے ہی رفتار تیز کردی۔ ابھی اس نے تین چار فرلانگ کی مسافت طے کی ہوگی کہ آگے کا راستہ بند دیکھ کے اسے رفتار قابو میں کرنی پڑی۔ کوئی حادثہ ہوا تھا۔ سامنے ایک لاری اور عام موٹر ایک دوسرے کے مقابل کھڑی تھیں بلکہ موٹر نے لاری کا راستہ روکے رکھا تھا۔ کئی آدمی نیچے اترے ہوئے تھے۔ انہیں نظر انداز کرکے ڈرائیور کنارے کے کچے راستے سے موٹر لے جانا چاہتا تھا کہ یک لخت بٹھل نے اس سے ٹھہر جانے کو کہا۔ میں نے بھی موٹر روک دینے کے لیے ڈرائیور کا بازو پکڑلیا تھا۔ موٹر قریب ہونے پر روشنی میں ان کے چہرے نمایاں ہوگئے تھے۔ میری آنکھیں حیرت سے دوچار تھیں۔ وہ سرغنہ اور اس کے ساتھی تھے۔ انہیں جمرو اور زورا نے تمنچوں کی زد پر رکھا ہوا تھا۔

سرغنہ مضطربانہ انداز میں انہیں قائل معقول کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ ہمارے ٹھہر جانے پر سب منتشر ہوگئے۔ زورا نے جھٹ سے تمنچے کی نال ہماری طرف موڑدی۔ بٹھل اٹھ نہیں سکتا تھا۔ میں دروازہ کھول کے فوراً باہر نکل پڑا۔ جمرو اور زورا بھی اچھل پڑے۔ آدمی آدمی کے لیے کبھی ہوا کے جھونکے کے مانند ہوتا ہے۔ کوئی دل نشین منظر' منتظر چہروں سے زیادہ راحت افزا نہیں ہوتا۔ مجھے تو ایسا لگا جیسے مدتوں بعد ہمارا آمنا سامنا ہوا ہے' جیسے مدتوں کے حبس کے بعد دریچے کھلے ہوں۔ انہیں اپنے سینے میں بھرنے کے لیے میرے دست وبازو ہمکنے لگے لیکن ایک قدم ہی چل کے میں رہ گیا۔ جمرو بھی رک گیا۔ اسے بھی بروقت ہوش آگیا تھا کہ سرغنہ اور اس کے ساتھیوں کے سامنے ہمارا یہ ربط والتفات مناسب نہیں ہے۔ ادھر نواب کا ڈرائیور بھی موجود تھا۔ جمرو نے آگے آکے جب تک بٹھل کو موٹر میں بیٹھا ہوا نہیں دیکھ لیا' اس کی وحشت کم نہیں ہوئی۔ بٹھل نے یقیناً انگلی اٹھائی ہوگی کہ جمرو نے پلٹ کے زورا کو سرغنہ کے راستے سے ہٹ جانے کی تاکید کی لیکن زورا نے ان لوگوں کے پاس رہ جانے والی دونوں بندوقیں اپنی تحویل میں لے کر ہی انہیں جانے کی اجازت دی۔ سرغنہ کی لاری نکل جانے کے بعد جمرو اور زورا نواب کے ڈرائیور کی وجہ سے میرے قریب آنے میں متذبذب ہورہے تھے۔ میرے خون آلود کپڑے دیکھ کے ان سے برداشت نہیں ہوا۔ وہ بے طرح مجھ سے لپٹ گئے اور بے تابانہ میرا جسم چھونے اور ٹٹولنے لگے۔

"میں ٹھیک ہوں" میری آواز بھرا گئی۔

"اور استاد؟" جمرو اضطراری لہجے میں بولا۔

میں نے سرہلا کے اسے اطمینان دلایا "مگر تم' تم یہاں کس طرح۔۔۔؟"

"ہم تو ادھری چک پھیری کر رہے تھے۔"

"یہاں!" میں نے حیرانی سے کہا "تمہیں معلوم تھا کہ ہم یہاں تک آچکے ہیں؟"

"اپن تو چلتے تیم سے آگے پیچھے کو ہے راجا! وہ تو ایدر سے اپن تھوڑا دوری پر چلا گیا تھا کہ بیچ میں یہ بے ٹکے کا' سالا ٹھیکرا لوگ باغ میں گھس پڑا" زورا نے بتایا کہ باغ کے قریب جب نواب نے موٹر خراب ہوجانے کی شعبدہ بازی کی تھی تو سامنے سے آنے والی جس موٹر کے ڈرائیور نے ہم سے مدد کے لیے پوچھا تھا' اس میں جمرو اور زورا بھی بیٹھے تھے۔ انہوں نے فاصلے سے موٹر کھڑی کی تھی۔ یعنی بٹھل سمجھ چکا تھا کہ موٹر میں سوار لوگ کون ہوسکتے ہیں اسی لیے اس نے کسی قدر کشادہ آواز میں ڈرائیور سے مجن میاں کے باغ کا پتہ پوچھا تھا۔ نواب نے رسمی شکریہ ادا کرکے انہیں چلتا کردیا تھا۔ بعد میں اس نے دبے دبے لہجے میں شکایت بھی کی تھی کہ اجنبیوں کے سامنے بٹھل کو رات گزارنے کے لیے اپنی منزل' مجن میاں کے باغ کا نام نہیں لینا چاہیے تھا۔ ان دنوں یہ علاقہ ویسے ہی خاصا پُرخطر سمجھا جاتا ہے۔ نواب نے تاویلیں پیش کی تھیں کہ بٹھل نے غور نہیں کیا۔ موٹر ہم سے اتنی دور کیوں روکی گئی اور ڈرائیور کے مانند موٹر میں سوار دوسرے مسافروں نے باہر آکر ہمدردی کا اظہار نہیں کیا' وغیرہ وغیرہ۔"

"پھر تم' تم ــــ" میری زبان اٹکنے لگی۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ جمرو اور زورا سچ کہہ رہے ہیں مگر وہ اتنی رات کو اس ویرانے میں بہ قائمی ہوش و حواس سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے نواب کے گھر سے اب تک کیا اذیت ناک وقت گزارا ہوگا۔ ہم سے کہیں زیادہ۔ وہ تو مسلسل ادھر سے ادھر بھٹکتے' منڈلاتے رہے ہوں گے۔ تصور ہی سے جسم سن سنا رہا تھا۔

"کیا ہے رے!" بٹھل کی دھمکتی آواز پر ہم تینوں ہڑبڑا گئے۔ ان دونوں نے بھی دیکھا تھا کہ نواب کس کشمکش کی حالت میں ہے اور اسے بس لمحوں کی بھیک مل رہی ہے۔ میں واپس موٹر میں بیٹھنے کے لیے پلٹ گیا تھا کہ جمرو اور زورا نے مجھے روک لیا۔ کہنے لگے کہ ذرا سی دیر لگے گی' ہم کپڑوں کا تبادلہ کرسکتے ہیں' ابھی رات باقی ہے۔ وہ راستے میں کسی ندی نالے پر خون کے نشانات بہادیں گے۔ وہ نہایت معقول بات کررہے تھے لیکن بٹھل نے انہیں جھڑک دیا۔

نشست پر میرے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے موٹر چلادی۔ اس نے رفتار بہت تیز رکھی تھی۔ آگے کا راستہ بھی صاف تھا۔ ہم نے جلد ہی عثمان ساگر عبور کرلیا۔ جمرو اور زورا موٹر بھی ہمارے پیچھے پیچھے آرہی تھی۔ تیز رفتاری کی وجہ جھٹکے بڑھ گئے مگر رفتار کم کرنے سے دیر ہوسکتی تھی۔ عثـ ساگر سے نکل کے موٹر ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ اب نہ پرزوں میں کوئی خرابی تھی' نہ ڈرائیور سے کوئی غلطی ہو تھی۔ جاتے وقت نواب وقت گزارنا چاہتا تھا' ایک مقـ وقت پر جو اسے مجن میاں کے باغ پہنچنا تھا۔ اب نواب وقت کی تنگی درپیش تھی۔

بٹھل ساکت وصامت بیٹھا ہوا تھا۔ خنکی اور بڑھ تھی۔ ذرا سا شیشہ گرانے پر ٹھنڈی ہوا جسم میں چبھنے لگ تین بجنے والے تھے۔ میری نظریں بھاگتی ہوئی سڑک پر ہوئی تھیں۔ روشنی میں سڑک ایک خاص حد تک ہی نظر تھی۔ اس سے آگے اور اطراف میں اندھیرا چھایا ہوا آسمان پر بادلوں کی ٹکڑیاں چاند کے سامنے سے گزرتیـ اندھیرا اور گہرا ہوجاتا۔ میرے سر پر بار بار آندھیاں اڈنے لگتی تھیں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ صرف را میں نگاہیں جمائے رکھوں' گزرے ہوئے وقت کا اعادہ کر اور آنے والے کی تجسیم و تشکیل اور قیاس و تخمین سے حاصل نہیں' جو ہوتا رہا ہے' اسے روکنا کتنا مقدر میں تھ پیش آیندہ پر تکدر و تردد کیا جائے لیکن اس درگزری صرف نظری کا اختیار آدمی کو کس قدر ہے؟ دیکھنے اور ـ تعلق جسم کے آلات ظاہری سے نہیں ہے۔ آنکھوں پر پٹی باندھنے اور کانوں میں روئی ٹھونسنے کے عمل سے نہیں پڑجاتا۔ سینہ سوز مناظر اور آوازوں سے تو اندھے بہرے بھی محفوظ نہیں ہوتے۔ ان کا خون بھی اسی طرح ہے۔ میں نے ہرچند پیچھے مڑ کے نواب کو دیکھنے سے پہلو کی لیکن اس کا چہرہ نظروں سے دور نہیں ہوتا تھا۔ وہ بدل بدل کے سامنے آجاتا تھا۔ کبھی میرے جی میں آتا' سے کہوں کہ اس سادگی و کشادگی کا کیا جواز ہے؟ نوا کو ہمیں کہیں ویرانے میں پھینک دیا جائے۔ کھلی جگہ گدھوں کی کمی نہیں ہوتی۔ یہ سوال میرے سینے میں لگا تا تھا کہ نواب کو آخر ہم سے ایسا کیا علاقہ تھا؟ یہ کون نسبت تھی؟ سرغنہ نے مال و زر کی طلب کی تھی لیکن اس ہیروں کا ذکر نہیں کیا۔ یقیناً نواب ہیروں کے ساتھ ہما کسی حوالے سے ناواقف تھا اور اپنے قبیلے والوں کی ندامت اور ملال کی تلافی اس کا مقصود نہیں تھا۔ یہ تو کچھ ہی تھا۔ بٹھل نے زور آزمائی قابو یافتگی کے ساتھ ساتھ کاری کی مشق بھی اچھی کی تھی۔ ممکن ہے' وہ گرہ کشائی

ـیائی میں کامیاب ہوگیا ہو۔ ڈرائیور کی موجودگی مانع ـ میں بٹھل سے پوچھتے پوچھتے رہ جاتا تھا کہ نواب نے ـمارا ستہ منتخب کیوں نہیں کیا؟

سڑک کے کنارے ..... کوئی گڑھا تھا' موٹر اچھل گئی۔ ـیور ہوش قائم نہ رکھتا تو موٹر درخت سے ٹکرا جاتی۔ ـ کراہنے لگا اور دیکھتے دیکھتے اس کی حالت ایسی غیر ہوئی ـ بٹھل کو موٹر رکوانی پڑی۔ ڈرائیور نے رفتار پہلے ہی کم ـی تھی۔ جمرو اور زورا کی موٹر بھی ہمارے پیچھے آکے ـی ہوگئی۔ ڈرائیور ڈکی سے پانی لے آیا۔ بہت مشکل سے ـب کے حلق میں پانی اتارا گیا۔ پانی پینے سے وہ کسی طور ـھلا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں ابھر آئیں اور وہ ـطراب کے عالم میں ویدے گھمانے لگا جیسے وہ جگہ' وقت ـ صورت حال اخذ کرنے کی کوشش کررہا ہو "تھوڑی دیر کی ـ ہے صاحب! اپنے کو تھام کے رکھو" بٹھل نے اسے ـادی۔

نواب کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں' ویران اور سنسان ـھیں' پھر ان میں دریا اتر آیا۔ بٹھل نے اس کے گال ـپ تھپائے تو آنسو پھوٹ پڑے۔ کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر ـھل نے ڈرائیور کو موٹر چلانے کا حکم دیا۔ ابتدا میں موٹر ـستہ آہستہ چلتی رہی اور پھر بتدریج رفتار تیز ہوتی گئی۔

اکادکا روشنیاں شروع ہوگئی تھیں۔ میں نے جانا کہ ـطراف میں دیہی بستیاں آباد ہیں لیکن روشنیوں کا سلسلہ ـراز ہوتا گیا۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ اتنی جلد ہم شہر پہنچ ـائیں گے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جاتے وقت ڈرائیور ہمیں ـگھماتا ہوا لے گیا تھا۔ ابھی اندھیرا باقی تھا۔ بٹھل کے پوچھنے ـ ڈرائیور نے نظامیہ اسپتال کا نام لیا تھا۔ کچھ دیر بعد بٹھل کو خیال آیا اور اس نے ڈرائیور سے نواب کے کسی قرابت ـار' دوست آشنا حکیم ڈاکٹر کے بارے میں معلوم کیا۔ کم ـمزی اچھے ملازم کی خوبی ہے۔ ڈرائیور نے شاید حد ادب یا ـبٹھل کے رعب کی وجہ سے خاموشی اختیار کی ہوئی تھی۔ ـاس نے بدحواسی میں ڈاکٹر ناصر مرزا کا ذکر کیا اور بتایا کہ نواب کے مرحوم والد کے زمانے سے سارے گھر کا علاج ڈاکٹر ناصر مرزا ہی کرتا ہے۔ ڈرائیور کی رائے اس کے جواب میں ـنر تھی۔

"کون سا پہلے کو پڑتا ہے؟" کچھ تامل کے بعد بٹھل نے بھاری آواز میں پوچھا۔

"پہلے اسپتال آتا ہے سرکار!"

"اور ڈاکٹر کا ٹھکانا کتنی دور ہے؟"

ڈرائیور نے جواب دیا کہ اسپتال سے قریب دس منٹ کی دوری پر ڈاکٹر کا گھر واقع ہے۔ بٹھل نے اسے وہیں چلنے کو کہا۔

رات کا آخری پہر تھا۔ شہر میں ہو کا عالم تھا۔ عمارتیں اور سڑکیں بھی جیسے سو رہی ہوں۔ وہ اوسط درجے کا بنگلا تھا۔ ٹھیک دروازے کے مطابق ڈرائیور نے موٹر ٹھہرائی۔ کئی بار اطلاعی گھنٹی بجانے پر اندر سے کسی بوڑھے ملازم کی گھبرائی ہوئی آواز آئی "کون ہے' کون ہے؟"

وہ باہر آنے سے جھجک رہا تھا۔ ڈرائیور اس کے نام سے واقف تھا "نور چاچا! اپن ہیں آپ کے خادم ہدایت علی' سرکار نواب ثروت یار صاحب کے یہاں سے۔ نواب صاحب بھی آئے ہیں" ڈرائیور نے بے ترتیبی سے ایک ہی سانس میں کہا۔

آہنی دروازے سے عمارت کے بیضوی برآمدے تک بیس قدم کا فاصلہ ہوگا۔ نہ زیادہ وسیع نہ مختصر لیکن برآمدہ صاحب خانہ کی خوش وضعی کا مظہر تھا۔ چھت کے وسط میں فانوس' دیوار پر ڈوبتے سورج کی روغنی تصویر' بید کا صوفہ اور میز' سہ قدی سیڑھیوں پر اور اندر فاصلے فاصلے سے رکھے ہوئے پھولوں سے لدے ہوئے گملے' چلمنوں کا بھی اہتمام تھا لیکن چلمنیں اٹھی ہوئی تھیں۔ برآمدہ لوہے کی گرل سے بند تھا۔ گرل پر کہیں کہیں بیلیں چڑھی تھیں۔ پہلے ایک قمقما ٹمٹما رہا تھا۔ اندر سے ملازم نے بٹن دبا دیا ہوگا کہ فانوس روشن ہوگیا۔ دائیں جانب کا دروازہ کھلا اور چادر ڈھانپے ایک سفید ریش شخص بڑبڑاتا ہوا نمودار ہوا۔ اس نے گرل کا دروازہ نہیں کھولا اور اندر ہی سے بولا "کیا بات ہے؟"

"ڈاکٹر صاحب سے کام ہے۔ سرکار بہت بیمار ہیں' خدا کے لیے دیر نہ کیجئے۔ ڈاکٹر صاحب کو فوراً جگا دیجئے' ہم لوگاں دور سے آرہے ہیں۔"

بوڑھے نے ٹارچ کی روشنی میں جب تک ڈرائیور ہدایت علی کی شکل نہیں دیکھ لی' اس کی آواز نہیں کھلی "اتنی رات گئے؟" وہ ناگواری سے بولا "ڈاکٹر صاحب کا حکم ہے کہ انہیں رات کو نہ جگایا جائے۔ انہیں سونے کا وقت ہی کتنا ملتا ہے۔ رات کو بھی دیر سے لوٹے تھے۔ آپ لوگاں اسپتال چلے جاؤ۔ پوری رات کھلا رہتا ہے۔ سویرے ڈاکٹر صاحب جا کے دیکھ لیں گے۔"

"اپن کو اسپتال کا رستہ معلوم ہے نور چاچا! کوئی ایسی بات ہے جو ادھر آئے ہیں" ڈرائیور نے ہیجانی آواز میں کہا "ذرا ایک بار ڈاکٹر صاحب حضور کی خواب گاہ پر دستک دیجئے اور سرکار نواب صاحب کا نام بولیے۔" ڈرائیور نے شکایت آمیز لہجے میں منت کی۔

"ہم مجبور ہیں ہدایت میاں' ہم کو اجازت نہیں ہے" بوڑھے نے رکھائی سے کہا۔

"آپ کیا باتیں کر رہے ہو چاچا! ایک آدمی کی زندگی کا سوال ہے۔ آپ اندر جا کے ڈاکٹر صاحب کو بولیے تو۔ وہ منع کردیں گے تو ہم چلے جائیں گے۔ سرکار نواب صاحب۔ ڈاکٹر صاحب کی پرانی رسم داری ہے۔ کچھ سمجھ کے ہی لوگاں ان کے در پہ آئے ہیں۔"

لگتا تھا' ڈرائیور کی آہ بکا سے نور چاچا کا پتھر پگھل گیا ہے۔ وہ شش و پنج کی کیفیت میں کھڑا رہا۔ پھر جانے اسے کیا ہوا' کہنے لگا۔ "ہم کیا کریں ہدایت میاں' نوکر آدمی ہیں' ڈاکٹر صاحب نے سختی سے منع کیا ہے۔"

"نواب صاحب زخمی ہیں چاچا!" ڈرائیور وحشت سے بولا "تم کو غوث پاک' پیر دستگیر کا واسطہ..."

بٹھل کو موٹر سے اترنا پڑا "تم کو جو بولا ہے' ویسا ہی کرو بڑے صاحب!" اس نے ترشی سے کہا "زیادہ چخ چخ مت کرو۔ ابھی اور ایک پل کی دیر کی تو دیوار اتنی اونچی نہیں۔ پھلانگ کے خود اندر آجائیں گے۔"

"آپ' آپ کیا بولتے ہو' یہ... یہ کیا ہے؟" بوڑھے کی زبان لڑکھڑانے لگی۔

بٹھل نے گھنٹی پر ہاتھ رکھ دیا اور زور زور سے دروازہ بجانے لگا۔ لوہے کا دروازہ تھا۔ سناٹے میں دور دور تک آواز گونجی ہوگی۔ بوڑھے کو یہ توقع ہرگز نہ تھی۔ "نکو' نکو بابا! ایسا نہ کرو" وہ چیخنے چلاتے ہوئے بولا اور اسے احساس ہوا کہ وہ تو خود اس شور و غل میں شامل ہوگیا ہے "ٹھہرو' ٹھہرو ہدایت میاں!" وہ عاجزی سے بولا "جاتا ہوں' میں اندر جاتا ہوں' کوشش..."

نور چاچا اندر جانے کے لیے پلٹ گیا۔ جس دروازے سے وہ برآمدے میں داخل ہوا تھا' اس نے اندر جا کے اسے بند کیا۔ چٹخنی لگانے کی آواز آئی لیکن ساتھ ہی اندر اور آوازیں آنے لگیں۔ دوسرے لمحے گاؤن پہنے' لمبے چھریرے جسم کا ایک ادھیڑ عمر شخص تیزی سے باہر نکلا۔ ڈاکٹر ناصر ہی ہوسکتا تھا۔ نور چاچا بکتا جھکتا اس کے پیچھے تھا۔ ڈاکٹر نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور گرل کے آکے ٹھہر گیا "ہدایت میاں!" وہ اضطراب سے بولا "کیا بات ہے' خیر تو ہے؟"

"خیر نہیں ہے سرکار!" ڈرائیور نے حواس باختگی سے سلام کیا اور فریادی لہجے میں بولا "دروازہ کھولیے حضور! سرکار نواب صاحب کو آپ کی ضرورت ہے۔ خدا کے لیے جلدی کیجئے۔"

ڈاکٹر کے ہاتھ اٹھانے پر نور چاچا نے قفل کھول دیا۔ ڈاکٹر لپکتے قدموں سے نیچے اترا۔ آگے بڑھ کے نور چاچا نے خاص دروازہ بھی کھول دیا۔ ڈاکٹر تیزی سے باہر نکل آیا۔ یہاں ہدایت علی کے ساتھ ہم اجنبی بھی کھڑے تھے' گو اس نے گرل ہی سے ہمیں دیکھ لیا ہوگا لیکن دروازے کی اوٹ میں خون سے رنگے ہوئے ہمارے کپڑوں پر اس کی نظر نہ جاسکی ہوگی۔ ہم اس قدر روشنی میں بھی نہ تھے اور ڈرائیور کو اتنی فراغت کہاں تھی کہ باقاعدہ ہمارا تعارف کرا سکتا۔ ڈاکٹر کو منتشر ہو جانا چاہیے تھا۔ اس کے چہرے کے رنگ بدلنے لگے۔ ہاتھ گاؤن کی جیب میں گیا۔ جیب میں ضرور کوئی ہتھیار ہوگا تاہم وہ ایک آزمودہ کار' حوصلہ مند شخص معلوم ہوتا تھا' اس نے اپنے آپ کو استوار کرلیا۔ ڈرائیور ہدایت علی کے بتانے پر کہ نواب موٹر میں موجود ہے' ڈاکٹر نے موٹر میں جھانک کے دیکھا۔ کسی برے خواب سے جیسے کسی کا وجود زیر و زبر ہو جائے' ایک لحظے کے لیے اس کی یہی حالت ہوئی۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا "یہ' کیسے ہوا؟"

"بعد کو سارا پوچھ لینا صاحب!" بٹھل نے تندی سے کہا "ابھی پہلے اپنا کام کرو۔"

ڈاکٹر نے ہینڈل گھما کے جھٹکے سے موٹر کا دروازہ کھولا اور نواب کی نبض ٹٹولنے لگا اور اس نے ہدایت علی سے کہا کہ موٹر اندر لے جائے۔

○☆○

برآمدے سے ملحق کمرا کھلوا دیا گیا تھا۔ نواب کو وہیں منتقل کردیا گیا۔ اندر لے جاتے ہوئے اس کی آنکھ کھل گئی تھی اور اس نے کراہنا شروع کردیا تھا لیکن ڈاکٹر نے سوئی لگا کر اسے پھر غنودہ کردیا۔ ڈاکٹر کو ایک مددگار کی ضرورت تھی۔ چند منٹ بعد ہی اس نے ہدایت علی ڈرائیور کو نور چاچا کے ہمراہ روانہ کردیا تھا۔ وہ کوئی آدھ گھنٹے بعد واپس آئے تو ان کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ اس دوران میں' میں اور بٹھل برآمدے میں بیٹھے رہے۔ ڈاکٹر کا سارا گھر جاگ گیا تھا۔ اس نے حکم دیا ہوگا کہ ایک ملازمہ ہمارے لیے استری کیے کپڑے لے آئی۔ ہم نے منع کردیا۔ کچھ وقت جاتا تھا کہ جمرو اور زورا کو آجانا تھا۔ انہوں نے ہم سے کچھ فاصلے پر موٹر ٹھہروائی تھی اور ہمیں ان سے کوئی بات کرنے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ یہ یقین کرکے ہم ڈاکٹر کے گھر میں داخل ہوچکے ہیں' انہیں ہوٹل کی طرف چلے جانا چاہیے تھا۔ یہی ہوا۔ تھوڑی دیر میں وہ میرے اور بٹھل کے لیے کپڑے لے کے واپس آگئے۔ ملازمہ نے مردانہ نشست گاہ سے متصل غسل خانے تک بٹھل کی رہنمائی کی۔ پہلے بٹھل نے کپڑے تبدیل کیے' پھر میں نے۔ ہمارے لیے سادگی اور سلیقے سے سجا ہوا بیٹھنے کا کمرا کھول دیا گیا۔

اندھیرے کا رنگ بدل رہا تھا پھر اذانیں گونجنے لگیں۔ اور پرندے چہچہانے لگے۔ ملازمہ نے چائے لا کے رکھ دی۔ نہانے اور کپڑے بدلنے ہی سے جسم خاصا ہلکا ہوگیا تھا' چائے نے گراں باری کچھ اور کم کی۔ زورا اور جمرو بھی ہمارے ساتھ بیٹھے رہنا چاہتے تھے۔ وہ بہت چاق و چوبند نظر آنے کا بہروپ بھر رہے تھے۔ ان کی حالت چہروں سے عیاں تھی۔ وہ تو مسلسل سفر کرتے رہے تھے۔ جانے کس طرح کیا کیا منت سماجت' دھونس دھاندلی سے انہوں نے ٹیکسی والے کو روکے رکھا ہوگا۔ بٹھل راضی نہیں ہوا۔ اس نے انہیں ہوٹل جا کے آرام کرنے کی ہدایت کی۔

صبح ہوچکی تھی اور دھوپ چھتوں پر اتر آئی تھی تب کہیں ژولیدہ رو ڈاکٹر ناصر مرزا کمرے میں وارد ہوا۔ اس کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔ ہم دونوں یک لخت اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کی صورت دیکھنے لگے۔ وہ صوفے پر بیٹھ کے گم سا ہوگیا۔ ہم نے انتظار کیا کہ وہی کچھ بتائے تو بہتر ہے۔ اسے ایک وقفہ سکون و سکوت کی ضرورت تھی۔ چند لمحوں بعد اس کے ماتھے کی لکیریں دور ہوئیں "آگے خدا کی مرضی ہے۔" وہ خود کلامی کے انداز میں بولا۔

"زخم گہرا تھا صاحب!" بٹھل نے آہستگی سے کہا۔

ڈاکٹر سہلانے لگا اور سینے میں سانس بھر کے بولا "ہم یہی کر سکتے تھے۔ خدا سے بہتری کی توقع کرنی چاہیے۔ خون بھی منگوایا ہے۔"

"اپنے پاس بھی کمتائی نہیں ہے۔"

ڈاکٹر نے چشمہ صاف کیا۔ اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ کی ایک لہر آکے گزر گئی "خون ایسے' ہر کسی کا ہر کسی کو نہیں دیا جاسکتا۔"

بٹھل نے کہا کہ اسے بھی معلوم ہے۔ ڈاکٹر خاموش ہوگیا اور کچھ توقف کے بعد چونک کے بولا "آپ نے چائے وغیرہ بھی پی؟ ناشتے کا وقت بھی ہوچکا ہے۔"

"بس صاحب' آپ کی مہربانی' چائے ہم نے پی لی ہے' باقی ٹھیک ہے۔ اپنے کو ضرورت نہیں ہے" بٹھل نے نرمی سے کہا۔

نہیں نہیں‘ یہ تو ناشتے کا وقت ہے۔" اس نے بے چینی سے ملازمہ کو آواز دی۔ ملازمہ کے بجائے نور چاچا حاضر ہوگیا اور اس نے سر جھکا کے بتایا کہ ناشتا بس تیار ہوا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر وہیں بیٹھا رہا‘ پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا‘ ہچکچاتے ہوئے کہنے لگا "کچھ ہمیں ہدایات علی ڈرائیور نے بتایا ہے لیکن یہ تو... یہ تو نہایت عجیب واقعہ ہے۔"

"کیا بولیں صاحب!" بٹھل نے بوجھل لہجے میں کہا۔

"ہمارے لیے یہ اپنی نوعیت کا پہلا کیس ہے" وہ اضطراب سے بولا "ریاست میں بسے ہوئے اب تو ہمیں بھی ایک زمانہ ہوگیا۔ یہاں ایسا نہیں ہوتا" اس کے لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کس فکر و تردد میں گھرا ہوا ہے۔ "آپ کو اندازہ ہے کہ یہ پولیس کا معاملہ ہے‘ پولیس دخل اندازی کرسکتی ہے‘ جواب طلبی بھی۔" اس کی آواز میں شکنیں پڑ گئیں۔ "نواب ثروت نہ ہوتے تو ہم بھی اس طرح..."

"اسی لیے تو آپ کی چوکھٹ پہ آئے تھے۔ تسلی کرو صاحب! آپ پر کچھ آئی تو بولیں گے کہ ہتھیار کے بل ہم نے آپ کو..."

ڈاکٹر نے پٹپٹاتی پلکوں سے بٹھل کو دیکھا اور اس کے ہونٹ کلبلا کے رہ گئے۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ ہدایت علی نے اسے کیا باور کرایا ہے۔ ہدایت علی کو توجیہہ و جواز کی مشکل پیش آئی ہوگی۔ اس نے لفظ بہت چبائے ہوں گے۔ وہ کمرے میں داخل بھی اس وقت ہوا تھا جب اس کے آقا کو زخمی ہوئے وقت گزر گیا تھا لیکن وہ وہاں موجود نہیں تھا یا دیر سے آیا تھا تو کیا ہوا‘ شریک کار تو ابتدا سے تھا۔ ڈاکٹر کی سیری نہیں ہوئی ہوگی مگر اس کے پاس حجت کا وقت نہیں تھا۔ گمان یہی ہے کہ ہدایت علی نے جو کچھ بھی گوش گزار کیا ہوگا‘ ڈاکٹر نے کسی جرح کے بغیر تسلیم کرلیا ہوگا۔ اب اسے فراغت تھی۔ اتنی دیر میں اس سلیم العقل شخص کا دماغ جانے کیا کیا وہم کاری‘ اندیشہ گری کرتا رہا ہو۔ اپنی تشفی کے لیے بجا طور پر اسے ہماری زبانی بھی احوال واقعی جاننے کی بے کلی ہونی چاہیے۔ بٹھل کے لیے یہی بہتر تھا کہ وہ محض ہدایت علی کے بیان کی تصدیق کرے۔ امکان یہی تھا کہ ہدایت علی نے ڈاکٹر کو وہی کچھ تاثر دینے کی کوشش کی ہوگی جو ہم نے باغ کے ملازموں کو دینا چاہا تھا۔ اس نے ہمیں کسی طور آلودہ نہیں کیا ہوگا۔ اسے برعکس اپنے مخدومی نواب کی خیر خواہی کی جستجو ہوگی۔ بہ صورت دیگر بٹھل کے لیے یہ مرحلہ اتنا ہی دشوار گزار تھا۔

اچھا ہوا کہ بٹھل کو اپنی داستان سرائی میں تاثیر پیدا کرنے کا کچھ اور وقت مل گیا‘ دوسرے لفظوں میں نظ[ر]

وقت۔ نور چاچا نے ناشتا لگ جانے کی اطلاع دی۔ [...] گاہ کے وسط میں پردے کے پیچھے پہیوں پر چلنے والی لک[ڑی کی] ایک دیوار تھی۔ پردہ ہٹا کے نور چاچا نے اسے بھی [ایک] طرف کردیا۔ یہ کھانے کا حصہ تھا۔ انگریزی طرز کی [میز کے] علاوہ ایک چوکی بھی دیوار کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔ ناصر مرزا کا تعلق شمالی ہندوستان کے کسی علاقے سے [تھا۔] ناشتے کا اہتمام باقاعدہ حیدر آبادیوں جیسا تھا‘ دوپہر اور [رات] کے کھانے کی طرح۔ آدمی کی کتنی زندگی ایک دوسرے [کے] لحاظ و تکلف میں گزر جاتی ہے‘ کسی کو بھوک نہیں بھی [ہوتی تو] رسم ادائی کے بغیر زندگی جو ادھوری رہ جائے۔ ڈاکٹر کو [شاید] زیادہ بات کرنی نہیں آتی تھی یا اسے کسی پچھتاوے [نے] گھیر رکھا تھا۔ وہ بجھا بجھا‘ تھکا تھکا سا تھا۔ اس نے [...] اصرار کی خانہ پری ضرور کی‘ کوئی اور بات کرنے کا محل [نہیں] تھا۔ نور چاچا اور ملازم مسلسل دخل اندازی کرتے ر[ہے۔] ہدایت علی نے ڈاکٹر سے ہمارا تعارف اپنے آقا کے مہما[ن کی] حیثیت سے کرایا ہوگا مگر ایک‘ صرف یہ اعتبار پہل[ی] آمنا سامنا کرنے والوں کی دھند دور کرنے کے لیے ناکافی [تھا۔]

ناشتے کے بعد ڈاکٹر ناصر مرزا‘ بٹھل کو لے کر نو[اب] ثروت کے کمرے میں چلا گیا۔ میں بھی ان کے ساتھ ج[انے] کے لیے بڑھ گیا تھا لیکن ڈاکٹر نے معذرت کرکے مجھے ر[وک] دیا‘ کہنے لگا۔ "ایک وقت میں ایک شخص مریض کے [پاس] جائے تو مناسب ہے" ڈاکٹر نے بٹھل سے سلسلہ جنبانی [کے] لیے دانستہ مجھے درگزر کیا ہوگا۔ وہ خاصی دیر بعد واپس آ[یا۔] لگتا تھا‘ بٹھل کے عرض حال سے ڈاکٹر کا اطمینان نہیں [ہوا] ہے۔ اس کے چہرے پر جمی ہوئی گرد کچھ اور گہری ہوگئی مگر اس نے صوفے پر کمر ٹکاتے ہی مجھے پیش کش کی کہ [میں] چاہوں تو نواب کو دیکھ سکتا ہوں۔ میں ہاتھ پاؤں باندھے بیٹھا رہا‘ مجھ سے یہ بھی نہ پوچھا گیا کہ نواب کس حال [میں] ہے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میں نواب کے لیے بہت متوحش [ہوں] گا۔ وہ گویا مجھے تسلی دلاسا دینے لگا کہ سردست تو نواب [سے] کوئی بات چیت ممکن نہیں ہے۔ اس پر ابھی تک غشی طا[ری] ہے‘ ڈاکٹر نے وہی کچھ کہا جو ہر حکیم ڈاکٹر کے ورد زبان [ہوتا] ہے کہ اس نے تو اپنے سارے ہنر آزمائے ہیں‘ باقی خدا [کے] ہاتھ میں ہے۔ پھر وہ بٹھل سے مخاطب ہوکے بولا کہ اس[نے] بہت غور و فکر کے بعد ہدایت علی ڈرائیور کو نواب کے گھر [بھیج] دیا ہے۔ نواب کی والدہ اور بہن کو اس حادثے کی اطلاع [ہونی] چاہیے۔

"ٹھیک کیا آپ نے صاحب!" بٹھل نے منمناتی آواز [مے]ں تائید کی۔

"کیا کرتے!" ڈاکٹر بے چارگی کے انداز میں بولا "ان کی [و]الدہ کم زور دل خاتون ہیں‘ عموماً بیمار رہتی ہیں۔ شوہر کے [ا]نتقال کے صدمے سے سنبھل نہیں پائیں۔ اب یہ سانحہ! نہ [ج]انے کس طرح برداشت کرپائیں‘ بہرحال‘ چھوٹی موٹی بات [ہ]وتی تو ہم چھپا لیتے۔ یہ تو نہایت سنگین... خدا خیر کرے۔"

"ایسا ہی ہوتا ہے صاحب!"

ڈاکٹر کو جھرجھری سی آگئی "ہمہ وقت نگرانی کی ضرورت ہے۔ ایک تجربہ کار آدمی تو ہم نے پاس چھوڑ دیا ہے‘ کسی [م]ستقل نرس کا بھی انتظام کرنا ہوگا۔ ہمیں بھی مطب اور [ا]سپتال سے کئی دن کی رخصت لینی پڑے گی۔"

"آپ زیادہ جانتے ہو صاحب!"

"یہ بات چھپی تو نہیں رہ سکتی" وہ بے قراری سے بولا۔

"یہ تو آپ نواب صاحب کی ماں بہن اور رشتے داروں پر چھوڑ دو۔"

"ہاں" ڈاکٹر کھوئی ہوئی آواز میں بولا "وہی اس کا فیصلہ کریں۔"

"آپ تو سب کو صاف بول دیں۔"

"جی‘ جی ہاں" وہ تذبذب سے بولا "آپ ٹھیک کہتے ہیں‘ ہمارا کیا ہے؟"

"ہم ادھری ہیں صاحب! کوئی الٹی سیدھی ہوئی تو ہم نے پہلے بول دیا ہے‘ آپ ہماری طرف انگلی اٹھادیں۔"

"نہیں نہیں" ڈاکٹر پر عواقب کا خوف غالب آگیا "خدا نہ کرے‘ ایسی نوبت آئے۔"

"فکر نہ کرو صاحب! بھروسا رکھو۔ اسپتال بیچ میں پڑتا تھا‘ پر سارے میں فیل مچ جاتا۔"

بٹھل کے یقین آمیز لہجے سے ڈاکٹر کا تکدر کسی قدر کم ہوا مگر میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ ڈرائیور ہدایت علی کے گھر جانے کا [س]ن کے مجھے اور وحشت ہونے لگی تھی۔ اب کسی وقت کسی [ل]محے نواب کی ماں اور بہن یہاں آسکتی تھیں۔ یہاں تو کہرام بپا ہوجائے گا۔ ہمارے یہاں دھرنا دیے بیٹھے رہنے سے حاصل بھی کیا ہے؟ ہم اس طرح نواب کے لیے کیا کرسکتے ہیں‘ کون سی مسیحائی؟ یہ اسپتال بھی نہیں‘ ڈاکٹر کا گھر ہے۔ مجھے ڈاکٹر کے اٹھ جانے کا انتظار تھا تبھی میں بٹھل کو ٹوک سکتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اندر کمرے میں ان دونوں کے درمیان کیا گفتگو ہوئی ہے۔ بٹھل نے حیدر آباد میں اپنی موجودگی‘ نواب سے اپنے تعلق‘ سفر کے مقصد اور اپنے قیام کے بارے میں کیا کچھ بتایا ہے۔ ڈاکٹر نے اتنے سوال نہ کیے ہوں تو بھی بٹھل نے اپنے تئیں اس کا آئینہ صاف رکھنے کی کوشش کی ہوگی۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی‘ جیسے بٹھل نے میرے دل کا حال پڑھ لیا ہو۔ مجھے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ اتنی جلد ہمیں فرصت مل جائے گی۔ ڈاکٹر سے مزید کچھ کہے بغیر بٹھل اٹھ گیا۔ ڈاکٹر نے اسے روکا بھی نہیں۔ وہ ہمیں دروازے تک رخصت کرنے آیا اور اسے یاد آیا کہ ڈرائیور تو موجود ہی نہیں ہے۔ اس نے ہدایت علی کی واپسی تک ہم سے ٹھہر جانے کے لیے کہا اور اپنے گھر سے چار کمان تک کی مسافت کا ذکر کیا۔ مطلب واضح تھا کہ بٹھل نے ہوٹل میں قیام کے بارے میں اسے بھی نہیں بتایا ہے۔ ڈاکٹر نے ازراہ وضع معذرت کی کہ موٹر تو اس کے پاس بھی ہے لیکن وہ خود چلاتا ہے اور نواب کی وجہ سے اس وقت اس کا گھر سے نکلنا ممکن نہیں ہے۔ "آپ پسند کریں تو بالائی منزل کا کمرا کھلوا دیا جائے۔ وہاں آپ آرام کرسکتے ہیں۔" اس نے دبے لفظوں میں کہا۔

بٹھل نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہنے لگا کہ نیند تو کھونٹے ہی پہ ڈھنگ کی آتی ہے۔ بٹھل نے ضرور تھکاوٹ اور آرام کا ذکر کیا ہوگا۔ یعنی ڈاکٹر کے یہ بتانے سے پہلے کہ ہدایت علی ڈرائیور نواب کی ماں کو اطلاع دینے کے لیے گھر جاچکا ہے‘ بٹھل نے اس سے اجازت مانگ لی تھی۔

"ہم ملازم کو بھیج کے آپ کے لیے سواری کا انتظام کرتے ہیں" ڈاکٹر نے شائستگی سے کہا۔

"چلے جائیں گے صاحب!" بٹھل پھیلی ہوئی آواز میں بولا "سواری ملنے کا ٹائم ہے۔ تھوڑا پیدل چلیں گے تو بدن کھلے گا۔ آپ اندر جاکے نواب صاحب کو دیکھو۔ ادھری آپ کی ضرورت زیادہ ہے۔ ہم لوگ شام دام کو پلٹیں گے‘ اچھی بات سننے کے لیے۔"

"انشاء اللہ" ڈاکٹر کی آواز کی ناتوانی شاید بٹھل نے بھی محسوس کی ہو۔

○٭○

آہستہ آہستہ اقامتی [علا]قے سے گزر کے ہم بڑی سڑک پر آگئے۔

زنداں کے جیسے در کھل گئے ہوں۔ میرے پیر لپک رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے زمین نرم ہوگئی ہے۔ دھوپ خوب نکل آئی تھی حالانکہ چوراہے کی گھڑی میں ابھی نو بج رہے تھے۔ دکانیں کھل رہی تھیں۔ دفتروں کا وقت ہوگیا تھا اور سڑک پر راہ گیروں اور سواریوں کا ہجوم تھا۔ یہ معظم جاہی مارکیٹ کے

گردونواح کا علاقہ تھا۔ عابد شاپ روڈ یہاں سے اتنی دور نہیں تھا۔ ہم پیدل بھی جاسکتے تھے مگر بٹھل نے گھوڑا گاڑی روک لی اور ہم چند منٹ میں ویکاجی ہوٹل پہنچ گئے۔ وہ دونوں جاگ رہے تھے۔ پہلی دستک پر انہوں نے دروازہ کھول دیا اور ہمیں دیکھ کے ان کی آنکھوں میں شرارے کوندنے لگے۔

"ہا استاد!" جمرو نے بے ساختہ صدا لگائی اور بٹھل سے لپٹ گیا۔ بٹھل نے بھی اسے بازوؤں میں بھرلیا۔ زورا میرے سینے سے چمٹ گیا۔ ان کے جسم دھڑک رہے تھے۔

"چائے منگا رے" بٹھل جوتا اتار کے مسہری پر نیم دراز ہوگیا۔

زورا نے فوراً گھنٹی بجادی۔ وہ دونوں مسہری پر بیٹھ کے پیر دبانے لگے۔ بٹھل نے انہیں منع بھی کیا لیکن وہ نہیں مانے "قسم سے استاد! سالی ایسی رتیا کبھی نہیں کاٹی۔" جمرو کے لہجے میں نازبرداری بھی تھی، تلخی بھی۔

"ہاں رے!!" بٹھل کا منہ بگڑ گیا "ابھی دودھ کے تیرے کاں ٹوٹے ہیں۔"

"ایمان سے رات کو تو اپنا تختہ ہوگیا تھا استاد! وہ سالا ٹیکسی والا، یتیم خانے کی اولاد موٹر کدھری بیڑویڑ میں اڑادیتا۔ بہت ٹنٹا کیا استاد حرامی نے، کیا بولوں۔ کبھی پیر پکڑتا، کبھی ہاتھ جوڑ کے بیوی بچوں کا واسطہ دیتا۔ بیچ میں منہ بند کرنے کے لیے ہم لوگ نے باربار ہڈی ڈالی پر وہ تو ایک دم اکھڑ گیا تھا۔ آخر میں سارے پیسے منہ پر ماردیے۔ بولتا تھا، مائی باپ، اپن کا گناہ معاف کرو، اپن کو آزادی دے دو۔ بھوتنی کا ساری وقت چراند کرتا رہا لیکن وہ جو کلکتیا لوگ بولتے ہیں، پورا روڈ کا راجا تھا، اپنے کام میں سولہ آنے فٹ، کتنی بار نواب کی موٹر سے آگے لے گیا اور لوٹا کے لے آیا۔"

"پیسے میں تو ڈنڈی نہیں ماری رے۔"

"وہ تو اپن نے بھردیا دادا!" زورا تڑخ کے بولا "کیا یاد کرے گا حرام کا، چھ مہینے رگڑا لگائے کے بھی اتنی پگار نہیں بناتا۔"

بیرا چائے لے آیا۔ چائے پی کے بٹھل نے بیڑی سلگائی اور مسہری پر پاؤں پھیلادیے اور زورا سے کہا کہ وہ کھڑکیوں کے پردے برابر کردے اور بہتر ہوگا کہ سب، دوپہر کے کھانے تک آرام کرلیں۔ وہ دونوں اس کے پاس سے اٹھنا نہیں چاہتے تھے اور پہیلیاں بوجھنے کے لیے بے تاب تھے۔ گو انہیں خوب معلوم تھا کہ بٹھل سے اس کی آمادگی کی شرط ہی پر کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ کھڑکیوں کے پردے گرانے سے کمرے میں تاریکی ہوگئی تھی۔ کہتے ہیں کہ بینائی روشنی سے مشروط ہے۔ روشنی نہ ہو تو بینائی کام نہیں کر[تی] اور بینائی نہ ہو تو روشنی اندھی ہوجاتی ہے مگر یہ شرط پور[ی] ہونے کے باوجود ایک اندھیرا پھر بھی باقی رہتا ہے، اندر [کا] اندھیرا۔ باہر کے اندھیرے میں نیند اچھی آجاتی ہے پر جب اندر ہی اندھیرا جاگزیں ہو تو آنکھیں جلتی رہتی ہیں۔ سار[ی] رات وہ اسی صبر آزما اندھیارے سے دوچار رہے تھے۔ [و]ہ بھی تو اتنے شامل رہے تھے جتنا میں اور بٹھل، بلکہ ہم سے کہیں زیادہ بے بسی اور بے چارگی کا وقت انہوں نے گزار[ا] تھا۔ انہیں اس فشار و غبار میں نیند کس طرح آسکتی تھی۔ [و]ہ لفظ تلاش کرتے رہے۔ جمرو کو کچھ اور سمجھائی نہیں دیا تو اس نے ایک آزمودہ حربہ اختیار کیا، راکھ کریدنے اور بھوبھل میں پھونکیں مارنے کا۔ اس نے چہکتی آواز میں کہا "رات [تو] استاد بس کتوں کی کسر رہ گئی تھی۔ باغ میں تمہارے اندر جانے کے بعد ہم لوگ ادھری اندھیرے میں پیڑ کے نیچے کھڑے ہوگئے تھے۔ وہیں ڈٹے رہتے تو وہ اٹھائی گیرے، حرام زادے ایسے اندر نہیں جاسکتے تھے۔ سالوں کی قسمت ساتھ دے رہی تھی کہ ادھری ہم جگہ سے ہٹے، جانے کون سی کھو[ہ] سے لاری اپنے پیچھے آگئی۔ اپنے کو لگتا ہے، وہ سور کی اولاد تمہارے پہنچنے سے پہلے باغ کے آس پاس ہی کدھری چھپے ہوئے تھے۔"

بٹھل ہاتھ پھیلائے بے حس و حرکت پڑا جمرو کا ہذیان سنتا رہا۔ جمرو نے بھی وقفہ نہیں کیا۔ اس کے کہنے کے مطابق، انہوں نے باغ کے دروازے سے دور درختوں کی آڑ میں ایک محفوظ جگہ موٹر ٹھہروائی تھی۔ موٹر سے اتر کے چند قدم کا فاصلہ طے کرنے پر دروازہ ان کی نگاہوں کے حصار میں آجاتا تھا۔ وہ وہیں آکے کھڑے ہوگئے تھے کہ انہوں نے دو آدمیوں کو دروازے سے نکلتے دیکھا۔ کچھ دور چلے جانے پر انہوں نے موٹر میں بیٹھ کے دونوں کا پیچھا کیا۔ آگے جاکے انہیں معلوم ہوا کہ ایک نواب کا ڈرائیور ہے۔ دوسرا جمرو کے خیال میں ضرور کوئی موٹر کا کام جاننے والا باغ کا ملازم ہوگا کیونکہ انہوں نے جلد ہی موٹر درست کرلی تھی۔ میں نے اور بٹھل نے دخل نہیں دیا کہ ڈرائیور نے باغ کے کسی ملازم کو رات کی وجہ سے احتیاطاً ساتھ لیا ہوگا۔ موٹر خراب ہی کہاں تھی جو درست ہونے میں وقت لگتا۔

جمرو کے بہ قول اسی دوران میں لاری وہاں پہنچی تھی اور اس میں سوار لوگ باغ میں جاچکے تھے۔ نواب کی موٹر کا تعاقب کرتے کرتے جمرو اور زورا آگے جاکے ٹھہر گئے۔ یہ

[دیکھ]تے کہ نواب کی موٹر کا رخ باغ کی طرف ہے، انہوں نے [رک]کے پھر اس کا تعاقب کیا اور درمیان میں ایک بڑا فاصلہ [رکھا] تاکہ کوئی شبہ نہ ہونے پائے۔ نواب کی موٹر باغ میں داخل [ہوئ]ے دیر ہوگئی تب وہ اپنی پرانی جگہ واپس آئے اور چند منٹ [توق]ف کرکے انہوں نے لاری تک پہنچنے کے لیے پیدل بڑھنا [شرو]ع کیا۔ مخالف سمت میں باغ کی فصیل کے ساتھ [درو]ازے سے کچھ دور لاری رکوائی گئی تھی۔ انہوں نے اندر جھانک کے دیکھا۔ لاری میں کوئی نہیں تھا۔ زورا نے [اشا]رہ دیا کہ لاری کے پہیوں کی ہوا نکال دی جائے۔ جمرو کو یہ [اقد]ام قبل از وقت معلوم ہوا۔ اس نے زورا کو روک دیا اور [دلی]ل دی کہ وہ دونوں تو بہرحال وہیں موجود ہیں۔ موقع پر کسی [وقت] بھی فائر کرکے ٹائروں کو نشانہ بنا سکتے ہیں۔ پہلے انہیں [لار]ی میں سوار لوگوں کی آمد کا سبب اور صورت حال کی [نوعی]ت سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

وقت گزر گیا۔ دروازے پر سناٹا ہی چھایا رہا۔ جمرو [مطم]ئن تھا کہ بٹھل کو باغ کے اردگرد اس کی اور زورا کی [موج]ودگی کا یقین ہوگا۔ ضرورت پڑنے پر بٹھل کسی طور ان [سے] رابطہ کرنے کی سبیل نکالے گا۔ موٹر کی خرابی کے وقت [نوا]ب کی مدد کے لیے ٹیکسی رکوا کے وہ بٹھل کو اپنی موجودگی [سے] باخبر کر ہی چکے تھے۔ تمام تر وحشت اور اضطراب کے [باو]جود جمرو کو یہ اعتماد بھی تھا کہ اندر بٹھل اکیلا نہیں، ساتھ [میں] بابر بھی ہے اور دونوں مسلح ہیں۔ باغ سے لوگ یقیناً اسی [راس]تے سے باہر آئیں گے۔ سو کسی غیر معمولی علامت یا [مشک]وک صورت نظر آنے تک انہیں تحمل کرنا چاہیے۔ وقت [سس]ک سسک کے گزر رہا تھا۔ ان کے پاس کھانے پینے کا [س]امان بھی نہیں تھا۔ ڈرائیور الگ عاجز کررہا تھا۔ وہ بے چینی [س]ے دروازے پر نگاہیں جمائے ٹہلتے رہے۔ دیر تک خاموشی [رہ]ی پھر اچانک فائروں کی آواز سے گردوپیش پر چھایا ہوا [سک]وت متلاطم ہوگیا۔ جمرو اور زورا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ [ک]یا کریں۔ باغ کی دیوار پھلانگیں یا سیدھے دروازے سے [اند]ر داخل ہونے کے لیے ہاتھ پاؤں ماریں۔ وہ دروازے [کے] قریب ہوتے گئے اور انہیں بھاگتے، چیختے لوگوں کا شور [سن]ائی دیا۔ پھر دروازے سے چند آدمی مجنونانہ حالت میں باہر [نک]لتے دکھائی دیے۔ ان سے بھاگا نہیں جارہا تھا کیونکہ ان کے [کن]دھوں پر زخمی یا مردہ آدمی لدے ہوئے تھے۔ وہ جلدی [ج]لدی انہیں لاری میں ڈالتے رہے۔ جمرو اور زورا اسی وقت [ا]ن کے سروں پر پہنچ کے انہیں گھیر سکتے تھے لیکن شور مچاتا ہوا [ہج]وم مسلسل دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جمرو اور زورا بھاگتے ہوئے اپنی موٹر کے پاس پہنچے اور ادھر لاری روانہ ہوئی، ادھر انہوں نے اپنی موٹر کو حرکت دی۔ لاری ابھی خاص سڑک کے نکڑ کے پاس پہنچی تھی کہ اپنی موٹر اس سے آگے نکال کے انہوں نے بیچ سڑک پر کھڑی کردی۔ لاری اب موٹر کے اوپر ہی سے آگے جاسکتی تھی۔ انہوں نے اپنے طمنچے نکال لیے۔ اتنے میں بٹھل اور میں وہاں پہنچ گئے۔

گزری ہوئی رات کا آموختہ جمرو کے لیے تکلیف دہ تھا۔ اس کے چہرے پر جال سا پڑ گیا۔ اس کا گلا خشک ہوگیا تھا اور آواز بھی جھرجھرانے لگی تھی۔ وہ چپ ہوگیا۔

بٹھل آنکھیں کھولے بے سدھ پڑا رہا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں یا وہ وہاں موجود ہی نہ ہو۔ بہت دیر بعد اس نے زبان کھولی "سوجا رے اب!" اس نے بھاری آواز میں کہا۔

"ٹھیک ہے استاد!" جمرو ترشی آمیز پژمردگی سے بولا۔

یہ تو محض تمہید تھی۔ اس احوال سے گزشتہ رات ہڈیوں میں سوزش کرنے والے وقت کا حساب پیش کرنا مقصود نہیں تھا۔ کچھ باور کرانا یا اپنے لیے کوئی اجر چاہنا۔ یہ ان کی وضع نہیں تھی۔ یہ تو ایک طرح کا حسن طلب تھا اور بلاغت کی بات تھی۔ وہ بٹھل کے خون کی گردش تیز کرکے اس کی زبانی کچھ جاننے کے آرزو مند تھے اور ہرچند انہیں اس جستجو کا پورا استحقاق تھا مگر اڈے کے استادوں سے اس طرح سوال نہیں کیے جاتے، اور وہ تو بٹھل تھا۔ جمرو نے اپنے بڑے بھائی جامو، اور زورا نے بمبئی کے سب سے بڑے دادا، پیرو دادا کو بٹھل کے سامنے نیچی پلکوں اور جھکی آواز میں بات کرتے دیکھا تھا۔

زورا سے برداشت نہیں ہوا "پر دادا!" وہ بچوں کے سے انداز میں مچل کے بولا "اپن کا سر ابھی تک گھمائے لا ہے کے سالا وہ چڑی مار کون لوگ تھا؟"

"ٹوٹھے رے، گھورے پہ کے۔"

"بھاڑے کا ہوگا پر آخر۔۔۔" زورا کے حلق میں آواز اٹک گئی۔

"وہ کتے تو نہیں تھے استاد جو پچھلی مرتبہ ادھری باوا کی حویلی میں۔۔ آئے تھے" جمرو نے دبی زبان سے کہا۔

"نہیں رے، دوسرے تھے نواب کے بھیجے۔"

"نواب کے!" ان کی آنکھیں پھیل گئیں "اپنا یہ، یہ نواب؟" دونوں نے ایک ساتھ کہا۔ انہیں یقین نہیں آرہا تھا۔

بٹھل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جمرو اور زورا کو سکتہ

سا ہوگیا تھا۔ بٹھل نے جماہی لے کے کروٹ بدلی۔ دونوں اس کی پائنتی پر گم صم بیٹھے رہے پھر جمرو نے بٹھل کے پیروں پر چادر ڈال دی اور اٹھ کے برابر کے کمرے میں آگئے اور انہوں نے مجھے نوچنا کھسوٹنا شروع کردیا۔ میں ان کے علم میں بٹھل سے زیادہ کیا اضافہ کرسکتا تھا۔ اسے بھی اس سے زیادہ کیا معلوم تھا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ آخر نواب نے کیوں؟ کیا نواب میں توازن کی کوئی خامی ہے؟ اسے یہ راستہ اختیار کرنے اور اتنا چکر کاٹنے کی کیا ضرورت تھی اور اسے ڈاکٹر کے حوالے کرنے میں بٹھل کو اتنی تلابیلی کیوں تھی؟ وہ طرح طرح کے سوال کررہے تھے۔ ان میں سے کسی ایک کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ آدمی کے اندر خود کچھ کم کانٹے نہیں ہوتے' برچھیاں' خنجر اور آگ۔ ذرا ہوا رخ بدل کے چلی' یہ کانٹے رگ جاں میں اڈنے لگے' برچھیاں اور خنجر تن گئے' آگ بھڑکنے لگی۔ میں نے اپنے آپ کو بہت روک کے رکھا تھا۔ انہوں نے پھر مجھے منتشر' متزلزل کردیا۔ میں تو صرف اتنا بتا سکتا تھا کہ بہ ظاہر نواب اچھی طرح دیکھتا اور سنتا تھا۔ اس کی نشست و برخاست' لہجہ ولب میں کوئی عیب نہیں تھا بلکہ یہ سلیقہ اور شائستگی تو لوگ اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آخر مجھے سوئیاں چبھوتے چبھوتے جمرد اور زورا خود ہی تھک گئے اور انہوں نے مسہری پر جسم ڈال دیے۔

میں بھی ان کے ساتھ بستر پر ڈھیر ہوگیا تھا۔ کمر ٹکاتے ہی جوڑ جوڑ دکھنے لگا۔ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ وہ بھی میری طرح مسہری پر لوٹتے رہے۔ بٹھل اسی لیے پہلو تہی کررہا تھا۔ ان کے اعصاب کے لیے کچھ دیر کی بے حسی و خوابیدگی ضروری تھی۔ لوگ غلط نہیں کہتے' جاننے سے نہ جاننا ہی کچھ بہتر ہوتا ہے۔ آگہی کبھی کیسی تلوار بن جاتی ہے' اور ادھوری آگہی تو اور عذاب ہے۔ اور کسی نے کہا ہے' مکمل آگہی تو ہوتی بھی کہاں ہے؟

اندھیرا ہونے لگا تھا۔ مغرب کی اذانوں کے بعد ہم کمرے سے نکل گئے۔ سڑک پر آتے آتے روشنیاں جل گئی تھیں۔ عابد شاپ روڈ پر آخر شام یا ابتدائے شب کی روشنیاں بہت سہانی لگتی ہیں۔ جمرد اور زورا ہمارے ساتھ نکلے تھے لیکن ہوٹل سے باہر آکے ہم سے تیس چالیس قدم پیچھے ہوگئے۔ کوئی خاص بات تھی کہ عابد شاپ روڈ پر عام دنوں سے زیادہ گہما گہمی تھی۔ ہم متوازن رفتار سے معظم جاہی مارکیٹ کی طرف بڑھتے رہے۔ گھوڑا گاڑی میں یہ رستہ نو دس منٹ سے زیادہ کا نہیں تھا۔ ڈاکٹر کے مکان کے علاقے تک پہنچتے پہنچتے آدھا گھنٹا ہو لیا تھا۔ بہرحال اب کچھ دور اگلے چوراہے سے ہمیں بائیں ہاتھ کو مڑجانا تھا۔ پھر دو فرلانگ بعد ڈاکٹر کا مکان تھا۔ یکایک میرے قدم ٹھٹھک گئے۔ میں نے بٹھل کو کہنی ماری۔ وہ بھی چوکنا ہوگیا۔ چارہ رہ گیا تھا کہ ہم پہلو کی دکان میں داخل ہوجائیں۔ دونوں اڈے کے آدمی تھے۔ مولانا کا نام مجھے خوب یاد دوسرے کا یاد نہیں آرہا تھا۔ وہ آکا کی بے دخلی اور بھورے دادا کی چوکی پر بٹھائے جانے کے تمام معاملات میں شریک رہے تھے۔ وہ کالے دادا کے قریب کے آدمی تھے۔ دادا چوکی پر بٹھائے جانے کے تمام معاملات میں شریک رہے تھے۔ وہ کالے دادا کے قریب کے آدمی تھے۔ اتفاق بروقت میری نگاہ پڑگئی۔ بٹھل بھی کہیں گم تھا۔ ان دونوں دھیان بھی بٹا ہوا تھا۔ دکان میں ہمارے داخل ہوتے ہی پیچھے' جمرد اور زورا بھی سنبھل گئے ہوں گے۔ وہ ہارڈویئر تالے' کنڈی وغیرہ کی دکان تھی۔ ہم نے اپنے جسم ترچھے کرلیے تھے۔ بس وہ لوگ اپنی دھن میں گزرتے چلے گئے حیدر آباد میں ہماری موجودگی ان کے وہم و گمان میں بھی ہوگی۔ کہیں وہ ہماری ایک جھلک دیکھ لیتے تو وہیں پھیل جا اور آناً فاناً اڈے کے آخری آدمی تک یہ خبر پہنچ جاتی بھورے دادا' کالے دادا' نام پلی کا ساجن دادا' جس جس معلوم ہوتا' ہماری طرف اڈا چلا آتا۔ بھورے دادا تو بالکل پاگل ہوجاتا۔ بٹھل نے آکا کو رسوا کرکے اس گوشہ نشیں دور افتادہ کو اڈے کے تخت پر بحال کیا تھا اور کالے دادا اس کی معاونت پر تعینات کیا تھا۔ بھورے دادا نے تو خواب میں بھی نہ سوچا ہوگا کہ اڈے کی چوکی کی عزت کبھی اسے یوں نصیب ہوگی۔

برس دو برس نہیں گزرے تھے' مہینوں کی بات تھی اتنی جلد اڈے پر کسی اور تبدیلی کا امکان تو نہیں تھا۔ آکا کی طرح اب کسی نئے دادا کا اڈے کی چوکی ہتھیانے کے لیے سر اٹھاتے ہوئے دس بار آگا پیچھا دیکھنا لازم ہے۔ انہیں اندازہ ہوگا کہ دو مرتبہ غیر متوقع طور پر حیدر آباد وارد ہو کے ہم نے نقشہ ہی پلٹ دیا تھا۔ اڈے پر بھورے اور کالے دادا مسند نشیں ضرور تھے لیکن کوئی ورپردہ کی بات نہیں تھی سب کا چشم دید تھا کہ اڈے کے اصل دعوے دار کون ہیں اور اگر' اس دوران کسی سرپھرے دادا نے واقعی بھورے اور کالے دادا کو ہٹا کے چوکی پر قبضہ جمالیا ہے تو شہر میں بٹھل دادا کی موجودگی کی خبر تو اور آگ لگ جائے گی کا مترادف ہوگی۔ علاقے کے تھانے کا انچارج بھی ابھی تک وہی کج کلاہ

در علی ہونا چاہیے۔ زنجیر کا سلسلہ اڈے سے تھانے' تھانے سے نواب راجا لوگوں تک جاتا ہے۔ ابا جان کی حویلی میں نقب زن بھیجنے والے اور حیدر آباد سے ہماری واپسی کے وقت ریل میں ہمارے پیچھے کتے دوڑانے والے ان سرگران نواب راجا لوگوں کا خون تو رگوں میں کوندنے لگے گا۔ وہ ہمارے شہر میں ہمارے لیے جال بچھا سکتے ہیں۔

اندھیرا اور بڑھ جانے تک ہوٹل میں ٹھہرے رہنے کی احتیاط سے بھی کیا حاصل تھا۔ اڈے کے آدمی اور ہمارے طلب گار' نواب راجاؤں کے نمک خوار شام ڈھلتے ہی آشیانوں میں روپوش نہیں ہوجاتے ہوں گے۔ ادھر ہم ڈھاٹا باندھ کے تو سڑکوں سے نہیں گزر سکتے۔ بٹھل کو خوب احساس ہوگا کہ ایسی کسی مڈبھیڑ کے نتائج کیا ہوسکتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں تیار ہی رہنا چاہیے۔ اس وقت ہم بچ گئے تھے۔ آگے چند قدم بعد ہی اڈے کا کوئی دادا ٹکرا سکتا تھا۔ وہ زورا اور جمرد کو ابھی اچھی طرح پہچانتے تھے۔

ڈاکٹر ناصر مرزا کی گلی میں داخل ہونے تک اندھیرا اور تیز ہوگیا۔ جمرد اور زورا بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ ساری عمارت روشن تھی۔ دو موٹریں دروازے کے پاس کھڑی تھیں۔ بس کچھ فاصلہ رہ جاتا تھا کہ ہمیں ٹھہر جانا پڑا۔ اسی لمحے اندر سے ڈاکٹر ناصر مرزا دو آدمیوں کے ساتھ باہر نکلا۔ اس کے پیچھے نواب کا ڈرائیور ہدایت علی بھی تھا۔ اس نے بڑھ کے دروازہ کھولا۔ ایک معمر شخص کے موٹر میں بیٹھنے پر موٹر روانہ ہوگئی۔ ڈاکٹر ناصر مرزا اور دوسرا آدمی فوراً اندر واپس چلے گئے۔ وہ ہمیں یقیناً نہیں دیکھ پائے تھے۔ بنگلے کا دروازہ بند ہوگیا تو ہم نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ بوڑھا ملازم شاید برآمدے ہی میں بیٹھا تھا۔ گھنٹی بجتے ہی وہ باہر آگیا۔ جیسے اسے ہماری آمد کی توقع نہیں تھی' ہمیں دیکھ کے دوبے تاب ہوگیا اور اندر چلنے کے لیے اصرار کرنے لگا۔

بٹھل نے ہاتھ اٹھا کے اسے تحمل کا اشارہ کیا اور نواب کے بارے میں پوچھا۔

ملازم کا چہرہ کھنچ گیا۔ اس نے آہ بھری اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے حسرت سے بولا "سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔"

بٹھل کے استفسار پر شکستہ آواز میں اس نے بتایا کہ صحیح حال تو ڈاکٹر ہی کو معلوم ہے۔ وہ تو اتنا جانتا ہے کہ صبح سے اب تک اس کے مالک کو ایک پل کے لیے قرار نصیب نہیں ہوا ہے۔ ہمارے جانے کے کچھ دیر بعد نواب کی والدہ اور اس کی بہن آگئی تھیں۔ ڈاکٹر کو نواب کے علاوہ انہیں سنبھالنے کا کام بھی کرنا پڑرہا ہے۔ سارا گھر ہی صبح سے انہی کی دل جوئی میں مصروف ہے۔ ان دونوں کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ مسلسل کلام پاک کا ورد جاری ہے۔ نواب کا ایک رشتے دار صبح گیارہ بجے آیا تھا' وہ ابھی تک موجود ہے۔ بوڑھے ملازم نے بتایا کہ دروازے پر جو موٹر کھڑی ہے' وہ اسی کی ہے۔

بٹھل سنتا رہا اور اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ اور کوئی نہیں آیا' بڑے صاحب' نواب کو پوچھنے؟"

جیسے کسی نے مجھ خوابیدہ کے چٹکی بھری ہو' میرا کچھ یہی حال ہوا۔ مجھے شبہ ہوا کہ یہ کوئی فریب سماعت ہے۔ سو میں نے اپنے سنے ہوئے کا اعادہ بلکہ توثیق کرنے کی جستجو کی مگر بٹھل نے کچھ اور نہیں کہا تھا۔ ظاہر ہے' اس نے کسی سبب کے بغیر ڈاکٹر کے ملازم سے یہ سوال نہیں کیا ہوگا۔ ملازم کے لہجے سے ابتدا ہی میں یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ ابھی تک سب کچھ نواب کے گھر تک رکھا گیا ہے۔ پولیس تک بھی بات نہیں پہنچی ہے۔ ایسی کسی صورت میں ہمارے لیے ملازم کی پذیرائی کا تور شاید مختلف ہوتا۔ نواب ثروت یار کی عیادت کے لیے بٹھل کو اور کس کس کی آمد کی توقع ہے؟ ایک شخص کے سوا کسی اور سے اسے کیا غرض تھی؟ اس کی مراد مولوی صاحب ہی ہوسکتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے' بٹھل کو شہر میں مولوی صاحب کی موجودگی کا یقین ہے۔ نواب کے سانحے کی اطلاع سن کے انہیں لازماً یہاں آنا چاہیے۔ یہ بھی محض نواب کی فسانہ طرازی ہوگی کہ مولوی صاحب اس کی زمینوں والے مکان میں مقیم ہیں۔ سارے جسم میں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ نواب صاحب جیسے صاحب اقبال کے لیے شہر میں مکانات کی کیا تنگی تھی کہ مولوی صاحب کو اتنی دور ٹھہرانے کی ضرورت پڑگئی مگر نواب کا اس طرح کیا مقصد.... !کون سا؟ .... میرا دماغ کچھ کام ہی نہیں کرتا تھا۔

بوڑھے ملازم نے نفی میں جواب دیا' پھر اسے یاد آیا کہ ڈاکٹر ناصر مرزا نے اپنے ایک مربی' شہر کے مشہور ڈاکٹر محمود علی صدیقی کو مشورے کے لیے بلایا تھا۔ وہ ابھی ابھی نواب کی موٹر میں واپس گیا ہے۔ "بس ابھی آپ لوگاں کے آنے سے چار پانچ منٹاں پہلے بڑے ڈاکٹر صاحب گئے ہیں" بوڑھے نے بتایا۔

بٹھل سرہلا کے رہ گیا۔ بوڑھا آدمی بھی کہیں کھوگیا تھا۔ اسے کچھ دیر بعد خیال آیا کہ ہم لوگ تو دروازے پر کھڑے ہیں۔ وہ بوکھلا سا گیا اور اندر چلنے کے لیے اصرار کرنے لگا۔

بٹھل نے کسی قدر توقف کیا اور اندر داخل ہوگیا۔

بوڑھا ہمیں اسی نشست گاہ میں لے گیا۔ جہاں صبح ہم بیٹھے ہوئے تھے۔ کمرے میں سوگوار سی خاموشی تھی۔ میرا دل ڈوبا جارہا تھا۔

بار بار میرا دھیان مولوی صاحب کی طرف جاتا تھا۔ مولوی صاحب کی یہاں آمد کا تو نواب پر گزرنے والی افتاد کی اطلاع پر منحصر ہے۔ چاہے وہ نواب صاحب کے وسیع مکان کے کسی حصے ہی میں کیوں نہ مقیم ہوں۔ اب تک لوگ یوں رکے ہوئے ہیں کہ انہیں خبر ہی نہیں ہوئی ہے مگر تابہ کے! نواب کے زخم خشک ہونے اور پوری طرح تندرست ہوجانے کا مرحلہ کوئی دو چار دن کی بات نہیں ہے۔ خود نواب کے گھر ملازموں کا ایک لاؤ لشکر ہے۔ شہر میں اس کے رشتے داروں اور شناساؤں کی بھی کوئی کمی نہ تھی۔ دولت میں تو رشتے یوں بھی ہزار ہوجاتے ہیں۔ دولت تو شہد کے مانند ہوتی ہے اور بڑی داد طلب ہوتی ہے۔ خراج ادا کرنے والے ایک ہجوم کے بغیر اسے چین نہیں آیا۔ نواب کی عزت وجاہ کا سلسلہ تو پشتوں سے ہے۔ زیادہ دیر تک نواب کو اس کے پرسانانِ حال سے روپوش نہیں رکھا جاسکتا۔ کسی کو ذرا سی بھنک مل گئی تو بات جانے کہاں تک پہنچے۔ بری خبر ویسے بھی آگ کی طرح پھیلتی ہے۔ ہدایت علی ڈرائیور واقف حال ہے۔ جیسا کہ بوڑھے ملازم نے بتایا ہے' ایک رشتے دار بھی اس کی ماں بہنوں کے ساتھ یہاں موجود ہے۔ ڈاکٹر ناصر مرزا اس کے گھر والوں' نرس اور معاون کے علاوہ ایک اور ڈاکٹر گزشتہ رات مجن میاں کے باغ میں آنے والے اور خود باغ کے ملازمین۔ اور آخر اس پردہ پوشی' پردہ داری کا جواز بھی کیا ہے۔ آدمی بیمار بھی ہوتا ہے' اسے حادثے بھی پیش آتے ہیں۔ آدمی کو سرِراہ سانپ بھی کاٹ لیتا ہے۔ کوئی اس طرح اسے تہ خانے میں بند نہیں کردیتا۔

ابھی تو صرف ایک پہر گزرا ہے۔ کوئی وقت نہیں جاتا کہ اطراف واکناف میں نواب کی عبرت ساماں داستان کا شہرہ ہوگا اور ڈاکٹر ناصر مرزا کے ہاں نواب کے بہی خواہوں کی بھیڑ لگی ہوگی۔ ایسے میں تو دشمن بھی تماشا دیکھنے آتے ہیں۔ مولوی صاحب کو بھی لازماً اپنے محسن' اپنے عالم پناہ نواب ثروت یار کے سرہانے دعائے شفا اور کلمات خیر کی رسم ادائی کے لیے آنا چاہیے۔ خبر ملنے کے بعد انہیں ٹھہرنا ہی نہیں چاہیے۔ وہ تو پھر کسی وقت بھی یہاں آسکتے ہیں۔ آج رات' کل صبح' کل کسی وقت یا زیادہ سے زیادہ ایک دو دن بعد۔ سو کہیں اور جانے کے بجائے ہمیں یہیں ڈیرا ڈال دینا چاہیے' اور یہاں ڈاکٹر ناصر مرزا کے گھر صبح شام ہمارا دھرنا دیے رہنا ممکن نہیں تو آس پاس کی گلیوں میں کوئی ٹھکانا بنایا جا[illegible] ہے۔ خاص سڑک سے مکان تک آنے جانے کے راستے اتنے پیچیدہ نہیں ہیں۔

ہمارا یہاں بار بار آنا اور دیر تک موجود رہنا کسی [illegible] مناسب نہیں۔ کل صبح یہاں لوگوں کی تعداد بڑھ سکتی [illegible] ان میں طرح طرح کے لوگ ہوں گے اور سبھی ہم [illegible] حادثے کی نوعیت جاننے کا تجسس ظاہر کریں گے۔ کہنی [illegible] بندھی ہو تو لوگ چین نہیں لینے دیتے۔ ممکن ہے بعض [illegible] طراز ہمی کو اپنی الزام تراشیوں کا ہدف بنائیں اور بعض [illegible] کی کھال نکالنے والے نواب کے جاں نثار معاملے کی [illegible] کے لیے پولیس کو شامل حال کرنے پر اصرار کریں۔ ا[illegible] ریاست کے عمائد کے لیے اس خوں آمیز واقعے کی اط[illegible] فکر واضطراب کا باعث ہونی چاہیے۔ نواب مجن میاں [illegible] باغ کے مرنے والے ملازمین کی خبر شہر تک پہنچنے میں [illegible] فاصلہ حائل نہیں ہے۔ ملازمین بھی وہ نواب مجن میاں [illegible] عالی نسب' عالی مقام نواب کے ہیں۔ نوکروں کی حیثیت [illegible] اہمیت بھی اپنے آقاؤں کی جلالت ومرتبت سے طے [illegible] ہے۔ سرغنہ کے ساتھ آنے والے چند آدمی بھی [illegible] کھو بیٹھے تھے۔ وہ جنگل میں نہیں رہے ہوں گے۔

ہر حاکم سے اوپر ایک حاکم' یہاں یہ سلسلہ فرماں رو[illegible] ریاست تک جاتا ہے اور اعلیٰ حضرت اپنے عمال سے [illegible] دور فرو کش نہیں ہیں۔ یہ رفت گزشت والی بات نہیں۔ پردہ داری میں سنگینی اور بڑھتی ہے۔ سفید وسیاہ جلد سا[illegible] آگیا تو خیال کار اپنے اپنے انداز سے طبع آزمائی کریں۔ بادشاہ تک بات پہنچ سکتی ہے۔ چنانچہ ہر پہلو سے خدام با[illegible] واقعے کے اسباب وعلل' تفصیل اور شہادتوں سے بہ [illegible] مسلح رہنا لازم ہے۔ جانے کب جواب دہی کے لیے [illegible] حکم نامہ صادر ہوجائے۔ نواب تو اوسان میں نہیں ہے [illegible] ڈرائیور ہدایت علی اور باغ کے ملازمین موجود ہیں۔ ان [illegible] علاوہ سب سے زیادہ ضرورت تو انہیں ہماری ہوگی۔ ہدا[illegible] علی موقع پر بعد میں حاضر ہوا تھا' باغ کے ملازمین اس [illegible] بعد۔ بہرحال یہ ایک ریاست ہے' چھوٹے بڑے نوا[illegible] راجاؤں کا دیس۔ ان کے اپنے قاعدے اور قانون ہیں [illegible] مزاج ہے اور اپنی مصلحت کاریاں۔ فیصلہ کتنا ہی تراند[illegible] ہو' فیصلے میں دیر نہیں لگتی۔ میری طرح بٹھل کو بھی اند[illegible] ہوگا کہ ہم کیسی گردشوں سے دوچار ہوسکتے ہیں۔ ہم ویسے [illegible] یہاں اجنبی ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ یہاں سے اٹھ کے ہو[illegible] سے سامان اٹھانا چاہیے اور پہلی گاڑی پکڑنے کی کو[illegible] کرنی چاہیے۔

ایک بار نظروں میں آجانے کے بعد ہماری گزشتہ روداد بھی چھپی نہ رہ سکے گی۔ چاقو' بندوقیں' اڈاگیری' ہیرے' مسلح آدمیوں سے نبرد آزمائی' شاہ کبیر اور آکا کا خاتمہ' خانم اور نواب عالم تاب کا قصہ' وسیع وعریض حویلی کی خریداری' سبھی کچھ آئینہ ہوسکتا ہے۔ وہ ہم سے ریاست میں بار بار آمد کا مقصد جاننا چاہیں گے۔ ریاست میں آمدورفت کے لیے پروانہ راہداری کی پابندی نہیں ہے لیکن ہم ڈھنگ سے کچھ نہ بتاسکیں گے اور ہم نے اصل ماجرا گوش گزار کرنے کی جسارت کی تو باقی کچھ اسی پر منحصر ہے۔ انہیں اعتبار آئے' نہ آئے کہتے ہیں سچ بجائے خود دلیل ہے۔ سب کہاوتیں ہیں۔ سچ کو بھی دلیل کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور دلیل کو حجت کی' ورنہ کرسی پر فائز منصف کو اتنا پس وپیش کیوں ہوا کرتا۔

میری رگوں میں خون اٹکنے لگا تھا۔ میں نے وحشت سے بٹھل کی طرف دیکھا۔ وہ بیڑی کے کش لگا رہا تھا اور سونف چبا رہا تھا۔ بوڑھا ملازم ہمیں وہاں بٹھا کے واپس جاچکا تھا۔ کچھ دیر میں وہ عربی قہوہ لے آیا اور کھجوروں' نان خطائیوں سے بھری طشتریاں بھی۔ اس نے بتایا کہ ڈاکٹر ناصر مرزا نواب کے کمرے میں مصروف ہے۔ سنا ہے' نواب کو ہوش آیا ہے۔ ڈاکٹر کو اسی لیے ہماری آمد کی اطلاع نہیں دی جاسکی ہے۔ بٹھل نے فنجان میں قہوہ بھر کے میری جانب بڑھادیا۔ میں نے ایک ہی گھونٹ میں اتار لیا۔ مجھے بہت گھبراہٹ ہورہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی چوک ہورہی ہو' ہم کچھ بھولے جارہے ہیں اور وقت تیزی سے گزر رہا ہو۔

ہمیں وہاں بیٹھے ہوئے آدھ گھنٹے کے قریب ہورہا ہوگا کہ یکایک سامنے کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر ناصر مرزا نمودار ہوا۔ ہم پہ نظر پڑتے ہی وہ پریشان سا ہوگیا اور بے اختیار اس نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔ اس کے عقب میں سلیٹی شیروانی میں ملبوس ایک گندم گوں' فربہ اندام ادھیڑ عمر شخص اور ایک برقع پوش نوجوان لڑکی تھی۔ لڑکی کی نقاب کھلی ہوئی تھی۔ اس پر چند ثانیوں کے لیے حیرت واضطراب کا غلبہ رہا اور اس نے جھٹ نقاب ڈال لی۔ بس جیسے تیز ہوا نے کسی دریچے کی چلمن اڑائی تھی اور جھماکا سا ہوا تھا۔ میں اسی قدر دیکھ سکا۔ وہ اوسط قد' نازک خال وخند' اکہرے بدن' لال رنگ یا گلنار چہرے کی لڑکی تھی۔ لگتا تھا' دھوپ سے کبھی گزر ہی نہ ہوا ہو۔ جس دروازے سے وہ داخل ہوئی تھی' اسی میں تیزی سے پلٹ گئی۔ ڈاکٹر ناصر مرزا ادھیڑ شخص کے ساتھ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ہمارے پاس آگیا۔ "آپ' آپ کب آئے؟"

اس نے تعجب آمیز شائستگی سے کہا۔
"تھوڑا ہی ٹائم ہوا ہے" بٹھل کھڑا ہوگیا۔
ادھیڑ شخص کی نگاہیں ہم دونوں پر منڈلا رہی تھیں۔ ڈاکٹر کو فوراً ہی احساس ہوا اور ہچکچاتے ہوئے کہا "یہ نواب ثروت یار کے سگے خالہ زاد بھائی' نواب فہمید علی۔"
بٹھل نے سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا اور مسکرا کے بولا "ہم پہچان گئے تھے اور ادھری بٹیا کو بھی ہم نے جان لیا تھا۔ وہ نواب کی بھینا تھی نا۔"
"جی' جی ہاں مگر ہمیں یاد نہیں آرہا' ہماری آپ کی شاید پہلی ملاقات ہے" نواب فہمید کی بھوئیں چڑھ گئی تھیں۔ اس کی آواز میں اچھا کس بل تھا۔
"خاندان بھی پیڑ کی طرح ہوتا ہے۔ ایسے بھی آپ نواب ہی لگتے ہو صاحب!"
"اوہ!" فہمید علی بل کھا گیا اور کسمساتے ہوئے بولا "ہمیں آپ کو دیکھنے کی بے چینی تھی۔"
"پھر آپ کو کیا خوشی ہوئی ہوگی؟"
"نہیں' نہیں جناب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں" فہمید علی نے ہکلاتی زبان میں کہا "اصل میں آپ سے مل کے ہم سمجھنا چاہتے تھے کہ یہ سب کیا ہوگیا' کیسے ہوگیا؟"
"اپنی سمجھ میں خود نہیں آیا تو آپ کو کیا بولیں۔"
"کون لوگ تھے وہ؟" فہمید علی کا چہرہ کھنچ گیا۔
"کون ہوسکتے ہیں؟"
"چاہتے کیا تھے؟"
"اٹھائی گیرے کیا چاہیں گے صاحب!"
"مال و زر چاہتے تھے؟"
"جو پلے تھا' آگے کردیا تھا ان کے۔"
"پھر!" نواب فہمید پھٹی آنکھوں سے بولا۔
"کیا بولیں" بٹھل نے اکھڑی ہوئی آواز میں کہا "لگتا ہے ڈاکٹر صاحب نے آپ کو سارا نہیں بولا۔"
"ہم نے عرض کیا تھا" ڈاکٹر نے بہ عجلت وضاحت کی "جو صورت حال آپ نے ہمیں بتائی تھی' ہم نے عرض کردی تھی۔"
"ڈاکٹر مرزا نے بے شک ہمیں بتایا تھا لیکن۔۔" نواب کی پلکیں سکڑ گئیں۔ چند لمحوں تک وہ چپ رہا' پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "اس قدر پیچیدگی ہے کہ ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ آئندہ حالات کیا کروٹ بدلیں۔ ڈاکٹر صاحب اور ہم یہی گفتگو کر رہے تھے کہ ہمیں اب پولیس کو مطلع کردینا چاہیے۔"

"ٹھیک سوچا ہے آپ نے" بٹھل نے کہا۔
"دیکھیے نا" نواب فہمید علی پہلو بدل کے بولا "پولیس ازخود بھی تو اس معاملے میں دلچسپی لے سکتی ہے۔ یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔"
"ہاں صاحب! بڑے آدمی کی بات بھی بڑی ہوتی ہے۔"
دونوں نے چونک کے بٹھل کو دیکھا لیکن بٹھل کے لہجے کی سادگی سے وہ غالباً مطمئن ہوگئے "نواب فہمید علی بے تابی سے بولا "ہمیں پولیس سے کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ سنا ہے اس کا طریق کار نہایت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ عجب موشگافیاں کرتی ہے۔"
"وہ بھی آدمی دیکھ کے بات کرتے ہیں' آپ بے فکر رہو۔"
"لیکن ان سے سابقہ پڑنے سے پہلے ہمیں ہر پہلو سے واقف ہونا چاہیے۔"
"ڈاکٹر صاحب نے جو آپ کو بولا ہے' سارا وہی دہرا دیں۔ اپنے پاس بھی اس سے اوپر نہیں ہے۔"
"لیکن کئی سوال اٹھتے ہیں" نواب اضطراری لہجے میں بولا "ان بدقماشوں کو معلوم تھا کہ آپ لوگ سفر میں ہیں۔ آپ کے پاس ظاہر ہے' کثیر نقدی' سونا چاندی' ہیرے جواہر وغیرہ نہیں ہونے چاہئیں۔ آپ کی ان کی کوئی ذاتی پرخاش بھی نہیں تھی۔ انہوں نے ہتھیار اٹھائے ہوں گے اور جان کی دھمکی دی ہوگی۔ یہ یقین ہوجانے کے بعد کہ جو کچھ آپ نے ان کے سپرد کردیا ہے' اس سے مزید ہوتا تو جان سے بڑھ کے نہیں تھا' آپ کبھی ان سے نہ چھپاتے پھر وہ ایسے خون خرابے پر کیوں۔۔؟"
"ان کو اپنی زبان نہیں آتی تھی۔"
نواب نے مفہوم اخذ کرنے میں وقفہ کیا "انہیں یقین نہیں آیا" وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا "ہدایت علی نے ہمیں بتایا ہے کہ ان کی تعداد آٹھ دس کے قریب تھی۔ وہ کہتا ہے کہ وہ تو اس وقت اندر آیا' جب ثروت زخمی ہوچکے تھے اور آپ ان پر قابو پاچکے تھے۔"
"ٹھیک بولتا ہے وہ" بٹھل نے سرد لہجے میں کہا۔
"ہمیں بتائیے' پھر اس دھینگا مشتی کی نوبت کیسے پہنچ گئی؟ آپ کی تعداد تین سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ آٹھ دس تھے کوئی توازن ہی نہ تھا۔"
"ہتھیار اپنے بل پر نہیں چلتا صاحب!"
"ہم' ہم سمجھ نہیں پائے" نواب نے ہڑک کے کہا۔
"ہتھیار بہت بکٹ ہوتا ہے' پہلے اس کو سدھانا پڑتا ہے

ر ہر کسی کے ہاتھ میں اچھا نہیں لگتا۔"
"جی' جی ہاں" نواب نے بے قراری سے سر ہلایا۔
"ہتھیار کے ساتھ کچھ اور بھی ساتھ رکھنا پڑتا ہے۔"
"آپ کا مطلب ہے' وہ ناپختہ لوگ تھے؟"
بٹھل نے واسکٹ کی جیبیں ٹٹولیں مگر بیڑی کا بنڈل
ونے پر اس کے کولھے سے دب گیا تھا۔ وہ دونوں اس کی
ورت دیکھتے رہے۔ بیڑی سلگا کے بٹھل نے کش لیا اور
اموش ہی رہا۔
"ہدایت علی بتا رہا تھا کہ ان کے بھی چند آدمی مارے
ئے" ڈاکٹر بے ربطی سے بولا "باغ کے ایک دو نوکر بھی؟"
"ایک دو نہیں صاحب' پورے تین!"
"یہ تو نہایت سنگین واقعہ ہے' سنگین بھی' حیران کن
ی" نواب کی آواز پر سراسیمگی چھا گئی۔ وہ کبھی میری طرف
یکھتا' کبھی بٹھل اور ڈاکٹر کی طرف "آپ لوگ آخر کہاں
رہے تھے؟"
"یہ آپ کو ہدایت علی نے نہیں بولا؟"
"اس نے ہمیں بتایا ہے کہ ثروت آپ کو زمین پر لے
رہے تھے" نواب کی آنکھیں لال ہوگئی تھیں "مگر کیوں؟"
"زمینوں پر کیوں جاتے ہیں' زمیں دار لوگ؟ پہلی بار
رہے تھے کیا وہ ادھری؟"
"معاف کیجیے" نواب فہمید نے کرکراتی سی آواز میں کہا
ہمیں نہیں معلوم کہ آپ کے ان کے مراسم کب سے ہیں۔
روت میاں کے بہت سے معاملات کا ہمیں علم رہتا ہے۔
یں یاد نہیں' ہم نے آپ کو پہلے دیکھا ہو یا آپ کے بارے
ں کچھ سنا ہو۔ ہمارے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے آپ
کے تعارف میں بڑی تشنگی ہے۔"
"کبھی اس کی ضرورت نہیں پڑی نا!"
"مگر اب شاید ہے بلکہ یقیناً" نواب فہمید کے لہجے میں
لخی بھی تھی' حکم بھی تھا۔
"اپنا بھی یہی ہے" بٹھل نے تنک کے کہا۔
"جی! بے شک" نواب منتشر ہوگیا اور وضاحت کرنے
ا "ڈاکٹر مرزا نے نواب ثروت سے ہمارے تعلق کے باری
ں آپ کو پہلے ہی بتایا ہے۔"
"پر اتنا تو نہیں صاحب!"
"خاطر جمع رکھیے' ہم ان کے سب سے قریب کے آدمی
ں شاید اسی لیے آپ کو یہاں نظر آرہے ہیں۔"
"اور ہم بہت دور کے! ہماری تو نواب صاحب سے یہ
وسری تیسری سلام دعا ہوئی تھی۔"

"کیا' کیا آپ سے زمین یا کسی جائداد کے سلسلے میں کوئی معاملت ہو رہی تھی؟"
میرا خیال تھا' بٹھل کو بتا دینا چاہیے کہ ہم تو مولوی محمد شفیق نامی ایک شخص کی جستجو میں یہاں آئے ہیں اور نواب ثروت نے خط لکھ کے ہمیں بلایا ہے۔ نواب فہمید اپنے خالہ زاد بھائی سے جب اتنی قربت کا دعویٰ کر رہا ہے تو ممکن ہے' مولوی صاحب سے بھی واقف ہو۔ اسی سے ہمارا مقصد حاصل ہوسکتا ہے۔ میرے جی میں آیا کہ میں دخل درمعقولات کروں اور بٹھل کے کچھ کہنے سے پہلے نواب فہمید کو صاف صاف بتا دوں تاہم میں سوچتا ہی رہ گیا۔
"ایسا ہی کچھ سمجھ لو صاحب!" بٹھل نے بھن بھنا کے کہا۔
نواب فہمید کی آنکھیں بجھ گئیں۔ مزاج میں نخوت اور تندی کے ساتھ اس میں مروت اور معاملہ فہمی بھی کم نہیں تھی۔ اس زود فہم نے غالباً گمان کرلیا کہ بٹھل سے نواب ثروت کے ساتھ ہمارے مراسم اور معاملات کے بارے میں تجسس کے اظہار سے کچھ حاصل نہیں۔ وہ اپنی نشست پر سیدھا ہوگیا اور چند لمحے ٹھہر کے دھیمی آواز میں بولا "جناب کا قیام کہاں ہے؟"
"ادھری چار کمان کی طرف" بٹھل نے سرسری انداز میں کہا۔ اسے معلوم ہوگا کہ یہ جواب نواب فہمید کی تشفی نہیں کرے گا' وہی ہوا۔
نواب کہنے لگا "پولیس والے آپ سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہیں تو ہم انہیں کیا بتائیں؟"
"ادھر آتے رہیں گے ہم۔ ابھی ہم شہر سے نہیں جا رہے' جب تلک نواب صاحب ٹھیک نہ ہوجائیں۔"
"ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ وقت لگ سکتا ہے۔" نواب فہمید کی آواز بکھرنے لگی۔
"اپنے کو بھی کیا جلدی ہے۔"
کسی وقت بھی پولیس یہاں آسکتی ہے۔ یہاں یا ہمارے گھروں پہ۔" نواب خود کلامی کے انداز میں بولا "یہ کیسا عجیب ہوگا۔ ہمیں قطعاً گوارا نہیں ہے۔"
"کس کو ہوتا ہے صاحب!"
"وہ ہم سے دوسرا سوال لازماً آپ کے بارے میں کریں گے۔"
"آپ بولو تو پھر ادھر ہی بیٹھے رہیں یا خود تھانے جا کے حاضری لگا دیں۔"
"نہیں' نہیں جناب' ہمارا مقصد یہ نہیں ہے۔" نواب

نے شدت سے تردید کی اور کہنے لگا "ثروت میاں کو اس حالت میں دیکھ کر ہمارے تو حواس ہی جاتے رہے۔ آپ ہی کچھ بتائیے' آپ کی رائے کیا ہے۔ ہمیں پولیس کو خبر کرنی چاہیے؟ بعد میں کوئی پیچیدگی نہ ہو۔"

"جیسا آپ سمجھو۔" بٹھل نے اچٹتی آواز میں کہا "پر اچھا ہوگا' ایک بار اپنے نواب صاحب سے بھی پوچھ لو۔"

نواب فہمید پلکیں جھپکانے لگا "آپ کی مراد ثروت میاں سے ہے؟" وہ تیزی سے بولا۔

"ہوش آنے پہ آپ ان سے اتنا پوچھ سکتے ہو۔"

"یہ' یہ ضروری ہے کیا؟" نواب نے متوحش لہجے میں کہا۔

"ایسے ہی صاحب۔" بٹھل نے زیر لبی سے کہا "اچھا رہے گا۔"

"کیا مطلب!" نواب کے چہرے پر خاک اڑنے لگی "دیکھیے جناب۔ معلوم ہوتا ہے' آپ ہم سے کچھ چھپا رہے ہیں یا ہم سمجھ نہیں پا رہے۔ کوئی ایسی بات ہو تو بندہ پروری کیجیے۔ ہمیں اندھیرے میں نہ رکھیے۔ ہم نواب ثروت کے خیر خواہ ہیں۔ ہم ان کے بھائی ہیں۔"

"جانتے ہیں صاحب! پر آپ اتنی سرماری کیوں کرتے ہو۔" بٹھل کی آواز میں نہ ترشی تھی نہ حلاوت "ہم کو جو آتا تھا' وہ ہم نے بول دیا ہے۔ باقی تھوڑا نواب کے لیے بھی رکھو۔"

نواب فہمید کہیں گم ہوگیا۔ کمرے میں سکوت ہوگیا تھا پھر نواب کو جانے کیا ہوا' معاً وہ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا "ہم اجازت چاہتے ہیں۔" اس نے اضطراری لہجے میں کہا اور گردن گھما کے شیروانی کا کالر درست کیا۔

ڈاکٹر کے ساتھ ہم دونوں بھی کھڑے ہوگئے۔ نواب دروازے کی طرف چل پڑا لیکن کچھ دور جا کے ٹھہر گیا اور سر جھکائے ہوئے پلٹ آیا۔ اس کے نتھنے پھولے ہوئے تھے۔ آنکھیں جیسے جل رہی ہوں۔ اس کی عمر لمحوں میں بڑھ گئی تھی۔ چہرے پر جا بجا لکیریں کھنچ گئی تھیں۔ اسے شاید لفظ نہیں مل رہے تھے اور ایک ہی بات اس کے دل و دماغ میں کھٹک رہی تھی۔ اس نے کھوئے ہوئے انداز اور بے ترتیب لفظوں میں وہی تکرار کی کہ اگر خود پولیس نے اس سے رابطہ کیا؟

"تو آپ کا کیا ہے صاحب۔" بٹھل کے لہجے میں کسی قدر درشتی آگئی "سارا آپ کا الٹایا ہوا ہے کیا؟ جتنا آپ جانتے ہو' آپ ان کو بول سکتے ہو۔ آپ ان کو کہہ سکتے ہو کہ نواب ثروت یار کے ہوش میں آنے کا انتظار کرو۔"

"لیکن وہ آپ کے بارے میں ہم سے جاننا چاہیں گے؟"

"پھر کیا ہوا صاحب! ہم لوگ آپ کا دیا ہوا نہیں کھاتے جو آپ کو پریشانی ہو' آپ ہمارے ٹھیکے دار نہیں ہو۔ ان کو بول دینا جب ہم دوبارہ ادھری نواب صاحب کو دیکھنے آئیں گے تو پولیس کو ہم بتا دیں گے۔ جب ہم لوگ واں زمینوں کی طرف جا رہے تھے تو آپ سے ٹھپا لگوا کے نہیں گئے تھے اور ادھر ہی کیا نوٹنکی ہوئی' آپ کا دیکھا ہوا نہیں ہے۔ ہدایت علی کو بھی کتنا پتہ ہے۔ باقی کا باغ کے لوگ باگ بھی تھوڑا ان کے آگے کریں گے۔"

نواب' بٹھل کے روبہ رو ساکت و صامت کھڑا سنتا رہا۔ بٹھل کی بات شاید اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی آگ کم ہونے لگی۔ میرے سینے کی دھند بھی چھٹ رہی تھی۔ بٹھل نے نواب سے مزید کچھ نہیں کہا۔ نواب کج کلاہ ضرور تھا' کج رو اور کج فہم نہیں۔ بین السطور کا اسے خود اخذ کرنا چاہیے تھا۔ بظاہر کوئی ابہام نہیں تھا۔ جیسا کہ واقعہ تھا' نواب پولیس کو ہمارے بارے میں مطمئن کر سکتا تھا کہ ابھی ہم شہر میں ہیں اور یہی نہیں کہ صبح شکستہ نواب ثروت کو ڈاکٹر ناصر مرزا کے حوالے کرکے ہم انسانی فرض سے سبکدوش ہوگئے ہیں' ہم شام کو بھی زخمی نواب کی چارہ گری کے لیے آئے تھے۔ نواب فہمید کو اس صاف بیانی میں کیا قباحت تھی کہ ہم اجنبی نواب ثروت کے مراسم دار ہیں اور خود اس کا ہم سے کوئی ربط ضبط نہیں ہے۔ اسے ہمارے اور نواب ثروت کے تعلق کی نوعیت کا کوئی علم نہیں ہے۔ یہاں تک کہ وہ شہر میں ہماری قیام گاہ کے پتے سے بھی ناواقف ہے۔ اپنے بھائی نواب ثروت کی اس ناگفتہ بہ حالت میں اسے کسی اور طرف دیکھنے کا ہوش ہی کہاں رہا ہے۔ نواب فہمید کی ان معقول توجیہات پر پولیس کے یقین نہ کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

بٹھل نے اسے نہیں جتایا تھا لیکن نواب فہمید احساس سے بیگانہ شخص نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اسے خیال کرنا چاہیے تھا کہ ہمی لوگ نواب ثروت کو ڈاکٹر ناصر مرزا کے پاس لائے تھے اور ڈاکٹر کو علاج پر آمادہ کرنے کے لیے تھوڑی بہت تلخی ترشی بھی ہوئی تھی۔ ایک نگاہ ارتکاز پر سبھی کچھ نواب کے لیے عیاں تھا۔ ہمارے سلسلے میں اس کے پاس بہت سی شہادتیں تھیں۔ پولیس کی آمد سے مراد محض تفتیش حال ہے۔ نواب فہمید اپنی لاعلمی اور بے اعتنائی کا اظہار کرے گا تو پولیس والے اسے ہتھکڑی پہنا کے حوالات میں نہیں لے جائیں گے۔ کچھ پولیس کو نواب کی حیثیت کا پاس اور ریاست میں اس کے اثر و رسوخ کا اندازہ بھی ہوگا' اور پولیس ہی کیا' نواب فہمید تمام اعزا' احباب کے سامنے بھی یہی موقف اختیار کر سکتا ہے کہ بس اسی قدر اس کا جانا ہوا ہے "باقی خدا بہتر جانتا ہے۔" یہ قول محفوظ اور قول فیصل یوں بھی زندگی کا ایک سلیقہ ہے۔

نواب کو اپنی استقامت کی بحالی کے لیے کسی ایک دلیل کی ضرورت تھی۔ بٹھل کو اسے جو باور کرانا تھا اور اس کے' اپنے لیے گوشۂ اماں کی طرف اشارہ کرنا تھا' وہ اس نے کر دیا تھا۔ بٹھل نے گویا کوئی لمحہ ضائع نہیں کیا تھا۔ اتنی تاویل و تلقین کے بعد کہیں یہ صورت ممکن تھی۔ نواب کو اب یک سوئی سے گھر واپس جانا چاہیے تھا۔ ہم بھی اب نسبتاً کشادگی سے ہوٹل واپس ہو سکتے تھے۔ کم از کم کچھ وقت کے لیے تو فراغت کی سبیل نکل آئی تھی۔ اڈے کے علاقے کے علاوہ شہر کی ساری عوام ہماری چہرہ شناس نہیں تھی۔ ڈاکٹر کے گھر ہماری موجودگی کے وقت بھی پولیس کی آمد پر ہماری شناخت کسی کے انگلی اٹھانے پر منحصر تھی۔ بہ صورت دیگر وحشت زدہ نواب فہمید سے کچھ بھی بعید نہ تھا۔ اپنی آنکھوں کی گرد میں وہ پولیس کے سامنے ہذیان کی حد تک یاوہ گوئی کر سکتا تھا۔ ناوقت اپنے لیے بھی الجھنیں پیدا کرتا' ہمارے لیے بھی شہر کے راستوں پر کانٹے بچھا دیتا۔

نواب نے ڈوبی ہوئی آنکھوں سے ہمیں سلام کیا اور رخصت ہونے لگا۔ ایک بار پھر وہ جاتے جاتے ٹھہر گیا اور اڈتی' ہمکتی آواز میں بولا کہ اگر ہم مناسب سمجھیں تو کیوں نہ اس کے گھر قیام کریں۔ وہاں الگ مہمان خانہ بھی ہے۔

"بس آنکھ سے دور رہیں گے صاحب۔" بٹھل نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے اور دھیمے لہجے میں اس سے کہا کہ کسی مجبوری کی وجہ سے وہ معذور ہے۔ نواب ثروت نے بھی یہی پیشکش کی تھی۔ نواب چپ ہوگیا اور آہستہ قدموں کمرے سے اوجھل ہوگیا۔

اسے موٹر تک رخصت کرکے ڈاکٹر کمرے میں واپس آگیا "ہم آپ کا زیادہ ٹائم نہیں لیں گے۔" بٹھل نے اسے سانس لینے کی بھی مہلت نہیں دی۔ ڈاکٹر صوفے پر بیٹھا ہی تھا کہ بٹھل نے دبی آواز میں کہا "جس بارے ادھری آئے تھے' اس کو پوچھنے کا موقع نہیں ملا۔ اپنے کو ذرا نواب صاحب کا بولو۔"

"ہاں۔" ڈاکٹر نے چھت کی طرف دیکھا اور سرد آہ بھر کے بولا "ہر کوشش جاری ہے' جو بھی امکان میں ہے۔"

"بڑے صاحب نے بولا' کوئی اور بھی ڈاکٹر دیکھنے کو بلایا تھا آپ نے؟"

"آپ کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے ہی ہماری درخواست پر شہر کے ایک تجربے کار ڈاکٹر آئے تھے۔ انہوں نے کچھ مشورے دیے ہیں۔ بس دعا کیجیے۔ دوپہر سے دوبار ہوش آچکا ہے لیکن وہ شدید بے چینی محسوس کرتے ہیں۔ ہاتھ پیر چلانے لگتے ہیں' ہمیں پھر سلانا پڑتا ہے۔ دماغ پر بہت بوجھ معلوم ہوتا ہے ان کے۔ غالباً واقعے کا گہرا اثر ہے۔ ہوش میں آتے ہی گزرا ہوا منظر جیسے تازہ ہو جاتا ہو۔ ابھی آپ یہاں آئے ہی ہوں گے کہ انہیں ہوش آیا تھا۔ وہ بے تحاشا آپ دونوں حضرات کا نام لینے لگے۔ دوپہر بھی یہی ہوا تھا۔ ہم نے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ آپ صاحبان خیریت سے ہیں اور اسی گھر میں ہیں' آپ سے قریب لیکن اس دلاسے سے کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ ان کی حالت غیر ہونے لگی تو ہمیں سوئی لگانی پڑی۔ وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر زخم کی شدت اور ناتوانی غالب آجاتی ہے۔ خون بھی دیا گیا' گلوکوز بھی دیا جا رہا ہے۔ اصل میں' مریض کے اندر کی بے کلی بھی علاج میں رکاوٹ کا سبب بنتی ہے۔"

دیر تک سکوت رہا۔ بٹھل سر جھکائے بیٹھا رہا۔ ہمارے پاس موجود رہنے سے زیادہ ڈاکٹر کو نواب ثروت کے قریب رہنا چاہیے تھا' شاید اسی خیال سے بٹھل ایک دم اٹھ گیا۔ ڈاکٹر نے ازراہ اخلاق اسے کچھ دیر اور رکنے کے لیے کہا لیکن بٹھل نے معذرت کرلی۔

برآمدے تک ڈاکٹر ہمارے ساتھ آیا اور ہمارے پوچھے بغیر نواب فہمید کے بارے میں مسکراتے ہوئے بتانے لگا کہ نواب عجب مخمصے میں گرفتار تھا۔ موٹر میں بیٹھتے ہوئے کہنے لگا کہ بعض قریبی اعزا سے نواب ثروت کی بات تادیر چھپائی گئی تو ہمیشہ کے لیے شکوہ ہو جائے گا۔ اسے اندیشہ تھا کہ اطلاع دینے کی صورت میں سبھی ڈاکٹر کے گھر کا رخ کریں گے۔ کسی کو یہ احساس نہ ہوگا کہ یہ ڈاکٹر کا گھر ہے' اس کا کلینک یا عام اسپتال نہیں ہے۔ اتنے لوگوں کی آمد سے ڈاکٹر کے گھر کا سکون متاثر ہوگا۔ بیک وقت مسیحائی اور مہمان نوازی ڈاکٹر کے لیے بار خاطر ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر کہنے لگا' نواب فہمید کی اس خفت اور تردد پر اسے بڑی ہنسی آئی۔ اس نے نواب کو تسلی دی کہ وہ جنگل میں نہیں رہتا ہے' زیادہ دیر تک قریب کے لوگوں سے چھپانا خلاف وضع ہے۔ کسی اور ذریعے سے انہیں علم ہوگیا تو اور نامناسب ہوگا' اور یہ بھی طے ہے کہ جن لوگوں کو مطلع کیا جائے گا' انہیں روکا بھی

نہیں جا سکتا۔ سو نواب فہمید گراں بار نہ ہو' اطمینان رکھے کہ ڈاکٹر اور اس کے افرادِ خانہ کو کسی قسم کی زحمت نہ ہو گی۔ اس صورت حال سے تو کسی کا بھی سابقہ پڑ سکتا ہے اور ایسی بات ہے تو ڈاکٹر اپنے متعلقین کو چند دنوں کے لیے کہیں اور بھیج سکتا ہے۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ نواب فہمید علی جلد ہی واپس آجائے گا۔ نواب ثروت کے گھر والوں کے لیے بالائی منزل کھلوا دی گئی ہے اور سب کو ہدایت کردی گئی ہے کہ کسی کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ یہ نوابوں جیسا گھر تو نہیں ہے لیکن جو بھی ہے' جیسا کچھ بھی ہے' بہ سر و چشم حاضر ہے۔

بٹھل کیا رائے دے سکتا تھا۔ "ہم نے آپ کو بہت پریشان کیا۔" اس نے تندی سے کہا "پر اس کے سوا اپنے پاس کوئی راستہ نہیں تھا صاحب۔"

"اب آپ بھی نواب فہمید کی طرح۔۔۔" ڈاکٹر نے اس کا کندھا تھپتھپایا "ہماری تو یہی تمنا ہے کہ ہم کسی طور سرخ رو ہو سکیں۔"

رات گہری ہو گئی تھی۔ گلی سے نکل کے ہم خاص سڑک پر آگئے۔ زورا اور جمرو کچھ دور جانے پر ہمیں نظر آگئے تھے۔ وہ ہمارے پیچھے پیچھے آتے رہے۔ آگے پیچھے چلتے ہوئے ہم ہوٹل میں داخل ہو گئے۔

کھانا کھانے کے بعد سب بستروں پر لیٹ گئے۔ بٹھل کے منع کرنے کے باوجود زورا اس کا جسم دبانے لگا۔ انہوں نے بتایا کہ جب وہ ڈاکٹر کے گھر سے ہماری واپسی کے انتظار میں آس پاس کی گلیوں میں بھٹک رہے تھے تو ایک بار پھر اڈے کے لوگوں سے ان کا آمنا سامنا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ وہ سامنے سے آرہے تھے۔ جمرو نے پھرتی دکھائی۔ اسے قریب کوئی آڑ' کوئی پردہ دکھائی نہیں دیا تو وہ تیزی سے پلٹ گیا۔ زورا نے بھی جھٹ اس کی تقلید کی۔ دونوں تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے' جیسے کوئی چیز بھول گئے ہوں' پہلی قریبی گلی میں گھس گئے۔

بٹھل کی پیشانی پہ کوئی شکن نمودار نہیں ہوئی اس لیے کہ یہ سانحہ تو کسی وقت بھی ممکن ہے۔ وہ آنکھیں کھولے گم صم سا پڑا رہا۔ معلوم نہیں' وہ کیا سوچ رہا تھا۔ زورا اور جمرو بھی سوال بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کے رہ جاتے تھے۔ اس جاں کنی اور جاں سوزی کا کوئی حاصل نہیں تھا مگر کبھی مجھے بہت گھٹن ہوتی تھی کہ ایک صرف میرا وجود کتنے لوگوں کو داؤ پر لگائے ہوئے ہے۔ ہر لمحے ایک نئی دیوار' ہر پل ایک آزمائش۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے عزیز ترین ساتھیوں کو زندگی گنواتے دیکھا تھا۔ کسی نہ کسی کی باری آجاتی ہے۔ یہ کون سی وضع' کیسا شیوہ دوستی ہے کہ ایک آدمی کے لیے خود کو اتنا منہا کردیا جائے۔ ایک آدمی کا آزار' ایک آدمی کو بھگتنا چاہیے۔ انہیں اس طرح ٹھوکریں کھاتے دیکھ کے میرا سینہ بہت جلتا تھا۔ وہ کیوں نہیں سمجھتے تھے کہ میرے لیے تو دو طرفہ عذاب ہے۔ مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگنا چاہیے۔ مجھ پر تو ان کے مصائب کا بار بھی پڑتا ہوگا۔ وہ میرے زر خرید تو نہیں ہیں۔ ایک آدمی دوسرے کے لیے کتنی دور تک جا سکتا ہے۔ یہ سلسلہ تو ختم ہوتا نہیں لگتا۔ جانے کب تک چلنا پڑے اور کہاں تک جانا پڑے۔ کل رات بھی بس خیر ہو گئی۔ سرغنہ کے ساتھی کا خنجر نواب کے بجائے بٹھل کے سینے میں ترازو ہو سکتا تھا۔ میرے لیے تو' توبہ کے دروازے بھی بند ہو جاتے پھر یہی رہ جاتا کہ اپنا چاقو میں اپنے سینے میں گھونپ لوں۔ اب تو کچھ ایسا لگتا تھا کہ سب کچھ ایک فریب ہے۔ میں تو اکارت ہی گیا۔ یہ کوئی زندگی تو نہیں ہے۔ میرا نہ ہونا' میرے ہونے سے بہتر ہے۔ آدمی کی شاید کسوٹی بھی یہی ہے کہ اس کا وجود دوسروں کے لیے کس قدر زحمت اور کس قدر راحت کا سبب ہے۔

واپس آتے ہوئے راستے میں' میں نے طے کیا تھا کہ ہوٹل پہنچ کے چپ نہیں رہوں گا۔ بٹھل سے تکرار کروں گا کہ اب جناب کا کیا ارادہ ہے۔ چلتے وقت ڈاکٹر کی باتیں تو یاد ہوں گی۔ نواب فہمید کے علاوہ اب اور کس کس کو قائل معقول کرنا ہے۔ کل صبح ڈاکٹر کے ہاں نواب ثروت کی پرسش کے لیے آنے والے اجتماع سے خطاب کا قصد تو نہیں؟ اب صرف نواب فہمید کی بات نہیں۔ نواب ثروت کے دیگر اعزا' احباب خبر سنتے ہی ڈاکٹر کے گھر کا رخ کریں گے۔ اپنے زخم خوردہ رفیق و عزیز کے تئیں جوش و جذبہ دکھانے کے یہی مواقع ہوتے ہیں۔ سب کے سب عالی نسب ہی ہوں گے۔ ان میں بہت بے قرار لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔ ایک ہم نشیں نواب سے یہ گستاخانہ سفاکی ان کی غیرت و حمیت کے لیے تازیانہ ہونی چاہیے۔ یوں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کی روش انہیں پسند نہیں آئے گی۔ صبح ہی شہر میں چہ میگوئیاں' قیاس آرائیاں شروع ہو جائیں گی۔

بٹھل کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ زورا پاؤں دباتے دباتے بڑبڑانے لگتا تھا۔ مسلسل کئی بیڑیوں کے دھوئیں نے کمرا غبار آلود کردیا تھا۔ میں بٹھل کو ٹوکنے کا ارادہ کرتا ہی رہ گیا۔ یہ تو سراسر ہرزہ سرائی ہے۔ سوئیاں چبھونے اور بوٹیاں نوچنے کے مترادف۔ بٹھل کسی شافی جواب کا پابند نہیں ہے۔ وہ یہی کچھ کر سکتا تھا۔ یہ تو اب نواب فہمید پر؟

کہ وہ اپنے مائل بہ غضب ہم دردوں' بہی خواہوں کو کس طرح تھامے رکھتا ہے۔ بٹھل نے نواب ثروت کے ہوش میں آنے تک اسے محتاط روی کا اشارہ کیا تھا۔ چاروں طرف سے سوالوں کی یورش میں نواب کے پاس یہی محفوظ طریقہ ہے کہ اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کا اظہار کرتا رہے۔ بٹھل کے اشارے کی سریت اور ایمائیت تو کیوں کر وہ کسی کو منتقل کرسکتا ہے کہ یہ ابہام تو خود اس کے لیے تشریح طلب ہے۔ نوابوں کو دولت کے ساتھ اپنے خاندان کے اعتبار کی بھی بڑی فکر ہوتی ہے۔ اعتبار لٹ جانے پر دولت بھی تکیہ نہیں دیتی۔ کسی ممکنہ اندیشہ زیاں میں نواب فہمید کو پھونک پھونک کے قدم اٹھانے اور چن چن کے لفظ ادا کرنے چاہئیں۔ کچھ اسے بھی اپنے بھائی کی مہم جو سرشت کا اندازہ ہوگا۔ کوئی فسانہ در فسانہ ہے' کوئی سفید و سیاہ' تو نواب ثروت ہی آئینہ کرسکتا ہے' اور تبھی کسی طرف داد و فریاد کرنے اور سرکشوں کے سر تن سے جدا کرنے کا عزم استوار کیا جا سکتا ہے۔ طول کلامی ویسے بھی کوئی اچھا وتیرہ نہیں۔ نواب ثروت کے حواس کی بحالی تک' گزشتنی کو نقب زنی' ڈکیتی کے ایک عام واقعے سے تعبیر کرنے کی تدبیر ہی نواب فہمید کے لیے ایک قرین حکمت وظیفہ ہے۔ ایک واقعہ جو بدقسمتی سے خوں ریزی پر منتج ہوا۔ قصہ مختصر نقب زن فرار ہو گئے اور تنگ آکے وہ یہی کہہ سکتا ہے کہ جیسا مناسب ہو' ویسا ہی کیا جائے۔ ریاست کے اعلیٰ حکام سے رابطہ' دربار سرکار تک رسائی' مگر سردست اسے مجبور' معذور ہی سمجھا جائے۔ اس کے لیے سب سے مقدم کام اپنے بھائی کے سرہانے خدمت بجالانا ہے۔ دہائیاں تو بعد کی بات ہے' پہلے کوئی اس کے بھائی کی سلامتی کی ضمانت تو دے۔

ہر آنے والے لمحے میں نواب فہمید کو نواب ثروت کے اعادہ ہوش و حواس کی خوش گمانی کرنی چاہیے۔ جیسے ہی نواب اپنے زور پر حرکت کرنے یا کم از کم دیکھنے' سننے کے لائق ہو جائے گا' اس کے چارہ گروں کا پارا بھی ٹھہر جائے گا۔ نواب فہمید کے سینے کا تلاطم بھی اسی وقت سکون پذیر ہو سکتا ہے۔ خلاصہ یہ کسی طور نواب ثروت جلد سے جلد ہوش میں آجائے۔ اس کے علاوہ دوسروں کی بھی اسی میں بہتری ہے۔ تبھی ہمیں یہاں سے نجات مل سکتی ہے۔

"مت بوجھا دے رے اتنا۔" بٹھل کی دھنکتی ہوئی آواز کمرے میں گونجی تو میں ہڑبڑا گیا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ اس نے زورا اور جمرو سے کچھ کہا ہے مگر وہ مجھی سے مخاطب تھا "غبارہ پھلایا ہے تو نے کبھی؟ اسی طرح کا ہوتا ہے۔"

"کیا' کیا مطلب؟" میں نے سٹپٹا کے کہا "کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"لگتا ہے' صفائی نہیں کرائی رے دنوں سے۔" وہ ہنکاری بھر کے زورا سے پوچھنے لگا "زورے! کن میلیے ادھری نہیں ہوتے؟"

زورا دیدے گھمانے لگا' پھر اس کی سمجھ میں آیا تو چہک کے بولا "دیکھتا ہوں دادا' ضرور ہوئے گا' نواب لوگ کے بھی کان ہوتا ہے' کچھ کچرا بھی سالا جمتا ہوگا' بولے تو پکڑ کے لائے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو تم؟" میری زبان ہکلانے لگی۔

"تیری ہی بھاشا بولتا ہوں بالم! سیدھی سادی۔" بٹھل منہ بنا کے بولا "بولتا ہوں' اتنی گھسائی مت کر۔"

مجھے حیرت ہوئی' جیسے وہ میرا ہذیان سن رہا تھا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی صورت دیکھا کیا۔

"جا کے ٹانگیں سیدھی کرلے۔ اوپر کے بل بھی نکل جائیں گے۔"

"مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔" میں نے چنچناتی آواز میں کہا "دوپہر سے شام تک اور کیا کرتے رہے تھے۔"

"یہی ٹھیک ہے رے!" وہ جماہی لیتے ہوئے بولا "ایسے میں تو اور بھی نہیں آئے گی۔"

"تم سو جاؤ' تمہیں کسی نے روکا ہے۔" میں نے ترشی سے کہا "میں تم سے کچھ کہہ رہا ہوں۔"

"اور کیا کاٹ کھائے گا؟"

"ہاں' کتا ہوں میں تو۔ ہر وقت بھونکتا' غراتا رہتا ہوں۔"

اسے ہنسی آگئی "پر ہے اصیل! پٹا ڈلا ہوا' پالتو! ذرا سے ھکڑے' ذرا سی بات پر چیاؤں چیاؤں کرنے لگتا ہے۔"

"تمہارے لیے تو ہر بات ذرا سی بات ہے۔"

"لاڈلے!" جمرو مجھے پچکارتے ہوئے بولا "سالی بڑی بھی ہو تو او کھلی میں ڈال ہی دیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا سالا۔"

"ہاں! زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا۔" میں نے بھڑک کے کہا "زیادہ سے زیادہ مارٹی چلا جاتا ہے' ماچھی' پیرو بھائی' کانتے' سلطان' کبن خاں۔۔۔ زیادہ سے زیادہ! یہی زیادہ سے زیادہ ہے نا!"

"کچھ طبیعت انیس لگتی ہے استاد' شہزادے کی۔" جمرو فکر مندی سے بولا "کیا بات ہے جانی! تجھ کو میری قسم' بول لاڈلے!" وہ میرے پاس آکے بیٹھ گیا اور اس نے میرے گلے

میں بانہیں ڈال کے مجھے دبوچ لیا "سب ٹھیک ہو جائے گا ایمان سے' اپنا دل بولتا ہے۔"

"اور جاستی دیر بھی نئیں لگنے کا دودھ پانی کے الگ ہونے میں۔" زورا نے اس کی ہم نوائی کی اور بولا "کیوں داوا! اپن ٹھیک بولتا ہے؟"

"پھر اپنے من کا بول دے رے۔" بٹھل نے تلخی سے کہا۔

"اپنے من کا۔۔۔" میری زبان لڑکھڑا گئی۔

ہاں میرے دل میں کیا ہے اور میں بٹھل پر کیا واضح کرنا چاہتا ہوں۔ یہ تو میں بھی نہیں جانتا کہ میری اس یاوہ گوئی کا کیا مطلب ہے۔ کیا اس طعن و طنز سے میری مراد سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے بمبئی واپسی کی تلقین ہے؟ پھر میرے لب و لہجے میں یہ کیسی بیزاری اور بے اعتباری ہے؟ کیا میری دانست میں وہ کسی ناروا خوش فہمی اور کوتاہی کے مرتکب ہو رہے ہیں اور میں جانتا ہوں کہ سیدھا اور صاف راستہ کون سا ہے؟ ان سے چھپا ہوا مجھ پر عیاں ہے اور میں اس کی نشان دہی کرسکتا ہوں؟ ان کے بس میں اس سے سوا ہے جو وہ کر نہیں پا رہے؟ یہ تو پہلے مجھے خود جاننا چاہیے کہ میں انہیں کیا جتانا' کیا باور کرانا چاہتا ہوں۔ بہتان طرازی کے لیے میرے پاس کوئی جواز تو ہونا چاہیے۔ میرے ہونٹ پھڑپھڑا کے رہ گئے۔

زورا خوش امیدی کا اظہار کررہا تھا کہ اب زیادہ وقت کی بات نہیں ہے۔ وہ کس بنیاد پر یہ دعوا کررہا تھا' مجھے بہلانے کے لیے! بٹھل نے بھی خاموش رہ کے گویا اس کی تائید کی تھی مگر ان کی خیال آفرینی کے برعکس نواب ثروت کی استواری میں دیر ہوئی تو؟ دو تین دن میں تو ٹھیک ہے' ایسی قیامت نہیں ٹوٹ پڑے گی۔ نواب فہمید روک تھام کرلے گا اور اس کے حیرتی' شعلہ خو' متعلقین اچھی خبر سننے اور نواب ثروت کی زبانی حقیقت حال جاننے کے انتظار میں راسیں کھینچے رہیں گے لیکن اگر دیر ہوگئی؟ جتنا وقت گزرے گا' شہر میں اتنی افواہیں' داستانیں عام ہوں گی اور ہم نادیدہ' پراسرار اجنبیوں کی ٹوہ میں ہر سو بکھری ہوئی نگاہوں کا جال بچھ جائے گا اور اگر خدانخواستہ کچھ اور ہوگیا۔ شاید میں بٹھل سے یہی کچھ کہنا چاہتا تھا کہ نواب فہمید کو نہیں تو ڈرائیور ہدایت علی کو یا اس جیسے نواب کے کسی اور معتمد ملازم کو ضرور مولوی صاحب کے ٹھکانے کا علم ہونا چاہیے۔ کسی نہ کسی کو تو نواب ثروت نے اعتماد میں لیا ہوگا۔ نواب کی بہن' والدہ' خادماؤں میں سے کوئی ایک! نواب ثروت کی عیادت کی فرض ادائیگی کے ساتھ ہمیں ایسے آدمی کی جستجو بھی کرتے رہنا چاہیے۔

ہدایت علی تو نمک کا پختہ معلوم ہوتا ہے۔ لگتا نہیں کہ چاقو کی نوک اور طمنچے کی نال پر وہ اپنے آقا کی وفاداری میں جنبش کھائے گا۔ چمڑی اور ہڈی دیکھ کے ہی بادشاہ' نواب لوگ کسی کو خاص ملازم کے درجے پر فائز کرتے ہوں گے۔ غالباً اسی لیے بٹھل نے اسے ٹٹولنے اور کھکھوڑنے کے اقدام سے اجتناب کیا ہے۔ ابھی وقت بھی کتنا ملا ہے۔ کل رات ہی ہم نواب مجن میاں کے باغ میں تھے۔ صبح سے شام تک صرف ایک دن گزارا ہے۔ اس دوران راستہ روک کے ہدایت علی سے بات کرنا ممکن بھی نہیں تھا' ہدایت علی سے یا نواب کے کسی اور پروردہ سے۔ ہوسکتا ہے' بعد میں کسی مناسب وقت کے لیے بٹھل نے انہیں نظر میں رکھا ہو۔

میں نے خود کو سمجھانے کی کوشش کی کہ میری بے آرامی اور پراگندگی شاید سب کچھ دیکھتے ہوئے' کچھ نہ جاننے کے سبب سے ہے۔ اصل میں مجھے بٹھل سے کچھ کہنا نہیں کچھ جاننا ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں' اگر واقعی مولوی صاحب اسی شہر یا گردو نواح میں مقیم ہیں تو نواب کی خبر سن کے کیا وہ خاموش بیٹھے رہیں گے۔ نواب کا مجھے خط لکھنا ہی مولوی صاحب کی یہاں موجودگی کی شہادت ہے ورنہ نواب کو مجھے بمبئی سے بلانے کی کیا ضرورت تھی؟ اور یہ بھی طے ہوگیا ہے کہ نواب ثروت اور لعل و جواہر کے جویا' ہمارے لیے سرگرداں دوسرے نوابوں کا کوئی تال میل نہیں ہے۔ ہوتا تو نواب کا تیور مختلف ہوتا اور جیسا کہ نواب کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا' اس نے ہمیں بمبئی سے بلانے کے بارے میں مولوی صاحب کو مطلع نہیں کیا تھا۔ یعنی وہ اچانک ہمیں ان کے روبرو پیش کردینا چاہتا تھا یا اس کے دل میں کچھ اور تھا۔ کچھ اور ہی ہوگا جو وہ ہمیں اتنی دور لے گیا تھا۔ باغ میں مسلح آدمی بھی اسی کے طلب کیے ہوئے تھے۔ مولوی صاحب ہماری حیدر آباد آمد سے لاعلم ہیں تو انہیں نواب کی عیادت کے لیے کسی حیل و حجت کے بغیر ڈاکٹر کے گھر جانا چاہیے۔ یہ غلط ہے تو وہ پوری طرح اطمینان کرکے ہی ادھر کا رخ کریں گے اور اگر انہیں کسی ذریعے سے ہمارے بارے میں سن گن مل گئی۔ میری آنکھوں میں رہ رہ کے یہی وہم و گمان کھٹکتے تھے۔

ڈاکٹر کے ہاں ہمارے پڑاؤ ڈال دینے کی بے شک کوئی تک نہیں ہے لیکن نواب کی خبر سن کے مولوی صاحب سے نہ رہا گیا اور انہوں نے ڈاکٹر کے گھر جانے کا ارادہ کرلیا تو ہمیں ان کی آمد کی آس میں وہیں کہیں منڈلاتے رہنا چاہیے۔ ایک بار وہ نظر آگئے تو بس۔ ایک بار وہ کسی طور نظر آجائیں۔ گو اتنی سی بات ہوتی' ایسی قسمت ہوتی تو اتنے

دن بس ہی کیوں لگتے۔ بہرحال اب پھر کوئی موہوم سا امکان پیدا ہوا ہے۔ ہمیں اس موقع پر پوری طرح مستعد رہنا چاہیے۔ سنا ہے' تقدیر بدلتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔ یہ تقدیر' تدبیر کا کھیل بھی عجیب ہے۔ کہتے ہیں' قسمت مہربان نہیں ہوتی تو لاکھ تدبیر کرو' مٹی ہے اور لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ قسمت کا مطلب ہاتھ پیر جکڑ کے بیٹھ جانا نہیں ہے۔ قسمت اس کا بھی ساتھ نہیں دیتی جو محض اس پر تکیہ کرتا ہے مگر ایک آدمی کو راہ چلتے کوئی خضر صورت دوست مل جاتا ہے' سڑک پر سونے سے بھری پوٹلی مل جاتی ہے۔ ایک آدمی زندگی بھر محنت کرکے ایک سائبان نہیں بنا پاتا۔ ایک آدمی محنت کرکے زندگی میں مقام پیدا کرلیتا ہے۔ معلوم نہیں' کیا حقیقت ہے۔ بس یہی کچھ سمجھ میں آتا ہے کہ آدمی کو تدبیر کرتے رہنا چاہیے۔

صبح ڈاکٹر کے ہاں نواب کے عزیزوں کا ہجوم ہوسکتا ہے۔ ہمارا وہاں جانا بھی ازبس ضروری ہے۔ نواب فہمید ازروئے احتیاط ہمیں آڑ میں رکھنے کی کوشش کرے گا۔ حاضرین سے ہمارے تعارف میں اسے مجلسی آداب سے بھی روگردانی کرنی چاہیے لیکن کسی کی انگلی بھٹک گئی یا کسی کی زبان بہک گئی تو سبھی کی نگاہوں کا مرکز و محور ہمی ہوں گے اور کیا ضروری ہے کہ نواب کی پرسش کے لیے آنے والوں میں ہمارا آشنا کوئی نواب مہاراجہ نہ ہو۔ نواب جہاں تاب کے ہاں قیام' نواب عالم تاب کی تدفین کے موقع پر ہم نقاب ڈالے ہوئے نہیں تھے اور جو نواب' گزشتہ مرتبہ ہاتھوں سے ہمارے نکل جانے اور بمبئی واپسی کے سفر میں ہمارا تعاقب کرنے والوں کی ناکام واپسی کی خلش دل میں لیے ہوں گے۔ ان میں سے کوئی بھی وہاں ہوسکتا ہے۔ نواب ثروت کے غم کے باوجود ہمیں دیکھ کے تو ان پر شادیٔ مرگ کا ہیجان طاری ہوجائے گا۔

میں بٹھل سے کچھ نہ کہہ سکا۔ یقیناً میری حجت سے افترا پردازی چھلکنے لگی تھی۔ اسے برگشتہ بھی ہونا چاہیے' آزردہ بھی۔ اس نے میری طرف سے کروٹ بدل لی۔ اس کی بند آنکھیں دیکھ کے زورا نے بھی اس کے پیروں سے ہاتھ اٹھالیے' مبادا اس کی نیند میں خلل پڑے' زورا نے اس کے آدھے جسم پر آہستگی سے چادر ڈال دی اور کوئی آہٹ پیدا کیے بغیر وہاں سے اٹھ گیا۔ جمرو نے دروازے کی چٹخنی چڑھا کے روشنی دھیمی کردی۔ باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ ہم ایک دوسرے سے بے نیاز رات گئے تک جاگتے رہے۔ کسی نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ مجھے ندامت ہو رہی تھی۔ کھانے کے بعد ان کی طبیعت میں کیسی شگفتگی تھی۔ میں نے ان کی آنکھوں میں ریت بھردی تھی۔ میں ان سے معذرت کرنا چاہتا تھا کہ میرا مطلب کچھ اور نہیں تھا لیکن مجھے ہمت نہیں ہوئی بعد میں اس لیپا پوتی سے حاصل بھی کیا تھا۔ سو میں چپ ہی رہا۔ ایک بجے کے قریب زورا کو چائے کی طلب ہوئی۔ بمبئی کے رہنے والوں کو چائے کی بڑی عادت ہوتی ہے۔ سونے سے پہلے بھی پی لیتے ہیں اور انہیں نیند بھی آجاتی ہے۔ کروٹیں بدلتے رہنے سے کچھ شغل ہی بہتر تھا۔ اس نے چائے منگوالی۔ جمرو نے منع کردیا مگر زورا کے خیال سے میں نے اس کا ساتھ دیا پھر رات کے آخری پہر کہیں میری آنکھ لگی اور سویرے ہی میں اٹھا ڈاکٹر کے گھر کی چار دیواری کے باہر سجی ہوئی گھوڑا گاڑی کے علاوہ تین چار موٹریں بھی کھڑی تھیں۔ نو بج رہے تھے۔ باہر مونڈھے پر بوڑھا ملازم دربان بنا بیٹھا تھا۔ اندر برآمدے میں بھی چند لوگ موجود تھے۔ ان میں ہدایت علی ڈرائیور بھی تھا۔ چھوٹا دروازہ کھلا ہونے کی وجہ سے اس کی نظر ہم پر پڑگئی۔ دوسرے لمحے وہ باہر آگیا اور اضطراری انداز میں سر جھکا کے اس نے بٹھل کو سلام کیا' میری خیریت پوچھی' اس کا چہرہ زرد پڑا تھا۔ وہ بہت مضطرب ہوگیا تھا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ بوڑھے ملازم نے ہم سے اندر چلنے کے لیے کہا لیکن بٹھل نے ان سنی کرکے اسے ہدایت کی کہ اندر جا کے ڈاکٹر ناصر مرزا کو ہماری آمد کے بارے میں مطلع کرے اور کہے کہ اگر کوئی حرج نہ ہو تو چند منٹ کے لیے باہر آنے کی زحمت کرے۔ ہمیں زیادہ دیر ٹھہرنا نہیں ہے۔

بوڑھا شخص اندر چلا گیا۔

ہدایت علی نے اس اثنا میں اپنے اوسان بحال کرلیے تھے۔ وہ دزدیدہ نظروں اور سراسیمہ آواز میں از خود بتانے لگا کہ اندر اس کے آقا کے کئی عزیز موجود ہیں۔ رات ہی سے یہ سلسلہ شروع ہوگیا تھا اور ابھی صبح سے تو قطار بندھی ہوئی ہے۔ ایک جاتا نہیں کہ دوسرا آجاتا ہے۔ نواب کی حالت کا ذکر کرتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔ اس سے ٹھیک طرح بات بھی نہیں ہو پا رہی تھی۔ وہ ابھی کچھ اور بتاتا کہ بائیں جانب سے ایک موٹر آکے رکی۔ ہدایت علی اکڑ سا گیا اور ہاتھ باندھ کے پیچھے ہٹ گیا "حضور نواب عابد علی خاں صاحب' اس نے کانا پھوسی کے انداز میں ہمیں بتایا۔ آنے والی موٹر کے ڈرائیور نے اتر کے پیچھے کا دروازہ کھولا۔ اندر سے ترکی ٹوپی' سفید شیروانی اور چوڑی دار پاجامے میں ملبوس' ایک سرخ و سفید' تخیم' گول مٹول سا شخص برآمد ہوا۔ ہدایت علی کورنش بجالایا اور ہمیں چھوڑ کے نواب کو

اندر لے گیا۔ چہرے بشرے ہی سے نواب عابد علی خاں کوئی بڑا نواب معلوم ہوتا تھا۔ اس نے ہماری طرف دیکھا ہی نہیں۔ موٹر سے اتر کے وہ سیدھا دروازے میں داخل ہو گیا۔ ہمارا شناسا کوئی نواب ہوتا تو اس کی نظر ہم پر ضرور ٹھہرتی۔

ملازم نے واپس آ کے بتایا کہ ڈاکٹر کے آنے میں دیر ہو سکتی ہے۔ اس کا مقصد تھا کہ ہم چاہیں تو اندر نشست گاہ میں بیٹھ جائیں۔ ہم وہیں کھڑے رہے۔ دس منٹ گزرے ہوں گے کہ ڈاکٹر ناصر مرزا کسی قدر گھبرایا ہوا برآمدے میں دکھائی دیا اور ملازم پر خفا ہونے لگا کہ ہم ابھی تک باہر کیوں کھڑے ہوئے ہیں۔ بٹھل کے بتانے پر کہ ہم نے خود ہی اندر جانے سے پہلوتہی کی ہے' ڈاکٹر کی تنی ہوئی بھویں درست ہوئیں۔ دروازے پر اس کا ہمارے ساتھ اس طرح تادیر کھڑے رہنا نازیبا تھا۔ بٹھل نے کہا کہ اسے احساس ہے' اندر کئی مہمان بیٹھے ہیں لیکن وہ زیادہ وقت نہیں لے گا۔ اسے صرف نوابؒ کا حال مطلوب ہے۔

ڈاکٹر نے جیسے اپنی الجھی ہوئی سانسیں ہموار کرنے کا وقفہ لیا اور دل سوزی سے بولا "رات تو نواب ثروت پر خاصی بھاری گزری ہے۔"

"بولتے ہیں' زخم کی پہلی رات ایسی کٹھن پڑتی ہے۔"

"ہاں!" ڈاکٹر نے یاسیت سے کہا "لیکن یہ معاملہ کچھ پیچیدگی اختیار کرتا جا رہا ہے۔ بے ہوشی کی تیز دواؤں کا نواب پر تھوڑی دیر کے لیے اثر ہوتا ہے کہ انہیں ہوش آ جاتا ہے' اور وہ مرحلہ ان کے لیے' ہم سب کے لیے خاصا اذیت کا ہوتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے' ایک نرس اور ایک تجربہ کار شخص مستقل ان کی نگرانی کر رہے ہیں۔ گو وہ انہیں سنبھال لیتے ہیں لیکن اس طرح یک بیک بے قرار ہو جانا نواب کے لیے اور نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ مجبوراً نرس کو ہدایت کی گئی ہے' اگر دوبارہ ان پر دورہ پڑے تو ہاتھ پیر باندھ دیے جائیں۔ رات پہلی بار انہیں ہوش آیا تو ہم نے بتانے کی کوشش کی کہ سب خیریت ہے' آپ مجن میاں کے باغ سے اب اپنے گھر' ہمارے گھر' محفوظ ہاتھوں میں آ گئے ہیں اور صحت یاب ہو رہے ہیں۔ یہ دیکھیں' آپ کی والدہ' بہن اور فہمی بھائی سامنے کھڑے ہیں۔ بس کچھ وقت کی بات ہے' حوصلہ رکھیں۔ انہوں نے سنا یا نہیں۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بس آپ دونوں حضرات کا نام ان کے وردِ زباں رہا۔ دوسری بار کوئی پانچ بجے کے قریب پھر ان کی حالت بگڑی مگر خدا کا شکر ہے' اس وقت کسی حد تک قابو میں ہے۔ آج ہم اور دیکھیں گے پھر آپ ہی سے گزارش کرنی ہوگی کہ آپ انہیں اپنا چہرہ دکھائیں اور یقین دلائیں کہ آپ الحمدللہ بہ عافیت ہیں۔ مریض کو نفسیاتی طریقوں سے بھی افاقہ ہوتا ہے۔ شاید اسی تدبیر سے کچھ بہتری ہو۔"

"جو آپ کا حکم ہو۔" بٹھل نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا اور کچھ توقف کے بعد ترختی آواز میں بولا "نواب صاحب کو ٹھیک ہونا چاہیے صاحب!"

ایک لحظے کے لیے ڈاکٹر کے چہرے پر دھند چھائی تھی کہ بٹھل کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے بولا "ہم سے ایسا نہ کہیے۔"

"اپنے کو پتہ ہے' ایسے ہی منہ سے نکل گیا صاحب!" بٹھل نے جھنجھی ہوئی آواز میں کہا اور معذرت چاہی کہ ڈاکٹر کو ہماری وجہ سے باہر آنا پڑا۔ رات کے لیے اس نے پیش بندی کی کہ اگر زیادہ مہمان ہوئے تو ممکن ہے' ہم ایک بار پھر ڈاکٹر کو باہر آنے کی زحمت دیں۔

"اچھا نہیں لگتا' آپ لوگ یوں دروازے سے لوٹ جائیں۔" ڈاکٹر کسمساتے ہوئے بولا۔

"اپنے کو بھی نہیں۔" بٹھل نے سرد مہری سے کہا "پر اچھا برا نواب صاحب کے بعد دیکھ لیں گے۔"

ڈاکٹر کے اظہار تاسف میں شدت بھی نہیں تھی۔ اس کی منشا بھی یہی معلوم ہوتی تھی کہ اتنے مہمانوں کی موجودگی میں ہماری آمد الجھن کا باعث ہوگی۔ نواب ثروت کی لحہ لمحہ نگہبانی اور اس کے معزز مہمانوں کا خیال رکھنے کا بکھیڑا ہی کچھ کم نہ تھا۔ ہو سکتا ہے' میری طرح بٹھل کو بھی ڈاکٹر کے حال پر ترس آیا ہو۔ وہ ایک گوشہ گیر' صلح جو اور لیے دیے رہنے والا شخص تھا۔ اس کے بال بے ترتیب تھے' پپوٹے بھاری بھاری۔ رات میں وہ کیا سو پایا ہوگا۔ اس کے گھر کا تو سارا نظام ہی زیر و زبر ہو گیا تھا۔

ہمارے پاس کوئی سات آٹھ منٹ سے زیادہ ڈاکٹر کو نہیں ٹھہرنا پڑا۔ گزشتہ رات کی طرح بٹھل نے آنے والوں کے بارے میں بوڑھے ملازم سے کوئی سوال کیا نہ ہدایت علی ڈرائیور سے سن گن لینے کی جستجو کی۔ میرا خیال تھا کہ دن شروع ہوتے ہی بٹھل نے ہوٹل سے نکلنے کا ارادہ کیا ہے تو اس کے ذہن میں ضرور کچھ ہوگا۔ ڈاکٹر کے ہاں نواب کی عیادت کے لیے آنے والوں کے بارے میں کسی کے سامنے اتنا تجسس ظاہر کرنا مناسب نہیں تھا تو ہم اپنے طور پر وہاں آنے جانے والوں پر نگاہ رکھنے کے لیے اردگرد کی گلیوں میں گھوم سکتے تھے۔ ظاہر تھا کہ بٹھل کو ڈاکٹر کے ہاں مولوی صاحب کی آمد کا یقین ہی نہیں ہے یا وہی جانتا تھا کہ اس کے دل میں کیا ہے۔ کوئی دوسرا کس طرح سکتا تھا۔

ابھی دس نہیں بجے تھے۔ دھوپ ہلکی ہلکی تھیں۔ دکانیں کھل رہی تھیں۔ ہم سیدھے ہوٹل آ کے اپنے کمرے کے زنداں میں محبوس ہو گئے۔

رات کو بٹھل نے عجلت نہیں کی۔ کھانا کھا کے اور چائے پی کے ہم ہوٹل سے باہر آئے۔ اندھیرا ہر سو جم چکا تھا اور قمقموں کی روشنیاں گہری ہو گئی تھیں۔ ڈاکٹر کے مکان پر اس وقت بھی کئی موٹریں کھڑی تھیں۔ سب سے پہلے بوڑھے ملازم ہی سے ہمارا سامنا ہوا۔ ہمیں دیکھ کے وہ حواس باختہ سا ہو گیا اور ہمارے کچھ کہنے سے پہلے ادھر ادھر تاکتے ہوئے اس نے سرگوشیانہ لہجے میں بتایا کہ شام کو سادہ لباس میں پولیس کے دو آدمی آئے ہیں' افسر معلوم ہوتے تھے۔ نواب فہمید اور ڈاکٹر الگ کمرے میں آدھے گھنٹے تک ان سے باتیں کرتے رہے۔

بٹھل کی طرف سے کسی استفسار یا ردعمل کی توقع میں ملازم ٹھہر گیا یا بٹھل کے جمود کی وجہ سے آگے کچھ کہنے کا حوصلہ نہ ہوا' اور آگے شاید اسے کچھ معلوم بھی نہ تھا۔ بٹھل کی ہدایت پر وہ ڈاکٹر کو بلانے کے لیے اندر چلا گیا اور فوراً واپس آ گیا۔ اس نے بتایا کہ نواب ثروت کی والدہ اور نواب فہمید کے اصرار پر ڈاکٹر خواب گاہ میں جا چکا ہے۔ کل صبح سے اب تک اس کے معمولات ہی بدل گئے تھے۔ مسلسل جاگتے رہنے سے ڈاکٹر کے متاثر ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ نواب فہمید نے مشورہ کر کے اس کی جگہ ایک اور ڈاکٹر کو بلا لیا ہے۔ ملازم نے پوچھا کہ بٹھل کی خواہش ہو تو وہ دوسرے ڈاکٹر کو ہمارے پاس آنے کے لیے آمادہ کرے۔ بٹھل نے منع کر دیا' اور اسی سے نواب کی خیریت دریافت کی۔ ملازم کے کہنے کے مطابق نواب نے نسبتاً پرسکون دن گزارا تھا۔ دن میں دو بار اسے ہوش آیا اور وہ سنبھلا ہی رہا۔ پہلے کی طرح اس پر خفقانی دورہ نہیں پڑا۔

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی' جیسے ہوا میں شبنم گھل گئی ہو' ہم پیدل ہی ہوٹل واپس آ گئے۔

ہوٹل کے نزدیک جمرو اور زورا فاصلہ کم کر کے ہمارے ساتھ ساتھ ہو گئے تھے۔ میں نے دانستہ انہیں ڈاکٹر کے ہاں پولیس کی آمد کے متعلق اشارہ کر دیا تھا تاکہ موقع ملنے پر وہ بٹھل کو ٹوکنے ٹٹولنے کی کوشش کریں۔ یہ بھی امکان تھا کہ خود بٹھل ہی جمرو اور زورا کو آئندہ کے لیے کوئی تاکید کرے مگر کمرے میں پہنچ کے بٹھل نے اس بارے میں کوئی بات کرنے کے بجائے انناس کا شربت منگوایا اور زورا سے سر کی مالش کی فرمائش کی۔ سر تو اب کھولنا ہی چاہیے تھا۔

بمبئی میں چمپی کرنے والے اپنے فن میں بڑے طاق ہوتے ہیں۔ کم و بیش سبھی مالش کرنے والے خاص رگوں کی شدبد رکھتے ہیں لیکن بمبئی کے لوگوں کا اپنا ایک ہنر ہے۔ ہتھیلی اور پنجے کے دباؤ کے علاوہ انگلیوں سے خوب کام لیتے ہیں۔ کبھی آہستہ' کبھی تیز۔ وہ انگلیاں اس مشاقی سے چلاتے ہیں کہ سر دبتا بھی ہے' بجتا بھی ہے۔ سر بجنے سے الگ راحت ملتی ہے۔ تواتر سے گونجنے والی آوازوں کے زیر و بم میں بڑا تناسب ہوتا ہے۔ اس تواتر و تکرار اور ترتیب و تناسب سے کوئی لے سی پیدا ہو جاتی ہے اور لوری کا کام دیتی ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم تھا' زورا نے کبھی یہ پیشہ اختیار نہیں کیا تھا۔ وہ کچھ عرصے کے لیے باقاعدہ ایک پاڑے کی چوکی پر بیٹھ چکا تھا۔ چھنگا کے پاڑے پر اس کی ممتاز حیثیت تھی۔ زورا کے ہاتھ ماہرانہ انداز میں چل رہے تھے جیسے وہ یہی کام کرتا رہا ہو۔ کہتے ہیں' شراب کی طرح مالش کے اثر کے لیے بھی آمادگی شرط ہے۔ سرور کی آمادگی نہ ہو تو سرور مشکل سے آتا ہے۔ بٹھل نے آنکھیں میچ لی تھیں۔ کرسی پر اس کا سر ڈھلک ڈھلک جاتا تھا۔ اسے لطف آ رہا ہو گا۔ اسی لیے اسے نیند بھی جلدی آ گئی۔ کسی قلبی طمانیت کی حالت ہی میں ایسی آسانی سے نیند آ سکتی ہے۔

بٹھل کے سکون کی ایک وجہ تو یہی ہو سکتی تھی کہ نواب فہمید اور ڈاکٹر ناصر مرزا نے پولیس افسروں کو کسی طرح سنبھال لیا ہو گا۔ ہمارے ذکر پہ انہیں مثبت باتیں ہی کرنی چاہئیں ورنہ وہ پولیس کو ہم سے باز پرس کے لیے روکے رکھتے۔ بٹھل کے اطمینان کی دوسری وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ آدمی دسترس بھر ہی تدبیر کر سکتا ہے۔ کچھ لکیروں اور ستاروں کا بھی حصہ ہوتا ہے اور کوئی سر' استطاعت سے سوا وزن نہیں اٹھا سکتا۔ وزن کیسا بھی ہو۔

سب سے بڑا جبر تو وقت ہے۔ ایک رات اور گزر گئی۔ صبح ہی صبح بٹھل کے حکم پر ہم ڈیوٹی کے لیے نکل گئے تھے اور ٹھیک آٹھ بجے ڈاکٹر کے دروازے پر موجود تھے۔ مجھے تو یہ سب کچھ مذاق سا لگ رہا تھا۔ سب جیسے راستہ بھول گئے ہوں اور ایک دوسرے کو بہلاوے دے رہے ہوں۔

ہماری درخواست پر ڈاکٹر ناصر مرزا فوراً باہر آ گیا۔ اس نے اچھی طرح آرام کیا ہو گا جبھی کل کے مقابلے میں آج اس کے چہرے پر تر و تازگی تھی۔

ہمیں دیکھ کے وہ کھل سا گیا "کل رات آپ تشریف لائے اور ملاقات نہ ہو سکی' ہمیں تو قید کر دیا گیا تھا۔"

"اپنے کو بابا نے بولا تھا۔" بٹھل نے مسکرا کر کہا۔

"کیا بتائیں۔" ڈاکٹر مچل کے بولا "نواب ثروت کی والدہ محترمہ اور نواب فہمید نے ہمیں بہ جبر خواب گاہ میں بند کر دیا تھا۔"

"اچھا کیا صاحب! ابھی آپ نئے نئے لگتے ہو۔"

"ہاں!" ڈاکٹر خوش گواری سے بولا "سچ پوچھئے تو نواب ثروت کی طرف سے کل رات پہلی بار ہمیں کچھ فراغت نصیب ہوئی تھی' شاید اسی لیے ہمیں نیند آ گئی۔"

"اب کیسے ہیں خان بہادر صاحب؟"

ڈاکٹر کو ہنسی آ گئی "دیکھئے' ابھی کوئی دعوا تو نہیں کیا جا سکتا لیکن کل کی نسبت آج یقیناً بہتری کے آثار ہیں۔ بس ایک بات اور۔۔۔!" ڈاکٹر کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی اور وہ الجھ سا گیا۔

"کیا صاحب؟" بٹھل نے تردد سے پوچھا۔

"نہیں' ایسی پریشانی کی بات نہیں۔" ڈاکٹر نے بہ عجلت سنبھل کر کہا "پہلے کی طرح اضطرابی دورہ تو نہیں پڑا لیکن اب ان پر یاسیت طاری ہے جو ناتوانی کی علامت ہے۔ وہ دیدے گھما کے چاروں طرف دیکھتے ہیں پھر جیسے ان کی آنکھیں بجھنے لگتی ہیں۔ مریض کے لیے یہ مایوسی' افسردگی بھی اچھی ہوتی' خیر!" ڈاکٹر سانس بھر کے بولا "بہرحال یہ سکوت زخم کے لیے ضروری ہے۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا صاحب!"

"انشاء اللہ۔" ڈاکٹر نے وثوق سے کہا پھر ہمک کر بولا "چلئے' اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔ اس وقت نواب ثروت اور نواب فہمید کے خاندان کے سوا کوئی نہیں ہے اور ہاں ان کے چند ملازمین بھی۔"

"نواب نوکر کی جوڑی پرانی ہے۔"

"واقعی' خوب کہا آپ نے!" ڈاکٹر کی آواز چہکنے لگی اور وہ شائستگی سے بولا "آئیے نا' اندر آئیے۔ کم از کم چائے پی کے جائیے گا۔ ناشتا بھی کہاں کیا ہو گا آپ نے۔"

بٹھل نے اس کا شکریہ ادا کیا اور عذر کیا کہ سردست کسی ضروری کام سے کہیں جانا ہے۔ شام تک وقت ملے نہ ملے اس لیے سویرے آ گئے ہیں۔ رات کو اندر بھیڑ بھاڑ نہ ہوئی تو ضرور بیٹھیں گے اور ڈاکٹر کے ساتھ عربی قہوہ پئیں گے۔"

بٹھل کے انکار پر ڈاکٹر مایوس ہوا تھا لیکن پھر شاید یہ خیال کر کے اس نے زور نہیں دیا کہ اب نہیں تو کچھ دیر بعد نواب کی عیادت کرنے والے اعزا' احباب کا ہجوم ہو سکتا ہے۔ کہنے لگا "ہم نے سوچا تھا' آج آپ کو نواب ثروت کے پاس لے جائیں گے پھر ارادہ بدل دیا کہ کہیں کوئی منفی اثر نہ ہو۔ آپ کو سامنے دیکھ کر یادیں تازہ ہو سکتی ہیں۔"

بٹھل نے سہلا کے تائید کی اور ڈاکٹر سے اجازت چاہی۔ اس سے رخصت ہو کے ہم چند ہی قدم دور گئے ہوں گے کہ اس کی آواز پر ٹھہرنا پڑا "ہم تو بھول ہی گئے تھے۔ کل شام وہ لوگ۔" ہمارے قریب پہنچتے ہی اس نے مضطربانہ کہا "وہ پولیس والے آئے تھے۔"

بٹھل نے تحمل سے سنا اور خاموش رہا۔

"اتفاق سے ان میں ایک افسر نواب فہمید کا شناسا نکلا۔ اس کے والد سے نواب صاحب کے مراسم تھے۔ دو افسر تھے' ایک کوئی بڑا منصب دار تھا۔ ہم نے آپ کو بتایا کہ ریاست میں ایسے واقعات شاذونادر ہی ہوتے ہیں۔ دونوں خاصے پریشان تھے۔ بہرحال نواب فہمید نے متانت اور استقامت سے گفتگو کی' صبر و سکون سے اور کوئی تکرار نہیں کی۔ انہوں نے آپ کے سلوک کا ذکر کیا کہ آپ کس طرح زخمی نواب ثروت کو یہاں تک لائے تھے۔ ہماری وکالت بھی کی کہ ہم تو پولیس کو مطلع کیے بغیر علاج کے لیے آمادہ ہی نہیں تھے لیکن آپ لوگوں نے طرح طرح کے واسطے دے کے ہمیں مجبور کر دیا۔ خیر پولیس افسروں کو اس بات پر کوئی تکدر بھی نہیں تھا۔ وہ یا تو واقعے کے اسباب جاننے کی فکر میں ہیں۔ حکام بالا نے رسی کھینچی ہو گی۔ انہیں نواب صاحب مجن میاں کے باغ میں ہلاک ہونے والوں کی اطلاع مل گئی ہے۔ کچھ باغ کے ملازمین نے بھی آنکھوں دیکھا بیان کیا ہو گا۔ پولیس کو ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا ہے۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتے تھے۔ نواب فہمید نے ان سے کہا کہ یہ کوئی مسئلہ نہیں' اس وقت بھی ڈاکٹر کے لہجے میں بڑی بے تابی تھی۔ کہنے لگا کہ نواب فہمید نے انہیں اطمینان دلایا کہ ہم لوگ یہیں موجود ہیں اور نواب ثروت کی عیادت کے لیے ازراہ نوازش دن میں کئی بار زحمت کرتے ہیں۔

"ہاں صاحب' ہم نے بولا تھا کہ ابھی ہم ادھری شہر سے نہیں جا رہے۔" بٹھل نے بظاہر سادگی سے کہا۔

"ممکن ہے' وہ پھر آئیں' اگر جلد ہی وہ مجرموں تک نہ پہنچ پائے تو دوبارہ رخ کریں گے۔"

"آنے دیں صاحب! ان لوگوں کا یہی کام ہے۔"

ڈاکٹر کے چہرے پر ایک ثانئے کے لیے بے چینی ہویدا ہوئی مگر بٹھل اس کے سوا کیا کہہ سکتا تھا۔

"نواب فہمید نے آپ کے بارے میں انہیں بتایا کہ آپ نواب ثروت کے مہمان ہیں اور شہر میں اجنبی۔ آپ

بھی ذہنی طور پر کچھ کم متاثر نہیں ہوئے ہیں۔ نواب صاحب نے کہا کہ ہم سمجھتے ہیں' مجرموں کی تلاش کا آغاز نواب مجن میاں کے باغ سے کیا جانا چاہیے۔ وہیں سے کوئی سراغ مل سکتا ہے۔ ہم چاہیں گے کہ نواب ثروت کے مہمانوں کو سب سے آخر میں زحمت دی جائے۔ ڈاکٹر رازدارانہ انداز میں بولا "معلوم ہوتا ہے' پرسوں رات' آپ کی گفتگو نواب فہمید کو ازبر تھی۔ انہوں نے صاف گوئی اور بے باکی سے پولیس افسروں سے کہا کہ سچ تو یہ ہے' ہم اس وقت تک کچھ بھی نہیں کہہ سکتے جب تک ہمارا بھائی کچھ بتانے کے لائق نہ ہو اور خدا نے چاہا تو ہماری آنکھوں کا پردہ ہٹنے میں ایسی دیر نہیں لگے گی پھر آپ کیا' وہ نطفہ تا تحقیق کسی کھوہ میں ہوں' ہم انہیں ڈھونڈ نکالیں گے' آپ کے پہنچنے سے پہلے۔"

بٹھل نے بہت دیر بعد سر اٹھایا اور ہچکچاتے ہوئے بولا "بڑے نواب صاحب کو بولو صاحب' پولیس والے زیادہ اڑی کریں تو ان سے اپنے لیے ٹائم لے لیں۔ چہرہ کرادیں گے ان کو پھر۔"

ڈاکٹر کچھ نہ کہہ سکا اور ہونٹ بھینچ کے رہ گیا۔ رات کو کسی وقت آنے کا کہہ کے بٹھل نے ڈاکٹر کو وداعی سلام کیا۔ ہم نو بجنے سے کچھ پہلے ہی ہوٹل واپس آگئے۔

رات تک اب فراغت ہی فراغت تھی۔ دیواریں تکتے رہنا اور بستر پر لوٹتے رہنا۔ اس کے علاوہ بھی اور مشغلے تھے۔ ہوٹل میں تیار ہونے والے پکوان اور مشروبات کی فہرست کا تجربہ کرنا' کھڑکی کا پردہ ہٹا کے شیشے سے حد نظر تک پھیلی اونچی نیچی عمارات کا نظارہ کرتے رہنا۔ جگہ کی کوئی تنگی نہیں تھی۔ جیل کی کوٹھری سے بیس گنا بڑے دو جڑے ہوئے کمرے تھے۔ فرش پر قالین' چھت پر فانوس' قد آدم آئینے' میز کرسیاں' صوفے' گل دان' دیواروں پر رنگ رنگ مناظر کی تصویریں' نرم گدوں کی مسہریاں' کھڑکیوں پر دو طرح کے پردے' اوپر مخملی' نیچے ریشم کے' سب چیزیں صاف وشفاف' آرام ہی آرام۔ سکون ہی سکون۔ بٹھل کی جیب میں پیسوں کی کمی نہیں ہوگی۔ ضرورت پڑنے پر بمبئی سے اور پیسے آسکتے تھے۔ ابا جان کے پاس تو پشتوں کا خزانہ تھا۔ ممکن ہے' چلتے وقت ابا جان نے حفظ ماتقدم کے طور پر بااثر نوابوں کی چشم خیرگی کے لیے چند نادر ہیرے بھی بٹھل کی جیب میں ڈال دیے ہوں۔

زورا نے کل کسی وقت تاش کی گڈی' شطرنج اور چوسر خرید لی تھی۔ تینوں چیزیں اس نے میز پر رکھ دی تھیں۔ کسی نے انہیں نہیں اٹھایا۔ زورا نے بھی کسی کو نہیں اکسایا۔

بٹھل ورزش کرتا رہا۔ جمرو اور زورا نے بھی اس کی دیکھا دیکھی ہاتھ پیروں کو حرکت دینا شروع کردیا تھا۔ ڈاکٹر کے ہاں زخمی ثروت کو تین دن گزر چکے تھے۔ تین دن اور اسی طرح گزر سکتے ہیں اور تین دن کیا' ایک اور ہفتہ ایک اور مہینہ! ہر صبح و شام ہمیں پابندی سے حاضری دینا ہے۔ نواب فہمید اپنا آموختہ سناتا رہے گا اور پولیس سنتی رہے گی اور ہم ویکاجی ہوٹل کے بلوریں کمروں میں اینڈتے' مستاتے رہیں گے۔"

ورزش سے نمٹ کے بٹھل نے چائے منگوالی۔ ہوٹل کے خدمت گاروں موقع کے منتظر رہتے تھے۔ گھنٹی بجتے ہی دروازے پر دستک ہوتی۔ ادھر منہ سے نکلتا نہیں تھا' ادھر تعمیل ہوجاتی۔ مٹھی بھرتے رہنے کا یہ کرشمہ تھا۔ پیسے پر آدمی کیسا پھرکی بن جاتا ہے۔ اسے تو جیسے پر لگ جاتے ہیں۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ کیا تعظیم بجالائیں' کس طرح خود کو نثار کردیں۔ دن میں دوبار کمروں کی صفائی' صبح گل دانوں میں تازہ پھولوں کی آرائش۔ کوئی بٹھل کے لیے عابد شاپ روڈ سے چاندی کے ورق میں لپٹی' لونگ ٹنکی ہوئی گلوریاں لے کر آتا تھا تو کوئی اگر بتیاں سلگا کر کمرا مہکا دیتا تھا۔

سارا دن سونے کے اس پنجرے میں کٹ گیا۔ بس اتنا تھا کہ پنجرے کی درکشائی اپنے اختیار میں تھی۔ زنداں بھی طرح طرح کے ہوتے ہیں۔ مجبوری تو سب سے بڑا زنداں ہے۔

رات کے نو بجے' کل کی طرح کھانے اور چائے پینے کے بعد بٹھل نے ہوٹل سے نکلنے کا ارادہ کیا۔ ہم آدھے گھنٹے میں ڈاکٹر کے محلے میں پہنچ گئے۔ گلی میں قدم رکھتے ہی مجھے جھٹکا سا لگا اور میں نے بھٹکتی نگاہوں سے بٹھل کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کو تو ایسا معلوم ہوا جیسے ہم غلطی سے کسی اور گلی میں آگئے ہوں۔ بٹھل کے پیر بھی اٹکنے لگے۔ ڈاکٹر کا مکان دور سے نظر آجاتا تھا۔ دروازہ بند تھا اور چاردیواری کے آس پاس کوئی موٹر یا دوسری کوئی سواری نہیں کھڑی تھی۔ روشنیاں بھی کم تھیں ابھی اتنی رات نہیں ہوئی تھی۔ کل ہم بھی تقریباً اسی وقت یہاں آئے تھے۔ صبح بھی اول وقت کے باوجود دو موٹریں کھڑی تھیں۔ بٹھل نے میرا شانہ تھپ تھپایا اور آگے چل پڑا۔ اس کی رفتار تیز ہوگئی تھی۔ جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے گئے' عمارت پر چھایا ہوا سناٹا اور محسوس ہونے لگا۔ میں نے پہلے دروازے کی جھری سے جھانک کر دیکھا۔ برآمدہ خالی پڑا تھا اور کم روشنی کا ایک قمقما ٹمٹما رہا تھا۔ میں نے بہ عجلت گھنٹی کا بٹن دبادیا۔ اندر برآمدے کا دروازہ کھلنے میں دیر نہیں لگی۔ وہ ڈاکٹر کا بوڑھا

ملازم تھا۔ اس کی صدا پر بٹھل نے اپنا نام بتایا۔ ملازم برآمدے سے نیچے آگیا۔ وہ ابھی دروازہ کھول رہا تھا کہ پیچھے سے ڈاکٹر کی آواز آئی "آیئے آیئے' اندر تشریف لایئے۔" ڈاکٹر تیز قدموں سے دروازے پر آگیا اور ملازم کو ہٹا کے خود باہر چلا آیا۔ روشنی اتنی زیادہ نہیں تھی لیکن ڈاکٹر کے چہرے پر جلتی ہوئی آگ صاف نظر آرہی تھی۔

"کیا بات ہے صاحب؟" بٹھل نے جکڑی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"آپ کو کچھ نہیں معلوم؟" ڈاکٹر اضطراری انداز میں بولا۔

"کیا ہے صاحب؟"

"ڈاکٹر نے ڈولتی ہوئی آنکھوں سے بٹھل کو دیکھا اور ہاتھ پھیلا کے اس کے سینے سے لپٹ گیا۔ دوسرے لمحے وہ ہنکاریاں بھرنے لگا۔ میرا سارا جسم شل ہوگیا تھا۔ بٹھل بھی دم بہ خود کھڑا رہا۔

"آپ کو بہت تلاش کرایا' ہدایت علی سارے چار کمان کے علاقے کا چکر لگا آیا۔ کوئی گیارہ بجے سے دو موٹریں مسلسل آپ کی تلاش میں گھومتی رہیں' جانے کہاں کہاں گئے یہ لوگ۔" ڈاکٹر بے ربطی سے بولا۔

بٹھل کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ "اپنے کو کھل کے بولو صاحب!" اس نے ڈاکٹر کو سینے سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا' کیا بتائیں۔" ڈاکٹر کی آواز رندھ گئی۔

بٹھل اس کا بازو تھام کر دروازے میں داخل ہوگیا۔ ڈاکٹر کو خود بھی اپنے ہیجان اور بدحواسی کا کچھ احساس ہوا۔ بوڑھا ملازم وہیں کھڑا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے نشست کا کمرا کھولنے کا اشارہ کیا۔

"ہم آپ کا شدت سے انتظار کررہے تھے۔ معلوم تھا کہ آپ رات کو کسی وقت آئیں گے۔ آپ نے رات ہی کو آنے کو کہا تھا نا۔" ڈاکٹر گرفتہ لہجے میں بولا "آپ نے دیر کردی۔ بہت دیر کردی۔ کاش ہم صبح آپ کو روک لیتے مگر ہمیں کیا۔ کیا۔"

ہم نشست گاہ میں آکے بیٹھ گئے۔ میری رگوں میں خون جم گیا تھا۔ بٹھل بھی گنگ بیٹھا رہا۔ اب پوچھنے کے لیے باقی کیا رہ گیا تھا۔ تاہم بٹھل نے جحت کی اور بڑبڑاتے ہوئے بولا "کیسے ہوگیا صاحب؟"

"ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ خدا جانتا ہے' ہم نے تو اپنی سی کوشش کی تھی مگر اسے منظور جو نہیں تھا۔"

"اپنی سمجھ میں نہیں آرہا صاحب!"

ڈاکٹر نے رومال سے اپنی آنکھیں خشک کیں اور ٹھنڈی سانس بھر کے بولا "ہمارا کام ہی ایسا ہے۔ موت یقینی ہے اور موت سے جنگ کرتے رہنا ہے۔ کبھی ہار' کبھی جیت' عارضی جیت کی خوشی اور یقینی ہار کا غم۔ شب و روز یہی تماشا رہتا ہے لیکن خدا گواہ ہے' ہم نے کبھی ایسا دکھ محسوس نہیں کیا۔"

"بٹھل بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔

"یہی کوئی سات بجے وہ انہیں لے گئے ہیں۔" ڈاکٹر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "ہم ابھی وہیں سے واپس آئے ہیں۔ یہاں گھر میں کہہ گئے تھے کہ آپ آئیں تو بٹھالیں۔ صبح نواب ثروت کی تدفین ہے۔"

آدمی اپنی خواہش کے خلاف سننے کے لیے مشکل سے آمادہ ہوتا ہے۔ بار بار یہ گمان ہوتا تھا کہ ڈاکٹر ہمارا امتحان لے رہا ہے۔ کبھی کبھی بہت سلجھے ہوئے' سنجیدہ قسم کے لوگ بھی بہت ناروا مذاق پر اتر آتے ہیں۔ لگتا ہے ابھی کچھ دیر میں ڈاکٹر شاید کوئی اور خبر سنائے۔

بٹھل کی آواز پر جیسے فالج گر گیا تھا۔ وہ پتھر بنا ہوا ڈاکٹر کی صورت دیکھتا رہا۔

ملازم نے جگ اور گلاس کا طشت لا کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ بٹھل نے ایک گھونٹ کے بہ قدر پانی پیا اور بوجھل آواز میں ڈاکٹر سے کہا "ایسا سننے کے لیے ہم ادھری نہیں آئے تھے۔"

"ہم بھی نہیں چاہتے تھے۔" ڈاکٹر بلبلاتے ہوئے بولا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے' کہنے لگا "ہمیں اندازہ ہے کہ آپ کو کس قدر صدمہ ہوا ہوگا' ہونا چاہیے۔ سوچ رہے تھے کہ آپ کو یہ خبر کس طرح سنائیں گے۔ کاش کسی اور ذریعے سے آپ کو معلوم ہوجائے۔"

بٹھل نے جیب سے بنڈل نکال کر بیڑی سلگائی۔

"زخم بہت گہرا تھا لیکن ان کا یہاں تک آجانا دوسری زندگی مل جانے کے مانند تھا۔ آپ نے وقت پر خون روکنے کی تدبیر کرلی۔ حفاظت اور احتیاط سے انہیں یہاں تک لے آئے اور سب سے اہم بات یہ کہ اس قدر جلد سے جلد ذرا سی غفلت ہوجاتی تو انہیں یہ مہلت بھی نہ ملتی' وہ تو اسی دن ختم ہوگئے تھے۔ شروع شروع میں تو ہم بھی مایوس ہوئے تھے لیکن کل سے امید بندھ چلی تھی۔ سب الٹ گیا۔"

بٹھل بیڑی کے کش لگاتا رہا۔

ڈاکٹر بھی چپ ہوگیا۔ کمرے میں موت کی سی خاموشی چھائی رہی۔ بہت دیر بعد ڈاکٹر نے سر اٹھایا اور ہونٹ چباتے

ہوئے بولا "ہم کو معاف کردیجئے۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا جناب کہ کیسے لوگ ہمارے گھر آتے رہے ہیں۔ ادھر نواب کی طرف سے بھی پل بھر کی فرصت نہیں ملتی تھی کہ ہم آپ کی کوئی خدمت' واجبی عزت کرسکتے۔"

"کیسا بول رہے ہو صاحب!" بٹھل نے دھندلائی ہوئی آواز میں کہا "اپنے کو بہت مان دیا آپ نے۔"

"سچ پوچھئے تو ہمیں آپ کے سامنے آنے کی ہمت ہی نہیں تھی۔ ہم نے تو جیسے آج ہی آپ کو دیکھا ہے۔"

"کیا صاحب!" بٹھل کے شانے سیدھے ہوگئے۔

"انہوں نے ہی آج ہماری آنکھیں کھولیں ورنہ ہم تو اندھیرے ہی میں رہتے۔ ہم سے کیسی نادانی ہورہی تھی۔" ڈاکٹر خود کلامی کے انداز میں بولا "نگران کے علاوہ ہمیں بتا بھی کون سکتا تھا۔"

"نواب صاحب نے کچھ کہا آپ کو؟"

"انہوں نے ہمیں سب کچھ بتادیا۔" ڈاکٹر کی آواز بکھرنے لگی "جو باتیں وہ آپ سے کرنا چاہتے تھے' آپ سے نہ کہہ سکے تو انہوں نے ہمیں اپنا امین بنایا۔ وہ آپ سے ملنے کے لیے اسی وجہ سے بے چین تھے۔ انہیں بہت پچھتاوا' بڑا ملال تھا۔ آخر دم تک ان کی زبان پر آپ کا نام تھا۔"

میری طرح بٹھل کا جسم بھی اکڑ گیا تھا۔ "کیا' کیا بولنا چاہتے ہو آپ؟" بٹھل نے کسی قدر ترشی سے کہا۔

"کچھ نہیں! ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ ہماری حیثیت تو تماشائی کی ہے۔" ڈاکٹر کا لہجہ میں جلی کیفیتوں کا غماز تھا۔ برہمی' حیرت' افسردگی اور طنز' کہنے لگا "ہمارے پاس تو ان کا کہا ہوا امانت ہے جسے ہم جلد سے جلد آپ کے سپرد کرکے بری الزمہ ہونا چاہتے ہیں۔ ہم سے پوچھئے تو ہمیں بار بار شبہ ہوتا تھا کہ کہیں نواب ثروت کی دماغی حالت تو غیر متوازن نہیں ہوئی ہے۔ وہ اتنے بے رحم' ایسے سنگ دل بھی ہوسکتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ آپ دونوں کو ختم کردینا چاہتے تھے۔ یہ بات آپ کو بھی معلوم ہوگئی تھی۔ اس کے باوجود آپ نے انہیں یہاں لانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ یہ کیا فسانہ ہے؟ یہ تو ایک ناقابل یقین قسم کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ ہم سوچتے ہیں تو ہمارا رواں رواں لرزنے لگتا ہے۔ نواب ثروت جیسے خاندانی' سلیم العقل اور بردبار آدمی اندر سے ایسے دیوانے اور خود غرض ہوسکتے ہیں۔" ڈاکٹر کی آواز سنسنا رہی تھی۔ وہ اپنا چہرہ کھسوٹنے لگا۔

"ہوجاتا ہے صاحب ایسا! آدمی پورا جنگل ہوتا ہے۔ سارے جانور ہوتے ہیں اس میں۔" بٹھل نے زہرخند سے کہا۔

"انہوں نے آپ کے لیے یہ سارا انتظام کیا تھا۔ دو آدمی انہی کے بلائے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے جھرجھری سی لی۔ ان کے پاس وقت کم تھا اور وہ شدید اذیت میں ہم سے یہ اعتراف' یہ اقرار کررہے تھے۔ وہ کہتے رہے' ہم بت بنے ہوئے سنتے رہے۔ کسی وضاحت یا تکرار کا محل نہیں تھا لیکن اس وقت ہمارا ذہن الجھا ہوا ہے۔ ہمارے دماغ سے یہ بات جاتی ہی نہیں۔ ہمیں تو ایسا لگتا ہے جیسے ہمارا سنا ہوا خود ہمارے ذہن کا انتشار ہے۔ ہم نے سب غلط سنا ہے۔ کاش کہ ایسا ہی ہوتا۔" ڈاکٹر کی زبان بہک رہی تھی جیسے اسے لفظ نہ مل رہے ہوں' وہ بے ترتیبی سے بولا "صبح آپ کے جانے کے بعد ان کی حالت اور سدھر گئی تھی۔ ہم نے اپنے سینئر ڈاکٹر صدیقی سے آنے کی درخواست کی تھی۔ وہ تشریف لائے اور اطمینان کا اظہار کیا لیکن پھر جانے کیا ہوا۔ ادھر ڈاکٹر صاحب گئے تھے' ادھر نواب کی حالت بگڑنی شروع ہوئی پھر وہی جنونی دورہ' وہی ہذیان اور نالہ و فریاد۔ انہوں نے بارہا آپ کا نام لیا۔ نواب فہمید' انی والدہ' بہن اور ہماری گزارش پر وہ کسی حد تک قابو میں آگئے تھے۔ ہمیں دیکھئے' کل کتنی بار آپ آئے' ہم نے ضرورت نہیں سمجھی کہ آپ کی قیام گاہ کا مفصل پتا پوچھیں۔ چار کمان کا علاقہ خاصا بڑا ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہدایت علی کو معلوم ہوگا۔ اس نے انکار کیا لیکن نکل گیا۔ ادھر نواب فہمید کے ڈرائیور نے بھی آپ کو یہاں آتے جاتے دیکھا تھا۔ وہ بھی شہر کی مختلف جگہوں پر آپ کو کھوجتا رہا۔ دونوں ناکام واپس آئے لیکن نواب فہمید نے انہیں دوبارہ بھیج دیا کیونکہ جتنی بار نواب ثروت کی آنکھ کھلتی' وہ ہڑبڑا کر آپ کے نام کا ورد کرتے۔ سب انہیں سمجھاتے رہے کہ آپ بس آیا ہی چاہتے ہیں' کچھ دیر ہوجاتی ہے۔ انہیں جیسے معلوم ہوگیا تھا کہ ان کا وقت ختم ہورہا ہے۔ تین بجے کے قریب ان پر پھر وہی اضطراب طاری ہوا۔"

ڈاکٹر نے چند لمحوں کے لیے توقف کیا اور جگ سے پانی لوٹ کے اپنا خشک گلا تر کیا اور کٹی پھٹی آواز میں کہنے لگا "ہم نے ڈاکٹر صدیقی کو بلانے کے لیے موٹر بھیجی اور اپنے جتن کرتے رہے۔ ہمارے پاس یہی چارہ رہ گیا تھا کہ ہم انہیں خوابیدگی کا انجیکشن لگادیں حالانکہ مسلسل اتنی کثرت سے انجیکشن لگانے کے بعد ہمیں بڑا تامل تھا۔ ڈاکٹر صدیقی بھی منع کرگئے تھے۔ کوئی اور صورت نہ دیکھ کے ہم نے نرس کو انجیکشن کا اشارہ کردیا تھا۔ نواب ثروت پوری طرح ہوش

تھے۔ انہوں نے نرس کے انجیکشن والے ہاتھ پر ہاتھ
نے کی کوشش کی۔ یہ حرکت ان کے لیے بہت مضر تھی۔
کے ٹانکے ٹوٹ گئے۔ ہم متعدد مرتبہ ایسے مرحلوں سے
زرے ہیں لیکن ہمارے ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے تھے۔ وہ جو
تے ہیں' مرنے والے کو اپنی موت کا علم ہوجاتا ہے اور کوئی
ت کا عزم کرلیتا ہے تو اس میں ایک توانائی آجاتی ہے۔
وں نے ہم سے التجا کی کہ وہ ہم سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔
لے ہم تحمل سے ان کی بات سن لیں۔ ہم نے درخواست
رکے ان کی والدہ' بہن اور نواب فہمید کو پہلے ہی باہر بھیج دیا
۔ وہاں ہمی تھے۔ نواب ثروت کی خواہش پر کہ وہ ہمی سے
ت کرنا چاہتے ہیں' ہم نے بادل ناخواستہ نرس اور اپنے
ادن کو بھی باہر چلے جانے کی ہدایت کردی۔ تب انہوں نے
بان کھولی۔ ان کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے اور انہوں نے
م سے کہا کہ آپ آئیں تو ہم ان کی طرف سے آپ کے پیر
ڑ کے معافی مانگ لیں اور کہا کہ ان کے گناہ کے کفارے
ں یہ سزا' موت کی سزا نہایت کم ہے۔ انہوں نے ہم سے کہا
۔ انہیں بابر زماں خاں کے لاشے کی ضرورت تھی۔"

میں اچھل پڑا۔ ڈاکٹر نے میرا ہی نام لیا تھا اور جو میں
نے سنا تھا' وہی کہا تھا۔ میرا سینہ بند ہونے لگا اور آنکھوں کے
آگے اندھیرا سا چھا گیا۔

"نواب ثروت نے کسی مولوی محمد شفیق صاحب کو طرح
طرح کے واسطے دیے اور مختلف حیلے' حربے بھی آزمائے۔"
ڈاکٹر نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا "اور آخر انہیں یقین آگیا کہ
مولوی صاحب ایک مجبور شخص ہیں۔ مولوی صاحب خود بابر
زماں خاں سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتے کیونکہ وہ دوہرے
قتل کے جرم میں ایک سزا یافتہ آدمی ہے اور ان کی نازک
اور حساس بیٹی کے لیے کسی طور موزوں نہیں رہا ہے لیکن ان
کی بیٹی جو کبھی بابر زماں خاں سے منسوب ہوچکی تھی' اسی کی
آس لگائے ہوئے ہے چنانچہ اتمام حجت کے بعد نواب ثروت
اس نتیجے پر پہنچے کہ وہ اس لڑکی کو کبھی حاصل کرسکتے ہیں جب
بابر زماں خاں کا کوئی وجود ہی نہ رہے اور جب تک لڑکی اپنے
مطلوب کا انجام اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لے۔" یکایک ڈاکٹر
رک گیا اور وحشت زدہ نظروں سے مجھے اور بٹھل کو دیکھنے
لگا "بابر زماں خاں آپ ہی ہیں نا؟" اس نے ہکلاتے ہوئے
مجھے مخاطب کیا۔

مجھ سے جواب نہیں دیا جاسکا۔ مجھ پر تو سناٹا طاری تھا۔
میرے بجائے بٹھل نے کہا "ہاں صاحب!"

"ہمیں معاف کردیجئے' ہم تو صرف نواب ثروت کا کہا دہرا رہے ہیں' اس میں ہمارا کچھ شامل نہیں ہے۔"

"آپ آگے کا بولو؟"

"جی' جی ہاں۔" ڈاکٹر منتشر ہوگیا۔ نواب ثروت کے بہ قول انہوں نے اپنے آپ کو باز رکھنے کی پوری کوشش کی لیکن وہ اس لڑکی کا خیال دل سے نہ نکال سکے۔ وہ ہر صورت' ہر قیمت پر اسے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مولوی صاحب عندیہ دے چکے تھے کہ وہ اپنی بیٹی کے لیے اس سے بہتر رشتے کا تصور نہیں کرسکتے مگر جب تک بابر زماں خاں کی دیوار حایل تھی' اس قول و قرار کی حیثیت محض ایک رسم کی ادائی' خوش فکری اور خوش خیالی سے زیادہ نہیں تھی۔ نواب نے غالباً اسی وقت سے خاکے بنانے شروع کردیے تھے جب سارے انتظامات مکمل ہوگئے ہوں گے تب انہوں نے آپ کو اپنے مقتل میں بلانے کا فیصلہ کیا اور آپ کو خط لکھ دیا۔ انہوں نے یہ وضاحت بھی ضروری سمجھی کہ اس میں مولوی صاحب کی ایما کا کوئی دخل نہیں تھا۔ حادثوں کا اتفاق ہر وقت ممکن ہے۔ انہوں نے ہمیں نہیں بتایا کہ لیکن ہمارا قیاس ہے' کسی اتفاقی حادثے کا تاثر دے کے نواب ثروت کو مولوی صاحب اور ان کی بیٹی کے سامنے بابر زماں کی لاش پیش کردینی تھی' اپنی طرف سے نہیں تو کارندوں کے ذریعے۔ ظاہر ہے' انہیں اپنی ستم گری کا یہ روپ مولوی صاحب اور لڑکی سے تو بہرطور چھپانا چاہیے تھا۔"

"اپنے کو باقی کا معلوم ہے۔" بٹھل نے تند لہجے میں کہا "آگے کا آپ کو کچھ پتا ہو تو بولو صاحب! مولوی صاحب ابھی کدھری ہیں؟"

"ہم سمجھ سکتے ہیں کہ یہ ذکر آپ کے لیے کتنا تکلیف دہ ہوسکتا ہے۔ خود ہمیں یہ سب کچھ دہراتے ہوئے بہت جبر کرنا پڑ رہا ہے لیکن ہم تو مرحوم نواب کی خواہش کی تعمیل کررہے ہیں۔ ان کے کہنے کے مطابق انہوں نے بے حد تاخیر سے اس وقت آپ کو جانا جب سارا کھیل ختم ہوچکا تھا اور آپ نے ان کی زندگی بچانے کے لیے یہ تگ و دو' یہ سلوک کیا۔ وہ کہتے تھے' تب انہیں اپنے دیوانے پن کا احساس ہوا اور یہ احساس بھی مولوی صاحب نے آپ کے متعلق یقیناً ان سے غلط بیانی کی ہے۔"

"ٹھیک ہے صاحب!" بٹھل نے تلخی سے کہا "پر ہم مولوی صاحب کے بارے میں پوچھتے ہیں؟"

"ہاں۔" ڈاکٹر پریشان سا ہوگیا "وہی آپ کو بتا رہے تھے۔ نواب ثروت نے ہمیں ان کے بارے میں بتایا ہے۔ وہ اسی شہر میں ہیں۔ نواب نے غازی بنڈا محلے' میں انہیں ایک

مکان لے کر دیا ہے۔"

بٹھل کی بھویں سکڑ گئیں۔ اس نے پہلو بدلا اور بظاہر تھمی ہوئی آواز میں پوچھا "نواب صاحب نے آپ کو پتا بولا ہے؟"

"جی ہاں، جی ہاں!" ڈاکٹر نے سرہلا کے تیزی سے کہا "نواب ثروت کا مقصود یہی تھا۔ ان کے پرانے شناسا حکیم نجیب الدین کا مکان ہے۔ حکیم صاحب مکان کے نچلے حصے میں مقیم ہیں۔ بالائی منزل پر مولوی صاحب ہیں۔ نواب ثروت نے ایک خادم اور باندی بھی مولوی صاحب کی خدمت کے لیے مقرر کی ہوئی ہے۔ نواب کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہوں نے یہ مکان اپنے گھر والوں سے روپوش رکھا ہے کیونکہ انہیں تو کوئی اور کارنامہ انجام دینا تھا۔ انہوں نے ہر کام اپنی دانست میں پختہ کیا تھا مگر انہی کے الفاظ ہیں کہ ڈاکٹر صاحب! ہم نے اچھی طرح بابر زماں کو دیکھا ہے' بے شک اس لڑکی پر اسی نوجوان کا حق ہے۔ کوئی کسی کے لیے اتنے برس صرف نہیں کرتا' اتنا تعاقب نہیں کرتا۔ یہ انہی کے الفاظ ہیں۔ اس کے بعد تو جیسے نواب کو سکون سا ہوگیا تھا اور ہماری کوئی کوشش کامیاب نہ ہوسکی۔ وہ چلے گئے لیکن ہمیں یقین ہے۔ خدا انہیں زندگی دیتا تو بابر زماں خاں کو وہ خود مولوی صاحب کے پاس لے کے جاتے۔ وہ بہت پشیمان تھے۔ ہمارے پاس لفظ نہیں کہ ہم ان کی بے قراری بیان کرسکیں۔"

کمرے میں سکوت ہوگیا۔

"غازی بنڈے میں کوئی نشانی' اتا پتا صاحب؟" بٹھل نے زیر لبی سے کہا۔

"غازی بنڈا۔" ڈاکٹر بڑبڑاتے ہوئے بولا "مصری گنج کے قریب ایک محلہ ہے۔ مکہ مسجد سے کچھ آگے۔ شرفا کی بستی ہے۔ سید علی کے چبوترے کے قریب۔ مغل پورے کی کمان اور شاہ روزی قتال کا گنبد وہیں آس پاس ہے۔"

"ہم کو اب اجازت دو صاحب!" بٹھل نے سانس بھر کے کہا۔

"کیا' کیا جناب ایسے کیسے؟" ڈاکٹر حیرانی سے بولا۔

"اب تو ہمیں فرصت ہی فرصت ہے۔" اس کی آواز پر مایوسی غالب آگئی۔

"پھر آئیں گے صاحب! ضرور آئیں گے۔"

"کچھ دیر تو اور بیٹھئے۔" ڈاکٹر التجا آمیز لہجے میں بولا "اچھا نہیں لگتا کہ اس صورت حال میں آپ سے قہوے کے لیے پوچھیں حالانکہ ہمیں یاد ہے' صبح آپ نے فرمایا تھا' آپ کہیں تو۔۔۔"

بٹھل نے اس کا شکریہ ادا کیا اور دوبارہ آنے کے وعدے کی تکرار کی۔

"مگر ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ کیا آپ کا ارادہ ابھی' اسی وقت مولوی صاحب کی طرف جانے کا ہے؟"

"ہاں صاحب!" بٹھل نے مختصراً کہا۔

"مگر اس وقت! خاصی رات ہوگئی ہے جگہ بھی دور ہے۔ پہنچتے پہنچتے رات ہوجائے گی۔"

"دیکھتے ہیں صاحب!"

"ممکن ہے مولوی صاحب مکان پر موجود نہ ہوں۔ نواب ثروت کی خبر انہیں اب تک مل جانی چاہیے۔"

"نواب نے کسی کو ان کے بارے میں نہیں بولا ہے تو ان تک کون خبر پہنچائے گا۔"

غالباً ہدایت علی ضرور جانتا ہوگا۔ وہ نواب کا معتمد آدمی ہے۔ ممکن ہے' اس کے ذریعے اطلاع مل گئی ہو پھر تو مولوی صاحب کو لازماً نواب ثروت کے گھر ہونا چاہیے۔ سات بجے وہ انہیں یہاں سے لے گئے ہیں۔ اب تک تو سارے قریبی اعزا' احباب میں شہرہ ہوچکا ہوگا۔ بہرحال نواب ثروت کا تعلق ریاست کے قدیم اور معزز خانوادے سے ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ مولوی صاحب کو اس سانحے کی خبر ہوجانی چاہیے۔"

"ہوسکتا ہے صاحب!"

"صبح تدفین کے وقت تو آپ سے۔۔۔!" ڈاکٹر آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

بٹھل اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے دروازے کی جانب قدم بڑھا دیے۔

"کہیں تو ہم' ہم آپ کے ساتھ غازی بنڈے تک۔" ڈاکٹر نے جھجکتے ہوئے کہا۔ جواب میں بٹھل نے ہاتھ پھیلا کر ڈاکٹر کو گلے سے لگالیا اور کمرے سے نکل گیا۔ ڈاکٹر ہمیں دروازے تک رخصت کرنے آیا تو معاً اسے کچھ یاد آگیا۔ مضطرب لہجے میں بولا "ہم نے انہیں کمرے سے باہر بھیج دیا تھا لیکن نواب ثروت کی حالت چونکہ نہایت ابتر تھی اس لیے نواب فہمیدہ دروازے کے آس پاس منڈلاتے رہے تھے۔ ہمیں شبہ ہے' مبادا انہوں نے اپنے مرحوم بھائی کی آخری باتیں' یہ سرگوشیاں سن لی ہوں۔ چلتے وقت نواب فہمید آپ کو بہت یاد کر رہے تھے' کہہ رہے تھے کہ آپ آئیں تو ہمارا سلام پیش کریں۔ ان کی طرف سے ہم آپ کو بہت پوچھ لیں۔"

○☆○

گلی میں روشنیاں اور کم ہوگئی تھیں۔ میرے پیروں میں جان ہی نہیں رہی تھی تاہم میں بٹھل کے تیز قدموں کا کسی ٹسی طرح ساتھ دیتا رہا۔ بڑی سڑک پر آتے ہی زورا اور ر سامنے کی طرف سے آتے دکھائی دیے۔ بڑی سڑک ب روشن تھی لیکن سنسان ہوچکی تھی۔ بٹھل نے ہاتھ ٹھا کے زورا اور جمرو کو پاس آنے کا اشارہ کیا۔ چند لمحوں میں لپکتے ہوئے ہم تک پہنچ گئے۔ انہیں کوئی سواری روکنے کی ایت کرکے بٹھل ایک بند دکان کے برآمدے کی آڑ میں کھڑا ہوگیا۔ میں نے بھی اس کی پیروی کی۔ زورا اور جمرو تلف سمتوں میں روانہ ہوگئے تھے۔ میرے دست و بازو کھنچے ارہے تھے۔ جیسے جسم کے گرد رسیاں تنگ ہو رہی ہوں۔ میں کان کے چبوترے پر بیٹھ گیا۔ زورا اور جمرو کو گئے دیر ہوگئی۔ ی اثنا میں ایک فراغت زدہ راہ گیر ٹھٹکتا ہوا ہمارے سامنے کے ٹھہر گیا اور ہمدردی ظاہر کرنے لگا۔ اس نے ہماری یریت پوچھی۔

بٹھل نے اسے بتایا کہ سواری کا انتظار ہے' آدمی بھیجا ہے۔ بٹھل کے جواب سے اس اجنبی کی سیری نہیں ہوئی' کہنے لگا کہ سواری مل جائے گی' رات کو چلتی رہتی ہیں۔ یہ اطمینان دلا کے اسے چلا جانا چاہیے تھا لیکن وہ ٹھہرا رہا اور تجسس سے بولا "آپ لوگاں باہر سے آئے ہیں؟"

بٹھل نے سرہلا کے تائید کی۔

"کہاں کو جانا ہے سرکار کو؟"

"گھر کو جانا ہے۔" بٹھل نے بے اعتنائی سے کہا۔

"اسی کے بارے میں پوچھتا ہوں حصنت!" اجنبی کے لہجے میں بھی ناگواری آگئی۔ اس کی باتیں زہر لگ رہی تھیں۔ وہ جانے اور کیا کیا سوال کرتا کہ زورا گھوڑا گاڑی لے آیا۔ متوحش اجنبی کو وہیں چھوڑ کر بٹھل گاڑی میں بیٹھ گیا۔ کچھ دور ہی ہمیں جمرو مل گیا۔ اس نے بھی ایک گاڑی روک لی تھی اور کوچوان کو آمادہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جمرو بھی ہمارے ساتھ ہوگیا۔

سڑکوں پر راہ گیروں اور سواریوں کی تعداد بہت کم تھی۔ نہ ہونے کے برابر۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہونے لگی۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور کسی وقت بھی تیز بارش ہوسکتی تھی۔ سڑکوں پر رکاوٹ نہ ہونے کی وجہ سے گاڑی پوری رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ میرا دل ہول رہا تھا۔ بٹھل کو بھی جیسے خبر ہوگئی تھی۔ اس نے میرا بازو اپنے پنجے میں جکڑ لیا۔ ان راستوں سے ہم متعدد بار گزرے ہوں گے لیکن سب کچھ بے گانہ بے گانہ' نیا نیا سا لگ رہا تھا' زورا اور جمرو نے شروع میں فضول گوئی کرنی چاہی تھی لیکن میرا اور بٹھل کا چہرہ دیکھ کے وہ خود چپ ہوگئے۔ نیا پل عبور کرنے سے پہلے گاڑی کی رفتار سست ہوگئی۔ آگے بہت سے لوگوں کی بھیڑ تھی اور چیخ پکار مچی ہوئی تھی۔ شاید کوئی حادثہ ہوگیا تھا۔ کوچوان گاڑی ٹھہرا کے حادثے کی نوعیت جاننا چاہتا تھا لیکن بٹھل کے حکم پر شور مچاتے اور گھنٹی بجاتے ہوئے اس نے راستہ بنالیا اور آگے بڑھتا گیا۔ نیا پل ختم ہوتے ہی پتھر گٹی آگئی۔ سالار جنگ کی ڈیوڑھی' عثمانیہ بازار' چار کمان اور چار مینار۔ اتنی دیر میں رات اور گہری ہوگئی تھی۔ اب زیادہ دور کی بات نہیں رہی تھی۔ جیسے جیسے فاصلہ کم ہو رہا تھا۔ میرے سینے کی دھمک بڑھتی جاتی تھی۔ میرا تو سر ہی چکرانے لگا تھا جیسے عمارتیں اور سڑکیں گھومنے لگی ہوں۔ گاڑی مکہ مسجد سے بھی آگے نکل آئی۔ یہیں کہیں ڈاکٹر ناصر مرزا نے مولوی صاحب کا پتا بتایا تھا۔

چھوٹے بڑے مکانات کے علاقے میں آکے کسی جگہ گھوڑا گاڑی رک گئی۔

اس کے معنی یہی ہوسکتے تھے کہ ہم محلہ غازی بنڈے پہنچ چکے ہیں۔ آس پاس کوئی راہ گیر نہیں تھا۔ ہر طرف سناٹا طاری تھا۔ کسی قدر تذبذب کے بعد بٹھل گھوڑا گاڑی سے اتر گیا۔ جمرو نے کوچوان کو پیسے ادا کیے۔ ہم نے سامنے کی نسبتاً تنگ و تاریک گلی میں داخل ہوگئے۔ اتنی رات کو کسی نشانی اور رہ نمائی کے بغیر کسی بھی مکان کی تلاش آسان بات نہیں تھی۔ یہی ہوسکتا تھا کہ آگے چل کے کوئی بھولا بھٹکا راہ گیر مل جائے یا کسی کھڑکی میں روشنی دیکھ کے اس مکان کے مکین کو بے آرام کیا جائے۔ بعد میں معذرت کرنے کے لیے لفظ ہی کتنے خرچ ہوتے ہیں۔ ایک گلی کے بعد ہم دوسری گلی میں آگئے پھر دوسری سے تیسری میں۔ گلی کے کتے بیدار ہوگئے تھے لیکن شاید ہماری تعداد کی وجہ سے کوئی ہمارے قریب نہیں پھٹکا۔ وہ غراتے اور بھونکتے رہے۔ کچھ دور آگے آکے ہمیں ایک پستہ قد دراز ریش شخص نظر آگیا۔ اس کے جسم پر چادر لپٹی ہوئی تھی اور ایک ہاتھ میں تسبیح تھی' دوسرے ہاتھ میں لاٹھی۔ وہ چوکیدار تو نہیں' کوئی عبادت گزار بزرگ یا کسی مسجد کا امام معلوم ہوتا تھا۔ قریب آنے پر ہم ایک دوسرے کے مقابل ٹھہر گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی سوال کرتا' بٹھل نے اسے سلام کیا اور جواب کا انتظار کیے بغیر حکیم نجیب الدین کا نام لیا۔ بوڑھے آدمی کو تامل ہونا ہی چاہیے تھا۔ اس نے سر گھما کر حیرانی سے ہم سب کو دیکھا اور

کسی حد تک برگشتہ لہجے میں ہمارے بارے میں پوچھا۔ بٹھل نے اسے بتایا کہ حکیم نجیب الدین کے مکان کی بالائی منزل پر جو مولوی صاحب رہتے ہیں' ہمیں ان سے ملنا ہے۔"

آپ کون لوگاں ہیں؟" بوڑھے راہ گیر نے کچھ تحمل کیا اور اپنا سوال دہرایا۔ جھجک کے باوجود اس کی آواز کا تناؤ دور نہیں ہوا تھا۔

اسے یک سر انکار کردینا چاہیے تھا۔ اس کے توقف سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مولوی صاحب کو جانتا ہے اور مولوی صاحب یہیں کہیں رہتے ہیں۔ آخر ہم صحیح جگہ آگئے ہیں۔ میرا سینہ بند ہونے لگا۔ اگر واقعی مولوی صاحب۔۔! کبھی نہ کبھی' کہیں نہ کہیں تو انہیں ملنا ہی ہے۔ چند لمحوں کے لیے میرے ہوش دحواس جاتے رہے۔ معلوم نہیں بٹھل نے بوڑھے آدمی سے کیا کہا اور اس نے بٹھل سے کیا حجت کی۔ بٹھل نے بہرحال اس اثنا میں اسے کسی طور پر قابو کرلیا تھا۔ بوڑھے شخص نے ہمارے پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔ ہم کچھ آگے آگئے تھے۔ واپس ایک گلی عبور کرنے کے بعد دوسری گلی کے نکڑ پر بوڑھے آدمی نے ایک طرف ہاتھ اٹھایا۔ بٹھل نے جمرو اور زورا کو وہیں روک دیا۔ میرا ہاتھ اس نے جکڑ رکھا تھا۔ مجھے پسینہ آرہا تھا۔ جسم جیسے سن ہوا جاتا ہو یا پھر ہوگیا ہو۔ لرزتی ٹانگوں سے میں گھسٹتا ہوا سا ان کے ساتھ بڑھتا رہا۔ سامنے کی گلی میں چند قدم چلنے کے بعد بوڑھا آدمی قدیم طرز کے دو منزلہ مکان کے سامنے رک گیا۔ وہاں کئی دروازے تھے۔ بوڑھے نے چبوترے کی سیڑھیاں طے کرکے عمارت کے کونے میں ایک دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ لمحے گزرنے کے باوجود کوئی آواز یا آہٹ نہیں ابھری تو اس نے دوبارہ دروازہ تھپ تھپایا اور انتظار کرتا رہا۔

میری سانسیں حلق میں اٹک گئی تھیں پھر بٹھل نے خود چبوترے پر جاکے دروازے کے بیچ میں نصب لوہے کا گول کنڈا تین چار بار بجایا۔ رات کے سکوت میں کنڈے کی گونج دور تک پہنچی ہوگی۔

شاید اوپر کا دروازہ کھلا۔ دوسرے لمحے کسی عورت کی گھبرائی ہوئی آواز آئی "کون ہے؟"

آواز سے عمر کا اندازہ کیا جاسکتا تھا۔ وہ کسی لڑکی کی آواز تھی مگر وہ کورا نہیں تھی۔

میرے دل کی حرکت بند ہوگئی تھی' جیسے پیر زمین میں دھنسے جارہے ہوں' سارا جسم ہی منجمد سا ہوگیا تھا۔ اوپر سے کوئی بھی جواب آسکتا تھا۔

"نواب صاحب کے گھر سے آئے ہیں۔ مولوی صاحب کو بولو" بٹھل نے آہستگی سے کہا۔

"مولوی صاحب!" لڑکی چونک سی گئی اور مضطربانہ میں بولی "پر وہ تو۔۔۔ بڑے صاحب تو گھر میں نہیں ہیں۔"

اس کے سوا کیا جواب ہوسکتا تھا۔ میں نے ا[illegible] آنکھوں سے بٹھل کی طرف دیکھا۔ اسے شاید کسی ا[illegible] جواب کی امید تھی۔ چند ثانیوں کے سکوت کے بعد ا[illegible] بڑبڑاتی آواز سناٹے میں گونجی۔

"گھر میں اور کون ہے؟" لڑکی کا جواب سننے سے [illegible] بٹھل نے پوچھا "گھر میں کوئی مرد نہیں ہے کیا؟"

"جی ہے' ہے صاحب! ان کو اٹھاؤں؟" زینے کے ا[illegible] موجود لڑکی نے بدحواسی سے کہا "آپ لوگاں کون ہیں؟"

"تم کو کیا بولا!" بٹھل کی آواز میں تلخی آگئی "ا[illegible] اٹھادو۔ ملنا ہے اپنے کو اس سے۔"

"جی' جی صاحب!" لڑکی نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

زینے سے بھاگتے قدموں کی چاپیں سنائی دیں۔ [illegible] گزر گئے۔ لڑکی نے دروازے کے قریب سوئے ہوئے [illegible] مرد کو جگانے کی کوشش کی تھی۔ کوئی نیند سے اچانک بید[illegible] کیے جانے پر ہڑبڑا اٹھا تھا۔ پہلے سرگوشیاں ابھریں پھر معد[illegible] ہوگئیں۔ دوبارہ کسی کے دروازے پر آنے میں دیر ہوئی [illegible] بٹھل نے پھر لوہے کا کنڈا کھٹ کھٹایا۔

"آتا ہوں' سرکار آتا ہوں" کہیں دور سے کسی مرد [illegible] ٹھکے ہوئے لہجے میں کہا اور تیز تیز قدموں سے زینہ اترنے ا[illegible] کنڈی کھولنے کی آواز آئی۔ اس نے دروازے کا ایک پٹ کھولا۔ مدھم روشنی میں اس کے خال وخط نظر نہیں آرہے تھے لیکن وہ اوسط قد کا ایک ادھیڑ شخص تھا۔ وضع [illegible] ہی سے وہ کوئی خدمت گار نظر آتا تھا۔ اس نے بے ربطی [illegible] سلام کیا اور اپنے سامنے کھڑے ہوئے لوگ دیکھ کے ا[illegible] قدم پیچھے ہٹ گیا "کا' کیا بات ہے سرکار!" اس نے ا[illegible] زبان سے کہا "مولوی صاحب گھر میں ناہیں ہیں۔"

"سن لیا رے!" بٹھل نے تندی سے کہا اور کچھ فا[illegible] پر کھڑے ہوئے زورا اور جمرو کی جانب اشارہ کیا۔ وہ دونو[illegible] لپکتے قدموں سے ہمارے پاس آگئے۔ زورا بوڑھے راہ گیر [illegible] قریب اور جمرو بٹھل کے نزدیک آکے ٹھہر گیا۔ میں نے نہیں سنا کہ بٹھل نے ان سے کچھ کہا بھی ہے۔ میں تو گنگ نظرو[illegible] سے انہیں دیکھ رہا تھا اور میرا سر بار بار چکرا جاتا تھا۔ [illegible] مجھے اچھی طرح احساس تھا کہ آدمی کو تاب ومجال ہو نہ ہو [illegible] اسے کسی طور اپنے منتشر حواس قابو میں رکھنا چاہیے۔ [illegible] نے خود کو تھپکی دی۔ ایک بات تو ضرور طے ہوچکی ہے کہ [illegible]

ڈاکٹر ناصر مرزا کے بتائے ہوئے پتے پر صحیح پہنچ گئے ہیں۔ اتنے برسوں' اتنی لمبی مسافت کے بعد ایک بار پھر ہم نے مولوی صاحب کا ٹھکانا ڈھونڈ لیا ہے۔ اب آگے خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

یکایک میرے اندھیرے وجود میں بجلیاں سی کوندنے لگیں۔ میں نے اپنی پراگندگی میں غور نہیں کیا۔ اگر وہ لڑکی اور یہ شخص مولوی صاحب کی خدمت یا نگرانی پر مامور ہیں تو انہوں نے محض گھر میں مولوی صاحب کی ناموجودگی کے بارے میں بتایا ہے' کچھ اور نہیں۔ مولوی صاحب کے گھر میں نہ ہونے سے یہ مراد نہ ہوگی کہ وہ یہاں رہتے بھی نہیں ہیں۔ ممکن ہے وہ نواب ثروت کی طرف گئے ہوں۔ نواب کے سانحے کی اطلاع ملتے ہی انہیں یہاں رکنا نہیں چاہیے۔ اور۔۔۔ اور یہ کیا ضروری ہے کہ کورا بھی ان کے ساتھ نواب کے گھر گئی ہو۔ مولوی صاحب نہیں تو کورا تو گھر میں ہوسکتی ہے' مولوی صاحب کے گھر سے نکلنے پر آخر وہ گھر ہی میں رہتی ہوگی۔ ہوسکتا ہے' مولوی صاحب نے بہ طور احتیاط اپنے ملازموں کو تاکید کی ہوئی ہو کہ کوئی اجنبی انہیں پوچھتا ہوا آئے تو وہ یہی جواب دہرایا کریں۔ کسی وقت بھی انہیں اچانک میرے سامنے آجانے کا دھڑکا تو لگا ہی ہوگا۔ ہوسکتا ہے' وہ اس وقت بھی گھر میں موجود ہوں اور اندر کسی کمرے میں سو رہے ہوں۔ نہ معلوم اندر سے مکان کتنا بڑا ہے۔ ورنہ اتنی دیر میں ان کی آنکھ کھل جانی چاہیے تھی اور ہمیں اوپر سے کوئی اور سن گن بھی ملنی چاہیے تھی۔ یہ بھی بعید نہیں کہ خادم نے مولوی صاحب کو جگانا ہی مناسب نہ جانا ہو۔ ادھر خدمت گاروں پر نواب ثروت کی طرف سے کوئی پابندی ہو۔ اصل میں تو وہ اسی کے ملازم ہوں گے۔ مولوی صاحب کو اس لاؤلشکر کی مقدرت کہاں ہوسکتی ہے۔

"سن رے"۔ بٹھل کی سرد آواز پر میرے کان دھمکنے لگے۔ وہ گھر سے برآمد ہونے والے آدمی سے مخاطب تھا "اپنے کو اوپر جانا ہے۔ کوئی ٹیں ٹیں کی تو۔۔۔" بٹھل کے ہاتھ میں کھلا چاقو تھا۔

اس شخص کی آنکھیں ابل پڑیں۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ جمرو نے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال کے دروازے سے باہر کھینچ لیا۔ جمرو نے چشم زدن میں اس کی گردن پر صرف ایک ضرب لگائی کہ ہلکائی سی سسکاری کے بعد اس کا سر ڈھلک گیا۔ یہ دیکھ کے بوڑھے راہ گیر نے مزاحمت کرنا اور شور مچانا چاہا مگر زورا اس کے آگے موجود تھا۔ "اپن کوئی چور ڈاکو نئیں ہے' بڑے صاحب! ابھی ایک

دم چپ چاپ کھڑے دیکھتے رہنے کا ہے۔ اسی میں تمہارے کا بھلا ہے۔ اپن کو تمہارے سے کوئی مطلب نئیں، سمجھا!"

"مگر یہ کیا، کیا ہے بھائی! آپ لوگاں کیا چاہتے ہو؟" بوڑھا آدمی بھنچی ہوئی آواز میں بولا۔

"ابھی سارے کا پتا چل جائے گا" زورا نے اس سے کہا "اپن لوگ سبھی ایدری ہیں۔"

اس اثنا میں بٹھل سیڑھیوں پر چڑھ چکا تھا۔ اس نے مجھ سے ساتھ چلنے کو نہیں کہا۔ مجھ سے تو چلا بھی نہ جاتا۔ میرے ہاتھ پیروں میں جان ہی نہیں رہی تھی۔ اوپر زینے کے سرے پر لڑکی کو کچھ اخذ کرنے اور چیخ پکار کرنے کا موقع نہیں مل سکا کہ بٹھل سیڑھیاں پھلانگتا ہوا، آناً فاناً اوپر پہنچ چکا تھا۔ لڑکی کی گھٹی ہوئی چیخ ابھری پھر شاید بٹھل اسے اندر کی طرف لے گیا اور خاموشی چھا گئی۔

وقت جیسے رک گیا ہو اور درودیوار کے ساتھ ہوا بھی جیسے پتھر ہو گئی ہو، لگتا تھا بٹھل کو اوپر گئے ہوئے سیر گزر گئے ہیں، ماہ وسال گزر گئے ہیں۔ میری رگوں میں خون دھڑک رہا تھا۔ اگر واقعی کورا اوپر موجود ہے، میرا تو سینہ پھٹ جائے گا۔ ممکن ہے بس لمحوں کی دیوار حائل ہو۔ آج ہی کا دن نصیب میں لکھا ہو۔ اس کے سامنے جا کے میرا کیا حال ہوگا! میری سانسیں پھولنے لگی تھیں اور سارا جسم پسینے میں نہا گیا تھا۔

بٹھل نہیں آیا۔ اسے ویسے بھی جلد سے جلد واپس آجانا چاہیے تھا۔ اتنی دیر کا کام بھی کیا ہے۔ اس کا کام مولوی صاحب اور کورا کی گھر میں موجودگی ناموجودگی کی تصدیق کرنا ہے۔ گلی میں بوڑھے راہ گیر کی طرح کوئی اور بھی بھولا بھٹکا گزر سکتا ہے۔ جمرو نے نیچے آنے والے ملازم کو خاموش کر دیا تھا مگر اوپر والی لڑکی موقع پا کے کسی وقت بھی غُل مچا سکتی ہے۔ رات میں تو آوازوں کو بھی پر لگ جاتے ہیں۔ بوڑھے آدمی نے زیرلب آیتیں پڑھنی شروع کر دی تھیں۔ وہ بھی کسی لمحے پھیل سکتا تھا۔ دیر ہو گئی تو میں نے جمرو اور زورا کی طرف دیکھا۔ انہیں کچھ خیال ہی نہ تھا۔ میں ان سے کہنا چاہتا تھا کہ ان میں سے کسی کو اوپر جا کے بٹھل کو دیکھنا چاہیے۔ وہاں کسی افتاد کا امکان تو نہیں مگر بری گھڑی کہہ کے بھی نہیں آتی۔ پھر میں نے خود ہی اوپر جانے کا ارادہ کیا لیکن نہ مجھ سے زورا اور جمرو سے کچھ کہا جا سکا نہ اپنی جگہ سے ایک قدم آگے بڑھایا گیا۔ اوپر سے کوئی سرگوشی، کوئی آہٹ نہیں آرہی تھی۔ یہ خاموشی اور عذاب تھی۔ وہی بات تھی۔ لمحے کی کمیت تو اس کی کیفیت سے طے ہونی چاہیے۔ جس پر جس طرح وقت گزرتا ہے، وہی اس کا حال جانتا ہے۔ کبھی ایک لمحہ سارا خون نچوڑ لیتا ہے، ساری زندگی سے بڑا ہوتا ہے۔ جانے کتنا عرصہ گزر گیا تب کہیں سیڑھیوں پر بھاری قدموں کی گونج اٹھی۔ وہ بٹھل کی چاپ تھی۔ اس کے ساتھ اور کوئی نہیں تھا۔ اس نے گن گن کے سیڑھیاں طے کیں اور نیچے آگیا۔ روشنی کم ہونے کے باوجود اس کے چہرے کا لکھا صاف پڑھا جا سکتا تھا۔ میں نے بہت دیر بعد گہری سانس لی اور مجھے سینے سے کوئی دھند چھٹنے، کسی تجسس سے نجات پانے کا احساس ہوا۔ یہی تو نوشتہ تھا، اسی بے چارگی کی تو عادت تھی۔ اندھیرا بھی آدمی کی عادت بن جاتا ہے اور شکست بھی تو ایک طرح کا سکون دیتی ہے۔

"آپ کا رستہ کھوٹا کیا بڑے صاحب!" بٹھل نے بھرّاتی آواز میں بوڑھے سے کہا۔

"کیا ہوا جناب! کیا مولوی صاحب موجود نہیں ہیں؟" بوڑھے آدمی نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

بٹھل نے سر ہلانے پر اکتفا کی۔

"ہو سکے تو کچھ بتائیں" بوڑھے نے دبی زبان سے کہا "ہو سکتا ہے، یہ ناچیز کسی کام آسکے۔"

"کیا بولیں بڑے صاحب!" بٹھل درشتی سے بولا۔ "برا حساب ہے، پر ابھی ٹائم نہیں آیا شاید" یہ کہتے ہی بٹھل چل پڑا۔

اوپر سے آنے والا آدمی زینے سے ملحق چبوترے پر بے سدھ پڑا تھا۔ بوڑھا شخص بھی وہیں کھڑا رہ گیا۔

تین چار گلیوں کے چکر کے بعد ہم بڑی سڑک پر آگئے۔

ہر طرف رات چھائی ہوئی تھی۔ سڑک پر کہیں کہیں روشنی کے چھینٹے سے پڑے ہوئے تھے۔ دور دور تک کوئی سواری دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ سب گونگے بنے سر جھکائے چلتے رہے۔ مکہ مسجد کے اردگرد بھی کسی سواری کا نام ونشان نہیں تھا۔ ابھی تک آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور بارش کسی اشارے کی منتظر تھی۔ اس موسم میں سواری ملنا اور مشکل تھا۔ سواری کے بغیر ہوٹل تک کا طویل فاصلہ عبور کرنے میں وقت لگ جاتا۔ اس طرح اُدھر کے کسی آدمی کا آمنا سامنا ہو جانے کا خدشہ الگ تھا۔ محرومی کی تھکن شاید زیادہ ہوتی ہے۔ سب کے جسم بکھر رہے ہوں گے۔ جو میرا حال تھا، کم وبیش ان کا بھی وہی ہوگا۔ ان کا اور سوا ہوگا۔ وہ تینوں تو بیگار بھگت رہے تھے۔ کسی کی رفتار میں تیزی نہیں تھی۔ تھوڑی دیر پہلے ہونے والی بوندا باندی نے سڑکیں گیلی کر دی تھیں۔ چلتے چلتے ہم چار مینار تک آگئے۔ وہاں سواری کے انتظار میں کھڑے رہنے سے بہتر

...لہ کم کرتے رہنا تھا۔ چار کمان اور عثمانیہ بازار کے بعد پتھر... کا علاقہ آگیا۔ یہیں سے ایک بار ہمیں پہلے بھی سواری ملی ...۔ مدینہ ہوٹل سے بٹھل بائیں طرف کی گلی میں مڑ گیا۔ ... کا قیاس درست تھا، کچھ قسمت بھی ایسے معاملوں میں ...ھ دے دیتی ہے۔ وہی پرانا کوچوان گاڑی میں سویا ہوا تھا ...ں سے حیدر آباد آنے کی پہلی رات ہمارا واسطہ پڑا تھا۔ ...ھل کے جگانے پر پہلے کی طرح وہ برگشتہ ہونے لگا لیکن جلد ...ہمیں پہچان گیا۔ بوکھلائے ہوئے انداز میں اس نے متعدد ...ام کیے اور پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ گزشتہ مرتبہ بٹھل کی ...زش کا خمار ابھی تک باقی تھا۔ گاڑی تیار کرنے میں اس ...ے پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لیے۔

ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ بس گھوڑے کی ٹاپیں اطراف پر ...ایا ہوا سکوت درہم برہم کر رہی تھیں۔ سب گم صم بیٹھے ...ہے۔ میری طرح زورا اور جمرو کے دماغ میں بھی ریت ...ر رہی ہوگی۔ کچھ حاصل ہونے کی امید ہی میں کوئی بٹھل ...ے بازپرس کی جرات کرتا۔ کچھ بتانا نہ بتانا اسی کی مرضی پر ...وقوف تھا۔ اسے احساس ہی نہیں رہتا تھا کہ دوسرے بھی ...ں کے ساتھ ہیں اور وہ جانور یا اس کے معمول نہیں ہیں۔ ...ی لیے میں بٹھل کو ساتھ لانے میں پہلوتہی کرتا تھا۔ پھر جو کچھ بھی ہوتا، میرا اختیار تو میرے پاس ہوتا۔ وہ ایک لحظے کی ...رگمانی تھی کہ دوسرے ہی لمحے جیسے کسی نے مجھے ٹھوکا دیا۔ یہ کیسی بے حسی، بے غیرتی ہے۔ بٹھل کا ساتھ نہ ہوتا تو اب تک میں کہاں ہوتا۔ میں اکیلا ہوتا تو نواب ثروت کو اتنی دور جانے کی ضرورت بھی نہ پڑتی۔ اس نے تو مجھے ختم کرنے کے لیے کب سے بساط جمائی ہوئی تھی۔ معظم جاہی مارکیٹ پر آکے کوچوان نے زبان کھولی۔ پچھلی مرتبہ ہوٹل تک گاڑی لے جانے کے بجائے بٹھل نے احتیاطاً معظم جاہی مارکیٹ سے کچھ آگے گاڑی رکوائی تھی پھر ہوٹل تک پیدل گئے تھے۔ بٹھل نے کوچوان کو چلتے رہنے کا اشارہ کیا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اب کسی احتیاط کی حاجت نہیں رہی ہے۔ اب وقت ہی وقت ہے۔ عابد شاہ روڈ پر جب ویکاجی ہوٹل سے گاڑی آگے نکل گئی تو زورا نے بٹھل کو ٹوکا "دادا! ابھی آگے جانے کا ہے کیا؟"

"ہاں، ہاں رے" بٹھل کھوئے ہوئے لہجے میں بولا "نام پلی کا بول حرام کے جنے کو۔"

نام پلی کا نام سن کے میرا ماتھا ٹھنکا اور میں بیٹھے بیٹھے اچھل پڑا۔ بمبئی کی گاڑی ملنے کا کوئی وقت نہیں تھا۔ ہمارا سامان بھی ہوٹل میں پڑا ہوا تھا۔ پھر نام پلی کی طرف جانے کی کیا تک ہے۔ کوئی مصلحت تو ضرور ہوگی۔ میری متوحش نظریں بٹھل کے چہرے پر منڈلانے لگیں۔

"اب، اب کہاں پہ جانا ہے استاد؟" جمرو سے نہ رہا گیا۔ اس نے جھنجھلاتی آواز میں بٹھل سے پوچھا۔

"نواب کی طرف" بٹھل نے تنک کے کہا۔

"نواب کی طرف" جمرو سیدھا ہو گیا "پر ادھر ادھر کیوں؟" اس سے آگے جمرو کی زبان لڑکھڑانے لگی۔

"دیکھتے ہیں رے" بٹھل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"کیا، کیا ادھری سے کوئی اشارہ ملا ہے استاد؟" جمرو نے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

"نہیں رے" بٹھل نے اسے جھڑک دیا۔

جمرو کا جسم اکڑ کے رہ گیا۔ اس کے چپ ہو جانے پر میں نے دخل دینے کا ارادہ کیا۔ ایسا بھی کیا تھا۔ جو لوگ ہمہ دم، ہمہ جاں شامل ہیں، ان کی حیرت ووحشت بھی فطری ہے۔ آخر اس وقت اتنی رات گئے، نواب ثروت کے گھر جانے کا کیا مقصد ہے لیکن میں بٹھل کی جانب دیکھا کیا۔ اس میں کسی تکدر ردتردد کی کیا گنجائش ہے۔ نواب کی طرف جانے میں اس کے سوا کیا رمز ہو سکتی ہے کہ مولوی صاحب وہیں موجود ہیں۔ کورا بھی لازماً انہی کے ساتھ ہوگی۔ میری سانسیں اکھڑنے لگیں۔ یہی بات ہو سکتی ہے۔ نواب کے انتقال کی خبر ملتے ہی مولوی صاحب کو بلا تاخیر اس کے گھر کا رخ کرنا چاہیے۔ اس شہر میں ایک نواب ہی تو ان کا مربی ومحسن تھا۔ یہ گھر اور نوکر چاکر وغیرہ تو اسی نے فراہم کیے ہوں گے۔ میرا دل بہت گھبرانے لگا تھا۔ پھر وہی بچھو جسم سے چمٹ گئے تھے۔

گھوڑا گاڑی تیزی سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں نام پلی اسٹیشن آگیا۔ اسٹیشن کی عمارت کے سامنے ہوٹلوں کے آس پاس چائے اور پان کی دکانیں کھلی تھیں اور خوب روشنی ہو رہی تھی۔ بٹھل بے حس وحرکت بیٹھا رہا۔ گھوڑا گاڑی وہاں سے بھی گزر گئی۔ نواب ثروت کی کوٹھی اب زیادہ دور نہیں رہ گئی تھی۔ جیسے جیسے فاصلہ کم ہو رہا تھا۔ میرے ہاتھ پیر اینٹھنے جا رہے تھے۔ امرا کے اقامتی علاقے کے نزدیک بٹھل نے گھوڑا گاڑی رکوا دی اور جیب سے نوٹ نکال کے کوچوان کے حوالے کیے کوچوان نے دیکھے بغیر مٹھی بند کر لی۔ اسے تو کسی دربار میں ہونا چاہیے تھا۔ درباریوں کے مانند وہ آدھا جھک گیا۔ بٹھل نے اس سے کہا کہ اگر وہ آدھ گھنٹے کے لیے انتظار کر سکتا ہو تو ٹھیک ہے۔ اسی جگہ ٹھہرا رہے۔ کوچوان نے دوبارہ سرخم کیا اور ہاتھ باندھ کے کہنے لگا کہ صبح تک اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا۔

بڑی سڑک سے اندر جانے والی گلی خاصی چوڑی تھی۔ یہاں سے بس منٹوں کی مسافت رہ گئی تھی۔ کچھ دیر چلنے کے بعد بائیں ہاتھ کے موڑ پر نواب کی گلی آگئی۔ بٹھل وہیں ٹھہر گیا۔ سامنے کچھ فاصلے پر نواب کی کوٹھی نظر آرہی تھی۔ موت پر روشنی بھی کیسی عجیب لگتی ہے۔ وہاں تیز روشنیاں ہورہی تھیں اور متعدد موٹریں، گھوڑا گاڑیاں اور سائیکلیں کھڑی تھیں۔ کوٹھی کی دیوار کے ساتھ کرسیاں بھی لگی ہوئی تھیں۔ کلام پاک کے ورد اور طرح طرح کی دھیمی اور تیز آوازوں کا ملا جلا شور گونج رہا تھا۔ باہر کئی ملازم اور مزدور شامیانہ نصب کرنے میں مصروف تھے۔ بٹھل چند لمحے خاموش کھڑا سامنے کا منظر دیکھتا رہا۔ پھر اس نے زورا سے کہا کہ وہ کسی طرح نواب کے ڈرائیور کو اس کے پاس لے آئے۔ اس نے زورا کو احتیاط کی ہدایت کی۔ اتنی رات کو ایک اجنبی کا گھر کے سامنے نظر آنا باہر موجود ملازموں اور مزدوروں کے لیے تجسس واضطراب کا باعث ہوسکتا تھا۔ نواب کے شناسا، ہر شخص کے لیے اس کی ناگہانی موت ایک معما ہوگئی۔ لوگ اپنے اپنے طور پر جانے کیسے کیسے فسانے وضع کررہے ہوں گے۔ اس کام کے لیے جمرو زیادہ موزوں تھا۔ معلوم نہیں کیوں، بٹھل نے زورا کو ترجیح دی تھی۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ایسے وقت ڈرائیور کو تلاش کرنا اور اسے ہمارے پاس آنے کے لیے آمادہ کرنا بہ طور خاص زورا کے لیے آسان کام نہیں تھا۔ بہرحال نواب کا ڈرائیور زورا کو پہچانتا تھا۔ اس رات نواب مجن میاں کے باغ سے واپسی کے وقت ہماری خیر خبر کی جستجو میں جب زورا اور جمرو نے سرغنہ اور اس کے مردہ اور زخمی ساتھیوں کی موٹر باغ سے کچھ دور روکے رکھی تھی کہ اتنی دیر میں نواب کی موٹر میں ہم بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ جمرو اور زورا ہمیں دیکھ کے بے قابو ہوگئے تھے اور نواب کے ڈرائیور سے ہم سب کا باہمی تعلق چھپانا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس رات ڈرائیور نے • را کو دیکھ لیا تھا۔ ادھر زورا اور جمرو کی موٹر سارے راستے نواب کی موٹر کے ساتھ چلتی رہی تھی۔ پھر علی الصباح ہمارے خون آلود کپڑے تبدیل کرنے کے لیے جب زورا اور جمرو ہوٹل سے ڈاکٹر ناصر مرزا کے ہاں ہمارے لیے نئے کپڑے لائے تھے تو بھی نواب کے ڈرائیور نے ان کے چہرے چشم نشیں کیے ہوں گے۔ اس کا ملنا شرط تھا۔ گھر میں اس کے آقا کی لاش پڑی تھی۔ سارے گھر پر قیامت سی ٹوٹ پڑی ہوگی۔ ڈرائیور کا حال بھی نہایت غیر ہوگا۔ نواب سے اس کا ایک ربطِ خاص بھی تھا۔ رات بہت ہوچکی تھی۔ گو اس وقت ڈرائیور کی موجودگی کا امکان زیادہ تھا لیکن اسے کوئی بھی مصروفیت ہوسکتی تھی۔

مجھے خیال آیا کہ جمرو کو نواب کے دروازے پر نہ بھیجنے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔ حیدر آباد آنے کی پہلی رات، نواب کے گھر داخل ہونے سے پہلے نہ ہمیں اس کے رویے اور پذیرائی کا کوئی اندازہ تھا، نہ اس کی طرف سے ملنے والے خط کے سفید وسیاہ کے بارے میں کچھ علم تھا۔ کوئی بھی بات ہوسکتی تھی۔ حیدر آباد میں ہماری طلبی زروجواہر کے جویا، بے جان پتھروں کے دیوانے نواب ثروت کے ہم نفس نوابوں کے اشارے پر بھی ممکن تھی۔ گزشتہ مرتبہ ہم ان پر بہت گہرے نقش چھوڑ کے گئے تھے۔ حیدر آباد میں ہمارے قیام کے دوران میں ابا جان کی نو خرید حویلی میں ان کے بے شمار مسلح آدمیوں کی پسپائی کا صدمہ انہیں ازبر ہوگا، کسی تازیانے کے مانند بمبئی میں ہمارے تعاقب کی مہم جوئی میں بھی انہیں ناکامی ہوئی تھی۔ نواب کے خط پر شبہ کرنے کے جواز کم نہیں تھے لیکن ایک عرصے بعد کہیں سے کورا کی بازیابی کی نوید آئی تھی..... تمام خدشوں کے باوجود ہمیں تو نواب ثروت کی بارگاہ میں حاضری دینی ہی تھی۔ بٹھل نے اسی لیے زورا اور جمرو کو نواب کی کوٹھی کے اردگرد گھومتے رہنے کی تاکید کی تھی اور انہیں اجازت دی تھی کہ نواب کے ہاں سے آدھی رات تک ہمارے برآمد نہ ہونے کی صورت میں وہ کوٹھی کی چاردیواری پھلانگ جائیں۔ نواب ثروت نے اس رات بہ اصرار ہمیں دسترخوان پر بٹھادیا تھا۔ ابھی آدھی رات کا وقت نہیں ہوا تھا لیکن واپسی میں ہمیں بہت دیر ہوچکی تھی۔ جمرو کو بے چینی ہوئی اور اس نے ایک دور افتادہ، غیر حیدر آبادی سائل کی حیثیت سے نواب کے دروازے پر جاکے دستک دی۔ اس کے بہ قول دربان سے اس کی خوب چق چق ہوئی۔ جمرو نے نواب ثروت سے ملنے اور اپنی حاجت عرض کرنے کی ضد کی تھی۔ دربان انکار کرتا رہا کہ سردست نواب سے ملنا ممکن نہیں ہے، وہ باہر سے آئے ہوئے مہمانوں کی نگہ داری میں مصروف ہے۔ جمرو کو بس یہی معلوم کرنا تھا۔ دربان کو جمرو کا چہرہ یاد ہوگا۔ کچھ وقت گزار کے جمرو دوسری بار بھی وہاں گیا تھا۔ اسی وجہ سے بٹھل نے جمرو کو وہاں بھیجنا مناسب نہیں جانا تھا۔ بٹھل اپنے ذہن میں سب کچھ سینت کے رکھتا تھا۔ میرا تو دماغ ذرا سی بات پر پھر جاتا تھا۔ اس بے دھیانی کا سبب کم عقلی ہی ہوسکتا ہے۔ کبھی کبھی تو اپنی اس حالت پر مجھے غصہ بھی بہت آتا تھا۔ چڑ بھی بہت ہوتی تھی۔ پر آدمی اپنے آپ کو کتنے طمانچے مارے، آدمی

ی خوشبو کا بھی تو اسیر ہوتا ہے۔

ہم دور کھڑے دیکھتے رہے۔ زورا آہستہ روی سے نواب ے مکان کے نزدیک ہوتا گیا۔ اس کی رفتار میں کسی قسم کی لت یا جھجک نہیں تھی۔ شامیانہ آدھے کے قریب نصب کیا اچکا تھا اور ہر کوئی اپنے کام میں مصروف تھا۔ اتنے زیادہ ادمی نہیں تھے۔ زورا کے لیے یہی بہتر تھا کہ وہ چپکے سے انہی ں شامل ہوجائے تاکہ نواب کے گھر سے متعلق لوگ اسے سمجھیں، اور مزدور نواب کے گھر کا کوئی فرد۔ نواب کا رائیور اگر گھر میں موجود تھا تو اس کے باہر ہونے کا امکان زیادہ تھا۔ اتنی رات میں زورا کو سامنے دیکھ کے ڈرائیور کی تو اس باختگی یقینی تھی۔ زورا کو اسی مرحلے پر ہوشمندی کا ثبوت دینا تھا۔

بٹھل کے آگے یوں تو سبھی مٹی کا ڈھیر معلوم ہوتے تھے لیکن صرف یہی تو نہیں تھا۔ زورا اور چھیدا نے جھنگا دادا کا اڈا حسن وخوبی سے چلایا تھا، زورا کوئی بے عقل شخص نہیں تھا۔ اسے کوئی وقت ضائع کیے بغیر ڈرائیور کو ساتھ چلنے پر ہموار کرنا تھا۔ زورا کے پاس کمر سے بندھا ہوا تمنچا بھی تھا، چاقو بھی۔ مجن میاں کے باغ میں سارا فتنہ ڈرائیور کا چشم دیدہ نہیں تھا لیکن جتنا بھی اس نے دیکھا تھا، اس کی عبرت سینے میں پیوست ہوگئی ہوگی اور بٹھل تو سراپا اس کی بینائی کا جزو بن چکا ہوگا۔ ڈرائیور کو یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ زورا بٹھل ہی کا ساتھی ہے۔

ہم تینوں کی نظریں زورا پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ کسی رکاوٹ کے بغیر مکان کے نزدیک پہنچ گیا تو بٹھل اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ میں نے اور جمرو نے بھی اس کی پیروی کی، پھر سب کچھ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔

ہم نواب کی گلی سے ملحق گلی سے گزرتے ہوئے بڑی سڑک پر آگئے۔ زورا کو وقت بھی لگ سکتا تھا۔ نواب کی گلی کے موڑ پر ہمارا تادیر کھڑے رہنا احتیاط کے منافی تھا۔ نواب کے مکان کے آگے کھڑی ہوئی موٹریں اور گھوڑا گاڑیاں قریبی رشتے داروں کی آمدورفت جاری رہنے کی علامت تھیں۔ کسی کا بھی اس طرف سے گزر ہوسکتا تھا جہاں سے ہم نے زورا کو آگے بھیجا تھا۔ اب تک تو سارے شہر میں نواب کی موت کی خبر عام ہوگئی ہوگی اور موت سے زیادہ موت کی نوعیت کے چرچے ہورہے ہوں گے۔ ہر طرف ایک کہرام سا برپا ہوگا۔ پولیس تو پہلے ہی سادہ لباس میں ڈاکٹر ناصر مرزا کے ہاں آگئی تھی اور نواب کے سگے خالہ زاد بھائی نواب فہمید نے کسی طرح اسے سنبھال لیا تھا۔ نواب کی زندگی تک بات اور تھی۔ اب سادہ لباس والوں کی جگہ باقاعدہ باوردی پولیس والے بھی حرکت میں آگئے ہوں گے۔ نوابوں کی ریاست ہے، وہی حاکم، انہی کی حکومت۔ یہ واقعہ ان سب کے لیے بڑی سبکی بلکہ توہین کے مترادف ہے۔ وہ اپنے قبیلے کے ایک ممتاز شخص کے ختم ہوجانے پر ہاتھ پیر توڑے نہیں بیٹھے رہیں گے۔ آج نہیں تو کل، نواب ثروت کی تدفین کے بعد انہیں محرک کا سراغ لگانے اور دست درازوں تک رسائی کے لیے کوئی بھی شدید حکم صادر کرنے میں رورعایت نہیں کرنی چاہیے۔

بٹھل نے صرف ایک چکر کاٹا پھر دوبارہ ہم پرانی جگہ آکے کھڑے ہوگئے۔ ہم نے موڑ سے نواب کی گلی میں جھانک کے دیکھا اور میرا دل یک لخت زور سے دھڑکنے لگا۔ زورا کے ساتھ ڈرائیور آرہا تھا۔ وہ زیادہ دور بھی نہیں تھے، لمحوں میں ہم تک پہنچ گئے۔ ڈرائیور کی حالت بہت شکستہ تھی۔ آنکھیں سوجی ہوئی، چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ وہ بڑی حد تک ہیبت زدہ بھی نظر آرہا تھا۔ اس نے دزدیدہ نگاہوں سے ہمیں دیکھا اور جھجکتے ہوئے سلام کیا۔

بٹھل نے جواب نہیں دیا اور چپ کھڑا اسے گھورتا رہا۔

ڈرائیور نے سر جھکالیا اور پژمردگی سے بولا "سرکار نے یاد فرمایا" اس کے لہجے میں اضطراب نمایاں تھا۔

"ہاں رے!" بٹھل نے سانس بھر کے کہا "اپنے کو بھولا تو نہیں رے؟"

"کیا، کیا بولتے ہیں سرکار!" ڈرائیور نے جلدی سے کہا "اپن سرکار کو کیسے بھول سکتا ہے۔"

"پھر تو ٹھیک ہے" بٹھل بدبداتے ہوئے بولا "کیا نام تھا تیرا؟"

"ہدایت علی، ہدایت علی سرکار!"

"ہاں، ہدایت علی صاحب بہادر، لاٹ صاحب!" بٹھل نے پھنکارتی آواز میں کہا "نواب کا پالتو ہے نا، اشارے پر بھاگتا، دم ہلاتا تھا۔"

مجھے ایسی توقع بالکل نہیں تھی۔ بٹھل کے تیور ہی بدلے ہوئے تھے۔ جانے وہ ڈرائیور سے کیا معلوم کرنا چاہتا تھا۔ میرے تو کچھ پلے نہیں پڑ رہا تھا۔

"سرکار!" ہدایت علی کی آنکھیں پھٹ گئیں "اپن، اپن سے کوئی خطا ہوگئی ہے؟ خدا کریم جانتا ہے اپن..."

بٹھل نے ہاتھ اٹھاکے اسے روک دیا "حرام کا جنا، بولے تو ابھی تجھ کو بھی نواب کے ساتھ بھیج دے۔ ادھری

بھی تو نواب کو تیری ضرورت پڑے گی بڑی۔"

"میں غریب آدمی ہوں حضت' بہت غریب۔ لاچار' غلام کو معلوم نہیں' کیا نادانی ہوئی ہے پر غلام کو معاف کردو' معاف کردو سرکار!" ڈرائیور گھگھیانے لگا۔

اس کی ضرورت نہیں تھی۔ زورا نے اپنا چاقو دانستہ ہی زمین پر گرایا ہوگا۔ کھلا چاقو' زمین پر چھناکا ہوا۔ زورا نے فوراً چاقو اٹھالیا اور اڈے کے داداؤں کی طرح ہوا میں اچھال کے مشاقی سے انگلیوں کی گرفت میں لے لیا۔

"بلے کتنے ہیں رے تیرے؟" بٹھل نے تلخی سے پوچھا۔

ڈرائیور کی سمجھ میں دیر سے آیا اور بدحواسی سے بولا "تین' تین سرکار' دو بچیاں' ایک بچہ' بیٹا چھوٹا ہے۔"

"پل جائیں گے سسرے پھر' نوابوں کو ادھری کمتائی نہیں ہے۔"

"آپ' آپ کیا فرماتے ہو؟" ڈرائیور کا جسم دھڑکنے لگا۔

"دیکھ رے' ہم سے الٹا سیدھا بولا تو ادھری سے بوجھا اٹھاکے لے جائے گا کوئی۔ اپنے پیروں سے نہیں جائے گا سور کی اولاد! اور سن لے' ٹائم بھی زیادہ نہیں ہے اپنے پاس۔"

یہ تو کوئی اور بٹھل تھا۔ مجھے وہ اڈے کا معمولی دادا لگ رہا تھا۔ اڈے کے عام داداؤں کی طرح وہ ڈرائیور سے مخاطب تھا۔ مجھے یاد آیا' اڈے کے آدمیوں کا طریقہ ہے کہ وہ آدمی دیکھ کے بات کرتے ہیں۔ غالباً یہی بات ہوگی۔ کسی دنگے فساد اور شوروغل کا وقت تھا نہ محل ورنہ ڈرائیور ایک ہاتھ کا بھی نہیں تھا۔

"کیا' کیا بات ہے سرکار؟" وہ بٹھل کے پیروں پر گرگیا۔

"اپن کو بولو' حکم کرو سرکار!"

"کدھری بھیجا ہے مولوی کو؟" بٹھل نے تڑختی آواز میں پوچھا۔

"مم... مولوی!" ڈرائیور کی زبان میں لکنت آگئی "کون مولوی' کون حضت!"

"نہیں جانتا رے' بیلا بھی ہے سسرا۔"

اسی اثنا میں جمرو اور زورا ڈرائیور کے قریب ہوگئے۔ جیسے وہ بٹھل کے حکم کے منتظر ہوں۔

یہ ستم بھی خوب ہے کہ آدمی کو اپنے حال پر ترس آیا کرے۔ میری حالت وہی تھی جو گرداب میں پھنسے' ہاتھ پاؤں مارتے کسی شخص کی ہوتی ہے۔ میں نے اپنے ہوش وحواس قائم رکھنے اور کچھ اخذ کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ بٹھل کی باتوں سے صاف ظاہر تھا کہ مولوی صاحب' نواب ثروت کے ہاں نہیں ہیں۔ گویا نواب ثروت کے گھر میں ان کی موجودگی کی خوش گمانی میں بٹھل یہاں نہیں آیا ہے۔ بٹھل کے خیال میں ڈرائیور کو ضرور مولوی صاحب کے... کسی نئے ٹھکانے کا علم تھا۔ میرے جی میں آتا تھا کہ ڈرائیور کی کمر پر ایک ضرب رسید کردوں' وہ دہرا ہوجائے گا اور اتنی دیر نہیں لگائے گا۔

"آپ' آپ مولوی شفیق صاحب قبلہ کا بولتے ہو؟" ڈرائیور گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔

"ہاں بالم! دیر میں آیا تیری کھوپڑیا میں۔"

"ہاں' اپن تو کل' کل ہی ان کے پاس گیا تھا۔"

"پھر کدھری بھیجا اس قبلہ کو؟"

"کدھر بھیجتا" ڈرائیور ہذیانی انداز میں بولا "آپ کیا بولتے ہو سرکار! اپن نے کدھر بھیجا ہوگا ان کو' اپن تو ان کو حضور نواب کی حالت کا بولے تھے' بس بس۔ ان بے چارے کو کچھ معلوم نہیں تھا۔"

"لگتا ہے' ٹائم آگیا ہے تیرا بھی" بٹھل نے بھڑک کے کہا۔

"خدا رسول کی قسم' آگے کا اپن کو نہیں معلوم۔ اپن بے قصور ہے سرکار۔ اس کے بعد اپن کو مولوی صاحب کے پاس جانے کا موقع ہی کہاں ملا؟"

"ہم کیا بولتے ہیں رے۔ ٹھیک سے سنا نہیں تو نے۔ ابھی کدھری ہے وہ؟"

"کون؟ مولوی صاحب' کیا وہ گھر پر نہیں ہیں سرکار؟" ڈرائیور سٹپٹاتے ہوئے بولا "اپن کو بالکل نہیں معلوم حضور۔"

"ادھری تیرے جانے کے بعد ہی اس نے گھر چھوڑدیا تھا۔"

ڈرائیور ہدایت علی کے چہرے پر حیرت امڈ آئی اور اس کے ہونٹ پھڑکنے لگے۔

"ہاں رے' پھر کدھری چھپایا ان کو؟"

"کیا بولتے ہیں حضت' اپن کہاں کو چھپاتے؟" ڈرائیور دریدہ آواز میں بولا "اپن کوئی نواب تو نہیں ہے' اپن تو بس حکم کا..."

"حکم ہی دیتے ہیں حرام کے تخم' تجھ کو۔ نمک کی اپنے پاس بھی کمتائی نہیں ہے۔ سیدھی طرح نہیں بولے گا تو' تو..." بٹھل نے تڑخ کے کہا "ہم کو زیادہ بات کرنی نہیں آتی۔"

اسی لمحے کہیں دور سے موٹر کی آواز گونجی۔ لمحہ بہ لمحہ ھتے ہوئے شور سے اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ بڑی سڑک سے وئی موٹر ہماری ہی طرف آرہی ہے۔ کچھ پیچھے ہوکے ہم سبتاً اور اندھیرے میں ہوسکتے تھے لیکن موٹر کی تیز روشنی رگوشہ روشن کردیتی۔ اس طرح پانچ آدمیوں کا یہ ناوقت جتماع کسی کو بھی شک میں ڈال سکتا تھا۔ خصوصاً نواب روت کے گھر کے قریب۔ چند ثانیوں میں موٹر کی آواز اور دیک ہوگئی۔ بٹھل نے معاً ڈرائیور کو دھکادیا۔ ادھر سے مرو نے اس کے بازو میں ہاتھ ڈالا' ادھر سے زورا نے۔ مگر زورا فوراً الگ ہوگیا۔ ڈرائیور بری طرح بوکھلا گیا تھا۔ جب سے موڑ سے نواب کی گلی کی طرف دھکیلا گیا۔ تبھی اس کی سمجھ میں کچھ آیا ہوگا۔ ہم سب کا رخ نواب کی گلی کی طرف ہوگیا تھا اور ہم نے نواب کے مکان کی سمت بڑھنا شروع کردیا تھا۔ موٹر اس گلی میں داخل ہوئی جہاں ہم سب کھڑے تھے' پھر گلی کا موڑ کاٹ کے نواب کے گھر کی جانب جانے لگی۔ موٹر میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی نظر ہم پر ضرور پڑی ہوگی۔ نہیں ہمارے چہرے نظر نہ آسکے ہوں گے کہ سامنے...... ہماری پشت تھی۔ موٹر ہمارے قریب سے گزرتے وقت ڈرائیور کے بپھر جانے کا امکان تھا۔ مگر دہشت اس کے رگ وپے میں اتر گئی تھی۔ اسے ذرا سا بھی خطرہ مول لینا نہیں چاہیے تھا۔ زورا کے ہاتھ میں چاقو دبا ہوا تھا۔ اسے چاقو کی نوک ڈرائیور کے جسم کے کسی حصے سے مس کرنے کی ضرورت بھی نہیں پڑی۔ آدمی' آدمی کی بات ہے۔ ہتھیار تو آگے کی منزل ہے۔ کبھی آدمی ہی سراپا ہتھیار ہوتا ہے۔ اس کی آنکھیں' آواز' دست وبازو اور اس کے تیور ہی چاقو' تلوار' طمنچے کا زور واثر رکھتے ہیں۔ ہنر ایک مستزاد خوبی ہے۔ انہوں نے ڈرائیور کو جیسے کسی شکنجے میں کسا ہوا تھا۔ موٹر ہمارے پاس سے گزرتی ہوئی آگے چلی گئی تھی کہ بٹھل پلٹ گیا۔ چند قدموں بعد ہم نے گلی کا موڑ طے کیا اور واپس پرانی جگہ آکے ٹھہر گئے۔ بٹھل نے توقف کے بغیر ڈرائیور سے دوبارہ مولوی صاحب کے نئے ٹھکانے کے بارے میں استفسار کیا۔ جواب میں ڈرائیور عاجزی کرنے اور گڑگڑانے لگا اور خدا رسول' غوث پاک کے واسطے دینے لگا۔ بٹھل کے اصرار میں بھی پہلے جیسی تندی نہیں رہی تھی۔ شاید اسے احساس ہوگیا تھا کہ ڈرائیور کی بس اتنی ہی استطاعت ہے۔ ہر شخص کے سینے کی ایک استطاعت ہوتی ہے' اور کوئی بہ قدر سینہ یا بہ قدر ظرف ہی امانتیں محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اپنے آقا نواب ثروت کے بعد ڈرائیور کا ظرف ویسے بھی شکستہ ہوجانا چاہیے۔

"جاکے ادھری ہم لوگوں کا کیا بولا تھا تو نے مولوی کو؟" بٹھل نے آتش بار لہجے میں پوچھا۔

"آپ کے بارے میں" ڈرائیور نے اپنا خشک گلا ترکیا۔ "کچھ بھی نہیں' کچھ بھی نہیں سرکار" پھر وہ خود ہی چونک پڑا اور کہنے لگا "نہیں نہیں' اپن سرکار کے بارے میں بولے تھے۔ اپن بولے تھے۔ اپن نے پوری بات تو نہیں کی' ہاں ان کو بولا کہ باہر کے دو صاحب حضور نواب کے ساتھ تھے۔ سچی بات ہے' ان لوگاں کا ہی دم تھا' اناں نے نواب صاحب کو بچانے' دوبارہ زندگی دلوانے میں اپنی جان بھی جوکھم میں ڈال دی تھی۔ اپن نے حضور کا نام لیا تھا۔ اپن نے پورا نہیں پر جو کچھ بھی اس قیامت کی رات کو دیکھا تھا۔ تھوڑا بہت ان کو بولا تھا۔ مولوی صاحب قبلہ غور سے سنتے رہے' پوچھنے لگے۔ کب ایسا ہوا؟ اپن نے بتایا۔ سن کے ایک دم چپ ہوگئے۔ اپن سمجھے' ان کو بہت قلق' صدمہ ہوا ہے۔ زبان سے کچھ بولے تو نہیں پر ڈاکٹر صاحب کے پاس حضور نواب کو دیکھنے کے لیے آنے کا بولے تھے۔ وہ نہیں آئے۔ سارے شہر کو نواب صاحب کا معلوم ہوگیا ہے۔ ایک ان کو معلوم نہیں ہوا۔ آپ ٹھیک فرماتے ہیں حضور' جب وہ وہاں ہیں ہی نہیں تو اس طرف آئیں گے بھی کیسے۔ اب کچھ کچھ اپن کی سمجھ میں بات آرہی ہے سرکار۔ اپن سے ضرور کوئی غلطی ہوئی ہے' پر سب ان جانے میں' اپن تو..."

"زیادہ ٹیں ٹیں نہ کر بھتنیا کے' کنجر کی اولاد!" بٹھل نے برہمی سے پوچھا "ادھری شہر میں اور کون کون مولوی کا سگا ہے؟"

"اپن کیا بول سکتے ہیں" ڈرائیور دہائیاں دینے لگا "اپن نہیں جانتا' ایک دم نہیں جانتا سرکار۔ مولوی صاحب گھر سے بہت کم باہر نکلتے تھے۔ ان کو یہاں آئے ہوئے ابھی دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ اپن جانتے ہیں' ان کا یہاں کسی سے حضور نواب جیسا واسطہ نہیں تھا۔" ڈرائیور کی زبان بھٹک رہی تھی' کہنے لگا "اپن کو معلوم ہے' نواب صاحب بہت کچھ ان کو فراہم کیے ہیں۔ مکان' سارا سازوسامان۔ نواب صاحب کے گھر والوں' ای حضور وغیرہ کو بھی شاید اس کا پتا نہیں ہے۔ ان دناں خود حضور نواب دو ایک بار مولوی صاحب کی خیر خبر لینے کو وہاں گئے تھے۔ اپن کے پیچھے بھی گئے ہوں تو کیا بول سکتے ہیں۔ کبھی مولوی صاحب ان کو ملنے آجاتے تھے یا نواب صاحب موٹر بھیج کے بلوالیتے تھے۔"

جمرو نے ڈرائیور کا بازو چھوڑدیا۔ بٹھل نے کچھ نہیں

کہا تھا لیکن جمرو کو ضرورت محسوس ہوئی۔ اس نے ڈرائیور کی گردن پر ہاتھ جھپٹا کے گدی کی چٹکی بھرلی۔ گرد و پیش میں واقع مکانات میں کسی بیدار شخص کو یقیناً مضطرب ہونا چاہیے اور سماعت کا فتور سمجھ کے درگزر بھی کردینا چاہیے۔ ایک لحظے کے لیے ڈرائیور کے ڈکرانے کی آواز گونجی تھی کہ اس کی کراہیں حلق میں گھٹ گئیں اور اس کا جسم پھڑکنے لگا۔ جمرو نے اسے متنبہ کیا کہ بہتر ہے' وہ ایک بار اور نظرثانی کرلے۔ بعد میں اس کے بیان میں ذرا سی بھی آلائش کا علم ہوا تو ہمیں اس کے سر تک پہنچنے میں بس ارادے کی تاخیر ہوگی۔ جمرو نے جب اپنی گرفت ڈھیلی کی تو ڈرائیور کی آنکھیں چڑھ گئی تھیں۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔

وہ نواب کا خاص ملازم تھا۔ نواب کے درون خانہ' درون سینہ معاملات کا شاہد' نگراں اور امین بھی۔ بعض غلام کتوں سے بدتر صفات رکھتے ہیں۔ آئینے کی طرح یوں بھی ہر ایک کی زندگی میں کسی نہ کسی بے پڑے چوپائے کا ضرور دخل ہوتا ہے۔ اسے نفس ناطقہ بھی کہتے ہیں۔ پہلی رات' بہت رات گزر جانے پر جب ڈرائیور ہدایت علی ہمیں چار کمان تک پہنچانے آیا تھا تو اسے ہماری اقامت کا سراغ لگانے کی بڑی بے قراری تھی۔ وہ ہمیں گھر کے دروازے تک پہنچانے کے لیے مچلتا رہا تھا۔ موٹر کسی گھر تک لے جانے کے بجائے بیچوں بیچ چار کمان کے علاقے میں بٹھل کے اتر جانے پر اسے بہت مایوسی ہوئی تھی۔ ہماری اقامت گاہ کی سمت جاننے کے لیے اس نے موٹر کی خرابی کا عذر کیا تھا اور دیر تک وہاں ٹھہرا کل پرزے چھوتا رہا تھا' اور اس رات جب ہم نواب ثروت مرحوم کے بہ قول اس کی زمینوں والے مکان میں مقیم مولوی صاحب کی طرف جارہے تھے تو راستے میں اس نے کئی مرتبہ موٹر خراب ہوجانے کا تماشا کیا تھا۔ اس طرح وہ کچھ وقت گزار کے اندھیرا گہرا ہوجانے کا منتظر تھا۔ مجن میاں کے باغ کے قریب اس نے موٹر بالکل ہی ٹھپ کردی تھی۔ تمام راستے وہ خندہ پیشانی اور سعادت مندی سے نواب کی لعنت ملامت سنتا رہا۔ سب کچھ ہدایت کے مطابق تھا۔ باغ کی عمارت میں ہمارے ٹھہر جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی وہ خاموشی سے موٹر باغ میں لے آیا تھا۔ سرغنہ اور اس کے ساتھیوں کی اچانک یلغار اور نواب کی زہرکاری و ستم گری افشا ہوجانے پر بٹھل کو یہی باور کرنا چاہیے تھا کہ موٹر کی خرابی نوٹنکی کا حصہ ہے۔ اب تک باغ میں موٹر آچکی ہوگی۔ سوختی نواب کو لے جانے کے لیے اس نے پورے یقین سے موٹر طلب کی تھی۔ نواب کی حالت نہایت شکستہ تھی۔

ڈرائیور ہدایت علی کی رد و قدح کی مجال نہ تھی۔ کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر اس نے عمارت کے چبوترے سے موٹر لگادی۔ ممکن ہے' اپنے طلبیدہ سرفروشوں اور جاں ہاروں کی آمد کے بارے میں نواب نے ڈرائیور کو باخبر رکھا ہو اور ہم سے نمٹ لینے کے بعد کی ہدایات بھی ازبر کرائی ہوں اور ہوسکتا ہے' نواب نے جزئیات سے پہلو تہی کی ہو۔ وہ ڈرائیور کو اپنی پاک دستی کا وہی تاثر دینا چاہتا ہو جو باغ کے مکینوں اور ریاست میں امن و عافیت کے ننگ داروں کو دینا چاہتا تھا۔ مقدار نمک سے زیادہ نمک خواروں کی آزمائش نہیں کرنی چاہیے ورنہ ان کے سینگ بھی نکل آتے ہیں۔ ہوش مندی کی جتنی ضرورت آقاؤں کو پڑتی ہے' اتنی غلاموں کو بھی۔ ایک غلام کو بھی دائرے سے سوا نہ سننا چاہیے نہ دیکھنا۔ اچھے غلام کا شعار محض تعمیل ہے۔ نکتہ رسی اور جزبینی کا شغل اسے راس نہیں آتا۔ ہمیں اس سے اب کوئی سروکار بھی نہیں تھا کہ ہمارے معاملے میں نواب نے ڈرائیور ہدایت علی کو کسی طور ہم نفسی کا شرف بخشا تھا۔ بٹھل کو تو ڈرائیور کی جانب سے مولوی صاحب کے بارے میں مبہم و موہوم ہی سہی' بس ایک اشارہ مطلوب تھا۔

زورا مطمئن نہیں ہوا۔ اسے ڈرائیور کی زبوں حالی پر کوئی شک تھا۔ سامنے سے جمرو کے ہٹتے ہی اس نے ڈرائیور کے سینے پر پوری طاقت سے ہتڑ رسید کیا۔ ڈرائیور کی پسلیاں چیخ گئی ہوں گی۔ لڑھکتا ہوا وہ دور جاگرا اور سینہ پکڑ کے دہرا ہوگیا۔ اس کی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔ زورا نے گردن پر پنجہ ڈال کے اسے دوبارہ زمین سے اٹھایا۔

"چھوڑ دے اسے" بٹھل نے بوجھل آواز میں کہا "کھونٹے سے بندھا ہے رے' جائے گا کدھری بھڑوا۔"

ڈرائیور کے شانے ڈھلک گئے تھے اور جسم بل کھا رہا تھا۔ چند لمحے اس نے سانسوں کی استواری میں صرف کیے پھر ہاتھ جوڑ کے معذرتیں' منتیں کرنے لگا اور ساری وہی تکرار۔ اس میں کچھ نیا نہیں تھا۔ بٹھل نے پھر اس سے کلام نہیں کیا۔ اب کچھ کہنے سننے کی ضرورت بھی کیا رہ گئی تھی۔ ڈرائیور کے کہنے کے مطابق نواب کے گھر سے متعلق کسی اور شخص کو مولوی صاحب اور ان کی بیٹی کورا کے ٹھکانے کا علم نہیں تھا۔ کوئی اور نواب کا محرم راز اور دم ساز ہوتا تو ہدایت علی اس کی جانب اشارہ کرنے میں کوئی پس و پیش کیوں کرتا۔ یہ راست گوئی تو اس کے لیے ہمارے عتاب سے نجات کا موجب ہی بنتی۔ نواب کا کوئی ایسا رفیق بھی عیادت کے لیے ڈاکٹر ناصر مرزا کے ہاں نہیں پھٹکا تھا۔ ہدایت علی

...ال نواب کا ملازم تھا۔ آقا اور غلام کے اپنے آداب ...تے ہیں۔ ملازموں کو دلیلیں نہیں دی جاتیں' فیصلے سنائے ...تے ہیں۔ مولوی صاحب اور نواب ثروت کے مابین کسی ...رده معاملت سے ڈرائیور کی ناواقفیت بہ ظاہر قریب قیاس ...لگتی تھی ورنہ اس زیردستی کے عالم میں کسی مرحلے پر اس ...زبان ضرور بہکتی۔ نواب کی اس سفاکانہ خلاقی کا بھی اسے ...ید کوئی اندازہ نہیں تھا کہ مجن میاں کے باغ میں نواب کے ...ئے ہوئے زر خریدوں کی شورہ پشتی کا سرا کسی طور مولوی ...حب سے جاملتا ہے۔

بٹھل بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہوگا۔ جو میں نے اخذ کیا تھا۔ ...ب اور کیا رہ گیا تھا۔ وہی دن' وہی راتیں۔ ساری جاں کاہی ...ر جاں سوزی کا حاصل اتنا تھا کہ شہر حیدر آباد میں مولوی ...حب کی دست یابی کا اب کوئی امکان نہیں ہے۔ ڈاکٹر ناصر ...زا کے ہاں موت سے نبرد آزما' زخم خوردہ نواب اس لائق ...نہیں تھا کہ ڈرائیور ہدایت علی کو مولوی صاحب کے پاس ...بھیجنے اور انہیں شہر میں ہماری موجودگی کے خطرے سے باخبر ...رکھنے کا کوئی حکم صادر کرسکے۔ خلاصہ صرف یہ تھا کہ ڈرائیور ...نے از خود مولوی صاحب کو نواب پر آئی ہوئی افتاد سے مطلع ...کرنا ضروری سمجھا اور جیسا کہ وہ کہہ رہا تھا' مجن میاں کے ...باغ تک نواب کے ہم راہ جانے والے دو اجنبیوں کا ذکر ...مولوی صاحب کے سامنے بر سبیل تذکرہ آگیا تھا۔ ڈرائیور کو ...باغ میں پیش آنے والے شعبدے سے مولوی صاحب کے ...کسی سلسلے اور تعلق کا تھوڑا بہت اندازہ ہوگا تو لازماً اس نے ...ہمارا تذکرہ دانستہ چھیڑا ہوگا۔ مولوی صاحب کو محتاط کرنے ...کے لیے یا اپنی تشنگی کی تکمیل کے لیے یا محض شوشہ طرازی ...کے لیے۔ ہمیں اس سے بھی کیا فرق پڑتا تھا کہ یہ ذکر شعوری ...تھا یا غیر شعوری۔ مولوی صاحب تو اب تک نہ جانے کتنی ...منزلیں دور جاچکے ہوں گے۔

آخری وقت' جب شاید آدمی کو سچ ہی میں راہِ نجات نظر ...آتی ہے' نواب نے ڈاکٹر ناصر مرزا سے اعتراف کیا تھا کہ وہ ...موجود بابر زماں خاں کو کورا کے سامنے پیش کردینا چاہتا تھا۔ ...اس کے بہ قول مولوی صاحب نے اس سے کہا تھا کہ کورا کی ...آس ٹوٹنے کی ایک ہی صورت نظر آتی ہے۔ ایک مرتبہ بس ...کسی تدبیر سے وہ جان لے کہ بابر زماں کی امید ایک سراب ...ہے' کسی دیوانے کا خواب۔ یہ ایک خواب مٹ جائے تو ...انہیں بھلا کورا کو نواب جیسے عالی شان' عالی مرتبت شخص کے ...سپرد کرنے میں کوئی عذر کیوں ہوگا؟ مولوی صاحب نے اسے ...یہ تاثر دیا تھا کہ تامل ان کی جانب سے نہیں' کورا کے سبب

سے ہے۔ کورا کے لیے نواب کے اشتیاق کے جواب میں مولوی صاحب کی یہ تاویل نہایت قابل فہم تھی۔ نواب مجھ سے بھی مل چکا تھا اور مولوی صاحب اور کورا کے لیے میری آنکھوں کی دھند کا اچھی طرح مشاہدہ کرچکا تھا۔ اسے میرا پتا بھی معلوم تھا۔ مولوی صاحب نے اس طرح ایک طرف نواب کا شوق فراواں بڑی حد تک قابو میں کرلیا تھا' دوسری طرف انہیں اس کے طفیل عرصے بعد ایک جائے سکون میسر آگئی تھی۔ حیدر آباد ویسے بھی ان کا محبوب شہر تھا' ممکن ہے مولوی صاحب کے سان و گمان میں نہ ہو کہ نواب اتنی دور تک جاسکتا ہے اور بالفرض وہ یہ معرکہ سر بھی کرلیتا ہے' میری دیوار ہٹانے بلکہ مٹادینے میں کامیاب بھی ہوجاتا ہے تو مولوی صاحب کے لیے اس سے بڑی راحت کیا ہوتی۔ کورا کو خود سے جدا کرنے کے دشوار گزار مرحلے سے تو انہیں کبھی نہ کبھی گزرنا ہی تھا اور کورا ان سے جدا بھی کہاں ہوتی۔ اسے نواب کی تحویل میں دینے کے بعد تو نواب کی نوازشیں ان پر اور ارزاں ہوجاتیں اور نواب جیسے باوقار' بردبار نوجوان کے لیے ہزار چراغ بھی ناکافی ہوتے۔ اور اگر انہوں نے یوں ہی دفع دقتی کے لیے نواب سے میری زنجیر کا ذکر کردیا تھا اور کورا کے لیے انہیں نواب کسی وجہ سے ناپسند تھا تو بھی ان کا کیا جاتا تھا۔ کسی بھی اندھیری رات' وہ کورا کو لے کے نکل کھڑے ہوتے۔ بستیاں بدلنے اور دربہ در مارے مارے پھرتے رہنے میں انہیں ملکہ حاصل ہوگیا تھا۔ اس مرتبہ زاد راہ بھی ان کے پاس کم نہیں ہوگا۔ مکان اور سازوسامان کے علاوہ نواب نے مولوی صاحب کو زرنقد سے بھی نوازا ہوگا اور کورا کے لیے بہ طور خاص دیگر تحفے تحائف کی نذریں الگ گزاری ہوں گی۔ ہر نئی جگہ جاتے وقت مولوی صاحب' کورا کو میری بازیابی کا آسرا ہی دلاتے ہوں گے۔ اس کی تلاش میں بھٹکنے والے تبت کے جانگ قبیلے کے لوگوں کا تو اب انہیں اتنا خوف نہیں ہونا چاہیے۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد ان سرپھروں کو تو اب کورا سے مایوس ہوجانا چاہیے۔

نواب کے لیے پہلا مرحلہ مجھے نابود کرنا تھا۔ پہلے مرحلے میں نواب کی سرخ روئی پر عہد شکنی کرنے' دوسرے لفظوں میں چپکے سے کہیں اوجھل ہوجانے سے پہلے مولوی صاحب میرے لاشے کا نظارہ کورا کو ضرور کراتے۔ معلوم نہیں' اس کے لیے نواب نے کیا اہتمام کیا تھا۔ ظاہر ہے' وہ کسی ایسی حالت میں مجھے کورا کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا کہ دور دور تک اس کے سائے کا بھی گمان نہ ہو۔ وہ میری لاش مولوی

صاحب کے دروازے پر پھنکوا سکتا تھا۔ کسی اجنبی کے ذریعے وہ مولوی صاحب کو یہ پیغام منتقل کرا سکتا تھا کہ باہر زماں خاں نامی کوئی شخص اس حالت میں فلاں جگہ' کوڑے کے کسی ڈھیر پر پڑا ملا ہے اور اس کے لباس سے مولوی صاحب کا پتا دستیاب ہوا ہے۔ باغ میں سرغنہ اسی لیے ہم پر گولی چلانے سے اجتناب کررہا تھا۔ سرغنہ کو شاید باغ سے ہمیں زندہ حالت میں کہیں لے جاکے نواب کے حسب منشا تمام کرنا تھا۔ زہر دے کے یا کسی اور طریقے سے۔ موت کے بے شمار طریقے ہوتے ہیں۔ اسے حادثے کی شکل دینے کے لیے نواب نے تمام تر احتیاطیں پیش نگاہ رکھی ہوں گی۔ پھر کورا نو یاس والم کی ایک مہلت دینے کے بعد وہ مولوی صاحب سے دوسرے مرحلے کے لیے سلسلہ جنبانی کرتا۔ بہت سوں کی طرح اسے بھی یہ کلیہ ازبر ہوگا کہ وقت ہر زخم کا آخری نسخہ ہے۔ کیا عجب کہ مولوی صاحب کے پاس میری مجبوری ومعذوری کا عذر کیے بغیر کوئی چارہ ہی نہ ہو' انہوں نے نواب کے تیور بھانپ لیے ہوں۔ کورا کے طلب گاروں کا انہیں خوب تجربہ ہوچکا تھا۔ مجھے تو صرف جیسلمیر کے خون خرابے کا علم تھا اور جانے کہاں کہاں انہیں کیسی کیسی قیامتوں سے واسطہ پڑا ہو۔ کیا معلوم' حیدر آباد آکے کن مصائب سے وہ دوچار تھے۔ خود ان کے اعصاب بھی تو جواب دے سکتے ہیں۔ نواب کا گوشۂ اماں انہوں نے اس وقت غنیمت جانا ہوگا۔ ایسا کوئی عذر ہی انہیں سانس لینے اور ستانے کا کچھ وقت فراہم کرسکتا تھا۔ اندر کا حال تو کچھ وہی جانتے ہوں گے کہ کوئی آس ہی تو کورا کو قائم رکھے ہوئے ہے ورنہ وہ تو پھولوں سے زیادہ لطیف' شیشے سے زیادہ نازک ہے۔ ان پے بہ پے ہجرتوں سے تو وہ کب کی کمھلا چکی' ٹوٹ چکی ہوتی۔ دولت بھی کبھی کیسی مصیبت بن جاتی ہے' خوش جمالی کی ہو یا زروجواہر کی۔ آدمی کا جینا دوبھر کردیتی ہے۔ خدا جانے یہ کیوں ہے؟ بادل' چاندنی کو ستاتے ہیں' پروانے روشنی کے دشمن ہیں۔ بھونرے پھولوں کو چین نہیں لینے دیتے۔ کہتے ہیں' بس یہی قرینہ قدرت ہے۔ منیر علی کی بیٹی زہرہ نے مجھے بتایا تھا کہ مولوی صاحب نے کورا کو برقع پہنادیا تھا اور وہ اس کے پردے کا بہت خیال رکھتے تھے۔ گھر میں پڑوسیوں کی آمد بھی محدود تھی۔ وہ اسے بری نگاہوں سے بچائے پھرتے تھے لیکن خوشبو بھی تو کوئی چیز ہے اور ہوا بھی تو کوئی چیز ہے۔ زہرہ کہتی تھی' لوگ بہانوں سے اسے دیکھنے آتے تھے' اس کی ایک جھلک۔ وہ کسی شہزادی سے آخر کیا کم ہے۔ اور وہ شہزادی ہے بھی۔ نواب کیا اسے دیکھ کے کسی کے بھی نہاں خانے میں آگ لگ سکتی ہے۔ کچھ لوگوں میں کسی کو پاگل کردینے کا ایسا ہی جادو ہوتا ہے۔

مجھے یاد آیا' مولوی صاحب نے نہیں' نواب نے ان سے میری آمد کا ذکر کیا تھا۔ نواب نے مجھے اور پیرو کو بتایا تھا ... میرا نام سن کے ان پر سکوت چھاگیا تھا' سکوت کیا' سنا ... ماری ہوجانا چاہیے۔ نواب کے تجسس وتردد پر وہ پریشان ہوگئے تھے' کیا کہیں' کیا نہ کہیں۔ اس وقت انہوں نے بردباری سے اسے خاموش کردیا تھا۔ نواب نے بھی اپنے بزرگ مہمان کی کشمکش محسوس کرکے چپ ہوجانے کی شائستگی کی تھی۔ اسی مرتبہ نواب کی والدہ نے مولوی صاحب سے کورا اور نواب کے رشتے کی آرزو کی تھی۔ اور اسی دن سہ پہر کو' جب نواب گھر پر نہیں تھا' مولوی صاحب کسی سے ودائی سلام دعا کیے بغیر گھر سے چلے گئے تھے۔ نواب کا خیال تھا کہ مولوی صاحب میں انکار کا حوصلہ نہیں تھا۔ مولوی صاحب کے اس ناروا انداز میں رخصت ہوجانے سے اس پر شدید یاسیت کا غلبہ تھا۔ میں نے اور پیرو نے وضاحت نہیں کی کہ مولوی صاحب اس کی وجہ سے نہیں' اس کی زبانی باہر زماں کا نام سن کے' اس کے ہاں باہر زماں کی دوبارہ آمد کے اندیشے کے سبب سے روپوش ہوگئے ہیں۔ میں نے نواب کا گھر جو دیکھ لیا تھا۔ نواب ثروت کو مولوی صاحب کی واپسی کی امید نہیں تھی۔ کچھ عرصے بعد ان کا نواب کے شہر اور گھر کا رخ کرلینا اس کے لیے حیرانی اور شادمانی کا باعث ہوگا۔ نواب کے ہاں مولوی صاحب کی آمد بے ارادہ' بے غرض نہیں ہوگی' ہرچند پیشانی عرق آلود ہوگی۔ ادھر میری طرف سے بھی انہیں اطمینان ہوگا کیونکہ درمیان میں خاصا وقت گزر گیا تھا۔ نواب کے ہاں ان کی واپسی کی امید سے مجھے تائب ہوجانا چاہیے تھا۔ میں نے نواب کی دہلیز پر پڑاؤ تو نہیں ڈال دیا ہوگا۔ بہتر ہے کہ حیدر آباد جاکے ایک بار نیازمند نواب کو ساری صورت حال سے آگاہ کردیا جائے۔ حالات کی کشاکش' مسلسل گردشوں سے تنگ آکر آخرکار نواب ہی پر ان کی نظر ٹھہری ہو۔ انہوں نے طے کیا ہو کہ نواب ہی کورا کے لیے ایک موزوں ترین شخص ہے یا پھر اس طرح نواب کو آلۂ کار بناکے میرے وجود کے عفریت سے نمٹنے کا سودا ان کے سر میں سماگیا تھا۔ انہیں بحالی نفس اور تجدید توانائی کے لیے کچھ وقت درکار تھا۔ اس کا موقع انہیں نواب کے ہاں بہ فراغت مل سکتا تھا۔ سو کچھ حقیقت' کچھ فسانے پر مبنی داستان سنا کے وہ نواب کی توجہ مبذول کرنے اور منتشر کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

جانے کیا سچ تھا۔ پر میرا دل نہیں مانتا تھا۔ کسی بدگمانی پر ... نسوں میں سوزش ہونے لگتی تھی۔ وقت آدمی کو اتنا ... بدل دیتا۔ مولوی صاحب ایسے سنگ دل' اتنے شقی ... نہیں ہوسکتے تھے کہ میرے لیے انہوں نے نواب کو ... ایسی غضب کاری وغارت گری کے لیے مہمیز کیا ہو۔ ... نے تو اپنی دانست میں نواب سے حقیقت حال کا اظہار ... ہوگا۔ وہ نیک وبد کی تمیز اور جزا وسزا کا عام لوگوں سے بہتر ... رکھتے ہیں۔ وہ ایک دین دار' مہذب' مہربان اور تعلیم ... شخص ہیں۔ انہوں نے تو کورا کو موسموں کی دست برد' ... نے کی نیرنگیوں سے بچائے رکھنے میں اپنی زندگی داؤ پر ... ہے' اس پر نچھاور کردی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ ... بہ وجوہ کورا کے لائق نہیں سمجھتے۔ حالانکہ کورا تو ان کے ... میری امانت ہے مگر کوئی کسی امانت کی اس قدر پاس بانی ... نہیں کرتا۔ ایسی نگہ داری اور ایثار پیشگی کے بعد انہیں ... را کے لیے ہر طرح کے فیصلے کا حق پہنچتا ہے۔ اس رات وہ ... تھ نہ ہوتے تو میرے سپاہیوں کے ہتھے چڑھ جانے اور ... جانے کے بعد کورا کہاں ہوتی' وہ تو وہیں' دریائے ہگلی ... گھاٹ پر ختم ہوجاتی۔ نواب سے میری کہانی بیان کرنے ... معنی یہ کہاں ہوتے ہیں کہ انہوں نے نواب کو کسی مذموم ... رکیک قدم اٹھانے پر مجبور کیا ہوگا۔ یہ تو نواب پر منحصر تھا ... وہ کس نفاست' بلاغت' سلیقہ وتدبیر سے کورا کے قلب ... نگاہ سے ایک نقش اتارنے اور دوسرا جمانے کی کوشش ... کرتا۔ اور مولوی صاحب تو اس سے میرے بارے میں ایک ... ظ بھی نہ کہتے اگر نواب خود ان سے میرا ذکر نہ چھیڑتا۔ ... نہوں نے تو نواب کے تجسس' نواب کے سوال کا ایک ... معقول جواب دیا تھا۔ انہوں نے نواب کو اشارہ کیا ہوگا کہ ... ب تک کورا کے رگ وپے میں باہر زماں' ایک ناہنجار' نابکار ... کی آس رچی بسی ہے' وہ کچھ بھی نہیں کرسکتے۔ یہ جواز ایک ... طرح کا انکار تھا۔ نواب نے بین السطور میں جھانکنے کی ... کوشش نہیں کی اور اپنے طور پر تشریحیں' تعبیریں وضع ... کرلیں تو یہ اس کی خطا ہے۔ جیل کا تصور بعض لوگوں کے ... لیے بڑا ہیبت ناک ہوتا ہے۔ ابتدا میں مولوی صاحب نے بالا ... ہی بالا میری خبرگیری ضرور کی ہوگی لیکن سات سال کے لیے ... جیل بھیج دیے جانے کی خبر سن کے انہوں نے شاید ہمیشہ کے ... لیے مجھے ترک کردیا۔ کون جانے ان کے پاس یہ گرہ کشائی ... کرتا کہ جیل میں آدمی' مجرموں کی صحبت کے علاوہ کچھ اور ... جتن بھی کرسکتا ہے۔ مولوی صاحب نے نواب سے کہا تھا کہ ... باہر زماں' دہرے قتل کے مجرم' ایک سزا یافتہ پر کورا جیسی گل

اندام پری جمال لڑکی کو بھینٹ نہیں چڑھایا جاسکتا۔ اس کا مطلب یہ کہاں نکلتا ہے کہ اس شخص کو نیست و نابود ہی کردیا جائے۔ بابر زماں کے مٹ جانے سے کورا کا نقش مٹ جانے کا دعویٰ وہ کس طرح کرسکتے تھے۔ اتنے عرصے میں انہیں کورا کے ثبات کا اندازہ خوب ہوگیا ہوگا۔ انہیں تو میرے لیے اس کی امید اور فزوں کرتے رہنا چاہیے کہ تارِ نفس پر آنچ نہ آئے۔ انہیں احساس ہوگا کہ اس کے سامنے میرے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات کرنے کے نتائج کیا ہوسکتے ہیں۔ ہر شخص کے ضبط کا ایک پیمانہ ہوتا ہے۔ نواب کے کامیاب ہوجانے پر بھی انہیں کورا کی آزمائش کرنے کی جرات نہ ہوتی۔ انہیں تو اس وقت کا انتظار ہوگا۔ جب کورا خود ہی اپنے خوابوں کی ناسپاسی سے مایوس ہونے لگے۔ زندگی ترغیب و تحریص سے عبارت ہے۔ رنگ کا جادو' روشنی کا جادو۔ زندگی طرح طرح کے جادو کرتی ہے اور بڑے بڑے گوشہ گیروں کو ناتواں کردیتی ہے۔ وہ دن چاہے کبھی نہ آئے مگر مولوی صاحب کو اسی دن کا انتظار ہوگا۔ نواب نے مجھے خط لکھ کے حیدر آباد طلب کرنے اور اپنے عزم کے بارے میں مولوی صاحب کو لازماً بے خبر رکھا ہوگا۔ امکان یہی ہے اس نے ساری خطاکاری خود تک محدود رکھی تھی۔ مولوی صاحب کی نظروں میں اس ہوش مند کو اپنی قدر و منزلت' اپنی عالی نسبی کا بھرم بہرصورت قائم رکھنا چاہیے تھا۔

ڈرائیور یہی کچھ کہہ رہا تھا۔ مجن میاں کے باغ میں پیش آنے والا ماجرا سن کے مولوی صاحب دم بہ خود رہ گئے تھے۔ ڈرائیور غلط نہیں کہہ رہا ہوگا۔ پھر مولوی صاحب کو نواب کی عیادت کے لیے ڈاکٹر ناصر مرزا کے ہاں جانے میں وقت بالکل ضائع نہیں کرنا چاہیے تھا۔ انہوں نے ڈرائیور سے معلوم کرلیا تھا کہ نواب کے مہمان' ہم دو اجنبی اس وقت کہاں ہیں؟ ادھر انہیں کسی دم میری آمد کا دھڑکا لگا ہوگا' ادھر باغ کے عبرت ساماں واقعے میں کسی طور ان کے ملوث ہوجانے کے دور دراز خدشے نے انہیں بے چین کردیا ہوگا۔ انہیں تو پھر بہت دور' ریاست کی حدود سے بہت دور چلا جانا چاہیے۔

جانے کتنی دیر مجھے گرد و پیش کی خبر ہی نہیں رہی۔ کہتے ہیں زندگی بھر آدمی دل اور دماغ کی آویزشوں کا نشانہ بنا رہتا ہے۔ دل کچھ کہتا ہے' دماغ کچھ۔ کاش آدمی کا دل ہی ہوا کرتا یا پھر دماغ۔ لوگ کہتے ہیں' دماغ جب ساتھ نہ دیتا ہو تو دل پر تکیہ کرنا چاہیے اور جب دل اضطراب آمادہ ہو تو دماغ کا کہا ماننا چاہیے لیکن جب دونوں ہی بے اختیار ہوں تو آدمی کیا کرے' کس سے سوال کرے اور جواب چاہے؟

جمرو نے مجھے کہنی ماری تو میں ہڑبڑا گیا۔ میں تو جیسے وہا موجود ہی نہ تھا۔ مجھ پر ایک ثانیے کی ندامت طاری ہوئی او میں نے پٹپٹاتی پلکوں سے دیکھا کہ لرزہ براندام ڈرائیو بٹھل کے سامنے سر جھکائے کھڑا ہے۔ بٹھل بھی کسی فکا میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے سوچا' اب فکر کرنے کو کیا رہ گ ہے۔ یکایک بٹھل نے تیز و تند لہجے میں پوچھا "بڑا نواب کدھری ہے۔"

"کون' حضور نواب فہمید علی؟" ڈرائیور ہکلاتے ہو بولا۔

"ہاں ہاں' وہی رے۔"

"سرکار ادھری ہیں اور جاگ رہے ہیں۔ کیا بولوا حضور' گھر میں تو ایک قیامت مچی ہے۔" ڈرائیور کی آوا بھرا گئی "امی حضور کی حالت تو بہت نازک ہے۔ چھوٹی سرکا بھی سکتے میں ہیں۔ شام سے لوگاں کی قطار بندھی ہے۔ طر طرح کی یا تاں بولتے ہیں۔"

بٹھل نے کچھ نہیں کہا اور سر اٹھا کے جمرو کو سامنے طرف اشارہ کیا۔ موڑ سے گزر کے انہوں نے نواب ثرو کی گلی میں اس کے مکان کی جانب بڑھنا شروع کردیا شامیانہ تقریباً نصب کیا جاچکا تھا اور کل صبح نواب ثروت تدفین کے انتظامات میں مصروف لوگ کرسیاں سیدھ کررہے تھے۔ ہم نے جلد ہی درمیانی فاصلہ طے کرلیا ڈرائیور کے ساتھ ہم چاروں کے پیدل جتھے کو دیکھ کے لوگ حیران ہوئے لیکن کسی نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ نواب گھر جانے کی وجہ میری سمجھ سے باہر تھی۔ اب کیا نواب فہ علی کی باری تھی؟ اسے کھکھوڑنے' جھنجوڑنے کی باری تھ بٹھل کو علم میں کسی اضافے کی توقع ہوگی۔ میری منتش نظریں زدرا اور جمرو پر منڈلائیں مگر شاید انہیں کچھ جا بوجھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ بے خبری بھی صحت کے ا مفید ہوتی ہے۔ بہت سے آزار سے بچائے رکھتی ہے دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر بٹھل ٹھہر گیا اور اس زیر لبی سے ڈرائیور کو کوئی ہدایت کی۔ ڈرائیور پہلے تو ہچکچا کئی بار اس نے پہلو بدلے' پھر دروازے میں داخل ہوگیا۔

ہمیں دروازے کے قریب کھڑے ہوئے تین چار منٹ سے زیادہ نہیں ہوئے ہوں گے کہ ڈرائیور نمودار ہوا۔ ا نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اس کے عقب جامنی رنگ کی شال شانوں پر ڈالے نواب فہمید علی بہ عجلہ باہر آگیا "آپ!" وہ حیرت آمیز شائستگی سے بولا "آپ با کیوں کھڑے ہیں' اندر آئیے' آئیے نا۔"

"نہیں صاحب!" بٹھل نے آہستگی سے کہا "اپنے کو زیادہ ٹائم نہیں لینا۔"

"ہمیں شبہ تھا کہ شاید آپ سے ملاقات نہ ہوسکے۔"

"ادھری ڈاکٹر صاحب کے پاس ہم دیری سے پہنچے۔" بٹھل نے تپیدہ لہجے میں کہا "آپ نکل چکے تھے۔"

"وہاں ٹھہرنے کو رہ بھی کیا گیا تھا" نواب کی آواز بکھرنے لگی۔

بٹھل نے گہری سانس لی اور توقف کے بعد بولا۔

"اپنے کو یہی ٹائم ملا' صبح ادھر آنا ہو کہ نہ ہو' سوچا کہ۔۔۔"

"مگر آپ اندر تو تشریف لائیے" نواب کی زبان اٹک رہی تھی۔ اس نے ہیجانی انداز میں ادھر ادھر دیکھا۔ اس کی ایک نظر قریب کھڑے ہوئے ہدایت علی کے لیے کاری ہوئی' وہ اپنی جگہ سے ہٹ کے دور چلا گیا "آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ گو یہ کوئی موقع تو نہیں ہے تاہم مناسب ہو تو کچھ دیر کے لیے اندر آنے کی زحمت کیجیے۔ خلوت بھی ممکن ہے" نواب کے اصرار میں عاجزی بھی تھی' کرب بھی شامل تھا۔

"بس صاحب! پھر آئیں گے کبھی ادھری۔ ریاست میں دوبارہ آنا ہوا تو ضرور۔۔۔" بٹھل نے بے ربطی سے کہا "اور کیا بول سکتے ہیں' لگتا تو ایسا نہیں ہے۔"

نواب کی پیشانی پر سلوٹوں کا جال پھیل گیا۔ اس کے نتھنے دھڑک رہے تھے "کیا ہوگیا یہ سب۔۔۔!" وہ فریاد کناں لہجے میں بولا "ایسا بھی کہیں ہوتا ہے؟"

"اس سے بھی اوپر ہوتا ہے" بٹھل نے زہرخند سے کہا "دوسرا پل پرایا ہوتا ہے صاحب! جھپکنے کا ٹائم بھی نہیں دیتا۔ سامنے کا سارا اوپر نیچے کردیتا ہے۔"

"کہتے ہیں' بس بہانے ہوتے ہیں' دن تو ایک ہی معین ہے' مقرر ہے۔ ہم سے لوگ کہتے ہیں' وہ اتنی ہی زندگی لے کر آیا تھا۔ آپ ہی بتائیں" نواب گرفتہ آواز میں بولا "یہ' یہ اس کے جانے کے دن تھے۔"

"جانے کو تو صاحب' ہر پل جانے کا ہوتا ہے۔ ٹل جائے تو اور بات ہے" بٹھل نے تنک کے کہا "تخم کے ساتھ موت کا پھیرا شروع ہوجاتا ہے۔ کبھی کسی مستانے سے سنا تھا صاحب! بولتا تھا' جب تک میں ہوں' موت نہیں ہے' جب سالی موت آئے گی تو میں نہیں ہوں گا۔ تھوڑی سی بات ہے۔ ایک چیز ایک بار ہی کو رہ سکتی ہے۔ زورا زوری تخم ٹھہرتے ہی شروع ہوجاتی ہے۔ اور بازی سدا بھاری پنجے کی ہوتی ہے۔ سب مٹی کا کھیل ہے۔ نواب صاحب! اپنے پلے تو یہی پڑتا ہے۔ مٹی کھلونے بناتی اور تھوڑی نوٹنکی کے بعد برابر کردیتی ہے۔"

نواب کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ وہ سنتا رہا اور دل دوز لہجے میں بولا "آپ درست فرماتے ہیں لیکن ہم کہاں جائیں' کسے اپنا سینہ کھول کے دکھائیں۔ کس سے اپنا حال بیان کریں۔ خدا نے ہمیں کس آزمائش سے دوچار کیا ہے۔ ثروت کیسے چپکے سے چلے گئے۔ سبھی کو حیران کرگئے۔ ہم آپ کو کیا بتائیں' وہ ہمیں کتنے عزیز تھے۔ خالہ زاد تو کہنے کی بات ہے۔ ہم تو انہیں اپنا سگا ہی سمجھتے تھے۔ ہمیں ان پر بہت ناز تھا۔ ذہین' طباع' ہر لحاظ سے مکمل۔ لوگ تو ان کی مثال دیتے تھے۔ ہمارا بھائی کیسا بے بدل' بے مثل تھا۔ یہ ہم سے نہیں' غیروں سے پوچھیے۔" نواب فہمید کی آواز رندھنے لگی۔

"آدمی دوسروں ہی کے لیے مرتا ہے" بٹھل نے سرد لہجے میں کہا "اپنا تو اس کو پتا بھی نہیں ہوتا۔"

نواب اضطراری انداز میں سر جھٹکنے لگا "مگر یہ تو' یہ تو خودکشی ہے جناب! یہ تو سراسر اپنے آپ سے دشمنی تھی۔ ثروت ایسے تو نہیں تھے۔"

"ہاں صاحب! پر سارے وقت تو آدمی ایک جیسا نہیں ہوتا" بٹھل کے لہجے میں ترشی کی آمیزش تھی "کبھی سے کوئی بھول ہوجاتی ہے۔ کبھی چھوٹی بھول کا بھگتان بڑا ہوتا ہے۔"

"ہم نہیں سمجھتے' یہ چھوٹی سی بھول تھی۔ یہ تو بہت بڑی' ہم اسے کیا نام دیں' نادانی' پاگل پن ہی اسے کہا جاسکتا ہے۔ ثروت میاں سے ہمیں اس کوتاہی' کج روی اور ہمیں کہنا چاہیے' بدنیتی' سفاکی کی توقع ہرگز نہیں تھی۔"

"جانے دیں صاحب! بیتا ہوا' منہ کا اگلا ہوا ہوتا ہے" بٹھل نے نرمی سے کہا "ہم نے پورا جتن کیا تھا ان کو روکنے کا۔ پر کیا بولیں' اپنے بس میں اس سے زیادہ نہیں تھا۔"

"ہمیں معلوم ہے" نواب نے بہ شدت تکرار کی "ہم آپ سے عرض کریں' ڈاکٹر ناصر مرزا نے ثروت میاں کی طرف سے آپ کو جو کچھ بتایا ہوگا' ہم نے بھی اسے سن لیا تھا۔ ثروت میاں کی حالت اچانک خراب ہوگئی تھی۔ وہ بری طرح آپ کو یاد کررہے تھے۔ آپ کو بہت تلاش کروایا لیکن آپ کہیں نہ مل سکے۔ انہیں معلوم ہوگیا تھا کہ ان کے پاس وقت کم ہے' ان کی سانسیں آپ کے انتظار میں رکی ہوئی تھیں۔ مجبوراً انہوں نے پھر ڈاکٹر ناصر مرزا کو اپنا امین بنایا۔ ان کی خواہش تھی کہ کمرے میں کوئی اور موجود نہ رہے لیکن ایسے وقت ہم وہاں سے نہیں ہٹ سکتے تھے۔ ہم وہیں نزدیک ہی پھٹکتے رہے اور ہم جو تصور نہیں کرسکتے تھے' وہ ہم نے اپنے

کانوں سے سنا' اپنے عزیز بھائی کی زبانی۔ کوئی اور کہتا تو ہمیں یقین نہ آتا۔ بہ خدا ہم اس کی زبان کھینچ لیتے۔" نواب کی سرخ آنکھوں میں چنگاریاں سی لپکتی تھیں کہ آنسوؤں میں ڈوب گئیں۔

بٹھل نے شانے پر تھپکی دی تو اس کا چہرہ اور دھندلا گیا۔ اسے زاروزبوں دیکھ کے میری رگیں بھی کھنچنے لگی تھیں۔ "ہمیں آپ سے شرمندگی ہے" اس نے رومال سے چہرہ خشک کیا اور نسبتاً تھمی ہوئی آواز میں بولا "ہمیں معاف کردیجیے۔ ہمارے دل میں بہت سی بدگمانیوں نے گھر کیا تھا۔ خدا نے ہمیں گناہ سے بچالیا۔ اس روز آپ سے ملاقات کے بعد ہم پر عجب کشمکش کا وقت گزرا ہے۔ آپ نے اعلیٰ ظرفی کی تھی' ایک بھائی کی نظر میں دوسرے بھائی کی پردہ پوشی کی اعلیٰ ظرفی۔ کچھ اسی وقت سے ہم ثروت میاں کے متعلق کھٹک گئے تھے۔ دوسری جانب اس کے حال سے ہمارا دل کلستا تھا اور آپ کے لیے کدورت پر اکساتا تھا۔ آپ نے کچھ واضح نہیں کیا تھا۔ سب کچھ ثروت میاں کے ٹھیک ہوجانے پر اٹھا رکھا تھا۔ سچ پوچھیے تو یہ سربستگی اور احتیاط کی تاکید ہمیں اور مضطرب کیے ہوئے تھی۔ ڈاکٹر ناصر کے گھر تفتیش احوال کے لیے دو مرتبہ پولیس کے کارندے آئے۔ ہمارے دل میں آیا کہ آپ کی طرف اشارہ کردیں' بعد میں جو ہوگا' دیکھا جائے گا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم سے کوئی لغزش نہیں ہوئی۔ آپ کے متعلق ہم نے انہیں مطمئن ہی کیا۔ ہم نہیں کہہ سکتے۔ آج اگر ڈاکٹر ناصر مرزا اور ثروت میاں کی گفتگو ہم نہ سن پاتے یا ڈاکٹر صاحب' اپنے دوست ثروت میاں کی ہدایت کے مطابق سب کچھ خود تک ہی محدود رکھتے تو ہم کیا فیصلہ کرتے؟ ثروت میاں کے سانحے کے بعد ہم کچھ بھی کرسکتے تھے" نواب فہمید نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھے اور آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کے بولا "اس نے ہم پر بہت کرم کیا۔ ہم اپنے بھائی کی طرف سے معذرت چاہتے ہیں۔ ہمیں احساس ہے کہ آپ کے حوصلے' استقامت اور ایثار کے آگے اس معذرت کی کیا حیثیت ہے لیکن آپ ہی فرمائیں' ہم اور کیا کہیں' ہم اور کیا کرسکتے ہیں۔ آپ کے تحمل اور تدبر نے ہمارے خاندان کو رسوائی سے محفوظ رکھا ہے ورنہ اپنے ثروت میاں نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ حیرت ہے' ان جیسے چار آنکھیں رکھنے والے شخص سے دوسرا رخ کیوں اوجھل رہا۔ صورت دیگر پر تو ذرا سی سوجھ بوجھ رکھنے والوں کی نظر ہوتی ہے۔ انہوں نے دوسرے پہلو کی شرم ناکی' اذیت ناکی پر غور کیوں نہیں کیا؟ وہ ایسے اندھے کیوں ہوگئے تھے؟ ان جیسا نرم خو' شائستہ مزاج آدمی ایسے قبیح اور رکیک فعل پر کس طرح آمادہ ہوگیا؟ اپنی ضعیف ماں کا' جوان بہن کا اور ہمارا خیال انہیں بالکل نہیں آیا۔ ہم سوچتے ہیں تو یقین کیجیے' دماغ پھٹنے لگتا ہے۔ ہمارا رواں رواں لرز جاتا ہے۔ ایسی سنگ دلی' یہ بے حسی تو ان میں کبھی نہ تھی۔ آدمی کے پاس ایک ضمیر بھی ہوتا ہے۔ وہ کامیاب ہوجاتے اور یہ معرکہ سر بھی کرلیتے تو کیا ان کا ضمیر انہیں قرار سے رہنے دیتا" نواب مچلتی تڑپتی آواز میں بولا "ہم آپ سے بہت نادم ہیں۔ ہمیں یہ گزارش کرنے کا بھی یارا نہیں کہ آپ' آپ ہوسکے تو ہمارے خودسر بھائی کو۔۔۔"

"نہیں صاحب! ابھی کچھ اور مت بولنا" بٹھل نے نواب فہمید کا ہاتھ تھام کر سینے سے لگالیا "آگے ابھی کچھ مت بولنا صاحب! اپنا حساب سامنے والوں سے رہتا ہے۔ جانے والوں کا اوپر والا ہی دیکھتا ہے۔"

"سچ ہے' کوئی شک نہیں" نواب فہمید کے ہونٹ پھڑپھڑانے لگے "ہمیں خیال آتا ہے کہ آخر میں ثروت میاں نے ازخود ڈاکٹر ناصر مرزا کے سامنے جو اعتراف گناہ کیا ہے' وہ آپ پہلے ہی جان سکتے تھے۔ اس کا کچھ اندازہ تو آپ کو نواب مجن میاں کے باغ ہی میں ہوگیا ہوگا۔ ثروت میاں کے مغلوب ہوجانے' بے دست و پا ہوجانے کے بعد مزید عقدہ کشائی کے کتنے موقع آپ کو ملے تھے۔ نواب مجن میاں کے باغ سے ڈاکٹر ناصر مرزا کے گھر تک ثروت میاں مستقل آپ کی دسترس میں تھے۔ یہ کیسا حسن سلوک ہے۔ باغ میں اپنے ستم گر کو اس کی حالت پر چھوڑ کے آپ اپنی راہ لے سکتے تھے۔ اپنے مجرم کو ڈاکٹر ناصر مرزا کے ہاں پہنچانے میں آپ نے جو' آپ نے جس۔۔۔" نواب کی آواز حلق میں پھنس گئی۔ اس کے سینے سے آہ بلند ہوئی اور اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔

"آگے نا ہی بولو صاحب!" بٹھل نے ناگواری سے کہا۔

"ہاں' اس ذکر کا اعادہ آپ کے لیے تکلیف دہ ہونا چاہیے" نواب یاسیت سے بولا پھر جیسے کسی نے اسے کچھ یاد دلایا اور وہ بے تاب ہوگیا "ہم اپنی خودغرضی میں یہ معلوم کرنا تو بھول ہی گئے' یہ تو فرمائیں' مولوی شفیق صاحب کی طرف بھی جناب کا جانا ہوا؟"

بٹھل نے اقرار میں سر کو جنبش دی۔

"گئے تھے آپ وہاں؟" نواب نے گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھا "تو' تو ملاقات ہوئی ان سے؟ خدارا' کم از کم اسی جانب سے ہمیں اطمینان دلائیے۔"

"وہ ادھری اب نہیں ہیں۔"

"جی!" نواب نے تذبذب سے کہا "کیا فرمارہے ہیں آپ؟ کہیں آپ کسی غلط پتے پر تو نہیں پہنچے؟"

"وہ ادھری سے نکل گئے ہیں۔"

"نکل گئے! مگر کہاں؟" بٹھل کی خاموشی پر وہ جیسے خود سے ہم کلام ہوا۔ "ہمیں یہی تعجب تھا کہ ثروت میاں کے ایسے رفیق' دم ساز اپنے مربی کی عیادت کے لیے ڈاکٹر صاحب کے گھر کیوں نہیں آئے' اور ہم نے سمجھا' ہوسکتا ہے انہیں ثروت میاں کے متعلق کوئی اطلاع ہی نہ ہوسکی ہو۔ پھر ہمیں جستجو ہوئی کہ اطلاع نہیں مل پائی تھی تو اتنے دنوں تک ثروت میاں کی جانب سے خاموشی کی صورت میں مولوی صاحب نے خود کوئی رابطہ کیوں نہیں کیا' اور یہ سوچ کے ہم چپ ہوگئے کہ ممکن ہے ثروت میاں نے انہیں اپنے گھر آنے سے اجتناب برتنے کی تلقین کی ہو۔ ظاہر ہے' اپنی منشا کی تکمیل تک وہ یہ سارا معاملہ پوشیدہ رکھنا چاہتے ہوں گے لیکن' لیکن آخر یہ مولوی صاحب کہاں چلے گئے؟"

بٹھل نے ڈرائیور ہدایت علی کا نام نہیں لیا اور نواب کو بتایا کہ کل کسی نے جاکے مولوی صاحب کو نواب ثروت کی شکستہ حالت کی خبر کردی تھی۔

"کس نے' کس نے؟" نواب نے ٹھٹک کے پوچھا "مگر پھر تو انہیں لازماً ڈاکٹر صاحب کے گھر۔۔۔" وہ ٹھہر گیا اور سانس لے کے بولا "اچ چھا۔۔۔ اچ۔۔ چھا۔ ہماری سمجھ میں آرہا ہے' ازراہ کرم آپ بھی کچھ وضاحت فرمائیں۔"

"اور کچھ نہیں ہے صاحب!"

"اس کے معنی یہ ہوئے کہ مولوی صاحب کو ثروت میاں کے ارادے سے۔۔۔" اس کی نظریں بٹھل کے چہرے پر مرکوز ہوگئیں اور وہ جھجکتے ہوئے بولا "ثروت میاں کا حال بتانے والے نے کہیں آپ کا تذکرہ تو ان سے نہیں کردیا؟"

بٹھل نے کچھ نہیں کہا۔

"کچھ سفر کی سمت' جگہ وغیرہ کے بارے میں بھی سن گن ملی؟ وہ گھر تو ثروت میاں نے انہیں لے کے دیا تھا۔ ملازم بھی یقیناً ہوں گے وہاں۔ ہماری مراد ہے' ملازمین نے کچھ نہیں بتایا؟"

"کچھ بول کے ہی چلے ہوں گے ان سے؟" بٹھل نے تلخی سے کہا۔

"کیا کہا انہوں نے؟"

"اس کو آپ مان لوگے صاحب!"

نواب کی آنکھیں جلنے بجھنے لگیں "یعنی آپ کہنا چاہتے ہیں' انہوں نے ملازمین سے۔۔۔" اسے اپنے لفظوں کی بے وقعتی کا احساس ہوا اور وہ چپ ہوگیا' پھر تیزی سے بولا "ممکن ہے وہ شہر ہی میں ہوں۔"

"کیا بولتے ہو صاحب!" بٹھل نے چنچناتی آواز میں کہا۔

نواب گم صم ہوگیا۔

"اب اجازت دو صاحب! اندر آپ کے مہمان بھی بیٹھے ہیں" بٹھل نے سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا۔

"ٹھہریے' براہ کرم کچھ دیر کے لیے ٹھہریے" نواب وحشت آمیز عاجزی سے بولا "آج ہی ہم نے ثروت میاں کی زبانی مولوی شفیق کا ذکر سنا تھا' اور ہم انہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ ہمارے اختیار میں ہوتا تو ہم آپ سے پہلے ان کے گھر پہنچنے کی کوشش کرتے لیکن ثروت میاں نے کوئی مہلت ہی نہ دی۔ ان کے سینے کا بوجھ ہی انہیں تھامے ہوئے' باندھے ہوئے تھا۔ یہ غبار چھٹتے ہی وہ بکھرنے لگے۔ ذرا بھی کسی کی پروا نہیں کی۔ ہم سے تو کچھ کہنے سننے کی انہیں کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ ان کے منہ پھیر لینے کے بعد' آپ اندازہ کرسکتے ہیں' ہمارا کیا حال رہا ہوگا۔ کئی بار خیال آیا' ثروت میاں کی خبر کرنے کے لیے کسی کو مولوی صاحب کے پاس بھیجیں۔ پتا تو ان کا ڈاکٹر ناصر مرزا سے معلوم ہو ہی گیا تھا۔ ہم ارادہ کرتے رہ گئے۔ ادھر یہ گمان بھی غالب تھا کہ جیسے ہی ڈاکٹر صاحب سے آپ کی ملاقات ہوگی' آپ سیدھے مولوی صاحب کے گھر کا رخ کریں گے اور اس طرح انہیں اطلاع ہو ہی جائے گی۔ گویا' کیا یہ نتیجہ اخذ کیا جائے" نواب کا جسم اکڑ سا گیا "کہ مولوی صاحب نے ثروت میاں کو اس اہم کام' اس فریضے کی ادائی کے لیے آمادہ کیا تھا اور ناکامی کا علم ہوجانے کے بعد انہوں نے روپوش ہوجانے میں عافیت جانی؟"

"یہ تو وہی ٹھیک سے بول سکتے ہیں" بٹھل کے لہجے میں تندی و بے زاری نمایاں تھی۔

لمحے گزر گئے۔ سب جیسے ایک دوسرے کے وجود سے بے خبر ہوگئے تھے "ابھی' ابھی کچھ قیام رہے گا جناب کا؟" نواب کی چرمراتی' ہچکچاتی آواز نے یہ سکوت توڑا۔

"اب کیا ہے صاحب!"

"ہاں' اب کیا" نواب نے حسرت سے کہا "اب کیا رہ گیا ہے' ہم تو سمجھ رہے تھے' کہیں ہم سے ملے بغیر نہ رخصت ہوجائیں۔ آپ تشریف نہ لاتے تو ہمیں بہت خلش رہتی۔"

"اپنے کو بھی ہوتی' ایسا کیسے صاحب' اپنے کو ضرور آنا تھا۔"

"خدا نے آپ کو کس کس طرح نوازا ہے۔ خسروی پھر

اور کیا ہے" نواب نے بے ساختہ کہا "ہم آپ کے بہت ممنون ہیں۔ بڑی نوازش ہے کہ آپ نے یہاں آنے کی زحمت کی۔ خصوصاً اس وقت تو۔"

"آپ سے بولانا' یہی ٹائم ملا اپنے کو' اور ٹھیک بھی یہی تھا شاید۔"

"جی' جی بے شک' ابھی تو کچھ نہیں' صبح یہاں تجہیز و تکفین کے وقت جانے کتنا ہجوم ہو۔ نہ ہم آپ سے کوئی بات کرسکتے تھے' نہ غالباً آپ کے لیے مناسب تھا۔ کسی کو ذرا سی بھنک مل جاتی کہ آپ دونوں حضرات ہی ثروت میاں کے ہم راہ تھے' آپ ہی عینی شاہد ہیں تو آپ سمجھ سکتے ہیں' بلکہ آپ اجازت دیں تو ہم کچھ عرض کریں؟"

"معلوم ہے صاحب! آپ کیا بولیں گے' ہم پہلی گاڑی سے نکل جائیں گے۔"

نواب پر حیرت طاری ہوئی "ہم' ہم یہی گزارش کرنا چاہتے تھے۔ ابھی رات نو بجے کے قریب دو پولیس افسر پوری نفری سمیت یہاں وارد ہوئے تھے' اور باتوں کے علاوہ وہ آپ کے بارے میں بھی پوچھتے تھے۔ ہم نے جہاں تک ہوسکا ان کی توجہ ہٹانے کی کوشش کی۔ آپ کے لیے اپنے سپاس کا اظہار ہی کیا لیکن ثروت میاں کی زندگی تک بات مختلف تھی۔ یوں کہئے کہ ہم نے انہیں روکے رکھا تھا۔ اب ہمارے بس میں کچھ نہیں ہے۔ پولیس کی زبانی علم ہوا کہ دربار تک خبر پہنچ گئی ہے اور سارا عملہ حرکت میں آگیا ہے۔ پولیس کا ہمیں کوئی تجربہ نہیں ہے۔ سنتے ہیں' انہیں بحث و تکرار' بال کی کھال نکالنے کا شوق ہوتا ہے۔ کچھ بھی ان کے دماغ میں سما سکتا ہے اور ہم سچ کہیں' ہمارے لیے اسی میں بہتری ہے کہ معاملہ حد سے تجاوز نہ کرسکے۔ ثروت میاں جو تاثر دینا چاہتے تھے' وہی قائم رہے۔ ورنہ طرح طرح کی داستانیں عام ہوسکتی ہیں۔"

نواب کے چہرے پر دھواں سا چھایا ہوا تھا' کہنے لگا "ہماری خواہش تھی کہ جناب غریب خانے پر قیام فرما ہوں' کچھ ہمیں بھی جناب کی میزبانی کا شرف حاصل ہو لیکن اس موقع پر ہم کیا کہیں' کیا نہ کہیں۔ ہمیں تو آنے والے دنوں کی فکر کھائے جاتی ہے۔ کس کس کو سنبھال پائیں گے۔ اس زرنگار محلے کی ویرانی ہم سے کس طرح دور ہوسکے گی۔ کیا ہوگیا یہ سب۔۔۔ کیوں' آخر کیوں' ہم نے تو خدا بہتر جانتا ہے' کبھی کسی کا برا نہیں چاہا ہے۔ یہ کس بات کی سزا ملی ہے ہمیں۔ ثروت میاں تو سبھی کو اجاڑ گئے۔ کیا تماشا ہے یہ۔۔۔"

نواب فہمید آہیں بھرنے لگا۔ اس کی آواز کپکپا رہی تھی اور گریئے جیسی کیفیت ہوگئی تھی۔

"نہیں نواب صاحب' جدھری دیکھو' ایسا ہی ہوتا ہے۔ آگے پیچھے' کوئی نیا نہیں ہے آپ کے ساتھ"۔ بٹھل سے کچھ کہا نہ جاسکا۔ اس نے نواب کے دونوں بازو پکڑ لیے۔

نواب بے تحاشا اس کے سینے سے لپٹ گیا اور جانے کیسا طوفان چھپا رکھا تھا اس نے' وہ بچوں کی طرح سسکنے' ہڑکنے لگا۔ بٹھل نے اسے بازوؤں میں بھینچ لیا۔

جمرو اور زورا نے میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں بھی بھری ہوئی تھیں۔ میرا دل تو پہلے ہی اُمڈ رہا تھا اور وہاں سے بھاگ جانے کو کرتا تھا۔ ہم تینوں سر جھکائے کھڑے رہے۔

نواب کا یہ حال دیکھ کے ڈرائیور ہدایت علی بھی لپکتا ہوا قریب آگیا لیکن ایک فاصلے پر آکے ٹھٹک گیا۔

ایک عرصہ دل ریزی و جاں سوزی کے بعد بٹھل نے اپنے بازو وا کیے تو نواب کو کچھ ہوش آیا۔ اس کی سانسیں اکھڑی ہوئی تھیں۔ بٹھل اس کی کمر پر ہاتھ رکھ کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ دروازے میں داخل نہیں ہوا اور نواب کو وہاں چھوڑ کر پلٹ پڑا۔ نواب ہماری نظروں سے اوجھل ہوگیا تھا کہ دوسرے لمحے پھر دروازے پر نمودار ہوا "جب بھی حیدر آباد آنا ہو تو ہمیں عزت ضرور دیجئے گا۔" اس نے ٹوٹی پھوٹی آواز میں کہا۔

"ضرور صاحب۔" بٹھل نے سادگی سے کہا "کبھی ادھری آنا ہوا تو ضرور آئیں گے۔"

"اب کیا آنا ہوگا جناب کا۔" نواب کا لہجہ خود ہی یقین سے عاری تھا۔

"دیکھو صاحب! کیا بول سکتے ہیں۔"

"اس طرف سے یک سوئی ہوجانے پر ہم خود حاضر ہوں گے جناب کی خدمت میں۔ بمبئی ہمارے لیے ویسے بھی اجنبی نہیں ہے۔ ہوسکے تو دولت کدے کا پتا عنایت کردیجئے۔"

"اپنا کیا ٹھور ٹھکانا صاحب' ادھری ماہم کے علاقے میں پیرو دادا کے پاڑے پر کسی سے نام لو تو بول دے گا۔" بٹھل نے بہ عجلت اسے سلام کیا اور پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

نواب ثروت کے گھر سے ہم ابھی دور نہیں ہوئے تھے کہ کسی کے بھاگنے کی آہٹوں پر ہمیں ٹھہر جانا پڑا۔ ہدایت علی ڈرائیور دوڑتا ہوا آرہا تھا۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا "سرکار فرماتے ہیں' جناب موٹر میں واپس جائیں۔"

"نہیں رے۔" بٹھل نے سر جھٹک کے بولا "سواری ہے اپنے پاس۔"

ہدایت علی نے بٹھل کا انکار تکلف پر محمول کیا۔ بٹھل

نے مزید اصرار کا موقع نہیں دیا اور ساتھ لیے ہوئے آگے قدم اور بڑھ آیا۔ جلد ہی گلی کا موڑ آگیا۔

"اچھا ہوا تو خود ہی ادھری آگیا۔" بٹھل نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور جیب ٹٹول کر معلوم نہیں کتنے نوٹ نکال کر ڈرائیور کے ہاتھ میں تھما دیے۔

ہدایت علی اس طرح اچھل پڑا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ "نہیں سرکار' نہیں سرکار۔" ہدایت علی نے تمام تر عاجزی سے انکار کیا لیکن بٹھل کی گرجتی آواز پر اسے چپ ہوجانا پڑا۔ اس کے جسم پر رعشہ سا طاری تھا۔ بٹھل نے واپس ہوجانے کی ہدایت کی تو جیسے ہدایت علی نے سنا ہی نہیں۔ بٹھل کے اشارے پر ہم آگے چلے آئے۔ ہدایت علی بت بنا ہمیں وہاں سے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

کوچوان نے سچ کہا تھا کہ وہ صبح تک انتظار کرتا رہے گا۔ بڑی سڑک پر گھوڑا گاڑی موجود تھی اور کوچوان جاگ رہا تھا۔ جس گلی سے ہم باہر نکلے تھے' اس کی نظریں اسی طرف لگی ہوئی تھیں۔

سارا شہر سویا ہوا تھا۔ دور دور تک سڑکیں سنسان پڑی تھیں۔ کتوں کا شور رات کا سناٹا اور فزوں کردیتا ہے۔ نام پلی اسٹیشن کے آمنے سامنے چائے اور پان کے کئی دکانیں ابھی تک کھلی تھیں۔ عابد شاپ روڈ تک پہنچتے پہنچتے بارش ہونے لگی مگر اتنی تیز نہیں تھی جتنے بادل گڑگڑا رہے تھے۔ گھوڑا اور کوچوان دونوں شرابور ہوگئے۔ گاڑی کی رفتار میں بھی کمی آگئی تھی۔ بٹھل نے ہوٹل سے نزدیک و دور کے بجائے ہوٹل کے عین سامنے گھوڑا گاڑی رکوائی۔ اب شاید کسی احتیاط کی حاجت نہیں رہی تھی۔ بہرحال اس طرح ہم مزید بھیگنے سے بھی محفوظ رہے۔

کوچوان کو صبح سویرے حیدر آباد کے مختلف اسٹیشنوں سے جانے والی گاڑیوں کے اوقات ازبر تھے۔ بٹھل کے استفسار پر اس نے اپنا آموختہ فرفر سنادیا۔ سامنے ہوٹل کا دربان دروازہ کھولنے کے لیے مستعد کھڑا تھا۔ ہم چاروں اندر داخل ہوگئے۔ استقبالی کمرا پوری طرح روشن تھا' فانوس بھی جل رہا تھا لیکن ساری کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ دربان کی کھنکار سے کاؤنٹر پر اونگھتا ہوا شخص چونک پڑا۔ اسی دم کہیں سے' کسی کھوہ میں چھپا ہوا ایک اور ایک آدمی بھی کاؤنٹر پر آگیا۔ دونوں نے یک زبان ہوکے مودبانہ انداز سے انگریزی میں شب بہ خیر کہا تھا کہ ان کی نظر گھڑی پر گئی۔ اپنی دانست میں اس کی کوتاہی پر انہوں نے معذرت چاہی اور مسکراتے ہوئے فوراً ترمیم کی۔ یہ بدحواسی بے جواز تھی لیکن ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے مسافروں کے لیے سرگرمی اور تپاک کا مظہر تھی۔ ان آداب کی انہیں باقاعدہ مشق کرائی جاتی ہوگی۔

"اپنی پرچی کاٹو۔" بٹھل نے کسی قدر بلند آواز سے کہا اور کاؤنٹر کے سامنے تھم سے لگی ہوئی آرام کرسی پر پھیل گیا۔

دونوں آدمیوں کو سمجھنے میں دیر لگی کہ پرچی سے مراد حساب کتاب ہے۔ جمرو اور زورا کو بٹھل نے کوئی اشارہ نہیں کیا ہوگا کہ وہاں ٹھہرنے کے بجائے وہ اوپری منزل جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔ میں نے بھی اسی طرف کا رخ کیا لیکن بٹھل نے روک دیا اور مجھے وہیں بٹھل کے قریب کی کرسی پر بیٹھ جانا پڑا۔ کرسی پر کمر سیدھی کرتے ہی سارا جسم بکھرنے سا لگا۔ بٹھل کا ارادہ صاف ظاہر تھا۔ ابھی اور نہ جانے کتنی دور اور کب تک اسی طرح وقت گزارنا تھا۔ بٹھل نے آنکھیں موند لی تھیں۔ میں نے کوشش کی تو جی اور گھبرانے لگا۔ مجھ سے تو اب اٹھا بھی نہیں جا رہا تھا اور اٹھ کے جاتا بھی کہاں؟ باہر بارش ہو رہی تھی۔ اوپر کمرے میں جمرو اور زورا سامان سمیٹ رہے ہوں گے۔ سامان ہی کتنا تھا۔ بستر کے گدوں میں چھپے ہوئے تھیلے نکالنے میں انہیں کچھ دیر لگنی چاہیے تھی۔ ابھی کاؤنٹر والوں نے بل تیار نہیں کیا تھا کہ وہ دونوں نیچے آگئے۔ ان کے پیچھے سامان اٹھائے ہوئے ایک خدمت گار بھی تھا۔ جمرو اور زورا اس کے ساتھ باہر چلے گئے۔

طشتری میں روپے رکھ کے بٹھل اٹھا ہی چاہتا تھا کہ باہر سے کئی موٹروں کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ دربان کے دروازہ کھولنے پر شیروانی میں ملبوس ایک پختہ کار نوجوان تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اس کے عقب میں دو نسبتاً ادھیڑ آدمی اور بھی تھے۔ دونوں صحت مند اور چاق و چوبند تھے۔ طشتری ہاتھ میں لیے بٹھل کے پاس کھڑا کاؤنٹر کا آدمی روپے گننا اور شکریہ ادا کرنا بھی بھول گیا اور سپاہیوں کی طرح سیدھا ہوگیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا کہ بھاری جسم کا ایک پستہ قد فرنگی مسکراتا ہوا اندر آیا۔ اس کا چہرہ انگارا ہو رہا تھا۔ آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ یہ عہدہ و نصب سے زیادہ کسی اور چیز کا نشہ معلوم ہوتا تھا۔ لمحے بھر بعد شیروانی کی شکنیں درست کرتا ہوا جو شخص دروازے سے برآمد ہوا' اسے دیکھ کر میرے دیدے پھٹے رہ گئے۔ میں نے متوحش نظروں سے بٹھل کو دیکھا۔ وہ شاید مجھ سے پہلے مہاراجا دھرم دیر کو پہچان چکا تھا۔ وہی دھرم دیر جو نواب حشمت کے پاس ابا جان کا نادر ہیرا دیکھ کر بے قرار ہوگیا تھا۔ اسے ہیروں سے خاص واقفیت تھی۔ ابا جان نے

کوئی بہت نادر ہیرا نواب حشمت کو پیش کیا تھا۔ ابا جان کو اس کی قدر و قیمت کا اتنا احساس بھی نہیں ہوگا لیکن راجا دھرم ویر ہیروں کے سلسلے میں وسیع معلومات رکھتا تھا۔ وہ ان کی تاریخ سے بھی واقف تھا۔ ہیروں کی ٹوہ میں وہ ابا جان کی نو خرید حویلی میں آ کے طرح طرح کی منتیں کرتا رہا تھا۔ ہماری خاموشی پر وہ بہت مایوس واپس ہوا تھا۔ مایوسی کا تو اس نے اظہار کیا تھا' ہماری تاویلوں سے وہ قطعاً مطمئن نہیں تھا۔ کوئی بعید نہیں کہ حویلی میں جس رات مسلح آدمیوں نے ہمیں نرغے میں لے لیا تھا' وہ اسی کے فرستادہ ہوں۔ وہ پتھروں کا ایسا ہی دیوانہ معلوم ہوتا تھا۔

بٹھل کرسی سے نہیں اٹھا۔ میں بھی منجمد بیٹھا رہا۔ فرنگی اور دھرم ویر زور زور سے باتیں کرتے اور قہقہے لگاتے ہوئے استقبالی کمرے میں آئے تھے۔ وہ انگریزی میں باتیں کر رہے تھے اور اندازہ ہوتا تھا کہ رقص و سرور کی کسی محفل سے اٹھ کے آئے ہیں۔ دھرم ویر ہمارے سامنے سے گزرتا ہوا' اپنی دھن میں مست کاؤنٹر سے راہ داری کی طرف بڑھ گیا۔ چہرے سے بھی وہ کچھ دھوندو لگ رہا تھا۔ شراب پی کے آدمی کا چہرہ ایسے ہی سوج جاتا ہے۔ ہم سے چند قدم آگے چلے جانے پر اسے خیال آیا اور معاً اس نے پلٹ کے دیکھا۔ وہ سٹ پٹا گیا تھا لیکن ایک تو کچھ آگے چلے جانے کی وجہ سے ہم پر اس کی نگاہ چھچلتی ہوئی ہی پڑ سکتی تھی' دوسرے اسے اپنے معزز و محترم مہمان کا ادب ملحوظ ہوگا۔ وہ گورے کے ساتھ ہی بڑھتا رہا۔ جیسے ہی وہ کچھ دور ہوئے' بٹھل کرسی سے اٹھ گیا اور سیدھے دروازے کا رخ کیا۔ موٹروں کی وجہ سے گھوڑا گاڑی کو اپنی جگہ سے ہٹ جانا پڑا تھا۔ ہم لپکتے قدموں سے بارش میں بھیگتے ہوئے گھوڑا گاڑی میں سوار ہو گئے۔

بظاہر دھرم ویر کی جلد واپسی کا امکان نہیں تھا۔ گورے سے عاجلانہ انداز میں رخصت نہیں لی جا سکتی تھی۔ کچھ گورے نے بھی ازراہ وضع روکنے کی کوشش کی ہوگی لیکن دھرم ویر نے مجھے اور بٹھل کو اچھی طرح پہچان لیا ہوگا۔ مہمان گورے کے پاس اس کا جی پھر بالکل نہیں لگنا چاہیے۔ وہ رسیاں تڑا رہا ہوگا۔ جس طرف کوچوان گھوڑا گاڑی ہنکانا چاہتا تھا' بٹھل نے اس کے مخالف رخ چلنے کا حکم دیا۔ خاصی دور جا کے ہم بائیں ہاتھ کی ایک سڑک سے مڑ گئے۔ کاچی گوڑ اسٹیشن پہنچتے پہنچتے پانچ بج چکے تھے۔ کوچوان نے گاڑی کا وقت بھی یہی بتایا تھا۔ راجا دھرم ویر نے اپنے مہمان سے جلد از جلد رخصت ہو کے تعاقب بھی کیا ہوگا تو اسے ہم سے پہلے کاچی گوڑا اسٹیشن پہنچ جانا چاہیے تھا۔ وہاں کوئی موٹر نہیں تھی۔ ممکن ہے تیز بارش نے اسے باز رکھا ہو یا ہمارے راستہ بدلنے کی تدبیر کارگر ہوئی ہو۔ گاڑی ابھی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ گھوڑا گاڑی چھوڑ کر کوچوان بھی ہمارے ساتھ پلیٹ فارم پر آ گیا۔ اس نے قلی کو آواز دی۔ ادھر سیٹی بجی' ادھر گاڑی نے رینگنا شروع کر دیا۔ بھاگتے بھاگتے ہم اول درجے کے پہلے ڈبے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ ڈبے کے دروازے پر پتلون اور قمیص میں ایک سن رسیدہ' اوسط قد کا شخص راستہ روکے کھڑا تھا۔ "یہ ریزرو ڈبا ہے۔" اس نے انگریزی میں کہا۔ قلی نے اس کی بات سنی ان سنی کر کے سامان اندر دھکیلا تو وہ ناراض ہونے لگا "یہ فرسٹ کلاس کا ڈبا ہے۔ اس بار اس نے ہندوستانی میں کہا۔"

"اپنے کو پتا ہے۔" زورا چڑ کر بولا۔

"زیادہ سے زیادہ رات کو یہاں دو مسافر سفر کر سکتے ہیں۔"

"اگلے اسٹیشن پر اتر جائیں گے صاحب!" یہ کہتے ہوئے بٹھل اوپر چڑھ گیا۔ وہ شخص دروازے سے نہیں ہٹا تھا کہ بٹھل نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کے اسے کچھ پیچھے کیا۔ "آپ کو تھوڑی تکلیف ہوگی۔ دوسرا ڈبا پکڑ لیتے' پر ادھری سالی گاڑی چل پڑی۔"

"گاڑی کا وقت ہوتا ہے۔" معمر آدمی نخوت سے بولا۔

"بارش سے الٹا ہو گیا صاحب! آپ دیکھ رہے ہو' آسمان آپے میں نہیں ہے۔" بٹھل نے دھیمی آواز میں کہا "آدھ گھنٹے میں کوئی اسٹیشن آ جائے گا۔"

"میں زنجیر کھینچتا ہوں۔ تم لوگ کو پھر جگہ مل جائے گی۔"

"ابھی آپ سے کیا بولا بابا' بولا کہ دوسرا اسٹیشن پر اتر جانے کا ہے۔" زورا سر پر ہاتھ رکھ کے بولا۔

وہ کوئی سخت گیر' کٹ حجت قسم کا شخص تھا۔ نواب تو نہیں معلوم ہوتا تھا' افسر ضرور ہو سکتا تھا۔ اس کی تیوریاں اور چڑھ گئیں۔ "ٹرین رک سکتی ہے۔ اتر کے تم لوگ دوسرا ڈبا تلاش کرو۔"

اس کے لہجے میں تحکم بھی تھا' تکبر بھی۔ اس نے زنجیر کھینچنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا کہ جمرو نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ٹھہر کے صاحب! ایسا کیسے' آپ ہندوستانی نہیں سمجھتے کیا؟"

"جمرو جیسے کوئی اچھوت ہو' بازو پکڑنے پر اس آدمی کو آگ سی لگ گئی۔ فرش پر اس نے کئی بار جوتے پٹخے اور جمرو سے اپنا بازو چھڑا کے جو منہ میں آیا' بکنے لگا۔

"اپنے کو بھی بول چال آتی ہے۔" جمرو نے ترخ کر کہا "اتنی گرمی آپ کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔"

"اوہ نان سینس' یہ بہت زیادہ ہے۔" وہ بھنچی ہوئی آواز میں بولا "تم لوگ نہیں جانتے' کس سے بات کر رہے ہو۔"

"آپ لاٹ صاحب ہیں' ایدر کا مائی باپ!" زورا نے ہاتھ جوڑ کر تلخی سے کہا "بس ابھی آرام سے رہو اور تھوڑا انسان کے ماف بات کرو۔"

"دیکھو' دیکھو زیادہ بات بالکل نہیں۔" اس شخص کی آواز بگڑنے لگی۔ دائیں ہاتھ کی انگلی اٹھا کر وہ تنبیہی اور تہدیدی انداز میں بولا "تم قانون کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔ یہ ڈبا ایک سرکاری افسر کے لیے مخصوص ہے' ایک پولیس افسر کے لیے' جو دلی شہر کا ڈی آئی جی ہے اور یہاں نظام سرکار کی درخواست پر پولیس کے محکمے کی درستی کے لیے آیا ہے اور وہ سرکاری افسر ہم ہیں۔ نام ٹھاکر بھیم سنگھ ہے۔ سنا تم نے اب یہاں سے فوراً نکل جاؤ۔ کوئی اور بات نہیں۔"

"کیسا بولتا ہے ابھی آپ۔" زورا پر اس تقریر کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ ہاتھ نچا کے بولا "ابھی ایدر سے چھلانگ لگا دے کیا! اور صاحب' ابھی پولیس کا تڑی ایک دم مت دیو' اپن بھی فرسٹ کلاس کا پسنجر ہے۔"

بارش تیز ہو جانے سے گاڑی کی رفتار سست ہو گئی تھی۔ ٹھاکر بھیم سنگھ بیماری کی حد تک ضدی شخص معلوم ہوتا تھا۔ ہمارا حال وہ دیکھ رہا تھا۔ اکھڑی ہوئی سانسوں' بھیگے ہوئے کپڑوں کے ساتھ ہم ڈبے میں داخل ہوئے تھے۔ بٹھل نشست پر اجنبی کی طرح بیٹھا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اسے زورا ہی کو کچھ تھمے رہنے کی تاکید کرنی چاہیے تھی۔ بات اور بڑھ سکتی تھی۔ ٹھاکر کے ساتھ پولیس کے دیگر آدمی بھی لازماً دوسرے ڈبوں میں ہوں گے۔ بہتر یہی تھا کہ اگلے اسٹیشن تک اسے کسی طرح قابو میں رکھا جائے ورنہ تو وہ آمادہ فساد تھا۔ منصب کا اسے کچھ زیادہ ہی نشہ معلوم ہوتا تھا۔ زورا کی تیز کلامی نے تیل چھڑکنے کا کام کیا۔ ٹھاکر کا منہ پھول گیا۔ وہ معنی خیز لہجے میں بولا "تم لوگ مجھے دوسرے قسم کے آدمی لگتے ہو' تم جیسوں سے نمٹنا ہم کو اچھی طرح آتا ہے۔"

"اپنی بھی عمر گزر گئی ہے۔" جمرو نے درشتی سے کہا "کیا کر لو گے آپ! اسٹیشن پر سولی چڑھا دینا۔"

"اس سے پہلے ہی انتظام کرتے ہیں۔ اسٹیشن تو دیر میں آئے گا۔"

"دیکھو صاحب' ابھی زیادہ تو تکائیں مت پڑو۔" جمرو نے اسے سمجھانے اور یقین دلانے کی کوشش کی کہ ہمارا ارادہ ڈبے پر قبضہ کرنے اور گھر لے جانے کا نہیں ہے۔"

"کیا بولا ہے تم سے۔" ٹھاکر بھیم سنگھ کی آواز میں نفرت بھری ہوئی تھی۔ "زیادہ بات بالکل نہیں۔ یہاں سے نکلنے کا کرو' ابھی اسی وقت!" ایک قدم آگے آ کے اس نے زنجیر کھینچنے کے لیے جھٹ ہاتھ بڑھایا۔ جمرو اسے نگاہ میں رکھے ہوئے تھا۔ زنجیر کھنچ جانے کے بعد کچھ بھی ممکن تھا۔ اس بارش میں اترنا اور دوسرا ڈبا تلاش کرنا آسان نہیں تھا۔ پہلے تو گارڈ اور ٹھاکر بھیم سنگھ کے سپاہیوں سے مڈبھیڑ لازم تھی۔ ہمارے پاس ٹکٹ بھی نہیں تھے۔ ٹھاکر کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ صرف یہی سلوک نہیں کرے گا کہ ہمیں ڈبے سے اتروا دے گا۔ ماتحتوں کو سامنے دیکھ کر ٹھاکر اور بھی پتھر ہو سکتا تھا مگر جمرو کے پاس بھی کیا چارہ تھا یہی کہ ٹھاکر کے بازو پر پنجہ ڈال کے اسے اس سنگ دلی سے روکے رکھے۔ جمرو نے یہی کیا۔ میں بھی یہی کرتا بلکہ میرے جی میں آتا تھا کہ اٹھا کر اسے باہر پھینک دوں پھر جو ہوگا' دیکھا جائے گا۔ جمرو کی دخل اندازی سے ٹھاکر کے جسم میں ہیجان برپا ہوا' وہ بری طرح گرجنے برسنے لگا۔ کسی کو بھی یہ توقع ہرگز نہ ہوگی کہ جانے کہاں سے چشم زدن میں وہ تمنچا نکال لے گا۔ "دور کھڑے ہو جاؤ۔" اس نے کچھ پیچھے ہٹ کے دہاڑتے ہوئے کہا "اپنی جگہ سے ایک دم بھی حرکت کی تو جان سے جاؤ گے۔"

برسوں سے بٹھل اور میں مسلسل سفر کر رہے تھے۔ کام ہی یہ رہ گیا تھا۔ سفر میں طرح طرح کے آدمیوں سے واسطہ پڑتا ہے مگر ایسا کبھی نہیں ہوا۔ ذرا سی بات پر کوئی اتنا پاگل بھی ہو سکتا ہے۔ آدمی شاید سب سے بڑا جانور ہے۔ کاش ہم ٹرین کے ابتدائی حصے ہی میں' تھرڈ کلاس' انٹر یا سیکنڈ کلاس کے کسی ڈبے میں جگہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ اس وقت تو ایسا ہوش بھی نہیں تھا۔ ٹرین چھوٹ جانے کی بدحواسی الگ تھی۔ کچھ قلی اور کوچوان نے بھی تیزی دکھائی۔ بار بار یہی کچھ ہوتا رہتا تھا۔ معلوم نہیں' ہم نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ یہ کیسی سزا تھی جس کا کوئی خاتمہ نہیں تھا۔ ہزار احتیاط کرو' لاکھ پھونک پھونک کر قدم رکھو' کوئی پتھر' کوئی مرکھنا' بیل اچانک سامنے آ جاتا تھا۔ اس کمینے راجا دھرم ویر کو بھی اسی وقت ہوٹل میں آنا رہ گیا تھا۔ اتنے دن کسی کی نظر نہیں پڑی۔ ہوٹل سے ہمارے نکلنے اور راجا دھرم ویر کی آمد منٹوں کی بات تھی۔ ذرا کچھ آگے پیچھے ہو جاتا تو ہم وقت سے پہلے ہی اسٹیشن پہنچ جاتے۔

جمرو وہیں کھڑا رہا بلکہ وہ زنجیر کے اور قریب ہوگیا۔ مجھے بٹھل پر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ اپنی نشست سے نہیں اٹھا۔ اس نے وہیں سے صدا لگائی "ہاں صاحب! چھٹی کرو حرام کے جنے کی۔ اپنے کو بھی گھوڑے پہ پڑا ملا تھا۔ اوپر نیچے کوئی بھی نہیں ہے اس کے بہت دن متالیا چھنال کا۔"

ٹھاکر کی آتش بار نظریں بٹھل پر جم گئیں۔

"ماں قسم' ایک دم فالتو ہے سالا چڑی مار' خلاصی کرو ہاں صاحب۔" زورا جلی ہوئی آواز میں بے ترتیبی سے بولا۔ ابھی ایک کا کیا صاحب' سبھی کا چھٹی کرو نئیں' دو گولی پھر بھی بچ جائے گا' ابھی سات والا ہے تو اکھا تین۔" زورا نے ٹھاکر کے ہاتھ میں دبے ہوئے تمنچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "سنا ہے' وردی والا کو سات خون معاف ہوتا ہے' ایسا؟"

پولیس افسر بھیم سنگھ کو کش مکش سے دوچار ہو جانا چاہ تھا۔ اس کی پیشانی کی شکنوں میں اضافہ ہوگیا۔ چہرہ بھی کھنچ گیا۔ اس نے تمنچے پر گرفت اور مضبوط کرلی ہے۔

"اپنے کو تو کھلونا لگے ہے استاد!" یہ صاف جھوٹ تھا۔ جمرو کو اس ہرزہ سرائی کی ضرورت نہیں تھی۔

بٹھل کے بجائے زورا نے استہزائی انداز میں کہا "نئیں بھڑو۔ ابھی پولیس افسر لوگ ہے۔"

ٹھاکر بھیم سنگھ نے سامنے کی دیوار پر بے دریغ گولی چلادی۔ بارش اور ٹرین کے شور میں گولی کی گونج ڈبے تک محدود رہی ہوگی۔

"زنجیر کھینچ۔" ٹھاکر قہر زدہ آواز میں بولا۔ اس بار اس نے جمرو ہی کو حکم دیا "ہم کہتے ہیں' زنجیر کھینچ ورنہ جان سے جائے گا۔"

"جان تو ادھار پر ہے صاحب! اپنا ہی بھلا ہوگا۔ مکتی مل جائے گی۔ چار دن ادھر ادھر کی بات ہے۔ پہلے جائیں گے تو دنیا اوندھیا نہیں جائے گی۔" جمرو کے لہجے میں ذرا بھی تردد نہیں تھا۔

زورا نے فوراً لقمہ دیا "اور جدر بھی آپ جیسا لوگ ہوئیں گا' ادر جی بھی کس حرامی کا لگے گا۔"

"لگتا ہے' صاحب بہادر کو ادھر سدا کے لیے نفیری بجانا ہے۔" جمرو نے زہریلے لہجے میں کہا۔

اب بہت ہوگیا تھا۔ کسی کو خیال ہی نہیں تھا کہ کوئی سرگشتہ لمحہ ٹھاکر پر حاوی آسکتا ہے۔ دوسری گولی جمرو پر چل سکتی ہے۔ میں نے طے کیا کہ میں ٹھاکر سے بات کروں اور انگریزی میں مناسب رہے گی۔ یہ انگریزی بھی اس قماش کے لوگوں کو زیادہ متاثر کرتی ہے۔ ڈبے میں داخل ہوتے وقت ہمارا حال بھی نہایت شکستہ تھا۔ سب کی وضع قطع ہی بدلی ہوئی تھی' بال چپکے ہوئے' پیروں سے پانی رستا ہوا' پائنچوں اور جوتوں میں کیچڑ بھری ہوئی۔ ہم نے ڈبے کا فرش گندہ کردیا تھا۔ آدمی کا تخمینہ کوئی نہیں لگتا۔ لباس اور لب و لہجہ کا وزن ہی کتنا ہوتا ہے۔ دستور کے مطابق ٹھاکر کو ہمارا تخمینہ لگانا چاہیے تھا اور ہر آدمی یوں بھی اپنی عقل سے دوسروں کو پرکھتا ہے یہ اور بات ہے کہ خود اپنے رتبے کے تعین میں عموماً لوگوں سے مبالغہ سرزد ہو جاتا ہے۔ ٹھاکر بھیم سنگھ ایسے لوگوں میں معلوم ہوتا تھا جو اپنی خوش گمانیوں کے طلسم کے اسیر ہیں' چار آنکھوں' چار ہاتھوں کا گمان' بینائی' ساعت کی بے کرانی کا فریب۔ زندگی میں سبز رنگ کا ایک عمل ہو تو خود فریبی لازمی ہے۔

اس وقت ٹھاکر ڈبے میں اکیلا تھا۔ اسٹیشن پر ماتحتوں کی موجودگی' اس کے زور واثر' اثر و رسوخ کا عالم دگر ہوگا۔ ہماری راہ میں کوئی بھی رکاوٹ ڈال سکتا ہے۔ بدتمیزی' فرسٹ کلاس کے مسافر کی حق غضبی ایک عالی مرتبت سرکاری افسر سے بدسلوکی؟ اس کے سوا بھی ٹھاکر کی زبان کون روک سکتا ہے۔ اس کا فرمایا ہوا مستند قرار پائے گا۔ ہم وضاحتیں کرتے رہ جائیں گے۔ سامان میں ہمارے پاس تمنچے بھی ہیں' چاقو بھی' کارتوس کا اچھا ذخیرہ موجود ہے۔ وہی ریاست' وہی پولیس ہے۔ نواب کے بہ قول' نواب ثروت کے ساتھ مجن میاں کے باغ تک سفر کرنے والے دو اجنبیوں سے ملنے کی ریاستی پولیس یوں بھی بہت مشتاق ہے پھر اس دوران میں دھرم ویر کے مانند کسی اور گم گشتہ راہ پر نواب راجا سے تصادم کا اتفاق بھی ہوسکتا ہے۔ حیدر آباد کے اڈے کے آدمیوں اور اڈے کے علاقے میں متعین ہمارے صورت آشنا پولیس والوں کی دسترس سے سکندر آباد بھی دور نہیں ہے۔ دونوں شہروں کا فاصلہ ہی کتنا ہے۔ تقریباً ایک ہی شہر ہیں۔ بیچ میں حسین ساگر عبور کرتے ہی ادھر سے حیدر آباد' ادھر سے سکندر آباد آجاتا ہے۔"

اس چپقلش سے نجات کی ایک اور صورت بھی تھی۔ ٹھاکر بھیم سنگھ اپنے گٹھے ہوئے جثے کے باوجود ایک ہاتھ کا بھی نہیں تھا۔ ایک ضرب دیر تک اسے خود سے بے گانہ رکھ سکتی تھی۔ اتنی دیر میں اسٹیشن آ ہی جاتا۔ اسے نشست پر لٹا کر اور پلیٹ فارم کی طرف کھلنے والا دروازہ بند کرکے ہم مخالف دروازے سے اتر سکتے تھے۔ اسٹیشن پر ٹھاکر کی خیر خبر لینے اس کے ماتحت آئیں گے تو دروازہ بند دیکھ کر لوٹ جائیں

گے کہ صاحب کے آرام میں مداخلت سوئے ادب ہے۔ یہ تبھی ممکن تھا کہ سکندر آباد اسٹیشن پر موجود گاڑی ہم ترک کردیں مگر بات تو وہی تھی۔ سکندر آباد اسٹیشن پر کون سا گوشہ اماں ہم ایسے بے کساں و بے چارگاں کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ اسی ٹرین کے کسی دوسرے ڈبے میں ٹھاکر کے ساتھ سفر کرتے رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایک رات اور تقریباً آدھے دن کے سفر کے بعد کہیں ریاست کی حدود ختم ہوتیں اور ضروری نہیں تھا کہ ٹھاکر کے کمرے کا بند دروازہ دیکھ کر اس کی خبر گیری کرنے والے سادہ لوح یوں ہی لوٹ جائیں۔ سکندر آباد پولیس کے بڑے بڑے افسر اس کی پذیرائی کو آسکتے ہیں۔ اسٹیشن پر ٹھاکر کی پہلے سے طے شدہ مصروفیات بھی ہوسکتی ہیں۔ ہوش میں آنے پر ٹھاکر جس اسٹیشن پر پولیس طلب کرکے ہمارے حلیوں کی تفصیل بیان کرے گا' یہاں سے وہاں تک ریاست کی پولیس حرکت میں آجائے گی۔ بس یہی ایک طریقہ تھا کہ ٹھاکر بالکل ہی خاموش کردیا جائے۔ اسٹیشن آنے پر مخالف دروازے سے اتر کر ہم مسافروں کے ہجوم میں گم ہوجائیں گے اور اسی گاڑی کے کسی دوسرے ڈبے میں اطمینان سے سفر کرسکیں گے۔ اس تصور سے مجھے جھرجھری آگئی۔

ٹھاکر سے بات کرنے کی ایک کوشش کرلینے میں کچھ نہیں جاتا تھا۔ مجھے گونگوں کی طرح کھڑا نہیں رہنا چاہیے تھا۔ میں مناسب لفظ جمع کررہا تھا کہ بٹھل کی آواز پر سب کچھ منتشر ہوگیا۔ وہ کسمساتا ہوا اپنی نشست سے اٹھا اور ٹھاکر کے مقابل جاکے ٹھہر گیا۔ "دیکھ لیا صاحب!" اس نے رسان سے کہا "پٹاخا اصلی ہے' آواز بھی کراری ہے۔ ولایتی لگتا ہے' پر ہم نے بہت دیکھے ہیں۔"

ٹھاکر کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ہونٹ بھینچ کے رہ گیا۔ اس کی آنکھیں بٹھل کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں اور سخت ذہنی انتشار سے دوچار نظر آتا تھا۔

"آپ بھی اپنے کو اصیل ہی دکھائی دیتے ہو۔" بٹھل کے لہجے میں تیزی نہیں تھی "بس صاحب' ابھی آرام سے بیٹھ جاؤ۔ اسٹیشن آنے والا ہے۔ آپ کو بول دیے ہیں۔ چلے جائیں گے۔ ادھری سے۔"

"وہ تو ہم کو معلوم ہے۔" ٹھاکر کی تلملاتی آواز جھرجھرا گئی "تم یہاں ٹھہر بھی نہیں سکتے لیکن آگے بھی کہاں جانا ہے۔ یہ ہم کو۔۔۔ تم کو۔۔۔"

بٹھل نے اس کی بات قطع کرکے آہستگی سے کہا "لگتا ہے کڑا ڈلوا کے ہم کو دم لوگے آپ! پھر کیا ہوگا صاحب!"

"تم نے کیا سمجھا ہے پھر جیل ہوسکتی ہے۔"

"کب سے پولیس میں آئے ہو صاحب؟"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" ٹھاکر پھنکارتی آواز میں بولا۔

"اپنے کو آپ نے زنخا' بھانڈ لوگ سمجھا ہے کیا؟" بٹھل نے تیکھے لہجے میں کہا "نظام نے آپ کو چوکی دینے کے لیے تو نہیں بلایا ہے۔"

"ابھی تم کو سارا معلوم ہوجائے گا۔" ٹھاکر جھنجلا کر بولا۔ "تم ایک سرکاری افسر کی مسلسل توہین کررہے ہو۔"

"اور آپ اپنے کو حلوہ چٹا رہے ہو' لوری سنا رہے ہو صاحب!" بٹھل نے تیور سے کہا "جنگل کے نکالے نہیں ہیں صاحب! آپ کی طرح کھونٹے کے پالتو ہیں۔ ہم نے پہلے آپ سے بنتی کی تھی۔ آپ تھوڑا اونچا سنتے ہو گیا۔"

"اونچا تم سنتے ہو۔" ٹھاکر نے ڈپٹ کے کہا "ہم نے بھی تم سے کہا تھا۔"

"مجبوری تھی صاحب! آپ کو کیا بولیں "جانا ضروری ہے اپنے پاس ٹکٹ خریدنے کا ٹائم بھی نہیں تھا۔"

"ٹکٹ بھی نہیں ہے تمہارے پاس؟" ٹھاکر حیرت سے بولا۔ اسے جیسے ایک جواز اور مل گیا تھا۔

"پیسہ ہے جیب میں' جرمانے کا بھی ہے صاحب اور ریل وئی کے کالے پیلے کا بھی اپنے کو کچھ پتا ہے۔"

"کہاں' کہاں جانا ہے تم کو؟" ٹھاکر کی دھمکتی آواز میں کسی حد تک طنطنے کی کمی تھی۔

"دور جانا ہے' پر ادھری ڈبے میں نہیں۔ بھروسا رکھو صاحب۔ اسٹیشن آنے پر ڈبے کی صفائی کرادیں گے۔"

ٹھاکر کے جسم میں ابال سا اٹھا اور اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش بھی کی۔ وہ تاسف آمیز برہمی سے بولا "تم نہیں جانتے ہو کہ۔۔۔ نہیں جانتے! اچھا ہوگا کہ بات کم کرو۔"

"ٹھیک ہے صاحب! تالا مار لیتے ہیں۔" پیچھے سے جمرو نکیلی آواز میں بولا۔

"ابھی آپ بھی اپن سے مسخری کرتا ہے کہ مخول ہے' زورا کو اب چپ ہی رہنا چاہیے تھا' منہ بنا کے کہنے لگا "ابھی سچ بولے نئیں۔ اپن آپ کو اپنا مانک آدمی کا اولاد ہی سمجھتا ہے۔ آپ تو سیدھا اوپر آیا پڑا ہے۔ غلطی ہوگیا مہادیو!" زورا نے ہاتھ جوڑ کر پیشانی پر مارتے ہوئے کہا "ابھی اپن کو بخشنے کا ہے کہ الٹا لٹکانے کا۔ یہ ڈبا آپ کا جاگیر ہے بابا! ساتھ ہی باندھ کے لے جانا اس کو۔ ٹھیک ہے!"

"تم ایک نمبر کے ہٹ دھرم ہو اڈیٹ۔" ٹھاکر کا پارا پھر چڑھنے لگا۔ "تمہیں اس کی سزا ضرور ملنی چاہیے۔"

"جیل کرادینے کا ہے نا! اور آپ کیا کرے گا۔ ماں قسم اپن بھی ماں کا جنا نئیں۔ لوٹ کے ایک بار پھر آپ کے پاس ضرور آئے گا۔"

"دھمکی دیتا ہے باسٹرڈ!" ٹھاکر بھنا کے بولا۔

"سبھی اپن ہی کرتا ہے۔ ابھی جیسا دادا بولا آپ تو ٹھمری سنا رہا ہے۔ ابھی زمین پر رہو صاحب! ابھی دکھاوے کا اپن لوگ چار ہے' گنتی کا چار' پر ایک دس کا برابر ہے۔ بیچ میں ایدر آپ کو کھڑکی سے نیچے لوٹ پلٹ بھی سکتا ہے۔ اتنا اپن بھی سننا نہیں مانگتا۔"

ٹھاکر کی رگوں میں بلبلاتا ہوا خون ایک لمحے کے لیے ضرور منجمد ہوگیا ہوگا۔ اس کی آنکھوں سے وحشت برسنے لگی۔

"یہ کیا ہو رہا تھا۔ میں نے بٹھل کو ٹوکنا چاہا مگر وہ تو ٹھاکر کے سامنے سے ہٹ کر دوبارہ نشست پر بیٹھ گیا تھا اور جیسے اسے کسی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

"کون ہو تم لوگ! کیا کرتے ہو؟" ٹھاکر نے اپنے اعصابی کشیدگی پر غلبہ پالیا تھا کہ جکڑی ہوئی آواز میں بولا۔

"آپ کیا سمجھتے ہو؟" جمرو نے بے اعتنائی سے کہا۔

"ہم جو پوچھتے ہیں' اس کا جواب دو۔"

"سچ بولیں گے تو پلٹی کھا جاؤ گے آپ۔"

ٹھاکر آتش بار نظروں سے جمرو کو گھورتا رہا پھر درشتی سے بولا "ت۔۔۔ ت۔۔۔ تم ضرور جرائم پیشہ لوگ۔۔۔" وہ خود ہی چپ ہوگیا۔

"آپ کو بس کالا ہی ٹیپتا ہے۔" جمرو نے کسی قدر جھڑکتے لہجے میں کہا "ایک بات بول دیں صاحب! ذرا سوچ کے زبان سے کچھ نکالنا' دل کا نشہ اتار کے' یہ دوسری جگہ ہے۔ ادھر چمڑی دمڑی دونوں کے پورے ہیں' اور پیچھے ٹھکانے لگانے والوں کی بھی کمی نہیں ہے۔"

جمرو کو باز رکھنے کے لیے میں نے اس کی کمر پر آہستہ سے کہنی ماری۔ اس نے پیچھے مڑ کے بھی نہیں دیکھا۔ زورا نے الٹا ایک آنکھ مار کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ زورا کی یہ تلقین میرے لیے ناقابل فہم تھی۔

گاڑی کی رفتار سست پڑنے لگی۔ انجن سیٹیاں بجا رہا تھا۔ اسٹیشن آہی جانا چاہیے تھا۔ رینگ رینگ کر گاڑی ٹھہر گئی۔ شاید سگنل نہیں مل رہا تھا مگر جلد ہی گاڑی چل پڑی۔ بارش اسی شدت سے ہو رہی تھی۔ ٹھاکر اپنی جگہ خاموش کھڑا ہوا تھا۔ یہ خاموشی بے سبب نہیں ہوگی۔ چہرے کے رنگ میں خون کی حدت نمایاں تھی۔ پیا ابھی تک اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ میرا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ اسٹیشن آنے پر ٹھاکر سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ سب کچھ اسی پر منحصر تھا۔

چھ بجا چاہتے تھے لیکن گہرا اندھیرا چھا رہا تھا۔ گاڑی لائنیں بدلنے لگی اور کھڑکیوں سے قمقموں کی روشنیاں ڈبے میں در آنے لگیں۔ زورا اور جمرو نے سامان اٹھانے میں عجلت نہیں کی۔ بٹھل بھی بے حرکت بیٹھا رہا پہیوں کی رگڑ کے ساتھ گاڑی سکندر آباد اسٹیشن پر ٹھہر گئی۔ زورا نے پلیٹ فارم کی طرف کھڑکیوں کے شیشے اوپر چڑھا دیے اور جھٹ دروازہ کھول دیا۔ پلیٹ فارم کا شور ڈبے میں امڈ آیا۔

ٹرین ٹھہرے چند لمحے گزرے ہوں گے کہ بندوق بردار سپاہی ہمارے ڈبے کی طرف لپکتے نظر آئے۔ ان کے پیچھے دو مستعد اور بے تاب پولیس افسر بھی تھے۔ ٹھاکر بھیم سنگھ نے ایک لمبی سانس کھینچ کے اپنی جگہ سے جنبش کی۔ کمر سے بندھی ہوئی بیلٹ کے ہولسٹر میں تمنچا رکھا' بالوں پر ہاتھ پھیرا' قمیص کی شکنیں درست کیں' نشست کے قریب ٹنگا ہوا کوٹ پہنا اور ہیٹ سر پر جما کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ پولیس افسروں کے ہاتھوں میں گوٹے کے ہار اور گل دستے تھے۔ ان کے عقب میں درجن بھر سپاہیوں کی نفری الگ موجود تھی۔ بٹھل بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ٹھاکر ابھی دروازے سے نیچے نہیں اترا تھا کہ بٹھل نے اس کے نزدیک جاکے آہستہ سے کہا "آگے جانے والوں سے کبھی ایک بات سنی تھی' آپ نے بھی ضرور سنی ہوگی' اس کا خیال رکھنا۔"

ٹھاکر نے سر گھما کر اضطراری نگاہوں سے بٹھل کو دیکھا اور ایک لحظے کے تامل کے بعد تیزی سے نیچے اتر گیا۔ ہاتھوں میں ہار اٹھائے پولیس افسر اس کے اترنے کے منتظر تھے۔ انہوں نے اس کے گلے میں ہار ڈال دیے اور بھی پولیس افسر ہجوم میں راستہ بناتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ ٹھاکر ان میں گھر گیا تھا کہ میں جمرو اور بٹھل بھی ڈبے سے اتر آئے۔ جمرو نے قلی روک کے سامان اٹھانے کی ہدایت کی۔ قلی کے ساتھ زورا بھی نیچے آگیا۔ پولیس افسروں کے پیچھے کھڑے ہوئے سپاہیوں کے دستے نے ایڑیاں بجا کر ٹھاکر کو سلامی دی۔ جواب میں ٹھاکر نے ہیٹ اتار کے سر جھکایا اور مسکرا دیا۔ منٹ سے کم عرصے میں اس کی مضطرب نگاہیں کئی بار ہم پر منڈلائیں۔ ادھر سامان بدوش قلی کو روک کے بٹھل' افسروں سے باتیں کرتے ہوئے ٹھاکر کے پاس جاکے ٹھہر گیا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔ اسے سامنے دیکھ کر ٹھاکر بھیم سنگھ کا جسم اکڑ گیا تھا۔ "یاد رکھیں گے صاحب

آپ کو۔" بٹھل نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ ٹھاکر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بٹھل بھی فوراً پلٹ گیا۔

میری سانسیں سینے میں اٹکی ہوئی تھیں۔ اپنی آنکھوں پر مجھے کسی خواب کا گمان ہوا۔ دیر تک مجھے اپنے گردو پیش سپاہیوں کی آہٹیں سنائی دیتی رہیں۔ دور جاکے میں نے مڑ کے دیکھا تو درمیان کے مسافروں کی بھیڑ میں سب کچھ گم ہوگیا تھا۔ گاڑی خاصی طویل تھی۔ ہم انجن کے حصے کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ انجن سے چند قدم کے فاصلے پر بٹھل ایک خالی بینچ پر بیٹھ گیا۔ اسٹیشن پر چھائے ہوئے شور میں کمی آگئی تھی۔ منتشر ہجوم بھی پرسکون ہوگیا تھا۔ بینچ کے پاس قلی نے سامان اتار دیا۔ زورا اور جمرو اس کے ساتھ چلے گئے۔ اندھیرا نسبتاً چھٹ چکا تھا۔ بارش کچھ اور تیز ہوگئی تھی یا ڈبے سے اترنے کے بعد زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ مسافر ڈبوں میں بیٹھ چکے تھے۔ دیر ہوگئی جمرو اور زورا واپس نہیں آئے۔ اسٹیشن پر گاڑی ٹھہرے رہنے کا وقت بیس منٹ سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس مختصر وقت میں انہیں جگہ اور ٹکٹ دونوں کا بندوبست کرنا تھا۔ میں نے سوچا، بٹھل سے کہوں گا کہ کوئی دوسری گاڑی کیوں نہ دیکھی جائے۔ مجھے اپنی یہ خواہش خود ہی بے محل، بے جواز لگی۔ سو میں چپ بیٹھا رہا۔ وقت گزارنا دوبھر ہو رہا تھا۔ امکان تو نہیں تھا لیکن آدمی تو گرگٹ کی طرح ہوتا ہے۔ ٹھاکر بھیم سنگھ کا دماغ کسی بھی لمحے پلٹ سکتا تھا۔ ابھی تک سب کچھ جوں کا توں تھا۔ اسٹیشن، پولیس، ٹھاکر اور ہم....

جمرو اور زورا تقریباً بھاگتے ہوئے واپس آئے اور جمرو نے ہانپتے ہوئے بتایا کہ مشکل سے سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں جگہ مل پائی ہے۔ وہ بھی بہت منتیں کرکے اور رشوت دے کے۔ آگے نظام آباد میں شاید کوئی معقول جگہ مل جائے۔ جمرو کی روداد ادھوری چھوڑ کے بٹھل بینچ سے اٹھ گیا۔ ڈبا اتنے فاصلے پر نہیں تھا۔ ڈبے میں موجود مسافروں نے دروازہ اندر سے بند کر رکھا تھا۔ قلی کی چیخ وپکار پر ایک مسافر دروازے پر نمودار ہوا۔ وہ چھریرے جسم، درمیانہ قامت اور اوسط عمر کا شخص تھا۔ تانبے جیسی رنگت، تیکھے نقش ونگار، سفید دھوتی اور کرتے میں ملبوس، ماتھے پر قشقہ، گلے میں سونے کی زنجیر۔ شکل وصورت سے کوئی نواب معلوم ہوتا تھا۔ راستہ روک کے وہ بیزاری سے بولا کہ ڈبے میں ایک عورت موجود ہے۔ کوئی اور ڈبا تلاش کیا جائے۔

زورا نے اس سے کہا، عورتوں کے لیے زنانے ڈبے ہیں اور ہم نے باقاعدہ ٹی ٹی سے اس ڈبے کے لیے اجازت حاصل کی ہے۔ قلی نے بھی شدومد سے زورا کی ہم نوائی کی اور ٹکٹ دکھائے۔ دروازے پر کسی پاسبان کی طرح کھڑے ہوئے مسافر اچھی خاصی بک بک جھک جھک کی لیکن زورا کی ایک ہی پھنکار تیر بہدف ثابت ہوئی۔

سامنے کی نشست پر کونے میں دبکی ہوئی ایک عورت بیٹھی تھی۔ وہ ساڑی میں ملبوس تھی۔ صرف ہاتھ نظر آرہے تھے اور کلائیوں میں آراستہ کانچ کی چوڑیاں۔ اگر مرد مسافر اس کا شوہر یا بھائی تھا تو وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ نہ تو عورت آرام سے سو سکتی تھی نہ سکون سے بیٹھ سکتی تھی مگر ڈبے میں چھ مسافروں کی گنجائش تھی۔ ہم پھر کہاں جاتے۔ زورا کے بقول ٹی ٹی نے اس ڈبے کی نشستیں ہمارے لیے تفویض کی تھیں۔ ڈبا بدلنے کا وقت بھی نہیں تھا۔

ہمارے بیٹھنے کے چند منٹ بعد گاڑی چل پڑی۔ گاڑی چل پڑنے پر ایسا لگا جیسے بند کھل گئے ہوں، دریچے کھل گئے ہوں۔ مجھے تو یقین نہیں آرہا تھا مگر گاڑی آہستہ آہستہ رفتار پکڑ رہی تھی۔ سکندر آباد شہر دور ہوتا جا رہا تھا۔ اجالا بھی بڑھ رہا تھا۔ کھڑکیوں کے قریب اونچے نیچے ٹیلے اور کھیت دکھائی دینے لگے تھے۔ حد نظر تو دیوار سے بھی مشروط ہے۔ موسلا دھار بارش کی دیوار نے دور کے مناظر چھپا دیے تھے۔ یکے بعد دیگرے سب نے کپڑے تبدیل کیے اور بٹھل اوپر کی برتھ پر چلا گیا۔ میرا ہاتھ دبوچ کے جمرو میرے پہلو میں بیٹھ گیا۔ اس کی گرفت سے اس کے سینے کے تلاطم کا اندازہ ہوتا تھا۔ جانے کب تک ہم یوں ہی بے سدھ سے بیٹھے رہے۔ کچھ دیر بعد کسی اسٹیشن کے آنے پر زورا نے چائے منگوائی۔ ساری رات ایسے ہی گزر گئی تھی۔ رات کو ڈاکٹر ناصر مرزا کے گھر جانے کے لیے جس وقت ہم ہوٹل سے نکلے تھے تب سے کسی نے کچھ کھایا تھا نہ پیا تھا۔ گرم چائے سے اوسان کسی قدر بحال ہوئے۔

گاڑی سکندر آباد سے میلوں دور آچکی ہوگی کہ زورا اور جمرو کو ٹھاکر بھیم سنگھ یاد آگیا، یاد کیا، اس کا نقش اتنی آسانی سے مٹنے والا نہیں تھا۔ وہ تو کسی بھوت کے مانند مستقل ان کے ذہنوں پر چھایا ہوا ہوگا۔ ان کے لب ولہجے کی بے چینی ظاہر کرتی تھی کہ انہیں بھی ٹھاکر کی رخنہ اندازی کی اتنی ہی فکر تھی۔ جتنی مجھے بلکہ مجھ سے کچھ زیادہ۔ کوئی بلا ٹل جانے پر جس اضطراب آمیز اطمینان اور تشکر سے چہرہ تمتمانے لگتا ہے، کچھ وہی ان کی کیفیت تھی۔ میں تو مسلسل ان پر پیچ و تاب کھاتا رہا تھا اور میری عقل میں نہیں آیا تھا کہ ٹھاکر سے ان کی حیل و حجت، بحث و تکرار ارادتاً ہے۔ ٹھاکر کی زبانی یہ

معلوم ہونے کے بعد کہ وہ ایک بااثر پولیس افسر ہے، انہیں بٹھل نے کوئی رو رعایت روانہ رکھنے کا اشارہ کردیا تھا۔ ہماری مجوبیت اور انفعالیت سے ٹھاکر کے تیوروں پر اور بل پڑ سکتے تھے۔ جھکی ہوئی شاخوں سے بعض لوگوں کو بیر ہوتا ہے۔ کم عقل ہی اتنے خود سر اور نااندیش ہوسکتے ہیں یا ایسی بے نیاز جو استغنا کے درجے پر فائز ہوں یا کسی چیز کو خاطر میں نہ لانے والے اپنے پس منظر کے مضبوط و مستحکم لوگ۔ انہیں ٹھاکر کو کچھ اسی قسم کا، اسی کج روی و کج کلاہی کا تاثر دیتے رہنا چاہیے تھا۔ بالا دست، بالادستی کی توانائی سے خوب واقف ہوتا ہے۔ جمرو کہہ رہا تھا، انہیں یقین نہیں تھا کہ ان کی کوششیں بار آرہی ہوں گی مگر اڈوں سے تعلق رکھنے والوں، سامان میں ہتھیار ساتھ لے کے چلنے والوں اور نواب ثروت جیسے رئیس کی موت کے سفر میں ساتھ رہنے والوں کے پاس اس کے سوا راستہ بھی کیا تھا۔ بصورت دیگر تو سب کچھ ٹھاکر کے اختیار میں تھا۔ اس نے زنجیر کھینچنے کی ٹھان رکھی تھی۔ بٹھل کو احساس ہوگیا تھا کہ اس آمادہ غضب شخص سے داد و فریاد کا کچھ حاصل نہیں۔ اچھا ہوا جو میں نے منہ سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ ورنہ ٹھاکر کا پتھر گداخت کرنے کے لیے میں عاجزی ہی کرتا۔ میری انگریزی دانی ٹھاکر کی جستجو مہمیز بھی کرسکتی تھی۔

میں بھی انہی کے ساتھ تھا لیکن میں کسی کے ساتھ کہاں رہتا ہوں۔ میں تو صرف اپنے ساتھ رہتا ہوں۔ مجھے تو صرف اپنے فشار و غبار سے غرض ہے۔ صرف میرا ہی جسم ٹوٹتا، میرا ہی سینہ دکھتا ہے۔ میں جمرو اور زورا سے ندامت کا اظہار بھی نہ کرسکا۔ نہ انہوں نے مجھ سے شکایت کی کہ وہ مجھے اچھی طرح جانتے تھے۔ کسی معذور، مفلوج شخص سے شکایتیں بھی کون کرتا ہے۔ میرا شمار تو درگزر کردیے جانے والوں لوگوں میں تھا۔

ہمارے ہم سفر مسافر کو ہماری آمد بہت ناگوار گزری تھی۔ گاڑی چلنے پر مسافر ایک دوسرے سے گھل مل جاتے ہیں۔ اس نے ازراہ وضع بھی منزل مقصود وغیرہ کے بارے میں ہم سے کوئی سوال نہیں کیا۔ نہ جمرو اور زورا نے پہل کی۔ زورا نے اسے چائے کی پیشکش کی تھی مگر مسافر نے بے دلی، بے رخی سے انکار کردیا۔ گاڑی منزلیں طے کرتی رہی۔ وہ دونوں ایک ہی برتھ پر بیٹھے رہے۔ عورت نے ذرا کھسک کے کھڑکی کی طرف منہ کرلیا تھا۔ مرد کبھی اس کے قریب ہوکے کھسر پھسر کرنے لگتا یا تیزی سے گزرنے والے مناظر تکتا رہتا۔ اسے چین نہیں تھا۔ اسٹیشن آنے پر وہ اٹھ کے دروازے پر کھڑا ہوجاتا۔ چھوٹے چھوٹے اسٹیشن ہی آتے رہے۔ ہر اسٹیشن پر دو تین منٹ سانس لے کر گاڑی پھر چل پڑتی۔ ڈبے کی روشنیاں کب کی بجھ چکی تھیں۔ اجالا ہی اتنا ہوگیا تھا کہ قمقموں کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ عورت کو سردی لگ رہی تھی یا مزید پردہ مطلوب تھا۔ مرد نے کینوس کے ایک بڑے بیگ سے منقش شال نکال کے اس کی پشت پر ڈال دی۔ عورت نے اس سلیقے سے کہ بدن کا کوئی حصہ عیاں نہ ہوجائے، چادر لپیٹ لی۔ حلیے اور طور طریق سے مرد خالص ہندو معلوم ہوتا تھا۔ ظاہر ہے، وہ خاتون بھی روایتی ہندو ہوگی۔ مسلمان عورتوں کی طرح ہندو عورتیں اتنی شدت سے اپنے آپ کو چھپائے نہیں رکھتیں۔ چار پانچ گھنٹے کے سفر میں یا تو انہیں ہم پر اعتبار نہیں آیا تھا یا کچھ ایسا ہی شدید ستر پوشی کا رواج ان کے یہاں ہوگا۔ ہندوستان تو ویسے بھی رسم و رواج کا جنگل ہے۔ شہر شہر قاعدے، ضابطے بدل جاتے ہیں۔

بٹھل اوپر کی برتھ پر سوتا رہا۔ زورا پر غنودگی نے غلبہ کیا تو پھر جمرو بھی گردن ڈالنے لگا۔ میری آنکھیں بند نہیں ہوئیں۔ بے ارادہ میری نظریں اپنے سامنے کے مسافر پر چلی جاتی تھیں۔ اس کا بھی یہی حال تھا۔ کبھی ہماری نظریں ٹکرا جاتیں تو وہ بے کل سا ہوجاتا، سر جھکالیتا یا منہ دوسری جانب کرلیتا، میرا اندازہ تھا کہ نظام آباد میں وہ کسی دوسرے ڈبے میں جگہ حاصل کرنے کی کوشش کرے گا یا عورت کو زنانہ ڈبے میں بھیج دے گا۔ اگر نظام آباد ان کی منزل نہیں ہے تو عورت کب تک گٹھری بنی رہے گی۔ ان کے پاس نہایت مختصر سامان تھا۔ کینوس کے بیگ کے علاوہ درمیانہ سائز کا صرف ایک سوٹ کیس۔ طویل سفر کے لیے بستر بند بھی لازم ہوتا۔ ان کے پاس کھانے پینے کی چیزیں بھی نہیں تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ حیدر آباد، سکندر آباد میں ان کا گھر نہیں ہے۔ مرد کی ہندوستانی صاف تھی اور وہ شمالی علاقوں کا رہنے والا معلوم ہوتا تھا۔ اس سے سلسلہ جنبانی کو میں سوچتا ہی رہ گیا۔

بارہ بج چکے تھے کہ گاڑی کی رفتار سست پڑنے لگی۔ کھڑکیوں سے نظر آنے والی پختہ عمارتیں کسی شہر کی علامت تھیں اور وہ نظام آباد ہی ہوسکتا تھا۔ مرد فوراً اٹھ گیا اور اس سے پہلے کہ گاڑی پلیٹ فارم میں داخل ہوتی، اس نے لمحے بھر عورت سے کوئی سرگوشی کی اور دروازے پر جاکے کھڑا ہوگیا۔

گاڑی سست ہوجانے سے جمرو کی آنکھ بھی کھل گئی۔ ہمارا ڈبا خاصا آگے تھا۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کے دیکھا۔ میرے سامنے سے پلیٹ فارم کا تقریباً تین چوتھائی ہجوم گزر

گیا۔ تب گاڑی نے سپر ڈالی۔ گاڑی کچھ آگے نکل گئی تھی۔ قریب ہی پلیٹ فارم کا سرا تھا۔ یہاں سے وہاں تک' سارے پلیٹ فارم پر فاصلے فاصلے سے سپاہیوں کی تعداد دیکھ کے میرا ماتھا ٹھنکا۔ یہ ریلوے پولیس نہیں تھی۔ میں نے جمرو کو ٹہوکا دیا تو وہ بھی پلکیں جھپکانے لگا۔ پلیٹ فارم پر اٹھنے والے شور سے زورا بھی جاگ گیا اور نیچے آگیا۔ سکندر آباد کی طرح یہاں بھی پولیس کا ایک دستہ الگ سے موجود تھا اور وہی پھولوں اور گوٹے کے ہار اٹھائے پولیس افسر۔ یقیناً یہ ٹھاکر بھیم سنگھ کی پذیرائی کا اہتمام ہوگا۔ پلیٹ فارم پر چھائی ہوئی پولیس دیکھ کے زورا نے مخالف سمت کی کھڑکیوں سے نظر کی تو اس کے ہونٹ چپل گئے۔ اس طرف لائنوں پر بھی پولیس کھڑی تھی۔ گاڑی رکتے ہی مرد مسافر نے پہلی بار ہمیں مخاطب کیا اور عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تیزی سے بولا "بھائی صاحب! ذرا دھیان رکھنا ہم ابھی آتے ہیں۔"

اس کی آواز پر عورت کے سراپا میں لہری اٹھی۔ بے اختیار اس نے مڑ کے اپنے ہم سفر مرد کو دیکھا اور دوسرے ہی لمحے سنبھل گئی۔ اس کی بس ایک جھلک ہی نظر آسکی تھی۔ پھٹی پھٹی چوڑی آنکھیں' کالے بال اور چمکتی دمکتی پیشانی کا جھماکا اور مرد نیچے جاچکا تھا۔ اسے ڈبے سے اترے ابھی چند منٹ بھی نہیں ہوئے ہوں گے کہ تین مسلح' غیر مسلح سپاہی درانہ ڈبے میں چڑھ آئے۔ ان کا انداز جھپٹ پڑنے کا تھا۔ اب کوئی چارہ نہیں تھا۔ شاید سب کچھ اکارت گیا تھا۔ ہم اپنی جگہوں پر ٹھٹک کے رہ گئے۔ سپاہیوں کی متجسس نگاہیں ڈبے میں چاروں طرف بھٹکتی رہیں۔ جیسے وہاں کونے کھدرے میں بھی مسافر چھپے ہوئے ہوں۔ ایک سپاہی نے جھک کے برتھوں کے نیچے دیکھا۔ دوسرے نے ضرورت خانہ کھول کے تسلی کی کہ اندر تو کوئی نہیں ہے۔ ان کے تذبذب سے میری طرح جمرو اور زورا کو بھی کسی قدر فراغت نصیب ہوئی ہوگی لیکن ابھی کیا کہا جاسکتا تھا۔ یہ تو پہلے ہی سمجھ میں آگیا تھا کہ وہ ٹکٹ چیکنگ کے لیے نہیں آئے ہیں۔ ان کی بکھری ہوئی نظریں پھر عورت پر جا کے ٹھہر گئیں۔

"کیا ہے حوالدار' کیا کھو گیا ہے؟" جمرو نے آنکھیں مسلتے ہوئے اچٹتی آواز سے پوچھا۔

"یہ' یہ کون ہے؟ ان میں سے ایک نے عورت کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ باقی دونوں کا افسر معلوم ہوتا تھا۔

"تم لوٹھیک سے نہیں سوجھتا۔" جمرو ناراضی سے بولا "اپنی ماں بہن کو نہیں پہچانتے انسپکٹر صاحب۔"

"یہ' یہ تمہارے ساتھ ہے؟" انسپکٹر نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"تم کو اعتراض ہے کیا؟"

"یہ کون ہے تمہارا؟"

"تم سے مطلب!" جمرو نے بگڑ کے کہا۔

"ہم پوچھتا ہے' یہ کون ہے؟"

جمرو کو جواب دینے میں تامل ہوا کہ یکایک اوپر کی برتھ سے بٹھل کی بھاری آواز گونجی "کیا بات ہے حوالدار! تھوڑا سنبھل کے بات کرو۔ دھیرج سے۔"

تینوں سپاہیوں کی نظریں بٹھل پر جم گئیں "ہم پوچھتا ہے' کون ہے یہ تمہاری؟" انسپکٹر کی آواز اکڑی ہوئی تھی۔

"تم کو بولنا ضروری ہے۔ تم پولیس کا آدمی ہے کہ خدائی فوج دار! یہ کوئی بھی ہے اپنا۔ تم کو کیا ہے۔" بٹھل نے دھمکتی آواز میں کہا۔

انسپکٹر بوکھلا سا گیا "دیکھو' ٹھیک سے بات کرو۔" اس کے لہجے میں مدافعت بھی تھی' تلخی بھی "کیا پوچھا ہے تم سے؟"

"اور ہم کیا بولتے ہیں۔" بٹھل نے برگشتگی سے کہا "یہ اپنی بٹیا ہے' بولو' ابھی کیا کرنے کا ہے؟"

"بیٹی ہے تمہارا!" انسپکٹر نے بے یقینی سے دہرایا۔

"اور اپن کا نہیں ہے۔" زورا سینے پر ہاتھ مار کے بولا "ابھی تم کس لیے پوچھتا ہے؟"

"ہم' ہم ایک عورت کی تلاش میں ہے۔"

"تو اپن اس کو تمہارے ساتھ کردے؟ ایسا!" زورا گرج کے بولا۔

"ایسا کب بولا ہے ہم نے۔" انسپکٹر تنک گیا۔

"پھر کیسا بولتا ہے۔" زورا کا پارہ چڑھنے لگا "تم ڈبا میں ابھی ایسا پوچھے بغیر کیوں آیا۔ اپن سیکنڈ کلاس میں بیٹھا ہے اور پھوکٹ میں نئیں۔"

"اے! زیادہ گرمی مت دکھاؤ۔" بندوق بردار سپاہی نے بپھر کے کہا "ہم کو اوپر سے حکم ملا ہے۔"

"اسی ڈبا کا! اور کوئی دکھائی نئیں پڑا تم کو؟" زورا مشتعل لہجے میں بولا

"ہم کو تمہارے سامان کا تلاشی چاہیے۔"

"ٹھیک ہے' تلاشی کا رسید ہے تمہارے پاس؟"

"کیسا رسید! کیا بولتا ہے یہ؟" سپاہیوں نے جز بز ہو کے اپنے ساتھیوں کو دیکھا۔

"تیرے باپ کا راج ہے۔" مرد بھی نشست سے اٹھ

کھڑا ہوا "سامان کو ہاتھ لگا کے دیکھ۔ ابھی تھوڑا کتاب پڑھ کے آتا۔ نوا نوا آیا ہے پولیس میں!"

تینوں سپاہی الجھ گئے تھے "دیکھو' ہوش سے بات کرو' ہم کو آرڈر ہے۔"

"آڈر ہے تو اپنے کو دکھاؤ' ایک کیا' سارے تلاشی دیں گے اور پگڑی اچھالنے پہ بعد کو تالی بھی بجائیں گے۔"

"کدھر سے تم لوگاں ٹرین میں بیٹھا ہے؟" جو سپاہی ابھی تک خاموش کھڑا تھا' اس نے نرمی سے کہا۔

"ایسا! ابھی تھوڑا تھام کے زبان کھولنے کا' ہاں! تمہارا دیا نئیں کھاتا اپن لوگ۔" زورا دھیمی آواز میں مگر رکھائی سے بولا "اپن سکندر آباد سے ٹرین پکڑا ہے اور کچھ؟"

"اور یہ' یہ عورت....؟"

"عورت نہیں!" زورا پھر اکھڑ گیا "اپن کیا بولا' ایک دم ماں بولنے کا ہے کہ بہن بولنے کا' سمجھا! اگر وردی والا تڑی دکھایا تو اپن' اپن...."

"نہیں نہیں' ایسا غصہ نہیں مہاراج!" نسبتاً خاموش طبع سپاہی نے کہا "ہم لوگوں کا تم سے دشمنی نہیں ہے۔"

"تم لوگ اپنے کو سمجھتا کیا ہے ابھی؟"

"تم ایسا ہی بہت آگے کا بولتا ہے' ہم پولیس کا آدمی ہے اور ڈیوٹی پر ہے۔"

"اور اپن تمہارا نوکر ہے' تمہارا غلام۔"

"اوپر سے حکم ہے' ہم سارا گاڑی کا تلاشی لے سکتا ہے۔"

"دے گا' تلاشی بھی ضروری دے گا' تمہارے آگے اکھا کپڑا اتار دیں گا' پر پہلا' پہلا اپن کو کاغذ دکھانے کا ہے' سمجھا!"

سپاہی شش و پنج میں پڑ گئے تھے۔ بے شک پولیس کی وردی اور نشانات سے ان کے جسم بھی مزین تھے مگر وہ ٹھاکر بھیم سنگھ جیسے عالی رتبہ افسر نہیں تھے۔ اسی نسبت سے ان کے ہاں کر و فر اور زود اثر کی کمی تھی۔ جمرو اور زورا کا تجربہ تازہ تازہ تھا۔ ان کے ہاں مشاقی اور روانی بھی اسی سبب سے تھی۔ کچھ وہی حال تھا مگر پہلے جیسی وحشت نہیں تھی۔ میری دانست میں اتنا ہی کافی تھا۔ جمرو اور زورا کو زیادہ الجھنا' اڑنا نہیں چاہیے تھا۔ پولیس والے تلاشی کے لیے ضد کرسکتے تھے اور تلاشی ہمارے لیے زہر کے مترادف تھی۔ تلاشی کے بعد ان میں اور ٹھاکر میں کوئی فرق نہ رہتا۔ ٹھاکر تو ویسے بھی ہماری طرف اشارہ کرکے اپنی راہ لیتا' اس کے بعد تو ہمیں انہی لوگوں سے سابقہ پڑنا تھا۔ شاید ہمیں شروع ہی سے ملوث نہیں ہونا چاہیے تھا۔ عورت اکیلی تھی تو کچھ دیر میں اس کے ساتھی کو واپس آجانا تھا۔ معلوم نہیں' کیوں زورا اور جمرو نے عورت سے وابستگی کا اظہار کیا اور بٹھل نے بھی توثیق ضروری سمجھی۔ ایک حل تو صاف تھا۔ یہ اطمینان ہوجانے پر کہ وہ ٹھاکر کے فرستادہ نہیں ہیں اور ان کی آمد کا مقصد کچھ اور ہے' ہمیں خاموش رہنا یا بتا دینا چاہیے تھا کہ عورت کے ساتھی مرد کا انتظار کریں۔ وہ جلد واپس آنے کو کہہ گیا ہے۔

"آپ لوگاں کیا کام کرتے ہو؟" کسی حد تک مہذب سپاہی نے رک رک کر پوچھا۔ اس نے پہلی مرتبہ ہمیں احترام سے مخاطب کیا تھا۔

"تم کو کیا دکھائی پڑتا ہے' چور' اچکا' اٹھائی گیر!" زورا نے برہمی سے جواب دیا۔

"کسی کے ماتھے پر نہیں لکھا ہوتا۔ ہم نے بہت لوگاں دیکھا ہے۔"

"لگتا ہے' آدمی نئیں دیکھا تم نے!" جمرو نے بہ ظاہر طنز کیا۔

سپاہی سر ہلانے لگا اور اس نے انتظار کیا کہ اس کے ساتھی بھی کچھ بولیں۔ وہ خاموش رہے تو سپاہی جھجک کے بولا "تم لوگاں ساتھ ساتھ ہے؟"

"تم کو الگ الگ دکھائی پڑتا ہے کیا۔" جمرو نے زورا کے گلے میں بازو ڈال دیا۔

"ٹھیک ہے' تم سامان دکھاؤ' ہم چلا جائے گا۔" انسپکٹر نے خاصی دیر بعد زبان کھولی۔ اس کے لہجے میں گرمی نہیں تھی۔

"سامان کا پہلے بول دیا ہے۔ ابھی زیادہ لفڑا نئیں کرو انسپکٹر صاحب! اپن پاس اتنا فالتو ٹیم نئیں ہے۔ اپن کو جاستی بولنا بھی نہیں آتا۔ اپن کو ابھی پیٹ پوجا بھی کرنے کا ہے۔ ایک بات اس کا بعد بھیجا چاٹنے کا نئیں۔ تلاشی کا کاغذ لاؤ اور سامان کھول کے دیکھو۔ اچھا لگے تو تھوڑا بال بچہ لوگ کے لیے بھی لے جاؤ۔"

"کاغذ کا تم کیا کرلے گا؟"

"اچار ڈالیں گا ابھی' ٹھیک ہے۔"

"تم ایسا نہیں دکھائے گا؟"

"ایک دم یہی بولا ہے۔"

"تم نہیں جانتا' پولیس کا کام میں روڑا ڈالنے کا مطلب کیا ہے؟" انسپکٹر نے کرخت آواز میں کہا۔

"تم سے جاستی جانتا ہے' پر تم ابھی کچھ نئیں جانتا' اپن کون لوگ ہے۔"

"کون ہے تم۔۔۔"

"بولے گا تو تم ابھی۔۔۔ ابھی۔"

"جانے دے رے۔" اوپر سے بٹھل نے ہانک لگائی اور انسپکٹر سے مخاطب ہو کے غنودہ لہجے میں بولا "جاؤ صاحب! ٹائم کھوٹا متی کرو۔ ادھری سے کچھ نہیں ملے گا۔ اتنی دیر میں پلے پڑجانا چاہیے تھا تم کو۔ نہیں تو اپنے کسی بڑے کو بلا کے لاؤ۔ اس کو بولتے ہیں 'تلاشی کا پرچا بھی کاٹا جاتا ہے' ٹھپا لگا کے۔"

انسپکٹر اور دونوں سپاہیوں کے چہروں کے رنگ بار بار بدل رہے تھے۔

"کیا بولتے ہیں لاڈلے اس کو فرنگی میں؟ ان لوگ کی سمجھ میں بھاشا نہیں آتی شاید۔"

بٹھل کے تخاطب پر میں گڑبڑا سا گیا اور سرچ وارنٹ کا لفظ میرے ذہن سے اوجھل ہو گیا۔ جب یاد آیا' اور میں نے انگریزی میں ان سے کہنا چاہا کہ حکم نامہ دکھائے بغیر کسی کے گھر یا سامان کی تلاشی لینا ناجائز بھی ہے اور غیر قانونی بھی۔ تو دیر ہو گئی تھی۔ مجھے قانون کا کچھ علم نہیں تھا' بس بٹھل کا عندیہ میری سمجھ میں آگیا تھا۔ مجھے یہی کہنا چاہیے تھا لیکن ضرورت ہی نہیں پڑی۔

انسپکٹر کی نظریں مجھ پر اور بٹھل پر بھری ہوئی تھیں' پھر آنکھوں آنکھوں میں انہوں نے ایک دوسرے سے کچھ کہا اور انسپکٹر تلخ و تند لہجے میں بولا "ٹھیک ہے' ہم ابھی تم کو دیکھتا ہے۔"

"ایک کو ایدری چھوڑ جاؤ صاحب!" روزا نے مضحکہ آمیز آواز میں کہا "سامان میں ابھی اپن ہیرا پھیری نئیں کروے۔"

"اس کا ضرورت نہیں' ہم پاتال سے نکال لیتا ہے۔" انسپکٹر نے ڈبے سے اترتے اترتے ایسے حتمی انداز میں کہا جیسے ابھی واپس آکے ہمارا خون پی لے گا۔

ان کے جانے کے بعد زورا اور جمرو کو قہقہہ لگانا چاہیے تھا۔ آخر وہ دوبارہ نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ دونوں نے نشست پر ہاتھ پیر ڈال کے آنکھیں میچ لیں۔ بٹھل بھی نیچے آگیا۔ لمحوں تک سکوت رہا۔ کہتے ہیں' ہر تلاطم کے بعد ایک سکون اور ہر شور کے بعد ایک سکوت لازم ہے۔ سکون کی شدت تلاطم کی شدت سے مربوط ہے۔ شور کا بھی یہی ہے ورنہ شاید آدمی ریزہ ریزہ ہو جائے اور سمندر میں آگ لگ جائے۔

"استاد! بولو تو نکال کے پٹاخوں کو گدے میں بٹھا دیں۔ چاقو سے سالی سیون اتار لیتا ہوں' پتہ بھی نہیں چلے گا۔" جمرو نے بٹھل سے سرگوشی کی کہ کہیں عورت نہ سن لے۔

"دیکھیں گے رے۔" بٹھل نے بوجھل آواز میں کہا۔

جمرو کچھ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ یہ تمنچے' کارتوس اور چاقو سامان میں چھپے نہ ہوتے تو ٹھاکر بھیم سنگھ اور سپاہیوں سے اتنی توتکار' منہ ماری کی نوبت نہ آتی مگر سردست یہ کام ممکن بھی نہیں تھا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر ٹھہری ہوئی تھی۔ پولیس والے بھی پلٹ سکتے تھے۔ کوئی اور شخص بھی اس دوران ڈبے میں داخل ہو سکتا تھا اور عورت کا ساتھی بھی واپس آسکتا تھا۔ بٹھل نے اسی لیے توجہ نہیں دی۔ گدے میں نہیں تو آگے راستے میں ہتھیار کہیں پھینکے جاسکتے تھے مگر ہتھیاروں سے دستبرداری اڈے کے لوگوں کے لیے اتنی آسان نہیں ہوتی۔ تمنچے اور کارتوس تو خاصے قیمتی تھے پھر ان کی اصل قیمت تو موقع و محل سے طے ہوتی ہے۔ قیمت کی بھی اتنی بات نہیں جتنی دستیابی کی ہے' کبھی بڑی پہیلیاں بوجھنے اور اندھی گلیوں کی بھول بھلیاں گزارنے کے بعد کہیں یہ حاصل ہوتے ہیں۔

پولیس کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد انجن سیٹیاں بجانے لگا۔ پلیٹ فارم کا ہجوم بھی سمٹ چکا تھا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے چل پڑی۔ عورت کا ساتھی ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ عورت نے کئی بار گھونگھٹ کی اوٹ سے دروازے پر نظر کی۔ میں نے بھی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ دور دور تک پلیٹ فارم پر کوئی شخص ایسا دکھائی نہیں دیا جو گاڑی چھوٹنے پر کسی ڈبے کا پائدان چڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ گاڑی کی رفتار معمول پر آنے تک دروازہ کھلا رہا۔

نظام آباد شہر کی حدیں کب کی ختم ہو گئی تھیں کہ جمرو نے بٹھل کو عورت کی جانب اشارہ کیا۔ عورت اپنی پناہ گاہ میں کسی اضطرابی کیفیت سے دوچار تھی۔ لگتا تھا' سسک رہی ہے "ابھی سب ٹھیک ہے ری' اپنے ساتھ تجھ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔" بٹھل نے بے ربطی سے کہا۔

عورت کی سسکیاں اور تیز ہو گئیں تو بٹھل اٹھ کے اس کی نشست پر چلا گیا "نا نا' ایسا نہیں ری۔" بٹھل نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "اب یہ گٹھری اتار دے۔ کوئی نہیں آئے گا اب اور' اور وہ بھی شاید اب نہیں آئے تیرا۔۔۔!" بٹھل کی زبانی عورت کے ساتھی کے بارے میں یہ قطعی فیصلہ سن کے میرے کانوں کی لویں سلگنے لگیں۔ اس کے معنی یہی نکلتے تھے کہ جس عورت کی تلاش میں پولیس نظام آباد اسٹیشن پر پھیلی ہوئی تھی' وہ کوئی اور نہیں ہے۔ چند

ں کے لیے تو خود اپنے حواس میرے لیے بیگانہ ہو گئے۔

بٹھل نے اس کی کمر پر تھپکیاں دیں تو وہ ہچکیاں بھرنے لی۔ اسے پردے اور گھونگھٹ کا بھی خیال نہیں رہا ادھری کوئی پرایا نہیں' سمجھ لے سب تیرے اپنے ہیں' اور نے تجھ کو اوپر سے بھیجے گئے ان تیس مار خانوں کے سامنے لچھ بولا تھا۔ سنا تھا تو نے؟"

عورت کا سارا بدن دھڑک رہا تھا۔ روتی ہوئی عورت رد کے پتھر کے لیے ایک آزمائش ہے "جیسا ہم بولتے ہیں' ی کو ٹھیک جان۔ اس سے آگے کو تیرے پاس اب ہے بھی یا۔ چھلانگ مارنے کو ڈبے کا دروازہ ہے' پر ہم تجھ کو ایسا یں کرنے دیں گے۔" بٹھل کی آواز میں بہت تپش تھی۔ یی تپش جس میں بڑی چھاؤں' بہت ٹھنڈک ہوتی ہے۔ ٹھل نے کہا "اس سے اچھا ہے تو اپنے کو ہم پر چھوڑ دے۔ ر آدمی کتا نہیں ہوتا۔"

عورت کا چہرہ میری جانب نہیں تھا۔ اس نے بٹھل کو شک بار آنکھوں سے دیکھا ہوگا۔ میرے لیے یہ منظر دیدنی نا۔ جب اس ناتواں نے بٹھل کے شانے پر اپنا سر ڈال دیا ور بے تحاشا ہمکنے' ہڑکنے لگی۔ اس کی شال فرش پر گر گئی ھی۔ نیم رخ اب وہ میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ دمکتی وئی بادامی رنگت' سیاہ بال' بڑی بڑی سراسیمہ سیاہ آنکھیں' ستواں ناک' ترشے ہوئے ہونٹ' بھرے ہوئے خدوخال' چیس سے تیس کے درمیان اس خوش چہرہ کی عمر ہوگی۔ بٹھل نے کوئی بند کھول دیا تھا۔ ایک دریا سا اس کی آنکھوں یں موجزن تھا۔ میں' جمرو اور زورا سن بیٹھے رہے۔

"اب کچھ نہیں ہوئے گا ری' ہم ادھری ہیں۔ تیرے بدلے جائیں گے۔" بٹھل نے حتمی لہجے میں کہا اور نہ جانے دھیمی آواز میں وہ اس سے اور کیا کچھ کہتا رہا۔

دوسرا اسٹیشن جلد ہی آگیا۔ تب تک عورت کی یہی حالت رہی پھر بٹھل کے ٹوکنے اور شانے سے جدا کرنے پر اسے کچھ ہوش آیا۔ بٹھل نے اس کی دل جوئی کا سلسلہ جاری رکھا۔ زورا اور جمرو نے بھی اسے اطمینان دلایا کہ وہ بالکل محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ گاڑی کسی چھوٹے اسٹیشن پر ٹھہری تھی کہ فوراً ہی چل پڑی۔ بہت دیر تک پھر ل نے اس سے کلام نہیں کیا۔ وہ بھی بت بنی سر جھکائے بیٹھی رہی اور اس کے ثبات و قرار' اس کے ہوش و حواس کی یکجائی کا یقین ہوا تو بٹھل نے اس کا نام پوچھا۔

عورت نے وحشت زدہ نظروں سے بٹھل کو دیکھا اور سسکتے ہوئے ہونٹوں سے کچھ بتایا۔ اس کی آواز اتنی ہلکی تھی کہ میں سن نہیں سکا۔ بٹھل کے دہرانے پر معلوم ہوا کہ اس کا نام سلمٰی بانو ہے۔

"تو' تو ہندنی نہیں ہے ری؟" بٹھل نے تعجب سے کہا۔

عورت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا سر اور جھک گیا۔

"پھر' پھر یہ ٹیکا! بندی!"

"اس نے' اس نے۔۔۔" سلمٰی بانو کی پلکیں مرتعش ہو گئیں۔ اس کی آواز ہی گھٹ گئی۔

"اس نے ایسا بولا تھا۔" بٹھل نے کہا "کون ہے رے وہ تیرا؟"

"سلمٰی بانو نے کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ سکی۔

"تیرا میاں ہے؟" بٹھل نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

سلمٰی بانو کے لیے جواب دینا پھر مشکل ہوا۔ اس طرح کی کوئی بھی عورت اتنی جلدی اجنبی مردوں کے سامنے زبان نہیں کھولتی۔

"اچ چھا' اچھا' ٹھیک ہے۔" بٹھل نے قدرے تامل کیا اور پوچھا "تیرا بھائی ہے؟"

سلمٰی بانو کا چہرہ پھر متغیر ہونے لگا۔

"دیکھ ری' ایسے گپ چپ میں دونوں کا گھاٹا ہوگا۔ اپنا بھی' تیرا بھی۔" اسے عواقب سے آگاہ کرنا اور باور کرانا ضروری تھا کہ ہم اسی صورت میں اس کے کسی کام آسکتے ہیں جب ہم سے کچھ ڈھکا چھپا نہ رہے۔ بصورت دیگر دونوں ہی کسی ناگہانی میں گھر سکتے ہیں' اور ہمارے لیے اتنا نہیں' یہ آدھا اعتماد بطور خاص اس کے لیے مزید الجھنوں' اذیتوں کا باعث ہو سکتا ہے۔ بٹھل نے اس سے کہا کہ وہ ایک پڑھی لکھی اور سمجھ بوجھ والی عورت معلوم ہوتی ہے۔ امکان تو نہیں ہے لیکن اگلے کسی اسٹیشن سے پھر سامنا ہو سکتا ہے اور ضروری نہیں کہ ہر بار اسی طرح نجات مل جائے۔

سلمٰی بانو کو بھی اس کا احساس ہوگا۔ اس کے چہرے کا رنگ' ہاتھوں کا اضطراب اور سانسوں کا زیر و بم یقیناً اندرونی خوف' حجاب یا حوصلے کی کمی کا مظہر تھا۔ نئے گرد و پیش سے مطابقت کے لیے اسے ایک مہلت تو چاہیے تھی۔ کبھی لفظ بھی کھو جاتے ہیں۔ ناگفتنی اور کسے کہتے ہیں؟ عرض مدعا کی مقدرت بھی ہر کس و ناکس کو نہیں ہوتی۔ یہ تو مدعا کی نوعیت پر بھی منحصر ہے۔

"کدھری جاتا ہے تجھ کو؟" بٹھل نے نرم لہجے میں پوچھا۔

سلمٰی بانو نے کچھ ہمت مجتمع کی اور کہا کہ دلی سے آگے

کسی بھی شہر میں۔
سلمٰی بانو نے بمشکل بتایا کہ اس کے ساتھی نے اس سے یہی کہا تھا۔
"تیرا گھر کدھری ہے ری؟" بٹھل نے الجھ کے پوچھا۔
"اب' اب کوئی گھر نہیں ہے۔" سلمٰی کی آواز بھرا گئی۔
"دیکھ ری! صاف صاف بول۔"
"ہاں بہنا! اپن کو پتہ ہے۔ ابھی تم کو یہ سارا بولنا کیسا بھاری ہے پر ٹیم ایک دم نئیں ہے۔ آگے اسٹیشن کسی ٹیم پر بھی آسکنے کا ہے۔ ابھی چپ رہے گا اور ٹھیک ٹھیک اپن کو نئیں بولے گا تو اپن سے کوئی بھی الٹ پلٹ ہو سکتا ہے' سمجھا!" زورا نے شفیق لہجے میں سلمٰی بانو کو جتانے کی کوشش کی۔
سلمٰی نے کچھ کہا تو نہیں' ایک ذرا پہلو بدل کے اس نے اپنے لباس میں کہیں دائیں طرف سے ایک بڑی سی پوٹلی نکال کے بٹھل کے سامنے کردی۔
"یہ' یہ کیا ہے؟" بٹھل نے حیرت سے کہا۔
"آپ' آپ' دیکھ لیں۔" سلمٰی زیر لبی سے بولی۔
"پر کیا ہے ری یہ؟"
"یہی تو' یہی تو۔۔۔" اس سے کچھ نہ کہا جاسکا۔
بٹھل نے کھدر کی پوٹلی اس کے ہاتھ سے اچک لی اور کچھ اوپر اٹھا کے اس کے وزن کا اندازہ کیا اور ہلا کے دیکھا۔ پوٹلی بھاری تھی اور کھنک رہی تھی۔ بٹھل نے اس کا بند کھول کے اپنے کرتے کے دامن میں لوٹ دی۔ جمرو' میں اور زورا اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ زر و جواہر کا ایک انبار بٹھل کے دامن پر بکھر گیا تھا۔ ترشے ہوئے ہیروں کی چمک آنکھیں خیرہ کررہی تھی۔ بٹھل نے مٹھی بھری اور واپس لوٹ دی "یہ' یہ کیا ہے ری! یہ تو بہت زیادہ ہے۔ یہ کدھری سے لیا تو نے؟" زورا کی مدد سے بٹھل نے جواہر پوٹلی میں واپس بھرے اور گانٹھ لگا دی "سنبھال کے رکھ ان کو۔" بٹھل نے سلمٰی بانو کی طرف پوٹلی بڑھاتے ہوئے کہا۔
"یہ میرے نہیں ہیں۔" سلمٰی نے آہستگی سے کہا۔
"پھر کس کے ہیں ری؟"
"آپ انہیں رکھ لیں۔"
"ہم رکھ لیں' ہم کیوں؟" بٹھل ناگواری سے بولا "ایسا کیسے۔ ہم کو ان کی کوئی ضرورت نہیں' اور تیرے پاس یہ زیادہ ٹھکانے سے رہیں گے۔"
"آپ انہیں رکھ لیجئے۔" سلمٰی بانو نے دوبارہ کہا۔ اس بار اس کی التجا میں قوت زیادہ تھی۔

"کیا' کیا بولتی ہے! کدھری سے لائی ہے یہ سارا۔
بچھو ہیں ری۔"
سرنگوں سلمٰی بانو بری طرح سسکنے لگی "مجھے بھی چاہئیں یہ۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں' یہ سانپ بچھو ہی ہیں
سلمٰی بانو کی حالت اضطراری ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں
مسلسل آنسو امڈ رہے تھے۔
"پھینک دیں ری پھر ان کو؟"
"آپ جیسا چاہیں' جو آپ کی مرضی ہو۔"
"کیسی ہے ری تو۔۔۔"
"میں چور نہیں ہوں' خدا جانتا ہے' میں چور
ہوں۔" سلمٰی بانو سراسیمگی سے بولی۔
"کون بولتا ہے سرا' ہم کو پتہ ہے' تو ہو بھی نہیں
اس کا دم اور ہوتا ہے۔ پر' پر یہ کیا ہے پھر؟"
"یہ چوری کے ہیں اور' اور چوری بھی۔۔۔" وہ بین کر
لگی اور اس نے اپنا منہ چھپا لیا۔
"تو نے ہی کی ہے۔ اس حرام کے جنے کے بولنے
تجھ کو اکیلی چھوڑ گیا ہے۔ ایسا ہی نا؟"
"جی' جی۔" سلمٰی بانو پھٹی پھٹی آنکھوں سے بولی"
نے زور دیا تھا' اسی نے مجبور کیا تھا۔ میں نے بہت منع
بہت منع کیا۔ میں تو پانچ برس سے انکار کررہی تھی۔"
"پانچ برس سے!" بٹھل کی تیوری چڑھ گئی "دیکھ
اپنے کو چاب چاب کے بولنا اچھا نہیں لگتا۔ جو بولنا
سیدھی طرح بول۔"
میں' زورا اور جمرو قریب کی نشست پر بیٹھ گئے۔
شروع میں سلمٰی بانو کی زبان اٹک رہی تھی لیکن پھر اس
استقامت استوار ہوتی گئی۔ اس دوران اس نے اتنا تو
لیا ہوگا کہ وہ جانوروں کے نرغے میں نہیں ہے۔ اس کی
کی لرزش سینے کی سوختگی کے بغیر ممکن نہیں تھی' چھلکتی
ہوئی آواز۔ چہرے پر گھنا سی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے بتا
اس کا تعلق روہیل کھنڈ کے شہر پیلی بھیت کے ایک زمیں
گھرانے سے ہے۔ شملے میں تعلیم کے دوران اس کے
نے لاہور کے کسی بڑے خاندان کی لڑکی سے شادی کرلی
لڑکی کے والدین بادل ناخواستہ تیار ہوئے تھے۔ سلمٰی با
باپ اپنی بیوی کو لے کر پیلی بھیت شہر واپس آیا تو اس کے
کلاہ بھائی بہنوں نے باہر کی بہو اور اس طرز کی شادی قبول
نہیں کی اور ایک طرح سے سماجی انقطاع کرلیا۔ ناچار
کے باپ نے اپنے حصے کی جاگیر اور زمینوں کا مطالبہ کر
خاندان سے الگ ہونا چاہا تو بھائیوں نے باہر سے لائی

رت سے دستبردار ہونے کی شرط عائد کی۔ خاندان کے
ارے چھوٹے بڑے اس کے خلاف سینہ سپر ہوگئے۔ انہوں
نے قدم قدم پر اپنے منحرف بھائی کے راستے میں رکاوٹیں
ھڑی کیں' الغرض سکون کی زندگی اس کے لیے محال بنا
ی۔
بات عدالت تک پہنچی۔ عدالت کے اپنے مرحلے
رتے ہیں۔ عدالت تو کسی کارخانے کے مانند ہوتی ہے۔ سو
رحلوں سے گزر کے انصاف کہیں صورت پذیر ہوتا ہے۔
رح طرح کی قانونی' موشگافیوں' سخن طرازیوں سے بد دل
وکے آخر سلمٰی کے باپ نے اپنا آبائی شہر ترک کیا اور دلی
اکے بس گیا۔ تھوڑے بہت اندوختے سے اس نے لال
نویں کے علاقے میں ایک چھوٹا سا گھر خریدا اور باقی پیسہ
جارت میں جھونک دیا۔ اس نے کئی کاروبار کیے لیکن
جارت کا نہ تو کوئی تجربہ تھا نہ مزاج سے مناسبت تھی۔ سو وہ
اکام رہا اور کشاکش روزگار میں دق کا مریض ہوگیا۔ وہ
ساس اور غیرت مند شخص تھا۔ دق ہی مرض الموت ثابت
ہوا۔ اس نے ترکے میں اپنے جواں سال بیٹے شہریار' نوخیز
بٹی سلمٰی اور قسمت گزیدہ بیوہ جہاں آرا کے لیے ایک ویران
گھر چھوڑا تھا۔ اس کے انتقال کے وقت سلمٰی کی عمر پندرہ اور
شہریار کی بیس سال کے قریب تھی۔ باپ کے بعض اوصاف
بیٹے کو وراثت میں ملے تھے۔ خودداری اور عزت نفس کے
اوصاف۔ گھربار چلانے کے لیے تعلیم چھوڑنا لازم تھا۔ ادھر
ماں باپ نے اپنے خاندان کے جور و ستم کی آگ اس کے سینے
میں کب سے فروزاں کی ہوئی تھی۔ ادھوری تعلیم کی وجہ سے
شہریار کو معقول ملازمت نہیں ملی اور ملازمت ایں نووارد
بساط کی طبع نازک سے کوئی میل بھی نہیں کھاتی تھی۔ اس
نے تجارت شروع کی بے سرمایہ تجارت عموماً شرمندگی سے دو
چار کرتی ہے۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر اس نے ضروریات کی
اشیاء کا خوانچہ بھی لگایا کہ ممکن ہے' اسی راستے پر کل کامیابی
کا سورج طلوع ہو۔ وہ تو باپ سے زیادہ ناتجربہ کار تھا۔ اسے
پھر ملازمت کرنا پڑی۔
ماں نے دوسروں کے گھر کام کاج کرکے کچھ لانا شروع
کردیا تھا۔ مناسب پڑھی لکھی تھی اس لیے محلے کی بچیوں
درس و تدریس سے بھی کچھ آمدنی ہونے لگی۔ زری کا کام بھی
اس نے سیکھ لیا تھا۔ سلمٰی بھی اس کا ہاتھ بٹانے لگی۔ سلمٰی گھر
باقاعدگی سے پڑھتی تھی اور اس نے کلام پاک کب کا مکمل
کرلیا تھا جیسے تیسے بہرحال ان کی گزربسر ہوتی رہی۔ بہن کی
دیکھا دیکھی بھائی نے بھی تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے کی کوشش

کی لیکن نہ تو وہ مزید تعلیم حاصل کرسکا نہ ٹھیک سے زمین پر اپنے قدم جما سکا۔ سلمٰی نے پرائیویٹ طور پر پہلے ہائی اسکول پھر انٹرمیڈیٹ کا امتحان دیا۔ پاس پڑوس کے گھروں سے اس کے متعدد پیام آئے لیکن ماں کو اپنا خاندانی پس منظر بہت یاد آتا تھا اور وہ کسی اچھے دن کی آس میں تھی۔ پر خواب الگ چیز ہے۔ تعبیر الگ چیز۔ اس زمانے میں سلمٰی کے بھائی کے ایک پختہ کار دوست ارشاد علی کی آمدورفت خوب ہوگئی تھی۔ ابتدا میں سلمٰی اس سے پردہ کرتی تھی۔ بعد میں ارشاد علی کی دقت بے وقت آمد اور گھریلو معاملات میں غیر معمولی عمل دخل کی وجہ سے پردہ برقرار نہ رہ سکا۔ ارشاد علی نکتہ رسی ودیدہ ریزی میں طاق تھا۔ دل داری و اشک شوئی کا فن بھی اسے اچھا آتا تھا۔ زبان میں لوچ تھا' لہجے میں تپاک۔ نرم خوئی شیوہ تھی۔ صاف ستھرا لباس پہنتا تھا' صاف ستھری باتیں کرتا تھا۔ ہر کام کے لیے ہمہ دم آمادہ' ہر مشکل کا ایک حل اس کے پاس موجود ہوتا تھا مگر ارشاد علی جیسے جاں فشاں' سرگرم دوست کی قربت کے باوجود روز بہ روز بڑھتی ہوئی دھوپ اور بڑھتے ہوئے اندھیرے نے شہریار کا چہرہ دھندلا دیا۔ ارشاد علی کی پیہم ترغیب اور حوصلہ افزائی پر اس نے باپ کی جاگیر پہ جاکے اپنا حق طلب کرنے کی ٹھانی۔ وقت کی گردشوں میں اس کے چچاؤں کا خون اور سفید ہوگیا تھا۔ کہتے ہیں' دولت ہمیشہ نشے میں ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنے بھتیجے کو کسی اعتنا کے لائق نہیں سمجھا اور بری طرح دھتکار دیا۔ آگ تو شہریار کے جسم و جاں میں ایک زمانے سے بھڑک رہی تھی۔ یہ ذلت و ہزیمت اس پر مستزاد تھی۔ پے در پے شکستوں نے اسے مجہول اور قنوطی بنا دیا تھا۔ ایک روز اس نے اپنے بڑے چچا کی بدسلوکی پر بندوق اٹھالی اور بے دریغ گولی چلا دی۔ وہ گرفتار کرلیا گیا۔ عدالت میں کئی برس مقدمہ چلا۔ ماں نے اونے پونے مکان بیچ کے وکیلوں کے اخراجات بھگتائے۔ بڑے بڑے حاکموں کے در پر جاکے عرضیاں گزاریں' بہت دادو فریاد کی' دامن پھیلایا۔ کوئی تدبیر کارگر ہوئی نہ دعا مستجاب۔ شہریار کو پھانسی کی سزا سنادی گئی۔

ارشاد علی ہر مرحلے پر سلمٰی کی ماں کے ساتھ رہا تھا لیکن وہ بھی ایک تہی دست شخص تھا۔ واللہ اعلم' اس کے کہنے کے مطابق ایک دفعہ تو اس نے اپنے عزیز از جاں' برادر مثال دوست شہریار کے مقدمے میں الٰہ آباد ہائی کورٹ کے وکیل کی خطیر فیس چوری کرکے ادا کی تھی۔ اکلوتے بیٹے کے صدمے سے جہاں آرا دیکھتے دیکھتے کھنڈر ہوگئی۔ اندر ہی اندر وہ گھلتی رہی۔ اسے اپنی جوان بیٹی کی بھی کوئی فکر نہ رہی۔ چار مہینے اس نے بیٹے کی جدائی میں بتائے اور کسی سے کچھ کہ سنا' ایک رات چپکے سے بیٹے کے پاس چلی گئیں۔

پھر ایک ارشاد علی' ایک وہی سایہ' چارہ گر و دم سلمٰی بانو کے لیے باقی رہ گیا تھا۔ ارشاد علی عمر میں اس خاصا بڑا تھا۔ سلمٰی بانو نے کبھی سوچا تک نہ تھا کہ ایک رو ناشدنی و ناکردنی بھی پیش آئے گی۔ ارشاد علی بھائیوں کی ط گھر آتا تھا۔ جہاں آرا کی زندگی میں اشارتاً بھی اس نے اس خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ مہربان' درد آشنا نے گساری کا یہ طور اختیار کیا کہ سلمٰی بانو کو شادی کی پیشک کردی۔ سلمٰی بانو میں اب کسی حیرت اور غم کی استطاعت نہ تھی۔ انکار تو دور کی بات ہے۔ خودکشی کا ایک راستہ لیکن خودکشی تو وہ ستم کش کرتے ہیں جن کے ہاں زندگی پر غ کرنے کے لیے کچھ بچا ہوتا ہے۔ سلمٰی بانو کا تو کوئی مدعا' مطالبہ ہی نہیں رہا تھا۔ یہ دنیا عورتوں کے لیے شاید بنی نہیں۔ ایک مرد تو یہاں تنہا رہ سکتا ہے' کوئی عورت ا جوان عورت بالکل نہیں رہ سکتی۔ ماں کے چلے جانے کے ا اردگرد والے چیل کوؤں کی طرح منڈیروں پر منڈلانے لگ ارشاد علی نے وہ محلہ ہی چھوڑ دیا اور کئی بستیاں دور جا سلمٰی کو محفوظ کیا یا محبوس کردیا۔ درد مندی کا دعوا کر والوں میں کسی ایک معتبر کا انتخاب کیا جاسکتا تھا۔ ہجوم کوئی ایک وفا پیشہ' قول و فعل کا پائیدار تو ضرور ہوگا۔ یہ ابھی اتنی جہنم بھی نہیں ہوئی ہے۔ پھول ابھی تک کھلتے خوشبو کے ساتھ۔

تنہائی بہت بڑا عذاب ہے اور بے اختیاری سب بڑی تنہائی' نوجوان سلمٰی اس دنیا سے بہت سہم گئی تھی حسن و جمال کی حامل عورتوں کو تو یوں بھی دریچوں' روزنو سے محتاط رہنا چاہیے۔ حسن و جمال بھی خزانے کے ما ہے' سانپ بٹھانے پڑتے ہیں اور سایوں پر شک کرنا پڑ ہے۔ ارشاد علی بھی دنیا کی نیرنگیوں اور شعبدہ کاریوں فسانے سلمٰی بانو کو بہت شدومد سے سنایا کرتا تھا۔ ایک د عصر کے بعد وہ محلے کے چند اجنبی لوگوں اور ایک قاضی کو گھ لے آیا پھر اسے سلمٰی کو تصویر کے دوسرے رخ' زندگی آم اور زندگی آموز قصے کہانیاں سنانے کی ضرورت پڑگئی۔ زند کا یہ ہے کہ کسی نہ کسی طور اپنی حیثیت پر مصر رہتی ہے۔ ا عرفان کامل کے باوجود کہ مال کیا ہے' آدمی زندگی کی ترغیبو یا اس کے بہکائے میں آجاتا ہے۔ موت کا خوف شاید بہ زیادہ ہوتا ہے کہ آدمی کانٹوں پر رات بسر کرلیتا ہے اور سو کے غروب ہونے کے آسرے میں شعلہ بار دن گزار دیتا ہے

اندھوں کو بھی ایک کنارہ تو ضرور دکھائی دیتا ہے۔

ارشاد علی کو جانے کہاں سے کوئی دفینہ ہاتھ لگ گیا تھا کہ دو ایک مہینے بعد وہ سلمٰی کو مسوری اور نینی تال کے کوہساروں میں لے گیا' وہاں سے لکھنؤ' کان پور' جے پور کی مٹرگشت میں کئی ہفتے گزار کے اس نے حیدر آباد دکن کے لیے کوچ کیا اور وہیں پڑاؤ ڈال دیا۔ سلمٰی بانو نے کبھی اس سے کہیں ٹھہر جانے کو کہا تھا نہ چل پڑنے کو۔ وہ ارشاد علی سے کوئی فرمائش کرتی تھی نہ شکوہ۔ وہ اپنے ہی پیروں سے چلتی تھی لیکن اپنا کوئی ارادہ نہ منزل۔ وہ آئینہ بھی دیکھتی تھی لیکن آئینے کی داد کی فکر نہ بے داد کی۔

حیدر آباد میں کچھ دن خاموشی سے گزار کے ارشاد علی نے سلمٰی بانو سے کہا کہ اب وہ بالکل قلاش ہوگیا ہے۔ زندگی بسری کے لیے کوئی معقول کام بھی سردست ہاتھ نہیں آرہا' اب سلمٰی بانو کچھ اس کا ساتھ دے۔ یہ حیدر آباد نواب راجاؤں کا شہر ہے۔ یہاں ان کی بڑی بڑی حویلیاں' محل دو محلے ہیں۔ دولت کی بہت ریل پیل ہے۔ انہوں نے ذرا احتیاط اور عقل سے کام لیا تو یہاں سے ایک نئی زندگی شروع کرسکتے ہیں۔ انہوں نے آخر کیا گناہ کیا ہے۔ کس جرم کی پاداش میں ان کے لیے زندگی کا یہ طور ہے۔ کیا یہی کسمپرسی و بے بسی مقدر رہے گی۔ اب کسی اور طرح بھی سوچنا چاہیے۔ یہ دنیا غریبوں اور ناداروں کے لیے نہیں ہے۔ یہ طاقت والوں کے لیے ہے اور طاقت صرف مال و دولت کی ہوتی ہے۔ بادشاہ غریب ہوجاتے ہیں تو تخت سے اتار دیے جاتے ہیں۔ ارشاد علی نے سلمٰی بانو سے کہا کہ شہریار کا غم اسے چین نہیں لینے دیتا۔ شہریار تو جیسے اس کے سینے میں دفن ہے۔ وہ اچانک سامنے آکے کھڑا ہوجاتا ہے اور کہتا ہے' دوست! تم تو بس تماشائی بنے رہے۔ شہریار کی وجہ سے اماں بھی چلی گئی۔ وہ اس کی ماں بھی تو تھی۔ اب اس کی ایک ہی تمنا ہے کہ جو کام شہریار سے نہ ہوسکا' اسے وہ انجام دے' تبھی شاید شہریار اور ماں کی روحوں کو کچھ قرار آئے۔ ایک روز وہ سلمٰی کے باپ' اپنے خسر کی جاگیر پہ ضرور جائے گا اور شہریار کی طرح نہیں۔ اسے اندازہ ہے کہ وہاں جاتے ہوئے شہریار کے پاس کس چیز کی کمی تھی۔ ارشاد علی اس کوتاہی کا اعادہ نہیں کرے گا۔ حق نہیں ملتا تو چھین لینا چاہیے مگر چھیننے کے لیے ایک تحمل شرط ہے۔ اس کے دماغ میں ایک تدبیر ہے۔ سلمٰی کا کام یہ ہے کہ وہ اس کی ہدایت پر عمل کرتی رہے اور یقین رکھے کہ ایک دن ضرور ایسا آئے گا جب تیر بھی ان کے ہاتھ میں ہوں گے' کمان بھی۔ ارشاد علی نے بتایا کہ ایک بزرگ شناسا نے اس کی درخواست پر ریاست کے ایک مشہور نواب کے زنان خانے میں خادمہ کے طور پر سلمٰی کی ملازمت کے لیے بات کی ہے۔ سلمٰی کو وہاں اپنے حسن خدمت' سلیقہ شعاری اور پارسائی کے نقش ثبت کرنے ہیں اور خاطر جمع رکھنی ہے کہ ایک روز اسے اپنے گھر واپس آنا ہے۔ ایسے گھر میں جو اپنے مکینوں سے عداوت نہ رکھتا ہو' آندھیوں اور بلاؤں سے محفوظ ہو' جہاں زندگی ان کے اشاروں کی مرہونِ منت ہو۔

ارشاد علی نے سلمٰی کو تاکید کی کہ اس نے بوجوہ سلمٰی سے اپنے ازدواجی رشتے کے بارے میں اپنے شناسا کو نہیں بتایا ہے۔ سلمٰی کو بھی نواب کی حویلی میں ارشاد علی کے متعلق یہی تاثر دینا ہے۔

سلمٰی نے ارشاد علی سے کوئی جرح نہیں کی۔ وہ سر جھکائے سنتی رہی اور اگلے روز ارشاد علی نے اپنے مربی کے ہمراہ حویلی کا رخ کیا تو چوں و چرا کیے بغیر وہ ان کے ساتھ چلی گئی۔

حویلی کی دنیا ہی اور تھی۔ چاروں طرف سبزہ زار کے وسط میں دودھیا مائل سرمئی رنگ کے پتھروں سے بنی ہوئی ایک وسیع و عریض عمارت' حوض' فوارے' منقش در و بام' قالین' زرنگار پردے' فانوس۔ حویلی میں ریشم اور شیشے کی افراط تھی۔ اور پھولوں سے مکینوں کو خاص شغف تھا۔ وہاں دھوپ مکینوں کی اجازت سے در آتی تھی۔ پریوں کے دیس کی بہت سی کہانیاں سلمٰی نے سنی اور پڑھی تھیں۔ حویلی میں صرف پریاں نہیں تھیں' باقی سب کچھ پریوں کے دیس جیسا تھا۔ سلمٰی کو وہاں تازہ ہوا کا احساس ہوا۔ جیسے آنکھ کھل جائے اور کوئی رنگین خواب آمادہ تعبیر ہو۔

سلمٰی نے حال ہی میں شہروں' شہروں ارشاد علی کی ہم سفری میں جانے کتنی طلسماتی اشیا اور عمارتیں دیکھی تھیں مگر اشیا آدمی کا بدل کہاں ہوتی ہیں۔ عمارتوں کی شان و شوکت سے مراد آدمی کی آسودگی نہیں ہے۔ سو اس نشاط خاطر کا سبب حویلی کی نادر و نایاب اشیا کی سحرکاری نہیں تھا۔ اصل تو حویلی کے مکین تھے۔ شستہ و شائستہ' خوش وضع و خوش گفتار۔ وہ اونچی آواز میں بات نہیں کرتے تھے۔ زنان خانے میں حویلی کی معزز خواتین کی حکومت تھی۔ ان کے گرد محکوم باندیاں چہچہاتی پھرتی تھیں۔ زنان خانے میں معدودے چند خاص خاص مردوں کا گزر ہوتا تھا۔ شروع شروع میں وہاں سلمٰی کو کچھ اجنبیت محسوس ہوئی تھی مگر رفتہ رفتہ وہ در و دیوار سے اور در و دیوار اس سے مانوس ہوگئے۔

سلمٰی بانو کے انکسار، حجاب، کم سخنی و نرم خوئی، سلیقہ شعاری و مستعدی نے زنان خانے کی مالک و مختار خواتین کو جلد ہی اس کا گرویدہ کردیا۔ یہ بات حویلی کی پرانی خادماؤں کو بہت ناگوار گزری لیکن سلمٰی کی بے نیازی اور بے غرضی سے الٹا انہیں شرم سار کیا۔ بعد میں تو وہ سلمٰی سلمٰی کا درد کرنے لگیں۔ سلمٰی نے نہیں بتایا لیکن قیاس کیا جاسکتا تھا، خوش اطواری اپنی جگہ، حویلی میں سلمٰی کی قبولیت اور پذیرائی میں کچھ اس کی خوش رخی و خوش اندامی کو بھی دخل ہوگا۔ حویلی کے مرصع و مسجع ایوانوں سے اس کے تاب ناک چہرے، قامت زیبا، رفتار گفتار کی بڑی مناسبت ہوگی۔ وہ تو حویلی ہی کا حصہ معلوم ہوتی ہوگی۔ خوش روئی کا ظاہری وصف اضافہ ہی ہوتا ہے۔ اتنے صدموں کی تپش کے بعد حویلی کی لطیف، عطر بیز ہواؤں میں اس کا روپ اور نکھر جانا چاہیے۔ وہ تو وہاں ویسے بھی بہت سوں میں ممتاز ہوگی۔ تمکنت تو اب بھی اس کے چہرے پر خوب تھی۔

آدمی کو کبھی خود احساس نہیں ہوتا کہ کون سا رنگ آنکھوں کے لیے خار ہے اور کون سا کلام سماعت کے لیے آزار اور لوگوں کا بھی یہی ہے، کون سے لوگ سینے میں گھٹن کرتے ہیں۔ ان کے دور ہوجانے ہی پر ان کی گراں باری کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ حویلی میں آکے سلمٰی بانو کو معلوم ہوا کہ ارشاد علی تو کابوس کے مانند تھا۔ وہ تو اس کے لیے کوئی پنجرا تھا۔ ماں اور شہریار کی یاد اسے بہت رلاتی تھی لیکن کبھی زندہ آدمی کا غم مرنے والے سے کہیں شدید ہوتا ہے۔ ارشاد علی کا خیال سلمٰی کے لیے زیادہ سوہان روح تھا۔

تین مہینے گزر گئے۔ ارشاد علی، سلمٰی کی خیر خبر لینے نہیں آیا۔ زبان سے نہیں تو دل ہی دل میں جانے کتنی بار سلمٰی نے دعا کی کہ خدا کرے، اب ارشاد علی کبھی نہ لوٹے۔ حویلی کی بیگمات اور سلمٰی کی ساتھی باندیوں نے کئی مرتبہ اس کا ماجرا جاننے کی جستجو کی۔ ارشاد علی کے تعلیم کیے ہوئے آموختے کے مطابق سلمٰی نے پوری احتیاط کی اور دلی کے بجائے پانی پت سے تعلق ظاہر کیا اور صرف خلاصہ بیان کرنے پر اکتفا کی کہ سر پہ ماں باپ میں سے کوئی نہیں ہے۔ صرف ایک بھائی ارشاد علی ہے۔ ہر بار وہ اسی بیان کی تکرار کرتی رہی۔ اس نے اپنی تعلیم کے بارے میں بھی زیادہ کچھ نہیں بتایا، بس اتنا کہ حرف شناسی کی معمولی شد بد رکھتی ہے مگر علم بھی مشک کے مانند ہوتا ہے۔ اس کے رکھ رکھاؤ، ٹھہراؤ، معاملہ فہمی، جز رسی اور نفاست و نزاکت نے حویلی کے مکینوں کو حیران کن مسرتوں سے دو چار کیا تھا۔ ہر ایک کی کوشش ہوتی تھی کہ سلمٰی اس کی جناب میں حاضر رہے۔ وہ اسے قیمتی ملبوسات، زر نقد، خوشبوؤں اور زیوروں سے نوازتی تھیں۔ یہ تحائف سلمٰی انہی کی تحویل میں دے دیا کرتی تھی کہ جب ضرورت ہوگی، وہ انہیں واپس لے لے گی۔

تین ماہ سے کچھ دن اوپر ہوئے تھے کہ ایک شام اسے حویلی میں ارشاد علی کی آمد کی خبر دی گئی۔ سلمٰی کے بقول اس کا دل دھڑ دھڑانے لگا۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ مفر کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اسے ارشاد علی کے روبرو حاضر ہونا پڑا۔ توقع کے خلاف ارشاد علی نہایت متانت سے پیش آیا۔ اس نے حویلی میں سلمٰی کا جی لگنے اور حویلی کے مکینوں کی نگاہ میں سلمٰی کی قدر و منزلت پر شکر ادا کیا اور کہا کہ بس وہ اسی خوش اسلوبی سے حویلی میں کچھ عرصہ اور گزار دے۔ اپنے بارے میں ارشاد علی نے بتایا کہ وہ ہر سمت ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ حیدر آباد سے وہ بمبئی چلا گیا تھا۔ وہاں کسی کی شراکت میں تھوڑا بہت کاروبار شروع کیا تھا اور فریب کھا گیا۔ جو ہاتھ میں تھا، وہ بھی گنوا دیا۔ ارشاد علی نے سلمٰی بانو کی ماں اور بھائی کے لیے پھر اپنے حسرت و الم، کرب و اضطراب کا اظہار کیا۔ شہریار کے ذکر پر ارشاد علی کی آنکھیں بھر آئیں اور آواز جلنے لگی۔ اس کے جذبہ و جوش کا وہی عالم تھا کہ چاہے کچھ ہوجائے، ایک دن اسے سلمٰی کا گھر اجاڑنے والوں کے پاس ضرور جانا ہے۔ وہ اسی لیے ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔ وہی جانتا ہے کہ سلمٰی کی جدائی اس پر کیسی شاق گزرتی ہے۔ اس کا تو اب کوئی گھر ہے نہ در۔ اس نے خاکستر کرید کے سلمٰی کو اور بے حال کیا۔ اس کی آہ زاری میں ایسا تاثر تھا کہ ایک بار تو سلمٰی بھی متزلزل ہوگئی۔ اس کے جی میں آئی کہ خنجر لے کر نکل کھڑی ہو اور اپنی آبائی جاگیر پر جاکے دم لے۔ اس جاگیر کا اس نے ذکر ہی سنا تھا، دیکھی کبھی نہ تھی۔ سلمٰی بانو نے خود پر جبر کیا اور آنسو بہا کے رہ گئی۔ ارشاد علی ایک پہر ٹھہر کے واپس چلا گیا۔

دوسری مرتبہ وہ خاصے طویل وقفے بعد آیا۔ اس کا حال ایسا شکستہ نہیں تھا۔ سلمٰی نے کچھ نقدی اور حویلی کے عطا کردہ تحائف اس کے حوالے کرنے چاہے۔ ارشاد علی نے انہیں ہاتھ نہیں لگایا، کہنے لگا کہ یہ سلمٰی کے پاس زیادہ محفوظ رہیں گے۔ وہ انہیں سنبھال کے رکھے۔ اگلی منزلوں میں کام آئیں گے۔ وہ اپنی گزر اوقات کسی طرح کرلیتا ہے۔ جس روز ستارے مہربان ہوگئے اور وہ اپنی مساعی میں کامیاب ہوگیا، سلمٰی کو یہاں سے لے جائے گا۔ اس نے سلمٰی کے تئیں حویلی کے مکینوں کے رویے کے بارے میں پوچھا۔ سلمٰی نے ازراہ احتیاط انکسار سے کام لیا کہ وہ بہ قدر توفیق اپنی سی کرتی ہے۔ بہ ظاہر تو سبھی مطمئن نظر آتے ہیں، دلوں کا حال خدا جانتا ہے۔ وہ بہرحال ایک باندی ہے اور اپنی حد سے تجاوز نہیں کرتی۔ ارشاد علی آہ بھر کے بولا، اسے اس تلخ حقیقت سے اچھی طرح آگہی ہے کہ یہ تو ایک مستقل ایثار ہے۔ ہر ایثار ایک مشقت، ایک جبر ہے لیکن یہی ایک راستہ ہے اور یہ تو ایک مرحلہ ہے۔ سلمٰی کو یہی جفاکشی کرتے رہنا ہے۔ خدمت سے قرب عبارت ہے۔ قرب، اعتماد کی علامت ہے، اور اعتماد سے مراد ہے کہ ان کی منزل دور نہیں ہے۔ ارشاد علی نے نمک پاشی کی کہ سلمٰی تو خود گواہ ہے۔ دہائیوں سے انصاف نہیں ملتا۔ سلمٰی کو یہ نکتہ ہر دم پیش نگاہ رکھنا ہے کہ وہ ایک مقصد سے حویلی میں موجود ہے اور اس پر کئی قرض واجب ہیں۔ کچھ صاف تھا اور بہت کچھ مبہم و موہوم۔ ارشاد علی کے لفظ پہلو دار تھے اور لہجہ بین السطور کے مانند رمز آمیز تھا۔ سلمٰی کشمکش میں پڑ گئی۔ ارشاد علی نے مزید صراحت نہیں کی۔ سلمٰی نے بھی خاموشی میں مصلحت جانی کہ مبادا عقدہ کشائی بہت زہریلی ہو۔ دوسری سانس میں ارشاد علی سمائی سے باہر کوئی بات نہ کہہ دے۔ ارشاد علی اسے حیرت زدہ، خوف زدہ چھوڑ کے چلا گیا۔ کئی دن تک وہ گم صم رہی اور اپنے طور پر گرہیں کھولتی رہی۔ جتنا وہ سوچتی تھی، اتنا ہی اسکا دل ڈولنے ہونے لگتا تھا۔ دن گزر گئے۔ ارشاد علی واپس نہیں آیا تو سلمٰی کو کچھ چین نصیب ہوا۔ اس سکون کی وجہ کچھ اس کی اپنی استواری بھی تھی۔ اسے اپنا عزم پختہ کرنے کا اچھا وقت مل گیا تھا۔

سلمٰی کو حویلی میں ٹھہرے ڈیڑھ سال ہوگیا تھا۔ کئی ماہ بعد ارشاد علی خستہ حالت میں اس کے پاس آیا۔ سلمٰی نے طے کرلیا تھا کہ اگر اس نے کوئی ایسی ویسی ہدایت دی تو وہ صاف انکار کردے گی مگر ارشاد علی کے سامنے جانے پر سب کچھ گڈمڈ ہوگیا۔ ارشاد علی نے بتایا کہ اسے ایک سودے میں بہت بڑا گھاٹا ہوگیا ہے۔ کاروبار شاید اسے راس نہیں ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا، کون سی چوک ہوجاتی ہے۔ جلد سے جلد زیادہ پیسہ سمیٹنے کی جستجو میں یا تو وہ بروقت فیصلے نہیں کرپاتا یا اسے آدمی کی پہچان نہیں ہے۔ لوگ اسے دھوکا دے جاتے ہیں۔ سلمٰی کو پہلی بار اس پر ترس آیا۔ اس نے جمع کی ہوئی ساری نقدی اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ ارشاد علی نے دبے لہجے میں کہا کہ یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ سلمٰی کے پاس بیگمات کے عطا کیے ہوئے چھوٹے موٹے زیور محفوظ تھے۔ وہ بھی اس نے ارشاد علی کی نذر کردیے۔ ارشاد علی کی تسلی نہیں ہوئی۔ سلمٰی پر بیگمات کی خاص توجہ اور عنایات تھیں۔ وہ اگر ان سے کچھ طلب کرتی تو کبھی منع نہ کریں لیکن ان کے آگے ہاتھ پھیلانا اسے گوارا نہیں ہوا۔ ارشاد علی وہیں ٹھہرا رہا، ایک دن، دو دن، تین دن۔ سلمٰی کی کچھ عقل میں نہیں آتا تھا کہ وہ کس طرح ارشاد علی کو مطمئن لوٹائے۔ آخر ارشاد علی نے ندامت زدہ لہجے میں کہا کہ وہ سلمٰی پر بوجھ بننا نہیں چاہتا لیکن پھر وہ کہاں جائے، سلمٰی ہی بتائے کہ وہ کس دروازے پر جاکے دستک دے۔ قرض داروں نے اس کی زندگی عذاب کردی ہے۔ وہ ان سے منہ چھپائے چھپائے پھر رہا ہے۔ کیا وہ نہیں سمجھتا کہ سلمٰی کے لیے کچھ مانگنا مناسب نہیں ہے۔ سلمٰی اگر واقعی اس کی مدد پر آمادہ ہے تو اس کی ایک تجویز ہے۔ یہی ایک صورت ہے کہ سلمٰی کوئی قیمتی پتھر یا زیور اس کے حوالے کردے۔ بیگمات کے پاس جواہر کا انبار ہوگا۔ عرصے تک تو شاید کسی کو پتہ بھی نہ چلے اور کبھی چلا تو زنان خانے کی مقرب خاص سلمٰی بانو پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ ارشاد علی کی یہ شرم ناک صلاح سلمٰی کے ہوش و حواس کے لیے تازیانہ تھی۔ اس نے یکسر منع کردیا کہ وہ ایسا کام ہرگز نہیں کرسکتی، وہ ایسا کر ہی نہیں سکتی لیکن ارشاد علی وہیں جم گیا تھا۔ اسے ایک بڑی رقم کی ضرورت تھی۔ اس نے وعدہ کیا کہ جو کچھ سلمٰی اس کے سپرد کرے گی، وہ اسے گروی رکھ کے مطلوبہ رقم حاصل کرے گا اور جیسے ہی حالات موافق ہوئے، وہ یہ امانت واپس کردے گا۔ سلمٰی کی تو راتوں کی نیند اڑ گئی۔ کھانا پینا حرام ہوگیا۔ بزرگ بڑے نواب بھی اس سے کمال مہربانی سے پیش آتے تھے۔ سلمٰی ارادے باندھتی رہی کہ ان کی خدمت میں جاکے عرض گزارے۔ سلمٰی کی ہم عمر، بڑے نواب کی بھتیجی خجستہ بھی سلمٰی کی والہ و شیدا تھی۔ کسی کے پاس جاکے اپنی راہ و رسم آزمانے کی ہمت ہی سلمٰی کو نہیں ہوئی۔ اس سے ارشاد علی کی منتیں اتنی ہی شدید ہوگئیں۔ جب تک بڑی بیگم کا ناپسندیدہ، قدیم طرز کا ایک جڑاؤ ہار سلمٰی نے ارشاد علی کی جھولی میں نہیں ڈال دیا، وہ حویلی سے نہیں ٹلا۔

دوسرے چاہے کتنا ہی ذلیل کریں، سب سے بڑی ذلت تو آدمی کا اپنی نظروں سے گر جانا ہے۔ ارشاد علی بہت بہت شکریہ ادا کرکے اور وعدے وعید کرکے چلا گیا لیکن سلمٰی کے لیے حویلی میں کانٹے بچھا گیا۔ سلمٰی کو بہت پچھتاوا ہو رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ کس طور ازالہ کرے۔ کنویں میں ڈوب مرے یا زہر پی لے۔ اس نے ہر ممکن احتیاط برتی تھی۔ کئی ماہ تک کسی کو خبر نہیں ہوئی پھر کسی تقریب کے موقع پر زیوروں کے انتخاب کے دوران ذخیرے میں ایک ہار کی کمی کا

چرچا ہوا تو حویلی میں کہرام مچ گیا۔ کسی نے سلمٰی پر شک نہیں کیا۔ اس سے تو پوچھا بھی نہیں گیا۔ تمام باندیاں بڑی بیگم کے سامنے پیش کی گئیں۔ حلف اٹھوائے گئے اور تلاشیاں لی گئیں۔ ستاروں کی شعبدہ بازی پھر کسے کہتے ہیں۔ تلاشی میں گل چہر نامی ایک نوجوان خادمہ کے سامان میں کسی بیگم زادی کی بالی دستیاب ہوئی۔ یہ بالی معمولی قدر و قیمت کی تھی اس لیے اس کی گمشدگی پر اتنی توجہ نہیں دی گئی تھی۔ گل چہر اچھی شکل و صورت کی ایک سلیقہ شعار' شگفتہ مزاج لڑکی تھی۔ ہر وقت چہکتی رہتی تھی۔ وہ بین کرتی رہی کہ گمشدہ ہار سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ کسی کو بھی یقین نہیں آیا۔ اسے بے لباس کرکے کیڑے مکوڑوں سے بھری ہوئی ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں کئی دن تک بھوکا پیاسا رکھا گیا۔ اس کی دل دوز چیخیں حویلی میں دور دور تک گونجتی تھیں۔ اس کے مسلسل انکار پر مزاج خسروی اور مکدر ہوا۔ گل چہر کے ناخن کھینچے گئے۔ اس کے بال بہت لمبے اور گھنے تھے' گھٹنوں تک دراز ہوتے تھے۔ بڑی بیگم کے حکم پر اس کا سر مونڈ دیا گیا۔ سلمٰی اپنا سینہ کھرچتی' اپنا چہرہ کھسوٹتی رہی' کئی بار اس نے عزم کیا کہ بے گناہ گل چہر کو عتاب سے بچانے کے لیے وہ اقرار کرلے مگر اس کے اعصاب نے جواب دے دیا۔ تا ایں کہ بڑی بیگم نے گل چہر کی ناک قطع کرنے کا فرمان جاری کیا۔ کسی کو صدا بلند کرنے کی مجال نہیں تھی۔ بڑی بیگم کو حکم دینے کی دیر لگتی تھی۔ سلمٰی کے لیے اب تماشائی بنے رہنا ممکن نہ رہا۔ جتنا گل چہر بھگت چکی تھی' اس کا تو کوئی مداوا نہیں تھا۔ سلمٰی اب یہی کرسکتی تھی کہ اپنے آپ کو پیش کردے۔ کسی بہتری کی تاریک امید میں وہ بڑی بیگم کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور اس نے بیگم کے پیروں پر سر رکھ کے پیر پیغمبروں کے' اولاد کے' اقبال کے واسطے دیے۔ سلمٰی نے خود سے عہد کیا تھا کہ بڑی بیگم نے اس کی بات نہ مانی تو اپنے جرم کا اعتراف کرلے گی۔ سلمٰی اسے بہت عزیز تھی۔ گل چہر کو بوڑھی ماں' تین چھوٹے بہن بھائی سمیت اسی دم حویلی سے نکال دیا گیا۔ گل چہر اپنے ہوش سے بے پروا ہوگئی تھی' جیسے کسی کو نہ پہچانتی ہو' کسی سے اس کا کبھی کوئی ناتا نہ رہا ہو۔ وہ لوٹ لوٹ کے حیران و پریشان نظروں سے حویلی کے در و بام دیکھتی رخصت ہوگئی۔

کچھ عرصے بعد ارشاد علی واپس آیا تو نسبتاً بہتر حال میں تھا۔ آنکھیں ممنونیت سے لب ریز تھیں۔ کہنے لگا کہ سلمٰی کی بر موقع اعانت نے اس کی عزت رکھ لی۔ وہ دن بھر کے لیے حویلی میں ٹھہرا اور اس نے سلمٰی کو کسی اور امتحان سے دوچار نہیں کیا۔ وہ اپنی روداد سناتا رہا اور اسے سلمٰی کی ماں اور شہریار یاد آگئے۔ بھولی بسری یادیں دہراتا اور آہیں بھرتا تھا۔ مختصر مختصر وقفوں سے وہ حویلی میں آتا رہا' کبھی ایک پہر' کبھی دن رات کے لیے پھر ایک طویل غیر حاضری کے بعد وہ آیا تو بہت الجھا ہوا تھا' برگشتہ اور بے زار سا۔ اس نے سلمٰی سے کہا کہ اب مزید تاخیر اس کی برداشت سے باہر ہے۔ اس نے ہر جتن کرکے دیکھا اور حاصل یہ نکلا کہ قسمت ہی اس کے ساتھ نہیں ہے۔ شاید اسے یک سوئی جو میسر نہیں ہے۔ وہ پورے انہماک سے کوئی کام شروع کرتا ہے' ذرا آگے چل کے جب کام میں جماؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے' اس کا دماغ بھٹکنے لگتا ہے۔ اسے ماں اور شہریار کی یاد ستانے لگتی ہے' اس کا خون رگیں کاٹتا رہتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ دل جمعی سے کر بھی کیا سکتا ہے۔ اس نے کسی تمہید اور تکلف کی ضرورت نہیں سمجھی اور سلمٰی سے کہا کہ وہ حویلی سے زر و جواہر کا ذخیرہ غائب کردے۔ یہ لوگ برباد نہیں ہوجائیں گے۔ ان کے پاس صرف یہی نہیں' زمینیں' جاگیر بہت کچھ ہے۔ ان کے پاس جانے کتنے بے کسوں کا خون ہے۔ یہ سن کر سلمٰی کا جو حال ہونا چاہیے تھا' وہی ہوا۔ اس کا سر گھومنے لگا۔ وہ تو بالکل ہی گنگ ہوگئی۔ ارشاد علی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کے دل سوز لہجے میں کہا کہ وہ ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرے اور سوچے بغیر کوئی جواب نہ دے۔ وہ اپنی ماں اور اپنے بھائی کو بھولی تو نہ ہوگی۔ ان کے لاشے انہی ہاتھوں نے اٹھائے ہیں۔ ان پر کیا کیا ستم نہیں ٹوٹے تھے۔ اس کا باپ بھی تو انہی حالات کی بھینٹ چڑھ گیا تھا پھر اس نے آخر سوچا کیا ہے۔ کیا بس یہی منزل ہے کہ سلمٰی ان امرا اور بیگمات کی خدمت کرتی رہے اور ارشاد علی دربدر مارا مارا پھرتا رہے۔ جہاں سلمٰی کی حکمرانی ہو' کیا سلمٰی کو ایسے کسی گھر کی طلب نہیں ہے؟ کیا اسے بچوں اور گھرداری کی خواہش نہیں ہے؟ ارشاد علی نے تکرار کی کہ وہ سلمٰی کو محض اس لیے خود سے جدا کرنے اور حویلی میں رکھنے پر تیار ہوا تھا کہ دونوں کو جمعیت خاطر کے لیے کچھ وقت مل جائے اور ممکن ہے' اس دوران ہوا کا رخ بدل جائے' آسمان ان پر مہربان ہوجائے' اور وہ صاف صاف بتائے۔ بے شک سلمٰی کو حویلی میں ٹھہرانے کا ایک مقصد اور بھی تھا کہ اگر ارشاد علی اپنی تگ و دو میں ناکام ہوجائے تو مجبوراً حویلی والوں سے کچھ حاصل کیا جائے۔ جن کے پاس ہر چیز کی افراط ہے مگر خدا گواہ ہے' اس کے ذہن میں اس مذموم ارادے کو اولیت نہیں تھی۔ اس نے تو پہلے اپنے ہی بل پر کچھ کرنے کو ترجیح دی تھی۔ سلمٰی کے باپ کی جاگیر پہ جانے

کے لیے تیر کمان' خنجر و بندوق سے مسلح ہونے کی اتنی اہمیت نہیں' جتنی مال و زر کی ہے۔ ارشاد علی نے کہا کہ سلمٰی ایک سادہ دل اور معصوم لڑکی ہے۔ اس پاک باطن کے لیے یہ کام بہت مشکل ہے لیکن اس کے بغیر وہ دونوں یوں ہی گھٹ گھٹ کے تمام ہوجائیں گے۔ اسے معلوم ہے' یہ ایک گناہ بھی ہے پر انہوں نے کیا گناہ کیا تھا۔ انہیں کن گناہوں کی سزا دی گئی ہے۔ ارشاد علی نے اور بھی بہت کچھ کہا۔ اس کی بہت سی باتیں دل کو چھوتی تھیں اور تن بدن میں آگ لگاتی تھیں۔ تاہم سلمٰی نے انکار کردیا۔ ارشاد علی نے اس وقت زیادہ اصرار نہیں کیا اور چلا گیا۔

تین سال اور گزر گئے۔ اس مدت میں ارشاد علی سلمٰی کو ہموار کرنے کے لیے نت نئی دلیلیں وضع کرتا اور آزماتا رہا۔ جرات کی کمی' خوف' حویلی میں بڑھتی ہوئی بندشیں' باندیوں پر بیگمات کے اٹھتے ہوئے اعتماد' زر و جواہر کے ذخیرے کی محفوظ جگہ منتقلی اور پہلے سے زیادہ نگرانی۔ سلمٰی سے بڑی بیگم کی ناراضی وغیرہ۔ سلمٰی بھی ارشاد علی کو باز رکھنے کے لیے طرح طرح کی حیلہ جوئیاں کرتی۔ طرح طرح کے فسانے تراشتی رہی۔

تین سال بڑی مدت ہوتی ہے۔ سلمٰی کے پاس عذر ختم ہوگئے تھے اور ارشاد علی بھی تاویلوں سے غالباً تھک چکا تھا۔ یہ مدت کسی کا بھی پیمانہ لبریز ہونے کے لیے کافی ہے۔ ابھی چند دن پہلے کی بات ہے' ارشاد علی نے سلمٰی کو متنبہ کیا اور کہا کہ لگتا ہے' سلمٰی کو اس پر اعتبار نہیں ہے اور لگتا ہے' سلمٰی نے ازدواجی رشتہ دل سے قبول نہیں کیا ہے۔ کوئی بات نہیں۔ یہ سلمٰی کا حق ہے۔ جہاں تک ارشاد علی کا معاملہ ہے' سلمٰی ہی اس کی زندگی ہے۔ ارشاد علی تو ابتدا سے ایک در ماندہ شخص ہے۔ ماں تو پہلے ہی چلی گئی تھی' پندرہ برس کا تھا کہ باپ بھی جدا ہوگیا۔ اعزا نے بھی ازاں بعد گھر کے دروازے بند کرلیے۔ وہ تو کب سے ٹھوکریں کھا رہا تھا کہ اسے شہریار جیسا بھائی مل گیا اور جہاں آرا جیسی ماں نصیب ہوگئی۔ اس نے تو پھر انہی کے گھر کو اپنا گھر جانا۔ ان کی چھاؤں میں آکے ایسا لگا' اب ساری کلفتوں' اذیتوں سے نجات مل گئی۔ اس کا بھی سلمٰی کے سوا کوئی نہیں۔ سلمٰی تو اس کے بارے میں سبھی کچھ جانتی ہے۔ سلمٰی خود بتائے' وہ دن یاد کرے۔ ماں کے چلے جانے کے بعد جب گھر کی چھت بے سایہ' دیواریں بے پردہ ہوگئی تھیں۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور گلی میں کتوں نے بھونکنا شروع کردیا تھا۔ سلمٰی کے تحفظ کے لیے پھر ارشاد علی کیا کرتا۔ یقیناً وہ کسی طور سلمٰی کے لیے موزوں نہیں تھا لیکن لوگوں کی زبانوں کو لگام دینے کے لیے یہی ایک طریقہ' یہی ایک راستہ رہ گیا تھا۔ اسی صورت وہ سلمٰی کے لیے مددگار ثابت ہوسکتا تھا جب سلمٰی پر اسے کوئی استحقاق ہو۔ وہ سلمٰی کو شجرہ نسب جانے بغیر کسی ایرے غیرے کے حوالے تو نہیں کرسکتا تھا۔ اب اس سے علیحدگی کی کوئی خواہش سلمٰی کے دل میں چھپی ہو تو سلمٰی ایک اشارہ کردے اور یقین رکھے کہ وہ اس کی راہ میں مزاحم نہیں ہوگا اور نہ سلمٰی سے اس کا روحی تعلق ختم ہوگا۔ ارشاد علی نے کہا کہ بس اس کی ایک درخواست ہے۔ اسے اپنے عہد کی تکمیل کا ایک موقع ضرور دیا جائے۔ اس کے بعد سلمٰی کو کوئی بھی فیصلہ کرنے کا اختیار ہے۔ اس کے بعد ارشاد علی کو خود سے' سلمٰی سے اور دنیا سے کوئی شکوہ نہ ہوگا۔

ارشاد علی کی باتوں میں بڑی حد تک سچ تھا۔ حویلی میں سلمٰی کے آنے کے بعد اتنی بار وہ حویلی آیا' اس نے کبھی سلمٰی کو اپنے ازدواجی تعلق کی یاددہانی نہیں کرائی۔ جیسا کہ حویلی کے مکینوں کو تاثر دیا گیا تھا' وہ سلمٰی سے ایک بھائی کے بہروپ ہی میں ملتا رہا۔ اس نے روزنوں کو بھی شک کرنے کا موقع نہیں دیا۔

سلمٰی کو اس نے بری طرح منتشر کردیا تھا۔ دو دن ہوئے' اس نے تین سال پہلے چرایا ہوا بڑی بیگم کا جڑاؤ ہار سلمٰی کے آگے رکھ دیا۔ ہار دیکھ کے سلمٰی ششدر رہ گئی۔ ششدر بھی' بدحواس بھی۔ ارشاد علی کو جتانے کی ضرورت نہیں پڑی کہ وہ یہ ہار بڑی بیگم کی خدمت میں پہنچا کے سلمٰی کے لیے کیسا عذاب مقسوم کرسکتا ہے۔ اس نے اپنی زبان سے ایسی کوئی پست بات نہیں کہی۔ سلمٰی اس کا اشارہ سمجھ گئی۔ کیونکہ تین سال پہلے ہار وصول کرتے ہوئے ارشاد علی نے جو وعدہ کیا تھا' ایفا نہیں کیا اور ہار دوبارہ اندرونی جیب میں محفوظ کرلیا۔ سلمٰی نے پھر کوئی حیلہ نہیں کیا۔

کل شام حویلی کے بیش تر مکینوں کو ایک بہت قریبی رشتے دار کی موت پر جانا پڑ گیا۔ سلمٰی ایسے موقع کی منتظر تھی۔ زنان خانے کی نگراں وہی تھی۔ اس نے جتنا کچھ ممکن تھا' پوٹلی میں بھرلیا۔ ارشاد علی نے کئی دن سے حویلی میں ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ سلمٰی سیدھی اس کے پاس چلی آئی۔

وہ حویلی میں دوسری باندیوں کو مطلع کرکے آئی تھی۔ ارشاد علی نے باہر نکلتے وقت اپنے شناساؤں کو حضرت یوسفین شاہ کے دربار جانے اور منت مانگنے کی معقول توجیہ پیش کی تھی۔ بیگمات اور باندیاں عموماً درگاہ پر حاضری دینے جایا کرتی تھیں۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جس پر کسی کو اعتراض ہوتا

یا تشویش ہوتی پھر وہ سلمیٰ تھی‘ حویلی کی سب سے با اثر باندی‘ بیگمات کی نفس ناطقہ۔ سنجیدگی اور دیانت کی الگ دھاک ہوتی ہے۔ وہ آسانی سے ارشاد علی کے ہمراہ حویلی سے نکل آئی۔

ارشاد علی نے سرائے سے سامان اٹھایا اور کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر سکندر آباد کا رخ کیا۔ سکندر آباد میں اس نے سلمیٰ کو برقع اتارنے اور ساڑی پہننے کی ہدایت کی۔ اپنی وضع قطع بھی اس نے سلمیٰ کی مناسبت سے بدل لی۔

سلمیٰ بانو چپ ہو گئی اور سسکنے لگی۔

○☆○

گاڑی تیز رفتاری سے بھاگ رہی تھی۔ درمیان میں جانے کتنے اسٹیشن گزر گئے۔ کسی کو احساس ہی نہیں ہوا۔

کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ سلمیٰ بانو سے کیا کہے۔ آدمی کی سماعت کا جتنا حوصلہ ہوتا ہے‘ کاش اس کے ہاتھوں کی بھی اتنی استطاعت ہوا کرتی۔

بہت دیر بعد بٹھل نے ہنکاری بھر کے سر اٹھایا اور تنی ہوئی آنکھوں سے سلمیٰ بانو کو دیکھا اور اس نے سلمیٰ کے شانوں پر بازو ڈال کے بے اختیار اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ سلمیٰ کی ہچکیاں بندھ گئیں "تا تا‘ ایسا نہیں ری۔ اب کیا ہے‘ سمجھ لے‘ اب سارا پیچھے چھوڑ کے آئی ہے۔" بٹھل نے کھردری اور ریتیلی آواز میں کہا۔

"ہاں ہاں‘ اب ہم لوگ ہیں‘ اب فکر کی کوئی بات نہیں۔" جمرو بے قراری سے بولا "بہت ہو گیا تمہارے ساتھ‘ کیا بولیں۔ اپنے کو کبھی لگتا ہے‘ اندھا بہرا ہونے میں ٹھیک تھا۔"

"دادا! ماں قسم‘ ایک بار کو وہ کتے کا اولاد ابھی اپن کو ٹکر جائے۔ کیا نام بولا تھا اس کا؟" زورا کی آواز تمتما رہی تھی۔

جمرو نے اسے ارشاد علی کا نام بتایا اور کہنے لگا "ہاں استاد! ایک بار اپنے کو بھی دیکھنے کا ارمان ہے سا مائی کے جنے کو۔"

"اپن کو ایک نمبر کا حرامی لگتا ہے سالا۔"

"چپ رے۔" بٹھل نے زورا کو جھڑک دیا اور سلمیٰ بانو کی کمر تھپ تھپاتے ہوئے آہستگی سے بولا "اچھا کیا جو اپنے کو سارا بول دیا۔ اب تھوڑا سنبھل کے بیٹھ ری۔ ہوتا ہے ایسا۔"

سلمیٰ کی آنکھوں سے اڈ اڈ کے آنسو برس رہے تھے۔ زورا نے بھی ٹوٹی پھوٹی آواز میں تسلی دینے کی کوشش کی اور خود کلامی کے انداز میں بولا کہ کتنا اچھا ہوا‘ ہم اس ڈبے میں آگئے۔

"اب رونا نہیں‘ میری ماں‘ میری بھنیا!" جمرو نے ہاتھ جوڑ کے سلمیٰ سے کہا "رونے کا مطلب ہے‘ تم کو اپنے پہ بھروسا نہیں۔"

جمرو کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا کہ بٹھل کی خشمگیں نگاہیں دیکھ کے خاموش ہو گیا۔

سلمیٰ کے چہرے پر چھائی ہوئی گھٹا اترنے میں دیر لگی۔ آنکھوں کی آگ بھی عجیب ہے۔ آگ لگتی ہے تو دریا سا امڈ آتا ہے۔ آنسوؤں کے سیل کے بعد‘ لمحوں کے لیے سہی‘ پر آنکھیں ٹھنڈی ضرور ہو جاتی ہیں۔

ڈھائی بجے کے قریب گاڑی ایک بڑے اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ یہ مدو کھیز جنکشن تھا۔ میں‘ زورا اور جمرو ڈبے سے اتر گئے۔ پیچھے پیچھے بٹھل بھی آگیا۔ کسی کو سلمیٰ کی دسراہٹ کے لیے ڈبے ہی میں رہنا چاہیے تھا۔ مجھے خیال آیا کہ بٹھل دانستہ نیچے آیا ہوگا۔ سکندر آباد سے اب تک سلمیٰ اپنی جگہ سکڑی سمٹی ہوئی بیٹھی رہی تھی۔ دو ایک پہر کی قربت میں اجنبیت ختم نہیں ہوتی۔ اسے بھی تو ہاتھ پاؤں سیدھے کرنے کے لیے کچھ مہلت ملنی چاہیے تھی۔ اعتماد کی بحالی کے لیے بھی یہ خلوت مفید تھی۔

ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اسٹیشن پر بھیڑ بہت کم تھی۔ ڈبوں سے اترنے والے مسافروں کی وجہ سے کچھ ہجوم ہو گیا۔ جمرو اور زورا کھانے پینے کے سامان کے لیے آگے نکل گئے۔ میں اور بٹھل ڈبے کے قریب ہی کھڑے رہے۔

باہر کی کھلی ہوا مصنوعی سی لگ رہی تھی۔ آدمی کے اندر حبس جاگزیں ہو تو باہر کی روشنی اور ہوا بھی پھیکی پڑ جاتی ہے۔ میری طرح سبھی کے جسم بوجھل ہوں گے۔ گزشتنی کا احوال سنانے والے کا غبار چھٹ جاتا ہے لیکن سننے والے کا سینہ بھی تو زد پر آجاتا ہے۔ بٹھل میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے آہستہ قدموں سے کچھ دور ہو گیا اور واپس آگیا۔ اس کی خاموشی کسی غبار و فشار ہی کی غماز تھی۔ زورا کہہ رہا تھا کہ اچھا ہوا جو ہم اس ڈبے میں آگئے۔ وہ یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ کاش ہم کسی اور ڈبے میں چلے جاتے مگر ایسا ہی ہوتا ہے۔ آدمی کو اپنی مرضی میں دخل ہی کتنا ہے۔ سارا کچھ تو ان ہونیوں پر منحصر ہے۔ حادثات اور اتفاقات۔ لوگ کسی اور طرح بھی اس کی تشریح کرتے ہیں کہ ہر بات کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ زریں بھی اسی طرح مجھے ریل گاڑی میں ملی تھی۔ اس کی ہم سفر عورت نسترن بیگم کو دیکھ کے میں ٹھٹک گیا تھا۔ جب میں کورا کے ساتھ کلکتے کے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا تو نسترن سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ مجھ پر اور کورا پر دل و جاں سے فریفتہ ہو گئی تھی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ تو کورا کو مجھ سے جدا کرنے اور اس کا سودا کرنے کے درپے ہے۔ ریل گاڑی میں تو میں زریں سے کچھ نہ کہہ سکا۔ ہر لمحے نسترن سامنے رہی لیکن میں نے طے کر لیا تھا کہ زریں کو یوں اس کے ساتھ نہیں جانے دوں گا۔ سات سال کا عرصہ درمیان میں تھا۔ نسترن مجھے پہچان نہیں پائی تھی‘ سو میری عاجزی پر اس نے مجھے گھریلو ملازم کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا۔ اسی وجہ سے میں زریں کو اس حرافہ کے چنگل سے نکال لانے میں کامیاب ہو گیا ورنہ مجھے اور دیر لگتی۔ میں زریں کو نسترن کے پاس چھوڑتا تو نہیں‘ گو سلمیٰ کی بپتا سے بہت مختلف تھی لیکن کردار وہی تھے‘ کردار تو وہی دو ہوتے ہیں‘ دو یا تین۔

زورا اور جمرو لدے پھندے واپس آئے۔ کھپچیوں کی ٹوکری میں وہ کھانے پینے کا سامان بھر لائے تھے۔ صراحی‘ مٹی کے بھولوے (کلھڑ) پھلوں کی تھیلیاں اور جانے کیا کیا۔ ڈبے کا پائے دان عبور کرنے سے پہلے بٹھل نے جھانک کے دیکھا پھر ہمیں ڈبے میں جانے کا اشارہ کیا۔ سلمیٰ منہ پھیرے بیٹھی تھی‘ ہماری آہٹ پر سیدھی ہو گئی۔ وہ کچھ تازہ تازہ‘ بدلی بدلی سی نظر آتی تھی جیسے برسات کے بعد پودوں اور پھولوں پر نکھار آجاتا ہے۔ زورا اور جمرو نے ٹوکری اس کے آگے رکھ دی اور جمرو نے کہا کہ اب باقی کام سلمیٰ کا ہے۔ جمرو کے لہجے میں دل جوئی بھی تھی اور استحقاق کی آمیزش بھی۔

وہ دونوں سارا بازار سمیٹ لائے تھے۔ پوری کچوری‘ پراٹھے‘ سادی روٹیاں‘ کئی قسم کی سبزیاں اور حلوہ‘ مٹھائی وغیرہ۔ پلیٹوں کی جگہ وہ کیلے کے تازہ پتے بھی لائے تھے۔ سلمیٰ نے سلیقے سے ایک ایک چیز نکالی۔ دستر خوان پر کھانا رکھتی ہوئی عورت کی نسوانیت اور فزوں ہو جاتی ہے۔ جمرو اور زورا بے صبری سے اس کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ سلمیٰ بانو کو بالکل بھی بھوک نہیں ہو گی۔ بھوک تو شاید کسی کو نہیں تھی لیکن ایسے شغل تندیٔ وقت میں اکسیر کا وصف رکھتے ہیں۔ سبھی نے کچھ نہ کچھ شکم پری کی یا ایک دوسرے کے سامنے خوش وضعی نبھائی۔ سلمیٰ بھی جھجکتے ہوئے بظاہر لقمے ٹونگتی رہی۔ اس کی حرکات و سکنات میں شائستگی رچی ہوئی تھی۔

مدو کھیز جنکشن کے بعد کوئی چھوٹا اسٹیشن آیا اور آدھے گھنٹے سے کم وقت میں گاڑی ناندیڑ آگئی۔ ناندیڑ اوسط درجے کا شہر ہے اور سکھوں کے پیشوا گرو گوبند سنگھ کے گردوارے کی وجہ سے سارے ہندوستان میں مشہور ہے۔ یہ سکھوں کا تیرتھ استھان ہے۔ کورا اور مولوی صاحب کی امید میں شہروں شہروں گھومتا ہوا ایک بار میں یہاں بھی آچکا تھا۔ ناندیڑ میں سلمیٰ اور ارشاد علی کی تلاش میں پولیس کی موجودگی کا اب امکان تو نہیں تھا۔ نظام آباد اسٹیشن پر تلاشی کے بعد آگے آنے والے اسٹیشنوں کے لیے پولیس کو یہ گاڑی مستثنیٰ قرار دے دینی چاہیے تھی‘ مگر کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ پلیٹ فارم آنے سے پہلے احتیاطاً زورا دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ سلمیٰ ابھی تک ہندو عورت کے روپ میں تھی۔ جمرو نے ٹکٹ کے بارے میں اس سے پوچھ لیا تھا۔ بدحواسی میں ارشاد علی اس کا ٹکٹ بھی ساتھ لے گیا تھا۔ بہرحال ٹکٹ چیکنگ کے مرحلے پر ہم میں سے کسی کا ٹکٹ سلمیٰ کو دیا جا سکتا تھا اور ہم سے کوئی ٹکٹ چیکر سے نمٹ سکتا تھا۔

پلیٹ فارم پر پولیس کا ہجوم دیکھ کے زورا نے سیٹی بجا کے سب کو محتاط رہنے کی تاکید کی مگر جلد ہی عقدہ کھل گیا کہ پولیس ٹھاکر بھیم سنگھ کے استقبال کے لیے اسٹیشن پر موجود ہے۔ ٹھاکر وہیں اتر گیا اور اس کے آگے پیچھے سارے سپاہی لیفٹ رائٹ کرتے ہوئے پلیٹ فارم سے باہر چلے گئے۔

ارشاد علی واپس نہیں آیا۔ وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے‘ ایسے لوگ زمین و آسمان کو بھی اتنی جلد مرغوب نہیں ہوتے۔ دو ہی باتیں ہو سکتی تھیں۔ یا تو وہ نظام آباد اسٹیشن پر پولیس کی غیر معمولی تعداد سے ایسا منتشر ہوا کہ اسٹیشن سے نکل گیا اور اسے لوٹنے کا وقت نہیں ملا یا وہ اسی گاڑی کے کسی اور ڈبے میں اس خیال سے الگ سفر کر رہا تھا کہ مختلف ڈبوں میں وہ اور سلمیٰ نسبتاً زیادہ محفوظ ہیں۔ آگے دو تین اسٹیشنوں پر پولیس کی جانب سے پوری طرح مطمئن ہو جانے کے بعد اسے سلمیٰ کی خیر خبر لینے آنا چاہیے تھا۔ اپنے مخدومی نواب کے اثر و رسوخ سے وہ خوب واقف ہوگا۔ ابھی گاڑی ریاست کی حدود میں تھی۔ اورنگ آباد کے بعد نظام سرکار کی عمل داری ختم ہوتی تھی۔ ارشاد علی نے سکندر آباد سے نظام آباد تک ہم لوگوں کے ساتھ خاصا طویل سفر کیا تھا۔ اس عرصے میں اس باراں دیدہ نے ہمارے بارے میں کوئی رائے ضرور قائم کی ہوگی۔ ہو سکتا ہے‘ دریں حالات اس نے ڈبے میں ہماری موجودگی سلمیٰ کے لیے سپر تصور کی ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ نظام آباد اسٹیشن پر کہیں وہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا ہو۔ پولیس والے تو اپنے سائے پر بھی شک کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں آگے چلی جانے والی سلمیٰ کے بارے میں

ارشاد علی نے پولیس کو ذرا بھی ہوا نہیں لگنے دی ہوگی کیونکہ سلمٰی کے عافیت سے نکل جانے پر اس کے دوبارہ ملنے کی امید کی جاسکتی تھی۔ ارشاد علی جہاں کہیں بھی ہوگا' اس کا دل' اس کا سارا وجود سلمٰی کی تحویل میں نوادر و جواہر کے ذخیرے کے لیے دھڑک رہا ہوگا۔ پولیس کی دہشت میں سلمٰی کو اس کے حال پر چھوڑ کے اپنی جان بچانے اور گویا مال و زر سے دست کش ہوجانے کی توقع اس شخص سے نہیں کی جاسکتی تھی۔ جس نے اسی دن کی آرزو میں اتنے برس خواب دیکھے ہوں۔ پولیس اس کے لیے کوئی نئی چیز بھی نہیں ہونی چاہیے۔

ناندیڑ سے گاڑی چلنے پر بٹھل نے سب کو اوپر کی برتھوں پر چلے جانے کی ہدایت کی اور سلمٰی سے کہا کہ وہ بھی کچھ آرام کرلے۔ بٹھل کے اصرار پر وہ نیم دراز ہوگئی۔ بٹھل نے اس کے بدن پر چادر ڈالی تو اس کے سمٹے ہوئے پیر اور پھیل گئے تاہم اس کا منہ دیوار کی جانب ہی رہا۔ ڈبے میں اندھیرا سا کردیا گیا تھا۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد پھر کوئی بڑا اسٹیشن آیا تھا۔ گاڑی دیر تک وہاں کھڑی رہی اور دروازے پر مسلسل دستک کی وجہ سے زورا کو اٹھنا پڑا۔ وہ ارشاد علی نہیں تھا' کوئی اور مسافر تھا۔ زورا کے بتانے پر کہ ڈبے میں جگہ نہیں ہے' مسافر نے جرح نہیں کی اور آگے چلا گیا۔ یہ پورنا جنکشن تھا۔ گاڑی پورنا سے چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر دم لیتی ہوئی سات بجے کے قریب پربھنی پہنچ گئی۔ کسی کو نیند نہیں آئی تھی۔ سب کروٹیں ہی بدلتے رہے تھے۔ پربھنی پر سبھی اٹھ گئے۔ زورا اور جمرو چائے لے آئے۔ چائے کے ساتھ وہ پان بھی لائے تھے۔ بٹھل سفر میں بڑے شوق سے پان کھاتا تھا۔ ویسے اسے پان کی کوئی عادت نہیں تھی۔ جمرو کی خواہش کے احترام میں سلمٰی نے بھی خوشبودار مسالوں کی آمیزہ گلوری منہ میں رکھ لی۔ پان کی اتنی بات نہیں ہوتی جتنی منہ کی ہوتی ہے یا ہونٹوں کی ہوتی ہے۔ سلمٰی کے ہونٹوں پر لالی خوب رچ گئی اس کے چہرے پر خاصا سکون تھا۔ سوگوار سا سکون۔ کتنا ہی اس نے خود کو ترک کردیا ہو' آنے والے وقت کے بارے میں اس کے دل و دماغ میں طرح طرح کے وہم و قیاس' اندیشے منڈلا رہے ہوں گے۔ اس کی حالت سمندر میں ڈوبتی' ڈولتی کشتی کے مانند تھی۔ اب جو بھی وہ' تقدیر جہاں لے جائے۔ کاش کسی کنارے پر لگ جائے۔ عورت تو یوں بھی کشتی کے مانند ہوتی ہے۔ نہ خود میں کھینے کی قوت' نہ لہروں سے نبرد آزمائی کا حوصلہ۔

پربھنی اسٹیشن گزر جانے کے بعد بٹھل سلمٰی بانو کی برتھ پر بیٹھ گیا اور اس نے دھیمی آواز میں پوچھا "کیوں ری! کیا ہے اب تیرے من میں؟"

سرِراہ جیسے کانٹا چبھ جائے یا ٹھہرے ہوئے پانی میں کوئی کنکر پھینک دے' سلمٰی کا وہی حال ہوا۔ اس کی آنکھوں میں حیرانی اتر آئی۔ حیرانی بھی' ویرانی بھی' اور وہ بٹھل کی جانب نگاہیں اٹھا کے رہ گئی۔

"اپنا مطلب ہے' تو بھی کچھ بول۔" بٹھل نے وضاحت کی "تیرے من میں گر کچھ ہو۔"

"میں کیا کیا۔۔۔" سلمٰی نے بمشکل کہا۔

"کدھری جانے کا ارادہ ہو تو بتا ری۔"

"میں' میں نے آپ سے کچھ نہیں چھپایا ہے۔" سلمٰی بانو کی آواز بھرا گئی "میں نے سب کچھ۔۔۔"

"وہ ٹھیک ہے' اپنے کو پتہ ہے' پر تیری اپنی بھی کوئی اچھا (مرضی) ہوگی ری۔ اسی کو بولتے ہیں۔"

سلمٰی بانو پر سناٹا چھایا رہا۔

"اپنی مان تو یہ مال ان بادشاہ زادوں کو جا کے واپس کردے۔ وہ اس کے لیے بہت سر پیٹ رہے ہوں گے۔"

سلمٰی کا رنگ بدل گیا "نہیں نہیں۔" وہ ہیجانی انداز میں بولی "وہ معاف نہیں کریں گے۔ وہ کبھی معاف نہیں کریں گے۔"

"تو بول سکتی ہے' اس حرام کے تخم کے بولنے پر تو نے ایسا کیا تھا جو سچ ہے' وہی جا کے بولنا۔ ان کو مال سے مطلب ہے۔"

"وہ لوگ بہت سخت ہیں۔ آپ' آپ ان کو نہیں جانتے۔ ذرا ان کے ناگوار خاطر کوئی بات ہوجائے' کسی کے مخالف ہوجائیں تو زمین آسمان ایک کردیتے ہیں۔"

"جانتے ہیں' بہت دیکھے ہیں ہم نے بھی۔ ایک سے ایک۔" بٹھل نے تلخی سے کہا "پر مال تو لوٹایا جاسکتا ہے۔ تو چاہے ادھری مت رہنا۔"

"نہیں' میں ان کے سامنے نہیں جاسکتی۔ میں جا ہی نہیں سکتی۔" سلمٰی کی آواز لرزنے لگی "ان لوگوں کو چھیڑنا بالکل ٹھیک نہیں ہے۔"

"پھر' پھر کیا کریں ری اس کا؟"

سلمٰی بانو نے بے چینی سے ہم تینوں کی طرف دیکھا اور بل کھا کے رہ گئی۔

"دیکھ ری! اس کو کدھری ٹھکانے بھی لگانا ہے۔"

"میں کچھ نہیں جانتی' مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

"ایسا کیسے ری۔"

"آپ اسے پھینک دیں۔ کہیں دفن کردیں۔ کہئے تو میں پھینک دیتی ہوں۔"

بٹھل کی بھویں چڑھ گئیں۔ چند لمحے خاموشی کے بعد اس نے کہا "سوچ کے بول' پھینکنے سے اچھا ہے' جن کا ہے' ان کو لوٹ جائے۔"

"کسی حاجت مند کو دے دیجئے' کسی کو بھی' کسی مسجد' یتیم خانے کو۔۔۔"

بٹھل سر ہلانے لگا اور تذبذب سے بولا کہ فی الحال ہماری حیدر آباد واپسی ممکن نہیں ہے۔ وقت ہوتا تو ہم سلمٰی کے ساتھ خود حویلی جاتے اور نوابوں سے بات کرتے۔

"انہیں بھول جائیے۔" سلمٰی نے التجا کی "اسی میں بہتری ہے۔"

"ٹھیک ہے ری پھر' دیکھیں گے بعد میں۔" بٹھل کھوسا گیا یا الجھ سا گیا۔ اس کی سیری نہیں ہوئی تھی یا اسے سلمٰی سے کچھ اور جاننے کا تجسس تھا۔ میرے خیال میں تو اب مزید تفتیش و استفسار' تلقین و تاکید کی گنجائش نہیں تھی۔ سلمٰی بانو کا چہرہ کمہلا گیا تھا۔ شیشے کی گرد سبھی کو گراں گزرتی ہے۔ میری دخل اندازی بٹھل کی برہمی کا سبب ہوتی سو جمرو اور زورا کی طرح میں بھی چپ بیٹھا رہا۔ بٹھل کے لہجے کی تیزی برقرار تھی۔ اس نے تنبیہی انداز میں دوبارہ سلمٰی کو ٹوکا کہ سلمٰی نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ ابھی من ماڑ آنے میں دیر ہے۔ وہ اچھی طرح غور کرکے جو اس کی خواہش ہو' کسی تردد کے بغیر بتائے۔

"میرا کیا!" سلمٰی گھٹی ہوئی آواز میں بولی "میرا کوئی بھی نہیں ہے۔" وہ پھر سسکنے لگی۔

"تیرے بھلے کو بولتے ہیں ری' پہلے تجھ سے جانکاری کرنا ٹھیک ہے۔"

"میں آپ' آپ کو کیا بتاؤں۔" وہ ناتوانی اور سرگرانی سے بولی "ایسا ہے تو مجھے زہر دے دیجئے۔"

"نا ری' ایسا نہیں ہے۔" بٹھل نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کے کہا کہ وہ ایک تعلیم یافتہ اور باہوش لڑکی ہے۔ اپنا اچھا برا سمجھ سکتی ہے مگر سلمٰی کے پاس کہنے کے لیے اور کسی دوسری طرف دیکھنے کے لیے کچھ ہوتا تو وہ اس قدر گریزاں کیوں ہوتی۔ بلکتے ہوئے بولی کہ حیدر آباد واپس بھیجنے کے بجائے بٹھل اس کے لیے جو تجویز کرے گا' وہی مناسب ہوگا۔

"دھیان سے سن ری۔" بٹھل نے اسی تندی سے کہا "پلے نہیں پڑا تیرے' کیا بولتے ہیں ہم۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا کہ سلمٰی اطمینان رکھے' ہم اس سے جدا نہیں ہو رہے یا اسے کسی رہ گزر پر تنہا چھوڑ کے نہیں جا رہے۔ اس کا عندیہ جاننے سے مقصود محض اس کی تالیف قلب ہے۔ مراد یہ ہے کہ آئندہ کے لیے کوئی آرزو اس کی آنکھیں بے خواب اور کوئی خواب اس کا دل متلاطم کرتا ہو تو ہم اسے ممکن کرنے کی کوشش کرسکتے ہیں۔ اسے سمجھنا چاہیے کہ ہم اسے اپنی مرضی کا راستہ اختیار کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں۔ وہ اشارہ کردے۔ بعد میں ہمارا کام ہے کہ ہم کس طور اس کی اعانت کرتے ہیں۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا' کچھ بھی نہیں۔" سلمٰی کا انداز خفقانی تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ ابھی یہ سب کچھ قبل از وقت ہے۔ سب سے بڑی شکستگی آدمی کا خود پر سے اعتبار اٹھ جانا ہے۔ پہلے تو اس کی بحالی لازم ہے اور یہ عمل ایک مرحلہ وقت سے مشروط ہے۔ گھڑی کا چکر تو ضرور پورا ہوتا ہے۔

"وہ حرام کا جو تیرے چاچاؤں کے پاس جانے کا بولتا تھا' وہ نہیں گیا تو ہم ادھری جاسکتے ہیں۔" بٹھل کا لہجہ عزم سے عاری نہیں تھا۔

"میرا ان لوگوں سے کیا واسطہ ہے۔" سلمٰی کٹی پھٹی آواز میں بولی "میں انہیں نہیں جانتی۔"

"پر تجھے تیرا حصہ ملنا چاہیے۔"

"مجھے کچھ نہیں چاہیے' کچھ بھی نہیں۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" سلمٰی پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے' اب چپ ہوجا ری ایک دم! اپنے کو تجھ سے کوئی بات نہیں کرنا۔" بٹھل نے اس کا بازو تھپکتے ہوئے کہا "بہائے چلی جاتی ہے۔ دوسرے کی سنتی نہیں۔"

جمرو اور زورا بھی قریب جا کے سلمٰی کو تسلی تشفی دینے لگے اور جمرو نے مشفقانہ' مربیانہ لہجے میں کہا کہ وہ ہم لوگوں کو نہیں جانتی۔ اسے بھی ہم سے کچھ پوچھنے کا حق ہے۔

"مجھے کچھ نہیں جاننا۔" سلمٰی بسورتے ہونٹوں سے بولی۔

بہت مشکل سے اس کے آنسو تھمے۔ کسی نے پھر اس سے کچھ نہیں کہا۔

دس بجے گاڑی جالنا پہنچ گئی۔ دوپہر کا کھانا خاصا بچا ہوا تھا۔ جمرو اور زورا نے ٹوکری کسی فقیر کو دے دی اور ڈبے سے اتر کے تازہ کھانا اور پانی لے آئے۔ کھانے کے دوران

وہ مسلسل سلمٰی کی دل جوئی میں لگے رہے۔ بٹھل اپنی برتھ پر چلا گیا۔ میں بھی اوپر کی برتھ پر آکے لیٹ گیا۔ جمرو اور زورا سلمٰی کے قریب بیٹھے چپکے چپکے جانے کیا باتیں کرتے رہے۔ یہی ہو سکتا تھا کہ وہ سلمٰی کو اپنے بارے میں کچھ بتانے کی کوشش کر رہے ہوں تاکہ بعد میں سلمٰی حیرت و تاسف کے کسی صدمے سے دو چار نہ ہو یا وہ اسے یقین دلا رہے ہوں گے کہ اگر واقعی سلمٰی نے خود کو ہماری جواب دہی' ہماری صوابدید پر چھوڑ دیا ہے تو آنے والا وقت شاید اس کے لیے ایسا زہر نہ ہو' شاید اس کی محرومیوں اور تشنگیوں کا کچھ ازالہ کر سکے۔

رات کی وجہ سے گاڑی نے چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر ٹھہرنا کم کر دیا تھا۔ گیارہ بجے اورنگ آباد آگیا۔ چائے کا کوئی وقت نہیں تھا لیکن کسی کو نیند نہیں آرہی تھی۔ بٹھل کی ہنکار پر جمرو نے دیر نہیں لگائی اور پلیٹ فارم سے چائے لے آیا۔ مٹی کے کوزے میں چائے سوندھی سوندھی ہو جاتی ہے۔ سبھی نے خوش دلی سے نوش جاں کی۔ زورا اور جمرو نے تاش کی گڈی نکال لی اور یوں ہی کچھ وقت دھکیلتے رہے۔ وقت کاٹنا' گزارنا اور دفع کرنا سب ایک گمان ہی ہے۔ ہر فرد' ہر چیز کو ایک مقام' کسی ایک مرحلے پر جاکے خود ہی تمام ہو جانا یا اپنی شکل بدل لینا ہے۔ شاید وقت کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ یہ نہ ساکن ہے نہ متحرک۔ آدمی نے اپنی اور اشیا کی ابتدا و انتہا کی نسبت سے وقت کی حرکت کا مفروضہ وضع کر لیا ہے' اپنی سہولت کے لیے۔ سورج یوں ہی جانے کب سے طلوع و غروب ہو رہا ہے اور چاند کا کب سے ایک ہی معمول ہے۔ یہ گھڑی تو بہت بعد کا کھلونا ہے۔

ابھی گاڑی من ماڑ سے دور تھی۔ زورا اور جمرو کا دل تاش میں نہیں لگا۔ وہ اوپر کی برتھوں پر چلے گئے۔ یکایک بٹھل نے اٹھ کے سلمٰی کو مخاطب کیا "جاگتی ہے ری۔" اس نے اونچی آواز میں پوچھا۔

"سلمٰی جاگ رہی تھی اور کسی خیال میں گم تھی کہ ہڑبڑا گئی۔

"تو نے حویلی والوں کا نام نہیں بولا۔"

سلمٰی کی پلکیں مرتعش ہو گئیں۔ اس نے جھجکتی آواز میں جواب دیا "بڑے نواب کا نام عابد علی خاں ہے۔"

"عابد علی خاں۔" بٹھل اوپر میری طرف دیکھ کے بدبداتے ہوئے بولا "یہ تو سنا ہوا لگتا ہے۔ تو نے بولا تھا کہ کل شام کو حویلی کے لوگ کسی کے پرسے میں گئے ہوئے تھے؟"

"جی' جی ہاں۔" سلمٰی گھبرا گئی اور تیزی سے بولی "ان کے قریبی عزیز نواب ثروت یار کا انتقال ہو گیا تھا۔"

میں اٹھ کے بیٹھ گیا' زورا اور جمرو بھی۔

"نواب ثروت یار۔" بٹھل نے شش و پنج سے کہا۔

"جی ہاں۔" سلمٰی اٹکتی زبان سے بولی "آپ انہیں جانتے ہیں؟"

"آگے کا بول۔"

"سنا ہے' وہ زمینوں پر جا رہے تھے۔ راستے میں ڈاکوؤں سے سامنا ہو گیا۔ وہ بہت زخمی ہو گئے تھے۔ نواب ثروت کے خالہ زاد بھائی نواب فہمید کے گھر میں بڑے نواب عابد علی خاں کی سگی بہن ہیں۔ ویسے بھی سب کی قرابت داری ہے۔"

"ایک نال سے جڑے ہوئے ہیں سب۔" بٹھل بڑبڑانے لگا "وہ تو پھر دیر سے حویلی لوٹے ہوں گے؟"

"آپ کی ان سے کوئی واقفیت ہے؟" سلمٰی نے مضطرب لہجے میں پوچھا۔

"نہیں ری' پر نواب ثروت کو جانتے تھے۔"

سلمٰی کی آنکھوں سے حیرت جھلکنے لگی' ہچکچاتے ہوئے بولی "وہ تو بہت اچھے آدمی تھے' مہذب' تعلیم یافتہ۔ سارے خاندان میں ان کی عزت تھی اور سبھی ان کے ذوق کے قائل تھے۔ ان کی عمر بھی اتنی نہیں تھی۔ شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ ان کی والدہ اور بہن بھی بہت نرم دل' اعلا اخلاق کی ہیں۔ اللہ جانے والدہ یہ صدمہ کس طرح برداشت کر پائیں گی۔ وہ تو بیمار بھی ہیں۔"

نواب عابد علی کا نام میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔ بہت دیر میں مجھے یاد آیا۔ دوسرے دن صبح کے وقت جب ہم نواب ثروت کی خیریت دریافت کرنے ڈاکٹر ناصر مرزا کے گھر گئے تھے اور ابھی دروازے پر کھڑے تھے کہ سفید شیروانی میں ملبوس ایک لحیم شحیم' گول مٹول سا شخص موٹر میں وہاں آیا تھا۔ چہرے بشرے ہی سے وہ کوئی بڑا نواب معلوم ہوتا ہے۔ اس نے صرف سامنے کی جانب نظر رکھی۔ بڑے آدمیوں کا جو شیوہ ہوتا ہے۔ وہ ادھر ادھر نہیں دیکھتے۔ کبھی نگاہ کرتے ہیں تو چھچلتی ہوئی۔ موٹر سے اتر کے وہ سیدھا دروازے میں داخل ہو گیا۔ ایسے لوگوں کو دروازے بھی کھلے ہوئے ملتے ہیں۔ میں نے بٹھل کو نہیں بتایا کہ نواب عابد علی خاں کو تو اس نے بھی قریب سے دیکھا ہے۔

"ادھری نواب ثروت کے گھر بھی تیرا کبھی جانا ہوا؟" بٹھل نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"جی' بیگمات کے ساتھ کئی بار۔" سلمٰی نے شائستگی سے جواب دیا۔

بٹھل نے سلمٰی سے نہیں پوچھا کہ نواب ثروت کے ہاں اس نے کبھی نرجس بانو نامی ایک لڑکی تو نہیں دیکھی یا اس کے والد مولوی محمد شفیق کا تذکرہ تو نہیں سنا۔ بٹھل کو اس سوال کا جواب معلوم ہوگا۔

ٹھیک تین بجے گاڑی من ماڑ آگئی۔

اسٹیشن پر دن کا سماں تھا۔ ہر طرف تیز روشنیاں۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ سلمٰی کی وجہ سے ڈبے سے اترنے میں کچھ دیر ہوئی۔ اس دوران ساری گاڑی خالی ہو گئی۔ پلیٹ فارم پر قدم رکھ کے عجیب سا لگ رہا تھا۔ دست و بازو کی اینٹھن کا اب کچھ اندازہ ہو رہا تھا۔ سارا جسم ہی جکڑا ہوا تھا۔ اب جیسے رسیاں کھل رہی تھیں۔ سب نے گہری سانسیں لیں اور جسم کو جھٹکے دیے۔ لگتا تھا' ہفتوں مہینوں سے سفر کر رہے ہوں۔ سفر بھی کیسی سزا ہوتی ہے۔

ہمارا اور سلمٰی کا سامان ایک ہی قلی نے اٹھا لیا۔ آدمی بس اپنی خواہش یا اپنے ذہن میں جمی ہوئی بات کی صورت گری چاہتا ہے۔ بٹھل نے قلی سے بمبئی کے بجائے دلی کی گاڑی کا وقت پوچھا تو مجھے بہت اچنبھا ہوا۔ میری حیرانی ایسی بے جواز بھی نہیں تھی۔ من ماڑ بمبئی سے بہت قریب تھا۔ اصولاً یہاں سے بمبئی کا رخ کرنا چاہیے تھا۔ ادھر ابا جان الگ پریشان ہو رہے ہوں گے۔ گزشتہ مرتبہ حیدر آباد میں گزارے ہوئے روز و شب وہ کبھی نہیں بھول سکتے۔ دلی جانے کے ایک معنی تھے کہ بٹھل نے سلمٰی کی وجہ ہی فیض آباد جانے کا ارادہ کیا ہے۔ میں نے سوچا' بٹھل سے کہوں کہ چند روز کے لیے بمبئی جاکے بھی فیض آباد کا سفر کیا جا سکتا ہے لیکن میں نے زبان بند رکھی۔ بٹھل کو زریں کی حویلی میں سلمٰی کی پذیرائی کی توقع زیادہ ہوگی۔ میں تو ابا جان کے خیال سے بٹھل کو ٹوکتا ورنہ میرے لیے دونوں جگہیں ایک جیسی تھیں' دونوں کیا' ہر جگہ ایک جیسی تھی۔ مجھے خود احساس تھا کہ زریں بہت انتظار کر رہی ہوگی۔ اس کا شکوؤں بھرا خط بھی آیا تھا۔ دن بھی بہت ہو گئے تھے۔ منیر علی کو بھی ابا جان نے بمبئی میں روک کے رکھا تھا۔ زریں تو اب دل برداشتہ ہونے لگی ہوگی۔ بٹھل کو اس کی فکر بھی بہت رہتی تھی۔ ایک زریں ہی' اس سے اپنے لہجے میں بات کرتی تھی۔ زریں کی خاطر بٹھل نے کلکتے کے اڈے کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ وہ تو بیش تر فیض آباد میں رہنا چاہتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اسے اس کا موقع نہیں مل پاتا تھا۔

قلی نے بتایا کہ دلی کی گاڑی کی روانگی میں پورے ڈھائی گھنٹے ہیں۔ گاڑی کی آمد میں اوپر سے تاخیر ہوئی تو اور دیر ہو سکتی ہے۔ طوفانی بارشوں نے گاڑیوں کے اوقات بری طرح متاثر کر دیے ہیں۔ ہم انتظار گاہ میں آگئے۔ یہ ایک صاف ستھری جگہ تھی۔ بڑی بڑی آرام دہ کرسیاں' صوفے' میز اور خدمت گار۔ وہاں پہلے سے ایک ادھیڑ مارواڑی جوڑا بیٹھا تھا۔ ہماری آمد سے دونوں پریشان سے ہو گئے اور اپنی جگہوں سے اٹھ کے ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ بٹھل کی فرمائش پر خدمت گار چائے لے آیا۔ دودھ اور شکر الگ الگ برتنوں میں تھے۔ سلمٰی نے چائے بنائی۔ اس چائے کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔ ابھی ہم نے چائے ختم نہیں کی تھی کہ کمرے کا دروازہ کھلنے پر جو تین آدمی نمودار ہوئے' انہیں دیکھ کے سبھی چونک پڑے۔ وہ ارشاد علی تھا۔ دائیں بائیں دو آدمی اسے سہارا دیتے ہوئے اندر لائے تھے۔ اس کی حالت نہایت ابتر تھی۔ الجھے ہوئے بال' کپڑوں پر شکنیں پڑی ہوئی' بدحواس سا' برسوں کا بیمار نظر آتا تھا "تم یہاں ہو!" سامنے بیٹھی ہوئی سلمٰی بانو پر نظر پڑتے ہی اس نے سٹپٹاتے ہوئے کہا "میں نے ساری گاڑی چھان ماری۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے دونوں آدمیوں کا شکریہ ادا کیا۔ وہ دونوں پہلے ہی بیزار کھڑے تھے۔ ارشاد علی کو دروازے کے قریب رکھی ہوئی کرسی پر بٹھا کے رخصت ہو گئے۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے ارشاد علی کی آہ بلند ہوئی "شکر ہے' تم مل گئیں۔" اس نے اکھڑی ہوئی سانسوں سے کہا۔

بٹھل کے پاس بیٹھی ہوئی سلمٰی بانو کے رخساروں کا خون خشک ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ ارشاد علی کوئی وضاحت کرنا چاہتا تھا کہ بٹھل نے نرمی سے پوچھا "کدھری چھپ گئے تھے بلما۔"

ارشاد علی کراہنے لگا "کیا بتاؤں صاحب! لمبی کہانی ہے۔" وہ نحیف آواز میں بولا۔

"اپن تو سمجھا تم ابھی اودر ہی خلاص ہو گیا۔" زورا نے کسی قدر حقارت سے کہا اور بٹھل کی نگاہ دیکھ کے ٹھٹک گیا۔

ارشاد علی کے چہرے پر شکنیں پڑ گئی تھیں لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا "ٹھیک کہتے ہو بھائی۔ کسر بھی کیا رہ گئی تھی۔ بس کچھ دقت اور لکھا تھا۔"

کسی نے اس سے کچھ نہیں پوچھا تاہم سب کی نظریں اس پر مرکوز تھیں۔ وہ خود ہی بتانے لگا کہ نظام آباد اسٹیشن پر اسے کچھ احساس ہوا کہ پولیس اس پر شبہ کر رہی ہے۔ کسی جھنجٹ سے بچنے کے لیے وہ پلیٹ فارم سے باہر نکل گیا اور یوں ہی کسی خواہش کے بغیر اس نے ایک ہوٹل سے شربت کا گلاس پیا تھا کہ جی متلانے لگا۔ اسی اثنا میں گاڑی نے سیٹی بجا

دی۔ جیسے تیسے وہ گاڑی کے آخری سرے تک پہنچنے اور ایک ڈبے کا دستہ پکڑنے میں کامیاب ہوا۔ ڈبے میں موجود مسافر بھی گھبرا گئے۔ سبھی اس کے گرد اکٹھے ہوگئے اور ہمدردی کا اظہار کرنے لگے۔ کسی نے زنجیر کھینچنے کا مشورہ دیا' کسی نے کمر سہلائی اور پیر سہلائے کسی نے کوئی ٹوٹکا کیا۔ طرح طرح کی تشخیصیں' تجویزیں۔ جو کھایا پیا تھا۔ ارشاد علی نے لوٹا دیا پھر اسے ہوش نہیں رہا۔ ایک مسافر نے اپنی برتھ اس کے لیے خالی کردی۔ آگے کسی اسٹیشن پر گاڑی ٹھہری تو انہوں نے کسی وید حکیم کے لیے دوڑ دھوپ کی' ان کی کوششیں بار آور نہ ہوسکیں۔ پھر شاید وہ نانڈیڑ اسٹیشن تھا کہ ایک مسافر کہیں سے لیموں لے آیا۔ نمک شکر اور لیموں کے سہ آتشہ پانی نے کچھ اثر کیا۔ ارشاد علی کی آنکھیں کھلنے لگیں اور وہ مسافروں کو بتانے کے قابل ہوسکا کہ آگے سیکنڈ کلاس کے ایک ڈبے میں اس کی بیوی کامنی دیوی راہ تک رہی ہوگی۔ جانے اس کا کیا حال ہوگا۔ براہ مہربانی کوئی جا کے اسے خبردار کردے۔ پربھنی میں ایک شخص ساری گاڑی کا چکر لگا کے واپس آگیا۔ مسافروں کی قیاس آرائیوں نے ارشاد علی کو اور ہولا دیا تھا۔ کوئی کہتا تھا کہ اس کی بیوی بوکھلاہٹ میں درمیان کے کسی اسٹیشن پر تو نہیں اتر گئی۔ کسی کی رائے تھی کہ ارشاد علی کو کیوں نہ ریلوے حکام کے حوالے کردیا جائے' وہ اس کی بیوی کو تلاش کرلیں گے اور ارشاد علی کے علاج معالجے کا بھی بندوبست ہوجائے گا۔ پربھنی کے بعد ارشاد علی کی طبیعت اور زیادہ خراب ہونے لگی لیکن وہ ضبط کرتا رہا پھر جس اسٹیشن پر گاڑی ٹھہری' ارشاد علی نے اتر کے اپنے ڈبے میں جانے کا عزم کیا۔ چند قدم چلنے پر اس کی سانسیں پھولنے اور ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں۔ مسافر اسے واپس ڈبے میں لے آئے۔ سلمٰی کی فکر نے ارشاد علی کو اور آزردہ کر رکھا تھا۔

رات کو جالنا اسٹیشن پر اس نے پھر ایک مسافر سے التجا کی۔ مسافر نے مطلوبہ ڈبا تلاش کرلیا تھا لیکن بتایا کہ ڈبا بند ہے۔ اس نے کئی بار دستک دی۔ کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔ ارشاد علی کے بقول سلمٰی کے تحفظ' اس کی استقامت اسے کسی ناگہانی سے بچائے رکھنے کے لیے وہ دعائیں مانگتا رہا۔ اسے کم از کم اس طرف سے یہ اطمینان تھا کہ ڈبے میں ہم شرفا بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہماری موجودگی میں سلمٰی کا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ اورنگ آباد میں جب اضطراب حد سے سوا ہوا تو ارشاد علی پھر ڈبے سے اترنے لگا۔ مسافروں نے اسے روک لیا کہ کسی طور اس کی طبیعت قابو میں آئی ہے۔ اب من ماڑ دور ہی کتنا رہ گیا ہے اور کچھ دیر کے لیے وہ سینے پر پتھر رکھ لے اور بہتر ہے کہ آرام کی کوشش کرے۔ من ماڑ اسٹیشن پر مسافروں کو بہت جلدی تھی۔ گاڑی ٹھہرتے ہی سب اجنبی سے ہوگئے۔ وہ اسے گیٹ کے پاس بینچ پر بٹھا کے چلے گئے اور ارشاد علی نے خود ہمت مجتمع کی۔ وہ سلمٰی کو ساری گاڑی میں کھوجتا رہا۔ دیکھتے دیکھتے گاڑی خالی ہوگئی اور ایک ایک کرکے سب مسافر گزر گئے تو اس نے دو آدمیوں سے درخواست کی کہ وہ اسے انتظار گاہ تک لے چلیں۔

ارشاد علی اپنی زیر و زبر سانسیں ہموار کرنے کے لیے بار بار رک جاتا تھا۔ اس نے ہم سب کا شکریہ ادا کیا کہ ہم نے باکمال شرافت سلمٰی کا خیال رکھا۔ اس کے پاس ممنونیت کے لیے لفظ نہیں' خدا ہی اس کا اجر دے گا۔

کسی نے دخل نہیں دیا۔ سب خاموشی سے اس کی تاویلیں سنتے رہے۔ یہ ایک کہانی تھی۔ ارشاد علی کو اپنے طویل غائب ہونے کا کوئی نہ کوئی عذر تو تراشنا تھا۔ اس کے سوا وہ کہہ بھی کیا سکتا تھا۔

سکندر آباد سے نظام آباد تک کا سفر اس نے ہمارے ساتھ کیا تھا۔ ہماری باتوں سے اسے معلوم ہوگیا ہوگا کہ ہماری منزل بھی من ماڑ ہے۔ یہی ایک خدشہ اس کے پیروں کی زنجیر بنا ہوگا کہ نظام آباد کی طرح پولیس کسی اور اسٹیشن پر یلغار نہ کردے۔ یہی قرین مصلحت تھا کہ وہ اور سلمٰی الگ الگ سفر کرتے رہیں۔ گاڑی اورنگ آباد پہنچنے کے بعد پولیس کی دست اندازی کا خدشہ بڑی حد تک دور ہوگیا تھا۔ ارشاد علی اپنے ڈبے میں واپس آسکتا تھا لیکن من ماڑ اسٹیشن پر اچانک ہمارے سامنے نموداری اس داستان سرا کی خلاقی کا اثر سوا کرتی تھی۔

ارشاد علی کے خاموش ہوجانے کے بعد کسی نے کچھ نہیں کہا۔ اس صورت حال سے اسے پریشان ہوجانا چاہیے تھا۔ سلمٰی بھی بے جنبش بیٹھی رہی۔ ارشاد علی کرسی پر پہلو بدلنے لگا۔ یہ جمود کسی کے لیے بھی نہایت اعصاب شکن اور صبر آزما ہوتا ہے۔ ارشاد علی کی سمجھ میں کوئی اور بات نہ آئی تو اس نے بے تابی سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پانی کی خواہش کی۔

جگ اور گلاس میز پر رکھے ہوئے تھے۔ ہم میں سے کوئی نہیں اٹھا۔ اسے سلمٰی سے توقع ہوگی۔ سلمٰی نے بھی جیسے کچھ نہیں سنا۔ زورا کے تالی بجانے اور صدا لگانے پر خدمت گار حاضر ہوا۔ زورا نے اسے ارشاد کو پانی پلانے کی ہدایت کی۔ پانی پی کے ارشاد علی نے نقاہت سے آنکھیں میچ لیں۔

"تم کو اسپتال بھجوا دیں لالا؟" جمرو نے آخر زبان

کھولی۔

ارشاد علی خالی خالی نظروں سے جمرو کو دیکھا کیا اور بے بسی کے انداز میں دونوں ہاتھ پھیلا کے رہ گیا۔

"تمہاری حالت تو بہت الٹی لگتی ہے۔" جمرو نے تیکھی آواز میں کہا "جلدی دوا دارو نہیں ہوئی تو اور مٹی نہ ہوجائے۔"

"کیا بتاؤں بھائی! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" ارشاد علی نے شکستگی سے کہا "گھر پہنچنا بھی ضروری ہے۔"

"کدھری ہے گھر تمہارا؟" جمرو نے بظاہر سادگی سے پوچھا۔

"ادھر نینی تال سے پہلے' سمجھو رام نگر جانا ہے۔" ارشاد علی نے ایک لمحے کے توقف کے بعد کہا۔

"وہ تو بہت دوری پے ہے بھیا!"

"دور تو ہے۔" ارشاد علی پژمردگی سے بولا "لیکن' لیکن گھر ہے۔"

"نہ۔۔۔ نہ' لالا! پہلے کسی وید حکیم کے پاس جا کے اپنے کو کسواؤ' ہم کو بولو' ہم کس کارن ادھری بیٹھے ہیں۔"

"آپ گاڑی میں سوار کرا دیں۔" ارشاد علی نے ناتوانی سے کہا "اب پہلے سے کچھ اچھا ہے۔ آپ کا بہت شکریہ۔ گھر پہنچ کے سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

"جیسی تمہاری مرضی مہاراج!" جمرو شانے اچکا کے بولا "دلی کی گاڑی میں ابھی دیری ہے' بیٹھو ادھری شانتی سے۔"

"دادا! بولے تو اپن لالا کے لیے ایک ٹوٹکا کرنے کا۔" زورا نے مچل کے بٹھل سے کہا' پھر ارشاد علی سے پوچھنے لگا "لالا! ابھی کیا نام بولا تم نے اپنا؟"

ارشاد علی نے ابھی تک اپنا کوئی مصنوعی نام ہی نہیں بتایا تھا' وہ کسمسانے لگا اور ہکلاتے ہوئے بولا "میرا نام پوچھتے ہو بھائی! ایشوری پرشاد' ایشوری پرشاد۔"

"لالا ایشوری پرشاد!" زورا نے آنکھیں چوڑی کرکے کہا "نام تو ایک دم فسٹ کلاس ہے۔" ابھی بولے تو اپن ایک پرانا ٹوٹکا کرکے دیکھے۔

"کیسا ٹوٹکا؟" ارشاد علی چونک کے بولا۔

"اپن کا باپ دادا سے چلتا پڑا ہے۔ ایک باری میں آدمی اکھا سیدھا ہوجاتا ہے۔" زورا نے وثوق سے کہا۔

"بس بھائی!" ارشاد علی کی گردن ڈھلک گئی "بہت تماشے کرلیے ڈبے کے لوگوں نے۔ بس کچھ اور نہیں' کوئی جادو ایسا کرو کہ جلد سے جلد گھر پہنچ جاؤں۔"

"وہی تو بولتا ہے' ایک ابھی اپن کا چمتکار بھی دیکھو۔ دوڑ کے ایک دم ابھی ایدر سے نئیں گیا تو ماں قسم' اپن آدمی کا جنا نئیں۔"

"ہاں دادا ہوجائے قسم سے۔" جمرو نے زورا کو مہمیز کیا اور ارشاد علی سے بولا "ابھی دیکھو لالا' دادا اتنا اونچا بولتا ہے تو خالی نہیں ہوگا۔"

"رہنے دو بھائی" ارشاد علی نے بیزاری سے کہا "میں نے آپ کو بتایا نا' اب پہلے سے بہت آرام ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ کامنی اور آپ لوگوں کو دیکھ کے آدھی تکلیف تو ویسے بھی دور ہوگئی۔"

"آدھا ابھی اپن خلاص کردے گا۔" زورا اپنی آواز کی گرمی نہ چھپا سکا۔

ارشاد علی ایک پرکار آدمی تھا۔ اسے کھٹک جانا چاہیے تھا لیکن اس کے پاس مفر کا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ اس پہلو تہی' درگزری کے رویے ہی میں اس کے لیے عافیت تھی۔ سلمٰی کی خاموشی اس کے سینے میں بہت شور مچا رہی ہوگی۔ بار بار اس کی نظریں سلمٰی پر منڈلانے لگتی تھیں۔ زورا کرسی سے اٹھ کے اس کے قریب پہنچا تو اس کی حالت اور اضطراری ہوگئی۔ اس نے ہاتھ جوڑ کے زورا سے کہا کہ اسے معاف رکھا جائے۔ وہ ٹوٹکوں پر یقین نہیں رکھتا۔

"ایسا کیسے لالا۔" زورا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ارشاد علی کو کرسی سے اٹھا کے پٹخ دے۔ اس نے آناً فاناً پیروں سے پشاوری طرز کا جوتا اتار لیا "ابھی ایک دو میں اکھا دھول اتر جائے گا۔"

ارشاد علی کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ وہ بھی کرسی سے اٹھ گیا "یہ' یہ آپ کیا کر رہے ہو۔ میں' میں آپ کو منع کر رہا ہوں۔"

"دیکھا دادا۔" زورا نے بٹھل سے کہا "اپن ابھی چالو بھی نہیں کیا' کیسا جان پڑ گیا لالا میں۔"

بٹھل نے سنی ان سنی کردی۔ اسے تو جیسے کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔ وہ بیڑی کا دھواں اڑاتا رہا۔ اس کا سکوت زورا کے لیے صاف اقرار تھا۔ زورا کو اب روکنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس نے ذرا بھی تاخیر نہیں کی' مبادا کسی جانب سے تحمل اور احتیاط کی صدا بلند ہوجائے' کسی اور طرف سے نہیں تو سلمٰی ہی کی طرف سے' جوتا اٹھا کے اس نے زور سے ارشاد علی کے کندھے پر رسید کیا۔ ارشاد علی بلبلا گیا اور فرش پر پیر مارنے لگا۔ زورا نے دوسری ضرب میں بس ہاتھ اٹھانے کا وقفہ کیا۔

مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن خود کو اچھا لگنے کی کوئی متبادل صورت بھی میرے ذہن میں نہیں تھی۔ ارشاد علی کسی رعایت کا حقدار نہیں تھا اور اس کے لیے شاید یہی طریق کار موزوں تھا۔ وہ اڈے کا آدمی بھی نہیں تھا ورنہ اس سے اڈے کے آدمیوں کے طور نمٹا جاتا۔

سلمٰی کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس پر حیرت اور ہیجان کا عالم طاری تھا' رنج و ملال کا بھی۔ ارشاد علی دروازے کی طرف بھاگنے لگا تھا کہ زورا نے اس کا راستہ روک لیا۔ مارواڑی اور اس کی بیوی اپنی نشستوں سے اٹھ کے دیوار سے چپک گئے۔ چیخ پکار سن کے خدمت گار بھی لپکتا ہوا اندر آگیا۔ میرا خیال تھا' زورا طول نہیں دے گا یا بٹھل کسی لمحے اسے ہاتھ روکنے کا اشارہ کردے گا لیکن بٹھل نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں' وہ تو جیسے وہاں تھا ہی نہیں۔ اس کے' زورا اور جمرو کے دماغ میں لازماً ایسی کوئی خوش فہمی نہیں ہوگی کہ ارشاد علی اس تحقیر و تذلیل پر ہماری نظروں سے دور ہوجائے گا یا سلمٰی سے دستبردار ہوجائے گا۔ پھر انہوں نے کیا سوچ کے یہ ابتدا کی تھی' یہ جگہ تو ویسے بھی ارشاد علی کی تہدید و تادیب کے لیے ناموزوں تھی۔ انتظار گاہ سے اٹھنے والا شور نزدیک سے گزرنے والوں کو متوجہ کرسکتا تھا۔ زورا تو دیوانہ سا ہوگیا تھا۔ اڈے کے آدمی کو یوں بھی عام آدمی سے مڈبھیڑ میں بڑی جھنجلاہٹ ہوتی ہے۔ ارشاد علی نے زورا کا ہاتھ گرفت میں لینے اور زورا کو خود سے دور رکھنے کے لیے شدومد سے اپنی جیسی کوشش کی تھی۔ اس کشمکش کے دوران زورا نے اس کی کمر پر ایک اور ضرب لگائی۔ ارشاد علی دہرا ہوگیا اور ڈکرانے لگا۔

زورا پھر ٹھہر گیا۔ ارشاد علی ہانپ رہا تھا۔ وہ کئی بار سلمٰی کو فریاد کناں نظروں سے دیکھ چکا تھا۔ ان نظروں میں برہمی بھی تھی' شکایت بھی۔ سلمٰی نے اپنا چہرہ ہی چھپالیا۔ ارشاد علی نے اتنی دیر میں ہمارے تیوروں سے بہت کچھ اخذ کیا ہوگا۔ کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے تک یا کسی موہوم خوش خیالی میں اسے بہر طور اپنی سادہ دلی و سادہ لوحی کا تاثر ہی دیتے رہنا چاہیے تھا۔

وہ کرسی پر سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔ اس کا جسم اب ڈھلکا ہوا نہیں تھا۔ چہرے پر رنگ آجا رہے تھے۔

"اب کیسا ہے لالا؟" کچھ دیر بعد زورا نے ٹھہری ہوئی آواز میں پوچھا۔

ارشاد علی نے دونوں ہاتھ اٹھا دیے اور عاجزی سے بولا "بس بھائی! ٹھیک' بالکل ٹھیک ہوں۔"

"ایسا نا!" زورا نے چہک کے کہا "اپن کیا بولا تھا۔ ابھی ایک بار بھاگ کے اکھا کمرے کا چکر لگانے سے بالکل پھڑ پھڑانے لگے گا' سمجھا!"

کمرے میں سناٹا سا ہوگیا۔ مارواڑی سیٹھ اپنی بیوی کے ساتھ دبے پاؤں باہر نکل گیا۔ اس دور بیں نے اس سکوت میں کسی عناد و فساد کی بو سونگھ لی ہوگی۔ بٹھل کی ترغیب پر سلمٰی میز کے گرد والی کرسی سے اٹھ کر آرام کرسی پر نیم دراز ہوگئی۔

بٹھل بھی اس کے قریب آگیا کہ سلمٰی کو سکون اور سائے کا احساس رہے۔ خدمت گار نے جمرو کی اجازت سے روشنیاں کم کردیں۔

ارشاد علی کے انتشار کا اندازہ کیا جاسکتا تھا۔ ہر لمحہ اس پر عذاب ہوگا۔ سب کچھ اس کے سامنے تھا۔ اپنی داستان کی بے اثری کا احساس اسے اچھی طرح ہوجانا چاہیے تھا اور داستان تو اس نے بعد میں سنائی تھی۔ اس کا خستہ و شکستہ حال بھی تو کچھ کہہ رہا تھا۔ نظام آباد سے من ماڑ تک کئی پہر کی گمشدگی کے بعد وہ سلمٰی کے سامنے آیا تھا۔ اسے دیکھ کے سلمٰی بے قرار ضرور ہوئی تھی لیکن ارشاد علی کو اس کی جانب سے شادیٔ مرگ کی سی کیفیت کی توقع ہوگی۔ شکایت یا ناراضی کے اظہار کی یا غصے کی۔ ممکن ہے ارشاد علی نے سلمٰی کی بے زبانی کسی بے بسی و بے چارگی پر محمول کی ہو اور کسی دم اسے گمان ہوا ہو کہ اس کی عدم موجودگی کے دوران ہم مختلف قسم کے اجنبیوں کے پاس سلمٰی پر اپنی دہشت بٹھانے کا اچھا وقت تھا۔ ارشاد علی کو یہ خدشہ بھی بجا طور پر لاحق ہونا چاہیے کہ ہم لوگوں کو کہیں سلمٰی کی تحویل میں نوادر و جواہر کے ذخیرے کا علم تو نہیں ہوگیا ہے۔ اس کی ایک جھلک آدمی کو اندھا کرسکتی ہے۔ واپس ارشاد علی کی پناہ میں آنے کے لیے اتنی دیر تک کوئی تو اضطراب سلمٰی کی آنکھوں' اس کے چہرے پر ہویدا ہونا چاہیے تھا۔

کوئی ایک گھنٹا ایسے ہی گزر گیا۔ ارشاد علی کے لیے یہ مدت برسوں کے برابر ہوگی۔ وہ ریت پر نقش بناتا رہا ہوگا۔ ہوسکتا ہے اس نے ہواؤں سے بچا کے کوئی خاکہ مکمل کرلیا ہو۔ گھنٹے بعد خدمت گار نے آکے مطلع کیا کہ اوپر سے گاڑی آدھے گھنٹے کی تاخیر سے آرہی ہے۔ دلی روانگی میں بھی کچھ یہی تاخیر ہوگی۔ سکندر آباد میں جمرو اور زورا نے من ماڑ تک کے ٹکٹ بنوائے تھے۔ باقی سفر کے ٹکٹ خریدنے کے لیے جمرو اور زورا خدمت گار کے ساتھ باہر چلے گئے۔ انتظار گاہ میں اب ہم صرف چار رہ گئے۔ بٹھل' سلمٰی ارشاد علی اور

میں۔ ارشاد علی کے پاس اپنی منزل کے ٹکٹ ہوں گے۔ اس لیے ٹکٹوں کے ذکر پر اس کے ہاں کوئی حرارت اور حرکت نہیں ہوئی۔ سلمٰی چادر لپیٹے ترچھی ترچھی کرسی پر سمٹی رہی۔ اس نے ارشاد علی کی طرف سے منہ پھیر رکھا تھا۔ میرا خیال تھا کسی بہانے ارشاد علی' سلمٰی سے سلسلہ جنبانی کی کوشش کرے گا۔ وہ بت بنا بیٹھا رہا۔ کوئی بیس پچیس منٹ میں جمرو اور زورا واپس آگئے۔ انہوں نے جوشیلے انداز میں بتایا کہ انہیں فرسٹ کلاس کے ٹکٹ مل گئے ہیں۔

ایک لحظے کے لیے ارشاد علی کی آنکھوں میں بجلیاں کوندی تھیں اور ہونٹ بھی پھڑکے تھے لیکن کسی احتیاط میں اس نے زبان ہی بند رکھی۔

گاڑی میں کچھ اور تاخیر ہوگئی تھی۔ چھ بجے اچھا خاصا اندھیرا ہوگیا تھا۔ گاڑی کی آمد سے آدھ گھنٹے پہلے خدمت گار نے ہمیں تیار ہوجانے کی مودبانہ تاکید کی۔ بٹھل کی ایما پر پہلے سلمٰی' پھر ہم سب نے انتظار گاہ سے پیوستہ غسل خانے میں۔۔۔ ہاتھ منہ دھویا۔ جمرو کے کنگھے سے سب نے بال درست کیے۔ صبح کی ہوا میں خنکی اور بڑھ گئی تھی۔ من ماڑ اسٹیشن پر گاڑی دیر تک رکنے کا امکان تھا۔ پلیٹ فارم پر جانے کے بجائے بٹھل وہیں بیٹھا رہا اور چند لمحوں بعد اس نے سرد لہجے میں ارشاد علی سے پوچھا کہ اس کا کیا ارادہ ہے؟

"کیسا ارادہ جناب؟" ارشاد علی نے تعجب سے کہا۔

"بٹیا تو اپنے ساتھ جارہی ہے۔"

"آپ کے ساتھ! کون' کون؟" ارشاد علی اچھل گیا "کون بٹیا؟"

"ادھری ایک ہی بیٹھی ہے۔"

"آپ' آپ کامنی کے۔۔۔"

"ہاں رے۔" بٹھل نے دھیمی آواز میں کہا "اس نے بولا ہے' یہ اپنے ساتھ جائے گی۔"

"پر کہاں' کہاں؟" ارشاد علی بری طرح بوکھلا گیا۔

"جدھری بھی ہم لے جائیں۔"

"کیا' کیا کہتے ہیں آپ!"

"ٹھیک بولتے ہیں' اسی سے پوچھ لے۔"

ارشاد علی گنگ ہوگیا۔ اس نے سلمٰی کی طرف دیکھا۔ وہ منہ چھپائے اور سر جھکائے ہوئے تھی "کامنی میری بیوی' میری پتنی ہے۔" وہ وحشت زدگی سے بولا۔

"پتہ ہے' اپنے کو سارے کا پتہ ہے۔"

"کیا' کیا پتہ ہے۔" ارشاد علی نے سٹپٹا کے کہا "کیا کیا۔۔۔"

بٹھل نے ہاتھ اٹھا کے اسے روکا "اتنا نہیں پوچھا اپنے سے۔ گاڑی آنے کو ہے۔ تجھ کو جو بولا ہے' اتنا ہی ٹھیک ہے۔ زیادہ چخ چخ کی تو تجھ کو گھاٹا ہوگا۔ تجھ کو آخری بار سلمٰی بٹیا سے بات کرنے کو ہے تو کرلے۔"

ارشاد علی کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ بٹھل کی زبانی سلمٰی کا نام سن کے اس کی رگوں میں خون منجمد ہوگیا ہوگا اور سانسیں سینے میں اٹک گئی ہوں گی۔ اس کا چہرہ ہی بگڑ گیا تھا۔ آگے اس سے کچھ نہیں کہا گیا۔ آگے کہنے کے لیے اسے کچھ اخذ کرنا بھی لازم تھا۔ جسم و جاں میں کتنی ہی پتھر کی آمیزش ہو' ارشاد علی پورا پتھر کا بنا ہوا تو نہیں تھا۔ اپنے حواس کی درستی تک اسے لب کشائی کی جرات نہیں کرنی چاہیے تھی۔

"کیا ہوگیا مہاراج؟ جاپ الٹا ہوگیا!" جمرو نے زہریلے لہجے میں کہا۔

ارشاد علی کی پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے۔ اس نے گہری سانس لی اور ڈوبتی آواز میں بولا "آپ کو سب بتادیا ہے بانو نے! اور' اور سچ ہی بتایا ہوگا۔"

"اپنے کو بھی تھوڑی پہچان ہے۔" بٹھل نے ترشی سے کہا۔

"اس نے کم ہی بتایا ہوگا۔"

"پھر میری بھی کچھ عرض سن لیجیے۔" ارشاد علی کی آواز پر ویرانی چھائی ہوئی تھی۔

"تو کیا بولے گا اب؟"

"ہاں۔" ارشاد علی نے ماتمی لہجے میں کہا "آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ آپ نے سب جان لیا ہے تو اب مجھے کیا کہنا ہے۔ میرے پاس اب کیا ہے۔"

"اچھا ہے' جلد تیرے سامنے میں آگئی۔ بہت تماشا کرلیا تو نے۔ اب راستہ لے اپنا۔"

"آپ نے کتنی آسانی سے فیصلہ کردیا۔ میں' میں کہاں جاؤں گا۔ میرا تو سلمٰی بانو کے سوا کوئی بھی نہیں ہے۔ بانو کو معلوم ہے کہ میرا کوئی بھی نہیں ہے۔"

"تیرا ٹھیکا نہیں لیا ہے بانو نے یا تو نے اس کا۔"

"آپ کو' آپ کو معلوم ہے' یہ میری منکوحہ ہے۔" ارشاد علی نے لکنت سے کہا۔

"معلوم ہے۔ سارا بول دیا ہے اس نے۔ چار آدمی کے بیچ بول پڑھوائے تھے تو نے۔ پر تو اب اس کی چھٹی کردے۔ جیسا تو نے نکاح کیا تھا' ویسے ہی ادھر حویلی میں بہن بھی بولا تھا اس کو۔"

"خدا جانتا ہے۔ میں تو سب کچھ سلمیٰ بانو کے لیے کرنا چاہتا تھا۔ مجھ اکیلے کا کیا۔ میرے آگے پیچھے کون ہے۔ بانو میری بیوی ہی نہیں' میری ذمے داری بھی ہے۔ اس نے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ میری تو ہر پل یہی کوشش' یہی آرزو رہی ہے کہ ایک دن ایسا آئے جب میں اس کے سارے دکھ دور کرنے کے قابل ہو جاؤں۔"

"اپنے پاس تو تکاری کا ٹائم نہیں ہے۔" بٹھل نے ناگواری سے کہا۔

"بانو میری زندگی ہے جناب' میری دنیا ہے' میں تو اس کے بغیر مر جاؤں گا۔"

"زمین تھوڑی ہلکی ہو جائے گی۔" بٹھل نے اچٹتی آواز میں کہا۔

"ایسا نہ کیجئے' خدا کے لیے ایسا نہ کیجئے' آپ کو بہت بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔" ارشاد علی دہائیاں دینے لگا۔

"اپنے کو کیا ہوئی ہے رے' اس کو تیری بانو کو ہوئی ہے۔ ہم کو کیا بولتا ہے' اسی سے پوچھ۔"

"بانو اب کیا۔ کیا کہے گی۔" ارشاد علی یاسیت سے بولا۔

"ابھی تو مینا کی طرح بولے گی۔ تیرے ساتھ نہیں ہے۔ اب تیرے سارے پنجرے تالے توڑ دیے ہیں ہم نے۔ اپنے سامنے نہیں تو اندر کمرے میں اسے لے جا۔"

ارشاد علی کو کسی پہلو قرار نہیں تھا۔ بانو سے مخاطب ہونے یا اسے اندر کمرے میں لے جا کے داد و فریاد کرنے سے کچھ حاصل ہونے کی توقع ارشاد علی کو نہیں رہی تھی اس لیے اس نے بٹھل کی پیش کش پر توجہ نہیں دی اور مایوسی سے کہا "ہو سکے تو پھر مجھے بھی ساتھ لے جائیے۔"

"تیرا کیا اچار ڈالیں گے بھیا!" جمرو نے لہرا کے کہا۔

"میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ میں بھی کہیں پڑا رہوں گا۔" ارشاد علی نے عاجزی سے کہا "مجھے ایک موقع دیجئے۔ میں اس دربدری سے تنگ آچکا ہوں' بہت تھک چکا ہوں۔"

"پھر کسی مسجد یا آستانے کی طرف نکل جا۔"

"دیکھئے بڑے صاحب! میری بات سنئے۔" ارشاد علی نے شکستہ آواز میں کہا "میں نے بہت کوشش کی ہے بانو کو خوش رکھنے کی۔ قسمت نے ساتھ نہیں دیا۔ میں آپ کو کیا بتاؤں' کہاں کہاں مارا مارا پھرتا رہا ہوں۔ جب کچھ نہ بنا تو بے شک الٹے سیدھے راستے بھی اختیار کیے۔ بچپن میں والدین جدا ہو گئے۔ گھر چھوٹا' شہر چھوٹا پھر ایک گھر ملا تھا' وہ بھی برباد ہو گیا۔ میں تو شروع سے بد نصیب ہوں۔ بانو کو میں نے سہارا دیا تھا لیکن بانو خود میرے لیے بہت بڑا سہارا بن گئی تھی۔ پھر میں نے اسی کے لیے سوچا' اسی لیے کیا ہے جو نہیں کر سکا' اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا جو کر سکا' اس سے زیادہ میرے بس میں نہیں تھا۔ عورت کی طرح مرد کو بھی کسی چھت' کسی سائبان کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"بہت بیلا ہے استاد قسم سے۔" جمرو سے برداشت نہیں ہوا' ہاتھ نچا کے کہنے لگا "کاشی والی نوٹنکی میں اچھا چلے گا۔"

"اپن پہلے ہی بولا تھا۔ ایک نمبر کا حرامی ہے۔" زورا منہ بنا کے بولا "ابھی کیسا طوطے کی مافک ٹیں ٹیں کرتا ہے سالا۔" گاڑی کی آمد کا وقت قریب آرہا تھا۔ بٹھل نے ہمیں اٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ ہماری دیکھا دیکھی ارشاد علی بھی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی حالت دیوانوں کی سی تھی۔ وہ ہذیان بکنے لگا۔ کسی نے اس کی جانب پھر جیسے دیکھا ہی نہیں۔ یکایک وہ جھپٹتا ہوا بٹھل کے مقابل آکے ٹھہر گیا۔ سلمیٰ بھی کھڑی ہو گئی۔ میری طرح سب یہی سمجھے ہوں گے کہ اب ارشاد علی سلمیٰ سے منت کرے گا یا بٹھل کے پاؤں پڑ جائے گا لیکن پلک جھپکتے میں اس نے جیب سے چاقو نکال لیا اور ایک قدم پلٹ کے سلمیٰ پر تان لیا۔ یہ کھٹکے والا رام پوری طرز کا چاقو تھا۔ اڈے کے آدمیوں کو اس قسم کا چاقو بہت مرغوب ہوتا ہے۔ ارشاد علی کی گرفت میں مشاقی تھی۔ ایک ہاتھ سے اچھال کے دوسرے ہاتھ میں چاقو پکڑنے کی مشق کا اظہار اس نے کمال چابک دستی سے کیا۔

"یہ تو اپنا ہی کوئی آڑی لگتا ہے استاد!" جمرو نے پٹ پٹاتی آنکھوں سے کہا۔

"کسی نے ایک قدم بھی اپنی جگہ سے حرکت کی تو بہت برا ہو جائے گا۔" ارشاد علی سرگشتگی سے بولا "اسے مجھ سے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔" اس کی آواز بھی بدل گئی تھی۔

سب اپنی اپنی جگہ ٹھہر گئے۔ ارشاد علی کی آنکھوں میں آگ بھڑکنے لگی تھی۔

"استاد! اب اصل روپ میں آیا ہے سور کی اولاد۔" جمرو نے من مناتے ہوئے کہا۔

بٹھل نے جھڑکتی نظروں سے جمرو کو دیکھا اور مفاہمانہ لہجے میں ارشاد علی سے بولا "پر یہ تو خود تجھ سے الگ ہونا چاہتی ہے۔"

"جانتا ہوں' تم لوگوں نے اسے کیا پٹی پڑھائی ہے۔ کوئی ایک اجنبی عورت پر یوں ہی مہربان نہیں ہو جاتا۔ تمہاری ہمدردی کی وجہ میں جانتا ہوں۔" ارشاد علی چیخ کے بولا۔

"یہ تو پاگل ہو گیا ہے رے۔" بٹھل نے تردد سے کہا

اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

"پاگل تو تم سارے مجھے لگتے ہو۔" ارشاد علی نے آتش باز لہجے میں بٹھل کو حکم دیا کہ وہ کرسی سے فوراً اٹھ جائے۔

"تسلی سے رے۔ ایسا کیا ہے۔" بٹھل نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے کہا۔

"بہت ہو گیا اب۔ بہت تسلی کر کے دیکھ لی تم سے۔" ارشاد علی پھنکارتے ہوئے بولا "تمہارا خیال ہے' میں دیکھتا رہوں گا۔ بانو کو ان لوگوں کے حوالے کر دوں گا جن کے آگے پیچھے کا کوئی پتا نہیں۔ بانو کے لیے میں نے پورے پانچ سال رات دن ایک کیے ہیں۔ اب ایک گھر بسانے' بانو کے دکھ درد دور کرنے' اسے سکھ دینے کا کوئی آسرا ہوا تو تم لوگ خدائی فوج دار بن کے بیچ میں آگئے" "ہا' کیسا مذاق ہے یہ۔"

"بیچ میں 'تو' تو آیا تھا اپنے۔ چاقو ہاتھ میں دھر کے بھی گھما پھرا کے بولتا ہے اور کم کیوں بولتا ہے۔ شروع سے لے۔ بانو کے گھر نقب لگانے کے ٹائم سے۔ پہلے بھائی کو بلی پہ چڑھا کے منکا تڑوا دیا پھر ماں کی ڈور کاٹ دی۔ پھر تو تو ہی تھا جنگل کا شیر ببر دہیں سے حساب کر۔"

"یہی سب کچھ تم نے بانو کو سمجھایا ہے نا۔"

"اس نے کتنا بولا "ہم نے کتنا' یہ تو یہی جانتی ہے رے۔" بٹھل نے ملامت سے کہا۔

"اس وقت ڈبے کی بات اور تھی۔ بانو کو میری واپسی کی امید نہیں رہی ہو گی۔ اس وقت اسے گھبرا جانا' خوف زدہ ہو جانا چاہیے تھا۔ عورت ذات ایسے میں کیا کر سکتی ہے۔ بانو نے لاچاری میں آنسو بہائے ہوں گے لیکن اب میں' میں اس کا نگہبان' اس کا رکھوالا واپس آگیا ہوں۔"

"دیر بہت ہو گئی تجھ کو آنے میں۔" بٹھل کی آواز ابھی تک ٹھہری ہوئی تھی "لاچار تو' تو ہی اسے بنا کے گیا تھا۔ اپنا گلا بچانے کو۔ اپنی عزت کو غیر مردوں کے بیچ چھوڑ کے چلا گیا تھا' پولیس اس کو ڈبے سے لے جاتی تو کدھری سے چھاتی پھلا کے آتا۔"

"تم کیا سمجھتے ہو۔" ارشاد علی سر جھٹک کے بولا "ایسے تھوڑی چلا گیا تھا' جان کے گیا تھا' بانو کے خیال سے۔ بانو کے لیے اور میرے لیے یہی بہتر ہے۔ میرے چلے جانے سے یہ زیادہ محفوظ ہو گئی تھی۔"

"پولیس کو ہم تلاشی سے روک کے نہ رکھتے تو تیری یہ گھر والی' تیری زندگی ادھری حوالات میں سلاخیں چاٹ رہی ہوتی۔" بٹھل نے بیڑا جلاتے ہوئے کہا۔

"ذرا بانو سے پوچھ بھتنیا کے' وہ تیری ماں کے یار' وردی والوں کو ہم نے کیسے روکا تھا۔" جمرو کو پھر تاؤ آگیا۔

"دیکھ رے' زبان سنبھال کے بات کر۔ مجھ کو بھی یہ زبان اچھی آتی ہے۔" ارشاد علی نے طیش میں کہا۔

"تجھ کو کیا نہیں آتا کتے' گھوڑے کی اولاد۔" جمرو کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ جھپٹ کر ارشاد علی کی گردن دبوچ لے۔

بٹھل نے جمرو کو ڈپٹ دیا اور ارشاد علی سے بولا "پولیس اس کو دھر لیتی تو اپنا بھی تختہ ہو جاتا۔ تو نے اپنے کو پھندا ڈلوانے کا پورا چکر چلا دیا تھا۔"

"یہ تو کہنے کی باتیں ہیں' تمہارا کیا بگڑتا۔ وقت پڑنے پر صاف الگ ہو جاتے۔" ارشاد علی ڈھٹائی پر اتر آیا۔ کہنے لگا "ڈبے میں چار مرد تھے اور سامنے ایک کمزور عورت بیٹھی تھی۔ تمہاری جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا۔"

"سب تیرے باپ کا نمک کھاتے ہیں نا؟"

"ٹھیک ہے' تم نے بہت احسان کیا۔ میرے باپ دادا پر احسان کیا۔" ارشاد علی دکھاوے کی بے زارگی سے بولا "اب کیا ہے' کیا چاہتے ہو تم؟"

"اپنی بول رے' چاہتا تو سارا تیرا ہی لگتا ہے۔ چاقو تیرے ہاتھ میں ہے۔"

"میرے راستے سے ہٹ جا۔"

"پھر تو کیا کرے گا؟"

"پھر خون خرابہ ہو سکتا ہے۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میں بانو کو نہیں چھوڑ سکتا۔ کسی حالت میں بھی۔" ارشاد علی نے دو ٹوک انداز میں بولا "تمہیں معلوم ہے' بانو کس خاندان کی بیٹی ہے؟"

"بولا ہے بانو نے۔" بٹھل نے سر ہلا کے کہا "اور یہ بھی بولا ہے کہ تو نے اسے حویلی میں نوکرانی رکھوا دیا تھا۔"

"ایسی ویسی جگہ نہیں۔" ارشاد علی جھلا کے بولا "وہ بہت بڑے' بڑی عزت و شان والے لوگ تھے۔ وہاں بانو پھول کی طرح رہی' بیگمات کی طرح۔"

"کیسا ہے رے' انہی کے گھر کا کونڈا کر دیا۔"

"تم کیا جانو اور تمہیں جاننے کی ضرورت بھی نہیں' ہم پر کیسی کیسی قیامتیں ٹوٹی ہیں۔" ارشاد علی کے پاس کوئی دلیل نہیں ہو گی۔ وہ یہی کہہ سکتا تھا جو سلمیٰ ہمیں پہلے بتا چکی تھی کہ ان عالی شان محل والوں کو اس معمولی خرد برد سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان کے لیے تو یہ آٹے میں نمک کے برابر ہے۔"

"پر تو نے اپنا خاندان نہیں بتایا حرام کے جنے۔" جمرو

نے لہک کے کہا "تو اپنے کو اٹھائی گیروں کے خاندان سے جان پڑتا ہے۔ بانو کی جوتی دیکھی ہے تو نے؟"

"جانتا ہوں' تم ایسی گھٹیا' اوچھی باتیں کرکے بانو کو کیا جتانا چاہتے ہو۔ تم نے ڈبے میں بھی کیا کیا سبز باغ نہ دکھائے ہوں گے۔ اس سے سب کچھ اگلوانے کے لیے کیسا جال بچھایا ہوگا لیکن وہ وقتی بات تھی۔ بانو اب تمہارے جھانسے میں نہیں آسکتی۔ بانو اتنی نادان نہیں' اپنا اچھا برا سمجھ سکتی ہے اور وہ نہ سمجھے تو میں' اس کا شوہر' اسے سمجھانے والا ہوں۔ ہر طرح میرا حق اس پر ہے۔ وہ مجھے تم سے زیادہ جانتی ہے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کا دکھ درد بانٹا ہے۔ تم کون ہو' کہاں سے آئے ہو' کیا کرتے ہو۔ بانو پوری تسلی تشفی کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھائے گی۔"

سلمٰی کا چہرہ سفید پڑگیا تھا۔ اس کا سارا بدن لرز رہا تھا۔ ارشاد علی اس کا بازو جکڑے ہوئے تھا۔ سلمٰی کا دم گھٹ رہا ہوگا۔ وہ کبھی ہماری طرف دیکھتی' کبھی ارشاد علی کی طرف' کبھی کھلے چاقو کی طرف۔ گاڑی کی آمد میں بہت کم وقت رہ گیا تھا۔ خدمت گار یا کوئی اور کسی لمحے بھی انتظار گاہ میں آسکتا تھا۔ ارشاد علی کو قطعًا اس کی پروا نہیں تھی۔

"پر تو نے یہ تلوار بانو پر کیوں تان رکھی ہے؟" بٹھل نے آخر وہی سوال کیا جو شروع سے میرے دماغ سے چمٹا ہوا تھا۔ بٹھل یا ہم میں سے کسی کو ہدف بنانے کے بجائے اس نے سلمٰی کا انتخاب بے سوچے سمجھے نہیں کیا ہوگا۔

"یہی تو بنیاد ہے۔" ارشاد علی نے دہکتی آواز میں کہا "تم لوگوں کو اس سے بہت ہمدردی ہوگئی ہے نا! اس کا اتنا خیال ہے تو اسے اس کی حالت پر چھوڑ دو۔"

"پھر وہی الٹی بات کرتا ہے۔" بٹھل نے بزرگانہ ناراضی سے کہا "ہم نے اس کا راستہ کب کھوٹا کیا ہے۔"

"پھر سیدھی طرح ہم کو جانے دو۔"

"پر ایسا کیسے رہے۔" بٹھل نے نسبتًا اونچی آواز سے کہا "بانو سے ہمارا بھی کوئی ناتا ہے۔"

"تمہارا ناتا!" ارشاد علی بپھر کے بولا "تمہارا کیا ناتا ہے؟"

"ہم نے بھی اس کو کچھ بولا ہے۔"

"کیا' کیا بولا ہے تم نے؟" ارشاد علی بھن بھنا گیا "رشتے ناتے بولنے سے تھوڑی سے ہوجاتے ہیں۔"

"بول کا ناتا تو تیرا بھی ہے۔"

"میرے پاس سلمٰی بانو کسی کی امانت بھی ہے۔"

"تالی بجا میں' تو نے امانت کا بہت دھیان رکھا۔"

"فضول باتوں سے تمہارا نقصان ہوگا۔" ارشاد علی نے زچ ہوکر کہا "تم چاہتے کیا ہو آخر؟ پیسہ! پیسہ چاہیے تم کو؟"

"ہاں' اب تو تو بڑا مال والا ہے۔"

"تم اپنا حصہ مانگنا چاہتے ہو؟"

"ہم نے اپنا حصہ بول دیا ہے۔"

"کون! کون سا حصہ؟"

"بانو کو ہم لے جارہے ہیں۔"

"کیا' کیا مطلب ہے تمہارا؟" ارشاد علی بدحواسی سے بولا۔

"کون سی بھاشا سمجھتا ہے' بولا کیا ہے رے۔" بٹھل کی آواز کی برف پگھلنے لگی تھی۔

"بانو کو بیچ میں مت لاؤ۔"

"تو مال اپنے کو دینا چاہتا ہے۔"

"ہاں!" ارشاد علی نے استہزائی لہجے میں کہا۔ "اب آئے نا اصلیت پر' مال چاہیے تمہیں؟"

"جیسی تیری مرضی' مال پھر ادھری کردے۔"

"مال پھر ادھری کردے۔" ارشاد علی نے غصے میں بٹھل کی نقل اتاری "مال مفتی کا ہے۔"

"پھر بانو کو ہم لے جاتے ہیں۔"

"دیکھو' دیکھو بڑے صاحب! اب تک تمہارا بہت لحاظ کیا ہے۔ وہ بھی اس وجہ سے کہ تم نے ہم دونوں پر احسان کیا ہے۔ اب زیادہ ہوشیاری مت دکھاؤ۔ میں نے تم کو کہا ہے' بہت برا ہوجائے گا۔" ارشاد علی بھنچے ہوئے ہونٹوں سے بولا "بانو کو اس طرح کسی ایرے غیرے کی بھینٹ چڑھانے سے بہتر ہے کہ اسے ختم کردیا جائے۔ میں اسے ختم کردوں گا اور پھر میں بھی نہیں رہوں گا لیکن اس سے پہلے تم میں سے بھی دو ایک ضرور جان گنوا بیٹھو گے۔ نشانہ میرا برا نہیں ہے اور اسے ایک چاقو مت سمجھنا۔ واقف کار ایک سے دس کا کام لیتا ہے۔" ارشاد علی نے چاقو اچھال کے تیزی سے دوبارہ گرفت میں لے لیا۔ "سیدھی طرح اندر کے کمرے میں چلے جاؤ۔ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ بڑے صاحب! کچھ بھی۔ ہوش میں رہو تو اچھا ہے۔ ایک بات کان کھول کر سن لو' دنیا ادھر سے ادھر ہوجائے' میں بانو کو نہیں چھوڑ سکتا۔"

"تو پھر مال پہ سودا کرلے۔" بٹھل نے کھردری آواز میں کہا۔

"مال میں تمہارا حصہ تم کو مل جائے گا۔" ارشاد علی تلخی سے بولا۔

"کتنا دے گا تو؟"

"تسلی ہوجائے گی تمہاری۔ آدھا آدھا چلے گا۔"

"دونوں میں آدھا آدھا۔" بٹھل نے دھیرے سے کہا۔

"دونوں میں۔۔۔؟" ارشاد علی کی آنکھیں ابل پڑیں۔

"بانو میں حصہ نہیں دے گا کیا؟"

"کیا بکتے ہو' تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔"

"بانو کو بھی آدھا آدھا کردے رے۔ دونوں میں اپنا حصہ بنتا ہے۔ مال کے ساتھ اس کو بھی ہم نے روکے رکھا تھا۔"

"تم ایسے نہیں مانو گے۔"

"دیکھ رے' آرام سے سن' آدھے آدھے کو بولتا ہے نا۔ بانو آدھی نہیں ہوسکتی تو اس کو تو پاس رکھ۔ مال پلے باندھنا چاہتا ہے تو بانو کو ادھری کردے۔"

بکھرا ہوا کچھ کچھ میرے ذہن میں سمٹ رہا تھا۔ واپس آکے ارشاد علی کو ایک دوسری سلمٰی بانو سے واسطہ پڑا تھا۔ اس دوران میں سلمٰی کے پر نکل آئے تھے۔ اس کے عزم اور پرواز کی قوت کے تخمینے کے بعد ہی ارشاد علی کو کوئی فیصلہ کرنا چاہیے تھا۔ اور سلمٰی کی نظروں میں ہمیں مطعون کرنے' عواقب سے آگاہ کرنے اور اپنا اترا ہوا رنگ جمانے کی تدبیر یہی ہوسکتی تھی کہ ارشاد علی' سلمٰی کو ہدف پر رکھے۔ خاکستر کی نئی آگ سے کتنا فرق پڑتا ہے۔ ہتھیار نکل آیا تھا۔ ہر ہتھیار سے خون کی بو آتی ہے۔ خون خرابے کی باتیں سن کے پہلے سے فشار زدہ سلمٰی کی استقامت جواب دے جانے کا امکان تھا۔ یہی کسی شریف النفس کی وضع ہونی چاہیے کہ اپنے محسنوں کو کسی اور آزمائش میں ڈالنے کے بجائے ترک وایثار کی روش اختیار کرے۔ ادھر زروجواہر کی نگراں سلمٰی کے قریب رہنا اور ہر دم اس پر نگاہ رکھنا ارشاد علی کے لیے ہر چند ضروری تھا۔ اسی چپقلش میں ذخیرہ اپنی تحویل میں لینے کا کوئی موقع نہیں نکل سکتا تھا۔ یہ ذخیرہ ارشاد علی کا مقصود ومطلوب تھا۔ اس کی جان اسی میں اٹکی ہوئی ہوگی۔ اس کے بعد ارشاد علی کے لیے ایک ہی مرحلہ رہ جاتا تھا' خوش اسلوبی سے فرار ہوجانے کا' سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کے اوجھل ہوجانے کا۔ بٹھل نے جبر کی حد تک اسے رعایت دی تھی۔ جس لمحے ارشاد علی نے چاقو نکالا' اسی وقت اسے منتشر کرنے اور اس پر قابو پانے کی کوشش کی جاسکتی تھی لیکن بٹھل کے تامل کا کوئی ایک سبب نہیں تھا۔ ارشاد علی کے تیوروں کا اندازہ لگانے کے لیے اسے کچھ وقت درکار تھا۔ ہماری دخل اندازی ارشاد علی کے خواب لٹ جانے کے مترادف تھی۔ سب کچھ ہاتھ سے جاتا دیکھ کے آدمی کبھی بہت پاگل ہوجاتا ہے۔ کہتے ہیں' چور کے لیے ایک دروازہ کھلا رکھنا چاہیے ورنہ وہ درندہ بن سکتا ہے۔ ہماری چستی ومستعدی سے ارشاد علی' سلمٰی کے لیے مہلک ہوسکتا تھا اور شاید سلمٰی پر بھی کوئی خوش گوار اثر مرتب نہ ہوتا۔ یہ تیزی وتیزدستی سلمٰی کے لیے مستقل ہیبت کا موجب ہوسکتی تھی۔ رفتہ رفتہ ہم ہی اڈا گیروں کا ادراک مناسب تھا۔ ایک نہ ایک دن تو اسے ہمارا سارا عرفان ہو ہی جانا تھا مگر اس دن کوئی دل افتادگی نہ ہوگی کہ رفتہ رفتہ آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوجاتیں' روشنی سے بھی۔

ارشاد علی نظر ثانی کے لیے طرح طرح سلمٰی کو دگرگوں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ بٹھل کو بھی سلمٰی کا عزم استوار رکھنے کے لیے ارشاد علی سے کٹ حجتی کو طول دینا لازم ہوگیا تھا۔ یہاں تک کہ ارشاد علی نے چاقو نکال لیا تھا۔ بٹھل کی یہی خواہش ہوگی کہ ارشاد علی کے پاس اپنے سوز وگداز کی کوئی دلیل باقی نہ رہے۔ ازروائے احتیاط آئندہ بھی سلمٰی کے ارادے کی توانائی کے لیے یہی بہتر تھا کہ ارشاد علی کے جسم پر محض لباس ہی کی پوشیدگی رہے۔ بٹھل کے ذہن میں پھر یہ نکتہ بھی رسا ہونا چاہیے کہ چاقو بردار ارشاد علی' سلمٰی کے لیے ایک صدمہ' ایک اور تازیانہ تھا تو اس انتہا کاری میں ارشاد علی کے لیے مثبت پہلو بھی نکلتا تھا۔ اس سے یہ مطلب بھی برآمد ہوتا تھا کہ ارشاد علی' سلمٰی کے لیے کتنی دور جاسکتا ہے۔ سلمٰی کے لیے اس کی جانب سے کیے جانے والے دعوؤں کا زور واثر یوں کچھ اور فزوں ہوتا تھا۔ الغرض ارشاد علی نے سلمٰی کو متزلزل کرنے کے لیے کوئی گوشہ نہیں چھوڑا تھا۔ ڈبے میں اپنی روداد سناتے وقت سلمٰی کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے تھے۔ اس سے توقع نہیں تھی کہ وہ ارشاد علی کی سخن سازیاں بھول جائے گی مگر کوئی بھی کم زور لمحہ کسی پر غالب آسکتا ہے۔ جب تمام سفید وسیاہ سے آگہی' تمام تر ہوش وحواس کے باوجود آنکھوں پر پردہ پڑجاتا ہے۔

دروازہ کھلنے کی چرچراہٹ پر سب چونکنے ہوگئے۔ خدمت گار متنبہ کرنے آیا تھا کہ گاڑی کی آمد میں بس لمحوں کی دیر ہے۔ دروازے سے لپکتا ہوا وہ چند قدم آیا تھا کہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ ایک لمحے کی حیرانی کے بعد وہ واپس جانے کے لیے فورًا مڑگیا تھا کہ ارشاد علی کی للکار پر جہاں تھا' وہیں ساکت ہوگیا۔ ارشاد علی نے اسے اندر کمرے میں جانے کا حکم صادر کیا۔ خدمت گار نے متوحش نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔ بٹھل نے سرہلا کے گویا اسے کسی چوں وچرا کے بغیر ارشاد علی کے حکم کی تعمیل کا مشورہ دیا۔

خدمت گار کے اندر جانے کے بعد بٹھل نے فیصلہ کن لہجے میں ارشاد علی سے پوچھا "گاڑی آرہی ہے رے۔ کیا گھومتا ہے دماغ میں پھر تیرے۔"

"تم سے کیا کہا ہے، سیدھے اندر چلے جاؤ۔" ارشاد علی نے گرج کے کہا "کوئی دوسری بات نہیں۔ تمہارے لیے اب کچھ نہیں ہے۔"

"پر، مال تو اپنے پاس ہے رے۔" بٹھل نے زورا کی جانب دیکھتے ہوئے ہاتھ کا اشارہ کیا۔

ارشاد علی کے جسم کو جھٹکا لگا۔ بجلی سی اس پر گری ہوگی۔ اس جانکا سانحے سے سنبھلنے کا موقع نہیں ملا تھا کہ یکایک زورا دروازے کی طرف بھاگ پڑا۔

زورا کے اس اچانک اقدام سے زروجواہر کے ذخیرے کا اس کی تحویل میں ہونا ظاہر تھا۔ ارشاد علی نے یہی جانا اور وہ اوسان میں نہیں رہا۔ سلمیٰ کا بازو چھوڑ کے بے اختیار اس نے بھاگنے والے زورا کے تعاقب میں جست لگائی۔ وہ چند قدم ہی بڑھا ہوگا کہ اوندھے منہ گر پڑا۔ زورا کے بعد دوسرے لمحے جمرو نے بھی دروازے کا رخ کیا تھا لیکن ادھر سے دروازے کی طرف اڈتے ہوئے ارشاد علی کی ٹانگوں میں ٹانگ اڑانے کے لیے جمرو ایک قدم بعد ہی ٹھہر گیا تھا۔ سلمیٰ کے سامنے یہی طفلانہ طریق کار مناسب تھا۔ گرنے کے باوجود چاقو ارشاد علی کے ہاتھ میں تھا۔ جمرو اس کے بہت نزدیک تھا۔ زورا کو بھی دروازے سے پلٹنے میں پل بھر کی دیر لگی ہوگی پھر دونوں کو ارشاد علی پر قابو پانے میں کوئی زحمت نہیں ہوئی۔

بٹھل کی آواز پر خدمت گار فوراً باہر آگیا۔ اس نے جلدی جلدی سامان اٹھایا۔ میں نے بھی اس کی مدد کی۔ بٹھل کی تاکید پر حیران و پریشان سلمیٰ نے معمول کے مانند عجلت کی جمرو اور زورا، ارشاد علی کو فرش سے اٹھانے کی کوشش کررہے تھے کہ سلمیٰ ان کے پاس سے گزرتے ہوئے ٹھہر گئی۔ اس کی اداس نظریں ارشاد علی پر بھٹکنے لگیں اور اس نے چادر میں چھپی ہوئی پوٹلی نکال کے بٹھل کی جانب بڑھادی "یہ انہیں ہی دے دیجیے۔" وہ ڈگمگاتی ہوئی آواز میں بولی۔

"نہیں، ری، ابھی دبوچ کے رکھ اسے۔" بٹھل نے حکمیہ لہجے میں کہا "ٹائم آنے پر جن کا ہے، ان کے منہ پر مارنے کا ہے۔ نہیں پھر ساری عمر کا ٹنٹا لٹکائے پھرے گی کیا۔"

سلمیٰ نے پھر کچھ نہیں کہا۔ بٹھل اس کی کمر پر ہاتھ رکھ کے تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات چھٹے حصے میں ملاحظہ فرمائیں جو کہ ساتھ ہی شائع ہورہا ہے۔

سب رنگ ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ

بازی گر

امنگوں حوصلوں آنسوئوں اور آہوں کی داستان

بازیگر

گاڑی آچکی تھی۔ پلیٹ فارم پر مسافروں کا اژدحام تھا۔ خدمت گار نے ڈبے تک ہماری رہبری کی۔ سلمیٰ کے ہاتھ پاؤں کپکپا رہے تھے۔ سانس بھی قابو میں نہیں تھی۔ بٹھل نے نشست پر بٹھا کے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا' اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور اسے بازو میں سمیٹ کے بولا "اب مٹی جھاڑ دے ری ساری۔"
سلمیٰ کی آنکھیں چھلک رہی تھیں۔ بٹھل کے شانے پر سر رکھ کے وہ پھوٹ پڑی۔ بہت دیر بعد بٹھل کی تسلیوں سے کہیں اس کے آنسو تھمے۔

گاڑی چلنے سے چند منٹ پہلے زورا اور جمرو خندہ پیشانی سے ڈبے میں داخل ہوئے۔ "بس استاد!" جمرو نے زیر و زبر آواز میں کہا "گاڑی چلنے تک شاید لوٹ کے نہ آئے۔ اس کے بعد سب ٹھیک ہے۔"

اس طرح سلمیٰ کو کچھ باور کرنا جمرو کا مقصود تھا۔ بٹھل نے بھی ان سے تفصیل نہیں پوچھی۔ جمرو اور زورا دو ایک ...ر کے لیے ضرور ارشاد علی کو خود سے بے گانہ کر کے آئے ...وں گے۔

انتظار گاہ کا اندرونی کمرا ایسی جگہ نہیں تھا جہاں سے ...وئی باہر نہ نکل سکے۔ دروازے کے ساتھ دائیں بائیں فرش سے قریباً دو فٹ اوپر کھڑکیاں نصب تھیں۔ دونوں کھڑکیاں اندر سے بند تھیں اور اندر ہی کی جانب پردے لگے ہوئے تھے۔ متعدد روشن دانوں نے کمرے میں ہوا اور روشنی کی کمی نہیں رہنے دی تھی مگر روشن دان بہت اونچے تھے۔ بچوں کی آمدورفت روکنے کی خاطر کھڑکیوں کے نچلے حصے پر لوہے کی جالی دار سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ ارشاد علی کے حکم کے بموجب ہم اندرونی کمرے میں بند ہو جاتے اور باہر سے وہ کنڈی لگا دیتا تو کرسی رکھ کر کھڑکیوں سے بیرونی کمرے میں کودا جا سکتا تھا۔ کھڑکیاں نہ ہوتیں تو دروازہ توڑنا ایسا دشوار نہیں تھا لیکن ارشاد علی کو وقت ہی کتنا چاہیے تھا' بس اس قدر کہ اندرونی کمرے میں ہمیں بند کرتے ہی وہ پوٹلی اپنے قبضے میں کرے اور آناً فاناً انتظار گاہ سے نکل کر اسٹیشن کے ہجوم میں گم ہو جائے۔ سلمیٰ کے ساتھ یقیناً رکاوٹ پیش آتی۔ مال ہاتھ میں آجانے کے بعد اسے سلمیٰ سے غرض بھی کیا تھی۔ سلمیٰ کو وہیں چھوڑ کے وہ کسی محفوظ سمت کو نکل سکتا تھا۔

سورج زمین سے خاصا اوپر ہو چکا تھا۔ یہ بڑی لائن کی گاڑی تھی۔ رفتار بہت تیز تھی۔ ڈبا بھی کشادہ تھا۔ سلمیٰ بانو کے خیال نے مجھے روکے رکھا۔ میں جمرو اور زورا سے نہ پوچھ سکا کہ انہوں نے ارشاد علی سے کس درجے کا سلوک کیا تھا۔

دلی تک کا سفر پورے دن اور رات پر محیط تھا۔ ہوش میں آتے ہی ارشاد علی سے بعید نہیں کہ وہ سیدھا پولیس کا رخ کرے۔ وہ کوئی بھی دیوانگی کر سکتا ہے۔ نواب عابد علی خان نے جس طرح حیدر آباد سے جانے والی گاڑیوں پر پہرے بٹھا دیے تھے، ہماری جستجو میں بھی آنے والے اسٹیشنوں پر پولیس چھاپے مار سکتی ہے اور ہمیں تلاش کرنا نہایت آسان ہوگا۔ چار آدمی، ساتھ میں ایک عورت اول درجے کے مسافر، ان عمروں اور ایسی وضع قطع کے حامل! زروجواہر کی پوٹلی کہیں محفوظ نہیں کی جا سکتی تھی۔ سامان میں تمنچے اور کارتوس الگ تھے۔ شاید مختلف ڈبوں میں سفر کرنا ہمارے لیے بہتر ہوتا یا پھر آنے والے کسی اسٹیشن پر اتر کے کوئی اور گاڑی پکڑنی چاہیے تھی۔

گاڑی من ماڑ سے دور آگئی۔ گم صم سلمٰی بانو نشست کے کونے میں دبکی ہوئی تھی۔ بٹھل دیر تک اس کے قریب بیٹھا جانے کیا کہتا رہا پھر وہ سامنے کی نشست پر آگیا۔ ابھی تک کسی کے چہرے سے شکنیں دور نہیں ہوئی تھیں۔ اس کا سبب محض گزشتہ رات کا غبار نہیں ہوگا یا درپیش سفر کی طوالت کا بار۔ میری طرح ان کے سروں پر بھی مکڑی جالا بن رہی ہوگی کہ وہ مجھ سے زیادہ شامل رہے تھے۔

جمرو اور زورا، ارشاد علی کو ختم کر کے نہیں آئے ہوں گے۔ اڈے پاڑے کے لوگ اور ہوتے ہیں۔ وہ ارشاد علی کو اندرونی کمرے کی آرام کرسی یا صوفے پر لٹا کے آئے ہوں گے۔ خدمت گار کو ابتدا میں بٹھل نے اچھی بخشش دی تھی اور میں نے بھی نوازا تھا۔ وہ مسلسل سلام کرتا رہا تھا۔ انتظار گاہ واپس جا کے جیسے ہی خدمت گار کی نظر بے حس و حرکت ارشاد علی پر جائے گی، وہ اپنے افسر کو مطلع کرے گا۔ کوئی حیل وحجت کے بغیر افسر کو طبیب اور پولیس طلب کرنا چاہیے۔ طبیب کی کوششوں سے ارشاد علی جلد ہوش میں آسکتا ہے۔ اپنے حواس کے قیام و قرار کے بعد اسے دو میں سے کوئی ایک فیصلہ کرنا ہے۔ اپنی جاں بخشی غنیمت سمجھے اور نوشتہ سمجھ کے دانش مندی کا ثبوت دے یا اپنی آگ کا فتیلہ پولیس کے ہاتھ میں تھما دے۔ سنا ہے، ڈوبتا ہوا آدمی کنارے پر کھڑے ہوئے لوگوں کے ڈوب جانے کی آرزو بھی کرتا ہے، خواہ دوستوں کے لیے کوئی ایسا نہ چاہے، دشمن تو دشمن ہوتے ہیں۔ دوسرا فیصلہ صاف خودکشی تھی لیکن روح کی طمانیت کے ساتھ فیصلہ کرنا ارشاد علی کے لیے اتنا سہل نہ ہوگا۔ زندگی زروجواہر کے بڑے سے بڑے ذخیرے سے بیش بہا ہوتی ہے۔ یہ زندگی ہی کا غلبہ تھا کہ اس نے نظام آباد اسٹیشن پر پولیس دیکھی تو سلمٰی بانو کو تنہا چھوڑ کر چلا گیا۔ اسے پوٹلی بھی ساتھ ساتھ لے جانی چاہیے تھی مگر پوٹلی کے ساتھ زندگی عذاب سے دوچار ہو سکتی تھی۔ زروجواہر ارشاد علی کا ترکا نہیں تھے کہ اجداد سے پشیمانی کا خیال کانٹے بچھائے رکھے۔ خاموشی میں ارشاد علی کے لیے بڑی نجات تھی۔ سلمٰی کی بازیابی خارج از امکان نہیں تھی۔ امید رکھنے والے کو دنیا ہمیشہ چھوٹی نظر آتی ہے، دیواریں بھی۔ قمار باز از سرنو بساط بچھانے سے نہیں گھبراتا بلکہ مچلتا رہتا ہے۔ ارشاد علی بہرحال ایک آدمی تھا۔ آدمی احساس سے عبارت ہے۔ ممکن ہے، کوئی خوابیدہ احساس ارشاد علی کے سیہ خانے میں بیدار ہو جائے اور آئینہ دیکھنے کے لیے ضد کرے۔

بٹھل کی ہدایت پر سلمٰی نے حویلی والے کپڑے پہن لیے، برقع بھی نکال لیا۔ ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت کے بعد چالیس گاؤں نامی اسٹیشن آگیا۔ درمیان میں جمرو اور زورا نے سلمٰی سے آڑ رکھ کے سامان میں کچھ ردوبدل کر دیا تھا۔ بٹھل کے اور میرے کپڑے سلمٰی کے اٹیچی کیس میں رکھ دیے گئے تھے۔ تمنچے اور کارتوس والی اٹیچی ساتھ لے کے جمرو اور زورا چالیس گاؤں نامی اسٹیشن پر اتر گئے۔ بٹھل نے زروجواہر بھی ان کے حوالے کر دیے تھے۔ دونوں میں سے کسی ایک کو اسٹیشن سے باہر جا کے بس سے ٹکٹ خریدنے تھے اور کسی بھی ڈبے میں بیٹھ جانا تھا۔ اس اہتمام سے ظاہر تھا کہ بٹھل کے دماغ میں بھی وہ خود رو وہم و قیاس نمو پا رہے تھے جن سے میرا سر جکڑا ہوا تھا۔

من ماڑ سے چلے ہوئے تین گھنٹے سے اوپر ہو چکے تھے۔ گیارہ بجے بھساول جنکشن آگیا۔ کسی سپاہی نے ہمارے ڈبے کا رخ نہیں کیا۔ پلیٹ فارم پر بھی دور دور تک پولیس نہیں تھی۔ چالیس گاؤں میں زورا اور جمرو کے ڈبے سے اتر جانے کے بعد بٹھل نے چائے منگوالی تھی۔ بھساول پر پولیس کی طرف سے مطمئن ہو کے زورا کھانے پینے کا سامان دے گیا تھا۔ دو گھنٹے بعد کھنڈو جنکشن آگیا۔ اس بار جمرو ہمارے ڈبے کے گرد چکر لگاتا رہا۔ ناشتا ہی اتنا زیادہ ہو گیا تھا کہ دوپہر کے کھانے کی ذرا بھی گنجائش نہ تھی۔ اٹارسے ہوتی ہوئی گاڑی ساڑھے پانچ بجے بھوپال پہنچ گئی۔ دلی جتنی قریب ہو رہی تھی، پولیس کی دست اندازی کا اندیشہ اتنا ہی دور ہوتا جا رہا تھا۔ ڈبے سے زروجواہر چلے جانے سے سلمٰی بانو کا چہرہ نکھر سا گیا تھا۔ اطمینان صرف چہرے کا نہیں ہوتا، آدمی کی حرکات و سکنات میں بھی ایک توازن آجاتا ہے۔ گو جمرو اور زورا کے ساتھ نہ ہونے سے بڑی اداسی ہو گئی تھی۔ سفر میں ساتھیوں کی کثرت سے منزلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ بھوپال شہر گزر جانے کے بعد میں اوپر کی برتھ پر چلا گیا۔ سلمٰی نے بھی مسلسل دو بے چین راتیں گزاری تھیں۔ عورت کو نیند میں بھی حجاب کا کیسا خیال رہتا ہے یا یہ سلیقے کی بات تھی۔ خوابیدگی کی حالت میں بھی سلمٰی کا سلیقہ دیدنی تھا۔ سر سے پیر تک بدن چادر میں چھپائے، چپکے چپکے سوتی رہی۔ درمیان میں آنے والے اسٹیشنوں کی مجھے بھی کچھ خبر نہیں تھی۔ بینا جنکشن پر بٹھل کی صداؤں سے کہیں آنکھ کھلی۔ جانے کہاں سے جمرو نفیس قسم کے کھانوں کا انبار اٹھا لایا تھا۔ ہم تینوں نے سیر ہو کے کھایا۔ جمرو اور زورا کو اب ڈبے میں واپس آجانا چاہیے تھا لیکن نہ بٹھل نے واپسی کے لیے ان سے کچھ کہا نہ انہوں نے زبان کھولی۔ چالیس گاؤں میں انہوں نے تیسرے درجے کے ٹکٹ لیے تھے اور جگہ نہ ملنے پر انٹر میں بیٹھ گئے تھے۔ بھساول اور بھوپال میں ٹکٹ چیکر ہمارے ٹکٹ چیک کرنے آیا تھا۔ زورا بتا رہا تھا کہ کھنڈو میں کسی قنوطی ٹکٹ چیکر نے ان کے ڈبے کا بھی پھیرا لگایا تھا اور انٹر میں ان کے سفر کرنے پر معترض ہوا تھا۔ زورا نے جب انٹر کا کرایہ ادا کرنے پر آمادگی ظاہر کی تو ٹکٹ چیکر بے پروائی سے بولا "رکھو یار، جب تک گوری سرکار ہے، عیش کرو۔"

زورا اور جمرو اس سے نہ کہہ سکے کہ گوری سرکار کا بوٹا تو انہوں نے پہلے ہی ترک کر دیا ہے۔ ان کے پاس تو من ماڑ سے دلی تک کے اول درجے کے ٹکٹ ہیں۔

صبح خوب روشن ہو گئی تھی۔ ٹھیک آٹھ بجے گاڑی دلی شہر میں داخل ہو گئی۔ زورا اور جمرو نے آخر تک احتیاط کی۔ دلی اسٹیشن ہی پر وہ ہمارے ساتھ ہوئے۔ ارشاد علی کے سر میں کسی وقت بھی سودا سما سکتا تھا۔ ممکن ہے، اس باریک بین کے ذہن پر یہ رمز نقش نہ ہو گیا ہو کہ ہم نے من ماڑ سے آگے کسی بھی اسٹیشن سے راستہ بدل دیا ہوگا۔ عاقبت اندیشی یہی ہے کہ ہمیں اس گاڑی سے دلی کا سفر نہیں کرنا چاہیے۔ جزرسی کی اپنی خامیاں، خوبیاں ہیں۔ کوئی عجب نہیں، یہی کچھ سوچ کے ارشاد علی نے ہمارے تعاقب کا ارادہ ملتوی کر دیا ہو۔ اس کے لیے یہ تلخی مستزاد تھی کہ پولیس کو مہمیز کرنے سے مراد اپنے آپ سے بھی دست بردار ہو جانا ہے۔

دلی اسٹیشن بھول بھلیوں کے مانند ہے۔ ہر وقت ایک ہنگامہ، کسی گاڑی کے کوچ کا نقارہ پٹ رہا ہے۔ کسی گاڑی کی آمد کا غلغلہ ہے۔ دلی سے ہمیں فیض آباد کا ٹکٹ لینا تھا لیکن جب بٹھل نے زورا اور جمرو سے مراد آباد کے ٹکٹ کے لیے کہا تو میرے پیر زمین پر جمے نہ رہ سکے۔ میرے لیے یہ بہت ان کہی، ان ہونی تھی۔ میں تو بٹھل کو دیکھتا رہ گیا۔ مراد آباد میں مولوی صاحب کی موجودگی کی کسی توقع ہی میں بٹھل نے یہ عزم کیا ہوگا۔ درمیان میں یقیناً مجھ سے تسلسل کی کوئی چوک ہو گئی تھی۔ مجھے کہیں بھی گمان نہیں ہوا کہ بٹھل کو حیدر آباد میں کسی جگہ مولوی صاحب کی اگلی منزل کا اشارہ ملا ہے اور اسے دلی آنے کی کیا ضرورت ہے۔ سلمٰی بانو کو زریں کے پاس فیض آباد پہنچنا ہے تو من ماڑ کے قریب کے کئی راستے ہیں۔ حیدر آباد میں ہر دم میں بٹھل کے ساتھ رہا تھا۔ صرف ایک جگہ جب ڈاکٹر ناصر مرزا کے بتائے ہوئے پتے پر وہ مولوی صاحب کی بالائی اقامت گاہ پر گیا تھا تو میں اس کے ساتھ نہیں تھا۔ یہی ہو سکتا تھا کہ وہیں خادمہ سے بازپرس میں اسے مولوی صاحب کے آئندہ پڑاؤ کی سن گن ملی ہو۔

ڈھائی گھنٹے انتظار کے بعد ساڑھے دس بجے مراد آباد جانے والی پسنجر ٹرین ہمیں مل گئی۔ دلی سے مراد آباد تک سو میل کا فاصلہ گاڑی نے رینگ رینگ کے کاٹا۔ راستے بھر میں نے مولوی صاحب کی بابت بٹھل سے کوئی سوال نہ کیا زورا اور جمرو سے میں اپنے آپ ہی کو تلقین کرتا رہا کہ مجھے کون سا کام درپیش ہے۔ جو پہلے ہوتا رہا ہے، اس سے زیادہ کیا ہوگا۔ کوشش کر لینے میں یہ ملال تو نہیں رہتا کہ ایک خانہ خالی رہ گیا تھا۔ خوش نمائی کی امید کم سے کم رکھی جائے تو آدمی ٹھکانے سے رہتا ہے۔ شکستہ تو یہ امید ہی کرتی ہے۔

مراد آباد کے اردگرد کے اسٹیشن مجھے ازبر تھے۔ امروہے سے مراد آباد بیس میل کی دوری پر ہے۔ امروہے ہی سے میرا دل اڑنے لگا تھا۔ آدمی دوسروں کی لگامیں خوب کھینچ سکتا ہے۔ خود کو قابو میں رکھنے کی دسترس اسے نہیں ہوتی۔ مراد آباد اسٹیشن پر قدم رکھ کے میرے ہاتھ پیر کھنچنے لگے تھے۔ ہمیں زیادہ دور نہیں جانا تھا۔ اسٹیشن کے عین مقابل، سڑک کے اس پار اسلامیہ مسافر خانہ واقع ہے۔ قلی نے ہمارا سامان وہاں تک پہنچا دیا۔ مسافر خانے کی دوسری منزل ایک زمانے سے ادھوری تھی۔ پہلی منزل پر ایک کشادہ کمرے میں سلمٰی بانو کا انتظام کر کے بٹھل نیچے مسافر خانے کے منیجر کے پاس آگیا۔ منیجر کی تبدیلی ہو گئی تھی۔ یہ ایک نوجوان شخص تھا اور مولوی صاحب کو بالکل نہیں جانتا تھا۔ قصہ تمام ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ گزشتہ تین چار دن کے مسافروں میں مولوی صاحب کا نام روزنامچے میں کہیں درج نہیں تھا۔ حیدر آباد سے مولوی صاحب کے براہ راست مراد آباد آنے کی صورت میں دو تین دن سے زیادہ کسی طور نہ ہوئے ہوتے۔ بٹھل سے بحث و تکرار فضول تھی ورنہ کئی بار

میرے جی میں آئی' اس پر واضح کردوں کہ اب مراد آباد کے اسلامیہ مسافر خانے میں مولوی صاحب کے قیام کا کوئی امکان نہیں ہے۔ انہوں نے اسی دن یہ طے کرلیا ہوگا جب حیدر آباد میں انہیں نواب ثروت یار کی زبانی ہماری آمد کی اطلاع ملی تھی۔ نواب ثروت یار کا پتا ہم نے مسافر خانے کے روزنامچے ہی سے حاصل کیا تھا۔ مولوی صاحب تو اس راستے سے اب گزریں گے بھی نہیں اور بٹھل کے خیال میں مولوی صاحب کو پے در پے حوادث' ایک مسلسل دربدری و درماندگی سے تنگ آکے آخر اپنے آبائی شہر میں پناہ لینے کا کوئی فیصلہ کرنا چاہیے۔ انہوں نے اپنے بھولے بسرے احباب' اعزا کے دروازوں پر دستک دی ہوگی۔ مغلوں کے زمانے سے مسلمانوں کی ایک سرائے بھی شہر میں موجود تھی لیکن وہاں کورا کے ساتھ قیام ممکن نہیں تھا۔

بٹھل کی گزارشانہ خواہش کی تعمیل میں منیجر نے کسی قدر توقف کے بعد اپنے معاون کو دفتر سے باہر بھیج دیا۔ خلوت ہونے پر بٹھل نے کسی تمہید کے بغیر اس سے کہا' بہتر ہوگا' وہ کوئی سوال نہ کرے کہ دونوں کا وقت ضائع ہوگا۔ ایک پرانی معاملت کے سلسلے میں ہمیں مولوی محمد شفیق کی تلاش ہے۔ اس نام اور حلیے کا کوئی شخص آئندہ مسافر خانے میں قیام کرے تو تار کے ذریعے ہمیں مطلع کردیا جائے۔ دو ہزار روپے ایک بڑی رقم تھی۔ منیجر کی آنکھیں حیرت سے دوچار ہوئیں۔ بٹھل نے اس خدمت یا سلوک کے عوض دو ہزار روپے کی نذر کا وعدہ کیا۔ منیجر ایک اصیل نوجوان تھا' اس نے ہمارے پتے پورے انہماک سے کاغذ نشین کیے' پھر مسکراتے ہوئے بولا "آپ کا کام ہوجائے گا جناب عالی! اس مسرت سے بڑھ کے کوئی انعام کیا ہوگا۔" بٹھل نے کرسی سے اٹھ کر اسے گلے سے لگالیا۔

بٹھل نے مسافر خانے ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ سلمیٰ کے پاس زدرا اور جمرد کو چھوڑ کے وہ شہر کی طرف چل پڑا۔ اسٹیشن سے کچھ فاصلے پر شہر شروع ہوجاتا ہے۔ بازار شاہی مسجد کے علاقے میں جامعہ قاسمیہ کا راستہ مجھے یاد تھا۔ تانگے والے نے ہمیں شاہی مسجد کے سامنے اتار دیا۔ ایک بڑی مسجد کے اطراف دو منزلہ عمارتوں پر دارالعلوم قائم ہے۔ درس گاہیں بند ہوچکی تھیں لیکن ایک بنگالی طالب علم نے محلہ گھیر سید خاں میں مقیم دارالعلوم کے مہتمم کے گھر تک ہماری رہ نمائی کی۔ مغرب کی نماز کا وقت گزر جانے کے بعد ہم نے ان کا دروازہ کھٹ کھٹایا۔ وہ نہایت متین اور خلیق بزرگ تھے۔ بیٹھک میں بٹھایا' شربت منگوایا۔ مولوی صاحب سے اچھی طرح واقفیت کے باوجود ایک عرصے سے انہیں مولوی صاب کی کوئی خبر نہیں تھی۔ البتہ ان سے شہر میں مولوی صاحب کے کئی شناساؤں کے نام اور پتے معلوم ہوگئے۔ وہاں سے اٹھتے اٹھتے عشا کی اذان ہو رہی تھیں۔ اس وقت کسی اور دروازے پر جانا مناسب نہیں تھا۔ پیدل چلتے چلتے ہم بازار منڈی چوک تک آگئے۔

چوک میں دن کا منظر تھا۔ آمنے سامنے قریب قریب جگمگاتی دکانیں' خوانچے والوں کی صدائیں' راہ گیروں اور خریداروں کا ہجوم' ایک جانب گل فروش پھولوں کی ٹوکریاں لیے قطار سے بیٹھے تھے۔ بٹھل نے موتیا کے بہت سے ہار خریدے۔ اتنے دنوں بعد یوں فرصت و فراغت سے بازاروں میں گھومنا عجب لگ رہا تھا' نیا نیا سا۔ اب نہ کوئی گراں باری تھی نہ وقت جلد یا دیر سے گزرنے کا احساس زیاں۔ پس پائی کی بے حسی بٹھل کے تیوروں سے نمایاں تھی۔ پس پائی کا سکون بہت ٹھہرا ہوا اور پتھریلا سا ہوتا ہے۔ اپنے ہنر تمام کرلینے کے بعد آدمی کے پاس سوزش کے لیے رہ بھی کیا جاتا ہے۔ بے کار معاش کچھ کیا کرے' پیپل کے بھیگے پتوں میں ہار پھول بندھوا کے بٹھل پان کی ایک سادہ اور صاف ستھری دکان پر ٹھہر گیا۔ دکان میں لوبان سلگ رہا تھا اور کرشن جی کے چھوٹے مجسمے کے سامنے دیا روشن تھا۔ اجلے کپڑوں میں ملبوس' قشقہ لگائے عمر رسیدہ پنواری نے خوش دلی سے ہمارا استقبال کیا اور اہتمام سے بیڑا بنا کے نقرئی طشتری میں بٹھل کو پیش کیا۔ سکے طشتری میں ڈال کے بٹھل چل پڑا تھا کہ پنواری نے ہاتھ کے اشارے سے رک جانے کی درخواست کی اور قسم قسم کے مسالوں سے مزین' چاندنی کے ورق میں لپٹا ہوا ایک بیڑا میری طرف بڑھا دیا "کھاؤ چھیلا!" وہ دیدے گھماتے ہوئے بولا "ایک تم بھی کھاؤ اور جان بناؤ۔ بھگوان نے چاہا' پنڈت کو یاد کرو گے۔"

مجھ سے منع نہیں کیا جاسکا۔ میں نے بیڑا منہ میں رکھ لیا۔ بہت نفیس پان تھا۔ منہ میں خوشبو بکھر گئی۔

"سچی بولو' راج کمار! سواد آیا؟"

"بہت اچھا ہے۔" میں نے ممنونیت سے کہا "کوئی خاص چیز ڈالتے ہیں آپ اس میں؟"

وہ اوپر کی طرف سر اٹھا کے بولا "سب اس کی لیلا ہے' وہی ڈالتا ہے۔"

"بولتے ہیں ہاتھ کی بات ہوتی ہے پنڈت جی۔" بٹھل نے لطف لیتے ہوئے کہا۔

"نا مہاراج! جو سچ پوچھو تو بات ساری من کی ہے۔ پان تو دن بھر لگاتا ہوں' پر دن میں کوئی کوئی آتا ہے جن میں من لگتا ہے۔"

"اس کی پہچان کیا ہوتی ہے پنڈت؟" بٹھل نے میرے منہ کی بات چھین لی۔ میں بھی یہی پوچھنے والا تھا۔"

"اب کیا بولیں بھیا' اس کا تو روپ ہی اور ہوتا ہے۔" پنڈت تیکھی آواز میں بولا "بن باس والا الگ سے پہچانا جاتا ہے۔"

میرا جسم بل کھا گیا۔ پنڈت کی نگاہیں مجھی پر مرکوز تھیں۔ جیسے مجھے حصار میں لیے ہوئے ہوں۔

"چکر پورے کرائے بنا نہیں مانے۔" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا "سے دیوتا بڑا ہٹیلا بہت نٹ کھٹ ہے۔"

"کیا ہے پنڈت جی۔۔۔؟" بٹھل نے تجسس سے کہا۔

"کیا بھیا۔" پنڈت آہ بھر کے بولا "اپنے ساجنا کو دیکھو' بگیا میں' مانو آگ لگ رہی ہے۔ سے کی جکڑن پوری ہے۔"

"پھر اپائے بھی تو بولو۔" بٹھل نے تندی سے کہا۔

"رام جی سے پوری چودہ گانٹھیں نہ کھوالیں تب تک منہ پیچھے کیا رہا۔ کیا اپائے کرے کوئی۔" پنڈت بے چارگی کے انداز میں بولا۔ جوگی کا کام پیچھے کرتے رہنا ہے۔ نہیں دم ہے تو پیٹھ کرلے پھر اپنی بھی۔"

وہ کوئی بڑا قیافہ شناس اور جہاں دیدہ شخص تھا مگر قیافہ کوئی یوں ہی تھوڑا ہی لگالیتا ہے۔ میری آنکھوں' میرے چہرے میں دوسروں سے جدا ضرور کوئی ایسی بات ہوگی' ضرور کچھ لکھا ہوگا جو پنڈت نے آسانی سے اخذ کرلیا۔ جرمن زبان وہی پڑھ سکتا ہے جو اسے جانتا ہو مگر کاغذ پر کچھ لکھا ہو تبھی تو۔ بٹھل اسے نمسکار کرکے آگے بڑھ گیا۔ پنڈت سے مزید پوچھنا اور اسے بتانا بھی کیا تھا۔ لوگ اس سے ہمدردی کا اظہار کیوں کرتے ہیں جو کسی ہم دردی کا خواہاں نہ ہو۔ سارے راستے پنڈت کی باتیں میرے کانوں میں چبھتی رہیں۔ میں تو کسی سے کچھ بھی نہیں کہتا۔ سب کچھ خود تک محدود رکھتا ہوں لیکن یہ آنکھیں' یہ چہرہ' کہاں چھپاؤں۔ اگر ان سے ایسی ہی دحشت برستی ہے تو لوگ کیوں اور کیا جتانا چاہتے ہیں۔ مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ مجھے تو اپنے آپ سے اور بیزاری ہونے لگتی ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ نوازش کیسی گراں گزرتی ہے۔ اس سے تو ٹھنڈک کے بجائے جسم و جاں میں اور تپش ہوتی ہے۔ یہ سلوک تو بھیک کے مانند لگتا ہے۔

چوک سے تانگے میں سوار ہوکے ہم مسافر خانے لوٹ آئے۔

منیجر عبدالباسط ہمارے انتظار میں باہر ٹہل رہا تھا۔ جمرد اور زدرا ابھی اس کے ساتھ تھے۔ شام کو شہر جاتے وقت بٹھل نے عبدالباسط کو رات کا کھانا ساتھ کھانے کی دعوت دی تھی۔ رسمی رد و قدح کے بعد وہ آمادہ ہوگیا تھا۔ ہماری عدم موجودگی میں اس نے عمارت کے بیرونی حصے میں ایک ہوٹل کے مالک صدیق باورچی کو احکام دے رکھے تھے۔ کھانا تیار ہوچکا تھا اور دفتر کی میز پر دسترخوان سجا ہوا تھا۔ سلمیٰ کے لیے ایک طشت اوپر بھیج دیا گیا۔ اتنے کم وقت میں اتنی اقسام کے خوش ذائقہ کھانے تیار کرلینا بجائے خود ایک کمال تھا۔ صدیق باورچی بھی موجود تھا۔ دعوت ہماری جانب سے تھی۔ سرگرم وہ دونوں تھے۔ کھانے کے بعد ان کی مسکوٹ کا عقدہ کھلا جب صدیق نے پیسے لینے سے انکار کردیا۔ کھانے کے ساتھ وہ باتیں بھی خوب جانتا تھا۔ مخمل کی پوری ٹوپی اتار کے کہنے لگا "بہتر ہے' بندہ پرور! آپ اپنی جوتی اتار لیں۔ خادم کی تو کسی کام کی نہیں ہے۔" بٹھل کے اصرار پر وہ ہاتھ جوڑ کے بولا "بہت سے وقت آئیں گے عالی جاہ! یہاں نہیں تو وہاں تو اگلا پچھلا سارا حساب کتاب ہوگا ہی۔ وہیں ایک دوسرے کو قائل معقول کرلیں گے۔"

کھانے کے دوران میں عبدالباسط مسافر خانے کی تعمیر کے بارے میں بتاتا رہا تھا۔ اس کا دعوا تھا کہ تعمیر مکمل ہونے کے بعد اس عمارت کو ہندوستان میں مسلمانوں کے سب سے بڑے مسافر خانے کا اعزاز حاصل ہوگیا۔ فرشی اور پہلی منزل کے چاروں طرف ہر کمرے پر پیتل کی تختیاں آویزاں تھیں۔ تختیوں پر ان صاحب حیثیت لوگوں کے نام کندہ تھے جنہوں نے ایک کمرے کے تعمیری مصارف کے بہ قدر یا اس سے زیادہ رقم عطیہ کی تھی۔ کھانے کی میز سے اٹھ کے ہم صحن میں آکے بیٹھ گئے۔ تب بٹھل نے ہزار روپے جیب سے نکال کے عبدالباسط کے سامنے رکھ دیے۔ عبدالباسط پر حیرانی طاری ہوئی مگر اس نے معذرت کرلی کہ وہ ایسے کسی عطیے کی وصولی کا مجاز نہیں۔ مسافر خانہ شہر کی ایک خاص برادری نے بنایا ہے اور متوالی سے بات کرکے ہی وہ اس رقم کی قبولیت کے بارے میں کچھ کہہ سکتا ہے۔ بٹھل نے وضاحت کردی تھی کہ اس کا مقصد کسی کمرے پر اپنے نام کی تختی آویزاں کرانا نہیں ہے۔ حالت سفر کی وجہ سے وہ فی الحال زیادہ رقم نہیں دے سکتا۔ متوالی آمادہ ہوجائے تو گھر پہنچ کے مزید رقم بھی بھجوائی جاسکتی ہے۔

عبدالباسط مجلسی قسم کا ایک خوش باش اور پُرعزم نوجوان تھا۔ مسافر خانے میں روز ہی بے شمار مسافر آتے جاتے تھے مگر کچھ لوگ کسی جواز کے بغیر مرغوب ہوجاتے

ہیں۔ ایک پہر میں عبدالباسط ایسا گھل مل گیا تھا جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ گو بٹھل کی مراد مسافر خانے کی تعمیر میں اعانت کے سوا کچھ نہ تھی مگر یہ سخاوت' جاہ و حشمت کا مظہر تھی۔ دولت سب سے بڑا وصف ہے جس کے پاس نہ ہو' اس پر اس کا جادو اور کاری ہوتا ہے۔ بٹھل کے عطیے سے مسافر خانے کے کم از کم دو کمرے اور تعمیر ہوسکتے تھے۔ یقیناً عبدالباسط پر بٹھل کی اس دریا دلی و داد و دہش کا اثر بھی گہرا ہونا چاہیے تھا۔ رات گئے گھر کے لیے رخصت ہوتے وقت اس نے از خود بٹھل سے وعدہ کیا کہ وہ مولوی صاحب کی ٹوہ میں رہے گا اور ان کے بارے میں ہونے والی معلومات سے ہمیں مطلع کرتا رہے گا۔ اگر واقعی مولوی صاحب کا تعلق مراد آباد سے ہے تو وہ انہیں کہیں سے بھی ڈھونڈ نکالے گا۔ ہم میں سے کسی نے اس کی عزم شکنی نہیں کی کہ اس نے دنیا ہی کتنی دیکھی ہے۔ دنیا حد نظر سے بڑی اور دست رسائی سے کہیں سوا ہے۔ اس میں بہت سمندر' بہت دریا' بہت پہاڑ' بہت پتھر اور دیواریں ہیں۔

عبدالباسط نے سلمٰی کے کمرے سے ملحق ایک اور کمرے کا بندوبست کردیا تھا۔ سلمٰی نے پرسکون رات گزاری ہوگی۔ صبح جب ہم اس کے کمرے میں گئے تو بڑی شگفتہ و تر و تازہ نظر آرہی تھی۔ وہیں سب نے ناشتا کیا۔ نو بجے کے قریب بٹھل اور میں شہر کی طرف نکل پڑے۔ امدادیہ مدرسہ' مدرسہ فلاح دارین میں مولوی صاحب نے کچھ عرصے قرآن پاک کی تعلیم دی تھی۔ جامعہ نعیمیہ میں ان کے پرانے ساتھی حافظ شفیع الدین کا نام بھی ہمیں کسی نے بتایا تھا۔ مولوی صاحب کے محلے' ان کے پڑوسی' دور دراز کے رشتے دار' شاگردوں کے علاوہ جس کمپنی کے برتنوں کے نمونے لے کر مولوی صاحب نے شہروں شہروں کمیشن ایجنٹی شروع کی تھی جس سمت کی لوگ نشاندہی کرتے رہے' ہم وہاں وہاں جاتے رہے۔ دوپہر کا کھانا ہم نے امروہہ گیٹ کے سلام ہوٹل میں کھایا۔ مراد آباد شہر اتنا بڑا نہیں ہے۔ تاہم رات آٹھ بجے تک کوچہ گردی کے بعد بھی بہت سی جگہیں اور لوگ رہ گئے۔ دوسرے دن پھر تیسرے دن دوپہر کو کہیں یہ تسلی ہوئی کہ شہر میں مولوی صاحب کے مزید شناساؤں سے مل کے کوئی نئی بات معلوم ہونے کا امکان نہیں ہے۔ بعض جگہوں سے ہمارا کئی بار گزر ہوا۔ کئی آدمی پہچاننے اور روک روک کر سلام دعا کرنے' حال احوال پوچھنے لگے تھے۔ مولوی صاحب کے بارے میں زبان کھولنے سے پہلے لوگ عموماً اپنا تجسس دور کرتے تھے۔ وہ ہم سے طرح طرح کے سوالات کرتے کہ ہم کون ہیں' کہاں سے آئے ہیں وغیرہ۔

مولوی صاحب کی کوئی امانت لوٹانے کا ایک ہی موثر و معقول عذر بٹھل کے پاس تھا۔ امانت ہی کی بات تھی۔ ہمیں لوٹانی تھی یا مولوی صاحب کو۔ مراد آباد شہر ترک کیے ہوئے مولوی صاحب کو دس برس سے اوپر ہوچکے تھے۔ ابھی تک شہر میں انہیں بہت سے لوگ جانتے تھے۔ ان کی راست بازی' معاملہ فہمی اور خوش اطواری تقریباً سبھی پر نقش تھے۔ کسی کی پیشانی ان کے ذکر سے شکن آلودہ نہیں ہوئی۔ شاید کسی کے سینے میں ان کے لیے کوئی عناد نہیں تھا۔ مولوی صاحب کے محلے کے بعض لوگوں کو ان کی حد درجے کنارہ کشی اور گوشہ گیری سے شکوہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ مولوی صاحب ہر کس و ناکس کے قریب نہیں آتے تھے۔ منڈی چوک میں مسلم پبلک لائبریری کا لائبریرین کہتا تھا کہ انہیں تاریخ کے ساتھ قصے کہانیوں کی کتابیں پسند تھیں۔ اخبار و رسائل سے بھی دلچسپی تھی۔ مولوی صاحب پر لائبریری کی تین کتابیں ابھی تک قرض تھیں۔ جامعہ نعیمیہ میں ان کے دوست حافظ شفیع الدین نے مولوی صاحب کی بذلہ سنجی کے بہت سے واقعات سنائے۔ بھٹی محلے کے حکیم سراج الحق کا کہنا تھا کہ مولوی صاحب کو شاعری کا بھی اچھا ذوق تھا۔ اساتذہ کا منتخب کلام حفظ تھا۔ میر کو وہ عشق کی حد تک پسند کرتے تھے۔ فارسی اور عربی میں غیر معمولی ادراک تھا۔ انگریزی میں بھی کچھ شدبد ہوگئی تھی۔ موزوں طبع تھے اور کچھ کہنا بھی شروع کردیا تھا۔ ممکن ہے چپکے چپکے کہتے رہے ہوں لیکن شاعری عشق اور مشک کی مانند ہے' زر کی طرح بھی۔ ان کا چھپانا مشکل ہے۔ مولوی صاحب کی طبیعت کو قرار نہیں تھا اس لیے وہ جامعہ قاسمیہ کی اعلیٰ ترین اسناد حاصل نہ کرسکے۔

محلہ تمباکو والان کے شیخ محمد یونس تاجر سے ان کے مراسم خصوصی تھے۔ مولوی صاحب کے ذکر پر شیخ یونس کی آواز چرا گئی' کہنے لگے' اکثر ہمارے درمیان مذہبی مباحث میں تیزی آجاتی تھی۔ مولوی صاحب حد سے زیادہ تجاوز کرجاتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے یقین میں آلودگی کا گمان ہوتا تھا باوجودیکہ صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ دیگر مسلک کے علما میں نشست و برخاست تھی۔ جامعہ نعیمیہ بھی جاتے تھے۔ شاہ بلاقیؒ کے مزار پر سماع کی محفلوں میں دعوت ملتی تو ضرور جاتے تھے۔ نذر و نیاز خود نہیں کرتے تھے لیکن معترض بھی نہیں تھے اور شرکت میں بھی اجتناب نہ تھا۔ کہتے تھے' سب کا مقصد ایک ہے' خدا سے قرب' رسولؐ سے محبت' اظہار کے طریقے مختلف ہیں۔ ہر شخص اپنے مسلک اور فرقے سے نسبت درست سمجھتا ہے اور درست کون ہے' اس کا فیصلہ کون کرے۔ ہر شخص کی نسبت اس کے والدین' خاندان اور برادری والے طے کرتے ہیں۔ وہ دوسرے مسلک کے خلاف اسے مسلسل بدگمان کرتے رہتے ہیں۔ مطالعے' مشاہدے اور تحقیق و تفتیش کا موقع ہر کسی کو نہیں ملتا۔ سب اپنی مخصوص تربیت' خاندانی عقائد اور عادتوں سے مشروط ہیں۔ کوئی بھی اپنے مسلک سے جدا ہونا نہیں چاہتا' برادری اور گھر میں معتوب ہونے کا خوف اس پر غالب رہتا ہے۔ شیخ صاحب کا مولوی صاحب سے اختلاف معمول بن گیا تھا۔ شیخ صاحب کو اختلاف تھا کہ مولوی صاحب ہر سال ساتویں محرم کو اپنے ایک بزرگ سید علی شیدا کے ہاں عاشورہ کی مجالس میں شرکت کرنے امروہے کیوں جاتے ہیں۔ شیخ کے توسط سے محلہ کٹھیرا کے ایک پرہیزگار خاندان میں مولوی صاحب کی شادی کی بات پکی ہوگئی تھی۔ مولوی صاحب کو لڑکی دیکھنے پر اصرار تھا۔ مراد آباد کے ثقہ ماحول میں یہ خواہش نہایت معیوب تھی اور اس کی تکمیل اتنی ہی ناممکن۔ شیخ نے ہر طرح لڑکی کی خوش چہرگی' خوش قامتی' تندرستی' تعلیم' سلیقے اور سیرت سے مطمئن کرنے کی کوشش کی لیکن مولوی صاحب اپنی ضد پر قائم رہے۔ آخر شیخ اپنے عزیز و محترم کا گھر بسانے کے لیے ایک غیر شرعی' غیر روایتی اقدام کیا۔ لڑکی کے گھر والوں کو اپنے ہاں مدعو کرکے کسی طور پر لڑکی کی جھلک دکھادی۔ شادی سے چند دن پہلے لڑکی کو یرقان ہوگیا اور مرض جان لیوا ثابت ہوا۔ مولوی صاحب نے پھر ہمیشہ کے لیے شادی کا ارادہ ترک کردیا۔ اس سانحے نے انہیں بہت آزردہ کردیا تھا۔ بہت دنوں بعد کہیں ان کے چہرے کی تابانی واپس آئی۔

گزشتہ چھ ماہ میں مولوی صاحب تین بار مراد آباد آئے تھے۔ شیخ صاحب کے بڑے بھائی حاجی شیخ محمد یوسف کے پاس مولوی صاحب کی والدہ مرحومہ کے زیورات کی امانت ایک زمانے سے محفوظ تھی۔ حاجی صاحب کا زیادہ وقت عرستان میں گزرتا تھا۔ جب بھی مولوی صاحب اپنی امانت واپس لینے کی غرض سے مراد آباد آئے' حاجی صاحب سے ان کی ملاقات نہ ہوسکی۔ تین ہفتے پہلے حاجی صاحب مراد آباد میں تھے۔ مولوی صاحب چند گھنٹے بھی نہیں ٹھہرے' اپنی امانت لے کر واپس چلے گئے۔ اس بار انہوں نے مسافر خانے میں قیام نہیں کیا۔ کرنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ کورا تو ان کے ساتھ ہی ہوگی' کچھ معلوم نہیں ہوسکا کہ کورا کو انہوں نے کہاں ٹھہرایا تھا۔ حاجی محمد یوسف کو بھی کچھ خبر نہیں تھی۔ مولوی صاحب ان کے پاس تنہا آئے تھے۔

مراد آباد کے مولوی صاحب چیدہ چیدہ لوگوں ہی سے ملتے تھے۔ دس سال کے عرصے میں انہوں نے کچھ لوگوں سے حساب فہمی کی تھی۔ ایک مختصر مکان' محلہ مغل پورہ کہنہ کی دو دکانیں اور حال میں مراد آباد سے سات میل دور ہرتلا بستی میں واقع ایک قطعہ اراضی فروخت کردیا تھا۔ مولوی صاحب کو ہمیشہ عجلت درپیش ہوتی تھی۔ شہر کے کسی دینی و سماجی اجتماع' کسی تقریب وغیرہ میں انہوں نے کبھی شرکت نہیں کی۔ دعوت کے لیے وہ معذرت کرلیتے تھے۔ تعزیت اور عیادت کے لیے شاید کسی کے گھر نہیں گئے تھے۔ عرصہ گزرا' مسافر خانے کے اہل کاروں کے ذریعے شہر میں مولوی صاحب کی جان پہچان والوں کو بھنک مل گئی تھی کہ مسافر خانے میں کوئی عورت بھی ان کے ساتھ مقیم ہے پھر شہر میں بہت دنوں تک چرچے ہوتے رہے۔ بعض احباب کے استفسار پر مولوی صاحب نے صرف اتنا بتایا کہ ان کا قیام بیش تر جنوبی ہندوستان کے شہر بنگلور میں رہتا ہے۔ وہاں عمارت سازی کا سامان بنانے والے ایک کارخانے میں شراکت داری ہے۔ کارخانے کی چیزوں کی کھپت کے لیے وہ مختلف شہروں کا دورہ کرتے ہیں اور اس طرح تبلیغ و ترویج کا کام بھی بہ قدر استطاعت انجام دیتے ہیں۔ اپنے ساتھ موجود عورت یعنی کورا کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ وہ ایک بے آسرا لڑکی' ان کی منہ بولی بیٹی ہے اور اب انہی کے ساتھ رہتی ہے۔ مراد آباد میں معدودے چند ان کے قریب ترین رفیقوں کو گلہ تھا کہ مولوی صاحب ان کے گھروں میں اپنی بیٹی کو کیوں نہیں لاتے اور وہ مسافر خانے میں کیوں قیام کرتے ہیں اور ہر بار انہیں واپسی کی اتنی جلدی کیوں ہوتی ہے۔ وہ مولوی صاحب سے ناراضگی کا اظہار بھی کرتے تھے۔ ہر مرتبہ مولوی صاحب نے آئندہ کے لیے وعدہ کیا تھا مگر یہ وعدہ کبھی وفا نہیں ہوا۔ مولوی صاحب کے مزاج میں تبدیلی آجانے پر سبھی متفق تھے۔ اب لوگوں نے ان سے زیادہ کہنا سننا چھوڑ دیا تھا۔ جتنا وقت گزرتا جارہا تھا' مولوی صاحب ان سے اوجھل ہوتے جارہے تھے۔ کوئی آٹھ دس برس پہلے مولوی صاحب اپنے ایک ہم جماعت' دیرینہ دوست' جامعہ قاسمیہ کے سابق مدرس حافظ عبدالخالق نگرایا سادات والے کے گھر کچھ عرصے ٹھہرے تھے۔ لوگوں کو یاد نہیں تھا کہ اس وقت ان کے ساتھ کوئی عورت تھی یا نہیں' لازماً ہوگی۔ یہی ہوسکتا ہے' حافظ صاحب نے اپنے دوست کی تاکید کے مطابق

احتیاط کی ہو' کورا کو اپنے گھر تک محدود رکھا ہو اور مولوی صاحب کے ساتھ ان کی موجودگی کا ذکر عام نہ ہونے دیا ہو لیکن حافظ صاحب نے کورا کو کوٹھری میں بند نہیں رکھا ہوگا۔ گھر میں ایک اجنبی لڑکی کی موجودگی پڑوسیوں سے چھپی نہیں رہ سکتی لیکن پڑوسیوں کے توحش و تردد کے لیے مولوی صاحب کے گردوپیش سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ واللہ علم۔ حافظ عبدالخالق' اب مراد آباد میں نہیں تھے۔ وہ زمینوں کی دیکھ بھال کے لیے مستقلاً اپنے آبائی شہر چلے گئے تھے۔

مراد آباد میں دوسرے دن جمرو اور زورا' سلمٰی کو شہر گھمانے لے گئے تھے اور انہوں نے سلمٰی کے لیے کئی جوڑوں کا کپڑا خریدا تھا' دیگر سامان بھی۔ زریں جہاں گیر' نیساں اور منیر علی کے گھر والوں کے لیے بھی انہوں نے سلمٰی کے مشورے سے بہت سی چیزیں اکٹھی کی تھیں۔ سلمٰی اپنے لیے کتابوں اور رسالوں کا ایک انبار بھی اٹھالائی تھی۔ مراد آباد میں قدیم جامعہ مسجد اور رام گنگا دریا کے کنارے کے سوا کوئی قابل دید جگہ نہیں ہے۔ اسی دن شام کو زورا' جمرو اور سلمٰی کو منیجر عبدالباسط کے دائیں جانب شہر کے سرسبز علاقے سول لائنز کی سیر کرانے لے گیا تھا۔ یہ علاقہ میرا دیکھا ہوا تھا۔ یہ مراد آباد شہر کا حصہ ہی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ یہاں چاروں طرف باغات اور صاف شفاف سڑکیں ہیں اور بڑے بڑے افسروں' دولت مندوں اور گوروں کی کوٹھیاں بنی ہوئی ہیں۔ شہر کے گلی کوچوں کی خاک چھاننے کے بعد رات کو ہم مسافر خانے واپس پہنچے تو زورا اور جمرو نے دن بھر کی روداد سنائی۔ سلمٰی بھی ان کی سرخوشی میں شامل تھی۔ عبدالباسط نے اپنے کسی عزیز کے ہاں سے سلمٰی کے لیے سلائی مشین عاریتاً منگوالی تھی۔ یوں مطالعے کے علاوہ سلمٰی کو ایک اور مصروفیت ہاتھ آگئی تھی۔ سینا پرونا اسے اچھا ہی آتا ہوگا۔ جمرو اور زورا کے پاس بھی اس کی دل جوئی' دل داری کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ دو دن میں ایسا لگتا تھا جیسے سلمٰی کے سراپا میں کونپلیں پھوٹنے لگی ہیں۔

تیسرے دن سہ پہر کو زورا' جمرو اور سلمٰی کو مسافر خانے چھوڑ کے بہمل مراد آباد سے تیس میل دور کے فاصلے پر تحصیل سنبھل کے لیے روانہ ہوگیا۔ معلوم ہوا تھا کہ کچھ دنوں تک سنبھل کے ایک مدرسے میں بھی مولوی صاحب نے درس و تدریس کا کام کیا تھا۔ واپسی کی گاڑی نہ ملنے کی وجہ سے رات کو ہمیں شہر کی ایک سرائے میں ٹھہرنا پڑا اور دوسرے دن صبح دس بجے مراد آباد واپسی ممکن ہو سکی۔ چند گھنٹے آرام کے بعد ہم مراد آباد سے مغرب کی جانب بیس میل دور تحصیل امروہہ جانے والی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ مولوی صاحب کے مربی سید علی شیدا کا انتقال ہوچکا تھا لیکن ان کے بھائی اور بیٹوں نے مولوی صاحب کا ذکر نہایت عزم واحترام سے کیا۔ وہ مولوی صاحب کو گھر ہی کا کوئی فرد سمجھتے تھے۔ رات کا کھانا کھلائے بغیر ان لوگوں نے ہمیں نہیں آنے دیا۔ سید علی شیدا کے خاندان والوں کے یہ قول محرم کی ساتویں کو وہ مولوی صاحب کا شدت سے انتظار کرتے ہیں لیکن مدت گزر گئی' مولوی صاحب نے امروہے کا رخ نہیں کیا اور ان کی خیریت کیا' اطلاع بھی نہیں ملی۔

صبح ناشتے پر سلمٰی' زورا' جمرو اور منیجر الباسط کے پاس کچھ وقت گزار کے ہم پھر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اس دفعہ بہمل نے مختصر سامان بھی ساتھ لیا تھا۔ نگینہ' بجنور' دیوبند' سہارن پور' سے ہوتے ہوئے ہم میرٹھ' بلند شہر' خورجہ اور ہاپوڑ کی طرف آگئے پھر مراد آباد میں ایک رات قیام کرکے چندوسی اور علی گڑھ کے لیے روانہ ہوگئے۔ مراد آباد کے اطراف کے ان شہروں میں پورا عشرہ گزر گیا۔ جامعہ قاسمیہ سے معلوم ہوا تھا کہ ابتدا میں مولوی صاحب مراد آباد سے قریب کی ان جگہوں پر کثرت سے دورے کرتے تھے۔ بعد میں جامعہ قاسمیہ کی جانب سے مختلف شہروں میں مدارس کے معیار اور تنظیمی تربیت کا کام بھی کچھ عرصے کے لیے انہیں سونپ دیا گیا تھا۔ مولوی صاحب کو قریباً سبھی پہچانتے تھے۔ بعض لوگ ان سے ربط خاص کے مدعی تھے لیکن مراد آباد سے رخصت ہونے کے بعد مولوی صاحب نے آس پاس کی کسی جگہ کو قصد نہیں کیا تھا۔ کورا کی وجہ سے مولوی صاحب کو جان پہچان کے علاقوں سے احتیاط ہی کرنی چاہیے تھی۔ شناسا بھی کبھی زندگی بہت عذاب کردیتے ہیں۔ کسی نے کہا تھا' میرے جاننے والے میرا زنداں ہیں۔ مراد آباد بھی مولوی صاحب مجبوراً ہی آتے ہوں گے۔ جب ہاتھ بہت تنگ ہوتا ہوگا۔ مراد آباد سے کچھ یافت کی امید ہو سکتی تھی۔ لگتا تھا' وہ اپنی چیزیں بیچتے رہے ہیں۔ اب تک شاید انہوں نے کسی سے قرض نہیں لیا تھا لیکن کب تک! خزانے خالی ہوجاتے ہیں۔ اس وقت توان کے پاس پیسوں کی کمی نہیں ہونی چاہیے۔ نواب ثروت یار نے زرنقد کے علاوہ کورا کو جواہر کے تحفوں سے کیا نہیں نوازا ہوگا؟ ہمیں یہاں تیرہ دن ہوگئے تھے۔ سلمٰی بھی ایک کمرے میں خود کو محبوس تصور کرنے لگی ہوگی۔ مسافر خانے میں ہر طرح کا آرام تھا۔

ملازم جمرو اور زورا کی خبر گیری کے لیے ذرا ذرا سی آہٹ پر مستعد رہتے تھے۔ درمیان میں ایک دن عبدالباسط بھی سلمٰی کو صبح سے شام تک اپنے گھر لے گیا تھا۔ روز مغرب کے بعد وہ تانگے میں سوار ہوکے سول لائنز کی طرف نکل جاتے۔ مراد آباد سے مشرق کی جانب بیس میل دور ریاست رام پور میں سالانہ نمائش لگی ہوئی تھی۔ ایک بار مجھے بھی وہاں جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ ہندوستان بھر سے لوگ آتے تھے۔ زورا اور جمرو دو مرتبہ سلمٰی کو نمائش دکھانے لے گئے تھے۔ وہاں انہوں نے سرکس' مداریوں کے کرتب موت کی چھلانگ اور نوٹنکی کے کھیل تماشے دیکھے تھے اور جانے کیا کیا سامان خریدا تھا۔ عبدالباسط بھی ان کی رہ نمائی کے لیے ساتھ تھا۔

بہمل کی سیری نہیں ہوئی تھی۔ ضروری نہیں تھا کہ وہ میرا مشورہ قبول کرے اور میرے لیے بھی لازم نہیں تھا کہ میں اپنی زبان بند رکھوں۔ میں نے بہت منع کیا کہ اب مزید جگہیں کھکھوڑنے سے کچھ حاصل نہیں مگر ایک رات مراد آباد ٹھہر کے وہ پھر اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ رام پور' شاہ جہان پور' نگریا سادات اور بریلی' فیض آباد کے رستے میں آتے تھے لیکن مراد آباد سے نزدیک فیض آباد سے دور تھے۔ یہی بہتر تھا کہ سلمٰی مراد آباد میں ٹھہری رہے۔ پہلے رام پور' بریلی پھر شاہ جہان پور کے بعد ہم نے نگریا سادات میں دم لیا۔ نگریا سادات کے معزز شہری حافظ عبدالخالق کا گھر تلاش کرنے میں ہمیں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

وہ ایک اوسط درجے کی حویلی تھی۔ زیبائش و آرائش میں کسی نواب کی حویلی کی مماثل۔ دوپہر کا وقت تھا۔ حافظ صاحب کسی قریبی بستی میں گئے ہوئے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی عبدالمتین نے ہمارے لیے بیٹھک کھلوادی۔ بہت دنوں بعد بہمل کے لیے حقے کا انتظام بھی ہوگیا۔ اتنی بستیوں' گلی کوچوں کی خاک چھاننے پر نگریا سادات آکے پہلی بار کہیں ایسا لگا جیسے یہیں آنے کی دیر تھی۔ مراد آباد کے لوگوں کی طرح ادھیڑ عمر عبدالمتین بلا کا باتونی تھا۔ ایک سوال کے دس جواب دیتا تھا اور خود دس سوالوں کے لیے بے چین رہتا تھا۔ ایسے لوگ جلد قابو میں آجاتے ہیں۔ بہمل نے مولوی صاحب کا نام نہیں لیا۔ ایک ضروری کام کے سلسلے میں حافظ عبدالخالق سے ملاقات کو اپنی آمد کی وجہ بتایا تھا۔ عبدالمتین کی تشویش بجا تھی کہ اس نے ہمیں دیکھا تھا نہ کبھی اپنے بھائی کی زبانی ہم دور افتادگاں کے بارے میں کچھ سنا تھا لیکن ایک مہذب شخص کا جو وتیرہ ہوتا ہے' دور سے آنے والے بڑے بھائی کے ملاقاتیوں سے چھوٹے بھائی کی بازپرس آداب کے خلاف تھی۔ روہیل کھنڈی عموماً تکلیف اور تصنع نہیں

کرتے۔ بہت متواضع، جرات مند اور صاف گو ہوتے ہیں لیکن عبدالمتین روہیل کھنڈیوں سے کچھ مختلف ثابت ہوا۔ لہجے میں نزاکت اور طرح داری لکھنؤ جیسی تھی۔ بمبئی شہر کے متعلق پوچھنے لگا کہ سنا ہے ولایت کے شہروں کا مقابلہ کرتا ہے۔ اپنا اضطراب دور کرنے کے لیے اس نے شائستگی سے ہمارے مشاغل، ہماری حیثیت اور دیگر کوائف جاننے کی کوشش کی۔ بٹھل کو ان سوالات سے واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ سو جواب ازبر تھے۔ بمبئی شہر میں آباؤاجداد کی آمدنی سے گزر اوقات، نئی عمارتوں کی تعمیر اور شکار وغیرہ کی مصروفیات، ان وضاحتوں سے بھی ہماری آمد کی نوعیت واضح نہیں ہو پاتی تھی تاہم شش و پنج کے باوجود عبدالمتین نے ہم اجنبی مہمانوں کے لیے دیدہ و دل کی ارزانی میں کوئی بخل نہیں کیا۔ بالائی اور خشک میوے کی آمیزہ رسادل اور خاص دان میں نفاست سے بنی ہوئی پان کی گلوریاں اس نے ہمیں کھلائیں۔ حقے ہی سے بٹھل کی آنکھوں میں سرور کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔

اتنی دیر میں عبدالمتین کے اطوار کے اعتماد اور بیان کے زور سے ہمیں ان دونوں بھائی کی خوش اخلاقی کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہوگیا تھا۔ ایک بھائی کا انتقال ہوچکا تھا۔ باقی دونوں بھائی اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ نگریا سادات کے علاوہ رام پور کے اطراف میں بھی ان کی زمینیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ایکھ (گنے کی کاشت) سبزیوں کے کھیت، کچی شکر بنانے کے دو کھنڈ سال، دو کولھوں اور بھینسوں کا باڑا، امرود اور آم کے باغ سے ظاہر ہے، انہیں معقول آمدن ہوتی ہوگی۔ خوش سمعی بھی داد و ستائش کے مانند ہے۔ بڑی حد تک لاف و گزاف سے آلودہ عبدالمتین کی باتیں بٹھل نے نہایت انہماک سے سنیں۔ جب ہمارے اور اس کے درمیان بے گانگی کا حجاب کسی طور پر کم ہوا تو بٹھل نے مولوی صاحب کا ذکر چھیڑا۔

جیسے کسی نے چٹکی بھر لی یا ریت اڑ کے عبدالمتین کی آنکھوں میں چلی گئی۔ ایک لمحے کے حیرت زدہ سکوت کے بعد وہ دگرگوں آواز میں گویا ہوا "آپ انہیں کس طرح جانتے ہیں؟"

میرے کان بھی کھڑے ہوگئے تھے۔ بٹھل نے مسکرا کے کہا کہ جو حافظ عبدالخالق کو جانتا ہے، مولوی صاحب سے بھی واقف ہوگا۔

یہ جواب شافی نہیں تھا لیکن عبدالمتین نے ایک بردبار، رکھ رکھاؤ والے شخص کے طور پر اپنے لہجے کی خوش اسلوبی قائم رکھی۔ وہ مولوی صاحب کی تعریف و توصیف کرنے لگا۔ نگریا سادات میں مولوی صاحب کی موجودگی کی اگر کوئی بعید ترین امید بٹھل کے دماغ میں نمو پزیر تھی تو ٹھٹھر جانی چاہیے تھی۔ ستاروں کو اپنی رفتار سے غرض ہوتی ہے۔ عبدالمتین کی بے قراری سے ایک بات ضرور طے ہوگئی کہ مولوی صاحب سے اس کے خصوصی روابط رہے ہیں۔ اس نے نسبتاً تحمل سے تکرار کی کہ ہم مولوی صاحب کو کس طرح جانتے ہیں؟"

"تھوڑی بہت جان کاری ہے۔" بٹھل نے بھی بظاہر سادگی سے کہا "کدھری رہتے ہیں آج کل؟"

"کب سے جانتے ہیں جناب ان کو؟" عبدالمتین نے بہ عجلت پوچھا۔

"کوئی خاص بات ہے کیا؟" بٹھل نے حقے کا کش لیتے ہوئے پوچھا "ٹھیک سے تو ہیں وہ؟ پہلے ادھری مراد آباد میں ہوتے تھے۔"

"جی، جی ہاں، ان کا تعلق مراد آباد سے ہے اور الحمدللہ خیریت سے ہیں لیکن جناب نے انہیں کب سے نہیں دیکھا؟"

"ٹائم ہوگیا اب تو۔" بٹھل نے زیرلبی سے کہا۔

ہر شخص کی حدود ہوتی ہے۔ کون کتنا خود پر قدرت رکھتا ہے، اس کا پیمانہ۔ کتنا غم، کتنی خوشی، کتنی احتیاط، کتنی برداشت، کتنی اذیت سہ سکتا، کتنی دے سکتا ہے۔ عبدالمتین کی ذات بس پہلے دوسرے در کے پرے تھی۔ بہت سے تو سطح پر آئینہ ہوجاتے ہیں۔ اس سے ضبط نہیں ہوا "کیا جناب مولوی صاحب کے سلسلے میں بھائی صاحب کے پاس آئے ہیں؟" اس نے بے کلی سے پوچھا۔

بٹھل کے لیے اس سوال کا جواب مشکل تھا۔ جب تک حافظ عبدالخالق نہ آئیں، ایک ہی جواب مناسب تھا کہ وہ صریحاً انکار کردے۔ اس نے یہی کہا۔

عبدالمتین کے چہرے پر سکون کے آثار ہویدا ہوئے، "میں نے عرض کیا ہے، بھائی صاحب کو شام تک واپس آجانا چاہیے لیکن دیر بھی ہوسکتی ہے۔ مجھے بتائیے، میں کسی کام آسکتا ہوں؟"

"آپ بہت کام آسکتے ہو پر اپنے کو ایسی جلدی نہیں ہے۔ حافظ صاحب آجائیں گے تو سامنے بات کریں گے، ہاں اگر آپ کو کوئی کام ہو تو ہم چلے جاتے ہیں۔ لوٹ کے آجائیں گے۔"

"کیا جناب! کیا فرما رہے ہیں آپ! یہ گھر آپ کا ہے۔ مہمان تو باعث خیر و برکت ہوتے ہیں۔" عبدالمتین معذرت خواہانہ انداز میں بولا "غریب خانے کا یہ حصہ مردانہ ہے اور مہمانوں کے لیے مخصوص ہے۔ جب تک چاہیں، قیام فرمائیں۔ یقین کیجیے دلی مسرت ہوگی۔"

"پھر تو ہم یہیں دھرے ہیں بھیا۔" بٹھل نے کسل مندی سے کہا "آپ کو سامنے کا کوئی کام ہو تو ہرجا مت کرو۔"

"مہمان کی خدمت سے بڑا کیا کام ہوسکتا ہے۔" عبدالمتین نے بے ساختہ کہا۔ میری تو سمجھ میں نہیں آرہا، جناب کی کیا خاطر مدارات کروں۔"

"سب سے بڑی خاطر تو آپ نے کردی۔" بٹھل نے حقے کی نے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا "تمباکو میں بڑا سواد ہے۔"

"مراد آباد کا ہے۔ شیخ شمس الدین، منظور الحق کے ہاں کا۔ بھائی صاحب کے پرانے مراسم ہیں۔ خاص طور پر ان کے لیے آتا ہے۔"

"ادھری تو ایک چھدا خاں بھی مشہور ہے۔"

"ہاں جناب!" عبدالمتین پھر کسمسانے لگا "معلوم ہوتا ہے، مراد آباد سے جناب کا کوئی تعلق ہے؟"

"نام سنا ہے چھدا کا۔" بٹھل نے استغنا سے کہا "مراد آباد بھی ایک دو بار جانا ہوا ہے۔"

"اب کیا جناب مراد آباد سے ہوتے ہوئے آرہے ہیں؟"

"ہاں، ادھری پتا چلا کہ حافظ صاحب نگریا سادات جا کے بس گئے ہیں۔ اپنا سامان بھی مسافر خانے میں پڑا ہے۔"

"بھائی صاحب نے تو عرصہ ہوا، مراد آباد کو خیر آباد کہہ دیا ہے۔ زمینوں کی جب تک خود دیکھ بھال نہ کرو، کاشت کار کام نہیں کرتے۔ بھائی صاحب کے آجانے سے بہت برکت ہوئی ہے۔ زمینیں بڑھیں، جائداد بڑھی اور جانے کیا کیا۔ یہ حویلی دیکھیے، رئیس اعظم مرزا دلاور بیگ نے دلی اور جے پور سے کاری گروں کو بلوا کے بڑے چاؤ سے بنوائی تھی۔ اولاد نرینہ سے محروم تھے۔ لڑکیاں گھروں کی ہوچکی تھیں، بیگم صاحبہ کب کی اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ مرزا صاحب کے انتقال کے بعد حویلی اجڑ گئی۔ دامادوں میں چپقلش ہوئی۔ بھائی صاحب نے صلح صفائی کرادی اور حویلی کے منہ مانگے دام ادا کردیے۔ یہ تین سال پہلے کی بات ہے۔ مرمت اور رنگ و روغن کے بعد کہیں حویلی کی یہ صورت نکلی ہے۔ بھائی صاحب نے مراد آباد سے آکے دن کو دن سمجھا نہ رات کو رات۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی کو سب کچھ یوں ہی نہیں مل جاتا جب تک خدا کا فضل شامل نہیں ہوتا۔"

بٹھل حقہ گڑگڑاتا اور سہلاتا رہا۔

دھوپ اتر چکی تھی۔ عبدالمتین کئی بار زنان خانے کی طرف گیا اور جلد واپس آگیا۔ یہ تو طے ہوچکا تھا کہ مولوی صاحب کا ذکر عبدالمتین کے لیے کش مکش کا باعث ہے۔ موضوع کی تبدیلی سے اس کی شگفتگی کیسی بحال ہوگئی تھی۔ مولوی صاحب کا ذکر مرعوب خاطر ہوتا تو دیگر جزئیات بیانیوں کی طرح وہ گل افشانی سے گریز نہ کرتا۔ وہ تو دریا بہا دیتا۔ یہ پہلو تہی اس بات کی غماز تھی کہ وہ مولوی صاحب کو دوسروں سے زیادہ جانتا ہے اور اس امر کی علامت یہ بھی تھی کہ پردہ پوشی کی کوئی مصلحت اسے درپیش ہے۔ ممکن ہے، یہ سب میرا وہم و قیاس ہو، بٹھل نے کچھ اور اندازہ لگایا ہو۔ میرے دماغ میں تو ایسے ہی جالے پڑنے شروع ہوجاتے تھے۔ بہرحال بٹھل نے عبدالمتین کو کچھ دیر کے لیے مطمئن کردیا تھا۔ عبدالمتین کو کیا معلوم تھا کہ اس نے ہمیں کتنا بے آرام کردیا ہے۔ اسے ذرا بھی احساس نہیں ہوا کہ ہمارے سینوں میں کیسا تلاطم برپا ہے۔ بہروپ بھرنے کی ہمیں خوب مہارت ہوگئی تھی۔ سب سے بڑے بہروپیے تو ہم خود تھے۔

اب سب کچھ حافظ عبدالخالق کی آمد پر منحصر تھا۔ ہمیں آئے ہوئے دیر ہوگئی تھی۔ میری نگاہیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ کسی وقت بھی عبدالخالق آسکتے تھے۔ شام ہوگئی۔ عبدالمتین نے چائے منگوالی اور کہنے لگا "صاحب! ہم دیہاتی لوگ ہیں، نگریا سادات میں چائے کا ایسا رواج نہیں ہے۔ یہ شہر ہے بھی نہیں، قصبہ بھی اوسط درجے کا ہے۔ مراد آباد میں بھائی صاحب کو چائے کی عادت پڑگئی تھی۔ انہی کی وجہ سے حویلی میں صبح و شام چائے بنتی ہے یا مہمانوں کی آمد پر۔ آپ بمبئی والے ہیں۔ سنا ہے، وہاں تو لوگ چائے کے بہت رسیا ہیں۔"

"وہ جنگل ہی اور ہے۔" بٹھل کی آواز کھو سی گئی۔ "کئی بار ارادہ کیا، جا کے دیکھ تو آئیں، کیا بہاریں ہیں لیکن یہ زمینیں چین ہی لینے نہیں دیتیں۔ کام ہے کہ ہر سال بڑھتا جارہا ہے۔"

بٹھل نے اسے بمبئی آنے اور گھر پہ ٹھہرنے کی دعوت دی اور کہا کہ اسے وہاں کسی قسم کی اجنبیت نہیں ہوگی۔

"آپ کا بہت شکریہ دیکھیے، آپ سے ملاقات ہوئی ہے تو اب کے شاید آنا ہو ہی جائے۔ سمندر کے قصے سن رکھے ہیں، کبھی دیکھا نہیں۔ بمبئی تو لوگ بتاتے ہیں، سارا سمندر

کے کنارے کنارے بسا ہوا ہے۔"
"پھر ساتھ ہی چلوا پنے!" بٹھل نے خسروانہ انداز میں کہا۔
"کیا صاحب، بھائی صاحب مان جائیں گے۔ توبہ کیجئے۔" عبدالمتین مچلتے ہوئے بولا۔ وہ تو ابھی تک مجھے بچہ ہی سمجھتے ہیں، ناتجربہ کار، ناپختہ اور ہے بھی کچھ یہی۔ ان کے آگے تو میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ ان کے لیے میں اولاد، وہ میرے لیے باپ کے مانند ہیں۔"
"آپ نے ادھری مراد آباد میں پڑھائی نہیں کی؟" بٹھل نے اچٹتی آواز میں پوچھا۔
"چند سال کے لیے میں بھی وہاں رہا ہوں۔ جامعہ قاسمیہ میں پڑھتا تھا لیکن صاف بات یہ ہے، ایک تو مجھے دینی تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، دوسرے والدہ کی بیماری کی وجہ سے تعلیم ادھوری چھوڑ کے واپس آنا پڑا۔ مشیت خداوندی دیکھیے، منجھلے بھائی جان بھلے چنگے تھے کہ اللہ نے والدہ سے پہلے انہیں اپنے پاس بلالیا۔ پھر تو مراد آباد واپس جانا ممکن ہی نہیں رہا۔"
"اپنے مولوی صاحب بھی تو ادھری پڑھاتے تھے؟"
"کون! مولوی شفیق صاحب! جی، جی ہاں" عبدالمتین نے تذبذب سے دہرایا "وہ بھی جامعہ قاسمیہ میں مدرس رہے ہیں۔"
"بعد کو تو انہوں نے چھوٹا موٹا دھندا شروع کردیا تھا۔" بٹھل نے جیسے خود کلامی کی "برتنوں کے نمونے شہر شہر لے جانے لگے تھے۔"
"مراد آباد کے بیشتر لوگوں کا یہی کاروبار ہے۔" عبدالمتین سرسری انداز میں بولا۔
"آج کل کیا کرتے ہیں؟" بٹھل کی آواز میں کسی قسم کا تکدر نہیں تھا۔
"واللہ اعلم" عبدالمتین بے گانگی سے بولا۔
"یہاں تو آتے رہتے ہوں گے؟"
عبدالمتین نے چند لمحوں کے سکوت کے بعد چونک کے جواب دیا "جی ہاں، کبھی کبھار، ان کا ایسا ہی ہے، آج یہاں، کل وہاں۔"
"پر بیس پچیس روز پہلے تو ادھری ضرور آئے ہوں گے۔ مراد آباد سے پتا چلا تھا کہ آگے نگریا سادات جانے کا بولتے تھے۔"
"جی، جی ہاں۔ آئے تھے" عبدالمتین بے اعتنائی سے بولا "اصل میں ان دنوں میں زمین کے ایک مقدمے کے سلسلے میں بریلی گیا ہوا تھا۔ یہاں آ کے معلوم ہوا، تشریف لائے تھے۔ میرے پیچھے آئے اور پیچھے ہی چلے گئے۔"
"شادی کی یا ابھی تک لنڈورے ہیں؟"
"کچھ صحیح نہیں معلوم" عبدالمتین کا چہرہ کھنچنے لگا۔
بٹھل نے اسے مزید زیربار نہیں کیا۔ زیادہ جستجو سے کچھ حاصل ہونے کی توقع نہیں رہی تھی۔ لگتا تھا، اس سے زیادہ کا عبدالمتین کو یارا بھی نہیں ہے۔ اس نے ایک گوشہ اماں ڈھونڈ ہی لیا تھا کہ لاعلمی کا اظہار کرتا رہے۔
بٹھل حقے میں مصروف ہو گیا۔ باقی حافظ عبدالخالق کی واپسی پر اٹھائے رکھنا ہی مناسب تھا۔
اب کوئی ابہام نہیں رہ گیا تھا۔ ہمیں بہرطور حافظ صاحب کے آنے تک وہیں جمے رہنا تھا اور اس دوران میں عبدالمتین پر چھائی ہوئی دھند دور کرنا بھی ضروری تھا کیونکہ ہم اسی کے گھر بیٹھے تھے۔ میزبان کی خوش نودی سے مہمان کی خوش وقتی مشروط ہے، دل جمعی بھی اور ہماری حیثیت تو یوں بھی سائل کی تھی۔ بٹھل نے کچھ دیر بعد اس سے پان کی فرمائش کی۔
بٹھل کی صدا پر غلطاں و پیچاں عبدالمتین گھبرا سا گیا۔
"کدھری کھو گئے بابا! کچھ یاد آ گیا کیا؟ کوئی کام وام؟" بٹھل نے سادگی سے کہا۔
"نہیں، نہیں جناب!" عبدالمتین سیدھا ہو کے بولا "آپ کیا فرما رہے تھے؟"
"پان مل سکتا ہے؟"
"ضرور ضرور، کیوں نہیں، میں تو بھول ہی گیا" وہ ندامت سے بولا اور دفعتاً مونڈھے سے اٹھ ... وہ ملازم کو بھی آواز دے سکتا تھا لیکن اٹھنے کے لیے بس جیسے وہ کسی عذر کا منتظر تھا "پان کے بغیر چائے کا لطف ہی ادھورا ہے" وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا اور خاصی دیر بعد واپس آیا۔ چہرے سے گرد و غبار دھو کے آیا تھا۔ آواز میں کوئی گرہ پڑی ہوئی نہیں تھی، خاص دان بٹھل کے سامنے رکھ کے آراستہ لہجے میں کہنے لگا "زنان خانے میں یاد دلایا، بھائی صاحب کے آنے میں رات بھی ہو سکتی ہے۔ کھانے کا وقت تو ویسے بھی ہو جائے گا۔ جناب کا کوئی پرہیز ہو یا کوئی خاص چیز پسند ہو تو کسی تکلف کے بغیر فرمادیں۔"
"گھر میں جو ہوگا، کھالیں گے۔"
"پھر بھی جناب!" وہ جھجکتے ہوئے بولا۔
"اپنے کو دوائی کی ضرورت کم پڑتی ہے۔"
عبدالمتین ایسا دیر فہم نہیں معلوم ہوتا تھا۔ مفہوم

کشائی میں اسے لمحے لگ گئے اور وہ کھل کھلا پڑا "بہتر ہے جناب! خدا کرے کبھی نہ پڑے۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے، پھر مجھ پر چھوڑ دیجئے۔"
"سارا آپ پر ہی ہے۔ مہمان تو آدھی جیل میں ہوتا ہے۔"
"بالکل، بالکل نہیں" عبدالمتین شوخی سے بولا "ہمارے یہاں ایسا نہیں ہوتا۔ مہمان کھلے رہتے ہیں۔ اتنا تکلف نہیں کیا جاتا۔ لکھنؤ تو یہاں سے ویسے بھی دور ہے۔"
"پر بمبئی اور بھی دور ہے۔" بٹھل نے مسکرا کے کہا۔
"وہاں کا تو معلوم نہیں، کیا دستور ہے؟" عبدالمتین نے برجستگی کی کوشش کی "میں تو جناب اپنے گاؤں کی بات کرتا ہوں۔"
"گاؤں، کھیت، کھلیان سے کیا ہے بادشاہ سلامت! ان کے بیچ بھی بڑے محل دو محلے، راجے مہاراجے دیکھے ہیں ہم نے۔ اور آپ کیا کسی سے کم ہو۔"
"کیا فرما رہے ہیں آپ!" عبدالمتین کا جسم دہرا ہو گیا۔ "ہم کو اس حویلی سے مت دیکھیے" اس کا قصہ تو آپ کو بتایا ہے، "ہم تو پیدائشی کسان ہیں، مزدور ہیں۔"
"سارا تو من کا کھیل ہے بابو صاحب!"
عبدالمتین کی آواز تمتمانے لگی "بے شک سب دل سے ہے۔ دل ہے تو سب کچھ ہے، دل نہیں تو کچھ بھی نہیں۔"
رات ہو گئی۔ بیٹھک میں قندیلیں روشن کردی گئیں۔ عبدالمتین نے حقہ تازہ کرادیا تھا۔ ملازم نے کب سے تخت پر دسترخوان بچھا رکھا تھا۔ عشا کی اذانیں گونجتی رہیں اور عبدالمتین دیر تک غائب رہا۔ دیواری گھڑی نے نو بجائے تھے کہ دو ملازموں نے دسترخوان پر تام چینی کے ڈونگے رکھنے شروع کردیے۔ عبدالمتین پے درپے انہیں احکام دیتا رہا۔ مقطر کی چٹنی، سرکے میں بھیگی پیاز، گرم کباب، گرم پراٹھے، ٹھنڈا پانی۔ یہ لاؤ، وہ لاؤ۔ کسی طے شدہ دعوت کی طرح عبدالمتین نے اہتمام کیا تھا۔ عمارت کے اندرونی حصے کی جانب سلفچی میں منہ ہاتھ دھو کے ہم دسترخوان پر آ گئے۔ ہم نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ ابھی تک بھوک نہیں تھی۔ بٹھل کو بھی نہیں ہوگی۔ عبدالمتین نے دسترخوان پر کھانوں کی دکان لگائی ہوئی تھی۔ بھوک بھی اسی نے مٹائی تھی۔ میرا دل تو اڑا جا رہا تھا۔ کچھ اچھا ہی نہیں لگ رہا تھا۔ میرے تو جی میں آتا تھا، حافظ عبدالخالق تو جب آئیں گے، آئیں گے۔ عبدالمتین بھی اسی گھر کا فرد ہے۔ یہ بھی بہت کچھ جانتا ہوگا۔ نہ جانتا ہوتا تو مولوی صاحب کے نام پر اس کی آواز کیوں اینٹھنے اینڈنے لگتی۔ یہ سیدھی طرح زبان نہیں کھولتا تو ٹھیک ہے، چاقو کی ایک جھلک ہی کافی ہوگی۔ ممکن ہے حافظ عبدالخالق کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ یہاں ہماری کون سی رشتے داری ہے اور کون سا بار بار ہمیں یہاں آنا ہے۔
ہم نے چند ہی لقمے حلق سے اتارے تھے کہ باہر گلی میں گھوڑے کی ٹاپیں سنائی دیں۔ ساتھ ہی تانگے کی پوں پوں اور مختلف لوگوں کا شور "لیجئے بھائی صاحب آ گئے" عبدالمتین معذرت کر کے دسترخوان سے اٹھ گیا۔ وہ دروازے سے باہر نہیں جا سکا تھا کہ آگے پیچھے کئی تومند، چست و چالاک آدمی بڑے بڑے تھیلے، کھیتی باڑی کا سامان، گنے اور سبزیوں کے گٹھے اور بوریاں ہاتھوں میں اٹھائے کاندھوں پر لٹکائے بیٹھک میں داخل ہوئے۔ ان میں سے کسی کے ہاتھ میں بندوق بھی تھی۔ ان کے عقب میں درمیانہ قد، گٹھے ہوئے جسم، اونچی باڑھ کی ٹوپی، شیروانی اور تنگ مہری کے پاجامے میں ملبوس، پچپن سے ساٹھ سال کی عمر کا ایک شخص دروازے پر دکھائی دیا۔ چہرے کی رنگت تانبے سے مشابہ تھی۔ ترشی ہوئی داڑھی میں سیاہ بالوں کی تعداد کم نہیں تھی۔ سب کی نگاہوں کا مرکز وہی تھا۔ حافظ عبدالخالق وہی ہو سکتا تھا۔ سامنے تخت پر ہم دو اجنبیوں کو دیکھ کے وہ متعجب ہوا اور کھنکتی ہوئی آواز میں اس نے ہمیں سلام کیا۔ میں اور بٹھل تخت سے اتر آئے۔
"بہت دیر ہو گئی" عبدالمتین نے شکایتی لہجے میں کہا۔
"کیا بتائیں، صاحب بہادر کلکٹر صاحب بھی وہاں آئے ہوئے تھے۔ کہیں سے بھنک مل گئی۔ بس بلوالیا۔ نواب راشد علی خاں کے ساتھ شکار پر جا رہے تھے۔ بہت منع کیا، کچھ نہیں سنی اور اتفاق دیکھو، پچھلے دنوں کتنی بار گئے، ہرن نظر ہی نہیں آئے۔ آج پورے چھ ہاتھ لگے" حافظ عبدالخالق فخریہ انداز میں بولے۔
"ہرن لائے ہیں؟" عبدالمتین نے اشتیاق آمیز حیرانی سے کہا۔
"نواب صاحب نے پورے دو عطا کردیے۔ ہرن کے علاوہ بھی آج بہت کچھ ہے۔ نواب صاحب کے ساتھ شکار کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ نشانہ تو کمال کا ہے۔ کئی بار تمہارا خیال آیا، تم بھی ساتھ ہوتے۔ نواب صاحب بہت پوچھتے تھے۔ تمہارے نشانے کے تو بڑے قائل ہیں۔"
"چلئے پھر سہی" عبدالمتین نے کشادہ دلی سے کہا "مجھے تو

فکر ۔۔ نے لگی تھی۔ ایسی کیا بات ہوئی۔ اتنی دیر تو آپ نے کبھی نہیں لگائی۔"

"مجبوری تھی۔ کلکٹر صاحب کی زبان سے میرا نام نکل گیا تھا۔ نواب صاحب نہیں مانے' کہنے لگے' حافظ کو بھی ساتھ لے لو۔ میں نے عرض کیا' گھر کہہ کے نہیں آیا ہوں' کہنے لگے "ہرکارہ بھجوا دیتے ہیں۔ عرشی صاحب بھی ساتھ تھے۔ راستے بھر شعر و شاعری ہوتی رہی۔ کیا اہتمام تھا۔ پورا لاؤ لشکر' بیس پچیس کے قریب نفری ہوگی' ہر چیز کی افراط۔"

"یہاں مہمان دوپہر سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

عبدالمتین کو آخر ہمارا خیال آگیا۔

"میں دیکھ رہا ہوں" حافظ عبدالخالق کی حیرت بھری نظریں ہم پر مرکوز ہوگئیں "جناب کی تعریف!"

اس سے پہلے کہ حافظ صاحب کچھ کہتے یا عبدالمتین زبان کھولتا' بٹھل نے دھیمی آواز میں کہا "اب آپ کو یاد نہیں ہوگا۔ بیچ میں برس ہوگئے۔ مراد آباد میں کبھی آمنا سامنا ہوا تھا۔"

حافظ عبدالخالق کے چہرے پر کشمکش کے آثار نمودار ہوئے "بہ خدا! مجھے یاد نہیں' اور میری یادداشت ایسی کمزور بھی نہیں" حافظ صاحب الجھی ہوئی آواز میں بولے "کہاں سے تشریف لائے ہیں جناب!"

"بمبئی سے آئے ہیں صاحب!" بٹھل نے کہا "ایک ضروری کام پڑ گیا ہے۔ سمجھو' تھوڑا آپ کو پریشان کرنا ہے۔"

"ضرور' حاضر ہوں جناب! سر کی ضرورت تو نہیں ہے؟" حافظ عبدالخالق خوش گواری سے بولے۔

"ہاں صاحب!" بٹھل نے تیکھے لہجے میں کہا "ایسا ہی ہے پر تھوڑی دیر کے لیے۔"

"خدا خیر کرے" حافظ صاحب پلکیں جھپکانے لگے۔

"پہلے مراد آباد گئے تھے۔ ادھری لوگوں نے بولا' آپ نگریا سادات لوٹ گئے ہو۔"

"ایسی کیا بات ہے جناب!" حافظ صاحب تردد سے بولے۔

"چندا لینے کو نہیں آئے۔"

حافظ صاحب کو ہنسی آگئی "پھر تو ٹھیک ہے' وہ لطف لیتے ہوئے بولے "ہماری تو جان پر بن گئی تھی۔"

"دھیرج سے بات ہوگی' اپنے کو جلدی نہیں ہے۔ پہلے آپ کھانا کھالو۔ ادھری آپ کے چھوٹے صاحب نے ہم پردیسیوں کا بہت دھیان کیا۔"

"انہیں یہی کرنا چاہیے تھا مگر سچ مانیے' مجھے یاد نہیں پڑتا' جناب سے کبھی ملاقات ہوئی ہے۔"

"ابھی آپ تھکے ہوئے لوٹے ہو۔ تھوڑا ٹھکانے سے ہوجاؤ۔ یاد آجائے گا سارا" بٹھل نے دسترخوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حافظ صاحب کو ساتھ بیٹھنے کی دعوت دی۔

"معاف کیجیے' بڑی کوتاہی ہوئی۔ یہاں تو ماشاء اللہ دسترخوان سجا ہوا ہے بسم اللہ' بسم اللہ۔ مجھے نہانے اور کپڑے بدلنے میں کچھ دیر ہوجائے گی۔ نہائے بغیر تو چین نہیں آئے گا۔ آپ کھانا جاری رکھیے' بسم اللہ۔"

"ہم بعد میں کھالیں گے" بٹھل سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔

"نہیں جناب! یقین کریں' بھوک بھی ایسی نہیں ہے۔ راستے بھر کچھ نہ کچھ کھاتے پیتے ہی رہے ہیں۔ اب زیادتی ہوجائے گی" حافظ نے لجاجت سے کہا۔

ملازم سارا سامان اندر صحن کی جانب لے جا چکے تھے۔ حافظ عبدالخالق بھی بیٹھک میں نہیں ٹھہرے۔ عبدالمتین کی وجہ سے ہمیں خانہ پری تو کرنا ہی تھی۔ ہم پھر تخت پر آگئے۔ نہایت لذیذ کھانے تھے لیکن معدے کے ساتھ دل و دماغ کی حاضری بھی ضروری ہے۔ ادھر عبدالمتین پیچھے پڑ گیا تھا۔ رکابی میں ایک قسم کا سالن ختم نہیں ہوتا تھا کہ وہ دوسرا ڈال دیتا۔ اتنا اصرار تو کوئی اذیت پسند ہی کر سکتا ہے۔ آدمی بساط سے زیادہ تو سن بھی نہیں سکتا' بول سکتا ہے نہ دیکھ سکتا ہے۔ معدہ تو بالکل کسی ظرف کے مانند ہے۔ جیسے تیسے ہم نے عبدالمتین کی مدارات کا مرحلہ طے کیا مگر میٹھے کے بغیر شکم سیری کہاں ہوتی ہے۔ میٹھے کو ہم بھول ہی گئے تھے۔ یاد بھی رہتا تو عبدالمتین ہمیں مستقل نگاہ میں رکھے ہوئے تھا۔ اس نے ہمارے لیے بطور خاص گجر بھتا بنوایا تھا۔ ہم نے جب تک زہر مار نہیں کر لیا' دسترخوان سے رہائی نہیں ملی۔

حافظ صاحب کو گئے ہوئے گھنٹے بھر سے اوپر ہوگیا تھا۔ انہیں اب تو آجانا چاہیے تھا۔ میرا سر پھٹا جا رہا تھا۔ مجھے گمان ہوا' کہیں وہ عبدالمتین کے اندر آنے کے منتظر نہ ہوں۔ وہ اپنے بھائی سے ہماری آمد کے مقصد کے بارے میں کوئی اندازہ کرنا چاہتے ہوں گے۔ عبدالمتین نگریا سادات کے اطراف کے واقعات کی قصہ گوئی میں مگن تھا۔ بٹھل جیسا سامع شاید اسے پہلی بار ملا تھا۔ بٹھل نے تو جیسے کانوں میں روئی ٹھونس رکھی تھی۔ دس بج چکے تھے' پھر ساڑھے دس ہوگئے۔ واپسی کے لیے گیارہ بجے والی گاڑی کا وقت نکل چکا تھا۔ عبدالمتین کے طویل کلام کا سلسلہ اس وقت منقطع ہوا جب ایک ملازم نے حیدر آباد دکن کا مرغوب عربی قہوہ اور

فنجانوں کا طشت بٹھل کے سامنے رکھا۔

"یہ کیا؟" بٹھل نے سرخوشی کے انداز میں صدا بلند کی۔

"بھائی صاحب کو بہت پسند ہے' اس کا مطلب ہے' وہ اب آیا ہی چاہتے ہیں۔ حج پر گئے تھے تو بس اس قہوے کی عادت پڑ گئی" عبدالمتین چہک کے بولا۔

ملازم نے طشت سے فنجان اٹھا کے سب کے سامنے رکھنے شروع کر دیے تھے کہ صحن کی جانب سے بھاری قدموں کی آہٹ سنائی دی اور دوسرے ہی لمحے حافظ صاحب گونجتی آواز میں سلام کرتے ہوئے بیٹھک میں داخل ہوئے۔ انہوں نے ململ کے کرتے پر سفید شال اوڑھ رکھی تھی۔ سر پر ٹوپی نہیں تھی۔ خاصے نئے نئے لگ رہے تھے۔ آتے ہی معذرت کی کہ عشا کی نماز میں وقت لگ گیا۔ بڑے بھائی کو دیکھ کے عبدالمتین بالکل گونگا ہوگیا تھا "رات مہمانوں کے لیے تم نے کیا انتظام کیا ہے" حافظ صاحب نے فکرمندی سے پوچھا۔

"بالائی کمرے کی صفائی کرا دی گئی ہے" عبدالمتین نے تن دہی سے جواب دیا۔

"پر شاید ہم رات بھر کے لیے آپ کو تکلیف نہ دیں۔" بٹھل نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اسٹیشن سے پتا چلا تھا کہ تڑکے میں مراد آباد کی کوئی گاڑی جاتی ہے۔"

"کیا جناب!" حافظ عبدالخالق کے لہجے میں شکوہ نمایاں تھا "ٹھیک پانچ بجے گاڑی ضرور جاتی ہے لیکن آپ رات کیوں بے آرام کرتے ہیں۔ ایسا ہی ہے تو صبح دس والی سے چلے جائیے' اور میں تو کہوں گا کہ کچھ اور قیام کیجیے۔ ہے تو یہ دیہات ہی۔ بمبئی والوں کا دل کہاں لگے گا لیکن اچھی کھلی سرسبز جگہ ہے۔ اطراف میں دل کش مقامات ہیں۔"

"جگہ سے زیادہ آدمی کی بات ہوتی ہے۔ آدمی دل کے کھلے ہوں اور چھاؤں والے ہوں" بٹھل نے نیچی آواز میں شکریہ ادا کیا اور عذر کیا کہ مراد آباد کے مسافر خانے میں ہمارے تین ساتھی ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔

"ابھی تو آپ سے کوئی بات بھی نہیں ہوئی' صحیح تعارف بھی نہیں ہوا اور آپ جانے کی بات کرنے لگے۔"

"بات کوئی لمبی نہیں ہے۔"

"پھر بھی جناب! ایک رات تو قیام کیجیے۔ رات کو کہاں سفر کیجیے گا" حافظ صاحب نے ہمدردانہ لہجے میں کہا اور فنجان میں قہوہ انڈیل کے بٹھل کو پیش کیا۔

"سفر ہی کتنا ہے' گھنٹے بھر کا۔"

"پورا گھنٹا بھی کہاں' درمیان میں صرف ملک اور رام پور چند منٹ کے لیے گاڑی ٹھہرتی ہے۔ لیکن بس آپ صبح ہی کو جائیے گا" حافظ صاحب نے حتمی طور سے کہا۔

"جیسا آپ کا حکم ہو" بٹھل نے سر جھکا لیا۔

"میزبان صرف درخواست کر سکتے ہیں۔"

"پر مہمان بن بلائے نہ ہوں تبھی صاحب۔"

"مہمان تو مہمان ہی ہوتا ہے جناب! بن بلائے کا اور لحاظ کرنا پڑتا ہے" حافظ صاحب نے لچکتی چمکتی آواز میں کہا پھر سنجیدگی سے بولے "بہتر ہے' آپ اپنا مدعا بیان فرمائیں۔ کیسے زحمت کی' ہزاروں کوس دور سے اس جنگل بیابان کا رخ کرنے کی۔ اور ہاں' بہتر ہوگا پہلے مجھے کچھ یاد دلائیے' کب اور کن حالات میں مراد آباد میں آپ سے ملاقات ہوئی تھی؟"

بٹھل نے حقے کا ایک گہرا کش لیا "بات ذرا۔" اس نے عبدالمتین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "چلیں' سویرے بات کریں گے۔ رات بہت ہوگئی ہے۔ آپ کے سونے کا بھی ٹائم ہوگیا ہوگا۔"

بٹھل کا اشارہ واضح تھا۔ دونوں بھائی سمجھ گئے اور عبدالمتین شائستگی سے بولا "اب بھائی صاحب موجود ہیں' انہی کا انتظار تھا نا آپ کو؟ اب کھل کے بات کیجیے۔ میں ذرا اوپر جا کے آپ کا کمرا وغیرہ دیکھتا ہوں۔"

کسی نے اسے نہیں روکا۔ عبدالمتین مونڈھے سے اٹھ گیا اور دیکھتے دیکھتے اوجھل ہوگیا۔ اس کے جانے کے بعد بیٹھک میں دیر تک گھڑی کی ٹک ٹک اور حقے کی گڑگڑاہٹ گونجتی رہی۔ حافظ عبدالخالق کی متجسس نگاہیں بٹھل پر جمی ہوئی تھیں۔ بٹھل نے پہلو بدل کے خاص دان حافظ صاحب کی طرف بڑھایا۔ حافظ صاحب نے گلوری اٹھا کے خاص دان بٹھل کو واپس کر دیا۔ بٹھل نے بھی ایک گلوری منہ میں رکھ لی۔

"دیکھو صاحب! ہم جانے کدھری سے چلتے ہوئے آپ کے پاس آئے ہیں۔ ہماری بات ذرا دھیان سے اور ٹھنڈے ہو کے سنو۔" اس مختصر تمہید کے بعد بٹھل نے کمتی ہوئی آواز میں کہا "ہم کو آپ سے مولوی شفیق کے بارے میں پتا کرنا ہے۔"

بٹھل کی جانب سے ایسی کوئی ابتدا حافظ عبدالخالق کے سان و گمان میں نہ تھی۔ وہ مونڈھے پر اچھل پڑے "مولوی شفیق!" وہ حیرے سے بولے۔

"آپ کا ان کا بہت ساتھ رہا ہے" بٹھل نے سرد لہجے

میں کہا "ہم کو بتاؤ' بڑے صاحب! وہ کدھری چھپے ہوئے ہیں؟"

"آپ' آپ کون ہیں؟" حافظ صاحب اضطراری انداز میں بولے۔

"ہم کوئی بھی نہیں' دروازے پر سوال کرنے والے لوگ سے نام پتا کون پوچھتا ہے اور مٹھی کھولنے کو یہ آپ کی کوئی شرط ہے تو ہم باپ دادا سے اپنا آگا پیچھا سارا بول دیں گے۔"

"کیا' کیا فرما رہے ہیں آپ؟" حافظ صاحب بدحواس ہو گئے۔

"اپنا مولوی صاحب کا ایک پرانا بل پڑا ہوا ہے۔ بل بھی ان کا ڈالا ہوا ہے۔ ابھی ٹائم بہت ہو گیا ہے صاحب!" بٹھل نے پتھریلی آواز میں کہا۔

"مگر مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں؟" حافظ صاحب کسی قدر سراسیمگی سے بولے "کیا' کیا آپ صرف اسی کام کے لیے آئے ہیں؟"

"اپنے پاس بہت دنوں سے اس کے سوائے کوئی کام نہیں ہے" بٹھل نے ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا "دیکھو صاحب! آپ حافظ ہو' نمازی آدمی ہو' اپنے کو اس خواری سے نکالو۔"

"کیسی خواری' کیا بات ہے جناب!" حافظ صاحب نے بوکھلائے ہوئے انداز میں اپنی ناتوانی اور بے چارگی کا اظہار کیا "میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"آپ چاہو تو بہت کچھ کر سکتے ہو۔"

"کاش ایسا ہو لیکن آخر کس وجہ سے آپ کو مولوی شفیق کی تلاش ہے؟" حافظ صاحب کی آواز حلق میں اٹک رہی تھی۔

"اپنی ایک چیز مولوی صاحب کے پاس ہے۔ ان کو بولو' اس کو لوٹا دیں" بٹھل نے سرگرانی سے کہا۔

"کیسی چیز؟" حافظ صاحب منتشر لہجے میں بولے "مولوی شفیق سے میرے اچھے مراسم ہیں۔ جہاں تک میں جانتا ہوں' وہ ایک سچے اور کھرے آدمی ہیں۔ دین دار' اعلیٰ تعلیم یافتہ اور امین۔ مجھے شبہ ہے' آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"دور کرا دو نا صاحب پھر" بٹھل کے لہجے میں تلخی آ گئی۔

"بہ خدا' میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا" حافظ عبدالخالق کی حالت غیر متوقع طور پر سیمابی ہو گئی۔

"آجائے گا صاحب! اپنے کو پتا ہے' ایسا آسان نہیں ہے آپ کے لیے۔ تھوڑی دیر کے لیے مولوی صاحب کو پرے کر کے دھیان دو گے تو سارا کالا سفید سمجھ میں آجائے گا۔"

"اگر' اگر آپ کی مراد مولوی صاحب کے اور آپ کے درمیان کسی پرخاش میں میری دخل اندازی سے ہے تو میں واضح کر دوں" حافظ صاحب نے رکھائی سے کہا "میں کسی کے ذاتی معاملات میں مداخلت نہیں کرتا۔ خصوصاً مولوی شفیق کے کسی معاملے سے میں الگ ہی رہنا چاہوں گا۔"

"اس کا کارن ان کا آپ سے پرانا ناتا ہے نا؟"

"جی' جی ہاں" حافظ صاحب جزبز ہو کے بولے "یہی سمجھیے۔"

"تو ہماری تو آپ سے کوئی ڈور بندھی نہیں ہے۔"

"جی' جی صاحب!" حافظ صاحب سٹ پٹا سے گئے پھر سنبھل کے بولے "مگر فریق کوئی غیر نہیں' مولوی شفیق ہیں۔"

"آپ کو ڈر ہے کہ ان کا گھاٹا ہو جائے گا؟"

"میں' میں نے یہ کب کہا؟"

"پھر کیا ہے' آپ کیوں گھبراتے ہو؟"

"گھبرانے کی کیا بات ہے" حافظ صاحب چین چنا کے بولے "یہ کام میرے مزاج کے خلاف ہے۔ یا یوں سمجھیے کہ مجھے اس کی ہمت نہیں۔ اس طرح آدمی دوستیاں کھو دیتا ہے۔ برا بن جاتا ہے۔ ممکن ہے' آپ حق پر ہوں مگر میں کوئی فیصلہ کرنے کا اہل نہیں ہوں۔ فریقین میں کسی ایک سے قرابت داری ہو تو منصف بھی معذوری ظاہر کر دیتا ہے۔"

"کیوں کر دیتا ہے؟" بٹھل نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"اس لیے کہ اس سے جانب داری سرزد نہ ہو جائے۔"

"ہم سے آپ کچھ نہیں کھوؤ گے۔"

"سمجھیے' ان سے مولوی شفیق سے کھو سکتا ہوں۔"

"یہی تو ہم بولتے ہیں' آپ کو ڈر ہے' ہم حق پر ہوئے تو آپ ان کو کھو دو گے۔ اس کو الٹا کرو تو آپ حق کو کھو رہے ہو۔"

"آپ کیوں الجھا رہے ہیں جناب! حافظ صاحب کی پیشانی سکڑ گئی "مجھے جو کہنا تھا' آپ سے کہہ دیا ہے۔"

"بات تو اسی تال میل کی ہوئی صاحب! پر مولوی صاحب کے بعد آپ نے گھر کے دروازے بند نہیں کر دیے ہوں گے۔ ہم کو بولو' ادھری ان کے برابر جگہ لینے کے واسطے ہم کو کیا جتن کرنا ہے۔ ویسے ہم بھی آدمی کے جنے ہیں۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ!" حافظ صاحب جھرجھری لے کے بولے "بس کیجیے جناب۔ میرے لیے آپ بھی نہایت محترم ہیں۔"

"ایک بات بولو صاحب! رستے میں ایک آدمی دوسرے آدمی کا گلا گھونٹتا ہے تو آپ دیکھتے ہوئے آگے چلے جاؤ گے' اس لیے کہ ان میں ایک آپ کا جاننے والا ہے' گلا گھونٹنے والا۔"

"آپ بات کیوں بڑھا رہے ہیں۔"

"اپنے کو جواب دو صاحب!"

حافظ صاحب نے ہونٹ بھینچ لیے۔

"گلا دبانے والے کا ہاتھ روکو گے یا اس کی پیٹھ پر تھپکی دو گے' مار ڈالو گے سور کی اولاد کو' آنکھ بچا کے بڑھ جانا بھی تھپکی دینے سے کم نہیں ہے۔"

"مجھے مولوی شفیق پر پورا بھروسا ہے۔"

بٹھل نے حجت نہیں کی کہ پھر پیش رفت میں کون سا خدشہ مانع ہے۔ اس نے سرپوش اٹھا کے چلم کی آگ انگلی سے کریدی اور پھونکیں مار کے فزوں کی۔ کوئلے چٹخنے لگے۔ اس وقفے میں حافظ صاحب پتھر بنے بیٹھے رہے "ٹھیک ہے بڑے صاحب!" بٹھل نے حقہ کھینچتے ہوئے کہا "ہم کو بولو' ہم کدھری جائیں؟"

"میں' میں کیا کہہ سکتا ہوں" حافظ صاحب بے رخی سے بولے۔

"آپ نے مولوی صاحب سے نہیں پوچھا کہ ان کے ساتھ وہ لڑکی کون ہے؟" بٹھل نے آہستگی سے کہا۔

"کون' کون سی لڑکی؟" حافظ صاحب کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"جوان کے ساتھ آپ کے گھر آئی تھی۔ ادھری رہی تھی۔ اس گھر' اس حویلی میں' نہیں کیا؟"

"میں آپ کے ہر سوال کی جواب دہی کا پابند نہیں ہوں۔"

"بالکل نہیں' ہم آپ کے سوتیلے بھی نہیں لگتے۔ پر ہم نے آپ سے پہلے ہی بولا تھا کہ ہم تو راج محل کی زنجیریں کھینچنے آئے ہیں۔ آپ کے چپ رہنے کا مطلب ہے کہ آپ بہت کچھ جانتے ہو اور چھپانے کا مطلب بھی کھلا ہے کہ آپ اپنے لنگوٹئے مولوی صاحب کے بارے میں خود بھی کھٹکا رکھتے ہو۔ دیکھنے میں بڑے صاحب! آپ کا سر ویسے بھی حساب سے بڑا ہے۔ ٹن ٹن بولنا چاہیے۔ دلکی ڈھائی گھر خوب چلتا ہو گا۔ کبھی رات کو سوچتے میں آپ نے ہر املا کے نہیں دیکھا کہ مولوی صاحب کو ہمارے آگے آنے میں کون سی بیڑی پڑی ہے؟"

"کوئی ہو گی جناب!" حافظ صاحب نے بے زاری سے کہا "اور دیکھئے' میرے محترم! مجھے اپنے بارے میں آپ کی کسی رائے' آپ کے کسی مشورے کی حاجت نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں' اس طرح آپ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔"

"اب تک یہی کیا ہے صاحب! پر شاید اب زیادہ نہ ہو' ہم کو آپ سے جو جاننا تھا' ہم نے جان لیا ہے۔"

"کیا' کیا جان لیا ہے؟" حافظ صاحب نے بھڑک کے کہا۔

"یہی صاحب کہ آپ کو ساری رام کتھا' سارے الٹ پھیر کا پتا ہے اور آپ ہم کو بھی پہچان گئے ہو کہ کون سی نسل کے کاٹ کھانے والے ہیں۔"

میں بٹھل سے یہی کہنا چاہتا تھا کہ اب مزید اصرار و تکرار سے کیا حاصل ہے۔ اب اور کیا نہاں رہ گیا ہے۔ اتنی دور سے آنے والے اجنبیوں کا مقصد جانتے' ان کا ماجرا سننے کی جستجو اور اضطراب اور ہی ہونا چاہیے تھا۔ مولوی صاحب سے اپنے دیرینہ تعلق کی نسبت سے تو حافظ صاحب کو جزئیات کی بے چینی ہونا لازم تھا۔ شناساؤں کے درون خانہ احوال' کچے چٹھے کی ٹوہ کے لیے ہر ایک کان لگائے رکھتا ہے۔ حافظ صاحب نے حیرت و تجسس کے بجائے تردد و تشویش کا اظہار شروع کر دیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ مولوی صاحب کی وکالت کا فریضہ انجام دے رہے ہوں۔ ان کے جواب بے محل تھے اور برہمی بے ساختہ نہیں تھی۔ لگتا تھا' ہم ان کے لیے اجنبی نہیں ہیں' جیسے کبھی کسی آنے والے وقت میں ہماری آمد کا دور دراز امکان انہوں نے احتیاطاً دماغ کے کسی گوشے میں محفوظ رکھا تھا۔ بے شک انہوں نے مولوی صاحب کی تلاش کی وجہ جاننے کی بے کلی ظاہر کی تھی مگر بہت رسمی۔ ان کی جانب سے اپنی دہشت چھپانے کی کوشش بھی مصنوعی لگتی تھی۔ بٹھل مجھ سے رائے طلب کرتا تو میں اسے ایک ہی اشارہ کرتا۔ گو نہ وقت موزوں تھا' نہ جگہ مناسب تھی لیکن میرے خیال میں اب چاقو اور شکنجے کا مرحلہ آگیا تھا۔ ہتھیار لوہار کی ضرب کی مانند ہے۔ سو دلیلوں کی ایک دلیل۔ ہتھیار کبھی کبھی تریاق بھی ثابت ہوتا ہے۔ بہت عرصے بعد' جیسلمیر اور حیدرآباد کے بعد کہیں حاشیے میں لیے ہوئے اس قصبے میں پھر کوئی ٹھکانا دستیاب ہوا تھا جہاں مولوی صاحب اور کورا کے پیروں کے نقش پیوست تھے۔ یہ نقش ہمیں منزل تک لے جا سکتے تھے۔ میرے پاس بھی چاقو تھا۔ بٹھل کے خیال سے میں ہاتھ جکڑے بیٹھا رہا۔

میرا جسم دھڑک رہا تھا۔
حافظ صاحب کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔ قندیلوں کی روشنی میں یہ سرخی کچھ اور تیز ہوگئی تھی۔ انہوں نے جھڑکنے کے انداز میں بٹھل سے کہا "دیکھیے جناب! آپ مہمان کی حدود سے تجاوز کر رہے ہیں۔ بہتر ہوگا' اب یہ باب بند کر دیجیے۔ مجھے آپ کے اور مولوی صاحب کے کسی مناقشے سے کوئی سروکار نہیں۔ مجھے اس بابت کوئی علم ہے نہ دلچسپی اور جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے' میں آپ کو بالکل نہیں جانتا۔ مجھے آپ سے کسی واقف کاری کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔ آپ چاہتے ہیں کہ میں یہاں سے اٹھ جاؤں تو میں اٹھا جاتا ہوں۔"

"ہم ایسا کیسے بول سکتے ہیں' آپ کا گھر ہے صاحب' آپ ادھری کے حاکم ہو" بٹھل نے کھردری آواز میں کہا "تسلی رکھو' ہم ادھری قبضہ جمانے کو نہیں آئے' ہی اٹھ جائیں گے پر آپ خالی ہاتھ لوٹا دو گے کیا! ہم کو بول دو صاحب! مولوی صاحب کو کدھری چھپایا ہے۔ اپنے لیے یہی جائداد' جاگیر' جان کے برابر ہے۔"

"یعنی' یعنی' آپ کا مطلب ہے۔ میں نے مولوی شفیق کو کہیں چھپا دیا ہے" حافظ صاحب تڑخ کر بولے "آپ کو یہ بدگمانی ہے تو اسے دماغی فتور کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔ یہ تو سراسر زیادتی ہے۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میں قطعاً لاعلم ہوں" حافظ صاحب چڑ سے گئے' کہنے لگے "آپ اونچا سنتے ہیں کیا؟"

"بیس دن پہلے مولوی صاحب ادھری تھے" بٹھل نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

حافظ صاحب کے نتھنے پھڑکنے لگے "یہ' یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"اپنے کو چھوٹے صاحب نے بولا تھا۔"

"انہوں نے ٹھیک بتایا ہے' آئے تھے' یقیناً آئے تھے۔ وہ کسی وقت بھی یہاں آ سکتے ہیں' ٹھہر سکتے ہیں۔ یہاں کوئی بھی مہمان آ سکتا ہے' جیسے آپ آئے ہیں۔"

"اب وہ کدھری کا بول کے گئے ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم' نہیں معلوم' میں آپ سے کتنی بار کہہ چکا ہوں' یوں میں دفع الوقتی کے لیے کسی جگہ کا نام لے سکتا ہوں۔ کیا آپ یہی چاہتے ہیں۔ بس کیجیے' جتنا کہا جا رہا ہے' اتنا ہی سنئے۔"

"ٹھیک ہے صاحب!" بٹھل نے اکڑی ہوئی آواز میں کہا "پر اچھا ہے' ایک بات جان لو صاحب! اتنی چھوٹی بھی ہے۔ یہ آنکھ مچولی کب تک چلے گی' پھر مولوی صاحب کو منہ چھپانے کو جگہ نہیں ملے گی اور ان کو بول دینا صاحب! اپنی لڑکی کو کچھ ہوا تو۔۔۔" بٹھل نے لمحے کے توقف میں خود پر قابو پایا اور دھیمے لہجے میں بولا "اچھا نہیں ہوگا۔ بالکل بھی نہیں۔"

"بہتر ہے' یہ دھمکیاں آپ انہی کو دیجیے گا۔ میں ان کا' آپ کا قاصد نہیں ہوں۔ مجھے آپ کس جنجال میں ڈال رہے ہیں۔ کون سے جرم کی سزا دے رہے ہیں۔"

"آپ ان کا بہت دم بھرتے ہونا۔"

"آپ کو کوئی اعتراض ہے؟ بے شک وہ میرے نہایت معتبر دوست ہیں۔ اس میں کوئی کلام نہیں" حافظ صاحب نے زور دے کر کہا لیکن ان کا عزم نمائشی لگتا تھا۔

"اسی واسطے آپ کو بولتے ہیں۔"

"مولوی شفیق اپنا اچھا برا مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔"

"پھر ایسا جھٹکا نہ کرتے۔"

"ٹھیک ہے' وہ کبھی اس طرف آئے تو میں ضرور آپ کا پیغام انہیں منتقل کردوں گا" حافظ صاحب نے گلوخلاصی کے لیے مفاہمت کا لہجہ اختیار کیا "اب آپ آرام کیجیے' اگر آپ کو صبح جانا ہے تو کچھ دیر کے لیے آرام کرلینا ضروری ہے۔ تانگے والے کو میں ہدایت کردیتا ہوں۔ میں تو شاید اٹھ نہ پاؤں۔ ملازم جاگ رہے ہوں گے۔ کوئی زحمت نہیں ہوگی آپ کو۔"

"ہم ابھی اور ادھری ٹھہرنا چاہتے ہیں۔"

حافظ صاحب کا عالم دگرگوں ہوا' کسمپرسی کا سا عالم اور انہیں جو کہنا چاہیے تھا' انہوں نے کہا "ضرور' ضرور' شوق سے۔"

"اپنے کو ادھری شیش محل میں نہیں تو کسی کوٹھری' کونے میں جگہ دے دینا۔"

"نہیں' نہیں۔ آپ یہیں ٹھہریے مگر مگر" حافظ صاحب ٹھٹکی ہوئی آواز میں بولے "معاف کیجیے' ابھی تو آپ فرما رہے تھے۔ آپ کو بہت عجلت ہے' مراد آباد کے مسافر خانے میں آپ کے ہم سفر انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"سوکھ جائیں حرام کے" بٹھل نے منہ بگاڑ کے کہا "ہم نے ارادہ بدل دیا ہے۔"

"جیسی آپ کی مرضی لیکن کوئی وجہ تو ہوگی؟"

"مولوی صاحب کسی ٹائم بھی ادھری آ سکتے ہیں۔"

"ان کے آسرے میں آپ ٹھہرنا چاہتے ہیں؟"

"آپ کو کیا اور کتنا بولیں' آپ نہیں سمجھو گے صاحب!" بٹھل نے دہکتی آواز میں کہا "ان سے اگلا پچھلا

برابر کیے بنا اپنی نہیں بجھے گی۔ بہت ٹائم لیا ہے انہوں نے بہت نچایا ہے اپنے کو' کتنے لوگ' کتنے گھر۔۔۔ جانے دو صاحب!"

"میں سمجھ رہا ہوں" حافظ صاحب معذرت آمیز ملائمت سے بولے "ضرور کوئی ایسی بات ہوگی لیکن جناب' ان کا کیا بھروسا ہے۔ وہ اپنی مرضی کے مالک و مختار ہیں۔ مہینے کیا' سال گزر جاتے ہیں۔ اس طرح کب تک آپ ان کی راہ دیکھیں گے۔"

"آخر تک' ادھری گھر سے آپ نکال دوگے تو باہر گلی میں' ادھری بستی میں آپ کے نزدیک ٹھکانا کرلیں گے۔ آپ فکر نہ کرو' دانے دنکے کے لیے اپنے پاس تھوڑا بہت سہارا ہے۔"

"جی' جی ہاں" حافظ صاحب کی آواز شکستہ ہوگئی' تذبذب سے بولے "میری مانیئے تو کچھ عرض کروں؟"

"اب تک آپ ہی کی مانی ہے۔"

"ایسا کیجئے' مجھے اپنا پتا دے دیجئے' جیسے ہی انہوں نے یہاں کا رخ کیا۔ میں جناب کو اطلاع کروں گا۔"

"ہم نے ماں کا دودھ چھٹ پن ہی میں چھوڑ دیا تھا۔"

"کیا مطلب!" حافظ صاحب جھلا کے بولے "اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ کیا آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے!"

"ان سے پوچھے بغیر آپ ہم کو لکھ دوگے؟"

حافظ صاحب کش مکش سے دوچار ہوئے پھر قطعیت سے بولے "نہیں' ان سے پوچھنا تو ضروری ہوگا۔"

"ان کا جواب جانتے ہوئے بھی؟"

"ممکن ہے' وہ آمادہ ہوجائیں' اطمینان رکھیں' میں آپ کی بے تابی' آپ کی شدت کا سارا احوال ان کے گوش گزار کردوں گا۔ میں ان پر پورا زور دوں گا۔ میں یہی کرسکتا ہوں۔"

بٹھل نے کچھ نہیں کہا اور شیشے کے جگ سے کٹورا بھر کے پانی پیا۔

بیٹھک میں خاموشی چھائے دیر ہوگئی تو حافظ صاحب نے دبی ہوئی آواز میں ٹوکا "تو پھر کیا طے کیا آپ نے؟"

"کیا بولیں صاحب!" بٹھل نے سانس بھر کے کہا۔

"آپ کو میری عرض پر یقین نہیں آرہا۔"

"آپ کو بھی ہمارے پہ نہیں آرہا" بٹھل نے بوجھل لہجے میں کہا "لگتا ہے' بہت باندھ کے رکھا ہے آپ کو مولوی صاحب نے' طوطے کی طرح اپنی بولی رٹائی ہے۔ اپنے بارے بھی کم نہیں بولا ہے' پر ہم پاگل خانے سے اٹھ کے نہیں آئے ہیں۔ بہت دھول چاٹ کے چکر کاٹ کے ادھری پہنچے ہیں۔"

بٹھل نے حقے کی نال نیچے میں اڑا کے واسکٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں چاقو دبا ہوا تھا۔ ایک کھٹکے پر چاقو کا پھلکا کھل گیا۔

حافظ صاحب کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکل آئیں۔ مونڈھے پر ان کا جسم پھڑپھڑایا۔ وہ اٹھنا چاہتے تھے لیکن مونڈھے نے جیسے انہیں جکڑ لیا تھا۔ "یہ' یہ کیا جناب!" اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکے۔ ان کی پھٹی ہوئی آواز حلق میں ڈوب گئی۔

میرا سارا وجود دھمکنے لگا تھا۔ بٹھل بھی آخر اسی نتیجے پر پہنچا جو میں نے پہلے ہی سوچ لیا تھا۔ اس نے خاصی دیر کردی تھی۔ میں اب تک گونگا بنا بیٹھا رہا تھا لیکن میں نے طے کر رکھا تھا۔ دونوں میں سے کسی ایک نے حجت تمام سمجھ کے بیٹھک سے اٹھنے کا ارادہ کیا تو میں خاموش نہیں رہوں گا۔ اس کا مطلب تھا کہ بٹھل نے حافظ صاحب کا شمار بھی مولوی صاحب کے ان واقف کاروں میں کرلیا ہے جن سے گزشتہ پندرہ دنوں کے درمیان ہم مراد آباد اور اطراف کی بستیوں میں مل چکے تھے۔ حافظ صاحب کسی طور بھی ان لوگوں کے زمرے میں نہیں آتے تھے۔

چاقو پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بٹھل نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آسکا مگر کسی معمول کی مانند میں نے اس کے اشارے پر عمل کیا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے پنجے میں جکڑ لیا اور کچھ اور سوچنے سمجھنے کی مہلت ہی نہیں دی۔ کسی تاخیر کے بغیر چاقو سے میری کلائی پر لکیر کھینچ دی۔ بس ایک آن کے لیے رگ و پے میں بجلی سی چمکتی تھی اور کلائی میں چنگاریاں لپکی تھیں۔ میں نے اپنی سسکاری سینے ہی میں گھونٹے رکھی۔ بٹھل نے کہنی اور ہتھیلی کے درمیان سات انچ کے قریب لکیر کھینچ کے کھال کھول دی تھی۔ حافظ صاحب کے ہونٹ پھڑک رہے تھے۔ ان کا چہرہ سفید پڑگیا تھا۔ "یہ آپ کیا کررہے ہیں؟" انہوں نے بہ مشکل تمام کہا۔ اسی وقت بٹھل نے اپنے بائیں ہاتھ کی کلائی پر بھی میری کلائی جیسی ایک دھاری ڈال دی۔ دونوں کا خون چھلکتے چھلکتے بہنے لگا۔

بٹھل نے چاقو بند کرکے جیب میں واپس رکھا تو سینے میں اٹکی ہوئی حافظ صاحب کی سانسیں کسی قدر بحال ہوئیں اور وہ بے تحاشا شور مچانے لگے "یہ کیا' یہ کیا' کیا آپ نے" ان کی لرزتی ہوئی صدائیں بیٹھک میں گونج رہی تھیں۔ دیوانوں کی طرح ادھر ادھر منڈلاتی ہوئی ان کی نظریں میزپوش پر گئیں اور انہوں نے اس کے کونے سے پہلے میری پھر بٹھل کی کلائی سے ابلتا ہوا خون بند کرنے کی کوشش کیا۔ پھر انہوں نے اپنی شال پھاڑ دینا چاہی۔ اسی اثنا میں فنجان کے طشت پر ڈھکا ہوا کپڑا ان کے ہاتھ لگ گیا۔ انہوں نے اسے چاک کردیا۔ بٹھل نے انہیں روکا اور چلم کی راکھ چٹکی میں بھر کے میرے اور اپنے زخم پر پھیردی۔ گرم راکھ سے مرچیں سی بھر گئیں "آرام سے بیٹھ جاؤ صاحب!" بٹھل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یہ کیا' کیا آپ نے؟" حافظ صاحب پر وحشت طاری تھی۔

"ٹوٹکا ہے صاحب' بولتے ہیں خون بہت کام کی چیز ہوتا ہے' جلدی اثر دکھاتا ہے۔"

"یہ تو بہت' بہت زیادتی ہے۔"

"اپنے ساتھ ہی کی ہے صاحب!"

حافظ صاحب کی چیخ پکار پر پہلے ایک ملازم بھاگا ہوا آیا' پھر دوسرا' تیسرا' "ارے جلدی کرو' پانی لاؤ' پھٹکری' روئی لاؤ۔ اسپرٹ ہے گھر میں؟ گیس کی لالٹین والی الماری میں دیکھو" وہ پے در پے احکام دینے لگے۔ تھوڑی دیر میں دو اور آدمی آگئے۔ ان میں ایک پچیس چوبیس سالہ صحت مند نوجوان بھی تھا۔ حواس باختہ عبدالمتین بھی ان کے پیچھے بیٹھک میں داخل ہوا۔ میزپوش کا بڑا حصہ خون میں رنگ گیا تھا۔ عبدالمتین وجہ جاننے کے لیے متوحش تھا۔ حافظ صاحب نے اسے جھڑک دیا۔ جگ کے پانی میں روئی بھگو کے انہوں نے ایک معمر ملازم کی مدد سے بٹھل کی کلائی دھوئی۔ بٹھل نے سوت کے چاقو چلایا تھا۔ لکیر زیادہ گہری نہیں تھی' نہ میری نہ اس کی لیکن خون بری طرح پھوٹ رہا تھا۔ حافظ صاحب نے اسپرٹ میں ڈوبی روئی زخم پر رکھی تو نہ میں نے اف کی نہ بٹھل نے۔ حافظ صاحب کو قرار نہیں آیا' انہوں نے حامد نامی ملازم کو ڈاکٹر پنت کو بلانے کی ہدایت کی اور کہا "میرا نام لینا' کہنا' جتنی جلدی ہوسکے' آجائیں۔ دیر نہ کریں۔ جس حالت میں ہوں' اٹھ جائیں۔ سو رہے ہوں تو جگا دینا' میرا نام لینا" بٹھل نے ملازم کو منع کردیا تھا لیکن حافظ صاحب ملازم حامد کے پس و پیش پر بے طرح برس پڑے۔

بٹھل کی ترغیب پر حافظ صاحب نے باقی ملازموں کو واپس چلے جانے کا حکم صادر کردیا تھا۔ ملازم چلے گئے لیکن باہر سے آتی ہوئی آہٹوں اور سرگوشیوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بیٹھک کے آس پاس ہی ہیں۔ عبدالمتین اور نوجوان وہیں بیٹھے رہے۔ ہم دونوں کے سکون سے حافظ صاحب کی کشیدہ تنی میں ظاہراً فرق آیا تھا' ہرچند ان کی چشم دریدگی' ذہنی انتشار کی مخبری کررہی تھی۔ انہوں نے سرزنش کے انداز میں نوجوان سے حقے' قہوے اور پان کا انتظام کرنے کی فرمائش کی۔ نوجوان ان کا بیٹا یا بھتیجا ہی ہوسکتا تھا۔ وہ وہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ بیٹھک کے باہر بھٹکتے ہوئے ملازموں کو حکم منتقل کرکے فوراً واپس آگیا۔ وہ اور عبدالمتین حادثے کا سبب جاننے کے لیے بے تاب تھے اور حافظ صاحب سے کچھ پوچھنے کا انہیں حوصلہ نہیں ہورہا تھا۔ بار بار کرسی کے ڈنڈے سے سر ٹکاتے اور ہڑبڑا کے سیدھے ہوجاتے اور ان کی بکھری ہوئی نظریں ہم پر آکے ڈھیر ہوجاتیں۔

پندرہ منٹ سے کم وقت میں گاؤن میں ملبوس افتاں وخیزاں ادھیڑ ڈاکٹر پنت نے بیٹھک میں قدم رکھا۔ ملازم حامد نے جانے کیا کیا حاشیہ آرائی کی ہوگی "خیریت تو ہے حافظ صاحب؟" ڈاکٹر پنت نے آتے ہی پوچھا۔ اس نے سوال حافظ صاحب سے کیا تھا اور نگاہیں ہم دونوں کو زد پر لیے ہوئے تھیں۔

حافظ صاحب نے ناوقت زحمت پر جیسے تیسے ڈاکٹر سے معذرت چاہی اور بہ عجلت ہماری جانب اشارہ کیا۔

بٹھل نے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کرکے مرہم پٹی سے انکار کردیا تھا مگر عبدالمتین اور حافظ عبدالخالق کے اصرار پر چپ ہوگیا۔ ڈاکٹر اپنا بکسا ساتھ لایا تھا۔ وہ ٹانکے لگانا چاہتا تھا۔ بٹھل نے اجازت نہیں دی۔ زخم گہرا ہوتا تو ڈاکٹر باز بھی نہ آتا۔ ہم دونوں کی کلائیوں پر ایک جیسی لکیر اس کے لیے حیرت و فکر کا باعث ہونی چاہیے تھی مگر اس نے بردباری کا ثبوت دیا۔ جب تک وہ مرہم پٹی سے فارغ نہیں ہوگیا' زخم کی وجہ کے بارے میں اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔

"آپ ہی پوچھیں ڈاکٹر صاحب!" حافظ صاحب ہراساں آواز میں بولے۔

اس سے پہلے کہ ڈاکٹر بٹھل سے مخاطب ہو' بٹھل نے بے نیازانہ کہا "کچھ نہیں صاحب! آپ نے دیکھ ہی لیا۔ معمولی دھاری ہے۔"

ڈاکٹر مطمئن نہیں ہوا۔ ہوتا بھی کیسے۔ دونوں لکیروں کی پیمائش یکساں تھی اور بٹھل نے نسوں کا خیال رکھا تھا۔

"میں نے کبھی ایسا نہیں دیکھا" ڈاکٹر پنت کدورت سے بولا۔

"اب تو دیکھ لیا صاحب!" بٹھل نے ہنس کے کہا۔

"مگر یہ تو۔۔۔ یہ تو۔۔۔" شاید ڈاکٹر کو احساس ہوا کہ ہمیں

بہرحال حافظ صاحب کے مہمان کی حیثیت حاصل ہے۔ سو اس نے اپنے لہجے کی ناگواری دور کرنے کے لیے کچھ توقف کیا۔

"کیا صاحب!" بٹھل نے سرسری لہجے میں کہا "تھوڑا چاقو کا کرتب تھا۔ لگتا ہے، ادھری کسی نے خون نہیں دیکھا۔"

"دیکھا ہے سب نے میاں جی! پر اس طرح سے نہیں" ڈاکٹر کلبلاتی آواز میں بولا۔

"کبھی ٹائم ملا تو بولیں گے صاحب!" بٹھل نے بات بڑھانے سے اجتناب کیا اور کسمسا کے بولے "اپنے کو دکھ ہے، اتنوں کی نیند اکارت ہوئی۔ ہم نے آپ کو بلانے سے منع کیا تھا۔ اب آپ گھر جاؤ صاحب!"

ڈاکٹر نے خشمگیں نظروں سے حافظ آباد صاحب کو دیکھا۔ حافظ صاحب کا ہیجان انگیز سکوت بالائے ستم تھا "اپنا کام یہی ہے مہاشے" ڈاکٹر پنت کی آواز میں ترشی کے ساتھ نخوت بھی عود کر آئی کہنے لگے "ڈاکٹر اور گھڑی کا کیا سمبندھ، فوجی اور ڈاکٹر کے لیے گھڑیاں نہیں بنیں۔"

"ادھری بمبئی، کلکتے آکے دکان کھولو تو پوچھیں گے صاحب!" بٹھل نے بدبداتے ہوئے کہا "دیوار، کلائی پر گھڑیاں ٹکاتے ہو یا نہیں۔"

اتنی دیر میں ملازم قہوہ لے آئے۔ خاص دان میں تازی گلوریاں اور تازی حقہ، چاقو اور خون کی بات تھی۔ ملازم اندر آنے کے بہانے ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ ڈاکٹر نے شکن آلود پیشانی سے ایک فنجان پیا اور اٹھنے سے پہلے متعدد پڑیاں، گولیاں ہمارے حوالے کیں، نسخہ لکھا، احتیاطی تدبیریں تجویز کیں اور رخصت ہوگیا۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد عبدالمتین اور نوجوان یادیر مونڈھوں پر بیٹھے پہلو بدلتے رہے۔ رات بہت ہوگئی تھی۔ عبدالمتین نے جھجکتے ہوئے اپنے بڑے بھائی کو اٹھ جانے اور آرام کرنے کا مشورہ دیا۔

"تم لوگ جاؤ" حافظ عبدالخالق چٹختی آواز میں بولے "مجھے مہمانوں سے کچھ بات کرنی ہے۔"

وہ دونوں بادل ناخواستہ مونڈھوں سے اٹھے اور بھاری قدموں سے باہر چلے گئے۔ اس وقت ڈیڑھ سے اوپر ہوچکا تھا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دور کہیں سے کتے بھونکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ صحن کی جانب بھی اندھیرا ہوگیا تھا لیکن سبھی جاگ رہے ہوں گے اور بیٹھک سے ابھرنے والی کسی آہٹ کے منتظر ہوں گے۔ ان کا مالک چاقو بردار اجنبیوں کے ساتھ تنہا بیٹھا تھا۔ میری کلائی میں ہلکی ہلکی کسک ہونے لگی تھی۔ بٹھل تو حقہ گڑگڑاتا اور پان چباتا رہا۔

بہت دیر میں کہیں حافظ صاحب کے جسم میں جنبش ہوئی، جیسے انہوں نے کوئی فیصلہ کرلیا ہو اور کسی نتیجے پر پہنچ گئے ہوں۔ ایک لہر سی ان کے سراپا میں اٹھی۔ انہوں نے سر اٹھایا۔ ان کی چلتی بجھتی نظریں مجھ پر مرکوز ہوگئیں اور ان کے چہرے پر اندرونی خلفشار کی درشتی ہویدا ہوئی "اچھا تو تم ہی نرجس بانو کو مولوی شفیق کے پاس لائے تھے؟"

میری رگوں میں خون رک گیا، نرجس بانو سے ان کی مراد کورا ہی تھی "جی، جی ہاں" میں نے اضطراری انداز میں سر ہلایا۔

"اور تمہی کو سزا ہوئی تھی، دو آدمیوں کے خون کے جرم میں؟" حافظ صاحب بے ربطی سے بولے۔

میں نے اکھڑی ہوئی سانسوں سے کہا "لیکن، لیکن میں نے دانستہ تو ایسا نہیں کیا تھا۔"

"معلوم ہے، لڑکی کو بدمعاشوں کے چنگل سے بچانے کے لیے تم یہ انتہا درجے کا قدم اٹھانے پر مجبور ہوگئے تھے۔"

حافظ صاحب کو بہت کچھ معلوم تھا۔ میں نے اپنی وحشت پر قابو پانے کی کوشش کی "میں کیا کرسکتا تھا" میں نے کٹی پھٹی آواز میں کہا "ہمیں مولوی صاحب دریائے ہگلی کی سیر کرانے لے گئے تھے، غنڈوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ان کے پاس ہتھیار بھی تھے۔ میرا کوئی دماغ خراب نہیں ہوا تھا۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا۔ سب تسلیم کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے سات سال کی سزا سنادی۔"

"اگر مولوی شفیق اس وقت موجود نہ ہوتے تو لڑکی کا کیا حال ہوتا؟ تم تو گرفتار ہوگئے تھے؟"

"لیکن میں ان غنڈوں کو ختم نہ کرتا تو وہ ہم پر حاوی آجاتے۔ نہ جانے کب سے وہ ہمارا تعاقب کررہے تھے۔ وہ اس کے لیے مولوی صاحب کا اور میرا خون بھی کرسکتے تھے۔"

"مگر میں کچھ اور کہہ رہا ہوں" حافظ صاحب کا انداز تنبیہی تھا، کہنے لگے "جو نہیں ہوا، اس کی ہولناکی تصور کی جاسکتی ہے۔ جو کچھ پیش آیا، ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے۔ مولوی شفیق اس وقت لڑکی کے لیے فرشتہ رحمت ثابت ہوئے۔ یقیناً تمہارے علم میں ہوگا، وہ ایک مجرد آدمی تھے۔ ان کا کوئی باقاعدہ گھر نہیں تھا، گھر میں کوئی عورت نہیں تھی۔ ایک نوجوان لڑکی کی ذمے داری اچانک ان پر آن پڑی تھی اور لڑکی بھی کیسی، چندے آفتاب، چندے ماہتاب۔ اس شہزادی کو بدنگاہوں سے بچائے رکھنا مولوی شفیق کے لیے کوئی آسان نہیں تھا، تم تو ایک مرتبہ سپربن کے راستے سے ہٹ گئے۔ مولوی شفیق کے ساتھ تو وہ ہردم موجود تھی۔ اس کے بعد مولوی شفیق صاحب کی زندگی کا رخ ہی بدل گیا۔ وہ اسے چھپائے چھپائے پھرتے رہے، نہ ان کا کاروبار رہا، نہ گھر۔ لڑکی کی نگہداشت، اس کی تربیت ہی ان کا مقصود بن گئی۔ انہوں نے نرجس بانو کے لیے سبھی کچھ ترک کردیا۔ اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھا۔ انہوں نے لڑکی پر کوئی آنچ نہیں آنے دی۔"

"ظاہر ہے۔" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا "ان کا بہت احسان ہے۔"

"صرف احسان نہیں" حافظ صاحب بے چینی سے بولے "میری بات توجہ سے سنو عزیز من! تمہیں خدانخواستہ موت کی سزا بھی ہوسکتی تھی۔ ہوسکتی تھی نا؟" میں ان کی صورت دیکھا کیا، مجھ سے کچھ کہا نہیں جاسکا۔

"سات سال کے بجائے تمہیں عمرقید بھی ہوسکتی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ سزا بھگتنے کے بعد تمہاری توجہ لڑکی کی طرف سے ہٹ جاتی اور تم ایک پرانی تکلیف دہ داستان سمجھ کر سب کچھ بھلادیتے۔ اس مدت میں۔"

"میں، میں اسے بھلادیتا! کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" میں نے حافظ صاحب کو آگے کوئی ہرزہ سرائی نہیں کرنے دی۔ "اس کے لیے میں نے گھر، بھائی بہنیں، ماں باپ۔۔۔ اس کی وجہ سے میں نے سات سال۔" میری آواز ہی نے ساتھ نہیں دیا۔

"مقصد یہ ہے برادرم!" حافظ صاحب نے گھبرائے ہوئے لہجے میں وضاحت کی "کچھ بھی ممکن تھا۔ اس عرصے میں مولوی شفیق کو بھی کوئی حادثہ پیش آسکتا تھا، تمہیں بھی۔ درمیان میں ایک زمانہ ہے۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ مولوی شفیق کسی معقول جگہ نرجس بانو کی شادی کردیتے۔ ہر لڑکی کو بہرحال ایک نہ ایک دن اپنا گھر بسانا ہوتا ہے، اور اس چاند جیسی لڑکی کے لیے رشتوں کی کیا کمی تھی۔ جیل جانے کے بعد تم عملاً نرجس بانو سے دستبردار ہوگئے تھے۔ تم زنداں میں بس اس کی سلامتی کے لیے دعائیں ہی کرسکتے تھے۔ وہ تم نے ضرور کی ہوں گی۔"

"آپ، آپ۔ کیا کہنا چاہتے ہیں؟" میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔

حافظ صاحب نے ہاتھ اٹھا کے مجھے تحمل کی تلقین کی اور تندی سے بولے "میں کہنا چاہتا ہوں کہ سزا ہوجانے کے بعد تمہارا اس پر کوئی اختیار نہیں رہا تھا۔ بعد میں سب کچھ مولوی شفیق ہی کو نرجس بانو کے لیے سوچنا اور کرنا تھا۔"

"انہوں نے بہت کچھ کیا۔ کوئی بھی شاید اتنا ایثار نہ کرپاتا، میں آپ کو کیا بتاؤں، جیل سے آزاد ہونے کے بعد میں نے جگہ جگہ ان کی تلاش کی، تقریباً ان ساری جگہوں پر جہاں ان کے ملنے کا امکان تھا۔ وہ کہیں نہیں ملے۔ جن خدشات کا آپ ذکر کررہے ہیں، خوش قسمتی سے وہ پیش نہیں آئے یا اتفاق سے وہ سب کچھ نہیں ہوا، آپ کے بہ قول جن کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ سات سال کے عرصے میں ہم تینوں موجود ہیں۔ جیل سے نکلنے کے بعد میں نے مولوی صاحب کی تلاش اس لیے کی تھی کہ ان کا سہارا بن سکوں، انہیں باور کراسکوں کہ اب برا وقت ختم ہوگیا ہے۔ اب وہ اطمینان سے بیٹھیں، میں ان کے مصائب کی تلافی کے لیے آگیا ہوں۔ جس طرح میں نے انہیں تلاش کیا تھا، انہوں نے مجھے کیوں نہیں کیا؟ انہوں نے ایک دفعہ بھی پلٹ کر میری خبر نہیں لی کہ مجھ پر کیا گزری، میں کس حال میں ہوں۔ میں نے کون سا گناہ کیا تھا، ایک طرح سے تو میں نے مولوی صاحب کی جان بھی بچائی تھی۔ وہ تو چشم دید گواہ تھے۔ آپ کے کہنے کے مطابق وہ تو بہت صادق، بہت امین آدمی ہیں۔"

"اس میں کوئی شک نہیں" حافظ صاحب نے بظاہر مشفقانہ انداز میں کہا "ذرا سوچو، جس لڑکی کے لیے مولوی صاحب نے اتنا وقت برباد کیا ہے، جس کی عزت و عصمت، جس کی خوشی و خوشنودی کے لیے انہوں نے اپنے آپ کو بھلادیا، اس سے ان کی وابستگی کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ وہ اس کے لیے جو بہتر سمجھتے ہیں، انہیں وہی کرنا چاہیے۔ انہیں لڑکی کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرنے کا اختیار ہے۔ وہ تمہارے تنخواہ دار تو نہیں تھے۔ کوئی کاغذ پتا بھی تمہارے ان کے درمیان طے نہیں ہوا تھا۔"

"کاغذ پتے کی کیا بات ہے؟" مجھ سے مزید برداشت نہیں ہورہا تھا، میں نے برگشتگی سے کہا "کاغذ پتا بھی ہوسکتا تھا۔ اس وقت نہیں تو بعد میں مگر انہوں نے اس کا موقع ہی کہاں دیا۔ جیل جانے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میری موت ہوگئی ہے۔ ورنہ جیل سے کسی وظیفے، روزینے کا بھی بندوبست ہوسکتا تھا۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اگر کچھ لوگ راستے کا پتھر بن جاتے ہیں تو سایہ دار لوگ بھی راستے میں ملتے ہیں۔ جیل میں مجھے ایسے مہربان مل گئے تھے جو سارا انتظام کردیتے۔ وہ اس کی حفاظت بھی مولوی صاحب سے بہتر کرسکتے تھے مگر مولوی صاحب کو کبھی میری یاد نہیں آئی۔

انہوں نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا کہ میں اس سے الگ نہیں ہوں۔ جیل آنے سے انہیں کوئی روکتا تو نہیں اور وہاں جا کے وہ مجرم تو نہیں بن جاتے' ناپاک تو نہیں ہوجاتے۔"

"تم نے عدالت میں لڑکی اور مولوی شفیق کے ذکر سے غالباً اجتناب کیا تھا۔ جہاں تک مجھے بتایا گیا ہے' اس رات چند ایک بدمعاش فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ ایسی صورت میں مولوی صاحب کو فوراً کلکتے سے چلے جانا چاہیے تھا۔

"مگر بعد میں سہی" میں نے بھری ہوئی آواز میں کہا "ایک سال' دو سال بعد۔"

یہ معلوم ہونے کے بعد کہ تمہیں کتنی لمبی سزا ہوگئی ہے' ان کے جیل آنے سے کیا حاصل تھا۔ تمہیں رہائی تو نہیں مل سکتی تھی۔ اس اشک شوئی سے تمہیں اور اذیت ہی ہوتی۔ میں نہیں کہہ سکتا لیکن شاید پھر مولوی شفیق کا کلکتے کی طرف جانا بھی نہیں ہوا۔ شروع کے دنوں میں تم ان کی کش مکش کا اندازہ کرسکتے ہو۔ پھر شاید انہیں روز و شب کی گردش سے مہلت ہی نہیں ملی' یا ہو سکتا ہے بھئی' انہوں نے تم سے نہ ملنے کا کوئی فیصلہ ہی کرلیا ہو۔ ممکن ہے' انہیں یہ اندیشہ ہو کہ اس رات ناکام ہوجانے والے بدمعاش مسلسل تمہارے سلسلوں کی تاک میں ہوں گے۔ جیل میں تم سے ملنے کون کون آتا ہے' تمہارا کن لوگوں سے رابطہ ہے' تمہارے جیل جانے کے بعد لڑکی پھر کہاں چلی گئی؟"

حافظ صاحب کو اپنی کٹ حجتی کا کچھ احساس ہوا اور وہ نرمی سے بولے "دیکھو بھائی! مولوی شفیق شروع سے ایک لاابالی' کسی جگہ جم کے نہ رہنے والے' کسی حد تک خود سر' اپنے خول میں مست شخص تھے۔ ہم لوگ انہیں بہت ٹوکتے' سمجھاتے تھے۔ نرجس بانو کے بعد میں نے ان میں نمایاں تبدیلیاں دیکھیں۔ پہلی بار وہ سنجیدہ اور فکرمند شخص نظر آئے۔ میں آپ کو یہی جتانے کی کوشش کررہا ہوں۔ نرجس بانو کی انہوں نے دل و جان سے حفاظت بلکہ خدمت اور پرورش کی ہے۔ لڑکی نے اپنے شعور کی عمر اُن کے ساتھ گزاری ہے۔ انہوں نے استطاعت سے زیادہ اس کا خیال رکھا ہے' اسے علم کے زیور سے آراستہ کیا ہے' اس کی ذہنی تربیت کی ہے۔ اسے انہوں نے پھولوں میں رکھا ہے۔"

"مگر اسے ان سے کون چھین رہا ہے" میں نے جھینپی آواز میں کہا "میرے مل جانے سے مراد یہ کہاں ہے کہ مولوی صاحب کا باب ختم ہوگیا اور وہ اس سے کنارہ کش ہوگئے۔ اس طرح وہ ان سے دور تو نہیں ہوجائے گی۔"

حافظ صاحب مجھے گھورنے لگے اور جز بز ہو کے بولے "ہاں' ہونا تو نہیں چاہیے لیکن شاید مولوی شفیق اس طرح نہیں سوچتے۔ نرجس بانو تو ان کے لیے بیٹی کے مانند ہے' بیٹی سے کہیں زیادہ۔ ہر باپ اپنی اولاد کے برے بھلے میں امتیاز کا حق رکھتا ہے۔ تمہارے ساتھ وہ رہی بھی کتنے دن ہے میاں! چند دن' ممکن ہے' کچھ زیادہ لیکن مولوی صاحب کی اور اس کی رفاقت کو ایک جگ ہورہا ہے اور یوں دیکھو تو نرجس بانو سے بہ باطن تمہارا تعلق بھی اتنی ہی دور کا ہے جتنا مولوی صاحب کا۔ وہ کوئی تمہاری سگی' ذات برادری وغیرہ کی تو نہیں ہے۔ تمہارے اور اس کے مابین خون کا تو کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

میرا سر گھومنے لگا تھا۔ حافظ صاحب جانے کیسی باتیں کررہے تھے۔ جی میں آتا تھا' ان کی زبان کھینچ لوں۔ دوسرا کتنی آسانی سے فیصلہ صادر کردیتا ہے۔ انہیں کچھ احساس نہیں تھا کہ وہ مسلسل اپنے مخاطب کی توہین کررہے ہیں۔ وہ جیسے مجھ سے کوئی بدلا لے رہے تھے یا مجھے آزار پہنچانے کی انہوں نے ٹھان لی تھی۔ جانے وہ مجھے کیا سمجھ رہے تھے۔ اس پر اپنے استحقاق کے لیے اب مجھے دلیلیں دینے کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ میں ان سے کیا کہتا کہ میرا وجود بجائے خود ایک دلیل ہے۔ مولوی صاحب نے اتنا وقت اس کے ساتھ کہاں گزارا ہے جتنا میں نے بتایا ہے۔ میرا تو کوئی لمحہ اس کے خیال کے سوا نہیں گزرا۔ جیل سے باہر آکے میں نے جیل کی زندگی گزاری ہے۔ وہ مسلسل میرے ساتھ رہی ہے' میں تو مسلسل اس کے ساتھ رہا ہوں۔ جس پر جس طرح گزرا ہے' اسے بھی تو وقت کی پیمائش میں شمار کرنا چاہیے۔ کبھی ایک لمحہ ایک جگ سے بڑا ہوتا ہے۔ کوئی کسی کے خون میں شامل ہوجاتا ہے۔ انہیں کچھ علم نہیں تھا کہ آدمی' آدمی کی آنکھوں میں روشن رہتا ہے۔ کوئی سینے میں ایسے جاگزیں ہوجاتا ہے کہ ایک دوسرے کا امتیاز باقی نہیں رہتا۔ حافظ صاحب بہت پتھر آدمی معلوم ہوتے تھے۔ انہیں کبھی ایسے سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ وہ پڑھے لکھے آدمی ہوں گے' سطروں کے درمیان کا پڑھنا انہیں نہیں آتا تھا۔ لگتا تھا بس ترازو کے سامنے بیٹھے رہے ہیں' وہ حاضری کو قربت تھے۔ ان سے شاید کبھی کوئی جدا نہیں ہوا تھا۔ اس دھوپ انہیں کوئی تجربہ نہیں تھا جو سورج کے طلوع و غروب کی نہیں ہوتی۔ انہیں وہ زبان ہی نہیں آتی تھی جو صورت و سیرت سے ماورا ہے۔ ایسے آدمی سے مزید بات کرنا ہی تھا۔ میں نے شکستہ آواز میں کہا "میں آپ کو بتاؤں

صاحب اس کے لیے اچھا نہیں کررہے۔ وہ اس سے کیسا ہی سلوک کرلیں لیکن وہ اچھا نہیں کررہے' وہ کیا سمجھتے ہیں۔ اس طرح وہ خوش رہ سکے گی؟ مجھے دور رکھ کے وہ اسے خوش رکھ سکیں گے؟"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟" حافظ صاحب ناراضی سے بولے "تم اس کی خوشی و ناخوشی کے بارے میں کس قدر اور کیا جانتے ہو؟"

"میں جانتا ہوں' اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"یہ تمہاری عمر بول رہی ہے۔"

"آپ کو کیا معلوم' مولوی صاحب نے اسے کس آسرے میں زندہ رکھا ہے' جس دن اس کی امید ٹوٹے گی' وہ نہیں رہے گی۔"

حافظ صاحب سر جھٹکنے لگے اور بٹھل کی جانب دیکھتے ہوئے برہم آواز میں بولے "آپ تو میری بات سمجھ رہے ہیں؟"

"پر آپ نہیں سمجھ رہے ہو" بٹھل نے بھڑک کے کہا۔

حافظ صاحب کا چہرہ لال ہونے لگا "میرے سمجھنے یا نہ سمجھنے سے کیا ہوتا ہے جناب!" وہ بے رخی سے بولے "میں تو مولوی صاحب کے معاملات کی وضاحت کررہا ہوں' وکالت نہیں۔"

"آپ جو بھی الٹا سیدھا کرو صاحب!" بٹھل نے اکھڑی ہوئی آواز میں کہا "اپنے کو بولو' مولوی صاحب کو سامنے آنے میں کیا لاج آتی ہے؟"

"جی' جی!" پہلے تو حافظ صاحب نے سر ہلا کے تائید کی پھر ان کا لہجہ سپاٹ ہوگیا "میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ظاہر ہے' وہ کسی کی ضرورت نہیں سمجھتے یا مناسب خیال نہیں کرتے۔ میں یہی کہتا ہوں' آپ مانیں یا نہ مانیں' حق بھی یہی ہے کہ انہیں لڑکی کے سلسلے میں کوئی بھی قدم اٹھانے اور اچھا برا سمجھنے کا اختیار ہے۔ زندگی دینے والا تو خدا ہے لیکن سبب بھی پیدا کرتا ہے۔ مولوی صاحب کی ذات نرجس بانو کے لیے زندگی کا سبب بنی ہے۔"

"ساری تو تکاری' گھما پھیری چھوڑو صاحب! ہم آپ کو نہیں بولتے۔ ہم لڑکی کا دھیان چھوڑ دیں گے' اگر لڑکی بول دے۔ ہمارے سامنے نہیں تو اپنے کو آپ پر بھروسا' آپ لڑکی سے خود پوچھو' وہ مولوی صاحب کے پاس جو رہنے کو چاہتی ہے یا اپنے لاڈلے کے پاس یا دونوں کے؟"

حافظ صاحب کوئی جواب نہیں دے سکے اور داڑھی کا بال نوچنے لگے پھر لمحوں کے تذبذب کے بعد بولے۔

"میں سمجھتا ہوں' یہ ایک معقول بات ہے۔"

"اپنے کو اس گھن چکر سے نکالو صاحب! ہم آپ کو زبان دیتے ہیں' ہم ایسے ہی لوٹ جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔" حافظ صاحب نے گہری سانس لی "ایسا ممکن ہے' بشرطیکہ مولوی شفیق صاحب اس طرف آجائیں۔"

"ہم آپ سے اب نہیں پوچھیں گے کہ ابھی وہ کدھری ہیں' سارا ہم آپ پہ چھوڑتے ہیں۔ آپ خدا والے آدمی ہو۔"

"میں کیا' میری بساط کیا" حافظ صاحب کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولے "میں اس کا نہایت عاجز بندہ ہوں' خدا مجھے معاف کرے۔ آپ مجھ پر بڑی ذمے داری ڈال رہے ہیں۔ فرض کیجئے' بابر میاں سے نرجس بانو کی ذہنی و قلبی ناوابستگی کا کوئی شبہ ہی مولوی صاحب کے اجتناب کا باعث ہو اور وہ اپنی دانست میں نرجس بانو کا یہ فعل' یہ امید' نادانی' نا سمجھی پر محمول کرتے ہوں' اور قلب ماہیت کی توقع رکھتے ہوں' کیوں کہ وقت بڑے بڑے زخم مندمل کردیتا ہے۔ کسی نہ کسی دن نرجس بانو کی آس پر اوس پڑ جائے گی۔ اس صورت حال میں آپ ہی فرمائیے' وہ مجھے کیا' کسی کو بھی لڑکی کا عندیہ جاننے کا موقع نہیں دیں گے اور اگر انہوں نے یہ موقع فراہم بھی کردیا یا میں اپنے طور پر نرجس بانو سے سلسلہ جنبانی میں کامیاب بھی ہوگیا اور اس کی جانب سے واقعی مجھے کوئی ایسا اشارہ بھی مل گیا جس کی بابت آپ یقین کا اظہار کررہے ہیں۔ تو اس طرح نرجس بانو سے مولوی شفیق کی دستبرداری کا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب یہ کہاں ہوا کہ وہ نرجس بانو سے بری الذمہ ہوجائیں گے یا میں انہیں آمادہ کرپاؤں گا۔ نتیجہ تو وہی رہا۔ سمجھ رہے ہیں آپ؟ مولوی شفیق ایک ضدی شخص ہیں پھر میں آپ سے کیا کہہ سکوں گا اور آپ کے لئے کیا کرسکوں گا؟"

"آپ پھر الگ ہوجانا' ہم ان کو دیکھ لیں گے۔ اتنا جان کے آپ کو ان کے ٹھکانے کے بارے میں بولنے میں اتنی اپابجی نہیں ہوگی' ایسا بل نہیں کھاؤ گے آپ پھر' آپ کو ہم سے بول دینا چاہئے صاحب!"

"میرے لئے پھر بھی یہ ایک مشکل مرحلہ ہوگا۔"

"سمجھتے ہیں صاحب! بہت کٹھن ہوگا' پر آپ ایک تھوڑا بول کے دو آدمی کو بچاؤ گے' ایک لڑکی کو' دوسرے لاڈلے کو۔ ہم آپ کو بولتے ہیں' لڑکی بھی ایسے زیادہ دونوں تک نہیں کھنچے گی' اور یہ شکرا بھی' آپ اس کو دیکھ رہے ہو

نا! اس کے پر کٹے ہوئے ہیں۔ ایک دم آدھا ہے۔ یہ آدھا بھی نہیں رہے گا جس دن۔ جس دن۔۔۔" بٹھل کی آواز بھاری ہونے لگی۔ ایک لمحے ٹھہر کے اس نے کہا "اور کیا کیا بولیں آپ کو، کڑی سے کڑی مل کے بڑا خرابا ہوا ہے۔ بیچ میں ایک دو نہیں، بہت لوگ، بہت گھر تلپٹ ہوئے ہیں اور جیل، کوئلے کی کان نہیں ہوتی صاحب کہ ہر کوئی ادھری سے کالا ہی ہو کے نکلے۔ ادھری اس نے اوپر کے درجے تک پڑھائی کی ہے۔"

"اچ... چھا" حافظ صاحب کی آنکھوں میں حیرت اُمڈ آئی "میں یہی سوچ رہا تھا بلکہ پوچھنے والا ہی تھا، گفتگو ہی سے اندازہ ہو رہا تھا۔ کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے میاں آپ نے؟"

میں نے جھجکتے ہوئے بتایا کہ میں نے ایم اے کیا ہے۔

"خوب، خوب، ماشاءاللہ۔ یہ تو آپ نے کمال کردیا۔ یقین نہیں آتا۔ سچ ہے، علم کے حصول کی خواہش ہو تو در کھلتے جاتے ہیں۔"

"ادھری جیل سے چھوٹ کے اس کو اپنے اڈے پہ آنا چاہئے تھا، پر یہ کسی کو بولے بنا سیدھا مولوی صاحب کو کھوجنے نکل گیا، اپنے پاس تو بہت بعد میں لوٹا" بٹھل نے مختصراً حافظ صاحب کو بتایا کہ سمتوں سمتوں بے شمار بستیوں کی خاک چھانتے ہوئے آخر جیسلمیر شہر میں ہم نے وہ محلہ اور وہ گھر دریافت کیا جہاں مولوی صاحب نے کچھ عرصے قبل قیام کیا تھا مگر مولوی صاحب وہاں سے جا چکے تھے۔ بٹھل نے جیسلمیر میں مولوی صاحب کے پڑوسی منیر علی اور رانا ماہ تاب کی روداد سے پہلو تہی کی اور کہا کہ بہت دنوں بعد ہمیں مراد آباد کے مسافر خانے کے روزنامچے سے معلوم ہوا کہ مولوی صاحب نے سکونت کے خانے میں حیدر آباد دکن کا پتہ لکھوایا ہے۔ ہم نے حیدر آباد کا رخ کیا مگر مولوی صاحب وہاں سے بھی کسی اور طرف نکل چکے تھے۔ اب بھی ہم حیدر آباد سے آرہے ہیں۔"

"آپ حیدر آباد سے آرہے ہیں؟" حافظ صاحب بوکھلا سے گئے۔

بٹھل نے بہ شد و مد ایک بار پھر اپنے عزم کی تجدید کی کہ دشت نوردی تو مولوی صاحب کے گریبان پر جا کے ختم ہوتی ہے۔ اس نے حافظ صاحب کو بتایا کہ حیدر آباد میں مولوی صاحب نواب ثروت یار کے ہاں مہمان ہوئے تھے۔ ہماری آہ و زاری پر نواب نے وعدہ کیا تھا کہ جیسے ہی حیدر آباد میں مولوی صاحب کی واپسی ہوئی، وہ ہمیں خط کے ذریعے مطلع کردے گا۔ مولوی صاحب کے حیدر آباد آنے پر اپنا وعدہ نبھانے، دوسرے لفظوں میں ہمیں خط لکھنے سے پہلے اس نے بہتر جانا کہ کیوں نہ مولوی صاحب کے سامنے ہمارا ذکر چھیڑ کے دیکھے۔ ہمارے بارے میں مولوی صاحب کی رائے جاننے کے بجائے وہ ہم سے کئے ہوئے وعدے کی تکمیل کو ترجیح دیتا تو ہم نے مولوی صاحب کو جالیا ہوتا۔ نواب کے قول، اس کی زبانی ہماری آمد کا احوال سن کے مولوی صاحب گنگ رہ گئے اور دوسرے دن کسی کو مطلع کئے بغیر وہاں سے چلے گئے۔ ان کے یوں چلے جانے سے نواب بہت دل برداشتہ تھا۔ ایک دن پہلے اس کی والدہ نے مولوی صاحب سے کورا کو اپنے گھر کی بہو بنانے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ نواب کو گمان تھا کہ دیرینہ خاندانی رابطہ ارتباط کے پس منظر میں رشتے سے برملا انکار کا حوصلہ مولوی صاحب کو نہیں ہو۔ اسی لئے انہوں نے چپ چاپ نواب کے گھر سے چلے جانا مناسب سمجھا۔ نواب کو دوبارہ مولوی صاحب کی حیدر آباد آمد کا یقین نہیں تھا مگر اس کی توقع کے خلاف اور اس کی آرزو کے عین مطابق مولوی صاحب دوبارہ حیدر آباد پہنچ گئے۔ اس بار نواب نے ایفائے وعدہ کیا اور بمبئی خط لکھ کے ہمیں حیدر آباد میں مولوی صاحب کی موجودگی کی اطلاع سے شاد کیا۔

"یعنی، یعنی نواب ثروت نے بذات خود آپ کو حیدر آباد، آنے کی دعوت دی؟" حافظ صاحب مضطرب لہجے میں بولے۔

بٹھل نے اقرار میں سر جھکالیا اور نواب ثروت کے ہاں پیش آنے والے واقعات خاصی تفصیل سے بیان کئے۔ حافظ صاحب مبہوت ہو کے سنتے رہے۔ ان کی پلکیں ساکت ہوگئی تھیں۔ جب بٹھل نے نواب کی موت کی خبر سنائی تو ان کی حالت اور غیر ہوگئی "کیا، کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ نواب ثروت کا انتقال ہوگیا؟"

جواب میں بٹھل سرد آہ ہی بھر سکتا تھا "اور، اور شفیق۔۔۔؟"

بٹھل نے انہیں بتایا کہ نواب ثروت کے ایک خدمت کار کو اپنے آقا کے انتقال سے ایک روز پہلے آیا کہ آقا کے حادثے اور جاں بہ لبی کی کیفیت کی اطلاع مولوی صاحب کے گوش گزار بھی کرنی چاہئے، اسی کو مولوی صاحب کا گھر معلوم تھا۔ خدمت گار کے رخصت ہوتے ہی مولوی صاحب نے رخت سفر باندھ لیا۔ انہوں نے محسن نواب ثروت کی عیادت کرنے میں بھی وقت ضائع نہیں کیا۔ دوسرے دن رات کو ہم ان کے گھر پہنچے تو ایک روز پہلے وہ وہاں سے جا چکے تھے۔

"جا چکے تھے! کہاں کہاں؟" حافظ صاحب بدحواسی سے بولے۔

"یہی جاننے کے لئے ہم ادھری آئے ہیں۔"

"مگر وہ، وہ یہاں تو نہیں آئے۔"

"آئے نہیں تو آجائیں گے صاحب!"

ایک عالم ہیجان کے بعد حافظ صاحب کے دست و بازو اکڑ سے گئے۔ وہ تو بت بن گئے تھے۔ ان کی حالت دیکھ کر بٹھل کی جزئیات بیانی کی وجہ اب کچھ میری سمجھ میں آرہی تھی۔ کچھ دیر بٹھل حقے سے شغل کرتا رہا پھر اس نے دھیمی آواز میں کہا "ہم تو ہاتھ پاؤں مار ہی رہے ہیں۔ گھیرا گھٹ رہا ہے، کسی دن پٹی بھی کھل جائے گی۔ اب نہیں تو آگے، سال بھر میں، اور زیادہ بھی، ایک دن کسی کونے میں تو مولوی صاحب کو ہاتھ لگنا ہی ہے پھر کیا ہوگا صاحب؟"

"وہ یہاں آئے تو میں ان سے بات کروں گا۔ آپ اطمینان رکھیے، میں ضرور ان سے بات کروں گا" حافظ صاحب کی زبان بہک رہی تھی "بے شک وہ بیس پچیس روز پہلے یہاں آئے تھے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ وہ مجھے بھی حیدر آباد ہی کا بتا کے گئے تھے اور یہ بھی کہتے تھے کہ حیدر آباد میں مستقل سکونت کے لئے نواب ثروت یار نے بہت اصرار کیا ہے، ہر طرح کی اعانت کا یقین دلایا ہے۔ گومگو کی حالت تھی۔ کہتے تھے کہ حیدر آباد جا کے صورت حال کا جائزہ لیں گے اور جیسا کچھ بھی ہوا، بذریعہ خط مجھے آگاہ کریں گے۔ ابھی تک ان کا کوئی خط نہیں آیا ہے۔ انہوں نے نواب ثروت یار کے بارے میں بہت کچھ بتایا لیکن نرجس بانو سے نواب کی دل چسپی کی بات مجھ سے مخفی رکھی۔ اس کا سبب غالباً یہی ہوگا کہ میں نے بھی ایک مرتبہ اشارۃً اپنے بیٹے عبدالحمید کے لئے ان سے بات کی تھی۔ ابھی ابھی جس بچے کو آپ نے دیکھا ہے، جو یہاں بیٹھا ہوا تھا، اسی کے لئے۔ ہمارے ہاں عموماً اپنی برادری میں شادیاں ہوتی ہیں لیکن مولوی صاحب کی پریشانی دیکھ کے میں نے زبان کھولی تھی۔ دوسرے، سچی بات یہ ہے کہ نرجس بانو مجھے پسند بھی بہت ہے۔ کون اسے اپنے گھر کی زینت بنانا نہیں چاہے گا؟ مولوی صاحب نے انکار کیا نہ اقرار، چپ ہوگئے پھر کچھ سوچ کے بولے "دیکھو حافظ! دوبارہ مت کہنا۔ جب کوئی صورت بنی تو میں خود تمہیں اشارہ کردوں گا۔ اگر تمہیں عبدالحمید کی شادی کی بہت جلدی ہے تو انتظار بھی مت کرنا، جہاں موزوں رشتہ ملے، بسم اللہ کردینا۔ صورت بننے اور سازگار حالات کی بات میری فہم سے بالاتر تھی۔ میرے ان کے درمیان کسی قسم کا تکلف نہیں ہے۔ عبدالحمید ان کے لئے اولاد کے مانند ہے۔ میں کوئی سوال کرکے انہیں کشمکش میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ کئی بار میں نے ترغیب دی، بھلے مانس! کب تک خانہ بدوشی میں گزارو گے۔ اس دربدری کی ضرورت کیا ہے میرا تمہارا معاملہ غیروں کا نہیں۔ نگریا سادات شریفوں کی بستی ہے، بہت پرسکون ہے۔ پہلو میں ریاست رام پور، اس سے بیس میل پرے تمہارا مراد آباد ہے۔ نینی تال، بریلی، سبھی نزدیک ہیں۔ دلی بھی ایسی دور نہیں۔ یہاں رہ کے زمینوں کا کام سنبھالو، اللہ برکت دے گا۔ مولوی شفیق نے ہر بار پورے غور و خوض سے مشورے سنے، تائید بھی کی لیکن عمل نہیں کیا۔ ہفتوں، مہینوں یہاں قیام کیا۔ یہاں سبھی ان کی بے انتہا عزت کرتے ہیں۔ بچے چھوٹے ابا کہہ کر پکارتے ہیں۔ بڑے القاب و آداب سے مخاطب ہوتے ہیں۔ ایک بار تو عرصے تک رہے، زمینوں پر میرے ساتھ ذوق و شوق سے جانے لگے لیکن پھر دل اکھڑ گیا۔ مجھے ان کی مالی حالت کا بھی علم ہے۔ مجھے کہنا نہیں چاہئے، محض عرض حال مراد ہے، متعدد دفعہ انہوں نے کھل کے کہہ بھی دیا۔ انہیں کرنا بھی یہی چاہئے تھا۔ خدا گواہ ہے، میں نے حکم کی تعمیل کی۔ ایک مرتبہ جیسلمیر سے بھی پریشانی کا خط لکھا تھا۔ مجھے معلوم ہے، انہوں نے اپنا سب کچھ بیچ دیا ہے۔ شاید اب کچھ بھی باقی نہیں بچا۔ شروع شروع میں تو انہیں بہت ٹوکتا تھا۔ بعد میں اس خیال سے یہ پند و نصائح کم کردیئے کہ کہیں ناگوار خاطر نہ ہوجائے۔ تنگی میں آدمی اور حساس ہوجاتا ہے۔ ایک نہ ایک دن لازماً انہیں اپنی روش بدلنی پڑے گی لیکن میرا اندازہ اب تک غلط ہی ثابت ہوا ہے۔ جانے کس ادھیڑبن میں ہیں۔ پہلے تبت کے لوگوں کی طرف سے فکر مند تھے۔ خیر ابتدا ہی سے نرجس بانو کو برقع پہنا دیا تھا۔ برقعے میں وہ خاصی محفوظ ہوگئی تھی۔ اب تو بہت وقت گزر گیا۔ تبت میں لڑکی کے قبیلے کے لوگ کب کے ناامید ہوچکے ہوں گے۔ اب اس جانب سے بھی بظاہر انہیں کوئی ایسی فکر لاحق نہیں ہونی چاہیے۔ گزشتہ مرتبہ انہوں نے کسی ایسے اندیشے کا ذکر بھی نہیں کیا۔"

"آپ کی مرضی ہو تو کچھ بولیں صاحب؟" صاحب کے چپ ہوتے ہی بٹھل نے کہا۔

"ضرور، ضرور، کیا بات ہے؟ حافظ صاحب چونک پڑے۔

"اب تک جو کچھ دھن دولت انہوں نے کھویا ہے، جو

کچھ بھی' ہم اس کا دس گنا' بیس گنا یا جتنا وہ بولیں' ان کو اپنے پہ بھروسا نہیں تو ہم پہلے بھی دینے کو تیار ہیں۔ ہم آپ کے پاس چھوڑ دیتے ہیں۔"

"جی' جی۔" حافظ صاحب کی زبان لکنت کرنے لگی۔ "مگر' مگر جناب! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

" بٹھل نے ہاتھ اٹھا کے انہیں مزید کچھ کہنے سے روک دیا "اس کو لڑکی کا برا مت سمجھو صاحب! اپنے کو پتہ ہے' لوگوں نے کمتی بولی نہیں لگائی ہے۔ اپنا مطلب ہے' ہم کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔"

"میں بھی کچھ عرض کروں" حافظ صاحب تپیدہ لہجے میں بولے "مولوی شفیق کو پیسے سے کبھی کوئی رغبت نہیں رہی' ورنہ انکے پاس بہت کچھ ہوتا' کیا نہیں تھا۔ خاندانی آدمی ہیں۔ چاہتے تو دس کاروبار کرسکتے تھے مگر مزاج ہی شاہانہ بلکہ فقیرانہ ہے۔"

"آپ ان سے بات کرکے دیکھ لو' ہم پہلے آپ کو بول دیئے ہیں' لڑکی ان سے الگ نہیں ہوجائے گی۔ بٹیا اپنے گھر کی ہوکے ماں باپ سے دور نہیں ہوجاتی۔ ہم نے آپ کو بھی بولا ہے کہ سارا لڑکی پر ہے۔ وہ منع بول دے گی تو ہم لوٹ کے بھی نہیں دیکھیں گے۔ روپیہ پیسہ بھی واپس نہیں لیں گے' ہمیں بھی اپنی طرف سے لڑکی کو کچھ دینا ہے' یہی جان لینا۔" یہ کہتے ہوئے بٹھل نے خاص دان سے گلوری اٹھائی اور حافظ صاحب سے سواری کا انتظام کرنے کو کہا۔

"کیا جناب!" حافظ صاحب بے قرار ہوگئے "جارہے ہیں آپ؟"

"پاس بولنے کو اور کچھ نہیں ہے" بٹھل نے بجھی ہوئی آواز میں کہا "اپنا پتہ رکھ لو' کبھی دل نے ساتھ دیا تو کام آئے گا' اور کبھی من کرے تو ادھری بمبئی کا چکر بھی لگانا صاحب! آنکھوں دیکھا' کانوں سنا اچھا بھی ہوتا ہے' پکا بھی۔"

حافظ صاحب سے ممنویت کے چند رسمی الفاظ بہ مشکل ادا ہوئے' انکسار سے بولے "کیا عرض کروں' کچھ منہ نہیں پڑتا۔ سچ تو یہ ہے' اب جی نہیں چاہتا کہ آپ ایسے چلے جائیں' بہرحال خاطر جمع رکھیے' مولوی صاحب یہاں نہ آئے' کسی جگہ سے ان کا خط آیا تو میں انہیں بلالوں گا یا خود ان کے پاس چلا جاؤں گا۔"

"بہت ٹائم لے لیا آپ کا صاحب! پوری رات کالی کردی۔ دیکھو' کبھی ادھری آئے تو ساتھ نینی تال چلیں گے۔ بولتے ہیں' ادھری رام نگر کے پاس شکار خود شکاری کے پاس آتا ہے۔"

"وہاں کی کیا بات ہے۔ وہ علاقہ تو شکاریوں کا مرکز ہے۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گا جناب! وہاں کے محکمہ جنگلات کا افسر اچھا واقف کار ہے' بہت خیال کرتا ہے۔"

بٹھل نے گھڑی کی طرف نظر کی تو حافظ صاحب فوراً اٹھ گئے اور انہوں نے صحن کی جانب رخ کرکے صدا لگائی۔ میرا اندازہ صحیح نکلا' ملازم جاگ رہے تھے۔ حافظ صاحب کو باہر جانے کی ضرورت نہیں پڑی' پہلی صدا پر لپکتے قدموں سے ایک آدمی اندر آگیا۔ حافظ صاحب نے اسے گھوڑا گاڑی تیار کرنے کا حکم دیا۔

"کیوں نہ ایک ایک فنجان قہوہ اور ہوجائے' اتنی دیر میں گاڑی تیار ہوتی ہے' کچھ گلوریاں بھی ساتھ لیتے جایئے۔" حافظ صاحب نے تکلف آمیز لہجے میں کہا۔

گھر کے لوگوں کو جگانے کا یہ کوئی وقت نہیں تھا' اچھا ہوا کہ بٹھل نے منع کردیا۔ حافظ صاحب کی ہدایت پر ملازم اندر سے کاغذ قلم لے آیا۔ مراد آباد آنے سے اب تک بے شمار لوگوں کو ہم اپنا پتہ دے چکے تھے۔ میں نے روانی سے ابا جان کا پتہ لکھ کے کاغذ حافظ صاحب کے حوالے کردیا۔

جب تک ملازم نے گھوڑا گاڑی تیار ہوجانے کی اطلاع نہیں دی' بٹھل دم توڑتا ہوا حقہ نچوڑتا رہا۔ ریل گاڑی کی روانگی میں ابھی وقت تھا۔ حافظ صاحب کچھ دیر اور ٹھہر جانے کے لئے اصرار کررہے تھے مگر بٹھل مونڈھے سے اٹھ گیا۔ بیٹھک کے دروازے سے مجھے ملازموں کے ساتھ حافظ صاحب کے بھائی عبدالمتین اور بیٹا عبدالحمید بھی باہر کھڑے نظر آئے۔ سبھی مستعد تھے۔

دروازے سے باہر نکلتے نکلتے بٹھل ٹھہر گیا اور حافظ صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے معنی خیز لہجے میں بولا۔ "کب تک سوانگ چلے گا۔ کبھی ٹائم ملے تو دھیان دینا صاحب! مولوی صاحب کا بس کتنا ہے۔ کسی ایک جگہ پاؤں نہ ٹکانے کی وجہ لڑکی کی کہنیاں بھی ہوسکتی ہیں۔ لگام کس کے ہاتھ میں ہے اور رستے کون دکھا رہا ہے؟"

حافظ صاحب کوئی جواب نہ دے سکے تھے کہ بٹھل نے ان سے کہا "ادھری تبت کے پاگل' ادھری ہم جنگلی لوگ' لڑکی کی ناک میں پھیری لگانے والے اٹھائی گیرے' حرام کے جنے' پر اس سے آگے بھی تو کوئی بات ہو سکتی ہے۔ لڑکی کو کوئی جواب دینا ہوتا ہے مولوی صاحب کو' سامنے مٹی کی مورتی نہیں ہے۔ آگے فیصلہ ایک انہی کو نہیں کرنا' اپن لاڈلے کی طرح ادھری وہ بھی بہت ہڑکتی ہوگی۔"

حافظ صاحب گم صم کھڑے تھے۔ بٹھل بیٹھک کا چبوترہ

پھلانگ کے گلی میں آگیا۔

اسٹیشن پر گنتی کے چند مسافر تھے۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔ گاڑی کے انتظار میں ڈیڑھ گھنٹے تک ہم پلیٹ فارم کی بینچ پر بیٹھے رہے۔

○☆○

صبح ٹھیک چھ بجے گاڑی مراد آباد پہنچ گئی۔ جمرو اور زوار کی بے کلی سے ایسا لگتا تھا' جیسے ہمیں ان سے جدا ہوئے زمانہ گزر گیا ہو۔ بچوں کی طرح اچھلنے کودنے لگے اور جمرو مچل کے بٹھل سے بولا "اب کے اپنے کو بھی ساتھ لے چلو استاد! یہاں پڑے پڑے سالے ہاتھ پاؤں اکڑ جائیں گے۔"

"اب چھٹی ہوگئی رے سب کی" بٹھل نے تھکی ہوئی آواز میں اسے مژدہ سنایا۔ کرتے کی آستینوں میں میری اور بٹھل کی کلائیاں چھپ گئی تھیں لیکن زورا اور جمرو کی نظروں سے تادیر نہ چھپا رہا سکا۔ میرا تو کچھ نہیں تھا لیکن استاد کی کلائی پر پٹی دیکھ رہے تھے" اس جواب سے ان کی تسلی نہیں ہوئی مگر بٹھل کی تیوری چڑھی ہوئی تھی۔ دونوں کو چپ ہوجانا پڑا۔

سب نے ساتھ ہی ناشتہ کیا۔ گھنٹے بھر کے قریب مسافر خانے میں ٹھہر کے بٹھل شہر کی جانب چل پڑا۔ ابھی بازار بند تھے۔ تاجر محمد یونس اور مولوی صاحب کے دو ایک قریبی شناساؤں کو دیکھ لینا کافی تھا۔ ہماری عدم موجودگی کے دوران مولوی صاحب نے مراد آباد کا رخ کیا ہوتا تو ان لوگوں سے ضرور ملے ہوتے۔

جمرو اور زوار نے ٹکٹ پہلے سے خرید رکھے تھے۔ سوا گیارہ بجے ہم ہاوڑا ایکس پریس میں بیٹھ گئے۔ مسافر خانے کے منیجر عبدالباسط کا عجب حال تھا' آنکھیں بھری ہوئی' چہرہ تمتمایا ہوا۔ بار بار مجھے اور بٹھل کو' زورا اور جمرو کو گلے لگاتا۔ گاڑی حرکت میں آنے تک وہ ڈبے سے نہیں اترا۔

گاڑی پھر اس سمت جارہی تھی جہاں سے صبح ہماری آمد ہوئی تھی۔ آدھ گھنٹے میں رام پور شہر آگیا' پھر آدھ گھنٹے سے کم وقت میں نگریا سادات۔ ڈبے میں ہمارے سوا کوئی مسافر نہیں تھا۔ جمرو اور زورا مسلسل چہک رہے تھے۔ پورے دو ہفتے بعد انہیں مسافر خانے کے زنداں سے نجات ملی تھی۔ سلمٰی بھی پھول کی طرح کھلی ہوئی تھی۔ رخساروں کا گلابی رنگ جیسے چھلک چھلک جائے۔ لگتا تھا' زورا اور جمرو ایک ہی کام کرتے رہے ہیں' اسے دھوپ' دھول اور ہواؤں سے بچائے رکھنا۔ جگہوں' موسم اور غذاؤں سے ایسا نہیں ہوتا' آدمی ہی آدمی کے لئے بہار اور خزاں ہوتے ہیں۔ آدمی ہی صحرا' آدمی ہی ریگستان۔ عبدالباسط دو دن کے لئے انہیں نینی تال بھی لے گیا تھا۔ کل ہی شام وہ واپس ہوئے تھے۔ زورا کہتا تھا' کسی کا وہاں سے آنے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن کسی وقت بھی انہیں ہماری مراد آباد واپسی کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ وہ نینی تال کے نظاروں کا احوال لہک لہک کے سناتے رہے۔ بٹھل بھی دل جمعی سے سنتا رہا۔

ڈیڑھ بجے گاڑی بریلی پہنچ گئی۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہوگیا تھا۔ منع کرنے کے باوجود عبدالباسط نے بہت سا سامان ساتھ کردیا تھا۔ صبح نو بجے مسافر خانے آکے ہی اسے میری اور بٹھل کی آمد کا علم ہوا تھا۔ دو گھنٹے بعد ہماری روانگی تھی۔ گھر سے کھانے پینے کا انتظام کرنا ممکن نہیں تھا' اس نے مسافر خانے کے باورچی صدیق سے جلدی جلدی مرچ قیمہ بھنوالیا تھا۔ پراٹھے' دلی طرز کی کچوریاں' انڈے کا حلوہ اور پھلوں سے ٹوکری بھری ہوئی تھی۔ عبدالباسط کو گھر سے کچھ لانے کا وقت مل جاتا تو شاید سارا باورچی خانہ ساتھ کردیتا۔ صدیق نے عجلت میں نہایت لذیذ قیمہ تیار کیا تھا۔ سب نے سیر ہوکر کھایا۔

سب کے سامنے میں نے اظہار نہیں کیا لیکن میری کلائی میں چنگاریاں اٹھ رہی تھیں۔ بریلی گزر جانے کے بعد میں اوپر کی برتھ پر آکے لیٹ گیا اور آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی مگر لیٹتے ہی درد سارے جسم میں پھیل گیا۔ دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ درد ناقابل برداشت ہوگیا تو میں نے پٹی کھول دی۔ زخم کے اردگرد سوجن ہوگئی تھی۔ مرہم لگانے کے بعد بھی غالباً خون رستا رہا تھا۔ ڈاکٹر پنت کی گولیاں جیب میں پڑی تھیں' چار قسم کی گولیاں تھیں۔ زورا کو آواز دے کر میں نے پانی مانگا اور وقفے وقفے سے چاروں گولیاں نگل لیں۔ ڈاکٹر نے نسخہ بھی لکھا تھا مگر مراد آباد میں دوائیں خریدنے کا خیال ہی نہیں رہا۔ زورا سے پانی مانگنا غضب ہوگیا۔ گلاس واپس لیتے وقت اس کی نظر میری کلائی پر پڑ گئی اور وہ فیل مچانے لگا۔ جمرو اور سلمٰی بھی بے قرار ہوگئے۔ مرہم اور خون میں سنی ہوئی کلائی کچھ اور وحشت خیز ہوگئی تھی۔ سلمٰی کی تو چیخ نکل گئی۔ انہوں نے مجھے نیچے اترنے پر مجبور کردیا۔ جمرو نے پرانی پٹی سے کلائی صاف کی۔ سلمٰی نے سامان سے کپڑا نکال کے نئی پٹی تیار کی۔ خون اب نہیں بہہ رہا تھا مگر انہوں نے ریشمی کپڑا جلا کے زخم پہ راکھ چھڑکنے کا ٹوٹکا آزمایا۔ مسافر خانے میں وقت گزاری کے لئے سلمٰی اپنے لئے جوڑے سیتی رہی تھی۔ اس کے پاس قینچی بھی تھی۔ ان تینوں نے ازسرنو میری کلائی پر پٹی باندھ دی۔ بٹھل اپنی جگہ

سے نہیں اٹھا۔ جمرو اور زورا نے پہلی ہی نظر میں زخم کی نوعیت بھانپ لی ہوگی۔ زخموں کی ویسے بھی انہیں اچھی پہچان تھی۔ چاقو کی لمبی ستواں لکیر کسی جگہ نہ ہلکی نہ گہری زخم جیسے تراشا کیا ہو۔ ایسی ہی ایک پٹی بٹھل کی کلائی پر بندھی تھی۔ یہ یکسانی جمرو اور زورا کے لئے کسی پہیلی سے کم نہ ہوگی۔ سلمٰی کی وجہ سے وہ زیادہ پھیل نہیں سکتے تھے۔ ادھر بٹھل نے انہیں پہلے جھڑک دیا تھا۔ انہیں اپنے اضطراب کا اظہار مؤخر کرنے میں بہت گھٹن ہورہی ہوگی۔ ڈاکٹر پنت کی گولیوں کا اثر تھا یا زخم کی صفائی اور نئی پٹی کا کرشمہ رفتہ رفتہ جلن کم ہوتی گئی۔ گولیوں میں یقیناً کوئی گولی خواب آور بھی تھی۔ کچھ ہی دیر میں سر بھاری ہونے لگا۔ میں دوبارہ اوپر کی برتھ پر چلا آیا پھر کون کون سے اسٹیشن آئے کہاں گاڑی ٹھہری، مجھے کچھ خبر ہی نہیں رہی۔ سورج تقریباً غروب ہوچکا تھا جب انہوں نے مجھے جگایا اور بتایا کہ لکھنؤ شہر آگیا ہے۔

باوڑا ایکس پریس فیض آباد نہیں جاتی تھی۔ جمرو کو فیض آباد جانے والی گاڑیوں کا علم تھا۔ فیض آباد تو خیر اس کا آبائی شہر تھا، لکھنؤ کے گلی کوچوں سے بھی اس کی واقفیت کم نہیں تھی۔ بٹھل کے دوست، لکھنؤ کے دادا کبن خاں مرحوم سے اس کے اور بڑے بھائی جامو کے خاص مراسم تھے۔ کبن خاں کی موت بھی ہماری، بلکہ میری وجہ سے ہوئی تھی۔ نہ ہم ابا جان کی تلاش میں تبت کا رخ کرتے، نہ بٹھل کو اڈا سنبھالنے کے لئے اسے کلکتے بلانا پڑتا۔ بٹھل کی موجودگی میں کلکتے کے اڈے پر قبضہ جمانے کا سودا رتنا کے دماغ میں کبھی نہیں سما سکتا تھا۔ زیادہ دنوں کی بات نہیں تھی۔ لکھنؤ شہر آکے بٹھل کو کبن خاں بہت ستا رہا ہوگا۔ مجھے یاد تھا ایک روز رات کو وہ فیض آباد کے اڈے پر گرجتا برستا آیا تھا کہ جامو کے چھوٹے بھائی جمرو نے روشن نامی طوائف لکھنؤ سے اغوا کرلی ہے۔ زریں کی حویلی اس کی خالہ کے ناجائز قبضے سے واگزار کرانے کے لئے بٹھل نے کبن خاں ہی کو خط لکھا تھا۔ رتنا نے شب خون مارا تھا ورنہ کبن خاں اس آسانی سے پسپا ہونے والا نہیں تھا۔

اسٹیشن سے باہر آکے ہم تانگے میں سوار ہوگئے۔ رات کے وقت لکھنؤ کی رونق ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ آسمان صاف تھا۔ ہوا میں گرمی کی ہلکی ہلکی آمیزش تھی۔ قمقمے روشن ہوگئے تھے اور سڑکوں پر خوب چہل پہل تھی۔ حضرت گنج کا علاقہ تو دیکھنے کی چیز ہے۔ جمرو ہمیں جدید طرز سے آراستہ ایک چمکتے دمکتے ہوٹل میں لے آیا۔ پردہ نشین خواتین کے ساتھ بیٹھنے کے لئے ہوٹل میں کیبن بھی بنے ہوئے تھے۔ بٹھل اور سلمٰی کو وہاں بٹھا کے جمرو اور زورا فوراً باہر آگئے۔ میں انہیں مسلسل یقین دلاتا رہا کہ اب مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے، وہ مانے نہیں اور ہوٹل سے کچھ فاصلے پر ڈاکٹر سری واستو کے مطب میں آکے ہی انہوں نے دم لیا۔ مطب میں مریضوں کی بھیڑ تھی مگر جانے جمرو نے کمپاؤنڈر پر کیسا جادو کیا کہ ڈاکٹر کے روبرو ہونے میں ہمیں پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ کوئی ایسی تشویش کی بات نہیں تھی۔ ڈاکٹر نے سوئی لگا کے اور نئی پٹی باندھ کے ہمیں جلد ہی رخصت کردیا۔ نگریا سادات کے ڈاکٹر پنت کے نسخے میں اس نے بس ایک دوا کا اضافہ کیا۔ ڈاکٹر کے تجسس پر جمرو مجھ سے پہلے بول پڑا۔ وہ شیشے اور ٹین لگ جانے ہی کا کوئی عذر کرسکتا تھا۔ ڈاکٹر کو اس نے مطمئن کردیا لیکن مطب سے نکلتے ہی اس نے اور زورا نے مجھے ٹھوکے مارنے شروع کردیئے۔ میں انہیں کیا بتاتا لیکن ادھر ادھر کے حیلوں سے ان کی تشفی نہ ہوتی۔ میں نے مختصراً اصل بات بتادی۔ دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ انہیں مجھ پر اپنے آپ سے زیادہ اعتبار تھا۔

آدھ گھنٹے کے اندر اندر ہم ہوٹل واپس پہنچ گئے۔ کس کو بھوک نہیں تھی لیکن یوں کرسیاں توڑ کے ہوٹل سے اٹھ جانا وضع کے خلاف تھا۔ بیرے سے صرف چائے لانے کو کہا گیا تھا۔ وہ کیک پیسٹریاں، نمکین بسکٹ اور سموسے بھی لے لایا۔ چائے ختم کرتے ہی ہم باہر نکل آئے۔

جمرو کی معلومات کے مطابق ساڑھے دس بجے کے قریب کوئی گاڑی فیض آباد کی طرف جاتی تھی۔ جمرو کی رائے تھی کہ کیوں نہ رات لکھنؤ میں گزاریں۔ صبح نو بجے کی گاڑی سے پہنچنے میں ڈھائی تین بج سکتے ہیں۔ اس وقت حویلی کے مکینوں کو بے آرام کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ بٹھل تذبذب میں پڑگیا تھا۔ رات کسی ہوٹل میں گزارنی پڑتی۔ مراد کے مسافر خانے کی بات اور تھی۔ ہوٹل کے کمرے میں سلمٰی کا ٹھہرنا اچھا نہیں لگتا تھا شاید اسی لئے بٹھل نے جمرو کا مشورہ مسترد کردیا۔ گاڑی کی روانگی میں خاصا وقت تھا۔ سلمٰی نے تانگے والے کو روک کے رکھا تھا۔ اس دوران ہم شہر کی کچھ اور جھلک دکھا سکتے تھے۔ گومتی پر جانے کا وقت نہیں تھا۔ بٹھل نے کوچوان کو سیدھے اسٹیشن چلنے کا حکم صادر کردیا۔

ابھی اسٹیشن دور تھا کہ تانگے کو رک جانا پڑا۔ رستہ بند تھا۔ بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ شور غل بھی بہت تھا۔

زورا حادثے کی نوعیت جاننے کے لئے تانگے سے اترنا چاہتے تھے، بٹھل نے روک دیا۔ اتنی دیر میں ہمارے پیچھے بھی مختلف گاڑیاں کھڑی ہوگئی تھیں۔ واپسی کا راستہ بند ہوگیا تھا۔ سپاہی بھی اڈتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے تھے اور سیٹیاں بجنے لگی تھیں۔ سپاہیوں کی دخل اندازی سے بھگدڑ مچ گئی۔ جمرو کے پوچھنے پر انتشار کی حالت میں بھاگتے ہوئے ایک راہ گیر سے صرف اتنا معلوم ہوسکا کہ دو آدمیوں کو چھرا گھونپ دیا گیا ہے۔ تماشائیوں کو ہٹانے کے لئے پولیس کو لاٹھی چلانی پڑ گئی۔ اسی لمحے ایک شخص لوگوں کی بھیڑ کاٹتا، گرتا پڑتا ہمارے تانگے کے بائیں حصے سے ٹکرایا۔ وہ آگے جانا چاہتا تھا کہ اس کی نظر جمرو پر پڑ گئی اور اس نے سرخوشی کے عالم میں نعرہ بلند کیا۔ جمرو بھی اسے دیکھ کر چیخ پڑا "ارے آغا پیا!"

آغا پیا تانگے کی لگام تھام کے ٹھہر گیا "جمرو استاد! قسم اللہ کی، کیا دیکھ رہا ہوں" وہ دیوانہ واری سے بولا اور اس کی جھپکتی آنکھوں سے بٹھل بھی روپوش نہ رہ سکا۔ "بائیں استاد! استاد بٹھل اپنے آقا بھی ہیں غلام واری۔"

میں نے اسے پہلے بھی دیکھا تھا۔ پینتیس سے چالیس کے درمیان عمر، لمبے قد، چھریرے جسم اور سانولی رنگت کا آغا پیا کبن خاں کے اڈے کا خاص آدمی تھا۔ بازار کا علاقہ اس کے پاس تھا۔ چاقو پر اس کی گرفت کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ اس نے بٹھل کے پیر چھو کے ماتھے پر ہاتھ لگائے۔ "زہے نصیب، زہے نصیب، آج تو اس نگری کے دن پھر گئے۔"

"کیا ہے ہریالے بنے، بہت مستی میں دکھائی دیتا ہے" بٹھل نے تانگے میں بیٹھے بیٹھے صدا لگائی۔

"مستی تو آقا، آپ کے دیدار سے ہوگئی۔ ہائے، کتنے دنوں بعد سرکار کو اس گاؤں کا خیال آیا۔ کبن خاں کیا گئے، آقا نے بھی لکھنؤ سے کنارہ کرلیا" آغا پیا ہاتھ لہرا کے بولا۔

"اب کون ہے رے ادھر؟" بٹھل نے بلند آواز سے پوچھا۔

"کون ہوتا عالم پناہ! کبن خاں کے جانے کے بعد سب لٹ لٹا گیا، وہی اپنے استاد، خدا عمر اور دراز کرے اور بلاؤں سے محفوظ رکھے، وہی شمشاد استاد ذرا اڈے کا بھرم رکھے ہوئے ہیں۔"

استاد شمشاد خاں، کبن خاں کا استاد تھا۔ کبن خاں کے رخصت ہوجانے کے بعد اسے مجبوراً اڈے کی چوکی پر بیٹھنا پڑا، ورنہ وہ کب کا گوشہ نشین ہوچکا تھا۔

"ابھی تک وہی گدھ چلا رہا ہے" بٹھل نے تعجب سے کہا "اب تو دن بہت ہوگئے۔"

"اس انوکھے لاڈلے بنے خاں کی نوک پلک سنوار رہے ہیں۔ کاٹا، چھانٹی پوری نہیں ہوپاتی۔ کہنے کو بنے خاں ہی اڈے کے بادشاہ سلامت ہیں مگر بس دیکھنے کے۔ کبن خاں جانی کا رنگ جمانے کو بہت نرت بھاؤ دکھانا پڑے گا۔ یہ لکھنؤ ہے، یہاں ایک سے ایک سورما خاندانی پڑا ہوا ہے۔ میں تو کہتا ہوں، کچھ دن کے لئے آقا ہی راج سنگھاسن پر بیٹھ جاتے تو سارے دلدر دور ہوجاتے۔ کلف لگے کپڑوں سے تو اڈا نہیں چلتا" آغا پیا کی آواز شور میں دب جاتی تھی۔ بٹھل کا تیور دیکھ کر جمرو نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا کہ سردست استاد شمشاد خاں کے پاس حاضری ممکن نہیں، ہمیں جلد سے جلد فیض آباد پہنچنا ہے۔ وہ تو گاڑی بدلنے میں کچھ وقت تھا اور لکھنؤ میں کچھ ضروری کام بھی تھا ورنہ شہر کی طرف آتے ہی نہیں۔ استاد شمشاد خاں کو سلام کہنا اور کہنا کہ شاید لکھنؤ جلد ہی آنا ہو۔

"واہ سرکار!" آغا پیا شکایتی لہجے میں بولا "استاد کو خبر ہوگئی تو کیسے حیران و پریشان ہوں گے کہ اپنے دلدار اتنے قریب آکے ملے بغیر چلے گئے۔"

"آئیں گے رے جلدی۔ کوئی مجبوری ہے۔ جیسا استاد جمرو نے بولا ہے، ایسا ہی استاد شمشاد کو جاکے بول دینا" بٹھل نے الجھ کے کہا۔

"جان کی امان پاؤں تو زبان کھولوں" آغا پیا ہاتھ جوڑ کے بولا "استاد شمشاد کو بہت ملال ہوگا، کمر میں بل آجائے گا۔"

پیچھے کی گاڑیوں نے واپس ہونا شروع کردیا تھا اس لئے کچھ گنجائش ہوگئی اور ہمارے تانگے کو بھی واپس ہونے کی جگہ مل گئی۔ جمرو اور زوار تانگے سے اتر گئے تھے۔ آغا پیا دور تک ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ پولیس کی نفری میں اضافہ ہوگیا تھا۔ آغا پیا کی زبانی معلوم ہوا کہ بازار میں ان دنوں کسی چاندنی بانو نامی دوشیزہ کا طوطی بولتا ہے۔ حسن و جمال میں یکتا، رقص کے فن میں بے مثل ہے۔ آواز بھی خوب پائی ہے۔ خاں پور کا کوئی سرکش نوجوان جنون کی حد تک چاندنی بانو کا طلب گار تھا اور ساری آبائی دولت اپنے مقصود پر نچھاور کرچکا تھا۔ چاندنی بانو کی نگراں تارا بیگم نے نوجوان سے ساری شرطیں پوری کرالینے کے باوجود وعدہ وفا نہیں کیا اور مزید ستم یہ کیا کہ بالا خانے پر کرائے کے ایک شورہ پشت، بازار کے معاملات کے مشاق اور ایسی صورتحال سے نمٹنے کے ماہر ہیرا لال سے مدد چاہی۔ ہیرا لال، چاندنی بانو اور

نوجوان کے درمیان دیوار بن گیا اور اس نے بھرے بازار میں نوجوان کو ذلیل و خوار کیا۔ نوجوان بہت دنوں سے ہیرا لال کی تاک میں تھا۔ وہ اڈے پر استاد شمشاد خاں کے پاس بھی دہائیاں دیتا ہوا آیا تھا۔ شمشاد خاں نے بازار کے معاملات میں اس قسم کی مداخلت سے صاف انکار کردیا تھا۔ آج نوجوان اور ہیرا لال کی مڈبھیڑ ہوگئی اور نوجوان نے بے دریغ ہیرا لال کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا۔ زخمی ہیرا لال بھی نہتا نہیں تھا۔ لڑکھڑاتے' ڈگمگاتے ہوئے اسے چاقو نکالنے اور نوجوان پر اوچھا ترچھا وار کرنے کا موقع مل گیا۔ دونوں خون میں لت پت ہوکے بے ہوش ہوگئے۔ وہی پرانی کہانی تھی۔ آغا پیا اتنا ہی جان سکا تھا کہ پولیس آگئی اور اس نے واردات کی جگہ سے بھاگ نکلنے میں عافیت جانی۔

بہت وعدے وعید اور اصرار و تکرار کے بعد آغا پیا ہم سے جدا ہوا۔ اسٹیشن پہنچ کے معلوم ہوا کہ گاڑی کی روانگی میں ابھی سوا گھنٹا باقی ہے۔ جمرو ٹکٹ خریدنے چلا گیا۔ ہم چاروں انتظار گاہ میں آگئے۔ منہ ہاتھ دھونے اور چائے پی کے تازہ دم ہونے میں آدھ گھنٹے کے قریب وقت چپکے سے نکل گیا۔ آغا پیا نے پانوں کا بڑا ساتھ کردیا تھا۔ بہت خوشبودار پان تھے۔ جمرو بھی واپس آگیا تھا۔ اپنے بڑے بھائی جامو کے کلکتے چلے جانے کے بعد جمرو ہی فیض آباد کے اڈے کا نگراں تھا۔ دونوں بھائی چاقو کے ہنر میں طاق تھے۔ لکھنؤ میں بھی ان کا شہرہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آغا پیا جمرو کو دیکھ کر مچلنے' پھڑکنے لگا تھا۔ میرے اور بٹھل کے ساتھ جمرو نے اپنے روز و شب کا بہت خون کیا تھا۔ کوئی کب تک کسی کے لیے اتنا وقت نثار کرسکتا ہے جہاں اس کی پذیرائی ہوتی ہو' جہاں لوگ اس کی آہٹیں پہچانتے ہوں۔ حلقہ بھی گھر کے مانند ہوتا ہے' بار بار نہیں بنایا جاسکتا۔ جمرو تو فیض آباد کے اڈے کا حاکم تھا۔ گھر جانے' اپنے ٹھکانے پر واپس جانے کی ایک اضطراری مسرت اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ اس کی رفتار و گفتار میں عجب بے تابی سی نظر آتی تھی۔

گاڑی کی روانگی میں پندرہ منٹ یا بیس منٹ رہ گئے تھے کہ بٹھل نے اٹھ جانے کا اعلان کیا۔ قلی نے سامان اٹھالیا تھا۔ سلمیٰ بھی برقع اوڑھ کے تیار ہوگئی تھی۔ ہم باہر نکلا ہی چاہتے تھے کہ اچانک دروازے پر شور ہوا اور اسی لمحے دروازہ کھول کے کئی آدمی اندر در آئے۔ سب سے آگے استاد شمشاد خاں تھا۔ بھرا ہوا جسم' میانہ قد' چمکتی ہوئی گندم گوں رنگت' چکن کے سفید کرتے اور پاجامے پر بھورے رنگ کی واسکٹ' سر پر دپلیا' ایک ہاتھ میں چاندی کا کڑا' گلے میں مختلف پتھروں کی مالا' کانوں میں سنہری دریا۔ اس سن رسیدگی میں جوانوں کی سی آن بان تھی۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں جیسے قمقمے روشن تھے "بٹھل بھائی! بٹھل بھائی!" وہ سر جھٹکتے اور ہاتھ پھیلائے ہوئے آیا اور بٹھل سے لپٹ گیا "اب آخری وقت میں یہ دن بھی دیکھنا ہوگا۔ یہ انصاف نہیں ہے۔" وہ بٹھل کو جھنجوڑتے ہوئے بولا "بھلا دیا اپنے دیوانے کو۔"

بٹھل نے بھی اسے جکڑلیا۔ "آغا پیا نے چھنال پنا کیا نا' سارا بول دیا تھا اٹھائی گیرے کو۔" بٹھل نے شمشاد خاں کی پیشانی چومتے ہوئے کہا "کیوں چلے آئے تم؟"

"کیسے نئیں آتا۔ لکھنؤ میں استاد بٹھل آئے اور شمشاد خاں چوکی پر اینڈتا رہے۔ یا تو سور کی اولاد چاندی کے پورے سو کا حق دار ہے۔"

"کیا بولیں شمشاد خاں! ضرور آتے پر..." بٹھل نے سلمیٰ کی جانب دیکھتے ہوئے آہستگی سے کہا "بٹیا سر آنکھوں پہ۔" شمشاد خاں سینے پر ہاتھ مار کے بولا "بیٹا شمشاد خاں نئیں ہے کیا؟"

"بہت چکر کاٹ کے آرہے ہیں سجنا!" بٹھل نے بوجھل آواز میں کہا۔

"پر گھر آرہے ہو۔ لکھنؤ میں شمشاد خاں زندہ ہے بھیا صاحب' مرا نئیں ہے۔ اپنے کو تو ایسے ہی تمہارا انتظار تھا۔" شمشاد خاں نے اپنے ساتھ آنے والے اڈے کے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ سامان اٹھا کے تانگے میں رکھیں۔ بٹھل کا ہاتھ پکڑ کے شمشاد خاں انتظار گاہ سے باہر آگیا۔ بٹھل نے اسے سمجھانا چاہا' وہ جلد ہی دوبارہ لکھنؤ آنے کا وعدہ کرتا رہا مگر شمشاد خاں نے ایک نہ سنی۔ اس کی چتون سے اندازہ ہوگیا تھا کہ کچھ کہنا سننا لاحاصل ہے۔ کسی کو بھی اتنے اصرار کے بعد انکار کی مجال نہ ہوتی۔

اڈے سے کچھ فاصلے پر شمشاد خاں کے رشتے کے بھائی عزیز خاں کا گھر تھا۔ اڈے جانے سے پہلے شمشاد خاں نے سلمیٰ کو وہاں پہنچایا اور بھائی کو تاکید کی کہ زنان خانے میں سلمیٰ سے شہ زادیوں کا سلوک کیا جائے' شمشاد خاں نے محض اس تاکید و انتباہ پر اکتفا نہیں کی' زنان خانے تک سلمیٰ کو خود پہنچا کے آیا۔

ہم اڈے آگئے۔ یہ پرانی طرز کی ایک کشادہ عمارت تھی۔ اتنی بڑی بھی نہیں مگر صاف ستھری تھی۔ در و دیوار پر حال ہی میں روغن کیا گیا تھا۔ دالان میں دیوار کے ساتھ تخت رکھا تھا۔ صحن اور دالان میں تخت کے آس پاس چاندنیاں بچھی ہوئی تھیں۔ تخت کے وسط میں بٹھل کو بٹھایا گیا۔ پہلے

سے خاصے لوگ موجود تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی تعداد بڑھتی گئی۔ جو آتا' پہلے بٹھل کو پھر شمشاد خاں کو سلام کرتا۔ کوئی بٹھل کے پیر چھوتا' کوئی ہاتھ چومتا' آغا پیا بھی نظریں جھکائے ہاتھ باندھے' بٹھل کے سامنے آکھڑا ہوا۔ بٹھل مسکرانے کے سوا کیا کرسکتا تھا۔ آغا موتیا کے ہار لایا تھا۔ سب کے گلوں میں اس نے ہار ڈالے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دالان اور صحن بھر گئے۔ دالان میں ستون کے ساتھ ساوا... اور چائے کی پیالیاں رکھ دی گئی تھیں۔ بٹھل کے لیے بہ طور خاص قلعی کی ہوئی فرشی' منقش نیچے اور چلم اور زر تار سنک کے حقے کا بھی بندوبست کردیا گیا تھا۔ بہت سے لوگ کسی نہ کسی کام میں مصروف تھے اور شمشاد خاں کے احکام ختم نہیں ہوپاتے تھے پھر کہیں سے کبن خاں کا جانشین جواں سال بنے خاں بھی آگیا۔ نکلتا ہوا قد' بادامی رنگت' کانوں میں مختصر سی سنہری بالی' ہاتھوں میں کڑا' سفید براق لباس اور کالی واسکٹ۔ وہ ایک جامہ زیب نوجوان تھا۔ اڈے کا آدمی معلوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ بنے خاں نے جھک کے سلام کیا' بٹھل کے پیر چھوئے' ہاتھ کو بوسہ دیا۔ بٹھل نے اسے پاس ہی بٹھالیا۔ تھوڑی دیر میں دسترخوان سجادیے گئے۔ جانے کس طرح اتنی جلدی اتنے لوگوں کے لیے انہوں نے کھانے کا انتظام کردیا تھا۔ بریانی' ہلکے شوربے کا سالن' لوکی کا رائتہ اور چپاتیاں۔ شمشاد خاں نے اسٹیشن جانے سے پہلے ہی کھانے کی تیاری کا حکم دے دیا ہوگا۔ اسے یقین تھا کہ وہ ہمیں اڈے سے لے کر ہی آئے گا ورنہ اتنے کم وقت میں تو یہ اہتمام ممکن نہیں تھا۔ کھانا ختم ہوتے ہوتے بارہ بج گئے اور پھر جیسے ہی دسترخوان اٹھائے گئے' صحن کے کسی گوشے سے یکایک زرق برق لباسوں میں ملبوس' سولہ سنگھار کیے ہوئے بھنڈیلے سازوسامان کے ساتھ نکل آئے۔ ان میں اور ناچنے گانے والی عورتوں میں کوئی فرق تھا تو مبالغہ آمیز ناز و ادا کا۔ پہلی نظر میں تو کوئی بھی دھوکا کھا سکتا تھا۔ انہیں اپنے درمیان دیکھ کے بام و در شور سے گونجنے لگا۔ مستانہ وار صدائیں' سیٹیاں اور آہیں۔ تخت کے سامنے آکے پہلے انہوں نے کورنش بجالانے کے انداز میں تعظیم پیش کی۔ بٹھل نے جیب میں ہاتھ ڈال کے انہیں کچھ نقدی نذر کی پھر وہ بنے خاں کے سامنے اڑ گئے۔ ایک شوخ بھانڈ نے گھونگٹ نکال کے ورمالا کی طرح گیندے کا ہار بنے خاں کی گردن میں ڈال دیا۔ ایک نے بڑھ کے بدن لچکاتے ہوئے بلائیں لیں۔ جب تک بنے خاں نے ان کی حسبِ دل خاطر خواہ نذر نہیں گزاردی' وہ وہیں کھڑے اٹکھیلیاں کرتے رہے۔ ان میں ایک سے بڑھ کے ایک تھا۔ سر تال کے پکے تھے' رقص کا اچھا ملکہ تھا' نقال بھی کمال کے تھے۔ ان کی عشوہ طرازیاں' ناز نخرے' چٹک مٹک اور ٹھمکوں نے سب ہی کو ہنساتے ہنساتے لوٹ پوٹ کردیا۔ ڈیڑھ بجے کے قریب جب محفل شباب پر تھی' شمشاد خاں نے ہاتھ اٹھا کے انہیں روک دیا۔

اڈے پر چند ہی آدمی رہ گئے۔ بٹھل' شمشاد خاں کے پاس بیٹھا۔ مجھے زورا اور جمرو کو بنے خاں پہلی منزل کے گنبد جیسے ایک کمرے میں لے آیا۔ کمرا سجا ہوا تھا۔ صاف بستروں کے علاوہ ضرورت کی ہر چیز وہاں موجود تھی۔ بٹھل کے لیے کسی اور جگہ انتظام کیا گیا تھا۔ آدھی رات تو ایسے ہی گزر گئی تھی۔ صبح کی گاڑی سے روانگی کا اب کوئی امکان نہیں رہا تھا۔ نیند کے لیے فراغت بھی شرط ہے' فراغت کے لئے بے حسی۔ بے حسی جبری بھی تو ہوتی ہے۔ ہم تینوں کو جلد ہی نیند نے آلیا۔

صبح ناشتے کے بعد اڈے کے آدمیوں کے سامنے شمشاد خاں نے بلند آواز میں اعلان کیا کہ وہ اڈے پر تادیر بیٹھنا نہیں چاہتا' اسے اب آزاد کیا جائے۔ بنے خاں کی رگوں میں تازہ خوں رواں ہے' حوصلہ مند' جز بیں اور معاملہ فہم ہے۔ جہاں تک بن پڑا ہے' بنے خاں کی تربیت دل و جاں سے کی گئی ہے' شاید اب کوئی کسر نہیں رہ گئی۔ باقی تجربہ خود سب سے بڑا معلم ہے۔ شمشاد خاں نے کہا' آرزو تھی کہ کبن خاں مرحوم کے جانشین بنے خاں کی چوکی پر بٹھانے کی رسم ادائی کے موقع پر استاد بٹھل بھی موجود ہو۔ کل جمعے کا دن ہے۔ اس دن کی ریت ہے' استاد بٹھل سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ کل اپنے ہاتھوں سے' بنے خاں کو اڈا سپرد کرنے کی رسم ادا کرے۔

چاروں طرف سے مسرت کے اظہار میں اٹھنے والے نعرے بنے خاں کی ہر دل عزیزی کے غماز تھے۔ گویا اب کل تک بھی فیض آباد روانہ ہونے کی صورت نہیں تھی۔

اڈے سے اٹھ کے ہم سلمیٰ کی خیر خبر لینے شمشاد خاں کے بھائی کے گھر چلے آئے۔ رہبری کے لیے شمشاد خاں نے ایک آدمی ہمارے ساتھ کردیا تھا۔ مراد آباد کے مسافر خانے میں قیام کے دوران میں سلمیٰ کو جمرو اور زورا سے مانوس ہوجانا چاہیے تھا۔ انہیں دیکھ کے اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ سلمیٰ نے بتایا کہ میزبانوں نے تو حد کردی۔ اس قدر تکلف اور تواضع کہ گھبراہٹ ہونے لگی ہے۔ میزبان خواتین کے ساتھ سلمیٰ لکھنؤ کے خاص مقامات اور بازاروں کی سیر کے لیے جانے والی تھی۔ وہ حیدر آباد کے محل دو محلوں کے آداب

سے واقف تھی سوائے لکھنؤ کے۔ اوسط درجے کے ایک خاندان کے سامنے نشست وبرخاست میں دشواری پیش نہیں آرہی ہوگی۔ سائبان' ریشم' پھول' چند نرم ولطیف لفظ اور ایک نگاہ لطف بھی آدمی کے لیے غذا کے مانند ہیں۔ زندگی بڑھتی نہیں تو آسان ضرور ہوجاتی ہے۔ جمرو اور زورا نے خدا حافظ کہتے ہوئے سلمٰی کے سر پر ہاتھ رکھا تو اس کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔

بٹھل کو بتا کے ہم تینوں اڈے سے نکل گئے اور حضرت شاہ میناؒ کے مزار' بھول بھلیاں اور چھتر منزل ہوتے ہوئے دریائے گومتی کی طرف چلے آئے۔ دوپہر کا کھانا بھی ہم نے امین آباد کے ایک معمولی ہوٹل میں کھایا۔ کھانا البتہ معمولی نہیں تھا۔ کبھی پیدل' کبھی تانگے پر بے سروپا گھومتے گھامتے شام کو جمرو پھر مجھے ڈاکٹر سری واستو کے مطب میں لے آیا۔ مجھے اب ایسی کوئی تکلیف نہیں تھی تاہم جمرو کی خواہش پر ڈاکٹر نے پٹی کی تجدید کردی۔ سورج ڈوبتے وقت کہیں ہماری واپسی ممکن ہوسکی۔

○☆○

اڈے پر گزشتہ رات سے زیادہ گہما گہمی تھی۔ فرش دھویا جارہا تھا' جھنڈیاں لگائی جارہی تھیں۔ دیواروں' منڈیروں اور طاقوں پر ترتیب سے چراغ رکھے جارہے تھے۔ گلی میں صدقے کے لیے بندھے ہوئے کالے بکرے شور مچارہے تھے۔ رات کے کھانے پر بھی کچھ کم اہتمام نہیں تھا۔

شمشاد خاں کے مشورے پر رات کے کھانے سے پہلے ہم نے کپڑے بدل لیے تھے۔ جمرو کا خیال تھا کہ آج مجرے کی محفل ضرور آراستہ کی جائے گی لیکن کھانا ختم ہوتے ہی شمشاد خاں چوکی سے اٹھ گیا۔ باہر تانگے تیار کھڑے تھے۔ کچھ ہی دور جاکے ہمیں شمشاد خاں کے ارادے کا اندازہ ہوگیا۔ بازار کے سرے پر سب تانگوں سے اتر گئے۔

بازار میں دنیا ہی دوسری تھی' کسی میلے کا سا منظر۔ روشنی' پھول' رنگ برنگے زرق برق ملبوسات' جھروکوں' جالیوں' دروازوں اور چلمنوں سے تانیں اٹھ رہی تھیں۔ ہوا میں جیسے راگ گھلے ہوئے ہوں۔ یوں بھی شمشاد خاں کی آمد سے بازار میں ہلچل سی مچ گئی تھی۔ کسی طرف سے گجرے' کسی جانب سے عطر کی پھریریوں کی نذر' کوئی گلوریاں طشتری میں لیے لپکا چلا آرہا ہے۔ کشمیری چائے کے کسی خاص دکان دار نے شمشاد خاں سے کچھ دیر ٹھہر جانے کی التجا کی۔ شمشاد خاں سلام کا جواب دیتا' سنی ان سنی کرتا اور لوگوں سے سرسری طور پر حال احوال پوچھتا ہوا تیز قدموں سے بڑھتا رہا اور بازار کے وسط میں واقع ایک منزلہ عمارت کے سامنے آکے ٹھہر گیا۔ بنے خاں نے کہنی مار کے سرگوشی میں جمرو کو بتایا کہ یہ چاندنی کا بالا خانہ ہے۔ آج کل اسی کی حکومت ہے۔" ایمان سے جمرو استاد! نظارے کی چیز ہے۔" بنے خاں کی آواز بھڑک رہی تھی' بہک رہی تھی۔

"مطلب ہے' زیادہ دنوں کی بات نہیں ہے بنے میاں۔" جمرو نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"کیوں جمرو بھائی؟" بنے خاں پلکیں جھپکانے لگا۔

"یہ راج پاٹ زیادہ راس نہیں آتا تارا بیگم کو۔ اس کا پنجرہ جلدی خالی ہوجاتا ہے۔"

"اب کے باہر سے نہیں' تارا بیگم کی اپنی بنائی سنواری بلبل ہے۔ تارا بیگم نے چپکے چپکے پروان چڑھایا ہے اور سنا ہے' خوب مانجھ کے ایک دم سے محفل میں اتارا ہے۔ پورے لکھنؤ میں دھوم ہے۔"

"تارا بیگم کی اپنی بیٹی ہے کیا؟"

"یہی سمجھ لو' بچپن سے اسی کے پاس ہے۔ بیٹی ہی کہتی ہے' جھوٹ سچ خدا جانے۔"

بالائی منزل کے ریشمی پردوں میں سرسراہٹ ہوئی اور کسی نے جھانک کے دیکھا۔ شمشاد خاں نے اڈے کا ایک آدمی اپنی آمد کی اطلاع دینے اوپر بھیج دیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے دو سازندے' ایک تنومند شخص کے ساتھ نیچے آگئے۔ انہی کے جلو میں ہم نے سیڑھیوں پر قدم رکھا۔ اوپر دروازے پر گوٹا کناری' ٹکے غرارے' جمپر اور گلابی دوپٹے میں لپٹی' زیورات سے لدی پھندی' ایک ادھیڑ عمر خوش جمال عورت ہمارے استقبال کے لیے مضطرب کھڑی تھی۔ یہ تارا بیگم ہی ہوسکتی تھی۔ زیادہ وقت نہیں گزرا ہوگا' وہ خود بھی بازار کی منتخب عورتوں میں سے ایک ہوگی۔ سرخم کرکے اس نے شمشاد خاں کو اور ہم سب کو باری باری آداب کیا اور کھنکتی آواز میں بولی "بندی تو سمجھ رہی تھی' اب کیا آنا ہوگا' اب تو شاید قاصد ہی آئے۔"

"بس کیا بتائیں ملکہ عالم' نکلتے نکلتے دیر ہوگئی۔" شمشاد خاں نے لہک کے کہا۔

"خاں صاحب کو معلوم ہوگا کہ بندی جمعرات کو محفل نہیں سجاتی۔ کبھی کبھار ہی ایسا ہوا کہ جمعرات کو۔۔۔"

"اپنے کو معلوم ہے۔" شمشاد خاں نے اس کی بات کاٹ کے کہا "کیا کریں' ادھر کلکتے کے بادشاہ' اپنے جان جگر استاد' بٹھل کو واپس جانے کی جلدی ہے۔"

"اخاہ! آپ ہی ہیں استاد بٹھل!" تارا بیگم چہکتی آواز اور چمکتی آنکھوں سے بولی "بہت نام سنا تھا سرکار کا' آج دیدار بھی ہوگئے۔" تارا بیگم نے شائستگی سے بٹھل کو دوبارہ آداب کیا اور ٹھنک کے بولی "زہے نصیب' بندی کے بخت جاگے' استاد بٹھل نے غریب خانے کا رخ کیا۔ کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں۔"

بٹھل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک لہر آکے گزر گئی۔

"بندی ضرور حاضر ہوتی خاں صاحب!" تارا بیگم معذرت خواہانہ لہجے میں بولی "لیکن خدا گواہ ہے' کسی سے پوچھ لیجئے' زمانہ ہوگیا' بندی نے باہر کی محفل آرائی کا سلسلہ ترک کیا ہوا ہے۔ پچھلے دنوں نواب صاحب منور عباس کے یہاں کوئی بڑا فرنگی افسر آیا تھا۔ نواب صاحب سے برسوں کے مراسم ہیں' بہت خیال کرتے ہیں ناچیز کا۔ بندی نے دست بستہ معافی مانگ لی۔ نواب صاحب کی عالی ظرفی ہے' نہ صرف بندی کی التجا قبول کی بلکہ فرنگی افسر کے ساتھ بہ نفس نفیس تشریف لائے۔ انہوں نے کم ترین کا مان رکھا' بڑی عزت دی۔"

"اپنے کو کوئی گلہ نہیں ہے تارا بیگم۔" شمشاد خاں نے بے پروائی سے کہا "بہت چرچا ہوا تھا تمہارے انکار کا' ہم نے بھی سنا تھا۔"

"لوگوں نے بتنگڑ بنادیا' بات ذرا سی تھی۔"

"پر نواب صاحب کی بات اور ہے' ہم تو فقیر لوگ ہیں۔"

"سبحان اللہ۔" تارا بیگم کھل کھلا پڑی۔ "پھر ہم لوگ کہاں جائیں گے' معلوم ہوتا ہے' آپ پر تو وقت ہی نہیں گزرا۔ وہی سج دھج' وہی آن بان' کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ ماشاء اللہ وہی شوخی اور زندہ دلی ہے۔"

"اور تمہارا اپنے لیے کیا خیال ہے؟" شمشاد خاں نے شگفتگی سے کہا "وقت کو تو جی تم نے پنجے میں دبا رکھا ہے۔"

تارا بیگم کے رخساروں پر لالی دوڑ گئی "اب کیا رکھا ہے خاں صاحب! داستان ختم ہوئی۔ بس آپ کا حسن نظر ہے۔"

"اپنے پاس تو نظر ہے' باقی تو سارا تمہارے پاس ہے۔"

"کیا خوب! ذرہ نوازی ہے آپ کی۔ اس دل جوئی سے جی کو بہت دلاسا ہوتا ہے لیکن۔" وہ بل کھا کے بولی "وقت کتنی رعایت دیتا ہے۔"

ہم ایک مختصر آراستہ وپیراستہ ڈیوڑھی جیسی گزرگاہ میں کھڑے تھے۔ شمشاد خاں کے ٹوکنے پر تارا بیگم پشیمان ہوگئی۔ اس نے آگے بڑھ کے اور ہاتھ پھیلا کے ہمیں اندر آنے کی دعوت دی۔ ہم ہال کی طرز کے جگمگاتے ہوئے ایک کشادہ بیضوی کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرے کے تین اطراف محرابیں بنی تھیں اور درمیان میں ریشمی پردے سرسرا رہے تھے۔ محرابوں کے پار ایک طرف بڑی شہ نشین' دوسری جانب کچھ فاصلے پر بے شمار طاقوں سے مزین درودیوار۔ دیوار میں قریب قریب' متعدد کمروں کے منقش دروازے نظر آرہے تھے۔ چھت' ستون اور دیواروں پر پچی کاری بہت مہارت سے کی گئی تھی۔ رنگ برنگے نقش ونگار میں جڑے ہوئے شیشے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے کسی شیش محل کا گمان ہوتا تھا۔ چھت کے وسط میں ایک بڑے فانوس کے علاوہ جا بہ جا چھوٹے فانوس روشن تھے۔ ساری تزئین وآرائش شاہانہ تھی۔ نواب' راجے ہی یہاں آتے ہوں گے۔ بٹھل اور شمشاد خاں سازندوں کے مقابل کی نشست پر پہلو بہ پہلو بیٹھ گئے۔ میں' زورا اور جمرو بنے خاں اور اڈے کے تین آدمی ان کے دائیں بائیں۔ کوئی سازندہ مدھم سروں میں ستار سے چھیڑ خانی کررہا تھا۔ خاص دان اور پیچوان تیار تھے۔ سازندوں نے کچھ ہی دیر میں ساز سنبھال لیے۔ تارا بیگم مہمانوں کے انداز میں بٹھل اور شمشاد خاں کے قریب بیٹھ گئی۔

یکایک بائیں جانب سے تسلیمات کرتی' چھم چھم کرتی ہوئی تیکھے خال وخد' گندمی رنگت کی ایک نوجوان' دل کش لڑکی نے آکے سازوں پر رقص شروع کردیا۔

"یہ' یہی چاندنی ہے کیا؟ کل اسی پر خون ہوا تھا؟" جمرو نے بے تابی سے پوچھا۔

"نہیں جمرو بھائی!" بنے خاں نے زیرلبی سے کہا "یہ تو اس کی چھوٹ بھی نہیں ہے۔ یہ تو ذرا محفل گرمانے کا چونچلا ہے۔"

"پر یہ بھی بہت پٹاخا ہے بنے میاں۔"

"بھول گئے' تارا بیگم کا بالا خانہ ہے۔ کوئی ایسی ویسی تو یہاں ٹھہر بھی نہیں سکتی۔ تصویر کی طرح بناتی ہے تارا۔ ایک نمبر کی پارکھ ہے۔"

لڑکی نے اپنا سراپا سازوں سے ہم آہنگ کرنے کی اچھی مشق کی تھی۔ رفتہ رفتہ جیسے اس کے پاؤں' اس کے ہاتھ' اس کا سارا بدن ہی سازوں کے اشارے کا معمول بن گیا۔ وہ سازوں کا کوئی حصہ بن گئی یا ساز اس کے سراپا میں مدغم ہوگئے۔ سب گم صم سے تھے۔ لڑکی کو آئے کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ تارا بیگم نے ہاتھ اٹھادیا۔ لڑکی نے نہیں دیکھا لیکن سازندوں نے ساز مدھم کردیے تھے اور طبلہ نواز

نے طبلے سے ہاتھ اٹھالیے تھے۔ لڑکی کے پیروں میں بھی پھر کوئی زنجیر سی پڑگئی۔

"کیا غضب کردیا' کیوں روک دیا؟" شمشاد خاں نے ہیجانی لہجے میں کہا۔

"جلدی بہکنے لگتی ہے۔" تارا بیگم اٹھلا کے بولی "ابھی نو آموز ہے۔"

"کس سے سکھوا رہی ہو؟" شمشاد خاں نے اشتیاق سے پوچھا "کوئی بڑا گنی لگتا ہے۔"

"شکر ہے' بارِ خاطر نہ ہوا۔ بندی تو ڈر رہی تھی۔" تارا بیگم مسکرا کے بولی "برووں ان کے گرودیو جوشی بابو کا نام شاید سنا ہو' وہ تو اب چار دیواری سے باہر نہیں نکلتے۔ کچھ عرصے کے لیے ان کے پاس بھیجا تھا' بڑی منت کی تھی' تب مانے' وہاں جاکے یہ دیوانی ہوگئی' نگلی۔"

"لگتا ہے' نرت کے لیے بنی ہے۔"

"ابھی کیا دیکھا ہے آپ نے' غضب ڈھانے والی تو اب آیا چاہتی ہے۔"

"اسی کے لیے تو اپنے بٹھل بھائی کو کھینچ کے لائے ہیں۔"

"استاد تو زمانہ دیکھے ہوئے ہیں۔ ان کے سامنے اسے حاضر کرتے ہوئے سچ پوچھئے تو دل دھڑکتا ہے۔ خدا لاج رکھے' میری التجا ہے' کوئی کوتاہی ہو تو بچی سمجھ کے درگزر کردیجئے گا۔ ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں اسے محفل میں آئے۔"

"پر دیر کیا ہے تارا بیگم' جلوہ کراؤ۔"

"کیا خاں صاحب' اب ایسی بھی کیا بے صبری۔ ذرا دم لیجئے' کچھ چائے وغیرہ نوش کیجئے۔ ایک زمانے بعد تو آپ نے غریب خانے کا رخ کیا ہے۔"

"وہ تو آنا بھی اپنے بھائی استاد بٹھل کی وجہ سے ہوگیا۔ کبن کے جانے کے بعد اب کہیں آنے جانے کو جی نہیں کرتا۔"

"آپ نے کبن خاں کا کیا ذکر چھیڑ دیا؟" تارا بیگم افسردگی سے بولی "آپ کے دکھ کا اندازہ ہے خاں صاحب! آپ ہی کا تراشا ہوا ہیرا تھا۔ یہاں سب ہی کو بہت قلق ہوا تھا۔ کسی کو یقین ہی نہیں آتا تھا۔ ایسا جوان جہان' کڑیل' دل والا آدمی' یہ عمر ایسی تو نہ تھی۔ کبھی کبھی یہاں آتے تھے اور کیا اعلیٰ ذوق پایا تھا' اتنے شعر یاد تھے کہ الاماں۔ ہر موقع پر ایک شعر حاضر' ہائے کیسا بانکا شخص تھا۔ ان جیسا شاید ہی لکھنؤ والوں کو کوئی ملے' آپ نے بہت اچھا کیا جو چوکی پر واپس آگئے۔"

"پر دل کا کیا کریں' نہیں لگتا تارا بیگم!"

"کیوں کر لگے گا مگر خاں صاحب' آپ چلے گئے تو جا[ئے] کیسی لوٹ مار مچے۔ جب تک کبن خاں کی جگہ لینے [کے] قابل کوئی نہ مل جائے' میری تو یہی بنتی ہے کہ آپ ہی بیٹھ[ے] رہیں۔"

"نہیں تارا بیگم! بنے خاں کو کل چوکی پر بٹھا رہے ہیں' بٹھل بھائی کو اسی لیے روکا ہے۔ بنے کو کبن بھی بہت سمجھ[تا] تھا۔ اپنا تو یہ آخری دن ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" تاراہ بیگم تعجب سے بولی۔

"تارا بیگم پلکیں پٹ پٹانے لگی اور اس کی منتشر نگاہ[یں] آخر بنے خاں پر آکے ٹھہر گئیں۔

"ارے واقعی! یہ تو سامنے ہی بیٹھے ہیں' کیسے الگ الگ۔ اب تو شاید اپنے ہوش و حواس بھی گئے۔ بندی۔ آپ کے اور استاد کے سوا کسی اور پر غور ہی نہیں کیا۔ [بنے] خاں کبن خاں مرحوم کے ساتھ کئی بار آچکے ہیں۔ ماشاء ا[للہ] اب تو کچھ اور ہی تیور ہیں۔ شہزادوں کی طرح۔"

جمرو نے بنے خاں کو کہنی ماری تو بنے خاں کا جسم اکڑ گیا۔ اتنی دیر میں دو کم سن لڑکیاں ہاتھوں میں طشت اٹھا[ئے] کمرے میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے ہمیں سلام کیا ا[ور] ہمارے سامنے طشت رکھ کے فوراً واپس چلی گئی۔ مٹھائیاں' خشک میوے' پھل' بھنا ہوا دھنیا' الائچی دانے اور نفیس کے برتنوں میں چائے۔

"یہ کیا' یہ کیا ہے؟" شمشاد خاں نے جھجکتے ہوئے بولا

"کچھ بھی نہیں' بندی تو کچھ کر ہی نہ سکی۔" ہر جمعرا[ت] کی شام زیارت کے لیے جاتی ہوں۔ برسوں کا معمول [ہے] آج وہاں کچھ دیر ہوگئی۔ مہلت ہی نہیں ملی کہ کسی اہتما[م] ادھر بانو کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ حکیم بھورے میاں یہاں آدمی بھیجا' انہی کی دوا بانو کے لیے شافی ہے۔ بڑی تھی' بندی نے کہا' بٹیا آج تو خود کو سنبھالے رکھنا ہے' خا[ص] مہمان آنے والے ہیں۔"

"اب کیسی ہے وہ؟" شمشاد خاں نے تشوش[یش سے] پوچھا۔

"اللہ کا کرم ہے' طبیعت بحال ہے۔"

"نہیں خاں صاحب! اتنا تو مجھے بھی خیال ہے۔"

"تمہیں نئیں ہوگا تو اور کس کو ہوگا۔"

"کیا بتاؤں کیسے کیسے جتن کیے' کتنی آرزوؤں' منـ[ـتوں] کے بعد یہ دن آئے ہیں کہ بانو کسی لائق ہوئی ہے۔ جی[...] سے بانو پر محنت کی ہے' اپنے اوپر بھی شاید اتنی نہیں کی۔ سا ایسا استاد ہے جس کے در پہ جاکے بھیک نہیں مانگی۔ کہاں کہاں نہ گئی۔ کوئی ایسے ہی تو نہیں بن جاتا صاحب!" تارا بیگم کی آواز بھرانے لگی۔

"ہاں تارا بیگم' بالکل آدھے آدھے کی بات ہے۔ آدھا اپنا بوتا' آدھا دوسروں کا۔ جتنا آدمی اپنے کام آتا ہے' اتنا دوسروں کی بھی اس کو ضرورت پڑتی ہے۔"

"بجا کہتے ہیں۔" تارا بیگم سہلا کے بولی "بے شک بانو میں خود بڑی صلاحیت تھی' میرا کام تو اجالنا' اجاگر کرنا ہی رہا ہے۔ میں ہر لڑکی کو بانو نہیں بنا سکتی اس لیے ہر لڑکی بانو نہیں ہوتی لیکن اب احساس ہوتا ہے' بانو کو اتنا وقت نہ دیتی' اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتی تو زیادہ اچھا ہوتا۔"

"کیوں تارا بیگم؟" شمشاد خاں نے الجھ کے کہا۔

"پچھتاوا کیسا؟ بانو تو اب تمہارے لیے حکومت ہے۔ تمہارے خرچ کیے ہوئے وقت کا ایک ایک پل اور لٹائے ہوئے پیسے کی ایک ایک پائی' ہزار کے حساب سے واپس آئے گی۔ دیکھنا' بانو لکشمی ثابت ہوگی۔"

"دولت' سکھ بھی تو ساتھ لائے۔"

"کیا' کیا مطلب' کوئی دکھ ہے تمہیں؟"

"نہیں' سب شکر ہے مولا کا۔"

"بولو' بولو تارا بیگم! کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں خاں صاحب!" تارا بیگم آہ بھر کے بولی "بس دعا کیجئے' خدا بانو کو سلامت رکھے' اسے بلاؤں سے محفوظ رکھے۔ وہی تو اب تعبیر' وہی تو اب ایک امید ہے۔ نہ بانو کسی کو بار بار ملتی ہے نہ زندگی اتنی۔" تارا بیگم جانے کیا کہنا چاہتی تھی کہ اس کی آواز حلق میں گھٹ گئی۔

"ہم کو بتاؤ تارا بیگم!" شمشاد خاں بے قرار ہوگیا۔

"کیا بتاؤں خاں صاحب!" تارا بیگم یاسیت سے بولی۔ اس نے سامنے رکھی ہوئی نوع بہ نوع چیزوں کی طرف ہماری توجہ مبذول کرانی چاہی اور طشتری اٹھاکے پہلے بٹھل کی طرف پھر شمشاد خاں کی طرف بڑھائی۔

"کوئی پریشانی ہے تارا بیگم؟ جی میں اٹکاؤ رہے گا۔" شمشاد خاں نے اصرار کیا۔

"بندی کو ڈر ہے' زبان بہک نہ جائے۔"

"نئیں نئیں' کھل کے بولو۔"

"آپ نے کل کی بابت کچھ نہیں سنا۔" تارا بیگم کی آواز میں شکوہ نمایاں تھا "ہم پر تو قیامت گزر گئی۔"

"کل کی بابت؟" شمشاد خاں سٹ پٹا کے بولا "اچ چھا' اچ چھا وہی کل جو چھرے نکل آئے تھے بیچ میدان میں۔ اسی کی طرف اشارہ ہے نا تمہارا؟"

"جینا اجیرن کردیا تھا اس مجنوں نے۔"

"یہ تو ہوتا رہتا ہے تارا بیگم! کوئی نئی بات تو نئیں ہے' سمجھو تو ایک دھوم مچ گئی ہے شہر میں چاندنی بانو کی۔"

"خاک! آپ اسے دھوم مچنا کہتے ہیں۔ اپنی تو جان پر بن گئی' کس عذاب میں وقت گزرا ہے' ہمی جانتے ہیں' ہر وقت ایک دھڑکا۔ در و دیوار سے خوف آنے لگا تھا' ایک تو بازار کے اپنوں میں بانو کی اٹھان سے کچھ کم سانپ نہیں لوٹے ہیں' ادھر یہ مجنوں' یہ فرہاد' کتنے خانوں میں چھپائے رکھوں یہ بلا۔ جب سے محفل میں آنا شروع کیا ہے' جنگل میں آگ لگ گئی ہے۔ نوابوں' نواب زادوں کی کوئی بھگت لے' بھگت ہی رہی ہوں۔ ایک سے ایک دعوے دار' پٹارے اشرفیوں کے بھرے لیے چلا آرہا ہے اور گل بکاؤلی سنا رہا ہے۔ ٹھیک ہے' لیکن یہ گلی کے چوڑے چمار' خبر ہے خاں صاحب' وہ بنیا زادہ کیسی کیسی دھمکیاں دیتا تھا' کہتا تھا کہ ایک دن سارے بالا خانے کو دیا سلائی دکھادوں گا' تیزاب پھینک دوں گا' سیندور کھلادوں گا۔ ایک مرتبہ تو اس ناہنجار نے مجھ پر بھی ہاتھ اٹھادیا۔ ایسی ذلت کبھی نہیں ہوئی تھی۔ کیا کیا امیدیں لگائی تھیں اس بانو سے کہ اب نچنت ہوکے کٹے گی مگر یہ بد نظر شہدے' سفلے' یہ مجھے چین نہیں لینے دیں گے نہ اس بچی کو۔ آپ کے پاس قاصد بھیجا تھا' آپ نے بھی خبر نہیں لی۔"

"تمہارے سر کی قسم' اپنے پاس کوئی سور کا تخم نئیں پہنچا۔ اپنے کو کچھ نئیں معلوم۔"

"آغا پا سے کہلوایا تھا' اس سے پوچھئے گا۔"

"اس حرام زادے نے کچھ نئیں بتایا۔"

"شبہ تھا' ایسا ہی ہوا ہوگا بھلا آپ کو معلوم ہو اور لوٹ کے نہ پوچھیں' یہ اندھیر تو کبھی نہیں ہوا تھا۔"

"آغا کو تو میں دیکھ لوں گا' بہت مستی کرنے لگا ہے۔"

"اس نے سوچا ہوگا کہ اتنی سی بات آپ کو کیا بتائے۔ اسے کیا خبر کہ بندی کس عالم سے دوچار ہے۔"

"پر آغا کو کہنا چاہیے تھا۔"

"یہ اس کی شکایت نہیں ہے' بندی میں اتنا حوصلہ نہیں۔ اسے میری طرف سے بدگمان نہ کردیجئے گا' علاقے کا تھانے دار ہے وہ۔"

"نمبر ایک حرامی ہے وہ' تم فکر نہ کرو۔ بنے خاں کو بولتے ہیں کہ ادھر کی طرف ایک آدمی اور بڑھادے۔ اب ذرا کوئی بات ہو' تم سیدھی بنے خاں کے پاس آدمی بھیجو' لیکن تارا بیگم!" شمشاد خاں نے آنکھیں چڑھا کے کہا "یہ جگہ ہی کھل

کھیلنے کی ہے۔ چھن چھنا چھن' تاک دھنا دھن' راگ رنگ' شاعری' عاشقی۔ اب عاشقی پر تو ہم پہرا نہیں بٹھا سکتے' بٹھانا بھی نہیں چاہیے۔ کسی زمانے میں ہم نے خود بہت وقت خراب کیا ہے۔"

"اپنے اپنے وقت پر سب رنگ کھیلتے ہیں لیکن ایسا تو نہیں ہوتا۔"

"سوچ لو بیگم صاحب! ہم نے ٹانگ اڑانی شروع کردی تو پنچھی اڑ بھی سکتے ہیں' بازار کے دوسرے لوگوں سے بھی پوچھ لو ہم پھر آگا پیچھا' الٹا سیدھا دیکھ کے آدمی بالا خانے کی طرف بڑھائیں گے۔ بولو' ٹھیک ہے؟"

"ایسا بھی نہیں خاں صاحب! بندی تو لچوں لفنگوں کی بات کرتی ہے' بالا خانے میں آکے جو بے لگام ہوجاتے ہیں' گالیاں گفتاریاں' دھمکیاں' توبہ توبہ۔"

"پر فرق کرنا آسان نہیں تارا بیگم! بعد میں پھر تم ہی کو انگلی اٹھانی پڑے گی' کون خرمستا زیادہ مستی میں ہے' کس کے سینگ نکلے ہوئے ہیں۔"

"خدا آپ کا بھلا کرے' یہی تو بندی کہہ رہی ہے۔" تارا بیگم ہنس کے بولی "ہر ایک کے لیے نہیں' سانڈوں کے لیے التجا کرتی ہوں۔"

بٹھل انہماک سے ان دونوں کی نوک جھونک سن رہا تھا اور خشک میوے کے دانے ٹونگ رہا تھا۔ بائیں جانب دو بچیاں پھر کمرے میں وارد ہوئیں۔ اس بار وہ بھاپ دیے آلو کے کباب اور پاپڑ کی قابیں لائی تھیں۔ تارا بیگم نے پیشانی پر ہاتھ رکھ کے خود کو ملامت کی کہ اپنی باتوں میں اسے ہماری تواضع کا خیال نہیں رہا۔ بٹھل کے منع کرنے کے باوجود اس نے طشتری میں مٹھائی کے دانوں کا اضافہ کردیا پھر وہ ان کے پاس سے ہٹ کے ہمارے سامنے آکے بیٹھ گئی۔ اس کے آنے سے ہمارے گرد خوشبو کا ایک حصار سا کھنچ گیا۔ خوشبو میں بھی کیسا سحر یا نشہ سا ہوتا ہے۔ ہم چاروں سمٹ گئے۔ اتنے قریب سے اسے دیکھنے کا موقع اب ملا تھا۔ اس کے ہاتھ بہت نرم و نازک تھے' انگلیاں لمبی لمبی' آنکھیں چمکیلی اور گہری۔ فانوسوں کی روشنی میں سرخی اور غازہ کی ہلکی تہ اور تاب دار ہوگئی تھی۔ عمر میں کمی اور حسن میں افزونی کے اس فریب سے دیکھنے اور دکھانے والے دونوں اچھی طرح واقف ہوتے ہیں پھر بھی یہ اچھا لگتا ہے۔ تارا بیگم کی آنکھیں پہلے مجھ پر پھر جمرو اور زدرا پر بھٹکتی ہوئی بنے خاں پر ٹھہر گئی "مبارک ہو خاں صاحب! تخت پر بیٹھ کے ہم خاک نشینوں کو بھول نہ جائیے گا۔"

بنے خاں کسی قدر کسمسا کے اور مسکرا کے رہ گیا۔

"اجازت ہو تو بندی کچھ عرض کرے؟" بنے خاں نے ہڑبڑا کے جیسے آنکھیں کھول دیں۔ تارا بیگم طرح داری سے بولی "جب ادھر کے ہنگاموں سے جی گھبرایا......کرے تو کبھی کبھی اس طرف کا رخ کرلیا کیجئے۔ تازہ ہوا کا احساس ہوگا۔"

"کبھی کبھی کیوں تارا بیگم؟" جمرو نے چٹک کے کہا۔

تارا بیگم کا چہرہ اور لال ہوگیا۔ اس نے ہمکتی نگاہوں سے جمرو کو دیکھا اور سینے پر ہاتھ رکھ کے بولی "کیوں نہیں' بہ سروچشم' بہ سروچشم لیکن بندی جانتی ہے' چوکی پر بیٹھنے کے بعد خاں صاحب کو کہاں موقع ملے گا۔ کبن خاں مرحوم کا بھی یہی حال تھا۔ مہینوں گزر جاتے تھے' صورت دیکھے ہوئے۔ الفت کو نخاس سے لے جانے کے بعد تو انہوں نے اس طرف آنا ہی بند کردیا تھا۔"

"یہ' یہ الفت کا کیا چکر تھا؟" جمرو نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"تارا بیگم نے گہری سانس کھینچی "بیتا ہوا دہرانے سے کیا حاصل' جب کہ بیتا ہوا دل بھی دکھاتا ہو۔"

"کچھ خبر ملی الفت کی؟"

"کسے معلوم' خدا ہی بہتر جانتا ہے۔" تارا بیگم سرد آہ بھر کے بولی "کہاں چلی گئی بدنصیب' خدا گواہ ہے' بندی نے کبن خاں کو اشاروں کنایوں میں خبردار کیا تھا۔ الفت کو بھی سمجھایا تھا لیکن دونوں پر جنون سوار تھا۔ بازار کی عورت سے نباہ ایسا آسان نہیں ہے میاں! بالا خانے پر بیٹھ کے عورت چاہے کتنی گھر گرہستی کی آرزو کرے لیکن اپنا گھر' اپنی چار دیواری اسے ملتی کہاں ہے۔ جاتی تو وہ یہاں سے اکیلی ایک مرد کے ساتھ ہے مگر صرف ایک شخص سے تو واسطہ نہیں رہتا۔ سینہ چھلنی کردیتے ہیں' آس پاس والے۔ دیکھ لیجئے' ڈیڑھ دو سال ہی بات چلی' وہ بھی جانے کس طرح۔ کبن خاں بے چارے نے تو دہرا صدمہ سہا۔ ایک بیوی کا دوسرا بیٹے کا۔"

پر اس میں کبن خاں کا کیا دوش تھا۔" جمرو نے تیزی سے کہا "کبن نے الفت کے لیے چوکھی لڑی تھی۔ اس نے کیا نہیں کیا تھا۔"

"بندی کو معلوم ہے۔ بالا خانے سے کسی عورت کو گھر لے جانے والے مرد کا ایثار بے شک بڑا ہوتا ہے۔ عورت اپنی عزت کی' بھلائی کی جستجو میں بالا خانے سے جاتی ہے۔ الفت نے اتنی بڑی قربانی نہیں دی جتنی کبن خاں نے دی تھی مگر آدمی کو تین اور طرف بھی دیکھنا چاہیے۔ بالا خانے کی عورت کے طور طریقے' رہن سہن' سوچ و فکر سبھی کچھ گھر کی عورت سے الگ ہوتا ہے۔ بندی پوچھتی ہے۔۔۔" تارا بیگم کی آواز کرکرا سی گئی "جوانی اور عاشقی کا ساتھ اس قدر کیوں ہے صاحب! جوانی کا طوفان ختم ہوجانے پر عاشقی بھی پھیکی پڑجاتی ہے۔ مرد کا کچھ نہیں جاتا مگر بالا خانے کی عورت کا کوئی ٹھکانا نہیں رہتا۔"

"پر الفت کو کون سی تکلیف تھی۔" جمرو نے تلخی سے کہا "اس کو کبن خاں نے نکالا ہے کیا؟"

"بندی کب کہتی ہے۔ اصل بات تو الفت ہی جانتی ہے۔ کچھ تو ہوگا جو کم بخت دودھ پیتے بچے کو لے کر چلتی بنی۔ کنوئیں میں ڈوب گئی یا گومتی کی بھینٹ چڑھ گئی۔ کوئی عورت ایسے ہی تو گھربار نہیں چھوڑ دیتی۔"

"بالا خانے کی دس عورتوں کو ہم بھی جانتے ہیں مہارانی!" جمرو نے منہ بگاڑ کے کہا "گھر جاکے انہوں نے پھر بالا خانے کی طرف نہیں دیکھا۔"

"بندی بھی واقف ہے۔" تارا بیگم کے نتھنے پھول گئے "پانچوں انگلیاں ایک سی نہیں ہوتیں۔"

"الفت نے کبن کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ اسی واسطے کبن نے اس کا پیچھا نہیں کیا۔ نہیں تو ڈھونڈ نکالنا کبن کے لیے کیا مشکل تھا۔"

"ہاں۔" تارا بیگم اداسی سے بولی "کبن خاں کا دل ہی ٹوٹ گیا ہوگا۔ اس نے اچھا کیا جو الفت کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ یہی تو بندی کہتی ہے۔ بالا خانے کی عورت اپنی جگہ ٹھیک رہتی ہے۔ وہ گھروں سے بہت دور ہوتی ہے۔ اسے نہیں چھیڑنا چاہیے۔"

"نہیں تارا بیگم! میں نہیں مانتا۔" جمرو نے ترشی سے کہا "بالا خانے کی عورت کے چار ہاتھ' آٹھ آنکھیں ہوتی ہیں کیا؟ اس کا من نہیں ہوتا کیا؟ وہ بھی تو سامنے آنے والے کسی پاگل دیوانے کے لیے بے کل ہوسکتی ہے۔"

"ہوسکتی ہے' کیوں نہیں لیکن دل کے ساتھ خدا نے دماغ بھی دیا ہے۔ دل کا چلا جانا' دماغ کا چلا جانا نہیں ہونا چاہیے۔"

"ایک بات پوچھوں تارا بیگم؟" جمرو نے مچل کے کہا۔

"اندازہ ہے کیا پوچھیں گے آپ' بندی نے ہمیشہ دل کو پیچھے رکھا ہے اور ٹھیک ہی کیا ہے۔ کوئی ملال بھی نہیں۔"

"اچھا ہے' پر ادھری سبھی کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا ہوگا۔"

"سب کی بات میں نہیں کرتی۔ میں تو پہلے ہی کبن خاں

سے کہتی تھی۔ اب بھی میرا یہی کہنا ہے۔ بالا خانے تو نوٹنکی کی طرح ہوتے ہیں۔ یہ تو گزرگاہ ہے' اسے سرائے کی طرح جانو۔ یہ تو سیر و تفریح کی جگہ ہے۔ جو گھروں میں نہیں ملتا' اس کا ہم یہاں بندوبست کرتے ہیں۔ یہ گھروں کی چیز نہیں ہے۔ گھروں میں خوش صورت لڑکیوں کی کمی تو نہیں ہوتی کہ لوگ بالا خانے کی لڑکیوں کے والہ و شیدا ہوتے ہیں پھر دونوں عذاب سے گزرتے ہیں۔ ساری پسندیدہ چیزیں ملکیت میں تو نہیں لی جاتیں۔ گلستان کے پھول اپنی شاخوں پر بھلے لگتے ہیں اور اگر توڑ لیے جائیں تو گلستان کا کیا حشر ہو۔"

"پر من کی بھی کوئی بات ہوتی ہے تارا بیگم! سارا کچھ آدمی کے بس میں نہیں۔ تم بھی ادھر آدمی پر جادو کر دیتی ہو۔"

"پر کوئی فریب تو نہیں۔ واپسی کے لیے دروازے کھلے ہوتے ہیں۔ شمعیں بجھا دی جاتی ہیں۔ جو کچھ عیاں ہے' عیاں ہے کچھ ڈھکا چھپا تو نہیں ہے۔ بالا خانے بازار میں ہوتے ہیں' شرفا کی بستیوں میں نہیں۔"

وہ اپنی شربتی نینا یاد ہے؟ وہ کسی شاعر کا شعر گاتی تھی' عشق پر نہیں زور کیا تھا وہ۔؟ پورا یاد نہیں آرہا۔"

"عشق پر زور نہیں' ہے یہ وہ آتش غالب۔" تارا بیگم کھل کھلا کر بولی "جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے۔ غالب کا شعر ہے۔"

"ہاں ہاں وہی' کسی کا بھی ہو' گاتی اچھا تھی۔" جمرو نے اچک کے کہا "کیا بولتی ہو پھر؟"

"عشق اپنی جگہ ہے پر ملکیت تو شرط نہیں' کیا عشق کے لیے لازم ہے کہ محبوب ملکیت میں آئے؟ میرے کہنے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ آدمی کو دور کا بھی دیکھنا چاہیے۔ آدمی کو ایسا بے گانہ نہیں ہو جانا چاہیے۔"

مجھ سے چپ نہ رہا گیا۔ "آپ کا کام بھی خوب ہے۔" میں اپنے لہجے کی برگشتگی دور نہ کر سکا' میں نے تارا بیگم سے کہا "دل جوئی بھی' دل شکنی بھی۔ اقرار و انکار' آمادگی و بیزاری' دروازہ کھلا رکھنا' دروازہ بند کر دینا' تماشا گاہ کا وقت مقرر ہے لیکن تماشے کا اثر تو دروازے بند ہو جانے پر بھی طاری رہ سکتا ہے۔ اکثر و بیشتر ہوش مند ہی تو آتے ہیں جو آپ کے بہ قول عواقب پر نظر رکھتے ہیں لیکن کبھی کوئی اپنا اختیار کھو بھی تو سکتا ہے۔ اس کا کیا بنے؟"

تارا بیگم کے سراپا میں موج سی اٹھی۔ "آپ' آپ سے تعارف ہی نہیں ہوا بنے خاں صاحب۔" وہ تجسس آمیز لہجے میں بولی۔

بنے خاں کے بجائے جمرو نے جواب دیا "یہ اپنا لاڈلا ہے' سمجھو استاد بٹھل کا بھائی' بیٹا' جو بھی سمجھو۔"

"یہ بھی کسی چوکی پر بیٹھتے ہیں؟"

"اس کے پاس بہت سی چوکیاں ہیں۔"

"لگتا بالکل نہیں ہے۔"

"کیوں؟ لگنے والے کی آنکھیں پیچھے کی طرف ہوتی ہیں؟" جمرو نے جلی کٹی سی آواز میں کہا۔

"نہیں' خدا نہ کرے۔" تارا بیگم بے ربطی سے بولی پھر سنبھل کے کہنے لگی "نگران کی آنکھیں۔۔ ان آنکھوں میں تو بڑی آگ لگ رہی ہے۔"

"وہ تو ہے۔" جمرو نے جھجکتے ہوئے تائید کی اور بولا "پر خود کو جلاتی ہیں۔"

تارا بیگم کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں "ماشاءاللہ تعلیم یافتہ معلوم ہوتے ہیں۔"

"جمرو کے کچھ کہنے سے پہلے میں نے کہا "حرف شناسی کی حد تک۔"

"میں اسے کسرِ نفسی کہوں گا۔"

"من آنم کہ من دانم۔ میری سمجھ میں آپ کی باتیں نہیں آرہیں۔"

"یہ وقت گزرنے کی بات ہے۔" تارا بیگم شائستگی سے بولی "اور ہو سکتا ہے' میری ہی فہم کی کوتاہی ہو۔"

"موجود وقت بھی تو کوئی فریب نہیں ہوتا۔ وہ بھی ایک حقیقت ہے۔"

"جی جی۔" تارا بیگم سرہلا کے بولی "وہ بھی' بے شک وہ بھی ایک حقیقت ہے۔ آپ نے کتنی سچی اور اچھی بات کہی ہے۔"

پہلو سے شمشاد خاں کی دھمکتی آواز نے اسے متذبذب کر دیا "کیا بات ہے تارا بیگم اور کب تم امتحان لو گی۔"

تارا بیگم مجھ سے معذرت کر کے جلد ہی ہمارے پاس سے اٹھ گئی "واقعی خاں صاحب! توبہ' بندی تو جانے کہاں کھو گئی۔ اس طرف آنے پر کچھ اور باتیں چھڑ گئیں۔"

تارا بیگم کے اشارے پر محرابوں کے پاس مودب کھڑی ہوئی بچیوں نے ہمارے سامنے سے کچھ سامان کم کر دیا۔ تارا بیگم چند لمحوں بعد واپس آنے کا کہہ کے اندر چلی گئی۔ سازندوں نے آہستہ آہستہ ساز تیز کر دیے تھے۔ طبلہ ان میں سب سے نمایاں تھا۔ زورا تو باقاعدہ تھرکنے لگا۔ پانچ سات منٹ بعد محرابوں کے پار ایک دروازے سے تارا بیگم نمودار ہوئی۔ اس کے عقب میں چوڑی دار سفید پاجامے' گھیر دار گلابی کرتے اور ہرے دوپٹے میں ملبوس نوجوان لڑکی چاندنی

بانو کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ نکلتا ہوا قد' کامنی صورت' ترشا ہوا سراپا' ترشے ہوئے نقش و نگار' بڑی بڑی شربتی آنکھیں۔ لمبے سیاہ بال' رخسار شعلوں کی طرح دہک رہے تھے۔ کسی دلہن کی طرح سجی بنی۔ کانوں میں ہیرے جڑے جھمکے' ناک میں لال ڈوری کے ذریعے کان تک بندھی ہوئی نتھ۔ کلائیوں میں طلائی چوڑیاں' گلے میں کئی طرح کے ہار' پیروں میں پازیب' صرف جھومر کی کمی تھی۔ وہ چھن چھن کرتی فرش کے وسط میں آکے کھڑی ہو گئی۔ سب کی نگاہیں اسی پر مرکوز تھیں۔ سازندوں نے ساز بند کر دیے اور کمرے میں سکوت چھا گیا۔ چاندنی بانو کے سرخ ہونٹوں نے شمشاد خاں اور بٹھل کی جانب' پھر ہماری طرف رخ کر کے سلام کیا اور فرش پر خاص انداز سے بیٹھ گئی' اس طرح کہ کرتے کے گھیرے نے دائرہ بنا دیا۔

"واہ تارا بیگم! واہ!" شمشاد خاں نے بے ساختہ صدا بلند کی "یہ تو مورتی کی طرح ہے۔ روز اس کی نظر اتارتی ہو نا؟"

چاندنی بانو نے شرم سے سر جھکا لیا۔ تارا بیگم نے مخصوص انداز میں دونوں ہاتھ کانوں پر گھما کے انگلیاں چٹخائیں اور چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "کوئی پل نہیں جاتا خاں صاحب!"

"سچی' ہم نے کم سنا تھا۔"

"عنایت ہے آپ کی۔" تارا بیگم دمکتی آواز میں بولی۔

بنے خاں اور جمرو کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ زورا کو بھی سانپ سونگھ گیا تھا۔ ہمارے ساتھ آنے والے اڈے کے تینوں آدمی بھی دم بہ خود ہو گئے۔ جمرو کو جیسے سب سے پہلے ہوش آیا اور اس نے بنے خاں کی آنکھوں کے آگے انگلیاں نچاتے ہوئے کہا "سنبھل کے نوشہ!"

بنے خاں سٹ پٹا سا گیا اور مضطرب نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ دونوں نو عمر لڑکیاں گھنگرو لے آئیں۔ چاندنی نے گھیر میں چھپے ہوئے پیر نکال کے ان کے سامنے کر دیے۔ لڑکیوں نے پازیب اتار کے پیروں میں گھنگرو باندھ دیے۔ اسی لمحے سازندوں نے ساز بجانا شروع کر دیے۔ تارا بیگم دوبارہ شمشاد خاں اور بٹھل کے قریب بیٹھ گئی اور چاندنی بانو کی سوالیہ نظروں کے جواب میں اس نے شمشاد خاں سے اجازت طلب کی۔

"ضرور ضرور' ہم تو کب سے اس گھڑی کو ترس رہے ہیں۔" شمشاد خاں نے خسروانہ لہجے میں کہا۔

تارا بیگم ہاتھ جوڑ کے عاجزی سے بولی "کوئی خامی ہو تو بچی سمجھ کے نظر انداز کر دیجئے گا۔"

"ہم کو معلوم ہے' بالکل نہیں ہو گی۔ اوپر والے نے اس کو بنانے میں پورا وقت لیا ہے۔ یہ تو اوپر سے نیچے تک سُر میں ہے۔"

چاندنی بانو نے سازندوں کی جانب کن انکھیوں سے دیکھ کے گنگنانا شروع کیا۔ بنے خاں اور جمرو سیدھے ہو کے بیٹھ گئے۔ اس کی گنگناہٹ سے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ خوبی خداداد ہے' قدرت نے آواز کی عطا میں بھی خوب فیاضی کی ہے۔ چاندنی نے سودا کی غزل سے آغاز کیا۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

مجھے نصیب میاں یاد آرہے تھے۔ کہتے تھے' سب سے پہلی شرط تو کسی کا سُر میں ہونا ہے۔ ایسا لگا جیسے کمرے میں ہر سُو گھنٹیاں بجنے لگی ہوں اور روشنی بھی مترنم ہو گئی ہو' ہوا بھی چاندنی کے ساتھ گا رہی ہو۔ اس کی ادائی' زیر و بم' لچک' سوز و گداز' سازندوں سے ہم آہنگی' مرکی بھاؤ۔ لگتا تھا چاندنی کا بدن پگھل رہا ہو اور اس کے مرتعش ہونٹوں سے ترنم کی کرنیں پھوٹ رہی ہوں۔ آواز کے بھی کیسے کیسے روپ ہوتے ہیں۔ غنا کار کا انہماک' اس کی شمولیت لازم ہے۔ چاندنی آپ اپنی اسیر معلوم ہوتی تھی۔ مصور اپنے شاہ کار میں خود بھی تو گم ہو جاتا ہے۔

ادھر اس نے غزل سرائی ختم کی' ادھر شمشاد خاں اٹھ گیا۔ اسے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کے چاندنی بانو گھبرا سی گئی' اس کی غزالی آنکھوں میں وحشت اڈ آئی۔ شمشاد خاں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اپنے گلے سے سونے کی زنجیر اتار کے چاندنی بانو کے گلے میں ڈال دی۔ چاندنی بانو نے جھک کر اسے سلام کیا۔

"اسے چھپا کے رکھو تارا بیگم! اسے چھپا کے رکھو۔" شمشاد خاں بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

"ہاں خاں صاحب!" تارا بیگم کے چہرے پر اداسی چھا گئی "ہے تو یہی بات۔"

"بتاتا ہوں تم کو۔" شمشاد خاں تنبیہی لہجے میں بولا "ڈاکا پڑ جائے گا۔"

"اسی لیے کہتی تھی' آپ کیسے رکھوالے ہو۔"

"جتنی جلدی مول تول کر لو' اچھا ہو گا ورنہ دیر نہ ہو جائے' دیر ہو جائے گی۔"

تارا بیگم کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں' وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ چاندنی بیگم نے داغ کی غزل شروع کر دی تھی۔

بھنویں تنتی ہیں، خنجر ہاتھ میں ہے، تن کے بیٹھے ہیں۔

سب گنگ بیٹھے رہے۔ نعرہ تحسین و آفریں بلند کرتے ہوئے شاید سب کو چاندنی بانو کے منتشر ہوجانے کا خدشہ تھا یا اس کی آواز کا سحر تھا جس نے سب کو جکڑ رکھا تھا۔ چاندنی بانو کو، راگوں کی باقاعدہ تربیت دی گئی تھی۔ جب وہ تان اٹھاتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ بس اب ٹوٹا، اب ٹوٹا، جیسے بدن کا شیشہ ٹوٹ جائے گا، چاندنی کرچیوں کی طرح فرش پر بکھر جائے گی۔ نصیب میاں کہتے تھے، آواز کی پہلی خوبی غنا ہے تو دوسری قابو یافتگی۔ کھینچو تو کھینچی چلی جائے، سمیٹو تو سمٹی چلی جائے۔ اٹھے تو آسمان سے جا ملے، اترے تو پاتال جا چھوئے۔ نصیب میاں کو سُر کی بڑی پہچان تھی۔ کلکتے کے اڈے پر جب کوئی سُر سے اترتا تھا تو ان کا منہ بگڑ جاتا تھا، وہ کانوں پر ہاتھ رکھ لیتے یا اٹھ کر چپکے سے باہر چلے جاتے۔ رقص و سرود کے بارے میں مجھے جتنی شدبد تھی، اس کا بیش تر نصیب میاں کا بتایا ہوا تھا۔ کبھی کبھی، طبیعت کی روانی کے وقت وہ بہت سی باتیں اور یادیں سناتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ آواز کا تعلق براہ راست دل سے ہے۔ آواز کی کمان سے نکلا ہوا تیر ٹھیک دل پر جا کے لگے، بات تو تب ہے۔ سُر گردش وقت سے بے نیاز کردیتا ہے اور یہ مبالغہ نہیں کہ ٹھہرا ہوا پانی متلاطم کردیتا ہے۔

تیسری غزل کے اختتام پر چاندنی بانو فرش سے اٹھ گئی اور اس نے ستار کی سنگت پر ناچنا شروع کردیا۔ طبلہ نواز تال دینے لگا۔ چاندنی بانو نے جیسے خود کو تال کے سپرد کردیا اور اس کا اپنا کوئی ارادہ نہ رہا۔ یہاں تک کہ صرف ناچ نظر آنے لگا، ناچنے والی اوجھل سی ہوگئی۔ طبلچی درمیان درمیان میں ٹھیکا لگا کے رقص کی شدت اور بڑھادیتا۔ رقص کی یہ دیوانہ وار حرکات و سکنات کسی جبلی تحریک، تائید و تسکین یا جبلی قوت کے بغیر ممکن نہیں۔ چاندنی پھولوں کی طرح لطیف، ریشم کی طرح نرم و نازک تھی۔ اتنی توانائی جانے کہاں سے اس میں آگئی تھی۔ رقص کے دوران میں اس کا رنگ اور نکھر رہا تھا۔ چہرہ اور خوں رنگ ہوگیا تھا۔ بمبئی میں کرشنا جی کے ساتھ میں نے ایک بار جنوبی ہندوستان کی ایک رقاصہ کا ایک ایسا ہی رقص، بھارت ناٹیم دیکھا تھا۔ وہ اپنے فن کی ماہر تھی۔ اس کا بھی انگ انگ پھڑکتا، تھرکتا تھا۔ لگتا تھا بس آخری رقص ہو اور رقص کرتے کرتے بس فنا ہوجانے کی آرزو ہو۔ چاندنی کسی طور اس سے کم نہیں تھی۔ اس کے اعضا، ستار نواز کی لے اور طبلے کی تھاپ سے بندھے ہوئے تھے۔ سبھی کا عالم دیدنی تھا۔ کہیں پلک جھپکنے میں کچھ کھو نہ جائے، سبھی ٹکٹکی باندھے برق اندام چاندنی کو دیکھ رہے تھے پھر ستار نواز نے کوئی راگ الاپنا شروع کردیا۔

برکھا میں گوری ابھاگن

رتیاں بتائے جل جل کے

گیت کے بولوں پر چاندنی یاس و الم کی تصویر بن گئی۔ کبھی لہروں کی طرح اس کا بدن اٹھنے لگتا، کبھی شعلوں کی طرح بھڑکنے لگتا، جمرو اور زورا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ چاندنی کے ساتھ رقص میں شامل ہوجائے۔ میرا جسم بھی دھڑک رہا تھا۔ اچھا ہوا کہ ستار نواز نے ہیتم کی بے وفائی پر اپنی آہ و بکا تمام کردی اور چاندنی کو قرار آگیا۔

شمشاد خاں سر جھٹکنے لگا۔ داد و تحسین کے جواب میں تارا بیگم بار بار آداب کرتی۔ رقص ختم کرتے ہی چاندنی چھلاوے کی طرح غائب ہوگئی۔ کمرے میں سناٹا ہوگیا۔

"کیا ہوا تارا بیگم؟" شمشاد خاں بدحواسی سے بولا "یہ کیا؟ کیا اٹھ جائیں؟"

"خدا خیر کرے۔" تارا بیگم نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کے آنکھیں چڑھالیں "ذرا دم تو لینے دیجیے سرکار۔"

شمشاد خاں نے اطمینان کی سانس لی پھر بے چینی سے بولا "اب ہم سے کسی اور کو نہ دیکھا جائے گا۔"

"وہی نامراد آئے گی۔" تارا بیگم مسکرا کے بولی "بس آیا ہی چاہتی ہے۔"

"کاش ہم بھی کوئی نواب ہوتے۔" شمشاد خاں نے حسرت سے کہا۔

"آپ کسی سے کیا کم ہیں خاں صاحب۔"

"ہاں... یہ کہتی ہو۔" شمشاد نے زہرخند سے کہا "پر تمہیں دینے کے لیے کوئی جاگیر نہیں ہے پاس۔"

"آپ کے دو لفظ ہی بندی کے لیے جاگیر کے مانند ہیں۔ جاگیروں والے تو صبح و شام یہاں آتے ہیں۔"

بنے خاں ابھی تک بت بنا ہوا تھا۔ جمرو نے اس کے بازو میں چٹکی بھری تو وہ اچھل پڑا "کیا ہے نوشہ! اب نیچے کو آجا ساجنا۔"

"جمرو بھائی۔" بنے خاں کی آواز سنسنا رہی تھی "تم نے، تم نے دیکھا؟"

"نیا نہیں ہے جانی!" جمرو نے بظاہر بے اعتنائی کا اظہار کرکے بنے خاں کی شدت کم کرنے کی کوشش کی۔

"اپنے لیے بالکل نیا ہے۔" بنے خاں تمتماتی آواز میں بولا۔

"پرانا بھی ہوجائے گا۔" جمرو نے بنے خاں کی ران پر تھپکی دی "ابھی دو ایک دانت کی کسر ہے۔"

"کیسی ہے وہ؟" بنے خاں نے بچوں کی سی سادگی سے پوچھا "شہزادی ہے بالکل۔"

"اچھی ہے۔" جمرو نے سرسری انداز میں کہا "اپنے کو ہاتھ لگنے والی چیز اچھی لگتی ہے۔"

"ہاں آں۔" بنے خاں کی آنکھیں بجھ گئیں "ایمان سے بولا جمرو بھائی! اس کے ملنے کے بعد کسی اور چیز کی کیا ضرورت ہے پھر اور کیا چاہیے۔ آدمی اسی کو دیکھا کرے۔" بنے خاں بہت اضطراب میں معلوم ہوتا تھا، کہنے لگا "کیوں، غلط کہتا ہوں کیا؟"

"ٹھیک ہی بولتا ہے بھائی جان۔" جمرو نے بوجھل آواز میں کہا "پر دنیا میں کمائی نہیں ہے۔ ایک کے اوپر ایک پڑا ہے۔"

بنے خاں کہیں کھو سا گیا۔

"یہ بلبلیں اڈے کے آدمی کو راس نہیں آتیں۔" جمرو نے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا۔

"اڈے پر ویسے بھی رہنے کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

وہ دونوں مجھے گھورنے لگے اور بنے خاں سر ہلا کے بولا "ہاں لاڈلے بھائی، پھر اڈا کیا بیچتا ہے سالا۔"

"میں تو چاندنی کے بغیر بھی کہہ رہا ہوں۔" میں نے وضاحت کی۔

"اڈے سے نکلنا بہت مشکل ہے لاڈلے بھائی۔" بنے خاں پژمردگی سے بولا۔

"کیا مشکل ہے۔" میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ ارادہ ہو تو اڈا چھوڑ دینا کیا دشوار ہے۔ اچانک سامنے سے بجلی سی چمکی۔ چاندنی بانو نمودار ہوئی۔ اس نے اتنی جلدی لباس تبدیل کرلیا تھا۔ چہرہ گلنار ہو رہا تھا۔ جھمکیوں کی جگہ اب کانوں میں چھوٹی چھوٹی بالیاں پڑی تھیں، ناک میں لونگ آویزاں تھی۔ فرش پر ایک خاص انداز سے بیٹھ کر اس نے مسکراتی نظروں سے سر گھما کے دیکھا اور جیسے ہی ساز بلند ہوئے، وہ نغمہ سرا ہوگئی۔ ہم لوگوں سے اب وہ اتنی دور نہیں بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ رقص کناں تھے۔ لہراتے ہاتھ، تھرکتی انگلیاں اور بل کھاتی پلکیں شعروں کا مفہوم اور سازوں کا زیر و بم اجاگر کررہی تھیں۔ لگتا تھا، چاندنی بانو کو اساتذہ کا کلام خوب یاد ہے۔ اس نے یکے بعد دیگرے ولی دکنی، میر، غالب اور آتش کی غزلیں سنائیں۔ شمشاد خاں مسلسل جھوم رہا تھا۔ بٹھل کے اشتیاق بھی دیدنی تھے۔ جمرو اور زورا کے دست و بازو بار بار پھڑک اٹھتے۔ بنے خاں کا حال البتہ مختلف تھا۔ وہ تو جیسے پتھر بن گیا تھا۔ آواز میں بھی کیسا نشہ ہوتا ہے، آدمی اپنے آپے میں نہیں رہتا۔ سب خود سے بیگانہ ہوگئے تھے۔

شمشاد خاں نے کچھ کہا ہوگا کہ تارا بیگم کے اشارے پر چاندنی بانو بٹھل اور شمشاد خاں کے سامنے آکے بیٹھ گئی۔ بٹھل نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکال کے چپکے سے شمشاد خاں کی طرف کھسکا دی۔ شمشاد خاں کو بٹھل کی جانب سے اس خسروی کی توقع نہیں تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس پر حیرت طاری ہوئی لیکن پھر اس نے گڈی کھول کے سارے نوٹ چاندنی پر نچھاور کردیے۔ جمرو بھی خالی نہیں تھا، چاندنی کو پاس بلانے کا یہی ایک طریقہ تھا کہ وہ بھی کچھ رقم سامنے رکھے۔ یہی ہوا، تارا بیگم نے کن انکھیوں سے چاندنی کو ہدایت کی اور شمشاد خاں کی طرف سے اٹھ کے چاندنی بانو ہمارے پاس آگئی۔ اتنے قریب سے اس کی تجلی کا منظر ہی کچھ اور تھا، رخساروں سے کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ چاند جیسے جل رہا ہو۔ جمرو نے اور اضافہ کیا۔ نوٹوں کی گڈی چاندنی کے سر پر گھما کے پرے بیٹھے ہوئے سازندوں کی جانب پھینک دی۔ فرش پر پرزے ہی پرزے بکھر گئے۔ چاندنی نے اس جود و سخا کے جواب میں اسے آداب کیا اور غزل مکمل ہوتے ہی ہمارے پاس سے اٹھ کے جانے لگی، جمرو نے اسے روک لیا اور وارفتہ لہجے میں بولا "آپ تو کمال کرتی ہو۔ اتنا بہت سا آپ نے کدھر سے سیکھ لیا؟"

"چاندنی بانو کا سراپا دوہرا ہوگیا "کنیز کو کیا آتا ہے؟" اس نے کھنکتی آواز میں جھجکتے ہوئے کہا۔

"آپ کو کیا معلوم، کیا نہیں آتا آپ کو، تیر چلانا، بجلی گرانا۔" جمرو مچل کے بولا "تھوڑا سننے اور دیکھنے والے کا بھی دھیان کیا کرو۔ آپ تو بہت امتحان لیتی ہو۔"

چاندنی بانو کا چہرہ اور سرخ ہوگیا۔

"ابھی ایک بات پوچھے؟" زورا نے ادھر ادھر دیکھ کے رازدارانہ انداز میں کہا۔

چاندنی بانو کی آنکھوں میں بے چینی ہویدا ہوئی۔

"ابھی آپ کو، آپ کو یہ سارا کیسا لگتا ہے؟" زورا نے سرگوشی میں پوچھا "اپن کا مطلب ہے یہ سارا..."

زورا کی مراد محفل آرائی سے تھی۔ چاندنی بانو بھی سمجھ گئی مگر اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ مضطرب ہوکے رہ گئی۔

"روز یہ نوے نوے لوگ کے آگے گانا گانے کا۔" جمرو

کے ٹھوکا مارنے سے پہلے زورا کو خیال آگیا کہ وہ بلاغت سے تجاوز کررہا ہے۔ اس نے لجاجت سے کہا "ابھی آپ کو کسی راج محل میں ہونے کا تھا۔ پتا ہے' ابھی ایدر کا سمراٹ بنے دادا کیا بولتا ہے۔" زورا نے سانس لینے کے لیے تامل کیا اور چاندنی کے چہرے پر نظریں جما کے کہنے لگا "ماں قسم' دادا بولتا ہے کہ آپ کے مل جانے پہ اور کیا چاہیے' آپ مل جاؤ تو اکھا۔۔۔"

چاندنی کا بدن لہرا گیا۔ بنے خاں مبہوت بیٹھا تھا۔ دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں اور دونوں ہی شاید ایک دوسرے کی تاب نہ لا سکے۔

چاندنی بانو گھبرا سی گئی۔

"ہم پوچھتے ہیں' مرد کا بھی تو کوئی مول ہوتا ہے؟"

چاندنی بانو کی آنکھیں جلنے بجھنے لگیں۔ اس کے لیے جواب آسان نہیں تھا۔ کھوئی کھوئی نظروں سے جمرو کو دیکھا پھر زیر لبی سے اٹکتی زبان میں بولی "لیکن لکھے ہوئے کو کون مٹا سکتا ہے۔"

تارا بیگم نے اسے زیادہ دیر ہمارے پاس نہیں بیٹھنے دیا۔ اس کی صدا پر چاندنی ہڑبڑا گئی اور ہم سے معذرت کرکے فوراً اٹھ گئی۔ تارا بیگم نے اسے اندر جا کے آرام کا مشورہ دیا۔ چاندنی نے حکم کی طرح مشورے کی تعمیل کی۔ سازندوں نے ساز ایک طرف کردیے۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ شمشاد خاں نے بھی وقت نہیں لگایا اور رسمی وداعی کلمات کہہ کے اٹھ کھڑا ہوا۔ تارا بیگم نے کچھ دیر کے لیے ہمیں اور روکنا چاہا' دوبارہ جلد آنے کی درخواست کی اور معذرت کا اظہار بھی کیا کہ وہ حسب خواہش شمشاد خاں اور اس کے معزز مہمانوں کی مدارات نہ کرسکی۔ وہ ہمیں دروازے تک رخصت کرنے آئی۔ سازندے بھی گلی کے نکڑ تک ہمارے ساتھ رہے۔

گلیوں میں اب اتنی چہل پہل نہیں تھی۔ پہلے کی طرح راستے میں اور کئی لوگوں نے شمشاد خاں کو اپنے اپنے بالا خانوں کی محفل میں شرکت کی دعوت دی۔ دکان دار بھی ہار پھول' چائے' مٹھائی اور پان وغیرہ سے تواضع کے لیے اصرار کرتے رہے۔ شمشاد خاں کہیں نہیں ٹھہرا۔ ہم آہستہ قدموں سے دور نکل آئے۔ بنے خاں بالکل گم صم تھا۔ جمرو نے ازراہ لطف پچکارنے کے انداز میں اس سے کہا "ادھر لکھنؤ میں ہی ٹھکانا ہے دولہا! کل ہی کی تو بات ہے' کون روکے گا بادشاہ سلامت کو۔ گدی سنبھالنے کے بعد آنکھیں سینکنے کو پھیرے لگاتے رہنا۔ بولتے ہیں' حسینوں کا دیدار بھی سرمے کا کام دکھاتا ہے۔"

بنے خاں سر جھکائے چلتا رہا۔ میں اس کے قریب تھا۔ اس نے کوئی توجہ نہیں کی تو جمرو نے مجھے مخاطب کیا۔ "لگتا ہے' ترچھا پڑ گیا ہے۔ پہلے ہی ہلے میں جھٹکا کردینا ٹھیک رہتا ہے۔"

"ہاں بنے بھائی!" میں نے مڑ کے بنے خاں کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ جل رہا تھا اور آنکھیں ڈوبی ہوئی تھیں میں نے اس کا ہاتھ سینے پر لگاتے ہوئے کہا "پیارے صاحب! کیا حال ہے؟"

میری اس سے ایسی بے تکلفی نہیں تھی' جانے اسے کیا ہوا' بے اختیار مجھ سے چمٹنے کے لیے امڈ پڑا۔ میں نے بھی اپنے بازو پھیلا دیے۔ آنکھوں کی طرح سینے کی بھی کوئی زبان ہوتی ہے۔ مجھے ایسا لگا جیسے اسے کسی پناہ کی ضرورت ہے' جیسے اس کا وجود مجھ میں پیوست ہوجانے' مجھ میں چھپ جانے کے لیے بے قرار ہو۔ میں نے اسے زور سے جکڑ لیا۔ چند لمحے مجھ پر کشاکش کے گزرے' میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے لیے کیا کروں' جی چاہتا تھا کہ اس کی نشاط خاطر کے لیے احکام صادر کروں۔ اسے کوئی یقین دلاؤں مگر جلد ہی مجھے اپنی توفیق و استطاعت کا احساس ہوگیا۔ اس کے لیے اپنی ہمہ جانی و ہمہ دلی کے باوجود میرے بس میں کیا تھا۔ میں نے اپنے بازوؤں کی گرفت ڈھیلی کی اور کسی موہوم عزم کی تلقین کے لیے اس کی کمر پر تھپکی دی۔ شمشاد خاں اور بٹھل ہم سے آگے چلے گئے تھے۔ ہم نے بھی رفتار تیز کردی۔

چند قدم بعد ہی میرے پیر اٹکنے لگے۔ میں نے بدحواسی سے زورا اور جمرو کو ٹھہر جانے کے لیے کہا۔ بنے خاں بھی رک گیا۔

"ٹھیک تو ہے؟" جمرو پریشان ہوگیا۔

"ہاں سب ٹھیک ہے۔" میں نے زورا سے کہا کہ وہ آگے جا کے بٹھل اور شمشاد خاں سے کہہ آئے کہ ہم کچھ دیر میں اڈے واپس آئیں گے۔

ایک لحظے کے پس و پیش کے بعد زورا لپکتا ہوا آگے چلا گیا۔ "کیا وچار ہے مہاراج!" جمرو معنی خیزی سے بولا۔

"واپس چلتے ہیں جمرو بھائی!"

"واپس! اب کدھر کو بھیا جی؟"

"وہیں تارا بیگم کے ہاں۔"

جمرو سیدھا ہوگیا اور اس نے میری کلائی پر ہاتھ ڈال کے نبض ٹٹولنا چاہا۔ "ادھر اب کیا رکھا ہے میرے باپ۔"

جمرو کی بھنویں کھنچ گئیں۔ اتنی دیر میں زورا آگیا۔

"دیکھتے ہیں جمرو بھائی!" میں نے اس کی منت کی "آؤ جلدی سے۔ ابھی سو تو نہیں گئی ہوگی وہ تارا بیگم۔"

"پرلا ڈلے۔" جمرو جز بز ہو کے بولا "ادھر' ادھر کیا۔۔"

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ مار کے اسے دھکیلا تو وہ چپ ہوگیا اور کندھے اچکا کے ہونٹ سکیڑتا ہوا چل پڑا۔

چند ہی منٹوں میں ہم بالا خانے کی گلی میں داخل ہوگئے۔ روشنیاں گل ہوچکی تھیں۔ زینے کا نچلا دروازہ بھی بند تھا۔ زورا کے کنڈی کھٹ کھٹانے پر اوپر کا دروازہ کھلا اور تیز قدموں سے کسی کے سیڑھیاں اترنے کی آواز آئی' کوئی مرد تھا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے پوچھا "کون ہے؟"

"ہم ہیں استاد شمشاد خاں کے مہمان' ابھی ابھی جو یہاں سے گئے تھے۔ تارا بیگم سے کہو' ان سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔" میں نے ٹھہر ٹھہر کے کہا۔

دروازے کا ایک پٹ کھول کر اور سر نکال کے اس نے پہلے ہمارے بارے میں تسلی کی۔ وہ شخص سازندوں میں شامل تھا "کیا بات ہے حضور؟" گھبرائے ہوئے لہجے میں اس نے پوچھا۔

"جا کے تارا بیگم سے کہو' زیادہ وقت نہیں لیں گے۔" میں نے نسبتاً بلند آواز میں کہا۔

تارا بیگم بھی زینے کے اوپر دروازے پر آگئی تھی۔ اس نے متردد لہجے میں پوچھا "کیا استاد شمشاد خاں ہیں؟ خیریت تو ہے؟"

"نہیں آپا' استاد نہیں ہیں۔ بنے خاں صاحب اور ان کے مہمان تشریف لائے ہیں۔" سازندے نے ٹھٹکی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

تارا بیگم نے کسی قدر تذبذب کے بعد سازندے کو حکم دیا کہ وہ ہمیں بہ عزت اوپر لے آئے۔

کمرے کی روشنیاں جلا دی گئیں۔ ہم فرش پر بچھے ہوئے قالین کی ایک جانب بیٹھ گئے۔ تارا بیگم وہاں نہیں تھی مگر اسے باہر آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس دوران میں اس نے لباس تبدیل کرلیا تھا۔ غرارے اور کرتے پر سفید شال سلیقے سے اوڑھے ہوئے تھی' ہونٹوں پر گلابی سرخی جمی تھی۔

"آپ کو زحمت ہوئی۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا "یقین تھا' ابھی آپ سو نہیں گئی ہوں گی۔"

"بندی کو نیند کتنی آتی ہے۔" اس نے یاسیت سے کہا پھر تجسس سے بولی "آپ فرمائیے' زحمت تو آپ کو ہوئی' کہیے کیا حکم ہے؟" اور میرے کچھ کہنے سے پہلے اس نے پوچھا۔ "کیا پیجیے گا' چائے' قہوہ' شربت؟"

"کچھ نہیں' آپ اطمینان سے بیٹھ جائیے۔"

"یہ کیا ہوا' قہوہ بننے میں کیا وقت لگے گا۔"

"خواہش نہیں ہے۔ بس آپ سے ایک بات کرکے چل دینا ہے۔"

وہ ہمارے قریب بیٹھ گئی۔ جمرو' زورا اور بنے خاں کی متوحش نظریں مجھ پر منڈلا رہی تھیں۔ "بیگم صاحبہ!" میں نے کھنچی ہوئی آواز میں کہا "جو بات ہم کہیں' سوچ سمجھ کے جواب دیجیے گا۔"

"اللہ خیر کرے' ایسی کیا بات ہے سرکار؟"

"ہم سودا کرنے آئے ہیں۔" میں نے کسی لمبی تمہید سے اجتناب کیا اور اپنی آواز دھیمی رکھنے کی کوشش کی "چاندنی بانو کا سودا! ہمیں اس کی قیمت بتائیے۔"

تارا بیگم کا عجب حال ہوا۔ سناٹا جیسے طاری ہوجائے' آنکھیں پھیل گئیں' چہرے پر شکنیں پڑ گئیں "کیا' کیا فرما رہے ہیں آپ؟" اس کی آواز بدل گئی تھی اور ہونٹ پھڑک رہے تھے۔

"دیکھیے' ہمیں زیادہ بات نہیں آتی' لاگ لپیٹ تو بالکل نہیں جو بھی قیمت آپ نے چاندنی بانو کی مقرر کی ہو' ہمیں بتائیے۔"

"آپ' آپ کیسی باتیں کررہے ہیں۔" تارا بیگم گھٹی ہوئی آواز میں بولی "معاف کیجیے' آپ ہوش و حواس میں تو ہیں؟"

"ہم بالا خانے پر آئے ہیں بیگم صاحبہ! کچھ ناوقت ضرور ہے مگر نامناسب نہیں۔ کوئی نئی بات نہیں ہے جو آپ اس قدر حیران پریشان ہورہی ہیں۔"

"مگر' مگر۔۔" اس سے کچھ اور نہ کہا گیا۔

"ہم سودا کرنے آئے ہیں' سودے بازی کرنے نہیں۔ اطمینان رکھیے۔" میں نے تحمل سے کہا "ہم کمی بیشی کے لیے ایک حرف نہیں کہیں گے۔"

"مگر مگر۔" تارا بیگم بے بسی کے انداز میں بولی "بندی نے اس بارے میں کبھی نہیں سوچا۔"

"لیکن کبھی نہ کبھی تو چاندنی بانو کو آپ سے جدا ہوجانا ہے۔ کسی نہ کسی وقت یہ مرحلہ آسکتا ہے' تو آج ہی کیوں نہیں' اور ابھی کیوں نہیں۔ کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ قبل ازوقت گاہک خود چل کے منہ مانگی قیمت ادا کرنے آگئے ہیں۔"

"آپ کو کیا معلوم' بانو تو میرا سرمایہ' میری جائداد' میری زندگی ہے۔ اسے کسی لائق بنانے کے لیے نہ دن کو دن سمجھا

ہے نہ رات کو رات۔ اس کے بغیر تو زندگی اجیرن ہو جائے گی۔"

"لیکن لڑکیاں تو ہر گھر سے ایک دن رخصت ہو جاتی ہیں۔ کیا آپ یہ نہیں چاہیں گی کہ چاندنی بانو اپنے گھر میں عزت اور سکون سے زندگی بسر کرے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں، یہ زندگی نہ آپ کو پسند ہوگی نہ بانو کو۔ اسے اگر کوئی موقع مل رہا ہے تو آپ کو رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ اس میں آپ کا کوئی نقصان بھی نہیں ہے۔ بانو سے آئندہ جتنے فائدے کی آپ کو امید ہے، اسے آپ ابھی سے وصول کر لیجیے، ضرب تقسیم کر کے۔ آپ کا کوئی گھاٹا نہیں ہونے دیں گے ہم۔"

تارا بیگم جلتی بجھتی آنکھوں سے مجھے گھورتی رہی پھر گرفتہ آواز میں بولی "آپ نے کیسی الجھن میں ڈال دیا ہے۔ سچ تو یہی ہے کہ بندی نے اس بارے میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے تو جواب بھی کیا دے سکتی ہے۔"

"بیگم صاحبہ!" میرے لہجے میں تندی آگئی "بہتر ہے، جو بھی بات ہو۔ آپ کھل کے کریں، ہر قسم کے اندیشے سے بے نیاز ہو کے۔"

"میں کیا کہوں۔" تارا بیگم حواس باختہ سی ہو گئی اور کہنے لگی "اچھا ہوگا، بندی کو سوچنے کی کچھ مہلت دیجیے۔"

"کیا سوچنے کی مہلت۔" میں نے ترشی سے کہا "ہمارے پاس اور کوئی وقت نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے، اس طرح آپ ایک اچھا طلب گار کھو دیں۔"

"جی، جی ہاں، ہو سکتا ہے لیکن صرف قیمت ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی جناب!" تارا بیگم بے اعتنائی سے بولی "ادھر ادھر بھی تو کچھ سوچنا دیکھنا پڑتا ہے پھر بانو سے بھی مشورہ کرنا ضروری ہے۔"

"بے شک، اس سے مشورہ کر لیجیے لیکن ادھر ادھر دیکھنے اور سوچنے سے آپ کی کیا مراد ہے؟ کسی راجے نواب کا تو انتظار نہیں ہے آپ کو؟"

"اب آپ سے کیا کہوں۔" تارا بیگم نے ٹھنڈی سانس بھری "اشارے تو کئی نوابوں نے کیے ہیں مگر صرف سونے چاندی کی بات نہیں ہوتی۔"

"نوابوں کے حال سے تو آپ ہم سے زیادہ واقف ہوں گی۔ بانو کو محل ضرور مل جائے گا، غالیچے، فانوس، باندیاں، شان و شوکت، پر وہ آرائش کی کوئی چیز بن جائے گی۔ بیگم تو شاید وہ نہ بن سکے۔ ہم آپ کو صاف بتا دیں، ہم اسے کسی محل حویلی وغیرہ میں نہیں لے جائیں گے، بس ایک عام سے گھر میں، مگر وہ گھر چاندنی بانو کا گھر ہوگا، اس کی حکمرانی ہوگی وہاں۔"

تارا بیگم پوری طرح متوجہ تھی، منتشر لہجے میں بولی "لیکن، لیکن آپ نے ابھی تک یہ نہیں فرمایا۔ آپ میں سے کون، کون بانو کا طلب گار ہے؟"

"کوئی بھی! اسے افشا کرنے کی ضرورت تو نہیں ہے، بہرحال ٹھیک ہے۔ آپ کی تسلی کے لیے کوئی مضائقہ بھی نہیں۔ ہم بنے خاں کے لیے چاندنی کو مانگ رہے ہیں۔"

بنے خاں نے آنکھیں بھینچ لیں اور زور سے میرا بازو پکڑ کر سر جھٹکنے لگا۔ میں نے اس کی پنڈلی دبا کے خاموش رہنے کی تلقین کی۔

"بنے خاں! استاد بنے خاں!" تارا بیگم حیرت سے بولی۔ "لیکن، لیکن یہ تو..."

تارا بیگم کے مزید کچھ کہنے سے پہلے میں نے جلدی سے کہا "بانو کے آجانے کے بعد بنے خاں کا اڈے سے واسطہ نہیں رہے گا۔"

تارا بیگم کی الجھی الجھی نظریں بنے خاں پر بکھری ہوئی تھیں۔

"اور کوئی پیچیدگی ہو تو بتائیے؟" اپنے لہجے میں برجستگی مجھے خود گراں گزری، سو میں نے توقف کیا اور نرمی سے کہا "بانو کی آئندہ زندگی کے لیے بطور مہر، بنے خاں ایک ایسی جائداد بھی لکھ سکتے ہیں جس کی معقول آمدنی مستقلاً بانو کی تحویل میں اور تصرف میں رہے اور کوئی بات؟" میں نے بانو بیگم سے پوچھا۔

"اللہ، یہ کیسی آزمائش ہے۔" تارا بیگم ناتوانی سے بولی "مجھے معلوم ہے، آپ بندی کا امتحان لے رہے ہیں۔ بندی نے بہت دکھ جھیلے ہیں سرکار!"

"ہمیں بھی اندازہ ہے لیکن یہ سمجھیے، اب دکھوں کے خاتمے کا دن آگیا ہے، سارے امتحان ختم ہوا چاہتے ہیں۔ جانتے ہیں، آپ کا تردد بہت فطری ہے۔ ہمارا مطالبہ، درخواست، کچھ بھی کہیے بہت اچانک ہے، اور ہمیں اس کا بھی احساس ہے کہ ہم کسی راج سنگھاسن سے نہیں، اڈے کی چوکی سے اٹھ کے آئے ہیں۔ نوابوں کو آپ نے بہت آزما لیا، اب کچھ گلی کوچوں والوں کا بھی تجربہ کر لیجیے۔ ہم کسی رعایت کے لیے آپ سے نہیں کہہ رہے، بیگم صاحبہ! آپ قیمت بتائیے۔"

تارا بیگم کی آنکھوں سے وحشت جھلکنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے میری بات پر یقین نہ ہو۔ کہنے لگی "آپ

انداز جتنا شاہانہ ہے اتنا بے رحمانہ بھی۔"

"صاف گوئی کو آپ بے رحمی سمجھتی ہیں تو جس طرح آپ بتائیں، ہم اسی طرح بات کریں۔ ہمیں ہرحال میں چاندنی بانو کو یہاں سے لے جانا ہے اور آپ کا حق ہے کہ آپ ہر طرح اطمینان کر لیں۔"

"کیا اطمینان اور کیسا اطمینان، میاں، تقدیر کے آگے ساری ضمانتیں دھری رہ جاتی ہیں۔" تارا بیگم کے لہجے میں بیزاری بھی تھی، بے رخی بھی۔ "عورتیں غریب تو تقدیر کے معاملے میں ویسے ہی ہوتی ہے اور کیا آقا، کیا غلام۔ کیا راجا، کیا پرجا، مرد تو سبھی ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اپنا تو یہی دیکھا ہوا ہے۔ دریا میں طغیانی آتی ہے اور گزر جاتی ہے۔ بنے خاں کا سمندر بھی کل اتر سکتا ہے۔"

"تو پھر باقی بانو کی تقدیر پر چھوڑ دیجیے۔ آدمی اپنی جیسی کرتا ہے، آنے والے کل کے بارے میں نہ آپ کچھ کہہ سکتی ہیں نہ ہم۔ یہاں بالا خانے پر چاندنی کو بٹھانے کے لیے آپ کل کے لیے یقین سے کیا کہہ سکتی ہیں۔ جس حد تک ہمارے امکان میں ہے، بانو کے تحفظ کے لیے ہم آپ سے کہہ ہی چکے ہیں۔"

تارا بیگم کش مکش میں پڑ گئی۔ دیر ہو گئی، وہ کچھ نہ بولی تو جمرو نے اکڑی ہوئی آواز میں کہا "اتنا سوچنے کو کیا ہے تارا بیگم! ایسے گاہک کدھر آتے ہیں۔ سمجھو، قسمت کی بات ہے۔ اب کیا اڑچن ہے۔ سارا کچھ ہم نے تم پر رکھا ہے۔ فٹا فٹ فیصلہ کرو، کھل کے بولو۔"

"کیا بولوں۔" تارا بیگم ہیجانی لہجے میں بولی "آپ ہی بتائیں۔"

"چیز تمہاری ہے، ہم تو گاہک ہیں۔"

"بندی کا دماغ ٹھکانے پر نہیں ہے۔"

"کیوں؟ ہم نے تو کھلی چھوٹ دی ہے تم کو۔" جمرو نے ناراضی سے کہا "بے فکری سے زبان کھولو۔"

تارا بیگم کے ہونٹ لرزنے لگے۔

"پھر بھی کچھ بولیں، پچاس ہزار، ایک لاکھ!"

"دو لاکھ۔" میں نے بہ عجلت اضافہ کیا۔

تارا بیگم نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

"یہ کیا، کیا ہو رہا ہے، نہیں نہیں۔" بنے خاں ہذیانی انداز میں بولا اور اٹھ جانے کے لیے مجھے جھنجھوڑنے لگا۔ میں نے آنکھ کے اشارے سے کسی رمز و کنایہ کا تاثر دیا اور بنے خاں سے چپ چاپ بیٹھے رہنے کو کہا۔ سب کچھ صاف تھا۔ بنے خاں جیسا شخص اس طرح کیسے مان جاتا۔ وہ بگڑنے لگا اور میرے بجائے اس نے جمرو سے تلخ و تند لہجے میں واپس چلنے کے لیے اصرار کیا۔ جمرو نے توجہ نہیں دی اور اپنی جگہ جما بیٹھا رہا تو بنے خاں خود اٹھ گیا۔ جمرو نے اس کی کلائی پر پنجہ ڈال کے ایک جھٹکے سے بٹھا لیا۔ اس سے پہلے کہ بنے خاں زیادہ مچلے اور بپھرے، جمرو نے اکھڑی ہوئی آواز میں کہا "تارا بیگم! کیا دو چار ہیں؟ اتنے دھن سے اپنی مانو تو کان بڑھا کے دانے گھماؤ، باقی پھر ہریالی ہے۔"

تارا بیگم نے جھرجھری سی لی۔

"اب کیا ہے؟" جمرو نے ترخ کے کہا۔

"کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں۔" تارا بیگم ہڑبڑا کر بولی۔

کل دو خون ہو گئے ہیں، آگے دو چار اور بھی لوٹ سکتے ہیں۔" جمرو نے منہ بگاڑ کے کہا "کیا سمجھتی ہو کل سے شہر میں ہلڑ مچا ہوا ہے۔ سارے میں آگ لگی ہے۔"

"معلوم ہے۔" تارا بیگم مایوسی سے بولی۔

"معلوم ہے تو پھر..."

"بانو سے بھی کچھ پوچھنا ہوگا۔"

"اس سے پوچھ کے بالا خانے میں بٹھایا ہے کیا؟"

"وہ میری بیٹی ہے۔"

"پھر ماں کی طرح سوچو، اپنا نوشہ بھی ہزاروں میں ایک ہے۔" جمرو نے بنے خاں کی ران پر ہاتھ مار کے کہا "پورا اصیل ہے۔"

"جانتی ہوں خدا نظر بد سے بچائے۔" تارا بیگم کے لہجے میں مصنوعی شیدائیت تھی "ہزاروں میں کیا، لاکھوں میں کہیے۔"

"پھر دیر کس بات کی ہے؟"

"اب ایسا تو نہیں ہوتا صاحب!"

"ہم لوگ اتنا نہیں سوچتے۔"

"لیکن یہ تو زندگی بھر کا معاملہ ہے۔"

"سوچ لو، لکشمی بار بار گھر نہیں آتی۔"

"کچھ وقت تو دیجیے۔"

"پھر وقت نکل نہ جائے۔"

میں نے جمرو کو روکا اور تارا بیگم سے پوچھا "کتنا وقت لیں گی آپ۔"

"بندی اس وقت کیا کہہ سکتی ہے۔"

"ہمیں کل یہاں سے چلے جانا ہے۔"

"اور کل کا بھاؤ پھر کل ہی دیکھیں گے۔" جمرو نے بھڑک کے کہا۔

"بندی ایک بات پوچھنے کی جسارت کرے۔" تارا بیگم

اٹک اٹک کے بولی "آپ کے خیال میں بندی کو بانو پر کتنا اختیار ہے۔"

"کیا مطلب؟" جمرو نے چونک کے کہا۔

"میرا مطلب ہے 'کتنا اختیار رہنا چاہیے۔" تارا بیگم نے وضاحت کی اور تیورا کے بولی "بندی کو انکار کا اختیار ہے نا؟"

"کیا گھما پھر کے بولتی ہو تارا بیگم! پھر تم سے اتنا سر مارنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"ہاں' آپ انکار کر سکتی ہیں۔" میں نے جمرو سے صبر و ضبط کی التجا کی اور تارا بیگم سے کہا "انکار کا کوئی جواب تو ہوگا۔"

"بتانا ضروری تو نہیں ہے سرکار!"

"لیکن وجہ جانے بغیر شاید ہم یہاں سے نہ جائیں۔" میں نے درشتی سے کہا۔

"کیا اتنا کافی نہیں کہ بندی ابھی بانو کو خود سے جدا کرنا نہیں چاہتی۔"

"ہاں' مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور میں نے جز بز ہو کے کہا "ٹھیک ہے' پھر ہم آپ کو مجبور نہیں کریں گے۔"

"نہیں تارا بیگم! ایسے نہیں' بالکل نہیں۔" جمرو جھینپتی آواز میں بولا "ہم جائیں گے' پھر کوئی اور بات ہے' تم ہم لوگوں سے سودا کرنا نہیں چاہتیں۔ تم کو بول دیویں کسی بھی طرح سے ہم آ سکتے تھے پھر بولی نہیں لگاتے اور طریقے بھی ہم کو آتے ہیں' سمجھیں!"

"جس لہجے میں آپ نے بات کی ہے' بس اسی تک رکھیے استاد!" تارا بیگم کی آواز میں برہمی کی لرزش نمایاں تھی۔

"تم بھی صاف بات نہیں کر رہی ہو' اس واسطے ایسا بولتے ہیں۔" جمرو نے بھر کے کہا "من میں کوئی تنکا ہو تو نکال باہر کرو تارا بیگم! ایک بات پر دھیان رکھنا۔ جو اتنی بڑی ڈھیر چلا رہا ہے وہ اس چیز کو بھی تم سے زیادہ سنبھال کے' سینت کے رکھے گا۔"

تارا بیگم سنتی رہی۔ ادھر بنے خاں مسلسل پیچ و تاب کھا رہا تھا "شہزادے بھی کچھ کہا چاہتے ہیں؟" تارا بیگم نے طنز آمیز لہجے میں بنے خاں کی طرف اشارہ کیا۔

"میں' میں کیا؟" بنے خاں بوکھلائے ہوئے انداز میں ہاتھ پھیلا کے رہ گیا اور خالی خالی نظروں سے میری اور جمرو کی شکلیں دیکھنے لگا۔

"استاد بنے کے بولنے کو اب کیا دھرا ہے تارا بیگم!"

جمرو نے زہریلی آواز میں کہا "بولی بڑھوانے کا خیال ہو تو صاف بول دیو۔ تم کو ہم سے زیادہ پتا ہے کہ اب نیلامی کا زمانہ نہیں ہے اور لکھنؤ کے راجوں نوابوں میں کتنا دم ہے۔ کوئی باپ دادا کی جاگیر کے پیچھے پڑا ہے تو ٹٹول لو۔ مل جائے تو ایک بار اس حاتم کی اولاد کا دیدار اپنے کو ضرور کروا دینا۔"

تارا بیگم بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔

جمرو کے اشارے پر ہم سب اٹھ گئے۔

تارا بیگم کو ہمارے اس طرح اٹھ جانے کی توقع نہیں تھی۔ وہ بے تاب ہو گئی "آپ' آپ جا رہے ہیں؟"

"جانا ہی ٹھیک ہے۔" دروازے کی طرف جاتے جاتے جمرو نے لوٹ کے کہا "اپنا بھیجا جلدی گھوم جاتا ہے۔"

"لیک' لیکن یہ کیا۔۔۔ نہ شربت نہ قہوہ' نہ۔۔۔ کم سے ایک گلوری تو۔۔۔!"

"آئیں گے پھر' دیکھو شاید جلدی۔" جمرو نے بھ[نّاتے] بھناتے ہوئے کہا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ زینے سے اترتے ہی بنے خاں ہم دونوں سے چمٹ گیا۔ اس کی سانسیں اکھڑی ہوئی تھیں۔ بری طرح وہ اپنا سر میرے سینے سے رگڑنے لگا۔ اوپر تارا بیگم کے بالا خانے دریچوں' چلمنوں سے ہم اوجھل نہیں ہوئے تھے۔ جمرو کسی طرح بنے کو سنبھالا اور اس کا بازو پکڑ کے تقریباً کھینچتا بالا خانے سے دور لے گیا۔ چند قدموں کا فاصلہ طے کر کے گلی سے نکل آئے۔ روشنیاں اور کم ہو گئی تھیں۔ کسی بالا خانے پر ابھی تک محفل جمی ہوئی تھی۔ اکا دکا دکانیں کھلی تھیں۔ بازار سے نکلتے ہی پان کی پہلی دکان پر زورا گیا اور تب سب کی نظریں بے اختیار بنے خاں کے چہرے جا اٹھیں۔ دکان کی تیز روشنی میں اس کے چہرے کی آگ نمایاں ہو گئی۔ زورا سے گدگدانے لگا۔ بنے خاں کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں' ہونٹ سسک رہے تھے۔ نے جانے کیا کہا تھا کہ بنے خاں بے تحاشا میرے سینے لگ کے ہڑکنے لگا۔ یہ محض ممنونیت کا اظہار نہیں تھا۔ اپنے احوال سے خود بھی واقف نہیں ہوتا۔ بنے خا[ں کی] وحشت یقیناً کسی گزشتنی کا غبار تھی۔ ہر آدمی فسانے پھرتا ہے' کبھی ایک تنکا' ہوا کا ایک جھونکا آبگینے گراں ہو جاتا ہے۔ پان والا بھی گنگ ہو گیا تھا۔ جمرو زورا' بنے خاں کو تھپکنے' تسلیاں دینے لگے۔ بہت مشکل انہوں نے اسے قابو میں کیا۔ تانگا قریب ہی کھڑا گلوریاں ساتھ لے کے ہم نے تیزی سے تانگے کا رخ اڈے پر رت جگے کا منظر تھا۔ رنگ برنگی جھنڈیاں

بازی

ساری گلی سجی ہوئی تھی۔ اڈے کی عمارت کی دیواروں اور منڈیروں پر چراغ روشن تھے۔ عمارت کے باہر اور اندر خاصی تعداد میں لوگ انتظامات میں مصروف تھے۔ "دیکھا استاد!" جمرو نے بنے خاں کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "ایسا میلا تو اپنے استاد بٹھل کے واں بھی نہیں ہوتا۔"

بنے خاں نے کوئی جواب نہیں دیا تو جمرو نے پچکارتے ہوئے کہا "بس ابھی سارا بھول کے راجا بن کے گدی پر سنبھالو۔ بعد کو ادھر کو دیکھیں گے۔ سنا ہے' کبن خاں کے بعد اڈے پر بہت الٹا سیدھا ہوا ہے۔ کئی حرام کے جنے ستانے لگے ہیں۔"

بنے خاں کی خاموشی پر جمرو نے اسے کہنی ماری "ایسا کیا استاد! بولتی سسری کیوں بند ہو گئی' اب ادھر سے لوٹ آؤ بھیا جی! دیکھنا' تارا بیگم کو آج نہیں تو کل بلانا ہے۔ ادھر کی بات ایک دم پکی سمجھو۔"

بہ دقت تمام بنے خاں نے پژمردگی سے کہا "نہیں جمرو بھائی! یہ تو اچھا ہی ہوا' اس نے منع کر دیا۔ میں تو۔۔۔ میں تو۔۔۔" اس کی آواز حلق میں پھنسنے لگی۔ کہنے لگا "بس اتنا' اتنا بہت ہے۔"

بنے خاں نے ایک نظر میری طرف دیکھا' کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ سکا' سر جھکائے ہوئے آگے چوکی کی طرف چلا گیا۔ شمشاد خاں اور بٹھل اڈے کے کئی آدمیوں کے ہجوم میں چوکی پر بیٹھے تھے۔ کچھ وقت ان کے ساتھ گزار کے ہم اوپر چلے آئے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی زورا اور جمرو نے مجھے دبوچ لیا اور میرے ہاتھ اور پیشانی چومنے لگے۔ وہ تو جیسے اس خلوت کے منتظر تھے۔ مجھے ان کی دیوانگی کا سبب معلوم تھا۔ ان کی شدت کم کرنے کے لیے یہی مناسب تھا کہ میں ان سے کسی ندامت اور انکسار کا اظہار نہ کروں۔ یہی ہوا۔ جلد ہی انہیں قرار آ گیا۔ ان سے نجات ملی تھی کہ کچھ ہی دیر میں بنے خاں کمرے میں آ گیا۔ دیوانگی کے آثار ابھی تک اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے تھے' میرے پاؤں پکڑ کے کہنے لگا کہ تارا بیگم کی طرف سے اقرار میں جواب آئے تو میں بے دریغ مسترد کر دوں۔ میں نے پوچھا "آخر کیوں؟" گھٹی گھٹی آواز میں بولا "یہ میری مرضی ہے۔"

میں نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم زبان دے کے آئے ہیں۔ بنے خاں کو یاد تھا کہ جمرو نے تارا بیگم پر اچھی طرح واضح کر دیا تھا' آج کی بولی آج پر ہے۔ کل کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ میں نے کہا۔ اگر تارا بیگم مان جاتی ہے تو آج اور کل سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ بات تو اصل میں جمرو نے تارا بیگم پر زور ڈالنے کے لیے کہی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ آدمی کی قیمت ہر رقم سے زیادہ ہوتی ہے۔ آدمی کا تو کوئی مول ہی نہیں ہوتا اور وہ تو چاندنی بانو ہے۔ اس رقم سے کوئی مصور یا بت تراش چاندنی بانو کا پیکر نہیں تراش سکتا۔ بنے خاں سنتا رہا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اسے محض رقم کی فکر ہے؟ وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کے بتائے' کیا چاندنی اسے مطلوب نہیں؟ یہ محض اتفاق ہے کہ اس کے بجائے میں بولی لگانے پر قادر ہوں۔ میں نے طرح طرح سے بنے خاں کا تکدر دور کرنے' اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس رقم کے چلے جانے سے میں قلاش نہیں ہو جاؤں گا اور مجھے یوں بھی روپے پیسے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ بنے خاں نے بہت پہلو بدلے' انگلیاں توڑتا' ہونٹ چباتا رہا۔ ادھر جمرو اور زورا نے دلیلیں تراشنی شروع کر دی تھیں۔ بنے خاں کشش و پنج کی حالت میں واپس چلا گیا۔

○☆○

صبح سب کی آنکھ دیر سے کھلی۔ ناشتے ہی کا وقت ملا' پھر بنے خاں کی چوکی پر بیٹھنے کی رسم ادا کرنے کا سمے آ پہنچا۔ ہم تینوں نیچے آئے۔ عمارت میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ ہر سو شور گونج رہا تھا۔ سامنے چوکی کے ایک طرف مٹھائی اور پھولوں کی ٹوکریاں رکھی تھیں۔ لوبان اور اگربتیوں کی خوشبو ساری عمارت میں بسی ہوئی تھی۔ چوکی پر شمشاد خاں اور بٹھل کے درمیان چکن کے سفید کرتے' پاجامے' عنابی واسکٹ میں ملبوس بنے خاں' سر پہ گیروے رنگ کا صافہ باندھے بیٹھا تھا' گلے میں سونے کی زنجیر' کان میں دریا' ہاتھ میں چاندی کا کڑا' کمر کے گرد منقش چرمی پیٹی' برات کے دولہا جیسا' صرف شیروانی کی کسر تھی۔ چہرے پر ابھی تک آگ دہک رہی تھی۔ ہمیں دیکھ کے کچھ مضطرب ہو گیا۔ ہمارے پہنچنے کی دیر تھی کہ شمشاد خاں نے بٹھل سے جلدی کی درخواست کی۔ سورج خوب چڑھ چکا تھا' زوال کے بعد لکھنؤ میں چوکی نشینی کی رسم معیوب سمجھی جاتی تھی۔

بٹھل کے سامنے رکھی ہوئی کوری ہانڈی میں دودھ بھرا تھا' ہانڈی کے اطراف دو عدد کلھڑ رکھے تھے۔ ہانڈی سے دودھ لوٹ کے بٹھل کو پہلے شمشاد خاں کی طرف کلھڑ بڑھانا تھا' پھر شاید ایک گھونٹ بھر کے بنے خاں کے سپرد کر دینا تھا۔ ایک دو گھونٹ پی کے بنے خاں کو کلھڑ کا دودھ ہانڈی میں لوٹ دینا تھا پھر ہانڈی کا دودھ مختلف جگہوں پر رکھے ہوئے شربت سے بھرے بڑے بڑے برتنوں میں شامل کیا جاتا تھا۔ یہ شربت سارے مجمع میں تقسیم ہونا تھا لیکن شربت کی تقسیم سے پہلے

بنے خاں کو اپنا چاقو شمشاد خاں کے پیروں پر رکھنا تھا' جواب میں شمشاد خاں کو اپنا چاقو بنے خاں کے حوالے کرنا تھا۔ سلگتے ہوئے لوبان کے برتن میں لوہے کی ایک سلاخ بھی نظر آرہی تھی۔ ممکن تھا کہ اس جلتی ہوئی سلاخ سے بنے خاں کے بازو یا گردن پر داغ ڈالا جائے۔ شمشاد خاں اور بٹھل کو اپنے خون سے بنے خاں کو تلک لگانے کی رسم بھی انجام دینی تھی۔ اس کے جواب میں بنے خاں کو کوئی نس کھول کر اپنا خون لوبان کے برتن میں ٹپکانا تھا۔ مختلف جگہوں پر چوکی سنبھالنے کی اپنی اپنی رسمیں ہوتی تھیں۔ بکروں کا صدقہ' لنگ' امام ضامن وغیرہ۔ کسی جگہ اڈے کے ہر آدمی کی طرف سے چوکی کے دادا کی خدمت میں نقدی کے علاوہ خون کی نذر بھی پیش کی جاتی تھی۔ لکھنؤ کی بات تو ویسے بھی جداگانہ تھی۔ مجھے کچھ زیادہ علم نہیں تھا کہ یہاں اور کیا کیا رسمیں ادا کی جاتی ہیں۔

عمارت میں خاموشی چھاگئی تھی۔ بٹھل نے ہانڈی سے دودھ لوٹ کے کلھڑ شمشاد خاں کی طرف بڑھایا' شمشاد خاں نے ایک گھونٹ بھر کے بٹھل کو واپس کردیا۔ بٹھل نے بھی گھونٹ بھر دودھ پیا اور کلھڑ بنے خاں کے سپرد کیا ہی چاہتا تھا کہ اس کا ہاتھ ٹھہر گیا۔ اسی دم دائیں طرف' چوکی سے کوئی دس قدم کے فاصلے پر ایک پستہ قد' کٹے پھٹے چہرے کے آدمی نے کھڑے ہوکے بلند آواز میں بٹھل اور شمشاد خاں کو مخاطب کیا اور انہیں یاد دلایا کہ وہ ایک اہم رسم کی ادائی سے کوتائی کررہے ہیں۔ انہیں عمارت میں موجود لوگوں سے پوچھنا چاہیے کہ کوئی دوسرا تو اڈے کی چوکی کا طلب گار نہیں ہے؟

یکایک ہر طرف شور مچنے لگا۔ شمشاد خاں بھڑک اٹھا۔ "کیا' کیا! کیسی بات کرتا ہے خنزیر کی اولاد! کیا تو' تو چوکی پر آنا چاہتا ہے؟ تجھ کو.... تجھ کو...." شمشاد خاں کے جملے پر عمارت میں قہقہے گونجنے لگے۔

وہ شخص نہیں بیٹھا' کسی قدر کھسیا کر بولا "میں تو ریت کی بات کرتا ہوں استاد!"

شمشاد خاں کی گالی گفتاری عمارت میں اٹھنے والے شور میں گم ہوگئی۔

بٹھل نے ہاتھ اٹھا کے سب کو خاموش کیا اور اونچی آواز میں کہا "ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔ ابھی کوئی بنے خاں کی جگہ اڈے کی چوکی واسطے اپنے آپ کو آگے کرتا ہے تو بول دے۔"

شمشاد خاں کی ناراضگی اس لمحے پراگندگی اور حیرانی سے دو چار ہوئی جب ٹوکنے والے آدمی کے قریب بیٹھا ہوا سانولی رنگت اوسط قد' سجل دست' وبازو کا ایک پختہ کار نوجوان کھڑا ہوا' سب کی نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئیں' عمارت میں سناٹا ہوگیا "تو' تو اپنا رجن!" شمشاد خاں پھیلی ہوئی آنکھوں سے بولا "کیا بات ہے؟ اب تجھ کو بھی مستی سوجھی ہے؟"

بٹھل نے مسکراتے ہوئے شمشاد خاں کو تسلی سے بیٹھے رہنے کو کہا اور رجن نامی نوجوان سے پوچھا "تو ادھری بیٹھنا چاہتا ہے رے۔"

رجن نے کچھ کہنے کے بجائے سرہلانے پر اکتفا کیا۔ اس کا سینہ آگے کو نکلا ہوا تھا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں گہری چمک تھی۔

"ٹھیک ہے۔" چند لمحوں کے سکوت کے بعد بٹھل نے آہستگی سے کہا اور بنے خاں کو اٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

"اچھی طرح سوچ لے رجن! بولتا ہوں' اندر جاکے ایک بار شیشہ دیکھ لے۔" شمشاد خاں کی آواز میں بہت تلخی تھی۔ "یہ مسخری بہت مہنگی پڑے گی تجھ کو ایمان سے۔"

رجن نے شمشاد خاں کی بات سنی ان سنی کردی۔ شمشاد خاں سے برداشت نہیں ہوا' مشتعل ہوکے بولا "کیا منہ سوکھ گیا تھا تیرا' یا نشہ کرکے آیا ہے۔"

بٹھل نے آنکھوں آنکھوں میں شمشاد خاں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اب اس غیظ و غضب سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔"

رجن سر اٹھائے' سینہ پھلائے کھڑا رہا۔

بٹھل کے حکم پر چوکی کے سامنے کا حصہ خالی کردیا گیا۔ جگہ پہلے ہی بہت تنگ تھی۔ لوگوں کے پیچھے ہٹنے سے ابتری سی ہوگئی لیکن جلد ہی سکون ہوگیا۔ بنے خاں نے صافہ اتار دیا اور کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر اپنا چاقو اچھالتا ہوا خالی ہونے والے دائرے میں آگیا اور دوسری جانب سے رجن بھی آکے بنے خاں کے مقابل کھڑا ہوگیا۔

عمارت میں سب ہی کی سانسیں جیسے رک گئی تھیں۔ شمشاد خاں چوکی کے کنارے پر آگیا۔ وہ مسلسل زیرلب پھنکار رہا تھا۔ بٹھل بھی اپنی جگہ سے اٹھ کے شمشاد خاں کے برابر بیٹھ گیا۔

بنے خاں کی تقلید میں رجن نے بھی اپنا چاقو بٹھل کے آگے کردیا۔ بٹھل نے دونوں چاقو ایک نظر دیکھے اور پہلے رجن کی طرف پھر بنے خاں کی طرف اچھال دیے۔ دونوں نے چابک دستی سے چاقو اچک لیے۔

"بولتا ہوں مان جا' گیدڑ والی بات نہ ہوجائے سالے۔" شمشاد خاں نے دہاڑتے ہوئے رجن کو تنبیہہ کی۔

رجن کی بے اعتنائی پر شمشاد خاں تلملا کے رہ گیا۔

بنے خاں اور رجن نے روایتی انداز میں دائرے کا ایک چکر پورا کیا اور دونوں نے ٹھہر کے خوں بار نظروں سے ایک دوسرے کا جائزہ لیا۔ رجن ہاتھ ملانا چاہتا تھا لیکن بنے خاں نے توجہ نہیں دی اور چاقو لہراتا ہوا دو قدم آگے بڑھ گیا۔ ...س کی چستی سے میری طرح جمرو اور زورا کو بھی اطمینان ہوا ...وگا۔ رجن نے بنے خاں کے مقابلے میں احتیاط کا ثبوت دیا ...لکہ کسی حد تک جھجک کا۔ بنے خاں آہستہ آہستہ فاصلہ کم کرتا ...وا اس کے قریب پہنچ گیا اور اس نے آناً فاناً ایک ہاتھ سے ...وسرے ہاتھ میں چاقو بدل کے اپنی برتری کی دھاک بٹھانا ...اہی۔ رجن اس کے پھیلے ہوئے بازوؤں کے نرغے سے پہلو ...با کے دوسری طرف ہوگیا۔ بنے خاں نے بھی پیش قدمی ...اری رکھی اور دوبارہ گھیرا تنگ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ ...جن غالباً یہی چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ بنے خاں اردگرد ...ں کے پیچھے ہٹنے کے لیے کوئی جگہ نہ چھوڑے اور دائیں ...یں نکلنے کی کوئی گنجائش نہ رہے' اس نے اپنی گزشتہ روش ...ک کی اور پھرتی سے اچھل کے بنے خاں سے مڈبھیڑ کی ...ان لی۔

دونوں کے درمیان بہت کم فاصلہ رہ گیا تھا۔ بنے خاں نے غلط اندازہ لگایا تھا' اس کا خیال تھا کہ رجن کو وہ اور پیچھے ...م کی طرف لے جائے گا۔ رجن کے اس اچانک اقدام کا ...یہ بنے خاں کے لیے مہلک ہوسکتا تھا۔ وہ اتنی جلدی الٹے ...موں پیچھے نہیں ہوسکتا تھا حالانکہ اس کے عقب میں دائرہ ...لی پڑا تھا۔ بس بنے خاں کا دماغ ایک سو تھا' یکایک وہ بیٹھ ...یا۔ اب اسے بڑی تن دہی سے کام لینا تھا' اس کے ہاتھ ...ن کی ٹانگوں کی طرف بڑھے' ٹانگیں گرفت میں آجانے کی ...رت میں رجن کا توازن بگڑ جانا لازم تھا۔ اسے مجمع کی ...ب پیٹھ کے بل گرنا چاہیے تھا مگر رجن کو جیسے اس اندیشے ...احساس تھا۔ اس نے حواس مجتمع رکھے اور جست کے ...از میں بیٹھے ہوئے بنے خاں کا جسم پھلانگ لیا۔ اپنی ...نک میں وہ گرتے گرتے بچا اور آگے ہی بڑھتا گیا۔ اگر ...یں رک کے اور پلٹ کے بنے خاں پر وار کرنے کا ارادہ ...کے سر میں سما جاتا تو اسے مہلت نہ ملتی کیوں کہ اس اثنا ...بنے خاں کھڑا ہوچکا تھا اور اس کا رخ رجن کی طرف تھا۔ ...بنے خاں نے بس ایک لمحے کا توقف کیا ہوگا کہ بجلی کے ...پھر اسی طرف بڑھا۔ رجن بھی پر تول چکا تھا۔ دائرہ اتنا بڑا نہیں تھا۔ دونوں کو دو بہ دو ہونے میں چشم زدن کا عرصہ لگا لیکن قریب آکے کوئی داؤ آزمانے کے بجائے رجن پھر جھکائی دے کے نکل گیا۔ کئی بار اس نے یہی کیا' سامنے ہوکر ایک دم کسی جانب نکل جاتا۔ اس صورت حال سے دیکھنے والوں کا یہی تاثر ہونا چاہیے تھا کہ رجن پر اپنی کم تری کا کوئی احساس غالب ہے' اس نے نادانی میں بنے خاں سے نبرد آزمائی کا دعوا کردیا ہے۔ ہوسکتا ہے' بعض لوگ اسے بنے خاں اور رجن کی ادلی بدلی ملی بھگت بھی سمجھ رہے ہوں۔ یہ بدگمانی بہرحال زیادہ دیر قائم رہنے والی نہیں تھی۔ ابھی تک یہی کہا جاسکتا تھا کہ رجن سامنے کے داؤ سے پہلوتہی کررہا ہے اور کسی ایک موقع کی تلاش میں ہے اور بنے خاں کو مشتعل کرکے اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے یا اسے بنے خاں کی کسی کم زوری کا علم ہے۔ اسے اپنی استقامت کی کوئی خوش فہمی ہے اور وہ بنے خاں کو پہلے خوب تھکا دینا چاہتا ہے۔ اس طوالت سے رجن کو ایک اور فائدہ بھی تھا کہ چشم دیدگاں شاہد رہیں' اس نے یہ معرکہ کسی فریب سے سر نہیں کیا ہے' مقابلہ تو اس ناتواں نے خوب کیا ہے۔ اس طوالت میں بنے خاں کی توہین کا پہلو بھی مضمر تھا۔

عمارت میں گاہے بہ گاہے بے چینی کی گھن گھناہٹ ہوتی اور خاموشی چھاجاتی۔ بنے خاں کی پیشانی پر رجن کی اس آنکھ مچولی سے شکنیں پڑنے لگی تھیں۔ اسے تبھی رجن کے کس بل سے اچھی طرح واقف ہونا چاہیے تھا۔ دونوں ایک ہی اڈے سے وابستہ تھے' عمر میں بھی کوئی ایسا فرق نہیں تھا۔ کبن خاں اور شمشاد خاں کی تربیت سے رجن نے بھی استفادہ کیا ہوگا۔ یہ کلیہ بنے خاں کو اچھی طرح ذہن نشین ہوگا کہ ناپختہ کار مقابل پر ذرا سی رعایت واجب نہیں اور دو فریقوں میں ایک کو فتح ہوتی ہے' دوسرے کو شکست۔ دونوں کے پاس چاقو تھا۔ ہتھیار سمیت زور اور سادے زور میں فرق ہے۔ ہتھیار کبھی کبھی بہک بھی جاتا ہے۔ ذرا سی کوتاہی ہوجائے تو بس! ضروری نہیں کہ ازالے کا وقت مل جائے۔

رجن کی پھرتی کسی طور پر بنے خاں سے کم نہیں تھی۔ وہ بنے خاں کو ادھر سے ادھر گھماتا رہا۔ بنے خاں نے ہر بار ہوش مندی کی۔ اسے معلوم ہوگا کہ حریف کسی بھی لمحے ارادہ بدل سکتا ہے اور یہی ہوا۔ رجن نے سامنے آکے کسی طرف نکل جانے کا تماشا نہیں کیا بلکہ جھکی دے کے بنے خاں کے چاقو والے ہاتھ کی کلائی پر پنجہ ڈالنے کی کوشش کی۔ وہ اچانک جھپٹ پڑا تھا۔ بنے خاں نے زیادہ مزاحمت نہیں کی اور اپنی کلائی رجن کے پنجے میں آسانی سے تھمادی جیسے جان

بوجھ کے۔ رجن کو اندازہ تھا کہ جواباً بنے خاں اس کے چاقو والے ہاتھ پر پنجہ ڈالنے کے لیے مضطرب ہوگا۔ چنانچہ جسم ترچھا کر کے اس نے چاقو والا ہاتھ دوسری طرف پھیلا لیا۔ ایک ہاتھ مخالف سمت پھیلا کے دوسرے ہاتھ سے مقابل کا چاقو والا ہاتھ قبضے میں رکھنے کے لیے بڑی مشاقی اور زور کی ضرورت پڑتی ہے۔ رجن کے پنجے میں جیسے ہی بنے خاں کی کلائی آئی' وہ کلائی کو جھٹکا دینے کے لیے زمین سے اچھل گیا' دوسری جانب بنے خاں نے اسی وقت اپنا دوسرا ہاتھ رجن کے قریب کیا۔ یہ ایک اضطراری اقدام بھی تھا لیکن اس کا ارادہ رجن کے چاقو والے ہاتھ پر قبضہ کرنے کا نہیں تھا۔ رجن کا پھیلا ہوا ہاتھ اس کی پہنچ سے دور تھا۔ اس کے لیے اسے تیزی سے گھوم جانا چاہیے تھا۔ وہ یہ بھی کر سکتا تھا کہ اپنا ہاتھ رجن کے پنجے سے چھڑانے کی کوشش میں کھینچا تانی جاری رکھے اور ساتھ ہی چکر کھانے شروع کر دے۔ فریق وہیں گھبرا جاتا ہے جب جواب اس کی توقع کے برعکس ہو۔ رجن ادھر بنے خاں کی کھینچا تانی سے اس کی کلائی... پر اپنے پنجے کی گرفت اور مضبوط کرتا' ادھر اپنا چاقو والا ہاتھ بنے خاں کی دسترس سے بچانے کے لیے بنے خاں کے ساتھ گھومتا رہتا اور یا تو کسی ناگہانی کے اندیشے میں بنے خاں کا ہاتھ آزاد کر دیتا یا دوسرے تیسرے چکر میں اچانک ٹھہر کے اپنا چاقو والا ہاتھ آگے کر دیتا دوسرے لفظوں میں گھومتے گھومتے دفعتاً بنے خاں سے بھڑ جاتا۔ بنے خاں نے کچھ اور ہی سوچ رکھا تھا۔ اس نے گھوم کے رجن کا چاقو والا ہاتھ قبضے میں لینے کی کوشش نہیں کی بلکہ اپنی جگہ کھڑے کھڑے رجن کی ٹھوڑی کو نشانہ بنایا۔ رجن سے ایک لمحے کی تاخیر ہو گئی۔ اس کے اچھلتے ہی بنے خاں نے اس کی تھوڑی پر ضرب لگائی۔ عجلت میں ضرب پھسلتی ہوئی لگی۔ رجن نے بنے خاں کا ارادہ بھانپ کے فوراً ہی اس کی کلائی چھوڑ دی اور بنے خاں کے سامنے اپنا چاقو والا ہاتھ لہرایا۔ بنے خاں کو اس افتاد کی وجہ سے قدم بھر پیچھے ہٹنا پڑا۔ ضرب سے رجن کا توازن بگڑ سکتا تھا لیکن وہ فاصلہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ دونوں دوبارہ دور جا کھڑے ہوئے۔

بنے خاں نے اب اتنی جلدی نہیں کی۔ ابتدا میں تیزی کا مطلب مقابل کو دباؤ میں رکھنا ہوتا ہے۔ بنے خاں کی سرخ روئی اسی میں تھی کہ وہ جلد از جلد یہ معاملہ نمٹا دے۔ رجن کو اتنی نہیں ہوگی جتنی بنے خاں کو اپنی عزت کی فکر ہوگی۔ ابتدا میں تیزی کا سبب غم و غصہ بھی ہوگا۔ عین وقت پر یہ رخنہ اندازی بڑی نازیبا تھی۔ شمشاد خاں اور اڈے کے بہت سے لوگوں کے سان و گمان میں نہ ہوگا کہ ان کے اڈے کا ایک آدمی اس طرح چوکی کی دعوے داری کے لیے اٹھ کھڑا ہوگا۔ اڈوں پر عموماً ایسا ہوتا نہیں۔ دو دن سے انتظامات ہو رہے تھے۔ لوگ ہمارے آنے سے پہلے بھی یہی سمجھتے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ شمشاد خاں' کبن خاں مرحوم کی جانشینی کے لیے بنے خاں کو تیار کر رہا ہے۔ تیاری صرف بل کی نہیں ہوتی۔ بل بے شک بہت بنیادی چیز ہے لیکن اصل بل تو دماغ کا ہوتا ہے۔ دماغ متناسب نہ ہو تو دست و بازو کی طاقت میں بھی آدمی کو کھرا ہونا چاہیے۔ لوگوں کو قابو میں رکھنے' مشکل وقت پر مناسب فیصلے کرنے اور اڈے پر بل اور ہتھیار کی تربیت کا کام آسان نہیں ہوتا۔ اثر و رسوخ' سب کا خیال ہوتا ہے۔ کبن خاں کے بعد شمشاد خاں اسی لیے اڈے پر آ کے بیٹھا تھا۔ اب اگر اڈے کے برگزیدہ استاد کی خواہش یہی تھی اور بات طے ہو چکی تھی تو اڈے کے تمام لوگوں کو اس کا احترام کرنا چاہیے تھا۔ کم سے کم کچھ عرصے کے لیے بنے خاں کے جوہر آزمانے میں کوئی ہرج نہیں تھا۔ نا اہل استاد ویسے بھی کتنی دیر تک برقرار رہ سکتا ہے۔

اڈے کے کئی آدمی بل میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کے ہو سکتے ہیں مگر چوکی پر سبھی تو نہیں بیٹھ سکتے۔ باقی سال زدہ والے ایک مرتبہ کسی کو چوکی پر بٹھا کے اسی کو واجب عزت سمجھتے ہیں۔ آج کا ناپختہ کار آدمی محنت اور جستجو اور زور آزمائی کی مسلسل مشق سے کل کسی لائق ہو سکتا ہے تو کیا اسے سینہ پھلا کے چوکی کا دعوے دار ہو جانا چاہیے۔ ممکن ہے' اڈے کے چند لوگ بنے خاں کو ناپسند کرتے ہوں اور اس کی جگہ رجن کو چوکی پر دیکھنے کے طلب گار ہوں لیکن ظاہر ہے' انہیں اس خواہش کے اظہار کے لیے کسی نے روکا تو نہیں ہوگا۔ ان کی خاموشی رضامندی کے مترادف تھی۔ رجن اور اس کے چند ہم نواؤں کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے تھی کہ اڈے کے بیشتر آدمی ذہنی طور پر بنے خاں کو چوکی کا مختار سمجھ چکے ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو چوکی نشینی کی رسم میں یہ میلا ٹھیلا اور دھوم دھڑکا نظر نہ آتا۔ رجن کو عوام پر نظر رکھنی چاہیے تھی۔ بنے خاں کو زیر کرنے کی صورت میں وہ اڈے کا دادا تو بن جائے گا لیکن اتنے آدمیوں کی ناپسندیدگی کے ماحول میں وہ چوکی پر کس طرح اطمینان سے [illegible] سکتا ہے۔

شمشاد خاں کی آنکھوں میں شعلے بھرے تھے۔ اتنی دیر میں رجن نے اپنی چابک دستی اور چستی کا مظاہرہ خوب کیا تھا۔ اس کا طور طریق بڑی حد تک دفاعی مگر سوجھ بوجھ کی علامت تھا۔ شمشاد خاں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ رجن کے لیے آخری درجے کا کوئی فیصلہ کیوں کر سنائے۔ بٹھل' حقے کی نے ہونٹوں میں دبائے ساکت بیٹھا تھا۔ دائرے میں بنے خاں اور رجن ایک دوسرے کو زچ کرنے کے لیے مختلف داؤ آزما رہے تھے اور کسی کو اب تک کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ دونوں بہت محتاط تھے۔ احتیاط تو ایک لازمہ ہے مگر حد سے زیادہ کوئی چیز بھی شاید اچھی نہیں ہوتی' عمارت میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی بے چینی بڑھنے لگی تھی۔ جمرو اور زورا کے چہرے بھی سوج گئے تھے۔ بنے خاں نے پھر جرات کی۔ وہ دائرے کے وسط میں بت کے مانند کھڑا ہو گیا۔

عمارت میں ایک غلغلہ بلند ہوا۔ دوسری جانب رجن کے پھڑکتے' تھرکتے ہوئے پاؤں بھی رک گئے۔ اس نے چند لمحے خاموشی سے بنے خاں کے تیور کا جائزہ لیا۔ یہ ایک نہایت مشکل مرحلہ تھا۔ اسے جلد از جلد کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ بنے خاں کے دونوں ہاتھ بھی دستبرداری کے انداز میں لٹکے ہوئے تھے۔ رجن موقع سے فائدہ اٹھا کے ایک دو جست میں بنے خاں کے سر پہ پہنچ سکتا تھا۔ اس نے توقف کیا اور تحمل سے ایک قدم بڑھایا پھر آہستہ آہستہ دبے پاؤں اس نے اپنے اور بنے خاں کے درمیان کا مختصر فاصلہ طے کیا۔ بنے خاں نے اسے پاس آنے دیا۔ قریب آ کے گز بھر کی دوری پر رجن ٹھہر گیا۔ دونوں لمحوں تک ایک دوسرے سے آنکھیں چار کیے بے حرکت کھڑے رہے۔ کسی ایک کو پہل کرنی تھی۔ معاً بنے خاں نے جنبش کی اور اپنا چاقو والا ہاتھ رجن کی طرف پھیلا دیا۔ بنے خاں کے ہاتھ اٹھانے میں لپک نہیں تھی۔ رجن فوراً نہیں سمجھ پایا کہ بنے خاں کی جانب سے اپنا ہاتھ گرفت میں دینے کی پیشکش رضاکارانہ ہے۔ اس نے بجا طور پر اسے بنے خاں کا کوئی حیلہ سمجھ کے خود کو بچاتے ہوئے اپنا چاقو والا ہاتھ بنے خاں پر جھپٹایا۔ بنے خاں ہر طرح تیار تھا۔ اپنا جسم دور رکھے رکھے وہ آہستگی سے کسی قدر ترچھا ہو گیا اور اس نے سبھی کو حیران کر دیا جب اچانک فرش پر گر کے اس نے پوری طاقت سے رجن کے پیر اپنے پیروں سے نشانہ بنائے۔ رجن نے بھی ابتدا میں اسی قسم کا سلوک کیا تھا۔ رجن کے پیر فرش سے اکھڑ گئے اور وہ متزلزل ہو گیا۔ ایسی حالت میں اڈے کے کسی بھی آدمی کا ردعمل یہی ہوتا کہ پہلے تو وہ زمین پر قدم جمانے کی تگ و دو کرے اور جسم کا زاویہ بدل کے ممکن ہو تو جواب میں فرش پر گرے ہوئے مقابل پر چاقو تان لے۔ بنے خاں نے کچھ سوچ کے ہی یہ خطرہ مول لیا تھا۔ گرنے کے بعد اس نے فوراً اٹھ جانے کے لیے خود کو آمادہ کر رکھا تھا۔ رجن نے قدم ڈگمگا جانے کی بدحواسی میں جیسے ہی چاقو والا ہاتھ بنے خاں کے جسم پر جھکایا' بنے خاں نے جھٹ کروٹ بدل لی اور نشانے سے ہٹ کے اتنی تیزی سے اٹھا کہ رجن کی کلائی اس کے پنجے میں تھی۔

عمارت میں پھر شور بلند ہوا۔ سبھی نتیجے کے منتظر تھے اور گنتی کے چند لوگوں کو چھوڑ کے سبھی بنے خاں کی کامیابی کے متمنی تھے۔ لگتا تھا' بنے خاں کی نگاہیں رجن کے چاقو کی نوک سے بندھی ہوئی ہیں۔ اس نے پہلے کروٹ بدل کے اپنا رخ بدلا اور سامنے کے بجائے بائیں جانب سے پنجہ ڈالا۔ بنے خاں نے صرف ایک کروٹ پر اکتفا کیا' دوسری اس کے لیے مہلک بھی ہو سکتی تھی۔ یہ وقت رجن کے لیے سخت آزمائش کا تھا۔ اسے تمام تر قوت سے اپنا جسم پیچھے ہٹانا چاہیے تھا۔ یوں تو بنے خاں آدھا اٹھ چکا تھا' باقی آدھا وہ رجن کے پکڑے جانے والے ہاتھ کے زور پہ اٹھا۔ ایسے پیچیدہ داؤ پیچ کے لیے بہت تجربہ چاہیے۔ تجربہ تو خیر ہر قدم' ہر مرحلے پر شرط ہے۔ پہلے رجن بے توازن ہوا تھا' دوسرے اپنا ہاتھ گرفت میں چلے جانے سے وہ بوکھلا گیا۔ یہ موقع بنے خاں کے لیے بالادستی کا تھا۔ کسی داؤ کے نتیجے میں متعدد صورتیں ذہن میں رکھنی پڑتی ہیں' پے در پے پینترے' آدمی کو بجلی بننا پڑتا ہے۔ اٹھتے ہی بنے خاں کو چاقو والے ہاتھ سے رجن کو مزید منتشر کرنا چاہیے تھا۔ اس کا یہی ارادہ ہوگا مگر رجن کے لیے جیسے زندگی کا یہ آخری معرکہ تھا۔ ایک لمحے کا حجاب مقابل کے عزم تازہ کا سبب بن جاتا ہے۔ جیسے ہی بنے خاں اپنے پیروں پر استوار ہوا' رجن ایک جھٹکے سے زمین پر بیٹھ گیا اور بیٹھتے ہی اس نے پیر پھیلا دیے اور مصرع طرح' پر پھڑکتی ہوئی گرہ لگانے کے مانند بنے خاں کا داؤ اسی پر لوٹانے کی کوشش کی یعنی بنے خاں کی ٹانگوں پر پیر مارنے کی۔ رجن کے لیے یہی ایک بہتر صورت تھی تاہم بنے خاں نے صبر و ضبط کا ثبوت دیا اور رجن کی کلائی پر اپنے پنجے کی گرفت بھرنے کی ضد نہیں کی۔ ضد کے لیے سو معرکوں کا خمار لازم ہے' بنے خاں نے اسی دم رجن کی کلائی چھوڑ دی اور پلک جھپکتے میں اس سے دور ہو گیا۔ پیچھے ہٹ کے کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر بنے خاں کو آندھی کی طرح بڑھنا اور رجن کو اٹھنے کا وقت نہیں دینا تھا۔ رجن کو بھی اپنی نسبتاً کمزور صورت حال کا احساس تھا' سو وہ فرش سے اٹھا ہی نہیں' گیند کی مانند لڑھکتا ہوا اپنی جگہ سے دور ہوتا گیا۔ جتنی دیر میں بنے خاں اس تک پہنچے' ایک محفوظ فاصلے پر جا کے وہ یک لخت اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں کی پیشانیوں سے پسینہ ٹپک رہا تھا۔ دور کھڑے کھڑے انہوں

نے سانسوں کی ہمواری کا وقفہ کیا اور بنے خاں نے پیش قدمی کے بجائے رجن کو بڑھنے کا اشارہ کیا۔ رجن نے بھی دیر نہیں کی اور چاقو گھماتا ہوا دوبارہ اپنی جگہ سے بڑھا اور کچھ آگے آکے اس نے ہاتھ میں دبا ہوا چاقو جھٹک دیا۔ چاقو گرنے کی آواز کے ساتھ عمارت میں حیرت آمیز سسکیاں سی گونجیں رجن کے دونوں ہاتھ اب خالی تھے۔ استغنا کے اس اظہار سے مقابل پر اپنا غلبہ و اثر جمانا مقصود ہوتا ہے' یہ ایک آزمودہ حربہ ہے مگر ہر دفعہ کارگر نہیں ہوتا۔ رجن کی یہ بے جگری اس کے اعتماد کا مظہر تھی تو ذہنی پراگندگی کی غماز بھی تھی۔ اس کا ایک ہی معقول جواب تھا۔ بنے خاں نے وہی کیا جو اڈے سے متعلق کسی بھی کج کلاہ استاد کا شیوہ ہو سکتا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک لہر نمودار ہوئی اور اس نے بھی کسی لٹنٹنے کے بغیر اپنا چاقو ترک کر دیا۔

پھر تو دونوں ایسی شدت سے ایک دوسرے کی جانب اڈے جیسے ٹکرا کے پاش پاش ہو جائیں گے۔ آمنے سامنے آکے انہوں نے طرح دی اور ایک دوسرے کے شانوں پر شانوں سے ضربیں لگائیں۔ دونوں ہی لڑکھڑا گئے اور گرتے گرتے بچے۔ تیز رفتاری سے آمنے سامنے ایک دم طرح دینا اور ضرب لگانا آسان بھی نہیں تھا۔ مقصد میں ناکامی پر پلٹ کے وہ بازوؤں کا زور لگانے لگے' اور بنے خاں نے اچھل کے رجن کے پیٹ میں گھٹنا مارنا چاہا۔ لگتا تھا' دونوں پاگل ہو گئے ہیں۔ مکوں سے' گھٹنوں سے ضربیں' پسلیوں سے ترچھے ہتڑ' گردن توڑ دینے' پیر کچل دینے اور اٹھا کر پٹخ دینے کی کوششیں۔ دونوں ایک دوسرے سے گتھے ہوئے فرش پر آئے۔ کچھ دیر کے لیے تو وہ پہلوؤں یا سڑک پر لڑنے والے دشمنوں کی طرح ایک دوسرے پر ٹوٹتے رہے۔ یہ اکھاڑا نہیں تھا نہ ہی کسی گلی کے چوک میں وہ دست و گریباں تھے۔ اڈے کے آدمی اپنے زور' ہنر مندی' خصوصاً چاقو پر گرفت سے برتری کا فیصلہ کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا۔ دونوں کہ کہنیاں چھل گئی تھیں اور کپڑے پھٹ گئے تھے' اس سے پہلے کہ انہیں ٹوکنے کے لیے بٹھل اور شمشاد خاں کی آواز بلند ہو' انہیں خود ہی ہوش آگیا کہ وہ وقت ضائع کر رہے ہیں' یہ اڈے کی روایت سے اجتناب ہے اور اس طرح انہیں کچھ حاصل نہیں ہو رہا۔ مشکل یہ تھی کہ کسی ایک کی جانب سے گرفت کمزور کرنے پر اسی کو ضرر پہنچنے کا احتمال تھا مگر بنے خاں نے حوصلہ کیا۔ اس نے رجن کی گردن سے بازو ہٹائے تو موقع غنیمت جان کے رجن بھی اڑنے سے باز رہا۔

دونوں بے حال ہو گئے تھے۔ ایک دوسرے کے تسلط سے نجات پاتے ہی پہلے رجن کھڑا ہوا پھر بنے خاں۔ رجن نے مجمع میں بیٹھے ہوئے اپنے کسی حمایتی کی طرف نگاہ اٹھائی تھی کہ ایک چاقو ہوا میں لہرایا۔ جسم کو ایک ذرا خم دے کے رجن نے یہ چاقو اچک لیا اور پھلکے کو بوسہ دیا۔ بنے خاں سوچتا رہا اور اس نے پہلی بار استفہامی تیور سے شمشاد خاں اور بٹھل کو دیکھا اور اس کی مضطرب نظریں ہم تینوں پر مرکوز ہو گئیں لائیں۔ ہم نے آنکھوں آنکھوں میں اسے عزم و ہمت تلقین کی۔ شمشاد خاں کی طرف سے کوئی تائیدی اشارہ ہوگا کہ بنے خاں نے جھک کر اپنا چاقو فرش سے اٹھالیا۔

اب تک کا حاصل اتنا تھا کہ مجموعی طور پر بنے خاں بھاری رہا تھا مگر پاسنگ بھر' رجن نے زیادہ تر احتیاط ہوشیاری کی تھی۔ ایک قدم بڑھ کے کترا جانا اور روا روی روکتے کوئی شوشہ طرازی کر کے بنے خاں کو مشتعل کر اشتعال میں لغزش کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ وہ ایک عجیب شخص معلوم ہوتا تھا' سفلہ بھی۔ اس چلتر پن سے مقابل بہت بیزاری ہوتی ہے اور غصہ آنے لگتا ہے۔ غصہ بجائے خود ایک قوت ہے مگر زہر بھی ہے اور یہ زہر دوسرے کے جتنا کاری ہو سکتا ہے' اتنا ہی اپنے لیے بھی ہوتا ہے' بیزار کے غصے میں آدمی سے کوئی بھی الٹا سیدھا قدم اٹھ سکتا۔ ادھر اپنا دفاع کرتے رہنا بھی معمولی بات نہیں۔ بل کے دفاع بھی ناممکن ہے۔ یوں سب سے آخری دفاع تو شکست آمادگی ہے۔ کسی مجمع ہی میں رجن نے اتنا بڑا دعوا کیا ہو بنے خاں نے اب تک اسے کوئی موقع نہیں دیا تھا تو مایوس بھی نظر نہیں آتا تھا۔ اسے کوئی اطمینان تھا کہ ہمیشہ بہت دور اور بہت قریب ہوتا ہے۔ بہت دیر ہو گئی اور اس سے یہ مراد تھی کہ کسی کے حق میں بھی فیصلہ ہے۔ جو لوگ بنے خاں سے امیدیں وابستہ کیے ہوئے ان کا اضطراب اور فزوں ہو گیا تھا۔ بہرحال کسی کے بس کچھ نہیں تھا' سب کچھ آنے والے لمحوں کے پٹارے مقید تھا۔ دونوں طرف سے ابھی تک کوئی ایسا داؤ نہیں گیا تھا جس کا جواب دفاع میں نہ ہوتا۔ شاید شروع ہی رجن اور بنے خاں نے ایک دوسرے کو سمجھنے میں غلط تھی۔

بنے خاں نے پہلے اپنا حلیہ درست کیا۔ بالوں انگلیاں پھیریں' لباس کی شکنیں ٹھیک کیں' گریباں ہو گیا تھا' دامن کھینچ کے اسے ہموار کیا۔ اس کے اطوار ایسا لگ رہا تھا جیسے اب اسے کوئی جلدی نہیں ہے۔ یہ اچھی علامت تھی۔ رجن خوں بار نظروں سے اسے

رہا۔ بنے خاں کے حرکت کرنے پر اس نے بھی اپنی جگہ سے جنبش کی۔ بنے خاں نے اچانک رفتار پکڑ کے فاصلہ کم کیا۔ ظاہر ہے' یہ دیکھ کر رجن کو دائیں بائیں ہو جانا تھا پھر دونوں نے دائرے میں نہایت تیز رفتاری سے چکر کاٹنے شروع کر دیے۔ ان کے چاقو والے ہاتھ متوازی تھے۔ دو تین چکروں کے بعد یکایک درمیان میں رخ بدل بدل کے وہ ایک دوسرے پر جھپٹنے لگے۔ کسی سے بھی پہلو بچانے میں ذرا سی چوک ہو جاتی تو چاقو اس کے کولھے اور پسلیاں کاٹ دیتا۔ اس داؤ میں بے پناہ چستی اور چابک دستی کی ضرورت ہوتی ہے' اور اصرار جاری رہے تو یہ کسی فیصلے ہی پر ختم ہوتا ہے۔ دونوں تھکے ہوئے تھے لیکن ان پر جنون طاری تھا۔ بنے خاں نے ابتدا کی۔ رجن کو بھی اپنا چاقو والا ہاتھ سیدھا یا متوازی رکھنا تھا۔ ایک دوسرے کے قریب آکے بھی انہوں نے ایک محفوظ دوری قائم رکھی۔

اس تکرار میں بنے خاں سے وہ کوتاہی ہو گئی جس کا رجن دیر سے منتظر تھا۔ اس لغزش کی پاداش واجب تھی۔ فرش پر بنے خاں کا پیر رپٹا یا اپنی جھونک میں اس کے پیر جمے نہ رہ سکے۔ اس دوران وہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جلدی جلدی چاقو بھی منتقل کرتے رہے۔ یہ شغل مقابل سے ایک فاصلہ ہونے ہی پر مناسب ہوتا ہے۔ رجن کا سامنے کیا ہوا چاقو بردار ہاتھ بنے خاں کی پسلیوں کے نزدیک آیا تو بنے خاں نے لمحے بھر پہلے چاقو دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا تھا۔ وہ اتنے آگے ہو چکا تھا کہ طرح دینا' پہلو بچانا اور بیٹھ جانا اس کے لیے ممکن نہ رہا۔ یہی ایک راستہ رہ گیا تھا کہ ادھر ادھر ہونے کے بجائے وہ رجن کا بڑھا ہوا ہاتھ پسلیوں اور بازو کے بیچ داب لے۔ یہ جکڑ اتنی مضبوط ہونی چاہیے کہ مقابل کسی طرح اپنا ہاتھ کھینچ نہ پائے۔ پسلیوں کی جکڑن بازو کی پکڑ کے مقابلے میں آدھی ہوتی ہے چنانچہ بہت احتیاط' بہت قدرت کی ضرورت پڑتی ہے۔ مقابل کی طرف سے ہاتھ کھینچ لینے میں کامیابی کا مطلب صاف ہے' چاقو بازو یا پسلیاں کاٹتا ہوا گزر جاتا۔ بنے خاں کو اس حقیقت کا اچھی طرح علم ہوگا کہ اس نے خود کو ایک خطرناک حالت سے دو چار کر لیا ہے۔ رجن کا ہاتھ اس نے جکڑ لیا تھا۔ یہ نازک گرفت مضبوط کرنے کے لیے اسے اپنا ہاتھ موڑ کے گرہ لگانا تھا اور بیک وقت' بیک وقت کئی کام کرنے تھے' اپنے جسم کو جھٹکا دینے اور اپنے کھلے ہوئے چاقو بردار ہاتھ سے رجن کو نشانہ بنانا تھا۔ کیونکہ اب رجن کا جسم بھی اس کی رسائی سے دور نہیں تھا مگر بنے خاں دسترس سے دور ہو چکا تھا۔ پہلے تو اپنے آپ کو قبضے میں رکھنا ہوتا ہے۔ اپنے آپ پر مستقل نگاہ یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ کچھ دیر' کم از کم اتنی دیر کے لیے جب تک مقابل سے نبرد آزمائی ہو' خود کو ایک ہی منظر سے' سامنے کے منظر سے باندھ کے رکھنا پڑتا ہے۔ رجن تو بس بنے خاں کی ایک گم رہی' گم گشتگی کی تاک میں تھا اور اسے آنے والے لمحے کی بے اعتباری کا خوب احساس تھا۔ سو اس نے موجود لمحہ ہی ستاروں کی مہربانی جانا اور کوئی بھول' کوئی نادانی نہیں کی۔ بنے خاں نے ادھر پسلیوں اور بازو کے درمیان اس کا چاقو والا ہاتھ جکڑا' ادھر رجن نے بندر کی طرح اچھل کود شروع کر دی۔ پسلیاں اور بازو بچانے کی فکر نے بنے خاں کو سرگرداں کیا۔ اس کا ارادہ ڈگمگا گیا۔ اس کے بازو اور پسلیوں کی گرفت سے باہر رجن کا ہاتھ انگلیوں میں دبے ہوئے چاقو کی حرکت میں آزاد تھا۔ رجن اپنا چاقو گھما سکتا تھا۔ اس کے چاقو کی نوک بنے خاں کی کمر یا پسلیوں میں چبھی تھی یا بنے خاں پر اس ضرر کا اندیشہ غالب آگیا تھا کہ وہ حواس کا تناسب برقرار نہ رکھ سکا۔ غالباً بنے خاں نے ساری توجہ رجن کا ہاتھ جکڑنے پر مرکوز رکھی۔ اپنے کھلے ہوئے چاقو بردار ہاتھ کی طرف سے غفلت یا بے پروائی اسے مہنگی پڑنی چاہیے تھی۔ رجن نے بنے خاں کے چاقو والے ہاتھ پر پنجہ ڈال کے اسے اور دگرگوں کیا۔ بنے خاں کا کھلا ہوا ہاتھ رجن کے تصرف میں جانا آخری کیل ٹھکنے کے مصداق ہوا۔ اتنی ہنر مندی اور کرشمہ سازی نہیں تھی' یہ محض رجن کی مستعدی کا ثمر تھا کہ ہیجان و اضطراب سے دو چار بنے خاں کے ہاتھ میں چاقو قائم نہ رہ سکا۔

شمشاد خاں نے اپنا منہ چھپالیا۔ رجن کا ہاتھ ابھی تک بنے خاں نے جکڑ رکھا تھا۔ ایک پل کی تاخیر ہو گئی۔ ایک پل کی تاخیر کبھی پہاڑ کے مساوی ہوتی ہے۔ دوسرے ہی لمحے ایک تیز جھٹکے سے رجن کے ہاتھ سے بھی چاقو گر گیا تھا مگر سبھی گواہ تھے کہ کون اپنے چاقو سے پہلے دستبردار ہوا ہے۔ عمارت میں موت جیسا سناٹا چھایا ہوا تھا پھر لگا جیسے کسی نے ساری دیواریں ہٹا دیں' سارے روزن کھول دیے۔ ایسا شور و غوغا ہوا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ دیکھتے دیکھتے دائرہ تنگ ہو گیا۔ چاروں طرف سے ہجوم امڈ پڑا تھا۔ سبھی اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ شمشاد خاں اور اڈے کے معمر' با اثر آدمیوں کی تنبیہ و تلقین سے لوگ کسی حد تک پرسکون ہوئے۔ دائرے کے وسط میں' ہجوم کے درمیان گھرے ہوئے' بت کے مانند فرش پر ایستادہ بنے خاں کی بس ایک جھلک دکھائی دی تھی' پھر وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ رجن کے ساتھیوں نے رجن کو کندھوں پر اٹھالیا تھا اور

تحسین و آفریں کے نعروں سے عمارت گونج رہی تھی۔ رجن سب کو سر جھکا جھکا کے سلام کررہا تھا۔ لوگ کندھوں پر اٹھائے اٹھائے اسے چوکی کے پاس لے آئے۔

شمشاد خاں کی آنکھوں میں دہکتی آگ اس کے زرد چہرے پر اور نمایاں ہوگئی تھی۔ بٹھل نے اس کا بازو تھام کے ایک طرح اس کی لگام کھینچے رکھی۔ چوکی پر بیٹھے ہوئے اور لوگوں کا حال بھی شمشاد خاں کی کیفیت سے مختلف نہیں تھا۔ ہم تینوں چوکی سے اتنی دور نہیں تھے' جمرو کے کھسک جانے پر کچھ اور قریب ہوگئے۔ اب وہاں بیٹھا نہیں جارہا تھا۔ رہ رہ کے بنے خاں کا خیال آتا۔ وہ یقیناً عمارت کے اندرونی حصے یا بالائی منزل کی طرف چلا گیا ہوگا۔ اسے اس وقت گداز کی بڑی ضرورت تھی۔ میری طرح زورا بھی اس کے پاس جانے کے لیے بے کل تھا۔ جمرو نے ہم دونوں کو اٹھنے نہیں دیا۔ ویسے بھی اتنے لوگوں کو پھلانگ کے بنے خاں تک پہنچنا آسان نہیں تھا۔

رجن کو چوکی کے نزدیک اتار کے اس کے ساتھیوں نے پھر نعرے لگانے شروع کردیے۔ رجن کو بنے خاں کی جگہ بٹھایا گیا۔ کسی شخص نے چوکی پر چڑھ کے پھولوں کا ہار اس کے گلے میں ڈال دیا۔ کسی نے بلائیں لیں اور پیشانی کو بوسہ دیا۔ اس کے ساتھی وفورِ مسرت سے دیوانے ہورہے تھے' انہیں کوئی احساس نہیں تھا کہ چوکی پر اور اطراف میں بیٹھے ہوئے بے شمار لوگوں کو ان کی نخوت آمیز مستی گراں گزر رہی ہوگی۔ چوکی پر موجود ایک سن رسیدہ شخص نے رجن کے سر پہ صافہ باندھ دیا۔ رجن کا چہرہ دمک رہا تھا' لرزتے ہونٹ' پھڑکتے ہوئے نتھنے۔ بار بار وہ سر گھما کے اِدھر اُدھر دیکھتا تھا۔

بٹھل نے دیر نہیں لگائی۔ دودھ سے کلھڑ بھر کے اس نے رجن سے گھونٹ لینے کو کہا۔ شمشاد خاں نے بظاہر بردباری کا ثبوت دیا مگر اس کے تیور بتا رہے تھے کہ اسے اب چوکی سے اٹھ جانے کی جلدی ہے۔ رسموں کی ادائی کا آغاز ہوا تو بہت سے لوگ اٹھ کے عمارت سے باہر چلے گئے۔ پیچھے دروازے کی طرف سے کسی کے سسکنے کی آواز آئی تھی۔ سب نے پیچھے مڑ کے اس شخص کو دیکھنا چاہا مگر اسے فوراً باہر لے گئے۔ بٹھل کی ترغیب پر رجن نے چاقو شمشاد خاں کے قدموں میں رکھ دیا۔ شمشاد خاں کی آنکھیں بھینچ گئیں تاہم جواباً اس نے بھی خاموشی سے اپنا چاقو رجن کے آگے بڑھا دیا۔

ابھی کئی رسمیں باقی تھیں۔ میرے جسم میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ دماغ بہت الجھا ہوا' دل بہت گھبرا رہا تھا۔ یہی اچھا تھا کہ ہم وہاں سے اٹھ جاتے' یہ سب کچھ تو نہ دیکھنا پڑتا۔ یکایک جیسے کسی نے مجھے ٹوکا' میں سیدھا نہ بیٹھا رہ۔ میری سوالیہ نظریں بٹھل کی جانب گئیں۔ وہ اپنے کام مصروف تھا۔ میں نے جمرو سے کچھ کہنا چاہا مگر اس سے کہے بغیر اٹھ کھڑا ہوا۔

جمرو اور زورا نے میری پنڈلیاں جکڑ لیں "کیا بات لاڈلے؟" جمرو نے بے تابی سے پوچھا۔

سبھی کی نگاہوں کا ہدف میں بن گیا تھا۔ شمشاد خاں بٹھل کو میری طرف متوجہ کیا۔ ایک لمحے کے لیے بٹھل پیشانی پر لکیریں کھنچ گئیں' پھر اس نے سر کو ہلکی سی دے کے دھمکتی آواز میں پوچھا "کیا' کیا ہے رے؟"

"استاد!" میں نے جھجکتے ہوئے کہا "تم نے کے وقت پوچھا تھا کہ کوئی اور تو اڈے کی چوکی کا طلب نہیں ہے؟"

شمشاد خاں کی حالت اضطراری ہوگئی "ہاں ہار تھا۔" بٹھل کے بجائے وہ پٹ پٹاتی پلکوں سے بولا۔

"ابھی کوئی اور رستم کا جنا ہے ادھری؟" بٹھل آواز سے پوچھا۔

"ہاں استاد!" میں نے سانس بھر کے کہا "ہو کوئی۔"

ہر جانب کھلبلی مچ گئی۔ لوگ اٹھ اٹھ کے مجھ لگے۔ رجن کی آنکھیں بھی پھیل گئیں۔

"کون' کون ہے وہ؟" شمشاد خاں مضطرب ہو کے جواب میں میرے تامل پر بٹھل نے کسی قدر سے پوچھا "تو' تو ادھری بیٹھنا چاہتا ہے؟"

بٹھل نے پہلے شمشاد خاں کی طرف پھر رجن دیکھا۔ رجن کے چہرے پر جسم کا سارا خون سمٹ آیا کی شعلہ بار نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں "کیا بولتے بٹھل نے متردد لہجے میں شمشاد خاں سے پوچھا۔

"ہم' ہم کیا بولیں۔" شمشاد خاں تذبذب

"اپنے کہنے کو کیا ہے۔ ٹھیک ہے' سولہ آنے ٹھیک۔ بھائی!"

عمارت میں دائیں سمت بیٹھا ہوا بھاری تن ایک شخص اٹھا اور چیخ کر بولا "ایسا کیسے استاد! بھائی کا نہیں ہے۔"

"کیا! کیا کہا تو نے؟" شمشاد خاں بھڑک کے پیچھے کا سوچ کر زبان ہلایا کر بنسی۔ یہ کدھر لکھا ہے باڑے کا جانور ہی چوکی پر آئے گا۔ کبن سیتا پور باڑہ

ن پور کا ہوں۔ بنے' ٹھیک ہے یہیں پیدا ہوا تھا پر یہ رجن' ن استاد!" شمشاد خاں کی آواز میں تلخی بھری ہوئی تھی۔ ں کی نال بھی تو لکھنؤ میں گڑی ہوئی نہیں ہے۔ باتیں کرتا سرا! تھوڑی دیر میں بولے گا' خاندان بھی جان عالم پیا کا نا چاہیے۔"

ہر سو سرگوشیاں بھنبھنانے لگیں۔

"اور ادھر کلکتے میں استادوں کا استاد اپنا بٹھل بھائی ن سا کلکتیا ہے۔ اڈے کی چوکی بازو پہ چلتی ہے راجا!" شاد خاں نے بازو دکھا کے کولہ روبنسی نامی شخص سے کہا ی اور میں راج گدی پر بیٹھنے کو ایسے ہی کیڑا کلبلاتا ہے تو ی کھڑا ہوجائے۔"

"مگر رجن استاد کو ابھی سامنا نہیں کرنا چاہیے۔" ل نرمی سے بولا۔

"کیوں' کیوں' میں اس کو بھی دیکھ لیتا ہوں۔" رجن نے خ کے کہا "یہ تمہارا پٹھا ہے نا استاد بٹھل؟"

"پر سامنے میں نہیں آرہا تیرے۔"

"تم بھی آجاؤ' حسرت نکال لو۔"

"ابھی تیری حالت ٹھکانے پر نہیں ہے رے۔"

"ہائیں!" شمشاد خاں اپنا سینہ کوٹنے لگا "استاد بٹھل آگے ایسا بولتا ہے مردار! کم نصیبے! دماغ لوٹ گیا ہے تیرا؟ لگتا ہوں' کھال میں رہ' کھال میں رہ۔"

"استاد بٹھل کیا خاص اوپر سے بھیجا گیا ہے۔" رجن چیخ کے کہا۔

"زبان کو لگام دے رجن! حرام کی اولاد۔" شمشاد خاں رکے بولا "آگے ایک بات بھی منہ سے نکلی تو زبان گدی الگ کردوں گا۔ استاد بٹھل اپنے مہمان ہیں سور کے مہمان!"

"ہاں ہاں' بڑے نمک حلال مہمان۔"

شمشاد خاں نے اٹھ کے رجن کے گریبان پر ہاتھ ڈالنا بٹھل آڑے آگیا۔ ایک ثانیے ٹھہر کے اس نے رجن لہا "زیادہ کیوں بولتا ہے بادشاہ سلامت! اپنے کو بتا' کب نے آنا چاہتا ہے؟"

"جب تم بولو مہاراج!" رجن بگڑی ہوئی آواز میں بولا تو کہتے ہیں' ابھی کیوں نہیں' جو ہونا ہے سالا' ابھی دودھ ھ' پانی کا پانی ہوجائے۔"

"نئیں رے' اتنی جلدی نہیں۔" بٹھل نے آہستگی ما "دو تین دن ذرا پٹھوں کی مالش کروا لے۔ بہت اچھل ا ہے تو نے۔"

ی گمز 6

"ہاں' بعد میں مت بولنا کہ استاد بٹھل اور شمشاد خاں نے الٹی چھری چلائی تھی۔" شمشاد خاں پھڑکتی آواز میں بولا۔ "تم کو ہمارا چوکی پر بیٹھنا پسند نہیں ہے استاد تو صاف بول دو۔"

"ابھی کچھ بولنے کا تو نے کدھر کو رکھا ہے خاں بہادر!"

طنز' غصہ' یاسیت' شمشاد خاں کا لہجہ ساری آلائشوں سے لبریز تھا۔ کہنے لگا "اور چوکی کی کیا بات کرتا ہے بھتنیا کے۔ چوکی کسی کی میراث نہیں ہوتی۔ جیسا تو بنے کے وقت مرکھنے بیل کی طرح بیچ میں آگیا تھا' ویسا کوئی اور بھی آسکتا ہے۔"

"اگلے جمعے کے دن میں بہت دیری ہے استاد!" بٹھل نے کھردری' اچٹتی آواز میں رجن سے کہا "اس ٹائم تک اپنے کو ٹھہرنا نہیں ہے۔ ایک دو دن کی بات الگ ہے۔ اس بیچ کوئی فیصلہ کرلو اور اپنی چھٹی کرو۔ تخت پر چاہے تم جمعے کے دن براجمان ہوجانا۔"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے بٹھل بھائی! سچ میں اپنا جی بہت بھاری ہے' خواہ مخواہ تمہارا رستہ کھوٹا کیا۔ پر اب زیادہ نہیں' بس دو ایک دن اور۔" شمشاد خاں التجائی انداز میں بولا اور اس نے خشمگیں نظروں سے رجن کو گھورتے ہوئے پوچھا "بول رے' پھر کیا وچار ہے تیرا؟"

"اپنا کیا وچار۔" رجن نے منہ ٹیڑھا کر کے جواب دیا "جیسا تم بولو' ہم تو ابھی تیار ہیں۔ ہاتھ پیر سارے سلامت ہیں اپنے۔"

بٹھل نے ہاتھ اٹھا کے کہا "کل سویرے کا بول دیں پھر؟ ہاتھ پیر کھولنے اور پانی دیکھنے کو پورا دن پڑا ہے۔ باقی تو ٹھیک ہی بولتا ہے۔ اوپر سے نیچے تک سارا بندھا ہوا ہے۔"

"جمعے کا دن کوئی اوپر کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ پرانے وقت سے چلتا آرہا ہے' اس واسطے سب مانتے ہیں۔" شمشاد خاں تیکھے لہجے میں بولا۔ "پر اس کو کل ہی تاج پہنادیں گے۔"

شمشاد خاں کی ہدایت پر پہلوان طرز کا ایک بزرگ شخص کھڑا ہوگیا اور اس نے مختصراً بلند آواز میں اعلان کیا کل صبح رجن استاد اور بابر استاد کے درمیان چوکی نشینی کا فیصلہ ہوجائے گا۔

اعلان کرنے والا آدمی خاموش ہوا تو رجن جلی ہوئی آواز میں بولا "اور کوئی ادھر ادھر چھپا ہو' نقارہ پٹوا دو۔ دنیا بہت بڑی ہے' مل جائیں گے بہت سے تیس مار خاں۔ ایک ساتھ سب کو سامنے کردینا۔"

شمشاد خاں کے تن بدن میں آگ بھڑکی' بٹھل نے بڑی

مشکل سے اسے سنبھالا۔

دوپہر ہوگئی تھی۔ کھانا کب کا تیار تھا۔ اڈے کے آدمیوں نے دسترخوان بچھا دیے لیکن عمارت میں نفری بہت کم رہ گئی تھی۔ بہت سے لوگ پہلے ہی چلے گئے تھے۔ کچھ اور لوگ بھی کھانا کھائے بغیر باہر نکل گئے۔ موت کے کھانے پر اسی طرح کی خاموشی ہوتی ہے۔ بنے خاں عمارت میں موجود نہیں تھا۔ اس کی تلاش میں ہم تینوں بھی باہر آگئے۔ گلی میں ایک اژدھام تھا اور طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ کئی آدمیوں نے میرے گرد گھیرا ڈال دیا۔ وہ عزم اور حوصلے کی تلقین کے علاوہ میری سرخروئی کی دعائیں کرنے لگے۔ انہی سے معلوم ہوا کہ بنے خاں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ اسی وقت کہیں چلا گیا تھا جب اس کے ہاتھ سے چاقو گر جانے پر عمارت میں واویلا ہوا تھا اور لوگ بے قابو ہوگئے تھے۔ کسی کو بھی بنے خاں کی خبر نہیں تھی۔

آغا پیا کی رہنمائی میں شام تک ہم بنے خاں کی ٹوہ میں مارے مارے پھرتے رہے۔ جانے وہ کون سی کھوہ میں جا چھپا تھا۔ شام کو ہم اڈے واپس آئے تو شمشاد خاں بہت فکر مند دکھائی دیتا تھا۔ اس نے بھی کئی آدمیوں کو مختلف سمتوں میں ..ا تھا۔

جمرو اور زورا، سلمیٰ کی وجہ سے بے چین ہو رہے تھے۔ کل پہلے پہر کے بعد سے اب تک ہمارا اس کے پاس جانا نہیں ہوا تھا۔ اڈے پر کچھ دیر ٹھہر کے ہم شمشاد خاں کے بھائی عزیز خاں کے گھر چلے آئے۔ یہاں سلمیٰ بھی واقعی کچھ کم مضطرب نہیں تھی۔ مطلوب صورتیں بھی کیسی باد بہاری ہوتی ہیں۔ ہمیں دیکھ کے اس کا چہرہ چمکنے لگا۔ زورا اور جمرو اس کے لیے موتیا کے گجرے لے گئے تھے، میزبانوں کے لیے مٹھائی کی ٹوکری بھی۔ جمرو نے عزیز خاں کے گھر والوں سے معذرت کی کہ ہماری روانگی میں دو ایک دن کی تاخیر ہوگئی ہے مگر وہ تو جیسے اس حادثے کے آرزو مند تھے۔ خوش چہرگی پر خوش شعاری مستزاد ہے اور لوگ کہتے ہیں، خوش شعاری اصل میں ہوش مندی ہے۔ دو دن میں سلمیٰ نے کیسا جادو کر دیا تھا کہ سبھی اس کے گرویدہ نظر آتے تھے۔ کل اور آج انہوں نے اسے لکھنؤ کی خوب سیر کرائی تھی۔ عزیز خاں کے گھر والوں کو اڈے سے وابستہ آدمیوں اور سلمیٰ کے تعلق کی نوعیت بوجھنے کی جستجو یقیناً ہوگی۔ ہم سے تو وہ کچھ پوچھ نہیں سکتے تھے۔ ہو سکتا ہے، انہوں نے سلمیٰ سے سن گن لینے کی کوشش کی ہو یا کسی ناگفتنی کے خیال سے وہ محتاط ہی رہے ہوں۔ بہرحال سلمیٰ کو بھی بات کرنے کا سلیقہ تھا۔

عزیز خاں کے ہاں خاطر مدارات میں ہم اتنے بے... تھے کہ رات کو کھانا کھایا ہی نہیں گیا۔ حالانکہ شمشا... نے ہمارے انتظار میں سب کو روکا ہوا تھا۔ اڈے پر بہ... لوگ موجود تھے لیکن ایک ویرانی سی چھائی ہوئی تھی۔ ویرانی تو دل سے ہوتی ہے۔ رات کے کھانے کے بعد سرود کی محفل کا اہتمام کیا تھا۔ تماشا گر واپس چلے گ... دیواروں کے سروں اور منڈیروں پر ابھی تک چراغ ... سے رکھے تھے لیکن روشنی کے بغیر۔ روشنی نہ ہو تو چ... ٹھیکرے ہیں، نابینا آنکھوں کے مانند۔ بنے خاں کی ... سے شمشاد خاں بہت متوحش تھا۔ لوگوں نے بتایا کہ ... کا زیادہ وقت اڈے پر ہی گزرتا تھا اور اپنی بڑی بہن ... بھی اس کا آنا جانا مستقل رہتا تھا۔ آغا پیا ہمیں وہاں ... گیا تھا۔ بنے خاں نے تاکید کی ہوگی، بہن کے گھر دا... سراغ لگا لیا۔ وقفے وقفے بعد اڈے کے آدمیوں کی ... بہن کو فکر لاحق ہوئی ہوگی چنانچہ اسے زبان کھولن... اڈے سے نکل کے بنے خاں سیدھا بہن کے گھر ... کچھ اسباب سمیٹ کے اور یہ بتا کے کہ وہ کچھ عرصے ... لکھنؤ سے باہر جا رہا ہے، وہ فوراً بہن کے گھر سے ... ہوگیا تھا۔ اگر ہم اس کے تعاقب میں اسی وقت ... ہو جاتے، جب اسے ہجوم کی افراتفری میں خاموشی ... جانے کا موقع مل گیا تھا تو کہیں نہ کہیں اس کا ... ہو جاتا۔ رجن سے تو ہم بعد میں بھی نمٹ سکتے تھے۔ ... کو اپنی ہزیمت کی توقع نہیں تھی۔ شکست تو بڑ... سورماؤں کو ہو جاتی ہے۔ اڈے کے آدمی کو اتنا شیشہ ... ہونا چاہیے۔ رات گئے ایک آدمی نے بتایا کہ غروب ... کے وقت بنے خاں کو چار باغ اسٹیشن کے نزدیک ... نے دیکھا تھا۔ لوگ اپنی اپنی بولیاں بولتے رہے کہ ا... جگہ فلاں مقام پر دیکھا گیا ہے۔ کسی نے خود اسے ... تھا۔ بہن کے گھر سے معلومات اور چار باغ اسٹیشن ... خاں کی موجودگی کی اطلاع سے یہی قیاس کیا جا سکتا ... اب لکھنؤ میں نہیں ہے۔ جتنا وقت گزرتا جا رہا ... خاں کے چہرے پر چھایا ہوا دھواں گہرا ہوتا جا رہا تھ... محض بٹھل کی وجہ سے چوکی پر بیٹھا وضع نبھا رہا ... بھی اڈا چھوڑ کے نکل گیا ہوتا۔ بنے خاں کے دو ... سازدوست بھی لازماً اسی کے ساتھ تھے۔ وہ بھی ا... نہیں آئے تھے۔ کاش بنے خاں کچھ دیر اور ٹھہر... کہاں معلوم ہوا ہوگا کہ رجن نے ابھی چوکی ... ہے۔ ابھی اسے کل صبح میری دیوار راستے سے ہٹا... :ا

اڈے سے اپنے جانے کے بعد کے واقعات کی بھنک بھی بنے خاں کے کانوں تک پہنچ جاتی تو وہ ارادہ بدل دیتا اور شہر بدری کا یہ انتہائی قدم نہ اٹھا پاتا۔ لکھنؤ کے لوگ اپنے شہر کے ویسے بھی بڑے شیدائی ہیں، کسی اور جگہ ان کا جی کم ہی لگتا ہے۔

ہم اوپر اپنے کمرے میں جانے کے لیے اٹھا ہی چاہتے تھے کہ اڈے کے ایک آدمی نے آکے سرگوشیانہ انداز میں مجھے بتایا کہ مبارک میاں نامی کوئی شخص مجھ سے ملنے کے لیے ...جازت کا خواہاں ہے۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔ اس نام کا تو کیا، لکھنؤ میں کسی نام کا میرا کوئی واقف کار نہیں تھا۔ جمرو اور زورا نے مشورہ دیا کہ اندر بلانے کے بجائے باہر چل کے ہی ...سے دیکھا جائے۔ اندر شمشاد خاں، بٹھل اور اڈے کے ...دوسرے لوگ بھی موجود تھے۔ دروازہ عبور کرنے سے پہلے ...مرو نے تارا بیگم کے فرستادے کا شبہ ظاہر کر دیا تھا اور وہ وہی ...ا، تارا بیگم کا سازندہ۔ اس نے مودبانہ سلام کیا اور نیچے تلے لہجے میں بولا "تارا بیگم کل کسی وقت غریب خانے پر ...سرکار کی منتظر رہیں گی۔ کوئی مصروفیت درپیش ہو تو پرسوں ...ہی۔ بڑی نوازش ہوگی، اگر پہلے اطلاع مل جائے۔"

میں نے جمرو کی طرف دیکھا اور اسی نے جواب دیا کہ ...یک ہے، آنے سے پہلے ہرکارہ بھیج دیں گے۔

جمرو نے بند مٹھی سے مبارک میاں کے ہاتھ میں کچھ ...زی منتقل کر دی۔ مبارک میاں نے بھی شمار نہیں کی، جیب ...ں رکھ کے سر خم کیا اور واپس چلا گیا۔

قاصد کے چلے جانے پر ہم تینوں وہیں کھڑے ایک ...سرے کو دیکھا کیے پھر جمرو ہنکارا بھر کے بولا "کیا خیال ہے ...ڈلے؟"

"کیا کہا جا سکتا ہے۔" میں نے کھوئی ہوئی آواز میں کہا ...ب تارا بیگم کے راضی ہونے نہ ہونے سے کیا حاصل۔"

جمرو کے پاس حجت کے لیے کچھ نہ تھا۔ اس نیرنگی صبح و ...م کے سامنے سبھی بے اختیار ہیں۔ وہ شانے سکوڑ کے رہ ...یا۔

ہم تینوں واپس چوکی پر نہیں گئے، بالائی منزل پر اپنے ...رے میں چلے آئے۔ سارا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ جمرو اور زورا ...ں بکھرے بکھرے دکھائی دیتے تھے۔ بیداری بھی کبھی کیسا ...ار کرتی ہے آدمی اپنے آپ کو برا لگتا ہے۔ زورا بستر ...د میں بدلتے بدلتے اوب گیا تو اٹھ کے کمرے میں ٹہلنے لگا ...بڑبڑاتے ہوئے بولا "دادا! ابھی ایک بات بولے۔"

میں نے اپنا بوجھل سر ہلا کے پوچھا "کیا ہے؟"

زی گر 6

"یہ اپن کا بنے دادا کیسا آدمی تھا۔" زورا نے بے ربط لہجے میں شکایت کی "ابھی پیچھے اتنا لوگ چھوڑ کے چلا گیا۔"

میں کیا کہہ سکتا تھا۔ زورا کہنے لگا "اپن سوچتا ہے' آج کا دن بنے دادا کو اس کتے کا بچہ رجن کے آگے جانے کا نئیں تھا۔"

"پھر کون سا دن رکھنے کا تھا دادا؟" جمرو نے اچکتی آواز میں دخل دیا۔

""نئیں جمرو بھائی! مسخری نئیں۔ ماں قسم' رات ادوری بائی جی کے کوٹھے پر بنے دادا نئیں جاتا تو سویرے ایسا نئیں ہوتا۔"

زورا کچھ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ رات تارا بیگم کے بالا خانے پر جا کے بنے خاں کو ایک سلسلۂ خیال کے سحر سے دو چار ہونا پڑا۔ چاندنی بانو کے سامنے میں نے اس کے چہرے پر بہت سے رنگ دیکھے تھے۔ حسرت' امید' اشتیاق اور جنوں کے رنگ۔ وہاں سے آ کے تو اس کی آنکھیں مسلسل خواب دیکھتی رہی ہوں گی۔ بس ایسے ہی کسی خواب آفریں' خواب انگیز لمحے کا فسوں اسے زیر و زبر کر گیا۔ رات ہی تارا بیگم آمادہ ہو جاتی تو بنے خاں کا عالم دگر ہوتا۔ شاید پھر اسے اس طرح روپوشی کی ضرورت نہ پڑتی۔ وہی اس وقت اڈے کی مسند پر بیٹھا ہوتا اور اڈے کی عمارت میں جانے کیسی دھومیں مچی ہوتیں۔

جمرو بھی اٹھ کے بیٹھ گیا اور خود کلامی کے انداز میں بولا "تارا بیگم کو بھی تو پتہ چل گیا ہوگا کہ بنے خاں آج چوکی پر نہیں بیٹھ پایا۔"

"ایک دم دادا!" زورا کی آواز میں تیزی آ گئی "رات نئیں دیکھا! بولی کے ٹیم کیسا چکری دیتا تھا بائی جی۔ ابھی سر میں نیچے کو آتا ہی نئیں تھا۔ اپن بولتا ہے' رات بھر نیند نئیں آیا ہوگا۔ اڈے پر بنے دادا کے الٹ جانے کا سن کے ہی آدمی ایدر آیا' ابھی سونا بھرا پوٹلی ہاتھ سے نکل نہ جائے۔"

"اور اس مکھن لال مبارک میاں نے تو بنے خاں کو پوچھا ہی نہیں۔" جمرو لہک کر بولا "سیدھا اپنے لاڈلے نواب کو پوچھتا ہوا آیا۔"

"بات بھی تو راجا دادا نے چلایا تھا۔ اس کے پاس ہی آدمی بھیجنے کا تھا۔"

"ادھر تارا بیگم نے سارا دن آس پاس نواب لوگوں کو ٹٹولا' کھکوڑا ہوگا۔"

"اکھا دن آجو باجو نواب لوگ کا تول کانٹا کیا ہوگا' پر ڈھیری کا بات ہے جمرو بھائی!" زورا نے کڑوی آواز میں کہا "ابھی سالا نواب لوگ پہلا مافک کیدر ہے۔ ایدر راجا دادا نے بولی بھی آسمان پر جا کر لگایا۔"

وہ دونوں دیر تک ایک دوسرے کی تائید و تردید کرتے رہے۔ میں بستر پہ پڑا سنتا رہا۔ میں نے ان سے بحث نہیں کی کہ یہ قیمت بھی کوئی قیمت ہے' لوگ تو تخت و تاج ترک کر دیتے ہیں اور زندگی نذر کر دیتے ہیں۔ ایک آدمی کی قیمت کیا ہو سکتی ہے۔ اس کا تعین تو کوئی طلب گار ہی کر سکتا ہے۔ کوئی کتنا ہی پری پیکر' گل اندام ہو' اور جیسا کہ لوگ کہتے ہیں' سانچے میں ڈھلا ہو' قیمت تو مطلوب کی ہوتی ہے او[ر] مطلوب کے لیے ملکوتی صفات لازم نہیں۔ اس کی قیمت [نہ] ظاہری اوصاف میں یکتائی سے مشروط ہے نہ باطنی حسن [کی] فضیلت سے۔ یہ تو سینے میں جا گزیں اور آنکھوں میں نقش ہو جانے کا معاملہ ہے۔ ہر شخص کا اپنا ایک پیمانہ ہے۔ جو [کو]ئی پیمانے پر پورا اتر جائے' یا کسی خنجر نگاہ کا کرشمہ ہے' جو اس زد پر آ جائے۔ دو آدمیوں کے مابین یک نفسی و یکجائی کی ر[مز] کوئی تیسرا کیا جان سکتا ہے۔ کبھی تو خود مطلوب کو خبر نہیں ہوتی' کون دروازے پر کھڑا دستک دے رہا ہے اور کتنا [بڑا] مدعی' کتنا بڑا فریادی ہے۔ یہ رقم تو کچھ بھی نہیں تھی۔ ج[س] طرح جمرو اور زورا کے کسی مطلوب کی قیمت وہی سمجھ [سکتے] ہیں' بنے خاں نہیں سمجھ سکتا' اسی طرح چاندنی بانو کی قد[ر و] قیمت کا تعین بھی بنے خاں ہی کر سکتا تھا۔ وہ کوئی نواب زا[دہ]، شہزادہ ہوتا تو سارا لاؤ لشکر نذر کر سکتا تھا' اور یہ تو محض ا[یک] اتفاق ہے' خوش نصیبی کا اتفاق ہے کہ بنے خاں کا مطلو[ب] نیلام میں دستیاب ہو سکتا تھا' لیکن جہاں بولی کا امکان نہ [ہو] وہاں طلب گار کا سونا چاندی کس کام کا' اس کے جواہر تو کنکر پتھر' اس کے محل دو محلے تو کھنڈروں کے مانند ہیں۔

آخر رات کے آخری پہر انہیں نیند نے آ لیا۔ کاذب کے وقت کہیں میری آنکھ بھی لگ گئی۔

○☆○

صبح بنے خاں کا دست راست مرزا دلبر نہ آتا تو ہم [نہ جانے] کب تک اپنے آپ سے بیگانہ رہتے۔ اس کی صدا [پر ہم] تینوں ہڑبڑا کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ نو بج رہے تھے۔ [سورج] دیواروں سے اتر آیا تھا۔ مرزا نے بتایا کہ نیچے عمارت [میں] بہت سے لوگ جمع ہو چکے ہیں اور ان کی آمد کا سلسلہ [جاری] ہے۔ رجن بھی اپنے ساتھیوں سمیت آ چکا ہے۔ بٹھل [اور] شمشاد خاں ہمارے منتظر ہیں۔ مرزا دلبر نے ناشتے کا اہتما[م کیا] ہوا تھا۔ جیسے تیسے نہا دھو کے ہم نے کپڑے تبدیل کیے [اور] جلدی جلدی ناشتا کر کے نچلی منزل پر چلے آئے۔

عمارت میں کل سے بڑا ہجوم تھا۔ جہاں تک نگاہ جاتی' سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کے بے تحاشا شور مچنے [ل]گا۔ چوکی کے وسط میں بٹھل اور شمشاد خاں حاکمانہ تیور سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ اڈے کے اور آدمی بھی چوکی [پر] موجود تھے۔ دودھ کے کلھڑ' لوبان کا برتن' ہار پھول وغیرہ [ک]وئی چیز بھی آج بٹھل کے آگے نہیں تھی۔ چوکی کے دائیں [ط]رف چار زانو نشست میں رجن خاموش بیٹھا تھا۔ چہرے کی [ش]ادابی و تر و تازگی درون خانہ اعتماد کے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔ [و]ہ سفید لباس میں ملبوس تھا۔ کرتے کے گلے سے سونے کی [ز]نجیر جھانک رہی تھی۔ زنجیر میں تعویذ بھی پیوست ہوگا۔ چمکتا [ہو]ا چاندی کا کڑا کلائی میں جھول رہا تھا۔ یہ کڑا کل اس کے [ہا]تھ میں نہیں تھا' بازو سے بندھا ہوا کالی دھجی کا امام ضامن [آ]ستین سے جھلک رہا تھا۔ ارد گرد بیٹھے ہوئے ساتھیوں نے [م]یری طرف اشارہ کیا تو اس نے سر گھمایا۔ اس کی آنکھوں [می]ں طرح طرح کی کیفیتیں نمودار ہوئیں' غصے' حقارت اور [اض]طراب کی لہریں پھر اس نے میری جانب سے نگاہ پھیر لی۔ [ہ]م تینوں کو جگہ دینے کے لیے لوگ پہلے ہی پیچھے ہٹ گئے [ت]ھے۔ شمشاد خاں کی ہدایت پر ہم رجن کے عین مقابل چوکی [کے] بائیں طرف بیٹھ گئے۔ چوکی کے سامنے دائرے کی جگہ [آ]ج کھلی رکھی گئی تھی اور لوگ دائرے میں بڑھنے سے لوگوں [کو] روک رہے تھے۔

ہمیں آئے ہوئے چند منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک [جہ]اں دیدہ قسم کے شخص نے کھڑے ہو کے خاموشی کی تاکید [کی]۔ اس کی ہمنوائی میں آگے پیچھے کئی آدمی کھڑے ہو گئے۔ [ان] کی کوششوں سے مجمع بڑی حد تک پر سکون ہو گیا۔ تب [بز]رگ آدمی نے مختصر لفظوں میں آج کے اجتماع کی غرض و [غای]ت بیان کی اور نیم تنبیہی' نیم التجائی آمیز لہجے میں کہا کہ [لوگو]ں کی خاموشی دونوں فریقوں کے لیے بہتر ہوگی۔ کوئی نازیبا [آواز] بلند کرنے' ناشائستہ کلمہ ادا کرنے والے کو عمارت سے [نکال] دیا جائے گا۔ رسی سے دائرے کی حدیں قائم کر دی گئیں [تو] بٹھل نے پہلے رجن سے' پھر مجھ سے ہماری آمادگی کی [با]ت پوچھا۔

ہم دونوں ایک ساتھ اٹھے۔ حسب روایت میں نے [جی]ب سے چاقو نکال کے اڈے کے استاد شمشاد خاں کے [ہاتھ]وں میں رکھ دیا۔ شمشاد خاں نے میرا چاقو سینے سے لگایا [اور] اپنا چاقو بٹھل کی طرف بڑھا دیا۔ بٹھل نے اسے میرے [حوا]لے کر دیا۔ رجن نے بھی یہی کیا۔ ہم دونوں دائرے میں [آ گ]ئے۔ رجن نے اپنی کمر کے گرد پٹکا باندھ لیا تھا۔ ایک نظر بٹھل کی طرف دیکھ کے میں نے چاقو کھول لیا۔ بٹھل نے جواب میں ہاتھ کو خفیف سی جنبش دی۔ میں نے سر جھکا کے گویا اپنی تفہیم کا اظہار کیا۔ یہ رمز و کنایہ مقابل پر دباؤ ڈالنے کا ایک موثر طریقہ ہے۔ رجن نے بھی اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ انہوں نے ہاتھ اٹھا اٹھا کے اس کا حوصلہ بلند کیا۔

میں نے طے کر لیا تھا کہ جلد از جلد' ہو سکے تو لمحوں میں کسی نتیجے پر پہنچنا ہے۔ حالانکہ جی یہی چاہتا تھا کہ اسے دیر تک گھمایا جائے۔ وہ میرے لیے اب ایسا اجنبی نہیں رہا تھا۔ کل میں اسے اچھی طرح دیکھ چکا تھا' البتہ وہ مجھ سے بالکل ناواقف تھا۔ ممکن ہے' کل سے اب تک اس نے میرے بارے میں کچھ سنا ہو لیکن لکھنؤ میں لوگ ہی کتنے مجھے جانتے تھے۔ شاید کوئی بھی نہیں۔ بٹھل کا نام بے شک بہت سے لوگوں نے سنا تھا اور بٹھل سے میری نسبت کی وجہ سے رجن کو بھی محتاط ہونا چاہیے تھا۔ خصوصاً ابتدا میں تو کچھ زیادہ ہی۔ اسے اس حقیقت کا بھی خوب احساس ہوگا کہ اس کے اور بنے خاں کے درمیان معرکہ آرائی کے بعد میں نے خود کو پیش کیا ہے تو یہ کسی بوتے اور برتے ہی پر کیا ہوگا۔ اس نے پہل نہیں کی۔ میں نے بھی اس کی تقلید میں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں چاقو منتقل کرنے کی مشق سے اجتناب کیا۔ شروع میں اپنی چابک دستی اور مشاقی سے بے خبر رکھنا میرے لیے سود مند تھا۔ مجھے اپنے زخم خوردہ ہاتھ کا بھی خیال رکھنا تھا' اس پر زیادہ زور نہیں دینا تھا۔ گو زخم بڑی حد تک ٹھیک ہو چکا تھا لیکن ابھی تک پٹی بندھی ہوئی تھی۔

پہلے وہ مجھ سے دور دور ہی رہا پھر میرے فاصلہ کم کرنے پر وہ بھی کسی قدر نزدیک آ گیا اور جیسے ہی وہ چاقو لہراتا دو بدو ہوا' میں نے اپنے خالی ہاتھ کے بجائے چاقو بردار ہاتھ اس کے چاقو بردار ہاتھ کی طرف دراز کیا۔ عموماً ایسا نہیں ہوتا' کسی طور مقابل کے چاقو والے ہاتھ کا پنجہ گرفت میں لے کے بے بس کر دینے پر زور اور وقت صرف کیا جاتا ہے لیکن اصل میں مجھے اپنے خالی ہاتھ سے اس کے شانے پر ضرب لگانی تھی۔ میرا چاقو والا ہاتھ اپنی جانب جھپٹتا دیکھ کے وہ ہوشیار بلکہ منتشر ہوا۔ مجھے اس کی تمام تر توجہ اس کے اور اپنے چاقو والے ہاتھ پر مرکوز رکھوانی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس نے سارا دھیان میرے اور اپنے چاقو والے ہاتھوں کی نقل و حرکت پر دیا۔ اٹھے ہوئے میرے خالی ہاتھ پر نہیں۔ دوسرے ہی لمحے میں نے خالی ہاتھ سے اس کے شانے پر پوری قوت سے ضرب لگائی۔ شانے پر گردن کے قریب

ترچھے ہاتھ کی ضرب صحیح لگ جائے تو کچھ دیر کے لیے سر سے پیر تک جسم متلاطم رہتا ہے۔ رجن کے حواس بھی یک جا نہیں رہے' اس کی سمجھ میں یہی آیا کہ وہ فرش پر بیٹھ جائے' کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔ ضرب سے اس کے قدم بھی... لڑکھڑائے تھے۔ اسے اپنے چاقو والے ہاتھ کا بھی ہوش نہیں رہا۔

وہیں کھیل ختم ہو جاتا۔ اس اثنا میں کہیں بھی میں اس کا جسم اپنے چاقو سے نشانہ بنا سکتا تھا لیکن ایک تو وہ فرش پر بیٹھتے ہی یا ڈگمگا کے گرتے ہی دور ہو گیا' دوسرے میں نے اسے دانستہ دور ہو جانے کا موقع دیا۔ میری خواہش تھی کہ بنے خاں پر کل اس نے جس داؤ سے برتری حاصل کی تھی' اسی کا آج اعادہ ہو۔ رجن اپنے پیروں پر دوبارہ کھڑا ہوا اور اوسان میں دکھائی دیا تو میں نے بنے خاں کی طرح چاقو والا ہاتھ عمودی یعنی سیدھا رکھ کے اس کی طرف بڑھنا شروع کیا۔

اب تو اسے اپنی جگہ سے حرکت کرنی ہی تھی اور میری پیروی میں چاقو والا ہاتھ جسم کے درمیان سیدھ میں اٹھائے رکھنا تھا۔ اس داؤ میں دائرے کے چکر کاٹتے رہنا ایک لازمہ ہے۔ کسی جگہ میرے قریب آنے پر اس کے پاس دو ہی راستے تھے کہ وہ طرح دے کے دائیں بائیں ہو جائے یا آمنے سامنے ہونے کا فیصلہ کر لے۔ دائرے کے چکروں کے دوران بجا طور پر ہر فریق کی جانب سے کسی بھی لغزش اور نافہمی کا امکان ہر وقت موجود رہتا ہے۔ گو مجھے رجن کی طرف سے کسی غیر متوقع حربے کا اندیشہ مطلق نہیں تھا' لیکن بہرحال اس کے ہاتھ میں کھلا چاقو تھا اور بٹھل کے بقول' مقابل کسی درجے کا ہو' کھلے چاقوؤں میں آنکھیں پوری طرح کھلی رکھنی چاہئیں۔ کسی وقت بھی اس کے دماغ میں کوئی خلاقی نمو پا سکتی تھی اور کسی وقت بھی مجھ سے حساب کتاب جیسی کوئی بھول چوک ہو سکتی تھی۔ ہزیمت کے شیبے میں آدمی کا دماغ بھٹک سکتا ہے اور کوئی اوچھی حرکت بھی سرزد ہو سکتی ہے۔ آہستہ آہستہ میں اپنے اور اس کے درمیان فاصلہ کم کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ خاصا پھرتیلا تھا۔ پینترا بدلنے میں اسے بڑی مشاقی تھی۔ کچھ دیر یہی صورت رہی۔ میرا فاصلہ کم کرتے رہنا' اس کا طرح دینا اور بھبکیاں دیتے ہوئے ادھر ادھر ہو جانا' مگر کب تک وہ یہ آنکھ مچولی کرتا رہتا۔ کبھی کبھی ایک دوسرے کے سامنے صف آرا فریقوں میں سے کسی ایک کو تماشائیوں کا لحاظ بھی آ جاتا ہے' اس عجلت یا مروت کے نتائج اچھے نہیں نکلتے۔ رجن کی طرف سے تو آخر دم تک اس غلطی کا ارتکاب ممکن نہیں تھا کہ ہجوم میں کتنے تماشائی اس کے دلدادہ و دلدار تھے۔

میرے تخمینے سے وقت کچھ اوپر ہو رہا تھا۔ یقیناً رجن میری منشا کا کچھ کچھ اندازہ ہو چلا تھا سو اسے نامراد بنے خ کے آخری داؤ والی صورت حال کی تکرار سے پہلو تہی کر رہنا چاہیے تھا۔ پہلے ہی ہلے میں جب میں نے اس شانے پر ضرب لگائی تھی' اسے میرے بارے میں رائے کرنے یا یوں کہا جائے کہ رائے بدلنے کا اچھا موقع مل تھا۔ اس کے بعد سے وہ کچھ زیادہ ہی چوکنا ہو گیا تھا۔ کل وہ بیشتر اپنا دفاع ہی کرتا رہا تھا لیکن کل اس کے دفاع میں اور غضب شامل تھا' آج اضطراب آمیز ہوش مندی ع تھی۔ اس نے جیسے اپنی جانب سے پیش قدمی کا ارادہ کر دیا تھا۔ مجھے اس بارے میں کچھ اور سوچنا چاہیے اصرار سے کچھ دیر لگ سکتی تھی اور رجن اس عزت وار نہیں تھا۔

ایک مرحلے پر فاصلہ خاصا کم رہ گیا تو میں نے اپنے ہاتھ پھیلا دیے۔ رجن نے چاقو والا ہاتھ سیدھ میں ہوا تھا۔ میرے اس غیر متوقع اقدام پر وہ ششدر بھی متذبذب بھی۔ پر سامنے سب کچھ صاف تھا۔ اس نا گ حسن اتفاق بھی کہتے ہیں۔ اس نے یہی بہتر جانا کہ ا بردار ہاتھ جوں کا توں سیدھا رکھے اور اب کوئی بدلے۔ میں اسے اپنی ذہنی ابتری اور خرد ماغی کا تاثر د تھا۔ رجن کا چاقو عمودی تھا۔ درمیان میں فاصلہ بہت اور میں بڑھا چلا آ رہا تھا۔ کوئی دیوانہ ہی اس مضحکہ خیز کا متحمل ہو سکتا تھا۔ بظاہر اس میں میرے ضرر کا امکا گنا تھا تو رجن کا ایک گنا بھی نہیں تھا۔ فاصلے کی باعث یہ میرے لیے ایک پیچیدہ مشکل منزل تھی مگر میزان کر کے ہی قدم اٹھایا تھا۔

ہونٹ بھینچ کے اور آنکھوں میں آگ بھر کے میری طرف زقند بھری۔ ہر سلیم العقل یہی کرتا اور اپنی تمام صلاحیتیں مجتمع کر کے اس کرشمہ' قسمت' ا لمحے سے بہرہ مند ہوتا۔ کچھ اور سوچنے کے لیے میں ہی نہیں دیا تھا' اسے اپنی جانب امڈتا دیکھ کے میں قدم منجمد کیے' اب اس کے لیے ٹھہر جانا' خود کو رو ثانی کرنا ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ اتنی قربت میں ا کو بھی زاویہ بدلنے کی توفیق نہ ہوتی' اور اس ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ سامنے اپنا کوئی زیاں آ رہا تھا۔ اس کے عمودی چاقو بردار ہاتھ کی زد لیے مجھے بروقت چند انچ دائیں جانب اپنا جسم ہٹانا

شانہ بالکل ٹھیک تھا۔ میرے جسم کے بائیں حصے کی پسلیوں کے نزدیک چاقو پیوست ہونا چاہیے تھا۔ گز بھر کی دوری پر میں نے تیزی سے جسم دائیں طرف ہٹایا تو خلا ہو گیا' جیسے ہی رجن کا دراز ہاتھ اس تکونی خالی جگہ یعنی میری پسلیوں کے قریب سے گزرا اور میرے اٹھے ہوئے ہاتھ کے نیچے آیا' میں نے اسے بازو یا پسلیوں کے درمیان جکڑ لیا۔ رد عمل کا مجھے حساس تھا۔ وہ چاقو انگلیوں میں گھما سکتا تھا مگر تبھی جب سے کوئی مہلت ملتی یا میں اپنے دوسرے چاقو بردار ہاتھ سے بنے خاں کی طرح غافل رہتا۔ بیک وقت میرے دوسرے ہاتھ نے اس کی گردن کے قریب چاقو کی نوک چبھوئی اور میں نے خود کو محفوظ کرنے کے لیے اپنے بازو اور پسلیوں کے درمیان جکڑے ہوئے اس کے چاقو والے ہاتھ کی کلائی پنجے میں لینے کی کوشش کی اور مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ رجن کی ساری توجہ اپنی گردن کے قریب چاقو کی نوک پر مرکوز تھی۔ بازو کی گرفت ڈھیلی کر کے اور ہاتھ مروڑ کے میں نے جھٹ اس کی کلائی پر پنجہ ڈالا تھا۔ اس احتیاط کی اگرچہ ایسی ضرورت نہیں تھی' رجن کو چند لمحوں میں اپنا چاقو ترک کر ہی دینا تھا مگر میری خواہش تھی کہ رجن اپنے ہاتھ میں چاقو برقرار رکھے۔ اسے ثابت و سالم تو واپس نہیں جانا چاہیے تھا' کم از کم کوئی نقش تو یادگار میں اس کے چہرے پر کندہ کرتا۔ اس کی گردن پر اپنے چاقو کی نوک کی پیوستگی میں اسی لیے میں نے شدت اختیار نہیں کی تھی لیکن رجن نے جلد ہی رشتہ اخذ کر لیا اور چاقو' ہاتھ سے چھوڑ بیٹھا۔ اس کے باوجود اس کی پیشانی پر درمیان میں ایک دوسرے کو قطع کرتی ہوئی لکیریں ڈالی جا سکتی تھیں۔ اس کی ناک بھی بمبئی کے تیواڑی ادا کی طرح چہرے سے جدا کی جا سکتی تھی' اور کچھ نہیں تو بس چاقو کی نوک اس کی گردن میں ذرا گہری کر سکتا تھا مگر وہ نہ صرف اپنے چاقو سے دستبردار ہوا بلکہ اس نے ہاتھ پیر بھی چھوڑ دیے۔ مزاحمت کے دوران کوئی داغ کندہ کرنے کی بات اور تھی۔ مجھے خود کو روکتے ہوئے بہت بیزاری ہوئی۔

میرے اندازے سے چند لمحے زیادہ صرف ہوئے۔ لوگوں کو اپنے دیکھے ہوئے پر یقین کرنے کے لیے۔ بہرحال کچھ وقت چاہیے تھا۔ سب کچھ دیکھتے دیکھتے' جیسے پلک جھپکنے کے عرصے میں ہوا۔ میرے جسم نے خود کار انداز میں ایک ساتھ کئی کام کیے تھے۔ رجن کے بڑھنے پر خود کو روکا' دائیں طرف جھکایا' خالی ہاتھ نے اس کا چاقو بردار ہاتھ جکڑا' میرے چاقو بردار ہاتھ نے اس کی گردن حصار میں لی۔ بٹھل کا کہنا تھا کہ چاقو کی گرفت اپنی جگہ لیکن اصل بات تو اس کے استعمال کے نظم و ضبط میں ہے' چاقو تو کوئی بھی گھونپ سکتا ہے۔ صحیح مہارت اور مشاقی یہ ہے کہ چاقو مقابل سے کتنے فاصلے پر رکھنا ہے؟ کیا مقصود ہے؟ محض مس کرنا ہے' ہلکی لکیریں ڈالنی ہیں' لباس چاک کرنا ہے یا نشانے کے لیے کوئی مخصوص جگہ مطلوب ہے؟ ایک دفعہ بٹھل نے حیدر آباد میں ایسے ہی ایک موقع پر مجھے سوت کے چاقو چلانے کا اشارہ کیا تھا سو میں نے شاہ کیرا کا ازار بند کاٹ دیا تھا۔ اڈے کے دادا کی اس سے بڑی رسوائی کیا ہو سکتی ہے۔ شاہ کیرا کے جسم کے کسی حصے سے چاقو مس نہیں ہوا تھا۔ رجن سے بھی کچھ ایسا ہی سلوک کیا جا سکتا تھا لیکن اس نے اپنا جسم ہی ڈھلکا دیا۔

عمارت میں شور کے سوتے پھوٹ پڑے۔ میں نے ٹھوکر سے رجن کا گرا ہوا چاقو اس سے دور کیا اور اس کی گردن سے ہاتھ اٹھا کے اپنا چاقو جمرو اور زورا کی طرف اچھال دیا۔ دونوں نے ہاتھ بلند کیے تھے لیکن جمرو نے چاقو اچک لیا۔ اچھا ہوا جو میرے ہاتھ میں چاقو نہیں رہا ورنہ انگلیاں بہت اینٹھ رہی تھیں۔ رجن کو دیکھ کے بنے خاں کا چہرہ نظروں میں گھوم جاتا تھا۔

جھٹکا دینے پر رجن مجھ سے الگ ہوا اور فرش پر لڑھک پڑا۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ کے میں نے چوکی کی طرف قدم بڑھائے۔

ادھر سے جمرو اور زورا نے' ادھر سے شمشاد خاں اور اڈے کے کئی آدمیوں نے چوکی سے اتر کے مجھے دبوچ لیا۔ ہر طرف سے لوگ امڈنے لگے۔ ہر کوئی چیخ رہا تھا' والہانہ نعرے لگا رہا تھا۔ انہوں نے میرے ہاتھ چومنے شروع کر دیے۔ جمرو اور زورا نے مجھے کندھوں پر اٹھا لیا۔ شمشاد خاں نے میری ٹانگ جکڑ لی۔ وہ میرے پیر سینے سے لگاتا' آنکھوں سے مس کرتا۔ اسی طرح وہ لوگ مجھے بٹھل کے سامنے لے آئے۔ بٹھل نے چمکتی آنکھوں سے ایک بار نظر پھیر کے مجھے دیکھا۔ جانے کیوں اس سے نگاہیں ملا کے مجھے وحشت ہونے لگی۔ بٹھل بھی سر جھکا کے حقہ گڑگڑانے لگا۔

سبھی جیسے پاگل ہو گئے تھے۔ ہر ایک چوکی کی طرف آنے کے لیے بے قرار تھا اور وہ ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ بہت ہاتھ پیر چلا کے بہت چیخ و پکار کے بعد جمرو' زورا اور اڈے کے آدمیوں نے مجھے ان سے بچایا اور بٹھل کے پاس بٹھا دیا۔

چوکی کے آدمی کھڑے ہو ہو کے نظم و ضبط کے احکام صادر کرتے رہے' پھر انہیں کسی کمرے سے لاٹھیاں منگوانی پڑیں' لاٹھیاں لے کر چند آدمی چوکی سے اترے تب جا کے

کچھ سکون ہوا۔ خاموشی ہوتے ہی شمشاد خاں نے با آواز بلند ہجوم سے کہا کہ شہر میں جتنی مٹھائی تیار ہو‘ جتنے ہار پھول جہاں کہیں نظر آئیں‘ اڈے پر سمیٹ لائیں‘ صدرو باورچی سے دیگیں چڑھوائی جائیں اور رتجگے کی منادی کردی جائے۔ یہ فرمان جاری کرتے کرتے شمشاد خاں کی آواز جھرجھرانے لگی‘ آگے اس سے کچھ نہیں کہا گیا۔ بٹھل نے تھپکی دے کے اسے پاس بٹھایا تو وہ بٹھل کے گلے سے لگ گیا اور بری طرح رونے لگا۔

بار بار عمارت میں اٹھتے شور سے میرا جی گھبرانے لگا تھا۔ چوکی سے ہٹ جانے کا محل نہ تھا۔ سب کی نظریں مجھ پر منڈلا رہی تھی۔ میں تماشا بنا بیٹھا تھا پھر آدھ گھنٹا بھی نہیں گزرا ہوگا کہ لوگ مٹھائی کے ٹوکرے اٹھالائے اور انہوں نے پھولوں کی پتیاں مجھ پر اور بٹھل پر نچھاور کردیں۔ شمشاد خاں کی دیکھا دیکھی اڈے کے آدمیوں نے اتنے ہار پھول میرے اور بٹھل کے گلے میں ڈال دیے کہ ہمارے چہرے ہی چھپ گئے۔

دھوپ عمارت کے صحن میں اتر آئی تھی۔ لوگ وہاں ٹھنسے بیٹھے رہے۔ انہوں نے چوکی کے قریب آنے کے لیے نذریں گزارنی شروع کردی تھیں۔ میں نے جمرو کو اٹھنے کا اشارہ کردیا تھا اور ہم اٹھا ہی چاہتے تھے کہ سامنے دروازے سے آغا پیا لپکتا جھپکتا‘ راستہ بناتا‘ ہجوم پھلانگتا ہوا چوکی پر آیا اور اس نے میرے پہلو میں بیٹھے ہوئے شمشاد خاں کے کان میں جلدی جلدی کچھ کہا ”ہائیں!“ شمشاد خاں اچھل پڑا اور بے طرح گالیاں بکنے لگا ”وہ چھنال زادی ادھر اپنی ماں کے یاروں کے پاس بھی پہنچ گئی۔“

”کیا ہے استاد؟“ بٹھل نے چونک کر پوچھا۔

”دیکھا تم نے‘ اس تارا بیگم سسری نے اپنے میکے والوں کو جاکے بول دیا۔ ہے بٹھل بھائی! بولتا ہے‘ خدائی فوج دار تھانے دار چوہان جی باہر کھڑے ہیں‘ ایک نمبری حرام خور‘ اس کو کوئی اور گھر دکھائی نہیں دیا۔“

تارا بیگم اور پولیس کے نام پر میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے بے تابانہ اور جمرو اور زورا کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں بھی سکڑ گئی تھیں۔

”بلوالو پھر اندر۔“ بٹھل نے تیوری چڑھا کے کہا۔

”ہاں ہاں بٹھل بھائی!“ شمشاد خاں مایوسی سے بولا۔ ظالم کی اولاد وقت دیکھتے ہیں نہ موقع۔ اس رنڈی کو اچھی طرح بول دیا تھا کہ اپنا کوئی واسطہ نہیں ہے۔“

آغا پیا منتظر تھا۔ اس کے ٹوکنے پر شمشاد خاں نے جھنجلا کے کہا کہ چوہان کو زینے کے بیرونی دروازے سے ... بالائی منزل پر بٹھایا جائے۔ اڈے کے ایک بزرگ ... سرگوشیوں میں ہدایات دے کے شمشاد خاں فوراً ... اٹھ گیا۔ بٹھل نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ انہوں نے ... نہیں پوچھا لیکن ہم وہاں کیسے بیٹھے رہ سکتے تھے۔ ہم ... اٹھ گئے۔ لوگوں نے پیچھے ہٹ ہٹ کے ہمیں راستہ ... پیا کی آمد اور یکے بعد دیگرے ہم سب کے بالائی منزل ... کرنے پر عمارت میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

زینے کا ایک دروازہ عمارت کے اندر بھی کھلتا ... نے آغا پیا کو زینے میں روک لیا اور تھانے دار چوہان ... کی وجہ پوچھی۔ آغا پیا نے سنسناتی آواز میں بہ عجلت ... بتایا‘ وہ ہمارے لیے ناقابل فہم بھی تھا‘ ناقابل یقین بھی ... کے کہنے کے مطابق کوئی سات بجے تانگے میں سوار ... تارا بیگم اڈے پر دہائیاں دینے آئی تھی۔ رات کے ... اس کے بالا خانے پر ڈھاٹے باندھے ہوئے کچھ لوگ آئے۔ ان کے پاس خنجر اور تمنچے تھے۔ انہوں نے با... پر موجود تمام افراد کو ایک کوٹھری میں بند کردیا اور ... سے ہاتھ پیر باندھ دیے۔ وہ چاندنی بانو کو اٹھا کر لے... کاذب کے وقت بازار میں گہرا سناٹا ہوتا ہے۔ آس... کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ تارا بیگم بار بار میرا نام ... تھی۔ شمشاد خاں نے اس کے ساتھ آنے وا... سازندے کو‘ بالائی منزل بھیج دیا کہ وہ اپنی آنکھوں ... لے‘ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ آرام کررہا ہوں ... خاں کے علاوہ صبح اڈے پر موجود چند اور آدمیوں نے ... بیگم کو مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ رات گئے تک ... ان سب کے درمیان اڈے پر بیٹھے رہے ہیں۔ شم... نے اس واقعے کی بابت ہمیں کچھ بتانا نامناسب ضروری سمجھا۔ عمارت میں لوگ جمع ہوچکے تھے او... دیر میں رجن سے میرا آمنا سامنا ہونے والا تھا۔ ا... تھا کہ تارا بیگم کے ہذیان کی روداد میرے لیے انتشا... ہوسکتی ہے۔ تارا بیگم کو کوئی غلط فہمی تھی تو شمشاد ... اپنی دانست میں رفع کردی تھی۔

آغا پیا کی زبانی یہ ماجرا سن کے سب گنگ رہ... اس سے کچھ اور جاننا چاہتا تھا مگر جمرو کی سرزنش ... ہوگیا۔ ہم نے تیز قدموں سے زینہ عبور کیا۔

بھاری تن و توش‘ مناسب قد و قامت‘ پھو... گالوں‘ چھوٹی چھوٹی آنکھوں‘ بادامی رنگ کا ادھیڑ ... چوہان دو سپاہیوں‘ ایک نوجوان ماتحت افسر کے سا... ... کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے دائیں بائیں۔ بٹھل اور شمشاد خاں تھے۔ کمرے میں ہمارے داخلے پر چوہان کی بھویں کھنچ گئیں۔

”یہی ہے وہ جس کا آپ نام لیتے ہیں۔“ شمشاد خاں نے میری جانب انگلی اٹھا کے مضطربانہ لہجے میں کہا ”یہی ہے اپنا ...بر۔“ بٹھل بھائی سمیت یہ تینوں ہمارے مہمان ہیں چوہان ...ن!“

چوہان تند نظروں سے ہمیں دیکھتا اور سرہلاتا رہا ”تم ...لیتے ہو‘ رات کو یہ تینوں بلکہ چاروں یہیں تھے۔“ وہ دھمکتی ...وازمیں بولا۔

”جی‘ جی ہاں جناب! یہاں کہا ہے۔“ شمشاد خاں نے ...ں کے کہا ”ادھر سارے لوگ جانتے ہیں۔ سبھی‘ سبھی۔“

”اور یہ‘ بنے خاں بہادر کہاں ہے؟“

شمشاد خاں نے ایک لمبی سانس کھینچ کے مختصراً اسے کل ...ے حادثے کے بارے میں بتایا اور کہا کہ کل صبح سے بنے ...ں کا کوئی علم نہیں۔

تھانے دار‘ ایک نظر اپنے ماتحت افسر کو دیکھ کے چپ ...لیا اور کچھ دیر کے مراقبے کے بعد مجھ سے مخاطب ہوکے

”تو تمہارا ہی نام بابر ہے؟“

میں نے سرجھکا کے تائید کی۔

”تمہی نے پرسوں رات تارا بیگم کے بالا خانے پر ...رنی بانو کے سودے کی بات کی تھی؟“

”جی ہاں۔“ میں نے اٹھی ہوئی آواز سے کہا۔

”اچ چھا۔“ چوہان کے لہجے میں طنز نمایاں تھا ”خوب! ...میں سودے کی بات کی تھی؟“

”آپ کو نہیں معلوم؟“

”ہم تم سے پوچھتے ہیں۔“ وہ نخوت سے بولا۔

”جو آپ کو معلوم ہوا ہے‘ وہی ٹھیک ہے۔“

اس کے چہرے پر ایک رنگ آیا تھا لیکن وہ سنبھل گیا ...نکیلے لہجے میں بولا ”تارا بیگم نے بتایا‘ تم نے دو لاکھ روپے ...لی لگائی تھی۔“

”آپ نے ٹھیک سنا۔“

”دو لاکھ!“ اس نے معنی خیز انداز میں دہرایا ”خاصی رقم ہوتی ہے۔“ میں نے کچھ نہیں کہا تو وہ ڈھٹائی سے ...نشہ کرکے تو بالا خانے پر نہیں گئے تھے؟“

”یہ تو تارا بیگم ہی صحیح بتاسکتی ہے۔“

میرے جواب سے وہ جزبز ہوا‘ اس کی آواز میں تبدیلی ...

”دو لاکھ! ایک ساتھ اتنی بڑی رقم کبھی دیکھی ہے تم نے؟“

میرا دماغ گھوم گیا تھا لیکن میں نے خاموشی مناسب سمجھی۔

”کیا پوچھتے ہیں ہم؟“ وہ درشتی سے بولا ”اونچا سنتے ہو کیا؟“

”بہتر ہے‘ آپ کام کی بات کیجیے۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی میری زبان سے نکل گیا۔

اس نے کرسی پر کئی پہلو بدلے اور جھڑکتی آواز میں بولا ”کام ہی کی غرض سے یہاں آئے ہیں صاحب زادے! جو کچھ ہم پوچھتے ہیں‘ تمہارے لیے اچھا ہوگا کہ ٹھیک ٹھیک جواب دو۔“

”بشرطیکہ آپ ٹھیک ٹھیک سوال بھی کریں۔“

اس نے پلکیں جھپکائیں‘ اس کے ہونٹ بھی سکڑ گئے ”کب سے تارا بیگم کو جانتے ہو؟“

”پرسوں رات سے۔“

”گویا پرسوں پہلی بار چاندنی بانو کو دیکھا تھا؟“

”یہی نتیجہ نکلتا ہے۔“

”اور‘ اور پہلی ملاقات میں بولی لگادی؟“

”آپ کو کوئی اعتراض ہے۔“

”نہیں نہیں۔“ وہ کسمسا کے بولا ”ہم کو کیا ہوسکتا ہے۔ لکھ لٹاؤ۔“

”تارا بیگم کا بالا خانہ ایک دکان ہے۔ کوئی بھی بولی لگا سکتا ہے۔“ میں نے ترشی سے کہا ”دو لاکھ کیا‘ اس سے دگنی‘ چوگنی رقم بھی لگائی جاسکتی تھی۔“

”جی ہاں‘ جی ہاں۔“ چوہان نے تمسخرانہ انداز میں کہا اور مچل کے بولا ”یہ رقم تمہارے پاس موجود ہے؟“

”بہتر ہے‘ آپ اس سوال پر نظر ثانی کرلیں ورنہ نامناسب جواب کا الزام عائد مت کیجیے گا۔“

”کچھ پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو۔“

شمشاد خاں مداخلت کرنا چاہتا تھا‘ بٹھل نے ہاتھ اٹھا کے اسے روک دیا۔

”معلوم ہوتا ہے‘ اڈے والوں نے اب دوسرے کام بھی شروع کردیے ہیں۔ زمانہ ہی بدل گیا ہے۔“ چوہان زہریلے لہجے میں بڑبڑاتے ہوئے بولا اور شمشاد خاں سے پوچھنے لگا ”سنا ہے‘ آج سے یہی نواب زادے چوکی کے استاد ہیں۔“

”جی ہاں چوہان جی!“ شمشاد خاں نے تیزی سے کہا ”اور ایسے نہیں‘ رجن حرام کے جنے کو ناکوں چنے چبوا کے‘

پوری طرح الٹا کے۔"
"سنا ہے ہم نے بھی۔ باہر لوگوں میں انہی کا چرچا تھا۔ کہتے تھے، چاقو اشاروں پر چلتا ہے۔"
"خدا کی قسم چوہان جی! آپ دیکھتے تو کہتے۔" شمشاد خاں تڑپ کے بولا "چاقو اٹھانا کسے کہتے ہیں، پتا نہیں، تل کیا ہوتا ہے۔"
"ہاں ہاں کیوں نہیں، کیوں نہیں۔" چوہان نے مصنوعی طور پر آنکھیں پھاڑ کے کہا "تیور بتا رہے ہیں، دل کے بھی متوالے لگتے ہیں۔"
"وہ تو سارا معاملہ ہی الٹا ہوگیا، بگڑ گیا تھا، رجن کتے کی اولاد ایک دم بیچ میں آگیا۔ میں نے تو چوکی چھوڑ دی تھی۔ خدا معلوم پھر اڈے کا کیا حشر ہوتا۔ اپنے بابر میاں نے لاج رکھ لی۔" شمشاد خاں نے مفاہمت کی کوشش کی۔
تھانے دار چوہان نے شمشاد خاں کی باتوں پر توجہ نہیں دی۔ اس کی نظریں مجھ پر مرکوز تھیں، کہنے لگا "کہاں کے رہنے والے ہو؟"
"اب تو بمبئی میں رہتے ہیں۔"
"وہاں بھی اڈا گیری کرتے ہو؟"
"اب کوئی بھی نہیں ہے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔
"کیوں؟ چھن گیا؟"
"چھوڑ دیا۔"
"کیوں؟"
"جی نہیں لگتا تھا۔"
"پھر آج کل کیا کرتے ہو؟"
"ایسے ہی۔" میں نے جھجکتے ہوئے جواب دیا "بس گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔"
"کوئی جاگیر وغیرہ بنالی ہے کیا؟"
"یہی جانئے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔
"تو اسی طرح حسیناؤں کی بولیاں لگاتے پھرتے ہو؟"
میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔
"کتنی بار جیل گئے ہو؟"
"اڈے کے آدمی شمار نہیں کرتے۔"
"کبھی آدمی وادمی بھی مارا؟"
"آپ کب سے پولیس مین ہیں؟"
"کیوں؟" وہ برہمی سے بولا اور شانے پھیلا کے کہنے لگا "یہ شمشاد خاں سے پوچھو۔"
"پشتی، جدی پولیس والے ہیں چوہان جی۔" شمشاد خاں نے توصیفی انداز میں بولا "بڑا نام ہے ان کا۔"

"پھر ایسا سوال یہ کیوں کر رہے ہیں؟" میں نے تیکھے لہجے میں کہا "شاید پہلی بار کوئی کیس ہاتھ لگا ہے۔"
چوہان کی آنکھیں سرخ ہونے لگیں، آواز اکڑ گئی "لگتا ہے، شمشاد خاں۔ تم نے ہمارا پورا تعارف نہیں کرایا۔"
شمشاد خاں مجھے سمجھانا چاہتا تھا کہ میں نے اس کی بات قطع کرکے کہا "اس کی ضرورت نہیں، نظر آرہا ہے۔"
"کیا، کیا نظر آرہا ہے؟" چوہان پیچ و تاب کھا کے بولا "زبان کو لگام دے کے رکھو استاد! ایک لڑکی اغوا ہوگئی ہے یہ نہایت سنگین واقعہ ہے۔ خبر ہے، تارا بیگم نے اپنے بیان میں کیا لکھوایا ہے۔ اس نے لکھوایا ہے کہ چاندنی بانو کے اغوا میں تمہارا ہاتھ ہوسکتا ہے۔"
"ساتھ میں یہ بھی تو بتایا ہے کہ ہم نے چاندنی بانو کی بولی لگائی تھی۔"
"ہاں بتایا ہے۔" چوہان پھنکارتی آواز میں بولا "اور یہ بھی کہ اس نے انکار کردیا تھا۔"
"لیکن شاید وہ یہ بتانا بھول گئی ہو کہ کل اس نے ایک قاصد بھی ہمارے پاس بھیجا تھا، آگے بات کرنے کے لیے۔ کس سلسلے میں؟ یہ آپ اندازہ لگانا چاہیں تو لگا سکتے ہیں۔"
"مگر تم وہاں نہیں گئے؟"
"قاصد کل رات ہی یہاں آیا تھا۔"
"اور صبح لڑکی اغوا ہوگئی، واہ! کیسا دلچسپ اور عجیب اتفاق ہے۔ ایک رات تم بالا خانے جاتے ہو، سودے کی بات کرتے ہو، دوسری رات لڑکی اغوا ہوجاتی ہے۔ تارا بیگم کی پوری زندگی کوٹھے پر گزری ہے۔ سارا بازار ایک زمانے سے قائم ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا۔" چوہان برگشتگی میں ہاتھ چلاتے ہوئے بولا "بولی تو جرم ڈھانپنے کے لیے بھی لگائی جاسکتی ہے۔"
"جو آپ کہنا چاہتے ہیں، کھل کر کہیے۔"
"ہم تمہیں چاندنی بانو کے اغوا کے شبے میں گرفتار کرسکتے ہیں۔"
"اور آپ کر بھی کیا سکتے ہیں؟ پھر دیر کاہے کی ہے۔ حجت کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے تلخی سے کہا "لیکن بات سمجھ لیجیے تھانے دار صاب! فرض کیجیے، جن لوگوں کی آپ کو تلاش ہے، اگر ہم وہ نہ نکلے تو آپ کو بہت شرمندگی ہوگی۔ بعد میں کچھ مت کہیے گا۔ ہمیں صرف اڈے کا آدمی مت سمجھو۔ تھوڑی بہت الف بے تے ہم کو بھی آتی ہے۔ جو دو لاکھ کی بولی لگا سکتے ہیں، وہ اور بھی جگہوں پر اپنا داغ دھونے کے لیے ڈھیریاں لٹا سکتے ہیں۔"

"تم، تم ہم سے یہ کس طرح کی زبان میں بات کر رہے ہو۔" طیش میں چوہان کی آواز بگڑ گئی "یہ تو سراسر دھمکیاں ہیں۔"
"آپ کو سیدھی زبان نہیں آتی، ہم کوئی آپ کے زر خرید نمک خوار نہیں ہیں۔ جرم بھی ثابت نہیں ہوا، نہ آپ ... کرسکیں گے۔ پولیس افسر آپ ہوں گے تو مجرموں کے ..."
"شمشاد خاں، شمشاد خاں!" چوہان مشتعل ہوکے بولا "... کیا ہورہا ہے، تمہارے سامنے ہم سے بدکلامی؟ اس ... کو بتاؤ کہ ہم اس طرزِ گفتگو کے عادی نہیں۔ اونچی آواز ... پسند نہیں، ہم زبان کتر لیتے ہیں۔ اس سے کہو کہ ... افسروں سے بات کرنے کی تمیز سیکھے۔"
چوہان کے چہرے پر آگ دہکنے لگی تھی۔ ہاتھ پیروں میں ... کی سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ اس کا ماتحت افسر اور ... سپاہی جیسے اشارے کے منتظر تھے کہ مجھ پر ٹوٹ پڑیں، ... بار چوہان کی طرف دیکھتے، اس کے سامنے لب کشائی کی ... نہیں ہوگی ورنہ اب تک خاموش نہ رہتے۔ بہرحال ... د خاں کی سمجھ میں کچھ آگیا تھا کہ میری زبان درازی کا ... کیا ہے۔ صاف لگ رہا تھا کہ چوہان کوئی ارادہ کرکے ہی آیا ہے، اڈے پر نشان لگا کے، اس نے کسی اور طرف ... کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ مجھے خود اپنا یہ لہجہ، یہ جیل ... زہر لگ رہی تھی لیکن اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ ... نے بالا خانے پر چاندنی بانو کی قیمت لگائی تھی اور مجھی کو ... ت کرنی چاہیے تھی۔ دوسروں کی دخل اندازی سے ... کا اطمینان نہ ہوتا۔
"سرکار! ایک بات کہوں، گستاخی معاف۔" شمشاد خاں ... ی سے اٹھ کے لجاجت آمیز جرات سے کہا "نہیں ... کے لوگوں کی طرح مت دیکھیے۔ بات آپ ہی کی ... ہوگی۔ رات بھر یہ چاروں مہمان اڈے کے لوگوں کے ... رہے ہیں۔ ایک دو نہیں، بہت سے گواہ ہیں۔ صبح نو ... مرزا دلبر نے انہیں جگایا ہے۔ میری بات مان لو ... ب! آپ غلط جگہ آگئے ہیں، ان کی کوئی بات بری لگی ہو، ... گستاخی ہوگئی ہو تو میں ..."
"کوئی گستاخی نہیں کی ہم نے۔" میں نے شمشاد خاں کو ... پوری نہیں کرنے دی اور زور دے کے کہا "الٹا چوہان ... مسلسل ہماری توہین کر رہے ہیں۔ کیا سمجھا ہے انہوں نے ..."
"اس کا دماغ خراب معلوم ہوتا ہے۔" چوہان بھڑک کے بولا۔
"دماغ آپ کا ٹھکانے پر نہیں ہے صاحب! آپ یہاں تفتیش کرنے آئے ہیں یا فیصلہ سنانے۔ جائیے، کسی اور جگہ جائیے۔ اس طرح آپ اپنا وقت بھی خراب کر رہے ہیں، ہمارا بھی۔"
اس نے پہلی بار متوحش انداز میں اپنے ماتحت افسر کی طرف دیکھا۔ ماتحت افسر نے دبے لہجے میں اسے مشورہ دیا کہ ہم سے یہاں کوئی بات کرنا فضول ہے۔ بس ایک ہی معقول صورت ہے کہ ہمیں تھانے لے جایا جائے۔ خود بہ خود ہوش ٹھکانے آجائے گا۔ چوہان نے اس کی ہمنوائی میں سرہلایا اور کہنے لگا "تم سے اب تھانے چل کر بات ہوگی۔"
"وہاں پھانسی پر لٹکائیں گے کیا! تھانے کے بعد بھی ایک جگہ ہوتی ہے، اور ہر جگہ آپ کی عمل داری نہیں ہے۔"
جُھل کی خاموشی میرے لیے تائید کے مانند تھی۔ اس کے اشارے پر میں نے اپنے لہجے میں کسی قدر ترمیم کی۔ اتنا ہی بہت تھا۔ سو میں نے تحمل سے کہا "چوہان جی! آپ سنجیدہ معلوم نہیں ہوتے۔ اگر آپ کو واقعی چاندنی بانو کی بازیابی کے لیے ایسی بے کلی ہے تو مناسب ہوگا، کسی اور طرف بھی نظر کریں۔ شاید آپ کو سرا مل جائے۔"
"ہم کو گائیڈ کرتے ہو۔" وہ جلی ہوئی آواز میں بولا "ہمیں اپنا کام اچھی طرح معلوم ہے۔"
"لیکن راستے نہیں۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔
"تو تم، تم سمجھاؤ گے راستے؟"
"جستجو شرط ہے۔"
"کون، کون سا راستہ؟" وہ بظاہر بے دلی بلکہ حقارت سے بولا۔
"تارا بیگم کے بالا خانے کا۔"
"کیا!" اس کا منہ بن گیا، پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں تاہم اس کے تیور میں مدافعت آگئی تھی "پولیس سب سے پہلے وہیں گئی تھی۔" اس نے بے اعتنائی سے کہا۔
"وہیں سے آپ کو سراغ مل سکتا ہے۔"
"وہاں سے۔" وہ سر جھٹک کے بولا "مجرم اپنی نشانی چھوڑ جائیں گے؟"
"سب سے بڑی نشانی تو خود تارا بیگم ہے۔"
"تارا بیگم! کیا بکتے ہو؟"
"دیکھیے، اس طرح کے لہجے میں آپ ہم سے مجرم ثابت ہونے کے بعد بات کیجیے گا۔"
"کیا!" وہ جھنجلا گیا "کیا اب تم ہمیں بات کرنے کا سلیقہ

بھی سکھاؤ گے؟"

"ہم اپنی زبان میں بات کریں تو پھر آپ کو بھی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔"

"تم ہو کون؟ بیچتے کیا ہو۔"

میرے جی میں تو کچھ اور آیا تھا لیکن میں نے خود پر جبر کیا "ہم کوئی بھی ہوں لیکن وہ نہیں ہیں جن کے لیے آپ بے قرار ہو رہے ہیں۔"

چوہان کے ماتحت کا پارا چڑھ گیا۔ اس سے برداشت نہیں ہوا' اس نے چوہان سے اجازت لیے بغیر کھردرے لہجے میں مجھے تنبیہہ کی کہ میں اپنی کھال میں رہوں اور اوقات سے بڑھ کے بات نہ کروں۔

"آپ بھی ذرا زمین دیکھ کے بات کیجئے جناب' اور آگے کچھ کہنے سے پہلے کان کھول کر سن لیجئے' اور آخری بار اس کے بعد جو مرضی ہو' کیجئے گا۔ استاد شمشاد خاں کی بات پر آپ نے غور نہیں کیا یا یقین نہیں کیا لیکن آپ کے پاس ذرائع کی کمی نہیں۔ اپنے طور پر' آپ یہاں اڈے پر موجود لوگوں سے ٹوہ لے سکتے ہیں کہ پچھلی رات ہم نے کہاں گزاری ہے۔ اب آپ پوچھیں گے کہ چاندنی بانو کو کون لے گیا' اس کا ایک جواب یہ ہے کہ ہم کوئی ٹھیکے دار نہیں ہیں۔ ایک دوسرا جواب بھی ہے۔ پہلے یہ شبہ کچھ دیر کے لیے سہی' ذہن سے نکال دیجئے کہ وہ ہمی سے ہو سکتے ہیں۔ جو میں کہتا ہوں' اچھا ہو گا' اسے توجہ سے سنئے اور ہو سکے تو درمیان میں دخل مت دیجئے۔ ایک ہی بات ہماری سمجھ میں آتی ہے۔ تارا بیگم نے چاندنی بانو کے لیے ہماری نذر یا قیمت سن کے بے شک انکار کردیا تھا لیکن اس کے انکار میں زور نہیں تھا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اسے سوچنے کا موقع دیا جائے۔ اسے چاندنی بانو کا عندیہ بھی لینا ہو گا۔ اتنی بڑی بولی سن کے اس کا پریشان ہو جانا لازم تھا۔ ہم نے خود بھی اسے سوچنے کی مہلت دی تھی اور باور کرایا تھا کہ اپنی آمادگی کی صورت میں وہ ہمیں جلد سے جلد مطلع کردے۔ ہو سکتا ہے' اس نے کل سارے دن بالا خانے پر آنے والے چاندنی بانو کے طلبگار راجاؤں' نوابوں سے رابطہ کیا ہو۔ ہم جیسا گاہک ہاتھ سے نکل جانے کے اندیشے میں اس نے انہیں بہت کم وقت دیا ہو گا۔ ان لوگوں کی طرف سے اسے کوئی امید افزا یا دوسرے لفظوں میں سنہرا جواب نہیں ملا تو اس نے فی الفور ہمارے پاس قاصد روانہ کیا۔ ہم رات ہی' اسی قاصد کے ہمراہ چاندنی بانو کو لانے کے لیے بالا خانے جا سکتے تھے لیکن جس شخص کے لیے ہم نے چاندنی بانو کی بات کی تھی' وہی کہیں گم ہو گیا تھا۔ اب ہمارے وہاں جانے سے کیا حاصل۔ بہتر ہے' پہلے ان لوگوں کو جا کے ٹٹو لیے جن سے کل تارا بیگم نے چاندنی کے لیے بات کی تھی۔ ہمیں معلوم ہے' وہاں آپ کی رسائی اتنی آسان نہیں ہو گی' اجازت لینی پڑے گی' ساتھ ساتھ کرنے پڑیں گے۔ اس طرح آپ منہ اٹھا کے وہاں نہیں جا سکیں گے جس طرح یہاں ہم چور اچکوں' اٹھائی گیروں کے پاس آگئے ہیں۔"

میری توقع کے مطابق اس مرتبہ چوہان ایسا برگشتہ نہیں ہوا۔ وہ منہ پھلائے' منہ سجائے کچھ سوچتا اور مسلسل گھورتا رہا' پھر چونک کے آمرانہ لہجے میں بولا "ہم کہیں جا سکتے ہیں۔ ہمارے راستے میں کوئی بھی رکاوٹ نہیں سکتا۔ سب ہمیں جانتے ہیں کہ ہم کسی لاٹ صاحب کی نہیں کرتے۔"

اتنی دیر میں آغا پیا بٹھل کے لیے پیچوان لے آیا۔ دلبر اور اڈے کے دوسرے آدمی مٹھائی کے طشت وغیرہ لے آئے۔ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔ کے آدمیوں کے واپس جاتے ہی چوہان اکھڑی ہوئی آواز میں بولا "ٹھیک ہے' دوسری طرف بھی ہم دیکھیں گے لیکن رہے استاد! ہم کسی وقت بھی واپس آسکتے ہیں۔"

میں نے سکون کی سانس لی اور کہا "آپ کو زحمت کی کیا ضرورت ہے۔ کسی کو بھی بھیج دیجئے گا' ہم خود گے لیکن ایک درخواست ہے جناب! زیادہ وقت نہ مہربانی ہو گی۔ ہمیں یہاں سے جلد از جلد روانہ ہونا آپ نہ آتے تو ہم آج شام یا کل صبح کسی وقت چلے جاتے۔"

"تم لوگ ابھی کہیں نہیں جاؤ گے۔"

"ہم ولایت نہیں جائیں گے جناب! یہیں میں رہیں گے اور اپنے اتے پتے سارے دیتے جائیں یہاں استاد شمشاد خاں بھی ہماری ضمانت کے لیے ہیں۔"

"بالکل' بالکل۔" شمشاد خاں نے سینے پر ہاتھ رکھ

"ایک میں ہی نہیں' سارا اڈا' اڈے کا ایک ایک آدمی"

"ہمیں صرف تمہارے مہمانوں سے واسطہ" چوہان حتمی لہجے میں بولا "یہ کہیں نہیں جائیں گے۔"

"میں آپ سے منت کرتا ہوں چوہان جی! ان کے نہ رکنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" شمشاد خاں سے بولا "ان کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ایک تو میں راستے کا پتھر بن گیا۔ یہ بے چارے تو آگے جا رہے معلوم ہوا تو میں ضد کرکے اسٹیشن سے یہاں لے وقت میں الو کا پٹھا' بٹھل بھائی کی بات مان لیتا تو یہ سارا کھٹ راگ کا ہے کو ہوتا لیکن ہونی کو' سچ بولتے ہیں' کون ٹال سکتا ہے۔ آپ کو خود اندازہ کرنا چاہیے کہ یہ گرمی بھی کسی وجہ سے ہے۔ میں آپ کو اصل بات بتاتا ہوں۔ شہزادے بابر میاں نے اپنے لیے نہیں' بنے خاں فراری' کے لیے چاندنی بانو کی بات کی تھی۔ بنے خاں اس پر مرمٹا تھا لیکن وہ سور کا بچہ ایسا غائب ہوا کہ پھر دکھائی ہی نہیں دیا' سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ پر ہوا یہی ہے بنے خاں میں بھی کوئی لڑکی اٹھا کے لے جانے کا دم نہیں ہے مگر کیا پتہ' غیرت مند کی اولاد تھا' پاگل ہی نہ ہو گیا ہو۔ وہ خریدی ہوئی چاندنی کے لیے تیار نہیں تھا۔ بنے خاں کو بھی ڈھونڈیے۔ یہ لوگ میرے مہمان ہیں اور مجھ کو جی جان سے پیارے ہیں۔ میرے منہ میں خاک' ان پر جرم ثابت ہو جائے اور یہ آپ کو ادھر دکھائی نہ دیں تو آپ مجھ کو لے چلئے گا۔ میں جرم قبول کرلوں گا۔ یہ واپس جا کے کیا کہیں گے۔ لکھنؤ میں ان سے ایسا برتاؤ ہوا۔"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے مگر جب تک ہماری اجازت نہ ہو۔" چوہان حکمیہ لہجے میں بولا "انہیں یہاں ٹھہرے رہنا ہے۔"

"اس سے بہتر ہے کہ آپ فوراً ہمیں عدالت میں پیش کردیں۔" میں نے اچٹتی آواز میں کہا۔

"وقت آنے پر تمہاری یہ خواہش بھی پوری کردی جائے گی۔"

"مگر ہم بہت دیر تک یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔"

"کیوں؟ تم کو تو یہاں کا اڈا سنبھالنا ہے۔"

"اڈے پر اب استاد شمشاد خاں ہی بیٹھیں گے۔"

"پھر رجن استاد سے مچٹیا کرنے کی ضرورت تھی؟"

"رجن نے حرامی پن کیا تھا۔" شمشاد خاں نے غصے اور نفرت سے لب ریز آواز میں کہا "رجن ادھر چوکی پر بیٹھ جاتا تو اڈا برباد ہو جاتا۔" شمشاد خاں نے از سر نو وہ حالات بیان کیے جن کے سبب مجھے رجن کے خلاف چاقو اٹھانا پڑا تھا۔

چوہان نتھنے پھلائے' ہونٹ بھینچے گپ چپ بیٹھا رہا' پھر اس نے اپنے ماتحت افسر سے انگریزی میں پوچھا کہ ہم لوگ تو یکسر مختلف کہانی سنا رہے ہیں' وہ کیا سمجھتا ہے۔

"جناب! میری رائے میں تو حفظ ماتقدم کے طور پر انہیں تھانے لے چلنا چاہیے۔" ماتحت افسر نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا "یہ کہانی سوچی سمجھی ہوئی بھی ہو سکتی ہے۔"

چوہان کا منہ جیسے کڑوا ہو گیا "میں ایسا نہیں سمجھتا۔"

"تو پھر یہاں ان کے ٹھہرے رہنے کی کیا ضمانت ہے؟ یہ بھاگ بھی سکتے ہیں۔"

چوہان نے کچھ تامل کے بعد اپنے ماتحت سے کہا "بھاگ کر کہاں جائیں گے' شمشاد خاں تو موجود ہے ہی' ہم اسے کھینچ دیں گے۔"

"شمشاد خاں لڑکی کو بازیاب کرانے میں کسی حد تک ہماری مدد کر سکتا ہے۔" ماتحت افسر مودبانہ لہجے میں بولا "ابھی تو بات اپنی حد تک ہے لیکن لڑکی جلد ہی بازیافت نہ ہوئی تو اوپر بھی پہنچ سکتی ہے اور سنگین صورت اختیار کر سکتی ہے۔ اہم بات لڑکی کا سراغ ملنا ہے۔"

"لیکن شاید ہمیں یہاں سے کچھ نہیں مل سکتا۔ تم نے نوجوان استاد کی گفتگو پر غور نہیں کیا۔ یہ اڈے کا آدمی معلوم نہیں ہوتا۔ لکھنؤ کے اڈے سے اسے دلچسپی ہوتی تو یہ خود یہاں ٹھہرنے پر اصرار کرتا۔"

"ٹھیک ہے جناب لیکن بیچ میں لڑکی بھی تو آگئی ہے۔ ایسے حالات میں ان کا شہر میں قیام کرنا کیونکر مناسب ہو سکتا ہے۔" ماتحت افسر نے زیر لبی سے کہا "یہ عاجزی بھی ہو سکتی ہے۔"

چوہان کچھ منتشر سا نظر آنے لگا' پھر بولا "لیکن یہ کیسا حیرت ناک واقعہ ہے کہ ایک نوواقف کی خوشنودی کے لیے کوئی اتنی بڑی رقم داؤ پر لگا دے۔"

"یہ کہانی کا سقم بھی تو ہے جناب!"

"مگر بولی لگائی گئی تھی۔ تارا بیگم کا بیان ہے۔"

"بولی لگانا اور بولی ادا کرنا دو مختلف باتیں ہیں۔ بولی کی ادائی کا مرحلہ کب آیا تھا اور آنا بھی کب تھا جناب! کیا اتنی بڑی رقم یہ ساتھ لیے پھرتے ہیں؟"

میرے جی میں آئی' اسے بتاؤں کہ رقم موجود ہے تو اس کا بندوبست ثانوی چیز ہے لیکن میں خاموش ہی رہا۔

چوہان نے گویا میری طرف سے جواب دیا "بات پکی ہونے پر رقم کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ جب تک لڑکی تارا بیگم کی تحویل میں رہتی۔"

"لیکن جناب! جیسا کہ آپ نے خود کہا ہے' بولی تو ارتکاب کیے جانے والے جرم کی ڈھال کے طور پر بھی لگائی جا سکتی ہے۔"

"پھر انہیں بولی لگانی ہی نہیں چاہیے تھی۔ بولی لگانے کے باعث تو ہم آسانی سے ان تک پہنچ گئے۔ لڑکی انہیں مطلوب تھی تو انہوں نے اتنی عجلت کیوں کی۔ کچھ روز کا وقفہ دے کے' لکھنؤ سے کچھ دن باہر رہ کے یہ چپ چپاتے واپس آتے اور یہ قدم اٹھا لیتے۔"

"میرا خیال ہے، ہمیں ٹٹولنا چاہیے کہ ان کے پاس رقم کی ادائی کی صلاحیت بھی ہے یا نہیں۔ اس نکتے سے بات آگے بڑھ سکتی ہے۔"

"یہ کوئی ایسا نکتہ نہیں۔" چوہان نے رکھائی سے کہا "یہ رقم کا انتظام کر سکتے ہیں۔"

"بہت بڑی رقم ہے جناب!"

خاموش رہنا میرے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ بٹھل نے اس اثنا میں آنکھیں میچ کے مجھے کوئی اشارہ کیا، میں کچھ اخذ نہیں کر سکا کہ یہ ان کی گفتگو میں مداخلت سے باز رہنے کی ہدایت ہے یا مداخلت کرنے کی۔ میری دانست میں ابھی مجھے ضبط ہی کرنا چاہیے تھا۔ میں بہرا بنا بیٹھا رہا۔

چوہان کو کشمکش سے دو چار دیکھ کے ماتحت افسر نے کہا "مجھے تو یہ لوگ بہت پراسرار لگتے ہیں۔ اگر واقعی یہ سچ ہے کہ انہوں نے چاندنی بانو کے لیے اس رقم کی پیش کش کی تھی تو آگے کا تخمینہ بھی لگایا جا سکتا ہے، اور آپ ہی کے بقول ایک نو واقف کے لیے یہ اس خطیر رقم کی سخاوت کر سکتے ہیں تو یہی کچھ، یہیں تک تو ان کے پاس نہیں ہوگا۔ یہ تو ایک معما ہے جناب! مجھے تو یہ سب کچھ مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ اصل بات کچھ اور ہے۔"

"ہو سکتا ہے، ہو سکتا ہے۔" چوہان متردد لہجے میں بولا "بہرحال آگے دیکھتے ہیں۔"

"فرض کرو، چاندنی بانو بازیاب ہو جاتی ہے اور بنے خاں بھی مل جاتا ہے۔" چوہان نے مجھے مخاطب کر کے پوچھا "تو تمہاری بولی قائم رہے گی؟"

"یہ بنے خاں پر منحصر ہے، اگر بنے خاں چاندنی بانو کے برآمد ہونے کے بعد بھی اس کا طلب گار ہے تو ہم اپنی زبان پر قائم ہیں۔"

"دیکھا آپ نے!" ماتحت نے بہ عجلت انگریزی میں کہا "اب پیشکش مشروط ہو گئی ہے۔ شاید اس لیے کہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔"

میں نے چاہا کہ کہوں، ظاہر ہے، اب صورت حال بدل گئی ہے لیکن میں نے کچھ نہیں کہا۔

چوہان نے غالباً اپنے ماتحت کی دل جوئی کے لیے اسی کا سوال دہرایا "رقم کا انتظام کتنی دیر میں ہو جائے گا؟ تم اتنی بڑی رقم ساتھ لیے تو نہیں پھرتے ہو گے؟"

"میں نے سوچا، کہوں، اس کا جواب وہی ہے جو ابھی خود اس نے اپنے ماتحت کو دیا تھا لیکن اپنی انگریزی کا اظہار سردست مناسب معلوم نہیں ہوتا تھا "بمبئی کے ایک بینک میں رقم محفوظ ہے۔ وہاں سے منتقل ہونے میں چند روز جائیں گے۔"

"پر پیشگی کے پیسے، پچیس تیس ہزار روپے تو ڈالے جا سکتے ہیں۔" بٹھل نے پہلی بار زبان کھولی۔

"اوہ!" چوہان دیدے پھاڑ کے رہ گیا۔

میرا خیال تھا کہ چوہان پولیس کا آدمی ہے، شک ا وتیرہ اور خاصہ ہے۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ رقم دکھائی جا اس نے خواہش نہیں کی۔

"شمشاد خاں نے مٹھائی اور شربت کی طرف چو توجہ دلائی لیکن اس نے کوئی رغبت ظاہر نہیں کی۔

"بہرحال ابھی تین چار روز تمہیں یہیں ٹھہرے رہنا ہے

"یہ حکم کس بنیاد پر ہے؟" میں نے الجھ کے کہا۔

"واقعے کی نوعیت کی بنیاد پر۔" وہ چڑ چڑے پن۔ "مشتبہ لوگوں کو پابند کرنے کا ہمیں اختیار ہے اور تمہا لیے بھی یہی بہتر ہے۔"

"لیکن ہم بھی آپ سے کچھ کہہ رہے ہیں۔"

"صرف تمہارے کہہ دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔"

"ہمارا اعتبار کیجئے۔ کوئی کسر رہ گئی ہو تو میں پھر وض کرتا ہوں۔" میں نے پژمردگی سے کہا "یقین کیجئے، کو اور مبالغہ نہیں ہے۔ ایک سیدھا سادا معاملہ پیچیدہ بنا لیے، بنے خاں، ایک نوجوان جس کے سامنے زندگ تھی، اس لڑکی چاندنی بانو کے بغیر بہت ادھورا رہتا۔ کبھ ایک آدمی دوسرے آدمی کے بغیر بہت ویران ہو جا صاحب! بنے خاں کے بس میں نہیں تھا کہ وہ اس ل حاصل کر سکے۔ یہ اتفاق تھا کہ چاندنی اس قسم کی لڑکیو تھی جنہیں اس طرح کا کچھ بدل دے کے، کچھ نذر حاصل کیا جا سکتا تھا۔ ادھر میرے پاس اپنی ضرورت زائد روپے تھے۔ یہ رقم چلے جانے سے مجھے کوئی فرق مگر بنے خاں کو چاندنی مل جاتی۔ کسی کو اس کا مطلو جائے تو اس سے بڑی بات کیا ہو سکتی ہے مگر آپ شای سمجھیں گے، میں سمجھا نہیں پاؤں گا۔ بس اتنی سی با جناب! بنے خاں، رجن سے کبھی کمزور نہ ہوتا۔ اس ہی حاضر نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے، وہی چاندنی بانو کو لے لیکن اس واقعے سے ہم لوگوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"ہم سمجھ رہے ہیں لیکن گواہ و شہادت، دلیل و قانونی واجبات ہیں۔" چوہان کی آنکھوں میں غیر معمو ہویدا ہوئی۔ پہلی بار مجھے اس کے لہجے سے جذب اور احساس ہوا۔ کہنے لگا۔ "آگے بیانات کے لیے تم ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

"مگر کبھی، جب ہم کسی طور ملوث۔۔۔" میں نے بٹھل کی طرف دیکھا اور پھر مجھ سے کچھ نہیں کہا گیا۔

"چوہان بھی ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ شمشاد خاں نے بہت اصرار کیا لیکن چوہان نے مٹھائی کا ایک دانہ، شربت کا ایک جرعہ لینا گوارا نہیں کیا۔ سبھی اس کے ساتھ اٹھ گئے اور پیچھے پیچھے گلی تک آئے۔

رسمی سلام ودعا کے بعد وہ رخصت ہو گیا۔ جمرو اور زورا نے زور سے میرے بازو پکڑ لیتے۔ چوہان کو مڑتے دیکھ کر وہ سیدھے ہو گئے۔ مجھے سمجھنے میں کچھ دیر لگی۔ چوہان نے میری جانب انگلی اٹھائی تھی۔ کچھ توقف کے بعد اٹکتے قدموں سے میں اس کے پاس پہنچا۔ پہلے تو وہ میری صورت دیکھتا رہا، پھر یکایک میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اس نے رازدارانہ لہجے میں پوچھا "کب جانا چاہتے ہو تم؟"

میں نے جلدی سے کہا "آج شام یا کل صبح کسی وقت۔" مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ چوہان نے انگریزی میں مجھ سے پوچھا ہے۔ گو میں نے جواب اپنی زبان میں دیا تھا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ آگے کوئی وضاحت کرتے ہوئے میری زبان لڑکھڑا گئی۔

وہ مسکرانے لگا اور میرا شانہ تھپکتے ہوئے بولا "میری نگاہ نے دھوکا نہیں کھایا۔ سب انسپکٹر رضوی سے اپنی گفتگو کے دوران تمہارے چہرے کے رنگوں سے مجھے شبہ ہوا تھا، آخر تم ہی سے ایک غلطی ہو گئی۔ مبالغے اور معمے کی بات تو میرے اور رضوی کے درمیان ہوئی تھی بھائی!"

ایک لمحے کے لیے مجھ پر سناٹا سا چھا گیا۔

"لیکن ایک حیرت ابھی باقی ہے۔ تم، تم ان لوگوں کے درمیان کیوں ہو۔" وہ کتراتی ہوئی آواز میں بولا "میری مراد ہے، اڈے کے اس ماحول میں۔"

میں کسی مجرم کی طرح سر جھکائے سوچتا رہا کہ اسے کیا بتاؤں۔

"یہ جاننے کا اشتیاق رہے گا، خیر پھر کبھی سہی۔ ہو سکے تو جانے سے پہلے ایک بار مجھ سے ملنا۔ اگر اب ممکن نہ ہو تو جب بھی یہاں آؤ۔ یقیناً تمہاری رواداری میرے تجربے میں اضافے کا سبب ہو گی۔"

"جی، جی۔" میں نے سٹپٹاتے ہوئے کہا۔

"اور اس بڈھے توتے شمشاد خاں سے کہنا، وہ کہہ رہا تھا کہ تم یہاں نہ ہوئے تو وہ خود کو پیش کر دے گا اور سارا جرم قبول کر لے گا۔ اس سے کہنا کہ وہ جرم تو ضرور قبول کر لے گا، لڑکی کو کہاں سے ہمارے حوالے کرے گا۔"

مجھے بھی ہنسی آگئی۔ میں نے بہ مشکل کہا "آپ نہایت مہربان پولیس افسر ہیں۔ مجھے معاف کر دیجئے، میرے دل میں آپ کے لیے بڑی بدگمانیاں۔۔۔"

"میری کمر پہ دھپ مار کے وہ مجھے گلے سے لگا لیتا لیکن شاید اسے اپنے منصب کا خیال آگیا۔ ادھر گلی میں بہت سے لوگ ہماری جانب نگراں تھے۔ چوہان نے رسمی انداز میں مجھ سے ہاتھ ملایا اور چلتے چلتے ٹھہر گیا۔ شام کو سب انسپکٹر رضوی کے آنے پر اپنا بیان لکھوا دینا۔ اس کے بعد تم جب چاہو یہاں سے۔۔۔"

وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا کہ پلٹ کے تیز قدموں سے آگے چلا گیا۔

اب کے انہوں نے انتظار کیا کہ چوہان اور اس کے ساتھی گلی کے موڑ پر نظروں سے اوجھل ہو جائیں۔ ان کے دور ہوتے ہی زورا، جمرو اور شمشاد خاں نے مجھے بری طرح بھینچ لیا۔ ان کی حیرت آمیز مسرت نہایت فطری تھی۔ مجھے بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ اس خوش وضعی سے یہ مرحلہ گزر جائے گا۔ ایک دفعہ پولیس کے نرغے میں آجانے کے بعد بچ نکلنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ ہمیں چند روز کیا، بہت دنوں تک روک سکتے تھے۔ خانہ پری کے لیے انہیں کچھ لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے اور اڈے کے آدمی پہلے زد پر آتے ہیں۔ پھر وہی کچھ ہو سکتا تھا کہ الجھتے الجھتے بہت سی گرہیں پڑ جاتیں مگر میں نے کوئی معرکہ سر نہیں کیا تھا۔ میرے لیے تو یہ محض آموختہ تھا۔ بٹھل کو کئی بار میں دیکھ چکا تھا۔ پیرو کے قتل کے دن، رات کو بمبئی پولیس سے اور تبت سے واپسی پر کلکتہ پولیس سے اس نے اسی طور نجات حاصل کی تھی، اسی نادیل وحجت سے۔ چند روز پہلے سکندر آباد اسٹیشن پر یہی کچھ ہوا تھا۔

پولیس کی آمد، عمارت میں موجود ہجوم کے لیے بے قراری کا باعث ہونی چاہیے تھی۔ لوگ وہم وقیاس کے جال بنتے جا رہے ہوں گے۔ گلی میں اسی لیے بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے کہ پولیس کی واپسی کا منظر بہ چشم خود دیکھ سکیں۔ وہ تو انسپکٹر چوہان نے خیال آرائیوں اور سخن طرازیوں کا باب ہی بند کر دیا۔ رخصت ہوتے وقت مجھ سے اس کے سلوک کے سبھی گواہ تھے۔ اب انہیں قرار آگیا ہوگا۔

دیگیں پک چکی تھیں۔ کھانے کی خوشبو عمارت میں بسی ہوئی تھی۔ اتنی جلدی اتنا بڑا انتظام بجائے خود ایک کارنامہ تھا۔ جیسے ہی ہم چوکی پر آکے بیٹھے، دسترخوان بچھا دیے گئے۔

کچھ لوگوں کو جگہ نہ ملنے کی وجہ سے باہر جانا پڑا۔ شمشاد خاں نے اعلان کردیا تھا کہ آج اڈے پر آنے والے ہر شخص کو مہمان کے طور پر برتا جائے گا۔ کھانا' مٹھائی' مشروبات' جس کی جو خواہش ہو' اسے سیر کردیا جائے' چار بجے شام تک کھانے کا سلسلہ چلتا رہا۔ دستر خوان بار بار اٹھائے اور بچھائے جاتے رہے۔ لوگوں کا تانتا بندھا رہا۔ عصر کے بعد شیرینی' شربت اور قہوے کا دور چلا۔ واللہ اعلم' مگر آغا پا نے مجھے بتایا کہ رجن بھی بنے خاں کی طرح خاموشی سے چلا گیا۔ اس کے بعد وہ نظر نہیں آیا۔ باہر چند لوگوں نے اس سے تاسف کا اظہار کیا تو جواب میں اس نے کسی تکدر اور تردد کے بغیر کہا کہ اس نے کچھ کھویا نہیں' پایا ہے۔ کسی ایسے ویسے سے نہیں' وہ استاد بٹھل کے شاگرد سے زیر ہوا ہے۔ اور اسے اطمینان ہے کہ لکھنؤ کے اڈے پر پہلی مرتبہ کوئی استاد آیا ہے۔ اڈے کی چوکی کی یہ مضبوطی اس کی دخل اندازی کی وجہ سے ممکن ہوئی ہے اور اگر وہ چوکی پر نہیں ہے تو کیا ہوا' بنے خاں بھی تو نہیں ہے۔ آغا پا کے مطابق رجن کہتا تھا کہ اس کشیدہ و برگشتہ ماحول میں اسے استاد بٹھل کے پاس جانے کی جرات نہیں لیکن یہاں نہ سہی' اس کی خدمت میں سلام پیش کرنے اور اس کے پیروں پر سر رکھنے وہ کلکتے ضرور جائے گا۔ اسے تو کسی ایسے ہی استاد کی تلاش تھی۔ یہ سن کے مجھے کچھ یہ گمان ہوا کہ آغا پا بھی رجن کے لیے نرمی کا ایک گوشہ رکھتا ہے اور اس کی عرض احوال میں رجن کے لیے کوئی سفارش پنہاں ہے۔

چوکی سے اٹھنا مشکل ہوگیا تھا' بطور خاص میرا۔ شام کے وقت تو قطار لگ گئی' ایک ہٹتا نہیں تھا کہ دوسرا آجاتا تھا۔ سلام کرتا' کیلے کے پتوں میں لپٹے ہوئے تازہ پھولوں کے ہار کھول کے بٹھل اور شمشاد خاں کے علاوہ میرے گلے میں ڈالتا' مٹھائی کا دونا آگے رکھتا اور لوٹ جاتا' کوئی سکوں سے بھری ہوئی ریشمی کپڑے کی تھیلی میری طرف چپکے سے بڑھا دیتا' کوئی ہاتھ چومنے لگتا۔ اڈے کا ایک بزرگ آدمی سامنے آنے والے شخص کا سرسری طور پر تعارف کراتا۔ میرا اور بٹھل کا سرہلانا' نذر گزار کی نذر قبول کرنے اور اس کا نام ذہن نشین کرلینے سے عبارت تھا۔ مجھے تو اس فضول معمول سے گھبراہٹ ہونے لگی۔ زورا اور جمرو بھی میری وجہ سے بندھے بیٹھے تھے۔ میں نے اشاروں میں جمرو سے التجا کی کہ وہ کسی طرح مجھے ان رسموں سے چھٹکارا دلائے۔ اسی نے میری مشکل حل کی اور شمشاد خاں کے کان میں کوئی عذر کرکے یکایک اٹھ کھڑا ہوا' پھر میں نے بھی پلٹ کے شمشاد خاں اور بٹھل کی طرف نہیں دیکھا اور چوکی سے اتر آیا۔

عمارت کے اندرونی حصے سے گزرتے ہوئے ہم با منزل کے کمرے میں آکے بستروں پر دراز ہوگئے۔ زورا جمرو کو بے چینی ہونے لگی کہ کچھ دیر کے لیے کیوں نہ سلہ دیکھ آئیں' بعد میں وقت ملے نہ ملے۔ پورا ایک دن ہوگ لیکن بستر پہ آکے کچھ اور کسل مندی ہوگئی۔ میں نے ان کہا کہ وہی سلمٰی کے پاس چلے جائیں' میری طرف سے پوچھ لیں۔ دونوں چلے گئے۔ نیچے جاکے انہوں نے دل بستگی کے لیے آغا پا کو بھیج دیا۔

آغا پا ایک خوش طبع شخص تھا اور ایران و تورا باتیں کرتا تھا۔ جانے کہاں کہاں کے مزے دار قصے کہ اسے ازبر تھیں۔ میں نے اسے بھی واپس کردیا۔ آدمی اپنے آپ سے باتیں کرنے کو بھی تو دل چاہتا ہے۔ نچلی سے اٹھنے والے شور سے کمرا بھی محفوظ نہیں تھا۔ طرح کی آوازیں دور جاکے یک آواز' یک طرز ہوجاتی ہیں او گراں نہیں گزرتیں۔ نیند تو بالکل نہیں آئی لیکن بہت محسوس ہوا۔ ہر بار ایک زنداں وار زنداں سے رہائی سکون۔ آدمی کو نوشتے پر یقین نہیں ہے' بار بار کی آزما کے باوجود ہر آزمائش نئی لگتی ہے۔ یہ چند دن بھی یو گزرنے تھے' خواہ مخواہ ضائع ہوگئے۔ وہی بات ٹھیک گوشہ گیری میں بڑی امان ہے۔ مجھے کسی مناسب و انتظار تھا۔ میں نے بٹھل سے حتمی بات کرنے کا فیصلہ تھا۔

میں نے طے کیا تھا کہ اس سے کہوں گا' وہ یا تو فیض میں زریں کے پاس ٹھہر جائے یا بمبئی میں ابا جان کے جائے۔ اب ہمیں کہیں اور نہیں جانا۔ گھر سے قد ہمیں راس نہیں۔ ہر جگہ ایک نئی افتاد جیسے ہماری منت ہے' اور اب اتنے شہر' اتنے گلی کوچے دیکھ لیے ہیں سے کوئی امید نہیں۔ آگے جہاں بھی' جن نئی جگہوں جائیں گے' کوئی ضمانت نہیں کہ مولوی صاحب وہاں اور طرف کا قصد نہ کرچکے ہوں۔ میں بٹھل کو قائل کے لیے نت نئے عذر تراشتا' دلیلیں کھوجتا رہا مگر مجھے نیا عذر' نئی دلیل سجھائی نہیں دی۔ بٹھل سے تو پہلے بہت کچھ کہہ چکا تھا' ناراضی اور تلخی کی حد تک اصرار کیا تھا' ایک مرتبہ نہیں' کئی مرتبہ۔ یہی ایک کہ فیض آباد اور بمبئی جانے کے بعد کسی دن تن تنہا ہوں اور اپنا آزار خود بھگتوں۔ کبھی واپس آگیا تو ٹھیک لوگ صبر کرلیں گے۔ صبر کتنا ہی جبر ہو' آدمی عادی ہے۔ ویسے بھی میں کسی کے لیے کتنا زندہ ہوں یا ایک دوسری صورت بھی تھی کہ اپنے آپ کو ترک کرکے ان کے حوالے کردوں۔ ان کا ارادہ میرا ارادہ ہو۔ آدمی غلامی بھی تو کرتا ہے' معذور بھی تو ہوجاتا ہے اور مال و زر کی طرح اپنے طلب گاروں میں خود کو تقسیم بھی تو کردیتا ہے۔ موت کے بعد ترکے کے سزاوار بھی تو یہی ہوتے ہیں۔ کوئی ایک فیصلہ تو کبھی نہ کبھی مجھے کرنا ہی ہے۔ اب شاید میرا ارادہ' میرا عزم میرے اختیار میں نہیں رہا لیکن جتنا میں کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتا' دھند اتنی ہی تیز ہوجاتی۔ ظاہر ہے' میں کہیں نہ کہیں منہ چھپالوں گا تو کتنے لوگ ویران ہوجائیں گے۔ ایک کے بعد ایک چہرہ۔ کیسے کیسے میرے دل ساز و دلنواز ہیں۔ میں خود کو ان کے سپرد کردوں تو یہ سپردگی کتنی حقیقی اور کھری ہوگی۔ میں ان میں شامل ہوکے کس قدر شاد رہا ہوں۔ کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔ پہلے بھی میں نے بہت جتن کیے ہیں۔ کیا حاصل ہوا؟ میں اپنے عزم اور ارادے کی بات کرتا ہوں مگر یہ میرے اختیار میں ہے کہاں۔ کوئی اور فیصلہ کرنے کی سکت مجھ میں کتنی ہے پھر شاید جو ہورہا ہے' یہی مناسب ہے' آدمی توفیق و مقدور کے سوا کیا کرسکتا ہے۔

اندھیرا چھا گیا تھا۔ وقت کی کچھ خبر ہی نہیں ہوئی۔ بیداری کی غفلت نیند سے زیادہ نادم کرتی ہے۔ جمرو اور زورا کے آجانے پر میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ دوسروں کا اتنا خیال بھی خود کو ترک کردینے کے مترادف ہے۔ یہ سب کچھ تو میں کرتا ہی رہا ہوں۔ اس مروت سے ان کی سیری ہوجاتی ہے تو س یہی میرے امکان میں ہے۔

آغا پا بالائی منزل پر میرے کمرے کے اردگرد منڈلاتا رہا تھا' چوکی دار کی طرح۔ میرے آرام کی خاطر وہ کمرے میں اخل نہیں ہوا اور روشنی بھی نہیں کی۔ اسے کیا معلوم تھا یک پل کے لیے بھی میری آنکھ نہیں لگی ہے۔ عمارت میں ہر و چراغاں ہورہا تھا۔ کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں چراغ نہ ل رہا ہو۔ اندر نچلی منزل پر تو جشن کا منظر تھا۔ باہر گلی میں بت بج رہی تھی۔ لنگر جاری تھا۔ آغا پا نے بتایا کہ کھانے کے بعد' پہلے زنانے اٹکھیلیاں کریں گے' پھر مجرے کی محفل آراستہ کی جائے گی۔ عرصے بعد کہیں اڈے کی رونق بحال وئی ہے' کلن خاں کے رخصت ہونے کے بعد اڈا ہی اجڑ گیا تھا۔ بٹھل اور شمشاد خاں گاؤ تکیے سے کمر ٹکائے چوکی پر بیٹھے تھے۔ ہم بھی وہیں چلے گئے۔ انہیں ہمارا ہی انتظار تھا۔ دکی پر دستر خوان بچھا دیے گئے۔ بریانی' پتلے شوربے کا رمہ' ماش کی پھریری دال' فیرنی' نان اور چپاتیوں کا اہتمام تھا۔ بھوک ایسی کھلی نہیں تھی لیکن کھانوں کی خوشبو بھی اشتہا مہمیز کرتی ہے۔ خوشبو بے جواز نہیں تھی۔ تمام چیزیں ذائقے دار تھیں۔ کھانے کے لیے بھی ایک ماحول چاہیے۔ لگتا تھا' عمارت میں موجود ہجوم آنے والے کل سے بے نیاز ہے' آنے والے کل کے معمول سے بہت بیزار' آج ہی سارا کچھ سمیٹ لینا چاہیے تھا۔

سب نے عجلت کی اور نو بجے تک دستر خوان اٹھا دیے گئے۔ عمارت کے وسط میں چاندنیاں بچھا دی گئیں اور زنانوں نے کھیل تماشا شروع کردیا۔ ہنساتے ہنساتے انہوں نے سب کو لوٹ پوٹ کردیا۔ میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا کہ لوگ زنانوں کو دیکھ کے بے قابو کیوں ہوجاتے ہیں اور ان سے ناروا قسم کی چھیڑ خانیاں کیوں کرنے لگتے ہیں۔ ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ یہ کوئی دوسری مخلوق ہے' یہ لوگ انسانوں کے گھر پیدا نہیں ہوئے۔ مجھے تو ہمیشہ ان پر ترس ہی آیا۔ یہ تو سراسر آدمیت کی توہین ہے۔ آدمی کی کسی پیدائشی خامی میں اس کی کیا خطا! پیدائشی اندھوں' گونگوں اور بہروں کا تو کوئی مذاق نہیں اڑاتا' پھر ان لوگوں سے ایسا سلوک کیوں کیا جاتا ہے۔ شاید اس میں کچھ ان لوگوں کا بھی قصور ہے۔ یہ اپنے آپ کو تماشا بنواتے ہی کیوں ہیں۔ اندھے' لولے' لنگڑے لوگ سولہ سنگھار کرکے اپنے آپ کو رسوا تو نہیں کرتے۔ وہ بھی تو کسی طور زندگی بسر کرتے ہی ہیں لیکن کیا بھیک مانگنا سوانگ بھر کے پیٹ پالنے سے بہتر ہے۔

گیارہ بجے کے قریب ان کی نوٹنکی بند ہوئی اور قہوے کے دوران مجرے کی محفل کا آغاز ہوا۔ دو نوجوان خوش اندام لڑکیاں' ایک کم سن دوسری نسبتاً پختہ کار رات کے دو بجے تک ناچتی گاتی رہیں۔ اچھا خاصا گالیتی تھیں۔ ناچ بھی خوب آتا تھا۔ دیکھنے میں شگفتہ و تابندہ تھیں۔ کچھ آرائش و زیبائش کی بات بھی تھی لیکن دو دن پہلے تارا بیگم کے بالا خانے پر ہم نے چاندنی بانو کا رقص دیکھا تھا اور اس کی آواز سنی تھی۔ گانے والے کا کمال یہ ہے کہ آواز بجائے خود ساز ہو' ساز مستزاد ہوں۔ کہتے ہیں' آواز وہی ہے جو دل چھولے اور رقص کے لیے لوگوں کا کہنا ہے کہ بدن میں لہروں جیسی بے ساختگی ہو' بجلی کی چمک اور شاخوں کا لوچ ہو۔ یہ لڑکیاں چاندنی کا عشر عشیر بھی نہیں تھیں تاہم تماش بین بے حال ہوتے رہے۔ سکوں اور روپوں کی بارش ہوتی رہی۔ کوئی نہیں چاہتا تھا کہ یہ رات تمام ہو لیکن شمشاد خاں نے بٹھل کے اشارے پر روشنیاں گل کرنے کا حکم صادر کردیا پھر بھی لوگ ڈھائی تین بجے تک بیٹھے رہے۔

مجھے حیرت تھی کہ لوگ بنے خاں کو کتنی جلد، کتنی آسانی سے فراموش کیے بیٹھے ہیں، یہ سارا اہتمام تواصل میں اڈے کے نئے استاد بنے خاں کے لیے کیا گیا تھا۔ اس کی اب تک کوئی خبر نہیں تھی اور کسی کو اس کی اب کوئی فکر بھی معلوم نہیں ہوتی تھی، شمشاد خاں تک کو۔ کچھ عجیب سی بات تھی۔ اس بے اعتنائی کی وجہ بظاہر بنے خاں کی اچانک روپوشی ہی ہوسکتی تھی جسے لوگ بنے خاں کی زود حسی و زود رنجی، رنگ دلی اور کم ہمتی پر محمول کررہے ہوں گے۔ ایک اور وجہ بھی تھی۔ غیر متوقع، رجن نے سامنے آکے سب کو مضطرب کردیا تھا۔ گو دوسرے دن وہ پسپا ہوگیا لیکن یہ ایک دن بڑے تلاطم اور انتشار کا دن تھا۔ اس صدمے سے جس شخص نے انہیں نکالا، وہ بنے خاں سے زیادہ فضیلت کا مستحق تھا اور یہ تبدیلی شمشاد خاں کی مرضی و معیار کے مطابق تھی تو اس سے بڑی سرخوشی کیا ہوسکتی تھی۔ وہ تو شمشاد خاں کی طرف دیکھتے تھے۔ شمشاد خاں ایک زمانے سے ان کا مرکز نگاہ تھا۔ اڈے کے معاملات میں اس کی منشا ان کے لیے اعتبار کا درجہ رکھتی تھی۔ ایک اور سبب بھی ہوسکتا تھا۔ شاید لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ بعد از خرابی بسیار آخر اڈے کو کبن خاں مرحوم کا جانشین مل گیا، اب اڈے پر نئے استاد کا قیام مستقل رہے گا۔

تین بجے کے قریب ہمیں بھی اپنے کمرے میں جانے کا موقع مل گیا اور جلد ہی نیند نے آلیا۔ آغا پیا کو ہم نے تاکید کردی تھی کہ صبح آٹھ بجے ہمیں جگا دے۔ ٹھیک آٹھ بجے آغا پیا اور مرزا دلبر نے دروازے پر دستک دی۔ ناشتے کا انتظام بھی انہوں نے وہیں کردیا۔ نیند آنکھوں سے پوری طرح دور نہیں ہوئی تھی یا بیداری میں کچھ کسر رہ گئی تھی کہ آغا پیا نے یہ بتا کے ہم تینوں کو سیدھا کردیا کہ رات سادہ لباس والے پولیس کے کئی آدمی محفل میں موجود تھے۔ گزشتہ رات کئی بار مجھے خیال آیا تھا کہ کسی وقت بھی انسپکٹر چوہان کا ماتحت رضوی ہمارے بیانات لینے آسکتا ہے۔ رضوی کے نہ آنے کا ایک ہی مطلب ہوسکتا تھا کہ چوہان نے یہ رسم بھی غیر ضروری سمجھی ہے یا اسے کسی اور طرف کوئی نشان نظر آگیا ہے۔ یہاں سے مایوس ہوکے پولیس کو زیادہ فعال و مستعد ہوجانا چاہیے تھا۔ پہلے تو انہوں نے سیدھے تارا بیگم کے بالا خانے کا رخ کیا ہوگا اور ان دل پھینک نواب زادگان کی سن گن لینے کی کوشش کی ہوگی جو چاندنی بانو کے والہ وشیدا تھے اور جن سے تارا بیگم نے میری بولی کے بعد رابطہ کیا ہوگا۔ بہرحال آغا پیا کی اطلاع صرف میرے لیے نہیں، جمرو اور زورا کے لیے بھی طمانیت و تقویت کا باعث تھی۔ اس سے اچھی بات کیا ہوسکتی تھی کہ پولیس ہماری نگرانی کررہی ہے۔ لازماً انہوں نے اڈے کے بعض کمزور آدمی بھی مخبری کے لیے مامور کیے ہوں گے۔ زورا کا خیال تھا کہ بنے خاں کے نگہدار ساتھی ابھی تک اڈے پر واپس نہیں آئے، کوئی بعید نہیں کہ بنے خاں ہی نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے چاندنی بانو کو اغوا کرلیا ہو۔ یہ ایک ناقابل یقین جرات تھی مگر سنا ہے، شکست خوردگی کبھی ایسے ہی جنون سے دوچار کردیتی ہے۔

رات محفل کے اختتام پر شمشاد خاں نے اڈے کے منتخب آدمیوں کو صبح اڈے پر جمع ہونے کی ہدایت کی تھی۔ نیچے آئے تو خاصے لوگ موجود تھے۔ چوکی پر ہمارے بیٹھتے بٹھل نے حقے کی نے ترک کی اور سپاٹ آواز میں انہیں مخاطب کیا "ہماری بات ذرا دھیان سے سنو۔ اپنے کو آگے جانا ہے۔ بیچ میں اڈے پہ انٹ پلٹ نہیں ہوجاتی تو ہم یہ ادھری سے نکل جاتے۔ ہمارے پیچھے پہلے کی طرح استاد شمشاد خاں چوکی کو دیکھے گا۔ کسی آدمی کے تیار ہوجانے تک استاد شمشاد خاں کی مرضی ہے۔ اس کو چوکی پر جگہ دے نہیں۔ رجن کی طرح کوئی حرام کا جنا کبھی سامنے آیا تو استاد شمشاد خاں ہم کو خبر کردے گا اور مہینے کے اندر اندر ہمارا آنا نہیں ہوا تو جیسا کہ اڈے کی ریت ہے، ویسا ہی ہوگا۔ اس ٹائم میں دو یا دو سے زیادہ سر اٹھانے والے پنچہ کرکے چوکی کا فیصلہ کرسکتے ہیں۔ سن لیا سب نے؟"

شمشاد خاں سر جھکائے سنتا رہا۔ بٹھل کے دم ہوجانے پر چند لمحوں بعد اس نے دل گیر آواز میں کہا "ٹھیک ہے، جو استاد بٹھل بھائی کہتے ہیں، ٹھیک ہے۔ ہم نے اس کو روکا تھا پر کیا پتہ تھا، سب الٹ پلٹ ہوجائے گا۔ اب معلوم ہے، بٹھل بھائی کو آگے جانا ہے۔ کچھ بولنا بیکار ہے۔ اپنا منہ بھی نہیں پڑتا لیکن ایک بات سارے سن لیں، بٹھل بھائی کے کہنے پر ہم یہاں ضرور بیٹھیں گے پر اڈا باہر استاد کے نام پر چلے گا۔ شمشاد خاں کی آواز بھرا گئی "سب جانتے ہیں، ہم نے ادھر سے ہٹنے کا طے کرلیا تھا۔ رجن کتے نے سب کھیل الٹا کردیا۔ اب اڈے کے آدمیوں سے ہمارا کہنا ہے، نیا آدمی جلدی سے تیار کرو اور بس ہماری چھٹی کردو۔ زیادہ دن نہیں بچے اپنے پاس۔ چوکی پر کوئی رجن جیسا، کی اولاد، سور کا بچہ پھر سامنے آجائے گا۔ پھر مت کہنا ایک بات!" شمشاد خاں کی ٹمٹماتی آواز میں تندی آگئی ایک بات کان کھول کے سن لو سب۔ بابر استاد کی

"ٹھیک ہے، لیکن رجن کی طرح کوئی دوسرا الو کا پٹھا شکل ہے ...گے آیا تو بابر میاں اور بٹھل بھائی کتنے ہی دور ہوں، اپنے ...ائی شمشاد خاں کے پکارنے پر ضرور لکھنؤ آئیں گے اور ...لھال نوچ لیں گے اس مستانے کی۔ شمشاد خاں اور کبن ...ان کی چوکی پر وہ کسی پاپی کو نہیں دیکھ سکتے۔ ہماری آنکھیں ...د ہونے کے بعد بھی یہ بات پکی سمجھو۔"

...بٹھل چوکی پر نہیں ٹھہرا۔ اس کے ساتھ سبھی نیچے آ...ئے اور گلی میں دور تک ہمارے ساتھ چلتے رہے۔ تانگے، ...امان اور ہجوم دیکھ کے مجھے اندازہ ہوا کہ ہم اسٹیشن کی ...رف جارہے ہیں۔ میں نے ہجوم سے چند قدم الگ لے ...کے جمرو سے تصدیق چاہی "کیا ہم یہاں سے جارہے ہیں؟"

"کیوں؟ کیا ہے لاڈلے؟" جمرو بمبئیا زبان میں شوخی ...سے بولا "ابھی اور ایدری ٹھہرنے کو مانگتا کیا!"

"یہ بات نہیں۔" میں نے الجھ کے کہا۔

"پھر کیا ہے۔ بڑی مشکل سے سالی گردن چھٹی ہے۔ ...ب ادھر رکھا بھی کیا ہے۔"

"کچھ دیر بعد ہم اسٹیشن نہیں پہنچ سکتے۔"

جمرو چونک کے بولا "بات کیا ہے؟"

"کچھ نہیں۔" میری نظریں بٹھل پر بھٹکنے لگیں۔

"ادھر کوئی کان لگائے نہیں ہے، صاف بتا۔"

"جمرو بھائی! ایک بات کا خیال آتا ہے۔" میں نے اٹکتی ...از میں کہا "اگر زورا کا کہنا...... صحیح ہے تو تارا بیگم تو برباد ...ئی۔ بنے خاں نے چاندنی بانو کو اغوا کیا ہے تو چاندنی تو اسے ...گئی۔ اب ہمیں جاکے تارا بیگم کو کچھ دینا چاہیے۔ مطلب ...کہ سب ہماری...... ہماری وجہ سے۔"

"ہا!" جمرو سر جھٹک کے بولا "کیا بولتا ہے۔ زورا داوا ...لا کوئی جیوتشی پیر فقیر ہے۔ وہ تو جو منہ میں آئے، اگل دیتا ...ہے۔ مانو اگر ایسا نہیں ہوا تو! تو ہم تارا بیگم کے آگے ڈھیری ...ں آئیں؟ اور وہ! وہ بنے خاں، تیس مار خاں۔ اتنا پاگل ...ں تھا۔"

"اور فرض کرو، زورا کی بات صحیح نکلی؟"

"تو ہم ٹھیکے دار ہیں کیا؟ ہم لوگوں پر بھی تارا بیگم کا حق ...یں بنتا۔" جمرو نے ناگواری سے کہا "پولیس ادھر پیچھے لگی ...ہے۔ ایسے میں کوٹھے پہ جاکے الجھٹا ڈالیں ہم۔ سیدھے ...ھاؤ بچ نکلنا ہی ٹھیک ہے۔" جمرو مجھے سمجھانے لگا کہ سفر کے ...رے انتظامات ہوچکے ہیں۔ گاڑی کی روانگی کے وقت ہی ...اڈے سے نکلے ہیں۔ زورا، مرزا دلبر کے ساتھ سلمٰی کو لینے ...چکا ہے۔ یہ مہم جوئی بہت مہنگی پڑسکتی ہے۔ بات چھپی تو نہیں رہے گی۔ بٹھل کو خبر ہوئی تو الگ ناراض ہوگا۔ کہنے لگا کہ چاندنی بانو کون سی تارا بیگم کی پہلو زاد ہے۔ کہیں سے، کسی سے خرید کے ہی تارا بیگم نے اسے پروان چڑھایا ہے۔ یہ عورتیں اپنی تربیت یافتہ لڑکیوں کو بیٹی ہی کہتی ہیں۔ اس رات بالا خانے پر جتنی لڑکیاں ہم نے دیکھی تھیں، سب تارا بیگم کی بیٹیاں تو نہیں تھیں۔ چاندنی بانو سے جتنا حاصل کرنا تھا، تارا بیگم نے کرلیا ہے۔ میں خاطر جمع رکھوں کہ چاندنی بانو کے چھن جانے سے تارا بیگم غارت نہیں ہوجائے گی۔

جمرو کی بات سمجھ میں آرہی تھی لیکن جی نہیں مانتا تھا۔ ادھر بٹھل، شمشاد خاں کے ساتھ تانگے میں بیٹھ چکا تھا۔ جمرو مجھے اپنے بازو میں بھر کے دوسرے تانگے میں سوار ہوگیا۔ تانگوں اور سائیکلوں کا ایک قافلہ اسٹیشن تک ہمارے ساتھ چلا۔ اسٹیشن پر پہلے سے کافی لوگ پہنچ چکے تھے۔ گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ ٹکٹ، ڈبے اور نشستوں کا بندوبست اڈے کے آدمیوں نے کرلیا تھا۔ زورا پہنچ چکا تھا۔ سلمٰی بھی ڈبے میں بیٹھی تھی۔ سلمٰی کو برقع میں دیکھ کے مجھے کھٹکا ہوا۔ سادہ لباس والے، ظاہر ہے۔ یہاں بھی موجود ہونے چاہئیں۔ وہ کہیں بدگمان نہ ہوجائیں۔ میں نے جمرو کو بتایا تو اس نے بھی تائید کی۔ سلمٰی کو نقاب اٹھائے رکھنے کی ہدایت بہت ناروا معلوم ہوتی تھی اور ہرچند چاندنی بانو کو اس طرح لے جایا بھی نہیں جاسکتا تھا مگر پولیس کا کچھ ٹھیک نہیں، وہ کوئی بھی رخنہ ڈال سکتی تھی۔ جمرو نے جانے کس طرح سلمٰی کو نقاب ہٹانے پر آمادہ کیا۔ ڈبے کے سامنے اڈے کے آدمیوں کا ہجوم تھا۔ بہت سے لوگوں نے اس کا چہرہ دیکھا ہوگا۔ سلمٰی برقع میں نہ ہوتی تو کوئی بات نہیں تھی یا پہلے سے نقاب کھلا ہوتا تو بھی کچھ نہیں تھا۔ اب اچانک نقاب اٹھالینا اور چہرے کی نمائش کرنا سلمٰی کو بالکل اچھا نہیں لگ رہا ہوگا لیکن پولیس کے اطمینان کے لیے یہی ایک چارہ تھا۔

زیادہ دیر نہیں لگی کہ انجن نے سیٹی بجادی۔ شمشاد خاں باربار ہم چاروں سے آکے گلے ملتا رہا، اس نے میری پیشانی چومی، ہاتھ چومے اور شکستہ آواز میں بولا "ہوسکے تو جلدی شکل دکھا دینا، زیادہ بار کے لیے نہیں کہتا، اب وقت بہت کم ہے اپنے پاس۔"

گاڑی حرکت میں آنے تک سب ہمارے ڈبے سے چمٹے رہے۔

○☆○

بارہ بج چکے تھے۔ تیز دھوپ پڑ رہی تھی۔ لکھنؤ شہر سے نکلتے ہی گاڑی نے رفتار پکڑلی۔ ڈبے میں ہمارے سوا کوئی

مسافر نہیں تھا۔ سو ہمیں اپنے آپ میں گم ہونے کی آزادی تھی۔ یہی ہوا۔ اتنی ہاؤ ہو کے بعد کسی گوشۂ سکوں میں آجانے سے آدمی خالی خالی ہوجاتا ہے۔ گزرے ہوئے مناظر کی بازگشت آدمی کو متلاطم کیے رہتی ہے۔ کچھ دیر کا سکوت تھا۔ فاصلے ذہن پر چھائے ہوئے مناظر دھندلے کرتے جاتے ہیں یا چھلنی کرتے جاتے ہیں۔ وقت بجائے خود ایک فاصلہ ہے مگر بعض نقش جو پتھر ہوجاتے ہیں' مٹائے نہیں مٹتے' نہ زمانی فاصلے سے نہ مکانی دوریوں سے۔

سلمیٰ نے بٹھل کے کہنے پر برقع اتار دیا تھا اور بدن پر شال لپیٹ لی تھی۔ اس کے چہرے پر شادابی نظر آرہی تھی۔ شادابی' خوشی کی علامت ہے۔ خوشی اس یقین کی کہ قسمت نے آخر کار کسی منزل پر پہنچا دیا ہے۔ اس نے بتایا کہ میزبانوں نے اسے قیمتی کپڑوں کے دو جوڑے تحفے میں دیے ہیں اور سونے کی چار چوڑیاں بھی۔ میزبانوں نے کھانے پینے کا بہت سارا سامان بھی ساتھ کردیا تھا۔ لکھنؤ سے فیض آباد کا سفر چند گھنٹوں کا ہے۔ یہ پسنجر گاڑی تھی۔ بقول شخصے' پیوں پیوں' چل رہی تھی۔ ہر چھوٹے بڑے اسٹیشن پر رکتی۔ آدھ گھنٹے میں ملہور' پندرہ بیس منٹ بعد جگور اور اس کے چند منٹ بعد سفید آباد آگیا۔ ڈیڑھ گھنٹے میں گاڑی بارہ بنکی پہنچ گئی۔ یوں بھی ڈیڑھ ہی بج رہا تھا۔ جمرو' زورا اور بٹھل ہلکی نیند لے چکے تھے یا ایسے ہی میری طرح آنکھیں میچے نشستوں پر پڑے رہے تھے۔

بارہ بنکی اسٹیشن پر جمرو نے سلمیٰ کے میزبانوں کا دیا ہوا توشہ کھولا اور زورا فضول میں پلیٹ فارم سے کچھ اور چیزیں لے آیا۔ رکابیاں موجود نہیں تھیں۔ سب نے انہی برتنوں میں کھایا جو شمشاد خاں کے عزیزوں نے ساتھ کیے تھے۔ بہت خوش مزہ کھانا تھا۔ پراٹھے' مرچ قلیہ' بھنا ہوا گوشت' شامی کباب اور سوجی کا حلوہ' چائے پی کے سب پھر ادھر اودھر نشستوں پر دراز ہوگئے۔ فرسٹ کلاس کے یہی ٹھاٹ باٹ ہیں۔ پیسے کا بھی کیا کرشمہ ہے۔ آدمی کتنی چیزیں حاصل کرسکتا ہے۔ آرام' خلوت' جلوت۔ کہتے ہیں' آدمی کی خواہشوں کے سامنے پیسہ ہمیشہ کم پڑجاتا ہے' اور کہتے ہیں' آدمی خواب نہیں خرید سکتا' خیال نہیں خرید سکتا پر اور ہزار چیزوں کے حصول کی مقدرت' جو پیسہ پیدا کرتا ہے۔ کتنی محرومیوں کی اشک شوئی' کتنی پشیمانیوں کی تلافی ہوجاتی ہے۔ اسی لیے لوگ دیوانگی..... سے پیسے کا تعاقب کرتے ہیں' پیسے سے آدمی کے دس ہاتھ ہوجاتے ہیں۔

سلمیٰ ٹھہری ہی کھڑکی سے باہر بھاگتے ہوئے مناظر دیکھ رہی تھی۔ میں بھی نیچے آکے اس کے سامنے کی نشست کے مقابل بیٹھ گیا۔ اتنے دن ہوگئے تھے' سلمیٰ سے رسمی سلا کلام کے علاوہ فراغت سے کبھی بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ ممکن ہے' وہ مجھے کوئی بد دماغ شخص سمجھتی ہو۔ میر جی میں آئی کہ اس کی نشست پر جاکے اس سے باتیں کرو پوچھوں کہ کوئی کسک' کوئی ملال' کسی قسم کا اندیشہ تو نہیں ہے اس کے دل میں' اور ہوسکے تو اسے تسلی دوں اب بیتے ہوئے کا اعادہ نہیں ہوگا۔ وہ بھی گزرا ہوا اند بھول جانے کی کوشش کرے۔ ایک بار جو اس نے کھڑکی نگاہیں ہٹائیں اور میری آنکھوں کو اپنی جانب نگراں پایا تو وہ سٹپٹائی' پھر اس کے ہونٹوں پر ایک شائستہ مسکراہٹ بکھ گئی' اس نے پیر اور سکیڑ لیے' پھر اسی نے جرات کی اور مندانہ لہجے میں بولی "طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

میں نے جلدی سے کہا "ہاں' ہاں' بالکل۔" اس ٹوکنے پر مجھے احساس ہوا کہ اوپر کی برتھ سے نیچے آکے کسی پہلو قرار نہیں رہا تھا۔ آدمی کو اپنی بے کلی کی بھی خود نہیں ہوتی۔"

اس نے دھیمی آواز میں جھجکتے ہوئے کہا "چائے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی ہے۔"

"ہاں' ان لوگوں نے گلوریاں بھی رکھی تھیں۔" کھنکتی ہوئی آواز میں بولی "میں تو بھول ہی گئی۔"

"ضرور۔" میں نے بظاہر اشتیاق سے کہا۔

وہ شال سنبھال کے اپنی نشست سے اٹھی اور ز کھکوڑنے لگی۔ نئی بنارسی ڈبیا میں بہت سی گلوریاں ر تھیں۔ سلمیٰ نے میرے پاس آکے ڈبیا میری طرف بڑھا میں نے ایک ساتھ دو گلوریاں کھائیں۔ واقعی منہ میں خو بس گئی۔ اس خدمت سے سلمیٰ کا چہرہ اور چٹکنے لگا۔ ر گل رنگ ہوگئے۔ بعض لوگ کسی سے سلوک کرنے کے بے تاب رہتے ہیں۔ سلمیٰ بھی زریں کی بہن معلوم ہ تھی۔ اس کے تکلف آمیز اطوار میں بڑی بے ساختگی تکلف تصنع سے عاری ہو تو بہت دل آویز ہوتا ہے۔ میں اس کا شکریہ ادا کیا۔

زنبیل میں ڈبیا رکھ کے وہ اپنی نشست پر جا بیٹھی دیر میں صفدر گنج اسٹیشن آگیا پھر سید خان پور' دریاباد' بنے خاں میرے سامنے آکے کھڑا ہوگیا۔ میں نے اسے سر سے جھٹکنے کی بہت کوشش کی لیکن بنے خاں تھا کہ آنکھوں سے دور نہیں ہوتا تھا بار بار اس کا خیال میر میں کھٹکنے لگتا۔ معلوم نہیں۔ اچھا ہوا یا برا' لیکن اگر

خاں ہی چاندنی بانو کو لے گیا ہے تو اس نے عواقب پر اچھی طرح غور کرلیا ہوگا۔ میری دانست میں اس کے اور چاندنی بانو کے درمیان پہلے سے کوئی غلط فہمی نہیں تھی۔ ایسی صورت میں اسے چاندنی پر اپنی چج کے اظہار میں کیسی دشواری پیش آسکتی ہے۔ کیا معلوم کہ چاندنی بانو کو بالا خانے کی زرق برق زندگی بہت مرغوب ہو اور کسی چار دیواری کی سادہ زندگی کا تصور اس کے ذہن میں نہ ہو یا اس کی مراد ہی نہ ہو۔ ضروری نہیں کہ بالا خانے پر بیٹھی ہوئی ہر عورت بالا خانے سے نامطمئن ہو۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ شمع محفل سے چراغ خانہ کا درجہ افضل ہے' محفل کی زیب و زینت کی نسبت گھر کی سادگی میں بہت عزت اور طمانیت ہے' اور ایسا تمنائی' ایسا شیدائی کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ بنے خاں کے پاس اتنے پیسے کہاں ہوں گے کہ ابتدائی دنوں میں چاندنی بانو کو کچھ باور کرانے کے لیے سائے اور سکون میں رکھ سکے۔ اس نے لکھنؤ ہی میں کسی جگہ چاندنی بانو کو چھپا رکھا ہے تو آخر کب تک اسے روپوش رکھا جاسکتا ہے مگر بنے خاں بھی کہاں تک ہاتھ پیر توڑے' بیڑیاں ڈالے بیٹھا رہے گا۔ کسی وقت بھی پولیس آہٹیں سونگھتی ہوئی اس کے سر پر پہنچ سکتی ہے۔ یہی ممکن ہے کہ لکھنؤ سے بہت دور کسی بڑے شہر میں وہ گھر بسانے کی کوشش کرے اور کوئی خزانہ اس کے ہاتھ لگ جائے ورنہ چاندنی بانو تو شیشے کی طرح نازک ہے۔ تارا بیگم نے اپنی پلکوں پر اس کی پرورش کی ہے۔ وہ تو ذرا سی دھوپ سے کمھلا جائے گی۔

یہی سمجھ میں آتا تھا کہ بنے خاں اتنا دیوانہ نہیں ہوا ہوگا اور یہی بات ٹھیک معلوم ہوتی تھی کہ تارا بیگم نے چاندنی کے دلدادہ نواب زادگاں کو بہت کم مہلت دی تھی۔ یک دن میں جواب مانگا ہوگا۔ کسی بھی نواب راجا کے لیے تنی خطیر رقم ادا کرنے کے بجائے' کرایے کے شورہ پشتوں کا ندوبست کرنا آسان تھا۔ بنے خاں نے بہت عجلت کی۔ اسے کچھ تو تحمل کرنا چاہیے تھا۔ بے شک کوئی ضمانت نہیں تھی کہ خریدی ہوئی چاندنی' بنے خاں کو دل و جان سے قبول کرلے۔ روپے سے آدمی خریدا جاسکتا ہے' اس کا دل و دماغ نہیں۔ پیسہ کسی حد تک چاندنی بانو کو مطیع رکھ سکتا تھا۔ اطاعت اور نجہ ہے' بندگی اور چیز' اور ربط خاطر اور چیز۔ اصل چیز تو خود رفتگی ہے۔ چاندنی پر مکمل اختیار کے باوجود یک جائی و یک نفسی لازم نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ پیمانے کے مطابق ں پیسے کو قابل اعتبار سمجھتے ہیں۔ جو لوگ جاہ و حشم ترک کرکے گوشہ نشین ہوجاتے ہیں' انہیں پیسے کی بے مائیگی بے ہنری کا ضرور کوئی عرفان ہوجاتا ہوگا' ریشم' پھول' شیشہ' جواہر' ہاتھی' گھوڑے' خدام دیوان' من و سلویٰ پیسے سے حاصل کیے جاسکتے ہیں مگر کسی کی طلب ان سے سوا' ان سے دگر ہو تو۔

آدمی اپنے آپ سے بھی تو ہذیان بکتا ہے۔ لکھنؤ مسلسل دور ہو رہا تھا۔ اپنی دل جمعی کے لیے ورق پلٹ دینا ہی بہتر تھا مگر کتاب ہی کے ورقے آسانی سے پلٹے جاسکتے ہیں' اور یہ تو گزشتہ ورق کے نوشتے کی سرایت کاری اور اثر گیری پر منحصر ہے کہ کب تک طاری رہے' کب تک نشہ غالب اور زہر قائم رہے۔ میرا قصور صرف اتنا تھا کہ میں نے بنے خاں کو دیکھ کے چاندنی بانو کے لیے بات کی تھی۔ تارا بیگم کا بالا خانہ اجڑ جائے گا اور چاندنی بانو کسی ناکردنی' ناگفتنی سے دو چار ہوجائے گی' یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ ممکن ہے' اب تارا بیگم مجھے کوسنے دے رہی ہو اور چاندنی بانو آہ و بکا کررہی ہو مگر میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو کیا کرسکتا تھا۔ میں نے تو یہاں تک سوچا تھا کہ ممکن ہوا تو چاندنی بانو کو کچھ عرصے کے لیے فیض آباد لے جائیں گے۔ زریں کی حویلی میں وہ گھر کے لطف و لذت سے آشنا ہوگی اور بنے خاں' ایسے طلب گار کی پاسبانی اور سایہ داری کا اسے کچھ اندازہ ہوگا۔ آدمی کو سمجھنے میں دیر تو لگتی ہے۔ خدا جانتا ہے' اس کی بولی لگا کے مجھے عجب مسرت ہوئی تھی۔ واقعی وہ ایسی ہی لڑکی تھی کہ جو کچھ بھی امکان میں ہو' اس پر نچھاور کردیا جائے۔ دکان پر رکھی ہوئی چیز کی قیمت کتنی ہی اونچی ہو' وہ بھی اس وجہ سے بے وقار ہوجاتی ہی کہ اس کی کوئی قیمت متعین ہے اور ادا کی جاسکتی ہے۔ چاندنی بانو بالا خانے پر نہ ہوتی تو اس پر جاگیریں قربان کی جاسکتی تھیں۔ میں نے بنے خاں کو چاندنی بانو کے سامنے بے کسی اور بے چارگی کی حالت میں دیکھا تھا۔ راج کرشنا جیسا کوئی مہربان بنے خاں کے لیے دفینہ چھوڑ جاتا تو وہ سارا کچھ داؤ پر لگا دیتا۔ صاحب نظر اور جوہر شناس ہی نہیں' قیمت تو صحیح وہی ادا کرسکتا ہے جسے کہیں' کسی موڑ پر اپنا مطلوب' اپنا مقصود نظر آجائے اور ضروری نہیں کہ ہر شخص دوسرے کے ارادے اور جستجو سے متفق ہو۔ ہر شخص صحرا نوردی کا متحمل نہیں ہوسکتا اور نہ جوئے شیر نکالنے کے عزم سے بہرہ مند' اس کے لیے بہت شرطیں ہیں۔

سوا تین بجے گاڑی ردولی اسٹیشن پر ٹھہر گئی۔ فیض آباد کا فاصلہ اب ڈیڑھ گھنٹے کے قریب رہ گیا تھا۔ میری نظر سلمیٰ پر گئی۔ پلیٹ فارم اس کی نشست کے سامنے آیا تھا۔ لوگوں کی نگاہوں سے بچنے کے لیے سلمیٰ نے کھڑکی کی جالی نیچے کردی۔

میں نے سوچا، بعد میں موقع ملے نہ ملے۔ میں اسے کچھ زریں
کے بارے میں بتا دوں تاکہ نئے گھر اور نئے ماحول میں وہ کوئی
اجنبیت محسوس نہ کرے۔ گو اس تمہید و تاکید کی ایسی ضرورت
نہیں، زریں کا دل تو ایک دریا کے مانند ہے جس کا پانی ہر دم
رواں، شفاف اور شہد آگیں ہو۔ وہ تو کوئی گلستاں ہے جہاں
ہر موسم میں پھول کھلے رہتے ہیں۔ وہ تو ایسا شجر ہے جس کے
ثمر اور جس کا سایہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ وہ تو سر سے سر پھول،
سرتاپا خوشبو ہے۔ اس کے لطف و التفات کے بیان کے لیے
لفظ کم پڑ جاتے ہیں۔ میں سلمیٰ کو یہی کچھ بتانا چاہتا تھا کہ کسی
لمحے زریں کی تیز آواز اور سرد لہجے سے وہ آزردہ نہ ہو۔
حالانکہ یہ تجربہ شاید سلمیٰ کو کبھی نہ ہو، لیکن ایک رعایت
آدمی کو اس کے درون خانہ تموج، نادیدہ فشار کی ضرور دینی
چاہیے اور آبگینے کی بھی۔ کبھی اپنی سماعت اور نگاہ کے غبار
میں دوسرے کے مطالب اور مفہوم اخذ کرنے کی چوک
ہو جاتی ہے۔ سلمیٰ خود ایک معاملہ فہم، نرم خو، پرتپاک اور
خوش سلیقہ لڑکی ہے۔ زریں بھی اس سے مل کے بہت خوش
ہو گی۔ اچھا تھا کہ سلمیٰ پوری طرح مطمئن ہو کے حویلی میں
قدم رکھے۔ جان لے کہ کسی ایسی ویسی جگہ نہیں، وہ ہمارے
گھر جا رہی ہے۔ وہ بٹھل کا اور میرا ہی گھر ہے، زریں تو
بٹھل کی چہیتی بیٹی ہے۔ سگے سے بڑا وہ ہوتا ہے جو چہیتا ہو۔
ایک وہی ہے جو بٹھل پر حکم چلاتی ہے اور وہ تعمیل کے لیے
آمادہ رہتا ہے۔

رودولی اسٹیشن پر گاڑی ٹھہرے چند لمحے ہوئے تھے کہ
بٹھل اوپر کی برتھ سے نیچے آ گیا۔ وہ جاگتا رہا تھا کیونکہ اس
نے نیچے بیٹھتے ہی پان کی فرمائش کی۔ اسی اثنا میں زورا پلیٹ
فارم میں تازہ چائے لے آیا تھا۔ رودولی پر تازہ دم ہونے کا
وقت گزار کے گاڑی پھر چل پڑی۔ چائے کا کلھڑ ختم کر کے
اور گلوری منہ میں دبا کے بٹھل سلمیٰ کی نشست پر چلا گیا اور
اس کے پاس بیٹھا دیر تک جانے کیا نکتہ پردازیاں کرتا رہا۔
زریں ہی موضوع سخن ہو گی۔ وہی ہدایت نامہ جو میں سلمیٰ کو
تعلیم کرنا چاہتا تھا اور ارادہ باندھتا، جمع کرتا رہ گیا تھا گاڑی
کے شور میں بٹھل کی دھیمی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔
دیوراکوٹ بھی گزر گیا، سالار پور کے بعد اب فیض آباد ہی آتا
رہ گیا تھا۔ گاڑی منزل پر پہنچنے میں ابھی پندرہ بیس منٹ ہوں
گے کہ زورا اور جمرو تکیے کھولنے اور سامان لوٹنے پلٹنے لگے۔
دونوں نے اپنا سامان الگ اٹیچی میں رکھ لیا۔ تمنچے، کارتوس
اور چاقو بھی۔ مجھے بے چینی ہوئی۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا
کہ وہ ہم سے جدا ہو کے فیض آباد سے آگے جا رہے ہیں یا
مجھے اور بٹھل کو فیض آباد میں نہیں رکنا ہے۔ میں چپ
چاپ دیکھتا رہا۔ ظاہر ہے، میری حیثیت کسی مجہول اور راض
بہ رضا شخص کی تھی۔ مجھے کچھ بتانا اور مشورہ کرنا ضرور
نہیں تھا اور اصلاً تو یہ سب کچھ میری وجہ سے تھا، یہی کیا
تھا۔ میں نے ان سے کچھ نہیں پوچھا۔ میرے علم میں جمرو
زورا کو آگے کوئی ایسا کام درپیش نہیں تھا۔ بٹھل کو و
بھی فیض آباد رکنا چاہیے تھا۔ فیض آباد اسٹیشن تک آ
زریں کو دیکھے بغیر آگے چلے جانے کی کوئی تک نہیں تھ
زریں سے رخصت ہوئے بہت دن ہو گئے تھے۔ بمبئی
اس کے متعدد شکایتی خط آئے تھے۔ منیر علی کو ابا جان
بمبئی میں روک کے رکھا تھا۔ خانم بھی خود گزیدہ نواب عالم
کی مسیحائی کے لیے حیدر آباد کے وہیں رہ گئی تھی۔ نیساں
جہاں گیر کے علاوہ زریں کے ساتھ منیر علی کا پورا کنبہ تھا
بٹھل وہاں نہیں تھا اور میں بھی وہاں نہیں تھا۔ زریں کو
دونوں ہی سے نسبت تھی۔ میں نے کئی بار چاہا کہ زری
بمبئی بلا لیا جائے۔ وہاں وہ سب سے مل لے گی یا پھر سب کو
آباد چلنا چاہیے۔ زریں نے فرخ، فریال، فاریہ اور اک
نہیں دیکھا تھا۔ جولین سے بھی وہ نہیں ملی تھی۔ دونو
ایک دوسرے سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ شہ پارہ، گیتا
گیتا کی ماں رانی نے زریں کے تذکرے ہی سنے تھے
زریں نے ان کے۔ بمبئی جا کے فرصت ہی نہیں ملی۔
کاٹتے گیا پھر پیرو۔ ابا جان محل خرید کے نوک پلک کی د
میں لگ گئے اور اچانک مارٹی چلا گیا۔ اس دوران حید
سے نواب ثروت کا خط آ گیا اور ہمیں حیدر آباد جانا پ
سب کچھ اتنی جلدی جلدی ہوا کہ نہ زریں کو فیض آبا
بلایا جا سکتا تھا نہ اس کے پاس جانا ممکن ہوا۔
ٹھیک پانچ بجے گاڑی فیض آباد شہر میں داخل ہو گئی
اور زورا اپنا کام کر چکے تھے۔ سبھی ڈبے سے اتر گ
اسٹیشن سے باہر نکلنے کے بجائے انہوں نے انتظار گاہ
کیا۔ لکھنؤ سے آنے والی یہ گاڑی یہیں ختم ہو جاتی تھ
لیے دوسری گاڑی سے آگے جانے والوں کو انتظار گا
ڈیرہ ڈالنا پڑتا تھا۔ ہمیں وہاں بٹھا کے جمرو اور زورا با
گئے۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ بٹھل کا شہر جانے کا
نہیں ہے۔ زورا اور جمرو کو آگے سفر کرنا ہوتا تو بٹھل ا
رخصت ہو جاتا۔ گویا زریں کے پاس سلمیٰ کو پہنچانے کی
داری زورا اور جمرو کے سپرد کی گئی تھی۔ مجھے یہ بات
عجیب لگی۔ ہر چند دخل در معقولات سے خود کو باز ر
بہت کوشش کی لیکن مجھ سے یہ نہیں ہوا اور مجھے اپنی

بازی

تپش پر بھی قابو نہیں رہا۔ میں نے بٹھل سے کہا "ہمیں کہاں جانا ہے؟"
"آگے رے۔" وہ بے نیازی سے بولا۔
"آگے کہاں؟"
اس نے سر اٹھا کے غنودہ آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا "تو نے سنا نہیں، توتے بولتے ہیں، جدھری دانا پانی زدر کرے۔"
"اس میں دانے پانی کی کیا بات ہے۔" میں نے جھنجلا کے کہا "میری مانو تو ہمیں سیدھے حویلی چلنا چاہیے۔"
"نہیں رے، ادھری ابھی نہیں۔"
"ابھی کیوں نہیں؟"
"ادھری بہت بیڑیاں ہیں اس کے پاس۔ بھری بیٹھی ہوگی۔ اپنا من بھی نہیں کرے گا جلدی لوٹنے کو۔ اکٹھے ہی جائیں گے اب۔"
"یہاں تک آکے حویلی نہ جانا۔۔۔! وہ کیا کہے گی کہ ہم اسٹیشن سے لوٹ گئے۔"
"بول دیا ہے ان سے، سمجھا دیں اس کو۔"
"لیکن یہ تو ہم بھی وہاں جاکے اسے بتا سکتے ہیں۔" میں نے ناگواری سے کہا "بیچ میں ہر جگہ کوئی نہ کوئی رکاوٹ ہوجاتی ہے۔ بعد میں پھر آنے میں نہ جانے کتنا وقت لگ جائے، ایک دو دن ٹھہر کے بھی ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں۔"
"نہیں رے۔" وہ بیڑی سلگانے میں مشغول ہوگیا۔
"دو تین دن ممکن نہیں ہفتے عشرے بعد سہی۔ لکھنؤ میں بھی تو آخر ہم رکے تھے۔"
"ادھری کی اور بات تھی رے۔"
"اور مراد آباد میں؟"
"ادھری بھی کام سے تھے۔" وہ تنک کے بولا۔
"مگر اب، اب کون سا کام ہے؟"
"ابھی آگے جاکے نہیں دیکھنا کیا۔" اس کے لہجے میں ترشی آگئی۔
"کیا دیکھنا ہے؟" میں نے زہر خند سے پوچھا۔
"تجھ کو پتہ نہیں؟ کیا بیچ میں چھوڑ دیں پھر۔"
"تمہارا مطلب ہے، ابھی کچھ باقی رہ گیا ہے۔ ٹھیک سے بیٹھا رہ۔"
"کوئی فائدہ نہیں۔" میں نے جلی ہوئی آواز میں کہا۔
کوئی جواب دینے کے بجائے وہ اضطراری انداز میں سر ہلاتا رہا۔
"اب چھوڑ دو سب۔" میری آواز ڈوبنے لگی "سب بیکار ہے۔ دنیا بہت بڑی ہے۔ کب تک کہاں تک۔۔۔"
"ابھی تھوڑا ساتھ ہے رے۔"
"ٹھیک ہے لیکن، لیکن۔۔۔ سلمٰی کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار دیکھ کے مجھے خود کو روکنا پڑا تاہم چند لمحوں کے توقف کے بعد میں نے دھیمے لہجے میں بٹھل کو قائل کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ میں نے کہا کہ ہمیں بمبئی سے چلے ہوئے بہت دن ہوگئے ہیں۔ اس دوران ہمیں زریں کی کوئی خیر خبر نہیں ملی ہے۔ جاکے پوچھتے ہیں، حویلی کا کیا حال ہے خدانخواستہ درمیان میں کوئی ایسی ویسی بات ہوئی ہو تو ہم لاعلم ہی رہیں گے۔ ممکن ہے، زریں کو ہماری ضرورت ہو۔
میری التجا کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بیڑی پھونکتا اور کہنے لگا "ادھری بمبئی سے چلتے ٹائم بڑے صاحب منیر، کو بولا تھا، اپنے کو پلٹنے میں دیر ہوجائے تو آپ فیض آباد جانا۔"
"اور اگر وہ نہ پہنچے ہوں؟"
"تو ابھی اپنے دونوں شکرے ادھری جا رہے ہیں۔"
"لیکن وہاں ہمارے جانے میں کیا ہرج ہے؟"
"ہے رے۔ جان کے بولتے ہیں۔"
"میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔"
"تو اتنا چیں چیں مت کیا کر۔ تجھ کو اپنے سے زیادہ ہے اس کی؟"
میرے پاس شاید کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کی بیزار برہمی سے ظاہر تھا کہ وہ کوئی دلیل سننا نہیں چاہتا۔ میں خواہ مخواہ اتنی حجت کی۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ اس کچھ کہنا اپنا ہی سر پھوڑنے کے مترادف ہے جو اس نے کرلیا ہے، وہی اٹل ہے۔ کرنے کو میں بھی بہت باتیں کر تھا، ایک بار میرے جی میں آئی تھی کہ اس سے کہوں، ہے، مجھے نہیں جانا اور ایسا ہی ہے تو میں زورا اور جمرو ساتھ چلا جاتا ہوں مگر سلمٰی سامنے بیٹھی تھی، وہ نہ ہوتی تو شاید میرا منہ نہ پڑتا۔
بے شمار موقعوں کی طرح میرے پاس یہی چارہ تھا کہ کو سرزنش کروں، مجھے آخر اتنی بے کلی کیوں ہے۔ ہ ہے، میں ہی کچھ غلط سمجھ رہا ہوں۔ کوئی بات ضرور ہوگی حویلی جانے پر رضامند نہیں ہے۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا یقیناً اسے مجھ سے زیادہ زریں کی فکر ہونی چاہیے۔ مجھے سوا کسی کی فکر ہی کتنی ہوتی ہے۔ ممکن ہے، وہ زریں سے وعدہ کر آیا ہو۔ حویلی میں تو اس کا جی بہت ہی لگتا ہے۔ نے تو اپنی عمل داری، اپنے اڈے ہی کو خیرباد کہہ دیا

جہاں ہر وقت اس کے خادموں، غلاموں کی ایک فوج اس کی ایک جنبش نگاہ پر سر پیش کرنے کو تیار رہتی ہے۔ جمرو اور زورا ہمارے لیے ٹکٹوں کا بندوبست کرنے گئے تھے۔ جمرو نے آکے بتایا کہ اگر تاخیر نہ ہوئی تو ہماری مطلوبہ گاڑی ڈیڑھ گھنٹے بعد فیض آباد پہنچ جائے گی۔ زورا انتظار گاہ کے خدمت گار سے چائے کے لیے کہہ آیا تھا۔ جیسے ہی انہوں نے چائے ختم کی، بٹھل نے زورا اور جمرو کو گھر جانے کی ہدایت کی۔ وہ اور ٹھہرنا چاہتے تھے لیکن بٹھل نے منع کردیا۔ دونوں بادل ناخواستہ کرسیوں سے اٹھے۔ سلمٰی بھی کھڑی ہوگئی۔ بٹھل نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا، کمر پر تھپکی اور پیشانی کو بوسہ دیا۔ سلمٰی کی آنکھیں بھر آئیں۔ "نانا، جاری اب، ادھر جاکے سب بھول جانا۔"
سلمٰی کے ہونٹ کپکپانے لگے۔ ہم ساتھ ہوتے تو کم از کم اس کی یہ کیفیت نہ ہوتی۔ "ادھری بٹیا ہے اپنی، بولا نا تجھ کو تیری بہنا، بس اس کے پاس جاکے سارا دھل جائے گا۔ دیکھنا!" بٹھل نے سلمٰی کو سمجھانے کی کوشش کی، کہنے لگا "اور جی نہ لگے تو اپنے لوٹنے تک پتھر رکھ لینا پھر کچھ اور دیکھیں گے ری۔"
دروازے سے نکلتے ہوئے سلمٰی نے پلٹ کے پھر ہماری طرف دیکھا "بٹلیا رکھ لی ہے پاس؟" بٹھل نے بھاری آواز میں پوچھا "کبھی ادھری دکن جانا ہوا تو ماردیں گے منہ پہ مال زادوں کے۔"
سرنگوں سلمٰی آگے چلی گئی۔ بٹھل انتظار گاہ کے دروازے تک اسے رخصت کرنے آیا۔ میں ان تینوں کے ساتھ اسٹیشن سے باہر آگیا۔
سورج زرد پڑ چکا تھا۔ اسٹیشن کے اطراف لوگوں کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی۔ اتفاق سے کوئی تانگا موجود نہیں تھا مگر جلد ہی ایک سواری آکے اتری اور انہیں تانگا مل گیا، معمر کوچوان جمرو کو دیکھتے ہی اچھل پڑا اور ربوبیا میں جمرو بھیا، جمرو بھیا کی گردان کرتا ہوا تھرکنے مٹکنے لگا "اپنی انکھیاں کا دیکھ رہل ہیں بھیا!"
جمرو بھی اسے پہچان گیا تھا۔ جمرو کا چہرہ بجھا ہوا تھا لیکن تانگے والے کے جوش و خروش کے جواب میں اس نے بھی مصنوعی تپاک کا اظہار کیا۔
تانگے کے وسط میں پچھلی نشست پر پردہ لٹکا دیا گیا۔ میں نے جھجکتے ہوئے سلمٰی کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ سلمٰی کے بیٹھتے ہی تانگے والے نے سامنے کی طرف بھی پردہ کھینچ دیا۔
مجھ سے گلے مل کے جمرو اور زورا بھی تانگے پر سوار ہوگئے۔ زورا اگلی نشست پر کوچوان کے پہلو میں بیٹھا اور جمرو، پردہ کمر کے پیچھے کرکے پچھلی نشست پر سلمٰی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ زورا نے مجھے بتایا کہ بس تھوڑے دونوں کی جدائی ہے۔ بٹھل نے تاکید کی ہے کہ چند روز فیض آباد ٹھہر کے وہ کلکتے پہنچ جائے اور جمرو چاہے تو اسے بھی ساتھ لے آئے۔
جمرو آخر تک ہاتھ ہلاتا رہا۔ جب تانگا نظروں سے اوجھل ہوگیا تب میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور آہستہ۔۔۔۔ قدموں سے انتظار گاہ میں لوٹ آیا۔ بٹھل آنکھیں موندے کرسی پر دراز تھا۔ میں بھی قریب کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔
ٹھیک سات بجے ہماری گاڑی آگئی تھی۔ راستے کی خرابی کی وجہ سے بار بار رکتی رہی۔ دوسرے دن صبح گھنٹے بھر مغل سرائے اسٹیشن پر ٹھہر کے ہم دوسری گاڑی میں سوار ہوگئے۔

○☆○

الہ آباد سے بنارس اور غازی پور ہوتے ہوئے ہم صوبہ بہار میں آگئے اور گیا کے علاوہ دولت گنج، سمستی پور، مظفر پور، پٹنا، دربھنگا، آرا، بھاگل پور، چمپارن، موتی ہاری، سہرسار، رانچی، ہزاری باغ اور جھریا۔ تقریباً سارے چھوٹے بڑے شہروں میں مولوی صاحب کے اسم کا ورد کرتے ہوئے بنگال کے صنعتی شہر آسن سول چلے آئے۔ صبح کہیں، شام کہیں، کبھی ایک دن، کبھی دو دن یا تین چار دن کا پڑاؤ۔ کبھی ریل میں، کبھی لاری اور تانگے کے ذریعے۔ جتنی بڑی بستی، اتنا ہی وقت۔ بستیوں اور مسلمانوں کی آبادی کی نسبت سے صرف ہونے والے وقت کی کمی وبیشی مشروط تھی۔ بعض جگہوں پر مسلمانوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی مگر مسلمان ہر جگہ موجود تھے۔
کئی دن سے جسم ٹوٹ رہا تھا۔ آسن سول آکے ٹانگیں جواب دینے لگیں۔ کلکتہ یہاں سے قریب تھا۔ سوچا تھا، کسی مناسب وقت بٹھل کو آمادہ کرنے کی کوشش کروں گا کہ کہیں اور جانے کے بجائے کچھ دن کے لیے کلکتے چلیں۔ چند روز آرام کرکے پھر اس طرف آئیں گے لیکن پھر یہ سوچ کے رہ گیا کہ کلکتے پہنچنے تک درمیان کی بستیوں میں زیادہ وقت نہیں لگنا چاہیے۔ ممکن ہے، اس دوران میں طبیعت قابو میں آجائے۔ بٹھل کو اپنی حالت بتا کے میں اسے اور پریشان ہی کروں گا حالانکہ صورت یہ تھی کہ ذرا دیر کہیں بیٹھ کے اٹھتا تو آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا۔ مختصر فاصلوں کی مسافت سے بھی پنڈلیوں میں کھولن ہونے لگتی۔

کلکتے سے سوا سو میل دور' دامودر ندی کے کنارے سے نزدیک' چھوٹا ناگ پور' کمشنری کے پلیٹو کے مغربی کنارے پر واقع' ریلوے کے بڑے مرکز' بجلی کے تار' شیشے' المونیم چینی کے برتن' سائیکل اور پارچہ بافی کے کارخانوں سے گھرے ہوئے شہر آسن سول کی آبادی لاکھ سے اوپر ہی ہوگی۔ اطراف میں کوئلے کی کانیں پھیلی ہوئی ہیں۔ دوسرے شہروں کی نسبت یہاں موسم خوش گوار تھا۔ آسن سول میں دینی مدارس کی تعداد چند ہی تھی' ہمیں وہاں سے مایوس ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ہاں' ایک مدرسے میں ایک نورانی صورت' درویش مثال بزرگ قاری فرمان احمد سے ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ ادھر ادھر بھٹکنے کے بجائے ہمیں شہر کے ایک معزز رئیس سید محمود علی سے مل لینا چاہیے۔ ان کی حویلی کے مہمان خانے میں اطراف واکناف سے آئے ہوئے مہمان ٹھہرتے ہیں۔ رئیس سید محمود علی بہت اثر ورسوخ کے آدمی ہیں' مزاج بھی مختلف ہے' علم وادب کے قدردان' موسیقی کے رسیا' بڑی سوجھ بوجھ کے' خوش خلقی اور وضع دار شخص ہیں۔ شہر میں ان کا گھر تہذیبی ادارہ ہے' محفلوں کا مرکز' قاری فرمان احمد کی رطب اللسانی سن کے میری طرح بٹھل کے دل میں بھی سید محمود علی سے ملاقات کی خواہش نموپذیر ہوئی ہوگی۔

صبح وقفے وقفے سے ہونے والی بارش ٹھہر گئی تھی لیکن آسمان بادلوں سے اٹا ہوا تھا۔ کوئی بھروسا نہیں تھا کہ بادل پھر برگشتہ ہوجائیں اس لیے ہم نے اپنے ٹھکانے پر جاکے دوسرے کپڑے بدلنے کا ارادہ ترک کیا۔ پانچ سے کچھ اوپر وقت ہوا ہوگا۔ بادلوں کی وجہ سے اندھیرا پھیل گیا تھا۔ اوسان درست کرنے کے لیے ہم نے سرِ راہ واقع چائے کے ایک ہوٹل میں منہ ہاتھ دھویا' کنگھی کی' لباس کی شکنیں درست کیں اور چائے پی کے گھوڑا گاڑی میں بیٹھ گئے۔ سڑکیں ابھی تک گیلی تھیں۔ بارش سے عمارتیں دھلی دھلی لگ رہی تھیں۔ چھوٹے شہر میں فاصلے ایسے طویل نہیں ہوتے۔ چند ہی منٹ میں گھوڑا گاڑی عام سڑک سے مڑ کے ایک کشادہ اور صاف ستھری گلی میں داخل ہوگئی۔

کوچوان سید محمود علی سے واقف تھا۔ اس نے عمارت کے عین سامنے گاڑی روک دی۔ باہر سے چار دیواری کے اندر عمارت کا کچھ حصہ نظر آرہا تھا۔ اردگرد بھی نئے پرانے' چھوٹے بڑے مکانات بنے تھے۔ کوچوان نے اتر کے پھاٹک جیسے دروازے کا کنڈا ایک بار ہی کھٹ کھٹایا تھا کہ دربان باہر آگیا۔ ہم گاڑی میں بیٹھے رہے۔ وہی ہمارے پاس آیا اور

قاری فرمان احمد کا نام سن کے اس کے چہرے پر اڈتی شکا صاف ہوگئیں۔ وہ فوراً اندر چلا گیا اور کچھ دیر بعد وا آکے خندہ پیشانی سے ہمیں اندر چلنے کی ہدایت کی۔ دیواری کے اندر تازہ رنگ وروغن سے آراستہ درم درجے کی ایک دو منزلہ عمارت ایستادہ تھی۔ اسے بنگا نہیں کہا جاسکتا تھا' نہ قدیم طرز کی حویلی۔ چار دیواری عمارت کی راہ داریوں تک کے فرش پر سبزہ بچھا تھا کنارے کنارے کیاریوں میں پھلواری سجی ہوئی تھ اطراف میں ادھر ادھر تناور درخت اٹھے ہوئے تھے دیواری سے عمارت کا فاصلہ کہیں کم تھا' کہیں زیادہ۔ پھ کے دائیں جانب سبزے کے وسیع حصے پر سنگ مرمر کا چ تھا اور بید کی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ عمارت سے مکیم خوش ذوقی اور نفاست جھلکتی تھی۔ دربان ہمیں وہاں ٹھ واپس چلا گیا اور نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ اسی اثنا میر دوسرا معمر باریش ملازم لپکتا ہوا باہر آیا اور اس نے م لہجے میں کہا کہ مالک کو اطلاع کردی گئی ہے' ذرا دیر انتظار کی زحمت ہوگی۔ اس نے ہم سے شربت وغیرہ کا پوچھا۔ بٹھل کے انکار پر وہ سر جھکائے آہستہ قدموں چلتا ہوا راہداری میں گم ہوگیا۔

بظاہر عمارت کے مکین سید محمود علی اور مولوی ص شناسائی کی کوئی توقع نہیں تھی' خانہ پری کی بات تھی۔ کی ہماری پاس کیا کمی تھی۔ بے شمار دروازے پر دستک چکے تھے۔ سائل خوش گمانی نہ کیا کریں تو ہر کس وناکس آگے ہاتھ کیوں پھیلائیں۔ کوئی ایک صدا تو کارگر ہے۔ ہمیں چبوترے پر بیٹھے دس منٹ سے زیادہ ہوگ صاحب برآمد نہیں ہوئے۔ بٹھل گم صم بیٹھا تھا۔ م سارے جسم میں ٹوٹن ہورہی تھی۔ بہتر یہی تھا' مجھے اپنی حالت بتادینی چاہیے تھی۔ یہاں آنے کے بجائے میں آرام کرنا ہی مناسب تھا۔ یہاں ہم پھر کسی اور دن آسکتے تھے۔ ایک پہلو بیٹھنا دوبھر ہورہا تھا۔ رگیں جیسے کوئی مسوس رہا تھا۔

یوں یہ ایک خوش گوار شام کہی جاسکتی تھی۔ فضا تھی' ہوا بھیگی بھیگی اور ٹھنڈی ٹھنڈی' سبزے اور سوندھی مہک ہر سو رچی ہوئی تھی' پرندے آشیانوں کے لیے شور مچارہے تھے مگر سارے موسم پابند ہو ورنہ ان کی کیفیتیں سب پر ایک جیسی مرتب ہونی چا مجھے مسلسل کرسی پر کسمساتا دیکھ کے بٹھل نے پوچھا "کیا ہے رے؟"

میں ہڑبڑا سا گیا "کچھ نہیں' کچھ نہیں۔"

"لوٹ چلیں پھر؟"

"نہیں نہیں' ابھی ـــ" میری آواز میرے قابو میں نہیں تھی' پھر میں نے منتشر لہجے میں کہا کہ ہاں ٹھیک ہے' واپس چلیں' یہاں پھر آجائیں گے۔"

"کچھ الٹا ہے کیا؟"

"ہاں!" میں نے کمر سیدھی کرکے کہا "بس دل کچھ گھبرا رہا ہے لیکن' لیکن چاہو تو کچھ دیر ٹھہر جاؤ۔"

"نہیں رے' چلتے ہیں۔" یہ کہتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا مگر ایک قدم بھی نہ بڑھ سکا تھا کہ چبوترے کے عقب میں واقع راہداری میں کھن کھناتی آواز سن کر رک گیا' دوسرے لمحے جو شخص ہمارے سامنے تھا' وہ مکان کے مالک کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ پچاس سے اوپر کی عمر' قد متناسب' نہ اتنا زیادہ نہ کم' گٹھا ہوا جسم' ناک نقشہ ترشا ہوا' گداز ہونٹ' سرخ سپید پتی ہوئی اور کسی قدر سیاہی مائل رنگت' ہلکی ہلکی مونچھیں' سفید کرتے' پاجامے اور سلک کی واسکٹ میں ملبوس' سلیم شاہی جوتا' ٹیڑھی مانگ' سامنے سے سر کے بال اڑ جانے کی وجہ سے پیشانی چوڑی ہوگئی تھی۔ کسی زمانے میں خاصا وجیہہ ہوگا۔ چہرہ دمکتا ہوا' بڑی بڑی آنکھوں میں گہری چمک۔ آسودہ حالی کی چمک دمک ہی اور ہوتی ہے۔ تیز قدموں سے سید محمود علی چبوترے پر آئے اور پرتپاک انداز میں ہم سے مخاطب ہوئے' کھنکتی آواز میں بتایا کہ وہی سید محمود علی ہیں۔ ہم دونوں کھڑے ہوگئے۔ مصافحے کے بعد بٹھل نے زحمت دینے کی معذرت چاہی اور آمد کا مدعا بیان کیا یعنی آموختہ دہرایا۔

سید صاحب کچھ سوچ میں پڑگئے "مولوی شفیق! نام تو کچھ سنا ہوا' آشنا آشنا سا لگتا ہے۔" وہ بدبداتے ہوئے بولے "ذرا حلیہ اور وضع قطع تو بتائیے۔"

بٹھل نے میری طرف دیکھا' مجھ سے بات نہیں ہو پارہی تھی۔ میں نے ہمت مجتمع کی اور مولوی صاحب کے بارے میں مزید کچھ تفصیل بتائی۔

"ہاں' ہاں کچھ یاد آتا ہے' یاد آتا ہے جناب!" سید محمود علی نے ہچکچاتے ہوئے کہا "ایک صاحب' بے شک' بے شک' یقیناً ان کا یہی نام ذہن پر نقش ہے مگر اب تو زمانہ ہوگیا نہیں دیکھے ہوئے۔" مولوی صاحب کے بارے میں انہوں نے کرید کرید کے مجھ سے دوبارہ استفسار کیا' میری تصدیق پر وہ تیزی سے سہلانے لگے اور بولے "وہ مدرس اور مبلغ ہی نہیں' وہ عالم آدمی ہیں۔ جی ہاں' یہاں تشریف لاچکے ہیں'

ایک بار نہیں' شاید دو تین بار۔ اچھی یاد اللہ تھی ان سے۔ اب تو بہت وقت ہوگیا۔"

اتنی ہی بات سے ظاہر ہوگیا کہ ہمیں یہاں سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں ہے لیکن اس طرح تو اب اٹھا نہیں جاسکتا' بٹھل نے بھاری آواز میں پوچھا "کے برس لگ بھگ؟"

"اچھا وقت ہوگیا' صحیح تو کچھ نہیں بتا سکتا۔" سید محمود علی نے جھجکتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے' دس سال سے زیادہ ہی گزرے ہوں گے۔ ان کا پتا محفوظ تھا۔ خیر خیریت کو عرصہ ہوگیا یاد آتا ہے' ایک دو مرتبہ انہیں خط بھی لکھے' کوئی جواب نہیں آیا مگر اب کہاں' کہاں ہیں قبلہ؟" سید صاحب نے فکر مندی سے پوچھا۔

"اپنے کو پتا ہوتا تو آپ کے در پر کیوں آتے۔"

"جی' جی ہاں۔" سید صاحب مچل کے بولے "آپ ان کے آبائی شہر مراد آباد بھی گئے؟ وہیں سے کچھ معلوم ہوسکتا ہے۔"

"وہ ادھری آئے تھے' ابھی تھوڑے دن ہوئے' اپنا اتا پتا کسی کو بول کے نہیں گئے۔" بٹھل نے گہری سانس بھر کے کہا۔

ابتدا ہی میں بٹھل اپنی آمد کی غرض وغایت بتا چکا تھا لیکن مختصر بیان سے سید محمود علی کی سیری نہیں ہوئی تھی' تجسس آمیز لہجے میں بولے "مگر ایسی' ایسی کیا' میرا مطلب ہے' آخر آپ کو ان کی اس قدر تلاش کیوں ہے؟"

"لمبی بات ہے صاحب!" بٹھل نے منہ بنا کے کہا اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے دوبارہ انہیں بتایا کہ میں مولوی صاحب کا عزیز ہوں' کچھ خاندانی جائداد کی تقسیم وغیرہ کے سلسلے میں مجھے مولوی صاحب کی تلاش ہے۔ یوں سمجھا جائے کہ مولوی صاحب کا حصہ انہیں لوٹانا ہے' وغیرہ وغیرہ یہ کہانی اسے حفظ ہوگئی تھی۔

"یعنی مولوی صاحب قبلہ کی کسی جائداد کے امین یہ خوش اطوار نوجوان بابر میاں ہیں؟" سید صاحب پلکیں پٹ پٹا کے بولے۔

"ٹھیک' بالکل ایسا ہی۔" بٹھل نے بے اعتنائی سے کہا۔

"یقیناً بڑی جائداد ہی ہوسکتی ہے جو آپ قریے قریے انہیں ڈھونڈ رہے ہیں؟" سید صاحب نے ہونٹ سیکڑ کے پوچھا۔

"بڑی ہے صاحب' اچھی بڑی۔"

سید صاحب نے ہنکارا ابھرا اور متانت سے بولے۔
"مولوی صاحب یہاں کا راستہ تو شاید بھول ہی گئے۔ خدا انہیں سلامت رکھے۔ بڑے درویش صفت آدمی ہیں' حدیث وفقہ کے عالم' شعروسخن کے دل دادہ' وہ ایک روشن خیال علامہ ہیں' اپنی بات منوانے اور دوسروں کی بات سننے کا حوصلہ رکھنے والے۔"
"پچھلی بار وہ اکیلے آئے تھے یا کوئی۔۔۔؟" سید صاحب نے سانس لینے کے لیے توقف کیا تھا کہ بٹھل نے پوچھا۔
"نہیں' بالکل تنہا' بالکل تنہا۔" سید صاحب نے بہ عجلت کہا "آپ کی مراد ان کی بیگم سے تو نہیں ہے؟ اس وقت تو جیساکہ انہوں نے فرمایا تھا' ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ کیا' بعد کو حضرت نے۔۔۔؟ کاش یہ ممکن ہوا ہو۔" سید صاحب کے لہجے سے بے تابی ہویدا تھی۔
"نہیں صاحب ابھی وہ پورے کے پورے ہیں۔"
سید صاحب کی سمجھ میں دیر سے آیا اور انہوں نے بے ساختہ قہقہہ لگایا "جی ہاں' واقعی شادی کے بعد تو آدمی آدھا ہی ہو جاتا ہے مگر آپ کی مراد۔" وہ سنجیدہ ہو کے بولے "پھر آپ کی مراد کس سے ہے؟ بھلا کون ان کے ساتھ ہوتا؟"
"ان کی بٹیا۔"
"ان کی بیٹی۔" سید صاحب نے چونک کے پوچھا "مگر انہوں نے تو شادی! آپ فرما رہے ہیں کہ۔۔۔"
بٹھل نے ہاتھ اٹھا کے صراحت کی "انہوں نے ایک کو منہ بولی بنالیا ہے۔"
"ہوں' اوں۔" سید صاحب چڑ مراتی آواز میں بولے "کب' کب یہ دل خوش کن واقعہ پیش آیا؟"
"برس بیت گئے۔" بٹھل نے آہستگی سے کہا۔
"یہ اچھی بات ہوئی' وہ اکیلے بھی بہت تھے۔" سید صاحب نے تبصرہ کیا "ویسے جناب کو ان کے بارے میں معلومات خاصی ہیں۔"
"اپنے کو کوئی اور کام نہیں ہے۔"
"کتنے برس ہوگئے قبلہ کی تلاش میں؟"
"اب گنتی یاد نہیں رہی۔"
سید صاحب کے چہرے پر ہمدردی اور فکر کا تاثر ابھرا اور انہوں نے نسبتاً دھیمی آواز میں کہا "معاف کیجیے' آپ صاحبان کے تعارف میں تشنگی محسوس ہوتی ہے۔" وہ اشتیاق اور کسی قدر لجاجت سے بولے "مناسب ہو تو کچھ اور بتائیے۔"
"کیا بولیں صاحب۔" بٹھل نے بڑبڑاتے ہوئے کہا کہ

بمبئی میں کچھ جائداد وغیرہ ہے' اس کی کی آمدنی پر گزرا ہے۔"
"ماشاء اللہ لیکن جناب بمبئی کے مستقل رہنے وا[لے] تو نہیں معلوم ہوتے۔"
"اب تو ادھری ہیں' پہلے فیض آباد میں ہوتے تھے جانے کدھری۔۔۔ اپنا دانہ پانی بہت مستی کرتا ہے۔"
"خوب۔" سید صاحب نے شگفتگی سے پوچھا "[...]سول پہلی بار آنا ہوا؟"
بٹھل نے سرہلانے پر اکتفا کی۔
"یہاں کہاں قیام ہے؟"
"ادھری نزدیک ایک جگہ پر بکسا دھرا ہے۔" بٹھل[...] سپاٹ لہجے میں کہا اور رخصت کی اجازت چاہی۔
سید صاحب بے قرار ہوگئے۔ "ایسا کیسے جناب! آ[پ] نے غریب خانے کو عزت بخشی ہے' کاش میں آپ کے ک[...] کام آسکتا لیکن اس طرح' اس طرح آپ یہاں سے کم از[کم] میرے گھر سے تو نہیں جاسکتے۔ واہ صاحب' اتنی دور[...] تشریف لائے ہیں' کچھ میزبانی کا موقع تو اس عاجز کو دیجیے[...]" انہوں نے اونچی آواز میں نصیر بابا نامی کسی ملازم کو پکارا۔
"آپ کا ٹائم بہت الٹا کیا' اتنا بہت ہے صاحب! ا[ب] اجازت دو۔" بٹھل نے میری ناسازی طبع کا عذر کیا ا[ور] کہ بہ صورت دیگر ہم کچھ اور بیٹھتے۔
سید صاحب کی پیشانی لکیروں سے بھر گئی "کیا بات۔ ارے رے؟ آپ نے پہلے کیوں نہیں فرمایا۔ حد ہے جنا[ب] کیسا محسوس کررہے ہیں آپ؟ انہوں نے مضطرب لہجے[...] مجھ سے پوچھا۔
میں نے شکستہ آواز میں انہیں مطمئن کرنے کی کو[شش] کی کہ "سفر کی تھکن غالب ہے۔ ایسے ہی بس جسم ٹو[ٹ رہا] ہے۔ کچھ آرام کرلوں گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔"
سید صاحب نے بے تابانہ کرسی سے اٹھ کے میری[...] تھام لی۔ ان کے ٹھنڈے ہاتھ سے مجھے اندازہ ہوا کہ مے[را بدن] تو جل رہا ہے "حیرت ہے صاحب' آپ اس طرح خود[...] ہوئے بیٹھے ہیں۔ آپ کو تو تیز بخار ہے۔ محض آرام[...] آپ کو تو دوا کی شدید ضرورت ہے۔"
"ادھری سے نکل کے کسی وید حکیم کو پکڑتے ہیں[...]"
"وید حکیم یہیں آجائے گا۔ آپ ذرا ٹھہریے' یہاں سے قریب ہے۔ انگریزی ڈاکٹر' میرے دوست کشن تواڑی۔ کتنے ہی مریض ہوں' پیغام ملتے ہی آ[...] گے۔ ہاتھ میں شفا ہے۔ تانتا بندھا رہتا ہے مریضوں ک[ا]

[...]رے لوگ آتے ہیں۔" ابن نامی ملازم آس پاس کہیں [...]ٹک رہا تھا کہ طلبی پر حاضر ہوگیا۔
بٹھل نے اس زحمت سے سید صاحب کو روکنے کے [لی]ے بہت کچھ کہا لیکن انہوں نے ایک نہ سنی۔ ابن کو جب [...]ک ڈاکٹر بلانے کی ہدایت نہ کردی' انہیں چین نہ آیا۔
[...]ب سے یہ کیفیت ہے؟"
"رات سے۔" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا "لیکن [...]ج کچھ بڑھ گئی۔"
"اور آپ چلتے رہے!"
"یہ ولایتی نہیں ہے' نہ ادھری لکھنؤ کا راجے نواب کا [...]نا' بھوسا چنے بہت چبائے ہیں اس نے۔" بٹھل نے میری [...]ت جانی کا انہیں یقین دلانا چاہا لیکن سید صاحب پر کوئی اثر [...]یں ہوا۔
دائیں جانب راہ داری سے خالص مقامی لباس پہنے [ہو]ئے ایک ادھیڑ عمر ملازمہ شربت' مٹھائی اور نمکین چیزوں کا [...]س قسم کی طشتریوں سے بھرا ہوا طشت لے کے حاضر ہوئی۔ [...]شت جھالروں والے گیروی رنگت کے ریشمی کپڑے سے [ڈ]ھکا ہوا تھا۔ ملازمہ نے کرسیوں کے وسط میں رکھی ہوئی گول [...]ز پر خوش نما طشتریاں سجادیں۔ اس دوران میں سید صاحب [...]ن سول کے موسم کی نیرنگی کے بارے میں بتاتے رہے۔ [...]چھا ہوا' انہوں نے مجھ سے کھانے پینے کے لیے اصرار نہیں [...]یا۔ بٹھل نے سموسے' مٹھائی کا دانہ اور لال رنگ سے [...]میز کیا ہوا دودھ کے شربت کا گلاس زہر مار کیا۔ مجھے معلوم [...]ا' اسے اس وقت کوئی چیز اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ زندگی [...]ا بڑا حصہ تو آدمی کا وضع نبھانے میں صرف ہو جاتا ہے۔
سید صاحب ٹھیک کہہ رہے تھے' انہیں ابن کو حکم دیے [ہ]وئے دس بارہ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ڈاکٹر کا بیگ [...]امے' تہ بند' کرتے اور ٹوپی میں ملبوس' چھریرے جسم کا [...]جوان ابن سامنے سے حاضر ہوگیا۔ اس کے پیچھے ڈاکٹر کشن [تو]اڑی ہی ہو سکتا تھا۔ وہ سانولی رنگت کا پستہ قد' گول مٹول [...]ور درمیانی عمر کا شخص تھا۔ دور ہی سے جانے کیا کیا بکتا ہوا [...]یا "سب خیر تو ہے بھیا صاحب۔"
سید صاحب اور ڈاکٹر کے مراسم بے تکلفانہ معلوم [ہ]وتے تھے۔ کسی رسمی تپاک کے بغیر سید صاحب نے میری طرف اشارہ کیا اور متردد لہجے میں کہا کہ میرے عزیز مہمان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔
ڈاکٹر نے کرسی پر بیٹھنے سے پہلے میری نبض ٹٹولی اور ابن کو حکم دیا کہ مجھے فوراً مہمان خانے کے کمرے میں منتقل کردیا

جائے۔ مہمان خانہ گھر کے خاص دروازے کے بائیں جانب تھا۔ اتنی دیر بیٹھے رہنے پر اچانک اٹھ جانے سے میرا سارا جسم ڈگمگا گیا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا۔ مہمان خانہ زیادہ دور نہیں تھا مگر اتنی سی مسافت میں سانس پھولنے لگی۔ وہ مجھے ایک صاف شفاف سجے ہوئے کمرے میں لے آئے اور نہایت صاف ستھرے بستر پر لٹادیا۔ ڈاکٹر نے کسی تاخیر کے بغیر مختلف آلات میرے جسم پر آزمانے شروع کردیے۔ درمیان میں وہ مجھ سے طرح طرح کے سوال بھی کرتا رہا۔
"کیا صورت ہے؟" ڈاکٹر کے نمٹنے پر سید صاحب نے بے تابی سے پوچھا۔
"تیز بخار ہے' ٹائی فائڈ کا اٹیک۔" ڈاکٹر کشن نے منمناتے ہوئے کہا "آرام' پرہیز اور دوا کی ضرورت ہے۔"
"اور تو سب ٹھیک ہے۔" سید صاحب الجھ کے بولے "میرا مطلب ہے' ایسی تشویش کی کوئی بات تو نہیں؟"
"بیماری کا پیچھا نہ کرو تو گلے میں اٹک جاتی ہے بھیا صاحب! یہ ٹائی فائڈ ہے ٹائی فائڈ' نزلہ زکام کھانسی نہیں۔"
"ابھی آپ اتنا کرو ڈاکٹر صاحب! اپنے کو کلکتے پہنچنے تک کی کوئی دوائی دے دو' ادھری بھی ہمارا گھر ہے۔" بٹھل نے نرمی سے کہا "کلکتہ ادھری سے زیادہ دور نہیں ہے۔"
"ہم کو بھی معلوم ہے' پر آپ کو اس سے کوئی دشمنی لگتی ہے کیا؟" ڈاکٹر تلخی سے بولا۔
بٹھل چپ ہوگیا اور چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے آہستہ سے پوچھا "کتنے دن لوگے آپ؟"
"کیا بول سکتے ہیں' یہ تو اس جوان پر ہے' دوا کے ساتھ بیمار کا زور بھی چلتا ہے۔ زیادہ تو نہیں لگنا چاہیے۔ آٹھ دن یا زیادہ بھی۔ ابھی اس وقت ٹھیک سے کچھ نہیں بول سکتے۔ ٹائی فائڈ تھوڑی نخرے والی بیماری ہے۔" ڈاکٹر اپنے کام میں مصروف رہا۔ اس نے بیگ سے انجکشن نکال کے میرے بازو میں گھونپ دیا اور مختلف رنگوں کی گولیاں کھانے کو دیں۔ میری کمر میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ دوا پینے کے بعد میں نے اٹھنا چاہا مگر ڈاکٹر نے مجھے جھڑک دیا اور خاموشی سے لیٹے رہنے کی تاکید کی۔
"سید صاحب! ایک بات تھوڑی تسلی سے سن لو۔" بٹھل نے دبی دبی آواز میں کہا "اپنے کو ادھری اپنے نزدیک کوئی ٹھکانا دلادو' آٹھ دس دن کے لیے' چاہے کتنے کا ہو۔"
"واہ صاحب! یہ گھر' یہ مہمان خانہ ہم نے کس لیے' کس کے لیے بنایا ہے۔" سید صاحب ناگواری سے بولے

"ٹھکانے آپ کو مل سکتے ہیں' اس سے بہت اچھے لیکن ہم آپ کو صاف بتائیں' یہاں جیسا آرام کہیں نہیں ملے گا۔ میں پوچھتا ہوں' اس میں حرج ہی کیا ہے۔ درست ہے' ہماری آپ کی پہلی مڈبھیڑ ہے لیکن پہلی نہ ہو تو دوسری بھی ممکن نہیں ہوتی۔ اجنبی سہی مگر آدمی کا آدمی سے ایک رشتہ تو سدا رہتا ہے۔ بہتر ہوگا' آپ سب کچھ ہم پر چھوڑ دیجیے' ملازم کو بتائیے سامان کہاں رکھا ہے' وہ لے آئے گا۔ آپ بابر میاں کو دیکھیے' انشاء اللہ جلد افاقہ ہوگا' ڈاکٹر کشن نام ہی کے نہیں گنوں کے بھی کشن کنہیا ہیں۔"

"ہاں آں' گوپیوں والے۔ بس ہم کو مرلی بجانا نہیں آتا۔" ڈاکٹر نے انگلیاں نچا کے کہا اور بٹھل سے بولا "بابا! آپ کیوں چنتا کرتے ہو' ادھر مزے سے ریٹھان کرو وشرام کرو' اپنے بھیا صاحب کو مہمان پالنے کا بہت شوق ہے۔"

"بے شک' بے شک۔" سید صاحب سینے پر ہاتھ رکھ کے بولے "میزبانی میری عادت ہے۔ یہاں مہمان خانے میں کوئی مہمان نہیں ہوتا تو سچ پوچھیے' عجیب اداسی سی رہتی ہے۔ یہاں دس بارہ افراد کے قیام کی گنجائش ہے۔ یہ اتفاق ہے کہ ان دنوں کم ہی لوگوں کا اس طرف آنا ہوا اور نہ برکت ہی برکت رہتی ہے۔ مہمان خانہ بسا رہتا ہے۔ بہاول پور ریاست کے ایک بزرگ البتہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہ بھی کل صبح رخصت ہو جائیں گے۔ اب تو خیر بات ہی دوسری ہو گئی' ویسے بھی جناب! ہم آپ کو ایسے تو نہیں جانے دیتے۔ کم از کم ایک رات کے لیے تو آپ ہماری درخواست رد نہیں کر سکتے تھے۔"

"آپ بھیا صاحب کو نہیں جانتے بابا!" ان کا دل کسی دن ضرور چیک کرنا ہے' اتنا بڑا ہونے پہ ڈاکٹری میں اچھا نہیں سمجھا جاتا۔" ڈاکٹر مسکراتے ہوئے بولا۔

"اب دل رہا ہی کہاں ہے۔" سید صاحب نے بظاہر سرد آہ بھر کے کہا۔

"رہے بھی کیسے' پاس رکھو تبھی تو بھیا صاحب!"

ڈاکٹر کشن اور کہنا چاہتا تھا کہ سید صاحب نے بہ عجلت کہا "تم نے پرہیز کے لیے کچھ نہیں بتایا مرلی منوہر۔"

"کم اور ایک دم ہلکا پھلکا' بہت نرم' دوائی کے ساتھ ابن مستانے کے ہاتھ پورا چارٹ بنا کے بھیج دوں گا۔" ڈاکٹر نے بیگ بند کیا' مجھے تھپکی دے کے اور منتظر مریضوں کی کثرت کا عذر کر کے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا کہ بٹھل نے چند قدم لپک کے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

سید صاحب بھی سمجھ گئے "تم جاؤ کنہیا!" انہوں نے ڈاکٹر سے کہا اور اشاروں سے بٹھل کو کچھ تلقین کرنی چاہی۔

"اب تو نوکری بھر موتی چور' چھوٹے میاں جی اچھے ہو جائیں' پھر کھائیں گے۔" ڈاکٹر مچلتے ہوئے لہجے میں بولا اور بٹھل کو تحمل کا درس دینے لگا۔ اس نے از خود وعدہ کیا کہ صبح و شام میری خبر گیری کے لیے آتا رہے گا۔ بٹھل کو اس نے شکریے کا موقع نہیں دیا اور تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد وہ دونوں میرے پلنگ کے نزدیک کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سید صاحب ڈاکٹر کشن کی طبی مہارت کے مختلف واقعات سناتے رہے۔ کہنے لگے کہ برسوں سے ان کی دوستی ہے۔ خاصا منہ پھٹ اور کسی قدر مسخرا شخص ہے۔ یہاں تو اس نے احتیاط کی' بے تکان گالیاں بکتا ہے۔ دل بہت اچھا ہے۔ الہ آباد سے تعلق ہے' برسوں پہلے آسن سول آ کے مطب شروع کیا تھا' اب فرصت ہی نہیں ملتی۔ پھر اپنے بارے میں بتانے لگے کہ آسن سول کے گرد و نواح میں ان کی تھوڑی بہت زمیں داری ہے' کچھ زمین بردوان میں ہے۔ شہر کی میونسپلٹی میں بھی ان کا عمل دخل ہے۔ بیشتر رفاہی فلاحی کاموں میں مصروف رہتے ہیں' ہفتے عشرے ایک دو دن کے لیے زمینوں کی نگرانی کے سلسلے میں دورے کرنے پڑتے ہیں۔ یہاں ان کے مراسم اعلیٰ حکام' تاجر' زمیں دار اور معززین سے بڑے گہرے ہیں۔ شاید ہی کسی تقریب میں انہیں مدعو نہ کیا جاتا ہو۔ وہ رنگ و نسل' و مسلک میں رعایت کے قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا تعلق ہر طرح کے لوگوں سے ہے اور اطراف و اکناف میں ان کی عزت کی وجہ بھی یہی ہے۔

"اور ادھری گھر میں ......" بٹھل نے پہلو بدل کے پوچھا "گھر میں بیوی بچے...؟"

"سید صاحب نے گہری سانس بھری' چہرے پر کئی رنگ آئے' کہنے لگے کہ گھر کے معاملے میں وہ زیادہ خوش قسمت نہیں ہیں۔ دو مرتبہ شادی کی' دونوں بیویاں گزر گئیں۔ پہلی بیوی سے ایک بیٹی' تین بیٹے ہوئے تھے۔ ایک بیٹے کا بچپن میں انتقال ہو گیا۔ باقی دو ولایت تعلیم حاصل کرنے گئے لیکن وہاں کی زندگی ایسی مرغوب ہو گئی کہ یہاں آنا نہیں چاہتے۔ سال دو سال بعد چکر لگاتے ہیں اور جلد ہی لوٹ جاتے ہیں۔ دوسری بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ بیٹی اپنے گھر کی ہو چکی ہے اور بھوپال میں آسودہ زندگی گزار رہی ہے' کبھی کبھی میکے آ جاتی ہے۔

"پھر تو گھر میں بچھو بڑھ گئے ہوں گے۔"

"جی' جی ہاں مگر نہیں ایسی تنہائی تو نہیں' گھر تو اللہ رکھے بھرا ہوا ہے' نوکر چاکر ہیں' دوست احباب کا جمگھٹا رہتا ہے۔ ایک بوڑھی رشتے دار خاتون بھی ساتھ ہیں' جی لگا رہتا ہے۔"

"پھر کانٹا کھینچ لیا کیا؟"

"جی' جی کیا فرمایا آپ نے؟"

"تیسری کوئی نہیں کھوجی پھر؟ شکر ہے۔" بٹھل کا لہجہ طنز سے عاری تھا "اچھا کیا۔"

"ایک ثانیے کے تردد کے بعد سید صاحب چہک کے بولے "تیسری بھی ممکن تھی' بس یوں سمجھیے ستارے نہیں ملے' ہو نہیں پائی' ہو بھی سکتی ہے۔ آپ فرمائیے' آپ نے تو اپنے بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں؟"

"کچھ بولنے کا ہو تو منہ کھولیں۔"

"کتنے بچے وغیرہ...؟"

"بہت سارے۔"

"ماشاء اللہ "کتنے؟" سید صاحب نے اشتیاق سے پوچھا۔

"کیا بولیں' گنتی یاد نہیں۔"

"یہ بھی خوب رہی۔ سید صاحب نے قہقہہ لگایا اور سنجیدگی سے بولے "زیادہ بچے رحمت بھی ہیں' زحمت بھی اور کچھ بیوی کا ہے۔ آج تک سمجھ میں نہیں آیا' ہونے یا نہ ہونے میں کون سی صورت زیادہ اچھی ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"

"اپنے کو سچ پوچھو تو کچھ پتا نہیں "

"آپ کا تجربہ کیا ہے؟"

"کبھی فرصت ہی نہیں ملی صاحب۔"

"آپ کے چہرے پر بہت تجربے لکھے ہیں۔"

"اپنے کو پتا نہیں' آپ پڑھے لکھے آدمی ہو۔"

"لگتا ہے زندگی بہت جھیلی ہے آپ نے۔"

بٹھل بے حرکت بیٹھا رہا۔

"یہ بابر میاں! آپ نے بتایا ہی نہیں کہ ان سے آپ کی عزیز داری...؟"

"سبھی کچھ۔"

"وہ تو نظر آ رہا ہے پھر بھی..."

"چھپا چھپانا ضروری ہے کیا؟"

"نہیں' بے شک نہیں۔"

"پھر جو آپ سمجھو' وہی ٹھیک ہے۔"

"مناسب ہے۔" سید صاحب خفیف سے ہو گئے اور کہنے لگے "ہماری گفتگو سے بابر میاں بے آرام ہو رہے ہوں گے' آئیے باہر چلتے ہیں۔"

میں نے بہ دقت کہنے کی کوشش کی کہ وہ میری فکر نہ کریں' بہتر ہے' یہیں بیٹھیں۔

لیکن سید صاحب اٹھ گئے "ملازم نصیر بابا کمرے کے باہر رہیں گے۔ دوسرے ملازموں کو بھی ہدایت کر دی گئی ہے۔ کسی فوری ضرورت کے لیے مہمان خانے میں ایک مختصر سا باورچی خانہ بھی ہے۔ نصیر بابا کو اشارہ کر دینا کافی ہوگا۔" انہوں نے میری جلتی ہوئی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور تسلی دیتے رہے۔

"مہمان ادھری آ کے تو پیچھے کا سارا بھول جاتا ہوگا؟" بٹھل نے چٹکی بھرنے والے انداز میں کہا۔

"نہیں صاحب! اپنی اپنی مصروفیت میں گھرے ہوئے لوگ آتے ہیں۔ میری تو بس یہی تمنا رہتی ہے کہ یہاں سے کوئی ناخوش نہ جائے مگر یہ کوئی بہت بڑا شہر تو ہے نہیں' آس پاس اچھے شاداب مقامات ہیں لیکن بمبئی' کلکتے' دلی کی رنگینیاں تو یہاں نہیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں' لوگ میری عزت افزائی کے لیے اس طرف کا رخ کرتے ہیں۔ کچھ لوگ کام کی غرض سے' کچھ خاص تعلق خاطر کی وجہ سے' بعض حضرات سکون کی تلاش میں غریب خانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ابھی چند ماہ پہلے ندوے کے ایک عالم کتاب لکھ رہے تھے' انہیں خلوت کی ضرورت تھی۔ یہاں تشریف لے آئے' مہینے ڈیڑھ مہینے قیام رہا۔ انہی دنوں دوسرے کمرے میں سنگیت سمراٹ استاد شاد خان ٹھہرے ہوئے تھے۔ صبح و شام کمرے میں بند ہو کے ریاضت کرتے تھے۔ افسر' مصور' شاعر' قسم قسم کے لوگ' تفصیل کیا عرض کروں۔"

"ادھری ہر ایک کو کھلی چھٹی ہے کیا؟"

"ہر ایک کو نہیں' معاف کیجیے یہ سرائے یا ہوٹل نہیں ہے۔ یہ تو محبت کی ایک رسم ہے' محبت کا ایک سلسلہ ہے جو جاری ہے' جاری رہے گا۔"

"ادھری کوئی کانٹا تو رکھا ہوگا آپ نے؟"

"آنکھ سب سے بڑی ترازو ہوتی ہے' نظر آ جاتا ہے جناب! اتنی پرکھ ہو گئی ہے۔" سید صاحب نے اعتماد سے کہا۔

"اپنے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

سید صاحب سے فوراً کوئی جواب بن نہ پڑا۔ بے ترتیبی سے بولے "آدمی بھی تو کوئی چیز ہوتا ہے۔"

"ہم تو دکھائی نہیں دینے چاہئیں صاحب! کسی ترازو پر

پورے نہیں اترتے۔"
سید صاحب کے جسم پر تموج سا نمودار ہوا "آپ نظر آرہے ہیں جناب! یہ کسر نفسی بھی خوب ہے' جانے دیجیے۔ سمجھیے' آپ ہمیں اچھے لگے' دوسروں سے الگ۔" انہوں نے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "دھوپ میں تو سفید نہیں ہورہے۔"

"پر ابھی پورے چٹے بھی نہیں ہوئے۔"

"ابتدا تو کب سے ہوچکی ہے' باقی کتنے دن کے ہیں۔"

"کبھی کوئی نوٹنکی والا بھی ٹکرایا ہوگا؟"

سید صاحب کی پلکیں مرتعش ہوگئیں' اضطراری لہجے میں بولے "جی ہاں' مگر مگر ایک دو بار ہی جی پر بار ہوا۔ اصل میں کوئی آدمی اتنا مکمل نہیں ہوتا مگر آپ' آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"ایسے ہی صاحب! اپنے بارے میں سوچتے ہیں۔"

"کچھ مت سوچیے اور آئیے' باہر کھلی ہوا میں بیٹھتے ہیں۔ موسم بڑا سہانا ہے' بارش کی بھی اپنی مستی ہوتی ہے۔"

بخار اور سردرد کی شدت کی باوجود مجھے ان کی باتوں سے لطف آرہا تھا۔ باہر سے ابن کے آجانے پر سید صاحب اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔ ابن دوا کی شیشی بلکہ شیشیاں اور گولیاں لایا تھا۔ اس کے پاس پرہیز کا مکمل گوشوارہ بھی تھا۔ چارٹ پر ایک نگاہ ڈال کے سید صاحب سہلاتے رہے اور بٹھل کی کمر پر ہاتھ رکھے اسے باہر لے گئے۔ کمرے میں کچھ دیر سناٹا سا ہوگیا۔ میری آنکھیں بند ہوگئی تھیں کہ کسی کی چاپ سے کھل گئیں۔ وہ ملازم نصیر بابا تھے۔ دبے قدموں چلتے ہوئے وہ میرے سرہانے آکے بیٹھ گئے اور سر دبانے لگے۔ میرا سر پھٹا جارہا تھا۔ اتنے عمر رسیدہ شخص کو یہ زحمت دینا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے بہت منع کیا' وہ نہیں مانے۔ ان کے ہاتھ سخت کھردرے تھے لیکن دباؤ میں بڑی نرمی تھی۔ انگلیاں بھی بولتی ہیں۔ گونگے بھی تو اپنے دکھ' اپنی خوشی کے اظہار پر قادر ہوتے ہیں۔ مجھے قرار سا آگیا۔ ایسی غفلت طاری ہوئی کہ رات گئے آنکھ کھلی۔ ڈاکٹر نے دواؤں میں یقیناً کوئی نیند آور دوا بھی شامل کی ہوگی۔

سید صاحب نے کوئی مبالغہ نہیں کیا تھا بلکہ واقعے سے کچھ کم ہی بیان کیا تھا۔ کسی بڑے ہوٹل میں یہ اہتمام اور اسپتال میں یہ نگہداشت ممکن نہ ہوتی۔ مطب جانے سے پہلے ڈاکٹر کشن معائنہ کرنے آیا اور مطب ختم کرکے رات کو ایک بار پھر چکر لگایا۔ سید صاحب بھی دن میں متعدد بار' کم وقت کے لیے سہی مگر پوچھ گچھ کے لیے آتے رہے۔ بوڑھی ملازمہ امتل گھر سے ہلکی پھلکی غذائیں اور پھلوں کا تازہ [illegible] لاتی رہی۔ ابن اور دوسرے ملازم بشارت اور نذرو بھی [illegible] مانوس ہوگئے تھے۔ نصیر بابا نے مچھردانی لگا کے اپنی چار[پائی] راہداری میں دروازے کے ساتھ بچھالی تھی۔ وہ میری [illegible] صدا' ایک آہٹ پر مستعد ہوجاتے تھے۔ بٹھل نے حسب عادت ملازموں کے انکار کے باوجود جانے کتنی رقم ان [میں] تقسیم کی تھی اور انہیں باور کرادیا تھا کہ سید صاحب [کو] عطیات کی بھنک نہیں پڑنے دی جائے گی۔ مال وزر تو [illegible] ہے' روپے کا ریشم آدمی کو زیادہ آسودہ رکھتا ہے۔ بٹھ[ل] بیش تر وقت میرے پاس کمرے میں گزرتا یا پھر وہ سید صا[حب] کے ساتھ گھنٹے دو گھنٹے کے لیے باہر چلا جاتا۔ کوئی اور [illegible] جانے کن کن مصنوعات پر نصیر بابا سے اس کی کھسر پھسر رہتی۔ نصیر بابا نے اس کے لیے حقے کا انتظام کردیا تھا [illegible] دونوں کے تعلقات دیکھ کے لگتا تھا کہ برسوں سے [illegible] ہے۔

چوتھے دن کہیں بخار کا زور ٹوٹا' پانچویں دن میں [اس] قابل ہوگیا کہ کمرے سے باہر دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ سکوں۔ پانچ چھ روز میں تقریباً سارے [ملازم] بٹھل کے مصاحب ہوچکے تھے۔ بٹھل کی جگہ کوئی ا[ور ہوتا] تو ان کی خاطر مدارات سے تنگ آجاتا۔

سید صاحب کے ہاں آئے ہوئے چھ دن ہوچکے تھا جیسے مہینے گزر چکے ہیں۔ چھٹے دن میری طبیعت خا[صی بحال] ہوگئی تھی۔ نصیر بابا بہت خوش تھے۔ وہ صبح مہمان خا[نے کے] عقب میں پھیلے ہوئے سبزہ زار میں چہل قدمی کے [لیے لے] کے گئے۔ بڑی دل کش جگہ تھی۔ چار دیواری [illegible] پھلوں اور پھولوں کے اونچے نیچے درخت' وسط می[ں مخمل] کے مانند سبزہ' کیاریوں میں آراستہ بڑے بڑے رنگ[ین] گلاب' ایک گوشے میں مغل طرز کی جالیوں کی دیوار [illegible] ملازم کے مکانات تھے۔ بیلوں نے آدھی دیوار ڈھا[نپ رکھی] تھی۔ شام کو سنگترے کا رس اور سبزی کے کباب [illegible] دوا کی خوراک نگلنے کے بعد سبزہ زار میں جانے کو م[ن] لگا۔ چھ دن کی قید کے بعد آج رہائی ملی تھی۔ میں تو [یہاں] سے دور بازار اور گلیوں میں جانا چاہتا تھا لیکن ڈاک[ٹر کی] راہ داری کے سوا کہیں اور چلنے پھرنے کی سختی سے [ممانعت] تھی۔ اس کے احکام کی تعمیل ہی کا اثر تھا کہ اب [illegible] محسوس ہورہا تھا۔ اس نے تنبیہہ کی تھی کہ ذرا س[ی بے احتیاطی سے] بخار لوٹ سکتا ہے مگر راہ داری سے چند قدم کے فا[صلے پر سبزہ] زار تھا۔ میں نے نصیر بابا سے وہاں چلنے کی فرمائش [کی تو انہوں] نے صاف انکار کردیا پھر جلد ہی کچھ اپنی محکومی کے [احس]اس' کچھ میری خوشنودی کی خاطر آمادہ ہوگئے۔ شام کے [وقت] سبزہ زار کا سماں اور فرحت انگیز تھا۔ نصیر بابا کے پاس [باتوں] کی کمی نہیں تھی' اتنے قصے کہانیاں یاد تھیں اور زندگی [کے] معمولات کے ایسے تجربے ازبر تھے کہ آدمی بس سنتا [رہ جائے]۔ باتوں باتوں میں پتا ہی نہیں چلا' ہم دور آگئے۔ صبح اس [طرف نہ] آسکے تھے۔ چلتے چلتے یکایک نصیر بابا کو خیال آیا اور وہ [مض]طرب ہوگئے۔ "واپس چلتے ہیں میاں! ادھر سے زنان خانے کا [حصہ] شروع ہوجاتا ہے۔"

میں مہمان خانے کی سمت پلٹنا ہی چاہتا تھا کہ سامنے [دا]ئیں ہاتھ کی جانب عمارت کے تکونی گوشے میں پہلی منزل پر [وا]قع محرابی دریچے کے پٹ کھلنے اور پردہ کھسکنے کی آواز پر [میر]ے قدم ٹھٹک گئے۔ آنکھیں بھی سماعت رکھتی ہیں۔ غیر [ار]ادی طور پر میری نگاہ نے دریچے کا تعاقب کیا۔ کوئی شاعر [ہو]تا تو برملا شاید یہی کہتا' جیسے ماہ تاب دریچے میں اتر آیا ہو۔ ایک جھماکا سا تھا۔ تپتا ہوا سرخ وسپید کتابی چہرہ' تیکھے [نقو]ش ونگار سانچے میں ڈھلے ہوئے بڑی بڑی آنکھیں' بے [تر]تیب سیاہ بال' کرتا سفید تھا' دوپٹا سبز رنگ کا' کانوں میں [م]وٹے آویزے جھول رہے تھے۔ وہ ایک حسین لڑکی تھی۔ [ہم] دونوں کی نظریں ایک لحظے کے لیے چار ہوئی تھیں کہ چشم [زدن] میں وہ کھڑکی سے ہٹ گئی۔ میں دیکھتا رہ گیا۔

نصیر بابا نے بھی اسے دیکھ لیا تھا' آہستگی سے میرا ہاتھ [تھ]ام کے وہ مہمان خانے کی جانب مڑ گئے۔ معمول کی طرح [میں] نے بھی ان کی پے روی کی۔ چند لمحوں کے لیے میں اپنے [آ]پ سے بیگانہ ہوگیا تھا۔ واپسی کا باقی رستہ خاموشی سے گزرا۔ نہ نصیر بابا نے کوئی کلام کیا نہ مجھ میں ان سے پوچھنے کی [ج]رات ہوسکی۔ منظر کی تبدیلی سے مراد منظر کی روپوشی نہیں ہے۔ بعض منظر آنکھوں میں جذب ہوجاتے ہیں' کیمرے سے کھینچی گئی تصویر کی طرح۔ میرے سبزہ زار جانے سے پہلے سید [ص]احب بٹھل کو کہیں لے گئے تھے' وہ ابھی تک واپس نہیں [آ]یا تھا۔ مجھے واقعی تھکن محسوس ہورہی تھی۔ کمرے میں [آ]کے میں بستر پر دراز ہوگیا۔ ملازمہ امتل اور نصیر بابا نے حسب معمول کسی چیز کی ضرورت کے لیے مجھ سے استفسار کیا اور میری طرف سے معمول کا جواب سن کے چلے گئے۔ میں کمرے میں تنہا دیر تک آنکھیں موندے لیٹا رہا اور جب بستر جسم میں چبھنے لگا تو باہر راہداری میں آکے آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ شام اندھیرے میں ڈوب رہی تھی۔ منع کرنے کے باوجود ملازم ابن نے میرے پیر دبانے شروع کردیے۔ خدمت گاری بھی شاید جزو جاں بن جاتی ہے۔ ابن میری صحت کی بحالی پر خدا کا شکر ادا کرتا اور مسرت کا اظہار کرتا اور سادگی سے کہنا لگا کہ اسے میرے اچھے ہوجانے کی جتنی خوشی ہے' اتنا ہی یہ سوچ کے دحشت ہوتی ہے کہ چند دن بعد میری طبیعت بالکل ٹھیک ہوجائے گی تو میں اور بٹھل یہاں سے چلے جائیں گے۔ بٹھل کو سارے ملازم بابا کہتے تھے۔ ابن بطور خاص اسے بابا صاحب' بابا سرکار کے لقب سے مخاطب کرتا تھا۔ ابن کی آواز میں کوئی کھوٹ نہیں معلوم ہورہی تھی۔ کہہ رہا تھا کہ مہمان تو آئے دن یہاں آتے ہی رہتے ہیں' بڑے بڑے اونچے لوگ لیکن ہم دونوں جیسے آج تک نہیں آئے۔ میرا تو خیر کیا ذکر تھا' میں تو ان کے لیے مسلسل بوجھ بنا ہوا تھا اور میں تو اتنے دن بستر پہ کروٹیں بدلتا' اینڈتا ہی رہا تھا۔ بٹھل ہی سے ان کی راہ ورسم ہوئی تھی۔ میرے جی میں آیا کہ ابن سے زنان خانے کے مکینوں کے بارے میں کچھ ٹوہ لوں۔ سید صاحب نے گھر میں رشتے کی ایک عمر رسیدہ خاتون ہی کا ذکر کیا تھا' باقی ملازماؤں کا البتہ انہوں نے مبہم انداز میں یہ بھی کہا تھا کہ اور بھی لوگ ہیں۔ ممکن ہے' زنان خانے میں مہمان خواتین بھی ٹھہرتی ہوں' سید صاحب کی عزیز رشتے دار خواتین۔ میں نے ابن سے کچھ نہیں پوچھا اور خود کو روک لیا کہ مجھے آخر کیا جستجو ہے۔ وہ لڑکی کوئی بھی ہو' مجھے اس سے کیا سروکار؟ میں نے کسی حد تک خود کو مطمئن کرلیا تھا لیکن جانے کیوں وہ دریچہ میری آنکھوں سے دور نہیں ہوتا تھا۔ اس تردد کا کچھ جواز بھی تھا۔ اس لڑکی کے چہرے پر اضطراب آمیز یاسیت چھائی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی بے تاثر نہیں تھیں۔ سوچتی ہوئی' کھوئی ہوئی آنکھیں۔ میں اس کیفیت کو کوئی نام دینے میں الجھتا رہا۔

بٹھل کوئی آٹھ بجے واپس آیا۔ اس رات اس نے کمرے میں کھانا کھایا۔ معلوم ہوا کہ سید صاحب کسی خاص دوست کے ہاں مدعو ہیں۔ بٹھل کا توشہ تو خاص الخاص تھا' میرے پرہیزی کھانے میں بھی کچھ کم اہتمام نہیں تھا۔ مرغ کا شوربہ' مونگ کی دال کی پتلی کھچڑی' چپاتی' سلاد دہی اور پھلوں کا رس' میٹھا دلیا بھی۔ مجھے رات کی خوراک پلانے اور بٹھل کے لیے تازہ حقہ لانے کے بعد روشنی کم کردی گئی۔ نصیر بابا سب سے آخر میں رخصت ہوئے۔ وہ دروازہ پوری طرح بند نہیں کرتے تھے تاکہ کسی ضرورت کے لیے ہماری آواز باہر راہداری میں دروازے کے ساتھ بچھی ہوئی ان کی چارپائی تک پہنچ جائے۔ تمام کھڑکیوں اور دروازوں پر جالیاں لگی تھیں۔ ہمارے کمرے میں آمدورفت کے راستے پر دو

دروازے آگے پیچھے نصب تھے' دوسرا جالی دار تھا۔ چاروں طرف سبزے کی کثرت کی وجہ سے کیڑے مکوڑوں کی بہتات ہو سکتی تھی مگر نصیر بابا کے کہنے کے مطابق ہفتے میں ایک بار ولایتی کیڑے مار دوا کے چھڑکاؤ اور کھڑکیوں پر دروازوں پر کھنچی ہوئی جالیوں سے عمارت کا اندرونی حصہ محفوظ رہتا تھا۔

اس وقت دیواری گھڑی نے گیارہ کا گجر بجایا تھا۔ بٹھل حقہ کشی میں مصروف تھا۔ کہتے ہیں' نیند کے لیے چشم بستگی شرط نہیں' نیند کا اپنا تیور ہے' کھلی آنکھوں میں بھی اتر آتی ہے۔ میرا ذہن جانے کہاں کہاں بھٹک رہا تھا اور نیند جیسے چھیڑ خانی کر رہی تھی۔ اچانک جالی والا دروازہ چرچرایا۔ دوپہر ہی نصیر بابا نے ان کو ہدایات کی تھی کہ وہ دروازے کے قبضوں میں تیل ڈال دے' کسی طور تو یہ تکلیف دہ آواز بند ہو۔ ہلکی روشنی کے باوجود پہچاننے میں دشواری نہیں ہوئی۔ وہ نصیر بابا تھے' چوروں کی طرح کمرے میں داخل ہوئے۔

"بابا!" انہوں نے سرگوشی میں بٹھل کو پکارا "سو تو نہیں گئے؟"

"نہیں بھایا' نندریا تو بجنی سمان ہے۔ اپنے سے بہت کھیلن کرتی ہے پر ایک دن تو۔" بٹھل نے گونجتی آواز میں کہا "تم بولو' آگے پیچھے سب ٹھیک ہے تو کھینچ لاؤ اس کو۔"

"یہی پوچھنے کے لیے آیا ہوں۔" نصیر بابا کے لہجے میں سراسیمگی عیاں تھی "میں نے اس کو بول دیا ہے' اچھی جی دار ہے' پر ڈر رہی ہے بہت۔ میں نے بڑی کمر تھپکی' دلاسے دیے کہ بڑے صاحب جلدی نہیں آئیں گے' محفل میں گئے ہیں۔ اسے بھی معلوم ہے' کبھی کبھی تو سویرے ہی پلٹتے ہیں۔"

"اس کو بولا نہیں' بڑے صاحب بیچ میں آ جائیں تو کیا ہے' دیکھ لیں گے پھر۔" بٹھل نے بے پروائی سے کہا۔

"میں نے بولا تھا' وہ تو کانپ گئی۔ آنے سے انکار کرنے لگی' میں نے سمجھایا پھر یہ وقت نکل جائے گا' اچھی طرح سوچ لو' تیار ہو گئی۔"

"پھر دیری کاہے کرت ہو؟" بٹھل نے پوربی لہجے میں کہا۔

"یہیں' یہیں۔ میرا مطلب ہے' یہیں لے آؤں۔" نصیر بابا ہچکچاتے ہوئے بولا۔ وہ بہت گھبرائے ہوئے تھے۔

"اور کدھری پھر؟" بٹھل نے تندی سے کہا۔

"کوئی دوسرا کمرا کھول دیتا ہوں' یہاں تو اپنے میاں۔"

"نہیں' اودھری لے آؤ۔ بڑے صاحب گھر لوٹیں گے تو اس ٹائم ادھری رخ نہیں کریں گے۔"

"اور کیا پتا کس حال میں ہوں۔"

"یہ تو تم اچھا جانتے ہو۔"

نصیر بابا یہ کہہ کے کہ وہ تھوڑی دیر میں واپس آ[...] اسی لمحے کمرے سے چلے گئے۔ مجھ سے بستر پر لیٹا [...] میں نے طے کیا تھا کہ بٹھل سے سوال کم ہی کروں [...] اس کی مرضی پر ہوتا ہے' خواہ مخواہ پھر مجھے بڑی الجھ[ن ہوتی] ہے لیکن میں خود کو نہ روک سکا "کون آ رہا ہے؟" یہ [...] میں نے جھنجلاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"دیکھتے ہیں رے ابھی۔" وہ حقے کا کش لیتے ہو[ئے ...]

"کون ہے وہ؟ مجھے کیوں نہیں بتاتے؟"

"ابھی سارا تیرے سامنے آ جائے گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے ترشی سے کہا [...] میں ہونٹ چبا کر رہ گیا۔

یہی بہتر تھا کہ آنے والے لمحوں کا انتظار [...] شاید وہ مجھے اب تک بچہ سمجھتا ہے یا اسے میری دما[غی حالت پر] شبہ ہے' اس کی دانست میں' میں ایک بے تواز[ن ...] اسی لیے وہ مجھ سے صحیح طرح بات نہیں کرتا۔ م[...] ہاتھ پاؤں مارے لیکن کوئی سرا مجھے سجھائی نہیں د[...] کون اسے باور کراتا کہ جتنا وہ مجھ میں شامل ہے' [...] سے کچھ سروکار رکھتا ہوں۔ اسے بالکل احساس [...] اس کے رویے سے دوسرے کو کتنی اذیت ہو [...] دوسرا کوئی اور نہیں' وہ میں ہوں۔"

نصیر بابا کو گئے دیر ہو گئی۔ گھڑی نے ساڑھے [...] بجایا۔ یقیناً زنان خانے سے کوئی آ رہا ہے۔ دیوا[ن] خانے کا فاصلہ اتنا زیادہ نہیں ہے۔ میری نظر پر[دے پر] جمی ہوئی تھی۔ ایسی خاموشی تھی کہ قدموں کی [...] کمرے میں در آئے۔ بٹھل دوبارہ بستر پر دراز [...] منال اس کی ہونٹوں سے چپکی ہوئی تھی۔ وقفے [وقفے سے حقے] کی گڑگڑاہٹ کمرے میں گونجتی رہی۔ میں پلنگ [...] کمر ٹکائے بت بنا بیٹھا رہا۔ گھڑی کی ٹک [ٹک سے] بیزاری ہونے لگی تھی۔

چند منٹ اور گزر گئے۔ میں نے پلنگ [...] ہوئی میز سے جگ اٹھا کر آدھا گلاس پانی پیا۔ [...] وقت گزارنے اور حواس یک جا رکھنے کی کو[شش ...] بارہ سے اوپر ہو گئے۔ اب رات بہت ہو گئی [...] آمد کا امکان کم ہوتا جا رہا تھا مگر بارہ نہیں بجے [...] واری میں سرسراتی چاپوں کا گمان ہوا۔ عام [...] تھا۔ لمحے بھر بعد جالی والے دروازے کی [...] دی۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ نصیر بابا نے

جھانک کر پہلے اطمینان کیا' پھر دبے قدموں آ کے بھنچی ہوئی آواز میں کہا "بابا! میں آ گیا ہوں۔"

"ہاں ہاں دیکھ لیا ہے۔" بٹھل بھی بستر پر بیٹھ گیا۔

"آجاؤ آجاؤ۔" نصیر بابا نے اپنے پیچھے سرمئی چادر میں لپٹی ہوئی عورت کے شانے پر ہاتھ رکھ کے تقریباً اسے دھکیلا۔ اس کی حالت اضطرابی' سیمابی سی تھی۔ جیسے ہی وہ اندر آئی۔ انہوں نے پلٹ کے جھٹ عام دروازے کی چٹخنی چڑھا دی "بیٹھ جاؤ' بیٹھ جاؤ۔ تسلی سے۔" نصیر بابا کی آواز دھڑک رہی تھی۔ "یہ ہیں اپنے بابا صاحب اور یہ' یہ چھوٹے صاحب بابر میاں۔ میں نے تم کو ان کے بارے میں سب بتا دیا ہے۔ اب گھبراؤ بالکل نہیں۔ کوئی ضرورت نہیں گھبرانے کی۔"

وہ پہلے تو سکڑی سمٹی دروازے کے پاس کھڑی رہی پھر نصیر بابا کی مسلسل تلقین و تاکید پر اس نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور جھجکتے' اٹکتے قدموں سے کونے میں رکھے ہوئے صوفے پر ایک جانب بدن چراتے ہوئے بیٹھ گئی۔ اس نے چادر کے آنچل سے آدھا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا' چادر سے پیشانی بھی چھپی ہوئی تھی۔ بٹھل کی طرف سے روشنی تیز کرنے کی ہدایت پر نصیر بابا کو کسی قدر تامل ہوا تھا لیکن انہوں نے تعمیل کر دی۔ روشنی بھی حیرت' خوف اور رنج و الم کچھ کم کرنے کا سبب ہوتی ہے۔

"اب ادھری آ گئی ہو تو آرام سے بیٹھو۔" بٹھل نے بستر سے اٹھ کے نرمی سے کہا اور صوفے کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا "ادھری تمہارے آ جانے سے لگتا ہے نصیر بابا نے کم ہی بولا ہے۔"

وہ صوفے پر دبکی بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ "بولو بیٹا۔" نصیر بابا نے پچکارتے لہجے میں کہا "اپنے کو جتنا پتا تھا' بابا صاحب کو بتا دیا ہے لیکن اصل بات تو تمہاری ہے۔ تم ہی اپنی زبان سے بولو تو اچھا ہے۔"

وہ کوئی لڑکی ہی تھی۔ اس کا سر اور جھک گیا اور ہونٹ لرزنے لگے پھر جانے اسے کیا ہوا' وہ سسکیاں بھرنے لگی۔ ادھر سے نصیر بابا لپک کے اس کے پاس پہنچے' ادھر سے بٹھل نے اٹھ کے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا تو وہ اور بکھر گئی۔ نصیر بابا جلدی سے پانی کا گلاس لے آئے اور مشفقانہ انداز میں بولے کہ وہ حوصلہ رکھے اور یقین کرے کہ ہمدردوں میں آئی ہے۔ خیال رہے کہ اسے زنان خانے میں' جتنی جلدی ہو سکے' واپس پہنچنا ہے۔ اگر اس نے یوں ہی چپ سادھے رکھی' اور روتی رہی تو کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوگا' یہ وقت نکل جائے گا۔"

نصیر بابا کے اصرار پر اس نے بہ مشکل گھونٹ بھر پانی پیا۔ اس کی چادر اس دوران میں چہرے سے ہٹ گئی تھی۔ اس نے دوبارہ چہرہ ڈھانپنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ وہ لڑکی نہیں تھی جس کی ایک جھلک میں نے سرِ شام زنان خانے کے دریچے میں دیکھی تھی۔ چودہ' پندرہ سے زیادہ اس کی عمر نہیں ہوگی۔ نکلتا ہوا قد' شفق رنگ رخسار' ستواں ناک اور ترشے ہوئے ہونٹ۔ اسے دیکھ کے بے اختیار مجھے نیساں یاد آئی۔ نیساں کے چہرے پر بھی ایسی ہی دل آویز معصومیت تھی۔ وہ بھی ایسی ہی نازک تھی' پھول کی پتیوں کی طرح۔ خال و خد میں دونوں کے فرق تھا جو فرق پھولوں میں ہوتا ہے۔"

"یہ تو ایک دم مورتی کی طرح ہے۔" بٹھل نے بے ساختہ کہا۔

"سچ بابا صاحب! کیا بولوں' دونوں بہنوں کو اللہ میاں نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔ شہزادیاں ہیں شہزادیاں' ایک کو اٹھاؤ' دوسری کو بٹھاؤ۔ پر نصیب بھی تو اچھا لکھا ہوتا۔" نصیر بابا آہ بھر کے بولے۔

دوسری بہن کے ذکر پر میرا ماتھا ٹھنکا۔ وہ دریچے والی لڑکی کہیں اس کی بہن تو نہیں؟ دونوں میں ایک شباہت ضرور ہے۔ میں بستر سے اٹھ کے بٹھل کے پاس جا بیٹھا۔

"کیا نام ہے ری تیرا؟"

"لڑکی کے ہونٹ پھڑک کے رہ گئے۔

"بولو بٹیا بولو' بابا صاحب کیا پوچھتے ہیں' اطمینان رکھو' تم اپنوں میں ہو' یہاں کوئی غیر نہیں ورنہ میں تم کو یہاں کیوں لاتا۔" نصیر بابا شکایت آمیز مربیانہ لہجے میں بولے۔

بٹھل نے دوبارہ لڑکی کا نام پوچھا تو اس نے زیرِ لبی سے یاسمن بتایا۔

"یاسمن!" بٹھل نے مجھے مخاطب کر کے پوچھا "کیا بولتے ہیں اس کو' کوئی پھول نا۔"

"ہاں' چنبیلی۔" میں نے کہا۔

" بٹھل نے اپنا بھاری سر ہلایا "اور بڑی کا؟" اس نے یاسمن سے پوچھا۔

"فروزاں۔" وہ پژمردگی اور ناتوانی سے بولی۔

بٹھل نے اس بار مجھ سے فروزاں کے معنی نہیں پوچھے۔ نصیر بابا کچھ کہنا چاہتے تھے کہ بٹھل نے ہاتھ اٹھا کے انہیں روک دیا اور تھمی ہوئی' تھپکتی ہوئی آواز میں یاسمن سے کہا کہ جس استقامت سے اس نے یہاں آنے کا عزم کیا ہے' یہی عزم و جرأت اسے اور فروزاں کو کرنا ہے۔ ہو سکتا

ہے' یہاں آنے کے بعد ہم سے مل کے' ہمیں دیکھنے کے بعد اسے اپنے فیصلے پر نظرثانی کی ضرورت محسوس ہوتی ہو۔ اس کے خیال میں ہم وہ لوگ نہ ہوں جن کی اسے تلاش ہے۔ اسے ہماری توفیق واستطاعت پر کوئی شبہ ہے یا ہم اسے معتبرو محترم لوگ نظر نہیں آرہے ہیں تو ہماری جانب سے کوئی اصرار بھی نہیں۔ یہ بات اسے ذہن میں رکھنی چاہیے کہ خود اس نے ہمارے دروازے پر دستک دی ہے' ہم اس کے پاس نہیں گئے ہیں۔ تاہم یہاں آکے اسے کوئی پچھتاوا ہورہا ہے تو نصیر بابا موجود ہیں' وہ اسی وقت واپس جاسکتی ہے اور وہ خاطر جمع رکھے' ہم اس کی آمد اور اس معاملے کا کسی سے ذکر نہیں کریں گے۔ ہمیں تو جلد از جلد یہاں سے چلے جانا ہے اور شاید دوبارہ اس شہر میں واپسی ممکن نہ ہو۔

یہ کیسی باتیں ہورہی ہیں؟ میں ان تینوں کو بے چارگی سے دیکھا کیا۔ سب سے بڑی بے چارگی تو دیکھنے اور سننے کی صلاحیت سے متصف ہونے کے باوجود کچھ نہ سنائی اور دکھائی دیتا ہے۔ میرا سر دھنک رہا تھا۔ یاسمن نامی یہ لڑکی کون ہے؟ اتنی رات کو اس کے یہاں آنے میں کیا رمز ہے؟ بٹھل کو اس قسم کی صراحتوں کی ضرورت کیوں پیش آرہی ہے؟ نصیر بابا نے لڑکی کے بارے میں کیا واقعہ بٹھل پر منکشف کیا ہے۔ آخر اس پاکیزہ صورت' نازک واندام' ناتواں لڑکی پر افتاد کیا پڑی ہے؟ صرف اس قدر واضح ہوسکا کہ سید صاحب' ملازموں اور زنان خانے کے مکینوں کی لاعلمی میں وہ یہاں آئی ہے۔ ظاہر ہے' کسی بڑی وجہ کے بغیر وہ یہ قدم نہیں اٹھاسکتی تھی۔ کچھ بٹھل کا سرد وگرم تخاطب بھی سمجھ میں آرہا تھا۔ اسے بہرحال عجلت ہونی چاہیے تھی کہ اس طرف کسی کے بھٹکنے سے پہلے مناسب ہوگا' وہ زنان خانے واپس چلی جائے۔ بٹھل کے سامنے زمانے کے پست وبلند سے ناواقف' زندگی کی نیرنگیوں سے ناآشنا' ایک ناپختہ کار لڑکی بیٹھی تھی۔ اجنبی مردوں کے درمیان اس طرح روبہ رو ہونے کا تجربہ یاسمن کو پہلے کبھی نہیں ہونا چاہیے۔ اس کا یہ امتناع نہایت فطری تھا۔ اپنے حواس کی یک سوئی اور ارادے کی استواری کے لیے اسے کچھ وقت تو لگنا چاہیے تھا' دونوں صورتوں میں جیسا کہ بٹھل نے اس سے کہا تھا کہ بصورت دیگر وہ کسی بھی لمحے زنان خانے واپس جانے کا فیصلہ کرسکتی ہے مگر اب آجانے کے بعد یہ فیصلہ اتنا آسان بھی نہیں تھا' وہ بیٹھی رہی۔ اس کی ذہنی کشمکش کا اندازہ اس کی سرخ آنکھوں اور جلتے بجھتے چہرے سے کیا جاسکتا تھا۔

"اتنے دنوں میں کتنے بڑے بڑے لوگ مہمان خانے میں آئے میں نے تم کبھی کچھ بولا۔ اب آدمی دیکھ کے ہ کی ہے بٹیا رانی!" نصیر بابا لجاجت سے بولے۔

"میں کیا' کیا کہوں۔" یاسمن کی چیختی آواز سینے م رہی تھی۔

"بابا صاحب کو بولو کہ تمہارے ساتھ کیا ہورہا ہوتا رہا ہے۔" نصیر بابا دل دہی کے لیے اس کے پاس گئے۔

"آپ نے نہیں بتایا؟" وہ کرب سے بولی۔

"لیکن تم بھی تو اپنی زبان سے ــــ"

بٹھل نے نصیر کو پھر روک دیا۔ "نہیں' اس کو بولنے کی ضرورت نہیں' ہم سارا جان گئے ہیں۔" و بھینچ کے بولا "ہم کو اتنا بول ری' آگے کیا مرضی ہے؟ آگے کی بات کرو۔"

یاسمن کے گلابی چہرے پر دھواں سا چھا گیا۔ ' بتاؤں' مجھے کچھ نہیں معلوم' بس کسی طرح ہمیں یہ ـــ یہاں سے ـــ" اس سے مزید کچھ نہیں کہا گیا۔

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔" بٹھل کی آواز پگھلنے "ادھری آس پاس رشتے ناتے کا کوئی ہو تو بولو؟"

یاسمن نے سر اٹھا کے ڈبڈبائی آنکھوں سے طرف دیکھا اور چادر سے چہرہ چھپا کے بری طرح بلکنے

"نا' نا۔" نصیر بابا نے بے تابانہ اس کے سر پر ہا شانوں پر تھپکیاں دیں اور بچوں کی طرح بہلانے لگے "اپنے آپ کو سنبھالو میری بیٹی! میری گڑیا! تم تو والی ہو۔ یہ رونے کا وقت نہیں' کوئی دور نزدیک صاحب کو بولو۔"

یاسمن بہت منتشر ہوگئی جیسے کسی آزمائش - ہویا کسی عذاب سے گزر رہی ہو۔ بہ مشکل اس ہموار کیا اور اٹکتی' لڑکھڑاتی زبان سے بتایا کہ اس جمال الدین سیفی کے کئی قریبی دوست' پٹنے' لکھنؤ حیدرآباد اور دلی وغیرہ میں ہیں لیکن کوئی رشتے دار میں نہیں ہے۔ اس کے عالم وفاضل' محقق ومجتہد الدین نوری کا تعلق ایران سے تھا۔ نوجوان بدخواہوں نے ان کے ایک مقام پر انہیں عتاب اتنا ہیبت زدہ کیا کہ وہ فرار ہوکے ہندوستان آ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں انہیں فارسی زبان او درس وتدریس کی عارضی ملازمت مل گئی پھر وہ حیا چلے گئے اور وہیں کے ہورہے۔ ہندوستان میں اولادیں ہوئیں' صرف ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہی ز

ں کو انہوں نے اعلیٰ تعلیم وتربیت سے آراستہ کیا تھا۔ گو ہوا' انہیں اطلاع مل گئی تھی کہ توقع کے برعکس ان قابلے پر دربار نے کشادہ قلبی وسیع النظری کا ثبوت دیا نہیں فضیلت سند سے نوازا ہے۔ دادا بہت پہلے اپنے وطن واپس جاسکتے تھے لیکن ریاست حیدرآباد میں نے بڑی عزت و مرتبت حاصل کرلی تھی۔ وہ یہاں خوش تھے۔ ہندوستان انہیں ایسا پسند آیا تھا کہ ترکِ کا فیصلہ کرلیا تھا۔ البتہ چند ماہ کے لیے ایران جاکے نے اپنے ہم پیشہ دیرینہ رفیق کار کے تعلیم یافتہ صاحب ے سے بیٹی کی شادی کردی تھی۔ بیٹی وہیں رہ گئی اور اپنے کے ساتھ عراق' پھر روس میں جابسی۔ روس میں آباد نے سے پہلے یاسمن کی پھوپی اور پھوپا سے خواب رابطہ شادی کے بعد ایک مرتبہ پھوپی عراق سے اپنے میکے ستان بھی آئی تھی۔ دادا نے بیٹی کی شادی کے سلسلے میں ن کے دورے میں اعلیٰ درباری وسرکاری عہدے پر فائز رشتے دار کی صاحب زادی سے اپنے اکلوتے بیٹے کے بات پکی کرلی تھی چنانچہ کچھ عرصے بعد اپنی پسند کی بہو کے لیے انہیں دوبارہ ایران جانا پڑا۔ بیٹے کی شادی کو بھر سے زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ زندگی کا باب ختم ا۔ ریاست حیدرآباد میں دادا نے ایک چھوٹی سی حویلی تھی۔ والیٔ دکن حضور نظام نے ان کے علمی وتحقیقی کام ستائش میں شہر کے قریب زرعی زمین کا ایک قطعہ بھی عطا تھا۔ اس کے علاوہ بھی انہیں ریاست کی طرف سے ازوانعام ملتے رہے تھے۔ یاسمن اور فروزاں حیدرآباد پیدا ہوئی تھیں' ان کا ایک بھائی شیر خواری کے زمانے میں ل کرگیا تھا۔ دونوں بہنیں کبھی ایران نہیں گئیں۔ ان والد جمال الدین سیفی بھی ہندوستانی بودوباش کے دل دادہ اور اپنے دانش ورباپ کے سچے پیروکار تھے۔ وضع وت میں یکتا' نہایت خوش گفتار' خوش شعار' ان کا بیش تر ت مطالعے میں گزرتا تھا۔ سیاحت کا شوق تھا اور دستان کی قدیم تہذیب پر تحقیق کررہے تھے۔ بڑی بہن زاں نے مشرقی علوم کی پہلی سند حاصل کرلی تھی۔ باپ بیٹیوں کے اتالیق بھی تھے۔ اردو اور انگریزی کے لیے وں نے گھر پہ استاد رکھے تھے۔ دونوں بہنوں کو خود بھی ھنے کا بہت شوق تھا۔ حیدرآباد میں ان کا گھرانا آسودہ' ت مندانہ زندگی گزار رہا تھا کہ نواب بھوپال کی پیش کش پر ال الدین سیفی بھوپال آگئے۔ وہاں ان کا زیادہ جی نہ لگا تو کا رخ کیا پھر لکھنؤ چلے آئے اور لکھنؤ سے پٹنا۔ پٹنے میں ان کی ملاقات سید صاحب سے ہوئی اور دونوں میں جلد ہی گہرے مراسم ہوگئے۔

نصیر بابا بٹھل کے لیے حقہ اٹھالائے تھے لیکن بٹھل نے ایک کش نہیں لیا۔ ہم تینوں خاموش بیٹھے یاسمن کی ٹوٹی پھوٹی آواز میں اس کی روداد سن رہے تھے۔ کہتے ہیں' عورت کے آنسوؤں میں بڑی تپش ہوتی ہے۔ ایسی کم سن' سادہ ومعصوم لڑکی کے آنسو تو برداشت ہی نہیں ہورہے تھے۔ بار بار یاسمن کی آنکھیں امڈ آتی تھیں۔ بار بار اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب جاتی تھی۔ اس کے اسلوب میں یکسانی تھی نہ ترتیب لیکن اس ہذیانی وہیجانی بیان میں بہت سوزش تھی۔ نصیر بابا کی آنکھیں بھی بھیگ گئی تھیں۔ یاسمن نے ابھی تک اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں کسی حد تک بتایا تھا اور کسی غیر معمولی حادثے یا سانحے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اس کے ماں باپ میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہا تھا مگر اس قسم کے تماشے تو آئے دن زندگی نہ جانے کتنے لوگوں سے کیا کرتی ہے۔ صرف اسی قدر ہوتا تو یاسمن کے لہجے میں ایسی دل گیری ودل سوزی نہ ہوتی۔ آگے یقیناً بہت کچھ مختلف تھا۔ اسے جاننے کی جستجو کے باوجود مجھے اس کی گرانی وستم ناکی کا اچھی طرح احساس تھا۔ سننے والے کی مستعدی اور شمولیت سے بھی کہنے والے کا حوصلہ کچھ سوا ہوتا ہے۔ اس دوران میں یاسمن کی دھند کچھ کم ہونی چاہیے تھی۔ ہم کتنے ہی اجنبی ہوں لیکن تماشائی تو نہیں معلوم ہوتے تھے۔ کہنے لگی کہ پٹنے میں سید صاحب کے مشورے پر اس کے والد نے حید آباد جاکے دادا کی حویلی اور زرعی زمین کا سودا کرلیا۔

"بس ری' بس کر۔" بٹھل نے بھاری آواز میں کہا۔

بٹھل کی اس اچانک مداخلت پر وہ حیران وہ پریشان ہوئی۔ چادر میں لپٹے اس کے سراپا میں تموج سا نمودار ہوا۔

"اور وہ' وہ کون تھا بھایا؟" بٹھل نے نصیر بابا سے پوچھا "اس کے باپ کے ساتھ والا جوان! کیا نام بولا تھا اس کا؟"

"کون' کون بابا صاحب؟" نصیر بابا گڑبڑا گئے۔

"وہی' جس کا تم بولتے تھے' اس کے باپ کا خاص چیلا' نام بھی بولا تھا تم نے۔"

"وہ' وہ ظفر میاں' ہاں بابا صاحب۔" نصیر بابا ہکلانے لگے "اس بے چارے نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی پر ـــ"

"اس کا کوئی اتا پتا ہے تمہارے پاس؟"

"مل جائے گا' ضرور مل جائے گا۔" نصیر بابا سینے پر ہاتھ رکھ کے بولے۔

بٹھل نے ہنکار بھر کے سر ہلایا اور نصیر بابا کو ہدایت کی

کہ وہ یاسمن کو واپس لے جائے۔
"جی' جی بابا صاحب!" نصیر بابا بدحواسی سے بولے اور پٹ پٹاتی پلکوں سے بٹھل کو دیکھنے لگے۔
مجھے بھی بڑی حیرت ہوئی لیکن میری لب کشائی کا کوئی محل ہی نہ تھا۔ نصیر بابا دیر تک گم صم سے رہے۔ انہیں گمان ہوگا کہ شاید بٹھل کوئی اور حکم صادر کرے۔ بٹھل نے حقے کی منال ہونٹوں سے لگالی تھی۔ ناچار نصیر بابا نے یاسمن کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ یاسمن کا چہرہ بھی زرد پڑگیا تھا تاہم نصیر بابا کے ٹوکنے پر اس نے جلدی جلدی چادر درست کی اور صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بٹھل نے بھی کرسی ترک کردی۔ صوفے سے اٹھ کے یاسمن دروازے کی طرف چلی گئی تھی کہ نصیر بابا نے اسے ٹھہرے رہنے کی تاکید کی۔ ان دونوں کے پیچھے پیچھے بٹھل بھی آہستہ آہستہ دروازے پر جا پہنچا اور یاسمن کے روبہ رو کھڑا ہوگیا۔ چٹخنی گرا کے نصیر بابا محتاط انداز میں دروازے سے سر نکال کے باہر جھانکنے لگے۔ یاسمن ابھی کمرے میں ہی تھی کہ بٹھل نے اس کے سر پر ہاتھ پھیلا دیا۔ یاسمن کا سر اور جھک گیا۔ بٹھل نے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور دھیمی آواز میں بولا "اب جا کے آرام کر' بڑی کو بھی سمجھا دینا۔"
یاسمن کی آنکھیں پھیل گئی تھیں' اس کے ہونٹ کپکپانے لگے۔ بٹھل نے اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور تادیر اسے تکتا رہا' پھر یکایک اس نے ہاتھ بڑھا کے اسے بازوؤں میں بھرلیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔
"نا' ناری نا' بٹیا' ایسے نہیں' بالکل نہیں' آگے اچھے کا آسرا رکھ' ابھی ہم ادھری ہیں اور اب شاید جلدی جانا نہ ہو۔"
نصیر بابا نے دروازے سے باہر جھانکنے ہی پر اکتفا نہیں کی' راہ داری میں جا کے بھی اطمینان کرلیا کہ یاسمن محفوظ طریقے سے زنان خانے واپس جاسکتی ہے۔ وہ اسے فوراً باہر لے گئے۔ میں جالی کے دروازے سے تھموں اور دیواروں کی آڑ میں چھپتے چھپاتے انہیں جاتے دیکھتا رہا' پھر وہ اندھیرے میں گم ہوگئے۔
کمرے میں جی نہیں لگا تو میں راہ داری میں آگیا۔ ہر سو سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مینڈکوں کی ٹرٹراہٹ سناٹا اور بڑھا دیتی ہے۔ بے ارادہ دروازے کے آس پاس بھٹکتے بھٹکتے میرے قدم خود بہ خود عقبی سبزہ زار کی طرف بڑھنے لگے۔ راہ داری کے سرے پر پکے فرش سے نیچے سبزے پر پاؤں رکھتے ہی مجھے خیال آیا کہ یہ میں کہاں جارہا ہوں۔ اس وقت اگر کسی کی نظر

مجھ پر پڑگئی تو؟ میرا دماغ ہی کام نہیں کررہا تھا۔ واپس ا
کمرے تک آکے میں نصیر بابا کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ا
گئے ہوئے دیر ہوگئی تھی یا مجھے گزرتے وقت کی رفتار کا
نہیں رہا تھا۔ مجھے نصیر بابا کا انتظار تھا اور یہ بلاغت یا
بھی میرے ذہن سے اوجھل ہوگئی تھی کہ اتنی رات گ
راہ داری میں نصیر بابا سے سرگوشیاں کسی طور مناسب ن
راہ داری میں قدموں کی آہٹ پر میں چونک پڑا۔ نصیر
ہوں گے۔ اس سے پہلے کہ اندھیرے سے نکل کر کوئی
آتا' میں کمرے میں آکے اپنے بستر پر لیٹ گیا۔
ادھورا علم بہت خوار کرتا ہے۔ پورے علم کی آ
ہی کچھ اور ہوتی ہے یا پھر آدمی سرے سے کچھ جانتا ہی
اندھوں اور بہروں کی طرح' اور شاید نہ جاننا ہی جا
بہتر رہتا ہے۔ مکمل آگہی کے بعد قرار و سکون کی کیا
ہے' یہ تو آگہی کی نوعیت پر منحصر ہے۔ بٹھل جاگ
کئی بار میں نے ارادہ کیا کہ ایک کوشش کرکے دیکھوا
کسی ترشی و تلخی کے اندیشے نے مجھے باز رکھا۔ اس را
نیند نہیں آئی۔ مجھے اپنے آپ سے چڑ ہورہی تھ
اذانوں کے وقت غنودگی طاری ہوئی تھی کہ کمرے میں
والی کھڑکھڑاہٹ سے آنکھ کھل گئی۔ صبح سویرے
بٹھل کا معمول تھا۔ نصیر بابا بھی نماز کے لیے جاگ گ
علی الصباح نصیر بابا نے بٹھل کو بتادیا تھا کہ ر
آخری پہر سید صاحب کی واپسی ہوئی ہے۔ بہ ظاہر ا
کا مقصد یہ معلوم کرنا بھی تھا کہ بٹھل کے ناشتے کا اہ
کیا جائے۔ میرا پرہیزی ناشتا اسی کمرے میں آجاتا تھ
روزانہ سید صاحب کے ساتھ کھانے کے خاص ک
ناشتا کیا کرتا تھا۔ سید صاحب کی عدم موجودگی میں ک
کمرے میں بٹھل کے تنہا ناشتا کرنے کی تک نہ
روشنی بڑھتے بڑھتے دوسرے ملازموں کی آمد بھی ش
تھی۔ کسی نے بستر درست کیا' چادریں بدلیں' کسی
کی' پھر ابن اور امتل ناشتے کے طشت لے آ
کھانے کو طبیعت نہیں چاہ رہی تھی لیکن ڈاکٹر کی ہ
مطابق دوا کی خوراک سے پہلے کسی قدر شکم پری ا
طرح طرح کی چیزیں طشت میں سجی ہوئی تھیں۔
تھوڑا سا دلیا لیا' دو ایک انگریزی بسکٹ اور پیال
کے بعد کسی اور چیز کی طرف رغبت ہی نہیں ہوئی۔
خاصا الجھا ہوا لگتا تھا۔ اس نے بھی بس ناشتے کی
پراٹھے اور آلو کی ترکاری کے چند لقمے اور دہی
چمچوں کے بعد ہاتھ کھینچ لیا۔ اس دوران ڈاکٹر

شور مچاتا کمرے میں داخل ہوا اور میری طرف آنے کے
بجائے وہ بٹھل کے سامنے رکھے ہوئے ناشتے کے طشت پر
پھٹ پڑا "اچ چھا' تو آج یہاں میلا لگا ہوا ہے۔ ٹھیک ہے'
نے مہاراجا سید میاں تو رات کی تھکن اتار رہے ہوں
گے صاحب بہادر ڈی سی کی دعوت تھی' مذاق نہیں۔ بڑی
رنگ دار محفل ہوگی' بڑے بڑے تیس مار درباری آئے ہوں
گے جلدی چھٹی کہاں ملتی" وہ لپکتی آواز میں خود کلامی کررہا
تھا' پھر بایت سے بولا "جانا تو ہم کو بھی تھا' پر کیا بولیں' رات
کو ادھر تالی بجاتے تو سویرے ادھر کلینک میں ہاہاکار مچی
دتی۔ یہ ڈاکٹری بھی سسری گلے کا پھندا ہے' گھر کا نہ گھاٹ
کا۔ ہا۔ اپنے سید بادشاہ کو دیکھو' من موجی' جدھر منہ اٹھا' چل
دیے۔ بہت چاؤ تھا میاں جی کو' چھوٹا بیٹا ڈاکٹری پڑھ لے۔
میں نے بولا' بھیا' اس کو آدمی ہی رہنے دو' آدمی ہونا تم کو برا
لگتا ہے کیا؟ بات متھے میں آگئی۔ میری حالت زمانے سے
دیکھ ہی رہے ہیں۔" بٹھل چپ چاپ سنتا رہا۔ ڈاکٹر کو
احساس ہوا تو چونک کے بولا "کیا بات ہے بابا صاحب! آج
آپ کا من بھی تھوڑا ٹھیک نہیں لگتا۔"
"اپنے کو کیا ہوتا!" بٹھل نے سیدھے ہو کے کہا "آدمی
کی کھال کدھری ہے اپنے پاس۔"
"ایسا ہی ہونا چاہیے" ڈاکٹر اچھل کے بولا "یہ کیا کہ
ذرا ہوا ذرا ٹیڑھی چلی اور آچ چھیں' آچ چھیں... کیا بولوں'
ایسا کیسا کانچ کا بنا' نواب کا سگا اپنے پاس آتا ہے۔ لکھنؤ تو
ویسے ہی بدنام ہے۔"
بٹھل نے ازراہ مروت اس کی ہنسی میں ساتھ دیا۔ میرا
خیال تھا' موقع دیکھ کے بٹھل' سید صاحب کے بارے میں
ڈاکٹر سے شاید کوئی سلسلہ جنبانی کرے۔ اس نے چپ
سادھے رکھی۔ پھلوں اور بسکٹوں سے اچھی طرح شغل
کرنے کے بعد ڈاکٹر میری طرف متوجہ ہوا۔ اس نے دوا میں
بھی' تبدیلی اور غذا میں رعایت کردی تھی۔ گزشتہ کل کا
مژدہ اسے حفظ تھا کہ بیماری پر بڑی حد تک قابو پالیا گیا ہے۔
اب کھوئی ہوئی توانائی کی بحالی کے لیے آرام' مقوی غذائیں
اور دوائیں ازبس لازم ہے۔ میں نے اسے یقین دلانا چاہا کہ
اب مجھے ذرا سی بھی کمزوری محسوس نہیں ہورہی ہے' میں
بالکل بھلا چنگا ہوں۔ اس نے منہ بنا کے مجھے جھڑک دیا' کہنے
لگا کہ بڑی اچھی بات ہے لیکن جیسا وہ کہتا ہے' مجھے تعمیل
کرتے رہنا ہے۔ وہ مجھے مختلف مریضوں کے تجربات سنانے
لگا' مجھے آج نہ وہ اچھا لگ رہا تھا' نہ اس کی باتیں متاثر کررہی
تھیں۔ جی چاہتا تھا' اسے نکال باہر کردوں۔ معمول کے خلاف

اس نے آج زیادہ وقت صرف کیا' بڑی مشکل سے وہ ٹلا۔
اس کے جانے کے کچھ دیر بعد' ساڑھے دس بجے کے قریب بٹھل نصیر بابا کو ساتھ لے کے جانے کہاں نکل گیا' دونوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ مجھے بتانا ضروری بھی کیا تھا۔ بعد میں ابن سے معلوم ہوا کہ ان دونوں کی جلد واپسی ممکن نہیں ہے۔ جاتے وقت بٹھل نے ابن سے کہا تھا کہ دیر ہوجائے تو سید صاحب دوپہر کے کھانے پر اس کا انتظار نہ کریں۔ میرے پاس اپنے آپ کو چٹکیاں بھرنے' نوچنے کھسوٹنے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔
ہمیں یہاں آئے ہوئے ساتواں دن تھا۔ بٹھل کئی بار گھر سے باہر جاچکا تھا لیکن جلدی واپس آگیا تھا۔ ایک دو مرتبہ سید صاحب اسے اپنی زمینیں دکھانے لے گئے تھے اور صبح سے شام ہوگئی تھی۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ بٹھل کے سر میں کیا سمائی ہوئی ہے۔ اس وقت وہ نصیر بابا کے ساتھ بے سبب تو کہیں نہیں گیا ہوگا' مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا' آنے والا وقت بہت کانٹے بکھیر سکتا ہے۔ دیکھیں' کیا رنگ دکھائے۔ ہمارے ساتھ جگہ جگہ یہی کچھ ہوتا رہتا ہے۔ آزمودہ کاروں کا یہ قول ہی شاید معتبر ہے کہ آدمی کو پہلے اپنے راستوں پر نظر رکھنی چاہیے۔ آدمی کی اپنی مجبوریاں' محرومیاں کم نہیں ہوتیں۔ کاش فیض آباد اسٹیشن پر بٹھل میری بات مان لیتا۔ درمیان میں خاصا وقت گزر گیا تھا۔ زریں ہمارے لیے بہت بے تاب ہورہی ہوگی۔ وہ بھی تو ہماری ذمے داری ہے۔ اتنے طویل سفر کے بعد فیض آباد میں چند دن قیام سے زریں کا اطمینان بھی ہوجاتا' ہمیں بھی آرام کا کچھ وقت مل جاتا۔ کچھ دنوں بعد بھی ہم سفر پہ روانہ ہوسکتے تھے۔ کون سی گاڑی نکلی جارہی تھی اور مولوی صاحب کو ہماری کون سی خبر تھی کہ دیر ہوجانے وہ کسی اور شہر کا قصد کرلیں گے۔ بٹھل سے زیادہ مولوی صاحب کے سراغ کی جستجو مجھے ہونی چاہیے۔ فیض آباد سے دوبارہ سفر پہ نکلتے وقت جمرو اور زورا بھی ہمارے ساتھ ہوتے اور بیماری کی صورت میں ہمیں سید صاحب کا زیر بار احساں ہونے کی ضرورت نہ پڑتی۔ اتنے عرصے ساتھ سفر کرتے ہوئے جمرو اور زورا کی رفاقت کی عادت ہوگئی تھی۔ بٹھل بے شک میرے ساتھ تھا لیکن لگتا تھا' وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے' میں تو اس کے ساتھ ہوں' وہ میرے ساتھ نہیں ہے۔
کمرے میں دن بھر ابن' نذرو' امتل اور دوسرے ملازموں کا تانتا بندھا رہا۔ دوپہر کا کھانا بھی ایسے ہی واپس چلا گیا۔ مجھ سے کچھ کھایا ہی نہیں گیا۔ سہ پہر کو سید صاحب

میری پرسش کے لیے آئے تھے، میری صحت کی بحالی پر انہوں نے بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ بٹھل کے بارے میں پوچھنے لگے۔ میں نے لاعلمی ظاہر کی تو انہوں نے کوئی تردد نہیں کیا۔ میں نے اخلاقاً ان سے کچھ دیر ٹھہرنے کی درخواست بھی کی لیکن میرے آرام کا عذر کرکے وہ جلدی میں رخصت ہوگئے۔ کمرے میں ابن سے تنہائی کا موقع ملا تھا، میں ادھر ادھر کی باتیں کرکے کوئی ٹوہ لے سکتا تھا۔ میں نے خود کو روکے رکھا، مبادا مجھ سے کوئی چوک ہوجائے اور تلافی مہنگی ثابت ہو۔ ضروری نہیں کہ ابن اور نصیر بابا میں کوئی فرق نہ ہو۔ ملازم تو دونوں ہیں مگر آدمی تو ایک نہیں۔ بعض ملازم کتوں کی صفات رکھتے ہیں۔

"چار بجے، پھر پانچ بج گئے۔ دن بھر میرا مشغلہ کبھی بستر پہ آکے جسم ڈھیر کردینا، کبھی کمرے سے باہر آکے راہداری میں ٹہلتے رہنا تھا۔"

دھوپ آسمانوں میں لوٹ چکی تھی کہ بٹھل اور نصیر بابا کی صورتیں دکھائی دیں۔ دونوں کے چہروں سے تکان عیاں تھی۔ میں نے ان سے کچھ نہیں پوچھا۔ آتے ہی بٹھل غسل کے لیے چلا گیا اور نئے کپڑے پہن کے راہداری میں رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھا حقہ کھینچنے لگا۔ ملازمہ امتل نے پھلوں کا طشت کمرے سے اٹھاکے اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ کل کی طرح سبزہ زار میں چہل قدمی کا وقت گزر چکا تھا۔ آنے کے بعد نصیر بابا بھی کہیں کھوگئے تھے۔ شاید زنان خانے کی طرف نکل گئے تھے یا ہوسکتا ہے، اپنے ہی کسی کام میں الجھ گئے ہوں۔ ملازموں کے اپنے بھی تو کچھ کام ہوتے ہیں۔ ایک ہی صورت تھی کہ میں کسی ملازم کے ذریعے باقاعدہ انہیں طلب کروں۔ یہ تدبیر کارگر ہوئی۔ ملازموں میں سب سے پہلے امتل مجھے نظر آئی۔ اسی سے میں نے کہا تھا۔ چند منٹ بعد ہی نصیر بابا حاضر ہوگئے۔ وہ بہت اجڑے اجڑے لگ رہے تھے۔ امتل سے مجھے یہ معلوم ہوگیا تھا کہ ملاقاتیوں کی خصوصی نشست گاہ میں سید صاحب اور ان کے چند خاص دوستوں کی محفل جمی ہوئی ہے۔ نصیر بابا کا آنا مشکل ہوگا مگر وہ آگئے۔

بٹھل کمرے کے باہر موجود تھا۔ نصیر بابا اس کے سامنے آئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ نصیر بابا کو کوئی حکم صادر کرے، میں نے انہیں عقبی سبزہ زار کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ متذبذب ہوئے تھے لیکن انکار کی جرات نہ ہوسکی "سید صاحب کی طرف تو آپ کی ضرورت نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ادھر کا انتظام کرکے آیا ہوں" نصیر بابا کی آواز پر ضعف طاری تھا "بولو میاں! کیا خدمت ہے؟"

"میرے ساتھ آیئے" میں نے نیم حکمیہ لہجے

"عشا کے بعد کھانے کا وقت ہوجائے گا" ہوئے بولے۔

"عشا میں ابھی وقت ہے اور کھانے میں تو کبھی بھی ہوجاتی ہے پھر ابھی تو سید صاحب کے مہمانوں کا دور چل رہا ہوگا" راہداری کا مختصر فاصلہ عبور کر زار میں آگئے۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ "آپ تھکے گے" میں نے قریب ہی ایک سنسان گوشے میں ر کی بینچ کی جانب بڑھتے ہوئے کہا اور کسی تمہید

"کیا ہوا، جہاں آپ گئے تھے، کوئی کامیابی ہوئی؟"

وہ میری صورت دیکھنے لگے۔ پھر انہوں نے نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ ملازموں کو تیور شنا مہارت ہوتی ہے یا ہونی چاہیے۔ انہوں نے سر میں کہا "ہاں میاں! ملاقات ہوگئی۔"

"کیا، کیا ہوا پھر؟" میں انہیں اپنی بے خبر نہیں چاہتا تھا اور اپنی دانست میں اسی طور ان سکتا تھا۔

ان کی ہراساں نظریں اطراف میں منڈلا جگہ ٹھیک نہیں ہے، سنا ہوگا میاں آپ نے، دیوا کان ہوتے ہیں۔"

"اس وقت یہاں کون پھٹک سکتا ہے، فکر میں نے انہیں دلاسا دیا "ہاں، تو آپ کیا کہہ رہے

"بات ہوگئی لیکن وہ تو امید کھو بیٹھا تھا" وہ ہوکے رازدارانہ انداز میں بولے "ہاتھ پیر ہی چھ بابا صاحب نے اسے بہت کچھ بولا تب جاکے ہامی

"کیسی ہامی!"

"یہی کہ وہ ہر طرح سے تیار ہے" تیار تو خ تھا۔"

"مجھے پوری بات بتایئے۔"

"لمبا قصہ ہے میاں!"

"کیا، کیا! کہہ رہا تھا وہ؟"

"اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ بابا صاحب مجھے دیکھ کے یا یوں کہو کہ بابا صاحب کی معنو حوصلہ پکڑا ورنہ وہ تو... وہ تو۔"

نصیر بابا کے جوابات میرا تجسس اور اضطـ کررہے تھے۔ یہی بہتر تھا کہ پہیلیاں بجھا کر کچھ کوشش کے بجائے میں اپنی تاریکی کا اعتراف اس میں ان کے محتاط ہوجانے کا اندیشہ تھا۔ ضـ

کہ بٹھل کی طرح وہ مجھے بھی رازداری کا سزاوار اعتبار سمجھیں۔ یہ امر ان کے سر میں گرہ بھی ڈال سکتا تھا کہ بٹھل نے اب تک مجھے اس معاملے میں شریک نہیں کیا ہے۔ میں انہیں کس طرح باور کراتا کہ بٹھل کی پردہ پوشی مصلحت کوشی نہیں ہے، یہ دانستہ خفا نہیں ہے "یاسمن بی بی سے بات ہوئی؟" مجھے کچھ اور سجھائی نہیں دیا تو میں نے انہیں ٹہوکا دیا۔

"وقت کدھر ملا، ہاں، آنے کے بعد اتنی تسلی ضرور دے آیا ہوں کہ ظفر میاں سے ملاقات ہوچکی ہے۔ زیادہ بات کرنے کا موقع نہیں تھا" وہ چپکے سے بولے۔

مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ میں وقت ضائع کررہا ہوں، اس طرح مجھے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ میں نے گویا سپر ڈال دی اور منت کی "نصیر بابا! مجھے شروع سے سب کچھ بتایئے۔"

میری توقع کے مطابق ان کی آنکھیں حیرت سے بھر گئیں "بابا صاحب نے کچھ نہیں بتایا؟"

"شاید میری بیماری کی وجہ سے" میں نے کسمسا کے کہا "لیکن اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھ پر کوئی دباؤ نہیں ہوگا یوں سمجھئے کہ کچھ نہ جاننا، فکر و تشویش کا باعث بن رہا ہے۔"

"میاں! یہ تو لمبی داستان ہے!" وہ ہونٹ سکیڑ کر بولے۔

"کچھ تو یاسمن بی بی کی زبانی مجھے سن گن مل چکی ہے۔ مجھے تفصیل سے بتایئے، ممکن ہے، میں بھی کوئی مشورہ دے سکوں" یاسمن کا ذکر میں نے عمداً کیا تھا تاکہ وہ جان سکیں، بٹھل کو مجھ سے کچھ چھپانا مقصود ہوتا تو وہ یاسمن کو میری موجودگی میں نہ بلاتا۔ گزشتہ رات، جیسا کہ خود نصیر بابا نے بٹھل سے معلوم کیا تھا، وہ کسی دوسرے کمرے میں بھی یاسمن کو بلا سکتا تھا۔

"کیا بولوں میاں! دہراتے ہوئے کلیجا منہ کو آتا ہے۔ اللہ جانتا ہے سوچتا ہوں تو سر چکرانے لگتا ہے" نصیر بابا کی آواز بھرا گئی۔

"میں سمجھ رہا ہوں۔"

"میں نے اس گھر کا نمک کھایا ہے لیکن کیا کروں، یہ اندھیر دیکھا نہیں جاتا۔"

"بات کیا ہے بابا؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"آپ نے سن ہی لیا تھا اس بچی کی زبانی تھوڑا بہت اجرا۔ اسے دیکھ بھی لیا ہے۔ دونوں ایسی ہیں کہ ذرا چھو لو تو میلی ہوجائیں" وہ ڈوبتی آواز میں بولے۔

"یاسمن بی بی نے اپنے والد کے پٹنا آنے تک کا احوال بیان کیا تھا اور کہا تھا کہ سید صاحب کی ایما پر ان کے والد نے حیدر آباد جاکے، ساری زمین، مکان وغیرہ کا سودا کرلیا تھا۔"

"وہ بڑے نیک آدمی تھے، بہت پڑھے لکھے، اللہ والے۔ خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ ان کی صورت اب تک آنکھوں میں گھومتی ہے۔ بہت نور تھا چہرے پر ان کے۔ ماتھا چمکتا تھا، منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ ہر وقت کھلے کھلے، ہم جیسے چھوٹے لوگوں کی بہت پوچھ کچھ کرتے تھے۔ مجھ سے تو خاص لگاؤ تھا، بس میاں!" نصیر بابا کا گلا رندھنے لگا۔

نصیر بابا سے بات کرنی مشکل ہورہی تھی۔ وقت کم تھا اور یہ جگہ بھی مناسب نہیں تھی تاہم پھر کب وقت ملتا۔ یاسمن کی طرح ان کے بیان میں بھی بڑی سوزش تھی، بار بار مغلوب ہوجاتے تھے۔

کہنے لگے "سید صاحب نے علامہ پروفیسر جمال الدین سیفی کو حیدر آباد کی جائداد سے ملنے والی رقم سے پٹنے کے نواح پھلواری شریف میں ایک زرعی زمین دلادی اور کچھ ہی دنوں میں خطیر منافع کے عوض اسے فروخت کردیا۔ دو ایک اسی نوع کے سودوں میں سید صاحب کے مشوروں اور اعانت سے پروفیسر کو اچھا منافع ہوا۔ پروفیسر نے روپے پیسے کی کبھی ایسی جستجو نہیں کی تھی، علم ہی ان کے لیے سب سے بڑا سرمایہ رہا تھا۔ گھر میں ویسے بھی کسی چیز کی تنگی نہ تھی، عزت آبرو سے گزر بسر ہوتی تھی۔ پہلی بار حصول زر کی تدبیر اور اس کی کرشمہ سازی کا عرفان ہوا تھا۔ دولت میں غالباً علم سے زیادہ کشش ہوتی ہے۔ طاقت کی فضیلت تو مسلمہ ہے۔ پروفیسر اپنے مربی سید صاحب کی فہم و فراست سے بہت متاثر تھے۔ سید صاحب کی طرز تپاک، حسن خلق، زندہ دلی اور دریا دلی مستزاد صفات تھیں۔ چھٹیوں میں سید صاحب نے پروفیسر کو خاندان سمیت آسن سول مدعو کیا۔ مہینے ڈیڑھ مہینے کی اس مہمانی اور میزبانی سے دونوں گھروں کو قریب آنے کا موقع ملا اور راہ و رسم کچھ ایسی بڑھی کہ ذرا وقت گزر جاتا تو کبھی سید صاحب، پٹنے کا رخ کرتے، کبھی پروفیسر آسن سول آکے دم لیتے۔ یہاں زنان خانے میں ملازماؤں اور ایک پختہ کار خاتون کے سوا کوئی نہ تھا، پروفیسر صاحب نے اپنی بیگم سے سید صاحب کا پردہ بھی ختم کرادیا تھا۔ پھر سید صاحب نے اپنے دوست پر ایک احسان یہ کیا کہ آسن سول سے دس میل کے فاصلے پر ایک بڑے زرعی قطعہ اراضی کی بات پکی کرلی۔ سنتے ہیں، اس خریداری میں کم پڑنے والی کچھ رقم سید صاحب نے بہ طور قرضہ حسنہ عطا کی تھی اور طے یہ پایا تھا کہ پہلی فصل کی آمدنی سے یہ قرض ادا کردیا جائے گا۔

پروفیسر نے یہ قطعہ اپنی بیگم کے نام سے خریدا تھا۔ وہ

پٹنے میں پڑھاتے تھے۔ سید صاحب کی کوشش سے آسن سول کے ایک مکتب میں بھی فارسی زبان کی تدریس کے لیے انہیں چند گھنٹوں کی تقرری مل گئی۔ یوں آسن سول میں ہر ہفتے پروفیسر کی آمد یقینی ہوگئی مگر اتنی قربتوں کے بعد تشنگیاں اور سوا ہوگئیں۔ سید صاحب نے اس کا حل یہ نکالا کہ آسن سول میں کرائے پر اٹھا ہوا اپنا ایک پختہ اور وسیع مکان خالی کرا کے پروفیسر کو پیش کردیا۔ سید صاحب کی خواہش تو یہ تھی کہ ان کی اپنی اقامت گاہ۔ں کچھ کم گنجائش نہیں ہے' پروفیسر کا کنبہ چار افراد پر مشتمل ہے' کیوں نہ پروفیسران کے بڑے مکان کے ایک حصے میں منتقل ہوجائیں۔ پروفیسر اس پیش کش پر آمادہ نہ ہوئے' ہاں آسن سول میں مستقل سکونت کے لیے تیار ہوگئے اور سید صاحب کا خالی مکان اس شرط پر قبول کرلیا کہ زرعی زمین سے سال بہ سال ہونے والی آمدنی سے مکان کی رقم ادا کی جاتی رہے گی۔ سید صاحب نے دو قدم آگے جا کے یہ سلوک کیا کہ ایک جزوی' علامتی قسم کی رقم کے بدلے مکان کی رجسٹری پروفیسر کے نام کرادی۔ کاغذات میں بعد کی قسط وار ادا کی جانے والی کثیر رقم کی شق بھی درج نہیں کی گئی تھی۔ سید صاحب کا یہ بے پناہ اعتماد بظاہر بے جواز بھی نہیں تھا کہ پروفیسر بہ باطن ایک اصول پرست' راست باز اور دیانت دار آدمی تھے۔ زرعی زمین سے ہر سال معقول آمدنی کا امکان تھا۔ چند سال میں اس رقم کی ادائیگی پروفیسر کے لیے کوئی دقت طلب یا صبر آزما مرحلہ نہ ہوتا۔

پروفیسر کا خاندان پٹنے سے ہجرت کرکے آسن سول میں آباد ہوگیا۔ پروفیسر اب ہفتے میں تین دن کے لیے پٹنے چلے جاتے' چار دن آسن سول میں قیام کرتے تھے۔ عدم موجودگی میں بیوی اور بیٹیوں کی خیر خبر کے لیے سید صاحب آسن سول میں موجود ہی تھے۔ دن میں ایک مرتبہ پروفیسر کے گھر پھیرا لگانا سید صاحب نے شعار بنالیا تھا۔ انہوں نے وہاں اطاعت پیشہ ملازم بھی رکھوا دیے تھے۔ امورِ خانہ داری میں ماہر ایک تجربہ کار ملازمہ بھی تعینات کی تھی۔ سید صاحب کی تجویز تھی کہ کچھ عرصے بعد پروفیسر زرعی زمین پر ایک چھوٹا سا گھر بنا کے مستقلاً وہیں اقامت اختیار کرلیں' اس سحر کار مرغ زار میں انہیں یک سوئی سے تصنیف و تالیف کے مواقع میسر آئیں گے۔ ساتھ ساتھ زمینوں کی نگہداشت بھی ہوتی رہے گی۔ پروفیسر پھر درس و تدریس کا مشغلہ ترک کردیں۔ ایک زمانے سے تخلیقی و تحقیقی کام کے لیے پروفیسر کو اس فراغت کی تمنا تھی۔ آسن سول میں ان کی شامیں سید صاحب کی معیت میں گزرتیں۔ سیاحت کا پہلے سے شوق تھا' سید صاحب انہیں آسن سول سے دور لے جاتے' کبھی پہاڑی مقامات پر' کبھی شہروں کی طرب گاہوں میں' کبھی دونوں شکار پر نکل جاتے' جنگلوں کی سیر کرتے۔ آسن سول شہر ہی میں نہیں' گرد و نواح میں دور و نزدیک سید صاحب کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ بڑی شاموں میں یا تو وہ خود کہیں مدعو ہوتے یا ان کے اپنے گھر ضیافتوں کا اہتمام ہوتا۔ کئی قریبی دوستوں کی محفلوں میں پروفیسر کو بھی لے جانے لگے۔

پروفیسر کے لیے یہ دنیا نئی تھی۔ یہ دنیا افسانوی نہ تھی' اس میں خواب کم' تعبیریں بہت تھیں۔ ممکن ہے شروع شروع میں انہیں اجنبیت محسوس ہوئی ہو لیکن رفتہ رفتہ وہ بدلی ہوئی زندگی میں شامل نظر آنے لگے تھے۔ انہوں نے روایتی لباس درس و تدریس کے لیے وقف کردیا۔ وہ سرخ و سپید رنگت' اٹھتے ہوئے قد' متوازن دست و بازو کے وجیہہ اور جامہ زیب شخص تھے۔ پینتالیس سے زیادہ کے ہوں گے' دیکھنے میں بہت کم کے لگتے تھے۔ نئی وضع قطع اور پر وقار ہوگئے تھے۔ جہاں جاتے' نگاہوں کا مرکز بن جاتے۔

دو دوستوں کی اس باہمی شیدائیت کو ڈیڑھ دو سال کا عرصہ گزر گیا۔ لگتا تھا' دونوں میں کوئی ازلی رشتہ ہے' بھائیوں میں بھی ایسی یگانگت' مہر و الفت کیا ہوگی۔

پھر ایک دن ایسا ہوا' آدھی رات کا وقت تھا۔ سید صاحب کو پروفیسر کی طبیعت اچانک خراب ہوجانے کی اطلاع ملی۔ سید صاحب کسی تاخیر کے بغیر وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے عزیز از جان دوست کے علاج معالجے کے لیے دن رات ایک کردیے۔ پروفیسر کو افاقہ ہوگیا تھا لیکن کچھ دنوں بعد طبیعت پھر بگڑنے لگی۔ کئی حکیم ڈاکٹر بدلے گئے۔ کوئی کچھ تشخیص کرتا تھا' کوئی کچھ۔ پروفیسر نے خود بھی خاصی طبع آزمائی کی۔ کبھی ان کی حالت درست ہوجاتی' کبھی بہت بگڑ جاتی۔ طرح طرح کے ٹوٹکے بھی آزمائے گئے' ورد و وظائف کا سلسلہ جاری رہا اور حاصل یہ نکلا کہ دوا کی ارزانی سے مرض بڑھتا گیا۔ سید صاحب' پروفیسر کو کلکتے کے بڑے اسپتال لے جانا چاہتے تھے مگر اس کا موقع نہیں آیا' ایک رات پروفیسر نے ساری اذیتوں سے نجات حاصل کرلی۔

ایک دو مہینے کے لوٹ پھیر میں ایک ترو تازہ شخص یوں چپکے سے چلا گیا۔ کسی کو یقین نہیں آتا تھا' یقین تو ایک جبر ہے' سب کو کرنا پڑتا ہے۔ سب کو معلوم ہے کسی کو یہاں نہیں رہنا۔ جتنے نظر آتے ہیں' سب نے' مٹ جانے کے لیے ہیں۔ کوئی کتنا ہی عزیز' رگ جاں سے قریب ہو' ہر ایک کو ہر ایک سے جدا ہوجانا ہے۔ وہ لوگ بھی مر جاتے ہیں' ایک خلقت کے جو کام آتے ہیں۔ جن کی ضرورت ہوتی ہے' وہ بھی مر جاتے ہیں۔ کوئی کتنا ہی گل بوٹے کھلائے' نقش رہ جاتے ہیں' نقش گر چلے جاتے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے' موت' زندگی کی توہین ہے اور حیف کہ زندگی اسی ذلت سے دوچار رہے گی۔ کاش یہ حقیقت آدمی تسلیم کرلے کہ زندگی حادثہ ہے' موت کوئی حادثہ نہیں۔

پروفیسر کی بیوی اور بیٹیاں خاصی ہوش مند تھیں۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ کسی کا قیام یہاں مستقل نہیں ہے لیکن جو چوک ہر ایک سے ہوجاتی ہے' ان سے بھی ہوئی۔ پروفیسر کے اس طرح چلے جانے سے ان کے رگ و پے میں خوف بیٹھ گیا۔ مرنے والا تو مر کے ہمیشہ کے لیے قرار سے ہوجاتا ہے' اس کے پرسان حال جو بار بار مرتے ہیں' مرتے رہتے ہیں اور مر بھی نہیں پاتے۔ پروفیسر نے نزع کے عالم میں۔۔۔۔ وصیت لکھی تھی اور سید صاحب کو اپنے گھر والوں کا ولی مقرر کیا تھا۔ بیوی اور بیٹیوں کو انہوں نے وصیت کی تھی کہ سید صاحب کو اپنا رہبر سمجھیں۔ کئی مہینے ماں بیٹیوں کا قیام اسی شوہر اور باپ کے گھر رہا۔ پروفیسر واپس نہیں آئے۔ پھر سید صاحب کے اصرار پر وہ ان کے گھر چلی آئیں۔

پروفیسر کے پس ماندگان میں ایک اور شخص بھی تھا' ایک نوجوان' پروفیسر کا عزیز ترین' لائق ترین شاگرد' مسمیٰ ظفر محمد خاں۔ اس کے والد پٹنے میں ریلوے کے افسر تھے۔ شاہ جہاں پور سے تعلق تھا۔ پٹنے میں مستقل تبادلے کی وجہ سے اسی شہر میں سکونت ہوگئی تھی۔ ریل گاڑی کے حادثے میں باپ کے ختم ہوجانے کے بعد ماں اور بہن کا واحد کفیل ظفر محمد خاں تھا۔ ظفر نے اپنے آبائی شہر شاہ جہاں پور جا کے بہن کی شادی خالہ زاد بھائی سے کردی۔ ماں' بیٹی اور داماد کے پاس ہی رک گئی تاکہ بیٹا دل جمعی سے اعلیٰ تعلیم مکمل کرلے۔ پٹنے سے واپس آ کے ظفر اپنی تعلیم میں منہمک ہوگیا۔ وہ انگریزی ادب کا طالب علم تھا اور کوئی بڑا سرکاری امتحان پاس کرکے سرکاری افسر بننے کا آرزو مند تھا۔ پٹنے میں اسی دوران میں اس کی ملاقات نابغہ روزگار پروفیسر جمال الدین سیفی سے ہوئی۔ انہی کے توسط سے اسے فارسی ادبیات سے شغف ہوا۔ معلوم نہیں' وہ فارسی ادب سے متاثر ہوا یا جمال الدین سیفی کی دل آویز شخصیت سے' پروفیسر کی شاگردی میں آنے کے بعد وہ انہی کا ہو رہا۔ اس کی ترجیحات ہی بدل گئیں۔ پروفیسر بھی اس کی سعادت مندی'

بازی گر 6

مستعدی، علم کی جستجو اور جستجو میں شدت کے اوصاف کے اسیر ہوگئے تھے۔ وہ ہر وقت اسے خود سے قریب رکھتے تھے۔ ابتدا میں ظفر کالج کے ہوسٹل میں رہتا تھا‘ بعد میں پروفیسر نے اسے اپنے گھر میں جگہ دے دی۔ ذہین‘ ایثار پیشہ‘ معاملہ فہم اور خوش مزاج ظفر نے اولاد نرینہ سے پروفیسر کی محرومی کا ازالہ بڑی حد تک کردیا تھا‘ سو پروفیسر کے ہاں اپنی دختر ول پذیر فروزاں اور شاگرد عزیز ظفر کو یک جا کردینے کی خواہش کی بالیدگی غیر فطری تھی نہ غیر منطقی۔ ان کی بیگم بھی شوہر کے اس خواب میں شریک تھیں اور ظفر کے لیے تو اس رفاقت کا تصور ہی ایک اعزاز تھا۔ وہ کیا‘ کوئی بھی اس کی جگہ ہوتا تو اپنی خوش بختی پر ناز کرتا۔ فروزاں حسن و جمال کی ایک مثال تھی‘ وہ تو ایک شاہ کار تھی۔ صورت و رنگ‘ خال و خد میں یکتائی کے علاوہ ذہانت و فطانت سے آراستہ۔ بہت سی خوبیاں تو اسے ورثے میں ملی تھیں۔

آسن سول منتقل ہوجانے کے بعد پروفیسر کے خاندان کے ساتھ ظفر بھی یہاں آگیا۔ حالانکہ اپنا ادھورا انصاب پورا کرنے کے لیے اسے باربار پٹنے جانا پڑتا تھا۔ جیسے ہی تعلیمی امور سے فراغت ملتی‘ وہ آسن سول کا رخ کرتا۔ تعلیمی سال مکمل کرکے وہ مستقل آسن سول آگیا۔ وہ پروفیسر کے گھر کا ایک جزو تھا۔ سید صاحب سے روزافزوں رسم و راہ کی وجہ سے پروفیسر کا گھر میں قیام کچھ کم ہونے لگا تھا مگر ایک جواں مرد‘ گھر کا ایک فرد ظفر گھر میں موجود تھا‘ اس کی موجودگی پروفیسر کو گھر کی فکر سے آزاد کردیتی تھی۔

اپنے مرشد کے منظور نظر ہونے کی نسبت سے سید صاحب ظفر کی نظروں میں نہایت واجب احترام تھے۔ ہرچند دونوں میں علیک سلیک کے سوا ربط و ارتباط کی کوئی خوش گوار صورت پیدا نہ ہوسکی تھی۔ اس بے گانگی میں ظفر کی جانب سے کسی قسم کی کوئی کوتاہی نہ تھی‘ سید صاحب ہی کھنچے کھنچے لیے دیے سے رہتے تھے۔ گو ان کی زبان سے ظفر کے لیے پروفیسر یا ان کی بیوی‘ بیٹیوں کے سامنے کبھی کوئی ناروا‘ نازیبا کلمہ ادا نہیں ہوا تھا نہ انہوں نے بالمشافہ ظفر سے خلوت و جلوت میں کسی موقع پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا تاہم وہ اس سے کچھ اس طرح پیش آتے تھے جیسے وہ وہاں موجود ہی نہ ہو‘ جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ سلام کے جواب میں ان کے ہاں لپک اور چمک کا فقدان ہوتا تھا۔ کسی خدمت کی پیش کش پر وہ بالعموم معذرت کرلیتے تھے۔ ان کی یہ بے نیازی‘ بے اعتنائی ظفر کو بہت کھٹکتی تھی۔ پروفیسر کے رخصت ہوجانے پر سید صاحب ان کی بیگم اور بیٹیوں کو صبر کی مسلسل تلقین کرتے رہے۔ ظفر کو بھی اس دل جوئی اور تلقین کی ضرورت تھی۔ سید صاحب کو خوب معلوم تھا کہ ظفر کے یہ صدمہ اتنا ہی کاری ہے جتنا پروفیسر کے اہل خانہ کے بزرگ ہونے کی حیثیت سے سید صاحب نے ایک مرتبہ اس سے کچھ نہیں کہا‘ ایک بار بھی اسے گلے نہیں لگا جب تک پروفیسر کی بیوہ اور بیٹیاں گھر میں رہیں‘ سید صا کی مغائرت میں کسی معاندت کا احساس ظفر کو نہیں ہو بعد میں دھندلے لفظ روشن ہوتے گئے۔

ظفر نے پروفیسر کی سوگ دار بیوہ اور بیٹیوں سے تھی کہ وہ اپنے گھر ہی رہیں‘ ظفر بکھرا ہوا گھر سنبھا استطاعت رکھتا ہے مگر سید صاحب کے سامنے ا حیثیت ہر اعتبار سے فروتر تھی۔ پروفیسر کے گھروا صاحب کے بے شمار احسانات‘ خسروانہ سلوک اور م مروت سے زیربار تھے۔ وہ تینوں ان دنوں ذہنی انتشا بھی دو چار تھیں۔ انہیں ظفر پر پورا اعتماد تھا لیکن صاحب کو انکار کردینے کی جرات بھی نہ تھی۔ پرو وصیت بھی ابھی تازہ تھی۔ پروفیسر کے کنبے میں اب بھی شمار ہونے لگا تھا۔ سید صاحب کے علم میں تھا کہ نے اپنی بیٹی فروزاں اور ظفر کے لیے کیا طے کیا ہ انہیں اپنے گھر پروفیسر کی بیوی اور بیٹیوں کو لے جا تکلفاً اور رسماً ظفر کو بھی ساتھ چلنے کے لیے کہنا چا انہوں نے یہ رواداری نہیں کی۔ ظفر کا تو ویسے بھی ا سید صاحب کے گھر جانا مناسب نہیں تھا۔ پروفیسر کی البتہ ظفر کے لیے سید صاحب کو اشارہ کیا تھا۔ سید نے انہیں مطمئن کردیا کہ ظفر ان سے کہاں دور ہو کیا پروفیسر کا گھر بند کردیا جائے؟ گھر کے کسی ایک فرد رہنا چاہیے۔ یہ عذر معقول تھا۔ پروفیسر کی بیگم ہر اپنے مرحوم شوہر کا گھر قائم رکھنا چاہتی تھی۔

سید صاحب کے ہاں پروفیسر کے گھر والوں ہوجانے کے بعد صبح و شام ان کی پرسش احوال ظف فرض کا درجہ رکھتی تھی۔ شروع کے چند دن تو خیر گئے۔ کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا۔ وہ بلاناغہ دن میں سید صاحب کے گھر جاتا رہا۔ آنے والے دن اس بڑی آزمائش کے تھے۔ ایک روز دربان نے اسے سے روک دیا۔ ظفر نے ناراضی کا اظہار کیا تو وہ ملازمین دربان کی تائید میں کمربستہ ہوگئے۔ سید صا ملنے کی التجا پر جواب دیا گیا کہ وہ جب چاہیں گے‘ خو مل لیں گے۔

وہ رنج و غم‘ غصہ و غضب کی حالت میں گھر واپس آیا۔ ں سید صاحب کا ایک فرستادہ بے دخلی کا حکم نامہ لیے پہلے سے موجود تھا۔ ظفر اس ذلت کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ نے اسی وقت سید صاحب کے گھر کا رخ کیا۔ اسے بی کی اجازت نہیں ملی۔ اس کے تو اوسان ہی جاتے ہے۔ پھر اس نے پروفیسر اور سید صاحب کے ایک مشترکہ تی ٹھاکر جگن ناتھ کے گھر جاکے دستک دی۔

اس اقدام سے اتنا ضرور ہوا کہ سید صاحب ملاقات لیے آمادہ ہوگئے لیکن وہ اسے ایک بدلے ہوئے آدمی نظر ئے‘ جیسے ان کا ظفر سے کوئی واسطہ ہی نہ رہا ہو‘ وہ اسے نتے ہی نہ ہوں۔ انہوں نے ظفر کو الگ گھر کا انتظام کرنے کم دیا۔ ظفر نے فریاد کی کہ وہ یہ کیا کہہ رہے ہیں‘ پروفیسر کا ان کا نہیں‘ پروفیسر کا ہے جو اس کے معنوی باپ اور مرشد تھے۔ پروفیسر نے اسے اپنے گھر مستقل قیام کی ت کی تھی بلکہ اسے مجبور کیا تھا‘ وہ اسے دل و جان سے جو رکھتے تھے۔ سید صاحب نے سنی ان سنی کردی اور کہنے ‘ یہ گھر بے شک پروفیسر کا ہے لیکن ظفر کا نہیں ہے۔ ظفر علق پروفیسر سے تھا اور پروفیسر اب موجود نہیں ہیں۔ دم کی وصیت کی رو سے وہ ان کے سارے معاملات کے ہیں۔ وہ جو بہتر سمجھتے ہیں‘ وہی کریں گے۔ ظفر نے زاں سے اپنے رشتے کی بات یاد دلائی۔ سید صاحب نے مہری سے کہا کہ وہ کس برتے پر اس رشتے کا دعوے دار ۔ اسے میزان کرنا نہیں آتا کیا؟ اسے اپنی حیثیت کا ن ہونا چاہیے۔ ظفر نے عاجزی کی کہ اسے مقامی کالج بہت اچھی ملازمت مل رہی تھی۔ وہ تو پروفیسر نے اسے ب رکھا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ ابھی وہ مزید تعلیم ل کرے۔ سید صاحب نے اسے دھتکار دیا کہ پہلے وہ کسی ں تو ہوجائے‘ تب آکے ان سے بات کرے۔ اس دوران فروزاں کے لیے انہیں بہتر رشتہ مل گیا تو وہ ظفر کا انتظار نہیں کریں گے۔ ظفر نے بہت دہائیاں دیں مگر سید نب تو پتھر کے ہوگئے تھے۔ پروفیسر کی بیگم سے ملاقات کی واست بھی انہوں نے سختی سے ٹھکرادی۔

ظفر ایک ذکی الحس‘ سلیم الطبع‘ سریع الفہم نوجوان ۔ اسے تخمینہ لگانے میں دیر نہیں لگی اور نہ یہ سمجھنے میں مزید دلیل و حجت کا کچھ حاصل نہیں ہے۔ سید محمود علی نظم و ترتیب کا پورا خیال رکھا ہے۔ سب کچھ ایک سلسلے ہے مگر اب وہ کیا کرے! وہ کہاں جائے؟ کس دہلیز پر جاکے یر کھٹکھٹائے۔ سید صاحب نے اسے خوب آئینہ دکھایا ہے۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہتے ہیں‘ وہ تو خود کو جانتا ہی نہیں‘ وہ کیسا بے دلیل ہے۔ وہ تو ریت کے گھروندے میں رہتا تھا۔ اس کے وجود کی استواری تو پروفیسر کے ستون سے مشروط تھی۔ اس نے اسی دن پروفیسر کا گھر چھوڑدیا۔ اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا کہ سید صاحب کے نمک خوار وہاں موجود تھے۔ اس کا ذہن معطل ہوچکا تھا۔ ہر جانب اندھیرا نظر آتا تھا۔ یہ ناگہانی تو پروفیسر کی موت سے بڑا سانحہ تھی۔ اس نے ڈھونڈ ڈھونڈ کے سید صاحب کے دوستوں کے گھر جاکے عرض گزاری کی۔ پھر اس نے کسی قانون داں سے مشورہ کرکے پولیس کی مدد حاصل کی۔ پولیس کا بڑا عہدے دار سید صاحب کے گھر سے شرم سار واپس آیا۔ سید صاحب نے پروفیسر کی وصیت کی نمائش کے علاوہ ان کی بیگم اور بیٹیوں کے بیانات بھی پولیس افسر کے گوش گزار کرادیے تھے۔ سید صاحب کے گھر سے واپس آکے اس نے الٹی ظفر کو سرزنش کی اور یہ فہمائش بھی کہ بہتر ہے‘ وہ سید محمود علی جیسے عزت دار‘ حیثیت مند شخص سے نبرد آزمائی کا خیال دل سے نکال دے ورنہ اسے گھاٹا ہوجائے گا۔ نوجوان ظفر نے خود کو کبھی ایسا بے دست و پا‘ بے بس محسوس نہیں کیا تھا۔ اس کی حالت دیوانوں جیسی ہوگئی۔ بدحواسی میں ایک روز اس نے سید صاحب کے مکان پر دھرنا دے دیا۔ نتیجے میں اسے ایک اذیت سے گزرنا پڑا‘ کرائے کے غنڈوں نے اس پر لاٹھیاں برسائیں اور ناتوانی کی حالت میں شہر کے کنارے پھینک آئے۔

کوئی بھی کہیں بھی اس کی بات سننا گوارا نہیں کرتا تھا۔ لگتا تھا‘ سارا شہر سید صاحب کے طلسم میں ہے۔ ظفر نے صرف کتابیں پڑھی تھیں‘ آدمی نہیں دیکھے تھے۔ کتابوں کے دل دادہ اس نوجوان کو پہلی بار تجربہ ہوا کہ آدمی وہ نہیں ہوتا جو نظر آتا ہے۔ جو اس کا چہرہ‘ ہاتھ پیر‘ جثہ و قامت دکھائی دیتے ہیں۔ آدمی تو وہ ہوتا ہے جو کبھی دو آدمیوں کے برابر ہوتا ہے‘ کبھی تین‘ چار یا اس سے زیادہ‘ بہت زیادہ۔ اور آدمی اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔ آدمی آدھا بھی ہوتا ہے اور نہ ہونے کے برابر بھی ہوتا ہے۔ قیافے‘ نظر اور تجربے سے آدمی کی پیمائش محض خوش گمانی ہے۔ آدمی کے سامنے تو سمندر بھی ہیچ ہے۔

ظفر نے سید صاحب کے ملازموں کا تعاقب شروع کیا۔ ایک ایک سے ہاتھ جوڑ کے بنتی کی کہ وہ اس کا ایک خط ہی پروفیسر کی بیگم تک پہنچادیں۔ پہلے تو وہ تیار نہیں ہوئے مگر نذرانے بھی ان سے مسترد نہ ہوسکے۔ ظفر کے بعد دیگرے

خط ان کے حوالے کرتا رہا' کسی کا جواب نہیں آیا۔ ملازم یہ خط اپنے آقا کی خدمت میں پیش کردیتے تھے اور آقا اپنے غلاموں کو ظفر کے نذرانوں سے کہیں زیادہ انعام واکرام سے نوازتے تھے۔ ملازم باہر جاکے ظفر کو باور کراتے رہے کہ وہ اس کا ہر خط بہ حفاظت بیگم صاحبہ تک پہنچادیتے ہیں۔ جواب دینا نہ دینا ان کی مرضی پر ہے۔ کسی ملازم نے ظفر کے کانوں میں یہ زہر بھی گھولا کہ بیگم صاحبہ اس کے خطوط پڑھے بغیر تلف کردیتی ہیں اور اس بات پر برگشتہ ہوتی ہیں کہ آخر وہ یہ خط وصول ہی کیوں کرتے ہیں' وہ ظفر سے کوئی تعلق ہی کیوں رکھتے ہیں۔ سید صاحب کے مکان کی دیواریں بہت اونچی تھیں۔ ظفر بھی قدوقامت میں کوتاہ نہیں تھا لیکن یہ دیواریں پار کرنے کے لیے بہت مختصر اور ناکافی قامت تھا اس کا۔

نصیر بابا کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اندھیرا اور بڑھ گیا تھا۔ رات کے کھانے کا وقت ایسا متعین نہیں تھا لیکن کسی بھی لمحے کوئی ہرکارہ ہمیں تلاش کرتا ہوا اس طرف آسکتا تھا۔ بہرحال بٹھل کمرے میں موجود تھا۔ اتنے دنوں تک سید صاحب کے ساتھ تینوں وقت' ناشتے اور کھانے میں وہی شریک ہوتا رہا تھا' میری ڈھنڈھیا نہیں پڑے گی۔ مجھ بیمار کا کھانا تو کمرے میں آجاتا تھا۔ بٹھل کے سامنے ہی میں نصیر بابا کولے کے عقبی سبزہ زار کی طرف چلا تھا' اسے اندازہ ہوگا کہ ناوقت مجھے نصیر بابا کی ضرورت کیوں پڑگئی ہے۔ وہ ملازموں سے کمرے میں میری عدم موجودگی کا کوئی بھی عذر کرسکتا تھا۔ مجھے ایسی کوئی بے چینی نہیں تھی لیکن نصیر بابا کو باربار کسی کے آجانے کا خوف گھیرلیتا تھا' میں نے بہ دقت انہیں روکے رکھا تھا۔

نصیر بابا کی ڈھلتی آواز میں نفرت اور بیزاری شامل ہوگئی تھی۔ سید صاحب کے ذکر پر وہ اپنا منہ نوچنے اور گالوں پر طمانچے مارنے لگے۔ کہنے لگے کہ یہاں سارے ملازم آدمی کی نہیں' جانوروں کی نسل سے ہیں۔ سب کو بس دم ہلانا آتا ہے۔ وہ بھی کبھی انہی میں سے تھے۔ وہ بھی بہت بڑے کتے تھے۔ سید صاحب کی نظروں میں تو ان کی یہی حیثیت ہے۔ نصیر بابا نے بتایا کہ وہ ایک زمانے سے سید صاحب کی خدمت کررہے ہیں۔ میرٹھ میں گوروں کے خلاف شورش نے فرقہ وارانہ فساد کی شکل اختیار کرلی تھی۔ بلوائیوں نے ان کے گھر کو آگ لگادی۔ بوڑھے ماں باپ' دو جوان بہنیں' ایک چھوٹا بھائی' ان کی بیوی اور تین بچے آگ کی نذر ہوگئے۔ ادھر مشتعل گوروں نے اندھادھند گرفتاریاں شروع کردیں۔ کبھی کسی موقع پر جوش میں آکے نصیر بابا نے گوروں کو ہندوستان

سے نکالنے کی تحریک میں اپنا نام بھی سرفروشوں میں لکھ[illegible] تھا۔ کسی غدار نے وہ فہرست گوروں کو فراہم کردی۔ [illegible] بھی زد پر آگئے۔ وہ عدالت میں داد وفریاد کرتے ر[illegible] گورے حاکم نے انہیں تین سال کے لیے جیل بھیج دیا [illegible] تین مہینے ہوئے تھے کہ ایک روز سیاسی قیدیوں نے با[illegible] کارکنوں کی مدد سے جیل میں ہنگامہ برپا کردیا۔ اس از[illegible] میں نصیر بابا کو جیل سے فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ میر[illegible] اب کیا رہ گیا تھا۔ وہ اپنے آبائی شہر خورجہ میں رشتے[illegible] کے پاس بھی نہیں جاسکتے تھے' مختلف شہروں میں حل[illegible] بدل کے منہ چھپاتے' پھرتے رہے' طرح طرح کے [illegible] اور بھاگتے بھاگتے آسن سول آگئے اور آخر انہیں[illegible] محمود علی کے ہاں پناہ مل گئی۔ سید صاحب بھی اس زما[illegible] اوسط درجے کے آدمی تھے۔ چھوٹے سے مکان میں ر[illegible] لیکن صبح وشام تک ودو میں لگے ہوئے تھے۔ دیکھتے د[illegible] کے پاس زر کی افراط ہونے لگی۔ انہوں نے یہ قل[illegible] مکان بنوالیا۔ نصیر بابا سید صاحب کے سب سے پرا[illegible] ہیں۔ اپنے حالات سے وہ اس قدر دل برداشتہ ہوچکے [illegible] سفید وسیاہ کی تمیز ہی جاتی رہی تھی۔ کہتے ہیں' کانٹوں[illegible] پودے ابتدا میں اکھاڑ پھینک دیے جائیں تو تناور[illegible] کیوں بنیں۔ کانٹوں کا یہ درخت نصیر بابا کے سامنے[illegible] چڑھا ہے' وہ اس کے سائے کے ساتھ کانٹوں کے [illegible] ہوگئے تھے۔ سب کچھ ان کے سامنے گزرا ہے اور روز بڑھتا' پھیلتا رہا ہے۔

نصیر بابا جکڑی ہوئی آواز میں کہنے لگے کہ [illegible] دہرائیں۔ زنان خانے کی ساری ملازمائیں چن چن[illegible] گئی ہیں۔ وہ ساری عورت ذات پر تہمت ہیں۔ ان[illegible] بوڑھی خاتون رئیس بیگم سید صاحب کی کوئی رشتے[illegible] اول درجے کی قطامہ ہے' کسی کٹنی کی مانند۔ یہ[illegible] جانے کہاں سے اسے لائے تھے۔ یقیناً کسی بالا[illegible] تعلق ہونا چاہیے۔ اس وقت سید صاحب کی پہلی[illegible] تھی' رئیس بیگم کی آمد کے سال بھر کے اندر اندر[illegible] بیماری کے بعد حیرت انگیز طور پر اس کا انتقال ہ[illegible] صاحب کے دونوں بیٹے نینی تال کے انگریزی ا[illegible] پڑھتے رہے ہیں' وہاں کی تعلیم کے بعد انہیں ولا[illegible] گیا۔ بیٹی اپنے گھر کی ہوگئی تھی۔ پہلی بیوی کی موت[illegible] دو سال بعد سید صاحب آگرے کی ایک طوا[illegible] درازقد' سانولی رنگت' تیکھے نقوش کی ایک نازک[illegible] کے ایسے شیدا ہوئے کہ منہ مانگی رقم پر گھر لے آ[illegible]

خوش شعار' پاکیزہ اطوار لڑکی تھی' عزت مندانہ زندگی کی طلب رکھتی تھی۔ نماز روزے کی پابند ہوگئی تھی مگر ایک روز وہ بھی اچانک بیمار پڑگئی۔ سید صاحب علاج کرانے کے لیے اسے الہٰ آباد لے گئے۔ رئیس بیگم بھی ہم راہ تھی۔ پندرہ بیس روز بعد دونوں واپس آئے تو وہ عفیفہ ساتھ نہیں تھی۔ بتایا گیا کہ اس کا وقت آگیا تھا۔ بڑے بڑے انگریزی ڈاکٹروں نے کوشش کی لیکن جس کا بلاوا آجائے' اسے کون روک سکتا ہے۔ اصل بات کا کسی کو علم نہ ہوسکا۔ اس واقعے کے بعد سید صاحب نے کسی عورت کو بہ حیثیت بیوی گھر پر نہیں رکھا۔ ہاں عورتیں آتی جاتی رہیں' آتی جاتی رہتی ہیں کبھی چند روز' ہفتے دو ہفتے' مہینے دو مہینے کے لیے۔

شہر اور اطراف میں دور ونزدیک سید صاحب کے دوستوں کا ایک وسیع حلقہ ہے۔ بہت سے ہم مزاج وقفے وقفے سے ایک جگہ اکٹھے ہوجاتے ہیں' پرشکوہ دعوتیں' راگ رنگ کی محفلیں' جام ومینا کے دور' ان کی دنیا ہی الگ ہے۔ ہندوستان بھر سے رقص وسرود کی ماہر حسین وجمیل عورتیں اہتمام سے ان محفلوں میں بلائی جاتی ہیں' کبھی اس اقبال مند کے گھر' کبھی اس منصب دار کے ہاں۔ سید صاحب کے ہاں کبھی کوئی مہمان خاندان سمیت آکے ٹھہرتا ہے اور اس میں کوئی دوشیزہ یا رشک آئینہ عورت سید صاحب کی نگاہ کو بھا جاتی ہے تو رئیس بیگم کا کام شروع ہوجاتا ہے۔ وہ شیشے میں اتارنے کا اپنا ہنر آزماتی ہے۔ رئیس بیگم ناکام کبھی نہیں ہوتی۔ وہ اور اس کی کنیزیں' زنان خانے کی مخصوص ملازمائیں سب مل کے تجویزوں' ترغیبوں' تحائف اور ان سب سے بڑھ کر خوابوں اور خیالوں کا ایسا جال بچھاتی ہیں کہ سید صاحب کی مطلوب کے لیے گریز کا راستہ نہیں رہ جاتا۔

مہمان خانے پہ کثیر مصارف ہوتے ہیں' وقت بھی کم صرف نہیں ہوتا لیکن میزبانی ومدارات کے اس سلسلے کا اصل بے اندازہ ہے۔ یہاں بڑے مختلف لوگ آکے ٹھہرتے ہیں۔ علوم وفنون کے ماہر جید ومستند عالم دین' بڑے سرکاری عہدے دار' کلاہ بردار زمیں دار اور زردار تاجر اور وہ لوگ جو سید صاحب کو زیادہ مرغوب ہیں۔ کسی بہت خصوصی مہمان کے لیے زنان خانے سے متصل عمارت کے بالائی حصے میں انتظام کیا جاتا ہے۔ ہر مسلک اور فرقے کے لوگوں سے سید صاحب کا تعلق ہے۔ مسجدوں میں چندہ ان کے ہاں سے جاتا ہے۔ دسہرے کی تقریبات میں بھی وہ بخل نہیں کرتے' خود بھی شریک ہوتے ہیں' بڑے دن کے جشن میں تو جوش وخروش سے حصہ لیتے ہیں۔ وہ اور ان کے بعض

خاص دوست اپنی پسندیدہ عورتوں کا تبادلہ بھی معیوب نہیں سمجھتے۔

نصیر بابا کو مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میری رگوں میں جلن ہونے لگی تھی۔ نصیر بابا کہہ رہے تھے' انہیں یقین ہے' یہ پروفیسر کی موت کا وقت نہیں تھا۔ وہ تو بڑے صحت مند' بہت زندہ دل آدمی تھے۔ ان کے گھر سید صاحب نے آزمودہ ملازم تعینات کیے تھے۔ پروفیسر کے پاس زرعی زمین کی صورت میں ایک بڑا اثاثہ تھا۔ سید صاحب سے سودا کیے ہوئے مکان کی دو ایک قسطیں بھی پروفیسر زرعی زمین کی آمدنی سے ادا کرچکے تھے مگر مال وزر کی بات تو ثانوی ہے۔ پروفیسر کی بیوی خانم فرخ ایک پری پیکر' ماہ جمال خاتون تھی۔ کسی ملکہ کے مانند' اس کے چہرے پر وقار تھا۔ اس کی آنکھوں میں بجلی سی کوندتی رہتی تھی۔ اس کا سراپا کسی لچکتی شاخ کے مثل تھا۔ اس کی شہابی رنگت' شفق سے مشابہ تھی۔ فارسی لب ولہجے میں وہ ہندوستانی بولتی تھی اور یوں اس کی طرز گفتار اور دل کش اور دل نشیں ہوجاتی تھی۔ ہر لباس اس پہ خوب سجتا تھا۔ وہ اپنی دو بیٹیوں کی ماں کے بجائے بڑی بہن نظر آتی تھی۔ بڑی بیٹی فروزاں ہو بہ ہو اس کی مثال ہے۔

سید صاحب کے گھر میں آنے کے بعد وہ تینوں ابتدائی چند دنوں تک بڑی آزردہ دل گرفتہ رہیں مگر یہاں ان کی دل بری ودلدہی کا سارا اہتمام کیا گیا تھا۔ رئیس بیگم ان کے لیے پلکیں بچھاتی تھی۔ رئیس بیگم کے اشارے پر دیگر ملازمائیں باندیوں کی طرح خدمت بجالانے کو مستعد رہتی تھیں۔ خود سید صاحب ہمہ وقت ان کی دل داری ودل جوئی کے لیے مضطرب رہتے تھے۔ یکایک جب ظفر کی آمد بند ہوگئی تو ماں اور بیٹیوں کی تشویش لازم تھی۔ ظفر تو ان کے لیے پروفیسر کی امانت' یادگار اور نشانی کی طرح تھا۔ ظفر تو ان کی امید تھا۔ سید صاحب نے ظفر کی اس روپوشی پر حیرت وتکدر کا اظہار کیا۔ خانم کو بتایا گیا کہ ظفر تو گھر میں بھی نہیں' پھر بتایا گیا کہ وہ تو اپنا سامان اور کتابیں اپنے ساتھ لے گیا ہے اور گھر میں موجود چوکی دار سے بھی کچھ کہہ سن کے نہیں گیا۔ خانم کو یقین نہیں آتا تھا۔ اس نے مختلف ملازموں سے گلی کوچے ظفر کا سراغ لگانے کی منت کی۔ ہر ایک ناکام واپس آکے خانم اور اس کی بیٹیوں کو وحشت زدہ کرتا رہا۔ سید صاحب مسلسل انہیں تسلی دیتے رہے کہ جلد یا بہ دیر ظفر کے بارے میں اچھی خبر آئے گی۔ وہ خاطر جمع رکھیں' ظفر کی تلاش میں کوئی کسر نہ رکھی جائے گی۔ انہوں نے ہر جگہ کہہ رکھا ہے'

یہاں تک کہ پولیس کی بھی مدد لی ہے۔ وہ پٹنے میں رہ چکی تھیں اور انہیں پروفیسر اور ظفر کے بعض ملاقاتیوں کے نام یاد تھے۔ ان کے اصرار پر ملازم پٹنے روانہ کیے گئے' ایک بار نہیں' کئی بار دوسرے تیسرے روز بظاہر وہ پٹنے سے واپس آکے مایوسی کا اظہار کردیتے تھے۔

شاہ جہاں پور میں مقیم ظفر کی ماں اور بہن کی بابت بھی خانم تھوڑا بہت جانتی تھی۔ ظفر اکثر ان کا تذکرہ کیا کرتا تھا۔ گھر کی الماریوں' کونے بچالوں میں شاہ جہاں پور سے آنے والے ظفر کے خطوط تلاش کرائے گئے یعنی خانم کو ایسا تاثر دیا گیا۔ سید صاحب نے خانم اور اس کی بیٹیوں کے اطمینان کے لیے ایک آدمی بھی شاہ جہاں پور روانہ کیا۔ جو کبھی وہاں نہیں تھا۔ دس پندرہ روز کے غیاب کے بعد آکے اس نے بھی خانم کو کوئی فرحت اثر خبر نہیں سنائی۔ ظفر کے لیے سب سے دل فگار فروزاں تھی۔ وہ کسی سے کچھ کہتی نہیں تھی لیکن اس کے چہرے پر بادل سے چھائے رہتے تھے۔ بہت دنوں بلکہ مہینوں تک انہیں ظفر کا انتظار رہا۔ وہ سید کے گھر سے مانوس ہونے لگی تھی۔ کسی مرد کے بغیر وہ تین جوان عورتیں اپنے گھر میں تنہا رہنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھیں۔ ادھر سید صاحب نے ان کی خوشنودی کے لیے ہر جتن کیا تھا۔ رئیس بیگم کی ترغیب پر خانم گھر کے معاملات میں بھی دلچسپی لینے لگی تھی کیونکہ اس کی رائے کو فوقیت دی جاتی تھی۔ سید صاحب بھی کبھی کبھار خانم سے ایرانی کھانوں کی فرمائش کرتے اور داد و تحسین کا حق ادا کردیتے۔

کچھ عرصے بعد سید صاحب نے گھر کی یکسانی سے اکتا کے پہاڑی مقامات پر جانے کا اعلان کیا۔ رئیس بیگم' نصیر بابا اور چند ایک ملازماؤں کے ساتھ یہ لشکر پہلے دار جلنگ گیا' وہاں کے سبزہ زاروں' کوہ ساروں کا نظارہ کیا' مشرقی بنگال میں سندر بن کی سیر کی۔ کلکتہ شہر میں گھومے پھرے۔ ایک ڈیڑھ مہینے مسلسل روبہ روئی کے اس سفر میں رہی سہی اجنبیت بھی ختم ہوجانی چاہیے تھی۔ کلکتے میں زیورات اور ملبوسات کی خریداری میں سید صاحب نے ہزاروں صرف کردیے۔ اس سفر سے خانم اور بیٹیوں پر لازماً خوش گوار احساس مرتب ہونے چاہیے تھے۔ گھر واپس آکے یقیناً اچانک نہیں' مناسب وقت دیکھ کے رئیس بیگم نے خانم کے کان میں شوشہ طرازی کی ہوگی کہ کیوں نہ وہ اور سید صاحب یہ رسمی دوریاں مٹادیں۔ نصیر بابا کا کہنا تھا کہ خانم اس کے لیے جلد آمادہ نہیں ہوئی ہوگی مگر رئیس بیگم ایک دست کار' شیشہ باز ہے' پتھر پگھلانے کے فن سے واقف۔ اس کی دلیلیں بھی توانائی سے

عاری نہیں تھیں۔ ظفر جاچکا تھا' آمنے سامنے' گرد و پیش سید صاحب کے سوا کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ دو بیٹیاں ا[illegible] ذمے داری تھیں۔ خود اس کے آگے زندگی پڑی تھی۔ ا[illegible] دنوں تک وہ سید صاحب کی شیفتگی و وارفتگی کا مشاہدہ کر[illegible] تھی۔ رئیس بیگم اس بار بھی اپنی سحرکاری میں ناکام نہ[illegible] ہوئی۔ ایک رات وہ خانم کو عمارت کے وسطی حصے میں [illegible] گئی۔ سید صاحب کے علاوہ وہاں ایک مولوی' نصیر بابا ایک اور شخص پہلے سے موجود تھے۔ دستخطوں کے لیے تیار تھا۔ منٹوں میں رسم ادا ہوگئی۔

رئیس بیگم کے مشورے پر سردست یہ واقعہ بیٹیو[illegible] چھپایا گیا' دوسرے ملازموں سے بھی مخفی رکھا گیا۔ خان[illegible] اس اخفا پر تعجب کا اظہار کیا تھا مگر عذر پیش کیے گ[illegible] فروزاں اور یاسمن ابھی ناپختہ اور حساس ہیں۔ ہوسکتا خانم اور سید صاحب کے اس محترم و مقدس رشتے کی [illegible] کے لیے ابھی وہ ذہنی طور پر تیار نہ ہوں۔ کچھ عرصے [illegible] جانے پر مرحوم باپ کے نقش ضرور دھندلے پڑجائیں۔ وقت سب سے بڑا مسیحا ہے۔ ابھی اس افشا سے ان[illegible] منفی اثر پڑا تو اندمال کی ساری کوششیں اکارت جائیں[illegible] باہر کے لوگ یا ملازم سید صاحب اور خانم کی اس یک[illegible] سے آشنا ہوئے تو فروزاں اور یاسمن سے بھی کچھ [illegible] نہیں رہے گا۔ بے شک یہ مبارک و مسعود کام [illegible] جاسکتا تھا لیکن خانم کو ذاتی طور پر گداز اور یقین کی [illegible] ہے اور جب کسی کام میں بہتری کا پہلو مضمر ہے تو [illegible] سہی' اسے انجام دینے میں دیر کیوں کی جائے۔ آخر [illegible] تو سبھی کو معلوم ہوجاتا ہے۔ ان توجیہوں نے خانم قائل نہیں کیا مگر سید صاحب کی زیرکی' دور اندیشی [illegible] پردازی تو مسلم تھی۔ وہ خاموش رہی' نصیر بابا کہہ ر[illegible] خود انہیں بھی بڑی حیرت ہوئی تھی' بہت دنوں بعد ان [illegible] پردہ داری کے راز منکشف ہوئے۔ نصیر بابا کے [illegible] مطابق اس وقت ایک بے نام خوف کے ساتھ انہیں بھی ہوئی تھی کہ خانم کے غم کا اس طرح کچھ مداوا تو نصیر بابا خود کو ملامت کررہے تھے' کہنے لگے' وہ یہ بھول خانم کی غم ناکی کا ذمے دار کون ہے۔ تاہم نصیر بابا۔ باندھی کہ اب شاید سید صاحب کی زندگی کا رخ بدل[illegible] خانم فرخ واقعی مبارک ثابت ہو۔ ایسی حور شمائل [illegible] بیوی کے بعد اب انہیں کسی اور طرف نہیں دیکھنا چا[illegible]

سید صاحب نے بڑی احتیاط کی' کسی کو ہوا نہ [illegible] خانم اور بیٹیوں کے الگ الگ کمرے پہلے سے مخصو[illegible]

[illegible]ئیس کی بیگم بیٹیوں کو سنبھال لیتی تھی اور خانم اپنے نئے [illegible]بازی خدا کے پاس خلوت میں چلی جاتی تھی۔ ان دنوں سید [illegible]اب کا عجب عالم تھا۔ پیر جیسے زمین پر نکلتے ہی نہ تھے' گالوں [illegible]ے سرخی پھوٹتی تھی' آنکھیں تاب دار ہوگئی تھیں۔ رفتار [illegible] تیزی آگئی تھی۔ لباس پر یوں بھی توجہ دیتے تھے' ان دنوں [illegible]رنگ ڈھنگ ہی بدل گیا تھا۔ لگتا تھا' جیسے انہوں نے دنیا [illegible]خیر کرلی ہو۔ کئی مہینے اس سرشاری میں گزر گئے اور خانم [illegible]وہ کناں ہونے لگی کہ اس طرح چوری چھپے سید صاحب کے [illegible]ں آنا اسے اچھا نہیں لگتا۔ وہ بیٹیوں کے سامنے خود کو مجرم [illegible]وس کرتی ہے۔ اسے ملازموں کے سامنے بھی شرمندگی سی [illegible]تی ہے۔ یہ کیسا ستم ہے' وہ سید صاحب کی بیگم' اس گھر کی [illegible]ہ ہے اور اپنے استحقاق کی دعوے دار نہیں ہے۔ اب [illegible] کو بتادینا چاہیے۔ خانم کو' اولاد نرینہ کی بڑی تمنا تھی۔ [illegible]فیسر کے زمانے میں گزر جانے والے بیٹے کی موت کی تلافی [illegible] طرح ہوسکتی تھی۔ نصیر بابا کہتے تھے' اولاد سے تو تجدید [illegible]ن ہوتی ہے۔ اس سے بندھن مضبوط ہوتے ہیں۔ درپردگی [illegible] ان تعلقات میں اولاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ [illegible] خانم کے لیے بڑی سوہان روح تھی۔

سید صاحب کی پردہ پوشی کی رمز کچھ اس وقت کھلی جب [illegible] کا چھوٹا بیٹا اسد علی لندن سے وارد ہوا۔ بیٹے آئیں یا بیٹی [illegible] داماد' رئیس بیگم سید صاحب کی اولاد کی آمد پر پروانہ وار ہوجاتی تھی۔ وہ اپنی خاطر تواضع سے ان کی ماں کی کمی دور [illegible]یتی تھی۔ سید صاحب نے بڑی ہدایتیں دی تھیں مگر ایک [illegible] زنان خانے کے جھروکے میں اسد علی نے فروزاں کا جلوہ [illegible]یا۔ وہ دم بخود رہ گیا۔ والد صاحب سے سلسلہ جنبانی کی [illegible]ت نہیں تھی۔ اس نے رئیس بیگم سے فروزاں کی بات [illegible]ی اور خوب منت سماجت کی۔ رئیس بیگم نے جواب میں [illegible] لمحے توقف نہیں کیا' معذرت کردی کہ اسد علی اس قسم [illegible]وئی آس نہ لگائے تو بہتر ہے۔ فروزاں اپنے والد مرحوم [illegible]سر کے ایک شاگرد ظفر سے منگ چکی ہے اور فروزاں خود [illegible] اس رشتے کی مدعی ہے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد ظفر [illegible] آنے کی دیر ہے' فروزاں اپنے گھر کی ہوجائے گی۔ یاسمن [illegible] شادی کی عمر کو نہیں پہنچی ہے لیکن یاسمن کے لیے بھی [illegible]سرائی زندگی میں رشتہ تلاش کرچکے تھے۔ یہ سن کے اسد [illegible]ر آشفتگی طاری ہوئی۔ وہ ضد کرنے لگا کہ بابا چاہیں تو سب [illegible] ہوسکتا ہے۔ اس نے نصیر بابا سے بھی ایک روز جھجکتے [illegible]ئے سید صاحب سے بات کرنے کی درخواست کی۔ نصیر بابا [illegible] موقع غنیمت جان کے ایک شام سید صاحب کو اسد علی کی

خواہش سے آگاہ کردیا۔ سید صاحب کی برہمی پر انہیں تعجب ہوا۔ انہوں نے نصیر بابا کو تاکید کی کہ وہ اسد علی کے دل سے یہ خیال نکالنے کی کوشش کریں اور نہ مانے تو واضح طور پر جتادیں کہ اس کے بابا اس بارے میں قطعاً مجبور ہیں' انہیں اپنے دوست پروفیسر جمال الدین سیفی سے کیے ہوئے وعدے کا پاس ہے۔ اسد علی سے رئیس بیگم نے جو کچھ کہا ہے' وہی صحیح ہے۔ اس کے لیے ایک سے ایک ماہ جبیں لڑکی ڈھونڈی جاسکتی ہے۔ نصیر بابا نے آقا کے حکم کی تعمیل کی' حالانکہ ان کے خیال میں ولایت میں پڑھنے والا اسد علی فروزاں کے لیے کوئی نامناسب لڑکا نہیں تھا۔ ادھر سید صاحب ظفر کا باب تو ہمیشہ کے لیے بند کرہی چکے ہیں۔ اب ان کے ذہن میں کیا ہے؟ اسد علی کے لیے فروزاں جیسی رشک ماہ تاب لڑکی انہیں ملنی مشکل ہے۔ آج نہیں تو کل' انہیں اپنے ہاتھوں سے فروزاں کی شادی کرنی ہی ہے۔ شاید خانم بھی منع نہ کرے۔ اسد علی نے بہت ہاتھ پیر مارے' بڑی سرکشی کی' اور ایسا دل گرفتہ ہوا کہ سفر ادھورا چھوڑ کے ولایت واپس چلا گیا۔

ادھر خانم نے شدت سے اصرار کرنا شروع کردیا تھا کہ فروزاں اور یاسمن نے نیا گھر اور نیا ماحول اچھی طرح قبول کرلیا ہے۔ اب کوئی ہرج نہیں۔ سید صاحب اور ان کی ماں کی شادی کی نوید سے انہیں ایسا صدمہ نہیں ہوگا۔ ممکن ہے وہ کچھ سکون ہی محسوس کریں۔ انہیں بھی تو اپنی ماں کا بہت خیال ہے۔ اس طرح انہیں اس گھر پہ اپنے حق کا اعتماد بھی ہوگا۔ گھر میں نصیر بابا اور رئیس بیگم' خانم اور سید صاحب کے خفیہ رشتہ ازدواج کے گواہ تھے۔ خانم نے ان سے بھی داد خواہی کی کہ وہی سید صاحب کو ہموار کریں۔ ایک نہایت متبرک تعلق' راز کیوں رہنے دیا جائے۔ اچھا ہوگا کہ اسے ایک مسلسل احساس ندامت سے نجات دلائی جائے۔ فروزاں اور یاسمن اب ایسی نادان بھی نہیں ہیں۔ سید صاحب نے حسب سابق کچھ اور مہلت مانگی اور اس مہلت میں ایک دن خانم کی طبیعت خراب ہوگئی۔ اسے پروفیسر جتنا وقت بھی نہیں ملا۔ وہی ڈاکٹر' حکیم اور ویدوں کا سلسلہ شروع ہوا اور قصہ مختصر' ہفتے ڈیڑھ ہفتے کی کش مکش یا زور آزمائی کے بعد خانم بھی پروفیسر کے پاس چلی گئی۔

فروزاں اور یاسمن کو سکتہ ہوگیا تھا۔ ان کی ویرانی کا حال بیان کرتے ہوئے نصیر بابا ہڑکنے لگے۔ ان دونوں نے سب سے کنارہ کرلیا تھا اور اپنے کمرے میں محبوس ہوگئی تھیں۔ رئیس بیگم واری صدقے جاتی تھی۔ سید صاحب ان

کے لیے آسمان سے تارے لانے کے دعوے کرتے۔ صبر کی تلقین کرتے کرتے ان کی آواز ڈوب جاتی تھی اور ان کی آنکھیں سیلاب ہو جاتی تھیں۔ سب موت وحیات کا فلسفہ بیان کرتے تھے۔ کہتے تھے' زندگی تو خدا کی امانت ہے' موت سے کسے مفر ہے۔ کوئی یہاں قیام کرنے والا نہیں۔ یہ سب تو پیدا کرنے والے کی مشیت ہے' جسے چاہے' جب چاہے' پاس بلالے۔ اس موقع پر خدا کے حوالے خاصے کار آمد ہوتے ہیں۔ کئی دن تک گھر میں کلام پاک کا ورد ہوتا رہا اور مرحومہ کی روح کو ثواب پہنچایا جاتا رہا' اس کی منزلیں آسان کی جاتی رہیں۔ گھر کے سارے افراد اشک شوئی کے لیے فروزاں اور یاسمن کے اردگرد رہتے تھے مگر صرف آنکھیں ہی تھوڑی روتی ہیں۔

نصیر بابا کا سر بھی اب گھومنے لگا تھا۔ دست وبازو کی طرح کے حواس کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ جیل سے فرار ہو کے انہیں یہ سب کچھ دیکھنا تھا تو جیل ہی اچھی تھی۔ کاش وہ بھی اپنے گھر والوں کے ساتھ جل مرتے۔ ایک دفعہ کی آگ' زندگی بھر کی آگ سے چھٹکارا دلادیتی۔ ان کی زندگی تو ایک اتفاق ہے۔ بلوائیوں کے ہلا بولتے وقت وہ گھر پہ ہوتے تو ان کا انجام بھی ماں باپ' بیوی بچوں جیسا ہوتا۔ اب انہیں یہ مستعار زندگی واپس کردینی چاہیے۔ بے اختیار زندگی تو موت سے بدتر ہے۔ موت کی سزا میں ایسی بے سکونی نہ ہوگی۔ نمک کا حق آخر کس قدر ہوتا ہے' ظرف سے سوا تو نہیں۔ کیا عجب کہ ایک یہ آخری اقدام عاقبت سنوارنے کا سبب بن جائے مگر اس سے پہلے انہیں فروزاں اور یاسمن کے لیے کوئی انتظام کرنا چاہیے۔ انہیں ظفر کو تلاش کرنا چاہیے۔ کچھ عرصے پہلے تک تو وہ درماندہ' درد آشنا' شکستگی سے دوچار شہر میں نظر آجاتا تھا۔ اب جانے کہاں کھو گیا ہے۔ بہت سوچ سمجھ ہی کے قدم اٹھانا ہوگا۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ وہ خنجر لے کے نکل کھڑے ہوں' انہیں فروزاں اور یاسمن کے لیے بہتر عواقب کی ضمانت درکار تھی۔ وہ مسلسل تگ ودو میں رہے اور کچھ نہ کرسکے۔ انہیں اپنے آپ سے وحشت ہونے لگی تھی' وہ کیسے ادھورے' کتنے تنہا اور لاچار آدمی ہیں۔ انہوں نے تو بس ایک تماشائی' ایک معمول کی زندگی گزاری ہے۔ انہوں نے بس سانس لینے کی آسائش پر قناعت کرلی ہے۔

ایک روز انہیں آس سول میں ظفر نظر آگیا۔ اس سے پہلے کہ وہ حرف بدعا زبان پر لاتے' ظفر نے ان کے پیر پکڑ لیے اور وہی دیوانگی کرنے لگا کہ ایک بار' صرف ایک بار اسے

خانم اور فروزاں یا یاسمن سے ملنے کا موقع فراہم کر جائے۔ اسے دیکھ کے نصیر بابا کا جی چاہا کہ وہ گلے سے لگا بین کریں مگر وہ بت بنے رہے۔ زیاں کے بہت سے اندیشہ نے انہیں گھیر لیا تھا۔ نصیر بابا نے خانم کے سانحے سے ا آگاہ نہیں کیا اور نہ کچھ اور بتایا۔ ظفر کے ہوش وحوا موزونیت پر انہیں شبہ تھا۔ ظفر شہر میں تھا' کسی اور ملازم بھی اس کی مڈبھیڑ ہوسکتی تھی۔ اس کے سامنے ظفر سے سی لغزش ہو جاتی تو نصیر بابا کے لیے زندگی اور مشکل ہو جا انہوں نے ظفر سے یہ بھی نہیں کہا کہ اس کے بھیجے ہو خانم اور اس کی بیٹیوں کے پاس پہنچ ہی نہیں پائے۔ انہوں نے ظفر سے ایک اور خط لکھنے کی گزارش کی۔ ا کی انہیں بڑی ضرورت تھی۔ ظفر کی تحریر سے حرماں نص فروزاں اور یاسمن کے ہاں امیدیں روشن ہوسکتی تھیں۔

شام کو اسی جگہ انہوں نے ظفر سے دوبارہ ملنے کا طے کیا۔ گھر سے باہر نکلنے کا موقع اور عذر تلاش کر انہیں دیر ہوگئی۔ ظفر بے قراری سے ان کا منتظر تھا۔ نے خط وصول کر کے کچھ حوصلہ کیا۔ انہوں نے دبے ل میں ظفر کو عزم واستقامت کی نصیحت کے علاوہ خبردار کہ اب ان کے سوا وہ سید صاحب کے کسی ملازم سے علاقہ نہ رکھے۔ مناسب ہوگا کہ اب وہ آس سول آیا کرے اور اس خط کے جواب کے لیے بھی اتنا متوحش ذرا تحمل کرے اور بہتری کی توقع رکھے۔ اب گزشتہ کی نہیں ہوگا۔ دیر سے سہی' امید ہے' اس خط کا جواب آئے گا۔ نصیر بابا نے اسے یقین دلایا کہ وہ خود اس سے کریں گے اور واضح رہے' ان دونوں کی ملاقات کی بھنک کسی کو پڑ گئی تو دونوں کے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ ظفر نے سول سے آدھ گھنٹے کی مسافت پر دھن باد شہر کا پتا دیا۔ عاجزی پر نصیر بابا کا دل بھر آیا۔ ایک بار تو ان کے جی کہ وہ اسے سارا احوال بتادیں۔ انہوں نے خود کو روکا بہرحال ایک نوجوان تھا۔ جوانی جلد ہی آگ پکڑ لیتی۔ بہت پاگل بھی ہوسکتا تھا۔ پھر فروزاں اور یاسمن کے نصیر بابا کی آنکھوں میں در آئے۔ درمیان میں وہ ستم بھی تو ہیں' صرف ظفر اور نصیر بابا کا معاملہ تو نہیں۔

خط جیب میں رکھ کے وہ واپس گھر آگئے۔ جیسے نے کوئی چوری کی ہو' چوری پکڑی نہ جائے' ان کا دل د کرتا رہا۔ زنان خانے میں ان کی آمد ورفت پر کوئی نہیں تھی۔ وہ خود ہی دستکیں دیتے اور کھنکارتے ہو جاتے تھے۔ خط کی وجہ سے ان پر احتیاط کا احساس او

یا تھا۔ رئیس بیگم اور دیگر ملازمائیں ان دنوں بہ طور خاص زاں اور یاسمن کی نگہداشت اور دلداری کے لیے ان گرد موجود رہتی تھیں۔ ایسے میں فروزاں اور یاسمن کے رے کا رخ کرتے ہوئے نصیر بابا کے قدم اٹکتے تھے۔ انہیں دن تک موقع نہیں ملا اور تین دن تک انہیں نیند بھی نہ اصل میں خط سپرد کرنا دوسرا مرحلہ تھا' اس سے پہلے زاں اور یاسمن کو عقل وہوش کا درس دینا ضروری تھا۔ تھے دن انہوں نے ہمت باندھی۔ ایک بے ضرری ترکیب کے منتشر دماغ میں آئی تھی۔ یاسمن اور فروزاں کے رے کے باہر کھڑے ہو کے انہوں نے ملازمہ امتل سے کہا وہ فروزاں اور یاسمن میں سے کسی کو ذرا باہر بلادے۔ ی معظم علی نے ردبلا اور سکونِ قلب کے لیے ایک سوہ اور آسان سا وظیفہ تجویز کیا ہے۔ اللہ نے چاہا' اس ورد سے دونوں بہنوں کی تشفی ہوگی۔ سادہ مزاج نصیر بابا پر قسم کا شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

حفظِ ماتقدم کے طور پر نصیر بابا نے یہاں تک خیال رکھا ہ قریبی مسجد کے مولوی معظم علی کی خدمت میں حاضر ے مذکورہ وظیفہ لکھوا لائے تھے اور ان کے سامنے اسے بھی کرلیا تھا۔ یاسمن فوراً باہر آگئی۔ اس پژمردگی سے نصیر وسلام کیا اور سر جھکائے کھڑی رہی۔ امتل سامنے نہیں ۔ نصیر بابا نے وظیفے کا پرزہ یاسمن کے حوالے کیا اور شیانہ انداز میں جلدی جلدی کہا کہ یاسمن ذرا توجہ سے 'اس سے ملنے کے لیے انہوں نے اس پرزے کا سہارا لیا 'کوئی اہم چیز اسے سپرد کرنی ہے لیکن اس سے پہلے ری بات بھی کرنی ہے اور بات تفصیلی ہے اس لیے یہاں نہیں کی جاسکتی۔ یاسمن اور فروزاں پہلے کی طرح زنان نے میں گھومنا پھرنا شروع کریں تو ان تک رسائی آسان ے۔ یاسمن مبہوت ہوگئی تھی۔ اس نے پھٹے ہوئے ں سے پوچھا کہ ایسی کیا بات ہے؟ نصیر بابا نے اس کے سر ھ رکھ کے دلاسا دیا کہ وہ پریشان نہ ہو' اور خیال رہے کہ نے والے دنوں میں دونوں بہنیں غیر ضروری عجلت اور ای سے اجتناب کریں۔ جو بھی بات ہے' ان کی خیر خواہی متعلق ہے اور جو ان کے تعاون کے بغیر ممکن بھی نہیں ۔ بس انہیں اپنے آپ کو سنبھالے رکھنا' زبان بند رکھنا محتاط رہنا ہے۔ حیرت زدہ یاسمن نے پوچھا' پھر کب وہ اس ملیں گے؟ نصیر بابا نے بتایا کہ وہ زنان خانے کا پھیرا لگاتے ہاکے ورنہ قریب تو رہیں گے ہی۔ ان کی کوشش ہوگی کہ ہی انہیں کوئی موقع مل جائے اور وہ صراحت سے اسے یا فروزاں کو کچھ باور کراسکیں۔

وہ یاسمن کو حیران وپریشان چھوڑ کے وہاں سے چل دیے۔

نصیر بابا کا قیاس درست نکلا' فروزاں اور یاسمن نے اسی دن سے اپنے کمرے میں بند رہنے کا طور ترک کردیا۔ لیکن چار دن ایسے ہی گزر گئے۔ یاسمن اور فروزاں سے کئی بار نصیر بابا کا آمنا سامنا ہوا مگر تنہائی میں بات کرنے کی صورت پیدا نہ ہوسکی۔ وہ مسلسل اسی فکر میں لگے ہوئے تھے اور انہیں ملال ہو رہا تھا کہ یاسمن اور فرزاں ان سے کہیں زیادہ مضطرب ہو رہی ہوں گی۔ پانچویں دن شام کا وقت تھا' سید صاحب گھر پر موجود نہیں تھے۔ نصیر بابا عقبی سبزہ زار کے اس حصے کی طرف چلے گئے جو خواتین کے لیے مخصوص تھا۔ فراغت کے اوقات میں عادت کے مطابق وہ کیاریاں درست کرنے لگے۔ یاسمن نے جھروکے سے انہیں دیکھ لیا۔ زنان خانے کی صورت حال بھی موافق ہوگی جبھی لمحوں میں وہ نصیر بابا کے پاس پہنچ گئی۔ نصیر بابا نے کیاریوں سے پھول توڑ کے چھوٹا سا گلدستہ بنایا اور ہر طرف سے مطمئن ہو کے ظفر کا مڑا تڑا رقعہ گلدستے کے ساتھ یاسمن کو پیش کردیا۔ "یہ ظفر میاں کا خط ہے بی بی!" انہوں نے دھڑکتی آواز میں کہا "پڑھ کے فوراً جلا دینا۔" ظفر کے نام پر یاسمن دنگ رہ گئی۔ نصیر بابا نے مختصر وقت میں جتنا کچھ ممکن تھا' بہ عجلت تمام یاسمن کو آگاہ کیا اور کہا کہ اب سارا معاملہ ان دونوں پر ہے کہ وہ کس ہوش مندی اور حوصلہ مندی سے آنے والا وقت بسر کرتی ہیں۔ انہیں سید صاحب' رئیس بیگم اور ملازموں کے سامنے اپنی حالت کی بحالی اور اوسان کی درستی کا تاثر دینا ہے تاکہ نگراں ملازموں کی بھیڑ اطراف سے چھٹ جائے۔ رئیس بیگم کی شیدائیت اور فدائیت کے جواب میں انہیں بھی اس کے ساتھ تپاک سے پیش آنا ہے۔ انہیں گھر کے ہر فرد کو یہ جتانا ہے کہ اپنی ماں کے سانحے پر انہوں نے صبروشکر کرلیا ہے۔ سب اللہ کی جانب سے ہے اور وہ اس گھر کا حصہ ہیں' ان کا مستقبل تو اسی گھر سے وابستہ ہے۔ نصیر بابا نے یاسمن سے کہا' انہیں معلوم ہے کہ یہاں تک تو سب ٹھیک تھا لیکن ظفر کا خط پڑھنے کے بعد ان پر گزرنے والی کیفیت بڑی مختلف ہوگی۔ بہت اندھیرا اور حبس انہیں یہاں محسوس ہوگا۔ ان پر ایک ایک لمحہ عذاب ہوسکتا ہے۔ انہیں اپنے اردگرد ہمہ دم مستعد پرسان حال' اپنے خدمت گاروں سے بڑی گھن آئے گی اور ڈر بھی لگے گا۔ وہ جان لیں' یہی وقت ان کی آزمائش کا ہے۔ نصیر بابا ادھر اپنی کوششوں میں لگے رہیں گے مگر دیر

ہو سکتی ہے' بہت دیر بھی ہو سکتی ہے پھر بھی انہیں امید ہے' کوئی راہ ضرور نکل آئے گی۔ وہ ظفر سے مسلسل رابطہ رکھیں گے۔ اس خط کا جواب بھی اسے پہنچا دیں گے۔ جواب صرف دو سطری ہونا چاہیے۔ صرف خط کی رسید اور اپنی خیریت سے ظفر کو مطلع کرنا ہے اور لکھنا ہے' اس سے پہلے اس کا کوئی خط فرزاں اور یاسمن کو نہیں مل پایا ہے' تفصیلی جواب وہ بعد میں لکھیں گی۔ اپنی ماں کے بارے میں بھی انہیں ایک لفظ نہیں لکھنا۔ سرگراں ظفر سے کوئی بھی الٹا سیدھا قدم اٹھ سکتا ہے۔ فرزاں اور یاسمن کو یقین کرنا چاہیے کہ وہ اس گھر میں تنہا نہیں ہیں۔ ایک بوڑھا آدمی نگران کا بہی خواہ' ان کا غمگسار نصیر بابا زندہ ہے۔ اسے موت بھی آنے لگی تو وہ یوں انہیں بے آسرا چھوڑ کے نہیں جائے گا۔ نصیر بابا نے عزم سے کہا' ایک فیصلہ تو ہر وقت ان کے پاس محفوظ ہے۔ وہ بھروسا رکھیں۔

ہکا بکا یاسمن سنتی رہی۔ نصیر بابا نے اسے اپنے پاس مزید نہیں ٹھہرنے دیا اور آئندہ بھی چاروں طرف سے مطمئن ہو کے اپنے قریب آنے کی تاکید کی اور کہا کہ دونوں بہنوں اور نصیر بابا کے درمیان غیر معمولی ربط و ضبط کا کسی کو احساس نہ ہونے پائے۔

ظفر کا خط ملنے کے بعد یاسمن کو پر لگا کے اپنی بہن فرزاں کے پاس پہنچنے کی وحشت ہونی چاہیے تھی مگر اس نے صبر و تحمل کا ثبوت دیا' کوئی جلدی نہیں کی۔ وہ شدید کشمکش اور شش و پنج سے دوچار نظر آتی تھی۔ اسی حالت میں وہ نصیر بابا کے پاس سے ہٹ گئی اور آہستہ قدموں سے دور ہوتی گئی۔

نصیر بابا بسورے ہونٹوں سے بولے کہ انہیں اتنے ہی لفظ آتے تھے۔ ان کی زبان ہی ساتھ نہیں دے پا رہی تھی۔ یاسمن کا دھواں دھواں چہرہ دیکھ کے ان کا سینہ کٹ رہا تھا۔ شکر ہے' یاسمن نے ان سے سوال جواب نہیں کیے' وہ خاموشی سے چلی گئی۔ کسی گوشے سے اچانک کسی کے نمودار ہو جانے کا خدشہ نصیر بابا کو اور ہولائے ہوئے تھا۔ یاسمن کے جاتے ہی انہیں ایک اور وسوسے نے آگھیرا کہ ان سے کوئی چوک تو نہیں ہو گئی؟ ظفر کا خط پڑھنے کے بعد تو دونوں بہنوں پر ایک باب حیرت کھل جائے گا۔ اب تک یہ گھر ان کے لیے ایسا زنداں نہیں تھا' اب تو سب کچھ انہیں بدلا ہوا نظر آئے گا۔ نصیر بابا نے کتنی آسانی سے ہدایتیں جاری کر دیں' یہ سوچے سمجھے بغیر کہ سامنے کون ہے' وہ تو شیشے کی طرح نازک ہیں' کس حد تک ان کے دکام کی گراں باری کی متحمل ہو سکیں گی' انہیں یہ زمانہ سازی' یہ سوانگ اور بہروپ کہاں آتا ہے۔ انہیں کبھی اتنے چہروں کے لوگوں سے کب وا[سطہ] پڑا ہوگا۔ وہ تو بڑے صاف و شفاف اطوار کی لڑکیاں ہیں' انہیں تو جھوٹ بولنا بھی نہیں آتا ہوگا کیونکہ انہیں کبھی ا[س] کی ضرورت ہی نہیں پڑی ہوگی۔ نصیر بابا کو یہ فکر کھائی جا[رہی] تھی کہ فرزاں اور یاسمن پر خوف و دہشت کے علاوہ مایو[سی] اور اداسی کا غلبہ بھی ہو سکتا ہے اور وہ' وہ... ایک انتہا[ئی قدم] ان کے ہاتھ میں بھی ہے' مایوسی میں آدمی زیادہ کم زور ہو[جاتا] ہے۔ اے خدا انہیں ہمت و استقامت دے' اے[خدا] انہیں اپنی امان میں رکھ۔ نصیر بابا نے ظفر کا خط نہیں [پڑھا] تھا۔ ظاہر ہے' ظفر نے اپنی بے بسی و بے چارگی کا حال ر[قم کیا] ہوگا۔ کاش ظفر کی تحریر ہی جوت جلائے رکھے۔ نصیر بابا[کا دل] بری طرح دھڑک رہا تھا۔ یاسمن کو گئے دیر نہیں ہوئی [تھی] ان کے قدم بے اختیار زنان خانے کی طرف اٹھ گئے[۔ وہ] دونوں اپنے کمرے میں تھیں۔ نصیر بابا ادھر ادھر کا چکر ل[گاتے] ہوئے واپس آگئے۔ اس رات وہ صبح تک دعائیں [مانگتے] رہے۔

مہمان خانے میں ان دنوں ایک دو مہمان ٹھ[ہرے] ہوئے تھے۔ نصیر بابا سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ مہما[نوں کو] جیسے تیسے ناشتے سے نمٹا کے انہوں نے فوراً زنان خ[انے کا] رخ کیا۔ انہوں نے پھر ایک گلدستہ تیار کیا اور ا[پنی] تاکیدیں بھول گئے۔ یاسمن کو انہوں نے کسی ملاز[مہ کے] ذریعے کمرے سے بلوایا۔ اسے دیکھ کے جیسے ان کی [جان] بحال ہوئیں۔ ایک رات میں یاسمن کی رنگت زر[د ہو گئی] تھی۔ آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں۔ انہوں نے [لرزتے] ہاتھوں سے گلدستہ اس کے حوالے کر کے سر پہ تھپک[ی دی] اور اس سے پہلے کہ یاسمن کی آنکھیں چھلکنے لگتیں' [وہ منہ پھیر] کے لے مڑ گئے۔

تین چار دن تک ان سے خود اپنی عاید کردہ احت[یاط پر] عمل نہ ہو سکا۔ عام روش کے برعکس وہ کثرت [سے زنان] خانے جاتے رہے اور دوسرے ہی دن انہیں چند [لمحوں کے] لیے یاسمن سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔ انہوں [نے] ارادۂ عزم کے سابق درس کی تکرار کی۔ یاسمن نے ظفر کے خط کا جواب ان کے سپرد کر دیا۔ نصیر بابا کو ... حد تک اچھی اردو آتی تھی مگر انہوں نے سرِ راہ ایک ... روک کے عام سے کاغذ پر چند سطری تحریر لکھوا لی۔ ... کو اردو نہیں آتی تھی۔ نصیر بابا جو بولتے گئے وہ ان[جان شخص] لکھتا گیا۔ کسی اور اجنبی سے نصیر بابا نے ظفر کا پتہ درج کرایا اور یاسمن کے خط کے ساتھ اپنا رقعہ لفا[فے میں بند]

کر کے لیٹر بکس میں ڈال دیا۔ انہوں نے مرسل کا نام بھی لفافے پر نہیں لکھا' نہ اپنے خط میں۔ ان کے مختصر خط کا متن بہت سادہ تھا۔ انہوں نے لکھوایا تھا کہ دوسرا خط آنے تک ظفر اپنی جگہ ٹھہرا رہے جب اسے بلایا جائے' تبھی آئے اور اگر اپنی مرضی سے آئے تو ان سے ملنے کی کوشش قطعاً نہ کرے۔ اسے امید رکھنی چاہیے شاید وہ جلد ہی اچھی خبر سے اسے مطلع کر سکیں۔

وعدے کے مطابق ظفر کو انہوں نے جواب بھیج دیا تھا لیکن وہ کچھ نہیں جانتے تھے کہ اچھی خبر سے جلد مطلع کرنے کا یہ دوسرا وعدہ کس طرح اور کب پورا کر سکیں گے۔ پہلی بار خط کا جواب مل جانے کے بعد ظفر کے وقف و تامل پر انہیں شک تھا' اور تحریر اگر فرزاں کی ہے تو ظفر کے حال کا تو خدا حافظ۔ کئی روز گزر گئے۔ یاسمن نے اشارتاً ان سے ایک بار ظفر کا ذکر چھیڑا۔ نصیر بابا نے کچھ نہیں چھپایا' صاف بتا دیا کہ انہوں نے ظفر کو دھن باد میں روکے رکھا ہے' اس کا اس شہر میں آنا مناسب نہیں ہے۔ انہوں نے اسے خط لکھنے سے بھی منع کر دیا ہے۔ وہ ڈاک کے ذریعے تو کوئی خط یہاں بھیج ہی نہیں سکتا۔ جب تک وہ یہاں نہ آئے' خیریت نامے کا امکان نہیں۔ دھن باد اتنی دوری پر نہیں ہے' کسی دن کسی بہانے وہ خود اس سے ملنے وہاں جائیں گے۔ یاسمن ان سے اصرار یا ضد کرنے کا ناز نہیں کر سکتی تھی حالانکہ اس ناز برداری کی نصیر بابا کو بڑی حسرت تھی۔ دونوں بہنیں ان کی ہدایت کے عین مطابق غم فراموشی اور زندگی میں رغبت کے وظیفے پر بہ تدریج عمل کر رہی تھیں۔ سید صاحب' رئیس بیگم اور ملازم' فرزاں اور یاسمن میں اتنی سرعت سے امید کی بحالی اور زندگی کی طرف مراجعت کے آثار پر بہت شاداں تھے۔ سید صاحب تو جب وہ سامنے آتیں' بقول شخصے' دیدہ و دل فرشِ راہ کر دیتے۔ رئیس بیگم ان کے اشارے سونگھتی پھرتی تھی۔ ملازمہ کے خیال میں فرزاں اور یاسمن میں یہ قرار اور استغنا مولوی معظم علی کے عطا کیے ہوئے وظیفے کی کرامت تھی۔ سید صاحب اسے رئیس بیگم کی مشاقی کا کرشمہ سمجھتے تھے۔ انہوں نے اس حسنِ خدمت کے اعتراف میں ایک جڑاؤ گلوبند رئیس بیگم کے زیب گلو کیا۔ فرزاں اور یاسمن نے سیاہ لباس کے بجائے رنگ برنگے کپڑے پہننے شروع کر دیے تھے۔ وہ گھر میں اپنی ماں خانم کے نقش خود ہی مٹا رہی تھیں۔ کوئی ان کے سامنے مرحومہ کا ذکر کر بیٹھتا تو وہ چپ سادھ لیتیں جیسی ان کی ماں کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ انہوں نے اپنی آنکھیں آنسوؤں سے عاری کر لی تھیں۔ عمران کی زیادہ نہیں تھی' تجربہ بھی کچھ نہیں تھا لیکن پہلی شرط تو آدمی کا عقل و ہوش سے آراستہ ہوتا ہے۔ کتابیں تو وہ مستقل پڑھتی رہی تھیں۔ کتاب پڑھنے والا آدمی زیادہ دیکھتا' زیادہ سنتا ہے۔ جو استاد نہیں کہہ پاتے' وہ کتابیں سکھا دیتی ہیں۔ سید صاحب نے بھی اپنے گھر میں ان کے لیے کتابوں کے ڈھیر لگا دیے تھے۔

وقت گزرنے پر نصیر بابا کے سر میں جالے پڑنے لگے۔ انہوں نے اپنی دانست میں کئی دروازے کھول دیے تھے مگر اب سمتیں جیسے ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھیں۔ ظفر سے رابطہ ہو جانے' گھر میں فرزاں اور یاسمن کے گرد پاس بانوں کا حصار ٹوٹ جانے سے یہ مراد کہاں تھی کہ حصار ٹوٹ گیا' پاس بانوں کو موت آ گئی۔ اب کچھ بھی نصیر بابا کی دسترس سے دور نہیں' کچھ وقت اور جاتا' کسی خوشگوار دن اور مبارک ساعت میں فرزاں اور یاسمن کو ایک اشارے کی ضرورت پڑے گی اور منزلیں سر ہو جائیں گی۔ درمیان میں حائل پتھروں اور کانٹوں کا نصیر بابا کو اتنا اندازہ نہیں تھا۔ اونچی اونچی دیواروں' پتھروں سے بھرے ستونوں پر استوار چار دیواری' مسلح دربان اور نمک کا احترام کرنے والے' خدا سے زیادہ ناخداؤں پر اعتبار کرنے کی سرشت رکھنے والے غلاموں سے آگے' دور دور تک سید صاحب کا سکہ چلتا تھا۔ نصیر بابا سید صاحب کے ہم مشربوں میں ایک ایک سے واقف تھے' کیسے کیسے بلند اقبال' زور و اثر والے ان میں شامل تھے۔ وقت گزرا جا رہا تھا' دیر ہو جانے سے اور پیچیدگیاں پیدا ہونے کا احتمال تھا۔ زنان خانے جا کے فرزاں اور یاسمن کے سامنے نصیر بابا کا سر جھک جاتا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی ان کے چہرے پر بکھری آرزو میں نصیر بابا کو بہت آزردہ' بہت سراسیمہ کرتی تھیں' سوچتے سوچتے ان کے اعصاب جواب دینے لگتے تھے۔ ان کی منشا کی تعمیل میں فرزاں اور یاسمن نے خود پر کیسا جبر کیا ہے۔ بہروپ بھرنے والوں کے سامنے بہروپ بھرنا ایک اذیت ناک مشقت ہے۔ کب تک وہ اس سوگ' اس تماشے پر قادر رہیں گی۔ کسی دن ان کا پیمانہ چھلک سکتا ہے۔ خواب اور تعبیر میں اتنی فصیل نہیں ہونی چاہیے۔

نصیر بابا کو رئیس بیگم کی طرف سے بڑی فکر تھی۔ وہ بزعم خود اس خوش گمانی سے سرشار تھی کہ ماں کی موت سے فرزاں اور یاسمن کے نہاں خانے میں جو اندھیرا رچ چکا تھا' اسے اس نے اپنی حکمت سے اجالے میں بدل دیا ہے۔ یہ پہلا مرحلہ تھا۔ پہلے مرحلے کی تکمیل کے بعد اب وہ دوسرے مرحلے کے تیز و تفنگ' دشنہ و خنجر صیقل کر رہی ہوگی۔ دوسرا

مرحلہ خانم کی طرح اس کی بیٹی فروزاں پر اپنے جوہر آزمانے کا ہے۔ سید صاحب نے ابھی سے بے صبری کا اظہار شروع کردیا ہوگا۔ بے شک اب کے رئیس بیگم ناکام ہوجائے گی کہ اس کے سامنے خانم نہیں' فروزاں ہے۔ سادہ شعار خانم کو رئیس بیگم کی صورت شناسی سے زیادہ دیکھنے اور سمجھنے کی فرصت نہیں ملی تھی۔ خوش قسمتی سے خانم کی بیٹی فروزاں کو رئیس بیگم کی سیرت آشنائی کا موقع فراہم ہوگیا ہے۔ مگر اس گھر میں تو رئیس بیگم کی موجودگی کا ایک ہی جواز ہے۔ اس کا تمام عزو افتخار اس کے کارفسوں کے سبب سے ہے۔ وہ ایسی آسانی سے پسپائی قبول نہیں کرے گی۔ اس لیے کہ اسے اس کی عادت نہیں ہے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اپنے آقا' اپنے ولی نعمت کی نظروں میں سرخروئی کے لیے پھر وہ کون سا حیلہ تراشے' کون سا پینترا بدلے' وہ انگلیاں ٹیڑھی کرنا بھی جانتی ہوگی اور فروزاں کا آب گینہ تو اس کی ماں سے زیادہ نازک ہے۔ وہ کہاں تک اپنی سپر کا بوجھ اٹھا سکے گی۔

وقت چپکے سے اور گزر گیا۔ نصیر بابا نے گھر سے باہر جا کے ظفر کے نام ایک اور خط کسی سے لکھوایا۔ انہیں اس کا بھی بہت خیال تھا۔ پہلے کی بات اور تھی' ظفر ہاتھ پیر چھوڑ بیٹھا تھا۔ نصیر بابا نے اس کی آنکھوں میں دوبارہ خواب جگا دیے تھے' اب اس کا حال دگر ہوگا۔ نصیر بابا نے تصدیق نہیں کی تھی مگر انہیں یقین تھا کہ فروزاں نے ان کی ہدایت سے بیش و کم ظفر کو کچھ نہیں لکھا ہوگا لیکن جتنا بھی لکھا تھا' ظفر کے لیے یہ ایک مقسود و مطلوب کی تحریر تھی۔ ظفر کے روز و شب تو پھر اس کے بس میں نہ رہے ہوں گے۔ نصیر بابا کا خط ملنے کے دوسرے ہی دن ظفر آسن سول آگیا۔ شہر سے دور ایک غیر آباد مقام کی سنسان مسجد میں ان کی ملاقات ہوئی۔ انہیں دیکھ کے ظفر نے سوالوں کی یورش کردی۔ نصیر بابا اس سے اتنا ہی کہہ سکے کہ وہ ایک آدھے' ادھورے آدمی ہیں' اپنی بساط کے اعتبار سے معذور بھی۔ جسمانی نقص سے آلودہ ہی معذور نہیں ہوتا' غلام بھی معذور رہوتا ہے' بے اختیار بھی معذور سے کم نہیں ہوتا۔ دنیا میں بہت سے آدمی اپنا کوئی وجود نہیں رکھتے' وہ بھی ان میں سے ایک ہیں۔ نصیر بابا کو اپنی بے امانی' بے سروسامانی' جسم و جاں کی ناتوانی کا ایسا احساس کبھی نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے ظفر سے کہا کہ وہ حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے' صرف اس قدر کہ اسے ان کی طرح آسمان سے لو لگانی چاہیے۔ وہ آسمان نشیں بھی تو سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ کیا ظفر بھول گیا' اس نے بھی تو کوئی گوشہ نہیں چھوڑا تھا' قانون' پولیس سفارشیں' دہائیاں۔ اس دن ظفر' نصیر بابا

کے بجھے ہوئے چہرے اور کمہلائی ہوئی باتوں سے آسودہ ہوا مگر نصیر بابا' ایک تہی دست اسے دے بھی کیا سکتے تھے۔

نصیر بابا خاکے بناتے اور فسانے وضع کرتے ر... ایک دن' کاش ان کے پاس جادو کی چھڑی آجائے... صاحب' رئیس بیگم' ملازم' دربان اور چار دیواری... ممکنہ تعاقب کاروں کی بصارت اس چھڑی سے زائل... یا پھر ایسا ہو' کسی دن سید صاحب زمینوں کے دورے وقت کے لیے گئے ہوئے ہوں تو خنجر بدست نصیر بابا... خانے میں داخل ہوجائیں' پھر کوئی بھی ان کے آڑے... یا وہ سید صاحب کی شکاری بندوق پر قبضہ کرلیں۔ بس... اتنا وقت چاہیے کہ سید صاحب کے والا مرتبت افسران عالی مقام کی قلم رو سے وہ پرے ہوجائیں... کوئی لغزش سرزد نہ ہو' فروزاں اور یاسمن کو کوئی گز... سکے۔ درمیان میں کہیں' کسی جگہ وہ ملوث ہو گئیں... چھوئی موئی کے مانند ہیں۔ گھر کی بات اور ہے' با... دوسری ہے۔ نصیر بابا کو اپنے آپ پر شک ہونے لگ... سے کوئی نادانی تو نہیں ہو رہی؟ انہیں یہ گمان ہوتا... صاحب ان سے کچھ محتاط ہوگئے ہیں۔ گھر کے ملا... نظریں بھی انہیں کبھی کبھی بدلی ہوئی لگتیں۔ انہیں... کھٹکا لگا رہتا کہ کسی کو ذرا بھی ان پر شک ہوگیا تو... نہیں رہے گا۔

یوں ہی دن گزرتے گئے اور نصیر بابا' فروزاں کا سامنا کرتے ہوئے پہلو کترانے لگے۔ بس ا... فیصلے کا عزم انہیں توانا رکھتا تھا اور وہ تنہائی میں... عزم کی تجدید کرتے رہتے تھے۔ انہیں صرف' ... یاسمن کے لیے ایک گوشۂ اماں کا یقین چاہیے تھ... فکر انہیں مطلق نہ تھی۔ اس کے بعد سارے ب... سزاؤں کے لیے گریباں چاک کرنے کی ہمت ا... موج زن تھی۔ پھر انہیں موت آجائے یا ان ک... تجویز کردی جائے۔ انہیں معلوم تھا کہ ایسی مو... نہایت اعلا ہوگی۔

اور پھر خدا نے' ان کے بقول "بابا صاحب... میں ایک صاحب دل بھیج دیا۔ اس دوران حسـ... مہمان آئے' بڑے بڑے صاحبان زر اور صاحبا... بات کے دھنی' قول و فعل کے پکے۔ نصیر بابا... مانوس بھی تھے' ان کا بڑا احترام کرتے تھے مگر... زبان کھولنے کی توفیق نصیر بابا کو نہ ہو سکی۔ جا...

کو دیکھ کے انہیں ایسا لگا جیسے انہیں بس اسی کا انتظار تھا پھر انہوں نے دیر بھی نہیں کی۔

سبزہ زار کی بینچ پر بیٹھے ہوئے ہمیں خاصا وقت ہوگیا تھا۔ نصیر بابا کا گلا ویسے بھی خشک ہونے لگا تھا اور اب کچھ کہنے کو بھی نہیں رہ گیا تھا۔ میں نے ان کی کمر پہ ہاتھ رکھ کے تسلی دی تو وہ سسکنے لگے۔ میں نے ان کا بازو پکڑ کے انہیں اٹھا دیا۔ میرے جسم میں اینٹھن ہو رہی تھی۔ بٹھل تو چوسر اور شطرنج کی طرح سوچ بچار میں لگا رہے گا۔ جی کرتا تھا' میں ہی جا کے سید محمود علی کو دیکھوں۔ میں بھی کوئی فیصلہ کرنے کی استطاعت رکھتا ہوں' میرے یہ ہاتھ پیر کس کام کے ہیں۔ سبزہ زار سے اٹھ کے ہم راہ داری میں آگئے۔ یہاں تیز روشنی تھی۔ بٹھل نہ کمرے کے باہر موجود تھا نہ کمرے کے اندر۔ نصیر بابا مجھ سے الگ ہو کے عمارت کے وسطی حصے کی جانب چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں کسی گوشے سے ابن نمودار ہوگیا۔ مجھ سے کمرے میں بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔ سینے میں بڑی کھولن ہو رہی تھی۔ ابن نے کھانے کے لیے پوچھا تو میں نے منع کردیا۔ میرے لہجے میں ترشی پر وہ چونک پڑا اور معذرتی انداز میں بولا کہ پہلے بھی وہ دو مرتبہ آچکا ہے۔

بٹھل نے اس سے کہہ دیا تھا کہ میں دیر سے کھاؤں گا اور جب ضرورت ہوگی' اسے طلب کرلیا جائے گا۔

بٹھل کے بارے میں استفسار پر ابن نے بتایا کہ چند منٹ پہلے وہ کھانے کے کمرے کی طرف گیا ہے۔ سید صاحب کے مہمانوں کو رخصت ہوئے پندرہ بیس منٹ ہی ہوئے ہوں گے' اس لیے آج کھانے میں دیر ہوگئی۔ اس گھر میں اب کچھ کھانے پینے کو دل ہی نہیں کرتا تھا' اتنا کچھ جانتے ہوئے جانے کس طرح بٹھل شکم پری کا مشغلہ جاری رکھے ہوئے تھا مگر آج کی بات تھوڑی ہے' اسے تو پہلے ہی سب کچھ معلوم ہوچکا تھا اور کھانا ترک کردینے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ جگہ کس کی تھی' یہ سازو سامان' یہ خدمت گار۔ ابن کے ساتھ میں بھی غیر ارادی طور پر کھانے کے کمرے تک چلا آیا لیکن دروازے میں داخل ہوتے ہی میرے قدم ٹھٹک گئے۔ مجھ سے ابھی شاید اس شخص کا سامنا نہ ہوسکے۔ بٹھل کی طرح مجھ سے یہاں نہیں بیٹھا جائے گا۔ میرے لیے یہی بہتر تھا کہ واپس چلا جاؤں۔

ابن نے اندر جا کے بتا دیا کہ میں باہر ٹھہرا ہوا ہوں۔ اسی لمحے اندر سے سید صاحب کی حلاوت آمیز آواز گونجی "ارے بھئی' آیئے آیئے بابر میاں! باہر کیوں رک گئے۔ مبارک ہو' آج تو مٹھائی کھلانے کا دن ہے۔ واہ وا! ماشاء اللہ۔"

سید صاحب اندر سے اٹھ کے میرے سامنے آگئے۔

انہیں دیکھ کے آنکھوں میں دھند اتر آئی تھی۔ سید صاحب نے میرا بازو تھاما تو سارا جسم متزلزل ہوگیا۔

چند لمحوں کے لیے دماغ سن ہوگیا تھا۔ اس کشادہ اور مرصع طعام گاہ میں پہلی بار میرا آنا ہوا تھا۔ یہاں مغربی و مشرقی' دونوں طرز کے انتظامات تھے۔ کمرے کے وسط میں وسیع میز کے اطراف کرسیاں رکھی تھیں اور سامنے کی دیوار کے ساتھ تخت بچھا تھا۔ چھت کے بیچ میں فانوس لٹک رہا تھا۔ دیواروں پر ابھرے ہوئے گل بوٹے کندہ تھے اور ان میں شیشے جڑے تھے۔ فرش پر قالین چسپاں تھا۔ چاروں طرف دیواروں کے ساتھ صوفے پیوست تھے "کہیے' اب کیا حال ہے۔ آج تو شہ زادے بہتر دکھائی دیتے ہیں۔" سید صاحب مسکراتے ہوئے مجھے تخت تک لے آئے "بسم اللہ کیجیے۔ آج واقعی بڑا وقت ہوگیا ہے۔ کیا بتائیں' پٹنے سے ایک پرانے واقف کار سرکاری افسر جب بھی اس طرف آتے ہیں' غریب خانے ضرور تشریف لاتے ہیں' اور جناب اچانک آدھمکتے ہیں۔ ساتھ میں ان کے دو تین احباب بھی تھے۔ محفل جم گئی۔ کھانے کا وقت ہوگیا تھا۔ میں نے گزارش بھی کی مگر وہ کہیں اور مدعو تھے۔" انہیں فوراً خیال آیا "ارے' وہ آپ کا تو پرہیزی کھانا چل رہا ہوگا۔ آپ نے کھانا کھالیا؟"

مجھے جواب دینے میں تامل ہوا۔

"کہاں کھو گئے؟" سید صاحب نے شگفتگی سے مجھے ٹہوکا دیا۔

"جی!" میں نے سٹپٹا کے کہا "جی نہیں' مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"رات کو تو کچھ نہ کچھ ضرور کھانا چاہیے اور بھوک نہ لگنا عالی جناب! اچھی نشانی نہیں ہے۔ دوا تو چل رہی ہے نا؟"

میں نے بمشکل اقرار میں سرہلایا۔

"ولایتی دوا سے پہلے کچھ کھانا کھالینا بہتر ہوتا ہے' میرا خیال ہے' ہمارے ساتھ ہی بیٹھ جایئے۔ یہاں بھی چند ایسی چیزیں ہیں جو آپ اطمینان سے کھا سکتے ہیں۔"

"رہنے دو صاحب!" بٹھل نے دخل دیا "بھوک سے کھائے تو ٹھیک ہے۔"

"یہ بھی مناسب ہے۔" سید صاحب نے برملا اس کی تائید کی اور اچھا ہوا کہ ان کی توجہ بٹھل کی جانب ہوگئی "تو پھر آپ نے کیا کیا دیکھا یہاں؟"

"اتنے میں کیا دیکھتے' سارا ٹائم چکر میں رہے۔"

"میرے ساتھ چلتے' یہاں اردگرد کے علاقے' خصوصاً چاۓ باسا اور پوردلیا شہر میں مسلمانوں کی مدرسوں سے تھوڑی بہت واقفیت ہے۔ قبلہ مولوی شفیق اس طرف کہیں ہوتے تو مجھے ضرور خبر ہوتی اور وہ اتنے قریب رہ کے یہاں کیوں نہ آتے۔"

"ان کو آنا ہی نہیں تھا۔ ادھری اتنے دن بند رہ کے گانٹھ پڑنے لگی تھی۔ کھلے میں جا کے تھوڑے ہاتھ پاؤں بھی کھلے۔ آدمی کو جانور سے زیادہ ہریالی کی ضرورت پڑتی ہے' چرتا نہیں تو کیا ہوا' آدمی بھی جنگل کا جانور ہے۔"

"بے شک' سبزہ زندگی ہے۔" سید صاحب چہکتی آواز میں بولے "اور یہاں کے کیا کہنے' یہاں تو زمین سے سبزہ ابلتا ہے۔ وہ جو کہتے ہیں' زمین سونا اگلتی ہے' یہاں کی زمین سونا نہیں' ہیرے موتی اگلتی ہے۔"

"اپنے کو ادھری منہ مارنے کو چھوٹا موٹا ٹکڑا مل جاۓ گا؟" بٹھل نے دھیرے سے پوچھا۔

سید صاحب اچھل پڑے "کیوں نہیں' چھوٹا موٹا کیا' آپ اشارہ کیجئے' بلکہ پہلے ارادہ تو کیجئے' لیکن..." وہ جھجکتے ہوۓ بولے "اور جگہوں کے مقابلے میں یہاں زمین کسی قدر مہنگی ہے۔"

"اب مہنگا سستا کیا دیکھنا' آپ جو پھوکٹ میں ملوگے۔"

سید صاحب نے قہقہہ لگایا "ہاں ہاں' آپ نے صحیح کہا' بالکل صحیح کہا۔" پھر وہ سنجیدہ ہو کے بولے "آپ فرمائیں تو کھوج لگاؤں؟"

"یہی بول رہے ہیں۔"

"ذرا سوچ لیجئے' بڑا فیصلہ ہے۔ کہاں بمبئی' کہاں یہ گاؤں آسن سول۔"

"ادھری آپ جو ہو۔"

"میں' میں کیا' ذرہ نوازی ہے آپ کی۔"

"سارا آپ پر ہے' ادھری پاس رکھنا چاہتے ہو کہ نہیں۔"

"اس سے بڑی خوشی کی بات میری لیے کیا ہو سکتی ہے۔ میں کل ہی نگاہ دوڑاتا ہوں' کچھ عرصہ گزرا' کسی نے مجھ سے کہا بھی تھا بلکہ یاد آیا' لیجئے' کل رات ہی دعوت میں کلکٹر صاحب اپنے کسی عزیز کی زمین کا ذکر کر رہے تھے۔"

میں تخت کے پاس صوفے پر بیٹھا ان دونوں کی گفتگو سن رہا تھا اور میری آنکھیں جل رہی تھیں کہ بٹھل یہ کس قسم کی باتیں کر رہا ہے۔ وہ تو اس طرح سید صاحب سے شیرو شکر

ہے جیسے کوئی اور بات ہی اس کے دماغ میں نہ ہو۔ جیسے نصر بابا نے جو کچھ مجھے بتایا ہے' بٹھل اس سے ناآشنا ہو۔

"آپ کا کیا خیال ہے بابر میاں؟" یکایک سید صاحب نے میری جانب پہلو بدل لیا "آپ کو یہ علاقہ کیسا لگتا ہے؟"

"جی' جی ہاں' اچھا ہے۔" میں نے ہکلاتی آواز میں "بہت اچھا ہے۔"

"آپ کیا کہتے ہیں؟ لگتا ہے' بابا صاحب نے تو یہیں ڈیرے ڈالنے کی ٹھان لی ہے۔"

میں بٹھل کی تائید کے سوا کیا کر سکتا تھا۔

"ایک اہم بات تو رہ گئی۔" سید صاحب نے شائستگی سے پوچھا "کم از کم کتنی زمین کی بات کی جاۓ؟"

"جتنی آپ ٹھیک جانو۔"

"یہ تو گز ڈالنے والی بات ہے صاحب! اب بات ہزاروں تک جاتی ہے' کہیں کہیں تو اس سے زیادہ' بہت زیادہ' مجھے ایک اندازہ تو ہونا چاہیے۔"

"اپنے کو پتہ نہیں' آپ جیسا بولو۔"

"اس طرح کیسے؟" سید صاحب کسی قدر بے چینی سے بولے "میری تو یہی خواہش ہوگی کہ آپ کی یہاں سب سے بڑی زمین ہو' کچھ مزا تو آۓ۔"

"پھر آپ بڑی کی بات کرلو' جتنی چاہے بڑی' بعد کو چھوٹی رہ جائی گی۔ مٹھی بھی شاید بڑی پڑ جاۓ۔"

"نہیں صاحب' یہاں میں آپ سے اتفاق نہیں کرتا جو آپ فرما رہے ہیں' وہ تو ہونا ہی ہے' سب یہیں دھرا رہ جاۓ گا۔ وہ جو کہتے ہیں' جب لاد چلے گا بنجارہ مگر یہ زندگی کوئی خواب ہے؟ یہ کوئی جھوٹ ہے؟ یہ بھی تو ایک سچ ہے اور جب تک ہے' اس کا پورا سواد کیوں نہ لیا جاۓ' اگر سواد دستیاب ہو سکتا ہو۔ زندگی میں رس بھی بہت ہے۔ کسی کو نظر نہ آۓ اور کوئی منہ پھیرے رکھے تو اسے کیا کہیں گے آپ کیا اس آنے والی زندگی کے لیے سامنے کی اس زندگی پر خاک ڈال دی جاۓ؟ نہیں صاحب نہیں' یہ بات اپنے آج تک نہیں پڑی۔"

"پر اپنے نرت بھاؤ میں تھوڑا دوسروں کا بھی دھیان رہے۔"

"کیا مطلب؟ معاف کیجئے' میں سمجھا نہیں۔" سید صاحب کا چہرہ تمتمانے لگا۔

"جانے دو صاحب!"

"نہیں نہیں' آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"کیا بولیں۔ دیکھا ہے' اپنی رنگ بازی کبھی دوسروں

بھی الٹی سیدھی چل جاتی ہے۔ کبھی کسی سے سنا تھا' لکھشمی کی طرف بھاگتے بھگاتے بیچ میں پڑنے والوں کا دھیان نہیں رہتا اور جدھر رو کڑے سے پوٹا تر ہوتا ہے' ادھری کسی کا گلا ضرور دبا ہوتا ہے۔ دھن کے بنا نوٹنکی بھی نہیں ہوتی۔ ایک کے بعد ایک' ایک سے بڑھ کے ایک۔ آدمی کو پھر نکٹ پار کا پتا نہیں۔"

"آہا ہا۔" سید صاحب نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ ان کی آنکھیں بھی بند ہو گئیں۔ نیاز مندانہ انداز میں بولے "واقعی جس نے کہا ہے' اچھا کہا ہے۔ جہاں تک ناچیز کا معاملہ ہے' کوشش تو یہی رہتی ہے' اپنے عیش و عشرت میں کسی دوسرے کا ضرر نہ ہو۔ آپ یہاں دیکھ ہی رہے ہیں۔"

"اچھی طرح سے دیکھ رہے ہیں۔"

"بس ہنس کھیل کر گزار لیتے ہیں' اور ہے بھی کیا' چند روزہ زندگی ہے جناب! اپنا تو اصول ہے' جو ملے اسے ٹھکراؤ نہیں' جو نہ ملے' اس کی جستجو کرو' ہاتھ پاؤں چلاؤ' دماغ لڑاؤ' پھر بھی نہ ملے تو راستہ بدل لو۔ معلوم ہے' کوئی یوں آ کے تو جھولی میں ڈالنے سے رہا۔"

"ایسے کتنی بار راستہ بدلا کیا ہے؟"

"جی!" سید صاحب پلکیں جھپکانے لگے "سچ پوچھئے تو ابھی تک اس کی نوبت نہیں آئی۔"

بٹھل نے کوئی تبصرہ نہیں کیا' شکر ہے' بات آگے نہیں بڑھی ورنہ سید صاحب کچھ کھٹک گئے تھے "ہم کیا بات کر رہے تھے؟" انہوں نے الجھے ہوۓ لہجے میں پوچھا۔

بٹھل کے یاد دلانے پر ان کی آواز دمک اٹھی "ہاں' میں کہہ رہا تھا جناب! ایسے نہیں' میرے لیے کوئی حد مقرر کر دیجئے۔ تاکہ میں اس کے اندر یا اس کے آس پاس ہی حساب کتاب پھیلاؤں۔"

"آپ کے لیے کوئی نہیں' جو حد آپ چاہو۔"

"یہ کیسی بات کر رہے ہیں آپ؟ شاید آپ سنجیدہ نہیں معلوم ہوتے۔"

"گز کی بات بولتے تھے آپ! اپنے پاس اس کی کمتائی نہیں ہے۔"

"ماشاء اللہ' خدا کا فضل و کرم کہیۓ۔ یہ بات ہوئی نا۔" سید صاحب کی آواز میں حیرت شامل تھی۔ ان کی نظریں بٹھل پر مرکوز ہو گئیں "دیکھیے' میں دیکھتا ہوں۔" وہ تذبذب سے بولے "لیکن اچھا ہوگا' آپ بھی ساتھ ایک نظر دوڑالیں۔"

"آپ سے اچھی نہیں ہے اپنی۔ دور کی' پاس کی' سبھی

میں انیس ہے یا ٹیڑھی بولو۔"

"کسر نفسی تو کوئی آپ سے سیکھے۔" سید صاحب مسکرانے لگے "میرا کہنا تھا' اب تو بابر میاں بھی روبہ صحت ہیں' آج کی طرح آپ کل بھی نکل سکتے ہیں۔"

"پہلے آپ پکی کرلو' اور آپ کے ہوتے اپنے کو کیا دیکھنا۔"

"مجھ پر اتنا اعتبار مت کیجئے' میں بھی انسان ہوں۔"

"آپ جیسا ابھی تک نہیں دیکھا۔"

ایک لمحے کے تردد و توقف کے بعد سید صاحب کھل کھلا پڑے "خدا میری لاج رکھے' آپ مجھے کانٹوں میں گھسیٹ رہے ہیں۔"

"ابھی تو کانٹوں کی بات ہے' آگے دیکھو صاحب!"

شیرینی کے پیالے پر یک لخت سید صاحب کا ہاتھ رک گیا' پھر انہوں نے جلدی سے چمچہ منہ میں رکھ لیا "تیار ہیں صاحب! چلئے یوں ہی سہی' آپ جان مانگئے۔"

کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہا تھا کہ زمین کی بات چھیڑنے اور طول دینے میں بٹھل کی کیا منشا ہو سکتی ہے مگر یہ تو ایک طویل مرحلہ تھا۔

"ایک بات بولیں مہاراج! اپنے کو جلدی ہے' ابھی آگے بھی جانا ہے۔" بٹھل نے رکھائی سے کہا "یہ سامنے رکھنا۔"

"آگے جانا ہے مگر ابھی تو آپ...!"

"وہ تو آپ ادھری ہو' جب بولوگے' لوٹ آئیں گے' ادھری دن ہو گئے۔ تھوڑا گھربار بھی دیکھنا ہے۔"

"مگر ابھی آپ کو جانا نہیں چاہیے۔ آپ بھول گئے۔ ڈاکٹر کشن نے کیا کہا تھا' بابر میاں کو پورے ہفتے آرام کرنا چاہیے۔"

"یہ تو شکرا ہے صاحب۔"

"یہ ایک بڑی بیماری سے اٹھے ہیں۔ ابھی دوا جاری ہے' ٹائیفائڈ تھا انہیں۔" سید صاحب زور دے کے بولے "ٹائیفائڈ کے بعد کم از کم ہفتے بھر مکمل آرام ضروری ہے۔"

"نہیں صاحب! میں آپ کو مشورہ نہیں دوں گا۔ کم از کم چند دن تو اور ٹھہریے۔ باقی آپ کی مرضی' میرا ارادہ تو بابر میاں کی صحت کی بحالی پر چھوٹا موٹا جشن منانے کا تھا۔"

بٹھل نے بحث نہیں کی' کہنے لگا کہ وہ اپنی یہ حسرت بعد میں بھی پوری کر سکتے ہیں۔ زمین وغیرہ کی کوئی بات طے پا گئی تو ہمیں واپس آنا ہی ہے۔ یہ جشن اس وقت تک کے لیے موخر کیا جا سکتا ہے۔

"ارے صاحب!" سید صاحب مچل کے بولے "کل پہ اتنا اعتبار کون کرے، کل کس نے دیکھی ہے۔ خوشی کے لمحے ارزاں ہوں تو لوٹ لینے چاہئیں۔ زیادہ بڑی نہیں، چھوٹی سی محفل رکھیں گے۔ اس بہانے یہاں کے بعض خاص لوگوں سے آپ کا تعارف بھی ہو جائے گا۔"

"آپ کے بعد اب کسی سے جان پہچان کیا کرنا۔"

"یہ تو آپ کی نوازش ہے۔" انکساری میں سید صاحب کا جسم سمٹ گیا "اصل میں وہ لوگ ابھی شہر میں ہیں۔" وہ رازداری سے بولے۔

"کون صاحب؟" بٹھل نے چونک کے پوچھا۔

"ارے جناب وہی، جو کل رات ہربرٹ اینڈریو کمشنر صاحب بہادر کی دعوت میں خاص طور سے بلائے گئے تھے۔ یاد رکھے جانے والے لوگ ہیں، اپنے فن میں طاق، ہر لحاظ سے یکتا دیگانہ۔ ساری رات جادو جگائے رکھا، رات بھر بجلی چمکتی رہی۔ ابتدا ہی میں مجھے آپ کے صاحبِ ذوق ہونے کا اندازہ ہو گیا تھا۔ خود آپ نے بھی فرمایا تھا کہ سُرتال سے دلچسپی ہے، نرت کا بھی شوق رکھتے ہیں۔ کل رات آپ بہت یاد آئے۔ بس کیا بتائیں، کیسی محفل رہی۔ کم کم ایسا دیکھا ہے۔ کمشنر صاحب بھی دنگ رہ گئے۔ چیدہ چیدہ لوگوں کا اجتماع تھا۔ خوب جماؤ رہا۔ کمشنر صاحب کو آج دلی جانا تھا۔ میں نے گزارش کی تھی، آج رات غریب خانے کو عزت دی جائے۔ افسوس کا اظہار کرنے لگے کہ دلی میں طلبی ہے، رک نہیں سکتے۔ خاک سار سے تو بہت خوش ہیں۔ ایک بار بس شکار کھلوایا تھا، اہتمام البتہ خاصا کر لیا تھا، بساط سے کچھ زیادہ۔ جنگل میں منگل کا سماں ہو گیا تھا۔ یہ گورے بھی کمال کے نشانے باز ہوتے ہیں۔ اچھی دھما چوکڑی رہی۔ رات کو جنگل میں محفل بجی۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، ایسی یاد اللہ ہوئی کہ کیا عرض کروں۔ اس طرف دورہ ہوتا ہے تو ضرور طلب کرتے ہیں۔ پوچھتے رہتے ہیں، کوئی پریشانی تو نہیں ہے، کوئی کام ہو تو بتاؤ۔ خادم نے اپنا کوئی کام ان سے نہیں کرایا ہے۔ ہاں، ایک بار مجبور ہو گیا۔ ادھر قریب کے علاقے رام گڑھ میں ایک بڑے زمیں دا لالہ بشن داس رہتے ہیں۔ حالات آدمی کے ایک جیسے نہیں رہتے۔ قرض لینے کی نوبت آ گئی۔ پرکھوں کی زمین گروی رکھنا پڑ گئی پھر کسی طرف سے کوئی انتظام ہوا تو قرض خواہ کی نیت میں بل آ گیا، ہیر پھیر کرنے لگا، آئیں بائیں شائیں کرتا رہا۔ مقصد وقت گزارنا تھا کہ لالہ کے پاس آنے والی رقم باقی نہ رہ سکے۔ وقت گزر گیا تو عدالت میں فیصلہ لالہ کے خلاف ہو گیا۔ آپ تو واقف ہی ہوں گے، ہر جگہ در پردہ الگ کھیل چلتا ہے۔ لالہ بشن داس کو کسی نے بتایا کہ گورے کمشنر سے سید محمود علی کی بڑی صاحب سلامت ہے۔"

ملازموں نے تخت پر بچھے ہوئے دسترخوان سے قابیں اٹھانی شروع کر دی تھیں۔ سید صاحب منتشر ہو گئے اور ناگواری سے ملازموں کو حکم دیا کہ وہ بہ عجلت اپنا کام نمٹائیں پھر انہوں نے بٹھل سے معذرت کی کہ وہ یہ کیا ذکر لے بیٹھے، ہمیں بے لطفی ہو رہی ہو گی۔ بٹھل نے ان کی توقع کے مطابق جواب دیا کہ ان کی تدبیر آمیز باتوں سے کوئی کیسے بے لطف ہو سکتا ہے، وہ سلسلۂ کلام جاری رکھیں، اور ہمیں جانا کہاں ہے۔ ملازموں نے قابیں اٹھا کے قہوے کا طشت تخت پر رکھ دیا اور سلیقے سے ہم تینوں کے لیے چھوٹی پیالیاں قہوے سے بھر دیں۔

"بس جناب!" سید صاحب قہوے کے گھونٹ سے تر کر کے بولے "ایک دن کیا دیکھتا ہوں، لالہ غریب خانے پر موجود ہیں۔ ضرورت بھی آدمی کو کہاں کہاں لے جاتی ہے۔ راجوں مہاراجوں سے تعلق ہے لالہ کا۔ اصطبل، جانور خانہ، بہت لاؤ لشکر ہے۔ میں نے کہا، مجھے بلا لیا ہوتا، آپ نے کیوں زحمت کی، مجھے شرمندہ کیا۔ کہنے لگے، غرض اپنی تھی بھیا۔ مدعا بیان کیا، کام پیچیدہ تھا، عدالتی فیصلہ ہو چکا تھا۔ اب عدالت میں جانے اور وہاں سے کوئی فیصلہ ہونے میں بال سفید ہو سکتے ہیں۔ میری عجب مشکل تھی۔ لالہ کو انکار کرنا بھی ممکن نہ تھا۔ لالہ جیسے ذی حیثیت آدمی کا گھر آنا، دستِ سوال دراز کرنا، آپ سوچئے، کیسے مخمصے میں پڑ گیا ہوں گا۔ ڈر تھا کہ اگر کہیں لاٹ صاحب گورے بہادر کے سمجھ میں نہ آئی؟ مجھ سے بیان کی کوتاہی ہو گئی؟ پھر لالہ کے سامنے کیا منہ لے کے جاؤں گا۔ خیر صاحب، کمشنر صاحب اس وقت پٹنے میں تھے۔ پٹنے جا کے ڈرتے ڈرتے خدمت میں حاضری کا خواستگار ہوا۔ باریابی میں دیر نہیں لگی۔ بے کم و کاست مدعا حضور والا کے گوش گزار کر دیا۔ کمشنر صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ منع بھی نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے کہا، معاملے میں پڑنے سے آپ کی ذات پر کوئی حرف آتا ہو تو میں واپس چلا جاتا ہوں۔ کہنے لگے، سید، تو پرامز، کوئی بات نہیں۔ فائل یہیں چھوڑ جاؤ، ہم دیکھتے ہیں۔ میں نے واپس آ کے یہی بات لالہ سے بیان کر دی۔ ہفتہ بھی پورا نہیں ہوا ہو گا کہ ایک روز لالہ گھوڑے پر سوار، ڈھول تاشے کے ساتھ، مٹھائی اور ہار پھولوں کے ٹوکروں سے لدے پھندے گھر آئے ہوئے، گلے سے لگا لیا۔ منہ چوما، کہنے لگے، سید! تم نے تو کمال کر دیا۔ وہ بدذات جیوتی رام حویلی آ کے کاغذات واپس کر گیا، اور کہہ گیا کہ پیسے جب چاہیں، بھجوا دیں۔ میں نے بھی اسی وقت منیم جی اور وکیل کے ساتھ ہرکارے دوڑا کے رقم بھجوا دی اور رسید حاصل کر لی۔ دیکھا آپ نے، گورے بہادر کا اقبال، اللہ اللہ۔ گورے بات کم، کام زیادہ کرتے ہیں۔ اور صاحب، کرشمہ کرتے ہیں، کرشمہ۔ سارے میں اس واقعے سے ناچیز کی رسوائی ہو گئی۔ اس کے بعد نہ پوچھیے، یہاں کے افسران جو پہلے ہی کم مہربان نہ تھے، ان کی شیدائیت کا حال کیا بیان کروں۔ بس جناب، بھرم رہ گیا۔" سید صاحب نے قہوے کی پیالی خالی کر کے بٹھل سے کہا "اتنی سمع خراشی سے مراد تھی کہ جان پہچان بڑے کام آتی ہے۔ رکھنی پڑتی ہے سلام دعا، غرض اور بے غرضی، دونوں صورتوں میں۔ اس سے زندگی آسان ہو جاتی ہے۔ شہر میں کہیں بھی اس عاجز کا نام لیجئے، اور۔۔۔" سید صاحب کانوں پر ہاتھ رکھ کے خود کو سرزنش کرنے لگے "بڑے بول سے توبہ، اللہ مجھے معاف کرے۔"

بٹھل سنتا رہا اور قہوے کی چسکیاں لیتا رہا "کچھ جان کے ہی ہم بھی داری ہوئے ہیں۔" اس نے مدھم لہجے میں کہا۔

"یہ تو آپ کی محبت ہے جو اتنی عزت دے رہے ہیں۔"

"کوئی کیا دے سکتا ہے، یہ تو آدمی خود لیتا ہے۔"

"ہاں جناب! کیا اچھی بات کہی آپ نے، عزت ایسی سڑک پر پڑی تو نہیں مل جاتی۔"

"اور ذلت کا بھی تھوڑا ہی چکر ہے۔"

"سید صاحب کا جسم تن سا گیا، زبان میں بھی لکنت آ گئی۔ یقیناً، سب کچھ، سب کچھ آدمی کے اعمال پر موقوف ہے۔ عزت، ذلت دونوں اپنے ہاتھوں میں ہوتی ہیں، اور عزت کی کمائی بڑی مشقت چاہتی ہے۔ ذلت کے لیے ایک نادانی بہت ہوتی ہے۔ آپ کتنی دل پر لگنے والی باتیں کرتے ہیں۔"

"پر دل ہی نہ ہو۔۔۔"

"ہاں ہاں جناب!" سید صاحب سر ہلانے لگے "دل کا ہونا بھی لازم ہے۔ دل ہونے کا مطلب صاحبِ دل ہونا نہیں ہے۔ لگتا ہے، ہماری آپ کی خوب چھنے گی۔"

"دیکھو صاحب، آپ چھناتے ہو کہ نہیں۔" بٹھل مسکرایا۔

"میں، میں، میری طرف سے بے فکر رہیے۔ خوب گزرے گی۔ بس کل سے کام شروع، انشاء اللہ کوئی نگینہ قطعہ ہی ڈھونڈیں گے۔"

"دوری پہ ہو تو بھی چلے گا۔ دور آنے جانے کا مزہ اور ہوتا ہے۔"

"بالکل، سفر کا اپنا ایک لطف ہے، میری زمین شہر میں ہے ہی کتنی، نہ ہونے کے برابر، بیشتر تو ادھر ادھر بکھری پڑی ہے۔"

"کچھ دام درم کی ضرورت بھی تو پڑے گی آپ کو، بولو تو رسی ڈوری کھینچیں۔"

"دام درم کس لیے؟" سید صاحب نے حیرانی سے پوچھا۔

"تھوڑا سا چارہ ڈالنے، بات پکی کرنے کو۔"

"یہاں زبان چلتی ہے، اور کہیں ضرورت پیش آئی تو اتنا تو یہ خادم بھی انتظام کر سکتا ہے، لیکن ایک بات طے سمجھئے، بات پکی کرنے سے پہلے ایک نظر آپ کا دیکھنا ضروری ہے اسی لیے گزارش کر رہا ہوں، ابھی آپ جانے کی جلدی نہ کیجئے۔"

"اپنی زبان کو ہماری زبان سمجھو۔"

"پھر بھی، دیکھیے روپے پیسے کا معاملہ ہے، اپنے اطمینان کے لیے مجھے آپ کی تصدیق کی ضرورت ہو گی۔ بہتر ہے، آپ بھی اچھی طرح دیکھ بھال لیں۔"

"ہم نے آپ کو دیکھ لیا ہے۔"

"ٹھیک ہے صاحب!" سید صاحب زچ ہو کے بولے۔ "خدا میری عزت رکھے۔ میں کل ہی نکلتا ہوں مگر۔۔۔ اس محفل کا کیا رہا؟"

"وہ آپ کی مرضی پر ہے۔"

"کل تو ذرا مشکل ہے، پرسوں پر رکھیں؟"

بٹھل نے اقرار کیا، نہ انکار۔

"معاف کیجئے، آپ کی جلدی نے میرے ارادے منتشر کر دیے۔ خیال تھا، بابر میاں چلنے پھرنے لگیں تو کسی روز شکار پر چلیں۔ مجھے یاد ہے، آپ نے شکار کا شوق ظاہر کیا تھا۔"

"پر صرف جانوروں کا۔"

سید صاحب پہلے تو سٹپٹائے، پھر ہنس کے بولے "جانوروں ہی کی بات کر رہا ہوں۔"

"کبھی انسان کا بھی کھیلا؟"

سید صاحب کی پیشانی لکیروں سے بھر گئی "آپ نے کھیلا؟" ان کے لہجے میں واضح طور پر تلخی آ گئی۔

"ہاں صاحب، جب بھی موقع لگے، کھیلتے ہیں اور ہم ہی

نے کیا کھیلا' جدھری دیکھو' کھیلا جاتا ہے۔ آدمی' آدمی کے پیچھے ہے۔ سب سے آسان شکار تو انسان کا ہوتا ہے۔ جال پھندے' ہتھیار کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ انسان تو سارے پالتو ہوتے ہیں' پالتو کا شکار آسان ہوتا ہے۔ برا تو نہیں مانے آپ؟"

"نہیں' نہیں۔" سید صاحب کے چہرے پر سکون کے آثار ہویدا ہوئے "آپ سے ملاقات میرے لیے ایک نیا تجربہ ہے۔"

"ابھی تو شروع ہوئی ہے۔"

"اور' آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔" سید صاحب کے قہقہے سے طعام گاہ گونج اٹھی "نشانہ کیسا ہے آپ کا؟" مضطربانہ انہوں نے پوچھا۔

"چوک بھی جاتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے' کمال کا ہے۔"

"کام چل جاتا ہے' نشانے پر آنے والے سے بھی غلطی ہو جاتی ہے۔"

"ایسا لگتا ہے' آپ وہ نہیں جو نظر آتے ہیں۔"

"پھر کیا ہیں؟"

"کچھ اور۔"

"کچھ اور کیا صاحب؟ بولو۔"

"ارے بھائی یہی' بہت زمانہ دیکھے ہوئے' گرم و سرد آشنا۔" وہ ہچکچاتے ہوئے بولے۔

"اور لگتے کیا ہیں؟"

"لگتے! بہت اچھے لگتے ہیں۔" سید صاحب کترائی ہوئی زبان سے بولے "سیدھے سادے' بھولے بھالے لگتے ہیں' اور کیا کہا جائے' آپ نے تو جناب بات پکڑ لی۔"

دیواری گھڑی کے ڈائل کے وسط میں چھوٹا سا دروازہ کھلنے پر کھٹاک کی آواز آئی' دروازے سے انگشت بھر چڑیا جھپاک سے برآمد ہوئی اور سر خم کر کے چہکنے لگی۔ ٹھیک گیارہ مرتبہ وہ چہکی۔ سید صاحب چونک پڑے اور معذرت کرتے ہوئے تخت سے اٹھ گئے "وقت خاصا ہو گیا۔" انہوں نے متانت سے کہا "آپ بھی آرام کیجیے۔"

ہم دونوں بھی کھڑے ہو گئے۔

دروازے سے باہر نکلتے نکلتے سید صاحب کو خیال آیا "ارے بابر میاں! حد ہو گئی جناب! یاد ہی نہیں رہا کہ آپ نے تو ابھی تک کچھ کھایا پیا ہی نہیں۔ کچھ کھائے بغیر نہ سوئیے گا' ہلکی غذا ضرور لیجیے یا پھل وغیرہ۔"

میں نے سر جھکا لیا۔

نصیر بابا اور ابن دوسرے ملازموں کے ساتھ کمرے باہر مستعد کھڑے تھے' ہمیں دیکھ کے وہ ایک طرف ہو سید صاحب شب بخیر کہتے ہوئے زنان خانے کی طرف گئے۔ ابن میرے کھانا نہ کھانے کی وجہ سے بے حد فکر معلوم ہوتا تھا۔ بھوک ہی نہیں لگ رہی تھی۔ ایسے بھوک لگتی بھی کیا۔ دماغ ہی حاضر نہ ہو یا جکڑا ہوا ہو تو جسم پابند ہو جاتا ہے۔ کمرے میں آ کے میں بستر پہ لیٹ گ سب کچھ ذہن سے محو کر دینے کی کوشش کرتا رہا لیکن محمود علی کا چہرہ بار بار آنکھوں میں گھومنے لگتا تھا۔ آد کتنی برتیں ہوتی ہیں۔ کیسی دیدہ دلیری سے وہ باتیں کر اور بٹھل بھی کیسی ڈھٹائی سے سنتا رہا تھا۔ کبھی کبھی ا ہوتا تھا' جیسے نصیر بابا کو کوئی بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔ عم طرح کے لوگ ہر جگہ پائے جاتے ہیں اور سب ایک نہیں ہوتے۔ اگر یاسمن کو میں نے خود نہ دیکھ لیا تو شاید سے یقین آتا۔ طعام گاہ میں کئی بار سینے میں غبار اٹھا میں بھی سید سے کچھ کہوں مگر بٹھل کی طرح مجھے اپ اور لہجے پر قابو نہ رہ پاتا۔ اس کے سامنے تو بیٹھنا ہی مجھ ہو رہا تھا۔ بہرحال بٹھل کی کٹ حجتی اور طول کلامی بے نہیں تھی' اور کچھ واضح نہیں ہو رہا تھا کہ اس کے سر تدبیریں سمائی ہوئی ہیں۔ یہ کوئی ایسا آسان کام تو نہیں ہو رہا تھا۔ اندازے کی ذرا سی غلطی سے ہم نامعلوم تک بے اختیار ہو سکتے ہیں۔ بٹھل کو بھی اس کا احساس ہو گا۔ مجھے کوئی کام نہیں تھا یا میرا وجود مجھ محدود تھا لیکن بٹھل کی تو بڑی ذمے داریاں تھیں۔ اس بہت سے طلب گار تھے۔ ایک زریں ہی نہیں' اور بھ سے' ایک میں بھی تو تھا۔

ابن میرے ارد گرد منڈلا رہا تھا اور کسی اشارے تھا۔ نصیر بابا سے سارا ماجرا سن کے اب کسی ملازم کی طبیعت زاغب ہی نہیں ہو رہی تھی۔ بات کرنے کو نہیں چاہتا تھا۔ ابن کو نظروں سے دور کرنے کے لیے تیار کھانوں کی بابت پوچھا اور مرغ کا سادہ شوربہ لا ہدایت کی۔ دس منٹ کے اندر اندر وہ آ گیا۔ طشت اور بھی چیزیں سمیٹ لایا تھا۔ میں نے اسے جلد ہی کر دیا۔ جیسا کہ مجھے توقع تھی' اس کے جاتے ہی کمرے میں آ گئے اور دروازہ بند کر کے بٹھل کے پائنتی پہ بیٹھ گئے۔ کچھ دیر خاموشی رہی' پھر بٹھل کی آواز گونجی "سویرے ہی ان کو تیاری کا بول دینا۔"

"کل' کل ہی۔۔۔؟" نصیر بابا سنسناتی آواز میں بو

ا م

"کل یا پرسوں' بولنا' گہنے پاتے' کاغذ نشانیاں ساتھ رکھ ں۔ زیادہ انبار نہیں' دو تین جوڑی کپڑے لا سکیں تو ٹھیک ہے' نہیں تو ایسی ہی چلی آئیں۔"

"مگر وہ حرافہ جو ناگن کی طرح پھن پھیلائے بیٹھی ہے" نصیر بابا کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

"دیکھ لیں گے اس کو بھی۔"

"ایک وہی نہیں' اور بھی سور کھانے والے پہرے پر ہیں۔"

"پتہ ہے۔" بٹھل نے تنک کے کہا "گھوڑا گاڑی میں تو دیری نہیں لگے گی؟"

"نہیں' آسانی سے مل جاتی ہے۔" نصیر بابا بھینچے ہوئے دانتوں سے بولے۔

"ابن یا نذرو کو باہر بھیج کر گاڑی بلوا لینا' پوچھیں تو ہمارا بول دینا۔ تم کو ادھری رہنا ہے۔"

نصیر بابا کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ جلدی جلدی سر ہلاتے رہے "اور' اور بیچ میں بڑے صاحب آ گئے تو۔۔۔؟"

"ان کو کون روک سکتا ہے؟ آنے دو پھر۔"

"خدا خیر کرے۔" نصیر بابا کی آواز کانپ رہی تھی۔ بولو تو ابھی نکل لیں پھر۔

"نہیں نہیں' یہ مطلب نہیں' جو آپ نے سوچا ہے' وہی ٹھیک ہے۔ پر اپنے ہاتھ پاؤں' دماغ ہی ٹھکانے پر نہیں ہے۔"

"کھونٹے پر باندھ کے رکھو' تم کو دیکھ کے تو وہ آدھی ہو جائیں گی۔"

"بس اللہ ساتھ خیریت کے معاملے نمٹا دے۔ میں تو ساری زندگی شکرانے کے نفل پڑھتا رہوں گا۔" نصیر بابا بہکی بہکی آواز میں بولے۔ پھر کچھ توقف کے بعد ہڑک اٹھے "اور' اور دروازے پر بھی دو رستم سہراب ڈٹے ہوئے ہیں۔ ایک کے پاس دونالی ہے' دوسرا لاٹھی لیے بھٹکتا رہتا ہے۔"

"پڑھیں گے کوئی منتر بابا!"

"بعض دفعہ خیال آتا ہے' میں نے آپ کا رستہ بھی کھوٹا کیا' یہ یہاں کس چکر میں پھنسا دیا ہے۔ خدانخواستہ کچھ ادھر ادھر۔"

"اب تو پھندا ڈال ہی دیا ہے۔"

"مناسب سمجھیں تو کوئی اور وقت رکھ لیں' کچھ دنوں بعد' ذرا اور دیکھ بھال کے۔"

بٹھل ہنکاری بھر کے حقہ پینے لگا۔ نصیر بابا بت بنے بیٹھے رہے۔ وقفے وقفے سے بٹھل کے حقے کی گڑگڑاہٹ کمرے

بازی گر

میں گونجتی یا پھر نصیر بابا کی تیز سانسوں کی آواز' اور کمرے میں سناٹا چھا جاتا۔ گھڑی کی ٹک ٹک تو خاموشی کا جزو بن چکی تھی۔ روشنی کم کر کے نصیر بابا دبے پاؤں کمرے سے چلے گئے۔

ساری رات مجھے نیند نہیں آئی۔ بٹھل بھی دیر تک حقے سے شغل کرتا رہا۔ صبح' وہ حسب معمول جلدی اٹھ گیا تھا۔ نصیر بابا نے آٹھ بجے کے قریب بتایا کہ سید صاحب باہر جا رہے ہیں' انہیں بٹھل ہی کے کام سے باہر نکلنا ہے۔ آج بھی ناشتے میں وہ شریک نہیں ہوں گے' دوپہر کے کھانے پر بھی شاید ملاقات نہ ہو سکے۔ ہاں' اگر کوئی پیغام ہو تو صبح دس بجے تک وہ گھری پر رہیں گے۔

بٹھل نے آنکھیں میچ لیں "ٹھیک ہے بابا!"

"اور ابھی ایک نئی بات ہوئی۔" نصیر بابا نے بٹھل کے اور قریب ہو کے سرگوشی کی "بڑے صاحب بولتے تھے کہ میں آپ دونوں پر ذرا نگاہ رکھوں۔ کہاں آتے جاتے ہیں' انہوں نے یہ بھی کہا کہ خاطر تواضع میں کوئی کمی نہ کی جائے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" نصیر بابا کا چہرہ جل بجھ رہا تھا۔

بٹھل سن کے چپ رہا' پر اس نے نصیر بابا کو تاکید کی کہ جیسے ہی سید صاحب باہر جائیں' اسے مطلع کر دیا جائے۔

کچھ دیر میں ڈاکٹر کشن آ گیا۔ پورے ہفتے' کل پہلی بار دوا میں تواتر نہیں رہا تھا۔ رات کی خوراک کا تو ناغہ ہو گیا تھا لیکن طبیعت بہتر تھی۔ نبض دیکھ کے اور سینے پر آلہ رکھ کے ڈاکٹر مطمئن ہو گیا۔ آج اس کی آمد بہت گراں گزر رہی تھی۔ کل کی طرح بٹھل کے لیے ناشتا کمرے میں آ چکا تھا۔ ڈاکٹر کشن نے آج پھلوں کے رس پر قناعت کی اور جلد ہی چلا گیا۔

میری نظریں گھڑی پر ٹکی ہوئی تھیں۔ ابھی دس بجے' دیر نہیں ہوئی تھی کہ نصیر بابا بولائے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور ہانپتی آواز میں بولے "وہ چلے گئے ہیں اور شام تک آنے کا کہہ گئے ہیں۔"

بٹھل نے انہیں تسلی سے بیٹھ جانے کو کہا اور چائے دانی سے چائے انڈیل کے اپنے لیے چائے بنائی۔ نصیر بابا کو کسی پہلو قرار نہیں تھا۔ چہرے پر ایک رنگ آتا' ایک جاتا تھا "آج تو بدلی گھری ہے سارے میں۔" بٹھل نے دھیمی آواز میں کہا۔

"ہاں' لیکن گہرے' گہرے بادل نہیں ہیں۔" نصیر بابا حواس باختگی سے بولے "اور کچھ کہا بھی نہیں جا سکتا' کب چھلک پڑیں۔"

"ادھری دونوں کو بول دیا ہے؟"

"ہاں ہاں' کہہ آیا ہوں' بڑی گھبرا رہی ہیں' بالکل پیلی پڑ گئی ہیں۔"

بٹھل نے چائے نوشی اور حقہ کشی میں وقت صرف کردیا' پھر کہیں گھڑی پر نظر ڈال کے کرسی سے اٹھا۔ گیارہ بجا چاہتے تھے۔ اتنی دیر میں ابن بھی آگیا تھا۔ بٹھل نے اسے تانگا لگانے اور بطورِ خاص عمارت کے اندر تانگا ٹھہرانے کی ہدایت کی۔

ابن نے فدویانہ انداز میں پوچھا "باہر جانے کا ارادہ ہے بابا؟"

"ہاں رے۔" بٹھل نے ناگواری سے کہا۔

"دوپہر کا کھانا۔۔۔"

"کھائیں گے رے ادھری' لوٹ کے۔"

ابن چند لمحے متذبذب ہوا تھا مگر اس نے مزید کوئی صراحت نہیں چاہی اور کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی بٹھل نے مجھے مخاطب کیا "تو بابا کے ساتھ اوپر جاکے دیکھ' خالی مت جانا۔"

اس کا اشارہ میں سمجھ گیا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے سنسناتی آواز میں کہا "بٹھل کو مجھ سے زیادہ بات کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ جیسے ہی نصیر بابا کے ساتھ کمرے سے باہر نکلا' میں نے جلدی سے اٹیچی کھولی۔ سیدھے پھل کا کھٹکے والا یہ اصلی رام پوری چاقو لکھنؤ میں مجھے شمشاد خاں نے دیا تھا۔ دونوں باہر میرے منتظر تھے۔ بٹھل وہیں ٹھہرا رہا۔ میں آہستہ قدموں نصیر بابا کے پیچھے پیچھے عقبی راستے کی طرف چل پڑا۔ ہمارا رخ زنان خانے کی طرف تھا۔

○☆○

دور ایک کیاری میں مالی پودوں کی تراش خراش کررہا تھا۔ اس نے نصیر بابا کو سلام کیا' نصیر بابا نے بد حواسی سے ہاتھ اٹھا کے اس کے سلام کا جواب دیا اور وحشت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے آنکھیں میچ کے انہیں صبر و سکون کی تلقین کرنی چاہی۔ ان کا قابو میں رہنا پہلی شرط تھا۔ میں نے اپنی رفتار کچھ کم کی اور نرمی سے انہیں سمجھایا کہ زنان خانے میں داخل ہوکے انہیں کیا کرنا ہے۔ وہ متذبذب انداز میں سرہلاتے رہے اور اضطراب سے بولے "اگر' اگر رئیس بیگم نے کوئی حجت کی؟"

"تو' تو پھر کیا ہوگا' مجھے ایسے ہی اندر جانا پڑے گا۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

"سوچ لو میاں۔" وہ سراسیمگی سے بولے "وہاں کوئی ایک تو نہیں ہے۔"

"آپ حوصلہ رکھیے' دیکھتے ہیں' کیا ہوتا ہے۔" میں نے کہنے کو تو کہہ دیا لیکن خود میری حالت ان سے کچھ مختلف نہیں تھی۔ اب واپس بھی نہیں ہوا جاسکتا تھا۔ آنے والے لمحوں کے لیے میں خود کو استوار کرتا رہا۔ نصیر بابا کی نگاہیں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔ کبھی وہ ہڑبڑا کے پیچھے دیکھتے' کبھی دائیں بائیں' کبھی اوپر عمارت کے در و بام کی طرف۔ میں نے ان کی کمر پہ ہاتھ رکھ کے تھپکی دی۔ وہ گہری سانس لے کے رہ گئے اور ہونٹ کاٹتے ہوئے کچھ فاصلہ اور کم کیا۔ زینے کے پاس آکے ان کے قدم ٹھٹکنے لگے۔ میں نے زور سے ان کا ہاتھ تھام کے سیڑھیاں طے کرنے کا اشارہ کیا "آپ کا کام زیادہ نہیں ہے مگر اس مختصر عرصے میں آپ کو بہت احتیاط کرنی ہے' آگے سب کچھ آپ پر منحصر ہے۔" میں نے سرگوشی میں ان سے کہا۔ ان کی پھٹی پھٹی آنکھیں مجھ پر جم گئیں۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ زینہ چڑھتے ہوئے وہ بالکل گم صم ہوگئے تھے۔ میں نے بھی دبے قدموں ان کی پے روی کی۔ اوپر دروازہ بند تھا۔ انہوں نے دھڑکتے ہاتھ سے کھٹ کھٹایا۔ میں ان کی آڑ میں ساکت کھڑا رہا۔ دروازہ بند نہیں تھا' تیسری بار ذرا تیز دباؤ سے کھل گیا۔ اوپر جا۔۔۔ انہوں نے پلٹ کے ایک نظر مجھے دیکھا اور اوجھل ہوگئے۔ دروازے کا ایک پٹ تھوڑا سا کھلا ہوا رہ گیا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ واپس آنے میں انہیں دیر لگ سکتی ہے۔

یہ ایک روشن اور صاف ستھرا زینہ تھا۔ نہ اتنا کشادہ' نہ اتنا تنگ۔ دونوں جانب سہارے کے لیے لکڑی کی بلیاں لگی ہوئی تھیں۔ میری ہدایت کے مطابق' اندر جاکے نصیر بابا کو کسی طرح رئیس بیگم کو دروازے تک لانا تھا۔ مجھے قطعاً توقع نہیں تھی کہ جو کچھ میں نے انہیں باور کرایا ہے' وہ اسی انداز سے رئیس بیگم سے کہہ سکیں گے۔ ان کی حالت تو اندر جاکے اور ابتر ہوسکتی ہے۔ زبان کہیں لڑکھڑا نہ جائے' رئیس بیگم کسی بھی لمحے شبہے میں پڑ سکتی ہے۔ نصیر بابا ہی کے بقول' وہ اول درجے کی قطامہ ہے۔ حالانکہ شبہے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ شاید یہی بہتر تھا کہ نصیر بابا کے پیچھے میں بھی زنان خانے میں داخل ہوجاتا۔ میں نے رئیس بیگم کی شکل نہیں دیکھی تھی' ظاہر ہے' وہ خادماؤں سے مختلف کلے ٹھٹے کی عورت ہوگی۔ میں اسے فوراً پہچان لیتا مگر ضروری نہیں تھا کہ زنان خانے میں پہلے رئیس بیگم ہی سے واسطہ پڑتا' کوئی خادمہ بھی ہوسکتی تھی' خادمہ یا خادمائیں۔ نصیر بابا کے ساتھ ایک اجنبی مرد دیکھ کے ان میں سے کوئی بھی بوکھلا سکتی تھی۔

وہی ہوا' جس کا مجھے اندیشہ تھا' ابھی نصیر بابا کو گئے چند ثانیے گزرے ہوں گے کہ تڑاق سے دروازہ کھلا اور ان کا زرد چہرہ دکھائی دیا "میاں' میرا دل بہت گھبرا رہا ہے" وہ اکھڑی ہوئی سانسوں سے بولے اور جھٹ دو سیڑھیاں اترے میرے پاس آگئے۔

"یہ کیا بات ہوئی' پھر تو کچھ بھی نہیں ہوگا' آپ کا کام ہی کتنا ہے' اسے میرے پاس لانا ہے۔ باقی تو مجھے سنبھالنا ہے۔ جائیے جائیے' ذرا ہمت پکڑیے۔ یہ موقع نکل گیا تو جانے پھر کب۔۔۔"

"شاید مجھ سے۔۔۔ مجھ سے۔۔۔" ان کی آواز لرز رہی تھی۔

"کمال ہے' آپ عجیب آدمی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا' وہ دروازے پر نہیں آئے گی' نہ آئے۔ میں نے آپ سے کیا کہا ہے' میں اندر چلا جاؤں گا۔ اب سب کچھ طے ہوگیا ہے تو آپ۔۔۔ ادھر نیچے بابا انتظار کررہے ہیں' تانگا بھی آگیا ہوگا۔ یہاں تک آکے آپ بالکل الٹی بات کررہے ہیں' وہاں تو اپنی جان' اپنے آپ کو داؤ پر لگا دینے کو۔۔۔" میں نے جھنجھلاہٹ سے کہا "آپ اوپر جاتے ہیں یا میں ہی جاؤں۔ ٹھیک ہے' آپ میرے پیچھے پیچھے آیئے۔ اتنا تو کرسکتے ہیں آپ کہ ان دونوں کو لے کے باہر چلے جائیں۔ اندر سب عورتیں ہیں اور کوئی' کوئی غلط کام کررہے ہیں آپ۔۔۔"

میری تلخی و تندی کا اثر ہوا۔ ان کے ڈھلکے ہوئے شانے سیدھے ہوئے' آنکھوں میں خاص قسم کی چمک ہویدا ہوئی۔ میں نے انہیں مزید تردد و تکدر کا موقع بھی نہیں دیا "جلدی کیجیے' اوپر سے کوئی بھی آسکتا ہے۔ نیچے کا دروازہ بھی کھلا ہے۔ جائیے' جائیے۔" میں نے انہیں تقریباً دھکیلتے ہوئے کہا۔ وہ پھر کچھ نہیں بولے۔ دو سیڑھیوں کے فاصلے پر دروازہ تھا۔ وہ دوبارہ اوپر چلے گئے اور اس بار انہوں نے پلٹ کے میری جانب نہیں دیکھا۔ انہوں نے دروازہ بھی بند کیا' کنڈی نہیں لگائی ورنہ آواز آتی۔

کئی منٹ گزر گئے' دروازے پر کوئی آہٹ نہیں ہوئی۔ انتظار کا یہ وقت کاٹنا دو بھر ہورہا تھا تاہم دیر ہوجانے کا مطلب تھا کہ اب کے نصیر بابا ایسے ہی واپس نہیں آئیں گے۔ میں پوری طرح مستعد کھڑا تھا۔ نیچے کھلے ہوئے دروازے پر بھی نگاہ رکھنی تھی۔ ادھر سے کوئی ملازم اوپر آسکتا تھا لیکن اس سے نمٹنا ایسا مشکل نہیں تھا۔ یہی اچھا تھا کہ کسی کے اس طرف بھٹکنے سے پہلے میں اوپر چلا جاؤں۔ جانے کتنا وقت گزرا' دس منٹ یا اس سے زیادہ یا اس سے کم۔۔۔

کم۔ یکایک اوپر قدموں کی چاپ سے میرا جسم غیر شعوری طور پر اکڑ سا گیا۔ میرے سارے حواس دروازے پر مرکوز تھے۔ وہ نصیر بابا ہی تھے۔ دروازے کا پٹ کھول کے انہوں نے تنی ہوئی' جکڑی ہوئی آواز میں مجھے مخاطب کیا "میاں! بیگم شکریہ ادا کرتی ہیں' کہتی ہیں' اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ مہمانوں کی خدمت سے ہمیں دلی خوشی ہوتی ہے۔ مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں اور اگر ایسا ہی ہے تو بہتر ہوگا' سید صاحب واپس آجائیں' شام تک انتظار کرلیں۔"

میں نے نصیر بابا کو تاکید کی تھی کہ اندر جاتے ہی وہ رئیس بیگم کو میری آمد کی اطلاع دیں اور کہیں کہ صبح و شام اتنے دنوں تک اس کی اور زنان خانے کی خادماؤں کی مہمان نوازی پر ممنونیت کے اظہار کے لیے میں حاضر ہوا ہوں اور اپنی دل جمعی کے لیے کچھ نذرانے پیش کرنا چاہتا ہوں' انہیں قبول کیا جائے گا تو عزت افزائی ہوگی۔ میرا بار کچھ کم ہوگا۔ میری بیماری کے دوران مسلسل نگہداشت اور پرہیزی کھانوں کے اہتمام میں خادماؤں نے بڑی زحمت اٹھائی ہے۔ کوئی کسی اپنے ہی کے لیے اتنا کرسکتا ہے۔

رئیس بیگم کوئی عام عورت نہیں تھی' کوئی خانہ دار' روایتی عورت۔ اس کے ہاں عام عورتوں ایسا اکراہ و امتناع نہیں ہونا چاہیے تھا' مجلسی قسم کے ادب و آداب اسے بہت آتے ہوں گے۔ امید یہی تھی' یہ پیغام سن کے وہ ضرور متجسس ہوگی۔ ممکن ہے' جواب کے لیے خود دروازے پر آجائے یا اندر مہمانوں کے کسی کمرے میں مجھے بٹھانے کی ہدایت کرے اور خود ہم کلام ہو۔ کوئی بھی صورت ہو' مراد اسی قدر تھی کہ نصیر بابا اسے کسی طور مجھ سے نزدیک لے آئیں یا اس کے پاس مجھے لے جائیں۔ انہوں نے یہ پہلا مرحلہ سر کرلیا تھا۔ دروازے کے پٹ سے ان کا آدھا جسم باہر نکلا ہوا تھا۔ مجھے ان کی استقامت پر حیرت ہوئی۔ رئیس بیگم کو دیکھ کے ان کے سینے کا غبار متلاطم ہوا ہوگا۔ ان کے پُر تکلف لب و لہجے اور دروازے پر ترچھے کھڑے ہونے کے یہی معنی نکلتے تھے کہ رئیس بیگم ان کے قریب ہی کہیں ہے۔ میں نے ایک پل کی دیر نہیں کی۔ ادھر نصیر بابا نے ہاتھ اٹھا کے مجھے اوپر آنے کا اشارہ کیا' وہ فوراً دروازے سے ہٹ گئے۔ جیب سے چاقو نکال کے میں نے درمیان کا فاصلہ جست کے انداز میں طے کیا۔ دوسرے لمحے میں اندر تھا۔ وہ ساز و سامان سے مرصع ایک چوڑی اور لمبی راہ داری تھی۔ درمیان میں بھی ایسے راستے نکلتے تھے۔ دونوں اطراف منقش محرابوں کے پیچھے کچھ دوری پر کمرے بنے ہوئے تھے۔ جو

عورت نصیر بابا سے گز بھر کے فاصلے پر کھڑی تھی' وہی ر بیگم ہوسکتی تھی' متوازن بدن کی ایک عورت۔ نہ اتنی ذ ایسی نازک اندام۔ قامت بھی متناسب' عمر چالیس کے بھگ۔ ہوسکتی ہے' اس سے زیادہ ہو۔ رنگت بادامی' گہری چمکیلی آنکھوں میں کاجل کے ڈورے' کشیدہ ب پتلے اور ترشے ہوئے ہونٹ' کانوں میں جھمکے آویزاں میں موتیوں کا ہار سجا ہوا' طلائی چوڑیوں سے بھری کلائیاں' بالوں میں جوڑا' گول چہرے کے گداز میں نگار مدغم ہوگئے تھے۔ سلیقے کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ پہننے کا سلیقہ ہر کسی کو نہیں آتا۔ گھر میں اور خصوصاً اس لباس اور آرائش کا یہ تیور طبعی نفاست اور آسودہ تن تھا۔ کسی وقت نہایت دلکش ہوگی' لگتا تھا' وہ تو شاید اب اسی گمان میں ہے۔ اس خوش گمانی کی آئینہ بھی تردید کرتا' آئینے میں ایک خوئے مروت بدرجہ اتم ہوتی ہے۔

اچانک مجھے سامنے دیکھ کے وہ بری طرح اچھل جیسے بچھو ڈنک مار جائے۔ آنکھیں پھیل گئیں' کھلے ہو سے گھٹی ہوئی چیخ برآمد ہوئی۔ میں نے جھپٹ کے اس درمیانی فاصلہ عبور کیا اور اس سے پہلے کہ وہ کسی طرف حاصل کرلے' اس کے منہ پر پنجہ کس دیا۔ میرے دو ہاتھ میں کھلا چاقو دیکھ کے اس کا بدن پھڑپھڑا کے ر میرے پنجے کی گرفت سخت تھی "چپ چاپ کھڑی ر میں نے بمشکل تمام کہا۔ اپنی آواز مجھ کو اجنبی لگی' بری میرے ہاتھ پاؤں ہی اینٹھ رہے تھے۔ کسی عورت کو قا کرنے کا یہ دوسرا اتفاق تھا۔ اس نے تھوڑی سی مز کی۔ چاقو کی نوک اس کی گردن کے پاس تھی۔ اس ڈھلک گیا۔ نصیر بابا کے دیدے بھی پھٹے ہوئے تھے۔ کے رنگ بدل رہے تھے۔ میں نے جھڑکتی آواز میں انہ "نزدیک کا کوئی کمرا کھول دو اور ان سب کو وہیں پہنچا دو ایک کو۔"

نصیر بابا ہڑبڑا کے ایک طرف دوڑ پڑے' پہلے ادھ منڈلائے پھر انہوں نے دائیں جانب کی محرابوں کے د قریب کا ایک کمرا کھول دیا۔

نیم جاں رئیس بیگم کا سینہ دھک دھک کررہا تھا نے اپنی گرفت ذرا ڈھیلی کی اور دبے لہجے میں کہا" دھیان سے سنو! تم سے مجھے کوئی غرض نہیں' جو م ہوں' اس پر عمل کرتی رہو تو اپنے حق میں بہتر کرا تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچے گی۔ زنان خانے میں موجود خادماؤں کو تمہیں چپ چاپ کمرے میں بیٹھے رہنے

فکر نہ کرو' مجھے یہاں ڈاکا نہیں ڈالنا' نہ کسی کو ختم کرنے کا ارادہ ہے۔ میرا کام کچھ اور ہے' اور مجھے زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا۔"

میں نے اس کے نرم ہونٹوں اور گالوں سے ہاتھ ہٹالیا۔ اس کی آنکھیں لوٹی جارہی تھیں۔ بدن پر رعشہ سا طاری تھا۔ ایسی ناگہانی سے اسے کہاں واسطہ پڑا ہوگا۔ جانے کیوں دوبارہ اس کا بدن چھونے سے مجھے جھجک ہورہی تھی مگر پس و پیش کا محل نہیں تھا۔ مجھے اپنے آپ کو ترک کیے رہنا تھا۔ اپنی پسند و ناپسند' مرضی و منشا سے بیگانہ۔ ناچار اس کی بانہ پکڑ کے میں اسے نصیر بابا کے کھولے ہوئے کمرے کی جانب لے آیا۔ اس نے ذرا بھی تامل نہیں کیا' کسی معمول کی طرح تعمیل کی۔ میں نے اس کا بازو آزاد کردیا۔

اوپر طول و عرض کے اس آراستہ و پیراستہ کمرے میں دونوں طرح کی نشست تھی۔ فرشی بھی' کرسیوں کی بھی۔ سامنے دیوار سے پیوست تخت پر قالین اور گاؤ تکیے' دونوں اطراف کی دیواروں کے ساتھ رکھی ہوئی قیمتی کرسیوں کے بیچ میں چینی کے بڑے گلدان' کھڑکیوں پر پھول دار ریشمی پردے' تخت سے اوپر اور کھڑکیوں کے درمیان خوش نما مناظر کی روغنی تصویریں۔ چھت سے جھولتے ہوئے فانوس سے ملتے جلتے شمع دان' جگہ جگہ دیواروں سے جڑے ہوئے۔ فرش کے وسط میں بھی قالین بچھا ہوا تھا۔ راہداری سے کھلنے والے دروازے سے ملحق دیواروں پر لکڑی کے بڑے جالی دار چوکھٹوں میں نصب آئینے آویزاں تھے۔ چھت کے کنارے کنارے کندہ کیے ہوئے گل بوٹوں کی پٹی کمرے کی سجاوٹ دو چند کرتی تھی۔ اچھا خاصا روشن کمرا تھا۔ چھوٹی موٹی محفلوں کے لیے موزوں تر۔ نصیر بابا نے سوچ سمجھ کے اس کا انتخاب کیا ہوگا۔ تخت کے برابر بھی ایک دروازہ تھا۔ نصیر بابا واپس جایا چاہتے تھے' یہ دروازہ اندر سے بند کروا کے ہی میں نے انہیں واپسی کی اجازت دی۔ ان کے جاتے ہی میں رئیس بیگم کو تخت تک لے آیا مگر یہ جگہ مناسب نہیں تھی۔ دروازے سے سامنے کا تخت صاف نظر آتا تھا۔ آنے والا رئیس بیگم کو اس ناگفتہ بہ صورت حال سے دوچار دیکھ کر دروازے ہی سے لوٹ سکتا تھا۔ دوبارہ مجھے دروازے کے پاس آنا پڑا۔ رئیس بیگم کو سامنے کرکے اس کی آڑ میں کھڑے رہنے میں قباحتیں تھیں۔ یوں آنے والی خادماؤں کو کوئی بھی اشارہ کرنے کا موقع اسے مل سکتا تھا۔ اس کے پہلو میں کھڑے رہنا ہی میرے لیے بہتر تھا۔ اس اثنا میں وہ کسی قدر سنبھل چکی تھی۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ آنے والی

خادماؤں کو وہ اتنی خستہ و شکستہ حالت میں نظر نہ آئے۔

راہداری میں لپکتے جھپکتے قدموں کی آہٹ پر میں سیدھا ہوگیا۔ دفعتاً تیزی سے دو خادمائیں اندر آئیں۔ ان کی نظر پہلے رئیس بیگم پر پڑی' پھر مجھ پر اور پھر میرے ہاتھ میں کھلے چاقو پر۔ ان پر جیسے بجلی گری۔ سسکاری بھر کے انہوں نے پلٹ جانا چاہا۔ دروازے پر نصیر بابا دیوار بنے ہوئے تھے "خاموشی سے ایک طرف بیٹھ جاؤ۔" میں نے بظاہر گرجتی آواز میں کہا "کسی نے اپنی جگہ سے حرکت کی تو..." میں نے چاقو بلند کیا اور رئیس بیگم کی گردن کو نشانہ بنانے کا تاثر دیا۔

کمر پر میرے ٹھوکے سے رئیس بیگم کا سراپا زیر و زبر ہوگیا۔ وہ ہذیانی انداز میں بولی "ہاں ہاں' جیسا یہ کہتے ہیں' ویسا ہی کرو' ویسا ہی کرو۔"

دونوں لڑکیاں حواس باختگی سے میرے پاس آگئیں۔ میں نے انہیں دروازے کے دوسری جانب اپنے عین مقابل بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ وہ ایک دوسرے سے چمٹی کھبی ہوئی' اپنے آدھے چہرے دوپٹوں سے چھپائے کرسیوں کے پاس ایک کونے میں دبک گئیں۔ دونوں بیس اکیس کے لگ بھگ ہوں گی۔ نقش و نگار سجل' ایک کا رنگ کھلتا ہوا چمپئی' دوسری کا سرمئی سرمئی تھا۔ دونوں تیکھی اور چھریری تھیں اور چوڑی دار پاجامے' کرتے اور دوپٹوں میں خاصی جاذب نظر لڑکیاں تھیں۔ ایک کا قد نکلتا ہوا تھا' دوسری کا کچھ دبا ہوا۔

تھوڑی دیر میں تین اور خادمائیں نصیر بابا کمرے کے زنداں کی طرف ہنکا کے لے آئے پھر تین اور' دو اور' اور ایک اور۔ نصیر بابا انہیں رئیس بیگم کے بارے میں کوئی ایسی وحشت اثر اطلاع پہنچاتے ہوں گے کہ وہ بولائی ہوئی تیز رفتاری سے کمرے میں داخل ہوتیں' اپنی جھونک میں کئی قدم اندر آنے کے بعد یکایک سامنے کا منظر ان کی بینائی خیرہ کرتا' وہ لڑکھڑاتیں' ان کی چیخیں بلند ہوتیں اور ایک دم ٹھٹھر جاتیں۔ اس ناقابل تصور واقعے سے گریز کے لیے ان کے قدم پلٹتے۔ دروازے پر نصیر بابا کی موجودگی انہیں اور بے حواس کرتی۔ ادھر میں' میرا چاقو اور رئیس بیگم ان کے پیروں کی زنجیر بن جاتی۔ وہ لمحوں میں ڈھیر ہوجاتیں۔ مجھے دوسری بار ان سے کچھ کہنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ رئیس بیگم نے میری مشکل آسان کردی۔ ان کے داخل ہوتے ہی رئیس بیگم پہلی دو خادماؤں کی طرح انہیں بے حس و حرکت اس گوشے میں بیٹھے رہنے کی تاکید کرتی رہی جو میں نے تجویز کیا تھا۔ اس تاکید میں کرب بھی شامل تھا' یہ التجا آمیز بھی

تھی۔
نصیربابا نہ ہوتے تو میرا کام یقیناً دشوار ہوجاتا مگر ناممکن نہیں تھا۔ کمرے میں آکے بھاگنے کے لیے ایک جرات مطلوب تھی' جرات اور ہوش مندی دونوں۔ نصیربابا دروازے پر فصیل بن کے ایستادہ نہ ہوتے تو ان خادماؤں کو دوسری طرح مجھے قابو میں کرنا پڑتا۔ دروازے سے میں بے حد قریب تھا۔ وہ ساری عورتیں تھیں اور ان میں بیشتر نوجوان اور ناپختہ کار لڑکیاں۔ وہ چھوئی موئی تو ایک دھمکی' ذرا سی اونچی آواز' ذرا سی دست درازی کی تاب نہ لا پاتیں۔ رئیس بیگم' ان کی ولی نعمت میرے حصار میں تھی' چاقو سے بڑا ہتھیار۔ رئیس بیگم پر ذرا سا دباؤ بڑھا کے انہیں پابند کیا جاسکتا تھا۔ بہرحال وہ نوکر تھیں۔ نوکر کو ویسے ہی اطاعت واجب ہے' یہ خوبی نہ ہو تو کوئی نوکر ہی کیوں ہو۔ چیخ و پکار کے سوا ان کی طرف سے کوئی اور خدشہ نہیں تھا۔ چیخ سے نصیربابا دیوانے ہوجاتے۔ انہیں جلد از جلد زنان خانے کے مختلف حصوں سے ساری خادماؤں کو ترغیب دے کر اس کمرے میں جمع کرنا تھا اور باری باری' ٹکڑیوں ہی کی شکل میں اس صبر آزما وظیفے کی انجام دہی ممکن تھی۔ اول پہر تھا' ہر کوئی اپنے روزانہ کے معمولات میں مصروف ہوگی۔ کسی ایک جگہ ان کے اکٹھے ہونے کا امکان نہیں تھا۔ آخر میں ایک بوڑھی عورت کو پہنچانے کے بعد نصیربابا نے سر کی جنبش سے مجھے مطمئن کیا کہ اب زنان خانے میں کوئی اور باقی نہیں رہ گیا۔ باہر نکل کے انہوں نے احتیاطاً دروازہ بھی بند کردیا۔

ان کی تعداد گیارہ تھی۔ گھر میں ایک مرد' سید صاحب' تین خواتین' فروزاں' یاسمن اور رئیس بیگم کی خدمت گزاری کے لیے یہ تعداد حیران کن تھی اور ضروری نہیں تھا کہ ان کی یہی نفری ہو۔ عمارت کے عقبی سبزہ زار کے ایک حصے میں ملازموں کے مکانات بنے ہوئے تھے۔ ہوسکتا تھا' ابھی کچھ اور اپنے گھروں میں موجود ہوں۔ کام کے اوقات بھی تو مقرر ہوں گے۔ اطاعت گزاروں کی کثرت سے مراد اظہار امارت ہے۔ اظہار کے بغیر امارت بے لطف رہتی ہے۔ جتنے زیادہ خدمت گار' اتنا بڑا آقا' اتنا بڑا بادشاہ۔ بڑے گھر میں سب سے سستے ملازم ہوتے ہیں۔ بڑے گھر کا سازو سامان زیادہ قیمتی ہوتا ہے اور سید صاحب کے گھر میں مخدوموں کی گنتی کتنی ہی کم ہو' مہمان خانہ تو ہروقت آباد رہتا تھا۔ ملازموں کی وہاں بھی ضرورت پڑتی تھی۔ مہمان خانے میں ٹھہرے ہوئے مہمانوں کے لیے کھانا زنان خانے میں تیار ہوتا تھا۔ سید صاحب کو بزم آرائی کا بھی بڑا شوق تھا۔

کمرے میں موجود خادماؤں میں ایک سن رسیدہ عورتوں' گیارہ بارہ سال کی ایک بچی کے سوا باقی نوجوان لڑکیاں تھیں' آگے پیچھے کی عمروں کی۔ تمام قاعدے قرینے کا سادہ و شوخ لباس پہنے ہوئے تھیں منتخب کرتے وقت لگتا تھا' شکل و صورت کی دلربائی نگار کی رعنائی اور قالب و قامت کی زیبائی کا خاص گیا ہے۔ خوش خرامی و خوش کلامی پر بھی توجہ دی گ رئیس بیگم ان کی نگراں تھی' معلم بھی ہوگی۔ اسے آداب آتے تھے' ہر طرح کے آداب۔ ان سب کے ترو تازگی و شادابی تھی۔ سب نئی نئی معلوم ہوتی تھ تازہ۔ ریشم' شیشہ' پھول' زرنگار در و بام اور آر زیبائش کی دیگر چیزوں کی طرح خوش جمال مکین بھ زیب و زینت اور فزوں کرتے ہیں۔ وہ کسی حسن تراش کے تراشیدہ مجسموں کی طرح تھیں' چلتے پھر ان میں سے دو تین خادمائیں میں نے مہمان خانے تھیں۔

کمرے پر سناٹا چھا گیا تھا۔ نصیربابا کو گئے ہوئے گزرے ہوں گے کہ میں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کھسکا کے آگے کی اور رئیس بیگم سے بیٹھ جانے کہا۔ اس نے پھڑکتے ہوئے ہونٹوں اور ڈبڈبائی آنکھ مجھے دیکھا' چند لمحے توقف کیا' میری پیشکش کی تصدیق شاید' پھر وہ جھجکتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ جیسے کوئی سے دھوپ میں ہانپتا کانپتا چل کے آیا ہو اور اسے جائے' کچھ یہی حال اس کا ہوا۔ اس نے ساری کے ڈھک لیا اور اپنے مقابل بیٹھی خادماؤں کی طرح ڈھانپ لیا۔ میں بھی کرسی سنبھال سکتا تھا۔ میرے سب کی سب بے بسی و بے چارگی کی حالت سے دوچار تھیں۔ عورت اور مرد کی مٹی میں ضرور کوئی فرق ہو عورتیں کسی اور مٹی کی بنی ہوتی ہیں۔ یہ محض مرد فرمودہ اور رچوں کہ ایک طرفہ ہے اس لیے مستند نہیں۔ طے نہیں ہوا کہ جسمانی طور پر عاجز عورتیں ذہنی طو لاغر ہوتی ہیں۔ مجھے محتاط ہی رہنا چاہیے تھا۔ ان باراں دیدہ رئیس بیگم بھی تھی۔ میں نے پہلے ہی کم رکھی ہوئی چیزوں کا جائزہ لے لیا تھا۔ بھاری گل دا سوا کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو ان کے اشتعال کے کام کرسکے۔ میرا چاقو گو اب رئیس بیگم سے دور تھا مگر بل دانوں کے مساوی ہوتا ہے' اس کی اپنی ایک کر ہے۔ ان کی مالکن تو میرے ہتھیار کی زد پر تھی۔

نصیربابا نے بتایا تھا' گزشتہ رات انہوں نے فروزاں اور سمن کو آج کے لیے تیار رہنے کی نوید دے دی تھی۔ ساری ات دونوں بہنوں نے بے کلی میں گزاری ہوگی۔ نیند بھی کیا ئی ہوگی۔ خادماؤں کی موجودگی میں' معلوم نہیں' وہ ضروری کپڑے' زیور اور دیگر چیزیں کس قدر سمیٹ پائی ہوں۔ اس کا موقع تو انہیں اب ملا ہوگا۔ بہتر یہی ہے کہ وہ چند ہی چیزوں اکتفا کریں۔ نصیربابا انہیں زیادہ مہلت بھی نہیں دیں گے۔ ب پر خاک ڈالیں۔ اتنا بہت ہے کہ بہ سلامت یہاں سے نجات پانے کی کوئی سبیل نکل آئی ہے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تاکہ رئیس بیگم کے پاس پہنچنے اور اسے میرے قریب لانے سے پہلے نصیربابا' فروزاں اور یاسمن کے پاس ہوکر آئے تھے یا نہیں۔ رئیس بیگم کو میری تحویل میں دینے کے بعد دو خادماؤں کو یہاں لانے کے لیے کئی بار عمارت کے اندرونی حصے میں گئے تھے۔ اس دوران میں انہوں نے فروزاں اور یاسمن کو آگاہ کردیا ہے تو اب تک دونوں کو اپنا مختصر سامان اکٹھا کرکے تیار ہوجانا چاہیے۔ نصیربابا نے اگر اس سارے کام سے فراغت کے بعد ان سے رابطہ کیا ہے تو بڑی نادانی کی ہے۔ مجھے بھی اپنی کشاکش میں خیال نہیں رہا کہ ان سے کہہ سکتا' جس وقت وہ نچلی منزل پر جانے کے لیے کمربستہ ہوں' مجھے بھی مطلع کرتے جائیں تاکہ میں کچھ دیر بعد اسیر خادماؤں کو آزاد کرسکوں۔ اسیر صرف وہی نہیں' میں ان سے کہیں زیادہ یہ عذاب بھگت رہا ہوں۔ کاش نصیربابا کو زنان خانے سے رخصت ہوتے وقت میری طرف آنے اور مجھے اس اذیت سے نجات دلانے کا خیال آجائے۔ وہ سیدھے چلے گئے تو مجھے پھر کتنی دیر یہاں ٹھہرے رہنا ہوگا۔ مزید پندرہ منٹ یا آدھا گھنٹا۔ اس سے زیادہ وقت فروزاں اور یاسمن کو نیچے لے جانے میں نصیربابا کو صرف نہیں کرنا چاہیے۔ نچلی منزل پر بٹھل ان کا منتظر ہوگا۔ تانگا بھی آچکا ہوگا۔ ابن کہتا تھا' تانگا قریب ہی مل جاتا ہے۔ مجھے پھر زیادہ دیر یہاں نہیں رکنا چاہیے۔ اس دوران کوئی بھی زنان خانے کا رخ کرسکتا ہے۔ فروزاں اور یاسمن کو لے جانے کے بعد نصیربابا زنان خانے کا خاص دروازہ کھلا ہی رہنے دیں گے۔ دوسری جانب' عقبی سبزہ زار کے جس راستے سے میں اور نصیربابا یہاں داخل ہوئے تھے' وہ بھی کھلا ہوا ہے۔
مگر میرا کیا ہے! میں تو آنے والے یا آنے والوں سے جیسے تیسے نمٹ لوں گا' میرا وہ کیا کرلیں گے۔ سارا معاملہ تو فروزاں اور یاسمن کا ہے۔ وہ کسی طور اس چاردیواری سے لار ہوجائیں۔ رئیس بیگم اور ان حیران و پریشان خادماؤں کو

پابند کرنے کا مرحلہ اتنا دشوار نہیں ہے جتنا نچلی منزل پر اتنے لوگوں کے درمیان سے فروزاں اور یاسمن کو بہ عافیت باہر نکال لے جانے کا ہے۔ سید صاحب کی عدم موجودگی میں' بٹھل اور نصیربابا کی معیت میں زنان خانے سے دو عورتیں تانگے میں باہر جارہی ہیں' کہاں جارہی ہیں؟ تانگے میں فروزاں اور یاسمن کے ساتھ صرف نصیربابا ہوتے تو یہ واقعہ اتنا تجسس انگیز نہ ہوتا۔ ظاہر ہے' زنان خانے کی خواتین کبھی نہ کبھی باہر بھی جاتی ہوں گی اور ان کے ساتھ کوئی مرد ملازم بھی ضرور ہوتا ہوگا۔ فروزاں اور یاسمن کے ساتھ گھر کے سب سے پرانے نمک خوار' وفاشعار' سید صاحب کے معتمد خاص نصیربابا ہیں۔ بے شک مختصر سامان بھی ان کے پہلو میں ہے لیکن یہ سامان یقیناً اتنا کثیر نہیں ہوگا کہ کسی قسم کا شک نمو پاسکے۔ ہاں' تانگے میں بٹھل کی ہمراہی ملازمین کے لیے کشمکش اور تردد کا باعث ہوسکتی ہے۔ نصیربابا کے گداز کے لیے بٹھل کی رفاقت بھی ضروری ہے۔ دور کسی محفوظ مقام پر پہنچنے تک نصیربابا کو بٹھل کی سپر' اس کی دیوار چاہیے۔ فروزاں اور یاسمن برقع میں روپوش ہوں گی۔ ملازم انہیں پہچان تو نہیں پائیں گے مگر حیوانوں اور انسانوں کی فوقیت کا کوئی ایک سبب تو نہیں ہے۔ وہم و گمان آدمی کا طرۂ امتیاز ہے۔ کسی کے بھی دماغ میں کانٹا چبھ سکتا ہے۔ کانٹے تو یوں بھی خودرو ہوتے ہیں۔

عمارت کے بڑے دروازے پر دو دربان تعینات ہیں' ان میں ایک مسلح بھی ہے۔ ابن' نذرو' بشارت اور کئی دیگر ملازم نچلی منزل میں منڈلاتے رہتے ہیں۔ لازم نہیں کہ بٹھل کو کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے' کوئی بھی عین وقت پر رخنہ انداز ہوسکتا ہے۔ بٹھل کو ان مزاحمتوں اور مدافعتوں کا اچھی طرح احساس ہوگا اور اس نے تمام عواقب و نتائج' ہر پہلو پر خوب سوچ سمجھ ہی کے یہ عزم کیا ہوگا۔ گھر کے سارے ملازم سات آٹھ دنوں میں بٹھل سے خاصے مانوس ہوچکے ہیں۔ برملا کہتے ہیں' پہلے ایسا کوئی صاحب دل مہمان یہاں نہیں آیا ہے۔ بٹھل نے درپردہ ان کا خیال بھی بہت رکھا ہے۔ ہر ایک کو اس کی خدمت سے بڑھ کے نوازا ہے۔ بٹھل پر انگلی اٹھاتے ہوئے' ان کے رگ و پے میں بڑی اینٹھن ہوگی۔ مروت سے بڑی زنجیر نہیں ہوتی۔ سب ہی بٹھل کا ورد کرتے ہیں۔ اس کے سامنے سر اٹھانے اور زبان کھولنے کی جرات مشکل سے ہونی چاہیے لیکن یہ حقیقت بھی بٹھل کے ذہن سے اوجھل نہ ہوگی' اس نے انہیں اتنا نمک نہیں کھلایا ہے' جتنے وہ سید صاحب کے نمک آشنا ہیں۔ اگر واقعی کسی کا دماغ پھر گیا تو

مجبوراً بٹھل کو دوسرا طریقہ یا اپنا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔ یہ نوبت نہ آئے تو اچھا ہے ورنہ بات بہت بگڑ جائے گی اور دور بھی چلی جائے گی۔

میرا دماغ پراگندہ ہو رہا تھا۔ طرح طرح کے وسوسے سر میں بھن بھنا رہے تھے۔ شک کرنے کا کوئی ایسا جواز تو نہیں ہے۔ تانگے میں دو خواتین اور نصیر بابا کے ساتھ بٹھل کی ہم نشینی کے کوئی بھی معنی لیے جاسکتے ہیں۔ سنا ہے' دل اور آنکھوں کا گہرا تعلق ہے۔ دل صاف نہ ہو تو بینائی بھی آلودہ ہو جاتی ہے۔ بٹھل کے لیے ان کے دل میں یوں کوئی آلودگی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ تاثر بھی قائم کیا جاسکتا ہے کہ جس طرف نصیر بابا اور دونوں خواتین کا قصد ہے' اتفاق سے وہی راستہ بٹھل کو بھی مقصود ہے۔ میں بھی تو بٹھل کے ہم راہ نہیں ہوں۔ ان کی دانست میں مجھے اس وقت مہمان خانے میں واقع اپنے کمرے میں ہونا چاہیے۔ ہمارا سامان بھی یہیں رکھا ہوا ہے۔ ہم دونوں میں سے کسی ایک کی گھر میں موجودگی دوسرے کی واپسی کی ضمانت ہے۔

رئیس بیگم اور اس کی حاشیہ بردار خادمائیں مسلسل میری نگاہوں کی گرفت میں تھیں لیکن آدمی کی صرف دو آنکھیں نہیں ہوتیں۔ زنان خانے کے اس کمرے میں میرا وجود ایک سراب کی مانند تھا۔ میں تو نچلی منزل پر بھٹک رہا تھا۔ میں تو جانے کہاں کہاں بکھرا ہوا تھا۔ یکایک اس خیال نے مجھے اور متلاطم کیا کہ تانگا طلب کرنے کا حکم تو بٹھل نے دیا تھا۔ اس نے ابن کو خاص طور سے عمارت کے اندر تانگا ٹھہرانے کی ہدایت کی تھی۔ ابن نے فدویانہ انداز میں استفسار کیا تھا کہ کیا دوپہر' کھانے کے وقت تک بٹھل کی واپسی ممکن ہو جائے گی۔ بٹھل نے سرسری سہی مگر جواب اقرار میں دیا تھا۔ بٹھل کے اچٹتے لہجے سے ابن کسی قدر متذبذب ہوا تھا اور ایک اچھے اطاعت شعار کا جو وتیرہ ہوتا ہے' اس نے خاموشی کو ترجیح دی تھی۔ گویا زنان خانے سے دو خواتین کے باہر جانے کے معاملے میں کسی نہ کسی طرح بٹھل کی منشا شامل ہے۔ آج تک زنان خانے سے بٹھل کے کسی ربط ضبط کا کوئی شاہد نہیں تھا پھر اچانک یہ رسم و راہ کس طرح صورت پذیر ہوئی؟ اب جو کچھ بھی ہو۔ میں نے خود کو مجتمع رکھنے کی کوشش کی۔ جب سامنے کا صاف نظر نہ آتا ہو تو آدمی کو پلکیں بھینچ لینا چاہیے۔

نصیر بابا کو گئے ہوئے دس منٹ کے قریب ہو چکے ہوں گے۔ مجھے کچھ دیر اور یہاں ٹھہرے رہنا ہے۔ اس کے بعد جو کچھ بھی ہو۔ میری جانب سے تو شاید کوئی کوتاہی نہیں ہوئی

ہے۔ رئیس بیگم سر جھکائے گنگ بیٹھی تھی۔ سامنے ایک دوسرے میں پیوست خادماؤں کی سراسیمگی کا وہی عالم تھا۔ کسی کی نظریں کبھی مجھ سے چار ہو جاتیں تو اس کا سراپا ... طرح لرز جاتا' وہ اپنے آپ میں اور سمٹ جاتی۔ اب انہیں بڑی حد تک اس جبر و بندش کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔ فروزاں ا... یاسمن کی تخصیص سے انہیں کھٹک جانا چاہیے۔ فروزاں ا... یاسمن کہیں چھپ تو نہیں گئی ہوں گی۔ نصیر بابا کو انہیں بلا... لاتا ہوتا تو اتنی دیر نہ لگتی' کب کی وہ یہاں آچکی ہوتیں۔ وق... گزرنے کے ساتھ رئیس بیگم اور خادماؤں کا یہ شبہ پختہ ہو... ہوگا کہ ان کی اسیری کا سلسلہ فروزاں اور یاسمن سے وابستہ ہے۔ ممکن ہے' فروزاں اور یاسمن کا فرار ان کے تصور... بعید ہو۔ اس کے بجائے کچھ اور خدشے در آئے ہوں' مذموم و مکروہ اندیشے۔ آدمی کا دماغ بہت بے مہار ہوتا... اور ایسی صورت میں تو اور بھی بے سمت' بے کنار۔ آئینہ... دھند جمی ہو تو شکلیں کچھ کی کچھ ہو جاتی ہیں۔ ان کے علم... ہے کہ زنان خانے میں ایک اور مہمان' میرا ساتھی اور بٹھل بھی ٹھہرا ہوا تھا۔ ان کی نظر میں اسے سرغنہ کی حیثیت حاصل ہوگی۔ ہو سکتا ہے' ہر طرف سے آسودہ ہو کے' بعد... وہ بھی نصیر بابا کی اعانت سے زنان خانے میں داخل ہو... اور... اندھیرے میں یہی کچھ ہوتا ہے' اختیار چھن جاتا... اندھیرے میں آدمی اندھا ہو جاتا ہے۔ بہرحال کچھ اور د... بات ہے۔ کچھ دیر میں ان کی یہ دھند چھٹ جائے گی... انہیں اپنے ذہنی فشار' اعصابی ابتری سے نجات مل... گی۔

زنان خانے سے میرے جانے کے بعد ان پر... وسکوت طاری نہیں رہے گا۔ وہ بلکتی اور بلبلاتی ہوئی... سے پہلے فروزاں اور یاسمن کی خلوت گاہ پر یورش کر... اور عمارت کے گوشے گوشے میں پھیل جائیں گی۔ کوئی... منزل کی طرف دوڑے گی اور ملازموں کو اس سانحے... دے گی اور ملازم جب فروزاں اور یاسمن کی روانگی کا... گوش گزار کریں گے تو سارے میں کھلبلی مچ جائے گی... ایک جانب نصیر بابا کے تانگے کے پیچھے' دوسری جانب... صاحب کی تلاش میں ہرکارے دوڑائیں گی پھر میرے... مناسب ہے؟ دانائی شاید اسی میں ہے کہ میں تادیر یہیں... رہوں اور انہیں اپنی نظروں کے حصار میں محبوس ر... اس طرح بٹھل اور نصیر بابا کو زیادہ سے زیادہ فاصلہ طے... کا موقع مل جائے گا۔ ہرچند یہاں زیادہ دیر ٹھہرے ر... کسی دخل اندازی کے امکانات اور بڑھ جاتے ہیں... ...ازی

...بٹھل اور نصیر بابا کے نکل جانے کے بعد پھڑکتی ہڈی کا ...شخص خاطر جمع رکھنے کے لیے یا اس دوران میں یوں ہی ...کسی معمول کے مطابق زنان خانے کا دروازہ کھٹ کھٹا ...ہے۔ دروازہ کھلا ہے اور کوئی آواز جھکار بھی نہیں ہے۔ ...کمرے سونگھتا ہوا وہ بے قرار اس کمرے تک بھی پہنچ ...ہے۔ وہ سب کے سب تو یہاں نہیں آسکتے۔ زنان خانے ...ملازم کو داخلے کی اجازت نہیں ہوگی۔ نصیر بابا کے علاوہ ...دو ہی اصیل اس رتبے سے نوازے گئے ہوں گے۔ کسی ...اچانک آجانے کی افتاد کے کے تو ہمہ جاں' ہمہ دم ...یہ بڑا نازک لمحہ ہوگا تاہم دروازے سے قریب رہنے ...ت یہی تھی کہ کسی آہٹ یا دستک پر' ممکن ہو تو از خود ...ہ کھول سکوں اور کوئی ایسا حربہ آزمایا جائے کہ آنے ...کو ہوش و حواس بجا رکھنے کی مہلت نہ مل سکے اور وہاں ...زل پر تعینات ملازم بھی مہمان خانے میں مجھے ایک نظر ...ر تسلی کرنا ضرور چاہیں گے۔ مجھے وہاں نہ پا کر ان کے ...ٹھنکیں گے اور کمرے میں ہمارا سامان جوں کا توں دیکھ ...ان کے اضطراب کا پارا اتنا بلند نہیں ہوگا لیکن انہیں ...سراغ حاصل کیے بغیر سکون نہیں آئے گا۔ اچھا یہی ہے ...بٹھل جلد سے جلد واپس آجائے۔ اس کی جلد واپسی سے ...کچھ سنبھل جائے گا' سنبھلے گا نہیں تو ایسا شدید بھی نہیں ...

...رئیس بیگم کی آواز پر میں چونک پڑا۔ پہلے تو مجھے اپنے ...ا پر کسی واہمے کا گمان ہوا۔ وہ مجھی سے مخاطب تھی۔ ...دور اندیش شخص کی طرح اس نے اتنی دیر میں خود کو ...ر کر لیا تھا۔ کسی نتیجے پر پہنچنے کے بعد یہ حوصلہ بیدار ہوتا ...۔ اس کے شائستہ لہجے میں نہایت عاجزی تھی۔ کہنے لگی ...کی جان سکتی ہے کہ ہم نے کیا قصور کیا ہے' یہ ہمیں کس ...کی سزا دی جا رہی ہے؟"

...میرے ہونٹوں پر زہر پھیل گیا۔ جی میں آیا' زور سے ...طمانچہ ماروں کہ کسی کو شکل دکھانے کے لائق نہ رہے۔ ...ظاہر اپنا قصور پوچھ رہی تھی۔ میں بل کھا کے رہ گیا۔ یہ ...ت فرد جرم عائد کرنے اور جرح بازی کرنے کا نہیں تھا۔ ...نے بھینچے ہوئے ہونٹوں سے کہا "سب معلوم ہو جائے گا' ...ذرا دیر میں۔"

اس نے پھر کچھ نہیں کہا' پھر چند لمحوں بعد ناتوانی سے ..."بندی کا حلق خشک ہو رہا ہے' کچھ پانی اگر..."

"پانی یہاں کہاں ہے۔" میں نے تلخی سے کہا۔ وہ ...دل طرف دیدے گھما کے رہ گئی۔ بے چارگی و بے بسی کی ...زرد گرد...

تمام علامتیں اس کے چہرے پر سمٹ آئیں۔ میں اسے پانی کہاں سے فراہم کرتا۔ وہ کیسا ستم ظریفانہ مطالبہ کر رہی تھی "بندی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ دوا جاری ہے۔" وہ اٹکتی زبان سے بولی۔

مجھے معلوم تھا' وہ حرفوں کی بنی ہوئی ہے۔ مجھے پہلے ہی اس کی کسی بات کا جواب نہیں دینا چاہیے تھا۔ میرے جواب سے اس کی ہمت سوا ہو رہی تھی۔ ابھی زبان کھلی ہے' بعد میں ہاتھ پیر بھی کھلنے لگیں گے۔ نصیر بابا کی زبانی اس کی شیشہ بازی سے مجھے آگاہی نہ ہوئی ہوتی تو بڑی وحشت ہوتی۔ وہ سارے واقعات رات بھر میری آنکھوں میں گھومتے رہے۔ میرا بس چلتا تو اسی وقت زنان خانے کی سیڑھیاں پھلانگ کے اس کے سر پہ جا پہنچا' رات بھر میرا خون جلتا رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اب اس سے کیا سلوک کروں۔ اس سے پہلے ایسی دو عورتوں سے میرا واسطہ پڑ چکا تھا۔ ایک وہ بدکار نسترن تھی۔ اس کمینی نے کورا کو مجھ سے جدا کرنے کے لیے جال پھیلایا تھا۔ سات سال بعد جب میں جیل سے لوٹا تو اتفاق سے دوبارہ وہ مجھے ریل کے ڈبے میں نظر آگئی۔ وہ مجھے پہچان نہیں پائی تھی۔ اس بار اس کے ساتھ خوش نہاد زریں تھی۔ لگتا تھا' خدا نے اسے اپنے ہاتھوں سے تراشا ہے۔ زریں کو دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ نسترن سے اس کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ نسترن کو میں چلتی گاڑی سے باہر پھینک دیتا' زریں کے خیال نے میرے ہاتھ باندھے رکھے۔ بعد میں بس مجھے نسترن کے چنگل سے زریں کو چھڑا لینے کا وقت ہی مل سکا۔ نسترن جانے اب کہاں ہو؟ خدا اسے غارت کرے۔ کاش وہ ایک بار اور ٹکرا جائے پھر چمپا بیگم کے لیے بھی میرے سینے میں ایسی ہی آگ بھڑکی تھی۔ اس نے نمی کو بالا خانے پر بٹھا دیا تھا۔ چمپا بیگم نے اپنی زندگی کا طور ہی بدل لیا۔ اس نے اپنا سب کچھ ترک کر دیا۔ پیچھے مڑ کے ہی نہیں دیکھا۔ وہ تو سراپا توبہ بن گئی' ایک مسلسل پشیمانی اور عجز و انکسار' اظہارِ ندامت کے لیے اس نے میرا تعاقب جاری رکھا' جاری رکھے ہوئے ہے۔ کون یقین کرے گا کہ جو عورت' نمی کو بالا خانے تک لے گئی تھی' وہی اب نمی کے گھر میں اس کی بہنوں کے ساتھ رہتی ہے۔ چمپا بیگم تو بالکل پگھل گئی تھی۔ اس کے اندر اتنی سیاہی نہیں تبھی تھی' کوئی کرن ضرور چھپی تھی اور اسے بس کسی کا انتظار تھا۔ مجھے معلوم تھا' اس عورت رئیس بیگم کا سردست میں کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا۔ پیٹ کے بغیر کتنے لوگ یوں گھروں' گلیوں اور بازاروں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ سب ان کے ختم ہو جانے اور ختم

کر دینے کی آرزو کرتے ہیں اور دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ ہر کوئی چمپا بیگم نہیں ہوتا۔ جو نہیں ہو پاتا' پھر اسے برتنا بھی دوسرے طریقے سے چاہیے۔

آدھ گھنٹے کے قریب وقت ہو چکا ہوگا۔ میرے پاس گھڑی نہیں تھی لیکن میں تو ایک ایک پل گن رہا تھا۔ مجھ پر تو یہ عرصہ مہینوں اور برسوں کی طرح گزرا تھا۔ رئیس بیگم اور خادماؤں سے زیادہ خوار تو میں خود تھا۔ اس کے بدلے بٹھل میرے ذمے کوئی اور کام لگا دیتا تو ایسی بیزاری اور وحشت نہ ہوتی۔ میں کچھ بھی طے نہ کر سکا کہ مجھے اور کتنی دیر یہاں ٹھہرے رہنا ہے۔ بٹھل اور نصیر بابا اب تک خاصی دور جا چکے ہوں گے۔ عمارت سے باہر نکلنے میں انہیں ناکامی ہوتی تو نصیر بابا مجھے اس محبس سے رہائی دلانے کسی طرح لوٹ کے ضرور آتے۔ یہ وقت تو بہرحال جیسے تیسے گزر گیا ہے' باقی بھی گزر جائے گا' آگے بھی کیا ہوگا' آگے کا بس تصور ہی کیا سکتا ہے۔ یہاں سے میرے جاتے ہی ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوگا۔ زنان خانے سے بلند ہونے والے شور سے نچلی منزل کے ملازم سرگرم ہو جائیں گے۔ میں تو مہمان خانے ہی میں ہوں گا۔ وہ مجھے ہر طرف سے گھیر لیں گے۔ ابتدا ہی میں مجھے ان سے دو ٹوک بات کرنی ہوگی۔ انہیں باور کرانا ہوگا کہ میں یہیں موجود ہوں اور بٹھل بھی واپس آ رہا ہے۔ بٹھل کی واپسی تک مجھ سے کوئی سوال جواب نہ کیا جائے۔ کمرے میں جاتے ہی احتیاطاً مجھے تمنچا سامان سے نکالنا ہوگا۔ شاید اس کی ضرورت نہ پڑے۔ اب ان سے مراسم کی نوعیت یکسر مختلف ہوگی۔ ان کی نگاہیں بدلی ہوئی ہوں گی۔ وہ مجھ سے خوف زدہ بھی ہوں گے اور مجھے نظروں سے دور بھی نہیں رکھیں گے' اگر اس دوران میں بھولے بھٹکے سید صاحب گھر آ گئے یا انہیں ڈھنڈوا کے بلوا لیا گیا تو ان کا قہر و غضب بے پناہ ہونا چاہیے۔ ہو سکتا ہے' وہ پولیس طلب کر لیں۔ بٹھل کی واپسی تک مجھے بہت صبر و تحمل کرنا ہوگا۔ بٹھل کو بھی میری وجہ سے جلد واپسی کی فکر ہوگی۔ مجھے اس سے کچھ پوچھنے' سمجھنے اور بوجھنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ اس نے کہا اور میں چل پڑا۔ میری طرح اسے بھی کچھ کر گزرنے کی بے چینی ہوگی جو اس نے آگے پیچھے کا مجھے کچھ بتانا ضروری نہیں سمجھا' غالباً دانستہ۔ اس نے باقی مجھ پر چھوڑ دیا تھا کہ پیش آنے والے نشیب و فراز کے مطابق میں خود ہی فیصلے کرتا رہوں۔ احکام سے آدمی پابند ہو جاتا ہے۔ اس نے ایسی ہدایتیں جاری کرنا عرصے سے بند کر دیا تھا۔ لکھنؤ میں رجن کا سامنا کرتے ہوئے بھی اس نے مجھ سے ایک لفظ نہیں کہا تھا بلکہ

رجن سے زور آزمائی کے لیے میں کھڑا ہوا تو اس نے مجھے نہیں روکا۔ چاندنی بانو کے لیے میری بولی پر بھی اس نے کوئی باز پرس نہیں کی۔ شمشاد خاں کے اڈے پر پولیس آئی تو خاموش بیٹھا رہا۔ میں خود ہی پولیس افسر سے الجھتا رہا۔ بے شک اس نے دخل دینا کم کر دیا تھا لیکن وہ میری سنتا بھی بہت کم تھا۔ میں نے کتنی عاجزی کی کہ فیض آباد تک آئے ہیں تو کچھ دن کے لیے یہیں ٹھہر جاؤ' زریں کو دیکھے ہوئے دن ہو گئے۔ وہ بہت ناراض ہوگی۔ بٹھل نے میری ایک نہ سنی۔ اگر ہم وہاں رک جاتے تو اس طرف آنا ٹل بھی سکتا تھا۔ وہی بات' جیسا لوگ کہتے ہیں' دانے دانے پر مہر ہوتی ہے۔ لمحے لمحے پر بھی یہی قول صادق آتا ہے۔ آدمی سوچتا کچھ ہے ہو کچھ جاتا ہے۔ طبیعت کی خرابی' سید کے ہاں قیام' نصیر سے ملاقات' یہاں دو ستم رسیدہ لڑکیوں کو ہماری ضرورت تھی' کیسی شدید ضرورت جیسے کسی نے دھکیل کے ہمیں یہاں بھیجا ہو۔ ہمارا یہاں آنا اچھا ہی ہوا' ہمارے لیے نہیں تو ان دونوں کے لیے۔ ہم نہ آتے تو ان کی مسیحائی کو کون آتا' کب آتا۔ ان کا بھی وہی حشر ہوتا جو ان کے والدین کا ہوا تھا۔ اب وہ کسی گوشۂ اماں میں چلی جائیں گی۔ ہمارا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اطراف و جوانب میں سید کا زور و اثر ہے' وہ ہمارے راستے میں بڑی رکاوٹیں کھڑی کر سکتا ہے۔ جانے کتنی مدت لگ جائے مگر ہمارے پاس روز و شب کی کمی ہے۔

کچھ وقت اور بیتا ہوگا کہ راہ داری کی طرف سے کسی کے تیز قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کوئی کسی کا نام لے رہا تھا۔ آواز مردانہ تھی اور گھبرائی ہوئی۔ زنان خانے کی ویرانی کے اس کا یہی حال ہونا چاہیے تھا۔ سامنے بیٹھی خادماؤں میں ایک تموج سا نمودار ہوا۔ رئیس بیگم کے ڈھلکے ہوئے شانے بھی اکڑ گئے۔ چاہیں اور قریب آ... میں نے جھٹ رئیس بیگم کا بازو پکڑ کر اسے کرسی سے ... اور دوبارہ چاقو اس کے نزدیک کیا۔ خادماؤں کی سسکیاں نکل گئیں۔ میں انہیں خاموش رہنے کی تلقین کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے خود کو روک لیا۔ میری آواز باہر بھی جا سکتی تھی۔ بہ عجلت دروازہ کھول کے میں نے رئیس بیگم کو ... رکھنے کے بجائے اپنے پیچھے' دائیں ہاتھ کے پہلو میں ... جانب کیا اور خود دروازے کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ ... بالکل چھپ گئی تھی۔ آنے والے کو دور سے اندر کمرہ فوراً کچھ نظر نہیں آ سکتا تھا تاوقتیکہ وہ کچھ آگے آ کر ... کے تصدیق نہ کرے۔ بہ صورت دیگر کسی خادمہ کی ...

... باہر سے نظر آ جاتی تو اندر آنے کے لیے اس کی بے تابی بھی ہو سکتی تھی۔ نہیں معلوم' اسے کوئی نظر آیا یا کھلے ... دروازے اسے مہمیز کیا۔ ہر دو صورت میں اس کا اندر آنا یا ... جھانکنا لازم تھا۔ دروازے پر آ کے اس نے اضطراری انداز ... ہنکاری بھری کچھ بڑبڑایا۔ میں اسی لمحے کا منتظر تھا۔ جیسے ہی اس نے اندر جھانکا اور قدم بڑھائے' میں نے چشم زدن میں دروازے کی اوٹ سے نکل کے اس کی گردن پر پنجہ ڈالنا چاہا۔ عین موقع پر وہ ترچھا ہو گیا اور اس کی کلائی میری گرفت میں آ سکی۔ ہاتھ کی ذرا سی ڈھیل دے کے طاقت سے جھٹکا دیا ... تو بازو اپنی جگہ نہیں رہتا۔ اس کی چیخ بلند ہوئی۔ وہ اس ... کے لیے قطعاً تیار نہیں تھا' پاگل سا ہو گیا پھر میں نے ... اس کے کولھے پر پیر سے ضرب لگائی تو وہ اوندھے ... قالین پر جا گرا اور ڈکرانے لگا۔ اس نے میرا چاقو دیکھ لیا ... مجھ سے دور ہونے کے لیے اسے فوراً کسی محفوظ گوشے ... ضرورت تھی' اس لیے وہ شدید تکلیف کے باوجود اٹھ ... اس سے پہلے کہ وہ دیوانگی کرے' میں نے اسے خادماؤں کے ساتھ خاموشی سے بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ اس صورت حال ... یہ رعایت اس کے لیے بڑی جاں فزا ہوگی۔ وہ ہڑبڑا کے ... رہتا' لوٹتا پوٹتا ہوا خادماؤں کی طرف جا پہنچا۔ ہیبت سے اس ... آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔ رئیس بیگم پر بھی اس نے نگاہ ... کی تھی۔ چند ثانیوں کے لیے مجھے اس سے دست بردار ہونا ... تھا۔ موقع غنیمت جان کے وہ فرار کی احمقانہ کوشش ... رکتی تھی مگر وہ تو اور کونے میں دبک گئی جیسے دیوار میں ... جائے گی۔

آنے والے شخص کا نام کچھ اور ہوگا' سب اسے بانکا ... کہتے تھے۔ عمر تیس سے اوپر' دبلا پتلا' اٹھتا قد' رنگت صاف ... بڑی بڑی نشیلی سی سرمہ بھری آنکھیں' پیچھے کی طرف ... اور سلیقے سے کنگھی کیے ہوئے لمبے بال اب بے ترتیب ہو گئے تھے۔ لٹیں ماتھے اور چہرے پر بکھر گئی تھیں۔ ... کے کرتے اور پاجامے میں ملبوس تھا۔ اچھی شکل صورت کا تھا مگر کچھ آواز میں بل تھا' کچھ اعضا میں' چلتے ... اور باتیں کرتے کرتے اچانک لہرا جاتا۔ کئی بار مہمان خانے میں میرے لیے کھانے کا طشت لے کے آیا تھا۔ مہذب اور جاں نثار قسم کا شخص تھا۔ ابن کہتا تھا' اس کے ہاتھوں' انگلیوں میں جادو ہے۔ ایسی مالش کرتا ہے کہ آدمی مدہوش ہو جائے' سارا جسم جھن جھنا جائے۔ بانکے نے متعدد مرتبہ میرے جسم کی مالش کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی' میں منع کر دیتا تھا۔ وہ خادماؤں سے زیادہ ہراساں ہو گیا۔ دیر تک

ہانپتا کانپتا رہا۔ میرے جی میں آیا' اس سے پوچھوں' نصیر بابا کہاں ہیں۔ کچھ تو سن گن ملے گی لیکن رئیس بیگم اور خادماؤں کو اس کے کسی جواب سے تقویت مل سکتی تھی۔ میں چپ رہا اور میں نے دوبارہ دروازہ بند کر دیا۔

بانکے کے بعد کوئی اور بھی آ سکتا تھا۔ میں دروازے کے قریب ہی رہا۔ کوئی پانچ منٹ اور گزرے ہوں گے کہ ایک اور ادھیڑ عمر عورت کو مجھے خادماؤں کے پاس بٹھانا پڑا۔ راہ داری میں وہ مضطربانہ صدائیں لگاتی ہمارے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ سیدھی اندر چلی آئی' مجھے کچھ زیادہ زحمت نہیں کرنی پڑی۔ دروازے کے پہلو سے اچانک اپنے سامنے میرے نمودار ہو جانے پر وہ چکرا گئی۔ منہ کھلے کا کھلا رہ گیا' جسم ڈگمگا گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ کھینچ کے خادماؤں کی طرف دھکیل دیا۔ وہ لڑھکتی پڑھکتی ان پر جا گری۔ کچھ خادماؤں نے اس نیم جاں کو سہارا دیا اور جگہ بنا کے اسے سمیٹ لیا۔

رئیس بیگم سمیت ان کی تعداد اب چودہ ہو گئی تھی۔ مزید دیر ہو جانے سے یہ تعداد بڑھ سکتی تھی۔ میں اکیلا تھا اور میرے پاس صرف چاقو تھا۔ اتنی بڑی نفری میں کسی کی غیرت بیدار ہو سکتی تھی۔ مجھے خون خرابہ بھی نہیں کرنا تھا۔ گو کسی نووارد سے نمٹنے کے لیے ذہن میں پہلے جیسی الجھن نہیں رہی تھی۔ وقت کچھ اور گزر گیا تھا' پون گھنٹے کے لگ بھگ لیکن کچھ طے نہیں تھا۔ آدمی خود پر گزرنے والی کیفیات سے وقت کی پیمائش کرتا ہے' تند ہو تو لمحے پہاڑ بن جاتے ہیں' لطف و کرم پر مائل ہو تو مانند حباب' مانند ہوا ہے۔ میں نے کچھ اور توقف کیا۔ اتنی تن دہی سے کھڑے کھڑے ٹانگیں جکڑنے لگی تھیں۔ مسلسل بخار سے ابھی میں اٹھا ہی تھا۔ دوا جاری تھی اور ڈاکٹر کشن نے زیادہ تھکاوٹ سے منع کیا تھا۔ مزید دس منٹ اور گزرے ہوں گے کہ میں نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور آدھا جسم باہر نکال کے راہ داری میں نگاہ دوڑائی۔ سکوت طاری تھا۔ دروازہ بند کر کے میں اندر آ گیا اور میں نے باہر نکلنے کا ارادہ کر لیا پھر ایک خیال نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے میرے قدم روک لیے۔ ایسے ہی چلے جانے کے بجائے اگر میں انہیں کشمکش و پیچ سے دوچار کر کے جاؤں تو کیا حرج ہے۔ مجھے رئیس بیگم سے کہنا چاہیے کہ کچھ دیر کے لیے مجھے باہر جانا ہے' جو جہاں موجود ہے' وہیں ٹھہرا رہے۔ کسی نے اپنی جگہ سے جنبش کی تو ... میری مراد یہ تھی کہ میرے جانے کے بعد کسی نتیجے پر پہنچنے میں انہیں پس و پیش ہو' ان کی داد فریاد' ہاؤ ہو میں کچھ تاخیر ہو جائے۔ یہ تب ہی ممکن تھا کہ

انہیں میرے واپس آجانے کا یقین ہو اور اگر ایسا نہیں ہوا
پھر معاً ایک اور تدبیر میرے دماغ میں کوندی اور مجھے منتشر کرگئی۔ کیوں نہ میں ان سب کو یہیں چھوڑ کے رئیس بیگم کو ساتھ لے کے باہر نکلوں۔ میری خواہش پر رئیس بیگم انہیں متنبہ کرتی جائے گی کہ اس کی واپسی تک سب یہیں موجود رہیں، کوئی بھی باہر نکلنے کی جرات نہ کرے۔ رئیس بیگم کا یہ انتباہ ان کے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ میں رئیس بیگم کو بے سدھ کر کے کسی اور کمرے میں محبوس کردوں۔ خادمائیں یہاں اس کی واپسی کا انتظار کھینچتی رہیں گی اور رئیس بیگم کسی اور کمرے میں بے خبر پڑی ہوگی۔ یوں کچھ اور وقت مل جائے گا مگر کتنا؟ کیا پھر مجھے نیچے چلے جانا چاہیے؟

○☆○

میں زنان خانہ مقفل نہیں کرسکتا۔ میرے باہر جاتے ہی کوئی بھولا بھٹکا ادھر آنکلا اور مختلف کمروں کی طرف تاک جھانک کرتا ہوا رئیس بیگم کے کمرے تک پہنچ گیا اور محصور خادماؤں تک! تو کیا حاصل ہوگا، کتنی دیر کی رعایت، اور اگر رئیس بیگم کو دوسرے کمرے تک لے جانے کے دوران میں ہی کسی نے اوپری منزل کا رخ کرلیا تو میری کیا ترجیح ہونی چاہیے؟ مجھے رئیس بیگم کو سنبھالے رکھنا ہے یا آنے والے شخص کو روکنا ہے؟ رئیس بیگم کو چاقو کی زد پر دیکھنے کے باوجود وہ شخص پسپا نہیں ہوا، خود کو ترک کرنے یا تعمیل حکم پر آمادہ ہونے کے بجائے الٹے قدموں بھاگ کھڑا ہوا تو مجھے رئیس بیگم سے ہاتھ اٹھا کے اس شخص کا تعاقب کرنا چاہیے؟ وہ تو نیچے جاتے ہی فیل مچادے گا۔ مجھے یہی مناسب معلوم ہوا کہ ان لوگوں کا اختیار واپس کرکے میں اپنی راہ لوں۔ جلد یا بدیر مجھے یہی کرنا ہے۔ اس کشمکش میں چند منٹ اور گزر گئے اور دروازہ کھول کے باہر نکل آیا۔ انہیں متذبذب رکھنے کے لیے چلتے چلتے یہ تنبیہ و تاکید مجھے ایسی سطحی اور غیر ضروری نہیں لگی کہ میں تھوڑی دیر بعد ان کے درمیان واپس آرہا ہوں۔ میری واپسی تک وہ اپنی جگہ قائم رہیں تو ان کے حق میں بہتر ہے۔ باقی اب ان پر تھا کہ میرے غلبہ و تسلط سے نجات پانے میں وہ کتنا وقت لیتی ہیں، خود سے کس قدر حجت کرتی ہیں۔

عقبی سبزہ زار کی جانب کھلنے والے دروازے کا زینہ اتر کے میں تیز قدموں سے نیچے آگیا۔ وہاں دور دور تک کوئی شخص نہیں تھا۔ کھلی ہوا میں آکے پسینہ آگیا اور ایسا لگا جیسے کسی بڑی مہم سے لوٹا ہوں، میں اندھیرے سے اجالے میں آگیا ہوں، آسمان پر بادل اتنے گھرے نہیں رہے تھے لیکن دھوپ بھی نہیں تھی۔ میں نے اپنی رفتار دھیمی کی۔ جسم تھکنے لگا تھا۔ مجھے دیکھ کے بشارت اچھل گیا اور ٹھٹکا
"آپ کدھر تھے چھوٹے صاحب؟" اس نے دور
متردد آواز میں پوچھا۔

"کیوں! کیا ہوا؟" میں نے درشتی سے کہا۔

"کچھ نہیں۔" وہ بل کھا گیا "وہ وہ ابن آپ کو
تھا۔"

"ابن کہاں ہے؟" میں نے نسبت ٹھہری ہوئی
پوچھا۔

"آپ کے کمرے کی طرف۔"

بشارت میرے ساتھ رہا، کچھ دور، چند قدم کا فا
کر کے میں اپنے کمرے تک پہنچ گیا۔ وہاں نذرو،
ایک اور ملازم جس کے نام سے میں واقف نہیں
رہے تھے۔ تینوں میری جانب امڈ پڑے۔ "کہاں
آپ؟" ابن نے وحشت سے پوچھا۔

"زنان خانے کی طرف۔" میں نے سکون سے
دیا۔

"وہاں! آپ وہاں تھے۔" وہ اٹکتی آواز میں بولا

"ہاں!" میں نے بے اعتنائی سے کہا "وہیں۔"

ان کے چہروں سے ظاہر تھا، میرے جواب
تشفی نہیں ہوئی ہے۔ اچھے ملازموں کو چہروں او
پہچان خوب ہوتی ہے۔ ابن کچھ اور کہنا چاہتا تھا
رہا۔

"بابا کب گئے ہیں؟" میں نے سرسری طور پر پو

"انہیں تو دیر ہوگئی۔"

"کب تک آنے کو کہہ گئے ہیں؟"

"جلدی ہی کا بول گئے تھے۔" ابن کی آواز
تھی۔

ایک بات تو واضح ہوگئی تھی کہ بٹھل اور
فروزاں اور یاسمن کو یہاں سے لے جانے میں کوئی
پیش نہیں آئی ہے لیکن اس وقت ابن اور دیگر ملاز
تکدر ہو نہ ہو، مہمان خانے سے اتنی دیر میرے غا
نے انہیں ضرور متوحش کیا تھا۔ آج تک چوں کہ
ہوا تھا۔ ممکن ہے انہوں نے ہی اپنا تجسس دور کر
بانکے کو زنان خانے بھیجا ہو اور وہ ابھی تک واپس
تھا یا آ نہیں سکا تھا۔

میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ ابن کی جانب
مشروب اور پھل وغیرہ کی پیش کش پر میں نے
ماڈ

ب کیا۔ اس نے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلنے اور مجھے
ونے میں خاصی مستعدی دکھائی۔ آنے والا وقت میرے
لیے ایک تجربے کی حیثیت رکھتا تھا۔ آنے والے وقت میں
بٹھل اور مجھ سے ان سعادت آثار خدمت گزاروں کا کیا
ر ہوگا؟ انہیں یک بیک اپنی وضع بدلنے میں کس قدر
واری ہوگی۔ سر جھکانا ان کا پیشہ ہے، کچھ ہی دیر جاری
عجب ندامت آمیز تلخی اور کدورت آمیز پشیمانی کا سا
م ہوگا ان کا۔

کمرے میں گھڑی موجود تھی۔ ساڑھے بارہ بج رہے
ف گویا بٹھل اور نصیر بابا کو گئے ہوئے سوا گھنٹے کے قریب
رہا تھا۔

ابن کمرے کی چیزیں درست کرنے لگا۔ یہ اس کا معمول
۔ جب بھی آتا، کبھی بستر کی چادر، میز پوش، پردے ٹھیک
رنے لگتا۔ کبھی کرسیوں، میزوں اور صوفوں کی صفائی۔
اف نظر آرہا تھا کہ آج اس کے اس مشغلے میں پہلے جیسی
جھی نہیں ہے۔ میں نے بستر پر جماہی لی تو وہ مردشناس سمجھ
یا کہ مجھے خلوت کی ضرورت ہے۔ چپکے سے وہ دروازہ بند
رکے چلا گیا۔ "سنو!" میں نے اسے پکارا تو وہ سٹ پٹاتے
ے لوٹ آیا۔ "میں یہیں کمرے میں موجود ہوں، کہیں باہر
یں جارہا۔" وہ پریشان نظروں سے مجھے دیکھا کیا "کچھ دیر
بابا آجائیں گے۔" میں نے کہا۔

"جی، جی اچھا۔" وہ گوں مگوں کی حالت میں بولا۔ اس نے
چھ توقف کیا پھر کمرے سے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی
ھی سے اتر کے میں نے سامان سے تمنچا نکالا اور بستر پہ
کے ڈھیر ہوگیا۔ بس کچھ دیر کا سکوت اور ٹھہراؤ پھر زنان
نے سے شور بلند ہوگا اور جیسے در و دیوار متحرک ہوجائیں
ے، سارے گھر کا موسم بدل جائے گا۔ میرا اندازہ صحیح تھا،
ئیس بیگم اور خادمائیں ابھی تک میری واپسی کی منتظر ہوں
ے۔ میری نظریں گھڑی پر ٹکی ہوئی تھیں۔ کمرے میں گھڑی
ی ٹک ٹک گونج رہی تھی۔ صدائیں ایک جیسی اور دھیمی
وں تو خاموشی اور گہری کردیتی ہیں۔ وقت دھڑک رہا تھا۔
میرا دل بھی دھڑک رہا تھا۔ میں نے خود کو ٹٹولا اور مجھے
مانیت ہوئی۔ اس دھڑکن میں خوف کی آمیزش نہیں تھی۔
نے والے وقت کی نگاہیں کیسی ہی بے مہر ہوں، وہ دونوں تو
ہاں سے چلی گئیں۔ کچھ تو اس جزا کی سزا ہمیں بھگتنی ہے۔
ں نے خود کو آسان کرنے کی کوشش کی، آنکھیں بند رکھنے
ور جسم کی گرہیں کھولنے کی کوشش۔ نہ آنکھیں بند ہوتی
ھیں نہ جسم کھلتا تھا۔ وقت کم رہ گیا تھا۔ اس اثنا میں بدلتے
رویوں اور تیوروں سے مزاحمت اور مدافعت کے لیے مجھے اپنا رد عمل متعین کرلینا چاہیے تھا۔ سید محمود علی کی عدم موجودگی میں گھر کے کارندے رئیس بیگم کے احکام کی پیروی کریں گے اور رئیس بیگم غصہ و غم میں انہیں کوئی بھی مذموم قسم کا حکم دے سکتی ہے۔ میرے لیے غالباً یہی ایک طریق سود مند تھا کہ بٹھل کے آنے تک بہرصورت منضبط اور متحمل رہوں۔ چاقو، تمنچے یا اوڑے کے کسی زور، بل کی نمائش سے وہ اور بدک سکتے، بھڑک سکتے ہیں۔ بٹھل کے آنے کے بعد تو میرا کام ختم ہی ہوجائے گا۔

دروازے کے باہر اٹھنے والے شور سے میں چونک پڑا۔ باہر سے بھاگتے ہوئے آدمی کی بے ہنگم چاپیں ایک دم تیز ہوگئیں، دروازہ تڑاخ سے کھلا اور حواس باختہ بشارت نامی ملازم اندر آیا، جیسے مجھے ختم کردینے کے درپے ہو۔ آیا وہ بہت زور شور سے تھا لیکن مسہری کے پاس آکے اس نے بر وقت خود کو تھام لیا تھا۔

میں اٹھ کے بیٹھ گیا "کیا ہے؟" میں نے ناگواری سے پوچھا۔

"آپ، آپ زنان خانے میں تھے؟" اس کی آواز قابو میں نہیں تھی۔

"ہاں۔" میں نے سرہلا کے کہا۔

"بانو صاحب بانو صاحب کیا بولتی ہیں؟" وہ خفقانی لہجے میں بولا۔

میں کوئی جواب دینے والا تھا کہ دروازے کے باہر پھر شور اٹھا۔ بڑے دروازے پر تعینات بندوق بردار دربان پاگلوں کی طرح تڑختا پھڑکتا ہوا کمرے میں آگیا۔ وہ گٹھے ہوئے جسم کا ادھیڑ آدمی تھا "بانو صاحب بولتی ہیں" اس آدمی کو باہر مت جانے دو۔ نئیں، تو نئیں تو۔" وہ وحشیانہ انداز میں بولا "کوئی اکڑ پھکڑ کرے تو گولی ماردو۔"

میں بستر پہ بیٹھا رہا۔

دربان نے بندوق تان لی۔ اس کا رخ میری طرف تھا۔ میں نے ہاتھ اوپر نہیں اٹھائے "میں یہیں بیٹھا ہوں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی میری آواز کھسیا گئی "تم بالکل فکر نہ کرو، جاؤ بڑے دروازے پر جا کے چوکسی دو، نہیں تو پھر یہیں آرام سے بیٹھو۔ بندوق دیکھ لینا، ٹھیک طرح چلتی ہے کہ نہیں۔"

وہ تلملا کے رہ گیا۔ اس نے بندوق نیچی نہیں کی۔ اتنی دیر میں ابن اور نذرو بھی ہونقوں کی طرح منہ پھاڑے بولائے ہوئے اندر آگئے۔ ان کے پیچھے بانکا بھی لپکتا ہوا کمرے میں داخل ہوگیا اور لرزتی آواز میں بولا "ہاں ہاں، بانو

صاحب بولتی ہیں' مالک کے آنے تک اس کمینے ناشکرے کو رسی سے' زنجیر سے باندھ کے رکھو۔ کہیں بھاگ نہ جائے۔ اس نمک حرام نے ہم لوگوں کو بڑا ستایا ہے۔ کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ کیا کیا بولوں تم کو۔ خدا خیر کرے' بانو صاحب کی حالت تو بہت خراب ہے۔" اس نے پنجہ پھیلاتے اور جھرجھری لیتے ہوئے کہا "اس کے پاس بہت بڑا چاقو ہے۔"

ان پانچوں نے مسہری کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ ابن کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ تاہم وہ انہی کے ساتھ تھا "چاقو کدھر ہے؟" دربان دہاڑتے ہوئے بولا اور بندوق سے نشانہ لینے کی بھبکی دینے لگا۔

"چاقو ہے میرے پاس؟" میں نے جیب تھپ تھپاتے ہوئے کہا "پہلے میری بات دھیان سے سن لو۔ تم لوگوں سے اپنا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ تمہارے ساتھ ہم نے اچھا وقت گزارا ہے۔ تمہیں اصل بات معلوم نہیں ہے۔ معلوم ہو جائے گی تو پچھتاوا ہوگا۔ اس لیے بہتر ہے..."

"ہم کو اس سے غرض نہیں۔" نذرو برہمی سے بولا "ہم تمہارے نوکر نہیں ہیں' جس کے ہیں' اس کے حکم پر چلنا ہے۔"

"تو مالک کو آنے دو۔ وہ اب نہیں تو..."

دربان نے بھی مجھے بات مکمل نہیں کرنے دی۔ کڑکتی آواز میں بولا "چاقو کدھر ہے؟"

"دیکھو! تمہیں یہی حکم ملا ہے ناکہ مجھے یہاں سے جانے نہ دو یا کچھ اور؟" میں نے نرمی سے کہا "بھروسا رکھو' میں یہیں موجود ہوں اور رسی' زنجیر اور جکڑنے کا شوق ہے تو ٹھیک ہے' یہ بھی پورا کر لو لیکن اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ تم پانچ ہو' میں اکیلا۔ تمہارے پاس بندوق بھی ہے ــ میں تمہارا گھیرا توڑ کے کس طرح جا سکتا ہوں' جانا چاہوں تو تم مجھے روک بھی نہیں سکتے تھے۔ میں کب کا جا چکا ہوتا۔ اپنا کام ختم کر کے زنان خانے سے سیدھا چلا جاتا۔ یہاں اپنے کمرے میں کیوں واپس آتا۔ ہمارا سامان بھی یہیں رکھا ہے۔ مجھے بابا کا انتظار ہے اور تمہارے مالک کا بھی۔ ان سے ملاقات کیے بغیر ہم نہیں جائیں گے۔ بات مت بڑھاؤ۔ اطمینان سے اپنے اپنے کام پر جاؤ یا پھر ادھر ہی میرے پاس بیٹھو۔ ذرا صبر و ضبط سے کام لو۔"

دربان نے سنی ان سنی کر دی "چاقو نکالو۔" وہ پھنکارتی آواز میں بولا اور میرے کچھ اور نزدیک آ گیا۔

جیب سے چاقو نکال کے میں اس کے حوالے کر سکتا تھا لیکن میں نے دانستہ تامل کیا کہ کچھ رو و قدح' حیل و حجت کے بعد انہیں چاقو حاصل کرنے کی سرخوشی زیادہ ہوگی۔ اس طرح وقت گزارنا بھی مقصود تھا۔ دربان کوئی مشاق اور آزمودہ کار آدمی معلوم ہوتا تھا۔ سید محمود علی نے بڑے دروازے کے لیے دس آدمیوں کے بعد ہی اسے منتخب کیا ہوگا۔ مجھے یقین تھا کہ ملازمین میں ایسی درجہ بندی نہیں۔ تاہم اس وقت دربان نے اپنے ساتھیوں کے حاکم یا سردار کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ ہتھیار پاس ہو تو آدمی کا غمزہ کچھ اور ہو جاتا ہے۔ آدمی بے پناہ' بے شمار ہو جاتا ہے۔ دربان نے مجھے کوئی مہلت نہیں دی اور اپنا ارادہ تبدیل کر کے ابن کو میری جیب سے چاقو نکالنے کا کام سپرد کیا۔ ابن کے انکار سے اس نے بری طرح اسے لتاڑا۔

ابن کے چہرے پر جال پھیل گیا تھا۔ وہ جھجکتے ہوئے میری طرف بڑھا۔ اس کی نگاہوں میں تاسف بھی تھا' معذرت بھی تھی۔ دربان نے بندوق سے میرا نشانہ لے رکھا تھا۔ مجھے بے حرکت ہی رہنا چاہیے تھا۔ وہ اڈے کے آدمی نہیں تھے جو کوئی وار کرتے ہوئے اوچھے پن سے اجتناب کریں۔ اڈے کے آدمی کو خیال رہتا ہے کہ پھر مقابل کو جواب میں ہر طرح کی آزادی مل جاتی ہے۔ مقابل سے کسی قاعدے اور ضابطے کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔ سارے گھریلو ملازم تھے' صرف ان کا سرغنہ' دربان ان سے خاصا مختلف تھا۔ آثار بتا رہے تھے کہ زندگی میں کبھی نہ کبھی اڈے پاڑے سے وابستگی رہی ہے۔

جُھل کہتا تھا' عام لوگوں کے نرغے میں اڈے کے آدمیوں سے زیادہ احتیاط کی ضرورت پڑتی ہے۔ مجھے احساس تھا' آقا کی خوشنودگی' اس کی نظروں میں سرخ روئی کی تمنا میں کسی کی بینائی بھی متاثر ہو سکتی تھی۔ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے اور کوئی معرکہ سرانجام دینے کا سودا کسی کے بھی سر میں سما سکتا تھا۔ رئیس بیگم کو اپنی آتش غضب سرد کرنے کا وقت نہیں ملا ہوگا۔ وہ مجھ پر یورش کا حکم دیتے ہوئے اس کے لیے حدود کا تعین نہیں کر پائی ہوگی۔

چاقو حاصل ہونے کے بعد ان کی رگوں میں خون کی گردش کچھ اعتدال پر آ سکتی تھی۔ میرے پاس کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ مزید چوں وچرا کیے بغیر ابن کو جیب سے چاقو نکالنے دوں لیکن یکایک میرے دماغ میں آیا کہ ان پانچوں سے کسی اور طرح بھی نمٹا جا سکتا ہے۔ کچھ اور سوچنے کا وقت نہیں تھا جیسے ہی ابن مسہری کے دائیں طرف میرے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالنے کے لیے آیا' میں نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے ہانک لگائی "دروازے پر کون ہے ... آؤ ... آ کر ...

آزمودہ ساحربہ تھا لیکن شاید ہر ایک کا آزمودہ ہے اور ... کارگر ہوتا ہے۔

دربان کی جگہ کوئی بھی ہوتا' ایک لمحے کے لیے اس کی ... دروازے کی جانب مبذول ہو جاتی۔ میں مسہری پر بیٹھا ... دربان مسہری کی پائنتی سے جڑا کھڑا تھا۔ اس کی بندوق ... نال میرے سینے سے ڈیڑھ دو فٹ کے فاصلے پر تھی۔ بندوق ... قریب نہیں رکھنا چاہیے۔ میری نگاہ نال پر جمی ہوئی ... ہاتھ اور نگاہ میں ایسے وقت جُھل کے یہ قول' بہت ... میل ہونا چاہیے' ہاتھ نگاہ کا پابند رہے' ہاتھ نگاہ بن ... یک بیک وقت ان سب کی نظریں دروازے پر مرکوز ... ذہنی طور پر بھی میری ہانک کا مفہوم اخذ کرنے کی ... میں وہ منتشر ہوئے۔ اسی دم بستر پر بیٹھے بیٹھے زقند ... کے انداز میں' میں اپنی جگہ سے بلند ہوا۔ بندوق کی ... پکڑنے اور ضرب لگانے کے لیے میں نے بایاں ہاتھ خالی ... تھا۔ بندوق کی نال پکڑنے اور لگانے میں پل بھر کا وقفہ ... مسہری پر کھڑے ہو جانے سے مجھے دربان پر موقع کی ... حاصل ہو گئی تھی۔ اس کے سر پہ ضرب لگاتے ہوئے ... نے پوری قوت جمع کی تھی۔ وہ بلک اٹھا' معاً کسی تاخیر کے ... میں نے اس کے پیٹ پر گھٹنا مارا۔ اس دوسری چوٹ کی وہ ... نہ لا سکا' بندوق پر اس کی گرفت متاثر ہونی چاہیے ... باقی چاروں مجھے روکنے کے لیے مسہری پر چڑھنے لگے۔ ... ان کی پروا کرتا تو دربان کو سانس لینے کی فرصت مل جاتی۔ ... چاروں کے مسہری پر چڑھنے سے پہلے بندوق کی نال ... پکڑے کود کر میں مسہری سے نیچے آ گیا۔ دربان بے ... ہو چکا تھا۔ نیچے آ کے میں نے الٹے ہاتھ سے اس کے منہ ... طمانچہ رسید کیا تو وہ بندوق پر اپنا تسلط برقرار نہ رکھ سکا۔ ... گروہ چاروں مجھ سے لپٹ گئے اور چھینا جھپٹی کرنے لگے۔ ... بندوق قبضے میں آ جانے کے بعد ان چاروں کو سنبھالنا دشوار ... تھا۔ چنانچہ میں نے بندوق کی نال اور بٹ سے ان پر بے ... ضربیں لگائیں تو افراتفری کی صورت ہو گئی۔ وہ دور دور ... لگے۔ میں نے فوراً دروازے کا رخ کیا تاکہ کوئی باہر نہ ... جائے۔

ان کی پیشانیاں سکڑ گئیں تھیں اور چہروں کے رنگ ... گئے تھے۔ بندوق کے نشانے پر دربان سمیت وہ چاروں ... طرف ہو گئے "دیوار کی طرف منہ کر لو۔" میں نے بلند ... آواز سے کہا۔

انہوں نے فوراً تعمیل کی اور صوفے کے پاس دیوار کی ... منہ کیے ایک دوسرے کے قریب کھڑے ہو گئے "وہ ...

پانچ تھے' ان کے معطل ہو جانے کے بعد رئیس بیگم کے احکام پر عمل کے لیے شاید اب تین چار ہی باقی رہ گئے ہوں۔ دروازہ بند کر کے میں نے گلاس میں بچے ہوئے پانی کے چند گھونٹ سے حلق تر کیا اور دروازے کے قریب کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا۔ انہیں کھڑے کھڑے چند منٹ گزرے ہوں گے کہ میں نے انہیں بیٹھ جانے کی ہدایت کی۔ بیٹھے ہوئے آدمی کو فعال ہونے میں کھڑے ہوئے آدمی کی نسبت کچھ دیر لگتی ہے۔

ڈیڑھ بج رہا تھا۔ جُھل کو آ جانا چاہیے تھا۔ مہمان خانے سے ابن' نذرو' بشارت' بانکے اور دربان کے نہ پہنچنے پر رئیس بیگم اور دیوانی ہو گئی ہوگی۔ اس نے یقیناً دو آدمیوں کو سید کی تلاش میں یا اس کے کسی صاحب حیثیت دوست کے پاس مدد کے لیے باہر بھیجا ہوگا۔ پہلے نہیں تو اب اسے کسی کو یہ خدمت سونپنی ہوگی بشرطیکہ کوئی چاق و چوبند ملازم اسے آسانی سے دست یاب ہو جائے۔ بعض خادماؤں کو مردان خانے میں آمد و رفت کی اجازت ہے' وہ گھر سے باہر نہیں جا سکتیں مگر بھاگ دوڑ کرنے والے کسی ملازم یا ان پانچ گم شدگان کے سراغ میں زنان خانے سے باہر نکل پڑی ہوں گی اور اب یہاں آیا ہی چاہتی ہوں گی۔ میں ان کا منتظر تھا۔ ان کا کیا' کسی کا بھی۔

زنان خانے کے زنداں کی بات اور تھی۔ بانکے کے سوا وہاں ساری عورتیں تھیں۔ ان سے نبرد آزمائی کا مجھے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ وہاں بند کمروں میں اتنی عورتوں کے سامنے میرا دم گھٹ رہا تھا۔ وقت گزرنے کا عمل بھی وہاں نہایت سست تھا اور مسلسل یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں ... اور نصیر بابا ناکام نہ ہو گئے ہوں۔ یہاں میں نسبتاً بہتر حالت میں اور بہتر زاویے سے تھا۔ آگے پیچھے کمرے کے دو دروازے تھے' ایک باہر کی طرف جالی کا' دوسرا اندر کی جانب عام دروازہ۔ جالی کے دروازے پر کوئی چٹخنی یا کنڈی نہیں تھی۔ میں نے اندر کا دروازہ دوبارہ کھول دیا۔ جالی کے دروازے سے باہر کا منظر اتنا صاف تو نہیں البتہ نظر ضرور آتا تھا۔ باہر سے جالی کے پار کمرے کا اندر کا کچھ حصہ ہی دکھائی دیتا تھا جب کمرا خوب روشن ہو۔ وہ پانچوں پہلے اکڑوں بیٹھے تھے' بعد میں چپکے چپکے انہوں نے آلتی پالتی کی نشست اختیار کر لی۔ زنان خانے سے دہائیاں دیتی ہوئی رئیس بیگم اور خادماؤں نے میری نسبت کچھ ایسی شدت انہیں باور کرائی تھی کہ کسی اور طرف دیکھنا اور سمجھنا انہوں نے ضروری نہیں سمجھا۔ حالانکہ کمرا کھلا ہوا تھا' میں بستر پر دراز تھا۔ ان کی اچانک آمد پر میں نے

کسی اضطراب کا اظہار بھی نہیں کیا تھا۔ انہیں جتا بھی دیا تھا کہ میں یہیں موجود ہوں۔ بہرحال میرے لیے تو ان کی سرکشی اور بدحواسی کا اچھا ہی نتیجہ برآمد ہوا۔ اب یہ احساس انہیں بھی شاید ہو رہا ہو۔

ان میں سے صرف ابن نے ایک بار سر گھمانے کے وزدیدگی سے میری طرف دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے کرسی پر تعینات دیکھ کے اس نے فوراً گردن سیدھی کرلی اور سرگوشی میں اپنے ساتھیوں کو کوئی فہمایش بھی کی۔ ظاہر ہے، احتیاط کی۔ ان کسمپرساں، بے چارگاں کو دیوار کے ساتھ بیٹھے ہوئے دس منٹ ہوچکے ہوں گے۔ ابھی تک باہر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ رئیس بیگم پر تو ایک ایک پل قیامت کی طرح گزر رہا ہوگا۔ میرے احوال کی تفتیش کے لیے اب تک کسی کو آجانا چاہیے تھا۔ وہ پانچوں بھی پہلو بدل رہے تھے مجھے ان کی یہ ہیت کذائی بالکل اچھی نہیں لگ رہی تھی مگر اس کے سوا تدارک بھی نہیں تھا۔ یہاں سے ہمارے رخصت ہوجانے کے بعد جانے کون کون سید محمود علی کے عتاب کا نشانہ بنے۔

ابن کو کسمساتا دیکھ کے مجھے خیال آیا کہ ان میں سے کسی کو بحال کردینے میں بظاہر کسی ضرر کا احتمال نہیں۔ میں نے ابن کو پکارا، وہ بیٹھے بیٹھے اچھل پڑا۔ میں نے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا تو اسے یقین نہیں آیا پھر وہ مجرموں کی طرح سر جھکائے، پھٹی پھٹی آنکھوں اور آہستہ قدموں سے مجھ سے کچھ فاصلے پر آکے کھڑا ہوگیا "اپنے ساتھیوں کو پانی پلاؤ۔" میں نے کہا "اور پھل وغیرہ بھی انہیں دے دو۔"

وہ حیرانی کے ایک عالم سے گزرا اور اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ خاموشی سے وہ جگ اور گلاس اپنے ساتھیوں کے پاس لے گیا۔ کسی کو پیاس لگی ہو یا نہیں، ہر ایک نے جلدی جلدی خود کو سیراب کیا، البتہ پھلوں کے طشت کو ہاتھ نہیں لگایا اور انہوں نے اپنے منہ دیوار کی طرف کیے رکھے۔ جگ اور گلاس میز پر رکھ کے ابن واپس اپنی جگہ چلا گیا مگر میری آواز پر پلٹ آیا۔ عین اس وقت مہمان خانے کی راہ داری میں آہٹیں گونجیں۔ میں نے کرسی چھوڑ دی۔ وہ دو لڑکیاں تھیں، چادر میں لپٹی ہوئی۔ جالی کی دیوار کی وجہ سے ان کے چہرے صاف نظر نہیں آرہے تھے۔ بڑی برق رفتاری سے وہ تقریباً بھاگتی ہوئی آئی تھیں اور میرے کمرے سے کچھ فاصلے پر آکے ٹھہر گئیں۔ ابن کو میں نے روک لیا تھا اور کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس سے کیا کہوں، خود دروازے پر جاؤں یا ابن کو بھیجوں یا ابھی انتظار کروں۔ لڑکیاں یہاں تک آچکی

تھیں لیکن وہ کسی ایسے کمرے میں بے دھڑک کہا داخل ہوسکتی تھی جو مجھ سے وابستہ ہو۔ انہیں تو دستک ہوئے بھی ہول آرہے ہوں گے۔ میں نے ابن کو درواز جانے کا اشارہ کیا۔ یہ بے اعتباری بے جواز نہیں تھی گ خود کو قائل نہ کرسکا کہ ابن جالی کے کھلے دروازے بھاگ سکتا ہے۔ شکر ہے، ابن نے مجھے شرم سار نہیں ک جالی کے قریب گیا اور فوراً واپس آگیا۔ اس نے سرگو لہجے میں مجھے بتایا کہ زنان خانے کی دو خادمائیں جو ہی ا باہر کھڑی ہیں۔

یہ تو میں نے بھی دیکھ لیا تھا۔ ان کے نام معلوم ہ سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ابن میرے دوسرے حکم مستعد تھا۔ میری خاموشی پر وہ ایک طرف ہوگیا اور ا اپنے ساتھیوں کے پاس نہیں گیا۔ باہر دونوں لڑکیا دوسرے کو ٹوک اور ٹھوک رہی تھیں۔ ان میں دروازے کے قریب پھٹکنے کی جرات نہیں ہو رہی تھ کو باہر بھیج کے کسی حیلے حوالے سے انہیں اندر ب کوشش کا کچھ حاصل بھی نہیں تھا اور یوں ابن کی شاید ہی اندر آتیں۔ ابن کو دیکھتے ہی وہ طرح طرح شروع کردیتیں، میری موجودگی میں ان کے سوال جواب ابن کے لیے آسان نہیں تھے۔ وہ کشمکش باہر کھڑی رہیں۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن وا ہوگی ان کی۔ دیر ہوگئی تو کسی ایک نے ہمت کی اور چھپچھاتی ہوئی سی آواز میں اس نے پہلے نذرو بشارت پھر بانکے اور ابن کا۔ اندر سے کوئی جواب نہیں انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے کمرے میں جھانکنے بھی کی۔ اندر کمرے میں اندھیرا ہی نظر آرہا تھا۔ ا سکوت کے باوجود انہیں کمرے میں داخل ہونے کا مول نہیں لینا چاہیے تھا۔ میں اگر اندر ہوں تو مج ہی رہنا چاہیے۔ زنان خانے کا آموختہ انہیں ا ضروری نہیں کہ زنان خانے سے وہ سیدھی یہا ہوں۔ پہلے انہوں نے بڑے دروازے پر جاکے وہا والے واحد دربان سے میرے بارے میں تصدیق عمارت کے مختلف گوشوں میں، مجھے ابن، نذرو وغیرہ کو تلاش کرتے ہوئے میرے کمرے کا ر یہاں آکے ان کی حیرتیں اور دبیز، اور شدید ہوجا اتنے سارے لوگ پھر کون سی کھوہ میں جا چھپے! از انہیں آسمان نے نگل لیا؟ چند منٹ بعد اتمام ج انہوں نے دوبارہ اپنے ہم قبیلوں کے نام پکار

کی لرزش نمایاں تھی۔ دو چار قدم بڑھ کے انہوں نے زے پر دستک دینے کی جسارت قطعاً نہیں کی، اس سے ایثار انہیں نہیں کرنا چاہیے تھا۔ خادم کے ترک و ایثار لیے مخدوم کا صدق و صفا شرط ہے۔ آخر انہوں نے واپس نے کا فیصلہ کرلیا اور تیز قدموں سے زنان خانے کی طرف گئیں۔ اچھا ہوا، وہ واپس چلی گئیں۔ کسی تدبیر سے اندر بلا کے نفری بڑھانے سے بہتر میرے لیے یہی تھا وہ خالی ہاتھ زنان خانے واپس چلی جائیں۔ رئیس بیگم کی ت میں حاضر ہوکے جانے اب وہ کیسی فسانہ طرازیاں ظاہر ہے، اسے اور سنسان اور ویران ہی کریں گی۔

○☆○

تین بجے کے قریب بٹھل واپس آگیا اور میں نے جانا، سر سے کوئی پہاڑ ہٹ گیا ہے، میرے جسم سے بندھی رسیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اس کے آنے پہلے کہیں سید محمود علی نہ آجائے۔ میں اس سے کسی مباحثے، عناد و فساد میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ میرے پاس ہی راستہ تھا کہ بٹھل کے آنے تک سید کو بھی تمنچے یا ن کے زیر رکھ لوں۔ بٹھل اتنا تھکا ہوا نہیں لگتا تھا۔ ے کا ماجرا دیکھ کے اس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ "یہ کیا رے؟" وہ تنک کے بولا۔

"میں نے انہیں بتایا تھا کہ مجھے تمہارا انتظار ہے۔ ابھی یہاں سے نہیں جانا، یہ نہیں۔" ۔۔ دربان نے ق تان لی۔"

بٹھل نے ہنکاری بھری۔ "اس نے کچھ زیادہ ہی کھایا۔" وہ بھڑک کے بولا "جاؤ رے، تمہاری ضرورت ادھری ہے۔"

اس نے جب ہاتھ جھٹک کے انہیں باہر جانے کے لیے تب ان کی سمجھ میں آیا۔ وہ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے کھڑے ہوئے لیکن باہر نہیں نکلے چونکہ دربان دروازے جانب بڑھتے بڑھتے ٹھہر گیا تھا۔ وہ بٹھل کے آگے ہاتھ کے کھڑا رہا، سبھی نے اس کی تقلید کی۔ "تو ٹنکی مت کر، کے آنے میں ابھی کوئی دیر نہیں ہے پھر کھولنے پڑ جائیں۔" بٹھل نے تلخی سے کہا۔

مجھے حیرت ہوئی، بٹھل نے دربان کی بندوق میرے ہاتھ اچک کے اس کی طرف اچھال دی۔ بندوق زمین پر رہائی مگر دربان نے پھرتی سے جھک کے اس پر قبضہ کرلیا ہا جگہ جما ہوا پھیلی ہوئی آنکھوں سے بٹھل کو دیکھتا ۔ نذرو کے ٹوکنے پر وہ حرکت میں آیا اور اپنے ساتھیوں

کے ساتھ سر جھکائے زنان خانے کی طرف بڑھ گیا۔

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ پانی پی کے بٹھل مسہری کے قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا حقہ ٹھنڈا پڑا تھا۔ سرپوش ہٹا کے اس نے انگلی سے چلم کی راکھ کریدی پھر بیڑی سلگا کے لمبے لمبے کش کھینچنے لگا۔ وہ اپنے ساتھ کاغذ کا ایک تھیلا لایا تھا۔ تھیلے پر روغنی دھبے پڑے تھے "بڑی دیر لگادی تم نے؟" میری آواز دھیمی تھی۔

"ہاں رے، ادھری گاڑی ٹائم پے نہیں تھی سسری، بڑھئو نے گردن میں رسی الگ سے ڈال رکھی تھی گاڑی چلنے پے ہی پھندا ہٹایا۔"

"وہ بھی ان کے ساتھ تھا، وہ وہ ظفر؟"

"ابھی اس کو اپنے کھونٹے پر ٹکنا چاہیے، بعد کو مل جائے گا ان سے۔"

"کس طرف بھیجا ان کو؟"

"ٹکٹ میں وہی ابھاگن ہے۔" وہ بدبداتے ہوئے بولا "دوری کا رستہ ان چھوئی موئیوں کے لیے ٹھیک نہیں رہتا۔"

میں سمجھ گیا، ابھاگن سے اس کی مراد زریں سے تھی۔ ابھی کچھ عرصے پہلے ہم نے سلمیٰ کو وہاں بھیجا تھا، اب یہ تینوں، فروزاں، یاسمن، اور نصیر بابا وہاں چلے گئے۔ منیر علی کا خاندان، نیساں اور اکبر پہلے ہی وہاں تھے۔ خانم بھی شاید اس دوران میں حیدر آباد واپس آچکی ہو۔ جگہ کی کوئی کمی تو نہیں تھی وہاں۔ بٹھل ٹھیک ہی کہہ رہا تھا، ابھی انہیں زریں ہی کے پاس جانا چاہیے تھا۔ بمبئی کا ماحول ان کے لیے بہت اجنبی ہوتا اور شاید زریں کی طرح ان کی دیکھ بھال بھی کوئی نہ کرپاتا۔ پذیرائی اور نگہداشت میں خاصا فرق ہے۔ زریں تو کسی دریا کے مانند ہے، اس کے پاس بہت سایہ، بہت ٹھنڈک، بہت ریشم ہے، وہ بھی تو ایسے وقت سے گزری ہے۔ دوسروں کا دکھ خوب سمجھتی ہے۔

میں بٹھل سے اور بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے کاغذ کا تھیلا میری طرف سرکا دیا "کچھ کھالے رے۔" وہ بوجھل آواز میں بولا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے چونک کے پوچھا۔

"ادھری اب دانہ دنکا بند ہی جان۔ بیچ میں دونے والا دکھائی پڑ گیا۔ جلدی کر، پھر ٹائم ملے نہ ملے۔"

"تم نے کچھ کھایا؟"

"ادھری اڈے پے چائے کی پیالی پی تھی، انگریزی بسکٹ بھی ساتھ تھے۔"

"مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔"

"تھوڑا سا چکھ لے' ہاکا پکا ہے سارا' بعد کا کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"

"تم بھی ساتھ دو۔"

میں نے تھیلے سے دونے نکال کے پھلوں کے لیے' رکھی ہوئی رکابیوں میں منتقل کیے۔ تازہ کچوریوں' سوجی کے حلوے' ترکاری اور پنیر کے سموسوں سے نصف تھیلا بھرا تھا۔ ابھی سب چیزیں نرم گرم تھیں۔ دیسی گھی کی خوشبو الگ سے پہچانی جاتی ہے۔ سارے کمرے میں پھیل گئی۔ ایک دو کچوریاں' تھوڑا سا حلوہ میں نے مل کی وجہ سے زہر مار کیا اور اس نے میری وجہ سے۔

ساری چیزیں تقریباً بچ گئی تھیں۔ جی ٹھکانے پر نہ ہو تو کیسی خوش منظری اور کیا خوش ذائقی۔ مل آنکھیں موند کے کرسی پر نیم دراز ہوگیا۔ مجھے بہت الجھن ہورہی تھی۔ کمرے میں ٹہلتے ٹہلتے ایک بار میں نے دروازے پر جاکے جالی کے پار دیکھا۔ دور راہ داری میں نذرو اور بشارت گھومتے نظر آئے۔ انہیں یقیناً ہماری نگرانی پر متعین کیا گیا ہوگا۔ پھر تو بڑے دروازے پر بھی خاصا اہتمام ہوگا۔ میں نے مل کی نقل میں بستر پر لیٹ جانا چاہا لیکن آدمی آدمی میں مٹی مٹی کا فرق ہوتا ہے۔ کوئی جیسے میرا جسم نوچنے لگا۔ بیماری کے دوران میں روز و شب اس کمرے میں رہتے ہوئے گوشے گوشے سے واقفیت ہوگئی تھی۔ یہی کمرا جو کل تک بلکہ صبح تک راحت و آرام کا سبب بنا ہوا تھا' اب اس کے در و دیوار کاٹ کھانے کے درپے تھے۔ کچھ واضح نہیں تھا کہ اس قفس سے کب اور کس طرح رہائی نصیب ہوگی۔ سید محمود علی ہمارے گلے میں ہار پھول ڈال کے ہمیں رخصت نہیں کرے گا۔ مل کو بھی کچھ اس کا احساس ہوگا' وہ گم سم سا لگ رہا تھا۔

پانچ بجے گھڑی کی آواز پر مل نے آنکھیں کھولیں' گھڑی پر اچٹتی سی نظریں ڈالیں اور بازو جھٹکتا ہوا کھڑا ہوگیا۔ کمرے میں روشنی کم ہوگئی تھی۔ وہ باہر جانے لگا تو میں نے بے تابانہ پوچھا "کہاں' کہاں جارہے ہو؟"

"ادھری ہوا بھاری ہے' تھوڑا تازی کو دیکھتے ہیں۔" وہ منہ بنا کے بولا۔ اس کے پیچھے پیچھے میں بھی باہر آگیا۔ ہم دونوں کمرے کے پاس رکھی ہوئی آرام کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ واقعی باہر کی ہوا کمرے سے بہت مختلف تھی' نرم اور خنک۔ دیواروں میں ہوا بھی تو قید ہوجاتی ہے' آزاد ہوا کی بات ہی اور ہے۔ نذرو اور بشارت ابھی تک راہ داری میں موجود تھے۔ وہ ہمارے پاس نہیں آئے تھے اور کچھ آڑ میں ہوگئے۔ آسمان سے ابھی تک بادل نہیں ہٹے تھے لیکن بارش کے آثار بھی نہیں تھے۔ کئی بار میں نے مل کو کریدنے' ٹٹولنے کا ارادہ کیا لیکن اسے دیکھ کے ہمت ہی نہیں پڑتی تھی۔ میرے ذہن میں واضح نہیں تھا کہ کون سی عقدہ کشائی مطلوب ہے۔ شاید مجھے کسی گداز کی ضرورت تھی اور خیال تھا کہ سردست وہ اس صلاحیت سے عاری ہے۔ اس کی حالت بھی مجھ سے جدا نہیں' سائل اور مسؤل ایک ہی ناؤ میں سوار ہوں تو کوئی کیا سوال کرے اور کوئی کیا جواب دے۔

ہمیں باہر آئے دس منٹ سے زیادہ نہیں گزرے ہوں گے کہ سید محمود علی ایک درمیانہ عمر ایک پختہ عمر کے بھاری بھرکم آدمیوں کے ساتھ راہ داری میں نظر آیا۔ اس کے ساتھیوں کے تن و توش سے آسودہ حالی نمایاں تھی۔ ایک سفید دھوتی اور سلک کے کرتے میں ملبوس تھا' دوسرا پاجامے اور رئل ٹل کے کرتے میں۔ اس کے گلے میں سونے کی زنجیر بھی پڑی تھی' کرتے کے بٹن بھی سونے کے تھے۔ دونوں کی رنگت تپتے تانبے جیسی تھی۔ دولت اور اختیار کی تابش چہرے اور آنکھوں سے چھلکتی ہے۔ ان کے پیچھے کچھ فاصلے سے نذرو' بشارت' ابن اور دربان کے علاوہ چند اور آدمی تھے۔ کندھے سے لٹکنے کے بجائے بندوق دربان کے ہاتھ میں دبی ہوئی تھی۔ سید اور اس کے ہم راہیوں کی رفتار تیز تھی۔ ہمیں سامنے دیکھ کے انہوں نے لمحے بھر تامل کیا اور سید نے ہاتھ اٹھا کے اپنے عقب میں آنے والوں کو روک دیا۔ وہ تینوں اس تیزی سے ہماری طرف بڑھے اور ہمارے سامنے آکے ٹھہر گئے۔ میری توقع کے مطابق سید محمود علی کے چہرے سے شعلے لپک رہے تھے۔ تادیر وہ خوں بار آنکھوں سے ہمیں دیکھا کیا۔ اس کے نتھنے اور ہونٹ پھڑک رہے تھے۔ اس کے ایک ساتھی نے اس کی کمر پر ہاتھ رکھ کے تھپکی دی۔

"کہاں ہیں وہ؟" سید نے کوئی تمہید ضروری نہیں سمجھی۔ شدتِ غضب سے اس کی آواز بھرا گئی۔

"کس کو پوچھتے ہو صاحب؟" مل نے سادگی سے کہا۔

"تھوڑا رسان سے بات کرو۔"

"کہاں ہیں وہ؟ وہ تینوں؟" سید محمود علی نے جلتی آواز میں تکرار کی۔

"وہ تو دور چلے گئے۔" مل نے گہری سانس بھری۔

"کہاں' کہاں؟" سید پیر پٹخ کے بولا اور چیخنے لگا "کہاں پوچھتے ہیں؟"

"کیا بات کرتے ہو صاحب! آپ کو کیسے بول دیں۔"

"تو' تو تم نہیں بتاؤ گے؟"

"کیسی الٹی بات کرتے ہو آپ۔" مل نے ترشی سے کہا "ہم نے ادھری سے ان کو نکالنے میں ٹھیکا دیا ہے' ہمی سے ٹھکانا پوچھتے ہو۔"

"یعنی تم ہی نے انہیں یہاں سے بھیجا ہے۔" سید نے بھڑک کے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور ہذیانی انداز میں بولا "دیکھا! دیکھا تم نے! یہ کیا بکتا ہے۔۔۔ یہ۔۔۔"

سید کے معمر ساتھی نے کہنی مار کے تحمل کا مشورہ دیا اور سلجھی ہوئی آواز میں مل سے مخاطب ہوا "تم نے ایسا کیوں کیا شری مان جی؟"

"اپنا کیا صاحب! ان کی مرضی یہی تھی۔ ان لوگوں نے ہم سے بنتی کی تھی۔ ہم نے سارا آگا پیچھا جان کے ان کو ادھری سے نکال دیا۔"

سید محمود علی پھر اکھڑ گیا مگر اس کے پختہ کار ساتھی نے اسے خاموش کروا کے مل سے کہا "تم اس گھر کے مہمان ہو یا مالک؟"

"کام کی بات کرو صاحب! ہم نے پٹی نہیں باندھ رکھی ہے۔ کالا پیلا اچھی طرح سے ٹیپتا ہے اپنے کو۔"

"تم کو اس کا انجام معلوم ہے۔" معمر آدمی کی آواز بھی بگڑ گئی "ادھر تمہارا بڑا مان کیا گیا' تم مہمان رہے ہو۔ تمہارے لیے اچھا ہوگا کہ تم سیدھی طرح بتادو' کدھر ان لوگ کو چھپایا ہے یا بھیجا ہے۔"

"آگے کا پورا جان کے ہی ایسا کیا ہوگا صاحب!" مل نے سپاٹ لہجے میں کہا "ایک بات بولیں' آپ ان کے سنگی ساتھی ہو پر آپ بیچ میں نہ آؤ تو ٹھیک ہے۔ سید صاحب سے ہم بات کرلیں گے۔ سارا سمجھادیں گے ان کو۔"

"یہ اس طرح نہیں مانیں گے۔" سید اپنے آپے میں نہیں تھا' پھنکارتا ہوا بولا "مجھے تو یہ اور قسم کے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ ان سے انہی کی زبان میں بات کرنی چاہیے۔ بسورا! تم نہیں جانتے' یہ جو اس رستم کے ساتھ چھوٹا سورما کھڑا ہے' اس حرام زادے نے گھر کے اندر گھس کے' پردہ دار عورتوں میں گھس کے کیا حرم زدگیاں کی ہیں۔ بہت لوٹ مار مچائی ہے اس نے۔ کمزور عورتوں پر ہاتھ اٹھایا ہے' مارا پیٹا ہے ان کو۔ یہ چاقو لے کے گیا تھا وہاں' اور اور۔۔۔ کیا کیا بتاؤں تمہیں۔ اوپر جا کے خود بانو سے پوچھو اور دیکھو' اس غریب کی کیا حالت ہے۔ اس حرامی پلے نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔" سید نے میری طرف ہاتھ اٹھا کے قہر آلود لہجے میں کہا "زندگی میں اتنا بڑا دھوکا نہیں ہوا' یہ مر رہا تھا سور کا بچہ۔ میں نے اسے روکا' اس کا علاج کرایا' سبھی نے اس کی خاطر کی۔ ہر ایک آگے پیچھے پھرتا تھا۔ اس کتے نے کیا سلوک کیا۔ ہا!" وہ مجنونانہ انداز میں سر ہلانے لگا۔

میری رگیں چٹخنے لگی تھیں۔ جی میں آیا' اسے زور کا طمانچہ ماروں یا گدی سے پکڑ کے زمین پر پٹخ دوں لیکن مل نے مجھے نہیں اٹھنے دیا۔ اس نے سلگتی آواز میں کہا "اپنے کو آپ سے زیادہ آتی ہے صاحب! چھان کے بولو تو اچھا ہے۔"

"تم نے کدھر رکھا ہے لڑکی لوگ کو؟" سید صاحب کے دوسرے ساتھی نے پہلی بار مداخلت کی "دیکھو' ابھی کچھ نہیں گیا۔ تم کو نہیں پتا' آگے تمہارے لیے کتنی بڑی مصیبت پڑ سکتی ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو' اس طرح شریف گھرانے سے عورت اٹھا کے لے جاؤ اور کچھ نہ ہووے؟ اس؟"

"سید صاحب ابھی ایسا بولتے تو ان کو اور جواب دیتے۔ شریف وریف کی بات جانے دو صاحب اور زیادہ اونچا بھی مت بولو۔"

"نہیں نہیں۔" معمر آدمی نے ہونٹ سکوڑ کے کہا "تم ٹھیک کہتے ہو سید! یہ ایسے نہیں سمجھیں گے۔ ایسے لوگوں کو منہ نہیں لگانا چاہیے۔"

"میں تم سے پہلے ہی کہہ رہا تھا' یہ اور قسم کے جانور ہیں۔" سید نخوت سے بولا "یہ پکے جرائم پیشہ معلوم ہوتے ہیں' ایک نمبر کے۔۔۔"

"کیا چاہتے ہو تم؟ تمہارے ساتھ اب کیا کیا جائے؟" معمر آدمی نے حقارت بھری آواز میں کہا "جو ہم کو پسند نہیں' اس پر مجبور مت کرو۔ بھگوان کی سوگند' بہت برا ہوجائے گا تمہارے لیے' پچھتاؤ گے۔ آگے ہم نہیں ہوں گے' جو ہوں گے' وہ بالکل دوسرے لوگ ہیں' بالکل جنگلی' دیکھو! ہمارے ہاتھ پیر وہ نہیں جو دکھائی دیتے ہیں۔ تم ہم لوگوں کو نہیں جانتے۔"

"جانتے ہیں صاحب! اوپر سے نیچے تک جانتے ہیں۔ آپ سارے راجے مہاراجے لوگ ہو' بادشاہ سلامت۔"

معمر آدمی ہونٹ کاٹنے لگا اور شانے اچکا کے بولا "انسپکٹر بوس کو بلاؤ سید! وہ ان طرم خانوں سے مل کے بہت خوش ہوگا۔ اس نے بڑے سے بڑے جانور کو سدھایا ہے' یہ دو کوڑی کے کیا بیچتے ہیں۔ دو چار جھٹکوں میں پورا دکھائی سنائی دینے لگے گا۔"

"اور وہ' وہ اپنا پالتو' وہ مرکھنا سانڈ' ناتھو کس دن کام آئے گا۔" ادھیڑ عمر سفاکی سے بولا "اسی سے کام بن جائے گا"

نہیں تو بوس کتنی دور ہے۔ ناتھو کو میں نے پہلے ہی بلا بھیجا ہے' آتا ہی ہوگا۔"

"بات مت بگاڑو۔" معمر آدمی نے بٹھل کو تنبیہہ کی۔ "ابھی ساری گھر کے اندر ہے۔"

"بات تو آپ بگاڑ رہے ہو۔"

"ہم بگاڑ رہے ہیں۔" معمر آدمی جھنجلایا۔

"ہم تو لوٹ کے گھر آگئے ہیں۔"

"تو' تو کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"ہم جا بھی سکتے تھے پر ہم کو سید صاحب سے کچھ بولنا تھا۔"

"کیا بولنا تھا؟"

"ان کی باتوں میں مت آؤ بسودا!" سید چن چنا کے بولا "ان کے یہاں موجود ہونے میں بھی کوئی پھیر ہے۔ ان بدمعاشوں نے پورا جال پھیلایا تھا' پوری سازش کی تھی۔ زمینوں کی بات کرنے کے لیے مجھے گھر سے باہر بھیجا۔ ایک آدمی نے اوپر جا کے چاقو کے زور پر عورتوں کو ایک کمرے میں بند کیا' دوسرا لڑکیوں کو لے کے نکل گیا۔ وہ نمک حرام نصیر' وہ کھوسٹ' اس کو تو میں دیکھ لوں گا۔ مٹی پلید کی اس نے' آخر میں۔ ان حرام زادوں نے اسے دام میں پھنسایا۔ بڈھا' معصوم لڑکیوں کو حیلے بہانے سے باہر لے گیا۔ یہ دونوں ساتھ جاتے تو ان کو ڈر تھا کہ زنان خانے سے شور اٹھے گا اور یہ ذرا سی دور پہنچ پائیں گے اور ان کے پیچھے لوگ لگ جائیں گے۔ یہ ایک بڑا والا نصیر بابا کے ساتھ تھا۔ دونوں ساتھ ہوتے تو اندھے چوکی دار بھی نہ جانے دیتے' اور دونوں ساتھ ہو کیسے سکتے تھے۔ زنان خانے میں ایک کو عورتوں پر قبضہ جمانا تھا۔ وہ وہاں کنڈلی مار کے بیٹھا رہا۔ جب اس نے دیکھا کہ دوسرا لڑکیوں کو دور لے جا چکا ہوگا تو وہ باہر نکلا اور واپس اپنے کمرے میں آگیا۔"

"پر لوٹ کے ادھر کیوں آگیا؟" بٹھل نے کسیلے لہجے میں کہا۔

"پھر نکل نہیں سکتا تھا۔" سید نے بھنا کے کہا "کمرے میں سامان بھی پڑا تھا۔ زنان خانے سے عورتوں نے چیخ پکار مچادی تھی۔ اس سے پہلے نکلنے کی کوشش کرتا تو کتنی دور جا پاتا' شور سنتے ہی لوگ اس کے پیچھے بھاگ پڑتے۔ ملازم پہلے ہی اس کے دیر تک کمرے سے غائب رہنے پر کھٹک گئے تھے۔

بٹھل نے بتایا میں نے جرح نہیں کی کہ جناب! زنان خانے سے چیخ پکار تو بہت بعد میں اٹھی تھی۔ اس سے پہلے اتنا وقت تھا کہ بڑے دروازے سے نکلنے کی کوشش کی جاتی۔ زنان خانے سے بلند ہونے والے شور کے بعد نمک خوار نے بندوق ترک کردی تھی۔ بندوق ہاتھ میں آجانے کے بعد ان کی حالت ایسی کی جاسکتی تھی کہ کوئی اپنے پیروں سے ... کے باہر نہ جاسکے پھر بے ہتھیار ایک ہی دربان ... دروازے پر رہ گیا تھا۔ اس سے نمٹنا آدمی کے لیے کیا ... تھا جو کمرے میں پانچ ملازم بے دست وپا کر چکا ہو لیکن ... کسی تاویل وتکرار میں پڑنے کی ضرورت کیا تھی؟ جو ... رئیس بیگم' خاداؤں اور خدام نے اسے باور کرایا تھا' جو ... شاطر وعیار کا اپنا وہم گمان تھا' اس سے ہمیں کیا سروکار۔

"ایک کا یہاں ٹھہرے رہنا اور دوسرے کا لوٹ آنا ... سازش کا ایک حصہ ہے۔ اس میں بھی کوئی بڑی عیاری ... ہے۔" سید کی زبان اس کے اختیار میں نہیں تھی۔ وہ گالیاں بکتا رہا اور کہنے لگا کہ ہمیں اس کی حیثیت اور مرتبت ... پوری طرح آگہی نہیں ہے۔ وہ اپنے اثر ورسوخ کے بارے میں لن ترانیاں کرنے لگا پھر نفرت بھرے لہجے میں اپنے ساتھیوں سے بولا "یہ غنڈے وقت گزاری کر رہے ہیں ... سمجھنے کی کوشش کرو۔"

پختہ عمر شخص نے بہ مشکل سید کی زبان کو لگام دی اور بٹھل سے بولا "ہاں' یہ کیوں نہیں گئے تم ادھر سے؟"

"تم سے کیا بولا؟" بٹھل نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا "ہم کو سید صاحب سے تھوڑی بات کرنی تھی۔"

"کیسی بات؟"

"اکیلے میں کریں گے۔"

"اکیلے میں کیوں؟ ہم میں اور سید میں کوئی بھید بھاؤ نہیں۔ بولو' کیا بات ہے۔"

"اس حرام الدہر کے دماغ میں کوئی اور بدمعاشی ہے۔" سید دہکتی آواز میں بولا۔

"کوئی پیسے ویسے کی بات ہے؟" درمیانہ عمر کے آدمی نے چیلے پن سے پوچھا "ایسا ہے؟"

"کتنا دے سکو گے؟"

"اچھا اچھا پیسہ چاہیے' پہلے کہہ دیا ہوتا' یہ بات ہے۔" معمر آدمی کی آواز میں طنز اور تمسخر کی آمیزش تھی۔ "کتنا پیسہ بولو۔"

"بولی تو آپ لگاؤ' دونوں پریاں ہیں۔ لگتا ہے' اوپر سے اتری ہیں۔ وہ جو بولتے ہیں اوپر والے نے اپنے ہاتھ سے ... ہے۔ دور دور تک ان جیسی نہیں ملیں گی۔"

سید آگ بگولا ہوگیا اور مغلظات بکنے لگا۔

پختہ عمر آدمی نے پوچھا "اب تمہارے پاس ہیں دونوں' ... دام بھی تم ہی بتاؤ گے۔ بولو' کتنا چاہیے۔"

"کتنا ہے آپ لوگوں کے پلے؟"

"ہم لوگ کی بات چھوڑو' تم نے سپنے میں بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ سیدھی طرح بولو' کتنا چاہیے؟"

"جانے دو صاحب! آپ نہیں دے سکو گے۔ آپ کو آدمی کا مول کرنا نہیں آتا۔"

"دیکھا تم نے بسودا!" سید تمتما کے بولا۔

"دیکھ رہا ہوں۔" پختہ عمر آدمی کی آنکھیں لال ہوگئیں "ٹھیک ہے سید! یہ تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ دیکھ لو ان کو۔"

"کوئی بات وات نہیں کرنا اسے' ہم کو گھما رہا ہے یہ۔ سارے بہانے ہیں۔ یہ کیا بات کرے گا ہم سے' بس وقت کاٹنا چاہتا ہے۔ اس کو صاف بتادو کہ پہلے لڑکیوں کے بارے میں بتائے۔ بات بعد میں ہوگی۔" سید نے فیصلہ سنادیا "اب دیر مت کرو' بہت ہوچکا۔ یہ ایسے زبان نہیں کھولیں گے۔" اچانک اس نے پلٹ کے اپنے پیچھے کھڑے ہوئے آدمیوں کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ ان کی تعداد پہلے سے بڑھ گئی تھی اور وہ منتظر ہی تھے کہ دوڑ پڑیں۔

"وہ گینڈا ناتھو بھی آگیا ہے۔" ادھیڑ آدمی جوش میں اچھل پڑا "ٹھیک ہے' ٹھیک ہے' اب وہی ان لوگوں کو دیکھے گا۔ بہت چربی چڑھائی ہے اس نے۔"

وہ سارے زیادہ دور نہیں تھے۔ ان کے درمیان منڈے ہوئے سر' گول چہرے' سرمئی رنگت' موٹی گردن' گٹھے ہوئے' تنے ہوئے جسم' اوسط قد کا ایک آدمی بھی تھا۔ سیدھے کان میں چاندی کی دریا' ہاتھ میں چاندی کا کڑا' گردن میں سوت سے بٹا ہوا' لال اور پیلے رنگ کا گنڈا۔ خاکی رنگ کے کرتے پاجامے میں ملبوس تھا۔ پینتیس سے زیادہ عمر نہیں ہوگی۔ وہ دونوں ہاتھ جسم سے دور کیے' سہلاتا' کسی قدر مستانہ انداز میں جھومتا ہوا ان تینوں کے سامنے آکے ٹھہر گیا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں شرارے کوند رہے تھے۔ یہی ناتھو ہوگا۔ اس کے دائیں بائیں کم وبیش اس کی وضع قطع کے دو آدمی بھی اڈے سے متعلق معلوم ہوتے تھے' عمر میں کچھ اس سے کم۔ ناتھو نے پہلے ادھیڑ آدمی کو ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا پھر معمر بسودا اور سید کو۔ "ناتھو' ناتھو! آگیا راجا۔ اتنی دیر لگادی تم نے۔" ادھیڑ عمر آدمی نے نازبردارانہ لہجے میں کہا۔

"دیر کہاں مہاراج! سندھیا ملتے ہی چل پڑے۔ آپ بلاؤ اور ہم دیر کردیں۔ کیوں سوچا آپ نے ایسا۔" ناتھو کی آواز اس کے بھاری جثے کی نفی کرتی تھی۔ پتلی سی کھنکتی ہوئی آواز۔ کہنے لگا "ہم تو دیر سے ادھر کھڑے ہیں کہ مہاراج اب دیکھتے ہیں' اب دیکھتے ہیں۔ یہی سوچ کے ٹھہرے رہے کہ ابھی اپنے کی ضرورت نہیں۔"

"ناتھو! یہ جو تم دو آدمی دیکھ رہے ہو۔" ادھیڑ آدمی نے بے صبری سے کہا "یہ کتے اپنے گھر' اپنے سید صاحب کے گھر سے دو عورتیں اٹھا کے لے گئے ہیں۔ تم کو ان حرام زادوں سے پوچھنا ہے۔ یہ ان کو کدھر لے گئے ہیں' کدھر رکھا ہے اور اب کیا مرضی ہے ان کی۔"

"عورت لے گئے ہیں' ہائیں؟" ناتھو کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ "ایسا کیسے؟" ناتھو نے اپنے گال باری باری چھوئے اور حیرت سے بولا "پر لاکھی بابو! پھر یہ ادھر کیوں ہیں؟"

ادھیڑ آدمی یعنی لاکھی بابو نے کہا "یہ انہی سے پوچھو' پکے حرامی لگتے ہیں۔" وہ منمنائے "ہم پولیس بلا سکتے ہیں لیکن ابھی نہیں' بعد میں ضرورت پڑی تو دیکھیں گے۔"

ناتھو نے پھرتی سے اپنا رخ بدلا اور سکڑی ہوئی آنکھوں سے ہمیں گھورتا رہا "نائیں مہاراج! کوئی دھوکا تو نہیں ہوگیا۔ یہ ایسے نہیں لگتے۔"

"جو ہم بولتے ہیں' اتنا ہی جانو۔" لاکھی بابو نے بگڑ کے کہا "دیر مت کرو' ہماری بھاشا یہ نہیں سمجھتے۔ ذرا اپنی بھاشا سمجھاؤ۔"

ناتھو کے چہرے پر فکر وتردد کا غبار ہویدا ہوا۔ چند قدم چل کے وہ بالکل ہمارے مقابل آگیا۔ "کیوں بھیا! یہ ہم کیا سنتے ہیں؟" وہ دیدے گھما کے بولا۔

بٹھل بے حرکت کھڑا رہا۔

"ہمارے بارے میں ان کو کچھ بتلایا مہاراج؟" ناتھو نے پلٹ کے لاکھی بابو سے پوچھا۔

"تم خود بتادو۔" لاکھی بابو نے اچکتی آواز میں کہا۔

"ہوں۔" ناتھو نے لمبی سانس کھینچی "کیا وچار ہے بھیا؟ ٹھیک ہے۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کے نیم تنبیہی نیم تہدیدی انداز میں بولا "پہلے ہم اپنے بارے میں بول دیں۔ نام تو سن لیا ہوگا ہمارا۔ چھٹ پن میں پٹنا سے آئے تھے پر ادھر لوگوں نے آس پاس کا راجا بنا کے بیڑی ڈال دی۔" چند لمحے اس نے سکوت کیا پھر کہنے لگا "اور کام کے بارے میں کیا بولیں' وہ ابھی تم جان لوگے' بہت الٹی کھوپڑیاں کے ہیں' سیدھوں کے ساتھ سیدھے' ٹیڑھوں کے ساتھ بہت ٹیڑھے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے بٹھل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی

بازی گر 6

کوشش کی۔ بٹھل نے نظریں جھکالیں "دیر سے ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ جب اٹھ جاتا ہے تو سسرا پھر رکتا نہیں پھر اپنے بس میں کچھ نہیں رہتا' سمجھے۔"

بٹھل خاموش رہا۔

"کچھ سنا' ہم کیا بولتے ہیں' ہم سے عمر میں بڑے ہو' کچھ ہمارا دھیان کرو' اپنے سے اوپر والے پہ ہاتھ اٹھانے کا پاپ ہم سے ناہیں کرواؤ۔"

"تم سامنے سے ہٹ جاؤ استاد!" بٹھل نے پہلی بار آہستگی سے زبان کھولی۔

ناتھو کی آنکھیں چڑھ گئیں "سامنے سے ہٹ جائیں۔" اس نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں ہاتھ نچا کے کہا "پھر کیا کریں' پھر بولو گے' ادھر سے چلے جائیں۔ ہمارے ہوتے ہماری نگریا' ہمارے گھر سے عورت اٹھا کے لے جاؤ' ہم تالی بجائیں پھر؟" اس کی آواز تیز ہوگئی "پتا ہے' یہ کون لوگ ہیں۔ یہ بڑے مان سمان والے لوگ ہیں۔ اتنی دیر سہ لیا' بہت ہے۔ یہ تو آگ لگا دیں گے۔ ہم پہ بھروسا کرتے ہیں جو ہم کو بلوایا ہے۔"

بٹھل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ناتھو خاصا جز بز ہوا۔

"کیا بولتے ہیں' ہم' اونچا سنتے ہیں کیا؟ ہماری بات کا جواب دو۔ یہ مون برت کا سمے نہیں ہے۔"

لاکھی بابو کو تاؤ آگیا "کیا ناتھو! کیوں دیر لگا رہے ہو' باتوں کا سمے نہیں ہے' باتیں تو ہم کر چکے ہیں۔"

"آپ شانت رہو' ناتھو کو بلایا ہے تو اس کو اپنا کام کرنے دو۔" ناتھو نے اپنے مربی کو نرمی سے لتاڑ دیا اور سکون سے بٹھل کو مخاطب کیا "مہاراج! لاکھی بابو کو جلدی ہے۔ ہم ٹھنڈا کر کے کھاتے ہیں پر ان کا بھی کچھ دھیان کرنا ہے۔" اس نے تند و ترش لہجے میں بٹھل کو آگاہ کیا کہ کسی کارروائی' نازیبائی کے بغیر ہم اسے لڑکیوں کے بارے میں بتا دیں تو مناسب ہوگا۔"

"ہم کو جو بولنا تھا' بول دیا ہے۔" بٹھل نے سرد لہجے میں کہا۔

"کیا بول دیا ہے۔" ناتھو گرج کے بولا "ان کو چھوڑ دو اب ہم سامنے ہیں۔"

"اپنے پاس نیا کچھ نہیں ہے۔"

میری حیثیت تماشائی کی ہوگئی تھی۔ ناتھو نے مجھ پر اب تک کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ بس ایک غلط انداز نگاہ ڈال کے رہ گیا تھا مگر یکایک اس کے دونوں ساتھی میرے دائیں بائیں آ کے کھڑے ہوگئے اور اسی دم ناتھو نے بٹھل کو طمانچہ یا مکا مارنے کے لیے ہاتھ بلند کیا۔ مجھے معلوم تھا' اس کے جواب میں وہ کیسی ندامت سے دوچار ہو سکتا ہے۔ چنانچہ میں اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا۔ ناتھو کا ہاتھ بلند ہوا' ادھر پلک جھپکنے کی مہلت میں اس کی کلائی بٹھل کے پنجے میں جکڑ گئی۔ ناتھو کو اس کی توقع نہیں تھی۔ میرے سوا کسی کو بھی نہ ہوگی۔ بٹھل کے پنجے میں ایسی گرفت تھی کہ اضطراری طور پر اچھلنے اور جسم کی ساری قوت صرف کرنے کے باوجود وہ اپنا ہاتھ نہ چھڑا سکا۔ بٹھل نے زیادہ دیر نہیں لگائی' دوسرے ہاتھ سے اسے چانٹا رسید کر دیا۔ چانٹے کی ضرب کے ساتھ ہی بٹھل نے اس کی کلائی سے پنجہ ہٹا لیا۔ بٹھل نے طمانچے کی شدت کے لیے ہاتھ ڈھیلا ہی رکھا ہوگا۔ ناتھو لڑکھڑا گیا۔ بٹھل نے اسی پر اکتفا نہیں کی' کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر اس نے ناتھو کی پنڈلی کے عین وسط میں ٹھوکر ماری۔ پنڈلی کی ہڈی ضرور مجروح ہوئی ہوگی۔ ناتھو توازن قائم نہ رکھ سکا' ڈگمگاتا ہوا فرش پر لڑھک گیا۔

ناتھو کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چوڑی ہوگئی تھیں۔ لمحوں میں گزرنے والے اس منظر سے سید محمود علی' اس کے دونوں اقبال مند ساتھی اور ان کے آس پاس کھڑے ہوئے لوگ سیدھے ہوگئے۔ اپنے چشم دیدہ کے لیے حیرت و تجسس کی ایک مہلت انہیں مطلوب تھی۔ ادھر ناتھو کا شرمساری کم کرنے کے لیے اٹھ جانا ضروری تھا۔ اس کے دونوں حاشیہ بردار مجھے چھوڑ کے بٹھل پر ٹوٹنا چاہتے تھے کہ اس نے کراہتے ہوئے انہیں جھڑک دیا اور بمشکل تمام اٹھنے میں کامیاب ہوگیا۔ اٹھتے اٹھتے اس نے جیب سے چاقو نکالا اور کھٹکا دبا کے کھول بھی لیا۔ پنڈلی کی تکلیف سے اس کا چہرہ بگڑا ہوا تھا۔ ہونٹ کے گوشے سے خون کی دھار پھوٹ آئی تھی۔ وہ بالکل ایک بدلا ہوا آدمی نظر آتا تھا۔ کھڑے ہوتے ہی شعلہ بار آنکھوں سے وہ دوبارہ بٹھل کے قریب ہوگیا اور ڈھٹائی سے بولا "بہت تیزی دکھائی تم نے بھیا! مزہ آیا۔ کوئی اور ہوتا تو بدھائی ضرور دیتے' پرنام کرتے' کیا کریں۔ ادھر دوسرے کام سے آئے ہیں' رام کسم' یہ چکو پورا کا پورا دستہ سمیت اندر اتار دیں گے۔ ہم کو بولو' کدھر نے کیا ان ناری لوگ کو؟" اس نے چاقو لہراتے ہوئے کہا اور رز... بدلے کے چاقو سیدھا کر لیا' ... کی طرح سیدھا' نشانہ لینے کے انداز میں' تاکہ بٹھل سامنے سے آنے کی جرات نہ کر سکے۔ آہستہ آہستہ اس نے فاصلہ کم کیا اور چاقو کی نوک بٹھل کے پیٹ میں گڑو دی۔ اب دونوں میں کوئی بھی حرکت کرتا تو چاقو بٹھل کے پیٹ میں پیوست ہو جاتا۔ بٹھل بس کچھ پیچھے ہٹ

کے اپنا دفاع کرسکتا تھا اور پیچھے اتنی گنجائش نہیں تھی۔ پیچھے نزدیک ہی کمرے کی دیوار تھی۔

ہر طرف سکوت ہوگیا تھا' موت کا سا سکوت۔ لاکھی بابو نے ایک بار کھنکار کے ناتھو کو کوئی اشارہ کرنا چاہا' شاید احتیاط کا۔ اپنی دیوانہ واری کے باوجود ناتھو کو بھی احساس ہوگا کہ بٹھل کو یا مجھے ختم کردینے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اسے اپنا ارادہ متوازن رکھنے کی دشواری پیش آرہی ہوگی۔ وہ اس... شہر کا راجا تھا اور خود بھی داؤ پر آچکا تھا۔ اپنی سرفرازی کے لیے اڈے کے آدمی کو بار بار ایسی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ بار بار اس امتحان کے لیے اسے تیار رہنا چاہیے۔ وہ یا تو کسی ایسے معاملے میں نہیں پڑتا جہاں ذلت و رسوائی کا اندیشہ ہو' پڑتا ہے تو مقابل کو اچھی طرح پرکھ کے۔ ناتھو اب یہاں سے واپس بھی نہیں جاسکتا تھا۔ ایسے شخص پر دیوانگی کا غلبہ ہونا چاہیے۔ اس حالت میں کوئی بھی رکیک حرکت اس سے بعید نہ تھی۔ اسے دو مقاصد بیک وقت حاصل کرنے تھے' اپنے محترم و مکرم داعیان کو مطمئن کرنا اور اپنا اعتماد قائم رکھنا۔ دونوں لازم و ملزوم تھے۔ ہم سے کسی معقول جواب سے زیادہ اسے اپنی فکر ہونی چاہیے تھی۔ ہم سے کچھ حاصل کرنے کی ناکامی اتنی سبکی آمیز نہیں جتنی خود اس کی ہزیمت۔ اس کی کوشش ہوگی کہ کچھ اور نہیں تو جسمانی طور سے ہمیں پسپا کردیا جائے۔ یہ اندازہ تو اسے اب تک ہوجانا چاہیے تھا کہ ہم سے کچھ جاننے کی جستجو میں وہ ناکام ہی رہے گا۔

بٹھل بغور ناتھو کو دیکھتا رہا' کچھ اس ہنر سے بھی مقابل متذبذب ہوسکتا ہے۔ میں اچانک پہلو سے اچھل کے ناتھو کو زیرو زبر کرسکتا تھا' تائید کے لیے میں نے بٹھل کی طرف دیکھا۔ اس کی خاموشی صبر و ضبط ہی سے تعبیر کی جاسکتی تھی۔ ناتھو ایک ہاتھ پھیلائے' آگے کی طرف جھکا ہوا' دوسرے ہاتھ سے چاقو' بٹھل کے پیٹ میں گھبوئے پوری طرح چوکنا تھا اور بری طرح گھڑکیوں' دھمکیوں کا راگ الاپ رہا تھا کہ بٹھل فروزاں اور یاسمن کی واپسی کا اقرار کرلے ورنہ......

سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ بس ایک ہی صورت تھی کہ بٹھل کسی طور ناتھو کی توجہ منتشر کرے اور اس ایک لمحے کی رعایت میں کوئی تدبیر کرے۔ بٹھل نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ "ٹھیک ہے استاد!" اس نے حتمی لہجے میں کہا "تم نہیں مانتے۔"

ناتھو یہ سن کے اور بے چین ہوا۔ اس کی آنکھوں کی وحشت اور فزوں ہوگئی "سے تم کو ہم نے پورا دیا۔"

"تم کو بولا تھا استاد! بیچ میں مت پڑو۔"

"کیا' کیا!" ناتھو کا چہرہ اس کا اپنا نہیں رہا۔

بٹھل نے مزید سلسلۂ کلام منقطع کیا اور معاً اپنا بایاں ہاتھ اس اہتمام سے بند کیا کہ ساتھ ہی ایک قدم پیچھے ہٹ جائے۔ اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ پر ناتھو کی نگاہ جانی چاہیے تھی۔ بٹھل کے پیچھے ہٹنے سے چاقو بھی قدم بھر کے فاصلے پر ہوگیا۔ بٹھل کا مقصد چاقو کے نشانے سے ہٹنا نہیں تھا' چاقو پر قبضہ کرنا تھا۔ بایاں ہاتھ اوپر کرنا' پیچھے ہٹنا اور لٹکے ہوئے دائیں ہاتھ سے ناتھو کی کلائی جکڑنا' تینوں جنبشوں میں ایک آن کی فصل ہوگی۔ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا جیسی کچھ ہوا ہی نہ ہو بلکہ نظر کا دھوکا ہو۔ چاقو والے ہاتھ کی کلائی جکڑتے ہی اس نے ناتھو کے منہ پر بائیں ہاتھ سے ضرب لگائی۔ اسے طمانچہ نہیں کہنا چاہیے۔ اس نے نیچے سے ناتھو کا منہ ڈھانپ دیا۔ اس کی انگلیاں' ناتھو کی ناک' آنکھوں اور گالوں میں کھب گئی ہوں گی۔ ناتھو ڈکرانے لگا' بٹھل نے اچھل کے اس کے جنگاسوں میں گھٹنا مارا۔ چاقو کی فکر تو بعد کی بات تھی' پہلے اسے خود کو سنبھالنا تھا۔ وہ پیچھے ہٹ کے بٹھل کی دسترس سے دور بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کی کلائی بٹھل کے شکنجے میں کسی ہوئی تھی۔ اس نے دوسرے کھلے ہاتھ سے اپنے چہرے پر قابض بٹھل کا ہاتھ ہٹانے کے لیے بہت زور کیا لیکن بٹھل کے گھٹنے کی ضرب سے وہ دہرا ہوگیا۔ اس کی آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ چاقو اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ چاقو گرتے ہی بٹھل نے اسے پرے دھکیل دیا۔ دفعتاً اس کے دونوں ساتھی بٹھل کی طرف کودپڑے' میں نے فوراً پیچھے سے دونوں کے بال پکڑلیے اور ان کے سر باہم ٹکرا دیے اور ہاتھ پیر سے دونوں کو پے در پے اتنی ضربیں لگائیں کہ انہیں اپنے آپ کو یکجا کرنے کا وقت ہی نہ مل سکا۔ دربان اور دوسرے آدمیوں کی دخل اندازی کا بھی مجھے خیال تھا۔ میرے پاس تمنچا بھی تھا' چاقو بھی لیکن ان میں سے کوئی ہمارے قریب نہ پھٹکا۔

بٹھل نے فرش پر گرا ہوا چاقو اٹھا کے ایک نظر اس کی ساخت کا جائزہ لیا اور پھل کا دستے میں سمو دیا۔ ناتھو اور اس کے ساتھی دور ہٹ چکے تھے۔ دربان بندوق تانے ہوئے تھا۔ سید اور اس کے بے قرار دوست مشورے میں مصروف تھے اور ان کی نظریں ہم ہی پر منڈلا رہی تھیں۔ اس دوران ناتھو بھی کسی قدر اپنے اوسان بحال کرچکا تھا۔ بٹھل نے چاقو اس کی طرف اچھال دیا۔ ناتھو بری طرح چونک پڑا۔ اسے یقین نہیں آرہا ہوگا مگر چاقو اس کے سامنے پڑا تھا' اس سے چند انچ کی دوری پر۔ اس نے جھٹ اسے اٹھالیا اور کھٹکا

دبا کے اسے پھر کھول لیا۔ وہ اپنی جگہ سے نشانہ لے کے بٹھل پر چاقو پھینک سکتا تھا۔ اڈے کے مستند آدمی ایسا نہیں کرتے مگر ناتھو کی حالت بڑی متغیر تھی۔ منہ کھلا ہوا' آنکھیں پھٹی ہوئیں۔ یہ اڈے کا کوئی معرکہ نہیں تھا جہاں مقابل ایک دوسرے پر چاقو کے داؤ آزماتے ہوئے بے قاعدگی سے پہلو تہی کریں۔ ناتھو کو اپنا چاقو واپس مل چکا تھا اور اس کے پراگندہ دماغ میں کچھ بھی سما سکتا تھا۔ مجھے اس کی جانب سے چاقو اچھال کے نشانہ لینے کے مذموم حربے کی ایسی تشویش نہیں تھی۔ بھینکے ہوئے چاقو سے بچنے بلکہ چاقو گرفت میں لینے کی مشاقی بٹھل کو بدرجۂ کمال تھی۔

ناتھو نے جھرجھری لے کے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ اس کا رخ پھر ہماری جانب تھا۔ ہمارے اس کے درمیان اتنا فاصلہ نہیں تھا۔ چند قدم بعد وہ بٹھل کے رو برو تھا۔ اس مرتبہ اس نے چاقو گھمایا پھرایا نہیں۔ بٹھل سے فٹ ڈیڑھ فٹ کے فاصلے پر آکے وہ منجمد کھڑا ہوگیا۔ لمحے گزر گئے۔ دونوں کے درمیان خاموشی رہی اور دونوں ایک دوسرے کو دیکھا کیے۔ یکایک سید اور اس کے پاس کھڑے ہوئے لوگوں میں ملی جلی آوازوں کی ایک ہوک سی اٹھی جب انہوں نے یہ دیکھا کہ ناتھو نے اپنا کھلا چاقو بٹھل کے پیروں میں ڈال دیا ہے اور جھک کے اس کے پیر پکڑ رہا ہے۔

بٹھل نے ناتھو کا بازو پکڑ کے اسے اٹھایا' اس کی کمر پہ ہاتھ رکھا اور اپنی آستین سے اس کے ہونٹوں سے بہنے والے خون کی دھار صاف کی۔ ناتھو ہونٹ بسورنے لگا۔ اس کی آنکھیں ڈوب گئی تھیں۔ وہ بٹھل سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن بٹھل نے آنکھوں کے اشارے سے اسے دور ہوجانے کے لیے کہا۔ ناتھو نے اپنا سر بٹھل کے سینے پر رگڑا اور الٹے قدموں پیچھے ہٹا اور مڑ کے بڑے دروازے کی طرف چل پڑا۔ لاکھی بابو نے اسے یوں جاتے دیکھ کے کئی بار پکارا لیکن اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔

دربان کو یقیناً کسی نے حکم دیا ہوگا' یکایک اس کے ہوائی فائر سے ساری عمارت گونج اٹھی۔ یہ ہمارے لیے سید اور اس کے حواریوں کی جانب سے ایک انتباہ تھا۔ فائر کی آواز سن کے راہداری کے آخری سرے سے گزرتے ہوئے ناتھو پلٹا اور بے تحاشا بھاگتا ہوا دربان کے پاس آگیا۔ اس نے جھپٹ کے دربان سے بندوق چھین لی۔ سید اور اس کے دوست شور مچانے لگے۔ ناتھو نے بندوق کے سرے دونوں ہاتھوں میں جکڑ کے گھٹنے کی ضربوں سے اسے دو لخت کردینا چاہا۔ بندوق ثابت و سالم رہی البتہ ناکارہ ضرور ہوگئی ہوگی۔

ناتھو نے دربان کو بندوق واپس کرنے کے بجائے راہداری کے پہلو میں سبزہ زار پر پھینک دی اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ واپس ہوگیا۔

سید محمود علی اور اس کے ہم مشرب دیکھتے ہی رہ گئے۔ ناتھو کے اوجھل ہوجانے کے بعد دیر تک بھنبھناہٹ رہی پھر معمر بسودا نے جھجکتے ہوئے بٹھل سے پوچھا "تم' تم کون لوگ ہو؟" اس کی آواز سنسنا رہی تھی۔

"اب بھی کچھ جاننا پوچھنا رہ گیا ہے بسودا!" سید نے تڑختی آواز میں کہا "تمہیں نظر نہیں آرہا' ہم تو پہلے ہی کہتے تھے۔"

"ہم نے پولیس بلالی ہے۔" لاکھی بابو نے دھمکی آمیز لہجے میں ہمیں مطلع کیا۔

"ٹھیک ہے صاحب۔" بٹھل نے تلخی سے کہا "بلوالی ہے تو ہم کیا بولیں۔"

"اور پولیس ناتھو راجا نہیں ہے۔"

"اس کو پہلے بلوا لیتے پھر۔"

"ہاں ہاں' ٹھیک بولتے ہو' غلطی ہوگئی۔ ناتھو حرامی تو گیدڑ نکلا۔" لاکھی بابو نے دھتکارتی آواز میں کہا "ہا! کیسا راجا بنا پھرتا ہے کتے کا بچہ۔"

"کب تک آجائیں گے تمہارے بینڈ باجے والے؟" بٹھل نے تکیلی آواز میں پوچھا۔

"کیوں' کیوں' جلدی ہے تم کو؟ بسودا اچک کے بولا۔

"ادھری سے اب جانا بھی ہے دادا۔"

"کدھر! کدھر جانا ہے؟" بسودا ڈگڈگی بجانے والے انداز میں ہاتھ گھما کے بولا "ایسے ہی چلے جاؤ گے؟"

"پھر کیسے وداع کرو گے؟ ہار پھول ڈلوا کے؟"

"ہار پھول نہیں تو چوڑی ضرور پہنائیں گے۔ بینڈ بھی بجوادیں گے۔"

"نہیں بسودا! بس کرو' اب پولیس ہی ان سے بات کرے گی۔ کیوں ان کے منہ لگ رہے ہو۔" سید نے برہمی کے ساتھ بسودا سے مزید سلسلہ جنبانی سے پرہیز کی درخواست کی۔

"ہم کو تم سے بات کرنی ہے صاحب!" بٹھل نے نرم آواز میں سید سے کہا "ہمارے ساتھ تھوڑے ٹائم کے لیے اندر چلو۔"

"اب بات کرنے کو کیا رہ گیا ہے۔" سید کے لہجے میں غصے اور بیزاری کے علاوہ یاسیت بھی عیاں تھی۔

"ابھی بہت ہے' تمہارے بھلے کا ہے۔"

"میرے بھلے کا!" سید نے بپھر کے کہا "میرا گھر ڈاکا ڈالو' پھر میرے بھلے کی بات کرو۔ خوب۔"

"تم سے کہا نا کہ پہلے لڑکیوں کے بارے میں بتاؤ۔" لاکھی بابو... گرج کے بولا۔

"انہی کے بارے میں کچھ بولنا ہے۔"

"دیکھو' ایک بات کان کھول کے سن لو! ہم کو پہلے دونوں لڑکیاں چاہئیں' آج ہی' کوئی دوسری بات نہیں ہوگی تم سے۔ پہلے بھی صاف کہا ہے۔" لاکھی بابو کی آواز بے لچک تھی۔

"وہ لوٹ کے آنے کو نہیں گئی ہیں۔"

"لوٹائے گا تو تمہارا۔۔۔" لاکھی کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ اس نے خود کو روکا اور کھسیا کے بولا "واپس تو ان کو لانا ہوگا۔"

"آؤ صاحب! گھبرانے کی ضرورت نہیں' کچھ کام کی بات ہی کرنا ہے۔" بھل نے دوبارہ سعید محمود علی کو مخاطب کیا اور ایک بار پھر کمرے میں چلنے کی دعوت دی۔

ساری بات اب پولیس کے سامنے ہوگی۔ پولیس کے آنے میں اب دیر نہیں ہے۔" سید کے بجائے لاکھی بابو نے دو ٹوک انداز میں ہمیں بتایا کہ پہلی مرتبہ جب ناتھو' بھل کے سامنے ٹک نہیں پایا تھا' تبھی انہوں نے پولیس کے لیے ہرکارہ دوڑا دیا تھا۔

انہوں نے پولیس طلب کرلی تھی۔ انہیں یہی کرنا چاہیے تھا۔ تینوں کا حال پہلے سے مختلف تھا۔ ناتھو کے چلے جانے کے بعد ہم سے مخاطب ہوتے ہوئے ان کے لہجوں میں فرق آگیا تھا۔ ساتھ ہی ان کی خشونت و وحشت بھی بڑھ گئی تھی۔ وہ بار بار ایک دوسرے سے سر جوڑے سرگوشیاں کرنے لگتے۔ قریب کھڑے ملازموں کو ڈانٹتے ڈپٹتے۔ وہ انہیں حکم پہ حکم دے رہے تھے۔ سید نے اپنی خاص بندوق بھی اندر سے منگوالی تھی اور دربان کے حوالے کردی تھی۔ راہداری میں ملازموں نے جلدی جلدی مزید کرسیاں رکھ دی تھیں۔ ایک گول میز بھی وسط میں سجادی گئی تھی۔ خاصی دیر بعد میں اور بٹھل بھی کرسیوں پر بیٹھ گئے' پھر انہوں نے جیسے ہم سے ترک تعلق کرلیا۔ کوئی بات نہیں کی مگر انہیں قرار نہیں تھا۔ صاف نظر آرہا تھا کہ وہ تینوں کسی ایک فیصلے پر متفق نہیں ہو پا رہے ہیں۔ کوئی ایک رائے قائم کرتا تو دوسرا نکتہ چینی کرنے لگتا۔

یہ وقفہ میرے لیے بڑا غنیمت تھا۔ ۔۔ل کی مثال بھی سامنے تھی۔ اس اثنا میں' میں خود کو ترک کرتا رہا۔ کسی نے کہا ہے' خود کو ترک کردینا بھی آزادی ہے' خود کو دوسروں کے حوالے کردینا بھی آزادی کے مترادف ہے۔ اختیاری کے علاوہ اختیار کھودینا بھی مانند آزادی ہے۔ آ والے وقت سے نبرد آزمائی کے لیے میں نے خود کو بڑی تک آزاد کرلیا۔ اب مجھے پیش آیندہ کی کدورت و عدا سے کوئی غرض نہیں تھی۔ کوئی نئی بات تو تھی نہیں۔ نوشتہ ہی سب سے معتبر چیز ہے' یہی ہوتا آیا تھا۔ کتنا ہی کے' پھونک پھونک کے قدم رکھو' کتنا ہی اپنے آپ چھپائے ہوئے کنارے کنارے چلو' راستے میں دوسر بے شمار ہوتے ہیں۔ دوسرے جو کہنی مارتے ہیں' اچا سامنے آجاتے ہیں اور دیوار بن جاتے ہیں۔ دوسر راہگیر وں کی کج روی کی کیا ضمانت۔ آدمی کو اپنے لیے زندگی ملتی ہے۔ کسی نے پیمائش نہیں کی' ایک چوتھائی نہیں شاید۔ کاش آدمی کا واسطہ آدمی سے نہ پڑا کرتا' سے جانوروں کی طرح۔

نذرو نے اڈتے ہوئے آکے سید کے کان میں سر کی' سید نے اپنے ساتھیوں کو خبردار کیا۔ تینوں اور مضط ہوگئے۔ چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ بشارت بھاگا آیا' اس نے پولیس کی آمد کی اطلاع دی۔ سید اور بسو دہیں روک کے لاکھی بابو خود پولیس کے استقبال کے لپکا۔

وہ تازہ تازہ وردیوں میں ملبوس چار آدمی تھے جو فو کی طرح ٹھک ٹھک کرتے تیز رفتاری سے راہداری بڑھتے دکھائی دیے۔ سب سے آگے کوئی بڑا افسر معلوم تھا۔ بھاری بھرکم جسم' اچھی پکی عمر' بڑی بڑی مونچھیں' ہوئی سی تنگ اور چمکیلی آنکھیں' گہری بادامی رنگت' بھرا چہرہ' پیٹ آگے نکلا ہوا' قد درمیانہ' کلے ٹھسے سے رعب دبدبے کا شخص تھا' تجربہ کار بھی لگتا تھا۔ اس کا ماتحت ہر سے اس کی ضد تھا۔ عمر کم' جسم چھریرا' رنگت کالی' قد ہوا' آنکھیں چوڑی اور چہرے کی ہڈیاں ابھری ہوئی۔ ان پیچھے بندوق بردار سپاہی تھے۔ دونوں افسر بھی ۔۔۔ لیس تھے۔ سید' لاکھی بابو اور بسودا سے ان کی پرانی آ ظاہر ہوتی تھی۔ لاکھی بابو نے جلد از جلد ہماری طرف اٹھا کے بڑے افسر کی توجہ مبذول کی۔ افسر کی رعونت نگاہیں ہم پر جم گئیں۔ بٹھل نے اسے سلام کیا۔ اس کی میں مجھے بھی ہاتھ اٹھانا پڑا۔ افسر نے کوئی جواب نہیں کرسی پر بیٹھتے ہی ان تینوں نے کانا پھوسی کے انداز میں نما سرگرمی و مستعدی اور برہمی و برشتگی سے روداد سنائی کی۔ دونوں افسر سنجیدگی اور حیرانی سے سنتے رہے۔ درمیاں کئی بار سر گھما کے انہوں نے ہم پر نظر کی۔ بڑے افسر نے' جیسے سب کچھ اخذ کرچکا ہو' ان تینوں کا احوال ادھورا چھوڑ کے کرسی کا رخ ہماری جانب کیا اور بلند آواز میں پوچھا "تم کو تھانے لے چلیں یا یہیں آدمی کی طرح بات کریں؟"

"یہ تو آپ پر ہے مائی باپ!" بٹھل نے دھیمی آواز میں کہا "ہم کو آدمی مانو کہ نہیں۔"

"کدھر ہیں لڑکیاں؟" افسر نے تیزی سے پوچھا۔

"آپ بھی یہی بولتے ہو' لڑکی لے جانے والوں سے ان کا اتا پتا پوچھتے ہو؟"

"دیکھا! دیکھا تم نے گھوش بابو!" بسودا اور لاکھی بابو نے ایک وقت تلملا کے کہا۔ گھوش بابو نے انہیں مداخلت سے روکا اور بٹھل سے بولا "دیکھو! ہم بات کرتے ہیں۔"

"ہم کو بھی یہ اچھا لگتا ہے۔" بٹھل نے سرہلا کے کہا۔

گھوش کی آنکھوں میں چنگاریاں سی لپکیں "تم کو بھی اچھا لگتا ہے۔" اس کی آواز غصے سے لبریز تھی "پھر کیا چاہتے ہو؟"

"ہم بھی زیادہ بات کرنا نہیں چاہتے۔" بٹھل نے صلح کن لہجے میں کہا "ہم کو آپ کا انتظار تھا۔"

"ہمارا انتظار تھا؟" افسر نے طنزیہ دہرایا۔

"ہاں صاحب! آپ حاکم آدمی ہو' آپ کی ان کی کتنی پرانی جمی ہوئی ہو' پر آنکھ اور کان تو پاس ہی رکھے ہوں گے' بیچ نہیں دیے ہوں گے۔ ہماری آپ کی پہلے سے کوئی گانٹھ بھی نہیں پڑی ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" افسر نے درشتی سے پوچھا۔

"ہم نے ان لوگ سے کئی بار بولا' ہم کو سید صاحب سے اکیلے میں بات کرنے دو' ہماری بات پلے نہ پڑے تو ہم ادھری سے بھاگے نہیں جا رہے۔ انہوں نے دھیان نہیں دیا۔ اب آپ آگئے ہو۔ ان کو بولو' اس میں ہرجا کیا ہے۔"

گھوش نے کوئی اور سوال کرنے سے پس و پیش کیا۔ پہلے سے بسودا' لاکھی بابو اور سید محمود علی نے اس کے کان بھرنے چاہے لیکن افسر نے ہاتھ اٹھا کے انہیں خاموش کردیا اور بٹھل سے بولا "کیا بات کرنا چاہتے ہو؟"

"وہ تو سید صاحب ہی سے بولیں گے' بعد میں ان پر ہے' چاہیں تو نقارہ پٹوا دیں۔"

"ہم کو نہیں بتاؤ گے؟" افسر نے حاکمانہ تیور سے کہا "ہم سے بھی اکیلے میں بات کرسکتے ہو۔"

"نہیں صاحب! اچھا ہے' زور مت دو۔ ہم کوئی الٹی بات نہیں کر رہے۔"

"ایک بات اچھی طرح سمجھ لو' ہم دوسری قسم کے پولیس والے ہیں۔"

"سارے وردی والے ایک جیسے ہوتے ہیں۔"

"ہم نہیں چھوڑتے پاپی کو' آخر تک پہنچاتے ہیں۔"

"اچھا ہے صاحب! پاپی کو گھر تک پہنچانا چاہیے۔"

"دو جوان لڑکیوں کا کڈنیپ' گھر میں گھس کے چاقو کے بل پر زورا زوری' نوکر لوگ سے ہاتھا پائی۔ گھر کے اندر کا نہیں معلوم' کتنا گھنایا تا' روپیہ پیسہ دبایا اور کس عورت کو ریپ کیا۔ ہوش ہے' کتنے کیس بنتے ہیں تم پر؟"

"ہے صاحب! پولیس چاہے تو دن کو رات سے' پورب کو پچھم سے پلٹ دے۔ ہم انکاری نہیں۔ ابھی خون کا کیس بھی لگاؤ تو انکاری بھی نہیں۔ پتہ ہے' آپ کو کیا کیا آتا ہے۔ ہتھکڑی' حوالات' ڈنڈا ڈولی' کچہری' جیل' سولی' سارے کی جانکاری ہے۔"

"لگتا ہے' پولیس سے ناتا پڑتا رہتا ہے۔"

"پرانی صاحب سلامت ہے۔ جب لڑکی لوگ کو لے جارہے تھے تو پتہ تھا' آپ آسکتے ہو۔ اسی لیے ہم لڑکی لوگ کو آگے بھیج کے ادھری لوٹ آئے کہ آپ کو پیچھا کرنے میں کوئی کشٹ نہ ہو۔"

"اوہ!" افسر کا سارا جسم پھڑک اٹھا "ہمارے کشٹ کا دھیان تھا تم کو؟"

"ادھر سید صاحب سے تھوڑی بات کرنی تھی اور معلوم تھا' ہمارے ادھری لوٹ آنے پر سید صاحب آپ سے ملائے بنا جانے نہیں دیں گے۔ تھوڑا متھے پر زور ڈالو گے صاحب تو ساری کالک چھٹ جائے گی۔"

گھوش نے کوئی جواب نہیں دیا' اپنے ماتحت سے مشورہ کیا "ٹھیک ہے سید صاحب! آپ اس سے بات کریں۔" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "دیکھیں' کیا کہتا ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں' اس کی ضرورت نہیں۔" سید محمود علی کے چہرے پر دھند چھا گئی "یہ بھی ان کی کوئی چال ہے۔ آپ ان کے جرائم اور دیدہ دلیری دیکھیے۔ یہ مجھے بہت خطرناک لوگ معلوم ہوتے ہیں' کسی رعایت کے مستحق نہیں ہیں یہ۔ پہلے لڑکیوں کی فکر کیجئے' جانے کہاں یہ بدمعاش انہیں لے گئے ہیں۔ وہ تو بہت معصوم' پھول جیسی بچیاں ہیں۔ جانے کیا حال ہوا ان کا۔"

"کوئی چھوٹ نہیں سید صاحب! آپ بھروسا رکھو۔ پہلے جیسا یہ کہتے ہیں' ویسا ہی کرو۔ بعد میں ہم دیکھ لیں گے۔ بڑے بڑے چھٹے ہوئے بھگتائے ہیں ہم نے۔ یہ بونگ کیا بیچتے

ہیں۔" گھوش نے آہستگی سے سید اور اس کے ساتھیوں کے کچھ اور بھی گوش گزار کیا۔ ہم تک اس کی آواز نہ پہنچ سکی۔ یقیناً صبرو ضبط کا درس دیا ہوگا اور شاید یہ بھی کہا ہو کہ یوں بھی اگر ہم نے زبان کھولنے میں دیر کی تو وقت ہی برباد ہوگا۔ گھوش کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ بٹھل سے اس کی مرضی کے بغیر کچھ جاننا اتنا آسان نہیں۔

سید آمادہ نہیں تھا۔ اس نے ناراضگی اور مایوسی سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ لاکھی بابو اور بسودا نے بھی گھوش کی تائید کرتے ہوئے سید کو دلاسے دیے "گھوش بابو زیادہ سمجھتے ہیں۔ ذرا دیکھو تو' آخر کیا چاہتا' کیا بکتا ہے۔ ہم لوگ تو یہیں بیٹھے ہیں۔" لاکھی بابو نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

"کتنا سمے لوگے؟" گھوش نے اکڑی ہوئی آواز میں بٹھل سے پوچھا "ہم تو زیادہ انتظار نہیں کریں گے۔"

"یہ تو سید صاحب پر ہے۔ کتنی جلدی گودے میں اترتی ہے۔"

"کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو سمجھ لینا۔" گھوش نے سختی سے کہا "تمہارا آدمی ادھر ہی بیٹھا رہے گا۔"

"ٹھیک ہے صاحب!" بٹھل نے کڑوی آواز میں کہا "آپ پھندا تیار کراؤ۔"

گھوش نے ہونٹ بھینچ لیے اور معنی خیزی سے سر ہلانے لگا۔

سید محمود علی بادلِ ناخواستہ کرسی سے اٹھا۔ بٹھل نے بھی کرسی چھوڑ دی۔ دونوں اس کمرے میں چلے گئے جو گزشتہ سات آٹھ روز سے ہمارا مسکن تھا۔ جاتے وقت اس نے کئی بار شانے اچکائے اور ہونٹ سکوڑے' پھیلائے۔ اس کے ساتھی اسے مہمیز کرتے رہے۔ سید کو ایک گردن زدنی شخص سے گفتگو پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ وہ تو میرا اور بٹھل کا خون پینے کے لیے بے چین ہوگا۔

ان دونوں کے کمرے میں چلے جانے کے بعد لاکھی بابو' بسودا' گھوش اور اس کے ماتحت نے کرسیاں کھینچ کے کمرے کے اور قریب کرلیں۔ ان کے اردگرد کھڑے ہوئے ملازمین نے بھی گھیرا تنگ کردیا۔ دربان ابھی تک بندوق کھینچے ہوئے تھا۔ دونوں سپاہیوں نے کندھوں سے بندوقیں اتار کے ہاتھوں میں دبالیں۔ سب کی نگاہیں دروازے پر مرکوز تھیں۔ ابتدا میں کچھ دیر خاموشی رہی پھر لاکھی بابو اور بسودا نے باقی رہ جانے والی روداد گھوش کو سنانے میں بڑھ چڑھ کے بیانات دینے شروع کردیے۔ یہ پروا کیے بغیر کہ میں ان کے سامنے بیٹھا ہوں۔ بیان کو بیتا ہوا انداز کچھ سے کچھ کردیتا ہے۔

انہوں نے زنان خانے میں عورتوں سے میری بدسلوکی کا ذکر کرتے ہوئے کچھ ایسے تیقن کا اظہار کیا جیسے سب کچھ ان کے سامنے ہوا ہو۔ کچھ ابن' بشارت' نذرو وغیرہ نے بھی حاشیہ آرائی کی ہوگی۔ کمرے میں دربان سے بندوق چھین لینے اور بٹیں مارنے کے واقعے میں انہوں نے خوب فسانہ طرازی کی۔ گھوش کے انہماک سے ان کی زبان اور رواں ہوتی رہی۔ وہ تکرار کرتے اور حیرانی کا اظہار کرتے رہے۔

"جناب! مجھے تو یہ عادی مجرم معلوم ہوتے ہیں۔" گھوش کا ماتحت زیادہ متاثر ہوگیا تھا۔ اس نے دبی آواز میں اپنے افسر سے کہا۔

گھوش کچھ فکرمند سا نظر آتا تھا' اس نے کوئی جواب نہیں دیا' ماتحت چپ ہوگیا۔

"آپ کا کیا وچار ہے؟ وہ اپنے سید بھائی سے کیا بات کرنا چاہتا ہے؟" لاکھی بابو نے کسمساتے ہوئے گھوش کو اکسایا۔

گھوش کے نتھنے پھول گئے "دیکھتے ہیں۔"

"ہم نے پیسوں کی بھی کیا بات کی تھی۔"

"پھر؟" گھوش نے چونک کے پوچھا۔

"پہلے ہم یہی سمجھے تھے لیکن وہ اس پر بھی نہیں نکا۔ بس ایک ہی رٹ لگائے رہا۔" بسودا نے لقمہ دیا۔

"میرا خیال ہے' میں نے اس آدمی کو کہیں دیکھا ہے۔" گھوش نے بڑبڑاتے ہوئے انگریزی میں اپنے ماتحت سے کہا۔

"کہاں' کہاں جناب؟" ماتحت نے حیرانی سے پوچھا۔

"کچھ یاد نہیں آرہا؟" گھوش تذبذب سے بولا۔

"یاد آسکتا ہے' یاد کیجئے جناب!" ماتحت کا اشتیاق دیدنی تھا "اس سے بہت فرق پڑسکتا ہے۔"

"یہی سوچ رہا ہوں مگر کہاں...؟"

"بہت سی جگہوں پر آپ کا تبادلہ ہوا ہے۔"

میں نے ذہن پر زور دیا۔ مجھے بھی کچھ یاد نہیں آرہا تھا۔ آسن سول سے کلکتہ اتنا دور نہیں ہے۔ ممکن ہے' کبھی کلکتے میں اس کا تبادلہ ہوا ہو۔ بٹھل کے اڈے کے علاقے سے وابستہ تھانے میں تو نہیں ہوا ہوگا۔ کلکتہ ایک بڑا شہر ہے' ہوسکتا ہے' شہر کے کسی اور علاقے میں وہ تعینات ہوا ہو اور بٹھل سے کبھی اس کا آمنا سامنا ہوا ہو۔ جیل میں سات سال کے دوران بھی متعدد افسران آتے جاتے رہے تھے' گھوش کی شکل و صورت کا کوئی آدمی میرے ذہن میں محفوظ نہیں تھا۔ جس زمانے میں مجھ پر دہرے قتل کا مقدمہ چل رہا تھا' تب مجھے ایسا کچھ ہوش نہیں تھا۔ کیا معلوم' اسی زمانے

گھوش نے مجھے اور بٹھل کو دیکھا ہو۔ یہ بات تو طے تھی اس کا ہمارا کوئی خاص ربط ضبط نہیں رہا ورنہ کم از کم' ٹھل کے نقش اس کے دماغ میں دھندلے نہ ہوتے۔

نذرو اور بشارت' پھل' خشک میوے اور چائے کے ت لے آئے تھے۔ انہوں نے سلیقے سے سامان میز پر چن ۔ کسی کو کھانے پینے سے رغبت نہیں ہو رہی تھی۔ بشارت نے چائے بنا کے پیالیاں ان کے سامنے رکھ دیں۔ چائے کے ایک گھونٹ حلق میں انڈیل کے اور میوے کے دو چار نے ٹونگ کے انہوں نے ہاتھ اٹھالیے۔ گھوش نے جیبی گھڑی نکال کے وقت دیکھا۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ ملازموں نے راہداری روشن کردی۔

بٹھل نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا بھی نہیں تھا۔ نصیر بابا کی زبانی فروزاں اور یاسمن کا ماجرا میں نے اپنے کانوں سے سنا تھا۔ سب سے بڑی توانائی خوشی کی ہوتی ہے۔ بٹھل نے مجھے ہدایت کی اور میں زنان خانے کی طرف چل پڑا۔ عورتیں سید ھی طرح قابو میں نہ آتیں تو مجھ سے کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ فروزاں اور یاسمن کے پیغام آنے کے لیے تو میں کب سے منتظر' کب سے مضطرب تھا۔ مجھے معلوم تھا' سید کے شکنجے سے انہیں نجات دلانے کی سرخوشی بے قیمت نہیں ہوگی۔ ہمیں کوئی بہت بڑی قیمت بھی چکانی پڑسکتی ہے لیکن مطلوبہ سرخوشی ہر قیمت سے بالا ہوگی۔ زنان خانے کے دریچے میں فروزاں کی تو میں نے ایک جھلک ہی دیکھی....... یاسمن کو بہت قریب سے دیکھا تھا' جب نصیر بابا کے ساتھ رات گئے وہ سہمی سہمی' چوروں کے مانند کمرے میں آئی تھی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کے روئی تو بٹھل کی بھی آنکھیں بھی پگھل گئیں۔ بٹھل کی آواز بھی جھرجھرا گئی تھی۔ شاید اسی لیے اس نے اسے جلد ہی واپس لے جانے کے لیے نصیر بابا کو اشارہ کردیا۔ مجھے رات بھر نیند نہیں آئی۔ رات بھر یاسمن کا آنسوؤں بھرا چہرہ میری نظروں میں گھومتا رہا۔

بٹھل کے پاس سید کو متلاطم کرنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ نصیر بابا سے بٹھل کے کتنی دیر میری بات ہوپائی تھی۔ سلسل بٹھل ہی سے ان کی چھنتی رہی تھی۔ کئی دنوں سے دونوں میں سرگوشیاں جاری تھیں۔ بٹھل نے خوب سوچ بچار کے بعد ہی یہ قدم اٹھایا ہوگا۔ اندر کمرے میں سید کو وہ نہ جانے کیا کچھ باور کرا رہا ہوگا کہ اس کے اقدام میں یاسمن اور فروزاں کی منشا و ایما کس قدر شامل ہے۔ اندر وہ سید کو آئینہ دکھا رہا ہوگا۔ کبھی سید نے اپنی شکل... آئینے میں اتنی

جزئیات سے نہیں دیکھی ہوگی۔ بٹھل کسی اور طرح بھی فروزاں اور یاسمن کو یہاں سے لے جانے کی تدبیر کرسکتا تھا مگر بہتر یہی تھا کہ ساتھ ہی سید کی آتشِ غضب سرد کردی جائے۔ بٹھل کو اچھی طرح احساس ہوگا کہ اس کا واسطہ کیسے شاطر' کینہ خصلت اور درندہ صفت شخص سے ہے۔ ایسے بے حس' سنگدل' بد باطن اور بہروپئے سے نمٹنا کوئی آسان کام نہیں۔ ہر آدمی کا ایک دائرہ ہوتا ہے' زندگی بھر وہ اسے سوا کرنے کی جستجو میں رہتا ہے۔ سید نے یہی کام تو شدومد سے کیا ہے۔ اسے اپنے اثر و رسوخ کا بڑا زعم ہے اور کچھ غلط بھی نہیں۔ وہ ثبوت و شواہد کی بات کرے گا۔ بٹھل کے پاس بھی اب دلیلوں کی کمی نہیں۔ فروزاں' یاسمن اور نصیر بابا اور رہاں ظفر بھی۔ وہ چاروں اب ہماری تحویل میں ہیں بلکہ اب تو وہ اپنی تحویل میں ہیں۔

اپنے خدام کی اعانت کے بغیر تنہا سید سے اتنے سنگین جرائم سرزد نہیں ہوئے ہوں گے۔ اب تک یہ معتمد اس کے حصار میں رہے' کسی نے ان کی جاں نثاری و وفا شعاری' آزمائش سے دوچار نہیں کی۔ اپنا سب سے زیادہ وفادار' سب سے بڑا دوست آدمی خود ہوتا ہے۔ کہتے ہیں' ہر امانت جو دوسرے کے پاس ہے' دوسرے کی صوابدید پر ہے۔ دوسرا کتنا ہی معتبر اور امین ہو' پہلے اور دوسرے آدمی کی مکمل یکجائی ممکن نہیں ہوتی۔ ترکِ وفا کی توفیق ہر کس و ناکس کو سزاوار نہیں ہوتی' معدودے چند ہی اس رتبے پر فائز ہوتے ہیں اور' وہ اور لوگ ہوتے ہیں۔ دو آدمی بہرحال دو آدمی ہیں۔ سید کے تمام خدمتگار جنس بازار ہیں۔ اطاعتوں کی خریدو فروخت اس بازار میں عام ہے۔ نیلام چیزوں ہی کا نہیں ہوتا' کسی نے کہا ہے' ہر آدمی نیلام پر ہے۔ تیسری صورت شاذ شاذ' خال خال ہے' آدمی پر غلبہ و تسلط کی دو ہی صورتیں مستند ہیں۔ اس پر مال و زاری کیا جائے یا اسے مال و زر سے عاری کردیا جائے۔ جو مال و زر سے مغلوب نہیں ہوتا' وہ زور زبر' زور و جبر سے ہوجاتا ہے کیونکہ آدمی بہر انداز زندگی کا خواہش مند ہے۔ کوئی سید سے بڑا اقبال مند' طالع آزما' سید سے بڑا حاکم و جابر کمند انداز ہو تو سید کے موجودہ خدام اس کے خلاف سب سے بڑی شہادت ہیں۔ زنان خانے میں رئیس بیگم کی زیردستی کا سبب میری بالادستی تھا۔ میں تھا' میرا چاقو تھا لیکن دوسرے طور سے بھی اس سے معاملت کی جاسکتی تھی' کی جاسکتی ہے۔ وہ بے تحاشا' بے محابا اپنے نفس کی اسیر ہے۔ اب تک رئیس بیگم کا نفسِ امارہ کسی نے نہیں چھیڑا۔

...ن کے پاس سید سے کہنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ سید کی اپنی دو بیویوں' فروزاں' یاسمن کی ماں اور باپ اور جانے کون کون۔ آسن سول میں قیام کے بعد سید کا سارا سفر' یہ جاہ و حشمت' شان و شوکت' کہاں سے کہاں تک کا سفر۔ کسی نے اب تک حرف زنی نہیں کی تھی۔ حرف زنی کے لیے جستجو اور حوصلہ بھی شرط ہے۔ سچ اگر بڑی توانائی ہے تو جھوٹ ناتوانی کا باعث بھی ہونا چاہیے۔ دولت بہت بڑی طاقت ہے لیکن دولت مند بہت کمزور آدمی ہوتا ہے۔ سید محمود علی بہت عیار و مکار شخص ہے مگر یہ اس کی خامی ہے اور ہر خامی کبھی نہ کبھی کسی زیاں پر منتج ہوتی ہے۔

مجھے امید تھی کہ بٹھل سرخ رو کمرے سے واپس آئے گا۔ گویہ امید خواہش پر مبنی تھی لیکن خواہش یا طلب کے بغیر کوئی بھی امید بے معنی ہے۔ خواہش اور طلب ہی سے امید استوار ہوتی ہے اور اگر بٹھل یوں ہی ناکام واپس آگیا تو اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہوگا کہ فروزاں اور یاسمن کو ترک کرکے آیا ہے۔ وہ کوئی عزم کرکے ہی اندر گیا ہوگا۔

میرا سر کوئی دھنک رہا تھا' طرح طرح کے وہم' تکرار' حجت' تاویلیں اور دلیلیں۔ میں وہاں بیٹھا قیاس آرائیاں ہی کرسکتا تھا۔ رات پوری طرح چھا چکی تھی۔ آسمان پر طاری بادلوں نے راہداری کے اطراف پھیلا ہوا اندھیرا شدید کردیا تھا۔ اندھیرا گہرا ہو تو روشنی بھی گہری ہوجاتی ہے۔ راہداری اور روشن ہوگئی تھی۔ لاکھی بابو' بسودا' پولیس افسر گھوش اور اس کا ماتحت شروع شروع میں بہت سرگرم تھے' اب خاصی دیر سے ان پر ایک ہیجانی خاموشی مسلط ہوگئی تھی۔ میری طرح انہیں بھی سید اور بٹھل کے باہر آجانے کا شدت سے انتظار تھا۔ مجھے کم از کم اندر ہونے والی گفت و شنید کی نوعیت کا علم تھا' وہ اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہوں گے اور سرے ڈھونڈ رہے ہوں گے اور کچھ ان کے ہاتھ میں نہیں آرہا ہوگا۔ وقت جیسے لنگڑاتا ہوا گزر رہا تھا۔ گھوش نے کئی بار گھڑی دیکھی۔ آخر ان دونوں کو اندر گئے ایک گھنٹے سے اوپر ہوگیا تو گھوش نے ایک سپاہی دروازے پر بھیجا۔ اس نے پہلے کان لگا کے سن گن لینے کی کوشش کی' پھر گھوش کی اجازت سے آہستہ سے دستک دی۔ اندر سے انتظار کے لیے کہا گیا' آواز سید کی تھی۔ سپاہی کے جواب سے انہیں کچھ تسلی ہوگئی۔ شاید یہ جان کے کہ سید ابھی زندہ ہے اور ہوش و حواس بھی قائم ہیں۔

کچھ اور وقت گزرا تو گھوش کرسی سے اٹھ گیا۔ اس کے ساتھ اس کا ماتحت' پھر لاکھی بابو اور بسودا بھی۔ گھوش چہل قدمی کرتا ہوا دروازے کے قریب گیا اور ٹھہرا رہا۔ اندر سے آنے والی آوازیں یا تو مدھم تھیں یا واضح نہیں تھیں۔ گھوش نے سپاہی کے مانند دروازے سے کان نہیں لگائے' وہاں سے ہٹ آیا۔ سپاہی نے اس کی خواہش پر پانی پیش کیا۔ گھوش نے کھڑے کھڑے سارا گلاس انڈیل لیا اور کچھ دیر یونہی ٹہلتا رہا اور دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا "یہ اندر کیا کررہے ہیں؟" وہ بڑبڑاتے ہوئے اپنے ماتحت سے انگریزی میں بولا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا جناب!" ماتحت نے اضطراری لہجے میں جواب دیا "ہمیں اور کتنی دیر انتظار کرنا چاہیے؟"

کچھ توقف کے بعد لاکھی بابو' بسودا اور گھوش کا ماتحت بھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ان کے آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں کے شانے ڈھلک گئے تھے۔ دربان نے بندوق نیچی کر لی تھی۔ سپاہیوں نے بھی بندوق کی بٹیں فرش سے ٹکا دی تھیں۔ ان سب کی نظروں کا ہدف میں تھا یا کمرے کا دروازہ۔ میری حیثیت کسی یرغمالی کی تھی بلکہ اصل میں تو میں کسی اچھوت سے بدتر تھا۔ میرے پیروں میں بیڑی نہیں تھی لیکن میں نہ کہیں جاسکتا تھا' نہ آسکتا تھا۔ میں نے ایسی کوئی کوشش بھی نہیں کی۔

بسودا اور لاکھی بابو' پولیس افسر گھوش کا بڑھتا ہوا اضطراب محسوس کررہے تھے اور کچھ پشیمان سے نظر آنے لگے تھے۔ چنانچہ اس تاخیر پر وہ تعجب کا اظہار کرنے لگے۔ ان کی سرگرانی کا نہ جانے کیا عالم ہوتا اگر کچھ اور وقت اسی طرح گزر جاتا۔ مگر جلد ہی دروازے پر ہونے والی آہٹ سے وہ ہڑبڑا گئے۔ ہر شخص میں بجلی سی دوڑ گئی۔ گھوش کا جسم تن گیا۔ اس کا ماتحت بھی کرسی پر نیم ایستادہ ہوگیا۔

جالی کا دروازہ کھلنے پر وہ دونوں برآمد ہوئے۔ آگے بٹھل نہیں محمود علی تھا۔ میرا دھڑکتا ہوا دل ایک لمحے کے لیے تو بند ہوا' دوسرے لمحے سب کچھ عیاں تھا۔ سید کا چہرہ میرے سامنے تھا' دھندلا دھندلا' دھواں دھواں' پیشانی پر سلوٹیں پڑی ہوئی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں جیسے عمر بڑھ گئی ہو۔ وہ سارے ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔ لاکھی بابو' بسودا' گھوش اور اس کے ماتحت نے سید کے قریب آنے کا انتظار نہیں کیا' آگے جا کے اسے گھیر لیا۔ سید کی نظریں جھکی ہوئی تھیں "کیا بات ہے؟" بسودا نے متوحش لہجے میں پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" سید نے بوقت کہا "کچھ نہیں۔"

"اتنی دیر کیوں ہوگئی؟" لاکھی بابو نے بے قراری سے سید کا بازو پکڑ لیا۔

"ہوگئی بس۔" سید نے پژمردگی سے کہا۔

"کیا' کیا کہتا ہے وہ؟"

"بتاؤں گا۔" سید نے دل گرفتہ آواز میں کہا۔

"تم ٹھیک تو ہو بھیا؟" لاکھی بابو نے آشفتگی سے پوچھا۔

"ہاں۔" سید نے انہیں مطمئن کرنے کی ناکام کوشش کی "میں' میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"اس نے تمہیں' تمہیں۔۔۔" لاکھی بابو نے بدحواسی سے پوچھا "کوئی چالبازی تو نہیں ہوئی؟ بولو نا بھیا۔"

بٹھل دروازے سے باہر آکے میرے پاس بیٹھ گیا تھا' میری سوالیہ نگاہوں کے جواب میں اس نے آنکھیں موند لیں پھر مجھے اس سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ میری رگوں میں خون ہمک رہا تھا۔

پولیس افسر گھوش حیران و پریشان سا کھڑا کبھی سید کا چہرہ دیکھتا' کبھی کرسی پر دراز بٹھل کا "کیا کہتا ہے یہ' کچھ بتایا؟" اس نے افسرانہ انداز میں سید سے پوچھا۔

کوئی جواب دینا سید کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے ادھر ادھر بے چارگی سے دیکھا اور بجھی ہوئی آواز میں بولا "معافی چاہتا ہوں گھوش بابو! آپ کو زحمت ہوئی۔ آپ کا خاصا وقت برباد ہوا۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" گھوش اچھل سا گیا۔

"مجھے' کچھ غلط فہمی ہوگئی تھی۔" سید نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"کیسی غلط فہمی؟"

"تفصیلی بات ہے' اس وقت مجھ سے کچھ نہ پوچھئے تو بہتر ہے۔"

"کیا بات ہے سید صاحب؟" گھوش اپنی حیرت و تشویش پر قابو پانے سے قاصر تھا۔

"ہم غلط سمجھ رہے تھے۔" سید نے لفظ چبا چبا کے کہا۔

"لڑکیاں! لڑکیاں کہاں ہیں؟"

"وہ' وہ ٹھیک جگہ چلی گئی ہیں۔"

"ٹھیک جگہ! پھر یہ' یہ سب کیا تھا؟"

"میں نے کہا نا' غلط فہمی ہوگئی تھی۔"

گھوش کو یقین نہیں آیا "صاف کہئے سید صاحب!" اس کا لہجہ حاکمانہ ہوگیا "یہ کس طرح ہوا؟ آپ سے اس نے کیا بات کی؟"

"مجھے حقیقت معلوم نہیں تھی۔ وہ ٹھیک کہہ رہے تھے' مجھے پہلے ان سے بات کرلینی چاہیے تھی۔ آپ سب کو پریشانی ہوئی۔" سید نے ہاتھ جوڑ لیے "مجھے معاف کردیجئے۔ یہ لوگ ایسے نہیں ہیں' جیسا' جیسا ہم سمجھے تھے۔"

"کچھ چھپاؤ نہیں سید! تم بہت دکھی لگتے ہو۔" لاکھی بابو نے بے تابی سے کہا "ہماری پریشانی چھوڑو۔ تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ دیکھو' دیکھو' اگر ایسی ویسی کوئی بات ہے تو کھل کے ہم سے کہو' ابھی گھوش بابو یہیں ہیں۔"

"جتنا میں کہہ رہا ہوں' اتنا ہی سمجھو بھائی۔" سید نے عاجزی سے کہا۔

"کیسے سمجھ لیں' یہ کیا! تمہاری کوئی بات نہ من کو لگ رہی ہے نہ مستک کو۔" بسودا نے شکایت کی "لگ رہا ہے' اس نے دھمکایا ہے تم کو۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کے کہنے لگا "سمجھ لو' یہ دونوں ایسے یہاں سے نہیں جاسکتے۔ ہم ابھی زندہ ہیں۔ ہم کو صاف صاف بتاؤ بھیا' بات کیا ہے؟"

"بات مت بڑھاؤ بسودا! اب ختم سمجھو' ختم کرو۔" سید نے دوبارہ ہاتھ جوڑ لیے۔

"ہم انہیں تھانے لے جاتے ہیں۔" گھوش نے حکم سنایا۔

"نہیں نہیں گھوش بابو! اس کی ضرورت نہیں ہے اب۔ میرے ان کے درمیان سب کچھ طے ہوچکا ہے۔ یہ میرے مہمان ہیں۔"

گھوش کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اس نے پلٹ کے رنج اور غصے سے اپنے ماتحت کو دیکھا' کچھ کہہ نہ سکا۔ ماتحت نے مایوسی سے کہا "یہ حیران کن ہے جناب! نہایت پُراسرار۔"

"اس نے ضرور سید کو ڈرایا دھمکایا ہے۔" گھوش نے جھجکتے ہوئے رائے ظاہر کی "مگر ہم کیا کرسکتے ہیں؟"

"بے شک جناب! کوئی شکایت نہ ہونے کی صورت میں ہم کیا کرسکتے ہیں۔" ماتحت نے اپنے افسر کی تائید کی۔

"مگر سید کو کہیں بعد میں پریشانی نہ ہو۔ وہ کیسا مجبور اور ہراساں معلوم ہورہا ہے۔ تم نے اس کا حال دیکھا؟ اب وہ بالکل ایک بدلا ہوا آدمی نظر آتا ہے۔"

"وہ خود انہیں ہمارے سپرد کرنے پر آمادہ نہ ہو تو ہم کیا کرسکتے ہیں جناب۔"

"ہم اپنے طور پر کارروائی کرسکتے ہیں۔"

وہ انگریزی میں باتیں کررہے تھے۔ میں نے سوچا' میں دخل دوں۔ مجھے پہلو بدلتے دیکھ کے بٹھل میری نیت بھانپ گیا' اس نے میرا ہاتھ دبا کے مجھے خاموش رہنے کی تاکید کردی۔

لاکھی بابو اور بسودا سید کو گھوش سے کچھ فاصلے پر لے گئے تھے اور سید کی قلب ماہیت کا سبب جاننے کی کوشش کررہے تھے۔ ان کی گفتگو کی بھنبھناہٹ ہی ہم تک پہنچ رہی

تھی۔
گھوش کے اس خیال پر کہ وہ ہمیں تھانے لے جا کے اپنے طور پر کارروائی کر سکتا ہے' اس کے ماتحت نے مودبانہ اسے مشورہ دیا "اور اگر سید محمود علی ہی ان کی حمایت پر سینہ سپر ہو گیا جناب تو کیا ہوگا۔ سید تھانے میں بھی ان کی وکالت کر سکتا ہے اور مجھے نہیں لگتا کہ وہ ہمیں ان کو یہاں سے لے جانے کی اجازت بھی دے گا۔"
"اس کی اجازت کے بغیر ہم انہیں یہاں سے لے جا سکتے ہیں ورنہ ہم معاملے کی تہ تک کبھی نہیں پہنچ سکتے۔" گھوش نے برہمی سے کہا۔
"وہ مشکل لوگ معلوم ہوتے ہیں۔" ماتحت زیادہ ذہین اور ہوش مند افسر معلوم ہوتا تھا۔ وہ محتاط لہجے میں بولا "تھانے میں وہ ہمارے لیے پیچیدگی کا سبب بھی بن سکتے ہیں۔ وہ بہت پختہ کار لوگ ہیں۔ دیکھتے دیکھتے انہوں نے سید محمود علی پر برتری حاصل کر لی ہے اور دیکھیے' وہ کس اطمینان سے بیٹھے ہیں۔ یہ اعتماد بے جواز تو نہیں ہوگا جناب! لڑکیوں کو یہاں سے لے جانے کے معاملے میں' ہو سکتا ہے' کوئی اور کہانی' کوئی اور رمز بھی پوشیدہ ہو۔ خیال رہے کہ وہ سید کی بیٹیاں نہیں ہیں' اس کے مرحوم دوست کی بیٹیاں ہیں۔ ہو سکتا ہے' یہ اغوا نہ ہو' فرار ہو اور اس میں ان لڑکیوں کی مرضی بھی شامل ہو۔ کسی ملازم نے اب تک یہ نہیں بتایا ہے کہ انہیں زبردستی یہاں سے لے جایا گیا ہے۔ کوئی ایسی شہادت اب تک سامنے نہیں آئی۔ گھر کا ایک پرانا اور بوڑھا ملازم بھی ان کے ساتھ گیا ہے۔"
گھوش توجہ سے سنتا رہا پھر مکدر آواز میں گویا ہوا "انہیں ورغلایا بھی تو جا سکتا ہے۔"
"اس کے یہ معنی بھی لیے جا سکتے ہیں جناب کہ وہ یہاں خوش نہیں تھیں۔ ان میں ایک لڑکی بڑی عمر کی ہے۔ وہ اتنی نادان نہیں ہیں۔ وہ پڑھی لکھی لڑکیاں ہیں اور جناب! یہ شخص جو ان کے ساتھ گیا تھا' واپس کیوں آ گیا؟ وہ سید سے گفتگو کے لیے کیوں اس قدر مصر تھا اور اسے خلوت ہی کیوں مطلوب تھی۔ ہم اس نکتے پر غور کیوں نہ کریں کہ واقعات وہ نہیں ہیں جو ہم سے بیان کیے گئے ہیں۔ ہم نے صرف ایک طرف کا بیان سنا ہے۔"
"لیکن دوسرے کوئی بیان دینا نہیں چاہتے۔"
"انہیں اب بیان دینے کی ضرورت بھی کیا ہے جناب!"
"ہمیں الگ لے جا کے سید کو ٹٹولنا چاہیے؟ سید سے پرانا تعلق خاطر ہے۔ کہیں اسے ہماری مدد کی ضرورت تو نہیں؟"
ماتحت نے اپنے افسر سے اتفاق کیا۔ گھوش نے پھر کوئی پس و پیش نہیں کیا۔ لاکھی بابو اور بسودا' سید سے الجھ رہے تھے' دونوں افسروں نے سید کو ان سے جدا کر دیا۔ ان کا رخ عقبی سبزہ زار کی جانب تھا۔ کچھ دور تک وہ نظر آتے رہے پھر اوجھل ہو گئے۔
میں نے نہیں دیکھا' درمیان میں ان کے آقا سید محمود علی نے اشارہ کیا ہوگا' دربان سمیت تمام ملازمین رفتہ رفتہ وہاں سے ہٹ گئے۔ دونوں سپاہیوں نے بندوقیں شانے پر لٹکا لیں۔ ہم سے کچھ دور لاکھی بابو اور بسودا ایک دوسرے کو قائل و معقول کر رہے تھے۔
سید' گھوش اور اس کے ماتحت کو گئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی ہوگی کہ تینوں عقبی سبزہ زار کی جانب سے واپس آتے دکھائی دیے۔ ہمارے روبرو ہو کے گھوش ٹھہرا رہا اور بٹھل کو خشمگیں نظروں سے گھورتا رہا "آپ کو بڑی تکلیف ہوئی صاحب!" بٹھل کی آواز طنز اور تصنع سے عاری تھی۔
گھوش کا منہ پھولا ہوا تھا۔ اس نے ہنکاری بھری' پلکیں جھپکائیں اور تیزی سے مڑ گیا۔ لاکھی بابو اور بسودا اسے یوں جاتا دیکھ کے بے کل سے ہو گئے۔ گھوش نے پلٹ کے دیکھا نہ ان کی کسی صدا کا جواب دیا۔ وہ سنی ان سنی کرتا راہداری میں بڑھتا رہا اور دور ہوتا گیا۔ لاکھی بابو اور بسودا بھی اس کے تعاقب میں لپکتے ہوئے مدھم روشنیوں میں گم ہو گئے۔
سید محمود علی تنہا رہ گیا تھا۔ وہ بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ کرسی پر ڈھیر ہو کے وہ جیسے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ اتنی دیر میں لاکھی بابو اور بسودا پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ واپس آ گئے اور کرسیوں پر ڈھے گئے۔ سید کی بے نیازی پر انہوں نے رسمی اجازت چاہی تو سید نے رک جانے کے لیے ایک لفظ نہیں کہا۔ ہاں' رسمی طور پر شکریہ ادا کیا اور معذرت کی۔ دونوں پھر وہاں نہیں ٹھہرے۔
بٹھل نے بیڑی سلگائی اور چند لمبے کش لے کے سبزہ زار پر پھینک دی اور کرسی سے اٹھ کے کچھ فاصلے پر سید محمود علی کے پاس جا کے بیٹھ گیا "ہم کو جانا ہے۔" اس نے بھاری آواز میں سید سے کہا۔
سید چونک پڑا۔ خاصے تامل کے بعد اس نے زبان کھولی "آپ سویرے بھی جا سکتے ہیں۔" اس کی آواز ٹھٹھری ہوئی تھی۔
بٹھل نے انکار کر دیا "ہم کو ساری چیزیں واپس کر دو'

زیور گہنا' روپیہ پیسہ' زمین' مکان کے کاغذ' نکاح کا کاغذ' جو بھی ان کا ہے' ابھی اسی ٹائم۔"
سید کا سر جھکا ہوا تھا۔
"کوئی چیز رہ نہ جائے' کہیں ہم کو لوٹ کے آنا پڑے۔"
"مجھے کچھ دیر لگ سکتی ہے۔" سید نے چٹختی آواز میں کہا۔
"پر زیادہ نہیں' ہم کو گاڑی پکڑنی ہے۔"
آہستہ قدموں سے سید محمود علی زنان خانے کی طرف چلا پڑا۔ اس کے دور ہوتے ہی بٹھل نے مجھے کمرے سے سامان باہر لانے کی ہدایت کی۔ یہ وقت کچھ پوچھنے کا نہیں تھا۔ میں نے خود پر جبر کیا۔ اتنا ہی بہت تھا کہ ہم سلامتی سے واپس جا رہے تھے۔ بکھرا ہوا سامان میں نے پہلے ہی سمیٹ لیا تھا' سامان تھا ہی کتنا۔ دو اٹیچیاں' ایک بٹھل کی' ایک میری' ایک بیگ۔ میں بہ عجلت باہر آ گیا۔
ابن' سید کے حکم کے بغیر ہمارے پاس نہیں آیا ہوگا۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے ہمیں سلام کیا اور پوچھا کہ ہمیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟ چائے' شربت' پھل وغیرہ؟ کھانا تو تیار ہے؟ بٹھل نے منع کر دیا۔ ابن نے حقے کی پیشکش کی تو بٹھل سے انکار نہ کیا جا سکا۔ وہ دوڑتا ہوا کمرے میں گیا۔ اس نے کمرے سے ملحق غسل خانے میں حقہ تازہ کیا ہوگا۔ حقے کا نیچا بھیگا ہوا تھا۔ فرشی پر بھی بوندیں چھلک رہی تھیں۔ حقہ اٹھا کے وہ ایک طرف بڑھ گیا اور منٹوں میں واپس آ گیا۔ جلدی جلدی پھونکیں مار کے اس نے کوئلے دہکائے اور منال بٹھل کے آگے کر دی۔ چلم ابھی پوری طرح دہکی نہیں تھی۔ بٹھل چلم سے شغل کرتا رہا اور یوں ہی حقہ گڑگڑاتا رہا اور دھوئیں کے مرغولے اس کے منہ سے ابلنے لگے۔ اطراف میں خمیرے کی خوشبو پھیل گئی۔ ابن ایک طرف ہاتھ باندھے کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے بہت دیر بعد جرات کی اور منمناتی آواز میں بٹھل سے پوچھا "آپ جا رہے ہو بابا؟"
"ہاں رے' آگے جانا تو ہر جگہ سے پڑتا ہے۔" بٹھل نے بوجھل آواز میں کہا۔
"ہم سے کوئی قصور ہو گیا ہو تو۔۔۔" ابن کی زبان اٹک گئی۔
"وہ تو اب ہو رہا ہے تجھ سے۔"
ابن کی سمجھ میں نہیں آیا؟ وہ بوکھلا سا گیا اور مسمسا کے بولا "ہم حکم کے غلام ہیں۔"
"پر آدمی تو پورا ہے۔"
"جی' میں۔" وہ ہکلانے لگا۔
"تھوڑا دیدے بھی کھلے رکھا کر۔"
ابن نے سر جھکا لیا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔
"کچھ پاس بھی رکھ۔ پورا بیچ دیا کیا۔"
ابن کو کسی کے آ جانے اور دیکھ لینے کی پروا نہیں تھی۔ اس نے بڑھ کے بٹھل کے پیر پکڑ لیے۔ بٹھل کا اس کے سر پہ تھپکی دینا اور غضب ہوا۔ وہ تو بڑکنے لگا "مجھ کو بھی ساتھ لے لو بابا!" اس نے بلکتی آواز میں کہا "میرا کوئی نہیں ہے یہاں۔"
"تیرا مالک ہے ادھری۔"
"نہیں بابا! اب یہاں رہنے کو من نہیں کرتا۔" وہ فریادی لہجے میں بولا "میرا ہاتھ بھی تھام لو۔ آپ کی اور چھوٹے صاحب کی خدمت کروں گا زندگی بھر۔ کبھی کوئی شکایت ہو تو جوتے مارنا' جوتے مار کے نکال دینا۔"
"ہم کو لوٹ کے گھر جانا ہے رے' پھر آنا ہوا تو دیکھیں گے یا بلوا لیں گے کسی سے۔" بٹھل نے اسے تسلی دی۔ وہ یہی کر سکتا تھا۔
"نا نا' بابا! منع مت کرو' منع مت کرو۔" وہ بٹھل کے پیروں سے سر رگڑنے لگا۔ بٹھل کو مکدر دیکھ کے میں نے اسے اٹھایا۔ ابن کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ بٹھل نے جیب سے روپے نکالے اور گنے بغیر اسے دینے چاہے۔ ابن نے ہاتھ نہیں لگایا اور گڑگڑا کے کہنے لگا کہ اسے روپے پیسے نہیں' ہمارا سایہ ہماری سرپرستی چاہیے۔ وہ زندگی بھر ہم سے ایک دمڑی کا طلبگار ہو تو نطفہ ناتحقیق۔
"ابھی کچھ نہیں بول سکتے رے' ابھی ادھری پٹا ڈالے رکھ۔" بٹھل نے منال ہونٹوں سے لگائی۔ میں نے نوٹ ابن کی جیب میں ٹھونس دیے۔ جانے کب کے رکے ہوئے آنسو اس کی آنکھوں سے ابل رہے تھے۔ میں نے اس کی دل جوئی کرنی چاہی اور ناچار اسے چھوڑ کر کرسی پر آ بیٹھا۔ میرا بس چلتا تو فوراً ہامی بھر لیتا۔ اس نے گزشتہ دنوں ہماری بہت خدمت کی تھی مگر بٹھل نے کچھ سوچ کے ہی یہ تغافل کیا ہوگا۔ سو میں اس کی سفارش بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے آنسو میرا سینہ جلاتے رہے۔
ابن کی توجہ ہٹانے اور اسے وہاں سے ہٹانے کے لیے بٹھل نے اسے کمرے میں جا کے ایک نگاہ ڈالنے کی ہدایت کی کہ کہیں ہمارا کچھ سامان وہاں رہ تو نہیں گیا ہے۔ ابن ایسا کم عقل بھی نہیں تھا۔ سمجھ گیا ہوگا۔ وہ چپ چاپ کمرے میں چلا گیا۔

سید کو گئے ہوئے گھنٹے بھر سے اوپر ہوگیا تھا۔ ابن کے بعد کوئی ملازم اس طرف نہیں آیا۔ ابن بھی تھوڑی دیر بعد کمرے کا معائنہ کرکے واپس آگیا۔ اس کے ہاتھ خالی تھے۔ وہ ایک جانب راہداری کے تھم سے ٹیک لگائے کھڑا رہا۔ اس نے پھر بہل سے کوئی منت نہیں کی لیکن اس کی خاموشی بجائے خود ایک التجا تھی۔

رات اور بڑھ گئی تھی۔ مینڈکوں اور جھینگروں کا شور رات کا احساس اور سوا کردیتا ہے۔ ہر طرف سکوت طاری تھا۔ گھر میں کوئی موت ہوگئی ہو جیسے' ایسا سکوت۔ کل یہاں اس وقت بہت ہلچل تھی۔ بیرونی سکوت کی نہاں خانے کی چیخ پکار سے کوئی نسبت نہیں۔ بہل کے پاس وقت گزاری کے لیے حقے کا مشغلہ تھا' میرے پاس انتظار کے سوا کچھ نہیں تھا۔ انتظار سے بدترین شغل کوئی نہیں ہوتا اور زندگی بیشتر انتظار ہی سے عبارت ہے۔ ہروقت کوئی نہ کوئی انتظار' ایک کے بعد دوسرا انتظار۔ شام سے صبح کا' اندھیرے سے اجالے کا انتظار۔ یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ بڑے عرصے پر پھیلے ہوئے انتظار میں آدمی کو صبر آجاتا ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے انتظار بہت جان لیوا ہوتے ہیں۔ اب سارے مرحلے نمٹ جانے کے بعد سید محمود علی کا انتظار تھا۔ کوئی بعید نہ تھا کہ اس وقفے میں رنگے سیار کے دماغ میں کوئی اور کمینگی نمو پا جائے۔ زنان خانے میں رئیس بیگم نے اس کا حوصلہ بڑھایا ہوگا۔ ابھی ہم اس کے گھر میں بیٹھے تھے۔ امکان تو نہیں تھا لیکن سید پر اعتبار نہ کرنے کے جواز بے شمار تھے۔

بہل اپنے آپ میں مگن تھا۔ میں نے خود کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ اب سب کچھ نمٹ چکا ہے۔ آزمائش کا ایک دن گزر چکا ہے' کیسا طویل اور صبر آزما دن۔ یہ دن کوئی بھی رخ اختیار کرسکتا تھا۔ اب رفت گزشت کے مصداق سب کچھ فراموش کردینا چاہیے۔ آنے والا وقت یقیناً ایسا کرخت اور گراں نہیں ہوگا۔ خوش امیدی کیسی ہی غیرواقعی ہو' باعث راحت ہوتی ہے۔ ہر امید اچھے برے خواب کی طرح ہوتی ہے۔ تعبیر مثبت نکل آئے یا مایوس کرے۔ تعبیر تو قرعہ ہے اگر خود بینی سے قرار آجایا کرتا تو نجات ہی نجات تھی۔ آدمی کا سارا جسم اس کے اختیار میں ہوتا ہے' بجز دماغ کے۔ آدمی سب سے بے اختیار اپنے دماغ سے ہوتا ہے۔ لوگ دل اور دماغ الگ الگ تصور کرتے ہیں۔ کہتے ہیں' دونوں کا مزاج ہی جدا ہے اور دونوں میں کوئی ضد سی ہے۔ کبھی دل غالب آجاتا ہے' کبھی دماغ۔ یہ ساری شاعرانہ باتیں ہیں۔ بے شک دل اور دماغ دونوں جدا جدا ہیں مگر دل کو تو بس دھڑکنا آتا ہے۔ دونوں میں اختلاف و انحراف یا بھی کوئی ربط باہم نہیں ہے۔ یہ دماغ ہی ہے جو اپنے آپ سے ضد کرتا ہے اور آپ ہی مان جاتا ہے۔ آدمی کا کوئی ایک دماغ نہیں ہوتا یوں کہا جائے' ایک دماغ میں کئی دماغ ہوتے ہیں جو بیک وقت مختلف سمتوں میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ دماغ آدمی سے بہت شوخیاں کرتا ہے' ستم ناک حد تک۔ یہ آدمی کا ہروقت امتحان لیتا رہتا ہے' رلاتا' ہنساتا' خود ہی سوال کرتا' خود ہی جواب دیتا ہے۔ بیچ چوراہے پر لا کے کبھی اس طرف کبھی اس طرف اشارہ کرتا ہے۔ جانے کب کسی دانش مند نے خواہشوں' خوش امیدیوں اور اداسیوں کے سارے معاملات دل سے وابستہ کیے تھے' باقی دماغ سے۔ یعنی کیفیت دل سے' کمیت دماغ سے مشروط ہے۔ حالانکہ اس تقسیم و تفریق کا حاصل ہی کیا' دونوں کا واسطہ آدمی سے ہے۔ دونوں کے وظائف ایک ہوں یا جدا جدا۔ ان پر قابو یافتگی سب سے بڑا ہنر' سب سے بڑا اختیار ہے۔ ایسے ہنرمند اور مختار لوگ بہت کم ہوتے ہیں مگر ہوتے ضرور ہیں۔ ایک تو میرے سامنے ہی بیٹھا تھا' ہر تعبیر کے لیے آمادہ۔

کچھ دیر کے لیے' کم از کم سید کے آنے تک میں اپنے آپ کو بیگانہ رکھنے میں ناکام رہا۔ ہاتھ پیر بکھرتے رہے تھے۔ اس وقت نیند کا کوئی سوال نہیں تھا مگر ایک گہری نیند کے لیے آنکھیں مچلتی' آنکھیں ترستی تھیں۔ ایک ایسی نیند جو دل و دماغ کو فکر و تجسس' اندیشہ و وہم کی آلائشوں سے بے نیاز کردے۔ ایسی نیند تو کب کی مجھ سے دور ہوچکی تھی۔ میں نے طے کرلیا تھا' بہل لاکھ حجت کرے' اس بار میں اڑ جاؤں گا کہ اب کہیں اور جانے کے بجائے ہمیں فیض آباد ہی جانا ہے۔ کچھ دن وہاں آرام کرکے ہم پھر روانہ ہوسکتے ہیں۔ اسے یقین ہے کہ کسی کھوہ میں چھپے ہوئے مولوی صاحب تک ایک روز ہماری رسائی ہوجائے گی۔ میری آس بھی نہیں ٹوٹی ہے۔ یہ جاں کاہی و جاں سوزی کسی نہ کسی دن ضرور بار آور ہوگی لیکن میں اس سے کس طرح کہوں' اپنا عذاب مجھے خود بھگتنے دو۔ اسے کیا معلوم' اس کی ہم رکابی بار بار مجھے کیسی پشیمانی اور آزردگی سے دوچار کرتی ہے۔ دوسرے کو کسی کا آزار ایک حد تک ہی جھیلنا چاہیے۔ میں نے طے کرلیا تھا' میں اب اس کی ایک نہیں چلنے دوں گا۔ آگے جانے سے قطعی انکار کردوں گا لیکن یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ ابھی تو ہم اس گھر' اس زنداں میں موجود ہیں۔ سب سے بڑا مرحلہ تو یہاں سے نکلنے کا ہے۔ جانے کیوں مجھے بہت بے کلی ہو رہی تھی۔ لگتا تھا' ہم یہاں برسوں سے قید ہیں۔ در و دیوار زہر لگ

تھے۔

ابن ہم سے اجازت لے کے چلا گیا تھا مگر جلد ہی واپس ...کھانے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ بہل تیار نہیں ہوا۔ ...کا حقہ بھی دم توڑ چکا تھا۔ اس نے نئی چلم بھرنے سے بھی ...کردیا پھر نذرو ہماری طرف آتا دکھائی دیا۔ اس نے بہل ...اور مجھے سلام کرکے سید کے آنے میں تاخیر ہوجانے پر ...رت کی اور بتایا کہ اس کا مالک اب آیا ہی چاہتا ہے۔

دس پندرہ منٹ ہی ہوئے ہوں گے' زنان خانے کی ...سے سید محمود علی برآمد ہوا۔ وہ اکیلا تھا۔ میں نے سکون ...سانس لی۔ بہل کا اطمینان بے سبب نہیں تھا۔ سید کے ...وں میں ایک بڑے رومال میں لپٹا ہوا کچھ سامان تھا۔ ابن ...نذرو کو اس نے چلے جانے کا حکم دیا۔ ان کے دور ...انے پر اس نے سامان میز پر رکھ کے رومال کھول دیا۔ یہ ...خاصا بڑا صندوقچہ تھا' زیوروں سے بھرا ہوا "یہ سارے ...رانی کے ہیں۔" سید ڈوبی ہوئی آواز میں گویا ہوا "یہ ...کی تحویل میں تھے۔ معلوم نہیں کیوں' چلتے وقت وہ ...ں چھوڑ گئیں۔ چابیاں بھی ان کے پاس تھیں۔ چابیاں ...ن کرنے میں دیر لگ گئی۔ تالا توڑنا پڑا۔" صندوقچے کے ...ایک دبیز چرمی مسل دبی ہوئی تھی۔ سید نے وہ نکال کے ...ل کے سامنے کردی "یہ ان کے مکان اور زرعی زمین کے ...ات ہیں۔ باپ کے مرنے کے بعد جائداد ماں اور بیٹیوں ...نام منتقل ہوگئی تھی۔ میں نے اپنے نام کچھ منتقل نہیں ...یا۔"

"وہ تو تمہارا ہی ہوجاتا۔"

سید نے مضطربانہ ایک نظر بہل کو دیکھا اور سر جھکا لیا ...ں اور بیٹیوں نے ایک مختار نامہ میرے نام کردیا تھا' ماں کی ...ت کے بعد وہ کالعدم ہوگیا۔ بیٹیوں کی طرف سے اس کی ...م اور تجدید نہیں کرائی گئی۔ یہ مختار نامہ بھی' جس کی اب ...کی حیثیت نہیں رہی' کاغذات میں موجود ہے۔ آپ دیکھ ...لیں۔"

بہل نے مسل میری طرف بڑھا دی۔ میں نے ایک ...کرکے کاغذات کا جائزہ لیا۔ مجھے ان کے اصلی نقلی ...کی ایسی تمیز نہیں تھی تاہم میں بغور دیکھتا رہا۔ ان میں ...نام درج تھے۔ باقاعدہ سرکاری مہریں کندہ تھیں۔ دستخط ...عدالتی ٹکٹ چسپاں تھے۔ کاغذ بھی عدالتی تھا۔

"اور نکاح کا پرچا؟" بہل نے کھردری آواز میں ...چھا۔

"وہ بھی ان میں ہے' بالکل آخر میں۔" سید کے ہاتھ بہک رہے تھے "دیکھیے۔" اس نے مسل کے کاغذات پلٹ کے مجھے نکاح نامہ دکھایا۔ اس پر سید' فردزاں اور یاسمن کی ماں' نصیر بابا' قاضی اور کئی اور لوگوں کے دستخط تھے۔

"سب پورا ہے نا؟" بہل نے مجھ سے پوچھا۔

"بظاہر تو مکمل ہی معلوم ہوتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ اطمینان رکھیے۔" سید کی آواز دھڑک رہی تھی "بالکل فکر نہ کیجیے۔"

"ابھی ہم کو وکیل ادھری بھیجنا پڑے گا' ساتھ میں اپنا آدمی بھی ہوگا۔"

"میں ہروقت حاضر ہوں۔"

"کدھری نکل جانے کا دھیان ابھی من سے نکال دو۔"

"میں' میں کہاں' میں کہیں نہیں جارہا' یہیں موجود ہوں جناب!"

"جدھری جاؤ گے' ہم پیچھے پہنچ جائیں گے اور تمہارے لیے..."

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" سید نے بہل کو بات مکمل نہیں کرنے دی اور صندوقچے کے پہلو سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کے بہل کے آگے کردیں۔

"یہ کیا ہے؟" بہل نے بے اعتنائی سے پوچھا۔

"مجھے ان کے حساب کتاب کا صحیح علم نہیں ہے' اندازاً پچاس ہزار روپے دے رہا ہوں۔"

"تمہاری طرف سے کچھ نہیں مانگتے' جو ان کا ہے' اتنا ہی لوٹاؤ۔ سمجھ میں آیا؟"

"جی' جی ہاں۔" سید حواس باختہ ہونے لگا "اندازہ ہے کہ اتنا ہی ہوگا۔"

"پورا ناپ تول کے ہی دو۔"

"جی' جی۔" سید ٹھٹک کے بولا اور کھسیانا سا ہوگیا "یہ کم ہوں تو میں..."

بہل نے ہاتھ اٹھا کے اسے مزید کچھ نہیں کہنے دیا "تم سے بولا نا' جو ان کا ہے' بس وہی لوٹانا ہے۔" اس نے جھڑکتی آواز میں کہا "مول مت سوچنا' سا اُلٹ جائے گا پھر۔"

سید محمود علی نے پھر کچھ نہیں کہا۔

بہل کا یہ طرزِ تخاطب میرے لیے حیران کن تھا مگر اس سے کچھ دیر پہلے کمرے میں اس کے اور سید کے درمیان ہونے والی گفتگو کا اندازہ کیا جاسکتا تھا۔

بہل کی ہدایت پر میں نے صندوقچہ اور نوٹوں کی گڈیاں اٹیچی میں منتقل کردیں۔ اٹیچی میں جگہ بنانے کے لیے

کچھ سامان نکال کے بیگ میں رکھا' کچھ دوسری اٹیچی میں منتقل کردیا۔

"تانگا منگواؤ۔"

بٹھل کے کہنے کی دیر تھی کہ سید فوراً ایک جانب لپک پڑا۔ اسے کوئی ملازم قریب ہی کہیں نظر آگیا تھا جو وہ بہ عجلت واپس آگیا۔ چند لمحوں میں بشارت اور نذرو بھی آگئے اور راہداری کے اس حصے میں ہمارا سامان لے آئے جہاں سے بڑا دروازہ نزدیک تھا۔ تانگا آنے میں بھی دیر نہیں لگی۔ سید ہاتھ باندھے کھڑا رہا۔ تانگے پر سوار ہونے سے پہلے بٹھل نے عین اس کے مقابل جاکے سرد لہجے میں کہا "تم کو ایسے چھوڑ کے جانے کا پچھتاوا رہے گا' پر لڑکیوں نے ہاتھ جکڑ رکھے ہیں۔ تم کو تمہاری جگہ پہنچانے کے لیے ان کو بھی الٹی سیدھی جگہ جانا پڑے گا۔"

سید محمود علی بت بنا کھڑا رہا۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔

"پھندا تم سے کبھی دور نہیں ہے۔" یہ کہتے ہی بٹھل تانگے میں بیٹھ گیا۔

اسٹیشن اتنا دور نہیں تھا۔ سڑکیں صاف اور دھندلی دھندلی تھیں۔ سناٹے میں گھوڑے کی ٹاپیں سارے راستے گونجتی رہیں۔ آدھ گھنٹے سے پہلے ہم اسٹیشن پہنچ گئے۔ اسٹیشن بھی سنسان پڑا تھا۔ خوب روشنیاں تھیں مگر اونگھ سی رہی تھیں۔ ہجوم میں روشنی بھی پُرشور ہوجاتی ہے۔ کوچوان نے ہمیں بتایا تھا کہ مغل سرائے کی طرف جانے والی گاڑی دو گھنٹے بعد اور کلکتے کی طرف جانے والی ڈھائی گھنٹے بعد یہاں سے گزریں گی۔ ابھی گیارہ بجے تھے۔ ہم نئے سازو سامان سے آراستہ فرسٹ کلاس کی کشادہ اور صاف ستھری انتظار گاہ میں آگئے۔ یہاں کوئی اور نہیں تھا۔ انتظار گاہ کے نگراں نے خوش دلی سے ہمارا استقبال کیا اور بٹھل کی فرمائش پر چائے اور بسکٹ کا انتظام کردیا۔ سہ پہر بٹھل بازار سے کچوریاں وغیرہ لایا تھا' اسی وقت ہم نے کچھ کھایا پیا تھا۔ حلق ویسے بھی سوکھ رہا تھا۔ چائے پی کے توانائی اور تازگی سی محسوس ہوئی۔ ہم دونوں باری باری منہ ہاتھ دھو کے کچھ تازہ دم ہوگئے تھے۔ ...ل کو بتا کے میں تو باہر نکل آیا۔ سارا جسم ہلکا ہلکا لگ رہا تھا۔ ہوا میں نرمی اور نمی تھی۔ لگتا تھا' جیسے جسم کے بند دریچے کھل گئے ہوں اور خوب ہوا' خوب روشنی در آئی ہو۔ آسن سول ایک بڑا جنکشن ہے۔ دیر تک میں یوں ہی ٹہلتا رہا۔

اتفاق سے اس وقت میرا رخ انتظار گاہ ہی کی طرف تھا۔ دور سے میں نے تین آدمی انتظار گاہ میں داخل دیکھے۔ وہ مسافر نہیں معلوم ہوتے تھے۔ بھاگنے ... فارم پر موجود لوگ مشکوک ہوجاتے' میں نے اپنی رفـ... اور دروازے پر پہنچ کے اندر جانے سے پہلے چاقو جـ... نکال کے ہاتھ میں دبالیا۔ آہستگی سے میں نے دروازہ... مجھے چاقو جیب میں واپس رکھنا پڑا۔ وہ ناتھو استاد اور ساتھی تھے۔ تینوں فرش پر بٹھل کے پیروں میں بیٹھـ... ناتھو نے اس کے پیر پکڑ رکھے تھے۔ میں قریب پہنچا تو نا... اس کے ساتھیوں نے ہاتھ جوڑ کے مجھے پرنام کیا۔ میر... کی جنبش سے انہیں جواب دیا۔ ناتھو' بٹھل سے معا... آیا تھا' کہہ رہا تھا' اس نے اپنا ایک آدمی سید محمو... مکان کے باہر تعینات کردیا تھا کہ جب بھی ہم باہر... اسے مطلع کردے۔ سید کے ہاں سے آنے کے بعد و... اپنے آپ کو سرزنش کرتا رہا کہ اس نے بٹھل... بدکلامی کیوں کی۔ اس سے بٹھل کو پہچاننے کی چوک... ہوگئی۔ ایک بار زک اٹھانے کے بعد اس نے چاقو... دوبارہ بٹھل کے سامنے آنے کی جرات کیوں کی۔ نا... سید کے مکان میں سب کے سامنے بٹھل سے معا... کرلی تھی لیکن وہ کہہ رہا تھا' اس کا دل مطمئن نہ... دوبارہ سید کے مکان میں جانا مناسب نہیں تھا۔ بعد... پولیس بھی آچکی تھی اور اسے یقین تھا کہ پولیس بھی ہو کے جائے گی۔ اگر پولیس بٹھل کو تھانے لے جا... تھانے میں حاضر ہوجاتا۔ وہ بھی بٹھل کو بابا کے لقـ... مخاطب کررہا تھا۔ پہلے مجھے شبہ ہوا تھا کہ کہیں وہ یا ا... ساتھی بٹھل کو پہچان تو نہیں گیا ہے لیکن ایسا نہیں تھـ... بٹھل خاموشی سے اس کی بے قراری کی دا...

رہا۔ ناتھو دہائیاں دینے لگا اور کہنے لگا کہ ا... خدمت بجالانے کا موقع دیا جائے۔ بٹھل اسے کوئی... اور مناسب سمجھے تو اپنے گھر کا پتہ بھی بتادے۔ ناتھو... اس کے تیور میں کوئی کھوٹ معلوم نہیں ہوتا تھا۔

"ابھی دور جانا ہے' دیکھو' جلدی پھر ادھر آنا ہو..." بٹھل نے نرمی سے کہا "تم کو بول دیں گے۔"

"ناتھو کو اپنا داس سمجھو پربھو!" ناتھو عاجزی... اور بٹھل کی پنڈلیاں دبانے لگا "تم نے معاف کردیا نا با... ...ہی تو پاپ ہوا اپنے سے۔ ہماری آنکھیں نکال لو۔ یہ ...بھتی نہیں تو کس کام کی۔"

...کام آئیں گی رے' سنبھال کے رکھ۔ پہلے دیدے کو ...ے کر۔ چاقو تو دیدہ ہی گھماتا ہے۔ ہاتھ تو آگیا کا پالن کرتا ...بھولے ناتھ!"

ناتھو نے پھٹی ہوئی آنکھوں سے سنا اور اچھل پڑا ...ل ٹھیک' بالکل ٹھیک بولتے ہو۔" اس نے اپنے منہ پر ...نچے مارے اور دیوانگی سے سر جھٹکنے اور تکرار کرنے لگا ...ے داس کو معافی دیو بابا!"

"آگیا تو ادھری' اتنا بہت ہے۔ یاد رہے گا تو بھی۔"

"...اپنے کو چرنوں سے دور مت کرو۔"

"آئیں گے رے ادھری لوٹ کے۔" بٹھل نے ...ے ہوئے لہجے میں کہا اور اپنے پیر سمیٹ لیے۔

ناتھو جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے ساتھی نے کہنی مار ...اسے ٹوکا تو وہ کسمسا کے اٹھا اور ہاتھ جوڑتا ہوا الٹے ...وں دروازے تک گیا اور باہر جاتے جاتے واپس آگیا ..."...س کو اپنی کوئی بھینٹ دے دیو بابا!" اس نے بھکاریوں ...انداز میں کہا۔

بٹھل نے جیب سے چاقو نکال کے اچھال دیا۔

ناتھو نے مشاقی سے اسے پکڑلیا اور آنکھوں سے لگایا' ...بار چومتا رہا "داس دیپ جلائے بیٹھا رہے گا۔" اس نے ...لی ہوئی آواز میں کہا اور انتظار گاہ سے نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں بٹھل کے برابر کی کرسی پر ...گیا۔ اس سے پوچھنے کے لیے سر میں بے شمار باتیں گردش ...رہی تھیں لیکن میری طرح اسے بھی گزشتنی کا غبار دور ...نے کے لیے ایک عرصہ سکون و سکوت درکار تھا' سب سے ...بار تو سر کا ہوتا ہے۔ ابھی ہم آسن سول میں تھے۔ کسی جگہ ...نسبت سے جسم و جاں پر چھائی ہوئی دھند میں فاصلے بھی ...ہوتے ہیں۔ ہمیں جلد از جلد یہاں سے دور ہوجانا ...ہیے تھا۔ میں چپ بیٹھا رہا۔ اس نے بھی مجھ سے کوئی ...ت نہیں کی۔ کچھ دیر بعد اسے خیال آیا' اچٹتی آواز میں ...لانے ٹکٹ لانے کے لیے کہا اور جیب میں ہاتھ ڈالا۔

"رہنے دو' کچھ روپے ہیں میرے پاس' تم ہی نے دیے ...ے' خرچ ہی نہیں ہوئے۔" میرے لہجے میں غیر ارادی طور ...فخر کی آمیزش ہوگئی "کہاں کے ٹکٹ لاؤں؟"

...اس نے تامل کیا پھر بے پروائی سے بولا "آگے کے لے ...آگے کہاں کے؟"

"ادھری سے بردوان شہر ہی بڑا پڑتا ہے۔"

"بردوان جانا ہے؟" میں نے چلا کے کہا "وہاں کیوں؟"

"آگے اب وہی تو ہے رے۔ بیچ میں درگاپور بھی ہے' پر اس کو بعد میں دیکھیں گے۔"

"کیا اب بھی آگے ہی چلنے کا ارادہ ہے؟"

"اب ادھری ہیں تو سارا نمٹا کے چلیں۔"

"اب اکٹھے ہی چلیں گے ادھری' جس کام کے لیے نکلے ہیں' پہلے اس کو تو پورا کرلیں۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔" اپنے لہجے کی تلخی پر مجھے شرمندگی بھی ہوئی۔

"تو کدھری جائے گا؟"

"ادھری تو جانا ہی ہے۔" وہ مفاہمت کے لہجے میں بولا "تجھ کو کیا اب مولوی کا دھیان نہیں ہے؟"

"یہ کون کہہ رہا ہے' میری بات سمجھتے کیوں نہیں۔"

"سمجھا رے پھر۔" اس کی تیوری پر بل پڑگئے "لگتا ہے' آس چھوڑدی تو نے۔ آج نہیں تو کل' کسی جگہ پر تو ٹکرے گا مولوی' پر کھوج بنا کیسے' گھر بیٹھ کے تو نہیں آجائے گا پاس اپنے۔"

"میں کچھ اور کہہ رہا ہوں۔" میں نے چڑ کے کہا "میں صرف کچھ دنوں کی بات کررہا ہوں۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا' اگر ہم کچھ دن فیض آباد ٹھہر کے روانہ ہوں۔ تمہیں اندازہ نہیں' ہمیں وہاں سے آئے ہوئے کتنا عرصہ ہوگیا۔ بابا جان کو جب ہم تبت سے لائے تھے' تب وہاں ٹھہرے تھے۔ درمیان میں فرصت ہی نہیں ملی اور کیا کیا حادثے ہوتے رہے۔ کبھی حیدر آباد' کبھی بمبئی' مراد آباد' لکھنؤ' دکن' پچھم' یوپی بہار اور اب بنگال۔ کتنے صوبے' شہر' قصبے۔ کچھ معلوم ہے' کتنا وقت گزر گیا؟ صرف خط لکھ دینے سے تم سمجھتے ہو' بات بن گئی' تمہاری ذمے داری پوری ہوگئی۔ وہ بھی ہمارا گھر ہے۔ ابھی کچھ عرصے پہلے ہم نے سلمٰی کو وہاں بھیجا ہے۔ ٹھیک ہے۔ اس کے ساتھ جمرو اور زورا تھے لیکن اب فروزاں اور یاسمن وہاں پہنچنے والی ہیں۔" میں نے بٹھل کو ہموار کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ میں نے کہا "فروزاں' یاسمن اور نصیر بابا کے لیے زریں کی حویلی بالکل اجنبی ہوگی۔ ہماری موجودگی ان کی اجنبیت دور کرنے میں معاون ہوگی۔ شروع شروع میں انہیں ہمارے گداز کی بڑی ضرورت ہوگی۔"

"وہ سارا دیکھ لے گی' وہ بڑی گنی ہے۔" میرے لہجے کی تپش اور نیت کے صدق کا بٹھل پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ کہنے لگا کہ وہاں اور لوگ بھی ہیں۔ منیر علی کا خاندان ہے۔

جہاں گیرتے' نیساں ہے' ملازمین ہیں۔ ہو سکتا ہے' جمرو اور زورا بھی ابھی وہیں ہوں اور خانم حیدر آباد سے آچکی ہو۔ نصیر بابا کو اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔ زریں کے نام چند سطری خط بھی لکھوا کے نصیر بابا کے حوالے کردیا ہے۔

میں اسے اپنی بات سمجھا نہیں پا رہا تھا وہ سمجھنا نہیں چاہتا تھا۔ شاید میرے ہی ادعا میں کوئی نقص تھا۔ میں اس سے کہہ نہیں پا رہا تھا کہ سائلوں کی طرح میرے ساتھ یوں گلی کوچوں میں اس کی خواری مجھے اچھی نہیں لگتی۔ ایک حد تک ہی آدمی' آدمی کے ساتھ چل سکتا ہے' ایک حد تک ہی کسی کو دوسرے کے بوجھ میں شریک ہونا چاہیے۔ میں غلط بھی کیا کہہ رہا تھا' میں نے دیکھا تھا' زریں کے پاس جا کے ل کے چہرے پر کیسا سکون چھا جاتا ہے۔ زریں تو واقعی کوئی شجر سایہ دار ہے۔ وہاں جا کے بتھل' زریں کے اشاروں کا منتظر رہتا ہے۔ آدمی کو تعمیل حکم میں جہاں آسودگی ملے' ل کے لیے زریں کی حویلی ایسی ہی ایک جگہ ہے۔ وہاں جا کے وہ کوئی دوسرا آدمی ہوتا ہے۔ اس نے اڈا ترک کردیا تھا' جہاں عرصے سے اس کی حکومت قائم تھی' اس نے اڈے کے ساتھیوں سے کنارہ کرلیا تھا جو غلاموں کے مانند اس کی جنبش ابرو کے اسیر تھے۔ اپنے ساتھ مجھے اس کی بے آرامی کا ہمہ دم احساس رہتا تھا۔ مجھے بھی تو کچھ اس کا خیال کرنا چاہیے۔ میں یہی کچھ اس سے کہنا چاہتا تھا لیکن لفظ ہی کھو گئے تھے۔ شاید مجھے اس کی دل برداشتگی اور ناراضگی کا خدشہ تھا اور خود مجھ پر واضح نہیں تھا کہ میری منشا کیا ہے۔ شاید وہ ٹھیک کہہ رہا تھا' میری امید میں پہلے جیسا عزم اور یقین نہیں رہا ہے۔ مولوی صاحب ہی مجھ سے دامن کش رہنا چاہتے ہیں تو میں کیا کرسکتا ہوں۔ جہاں جہاں ہم ان سے قریب پہنچتے رہیں گے' وہ ہم سے اور دور ہوتے جائیں گے۔ وہ ایک جگہ ٹھہرے رہتے تو ان تک پہنچنا کوئی دشوار نہیں تھا۔ یہ نہیں تھا کہ ان کے تعاقب میں ہم ناکام ہی رہے ہوں' کئی جگہ بس آگے پیچھے کی بات رہ گئی۔ ہم ان گھروں تک پہنچ گئے تھے جہاں ان کا قیام رہا۔ جیسامیر' مراد آباد' نگریا سادات' حیدر آباد۔

یا پھر یوں تھا کہ میں ہی زریں کے پاس جانے کے لیے مضطرب تھا۔ ل کی طرح وہ میری ذمے داری بھی ہے۔ میں اپنی پشیمانی کی تلافی کے لیے وہاں جانا چاہتا تھا اور جواز کے لیے بتھل کے سامنے دلیلیں وضع کررہا تھا۔ وہ میری آس کی ناتوانی کی بات کررہا تھا۔ آدمی اپنا حال خود ہی بہتر جانتا ہے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ درمیان میں یہ طرح طرح کے حادثے اور سانحے جو دیوار بن جاتے ہیں تو مجھ پر کیا گز ہے۔ میں کسی ان ہونی میں شامل نہ بھی ہوں تو الگ کر سکتا ہوں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے شامل ہونا پڑتا ہے بابا کی زبانی فروزاں اور یاسمن کی روداد سن کے ہم اپنا بھی لے سکتے تھے۔ ریل میں سلمیٰ کا احوال جان کے مجبوری کا عذر کرسکتے تھے۔ فروزاں اور یاسمن اپنے ماں کی طرح سید محمود علی کی بھینٹ چڑھ جاتیں۔ ارشاد علی آسرا سلمیٰ کا پھر کہیں اور سودا کردیتا۔ سلمیٰ کے ز چرائے ہوئے ہیرے جواہر لے کے کہیں چلتا بنتا۔ یہی مقصود تھا۔ اگر میں بروقت مداخلت نہ کرتا تو حملہ آور کو ختم کرنے کے ارادے ہی سے آئے تھے۔ کرشنا جی لیے بالکل اجنبی تھے۔ کوئی کتنا ہی اجنبی ہو' آدمی کی نسبت تو آدمی سے ہے پھر کرشنا جی نے میرے پیروں میں ڈال دی۔ انہوں نے میرے لیے کیا کیا نہ کیا۔ مجھے چھوٹے بھائی کی طرح عزت دی' ساری جائداد میرے گئے۔ ابا جان تک ہم انہی کی کوششوں سے پہنچ پائے ریل ہی میں مجھے زریں ملی تھی۔ اسے اس فاحشہ کے چنگل میں دیکھ کے میں کس طرح ہاتھ پیر توڑے بیٹھا تھا' زریں کو کیا اس کے حال پر چھوڑ دیتا۔ آدمی آئینے بھی تو کرتا ہے۔ راستے کے پتھروں کا آدمی کیا کرے موسموں کا کیا اعتبار۔ میرا ستم تو مستزاد تھا' اپنے درد کے فشار میں یہ پتھروں اور موسموں کا آزار' جو خود ہی معذور ہو' وہ کسی کی داد رسی کیا کرے' کس قدر کرسکے ل کو میں کیا بتاتا کہ میں اس کے ساتھ ہوتے ہوئے کیسا تنہا رہتا ہوں۔ میرے سینے میں مسلسل ہوک ا ہے۔ جی چاہتا ہے' دیواروں سے سر پھوڑ لوں' اپنا لوں' کہیں کسی ویرانے میں جا بسوں۔ کوئی میری پر کرے۔ میں کوئی پاگل تو نہیں ہوں' اپنا اچھا برا خو ہوں' مجھے رنگوں کی تمیز ہے' خوب اچھی طرح دکھا دیتا ہے لیکن میں کیا کروں' بہت خود کو ٹوکتا ہوں' اپنے سمجھاتا ہوں کہ میری استطاعت بس اسی قدر ہے۔ محدود ہے۔ بس ایک دائرے میں دیکھنے' سننے اور صد کی توفیق رکھتا ہے۔ یہ دنیا آدمی سے بہت بڑی ہے کوئی شمار' کوئی حد و حساب ہی نہیں' بے شمار اس کی ہیں' بے پناہ اس کے فاصلے۔ کوئی مقدرت کے مطا بھاگ سکتا ہے۔ جیل سے آنے کے بعد میں نے کوئی گنوایا' میں تو بھاگتا ہی رہا۔ میں جو نظر آتا ہوں ہوں۔ ایک آدمی کا اندرون دوسرے کو کتنا نظر تھل کو جو نظر آتا ہے' وہ اتنا نہیں ہے' جتنا میں خود سے نبرد زما ہوں۔ میں اس سے کہنا چاہتا تھا' بے شک' زریں کے یال سے لطف و راحت کا احساس ہوتا ہے لیکن جانے یوں' جب وہ سامنے آتی ہے' کہیں سے کورا بھی چپکے سے ں کے پہلو میں آکے کھڑی ہوجاتی ہے پھر میری آنکھیں اور لے لگتی ہیں' میرا سینہ اور گھٹنے لگتا ہے۔ بتھل سے میں کیا تا کہ فیض آباد میں زریں کی حویلی ہو یا بمبئی میں ابا جان کا ل' میں رما کے ساتھ کشتی میں سوار ہوں اور لہریں جھولا جھلا رہی ہوں اور رما کا نہایت بلیغ و شائستہ' دل نشیں' اثر آفریں کلام جاری ہو۔ وہ جولین ہو جس کی معیت میں زریں جیسی ماؤں' ٹھنڈ اور جذب و کیف ہے۔ میں کسی نہایت سراپا لطف و عنایت شخص کے روبرو ہوں یا کسی نظر فریب' خوش منظر کے سامنے۔ میرا دل بہت جلد گھبرانے لگتا ہے' مجھے تو خفقان سا ہونے لگتا ہے۔ میں تو مسلسل اس کی آوازیں سنتا ہوں' جیسے وہ مجھے پکار رہی ہو' میری طرح وہ بھی آرزدہ ہو۔ کوچہ گردی کی اس تدبیر میں کم از کم ایک طمانیت تو ہے کہ یوں ہی کسی دن میں اس کے پاس پہنچ سکتا ہوں۔ گھر بیٹھ کے تو کچھ نہیں ہوگا' گھر بیٹھے تو دعائیں ہی کی جاسکتی ہیں۔ وہ تو ل بھی میرا رواں رواں کرتا ہے۔ دعا کے لیے حرف دعا لازم نہیں۔ خاموشی کی زبان خدا سے زیادہ کون سمجھتا ہوگا۔

"کدھری کھو گیا رے۔" مجھے چپ دیکھ کے بتھل نے کہا۔

"کہیں نہیں' بس یوں ہی۔" میں نے بل کھا کے کہا۔

"کیا وچار ہے تیرا؟"

"جو تم سمجھتے ہو' وہی ٹھیک ہے۔" میں نے چڑچڑاتی آواز میں کہا۔

"تو بڑا کٹ کھنا ہے' ایسا کر' تو ادھری چلا جا' بٹیا کے پاس فیض آباد میں۔"

"اور تم' تم۔"

"میں مولوی کی ٹوہ میں آگے نکلتا ہوں۔"

"اس کے الٹ بھی تو ہو سکتا ہے۔"

"ادھری جا کے جلدی نکلنا نہیں ہوگا" فیض آباد اسٹیشن پر جب ہم سلمیٰ کو رخصت کررہے تھے اور میں نے اس سے اصرار کیا تھا' تب بھی اس نے یہی عذر کیا تھا۔

"وہ کیا بیڑی ڈال دے گی؟"

"اس سے بڑی بیڑی کیا ہے' اس کی آنکھیں دیکھی ہیں تم نے نہیں جانتا رے' وہ کیسی ہے؟"

"ہاں' میں کیا جانوں' تمہاری سگی ہے وہ۔"

"اور تو سب کا سوتیلا ہے۔"

"اس بات کا مجھ پر چھوڑ دو' میں اس سے بات کرلوں گا۔ ایک بار تو خود اس نے مجھ پر زور دیا تھا کہ مجھے اپنا سفر جاری رکھنا چاہیے۔ وہ بڑی سوجھ بوجھ کی اور حوصلے والی ہے۔"

"پتا ہے' چپ ہو جائے گی پر اس کا مان تو پاس ہی رہنا چاہیے کہ جب چاہے وہ ہماری لگام کھینچ سکتی ہے۔"

اسے زریں اس قدر عزیز تھی۔ مجھ سے فوراً کوئی جواب نہ دیا جاسکا۔

"پر تو بھی ٹھیک ہی بولتا ہے" وہ سہلا کے بولا "چل پھر ادھری چلتے ہیں۔ دیکھ لیں گے' اس کو بھی۔"

○☆○

راستے میں موسلادھار بارشوں کی وجہ سے ریل کو کئی جگہ ٹھہرنا پڑا۔ رفتار بھی سست رہی۔ آسن سول سے مغل سرائے کا فاصلہ سوا تین سو میل ہے اور وہاں سے فیض آباد ایک سو چالیس میل کی دوری پر ہے۔ مغل سرائے میں ہم نے گاڑی بدل دی۔ بارشوں نے موسم بھی خوش گوار کردیا تھا۔ میں تو بیشتر کھڑکی کے پاس بیٹھا رہا اور کھیتوں' باغوں' دریاؤں اور پہاڑیوں کے دلکش مناظر دیکھا کیا۔ بتھل تو تقریباً آرام ہی کرتا رہا۔ میں مختلف اسٹیشنوں پر اتر کے گھوم آتا اور بتھل کے لیے ہر بار کچھ نہ کچھ لے آتا۔ پان' بیڑی' چائے' پوریاں وغیرہ۔ ریلوے کی طرف سے اول درجے کے مسافروں کے لیے کھانے کا انتظام عمدہ تھا۔ سفر کا احساس ہی نہیں ہوا۔ فیض آباد آتے آتے رات کے گیارہ بج گئے۔ وہاں بارش نہیں تھی لیکن بادل اٹے ہوئے تھے۔ سڑکیں سو چکی تھیں۔ کہیں کہیں پان بیڑی اور چائے کی دکانیں کھلی تھیں اور گراموفون ریکارڈ بج رہے تھے۔

آدھ گھنٹے کے اندر اندر تانگا ہمیں حویلی کے سامنے لے آیا۔ میرا تو عالم ہی دگر تھا۔ تانگا ابھی ٹھہرا ہی تھا کہ میں کود کے اتر پڑا۔ حویلی پر نیا رنگ و روغن کیا گیا تھا۔ بہت دھلی دھلی' روشن روشن نظر آتی تھی۔ مکان کا مکین کے ذوق سے گہرا تعلق ہوتا ہے اور خوش ذوقی و خوش سیرتی دو مختلف چیزیں ہیں۔ زریں کے ہاں دونوں خوبیاں تھیں۔ سید محمود علی کا ذوق جتنا اعلیٰ تھا' طبعاً پست بھی وہ اتنا ہی تھا۔ وہ کمینہ میرے دماغ سے نکلتا ہی نہیں تھا۔ زریں کے ہاں نفاست کوٹ کوٹ کے بھری تھی۔ خود بھی وہ ہمیشہ نفیس لباس پہنتی تھی۔ کرتا' آڑا پاجامہ اور ستاروں بھرا دوپٹا اس کا پسندیدہ لباس تھا۔ سفید رنگ اسے بے حد مرغوب تھا۔ اس کے بعد گلابی' گلابی رنگ تو خود اس کا اپنا تھا' وہ تو سراپا گلاب تھی۔

دروازے پر تعینات بوڑھا دربان ممّا تانگے کی آواز سن کے پوری طرح بیدار ہوگیا۔ نام تو اس کا کچھ اور تھا' زمانے سے جگت ممّا بن چکا تھا۔ سن رسیدگی کے باوجود جسم کسرتی تھا' جوانوں کی سی پھرتی تھی۔ شیرا کو ہٹا کے استاد جامو نے اسے یہاں رکھا تھا۔ ہم اسے بہت پہلے سے جانتے تھے۔ زریں نے دروازے پر اس تبدیلی کے بارے میں ہمیں لکھا تھا۔ ممّا کبھی نشانے کا بڑا کھرا تھا۔ کسی جاگیردار کے ہاں ملازم تھا کہ جاگیردار سے کسی کا قتل ہوگیا۔ ممّا نے الزام اپنے سر لے لیا۔ اسے پھانسی ہو جاتی لیکن شہادتیں منتشر کردی گئی تھیں۔ صرف سزا ہوئی۔ مقتول کا کوئی عزیز اصل واقعے کا شاہد تھا۔ وہ تاک میں رہا' موقع پا کر اس نے جاگیردار کا خون کردیا اور فرار ہوگیا۔ پولیس اسے کبھی نہ پکڑ سکی۔ ممّا نے اپنی سزا پوری کی پھر جامو کے اڈے پر آگیا۔ حویلی کی ڈیوڑھی سے ملحق کمرا اس کے لیے مختص کردیا گیا تھا۔ عموماً رات کو وہ چوکسی دیتا تھا' دن میں اس کا بھتیجا نگرانی کرتا تھا۔ حویلی میں تواتر سے مختلف لوگوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ ممّا ہی ان کی خاطر مدارات کیا کرتا تھا۔ اصل میں ممّا دربان ہی نہیں' حویلی کے بعض معاملات کا منتظم بھی تھا' تانگے سے اترنے والے مسافروں کو پہچان کے ممّا کا عجب حال ہوا۔ اس نے نعرے لگانے شروع کردیے۔ دیوانہ واری سے چبوترے کی سیڑھیاں پھلانگ کے آیا اور شور مچانے لگا "ہائیں' ہائیں' ہم کیا دیکھتے ہیں' اپنے بابا صاحب آئے ہیں۔"

بٹھل نے بڑھ کے اسے گلے لگالیا' پھر ممّا مجھ سے لپٹ گیا اور اس کی آواز جھرجھرا گئی۔ بار بار میرے ہاتھ جکڑتا اور سینے سے لگاتا۔ تانگے سے سامان اتارنے کا بھی اسے ہوش نہ رہا۔ کوچوان نے اٹیچیاں نیچے رکھیں۔ ہمیں چھوڑ کے ممّا نے تیزی سے چبوترے کی سیڑھیاں طے کیں اور اپنے کمرے میں جا کے غائب ہوگیا۔ اس کے کمرے سے ڈیوڑھی میں راستہ نکلتا تھا۔ اندر جا کے اس نے ڈیوڑھی کا وسیع دروازہ کھول دیا اور اندرونی دروازے پر بے تحاشا دستک دینے لگا۔ کسی ملازمہ نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا "کیا بات ہے ممّا! خیریت تو ہے؟"

"بہت خیریت ہے شکورن بی! دروازہ کھولو' دیکھو کون آیا ہے؟" ممّا نے وارفتگی سے کہا "ارے بابا صاحب آئے ہیں اور اپنے شہزادے گلفام' بابر میاں۔"

شکورن نے اندرونی دروازے میں نصب روزن کی لکڑی ہٹا کے تصدیق کی۔ روزن سے اس کی آنکھیں اور پیشانی ہی دکھائی دے سکی۔

"جاؤ بھاگوان' بٹیا کو خبر کرو' جگا دو سب کو۔" ممّا نے چلا کر کہا۔

"ساروں کو نہیں' صرف بٹیا کو بولو" بٹھل نے تاکید کی۔

بٹھل کی آواز سن کے شکورن دوڑ پڑی۔ ہمارے اندر آنے کے لیے اسے دروازہ کھولنے کا بھی خیال نہیں رہا۔

"ارے دروازہ تو کھول خوش بخت!" ممّا آواز دیتا رہا "کیسی باؤلی ہے' اڑ گئی۔"

"آجاوے گی" بٹھل نے ممّا کو تحمل کے لیے کہا اور پوچھا "نئے مہمان کب پہنچے ادھر؟"

"نئے مہمان؟" ممّا الجھ گیا۔

"وہ دو بیبیاں اور بوڑھا۔"

"وہ... وہ تو دوپہر سے پہلے آگئے تھے۔"

میں نے آنکھیں میچ لیں۔ بٹھل کو بھی فرحت احساس ہوا ہوگا۔

"بہت تھکے لگتے تھے۔ بیبیاں بھی گھبرائی ہوئی تھیں۔ خیر خیریت سے پہنچ گئے" ممّا نے بتایا۔

دروازہ کھلنے اور ہمارے اندر جانے کی دیر تھی کہ سا حویلی جاگ گئی۔

سب سے پہلے وہی مجھے نظر آئی۔ سب سے پہلے اسی کو دیکھنے کی تمنا تھی۔ وہ اندر سے بھاگتی ہوئی آئی تھی' ہانپ رہی تھی۔ وہ بالکل نہیں بدلی تھی۔ سفید دوپٹے اس کا سر ڈھکا ہوا تھا اور بدن پر عنابی رنگ کی چادر لپٹی تھی۔ اس کا چہرہ دہک رہا تھا' آنکھوں میں شرارے کوند رہے تھے۔ ہم سے کچھ فاصلے پر وہ ٹھٹک کے رک گئی۔ اسے یقین آرہا ہو جیسے یا اسے اندیشہ تھا کہ وقت نے ہمارے احساس گرد آلود تو نہیں کردیے ہیں۔ لمحوں تک وہ گم رہی۔ بٹھل بھی اسے دیکھتا رہا۔ پھر چند قدم آگے جا کے نے بازو پھیلا دیے۔ زریں کے بدن میں تلاطم سا اٹھا اور اختیار وہ بٹھل کے بازوؤں میں امڈ آئی اور بٹھل بدبداتے ہوئے جانے کیا کہا کہ زریں کو صبر کا یارا نہ رہا' بری طرح پھپھکنے لگی۔

پھر تو دیکھتے دیکھتے وہاں ایک ہجوم سا ہوگیا' شور مچ گیا تھا۔ جہانگیر' نیساں' زہرہ اور منیر علی کا سارا خاندان وہاں' زہرہ سے پیوستہ' جھکتے رخساروں کے ساتھ سلمٰی وہاں نظر آئی' اس نے مجھے آداب کیا۔ میری نگاہیں فروزاں اور یاسمن کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ بھی ایک کونے میں دبکی ہوئی وہاں موجود تھیں۔ انہیں اس گھر میں آئے ایک پہر ہی ہوا تھا۔ ان کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی وہ تجسس اور تحیر سے اس منظر کی تماشائی ہیں۔ فروزاں میرا سامنا دوسری بار ہوا تھا اور اس مرتبہ بھی مجھے بس اس کی ایک جھلک دیکھنے کا موقع ملا۔ جہانگیر اور نیساں نے گھیر لیا اور کہیں سے اچانک خانم میرے سامنے آگئی۔ "ارے آپ! آپ کب آئیں آپی؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"اب تو دو مہینے کے قریب ہو رہے ہیں" وہ کھنکتی آواز میں بولی "تم بتاؤ' تم کیسے ہو؟ کہنا تو نہیں چاہیے مگر کچھ دبلے لگ رہے ہو۔"

"ہاں' بس ایسے ہی۔ بہت دنوں سے سفر میں ہوں' ادھر ایک ہفتے بیمار بھی ہوگیا تھا۔"

"خدا خیر کرے" وہ تشویش سے بولی "اب کیسے ہو؟"

"اب تو بہت ٹھیک ہوں آپی لیکن مجھے پورے ہفتے بستر باندھے رکھا۔"

نیساں میرے ایک بازو پر' دوسرے پر جہانگیر جھول گیا

دیر تک ہم عجوبہ بنے رہے۔ زریں کو بازو میں دبوچے ہوئے بٹھل ہر ایک کے پاس گیا اور ہر ایک سے اس کا حال پوچھا۔ فروزاں اور یاسمن کے پاس جا کے وہ ٹھہر گیا۔ "کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی رستے میں؟" اس نے مشفقانہ انداز میں پوچھا۔

"نہیں بابا!" یاسمن نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا "بالکل بھی نہیں' بہت آرام سے آگئے۔ یہاں سب لوگ بہت اچھے ہیں۔"

"سب اچھے ہی رہیں گے ری" بٹھل نے پُرعزم لہجے میں کہا "اور نہ رہیں تو ہم کو صاف بولنا۔"

یاسمن کے چہرے پر رنگ آ جا رہے تھے۔ اس کے برابر فروزاں سر جھکائے کھڑی تھی۔ بٹھل نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو اس کے ہونٹ سسکنے لگے۔ اس سے پہلے کہ وہ او رنہ جائے' زریں نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو بوسہ دی۔ فروزاں' زریں کے پہلو میں آگئی۔

حویلی کا بڑا کمرا کھول دیا گیا۔ یہ ڈیوڑھی سے متصل تھا اور طول و عرض کے اعتبار سے کسی ایوان سے مشابہ۔ عموماً مردانہ بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اردگرد مہمانوں کے لیے کمرے بنے تھے۔ حویلی کا یہ حصہ حویلی میں شامل بھی تھا' حویلی سے الگ بھی۔ ہمیں اٹیچیاں کھولنے کی ضرورت نہیں پڑی ہم دونوں کے کپڑے تیار رکھے تھے۔ زریں نے ہماری آمد کی امید میں کب سے اہتمام کر رکھا تھا۔ ملازمہ نے بتایا کہ بٹھل کے لیے ہر ماہ نیا خمیرہ آتا تھا تاکہ بٹھل جب بھی گھر آئے' حقے کے بندوبست میں دیر نہ لگے۔ منہ ہاتھ دھو کے اور نیا لباس پہن کے باہر آیا تو بٹھل کا حقہ سلگ رہا تھا۔

مردانہ بیٹھک کی تزئین و آرائش نئے سرے سے کی گئی تھی۔ ساز و سامان اس قدر زیادہ تھا اور سادہ بھی تھا لیکن سادگی میں سلیقہ سب سے بڑی آرائش ہے۔ ہر چیز اپنی جگہ سے مطابقت رکھتی تھی جیسے اسی جگہ کے لیے بنائی گئی ہو۔ کہیں بھی گرد کا نشان نہیں تھا۔ ہم ریل میں رات کا کھانا کھا چکے تھے۔ انہوں نے ہم سے پوچھنے کی زحمت نہیں کی۔ ہمیں آئے ہوئے ایک ڈیڑھ گھنٹا ہی ہوا ہوگا۔ انہوں نے چوکی پر دسترخوان بچھا دیا۔ ہمیں تو اس وقت معلوم ہوا جب زریں نے دوسرے کمرے میں چلنے کا حکم صادر کیا۔ انکار کی مجال نہیں تھی۔ بٹھل کے اٹھ جانے پر میں بھی اٹھ گیا۔ ایک جاتا تھا' ایک آتا تھا۔ وہ سب کی سب بھاگی بھاگی پھر رہی تھیں۔ انہوں نے جانے ہمیں کیا سمجھ رکھا تھا جیسے ہم صرف دو نہیں بلکہ بہت سے بھوکے پیاسے گھر آگئے ہوں۔ دسترخوان پر اقسام کی اتنی کثرت نہیں تھی جتنی مقدار کی۔ سارے کھانے تازہ تازہ تھے۔ بھاپ اٹھ رہی تھی اور خوشبو کمرے میں پھیل گئی تھی۔ میٹھے چاول بھی تھے۔ زریں کو یاد تھا کہ مجھے میٹھے چاول کس قدر مرغوب ہیں۔ اس نے امی کو نہیں دیکھا تھا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا' امی نے خواب میں آکر اسے ترکیب بتائی ہو' بالکل وہی ذائقہ تھا' وہی خوشبو۔ میں نے زریں کے خیال سے سیر ہو کے کھائے۔

کھانے کے بعد سب نے چوکی پر ہمارے گرد ہالہ سا بنالیا۔ نیساں اور جہانگیر' بٹھل کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ بہت مطلوب اور محبوب لوگوں کے لیے ایسا اشتیاق ہوتا ہے۔ بٹھل بھی بہت ہلکا پھلکا لگ رہا تھا۔ گھر اسی کو کہتے ہیں جہاں آدمی بے وزن ہو جائے۔ زریں کی حویلی تو بہت پہلے تعمیر ہوئی تھی' اسے زریں کا گھر بٹھل ہی نے بنایا تھا۔ میں بٹھل سے یہی کچھ تو کہہ رہا تھا کہ ہم اس گھر کا جزو ہیں' کیونکہ یہ زریں کا گھر ہے۔ مجھے شدت سے محسوس ہو رہا تھا کہ ہمیں یوں خالی ہاتھ نہیں آنا چاہیے تھا۔ گو ان کے لیے سب سے بڑی سوغات ہم ہی تھے لیکن تحفہ و نذر کی اپنی ایک دلکشی ہوتی ہے۔ اس کا موقع ہی کہاں ملا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ کل صبح بٹھل سے کچھ نقدی لے کے بازار جاؤں گا اور ہر ایک

کے لیے کچھ نہ کچھ خرید کے لاؤں گا۔

بٹھل کے استفسار پر جہانگیر نے بتایا کہ جمرو اور زورا دس دن پہلے ہی یہاں سے گئے ہیں۔ یہاں قیام کے دوران میں انہوں نے کئی خط بھیجے۔ یہی جواب آتا رہا کہ ہم ابھی تک وہاں نہیں پہنچ سکے ہیں۔ وقفے وقفے سے بمبئی اور فیض آباد کے لیے چند سطری خیریت نامے لکھوانا بٹھل کا معمول تھا۔ یہ یک طرفہ رسم وراہ بھی خوب تھی۔ آدھا اطمینان۔ ہم صبح وشام شہر بدلتے رہتے تھے اور اپنا کوئی مستقل پتا بتا ہی نہیں سکتے تھے۔ بہرحال اس طرح فیض آباد میں زریں کو' بمبئی میں ابا جان کو ہماری خیر خبر سے کچھ تسلی ہوجاتی ہوگی۔ ان کی کوئی اچھی یا بری خبر ہمیں نہیں مل پاتی تھی۔ جہانگیر کہہ رہا تھا' پندرہ دن کا وقفہ ہوگیا اور ہماری طرف سے کوئی خط نہیں آیا تو زورا اور جمرو کو بے چینی ہونے لگی۔ انہوں نے کلکتے تار بھیجا حالانکہ تار کا جواب فوراً آگیا تھا مگر انہوں نے کلکتے جانے کا قصد کرلیا۔ اب وہ کلکتے میں ہمارا انتظار کررہے ہیں۔ ظاہر ہے' وہ کب تک یہاں ٹھہرے رہتے۔ ہم کلکتے کے قریب بہار اور بنگال کی بستیوں کی خاک چھانتے رہے تھے۔ انہیں امید ہوگی کہ اب ہم جلد ہی کلکتے پہنچا چاہتے ہوں گے۔

جہاں گیر کی زبانی معلوم ہوا کہ مہینے بھر پہلے منیر علی بھی بمبئی سے یہاں آئے تھے۔ جانے انہیں بمبئی میں کون سا اہم کام تھا جو واپسی کی ایسی عجلت تھی۔ اپنے گھر ہفتے بھر سے زیادہ نہیں ٹھہرے۔ ابا جان کے بغیر انہیں چین نہیں آرہا ہوگا۔ دونوں تقریباً ہم عمر تھے۔ بمبئی میں' میں نے ان کی یک جائی اور ہم نوائی دیکھی تھی۔ ابا جان تو اب اپنی حسرتوں کی تجسیم کررہے تھے اور منیر علی سے زیادہ معتبر و محترم' راست باز دوست انہیں کہاں میسر آسکتا تھا۔ دولت کو دوستوں کی بڑی ضرورت پڑتی ہے' دوست' مصاحب یا غلام۔ منیر علی نے جیسامیر میں بڑی محدود زندگی گزاری تھی۔ فیض آباد میں ماحول جیسلمیر جیسا تھا لیکن بمبئی ایک مختلف شہر تھا۔ انہوں نے پہلی بار اتنی بدلی ہوئی دنیا دیکھی تھی اور جہاں دولت ہو' وہاں تو دنیا کے تیور ہی اور ہوتے ہیں۔ دنیا کو دولت بہت مرغوب ہے اور دولت کو دنیا۔ ابا جان نے کورا کی لائی ہوئی دستاویزوں کی تحقیق و تفتیش میں برسوں ریاضت کی تھی۔ انہوں نے اپنا آبائی گھر کھویا تھا' ایک جوان بیٹی گنوائی تھی۔ ان کے دو بیٹے بھی ان کے لیے تو مر ہی چکے تھے۔ ابا جان مزید اور کچھ کھونے کا بھی حوصلہ رکھتے ہوں گے۔ اس ایثار کا انہیں کوئی تو ثمر ملنا چاہئے تھا۔ منیر علی نے جیسامیر سے ہجرت کرکے فیض آباد میں زمینیں خریدی تھیں۔ انہیں اپنی زمینوں کی بھی فکر نہیں تھی۔ ابا جان کی جاہ وحشمت کے آگے اس جاگیر کی کیا حیثیت تھی۔ ادھر زریں کی حویلی کی طرف سے بھی وہ بے فکر ہوں گے' اس سے زیادہ محفوظ پناہ گاہ اور کیا ہوسکتی ہے۔ کہتے ہیں' بچھڑنے کے بعد اپنا گھر بہت یاد آتا ہے' اپنا گھر' اپنا محلہ' اپنا شہر' مگر تمام یادیں نئے ماحول اور نئی بستیوں کی پذیرائی پر منحصر ہیں اور یادوں کا تو یہ ہے' یاد رکھی جائے تو ہر بات ایک یاد ہے' بیتا ہوا ہر پل ایک یاد ہے۔ بڑے سے بڑا نقش ماند پڑجاتا ہے اور ایک نوک خار زندگی بھر رگ جاں تلملائے رکھتی ہے۔ ہجرت کبھی بہت راس آتی ہے۔ آدمی پلٹ کے دیکھنا ہی نہیں چاہتا۔ منیر علی گھر سے بے گھر ہماری وجہ سے ہوئے تھے اور گھر کیا' وہ تو شہر بدر ہوگئے تھے۔ روپیہ پیسا ہی نہیں' احباب' اعزا' واقف کار بھی اثاثے کے مانند ہوتے ہیں۔ منیر علی سے یہ دولت چھن گئی تھی۔ اس کے ازالے کے لیے انہیں بہت سا یہ بہت اطمینان چاہیے تھا۔ یہاں ان کا جی لگ گیا ہے تو بڑی غنیمت کی بات ہے۔

خانم کے سوا کسی کو وقت کا احساس نہیں تھا۔ دو بج چکے تھے۔ خانم نے کئی بار اشارے کیے۔ وہ مسلسل انہیں ٹوکتی رہی کہ رات بہت ہوگئی ہے۔ ہمیں سفر کی تکان ہوگی۔ میں نے خانم سے نہیں کہا کہ یہاں آکے تو ساری کلفت دور ہوگئی ہے۔ بٹھل بھی چپ رہا۔ میری طرح اسے بھی ان سب کے آرام کا خیال ہوگا۔ خانم کے حکمیہ لہجے پر آخر ان سب کو اٹھنا پڑا۔

دیر تک مجھے نیند نہیں آئی۔ نیند کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ حالت سکون میں بھی لازم نہیں کہ مہربان رہے مگر سکون بجائے خود ایک نیند ہے' ایک نشہ ہے۔ مجھے کوئی وحشت نہیں تھی۔ گھر شاید اسی کو کہتے ہیں۔ کمرے میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ نرم نرم بستر' صاف چادریں اور تکیے' سرہانے چھوٹی میز پر جگ اور گلاس' ریشمی کپڑے سے ڈھکی ہوئی پھلوں کی ایک مختصر قاب۔ اس کمرے میں میں پہلے بھی ٹھہرا تھا۔ اب تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ کسی بڑے ہوٹل کے آرام دہ کمرے کا انداز تھا۔ پھول دار ٹائلوں کا چمکتا ہوا فرش' دیواریں اجلی اجلی' کھڑکیوں پر رنگین پردے پڑے ہوئے۔ اطراف میں دیوار کے ساتھ گدے دار کرسیاں' دیوان اور سنگھار میز' سلفچی' شیشے کی ایک چھوٹی الماری میں کتابیں چنی ہوئی تھیں اور کپڑوں کے لیے لکڑی کی ایک بڑی الماری ایک کونے میں کھڑی تھی۔ زریں کو تو ہمی

...ں ابا جان کی محل جیسی کوٹھی میں ہونا چاہیے۔ ابا جان کے ...وہ بہت کام آسکتی تھی۔ میرا جی چاہا' اسے بلاؤں۔ اس سے ...ت سی باتیں کرنے کو جی امڈ رہا تھا۔ وہ ابھی جاگ رہی ہوگی ...لیکن بس میں سوچتا رہ گیا اور جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

...کسی نے مجھے جگایا نہیں تھا۔ میری آنکھ کھلی اور گھڑی پر ...نظر گئی تو ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ نو بج رہے تھے۔ دیر سے اٹھنے پر ...مجھے ہمیشہ ندامت ہوتی ہے۔ نہادھو کے میں باہر آیا تو ہلکی ہلکی ...پھوار پڑرہی تھی۔ موسم بہت خوش گوار تھا اور حویلی میں ...خوب چہل پہل تھی۔ انہیں میرے بیدار ہونے کی خبر پہلے ...ہی ہوگئی تھی۔ مردانہ بیٹھک میں گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے ...بٹھل حاکموں کی طرح بیٹھا تھا۔ نصیر بابا اور منیر علی کا بھانجا ...رشید' دونوں بیٹے تنویر اور مجو اس کے سامنے موجود تھے۔ ...مجھے دیکھتے ہی نصیر بابا اٹھ کھڑے ہوئے اور بے تابانہ مجھے گلے ...سے لگالیا۔ "اچھا ہوا' آپ آگئے' میرا دل دعائیں کررہا تھا" ...بھرائی ہوئی آواز میں بولے "بابا نے تو منع کردیا تھا۔"

"یہاں سب ٹھیک ہے نا؟" میں نے جھجکتے ہوئے ...پوچھا۔

"اللہ کا شکر ہے' اس کا لاکھ لاکھ احسان ہے" نصیر بابا کی ...آنکھیں چھلک اٹھیں "یہاں بہت سکون' بہت آرام ہے۔ ...یہاں تو لوگ ہی دوسرے ہیں۔ اللہ' یہ جنت آباد رکھے' اللہ ...سب کو خوش رکھے۔"

"اور ان کا کیا حال ہے' ان دونوں کا؟"

"وہ' وہ تو خود ان سے پوچھ لیجئے۔ راستے بھر سہمی سہمی ...رہیں۔ جانے نیا گھر کیسا ہو' کن لوگوں سے واسطہ پڑے۔ ...سارے راستے میں تسلی دیتا رہا۔ سچ پوچھئے تو خود میری حالت ...انہی جیسی تھی۔ جب بابا کا اور آپ کا خیال آتا تو جی کو قرار ...آجاتا۔ سوچتا تھا' اگر بابا کی اور آپ کی طرح یہ لوگ نہ ہوئے ...اور بچیوں کا دل نہ لگا تو کہاں جاؤں گا' پھر خیال آتا تھا' بابا نے ...صاف کہہ دیا ہے' خدانخواستہ ایسا کچھ ہوا تو وہ دوسرا انتظام ...کردیں گے۔ راستے بھر میں یہی سوچتا رہا اور دل دھڑکتا ...رہا۔" نصیر بابا کی آواز بہک رہی تھی "اللہ نے بڑا کرم کیا ...میاں!" وہ کہنے لگے "ایک اور فکر کھائے جارہی تھی۔ آپ ...وہاں اکیلے تھے۔ بابا دیر سے پہنچے ہوں گے۔ تنہا کس طرح' ...آپ کس طرح ان سے نمٹ رہے ہوں گے اور بابا کے پہنچ ...جانے کے بعد کن حالات کا سامنا کرنا پڑے۔ اس کے بڑے ...لمبے ہاتھ ہیں۔ پولیس' کچہری' تھانا' اس کے بائیں ہاتھ کا ...کھیل ہے۔ وہ تو پاگل ہوجائے گا۔"

"وہ پاگل ہی ہوگیا تھا" میں نے مسکرا کے کہا۔

"آپ ہی لوگوں کا جگرا تھا میاں! میں تو اسٹیشن سے بابا کے واپس جانے کے حق میں نہیں تھا لیکن آپ وہاں رہ گئے تھے۔ مجھے ہول آ رہے تھے۔ دماغ ہی کام نہیں کر رہا تھا۔ اب بھی مجھے یقین نہیں آتا' آپ نے کیا جادو کر دیا۔ اس خون خوار آدمی' آدمی کیا' اسے تو بھیڑیا کہنا چاہیے' اسے تو..." نصیر بابا کی آواز حلق میں اٹک گئی۔

"اب جانے دیجیے جو بیت گیا' اس کا کیا ذکر۔ سمجھیے' وہ کوئی خواب تھا' اب آگے کی سوچیے۔"

"ہاں میاں!" نصیر بابا نے گردن میں پڑے ہوئے رومال سے آنکھیں پونچھیں اور کسی قدر اعتماد سے بولے "اب آگے کی مجھے فکر نہیں' میرا کام پورا ہو گیا۔ اب آرام سے موت آئے گی۔ میں سب سے بڑا گنہ گار ہوں۔ سب دیکھتا رہا اور چپ رہا۔ اس سے بڑا گناہ کیا ہو سکتا ہے۔ شاید اسی طرح اللہ نے میری نجات کی سبیل پیدا کر دی۔"

منیر علی کے بڑے بیٹے تنویر' چھوٹے بیٹے مجو اور بھانجے ارشد نے مجھے گھیر لیا۔ وہ منتظر تھے کہ نصیر بابا کی باتیں ختم ہوں تو اپنے تپاک کا اظہار کریں۔ وہ باری باری مجھ سے بغل گیر ہوئے۔ تنویر نے علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم ایس سی کر لیا تھا۔ میں نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ اس نے سرکاری ملازمت کے لیے مختلف امتحانات دیئے ہیں اور جلد کسی موزوں عہدے پر تعینات ہونے کا امکان ہے۔ وہ ایک صحت مند' دراز قد' وجیہہ اور ذہین نوجوان تھا۔ چھوٹے مجو کو جب ہم جیسلمیر سے یہاں لائے تھے تو اس کی عمر بارہ سال تھی۔ اب اس نے کچھ قد نکال لیا تھا اور نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ منیر علی کے بھانجے ارشد کی حالت بھی اب درست معلوم ہوتی تھی۔ بہن کے مرنے کے بعد منیر علی اسے اپنے گھر لے آئے تھے۔ بی اے تک ارشد نے تعلیم حاصل کی تھی۔ اچھا ابھرتے ہوئے قد کا جامہ زیب نوجوان تھا۔ جیسلمیر میں جب مولوی صاحب منیر علی کے مکان میں جا بسے تھے تو منیر علی نے کورا کے لیے ارشد کا پیغام دیا تھا۔ مولوی صاحب کے انکار اور ایک دن اچانک ان کے گھر سے چلے جانے کے بعد ارشد علی کی حالت دیوانوں کی سی ہو گئی تھی۔ اسے دورے پڑنے لگے تھے' ہاتھ پاؤں اکڑ جاتے۔ کھانے پینے کا ہوش رہتا تھا نہ لباس کا۔ کئی کئی دن کے لیے گھر سے نکل جاتا اور چاک گریباں' برے حال احوال میں گھر واپس آتا۔ منیر علی کی مرحومہ بہن نے ان کی بیٹی زہرہ کے لیے ارشد کا رشتہ مانگا تھا اور یہی طے تھا کہ زہرہ کی شادی ارشد سے ہو جائے گی لیکن کورا کو دیکھ کے ارشد سے اپنی ماں کے پیمان کی پاس داری نہ کی جا سکی۔ ماموں نے اپنے بھانجے کا میلان دیکھ کے مو صاحب سے سلسلہ جنبانی کی۔ ان کے بہ قول' کیوں کہ کورا (نرجس بانو) کو بھی اپنی بیٹی زہرہ کی طرح سمجھتے تھے مولوی صاحب نے اپنے محسن منیر علی سے تمام قربتوں باوجود انکار کر دیا۔ پھر ارشد پر ایک قیامت گزری۔ نیف آ کے بھی بہت دنوں تک وہ اپنے آپ کو جھیلتا رہا اور پس پا ہو گیا۔ شاید کہیں سے اسے بھنک مل گئی تھی کہ کو مطلوب تو کوئی اور ہے اور اس کا مدعی تو کوئی اور ہے اور کب سے اسے گلی گلی' کوچے کوچے آوازیں لگا رہا کسی اور کا حال ارشد سے بڑی دیوانگی کا ہے۔ ارشد ا ایک متین' بردبار شخص کی حیثیت سے میرے روبہ رو منیر علی کی ہدایت پر ان کی خریدی ہوئی زمین اور زیر آبائی جاگیر کی دیکھ بھال اس نے شروع کر دی تھی۔

ان تینوں میں بڑا انکسار تھا' خوش خلقی اور سنجید آخر منیر علی جیسے شریف النفس' نجیب الطرفین شخص سے کا تعلق تھا۔ تینوں کے ہاں میرے لیے ایسی گرم جوشی تھ میرا ایسا لحاظ کر رہے تھے جیسے میں کوئی بہت بزرگ ہوں' میں کوئی حاکم ہوں' اس حویلی کا مالک ہوں۔ ا زمانے میں کچھ وقت کے لیے تو خیر میں مالک تھا بھی۔ ز نے اپنی حویلی اور جاگیر میرے نام کر دی تھی' میں کاغذات لوٹا دیے تھے۔ مالک تو میں یوں بھی تھا کہ زریں بے حد عزیز تھی اور مجھے معلوم تھا' مجھ سے زیادہ وہ مجھے رکھتی ہے اور اس کی جانب سے مجھے اس کی ہر چیز پر تصر حق حاصل ہے۔ کاش یہ اعتماد میں بھی اسے دے سکتا۔

وہ تینوں' تنویر' مجو' ارشد جھکتی پلکوں سے مجھے تھے۔ جانے کیا کچھ میرے بارے میں انہیں بتایا گیا میرے پاگل پن کے قصے' میری بے جگری اور دولت مند داستانیں۔ ان کی آنکھیں تجسس و حیرت' شوق و مسرت معمور تھیں۔ انہیں یہاں آئے ہوئے اب ایک وقت تھا لیکن اب بھی بہت کچھ ان کے لیے کسی خواب کی ہو گا۔ اس حویلی کا سلسلہ ہی جدا تھا۔ بہمل کی مختاری کے آدمیوں کی آمد و رفت اور نگرانی' ان کی مخصوص و برخاست اور وضع قطع اور میں! میری خاک بسری اور د نوردی کے فسانے۔ بہرحال زریں نے تو اپنی زبان بند رکھی ہو گی مگر کسی کی بات چھپتی کہاں ہے۔ آدمی میں صلاحیت کم سننے اور زیادہ اخذ کرنے کی بھی خوب ہوتی ان تینوں کی نگاہیں مجھے اپنے چہرے پر چبھتی اور منڈ محسوس ہو رہی تھیں۔ اچھا ہوا' جہاں گیر درمیان میں

وہ ناشتے کے لیے سب کو بلانے آیا تھا۔

چوکی پر یہاں سے وہاں تک دسترخوان بچھا تھا اور قابیں سجی ہوئی تھیں۔ مرچ قیمہ' ترکاری' پوریاں' حلوہ' پراٹھے' ...یاں' خاگینہ اور جانے کیا کیا۔ ہم سات مردوں کے علاوہ وہ بھی ایک جانب بیٹھی ہوئی تھیں۔ فروزاں' یاسمن' نیساں' زہرہ' خانم' سلمٰی اور سلمٰی۔ اب یہاں دو سلمائیں ہو گئی تھیں۔ ایک منیر علی کی چھوٹی بیٹی' دوسری ہمارے ساتھ حیدر آباد سے آئی ہوئی۔ زریں ان میں نہیں تھی۔ وہ ناشتے کے اہتمام میں مصروف تھی۔ خانم کے اصرار پر وہ بھی کچھ دیر میں ہمارے درمیان آ کے بیٹھ گئی۔ رات کو تو رات کی دھند چھائی ہوئی تھی۔ دن کی روشنی میں ان کے چہروں کی تابانی ہی کچھ اور تھی۔ سب کھلے کھلے ہوئے تھے' نوشگفتہ پھولوں کی طرح۔ کہتے ہیں' چہرے آدمی کے دروں کا آئینہ ہوتے ہیں۔ ان کے چہرے چمک دمک رہے تھے۔ یہ شگفتگی اور تابانی ان کی قلبی طمانیت کی مظہر ہی ہو گی۔ انہیں بہروپ کی ضرورت بھی کیا تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے کئی بار فروزاں اور یاسمن کو دیکھا۔ انہیں حویلی میں قدم رکھے ابھی گھنٹے بھی پورے نہیں ہوئے تھے۔ ایک تکلف سا ان کے طور اطوار میں نظر آتا تھا۔ فروزاں کے بارے میں نصیر بابا کہتے تھے۔ وہ تو جیسے پرستان سے آئی ہو' پری اپنے پر جیسے کہیں کھو آئی ہو۔ وہ تو سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ خال و خد نقش و نگار اپنی جگہ۔ لیکن تناسب و توازن پہلا وصف ہے۔ رنگ تو پھر مستزاد ہے۔ اس کا رنگ گلابی شہابی تھا' بڑی بڑی آنکھیں' غزال آنکھیں شاید اسی کو کہتے ہیں۔ رخساروں پر شفق پھوٹ رہی تھی۔ اس کے برابر بیٹھی ہوئی یاسمن کسی قدر متفکر و متردد نظر آتی تھی مگر یہ اضطراب' حزن و ملال' بے قراری و ناامیدی کا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ نئے ماحول' نئے لوگوں سے مطابقت و مفاہمت کے لیے آمادگی ہی کافی نہیں ہوتی۔ وقت بھی اپنے چکر پورے کرتا ہے۔ آدمی آئینہ نہیں ہوتا کہ کوئی دم لیے بغیر بدلتے چہرے اور منظر اخذ کرتا رہے۔ آئینے کو صرف سامنے آنے والے سے غرض ہے' گزر جانے والے سے واسطہ نہیں۔ آدمی کے آئینہ بصارت پر چہرہ و منظر کی پرتیں چڑھتی رہتی ہیں اور نئے نقش کا جذب و قبول گزشتہ نقش کی شدت سے بھی مشروط ہے یا پھر نئے نقش کی اپنی پختگی اور توانائی پر۔ فروزاں کو ضبط کرنا آ گیا تھا۔ یاسمن ابھی چھوٹی تھی' وہ ویسے بھی بڑی سیماب صفت لگتی تھی۔ اچانک بے تاب ہو جاتی تھی جیسے پنڈے میں کوئی سہیلی چٹکی بھر لے۔ اس کا یہ ہیجان اسے اور دل کش کر دیتا تھا۔ لگتا تھا' کچھ بڑی ہو کے وہ اپنی بہن کا پر تو ہو گی۔

زریں' بہمل کے آگے چیزیں سرکاتی رہی۔ اتنی بہت سی چیزیں تھیں کہ ذرا ذرا سی بھی چکھی جائیں تو جی بھر جائے۔ کھانے میں پھر کیا انتظامات ہوں گے۔ بہمل نے ابھی ہاتھ کھینچا ہی تھا کہ نیساں نے اپنی جگہ سے اٹھ کے اس کے سامنے مقطر کی چٹنی کا مرتبان رکھ دیا۔ بہمل نے اس کا کان پکڑ لیا "مائیکے میں آئے ہیں ری' تیری سسرال میں نہیں۔"

نیساں بری طرح لجا شرما گئی۔ بہمل نے اسے بازو میں دبوچ لیا "یہ اس نے بنائی ہے" خانم نے مسکراتے ہوئے کہا "اسے کھانا پکانے کا بہت شوق ہے۔"

"پر یہ آپ تو کھاتی پیتی نہیں لگتی' یہ تو بڑی اکہری ہے۔"

"ہاں' یہ عجیب بات ہے۔ جتنا پکانے کا شوق ہے' اتنا کھانے کا نہیں۔ دوسروں کو کھلا کے خوش ہوتی ہے۔"

"لا' پھر نکال اپنے ہاتھ سے" بہمل نے فراخ دلی سے کہا۔

نیساں نے جلدی جلدی طشتری میں چٹنی نکالی۔ بہمل نے پوری کے ٹکڑے سے اسے کھایا اور طشتری میری طرف بڑھا دی۔ میں نے بھی ایک لقمہ لیا۔ واقعی مزے دار تھی اور نفاست سے بنی ہوئی تھی۔ بہمل نے نیساں کی کمر تھپکی اور دیر تک اسے پہلو سے چمٹائے رکھا۔

ناشتے کے بعد سب منتشر ہو گئے۔ بہمل حویلی کے وسیع صحن میں چہل قدمی کرتا رہا۔ اب صحن کسی گلستاں کی نظیر تھا۔ دیواروں کے ساتھ کیاریاں کھدوا کے پھلواری لگا دی گئی تھی۔ جا بجا گملوں کی افراط تھی۔ ان میں رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔ سبھی کچھ بدل دیا گیا تھا۔ دالان' دروازوں' محرابوں کی از سر نو تزئین کی گئی تھی۔ طرز تعمیر ہی پرانی تھی' باقی سارا کچھ تازہ تازہ نیا نیا لگ رہا تھا۔

صحن میں بہمل کو روک کے اور نقدی لے کے میں کسی سے کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔ ڈیوڑھی کے باہر مجھے دیکھتے ہی ممّا تانگا لے آیا۔ میں پیدل ہی جانا چاہتا تھا لیکن دیر تک مسلسل پھوار سے راستے گیلے ہو چکے تھے۔ پھوار اب بند ہو چکی تھی۔ ممّا سمجھ رہا تھا کہ میرا ارادہ اڈے کی طرف جانے کا ہے۔ اڈے پر جانا چاہیے تھا لیکن وہاں جا کے تو میں گھر جاتا' پھر ادھر حویلی میں بھیڑ اکٹھی ہو جاتی۔ میں نے ممّا کو بھی منع کر دیا کہ ہماری آمد کی خبر وہ اڈے کے کسی آدمی کو نہ کرے اور اچھا ہے' پہلے بہمل سے معلوم کر لے۔

مجھے خریداری بالکل نہیں آتی تھی۔ نہ مول تول کا علم تھا۔ بازار جاکے اندازہ ہوا کہ دوسرے کے لیے کسی چیز کا انتخاب کس قدر مشکل ہے۔ کپڑے کی اقسام' معیار اور رنگ وغیرہ کے بارے میں مجھے کچھ نہیں آتا تھا۔ سونے کی چیزوں کے لیے تو آدمی کو خاصا تجربہ چاہیے۔ ادھر ادھر بھٹکتا ہوا میں سنار کی ایک بڑی دکان پر جاکے ٹھہر گیا۔ شیشے کی الماری میں رکھا ہوا ایک گلوبند مجھے اچھا لگا۔ ان سبھوں کی گنتی کرکے میں نے اس قسم کے آٹھ گلوبندوں کی قیمت پوچھی۔ دبلا پتلا' تیز و طرار درمیانہ عمر کا سنار میری شکل دیکھا کیا اور قیمت بتانے کے بجائے اس نے میری نگاہ کی تعریف کی اور گلوبند کی بناوٹ اور خالص سونے کی مقدار کے بارے میں زمین آسمان کی باتیں کرنے لگا۔ کہنے لگا کہ لکھنؤ کے بہت سے صاحب ذوق نوابین کی طرح نواب اعظم رضا کو بھی اسی کے ہاں کے بنوائے ہوئے زیورات پر اعتماد ہے۔ یہ خاص انہی کی فرمائش پر بنوایا گیا ہے۔ اس کا کاری گر بھی اپنے فن میں یکتا و یگانہ ہے۔ مصری نگینے جڑے ہوئے ہیں اس میں۔ بہرحال میں اسے لے جاسکتا ہوں۔ ایسے قدردان کو لوٹایا کیسے جاسکتا ہے۔ نواب صاحب کے لیے وہ جلد ہی اور بنوالے گا۔ اس نے معذرت کی کہ سردست اس کے پاس دو ہی عدد ہیں۔ دو ہفتے میں وہ مزید چھ عدد تیار کروالے گا۔ میری مایوسی پر اس نے یہ مدت ایک ہفتے کردی۔ بڑی مشکل سے میں نے اس سے جان چھڑائی اور مجھے ایک ترکیب سوجھی' کیوں نہ میں سب کو یکساں نقدی سپرد کروں' وہ خود اپنی مرضی کی سوغات منتخب کرلیں لیکن لائی ہوئی چیز کی بات ہی اور ہوتی ہے' پھر مجھے خیال آیا کیوں نہ صرف ایک گلوبند ہی خریدا جائے۔ میں چپکے سے کسی وقت اسے زریں کے حوالے کردوں گا' باقی کا پھر دیکھا جائے گا مگر کیا یہ مناسب ہوگا؟ زریں کے لیے تو کوئی بہت بڑا تحفہ ہونا چاہیے بلکہ ہونا تو یہ چاہیے کہ سبھوں کو کوئی نہ کوئی تحفہ نذر کیا جائے' زریں کو اس رسم سے دور رکھا جائے۔ زریں کا معاملہ تو دوسرا ہے۔ وہ تو اپنی اس تخصیص پر نازاں ہوگی۔ غلطی میری ہی تھی۔ مجھے زریں سے مشورہ کرکے بازار کا رخ کرنا چاہیے تھا۔ میں بازاروں میں یوں ہی بھٹکتا رہا اور کوئی فیصلہ نہ کرسکا۔ اپنی اس ناموزونی اور بے مائیگی سے مجھے الجھن ہونے لگی۔ جو اوروں کو آتا ہے' وہ مجھے کیوں نہیں آتا۔ میں تو جیسے اس دنیا کا آدمی ہی نہیں ہوں۔ کچھ یہی وجہ ہوگی جو حویلی میں سب مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں کوئی عجوبہ ہوں جیسے۔

تانگا میرے ساتھ تھا۔ میں نے اسے واپس چلنے کی ہدایت کی اور وہی ہوا' جس کا ڈر تھا۔ واپسی کے راستے میں ایک جگہ تانگے کو رک جانا پڑا۔ آگے بہت بھیڑ تھی۔ میں نے اتر کے دیکھنا چاہا اور ٹھہر گیا۔ پیچھے اور سواریاں آجانے سے تانگا واپس ہونے اور کسی اور راستے سے جانے کا امکان بھی مسدود ہوگیا تھا۔ شور بڑھتا گیا اور ہجوم بھی۔ میں نے طے کیا' تانگا چھوڑ کے پیدل ہی چلوں۔ تانگے والے کو پیسے ادا کرکے کنارے کنارے راستہ بناتا ہوا میں آگے نکلتا گیا۔ چند قدم بعد راستہ اور تنگ ہوگیا اور ہجوم عبور کرنا دوبھر ہوگیا۔ لوگوں نے پیچھے ہٹتے ہٹتے دائرہ بنادیا تھا۔ ہریا' ہریا کی پکار پر میرا ماتھا ٹھنکا۔ وہ فیض آباد کے اڈے کا پرانا آدمی تھا۔ تیس سے کچھ اوپر عمر ہوگی' جمرو اور جامو کا خاص آدمی تھا۔ ہریا کا نام سن کے مجھ سے ٹھہرا نہ گیا اور میں لوگوں کی بھیڑ کاٹتا ہوا دائرے میں آگے کی طرف چلا گیا۔ وہ ہریا ہی تھا اور ایک چاقو بردار نوجوان سے زور آزمائی کررہا تھا۔ میں نے لوگوں سے واقعے کی نوعیت پوچھی مگر انہیں تماشا دیکھنے ہی سے فرصت نہیں تھی۔ کوئی کچھ کہتا' کوئی کچھ۔ ان کے اچھلتے ہوئے کلمات سے اتنا ہی معلوم ہوسکا کہ کوئی لڑکی وجہ نزاع ہے۔ ایک سن رسیدہ آدمی نے اعانت کی' کچھ اس کی زبانی اور کچھ دوسروں کے بیان کے مطابق خلاصہ یہ تھا کہ کسی نوجوان لڑکی کے باپ نے فیض آباد سے باہر دور کے ایک رشتے دار کو اپنی لڑکی کا رشتہ دینے سے انکار کردیا تھا۔ لڑکے کے والدین مال و زر میں حیثیت مند تھے۔ انہوں نے طرح طرح زور ڈالا اور آخر لڑکی کو بہ جبر لے جانے کی دھمکی دی۔ لڑکی کے باپ نے ہریا کے پاس جاکے دہائی دی۔ گزشتہ دنوں ایک رات لڑکے والے اپنے شہ زوروں کی مدد سے لڑکی کو اغوا کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے کہ ہریا ان کے راستے کا پتھر بن گیا۔ اس نے انہیں مار بھگایا اور لڑکی کو بہ سلامت والدین کے پاس پہنچادیا۔ اب لڑکے والوں نے اس رات اپنی ناکامی کا صدمہ مٹانے اور لڑکی کے باپ کو سبق سکھانے کے لیے اس شورہ پشت نوجوان کو فیض آباد بھیجا ہے۔ نوجوان نے سرراہ ہریا کو للکارا اور حملہ کردیا۔

میں سامنے نہیں ہوا' لوگوں کی آڑ سے دیکھا رہا۔ ہریا اپنا چاقو گنوا چکا تھا اور چاقو بدست نوجوان کو زیر کرنے کے جتن کررہا تھا۔ دونوں کو زخم آئے تھے اور خون رس رہا تھا لیکن دونوں وحشیانہ انداز میں ایک دوسرے پر حاوی آنے کے لیے داؤ آزما رہے تھے۔ ہجوم میں بیشتر ہریا کے حمایتی تھے۔

اتنے بہت سے لوگ اپنے محلے' اپنے شہر کی لڑکی کی [ع]زت کے لیے ایک نوجوان کو قابو میں نہیں کرسکتے تھے۔ وہ [ح]وصلہ کرتے تو نوجوان کو اس دیدہ دلیری کی جرات نہ [ہوتی۔ س]ب نظارہ بازی کررہے تھے اور شاید نوجوان کے غضب تیوروں سے زیادہ اس کے کھلے چاقو سے ہیبت [زدہ] تھے۔ ہتھیار کی اپنی دھاک ہوتی ہے۔ نوجوان یقیناً اکیلا نہیں ہوگا۔ اس نے لوگوں اور خصوصاً ہریا پر اپنا اثر قائم رکھنے کے لیے اپنے ساتھی یا ساتھیوں کو الگ [رکھا] ہوگا۔ ہریا تھکا تھکا لگ رہا تھا۔ نوجوان میں پھرتی زیادہ [تھی] اور اسے اپنے زور پر کوئی ناز ہی ہوگا جو اس اجنبی شہر میں [بے خوف] معرکہ آرا تھا۔ وہ ہریا کو تقریباً نچا رہا تھا بلکہ اب تو [ایسا لگ رہا تھا] جیسے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ ہریا کی ہر کوشش ناکام [ہو رہ]ی تھی۔ اس کا تعلق جمرو اور جامو کے اڈے سے تھا۔ [باہر کے کسی آدمی کو]، ویسے تو وہاں داخل ہی نہیں ہونے دیا جاتا تھا۔ اتنی [دیر تک] چاقو کے بغیر اپنا دفاع کوئی کہنہ مشق ہی کرسکتا تھا تاہم [اس] کو یہ نکتہ ذہن میں رکھنا چاہیے تھا کہ اس کا حریف [اناڑ]ی نہیں نوجوان ہے تو ناپختہ کار بھی ہو۔ وہ صاف اڈے [کا آد]می تھا۔ کسی مستند استاد سے اس نے تربیت حاصل کی [ہوگی] اور استاد کی نگہ داری کتنی ہی اہم ہو' اڈے کا آدمی تو [اپنے] جوہر' ارادے' اپنی جستجو اور ریاضت سے بنتا ہے اور [وقت] اور تجربے سے اس پر اور نکھار آتا ہے۔

ہریا نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ اپنے مقابل کے سوا اسے اور طرف دیکھنے کی فرصت بھی کہاں مل سکتی تھی۔ میں اپنے آپ کو چھپائے ہوئے تھا۔ جلد یا بدیر اڈے پر اس فساد کی خبر پہنچ جانی تھی اور اڈے کا کوئی بھی آدمی کسی [وقت] یہاں آسکتا تھا۔ فیض آباد کا اڈا میرے لیے کوئی غیر جگہ [نہیں] تھا۔ یہ جمرو اور جامو کا اڈا تھا۔ ہم میں بھائیوں کا رشتہ [تھا۔] بھائی کے رشتے کے لیے بھائی ہونا لازم نہیں ہے۔ جامو [نے] ٹھل کی خاطر اپنا فیض آباد کا اڈا ترک کردیا تھا اور کلکتے [کے اڈ]ے کی نگرانی کررہا تھا۔ اس نے ابا جان کی تلاش میں [میر]ے ساتھ تبت کا صبر آزما سفر کیا تھا۔ زریں کی حویلی [کو بیچنے سے با]ز رکھنے میں جامو پیش پیش تھا۔ اس کے چھوٹے بھائی [جمرو] نے بھی ہماری وجہ سے اپنا اڈا خیرباد کہہ دیا تھا اور عرصے [تک] بستی بستی ہمارے ساتھ سفر کی صعوبتیں جھیل رہا تھا۔ [ا]بھی وہ اپنا گھر' اپنا شہر چھوڑ کے کلکتے میں ہم دونوں کا منتظر [تھا۔] یوں فیض آباد کا اڈا ٹھل کا اور میرا ہی اڈا تھا۔ اپنے [اڈے] کا ایک شخص مشکل وقت سے دوچار تھا۔ میرے ہاتھ [پیرو]ں میں اینٹھن ہونے لگی۔ میں نے خود کو ٹوکا' پھر مجھے کیا

کرنا چاہیے؟ ایسے وقت میں کوئی اور ہوتا تو اسے کس ردعمل کا اظہار کرنا چاہیے تھا؟ اس کا شاید ایک ہی جواب تھا۔ میں نے نوجوان کا اچھی طرح تخمینہ کرلیا تھا۔ اس کی لگام اسی کے ہاتھوں میں تھی اور وہ خاصا اترایا اترایا نظر آتا تھا۔ اترانے والا جلد بھڑک جاتا ہے۔ بھڑکے ہوئے آدمی کو چاقو زیب نہیں دیتا۔ میں نے طے کرلیا تھا' اس کے سامنے جانے کی صورت میں اس کا پارا اور بسمل کرنا ہے۔ اشتعال میں آدمی ضد پر آجاتا ہے اور ضد میں بینائی متاثر ہوتی ہے۔ میں نے بہ جبر خود کو روکا۔ مجھے ٹھل کی بات یاد آئی۔ چاقو بردار کیسا ہی نو مشق' غصہ ور ہو' یہ دھیان رکھنا چاہیے کہ اس کے ہاتھ میں چاقو ہے۔ اس کے سامنے اسی وقت جانا چاہیے جب کوئی متبادل راستہ نہ ہو۔ چاقو باز کی نیت کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ نیت کی استواری' مقصد کی توانائی یا ناتوانی پر منحصر ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی مقصد پس پشت چلا جاتا ہے۔ آدمی پر انا اور غیرت مسلط ہوجاتی ہے۔ یہ مرحلہ بڑا جنون انگیز ہوتا ہے۔ یہ جنون جاں نثاری پر بھی آمادہ کرتا ہے اور ہزیمت کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ پھر بہت کچھ مخالف فریق کی سوجھ بوجھ پر ہے کہ جنوں کم کرنا اس کے لیے سودمند ہوگا یا فزوں کرنا۔ ٹھل کے خیال میں بدلتی صورت حال میں فیصلہ بدلنے کی اہلیت کی لمحے لمحے ضرورت پڑتی ہے۔ نوجوان کا مقصد اتنا توانا نہیں تھا۔ وہ اپنے لیے نہیں' دوسرے کے لیے سینہ سپر تھا۔ وہ خریدا ہوا تھا' سو اس کی نیت بھی مجہول ہوگی۔

میں نے خود کو ضبط و تحمل کی تاکید کی۔ ہریا اگر پسپا ہوجاتا ہے تو جمرو اور جامو کے اڈے پر اکیلا ایک ہریا ہی نہیں ہے۔ میرے لیے مداخلت سے باز رہنا ہی بہتر ہے۔ بات دور تک بھی جاسکتی ہے اور میری خوش گمانی کے برعکس بھی ہوسکتی ہے۔ پھر سارے شہر میں چرچا ہوگا۔ درمیان میں پولیس بھی آسکتی ہے۔ پھر وہی سوال و جواب' وہی سلسلہ۔ ابھی کل ہی ہم آسن سول سے کسی طور بچ کے آئے ہیں۔ پہلے ہی کچھ کم تجربے نہیں ہوئے ہیں۔ بات حویلی تک بھی جائے گی اور حویلی جو بہت دنوں سے سب کے لیے ایک گوشہ اماں ہے' نگاہوں کی زد پر آجائے گی۔ منیر علی کے دونوں بیٹے تنویر' مجو اور بھانجا ارشد اسی شہر میں رہتے ہیں۔ حویلی سے باہر اب مختلف لوگوں سے ان کی اچھی سلام دعا ہونی چاہیے۔ جانے کیسی کیسی کہانیاں انہیں سننے کو ملیں۔ اپنے لیے نہیں تو اپنے متعلقین کے لیے مجھے محتاط رہنا چاہیے۔ میں اور پیچھے ہٹ آیا۔ اس سے پہلے کہ اڈے کے آدمی یہاں پہنچیں اور پولیس آجائے' مجھے دور ہوجانا چاہیے۔ کسی کی نگاہ مجھ پر

پڑسکتی ہے۔ اڈے کے تقریباً سارے آدمی مجھ سے واقف ہیں۔ میں اس وقت گھر سے نہ نکلتا یا ہم اس شہر میں ایک دن کی تاخیر سے پہنچتے تو! لمحوں تک میں خود سے حجت کرتا رہا اور میں نے سر اٹھا کے آخری بار دائرے میں جھانک کے دیکھا۔ ہریا ابھی تک اپنا دفاع کر رہا تھا اور نوجوان اس کی ذلت کے درپے تھا۔ میں ہجوم کے دائرے سے باہر آگیا لیکن اپنی ہی تاویلیں میرے رگ دپے سے چمٹ گئی تھیں۔ مجھے کیا یہی کرنا چاہیے تھا؟ جامو اور جمرو کے کسی عزیز ترین شخص کا یہی طور ہونا چاہیے؟ کسی کو یہاں میری موجودگی کا علم نہیں ہے مگر میں خود تو جانتا ہوں۔ میں یہاں بہ تمام ہوش و حواس حاضر و ناظر تھا۔ اس اقدام سے تو ناروائی' بے غیرتی' کم ہمتی اور خود غرضی کی بساند آتی ہے۔ اگر یہ گریز کسی بڑی بھلائی کے لیے ہے تو تاسف و ندامت کا کانٹا کیوں سینے میں کھٹک رہا ہے۔ میں دور ہوتا رہا اور میرے پیر الجھتے رہے۔ ہجوم کا شور میرا تعاقب کر رہا تھا۔ نہ معلوم' میں نے کتنا فاصلہ طے کیا' دو سو قدم' تین سو' چار سو۔ یکایک میں نے پلٹ کے پھر ہجوم کا رخ کیا۔ میں اب کچھ اور سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ بھاگتا ہوا میں دائرے تک پہنچا اور ہجوم چیرتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔

دائرے کے اگلے حصے میں کھڑے ہوئے لوگ تیسرے شخص کی اس ناگہانی آمد سے ہڑبڑا سے گئے۔ وہ دونوں' ہریا اور نوجوان اس وقت دائرے کے وسط میں ایک دوسرے کو بھپکیاں دے رہے تھے۔ دونوں منتشر ہوئے' حیران بھی۔ دونوں کو ٹھہر جانا پڑا۔ کسی جھجک کے بغیر میں ان کے درمیان جا کھڑا ہوا تھا۔ نڈھال ہریا ہذیانی انداز میں چیخا "ارے لاڈلے میاں! تم!" اس کی سانس اکھڑی ہوئی تھی۔

میں نے ہاتھ اٹھا کے اسے پرسکون رہنے کی تلقین کی اور گز بھر کی دوری پر رہ کے نوجوان سے پوچھا "کیا ہو رہا ہے یہ؟"

"تم۔۔۔ م م! کون ہو تم؟" اس نے بپھر کے کہا "دکھائی نہیں دیتا تم کو؟"

"دے رہا ہے' اچھی طرح دکھائی دے رہا ہے پر کیوں' کیوں۔۔۔؟"

میری بات اس نے پوری نہیں سنی۔ وہ قہر و غضب کی حالت میں تھا۔ میرا سرد اور فہمائشی لہجہ اسے گراں گزرنا چاہیے تھا بلکہ چڑ ہونی چاہیے تھی۔ وہ دہاڑ کے بولا "ہٹ جاؤ ایک دم ادھر سے۔"

میں نے آہستگی سے کہا "ہم کو بولو' بات کیا ہے' کیوں خون خرابا کرتے ہو۔"

"وہ اس حرام کے جنے سی پوچھنا" نوجوان نفرت بولا "اس نے اپنے ٹھاکر صاحب کا رستہ روکا ہے پر آج ہو جائے گا۔"

"یہ جگہ ٹھیک نہیں ہے" میں نے اپنی آواز نرم "کوئی فیصلہ کرنا ہے تو اس کا اڈا کھلا ہے' وہاں جا کے کرو۔"

"ارے ہٹو" وہ گرج کے بولا "تم کوئی ٹھیکے دار۔ اس نے میرے سینے پر ہاتھ مار کے مجھے دھکیل دیا اور لہرانے لگا۔

اس کے دھکیلنے سے میں ایک قدم پیچھے ہوگیا تھا او کچھ ڈگمگا بھی گیا تھا۔ وہ نوجوان کے ساتھی ہوں گے نے پچکارتے ہوئے مجھے مشورہ دیا "جاؤ بھیا صاحب! کرو' تم بیچ میں مت پڑو' تمہارا یہاں کوئی کام نہیں ہے۔ کوئی جواب دینے کے بجائے میں ایک قدم بڑھ نوجوان کے سامنے ہوگیا۔

"کیا کہا تم کو!" اس نے دوبارہ میرے سینے پر د چاہا' میں خود پیچھے ہٹ گیا۔ مجھے اصول قاعدے کا نہیں رکھنا تھا۔ میں اڈے پر نہیں تھا' نہ یہ اڈے کی اپنا حق جتانے کا کوئی معاملہ تھا۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا کرنا تھا لیکن چند تمہیدی کلمات تو ضروری تھے۔ امکان اس خوش فہمی کا بھی تھا کہ وہ ایسے ہی باز آ نشان دہی ہونے کے بعد اس کے دونوں ساتھی بھی میری نظر میں تھے "جاؤ' جاؤ' اپنا کام کرو" وہ مجھے دھ لگا۔

"اپنا چاقو تو مجھے دے دو" میں نے رسان سے کہا۔ وہ مچل پڑا' اس نے کئی بار بل کھائے "چاقو د تمہیں' ہیں' گلا کاٹو گے تم اس کا یا اپنا" اپنے ساتھ طرف دیکھ کے وہ طنز' حقارت اور مضحکہ اڑانے وا میں بولا "کیا بولتے ہیں صاحب بہادر! چاقو دے دوں لے چاقو" اس نے اپنا چاقو والا ہاتھ تیزی سے ا میری طرف بڑھایا جیسے واقعی چاقو میرے سپرد کرنا چا میرے ہاتھ بڑھانے پر اس نے جلدی سے ہاتھ کھینچ بار اس نے یہی کھیل کیا۔ بچوں کو ان کی کوئی پسندیدہ کے لیے جیسے لطف لیا جاتا ہے۔ چاقو حاصل کرنے میرا شوق و اضطراب اور میرے پھیلے ہوئے ہاتھ پر اپنا ہاتھ پیچھے کرلیتا۔ مجھے عجلت کی فکر تھی لیکن اتنی جل براری کی توقع نہیں تھی۔ دوسری بار' تیسری' چوتھی ۔۔۔ پھر ایک بار وہ اپنا بڑھا ہوا ہاتھ کھینچ نہیں سکا۔

بازی

ئی میرے پنجے کی گرفت میں تھی۔

مجھے معلوم تھا' پہلے تو وہ ششدر ہوگا پھر سارے جسم کا صرف کرے گا۔ وہ بری طرح بوکھلا جائے گا۔ میرے ہاتھ اپنے دوسرے ہاتھ سے ضرب لگائے گا یا میرے سینے پر ٹے مارے گا۔ یہ تبھی ممکن ہوتا جب میں اسے کوئی ت دیتا۔ ایک ہاتھ سے اس کی کلائی پر پنجہ ڈال کے میں دوسرے ہاتھ سے اس کے منہ پر طمانچہ رسید کیا اور اس چاقو والا ہاتھ پکڑے پکڑے ادھر کھلے ہاتھ سے پے در پے ہیں اور مسلسل ٹھوکریں لگائیں۔ اسے سنبھلنے کا موقع ہی ں ملا۔ اسے حواس باختہ ہوجانا چاہیے تھا۔ یہ دیکھ کے کے دونوں ساتھی مجھ پر جھپٹ پڑے۔ ایک کو تو میں نے ر مار کے دور کردیا۔ جانے کہاں اسے چوٹ لگی تھی کہ وہ ہیں دہرا ہوگیا' دوسرا میری زد پر نہ آسکا۔ اس نے عقب میری پیٹھ اور گردن بے دریغ مکوں سے نشانہ بنائی۔ مجھے ضربیں برداشت کرنی تھیں اس لیے کہ مجھے اپنی ساری توجہ وان کی کلائی پر مرکوز رکھنی تھی اور ایک جگہ کھڑے رہنے بجائے گھوم پھر کے ہی میں اسے بے حال کرسکتا تھا۔ اس ساتھی نے پیچھے سے میری گردن جکڑنے کی کوشش کی لیکن میں نوجوان کو کھینچتا' اس کے ہاتھ کو جھٹکے دیتا رے میں یہاں سے وہاں گردش کرتا رہا۔ اس کا دوسرا تھی بھی اٹھ کے مجھ سے چمٹ چکا تھا' وہ میرے ایک جگہ ے نہ رہنے سے کامیاب نہ ہوسکا۔ میں پل بھر میں اپنا خ تبدیل کرلیتا تھا' پھر ادھر سے ہریا آگیا۔ حالانکہ میں نے ذا میں اسے خاموشی سے کھڑے رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ پہلی رمیں نے دیکھا کہ ہریا بھی اکیلا نہیں ہے۔ اڈے کا ایک ر آدمی اس کے ساتھ تھا۔ مجھے اس کا نام یاد نہیں آرہا تھا۔ نوں' نوجوان کے ساتھیوں پر ٹوٹ پڑے۔ یوں مجھے کچھ یک ہونے کی فراغت مل گئی۔ میری پہلی اور آخری ترجیح یہی ی کہ کسی طرح جلد سے جلد نوجوان کو چاقو سے دستبردار کردوں۔ اس اذیت سے بے پروا ہو کے کہ وہ کہاں کہاں مجھ ضربیں لگاتا ہے' میں بیشتر' جب بھی موقع ملا' اس کے چاقو الے ہاتھ کی کلائی اور بازو پر ترچھے ہاتھ سے وار کرتا رہا۔ میں نے بہت زور لگایا تھا مگر تنہا زور کافی نہیں ہوتا۔ زور کے ساتھ ایک ہنر بھی چاہیے۔ اس کے چاقو والے ہاتھ پر ن ضربوں میں کوئی ایک کاری ہونی چاہیے تھی۔ اس کی ٹوٹی یا بازو اترا کہ ایک چیخ بلند ہوئی۔ چاقو جیسے ہی اس ہاتھ سے چھوٹا' میں نے اسے ایک طرف دھکیل دیا۔ وہ توازن کھو چکا تھا' لڑکھڑاتا ہوا ہجوم پر جا گرا۔ اس اثنا میں

جتنی جلد ممکن ہوا' میں نے چاقو زمین سے اٹھا کے اور چند لمحے اپنے پاس رکھ کے ہریا کی طرف اچھال دیا۔

میرے اشارے پر ہریا اور اس کے ساتھی نے نوجوان کے ساتھی چھوڑ دیے۔ وہ کچھ ادھ موئے اپنے سرغنہ کا حال دیکھ کے بھی ہوگئے تھے۔ اب مزید زحمت کی ضرورت نہیں تھی لیکن پیش بندی کے لیے میں نے دونوں کو سنبھال لیا اور جب تک وہ زمین پر ڈھیر نہیں ہوگئے اور ان کے ہاں التجا اور رحم طلبی کے آثار نمودار نہیں ہوئے' میں نے ہاتھ نہیں روکا۔ اس میں کچھ انہی کا بھلا تھا۔ آیندہ وہ منہ اٹھائے کسی طرف نہیں چل پڑیں گے' دس بار عواقب پر ضرور غور کریں گے۔

پھر میرے وہاں ٹھہرے رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہریا نے نیم جاں نوجوان کے بال پکڑے' اس کے سر کو جھٹکے دیے اور گرجنے لگا "دوبارہ تو نے اگر اس شہر کا۔۔۔"

اس کے بعد مجھے کچھ سنائی نہیں دیا۔ لوگوں نے مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کے دھکم پیل کرتے ہوئے راستہ دیا۔ مجھے احساس تھا کہ ان کی نظریں مجھ پر منڈلا رہی ہیں لیکن میں نے پلٹ کے نہیں دیکھا اور سر جھکائے تیز رفتاری سے بڑھتا رہا۔

○☆○

میرا گریباں چاک ہوچکا تھا۔ سڑک گیلی تھی۔ پائنچوں پر کیچڑ تھپ گئی تھی۔ کمر سے کرتا بھی پھٹ چکا تھا۔ اس حالت میں حویلی جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ ایک صورت تھی کہ اڈے جا کے گھر سے نیا جوڑا منگواؤں مگر اڈے پر جا کے جلد چھٹکارا نہ ملتا۔ اس حلیے میں بازاروں سے گزرنا مشکل ہو رہا تھا۔ لوگ میری طرف حیرت سے دیکھتے تھے۔ اس وقت یہی ترکیب سوجھی کہ کہیں سے نئی چادر یا شال خریدوں۔ تانگا پکڑ کے اور مطلوبہ دکان تک سفر کرکے میں نے سفید کشمیری شال خریدی اور جسم پر لپیٹ لی۔ جس طرح حکیموں اور ڈاکٹروں کے پاس بیمار جاتے ہیں' میں حویلی میں داخل ہوا۔

دو بج چکے تھے۔ سب میرے منتظر تھے۔ کسی نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ میری اس ہیئت کذائی پر انہیں مضطرب ہونا چاہیے تھا' ان کے کسی سوال کا جواب دینے کے بجائے میں سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ان کے سامنے جا کے مجھے ایسی ندامت نہیں ہو رہی تھی۔ میرا جسم ہلکا ہلکا تھا۔ لباس تبدیل کرکے میں باہر آیا تو دسترخوان پر کھانا چن دیا گیا تھا۔ لگتا تھا' سبھی صبح سے بس کھانے کا اہتمام کرتی رہی ہیں۔ طرح طرح کے خوان یہاں سے وہاں تک سجے ہوئے تھے۔ صبح دیر سے ناشتا کیا تھا لیکن طبیعت حاضر ہو' سر پہ کوئی بوجھ نہ

ہو اور وہ جو کہتے ہیں' آدمی محلی بالطبع ہو' نشاط خاطر والی کیفیت ہو تو بھوک بھی اچھی لگتی ہے۔ پھر ماحول ہی کھانے کا تھا۔ برسات کی نسبت سے انہوں نے برسات میں کھائی جانے والی چیزوں کا خیال رکھا تھا۔ کھانے کے بعد میں اپنے کمرے میں آگیا۔ بستر پر ذرا کمر ٹکائی تو آنکھیں بھاری ہونے لگیں۔ نوجوان کے ساتھی نے میری کمر پہ بہت مکے مارے تھے۔ درد تو نہیں تھا لیکن تھوڑی دیر بعد کسک سی اٹھتی۔ کچھ مرغن کھانوں کا خمار' کچھ گھر کی فراغت و راحت' کچھ یہ اطمینان کہ جمرو اور جامو کا سامنا کرنے میں پیشانی سے پسینہ نہیں چھلکے گا' مجھے نیند آگئی اور دروازہ بند کیے بغیر میں شام تک سوتا رہا۔

شام کو جہاں گیر کی دستک پر آنکھ کھلی۔ وہ بتانے آیا تھا کہ بہت سے لوگ ملاقات کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ مجھے معلوم تھا' وہ کون لوگ ہو سکتے ہیں۔ منہ ہاتھ دھو کے میں بیٹھک میں آیا تو چوکی پر تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ مجھے دیکھتے ہی سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ اڈے کے نگراں سلامت' عرف سلامی نے تو دیر تک مجھے سینے سے چمٹائے رکھا۔ ہریا بھی وہاں تھا یعنی بہل کو سارے واقعے کی خبر ہو چکی تھی۔ یہ چھپی بھی کیسے رہ سکتی تھی۔ جلد یا بدیر معلوم ہونا ہی تھا۔ درمیان میں بہت سے لوگ تھے۔ میں بہل سے دور چوکی کے کنارے پر بیٹھ گیا' ہریا اور اس کے ساتھیوں نے مجھے گھیر لیا۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ ہریا سے زور آزمائی کرنے والا نوجوان گورا کے لقب سے مشہور ہے۔ ساٹھ میل دور بارہ بنکی سے اس کا تعلق ہے۔ اڈے کے پرانے استاد کو نکال کے اس نے چوکی پر قبضہ جمالیا تھا اور دور دور تک اپنے چاقو کی دھاک بٹھادی تھی۔ اصل میں وہ ٹھاکر ہردیو کا پروردہ تھا۔ ٹھاکر کے نوجوان اور اوباش لڑکے بل دیو نے قریبی شہر ایودھیا میں تیرتھ یاترا کے دوران میں فیض آباد کے اوسط درجے کے ایک تاجر لکشمی داس کی نوجوان حسین و جمیل بیٹی برکھا کو کہیں دیکھ لیا تھا۔ اس نے تیرتھ استھان ہی میں برکھا سے زیادتی کی کوشش کی تھی اور ناکام رہا تھا۔ پھر اس نے فیض آباد میں باقاعدہ لکشمی داس کو برکھا کے لیے پیغام بھیجا۔ بہ ظاہر یہ رشتہ لکشمی داس کے لیے عزت و مرتبت کا باعث ہونا چاہیے تھا۔ ٹھاکر ایک صاحب حیثیت آدمی تھا' آس پاس کے کئی علاقوں میں اس کی زمینیں پھیلی ہوئی تھیں لیکن جہاں دیدہ لکشمی داس کو اس پیام کے پیچھے ٹھاکر کے مذموم ارادوں کا اندازہ تھا۔ ٹھاکر کے عیش و عشرت اور زور و اثر کی داستانیں اطراف و اکناف میں عام تھیں۔ لوگ اپنی نوجوان لڑکیوں کو پردوں میں چھپائے رکھتے تھے۔ لکشمی داس کو معلوم تھا کہ انکار کے جرم میں وہ کیسے عبرت ناک انجام سے دوچار ہو سکتا ہے لیکن اپنی لخت جگر کو وہ جیتے جی' سب کچھ جانتے بوجھتے جہنم میں تو نہیں دھکیل سکتا تھا۔ وہ بہانے کرتا رہا' ٹھاکر کو بہت جلدی تھی۔ اس نے دھمکیاں دینی شروع کردیں۔ لکشمی داس نے ہامی نہیں بھری تو ٹھاکر نے اپنے گرگوں کے ذریعے برکھا کو اغوا کرالیا۔ اڈے کے لوگوں کو بروقت خبر ہوگئی اور انہوں نے ٹھاکر کے کارندوں کو راستے میں جالیا اور مار بھگایا پھر ٹھاکر نے فیض آباد کے اڈے کے لوگوں پر دباؤ ڈالنے یا انہیں آزمانے کے لیے گورا کو یہاں بھیج دیا یا گورا خود اپنے مالکوں کی سبکی کی خبر سن کے دیوانہ ہوا۔ کم و بیش یہ وہی داستان تھی جو میں نے مختلف لوگوں اور ایک بوڑھے تماشائی سے سنی تھی۔ ہریا اور اڈے کے دیگر آدمی رازدارانہ انداز میں مجھے ٹھاکر کے جاہ و اقبال اور شقاوت و سفاکی کے قصے سناتے رہے اور مجھے ایسا لگا جیسے مجھے جتا رہے ہوں کہ گورا کی ہزیمت سے مراد یہ نہیں ہے کہ ٹھاکر بل دیو نے بھی شکست قبول کرلی ہے۔

ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ اندر حویلی سے ان کے لیے کھانے پینے کا سامان آتا رہا۔ چائے' شربت' نمکین مٹھائیاں' پان حقہ' بیڑی' سگریٹ کا دور مسلسل چل رہا تھا۔ پھر اندھیرا گہرا ہو جانے پر ممانے آکے لکشمی داس کی آمد کی اطلاع دی۔ وہ مجھ سے ملنے آیا تھا۔ میں نے سوچا' منع کروں۔ میں یہ معاملہ آگے بڑھانا نہیں چاہتا تھا لیکن ہریا کی سفارش پر میں نے اسے بلالیا۔ وہ ایک ادھیڑ' دراز قد' دبلا پتلا گندمی رنگ کا خوش پوشاک شخص تھا۔ دھوتی' کرتے اور بند گلے کے کوٹ میں ملبوس تھا۔ ممانے اسے میرے پاس پہنچادیا۔ اس نے ادب سے مجھے پرنام کیا اور میرے پیر چھونے چاہے تو میں نے اسے روک دیا۔ میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے' وہ بہت دل برداشتہ نظر آرہا تھا۔ کہنے لگا' وہ ایک عزت دار آدمی ہے' چھوٹا موٹا کاروبار ہے۔ اچھی گزر بسر ہو جاتی ہے۔ زیادہ کی ہوس نہیں ہے۔ اس نے اپنی بیٹی برکھا کو بی اے کی تعلیم دلائی ہے۔ برکھا کے علاوہ اس کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ دو بیٹے بچپن میں مر گئے۔ دوسرے بیٹے کی ولادت پر بیوی بھی جدا ہوگئی تھی۔ برکھا کو اس نے ماں کی طرح پالا پوسا ہے۔ وہ مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہے۔ کئی رشتے اسی لیے مسترد کردیے۔ لکشمی داس دل سوزی سے کہہ رہا تھا کہ وہ ٹھاکر بل دیو کے زور و اثر سے بہ خوبی واقف ہے۔ کسی طور وہ اس کا ہم سر نہیں' وہ

ں کے سامنے بات کرنے کی جرات بھی نہیں کرسکتا۔ اغوا کے واقعے کے بعد برکھا کی حالت نہایت ابتر ہے' وہ بیٹھے بیٹھے چونک پڑتی ہے۔ نہ کچھ کھاتی ہے' نہ پیتی ہے' ساری رات بیداریں تکتی رہتی ہے اور کبھی کبھی بری طرح کپکپانے لگتی ہے۔ وہ بہت خوف زدہ ہے۔

میں نے اسے تسلی تشفی دی "سب ٹھیک ہو جائے گا' حوصلہ رکھیے" میں یہی کہہ سکتا تھا۔ گو مجھے اپنے لفظوں کی بے قدری کا خوب احساس تھا۔

ہریا' لکشمی داس کو میرے پاس سے اٹھا کے بہل کے پاس لے گیا۔ میں نے دور سے دیکھا' لکشمی داس نے بہل کے پیر پکڑ لیے اور بلک بلک کے اپنی روداد سنانے لگا۔ اس کی آواز مجھ تک اس قدر نہیں پہنچ رہی تھی۔ بہل بے حس و حرکت بیٹھا سنتا رہا۔ جہاں دیکھو' آدمی' آدمی کا تعاقب کررہا ہے اور آدمی' آدمی سے بھاگ رہا ہے۔ لکشمی داس کی حالت دیکھ کے جی تو یہ کرتا تھا کہ ٹھاکر کے علاقے میں جاکے اس کا قصہ ہی ہمیشہ کے لیے ختم کردوں۔ موذی جانور بھی تو مار دیے جاتے ہیں۔ ہر جگہ یہی ہوتا ہے۔ مٹھی بھر آدمی' انسانوں کے ایک ہجوم کی زندگی عذاب کردیتے ہیں۔ ہر جگہ یہ دنیا گنتی کے آدمی ہی خراب کرتے ہیں۔ کوئی ان کا کچھ نہیں کرپاتا۔ سب دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ آدم خور درندوں کی طرح آدم خور آدمیوں کو بھی لوگ گھیر کے' اکٹھے ہو کے مار دیا کریں تو دنیا ہی بدل جائے۔

لکشمی داس جلد ہی چلا گیا۔ اڈے کے کئی آدمی رات گئے تک بیٹھے رہے۔ ان کے جانے کے بعد کھانا ہو سکا۔ میں بہل کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ کسی سوچ میں ڈوبا ہوا لگتا تھا۔ کھانا بھی اس نے خاموشی سے کھایا۔ مجھے شبہ ہو رہا تھا کہ کہیں یہ سکوت میری وجہ سے تو نہیں ہے؟ ممکن ہے' ہریا اور گورا کے معاملے میں میری مداخلت سے وہ ناخوش ہو۔ میں کیا صفائی پیش کرتا۔ میں نے خود کو بہت روکا تھا۔ میں تو وہاں سے ہریا کو اس کے حال پر چھوڑ کے چل ہی پڑا تھا مگر مجھ سے آگے نہ جایا جا سکا۔ میری جگہ وہ ہوتا تو کیا کرتا؟ کھانے کے بعد وہ بیٹھک میں آبیٹھا۔ اس وقت لوگ کم تھے' جہاں گیر' نیساں' منیر علی کے دونوں بیٹے اور نصیر بابا وہاں موجود تھے۔ میں نے سوچا' اسے کریدوں لیکن مجھے کوئی سرا ہی نہیں مل رہا تھا۔ کوئی اور بات سمجھ میں نہیں آئی تو اس کا جمود توڑنے اور دھیان بٹانے کے لیے میں نے اسے یاد دلایا "وہ فروزاں اور یاسمن کی چیزیں" میں نے دبی آواز سے پوچھا "تم نے ان کے سپرد کردیں؟"

"ہاں رے' وہ تو یاد ہی نہیں رہا" وہ کسمسا کے بولا' اس کی آواز بھاری تھی "دے دے ان کا سارا۔"

"میں' میں کیا!" میں نے ہکلا کے کہا "تم' تم خود ان کے حوالے کرو' میں سامان لے آتا ہوں اور انہیں بلالیتا ہوں۔"

وہ پھر کہیں گم ہوگیا۔

میں نے جہاں گیر سے فروزاں اور یاسمن کو بلانے کے لیے کہا اور کمرے میں جاکے' اٹیچی سے ان کا صندوقچہ اٹھالایا۔ ان دونوں کے ساتھ وہ سبھی آگئیں۔ خانم' زریں' زہرہ اور دونوں سلمائیں۔ صندوقچہ میں نے بہل کے سامنے رکھ دیا۔ "ادھری آجاؤری!" اس نے فروزاں اور یاسمن کو مخاطب کیا۔

دونوں گھبرائی ہوئی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے انہیں تردد ہوا پھر سر جھکائے' اپنا سراپا چرائے ہوئے وہ بہل کے قریب جاکے بیٹھ گئیں۔ بہل نے خانم کو صندوقچہ کھولنے کا اشارہ کیا۔

"کیا ہے اس میں؟" خانم نے حیرانی سے پوچھا۔ حیرانی میں اشتیاق کی آمیزش غالب تھی۔

بہل نے حقے کا لمبا کش کھینچ کے بدبداتے ہوئے کہا۔ "ناگن ہے اس میں۔"

سب اپنی جگہوں سے کھسکتے ہوئے بہل کے گرد جمع ہوگئے تھے۔ ان کی آنکھیں تجسس سے چمکنے لگی تھیں۔ خانم نے احتیاط سے صندوقچہ کھولا اور پلکیں جھپکانے لگی۔ "ہائیں' یہ کیا ہے؟ اتنا سارا" اس نے اوپر رکھا ہوا ہیروں جڑا ہار اٹھا کے دیکھا۔ اس کے ہیرے جگ مگ کررہے تھے۔ سبھوں نے باری باری وہ ہار دیکھا۔ فروزاں اور یاسمن تو مبہوت سی ہوگئی تھیں۔ حیرت و مسرت سے انہوں نے سسکاری بھری۔ ان کی دیدے بھی ہیروں کے مانند دمکنے لگی۔ وہ اپنا ہار پہچان گئی ہوں گی۔ دونوں بہنیں ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگیں۔ انہیں جیسے یقین نہ آرہا ہو۔

"دیکھ لو اچھی طرح" بہل نے تھکتی آواز میں کہا "ہم کو معلوم نہیں' اس کتے نے کتنا کم دیا۔ پورا نہیں تو ہم کو بولو' چلے جائیں گے پھر اس کے پاس۔"

خانم ایک ایک کرکے سارے زیور صندوقچے سے نکالنے لگی۔ وہ خاصا بڑا ذخیرہ تھا سید محمود علی کے گھر تو ہم نے سرسری طور سے دیکھا تھا۔ اس وقت تو حالت ہی دوسری تھی۔ زیورات کے پہلو میں دبی ہوئی نوٹوں کی گڈی اور زمین' مکان کے کاغذات' خانم نے ایک نگاہ ڈال کے فروزاں اور

یاسمن کے آگے رکھ دیے۔ بٹھل نے مختصراً انہیں نقدی اور کاغذات کے بارے میں بتایا اور کہنے لگا "ابھی تھوڑا ٹھہر کے آدمی ادھری بھیج دیں گے۔ مکان، زمین کا سودا کرنے کو، یا جیسا تم بولو۔"

دونوں بہنوں کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ ان سے کچھ نہ کہا گیا۔ فروزاں نے دوپٹے سے اپنا منہ ڈھانپ لیا۔ یاسمن کے ہونٹ پھڑک رہے تھے۔ خانم اور زریں نے انہیں بانہوں میں چھپالیا۔ نصیر بابا کی آنکھیں بھی بھیگی ہوئی تھیں۔ کبھی بٹھل کو دیکھتے تھے، کبھی مجھے اور فروزاں، یاسمن کو اور ہاتھ اٹھا کے شکر ادا کرتے تھے۔

جانے کیوں یہ منظر دیکھنے کی مجھے بہت آرزو تھی۔ زریں کے علاوہ یہ بھی ایک وجہ تھی جو میں فیض آباد آنا چاہتا تھا۔ آدمی کبھی کبھی اپنی مرادوں، امیدوں سے خود آگاہ نہیں ہوتا، وہ بر آتی ہیں تب اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بھی تو نہاں خانے میں کہیں جاگزیں تھا۔

یہ سب کچھ اتنا وافر تھا کہ فروزاں اور یاسمن آسودگی سے زندگی بسر کرسکتی تھیں مگر بٹھل کے بہ قول یہ مال و زر ان کے ماں باپ کا بدل نہیں تھا۔ بٹھل نے ان سے کہا کہ ہمیں ان تک پہنچنے میں بہت دیر ہوگئی تھی۔ ساری زندگی یہی دیر سویر ہوتی رہتی ہے۔ وقت پر پہنچ جانے کا موقع تو آدمی کو کم کم ہی ملتا ہے۔ دونوں بہنوں سے ضبط نہ ہوسکا۔ کہتے ہیں، آنسوؤں میں بڑا زہر ہوتا ہے، جتنا نکل جائے، اتنا ہی اچھا ہے۔ ابھی دونوں کی عمر ہی کیا تھی۔ شاید آنسوؤں پر قابو پا لینا پختگی ہی ہے۔ وہ بچوں کی طرح ہڑکنے، بلکنے لگیں۔ زریں اور خانم نے انہیں اپنا جزو بنائے رکھا تھا۔ ایک کے آنسو دوسرے کے لیے کچھ کم عذاب نہیں ہوتے۔ وہ فروزاں اور یاسمن کو سنبھال رہی تھیں اور خود انہیں اپنا یارا نہیں تھا۔ پھر نصیر بابا اپنی جگہ سے اٹھ کے فروزاں اور یاسمن کے سامنے بیٹھ گئے اور طرح طرح سے ان کی دل جوئی کرتے رہے حالانکہ ان کی آواز بھی چھلک رہی تھی۔ کہنے لگے، گزرا ہوا بھول جانے ہی میں بہتری ہے۔ سمجھو، اس کی مشا یہی تھی، اور اس کا کوئی کام مصلحت کے بغیر نہیں ہوتا۔ انہیں اب شکر ادا کرنا چاہیے کہ ایک قیامت ان کے سر سے گزر گئی۔ اب آگے، اللہ نے چاہا تو سارے دکھوں کا مداوا ہوجائے گا۔ وہ بہت مہربان لوگوں میں آگئی ہیں۔ ایسے لوگ قسمت والوں ہی کو ملتے ہیں۔ زندگی کا حاصل یہی ہے کہ کتنے اچھے لوگوں کی رفاقت نصیب ہے۔

نصیر بابا کی باتوں میں بڑی دردمندی اور دل نشینی تھی۔ سچ کا اپنا اثر ہوتا ہے۔ پھر بٹھل نے ظفر کا ذکر چھیڑ کے جیسے چراغ روشن کردیے۔ دونوں کے ہاں ظفر کے نام سے تموج سا نمودار ہوا۔ بٹھل نے انہیں مژدہ سنایا کہ جلد ہی ظفر بھی یہاں آجائے گا اور کوشش یہی ہوگی کہ ان کا اپنا ایک گھر ہوجائے۔ یہ بھی انہی کا گھر ہے اور ان کی مرضی پر ہے، وہ یہاں رہیں یا اپنے گھر، اس شہر میں یا کسی اور جگہ۔ ہم ان سے کہیں بھی دور نہیں رہیں گے۔ جب بھی ہماری ضرورت پڑے، وہ اپنا حق سمجھ کے ہمیں بلا سکتی ہیں۔ وہی حق جو انہیں اپنی ماں اور اپنے باپ کی طرف سے حاصل تھا۔

میرا بھی جی چاہتا تھا، میں بھی ان سے کچھ کہوں۔ میرے دل میں بھی بہت سی باتیں مچل رہی تھیں۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ وہ خود کو کبھی تنہا، بے یار و مددگار نہ سمجھیں۔ ظفر کو وہ اچھی طرح جانتی ہیں۔ میں نے بھی اس کے بارے میں سب کچھ اچھا ہی سنا ہے۔ یقیناً وہ ان کے لیے بڑا سہارا ہوگا۔ اب آگے اسی کا کام ہے لیکن کسی مرحلے پر وہ ان کے اعتبار پر پورا نہ اترے تو وہ دل برداشتہ نہ ہوں، خاطر جمع رکھیں اور صرف ظفر ہی نہیں، نصیر بابا، بٹھل اور زریں اور خانم ہی نہیں، ایک میں بھی ہوں۔ اور ان میں کوئی بھی نہ ہو تو میں تو ہوں اور میں اکیلا بھی بہت ہوں، اور بہت سے میری مراد ہے کہ میرے سینے میں ان کے لیے بے پناہ احساس موجزن ہے شاید سب سے زیادہ، اور یہ محض ہم دردی ہے تو ہم دردی کوئی کم تر درجے کا جذبہ نہیں ہوتی۔

میں سوچتا ہی رہ گیا۔ زریں اور خانم انہیں وہاں سے اٹھا لے گئیں۔

○☆○

دوسرے دن صبح میرے بیدار ہونے سے پہلے ناشتا کرکے بٹھل اڈے چلا گیا تھا۔ وہ رات گئے واپس آیا اور کچھ دیر بیٹھک میں نشست کے بعد اپنے کمرے میں روپوش ہوگیا۔ وہ الجھا الجھا سا لگ رہا تھا۔ اگلے دن صبح بھی یہی ہوا۔ وہ سویرے سویرے نکل گیا۔ اس روز میرا بھی اڈے پر جانے کا ارادہ تھا لیکن جہاں گیر نے گزشتہ کل کی طرح بساط بچھادی۔ جہانگیر نے گزشتہ کل کی طرح بساط بچھادی۔ میں نے عرصے بعد شطرنج کو ہاتھ لگایا تھا۔ گیا میں اسکول کے دنوں میں شطرنج خوب کھیلی تھی۔ اب تو تقریباً بھول ہی گیا تھا۔ جہانگیر کے ساتھ چند بازیاں کھیلنے کے بعد خانے اور مہرے سمجھ میں آنے لگے۔ کیرم، پچیسی، گنجفہ اور کئی طرح کے درون خانہ کھیل ان کے روز مرہ میں شامل تھے۔ عمارت کے عقب میں واقع باغ کے ایک حصے میں فرش پختہ کرکے بیڈ منٹن کا اہتمام

ی کیا گیا تھا۔ زریں نے اوپر کی منزل میں درمیانہ درجے کا یک کمرا کتب خانے کے لیے وقف کردیا تھا۔ وہاں کتابوں ور رسالوں کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا۔ نیساں نے مجھے بتایا تھا کہ ر ماہ اس ذخیرے میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ زریں کی دیکھا بھی سبھی کو مطالعے کا چسکا پڑگیا ہے۔ کتابوں کی حفاظت ے لیے بہ طور خاص شیشے کی الماریاں بنوائی گئی تھیں اور ا، روشنی اور خاموشی کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ فروزاں ر یاسمن کا تو پھر یہاں بہت جی لگنا چاہیے۔ کتابوں اور سالوں سے ان کا تعلق تو موروثی تھا۔ گیا میں انگریزی کا ڑھا پروفیسر کہتا تھا، کثرت مطالعہ سے بہتر، منتخب مطالعہ ہے۔ کثرت مطالعہ کو کثرت حافظہ بھی چاہیے اور وہ کہتا ا ادب ضرور پڑھنا چاہیے، ادب آدمی کو مہذب کرتا ہے۔ بارا موضوع کوئی سا ہو، منطق ہو یا ریاضی، طبیعات ہو یا ضیات۔ ایک دوتی صد ادب یا لٹریچر کی گنجائش رکھنی ہیے۔ مجھے یاد ہے، میں نے پوچھا تھا "اور کھیل؟" اس نے جواب دیا تھا، وہی کھیل کھیلنے چاہئیں جن میں دونوں فریق بت سکیں، کسی کی ہار نہ ہو۔ کھیلوں میں فریق مخالف کی ہار پر ظہار مسرت ایک غیر اخلاقی رویہ ہے۔ کہتا تھا، مغربی ملکوں ں باکسنگ بہت مقبول ہے۔ کھیل میں دو مخالف ایک سرے پر مکے برساتے رہتے ہیں اور لہولہان ہوجاتے ہیں، جتنی ضربیں لگائے اور جو جتنی ضربیں کھائے۔ دیکھنے لے اس تماشے پر خوب اچھلتے کودتے ہیں۔ یہ کیسی اذیت ندی ہے۔ وہ ورزش اور بہادری کے کارناموں کا حامی تھا۔

جہانگیر مجھ سے جیت رہا تھا اور اسے ایک ندامت آمیز رخوشی بھی تھی۔ شطرنج بھی عجب نشہ ہے۔ ارد گرد سے آدمی بے گانہ ہوجاتا ہے۔ نصیب میاں کہتے تھے، آدمی کسی کام کا ہیں رہ جاتا۔ گھر بیٹھے وافر آمدنی کی صورت ہو تو اس سے چھا مشغلہ بھی کوئی نہیں۔ آدمی ساری زندگی شطرنج کی فاقت میں گزار سکتا ہے۔ ایک زمانے میں نصیب میاں کو طرنج کا عارضہ تھا، ایک دن اچانک چھوڑ دی۔ میں نے پوچھا کیوں؟" کہنے لگے "میاں! سری خواب میں بساط بچھنے لگی ی، مہرے گردش کرتے رہتے تھے" عادتیں بھی جزو بدن ن جاتی ہیں اور غالباً ضد ہی ان کا ایک علاج ہے۔ میں نے طرنج میں اپنی دلچسپی کا اظہار کچھ جہانگیر کی خاطر کیا، کچھ میں د کو حویلی میں قیام کے دوران میں اپنے آپ سے دور رکھنا اہتا تھا۔ میں شاید کوئی تجربہ کر رہا تھا۔ یوں بھی میزبان، مانوں کی خوشنودی کا لحاظ رکھتے ہیں تو مہمانوں پر بھی اپنے زبانوں کی دل جوئی لازم ہے۔ میزبانی کے بھی آداب ہوتے ہیں، مہمان نوازی کی طرح اسے میزبان نوازی کہنا چاہیے۔

تنویر بھی میرے اور جہانگیر کے درمیان بازی میں شریک ہوگیا تھا اور جہانگیر کی التجاؤں کے باوجود مجھے مشورے دینے سے باز نہیں آیا۔ کچھ دیر میں خانم بھی ہمارے پاس آکے بیٹھ گئی اور جہانگیر نے بتایا کہ خانم سے کسی کا جیت جانا بہت مشکل ہے، انہوں نے زہرہ اور زریں کو بھی ماہر کردیا ہے۔ خانم کو دیکھ کے جہاں گیر بساط کے آگے سے ہٹ گیا۔ اس کی ادھوری بازی خانم نے جاری رکھی اور وہ مجھے مسلسل مات دیتی رہی۔

سونے، کھانے اور کھیلنے میں دو دن ایسے ہی گزر گئے۔ وقت کا کچھ احساس ہی نہیں ہوا۔ بٹھل پھر رات کو واپس آیا۔ رات کو اس کے چہرے کا غبار مجھے کھٹکنے لگا۔ یہ تھکن نہیں تھی۔ اڈے پر بھی وہ آرام ہی کرتا رہا ہوگا۔ وہاں کون سے ہل بیل جوتے ہوں گے۔ پھر کیا ہے؟ وہ اڈے پر اتنی دیر کیوں بیٹھا رہا ہے؟ وہ تو اب اڈوں پاڑوں سے دور دور رہتا ہے۔ اسے زریں کا خیال بھی نہیں ہے۔ یہاں آکے تو وہ یہیں کا ہوجاتا ہے۔ زریں کچھ دیر کے لیے اوجھل ہوجاتی ہے تو اسے بے کلی ہونے لگتی ہے۔ اسی لیے تو وہ فیض آباد آنے سے کتراتا رہا تھا کہ پھر یہاں سے جلد نکلنا ممکن نہ ہوسکے گا۔ زریں مزاحم ہوجائے گی۔ زریں کے سامنے تو وہ بہت ناتواں ہوجاتا ہے۔ اس سے کچھ پوچھنے کے بجائے میں نے طے کیا کہ کل اڈے جاکے خود دیکھوں گا، ایسی کیا بات ہے۔ ممکن ہے، مجھے یوں ہی وہم ہو رہا ہو۔ جامو اور جمرو کے چلے جانے کے بعد ظاہر ہے، اڈے کی پہلے جیسی حالت نہیں رہنی چاہیے۔ اڈا تو مضبوط استاد ہی سے ٹھیک طرح چلتا ہے۔ کوئی کتنا ہی زور آور، چاقو کا دھنی ہو، اڈے کے نگراں کو دوسری خوبیوں سے بھی متصف ہونا چاہیے۔ اڈے کا تعلق جامو اور جمرو سے تھا۔ بٹھل نے ضرور کوئی ایسی بات دیکھی ہوگی جو اسے صبح سے رات تک وہاں بیٹھنے کی ضرورت پیش آگئی ہے۔

تیسرے دن، میں جلدی اٹھ گیا تھا یا اسے دیر ہوگئی تھی۔ وہ اڈے جانے کے لیے تیار ہوا تو میں نے بھی اس کے ساتھ چلنے کی خواہش ظاہر کی۔

"نہیں رے" اس نے صاف منع کردیا بلکہ دھتکار دیا "تو ادھری رہ، دو میں ایک کو ادھر ہی ہونا چاہیے۔"

"مگر تمہیں روز اتنی پابندی سے وہاں جانے کی ضرورت کیوں پڑگئی ہے؟"

"ہے رے۔"

"کیوں؟ ایسی کیا بات ہے؟"
"اڈے کو تھوڑا دیکھنا ہے۔"
"کیا دیکھنا ہے؟ اڈے پر بیٹھنے یہاں آئے ہو؟"
"دو ایک دن میں کیا ہو جائے گا۔"
"بس رے!" اس کی تیوری چڑھ گئی' اس نے کچھ اور کہنے سننے کا موقع نہیں دیا' دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میں اس کے ساتھ جا سکتا تھا لیکن اس حجت سے اس کی ناگواری کا امکان تھا۔ میں چپ ہو گیا۔ میری خاموشی میرا شکوہ تھی۔ اسے بھی اس کا احساس ہونا چاہیے۔ اس نے پلٹ کے میری طرف دیکھا ہی نہیں' وہ چلا گیا اور سارے دن کے لیے مجھے اجیرن کر گیا۔

دن بھر میرے سر میں ریت اڑتی رہی۔ اس دن شام حویلی میں اڈے کے لوگوں کی آمد ہوئی اور دوسرے دن سے بٹھل نے اڈے پر بیٹھنا شروع کر دیا۔ اس تواتر اور اتنے اتنے وقت کے لیے اڈے پر اس کی حاضری کسی علت کے بغیر غیر ضروری سمجھی گئی ہے یا دانستہ مجھے الگ رکھا جا رہا ہے۔ بار بار ایک ہی خدشہ مجھے ڈنک مارتا تھا کہ بٹھل کی اس تندہی اور سرگرمی کا سبب لکشمی داس اور اس کی بیٹی برکھا تو نہیں ہے۔ ہریا اور لکشمی داس نے ٹھاکر ہردیو کے زور و اثر کے بارے میں جو کچھ مجھے ذہن نشین کرایا تھا وہ مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ اس روز ہریا اور گورا کے درمیان معرکہ آرائی کا فیصلہ ہو چکا تھا لیکن وہ فیصلہ قصہ تمام ہو جانے کی ضمانت نہیں تھا۔

شام کو ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا کہ بٹھل آ گیا' مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا' اس کے ساتھ جامو تھا۔ جامو نے مجھے دیکھتے ہی لپک کے بازوؤں پر اٹھا لیا۔ سینے کی زبان سینہ خوب سمجھتا ہے۔ اس کے ہاں' ایسا جذب تھا جو کسی بہت ہی محبوب اور مطلوب شخص کے لیے ہو سکتا ہے۔ دیر تک وہ مجھے پیوست کیے رہا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوئے تو میں نے حیرت سے پوچھا "جامو بھائی! تم کیسے یہاں؟"

"بس آ گئے بھیا!" وہ وفور مسرت سے بولا۔
"کمال ہے!" میں نے چہچہاتی آواز میں کہا۔ "اتفاق ہے یا تمہیں معلوم۔۔۔"
"بس آ گئے استاد! وہ' جو بولتے ہیں' پسلی کا پھڑکنا' کیا بولتے ہیں اس کو" وہ ہنستے ہوئے بولا "ابھی تم کو دیکھنے کو جی بہت کرتا تھا۔"
میں نے تحمل کیا۔ جامو اپنی اچانک آمد کے بارے میں سچ کے اظہار کے گریز کر رہا تھا۔ ہمیں یہاں سے جلد ہی بنگال کی طرف جانا تھا۔ دو ایک شہروں کے بعد کلکتے پہنچ ہی جانا تھا۔ جامو کے ساتھ جمرو اور زورا بھی نہیں تھے۔ بلانا تھا تو بٹھل کو پہلے انہیں بلانا چاہیے تھا" "سب خیریت تو ہے جامو بھائی؟" میری آواز کا تردد اس جہاں دیدہ سے اوجھل نہیں رہا ہو گا۔

"ہاں بھیا' کشل منگل' سب ٹھیک' ایک دم۔"
بٹھل اسے چوکی پر لے گیا۔ زریں بھی بھاگی بھاگی آ گئی۔ جامو نے جلدی سے اٹھ کے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ زریں بھی اس کی غیر متوقع آمد پر پلکیں جھپکا رہی تھی۔ میری طرح اس نے بھی تعجب سے پوچھا۔ جواب میں جامو مسکرانے لگا اور اس نے وہی جواب دیا "بس آ گئے بھنو!"
"بہت اچھا ہوا' آپ کو دن بھی کتنے ہو گئے۔ میں نے تو خط میں بھی لکھا تھا' جامو بھیا! ہمیں بھول گئے گیا۔ جمرو بھائی کے ہاتھ خط بھیجا تھا" زریں چہکتی آواز میں بولی۔
"خط مل گیا تھا' خط بھی اور تمہارا گاجر کا حلوہ بھی۔ جی کرتا تھا' اسی دم چل پڑوں پر کوئی نہ کوئی۔۔۔" جامو مچل کے بولا "حلوہ سبھی نے کھایا۔ سب انگلی چاٹتے تھے۔ ہم نے بولا' یہ میری بہنا نے اپنے ہاتھ سے بنا کے بھیجا ہے۔"
"وہ تھا ہی کتنا" زریں کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔
"کم چیز زیادہ اچھی لگتی ہے۔"
"پھر تو اس کا کم ہونا اچھا ہوا۔"
"نہیں' نہیں" جامو نے گھبرا کے تردید کی "ایسی بات نہیں بہنا! ادھر تو کتنا ہی زیادہ بھیجتیں' چٹ ہو جاتا۔"
"اور' اور جمرو بھائی آپ کے ساتھ نہیں آئے؟"
زریں نے موضوع بدل کے جامو کو عافیت دلائی۔
"ادھر ان کا تھوڑا کام تھا" جامو صاف بہانے بازی کر رہا تھا۔ جمرو اور زورا سے تو ہمارے فیض آباد پہنچ جانے کی خبر سن کے رہا نہیں جا رہا ہو گا۔ جامو نے بھی انہیں مشکل سے روکا ہو گا اور یہ ہدایت بٹھل ہی کی ہو سکتی ہے۔
اتنی دیر میں جہاں گیر' نیساں' تنویر اور ارشد آ گئے۔ جامو سے ان کا خاص ربط ضبط معلوم ہوتا تھا۔ وہ اسی گھر کا کوئی فرد لگ رہا تھا' بالکل ایک مختلف آدمی' جیسے اڈے سے اس کا واسطہ ہی نہ ہو۔ کسی کو بھی شاید معلوم نہیں تھا کہ جامو' اڈے کا کیسا پختہ کار آدمی ہے' چاقو اس کے اشاروں کا تابع رہتا ہے' زور آور' وہ بلا کا ماہر ہے۔ بڑے بڑے استاد اس سے پہلو بچاتے ہیں۔ اس کے اڈے سے وابستہ آدمی اس کے سامنے سر نہیں اٹھاتے' سوچ سمجھ کے زبان کھولتے

تھوڑی دیر میں کھانے کا وقت ہو گیا۔ جامو نے وہیں کھانا کھایا اور اڈے واپس نہیں گیا۔ اس سے خلوت میں بات کرنے اور سن گن لینے کا موقع میں تلاش کرتا رہا۔ رات گئے بٹھل نے اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔
میں نے تقریباً ساری رات جاگ کے گزاری۔ جامو کی آمد نے مجھے اور بدگماں اور ویراں کر دیا تھا بلکہ ہراساں۔ یہ وہم اندیشے تو اور ستم کرتے ہیں۔ صبح میں جلدی اٹھ گیا اور یہ جان کے مجھے اور حیرانی ہوئی کہ جامو علی الصباح حویلی سے چلا گیا ہے۔ بٹھل بھی نکل جاتا۔ وہ تو میں نے اسے دروازے پر روک لیا اور جامو کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بے نیازی سے بتایا کہ جامو کو کسی کام سے کہیں جانا تھا۔
"مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔
اس نے آنکھیں میچ لیں اور بدبداتے ہونٹوں سے جانے کیا کہا جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔
"میں کچھ جاننا چاہتا ہوں" میرے لہجے میں تلخی آ گئی۔
"کیا رے؟" وہ تنک کے بولا۔
"جو تم بتا نہیں رہے' بتانا نہیں چاہتے۔"
"کیا بتا میں رے؟"
مجھے یہ استغنا گراں گزرا' میں نے جھلا کے کہا "میں کوئی پاگل آدمی نہیں ہوں۔"
"پورا نہیں تو آدھا تو ہے۔"
میرا سر گھومنے لگا "وہاں میں نے کیا غلط کیا تھا؟"
"کدھر ہی رے؟"
"وہی' ہریا اور گورا کے بیچ میں پڑ کے۔ گورا اس پہ زور ڈال رہا تھا۔ میں نے تو۔۔۔"
اس نے میری بات پوری نہیں ہونے نہیں دی "نئی بات کر۔"

"پھر نئی کیا ہے؟ یہی تو جاننا چاہتا ہوں۔"
"تیرے الجھنے کو نہیں ہے۔"
"لیکن یہ' یہ اندھیرا تو مجھے اور الجھاتا ہے۔"
"کوئی اندھیارا نہیں۔" وہ سرسری انداز میں بولا "تو گھڑی آرام کر۔" اس نے فیصلہ سنایا اور دروازے سے نکل گیا۔ میں وحشت زدہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔
ناشتے کے بعد کمرے میں آ کے میں نے دروازہ بند کر لیا۔ ممکن ہوتا تو میں کمرے کے باہر پہرے دار بٹھا دیتا یا بعض ہوٹلوں کی طرح تختی آویزاں کر دیتا کہ کوئی دستک نہ دے۔ میں اب آرام ہی کرنا چاہتا تھا۔ شاید بٹھل کا مشورہ صائب تھا کہ مجھے ہر طرف سے بے نیاز ہو کے آرام کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے' وہ سب کچھ اتنا نہ ہو جتنا مجھے نظر آ رہا ہے۔ میں تو یوں بھی اس کے بہ قول آدھا دیوانہ ہوں۔ میری نگاہ یا تو کم دیکھتی ہے یا بہت زیادہ۔ مجھے تسلیم کر لینا چاہیے کہ میں ایک ادھورا آدمی ہوں۔ دنیا میں ایک مکمل آدمی کے لیے جو معیار مستند قرار دیے گئے ہیں' میں ان پر کس قدر پورا اترتا ہوں۔ ایک بے توازن شخص کو انہیں دور ہی رکھنا چاہیے۔
کمرے میں میرے سوا کوئی نہیں تھا لیکن آدمی کتنا ہی تنہا ہو' وہ اپنے ساتھ بھی تو ہوتا ہے۔ کوئی آدمی شاید ایک آدمی نہیں ہوتا' کبھی وہ دو ہوتا ہے' کبھی اس سے زیادہ۔ کبھی ایک حاوی آ جاتا ہے' کبھی دوسرا' تیسرا' اور کبھی بہت سے ایک پر غالب آ جاتے ہیں۔ یہ جو آدمی ایک نظر آتا ہے' یہ ایک نہیں ہوتا' جانے کتنے آدمی ایک آدمی میں شامل ہوتے ہیں۔ اسے خود نہیں معلوم ہوتا کہ اس کا کون سا آدمی کس وقت کیا رنگ اختیار کر سکتا ہے۔ بیک وقت اسے طرح طرح کی ترغیبیں ملتی رہتی ہیں کبھی پہلا آدمی اپنے دوسرے آدمی کے سامنے بہت بے بس ہو جاتا ہے' کبھی دوسرا پہلے کے سامنے۔ ایک آدمی' ایک آدمی ہوا کرے تو پھر ایک ہی آدمی کا ارادہ ہوا کرے۔ یہ جو ایک آدمی میں بہت سے آدمی نہاں ہوتے ہیں' یہی اسے منتشر کرتے رہتے ہیں۔ بہت کم' یہ کہیں متفق ہوتے ہیں۔ صرف ایک آدمی ہوا کرے تو فکر و خیال کی ایسی یورش نہ ہو اور زندگی کیسی آسان ہو جائے۔ میں اپنے آپ پر غلبہ و تسلط حاصل کرنے اور یکسو ہو جانے کے جتن کرتا رہا' سکون بھی جبری ہو تو کیسا عجیب ہوتا ہے۔ میں نے نرمی اور متانت سے خود کو باور کرانے کی کوشش کی کہ بدگمانی سے اجتناب میں میرے لیے بہتری ہے اور بٹھل کی نسبت تو کسی بدگمانی کا تصور بھی نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے دور رکھنے یا الگ رکھنے میں ضرور میری آسودگی کا کوئی پہلو مضمر ہے۔ دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں یا تو کوئی ایسا واقعہ ہی نہیں جو مجھے قریب رکھنے' مجھے زحمت دینے کی ضرورت پیش آئے یا کوئی بڑا واقعہ درپیش ہے جس میں میرے زیاں کا احتمال ہے یا پھر میری شرکت میں میری جانب سے کسی کوتاہی یا کوتاہ بینی کا کوئی شبہ بٹھل کو لاحق ہے کہ یہی ہوتا رہا ہے۔ میرا ضرر اسے گوارا نہیں یا یوں ہے کہ میری شرکت میرے بہی خواہوں اور دردمندوں کے لیے کسی ضرر کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے۔ دونوں صورتوں میں میرے پاس کیا چارہ ہے؟ میں خاموش بیٹھا

سورج طلوع ہوتے اور غروب ہوتے دیکھتا رہوں۔ بسمل کے خیال سے گوشہ گیری ہی میں میرے لیے عافیت ہے۔ اس کی خواہش کا احترام بہرحال مجھ پر واجب ہے۔ یہ تو عین سعادت ہے۔

بے شک کچھ دیر کے لیے میں خود کو یک جا کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا لیکن کسی کج فہم' شوریدہ نگاہ کو قرار کہاں سزاوار ہے پھر وہی حشرات میرے جسم سے چمٹ گئے اور میری نگاہیں دیواروں کے پار بھٹکنے لگیں۔

فیض آباد کا اڈا ایک پرانا اور مضبوط اڈا ہے۔ یہاں جامو اور جمرو کے تربیت یافتہ آدمی موجود ہیں مگر تبت سے ہماری واپسی کے بعد جامو کلکتے میں بسمل کی مسند کا نگراں ہے' جمرو عرصے سے ہمارے ساتھ کوچہ گری کر رہا ہے۔ ان دونوں بھائیوں کی عدم موجودگی کے باعث اڈے کے نظم وضبط میں شکستگی لازم ہے۔ بسمل نے جامو کو فیض آباد طلب کرلیا ہے لیکن جامو کی ضرورت اسے اڈے کی استواری کے لیے نہیں پڑی ہوگی۔ جامو کو اس لیے طلب کیا جانا چاہیے کہ وہ اس علاقے کے گوشے گوشے سے آشنا ہے۔ وہ ٹھاکر ہردیو سے بھی واقف ہوگا۔ اڈا چاہے استاد جامو یا استاد جمرو کی تحویل میں ہو یا ان جیسے کسی بے بدل استاد کے قبضے میں' ٹھاکر ہردیو کے جاہ و حشم کے آگے بہت بے حیثیت اور کم حیثیت ہے۔ ٹھاکر کے پروردہ اور فرستادہ نوجوان استاد گورا کے راستے میں رخنہ اندازی کا شاخسانہ کسی طور ظاہر ہو سکتا ہے۔ اب تک مجھ سے بھی ٹھاکر اچھی طرح متعارف ہو چکا ہوگا۔ میرے مسکن' زریں کی حویلی کا محلِ وقوع بھی اسے اچھی طرح نقش کرا دیا گیا ہوگا۔ میں اور بسمل آج نہیں تو کل یہاں سے چلے جائیں گے۔ کل پھر یہ حویلی معمول کے مطابق اڈے کے لوگوں کی نگرانی میں ہوگی۔ وہ تمام بڑے جاں باز' ایثار پیشہ لوگ ہیں۔ ایک' دس کے مساوی ہے۔ ہتھیار ساتھ ہو تو بے شمار بھی ان کے سامنے ہیچ ہیں تاہم وہ ٹھاکر کے لاؤ لشکر کے آگے کتنی دیر دیوار بنے رہیں گے۔ لاؤ لشکر کے اعتماد میں قہر و غضب بھی شدید ہوتا ہے۔ شہر میں اپنی حویلی کے فسانے بھی کم نہیں ہوں گے۔ چھوٹے شہروں کے لوگوں کے کان بڑے ہوتے ہیں۔ چھوٹے شہروں میں گھروں کی دیواریں کتنی ہی اونچی ہوں' لوگوں کی نگاہیں بڑی کاری ہوتی ہیں۔ لوگوں کی نگاہیں روزن تراش لیتی ہیں۔ چھوٹے شہروں کا پسندیدہ مشغلہ ایک دوسرے سے باخبر رہنا ہے۔ زریں کی حویلی سے تو ایک داستان منسوب ہے۔ بہت سوں کو آگہی ہوگی کہ حویلی کی واگزاری کس طرح ممکن ہوئی تھی' پشت پر کون سورما تھے کون کون یہاں اقامت گزیں ہے' کن لوگوں کی آمد و رفت رہتی ہے' وغیرہ۔

انہی عواقب پر مشورت کے لیے بسمل نے جامو کو طلب کیا ہوگا۔ یقیناً لکشمی داس نے بسمل کے روبہ رو ہو کے بڑی دہائیاں دی تھیں' اس کی نوجوان لڑکی اجودھیا میں تیرتھ کے دوران ٹھاکر کے شکنجے میں بس آ ہی گئی تھی کہ بال بال بچ گئی۔ دوسری بار بھی نرغے میں آجانے کے باوجود اڈے کے آدمیوں نے اسے بچا لیا تھا۔ ادھر میں ٹھاکر کے حاشیہ نشین گورا کو خستہ حالت میں واپس بھیج چکا ہے۔ علاقے میں ٹھاکر کی حرص و ہوس' سینہ زوری اور تو زی کی کہانیاں زباں زد ہیں۔ صاحبانِ زر چھوٹے بادشاہ ہوتے ہیں اور بادشاہ تو بادشاہ ہی ہوتا ہے' سرکار کی' عمال ان کے۔ زر سب سے بڑا زور ہے۔ جس کے پاس جتنا' اتنا ہی وہ پرانا۔ دولت آدمی کو آدمی کا غلام بنا دیتی ہے۔ ٹھاکر کے ولی عہد کے ساتھ جو کچھ ہوتا رہا ہے' وہ اس کا نہیں ہے۔ یہ مزاحمتیں تو ایک کج کلاہ کی توہین کے مترادف ہیں۔ کہتے ہیں' زردار کا کینہ بڑا ہلاکت خیز ہوتا ہے۔ دولت مندوں کو انکار سے چڑ ہوتی ہے۔ دولت سے مراد اقرار اقرار کا اختیار ہے۔

سو کلکتے سے استاد جامو کی آمد کا مقصد محض لکشمی داس کی بیٹی برکھا کو ٹھاکر کی آتشِ نفس سے محفوظ کرنا ہی نہ ہو۔ بسمل کو یہ آنچ اپنے قریب بھی محسوس ہو رہی ہوگی۔ اور ہریا کے معاملے میں میری مداخلت سے پہلے ٹھاکر کو یہ لکشمی داس کا گھر معلوم تھا یا فیض آباد کا اڈا۔ اب ایک تیسرے راستے' حویلی کی طرف جانے والے راستے کی نشان دہی بھی ہو گئی ہے اور بسمل کے لیے یہ حویلی تاج محل کا درجہ رکھتی ہے مگر کیا واقعی مجھے وہاں سے لوٹ آنا چاہیے۔ بسمل نے اس نادانی کی بابت مجھ سے ایک لفظ نہیں کہا۔ شاید وہ بھی ایسی صورت حال میں یہی کچھ کرتا' میں نے عجلت بھی نہیں کی تھی۔ ہر پہلو پر غور کر کے قدم بڑھایا تھا۔ ٹھاکر کی منزلت و مرتبت کے تخمینے میں البتہ مجھ سے چوک ہو گئی تھی۔ بلکہ میں نے اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ آدمی اتنی سمتوں میں دیکھنے کی احتیاط کرے تو پھر کچھ کر سکے۔ پھر تو وہ ویرانوں میں نکل جائے' جنگلوں میں جا بسے۔

اپنے سر میں بھن بھناتے ہوئے مبہم و موہوم خدشات کی صورت گری سے مجھے کچھ اطمینان ہوا اور اس یقین نے مجھے تقویت و استقامت عطا کی کہ دخل اندازی کا میرا فیصلہ ہر اعتبار سے صائب تھا۔ یہ فیض آباد کے اڈے

...اور جمرو سے متعلق اڈے کے بھرم' اس کی وقعت کا ...لہ تھا۔ مجھے کمرے کے خلوت سے بیزاری ہونے لگی۔ ...باہر آگیا۔

...چمک دار دھوپ بکھری ہوئی تھی مگر دھوپ میں تیزی ...تھی۔ ملازمائیں فرش' طاقوں اور محرابوں کی صفائی میں ...وف تھیں۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے ...چا' حویلی سے باہر جا کے دیکھوں۔ کئی دن مجھے گھر میں بند ...ئے ہو گئے تھے لیکن پھر میرے قدم زریں کے کمرے کی ...اٹھ گئے۔ زریں سے ابھی تک کوئی بات ہی نہیں ...ائی تھی۔ ہر وقت مجھے کوئی نہ کوئی گھیرے رہتا تھا یا میں خود ...رہتا تھا۔ وہ بھی کبھی تنہا دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میں اس ...کمرے کے قریب پہنچ چکا تھا کہ نیساں اچانک کسی طرف ...نکل آئی۔ وہ اب خاصی بڑی بڑی لگتی تھی۔ رنگ و روپ ...خوب نکھر آگیا تھا۔ یہ حیدر آباد کی وہ نٹ کھٹ نیساں تھی ...نہیں جسے میں نے پہلی بار خانم کے بالا خانے پر دیکھا تھا۔ ...دیکھ کے اس کا سراپا کھل اٹھا۔ دوڑی دوڑی بابر بھائی' ...بھائی کا ورد کرتی' چہکتی ہوئی میرے پاس چلی آئی اور ...ے بازو سے چمٹ گئی اور زیر و زبر سانسوں سے پوچھنے لگی ...میری طبیعت تو ٹھیک ہے۔

میں نے مسکرا کے کہا "کیوں' کیا میں بیمار لگتا ہوں؟"

"آپ صبح ناشتے کے دوران میں بہت خاموش ...آرہے تھے پھر اپنے کمرے میں جا کے آپ نے دروازہ بند ...لیا۔ ہم لوگوں نے کئی چکر لگائے۔ دروازہ بند دیکھ کے لوٹ ...ئے۔" وہ پٹر پٹر باتیں کرتی تھی۔

میں نے شرمندگی سے کہا "ہاں کچھ سر بھاری تھا۔"

"اب کیسے ہیں آپ؟" وہ پریشانی سے بولی "درد تو نہیں ...ہے؟ لائیے' میں دباتی ہوں۔ خانم تو مجھی سے مالش کراتی ...ہیں۔ کہتی ہیں' میری انگلیوں میں جادو ہے' اور زری آپا بھی۔ ...آزمائش شرط ہے۔" وہ کھل کھلانے لگی۔

"اچ ۔۔۔ چھا۔" میں نے دیدے گھما کے کہا "دیکھیں ...گے پھر کسی دن تمہارا کرشمہ۔"

"کسی دن کیوں' آج اور ابھی کیوں نہیں۔" وہ وارفتگی ...سے بولی "ہاں بابر بھائی!"

"ابھی تو بالکل ٹھیک ہے۔" میں نے اسے بازو میں ...سمیٹ لیا "تم خوش تو ہو مینا؟"

"جی' جی ہاں۔" وہ چونک سی پڑی "کیوں' آپ نے یہ ...کیوں پوچھا؟"

"ایسے ہی بس' تم بتاؤ' کوئی ایسی ویسی بات ہو تو چپکے سے کان میں مجھے بتا دو۔"

"آپ کیا' کیا کہہ رہے ہیں؟" وہ بے کل سی ہو گئی۔

"میرا مطلب ہے۔" میں نے جلدی سے صراحت کی "تمہیں کسی بات' کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتاؤ۔"

"زری آپا کے ہوتے ہوئے یہاں کس چیز کی کمی ہو سکتی ہے۔"

وہ اب بڑوں جیسی باتیں کرنے لگی تھی۔ میں تو اسے یوں ہی چھیڑ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی شگفتگی و شادابی اس کی باطنی طمانیت کی غماز تھی۔ میرے لیے تو وہ کسی تخلیق کے مانند تھی جیسے میں نے اسے تراشا ہو۔ اسے شاداں دیکھ کے مجھے ایک سرشاری سی محسوس ہوتی تھی۔ اس سے بہتر خریداری کیا ہو سکتی ہے۔ کرشنا جی کی روح ان کے لیے ہوئے پیسوں کے صحیح تصرف سے بہت خوش ہوگی۔ ساٹھ ہزار روپے کی پیش کش پر نیساں کی خود ساختہ ماں شوکت آرا نے میری دماغی حالت پر شک کیا تھا' خاصی حیران ہوئی تھی کہ میں نے اتنی بڑی رقم کی بولی کیوں لگا دی۔ وہ تو شوکت آرا آگے نہیں بڑھی' میں تو نیساں کے لیے کرشنا جی کی بخشی ہوئی ساری دولت اس کے آگے رکھ دیتا۔

"آپ بتائیے بابر بھائی!" نیساں مچل کے بولی "یہ آپ کا سفر کب ختم ہوگا؟"

مجھ سے فوراً کوئی جواب نہ دیا جا سکا "دیکھو!" میں نے بجھتی بجھتی آواز میں کہا۔ "کب ختم ہوتا ہے' کسی دن تو ختم ہونا ہی ہے۔"

وہ ایک ذہین اور حساس لڑکی تھی۔ اسے فوراً احساس ہو گیا کہ اس سوال کا جواب میرے لیے گراں باری کا سبب ہوگا "میں نے آپ کے لیے بہت دعائیں کی ہیں بابر بھائی!" وہ والہانہ انداز میں بولی۔

"مجھے معلوم ہے۔"

"اور مجھے یقین ہے' میری دعائیں ضرور قبول ہوتی ہیں۔ ہاں' دیر سویر کی بات اور ہے۔"

"بس تم دعا کرتی رہو' کسی دن تو ۔۔۔" میری آواز گھٹنے لگی۔

"خانم آپا کہتی ہیں' آدمی کو ناامید نہیں ہونا چاہیے۔"

"امید ہی سے تو سلسلہ جاری ہے۔" میں نے پژمردگی سے کہا اور موضوع بدلنے کے لیے زریں کی مصروفیات کے بارے میں پوچھا۔ اس کا دریا رواں ہو گیا۔ کہنے لگی کہ زریں کو تو وقت ملتا ہی نہیں۔ خالی بیٹھنا اسے آتا ہی نہیں۔ ہر ایک کی خیر خبر رکھنا' جہاں گیر' نیساں اور زہرہ کی چھوٹی بہن کی

نصابی تعلیم میں مدد کرنا، انہیں ٹوکتے رہنا، تحفے تحائف تقسیم کرنا۔ حویلی میں آئے دن اکھاڑ پچھاڑ ایک معمول بن چکا ہے، آج یہ تبدیلی، کل وہ تبدیلی۔ بار بار نئے سازو سامان کی خریداری۔ کمروں کی آرائش، وزیبائش، نئے نئے کھانوں کا تجربہ، باغ کی نگہداشت، دور دور سے طرح طرح کے پھولوں کے پودے منگوانا اور گلدستے بنانا، روزانہ تقریباً آدھ گھنٹے بیڈ منٹن کھیلنا، ورزش اور یوگا کی مشقیں، مہینے میں ایک بار یتیم خانے کے بچوں کے لیے کھانا بھیجنا، خط لکھنا، کبھی ابا جان کو بمبئی، کلکتے میں جامو کو۔ لائبریری پر اس کی خاص توجہ ہے۔ تازہ رسالے اور کتابیں آتی رہتی ہیں۔ بہت دنوں تک انگریزی کا ایک استاد، انگریزی کے استعداد بڑھانے کے لیے آتا رہا تھا۔ کسی اور شہر میں اس کا تبادلہ ہو جانے کی وجہ سے یہ سلسلہ اب موقوف ہو گیا ہے۔ رات کو دیر تک مطالعہ کرتی رہتی ہے اور جب بھی فراغت ہو، خانم سے ستار بجانے کی فرمائش کرتی ہے اور ہاں۔" یہ تفصیل بتا کے نیساں چہکتی آواز میں بولی "اور ہاں، ایک اور وظیفہ، صبح و شام بابا (بٹھل) کو یاد کرنا، آپ کا ذکر کرنا اور اس بات پر کڑھتے رہنا کہ اتنے دنوں سے آپ لوگوں کا خط کیوں نہیں آیا۔ جب کہیں سے آپ کا خط آجاتا ہے، زری آپا کی خوشی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔"

میں اضطراب آمیز اشتیاق سے سنتا رہا۔ اضطراب یہ تھا کہ کہیں نیساں کے منہ سے زریں کے متعلق کوئی ایسی ویسی بات نہ نکل جائے مگر زریں کا کلمہ پڑھتے ہوئے اس کی زبان رکتی، تھکتی ہی نہیں تھی۔ اتنا کچھ سن کے جانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے وہ میری خوبیاں گنوا رہی ہو۔ اپنے اوصاف سن کے آدمی کو جو مسرت ہوتی ہے، وہی حال میرا تھا۔ میں نے یہی جاننے کے لیے نیساں کو کریدا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ حویلی میں نہ منیر علی کا خاندان اپنے قدیم گھر سے بچھڑ جانے کے ملال سے آلودہ ہے نہ کوئی اور۔ خانم، نیساں، جہاں گیر اور حیدر آباد سے آئی ہوئی سلمیٰ یہ تمام و کمال اس گھر میں شامل ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فروزاں اور یاسمن بھی اس گھر کا حصہ بن جائیں گی کیونکہ یہاں زریں ہے۔ سمندر کے مانند بے کراں۔

گزشتہ کئی دن سے وہ میرے سامنے تھے۔ ان کی آنکھیں چمکتی تھیں اور چہرے دمکتے تھے۔ ان کے اطوار، ان کی باتوں سے سکون جھلکتا تھا لیکن آدمی کے اتنے رنگ دیکھ لیے تھے کہ مشکل ہی سے دیکھے اور سنے ہوئے پر اعتبار آتا تھا، کوئی تہ خانہ آدمی جتنا گہرا نہیں ہوتا۔ ساتویں در میں بھی آدمی کے اسرار نہیں کھلتے۔ اپنی خوشی، دکھ، کینہ اور حسد چھپانے میں آدمی کو بڑی مہارت ہوتی ہے۔ نوٹنکی ہی میں لوگ بہروپ نہیں بھرتے، ہر شخص اس ہنر پر قادر ہوتا ہے۔ بس یہ ہے عام آدمی کا معلوم نہیں ہوتا، نوٹنکی میں بہروپ عیاں رہتا ہے مگر اعتبار کی خوش گمانی کے سوا چارہ بھی نہیں ہے۔ بے شک ایک آدمی، ایک آدمی ہوتا ہے، دوسرا آدمی، دوسرا۔ دو آدمی دو آدمی ہیں۔ کوئی زود حس، زود رنج، کوئی سنگ دل اور کج باطن، کوئی راگ رنگ کا دیوانہ، کوئی سوزو گداز سے عاری۔ لوگ کہتے ہیں، کئی آدمی ایک جگہ جمع ہو جائیں تو برتنوں کی طرح کھڑکتے ہیں۔ اختلاف و انحراف ان کا شیوہ بلکہ خاصہ ہے۔ اختلاف تو فرشتوں نے بھی کیا ہے، حویلی کے مکیں تو پھر بھی آدم زاد تھے۔ آدم زاد تو ابتدا ہی سے ایک دوسرے کے درپے آزار ہو گئے تھے۔ حویلی کے مکین ابھی تک، اتنے دن گزر جانے کے باوجود جُٹے ہوئے، جڑے ہوئے ہیں تو بڑی غنیمت ہے، شاید اس لیے کہ یہ بڑے حادثوں اور سانحوں کے بعد یہاں تک پہنچے ہیں۔ منیر علی کو اپنا آبائی گھر خیرباد کہنا پڑا تھا۔ اگر ہم بروقت انہیں جیسلمیر سے یہاں نہ لے آتے جانے ان پر کیا قیامت گزرتی۔ گو اس عتاب و عذاب کا سبب بھی ہمی تھے۔ خانم بھی تہمت و دشنام کے ایک دور سے گزر کے یہاں آئی ہے۔ بالا خانے پر کوئی عورت، عورت نہیں رہتی، وہ کچھ اور ہو جاتی ہے۔ وہ مورتی ہو جاتی ہے۔ خانم۔ خود کو بہت محدود کر رکھا تھا لیکن تعلق تو اس کا بالا خانے ہی سے تھا۔ نیساں اتنی بڑی نہیں تھی پر ہوش مندی کی عمر میں اس نے بالا خانے کے دن دیکھے تھے۔ سوتے دنوں اور جاگتی راتوں کا وہ زمانہ، وہ دن اسے خوب یاد ہوں گے۔ وہیں ہوتی رقص و موسیقی کی تعلیم سے آراستہ ہو کے محفل میں بیٹھ چکی ہوتی اور اگر ہم سلمیٰ کو بے آسرا چھوڑ کے چلتے بنتے تو وہ کیا خصلت ارشد علی، سلمیٰ جیسی نرم و نازک، خوش و نہاد اور پاک باز لڑکی کو کس رسوائی سے دوچار کر دیتا۔ اس نے سلمیٰ کو چور تو بنا ہی دیا تھا اور زریں کا بھی یہی کچھ ماجرا تھا۔ وہ اس فاحشہ نسترن کے پھندے میں پھنس چکی تھی۔ اسے بھی بالا خانے میں سجا دیا جاتا۔ وہ بھی کٹھ پتلی بن گئی ہوتی۔ زریں یہ ذلت برداشت نہ کر پاتی۔ وہ چوڑیاں پیس کے پھانک لیتی۔ حویلی کی زندگی سب کے لیے نئی زندگی تھی اور نئی زندگی انہیں اس لیے عزیز ہونی چاہیے تھی کہ بیتے وقت نے ان سے بہت مخاصمت اور عداوت کی تھی۔ وہ سارا کچھ ان کے لیے کسی بدترین خواب کے مانند ہونا چاہیے۔ نئے وقت میں روشنی، نرمی اور کشادگی بے حساب تھی۔ یہ گھر اور یہاں سے بالکل مختلف تھا۔ یہاں درد مشترک کی بنیاد پر رشتے استوار ہوئے تھے۔ بہ قول شاعر۔ "بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب سہی" یہاں آدمی، آدمی کی پناہ تھا، آدمی، آدمی کا قدر داں اور زریں ان کے درمیان تھی۔ وہ ترک کی رمز سے آشنا تھی۔ ترک کیا ہے؟ ترک ایثار ہے اور شاید سب سے اعلیٰ انسانی وصف ہے۔ میں نے دیکھا تھا۔ وہ سب زریں ہی کو مختار سمجھتے ہیں اور زریں نے اپنا اختیار ان پر نثار کر دیا ہے، اور زریں کی مثال ان کے لیے درس کا درجہ رکھتی ہے۔ سب نے اسی طور میں امان سمجھی ہے۔ وہ سارے ایک دوسرے کو رعایت دیتے ہیں۔ ہر کوئی یہاں خود مختار ہے اور کوئی بھی اپنے اختیار کا داعی نہیں۔ انہیں دیکھ کے زندگی پر اعتبار آتا ہے۔ آدمی میں ایک خوبی اچھائی کی بھی تو ہوتی ہے۔

مجھے یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ حویلی کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ آدمی کی یادداشت خاصی کم زور ہوتی ہے۔ وہ پرانے وقت کے نقش محفوظ رکھیں گے تو نئے وقت کی روشنی، نرمی اور کشادگی کا احساس تازہ رہے گا۔ آدمی جلد بھول جاتا ہے کہ کیسے تنگ و تاریک راستوں سے گزر کے وہ کسی سایہ دار درخت تک پہنچ پایا ہے۔ عجیب بات ہے، سائے، خوشبو، روشنی اور گداز کے تسلسل اور یکسانی سے بھی وہ اکتا جاتا ہے۔ تنوع اور تلون بھی جبلتوں میں شامل ہے اور جبلت کا کوئی کیا کرے۔ کل کی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ کل بھی یہی سکون رائج رہے گا مگر کسی کے پیر میں زنجیر نہیں پڑی تھی۔ بٹھل نے انہیں جتا دیا تھا کہ ہر شخص کا ارادہ اس کے پاس ہے۔ وہ کسی وقت، کسی بھی لمحے دوسرا راستہ منتخب کر سکتے ہیں۔ وہ تسلی رکھیں کہ کوئی وکیل دے گا نہ کوئی مزاحم ہو گا۔ نیساں مجھے بتا رہی تھی کہ یہاں سب ہی ایک دوسرے کے لیے مقدم و محترم ہیں اور سب ایک دوسرے کے حکم کے تابع۔ کوئی اس وقت تک کسی کو نہیں ٹوکتا جب تک وہ خود مشورے کا طالب نہ ہو۔ ان کی احتیاط خود ان کی جانب سے ہے، ان پر محتاط روی کا کوئی دباؤ نہیں۔

یہ میرا گھر، بٹھل کا گھر ہے اور یہ ان سب کا گھر ہے۔ یہ صرف زریں کا گھر نہیں ہے۔ ہم نے یہ گھر بنانے کے لیے کئی بار اپنے آپ کو داؤ پر لگایا تھا۔ سو حویلی پر بری نظر ڈالنے والے کو نہ بٹھل برداشت کر سکتا تھا نہ میں، نہ جامو اور جمرو اور فیض آباد کے اڈے کے بہت سے لوگ۔ اور زریں ایک ایسی لڑکی ہم سب کی حاکم تھی اور خود اسے اپنی حکومت کا علم نہیں تھا۔ زریں کا کوئی زور تھا نہ جبر۔ اس کا جلال تو اس کے جمال میں تھا اور یہ جمال محض تراشے ہوئے لب و رخسار، شفق گوں رنگت اور سانچے میں ڈھلے ہوئے سراپا کا نہیں ہوتا، یہ تو ذکاوت، حلم، ایثار اور تپاک سے بھی عبارت ہے۔ کوئی پری زادہ، ماہ پیکر، بہت بے ذوق، کم نگاہ اور ستم شعار، کوئی بے تناسب اور کم رو نہایت نرم و شیریں خوش نظر و خوش اطوار ہو سکتا ہے اور نہیں بھی ہوتا ہے۔

زریں کی جستجو میں نیساں مجھے حویلی کے اس حصے میں لے آئی جہاں منیر علی کا خاندان مقیم تھا۔ حویلی کا ایک گوشہ ان کے لیے مختص کر دیا گیا تھا۔ منیر علی کی بڑی بیٹی زہرہ ایک طرح فیض آباد آئی تھی اور میں اسے آپ سے مخاطب کر رہا تھا تو وہ ناراض ہو گئی تھی۔ زہرہ سے میری ایک نسبت خاص یوں تھی کہ اس نے جیسلمیر میں کورا کے ساتھ وقت گزارا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب ہو گئی تھیں۔ زہرہ نے کورا کے بارے میں مجھے بہت سی باتیں بتائی تھیں۔ اس نے بتایا تھا کہ نرجس (کورا) کو تو جب دیکھو، اپنے آپ میں گم رہتی تھی، ذرا سی آہٹ سے چونک پڑتی؛ جیسے کسی کا انتظار ہو۔ وہ بہت کم کسی سے بات کرتی تھی، ہر وقت جیسے خواب دیکھتی رہتی ہو۔ صبح ناشتے پر زہرہ سے آمنا سامنا ہوا تھا لیکن اب اپنی طرف میرے آنے سے وہ بڑی بے تاب ہوئی اور خاطر میں لگ گئی۔ مجھے اناس کا رس پلایا، گلوری بنا کے لائی۔ وہاں اس کی چھوٹی بہن سلمیٰ کے علاوہ حیدر آباد سے آئی ہوئی سلمیٰ بھی تھی۔ سلمیٰ سے اب تک میری رسمی بات چیت ہی رہی تھی۔ فیض آباد کے اسٹیشن پر جب ہم نے اسے زورا اور جمرو کے ساتھ زریں کی حویلی کے لیے وداع کیا تھا اور ہم آگے سفر کے لیے نکل گئے تھے، تب سے اب تک مہینے گزر گئے تھے۔ اس دوران میں زریں، خانم، زہرہ نیساں اور جہاں گیر نے اسے میرے اور بٹھل کے بارے میں بہت کچھ بتایا ہو گا۔ زہرہ کہتی تھی، کوئی دن ایسا نہیں جاتا تھا جب ہمارا ذکر نہ ہوتا ہو۔ مجھ سے بات کرتے ہوئے سلمیٰ کے ہاں بہت جوش اور شوق تھا۔ شناسائی کے بغیر یہ پذیرائی نہیں ہوتی۔ میری نظروں میں بار بار وہ سلمیٰ بھٹکنے لگتی جیسے ہم نے پہلی بار ریل گاڑی میں دیکھا تھا۔ پولیس اس کے تعاقب میں تھی اور بدباطن ارشد علی اسے ڈبے میں تنہا چھوڑ کے فرار ہو گیا تھا اور پولیس آگئی تھی۔ پولیس کی توجہ سلمیٰ کی طرف سے ہٹانے کے لیے ہم نے سارا زور صرف کر دیا تھا پھر جب سلمیٰ نے زیورات اور جواہر سے بھری ہوئی پوٹلی بٹھل کے آگے رکھی تو ہم سب ہی حیران رہ گئے۔ بٹھل کے استفسار پہ وہ پھوٹ پھوٹ کے روئی تھی۔ وہ سہمی ہوئی دبکی ہوئی سلمیٰ اب

بالکل بدلی ہوئی معلوم ہورہی تھی۔ رخساروں پر لالی پھوٹ رہی تھی۔ حسین تو وہ پہلے ہی کچھ کم نہیں تھی۔ اب تو بات ہی کچھ اور تھی۔ آدمی بھی سارے نہیں تو اکثر پھولوں اور پودوں کے مانند ہوتے ہیں' موافق موسموں کے پابند۔ سلمیٰ نے ایک عرصہ حیدر آباد کے ایک بڑے نواب کے ہاں گزارا تھا۔ محلات کی بودوباش سے وہ خوب واقف تھی۔ ایسی لالہ رخسار لڑکی کو وہاں کی بیگمات نے زنان خانے ہی تک محدود رکھا ہوگا کیونکہ وہ انہی جیسی ہوگی۔ شہزادیاں کیا سونے کی بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ سلمیٰ نے بتایا کہ وہ بڑی بیگم کی منظور نظر تھی۔ ایک عام خادمہ کی حیثیت سے محل میں داخل ہونے والی سلمیٰ نے بہت جلد اپنی فرض شناسی' ذہانت اور سادہ شعاری سے سبھی کو اپنا گرویدہ کرلیا تھا۔ کسی کو کیا معلوم تھا کہ وہ تو ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ ایک بڑے گھر سے اس کا تعلق ہے لیکن سوختگی قسمت کیا کہیئے۔ سلمیٰ کی آواز میں شگفتگی اور شائستگی تھی' کھنک اور لپک۔ وہ ہر لمحے مستعد سی نظر آتی تھی' کسی اشارے کی منتظر' کوئی خدمت بجالانے کے لیے کمربستہ۔

میں وہاں بیٹھا رہا۔ عرصے بعد اس طرح فراغت سے ان لوگوں کے درمیان بیٹھنے کا موقع ملا تھا' ان کی نظروں میں میرے لیے لطف ہی لطف تھا۔ وہ سب ہی میری قربت کے خوگر تھے اور میرے لیے دعا کرتے تھے اور میرا انتظار کرتے تھے۔ بمبئی میں فرخ' فریال' فارہہ' گیتا' اس کی ماں جولین' اس کی ماں شہ پارہ اور چمپا بیگم کا بھی یہی حال تھا اور ہاں رما! اس کا تو معاملہ ہی دگر ہے۔ اسے کون بھول سکتا ہے۔ وہ کسی اور دنیا کی لڑکی ہے۔ میں خود کہنے والا تھا کہ زہرہ نے جیسے میرے منہ کی بات چھین لی۔ ناز برداریاں انداز میں کہنے لگی "بابر بھائی! آپ ہمیں بمبئی کب لے جائیے گا؟" میں نے اس سے وعدہ کیا کہ بس جلد ہی۔ اب شاید زیادہ دیر نہ لگے۔ واقعی انہیں وہاں جانا چاہیے تھا یا فارہہ' فرخ' فریال' اور جولین وغیرہ کو یہاں آنا چاہیے تھا۔ دونوں ایک ہی گھر تھے اور گھر کے بیش تر افراد نے ایک دوسرے کو نہیں دیکھا تھا۔ یقیناً منیر علی نے بمبئی سے آکے ابا جان کی خریدی ہوئی کوٹھی کی کشادگی اور خوش نمائی کی جزئیات اور بمبئی شہر کی رونق' سمندر' سیر گاہوں' بلند وبالا عمارتوں اور روشنیوں کا حال احوال سنا کے انہیں اور بے تاب کیا ہوگا۔ پھر کانتے' مارلی اور پیرو دادا کا ذکر آگیا۔ زہرہ نے ان تینوں کو دیکھا تھا۔ ان کے ذکر پہ وہ خود بھی آزردہ ہوئی' مجھے بھی دل گیر کیا۔ وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ درمیان میں جہاں گیر اور تنویر بھی آگئے تھے۔ زریں اور خانم اس طرف نہیں آئیں۔ ان کے بارے میں معلوم ہوا کہ دونوں باورچی خانے میں مصروف ہیں' بٹھل کے لیے دوپہر کا کھانا بھیجنا ہے۔ اڈے پر کھانا بھیجنے سے مراد تھی کہ انہیں ایک چھوٹی موٹی برات کے لیے کھانا تیار کرنا ہے۔

○☆○

رات کو بٹھل ڈیڑھ بجے کے قریب واپس آیا۔ دونوں باتیں پریشان کن تھیں۔ ایک تو اتنی دیر سے اس کی آمد' دوسرے اس کے ساتھ جامو نہیں تھا۔ میں بیٹھک میں نیم دراز ان کا منتظر تھا۔ کچھ دیر اور ہوجاتی تو مجھے کسی اور کو اڈے بھیجنا پڑتا یا خود جانا پڑتا۔ میرے پوچھنے پر بٹھل یہ کہتا ہوا کہ جامو شہر سے باہر گیا ہوا ہے' اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

میں چوکی سے اٹھ کے لپکتا ہوا اس کے قریب جا پہنچا۔ "کب تک کے لیے؟"

"بول نہیں سکتے' کب لوٹے گا' لوٹے گا بھی کہ نہیں۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

"کیا کہہ رہے ہو؟" میں نے کبیدگی سے کہا۔

"اس کو کام ہے رے۔"

"کیسا کام؟"

"اس نے یا تو سنا نہیں یا ان سنی کرتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہوگیا لیکن میں نے خود کو روک لیا۔ مجھے اتنا ہی سمجھنا چاہیے تھا جتنا وہ بتانا چاہتا تھا یا جتنا میری فہم کے مطابق تھا یا میری صحت کے لیے بہتر۔

حسبِ معمول وہ صبح سویرے اڈے چلا گیا اور رات کو پھر تنہا آیا۔ وہ میرے سامنے آیا تھا۔ نہ میں نے کوئی سلسلہ جنبانی کی نہ اس نے مجھ سے کلام کرنے کی ضرورت سمجھی۔ اس وقت وہ جلد واپس آگیا تھا۔ بیٹھک میں حقہ کاری کرتا رہا۔ گھر کے تقریباً سب ہی لوگ اس کے گرد جمع ہوگئے تھے اس لیے کہ وہ گزشتہ کئی روز سے پورے پورے دن کے لیے اڈے چلا جاتا تھا۔ صبح ناشتے پر کچھ ہی دیر کے لیے اس سے ملاقات ہوپاتی تھی۔ نصیر بابا کو ارشد علی اپنے ساتھ زمینوں پر لے گیا تھا۔ نصیر بابا اطراف کے سبزہ زاروں کی خوب صورتی اور شکار کی کثرت کا ذکر کرکے بٹھل کو اکساتے رہے۔ رات گئے تک محفل جمی رہی۔ خنکی بڑھ گئی تھی لیکن سردی ایسی نہیں تھی۔ ہر محفل بہ قول نصیب میاں "چرندم خرندم" کے بغیر ادھوری رہتی ہے۔ خانم اور بڑی سلمیٰ فنجانوں میں قہوہ بھر کے سب کو پلاتی رہیں اور خشک میوے کی طشتریاں ادھر

گردش کرتی رہیں۔ بٹھل کے حقے کی خوشبو بیٹھک میں ...ئی تھی۔

...رات کا آخری پہر تھا۔ خاص دروازے پر بڑا کنڈا کھٹ...نے اور گھنٹا بجنے کی آواز پر میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ ...می کے ایک گوشے میں دیوار کے ساتھ لٹکی ہوئی زنجیر ...نچنے پر اندر عمارت میں چھت سے ٹنگا ہوا مندروں کی طرح کا بڑا گھنٹا بجنے لگتا تھا۔ بہت ضروری موقعوں پر گھنٹے کی ...کھینچنے کی اجازت تھی اور شاید پہلی بار یا بہت عرصے بعد ...بت آئی تھی۔ میں اِدھر سے باہر آنکلا' اُدھر سے بٹھل۔ ...ں میں سب ہی جاگ گئے تھے۔ سب ہی کا رخ دروازے ...طرف تھا۔ ملازمہ شکورن نے پہلے دروازے کے وسط میں ...ب چند انچی قطر کے سوراخ کی لکڑی کو کھسکا کے پوچھا ...نا ہے؟"

جواب میں مما کی گھبرائی ہوئی آواز گونجی "ارے ...رن بی! بابا سے بولو! استاد سلامی آئے ہیں' ضروری کام ...۔"

احتیاطاً میں نے کرتے کی جیب میں تمنچا اور چاقو رکھ لیا اور میرا ہاتھ جیب ہی پر تھا۔ بٹھل نے حیران وپریشان ...رے حویلی کے مکینوں کو اپنے اپنے کمروں میں واپس جانے ...شارہ کیا۔ وہ جانا نہیں چاہتے تھے لیکن بٹھل کو دوبارہ ہاتھ ...نے کی ضرورت نہیں پڑی' وہ دور ہوگئے۔ شکورن نے ...ازہ کھول دیا۔ مما کے ساتھ تین آدمی حواس باختہ انداز ...اندر آئے۔ ان میں اڈے کا نگراں استاد سلامی' بٹھل کو ...کے جھپٹتا ہوا اس کی طرف بڑھا اور ادھر ادھر نگاہیں ...اتے ہوئے اس نے کچھ کہنا چاہا' بٹھل نے اسے روک ...

"آ' اندر چل۔"

تینوں کے چہروں پر وحشت چھائی ہوئی تھی۔ بیٹھک کی ...پر بیٹھنے سے پہلے استاد سلامی نے سنسناتی آواز میں کہا ...تاد غضب ہوگیا۔"

بٹھل نے آنکھیں میچ لیں۔

سلامی کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اس ...بے ترتیبی سے بتایا کہ ابھی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے پہلے ہریا اور ...ا کے چھوٹے بھائی لچھو کو ختم کردیا گیا ہے۔ اڈے سے ...وکے ہریا' لچھو کے ساتھ لکشمی داس کے محلے میں معمول ...کے دورے پر تھا کہ انہیں چاقو مار کے ہلاک کردیا گیا۔ ایسا ...علوم ہوتا ہے' اندھیرے میں تاک لگائے ہوئے آدمیوں ...نے اچانک ان پر حملہ کیا۔ دونوں کو سنبھلنے کی مہلت ہی نہیں ...پے درپے وار کیے گئے۔ حملہ کرنے والوں کی تعداد بھی زیادہ ہی ہوگی کہ ایسا شوروغل نہ ہوسکا۔ دونوں کی لاشیں قریب کی اندھیری گلی میں پھینک دی گئیں۔ ادھر انہوں نے ہریا اور لچھو کو ختم کیا' ادھر ان کے دوسرے ساتھی لکشمی داس کے گھر میں داخل ہوکے اس کی لڑکی برکھا کو اٹھا کے لے گئے۔ چند دن ہوئے' لکشمی داس نے گھر کے ایک حصے میں ایک ادھیڑ میاں بیوی کو ملازم رکھ لیا تھا۔ مرد اچھا جان دار اور جی دار شخص تھا۔ عورت کے بیان کے مطابق اس کے شوہر نے لاٹھی سنبھال لی اور ایک دو کو زخمی کردیا تھا لیکن وہ تعداد میں کئی تھے۔ انہوں نے اس کے شوہر کے پیٹ میں چاقو گھونپ دیا۔ عورت کی آہ وبکا' برکھا اور لکشمی داس کی چیخ وپکار پر کوئی پڑوسی مدد کو نہیں آیا۔ دبلے پتلے لکشمی داس نے بساط بھر مزاحمت کی کوشش کی مگر انہوں نے اس کے سر پہ کسی بھاری چیز سے ضرب لگائی یا اس کا سر دیوار سے ٹکرایا' وہ بے ہوش ہوگیا' عورت بھی یہ منظر دیکھ کے اپنے حواس کھوچکی تھی۔ لکشمی داس نے ہریا کے مشورے پر ایک گورکھا دربان بھی تعینات کیا تھا۔ سب سے پہلے وہی نشانہ بنا۔ لکشمی داس کو زخمی حالت میں بڑے اسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔ اس کے بچنے کی امید کم ہے۔ پولیس ہریا اور لچھو کی لاشیں تھانے لے گئی ہے۔"

بٹھل خاموش رہا اور استاد سلامی کے چپ ہوجانے پر اس نے سرہلانے پر اکتفا کیا۔

"ایسا یہاں کبھی نہیں ہوا۔" سلامی کی آواز تمتما بھی رہی تھی' ماتم وکناں بھی تھی "ایسا کبھی نہیں ہوا استاد! ہریا اپنے اڈے کا ہیرا تھا۔"

بٹھل بے حس وحرکت بیٹھا رہا۔

"ادھر اڈے پر وہ سارے بہت پاگل ہورہے ہیں۔ مشکل سے ان کو روک کے آیا ہوں۔ ان کے سر پہ خون سوار ہے۔ بولتے ہیں' ہریا' لچھو کی ارتھی پر ان حرامی پلوں کے خون سے رنگی چادر چڑھائیں گے تب ہی ان کو چین آئے گا۔"

"تو کیا بولتا ہے۔" بٹھل نے ترشی سے پوچھا۔

"میں' میں کیا بولوں۔" استاد سلامی اضطراری انداز میں بولا "اپنی پوچھتے ہو تو اپنا خون بہت کھول رہا ہے استاد! قسم سے' تم کو کیا بولوں۔ اپنا دماغ گھوم رہا ہے۔ اپنے کو معلوم ہے' کس طرف جانا ہے۔ بس تم اجازت دیو۔"

"تجھ کو اب اڈے پر نہیں بیٹھنا چاہیے۔" بٹھل نے ناگواری سے کہا۔

"کیوں؟ کیا' کیا بولتے ہو استاد؟" سلامی بوکھلا گیا۔

بٹھل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چند لمحے سناٹا طاری رہا پھر بٹھل چوکی سے اٹھ گیا اور سلامی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اس نے تھپکی دی اور سوجی ہوئی آواز میں بولا "تھوڑا ولب کے رکھ کاکا۔"

سلامی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھا کیا۔

"چل دیکھتے ہیں ادھری چل کے۔" بٹھل نے آہستگی سے کہا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

سلامی کی حالت دگرگوں تھی۔ اس نے اپنا سر میرے شانے سے ٹکا دیا اور ہڑکنے لگا "نہیں نہیں سلامی بھائی! ایسے نہیں، حوصلہ رکھو، ذرا صبر سے کام لو۔" مجھ سے اس کی تسلی تشفی نہیں کی جا سکی۔ خود میرا حال اس سے مختلف نہیں تھا۔

"خبر ہے، ابھی رات کو اڈے سے نکلتے ہوئے ہریا کیا کہہ رہا تھا۔" سلامی زار زار آواز میں بولا "کہہ رہا تھا، استاد کئی دن ہو گئے۔ اپنے لاڈلے راجا کے درشن کیے ہوئے۔ کیا خیال ہے، کل سویرے ان کی طرف چلتے ہیں۔ تمہارا تو وہ دیوانہ تھا بھیا! کہتا تھا، ان سے بنتی کروں گا، اپنے کو بھی دو چار جادو کے ہاتھ سکھا دو۔ اس دن کے بعد سے اٹھتے بیٹھتے وہ تمہارا ہی نام جپتا تھا۔" استاد سلامی کی آنکھوں سے آنسو ابل رہے تھے۔ "ہائے مر گیا حرامی۔"

"میری آنکھیں بھی جل رہی تھیں اور دل بیٹھا جا رہا تھا۔ یکایک مجھے جامو کا خیال آیا، میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا "اور یہ جامو بھائی کہاں ہیں؟"

سلامی کو بھی کچھ معلوم نہیں تھا، اتنا ہی کچھ جو بٹھل نے مجھے بتایا تھا، کہنے لگا کہ جامو صرف ایک دن کے لیے آیا تھا اور پورا دن بھی کہاں ٹھہرا۔ کسی کو کچھ بتائے بغیر چلا گیا اور کچھ معلوم نہیں، کہاں گیا ہے، کب واپس آئے گا۔ اس سے پہلے کہ میں سلامی سے کچھ اور پوچھتا، بٹھل تیار ہو کے آگیا "میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"تو ابھی ادھری رہ، ضرورت پڑی تو بلا لیں گے۔" بٹھل کی آواز بگڑی ہوئی تھی۔

"میں جلد واپس آجاؤں گا، میں چلنا چاہتا ہوں۔"

"نہیں رے، ابھی نہیں۔"

"ابھی کیوں نہیں؟" میں نے درشتی سے کہا۔

"ابھی تجھ کو ادھری رہنا ہے۔"

"یہاں میں کیا کروں گا؟"

"ادھری بھی کیا تیر مار لے گا۔"

"مجھے ہریا اور لچھو کے کریا کرم میں شریک نہیں ہونا؟"

"تیرے بنا بھی پھنک جائیں گے سور کے جنے۔"

"تم سمجھتے کیوں نہیں، میں یہاں اکیلا الجھتا رہوں گا۔"

"پھر میں ادھری ٹھہر جاتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"مطلب ایک ہی ہے رے، ایک آدمی کو ادھری رہنا ہے۔"

"ہاں لاڈلے بھائی! استاد ٹھیک بولتے ہیں۔ سمجھا کر۔" سلامی نے مجھے نرمی سے مشورہ دیا "ادھر پولیس کا چکر چلے گا۔ ابھی تو لوگوں کو معلوم نہیں، سویرے شہر کا کیا نقشہ ہو گا کیا کہا جا سکتا ہے، تم الگ ہی رہو بھیا!"

بٹھل نے کوئی تاخیر نہیں کی۔ وہ تینوں تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے ڈیوڑھی میں داخل ہو کے اندھیرے میں گم ہو گئے۔ سلامی تانگے میں آیا تھا۔ دیر تک تانگے کی آواز گونجتی رہی پھر معدوم ہو گئی۔

میں نے کمرے میں جا کے گھڑی دیکھی۔ سوا تین بج رہے تھے۔ کمرے میں مجھے وحشت ہوئی تو میں نے صحن کا رخ کیا۔ میرا سر بھن بھنا رہا تھا۔ صحن میں کچھ فاصلے پر محرابوں کے درمیان مجھے سائے سے نظر آئے۔ وہ خانم، زریں اور زہرہ تھیں۔ مجھے دیکھ کے وہ روشنی میں آگئیں۔ "خیریت ہے میاں؟"

خانم نے ٹھٹکی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کچھ نہیں، کوئی ایسی بات نہیں، یہ تو ہوتا رہتا ہے ہوتا رہے گا۔" میرے لہجے کی تپش سے وہ اور ہراساں ہو گئیں میں نے دھیمی آواز میں کہا "آپ آرام کریں آپا! آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"ہو سکے تو کچھ ہمیں بھی بتاؤ۔" خانم نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بتاؤں۔" میں نے جھنجلا کے کہا "مجھے خود اتنا نہیں معلوم۔"

خانم نے مزید باز پرس نہیں کی۔ اسے چہروں اور لہجوں کی اچھی پہچان تھی۔ وہ تینوں وہاں سے ہٹ گئیں۔ میں دوبارہ اپنے کمرے میں آکے بستر پر دراز ہو گیا۔ مجھے کسی کل چین نہیں تھا۔ ہریا کا چہرہ بار بار نظروں کے سامنے آجاتا۔ زندگی کیسی بے وقار ہوتی ہے۔ زندگی اور موت میں بس ایک گمان کا فاصلہ ہے۔ آدمی ہر وقت موت کے قریب ہے، موت کے پہلو میں۔ میں جاگتا ہی رہا۔

شام تک اڈے سے کوئی نہیں آیا۔ اندھیرا گہرا ہو گیا باہر کا بھی اور میرے اندر کا بھی۔ میں نے ڈیوڑھی میں

مما سے بات کی۔ اس کا بھتیجا مجھے ٹکرا گیا۔ اس نے بتایا کہ دن بھر شہر میں ہو کا عالم رہا ہے۔ صبح سے لوگ گلی کوچوں میں ٹولیاں بنائے کھڑے تھے کہ پولیس نے دفعہ ایک سو چوالیس نافذ کر دی۔ سارے شہر میں سپاہی گشت کرتے رہے۔ اڈے کے لوگ ہریا اور لچھو کی لاشیں صبح اسپتال سے اڈے لے آئے تھے۔ اڈے پر تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ چار بجے کے قریب دونوں کی ارتھیاں اٹھائی گئیں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ سپاہیوں کی ایک بڑی نفری موت کے جلوس کے ساتھ چلتی رہی۔ لکشمی داس کے ملازم اور گورکھے چوکی دار کی ارتھیاں الگ اٹھائی گئیں۔ شمشان گھاٹ پر ایک اژدحام تھا۔ ادھر اڈے پر لوگ بین کرتے رہے۔ بٹھل اس رات نہیں آیا۔ اڈے کے ایک آدمی کو اس نے نیا جوڑا منگوانے کے لیے بھیج دیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ استاد جامو ابھی تک واپس نہیں آیا ہے۔ وہ فیض آباد کے آس پاس ہوتا تو ہریا اور لچھو کی آخری رسوم کے لیے اس کا انتظار ضرور کیا جاتا۔ بٹھل نے جامو کو کیوں طلب کیا اور وہ اتنی جلدی واپس کیوں چلا گیا؟ بٹھل نے صاف طور سے یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ جامو کلکتے واپس چلا گیا ہے۔ وہ کلکتے واپس جاتا تو مجھ سے اور زریں سے ملے بغیر کیسے چلا جاتا؟ جامو کی اچانک آمد کا مطلب سمجھ میں آتا تھا لیکن اس کے اس طرح غائب ہو جانے کے عقدے سے ل ہی واقف ہو گا۔ یہ کوئی احتیاط ہی ہو سکتی ہے کہ اڈے کے نگراں، جامو کا دست راست اور جانشین استاد سلامی بھی اپنے مربی کے حال احوال سے بے خبر تھا۔ میں نے اپنے طور پر اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارنے کی بہت کوشش کی لیکن کوئی سرا ہاتھ نہیں آیا۔

بٹھل دوسرے دن بھی اڈے پر رہا۔ دوسرے دن میں نے اڈے جانے کی ٹھان لی تھی اور حویلی سے نکل بھی گیا تھا کہ کچھ دور جا کے واپس آگیا۔ مجھے خود پہ اعتبار نہیں رہا تھا۔ آدمی کا سب سے بڑا انتشار خود اس کی بے اعتباری ہے۔ یہ اعتبار بٹھل کو بھی مجھ پر نہیں تھا اسی لیے اس نے مجھے حویلی میں مقید کر دیا تھا۔ دوسرے دن رات کو بھی بٹھل گھر نہیں آیا۔ ہریا اور لچھو کے کریا کرم کے بعد تیسرا دن تھا، مما کے بھتیجے نے مجھے بتایا، صبح سویرے سحر خیزوں کو لکشمی داس کی بیٹی برکھا کی برہنہ لاش گھر کے قریب سڑک پر پڑی نظر آئی۔ ایک کہرام مچ گیا۔ برکھا کی حالت نہایت شکستہ تھی۔ جن لوگوں نے یہ منظر دیکھا ہے، ان کا کہنا ہے کہ جسم پر جا بجا نوچنے کھسوٹنے کے نشانات تھے۔ برکھا کا باپ لکشمی داس

اسپتال میں ہے اور معلوم نہیں' اسے اس سانحے کی اطلاع دی گئی ہے یا نہیں۔ لوگ کہتے ہیں' وہ خود موت اور زندگی کی کشمکش میں ہے۔ ہوش میں آتا ہے تو چیخنے چلانے لگتا ہے۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ وہ پاگل ہو چکا ہے۔

میں نے برکھا کو نہیں دیکھا تھا لیکن اس کا ماجرا سن کے ایک شناسائی سی ہو گئی تھی۔ ہریا ہی نے اس کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ بے حد حسین اور ذہین لڑکی ہے۔ اس کے باپ نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہے۔ گریجویشن تو اس نے کر ہی لیا تھا۔ اپنی بیٹی کے شوق علم کی خاطر باپ نے اس کی شادی مؤخر کر دی تھی۔ وہ اس کی اکلوتی لڑکی تھی۔ لکشمی داس کہتا تھا کہ برکھا میری بیٹی ہی نہیں' میرا بیٹا بھی ہے۔ کہتا تھا' وہی میری زندگی ہے۔ اب لکشمی داس کو بھی ختم ہو جانا چاہیے۔ معلوم نہیں' جو لوگ برکھا کو لے جانے میں کامیاب ہو گئے تھے' وہ انہی کے قبضے میں تھی پھر انہوں نے اسے مار کیوں دیا۔

مما کے بھتیجے نے یہ روداد سنا کے میرے جسم میں آگ لگا دی۔ اس رات استاد سلامی جب ہریا اور لچھو کی موت کی خبر سن کے حویلی آیا تھا تو اس نے بٹھل سے اجازت مانگی تھی اور کہا تھا' اسے معلوم ہے' کس سمت جانا ہے۔ مجھے بھی سمت کا اندازہ تھا۔ شہر کے بہت سے لوگوں کو علم ہو گا۔ پولیس بھی جانتی ہو گی کہ کون اتنا سفاک' اتنا بڑا درندہ ہو سکتا ہے۔ برکھا کے ختم ہو جانے اور اس کے باپ کے پاگل ہو جانے کے بعد یہ قصہ تمام ہو گیا ہے مگر کیا یہ قصہ یہیں ختم ہو جانا چاہیے؟ میرا جی کرتا تھا' اسی وقت گھر سے نکل پڑوں۔ چن چن کے ایک ایک کو ختم کر دیا جائے۔ ایسے آدمیوں کی یہی سزا ہونی چاہیے۔ اس شہر میں بے شک مجھے کچھ لوگ جانتے ہیں لیکن اطراف میں کوئی واقف نہیں ہے۔ استاد سلامی کی طرح بٹھل سے میں کہوں گا تو وہ آگ بگولا ہو جائے گا۔ مجھے خود ہی نکل جانا چاہیے۔ پوچھتا پاچھتا اپنی منزل پر پہنچ ہی جاؤں گا۔

تیسرے دن رات کو ہریا اور لچھو کے تیجے کی رسم ادا کرکے بٹھل گھر واپس آیا۔ وہ بس اپنی صورت دکھانے اور ہماری صورتیں دیکھنے حویلی آیا تھا۔ صبح ناشتے کے بعد چلا گیا۔ رات اور صبح ناشتے کے دوران میں اس سے بات کرنے کا موقع ملا تھا مگر میں نے خاموشی اختیار کی۔ دن بھر حویلی میں میرا کام' جہاں گیر' خانم' تنویر اور نیساں کے ساتھ شطرنج اور کیرم کی بازیاں جمانے' بیڈمنٹن کی مشق کرنے' انواع واقسام کے ذائقے آزمانے' حویلی میں ادھر ادھر مٹر گشت کرنے اور اپنے کمرے میں یا اپنے حجرے میں بند ہو کے گزراں وقت سے آنکھیں چرانے اور وقت دھکیلتے رہنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وقت بھی کیسا آئینے کے مانند ہوتا ہے۔ آدمی کبھی اس سے بہت آنکھیں چراتا ہے اور درگزر کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر وقت آئینہ بھی تو نہیں جسے توڑ دیا جائے' جس سے منہ چھپا لیا جائے۔ وہ سامنے کھڑا رہتا ہے اور ٹھینگا دکھاتا رہتا ہے۔

ہریا اور لچھو کے تیجے کے بعد دو دن اسی طرح گزر گئے۔ بٹھل کا وظیفہ بھی وہی تھا۔ صبح جا کے رات کو کبھی جلدی' کبھی دیر سے واپس آنا۔ اڈے پر اس تواتر سے اس کی آمدورفت کسی سبب کے بغیر نہیں ہو گی۔ اسے نصیب ہی کہنا چاہیے' ہمارے نصیب میں سکون نہیں لکھا تھا' شاید یہی بہتر ہوتا کہ ہم آسن سول سے آگے بڑھ جاتے۔ فروزاں اور یاسمن کا سامان بہت قیمتی تھا لیکن آسن سول سے کلکتہ دور ہی کتنا رہ گیا تھا۔ درمیان میں دو تین جگہ رکتے ہوئے بھی ہمیں چند دن بعد کلکتے پہنچ جانا تھا۔ کلکتے میں یاسمن اور فروزاں کا اثاثہ کسی معتبر شخص کے حوالے کیا جا سکتا تھا۔ وہاں جامو تھا' جمرو اور زورا تھے۔ مگر یہاں آنے کے لیے میرا اصرار اتنا بے جواز بھی نہیں تھا۔ یہاں آئے ہوئے ہمیں ایک وقت گزر چکا تھا۔ زریں' جہاں گیر' نیساں وغیرہ کے خیال سے زیادہ حویلی میں نووارد فیروزاں اور یاسمن کی دل داری مقصود تھی۔ صرف ایک روز بعد یہاں ہماری آمد سے انہیں یقیناً بڑی طمانیت اور تقویت ملی ہو گی۔ انہیں اس گداز کی بہت ضرورت تھی۔ اس لیے بٹھل بطور خاص ان سب سے زیادہ ان کی پرستش کرتا تھا۔ میں بھی صبح وشام انہیں پوچھتا رہتا۔ یاسمن تو اب مجھ سے خاصی مانوس ہو گئی تھی اور تقریباً سبھی سے گھل مل گئی تھی۔ آسن سول سے آگے بڑھ جانے کے بعد ہمارا کیا ٹھیک تھا' کہاں کون راستہ روکے کھڑا ہو پھر نہ جانے کب اس طرف آنے کا موقع ملتا۔ یہاں آنے کے بعد مجھے ہمہ دم یہاں کے مقصد کا خیال رہا۔ حویلی کے مکینوں کے روزوشب اور معاملات ومشاغل میں ہمہ جاں شامل رہنے کے تاثر میں شاید میں نے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ شاید کسی کو احساس نہ ہوا ہو کہ میری یہاں موجودگی بربنائے وضع ومروت ہے ورنہ میں تو کوئی اور آدمی ہوں۔ میں صرف اپنا بوجھ اٹھائے ہوئے پھرتا ہوں۔ ان کی جانب میری نگراں نگاہیں میری شائستگی اور ادائے فرض پر محمول کرنی چاہئیں۔ میری نگاہیں تو جانے کہاں کہاں بھٹکتی ہیں۔ کسی ایک جانب مرتکز نگاہوں سے یہ مراد نہیں کہ آدمی اسی جانب مصروف دید ہے۔ کسی جگہ میری موجودگی سے مراد میری موجودگی نہیں' میں ہوں اور نہیں بھی۔ غالب نے کہا تھا' ہر چند کہیں کہ ہے' نہیں ہے۔ اپنی اس کجی کی خفت مٹانے کے لیے میں زیادہ سے زیادہ ان کے درمیان رہتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے شبہ ہوتا کہ انہوں نے میری چوری پکڑ لی ہے' میرے اندر کا احوال بھانپ لیا ہے' مگر حرفِ شکایت زبان پر لانے میں پاس وضع' پاس وادب لازم ہے۔ ان کے پاس چارہ بھی کیا تھا۔ انہیں میری خود سری' میرے اصرار کی توانائی اور اپنی اختیار کی ناتوانی کا خوب اندازہ تھا۔ سو یہی قرینہ موزوں تھا کہ وہ مجھ پر اپنی نوازشوں کی ارزانی کریں۔ بچھ بچھ جانا' میرے اشاروں کی جستجو میں رہنا انہوں نے شعار بنا لیا تھا۔ کچھ اسی طرح مجھے زچ کیا جا سکتا تھا یا شرمندہ کیا جا سکتا تھا۔

اس روز میں لائبریری کی طرف نکل گیا۔ یہ ایک پرسکون جگہ تھی۔ یہاں نئی اور پرانی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا۔ شروع شروع میں میرا دل گھبرایا۔ اوروں کا نہیں معلوم' اتنی کتابوں کے درمیان مجھے تو ہمیشہ بڑی کم تری بلکہ بے بسی کا احساس ہوا ہے۔ میں نے وہاں بیٹھے رہنے کی ضد کی۔ ضد' جبر ہے اور جبر سے اچھے نتائج بھی برآمد ہوتے ہیں میں نے افسانوی ادب کی کتابیں تلاش کیں۔ آدمی کا دل سب سے زیادہ کہانیوں میں لگتا ہے۔ کہانیاں' دریچوں اور چلمنوں کی طرح ہوتی ہیں' لفظوں میں جھانک کے دیکھو تو عجب عجب مناظر سے واسطہ پڑتا ہے۔ گیا میں ہمارا بوڑھا پروفیسر کہتا تھا' ثقہ کتابوں میں جی نہ لگے تو افسانوی کتابیں پڑھا کرو۔ یہ وقت کا بہترین مصرف ہے۔ افسانوی کتابیں گداز پیدا کرتی ہیں اور خیال وخواب بیدار کرتی ہیں۔ کہانی کی کتاب ایک طرح کی سیاحت ہے۔ سیاحت میں جس طرح نئے نئے تجربے ہوتے ہیں' کہانیاں بھی زندگی کے نئے نئے رنگ دکھاتی ہیں اور وہ کہتا تھا' کہانی کی ہر کتاب نہیں پڑھنی چاہیے' زندگی اتنی بڑی نہیں ہوتی کہ فضول کتابوں میں وقت گنوایا جائے۔ چنے بغیر ہر طرح کی کتاب پڑھنے سے دماغ منتشر ہوتا ہے' منتخب کتابوں ہی کو ترجیح دینا چاہیے۔ کتاب کی قدروقیمت اس کی ضخامت سے نہیں' متن سے ہوتی ہے۔ متن خیال انگیز' فکر افروز ہو تبھی کتاب ختم کرنی چاہیے ورنہ ادھوری چھوڑ دینی چاہیے اور ہاں پروفیسر کہتا تھا' پرانی کتابوں سے زیادہ نئی کتابوں پر توجہ کرنی چاہیے۔ پرانی کتابوں کی فکر بھی بوسیدہ ہو جاتی ہے۔ زمانے کے ساتھ سب کچھ بدل جاتا ہے۔ اشارے' ذوق' مزاج' لہجے بدل جاتے ہیں۔ آدمی کو ہمیشہ اپنے عہد میں رہنا چاہیے اور آنے والے وقت کے لیے مستعد' پرجوش' پیش قدم۔ اب اتنا وقت گزرنے کے بعد اس کی باتیں مجھے بہت یاد آتی تھیں اور زیادہ سمجھ میں آتی تھیں۔ وہ کچھ انتہا پسند بھی تھا۔ کبھی بہت عجیب باتیں کیا کرتا تھا۔

میں نے کئی چھوٹی بڑی کہانیاں ختم کر ڈالیں۔ یہ اچھا مشغلہ ثابت ہوا۔ مجھے کچھ اپنی بساط کا بھی اندازہ ہوا کہ مجھے کچھ آتا ہی نہیں' میں تو بہت پس ماندہ ہوں۔ اچھی کتاب پڑھ کے کیسی سرشاری ہوتی ہے۔ اچھی تحریر کوئی نشہ ہے۔

ہریا اور لچھو کی موت کا پانچواں دن تھا۔ رات کو بٹھل اڈے سے جلدی واپس آ گیا۔ رات کا کھانا بھی اس نے سب کے ساتھ کھایا۔ میں نے اڈے کے بارے میں اس سے کوئی بات کرنا ہی بند کر دیا تھا۔ بٹھل اس وقت ہلکا پھلکا سا لگ رہا تھا۔ کھانے کے بعد بیٹھک میں محفل جم گئی۔ حقہ سلگا دیا گیا۔ نیساں کچھ طے کرکے آئی تھی۔ بٹھل کی خوش گواری دیکھ کے اس نے چپکے سے کہا "بابا! ایک بات کہوں؟"

"بول ری۔" بٹھل فیاضی سے بولا۔ نیساں نے بھی دبی زبان سے نینی تال دیکھنے کی فرمائش کی تھی کہ بٹھل نے کسی تردد کے بغیر نرمی سے معذوری ظاہر کر دی اور آہستگی سے بولا "ہم نہیں جا سکتے پر دیکھتے ہیں' تیرا کوئی انتظام کرتے ہیں۔"

"نہیں بابا!" نیساں نازبرداری سے بولی "ہمیں تو آپ کے اور بابر بھائی کے ساتھ جانا ہے۔"

"پھر ابھی نہیں ری۔ اپنے کو اب واپس جانا ہے۔ ادھری لوٹ کے جدھر بولے گی' چلیں گے۔ لگام تیرے ہاتھ میں دے دیں گے۔"

"واہ' اب آپ کو جانے کی جلدی ہے۔" نیساں شکایتی لہجے میں بولی "ابھی آئے ہی کتنے دن ہوئے ہیں۔"

"ہاں ری' اب جانے کا ٹائم ہو گیا ہے۔"

"اتنے کم وقت کے لیے آنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"تیرے درشن کو۔" بٹھل نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کے چوم لیا۔

"نہیں بابا!" نیساں حکمیہ لہجے میں بولی "ابھی آپ ٹھہریے' چلیے نینی تال مت جائیے۔"

"اب کے جلدی لوٹیں گے ری پھر تو ادھری رہنا ہے۔"

نیساں کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ خانم نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ نیساں بل کھا کے رہ گئی "اب کب جانا ہے آپ کو؟" وہ اداسی سے بولی۔

"بس جلدی' تین چار دن بعد کو۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ کیوں زری آپا' آپ نے سنا! آپ

کیوں نہیں بولتیں۔" نیساں نے زری کو مہمیز کرنے کی کوشش کی۔

زریں نے مضطرب آنکھوں سے پہلے ...ل کی پھر میری طرف دیکھا اور یاسیت بھری آواز میں بولی "بابا کو کام ہے ورنہ نہ جاتے۔"

"دیکھاری' بٹیا جانتی ہے اور سمجھتی ہے۔"

...ل نے روانگی کے لیے تین چار دن بتائے تھے۔ گویا اب وہ فیض آباد کے اڈے کے کاموں سے نمٹ چکا تھا۔ فیض آباد کے علاقے یعنی بٹھل کے علاقے میں ایک نوجوان لڑکی اغوا کرلی گئی اور ختم کردی گئی۔ ایک شخص پاگل ہوگیا اور جاں کنی کے عالم میں ہے۔ اس کے دو بے گناہ ملازم مار دیے گئے۔ اڈے کے دو آدمی ہریا اور پھو نشانہ بنادیے گئے اور جیسے کچھ نہیں ہوا' جیسے ان سب کو تو مرنا ہی تھا۔ کوئی واقعہ نہیں ہوا تھا۔ موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ بٹھل کو اب واپس جانا چاہیے چنانچہ وہ واپس جارہا ہے۔ استاد جامو بھی اتنے بڑے سانحے کے بعد فیض آباد نہیں لوٹا۔ کلکتے میں جمرو کو بھی خبر ہوگئی ہوگی۔ وہ بھی نہیں پلٹا۔ شاید انہوں نے خاموشی بہتر سمجھی ہے۔ یہی ہوتا آیا ہے۔ چھوٹا حاکم بڑے حاکم سے مغلوب ہوجاتا ہے' یا پھر وہ کسی مناسب موقع کے منتظر ہیں اور اس درمیان میں کوئی اور حادثہ پیش آسکتا ہے۔ بڑا حاکم اپنے اس غلبے پر کیوں قناعت کرے گا۔ اسے اپنے کم تر کو سانس لینے کی مہلت بھی نہیں دینی چاہیے۔ حاکمیت کو اپنے اثر و تسلط کے مسلسل اظہار کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہریا اور پھو کے بعد کوئی اور۔۔۔ وہ مجھ سے بھی واقف ہوگئے ہیں۔ اڈے کی چوکی پہ بٹھل کے مستقل قیام پر بھی وہ نظر رکھے ہوئے ہوں گے اور اڈے سے حویلی کی خاص وابستگی بھی ان کے علم میں ہوگی۔ میرے دماغ میں بہت سے سوال سر اٹھا رہے تھے لیکن نہ یہ موقع تھا نہ بٹھل سے توقع تھی کہ وہ جواب دہی کی زحمت کرے گا۔

رات بہت ہوگئی تو بٹھل نے انہیں آرام کا مشورہ دیا۔ آہستہ آہستہ سب ہی چلے گئے' صرف خانم موجود رہی۔ سب کے چلے جانے کے بعد اس نے بٹھل سے کہا "بابا! آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔"

بٹھل نے منال ہونٹوں سے ہٹالی اور چونک کے بولا "ہاں ہاں بولو؟"

"سوچا تھا' آپ کو خط لکھوں گی لیکن کسی ایک جگہ آپ کا ٹھکانا نہیں ہوتا' میرا مطلب ہے۔ کوئی مستقل پتا۔۔۔" خانم کو بات کرنے کا سلیقہ آتا تھا۔ ابتدا میں اس نے شائستگی سے بات کی' کسی گفتگو ... تصنع کا گمان ہوتا تھا مگر اس کا یہی طور تھا۔ سب اس تکلم کے عادی ہوگئے تھے۔ ممکن ہے' ...نا طرح کسی اور کے جی میں یہ خواہش امڈتی ہو کہ کاش یہ آواز مجسم ہوجائے۔ اس وقت خانم کا تیور خاصا مختلف تھا' اس کے لب و لہجے پر سنجیدگی کا عنصر حاوی تھا۔

"کیا ادھری حیدر آباد کی کوئی بات ہے' نواب لوگ کی؟" ...ل الجھ کے بولا۔

"نہیں بابا! وہ داستان تو ختم ہوگئی۔ وہ لوگ بہت منتیں کررہے تھے لیکن میرے رکے رہنے سے نواب صاحب کو واپس تو آنا نہیں تھا۔ اتنے عرصے تک ان سب کے اصرار نے مجھے مجبور کیے رکھا۔ میرا دل تو یہیں لگا ہوا تھا۔ بے شک نواب بڑے کی نوازشوں کا ٹھکانا نہیں تھا۔ چھوٹے نواب عالم تاب کی بیوہ کی بھی یہی خواہش تھی کہ اپنے شوہر کی نشانی سمجھ کے مجھے اپنے پاس ہی رکھیں' وہ ایک عالی ظرف خاتون ہیں۔ میں نے ان سے التجا کی کہ میرا ایک بھرا پرا گھر ہے جو مجھے سارے جہاں سے زیادہ عزیز ہے۔ وہاں میری بہنیں' میرے بھائی رہتے ہیں۔ وہ میری راہ تکتے ہوں گے۔ کیا بتاؤں' انہوں نے کس مشکل سے اجازت دی۔ چلتے وقت بہت تحفے تحائف دینے چاہے' میں نے معذرت کرلی۔"

"اچھا کیا' ہم سوچتے تھے تھوڑا ٹائم اور بیتنے اور برف جم جانے کے بعد تم کو لانے کے واسطے ایک پھیرا ادھری کا لگادیں گے۔" بٹھل نے بوجھل آواز میں پوچھا "پر تم کو اور کیا بولنا ہے خانم؟"

"یہی کبھی اس گھر' اس حویلی کے بارے میں۔" خانم ادھر ادھر نظریں گھماتے ہوئے کسی قدر بے چینی سے بولی۔

"مجھے خیال ہوا' کہیں میری موجودگی سے تو خانم کی آواز میں گرہ نہیں لگ رہی ہے۔ میں اٹھ گیا۔

"ارے تم' تم کہاں چلے؟" وہ گھبرا گئی "تم آخر کیوں؟ نہیں نہیں' ایسی کوئی بات نہیں۔ تم کیا سمجھے؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے کسمسا کے کہا "بس یوں ہی۔"

"جو بات میں کرنا چاہتی ہوں' اس کا تعلق تم سے بھی ہے لیکن۔۔۔" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"کیا' کیا بات ہے آپی؟" میں نے تذبذب سے کہا۔

"سوچتی ہوں' اب رات بہت ہوگئی ہے۔ اس وقت طبیعت حاضر نہ ہو تو پھر سہی۔۔۔"

"اپنے کو سارا برابر ہے' کیا رات' یا دن۔ تم آگے بولو۔"

بٹھل کی رسمی اجازت پر خانم سر جھکائے تھمی تھمی آواز

...بولی کہ اس حویلی پر خدا کا لطف و کرم بے اندازہ ہے۔ دنیا ...ہر چیز یہاں میسر ہے جو نہیں ہے' اس کی کسی کو جستجو بھی ...ہے۔ جتنا کچھ انہیں فراہم ہے' وہ کتنوں کو نصیب ہوتا ...یہ حویلی بہت کشادہ ہے۔ اس کی نسبت یہاں مکینوں کی ...بھی بہت کم ہے۔ منیر علی کے خاندان کے پانچ افراد' ...چھوٹی سلمٰی' تنویر' ارشد' مجو اور زریں' نیساں' خانم ...اور جمرو غیرہ' کبھی ہم' میں اور بٹھل آجاتے ہیں تو حویلی ...رونق بڑھ جاتی ہے۔ یہاں اور بہت سے لوگ سما سکتے ہیں۔ ...کی کشادگی اپنی جگہ مگر یہاں کے مکینوں کے دل اس سے ...کشادہ ہیں۔"

مجھے شبہ ہوا' کہیں خانم' فروزاں اور یاسمن کی آمد پر تو ...باری محسوس نہیں کررہی۔ بظاہر وہ سبھی شیر و شکر نظر ...ہیں۔ فروزاں اور یاسمن بھی بہت کھلی کھلی لگتی ہیں ...اندر کا حال مختلف بھی ہوسکتا ہے۔ جلد ہی خانم نے ...دھند دور کردی۔ کہنے لگی کہ خدا ہمیں اس نیکی کا اجر ...دے گا۔ ہم نے اتنے ستم رسیدگاں کو اس حویلی کی پناہ ...عزت' عافیت اور مسرت کی ایک نئی زندگی کا موقع دیا ...کون کسی کے لیے اتنا کچھ کرتا ہے لیکن کیا بس بات اسی ...ہوجاتی ہے۔"

خانم نے توقف کیا تو بٹھل نے اکڑی ہوئی آواز میں کہا ...بولو خانم!"

"سمجھ میں نہیں آتا' کس طرح بات کروں۔" خانم ...تے ہوئے بولی "شاید آپ نے غور نہیں کیا۔ حویلی کے ...میں بیش تر نوجوان لڑکیاں ہیں۔ زریں' زہرہ' چھوٹی ...اور بڑی سلمٰی' نیساں' فروزاں اور یاسمن۔۔۔"

"ہاں ہاں' کیا ان کو کسی نے کچھ بولا؟" بٹھل کی آواز ...

"نہیں نہیں' یہ مراد نہیں ہے۔"

"پھر کیا بات ہے؟"

"کیا' کیا یہ سب اسی گھر میں بیٹھی رہیں گی؟"

بٹھل کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"آپ نے ان کے بارے میں کیا سوچا ہے؟ یہ لڑکیاں دوسرے گھروں کی امانت ہوتی ہیں۔"

"ہاں ہاں۔" بٹھل نے اضطراری انداز میں سہلایا۔

"اور انہیں ایک عمر تک ہی گھر میں بٹھانا مناسب ہوتا ...

بٹھل' خانم کی صورت دیکھنے لگا "پھر کیا کریں' تمہی ...

"میں' میں کیا بتا سکتی ہوں۔ یہاں حویلی میں آس پاس کے خاندانوں سے واجبی قسم کا تعلق ہے۔ حویلی کے بارے میں معلوم نہیں' باہر کیا کیا مشہور ہے۔ یہ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے۔ اس کیفیت میں مجھے شبہ ہی ہے کہ اس شہر سے کوئی رشتہ آئے۔ زریں کے اعزا مستقل کنارہ کشی کیے ہوئے ہیں۔ ہم بھی کہیں نہیں جاتے۔ جیسا میرے آنے کے بعد بڑے صاحب منیر علی کا اپنے عزیز و اقارب سے کوئی واسطہ نہیں رہا ہے۔ رشتے میل جول' رسم و راہ سے آتے ہیں۔ ہماری لڑکیاں ہر اعتبار سے مثالی ہیں لیکن شاید یہاں کوئی رشتہ نہ آئے' پیغام ایسے نہیں آجاتے۔"

بٹھل گم صم ہوگیا۔

چند لمحے سکوت کے بعد خانم آزردہ لہجے میں بولی کہ منیر علی بمبئی جاکے ایسے بسے ہیں جیسے یہاں ان کی ضرورت ہی نہ ہو۔ بزرگ ہی یہ سلسلے بڑھاتے ہیں' انہی کی زبان سے سنا ہے' وہاں بمبئی میں ابا جان نے ایک عالی شان کوٹھی خریدی ہے۔ اس کی تزئین و آرائش دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے لیکن وہاں بھی یہی کچھ صورت ہے۔ وہاں بھی نوجوان لڑکیاں ہیں' فرخ' فریال' فارہہ' جولین' گیتا' شہ پارہ وغیرہ۔ ابا جان نے ان کے بارے میں معلوم نہیں' کیا سوچا ہے۔ آج نہیں تو کل' انہیں اس طرف توجہ کرنی ہوگی۔"

بٹھل چپ بیٹھا رہا' اس کے ہونٹ سکڑ گئے تھے۔

"بس یہی کچھ کہنا چاہتی تھی۔" خانم دھیمی آواز میں بولی "یہاں کوئی پریشانی نہیں' یہ گھر تو جنت کے مانند ہے۔ وہ زندگی ایسے بھی گزار سکتی ہیں لیکن ایسا ہوتا نہیں۔ فروزاں کے متعلق سنا ہے' اس کا رشتہ والدین طے کرگئے ہیں اور آپ سے معلوم ہوا ہے' وہ لڑکا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ ظاہر ہے' والدین نے سوچ سمجھ کے ایسی ہیرا لڑکی اس کے لیے منتخب کی ہوگی مگر اس کے بعد یاسمن یہاں' اور دوسری بھی ہیں۔"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔" طویل وقفے بعد بٹھل بڑبڑا کے بولا۔

خانم نے پھر کچھ نہیں کہا' اپنے آپ میں گم بیٹھی رہی پھر اس نے بٹھل سے کسی چیز کی خواہش کے بارے میں پوچھا۔ بٹھل کے انکار پر وہ اٹھ گئی۔ بٹھل کے پاس تو حقے کا شغل تھا۔ میں اپنی انگلیاں توڑتا' ناخن کریدتا رہا۔ جب تک بٹھل نے اپنے کمرے کا رخ نہیں کیا' میں وہیں رہا۔

اس رات میری طرح بٹھل کے رگ و پے میں بھی اینٹھن ہورہی ہوگی۔ خانم تو جیسے کانٹے بکھیر کے چلی گئی تھی۔

کوئی دوسرا آئینہ دکھاتا ہے تو اس کا عکس زیادہ گہرا اور شدید ہوتا ہے۔ اس نے ایسا کوئی انکشاف نہیں کیا تھا مگر آدمی کتنی حقیقتوں سے آشنائی کے باوجود کیسا غافل رہتا ہے۔ غفلت بھی جہالت ہے۔ آدمی کو بیش تر اپنے صبح و شام، گردوپیش، اپنے سامنے ہی کا نظر آتا ہے۔ عقب کا، دور کا، اطراف کا اس قدر نہیں۔ دنیا کے اپنے رنگ ڈھنگ ہیں۔ آدمی دنیا کا پابند ہے، دنیا آدمی کی نہیں۔ آدمی کو انہی راستوں پر چلنا پڑتا ہے جو ہموار کردیے گئے ہیں۔ لڑکیاں جہاں پیدا ہوتی ہیں، وہ ان کا گھر نہیں ہوتا۔ شہزادیوں کو بھی محل چھوڑنے پڑتے ہیں۔ جنہیں ہم نے خانم کے بہ قول عزت و عافیت کی زندگی سے ہم کنار کیا ہے، وہ ایک ادھورا کام ہے، یہ عارضی پناہ گاہ ہے۔ ابھی انہیں کہیں اور جانا ہے۔ آگے ان کے فیصلے بھی ہمیں کرنے ہیں۔ ان سب کو چلے جانا ہے۔ زریں جو اس حویلی کی دھڑکن ہے، اسے بھی یہاں سے چلے جانا ہے۔ یہ حویلی اس کے بغیر کیسی لگے گی۔ میرے لیے اس منظر کا تصور ہی وحشت انگیز ہے کہ زریں کسی اجنبی یا شناسا کے ساتھ یہاں سے وداع ہورہی ہے۔ گویا زریں ہماری ملکیت نہیں ہے اور ہم پر اس کا اختیار عارضی ہے۔ لڑکیاں پیدا ہی کیوں ہوتی ہیں اور ہوتی ہیں تو ایسا ہی کیوں ہوتا ہے۔ خانم کا مخاطب میں بھی تھا حالانکہ وہ جانتی تھی کہ میری بات تو جداگانہ ہے۔ میں تو کوئی اور آدمی ہوں۔ مجھے اپنے آپ ہی سے فرصت کہاں ہے۔ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ میری بھی تین جوان بہنیں ہیں۔

میرا سر جیسے دھنک رہا تھا۔ بٹھل بھی جاگ رہا ہوگا، جی میں آتا تھا، اس کے پاس جا کے بات کروں لیکن یہ سوچ کے رہ گیا کہ اسے اور تنگ کروں گا۔ اس کے پاس کون سی جادو کی چھڑی ہے۔ وہ تو بیش تر اڈوں باڑوں میں رہا ہے۔ میرا بھی ایک زمانے سے کون سا گھر سے تعلق ہے۔ سات سال جیل میں گزرے اور کئی سال سے سفر جاری ہے۔ ہم دونوں کو کسی گھر کے قواعد و ضوابط کا تجربہ ہی کتنا ہے۔ ہمیں تو چاقو بازی کا تجربہ ہے، اڑتی چڑیا کو نشانہ بنا سکتے ہیں مگر ہر جگہ زور وبازو کام نہیں آتا، نہ دولت کام آتی ہے۔ گویا سب کی سب حسن و جمال میں یکتا ہیں، ایک سے بڑھ کے ایک، سلیقہ شعار، خوش گفتار، تعلیم یافتہ اور صاحب کردار۔ ان کے ساتھ زندگی بسر کرنے والے بھی پھر انہی جیسے ہونے چاہئیں۔ خانم کہتی تھی یہ حویلی کسی جنت کے مانند ہے مگر یہ جنت تو ایک جزیرہ ہے۔ ایک جزیرہ جہاں باہر کی دنیا کی معدودے چند لوگوں کے سوا کسی سے کوئی رابطہ واسطہ نہیں۔ باہر کے لوگوں کو حویلی میں آباد لوگوں کے صفات و کمالات کی کیا [illegible] کون انہیں بتائے کہ یہاں کیسے نادر لوگ بستے ہیں۔ یہ تو [illegible] کے مانند ہیں، انہیں پھولوں سے شغف ہے، نہ کتابیں [illegible] ہیں اور نہ دل نشین باتیں کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کا [illegible] واحترام ان کا شعار ہے اور ان میں ایک دوسرے کو [illegible] کرنے، رعایت دینے کی خوبدرجہ کمال ہے۔

شہر میں سب کو معلوم ہے کہ اڈے کے آدمیوں [illegible] زریں کی حویلی اس کے غاصب رشتے داروں سے [illegible] کرائی ہے۔ فہمیدہ کا واقعہ بھی وہ نہیں بھولے ہوں [illegible] فہمیدہ کا تعلق بھی بازار سے تھا۔ بہت سوں نے دیکھا تھا [illegible] بازار سے فہمیدہ کا جنازہ حویلی میں آیا تھا۔ انہیں معلوم [illegible] کلکتے میں مقیم فیض آباد کے اڈے کا مشورہ زمانہ استاد [illegible] فیض آباد کی... حویلی میں ٹھہرتا ہے۔ اس کے چھوٹے [illegible] جمرو کا قیام بھی یہیں رہتا ہے۔ یہ سب ان کا چشم دید [illegible] حویلی میں ایک بڑا استاد، استاد بٹھل کبھی کبھی آکے [illegible] ہے، جب وہ حویلی سے نکلتا ہے اور فیض آباد کی سڑکوں [illegible] گزرتا ہے تو اڈے کے آدمی اسے جلو میں لیے ہوتے [illegible] اڈے پر اس کے زور داشت کے فسانے بھی انہوں نے [illegible] ہوں گے۔ ابھی چند دن ہوئے، میں نے بھی ہریا اور نو [illegible] بیچ میں پڑ کے انہیں کچھ جتایا تھا۔ وہاں بہت سے لوگ [illegible] اجتماع تھا۔ کتنے لوگوں نے میری شجاعت، چاقو پر میری [illegible] کا تماشا دیکھا تھا۔ کون کس کو باور کرائے کہ ایسا چہ [illegible] ہے، جیسا وہ سمجھتے ہیں، جیسا انہیں تلقین کیا گیا ہے [illegible] سے وابستگی سے یہ مراد کہاں ہے کہ یہ حویلی اڈے کا [illegible] حصہ ہے۔ اڈے کے ہر آدمی کو یہاں آنے کی اجازت [illegible] ہے۔ جو یہاں آتے ہیں، وہ یہاں کے مکینوں کے سا[illegible] نہیں اٹھاتے۔ وہ جیسے کسی عبادت گاہ میں آتے ہیں [illegible] آکے وہ اڈے کے آدمی نہیں رہتے، وہ گھر میں آتے [illegible] کون اتنے لوگوں کی بدگمانیاں رفع کرے گا کہ ان کا [illegible] جانا ایک بہتان ہے۔ میلے کپڑے دھل کے اجلے ہو [illegible] ہیں، غسل سے ناپاک آدمی پاک ہوجاتا ہے۔ بڑے بڑے [illegible] مندمل ہوجاتے ہیں۔ بڑی گہری سیاہیاں مٹ جاتی ہیں [illegible] کسی حادثے یا سانحے کی وجہ سے کسی لڑکی کا واسطہ باز[illegible] ہوجائے تو سمندر بھی ناکافی ہے۔ عبادت گاہوں سے [illegible] آکے لوگ کیا دوبارہ ناپاک نہیں ہوتے۔ بازار کی ترک کردینے کے باوجود کیا کوئی کبھی پاک صاف ہوسکتا۔ لوگ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ کون اپنی مرضی سے وابستہ ہے اور کون وہاں کے پنجرے میں پھڑپھڑا [illegible]

[illegible] کا لگانے والے خطا کار کون تھے۔ سارے بازار [illegible] بازار میں پیدا نہیں ہوتے۔ سنا ہے، خدا بڑی بڑی [illegible] معاف کردیتا ہے، مگر آدمی! آدمی تو بہت تنگ دل [illegible] تے ہیں۔

خانم نے اپنا نام نہیں لیا تھا لیکن خانم کی عمر کون سی [illegible] کرگئی تھی۔ وہ بس زریں کی بڑی بہن معلوم ہوتی تھی [illegible] شکوہ و تمکنت میں کسی سے کم نہیں تھی۔ وہ اپنی بے پناہ [illegible] ہی کی وجہ سے حیدر آباد کے رئیس اعظم مرحوم نواب [illegible] تاب کو مطلوب ہوگئی تھی۔ اس کا نقش اتنا گہرا تھا کہ [illegible] سے اس کی جدائی برداشت نہ ہوسکی۔ خانم کے انداز [illegible] میں ایسی دل کشی تھی کہ نواب کے پس ماندگان اسے [illegible] پاس ہی رکھنا چاہتے تھے۔ حیدر آباد کے بازار محبوب کی [illegible] کی بات اور تھی۔ وہاں کے رسم و رواج الگ ہوتے [illegible] یہاں خانم ایک گھر میں رہتی تھی۔ اس کے آگے بھی یہ [illegible] زندگی پڑی تھی۔ تاہم وہ اپنی زبان سے کس طرح [illegible] کہ اس کا بھی اپنا ایک گھر ہونا چاہیے۔ اس نے مختصر [illegible] میں اپنا مدعا بیان کردیا تھا۔ حویلی کی چھاؤں، اس کے [illegible] کی سرخوشی، راست بازی اور پاکیزگی کتنا ہی بڑا سچ ہو، [illegible] کے لوگوں کی توثیق ان کی سند کے بغیر ایک واہمہ ہے۔ [illegible] کے لوگ اسے معتبر قرار دیں گے، تبھی یہ معتبر ہوگی۔

خانم نے بمبئی میں ابا جان کے گھر کی طرف بھی اشارہ کیا [illegible] وہاں ایسی بات نہیں تھی۔ بمبئی ایک بڑا شہر ہے۔ وہاں [illegible] ایک دوسرے کے قریب رہ کے بھی قریب نہیں [illegible] تے۔ نہ وہ ٹوہ میں لگے رہتے ہیں۔ انہیں اپنی ہی بھاگ دوڑ [illegible] فرصت نہیں ملتی۔ بڑے شہر کے لوگوں کی یادداشت بھی [illegible] کمزور ہوتی ہے۔ بمبئی میں ابا جان اپنی شان و شوکت کے [illegible] مارے خود گزرے تھے اور خود عائد کردہ شدائد اور [illegible] کی تلافی کررہے تھے۔ وہ شاید ساری دنیا خریدنے کے [illegible] تھے۔ دولت مندوں کی بات تو ہر جگہ بالا ہوتی ہے مگر [illegible] شہروں میں غریب اور ناتواں لوگوں کی خوب پردہ پوشی [illegible] ہے۔ بڑے شہروں میں ذات پات، چھوت چھات، [illegible] کسی کے ماضی و مستقبل سے ایسا سروکار نہیں ہوتا۔ [illegible] رما جیسی شعلہ صفت لڑکیاں رہتی ہیں، ہر دم کچھ نیا [illegible] نیا کرنے کے لیے بے تاب اور کیلاش جیسے نوجوان۔ [illegible] عالی مقام خانوادے کی وہ نوجوان لڑکی رما... بڑے ذوق [illegible] ابا جان کے گھر آتی ہے اور سب سے گھل مل جاتی [illegible] اس کی بے باکی، روشن خیالی اور آزادی... میں کسی قسم [illegible] ہماری نہیں ہے۔ وہ ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ گھریلو تعلیم و تربیت کے علاوہ رما کے ہاں کچھ خود اس کی افتادِ طبع، کچھ بڑے شہر کے بے نیازانہ اور فراخ دلانہ ماحول کا بھی بڑا دخل ہے۔ اس کی رفاقت میں کوئی تلاطم سا سینے میں بیدار ہوجاتا ہے۔ وہ میری دوستی کی مدعی ہے اور بس، اس کے سوا اس کا کوئی ادعا نہیں۔ وہ کہتی ہے "تم سے میرا تعلق خاطر میرا اپنا معاملہ ہے۔ تم اپنے مثبت یا منفی رد عمل کی زحمت میں نہ پڑنا، ہاں میری کوشش ہوگی، میری آرزو ہے کہ تم مجھے محسوس کرتے رہو۔" ایک بار اس نے ایسا ہی کچھ کہا تھا۔ وہ مجھے کشتی میں بٹھا کے دور پانیوں میں لے جاتی ہے اور میرا سر اپنے زانو پر رکھ کے میری چارہ سازی کے لیے بے قرار رہتی ہے اور اس کا بھائی، خوش کلام و جامہ زیب نوجوان ڈاکٹر کیلاش اوسط درجے کے گھر سے تعلق رکھنے والی ایک لڑکی جولین کا طلب گار ہے۔ جولین کے لیے وہ اپنے باپ کے آن جہانی جج دوست کا بڑا ترکہ قربان کردینے کے درپے ہے۔ یہ کیسا عجوبہ ہے، ہر جگہ ایک جیسے آدمی ہوتے ہیں۔ جگہ جگہ ان کے تیور بدلے ہوئے ہیں۔ دنیا کے طور طریقے جگہ جگہ جدا ہوتے ہیں۔ بڑے شہروں میں چھوٹی بڑی بستیوں سے آکے لوگ آباد ہوتے ہیں اور کیسے مختلف ہوجاتے ہیں۔

کچھ ابا جان کو بھی احساس ہوگا۔ وہ ایک دور اندیش آدمی ہیں۔ ہر طرف ان کی نگاہ جاتی ہے۔ جزئیات میں تو وہ بے مثال ہیں۔ انہیں احساس ہونا چاہئے، وہ کتنے ہی محل تعمیر کرلیں، موٹر کاریں، چار گھوڑوں کی سواری، مصاحبوں اور خدمت گاروں کا لاؤ لشکر جمع کرلیں، ان کے وابستگان کی آسودگی کے بغیر ان کی بادشاہت ادھوری ہے۔ بادشاہ کا سکون، رعایا کے سکون سے پیوستہ ہے۔ ابا جان کوئی برے آدمی نہیں ہیں، وہ بمبئی میں اتنے لوگوں کو اپنے گھر، اپنی قلمرو میں جمع کیے ہوئے ہیں تو یہ ان کی خوئے خسروانہ ہے۔ وہ اپنے لیے بطور خاص الگ محل بھی بنواسکتے تھے۔ دولت کی ان کے پاس کمی نہیں ہے۔

شاید یہی بہتر ہے کہ فیض آباد کی حویلی کے سارے مکین بمبئی منتقل ہوجائیں، ویسے بھی سب کو ایک ہی جگہ ہونا چاہیے۔ دونوں گھر ایک ہی ہیں۔ بمبئی اور فیض آباد میں فاصلہ بھی بہت زیادہ ہے۔ بمبئی شہر ان سے ایسی مغائرت نہیں برتے گا مگر وہ بمبئی ہو یا فیض آباد یا کوئی اور جگہ، لوگ سڑک پر پڑے ہوئے تو نہیں مل جاتے۔ اچھے آدمی بہت کم یاب ہوتے ہیں۔ دولت کتنی ہی کرشمہ کار ہو، ہر آدمی پر اس کا طلسم کارگر نہیں ہوتا اور اچھے آدمی کا تو کوئی مول بھاؤ نہیں ہوتا۔ صرف ابا جان، بٹھل اور منیر علی کی تن دہی،

مستعدی کافی نہیں' مجھے بھی یوں ہاتھ توڑے نہیں بیٹھے رہنا چاہیے۔ آگے کسی سفر سے پہلے مجھے اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھانا چاہیے۔ میری سرگرمی انہیں بھی مہمیز کرے گی۔ چند روز بعد بٹھل یہاں سے جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ میں انکار کردوں گا۔ خانم ٹھیک کہتی ہے' وقت تو پھر اسی طرح گزرتا رہے گا اور مزید غفلت کی گئی تو اور دور چلا جائے گا۔ وقت کسی کی نہیں سنتا' اسے اپنی رفتار سے غرض ہے۔ آگے سفر میں کوئی مدت طے نہیں ہے۔ کچھ بھروسا نہیں کہ کہاں کس جگہ کوئی نواب ثروت... یا سید محمود علی راہ میں مزاحم ہوجائے۔ مجھے اپنا یقین استوار رکھنا چاہیے کہ کتنی ہی دیر ہوجائے' وہ میرا انتظار کرے گی۔ مولوی صاحب اسے مجھ سے دور رکھنے کے کتنے ہی جتن کریں' انہیں مایوسی ہوگی' کورا کی آس نہیں ٹوٹے گی۔ میری امید قائم ہے تو اس کی بھی یقیناً قائم ہوگی۔ میرا دل یہی کہتا ہے۔ مولوی صاحب کیا جانیں' میرا اس سے کیا تعلق ہے۔ میں نے اس کے لیے گھر چھوڑ دیا ہے۔ مولوی صاحب خود گواہ ہیں' میں نے اس کے لیے دو آدمیوں کا خون کردیا تھا اور سات سال جیل میں گزارے تھے۔ میں تو ابھی تک کسی زنداں میں ہوں اور اندھیری رات میں بدھ گیا سے اپنے اتالیق اور واحد سرپرست کے قتل کے بعد جان بچا کے جب میرے گھر آئی تھی تو یوں ہی نہیں آگئی تھی' کسی اعتماد میں اس نے میرے گھر کا رخ کیا تھا۔ اپنے مشفق اتالیق کی موت کے بعد اسے حوصلہ ہار دینا چاہیے تھا لیکن کوئی یقین ہی اس کی توانائی کا باعث تھا۔ اسے معلوم تھا' وہ اب اکیلی نہیں ہے۔ کوئی اور بھی ہے جو اس کے لیے بازو پھ ۔ئے کھڑا ہے۔ وہ بھی کچھ طے کرکے آئی تھی۔ وہ خود کو ترک کرکے آئی تھی اور اس نے خود کو میرے سپرد کردیا تھا۔ مولوی صاحب کیا جانیں' ہم دونوں ایک دوسرے کی امانت ہیں۔ دو آدمی ایک نہیں ہوسکتے لیکن ایک اگر دوسرے کے لیے خود کو ترک کردے' صدق طلب ہو تو ترک بھی حصولِ مراد کا ایک قرینہ ہے۔ مولوی صاحب بہت عالم آدمی ہیں مگر اس رمزو عیاں سے ناآشنا ہیں۔ کب تک وہ حجت کرتے رہیں گے۔ ایک دن وہ قائل ہوجائیں گے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بچھڑ گئے ہیں تو یک جائی کے بغیر دونوں ہی ادھورے' دونوں ہی معطل ہیں۔ وہ تو میرا وجود ہے اور میں تو اس کا وجود ہوں۔

مجھے ایک بار نگریا سادات میں حافظ عبدالخالق کے پاس اور جانا چاہیے۔ فیض آباد سے نگریا سادات اتنی دور نہیں ہے۔ ممکن ہے' اس دوران میں مولوی صاحب نے اپنے دوست حافظ صاحب سے رابطہ کیا ہو یا حافظ صاحب کے موجودہ ٹھکانے کا کچھ علم ہوا ہو۔ حافظ عبدالخالق نے وعدہ کیا تھا اور وہ ایسے آدمی نہیں ہیں' اپنی بات کریں گے' نہیں کریں گے تو انہوں نے اچھی طرح جتا تھا کہ ہمیں دوسرے انداز سے بھی بات کرنا خوب آتا وہ رات انہیں یاد ہوگی جب بٹھل نے اپنے اور میرے کی کلائیوں پر چاقو سے لکیر کھینچ دی تھیں۔ یہ لکیریں کلائی پر ابھی تک کندہ ہے۔

مجھے نیند نہیں آئی لیکن کسی عزم کی طمانیت سے ہلکا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے طے کیا کہ کل پہلے زریں پھر بٹھل سے بات کروں گا۔ زریں کے لیے اس حویلی کو کہنا آسان نہیں ہوگا۔ مجھے اس سے عارضی طور پر بمبئی کی بات کرنی چاہیے۔ مستقبل کی بات ہی نہیں کرو بمبئی جا کے دیکھا جائے گا۔ وہاں سے فوراً واپس آنے اس کا جی نہیں چاہے گا اور اسے آنے کون دے گا۔ طرح وہ بٹھل کی چہیتی ہے' اسی طرح ابا جان کی منیر وہاں فرخ' فریال' فارہہ اسے پلکوں پر بٹھائیں گی۔ وہاں ہے اور اس کی نہایت خوش نہاد ماں اور شہ پارہ ہے ہے۔ وہاں اس کی ملاقات رما سے ہوگی۔ دونوں میں باتیں مشترک ہیں۔ بمبئی میں سمندر ہے اور بہت ہیں' کشادہ سڑکیں' اونچی عمارتیں' باغات' وہاں فیض جیسی چار دیواریاں ہیں' ایسے گھر نہیں ہیں' زندان مانند۔ فیض آباد تو بوڑھے بوڑھے گھروں کا شہر ہے۔ جانے کس وقت میری آنکھوں میں نیند اتر آئی۔

○☆○

صبح ناشتے کے بعد حسب معمول بٹھل اڈے چلا میں نے اسے نہیں ٹوکا کہ اب تو ہرا اور لچھو کا تیا ہے اور اڈے کے لوگوں نے گزشتنی نوشتہ دیوار سمجھ قبول کرلیا ہے تو اب وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے کے چلے جانے پر میں لائبریری کی طرف نکل آیا۔ ان کتابوں میں میرا جی نہیں لگا تاہم دیر تک مختلف کتابوں ابتدائی صفحات پڑھ کے انہیں واپس ان کی جگہ رکھا دوپہر کے کھانے پر سب کے ساتھ زریں بھی موجود تھی لمحوں کے لیے وہ میٹھے چاول کی قاب رکھنے میرے قریب تو سرگوشی میں اتنا کہنے کا موقع مل گیا کہ مجھے اس سے کرنی ہے۔ وہ ایک لمحے کے لیے چونکی' پٹ پٹاتی پلکوں اس نے میری جانب دیکھا اور اس کے چہرے کی سرخی ہوئی پھر وہ سنبھل گئی۔ جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں

کے کمرے میں جاسکتا تھا یا اسے اپنے کمرے میں آنے کے لیے کہہ سکتا تھا لیکن کوئی بھی کسی وقت دخل انداز ہوسکتا تھا۔ دن میں متعدد بار میرا اس کا آمنا سامنا ہوتا تھا ان اب تک خلوت میں بات کرنے کی کوئی صورت نہیں بنی مجھے اس سے بہت سی باتیں کرنی تھیں۔ کچھ اطمینان تھا کہ ابھی تو دنوں تک یہاں رہنا ہے یا پھر کچھ ایسا تھا کہ خود ہی گریزاں تھا۔ اس کے سامنے جاتے ہوئے کوئی ہوتی تھی' کسی پشیمانی کا احساس غالب تھا۔ اس کے تکدر کا خوف لاحق تھا یا اس کے ایسے سوالوں کا اندیشہ کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ غالباً کوئی ایسی ہی بات یا پھر میری خواہش تھی کہ وہ خود کسی وقت موقع نکال کے میرے پاس آئے۔ مجھے خود نہیں معلوم' یہ کیا تھا یا کچھ بھی تھا۔ نہ اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ تھا' نہ میرے اعتبار کرتے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ میرے سینے میں اس کا مرتبہ ہے' وہ مجھے کس قدر عزیز ہے' حویلی میں سب سے زیادہ' اپنے چھوٹے بھائی جہاں گیر سے بھی زیادہ اور یہ حقیقت مجھ پر روشن تھی کہ وہ بہرحال میری بامرادی' کامرانی کی رہتی ہے۔ میری نسبت' بے شمار آرزوئیں اس کے خانے میں موجزن ہیں۔ اسے تو میری خوشنودی سے کار ہے۔

بٹھل رات کو دیر سے واپس آیا۔ اس کے انتظار میں نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ کھانے کے بعد سب بیٹھک میں ہوگئے۔ بٹھل پر گزشتہ رات خانم کی آئینہ نمائی کی گرانی یا وہ اڈے سے کوئی بوجھ لے کر آیا تھا کہ جلدی اٹھ گیا۔ اس کی وجہ سے جمی ہوئی تھی پھر یکے بعد دیگرے سبھی گئے۔ میں نے زریں کی طرف استفہامی نظروں سے دیکھا جواب میں اس نے آنکھیں میچ لیں۔ میں نے اسے کسی رے پر محمول کیا اور تحمل کی تلقین کے سوا کچھ اور قیاس کرسکا۔ خانم اس کے پہلو میں کھڑی تھی اور کوئی صراحت نہ تھی' ان دونوں کے چلے جانے کے بعد میں اپنے رے کے باہر بے ارادہ ٹہلتا رہا۔ نیساں نے سر کی مالش نے اور جہاں گیر نے شطرنج کی ایک بازی کھیلنے کی پیش کش۔ میری ناآمادگی پر دونوں بجھ سے گئے اور مجھے اپنی اس ری پر ملال بھی ہوا لیکن میں انہیں منع کرچکا تھا۔ میں نا میں چلا آیا۔ چاندنی اور رات کی رانی کی خوشبو ہر جانب ری ہوئی تھی۔ چاند اتنا نزدیک نظر آرہا تھا جیسے حویلی کے نا میں اترنا چاہتا ہو' اس کے اطراف ستاروں کا جھرمٹ! تھا جیسے آسمان میں موتی ٹنکے ہوں۔ اتنے چھوٹے

چھوٹے تاروں کے درمیان اتنا بڑا چاند' خصوصاً چودھویں کا چاند کچھ بے ہنگم سا معلوم ہوتا ہے۔ یا تو چاند کچھ چھوٹا ہوتا یا تارے کچھ بڑے ہوتے تو تناسب کی یہ کمی محسوس نہ ہوتی۔ لوگ کہتے ہیں' چاندنی ہمیشہ پرسکون ہوتی ہے' نرم نرم' نازک نازک' دھیمی دھیمی' ہلکی ہلکی' شرمائی' لجائی سی' بالکل دھوپ کی ضد۔ میں تو کہتا ہوں' چاندنی میں کوئی اداسی چھپی ہوتی ہے۔ کچھ دیر بعد میرا تو جی ڈولنے لگتا تھا۔ میں جلد ہی اپنے کمرے میں آگیا مگر میں نے دروازہ کھلا اور کمرا روشن رکھا۔ مجھے شبہ تھا' زریں آسکتی ہے یا نہ بھی آئے۔ کیوں نہ میں ہی اس کے کمرے کا رخ کروں پھر ایک اور خیال نے مجھے آزردہ کیا۔ وہ یہاں آئے یا میں اس کے پاس جاؤں' دونوں صورتوں میں اس طرح رات کو چوری چھپے اس کا آنا یا میرا اس کی طرف جانا نامناسب لگتا ہے۔ کسی نے دیکھ لیا تو جانے کیسے کیسے گمان اس سادہ شعار کے دل میں نمو پائیں۔ بہتر یہی ہے کہ کل دن میں کسی وقت زریں کو لائبریری میں آنے کے لیے کہوں۔ وہاں خاصا سکون ہوتا ہے۔ زریں ایک ہوش مند لڑکی ہے۔ وہ خود بھی احتیاط کرے گی' البتہ وہ فکر مند خاصی ہوگی' آخر وہ کون سی بات ہے جس کی مخاطب صرف وہی ہے۔ جانے کیوں دیر تک اس کی آمد کا ایک موہوم سا امکان بھی میرے دماغ سے چمٹا رہا اور آخر طرح طرح کی تاویلیں اس امکان یا خواہش یا امید پر غالب آگئیں اور یوں مجھے کچھ قرار آگیا۔ بے بسی بھی ایک طرح کا قرار ہے۔ میں نے بستر سے اٹھ کے دروازہ بند کیا اور آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی مگر نیند تو اپنی مرضی سے آتی ہے۔ بستر کے سرہانے رکھی ہوئی چھوٹی الماری میں سجے ہوئے رسالے اٹھا کے میں نے پڑھنے شروع کیے۔ سنا تھا' مطالعہ بھی لوری کا کام دیتا ہے۔ یہ کلیہ بھی فضول ثابت ہوا۔ سارا اول و آخر دماغ ہی ہے۔ آنکھ کے کسی ایک جگہ مرکوز ہونے سے بصارت مراد نہیں ہے۔ کسی بلند صدا کی رسائی تبھی ممکن ہے جب دماغ متوجہ ہو یا پھر آواز اتنی سحر انگیز' اتنی توانا اور منظر ایسا نادر یا حیران کن ہو کہ دماغ کو اپنی جانب کھینچ لے۔ لوگ دلکش تو کہتے ہیں' دماغ کش کیوں نہیں کہتے۔ میں ایک کے بعد ایک رسالہ الٹ پلٹ کے دیکھ رہا تھا اور کسی جگہ نظر ٹھہرتی ہی نہ تھی کہ کمرے کے باہر قدموں کی چاپ پر اٹھ کے بیٹھ گیا۔ چند لمحے اس تذبذب میں گزرے کہ باہر جا کے دیکھوں۔ یکایک دروازے پر ہلکی دستک ہوئی اور میں اچھل سا پڑا۔ دروازہ بند تھا لیکن چٹخنی لگی ہوئی نہیں تھی۔ بستر سے اٹھ کے میں نے جلدی جلدی چپل پہنی اور لپک کے دروازے کا رخ کیا۔ مجھے

یقین تھا' وہ زریں ہوگی' اور اسے اپنے سامنے دیکھ کے مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ کسی ملکہ یا شہزادی کے مانند دروازے کے پار کھڑی تھی۔ سرتاپا نیلگوں لباس' نیلے دوپٹے میں اس کا گلابی' شہابی رنگ دمک رہا تھا۔ میری آنکھیں چندھیا گئیں اور میں بت بنا اسے دیکھ کیا۔

"سو تو نہیں گئے۔" وہ مترنم آواز میں دھیرے سے بولی۔

"نہیں نہیں' ابھی کہاں' آؤ آؤ اندر آؤ۔" میں نے بے ربطی سے کہا اور اسے اندر آنے کی جگہ دینے کے لیے ایک طرف ہٹ گیا "میں تو تمہارا انتظار کررہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ خود ہی تمہاری طرف۔۔۔" میری آواز بھٹک رہی تھی۔

وہ آہستہ قدموں سے اندر آئی "میں نے آج آنے کو کب کہا تھا۔" وہ کھنکتی آواز میں بولی۔

"نہیں کہا تھا مگر مجھے تمہارا انتظار تھا۔" میں نے کرسی کھینچ کے مسہری کے سامنے کردی "اچھا ہوا' تم آگئیں۔"

"میں کہیں باہر سے نہیں آئی ہوں۔" اس نے شگفتگی سے کہا۔

"معلوم ہے' یہیں سے آئی ہو لیکن فاصلے مقامات ہی سے طے نہیں ہوتے۔"

اس نے نگاہیں اٹھائی تھیں کہ پھر جھکالیں۔

"اتنے دن ہوگئے' تم سے کوئی بات ہی نہیں ہوپائی۔" میں نے اڈتی آواز میں کہا۔

"میں تو ہروقت موجود تھی۔"

"لیکن' لیکن اور لوگ بھی تو تھے۔"

"کوئی ایسی بات تھی کیا؟" اس کی آنکھیں جگنو کی طرح جلنے بجھنے لگیں۔

"نہیں' ایسی کوئی خاص بات نہیں۔" میں نے شانے اچکا کے کہا "بس یوں ہی' تم سے پوچھنا تھا' اتنے دن تم کیسی رہیں۔ کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی۔ تم' تمہاری باتیں' تمہاری اپنی باتیں' بس یہی کچھ۔۔۔"

"میں نے بہت اچھا وقت گزارا۔" اس کی سادگی میں ایک عجب تیکھا پن تھا "یہاں کسی چیز کی کمی نہیں' اور کیا چاہیے۔"

"پھر بھی' لیکن ٹھیک ہے' تم ایسے کیوں کچھ کہوگی۔"

"کچھ ہو تو بتایا جائے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی "تم کیا محسوس کرتے ہو؟"

"بظاہر تو واقعی کچھ نہیں ہے۔ میں بھی دیکھ رہا ہوں مگر۔۔۔" مجھ سے کچھ کہا نہ جاسکا۔

"مگر کیا؟" وہ تجسس سے بولی۔

"مگر کچھ نہیں۔ مجھے تو یہ سب دیکھ کے رشک آتا ہے اور سچ تو یہ ہے' ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے۔ نظر کا میں قائل نہیں لیکن کچھ بھی اچانک ہوجاتا ہے۔ میرا تو اب اعتبار ہی اٹھتا جارہا ہے۔ سفر میں ایسے ایسے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے کہ کیا بتاؤں' آدمی کے بہت روپ دیکھے ہیں۔ گرگٹ کو لوگ کہتے ہیں مگر یہ آدمی تو پل پل میں رنگ بدلتا ہے۔"

"کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔"

"ہاں' نئی تو نہیں مگر ہربار دکھ پہنچاتی ہے۔"

"زیادہ توقع ہی نہ کی جائے۔" اس کی آواز کھو سی گئی۔

"یہ بھی آسان کام نہیں' واسطہ تو صبح و شام انہی انسانوں سے پڑتا ہے' طرح طرح کے لوگوں سے اور باربار چوک ہوجاتی ہے۔"

"مگر دنیا ایسی بری بھی نہیں ہے۔"

"ہاں' کہتے ہیں کہ ابھی پھول کھلنے بند نہیں ہوئے۔ [illegible] ہوتی ہے اور روز سورج نکلتا ہے' خزاں کے بعد بہار بھی آ[illegible] ہے۔" میں نے خود کو روکا' کہیں میں اول فول تو نہیں بک ر[illegible] ہوں۔ میں نے منتشر لہجے میں کہا "میری مراد ہے' بے شک ابھی سارے لوگ خراب نہیں ہوئے اور جو کہا جاتا ہے' دنیا انہی کے دم سے جاری ہے اور' اور ان میں سے ایک بھی ہو۔ کبھی میں سوچتا ہوں' تم کیا ہو۔"

"کیوں؟" کرسی پر اس کا سراپا متلاطم سا ہوگیا "میں [illegible] ہوں؟"

"تم ایک مثال ہو۔"

"یہی کچھ کہنے کے لیے تم نے مجھے بلایا ہے؟" اس نے سر جھکا اور آنکھیں بند کرلیں' پھر کسی قدر کترا کے بولی "خد[illegible] کے لیے کوئی اور بات کرو' ایسا مت کہو۔"

"ٹھیک ہے' نہیں کہتا مگر ہے تو یہ ایک واقعہ۔ تم نے ایک اور بات ثابت کی ہے۔ میں دیکھتا ہوں' تم کیسی حاکم ہو' بے تاج' بے تخت کی حاکم' کسی جگہ کبھی پڑھا تھا' سب سے بڑا حاکم اعلا اوصاف والا ہوتا ہے۔ اس حاکم سے بڑا جو تخت نشیں ہوتا ہے اور حکم صادر کرتا رہتا ہے مگر جس کے ہاں مسلسل انکسار' مسلسل ایثار ہے' اس پر لوگ دیوانہ وار نثار ہوتے ہیں۔ یہاں سبھی دل و جان سے تمہاری عزت کرتے ہیں۔ یہ مرتبہ تمہیں یونہی حاصل نہیں ہوا۔ یہ تمہیں وراثت' کسی حادثے اور زور و زر سے نہیں' یہ تمہارے کمالِ سلوک سے ملا ہے۔ حاکمیت کا یہ پہلو بھی خوب ہے۔" وہ سر جھکائے انگلیوں میں آنچل مروڑ رہی تھی۔

[illegible] نے بے ترتیبی سے پوچھا "کیوں' کیا میں کچھ غلط کہہ رہا [illegible]؟"

"کیا کہوں۔" اس کی آنکھوں میں شوخی بھر گئی "معلوم [illegible] ہے گزشتہ سفر میں زورِ بیاں کی اچھی مشق کی ہے۔"

"تم اسے کچھ بھی کہو' لیکن میں جانتا ہوں' میں مطمئن [illegible] کہ میں سچ بول رہا ہوں۔"

"تمہیں جھوٹ بولنا آتا بھی نہیں۔ تم شاید بول بھی [illegible] سکتے۔" اس کے لہجے میں تصنع کی رمق نہیں تھی' کہنے [illegible] "لیکن لازم نہیں' تمہارے اندازے اور قیاس اور [illegible]اری تعبیریں درست بھی ہوں۔"

"میرا سوچا ہوا غلط ہوسکتا ہے مگر میرا دیکھا ہوا تو۔۔۔"

"اب جانے بھی دو۔" اس نے مجھے بات پوری نہیں [illegible] نے دی اور چمکتی آواز میں بولی "تم اپنی کہو' یہ بتاؤ' سفر کیسا [illegible] اب کے تو بہت دن ہوگئے۔"

"ہاں' دن تو بہت ہوگئے' لمبی روداد ہے۔" میری آواز [illegible] یاسیت عود کر آئی "لیکن ایک بات کہوں' ہم کبھی تم سے [illegible] نہیں رہے۔ نہ میں' نہ بٹھل بھائی۔ تم ہمیں یاد آتی [illegible] بہت یاد آتی رہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" اس کے رخساروں پر شفق چھاگئی۔ "خبر ہے' آسن سول میں بٹھل بھائی آگے سفر کے لیے [illegible] تھے۔ میں نے ضد کی کہ اب فیض آباد چلو' زری کیا کہتی [illegible] بہت مشکل سے وہ آمادہ ہوئے۔"

"بابا بتا رہے تھے۔" اس کی آواز لہرانے لگی اور ایک [illegible] توقف کے بعد وہ کسی قدر ناز سے بولی "ہوسکے تو تفصیل [illegible] بتاؤ' کہاں کہاں جانا ہوا اور کس حد تک۔۔۔؟" وہ شاید [illegible]الی کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی کہ میرے آبگینے کے [illegible] سے رک گئی اور جھک کے کہنے لگی "اتنے عرصے میں تو [illegible] دنیا گھوم لی ہوگی؟"

"کہاں' یہ دنیا بہت بڑی ہے پھر بھی بس گھومتے رہے۔ [illegible] یہاں' کل وہاں' صبح کہیں' شام کہیں۔ اب تو شہروں [illegible] کے نام بھی یاد نہیں رہے۔ تفصیل سے بتانا شروع کیا [illegible] ہوجائے گی۔"

"پھر کیا ہوا؟ رات اپنی ہے۔"

"رات تو اپنی ہے مگر اسے کیوں اذیت سے دوچار کیا [illegible]"

"میں جاننا چاہتی ہوں۔" وہ بے کلی سے بولی۔

اس کے اصرار پر میں نے شکستہ آواز میں کہا "کیا کروگی [illegible]"

"میں نے آگے کچھ کہنا چاہا تھا کہ اس نے مجھے روک دیا "کہو تو چائے یا قہوہ بنا کے لے آؤں؟ کسی اور چیز کی ضرورت ہے تو بتاؤ' خشک میوہ یا گلوری وغیرہ۔۔۔؟"

"کسی چیز کی خواہش نہیں۔ بس تم یہیں بیٹھی رہو' ایسے ہی۔"

وہ ہمہ تن گوش تھی۔ مجھے بیتا ہوا دہرانے سے الجھن ہوتی تھی لیکن اس کے اضطراب آمیز اشتیاق سے مجھے پسپا ہونا [illegible]۔ گزرا ہوا' بکھرا ہوا حال سمیٹنے میں' میں نے کچھ تامل [illegible] سے بہت بے تابی تھی۔ مجھے گم دیکھ کے بچوں کے سے انداز میں اس نے مجھے ٹوکا "کہاں کھوگئے؟"

"کہیں نہیں۔" میں نے چونک کے کہا "سوچتا ہوں' کہاں سے شروع کروں۔"

"میں بتاؤں۔" وہ ہمک کے بولی "یہاں سے بمبئی جاتے ہوئے تم ایک پہر کے لیے مراد آباد ٹھہر گئے تھے۔ وہاں سے حیدر آباد چلے گئے۔ ظاہر ہے' مراد آباد سے بمبئی جانے کے بجائے حیدر آباد کا سفر کرنے کی کوئی بڑی وجہ ہی ہوسکتی ہے۔"

"وہ تو اب پرانی بات ہوگئی۔"

"میرے لیے سب کچھ نیا ہوگا۔ کچھ کچھ مجھے معلوم ہے اور کچھ اندازہ ہے لیکن تمہاری زبانی تو۔۔۔" وہ تجسس سے بولی "وہ اصل بھی ہوگا اور نیا بھی' اور مجھے معلوم ہی کتنا ہے۔"

ابتدا میں میری زبان اٹک رہی تھی کہ کیا بتاؤں' کیا نہیں لیکن سننے والے کا انہماک کہنے والے کے لیے ترغیب کا درجہ رکھتا ہے۔ بعد میں خود مجھ پر منکشف ہوا کہ اپنے حبس سے نجات پانے کے لیے مجھے اس جیسے کسی سامع کی ضرورت تھی۔ دردمند سامع بھی کسی مسیحا کے مانند ہوتا ہے۔ زورِ کلام' شوقِ سماعت سے مشروط ہے۔ آنسو' آنکھیں ہلکی کردیتے ہیں اور سینہ ہلکا کردیتے ہیں کیونکہ آنسوؤں کا منبع تو سینہ ہوتا ہے۔ سینے میں یہ آگ سی بھڑکائے رہتے ہیں۔

اس کے چہرے پر اس کے نہاں خانے کا ہیجان صاف نمایاں تھا۔ کسی میں شمولیت کے بغیر یہ اضطراب ممکن نہیں ہوتا۔ میں نے کہا "یہاں سے بمبئی ہی جانے کا ارادہ تھا مگر مراد آباد راستے میں پڑتا تھا۔ میں نے سوچا' یہاں سے گزر رہے ہیں تو کیوں نہ شہر جا کے ایک بار ا ور مولوی صاحب کے بارے میں پوچھ آئیں۔ پھر نہ معلوم' کب اس طرف آنا ہو۔ راستہ کھوٹا کرنے کا نتیجہ کچھ بہتر ہی نکلا۔ معلوم ہوا' مولوی صاحب اس دوران مراد آباد آئے تھے۔ مسافر خانے کے روزنامچے میں ان کا پتہ درج تھا۔ میری التجا پر پیرد بھائی بمبئی

جانے کے بجائے حیدر آباد چلنے پر آمادہ ہوگئے۔ گو ابا جان کو جلد سے جلد بمبئی پہنچنے اور اپنے بیٹے اور بیٹیوں سے ملنے کی بڑی بے چینی تھی لیکن وہ بھی تیار ہوگئے۔"

دلی کے بعد میں نے ریل میں کلکتہ جیل کے جیلر صاحب کی لڑکی سونیا کے واقعے سے اجتناب کیا۔ زریں شاید اس سانحے کی متحمل نہ ہوتی یا شاید مجھی میں اس کے اعادہ بیان کی ہمت نہیں تھی۔ میں نے اسے بتایا "حیدر آباد میں ابا جان کو ہوٹل میں ٹھہرا کے میں نے اور پیرو بھائی نے اس پتے پر پہنچنے میں کوئی تاخیر نہیں کی جو ہمیں مراد آباد کے مسافر خانے کے روزنامچے سے ملا تھا۔ وہ ایک مہذب نواب ثروت یار کی عالی شان کوٹھی تھی۔ بہت زیب و زینت تھی اس کی مگر مولوی صاحب کچھ عرصے پہلے وہاں سے جاچکے تھے۔ نواب نے بتایا کہ وہ جلد ہی واپس آنے کا کہہ گئے تھے لیکن جانے کیوں' آئے نہیں۔ ہم نے نواب سے کہا تھا کہ مولوی صاحب کی کوئی امانت لوٹانے کے لیے ہمیں ان کی تلاش ہے۔ کیا ہی مناسب ہو' مولوی صاحب آجائیں تو انہیں ہماری یہاں آمد کے بارے میں کچھ نہ بتایا جائے اور ہمیں بمبئی مطلع کردیا جائے۔ ہم خود مولوی صاحب کے روبہ رو حاضر ہوکے ان کا تکدر دور کرنے کی کوشش کریں گے۔ نواب سے وعدہ لے کے ہم رخصت ہوگئے۔ حیدر آباد میں اب ہمارا کوئی کام نہیں رہا تھا لیکن ایک مقام پر اچانک کچھ لوگ ہمارے آڑے آگئے۔ تلخ کلامی سے بات ہاتھا پائی تک جا پہنچی۔ نتیجے میں پولیس آگئی اور ہمیں حوالات میں بند کردیا گیا۔

"کیا؟" زریں کی آنکھیں پھیل گئیں "اس طرح کیسے؟ یہ تو بڑی زیادتی ہے۔"

"ہاں' ان کا ہمارے راستے میں مزاحم ہونا دانستہ تھا۔ ان کا مقصد ہمیں کسی طور حوالات پہنچانا تھا۔ یہ سازش کا حصہ تھا۔ اتفاق سے حوالات میں تھانے دار کے ایک ملاقاتی کو حوالات میں داد فریاد کرتے ہوئے ہم دو ستم زدگاں پر ترس آگیا۔ وہ صاحب ہم اجنبیوں کی ضمانت لینے کی سخاوت پر اتر آئے۔ ہم ان کے ممنون احسان تھے۔ جب انہوں نے ہماری تواضع کے لیے اپنے گھر چلنے کی درخواست کی تو ظاہر ہے' ہم منع نہ کرسکے۔ ہمارے سان و گمان میں نہیں تھا کہ یہ کوئی اتفاق نہیں ہے۔ اس شخص نے ایک بہت بڑے نواب' جہاں تاب کی عظیم الشان حویلی میں لے جاکے ہمیں نواب صاحب کے سامنے پیش کردیا۔ نواب نے ہمیں خانم آپی کے کوائف بتانے کے لیے مجبور کیا۔ ہمارے انکار پر ہمیں حویلی کے ایک کمرے میں محبوس کردیا گیا۔ پہرے دار بٹھا دیے

گئے۔ ہم نواب کو خانم آپی کے بارے میں کیسے کچھ بتاتے تھے۔ اس کے چھوٹے بھائی نواب عالم تاب کو خانم آپی کی حیدر آباد سے ہجرت' ان کی جدائی بہت شاق گزری تھی۔ بہت عرصے سے وہ بستر نشیں تھا' مگر کیا۔" میں نے رک کے زریں سے پوچھا "تمہیں آپی نے کچھ نہیں بتایا؟"

"کسی قدر۔ میں نے خود تفصیل میں جانا مناسب نہیں سمجھا' کچھ اندازہ ہوگیا تھا کہ آپی کے لیے یہ ذکر تکلیف دہ ہوسکتا ہے۔" وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

"بس' ہم اپنے طور پر وہاں سے رہائی کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہے۔ پہرا سخت تھا۔ ایک روز نواب عالم تاب بیگم اور بہن جرات کرکے' حویلی کے آداب بالائے طاق رکھ کے' خادموں کو کسی طرح رام کرکے چھپتی چھپاتی ہم تک آگئیں۔ وہ نہایت شائستہ' نفیس طبع اور نازک اندام خواتین تھیں۔ انہوں نے بہت عاجزی کی' بڑی منتیں کیں' ایک نے اپنے شوہر' دوسری نے اپنے بھائی کی زندگی کی بھیک مانگی' کے واسطے دیے۔ کہنے لگیں کہ خانم ہی ان کے جاں بلب شوہر اور بھائی کا مداوا ہیں۔ ہم ان کے حال پر رحم کریں۔ ان کی آہ و زاری نے ہمیں بہت آزردہ کیا۔ ہم نے ان سے کہا کہ یہاں سے آزاد ہونے کے بعد ہی ہم کچھ کرسکتے ہیں۔ پہلے تو ہمیں خانم سے بات کرنی ہوگی۔ یوں ہم خانم کا پتہ نہیں بتا سکتے۔ اس قید و بند میں کئی روز گزر گئے۔ نواب طرح طرح سے ہم پر زور ڈالتا' ہمارا حوصلہ آزماتا رہا پھر ایک دن ہمارے ذہن میں ایک تدبیر آئی۔ ہم نے بڑے نواب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ گویا پہرے داروں کو سپر ڈالنے کا تاثر دیا۔ نواب کے پاس جاکے ہم نے تخلیئے کا مطالبہ کیا۔ وہ راضی ہوا۔ تخلیہ ہوتے ہی' پیرو بھائی نے بہ عجلت اسے قابو میں کیا اور باہر سے پہرے دار آیا تو میں نے اسے ... بندوق کے ساتھ نواب کو اپنے حصار میں لیے اس کی موٹر میں ہم حویلی سے دور ہوتے گئے اور ایک محفوظ جگہ پر ہم نے نواب سے ہاتھ اٹھالیا اور موٹر سے اتر گئے۔"

میں نے زریں کو نہیں بتایا کہ اس کے بعد ہوٹل میں منتظر ابا جان کے پاس جانے کے بجائے پیرو نے وہاں سے سیدھے بازار کے اڈے کا رخ کیا اور مجھے اڈے کی ... بٹھل کو بیٹھا دیکھ کے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ پیرو کو یقین تھا کہ اتنے دنوں میں بٹھل کو ہماری خیر خبر لینے ... آباد سے حیدر آباد آجانا چاہیے اور حیدر آباد کے اڈے پر ہونا چاہیے۔ زریں نے بھی کوئی کرید نہیں کی۔ میں ...

"ادھر ابا جان شدت سے ہمارا انتظار کررہے تھے۔

... طرح غائب ہوجانے سے ان کی حالت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ زدرا' شامو ٹھنگو اور مارٹی وغیرہ ہمیں گلی گلی ڈھونڈتے رہے۔ ابا جان نے حیدر آباد میں ایک اجنبی شہر میں اپنے اثر رسوخ کے لیے ایک بڑے نواب' نواب حشمت جنگ تک رسائی حاصل کی اور اسے ایک بیش قیمت ہیرا نذر کیا۔ نواب جوہر شناس و جواہر شناس تھا' ہیرا دیکھ کے وہ ششدر رہ گیا۔ ابا جان نے حیدر آباد میں مستقل سکونت کے لیے کوئی منقول حویلی خریدنے میں نواب سے اعانت کی درخواست کی۔ دوسری طرف انہوں نے بٹھل بھائی کو فوراً حیدر آباد طلب کرلیا۔ بٹھل بھائی نے حیدر آباد آکے پہلے ہمارے غائب ہونے کی وجوہ جاننے کی کوشش کی اور سرا ملتے ہی نواب جہاں تاب کے پاس پہنچے۔ نواب اپنے زنداں میں ہماری موجودگی کے سلسلے میں کیوں کچھ قبول کرکے دیتا تاہم اس نے خانم آپی کی موجودہ سکونت جاننے والے ایک اور شخص کی آمد غنیمت جانی۔ اسے بٹھل بھائی کو زنداں میں ڈالنے کی جرات نہیں ہوئی۔ اس مرتبہ اس نے عاجزی اختیار کی اور اپنے عزیز بھائی کی شکستہ حالت کے بارے میں بٹھل بھائی کو قائل کرلیا۔ بٹھل بھائی بھی یقیناً اس نتیجے پر پہنچے کہ نواب عالم تاب کی ڈولتی ڈوبتی زندگی کو خانم آپی کی آمد سے شاید کوئی کنارہ مل جائے' شاید کوئی معجزہ ہوجائے۔ بٹھل بھائی نے خانم آپی کو حیدر آباد بلانے کا وعدہ کیا اور چلتے چلتے نواب کو یہ انتباہ بھی کیا کہ ان کے دو آدمیوں کو کوئی گزند نہیں پہنچنا چاہیے ورنہ۔۔۔ جیسے ہی خانم آپی حیدر آباد آئیں' انہیں ساتھ لے کے وہ نواب کی حویلی جا پہنچے مگر اس سے پہلے ہم آزاد ہوچکے تھے۔ نواب کو بٹھل بھائی سے اس فیاضانہ سلوک کی توقع ہرگز نہ ہوگی۔ بٹھل بھائی نے خانم آپی کی حیدر آباد آمد ہماری رہائی سے مشروط نہیں کی تھی۔ انہوں نے اپنا وعدہ نبھایا پھر تو نواب کے تیور ہی بدل گئے۔ وہ ایسا نادم ہوا کہ ہردم' ہر آن شکر گزاری کے موقع ڈھونڈتا رہتا۔ خانم آپی کی آمد کو دیر ہوگئی تھی مگر اتنا بے شک ہوا کہ نواب کو طویل جاں کنی سے نجات مل گئی۔ اس کی سانسیں خانم آپی کے لیے اٹکی ہوئی تھیں۔ اپنے سرہانے خانم آپی کو دیکھ کے پھر اس کا کوئی مدعا نہ رہا۔"

میں نے زریں کا چہرہ دیکھا۔ وہ بت بنی ہوئی تھی "سن رہی ہو؟" میں نے اسے ٹوکا۔

"ہاں' ہاں۔" وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولی "نواب عالم تاب کو بس خانم آپی کا انتظار تھا مگر کیا خانم آپی کو نواب کے لیے۔" وہ جیسے لفظ ڈھونڈنے لگی "خانم آپی کو نواب صاحب کے اس التفات' ان احساسات کا پہلے سے کوئی اندازہ نہیں تھا؟"

"ہوتا تو وہ حیدر آباد سے چلے آنے پر کیوں آمادہ ہوتیں۔ نواب کو حیدر آباد سے ان کی ہجرت کی اطلاع ملی تو اس نے نذرانے بھرے طشت کے ساتھ پیغام بھیجا تھا' خانم آپی نے اپنا ارادہ نہیں بدلا اور جب ہم روانگی کے لیے ریل گاڑی میں بیٹھ چکے تھے تو نواب عالم تاب نے اسٹیشن آکے خانم آپی سے عرض گزاری تھی۔ اس کا جلتا ہوا چہرہ اور جلتی ہوئی آنکھیں میں نہیں بھول سکا ہوں مگر خانم آپی نے کچھ سوچ کے ہی اسے نامراد و ناشاد واپس کیا ہوگا۔ وہ ایک متوازن خاتون ہیں۔ نوابوں کی اپنی ایک روایتی طرز زندگی ہوتی ہے۔ آپی نے سوچا ہوگا' وہ کہاں' کس حد تک نواب کے ماحول میں موزوں ہوسکتی ہیں۔ کچھ عرصے میں نواب کا جوش و جذبہ سرد نہ پڑجائے۔ مال و زر والوں کو ایک گداز اپنے مال و زر کا تو ہوتا ہی ہے۔ ان کی طبیعت میں قرار نہیں ہوتا۔ مال و زر کی ارزانی انہیں کچھ نیا دیکھنے' نیا کرنے پر اکساتی رہتی ہے۔ ممکن ہے' خانم آپی نے نواب کو شاید اتنا محسوس نہ کیا ہو جتنا نواب نے انہیں کیا تھا یا شاید آپی کو اپنا احوال' اپنی قلبی کیفیت منتقل کرنے کی کوتاہی نواب سے ہوئی ہو۔ کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایک آدمی کسی کے بہت قریب ہو اور کسی کو بہت عزیز سمجھتا ہو تو ضروری نہیں کہ دوسرا بھی اسی نسبت سے یہ احساس قربت اخذ کرتا ہو' یا اس کا عرفان رکھتا ہو یا جواب میں اسی شدومد سے تپاک کا اظہار کرے۔ ٹھیک ہے نا؟" میں نے اسے گم صم دیکھ کے تذبذب سے پوچھا۔

"ہاں ہاں۔" زریں کے ہونٹ پھڑپھڑانے لگے۔

"اور یہ بھی ہوسکتا ہے' ایک کے جذبہ و احساس کے یقین و اعتراف کے باوجود دوسرے کے اپنے تحفظات ہوں' اس کا بھی اپنا ایک ارادہ' ایک اختیار ہوتا ہے۔"

زریں نے سر جھکالیا اور کسی قدر ناتواں آواز میں تائید کی "ہاں' دوسرا بھی تو اپنا اختیار رکھتا ہے۔"

"میں کہنا چاہتا ہوں۔" میں نے روانی میں کہا "دو آدمیوں کی یکجائی کے لیے دونوں کی ایک دوسرے سے آگہی اور آمادگی ضروری ہے۔ خانم آپی' نواب کی خاطر وہاں رک جاتیں تو جہاں گیر سے محروم ہوجانے کا خدشہ انہیں لاحق ہوگا۔ یوں سمجھو کہ جہاں گیر سے جدائی انہیں گوارا نہیں ہوگی۔ دو راستوں میں سے ایک تو منتخب کرنا تھا۔"

"انہوں نے کیا نواب عالم تاب سے اس سلسلے میں کوئی

بات کی تھی؟" زریں متجسس لہجے میں بولی۔

"اس کا موقع نہیں ملا' شاید آپی جانتی ہوں گی کہ مغلوب نواب ان کی ہر بات تسلیم کرلے گا لیکن کتنے دنوں تک کوئی خوشگوار صورت حال جاری رہ سکتی ہے۔ نواب کے قول و قرار سے زیادہ خانم آپی کو اپنے اختیار میں ضمانت محسوس ہوتی ہوگی۔ کچھ ایسی ہی بات ہوگی۔"

"ہاں' ہوش مندی تو یہی تھی۔" زریں زیرِ لبی سے بولی "مگر سب کچھ ہوش ہی تو نہیں ہوتا۔"

میں اسے دیکھا کیا اور مجھ سے کوئی جواب نہ دیا جاسکا۔

"پھر نواب عالم تاب شاید زندہ رہتے۔" وہ اداسی سے بولی۔

"یہی کہا جاسکتا ہے کہ خانم آپی کو نواب کے تلاطم کا پوری طرح اندازہ نہیں تھا' احساس میں نہیں کہہ رہا۔ وہ ایک حساس اور نرم و نازک خاتون ہیں۔ نواب کی موت کے بعد شاید انہوں نے اسے جانا یا پہچانا۔ کچھ بھی کہہ لو۔ نواب کے انتقال کے بعد عرصے تک اس کے سوگوار گھر میں ان کے قیام کی یہی وجہ ہوسکتی ہے۔ میں سوچتا ہوں' نواب کی کم ہمتی' اس کی لغزش تھی' اس نے پیروی کیوں نہیں کی' وہ اپنے گھر سے کیوں نہیں نکل گیا۔ اسٹیشن سے وہ گھر واپس کیوں چلا گیا؟ ایک آدمی تو کبھی کسی کے لیے ساری دنیا سے بڑا ہوتا ہے' ساری دنیا ہوتا ہے۔ نواب کو معلوم نہیں تھا' ایک آدمی کے لیے کبھی ساری زندگی ترک کرنی پڑتی ہے۔"

"اور انہوں نے ترک کردی۔" وہ یاسیت سے بولی۔

"یہ ترک سے زیادہ پسپائی ہے۔ وہ اسی پر کیوں مایوس ہوگیا۔"

"اور اگر پے روی کے بعد بھی یہی صورت ہوتی۔"

"ہوسکتا ہے لیکن' لیکن۔" میں نے جز بز ہوکے کہا "بہرحال اس نے دستبرداری میں عجلت کی۔ اسے خاطر جمع رکھنی چاہیے تھی کہ اب نہیں تو کل' بعد میں آپی' جو اب تک نہیں جان سکی ہیں' جان لیں گی۔ یوں کسی دن وہ آپی پر اثر انداز بھی تو ہوسکتا تھا۔"

"اور اگر ایسا نہ ہوتا؟ یہی حاصل رہتا؟"

"تو' تو۔" میری آواز بجھ گئی "ہاں تو پھر یہی ہوتا۔"

"ممکن ہے' نواب عالم تاب اسی نتیجے پر پہنچے ہوں کہ اب مزید عرضِ حال حجت کے مترادف ہے۔ پھر وہ کیا کرتے؟ منتیں تو نہیں کی جاسکتی تھیں' دہائیاں تو نہیں دی جاسکتی تھیں۔ خانم آپی کے ہاں انہوں نے کوئی گوشہ نہیں دیکھا تبھی پھر انہیں کیا کرنا چاہیے تھا؟ دوسرے آدمی پر تو بہت کچھ منحصر ہے۔ دوسرے آدمی میں اتنا سمندر نہ ہو یا اور منظر کے سحر میں ہو۔ دوسرے آدمی کا تمہارے بقو ارادہ' اپنے تحفظات' اپنے اندیشے اور اپنی ہوش ہے۔ جستجو اور طلب بھی تو کسی کے اختیار میں نہیں' کوئی کسی کی شدید طلب کے باوجود اس سے محروم رہ ہی صورتیں رہ جاتی ہیں یا تو وہ اپنے مطلوب کی آس دے' اس سے کنارہ کش ہوجائے' اسے فراموش کر کوشش میں اپنے آپ پر قدرت حاصل کرلے۔ یہ تم ہو تو مطلوب کی یاد' اس کا تصور ہی متاعِ جاں سمجھے' قناعت کرے لیکن یاد سے تو طلب اور سوا ہوتی ہے۔ نواب اپنی مراد بر آنے سے مایوس ہوگئے ہوں گے لیکن نقش مٹانے پر قادر نہیں ہوں گے۔ وہ دوست بردار ہوئے تھے۔ وہ تو اور وابستہ ہوگئے تھے۔ وہ ہوش من منزل سے دور جاچکے تھے' شاید بہت دور جاچکے تھے۔ ا بس میں کچھ نہیں رہ گیا ہوگا۔ کسی کے لیے یہ کیسا عذا کہ اتنی امنگوں' اتنی قربتوں کے بعد کوئی دوسرا اس کی مائل نہ ہو۔ اور طلبگار کی بھی اپنی ایک انا ہوتی ہے سرکشی پر اکساتی ہے تو شکستہ بھی تو ہوتی ہے۔ آدمی پھ آپ کو تمام کرلیتا ہے۔ یہ تو بابا کی عنایت ہوئی۔ انہو آپی کو وہاں پہنچانے کا وعدہ کرلیا اور نواب کو آخری میں سکون کی سانسیں نصیب ہوگئیں۔"

میری حیران نگاہیں اس پر مرکوز تھیں۔ اس کے میں بڑی اثر انگیزی تھی۔ زریں کی سوجھ بوجھ کا میں کیا قائل تھے لیکن یہ نکتہ آفریں کلام' یہ شدتِ اظہار' مندی اور دل سوزی۔ ان معاملات میں اس کی نظر اتنی اور تیز ہے' اس کا مجھے علم نہیں تھا۔ لگتا تھا' اس گزشتہ عرصے میں کثرت سے مطالعہ کیا ہے۔ مط دریچے کھولتا' سمتیں روشن کرتا ہے۔ وہ چار دیواری میں رہتی تھی' مگر کتابوں سے کچھ کم مشاہدہ نہیں ہوتا مشاہدے کے لیے جستجو اور فکر بھی تو لازم ہے۔ مجھے ا رشک آرہا تھا۔ مجھے رما یاد آئی' وہ بھی ایسی فکر آفریں کرتی تھی' اور ہاں جولین بھی۔ اپنے چہرے پر میری کھ نگاہوں سے وہ سمٹنے لگی اور کچھ شرما سی گئی۔ اس کا چ ہوگیا "شاید تمہی ٹھیک کہہ رہی ہو۔" میں نے بے سے کہا "تم تو... تم تو... کمال ہے۔"

اس نے موضوع بدل دیا اور رک رک کے بولی" ہوا؟ نواب عالم تاب کے انتقال کے بعد...؟"

"پھر' پھر ہم کئی دن تک اس کے گھر مہمان ر

اب جہاں تاب نے ہمیں بہ اصرار روک لیا تھا پھر وہاں ے ہم نواب حشمت جنگ کے توسط سے ابا جان کی خریدی ولی حویلی میں منتقل ہوگئے۔ حویلی کیا تھی' کوئی محل تھا۔ اب حشمت جنگ ابا جان کا والہ و شیدا ہوچکا تھا۔ اس نے ل و جواہر کے دل دادہ اپنے ہم مشرب نوابوں کو ابا جان کے ر کیے ہوئے ہیرے کا دیدار کرایا تو سبھی دنگ رہ گئے۔ طرح لرح کے امرا' رؤسا ابا جان کے پاس نوادر کی امید میں آئے ر کسی نے ابا جان کی معذرت قبول نہیں کی۔ ایک رات نی میں سے ایک جنونی نے ابا جان کی نو خرید حویلی میں شب ن مارا' مسلح آدمیوں کا دستہ دیواریں پھاند کے اندر گھس یا اور ہم سب کو گھیر لیا۔ ان کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ ہم اپنا اہر کا خزانہ ان پر ظاہر کردیں' انہوں نے ہم سب کو ایک لمرے میں جمع کردیا اور بطور خاص ابا جان کو ہدف بنایا' جنگلی ن کی انتہا کردی۔ ہمارے سامنے ابا جان کو گالیاں بکیں' ربان پر ہاتھ ڈالا' طمانچے' مکے' ضربیں' لباس تار تار کردیا ر ہم بس داد فریاد کرتے رہے۔ ابا جان کے پاس محفوظ وہ ند نادر ہیرے ان کے منہ پر مارے جاسکتے تھے۔ ابا جان کے ں ان کی کوئی کمی نہیں تھی مگر پھر تو ریاست میں ہم سب کی لروں میں آجاتے۔ ریاست سے ہمارا نکلنا مشکل ہوجاتا۔ وہ رائے کے آدمی تھے' بڑے شورہ پشت' اول درجے کے بے تم۔ وہ طے کرکے آئے تھے کہ انہیں خالی ہاتھ نہیں لوٹنا۔ ہمیں سنبھلنے' کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں دے رہے تھے۔ ہم سبھی نے اپنی اپنی کوشش کی' پھر کانتے سے ضبط میں ہوا۔ اس نے خود کو داؤ پر لگا دیا' سرغنہ کے سامنے اکے کھڑا ہوگیا اور الجھ پڑا۔ اس جرات کی اسے قیمت ادا لرنی پڑی۔ انہوں نے سے بری طرح مارا اور اپنے چند ادمیوں کو حکم دیا کہ وہ اسے کمرے سے لے جائیں۔ کانتے نے انہیں کچھ ایسا تاثر بھی دیا تھا کہ وہ حویلی میں چھپے ہوئے ہیروں کی جگہ آشکار کرسکتا ہے۔ دھکیلتے' مارتے پیٹتے ہوئے چار آدمی کانتے کو کمرے سے لے گئے۔ ان کی تعداد اس طرح کچھ کم ہوگئی تھی۔ چوبیس کی نفری تھی۔ کچھ باہر پہرا دے رہے تھے' کچھ مختلف کمروں کی تلاشی میں مصروف تھے۔ کانتے کے چلے جانے کے بعد ہم نے آپسی اختلاف کی شوشہ طرازی کی۔ بظاہر بٹھل بھائی اور پیرو بھائی میں ٹھن گئی۔ سرغنہ نے بٹھل کو طمانچہ مارا۔ پیرو بھائی نے ہیرے افشا کرنے کی آمادگی ظاہر کردی تھی اور بٹھل بھائی انہیں سرزنش کررہے تھے۔ جیسے ہی سرغنہ پیرو بھائی کے مقابل آیا' انہوں نے یکایک پینترا بدل کے نہایت مشاقی اور پھرتی سے اسے جکڑ لیا۔ یہ منظر دیکھ کے سرغنہ کے ساتھی بدحواسی میں پیرو بھائی کی طرف دوڑ پڑے۔ اور ہمیں اس لمحے کی رعایت مل گئی جس کے ہم سب منتظر تھے۔

وہ رات قیامت کی رات تھی۔ بٹھل اور پیرو بھائی' شامو' جمرو' ٹنگو' مارٹی' زورا اور میں' ہم نے ان سے ہتھیار چھین لیے۔ ادھر دوسرے کمرے میں کانتے ان کے چار آدمی بے بس کرچکا تھا مگر اس کوشش میں خود کانتے بری طرح زخمی ہوچکا تھا۔ ان ڈاکوؤں' حملہ آوروں کو جان سے مار دینے کے بجائے ہم نے انہیں بھاگنے پر مجبور کردیا۔ ان کی بندوقیں ناکارہ کرکے انہیں لوٹا دیں اور ان سے یہ بھی معلوم نہیں کیا کہ انہیں پتھروں کے کس دیوانے نے بھیجا تھا۔"

"کیوں؟ اس میں کیا مصلحت تھی؟" زریں تعجب سے بولی۔

"ہمیں ریاست سے کسی طور بہ عافیت نکل جانا تھا' مزید کسی بکھیڑے میں پڑے بغیر۔ ہماری ذرا سی نادانی سے پولیس کی دخل اندازی ہوجاتی۔ ابا جان کی حویلی مرکزِ نگاہ بن جاتی۔ اور جانتی ہو' ہم نے ان وحشیوں سے کیوں یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہ کس ذی حیثیت شخص کے فرستادہ ہیں؟"

"میں' میں سمجھ گئی۔" وہ تیزی سے بولی "یہی پردہ پوشی بہتر تھی۔ وہ شخص زچ ہوکے یا منتشر ہوکے یا اشتعال میں آکے' اپنی رسوائی سے بچنے کے لیے کوئی بھی قدم اٹھا سکتا تھا اور تمہارے راستے کی رکاوٹ بن سکتا تھا۔ یوں مزید پیچیدگی پیدا ہوسکتی تھی۔ یہی نا؟"

"بالکل' بالکل۔" میں نے اضطراری لہجے میں کہا "یہی بات تھی' اور پھر ہم نے حیدر آباد سے روانگی میں بہت عجلت کی لیکن پیرو بھائی نے ایک بار پھر نواب ثروت یار سے مل لینا مناسب سمجھا۔"

زریں کچھ مستعد ہوگئی اور پلکیں پٹ پٹاتے ہوئے بولی "میں یہی پوچھنا چاہتی تھی۔"

"میرا تو وہاں جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ پیرو بھائی نے مجھے بتایا بھی نہیں' بس چل پڑے۔ مجھے تو اس وقت معلوم ہوا جب ہم نواب ثروت یار کے محلے حمایت نگر میں داخل ہوئے۔ اتنی جلد ہمیں دوبارہ دیکھ کے نواب حیران ہوا۔ ہم نے اسے بتایا کہ ابھی ہم حیدر آباد ہی میں تھے۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہنے لگا کہ اسے اتفاق کہیے' آپ لوگوں نے یہاں آنے میں کچھ دیر کردی۔ اس دوران مولوی صاحب آئے تھے۔ وہ کچھ پریشان سے تھے اور حیدر آباد میں

مستقل قیام کے لیے کوئی چھوٹا مکان حاصل کرنا چاہتے تھے۔ نواب کی درخواست پر کہ جب تک کسی معقول مکان کا بندوبست نہیں ہوجاتا' وہ اس کے گھر قیام کریں' مولوی صاحب راضی ہوگئے۔ مولوی صاحب کی گفتگو سے نواب کو محسوس ہوا کہ وہ مالی طور پر خاصے فکر مند ہیں۔ اس نے گزشتہ ملاقات میں ہم سے وعدہ کیا تھا کہ اگر مولوی صاحب حیدر آباد واپس آگئے تو وہ انہیں ہماری آمد سے مطلع نہیں کرے گا اور ہمیں بمبئی خط لکھ دے گا۔ نواب کے بقول' وہ اپنے وعدے پر کار بند رہا اور یہ سوچ کے اس نے ہمیں خط لکھنے میں جلدی نہیں کی کہ اب تو مولوی صاحب کا قیام مستقل حیدر آباد ہی میں ہے' کسی وقت بھی وہ ہمیں مطلع کرسکتا ہے پھر ایک روز اس نے سوچا' کیوں نہ اشارتاً مولوی صاحب سے ہمارا ذکر کرکے ان کا عندیہ جاننے اور ہماری طرف سے ان کا تکدر دور کرنے کی کوشش کرے۔ مولوی صاحب کی مالی حالت اس طرح بھی بہتر ہوسکتی ہے' اگر انہیں ان کی آبائی جائداد یا ہماری تحویل میں ان کی کوئی پرانی امانت واپس مل جائے۔ پچھلی ملاقات میں ہم نے مولوی صاحب کی تلاش کی یہی وجہ نواب سے بیان کی تھی۔ نواب کی زبانی میرا نام سن کے مولوی صاحب کا عجیب حال ہوا۔ وہ بے کل ہوگئے۔ پوچھنے لگے' کب آئے اور کیوں آئے تھے؟ نواب ثروت یار نے تحمل سے ہماری آمد کی روداد سنائی کہ کہاں سے ہمیں مولوی صاحب کا پتہ ملا' ہم ان کے لیے کتنے مضطرب تھے اور ہم نواب کو بمبئی کا پتہ دے گئے ہیں۔ نواب نے مولوی صاحب سے پوچھا' اجازت ہو تو ہمیں بمبئی مطلع کردیا جائے۔ کیا ہرج ہے' ایک بار ان سے مل لیجئے اور کوئی خطا ہوگئی ہو تو معاف کردیجئے۔ نواب نے ہماری بڑی سفارش کی۔ جواب میں مولوی صاحب نے کہا کہ ہمارا پتہ انہیں دے دیا جائے' ابھی دماغ حاضر نہیں ہے' کسی مناسب وقت ہم سے رابطہ کرلیا جائے گا۔ نواب پھر کیا کہتا' چپ ہوگیا۔ رات کے کھانے پر نواب سے مولوی صاحب کی ملاقات ہوئی تو مولوی صاحب نے ہمارا پتہ طلب نہیں کیا۔ دوسرے دن نواب اپنے کسی ہندو دوست کی شادی میں حیدر آباد سے ملحق شہر سکندر آباد چلا گیا تھا کہ مولوی صاحب کسی ملازم یا گھر کے کسی فرد کو بتائے بغیر وہاں سے رخصت ہوگئے۔ مولوی صاحب کے اس طرح روپوش ہوجانے سے نواب بہت غم زدہ تھا۔ کہنے لگا کہ وہ سمجھنے سے قاصر ہے' آخر اس کی کون سی بات مولوی صاحب کو گراں گزر گئی۔ اس نے بتایا کہ اس کی والدہ کو کورا اتنی پسند آئی تھی کہ وہ مولوی صاحب سے نواب اور کورا کے رشتے کی خواہش کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکیں۔ اس کی ماں کا خیال تھا' ممکن ہے' مولوی صاحب ایک نوجوان بیٹی کی ذمے داری کی وجہ سے متفکر ہوں۔ اس طرح ان کا بوجھ ہلکا ہوجائے گا اور ایک ماں کو اپنی پسند کی بہو مل جائے گی میں نے نواب کو نہیں بتایا کہ یہ بات نہیں تھی۔ مولوی صاحب کو نواب ثروت یار جیسے ذی وقار' وجیہہ اور عالی نسب شخص سے کورا کا رشتہ منظور نہیں تھا تو وہ بیس عذر کرسکتے تھے' سوچنے کے لیے وقت طلب کرسکتے تھے۔ شاید کوئی بھی فوراً ہاں نہیں کردیتا۔ مولوی صاحب تو میری وجہ سے کہ کہیں نواب ثروت یار کے قیام کے دوران میں نہ پہنچ جاؤں' فوراً وہاں سے چلے گئے' چلے گئے یا فرار ہوگئے۔"

میری آواز گھٹ گئی۔

"مگر کیوں؟" زریں بے چینی سے بولی۔

"کیا کہا جاسکتا ہے' ظاہر ہے' وہ مجھے کوئی بہت برا آدمی سمجھتے ہیں اس لیے کہ میں سزا یافتہ ہوں' سات سال جیل میں گزارے ہیں میں نے۔ وہ مجھ سے خوف زدہ ہیں۔ اب وہ کورا کو میری امانت نہیں سمجھتے۔ انہیں اندیشہ ہے کہ میں ان سے کورا کو چھین لوں گا۔ کیا بتاؤں' یہی کچھ ہوسکتا ہے۔"

"اور وہ' وہ کورا' نرجس بانو کو' وہ اسے کیسے سمجھاتے ہوں گے' کیا باور کرایا ہوگا انہوں نے اسے؟"

"جانے کیا کہا ہوگا' یہی کہ وہ تو میری تلاش میں جگہ جگہ گھوم رہے ہیں۔ انہوں نے اسی آسرے میں اسے زندہ رکھا ہوگا۔"

"مگر کب تک وہ اس نازک لڑکی کو دلاسے دیتے رہیں گے؟"

"جانے انہوں نے کیا سوچا ہے۔ ان کے دل میں کیا ہے' یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔" میں نے جھرجھراتی آواز میں کہا۔

"زہرہ نے مجھے کورا کی بہت سی باتیں بتائی ہیں۔ وہ بہت یاد کرتی ہے اسے' کہتی ہے' خدا نے اسے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔" زریں جھجکتے ہوئے بولی۔

"ہاں۔" میری آواز ڈوبنے لگی "مگر اب تو وہ مولوی صاحب کے قبضے میں ہے۔"

زریں چپ ہوگئی۔ میں بھی خاموش ہوگیا۔ مولوی صاحب کے ذکر سے میرے رگ وپے میں پھر وہی سوزش ہونے لگی تھی۔ لمحے گزر گئے' پھر زریں نے جیسے جھجکتے ہوئے پوچھا "پھر تو حیدر آباد سے سیدھے بمبئی چلے گئے ہوگے؟"

"ہاں آں۔" میں نے چونک کے کہا "اسی دن' رات

راستے میں زخمی کانتے کی حالت اور خراب ہوگئی۔ ادھر ہوا کہ کچھ لوگ ہمارے تعاقب میں ہیں۔ ہم ان سے بان بنے رہے۔ دو ایک کو تو راستے میں بھگتا دیا' دو کو تک لے آئے۔ وہاں پیرو بھائی کے ٹھکانے میں' سمجھو' قید کردیا گیا۔ بعد میں جب ان کی پٹائی کی گئی تو انہوں یدر آباد کے ایک بڑے سرکاری افسر' نسبت شاہ کا نام انہیں کچھ اور ایذا پہنچائی گئی تو معلوم ہوا کہ نسبت شاہ ن کے دوست نواب حشمت جنگ کا ماتحت ہے۔"

"ارے!" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بولی "یعنی اس ی ابا جان کی حویلی میں وہ درندے اس نے بھیجے تھے؟"

"یہ تو انہوں نے قبول نہیں کیا' ان کا کہنا تھا کہ انہیں تو ے ہمارے پتے' ہمارے کوائف جاننے کے لیے ہمارا ب کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ خیر' ہم نے زیادہ چھان نہیں کی۔ اب ہمیں کرنا بھی کیا تھا۔ اس شخص کی نشان بھی ہوجاتی تو ہم حیدر آباد جا کے کون سا اس کے محل' پر یلغار کرتے۔"

"فرخ' فریال وغیرہ سے کب ملنا ہوا؟" زریں نے باق سے پوچھا "اور کیا حال ہوا؟"

"کچھ نہ پوچھو' تبت کے سفر پہ روانہ ہوتے ہوئے ابا کو واپسی کا اعتماد نہیں تھا' انہوں نے وہاں جانے سے سارا انتظام کردیا تھا۔ اپنے بچوں کے نام ایک سہ منزلہ ن خرید کے انہوں نے ایک شریف النفس' دین دار شخص ی اکرم کے سپرد کردیا تھا۔ اوپر کی دو منزلیں کرایے پر اٹھا ئی تھیں' اس کرایے سے مولوی اکرم گھر کا خرچ چلاتے ۔ مولوی اکرم کو ایک بڑی رقم الگ سے بھی دی تھی اور کردیا تھا کہ تین سال تک ان کی واپسی نہ ہوسکے تو مولوی م کو مناسب جگہوں پر لڑکیوں کے رشتے کرنے کا اختیار ۔ دستاویز کی رو سے اکبر کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے ۔ مولوی اکرم ہر معاملے کے مختار تھے البتہ مکان فروخت نے یا اپنے نام منتقل کرنے کے مجاز نہیں تھے۔ مولوی م چھوٹا موٹا کاروبار کرکے اچھی بھلی گزر بسر کرتے تھے۔ مکان میں آنے کے بعد کل وقتی نگرانی کی وجہ سے انہیں مستقل کاروباری شغل ترک کرنا پڑا۔ انہوں نے شرافت انتہا کردی۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔ بمبئی کانتے اور مارٹی کو جولین کے گھر' جمرد' شامو وغیرہ کو پیرو ئی کے ٹھکانے پر روانہ کردیا گیا۔ ہم پانچ' میں' ابا جان' پیرو نیر علی صاحب اور بیٹھل بھائی نے ابا جان کے گھر کا کیا۔ کیا کہوں۔ نہ انہیں یقین آتا تھا' نہ مجھے۔ وہ بھی جیسے کوئی خواب دیکھ رہی تھیں' میں بھی اسے خواب ہی سمجھ رہا تھا۔ اتنے دنوں بعد ان کا بھائی اس طرح سامنے آجائے گا اور اتنے دنوں بعد میں ان کی شکلیں دیکھ سکوں گا۔ یہ سارا کچھ کسی خواب کے مانند ہی تھا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ مجھے تو اپنا یارا ہی نہ تھا۔ ان کی خوشی تو دہری تھی۔ ابا جان بھی بہ سلامت واپس آگئے تھے پھر انہیں جہاں گیر کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ بھی ان سے دور نہیں ہے۔ وہ سب مجھے چھو چھو کے دیکھتی تھیں اور ان کے پیر زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ اکبر میرے گلے میں جھول جھول گیا۔ وہ منظر عجیب تھا۔ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اتنے عرصے بعد ہم اکٹھے ہوئے تھے۔ مجھے ای اور فہمی بہت یاد آرہی تھیں مگر' مگر کانتے نے سب کچھ منتشر کردیا' اسے اسپتال میں داخل کردیا گیا تھا اور آخر وہ ہار گیا' وہ شخص جو دس بارہ آدمیوں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا' خود سے ہار گیا۔ آدمی کی سب سے بڑی شکست تو خود سے ہوتی ہے اور کانتے کی موت کا بیسواں دن تھا۔ جولین کے گھر سب جمع تھے۔ پیرو بھائی اور ماچھی رات کو گھر سے نکلے۔ انہیں گولی ماردی گئی۔ وہ بھی چلے گئے۔"

زریں کو کانتے' پیرو اور ماچھی کی موت کا علم تھا۔ اس نے سر جھکالیا اور دل گرفتہ آواز میں بولی "مگر ان دونوں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا؟"

"وہ ایک لمبی کہانی ہے۔" میں نے زہر خند سے کہا "یوں سمجھو کہ تبت کے سفر پر ہماری ساتھ جانے کی وجہ سے پیرو بھائی نے اپنا ٹھکانا اپنے معتمد' معتبر لوگوں کے سپرد کردیا تھا۔ ان کی عدم موجودگی میں ان کے پروردہ لوگوں نے خوب گل کھلائے۔ وہ سمجھے تھے کہ اب شاید پیرو بھائی واپس نہ آئیں۔ پیرو بھائی اچانک ایک روز بمبئی واپس پہنچ گئے تو سبھوں کو سانپ سونگھ گیا۔ پیرو بھائی نے جب سب کچھ الٹ پلٹ دیکھا تو ایک ایک کو خوب لتاڑا' رگیدا۔ کچھ تو سنبھل گئے' کچھ نے دل میں کینہ رکھ لیا۔ ان میں ایک شخص تھا' جارجی نام کا' پیرو بھائی ہی کا بنایا ہوا تھا۔ اس کی شادی بھی پیرو بھائی نے اپنی معنوی بیٹی ماری سے کرائی تھی۔"

میں نے بہت احتیاط کی لیکن جارجی کا نام آتے ہی بے اختیار میری زبان سے نکل گیا "اسی کتے نے اپنے ایک ساتھی کی مدد سے پیرو بھائی کو ختم کیا تھا۔"

زریں نے اپنی آنکھوں پر پلکوں کا پردہ کرلیا اور مجھے پشیمانی سے بچالیا۔ میں نے کہا "وہ بڑا کمینہ تھا۔ سارے شہر میں پیرو بھائی کی موت کا چرچا تھا۔ پولیس ہم پر بھی شک کررہی تھی۔ ہمیں بھی طلب کرلیا گیا تھا۔ ہم نے بہت دلیلیں

دیں تبھی ہمیں چھوڑا گیا' ہم نے ان سے کچھ وقت مانگا تھا۔ بہت صاف ستھرا قتل کیا تھا جارجی نے' وہ کبھی نہ پکڑا جاتا۔ ایک روز اس کی بیوی ماری نے اسے انجام کو پہنچا دیا اور تھانے آکے اقبالِ جرم کرلیا۔ ماری نے سارے واقعات سے پردہ اٹھایا۔ یوں ہم بھی پولیس کے عتاب سے بچ گئے۔ تھانے میں بٹھل بھائی اور میں' ماری سے ملے تھے' وہ اپنے اقدام پر ذرا بھی شرمندہ نہیں تھی۔ وہ تو اپنے بچوں کی طرف سے وحشت زدہ تھی۔ جب تک اس نے اپنے بچوں کو دیکھ بھال کے لیے بٹھل بھائی سے وعدہ نہیں لے لیا' اس کی آہ و بکا جاری رہی۔ بعد میں ابا جان سے کہہ کے بٹھل بھائی نے ماری کے بچوں کی نگرانی کا مستقل انتظام کرادیا۔ ان کی خیر خبر رکھنے کا کام جولین کے سپرد کیا۔

میں نے اپنی طرف سے اڈے پاڑے کے ذکر سے اجتناب کیا تھا۔ حالانکہ زریں کو بہت کچھ معلوم تھا لیکن اپنی زبان سے مجھے اچھا نہیں لگتا تھا اسی لیے میں نے پاڑے کے بجائے پیرو بھائی کا ٹھکانا کہا تھا۔ وہ ایک معاملہ فہم لڑکی تھی' سمجھ گئی ہوگی۔ میں نے اسے نہیں بتایا کہ پیرو کی موت کے بعد اس کے پاڑے پر کیا واقعات رونما ہوئے' اس کی [illegible] رتھی میں کتنے لوگ شامل تھے۔ میں نے صرف یہ بتایا کہ پیرو کی بیوی اور بیٹی کو ہم اپنے گھر لے آئے۔

آپس میں چاقو بازی کی مشق کے دوران مارٹی کے زخمی ہوجانے اور دم واپسیں جولین کے دیدار کی حسرت کے واقعے سے زریں بہت متلاطم ہوئی۔ میں نے اسے بتایا کہ اس دوران حیدر آباد سے نواب ثروت یار کا خط بھی آگیا تھا کہ مولوی صاحب حیدر آباد واپس آچکے ہیں۔ مارٹی کی ناگفتہ بہ حالت میں ہم کیسے سفر کرسکتے تھے اور اس کے سانحے کے بعد تو کہیں آنے جانے کا کیا سوال' کسی کام میں جی ہی نہیں لگتا تھا لیکن بٹھل نے سفر کا ارادہ کرلیا۔ حیدر آباد میں نواب ثروت کے ہاں پہنچنے' اس کی زبانی مولوی صاحب کی موجودگی کا مژدہ سننے اور اس کی معیت میں حیدر آباد شہر سے کچھ دور مولوی صاحب کے گھر کے لیے روانگی' درمیان میں ایک سنسان جگہ موٹر کی خرابی کے بہانے رات گزارنے کے لیے نزدیک ترین پناہ گاہ' کسی نواب محسن کے وسیع و عریض باغ میں واقع کوٹھی میں ہمیں ہنکا کے لے جانے' رات گئے اس کے فرستادہ مسلح آدمیوں کا حملہ اور حیرت انگیز طور پر بٹھل کا اصل معاملہ سونگھ لینا۔ ان لوگوں پر بہ وقت تمام قابو پا لینا' بٹھل کا نواب ثروت کو جکڑ لینا اور سرغنہ کا ہیجان و اضطراب' عین لمحے بٹھل کا سرغنہ کے نشانے سے خود بچنا اور اپنے ستم گر نواب کو بھی بچانے کی کوشش اور بدقسمتی سے سرغنہ کے نشانے پر اس کے آقا نواب ثروت کا آجانا' شدید زخمی حالت میں نواب کو اس کے ایک شناسا ڈاکٹر کے ہاں پہنچانا' آخری وقت میں ڈاکٹر کے سامنے نواب ثروت کا اعتراف کہ مولوی صاحب نے حیدر آباد آکے کورا اور اس کی وابستگی کے لیے میری دیوار کا ذکر کیا تھا۔ مجھے راستے سے ہٹانے اور کورا کو یہ باور کرانے کے لیے کہ اب میرا انتظار محض ایک سراب ہے' وہ میری آس ترک کردے' نواب نے یہ ساری نوٹنکی کی تھی۔

زریں کی آنکھوں میں آنسو لرزاں تھے۔ اس کے ہونٹ پھڑک رہے تھے۔

"نواب ثروت بھی نہیں رہا۔" میں نے اسے بتایا۔

"ڈاکٹر کے بقول' آخری وقت نواب ہم سے اپنے گناہ کی معافی مانگنے کے لیے بے قرار تھا۔ اسے وقت ہی نہیں ملا۔ ہم کچھ دیر سے ڈاکٹر کے ہاں پہنچے' ڈاکٹر کو اس نے مولوی صاحب کے گھر کا پتہ بھی بتایا تھا۔ کسی تاخیر کے بغیر ہم وہاں سے سیدھے اس محلے پہنچے جہاں مولوی صاحب کی سکونت تھی مگر وہ وہاں سے جاچکے تھے۔"

"وہ کیسے؟" زریں ہڑبڑا سی گئی۔

"نواب ثروت کئی دن تک ڈاکٹر کے ہاں زیر علاج رہا تھا۔ اس کے ڈرائیور نے بہتر سمجھا کہ اس کی شدید حالت سے مولوی صاحب کو بھی مطلع کردے تاکہ بعد میں انہیں شکایت نہ ہو۔ مولوی صاحب نے اپنے محسن' اپنے مربی نواب ثروت کی عیادت کے لیے ڈاکٹر کے ہاں جانے کے بجائے اسی دن' شاید اسی وقت حیدر آباد چھوڑ دیا' کیونکہ ڈرائیور نے نواب کے ہم سفر ہم دو اجنبیوں' بٹھل بھائی اور میرا ذکر بھی ان سے کیا تھا۔

حیدر آباد سے واپسی پر ریل میں سلمٰی سے ملنے کا ماجرا تم سلمٰی سے سن ہی چکی ہوگی۔ حیدر آباد سے دلی جاتے ہوئے ہم مراد آباد کے مسافر خانے میں ٹھہر گئے۔ جمرو' زورا اور سلمٰی کو وہاں روک کے بٹھل بھائی اور میں ہفتے ڈیڑھ ہفتے اطراف کے شہروں میں گھومتے رہے۔ مراد آباد میں ہمیں مولوی صاحب کے ایک دیرینہ رفیق حافظ عبدالخالق کے بارے میں معلوم ہوا تھا۔ وہ دونوں کبھی ایک ساتھ مراد آباد کی مشہور دینی درس گاہ جامعہ قاسمیہ میں پڑھاتے تھے۔ حافظ عبدالخالق نے بھی مدرسہ چھوڑ دیا تھا اور عرصہ ہوا اپنی زمینوں پر نگریا سادات چلے گئے تھے۔ ہم وہاں پہنچ گئے۔

نگریا سادات میں مولوی صاحب کے دیرینہ رفیق حافظ عبدالخالق سے ملاقات' ان سے بحث و تکرار' بٹھل کا اپنی اور میری کلائی پر چاقو سے لکیر کھینچنا اور حافظ عبدالخالق کا پگھل جانا۔ "ہماری روداد سن کے ان کا وعدہ کہ اب جب بھی مولوی صاحب ان کے پاس آئے' وہ ہمیں ضرور مطلع کریں گے اور میری بابت مولوی صاحب کا غبار یا خوف دور کرنے کی کوشش کریں گے۔" نگریا سادات سے فیض آباد روانگی اور لکھنؤ میں کبن خاں کے استاد' شمشاد خاں کے مزار پر تین چار دن قیام' فیض آباد اسٹیشن پر جمرو' زورا اور سلمٰی کو وداع کرکے آگے کا سفر' مشرق یوپی اور بہار کی بے شمار بستیوں کی خاک چھاننے کے بعد شہر آسن سول میں سید محمود علی کے ہاں پڑاؤ کی بابت میں نے تفصیل سے اسے بتایا اور لکھنؤ میں استاد شمشاد خاں کے اڈے پر رجن اور بنے خاں کا معرکہ اور بنے خاں کی شکست پر رجن سے میری مڈبھیڑ' بنے خاں کے غیاب اور چاندنی بابو کا قصہ۔ چاندنی بانو کے اغوا کے بیان سے میں نے پہلو تہی کی "آسن سول کے بارے میں نصیر بابا' فرزاں اور یاسمن نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہوگا۔" میں نے پژمردگی سے کہا۔

وہ ہونٹ بھینچتے ہوئے بولی "فروزاں اور یاسمن کا وہاں سے بچ نکلنا کسی معجزے سے کم نہیں۔"

"اتفاق ہے' مجھے تیز بخار آگیا تھا اور آسن سول سے آگے سفر مشکل تھا۔ ہرچند میں کلکتے جانے کے لیے کمربستہ تھا۔ کلکتہ اتنا دور بھی نہیں رہ گیا تھا مگر سید محمود علی نے روک لیا۔ اس نے مہمان نوازی کی حد کردی۔ صبح و شام ڈاکٹر آتا تھا۔ کیا تپاک تھا' کیا خاطرداری تھی۔ طرح طرح کے لوگ اس کے مہمان خانے میں آکے ٹھہرتے ہیں' عالم فاضل' اپنے اپنے فن کے ماہر' بڑے معزز اور مشہور لوگ۔ کوئی بھی نہیں جانتا ہوگا' ایسا متواضع میزبان اتنا' اتنا بڑا...." میں نے خود کو لگام دی' سید محمود علی کے لیے کوئی بدترین خطاب میری زبان پر آتے آتے رہ گیا "نصیر بابا کہتے ہیں' کتنے لوگ آئے۔ مدد کے لیے سوچتے رہے' کس سے بات کریں' کس کی منت کریں۔ آخر ہم وہاں پہنچ گئے' انہیں بہت دنوں سے جن لوگوں کا انتظار تھا۔ تم نے دیکھا؟ وہ کیسی شیشے کی بنی ہوئی لڑکیاں ہیں۔ دھوپ سے جیسے ان کا کبھی گزر ہی نہ ہوا ہو۔ وہ کیسے شقی القلب کے سائے میں زندگی بسر کررہی تھیں۔" میں نے گہری سانس لی "بس یہی کچھ تھا۔ بہت سی باتیں تو میں نے تمہیں بتائیں بھی نہیں' بہت کچھ مجھے خود یاد نہیں رہا۔"

وہ سرنگوں گم بیٹھی رہی۔ دیر تک سکوت چھایا رہا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"کچھ نہیں۔" وہ افسردگی سے بولی "سمجھ میں نہیں آتا' کیا کہا جائے۔"

"کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اسی لیے مجھے تامل تھا کہ میرے پاس تمہاری آسودگی کی کوئی بات نہیں ہے۔"

"لیکن یہ سب جانے بغیر مجھے ایک محرومی سی رہتی۔"

"میں نے پہلے ہی کہا تھا' بیتے ہوئے میں کچھ ایسا نہیں ہے جسے دہرا کر کوئی سکون حاصل ہو۔ یہ تو تم تھیں' کسی دوسرے کے سامنے تو شاید میری زبان ہی نہ کھلتی۔"

"یہ سب کیسا عجیب ہے۔"

"مجھے خود بھی یقین نہیں آتا۔"

"کبھی مجھے تم پر بہت ترس آتا ہے اور کبھی غصہ۔"

"یہی میرا حال ہے۔"

"اور عجب بے بسی ہوتی ہے کہ میں تمہارے کسی کام نہیں آسکتی۔"

"سچ پوچھو تو تم میرے بہت کام آتی ہو۔ میرے ساتھ نہ رہتے ہوئے بھی تم میرے ساتھ رہتی ہو۔ تمہارے خیال سے میری ہمت بڑھتی ہے۔ میں خود کو مضبوط محسوس کرتا ہوں۔ مجھے احساس رہتا ہے کہ کوئی میرے لیے بہت دعائیں کررہا ہے۔ تم میرا یقین ہو' تم میرا سچ ہو۔"

"اتنا مت کہو۔" اس کی آواز ڈولنے لگی۔ اس کے سراپا میں تموج سا نمودار ہوا "میں تو صرف دعائیں ہی کرسکتی ہوں لیکن مجھے معلوم ہے' تمہیں اس سے سوا کی ضرورت ہے۔ کاش میں بھی بابا کی طرح' جمرو بھائی' زورا بھائی کی طرح تمہارے ساتھ ہوتی۔ میں کیوں نہیں ہوسکتی؟" اس کے لہجے میں بہت سے جذبے نمایاں تھے۔

"بٹھل بھائی اور دوسرے کیا کم میرے لیے آزار بھگتتے ہیں کہ ایک تمہارا بھی اضافہ ہو۔ مجھے انہی سے بڑی ندامت ہوتی ہے۔ کبھی میں سوچتا ہوں' میری وجہ سے کتنے گھر' کتنے لوگ منتشر ہوئے۔"

"اور کتنے گھر آباد' کتنے لوگوں کی نجات بھی تمہارے سبب سے ہوئی۔ ابھی حال ہی میں دیکھو۔ یہ فروزاں اور یاسمن' تم وہاں نہ جاتے تو ان دونوں پر کیا گزرتی۔"

"ہاں ان کا تو واقعی عجیب ہوا۔"

"وہ تو تمہاری بہت احسان مند ہیں۔ ہر وقت خدا کا شکر ادا کرتی ہیں۔ ہر وقت ان کی زبان پر تمہارے اور بابا کے نام کا ورد ہے۔"

"یہاں تو وہ خوش ہیں نا؟" میں نے یوں ہی پوچھا۔

"بظاہر تو بے حد، شاید بباطن بھی۔"

"یہاں تم ہو تو وہ کیسے ناآسودہ، ناخوش ہو سکتی ہیں۔"

"ہاں۔" وہ تیکھے لہجے میں بولی "میں تو کوئی آدمی نہیں ہوں۔۔۔"

"تم واقعی آدمی نہیں ہو۔"

"پھر کیا ہوں؟"

"تم، تم۔" مجھے فوراً کوئی مناسب لفظ نہ سوجھ سکا "تم نہ جانے کیا ہو۔"

"میں جانے کیسی مٹی کی بنی ہوں، یہ کہنا تو نہیں چاہتے؟"

"نہیں نہیں، مٹی کی نہیں، تم تو شہد کی، ریشم کی بنی ہو، تم تو۔۔۔"

"بس، بس، خدا کے لیے بس کرو۔" اس کا بدن ایک لمحے کے لیے بھڑک سا اٹھا، کہنے لگی "مجھے تو اپنے آپ سے ڈر لگنے لگا ہے۔"

"کیوں، کس بات سے؟"

"کہیں کسی لمحے شیشہ ہاتھ سے نہ گر جائے۔" وہ اداس ہو گئی "ہاتھ بہک بھی تو جاتے ہیں، بھٹک بھی تو جاتے ہیں۔"

"نہیں ہو گا ایسا۔" میں نے عزم سے کہا۔

"کاش کہ ایسا ہی ہو۔" وہ خمیدہ پلکوں سے بولی۔

اسی لمحے کہیں دور سے مرغ کی بانگ سنائی دی۔ میں نے چونک کے گھڑی دیکھی۔ تین بج چکے تھے "یہ مرغ اب ناوقت بھی بانگ دینے لگے ہیں۔"

"یہ نئے زمانے کے مرغ ہیں۔" وہ مسکرا کے بولی "نئے زمانے میں ہر ایک کو جلدی ہے۔"

"پھر بھی رات بہت ہو گئی ہے۔ تمہیں نیند تو نہیں آرہی؟"

"تمہیں آرہی ہے؟"

"مجھے تو جاگنے کی عادت ہے۔"

"مجھے بھی سونے سے کوئی ایسی رغبت نہیں، پھر اتنے عرصے بعد تو یہ موقع ملا ہے۔ نیند تو ادھار بھی کی جا سکتی ہے۔"

"اور کہتے ہیں، نیند کا ادھار زیادہ مدت کا نہیں ہوتا۔ نیند اپنا قرض معاف نہیں کرتی۔"

یکایک اسے خیال آیا، اس نے ہمک کے پوچھا "قہوہ بنا کے لاؤں؟"

"تمہیں خواہش ہو تو لے آؤ۔"

"تمہیں نہیں ہے؟"

"تمہاری زحمت کا خیال آتا ہے۔ اب اتنی رات گئے، آگ جلاؤ گی، پانی، پیالیاں۔۔۔"

"کچھ دیر نہیں لگے گی، بس چٹ پٹ۔"

"پھر میں بھی ساتھ چلتا ہوں، تمہاری کچھ مدد کر سکتا ہوں۔ مجھے باورچی خانہ دیکھے ہوئے صدیاں ہو گئیں۔"

"باورچی خانہ کوئی ایسی قابلِ دید جگہ نہیں ہے۔"

اس نے مجھے روک دیا اور اٹھ کے تیزی سے باہر چلی گئی مگر کمرے سے چلے جانے کے بعد بھی وہ موجود رہی۔ اس کی خوشبو، اس کا خیال۔ میں اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ ہر اعتبار سے کیسی مکمل لڑکی ہے۔ حسین و جمیل عورت اور وجیہ و شکیل مرد میں ذہانت نہ ہو تو کیسا ادھورا پن ہے۔ ذہانت بجائے خود حسن ہے۔ ذہانت، سلیقہ، خوش گفتاری، خوش اطواری بھی حسن ہے۔

وہ جلد ہی واپس آگئی۔ اس کے ہاتھ میں بھرا پرا طشت تھا۔ قہوہ دانی، شکر دانی، فنجان اور چمچوں کے علاوہ طشت میں خشک میوہ بھی رکھا تھا، اناس کی قاشیں اور گلوریاں بھی۔ اتنی جلد اس نے یہ اہتمام کر لیا تھا۔ کام کرنے کا جذبہ ہو تو سارا کام جادو کی طرح ہوتا ہے۔ جذبہ، جادو ہے۔ میں نے میز کھسکا کے طشت میز پر رکھنے میں معاونت کی۔ اس نے فنجانوں میں قہوہ بھرا۔ میں بھول ہی گیا تھا کہ میں نے اسے کیوں بلایا ہے۔ قہوے سے مجھے بمبئی کے علاقے دادر میں واقع ایرانی ہوٹل یاد آیا اور میں نے اس کی شگفتگی دیکھ کے سلسلہ جنبانی کی "تمہارا بمبئی جانے کو نہیں جی نہیں چاہتا؟" اس نے سرسری انداز میں پوچھا۔

"کیوں نہیں۔" اس نے بے ساختہ کہا "میں نے اب تک فرخ، فریال، فارہہ اور اکبر کو نہیں دیکھا ہے۔ ان سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے۔"

"اور وہاں صرف وہی نہیں، وہاں جولین، شہ پارہ اور گیتا ہے۔ وہ بھی اسی گھر کی فرد ہیں۔ میرے لیے تو فرخ، فریال کی طرح، اور ہاں، وہاں رما اور کیلاش بھی تو ہیں۔"

اس نے رما اور کیلاش کے بارے میں تجسس ظاہر کیا۔

میں نے اسے بتایا "کانتے کی بیماری کے دوران اسپتال میں ڈاکٹر کیلاش سے تعارف ہوا تھا۔ تعارف، تعلق میں بدل گیا اور مراسم ایسے بڑھے کہ گھر آنا جانا ہو گیا۔ دونوں بھائی بہن اعلا تعلیم یافتہ ہیں۔ دونوں میں بڑی دلکشی ہے۔ رما سے مل کے تو تمہیں احساس ہو گا، جیسے ایک شخص کی اب تک کی بھی۔ وہ بالکل الگ لڑکی ہے، بڑی روشن خیال، اور میں تو کہوں گا، مفکر بھی ہے، بڑی فکر انگیز باتیں کرتی ہے۔ تم میں اور

اس میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔" میں رما اور ڈاکٹر کیلاش کے بارے میں تفصیل سے بتاتا رہا۔ وہ پرشوق نگاہوں سے سنتی رہی "تو پھر بمبئی چلتے ہیں' ہاں۔" میرے فیصلہ کن لہجے میں التجا بھی شامل تھی۔

"اچانک یہ خیال کیسے آگیا؟" وہ حیرانی سے بولی۔

"بس آگیا' اصولاً تو بہت پہلے تمہیں وہاں ہونا چاہیے تھا یا ان اڈوں کو اس طرف آنا چاہیے تھا مگر سارے حالات تو تم سن ہی چکی ہو۔ فرصت ہی کہاں ملی لیکن اب' اب تم تیار ہو جاؤ۔"

"مگر تم تو کہیں اور جا رہے ہو؟"

"کہیں اور نہیں' پہلے بمبئی جائیں گے۔"

"مگر بابا تو بنگال کی طرف ارادہ رکھتے ہیں۔"

"ان سے میں بات کرلوں گا بلکہ تم بھی ان پر زور دینا' تمہاری بات تو وہ ٹالیں گے نہیں۔"

"اور تمہاری ٹال دیں گے؟"

"میری بات جانے دو' مجھ سے تو وہ کبھی کبھی بہت ضد کرتے ہیں۔ میری بات پر کان نہیں دھرتے۔ بہرحال' میرا خیال ہے' انہیں اعتراض بھی نہیں ہونا چاہیے۔ ہم ان سے کوئی نامناسب فرمائش تو نہیں کر رہے۔" بمبئی شہر کی فضیلتوں کے لیے میں طرح طرح کی دلیلیں وضع کرتا رہا۔ میں نے کہا "تمہیں وہاں جا کے ہی کچھ اندازہ ہوگا کہ وہ کیسا مختلف شہر ہے پھر شاید لوٹنے کو جی نہ کرے۔"

"میں نے کلکتہ دیکھا ہے۔ وہ بھی تو بڑا شہر ہے' بلکہ بہت بڑا۔"

"بے شک' وہ بمبئی سے بڑا شہر ہے لیکن بمبئی کی بات دوسری ہے۔ وہاں اتنے کشادہ گھر تو نہیں لیکن وہ بھی گھر ہیں۔ وہاں لوگ کام کرتے ہیں اور اپنے آپ سے غرض رکھتے ہیں۔ وہاں آدمی تیز چلتا ہے اور گھڑی پر اس کی نظر رہتی ہے۔ سمجھو ہر شخص کوئی ترازو پاس رکھتا ہے۔ لوگوں کی کثرت کی وجہ سے کسی حد تک پیچیدگی اور افراتفری بھی نظر آتی ہے لیکن وہاں زندگی ایسی گھٹی' تنگ اور اجاڑ نہیں ہے۔ یہاں تو گھڑی بھی شاید سست چلتی ہے۔ یہاں صرف سکون ہی سکون ہے۔ سکون کی اتنی افراط بھی نہیں ہونی چاہیے۔"

اس نے تحمل سے سنا۔ اس تحمل میں تاک بھی تھا "میں وہاں جانے سے کب انکاری ہوں اور مجھے کسی شہر سے اتنی غرض نہیں جتنی وہاں کے مکینوں سے ہے اور مکینوں میں بھی چند سے۔ مکین اپنے نہ ہوں تو کوئی بستی اپنی نہیں لگتی۔"

"لیکن شہر سے بھی بڑا فرق پڑتا ہے۔ یہاں ان چھوٹے چھوٹے شہروں اور بستیوں میں آدمی کچھ دوسروں کا پابند نظر آتا ہے۔ لگتا ہے' یہاں ہر شخص' ہر شخص کا نگراں ہے۔ مثلاً تم یہاں بازار میں بڑے اہتمام ہی سے جا سکتی ہو' بہت چھپا کے' اپنے آپ کو سمیٹ کے۔ وہاں یہ سب کچھ نہیں ہے۔ یہاں ذرا سی بات ہو تو فسانہ ہو جاتی ہے' سارے شہر کو خبر ہو جاتی ہے' وہاں پڑوسی کو خبر نہیں ہوتی۔ تم ایک پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ تمہارا جی نہیں چاہتا کہ تم ان بے سروپا آداب سے نجات پاؤ؟ یہاں تو ہر عورت جیسے کسی زنداں میں رہتی ہے۔ یہ چھوٹے شہر خصوصاً عورتوں کے لیے بڑے تنگ نظر ہوتے ہیں۔"

"کیا بات ہے؟" وہ کسی قدر شوخی سے بولی "پہلے کبھی تم اس شدومد سے اس شہر کے مخالف نہیں تھے۔"

"مخالفت نہیں' مسلسل سفر کی وجہ سے مجھے موازنے کا موقع اچھا ملا ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے' بڑے شہر میں سکونت سے مراد ہے' آدمی نئی زندگی سے قریب ہے۔ نئی زندگی کے سفر میں شامل ہے' وہ پچھڑا ہوا نہیں ہے۔ اگر یہ چھوٹے شہر بھی ایسے متحرک اور سرگرم ہو جائیں تو کیا خوب ہو۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ خوش دلی سے بولی "بمبئی بھی دیکھیں گے۔"

"دیکھیں گے کیا معنی؟ بس چلنا ہے' دور کی بات نہیں' سب سے کہہ دو۔"

"ایسے کیسے؟ یہ اتنا آسان نہیں ہے۔"

"کیوں' اس میں سوچنے کی کیا بات ہے' کون سی بڑی تیاری کرنی ہے۔ وہ ایک دوسرا گھر ہے' اسی گھر کے مانند' وہاں ساری چیزیں موجود ہیں۔"

"جہاں گیر' نیساں' سلمیٰ اور مجو میاں کے سالانہ امتحانات میں دو مہینے رہ گئے ہیں۔"

"یعنی جب تک تم کہیں آجا نہیں سکتیں۔"

"کیا مجھے اکیلے جانا ہے؟"

"نہیں' سبھی کو' سبھی کو جانا چاہیے۔"

میری مرجھائی ہوئی آواز سے اس کا بدن بسمل ہوا۔ اس نے سمجھانے کے انداز میں متعدد عذر پیش کیے۔ کہنے لگی کہ زمینوں کی دیکھ بھال کا کام اب منیر علی کا بھانجا ارشد کر رہا ہے۔ معلوم نہیں' فصلوں کی کیا صورت حال ہے۔ ارشد کے ساتھ منیر علی کا بیٹا تنویر بھی کھیتی باڑی میں دلچسپی لینے لگا ہے۔ دونوں پڑھے لکھے ہیں۔ انہوں نے کاشت کاری کے نئے

یقے آزمانے شروع کیے ہیں' کچھ اور زمینوں کا اضافہ بھی
ہے۔ باغ بھی کثرت سے لگائے ہیں۔ زریں نے حویلی کے
ھانے میں مدفون تبت سے لائے ہوئے نوادر سے بھرے
ے صندوقوں کی طرف بھی اشارہ کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ تہ
نے جانے والے راستے پر نہایت رازداری سے دیوار چن
گئی ہے۔ زریں کا یہ عذر ایسا معقول نہیں تھا۔ بٹھل نے
صندوقوں کا کوئی بہت ہی معقول انتظام کیا ہوگا۔ نہ
لوں کے معاملات اتنی اہمیت رکھتے تھے۔ البتہ جہاں گیر اور
اں وغیرہ کے تعلیمی سلسلے میں رخنہ اندازی کا معاملہ نظر
از نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں چپ ہو گیا۔

"ہو سکے تو اب کے سفر مختصر رکھنا۔" وہ نرمی سے بولی
ڈھائی مہینے بعد تمہارا ادھر آنا ہوا تو سب کو تیار پاؤ گے یا
تم بمبئی سے کہیں قریب ہو تو سیدھے وہیں چلے جانا اور
یں لکھ دینا۔ ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔ امتحانات کے بعد
اغت ہی فراغت ہوگی۔"

"دو ڈھائی مہینے کیا۔" میں نے بے دلی سے کہا "سفر میں
ھ یقین نہیں ہوتا' کہاں کتنا وقت لگ جائے۔ کہاں زنجیر
روں میں پڑ جائے۔ سفر اپنے اختیار کا نہیں ہوتا۔ تم نے
ی یہی کچھ تو سنا ہے۔"

"ضروری نہیں کہ ہر بار ایسا ہی ہو۔ ممکن ہے' اس سفر
کے بعد کسی اور سفر کی ضرورت ہی نہ پڑے۔"

"کیا معلوم۔" میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا "کب
تک یہ سلسلہ چلے' کہاں جا کے ختم ہو۔"

"تم بالکل نہیں بدلے' پھر وہی مایوسی کی باتیں' بالکل
وہی ہو جو پہلے تھے۔"

"تم کیا توقع کر رہی تھیں' میرے سینگ نکل آئیں گے؟"

وہ کھلکھلا پڑی۔ کمرے میں جیسے گھنٹیاں بج اٹھیں' پھر تلقینی انداز میں کہنے لگی "میں سمجھتی تھی' تمہارا ارادہ اور پختہ ہو چکا ہوگا۔ پہلے بھی تم نے ایسی ناامیدی کی باتیں کی تھیں مگر تم نے دیکھا۔ کئی جگہوں پر تم منزل پر پہنچ ہی گئے تھے۔ بس یہی تو ہوا' پہنچنے میں کچھ دیر سویر ہو گئی' جیسلمیر' حیدر آباد' نگر یا سادات۔۔۔"

"منزل پر پہنچ کے ناکام واپس آجانا' منزل پر پہنچ جانا نہیں ہے۔" میں نے ترشی سے کہا۔ اپنے لہجے کی بیزاری مجھے خود اچھی نہیں لگی۔

"لیکن راستے بند تو نہیں ہوئے۔"

"جتنے راستے ہیں' اتنی بڑی زندگی نہیں ہوتی۔"

"پھر یہ بھی تو ملال نہیں ہوتا کہ ہم نے راستے آزمائے ہی نہیں۔ تمہارا عزم تو استوار رہا۔ نیت تو ثابت تھی' جستجو تو جاری رہی تھی۔" اس نے میرے فنجان میں کچھ اور قہوہ ڈال دیا۔ میں نے منع نہیں کیا۔ قہوہ ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ میں نے دو گھونٹ میں ختم کر لیا۔

"تم بھی نہیں بدلیں' بالکل وہی ہو۔ مجھے یاد ہے' پچھلی مرتبہ بھی تم نے یہی کچھ کہا تھا' اور کوئی کہہ بھی کیا سکتا ہے۔ کسی کے پاس ان تشفیوں کے سوا ہو بھی کیا سکتا ہے۔ سب مجبور ہیں' میری طرح۔ لوگ دعاؤں کی قبولیت' ستاروں کی کرشمہ سازی اور نوشتہ دیوار کی بات کرتے ہیں۔ کسی کو نہیں معلوم' میرے لیے دعاؤں کی قبولیت کا وقت کب آئے گا۔ ستارے کب مہربان ہوں گے اور دیوار کا لکھا کب بدلے گا۔" میرے سینے میں ہوک سی اٹھی اور میری آواز ڈولنے لگی "میرے لیے تو شاید سب کچھ طے ہو چکا ہے۔ اب شاید کچھ بھی نہیں بدلے گا۔ یوں ہی میں بھاگتا رہوں گا' یہی کچھ' بس یہی ہوتا۔۔۔"

"تم ایک باہمت اور بہادر نوجوان ہو۔ تم نے تو مثال قائم کی ہے۔ تم نے تو۔۔۔"

"مگر کیا حاصل؟ میں نے کیا قصور کیا ہے' کسی کا کیا بگاڑا ہے۔ میں تو۔۔۔ میں تو۔۔۔" میری آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

"ارے رے' یہ کیا! نہیں نہیں' یہ نہیں۔" وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اڑتی ہوئی مسہری کے پاس آکے بے تابانہ اس نے میرا سر اپنی آغوش میں چھپا لیا۔ میں نے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کی لیکن اس کے لمس میں ایسی جاذبیت اور وارفتگی تھی کہ میری آنکھیں اور جلنے اور گھلنے لگیں۔ مجھے کچھ یارا ہی نہ رہا۔ میں سسک سسک کے بلک بلک کے روتا رہا۔ اس نے میرا سر اپنی بانہوں میں جکڑ لیا تھا پھر وہ اضطراری انداز میں میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ میرے آنسوؤں سے اس کا کرتا بھیگ گیا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اس کے سراپا میں جذب ہو جاؤں۔ میرا وجود انہی آنسوؤں میں تحلیل ہو جائے۔ اس کے ہاں بہت گداز تھا' بہت چھاؤں تھی۔

جانے کب یہ آنسو تھمے۔ سیلاب بھی کہیں جا کے تھم جاتا ہے۔ اس نے اپنے آنچل سے میرے آنسو پونچھے' میرے بھیگے ہوئے گال خشک کیے' میرے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ میں نے سر اٹھا کے دیکھا۔ اس کی آنکھیں بھی لبریز تھیں۔ میں نے اسے بھی رلا دیا۔ میری حالت کسی بچے کی سی ہو گئی تھی۔ اس نے گلاس بھر کے مجھے پانی پلایا۔ میرے اوسان کچھ

بحال ہوئے تو ندامت نے آگھیرا۔
کمرے میں دیر تک سکوت رہا۔
"تم جاؤ اب، صبح ہونے والی ہے۔" میں نے ناتوانی سے کہا۔ گو جی چاہتا تھا کہ وہ میرے پاس ہی رہے۔
"ہاں، اب مجھے جانا چاہیے۔" وہ بدبداتے ہوئے بولی "لیکن تم اپنے آپ کو سنبھالے رکھو گے۔"
"مجھے کچھ نہیں ہوا۔" میں نے تندی سے کہا "بس ایسے ہی کبھی کبھی، ایسا کچھ ہو جاتا ہے اور میں تنہا اپنے آپ سے نمٹ لیتا ہوں، میں نے تمہیں بھی پریشان کیا۔"
"کوئی سب کے سامنے، ہر ایک کے سامنے نہیں روتا۔" اس کی آواز بھی بکھری ہوئی تھی "آنسوؤں کا بہہ جانا ہی اچھا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہی ہونا چاہیے۔ رکے ہوئے آنسو زہر ہوتے ہیں اور آنسوؤں کے بغیر آدمی نامکمل ہوتا ہے۔"
صبح بہت تیزی سے طلوع ہوتی ہے۔ اندھیرا کم زور پڑنے لگا تھا۔ اذانوں کی آواز پر وہ اٹھ کھڑی ہوئی "جا رہی ہو۔" میں نے جھپکتی پلکوں سے کہا۔
"اب تم آرام کرو، پوری رات ہو گئی۔"
"میرا کچھ نہیں تم، تم یقیناً بے آرام ہوئیں۔"
"میرے لیے اس سے اچھی رات کیا ہو گی۔"
"کہ تمہیں تلخیوں اور آنسوؤں سے واسطہ پڑا۔"
"لیکن ان کی نسبت تم سے تھی۔" اس نے یاسیت آمیز برجستگی سے کہا۔
"میری ویران نظریں اس کے چہرے پر بھٹکنے لگیں۔ اس نے دروازے کا رخ کیا تو میں بھی مسہری سے اٹھ کھڑا ہوا اور میں نے چاہا کہ اس کے کمرے تک اسے پہنچا آؤں۔
"میں چلی جاؤں گی۔" اس نے دروازے کے پاس جا کے کہا۔
دروازے سے باہر نکلتے نکلتے وہ ٹھہر گئی اور پلٹ کے اس نے مجھے ایک نظر دیکھا۔ میں نے بے اختیار بڑھ کے اپنے بازو پھیلا دیے۔ ایک لحظے بعد وہ میرے بازوؤں میں سمٹ آئی۔ میں نے جیسے پھولوں کو، ریشم کو اپنے حصار میں لے لیا ہو۔ میرا جسم شل سا ہونے لگا۔ میرا جسم جیسے میرا نہ رہا ہو، جیسے میں کوئی اور شخص ہوں، جیسے میں اپنے آپ سے بچھڑ رہا ہوں۔ اس نے اپنا چہرہ میرے شانے پر ٹکا دیا تھا یا چھپا دیا تھا۔ اس کی دھڑکنیں مجھے صاف سنائی دے رہی تھیں۔
یکایک میں نے اسے آزاد کر دیا۔
وہ مجھے سلگتی آنکھوں سے دیکھتی رہی مگر مجھ سے اس کی طرف نہ دیکھا گیا۔ میں نے اس کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ دوسرے لمحے وہ تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔ میں نے اسے پکارنا چاہا اور گنگ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ جلد ہی وہ راہداری کے اندھیرے میں گم ہو گئی۔
میں نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا تھا اور بستر پہ آ کے آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی تھی لیکن نیند نہیں آئی۔ آدمی کو کبھی اپنا آپ بھی کیسا اجنبی لگتا ہے۔ میرا بھی کچھ یہی حال تھا۔ میں شاید کوئی فیصلہ، کوئی ارادہ کرنا چاہتا تھا لیکن دماغ ہی ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ کھڑکیوں اور روشن دانوں سے اجالا کمرے میں در آیا تھا، پرندوں کی چہکار بھی معتدل ہو گئی تھی۔ یہ کیسی حالت ہے آدمی کو نیند بھی نہ آئے اور وہ بیدار بھی نہ ہو۔ نیم خوابیدگی و نیم بیداری شاید معذوری ہی کی کوئی کیفیت ہے۔ کمرے کے باہر بھی چہل پہل ہو گئی تھی۔ میں بستر پہ پڑا اپنی کوئی کھوئی ہوئی چیز ڈھونڈتا رہا اور ایک سناٹا سا مجھ پر طاری رہا۔ شاید میرا ارادہ کھو گیا تھا۔ ارادہ بھی تو کھو جاتا ہے۔ ایسی بے بسی تو اسی محرومی میں ہوتی ہے۔
جانے کتنا وقت گزر جاتا اور جانے کتنا وقت ہوا تھا۔ کسی نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔ میری نظر فوراً گھڑی پر گئی۔ گیارہ بج چکے تھے۔ دستک دوسری بار نہیں ہوئی۔ لیکن میں نے اٹھ کے دروازہ کھول دیا۔ وہ جہاں گیر تھا۔ بہت تر و تازہ لگ رہا تھا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور میری طبیعت کے بارے میں اضطراب کا اظہار کرنے لگا۔
"میں ٹھیک ہوں۔" میں نے بظاہر مستعدی سے کہا۔
"کہاں، معلوم ہوتا ہے، آپ رات بھر جاگتے رہے ہیں۔ آنکھیں سوجی سوجی ہیں۔ ناشتے پر سبھی آپ کو پوچھ رہے تھے۔ زری آپا نے کہا، آپ کو آرام کرنے دیا جائے۔"
میں نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے بٹھل کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ تو ناشتے سے پہلے گھر سے نکل گیا ہے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی "کب؟ کس وقت؟"
"شاید بہت سویرے۔" وہ بے یقینی سے بولا۔
"ناشتا بھی نہیں کیا؟"
"میرے سامنے تو نہیں کیا لیکن زری آپا نے انہیں ایسے کیسے جانے دیا ہو گا۔" میری بے چینی جہاں گیر نے محسوس کر لی۔ اس نے مضطربانہ سادگی سے پوچھا "کیا بات ہے؟ بھائی! خیریت تو ہے؟"
"ہاں ہاں۔" میں نے بہ عجلت خود کو ہموار کیا اور جہاں گیر کے مزید سوالوں سے گریز کے لیے اسے چائے بنوانے کی ہدایت کی "اتنی دیر میں، میں تیار ہوتا ہوں۔" میں نے کہا۔

کسی معمول کی طرح وہ لپکتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔
منہ ہاتھ دھو کے اور نیا لباس پہن کے میں بیٹھک میں
[...]تو کوئی نیا آدمی لگ رہا تھا، کم سے کم اپنے آپ کو۔ چوکی پر
[...]تا سجا ہوا تھا۔ نیساں، زہرہ، بڑی سلمٰی اور یاسمن نہایت
[...]رم تھیں۔ یوں اکیلے سب کے سامنے ناشتا کرتے ہوئے
[...]سا محسوس ہوتا تھا۔ انہیں بھی خیال تھا۔ میرا ساتھ دینے
[...]وہ بھی بیٹھ گئیں اور ٹونگتی رہیں۔ جہانگیر البتہ پیش پیش
[...]۔ زریں وہاں نہیں تھی۔ کئی بار جی میں آیا، اس کے
[...]ے میں پوچھوں لیکن میں خاموش رہا۔
بٹھل نے پرسوں رات روانگی میں چند دن بتائے تھے تو
[...]ب وقت بہت کم رہ گیا تھا اور یہ وقت مجھے زیادہ تر انہی کے
[...]تھ گزارنا چاہیے تھا۔ اس میں میرے لیے عافیت کا پہلو
[...]ں تھا کیونکہ تنہائی میں طرح طرح کے وہم سر میں پنپنے لگتے
[...]ے۔ بار بار دھیان بٹھل کی طرف جاتا تھا۔ کچھ سمجھ میں
[...]ں آتا تھا کہ اس باقاعدگی سے اڈے پر اس کی حاضری کا کیا
[...]ب ہو سکتا ہے۔ ہریا اور بچھو کی موت کو سات دن ہو گئے
[...]ے۔ بٹھل نے روانگی کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ اب اسے یہ
[...]ر دن تو حویلی کے لیے وقف کر دینے چاہئیں تھے۔ میری
[...]ح سبھی کو بٹھل کی یہ مستقل ناموجودگی کھٹکتی ہو گی۔
دوپہر کے کھانے میں زریں بھی موجود تھی۔ اس کی
[...]یدگی میں بڑی شادابی تھی۔ گلابی جوڑے میں ملبوس، سراپا
[...]اب ہو جیسے۔ یہ رنگ اس پر خوب سجتا تھا۔ لباس کے اور
[...]ں کے رنگ میں تمیز کرنا مشکل تھا۔ زریں کو خود پر بڑی
[...]رت تھی۔ گزشتہ رات کا کوئی تاثر میں نے اس کے چہرے
[...]ڑھنے، کھوجنے کی کوشش کی لیکن یہ میری بے ہنری ہی
[...]ی۔ کسی کو پڑھنا ہی نہ آتا ہو اور اخذ کرنا ہی نہ آتا ہو تو وہ کیا
[...]ھے اور کیا جانے۔ مجھے اس کے معمول سے ایک طمانیت
[...]سوس ہوئی۔ کھانے کے دوران میں اپنی عادت کے مطابق
[...]ا سر جھکائے میرے آگے یکے بعد دیگرے ڈونگے رکھتی
[...]ہی۔ کھانے کے بعد نیساں، جہانگیر اور خانم وغیرہ کا ارادہ
[...]زی جمانے کا تھا مگر زریں نے مجھے آرام کا اشارہ کیا، میں
[...]پکے سے کمرے میں چلا آیا اور مجھے نیند نے آ لیا۔
خانم مغرب کے وقت سونا اچھا نہیں سمجھتی تھی۔ سو
[...]ں نے نیساں کو بھیج کے مجھے اٹھوا دیا۔ آتے ہی نیساں نے
[...]خانم کی طرف سے حکم صادر کیا کہ بابر بھائی! دونوں وقت مل
[...]رہے ہیں۔ میں نے تعمیل کی اور تازہ دم ہو کے ان کے
[...]درمیان بیٹھک میں آ بیٹھا۔ وہاں تو ایک محفل آراستہ تھی۔
[...]نوریز، ارشد، مجو میاں اور نصیر بابا بھی شریک تھے جو اب گھر ہی
کے کوئی فرد ہو گئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ گلے سے لپٹ جاتے اور بے تحاشا دعائیں دینے لگتے۔ گھر کی بہت سی ذمے داریاں، سودا سلف لانے کا کام انہوں نے سنبھال لیا تھا۔ وہ عموماً کسی نہ کسی بہانے خود کو مصروف رکھ کے ہم سب کے ساتھ بیٹھنے سے اجتناب کرتے تھے۔ آدمی، عزت کا سب سے زیادہ آرزو مند ہوتا ہے اور وہ عزت جو دولت کے بغیر حاصل ہو، سب سے بڑی مرتبت یا سب سے بڑی دولت ہے۔ اتنی جلد ان کے چہرے کی جھریاں بھر رہی تھیں اور رنگ نکھر رہا تھا۔ پانچوں وقت کی نماز وہ پابندی سے ادا کرتے تھے۔ زریں نے ان کے لیے نئے جوڑے بنوائے تھے۔ وہاں سے تو وہ ایک ہی جوڑے میں آئے تھے، اس کمینے سید محمود علی کی برسوں کی رفاقت اور خدمت کا صلہ ایک جوڑا تھا۔ اسے بھی انہیں جلا دینا چاہیے تھا یا اس وحشی کو ڈاک کے ذریعے واپس کر دینا چاہیے تھا۔
بٹھل، رات کے کھانے کے وقت واپس آ گیا۔ میں نے اپنے سر میں ڈنک مارتے ہوئے سوال خود تک محدود رکھے۔ یہ بے نیازی اس کا شیوہ اور یہ سوزش و شورش میرا حصہ تھی۔ کھانے کے بعد رات گئے تک تقریباً سبھی اس کے گرد جمع رہے۔ گزشتہ رات کی طرح میں زریں کو اپنے کمرے میں آنے کا اشارہ کر سکتا تھا لیکن سوچتا ہی رہ گیا۔
دوسرے دن صبح میرے اٹھنے سے پہلے بٹھل پھر غائب تھا۔ اس روز ناشتے کے بعد میں نے لائبریری کا رخ کیا ہی تھا کہ دروازے میں داخل ہوتے ہوتے میرے قدم ٹھٹک گئے۔ مجھ سے پہلے وہاں فروزاں موجود تھی اور کسی کتاب کی ورق گردانی میں محو تھی۔ چند لمحے میں شش و پنج سے دوچار رہا کہ واپس کیوں نہ چلا جاؤں لیکن فروزاں کرسی سے کھڑی ہو گئی۔ اس نے سر خم کر کے مجھے آداب کیا تو مجھ سے واپس نہ جایا جا سکا۔ فروزاں سے اب کوئی ایسی اجنبیت نہیں رہی تھی۔ صبح و شام آمنا سامنا ہوتا تھا۔ ابھی کچھ دیر قبل ناشتے پر اسے دیکھا تھا لیکن اس طرح خلوت کا موقع پہلے نہیں ملا تھا۔ کوئی اور بات نہ سوجھی تو میں نے جھجکتے ہوئے کہا "اچھی ہیں آپ؟"
"جی، جی" وہ کسی قدر گھبرائے ہوئے انداز میں بولی "آپ بیٹھیے نا۔"
"جی، جی ہاں" میں بھی کچھ سٹپٹا سا گیا تھا، بے ارادہ اس سے کچھ دور کرسی پر بیٹھ گیا۔ میری موجودگی شاید آپ کے مطالعے میں حارج ہو" میں نے بہ مشکل کہا "میں پھر آ جاؤں گا۔"

"نہیں' نہیں" وہ تکلف آمیز عجلت سے بولی "میں تو ایسے ہی کسی نئی کتاب کی تلاش میں آنکلی تھی۔ سنا تھا' کل ہی نئی کتابوں کا پارسل آیا ہے۔"

"ہاں' نصیر یابا نے بتایا تھا' آپ کو مطالعے کا بہت شوق ہے۔"

"بس یوں ہی" وہ شرما سی گئی اور اس کے رخساروں میں گڑھے پڑ گئے۔

"کون' کون سے موضوعات آپ کو پسند ہیں؟"

"ہر اچھی تحریر' افسانہ و شاعری' ادبیات کہئے' کچھ کچھ تاریخ بھی۔" وہ کچھ سوچ سوچ کے اٹک اٹک کے بولی۔ اس کے انداز میں بلا کی شائستگی اور نفاست تھی۔ "اور آپ! کوئی بتا رہا تھا' آپ کو بھی مطالعے کا خاصا شوق ہے" اس نے ترنم ریز آواز میں پوچھا۔

"مجھے مطالعے کا وقت کہاں ملتا ہے۔ اسے شوق کی کمی ہی کہئے لیکن مطالعہ تو کرنا چاہیے۔ مطالعے سے دریچے کھلتے ہیں۔"

"آپ کو کون سے موضوعات......؟" اس نے سمٹی ہوئی آواز میں پوچھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"میرا بھی کچھ یہی ہے" میں نے ہچکچا کے کہا۔ "بالکل آپ جیسا' اصل میں کچھ فکر انگیز قسم کی تحریریں ہی اچھی لگتی ہیں۔ نئے خیال' نئے لفظ' نئی ترکیبوں سے مرصع' پہلے سے نئی' پہلے سے کچھ مختلف۔"

"اور ایسی تحریریں کم کم ہی ملتی ہیں" وہ مستعدی سے بولی۔ اس کی مدھم آواز میں بھی رس گھلا ہوا تھا۔

"کسی اچھی تحریر تک پہنچتے پہنچتے بڑی ناگوار تحریروں سے گزرنا پڑتا ہے اور مشکل یہ ہے' ایک معیاری تحریر کے مطالعے کے بعد کم تر درجے کی تحریروں میں جی نہیں لگتا اور یوں آدمی کا دل مطالعے سے اکتا بھی سکتا ہے" میں نے خود کو لگام دی' کہیں میں تجاوز تو نہیں کر رہا ہوں۔ اس کے لبوں پر دل آویز مسکراہٹ کھلی دیکھ کے مجھے تقویت حاصل ہوئی۔ میں نے پوچھا "آپ تو فارسی خوب جانتی ہوں گی؟"

"بس جانتی ہوں۔"

"آپ کی مادری زبان تو فارسی ہے۔"

"جی ہاں" اس نے دمکتی آواز میں کہا "لیکن مطالعے اور باقاعدہ زبان جانے بغیر مادری زبان سے کیا ہوتا ہے۔"

"آپ کی بات سے مجھے یاد آیا' عرصہ ہوا' ہمارے کالج میں ایک سن رسیدہ پروفیسر ہوتا تھا۔ عجب عجب قسم کی دلیلیں تراشتا' کلیے وضع کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا' ذرد اس علم سے جو اکتسابی ہو۔ علم سے اس کی مراد زبان ہی تھی۔ کیونکہ اس وقت یہی بحث ہو رہی تھی کہ زید کی مادری زبان انگریزی ہے اور بکر نے ذوق و شوق سے انگریزی سیکھی ہے' دونوں میں بہتر کون ہوا؟ پروفیسر سیکھنے والے کو فوقیت دیتا تھا لیکن کوئی کتنا ہی سیکھ لے' میرا خیال ہے مادری زبان کی برتری تو اپنی جگہ ہے۔"

"مادری زبان بھی اکتساب کے بغیر نامکمل ہے" وہ باوقار انداز میں بولی۔

"یعنی کچھ یوں ہے' دونوں خوبیاں آمیز ہوں تو بات بنے" میں نے لپکتی آواز میں کہا "آپ کا تو علمی و ادبی خانوادے سے تعلق ہے۔ فارسی میں یقیناً بہت کچھ پڑھا ہوگا آپ نے؟"

"سیکھ رہی تھی لیکن بس...." اس کی آواز جیسے ٹوٹ گئی اور چہرے پر گھٹا سی چھانے لگی۔

مجھے دھچکا لگا۔ افسوس بھی ہوا' خجالت بھی ہوئی۔ واقعی اس کی عمر تو سیکھنے کی تھی کہ سید محمود علی نے اس کے والدین اس سے جدا کر دیے۔ میں نے اس کی دل جوئی کے لیے کہا "خیر' آپ یہ سلسلہ اب بھی جاری رکھ سکتی ہیں۔ آپ چاہیں گی تو یہاں کسی فارسی استاد کا بندوبست ہو جائے گا۔"

وہ ایک آہ بھر کے رہ گئی۔

وہ ایک ماہ جمال لڑکی تھی' حسن و جمال کا بھی کوئی دبدبہ ہوتا ہے۔ بار بار احتیاط کا خیال آتا تھا کہ کہیں میری کوئی بات اس نازک اندام کو ناگوار خاطر نہ ہو جائے۔ غالباً اسی لیے میری زبان لکنت کرنے لگتی تھی۔ کچھ یہ امتناع پہلی مرتبہ کی روبہ روئی' دوبہ دوئی کے سبب سے بھی ہوگا۔ یقیناً اُسے احساس ہوگا کہ میں نے اس کے زخم پر دانستہ خارزنی نہیں کی ہے اور جو کسی مہذب شخص کا وتیرہ ہوتا ہے' وہ اپنے دکھ' اپنے ستم خود ہی تک محدود رکھتا ہے۔ ان کا اظہار کرکے وہ دوسرے کو بے آرام نہیں کرتا۔ ایک وقفہ سکوت کے بعد وہ سرگوشیانہ انداز میں بولی "آپ کو فارسی بہت پسند ہے؟"

"بے حد!" میں نے کسی قدر جوش سے کہا "فارسی تو بہت شیریں' بڑی نرم و نازک زبان ہے۔"

"جس زبان میں ڈ' ٹ' ٹھ' ڈھ وغیرہ جیسے کریہہ حرف نہ ہوں' اس کی نفاست اور فصاحت اور لطافت کیا کہنے۔"

وہ بے ساختہ کھل کھلا پڑی اور ایسا لگا جیسے پھل جھڑیاں چھوٹ پڑی ہوں' کسی نے ستار کے تار چھیڑ دیے ہوں۔

"فارسی میں' کہتے ہیں' شاعری بے پناہ ہے بلکہ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ فارسی زبان بنی ہی شاعری کے لیے ہے۔

۔۔ نے ابتدا میں تھوڑی بہت فارسی سیکھی تھی۔ اب تو سب ۔۔ بھول بھال گیا ہوں۔ کاش یہ سلسلہ جاری رہتا۔ کبھی ۔۔ ملا تو دو زبانیں ضرور سیکھوں گا' ایک فارسی' دوسری ۔۔نیسی۔ میں آپ کو بتاؤں' میرے ایک بزرگ دوست اور ۔۔ئی تھے' راج کرشنا۔ پولیس کے بہت بڑے افسر تھے لیکن ۔۔لیس میں ہونے کے باوجود ایک عالم آدمی تھے۔ ان کے ۔۔ں کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ تھا۔ انہیں بہت عمدہ انگریزی آتی ۔۔ی لیکن وہ فرانسیسی اور فارسی زبانوں کی تعریف کرتے نہیں ۔۔کتے تھے۔"

آپ کی مادری زبان تو اردو ہے' اردو داں جلد فارسی ۔۔کھ سکتے ہیں" اس کا لہجہ مہربانہ بھی تھا' والہانہ بھی۔

"مگر کبھی فرصت ملے تبھی تو۔"

"ابتدائی طور پر تو میں بھی کچھ مدد کر سکتی ہوں" وہ آہستگی ۔۔ے بولی۔

"آپ!" میرا جسم لہرا گیا "آپ جیسا استاد ہو تو پھر کوئی ۔۔یوں نہ پڑھے" میری زبان سے نکل گیا اور میں نے اس بے ۔۔تکلفی پر خود کو سرزنش کیا۔ سب سے بڑا نظم و ضبط زبان ہی کا ۔۔ہوتا ہے اور یہی آدمی سے نہیں ہو پاتا۔

اس کے رخسار تمتما اٹھے' جیسے شعلے سے بھڑک اٹھے ۔۔ہوں مگر جلد ہی وہ سنبھل گئی' گویا اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ ۔۔پھر وہ کھنچی ہوئی' دبی ہوئی آواز میں بولی "آپ جا رہے ہیں؟"

"ہاں' ہمیں اب جانا ہے" میں نے انکسار سے کہا۔

"پھر کب' کب واپسی ہوگی؟"

"دیکھیے' کچھ کہا نہیں جا سکتا لیکن جلد ہی' جلد ہی آنے کی کوشش کروں گا" وہ چپ رہی' میں نے کہا "یہ بتائیے' آپ کو یہاں کسی قسم کی پریشانی تو نہیں؟"

"کیسی پریشانی؟" وہ ہراساں سی ہو گئی۔

"ہر نئی جگہ ذرا سا وقت تو لیتی ہے۔ ہمارے پاس یہی کچھ تھا۔ کوئی چیز آپ کے مزاج سے مناسبت نہ رکھتی ہو تو درگزر کر دیجیے گا۔ اتنے لوگوں میں کبھی کبھی انیس بیس ہو ہی جاتی ہے۔"

"یہاں کا تو ہم تصور ہی کر سکتے تھے" اس کے لہجے سے ممنونیت ٹپک رہی تھی۔

"آپ سے میری بات ہی نہیں ہو پائی اور میرے پاس کہنے کے لیے کوئی نئی بات بھی نہیں۔ یہ تلقین تو سبھی نے آپ کو کی ہوگی کہ یہاں آپ خود کو کچھ غیر نہ سمجھیں' کسی قسم کی اجنبیت نہ برتیں۔ گھر ایک دوسرے سے مماثلت کے باوجود ایک جیسے نہیں ہوتے اور زندگی میں گھر بدلتے رہتے ہیں۔ اب یہ آپ کا نیا گھر ہے۔ اس پر آپ کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا یہاں کے کسی دوسرے مکین کا۔"

"یہ گھر تو ہماری کسی نیکی کی جزا ہے" وہ جھن جھناتی آواز میں بولی۔

"دیکھیے' آپ کے نقصان کی تلافی تو کسی طور نہیں ہو سکتی۔ جانے والوں کا بدل نہیں ہوتا لیکن جانے والے کو جانا ہی ہوتا ہے۔ سب کی یہی آرزو ہے' یہاں آپ کو کوئی تنگی نہ ہو۔ پھر کچھ عرصے بعد ظفر میاں بھی آجائیں گے' وہ اب تک آ بھی جاتے مگر بابا یہاں آ کے کچھ ایسے مصروف ہو گئے کہ اس طرف توجہ دینے کا موقع نہیں ملا۔ ظفر میاں کے آجانے کے بعد آپ کو اور تقویت اور طمانیت ہوگی پھر انہیں اختیار ہے۔ وہ یہاں رہیں یا کہیں اور...."

وہ سنتی رہی۔ اس کے چہرے پر مضطربانہ سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ پھر اس نے عزم سے کہا "ہم یہاں سے کہیں اور نہیں جائیں گے' ہمیں معلوم ہے' اس سے بہتر تلافی ممکن نہیں ہو سکتی۔ ظفر آجائیں تو اچھا ہے لیکن اگر انہوں نے یہاں سے کہیں اور جانے کی خواہش کی تو شاید ہم ان کا ساتھ نہ دے سکیں' ہم انکار کر دیں گے۔"

میرے ذہن میں بہت سی باتیں منڈلائیں۔ اس کے لہجے کا اثبات دیکھ کے مجھے ہمت نہیں ہوئی "جو آپ مناسب سمجھیں" میں نے متانت سے کہا "یہ تو اور اچھی بات ہے۔ ہمارا ایک دوسرا گھر بھی ہے۔ سفر سے واپسی پر سب کو وہاں لے جانے کا ارادہ ہے۔ آپ نے بمبئی میں ابا جان کے گھر کے بارے میں شاید کچھ سنا ہو؟"

"مجھے معلوم ہے" وہ مسکرا کے بولی۔

"پھر تو مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میری کوشش ہوگی' اب کے جلد واپسی ہو جائے۔ یوں ہم خط لکھتے رہیں گے لیکن چونکہ ہم آج اس جگہ' کل اس جگہ' ہمارا کوئی مستقل ٹھکانا نہیں ہوتا اس لیے ہمیں آپ کا خط نہیں مل سکتا اور اس کی نوبت بھی نہ آئے شاید۔ یہاں زری اور خانم آپی ہیں۔ ان کی موجودگی میں آپ کو کسی قسم کی گھٹن نہیں ہونی چاہیے۔"

"وہ تو' وہ تو..." فردزاں سیمابی آواز میں بولی "ان کے لیے کیا کہا جائے۔ خدا نے انہیں اعلیٰ صفات سے نوازا ہے۔ وہ تو سراپا محبت ہیں۔ ان کا لطف و کرم تو بے پایاں' بے کنار ہے۔"

"خدا کرے' ایسا ہی رہے۔"

فروزاں کی تابندہ آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ اپنے بیان

میں کتنی مصمم اور پرجوش ہے۔ چند ثانیوں بعد وہ نازبردارانہ لہجے میں بولی "آپ سے ایک گزارش ہے۔"

"ہاں ہاں' کہیے۔ کیا بات ہے؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"آپ مجھے آپ کہہ کے کیوں مخاطب کرتے ہیں؟"

"بس یوں ہی' جانے کیوں۔" میں نے بہکی بہکی آواز میں کہا "مگر آپ بھی تو اس جرم کی مرتکب ہو رہی ہیں۔"

"آپ کی بات دگر ہے۔"

"میری بات کیا ہے؟" میں نے لطف لیا۔

"مجھ سے نہیں کہا جائے گا" وہ شرگیں لہجے میں بولی "یاسمن کو تو آپ اس ادب و احترام سے مخاطب نہیں کرتے۔"

"لیکن آپ... ٹھیک ہے" مجھے اس کی دل بستگی عزیز تھی۔ میں نے وعدہ کیا "چلیے میں کوشش کروں گا۔"

"اور... اور آپ سے کچھ اور بھی کہنا تھا۔"

"کیا؟" میں نے گھبرا کے کہا "دیکھیے ممنونیت کی کوئی بات..."

"آپ نے تو..."

وہ شاید یہی کچھ کہنا چاہتی تھی یا کوئی اور بات' سیڑھیوں پر دھمکتی چاپوں سے وہ رک گئی۔

کوئی تیزی سے سیڑھیاں طے کر رہا تھا۔ وہ نیساں تھی۔ "ارے بابر بھائی!" وہ اکھڑی ہوئی سانسوں سے بولی "آپ یہاں ہیں' سارے میں ڈھونڈ لیا۔"

"خیریت تو ہے؟ ذرا تسلی سے بھئی۔"

"مما بتاتے ہیں" نیساں پٹ پٹاتی آواز میں بولی "بابا نے آپ کو بلایا ہے' دو آدمی پیغام لے کے آئے ہیں۔"

"بابا نے بلایا ہے" میں کرسی سے فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ "کیا کہتے ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم' آپ جا کے پوچھیے۔"

میں نے فردزاں کی طرف دیکھا اور معذرت چاہی۔ وہ بھی سراسیمہ ہو گئی تھی۔ جلدی جلدی سیڑھیاں اتر کے' میں ڈیوڑھی میں پہنچا۔ مما کے پاس اڈے کے دو آدمی بیٹھے تھے۔ انہیں میں جانتا تھا' نام یاد نہیں آ رہے تھے۔ کسی دھوکے کا امکان نہیں تھا۔ وہ اڈے کے مستند آدمی تھے۔ پھر بھی میں نے تصدیق چاہی "استاد کہاں ہیں' اس وقت؟"

"اڈے پر ہیں بھیا!" دونوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔

"انہیں وہیں بٹھا کے میں اندر آیا' چپل کے بدلے جوتیاں پہنیں' واسکٹ پہنی اور احتیاطاً چاقو جیب میں رکھ لیا۔

راستے بھر میں مستعد رہا لیکن ان دونوں کا رخ اڈے ہی کی جانب تھا۔

اڈے کی چوکی پر بٹھل بیٹھا تھا۔ اس کے ارد گرد بھیڑ لگی ہوئی تھی اور حقہ سلگ رہا تھا۔ مجھے آتا دیکھ کے سب اٹھ گئے اور انہوں نے مجھے گھیر لیا۔ بٹھل کے چہرے پر چھائے ہوئے اطمینان کے باعث میں نے سکون کی سانس لی۔ سارے راستے طرح طرح کے وسوسے مجھے تنگ کرتے رہے تھے۔ بٹھل نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے پاس بلا لیا۔ میں نے اپنی اس اچانک طلبی کا مقصد جاننے میں تحمل کیا۔

دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ چوکی پر کھانا چن دیا گیا۔ وہ سادہ سا کھانا تھا۔ کھانے کے بعد حقے کے چند لمبے کش لے کے بٹھل اٹھ گیا۔ استاد سلامی اور اڈے کے دو آدمی بھی ہمارے ہم راہ تھے۔ تانگے میں بیٹھ کے ہم بازار آ گئے اور بٹھل کپڑے کی دکانوں پر خریداری کرتا رہا۔ مجھ سے بھی کپڑے کی اقسام اور رنگ کے بارے میں وہ پوچھتا جاتا تھا۔ مجھے کپڑوں کی قسموں کا کوئی تجربہ نہیں تھا لیکن جو نظر کو بھاتا' میں نشان دہی کر دیتا۔ اس نے مردانہ کپڑے بھی خوب خریدے۔ تنویر' ارشد' مجو میاں اور جہانگیر کے لیے قیمتی قیمتی کپڑے۔ میں سمجھ گیا' یہ روانگی کی تیاری ہے۔ ہم خالی ہاتھ واپس آئے تھے۔ اب جاتے وقت ہمیں ایسے نہیں جانا چاہیے تھا۔

بازار میں شام ہو گئی۔ کپڑوں کے کئی پلندے بن چکے تھے۔ انہیں ساتھ آنے والے آدمیوں کے سپرد کر کے ہم آگے چلے آئے۔ استاد سلامی ہمارے ساتھ رہا۔ پھر فیض آباد کے بڑے اسپتال آ کے ہم نے دم لیا۔ برکھا کے باپ لکشمی داس کی جان اس کے ڈھانچے میں کہیں اٹک گئی تھی۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ اس کے دماغ کی رگ پھٹ چکی ہے۔ انہیں حیرت تھی کہ اتنے دنوں سے وہ کیسے زندگی جھیل رہا ہے۔ آدمی کو موت بھی پریشان کرتی ہے۔ لکشمی داس کو بالکل ہوش نہیں تھا' زندہ لاش کے مانند تھا۔ اسپتال سے نکلتے نکلتے اندھیرا چھانے لگا اور مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ چلتے چلتے وہ پولیس اسٹیشن میں داخل ہو گئے۔ تھانے دار موجود نہیں تھا لیکن اس کا ماتحت اس کی جگہ سنبھالے ہوئے تھا۔ وہ ایک سنجیدہ شخص تھا۔ اس نے ہمیں کرسیوں پر بٹھایا اور خوش خلقی سے ہماری آمد کا مقصد و مدعا پوچھا۔ استاد سلامی نے مجھے اور حیران کیا۔ اس نے دہائی دی کہ اس کے اڈے کے دو آدمی ہریا اور پچھو مارے گئے۔ اتنے دن گزر گئے پولیس نے اب تک قاتلوں کی گرفتاری میں کوئی پیش رفت

...ی کی۔ پولیس کی اس بے توجہی اور سرد مہری سے اس کے ...ے کے آدمی نہایت شاکی اور بے چین ہیں' مایوس ہیں۔ ...س کے سامنے اڈے کے ایک استاد کی طرف سے اس ...ح کے شک اور خدشوں کا اظہار میرے لیے نیا بھی تھا' ...بھی۔ استاد سلامی پولیس افسر کو قائل کرتا رہا' بٹھل ...ی ہم نوائی کر رہا تھا کہ شہر میں طرح طرح کی افواہیں پھیلی ...ہیں' بازاروں اور محلوں پر دہشت چھائی ہوئی ہے۔ آگے ...اور بھی سنگین واقعہ پیش آ سکتا ہے۔ پولیس کی ناکامی سے ...ہ پشتوں کے حوصلے اور بڑھ سکتے ہیں۔ وہ پاگل اڈے پر بھی ...نے کی جرات کر سکتے ہیں۔ استاد سلامی نے کہا کہ اس نے ...نے آدمیوں کو اب تک تھامے رکھا ہے' اب وہ انہیں ...ے سے بہت کم باہر نکلنے کی اجازت دیتا ہے لیکن کب تک ...س کے قابو میں رہیں گے' کب تک پولیس کی طرف سے ...ی جوابی کارروائی کا انتظار کرتے رہیں گے۔ ان کی عجیب ...یت ہے۔ اپنے ساتھیوں کے خون پر وہ جتنے غم زدہ ہیں' ...نے ہی مشتعل بھی ہیں' مایوس بھی اور کسی حد تک خوف ...ہ بھی۔

پولیس افسر تندہی سے استاد سلامی کی عرض داشت پر ...ردی کا اظہار کرتا رہا۔ استاد سلامی اور بٹھل نے تجویز ...ی کی کہ کسی ممکنہ فتنے کے پیش نظر چند دنوں کے لیے اڈے ...یا اڈے کے آس پاس پولیس تعینات کر دی جائے تو بہتر ...ہے گا۔ رفع شر کے لیے یہ مشورہ معقول تھا۔ پولیس افسر ...نے اس کی تائید کی اور ہمیں عزت سے رخصت کیا۔

پولیس اسٹیشن سے نکل کر ہم تینوں سڑکوں پر ٹہلتے ...ہے۔ پھر ایک چائے خانے میں آ کے ہم نے چائے پی اور ...ول میں خاصا وقت گزارا۔ اڈے واپس پہنچتے پہنچتے رات ...گئی۔

پولیس افسر نے وعدہ نبھانے میں بڑی مستعدی دکھائی۔ ...ے کی عمارت کے باہر تین بندوق بردار سپاہی موجود تھے۔ ...ایک کو ہم نے گلیوں میں گشت کرتے دیکھا تھا۔ استاد ...لامی نے ان سے بہت تپاک سے سلام دعا کی۔ وہ اس کی ...ان پہچان کے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ نہ ہوتے تو پولیس ...لوں سے جان پہچان میں کون سی مشکل ہوتی ہے۔ استاد ...لامی نے انہیں رات کے کھانے کی پیش کش بھی کی اور کہا' ...کی چیز کی ضرورت ہو تو وہ کوئی تکلف نہ کریں۔ اڈے کے ...روازے ان کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ کھانا بھی تیار ہی تھا۔ ...ارے پہنچنے کی دیر تھی کہ دسترخوان بچھا دیا گیا۔

کھانے کے بعد استاد سلامی' بٹھل اور اڈے کے چند آدمی باہر نکل آئے۔ مجھے بھی انہوں نے ساتھ رکھا تھا۔ ہریا اور پچھو کی موت کا آٹھواں دن تھا۔ اڈے پر انہی کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ہر شخص مغموم تھا۔ انہیں اب بازار کی طرف بڑھتے دیکھ کے میرا سر گھومنے لگا۔ بازار میں دن کا سماں تھا۔ در و بام نے جیسے گھنگھرو باندھ رکھے ہوں۔ سارا علاقہ ساز و آواز سے گونج رہا تھا۔ ایک بالا خانے پر ہمارے قدم رکھتے ہی نغمہ سرائی بند ہو گئی۔ استاد سلامی کا وہاں بڑا رعب و دبدبہ تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی حاکم جلوہ افروز ہو گیا ہو۔ ہمیں ایک جانب قالین پر بٹھا دیا گیا۔ ہم سے پہلے وہاں اور بھی تماش بین موجود تھے۔ ہماری جگہ خالی رکھی گئی تھی۔ سب ہماری آمد کے منتظر تھے۔ بٹھل کے لیے پیچوان کا اہتمام تھا۔ لچکتی مٹکتی ہوئی کم سن لڑکیاں پھلوں کے طشت' گلدستے اور گلوریاں لے آئیں۔ انہوں نے موتیا کے ہار ہمارے گلوں میں ڈالے۔ قہوہ بھی آ گیا۔ یہ ایک بڑا بالا خانہ تھا' خوب سجا ہوا' زرنگار پردے' منقش در و دیوار۔ نفری بھی کم نہیں معلوم ہوتی تھی۔ دراز قد' فربہ اندام نائکہ نے ہم سے باقاعدہ اجازت مانگی اور دل کش نقش و نگار کی ایک نوجوان سانولی سلونی لڑکی نے از سر نو تان اٹھائی۔ اس کی آواز بھلی تھی' ادائیگی بھی بری نہیں تھی۔ کلام بھی معاملہ بندی' چھیڑ خانی کا خوب یاد تھا۔ کھلتی ہوئی گندمی رنگت کی دو نوخیز لڑکیاں رقص کناں تھیں۔ واجبی سا رقص آتا تھا۔ لباس ہی ایسا چمکتا دمکتا' سلمے ستاروں ٹنکا پہنا ہوا تھا کہ رقص کی تیزی و طراری دوچند ہو گئی تھی۔ لکھنؤ میں چاندنی بانو کی نغمہ سرائی اور رقص کاری دیکھنے کے بعد اب سب کچھ ہیچ معلوم ہوتا تھا۔ میرا تو دماغ ہی الجھا ہوا تھا' محسوس کیا کرتا۔ میں تو بٹھل اور استاد سلامی کی وجہ سے خود کو جکڑے ہوئے وہاں بیٹھا تھا اور کوئی پہیلی تھی تو مسلسل اسے بوجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

انہیں وقت کا کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ ایک اور مغنیہ آ گئی پھر ایک اور پھر چھریرے بدن کی ایک خوش چہرہ پختہ عمر کی عورت نے سر الاپنے شروع کر دیے اور سماں باندھ دیا۔ وہ بہت سریلی تھی' آواز میں گونج تھی اور اعتماد بھی بلا کا تھا۔ دوسرے تماشائی رفتہ رفتہ کم ہوتے گئے۔ آخر میں ہمی باقی رہ گئے۔ نائکہ نے بٹھل کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ استاد سلامی نے ابتدا میں بٹھل کا تعارف کرا دیا تھا۔ بٹھل کی سامنے وہ خود بھی مودب' ہاتھ باندھے' تقریباً دوزانو بیٹھا رہا اور بٹھل کے عطیات آگے کرتا رہا۔

کوئی تین بجے کے قریب یہ محفل تمام ہوئی اور گھر جانے

کے بعد بجائے بٹھل اڈے واپس آگیا۔ پولیس گلیوں میں بھی موجود تھی' اڈے کی عمارت کے باہر بھی۔ استاد سلامی نے ہر ایک کی خیریت دریافت کی۔ اڈے کی وسیع چوکی خالی پڑی تھی۔ ادھرادھر کی باتوں میں چار بج گئے' پھر سب وہیں چوکی پر پڑ رہے اور دو ایک گھنٹے بعد ہی اٹھ گئے۔ میں تو جاگتا ہی رہا تھا۔ صبح ناشتے کا اہتمام ہوتے ہوتے نو بج گئے اور کوئی ساڑھے دس بجے بٹھل نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں تو کل دوپہر سے ایک معمول تھا' منہ اٹھائے اس کے پیچھے چل دیا۔ عمارت کے باہر تانگا تیار کھڑا تھا۔ ہم جلد ہی حویلی واپس آگئے۔

○☆○

گوکہ بٹھل نے گزشتہ رات گھر نہ آنے کی بابت کہلوا دیا تھا' لیکن حویلی میں سب کے ستے ہوئے چہرے بتا رہے تھے کہ انہوں نے رات آرام سے نہیں گزاری ہے۔ بٹھل نے ان کی دل داری دل نوازی کے لیے احکام جاری کرنے شروع کردیے۔ اسے دیسی غذائیں مرغوب تھیں۔ میٹھی ٹکیاں' چنے کی دال کا حلوہ' سرسوں کی بھجیا' چھلکوں والی ماش کی دال کی کھچڑی وغیرہ۔ دوپہر کے کھانے پر اس کے فرمائشی کھانے سجے ہوئے تھے۔ کھانے کے بعد بیٹھک میں اس نے زریں کو حکم دیا کہ سفر کا سامان تیار رکھا جائے۔ آئندہ دو تین دن میں کسی وقت بھی ہماری روانگی ہوسکتی ہے۔ پھر اس نے فروزاں اور یاسمن کو پاس بلا کے کہا کہ اس نے ایک آزمودہ کار وکیل سے بات کرلی ہے۔ ہفتے بھر میں وکیل کلکتے چلا جائے گا اور استاد جامو کو ساتھ لے کے آسن سول میں ان کی زمین اور جائداد کے معاملات نمٹائے گا۔ وہ ظفر کو بھی ہر مرحلے اور ہر معاملت میں ساتھ رکھیں گے اور ظفر کو پھر یہیں لے آئیں گے۔ فروزاں اور یاسمن سرجھکائے سنتی رہیں۔ بٹھل کے ٹوکنے پر فروزاں نے کچھ جرات کی اور دبے لہجے میں اپنے اندیشے کا اظہار کیا کہ آسن سول کا رخ کرنے میں پھر کوئی قضیہ نہ کھڑا ہوجائے' کیوں نہ زمین اور جائداد پر خاک ڈال دی جائے۔ انہیں اب اس کی ضرورت نہیں' یہاں انہیں سبھی کچھ مل گیا ہے۔ فروزاں نے ظفر کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اتنے لوگوں کے سامنے اس کی زبان پر ظفر کا نام آنا شاید مناسب بھی نہیں تھا۔

"نہیں ری' اب سارا ٹھیک ہوگا" بٹھل نے کڑوی آواز میں کہا "رستے میں چھوٹ گیا ری وہ..." اس کی زبان پر سید محمود علی کے لیے کوئی برا لفظ آتے آتے رہ گیا۔ وہ سرجھٹک کے بولا "بہت بوجھا ہے اپنے پر۔ ٹائم ملا تو اس کو دیکھیں گے۔"

فروزاں اتنا ہی کہہ سکتی تھی' چپ ہوگئی۔ کھانے کے بعد خاصی دیر محفل جمی رہی اور جمی ہی رہتی لیکن یقیناً زریں نے انہیں اشارہ کیا ہوگا کہ ایک ایک کرکے سب جانے لگے۔ ان باتوں کے احساس میں زریں ماہر تھی' اسے اندازہ ہوگا کہ گزشتہ رات ہم کتنی دیر سوپائے ہوں گے۔ میں بھی اٹھ گیا تھا لیکن اپنے کمرے کی جانب ابھی میں نے چند قدم کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ رک جانا پڑا۔ کسی نے استاد سلامی کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ زریں' خانم' نیساں اور جہانگیر ابھی وہاں موجود تھے۔ یہ سن کے انہوں نے جلدی جلدی تخت صاف کیا اور لمحوں میں وہاں سے چلے گئے۔ اڈے کے آدمی آجانے پر پھر کوئی بیٹھک میں نہیں پھٹک سکتا تھا تاوقتیکہ اسے طلب نہ کیا جائے۔

استاد سلامی بولایا ہوا بیٹھک میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ اڈے کے تین اور آدمی بھی تھے۔ سلامی کا چہرہ تمتما رہا تھا' آنکھیں پھٹی پھٹی سی تھیں' اسے سلام کا بھی خیال نہیں رہا۔ بوکھلائی ہوئی آواز میں اس نے بتایا کہ اسے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے' گزشتہ رات ٹھاکر ہردیور اور اس کے بیٹے ٹھاکر بل دیو کا خون ہوگیا ہے' ان کی خاندانی حویلی اور کھیت کھلیان راکھ ہوگئے ہیں۔ ٹھاکر ہردیو کی پتنی اور کنبے کے سارے افراد ختم ہوچکے ہیں' ان میں سے کوئی نہیں بچا' یہاں تک کہ ٹھاکر کا پروردہ استاد گورا اور اس کے ساتھی بھی مارے گئے۔

بٹھل نے ہنکاری بھری اور خاموش رہا۔

سب کی مضطرب نظریں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ اس کے جمود پر استاد سلامی اور بدحواس ہوا "سنا تم نے استاد؟"

"سن لیا رے!" بٹھل نے منہ بنا کے کہا' اس نے ملازم کو بلا کے استاد سلامی اور اس کے ساتھ آنے والے اڈے کے آدمیوں کے لیے چائے ناشتے وغیرہ کا بندوبست کرنے کی ہدایت کی۔

"یہ کیا؟ کیسے ہوگیا استاد؟" سلامی جھنجھلائی آواز میں بولا۔

"کیا بولیں رے!" بٹھل نے تنک کے کہا "خبر تو پکی ہے؟"

"ایک دم پکی استاد! مجھ کو اپنے خاص حوالدار نے بتایا ہے۔ دیکھ لینا' تھوڑی دیر میں سارے شہر میں بگل بج جائے گا۔"

"تو جا کے اب کمر ٹکا' پوری رات کا جاگا ہوا ہے!

کدھری سویا ہوگا۔"

"کدھر استاد!" سلامی بیزاری سے بولا "تمہارے جانے کے بعد کمر سیدھی کرنے کو چوکی پر پھیلا تھا پر سالی اوراچاٹ ہوگئی۔"

"اب ٹھیک سے آئے گی رے۔" بٹھل نے حقے کا کش لیتے ہوئے کہا۔

"کیا بولتے ہو استاد!" سلامی کھسیاسا گیا "اپنا حوالدار بولتا تھا' ٹھاکر کوئی چھوٹا موٹا آدمی نہیں تھا۔ بڑا خاندانی رئیس تھا' ہاتھی' گھوڑے اوپر نیچے بہت زور تھا اس کا۔ پولیس میں بھی آگ لگی ہوئی ہے۔ لکھنؤ تک بات جاپہنچی ہے۔ سرا کوئی بھی ہاتھ نہیں آیا۔ کیا صفائی سے کام دکھایا ہے۔ پولیس سارے میں چھاپے ماررہی ہے۔"

بٹھل سرہلاتا رہا۔

سلامی کے ساتھ آنے والے اڈے کے پرانے آدمی تھے' ماکھن' دولھے خاں اور ڈوڈا' تینوں اپنے دماغوں پر چھایا ہوا اندھیرا دور کرنے کے لیے ذرا سی روشنی' ذرا سے گداز کے طالب تھے۔ بٹھل اس سخاوت پر قادر تھا مگر سردست اس کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ بٹھل کی بے نیازی' بے حسی کے مترادف تھی۔ یہ انہیں اور مضطرب اور متوحش کررہی تھی۔ پھر وہ خود ہی الجھنے' ایک دوسرے سے حجت کرنے لگے۔ میں گنگ بیٹھا ان کے وہم وگمان' قیاس آرائیاں' شوشہ طرازیاں سنتا رہا۔ پھر میں نے وہاں سے اٹھ جانا ہی مناسب سمجھا۔ میری رگوں میں خون جمنے لگا تھا لیکن میری حالت ان سے مختلف تھی۔ معلوم ونامعلوم کا ستم مختلف ہوتا ہے۔ جاننے کا عذاب نہ جاننے سے سوا ہوتا ہے مجھے اٹھتا دیکھ کے بٹھل نے دھمکتی آواز میں پوچھا۔ "تو کدھری چلا رے؟"

"کمرے میں" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"تو بھی جا کے اب لمبی کھینچ۔"

میں نے اسے گھور کے دیکھا۔ بہت سی باتیں سینے میں امڈیں لیکن یہ گفتگو کا موقع نہیں تھا۔ میں نے خود کو تھام لیا اور اپنے کمرے میں آکے بستر پر دراز ہوگیا۔ مجھے استاد سلامی کی سادگی پر حیرت ہورہی تھی۔ اس کی صرف دو ہی آنکھیں تھیں' صرف سامنے کی طرف دیکھنا آتا تھا اسے۔ جانے کون سی خصوصیت پر جامو نے اسے اڈے کا نگراں نافذ کیا تھا۔ وہ کل دوپہر سے بٹھل کے ساتھ تھا اور بٹھل سے سوال کررہا تھا۔ ایسے سوال جن کے جواب نہیں دیے جاتے۔ کون سی عقدہ کشائی اسے مطلوب تھی۔ اس کے معنی تھے' کل سے استاد سلامی محض' بٹھل کا آلۂ کار رہا تھا۔ ایک سعادت آثار' اطاعت گزار شخص کی طرح بٹھل کے احکام کی تعمیل اس نے مقدم جانی تھی۔ کسی اور طرف جاننے بوجھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اسے بٹھل سے برائے نام آگہی تھی۔ اسے صرف استاد بٹھل کے بل' چاقو بازی میں کرشمہ سازی اور اڈاگیری کے معاملات میں حسن تدبیر ہی کا علم تھا۔

سلسلہ اسی دن سے شروع ہوتا ہے' استاد گورا اور ہریا کے معاملے میں میری دخل اندازی سے۔ کلکتے سے جامو کی اچانک فیض آباد آمد اور ایک رات کے قیام کے بعد شہر سے غیاب پر میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ بٹھل کا اڈے پر مستقل پڑاؤ اور اڈے کے آدمیوں کی باگیں کھینچے رکھنا' مجھے ہر معاملے میں الگ رکھنا اور مسلسل حویلی میں محبوس رکھنا۔ میں نے بھی عواقب پر اچھی طرح غور کیا تھا اور میں نے بھی کچھ یہی نتائج اخذ کیے تھے جن کی توثیق ان کی طرف سے کی گئی ہے۔ حویلی کے خیال نے مجھے بھی وحشت زدہ کیے رکھا تھا۔ جامو' ہریا اور لچھو کی موت سے پہلے فیض آباد آیا تھا۔ گویا اس سے پہلے ہی امکانات ذہن نشین کرلیے گئے تھے اور دیوار پر نوشتہ کندہ کردیا گیا تھا' نوشتہ آدمی بھی تحریر کرتے ہیں۔ جامو اور جمرو' دونوں بھائی اپنے دیرینہ رفیق ہریا اور لچھو کی موت پر' اتنے بڑے سانحے پر نہیں آئے۔ سوم بھی ایسے ہی گزر گیا۔ جامو اور جمرو دوسرے اہم کام میں جو مصروف ہوں گے۔ ہریا اور لچھو کی جدائی کے صدمے نے انہیں مہمیز کیا ہوگا۔ پھر ادھر ان کے علاقے میں ایک نوجوان لڑکی برکھا' اس کے بدنصیب باپ لکشمی داس' اس کے بے گناہ ملازمین کے خون کے بعد تو انہیں اپنے اقدام کی تجدید وتائید کا ایک اور جواز مل گیا تھا۔ ان کے عزم میں پھر اور پختگی آنی چاہیے۔ انہوں نے کوئی جلدی نہیں کی۔ جامو اور جمرو کو کلکتے ہی میں ہونا چاہیے۔ بالکل اپنے مخدومی ومکرمی استاد بٹھل کے نقش قدم پر۔ وہ کل سہ پہر سے مختلف جگہوں پر اپنے نشانات ثبت کرتا رہا تھا اور کل اس نے مجھے بھی حویلی کی قید سے آزاد کردیا تھا کیونکہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میری چہرہ نمائی کے لیے یہ رہائی بڑی ضروری تھی۔

بٹھل اور جامو کے پاس حاشیہ برداروں کی کمی نہیں۔ ادھر بمبئی' ادھر کلکتہ اور حیدر آباد۔ جانے کتنی جگہوں سے ان کے اشارے پر سربازوں' سرفروشوں کی فوج اکٹھی ہوسکتی ہے۔ ان کے پاس پیسے کی بھی کمی نہیں اور جہاں حویلی کی حرمت اور حفاظت پیش نظر ہو' وہاں تو وہ... میں نے تبھی تو ارادہ کیا تھا کہ کیوں نہ چپکے سے ایک دن خود ٹھاکر کی ریاست' اس کے محل دو محلوں کی طرف نکل جاؤں۔ یہ کیسی

نادانی ہوتی! یہ کام کیا ایک آدمی کے بس کا تھا۔
سب کچھ آئینے میں صاف نظر آتا تھا مگر نظر آنے سے مراد خاطر جمعی نہیں ہے۔ میرا جسم بار بار دھڑکنے لگتا تھا مجھ سے تادیر بستر پر نہ رہا گیا اور نہ ہی کسی سے ملنے، کسی کو دیکھنے کو دل چاہا۔ استاد سلامی ابھی تک وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ اسے بٹھل کے سایہ عاطفت کی اس قدر شدید ضرورت ہوگی، وہ اور اس کے ساتھیوں کا زوروشور تھم چکا تھا۔ کسی نتیجے پر نہ پہنچنے کا پہلا مرحلہ حیرانی، دوسرا مایوسی کا ہوتا ہے۔
میں وہاں سے گزرتا ہوا باہر آگیا اور ڈیوڑھی میں مونڈھے پر مما کے پاس بیٹھ گیا۔ مما کے سینے میں داستانیں دفن تھیں۔ اڈے سے بھی اس کا بہت عرصے تعلق رہا تھا۔ وہ اہل ثروت کا ڈسا ہوا تھا، زہر اگلتا رہا۔ اس کے بوڑھے جسم میں بڑی نفرت بھری ہوئی تھی۔ کچھ دیر میں اس کا بھتیجا بھی آگیا۔ مما نے اسے شہر کی سن گن لینے کے لیے بازار کی طرف بھیجا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا، ہر جگہ ایک ہی چرچا ہے بہت سی دکانیں بند ہوگئی ہیں۔ شہر میں جابجا پولیس گھوم رہی ہے۔ شہر سے باہر جانے والے ہر راستے پر پولیس کا پہرا ہے۔ ہر آنے جانے والے شخص، سواری کی تلاشی لی جارہی ہے۔ ٹھاکر کی بستی سے آنے والے لوگ بتاتے ہیں کہ ٹھاکر کی قدیم حویلی کا ڈھانچا ہی باقی رہ گیا ہے۔ ابھی تک دھواں اٹھ رہا ہے اور باغات میں تو اب تک آگ بھڑکی ہوئی ہے۔ حویلی کی فصیل کے اندر آبادی میں ملازم، عورتوں اور ان کے بچوں کے سوا کوئی نہیں بچا۔ حملہ آور، چاقو، خنجر، بندوق اور تمنچوں سے لیس تھے اور ان کی تعداد خاصی تھی۔ انہوں نے اپنے کام بانٹ رکھے تھے۔ پولیس نے ساری بستی گھیرے میں لے لی ہے۔ خاکستر حویلی میں تو کسی کو جانے کی اجازت نہیں۔ مما کے بھتیجے نے جگہ جگہ لوگوں سے اصل واقعے کی ٹوہ لینے کی کوشش کی مگر ہر جگہ تضاد بیانی ملی۔ کوئی کہتا تھا، حملہ آوروں نے بہت لوٹ مار کی اور عورتوں سے زیادتی کی، کسی کا کہنا تھا وہ آندھی کی طرح نمودار ہوئے اور جلد سے جلد اپنا کام نمٹا کے آناً فاناً غائب ہوگئے۔ ان کے پاس عورتوں سے زیادتی اور لوٹ مار کرنے کا وقت ہی نہیں تھا۔
اندھیرا گہرا ہوگیا تب استاد سلامی اور اس کے ساتھی بٹھل سے رخصت ہوئے۔ میرے قدم کہیں بھی نہیں ٹک رہے تھے۔ رات کے کھانے پر معمول کے مطابق دسترخوان پر اہتمام تھا۔ بٹھل بھی کھانے میں شامل تھا۔ میں تو اسے دیکھا کیا اور خانہ پری کے لیے وہاں بیٹھا رہا۔ کھانے کے بعد پرسوں رات کی طرح وہ سارے بیٹھک میں آگئے اور بٹھل نے نیساں سے فرمائش کی کہ وہ اسے کچھ سنائے۔ نیساں کی آواز بہت اچھی تھی۔ اب نیساں بڑی ہوگئی تھی، وہ شرمانے لگی مگر بٹھل کا حکم کس طرح رد کیا جاسکتا تھا۔ اس نے ایک پوربی گیت سنایا پھر زریں کی فرمائش پر ایک غزل اس نے شروع کی۔ اس کی آواز بہت سُر میں تھی۔ سب محو ہوگئے، شاید سوائے میرے۔ میرا دماغ ہی بھٹکا ہوا تھا۔ ابھی نیساں نے غزل ختم نہیں کی تھی کہ دروازے پر مما کو منڈلاتے دیکھ کے میں اور منتشر ہوگیا۔ مما اندر آنے کے لیے مضطرب معلوم ہوتا تھا۔ میں تخت کے کنارے ہی بیٹھا تھا۔ غزل ختم ہونے ہی پر مجھے اٹھنا چاہیے تھا لیکن میں آہستہ سے اٹھ گیا اور دبے پاؤں باہر چلا آیا۔ کسی نے محسوس کیا یا نہیں، میں نے پلٹ کے نہیں دیکھا۔ میرا اندازہ صحیح تھا۔ مما، بٹھل کو یہ اطلاع دینے اندر آنا چاہتا تھا کہ پولیس حویلی کے آس پاس بھی آچکی ہے۔ یہ بڑے مکانات اور حویلیوں کا علاقہ تھا۔ جہاں شہر کے گنجان علاقوں کی طرح پولیس کی ایسی ضرورت نہیں تھی۔
"کب پولیس آئی؟" میں نے پوچھا۔
"ابھی کچھ دیر پہلے۔" مما بہت گھبرایا ہوا تھا۔
"ٹھیک ہے" مجھے اس کے سامنے استقامت کا اظہار ہی کرنا چاہیے تھا۔ اس کی کمر تھپتھپا کے میں بیٹھک میں واپس آگیا۔ جیسے ہی نیساں نے غزل ختم کی، میں بٹھل کے پاس جا پہنچا۔ میں نے سرگوشی میں اسے بتایا تو اس نے توجہ سے سنا اور سر کی جنبش پر اکتفا کیا۔ سبھی کو میرے اس طرح باہر جانے اور بٹھل سے کانا پھوسی کرنے پر کھٹک جانا چاہیے تھا۔ بٹھل نے اس کے تدارک کے لیے نیساں سے پھر کچھ سنانے کی خواہش کی۔ اوروں نے بھی شدومد سے بٹھل کی ہم نوائی کی۔ نیساں نے اب کے میر کی غزل 'پتا پتا بوٹا بوٹا' شروع کی۔ اس دوران میں اس کی آواز اور کھل گئی تھی۔ سب کی محویت نیساں کے لیے داد کے مانند تھی۔ پچھلی مرتبہ بھی بٹھل نے اس سے چند غزلیں سنی تھیں۔ اب تو اور نکھار آگیا تھا۔ غزل ختم ہونے پر بٹھل نے نیساں کو اپنے پہلو میں دبوچ لیا، اس کی پیشانی چومی۔ زریں، فروزاں اور زہرہ بھی نیساں سے لپٹ گئیں۔ اسے بہت پیار کیا۔ پھر نیساں کی باری تھی۔ وہ مچل کے بولی "بابا! کچھ دن کے لیے اور ٹھہر جائیے۔"
بٹھل نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا، پھر بھاری آواز میں بولا "ہاں ری، دیکھیں گے ابھی۔"
اس رات جلد ہی سب اٹھ گئے۔ ان سب کے ہٹ جانے کے بعد میں بٹھل سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے موقع نہیں دیا، اپنے کمرے میں جاکے دروازہ بند کرلیا۔ میں نے بھی یہی کیا۔ کل رات بھی میں ایک پل کے لیے نہیں سو پایا تھا۔ کل رات میں بٹھل کا پابند تھا، آج خود اپنا۔ خود پر اختیار رکھنا آدمی کے لیے سب سے بڑی آزمائش ہے۔ میں نے اپنی دل جوئی کی ہر ممکن کوشش کی کہ میں اچھی طرح دیکھ اور سن سکتا ہوں۔ مجھے دلیلیں دینا آتا ہے اور سیاہ و سفید بھی خوب نظر آتا ہے اور میں اکیلا تو نہیں ہوں۔ ادھر بٹھل بھی ہے اور کیا مختلف ہے؟ پہلے بھی ایسا ہی کچھ ہوتا رہا ہے۔ اور کوئی کو میرا اضطراب نہیں روک سکتا۔ کون سی دلیل میرے سینے میں کانٹا بنی ہوئی ہے۔ کئی بار میں نے زریں کی طرف جانے کا ارادہ کیا کہ اس کے ہاں بہت سایہ ہے لیکن یہ بہلاوا مجھے قائل نہ کرسکا۔ آدمی کتنی بار اپنی زندگی ختم کرنے کے درپے ہوتا ہے اور زندگی ہے کہ اڑی رہتی ہے۔ اس رات بھی مجھے موت نہیں آئی۔

○☆○

صبح ابھی پوری طرح بیدار نہیں ہوئی تھی کہ کمرے کے باہر شور پر میں نے باہر جاکے دیکھا۔ حویلی کی معمر خادمہ نکورن بی، بٹھل کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی۔ میں نے پاس جاکے پوچھا تو اس نے ہانپتی ہوئی آواز میں بتایا۔ 'پولیس نے حویلی گھیرے میں لے لی ہے۔ مما کہتا ہے' بابا کو نادو، پولیس بابا کو اور آپ کو پوچھ رہی ہے۔"
بٹھل بھی اتنی دیر میں باہر آگیا "ٹھیک ہے ری، فیل کیوں مچاتی ہے۔" بٹھل نے اسے جھڑک دیا۔ "ان کو بولو آتے ہیں باہر۔"
بٹھل نے مجھے تیار ہوجانے کا اشارہ کیا۔ جانے کیوں، مجھے کچھ سکون سا محسوس ہوا۔ اس حبس سے تو کوئی قیامت ہی بھلی۔ جلدی جلدی کپڑے بدل کے میں باہر آیا تو بٹھل بھی تیار ہوچکا تھا۔
ڈیوڑھی کے باہر چبوترے پر دس بارہ پولیس والے مونڈھوں پر موجود تھے، ہمیں باہر نکلتا دیکھ کے پختہ عمر کا افسر کھڑا ہوگیا "تمہی استاد بٹھل اور استاد بابر ہو؟" اس نے نخوت سے پوچھا۔
"کیا بات ہے؟" بٹھل نے ناگواری سے کہا۔
"تم کو ہمارے ساتھ چلنا ہے" افسر نے اکڑی ہوئی آواز میں حکم دیا۔
"پرچی لائے ہو؟" بٹھل نے تلخی سے پوچھا۔
پولیس افسر نے سرتاپا بٹھل کو دیکھا اور دھتکارتے لہجے میں بولا "کیسی پرچی؟"
"آدمی تو پرانے جان پڑتے ہو، تھوڑا حساب بھی آتا ہوگا" بٹھل کی آواز بھی اکھڑی ہوئی تھی۔ "نیوتا ساتھ ہو تو درشن کراؤ مہاراج!"
"نیوتا!" پولیس افسر چونک پڑا، پھر سر ہلا کے بولا "اچ چھا، اچ چھا، نیوتا!" اس نے نخوت سے کہا "ہم تم کو دکھائی نہیں دے رہے؟"
"تلے سے اوپر تک، پورے کے پورے دکھائی دے رہے ہو" بٹھل نے تیکھے لہجے میں کہا "ادھری فیض آباد میں گوری سرکار کا تختہ ہوگیا کیا؟ یہ پرچی پٹے کا چکر اسی نے چلایا ہے۔ ہم کیا الٹی بات بولتے ہیں صاحب بہادر!"
"ہم، ہم تم کو گرفتار کرنے نہیں آئے" پختہ عمر پولیس افسر نے بہ عجلت دخل اندازی کی "کوتوال صاحب کو تم سے ملنا ہے۔"
"تو ایسا بولو نا صاحب!"
"تم سے پہلے کیا بولا تھا" ماتحت افسر نے دوبارہ مداخلت کی اور مفاہمانہ انداز میں بولا "اب جلدی کرو۔"
"ایسا کیسے، گھر آئے ہو پہلی بار، تھوڑا جل پان کرکے چلو، ابھی ناشتا بھی کدھری ملا ہوگا۔ لگتا ہے، رات ساری کانٹوں پر بتائی ہے۔ پپوٹے لوٹے ہوئے ہیں۔"
بٹھل کے تیور کی تبدیلی برموقع تھی۔ ان سے زیادہ حجت کرنا لاحاصل تھا، نامناسب بھی۔ ہمیں بہرحال ان کے ساتھ جانا اور اس پہلے مرحلے پر کوئی ناروا تاثر قائم نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بس اتنا ہی، جس کے وہ متحمل ہوسکیں اور ہمارے بارے میں ان کی کوئی حتمی رائے متزلزل ہوسکے۔ ظاہر ہے، یہ رائے منفی ہی ہوسکتی تھی۔ وارنٹ کا مطالبہ بھی بے جا نہیں تھا۔ وہ اڈے پر نہیں، فیض آباد کے ایک اقبال مند، عزت دار محلے کی ایک بڑی حویلی میں آئے تھے لیکن وارنٹ پر اصرار کتنا ہی اصولی اور قانونی ہو، زیادہ دیر حویلی کے چبوترے پر انہیں روکے نہیں رکھنا چاہیے تھا۔ صبح کنارے پر کھڑی تھی، سورج اُمڈ رہا تھا۔ سورج کو طلوع ہونے میں ایک رات کی منزل طے کرنی پڑتی ہے اور جب طلوع ہوتا ہے تو اسے بڑی بے کلی ہوتی ہے۔ عبادت گاہوں میں جانے اور چہل قدمی کرنے والے سحر خیز سویرے سویرے حویلی کے چبوترے کی تماش بینی کو اپنے معمولات پر ترجیح دیں گے۔ پہلے ہی حویلی کی داستانیں کیا کم زبان زد خاص و عام تھیں۔ ادھر اس اثنا میں حویلی کے مکین بھی جاگ سکتے تھے۔ پولیس کی آمد کا سن کے تو اندر کہرام مچ جاتا۔ چلتے چلتے بٹھل

نے احتیاط کی تھی۔ شکورن بی اور مما کو زباں بندی کی سختی سے تاکید کردی تھی۔

"تم ٹھیک کہتے ہو" ماتحت افسر نے کسی قدر بیزاری سے کہا "ہمیں رات بھر آرام نہیں ملا ہے اور ابھی جانے کب نصیب ہو۔"

"پر ہم لوگوں نے دانا دنکا نہیں کیا ہے' منہ اٹھائے سیدھے بستر سے آگئے ہیں۔ ایسے کیا نہار منہ دربار میں سلامی کو جائیں' ایسا کرو صاحب! ہم کو عزت دینا آپ کو بھاری پڑتا ہے تو آپ اپنے ٹھکانے چلو' پیچھے ہم آتے ہیں' کدھری جانا ہے؟"

"کوتوالی چلنا ہے' اطمینان رکھو۔ ناشتا بھی وہیں مل جائے گا۔ وہاں ہمارا انتظار ہوگا۔"

"پر بات کیا ہے صاحب؟" بٹھل نے تجسس آمیز سادگی سے پوچھا۔ "یہ تو آپ بولے نہیں؟"

"وہ تم کو وہاں جاکے پتا چل جائے گا۔"

"ٹھیک ہے صاحب!" بٹھل نے بہ ظاہر تذبذب سے کہا "بڑے صاحب نے بلایا ہے تو ضرور کوئی بڑی بات ہوگی' پر اتنی سینا بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔ کوئی ایک چلا آتا' سر کے بل پہنچ جاتے۔ ادھری ہم گھر پہ رہتے ہیں۔ یہ اڈا نہیں ہے۔ ادھری اور بھی لوگ رہتے ہیں' کیا بولیں گے ان کو۔ اور وہ لوگ آس پاس والوں کو۔"

"وقت برباد مت کرو" پختہ عمر افسر نے کبیدگی سے کہا "زیادہ بات بالکل نہیں' سمجھے!"

بٹھل نے سر اٹھا کے تند نظروں سے اسے دیکھا۔ "ایسا نہیں صاحب! ذرا رسان سے' ہم جانے سے منع بھی بول سکتے ہیں۔"

"پھر تم اپنے لیے اچھا نہیں کروگے۔" اس بار ماتحت افسر کا لہجہ بھی ترش تھا۔

"پھر آپ کیا کرلوگے صاحب؟ توپ دم کرادوگے؟"

"ہم تمہیں ایسے بھی لے جاسکتے ہیں۔"

"نا صاحب! نا' ایسا نہیں" بٹھل نے سپاٹ آواز میں کہا "تھوڑا اپنا بھی دھیان کرو' آگے سارا اوندھیا جائے گا۔"

"یہ کیا' کیا ہو رہا ہے" پختہ عمر افسر بھن بھنا کے بولا "یہ' یہ آدمی کس طرح بول رہا ہے" اس نے بٹھل کو گالی دی۔

"ناپ تول کے منہ کھولو' اچھا رہتا ہے۔ اونچے سر' اپنے کو راس نہیں آتے۔ آپ بادشاہ لوگ ہو' اپنا بھی راج دربار سے پرانا تال میل ہے۔ پرچی ساتھ لاتے تو اتنا نہیں بولتے' رسی ہاتھ میں تھما دیتے۔ کوتوال صاحب شہر کے لاٹ صاحب ہیں' پر ہم ان کے پالتو نہیں ہیں۔ جاکے ان کو بولو' اپنے سے کام ہے تو ادھری آنے کا کشٹ کریں' دوپہر کو دال دلیا اپنے ساتھ کھائیں۔"

مونڈھوں پر بیٹھے ہوئے سارے سپاہی ایک دم کھڑے ہوگئے اور انہوں نے بندوقیں سیدھی کرلیں۔ پختہ عمر افسر کی آنکھیں چڑھ گئی تھیں۔ وہ مضطربانہ چند قدم آگے آگیا۔ کچھ بعید نہ تھا کہ وہ بٹھل کے گریبان پر ہاتھ ڈالے یا کوئی اور حرکت کرے مگر معاً اس کا ماتحت درمیان میں آگیا اور وحشت زدہ لہجے میں بولا "بات مت بڑھاؤ استاد!"

"بات تو آپ بڑھا رہے ہیں۔" بٹھل نے مجھے کوئی اشارہ نہیں کیا تھا لیکن اس کی تیوری سے کچھ کچھ اندازہ ہوگیا تھا۔

میں نے اپنی آواز پر قابو رکھنے کی کوشش کی "آپ نے کیا سمجھا ہے' آپ یوں سر اٹھائے ناوقت کسی کے گھر آکے اس کی توہین کیجیے' نہ فرد جرم سنائیے نہ وارنٹ دکھایئے۔ کسی معاملے میں ہماری ضرورت ہے تو بہتر ہے' اپنا لہجہ بدل کے بات کیجیے۔ ہم آپ کی رعیت نہیں ہیں۔"

سب کی نظریں مجھ پر مرکوز ہوگئیں۔ ماتحت افسر نے ہیجانی انداز میں اپنے افسر کو دیکھا۔ ان کی جانب سے کسی ردعمل سے پہلے میں نے سر جھٹک کے کہا "چلیے' کہاں جانا ہے؟" یہ کہتے ہی میں چبوترے کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ بٹھل نے بھی پھر کوئی دیر نہیں کی۔

نیچے پانچ تانگے قطار میں کھڑے تھے' پختہ عمر افسر لپکا جھپکتا سب سے آگے والے تانگے کی پچھلی نشست پر جا بیٹھا۔ ماتحت افسر کے تانگے میں ہم دونوں سوار ہوگئے۔ اگلی نشست پر اس کے ساتھ ایک بندوق بردار سپاہی بھی آگیا۔ دوسرے سپاہیوں نے بھی جلدی جلدی باقی تانگوں میں جگہیں سنبھال لیں۔ چلتے وقت انہوں نے یہ اہتمام رکھا کہ ہمارا تانگا درمیان میں رہے۔ گھوڑا گاڑیوں کی چرخ چوں اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے گلی کوچے دھمکنے لگے تھے جیسے کوئی لشکر گزر رہا ہو۔

اندھیرا سمٹ رہا تھا۔ صبح بیدار ہونے والوں کی تعداد ایسی زیادہ نہیں تھی مگر ایک ساتھ اتنے تانگے اور پولیس والے دیکھ کے وہ ٹھٹکتے اور رک جاتے۔ گشت کرنے والے سپاہی ٹولیوں میں جگہ جگہ تعینات تھے۔ ہمارے کارواں کی آمد کی اطلاع انہیں دور سے ہوجاتی ہوگی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک حویلی کی طرف جانے والے تانگوں کی واپسی کی توقع بھی ان کی چستی و مستعدی کا سبب ہوگی۔ ایسے شور سے آخری ساعت کی نیندیں منتشر ہوجانی چاہیے تھیں۔ کئی جگہ لوگ سٹ پٹاتے ہوئے گھروں سے باہر نکل آئے۔ بہت سوں نے دریچوں' موکھلوں اور چھتوں سے ہمارے مختصر قافلے کا حیرانی پریشانی سے نظارہ کیا۔ سڑکوں پر کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ گھوڑے بھی خاصی جلدی میں معلوم ہوتے تھے۔ راستے میں ماتحت افسر نے کوئی کلام کیا نہ ہم نے سلسلہ جنبانی کی۔ میری طرح بٹھل بھی آنے والے وقت سے نبرد آزمائی کے لیے خود کو مجتمع کررہا ہوگا۔ آنے والا وقت بڑی آزمائش کا بھی ہوسکتا ہے' بات بہت دور بھی جاسکتی ہے۔ پولیس کے طور طریقے ہمارے لیے اجنبی نہیں تھے۔ وہاں کوئی ایک شخص نہیں ہوگا۔ جہاں بہت سے لوگ ہوتے ہیں' وہاں اختلاف ضرور ہوتا ہے۔ آدمی کتنے ہی ایک جیسے' ایک دوسرے کے قریب ہوں' وہ ایک دوسرے سے بہت الگ' بہت دور بھی ہوسکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔ آدمی ایک جیسے ہوا کرتے تو زندگی کیسی آسان اور سہل ہوتی۔ کئی مرتبہ ہمیں ایک سے زیادہ پولیس افسروں کے سامنے پیش ہونے کے تجربے سے گزرنا پڑا ہے۔ ہر ایک شوشہ طرازیوں اور نکتہ پردازیوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی جستجو میں سرگرداں رہتا ہے۔ دلیلیں تاویلیں کیسی ہی مضبوط ہوں' بہت سے اختلاف آدمی کی اپنی انا کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ انا بھی ایک کجی ہے اور کہتے ہیں' آدمی کی سب سے بڑی کمزوری اس کی انا ہے۔ زندگی بھر وہ جا و بے جا اختلاف پر آمادہ رہتا ہے اور یوں اپنی انا کی افزائش و پرورش کرتا رہتا ہے۔ پولیس افسروں کا یہ باہمی اختلاف کبھی ہمارے لیے مفید بھی ثابت ہوا ہے۔ ایک دوسرے کو قائل کرتے ہوئے وہ زچ ہونے لگتے ہیں اور انہیں خود اپنی جزرسی و نکتہ آفرینی دگرگوں کردیتی ہے۔ کسی نتیجے پر نہ پہنچ پانے کی بیزاری میں وہ کسی آسان راستے اور دفع الوقتی قسم کے فیصلے پر متفق ہوجاتے ہیں۔ اب جو کچھ بھی ہو' ہمیں بہرحال بدترین صورتِ حال کے لیے خود کو تیار رکھنا چاہیے۔ واپسی کا تعین بٹھل بھی نہیں کرسکتا ہوگا۔ پولیس شک کی بنیاد پر ہمیں دیر تک روک سکتی ہے۔ اصل مجرم کا سراغ نہ ملنے کی صورت میں اپنے حکام کے سامنے جواب دہی اور خود اپنی دل دہی یا تن آسانی کے لیے پولیس مشکوک آدمی ہی کو سر بنالیتی ہے۔ ویسے بھی اصل مجرم تک ان کی رسائی تقریباً ناممکن ہے لیکن انہیں ایسی آسانی سے دستبردار بھی نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارے ساتھ بیٹھے ہوئے ماتحت اور سب سے آگے کے تانگے میں فروکش اس کے افسر کی بدحواسی ظاہر کررہی تھی کہ کچھ دیر میں انتشار سے دوچار کیسے کیسے افسروں سے ہمارا واسطہ پڑسکتا ہے۔ ان پیشیوں کے ہم کتنے ہی تجربہ کار ہوں' واقعے کی نوعیت تو ہر جگہ مختلف ہوتی ہے۔ سامنا پڑنے والے لوگ بھی ہر بار بدلتے رہتے ہیں۔

بیس پچیس منٹ کے سفر کے بعد قدیم و جدید طرز کی ایک عمارت کے سامنے تانگے ٹھہر گئے' اندھیرا ماند پڑچکا تھا اور اجالا ابھی ایسا روشن نہیں ہوا تھا۔ اول صبح بستیوں پر چھا جانے والی پرندوں کی چہکار تھم چکی تھی۔ صبح سے بہتر روز و شب کا کوئی پہر نہیں ہوتا۔ کسی نے تو یہاں تک کہا ہے کہ صبح قدرت کا سب سے شاہکار منظر ہے۔ صبح نہ ہوتی تو یہ دنیا بڑی ادھوری ہوتی مگر وہی بات ہے' ساری خوش منظری اور خوش موسمی آدمی کی اپنی کیفیت سے مشروط ہے۔ آدمی میں اندھیرا چھایا ہو تو کیا سہانی صبح اور کیا نشیلی شام۔

عمارت میں ہر طرف سپاہی موجود تھے۔ تانگے سے اتر کے بٹھل نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے پنجے کے دباؤ سے شاید میں نے وہی اخذ کیا جس کی وہ تلقین کرنا چاہتا تھا۔ ماتحت افسر کی پیروی میں ایک مختصر راہداری سے گزرتے ہوئے ہم اونچی چھت والے ایک وسیع کمرے میں داخل ہوگئے اور دیوار کے ساتھ لگی ہوئی بینچوں میں سے ایک پر بیٹھ گئے۔ کمرے کی حالت خاصی ابتر تھی۔ دیواریں سیلن زدہ' رنگ روغن میلا میلا' روشنی بہت مدھم' ہمارے سامنے کی دیوار پر لکڑی کے فریم میں محصور ایک بڑا نقشہ آویزاں تھا۔ نقشے کے نیچے لمبی پشت کی بھاری کرسی اور اس سے آگے بہت بڑی میز تھی' میز کے اردگرد چھ کرسیاں' میزپوش البتہ صاف ستھرا تھا۔ فرش بھی دیواروں کی نسبت کچھ بہتر تھا۔

ماتحت افسر بہت بے کل نظر آتا تھا "ابھی انتظار کرو۔" اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا "اندر میٹنگ ہو رہی ہے۔"

بٹھل کی خاموشی سے وہ جزبز ہوا' کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن لمحے بھر ٹھہر کے واپس چلا گیا۔ کمرے کے کئی دروازوں اور کھڑکیوں میں سے صرف ایک دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس پر دو مسلح سپاہی فی الفور مامور کردیے گئے تھے۔ وہ چند فٹ کی لمبائی میں ایک دوسرے کے مخالف فوجیانہ انداز میں گشت کرنے لگے۔ ایک ادھر آتا تو دوسرا ادھر جاتا اور دروازے کے وسط میں دونوں ایک دوسرے کے مقابل ہوجاتے۔ کمرے میں خاموشی طاری تھی۔ لیکن باہر راہداری میں خاصی سرگرمی تھی۔ بٹھل نے بیڑی سلگائی اور گہرے کش بھرنے لگا۔ جانے

کیوں میرا خیال تھا یا میری خواہش تھی' وہ آنے والے لمحوں کے بارے میں کچھ زبان کھولے یا مجھے کوئی ہدایت دے۔ وہ اپنے آپ میں گم بیٹھا رہا۔ کسی رائے اور مشورے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ اس کی موجودگی میں میری حیثیت ایک معمول کی سی تھی۔ مجھے خاموش رہنا تھا اور میں جانتا بھی کس قدر تھا۔ میرا علم میرے قیاس پر مبنی تھا۔ جو میں سمجھ رہا تھا' ضروری نہیں اسی ترتیب سے وہ کچھ پیش آیا ہو' وہ اس سے مختلف بھی ہوسکتا ہے لیکن جو کچھ بھی ہوا ہے' بہت ناقابل یقین' بڑا لرزہ خیز ہے۔ پولیس کو تحقیق و تفتیش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھنی چاہیے۔ یہ اس کی آن اور ساکھ کا معاملہ ہے۔ فرائض سے زیادہ پولیس کو اپنی ساکھ اور آن کا خیال ہوتا ہے۔ انہوں نے ہمیں خاصی دیر بعد طلب کیا ہے۔ پورا ایک دن اور ایک رات گزر جانے کے بعد۔ پہلے انہوں نے شہر کی ناکابندی کی' سارے شہر اور گردونواح میں پولیس کا جال بچھا دیا پھر انہوں نے حویلی کے علاقے میں پہرا لگا دیا۔ گویا ہر سمت اور ہر پہلو ٹٹولنے کے بعد ان کی نظریں حویلی پر جا کے ٹکی ہیں اور واقعے کے محرک تک رسائی میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوچکے ہیں' آگے اور سرے بھی ان کے ہاتھ آسکتے ہیں۔

میں نے ہتھیلتی نگاہ سے بٹھل کو دیکھا اور مجھے اس کے چہرے سے کچھ جاننے میں ناکامی ہوئی۔ وہ تو جیسے پتھر کا ہوگیا تھا' کبھی کبھی مجھے اس کی اس بے چہرگی سے بڑی الجھن اور چڑ ہوتی تھی۔ وہ چہرہ جس پر کوئی نقش' کوئی تاثر مرقوم نہ ہو' کورے کاغذ کی طرح وہ تو اور متوحش کرتا ہے۔ یقیناً بٹھل کو اس تلخی کا اچھی طرح احساس ہوگا کہ یہ کوئی اور شہر نہیں' فیض آباد ہے' یہاں زریں کی حویلی ہے اور یہاں زریں ہے۔ آدمی کی استقامت کا ایک پیمانہ ہوتا ہے اور جگہوں کی بات دیگر تھی' یہاں حویلی میں زریں کے علاوہ ہمارے اور بھی خوش نہاد پرسان حال ہیں۔ ان کے لیے ہم سائے اور ستون کی علامت ہیں' روشنی کے بھی۔ ہمارے اچانک غیاب کی خبر کب تک ان سے چھپی رہے گی۔ حویلی کے گرد پولیس کے گھیرے کی اطلاع گزشتہ رات انہیں نہ ہوسکی ہوگی تو آج ہوجائے گی۔

منیر علی کے بھانجے ارشد اور بیٹے تنویر کو فیض آباد میں آباد ہوئے اب وقت گزر گیا ہے۔ وہ حویلی میں محبوس نہیں رہتے' زمینوں کی دیکھ بھال کرنے جاتے ہیں' شہر کے لوگوں سے بھی اب ان کی اچھی رسم و راہ ہونی چاہیے۔ کچھ دیر پہلے حویلی میں صبح صبح پولیس کی آمد اور ہمیں ساتھ لے جانے کا واقعہ دن چڑھتے تک ہر شخص کے وردِ زباں ہوگا اور ہماری قیدوبند کے پس منظر' سنگینی و سفاکی کی ساری جزئیات' کچھ حقیقتوں' کچھ فسانوں کے ساتھ۔ ارشد اور تنویر بہت لائق اور ہوش مند نوجوان ہیں۔ ان سے یہی توقع ہے کہ شہر میں گونجتے ہیبت ناک تذکروں سے حویلی کے مکینوں کو دور رکھنے کی احتیاط کریں لیکن خود ان کا کیا عالم ہوگا' انہیں ایسے سانحوں اور حادثوں کا تجربہ ہی کس قدر ہے۔ اُدھر حویلی کا واسطہ بیرونی ملازموں اور دیگر چھوٹے موٹے کام کرنے والوں سے بھی رہتا ہے۔ بدنامی کے پر لگ جاتے ہیں۔ اوروں کا اتنا نہیں' مجھے تو فروزاں اور یاسمن کا خیال آتا ہے۔ کس قیامت سے گزر کے وہ اس پناہ گاہ میں پہنچی ہیں۔ انہیں تو ابھی نرمی و گداز کی ضرورت ہے۔ وہ تو کمہلا جائیں گی۔ وہ تو ویسے بھی شیشے کے مانند ہیں۔

اور پولیس سے کیا بعید ہے۔ ہم پر زور ڈالنے کے لیے وہ کسی وقت حویلی میں نہ داخل ہوجائے۔ مطلب براری کے لیے پولیس کسی بھی ناروا اور انتہائی حربے پر اتر آتی ہے خواہ بعد میں لوگ دہائیاں دیتے پھریں اور پولیس کو پشیمانی اٹھانی پڑے لیکن اس پشیمانی سے عتاب زدگان کے زیاں کی تلافی نہیں ہوتی۔ شہر کے سمندر میں پہلے ہی حویلی کسی جزیرے کا درجہ رکھتی ہے۔ ان ہرزہ سرائیوں کے باعث وہ اور ہدفِ توجہ بلکہ ہدفِ ملامت ہوکے رہ جائے گی۔ پھر حویلی کے بے چارگان کے پاس یہی ایک چارہ ہوگا کہ وہ بمبئی ابا جان اور منیر علی کو' کلکتے جامو اور جمرو کو تار دے کے بلائیں۔ میں اس رات زریں کو یہی کچھ تو باور کرانا چاہتا تھا۔ یہ چھوٹے شہروں کے لوگ بڑے فسانہ طراز ہوتے ہیں' قصے کہانیوں میں ان کا جی بہت لگتا ہے۔ ان کے پاس وقت ہی وقت ہوتا ہے۔ یہی ٹھیک تھا کہ ہم پہلی فرصت میں بمبئی کی طرف نکل جاتے۔ بمبئی جا کے بھی جہاں گیر' نیساں اور مجو میاں اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھ سکتے تھے۔ بڑے فائدے کے لیے تھوڑا نقصان برداشت کرلیا جاتا ہے۔ کچھ میں زریں کو قائل نہ کرسکا' کچھ خود میری کوتاہی' نادانی۔ اس دن ہریا اور گورا استاد کے معاملے میں دخل اندازی کرنے کی چوک جو مجھ سے ہوگئی تھی' بات اتنی دور جانے کا مجھے کوئی اندازہ ہی نہ تھا پھر سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ وقت ہی نہیں ملا۔ ہم اتنی جلد بمبئی روانگی کے فیصلے پر کس طرح عمل کرسکتے تھے۔

دوسروں کے کیا' آدمی تو اپنے قابو میں نہیں ہوتا' خود کو اپنا مطیع نہیں کرسکتا۔ اپنے دل و دماغ تابع نہیں رکھ سکتا۔ اسی کے اپنے دست و بازو منحرف ہوجاتے ہیں۔

اچانک جسم کا کوئی حصہ اذیت سے دوچار کردیتا ہے۔ ...ہک دل بہکنے' دماغ بھٹکنے لگتا ہے۔ آدمی کی سب سے بڑی ...یا توانائی اس کی اپنی قابو یافتگی ہے۔ میں نے بٹھل کی ...ح سکون و سکوت اختیار کرنے کی کوشش کی لیکن جسم میں ...گرہیں پڑ گئی تھیں۔ طرح طرح کی دہم و گمان سر میں بھن ...ارہے تھے۔ یہ اندیشے اور وسوسے خودرو کانٹوں سے ...ابہ ہوتے ہیں۔ کانٹوں بھرے پودے پتھروں میں بھی ...پالیتے ہیں۔ آدمی کتنا ہی مضبوط ہو' وہم و گماں کے خار ...ں سے اسے مفر نہیں۔ میں اپنے آپ سے الجھتا رہا۔ مجھے ...لوم تھا اس تشویش و تردد سے کچھ حاصل نہیں۔ ہم بہ ہمہ ...رد کوتوالی میں موجود ہیں۔ تھوڑی دیر میں پیشی ہونے والی ...۔ اب فیصلہ کرنے والوں پر منحصر ہے کہ وہ کس تحمل اور ...رے ہماری روداد' ہماری بات سنتے ہیں۔ ہم تو اپنے جتن ...یں گے ہی لیکن اگر انہوں نے کچھ اور ٹھان رکھی ہو تو؟ ...نیم جانی و نیم زندانی میں گھنٹے بھر سے زیادہ ہوگیا۔ درمیان ...ایک مجہول قسم کا سپاہی تاروں کے اسٹینڈ میں اٹکے ...ے چھوٹے چھوٹے گلاسوں میں بھری چائے لے کے آیا۔ ...ھل کے انکار پر اس کا بگڑا ہوا چہرہ اور بگڑ گیا' وہ بڑبڑاتا ہوا ...ہی چلا گیا۔ روشنی بڑھ گئی تھی لیکن روشنی اور حبس میں ...ئی نسبت باہم نہیں ہے۔ ان کی طرف سے ہماری طلبی میں ...تاخیر ناقابل فہم تھی۔ بٹھل نے اس دوران کئی بیڑیاں ...پھونک ڈالیں۔

کمرے میں پرانے زمانے کی دیوارگیر گھڑی جانے کب ...ے بند پڑی تھی۔ گھڑی کا شیشہ گرد و غبار سے دھندلا گیا تھا۔ ...ئی ڈیڑھ گھنٹے بعد ماتحت افسر کا تمتماتا چہرہ دروازے پر ...ائی دیا۔ وہ تیز قدموں سے اندر آیا "چلو' اٹھ جاؤ" اس ...ے مصنوعی تحکمانہ لہجے میں کہا۔

بیڑی زمین پر پھینک کے بٹھل کھڑا ہوگیا اور کسمساتا ...ا مجھ سے مخاطب ہوا "چل رے' ابھی اندر کا نرت بھاؤ بھی ...ہیں۔"

"دیکھو استاد!" ماتحت افسر تنبیہی انداز میں بولا "ذرا ...یان رکھنا' یہ عام لوگ نہیں' تینوں اونچے افسر ہیں۔ کل ...ت سورج ڈوبتے لکھنؤ سے ادھر پہنچے ہیں اور رات بھر ...گے رہے ہیں۔ ان میں ایک افسر ورما صاحب سینٹر سے ...پوٹیشن پر لکھنؤ آئے ہوئے ہیں۔ اتنے پرانے نہیں پر ...ے بڑے کیس کیے ہیں۔ بڑا نام ہے ان کا۔ ولایت میں ...رے پانچ سال گوروں کے ساتھ کام کیا ہے۔"

بٹھل نے اپنا بھاری سر ہلایا "ہاں صاحب! گوروں کی کیا بات ہے۔ گوروں کی چھایا بھی گوری ہوتی ہے' ان کا چھوا بھی سونے کا ہوجاتا ہے۔"

"تمہارے بھلے کو بولتے ہیں" ماتحت افسر ناگواری سے بولا "آگے تم جانو۔"

"بولو تو منہ بند رکھیں؟"

"نہیں نہیں' یہ ہم نے کب بولا ہے' پر تھوڑا دھیان رکھنا' ہاں!"

"یہ تو ان پہ بھی ہے صاحب! ایک ہاتھ سے کدھری بجتی ہے۔"

ماتحت افسر کے چہرے پر رنگ آیا' وہ چپ رہا اور عجلت سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ہم بھی کمرے سے باہر آگئے۔ چند قدم کا فاصلہ طے کرکے وہ بائیں جانب مڑ گیا اور پہلے دروازے پر ٹھہر کے اس نے وہاں تعینات سنگین بردار سنتری کو ہمیں اندر لے جانے کا اشارہ کیا۔ سنتری نے اسے سلام کیا اور کسی توقف کے بغیر دروازہ کھول دیا۔

وہ ایک کشادہ' روشن اور صاف ستھرا کمرا تھا۔ کھڑکیوں پر سفید اور گیروے دھاری دار پردے جھول رہے تھے۔ سامنے عنابی رنگ کے کپڑے سے ڈھکی ہوئی وسیع میز پر دفتری سامان سجا ہوا تھا۔ کرسیاں بھی نئی نئی تھیں۔ میز کے اس پار تین کرسیوں پر تین اور میز کے دائیں بائیں کرسیوں پر دو افسر موجود تھے۔ ان کی عمریں چالیس اور پچاس کے درمیان تھیں۔ وسط میں جو شخص تمکنت سے کرسی نشیں تھا' غالباً وہی ورما ہوگا۔ ان میں سب سے کم عمر وہی لگتا تھا' ناک نقشہ ترشا ہوا' چوڑی پیشانی' بڑی بڑی چمک دار آنکھیں' سیاہ بال' سلیقے سے مانگ نکلی ہوئی' رنگت بادامی' قد متناسب' جسم فربہی کی طرف مائل۔ سینے اور شانوں پر پولیس کے امتیازی نشانات آویزاں۔ وہ تازہ کڑک وردی میں ملبوس تھا' وردی میں نہ ہوتا تو کوئی بھی اسے پولیس والا نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس کے دونوں جانب بیٹھے ہوئے افسر پختہ گندمی رنگت کے حامل' بھاری جسامت کے اور نسبتاً معمر تھے۔ میز کی شرقی و غربی جانب دو افسروں میں ایک سرمئی رنگ کا' بانس کی طرح لمبا' چھریرا اور چشمہ لگائے ہوئے تھا۔ پولیس میں اتنی عمر کا ایسا سوکھا ہوا آدمی شاذونادر ہی ہوتا ہے۔ دوسرا خود سر افسر وہی تھا جو صبح صبح حویلی آیا تھا اور وارنٹ کے مطالبے پر برگشتہ ہوگیا تھا۔ پانچوں افسروں کے آگے کاغذ اور قلم رکھے تھے۔ وہ سب ہمارے منتظر تھے۔ ان کے چہروں سے بے چینی ہویدا تھی۔ ہمارے داخل ہوتے ہی ان کے جسم تن گئے۔ ہم میز

سے گز بھر کے فاصلے پر جا کے ٹھہر گئے۔ ایک قدم دور کرسیاں خالی تھیں۔ انہوں نے ہم سے بیٹھنے کے لیے نہیں کہا۔ بٹھل نے ہاتھ اٹھا کے انہیں سلام کیا۔ میں نے بھی بادل ناخواستہ اس کی نقل کی۔ درمیان میں بیٹھے ہوئے افسر نے سر کی خفیف سی جنبش پر اکتفا کیا۔ ان سب کی نظروں نے جیسے ہمیں حصار میں لے رکھا تھا۔ اسی اذیت ناک خاموشی میں کئی لمحے گزر گئے پھر وسط میں بیٹھے ہوئے افسر نے شانے اچکائے اور سامنے رکھے ہوئے گلاس سے گھونٹ بھر پانی پی کے کھن کھناتی آواز میں بولا "استاد بٹھل! استاد بابر!" اس کے تخاطب میں طنز اور استہزا کی آمیزش تھی۔

بٹھل بے حس و حرکت کھڑا رہا۔

"نیوتے بنا تم کو یہاں آنا پسند نہیں تھا' کیوں استاد؟" اسی افسر نے زہر خند سے کہا۔

"بنا تو آپ نے ڈالی ہے" بٹھل نے دھیمی آواز میں جواب دیا "پر اب تو ادھری ہیں۔"

"یہ تو اچھا کیا استاد' سیدھے سبھاؤ آ گئے۔"

"اب اچھا ہو کہ برا' دیکھیں گے صاحب!"

"بڑی تعریف سنی ہے تمہاری استاد بٹھل! کلکتہ شہر کے استاد' فیض آباد کے استاد' ابھی پتا چلا کہ لکھنؤ کی گدی استاد بابر کے نام پر چلتی ہے۔ وہاں بابر استاد اپنی مرضی کا پنتر بٹھا کے آئے ہیں۔ ادھر بٹھل استاد نے' سمے بیتا' جامو استاد کو فیض آباد سے لے جا کے کلکتے کے راج سنگھاسن پر بٹھلا دیا ہے۔ دوسرے شہروں کا ابھی ہم کو پتا نہیں۔ ہندوستان بہت بڑا ہے۔ لوگ کہتے ہیں' بابر استاد کو کچھ لکھنا پڑھنا بھی آتا ہے' دونوں کی پرانی جوڑی ہے اور دونوں کے ہاتھ میں جادو ہے۔ چاقو' چھرا' خنجر' لاٹھی' ڈنڈا' بلم' بندوق' تمنچا ہاتھ میں آنے کی دیر ہوتی ہے' آواز کا نشانہ لے لیتے ہیں۔ کوئی گھر بند نہیں' پیادوں کی پوری سینا حاضر' اشاروں پر ناچے' سمے پڑنے پر سر بھی کٹا دے۔ پولیس سے آنکھ مچولی من بھاتا کھیل ہے۔ جیل' کچہری' تھانا گھر کی طرح ہے۔ بڑی موٹی کھال ہے۔ ان سے دشمنی پاپ ہے۔ پلٹ جائیں تو کسی کو شما نہیں کرتے۔ دور دور تک نام ہے استاد بٹھل کا" پولیس افسر نے سر جھکا کے سامنے رکھے کاغذوں پر نظر ڈالی اور رک رک کے بولا "استاد بٹھل! استاد بابر! استاد جامو' جمرو' شمشاد خاں اور۔۔۔ اور لمبی لسٹ ہے" اس نے بٹھل کو مخاطب کر کے چبلے پن سے پوچھا "کیوں استاد' ایسا ہی ہے نا!"

"ہم کیا بولیں صاحب! آپ کرسی پر بیٹھے ہو" بٹھل نے جیسے اپنے آپ سے کہا "ایسا ہی ہوگا۔"

"نا نا' کچھ کم' زیادہ یا غلط ہو تو بولو؟"

"ابھی کم ہے صاحب!"

"ہا آں" پولیس افسر کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ کرسی پر سیدھا نہ رہ سکا' اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں بولا "کم ہی ہوگا' ہم کتنا جان سکتے ہیں' پھر تم ہی کچھ بتاؤ استاد!"

"اپنے منہ سے کیا بولیں" بٹھل نے آہستگی سے کہا "اچھا نہیں لگتا صاحب! اور آپ شاید سن بھی نہ پاؤ۔"

"رات بھر تمہارا ہی چرچا ہوتا رہا ہے۔ شہر میں تمہارے ٹھکانے کے سنگی ساتھی رات سے ہمارے مہمان ہیں۔ کیا کیا بولتے ہیں وہ تمہارے بارے میں' تمہارا دم بھرتے ہیں۔ بولتے ہیں' یہاں شہر میں تمہاری محل جیسی اونچی حویلی ہے۔ حویلی کی اصل مالک جوان کنیا' اور اس کا تو نام ہے' حویلی کے مالک تم ہو یا استاد بابر۔ تم کو وہ بابا بولتی ہے بابر استاد کو بھی کچھ مانتی بولتی ہوگی۔ معلوم ہوا ہے' اڈے کے بس خاص خاص آدمیوں کا وہاں آنا جانا رہتا ہے اور سنتے ہیں حویلی میں اور بھی لوگ رہتے ہیں جن کا رشتہ ناتا فیض آباد سے نہیں ہے۔ شہر میں تمہارے نہ ہونے پر حویلی کی دیکھ بھال اڈے کے آدمی کرتے ہیں اور کسی میں ہمت نہیں کہ حویلی کی طرف سر اٹھا کے دیکھے یا نظر ٹیڑھی کرے" پولیس افسر نے چبھتی ہوئی آواز میں پوچھا "ایسے کون کون لوگ حویلی میں رہتے ہیں استاد؟"

بٹھل کو جواب دینا چاہیے تھا کہ وہ کون ہوتا ہے' ایسی باتیں کرنے اور اتنا کچھ پوچھنے والا۔ میری توقع کے خلاف بٹھل نے دبے لہجے میں کہا "اپنے ہی لوگ ہیں صاحب!"

"اپنے کیا؟ تمہارے رشتے دار یا۔۔۔"

"اب تو سارے اپنے ہیں۔"

"پہلے کیا تھے؟"

"پہلے نہیں تھے" بٹھل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"سنا ہے' بابر استاد کی سگی بہن کا جنازہ بھی حویلی سے اٹھا تھا۔ وہ شہر کے کوٹھے پر ناچتی تھی۔"

فہمیدہ کے ذکر پر میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ وہ حد سے تجاوز کر رہا تھا۔ جی میں آیا' میز پھلانگ کے اس کے سر پر جا پہنچوں' زبان کاٹ لوں یا گلا دبوچ دوں۔ بٹھل نے زور سے میرا ہاتھ تھام لیا۔

وہ کمینہ پولیس افسر ہرزہ سرائی کرنے لگا "ایک رات کوٹھے پر بہن کا بھائی سے سامنا ہو گیا۔ بھائی کو دیکھ کے بہن کھڑکی سے کود پڑی اور بے چاری نے جان دے دی۔ کیا نام بتایا ان لوگ نے بائی کا؟" اس نے اپنے برابر بیٹھے ہوئے افسر سے پہلو بدل کے پوچھا "نیلم' نیلم جان!" افسر نے کاغذات لوٹ پلٹ کے کہا۔

میرا جسم کپکپانے لگا تھا۔

"بڑی دکھ بھری بپتا ہے۔ رات ہی سنی' کیا بات تھی؟" درمیان میں بیٹھا ہوا افسر مسلسل ٹٹھول کر رہا تھا۔

"کام کی بات کرو صاحب!" بٹھل کی آواز تپی ہوئی تھی۔ ادھر اس نے میرا ہاتھ زور سے جکڑ رکھا تھا۔

"ٹھیک ہے' کام کی بات کرتے ہیں' اسی واسطے تم کو یہاں بلایا بھی ہے۔ دیکھو استاد!" اس کی آواز تند ہو گئی "اچھا ہوگا' ایک بات دھیان سے سن لو۔ ہم کو دونوں طریقے آتے ہیں' دیسی بھی' ولایتی بھی۔ تم کو کون سا پسند ہے؟"

"ادھری تمہارے سامنے ہیں' اپنے گھر میں نہیں" بٹھل نے ترشی سے کہا "اپنے سے کیا پوچھتے ہو۔"

"آل رائٹ!" وہ ڈھٹائی سے بولا "صاف صاف بات کرتے ہیں۔ تم نے ساتھ دیا تو کام آسان ہو جائے گا۔ بعد میں یہ لوگ جانیں" اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ان کو دیسی طریقے آتے ہیں' ولایتی پہ یہ وشواس نہیں کرتے۔ تم سے اتنی بات کرنے کی بھی ضرورت نہ پڑی کہ تم جان لو' ہم تمہارے بارے میں کتنا کام کر چکے ہیں' کتنی جان کاری رکھتے ہیں۔"

"ایسے اپنا بھی بھلا ہوا ہے۔"

"تمہارا کیا؟" پولیس افسر بے کل ہو گیا "تمہارا بھی بھلا؟ ہاں!"

"اپنے کو بھی تھوڑی آپ لوگ کی جان کاری کا۔۔۔" بٹھل نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"ہا' رئیلی' اٹز گڈ۔ اٹز فنٹاسٹک!" اس نے جوش مسرت کا طنزاً اظہار کیا پھر تجسس سے بولا "تم نے' تم نے کیا جانا؟"

"آپ کا دھیان ہے صاحب! مت پوچھو۔"

"نا نا' بتاؤ' بولو!"

"چھوڑو صاحب! آپ ولایت سے پلٹے ہو' مرچی چھوٹ جائے گی ہوگی۔"

پولیس افسر نے پہلے تو پلکیں پٹ پٹائیں اور کرسی پر اچھل پڑا۔ وہ ایک تیز فہم افسر تھا۔ بٹھل کا مفہوم اخذ کرنے میں اسے لمحہ بھر صرف ہوا اور اس نے قہقہہ لگایا۔ قہقہے میں بے ساختگی کم تھی لیکن اس کے ساتھیوں نے ہم نوائی کی اور جلد ہی سنجیدہ بھی ہو گئے۔ ہم سے مخاطب افسر نے تنی ہوئی آواز میں کہا "تمہاری غلط فہمی ابھی دور ہو جائے گی استاد!"

"دیکھتے ہیں صاحب! کس کی دور ہوتی ہے" بٹھل زیر لبی سے بولا۔

پولیس افسر کے دائیں جانب بیٹھے ہوئے افسر نے معاً اپنا سر قریب کر کے دخل اندازی کی اور سرگوشی میں غالباً کوئی مشورہ دینے کی جسارت کی۔ اس کا انداز مودبانہ تھا' فدویانہ بھی۔ جواب میں پولیس افسر متانت سے سر ہلاتا رہا۔ کچھ دیر وہ گم صم سا رہا۔ اس کی پھنکارتی نظریں ہم پر بکھری ہوئی تھیں "ہاں استاد' استاد بٹھل!" وہ جکڑی ہوئی آواز میں بولا "آگے کی بات کریں' تم اچھی طرح جانتے ہو گے کہ تم کو یہاں کیوں بلایا گیا ہے؟"

"اپنے کو پیچھے کا دکھائی نہیں دیتا" بٹھل نے تنک کے کہا۔

"ٹھیک ہے" پولیس افسر کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی "ہم دکھاتے ہیں' پرسوں رات پڑوس کی ٹھاکر بستی میں ۲۷ آدمیوں کو یا تو مار دیا گیا ہے یا زندہ جلا دیا گیا ہے۔ پورے ۲۷ آدمی۔" وہ زور دے کے بولا۔

بٹھل خاموش کھڑا رہا۔

"مرنے والوں میں ٹھاکر بل دیو' ٹھاکر ہردیو' جیسے نامی لوگ شامل ہیں۔ وہ اس طرف کے بہت بڑے زمیں دار تھے' پرکھوں سے رئیس' بڑی آن بان والے۔ یہ عام لوگوں کی ہتیا نہیں ہے۔"

"بڑے لوگ کی ہتیا بھی بڑی ہوتی ہے۔" بٹھل نے بہ ظاہر تاسف سے کہا۔

"یہاں ایسا' ایسا اندھیر دور دور تک نہیں ہوا' سرکار نے اب ہم کو ادھر بھیجا ہے اور بھیجا ہے تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی بھیجا ہوگا۔ ان کو معلوم ہے' ہم نے ناکام ہونا نہیں سیکھا اور ہم پولیس' چاروں طرف دیکھنے کے بعد ہی ہم کسی پر ہاتھ ڈالتے ہیں۔"

"چار کھونٹ دیکھ کے ہی بڑھنا ٹھیک رہتا ہے" بٹھل نے کسمساتے ہوئے کہا "ایک بات پوچھیں صاحب! آپ کا کوئی رشتہ ناتا لگتا ہے ٹھاکروں سے؟"

"کیا' کیا کہا' کیا کہنا چاہتے ہو تم؟"

"تھوڑا ٹھاکروں کا بھی آگا پیچھا' الٹا سیدھا دیکھا آپ نے؟"

"کیا مطلب؟" پولیس افسر بھڑک اٹھا "وہ بہت جانے پہچانے لوگ تھے۔ بہت اونچا گھرانا ہے ان کا۔ ان کے دادا رگھوبیر ٹھاکر کو انگریزوں نے سر کا ٹائٹل دیا تھا۔ اس علاقے

میں کون ہے جو ان کو نہیں جانتا۔"

بٹھل نے سرہلا کے تائید کی "ہاں صاحب! چرچے سنے ہیں ٹھاکروں کے۔"

صرف چرچے سنے ہیں" پولیس افسر نے گویا بٹھل کی نقل اتاری۔ "اور کچھ نہیں؟"

"اور کیا صاحب؟" بٹھل نے اکھڑی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"دیکھا نہیں کبھی؟"

"ہاں صاحب! درشن سے رہ گئے۔"

"درشن ضروری بھی نہیں' جاننا کافی ہے۔"

بٹھل نے خاموشی مناسب سمجھی۔

"استاد بٹھل!" پولیس افسر کی زبان کسی اندرونی خلفشار سے ہکلا گئی' کہنے لگا "ٹھاکر بل دیو' ٹھاکر ہردیو اور ان کے گھرانے کے اتنے لوگوں کی موت پر سرکار ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں رہ سکتی۔ سینٹر تک بات جاچکی ہے۔ ٹھاکروں کی حویلی میں ڈھانچوں کے سوا کچھ نہیں بچا۔ اس خون خرابے کی سزا بھی آخری درجے کی ہوگی۔ مجرموں سے پھانسی کا پھندا دور نہیں ہے۔ وہ بچ نہیں سکتے۔"

"نہیں بچنا چاہیے' پر صاحب بہادر! آپ نے گھٹنا کے کارن پر دھیان دیا؟ کوئی کارن تو ہوگا۔"

"کارن ایک ہی ہو سکتا ہے' ٹھاکروں سے دشمنی کا' کسی بدلے کا۔"

"لگتا ہے' پرانا بیر ہوگا۔ پہلے آپ اس کی کھوج کرو۔"

"تمہارے سجھاؤ کی ضرورت نہیں' ہم یہاں جھک نہیں مار رہے" پولیس افسر کا پارا چڑھ گیا "بیر نیا بھی ہو سکتا ہے۔"

"ہاں صاحب! نیا پرانا کیا' بیر تو بیر ہے پر اس کا بھی کوئی سرا ہوگا۔ ٹھاکروں نے کسی کو بڑی چوٹ دی ہوگی جو گھٹنا بھی اتنی بڑی ہوئی۔ لوگ بولتے ہیں' ٹھاکر' ٹھاکر نہیں رہے تھے' بس تاج ہی نہیں اٹکا تھا اوپر' اور یہ چھوٹا ٹھاکر' وہ راج کمار تو آدمی کا جنا نہیں لگتا تھا۔ بہت کٹ کھنا' مرکھنا تھا' منہ مارتا' ڈکراتا پھرتا تھا سارے میں۔ ادھری لوگوں سے پوچھو' بولتے ہیں صاحب' ایک دم کھلا ہوا تھا۔"

"اور کیا جانتے ہو تم ٹھاکروں کے بارے میں؟"

"اور کیا صاحب....!" بٹھل کا منہ بن گیا۔

کئی بار میرے جی میں آئی کہ دخل دوں مگر کسی بے زبان' مخبوط الحواس' کسی بے جواز آدمی کے مانند میں بٹھل کے پہلو میں بت کی طرح ایستادہ تھا۔ کسی یقین ہی میں زبان ساتھ دیتی ہے اور بیان میں تاثیر کے لیے کوئی یقین لازم ہے اور یقین کے لیے علم کی شہادت' علم کی سند چاہیے۔ میرا [illegible] مفروضوں' اندازوں اور قرائن و آثار تک محدود تھا۔ یہ دل کہتا تھا کہ ٹھاکر کی حویلی کا رخ کرنے والے آتش بدو[ش] مہم جو بٹھل ہی کے فرستادہ تھے اور وہ وہی ہوں گے' پھر ا[ور] کون ہو سکتے ہیں لیکن ایک تنگ و تاریک گوشہ ان کے ہونے' کسی اور کے ہونے کا بھی از روئے امکان موجود تھا۔ بہرحال اتنا تو واضح ہو گیا تھا کہ ہمیں کوتوالی طلب کرنے [کے] باوجود اب تک وہ کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے ہیں اور ا[س] نوک جھونک' حجت و تکرار کا سبب کوئی رائے قائم کرنا ہے۔ بٹھل کو میں نے ایسا محتاط کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ پھونک پھونک کے انہیں جواب دے رہا تھا شاید اس لیے کہ [ا]یسی' اتنی بڑی واردات یا سانحے کے سلسلے میں ہم کبھی پ[یش] نہیں ہوئے تھے۔ واقعے کی نوعیت پہلے سے مختلف تھی۔ [وہ] ولایت کا تربیت یافتہ پولیس افسر ورما بھی عام افسروں ج[یسا] نہیں تھا۔

اس کی ساتھی بار بار پہلو بدل رہے تھے۔ ان کے چہرو[ں] سے کدورت اور خشونت جھلکتی تھی جیسے ان کا بس نہ چل[تا] ہو کہ وہ اس تو تکار کے بجائے جلد از جلد کوئی حکم نافذ کریں [کہ] بعد میں یہ حکم واپس بھی لیا جا سکتا ہے۔ پشیمانی پولیس [کا] معمول ہے۔ ان کا چلایا ہوا تیر کبھی نشانے پر بھی لگ جا[تا] ہے۔ ان کے درمیان بیٹھے ہوئے پولیس افسر کو [اس] کارروائی اور خانہ پری سے غرض نہیں تھی۔ وہ سرا پکڑ[نے] کی جستجو میں تھا۔ ولایت والوں کو یوں بھی وقت بہت ع[زیز] ہوتا ہے۔ وقت کی قدر و قیمت کا فرنگیوں کو کوئی غیر معمو[لی] احساس ہی ہوگا کہ ایک دنیا ان کی اسیر تھی۔ دیسی لوگوں [کے] پاس وقت بہت وافر ہوتا ہے اور کہتے ہیں' جو چیز وافر ہو[تی] ہے' اس کی قدر و قیمت بھی کم ہوتی ہے۔ دیسی لوگ ا[یسے] معاملات میں بھی جوش و خروش سے شامل ہوتے ہیں جن [سے] ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ پولیس افسر ورما ایک طباع [افسر] تھا' ایک حقیقی پولیس افسر جو کسی معاملے کی تہ تک پہنچنے [کے] لیے اپنی ذات سے بے پروا ہو جاتا ہے' خود سے کوئی سرو[کار] نہیں رکھتا اور ایسا شخص زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ ولایت [کے] بارے میں کسی نے مجھے بتایا تھا۔ شاید کرشنا جی نے' وہا[ں] پولیس کے لوگ تحقیق و تفتیش کی دوران میں مشین [بن] جاتے ہیں۔ مجرم یا ملزم سے انہیں ذاتی قسم کا عناد نہیں ہو[تا]' ان کا مقصد اپنے مقصد کا حصول ہوتا ہے۔ وہ مجرم کے نہی[ں] جرم کے دشمن ہوتے ہیں اور دلیل و منطق کی ترازو ان [کے] ہاتھ میں ہوتی ہے۔ کرشنا جی کہتے تھے کہ کبھی مجرم کے جرم [کی] [illegible] نوعیت' اس کے وحشیانہ تیور' اس کے سفید جھوٹ اور پینترے بازی پر بہت خون کھولتا ہے' جی کرتا ہے' اسے وہیں گولی ماردی جائے۔ عدالت تو بہت دیر میں فیصلہ سناتی ہے اور کبھی شہادتوں کی کجی اور دلیلوں کی کوتاہی سے فیصلہ مجرم کے حق میں بھی ہو جاتا ہے' پولیس منہ دیکھتی رہ جاتی ہے لیکن پولیس کا کام مجرم کو اس کے اعمال نامے کے ساتھ عدالت کے سپرد کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ایک انصاف پسند' فرض شناس پولیس افسر کو واقعی اپنی ذات بالائے طاق رکھ دینی چاہیے۔ مجرم سے نفرت و حقارت' بغض و عداوت اور احساس توہین و شکست جیسی ذاتی آلودگیوں سے مبرا ہو کے کوئی پولیس افسر جلد اور بہتر نتائج اخذ کر سکتا ہے۔ سرزد ہو جانے والا جرم ماضی ہوتا ہے۔ جتنا نقصان ممکن تھا' ہو چکا ہوتا ہے۔ مجرم موجود ہوتا ہے اور اس کا مستقبل بھی ہوتا ہے۔ مجرم سے آئندہ قلب ماہیت کی توقع کی جاسکتی ہے۔ ورما بھی کچھ کرشنا جی کے قبیل سے تعلق رکھتا تھا مگر وہ کرشنا جی کا مثیل نہیں تھا' کرشنا جی میں ہم دردی' مروت اور انسان دوستی بدرجہ کمال تھی۔ ورما اپنے طور پر ہم سے معاملت کر رہا تھا۔ اسے اپنے ساتھیوں کے تردد و تکدر کی کوئی پروا نہیں معلوم ہوتی تھی۔ "تمہیں تو ٹھاکروں نے کوئی چوٹ نہیں دی؟" اس نے جھنپتی آواز میں پوچھا۔

"اپنے کو کیا صاحب!" بٹھل نے سر جھٹک کے کہا۔ اپنے کو ادھری آئے کبھی تو برس لوٹ جاتے ہیں' آتے ہیں تھوڑے ٹائم کے لیے۔" بٹھل کا لہجہ نرم تھا لیکن مدافعانہ تھا۔

"اب کتنے دن بعد آنا ہوا؟"

"ٹھیک سے یاد نہیں پڑتا۔"

"بیچ میں کہاں کہاں رہے؟"

"ایسے ہی گھوما پھیری رہی" بٹھل نے بے اعتنائی سے کہا "کیا بولیں؟"

"کیوں گھوما پھیری کیوں؟ کوئی خاص بات؟"

"اپنے کو کتے نے نہیں کاٹا ہے۔"

"کتے آدمی کو کاٹتے ہیں" ورما کے بائیں طرف بیٹھے ہوئے افسر نے اچک کے کہا۔ ورما نے آنکھیں میچ لیں' اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار صاف نمودار ہوئے۔

"جواب آتا ہے اپنے کو" بٹھل درشتی سے بولا "پر آپ بدک جاؤ گے صاحب!"

"ہاں' بتاؤ گے نہیں؟" ورما نے بہ عجلت کہا "کیا بات ہے؟"

"آپ کا واسطہ نہیں اس سے" بٹھل آہستگی سے بولا "اپنے کو کسی کی کھوج ہے۔"
"کس کی؟" ورما نے ہمک کے پوچھا "کون ہے وہ؟"
"کوئی کھوگیا ہے اپنا۔"
"کھوگیا ہے؟" ورما تذبذب سے بولا "کون؟ اڈے کا آدمی؟"
"گھر کا آدمی۔"
"اوہ!" پولیس افسر ورما نے لمبی سانس کھینچی۔
"وہ الگ چکر ہے" بٹھل نے کھردری آواز میں کہا "آپ اپنی پھرکی گھماؤ۔ ہم کو ادھری کیوں بلایا ہے؟ لگتا ہے' آپ ہم پر شک کرتے ہو۔"
جانے کیوں سبھی مضطرب ہوگئے۔ ورما کی آنکھوں کی چمک اور گہری ہوگئی۔ تڑخ کے بولا "تم پہ کیوں نہیں کیا جاسکتا؟"
"کرو صاحب!" بٹھل کے لہجے میں تلخی نمایاں تھی۔
"ہم اڈے کے آدمی ہیں۔"
"اور اڈے پہ بھی نمبر ایک۔"
"تو دیری کاہے کی؟"
"ابھی نہیں استاد! ابھی تم سے کچھ اور جاننا ہے۔"
"اب آگے جا کے ہی زبان کھولیں گے۔"
"آگے کدھر؟"
"ابھی ادھری سارا ختم نہیں ہوجاتا۔"
"تم ایک چالاک آدمی ہو استاد!"
"پہلا نمبر ہی بولا تھا آپ نے؟"
"ہاں' اور اس میں اب شک بھی نہیں۔ پہلے سنا تھا' اب دیکھ رہے ہیں لیکن استاد! ہمارا نمبر بھی کم نہیں ہے۔ جہاں کی تم بات کررہے ہو' وہاں بھی ہمارا دیکھا اور جانا ہوا سامنے رکھا جاتا ہے۔"
"ادھری ہم ہوں گے اور اکیلے نہیں۔ ساتھ میں چونچ لڑانے کو اور بھی کالے پیلے پنچھی۔ ادھری ہم جو بھیرویں الاپ رہے ہیں اور آپ کے پلے نہیں پڑرہی' ادھری ایسا نہیں ہوگا۔ ادھری کانٹے کا بڑا دھیان ہوتا ہے' آنے پائی کا حساب۔"
"کیا کہنا چاہتے ہو تم؟" ورما کی زبان بگڑنے لگی "اور کہہ بھی کیا سکتے ہو۔ اچھی طرح جان لو استاد! تمام شہادتیں تمہارے خلاف جاتی ہیں۔ تمہارے ٹھکانے کا آدمی بیچ بازار میں ٹھاکر کے کھلائے پلائے استاد گورا کے دباؤ میں ہوتا ہے کہ کہیں سے استاد بابر سینہ پھلا کے آجاتا ہے۔ اپنے اڈے کے آدمی کی بری دشا دیکھ کے اس کا خون جوش مارتا ہے۔ استاد گورا پر ٹھاکر کی چربی چڑھی ہوئی تھی۔ اس دو آنکھوں کے اندھے کو پتا نہیں تھا کہ سامنے کون مانا ہوا استاد ہے' چاقو کا' بل کا دھنی۔ ان جانے میں استاد گورا سے بھول ہوگئی اور زمین کا منہ دیکھنا پڑا' ایسا ہی نا؟"
"ایک دم ایسا ہی" بٹھل نے ستائشی انداز میں کہا "لگتا ہے' ولایت میں کوئی میم نہیں پالی صاحب نے' گھڑیال سے بندھے رہے ہو پر ذرا پچھلے سے بات کرو۔"
"پچھلے سے کیا؟" ورما گڑبڑا گیا۔
بٹھل نے ٹھہری اور جمی ہوئی آواز میں اسے بتایا کہ فیض آباد شہر کے ایک آسودہ حال' سادہ شعار کاروباری فخر لکشمی داس کی جواں سال' نازک اندام' تعلیم یافتہ اور زیر تعلیم بیٹی برکھا ایودھیا میں تیرتھ یاترا کو گئی ہوئی تھی کہ ٹھاکر بستی کے مالک و مختار ٹھاکر بل دیو کے منہ زور' بے لگام اور نفس پرست بیٹے ہردیو کی نظروں میں آگئی۔ برکھا کا حسن و جمال دیکھ کے ٹھاکر اوسان کھو بیٹھا۔ اس نے وہیں تیرتھ استھان پر برکھا سے زیادتی کرنی چاہی اور ناکام رہا۔ پھر اس نے فیض آباد میں لکشمی داس کو برکھا کے لیے پیغام بھیجا۔ ٹھاکروں کے مال وزر' عیش و عشرت' رعب' دبدبے اور جوروستم سے لکشمی داس خوب آشنا تھا۔ آس پاس کے لوگ اپنی نوجوان لڑکیاں پردوں میں چھپائے رکھتے تھے۔ لکشمی داس اس حقیقت سے واقف تھا کہ انکار کی سزا کیسی عبرت ناک ہوسکتی ہے لیکن سب کچھ جانتے بوجھتے وہ اپنی نرم و نازک بیٹی کو ٹھاکر کے جہنم میں نہیں دھکیل سکتا تھا۔ وہ بہانے کرتا رہا۔ ٹھاکر نے دھمکیاں دینی شروع کردیں اور ایک روز اپنے شورہ پشت کارندوں کے ذریعے برکھا کو اغوا کرالیا۔ شہر کے اڈے کے آدمیوں کو بروقت خبر ہوگئی۔ انہوں نے ٹھاکر کے نمک خواروں کو راستے میں جالیا اور مار بھگایا۔ برکھا بہ سلامت گھر واپس آگئی۔ اڈے کے آدمیوں کی یہ جرات ٹھاکر کے لیے سبکی اور توہین کے مترادف تھی۔ انہیں قابو میں رکھنے کے لیے ٹھاکر نے اپنے پروردہ بارہ بنکی کے ہتھ چھٹ' چاقوباز' اڑاگیر استاد گورا کو فیض آباد بھیج دیا۔ گورا نے فیض آباد میں داخل ہو کے بیچ بازار میں ایک دن لکشمی داس کے محلے میں تعینات استاد ہریا کا راستہ روک لیا۔ چاقو نکل آئے۔ بٹھل نے کہا کہ اتفاق سے اسی دوران میں بابر (یعنی میں) کسی کام سے وہاں سے گزر رہا تھا' مجمع دیکھ کے ٹھہر گیا۔ اس کی دخل اندازی کی وجہ سے گورا چاقو پر گرفت قائم نہ رکھ سکا۔ ٹھاکر ہردیو کو پہلی ذلت اس

[...]ت ہوئی تھی جب لکشمی داس نے اپنی بیٹی کے لیے اس کے [...]ے پر ہامی نہیں بھری تھی۔ دوسری ندامت گورا کی ہزیمت [...] ہوئی۔ ادھر برکھا اپنے اغوا کے حادثے سے ایسی دل [...]شت ہوئی کہ ہنسنا بولنا' کھانا پینا بھول گئی۔ وہ سکتے کی سی [...]یت سے دوچار تھی۔ اس طرف ٹھاکر کے سینے میں پھانس [...] گئی تھی۔ اور جلد ہی چند دنوں کے اندر اندر ٹھاکر ہردیو [...] ایک رات اپنے زر خرید مسلح آدمی دوبارہ شہر بھیج دیے۔ [...]ندھیرے میں تاک لگائے بیٹھے تھے۔ انہوں نے چھپ کر [...]ے علاقے کا گشت کرنے والے ہریا اور اس کے حقیقی بھائی [...] پر وار کیا اور انہیں ختم کردیا اور لکشمی داس کے گھر پر [...]رگی۔ اس کے گھور کے دربان اور ملازم کو راستے سے [...]کے وہ برکھا کو ساتھ لے گئے۔ لکشمی داس کو بھی انہوں [...] زخمی کیا۔ وہ اب پاگل ہوگیا ہے اور اسپتال میں ہے۔ [...]ے کے دو جوان آدمیوں کا قصور یہ تھا کہ وہ اپنے شہر کی [...] لڑکی کی عزت و آبرو محفوظ کرنے پر سینہ سپر ہوگئے تھے۔"
بٹھل ابھی کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ پولیس افسر ورما نے [...]ر اٹھا کے اسے روک دیا "آگے ہم بتاتے ہیں استاد!" اس [...]ہرہ تمتما رہا تھا' وہ اضطراری انداز میں بولا "بالکل ویسا ہی [...]م بولنا چاہتے ہو۔ پھر یہ ہوا کہ لکشمی داس بچ گیا لیکن بے [...] مردے سے بدتر' ٹھاکر کے لوگ برکھا کو لے گئے اور [...]رے دن برکھا کی ادھڑی ہوئی برہنہ لاش شہر کے کنارے [...]ڑیوں میں پڑی ملی۔ لکشمی داس پہلے ہی سدھ بدھ کھو بیٹھا [...] اس دکھ سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ ہریا' لچھو' [...]ی داس کے دونوں نوکر اور بیٹی برکھا' سب کی ارتھیاں [...]کے پیچھے اٹھیں۔ شہر کے بہت سے لوگ کریا کرم میں شریک [...]ئے۔ اتنا ہی نا؟ چلو مان لیا کہ یہ ہتیا ئیں ٹھاکر کے آدمیوں [...]کیں لیکن اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ بولو استاد!"
"جو آپ کی مرضی ہو' بول دیں۔ اپنے پلے اب کیا رہ [...]ا ہے۔" بٹھل نے برگشتگی سے کہا "ہاں' اس کے بعد [...]ڈی والوں نے چوڑیاں ڈال کے شہر میں ٹھمکا لگایا پھر کھیل [...] پیسہ ہضم۔"
"اور ان کی جگہ کسی اور نے لے لی۔ ٹھاکر بستی کا صفایا [...]ردیا' ایک دو نہیں' پورے ستائیس آدمی بھون دیے۔ ان [...]ے سارے کھیت کھلیان' سارا کچھ" ورما کی آواز حلق میں [...]ٹکنے لگی اور اس نے تقریباً بلبلا کے پوچھا "وہ' وہ کون تھے؟"
"اب سُرتال آپ ملاؤ صاحب!" بٹھل نے بے نیازی [...]ے کہا۔
"وہی کررہے ہیں" پولیس افسر ورما تڑخ کے بولا "اور ایسا گمبھیر معاملہ نہیں' دھیان دو تو ادھر ادھر آمنے سامنے کا صاف دکھائی پڑتا ہے۔ زیادہ دن نہیں بیتے تھے' ہریا اور لچھو کو شمشان گھاٹ پہنچائے' ٹھاکر ہردیو کو پورے کنبے پریوار' نوکر چاکر' دھن دولت سمیت ختم کردیا گیا اور جانا کہ حساب چکتا ہوگیا ہے اور یہ سارا اس سمے ہوا جب کلکتے کا بادشاہ بٹھل اور اس کا وزیر بابر' فیض آباد میں تھے۔"
اب کیا کلام رہا تھا۔ پولیس افسر کے لہجے میں ایسی کوئی رمزیت اور معنی خیزی نہیں تھی' بٹھل کو کسی خوش فہمی میں نہیں رہنا چاہیے تھا۔ اس نے خاموشی اختیار کی' شاید اس لیے کہ غیر معقول جواب سے خاموشی بہتر ہوتی ہے۔
"تم اسے اتفاق بولوگے' ہیں نا؟ تم کو ایسا ہی بولنا چاہیے لیکن ایسے اتفاق بڑے کم ہوتے ہیں استاد! اڈے کے دو جوان مارے گئے۔ آج دو کم ہوئے تھے' کل چار بھی ہوسکتے تھے۔ کیا اڈے کے آدمی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں؟ اڈا ہوتا کس لیے ہے؟ اس کے آدمی اتنے سستے نہیں ہوتے' کیوں استاد!"
"اڈے کے آدمی کا کیا مول۔ وہ حرام کا' بلی کا بکرا ہوتا ہے۔" بٹھل نے بے زاری سے کہا "کوئی نئی بات کرو صاحب! آپ نے فیصلہ کردیا ہے' اب آگے حکم کرو۔"
"نہیں استاد' معلوم ہے تم کس نشے میں ایسا بول رہے ہو۔ کام پکا ہوا ہے' سولہ آنے پکا۔ ہم نے تمہارے پٹھو استاد سلامی اور اڈے کی اور آدمیوں سے پوری جان کاری لے لی ہے' پرسوں شام سے کل صبح سویرے تک تمہارے اٹھنے بیٹھنے کی۔ پرسوں شام تم سلامی کے ساتھ پولیس کی مدد مانگنے تھانے گئے تھے۔ پھر کسی ہوٹل میں چائے پی' بازار گھومے اور اسپتال جا کے لکشمی داس کی پوچھ گچھ کی۔ اڈے سے رات کو گانا سننے کوٹھے پہنچے اور دیر تک مستی کرتے رہے پھر اڈے لوٹ کے باقی رات وہیں گزار دی۔ دوسرے دن سورج نکلنے بلکہ دن چڑھنے کے بعد گھر کا رستہ لیا۔ اس میں کچھ غلط تو نہیں ہے؟" ورما نے تیدہ آواز میں پوچھا۔
"آنے پائی سے برابر!" بٹھل نے مصنوعی حیرانی سے کہا۔
"معلوم ہوا' فیض آباد آنے کے بعد استاد بابر گھر میں یا حویلی میں بند رہا۔ وہ صرف اس دن باہر نکلا تھا اور یہ دوسرا دن تھا' جب بازار میں ہریا اور استاد گورا میں چاقو چل رہے تھے اور ہریا کے پاؤں اکھڑ چکے تھے۔ پھر اتنے دن بعد پرسوں پہلی بار استاد بابر اڈے پر آیا' وہ بھی تمہارے بلانے پر' تم نے اڈے کے آدمی بھیج کے اسے بلایا تھا۔ ہریا اور لچھو کے کریا

کرم میں بھی وہ شریک نہیں ہوا تھا۔ وہ استاد بابر' جو ہریا کو نچلا پڑتے دیکھ کے تڑپ گیا تھا' ہریا کی موت پر گھر میں آرام کرتا رہا۔ لکشمی داس کی یاد بھی پرسوں تم دونوں کو بہت آئی جب کہ وہ کئی دن سے اسپتال میں مر رہا تھا۔ ہریا اور بچھو کے مرن کو ابھی سے نہیں بیتا تھا کہ گانا سننے اور ناچ دیکھنے کا تمہارا من ہوگیا۔ رات گئے تک آشا بائی کے کوٹھے پر چمکی کے گھنگرو کھنکتے رہے۔ ادھر شہر میں بیس آدمی گواہ ہیں کہ تم دونوں یہیں تھے' بیچ شہر میں۔ سب کے سامنے اور اڈے کا کوئی بھی آدمی باہر نہیں تھا۔ تھانے جاکے تم نے رات کو اڈے کے آس پاس پولیس کا پہرا بھی لگوالیا تھا۔ اتنے دن بعد تمہیں اڈے کی رکھوالی کی بھی چنتا ہوگئی۔ سارے کام اسی شام اور اسی رات۔ بڑے تجربے کے بعد ایسا تانا بانا بننا ممکن ہوتا ہے۔ تجربہ بڑی چیز ہے" ورما نے آخری لفظ انگریزی میں ادا کیے اور نتھنے پھلائے ہوئے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ بٹھل کی خاموشی پر اس نے تقریباً جھڑکتے ہوئے ٹوکا "بولو استاد! پرسوں رات اور کل صبح تک ہی اتنی چلت پھرت کیوں...؟"

"بھول ہوگئی صاحب!" بٹھل نے پشیمانی کے انداز میں کہا "پر اتنا صاف ہوگیا' ادھری ٹھاکر بستی میں جانے اور تاک دھنا دھن کرنے والے ہم نہیں تھے۔"

"لیکن اس کا یہ مطلب کہاں ہوا کہ ٹھاکر بستی میں چیر پھاڑ کرنے والے وحشی' وہ بھیڑیئے تمہارے بھیجے ہوئے نہیں تھے۔"

"آپ جو مطلب نکالو صاحب!" بٹھل نے سر جھکا کے کہا۔

"وہ لوگ کون تھے؟" ورما اکڑی ہوئی آواز میں بولا "تم کو اب یہی بتانا ہے' وہ کون تھے؟ ہمیں وہ آدمی چاہیں"

"سمجھو' ہمی تھے وہ" بٹھل نے دبے لہجے میں کہا۔

وہ پانچوں اپنی نشستوں پر زیروزبر ہوگئے۔ پولیس افسر کے جسم میں ہڑک سی اٹھی "ہاں ہاں" اس نے بے تابی سے کہا "تم یا تمہارے آدمی' سنگی ساتھی۔ بات ایک ہی ہے۔"

بٹھل نے ہاتھ جوڑ دیے "ایک بات تو دوسری کوئی نہیں رہی مہاراج!"

"اب صرف اتنا رہ جاتا ہے کہ تم جلد سے جلد ان آدمیوں کے نام بول دو۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے' ہم بولتے ہیں' وہ ہمی تھے۔ ہم یا ہمارے سنگی ساتھی اور آپ نے ابھی ڈنڈا گھمادیا ہے۔ بات ایک ہی ہے تو آپ کا کیا جاتا ہے۔ ان کے بدلے ہمیں کھینچ دو۔ پھندے کے لیے گردن چاہیے آپ کو' ہماری کر ان کی۔ اپنا کام ہلکا کرو اور گھر جاکے کمر سیدھی کرو' بل کھاگئی ہوگی۔"

"جانتے ہیں' ایسا کیوں بولتے ہو" ورما کی آواز کا زہر فزوں ہوگیا "اس پہ تم چھوٹ جاؤ گے لیکن وہ بعد کی بات ہے۔ ابھی تم یہاں ہو' کیا سمجھتے ہو' ہم تمہیں اتنی آسانی سے آگے جانے دیں گے؟ ایک دن' دو دن' ہفتے بھر' کئی ہفتے تک ہم تمہیں روک سکتے ہیں۔"

"پر ایک دن تو بدا کرو گے" بٹھل نے چڑچڑاتی آواز میں کہا۔

"وہ دن ابھی دور ہے۔"

بٹھل کسمسا کے رہ گیا۔

چند لمحے وہ تینوں سرگوشیاں کرتے رہے۔ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میز کے دونوں طرف بیٹھے ہوئے مقامی افسر بھی شامل ہونے کے لیے مضطرب تھے۔ معاً ورما کی بھڑکتی ہوئی آواز کمرے میں گونجی "کون تھے وہ؟"

"آپ سمجھتے ہو' ہم بتادیں گے؟"

"نہیں تو اپنے لیے برا کرو گے۔"

"اور بتائیں گے تو کیا ہمارا کچھ بھلا ہوگا؟"

"اس میں تمہارے لیے ضرور کوئی نرمی ہوجائے گی' بھی سفارش کریں گے۔"

"اور چپ رہنے پہ کیسا رہے گا؟"

"یہ دھیان من سے نکال دو پھر تمہارا انگ انگ بو- گا' ہم کو معلوم ہے' کیسے۔"

بٹھل نے جھجکتے ہوئے کہا "اس سے آپ کو کیا ملے؟ کچھ بھی نہیں صاحب! کچھ نہیں۔"

"دیکھیں گے' تم ہی لوگوں میں ہماری بھی گزری ہے۔"

"اپنے ساتھ نہیں گزری صاحب! وہ اور لوگ ہوا گے۔"

"تم' تم کون ہو؟" ورما کو طیش آگیا "دادا گیر؟ پھنے خاں طُرم باز؟"

"ہم کیا' کچھ بھی نہیں صاحب! دھوکا ہو رہا ہے آپ دور ہو جائے گا۔"

"ایسے' ایسے ہی دور ہو جائے گا؟" ورما چلا کے بولا۔

"بنتی ہی کرسکتے ہیں صاحب!"

"ہا' بنتی' بنتی" ورما اکھڑ گیا اور اپنے ساتھیوں مخاطب ہوکے بولا "سنتے ہیں آپ' استاد بٹھل کیا بولتے ہیں!"

کررہے ہیں۔ انہیں ٹھا کردیا جائے۔ واہ استاد!" ورما ...ساتھیوں کے چہروں پر رعونت آمیز مسکراہٹ پھیل گئی ...تم اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہو استاد!" ورما کڑکتی ...میں بولا۔

...بٹھل اپنے جتن کررہا تھا۔ اپنی اور میری برات کی ...اسے آخری لمحے تک کرنی تھی۔ میرا اتنا کچھ نہیں ...مجھے تو اپنی لاعلمی کی ایک آسودگی حاصل تھی۔ اسے ...ہی کہنا چاہیے۔ اندھے اور بہرے کو دیکھنے اور سننے ...امان حاصل رہتی ہے' گونگے کو بولنے سے۔ آدمی کو ...نہیں ہے' نہ دیکھنے پر' نہ سننے پر' نہ بولنے پر۔ مجھے کوئی ...نہیں کرنی تھی۔ وہ مجھ سے کوئی سوال کرتے تو میرا ایک ...جواب ہوتا' اپنی معذوری کا اظہار۔ غالباً میری ثانوی ...سے وہ بھی اچھی طرح آگاہ تھے۔ ان کے خیال میں مجھ ...ہم کلامی وقت کے ضیاع کے مترادف ہوگی۔ بٹھل ہی کو ...پیروی کرنی تھی مگر مآل دونوں کا مقدر تھا۔ بٹھل کی ...کشمکش کا مجھے خوب اندازہ تھا۔ اس شخص کے لیے اپنی ...کیسی اعصاب شکن اور صبر آزما ہوگی جو فی الواقعی کسی ...گرفت اقدام کا مرتکب ہوا ہو۔ صاف دامنی کی توانائی ...اور ہوتی ہے بہرحال ایسا انتہائی قدم اٹھاتے ہوئے ...کو عواقب و مضمرات کا بدرجہ تمام احساس ہوگا۔ حویلی ...پولیس کی آمد' کوتوالی میں طلبی' اس طرح کمرے میں ...ہوئے مجرموں کی طرح بازپرس اور دلیلیں' تاویلیں ...اور بعد میں پیش آنے والے ممکنہ' بہت نارَوا بڑے اذیت ...مرحلوں سے نبرد آزمائی کے خاکے بھی اس کے ذہن میں ...ہونے چاہئیں۔ ٹھاکر کوئی ایک آدمی نہیں تھا۔ کوئی بھی ...مند شخص ایک آدمی نہیں ہوتا' کبھی وہ دو کے مساوی ...ہے کبھی چار کے' کبھی سو کے اور کبھی ہزار کے۔ اپنی اپنی ...پر موقوف ہے۔ ٹھاکر کی موت کوئی معمولی واقعہ نہیں ...پولیس افسر ورما کے تجزیئے پر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ یہ ...وہی تھا جو میں نے اپنے طور پر قیاس کیا تھا۔ ورما نے ...اس کی تصدیق یا تکرار کی تھی۔ اس کی زبانی یہ ترتیب ...مسلسل سن کے مجھے ایسا لگا جیسے وہ میرا ہم زاد رہا ہو۔ ابھی ...بٹھل' ٹھاکر بستی میں جانے والے جاں بازوں سے اپنی ...لاتعلقی کی کوئی معقول' مدلل توجیہہ پیش نہیں کرسکا تھا۔ اس ...اقرار بھی مبہم تھا' انکار بھی۔ کبھی تردید' کبھی تائید' کبھی ...کبھی نرمی' مدافعانہ اور سرکشانہ۔

انہوں نے ہمیں طلب کرنے سے پہلے ہمارے بارے ...بہت سی معلومات جمع کرلی تھیں۔ اڈے کے آدمیوں نے

ازراہِ نیاز مندی ہماری ہنرکاری و مشاقی' چستی و چابک دستی کے فسانوں میں خاصی مبالغہ آرائی کی ہوگی۔ سب کچھ تازہ تازہ تھا۔ یہ نقش دھندلانے یا زائل کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ وقت تو درکار ہوتا۔ بٹھل نے ابتدا ہی میں اندازہ کرلیا ہوگا کہ ہمیں سامنے بلانے سے پہلے وہ کوئی رائے قائم کرکے بیٹھے ہیں۔ سیدھا انکار انہیں آسانی سے منظورِ خاطر نہ ہوگا۔ وہ سارے بڑے اہتمام میں نظر آتے تھے۔ کچھ دیر کے لیے سہی' انہیں ان کی جزرسی و دیدہ ریزی' خود کچھ اخذ کرنے کی سرخوشی سے محروم نہیں رکھنا چاہیے۔ بٹھل کی جانب سے صاف انکار انہیں مایوس کرسکتا تھا۔ مایوسی کبھی اشتعال کا رخ اختیار کرلیتی ہے۔ یہ میرا گمان تھا' بٹھل کی طول کلامی بھی بے سبب نہیں معلوم ہوتی تھی۔ پتنگ بازی کے دوران میں ڈھیل دینے جیسا کوئی حربہ۔ وہ انہیں متردد و متذبذب کرنے کی جستجو میں تھا لیکن ورما بھی کوئی روایتی طرز کا پولیس افسر نہیں تھا۔ اس کا طریقِ کار جداگانہ تھا۔ ہمارے لیے بہت نیا۔ امتیازی کارکردگی کی کوئی وجہ ہی ہوگی جو اس نے کم عمری کے باوجود پولیس میں یہ مرتبہ حاصل کیا تھا۔ اب خلاصہ اتنا تھا' ورما کچھ ٹھانے ہوئے تھا' ہم اس کی تحویل میں تھے اور اسے ہر لحاظ سے ہم پر فوقیت حاصل تھی۔ اپنی دھمکی کے مطابق وہ ہمیں عرصے تک حوالات میں روک سکتا تھا اور یہ عرصہ کسی طور ہمارے لیے سودمند نہیں تھا۔ اگر واقعی ٹھاکر بستی میں ٹھاکر بل دیو' اس کے خاندان اور کھیت کھلیان نیست و نابود کرنے والے بٹھل ہی کے بھیجے ہوئے آدمی تھے تو اپنا کام پورا کرکے راتوں رات وہ بہت دور جاچکے ہوں گے۔ ہوسکتا ہے' گروہ کے بجائے وہ الگ الگ سمتوں میں بکھر گئے ہوں۔ انہوں نے ہر ممکن احتیاط کی ہوگی مگر کہتے ہیں' جرم اپنے سائے چھوڑ جاتا ہے۔ ان کی ذرا سی لغزش بھی ہمیں بڑے عذاب سے دوچار کرسکتی تھی۔ وہ کلکتے اور بمبئی کے آدمی ہوں گے۔ ان شہروں کے سوا کہاں کے ہوسکتے ہیں اور ضرور انہیں جامو اور جمرو نے اکٹھا کیا ہوگا' بٹھل تو مستقل فیض آباد میں تھا۔

دیر تک ایک جگہ خود کو باندھے ہوئے کھڑے کھڑے ٹانگیں اکڑنے لگی تھیں۔ "دیکھو صاحب!" بٹھل نے نیم التجائی' نیم شکایتی لہجے میں کہا "اپنی مانو تو کچھ بولیں؟"

"اب کیا رہ گیا ہے۔ اب تک تمہاری ہی سنی ہے" ورما آتش بار آواز میں بولا۔

"اچھا ہوگا کسی اور طرف بھی دھیان دو۔"

"کسی اور طرف؟ کس طرف؟" ورما کے تیوروں میں

ذرا بھی مناہمت نہیں تھی' بگڑ کے بولا "بس استاد! تم کو اب صرف یہ بتانا ہے' وہ کون لوگ تھے؟"

بٹھل نے ایک بار پھر صراحت سے مدعا بیان کرنے کی کوشش کی۔ اس نے بندھی ہوئی آواز میں کہا کہ بہتر ہوگا' وہ ہم وردانہ انداز میں ہمارے معاملے پر نظر ثانی کریں۔ کیا یہ معلوم کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی کہ کس بنیاد پر اتنے بڑے واقعے میں ہمیں ملوث کیا جارہا ہے۔ لکشمی داس کی نوجوان اور معصوم بیٹی برکھا کے اغوا' خون اور ساتھ میں دو ملازموں کی ہلاکت اور لکشمی داس کی بے چارگی' اس کی شکستہ حالت پر اڈے کے آدمی دل گرفتہ تھے۔ شہر میں ان کے ہوتے ہوئے یہ سانحہ کیسے ممکن ہوگیا۔ یہ ان کے لیے بڑی سبکی اور شرم کی بات تھی۔ لیکن ظاہر ہے' اس سے بڑا صدمہ انہیں اپنے دو بے گناہ ساتھیوں کی موت کا ہونا چاہیے۔ وہ تو بے حال تھے اور ان کی کیفیت جنونیوں کی سی تھی۔ ہریا اور لچھو کے کریا کرم سے پہلے وہ بارہ بنکی جا کے استاد گورا کے سر پر پہنچنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ ان سے معلوم کیا جائے یا شاید خود انہوں نے پولیس کو بتایا ہو کہ ان کی لگامیں کس نے کھینچے رکھیں' کس نے انہیں صبر و ضبط کی تلقین کی' کون راہ کی دیوار بن گیا' کس نے انہیں تسلی دی کہ وہ خاطر جمع رکھیں' گورا کو معاف نہیں کیا جائے گا۔ اسے یہ سودا لازماً بہت مہنگا پڑے گا۔ عجلت مناسب نہیں' کوئی بھی الٹا سیدھا قدم پڑ سکتا ہے۔ ٹھاکر بل دیو اور ٹھاکر ہردیو سے اڈے کے آدمیوں کا براہِ راست کوئی معاملہ نہیں تھا۔ انہیں تو گورا مطلوب تھا' وہ اور اس کے ساتھی۔ گورا ہزار ٹھاکروں کا پروردہ ہو لیکن انہیں گورا سے سروکار تھا۔ اصولاً گورا ہی ان کا ہدف ہونا چاہیے۔ ٹھاکر تو دور کی بات تھے۔ گورا کی ہزیمت ٹھاکروں کے لیے درسِ عبرت ہوتی۔ اڈے کے آدمی بس اشارے کے منتظر تھے۔ وہ انگاروں پر وقت گزار رہے تھے لیکن ہوش و حواس سے عاری نہیں ہوئے تھے۔ ٹھاکروں پر ہاتھ ڈالتے ہوئے انہیں بدترین نتائج کا احساس ہونا چاہیے تھا۔ ٹھاکروں کے جاہ و جلال اور اثر و رسوخ سے وہ خوب واقف تھے۔ وہ اتنی ہی دور تک جاسکتے تھے جتنی ان کی استطاعت ہے۔ اڈے کے آدمیوں کو چاقو اور زور کے علاوہ پولیس اور قانون کی بھی شدبد ہوتی ہے۔ کسی کو بھی زنداں پسند نہیں۔ کوئی بھی سولی پر چڑھنا نہیں چاہتا۔ یہاں سب ایک دوسرے کے گواہ ہیں اور شہر کے لوگ بھی۔ اڈے کے آدمیوں میں کوئی بھی اس عرصے میں شہر سے باہر نہیں گیا۔ نہ یہاں باہر سے کوئی آیا۔ شاید پولیس نے بھی تسلیم کرلیا ہے کہ

فیض آباد کے اڈے کا کوئی آدمی ٹھاکر بستی کی غارت گری میں شامل نہیں تھا۔ پھر وہ کون تھے؟ وہ کون ہوسکتے ہیں؟ وہ اڈے کے آدمی نہیں تھے تو ان کے فرستادہ ہوسکتے ہیں یعنی اڈے کے آدمیوں نے ادھر ادھر اپنے دوستوں سے فریاد کی ہو یا مال و زر صرف کرکے کرائے کے آدمی جمع کیے ہوں اور انہیں ٹھاکر بستی جانے والے راستے کی طرف ہنکا دیا ہو۔ وہاں تباہی مچانے والوں کی نفری بھی زیادہ ہونی چاہیے۔ ٹھاکروں کی حویلی کی دیواریں اونچی ہوں گی' پہرے دار بھی کم نہیں ہوں گے۔ ٹھاکروں کے اتنے بڑے گھر اور لاؤ لشکر پر چند آدمیوں سے غلبہ نہیں پایا جاسکتا۔ وہ لوگ بہت منظم ہوں گے اور مسلح بھی خوب' پیشہ ور بھی۔ اس منصوبے پر انہوں نے پوری طرح غور و فکر کیا ہوگا۔ غور و فکر کے لیے وقت کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ آندھی کی طرح ٹھاکر بستی میں وارد ہوئے تھے اور چھلاوے کے مانند غائب ہوگئے۔ اس مفروضے کی کوئی معقول وجہ ہونی چاہیے کہ یہ سرفروش مہم جو فیض آباد کے اڈے کے آدمیوں کی تحریک پر ٹھاکر بستی میں آئے تھے اور اس طرح فیض آباد کے اڈے کے آدمیوں نے مرنے والے اپنے عزیز ساتھیوں سے رفاقت کا حق ادا کردیا۔ ان کی روحوں کو سکون پہنچانے کے اسباب پیدا کیے اور اپنے سینوں کا بوجھ ہلکا کیا۔ کسی مضبوط جواز' معتبر شہادت اور بین ثبوت کے بغیر ان پر ایسا کاری الزام عائد کرنا ستم ہے' ناانصافی اور ہٹ دھرمی ہے۔ "ایسا کیسے صاحب!" بٹھل نے گمبھیر لہجے میں کہا "یہ اتنا بڑا کارن نہیں ہے کہ اڈے کے دو آدمی مارے گئے تھے۔ چاقو رکھنے اور زور کرنے والوں کے بیچ ایسا اوپر نیچے روز ہوتا ہے۔ ہم پاگل نہیں ہیں صاحب!"

پہلی بار مجھے اپنے آپ پر شبہ ہوا۔ میں یقیناً کسی بدگمانی کا مرتکب ہورہا ہوں۔ بٹھل کے بیان میں بڑا اثر تھا۔ پانچوں افسر انہماک سے سنتے رہے۔ ورما کے دائیں جانب بیٹھے ہوئے معمر افسر نے دخل اندازی کرنی چاہی تو ورما نے اسے روک دیا۔ بٹھل کے چپ ہوجانے پر چند لمحے سناٹا چھایا رہا' پھر ورما کی بھری ہوئی آواز گونجی "کارن پوچھتے ہو گرودیو! کارن ہے۔ سب سے بڑا کارن تم خود ہو۔ شہر میں تم ہو' یہاں تمہارا اور تمہارے سیدھے بازو والے استاد بابر کا ہونا سب سے بڑا کارن ہے۔ تم اڈے کے آدمیوں میں خود کو کیوں شامل کررہے ہو۔ ان سے خود کو الگ کرکے بات کرو۔ تم ٹھیک بولتے ہو۔ ان لوگ نے بھی یہی بولا ہے۔ تم ہی نے انہیں روکا تھا پر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم نے خود کو بھی روکے رکھا ہو۔ تم نے انہیں ہوا ہی نہیں لگنے دی۔ تمہیں

معلوم تھا کہ ٹھاکر بستی سے کچھ دنوں بعد ایسی سوچنا آنے پہ وہ بھی آپ ٹھنڈے ہوجائیں گے۔ ہم نے چاروں طرف پھیلا دیا' پوری چھان بین کی ہے۔ پرکھوں سے آس پاس میں ٹھاکروں کا سکہ چل رہا ہے۔ کوئی بڑی دشمنی نہیں تھی ان سے کسی کی۔ دشمنی کے لیے برابر کا ہونا چاہیے۔ ہم نے ادھر کلکتہ پولیس کو بھی ارجنٹ تار دیے۔ کلکتے کی ساری پولیس استاد بٹھل کو جانتی اور مانتی ہے۔ بولتے ہیں' استاد بٹھل کے کاٹے کا کوئی منتر نہیں۔ ایک وقت سارے کلکتہ شہر میں اسی کا راج تھا۔ اب بہت دنوں سے استاد کلکتے میں نہیں ہے اور جامو استاد اس کی گدی پر بیٹھا ہوا ہے' ویسے اڈا استاد بٹھل کے نام ہی پہ چلتا ہے۔ جامو بھی بڑا تگڑا استاد ہے۔ استاد بٹھل نے کوئی ایسا ویسا تو اپنی جگہ نہیں بٹھایا ہوگا۔ کلکتے سے آنے والی رپورٹ میں بڑی بڑی باتیں' بڑی بڑی کہانیاں لکھی ہیں تمہارے لیے۔"

"وہ تو سارا ٹھیک ہے" بٹھل نے ناراضگی سے کہا "پر یہ کدھری نہیں کہ ٹھاکر بستی پہ ہمارے آدمی چڑھ دوڑے تھے۔"

"وہی تم کو بتانا ہے" ورما نے جلی کٹی آواز میں کہا۔ "پولیس ایسے کسی پر الزام نہیں دھرتی۔ ہمارے پاس کارن ہیں۔ یہ بھی تم ٹھیک بولتے ہو' دو ساتھیوں کو کھودینا اڈے کے آدمیوں کے لیے اتنی بڑی بات نہیں تھی۔ دیر سویرے سہی' وہ گورا ہی سے نمٹتے۔ ٹھاکروں تک وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ٹھاکروں تک وہی سوچ سکتا ہے جس کی آنکھ دور تک دیکھتی ہے۔ یعنی وہ آدمی تم جیسا ہو یا تم۔ اڈے کے آدمیوں کو ہم نے دیکھ لیا ہے۔ ان میں زیادہ تر گدھے ہیں۔ بس ان کو سامنے کا دکھائی دیتا ہے۔ جامو اور جمرو کو تم نے بلالیا۔ اب یہاں ان دونوں جیسا کوئی استاد نہیں رہا۔ پھر بھی اڈا چل رہا ہے اور یوں چل رہا ہے کہ اڈا جمرو اور جامو کا ہے اور ان کے اوپر استاد بٹھل بیٹھا ہے' کوئی سینہ پھلا کے دندناتا ہوا آئے کیسے آئے؟"

ورما کو معاً کچھ خیال آیا۔ اس نے رک رک کے ایک نگاہ سامنے رکھے ہوئے کاغذات پر ڈالی۔ دو ایک ورق الٹنے کے بعد وہ اسی کرخت لہجے میں بولا "اب کے یہاں تم بہت دنوں بعد آئے۔ تم کہیں بھی رہو' کہیں بھی جاؤ' کتنی ہی دور رہو' لیکن تو تمہارا یہاں اٹکا رہتا ہے۔ تم کو بار بار یہاں آنا ہے' جب تک تمہارا راج محل کھڑا ہے اور محل میں بٹی رہتی ہے' بٹیا یا جو کوئی بھی ہے۔ محل کی چوکیداری اڈے کے آدمی کرتے ہیں۔ جامو اور جمرو کے ناتے شہر کا اڈا تمہارا اڈا اور

مونچھ کی کمان کھنچی ہو۔ سینہ پھلائے' ہنٹر لہراتا وہ بٹھل کے عین مقابل آ کے ٹھہر گیا۔ ورما کے اشارے پر دو سپاہی مجھے بٹھل سے کچھ دور لے گئے۔ گویا وہ ابھی صرف بٹھل کو تختہ مشق بنانا چاہتے تھے۔ بڑی مونچھ والا سپاہی' بٹھل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھورتا رہا "تو ہی رستم ہے؟" بٹھل نے کاٹ دار آواز میں پوچھا۔

سپاہی کا جسم بل کھا گیا' آنکھیں کچھ اور چوڑی ہوگئیں۔ اس کے بجائے معمر افسر نے اشتعال کی حالت میں کہا "ہاں' یہی رستم ہے' یہ سپاہی کم' جلاد زیادہ ہے۔ اس کو تمہارے جیسے موٹی کھال کے سوروں کے لیے یہاں رکھا ہے۔"

"اپنے کو نقلی لگتا ہے۔" بٹھل نے جھٹ ہاتھ بڑھا کے سپاہی کے بائیں گال پر پھیلی ہوئی مونچھ کی نوک مروڑ ڈالی "مونچھ تو اس کی کراری ہے۔ تیل پلاتا ہے رے اس کو؟"

سارے افسر بھڑک اٹھے۔ سپاہی رستم بری طرح سٹپٹا گیا۔ ایک قدم پیچھے ہٹ کے اس نے ہنٹر گھمایا پھر کچھ خیال آنے پر اپنے ساتھی سپاہی کو بٹھل کے ہاتھ باندھنے کی ہدایت کی۔

"آدمی بھی کرارا ہے۔" ایک مقامی افسر نے زبان کھولی "مونچھ ہی کو نہیں' سارے بدن کو تیل پلاتا ہے۔"

"اپنے کو تو بہروپیا دکھتا ہے۔ کسی اور کو بلاؤ صاحب! اس نے بس چربی چڑھا لی ہے۔" بٹھل نے یقیناً کوئی فیصلہ کرلیا تھا۔

رسی باندھنے کے لیے دو سپاہی بٹھل کا ہاتھ پکڑ کے پشت کی طرف کرنے کو آگے بڑھے ہی تھے کہ بٹھل نے اچانک دونوں ہاتھ پھیلا کے ان کی گردن پر ترچھی ضرب لگائی۔ یہ افتاد دونوں کے سان و گمان میں نہ ہوگی۔ دونوں بے توازن ہوئے اور پاگلوں کے مانند چیختے ہوئے بٹھل کی طرف جھپٹے۔

لمحے بھر میں کمرا منتشر ہوگیا' پانچوں افسروں نے کرسیاں چھوڑ دیں۔ معمر افسر نے تمنچا نکال کے تان لیا۔ دو سپاہی میرے لیے جست لگانے کا تاثر دیا تو انہوں نے اپنی گرفت سخت کردی۔ میرا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ مجھ سے الجھے رہیں اور انہیں بٹھل کے پاس جانے کا موقع نہ ملے۔ نوجوان افسر کھنا بھی بٹھل کی طرف دوڑ پڑا تھا۔ رستم ہوش و حواس سے بیگانہ سا ہوگیا تھا۔ اس نے بٹھل کے ہاتھ بندھ جانے کا انتظار کرنے کے بجائے ہنٹر بلند کیا اور گھما کے بٹھل کو مارنا چاہا مگر بٹھل نے ہنٹر کا چمڑا چابک دستی سے اچک لیا اور اپنے

ہاتھ میں تیزی سے لپیٹ لیا۔ رستم کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں، سارا جسم پھڑک رہا تھا۔ ادھر سے نوجوان افسر اور دو سپاہیوں نے بھل کو دبوچ لیا لیکن بھل نے پھر کوئی مزاحمت نہیں کی "ان بھانڈوں کو دور کرو صاحب!" اس نے گونجتی آواز میں کہا۔

"تم ایک اور جرم کر رہے ہو۔" ورما دہاڑنے لگا "قابل دست اندازی پولیس۔"

"خون سے بڑا نہیں ہے، ان کو روکو صاحب! ہم مانتے ہیں، ہمی ٹھاکر بستی میں گئے تھے۔"

"ہونہہ۔" ورما کے چہرے پر سکون کے آثار ہویدا ہوئے۔ اپنے آپ کو قابو میں رکھنے کے لیے اس نے کچھ وقت لیا "مگر تم نہیں، تمہارے ساتھی۔" اس کی آواز کی جھلاہٹ ابھی دور نہیں ہوئی تھی۔

"جامو اور جمرو استاد۔" بھل نے سر جھکا کے کہا۔ مجھے جھٹکا سا لگا، یہ جواب میں نے اپنی سماعت کا فتور جانا مگر بھل نے جامو اور جمرو ہی کے نام لیے تھے۔

"جامو اور جمرو استاد، ہا!" ورما بپھر گیا "پھر تم... تم پھر چکر چلا رہے ہو۔ یہ، یہ تار دیکھتے ہو، یہ، یہ۔" ورما نے بے قراری سے میز پر بکھرے ہوئے کاغذات ٹٹول کے ایک کاغذ اٹھایا اور بھل کو دکھانے لگا۔ لال رنگ کا یہی کاغذ تھوڑی دیر پہلے نوجوان افسر کھنا نے ورما کے حوالے کیا تھا "تار میں لکھا ہے، جامو اور جمرو دونوں کلکتے میں موجود ہیں، موجود رہے ہیں اور اڈے کے دوسرے آدمی بھی۔ کلکتہ پولیس کی طرف سے ہماری پوچھ گچھ کے جواب میں یہ تار آیا ہے۔" ورما کی زبان فرط غضب سے بہکنے لگی۔

"پھر کس کا بولیں صاحب! آپ تو ادھار کھائے بیٹھے ہو۔" بھل کا لہجہ ورما کی ضد تھا، بڑی حد تک معتدل "آپ کو بولا ہے، ہم اڈے کے لوگ ہیں، اپنا کام دوسرا ہے۔ آپ کو تھوڑا ٹھنڈا ہونے کا ٹائم ملے، اس واسطے ہم نے جامو اور جمرو استاد کا نام لیا ہے۔"

میرے سینے سے کوئی بوجھ ہٹ گیا۔ بھل نے ورما سے پوچھا کہ اس نے جواب نہیں دیا؟ جب کہ ورما نے ابھی تسلیم کیا ہے کہ ہریا اور لچھو، لکشمی داس کے دو ملازم، برکھا کے اغوا اور اس کے ساتھ درندگی کے واقعات میں ٹھاکر ہردیو اور استاد گورا ہی ملوث تھے۔ بھل نے ایک بار پھر اپنا مدعا دہرایا "ہم کو بولو صاحب! شہر کی پولیس پھر اس طرف کیوں نہیں گئی؟"

"ان کی طرف جانے کے لیے پولیس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔" ورما نے اکڑی ہوئی آواز میں کہا "ہم سمجھتے ہیں، وہ ٹھاکر ہی ہو سکتا ہے، ٹھاکر اور اس کے کارندے لیکن کسی نے انہیں دیکھا نہیں، کسی نے تھانے میں آکے کوئی شکایت نہیں کی، کسی نے رپٹ درج نہیں کرائی۔"

"پر آپ جانتے ہو، سارے جانتے ہیں، ادھری سارا شہر بولتا ہے، وہ کوئی اور نہیں تھے۔ اپنی بھی کسی تھانے میں آکے پرچی نہیں کٹائی، اپنے کو بھی کسی نے نہیں دیکھا اور پولیس کو معلوم ہے، اس رات ہم ادھری شہر میں تھے۔ اپنا کیا ثبوت ہے صاحب؟"

بھل نے ورما کو جواب دہی کی زحمت نہیں دی۔ شاید اسے یقین تھا کہ ورما کے پاس کوئی معقول جواب نہیں ہے۔ کبھی ایسے جواب طلب نہیں کرنے چاہئیں کہ مسئول زچ ہو کے اپنے کسی نادر، غیر مدلل جواب ہی پر اڑ جائے۔ بھل کے رنگ بدلتے لہجے میں اب حیرت انگیز مدافعت اور مفاہمت نظر آتی تھی۔ دو سپاہی اور نوجوان افسر اسے جکڑے ہوئے تھے۔ رستم کچھ فاصلے پر ہنٹر لیے اپنی سبکی کی تلافی کے لیے بے تاب تھا۔ بھل کی عدم مزاحمت اور افسران کی جانب سے کوئی ترغیب نہ ملنے پر سپاہیوں کا جوش اور جذبہ کسی قدر ماند پڑ چکا تھا لیکن بس وہ کسی ہدایت کے منتظر تھے۔

بھل نے ورما سے کہا کہ اس نے طرح طرح اپنی بے گناہی باور کرانے کی کوشش کی ہے۔ وہ یہی کر سکتا ہے۔ اس اعادہ و تکرار کے سوا اس کے پاس چارہ بھی کیا ہے۔ اسے مجرم قرار دینے کی بنا پولیس کے اعلا افسر نے اپنے طور پر اخذ کیے ہوئے چند حقائق پر رکھی ہے، ان کا خلاصہ یہ ہے۔ اڈے سے بھل کی پرانی وابستگی، اڈے کے نامی گرامی استاد کی حیثیت سے شہرت، اڈے کے دو نوجوان ساتھیوں کے خون پر غم و غصہ، اڈے کے زیر نگرانی شہر کے ایک محلے کے مکین لکشمی داس کے گھر کی تباہی پر ندامت اور ذلت کا احساس، شہر میں بھل کے شیش محل اور اس کے شیشہ نفس مکینوں کی عزت و حرمت پر آنچ آنے کے اندیشوں کا غلبہ، استاد جامو کی کلکتے سے ہنگامی انداز میں آمد اور روانگی۔ پولیس کی دانست میں ٹھاکر بستی پر یلغار کے ناقابل یقین جرم کے لیے یہ حقیقت آمیز نشانیاں کافی ہیں مگر یہ ثبوت اور شہادتوں سے عاری ہیں۔ بین ثبوت کے بغیر، جیسا کہ اس نے پہلے بھی کہا ہے، یہ محض ایک مفروضہ ہے۔ اس کی کوئی عقلی حیثیت ہے نہ قانونی۔ پولیس کی یہ امید کہ اپنی عام روش، آخری درجے کی ایذاؤں سے وہ بھل اور بابر کو اعتراف پر مجبور کر دیں گی ایک خام خیالی، خوش خیالی ہے، جرم کے مرتکب نہ ہونے کی

...رت میں وہ کس طرح اپنی گردنوں کی نذر پر آمادہ ہو جائیں ... آخر پولیس کو بھی انہیں عدالت میں پیش کرنا ہے۔ اگر ...بیان پولیس کے جبر و ستم سے سرنگوں بھی ہو جائی عدالت ...منحرف ہو سکتے ہیں۔

ورما توجہ سے سنتا رہا، بھل نے اسے دخل اندازی کا ...ع بھی نہیں دیا۔ بھل نے کہا کہ کچھ دیر جاتی ہے، زیادہ ...س کا وکیل عدالت کی ابتدائی کارروائی مکمل کر کے ...الی میں پولیس کی زبردستی اور زیادتی پر باز پرس کے لیے ...ہی چاہتا ہوگا۔ وہ ایک مستند وکیل ہے اور ایسے پیچیدہ ...نہ معاملات کا ماہر۔ اپنے موکلین کی برات کے لیے وہ ...ں تک، جس حد تک ممکن ہوا، حکام بالا کی، یہاں تک کہ ...ے حاکموں کی خدمت میں حاضر ہو کے داد و فریاد سے نہیں چوکے گا اور حویلی کے مکین بھی اپنے دریچے، ...زے مقفل کر کے نہیں بیٹھ جائیں گے۔ وہ اعلا تعلیم سے ...ستہ ہیں اور اپنے اور دوسروں کے حقوق کا پورا شعور ...ے ہیں، وہ جس حد تک بھی آسودہ ہیں۔ اس سے کہیں ...ہ اپنے مربی و محسن بھل اور بابر کی عافیت کے لیے داؤ پر ...نے سے دریغ نہیں کریں گے۔ ورما نے انہیں یہاں طلب ...نے کی دھمکی دی ہے حالانکہ پولیس اچھی طرح اس ...ت سے واقف ہے کہ اڈے کے لوگ ٹھاکر بستی کی خوں ...ں میں بھل اور بابر، جامو اور جمرو کے کسی بھی تعلق سے ...بے خبر ہیں۔ پولیس نے گزشتہ رات انہیں کن کن ...ئشوں سے دوچار نہ کیا ہوگا، پولیس بہتر جانتی ہے، اسے ...قدر مایوسی ہوئی ہے۔ حویلی کے مکین تو بہت دور کے ...ہیں۔ انہیں تو اور رکھا گیا ہوگا۔ ورما نے حویلی کی خانہ ...خواتین کو کوتوالی بلا کے رسوا کرنے کی شوشہ طرازی بھی ...ہے۔ بے شک اس جگہ قدم رکھنے کا حادثہ ان کے لیے ...ناروح ہوگا لیکن ظاہر ہے بھل اور بابر کی سلامتی ان ...لیے بہر طور مقدم ہونی چاہیے اور رسوائی کی ابتدا تو گھر اس چار دیواری کا رخ کرنے ہی پر ہو جاتی ہے پھر کیا رہ ...ہے پھر ان کے لیے کیا رکاوٹ رہ جائے گی۔ یہ نقش کی ...ہے۔ پولیس کی سمجھ میں نہیں آئے گی جتنے گہرے نقش، ...ی وابستگی، وارفتگی اور اتنا ہی ایثار۔ بھل نے پیشکش کی ورما کو یقین نہ آئے تو انہیں طلب کر کے دیکھ لے۔ ...ل نے کہا کہ اسے اور بابر کو اڈوں ہی سے متعلق نہ سمجھا ...گے۔ اڈوں کے سوا بھی ان کے بہت سے پرسان حال ہیں ...تماشا نہیں دیکھتے رہیں گے، وہ ہر سطح پر، ہر جگہ یہ سوال ...یں گے کہ کن شہادتوں کے جواز پر ان کے رفیقوں، عزیزوں کو مورد عتاب ٹھہرایا گیا ہے۔

ورما کی نگاہیں بھل پر مرکوز تھیں۔ دوسرے افسروں کے چہروں پر خون جل رہا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو کن انکھیوں سے دیکھتے اور ان کی آنکھیں چڑھ جاتیں۔ ورما کا یہ شوق سماعت انہیں گراں گزر رہا ہوگا مگر ورما تو جیسے ان کی موجودگی بھول چکا تھا۔

بھل نے اپنا بیان جاری رکھا، کہنے لگا کہ ٹھاکر بستی میں دو آدمیوں کے خون کی واردات کتنی ہی ہولناک اور سنگین ہو لیکن ایک دوسرا پہلو بھی توجہ طلب ہے۔ ایک بار یوں ہی، از راہ آگہی ارد گرد کے دیہات، قصبوں اور شہر کے لوگوں کے پاس جا کے پوچھا جائے کہ وہ اب کیسا محسوس کرتے ہیں؟ اب کچھ موسم بدلا ہوا لگتا ہے کہ نہیں؟ بعض خرابیاں اور تباہیاں باعث مسرت بھی ہوتی ہیں۔ کون جانے، کتنے ہریا اور لچھو جیسے جوان، ٹھاکروں نے اپنے اقبال کی بھینٹ چڑھائے ہوں۔ جانے کتنی برکھائیں ان کی ہوس کا شکار ہوئی ہوں، پولیس کو خوب احساس ہوگا کہ ٹھاکروں کی زندگی میں کتنے موقعوں پر وہ خود بے بسی و بے چارگی سے دوچار ہوئی ہے۔ یہاں کون ہے، شاید کوئی بھی نہیں جس کے دل میں ٹھاکروں کے اس انجام پر ہوک اٹھی ہو، ان کے ختم ہو جانے پر کسی نے دہائی نہیں دی، کہیں ماتم برپا نہیں ہوا، پولیس کچھ دیر کے لیے زمین پر آکے دیکھے تو اسے اپنے مطلوب مجرم ایسے شقی القلب معلوم نہیں ہوں گے۔ انہوں نے ٹھاکروں کے مانند ناداروں کے خون سے ہاتھ نہیں رنگے۔ انہوں نے ٹھاکروں کو نشانہ بنایا ہے، کسی اور کو نہیں، لکشمی داس، برکھا اور ان کے بے زبان ملازموں کو نہیں۔ جانے کتنے لوگ ٹھاکروں کے لیے سینوں میں آگ جلائے، زہر چھپائے ہوئے تھے۔ ان گنت ماہ و سال، روز و شب کے دکھوں کے بعد کم سے کم ایک پہر تو ان کا بھی ہونا چاہیے تھا۔ بھل نے کہا، اس کا بس چلتا تو وہ بھی ٹھاکروں کے لیے کچھ ایسی ہی سزائیں تجویز کرتا لیکن، لیکن بھل نے خود کو روکا اور ڈھلکی ہوئی آواز میں بولا کہ اس تلخ نوائی اور حقیقت بیانی کے اظہار سے مجرموں کی وکالت اس کا مقصود نہیں ہے۔ پولیس اپنا کام جاری رکھے۔ ایسے واقعات کے اعادے کی پیش بندی کے لیے اسے حرکت میں رہنا چاہیے۔ یہ توحش و تجسس، تردد و تشویش اس کے منصب کا لازمہ ہے کہ آخر وہ کون تھے۔ وہ کون تھے، کینہ پرور، شوریدہ پشت یا زخم خوردگاں، ستم زدگاں، آمنے سامنے کچھ دکھائی سجھائی نہ دینے پر پولیس کی بھٹکتی نظریں اڈے پر منڈلانے لگیں۔ وہ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ وہ بھل اور بابر بھی

ہوسکتے ہیں' وہ یا ان کے ساتھی' اندھیرے میں شک کی نمو زیادہ ہوتی ہے۔ شک ہی سے راہیں نکلتی ہیں۔ ایک شک بٹھل اور بابر پر بھی کیا جاسکتا ہے لیکن شک اور یقین میں بہت دوری ہے۔ شک محض شک ہے۔ شہادتوں کے اعتبار کے بغیر محض شک ہے اور کوئی شہادت یوں نہیں اور نہ آئندہ اس کا امکان ہے کہ وہ بٹھل اور بابر نہیں ہیں۔ پر مجرم کتنا ہی پختہ کار اور دیدہ دلیر ہو' ارتکاب جرم کی ایک پشیمانی' ناتوانی اس کے ہاں ضرور ہوتی ہے۔ اسے پرکھنے کے لیے چشم بینا اور گوش نیوش چاہیے۔ پولیس کے خیال میں بٹھل اور بابر کے ساتھیوں نے بٹھل اور بابر کے ایما پر یہ سرفروشانہ یا وحشیانہ کام کیا ہے۔ کسی کامل اعتماد اور غیر معمولی تعلق کی خاطر ہی میں انہوں نے یہ جرات کی ہے اور اگر واقعتاً ایسا ہی ہے تو بابر اور بٹھل پر اپنے جاں نثاروں کی تعظیم بہرحال واجب ہے۔ پولیس نے یہ کیسے قیاس کرلیا کہ بٹھل اور بابر اتنے حقیر ثابت ہوں گے کہ اپنے مبینہ محسنوں کی نشان دہی کردیں گے۔ انہیں آشکارا کرنے سے مراد ہے جیسے پولیس کی خدمت میں ان کے سر طشت میں رکھ کے نذر کرنا۔ بٹھل اور بابر کی کھال تن سے جدا کردی جائے' انہیں شکنجے میں کس دیا جائے' انہیں انکار ہی کرنا چاہیے۔ وہ تو انکار ہی کرتے رہیں گے' آخری دم تک۔ وہ اس احسان کشی' اعتماد شکنی' اس کمینگی و ذلالت پر موت کو ترجیح دیں گے۔ انہیں تو پھر مر ہی جانا چاہیے۔ وہ تو مرجائیں گے پھر پولیس کو کیا حاصل ہوگا؟

بٹھل نے کہا کہ وقت گزاری کے لیے طرح طرح کے نام لے کے پولیس کو جگہ جگہ بھٹکایا دوڑایا جاسکتا ہے۔ ہمیں وقت کی ضرورت ہے۔ آخر پولیس کو ایک دن ہمیں عدالت کے حوالے کردینا ہے جہاں ترازو سے فیصلہ ہوتا ہے۔ سو ہمارے لیے یہی ایک تدبیر قرین عافیت ہے کہ پولیس اپنی تحویل میں رکھنے کا ایک محدود وقت گزارنے کے بعد ہمیں عدالت میں پیش کردے۔ ادھر ہمارے وکیل' غرض مند اور دعوے دار بھی اپنی کوششیں کرتے رہیں گے اور وہ لوگ بھی۔۔۔ بٹھل کی زبان یکایک چرمرا سی گئی' وہ سمٹی ہوئی آواز میں بولا کہ اگر پولیس کا اندازہ درست ہے تو وہ لوگ جو اپنے رفیقوں کے لیے اتنی دور جاسکتے ہیں' ایسا ایثار کرسکتے ہیں' ان سے کیا بعید ہے کہ ہم پر پولیس کے بے جا تصرف سے ان سرکشوں کے دماغ میں کس وقت کیا سما جائے۔ ان کی دحشت کا کیا عالم ہو' آگے وہ کیسی دیوانگی پر تل جائیں۔

ورما کے ساتھ بیٹھے ہوئے معمر افسر کو سب سے پہلے بچھو نے ڈنک مارا' اس کا رنگ متغیر ہوگیا' آنکھیں ابل آئیں "یہ' یہ دھمکی ہے سر! سنا آپ نے' یہ کیا بکتا ہے؟" وہ بلبلاتے ہوئے بولا "اس کا اشارہ کس طرف ہے؟"

"اور اس دھمکی میں اقرار بھی چھپا' بلکہ کھلا ہے۔" دوسرے افسر نے شدومد سے اس کی تائید کی۔

ورما اپنے ساتھیوں کی برانگیختگی سے دگرگوں ہوگیا تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کے انہیں تحمل کا مشورہ دیا اور گمبیھر آواز میں بٹھل سے مخاطب ہوا "کیا' کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"صاف ہے صاحب! پولیس نہیں مانتی اور اپنے کو ایسے کھنچے ہوئے ہے تو۔۔۔" بٹھل نے تنک کے کہا "ادھر ہی آپ بولتے ہو' وہ ہمارے سنگی ساتھی تھے۔ وہ ہمارے ساتھی ہیں تو وہ تو اب بھی کھلے ہوئے ہیں۔ ان کا کیا ٹھیک ہے۔"

"دیکھا سر آپ نے!" ورما کے بائیں جانب بیٹھا ہوا افسر چمک کے بولا "یہ کہنا چاہتا ہے' اگر ہم نے اسے آزاد نہ کیا تو۔۔۔"

ورما نے اس کی بات پوری نہیں سنی اور بٹھل کی طرف انگلی اٹھا کے درشتی سے پوچھا "یہی مطلب ہے تمہارا۔۔۔؟"

"کیا بولیں صاحب! جو آپ کی مرضی ہو' نکال لو' نہیں تو صاحب لوگوں سے پوچھو' ان کا زیادہ چلتا ہے۔ اپنے کو جو بولنا تھا بول دیا ہے۔"

سبھی بگڑ گئے تھے۔ بٹھل کو ایسا کچھ کہنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ اچھے خاصے موثر انداز میں عرض گزاری کرتے کرتے اسے یہ کیا ہوگیا۔ پولیس افسروں کی خاموشی سے ظاہر تھا کہ بٹھل کا کہا ہوا ان تک منتقل ہو رہا ہے۔ اس موقع پر بے ربطی بلاغت کے منافی تھی۔ زبان پر اختیار سب سے بڑا اختیار ہے۔ لوگ صحیح کہتے ہیں' زبان آگ' زبان شبنم ہے۔ آدمی کو آدمی سے قریب کردے اور دور کردے۔ اپنے افسروں کی برہمی دیکھ کے مجھے اور بٹھل کو حصار میں لیے ہوئے سپاہیوں میں کچھ اور پھرتی آگئی لیکن ہم دونوں نے کوئی مدافعت نہیں کی۔

اس سے پہلے کہ ورما یا کوئی دوسرا افسر ہم پر یورش کرتا' بٹھل نے ورما سے کہا "دیکھو صاحب! اپنی آپ کی کوئی پرانی اٹکی ہوئی نہیں ہے۔ رشتہ ناتا بھی نہیں ہے پہلے کوئی اپنے سے۔ کوئی عورت بھی اپنے بیچ میں نہیں آئی' زمین مال کا پھیر بھی نہیں۔" بٹھل کا لہجہ کئی قسم کے تاثرات کا آمیزہ تھا' تلخی' تاسف' یاسیت اور اس میں انتباہ بھی شامل تھا۔ اس نے کہا کہ ورما کے ساتھ موجود پولیس افسروں کے تیورے

محسوس ہتا ہے جیسے ہمارے ان کے درمیان کوئی خاندانی بغض و عناد ہے اور انہیں اصل مجرموں کی اتنی جستجو نہیں جتنی ہم سے اپنی کسی عداوت کی ضد ہے۔ ہمیں احساس ہے کہ اڈے سے وابستہ آدمی پولیس کی نظروں میں ہمیشہ مشکوک رہتے ہیں۔ سب سے پہلے وہی معتوب قرار پاتے ہیں لیکن یہ ایک بالکل مختلف معاملہ ہے۔ ہمیں بہرحال اپنا دفاع کرنا ہے۔ پولیس ایک جبری اعتراف پر کیوں مصر ہے۔ ہمارا مشورہ ہے' ماننا نہ ماننا پولیس کی مرضی ہے' پولیس واقعی اصل مجرموں تک پہنچنا چاہتی ہے تو اسے اپنے نقطہ نگاہ اور طریق عمل پر نظرثانی کرنی ہوگی۔ اسے ازسرنو اپنی تفتیش کا آغاز کرنا چاہیے۔ اس دوران وہ ہم پر بھی نظر رکھے' ہمیں اپنی تفتیش کے دائرے سے خارج نہ کرے۔ یہاں سے ہمیں رخصت کردینے سے مراد یہ نہیں ہے کہ ہم پولیس کے ہاتھوں سے نکل گئے' ہمارے گناہ معاف ہوگئے اور یہ آخری موقع تھا۔ پولیس کو اپنی حاکمیت' ذرائع اور اہلیت پر اعتماد رکھنا چاہیے۔ اس کے ارادے اور راستے میں کون مزاحم ہوسکتا ہے۔ وہ بار بار ہمارے دروازے پر دستک دے سکتی ہے۔ ہم ابھی شہر میں ہیں۔ گویا ہمیں جلد سے جلد یہاں سے روانہ ہوجانا تھا۔ پولیس خاطر جمع رکھے' اس کے خیال سے ہم یہاں اپنے قیام کی مدت کسی حد تک بڑھا سکتے ہیں' اور ہمارے یہاں موجود رہنے نہ رہنے سے بھی کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم جہاں بھی ہوں گے' جتنی دور بھی' ہر جگہ پولیس کے قریب ہوں گے۔ اطراف و اکناف میں' کون سی ایسی جگہ ہے جہاں پولیس کا جال نہ تنا ہو۔ ہم کوئی گمنام لوگ نہیں اور اتنے کم فہم بھی نہیں کہ فرار ہونے کی نادانی کریں۔ کلکتہ ہمارا پرانا ٹھکانا ہے۔ لکھنؤ کا اڈا بابر کے نام سے چلتا ہے۔ یہاں فیض آباد میں بھی ہمارا اڈا ہے اور یہاں ہمارا ایک گھر ہے۔ اتنے لوگوں سے روپوش ہوکے ہم کہاں جاسکتے ہیں۔ بٹھل نے بمبئی اور حیدرآباد وغیرہ کا ذکر نہیں کیا اور ورما سے فیصلہ کن لہجے میں کہا کہ اب اسے کچھ کہنا اور نہ کسی سوال کا جواب دینا ہے۔

شاید انہیں توقع نہیں تھی کہ بٹھل اس طرح اچانک خاموش ہوجائے گا۔ ورما نے مضطرب ہوکے اپنے ماتحتوں کی طرف دیکھا۔ وہ سب شش و پنج کی کیفیت سے دوچار تھے۔ کمرے میں ہیجان آمیز سکوت چھاگیا۔ لمحے گزر گئے پھر بٹھل ہی نے یہ سکوت توڑا اور الجھی ہوئی آواز میں کہا "ہم کو اجازت دو صاحب!"

ورما چونک سا پڑا' اس کی پیشانی پر شکنوں کا جال بچھ

اڈے کے آدمی تمہارے آدمی ہیں۔ اس اڈے کا تم کو کلکتے کے اڈے سے زیادہ دھیان ہونا چاہیے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اڈے کے دو آدمی مارے جائیں اور استاد بٹھل گردن ڈالے بیٹھا رہے۔ تم بارہ بنکی جا کے استاد گورا کو ڈھیر کر سکتے تھے۔ تمہارے آگے وہ کتنی دیر کا تھا پر ٹھنڈا کر کے کھانا اچھا رہتا ہے۔ تم کو پتا تھا' وہ ٹھاکروں کا پالا ہوا ہے۔ یہ پالتو مالکوں کے ہاتھ پیر ہوتے ہیں۔ پرجا کے بنا راجا نہیں ہوتا۔ جیسے تمہاری آن کی بات تھی ویسی ٹھاکروں کی بھی ہو گی اور ٹھاکروں سے بیر کا تم کو معلوم تھا' بھاری پڑے گا۔ یہ تمہارے بس کا نہیں تھا۔ ٹھاکر بگڑ جاتے تو چن چن کے اڈے کے آدمی سلا دیتے۔ تم نے اپنے آدمیوں کو روک لیا تھا اور تم بھی گورا استاد سے بدلے کا دھیان من سے نکال دیتے۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید یہی کرتا۔ گورا کو ایک بار ڈھیل دینے سے وہ اور پھیل سکتا تھا۔ آج اس نے اپنے اڑے آنے والے دو آدمی مار دیے' لکشمی داس کا گھر اجاڑ دیا' کل اس کا سانڈ پنا اور بڑھ سکتا تھا۔ اس کے پیچھے ٹھاکر تھے اور ٹھاکر ہردیو' اسے جوانی اور پیسے کا نشہ کچھ زیادہ ہی تھا۔ ایک بار منہ کو خون لگ جائے تو آگے کوئی ٹھکانا نہیں رہتا۔ کل تمہارے راج محل پر بھی اس کی نظر پڑ سکتی تھی۔ وہاں راج کماریاں' اور لوگ بولتے ہیں' بے پروں والی پریاں رہتی ہیں۔ اپنے کتے استاد گورا کے ختم ہو جانے پر ٹھاکر ہردیو نچلا بیٹھنے والا نہیں تھا۔ اس کا دماغ بہت پھرا ہوا تھا۔ تم نے اسی سمے آگے کا سونگھ لیا تھا جب بازار میں ہریا اور گورا کا مچیٹا ہوا تھا اور استاد بابر نے بیچ میں کود کے گورا کو ادھ موا کر کے ایک طرح سے جیون' دان کر دیا تھا۔ اسی سمے سے تم کو... چار کرنا تھا کہ آنے والے دن کیسے بدلے ہوئے' پرکشا کے' کتنے کٹھور بلکہ کٹھن ہو سکتے ہیں۔ استاد سلامی نے تم کو بول دیا تھا کہ گورا کس راستے سے آیا تھا' اس کی ڈوری کس کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے دوسرے دن سے تم نے سویرے سے شام تک اڈے پر بیٹھنا شروع کر دیا۔ تم کو کئی طرف دیکھنا تھا۔ اڈے کی طرف' اڈے کے بیوپار کی ساکھ باقی رکھنا یا بند باندھنا' اڈے کے لوگوں کی رکھشا کرنا' اپنے دوست جمرو اور جامو کو منہ دکھانا اور اپنے راج محل کو بچانا' اڈے پر بیٹھتے ہی تم نے سوچ بچار کے لیے پہلا کام یہ کیا کہ تار دے کے استاد جامو کو کلکتے سے بلا لیا۔ جامو' ہریا اور لچھو کی موت سے پہلے آیا تھا۔ وہ ان کی موت اور تیجے پر نہیں آیا' کیوں؟ یہ تم ہی بہتر جانتے ہو گے کہ اسے کون سا کام پڑ گیا تھا جو شہر میں صرف ایک رات بتائی اور چلا گیا اور سنا ہے' کسی کو بتائے بنا۔"

ورما نے گلاس اٹھا کے گھونٹ بھر پانی پیا اور رومال سے باچھیں خشک کر کے کہنے لگا "چھوڑو' آگے چلتے ہیں۔ ادھر آؤ صاحب بہادر ٹھاکر ہردیو کے پاس۔ گانٹھ تو اسی دن پڑ گئی تھی۔ جب گورا پھٹے کپڑوں' سوجے منہ اور ان نکلتے پیروں سے اس کے سامنے پہنچا تھا۔ اپنے پٹھو کی یہ درگت دیکھ کے چھوٹے ٹھاکر کا خون کھول جانا چاہیے اور یہ جان کے تو او سر گھوما ہو گا کہ گورا اور ہریا کے بیچ میں آنے والا اجنبی' کو شیر کا بچہ تھا' کدھر رہتا اور کیا کرتا ہے۔ گورا کا ایسے اکھڑ سانسوں سے لوٹنا صاف ٹھاکر کا اپمان تھا۔ ٹھاکروں کی ناک لمبی ہوتی ہے۔ پھر اس سوچنا پر کہ اب فیض آباد کے اڈے کوئی اور نہیں' استاد بٹھل بیٹھنے لگا ہے' جس کا دور دور تک کوئی جوڑ نہیں۔ ٹھاکر کی چھاتی میں اور کھلبلی مچنی چاہیے اس سے پہلے کہ استاد بٹھل اڈے پر پنجے جمائے' اس کا کچھ کچل دینا ہی ٹھیک ہے۔ ٹھاکر کے من سے برکھا بھی چپٹی ہو تھی۔ ایک بار وہ اس کے ہاتھ میں آتے آتے نکل گئی اور نکلوانے والے ہریا اور اڈے کے آدمی تھے۔ گورا بھی اپنے مالک کی آنکھوں اور دل میں کھوئی ہوئی جگہ پا کے لیے بڑا ویاکل ہو گا۔ اسے بھی جلدی تھی۔ استاد بٹھل اڈے پر اپنے آپ کو تھپکیاں دے رہا تھا اور اچھے سمے شگون لے رہا تھا کہ گورا ایک رات فیض آباد آ گیا۔ اب وہ بڑی تیاری سے آیا تھا۔ اس نے اپنا کام کر دکھایا۔ ٹھاکر برکھا بھینٹ کروی اور ہریا اور لچھو کو گرا کے اپنی طرف۔ ہارا ہوا یدھ جیت لیا لیکن ٹھاکر اور گورا استاد' دونوں کو ا بٹھل کی جان کاری پوری نہیں تھی۔ جانے نہ جانے سارا چمتکار ہے' اور بڑھتی کمتی جانے کا۔ کچھ نہیں معلوم کہ دوسری طرف کیا فیصلہ ہو سکتا ہے اور کیا فیصلہ ہو چکا۔ دوسری طرف استاد بٹھل ہے۔ اڈے کے آدمی رات ہی کو بولے تھے۔ استاد کی چار آنکھیں' آٹھ ہاتھ پاؤں ہیں ہاتھ پیر ناپ تول کے اٹھتے ہیں۔ استاد کے دماغ میں' ما شطرنج بچھی رہتی ہے۔ لگتا ہے' ہریا اور لچھو کے جانے پہلے ہی استاد بٹھل نے سارا بھانپ لیا تھا۔ ان کے جا کے بعد فیصلے پر ٹھپا لگا دیا۔ ادھر ادھر کی جانچ پڑتال پر بر اپائے بجھائی دیا کہ ایک ہی جھٹکے میں سارا ٹنٹا بھگتا دیا جا۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ کون گورا استاد' کون ٹھاکر' دیو' ہردیو' حویلی' سونا' چاندی' نوکر چاکر' زمین جاگیر' گاجر کی طرح سارا ہی جڑ سے اکھاڑ دو۔ وہ کیا بولتے ہیں' سو کی' ایک لوہار کی۔"

"اور ایک بات بولیں استاد!" ورما کے مشتعل لہجے

ہیبت سی نمودار ہوئی "استاد گورا ذرا خود کو تھام کے رکھتا اور ٹھاکر ہردیو کا خون بھی اتنی گرمی نہ کھاتا تو بھی کیا ہوتا! ہاں' ہریا اور لچھو ضرور بچ جاتے۔ برکھا بھی زندہ رہتی۔ اس کے دو نوکر بھی جان سے نہ جاتے' لکشمی داس بھی پاگل نہ ہوتا' پر ادھر کا' ٹھاکر کی طرف کا شاید کچھ نہ بدلتا۔ ان کا فیصلہ تو لکھا جا چکا تھا۔ ہریا اور لچھو کے کریا کرم اور تیجے اور ٹھاکر بستی کی دُرگھٹنا کے بیچ میں سمے کم ہے۔ اتنے لوگ اکٹھے کرنے میں کچھ سمے تو لگنا ہی چاہیے۔ یہ تو جان پڑتا ہے' اسی سمے طے ہو چکا تھا جب ہریا اور گورا کے ٹکراؤ میں استاد بابر نے آ کے پانسا پلٹ دیا تھا۔ اس کے دوسرے تیسرے دن جامو کلکتے سے آ گیا تھا۔ جامو کا اچانک فیض آباد آنا اور ترنت واپس ہو جانا بھی کسی کارن بنا نہیں ہو گا۔ جامو استاد کو ٹھاکروں کی چھب' ڈھب' چلت پھرت' ان کی راج ہٹ کا پورا معلوم تھا' سارا کچا چٹھا۔"

میری آنکھیں جل رہی تھیں۔ ورما نے پھر مجھے متزلزل کر دیا تھا۔ وہ جیسے مجھے اور بٹھل کو آئینہ دکھا رہا تھا۔ اس کی تجزیے میں ان سنے اور ان دیکھے کی کوئی بے اعتباری نہیں تھی۔ وہ ایسا پراعتماد تھا جیسے ہر مرحلے میں شریک رہا ہو اور گزشتہ کی نگرانی کرتا رہا ہو۔ اس الزام تراشی یا فردِ جرم کا بقیہ حصہ بھی وہی تھا جو نزدیک و دور کے مشاہدے سے میں نے وضع کیا تھا یا میری جستجو کا حاصل تھا۔ ورما جیسے میرا آموختہ دہرا رہا تھا مگر وہ ہمیں یہ سب کچھ جتانے پر کیوں مصر تھا' ان وضاحتوں کی اسے کیا ضرورت تھی؟ اس حد تک تفصیل سے۔ اپنی منطق وہ خود تک بھی محدود رکھ سکتا تھا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ وہ طبیعتاً کوئی اذیت پسند شخص تھا' اس قدر جزئیات بیانی سے وہ ہمیں کوئی آزار پہنچانے کے درپے تھا یا وہ کوئی سفلہ آدمی تھا' خودنما' خود پسند۔ بعض ذہین آدمیوں کو داد طلبی کی عادت پڑ جاتی ہے۔ اس تجزیہ و تحلیل سے اپنے ساتھیوں پر اپنی ذہانت و فطانت' نکتہ رسی و خیال آفرینی کا کوئی اثر ڈالنا مقصود تھا یا پھر اپنے اخذ کیے ہوئے نتیجے پر اسے کوئی شبہ تھا۔ بٹھل کا ردِعمل شاید اس کی توقع کے مطابق نہ ہوا اس لیے وہ اسے کھکوڑ اور جھنجھوڑ رہا تھا۔ ورما کے لب و لہجے کا اعتماد ہرچند کسی شک یا ابہام کی نفی کرتا تھا۔ یہ اعتماد شخصی بھی ہو سکتا ہے۔ کچھ لوگ اپنے قیاس اور شکوک کا اظہار بھی بڑے تیقن سے کرتے ہیں' بعض لوگوں کا انداز ہی حکمی ہوتا ہے اور ورما تو پولیس کے بڑے عہدے پر سرفراز تھا۔ اس کی آواز کی توانائی کچھ اپنے منصب کے سبب سے بھی ہو گی۔ عہدہ و منصب' مال و زر' شہرت و مقبولیت کی قوت ہی کچھ اور ہوتی ہے یا ہو سکتا ہے' اپنی تشریح و توضیح سے وہ بٹھل کو متنبہ کرنا چاہتا ہو کہ جس شخص کی نگاہ اتنی تیز اور رسا ہو' دیر تک اس سے کچھ چھپانا لاحاصل ہے۔ ورما کو سرے ڈھونڈنے کا فن آتا تھا۔ وہ کھوجیوں کے مانند تھا۔ بہرحال جو کچھ بھی تھا' میری طرح بٹھل کو بھی جکڑے ہوئے ہو گا۔ پولیس افسر ورما ہوا میں تیر نہیں چلا رہا تھا۔

میں نے سر گھما کے ایک نظر بٹھل کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی اور بس! اس کا کچھ طے نہیں تھا۔ باطن تو نہاں ہوتا ہے' ظاہر بھی عیاں نہیں تھا۔ مجھے تو بڑی وحشت ہو رہی تھی۔ دماغ پھٹا جا رہا تھا' جسم جیسے کوئی دھنک رہا ہو۔

ورما نے بیٹھے بیٹھے جھرجھری سی لی' چھت کی طرف دیکھا اور ایک لمحاتی توقف کے بعد اضطراری لہجے میں بولا "ہاں استاد!" وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن جانے کیوں رک گیا۔

بٹھل خاموش رہا۔

"کچھ انیس بیس ہو تو بولو!" ورما کی ڈنک مارتی آواز گونجی۔

"پورا سو ہے صاحب! آپ گیانی دھیانی ہو۔"

"کارن پر زور تھا نا تمہارا' اور کو تو جانے دو' ہم نے بولا تھا' سب سے بڑا کارن تم ہو' ادھر تمہاری حویلی بڑا کارن ہے۔ حویلی میں تمہاری جان اٹکی ہے۔ پتا نہیں' کیا ہے وہاں' کچھ ہردے (دل) کا سمبندھ ہو گا۔ تم آج فیض آباد میں ہو' کل تم کو یہاں سے چلے جانا ہے۔ اڈے کے آدمیوں کے کس بل کا تم کو اچھی طرح معلوم ہے۔ سمے پڑنے پہ وہ کتنی دیر ٹھہر سکتے ہیں۔ ایک طرف تو چاقو' چھرا' لاٹھی' بلم دوسری طرف بندوق' تمنچا' پوری ایک سینا' سرکار دربار میں جان پہچان بلکہ خود سرکار دربار۔ تم نے اپنی جگہ ٹھیک سوچا۔ ٹھاکر ہردیو اور استاد گورا کو کھلا چھوڑ دیا جاتا تو لکشمی داس کے گھر کی طرح اور گھروں سے بھی لڑکیاں بالیاں اٹھتیں۔ وہ حویلی کی طرف بھی جا سکتے تھے۔ سمجھ میں یہ آتا ہے' پہلے تو ادھر ہی جانے کو پھڑپھڑاتے۔ استاد بابر نے سامنے آ کے ان کو اپنی حویلی کا رستہ دکھا دیا تھا' پر استاد! ان کو کوئی اور روک بھی ہو سکتا تھا۔ اتنا آگے' اتنا زیادہ ہی کیوں؟"

"لگتا ہے' گانٹھ کس گئی ہے۔" بٹھل نے رکھائی سے کہا

"کچھ اور ہو تو بولو صاحب!"

"اب تمہاری باری ہے' سب تم کو بولنا ہے۔"

"اپنے پاس کچھ نہیں۔"

"اتنا کچھ سن کے اب تم کو اپنے ساتھیوں کا بول دینا

چاہیے" ورما سنی اَن سنی کرتا ہوا بولا۔

"ہم سے کیوں پوچھتے ہو؟"

"پھر کس سے، مرنے والوں کی آتماؤں سے پوچھیں؟"

"آپ کے لیے کیا دور ہے، پل بھر میں دودھ پانی الگ کردیتے ہو، اپنی اتنی ٹوہ کی ہے، ان کے لیے بھی تھوڑا زور لگاؤ۔"

"وہ تو ہم پہنچ ہی جائیں گے ان تک بھی۔ آج نہیں تو کل" ورما کی آواز تکبر آمیز تھی۔

"دیکھو صاحب! اپنے کو زیادہ گھوما پھیری نہیں آتی۔" بٹھل نے سپاٹ لہجے میں کہا "جو پہلے بول دیا ہے، پورا تول کے بولا ہے۔ اسی کو آخری جانو۔ اپنا کوئی ساتھی نہیں تھا اور ہوگا تو آپ سمجھتے ہو، ہم بول دیں گے؟"

"تم کو بولنا ہے، تم کو بولنا پڑے گا استاد!" ورما نے حکمیہ انداز میں کہا پھر اسے کچھ خیال آیا اور اس کی غراتی آواز ماند پڑگئی، کہنے لگا "اچھا ٹھیک ہے، ہم یہاں سے اٹھ جاتے ہیں، تم کو ہماری زبان نہیں آتی۔ اب ہمارے افسر تم کو دیکھیں گے پھر یہ جانیں اور تم جانو۔ ہم نے تم کو جتا دیا ہے، یہ دیسی لوگ ہیں۔"

"ہم بھی پردیسی نہیں، یہ کیا کرلیں گے صاحب!"

بٹھل کی بے باکی گستاخی پر محمول کی جانی چاہیے تھی۔ یہی ہوا، وہ سارے تلملاتی نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"ابھی پتا چل جائے گا" ورما گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔ "یہ آدمی کی شکل بگاڑ دیتے ہیں، اس کو آدھا کردیتے ہیں۔"

"آدھے پہ رہتے ہیں نا!"

"پھر سچ اگلتے ہی بن پڑتا ہے۔"

"دیکھتے ہیں صاحب! ان کو بھی۔"

"ہاں، تمہارا تجربہ بھی کم نہیں ہوگا۔"

"اپنے کو تو ہر بار نیا لگتا ہے۔"

"اس بار بہت نیا ہوگا اور شاید آخری بھی، یہ تمہیں اس قابل نہیں چھوڑیں گے کہ تم دوبارہ کوئی من مانی یا ہٹ دھرمی کرسکو۔"

بٹھل سرہلانے لگا اور کسی قدر سنبھلی ہوئی آواز میں بولا "ایک بات پوچھیں صاحب! آپ ہمی پر کیوں جم گئے ہو؟"

ورما نے شانے اچکائے اور کسمسا کے بولا "کارن بنا نہیں تھے، اور کارن تم کو ایک ایک کرکے گنا دیے ہیں۔"

"اگر اس کے الٹ ہو تب صاحب!"

کوئی جواب دینے کے بجائے ورما شعلہ بار نظروں سے بٹھل کو گھورا کیا۔

"تب ہم کو آپ کے اور ان کے ساتھ کیا کرنا چاہیے؟" بٹھل نے نکیلی آواز میں پوچھا۔

"تم۔۔۔ تم کیا کرسکتے ہو؟" ورما چنچنا کے بولا۔

"ہم تو بس پوچھتے ہیں مائی باپ! پھر اپنے کو کیا کرنا چاہیے؟ ہم جنگل میں نہیں بستے۔"

"جنگلی، جنگل ہی میں نہیں بستے۔"

"اپنی بات کا جواب دو صاحب!"

"پھر تم اپنا رستہ لینا، ہم اپنا" ورما جھلا کے بولا۔

"اور اپنے ساتھ مستی کرنے کا بھگتان کون دے گا؟"

"اس کے لیے تم کچہری جا کے زنجیر کھینچنا، کچہریاں ہر طرف کھلی پڑی ہیں۔"

بند دروازے پر دستک سے سبھی چونک پڑے۔ دوسرے ہی لمحے وہ نوجوان پولیس افسر دروازے پر نمودار ہوا جس نے ہمیں اس کمرے تک پہنچایا تھا۔ ورما کی اجازت سے وہ لپکتا ہوا اندر آیا اور اس نے مستعدی سے ایک کاغذ ورما کے سامنے رکھ دیا۔ نوجوان افسر فوراً واپس ہوگیا۔ ورما نے غور سے کاغذ دیکھا، اس کے نتھنے پھول گئے، بھویں سکڑ گئیں۔ بے دلی سے اس نے دائیں طرف بیٹھے ہوئے افسر کی طرف کاغذ بڑھا دیا۔ ان چاروں نے باری باری اسے دیکھا اور ان کے چہروں پر شکنیں کھنچ گئیں۔ چند ثانیے ورما اپنے آپ میں گم رہا پھر بھاری آواز میں بولا "تم کو بول دیں استاد! ہم کو حویلی کا رستہ بھی معلوم ہے۔ چھان بین کے لیے ہم کو کوئی گھر بند نہیں۔"

"جاؤ صاحب! ادھری بھی جاؤ۔ آپ وردی والے ہو، منہ اٹھائے کسی بھی گھر میں گھس سکتے ہو۔ اپنے کو آپ کے لیے ہاتھ کا پتا ہے۔ ہر جگہ سات کی معافی بولتے ہیں، آپ کے لیے کوئی گنتی نہیں، آپ ساری حویلی اٹھا کے ادھری لے آؤ۔"

"تم نہیں مانتے تو ایسا ہی ہوگا، بولتے ہیں، وہ موم کی بنی ہیں، موم کی یا ریشم کی، جو بولو۔ بہت سنبھال کے رکھا ہے تم نے ان مورتیوں کو۔ ادھر تمہارے سامنے آئیں گی تو سارا موم، سارا ریشم۔۔۔" ورما نے خود کو روکا اور مچلتے ہوئے بولا "جس حویلی کے لیے تم اتنی دور کا سوچ سکتے ہو استاد! وہاں کے لوگوں کے حوالات میں آنے پہ، دیکھتے ہیں، تم کتنی دیر ٹھہرتے ہو۔"

"اپنی مانو صاحب! تھوڑا آرام کرکے متھے پہ زور ڈالنا،

رت جگائی سے الٹا ہوجاتا ہے کبھی۔" بٹھل نے تاکیدی لہجے میں کہا۔

بڑی عمر سے مراد تحمل اور برداشت نہیں ہے۔ دائیں طرف کے معمر افسر نے برہم انداز میں ورما سے درخواست کی "دیر نہ کیجیے سر! ان کو ان کی اصل جگہ بھیج دیجیے۔ ہم دیکھتے ہیں ان کو، یہ لاتوں کے بھوت ہیں، ایسے حرام ڈیلوں سے نمٹنا ہم کو آتا ہے۔"

اس سے پہلے کہ ورما کوئی رائے ظاہر کرتا، بٹھل نے اونچی آواز میں کہا "ان کی بات مان لو صاحب! کسی کو کھجلی زیادہ ہوتی ہے۔ یہ بھی پولیس کے افسر ہیں۔ ادھری منہ دکھائی کو نہیں بیٹھے۔ ان کو بھی کچھ حلال کرنے دو۔"

"زبان سنبھال کے استاد!" ورما بگڑ کے بولا "اپنی حد سے مت بڑھو۔"

"حد ساری آپ کے لیے ہے۔ آپ بھی تھوڑا اندر رہو، آپ کی چاکری نہیں کرتے۔"

بٹھل کا لہجہ واضح طور پر مختلف تھا۔ مجھ سے زیادہ اس پر پولیس کو حیرت ہونی چاہیے تھی۔ برافروختگی ان کے چہرں سے عیاں تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ یہ تبدیلی بے وجہ نہیں ہوگی لیکن وجہ کچھ میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ یہی ہوسکتا تھا کہ بٹھل کو ان سے کسی رعایت کی توقع نہ رہی ہو۔ ورما نے بے چینی سے اپنے آمادہ غضب افسر کو دیکھا۔ اسے کچھ پس و پیش تھا لیکن معمر افسر کو اب مزید اپنے عالی مرتبت افسر کی خاطر منظور نہ تھی، اس نے اپنے سامنے رکھی ہوئی گھنٹی پر زور زور سے ہاتھ مارا۔ سنتری جیسے ہی اندر داخل ہوا، معمر افسر نے کھنا نامی کسی شخص کو جلد از جلد حاضر ہونے کا حکم دیا۔

کھنا راہداری میں دروازے کے قریب ہی منڈلا رہا ہوگا، فوراً اندر آگیا۔ یہ وہی نوجوان تھا جو ابھی کچھ دیر پہلے کوئی اہم کاغذ لے کے آیا تھا "دونوں کو ڈارک روم لے جاؤ۔" معمر افسر نے ترختی آواز میں کہا "اور اپنے رستم کو بولو، وہ بھی تیار رہو جائے۔"

"وہ تیار ہے جناب!" نوجوان افسر نے مودبانہ جواب دیا۔

"یہاں کیوں نہیں؟" ورما کچھ الجھتے ہوئے بولا۔

"ڈارک روم میں پورا انتظام ہے سر!" معمر افسر کی بوڑھی آواز جوش میں ہکلا گئی "ابھی دیکھیے گا، ہوش ٹھکانے آجائیں گے ان کمینے خانوں کے۔"

"کیا، کیا نام لیا تھا اس کا؟" ورما نے تذبذب سے کہا "ہاں، وہ رستم، سہراب، اس کو یہاں کیوں نہیں بلایا جاسکتا؟" ورما کو اپنی جگہ سے اٹھنے میں جانے کیوں تامل تھا۔

"یہاں بھی بلا سکتے ہیں سر لیکن۔۔۔"

ورما نے ہاتھ اٹھا کے افسرانہ تمکنت سے کہا "اسے یہیں آنے کا کہو۔"

معمر افسر نے بادل ناخواستہ کھنا کو اشارہ کیا۔ کھنا نے فدویانہ انداز میں سر جھکایا اور کسی تاخیر کے بغیر دروازے کی طرف لوٹ گیا۔

"ہم ایسا نہیں چاہتے تھے استاد!" کھنا کے جانے کے بعد کمرے پر چھائی ہوئی خاموشی ورما کی آواز سے ٹوٹی۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا "وہ کمرا ہم نے دیکھا نہیں لیکن بڑی باتیں سنی ہیں۔ وہاں آدمی کا دم گھٹنے لگتا ہے۔"

"ادھری آپ کون سا سانس لینے دے رہے ہو۔" بٹھل نے بیزاری سے کہا۔

"ہم نے تم کو پورا موقع دیا۔"

"کاہے کا صاحب! اس کا کہ جو آپ بولو، اس کو مان لیں؟ وہ رستہ تو سیدھا سولی کی طرف جاتا ہے۔"

"دھیرج رکھو، تم کو بولا ہے، ہمارا کام آسان کرنے پر تم کو چھوٹ مل جائے گی۔ ہمارا کام آسان کرنے کا مطلب سمجھتے ہو؟"

"چھوٹ تو اپنے کو پوری ملے گی، آپ کے پنجے سے نکلتے ہی مل جائے گی اور آپ کا پنجہ بھی کتنی دیر کا ہے۔ زیادہ ٹائم کو نہیں روک سکتے اپنے کو آپ۔"

"تم ایسا ہی سوچو، ہم جانتے ہیں، تم کو کب تک روک سکتے ہیں۔"

نوجوان افسر ٹھیک کہتا تھا۔ یکایک تازہ وردیوں میں ملبوس پانچ تنومند سپاہی جوتے بجاتے اندر داخل ہوئے۔ ہم سے قریب آکے انہوں نے اپنے افسروں کو تمام تر سرکاری ادب سے سلام کیا۔ نوجوان افسر کھنا بھی ان کے ساتھ تھا۔ ابھی وہ اس رسم سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ ایک چوتھا سپاہی ہاتھ میں کینوس کا لمبا بیگ لیے اندر آیا۔ وہ آخری درجے کا سپاہی ہوگا کہ ایک گوشے میں بیگ رکھ کے چپکے سے واپس چلا گیا "ان کو دیکھتے ہو؟" معمر افسر نے حاکمانہ لہجے میں کہا "یہ جو دو سورما تمہارے پاس کھڑے ہیں۔ ذرا دیکھو، راون کے ان کتوں میں کس نے ماں کا کتنا دودھ پیا ہے۔"

"بھاری بھرکم جثے، اوسط قد، تانبے جیسی چمکتی رنگت، گول چہرے کے ایک ادھیڑ سپاہی نے بیگ سے ہنٹر نکالا۔ اس کی بڑی مونچھیں چہرے پر چھائی ہوئی تھیں، بالوں پر جیسے

گیا۔ اس کی پھیلی ہوئی آنکھیں بٹھل پر بھٹکنے لگیں پھر اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف نگاہ کیے بغیر ہاتھ اٹھا کے ہمیں گھیرے ہوئے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ ایک کے تذبذب و تامل کے بعد سپاہیوں نے پنجوں میں جکڑے ہوئے ہمارے بازو آزاد کردیے "تم' تم جا سکتے ہو۔" ورما نے بوجھل آواز میں کہا "لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔"

بٹھل نے اسے روک دیا "کچھ اور نہیں صاحب!" اس نے تنبیہی انداز میں کہا "ہم پہلے آپ کو سارا بول چکے ہیں۔"

ورما نے آنکھیں میچ لیں اور ایک گہری سانس بھر کے کرسی کی پشت سے کمر ٹکا دی۔

سپاہی ہم سے دور ہو گئے۔

مجھے اپنی آنکھوں اور کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میرا جسم ہی معطل ہو گیا تھا جیسے میں خواب کی حالت میں ہوں اور میں نے جو دیکھا' سنا ہے' وہ کوئی فریب نظر' فریب خیال ہے۔ سپاہی ہٹ جانے کے بعد بھی میں اپنی جگہ گنگ کھڑا رہا۔ بٹھل نے بھی دروازے کی جانب لوٹنے میں عجلت نہیں کی۔ وہ اپنی جگہ موجود رہا' پھر آہستہ آہستہ میں نے اسے اپنی طرف آتے دیکھا۔ میری رگوں میں خون سن سنا رہا تھا "چل رے۔" اس نے بدبداتے ہوئے کہا۔ میرا ہاتھ اس نے اپنے ہاتھ میں تھاما تو میں ہڑبڑا سا گیا اور پتھر قدموں سے اس کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھتا رہا۔

باہر جاتے جاتے بٹھل ٹھہر گیا "ایک بات صاحب!" اس نے مودبانہ لہجے میں کہا "اپنی بنتی ہے' آج نہیں تو کل' جب بھی آپ کو ٹائم ملے' وہ جو آپ بولتے ہو' اپنے راج محل میں آؤ۔ آپ نے ادھری رہنے والوں کو جانے کیا کیا بولا ہے۔ وہ ایسے کسی کے سامنے نہیں آتے پر آپ کی دوسری بات ہے۔ ایک بار ان کو اپنی آنکھ سے دیکھ لینا۔ گھر تو آپ کا بھی کوئی ہوگا۔"

یہ کہتے ہی بٹھل دروازے سے نکل آیا۔

○☆○

دھوپ ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ کوتوالی سے چند قدم کے فاصلے پر کئی تانگے خالی کھڑے تھے۔ کچھ کہے بغیر بٹھل پہلے تانگے پر سوار ہو گیا۔ دن اس قدر چڑھنے کے باوجود سڑک پر ایسی چہل پہل نہیں تھی۔ جگہ جگہ پولیس موجود تھی۔ ہم نے آدھ میل کے قریب راستہ طے کیا ہوگا کہ بٹھل نے ایک کچے پکے اور صاف ستھرے ہوٹل کے پاس تانگا رکوا دیا۔ اس کے اتر جانے پر مجھے بھی اترنا پڑا۔ وہ ہوٹل کے باہر کھلی جگہ میں رکھی بینچ پر بیٹھ گیا۔ اس طرف سایہ تھا اور سکون بھی۔ ہم منہ اندھیرے گھر سے نکلے تھے۔ بٹھل کو صبح چائے پینے کی عادت تھی۔ اسے طلب ہو رہی ہوگی' مجھے تو بھوک اور پیاس کا احساس ہی نہ رہا تھا۔ میں گھر پہنچ کے اپنے کمرے میں بند ہو جانا چاہتا تھا۔ گھر دور تھا اور اتنی دور بھی نہیں تھا کہ سیدھے گھر کا رخ کر لیتے تو وقت صرف ہو جاتا۔ میں نے نہیں سنا کہ بٹھل نے چائے والے سے کیا کہا ہے۔ گلاس بھر پانی ایک ہی سانس میں پی کے اس نے بیڑی سلگا لی اور گہرے گہرے کش لینے لگا۔ اسے تھکن ہونی چاہیے تھی۔ میرا جسم تو کوئی بوجھ بنا ہوا تھا۔ ایک جگہ کھڑے رہنے کے سوا ہم نے کوئی مشقت نہیں کی تھی لیکن تھکن کا تعلق تو گزرتے ہوئے وقت کے رویے سے ہے۔ کبھی ایک لمحہ ہی پہاڑ ہو جاتا ہے' آدمی کو ویران کر دیتا ہے۔ زندگی تو ویسے بھی لمحوں میں بٹی ہوتی ہے' تند و گرم' بے جان' بے بس' نرم و لطیف لمحوں پر مشتمل' دبلے پتلے کم عمر لڑکے نے ہمارے سامنے ملائی سے ڈھکی ہوئی چائے اور گرم گرم کچوریاں رکھ دیں۔ میرا جی لوٹ رہا تھا۔ بٹھل کے خیال سے کچوری کا ایک ٹکڑا منہ میں لیا تھا کہ گلے میں پھنسنے لگا۔ ملائی کی تہہ ہٹا کے میں نے چائے کے چند گھونٹ کسی طرح انڈیل لیے "کیا ہے رے؟" بٹھل نے ناگواری سے مجھے ٹوکا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا "بس چائے ٹھیک ہے' اب گھر چلو۔"

"چلتے ہیں رے۔" وہ منہ بنا کے بولا "تھوڑا دم لے۔"

اس نے بھی دو ایک کچوریوں پر قناعت کی اور چائے کی چسکیوں سے خود کو سیراب کیا۔ کاش آدمی کو جانوروں کی طرح جسم کی آب یاری کے لیے خورد و نوش کی حاجت نہ ہوا کرتی یا پھر وہ جانوروں سے مختلف نہ ہوتا۔ ہم نے چائے ختم نہیں کی تھی کہ دور سے شور بلند ہوا۔ استاد سلامی کے ساتھ اڈے کے کئی آدمی لپکے' بھاگتے ہماری جانب امڈ رہے تھے۔ انہوں نے دور سے ہمیں دیکھ لیا تھا اور دیوانے سے ہو گئے تھے۔ ہوٹل میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی پریشان ہو گئے۔ ہمارے پاس پہنچ کے اڈے کے آدمیوں کا شور اور بڑھ گیا۔ وہ سارے بٹھل اور مجھ سے گلے ملنے کے لیے ہمک رہے تھے۔ تقریباً سب کی حالت ایک جیسی تھی' بال بکھرے ہوئے' کپڑے شکستہ' آنکھیں بھاری بھاری' چہروں پر دھول جمی ہوئی۔ بٹھل اپنی جگہ سے نہیں اٹھا۔ اس نے انہیں شور مچانے سے منع کیا اور سکون سے بیٹھ جانے کی ہدایت کی۔

ب نے ادھر ادھر سے بنچیں کھینچ کے ہمارے قریب کرلیں۔ کچھ اندر سے کرسیاں اٹھا لائے' کرسیاں' اسٹول' ونڈھے' جس کے جو ہاتھ لگا۔ سارے ہوٹل میں افراتفری ہوگئی۔

"اپنے کو ابھی پتہ چلا' وہ حرام کے جنے تم کو بھی سویرے سویرے کوتوالی لے آئے تھے۔" استاد سلامی حواس باختگی سے بولا۔

"پہلے ذرا سانس باندھ لے۔" بٹھل نے اس کے شانے پر تھپکی دی۔

"کیا استاد کیا بولوں' سالوں نے رات حویلی سے نکلتے ہی' بچھن میاں کی اٹریا تک گئے تھے کہ دھر لیا' رات بھر حرامی لوں نے پل بھر کو کمر ٹکانے نہیں دی۔" استاد سلامی کراہتے ہوئے بولا۔ بٹھل کی ہمدردی سے وہ اور بکھر گیا اور ہذیانی انداز میں کہنے لگا کہ اڈے کے تقریباً سبھی آدمیوں نے رات بڑی آزمائش میں گزاری ہے' پولیس نے ایک ایک کو الگ کمرے میں لے جا کے جیسے کسی پرانی دشمنی کا حساب چکتا کیا ہے۔ گھونسے' طمانچے' ٹھوکریں' ڈنڈے' ہنٹر اور قمچیاں۔ کسی کو الٹا لٹکایا' کسی کو برہنہ کر کے ہنٹر اور قمچیوں سے نیل ڈال دیے۔ سب سے زیادہ بدسلوکی استاد سلامی سے کی گئی۔ کچھ اڈے کے نگراں کی وجہ سے' کچھ اپنی تلخ کلامی کی وجہ سے وہ عتاب کی زد پر رہا۔ اس کے بقول اس سے برداشت نہیں ہوا۔ پولیس کی زیادتی پر وہ منہ پر آئیں مغلظات نہ روک سکا۔ نتیجے میں افسروں کا پارا اور چڑھ گیا۔ سلامی کا منہ سوجا ہوا تھا اور گالوں پر کھرونچے نمایاں تھے۔ وہ کہہ رہا تھا' جتنا وہ انہیں یقین دلانے کی کوشش کرتا تھا' وہ اور اکھڑ جاتے تھے۔ اڈے کے کسی آدمی نے رات کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ پولیس نے کھانے کو پوچھا نہ چائے پانی کو۔ صبح چھوٹے سے گلاس میں چند گھونٹ کڑوی چائے دی گئی تھی۔ بٹھل سنتا رہا۔ سلامی کے ساتھ سبھی اپنی شب بیتی سنانے کے لیے بے قرار تھے۔ ایک ساتھ کئی بول اٹھتے تھے۔ بٹھل نے جھڑک کے انہیں خاموش کیا۔

"اور تم' تمہارے ساتھ کیا بیتی استاد!" سلامی نے ہچکتے ہوئے پوچھا "ان کتوں نے تم کو تو کچھ' کچھ۔۔۔" اس کی آواز حلق میں بیٹھ گئی۔

بٹھل نے جواب میں آنکھیں میچ لیں۔

"ہاں۔" سلامی کا منہ کھل گیا۔ بٹھل کی خاموشی سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا "تم' تم سے بھی استاد۔۔۔! نہیں' نہیں۔" وہ سر جھٹکتے ہوئے بولا "قسم سے دیکھ لوں گا ان کو' وقت اپنا بھی آئے گا۔ وہ حرامی مچھر!! آج تو اس توتے کی آنکھیں ہی پھری ہوئی تھیں۔ سالا کاغذی شیر' افسروں کے آگے تیس مار خاں بنا ہوا تھا۔" سلامی یقیناً لمبی مونچھ والے رستم نامی اس سپاہی کے بارے میں بتا رہا تھا جو افسروں کی طلبی پر بٹھل اور مجھے ہنٹر مارنے آیا تھا۔ سلامی نے بتایا کہ گزشتہ کل' شام ہوتے ہی پولیس کی بہت بڑی نفری نے اڈا گھیرے میں لے لیا تھا۔ استاد سلامی اس وقت وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ بٹھل سے ملنے حویلی گیا ہوا تھا۔ سلامی اڈے پر کسی کو بتا کے نہیں آیا تھا کہ وہ حویلی کی طرف جا رہا ہے ورنہ پولیس اس کے تعاقب میں حویلی آ دھمکتی۔ جو لوگ چھاپے کے وقت اڈے پر موجود نہیں تھے' انہیں گلی کوچوں اور ان کے گھروں سے پکڑا گیا۔ ٹولیوں میں انہیں کوتوالی کے مختلف کمروں میں بند کر دیا گیا۔ ساری رات ان سے بازپرس ہوتی رہی۔ ہر ایک نے ایک ہی بات دہرائی کہ ٹھاکر بستی میں ہونے والے واقعے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے لیکن پولیس پر وحشت طاری تھی۔ کسی کے پاس' دوسرے سے زیادہ کہنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں جو پولیس کی مشکل آسان کرتا۔ وہ کہہ رہے تھے' بٹھل اور میرے بارے میں پولیس افسروں نے کرید کرید کے طرح طرح کے سوال کیے۔ سب کا ایک ہی جواب تھا۔

بٹھل نے ہاتھ بلند کر کے حیران و پریشان ہوٹل والے کو طلب کیا۔ رام پوری مخملی ٹوپی' چکن کے سفید کرتے اور پاجامے میں ملبوس چھریرے جسم کا ہوٹل والا اڈے کے آدمیوں سے خوب واقف معلوم ہوتا تھا۔ اس نے سہمے ہوئے انداز میں قریب آ کے بٹھل کو سلام کیا اور گھٹنے چھوئے۔ بٹھل اسے سب کے لیے ناشتے کی تیاری کا حکم دینا چاہتا تھا کہ ہوٹل والے نے سر جھکا کے اور سینے پر ہاتھ رکھ کے شائستگی سے کہا کہ وہ پہلے ہی اپنے کارندوں کو ہدایت دے چکا ہے۔ ناشتا تیار ہو رہا ہے۔ اس نے کہا' اسے معلوم ہے' اور اسے کیا' سارا شہر جانتا ہے کہ اڈے کا ہر آدمی کل رات' پولیس گھیر کے لے گئی تھی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ سب صحیح سلامت واپس آ گئے۔ پوچھنے لگا' ناشتے کو جانے دیجیے' کوئی اور خدمت ہو تو اسے بتائی جائے۔ کوئی اور خدمت کیا ہوتی جو اسے بتائی جاتی۔ بٹھل کے اشارے پر سب نے وہیں میزوں پر رکھے جگوں سے منہ پر چھپکے مارے اور آستینوں' دامنوں سے چہرہ خشک کیا۔

"تم نے چگوا کو دیکھا استاد؟ اتنی دھنائی کی سور کے جنوں نے کہ نکسیر چل پڑی۔" سلامی کو رہ رہ کے گزری ہوئی

رات ستا رہی تھی' کہنے لگا "سالا خون رکتا ہی نہیں تھا۔ ادھر اپنے بچھن کو ٹھوکریں مار مار کے دیوار میں گھسیڑ دیا۔ آگے طاق کی اینٹ نکلی ہوئی تھی' جا کے متھا ٹکرایا' وہ تو کہو' آنکھ رہ گئی۔ کپڑے دیکھتے ہو استاد اس کے۔" سلامی نے بے تابانہ ادھر ادھر دیکھ کے بچھن کو آواز دی۔ بچھن دور بیٹھا تھا۔ اڈے کے آدمیوں نے اسے اٹھا کے آگے کی جانب دھکیل دیا۔ بچھن کی پیشانی پر میلی سی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ جا بجا خون کے دھبوں نے کپڑے رنگ دیے تھے۔ بٹھل نے بچھن کو پاس بٹھا لیا۔

"یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی استاد۔" سلامی کا شکایتی لہجہ غصے سے لبریز تھا' کسی کی بھی گردن پکڑ کے اندر کردو' آدمی دیکھو نہ آدمی کی ذات' چھوٹا دیکھو نہ بڑا' دے دھواں دھوں... کوتوالی نہیں' قصائی خانہ ہے۔ سالے کوئی بات ہی پوری نہیں سنتے تھے۔ سب نے چڑھائی ہو جیسے۔ ایسا جنگلی پنا' حرامی پنا ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔ یہ کیا ہے استاد؟"

بٹھل سر جھکائے بیٹھا رہا۔

اتنی دیر میں ہوٹل کا مالک اور اس کے آدمی میزوں پر ناشتا لگانے لگے اور یوں وہ سارے بھوکے پیاسے رکابیوں اور پیالیوں پر ٹوٹ پڑے۔ بٹھل نے ان کے لیے خوشبودار پان منگوائے اور تمباکو نوشی کرنے والوں کو سگریٹ' بیڑی سے آسودہ کیا۔ ہوٹل والا ناشتے کے پیسے لینے پر آمادہ نہیں تھا۔ بٹھل نے اس کی جیب میں روپے ٹھونس دیے۔ وہ روپے واپس بٹھل کی جیب میں ڈال دینا چاہتا تھا کہ بٹھل کی ناراضگی بھانپ لی اور اس کا جسم چرمرا کے رہ گیا۔

ہوٹل سے کچھ دور تک سب پیدل چلتے رہے۔ بازار میں ہم تماشا بن گئے تھے۔ راہ گیر ٹھہر ٹھہر کے ہمارا گزرتا قافلہ دیکھتے اور کانا پھوسی کرنے لگتے۔ بعض راہ گیروں نے بڑھ کے اپنے شناسا اڈے کے آدمیوں کو مبارک باد بھی دی۔ آمنے سامنے' دائیں بائیں ہر طرف لوگ جمع ہونے لگے۔ کھڑکیوں اور چھتوں پر عورتوں اور بچوں کے چہرے نظر آنے لگے تھے اور اطراف میں دبا دبا شور گونجنے لگا تھا۔ بٹھل اور میں سامنے پڑنے والے پہلے تانگے میں بیٹھ گئے۔ وہ سارے ہمارے پیچھے آنا چاہتے تھے لیکن بٹھل نے استاد سلامی کو اڈے جا کے حلیے درست کرنے کی تلقین کی اور کہا کہ پولیس دوبارہ آئے تو اڈے کا کوئی آدمی اپنے تکدر کا اظہار نہ کرے اور نہ شہر میں گزشتہ رات کو توالی کی روداد کا چرچا کرے۔ بہتر ہے' وہ سب اڈے پر جمے رہیں اور آرام کریں اور شہر میں غیر ضروری گشت سردست ملتوی کردیں۔ کسی مشورے کے لیے سلامی کسی وقت بھی بٹھل کے پاس حویلی آسکتا ہے ورنہ آج شام یا کل صبح' جیسا مناسب ہوا' بٹھل خود اڈے آئے گا۔

کچھ دور وہ ہمارے ساتھ تانگے کے پیچھے چلتے نظر آئے پھر ایک موڑ پر اوجھل ہو گئے۔ پندرہ بیس منٹ کی مسافت کے بعد حویلی آگئی۔ تمام راستے اور خصوصاً حویلی کے اردگرد پولیس تعینات تھی۔ مما اور اس کا بھتیجا گلو چبوترے پر پہرا دے رہے تھے۔ مما کے کندھے پر دو نالی بندوق لٹکی ہوئی تھی۔ ہمارا تانگا دیکھتے ہی دونوں میں تلاطم سا اٹھا۔ ان کے چہروں پر کوندتی تابانی دیدنی تھی۔ مما' بٹھل کا بہت لحاظ کرتا تھا' تیزی سے چبوترے کی سیڑھیاں اتر کے وہ بٹھل سے لپٹ گیا۔

دھوپ اپنی انتہا پر تھی لیکن تپش برائے نام تھی۔ ارشد' تنویر اور جہانگیر یقیناً ڈیوڑھی ہی میں موجود تھے کہ ہماری آوازیں سن کے تقریباً بھاگتے ہوئے باہر نمودار ہوئے اور جیسے ہم کوئی عجوبہ ہوں' پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہماری شکلیں دیکھنے لگے۔ لمحے بھر سکتے جیسے ایک عالم کے بعد انہوں نے خود کو سنبھال لیا۔ ان کے دیدوں میں روشنیاں سی جھلملانے لگیں۔

صاف نظر آرہا تھا' ان کے سینوں میں بہت سے سوال دھڑک رہے ہیں لیکن کسی استفسار میں پاسِ ادب ملحوظ ہے۔ باہمی مفاہمت کے لیے یہی ایک طور کارگر ہے اور وہی بات۔ وہ سوال ہی کیوں کیے جائیں جن میں مسئول کی گراں باری کا شائبہ ہو۔ سوالوں کا تو یہ ہے' آدمی کبھی خود کو بھی ٹھیک سے جواب نہیں دے پاتا تو دوسرے کو کیا مطمئن کرسکتا ہے۔ سوال آسان' جواب مشکل ہوتے ہیں۔ بہت سے سوال صرف سوال ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔ بہت سے سوال خوابوں کے مانند ہوتے ہیں اور شرمندہ جواب نہیں ہوپاتے۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ مضطرب ارشد' تنویر اور جہانگیر کو اپنی جلو میں لیے ہوئے ہم اندر چلے آئے۔

زریں' خانم' نیساں اور زہرہ خاص دروازے کے پہلو میں واقع بیٹھک میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہاں ان کی موجودگی کی ایک یہی وجہ ہوسکتی تھی کہ حویلی سے باہر کی دنیا سے قریب رہیں۔ ہماری آہٹوں پر ان کے کان لگے رہیں۔ مطلب کی آمد رات کو متوقع ہو' طلب گار صبح سے انتظار کی اذیت سے کیوں دوچار ہوتے ہیں؟ اور ہماری واپسی کا تو کوئی وقت ہی طے نہیں تھا اور یہ فاصلوں کا گمان بھی خوب ہے۔ فاصلوں کی کمی وبیشی سے کسی کی طلب یا کسی کی یاد کی شدت

کہاں متاثر ہوتی ہے؟ کوئی دیوار کے پار ہو یا سمندروں کی دوری پر' دوری تو ایک ہی ہے۔ دسترس کی دوری سب سے بڑی دوری ہے۔ ارشد' تنویر اور جہانگیر کی ڈیوڑھی میں اور خانم' زریں' نیساں اور زہرہ کی بیٹھک میں نشست میں ایک ہی سلسلے کی کڑی معلوم ہوتی تھی۔ صبح حویلی میں پولیس کی آمد اور ہمیں ساتھ لے جانے کے معاملے کو مما نے کتنا ہی چبا چبا کے بیان کیا ہو' یہ تو سننے والے پر موقوف ہے' اسے لفظوں کی شکنیں درست کرنے اور گرہیں نکالنے کی کتنی مہارت ہے۔ ان سب کی ہوش مندی میں کیا کلام تھا۔ حویلی میں آنے جانے والے ملازمین سے انہیں کل شام ہی معلوم ہوجانا چاہیے کہ حویلی کو چاروں طرف سے پولیس نے گھیرے میں لے لیا ہے اور شہر میں جگہ جگہ اس کے دستے ڈیرا جمائے ہوئے ہیں اور اس کی وجہ بھی ذہن نشین کردی گئی ہوگی کہ شہر سے کچھ دور ٹھاکر بستی میں کیسا خوں ریز واقعہ ہوچکا ہے۔ ارشد اور تنویر حویلی میں قید نہیں رہتے تھے۔ باہر جانے کتنے لوگوں سے ان کے مراسم رسمی نوعیت سے تجاوز کرگئے ہوں گے۔ آدمی کتنا ہی خلوت نشیں' محتاط اور مردم بیزار ہو' نئی جگہوں پر دوسرا دن اس کے لیے ایسا اجنبی نہیں رہتا۔ ارشد اور تنویر کو تو فیض آباد میں بسے ہوئے وقت گزر چکا تھا۔ بیٹھک میں موجود زریں' خانم' نیساں اور زہرہ کے لالہ رنگ رخساروں پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ بٹھل نے جاتے ہی دستر خوان آرائی کی فرمائش کی۔ دو بج چکے تھے۔ کھانا کھانے کا جواز بھی تھا' بٹھل کو توضیح و توجیہ کی عادت نہیں تھی لیکن ان کے کسی سوال سے پہلے اس نے ازخود واضح کیا کہ پولیس کسی غلط فہمی میں انہیں کوتوالی لے گئی تھی۔ پولیس کو جب یقین آگیا کہ ہم لوگ تو کئی دن سے فیض آباد سے باہر نہیں نکلے' معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ نیساں اور زہرہ کو اس کے سامنے لب کشائی کی توفیق نہیں تھی۔ زریں اور خانم نے خاموشی شعار کی۔ نیازمندی کا یہی شیوہ ہونا چاہیے کہ جو کچھ کہا جارہا ہے' جوں کا توں تسلیم کرلیا جائے اور اپنے مربی و محسن کو جواب دہی کا آزار نہ دیا جائے۔ ان کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں لیکن آنسو انہوں نے آنکھوں ہی میں جذب کرلیے اور وہاں سے منتشر ہوگئیں۔

میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ مجھے تو ایسا لگ رہا تھا' ایک پہر نہیں' جیسے صبح حویلی سے جانے اور دوپہر واپس آنے میں کئی دن' کئی مہینے گزر چکے ہیں۔ میں نے کمرا بند کرلیا۔ میں کچھ دیر اپنے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ مجھے بھی تو بہت سے جواب مطلوب تھے۔ وہ تو بٹھل کی زبان سے ایک کلمۂ خیر سن کے چلی گئی تھیں لیکن میں نیازمندی کے اس درجے پر فائز نہیں تھا جہاں تسلیم و رضا کے سوا کوئی چارہ نہ ہو۔ ان کے لیے ایک پہر بعد ہماری واپسی ہی مژدہ جاں فزا تھی۔ انہیں کیا معلوم تھا' یہ ایک پہر ہم نے کیسا گن گن کے' کیسا کانٹوں پر بتایا ہے۔

مجھے کسی طور قرار نہیں تھا۔ میں نے بستر پر جسم پھیلا کے' آنکھیں موند کے گہری گہری سانسیں بھرنے کی مشق کی۔ کہتے ہیں' جسم و جاں پر چھائی دھند سے نجات کے لیے آمودہ کاروں کا یہ حربہ خاصا مجرب ہے مگر درون خانہ ہی زہر پھیلا ہوا ہو۔ بٹھل اور میں اپنے بے دریدہ چہرے اور بے شکستہ لباس کے ساتھ واپس آگئے تھے۔ پولیس ہمیں کوتوالی میں روک سکتی تھی۔ بہرحال اب ہم بہ ہمہ وجود اپنے گھر میں تھے' اپنے در و بام' اپنے لوگوں کے درمیان۔ ہماری خلوت گاہیں ہمارے ارادے سے قریب تھیں۔ ہمیں اپنا اختیار واپس مل چکا تھا لیکن یہ تو بٹھل ہی جانتا تھا کہ اس اختیار کی نوعیت کس قدر عارضی یا دائمی ہے۔ اس نے پولیس کو قائل کردیا تھا کہ ٹھاکر بستی میں ٹھاکروں اور ان کے حواریوں کو نیست و نابود کرنے والے اس کے اشاروں کے تابع نہیں تھے' دوسرے لفظوں میں وہ کوئی اور مہم جو' غیرت مند' حمیت پسند' ٹھاکروں کے زخم زدہ' ستم دیدہ یا ٹھاکروں کے ہم پلہ و ہم رتبہ رقیب تھے۔ بٹھل نے بہ ظاہر پولیس افسروں کو باور کرا دیا تھا کہ ٹھاکر بستی میں پیش آنے والے واقعے کی رات ہمارے بالا خانے کا رخ کرتے اور دیر تک رقص و سرود کی محفل میں قیام کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور اس سے پہلے شام کو بازار میں خریداری اور چائے خانے میں چائے نوشی' اسپتال میں جاں بلب لکشمی داس کی عیادت' ہریا اور پھو کی موت پر دہائی دینے اور مجرموں کے تعاقب میں پولیس کی بے حسی کا ماتم کرنے اور بطور حفظ ماتقدم اڈے پر پولیس کی نگہداری کے مطالبے کے لیے تھانے میں حاضری کے مشاغل بھی غیر شعوری اور غیر ارادی تھے۔ یہ تو میں جانتا ہوں اور پولیس افسر رما نے بھی حیرت کا اظہار کیا تھا کہ فیض آباد آمد کے اتنے دن گزر جانے کے بعد بٹھل کو ایکایک مجھے حویلی سے اڈے طلب کرنے کا خیال کیوں آیا۔ اسی دن کیوں' ایک دن پہلے اور ایک دن بعد کیوں نہیں؟ مجھے اسپتال اور تھانے میں ساتھ لے جانے' رات کو مجرے کی محفل میں شریک رکھنے' باقی رات اڈے پر گزارنے اور صبح سورج چڑھ آنے کے بعد حویلی واپس ہونے میں کیا مصلحت تھی یا یہ بھی محض اتفاق تھا؟ صرف اسی شام اور خاص اسی

رات' ٹھاکر بستی کی واردات کے عرصے میں میری ہمراہی کی ضرورت کیوں پیش آگئی تھی؟ اور ایک رات کے لیے کلکتے سے جامو کی فیض آباد آمد کا بھی اس سارے فسانے سے کوئی تعلق نہیں ہے؟

یہ سارے اتفاقات کیسے غیر یقینی اور عجیب و غریب ہیں' ایک ساتھ اتنے اتفاقات! یہی بہتر تھا کہ میں خود کو کسی بد ترین نتیجے کے لیے آمادہ رکھوں۔ آدمی بد ترین کے لیے ہمہ وقت کمربستہ رہے تو آنے والی ابتلا کی شدت کم ہوجاتی ہے۔ بٹھل نے کوتوالی میں اپنے جتن تمام کیے ہیں۔ رائیگاں گئے تو کیا ہوگا؟ زیادہ سے زیادہ کیا ہوسکتا ہی؟ جو ہوگا' اس سے مفر کی صورت بھی وہی باراں دیدہ بٹھل جانتا ہوگا اور... اور مفر کی ایک صورت یہ بھی تو ہے کہ میں یہاں سے نکل بھاگوں کہ میرا تعلق تو کسی معاملے سے نہیں ہے۔ میں تو تماشا دیکھنے والوں میں بھی شامل نہیں تھا۔ میرے وجود میں حقارت کی کوئی لہر سی اٹھی۔ سارا جسم جیسے غلاظت میں لتھڑ گیا ہو۔ میں آدمی سے کچھ اور بن گیا ہوں۔ دوسرے کو نہیں' آدمی کو سب سے زیادہ مشکل خود کو قابو میں رکھنے کی ہوتی ہے۔ آدمی کتنے ہی ہاتھ پاؤں باندھ کے رکھے' دل و دماغ کے آگے بے بس ہے اور دل بھی کیا' آدمی سر بہ سر' سرتاپا دماغ ہی ہے۔ نیکی دماغ' بدی دماغ ہے' دماغ ہی بہکتا' بھٹکتا رہتا ہے۔ یہ دماغ کوئی عجائب خانہ ہے۔ کبھی ایسے خیال اور ارادے در آتے ہیں کہ خود پر ہزار نفریں بھیجنے سے بھی بوجھ کم نہیں ہوتا۔ سب سے بڑی ذلت خود اپنی نظروں میں رسوا ہوجانا ہے اور آدمی خود کو کس طرح معاف کرے۔ ایسے رکیک اور مذموم خیال پر مجھے خود کو طمانچے مارنا یا کہیں ڈوب مرنا چاہیے۔ اگر سب کچھ اسی ترتیب سے واقع ہوا جس پر پولیس افسر دربا اصرار کررہا تھا تو بٹھل نے پرسوں شام اڈے کے آدمیوں کو حویلی بھیج کے مجھے اڈے طلب کرنے اور مسلسل اپنے ساتھ رکھنے میں کیسی ایک سپر فراہم کی۔ اسے کس درجے کا مربیانہ سلوک کہنا چاہیے۔ پولیس تو ہر حال میں میری بھی جستجو کرتی اور واردات کی رات' میں حویلی میں اپنی موجودگی اور کسی معاملے سے لاتعلقی کی شہادتیں کس کس طور سے پیش کرتا اور وہ میری بات پر کس قدر یقین کرتے۔ اس سارے فسانے کی ابتدا تو مجھی سے ہوئی تھی' ہریا اور لاکھو کے بیچ میں دیوار بن جانے اور نقشہ پلٹ جانے سے۔ پولیس' استاد بٹھل کے "سائے" سے ایسی بے نیاز کیوں رہ سکتی تھی اور رہتی بھی تو کیا بٹھل کو تنہا پولیس کے نرغے میں جاتا دیکھ کے میں سرنہواڑے بیٹھا رہتا۔ جو بٹھل کا نوشتہ ہے' وہی میرا ہونا چاہیے' میری زنجیر تو اس سے بندھی ہوئی ہے۔

یہ کوئی خوف ہے؟ میں اپنی رگوں سے چمٹے ہوئے کسی خوف' احساس زیاں کی نشان دہی کے لیے اپنے آپ میں بھٹکتا رہا۔ یہ کاہے کے اندیشے مجھے بے آرام کیے ہوئے ہیں۔ کہیں میری وحشت زدگی کا سبب یہ تو نہیں کہ اس بار اس پیچیدہ معاملے میں الجھ کر کب گلو خلاصی ہو اور ہو بھی یا نہیں۔ یوں میرا تو سب کچھ تمام ہوجائے گا۔ سفر میں اسے کھوجنے کی ایک تشفی تو رہتی ہے۔ سمتوں کی خاک چھانی ہے' سمتوں کی خاک چھانے بغیر وہ کیسے مل سکتی ہے۔ چار سمتوں کے تو صرف نام ہیں' جدھر نگاہ اٹھے' وہی سمت ہے۔ دیر ہوجانے کی ایک ہیبت ہر لمحے میرا سینہ کھرچتی رہتی ہے۔ اب اور کب تک' کتنے عرصے تک وہ میرا انتظار کرے گی۔ انتظار' استطاعت سے سوا نہیں ہونا چاہیے اور مولوی صاحب بھی ایک دن کسی نواب ثروت یا حافظ عبدالخالق کے سامنے پسپا ہوجائیں گے۔ ایک راستہ میری طرف بھی آتا ہے اور وہ اس راستے کا رخ کرنا چاہتے تو میں کتنی دور تھا۔ منزلیں ارادے کی دوری پر ہوتی ہیں۔ انہوں نے میری حیثیت متعین کرلی ہے' جرم و سزا کی نوعیت کا اچھی طرح علم ہوجانے کے باوجود میں ان کی نظر میں ایک سزا یافتہ' عدالت کی طرف سے تسلیم کیا ہوا قاتل ہی ٹھہرا ہوں۔ حیرت ہے' اتنا وقت گزر جانے کے بعد ان جیسے جہاں دیدہ' صاحب نظر کو اس حقیقت کا عرفان کیوں نہ ہوسکا کہ کورا کی تو ایک ہی منزل ہے مگر مولوی صاحب کا واسطہ بیشتر لفظوں اور کتابوں سے رہا ہے۔ کچھ ماورائے علم' ماورائے بیاں بھی ہوتا ہے۔ وہ یہ باتیں کیا جانیں۔ کوئی ایک شخص ہی کسی کی منزل ہوتا ہے۔ نہ دولت نہ طاقت' کسی کے لیے کوئی ایک شخص ہی کل کائنات ہوتا ہے۔ وہ حاصل نہ ہو تو آدمی کا ہونا نہ ہونا بس ایک گمان ہے۔ مولوی صاحب یقیناً کورا کے لیے کسی محفوظ پناہ گاہ کے بارے میں بھی سوچتے ہوں گے۔ آدمی کا کیا یقین ہے۔ پل میں خاک ہوجاتا ہے۔ یہاں کون جاودانی زندگی کے لیے آتا ہے۔ اپنے بعد کا بھی سوچا ہوگا انہوں نے۔ نواب ثروت اور حافظ عبدالخالق کی پناہ گاہیں ان کے لیے بہت مضبوط اور محفوظ تھیں اور کتنے اس کے طلب گار' سایہ دار لوگ انہیں مختلف جگہوں پر ملے ہوں گے۔ کہیں ہامی نہ بھرنے کی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ انہیں معلوم ہوگا' کورا نے اب تک خود کو ترک نہیں کیا ہے۔ مولوی صاحب نے نواب ثروت یا کسی حافظ عبدالخالق جیسے صاحب اعتبار کی دہلیز پر

ٹک جانے کا قصد کرلیا تو کورا کے لیے وہ آخری دن ہوگا۔ انہیں توقع ہوگی کہ ایک دن بالآخر کورا مایوس ہوجائے گی اور اپنا ارادہ ان کے حوالے کردے گی۔ مجبوری کی بات دوسری ہے' عمداً وہ اسے میری تلاش میں اپنی تگ و دو کا تاثر دینے کے لیے جگہیں بدلتے رہتے ہیں۔ کچھ اسی طرح وہ اسے اب تک مطمئن رکھے ہوئے ہیں۔

میرے جیل جانے کے بعد انہوں نے میری سزا کے بارے میں جانے اسے کیا باور کرایا ہو۔ سات سال' دس سال یا چودہ سال۔ وہ اسے میری موت کی اطلاع بھی دے سکتے تھے۔ تصدیق کے لیے وہ کہاں جاتی لیکن مولوی صاحب کو اس خبر کے نتائج کا اچھی طرح احساس ہوگا۔ وہ تو مجھے موت کی سزا ہوجانے کی خبر بھی لازماً اس سے چھپاتے۔ انہوں نے اسے میری سزا کی مدت صحیح بتائی ہے تو سال گزر جانے کے بعد کورا کو ان سے میرے گھر گیا شہر چلنے کے لیے اصرار کرنا چاہیے۔ کورا کو میرے محلے اور گھر کا پتا خوب یاد ہوگا۔ کیا کہا جاسکتا ہے' مولوی صاحب نے اسے گیا کے سفر سے باز رکھنے کے لیے کیسے کیسے عذر تراشے ہوں اور اس کی دل جوئی کے لیے بادل ناخواستہ گیا کا سفر کیا بھی ہو تو وہاں پہنچ کے اسے میرے گھر سے دور رکھنے کی کیا تدبیریں کی ہوں۔ گیا پہنچ کے انہیں ملتا بھی کیا' سارا گھر ہی اجڑ گیا تھا۔ امی جان کے رخصت ہوجانے کے بعد ابا جان نے اپنا شہر' عزیز و اقارب' کاروبار سبھی کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ مولوی صاحب کو وہاں کیا حاصل ہوتا۔ چند محلے دار اور اعزا سے ان کی ملاقات ہوتی بھی تو کیا فرق پڑتا۔ رہائی کے بعد میں نے بھی وہاں کا رخ کیا تھا۔ ابا جان کسی کو کچھ بتا کے ہی نہیں گئے تھے اگر واقعی کورا کی ضد پر مولوی صاحب گیا جانے پر مجبور ہوگئے ہوں تو انہوں نے کورا کو کہیں ٹھہرا کے پہلے خود ہمارے محلے میں جاکے سیدھے ہمارے گھر پر دستک دینے کے بجائے ارد گرد سے سن گن لینے اور آس پاس کی صورت حال کا اندازہ لگانے کی احتیاط کی ہوگی پھر یہ تسلی کرکے وہاں اب کوئی نہیں' کچھ بھی نہیں' وہ بعد میں کورا کے اطمینان کے لیے اسے بھی ساتھ لے گئے ہوں۔ یہی کچھ ہوا ہوگا۔

کوئی آس' کوئی امید' کوئی یقین ہی کورا کے لیے نشاط روح ہے جس دن یہ آس' یہ امید ٹوٹ گئی' میری بازیابی کا یقین اٹھ گیا' مولوی صاحب اسے کھو دیں گے مگر کب تک۔ کب تک وہ اسے آنے والی بدلی ہوئی کل کی بشارت دیتے رہیں گے۔ ایک یہی ہول تو میرے دل میں بار بار اٹھتا ہے کہ کہیں دیر نہ ہوجائے۔ مجھے تو کوئی لمحہ ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے تو اندھیروں' آندھیوں میں رات دن چلتے رہنا چاہیے۔ یوں ہاتھ پیر توڑے گھر بیٹھے رہنے سے تو کچھ نہیں ہوگا۔ اس کے پاس میرے جلد پہنچ جانے سے اس کی زندگی مشروط ہے۔ اس کے پسپا ہوجانے سے مراد نواب ثروت یا حافظ عبدالخالق کی چوکھٹ پر اپنے آپ سے دستبردار ہوجانا نہیں ہے۔ اس کے پسپا ہوجانے سے مراد خود کو تمام کردینا ہے اور مولوی صاحب کے اعصاب جواب دے گئے تو... پھر کیا ہوگا؟ پھر وہ کہاں جائے گی؟ اس کے پاس کون سا راستہ ہوگا؟ اور مجھے مجھے...

میری سانسیں الجھنے لگیں جیسے کسی نے مجھے کہنی ماری یا چٹکی بھری ہو' میں بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ جیسے کسی نے مجھ سے کہا' میں یہ کیوں سمجھتا ہوں کہ ایک روز اس کی امید ٹوٹ گئی تو اس دن وہ... وہ موجود نہیں رہے گی۔ مجھے تو ہر حال میں اس کی سلامتی مقدم ہونی چاہیے۔ میری یہ خواہش ایک طرح کی خود غرضی اور کس قدر ستم ظریفانہ ہے کہ میں اس سے انتہا درجے کی تاب استقامت چاہتا ہوں۔ آدمی اپنے بس سے زیادہ کیا کرسکتا ہے۔ وہ ایک ہوش مند لڑکی ہے۔ بے شک ایک شخص کا ایک شخص سے بے ربط ضبط کبھی عقل و ہوش سے سوا ہوجاتا ہے' دونوں بے اختیار ہوجاتے ہیں لیکن یہ جنون نہیں ہے۔ یہ زندگی سے بالاتر نہیں ہونا چاہیے۔ زندگی ہے تو سب کچھ ہے۔ اسے بہت طور قائم رہنا چاہیے۔ میرے ملنے نہ ملنے کی شرط کے بغیر اور یہی بہتر ہے' کوئی ایسا ویسا فیصلہ کرنے کے بجائے وہ اپنے آپ کو مولوی صاحب کی مرضی و منشا کے سپرد کردے۔ اس نے بہت حوصلہ کیا' بہت میری راہ دیکھی' بہت دعائیں کی ہوں گی اس نے۔ وہ تو ہر لمحے ایک ہی دعا کرتی ہوگی۔ کہتے ہیں' دعاؤں کی قبولیت کی گھڑی ہوتی ہے۔ زندگی گزر جاتی ہے اور کسی کے لیے وہ گھڑی نہیں آتی۔ معلوم نہیں' یہ سب کیا ہے؟ ایسا کیوں ہوجاتا ہے؟ یہ کیسا امتحان ہے؟ دو آدمی ایک دوسرے کے طلب گار ہیں۔ اس میں کیا مصلحت ہے کہ وہ ایک دوسرے سے جدا رہیں۔ بس وہ باقی رہے' میرا کیا ہے۔ اتنا وقت اس کے بغیر گزارا ہے' اور گزر جائے گا اور نہ بھی گزرے تو کیا ہے۔ قسمت کی بات ہے تو کوئی کیا کرسکتا ہے۔ مجھے تو آخری دم تک یا اس کے نظر آجانے تک سمتوں سمتوں چلتے رہنا ہے اور مجھے تو یہی دعا کرنی چاہیے کہ وہ شکستہ خاطری' مجھ سے دور رہنے' میرے نہ ملنے کی محرومی کے باوجود اپنے آپ کو قائم رکھے۔ میرے لیے یہی بہت ہونا چاہیے۔ وہ جسمانی طور پر مجھ سے کتنی ہی جدا رہی ہو' وہ تو میری سانسوں

میں موجود ہے۔ اس کی خوشبو میرے سینے میں بسی ہوئی ہے۔ میرے کانوں میں اس کی آہٹیں سرسراتی رہتی ہیں۔ وہ تو ہر پل میرے ساتھ رہتی ہے اور ساتھ رہے گی۔ میری تو یہی متاع ہے۔ مجھے اس کی سلامتی کے عوض اسی کو غنیمت جاننا چاہیے۔ میری عمر بھی اسے لگ جائے۔

مجھے کچھ نہیں معلوم' یہ جاننے کے بعد کہ وہ نواب ثروت یا حافظ عبدالخالق جیسے آسودہ خانوادوں سے وابستہ ہو چکی ہے' میرا کیا حال ہوگا۔ میرا جو بھی حال ہو' یہ کیا کم ہے کہ وہ سلامت ہے' وہ امان میں ہے۔ گو ایسی کسی جگہ اس کا حال بھی کیا مختلف ہوگا۔ جانے کتنے لوگ اپنے محسنوں' عزیزوں کے لیے اپنی ذات کی نفی کر دیتے ہیں۔ مولوی صاحب کی خوشنودی کے لیے وہ بھی ایک دن شاید خود کو نذر کر دے لیکن پھر وہ کہاں رہے گی۔ وہ اپنے لیے کتنی زندہ ہوگی۔ آدمی اپنا تو اپنے ارادے سے ہوتا ہے۔ اس کا نام' اس کا چہرہ وہی رہتا ہے' رفتار گفتار بھی وہی مگر بس ایک گمان' ایک قیاس' جانے کتنے لوگ' چلتے پھرتے' زندگی میں شامل' کوئی نہیں جانتا کہ وہ کتنے زندہ ہیں' کتنے نہیں۔ ان کی زندگی کتنی اپنی ہے' کتنی پرائی۔ مولوی صاحب' کورا کے لیے بڑے محترم و محبوب ہوں گے۔ وہ نہ ہوتے تو وہ کہاں ہوتی۔ دریائے ہگلی کے کنارے دو خون کرنے کے جرم میں جب پولیس نے مجھے گرفتار کر لیا تھا' مولوی صاحب اسے بچا لے گئے ورنہ وہ اسی رات ہگلی میں ڈوب جاتی۔ یہ مولوی صاحب ہی تھے جنہوں نے خود کو اس کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس کی نظروں میں مولوی صاحب کا کیا مقام' کیسا درجہ ہوگا۔ تمام مراتب ان پر تمام ہیں۔ ان کا وجود اس کے لیے سائے اور ستون کی حیثیت رکھتا ہے۔ جیسلمیر میں جب مولوی صاحب منیر علی کے پاس رہتے تھے' زہرہ' کورا سے خاصی مانوس ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ مولوی صاحب کورا کو شہزادیوں کی طرح رکھتے تھے اور شہزادی جب دیکھو گم صم' مضطرب مضطرب سی رہتی تھی۔ بہت کم کسی سے بات کرتی۔ کسی دن اس کی حالت زیادہ اضطرابی ہوتی تو مولوی صاحب کی پریشانی دیدنی ہوتی تھی۔ زہرہ کہتی تھی' ان دونوں کے درمیان ایک عجب تعلق تھا۔ زہرہ نے انہیں بہت کم ہمکلام ہوتے دیکھا تھا اور دونوں ایک دوسرے کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ مولوی صاحب منتظر رہتے تھے کہ وہ کوئی خواہش کرے لیکن وہ ایک بے نیاز لڑکی تھی۔ نہ آرائش و زیبائش سے اسے کوئی سروکار تھا نہ کہیں آنے جانے اور کھانے پینے سے کوئی ایسی رغبت۔ مولوی صاحب سے کبھی وہ فرمائش کرتی تو کتابوں کی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے' مولوی صاحب نے اسے تعلیم سے اچھی طرح آراستہ کیا ہے۔ وہ ایک عالم کے ساتھ تھی۔ بہت سیکھا ہوگا اس نے مولوی صاحب سے۔ مجھ سے بچھڑتے وقت اس کی عمر ہی کیا تھی' سیکھنے کی عمر تھی۔ تنہائی میں کتابوں سے بڑا رفیق کوئی نہیں ہوتا۔ کچھ کتابوں نے بھی اس کا حوصلہ استوار کیا ہوگا۔ مطالعہ وقت کا بہترین مصرف ہے۔ علم سے زندگی زیادہ سمجھ میں آتی ہے۔ برداشت اور تحمل کی قوت بھی علم فزوں کر دیتا ہے۔ بہرحال کچھ حاصل کرنا' کچھ نہ حاصل کرنے سے بہتر ہے۔ اسی کی طرح مولوی صاحب میرے بھی کیا کم مربی و محسن ہیں۔ وہ کوئی دولت مند جاگیردار آدمی نہیں تھے۔ انہوں نے اپنی ناتوانی اور دربدری کے باوجود کیسا اسے اپنی امان میں رکھا ہے۔ زمانے کی دھوپ اور تیز ہواؤں سے بچا کے۔ اس کی خاطر زندگی ہی بدل دی۔ جانگ قبیلے کے جنونی لوگوں سے آمنا سامنا ہو جانے کا بھی دھڑکا انہیں ہر وقت لگا رہتا ہوگا۔ گیا میں کورا کے اتالیق پر حملے کے وقت کورا بھی زد پر آ جاتی۔ وہ تو اس کی زندگی تھی' اسے بچ نکلنے کا موقع مل گیا۔

جانگ قبیلے کے وحشت زدہ لوگ اس کی جستجو میں ابھی تک سارے ہندوستان میں بھٹک رہے ہوں گے۔ کورا کی بازیابی کی صورت ہی میں انہیں اپنے قبیلے کی متبرک دستاویزات کا سراغ مل سکتا ہے۔ ان کی ملکیت قبیلے کے لیے سعادت ہے۔ ان کے بغیر قبیلہ بدبخت ہے اور سردار ناتواں۔ اس کی حکمرانی عبوری ہے۔ ایسی آسانی سے وہ ان سے دست کش نہیں ہو جائیں گے۔ وہ تو اپنی نسلوں کو یہ فرض منتقل کرتے رہیں گے۔ کون انہیں اس واقعے سے آگاہ کرے کہ ان کے یہ مقدس صحیفے انہیں اب کبھی واپس نہیں مل سکیں گے۔ وہ ... تو کورا جس رات اپنی جان بچا کے ہمارے گھر آئی تھی' ابا جان کی تحویل میں آ گئے تھے۔ میں نے ان کی ورق گردانی نہیں کی تھی' میں سمجھتا بھی کیا۔ ان کی زبان قدیم اور مختلف ہوگی۔ یقیناً وہ میری فہم اور استطاعت سے بالاتر ہوں گے۔ ان میں بدھ نظریے' فلسفے' اقوال و ارشادات ہدایا تو احکام مندرج ہونے چاہئیں اور ان پر کندہ پیچیدہ خطوط اور اشارتی عبارتوں سے ایک مدفون گنج بے بہا کی نشان دہی بھی ہوتی ہوگی۔ ابا جان ایسے ہی ہوش و حواس سے بیگانہ نہیں ہو گئے۔ ابتدا ہی سے وہ ایک نکتہ بیں اور جزرس شخص ہیں۔ جن کاغذات کی وجہ سے تبت کے ایک معتبر عالم کا قتل ہو گیا تھا' ان کی نوعیت اور اہمیت کے بارے میں ابا جان کا متجسس ہو جانا لازم تھا۔ پہلے انہوں نے کاغذات کی

زبان سے آشنائی حاصل کی ہوگی۔ برسوں کی شب و روز ریاضت کے بعد کہیں انہیں لعل و جواہر کے ذخیرے کی موجودگی' محل وقوع سے متعلق اسرار و رموز تک رسائی ہوئی ہوگی۔ جانگ قبیلے کے لوگوں کو مدفون خزانے سے اتنی غرض نہیں ہونی چاہیے جتنی انہیں کاغذات کی یادگاری' تاریخی اور روحانی حیثیت سے ہوگی۔ عقیدت بجائے خود ایک دولت ہے۔ عقیدت کا بینائی سے ایسا تعلق نہیں ہوتا۔ یہ سینے کا معاملہ ہے۔ کاش کورا کا اتالیق تبت سے بھاگتے وقت یہ کاغذات ساتھ نہ لاتا پھر نہ وہ زندگی سے جاتا' نہ کورا کو اپنے قبیلے کے لوگوں کے مسلسل تعاقب کی فکر ہوتی' نہ ابا جان اپنا آبائی شہر چھوڑنے کا فیصلہ کرتے اور شاید امی بھی اس طرح زندگی نہ ہار بیٹھتیں۔ فہمی بھی گھر میں محفوظ ہوتی' بالا خانے تک نہ جاتی۔ ان کاغذات نے ابا جان پر جیسے جادو کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنے آپ کو' اپنے سارے خاندان کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ خاندان میں نوجوان لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ ایک بے اندازہ دولت کی صورت میں اذیت ناک حوادث اور مصائب کی تلافی ہو گئی تھی اور یہ ابا جان ہی بہتر جانتے ہوں گے کہ اس تلافی سے ان کا دل کس قدر مطمئن ہے۔

کہیں کسی جگہ یقیناً جانگ قبیلے کے لوگوں سے مولوی صاحب کا تصادم نہیں ہوا ورنہ مولوی صاحب کو نجات حاصل کرنی مشکل ہو جاتی۔ مولوی صاحب نے کورا کا نام بدل کے نرجس بانو رکھ دیا اور پردہ کرا دیا تھا۔ ان کے پاس رہ کے وہ انہی کے شعائر سیکھ سکتی تھی۔ مولوی صاحب کے ساتھ ایک برقع پوش لڑکی کو دیکھ کے کسی کو بھی شک نہیں ہوتا ہوگا مگر مولوی صاحب اپنی جگہ تو بہت محتاط رہے ہوں گے۔ پھونک پھونک کے اس کے ساتھ سفر کرتے رہے ہوں گے۔ یہ تو یہی ہے' مجھ سے زیادہ اس پر مولوی صاحب کا استحقاق ہے۔ بس وہ ایک بات کیوں نہیں جانتے۔ انہیں ایک بار تو تحقیق کرنی چاہیے تھی کہ جیل جانے کے بعد مجھ پر کیا گزری۔ یہی بات میں نے اور بتھل نے حافظ عبدالخالق سے کہی تھی' سزا ہو جانے کا مطلب میرا مرجانا یا منقلب ہو جانا نہیں ہے۔ مولوی صاحب نے اپنے طور پر یہ کیسے سمجھ لیا کہ اب میں کسی کام کا نہیں رہا ہوں' جیل جانے کے بعد میرا چہرہ' میرا دل سیاہ ہو جائے گا۔ وہاں آدمی صرف چوری چکاری سیکھ سکتا ہے۔ حافظ عبدالخالق نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا تھا مگر ان کا لہجہ نرم پڑ گیا تھا۔ مولوی صاحب کبھی نگریا مرادات واپس آئے تو حافظ صاحب ضرور ان سے میری وکالت کریں گے۔ وہ ایک سلجھے ہوئے' اصول پسند' شریف الطبع شخص نظر آتے تھے۔ ان کی گفتگو سے معلوم ہوتا تھا کہ مولوی صاحب پر ان کا بہت اثر ہے۔

میرا سر گھوم رہا تھا۔ کمرے میں مجھے بہت حبس محسوس ہونے لگا۔ بس یہی ایک تلقین اور تاکید دماغ میں کھبی جاتی تھی کہ ہمیں کسی طرح جلد سے جلد اپنے سفر پر روانہ ہو جانا چاہیے۔ جی یہی کرتا تھا کہ سب کی نظروں سے بچ کر یہاں سے بھاگ نکلوں اور دوسرے لمحے سارا وجود زنجیروں میں جکڑا ہوا لگتا تھا' رواں رواں جیسے بندھا ہوا ہو۔ میں اگر ٹھان لوں تو یہاں سے کسی بھی وقت جا سکتا ہوں۔ کون مجھے روک سکتا ہے لیکن خود میری ایک دیوار تو درمیان میں حائل ہے۔ دروازے کھلے ہوئے ہوں' پروں کو بھی تو تاب پرواز چاہیے۔ میں ایسے کس طرح کہیں جا سکتا ہوں۔ مجھے تو ایسا سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ بتھل نے پولیس افسر ورما سے صاف کہا تھا کہ وہ پولیس کی خاطر جمعی کے لیے مجبوراً ابھی کچھ عرصے فیض آباد میں رہے گا۔ میرے چلے جانے سے بتھل پر نظریں مرکوز ہو جائیں گی اور میرے یوں چلے جانے سے پولیس جانے کیا کیا مفہوم اخذ کرے۔ بتھل تو پھر بہت ناتواں ہو جائے گا۔ مجھے تو اس وقت تک یہیں ٹھہرے رہنا ہے جب تک حویلی پولیس کی نگاہوں کے حصار سے آزاد نہ ہو جائے۔ اصل بات تو اب بھی وہی ہے۔ پولیس نے ہمیں چھوڑ دیا ہے لیکن جیسا کہ بتھل نے خود پولیس افسر ورما سے کہا تھا' اس سے یہ کہاں مراد ہے کہ پولیس نے ہم سے ہاتھ اٹھا لیا ہے۔ آدمی کے متعلقین بھی اس کے وجود کا حصہ ہوتے ہیں۔ آدمی کیا ہے' اپنے منظر و پس منظر کا شیرازہ۔ بتھل کے علاوہ یہاں زریں ہے' نیساں' خانم' جہانگیر' منیر علی کا خاندان' فروزاں یاسمین اور نصیر بابا ہیں۔ میرے اس طرح روپوش ہو جانے سے وہ دل گرفتہ تو اور آزردہ ہو جائیں گے۔ سب کو بتا کے جانے کی بات ہی دوسری ہوتی ہے۔

میں اپنے کمرے سے نکل آیا۔ بیتے ہوئے کے اعادہ و تکرار سے ذہن بہت پریشان ہوتا ہے لیکن اس بازگشت سے کچھ سکون بھی ملتا ہے کہ آدمی کا رشتہ اپنے آپ سے قائم ہے۔ وہ اپنے آپ کو بھولا نہیں ہے۔ ابھی دن خوب روشن تھا۔ سب سے پہلے نیساں مجھے دکھائی دی۔ وہ میری طرف ہی آ رہی تھی' مجھے کھانے پر بلانے کے لیے۔ اچھا ہوا جو میں خود باہر آ گیا۔ بیٹھک سے متصل بڑے کمرے میں یہاں سے وہاں تک دسترخوان سجا ہوا تھا۔ آج ناشتے میں اتنی فراوانی اور گوناگونی نہیں تھی۔ انہیں وقت ہی کتنا ملا تھا۔ یہ سن کے کہ

ہمیں صبح صبح پولیس لے گئی ہے۔ ان کا عالم بھی عجیب رہا ہوگا۔ انہیں شاید اتنی جلد' صرف ایک پہر بعد ہماری واپسی کی توقع بھی نہ ہو۔ جانے کیوں اب مجھ پر ایسا بار نہیں تھا۔ غالباً اس لیے کہ مجھے اپنا بکھرا ہوا سمیٹنے' الجھا ہوا سلجھانے اور کسی گوشے میں محفوظ کرنے کا وقت مل گیا تھا۔ کسی نتیجے پر پہنچنے اور اپنی بے دست و پائی کے احساس سے بھی آدمی کو قرار آجاتا ہے۔ سامنے جو دنیا پڑی ہوئی تھی۔ اسے پھلا نگنا میری استطاعت سے باہر تھا۔ ناتوانی' قناعت پر آمادہ کرتی ہے۔ بٹھل بھی وہاں موجود تھا اور تقریباً سبھی۔ ارشد اور تنویر مجھے اپنے پاس بٹھانے کے لیے ادھر ادھر سمٹ گئے۔ میرے انتظار میں وہ ہاتھ روکے بیٹھے تھے۔ زریں' خانم' نیساں اور یاسمین لپکتے جھپکتے گرم گرم کھانوں کے ڈونگے لاتی رہیں پھر اطمینان سے بیٹھ گئیں۔ یہ سارے لوگ ایک دستر خوان پر جمع ہوجاتے تو اچھا خاصا کسی دعوت کا منظر ہوجاتا تھا۔ میں نے نگاہ اٹھا کے دیکھا' سب کے چہروں پر بادل سے چھائے ہوئے تھے اور لگتا تھا' وہ گویا کھانے کی رسم ادائی کے لیے وہاں اکٹھے ہوگئے ہیں۔ کھانے کے لیے خلوئے معدہ سے زیادہ خلوئے دماغ ضروری ہے۔ بٹھل نے کچھ کھانوں کی تعریف' کچھ نئے کھانوں کی فرمائش کے تذکروں سے تکدر دور کرنے اور یہ جتانے کی کوشش کی کہ باقی سب خیریت ہے۔ مجھے فروزاں اور یاسمن کا خیال آتا تھا۔ یہاں آتے ہی حویلی کے اردگرد پولیس کی موجودگی' حویلی کے دروازے پر پولیس کے آنے اور ہمیں ساتھ لے جانے کی سرگوشیوں کی بھنک سے ان کے دل بھی بہت دھڑکے ہوں گے۔ ان کے چہروں پر گہری سنجیدگی طاری تھی' البتہ وحشت نہیں۔ آس پاس غم گساروں کی کثرت ہو تو وحشت یوں بھی کم ہوجاتی ہے۔

کھانے کے بعد وہ بیٹھک میں آکے بیٹھ گئے اور بٹھل اپنی خاص جگہ پر گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز ہو کے حقہ کشی کرنے لگا اور اس نے جہانگیر سے پیچیں منگوائی۔ ارشد اور تنویر بھی شامل ہوگئے۔ ان کے مصروف ہوجانے پر مجھے باہر جانے کا موقع مل گیا۔ ڈیوڑھی میں مما سے معلوم ہوا کہ صبح دس بجے کے قریب شہر کا بڑا وکیل رام پرساد بھارگو زریں سے ملنے آیا تھا۔ اس نے کاغذات پر زریں سے دستخط کرائے اور بہ عجلت روانہ ہوگیا۔ زریں اور وکیل کے درمیان ہونے والی گفتگو کا مما کو علم نہیں تھا۔ یقیناً وہ ضمانت کے کاغذات ہی ہوسکتے ہیں۔ وکیل کو عدالتی کارروائی میں دیر لگ گئی جو وہ ہماری موجودگی میں کوتوالی نہ آسکا۔ میرے پوچھنے پر مما نے بتایا کہ حویلی سے کوئی ہرکارہ وکیل کو صورت حال سے آگاہ کرنے یا بلانے کے لیے نہیں گیا تھا۔ صاف ظاہر تھا' بٹھل نے یہ انتظامات گزشتہ رات ہی کرلیے ہوں گے۔ اس نے کل رات یا ممکن ہے' کچھ اور پہلے وکیل بھارگو کو آج صبح سویرے سے بلکہ ہمہ وقت حویلی پر نگاہ رکھنے' پولیس کی دخل اندازی کی صورت میں مستعد رہنے کے لیے کسی ذریعے سے کوئی رابطہ کیا ہی ہوگا۔ وکیل از خود تو نہیں آسکتا تھا۔ بٹھل نے حویلی کے محاصرے کی خبر سن کے اور شاید اس سے بھی پہلے سارے امکانات قیاس کرلیے تھے۔ ہوسکتا ہے' اس نے زریں کو بھی پیش آنے والے سانحوں کے لیے حوصلہ قائم رکھنے کی فہمائش کی ہو۔ صبح وکیل کی آمد پر زریں نے خاموشی سے کاغذات پر دستخط کردیے۔ اس آمادگی میں اس کی معاملہ فہمی کے علاوہ بٹھل کی تلقین و تاکید کا بھی دخل ہوگا۔ مما نے مجھے نہیں بتایا کہ وکیل کی آمد پر زریں نے کسی تشویش یا حیرت کا اظہار کیا ہو۔ ادھر کوتوالی میں بٹھل نے پولیس افسر وما کے سامنے یوں ہی ہوا میں تیر نہیں چلایا تھا کہ اس کا وکیل ہم دونوں کے قانونی تحفظ کے لیے بس آیا ہی چاہتا ہوگا۔ وکیل وقت پر نہ پہنچ سکا۔ اس اثنا میں بٹھل نے اپنی وکالت کا فریضہ خود انجام دے لیا تھا لیکن اس کے یہ معنی نہیں نکلتے تھے کہ وکیل کی اب ضرورت نہیں رہی۔ کسی وقت بھی ہمیں اس کی ضرورت پڑسکتی تھی۔

شام کو میں یوں ہی وقت گزاری کے لیے ٹہلتا ہوا بالائی منزل پر واقع لائبریری میں چلا گیا تھا۔ مجھے تازہ رسالوں کی ورق گردانی میں وقت لگ گیا۔ وہاں سے واپسی پر معلوم ہوا کہ وکیل بھارگو بٹھل سے ملنے آیا تھا۔ مجھے ان کے درمیان موجود نہ رہنے کا ملال تھا۔ اس دن اڈے سے کوئی شخص حویلی نہیں آیا۔ بٹھل بھی حویلی میں بند رہا۔ رات کو کھانے کے بعد مما سے گردوپیش کی سن گن لینے کے لیے ایک بار پھر میں نے ڈیوڑھی کا رخ کیا۔ مما کا بھتیجا بھی وہاں موجود تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ سارے شہر میں طرح طرح کی افواہیں پھیلی ہوئی ہیں۔ پولیس نے جانے کتنے لوگ گرفتار کرلیے ہیں۔ کسی بھی مشکوک راہ گیر سے پولیس پوچھ گچھ شروع کردیتی ہے' جو ذرا سی مزاحمت یا حجت کرتا ہے' پولیس والے اسے ساتھ لے جاتے ہیں۔ شہر سے باہر جانے والے راستوں پر پولیس کی نفری میں اور اضافہ کردیا گیا ہے۔ سنا ہے' بارہ بنکی سے پولیس کے دستے بلوائے گئے ہیں۔ شام کو دکانیں بند ہوگئی تھیں۔ دن بھر شہر میں ہو کا سا عالم رہا ہے۔ اڈے پر بھی پولیس کی بھاری جمعیت ہے لیکن اڈے کے آدمیوں نے خود کو عمارت تک محدود رکھا ہے۔ بٹھل نے دوپہر رخصت

ہوتے وقت انہیں یہی مشورہ دیا تھا۔

کھانے کے بعد بیٹھک میں سبھی موجود تھے۔ میری طرح ہر ایک کو توقع ہوگی کہ بٹھل رات گئے تک ان کے ساتھ بیٹھا رہے گا۔ وہ جلد ہی اٹھ گیا۔ اس کے چلے جانے کے یکے بعد دیگرے سبھی کسمساتے ہوئے اپنے اپنے کمروں کی طرف چلے گئے۔ میں بھی پھر وہاں سے اٹھ گیا۔ جی میں آیا تھا کہ زریں' خانم' نیساں' جہانگیر وغیرہ سے کمرے میں آنے کو کہوں گا مگر اس خیال سے رک گیا کہ وہ ایسے سوالات شروع کردیں جن کا جواب دینا میرے لیے آسان نہ ہو۔ بہت سے جواب مجھے خود نہیں معلوم تھے۔ نیساں اور یاسمن جگ اور گلاس کا طشت رکھنے آئیں تو میں نے انہیں بھی نہیں روکا۔ نیساں نے سر کی مالش کے لیے بھی مجھ سے پوچھا تھا۔ مالش کا تو عذر ہوگا' ان کی چمکتی آنکھوں سے ظاہر تھا کہ دونوں کچھ وقت میرے ساتھ گزارنے کی خواہش مند ہیں۔ میرے انکار پر وہ چپ چاپ چلی گئیں۔ لائبریری سے لائی ہوئی کتابوں اور رسالوں میں بھی جی نہیں لگا تو میں نے آنکھیں موندلیں اور کسی وقت جیسے رسیاں کھل گئیں' نیند بھی ایک طرح کی آزادی ہے' بے اختیار آزادی اور اختیار کے احساس کے بغیر آزادی کیسی۔

دوسرے دن ناشتے کے بعد بٹھل حویلی سے نکل گیا۔ مجھ سے اس نے ساتھ چلنے کو نہیں کہا تھا اور جانے کیوں میں اسے اکیلا جانے نہیں دینا چاہتا تھا لیکن اس نے مجھ سے نہیں کہا تو میں بھی چپ رہا اور اس کی طرف استفہامی نظروں سے دیکھتا رہ گیا۔ مما سے اس نے تانگا منگوایا تھا۔ اڈے کے علاوہ وہ کہاں جاسکتا تھا۔ دوپہر کھانے کے وقت وہ واپس آگیا۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا تو میں نے زیر لبی سے پوچھ ہی لیا "ادھر سب ٹھیک ہے؟"

"ہاں رے۔" اس نے سرسری انداز میں جواب دیا "اینڈ رہے ہیں حرام کے جنے۔"

"سنا ہے' شہر میں ہر طرف پولیس ہے۔" میں نے اپنا اضطراب خود تک محدود رکھنے کی کوشش کی "پولیس بہت دلائی ہوئی ہے۔"

اس کی آنکھیں چڑھ گئیں' گہری سانس لی' کچھ کہنا چاہا اور ہڑبڑا کے رہ گیا۔ وہ کوئی بات ہی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ مجھے کیا سمجھتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے بہت غصہ آتا تھا بلکہ اپنے آپ سے چڑ سی ہونے لگتی تھی۔

رات' کھانا کھانے کے بعد بیٹھک میں جانے کے بجائے میں ڈیوڑھی میں چلا آیا۔ مما کا بھتیجا مجھ سے اب خاصا مانوس ہوچکا تھا۔ ان لوگوں میں اس کا شمار ہوتا تھا جو سوتے میں بھی چپ نہیں رہتے۔ مجھے کریدنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ رواں ہوگیا۔ کہنے لگا' صبح وہ بازار سے حویلی کی طرف آرہا تھا کہ چوراہے پر اسے بٹھل کا تانگا نظر آگیا۔ بٹھل نے اسے بھی ساتھ بٹھالیا۔ راستے سنسان تھے' ہر جگہ راہ گیر کم تھے' پولیس پھیلی ہوئی تھی۔ دو جگہوں پر پولیس مزاحم ہوئی اور فضول قسم کے سوالات شروع کردیے۔ بٹھل نے انہیں اپنی منزل یعنی اڈے' جامو استاد کی چوکی کا پتہ بتایا اور اپنی سکونت کے بارے میں کچھ نہیں چھپایا۔ حویلی کے ذکر پہ سوال کرنے والوں کی بھویں تن گئیں لیکن اس اطمینان کے بعد کہ کل صبح کوتوالی میں بٹھل ہی کو بلایا گیا تھا' انہوں نے مزید کوئی تعرض نہ کیا۔ اڈے سے قریب پولیس کا دستہ زیادہ محتاط تھا۔ انہوں نے بٹھل کو تانگے سے اتارلیا' تلاشی لی۔ بٹھل کی جیب سے چاقو برآمد ہونے پر ان کا پارا چڑھ گیا۔ بٹھل نے ہر سوال کا جواب نرمی سے دیا اور صاف بتا دیا کہ وہ اڈے کا آدمی ہے۔ چاقو تو اس کے لیے جسم کے کسی حصے کی مانند ہے۔ وہ فیض آباد پولیس کے آدمی نہیں معلوم ہوتے تھے۔ کسی بات سے ان کی تسلی نہیں ہوئی۔ چاقو کی موجودگی اور اڈے سے تعلق کے اعتراف نے انہیں اور متوحش کیا۔ تھانے لے جانے کے لیے وہ بٹھل اور مما کے بھتیجے کو تقریباً دھکے دیتے' دھکیلتے ہوئے اڈے کی گلی سے باہر لے آئے' کچھ اس طرح کہ دو پولیس والے دائیں بائیں' دو پیچھے' ایک آگے' پورا گھیرا ڈال کے۔ گھیرے کے ساتھ ان کا افسر چل رہا تھا۔

مما کا بھتیجا کہہ رہا تھا' بٹھل کا ساتھ ہونے کے باوجود اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ اس سے تو ٹھیک طرح چلا بھی نہیں جارہا تھا۔ بازار والی سڑک پر بہت سے راہ گیر یہ منظر دیکھنے کے لیے اپنی اپنی جگہوں پر ٹھہر گئے تھے۔ کسی کو قریب آنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ سڑک کے نکڑ سے فرلانگ بھر کے فاصلے پر گشت کرتی ہوئی فیض آباد پولیس کی دخل اندازی پر کہیں یہ تماشا ختم ہوا۔ پہلے تو ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ انہوں نے جانا' شاید بٹھل کسی نئے جرم کا مرتکب ہوا ہے۔ بٹھل کو ساتھ لانے والے پولیس والوں سے استفسار پر ان کے چہروں کی تندی دور ہوئی۔ مقامی اور غیر مقامی سپاہیوں میں تھوڑی سی تکرار ہوئی۔ بٹھل اس دوران خاموش کھڑا رہا۔ فیض آباد پولیس کے حوالدار نے غالباً اپنے غیر مقامی ساتھیوں کی خوشنودی کے لیے تحکمانہ لہجے میں بٹھل سے بازپرس کرنی چاہی۔ بٹھل نے کہا کہ ان

سوالوں کے جواب وہ پہلے دے چکا ہے۔ حوالدار اپنے ساتھیوں سے پوچھ لے۔ حوالدار نے شہر کی مخدوش حالت میں چاقو ساتھ لے کے چلنے پر سرزنش کی اور کہنے لگا کہ بہتر ہے' وہ ان دنوں خود کو گھر تک محدود رکھے۔ اس نے بٹھل کو متنبہ کیا کہ شہر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کردی گئی ہے' سایوں پر بھی شک کیا جارہا ہے' افسران کا حکم ہے' کسی سے کوئی رعایت نہ کی جائے جو بھی ذرا سا مشکوک نظر آئے' پکڑ کر تھانے لے آئیں۔ بٹھل نے رکھائی سے کہا "سوچا اس کیا' پورا شہر تھانے میں بند کردو۔" حوالدار زچ سا ہوگیا اور بھنا کے بولا کہ وہ تو بٹھل کی بھلائی کی بات کررہا ہے۔ بٹھل کی سمجھ میں نہیں آرہا تو جہنم میں جائے۔ حوالدار بکتا جھکتا غیر مقامی پولیس افسر کو الگ لے گیا اور سرگوشیوں میں جانے کیا کچھ باور کراتا رہا۔ افسر کے اشارے پر سپاہی' بٹھل اور مما کے بھتیجے کے محاصرے سے دستبردار ہوگئے۔ بٹھل نے وہاں سے حرکت نہیں کی اور اپنے چاقو کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ افسر کو چاقو کی واپسی میں کچھ عار تھی لیکن چند لمحوں کے پس و پیش کے بعد اس نے منہ بگاڑتے اور گالیاں بکتے ہوئے چاقو بٹھل کی طرف اچھال دیا۔

یوں بٹھل اڈے تک پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ مما کے بھتیجے کے مطابق' اڈے پر لوگوں کا اژدھام تھا' بٹھل کو دیکھ کے سبھی پاگل ہوگئے۔ ساری عمارت نعروں سے گونج اٹھی۔ ہر شخص بٹھل کی پذیرائی کے لیے مضطرب تھا۔ استاد سلامی نے فوراً حقہ تازہ کرایا۔ مما کا بھتیجا چوکی سے دور بیٹھا تھا اس لیے وہ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو نہ سن سکا۔ دو ڈھائی گھنٹے اڈے پر قیام کے بعد بٹھل وہاں سے اٹھ گیا' اس کی واپسی کے انتظار میں تانگا اڈے کے باہر کھڑا تھا۔ واپسی کے راستے میں بھی ایک جگہ انہیں روکا گیا اور چند سوالات کے بعد آگے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ دوپہر کے وقت سڑکوں پر سناٹا اور بڑھ گیا تھا۔ کل رات بازار کے علاقے میں بالا خانے بھی بند رہے۔

اس رات بھی بٹھل نے بیٹھک میں زیادہ دیر نشست نہیں جمائی۔ حالانکہ کھانے کے بعد تقریباً سبھی بیٹھک میں آچکے تھے اور کسی رگ جگے کے آرزو مند معلوم ہوتے تھے۔ ڈیوڑھی سے اٹھ کے میں بیٹھک میں داخل ہوا تھا کہ بٹھل نے سب کو آرام کرنے کی ہدایت کی۔ نصیر بابا نے اس کا حقہ اس کے کمرے میں پہنچا دیا۔ بیٹھک میں میری موجودگی کی وجہ سے کچھ دیر وہ سارے بیٹھے رہے اور کلبلاتے رہے۔ میرا سر خالی خالی تھا۔ دماغ پر ہجوم بھی خالی پن کا سبب ہوتا ہے۔ ان سبھوں کی حالت بھی کچھ مختلف نظر نہیں آرہی تھی۔ حسن نے بھی محسوس کیا ہوگا کہ حویلی کے مکین اس کی جانب سے خوش امید کی کسی نوید کے طلبگار ہیں۔ ظاہر ہے' گرد و پیش کے گرد و غبار نے ان کے اعصاب بھی شکستہ کیے ہوں گے۔ بٹھل کو زیادہ نہیں تو کچھ دیر ان کی نشاط خاطر کے لیے وہاں بیٹھے رہنا چاہیے تھا لیکن لگتا تھا' بٹھل بھی آنے والے دنوں کے سازگار موسم کی پیش گوئی سے قاصر تھا اور کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتا تھا' آگے جس کی تردید میں سبکی کا امکان ہو۔ بٹھل کی جگہ ان کی دل داری و دل جوئی کا کام میں بھی کرسکتا تھا لیکن میری باتوں سے ان کی ایسی تشفی نہیں ہوتی اور پہلے تو خود مجھے اس تشفی کی ضرورت تھی۔

بٹھل کی پان خوری شوقیہ تھی۔ ہرچند پانوں کی اقسام کے بارے میں اس کی معلومات پان کے عادی کسی شخص سے کم نہیں تھیں' حویلی میں اس کے قیام کے دوران پان دان کا خاص اہتمام ہوتا تھا۔ صبح و شام' ناشتے اور کھانے کے بعد چاندی کے ورق میں ملبوس گلوریاں اس کے سامنے رکھ دی جاتیں۔ الائچی دانے' لکھنؤ کے خاص زردے' زعفران اور طرح طرح کے مسالوں سے بھری چھوٹی چھوٹی منقش بنارسی ڈبیوں سے خاص دان آراستہ کیا جاتا تھا۔ بٹھل کے ہونٹوں پر پان رچتا بھی خوب تھا۔ اس رات معمول کے خلاف سامنے رکھے خاص دان رکھ آنے کی تاکید کی۔ نیساں کے واپس آنے پر زریں کا اضطراب کچھ کم ہوا۔ یہ کام وہ خود بھی کرسکتی تھی مگر اس کے بٹھل کے پاس جانے کی بات اور ہوتی۔ اسے سامنے دیکھ کے بٹھل کو توجہ اس کی طرف مرکوز کرنی پڑتی اور یہ توجہ مزید گراں باری کا سبب ہوسکتی تھی۔ زریں نے یقیناً بٹھل کے چہرے پر کسی قسم کا تکدر بھانپ لیا تھا۔ حسن اور نازکی لازم و ملزوم ہیں۔ وہ بہت شیشہ نفس لڑکی تھی۔ نازکی سے مراد صرف یہ نہیں ہے کہ آدمی آب گینے کے مانند ہے۔ اسے دوسروں کے آب گینے کا احساس بھی اتنا ہی ہونا چاہیے۔ جہانگیر اور نیساں بساط بچھانے کے لیے مچل رہے تھے۔ خانم کا تور دیکھ کے دونوں بجھ سے گئے اور سر جھکائے بیٹھک سے نکل گئے۔ کچھ دیر میں سبھی ایک دوسرے کے پیچھے وہاں سے رخصت ہوگئے۔ میں بھی پھر آہستہ قدمی سے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اپنا ساتھی آدمی کو بہت مرغوب ہوتا ہے لیکن اپنا آپا ہی زہر لگے۔ کبھی اپنے آپ سے دور ہونے کو جی کرتا ہے' اپنا چہرہ دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔

ہمیں کوتوالی میں حاضری دیے تیسرا دن تھا۔ بٹھل بیشتر اپنے کمرے میں بند رہا۔ سرِ شام استاد سلامی کی آمد کی اطلاع پر وہ بیٹھک میں آیا۔ میں ڈیوڑھی میں تھا اس لیے سب سے پہلے میرا اس کا سامنا ہوا پھر میرے ساتھ ہی وہ بیٹھک میں داخل ہوا۔ یوں مجھے اس کے اور بٹھل کے درمیان موجود رہنے کا ایک جواز مل گیا۔ استاد سلامی کے پاس سنانے کے لیے یہی ایک خبر تھی کہ دوپہر کے وقت پولیس کا ایک مسلح دستہ اڈے پر وارد ہوا اور اسے کوتوالی چلنے کا حکم دیا۔ کوتوالی میں جلد ہی اسے ایک مقامی' دو غیر مقامی افسروں کے سامنے پیش کردیا گیا۔ یہ کمرا اس کمرے سے مختلف تھا جہاں تین دن پہلے اڈے کے آدمی لے جائے گئے تھے اور ان کی زبانیں کھلوانے کے لیے طرح طرح کی ایذائیں دی گئی تھیں۔ استاد سلامی سے از سرِ نو وہی سوال کیے گئے جن کے جواب وہ اس روز تفصیل سے دے چکا تھا۔ یہ سوال زیادہ تر بٹھل اور میرے متعلق تھے۔ اس مرتبہ پولیس افسروں کی ترش گفتاری میں پہلے جیسی تیزی نہیں تھی۔ استاد سلامی کے بہ قول اس نے ایک بار پھر صراحت کی کہ استاد بٹھل اڈے کا والی ہے اور محض اڈے کے آدمی قتل و خون کے اتنے بڑے اور منظم واقعے میں ملوث نہیں ہوتے۔ وہ ڈاکو اور نقب زن نہیں ہوتے۔ میرے بارے میں اس نے پولیس افسروں کو بتایا' اڈے اور چاقو سے میرا تعلق بالواسطہ ہے۔ میں اڈے کا آدمی قطعاً نہیں ہوں۔ بٹھل سے ربط خاص کی وجہ سے کچھ کا کچھ سمجھا جاتا ہے۔ بے شک استاد بٹھل کی معیت کی وجہ سے مجھے چاقو' بلم' لاٹھی اور زور آزمائی وغیرہ میں بڑی مہارت حاصل ہے لیکن اڈا گیری اور چاقو بازی میرا مقصود نہیں ہے۔ ضرورت ہی پر میں قدم بڑھاتا ہوں' کسی سے زیادتی ہورہی ہو یا درمیان میں پڑے بغیر کوئی چارہ نہ ہو۔ ہریا کے معاملے میں بھی یہی ہوا تھا۔ ہریا' جامو استاد کے اڈے کا آدمی تھا۔ یہ کس طرح ممکن تھا' جامو استاد کے شریف آباد میں اس کے اڈے کے ایک آدمی پر باہر کا آدمی حاوی آرہا ہو اور استاد باہر کھڑا دیکھتا رہے۔

پولیس نے گھما پھرا کے سوال کرنے اور استاد سلامی کو الجھانے کی کوشش کی۔ استاد سلامی نے ہوش و حواس قائم رکھے۔ اصل صورت حال کی تصدیق کے لیے انہوں نے ہردیو اور رمل دیو کی بستی میں خون خرابہ ہونے والی رات بٹھل کی مصروفیات کی ترتیب دہرائی اور اپنی طرف سے ترمیم و اضافہ کردیا۔ استاد سلامی نے شدت سے تردید و تصحیح کی کہ اس نے ایسا کبھی نہیں کہا۔ استاد بٹھل اس روز شام کو چائے خانے میں چائے نوشی کے بعد سنار کی کسی دکان پر نہیں گیا اور نہ ہی اسی رات اس نے شاہ زادی کے بالا خانے کا رخ کیا۔ افسران نے اس سے بحث نہیں کی اور اسے اڈے واپس جانے کی اجازت دے دی۔

"یہ اپنی مائی ہریالی کدھر ڈوب گئی؟" یکایک بٹھل نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں سمجھ گیا' استاد سلامی کو آئے دیر ہوگئی تھی۔ اس کی خاطر تواضع کے لیے کسی نے توجہ نہیں کی تھی۔ حویلی میں کسی مہمان کی آمد کی اطلاع زریں' خانم اور زہرہ کو فی الفور ہوجاتی تھی اور محمودی نامی ادھیڑ عمر ملازمہ حرکت میں آجاتی تھی۔ اور کچھ ہی دیر میں سارا انتظام جیسے خود بہ خود ہوجاتا تھا۔ محمودی بیگم اس کا اصل نام تھا۔ حویلی کے مکین اسے موواہوا کہتے تھے۔ وہ بیشتر سبز دوپٹا اور سبز چادر اوڑھے رہتی تھی۔ اس نسبت سے بٹھل نے اس کا لقب ہریالی رکھ دیا تھا۔ مہمانوں کے لیے وہی باورچی خانے سے خورونوش کا سامان بیٹھک میں لاتی تھی۔ میں باورچی خانے جانے کے لیے نکلا ہی تھا کہ وہی ہوا۔ محمودی بیگم طشت اٹھائے بیٹھک کی طرف آتی دکھائی دی۔ میں بیٹھک میں واپس جانا چاہتا تھا' مجھے گمان ہوا' کہیں میں بٹھل اور استاد سلامی کی گفتگو میں مخل تو نہیں ہورہا ہوں۔ مجھے اٹھانے کے لیے بٹھل نے یہ بلاغت اختیار کی ہو۔ شاید مجھے وہاں بیٹھے ہی نہیں رہنا چاہیے تھا۔ میں نے پھر بیٹھک میں واپس جانا مناسب نہیں سمجھا اور لائبریری کی طرف نکل گیا۔

سورج ڈوب رہا تھا' نرم نرم ہوا چل رہی تھی۔ حویلی کے اندرونی حصے میں خاصی چہل پہل تھی۔ جہانگیر مل گیا اور اس نے بتایا کہ پیچھے باغ میں ارشد اور تنویر بیڈمنٹن کھیل رہے ہیں لیکن باغ میں جانے کے بجائے میں نے لائبریری کی سیڑھیاں طے کیں اور دروازے میں داخل ہوتے ہوئے میرے قدم ٹھٹک گئے۔ وہاں فروزاں موجود تھی۔ شاخ پر جیسے گلاب تازہ تازہ کھلا ہو۔ سفید چکن کے کرتے' دوپٹے اور آڑے پاجامے میں ملبوس۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے' جیسے سیاہ بادلوں کی اوٹ سے چاند دمکتا ہو۔ بصارت کی بھی ایک استطاعت ہوتی ہے۔ روشنی بصارت سے سوا ہو تو! میری آنکھیں ایک لمحے کے لیے بینائی کھو بیٹھیں' لگتا تھا' چہرے سے چنگاریاں لپک رہی ہوں یا کرنیں پھوٹ رہی ہوں۔ ذرا ہوا کا رخ بدلے' ذرا دھوپ نرم ہو اور ذرا سی پھوار پڑے تو پژمردہ پودوں اور پھولوں پہ زندگی لہلہانے لگتی ہے۔ آدمی بھی کچھ انہی کی طرح کے ہوتے ہیں۔ بس ذرا سا سایہ' ذرا سا

گداز اور ذرا سا گردوپیش کا اعتبار ہونا چاہیے۔ وہ کسی کتاب کے مطالعے میں گم تھی۔ مجھے سامنے دیکھ کے سٹپٹا سی گئی اور اضطراری انداز میں دوپٹے سے سر ڈھانپا' لباس درست کیا اور کسی قدر سراسیمہ آواز میں آداب کیا۔ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی "آیئے' آیئے۔"

میں نے سر جھکائے کرسی کھینچ لی "آپ' آپ ٹھیک تو ہیں" اپنی آواز کا ہیجان خود مجھے کھٹک رہا تھا۔ ناشتے' کھانے اور بیٹھک میں روز دو تین بار تو چہرہ نمائی ہوجاتی تھی لیکن اس طرح آمنے سامنے بات کیے ہوئے دن ہوگئے تھے۔ "کوئی' کوئی پریشانی تو نہیں آپ کو؟" میں نے بے ترتیبی سے کہا۔

اس نے اپنی غزالیں آنکھیں میچ لیں' تراشیدہ لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی اور وہ جھجکتے ہوئے بولی "یہاں تو کسی اور دنیا کے لوگ رہتے ہیں۔"

"جی' جی مگر۔۔۔" جانے میں کیا کہنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنی زبان قابو کی اور معذرت خواہانہ لہجے میں کہنے کی کوشش کی "گزشتہ دنوں بٹھل بھائی اور میں کچھ بے ہنگم سے معاملات میں گھرے رہے۔ بس اتفاقات کیسے۔ ایسے اتفاقات ہمارے ساتھ آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ مجھے باربار خیال آتا رہا' آپ اور یاسمن کیا کہیں گی' ہم آپ کو کوئی وقت ہی نہ دے سکے۔ جس صورت حال میں آپ یہاں آئی ہیں' اس کی ستم ناکی کا ہر لمحے احساس رہتا ہے۔ خدا کرے' یہاں آپ کو کوئی الجھن' کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس نئے ماحول میں آپ کا جی لگ جائے۔ ہر جگہ کی اپنی مشکلیں اور آسانیاں ہوتی ہیں۔ کوئی شخص مکمل نہیں ہوتا اور جگہ کا بھی کچھ یہی ہے۔ کبھی کوئی ایسی ویسی بات ہوجائے تو نظرانداز کردیجیے اور کسی چیز کی ضرورت ہو' کہیں آنا جانا اور کبھی کچھ ناگوار خاطر ہوجائے تو براہِ راست مجھے بتادیجیے' مجھے یا بٹھل بھائی کو یا زریں کو۔"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" اس کی آواز کرچی کرچی سی ہورہی تھی "آپ شاید بھول گئے۔ یہی کچھ آپ نے پہلے بھی کہا تھا۔ یہ تو ہماری خوش بختی ہے کہ اس طرف آپ کا آنا ہوگیا۔ خدا نے آخر ہماری بھی سن لی اور نہ جانے کیا۔۔۔ کیا۔" اس کی آواز جھرجھرائی۔

"نہیں' ایسے نہیں" میں نے منتشر لہجے میں کہا "اسے اب' وہ سب کچھ اب بھول جایئے' کوئی دھیان ہی مت دیجیے اس طرف۔ سمجھیے کوئی برا' بھیانک خواب تھا۔ واقعی یہ کیسا اتفاق ہے۔ کوئی جیسے کھینچ کے ہمیں وہاں لے گیا تھا۔ سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے۔ کہاں آسن سول' اس وحشی سید محمود علی سے ملاقات' اس کا مہمان خانہ' میری بیماری اور وہاں قیام کی معذوری' نصیر بابا سے رسم و راہ اور ہم پر ان کا اعتماد۔ کیسا تانا بانا ہے یہ۔ ہم تو بستی بستی گھومتے رہتے ہیں۔ آج یہاں' کل وہاں۔ آسن سول کی طرف نہ جاتے' ہوسکتا ہے کسی اور شہر کا رخ کرلیتے۔"

وہ مضطربانہ طلائی چوڑیاں گھماتی رہی۔ اس کے شفق زار رخساروں پر بادل سے امڈ آئے۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر وہ آہستگی سے بولی "اب آپ کب جارہے ہیں؟"

"جلد ہی مگر' مگر سچ پوچھیے تو ابھی کچھ طے نہیں ہے۔ کچھ نہیں معلوم' کتنا وقت اور لگ جائے۔ میں یہی تو کہہ رہا تھا' یہاں آتے ہی ایک ناگہانی سے دوچار ہوگئے اور یوں سمجھیے' ابھی پیروں میں زنجیر پڑی ہے۔"

وہ اپنی ریشمین پلکیں پٹ پٹا کے بولی "ایسی کیا بات ہے' کچھ بتایئے گا؟"

"کوئی خاص نہیں۔" میں نے پہلو بدل کے کہا "ہمارے لیے تو یہ معمول ہے۔ یہ گھٹائیں تو صبح و شام ہم پر منڈلاتی رہتی ہیں اور کوشش یہی رہتی ہے کہ حویلی پر کوئی آنچ نہ آئے۔ ایسا ہی ہوگا لیکن میں آپ سے کہتا ہوں' آپ ایک تعلیم یافتہ اور ہوش مند لڑکی ہیں۔ تجربوں کے لیے درازیٔ عمر ضروری نہیں ہے۔ کم عمری کے باوجود زندگی نے آپ پر بہت کچھ آئینہ کردیا ہے۔ ایک فیصد امکان ناگہانی کا ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے' بس حوصلہ نہیں کھونا چاہیے۔ ہمارا کچھ نہیں ہے۔ کچھ دن سکون سے گزرتے ہیں کہ پھر کوئی افتاد۔ جانے کب سے آزمائشوں' اندھیروں' اجالوں کی آنکھ مچولی جاری ہے۔ آنے والا کل ہمارے لیے بہت بے یقین ہوتا ہے۔ کچھ راستے ساتھ نہیں دیتے' کچھ ہماری اپنی کجی ہے۔ بس ہم ایسے ہی لوگ ہیں' الٹے سیدھے اور یہ بھی تو ایک سچ ہے' ہم ایسے نہ ہوتے تو آپ ابھی تک اس ارزل ترین شخص' سید محمود علی کے۔۔۔"

میرا دماغ کوئی مناسب لفظ نہ ڈھونڈ سکا اور میری زبان اینٹھ کے رہ گئی۔ اپنے آپ کو مجتمع کرنے کے لیے میں نے کچھ توقف کیا اور قدرے تھمی ہوئی آواز میں کہا "اس خیال سے ہول آتا ہے' اگر ہم بروقت نہ پہنچ پاتے' وقت تو ویسے بھی بہت نکل چکا تھا۔ کاش' ہم کچھ پہلے ہی ادھر چلے جاتے تو شاید وہ سب کچھ نہ ہوتا جو ہوچکا تھا۔ پھر بھی یہ کیا کم ہے کہ آپ' یاسمن اور اس ناتواں بوڑھے نصیر بابا کے ہم کچھ کام آسکے۔۔۔ اب آپ کو یہاں دیکھ کے' کیا بتاؤں' مجھے اور بٹھل بھائی کو کیسی طمانیت ہوتی ہے۔"

"ہم سے' ہم تینوں سے زیادہ نہیں" اس نے بے ساختہ ...ا۔ اس کی کھنکتی آواز انفعال و امتنان' حسرت و شیدائیت کا ...یزہ تھی "ہمارے لیے تو یہ دوسری زندگی ہے۔"

"اور یہاں سب کی خواہش بلکہ آرزو ہے کہ اس نئی ...رگی میں' خدا کرے آپ کے تمام دکھوں کا ازالہ ہوجائے۔ ...ب آپ اپنے اختیار کی زندگی گزاریں جہاں تک ہمارا ...لہ ہے' میں نے کہا تا' ہمارا کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ آنے ...لے کل کے تیور' ہمارے لیے کیا اور کیسے ہوں لیکن ہم ...ں ہوں یا کہیں اور' کہیں بہت دور' کیسے ہی حالات اور ...دش سے نبرد آزما۔ یہاں سبھی ہمارے بجائے ہیں۔ ان کا ... آپ کا گزرا ہوا کچھ جدا نہیں ہے اور دردِ مشترک بھی ...ی چیز ہے۔"

میری زبان پر جو آیا کہتا رہا۔ کل اسے ہمارا سارا سفید ...ہ معلوم ہو ہی جاتا تھا۔ شاید میں کسی پیش بندی کی شعوری ...ر شعوری کوشش کررہا تھا۔ آنے والے کل کا کسی تاریکی ...اس کی آمادگی یا کل کسی ناروا انکشاف کا اثر اور شدت ...کرنے کے لیے۔ یوں اسے اب تک ہمارے بارے میں ...ڑا بہت اندازہ ہوجانا ہی چاہیے تھا۔ میں نے اپنے آپ ...روکا۔ اتنا ہی بہت تھا۔ اس سے پہلے کہ اس شیشہ نفس' ...گل اندام کے نہاں خانے میں ان جانے اندیشہ و اوہام ...انے لگیں' میں نے صراحت کی "میں یہ سارا کچھ اس ...باور کرا رہا ہوں کہ آپ کی استقامت اور آپ کا حوصلہ ...ی توانائی کا سبب ہوگا۔ اپنے گھر سے وابستہ افراد یا یوں ...یے' اپنے متعلقین اور پُرسان حال کے عزم و ارادہ کی ... کا یقین ہو تو پیش آنے والے سخت مرحلوں' منزلوں کی ...ی ارزاں ہوجاتی ہے۔"

میں نے نظر اٹھا کے دیکھا' اس کی آنکھیں چمک رہی ...ں۔ اس کے ہونٹ مرتعش تھے اور انہیں دیکھ کے گلاب ...پنکھڑی کا گمان ہوتا تھا' میں نے کہا "ذرا کچھ وقت' یہ ...ش کا وقت ٹل جائے تو بمبئی چلیں گے۔ مجھے یاد ہے' میں ...آپ سے بمبئی کا ذکر کیا تھا کہ وہاں بھی ہمارا ایک گھر ہے' ...ڑا گھر۔ فرخ' فریال' فارہہ' اکبر' گیتا' جولین' شہ پارہ' چمپا ...' اباجان اور زہرہ کے بابا' منیر علی صاحب وہاں موجود ہیں ...ہاں ایک اور لڑکی بھی۔ اس کا نام رما ہے۔ اس کے ...ر انوکھے ہیں۔ بڑی پڑھی لکھی' بہت عجیب لڑکی ہے وہ۔ ...ت خیال آفریں باتیں کرتی ہے اور بھی بہت کچھ ہے وہاں۔"

"گھروں اور جگہوں سے کیا ہوتا ہے؟" وہ خوابیدہ لہجے میں بولی "سب کچھ مکینوں سے ہے۔"

"ہاں' آپ ٹھیک کہتی ہیں لیکن جگہوں کی بھی اپنی حیثیت ہوتی ہے۔ بمبئی ایک بڑا شہر ہے۔ جگہ جگہ کے لوگ وہاں آباد ہیں۔ ان کے روز و شب کے معاملات گاؤں دیہات اور چھوٹے شہروں سے الگ ہیں۔ لوگ ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں اور دور بھی بہت۔ یہ دوری و نزدیکی غالباً ہر بڑے شہر کی خصوصیت ہے۔ بڑے شہروں کی گنجانی اداس بھی کرتی' جی بھی خوب بہلاتی ہے۔ بڑے شہر میں رنگارنگی بہت ہوتی ہے۔ صاحب استطاعت شہریوں نے گنجان آبادیوں سے دور بڑے بڑے محل جیسے گھر بنالیے ہیں اور ان گھروں میں ان کی اپنی ایک دنیا ہے۔"

"مگر آپ تو کہیں اور جارہے ہیں" اس کے لہجے کا تیکھا پن شائستگی سے عاری نہیں تھا۔

"ہاں دیکھیے' اب کے کس طرف جانا ہو لیکن ہم کہیں بھی جائیں' میں نے زریں سے بات کی ہے' کچھ وقت جاتا ہے' یہ عارضی دھند جلد چھٹ جائے گی۔ جہاں گیرا اور نیساں کے امتحانات کے بعد زریں کا ارادہ ہے۔ بہرحال کسی ذریعے سے ہمیں معلوم ہوجائے گا اور ہم سیدھے بمبئی پہنچ جائیں گے۔ کوشش کریں گے کہ اس مرتبہ سفر اتنا طویل نہ ہو۔"

"یہاں بہت سکون ہے" اس نے سرسراتی آواز میں کہا "یہاں کیا کچھ نہیں ہے۔"

"بمبئی جانے سے مراد ہجرت نہیں ہے۔ میرے کہنے کا مطلب ہے' وہاں بھی ایسا ہی ایک گھر ہے' جی لگے تو وہاں رہیے' نہیں تو واپس آجایئے۔"

"مگر۔۔۔" وہ کسی قدر ہچکچاتے ہوئے بولی "دیکھا جائے تو ہماری طرز کے گھروں کی عورتوں کو بستیوں اور شہروں کے طول و عرض کی کمی بیشی اور رنگارنگی سے کیا غرض ہوسکتی ہے۔ چار دیواریاں تو ہر جگہ چھوٹی بڑی ایک جیسی ہوتی ہیں۔"

"واقعی!" میں کرسی پر سیدھا نہ بیٹھا رہ سکا "آپ نے کیا سچی بات کہی ہے" میں نے اُمڈتی آواز میں کہا "بے شک' ہمارے خاص طرز کے خاندانوں کی عورتیں تو زندگی بھر چار دیواریوں میں رہتی ہیں' ایک کے بعد دوسری' تیسری چار دیواری۔۔۔ مگر ساری دنیا میں ایسا نہیں ہے۔ ادھر گوروں کے ملکوں میں عورتیں' مردوں کی طرح زندگی کے معمولات میں شامل رہتی ہیں اور مرد نہیں بن جاتیں۔۔۔ اور آپ کو' آپ کو کیا اچھا' کیا مناسب لگتا ہے؟"

"مناسب نامناسب کیا" وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولی

"سب کچھ موجود وقت سے پیوستہ ہے۔ وقت حاکم ہے' یہ بدل جاتا ہے تو سارے طور اطوار' سبھی کچھ بدل جاتا ہے۔ پچاس سال پہلے کچھ اور تھا جو اب نہیں ہے۔ پچاس سال بعد یہ نہیں ہوگا جو اب ہے۔ کس وقت کیا صحیح' کیا غلط تھا اور ہے اور آنے والے وقت میں کیا صحیح' کیا غلط ہوگا۔ وقت یہ سوچنے اور فیصلہ کرنے کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ دریا و سمندر کے مانند' وقت کنارے بدلتا رہتا ہے اور اس سے وابستہ تمام ذی حیات اس کے ساتھ سمٹتے اور پھیلتے رہتے ہیں۔ جو دھاروں سے بچھڑ جاتے ہیں' وقت ان سے سروکار نہیں رکھتا۔ وہ نابود ہوجاتے ہیں۔ آدمی وقت کے زنداں میں رہتا ہے۔"

"دیکھیے نا' مطالعے اور علم کا یہ فیضان ہے۔ آدمی خیال کرتا اور فکر کرتا ہے" میری آواز تمتمانے لگی تھی "آپ کے مطالعے کے غیر معمولی شوق سے میں واقف ہوں لیکن یہ ..... یہ آپ کیسی فکر انگیز اور دل نشیں باتیں کرتی ہیں۔ کبھی لکھنے کی طرف بھی توجہ کی؟"

اس کے رخساروں کی سرخی بکھر بکھر گئی "میں کہاں ....." اس کے سراپا میں جیسے کوئی تلاطم سا اٹھا "پہلا مرحلہ تو حرف شناسی ہے۔ ابھی تو یہ بھی..."

"اسے انکسار کہا جائے جو علم کا خاصہ ہے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "لکھنے کی صلاحیت تو خداداد ہوتی ہے۔"

"علم کے بغیر ہر صلاحیت محدود بلکہ بے سود ہے۔"

"آپ کا بہرحال ایک تہذیبی اور علمی پس منظر ہے۔"

"علم ورثے میں کہاں ملتا ہے۔ اس کا خون سے کوئی تعلق نہیں۔ ہر طلب گار کو خود جستجو کرنی پڑتی ہے۔"

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ دولت کی طرح علم کا ورثہ منتقل نہیں ہوتا۔ ہر عالم کی اولاد جاہل پیدا ہوتی ہے اور جاہل ہی رہتی ہے تاوقتیکہ علم و فن کے رموز جاننے اور کسب واکتساب کی بے چینی نہ ہو۔ میں نے اشتیاق آمیز لہجے میں کہا "جانے کیوں میرا دل کہتا ہے' آپ لکھنے کی طرف توجہ کریں تو کسی سے کم نہ ہوگا۔ لکھنے کے لیے شوقِ علم شرط ہے تو آپ اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔ میں نے کسی جگہ پڑھا تھا' علم روحی یا ذہنی آسودگی کا سبب بنتا ہے تو اظہار کے لیے بھی بے قرار رہتا ہے۔ علم سے خیال کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔ کچھ نئے خیال' نئے تصورات اور نئے راستے افشا ہوجاتے ہیں۔ علم سے اندھیرے چھٹتے ہیں' یہ امکانات سوا کردیتا ہے پھر جی چاہتا ہے کہ انہیں دوسروں تک' یہ روشنی دوسروں تک منتقل کی جائے۔ علم کسی خام خیال کی تجسیم کرتا' اسے جلا دیتا ہے اور صرف یقین ہی نہیں' علم شک بھی پیدا کرتا ہے۔ شک مزید علم کی طرف راغب کرتا ہے اور کسی نے کہا تھا' شک ایک فضیلت ہے۔ شک سے ارتقائی سفر تیز ہوجاتا ہے' خدا جانے اور کیا کیا..."

مجھے متجاوز ہوجانے کا خیال آیا اور میری آواز خود بہ خود ماند پڑنے لگی۔ میں نے معذرت کی "مجھے تو اتنا نہیں معلوم میں پڑھتا بہت کم ہوں یا توجہ نہیں لگتا یا وقت نہیں ملتا۔"

اس کی جھلمل آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں اور تجسس واشتیاق سے لب ریز تھیں۔ میرا وجود کسمسانے لگا "مجھ اجازت دیں تو کہوں" وہ ہمکتے لہجے میں بولی "لکھنا تو اصل میں آپ کو چاہیے۔ زری بھی کل کہہ رہی تھیں' جو کچھ آپ گزری ہے آپ لکھیں تو...."

"واہ!" میں کرسی پر اچھل سا گیا "یہ میں بیچ میں کہا آگیا۔ میں ایسی کسی خوش فہمی کا متحمل کیسے ہوسکتا ہوں مجھے اپنی بساط اور توفیق کا اچھی طرح اندازہ ہے" میں نے تابی سے پوچھا "یہ زریں نے آپ کو کیا کیا بتایا؟"

"کچھ نہیں" وہ کسی قدر ٹھٹک گئی "لیکن جب آپ کا ذ آتا ہے' ان کی زبان پر آپ کے لیے دعائیں اور آرزوئیں ہوتی ہیں۔"

میں نے سکون کی سانس لی۔

"کل رات ہی کہہ رہی تھیں۔ زندگی نے آپ بہت اجنبیت اور مغائرت برتی ہے۔ کم عمری ہی سے آپ کوئی احساسِ لطافت اسے منتشر کرگیا۔ وہ رک گئی او شکستگی سے کہنے لگی "زری کہہ رہی تھیں' آپ کے تجر بے پناہ ہیں۔"

"کیا تجربے؟" میرے ہونٹ پھیل گئے "تجربے شک محتاط کردیتے ہیں لیکن ہر بار ایک نئی حیرت.... ایک جانا منظر' ایک نیا تماشا' عبرت کا کوئی اور درس۔ تجربوں کبھی اختتام نہیں ہوتا۔ کسی کو کم' کسی کو زیادہ' تجربے او زندگی لازم وملزوم ہیں۔ نت نئے تجربے' ایک دوسرے ضد۔ زندگی بہت پیچیدہ اور گوناگوں ہے اور اسی نسبت تجربے بھی۔" میرے لہجے میں تندی آگئی "جانے دیجیے ا ذکر کو۔"

اس کے مخروطی لب کچھ کہنے کے لیے دھڑک رہے لیکن کوئی احتیاط مانع آگئی۔ اس نے موضوع بدل دینا منا سمجھا اور آہستگی سے بولی "زری سے کہا ہے کہ وہ لکھنؤ کچھ کتابیں منگوادیں تو بڑا اچھا ہو۔ ہماری نادر کتابیں تو وہ رہ گئیں۔ زری کے لیے کئی جگہ سے کتابیں آتی ہیں۔ مطا

تو اصل میں وہی کرتی ہیں' خوب جم کے۔ انہیں انگریزی بھی بہت آتی ہے۔ حیرت ہے' اتنے بڑے گھر کی دیکھ بھال' ہر کسی کا خیال رکھنے کے بعد وہ مطالعے کے لیے وقت نکال لیتی ہیں۔"

"اس کی کیا کہیے' خدا نے اسے کسی اور مٹی سے بنایا ہے۔"

"یقیناً' ان کے ہاں تو کوئی سمندر ہے۔ وہ' وہ تو... ان کے اوصاف کے بیان وشمار کے لیے نہ لفظ وضع ہوئے ہیں نہ ...رد۔ یوں تو یہاں سبھی ایک دوسرے کا پرتو ہیں لیکن زری... ...ری تو ایک مثال ہیں۔ وہ تو پریوں کی کسی کہانی کا کردار ہیں۔ ...کتابوں اور رسالوں میں بھی ایسے کردار نہیں ملتے" لہجے کی ...شدت سچ کے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔ کہنے لگی "کبھی کبھی تو ...ن سے ڈر لگتا ہے۔"

"کیوں؟" میں نے مسکرا کے پوچھا۔

"ان کے تپاک' دریا دلی' نظم وضبط' برداشت' خوش ...ی' خوش وضعی' ذہانت اور مطالعے کے سامنے اپنا آپا ...ت کم تر لگتا ہے۔"

"ہاں' وہ ایسی ہی ہے' بہت عجیب ہے وہ۔"

"کبھی کبھی یاسمن کہتی ہے۔ اسے بہت احساس ہے' ...ی ہے' کسی کا اتنا خیال رکھنا بھی تو ایک بار ہے۔ سب ...ہم پر خاص توجہ دیتے ہیں۔ میں نے زری اور خانم آپی ...کہا تھا' آپ اتنا ہمیں نہ پوچھا کیجیے۔ شرمندگی ہوتی ہے۔ ...کوئی مہمان تو نہیں' اس گھر کے فرد ہیں۔"

"یہ ابتدا کی بات ہے اور آپ یہ اندیشہ دل سے نکال ...ے کہ آپ کی پرسش ان کے لیے کسی بوجھ کا باعث ہوسکتی ...۔ کچھ دنوں میں آپ کو خود اندازہ ہوجائے گا کہ یہ سب ...ان کی سرشت میں داخل ہے۔ یہاں سارے ایک ...رے کی خوشنودی کے بہانے ڈھونڈتے ہیں' انہیں دکھ ...آتا ہے۔ جن کا دکھ سے واسطہ پڑا ہو' انہی کو تو یہ ہنر آتا ...۔یوں جانیے' یہاں سب اپنے آپ کو ترک کردینے اور ...دوسرے کو رعایت دینے کا کوئی تجربہ کررہے ہیں اور جیسے ...اس ترک وایثار کے ثمرات' اس سے حاصل ہونے والی ...انی کے اسرار ورموز ان پر کھل رہے ہیں' ان کی ...امت بڑھ رہی ہے۔ سلمیٰ کو دیکھیے' شاید اس پر گزری ...کسی نے آپ کو سنائی ہو۔ وہ ہمیں حیدر آباد سے واپسی ...سفر میں ریل کے ڈبے میں ملی تھی۔ اتفاق سے ہم بھی اسی ...میں سوار ہوئے۔ یہ اتفاق نہ ہوتا تو جانے کیا ہوتا۔ ...وہ کہاں' کس حال میں ہوتی۔ عجیب وغریب واقعات پیش آئے تھے اس کے ساتھ۔ بڑی لمبی روداد ہے۔ ہم اسے یہاں لے آئے۔ اس حویلی میں وہ ایسی شامل ہوئی جیسے انہی در و بام کا حصہ ہو' یہیں پیدا ہوئی ہو' اسے یہاں آئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔"

"ہاں' اپنی سلمیٰ آپا' وہ تو بہت دل کش ہیں" وہ چہکتی آواز میں بولی "یاسمن تو ان کا دم بھرتی ہے۔ آپ سچ کہتے ہیں۔ یہ تو کوئی تصوری' طلسمی دنیا ہے۔ کبھی تو یقین نہیں آتا۔ کسی فریب کا گمان ہوتا ہے مگر یہ کیسی خیال آفریں' مثال آفریں حقیقت ہے۔"

"آپ کتابوں کا ذکر کررہی تھیں۔ آمن سول میں رہ جانے والی آپ کی نادر کتابوں کا ذخیرہ ضائع نہیں جائے گا۔ ذرا کچھ وقت گزر جائے' بٹھل بھائی کا ارادہ ایک بار پھر وہاں جانے کا معلوم ہوتا ہے۔ آپ کے اور معاملات بھی وہاں جاکے نمٹانے ہیں۔"

"اب وہ قصہ ختم کیجیے" اس کی آواز پر اداسی طاری ہوگئی "ہم یہاں بہت خوش ہیں۔ اب ہمیں کچھ اور نہیں چاہیے' وہاں جاکے اور مسائل پیدا ہوسکتے ہیں۔ بابا بھی چند دن پہلے یہی کہہ رہے تھے۔ ان کے سامنے لب کشائی کا یارا نہیں تھا۔ کیا مل جائے گا اب وہاں جاکے۔ مکانوں اور زمینوں کی رقم! اور کیا؟ اور چیزیں تو واپس نہیں مل جائیں گی۔ اور ہم اس دولت کا کیا کریں گے۔ یہ دولت جو ہمیں یہاں ملی ہے' کسی سے کم ہے کیا۔ وہاں کے خیال سے ہمیں ہول آتا ہے۔"

"مگر ایک بار وہاں جاکے اس سید محمود علی کو دیکھنے کو دل بہت مضطرب ہوتا ہے۔ اسے بہت کم سزا ملی' اس کا قلق ہے" میں اپنی آواز کی تپش پر قابو نہ پاسکا۔ سید محمود علی کے نام پر سینہ جلنے لگا تھا "اس وقت کی بات کچھ اور تھی۔ ہمیں آپ دونوں اور نصیر بابا کی فکر تھی کہ آپ کسی طور جلد سے جلد وہاں سے دور ہوجائیں اور بہ سلامت منزل پر پہنچ جائیں لیکن سید محمود علی کا حساب باقی ہے۔ اسے اس درمیان وقت مل گیا ہے۔ چلتے ہوئے بٹھل بھائی نے اسے آگاہ کیا تھا کہ ہم جلد ہی واپس آئیں گے۔ اسے بھی کسی وقت ہماری اچانک آمد کا دھڑکا لگا ہوگا۔ یا تو اسے آمن سول سے ہجرت کرجانی چاہیے یا اس نے اس عرصے میں اپنے اردگرد حصار اور مضبوط کرلیا ہوگا۔ وہ جہاں بھی ہوگا' ہم بہرحال اسے ڈھونڈ لیں گے۔"

"اب خاک بھی ڈالیے ان پر' رفت گزشت" وہ سراسیمہ لہجے میں بولی۔ اس میں التجا بھی شامل تھی "اتنا ہی

بہت ہے کہ ہمیں وہاں سے رہائی مل گئی۔ آپ کو آگے سفر درپیش ہے۔ بہتر ہوگا‘ پہلے آپ اپنے کام کو اولیت دیجئے بعد کو کسی مناسب وقت اس طرف جانے کا قصد کیجئے۔"

"ہاں‘ ابھی اتنی جلد ممکن بھی نہیں مگر میں آپ سے سچ کہوں‘ جی چاہتا ہے کہ پہلی فرصت میں وہاں پہنچوں۔ بٹھل بھائی بھی یہی کچھ سوچتے ہوں گے۔ انہوں نے یہاں اپنے وکیل سے آپ کے معاملے پر ضروریات کی ہوگی‘ مجھے اس بابت ویسے کچھ علم نہیں ہے‘ صرف اندازے سے کہہ رہا ہوں۔ ظفر میاں کو بھی یہاں آنے دیجئے۔ انہیں بھی ساتھ رکھیں گے۔ مجھے تو یہ نہیں معلوم کہ ظفر میاں سے بٹھل بھائی یا نصیر بابا کی کیا بات ہوئی ہے۔ میں ان کے ساتھ نہیں گیا تھا۔ میرے خیال میں انہیں اب تک یہاں آجانا چاہیے۔ شاید بٹھل بھائی نے ان دنوں یہاں کی دگرگوں صورت حال دیکھ کے انہیں بلانے میں تامل کیا ہو۔ آپ اطمینان رکھیں‘ وہ آجائیں گے۔" میں نے سر اٹھا کے ظفر کے ذکر سے اس کے رخساروں پر آتے جاتے رنگ دیکھنے چاہے لیکن اس کے چہرے پر دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ وہ گم صم بیٹھی رہی "ظفر میاں نے بڑی اذیتیں جھیلی ہیں" میں نے کہا "انہیں دیکھئے‘ ان سے ملنے کا اشتیاق ہے۔ کاش وہ ہماری موجودگی میں یہاں آجائیں۔ بڑی تعریفیں سنی ہیں ان کی۔ نصیر بابا بتا رہے تھے کہ علم کا شوق ہی انہیں آپ کے والد محترم کے دروازے پر لے گیا تھا۔"

وہ سر جھکائے دوپٹے کی بیل کریدتی رہی۔

"ان کے آنے کے بعد یہ خلش بھی دور ہوجائے گی کہ وہ آپ کے ساتھ نہیں ہیں۔"

"ہم یہاں ہر طرح مطمئن ہیں" اس نے بہ عجلت کہا۔

"لیکن ابھی ایک حصہ تو باقی ہے۔ ظفر میاں کے آجانے پر گویا ایک خانوادہ مکمل ہوجائے گا۔"

"لیکن ہمیں کہیں اور نہیں جانا" وہ کسی حد تک نازبردارانہ انداز میں بولی۔

"بالکل‘ بالکل‘ کون آپ سے کہتا ہے‘ یہ تو آپ پر منحصر ہے۔ آپ کا اختیار ہے۔ ظفر میاں چاہیں تو وہ بھی یہیں رہیں‘ ہم سب کے ساتھ۔۔۔"

"وہ نہیں چاہیں گے تو۔۔۔ تو بھی" اس نے زیرلبی سے کہا۔

"جی جی‘ جی ہاں" میں نے مضطربانہ تائید کی۔

"ہم کہیں اور نہیں جائیں گے" وہ مچل کے بولی۔

خوش اندام‘ خوش کلام اور خوش اطوار لوگوں کی صحبت بھی کسی سیرگاہ کی طرح ہوتی ہے۔ اس کے روبہ رو وقت احساس ہی نہیں رہا۔ اندھیرا جتنا گہرا ہوتا جاتا ہے‘ رو بھی اتنی گہری ہوجاتی ہے۔ کئی اطراف جلتی روشنیوں لائبریری جگمگا رہی تھی۔ ان روشنیوں میں اس کے کانو میں جھولتے آویزوں کے نگینے دمک اٹھتے تھے۔ مجھے وہاں بی رہنا اچھا لگ رہا تھا۔ شائستگی کی بھی اپنی ایک تمکنت ہو ہے۔ اس کی آواز میں ترنم تھا اور تکلف اور تصنع سے ماو تھا۔ جیسی وہ خود سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی‘ سانچے میں ڈ ہوئی اس کی گفتگو بھی تھی۔ اس طرح باتیں کرتی تھی جی کوئی شہ زادی ناپ تول کے خرام کرتی ہو۔ کبھی کبھی فار لب ولہجہ اور تراکیب کی آمیزش اس کی گفتار کا تیور اور دو نشیں‘ اثر آفریں کردیتی تھی۔ حسن اور ذہانت دو آتشے مانند ہے اور کوئی جوہر علم سے آراستہ ہو تو مستزاد ہے۔ ہردم یہ احساس رہا کہ میں ایک مختلف‘ ایک منفرد لڑکی ہم کلام ہوں۔ میں وہاں بیٹھا باتیں بناتا رہتا کہ زینے پر کسی تیز چاپوں سے وہ بھی چونک پڑی‘ میں بھی منتشر ہوا۔ وہ نیسا تھی۔ جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھنے سے اس کی سانسیں پھول رہی تھیں "ارے آپ یہاں ہیں؟" وہ ہانپتے ہوئے ب "سارے میں دیکھ لیا۔"

"کیوں خیریت تو ہے؟"

"بابا‘ آپ کو یاد کررہے ہیں۔"

"کیا بات ہے؟" میں نے تردد سے پوچھا۔

"کوئی مہمان ان کے پاس آئے ہیں۔"

"کون مہمان؟"

"مجھے نہیں معلوم" وہ سادگی سے بولی۔

"استاد سلامی؟ وہ‘ وہ ہیں یا کوئی اور؟" لیکن نیساں کو معلوم ہوسکتا تھا‘ مجھے تشویش ہونے لگی۔ میں نے فروزاں طرف دیکھا۔ وہ بھی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے ربطی سے معذرت کی اور سیڑھیاں طے کرکے نیچے آگیا۔

بیٹھک میں کوئی اور نہیں‘ استاد سلامی تھا۔ میرے سے جیسے کوئی بوجھ اتر گیا "کدھری کھو گیا تھا رے؟" بٹھل نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔

"کیوں‘ یہیں تھا‘ لائبریری کی طرف" میرا لہجہ غیر ارادی طور پر سپاٹ تھا۔

"ادھری سلامی کب سے تیرے لیے ہڑک رہا ہے بار بار کہنی مارتا تھا‘ یہ اپنا لاڈلا راجا۔۔۔"

بٹھل کی بات استاد سلامی نے مکمل نہیں ہونے دی جھنجھلاتی آواز میں بولا "ہاں لاڈلے استاد‘ اپنے کو بے کلی تھی

تم ایک دم۔۔۔ ایک دم سے۔" سلامی نے بے تابانہ اٹھ کے مجھے گلے لگالیا اور دبوچنے لگا۔

رات کا کھانا ہم تینوں نے بیٹھک میں کھایا۔ کھانے کے بعد سلامی زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ بٹھل اور اس کے رویے سے مجھے اپنی بدگمانی پر ندامت ہوتی رہی۔ میرا دماغ ایسے ہی الٹے سیدھے جالے بنتا رہتا ہے۔ استاد سلامی کی خاطرداری کے لیے باہر جاکے کسی کو متوجہ کرنے کی ہدایت پر میرا دماغ کیوں بہکنے بھٹکنے لگا تھا۔ گھر کے اندر میں ہی جاسکتا تھا یا بٹھل۔ میں نے کیوں سمجھا کہ میری موجودگی بٹھل اور استاد سلامی کے مابین حارج ہورہی ہے۔ بٹھل تو یوں بھی مجھے ٹھاسکتا تھا۔ اس عذر کے تکلف کی اسے ضرورت نہیں تھی۔ اسے بھی کچھ میری بدظنی کا اندازہ ہوگیا تھا۔ اس نے صراحت نہیں کی اور اچھا ہی کیا۔ مجھے اور شرمندگی ہوتی۔ میری بدوضعی کی اسے عادت ہوجانی چاہیے۔ میں نے بھی خاموشی مناسب سمجھی۔ ندامت کا سب سے موثر اظہار خاموشی ہے۔ کھانے کے بعد میں بیٹھک سے جلد ہی اٹھ گیا اور کمرے میں آکے بستر پر پڑا اپنے آپ کو نوچتا رہا۔

○☆○

ہمیں کوتوالی میں حاضری دیے ساتواں دن تھا۔ رات کا کھانا کھا کے تقریباً سبھی بیٹھک میں بیٹھے تھے۔ حقے کے سلگتے ہوئے خمیرے کی خوشبو ہر طرف مہکی ہوئی تھی کہ مماسٹ تا ہوا اندر آیا۔ مما کو سب کے سامنے زبان کھولنا دشوار رہا تھا۔ بٹھل خود ہی اٹھ گیا۔ میں نے بھی اس کی پیروی ۔ بیٹھک سے باہر آنے پر مما نے بوکھلائی آواز میں بتایا کہ ترے پر پولیس موجود ہے۔

بٹھل نے آنکھیں میچ لیں اور مما کی کمر تھپکتے ہوئے "بولو‘ آتے ہیں۔ ادھری بیٹھنے کو مونڈھا کرسی لگوادو۔"

میرا وجود ایک لمحے کے لیے متلاطم ہوا تھا لیکن میں نے کو سنبھال لیا۔ پولیس کی آمد تو کسی وقت بھی ممکن تھی۔ ۃالی سے آنے کے بعد کسی بھی لمحے‘ مجھے تو جیسے ان کا مار تھا۔

بیٹھک میں واپس آکے بٹھل نے پان کا بیڑا کھایا‘ حقے چند کش لیے‘ بیڑی کا بنڈل جیب میں رکھا اور دھیمی آواز زریں کو مخاطب کیا "اپنے کو جاتا ہے ابھی‘ لوٹنے میں بھی لگ سکتی ہے۔ رات بھی لگ جائے‘ تم لوگ آرام ۔"

بیٹھک میں سکوت چھا گیا۔

بٹھل نے پیچھے مڑ کے نہیں دیکھا۔ ہم دونوں ڈیوڑھی پار کرکے چبوترے پر آئے تو کئی سپاہی ادھر ادھر منڈلاتے دکھائی دیے۔ مما اور اس کا بھتیجا اندر سے کرسیاں لالا کے رکھ رہے تھے۔ چبوترے کے نیچے گلی میں اتنی روشنی نہیں تھی لیکن تانگوں کی ٹمٹماتی روشنیوں میں پولیس کا دستہ وہاں بھی مستعد کھڑا نظر آرہا تھا۔ چبوترے پر موجود سپاہیوں کے درمیان پولیس افسر وہی تھا جو گزشتہ مرتبہ ہمیں حویلی سے کوتوالی لے گیا تھا اور اس نے پانچ افسروں پر مشتمل جماعت کی خدمت میں پیش کرنے سے پہلے ہمیں احتیاط کی تلقین کی تھی۔ ہمیں سامنے دیکھ کے اس کا جسم اکڑ گیا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بٹھل اور مجھ پر جم گئی تھیں جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو یا پہچاننے کی کوشش کررہا ہو "کیا ہے مہاراج! کوئی سپنا دیکھ لیا پھر یا رستہ بھول گئے؟" بٹھل نے اٹھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

پولیس افسر نے ہونٹ بھینچ لیے۔ اس کے کندھے لٹک گئے "ٹھیک ہے استاد!" اس نے منہ بنا کے کہا "تم کو دیکھنا تھا۔"

"مورتی بنوا کے بھجوادیں ادھری۔۔۔" بٹھل تنک کے بولا۔

پولیس افسر کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور خشمگیں نظروں سے بٹھل کی صورت دیکھا کیا۔

"اتنا کشٹ کیوں کیا مائی باپ! پوری سینا کے ساتھ آئے ہو۔" بٹھل کا لہجہ بدلا ہوا تھا‘ کہنے لگا "اپن کسی پالتو کو بھیج دیتے۔ سر کے بل آجاتے درشن کو۔"

"زیادہ بات نہیں استاد!" پولیس افسر نے چڑچڑے پن سے کہا "ٹھیک ہے‘ اب جاکے آرام کرو۔"

"ایسا کیا صاحب!" بٹھل نے حیرانی کا اظہار کیا "کچھ الٹا ہوگیا کیا؟"

"بس بس‘ ٹھیک ہے‘ تم کو بولا نا‘ اندر جاؤ اور لمبی کھینچو۔ ہم کو دیکھنا تھا‘ تم یہیں پر ہو کہ نہیں۔"

"صاحب بہادر‘ کو بول کے چلے تھے‘ پندرہ بیس روز تک ادھری رہیں گے۔ کدھری نکلیں گی تو پرنام کرکے‘ اگلے پچھلے سارے معاف کراکے۔"

"دیکھو استاد!" پولیس افسر مصنوعی تحکم سے بولا "تمہاری بھلائی کے واسطے بولتے ہیں۔ ابھی احتیاط کرو‘ بہت خراب حالت ہے۔ اڈے کے آدمیوں کو بھی تھام کے رکھو۔ پوری حکومت یہاں سے وہاں تک پلٹی ہوئی ہے۔ گورے ریزیڈنٹ نے لکھنؤ پولیس کی گردن دبوچ رکھی ہے۔ اب تک مجرم گرفتار کیوں نہیں ہوئے؟ پولیس کیا کررہی ہے؟

آواز پر اس کی ہمت استوار ہوئی۔ "ارے یاسمن' آؤ آؤ' ادھر آؤ میرے پاس" میں نے اشتیاق سے کہا "دیکھو' اس نیساں کی بچی' تمہاری ہم زاد نے میرا کیا حال کردیا ہے۔"

بستر کے نزدیک آکے وہ متذبذب سی' سمٹی سکڑی کھڑی رہی۔ میں نے اسے پاس آنے کو کہا۔ وہ قریب آئی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے بستر پر اپنے سامنے بٹھالیا' وہ بہت معصوم اور دلکش لگ رہی تھی۔ نیساں اور اس کی عمر میں انیس بیس ہی کا فرق ہوگا۔ دونوں ایک دوسرے کا سایہ بن چکی تھیں۔

"دیکھا' نیند نہیں آرہی نا" نیساں لہکتی آواز میں بولی "میں نے تو پہلے ہی کہا تھا'۔ اتھ چلو' بابر بھائی تمہیں دیکھ کے خوش ہوں گے۔"

"کیوں؟" میں نے بناوٹی حیرانی سے وضاحت چاہی۔ "یاسمن یہاں آنا نہیں چاہتی تھی کیا؟"

"نہیں بابر بھائی! یہ تو آپ کا دم بھرتی ہے' آنے کے لیے بے کل بھی تھی اور جھجک بھی رہی تھی۔ کہتی تھی' اس وقت انہیں زحمت ہوگی۔"

"کیسی زحمت!" میں نے شکایتی لہجے میں کہا اور یاسمن کا ہاتھ اٹھا کے اسے بوسہ دیا "جیسے نیساں' ویسے تم..... تم جب چاہو' بے روک ٹوک آسکتی ہو اور ایسے آؤگی تو سچ' مجھے بڑی خوشی ہوگی" اس کا ہاتھ میں نے سینے سے لگائے رکھا۔ اس لمحے اس کی لیے میرا دل بہت اُمڈا اور میری سمجھ میں نہیں آیا' میں اس سے اپنی شیفتگی کا اظہار کس طرح کروں۔ نیساں نے مالش کی زنجیر سے مجھے باندھ رکھا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ یاسمن کا رہا سہا امتناع' اس کی بچی کھچی اجنبیت دور کرنے کے لیے مجھے بہت شفقت' بہت محبت اور بہت گداز کا تاثر دیتے رہنا چاہیے۔ دن میں کئی بار آمنا سامنا ہوتا تھا اور ہر بار میری کوشش رہتی تھی کہ بیتے ہوئے دن وہ جتنی جلد ہوسکے' بھول جائے۔ آج اگر بہتر نہ ہو تو گزرا ہوا کل ستانے لگتا ہے' چاہے کتنا ہی کرب ناک رہا ہو۔ آج اگر بہتر ہو تو گزرے ہوئے کل کی طرف کوئی پلٹ کے نہیں دیکھتا۔ آج کی شادمانی گزرے ہوئے کل کی ہولناکی سے سوا ہوجاتی ہے' جب بھی وہ میرے سامنے آتی تھی' میری نظروں میں وہ منظر گھوم جاتا تھا جب آسن سول میں سید محمود علی کے مہمان خانے میں پہلی بار نصیر بابا کے ساتھ چھپتی چھپاتی کسی وحشت زدہ ہرنی کی طرح ہم دو اجنبیوں کے پاس آئی تھی۔ اس کا سراپا لرز رہا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ چہرے پر بے یقینی' ناامیدی کی ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ نصیر بابا کی زبانی اس کی روداد سن کے ہی میرا سینہ بہت جلا تھا۔ اس رات اسے سامنے دیکھ کے تو میں گنگ ہوگیا تھا۔ اس کا وہ چہرہ' گلاب ابھی کھلا نہیں کہ مرجھا گیا' اس کا وہ خزاں زدہ چہرہ آنکھوں میں نقش تھا۔ یہاں آکے اتنے دنوں میں اس کا رنگ روپ ہی بدل گیا تھا۔ اس کے عارض چٹک رہے تھے' پہلے سے بڑی معلوم ہوتی تھی۔ بہت سے لوگ بہت دل کش ہوتے ہیں لیکن سب کے لیے دل ایسا نہیں کھنچتا۔ کچھ لوگوں میں جانے کیا خوبی ہوتی ہے کہ بے اختیار ان سے ربط خاطر کو جی مچلتا ہے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ وہ نیساں کی طرح چہکا کرے' نیساں کی طرح وہ میرے بازو میں جھول جائے اور مجھ سے شکایتیں کرے' ناز کرے' یاسمن سے باتیں کرنے کی ایک ہی صورت تھی۔ میں نے نیساں سے منت کی کہ اب وہ اپنا یہ شغل سرنوازی ترک کرے۔ آخر وہ مان گئی۔ اس نے میرے روغن زدہ بال' گردن اور پیشانی کو تولیہ سے رگڑ رگڑ کے خشک شوئی کی۔ بالوں میں کنگھی کی۔ غسل خانے جاکے صابن سے ہاتھ دھوئے اور واپس آکے میرے پہلو میں دبک کے بیٹھ گئی اور رات گزرتی رہی۔ جتنی دلچسپ باتیں' لطیفے' فنی' فریال' امی' گھر اور اسکول کے زمانے کے قصے ذہن میں محفوظ تھے' میں انہیں سناتا رہا۔ میرے پاس خوش گوار یادوں کا ذخیرہ تھا ہی کتنا۔ جتنی شوخی اور شگفتگی مجھے آتی تھی' میں نے ان پر تمام کی۔ وہ مسکراتی' کھل کھلاتی رہیں۔ وقت چپکے سے گزر گیا۔ کچھ یاد نہیں رہا کہ رات کوتوالی سے پولیس شہر میں ہماری موجودگی کی تصدیق کے لیے حویلی آئی تھی اور کل کا کچھ اعتبار نہیں ہے' کب وہ پھر آن دھمکیں۔ ہم اپنے گھر میں ہیں' پر کٹے پرندے کی طرح۔ اسے پنجرے کی قید سے آزاد کردیا جاتا ہے۔ ہم اپنے گھر میں ہیں اور گھر کو چاروں طرف سے پولیس نے گھیر رکھا ہے۔ کوئی عاقبت اندیشی یا کسی کی عائد کردہ پابندی' گھر اور زنداں میں پھر کیا فرق ہے۔ یہ کیسی رہائی' کیسی اسیری ہے۔

کوئی تین بجے کے قریب نیساں کو ہوش آیا۔ اس کے ٹوکنے پر یاسمن بھی بڑبڑاتی ہوئی بستر سے اٹھ گئی۔ وہ منع کررہی تھی لیکن ان کا اکیلے جانا مناسب نہیں لگتا تھا۔ انہیں طویل راہ داری سے گزرنا تھا۔ میں بھی ان کے ساتھ باہر نکلا۔ اپنے کمرے میں جاتے جاتے وہ پلٹ کے بے تابانہ مجھ سے چمٹ گئیں۔ جانے کیوں میری آنکھیں سلگنے لگیں۔ میں نے ان کے سروں پر ہاتھ رکھا' پیشانیاں چومیں اور ان کے شانے تھپ تھپاتا لوٹ آیا۔ وہ چلی گئی تھیں لیکن دیر تک وہ میرے ساتھ رہیں۔ پھر کسی وقت آنکھ لگ گئی اور نیند ٹوٹی تو کمرے میں ہر سو روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ دیواری گھڑی

...لیس جھک مار رہی ہے" پولیس افسر نے پولیس کو غلیظ گالی ...ی اور جلی بھنی آواز میں بولا "پولیس کے پاس جادوئی ڈنڈا ...؟ گھمایا اور مجرم حاضر۔ سالے اوپر بیٹھے حکم پر حکم ...ے۔ تم کو کیا بولیں۔ آٹھ دن ہو رہے ہیں۔ ٹھیک ...ٹار ہے ہیں۔ ...ے کر نکانے کو نہیں ملی سمجھو' ۲۴ گھنٹے کی بیگار بھگتنی پڑ رہی ...ے۔ ان لوگوں نے جادوگر سمجھ کے ورما صاحب کو بھیجا تھا۔ ...تے ہی چمت کار ہو جائے گا۔ دو سورما چیلے بھی نتھی کیے ...ے۔ وہ بھی اب ڈھے ڈھے سے نظر آتے ہیں۔ کتنے پکڑے' ...چھوڑ دیے۔ کتنے ابھی حوالات میں سڑ رہے ہیں۔ سارے ...ں پولیس کتوں کی طرح مجرم سونگھتی پھر رہی ہے۔"

بھٹل خاموشی سے سنتا رہا۔ اسی اثنا میں مما اور اس ...ے بھتیجے نے ترتیب سے کرسیاں رکھ دی تھیں۔ بھٹل نے ...ولیس افسر سے ہمدردی کا اظہار کیا "آپ بیٹھو نا صاحب! گھر ...ئے ہو' تھوڑا جل پان کر کے جاؤ۔"

"نہیں استاد! اب چلتے ہیں' جاکے رپورٹ کرنی ہے' ...ولیس افسر کا منہ ابھی تک چڑھا ہوا تھا۔ "تم کو بول دیں' تم ...سامنے نہیں آتے تو ہمارے پاس حویلی کی تلاشی کا حکم تھا۔"

"اپنے کو معلوم ہے' آپ کتنا لوٹ پلٹ کر سکتے ہو۔ اپنی ...ور بھی اڈے نے داب رکھی ہے۔ اڈے کی گانٹھ نہیں پڑی ...ہی تو بات اور ہوتی ان داتا!" بھٹل نے بوجھل آواز میں ...کہا۔

پولیس افسر کے سانولے چہرے پر آگ بھڑکی تھی لیکن ...ں نے مشفقانہ لہجہ اختیار کیا "ہاں' ابھی کھینچ ہی کے رکھو ...ستاد' تم کو جانے دیا ہے۔ ورما نہیں ہوتا تو ایسے ڈھلے ...ڈھلائے نہیں آجاتے' پر ورما ہویا دوسرے۔ صاف بول دیں' ...ار باران کا دھیان جاتا تمہاری ہی طرف ہے۔"

"ٹھیک ہے صاحب!" بھٹل نے گہری سانس بھری اور ...صرار کیا "بیٹھو نا صاحب! گھر آکے ایسے جانا اپنے کو...."

"نہیں استاد!" پولیس افسر نے بھٹل کا شانہ پکڑ کے ...نرمی سے کہا "پھر دیکھیں گے۔ ذرا یہ آنکھ مچولی' کھینچم ...کھانچی کا سے اترنے دو۔ آئیں گے ضرور' ہم کو تو ادھر ہی ...رہنا ہے۔"

جب تک وہ تانگوں میں بیٹھ نہیں گئے' ہم چبوترے پر ...کھڑے انہیں جاتا دیکھتے رہے۔

ان کی آمد اور روانگی میں چند ہی منٹ صرف ہوئے ...ں گے۔ ہم بیٹھک میں واپس پہنچے تو نیساں اور یاسمن کے ...وا کوئی موجود نہیں تھا۔ ہمیں دیکھ کے ان کے چہروں پر جیسے ...روشنی پھوٹنے لگی۔ دونوں ادھر ادھر بکھری ہوئی خشک میوے کی تشتریاں اور قہوے کی پیالیاں سمیٹ رہی تھیں۔ بھٹل نے اپنی جگہ بیٹھ کے چلم کی راکھ کریدی اور پھونکیں مار مار کے سوئی ہوئی آگ بیدار کی۔ نیساں نے گو تازہ حقہ بھر کے لانے کے لیے کہا لیکن حقے کے رموز سے بھٹل خوب واقف تھا۔ دو چار کشوں کی جمت کے بعد نے سے دھواں افراط سے آنے لگا۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ تمباکو میں ابھی جلنے کی سکت ہے۔ دھوئیں کا بھی ذائقہ ہوتا ہے۔ میں نے پہلے کبھی ایک دو کش لے کے دیکھے تھے' میرا تو سر گھومنے لگا۔ حلق میں دھواں جیسے اٹک گیا ہو۔ بھٹل نے فرمائش نہیں کی تھی۔ نیساں بھاگم بھاگ کہیں سے تیل کی شیشی لے آئی۔ شاید بھٹل کو بھی کچھ سکون یا توجہ منتشر ہونے کی ضرورت تھی۔ نیساں کا ارادہ بھانپ کے اس نے سپر ڈال دی۔ آنکھیں موندے حقہ گڑگڑاتا رہا۔ نیساں حویلی کے مکینوں کی دل جوئی کے بہانے ڈھونڈتی تھی۔ ہر دم کوئی خدمت بجا لانے کے لیے مستعد۔ اشارے کی جستجو اور اشارے پر تعمیل کے لیے بے کل۔ مالش کی تو وہ ماہر تھی۔ ایسی پھوکی پھوکی انگلیوں سے سر دباتی اور بالوں میں تیل پیوست کرتی تھی کہ ایک سرور سا رگ وپے میں اترنے لگتا تھا۔ بھٹل کے عقب میں کھڑی نیساں نے مسکراتے ہوئے آنکھوں آنکھوں میں مجھے اشارہ کیا کہ بھٹل کے بعد میری باری ہے۔ ادھر یاسمن نے خود کو مصروف رکھنے کے لیے گاؤ تکیے ترتیب سے رکھنے اور فرش وغیرہ کی درستی کا کام اپنے ذمے لے لیا تھا۔ کچھ دیر تو میں چپ چاپ بیٹھا انہیں دیکھتا رہا پھر دبے قدموں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ دیگر ضرورتوں کے علاوہ ہر آدمی کو کسی خلوت کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ گھر اور گھر میں گوشے نہ ہوتے تو آدمی کو خود سے نمٹنا کیسا دشوار ہوتا ہے۔ کہتے ہیں' آدمی گروہ بند' غول پسند مخلوق ہے لیکن تنہائی کی بھی اسے شدت سے طلب ہوتی ہے۔

رات اتنی گہری نہیں ہوئی تھی۔ بستر پر جسم پھیلا کے میں نے بھی بھٹل کے مانند آنکھیں بند کرلیں مگر کھلی آنکھوں میں سامنے کے منظر کی ایک حقیقت یا دیوار حائل رہتی ہے۔ بند آنکھوں میں گزرا ہوا منظر اور اجاگر ہوجاتا ہے۔ گزرا ہوا منظر آنکھوں میں کھبا ہوا تھا۔ پولیس افسر ہمیں دیکھنے آیا تھا۔ وہ ہمیں ساتھ بھی لے جاسکتا تھا' پھر سب کچھ بدلا ہوا ہوتا' حوالات کا بوسیدہ کمرا' سلاخیں' مردہ روشنیاں' شکستہ بنچیں اور پہرے داروں کی دھمکتی چاپیں' ان کی گھڑکیاں' دھمکیاں اور جانے کیا کیا۔ مما کے بھتیجے کے بہ قول شہر میں طرح طرح کی افواہیں گردش کررہی تھیں۔ ہماری روپوشی کی افواہ ہی

نے پولیس کو اس وقت حویلی پر یلغار کرنے کے لیے مجبور کیا ہوگا۔ ایک بات تو واضح ہوگئی تھی اور پولیس افسر بھی کچھ باور کرا رہا تھا کہ پورا ہفتہ گزر جانے کے بعد بھی وہ ہماری طرف سے غافل نہیں ہوئے ہیں۔ حویلی کے گرد پولیس کی نفری ابھی تک تعینات تھی۔ شہر کے ناکوں' باہر جانے والے راستوں پر وہ مسلسل نگرانی کر رہے تھے۔ اس حصار کے بعد انہیں ہمارے بارے میں کسی افواہ پر توجہ نہیں دینی چاہیے تھی۔ اس سے پولیس کی بدحواسی اور بے چارگی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ دو دن پہلے بٹھل دوسری بار اڈے کی طرف گیا تھا۔ اس مرتبہ مما کا بھتیجا اس کے ساتھ نہیں تھا' سو مجھے نہ معلوم ہوسکا کہ اب کے اڈے جانے والے راستوں پر اسے کتنی جگہ روکا گیا اور کیا تو تکار ہوئی۔ سہ پہر کو وہ حویلی واپس آگیا تھا۔

یکایک ایک خیال نے مجھے بستر سے اٹھا دیا۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ فیض آباد سے ہمارے فرار کی شوشہ طرازی اڈے کے آدمیوں ہی نے کی ہو۔ ظاہر ہے' بٹھل کی ایما پر' اس کی اجازت سے۔ بٹھل سے کچھ بعید نہیں تھا۔ اس طرح وہ پولیس پر اپنا اعتبار برقرار رکھنے کا کوئی مقصد حاصل کرنا چاہتا ہو۔ گزشتہ سات دن میں ٹھاکر بستی کی واردات کی تفتیش سے متعلق کسی افسر سے یہ ہمارا پہلا رابطہ تھا۔ ہوسکتا ہے' اتنا وقت گزر جانے کے بعد بٹھل نے اپنے اطمینان اور استغنا کا اظہار ضروری سمجھا ہو۔ کسی افواہ کی ترغیب ہی پر حویلی میں پولیس کی آمد ممکن تھی۔ یہ ایک بالواسطہ دعوت تھی۔ ہماری طمانیت اور بے نیازی یقیناً پولیس کا شک متزلزل ہونے کا باعث ہوسکتی ہے۔ دوسری جانب بٹھل کو بھی کچھ پولیس کا رجحان' اس کی فکر کی سمت جاننے کی جستجو ہونی چاہیے۔ اس اقدام میں کئی پہلو مضمر تھے۔ پولیس کو اس یقین کا اعادہ بھی بٹھل کا مقصود ہوگا کہ ہم اس کی دسترس سے دور نہیں ہیں۔ یہ امکان تو قطعاً نہیں ہے کہ بٹھل کے ذہن میں شہر سے فرار کا کوئی ارادہ پنپ رہا ہو اور یوں وہ حویلی کے گرد پولیس کا محاصرہ ختم کرنا چاہتا ہو۔ اس کے چہرے پر فکر و تردد کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ کچھ لکھا ہو تو کچھ پڑھا جائے۔ آدمی لفظ پڑھ سکتا ہے' نشانات' شناخت کرسکتا ہے۔ بٹھل کا چہرہ تو کورے کاغذ کی طرح تھا۔ وہ تو کوئی بت تھا' چلتا پھرتا بت۔ جس نے جو کچھ نہیں دیکھا اور جس نے جو کچھ نہیں جانا' اس کی آنکھیں کتنی ہی روشن ہوں' وہ بینا تو نابینا کے مانند ہے اور کسی نابینا کی طرح چیزیں ٹٹولنا اور راستے کھوجنا ہی میرا کام تھا۔ میں تو سرے ہی ڈھونڈ سکتا تھا۔

میرے اندیشے اور وسوسے اس واقعے پر انحصار کرتے تھے کہ ٹھاکر بستی کی خوں ریزی سے بٹھل کا کوئی واسطہ ہے کہ نہیں۔ بہرحال کچھ بٹھل کو بھی احساس ہوگا کہ پولیس' ٹھاکر بستی کے اتنے بڑے سانحے سے یوں دستبردار نہیں ہوجائے گی۔

دروازہ کھلا ہوا اور کمرے میں خوب اجالا تھا۔ نیساں شور مچاتی' کودتی پھاندتی اچانک وارد ہوئی "ہاں بابر بھائی' اب تیار ہوجایئے" مالش والوں کی طرح تیل کی شیشی اس کے ہاتھ میں دبی اور سفید تولیہ کلائی پر لٹکی ہوئی تھی۔

"ارے ارے' یہ ایک دم حملہ۔۔۔۔ آج چھوڑو بھئی' کل دیکھیں گے" میں نے کتراتی آواز میں کہا "تم تھک گئی ہوگی۔"

"تھکنا کیسا؟" وہ چہکنے لگی "آزمالیجئے۔ پوری رات کی شرط۔ اچھا' ٹھیک ہے جب تک آپ کو نیند نہ آجائے۔"

اس نے مزید کسی عذر جوئی کا موقع نہیں دیا' مسہری کے سرہانے کے عقب میں کھڑی ہوکے اس نے تیزی اور مہارت سے اچھی طرح تولیہ میری گردن اور سینے پر لپیٹ دی۔ تیل کے قطروں کی ٹھنڈک مجھے سر میں محسوس ہوئی۔ شیشی بند کرکے پہلے وہ ہتھیلیوں کی نرم نرم تھپکیوں سے مساموں میں تیل سموتی رہی پھر اس کی موی' ریشمی انگلیاں بالوں میں تیرنے' سرسرانے لگیں۔ ہاتھوں کی بھی کیا کرشمہ کاری ہوتی ہے۔ آدمی کے حواس جیسے خواص ہوتے ہیں' ہاتھوں میں ہاتھ بولتے' ہاتھ سنتے' ہاتھ دیکھتے ہیں۔ نرم و سخت گرم و سرد' تلخ و شیریں' ریشم بھی' پتھر بھی۔ ہاتھوں کی اپنی ایک حیثیت ہوتی ہے۔ نیساں کے ہاتھوں کی لپک' اس کی تپاک' اس کی وارفتگی کی مظہر تھی۔ آنکھوں میں خمار سا چھانے لگا۔ وہ باربار انگلیوں کے پینترے بدلتی تھی۔ ہتھیلی سے کنپٹیاں دباتی' پوروں کی دھیمی دھیمی چٹکیوں سے بھویں گرفت میں لیتی' کبھی پیشانی پر وہ ایک تواتر و توازن سے انگلیاں تھرکاتی' انگلیاں بجاتی تھی۔ مالش میں انگلیوں کا ردم بہت ضروری ہوتا ہے۔ وہ اس رمز سے بھی بہ خوبی واقف تھی کہ مالش کے دوران میں اندازہ ہوتا ہے کہ سر میں کتنا درد چھپا ہوا تھا۔ نیساں کی انگلیاں میرے سر پر رقص کر رہی تھیں اور مجھ پر ایک سرور آمیز' نشاط انگیز کیفیت طاری ہورہی تھی۔ میرا جسم نیساں کی انگلیوں کی لوری میں جھول رہا تھا یا محو پرواز تھا کہ دروازے پر ابھرتی آہٹ نے چونکا دیا۔ نیساں نے اسے مجھ سے پہلے دیکھ لیا تھا۔ وہ یاسمن تھی نیساں کے اصرار کے باوجود دروازے پر کھڑی رہی۔ میرا

میں دس بج رہے تھے۔

اس دن بٹھل صبح سویرے حویلی سے نکل گیا تھا۔ اڈے کے سوا کون سی منزل ہوگی۔ سورج ڈوبتے وقت وہ واپس آگیا۔ دوسرے دن مما کے بھتیجے نے مجھے بتایا کہ شہر میں تعینات غیر مقامی پولیس واپس چلی گئی ہے۔ اب مقامی پولیس ہی خاص خاص مقامات پر گشت کر رہی ہے۔ صبح دکانیں وقت پر کھلنے لگی ہیں لیکن شام کو جلد بند ہوجاتی ہیں۔ لوگ جلد ہی گھروں میں چلے جاتے ہیں۔ کئی دن پہلے بازار کا علاقہ کھل گیا تھا لیکن بالاخانے سونے پڑے ہیں۔ شہر میں مسافروں کی آمد و رفت بہت کم ہے۔ باہر سے ضروری اشیا اور دیگر سامان پہنچانے والے تاجروں نے جگہ جگہ پولیس کی مداخلت کی وجہ سے باربردار گاڑیاں لانی بند کردی ہیں اس لیے شہر میں بعض اشیا کی قلت ہوگئی ہے۔ مما کے بھتیجے کو اس کے کسی شناسا پولیس والے نے بتایا تھا کہ گوروں کے حکم پر سنگین واردات کی تفتیش کرنے والے خاص ماہروں کی ایک اور جماعت ٹھاکر بستی بھیجی گئی ہے۔ دو دن سے وہ حویلی کے خاکستر میں ایک ایک چیز کرید رہے ہیں لیکن شاید وہ بھی ناکام ہوجائیں۔ [illegible]ع کے روز پولیس واردات کی جگہ دیر سے پہنچی تھی۔ سنا ہے' آس پاس کے دیہاتوں کو لوٹ کھسوٹ کا خوب وقت مل گیا تھا۔ لوگوں کا کہنا ہے' پولیس نے بھی دیہاتیوں سے بچ جانے والا سازو سامان کہاں چھوڑا ہوگا۔ ٹھاکروں کی حویلی [illegible] قدیم اور وسیع و عریض حویلی تھی۔ بہت مال و اسباب تھا [illegible]ل۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ حملہ آوروں نے روپے پیسے [illegible]ر اور نادر اشیا سے سروکار نہیں رکھا تھا۔ روز نئی [illegible]یحات اور تاویلات کی جارہی ہیں۔ کچھ لوگ مصر ہیں کہ [illegible]ئی اور نہیں' پولیس خود الجھ رہی ہے۔ مختلف شہروں اور [illegible]بوں میں مقیم' مرنے والے ٹھاکروں کے دور و نزدیک کے [illegible]تے داروں کی باہمی رنجش' عداوت اور حسد اس [illegible]نسانے کی اصل وجہ ہے۔ ٹھاکروں کی زمینوں پر کام کرنے [illegible]لے کسانوں کے ایک گروہ کے مطابق' ٹھاکروں کے ساتھ [illegible]ہنے والے واحد چچا زاد بھائی ٹھاکر ہرچرن کی وفا شعار بیوہ [illegible] اپنی جان کا نذرانہ دے کے اپنے شوہر کی ارتھی پر کیا ہوا [illegible] نبھایا ہے۔ ٹھاکروں نے آبائی جائداد میں بڑی حصے داری [illegible] وجہ سے اس کے شوہر کو زندہ رہنے نہیں دیا۔ اسے اپنے [illegible]ہر کی طبعی موت کا یقین نہیں تھا۔ وہ مسلسل آگ میں جل [illegible]ہی تھی۔ یہ تو لوگ پہلے ہی کہتے تھے کہ سارا کچھ لکشمی داس [illegible]نیا برکھا کی روح کی پاداش ہے۔ وہ ایک نہایت پاک باز اور [illegible]سوم لڑکی تھی۔

اس سے اگلے دن شام کو میں تنہا لائبریری میں بیٹھا تھا کہ جہانگیر نے آکے کہا "گلو آپ کو یاد کر رہا ہے۔ کہتا ہے' آپ اپنے کام سے نمٹ جائیں تو ذرا ڈیوڑھی کی طرف آجائیں۔"

میرا دل پھر کسی کتاب میں کیسے لگ سکتا تھا۔ یقیناً مما کا بھتیجا پھر کوئی نئی خبر لے کے آیا ہے۔ ڈیوڑھی میں وہ میرا منتظر تھا۔ اسے یقین تھا کہ پیغام ملتے ہی میں آجاؤں گا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں سلام کیا' پھر رازدارانہ لہجے میں کہنے لگا "چھوٹے صاحب سیدھا بازار سے آرہا ہوں۔ مدنی ہوٹل کے مالک شدن میاں سے اپنی یاد اللہ ہے۔ آتے جاتے سلام دعا ہوجاتی ہے۔ میں نے خیریت پوچھی تو پاس بلا کے بولے' برخوردار' وہ تو نقشہ ہی دوسرا بن رہا ہے' ابھی سہ پہر کے وقت تین چار وردی والے لاٹ صاحب اپنے ہاں چائے پینے کو آئے تھے' وہ تو کچھ اور ہی راگ الاپ رہے تھے۔

مما کے بھتیجے نے مجھے بتایا کہ ٹھاکر بستی میں واردات سے ایک دن پہلے لکھنؤ سے مینا نامی رقاصہ اپنے چند سازندوں کے ساتھ محفل آرائی کے لیے آئی تھی۔ اسے حویلی کے مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا۔ دو دن بعد اس کی محفل طے ہوگئی تھی۔ اردگرد کے رؤسا اور اعلیٰ حکام مدعو کیے جاچکے تھے۔ کسی کے سان و گمان میں نہیں تھا کہ مینا' بینا کی بڑی بہن ہے۔ بینا کچھ عرصے پہلے حویلی سے چند کوس کے فاصلے پر ٹھاکروں کے باغات میں واقع عشرت گاہ میں اسیر رہ چکی تھی۔ بنارس کے بازار میں ٹھاکر بل دیو نے اسے دیکھا تھا' پھر وہ روز بالاخانے جانے اور مال و زر لٹانے لگا۔ اس نے بینا کی ماں لیلا کو راضی کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کسی طور حسن و جمال میں بے پایاں' نرت بھاؤ میں بے مثل بیٹی سے دستبردار ہونے پر تیار نہ ہوئی۔ ٹھاکر میں انکار سننے کا حوصلہ نہیں تھا۔ وہ ناشاد بنارس سے واپس آگیا۔ کچھ مدت اس نے جبر کیا' آخر ایک دن اس کے شورہ پشت نمک خواروں نے بینا کو اپنے آقا کی جناب میں پیش کردیا۔ بینا کو باغات والی عشرت گاہ میں محصور کردیا گیا۔ آس پاس بیٹی کی تلاش میں ناکامی کے بعد لیلا کی نظریں ٹھاکر بل دیو پر گئیں لیکن ٹھاکر بستی پہنچ کی اسے اپنی کم قامتی اور ٹھاکروں کی بلند اقبالی کا اندازہ ہوا۔ اس نے بہت دہائیاں دیں' کون اس کی فریاد سنتا۔ اوپر سے نیچے تک عمال' حکام ٹھاکروں کے تابع تھے۔ وہ آہ و بکا کرتی ہوئی بنارس لوٹ گئی۔ بنارس میں ٹھاکروں کا سکہ نہیں چلتا تھا۔ کوئی کتنا ہی عالی مرتبت ہو مگر یہ دنیا بہت بڑی ہے۔ لیلا

ایک ممتاز خاندانی طوائف تھی۔ زندگی بھر دونوں ہاتھوں سے سمیٹا تھا اور ایسی دو بیٹیوں کی ماں تھی جن پر اہلِ ثروت لعل وجواہر نچھاور کرتے تھے۔ بنارس سے اسی نے ٹھاکروں کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا ارادہ کیا لیکن اسے کچھ مہلت ہی نہیں ملی۔ ٹھاکر کے کارندے اس کے تعاقب میں تھے۔ ایک صبح اس سمیت سارے مکین مردہ پائے گئے۔ ادھر ٹھاکر بستی میں مینا کا بھی یہی انجام ہوا۔ سنا ہے' وہ ماں بننے والی تھی۔

لکھنؤ میں مقیم لیلا کی بڑی بیٹی' مینا کی بڑی بہن مینا کے ساتھ سازندے بھی ٹھاکر بستی آئے تھے۔ سازندے یا کوئی اور۔ قیاس ہے' اس نے باہر بھی ہتھیار بند لوگ تیار رکھے ہوں گے۔ اسی سرتاپا غضب نے ٹھاکر بستی کھنڈر کی ہے۔ وہ پورے اہتمام وانتظام سے آئی ہوگی۔ بعض لاشیں ایسی مسخ ہوگئی تھیں کہ انہیں پہچاننا مشکل تھا۔ مینا لکھنؤ واپس نہیں پہنچی۔ وہ اور اس کے سازندے کہاں چلے گئے؟ پولیس نے مختلف شہروں کے بالا خانوں پر چھاپے مارے' مینا کا کہیں کوئی سراغ نہیں ملا۔ ابھی تک وہ اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ یا تو یہ قصہ ہی سرے سے غلط ہے۔ مینا بھی ٹھاکروں کے خاندان اور ملازموں کے ساتھ لپیٹ میں آگئی یا پھر وہ خود کو فنا کردینے کا کوئی عزم کرکے لکھنؤ سے چلی ہوگی۔ دولت کی اس کے پاس کمی نہیں ہوگی۔ دولت ہونی چاہیے۔ آدمی کو نچانے والے' آدمی کو ختم کرنے والے بہ کثرت مل جاتے ہیں' ہوسکتا ہے' مینا نے بالا خانے کی زندگی ہی ترک کردی ہو اور دور دراز کسی شہر میں شرفا کی بستی کا رخ کرلیا ہو۔ ماں اور بہن کے چلے جانے کے بعد اب اس پر گزر بھی کیسی رہی ہوگی۔ اس خوں ریز واقعے کے انجام کا اسے خوب علم ہوگا اور اس نے ہر ممکن احتیاط کی ہوگی۔ آدمی کبھی اس نتیجے پر بھی پہنچتا ہے کہ کیا جینا اور کیا مرنا۔ کبھی کسی کی زندگی خود اس کی نظروں میں بہت حقیر ہوجاتی ہے۔

مما کا بھتیجا گلو کہہ رہا تھا کہ شہر میں سبھی متفق ہیں' مرنے والوں کی جتنی تعداد پولیس نے بتائی ہے' اس سے کہیں زیادہ ہے۔

کچھ سادہ دل یہ سانحہ ٹھاکروں کے اعمال کا مال قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے' خدا کے ہاں دیر ہے' اندھیر نہیں۔ ہر شخص بہ قدر توفیق تخلیق کار ہوتا ہے اور کوئی نہ کوئی رائے قائم کرنے کے لیے بے قرار رہتا ہے۔ رائے کی اصابت دیگر بات ہے۔ جب کسی معقول اور مستند ذریعے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا تو لوگ خود ہی جیسا تیسا اخذ کرنا شروع کردیتے ہیں اور فیصلے صادر کرنے لگتے ہیں' اندھیرے میں کتنی قیاس ہی کی جاسکتی ہیں' کوئی ایک ان میں درست بھی ہوتی ہے۔ کچھ داستانیں مجرموں نے بھی عام کی ہوں گی۔ تو یہ نو داستانوں کی بھول بھلیوں میں مجرم تک رسائی آسان نہیں رہتی۔

مما کے بھتیجے سے حویلی کے باہر کا احوال سن کے میں خاموش رہا۔ میں نے اس سے نہیں کہا' ظاہر ہے' پولیس نے ہر متبادل' امکان پر جگر کاوی کی ہوگی۔ وہ شہر میں منڈلاتی خیال آفرینیوں اور قیاس آرائیوں سے بھی بے بہرہ نہیں رہے ہوں گے۔ ان میں ورما جیسے دیدہ ور' تدبیر گر افسر موجود ہیں۔ ورما نے اس واقعے سے ہمارے تعلق کی جس یقینی اور منطقی انداز میں توجیہ کی تھی' اسے سن کے میں ششدر رہ گیا تھا۔ ورما نے مجھے بھی دگرگوں کردیا تھا۔ جیسا کہ اس نے کہا تھا' بے شک ٹھاکر بستی کی واردات کسی نہایت منظم' ماہر ومشاق پیشہ وروں کی شعبدہ گری ہے۔ ان کی تعداد بھی کم نہیں ہوگی۔ انہیں ٹھاکر بستی کی طرف کوچ کرنے سے پہلے وہاں سے بہ سلامت واپسی کی فکر ہوگی۔ نہ وہ ایک ساتھ وہاں داخل ہوئے ہوں گے نہ ایک ساتھ واپس۔ کسی دل فگار بیوہ کسی برگشتہ بہن اور بیٹی اور کسی حاسد رشتے دار کی آتشِ انتقام شاید اتنی شدید واردات کی متحمل نہیں ہوتی۔ حالت غضب میں بینائی متاثر ہوتی ہے اور کوئی نہ کوئی چوک ہوجاتی ہے۔ فریق اور فریق کے فرستادے میں فرق ہوتا ہے۔ ٹھاکر بستی میں جانے والے کسی فریق کے فرستادے ہی ہوسکتے ہیں۔ اصل فریقین کی دبدھائی میں خون کی گردش کا عالم کچھ اور ہوتا ہے۔ یہ تو خود کو قابو میں رکھنے والوں کا کام نظر آتا ہے۔ یہ نکتہ پولیس اور بہ طور خاص ورما کے ذہن رسا سے پیوست ہوجانا چاہیے۔

گزشتہ تین چار دن سے بٹھل نے اڈے جانا معمول بنالیا تھا۔ کبھی سہ پہر کبھی شام کو وہ واپس آجاتا۔ کوتوالی میں ہماری پیشی کے پندرہویں روز' دوسرا پہر تھا کہ سن رسیدہ کلکلیں بھرتا میرے پاس آیا۔ اس وقت بٹھل گھر پر نہیں تھا۔ مما نے دھڑکتی آواز میں حویلی کے اطراف پولیس ہٹ جانے کا مژدہ سنایا۔ دو دن پہلے اڈے اور شہر کے بعض مقامات سے پولیس کے دست کش ہوجانے کی خبر مجھے اس کے بھتیجے سے مل ہی چکی تھی۔ شہر میں زندگی معمول پر آرہی تھی۔ روز وشب کی ضرورتیں ایک حد تک ہی ڈھیل دے سکتی ہیں۔ ضرورتیں بھی قرضے کی طرح ہوتی ہیں۔ بٹھل نے شروع میں منیر علی کے بھانجے اور بیٹے ارشاد اور تنویر کو حویلی تک محدود رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ مشورہ حکم کا درجہ رکھتا تھا' پھر چند دن بعد انہیں شہر جانے کی اجازت اس ہدایت کے ساتھ دی گئی کہ وہ گھر واپسی میں دیر نہ لگائیں اور غیر ضروری لوگوں سے سرِدست رسم وراہ موخر رکھیں۔ اب کوئی تین چار دن پہلے اپنے کام کی دیکھ بھال کے لیے انہیں زمینوں پر جانے کا اختیار بھی دے دیا گیا تھا۔ دونوں اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور معاملہ فہم بھی۔ انہوں نے اپنے طور پر دور اندیشی کی۔ بیش تر وقت حویلی میں گزارا۔ اس احتیاط میں خوف بھی شامل ہوگا۔ خوف ہر موقع پر بزدلی نہیں ہوتا۔

یقیناً بٹھل کو حویلی کے محاصرے کے باوجود رفتہ رفتہ ہوا کا رخ اپنے حق میں بدلنے کا اندازہ ہوچلا تھا۔ بہرحال اب حویلی سے پولیس ہٹالی گئی تھی۔ بہ ظاہر یہ دھند چھٹ جانے کی علامت ہے مگر حویلی شہر میں سب سے آخری مقام ہے جہاں مسلح وردی پوش دھرنا دیے بیٹھے رہے۔ یہ حقیقت محلِ نظر ہے۔ بٹھل کو ہمہ دم اس کا احساس ہوگا' ہونا چاہیے۔

بٹھل نے مجھ پر کوئی پابندی عائد نہیں کی تھی لیکن میں نے از خود شہر کا رخ نہیں کیا۔ مجھے اپنے آپ سے ڈر لگتا تھا' کوئی کوتاہی' کوئی نادانی مجھ سے سرزد ہو ہی جاتی تھی اور میں باہر نکل کے کرتا بھی کیا۔ گلو سے شہر بھر کی اطلاعات مل ہی جایا کرتی تھیں۔ دن بھر میں حویلی کے مکینوں کے ساتھ رہتا۔ اس رات نیساں اور یاسمن کے ساتھ کچھ وقت گزار کے مجھے اپنی دل بستگی اور خوش نودی کا جیسے کوئی نسخہ ہاتھ لگ گیا تھا۔ پھر میں ان سب میں شامل رہا۔ شام کو بیڈ منٹن' دن بھر شطرنج' چوسر' کیرم' نئے نئے کھانوں کے تجربے' خوش گپیاں اور مطالعہ' کبھی لائبریری میں' کبھی اپنے کمرے میں' رات کو دیر تک کمرے میں محفل جمی رہتی۔ میں انہیں خود مدعو کرتا تھا۔ جب میں اکیلا ہوتا تو اپنے سامنے آجاتا تھا۔ میں اپنا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میرا دل پھر الجھنے' گھبرانے لگتا تھا۔

وہ اٹھارہواں دن تھا۔ صبح ناشتے کے بعد بٹھل نے مجھے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ مجھے حیرت ہوئی اور میں نے منزل پوچھنی چاہی مگر چپ رہا۔ کسی جواب سے حاصل بھی کیا تھا۔ میرے لیے بہرصورت تعمیل واجب تھی۔ کپڑے صاف ستھرے تھے۔ بٹھل نے کوئی اعتراض بھی نہیں کیا۔ باہر تانگا ہمارا منتظر تھا۔ اتنے دنوں بعد باہر آکے گلیوں اور بازاروں سے گزرتے ہوئے اجنبیت سی محسوس ہورہی تھی۔ گیارہ بج رہے ہوں گے۔ دھوپ ہر سو قابض ہوچکی تھی۔ گلو ٹھیک ہی کہہ رہا تھا' سارا کچھ بحال ہونے کے باوجود شہر ٹھہرا ٹھہرا' تھکا تھکا سا نظر آرہا تھا۔ راستے میں کئی جگہ لوگوں نے چونک کے ہماری طرف انگلیاں اٹھائیں۔ لگتا تھا' اتنے دنوں میں سب لوگ بٹھل کو پہچان گئے ہیں۔ چوک میں اڈے کے آدمی گشت پر تھے۔ ہمیں دیکھ کے پھڑکنے لگے۔ وہ اس کے تیور شناس تھے۔ کسی کو قریب آنے کی ہمت نہ ہوئی۔ جس نکڑ سے اڈے کی طرف راستہ جاتا تھا' تانگا وہاں سے آگے گزر گیا تو مجھے گھٹن ہونے لگی اور جلد ہی دور ہوگئی۔

کوتوالی کی عمارت کے سامنے تانگا رک گیا۔ عمارت میں سپاہیوں کی ایک بڑی نفری ادھر ادھر بکھری ہوئی تھی اور پہلے جیسی چہل پہل نہیں تھی۔ ان میں کئی ہمارے صورت آشنا تھے۔ ہمیں یوں عمارت کی طرف بڑھتا دیکھ کے وہ گڑبڑا سے گئے اور دو سپاہیوں نے تیزی سے عین ہمارے مقابل آکے' روکھی آواز میں ہماری آمد کا مقصد جاننا چاہا۔ ورما کا نام سن کے ان کے جسم تن گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف مضطرب نظروں سے دیکھا۔ انہیں متذبذب چھوڑ کے ہم عمارت میں داخل ہوگئے۔ دونوں سپاہی لمحوں کے تامل کے بعد ہمارے پیچھے لپک پڑے اور انہوں نے ہمیں ٹھہر جانے کا حکم دیا۔ ایک سپاہی راہ داری میں آگے چلا گیا۔ وہ فوراً ہی لوٹ آیا اور ایک کشادہ اور صاف کمرے میں ہمیں لے گیا۔ وہ کوئی نیا پولیس افسر تھا۔ پینتیس سے چالیس کے درمیان عمر' رنگ سرمئی' قد مناسب' الٹی مانگ نکالے ہوئے۔ کڑک وردی پہنے ہوئے تھا۔ رسمی سلام کے بعد بٹھل نے نرمی سے کہا "اپنے کو بڑے صاحب' ورما جی سے ملنا ہے۔"

"کیا کام ہے؟" پولیس افسر نے ناگواری سے پوچھا۔

"انہی کو ملنا ہے صاحب!"

"کس واسطے؟" پولیس افسر کے لہجے میں درشتی آگئی۔

"ان کو معلوم ہے' استاد بٹھل بولوگے تو پورا سمجھ جائیں گے۔"

"اوہ' استاد بٹھل!" پولیس افسر کرسی پر مچل سا گیا۔ اس کی متجسس نگاہیں بٹھل کے چہرے پر اٹک گئیں "بہت نام سنا ہے تمہارا۔"

"ادھری آپ نئے نئے آئے ہو؟"

"ہاں' تین چار دن ہی ہوئے لیکن باربار تمہارا نام سنا ہے" پولیس افسر کے لہجے میں طنز نمایاں تھا پھر نخوت سے بولا "کیوں ملنا چاہتے ہو بڑے صاحب سے؟ وہ اس وقت میٹنگ میں ہیں۔"

"اپنے پاس ٹائم ہے۔"

"ہم کو بولو' کیا بات ہے؟"

"تھوڑی اپنی ان کی بات ہے" بٹھل نے سرسری انداز میں کہا "آپ جان کے کیا کروگے؟"

پولیس افسر کی آنکھوں میں خشونت اتر آئی' چہرے پر

تناؤ بڑھتا‘ کم ہوتا رہا۔ اس نے سر کو جھٹکا دیا اور کوئی ارادہ کر کے کرسی سے اٹھ گیا۔ اس کی ہدایت پر ہم کمرے کے باہر بینچ پر بیٹھ گئے۔

کوئی دس منٹ بعد وہ راہ داری میں واپس آتا دکھائی دیا اور اس نے ہمیں دوبارہ کمرے میں آنے کی دعوت دی اور اس بار کرسیوں پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ اس نے بتایا کہ ورما ایک ضروری میٹنگ میں مصروف ہے اور میٹنگ کے اختتام کا کچھ طے نہیں ہے۔ باہر سے کئی پولیس افسران آئے ہوئے ہیں۔ وہ اندر نہیں جا سکا لیکن اس نے پہرے دار کے ہاتھ رقعہ بھیج کے ہماری آمد سے ورما کو مطلع کیا تھا۔ پولیس افسر کے ہاتھ میں ایک مختصر رقعہ دبا ہوا تھا جو اس نے ہماری طرف بڑھا دیا پھر شاید یہ سوچ کے کہ ہم اسے پڑھنے سے قاصر ہوں گے‘ وہ رقعہ میز پر رکھنا چاہتا تھا کہ میں نے اس کے ہاتھ سے اچک لیا۔ یہ جسارت ایسی گستاخانہ بھی نہیں تھی۔ پولیس افسر نے پہلے ہی رقعہ ہماری طرف بڑھایا تھا‘ شاید اسی لیے اس نے برا بھی نہیں مانا‘ صرف کندھے اچکا کے اور منہ بنا کے رہ گیا۔ مجھے پڑھنے میں دیر نہیں لگی۔ پولیس افسر کی جانب سے ہماری آمد اور ملاقات کی خواہش اور نیچے ورما کا جواب رقعے پر سادہ اور مختصر لفظوں میں مندرج تھا۔ دونوں تحریریں انگریزی میں تھیں۔ ورما نے جواب میں لکھا تھا کہ وہ اس وقت کسی سے نہیں مل سکتا۔ ملاقات کا مقصد معلوم کیا جائے۔

”تم‘ تم انگریزی جانتے ہو؟“ اس نے تعجب سے پوچھا۔

”تھوڑی بہت“ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

بہت خوب‘ تم تو جامو استاد کے ڈیرے کے آدمی ہو؟“ وہ جھجکتے ہوئے بولا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”کیا کہنا چاہتے ہو تم لوگ‘ مجھے بتاؤ۔“ اس کی آواز میں ہیجان چھپا ہوا تھا ”بڑے صاحب تک تمہارا پیغام پہنچا دیا جائے گا“ وہ انگریزی میں بولا پھر شاید بٹھل یا میری کم فہمی کے خیال سے ہندوستانی میں اپنا مدعا بیان کرنا چاہا۔

بٹھل نے اس کی بات پوری نہیں سنی‘ ہاتھ اٹھا کے بولا ”ٹھیک ہے صاحب‘ ان کو بولو‘ اپنے کو اب ادھری سے باہر جانا ہے۔ جتنا ہم نے بولا تھا‘ اتنا ٹائم پورا کر لیا ہے۔“

”کہاں جانا ہے؟“ پولیس افسر نے تفتیشی انداز میں پوچھا۔

”صاحب بہادر کو پتا ہے۔“ بٹھل نے سپاٹ لہجے میں کہا اور یہ کہتے ہی اٹھ گیا۔ پولیس افسر اس طرح ہمارے اٹھ جانے پر حیران و پریشان ہوا۔

دروازے سے نکلتے ہوئے بٹھل ٹھہر گیا اور نسبتاً اونچی اور بھاری آواز میں کہا کہ ورما کو بتا دیا جائے‘ ابھی تین چار دن تک ہمارا قیام یہیں ہے۔ ہماری کوئی ضرورت ہو تو ہمیں بلا لیا جائے یا کسی کو حویلی بھیج دیا جائے۔ آنے والے دنوں میں ہم مسلسل سفر میں رہیں گے اور کوشش ہوگی کہ کلکتے میں استاد جامو کو اپنے آیندہ ٹھکانوں سے آگاہ کرتے رہیں۔ اس دوران ہم مطلوب ہوں تو استاد جامو کو مطلع کر دیا جائے۔ ہمیں پیغام مل جائے گا۔

اس پیغام رسانی میں کچھ دیر لگ سکتی ہے لیکن پولیس نے جس طرح اب تک ہم پر اعتماد کیا ہے‘ آیندہ بھی وہ تسلی رکھے‘ جب بھی ہمیں طلب کیا جائے گا‘ ہم جلد یا بدیر حاضر ہو جائیں گے اور واضح رہے‘ پولیس نے ہم سے رابطہ کیے بغیر یہاں ہمارے متعلقین سے کسی قسم کی بازپرس کی تو ہم سے کوئی امید نہ رکھی جائے پھر ہم وہی کریں گے جو اپنے دفاع میں ہمیں کرنا چاہیے۔ بہتر ہوگا‘ پہلے ہمارا انتظار کیا جائے۔

پولیس افسر کرسی سے اٹھ گیا۔ اس کے نتھنے پھول گئے تھے اور ہونٹ کچھ کہنے کے لیے دھڑک رہے تھے‘ بٹھل کمرے سے نکل گیا۔

○☆○

رات کو کھانے کے بعد حقہ نوشی کرتے ہوئے بٹھل نے بتایا کہ اب سفر درپیش ہے۔ اسے جلد سے جلد یہاں سے چلے جانا ہے۔ اس وقت تقریباً سبھی موجود تھے۔ بیٹھک میں سکوت چھا گیا۔ یہ سکوت بڑا فطری تھا۔ انہیں دشواری پیش آ رہی ہوگی کہ وہ سوگواری کا اظہار کریں یا مسرت کا۔ ان کی آنکھیں جھلملا رہی تھیں۔ آنکھیں بہت چھوٹی موٹی ہوتی ہیں‘ غم کی تاب لا پاتی ہیں نہ خوشی کی۔ اس اطلاع میں ہماری جدائی کی اداسی کے ساتھ سکون کا ایک پہلو بھی مضمر تھا‘ ہماری روانگی‘ ہمارے حق میں ہونے والے کسی فیصلے کی نوید کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ ایسے فیصلے کے شدت سے آرزو مند ہوں گے۔ اس میں ایک طرف کسی بڑے عتاب سے ہماری برات‘ دوسری طرف خود ان کے‘ حویلی کے مکینوں کی عزت و عافیت کی تجدید کی سرخوشی نہاں تھی۔ انہوں نے بھی یہ دن پوری نیند نہیں گزارے ہوں گے۔ ٹھاکر بستی کی واردات پر انہوں نے ہم سے کوئی سوال جواب نہیں کیا تھا لیکن انہیں اچھی طرح دیکھنا‘ سننا اور محسوس کرنا آتا تھا اور حویلی کی دیوار کتنی ہی اونچی ہوں‘ حویلی میں بہت سے دروازے‘ دریچے اور روزن تھے۔ گرم و سرد ہوا میں تو

خانوں میں در آتی ہیں۔ انہوں نے یہاں آ کے اپنی تربیت کی تھی اور یہ رمز جان لی تھی کہ کون سی بات کس وقت کہنی اور پوچھنی چاہیے۔ انہیں اپنی اور ہماری نسبتوں کی پائداری کا یقین تھا۔ ہمارے درمیان تعلق خاطر کی ایک وضع خود بخود طے ہو گئی تھی اور یہ ہم دونوں کو بڑی عزیز تھی۔

اس رات بٹھل رات گئے تک بیٹھک میں موجود رہا۔ اس کی فرمائش پر نیساں نے کئی غزلیں سنائیں۔ اس رات نیساں کی آواز بھی جولانی پر تھی۔ وہ جو کہتے ہیں‘ واقعی رنگ جما دیا۔ جی چاہتا تھا‘ رات بھر وہ گاتی رہے اور رات کبھی ختم نہ ہو۔ باورچی خانے سے گرم گرم قہوہ آتا رہا اور وہ گاتی رہی۔ پھر اس کے اشارے پر بٹھل نے جیسے یاسمن کی کوئی چوری پکڑ لی۔ میرے لیے یہ انکشاف تھا۔ سب یاسمن کے پیچھے پڑ گئے۔ پہلے تو وہ بہت شرمائی‘ لجائی۔ بالکل چر مراسی گئی لیکن زریں‘ خانم اور اپنی بہن فروزاں کے اصرار اور حوصلہ افزائی پر اس نے مخصوص فارسی ترنم میں عمر خیام کی تین رباعیاں سنا کے سبھی کو گم صم کر دیا۔ لحن داؤدی پھر کسے کہتے ہیں۔ شاید کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ یاسمن میں یہ گن بھی ہے۔ بڑی رس بھری‘ رنگ بھری آواز تھی اس کی۔ بٹھل آنکھیں موندے سر جھکائے سر ہلاتا رہا۔ ہر زبان کا اپنا ایک خاص ترنم اور تکلم ہوتا ہے۔ فارسی کلام خالص ایرانی لب و لہجے میں اور موثر ہو گیا تھا۔ فروزاں اور غالباً زریں کے سوا معانی و مفاہیم بہت کم کسی کی سمجھ میں آ رہے ہوں مگر آہنگ کا بھی اپنا ایک اثر اور سحر ہوتا ہے‘ لے اور تال کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔ سر کسی زبان سے مشروط نہیں ہے۔ الاپ بھی محض آواز ہوتا ہے۔

بٹھل کے اٹھ جانے اور اپنے کمرے میں چلے جانے کے بعد بھی سب وہیں بیٹھے رہے۔ پھر زریں‘ نیساں‘ یاسمن‘ فروزاں‘ زہرہ‘ اس کی چھوٹی بہن سلمٰی اور بڑی سلمٰی میرے کمرے میں چلی آئیں۔ جہانگیر اور مجو میاں بھی آ گئے۔ صبح کاذب کے وقت زریں کے ٹوکنے پر انہوں نے اپنے اپنے کمروں کی راہ لی۔ صبح سبھی دیر سے اٹھے۔ ناشتا بھی دیر سے ہوا۔ بٹھل صبح سویرے اڈے چلا گیا تھا۔ مغرب کے وقت واپس آیا۔ سارے گھر میں دن بھر ہنگامہ سا رہا۔ طرح طرح کے دیسی پکوان پکتے رہے۔ زریں نے اپنے پرانے درزی کو بلوا لیا تھا۔ میرے اور بٹھل کے پاس کپڑوں کی کوئی کمی نہیں تھی اور بٹھل سفر میں زیادہ سامان لے کر چلنے کا قائل بھی نہیں تھا۔ مختلف جگہوں پر کپڑے دھلوا دھلوا کے ہم کام چلا لیتے تھے۔ حیدر آباد میں نئے سلوانے کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ دگنی سلائی پر درزی نے ایک دن میں کئی جوڑے تیار کر دیے۔ اعلیٰ درجے کے لباس کا نہ بٹھل کو شوق تھا نہ مجھے۔ درزی کے ناپ لینے پر معلوم ہوا کہ زریں میرے لیے شیروانی سلوا رہی ہے‘ میں نے منع کیا کہ واسکٹ ہی میرے لیے موزوں ہے۔ شیروانی میں آدمی بہت نمایاں ہو جاتا ہے اور اسے کون سنبھالے سنبھالے پھرے گا۔ بچپن میں کبھی باقاعدہ شیروانی پہنی تھی۔ کسی تقریب میں تو شیروانی پہن کے جانا بہرحال لازم تھا۔ زریں نے ایک نہ سنی۔ درزی کو سخت احکام دیے گئے تھے کہ دوسرے دن وہ آخری ناپ کے لیے کچی سلائی کی سیاہ شیروانی لے کے حاضر ہو گیا۔ رات بھر وہ اور اس کے کارندے اسی پر مشق کرتے رہے ہوں گے۔

بٹھل نے روانگی کے دن کا اعلان نہیں کیا اور اس کا کیا ٹھیک تھا‘ کب اچانک سامان اٹھا لے۔ اتنے دن حویلی میں رہنے کے بعد سفر کے خیال سے اب جی کچھ بھاری بھاری سا ہو رہا تھا۔ مگر جانا تو تھا ہی۔ گزشتہ رات میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ کوشش کریں گے‘ اب کے اتنا وقت نہ صرف ہو۔ درمیان میں کچھ عرصے کے لیے آ جایا کریں گے۔ زریں بھی سن رہی تھی‘ دبی زبان سے کہنے لگی ”اس طرح کیوں کہیے۔ دعا کیجیے کہ اس کے بعد کسی ایسے سفر کی نوبت ہی نہ آئے۔ اس بار ہی سرخ روئی نصیب ہو۔ کسی ایک سفر میں تو یہ ضرور ہوگا‘ سوا یں مرتبہ ہی کیوں نہ ہو“ جواب میں‘ میں کیا کہتا۔ ہر بار یہی توقع تو ہوتی ہے مگر یہ دنیا بہت بڑی ہے۔ یہ زمین آدمی کی نسبت سے بہت بڑی ہے۔ اتنی بستیوں‘ شہروں اور انسانوں کے اتنے ہجوم میں ایک آدمی کی تلاش کوئی آسان کام نہیں۔ کاش آدمی کی کئی آنکھیں ہوا کرتیں۔ یوں بھی ہر شخص کو صرف آدھا نظر آتا ہے۔ اسے تو صرف سامنے کا نظر آتا ہے۔ عقب کی ایک دنیا اوجھل رہتی ہے اور سامنے کا بھی کتنا نظر آتا یا آ سکتا ہے‘ بس ایک دیوار تک‘ اور دیوار نہ ہو تو بینائی خود دیوار بن جاتی ہے۔

دو دن بعد میں نے نصیر بابا کو ساتھ لیا۔ کچھ نقدی میرے پاس تھی‘ کچھ بٹھل سے مانگ لی۔ نصیر بابا کو اس خیال سے ساتھ رکھا تھا کہ کسی کے ساتھ میں سنبھلا رہوں گا حالانکہ یہ احتیاط اپنے آپ سے حجت کے مترادف تھی۔ میں نے خود کو چھپانے کی بہت خواہش کی لیکن چوک سے کچھ آگے اڈے کے دو آدمیوں سے سامنا ہو گیا۔ مجھے دیکھتے ہی بے قابو ہونے لگے۔ سلام دعا کر کے میں نے ان سے صاف معذرت چاہ لی کہ مجھے کچھ ضروری ذاتی کام درپیش ہیں۔ دونوں تلملا کے رہ گئے۔ جتنے پیسے میری جیب میں تھے‘ کپڑوں اور زیوروں کی

خریداری میں تمام کرڈالے۔ ایک بالی مجھے بہت اچھی لگی۔ اس کا دائرہ درمیانے درجے کا تھا اور نگینے جڑے ہوئے تھے۔ سنار کے پاس تین چار جوڑیاں ہی تھیں۔ میرے اصرار پر وہ شش و پنج میں پڑگیا اور اس نے کسی اور جگہ جانے نہیں دیا۔ کچھ مہلت طلب کی اور جانے کہاں سے بھاگ دوڑ کرکے وہ اور اس کے ملازم کم و بیش اسی طرز کی بالیاں مطلوبہ تعداد میں اکٹھی کرلائے۔ اتنی دیر میں' میں نے کچھ اور کپڑے خریدے۔ کپڑوں میں یکسانی ضروری نہیں تھی۔ مجھے انتخاب کا سلیقہ آتا تھا نہ خریداری کا ایسا تجربہ تھا۔ بس جو کپڑا سب سے زیادہ مہنگا' دیکھنے میں خوش نما اور چھونے میں نرم و لطیف لگا' میں الگ کرتا رہا۔ واپسی میں اچھا خاصا گٹھر بن گیا۔ ہم لدے پھندے گھر لوٹے۔ بٹھل اڈے پر گیا ہوا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد میرے اشارے پر نصیر بابا نے خانم کی خدمت میں گٹھری پیش کردی۔ ان کے چہروں کی تابانی دیکھنے کے لائق تھی۔ گو میں نے دکان دار سے کہہ دیا تھا کہ کوئی چیز پسند نہ آنے کی صورت میں واپس کردی جائے گی۔ شکر ہے' سبھی کے چہرے کھلے ہوئے تھے۔ ارشد' تنویر' مجو میاں اور جہانگیر کے لیے انگریزی سوٹ اور شیروانی کا کپڑا میں نے الگ خریدا تھا۔ نصیر بابا' مما' اس کے بھتیجے گلو اور دیگر ملازمین کا بھی خیال رکھا تھا۔ بالیاں لیتے وقت گنتی میں کچھ چوک ہوگئی۔ ایک بالی بچ گئی۔ میں نے اسے خانم کے سپرد کردیا۔

تحفہ کتنا ہی قیمتی یا بے حیثیت ہو' اس کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ رات کو کھانے کے بعد میں نے دیکھا۔ بٹھل بھی حیران ہوا۔ سب نے وہی بالیاں پہنی ہوئی تھیں اور بالیاں ان پر خوب سج رہی تھیں۔ روشنی میں بالیوں کے رنگ برنگ نگینے دمک رہے تھے۔ ان سب کی آنکھیں بھی دمک رہی تھیں اور یہ روشنی جیسے میرے سینے میں اتر رہی تھی۔

چار دن گزر گئے۔ بٹھل نے روانگی کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا۔ وہ روز اڈے جا رہا تھا۔ جانے اب کیا رکاوٹ تھی۔ کوئی بات تو ضرور ہوگی۔ مما کے بھتیجے گلو نے بھی ان دنوں شہر سے متعلق کوئی خاص بات نہیں بتائی تھی' بس یہی کہ شہر بتدریج اپنے پرانے روز و شب کی طرف واپس آرہا ہے' پولیس کا گشت جاری ہے لیکن پولیس اب دور دور ہی رہتی ہے۔ ہاں' گلو سے یہ معلوم ہوا تھا کہ ٹھاکر بستی کا ملبہ کریدنے' کھرچنے' واردات کی رات بچ جانے اور حویلی میں موجود نہ رہنے والے ٹھاکروں کے اہل کار اور عام کسانوں سے تفتیش پر پولیس نے ساری توجہ مرکوز کی ہوئی ہے۔ ابھی تک باہر سے افسران کی آمد و رفت جاری ہے۔ ان میں گورے افسر بھی ہیں۔ صبح و شام پولیس کی گاڑیاں ٹھاکر بستی کی طرف آتی جاتی نظر آتی ہیں اور شہر کے لوگوں کا وہی عالم ہے' صبح کوئی رائے قائم کرتے ہیں' شام کو کوئی اور قصہ سناتے ہیں۔

بٹھل کے ذہن نشیں ہوگا کہ چار دن پہلے کوتوالی میں حاضری کے وقت جس نوجوان پولیس افسر سے ہمارا واسطہ پڑا تھا' اس نے کیا کہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ شہر میں اس کا تبادلہ ہوئے چند ہی دن ہوئے ہیں اور اس نے متعدد بار بٹھل کا نام سنا ہے۔ یہ نام بے سبب تو نہیں لیا جا رہا ہوگا۔ شہر میں ہماری موجودگی کی تصدیق کے لیے حویلی آنے والے پولیس افسر نے بٹھل کو محتاط رہنے کی صلاح دی تھی' پھر کوئی نزاکت ہی بٹھل کو روکے ہوئے ہے۔ کیا شہر' اطراف اور خصوصاً حویلی سے پولیس کا ہٹ جانا محض ایک سراب ہے۔ ہمارے لیے کوئی ذہنی آسائش اور باقی سارا کچھ جوں کا توں ہے۔ ایسا ہوتا تو۔۔۔ اس دن کوتوالی میں بٹھل صاف طور سے متنبہ کر آیا تھا کہ اب وہ شہر سے جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ پولیس کو روکنا ہوتا تو ضرور کوئی کارروائی کرتی۔ اس خاموشی سے یہی ظاہر ہے کہ ہمارے شہر میں موجود رہنے نہ رہنے سے پولیس کو کوئی غرض نہیں ہے۔ کیا معلوم' بٹھل اب پابندی سے اڈے جا رہا ہے' اس دوران میں پولیس کا کوئی قاصد نیا حکم لے کے اڈے آیا ہو اور بٹھل نے روانگی موخر کردی ہو۔ کسی کی تعمیل میں یا ازخود حفظ ماتقدم کے طور پر۔ کون جانے' یہ سلسلہ کہاں جاکے ختم ہو۔ معذور کے پاس اپنی بے جانی و بے حالی سے مفاہمت کے سوا کیا چارہ رہ جاتا ہے۔ لاعلمی بھی ایک معذوری ہے اور مجھے اپنی یہ ناتوانی و ناداری تسلیم کرتے رہنا چاہیے۔

پانچویں دن بٹھل ناشتے کے بعد معمول کے مطابق اڈے جانے کے لیے تیار تھا اور بیٹھک میں حقے کے آخری کش لے رہا تھا کہ ملازمہ شکورن بی نے آکے مطلع کیا' کوئی مہمان موٹر میں بٹھل سے ملنے آیا ہے۔

"موٹر میں؟" میں نے چونک کے پوچھا "کون' کون؟"

بٹھل نے حقہ چھوڑ دیا۔ شکورن بی کو اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں تھا۔ اڈے یا پولیس کا کوئی آدمی ہوتا تو مما' شکورن بی کو کوئی حوالہ ضرور بتاتا۔ اڈے سے مستقل آنے والوں کے نام اسے ازبر تھے۔ میں نے عجلت کی اور بیٹھک سے اتر کے ڈیوڑھی کی طرف لپک پڑا۔ ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہوتے بٹھل کے آنے کے انتظار میں' میں نے تحمل

یا۔

مجھے کوئی جھٹکا سا لگا۔ میری طرح بٹھل کو بھی اپنی ‍ آنکھوں پر یقین نہیں آیا ہوگا۔ ڈیوڑھی میں کرسی پر پولیس ‍ افسر ورما بیٹھا تھا۔ مجھے تو کسی خواب کا گمان ہوا۔ ورما تنہا تھا ‍ ور سوٹ اور ٹائی میں ملبوس نہایت تازہ تازہ لگ رہا تھا ‍ صاحب' آپ؟" بٹھل نے تعجب سے کہا "کوئی خبر بھی نہیں ‍ " بٹھل نے اسے سلام کیا۔ میں بے حس و حرکت کھڑا ورما ‍ و دیکھتا رہا۔

"ہاں استاد تم نے اس روز حویلی آنے کی دعوت دی ‍ ی۔ یاد ہے؟ سوچا' اس سے پہلے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ' ‍ ے مل لیں۔" ورما کے چہرے پر نہ نرمی تھی نہ ترشی۔ اس ‍ لہجہ بھی کسی قسم کے تاثر سے عاری تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھا ‍ ہا۔

"آپ نے مان بڑھایا صاحب' کسی کو بول دیتے' ہم ‍ جاتے۔" بٹھل نے سادگی سے کہا "اپنے کو سمجھ میں نہیں ‍ رہا' کیا بولیں۔ سب ٹھیک تو ہے صاحب؟"

"ہاں آں۔" وہ آنکھیں چڑھا کے بولا "ابھی تک تو ‍ ارا ٹھیک ہے۔ دھیرج رکھو' کوئی پرچی ورچی لے کے نہیں ‍ ئے۔"

"وہ تو صاحب پرچی نکلتی تو آپ ادھری کیوں ہوتے۔" ‍ بٹھل نے مسکراتے ہوئے کہا "آؤ صاحب اندر آؤ' اندر ‍ ۔"

ورما نے کوئی تکلف نہیں کیا' کرسی سے اٹھ گیا' بٹھل ‍ نے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ورما نے آگے جاتے ‍ ئے پہلے بٹھل کو دروازے میں داخل ہونے کی پیش کش ‍ ۔ بٹھل آگے چلا گیا "آؤ صاحب ادھری سے۔" ڈیوڑھی ‍ ے نکل کے اس نے دائیں جانب چلنے کا اشارہ کیا۔ ورما نے ‍ ر آتے ہی' سر گھما کے ایک سرسری نظر حویلی کے اندرونی ‍ ے پر ڈالی پھر بٹھل کی معیت میں تیزی سے چند قدم کا فاصلہ ‍ ے کرکے بیٹھک کے قریب آگیا۔ بٹھل نے جوتے اتارے ‍ س نے بھی تقلید کی۔ ہمیں اندر مطلع کرنے کا موقع نہیں ‍ سکا تھا۔ زہرہ اور زریں بیٹھک میں موجود تھیں۔ ہمارے ‍ تھ ایک اجنبی دیکھ کے وہ سٹپٹا گئیں اور منہ چھپائے ‍ ے دم بیٹھک سے نکل جانا چاہتی تھیں کہ بٹھل نے انہیں ‍ ک لیا۔

دونوں نے سروں پر دوپٹے اس طرح ڈھانپ لیے کہ ان ‍ کے چہرے آدھے چھپ گئے۔ اندر جانے والے دروازے ‍ کے پاس دیوار سے چپک کے وہ سکڑی سمٹی کھڑی رہیں۔ "یہ ورما صاحب ہیں بیٹا! پولیس کے بڑے اونچے افسر۔ ان سے پردہ نہیں۔ یہ اپنے گھر آئے ہیں۔" بٹھل نے بلند آواز میں کہا "اور صاحب' یہ دونوں بیٹا ہیں اپنی۔ ایک کا نام زری ہے' دوسری کا زہرہ۔" بٹھل کے لہجے سے فخر و ناز چھلک رہا تھا۔ زہرہ اور زریں نے اضطراری انداز میں سر کے ایک خفیف خم سے ورما کو آداب کہا۔

"اب جاؤ' جاکے بڑے صاحب کے لیے کچھ چائے پانی کا کرو۔"

"نہیں نہیں' اس کی ضرورت نہیں۔" ورما نے ہاتھ اٹھا کے شدت سے منع کیا۔

"کیا صاحب' ادھری آکے ایسے چلے جاؤ گے آپ۔" بٹھل شکایتی لہجے میں بولا۔ "ادھری کوتوالی میں ہم آپ کے بندی تھی' ادھر آپ ہمارے گھر میں ہو۔" بٹھل کو یکایک خیال آیا اور وہ متردد آواز میں بولا "آپ کو اپنے ہاں جل پان کرنے میں کوئی۔۔۔"

"نہیں نہیں۔" ورما نے فوراً تردید کی۔ "ہم بہت دنوں ولایت میں رہے ہیں۔"

"تو ٹھیک ہے صاحب۔" بٹھل نے شگفتگی سے کہا "اب ہم پر چھوڑ دو' دیکھو' اپنی راج کماریوں کے ہاتھ میں کیسا سواد ہے۔ بول دیتے ہیں' لوٹ کے بھی آؤ گے۔"

ورما کا جسم پینترا کے رہ گیا۔

میں نے نہیں دیکھا' زہرہ اور زریں کس لمحے بیٹھک سے نکل گئیں۔

"آپ کو دیکھ کے اپنا من بھی ولایت جانے کو ہمکتا ہے۔" بٹھل نے خوش دلی سے کہا "آدمی آپ جیسا ہوجاتا ہے تو ایک بار سب کو ادھری کا چکر لگانا چاہیے۔"

ورما کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی "وہاں کی بات دوسری ہے۔" وہ خوابیدہ سی آواز میں بولا۔

"ہاں صاحب' ایسا ہی سنتے ہیں۔ گوروں میں کچھ الگ سے ہوگا۔ سارے میں انہی کا ٹھپا چلتا ہے۔"

"ان کے پاس گیان ہے۔" ورما کی آواز میں مایوسی شامل تھی۔

"بٹھل نے پھیلی ہوئی آنکھوں سے سنا اور کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ "آپ ٹھیک سے بیٹھو صاحب' تھوڑا آرام سے۔" اس نے گاؤ تکیہ ورما کے آگے کردیا۔

انگریزی لباس کو فرشی نشست سے مناسبت نہیں ہے لیکن ورما نے لباس کی پروا نہیں کی۔ تکیے سے ٹیک لگا کے کسی قدر پاؤں پھیلا لیے۔ اس کے سکون سے میری رگوں

کے بل کھل رہے تھے۔ "کب جارہے ہو؟" اس نے سرسری انداز میں پوچھا۔

"بس آج کل میں صاحب۔"

"کس طرف جانا ہے؟"

"ایک ٹھکانا ہو تو بولیں۔"

"کس کام سے؟" ورما نے بہ ظاہر سادگی سے پوچھا۔

"آپ کو بولا تھا' اپنے کو کسی کی کھوج ہے۔" بٹھل نے گہری سانس لی۔

"کون ہے' کون ہے وہ؟"

"کیا بولیں صاحب۔" بٹھل کی آواز بجھنے لگی "اچھا ہے' مت پوچھو۔"

"نہیں پوچھتے۔" ورما سر جھٹک کے بولا۔

"آپ کی ٹھاکر بستی سے اس کا کوئی ناتا نہیں ہے۔"

ورما کے چہرے پر لہریں گزر گئیں پھر وہ معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا اور تیکھے لہجے میں بولا "تو جس کا ٹھاکر بستی سے ناتا ہو' اس کی بات کرو۔"

"لگتا ہے' سوئی اٹک گئی ہے۔"

"ہاں استاد' ایسا ہی ہے کچھ' کتنی چابی بھرو' سوئی ایک جگہ پہ آکے پھنس جاتی ہے۔" ورما نے سنجیدگی سے کہا "آس پاس کوئی اور دکھائی نہیں دے رہا۔"

"پھر صاحب' آپ کے سنگ چلیں۔"

"اس کا سمے نہیں آیا لیکن آجائے گا۔"

"پر اپنے کو اب آگے جانا ہے۔"

"معلوم ہے۔" ورما سرہلا کے بولا "کتنے آگے جاؤ گے' ہندوستان کے پار؟"

"یہی بہت بڑا ہے صاحب۔"

"لیکن راج ایک ہی ہے۔"

"اپنے کو آپ نے کیا جانا ہے؟"

ورما نے کچھ توقف کیا اور جیسے خود سے مخاطب ہو' بدبداتے ہوئے بولا "تم جیسا نہیں دیکھا۔"

"کچھ زیادہ ہی جان لیا آپ نے۔"

"نہیں استاد' لگتا ہے' ابھی بہت کم ہے لیکن ابھی تو گیان دھیان چل رہا ہے۔ آگے دیکھو' اور کیا کیا دیکھنے اور سننے کو ملتا ہے۔"

"ایک بات پوچھیں صاحب؟" بٹھل کی آواز میں کوئی کجی نہیں تھی "دیر کاہے کی ہے؟"

"ہاں استاد! یہ سوال اچھا ہے۔ ہمارے ساتھی بھی کل یہی بول رہے تھے' دیر کیوں کرتے ہو صاحب۔"

"پھر آپ نے کیا بولا؟"

"جواب تم بھی جانتے ہو۔"

"اور جواب یہی رہے گا۔"

"نہیں استاد' اتنی جلدی ہاتھ پیر نہیں ڈالتے ہم۔"

"پر ایک دن ڈال دو گے۔ الٹے چلنے پہ دیوار دکھائی نہیں پڑتی۔"

"دیکھتے ہیں۔" ورما بے نیازی سے بولا "پہلا مل گیا ہے تو دوسرا بھی مل جائے گا۔"

"یہ تو الجھنے پر ہے صاحب' کتنا بڑا ہے۔ کبھی دوسرے کے چکر میں پہلا بھی ہاتھ سے نکل پڑتا ہے۔"

ابھی تک دونوں کے چہروں پر کشیدگی اور لہجوں میں کدورت نہیں تھی لیکن نظر آرہا تھا کہ کسی بھی وقت یہ طرز کلام تلخی میں بدل سکتی ہے۔ بٹھل کو بھی اس کا احساس ہوگا اور اسے حویلی میں ورما کی آمد کا سبب معین کرنے کی جستجو یقیناً ہوگی۔ ورما کو آخر اچانک اڈے یاڑوں سے متعلق ایسے اجنبیوں کے گھر آنے کی کیا ضرورت تھی جنہیں وہ آلودہ قرار دینے کے درپے تھا' گو اس کا اظہار کنایتہً کیا مگر کنایے میں کوئی ابہام بھی نہیں تھا اور بے شک ایک دوسرا امکان بھی قیاس کیا جاسکتا تھا کہ یوں منہ اٹھائے حویلی میں آنے سے مراد خود اس کے اپنے ہاں کا کوئی ابہام ہے۔ اچھا ہوا' شکورن بی نے آکے کچھ دیر کے لیے دونوں کو خاموش کردیا۔ وہ دسترخوان لے کے آئی تھی۔ میں نے دسترخوان بچھانے اور چینی کی پلیٹیں' چمچے ورما اور بٹھل کے آگے رکھنے میں شکورن بی کی مدد کی۔ وہ چلی گئی تو ورما کی تیور بھری آواز بیٹھک میں گونجی "ہم کبھی ناکام نہیں ہوئے استاد۔"

"اس بار بھی کیوں ہوگے صاحب۔"

"ہونا نہیں چاہیے۔" ورما عزم سے بولا۔

"اسی لیے تو آپ کو ادھری بھیجا ہے' کچھ جان بوجھ کے' پہلے کا دیکھ کے ہی۔"

"اور اس بار ہم ناکام ہوئے تو پولیس چھوڑ دیں گے۔"

"کیوں صاحب' آپ اکیلے تو ادھری نہیں ہو۔ ایک بار نشانے پر نہیں بیٹھا تو پچھلے پر پانی پڑ جائے گا کیا؟"

"ان کا نہیں۔" "ہمیں کسی کی فکر نہیں۔ یہاں گورے افسر بھی آئے ہوئے ہیں۔ ہمیں تو اپنی فکر ہے۔ اپنے آپ کا بھی تو سامنا کرنا پڑتا ہے۔"

"ایسا ہے تو ایک دن آپ پہنچ جاؤ گے۔"

"پہنچ تو ہم اب بھی گئے ہیں۔" ورما کے لہجے میں پہلی مرتبہ نخوت کی جھلک دکھائی دی۔

"پھر کھنچوا دو صاحب۔"

"ہم راج گدی پر نہیں بیٹھے۔"

"یہ تو پرجا کے بھاگ ہے۔"

ورما کی آنکھوں میں سرخی کوندی لیکن اس نے سرد آواز میں کہا "پولیس بھی بندھی ہوئی ہے۔ اس کے ہاتھ کتنے ہی لمبے ہوں' چھوٹے پڑجاتے ہیں۔"

"ادھری کون کھلا ہے اور کون سارے پہ بھاری ہے۔ چھور (کنارہ) بنا تو کوئی نہیں' کچھ بھی نہیں۔" بٹھل زیر لبی سے بولا "اپنے کو معاف کرنا' پھر پہنچنا کیسا صاحب؟"

"ہاں۔" ورما کا چہرہ سوج سا گیا "تم ٹھیک کہتے ہو۔"

دروازے پر آہٹیں نمودار ہونے پر وہ پھر منتشر ہوئے۔ دروازے کے پاس مجھے زریں' زہرہ اور نیساں کے چہرے دکھائی دیئے۔ ان کے ہاتھوں میں خوان پوشوں سے ڈھکے تشت تھے۔ میں نے جلدی سے دروازے کا رخ کیا' زہرہ کے ہاتھ سے تشت لیا۔ اتنے میں جہاں گیر بھی آگیا۔ تشت ہمارے حوالے کرکے وہ تینوں پلک جھپکتے میں غائب ہوگئیں۔ میں نے خوان پوش ہٹائے تو ورما بے قرار ہوگیا "یہ کیا ہے استاد!" وہ تشتوں میں نفاست سے رکھی چیزیں دیکھ کے حیرانی سے بولا۔

"آپ کو پتا ہے' ہم نے کچھ نہیں بولا تھا۔ آپ شروع کرو صاحب' سارا تازہ تازہ ہے۔"

کئی قسم کی شیرینی' کئی قسم کا نمکین' خشک میوہ' پھل' ایک تشت میں چائے دانی' پیالیاں' چمچے' کانٹے' چھری اور پھلوں کے رس سے بھرا شیشے کا جگ' سارے برتن چمکتے دمکتے ہوئے۔

ورما نے ابتدا میں تکلف سے کام لیا تھا پھر اس سے رہا نہیں گیا اور اس کی آنکھوں کی تابانی فزوں ہوتی گئی۔ کہنے لگا کہ وہ ناشتہ کرکے گھر سے چلا تھا۔ ہم دونوں بھی ناشتہ کرچکے تھے لیکن میزبانی کے آداب واجب تھے۔ ادھر زریں نے کچھ زیادہ ہی اہتمام کرلیا تھا۔ ورما داد و تحسین میں کفایت کا آدمی معلوم ہوتا تھا لیکن وہ جو کہتے ہیں۔ یہی تو شعر کی خوبی ہے کہ سننے اور پڑھنے والے کو متلاطم کردے۔ بتدریج اس کے ہاتھ کھلتے گئے اور زبان بھی رواں ہونے لگی۔ مجھے معلوم تھا' لوکی کے حلوے کی ترکیب خانم نے زریں کو تعلیم کی تھی۔ حیدرآباد میں پہلی بار ہم نے نواب ثروت کے ہاں یہ حلوہ کھایا تھا۔ زریں نے اپنی طرف سے کچھ ترمیم و اضافہ بھی کیا ہوگا کہ ذائقہ اور سوا ہوگیا تھا۔ زعفران کی آمیزش نے اسے اور اشتہا انگیز کردیا تھا۔ چاندی کے ورق اور طرح طرح کے میووں سے اس کی آرائش کی گئی تھی۔ ورما کو بہت مرغوب ہوا اور اس نے نکیلی آواز میں پوچھا "تم یہی کچھ کھاتے ہو استاد؟"

"کیوں صاحب؟" بٹھل نے تجسس ظاہر کیا۔

"سوچتے تھے' اس گرمی' تیزی پھرتی کا کوئی کارن تو ہوگا' سو ایک یہ بھی ہے۔ اچھی خوراک سے دماغ ہرا بھرا رہتا ہے۔"

"جب تلک آپ شہر میں ہو' ادھر آجایا کرو' آپ کو آج کل تھوڑی ضرورت بھی ہے۔"

بٹھل کی یہ برجستگی خود کلامی کے انداز میں تھی۔ ورما کے حواس بہت تیز تھے' اس نے سن لیا اور لقمہ اس کے حلق میں اٹک گیا۔ وہ اپنی ہنسی نہ روک سکا "ہاں ہاں' پھر یہی کرتے ہیں' پر تم اپنے لیے وچار کرو' اس طرح تمہارا گھاٹا نہ ہوجائے۔"

"اپنی چھوڑو صاحب۔" بٹھل نے بے نیازانہ کہا "مٹی سب ایک جیسی نہیں ہوتی اور' اور کوئی ایک تو آخری دن ہوتا ہی ہے۔"

ورما نے ایک لمبی ہنکار بھری اور کہیں گم سا ہوگیا۔

بٹھل نے اس کے رکے ہوئے ہاتھ پر اعتراض کیا اور پنیر کے پکوڑوں کی قاب اس کی طرف بڑھادی۔ ان پکوڑوں کی بٹھل خود فرمائش کرتا تھا۔ پکوڑے واقعی خستہ و لذیذ تھے۔ ورما تعریف و توصیف میں سر گھمانے لگا "ادھری ولایت میں تو صاحب سارا سواد لوٹ پلٹ گیا ہوگا۔" بٹھل کے استفسار میں تبصرہ بھی شامل تھا۔

"شروع شروع میں پریشانی ضرور ہوئی۔" ورما نے جواب کا اعزاز بخشا "بعد میں منہ کو ایسا لگا کہ دیسی کی یاد ہی نہیں آتی تھی۔ لگتا تھا' اب ٹھیک سے کھانے کو ملا ہے۔ پہلے تو جیسے گھاس کچرا تھا۔ وہاں کی کیا بات ہے۔ وہ لوگ کھانا پکانے اور کھانا سجانے پہ ایک سا دھیان دیتے ہیں۔ روز نئی نئی ترکیبیں نکالتے ہیں۔ وہ اتنا پکاتے اور بھونتے نہیں کہ سبزی ماس کا اپنا رنگ جاتا ہے نہ سواد۔ ادھر تو مرچ مسالے کی بھرمار سے اصلی رنگ اور سواد کا پتا ہی نہیں چلتا۔ یہاں آکے دوبارہ اپنے کھانوں کی طرف لوٹنے میں بڑی مشکل ہوئی۔ ہم سے اب زیادہ مرچ مسالے نہیں کھائے جاتے لیکن یہ' یہ تو بہت سواشٹ (ذائقے دار) ہے۔" اس نے سامنے رکھے ہوئے خوان کی طرف ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا "ہم نے ایک ساتھ اتنی سواد بھری چیزیں کبھی نہیں کھائیں اور پھر یہ' یہ۔" اس کا اشارہ یقیناً کھانا پیش کرنے کی نفاست

ولطافت، خوش رنگی و رنگا رنگی سے متعلق تھا۔

بٹھل نے اس پسندیدگی پر ممنونیت کا اظہار کیا اور دوپہر کے کھانے تک ٹھیر جانے کی درخواست کی۔ بٹھل نے کہا کہ یہ سارا کچھ تو عجلت میں تیار ہوا ہے اور یہ تو کھانا نہیں تھا۔ دوپہر کا باقاعدہ کھانا ورما کے لیے مزید لطف و لذت کا باعث ہوگا۔ ورما نے صاف انکار کر دیا وہ تا دیر نہیں ٹھیر سکتا اور اتنی شکم سیری کے بعد دوپہر کے کھانے کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے۔ اس نے ابھی تک اپنی آمد کے مقصد کا سراغ نہیں لگنے دیا تھا۔ ایک ہی صورت نظر آتی تھی کہ کسی طور اسے آمادہ گفتار رکھا جائے۔ کھانے کے دوران، بٹھل اسے مسلسل ٹوکتا اور ادھر ادھر کے موضوعات و معاملات پر اکساتا رہا۔ ہم دستار خوانی کی مروت بھی خوب ہوتی ہے اور جب کوئی میزبان شستگی و شائستگی سے ایسے سوالات اٹھا رہا ہو جن کے جواب میں کسی پیچیدگی اور ناگواری کا پہلو نہ نکلتا ہو تو چاہے کوئی طبیعتاً کتنا ہی کم سخن ہو یا اپنے رتبہ و منصب کی وجہ سے دانستہ کم سخنی و کم گوئی شعار کیے ہو، کتنی دیر تک اپنے اس ناروا، نازیبا سکوت کا متحمل ہو سکتا ہے۔ میں نے اور بٹھل نے کسی تردید اور اختلاف سے بھی اجتناب کیا تھا۔ ہم ایک بہترین سامع بنے ہوئے تھے، کسی طالب علم اور کسب فیض کرنے والے عاجز کے مانند۔ اچھے سامع ہر ایک کو مرغوب ہوتے ہیں بلکہ ان کی تلاش رہتی ہے۔ بٹھل کی کوشش رائیگاں جاتی رہی۔ وہ ورما کی آمد کی غرض و غایت جاننے میں ناکام رہا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ ورما کے چہرے پر کھنچی مغائرت اور کدورت کی لکیریں کم ہوتی رہیں۔ وقت خاصا گزر گیا۔

قہوے کی چسکیاں لیتے ہوئے ورما نے ایک بار پھر مجھے کشمکش سے دوچار کیا۔ کہنے لگا "تم نے سنا ہوگا استاد، پولیس کی دوستی اچھی ہے نہ دشمنی۔"

"اپنی آپ کی دشمنی کا کوئی کارن نہیں بنتا۔" بٹھل نے مستعدی سے کہا۔

"اور دوستی کا بھی تو۔" ورما بے باکی سے بولا۔

"دوستی کا ایک ہی کارن بہت ہے، ایک کا دوسرے کو بھلا لگنا۔"

"ہم، ہم تمہیں کیسے لگتے ہیں؟"

"ہم آپ کو ابھی باہر سے لوٹا سکتے تھے۔"

ورما بیٹھے بیٹھے لہرا سا گیا اور خاموش رہا پھر اٹھنے کے لیے کسمسانے لگا "اب چلتے ہیں استاد۔"

"ایسا کیسے صاحب۔" بٹھل کی استدعا رسمی تھی "تھوڑا اور بیٹھیے۔"

"جانا ہے۔" ورما نے مختصراً کہا اور کسی قدر بے چینی سے بولا "تم نے نہیں پوچھا، ہم یہاں کیوں آئے ہیں۔"

"کیا جاننا ہے۔ اپنے واسطے آپ کا ادھر آنا اور ساتھ بیٹھنا بہت ہے اور کوئی بات ہو تو بولو۔"

"تم کو دوبارہ دیکھنے کو من کرتا تھا استاد۔" ورما اپنے لہجے کا طنز نہ چھپا سکا۔

"ہم تو دیدن کرانے اس دن کوتوالی پہنچے تھے۔"

"ہاں!" ورما تیوری چڑھا کے بولا "اس دن ضروری میٹنگ تھی۔"

"بعد کو کسی نچنت ٹائم پہ اپنے کو بلا لیتے۔"

"سمے ہی نہیں ملا اور ہم کو خود یہاں آنا بھی تھا۔" ورما نے بیٹھک کے در و بام پر اچٹتی نظر ڈالتے ہوئے کہا "تم کو دیکھنے، تمہارا یہ راج سنگھاسن دیکھنے۔"

"یہ اپنا راج سنگھاسن نہیں ہے۔"

"جو کچھ بھی ہے، راج بھون بولو، سنا بہت تھا پر آج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔"

"کدھری دیکھا ابھی، تھوڑا ٹائم اور دو، اندر چلتے ہیں۔"

"نہیں، اب اس کی ضرورت نہیں۔ اتنا ہی بہت ہے۔ اٹ از وری مسٹیریس۔ اس کو دیکھنے کے بعد۔۔۔" ورما پہلو بدل کے بولا "کوئی شک نہیں، کسی کو بھی اس کی فکر ہونی چاہیے۔ کوئی بھی اور کبھی بھی ٹھاکروں جیسے راون رستہ بھٹک کے ادھر کا منہ کر سکتے ہیں۔"

ورما نے اب کوئی ابہام رہنے نہیں دیا تھا۔ بٹھل نے غیر متوقع طور پر جواب نہیں دیا۔

ورما اپنی نشست سے یکایک اٹھ کھڑا ہوا اور کپڑوں کی شکنیں، ٹائی درست کرتا ہوا، بٹھل کے روبرو آ کے بولا "ہمارا کام جاری ہے۔ ہم نے ہر طرف چھان بین کرلی ہے اور کر رہے ہیں اور ہمی نہیں، سینٹر سے گورے ماسٹر بھی آگئے ہیں۔ کسی کو کچھ نہیں مل رہا۔ لوٹ کے وہ اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اتنا ڈسی پلینڈ جرم کوئی بڑا گروہ ہی کر سکتا ہے۔ وہ ٹھاکروں کے رشتے دار یا ان کے مال پہ نظر رکھنے والے ڈاکو لٹیرے نہیں ہو سکتے۔ یہ تو بہت پلانڈ، سوچا سمجھا ہوا، ایکس پرٹ لوگوں کا ایڈونچر ہے۔"

بٹھل نے آنکھیں موند لیں۔

اس کی خاموشی سے ورما جزبز ہونے لگا اور سرد آواز میں بولا "اور یہ معاملہ ایسا نہیں، ایک دو آدمیوں کا نہیں

42 آدمیوں کا خون کا ہے۔ وہ ستائیس نہیں تھے۔ یہاں کی پولیس نے جان بوجھ کے گنتی کم کی یا اسے اس رات ٹھاکر بستی میں باہر سے آنے والوں کے بارے میں پوری جان کاری نہیں تھی۔ پولیس تھک کے چپ ہوجائے اور ہاتھ پیر چھوڑ دے تو اوپر سرکار تلی بیٹھی ہے۔"

"ایسا ہی ہونا چاہیے۔" بٹھل نے ہم نوائی کی۔

"اور صرف دوسرا سرا ملنے کی دیر ہے۔"

"شاید نہیں ملے آپ کو۔"

"یہ، یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو؟"

"آپ ہی بول رہے تھے۔ کوئی سورما لوگ تھے۔ پورا دیکھ بھال کے ادھری گئے ہوں گے۔"

"لیکن پولیس میں بھی کمی نہیں، دیکھنے، سننے سوچنے اور بال کی کھال نکالنے والوں کی۔"

"پھر تو مل جائے گا۔" بٹھل کا لہجہ استہزائی نہیں تھا۔ اس نے بہ ظاہر اکتاہٹ سے کہا "اپنے لیے کوئی حکم ہو تو بولو۔"

"تمہیں معلوم ہے، تم کس وجہ سے کھلے پھر رہے ہو؟"

"آپ برا مانو گے، پر صاف بولیں۔" بٹھل نے اینٹھی ہوئی آواز میں کہا "بیچ میں آپ کے ہونے سے اتنا ٹائم بھی لگا اپنے کو۔ ہم لٹکے رہے۔"

"ورنہ کیا ہوتا؟" ورما نے تلخی سے پوچھا۔

"جتنی جلدی وہ کرتے، اتنی جلدی اپنی مکتی ہوجاتی۔ ایک ہاتھ سے پھندا ڈالتے، دوسرے سے گانٹھ کھولتے۔ اپنے ساتھ اب کچھ نیا نہیں ہوتا۔ ادھر ہم بھی ایسے سے کے لیے ڈوریاں ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ آپ نے کوئی چھوٹ ڈھیل نہیں دی اپنے کو۔ آپ ان میں زیادہ سیانے ہو۔ ٹہنی پہ پکے کی بات اور ہوتی ہے۔ تھوڑا اپنے کو دیکھنا، آگے پیچھے کا وچار بھی کرنا تھا آپ کو۔ ذرا ترچھا پڑنے پہ پچھلے کا سارا اکارت ہوجاتا۔ سامنے صاف ہونے پہ تھوڑا وابنا ٹھیک رہتا ہے۔ کیا بولیں، آپ سارا جانتے ہو۔ اوپر سر کے اجلے کالے سے اندر گودے کا کوئی ناتا نہیں۔ کوئی آگے کی بات ہو تو بولو صاحب۔" بٹھل نے ناگواری سے کہا۔ "پہلی دفعہ سامنے پڑنے پہ ہم نے سارا برابر کردیا تھا۔ اس کے بعد اپنے پاس کچھ نہیں ہے اور اب ہم ادھری سے جارہے ہیں۔"

ورما کا چہرہ بھبھک رہا تھا۔ بٹھل کے چپ ہوجانے پر اس نے جیسے کب کی رکی ہوئی سانسوں سے سینہ ہلکا کیا اور زہر خند سے بولا "اور جلدی تم کو لوٹ کے بھی آنا ہے۔"

"وہ بھی دیکھ لیں گے صاحب، جدھری ہوں گے، آجائیں گے، بعد کو پورا ہرجانہ خرچا بھی لیں گے اور آپ دھیرج رکھو، آپ پہ بھاری نہیں پڑنے گا۔" بٹھل نے ورما کو مزید کچھ کہنے نہیں دیا اور تاکیدی انداز میں وہی کچھ دہرانا مناسب سمجھا جو وہ چند پہلے کوتوالی میں ورما کے ماتحت پولیس افسر سے کہہ چکا تھا۔ اس نے کہا کہ بہتر ہوگا، ہماری عدم موجودگی میں حویلی کے مکینوں سے کوئی علاقہ نہ رکھا جائے۔ انہیں چھیڑنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ پیچیدگی ہی بڑھے گی۔ ہماری طلبی مقصود ہو تو کلکتے میں استاد جامو سے رابطہ کیا جائے۔ ہم تک طلبی کی اطلاع پہنچنے اور ہمارے فیض آباد آنے میں کچھ وقت صرف ہوسکتا ہے لیکن پولیس اطمینان رکھے، ہم بہرصورت واپس آجائیں گے۔

ورما کے ہونٹوں پر طنز و نخوت سے آلودہ مسکراہٹ عود کر آئی۔ اس نے سرہلایا اور ڈیوڑھی کی طرف جانے والے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ جوتے پہن کر ہم تینوں ایک دوسرے کے پیچھے ڈیوڑھی میں آئے۔ ادھر سے شکورن بی کی ہڑبڑاتی چاپیں سنائی دیں۔ تینوں رک گئے۔ شکورن بی خاص دان لائی تھی۔ میں نے خاص دان اس کے ہاتھ سے لے کے ورما کے سامنے پیش کردیا "ہم ہم پان نہیں کھاتے۔" وہ گھبرا کے بولا۔

"ادھری جیسا پیچھے نہیں کھایا ہوگا۔" بٹھل نے اسے حوصلہ دیا اور اشتیاق پیدا کیا۔

ورما نے ایک لمحاتی تامل و تردد کے بعد چاندی کے ورق میں ملبوس بیڑا اٹھایا۔ ابھی اس نے بیڑا منہ میں رکھا تھا کہ پلکیں جھپکانے لگا اور انگریزی میں بے ساختہ بولا "ہا" انڈ ڈیلی شس۔۔۔ مارویلس۔"

اس کے چہرے کی بشاشت کسی قدر لوٹ آئی تھی۔ حویلی کے وسیع چبوترے کے نیچے گلی میں سیاہ رنگ کی موٹر کھڑی تھی۔ بندوق بردار اردلی اور وردی پوش ڈرائیور وہاں موجود تھے۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے بٹھل نے بڑبڑاتے انداز میں کہا "پولیس کا الٹا سیدھا بھی پلے نہیں پڑتا صاحب، راون کو مٹانے والے کو بھی شما نہیں دیتی۔" ورما ایک ذکی الحس اور تیز فہم شخص تھا، اس نے بٹھل کا مفہوم سمجھ لیا ہوگا کہ کسی ستم کار سے خلق خدا کو نجات دلانے والا بھی مستوجب سزا ہے، گردن زدنی ہے، یہ بوالعجبی بھی خوب ہے۔

موٹر میں بیٹھنے سے پہلے ورما چند لمحے مجھے اور بٹھل کو متلاطم نظروں سے دیکھا کیا۔ اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھانے میں بھی پہل نہیں کی تو ہم نے بھی اپنے ہاتھ کھینچے

رکھے لیکن ہمارے سلام کا جواب اس نے سر کی خفیف جنبش سے ضرور دیا۔ اس کے بیٹھتے ہی موٹر روانہ ہوگئی۔

بٹھل اور میں دیر تک چبوترے پر کھڑے رہے، دیکھتے ہی دیکھتے موٹر گلی کے نکڑ سے اوجھل ہوگئی۔

ہم ٹھیک آٹھ بجے فیض آباد اسٹیشن پہنچ گئے۔

اندر آنے پر معلوم ہوا کہ گاڑی چالیس منٹ کی تاخیر سے لکھنؤ سے آرہی ہے۔ بٹھل ویٹنگ روم کا رخ کیا۔ فرسٹ کلاس کے اس ویٹنگ روم میں نسبتاً سکون تھا۔ پلیٹ فارم پر تو بہت بھیڑ تھی اور چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔ باوردی نگراں نے ہمیں ایک گوشے میں آرام کرسیوں پر بٹھادیا اور چائے کے لیے پوچھا۔ خالی بیٹھے رہنے سے کچھ شغل بہتر تھا۔ بٹھل سے اجازت ملنے پر نگراں نے فدویانہ انداز میں سینے پر ہاتھ رکھا اور سر جھکائے باہر چلا گیا۔

اس کشادہ اور عمدہ قسم کے ساز و سامان سے آراستہ صاف ستھری انتظار گاہ میں پہلے سے ایک جوڑا موجود تھا۔ ایک خوش پوش ادھیڑ آدمی اور گلابی ساڑھی میں ملبوس، لگ بھگ تیس سال کی عمر کی ایک سانولی، نازک اندام عورت۔ مرد کوئی بڑا افسر معلوم ہوتا تھا۔ ہماری آمد پر اس کا چہرہ واضح طور پر بگڑ گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ ہماری وضع قطع اول درجے کے مسافروں سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔

دوپہر کھانے کے بعد، بٹھل نے روانگی کا اعلان کیا تھا۔ اس وقت سبھی دسترخوان سے اٹھا چاہتے تھے۔ سبھی کو جیسے جھٹکا سا لگا۔ حالانکہ بٹھل نے دو تین دن پہلے ہی انہیں اپنے ارادے سے آگاہ کردیا تھا۔ کھانے کے بعد قیلولہ کرنے کے بجائے بٹھل حویلی سے نکل گیا اور سورج غروب ہوتے وقت واپس آیا، یقیناً وہ اڈے کے لوگوں سے وداعی ملاقات کے لیے گیا ہوگا یا پھر کہیں اور، وکیل بھارگو سے صلاح مشورہ کرنے، اسے کچھ ہدایتیں دینے۔ ورما، خانہ پری والا افسر نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اس نے کوئی ابہام بھی نہیں رہنے دیا تھا۔ صاف جتلا دیا تھا کہ حقائق جاننے کے لیے وہ کتنا مضطرب ہے اور کہاں تک جاسکتا ہے۔ ناکامی کی صورت میں اس نے پولیس کی ملازمت سے دست بردار ہوجانے کا عہد کر رکھا ہے۔ کون جانے، ہماری روانگی میں رکاوٹ نہ ڈالنے میں بھی کوئی مصلحت چھپی ہو۔ ورما سے کچھ بعید نہیں تھا۔ اس کے کام کرنے کا انداز ہی مختلف تھا۔ بٹھل کو بھی اس کا احساس ہوگا کہ ابھی دھند پوری طرح نہیں چھٹی ہے۔ ہمیں بہت محتاط رہنا تھا۔ پولیس نے کوئی شرط عائد نہیں کی تھی لیکن بٹھل نے اپنی جانب سے ایک طرح کا وعدہ کیا تھا کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے ہوئے کلکتے میں مقیم استاد جامو کو باخبر رکھے گا۔ بہتر ہے، حویلی کے مکینوں کو تنگ کرنے کے بجائے پولیس پہلے استاد جامو سے رابطہ قائم کرے۔ ہر چند یہ ایک مشکل کام تھا۔ نئے مقامات پر ہمیں اپنی سکونت کا کچھ علم نہیں ہوتا تھا۔ بس یہی ہوسکتا تھا کہ ریل سے اترتے ہی ہم اس مقام کے اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹائیں اور اسٹیشن ماسٹر کی معرفت جامو سے تار منگوائیں۔ ہر جگہ آمد اور روانگی کے وقت اسٹیشن ماسٹر کی خدمت میں حاضری لازم قرار دیں۔ مشکوک لوگ جس طرح صبح و شام تھانے میں حاضری دینے کے لیے پابند کیے جاتے ہیں۔

انتظار گاہ کے نگراں کے ساتھ سفید وردی پوش خادم ہاتھ میں تشت اٹھائے اندر آیا۔ تشت سفید کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔ ضیاع بھی اقبال مندی کی ایک نشانی ہے۔ ضیاع سے دولت کو واد ملتی ہے۔ بٹھل نے صرف چائے کے لیے کہا تھا۔ تشت میں چائے کے علاوہ تشتریوں میں کئی طرح کے لوازم سجے ہوئے تھے، مکھن توس، انگریزی بسکٹ، کیک اور پیسٹریاں۔ ہم میں سے کسی کو ان کی طرف رغبت نہیں ہوئی۔ گھر سے ہم خوب کھا پی کے چلے تھے اور زریں نے منع کرنے کے باوجود جانے کیا کیا چیزیں ساتھ کردی تھیں۔ بٹھل نے چائے نوشی سے پہلے کمرے میں موجود مسافر سے چائے کے لیے پوچھا۔ مسافر لمحے بھر کے لیے سٹ پٹایا پھر اس نے انکسار سے انکار کردیا۔ انکسار صاف مصنوعی تھا۔

اتنے دن گھر میں رہنے اور گھر میں تقریباً بند رہنے کے بعد مجھے یہ گرد و پیش عجیب سا لگ رہا تھا جیسے سفر کیے ہوئے وقت گزر گیا ہو۔ ان سب کے چہرے آنکھوں میں گھوم رہے تھے کانوں میں ان کی آوازیں، آہٹیں بسی ہوئی تھیں۔ ہمیں رخصت کرنے کے لیے وہ سبھی اسٹیشن آنے کے خواہش مند تھے۔ بٹھل نے انہیں روک دیا۔ ان آخری لمحوں میں جب حویلی سے باہر جانے کے لیے ہم دروازے کی طرف بڑھا چاہتے تھے، ہمیں ٹھیر جانا پڑا۔ یاسمن ہڑکنے لگی تھی۔ بٹھل نے پلٹ کے اسے بازوؤں میں چھپا لیا اور اسے تھپکیاں دیتا رہا۔ نیساں اور فروزاں، بڑی اور چھوٹی سلمٰی بھی پھر ضبط نہ کرسکیں۔ زریں، خانم اور زہرہ کو اپنے آپ کو قابو میں رکھنا آتا تھا لیکن کبھی خاموشی آنسوؤں سے زیادہ کاری ہوتی ہے۔ ادھر ارشد، تنویر اور نصیر بابا بھی بہت سراسیمہ، گھبرائے گھبرائے سے لگتے تھے۔ فیض آباد میں ہمارے آنے کے بعد پیش آنے والے حالات سے وہ کم و بیش واقف تھے۔ یہ کم و

بیش کی شناسائی بھی بڑی ستم ناک ہوتی ہے۔ تاہم کسی نے ہم سے مزید کچھ عرصے ٹھیر جانے کی التجا نہیں کی۔ انہیں احساس ہونا چاہیے تھا کہ بٹھل نے روانگی کا ارادہ کسی اطمینان کے بعد ہی کیا ہوگا۔ بٹھل نے انہیں یہی کچھ جتانے کی کوشش کی تھی۔ اس نے ایک بار پھر باری باری سب کے سروں پر ہاتھ رکھے اور بہ طور خاص فروزاں کے پاس جا کے اس کی پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے بولا "جلدی آنے کا کریں گے اب کے اور پیچھے خیر خبر بھی رکھیں گے۔ کوئی بات ہو تو اپنے کو کلکتے کے پتے پر چٹھی ڈال دینا۔" فروزاں بلک پڑی۔ اسے زریں کے حوالے کر کے بٹھل نے پھر مڑ کے نہیں دیکھا اور بہ عجلت دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے جلدی نہیں کی۔ میں نے بھی جو لفظ مجھے آتے تھے' فروزاں کی دل جوئی کرنی چاہی مگر وہ کچھ اور ہی سننا چاہتی تھی۔ کوئی کچھ اور سننا چاہتا ہو اور کہا کچھ اور جا رہا ہو تو لفظ بڑے بے وقعت ہوجاتے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ اُمڈ کے آرہے تھے۔ میرا سینہ بھی پگھلنے لگا تھا۔ میں نے طے کیا کہ بٹھل سے کہوں گا' پہلے وہ دھن باد اترے اور ظفر کو فیض آباد روانہ کرنے کی تعمیل کرے۔ وہ تو اشارے کا منتظر ہوگا۔ اس کی آمد سے دونوں بہنوں کے اضطراب میں کمی ہوجائے گی۔"

ویٹنگ روم میں ہمیں آئے پندرہ منٹ ہوئے ہوں گے کہ سامنے دروازے کے پٹ جھٹکے سے کھلے۔ وہ استاد سلامی تھا۔ اس کے ساتھ اڈے کے دو اور آدمی دیبو اور پنا بھی تھے۔ تینوں قاعدے کا لباس پہنے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کے بٹھل کا جسم تن گیا اور پیشانی پر لکیریں کھنچ آئیں۔ استاد سلامی دروازے ہی سے ہاتھ باندھے آیا تھا "اپنے کو معاف کرو استاد!" وہ مچلتی آواز میں بولا "تم نے منع بولا تھا پر ایمان سے جی نہیں مانا۔"

بٹھل بت بنا رہا۔

استاد سلامی نے اس کے پیر پکڑ لیے "جبل پور سے تمہارے لیے خاص قسم کی بیڑی منگوائی تھی۔ سالے دکری نے آنے میں دیر لگادی۔ سوچا ادھری پڑی پڑی سوکھ جاویں گی۔ اب پھر تمہارا کب پھیرا لگے۔" اس نے دائیں طرف بیٹھے دیبو کی طرف جلدی سے ہاتھ بڑھایا۔ دیبو نے بڑبڑاتے ہوئے ریشمی کپڑے کی ایک چھوٹی پوٹلی بٹھل کے آگے کردی۔ بٹھل نے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ میں نے دیبو سے پوٹلی لے کے بیگ میں ڈال دی۔

"چا پینی ہے۔" بٹھل نے تنک کے پوچھا۔

"نانا استاد۔" سلامی سر جھٹک کے بولا "تم کو دیکھ لیا' جانو ساری پیاس تھکن دور ہوگئی۔ من میں شام سے بے کلی ہو رہی تھی۔ وہ تو سالے سارے کے سارے آنے کو پھڑک رہے تھے۔ مشکل سے کھونٹے سے باندھ کے آیا ہوں بھی' پوچھو ان حرام خوروں سے۔" استاد سلامی نے دیبو اور پنا کی تائید چاہی۔

"بیٹھ جا رے چپکا۔" بٹھل نے ناگواری سے کہا پھر لمحے بھر کے توقف کے بعد بولا "ان کو کھینچ کے رکھنا ہے۔"

"پکا استاد!" سلامی سینہ ٹھونک کے بولا "جو حرام کا جنا مستی کرے گا' اپنی مٹی خراب کرے گا۔ تم آرام سے جاؤ۔ آگے تم دیکھنا..... چاروں خانے ٹھیک رہے گا۔"

سلامی کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ رک گیا۔ انگریزی لباس میں تیس بتیس سالہ شخص ہاتھ میں بڑا سا چرمی بیگ لیے انتظار گاہ میں داخل ہوا اور ادھر ادھر نظر دوڑاتے ہوئے ہمارے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی رسالہ دبا ہوا تھا۔ کرسی پر بیٹھ کے وہ رسالے کے مطالعے میں مصروف ہوگیا۔ سلامی نے معنی خیز نظروں سے بٹھل کو دیکھا اور تیکھے لہجے میں بولا "کیا بولتے ہو استاد!"

بٹھل نے کوئی تاثر ظاہر نہیں کیا۔

"اپنے کو نوٹنکی والا جان پڑے ہے۔"

بٹھل نے ہنکاری بھری۔

"پھر تو استاد تمری تیرتھ یاترا اچھی گرما گرم رہے گی۔" سلامی چلبلے پن سے بولا "بٹھل کی خاموشی پر وہ سنجیدہ ہوگیا اور اس کا منہ بن گیا "حرام کے اور سرکاری مال میں تھوڑا ہی انتر ہے۔ سالے اوپر والوں کو گھما رہے ہیں اور خوب مال پانی بنا رہے ہیں۔ اوپر والوں کو کھپڑیا بھی لونی لگتی ہے۔ تم جا رہے ہو پر ابھی سارا ٹھیک نہیں ہے۔ یہ سور کھانے آگے بھی بہت اندھا پن کریں گے۔"

"پر ادھری چوکی پر تو بھی تو راجا بنا بیٹھا ہے۔"

"جتنا چاہے جوتے مار لو' تمہارا حق ہے۔ اپنے کو پتا ہے' کوئی مائی کا لال ہی چوکی پر بیٹھتا ہے۔ تمہارے اس غلام نے بھی اپنی ماں ہی کا دودھ پیا ہے۔ وہ تو تم ادھر تھے' اپنے لیے دیکھنے اور کرنے کو کیا رہ جاتا تھا۔ آگے جو ہوگا' دیکھ لیں گے استاد۔ تم سے بھی سارا جان لیا ہے اور اپنے سب حرام زادوں کو بھی بول دیا ہے۔ تم بے فکر ہو کے جاؤ اور کچھ زیادہ انیس بیس ہوا تو اپنا استاد جامو کتنا دور ہے۔ شام کو تار ملے گا' سویرے ادھر آجاوے گا۔ اب اپنے پہ تھوڑا بھروسا کرو۔ جامو اور جمرو استاد نے کچھ سمجھ ہی کے چوکی پر راجا گیری کرنے کا مان دیا ہے۔" سلامی کے عجز میں شکوہ بھی نمایاں

تھا۔ بٹھل نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ سلامی اس کے پیر دبانے لگا۔ اول درجے کی انتظار گاہ میں ایسا کچھ نہیں ہوتا ہوگا۔ پہلے سے موجود میاں بیوی ہم سے دور بیٹھے تھے۔ سلامی کی آواز شاید ان تک نہ پہنچ رہی ہو لیکن کمرے میں خوب روشنی تھی اور بینائی کے وہ دونوں کمزور بھی نہیں معلوم ہوتے تھے۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ سلامی کی نظریں بار بار رسالے کے مطالعے میں مصروف مسافر پر جاتی تھیں۔ وہ شخص بے نیاز بیٹھا تھا۔ سلامی کو جیسے کسی نے کانٹا چبھو دیا ہو' یکایک اور وہ جھینپتی آواز میں بولا "ایک بات پلے نہیں پڑتی استاد۔ جس رات ٹھاکروں کے ہاں ہولی کھیلی گئی' ہم لوگ دلن بیگم کے کوٹھے پہ مجرے کی محفل میں تھے۔ ایک دو نہیں' گانٹھ کے پورے نہ ہوں پر آنکھ کے پورے' بیس گواہ تھے اور پھر ان سسرے تیس ماروں نے خود بھی اچھی طرح چھان پھٹک کرلی ہوگی۔ یہ بات تو سامنے کی ہے کہ اس رات ہم ادھر شہر میں تھے..... پھر کیا رہ جاتا ہے' کون سے قانون سے۔"

"چپ رہ۔" بٹھل نے اسے دھتکار دیا "قانون کے آگے ڈوری کھینچنے والا بھی اتنا ہی پاپی ہوتا ہے۔ ان کا بولنا ہے' ڈوریاں اپنے ہاتھ میں تھیں۔"

"ہا!" سلامی نے کسی قدر ہذیانی انداز میں کہا "ایسا کیسے..... اپنا کیا واسطہ....." وہ ہکلانے لگا اور گالی بکتے ہوئے بولا۔ "سارے بالکل ہی بیدل ہوگئے ہیں۔"

"نشانہ ٹپ نہیں رہا رے۔" بٹھل کی آواز بھری تھی۔

"تیر کمان تو چاروں اور گھمانا پڑے گا۔"

"اور بیچ میں جو دس بیس حرام موت کام آجاویں گے۔"

"آجانے دے۔ سرکار کو معاف ہوتا ہے' پھر سرکار کاہے کی ہوئی۔" بٹھل نے سرد مہری سے کہا۔

"اتنا بھی اندھیر نہیں ہوتا۔" سلامی کی آواز بجھ سی گئی اور وہ کسی حد تک بچوں کی طرح مچل کے بولا "ایک بات بولوں استاد! ایسے وقت تم ادھری نہ ہوتے تو یہ سور کی اولاد اپنے کو تو تگنی کا نچا دیتے۔ کوتوالی میں اس رات جب اپنے پنٹروں کی بے وجہ دھنائی کی جا رہی تھی تو سب بولا گئے تھے۔ ایک دم پڑی سے اتر گئے تھے ایمان سے۔ دو چار کو تو اس رات ضرور ٹھکانے لگا دیتے۔ بعد کو کیا ہوتا' بعد کو دیکھا جاتا۔ ان پہ تو خون سوار تھا۔ وہ تو بس تمہارا دھیان تھا استاد!"

میری توجہ کسی اور طرف تھی۔ میری سمجھ میں دیر سے آیا کہ ان کا مقصد ایک دوسرے کو قائل کرنا نہیں' انہیں اپنے بازو میں بیٹھے ہوئے شخص پر شبہ ہے اور وہ اسے اپنی تکرار سے کچھ باور کرانا چاہتے ہیں۔ یہ سوال و جواب' حیرانی' غصہ' نفرت اور بیزاری کا اظہار عمداً ہے۔ سلامی نے ٹھاکر بستی میں خون خرابے کی رات مجرے کی محفل میں ہماری موجودگی کا ذکر بہت چونک کے بٹھل سے کیا تھا۔ جیسے پہلی بار یہ نکتہ اس کے دماغ میں روشن ہوا ہو۔ ابھی ابھی یہ دلیل اسے سوجھی ہو۔ یہ دلیل ہماری سب سے بڑی سپر تھی۔ دلیل کیا' شہادت۔ اس سے ہماری برات کے پہلو نکلتے تھے۔ سلامی کی حیرانی کے جواب میں بٹھل کی وضاحت اور وضاحت کی سادگی بھی دانستہ تھی۔ سلامی کا شبہ کچھ ایسا خیالی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ رسالے کے مطالعے میں مصروف شخص ہم سے اتنے قریب بیٹھے رہنے کے باوجود کیسا بیگانہ بنا ہوا تھا۔ وہ اندھا نہیں تھا' بہرا بھی یقیناً نہیں ہوگا۔ بٹھل اور سلامی کے درمیان ہونے والی اس قسم کی گفتگو سن کے کسی تشویش اور اضطراب کے آثار اس کے چہرے پر نمایاں ہونے چاہیے تھے۔ اس کے برعکس نسبتاً دور بیٹھے میاں بیوی خاصے بے چین نظر آرہے تھے۔ اگر واقعی وہ آدمی پولیس کا فرستادہ ہے تو سلامی کا یہ اندیشہ بھی درست ہونا چاہیے کہ آگے سفر میں بھی ہمارے تعاقب کا سلسلہ جاری رہے گا۔ پولیس افسر ورما نے بھی صبح حویلی میں آکے یہی کچھ کہا تھا کہ پولیس نے ہمیں شبے سے بری نہیں کیا ہے۔ ادھر بٹھل اور سلامی کو بھی اڈے میں کچھ کالی بھیڑوں کی موجودگی کا تلخ احساس ہونا چاہیے۔ بٹھل نے سہ پہر اڈے جا کے اپنی روانگی کے متعلق بتایا تھا۔ اڈے ہی کے کسی آدمی سے اس نے ٹکٹ منگوائے ہوں گے۔ پولیس کیسے خبر ہوگئی۔ یہ الگ بات ہے' بٹھل ہی نے اڈے کے لوگوں کو اپنی مخبری پر مامور کیا ہو کہ پولیس کو ہمارے تعاقب سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں تھا بلکہ ہمارے لیے تو یہ کچھ بہتر ہی تھا۔ ہمارے سفر کی مصروفیت جان کے ان کی شدت میں کمی ہوسکتی تھی۔ یہ تعاقب ان کے لیے اعصاب شکن بھی تھا اس کا احساس چند بستیوں کے بعد ہی انہیں ہونا چاہیے۔

انتظار گاہ کے نگراں نے سر جھکا کے ہمیں بتایا کہ گاڑی کی آمد کا اعلان ہوچکا ہے۔ چند لمحوں میں چائے لانے والا خادم بھی آگیا۔ سلامی نے اسے بخشش کے ساتھ چائے کے پیسے ادا کیے۔ نگراں کو بھی اس نے بند مٹھی سے کچھ رقم دی۔ نگراں کا سارا جسم لہرا گیا۔ ہم اٹھنا چاہتے تھے کہ سلامی

نے بٹھل کے پیر پکڑ لیے۔ "استاد! بس ایک منٹ ... اپنے یہ دیبو اور پنا..." بٹھل کی آنکھوں میں تندی دیکھ کے سلامی کی آواز حلق میں پھنس گئی۔

"کیا ہے رے؟" بٹھل نے جھڑکتی آواز میں پوچھا۔

سلامی کے اشارے پر دیبو اور پنا نے نہایت عجلت سے اپنی جیبوں سے کھٹکے دار چاقو نکال کے بٹھل کے قدموں میں ڈال دیے۔ چاقو نئے معلوم ہوتے تھے۔ یہ ایک قدیم رسم تھی۔ نئے چاقو پر کسی مستند استاد کا ہاتھ پھروانا اچھی علامت سمجھا جاتا تھا مگر اس مظاہرے کا اس وقت کوئی محل نہیں تھا۔ مجھے ناگوار محسوس ہوا۔ بٹھل کا چہرہ بھی مکدر ہوا لیکن اس نے تحمل سے دونوں چاقو اٹھا لیے۔ ان کے دستے نقشین تھے۔ پورے چھ انچ لمبائی ہوگی۔ بٹھل نے باری باری انہیں کھولا۔ کھٹکا دبتے ہی تیزی سے پھلکا باہر آجاتا تھا۔ روشنی میں پالش کیے ہوئے پھلکے چمچما رہے تھے۔ بٹھل نے انگلی پھیر کے دھار کا اندازہ کیا "اچھے ہیں رے۔" اس نے سرہلاتے ہوئے کہا۔

"پھر قبول کرو استاد۔" سلامی جھٹ سے بولا۔

"نا رے۔" بٹھل نے چاقو بند کرکے دیبو اور پنا کے ہاتھوں میں تھما دیے۔ انہوں نے سر سے، آنکھوں سے لگایا اور جیبوں میں واپس رکھ لیے۔

"چاقو سے پہلے انگلیوں پہ دھار رکھ۔" بٹھل کا لہجہ تلقینی بھی تھا تنبیہی بھی۔ یہ کہتے ہوئے وہ کرسی سے اٹھ گیا۔ میں نے پلٹ کے دیکھا۔ دونوں میاں بیوی نے کرسیاں چھوڑ دی تھیں۔ ان کے لیے یہ منظر ایک تجربہ ہوگا۔ اس اثنا میں ان کا قلی بھی آگیا تھا لیکن ہمیں اٹھتا دیکھ کے وہ دوبارہ بیٹھ گئے۔ پڑوس کا مسافر رسالہ تہ کرکے بیگ اٹھائے بے نیازانہ پہلے ہی دروازے سے نکل چکا تھا۔ ہمارا قلی بھی ہانپتا کانپتا اندر آگیا تھا۔ دیبو اور پنا نے اسے سامان اٹھانے نہیں دیا۔ قلی خالی ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ ڈبے تک اس نے ہماری رہنمائی کی۔ گاڑی آنے پر افراتفری سی ہوگئی تھی۔ مگر جلد ہی پلیٹ فارم پر گونجتے شور اور بھاگ دوڑ میں ٹھہراؤ آگیا۔ جب تک گاڑی نے حرکت نہیں کی، سلامی، دیبو اور پنا ہمارے ساتھ ہی بیٹھے رہے اور چلتی گاڑی سے کود کے رخصت ہوئے۔ ان کا بس چلتا تو ہمارے پاس ہی بیٹھے رہتے۔ منٹوں میں گاڑی کی رفتار تیز ہوگئی۔ فیض آباد شہر کی روشنیاں کچھ دور ساتھ چلتی رہیں پھر گاڑی اندھیروں میں آگئی۔

☆

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات

ساتویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

سب رنگ ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ

بازیگر

7 واں حصہ

بازی گر

پیسے کی عجب کرشمہ کاری ہے۔ اسی ریل گاڑی کے دوسرے ڈبوں میں لوگ ٹھس ٹھس کر بیٹھے ہوں گے۔ بعض لوگوں کو تو شاید کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہ ملی ہو۔ ڈبا گو مختصر تھا لیکن ہمارے سوا یہاں کوئی اور نہیں تھا۔ اوپر کی دو برتھیں، نیچے کی دو کشادہ برتھیں اور ہم۔ بیچ میں دیوار سے نکلی ہوئی لکڑی دونوں برتھوں کے لیے میز کا کام دیتی تھی۔ راکھ دانی سرہانوں کے قریب جڑی ہوئی تھی۔ گلاس رکھنے کے لیے اسٹینڈ بھی پیوست تھا۔ ڈبا نئے رنگ روغن سے آراستہ تھا۔ ہر چیز نئی معلوم ہوتی تھی۔ فرش بالکل اجلا، چھت پر پنکھے، گدے نرم اور لچکیلے، بیٹھو تو آدمی دھنستا جائے۔ نرمی، گداز، رنگ، روشنی دولت کو بہت مرغوب ہیں۔ مرغوب تو ہر ایک کو ہیں لیکن دولت ہر ایک کے پاس نہیں ہوتی۔ کہتے ہیں دولت سے زندگی نہیں خریدی جاسکتی مگر دولت زندگی کیسی آسان کر دیتی ہے۔ دولت تو ایک طاقت ہے، جس کے پاس جتنی زیادہ، اتنا وہ طاقت ور۔ دولت سے معذور و ناتواں، نحیف اور ضعیف بھی کیسے قوی و جری، مقتدر و بااثر ہو جاتے ہیں۔ دولت سے آدمی خریدے جاسکتے ہیں۔ ہوا، پانی، روشنی، دولت سے موسم خریدے جاسکتے ہیں۔

بٹھل نے خانم کی دی ہوئی گلوریوں کی ڈبیا سے گلوری نکالی اور سلامی کی نذر کی ہوئی بیڑی سلگائی۔ ڈبے میں کسی قدر خنکی تھی۔ کھڑکیوں کے شیشے گرا دینے سے کچھ گرمی ہوگئی۔ میرے سامنے کی برتھ پر دیوار سے ٹیک لگائے، ٹانگیں پھیلائے بٹھل گلوری چباتا اور بیڑی کے کش لیتا رہا، پھر باتھ روم جاکے اس نے منہ صاف کیا اور واپس آکے برتھ پر دراز ہوگیا۔ ابھی گاڑی نے پوری رفتار نہیں پکڑی تھی کہ کسی چھوٹے سے اسٹیشن پر ٹھہر گئی اور ایک دو منٹ بعد ہی چل پڑی۔ کوئی دس منٹ بعد مشہور تیرتھ استھان ایودھیا آ گیا۔ گاڑی یہاں بھی بہت کم وقت ٹھہری۔ ایودھیا گزر جانے کے بعد میں نے روشنی کم کردی اور بیگ سے کھیس نکال کے ایک بٹھل کو دیا، دوسرا اپنے پاس رکھا۔ روشنیاں کم ہونے سے ڈبے کا ماحول خوابیدہ سا ہوگیا تھا۔ تواتر

سے چلتی گاڑی بھی لوری کا کام کرتی ہے اور تواتر سے ڈبے کی لرزش پنگوڑے کی کیفیت رکھتی ہے۔ میں نے بھی بٹھل کی تقلید میں لیٹ جانا چاہا لیکن نیند نہیں آرہی تھی۔ باربار حویلی کے درو بام سامنے آجاتے تھے اور حویلی ہر لمحے دور ہورہی تھی۔ بینائی پر نقش مناظر دیواروں اور فاصلوں سے نہیں مٹتے۔ اس مرتبہ وہاں کچھ زیادہ ہی وقت گزارنے کا موقع مل گیا تھا۔ ٹھاکر بستی کی واردات نہ ہوتی تو بٹھل آٹھ دس دن سے زیادہ کبھی نہ ٹھہرتا۔ رہ رہ کے یہ احساس میرا سینہ جلاتا تھا کہ سب کچھ میری نادانیوں اور کوتاہیوں سے شروع ہوتا ہے۔ آسن سول اسٹیشن پر میں اتنی ضد اور ناراضی کا اظہار نہ کرتا تو حالات بہت مختلف ہوتے۔ بٹھل تو فیض آباد کا رخ کرنے کو تیار ہی نہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ اول تو ہمیں فروزاں اور یاسمن کو ساتھ لے کر فیض آباد جانا چاہیے تھا۔ یہ ممکن نہ ہوا تو پہلی گاڑی سے ہمیں وہاں پہنچ جانا چاہیے۔ ہمارے بغیر فروزاں اور یاسمن کو حویلی میں بہت اجنبیت محسوس ہوسکتی ہے۔ پے بہ پے اتنے بڑے حادثات کے بعد انہیں تو بہت گداز چاہیے مگر یہ میرا گمان تھا۔ فروزاں اور یاسمن کے فیض آباد پہنچ جانے کے دن بھر بعد ہم بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ بے شک ہمیں دیکھ کے ان کے چہرے کھل اٹھے تھے۔ ہماری آمد سے یقیناً انہیں بہت حوصلہ ملا ہوگا لیکن بٹھل بھی کیا غلط کہہ رہا تھا، ان کے پیچھے پیچھے ہمارے فیص آباد پہنچنے کی واقعی کوئی ضرورت نہ تھی۔ میں بھول گیا تھا کہ حویلی میں زریں اور خانم موجود ہیں۔ وہاں نیساں ہے۔ انہیں حرماں نصیبوں کی اشک شوئی کا فن آتا ہے۔ کاش جیسا کہ بٹھل کا ارادہ تھا، ہم اس وقت فیض آباد نہ جاتے تو نہ ہریا اور گورا کا واقعہ پیش آتا اور نہ شاید ٹھاکر بستی میں پورے 47 آدمی جان سے جاتے۔ بٹھل صاف انکاری تھا کہ اس خون خرابے سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے اور میں نے بھی یہی تسلیم کرلیا تھا مگر جب تانے بانے کا خیال آتا تھا تو کچھ دکھائی سجھائی نہ دیتا تھا۔ بٹھل کو اسی شام اور اسی رات مجھے ساتھ لے کے شہر کے مختلف مقامات اور خصوصاً رات کو دلن بیگم کے بالاخانے پر جانے کی ایسی کیا پڑی تھی؟ اسی شام، اسی رات ہی کیوں؟ شہادتیں نقش کرنے کی صورت ہی میں یہ تدبیریں کی جاتی ہیں اور پولیس کے جہاں دیدہ، گرگ باراں دیدہ افسران کسی قسم کا کوئی نشان کھوجنے میں کیوں ناکام رہے؟ کوئی عام مجرم ہوتے تو اپنے آثار ضرور چھوڑ کے جاتے۔ ٹھاکر بستی پر یلغار کرنے والے کیسے ہنرمند اور پختہ کار لوگ تھے۔ یہی چیستاں نکتہ رس پولیس افسر ورما کی نیندیں حرام کیے ہوئے ہے۔ ایک دو نہیں اور بھی بہت سی باتیں تھیں۔ جامو کا اچانک کلکتے سے آنا اور ایک رات کے بعد چھلاوا ہوجانا۔ اپنے آدمی گورا استاد کی ہزیمت کے بعد میری تلاش میں یا حویلی کے مکینوں کو زک پہنچانے کے لیے شورہ پشت ٹھاکر بل دیو کی حویلی کی طرف کوچ کرنے کے امکانات نظر انداز نہیں کیے جاسکتے تھے اور تدارک کی یہی صورت تھی کہ ٹھاکر بستی سرے سے نیست و نابود کردی جائے۔ یوں حویلی ہی محفوظ نہیں رہے گی، ایک خلقت کو بھی امان مل جائے گی۔ جب بھی ان پہلوؤں اور عواقب پر دھیان جاتا تھا، میرا سر پکنے لگتا تھا۔ سارے جسم پر کانٹے سے اگ آتے تھے۔ بارہا میں نے اپنے آپ کو منضبط کرنے، خود کو الگ رکھنے اور سب کچھ فراموش کردینے کی کوشش کی لیکن دوسرے پر قابو پانا آسان، خود کو قابو میں رکھنا مشکل ہوتا ہے۔

کہیں بٹھل سے فیض آباد سے روانگی میں عجلت تو نہیں ہوگئی ہے۔ آدمی بہت ہوش مند ہو، بھٹکے ہوئے لمحوں کی زد پر رہتا ہے۔ وہ مجھے کسی قابل سمجھتا تو میں کچھ دن اور وہاں ٹھہرے رہنے کا مشورہ دیتا۔ اس نے صاف لفظوں میں پولیس افسر ورما کو متنبہ

کردیا تھا کہ اس کے غیاب میں حویلی کے مکینوں سے کوئی بازپرس نہ کی جائے۔ ورما نے کوئی وعدہ کیا تھا نہ اختلاف کیا تھا۔ لیکن پولیس کا کیا بھروسا ہے۔ ایک ورما ہی نہیں، دوسرے افسر بھی بااختیار ہیں۔ کسی وقت بھی کسی کا دماغ گھوم سکتا ہے۔ ورما کا تبادلہ بھی ہوسکتا ہے۔ ادھر حویلی کے لوگوں کو ہمارے باہر کے معاملات سے کتنی ہی آشنائی ہو، پولیس، تھانے، کچہری کا انہیں کوئی تجربہ نہیں ہے۔ ہمارے چلے جانے کے بعد انہیں بے امانی، بے سروسامانی سی محسوس ہورہی ہوگی۔ بٹھل کی ہدایتوں پر وہ ہر طرح کاربند ہیں مگر کوئی دھڑکا تو انہیں ہر دم لگا رہنا چاہیے۔ یہ سفر تو ہم کچھ دن بعد بھی کرسکتے تھے۔ چند دن پہلے یا چند دن بعد سے کیا حاصل ہونے والا تھا۔ آدمی وقت کا پابند رہے، وقت بھی تو اس کا کچھ خیال کرے۔ وقت ہمارے اختیار سے نکل جاتا تھا۔ راستوں میں دیواریں کھڑی ہوجاتی ہیں۔ راستے بھی تو رخ بدل لیتے ہیں۔ مجھے تو اب یہ سارا کچھ معمول سا لگتا تھا، کسی فرض یا قرض کی ادائی کی طرح۔ کبھی کبھی تو معلوم ہوتا تھا کہ ہم محض اپنی تسلی، اپنی دل جوئی کے لیے صبح و شام سفر کا وظیفہ انجام دے رہے ہیں، کیونکہ ہمیں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے نہیں رہنا چاہیے، کیوں کہ سفر کے سوا ہماری استطاعت میں کیا ہے۔ پہلے کسی بستی میں داخل ہوتے وقت دل دھڑکنے لگتا تھا کہ اب منزل دور نہیں ہے۔ اب اتنی بستیوں کی خاک چھاننے کے بعد کسی نئی جگہ جاتے ہوئے ناکامی کے احساس سے قدم بوجھل ہوجاتے ہیں۔ بٹھل کا البتہ یہ حال نہیں تھا۔ ہر صبح تروتازہ ہو کے محلوں اور گلیوں میں مولوی صاحب کی صدائیں لگانے کے لیے تیار ہوجاتا۔ سب ایک مٹی سے بنے ہیں تو ہر شخص کی مٹی الگ ہے۔ بٹھل کا یقین قائم تھا۔ اتنے آرام، خاطر مدارات، عزیزوں کی رفاقت چھوڑ کے وہ سفر کے لیے مضطرب رہتا تھا۔ سفر چاہے شاہی بجرے میں کیا جائے یا آٹھ گھوڑوں کی بگھی میں، سفر تو سفر ہوتا ہے۔ سفر، اپنا محل، عشرت کدہ، اپنا گھر نہیں ہوتا۔ بٹھل کا یقین کچھ ایسا بے جواز بھی نہیں تھا۔ بے شمار بستیوں کی کوچہ گردی کرتے ہوئے ایک شہر جسلمیر میں ہم مولوی صاحب کے ٹھکانے پر پہنچ گئے تھے۔ حیدرآباد میں بھی ہم نے ان کا گھر ڈھونڈ لیا تھا۔ نگریا سادات میں مولوی صاحب کے خاص دوست حافظ عبدالخالق تک ہماری رسائی ہوگئی تھی۔ وہ بھی مولوی صاحب کا ایک گھر تھا۔ اتنا کچھ حرکت میں رہنے ہی سے ممکن ہوا تھا۔ منزل، مراد سے مشروط نہیں ہے۔ منزل مل جانا اور چیز ہے، مراد پانا اور۔ اور جہاں مراد بر نہ آئے، اسے منزل ہی کیوں کہا جائے۔ کاش دنیا ہی کچھ چھوٹی ہوتی اور اسی نسبت سے لوگ بھی کم ہوتے۔ خدا کو آخر اتنی بڑی دنیا بنانے کی کیا ضرورت تھی یا پھر آدمی کی سمائی بھی بڑھائی ہوتی۔ آدمی کی چار آنکھیں، آٹھ ہاتھ پیر بنائے ہوتے، آدمی کے پر لگائے ہوتے۔ دنیا کی وسعت کے اعتبار سے یہ آدمی تو بہت حقیر ہے۔ آدمی تو دو گز کا ہوتا ہے۔

یہ پسینجر گاڑی تھی۔ چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر دم لیتی بڑھتی رہی۔ میں تو جاگتا ہی رہا۔ میرے سر میں بھی کوئی ریل چل رہی تھی۔ بٹھل میری طرف سے منہ پھیر کے سوگیا تھا۔ اس کے غافل ہوجانے سے مجھے کچھ اطمینان ہوا تھا۔ تنہائی کا سا احساس، اس وقت جانے کیوں مجھے اس تنہائی کی بڑی طلب تھی۔ بٹھل جاگ رہا تھا تو مجھے بہت گھبراہٹ ہورہی تھی جیسے وہ مسلسل مجھے دیکھ رہا، میرے بارے میں سوچ رہا مگر یہ تنہائی بھی عجب ایک خود فریبی، کیسا ایک گمان ہے۔ آدمی کتنا ہی اکیلا ہو، اکیلا کہاں ہوتا ہے۔ جانے کتنے لوگ، کتنے منظر نئے پرانے، اچھے برے اسے گھیرے میں لیے ہوتے ہیں۔ آدمی تو سوتے میں بھی کتنا تنہا ہوتا ہے۔ تنہائی تو شاید ایک ہی وقت، ایک ہی صورت

میں ممکن ہوتی ہے اور کسی نے کہا ہے، آدمی اکیلا کہاں ہوتا ہے۔ وہ مستقل اپنے ساتھ جو ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے خود پر ہنسی آتی تھی۔ یہ میں کیسا آدمی ہوں۔ سامنے کا سارا آئینہ ہونے کے باوجود میرا دماغ الجھنے، بھٹکنے لگتا ہے۔ اپنے ہوش وحواس پر کبھی خود مجھے بہت شک ہوتا ہے۔ کسی معذور، بے توازن، کسی مجہول آدمی میں مجھ سے سوا پھر کیا ہوسکتا ہے۔

پھر کوئی اسٹیشن آرہا تھا۔ انجن زور زور سے سیٹیاں بجانے لگا تھا مگر جیسے بادل گرجے ہوں یا زمین زیر دزبر ہوگئی ہو۔ آہستہ ہوتی ہوئی گاڑی کو یکا یک جھٹکا لگا۔ گاڑی رک گئی تھی۔ دوسرے لمحے دو تین اور جھٹکے لیے اور گھسٹتی، ڈگمگاتی، دھڑ دھڑاتی ہوئی دوبارہ رک گئی۔ رات کے وقت ڈبے ٹکرانے کی گونج اور پہیوں اور پٹریوں کی چیخیں دور تک گئی ہوں گی۔ دھچکے اتنے شدید تھے کہ میں کونے میں دبکا نہ بیٹھا ہوتا تو فرش پر جا پڑتا، پھر بھی سر کھڑکی سے ٹکرایا اور سارا جسم جھن جھنا گیا۔ چند لمحے تو مجھے اپنا ہوش نہیں رہا پھر بٹھل کا خیال آیا۔ میں نے دیکھا کہ سامنے کی برتھ پر وہ بھی سر پکڑے ہوئے ہے۔ چہرہ بگڑا ہوا، آنکھیں بھنچی ہوئی ہیں۔ میں تیزی سے اس کی طرف جھپٹا۔ اسی اثنا میں وہ کسی قدر سنبھل گیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میری پیشانی پر دائیں آنکھ سے اوپر خون چھلک آیا ہے۔ آمنے سامنے ہم ایک دوسرے کو مضطربانہ دیکھا کیے اور وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا تو میری جان میں جان آئی۔ اس نے میری پیشانی چھوئی اور کھیس کا کونا چھلکتے خون پر رکھ دیا۔ ''کوئی ایسی چوٹ نہیں۔'' میں نے اس کی تشفی کے لیے بہ ظاہر بے پروائی سے کہا۔

اس نے سنا نہیں۔ کھیس ہٹا کے دوبارہ میری پیشانی کا جائزہ لیا۔ پیشانی ادھر ادھر سے دبا کے اسے سکون ہوا۔ میری جیب میں زریں کا دیا ہوا رومال تھا۔ اس وقت یہی ایک چارہ تھا کہ اس سے کام لیا جائے۔ اس نے پیشانی پر کس کے رومال باندھ دیا۔

''تمہارے بھی تو چوٹ لگی ہے۔'' میں نے الجھی ہوئی آواز میں کہا۔

''کچھ نہیں۔'' اس کی بے نیازی بھی مصنوعی تھی۔'' تھوڑا سر دیوار پہ جا ٹکا تھا۔''

''زور سے لگا ہے؟ تکلیف تو ہوگی؟''

''ٹھیک ہو جاوے گا لوٹ پیٹ کے۔''

''مجھے بتاؤ، سب ٹھیک تو ہے نا۔'' میں نے اضطراری انداز میں پوچھا اور اس کا سر دیکھنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس نے میرا ہاتھ روک دیا۔

''پر یہ کیا ہوا رے؟ میں تو مرا ہوا تھا۔'' اس نے اپنی جانب سے میری توجہ ہٹانے کی کوشش کی۔

''کچھ معلوم نہیں۔ میں جاگ رہا تھا، گاڑی آہستہ ہوتی ہوئی رکنے والی تھی کہ کیا ہوا، ایک دم جھٹکے لینے لگی۔ پہلا جھٹکا تو بہت زور کا تھا۔ ذرا تیز ہوتی تو لوٹ جاتی۔ اسٹیشن پر آکے ایسا ہوا ہے۔ گاڑی تو پلیٹ فارم میں داخل ہوچکی تھی۔'' اپنی آواز کا ہیجان خود مجھے کھٹکنے لگا اور میں نے کچھ ٹھیر کے کہا۔''میں باہر جاکے دیکھتا ہوں۔''

ہمیں اپنی بدحواسی میں کچھ احساس ہی نہیں ہوا۔ چیخ پکار تو اندر تک آرہی تھی۔ میں نے شیشہ چڑھا کے باہر جھانکا۔ پلیٹ فارم پر تو قیامت سی مچی ہوئی تھی۔ لوگ دائیں بائیں بھاگ رہے تھے۔ دروازہ کھول کے میں نیچے اتر گیا اور مجھے گاڑی کے پاس ایک جگہ کھڑے رہنا مشکل ہوگیا۔ پاگلوں کی طرح بھاگتے ہوئے کچھ لوگ مجھ سے ٹکرائے اور مجھے گاڑی سے کچھ دور سائبان کے کھمبے کی طرف ہٹ جانا پڑا۔ یہاں سے وہاں تک لوگ ڈبوں کے دروازوں پر اُمڈ رہے تھے۔ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ جن ڈبوں میں زیادہ مسافر ہوں گے۔ ان کا برا حال ہوا ہوگا۔ وہ تو جیسے ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے ہوں گے۔ سامان لڑھکنے سے چوٹیں الگ

آئی ہوں گی اور کچھ دیر میں یہی دیکھنے میں آیا۔ بہت سے لوگ زخمی ہوئے تھے اور لوگ انہیں جلد سے جلد ڈبو سے نکالنے کے لیے ایک دوسرے کی مدد کررہے تھے اور ان کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔ دیکھتے دیکھتے پلیٹ فارم لوگوں سے بھر گیا۔ بہت سے زخمیوں کو کھڑکیوں سے باہر نکالا گیا۔ جو کپڑا ہاتھ میں آیا، جیسے تیسے فرش پہ بچھا کے زخمیوں کو لٹا دیا گیا۔ لوگ کراہ رہے، سسک رہے اور چیخ رہے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں، بچے بھی تھے۔ سارا پلیٹ فارم طرح طرح کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔

یہ اکبر پور جنکشن تھا۔ فیض آباد سے یہاں تک کا فاصلہ 35 سے 40 میل کے قریب ہوگا اور گاڑی نے پورے دو گھنٹے میں طے کیا تھا۔ سست رفتاری کی وجہ انجن کی خرابی ہی ہوسکتی ہے۔ لوگ اس حادثے کی اپنے اپنے طور پر تاویلیں کررہے تھے۔ ریلوے کے محکمے، حکومت اور انجن ڈرائیور کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ میں نے انجن تک جانے کا ارادہ کیا تھا اور چند قدم چل کے رہ گیا۔ آگے جانے سے کیا حاصل تھا۔ ہر طرف ایک ہی منظر تھا۔ آگے جانا آسان بھی نہیں تھا۔ جانے کہاں سے لوگ نکل آئے تھے۔ ڈبوں کے قریب تو بڑی بھیڑ تھی۔ میرے سر میں اب ہلکی ہلکی ٹیس اٹھ رہی تھی۔ مجھے پھر بٹھل کا خیال آیا۔ میں اسے اکیلا چھوڑ کے چلا آیا تھا۔ اس نے اپنی چوٹ کی نوعیت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا جس وقت گاڑی نے پہلا جھٹکا لیا، وہ سویا ہوا تھا۔ یہی ہوسکتا ہے، سوئے ہوئے آدمی کا صرف وزن ہوتا ہے، اختیار نہیں ہوتا۔ جھٹکے نے جسم پیچھے کی طرف دھکیل دیا اور سرہانے کی دیوار سے سر جا ٹکرایا، لڑھک کے وہ فرش پر بھی گر سکتا تھا۔ لیٹے رہنے کی وجہ سے محفوظ رہا۔ جب میری نظر اس پر گئی، وہ سر پکڑے ہوئے تھا۔ کسی شدید چوٹ میں کوئی اتنے کرب میں ہوسکتا ہے۔ ڈبے سے میں قریب ہی تھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہ سر کی مالش کررہا تھا۔ ''درد ہو رہا ہے کیا؟'' میں نے تشویش سے پوچھا۔

''ایسا کر کے ٹھیک رہتا ہے۔'' وہ دھیمی آواز میں بولا۔

''میں دباتا ہوں۔''

وہ منع کرتا رہا، میں نے اس کے ہاتھ ہٹا کے ہلکے ہلکے اس کا سر دبانا شروع کیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کس جگہ زور سے دبانے پر اس کا کیا تاثر ہوتا ہے اور میں کچھ نہ جان سکا۔ وہ سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا اور کچھ دیر بعد اس نے مجھے روک دیا۔''اب بیٹھ جا ادھری۔ باہر تو بڑا فیل مچا ہے۔''

میں نے مختصراً اسے باہر کا احوال بتایا اور کہا۔''گاڑی اب بہت لیٹ ہوسکتی ہے۔''

''کیا بولیں پھر۔'' وہ اچٹتی آواز میں بولا۔

''تمہارے لیے چائے لادوں؟''

''ایسے میں کدھری ملے گی۔''

''دیکھتا ہوں، شاید مل جائے۔'' میں نے کھڑکی سے جھانک کے دیکھا۔ پلیٹ فارم پر وہی نفسا نفسی تھی۔ ہجوم اور بڑھ گیا تھا۔ اسٹیشن کے آس پاس بسنے والے بھی تماشا دیکھنے آئے ہوں گے۔ پولیس بھی نظر آرہی تھی۔ ڈبے سے اتر کے راستہ بناتے ہوئے میں چائے کا اسٹال ڈھونڈتا رہا۔ اسٹال مل گیا لیکن چائے حاصل کرنا دشوار تھا۔ پہلے سے بہت مضطرب اور منتظر طلب گار وہاں دھرنا دیے ہوئے تھے۔ چھینا جھپٹی کا سا منظر تھا۔ چائے بنانے والے کے اوسان بھی خطا معلوم ہوتے تھے۔ ایک ہی تدبیر ذہن میں آئی۔ میں اسٹیشن سے باہر چلا آیا۔ اسٹیشن کی عمارت سے کچھ فاصلے پر ایک پختہ ناپختہ قسم کا ہوٹل موجود تھا۔ بھیڑ تو وہاں بھی کم نہ تھی مگر چائے ملنے کا آسرا ہوگیا۔ ہوٹل والا گلاس دینے کو تیار نہ تھا۔ میں نے ضمانت کے طور پر پانچ روپے پیش کیے تو وہ تو دوسرا آدمی بن گیا۔ چائے بھی پھر

اس نے توجہ سے بنائی، ملائی بھی ڈالی۔ مجھ سے چوک ہوگئی۔ میں دس روپے کا نوٹ بڑھاتا تو وہ ڈبے تک چائے پہنچانے کے لیے بھی آمادہ ہوجاتا۔ اندر پلیٹ فارم پر لوگوں سے بچتے بچاتے اپنے ڈبے تک پہنچنے میں مجھے پھونک پھونک کر قدم بڑھانے پڑے۔ لوگ راستہ ہی نہیں دے رہے تھے۔ خود سے زیادہ مجھے گلاس اسٹینڈ کا خیال تھا۔ کھانے پینے کی کسی چیز کے لیے میں نے ایسی ریاضت کبھی نہیں کی تھی۔ یہ تو ایک آزمائش تھی۔ بہرحال، کسی طور میں ڈبے تک آنے میں کامیاب ہوا۔ ہوا میں خنکی تھی اور ایسی نہیں کہ چائے جلدی ٹھنڈی ہوجائے۔ بٹھل کو واقعی چائے کی طلب تھی۔ چند گھونٹوں میں تمام کرلی۔ ''کچھ دانا دنکا بھی کرلیتا۔'' وہ کسمساتے ہوئے بولا۔

''جی نہیں چاہ رہا۔'' میری آواز بھی تھکی ہوئی تھی۔

''گھر سے چلے ٹائم ہوگیا۔ تھوڑا ہلکا پھلکا کرلے۔''

''تمہیں کچھ خواہش ہے؟''

''اپنے کو بھی نہیں ہے پر اس کی رکھی چیزیں ڈھیر نہ ہوجائیں۔'' وہ تردد سے بولا۔ اس کا اشارہ زریں کی طرف تھا۔ زریں نے بیگ میں کھانے پینے کی چیزیں رکھ دی تھیں۔ معلوم نہیں، کیا کیا تھا۔ بھوک ہی نہیں تھی تو کیا کھول کے دیکھتا۔ زریں نے ضرور خیال رکھا ہوگا کہ جلد خراب ہوجانے والی چیزیں ساتھ نہ کی جائیں۔

چائے پی کے اور بٹھل کو پلا کے میں پھر ڈبے سے باہر آگیا۔ اتنی دیر میں کسی قدر نظم وضبط ہوگیا تھا۔ شور کی جگہ بھن بھناتی سوگواری نے لے لی تھی۔ سپاہیوں کی بڑی تعداد نے بکھرے اور بپھرے ہوئے لوگوں کو قابو میں کرنا شروع کردیا تھا۔ دو چار ڈاکٹر بھی آگئے تھے اور زخمیوں کی مرہم پٹی کررہے تھے۔ اسٹریچروں کی کمی معلوم ہوتی تھی۔ لوگ چارپائیوں پر شدید زخمیوں کو باہر لے جارہے تھے۔ میں تماشائی بنا کب تک کھڑا رہتا۔ میں بھی ان میں شامل ہوگیا اور چارپائیاں اٹھانے میں مدد دیتا رہا۔ پھر کئی بچوں کو گود میں بھر کے میں نے پلیٹ فارم سے باہر پہنچایا۔ جہاں ڈاکٹر زخمیوں کی چارہ گری میں مصروف تھے، اس بینچ کے کونے سے ٹکی، گٹھری بنی ایک بوڑھی عورت پر میری نظر گئی۔ اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دے رہا تھا۔ وہ چیخ پکار کر کے لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کے قابل بھی نہ تھی۔ لگتا تھا، اسے کوئی اندرونی چوٹ لگی ہے۔ اس کا ڈھلکا ہوا سر دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا کہ کہیں...... میں نے جھجکتے جھجکتے اس کا کندھا ہلایا تو اس نے چونک کے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں میں وحشت سمائی ہوئی تھی۔ میں نے اس کا حال پوچھا۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی آواز میں کولھے پر ہاتھ رکھ کے کچھ بتانے کی کوشش کی۔ میرے پلے کچھ نہیں پڑا۔ میں نے پوچھا، اس کے ساتھ کون ہے؟ کیا وہ اکیلی سفر کررہی تھی؟ وہ کہاں سے آرہی اور اسے کہاں جانا ہے؟ اس کا سامان کہاں ہے؟ اور ڈبے سے یہاں تک کون اسے لایا ہے؟ وہ اتنے سوالوں کے جواب میں دیدے گھما کے رہ گئی۔ اس کے ساتھ کوئی ہوتا تو اسے یوں اکیلا نہیں چھوڑ دیتا یا پھر معلوم نہیں، اس شخص پر بھی کیا گزری ہو۔

بینچ پر بیٹھا ڈاکٹر پاگل ہورہا تھا۔ قریب کوئی اسٹریچر یا چارپائی بھی نہیں تھی۔ بوڑھی عورت کی حالت نہایت شکستہ تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں۔ اس سے پہلے میں دیکھ چکا تھا کہ کچھ لوگ زخمیوں کو اپنی پیٹھ پر بٹھا کے باہر لے گئے تھے۔ وہ ان کے عزیز ہی ہوں گے۔ بڑھیا کو بھی ڈبے سے یہاں تک کسی نے پہنچایا ہوگا۔ اپنے پیروں چل کے تو وہ نہ آسکی ہوگی۔ کوئی اور چارہ نہ دیکھ کے میں نے بھی اس کے ہڈیوں بھرے جسم کی گٹھری بازوؤں میں بھرلی۔ وہ بہت دھان پان تھی۔ باہر جانے کے لیے گیٹ پلیٹ فارم کے وسط میں تھا اور زیادہ دور نہیں تھا۔ تیز قدموں، رکاوٹوں اور بڑھیا کو احتیاط سے جکڑنے کی وجہ سے میری سانس پھول گئی۔

اسٹیشن کی عمارت کے ساتھ بہت سے تانگے اور دوسری سواریاں زخمیوں کو لے جانے کے لیے منتظر کھڑی تھیں۔ مجھے دیکھ کے کئی آدمی میری طرف لپکے۔ بڑھیا کو تانگے میں بٹھایا گیا اور دو آدمیوں نے اس کے دائیں بائیں بیٹھ کر اسے تھام لیا۔ لوگ غلط نہیں کہتے۔ دنیا میں اچھے لوگوں کی کمی نہیں ہے یا پھر یہ کہ کوئی کتنا ہی بڑا ظالم، کتنا ہی برا ہو، کسی وقت بھی بہت اچھا اور رحم دل ہوسکتا ہے۔ شہر کے لوگ یہ افتاد سن کے اتنی رات کو، اپنا آرام چھوڑ کے اسٹیشن پر اُمڈ آئے تھے اور ہر کوئی اپنی توفیق کے مطابق سرگرم تھا۔ کسی تخصیص کے بغیر کہ کون کیا ہے۔ تانگا روانہ ہوا چاہتا تھا کہ میں نے بڑھیا کے سامنے جاکے اس کے زانوں پر تھپکی دی۔ وہ بڑبڑانے لگی۔ پوربی مجھے بھی خوب آتی تھی لیکن اس کی آواز بہت دھیمی اور منتشر تھی، میں کچھ اخذ نہ کرسکا۔ شاید وہ دعائیں دینا چاہتی تھی۔ جب میں نے اس کے زانوں پر تھپکی دی تھی تو اس کی ویران آنکھوں میں لمحے بھر کے لیے چمک پیدا ہوئی تھی۔ آنکھوں کی زبان سب سے بلیغ ہوتی ہے۔ اس زبان کا کوئی نام نہیں اور ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ممنونیت کی ٹمٹماتی لو دیکھ کے میرا دل بھی ڈولنے لگا اور مجھے ایسا لگا جیسے میرا قد بڑھ گیا ہو اور میں بے وزن ہوگیا ہوں اور جیسے مجھ پر منکشف ہوا کہ میرا وجود صرف میری غرض نہیں، دوسروں کو بھی اس سے کچھ سروکار ہے۔ کوئی اپنے لیے ٹھیک سے جی نہیں سکتا تو اصرار بھی کیوں کرے، خود کو دوسروں کی نذر کیوں نہ کردے۔ آدمی اپنے آپ سے کوئی علاقہ ہی نہ رکھے۔ آدمی کو آدمی کی بڑی ضرورت ہے، اشیا سے زیادہ۔

اسٹیشن کی عمارت کے باہر کھڑا میں تانگا جاتے دیکھتا رہا۔ بوڑھی عورت کی نظریں مجھ پر منڈلار[ہی] تھیں لیکن وہ اپنی مجتمع کی ہوئی توانائی تادیر بر قر[ار] نہ رکھ سکی۔ میں نے دیکھا، اس کا جسم دائیں طرف بیٹھے ہوئے شخص پر ڈھلک پڑا۔ تانگا دور ہوتا رہا۔ میرے جی میں آیا کہ تانگہ کا تعاقب کروں مگر اور [کیا] کرسکتا تھا۔ اسے وہ لوگ اسپتال کی طرف ہی لے جارہے تھے۔

پلیٹ فارم پر واپس آکے بٹھل کی خیر خبر لینے کے لیے میں نے ڈبے کا رخ کیا۔ وہ برتھ پر درا[ز] تھا۔ میں نے حال پوچھا تو اس نے وہی جواب د[یا جو] مجھے معلوم تھا۔ کچھ دیر اس کے پاس رہ کے میں اپنے ڈبے سے نزدیک کی بینچ پر بیٹھے ڈاکٹر کے پاس چ[لا] آیا اور اس کی ہدایت پر میں بھی لوگوں کو پٹیاں باندھنے میں مصروف ہوگیا۔ شروع شروع میں جھجک ہورہی تھی لیکن جلد ہی ہاتھ رواں ہوگیا۔

2 بجے کے قریب اسٹیشن خاصا پرسکون ہوگیا تھا۔ شہر کے بہت سے لوگ گھروں کو واپس جا چکے تھے۔ پلیٹ فارم پر یا تو ریلوے کا عملہ تھا۔ شہری افسران تھے، پولیس تھی یا مسافر تھے۔

ڈبوں کے بجائے اب مسافر ٹولیوں کی شکل میں جا بجا پلیٹ فارم کے فرش پر اوندھے سیدھے پڑے ہوئے تھے۔ اتنے عرصے میں ڈاکٹر، کمپاؤنڈر اور ارد گرد کھڑے سپاہی مجھ سے مانوس ہو چکے تھے۔ زخمیوں سے فارغ ہوکے ڈاکٹر کے اوسان بحال ہوئے تو اس کی نگاہ میری پیشانی پر بندھے رومال پر گئی۔ وہ شرمندہ بھی ہوا، پریشان بھی۔ میں منع کررہا تھا لیکن اس نے رومال کی گرہ کھول کے میرے زخم کا توجہ سے معائنہ کیا اور مرہم لگا کے پٹی باندھ دی۔ کئی گولیاں بھی ہر چھ گھنٹے بعد پانی کے ساتھ نگلنے کو دیں۔ وہ ایک مہربان آدمی تھا۔ اس نے میرا سینہ دیکھا، نبض دیکھی۔ پٹی سے مجھے سکون ہوا۔ پیشانی کی جلن میں خاصی کمی ہوگئی تھی۔ پھر ڈاکٹر نے مجھے ساتھ ہی بٹھالیا اور سگار پینے لگا۔

اب انہیں حادثے کی نوعیت کے بارے میں غور کرنے کی مہلت ملی تھی۔ بینچ کے عقب میں کھڑا ایک عمر رسیدہ سپاہی کچھ زیادہ ہی واقف احوال تھا۔ اس نے بتایا کہ انجن میں کوئی بڑی خرابی پیدا ہوگئی تھی۔ ڈرائیور پرانا آدمی تھا، کسی طرح گاڑی یہاں تک لے آیا۔ اس نے کمال مہارت اور ہوش مندی سے کام لیا ورنہ گاڑی کسی بڑے حادثے سے دوچار ہو جاتی۔ جو میں نے قیاس کیا تھا، سپاہی کم و بیش اسی ترتیب سے بیان کر رہا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق، اوپر کی برتھوں پر بیش تر مسافر سوئے ہوئے تھے، نیچے بیٹھے ہوئے بھی نیم خوابیدگی و نیم بیداری کی حالت میں تھے۔ عموماً تیسرے درجے کے ڈبوں میں گنجائش سے زیادہ مسافر ہوتے ہیں۔ اچانک شدید جھٹکے کی وجہ سے اوپر کی برتھوں پر سوئے ہوئے مسافروں کو سنبھلنے کا موقع نہیں ملا۔ پلک جھپکتے میں سب کچھ غت ربود ہو گیا۔ رہی سہی کسر دوسرے جھٹکوں نے پوری کردی۔ اوپر کی برتھوں پر رکھے سامان نے اور زیادہ تباہی مچائی۔ ایسے موقع پر آدمی کو اپنے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اس کے سامنے محض وہ ہوتا ہے، اس کی اپنی ذات، اپنا وجود۔ ہر مسافر نے اس ناگہانی سے بچنے کے لیے دروازے اور کھڑکیوں سے کودنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانی چاہی، حالاں کہ گاڑی منٹ دو منٹ کے تلاطم کے بعد پرسکون ہوگئی تھی مگر وقت کی کمیت کیا، وقت تو کیفیت سے عبارت ہے۔ کبھی ایک لمحہ ہی بہت کاری ہوتا ہے۔ ایک لمحے میں منظر بدل جاتا ہے۔

سپاہی نے بتایا کہ قریب قریب کے شہروں سے مدد آرہی ہے۔ لکھنؤ سے نئی گاڑی چل پڑی ہے۔ ریلوے والوں نے فیصلہ کیا ہے موجودہ گاڑی اور انجن کو کل پرزوں کی جانچ پڑتال کے بغیر نہیں چلایا جائے گا۔ فیض آباد اور بارہ بنکی سے ڈاکٹروں، نرسوں اور حادثے کی تفتیش کے لیے بڑے افسران کی ایک کھیپ آرہی ہے۔ اکبر پور سے ادھر مشرق میں 30 میل دور شاہ گنج، 45 میل دور جون پور اور مغرب میں 35 میل دور فیض آباد، سو میل کی دوری پر بارہ بنکی ہے۔ کچھ دیر جاتی ہے، ہر طرف سے مدد آجائے گی۔ کئی زخمیوں کی حالت بہت نازک ہے، خصوصاً بچوں اور عورتوں کی۔ شہر والوں نے اسپتال میں جگہ کم پڑنے پر آشرم میں انتظام کرلیا ہے پولیس نے احتیاطاً مسافروں کا سامان ڈبو سے نکلوا کے پلیٹ فارم کے ایک کمرے میں محفوظ کروادیا ہے۔ کئی شدید زخمی مسافروں نے اپنے سامان کے بغیر اسپتال جانے سے انکار کردیا تھا۔ وہ یہیں پلیٹ فارم پر پڑے ہوئے ہیں۔ صرف درمیانہ اور تیسرے درجے کے مسافروں کے ڈبے خالی کرائے گئے ہیں۔ اول اور دوم درجے کے مسافروں کو بھی گہری چوٹیں آئی ہیں لیکن ان میں زیادہ تر اپنے ڈبو میں ہیں۔

ڈاکٹر کا نام مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ اس کا نام آنند کشور سکسینہ تھا۔ وہ ایک پسندیدہ شخص تھا۔ شاید میں بھی اسے پسند آگیا تھا۔ وہ مجھ سے باتیں کرتا رہا، کچھ اپنی سناتا، کچھ مجھ سے پوچھتا رہا۔ میں نے اس سے کہا کہ اتنے زخمیوں کی خبر گیری کے بعد وہ تھک گیا ہوگا، اسے گھر جانا چاہیے، باقی ڈاکٹر بھی جاچکے ہیں۔ کہنے لگا۔ ''ایسے کاموں سے کوئی تھکن ہوتی ہے۔'' پھر بولا۔ ''تھکن دو طرح کی ہوتی ہے، ایک میٹھی، دوسری کڑوی۔ یہ بڑی میٹھی تھکن ہے۔'' پلیٹ فارم کی گھڑی ساڑھے تین بجا رہی تھی تب وہ اٹھا۔ چلتے وقت مجھ سے بہت زور سے مصافحہ کیا اور اسی جوش سے بولا۔ ''تم سے اب شاید کبھی بھینٹ نہ ہو پر تم مجھ کو یاد رہو گے۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے بھی آپ یاد رہیں گے۔ کبھی اس طرح آنا ہوا تو ایک بار ضرور آؤں گا۔ اتنی دیر میں، میں نے آپ سے بہت جانا ہے۔ آپ جیسے آدمی کم ملتے ہیں۔'' وہ مسکراتا اور سگار پیتا ہوا گیٹ

کی طرف جانے لگا تو میں نے چند قدم لپک کے اسے پھر جالیا۔ ''ڈاکٹر صاحب، مجھے دھیان نہیں رہا تھا۔'' میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ''ایک گزارش ہے۔''

''ہاں ہاں بولو!'' وہ پلکیں جھپکانے لگا۔

میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا کہ اگر زحمت نہ ہو تو وہ میرے ہم سفر کو بھی دیکھ لے۔ گاڑی کے جھٹکے سے اس کا سر دیوار سے جالگا تھا۔

وہ ناراض ہونے لگا کہ میں نے اسے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ پلٹ کے اس نے کمپاؤنڈر کو واپس چلنے کا اشارہ کیا۔ مجھے بٹھل کو پہلے مطلع کر دینا چاہیے تھا لیکن اس کا وقت نہیں رہا تھا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ وہ سو نہیں رہا تھا۔ میرے پیچھے دو اجنبیوں کو داخل ہوتا دیکھ کر فوراً اٹھ بیٹھا۔ کمپاؤنڈر کے ہاتھ میں ڈاکٹروں کا مخصوص بیگ تھا۔

''ان کو کیوں کشٹ دیا رے۔'' وہ الجھی ہوئی آواز میں بولا۔

''کشٹ کیسا شری مان۔'' ڈاکٹر نے خوش گواری سے کہا اور بٹھل کو کچھ اور کہنے کا موقع نہیں دیا۔ مختلف جگہوں پر اس کا سر دبایا۔ بٹھل نے کوئی تاثر ظاہر نہیں کیا تو پوچھنے لگا۔ ''دکن ہوتی ہے؟''

بٹھل نے کچھ توقف کے بعد تندی سے جواب دیا۔ ''تھوڑی بہت تو ہوگی۔''

''تھوڑی بہت یا زیادہ؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''اپنے کو چلتی ہے۔'' بٹھل نے سر جھٹکا۔

مجھے یہی خدشہ تھا۔ اس کے جواب سے مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔ اسے کچھ زیادہ ہی تکلیف ہوگی جو اس نے ڈاکٹر سے اقرار کر لیا تھا۔ وہ ڈبے سے باہر بھی نہیں نکلا تھا۔ ڈاکٹر نے دوبارہ سر کا معائنہ کیا اور بیگ سے آلہ نکال کے سینے کا بھی، تھرمامیٹر لگا کے حرارت بھی دیکھی۔ ''کوئی، کوئی ایسی بات تو نہیں۔'' میں نے مضطربانہ پوچھا۔ ''فیض آباد بہت قریب ہے۔ کیا ہم گھر واپس چلے جائیں؟''

''کیا بولتا ہے رے۔'' بٹھل تنک کے بولا۔

''تم مت بولو، مجھے ڈاکٹر صاحب سے بات کرنے دو۔'' میں نے سختی سے کہا اور ڈاکٹر سے پوچھا، ہاں ڈاکٹر صاحب! آپ کا کیا مشورہ ہے؟''

''ویسے تو سب ٹھیک لگتا ہے پر تکلیف باقی رہے تو گھر لوٹ جانا چاہیے اور کسی اچھی جگہ دکھانا چاہیے۔'' ڈاکٹر کے لہجے میں، میں نے کوئی فکر اور تشویش کھوجنے کی کوشش کی مگر اس کا لہجہ سرد اور سپاٹ تھا۔ اس نے نسخہ لکھا اور تاکید کی کہ بازار سے یہ دوائیں لے کے پابندی سے استعمال کی جائیں۔ اس کی ہدایت پر کمپاؤنڈر نے کئی قسم کی گولیوں کو الگ الگ پڑیاں بنا کے دیں اور ان پر خوراک کی مقدار درج کر دی۔

میں اب بٹھل کے پاس ہی رہنا چاہتا تھا لیکن ڈاکٹر کو پلیٹ فارم کے باہر تک چھوڑنے کے لیے مجھے جانا چاہیے تھا۔ میں نے راستے میں اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ کوئی ایسی ویسی بات نہ کہہ دے۔ وہ بھی چپ رہا۔ اس کی خاموشی بھی مجھے پریشان کر رہی تھی۔ جیسے تیسے اس کا رسمی شکریہ ادا کر کے میں نے اسے رخصت کیا اور تقریباً بھاگتا ہوا اپنے ڈبے تک آیا۔ بٹھل اب دیوار سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ پہلے میں نے اپنی سانسیں بحال کیں پھر آواز دھیمی رکھ کے مفاہمانہ انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کی بہتر یہی ہے ہم فیض آباد لوٹ جائیں، وہاں آرام کا وقت مل جائے گا، وہاں اچھے ڈاکٹر حکیم ہیں، اسپتال بھی بڑا ہے۔ چند دن بعد پھر چل پڑیں گے۔ احتیاط کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔

''چوٹ مجھ کو لگی ہے رے۔'' وہ جھنجلا کے بولا۔

''ٹھیک۔'' میں نے تحمل سے کہا۔ ''تمہی کو لگی ہے۔ تمہی بہتر جانتے ہو گے لیکن مجھے لگتی تو تم سفر جاری رکھتے؟''

''پہلے تجھ سے پوچھتے۔''

''اور میں تمہاری طرح ٹالتا رہتا تو......''

میں نے اسے قائل کرنے کے بہت جتن کیے، وہ سنتا رہا پھر کہنے لگا، آگے جا کے دیکھتے ہیں۔ آگے کچھ اچھا محسوس نہیں کیا تو کسی وقت بھی واپسی کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ فیض آباد سے دور ہوئے تو کلکتے چلے جائیں گے۔ اس کی بات کسی حد تک معقول تھی لیکن میری تجویز اس سے زیادہ معقول تھی۔ مجھے معلوم تھا، میری دلیلیں رائیگاں جائیں گی۔ میں نے پھر کچھ نہیں کہا۔ بیگ سے گلاس نکالا اور پلیٹ فارم کے نلکے سے پانی بھر کے ڈاکٹر سکینہ کی دی ہوئی گولیاں اس کے سامنے بڑھا دیں۔ یہی بہت تھا کہ اس نے گولیاں نگلنے میں کوئی پس و پیش نہیں کیا۔

صبح چھ بجے لکھنؤ سے خالی گاڑی آ گئی۔ صبح کہیں بھی ہو، بہت نرم اور ہلکی ہلکی ہوتی ہے۔ جیسے دنیا کا وزن کم ہو گیا ہے۔ ریلوے لائنوں پر بکھرے کوئلوں میں سبزہ پھوٹ رہا تھا۔ صبح کے اپنے رنگ ہوتے ہیں۔ سبزے کا رنگ کچھ اور، پھولوں کے رنگ کچھ اور۔ ریلوے کے عملے کی درخواست پر اول اور دوم درجے کے مسافر اپنے اپنے ڈبوں سے نکل آئے۔ ان میں بھی کئی لوگوں کے پٹیاں بندھی ہوئی تھیں یا پھائے چسپاں تھے۔ بعض لوگوں سے ٹھیک طرح چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ منہ ہاتھ دھو کے بٹھل بھی تیار ہو گیا۔ قلی نے ہمارا سامان پہلے ہی اٹھا رکھا تھا۔ میں نے بہت غور سے دیکھا۔ چلتے ہوئے بٹھل کے پیروں میں کوئی لغزش نہیں تھی۔ البتہ اس کی رفتار سست تھی۔ پل پار کر کے ہم دونوں پلیٹ فارم پر آ گئے تھے کہ میرے قدم اٹکنے لگے۔ کچھ فاصلے پر موجود پولیس کے گروہ میں مجھے ایک شناسا افسر نظر آیا۔ اس نے بھی ہمیں دیکھ لیا۔ یہ وہی افسر تھا، دوسری بار کوتوالی میں حاضری کے وقت جس سے ہماری مڈبھیڑ ہوئی تھی ''استاد بٹھل!'' اس نے دور سے پکارا اور تیزی سے بڑھ کے عین ہمارے مقابل کھڑا ہو گیا۔ اس طرح کہ ہم آگے جانے کے لیے پہلو بدل ہی کے گزر سکتے تھے۔ اس کے ماتحت سپاہی بھی اس کے عقب میں کھڑے ہو گئے تھے۔ ایک لحظے کے لیے میرے دماغ میں کئی طرح کے وسوسوں نے یلغار کی۔ میں نے بے چینی سے بٹھل کی طرف دیکھا۔ بٹھل نے توقع کے خلاف اسے سلام کیا نہ کلام کرنے میں پہل کی۔ پولیس افسر کچھ مکدر ہوا اور تنی ہوئی آواز میں بولا۔

''تم بھی اسی گاڑی میں تھے؟''

''ٹکٹ دکھائیں مائی باپ!'' بٹھل کے لہجے کی تلخی پر مجھے حیرت ہوئی۔ یہ نامناسب بات تھی۔

پولیس افسر کی پیشانی تنگ ہو گئی، آواز بھی اکڑ گئی۔ ''ہم کو پتا ہے۔ تم چھوٹا کام نہیں کرتے۔''

'بڑا امان بڑھایا تم نے۔''

''کہاں جا رہے ہو؟''

''کیوں پوچھتے ہو صاحب؟''

''نہیں بتانا چاہتے؟''

''ادھر ساروں سے پوچھ رہے ہو؟''

''تم سے پوچھتے ہیں۔'' پولیس افسر نے افسرانہ تیور سے پوچھا۔

''اپنے کو یاد نہیں، کوئی ناتے داری نکلتی ہو تم سے۔''

''ناتا جوڑنے میں کیا دیر لگتی ہے۔''

''پہلے تم ہاتھ بڑھاؤ گے یا ہم آگے کریں؟''

''اس کا سمے بھی آ جائے گا۔'' پولیس افسر کی آواز بل کھا گئی۔

''کام کی بات کرو مہاراج!'' بٹھل نے برگشتگی سے کہا۔

''اپنے لیے کوئی پرچی چالان لائے ہو تو ویسا بولو، نہیں تو اپنا رستہ چھوڑو۔''

پولیس افسر سمٹی ہوئی آنکھوں سے اسے گھورتا رہا۔ اس کا چہرہ دہکنے لگا تھا۔ اس کے ارد گرد کھڑے سپاہیوں کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ پولیس افسر

نے ہمارے سامنے سے ہٹنے میں تامل کیا۔ شاید اس کی خواہش تھی کہ بٹھل ہاتھ بڑھا کے اسے ایک طرف کرنے کی جسارت کرے تو بات آگے بڑھے اور اسے من مانی کرنے کا جواز مل جائے۔ آنے والے لمحے میں کچھ بھی ممکن تھا۔ میرا جسم اینٹھنے لگا تھا۔ ہمارے آگے پیچھے گاڑی کی طرف بڑھنے والے مسافر بھی ٹھیر کے ہمیں دیکھنے لگے۔ بٹھل نے ضبط کیا۔ آخر پولیس افسر خود ہی ایک جانب ہو گیا۔

آگے ریلوے کا عملہ پہلے اور دوسرے درجے کے مسافروں کی معاونت میں مصروف تھا۔ ہمیں پہلے جیسا ہی ڈبا ملا۔ جب تک میں نے ڈبے میں قدم نہیں رکھا، مجھے یہی محسوس ہوتا رہا کہ کوئی ہمارا تعاقب کر رہا ہے اور کوئی کسی وقت اچانک سامنے آ کے ہمیں روک لے گا۔ رات بھر کی بیداری کے باوجود کسی تھکن کا احساس نہیں تھا لیکن اب جانے کیا ہو رہا تھا، کیا ہو گیا تھا، دل ڈوب سا رہا تھا۔ لگتا تھا، بہت دور سے چل کے آ رہا ہوں۔ ڈبے میں آ کے مجھے کچھ خیال نہیں رہا۔ میں نے برتھ کے گدے پر خود کو ڈھیر کر دیا۔ جی چاہتا تھا کہ آنکھیں بند کر لوں اور نہ کچھ دیکھ پاؤں، نہ سن پاؤں لیکن اپنے آپ سے بے گانگی کے چند لمحے بھی مجھے نہ مل سکے۔ قلی کی آواز پر مجھے سنبھلنا پڑا۔ میں بھول گیا، میں نے ابھی کچھ طے کیا تھا۔ بٹھل کی حالت مجھے ٹھیک نہیں لگتی تھی ورنہ پولیس افسر سے یہ تکرار نہ ہوتی۔ میں نے طے کیا تھا کہ اسے بس آرام کرنے دوں گا اور سارے کام خود کروں گا۔ مجھے اپنی دل جمعی اور خوش گواری کا تاثر دیتے رہنا چاہیے۔ سامان رکھنے کے بعد قلی کسی اور خدمت کے لیے پوچھنے لگا۔ جانے وہ ہمیں کیا سمجھا ہو۔ پولیس افسر سے حجت کے دوران وہ سامان اٹھائے وہیں کھڑا رہا تھا۔ بٹھل نے اس سے چائے کی فرمائش کی تو اس نے جیسے کوئی اعزاز سمجھا۔ پلک جھپکتے میں باہر چلا گیا اور تھوڑی دیر میں چائے لے آیا۔ چائے بھی خاص قسم کی تھی۔ اول درجے کے مسافروں کے شایانِ شان، الگ الگ برتنوں میں۔ بٹھل نے اسے پاس بیٹھنے اور چائے پینے کی پیش کش کی تو وہ بری طرح گڑبڑا گیا۔ دو ہی پیالیاں تھیں۔ میں نے اپنے لیے گلاس میں چائے بنائی اور اسے پیالی دینا چاہی۔ اس نے شدت سے انکار کر دیا اور اچک کے میرے سامنے سے گلاس اٹھا لیا۔ وہ ہمارے برابر بیٹھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ ایک مودب اور خدمت گزار آدمی تھا۔ بٹھل کے اصرار پہ بہ مشکل برتھ پر کونے میں سکڑ کے بیٹھ گیا اور جھجکتے ہوئے اس نے ہماری خیریت پوچھی پھر از خود رات کے واقعات بیان کرنے لگا۔ اس کی اطلاع کے مطابق، ڈاکٹر نے بہت کوشش کی لیکن تین عورتیں، دو بچے اور دو مرد مسافروں کو موت سے نہ بچا سکے۔ کچھ اور زخمیوں کی حالت بھی اچھی نہیں ہے۔ بہت سے مسافر احتیاطاً روک لیے گئے ہیں۔ وہ رکنے کو تیار نہیں تھے لیکن افسروں نے انہیں اجازت نہیں دی۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ بعض زخمیوں کو لکھنؤ اور فیض آباد بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ قلی بھی انجن ڈرائیور کی تعریف کر رہا تھا کہ اس کی مشاقی سے گاڑی کسی بڑے حادثے سے بچ گئی۔ کہنے لگا کہ خدا نے خیر کر لی۔ جس کی لکھی تھی، اسے تو جانا ہی تھا۔ موت کے بھی کیسے کیسے بہانے ہوتے ہیں۔ میں نے اس کی اجرت اور اندازاً چائے کی قیمت سے زیادہ روپے دیے تو وہ حساب بتانے اور باقی روپے واپس کرنے لگا۔ میں نے واپس ہی نہیں لیے۔ وہ سلام کر کے اور دعائیں دے کے چلا گیا اور جلد ہی لوٹ آیا۔ اس کے ہاتھ میں پانی بھری کوری صراحی تھی۔ پانی کے لیے مجھے بار بار مختلف اسٹیشنوں پر اترنا پڑتا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور شکریہ رسمی نہیں تھا۔

جتنی دیر گاڑی اکبر پور اسٹیشن پر کھڑی رہی۔ قلی کی موجودگی کے باوجود مجھ پر ہیجانی سی کیفیت طاری رہی۔ روشنی اب پختہ ہو گئی تھی۔ صبح کی تازگی

اور معصومیت رخصت ہوگئی تھی۔ ٹھیک آٹھ بجے گاڑی نے حرکت کی۔ اکبر پور تیزی سے دور ہوتا رہا اور گاڑی دونوں طرف پھیلے سبزہ زاروں سے گزرنے لگی تو میں نے بیگ کھول کے توشہ دان نکالا۔ چار حصوں پر مشتمل توشے دان میں مرچ قیمہ، میتھی پالک کی بھجیا، پوریاں، میٹھی ٹکیاں اور سوجی کا حلوہ رکھا ہوا تھا۔ پوریوں اور ٹیکیوں کے خانے میں چھوٹی چھوٹی سلور کی کٹوریاں اچار اور چٹنیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ زریں نے ایسی چیزیں ہی منتخب کی تھی جو سفر میں جلد متاثر نہ ہوسکیں۔ بیگ میں تام چینی کی دو پلیٹیں، آسمانی رنگ کے ریشمی کپڑے میں لپٹی اور سنہری ڈوری سے بندھے چمچے اور ایک مختصر پھول دار دسترخوان بھی رکھا ہوا تھا۔ یہ سلیقہ دیکھ کے زریں کا سراپا آنکھوں میں اتر آیا۔ کسی نے کہا ہے، سلیقے سے مراد احساس تناسب ہے اور سلیقہ حسن ہے۔ سلیقہ آدمی کے اندر کے سلجھاؤ کی غمازی کرتا ہے اور سلیقہ برداشت ہے۔ چیزوں کی تقدیم وتاخیر درجہ اور سلسلے وار ترتیب میں ایک تحمل چاہیے۔ زریں میں یہ خوبیاں بدرجہ تمام تھیں۔ کچھ قدرت کا عطیہ، کچھ خود اپنی نیت اور کوشش کا حاصل۔ کوئی بہت حسین ہو بہت بے سلیقہ بھی ہوسکتا ہے۔ زریں کو قدرت نے ہر طرح سے نوازہ ہے۔ وہ خود بھی مجسم تناسب، مجسم سلیقہ ہے۔ حسن صرف رنگ روپ نہیں، ایک تناسب بھی ضروری ہے۔ زریں کا وجود تو جیسے تراشا گیا تھا۔ میں نے برتھ پر دسترخوان بچھا کے کھانا چن دیا۔ مجھے بالکل بھوک نہیں تھی لیکن کھانے کے رنگ اور خوشبو کا بھی ایک تاثر ہوتا ہے۔ بٹھل بھی کھانے کی برتھ پر چلا آیا۔ ایک تو کھانا لذیذ تھا، کچھ ایک دوسرے کے خیال سے ہم نے سیر ہو کے کھایا۔ کھانے کے بعد میں نے بٹھل کو دوا کی دوسری خوراک دی اور پانوں کی ڈبیا اور بٹوا اس کے پہلو میں رکھ دیا۔ گلوری کھا کے اور بیڑی سلگا کے وہ کھڑکی کے پاس بیٹھا باہر کا نظارہ کرتا رہا، پھر برتھ پر دراز ہوگیا۔

اکبر پور سے مغل سرائے کا فاصلہ 100 میل سے کچھ کم ہے۔ دوپہر دو بجے گاڑی مغل سرائے پہنچ گئی اور اتفاق سے آدھ گھنٹے بعد ہی ہمیں کلکتے کی طرف جانے اور بڑی لائن پر چلنے والی تیز رفتار گاڑی مل گئی۔ میرا خیال تھا، بٹھل پہلے دھن باد جا کے ظفر سے بات کرے گا۔ ظفر کو اب اپنی منگیتر فروزاں کے پاس چلے جانا چاہیے۔ گو فروزاں، یاسمن اور ان کے مربی نصیر بابا نے فیض آباد میں اس کی آمد کے لیے کسی بے کلی کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن اب خاصے دن ہوگئے تھے۔ فروزاں کے والد ایرانی نژاد پروفیسر کے انتقال کے بعد ظفر ہی ان کے گھر کا واحد نگراں تھا۔ وہ یقیناً کوئی ایسا فرض شناس وجیہہ وشکیل، لائق فائق نوجوان ہوگا جو پروفیسر جیسے دیدہ ور نے اپنی نازک اندام، حور شمائل بیٹی کے لیے منتخب کیا تھا۔ میں نے ظفر کی شرافت، نجابت اور لیاقت کے متعلق بہت سنا تھا اور مجھے اسے دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ وہ لاکھوں میں ایک فروزاں جیسی لڑکی کا منگیتر تھا۔ علم وفضل کے جویا اس سادہ شعار نوجوان پر کمینہ صفت سید محمود علی نے ہر ستم آزمایا تھا۔ اس نے پروفیسر کی مرحومہ بیوی اور اس کی بیٹیوں تک ظفر کی رسائی کا ہر راستہ بند کردیا تھا۔ پروفیسر کے بے سہارا خاندان کو ظفر سے بدظن کرنے کے لیے اس نے بڑی شعبدہ بازی کی تھی۔ شہر آسن سول کی زمین اس شاطر نے ظفر کے لیے تنگ کردی تھی۔ ظفر کو پڑوسی شہر دھن باد میں پناہ لینی پڑی اور اس کی حالت پاگلوں جیسی ہوگئی۔ میرے پوچھنے پر بٹھل نے بردوان شہر کا نام لیا۔ آسن سول سے ہم فیض آباد نہ جاتے تو ہمیں بردوان ہی جانا تھا۔ میں نے تعجب کا اظہار کیا۔ ''ظفر میاں کے پاس نہیں جانا؟''

''نہیں رے۔'' اس نے اکتائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''نصیر بابا کہتے تھے، اس کی حالت ٹھیک نہیں

تھی۔ اب دن بھی بہت ہوگئے۔ فیض آباد جا کے وہ سنبھل جائے گا اور ان دونوں، فروزاں اور یاسمن کی تسلی بھی ہو جائے گی۔''

''ابھی اس کو ادھری رہنے دے۔''

''کیوں؟ اب نہیں تو پھر کب؟''

''ابھی ٹائم نہیں آیا۔'' بٹھل نے آنکھیں میچ کے کہا۔

وقت سے اس کی کیا مراد ہے؟ میں نے وضاحت نہیں چاہی اور خود سمجھنے کی کوشش کی۔ ایک ہی وجہ قریب قیاس نظر آتی تھی کہ فیض آباد کے دگرگوں حالات کے پس منظر میں ظفر کا وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔ باقی لوگوں کی بات دوسری ہے۔ زریں کی حویلی اور فیض آباد، ظفر کے لیے اجنبی ہیں۔ میں نے پھر کوئی بحث نہیں کی۔ وقت کم تھا۔ کلکتے کی طرف جانے والی گاڑی تیار کھڑی تھی۔ مجھے ٹکٹ لینے کے لیے اسٹیشن سے باہر جانے میں وقت ضائع کرنا نہیں پڑا۔ میری درخواست پر گاڑی کے ٹی ٹی نے بردوان تک کا کرایہ لے کر پرچی کاٹ دی۔

اول درجے میں کوئی جگہ نہیں تھی، مجبوراً ہمیں دوسرے درجے میں بیٹھنا پڑا۔ ڈبے میں پہلے سے نوجوان مرد وعورت اور شیر خوار بچہ موجود تھے۔ لباس سے آسودہ حال معلوم ہوتے تھے۔

چہروں کی تازگی اور چمک ہی آسودہ حالی کی چغلی کھاتی ہے۔ نوجوان نے ڈبے میں ہمارے داخل ہوتے وقت ہمیں ٹوکا تھا کہ یہ سیکنڈ کلاس کا ڈبا ہے، یہ سن کے مجھے حرارہ آیا تھا۔ میں نے ترخ کے کہا۔ ''ہمیں معلوم ہے۔'' وہ کچھ شرمندہ ہوا اور کسمسا کے رہ گیا۔ نظر آرہا تھا کہ اسے یقین نہیں آیا ہے۔ اس کی خوب صورت بیوی ہمیں دیکھ کے منہ پھیر کے بیٹھ گئی۔ یہ تجربہ ہمیں کئی بار ہو چکا تھا۔ اونچے درجے اور اونچے لوگوں میں بیٹھنے کے لیے دام ودرم ہی کافی نہیں ہوتے، کچھ اور بھی لوازم ہوتے ہیں۔ یوں بھی پہلے سے بیٹھا ہوا ہر مسافر ڈبے کو اپنی جاگیر سمجھتا ہے۔ بہرحال بٹھل کو آرام کے لیے پوری برتھ مل گئی۔ بردوان تک طویل فاصلہ تھا۔ چار سو سوا چار سو میل کے قریب۔ کم از کم بارہ گھنٹے کا سفر۔ صبح اکبر پور سے نکلتے ہی ہم نے کھانا کھایا تھا۔ اب دوپہر ہوگئی تھی۔ بٹھل نے چائے کے ساتھ زریں کی دی ہوئی دو میٹھی ٹکیاں کھائیں اور مزید کچھ کھانے سے انکار کردیا۔ میں نے بھی اسی پر اکتفا کیا۔

چھوٹے چھوٹے اسٹیشن درگزر کرتی ہوئی گاڑی تیز رفتاری سے سفر کررہی تھی۔ مغل سرائے سے گاڑی چلے ہوئے ڈھائی گھنٹے ہوئے ہوں گے کہ بٹھل یکایک اٹھ بیٹھا۔ میں جاگ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں ہیں۔ ''کیا بات ہے؟'' میں نے اضطراب سے پوچھا۔

''پٹنا اب کتنی دور ہے؟'' اس کی آواز بھی بدلی ہوئی تھی۔

''قریب ہی ہونا چاہیے۔ مغل سرائے سے سوسوا سو میل کی دوری تو ہے؟'' میں نے تذبذب سے کہا۔

ہمارے ہم سفر نے بھی سن لیا تھا۔ اس نے بھی دخل دیا کہ سات بجے تک گاڑی پٹنا پہنچ جانی چاہیے۔

''پٹنے کو کیوں پوچھ رہے ہو؟ کوئی کام ہے؟'' میں نے منتشر آواز میں پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' وہ آہستگی سے بولا۔'' جب آئے تو بول دینا۔''

''طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''سر میں تھوڑی دھن ہے۔''

''دھن ہے، ہاں!'' میری زبان لڑکھڑا گئی اور مجھے دھچکا سا لگا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کے میں اس کی

برتھ کی طرف جھپٹا اور اس کے پاس جا کے ٹھٹک گیا۔ میں نے غیر ارادی طور پر اس کی کلائی پکڑی۔ کلائی گرم تھی۔ اس کی پیشانی چھوئی۔ پیشانی کلائی سے زیادہ گرم تھی۔ ''تمہیں تو بخار؟'' میں نے سٹ پٹاتے ہوئے کہا۔ '' کیا، کیا بہت زیادہ تکلیف ہو رہی ہے؟''

''اتنی نہیں جتنا تو......'' وہ بیزاری سے بولا۔ ''بولا نا، تھوڑا دکھتا ہے۔''

''قریب کے کسی اسٹیشن پر اتر جاتے ہیں۔ میں پہلے ہی کہہ رہا تھا، واپس چلو مگر تم......'' میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اب آراء شہر آ رہا ہے۔ آتا ہی ہوگا۔ بکسر گزر چکا ہے۔ آراء بھی جنکشن ہے۔ ٹھیک ہے، وہاں اتر جاتے ہیں۔ وہاں سے ہمیں کوئی بھی گاڑی مل جائے گی۔''

اسے کچھ زیادہ ہی تکلیف ہوگی ورنہ چھوٹی موٹی تکلیفوں کا تو وہ ذکر ہی نہیں کرتا تھا۔ میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ چلتی گاڑی میں، میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ ڈاکٹر نے جو گولیاں دی تھی، اس کی دو خوراکیں میں دے چکا تھا۔ شاید انہی کا اثر تھا کہ وہ اب تک کسی قدر آرام سے رہا۔ میں نے وہی گولیاں نکال کے اسے دیں۔ اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ آدھے گلاس پانی سے نگل لیں۔ سر دبانے کے لیے ڈاکٹر نے مجھے منع کر دیا تھا۔ گولیاں کھا کے وہ پھر لیٹ گیا۔ میں اپنی نشست پر پہلو بدلتا رہا۔ مجھے تو اپنی فکر ہی رہتی تھی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ بیمار بھی ہو سکتا ہے، اسے بھی چوٹ لگ سکتی ہے۔ اس دوران گاڑی دو ایک اسٹیشنوں پر ٹھیری اور گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں آراء جنکشن آ گیا۔ میں نے سامان سمیٹ لیا تھا۔ سمیٹنا بھی کیا تھا، صرف ایک بیگ ہی کھولا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ میں نے بہت کہا لیکن وہ آراء پر اترنے کو آمادہ نہیں ہوا۔ دوا سے شاید اسے کچھ افاقہ ہوا ہو۔ ''اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟ کیا بات ہے، بتاتے کیوں نہیں؟'' میں نے بہ ظاہر ناراضی سے کہا۔

''ٹھیک ہے رے۔'' وہ بہت دھیمی آواز میں بولا۔

''میں کہتا ہوں، یہیں اتر جاتے ہیں۔ میری بات مان لو۔''

''پٹنے پہ دیکھیں گے۔''

میری التجا کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ کوئی تک ہی نہیں تھی کہ ہم اور دور جا کے فیض آباد والی گاڑی پکڑیں۔ میں اس حالت میں اس سے حجت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ آراء شہر بھی گزر گیا۔ ہمارے ہمسفر نے پٹنے پہنچنے کا وقت سات بجے بتایا تھا۔ گاڑی آٹھ سے کچھ پہلے پٹنا شہر میں داخل ہوئی۔ بٹھل کو میں نے پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔ وہ تیار تھا۔ میں دروازے پر کھڑا ہو گیا کہ قلی کو فوراً بلا لوں۔ گاڑی رکتے ہی قلی اندر آ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ مغل سرائے کے لیے اب گاڑی کس وقت ملے گی تو وہ حیرت زدہ ہوا تاہم اس نے بتایا کہ دو گھنٹے بعد ہاوڑا ایکس پریس ادھر سے گزرے گی۔ میں نے اسے ہدایت کی کہ وہ ہمیں فرسٹ کلاس کے ویٹنگ روم میں پہنچا دے۔ بٹھل سنتا رہا تھا۔ جب میں قلی سے بات کر رہا تھا، وہ کچھ نہیں بولا۔ گاڑی سے اتر کے اس نے قلی کو اسٹیشن سے باہر چلنے کا حکم دیا۔ میں اس کی صورت دیکھتا رہ گیا۔

''شہر جانا ہے۔'' میں نے جھلا کر کہا۔ ''شہر کیوں؟ پھر بردوان ہی چلو۔'' کوئی جواب دینے کے بجائے وہ آہستہ آہستہ پلیٹ فارم کے گیٹ کی طرف بڑھتا رہا۔ میری کسی بات کی اس کی نظر میں کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ مجھے بڑی جھنجلاہٹ ہو رہی تھی لیکن مجھے اس کے ساتھ ہی چلتے رہنا تھا۔ میں نے چپ سادھ لی۔

اسٹیشن کے باہر ایک دوسرے سے پیوست بگھیوں اور تانگوں کی ایک بڑی تعداد مسافروں کی

منتظر تھی۔ بٹھل نے بگھی والے کو اشارہ کیا اور اسے گرانڈ ہوٹل چلنے کو کہا۔ بگھی میں ہمارے درمیان سکوت رہا۔ ابھی رات کی ابتدا تھی۔ شہر کی سڑکیں صاف ستھری اور روشن تھیں اور خوب چہل پہل تھی۔ اسٹیشن سے ہوٹل کا فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا۔ بگھی نے ہمیں ہوٹل کے سامنے اتار دیا۔ کاؤنٹر پر ہوٹل کے رجسٹر میں رسمی خانہ پری کے بعد مجھے کمرے کی چابی مل گئی اور مجھے حیرت ہوئی۔ کمرے میں جانے کے بجائے بٹھل کاؤنٹر کے سامنے صوفے پر بیٹھا رہا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اب میں اپنی زبان ہی بند رکھوں گا۔ ہوٹل کے خدمت گار نے ایک کشادہ، نہایت آرام دہ کمرے میں ہمارا سامان پہنچایا۔ سامان رکھ کے اور کمرا مقفل کر کے میں فوراً بٹھل کے پاس چلا آیا۔ میرے پہنچتے ہی وہ اٹھ گیا۔ میں نے سنا نہیں تھا۔ اس نے کس وقت بگھی کو ٹھیرے رہنے کے لیے کہا تھا۔ کوچوان کو جب اس نے پٹنا میڈیکل کالج اسپتال کا نام بتایا تو میرا ماتھا ٹھنکا اور میں چپ نہ رہ سکا۔ ''اسپتال جا رہے ہو؟'' میں نے سراسیمگی سے کہا۔

''ہاں رے، دکھا دیں ادھری۔''

''کیا بات ہے؟ سچ بتاؤ، کیا حال ہے؟''

''دیکھتے ہیں رے ادھر جا کے۔''

''مجھ سے مت چھپاؤ۔'' میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔

''تیرے ساتھ ہی چلتے ہیں۔''

''کیا، کیا بہت زیادہ......'' میری آواز پھٹنے لگی۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے خاموش رہنے کی تلقین کی۔ مجھے احساس ہوا کہ میری پرسش یا دخل اندازی اسے گراں نہ گزر رہی ہو۔ اس موقع پر مجھے سوال جواب نہیں کرنے چاہئیں۔ میرا دل ہول رہا تھا۔ ہوٹل سے اسپتال کا فاصلہ کم نہیں تھا۔ بگھی کی رفتار سست تھی جتنی دیر ہو رہی تھی۔ میری وحشت بڑھتی جاتی تھی۔ آخر بگھی ایک بڑے اسپتال کے سامنے رک گئی۔ بگھی سے اتر کے ہم نے خاص عمارت کا رخ کیا۔ جانے بٹھل کس طرح چل رہا ہوگا۔ کچھ وہی جانتا ہوگا کہ اس پر کیا گزر رہی ہے۔ وہ اسپتال کی عمارت میں اپنے پیروں سے داخل ہوا تھا لیکن ظاہر تھا، کسی بڑی تکلیف ہی میں اس نے سفر ترک کر کے اسپتال کا رخ کیا ہے۔ دواؤں اور علاج معالجے سے اسے ویسے بھی کبھی سروکار نہیں رہا تھا۔ اسپتال کے عملے نے ہمیں پختہ عمر کے ایک جواں شکل ڈاکٹر کے کمرے میں پہنچا دیا۔ کوئی توقف کیے بغیر میں نے اسے جلدی جلدی سارا واقعہ بتایا اور گزارش کی کہ وہ ہم پر خصوصی توجہ دے۔ وہ ایک کم گو آدمی تھا۔ عینک لگائے، کچھ ڈھیلا ڈھالا سا، کسی انگریزی کتاب کے مطالعے میں مصروف، بے تاثر سا ایک شخص۔ اس نے کچھ کہے بغیر بٹھل کو ایک گوشے میں رکھے معائنہ بستر پر لیٹ جانے کا اشارہ کیا اور سر کے مختلف حصے دبا کے دیکھے اور کچھ وہی سوال کرنے لگا جو گزشتہ رات ریل کے ڈبے میں اکبر پور کے ڈاکٹر سکسینہ نے کیے تھے۔ وہ مجھے نو آموز ڈاکٹر لگتا تھا۔ میں نہیں کہنا چاہتا تھا لیکن میرے بس میں نہیں تھا۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ بہتر ہے، وہ اسپتال کے کسی اور ڈاکٹر کو بلا کے اس سے مشورہ کرے۔ میری تجویز پر وہ برافروختہ نہیں ہوا، سر ہلانے لگا۔ گھنٹی بجا کے اس نے چپراسی کو طلب کیا اور کسی ڈاکٹر سری ناتھ کو بلانے کے لیے کہا۔

کچھ دیر میں کئی ڈاکٹر کمرے میں جمع ہو چکے تھے۔ ان میں ایک زیادہ عمر کا تھا۔ ان سب نے بٹھل اور مجھ سے سوالوں کی تکرار کی اور بٹھل کے پاس سے ہٹ کے مشورت کرنے لگے۔ وہ بیش تر انگریزی میں بات کر رہے تھے۔ بہت کچھ مجھے بھی سنائی دے رہا تھا۔ پہلے تو وہ آپس میں الجھتے رہے۔ ان کی رائے تھی کہ بہ ظاہر کسی بڑی چوٹ کے آثار نظر

نہیں آتے۔ پھر انہوں نے طے کیا کہ صبح تک بٹھل کو اسپتال میں روک لیا جائے۔ اسپتال کا بڑا ڈاکٹر، ڈاکٹر رائے صبح سویرے اسپتال آجاتا ہے۔ اس کے آنے تک بٹھل کو سکون کی دوائیں دی جاتی رہیں اور رات کسی طور گزار دی جائے۔ ممکن ہے، ایکس رے کی ضرورت پڑے۔ یہ فیصلہ بھی ڈاکٹر رائے ہی کر سکتا ہے۔ ان کا انداز بے حد سرد مہری کا تھا۔ آپس میں صلاح مشورے کے بعد بڑی عمر کا ڈاکٹر مجھ سے مخاطب ہوا۔" ہم مریض کو رات بھر کے لیے......"

مجھے معلوم تھا، وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے روک دیا اور انگریزی میں پوچھا۔" ڈاکٹر رائے اس وقت کیوں نہیں آسکتے؟"

مجھے انگریزی میں بولتا دیکھ کے ان کے جسم لہرا گئے، آنکھیں پھیل گئیں۔ عمر رسیدہ ڈاکٹر نے چند ثانیوں کے سکوت کے بعد نرمی سے کہا۔" وہ اس وقت گھر پہ رہتے ہیں اور مریض دیکھنا پسند نہیں کرتے۔"

"یہ کون سا ڈاکٹر ہے؟" میں نے برہمی سے کہا۔" مرض گھڑی دیکھتا ہے جو ڈاکٹر گھڑی کا پابند ہے۔ یہ اسپتال بھی رات کو بند کر دیا کریں۔ رات آرام کے لیے ہوتی ہے۔ آپ سارے بھی یہاں کیوں ہیں۔ گھر جا کے آرام کریں۔"

"آپ اطمینان رکھیے۔ ہم رات بھر ان کی خبر گیری کریں گے۔ کوئی ایسی گھبرانے والی بات نہیں معلوم ہوتی۔" ڈاکٹر نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"ہم بردوان جا رہے تھے۔ پٹنے کے اس اسپتال میں دکھانے کے لیے ہم نے آگے کا سفر ختم کیا۔ ہم کسی امید سے آپ کے پاس آئے ہیں۔ ازراہِ کرم آپ ڈاکٹر رائے سے رابطہ کیجیے یا مجھے ان کا پتا بتائیے۔ میں ان کے پاس جا کے منت کرتا ہوں۔ ہم ان کی، جتنی بھی فیس ہو، ادا کر دیں گے۔"

"ڈاکٹر رائے کے کچھ اصول ہیں جناب۔" ڈاکٹر نے متانت سے کہا۔

"پھر کسی اور ڈاکٹر کو بلانے کا بندوبست کیجیے۔ کیا اس بڑے شہر میں ڈاکٹر رائے کے سوا کوئی اور ڈاکٹر نہیں ہے۔ میں نے آپ سے کہا نا، روپے پیسے کی فکر مت کیجیے۔ کوئی بھی فیس اور کتنا بھی خرچ ہو۔" میری درخواست میں درشتی شامل تھی۔

عمر رسیدہ ڈاکٹر کسی قدر بے چارگی کی سی کیفیت میں اپنے ساتھیوں کے چہرے دیکھنے لگا۔

"دیکھیے نا!" میں نے اس سے کہا۔" اسپتال میں کوئی بھی مریض کسی وقت، کسی حالت میں آسکتا ہے، کیا بس یہاں ڈاکٹر رائے پر انحصار کیا جاتا ہے۔ آپ، آپ لوگ یہاں پھر کس لیے ہیں؟"

"یہ کیس پیچیدہ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ دماغ کا معاملہ ہے۔ ہمیں احتیاط کرنا ہے۔" ڈاکٹر کی آواز الجھ رہی تھی۔

"پھر تو اور ضروری ہے۔ آپ یہ کیس صبح پر کیوں ٹال رہے۔ پھر ایک مہربانی کیجیے اس شہر میں، میں اجنبی ہوں، کوئی سواری مجھے فراہم کر دیجیے۔ میں خود ڈاکٹر رائے کے گھر جا کے دہائی دیتا ہوں یا جس ڈاکٹر کو آپ بتائیں جس کے اصول اتنے سخت نہ ہوں۔ جو اپنے پیشے سے انصاف کرتا ہو، جو واقعی ڈاکٹر ہو یا کوئی ایسا ڈاکٹر جو روپے پیسے کو بہت عزیز سمجھتا ہو۔ میری مدد کیجیے۔ یوں کھڑے کھڑے آپ وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں۔"

میرے منہ میں جو آیا، میں کہتا گیا۔ جی میں تو یہ آتا تھا کہ جیب سے چاقو نکال لوں۔ یہ زبان ان کی سمجھ میں نہیں آتی تو دوسری ضرور آئے گی۔

جواب میں عمر رسیدہ ڈاکٹر دیر تک چپ رہا پھر اس نے ایک نوجوان ڈاکٹر سے کہا۔" ڈاکٹر رائے کے پاس جا کے ساری صورت حال بتاؤ ورنہ پھر انہیں ڈاکٹر سمپت کے پاس بھیجنے کا انتظام کرو۔

ڈاکٹر سمپت اس اسپتال میں نہیں آئیں گے۔ ان کے گھر ہی جانا ہوگا۔ وہ ایک مہربان آدمی ہے لیکن پہلے ڈاکٹر رائے کو دیکھو، شاید وہ......وہ۔" وہ شانے اچکا کے بولا۔

"وہ نہیں آئیں گے جناب! آپ کو معلوم ہے، انہوں نے سختی سے تاکید کی ہے۔ پہلے بھی......" نوجوان ڈاکٹر کی آواز بیٹھی ہوئی تھی۔

"اچھا ہے، ایک بار انہیں دیکھ لو۔" عمر رسیدہ ڈاکٹر کا لہجہ نیم حکمیہ تھا۔" بعد کو کوئی شکایت بھی ہو سکتی ہے۔"

"آپ کہیں تو میں ساتھ چلتا ہوں۔" میں کہنا چاہتا تھا، شاید میری التجا سے ڈاکٹر رائے متاثر ہو جائے۔

"نہیں۔" عمر رسیدہ ڈاکٹر نے صاف انکار کر دیا۔" آپ یہیں ٹھیریں اور انتظار کریں۔ سر دست ہم مریض کو کچھ دوائیں دیتے ہیں۔"

اس سے اب کوئی اور بات کرنی مناسب نہیں تھی۔ اس کی ہدایت پر کمرے میں پہلے سے تعینات ڈاکٹر نے بٹھل کے بازو میں سوئی گھونپ دی اور چند گولیاں بھی کھلائیں۔ اس کے اور عمر رسیدہ ڈاکٹر کے سوا باقی ڈاکٹر چلے گئے۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی، ہیبت ناک سی خاموشی۔ پھر عمر رسیدہ ڈاکٹر ......نے کرسی پر بیٹھ کے پائپ سلگایا اور مجھ سے پوچھنے لگا۔" یہ آپ کے کون ہیں؟"

"کیا بتاؤں۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "یہ میرے سب کچھ ہیں، میرے بھائی، دوست میرے بزرگ، میرے محسن......"

"آپ کا ان سے کوئی خونی رشتہ نہیں ہے؟"

"تمام انسانوں کا ایک دوسرے سے خونی رشتہ ہوتا ہے۔"

"ہاں۔" وہ کچھ بے قرار ہوا اور ٹھنڈی سانس بھر کے بولا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں بلکہ آپ نے بڑی سچی بات کہی ہے۔" پھر پوچھنے لگا۔" آپ لوگوں کا کیا مشغلہ ہے؟"

مجھے جواب دینے میں تامل ہوا۔ وہ چمکتی آنکھوں سے منتظر تھا۔ میں نے کہا۔" ہماری زمینیں ہیں۔" زمینوں کا سن کے عموماً دوسرے سوالات نہیں کیے جاتے۔

"آپ زمیں دار ہیں؟"

"جی ہاں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"فیض آباد میں آپ کی زمینیں ہیں؟"

"اور بھی کئی جگہ......" میں نے یوں ہی کہہ دیا۔

اس نے توصیفی انداز میں آنکھیں پھیلائیں۔

"آپ تو خوب تعلیم یافتہ معلوم ہوتے ہیں۔"

"انگریزی گوئی سے مراد علم یافتگی نہیں ہے۔"

"ہاں ہاں۔" اس کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔" لیکن سمجھا کچھ ایسا ہی جاتا ہے۔"

"حکم رانوں کے لاؤ لشکر میں ان کی تہذیب بھی ہوتی ہے۔ گوروں کو تو یہاں حکم رانی کرتے ہوئے زمانہ گزر گیا۔"

"بے شک، بے شک، اور یہ بھی تو سچ ہے کہ اب وہ ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔ ان کا وقت ہے، کیوں کہ ان کے پاس علم ہے۔" اس وقت ان باتوں کا کوئی محل نہیں تھا۔ حکیم ڈاکٹر کو علاج معالجے کے علاوہ کچھ اور بھی جاننا چاہیے۔ اس کی مزید سوالوں سے بچنے کے لیے میں کرسی سے اٹھ گیا اور میں نے بٹھل کے بستر پہ جا کے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ میں نے پوچھا۔" ٹھیک ہے کچھ؟" اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ بکھر گئی اور اس نے لمحے بھر کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔" بس اب ڈاکٹر صاحب آتے ہی ہوں گے۔" میں نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔ میں نے ہلکے ہاتھ سے اس کے بکھرے بال درست کیے اور ڈاکٹر کے پاس

آ کے بیٹھ گیا۔

"میں آپ کی بے چینی سمجھ رہا ہوں۔ کبھی مریضوں سے زیادہ ہمیں تیمارداروں کو سنبھالنا پڑتا ہے۔ مشکل یہ ہے، انہیں پرسکون رہنے کی دوا بھی نہیں دے سکتے۔" عمر رسیدہ ڈاکٹر مجھے تسلی دینے لگا۔ "اطمینان رکھیے، آپ صحیح جگہ آ گئے ہیں۔"

میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ ڈاکٹر بھی چپ ہو گیا۔ اسے کیا اندازہ ہو سکتا تھا، مجھ پر یہ وقت کیسے گزر رہا ہے۔ میں تو لمحے گن رہا ہوں۔ کمرے کی دیواری گھڑی نے ساڑھے گیارہ کا گھنٹا بجایا تو ڈاکٹر نے اپنے بند گلے کے کوٹ سے جیبی گھڑی نکال کے وقت کی تصدیق کی اور نوجوان ڈاکٹر سے بولا۔ "ہریش کو گئے دیر ہو گئی۔ اسے اب تک واپس آ جانا چاہیے۔"

"ڈاکٹر رائے کا گھر کتنی دور ہے؟" میں نے تندی سے پوچھا۔

"ایسا دور نہیں، قریب ہی ہے۔" ڈاکٹر کے لہجے میں بے چینی بھی تھی، پشیمانی بھی۔ "کچھ دیر اور دیکھتے ہیں۔"

کچھ دیر اور گزر گئی۔ میری نگاہیں کبھی دروازے کی طرف اٹھتی تھیں کبھی بٹھل کی طرف۔ اگر ڈاکٹر رائے آمادہ نہ ہوا؟ بٹھل کی حالت مجھے بالکل ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ اس وقت اس اجنبی شہر میں، میں کہاں کہاں، کس کس دروازے پر دستک دوں گا۔ یہ سوچ سوچ کے میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ عمر رسیدہ ڈاکٹر کا حال یقیناً مجھ جیسا نہیں ہوگا لیکن وہ بھی اب خاصا متفکر معلوم ہوتا تھا۔ کرسی سے اٹھ کر وہ کمرے میں ٹہلنے لگا، بٹھل کے پاس بھی گیا اور اسے ایک نظر دیکھ کے پلٹ آیا۔ میں اس سے منت کرنا چاہتا تھا کہ ڈاکٹر رائے کا مزید انتظار کرنے کے بجائے وہ کوئی اور تدبیر کرے۔ میں نے کچھ کہنے کے لیے ہمت استوار کی تھی کہ اسی دم کمرے کے باہر سے تیز قدموں کی چاپیں ابھریں۔ نوجوان ڈاکٹر نے بھی کرسی چھوڑ دی۔ میں بھی کھڑا ہو گیا۔ عمر رسیدہ ڈاکٹر نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "اگر واقعی وہی ہیں تو حیرت ہے؟" یہ کہتا ہوا وہ لپک کے دروازے کی طرف بڑھ گیا مگر اس کے باہر نکلنے سے پہلے ستر سال کے لگ بھگ عمر، اوسط قد کا، بھورے رنگ کی پتلون پر آدھی آستینوں کی پھول دار قمیض پہنے، کھلتی ہوئی سرمئی رنگت کا ایک صحت مند شخص کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ڈاکٹر رائے ہی ہو سکتا تھا۔ اس کے عقب میں نوجوان ڈاکٹر ہریش کے علاوہ ایک اور شخص بھی تھا۔

"کیا ہوا؟" ڈاکٹر رائے نے کھردری آواز میں پوچھا۔

عمر رسیدہ ڈاکٹر نے انگریزی میں مختصر بٹھل کے مرض کی نوعیت سے آگاہ کیا اور بٹھل کے بستر کی طرف انگلی اٹھائی۔ ڈاکٹر رائے نے خود بھی مڑ کے دیکھ لیا تھا۔ ناگواری اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

اپنے سرہانے سرسراتی آہٹوں پر بٹھل نے آنکھیں کھول دیں۔

"ڈاکٹر گوکھلے! تم کہہ رہے تھے، تم نے اسے...... دی ہے۔" ڈاکٹر رائے نے کسی دوا کا نام لیا تھا۔ میں پوری طرح نہ سن سکا۔ "کتنی دیر ہوئی؟"

پہلی بار مجھے علم ہوا کہ عمر رسیدہ ڈاکٹر کا نام گوکھلے ہے۔ اس نے تندہی سے جواب دیا۔ "دیر ہو گئی جناب! شاید گھنٹا بھر پہلے۔"

"ایک گھنٹا!" ڈاکٹر رائے کی تیوری چڑھ گئی۔ "مگر یہ تو جاگ رہا ہے۔"

"جی، میں بھی دیکھ رہا ہوں مگر ہم نے اسے پوری خوراک دی تھی۔ یا تو درد شدید ہے یا یہ آدمی اعصاب کا مضبوط ہے۔ یہ اپنے پیروں سے چل کے یہاں آیا تھا جناب!" ڈاکٹر گوکھلے کی عمر ڈاکٹر رائے کے برابر ہوگی، ممکن ہے، کچھ زیادہ ہی۔ وہ ڈاکٹر رائے کی جناب میں نہایت مودب تھا اور یہی

حال دوسرے ڈاکٹروں کا تھا۔ وہ تقریباً ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ ان سب کی نظروں میں ڈاکٹر رائے کی اس قدر منزلت سے مجھے کچھ سکون ہوا۔ وہ کوئی بڑا ہی ڈاکٹر ہوگا۔ ہر صاحب کمال کے اپنے تیور ہوتے ہیں۔ وہ بھی کچھ الگ قسم کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔

ڈاکٹر رائے، بٹھل کے جسم پر جھک گیا اور مختلف زاویوں سے تادیر اس کا سر دباتا رہا۔ بٹھل کا چہرہ کھنچتا اور کھلتا رہا۔ اس کی کوئی آہ یا کراہ بلند نہیں ہوئی۔ ''کتنا درد ہے؟'' ڈاکٹر نے ہندوستانی میں پوچھا۔

''ابھی تھوڑا کمی ہے۔'' بٹھل نے مدھم آواز میں رک رک کے کہا۔

ڈاکٹر اس کے سر پہ ٹھونگیں مارنے لگا اور اس نے اپنا کان سر کے قریب کرلیا۔ ''جدھر جاستی ہوتا ہے، مجھ کو بولو۔'' ڈاکٹر رائے ہر لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا اور پوچھنے لگا۔ ''ابھی پورا سننے میں آتا ہے، میں کیا بولتا ہوں؟''

بٹھل نے آہستہ سے سر ہلایا۔

ڈاکٹر نے پورے سر پہ ٹھونگیں مارنے کا عمل دہرایا۔ پہلے ہلکے ہلکے پھر رفتہ رفتہ زور زور سے۔ بٹھل کے چہرے پر شکنیں گہری ہوتی گئیں۔

''بولو، کس جگہ پہ زیادہ دکھتا ہے؟''

بٹھل نے آنکھیں بھینچ لیں اور بہ مشکل جواب دیا۔ ''سارا پھٹتا ہے۔'' ڈاکٹر رائے نے اس کے سر سے ہاتھ ہٹالیا اور آلہ لگا کے جسم کے مختلف حصوں کا جائزہ لیا، نبض دیکھی، پپوٹے اٹھا کے دیکھے اور بازو پر پٹی باندھ کے خون کے دوران کا معائنہ کرتا رہا۔ ''اس کے ساتھ کون ہے؟'' اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

میں ڈاکٹر گوکھلے کی آڑ میں کھڑا تھا۔ اس نے ایک طرف ہٹ کے مجھے سامنے کیا اور مودبانہ کہا۔ ''یہ نوجوان اس کے ساتھ ہے۔''

ڈاکٹر رائے نے سر تاپا مجھے گھور کے دیکھا۔

''اوہ...... تم! تم مریض کا کیا لگتا ہے؟''

وہی سوال! اس کے جواب سے مجھے خفقان سا ہونے لگتا تھا۔ میں کسی کو کیا جواب دوں۔ جو رشتے ناموں اور درجوں سے سوا ہوتے ہیں، کوئی ان کی تشریح کیا کرے۔ مجھے متذبذب دیکھ کے ڈاکٹر گوکھلے نے میری مشکل آسان کی۔ ''یہ دونوں بھائی ہیں جناب!''

ڈاکٹر رائے کے ہونٹ پھیل گئے۔ بٹھل کے سر پہ تھپکی دیتا ہوا وہ کمرے کے وسط میں رکھی میز کی طرف آگیا۔ میری نظریں اس پر مرکوز تھیں۔ اس کے چہرے پر فکرمندی کے آثار تھے یا یہ میرا وہم تھا۔ میں کچھ اندازہ نہیں لگا سکا۔ مجھے تو بہت گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ ''ہم اس کو ابھی ادھر روکتا ہے۔ سمجھے! ایک رات یہ آبزرویشن میں رہیگا۔ سویرے اس کو پھر دیکھے گا۔ مجھ کو ابھی سارا بات بولو۔'' ڈاکٹر رائے نے دوٹوک انداز میں مجھے مخاطب کیا۔

میں نے اپنا حلق تر کیا اور شکستہ آواز میں گزشتہ رات کی روداد سنانی شروع کی تو ڈاکٹر گوکھلے نے دخل دیا کہ بہتر ہے، میں ڈاکٹر رائے کو انگریزی میں تفصیل بتاؤں۔ ڈاکٹر رائے بھی میری انگریزی دانی پر متعجب ہوا تھا مگر اس نے گوکھلے کی طرح مجھ سے سوال جواب نہیں کیے۔ میں نے اسے ڈبے میں ڈاکٹر سکینہ کی آمد، اس کے معائنے، اس کے لکھے ہوئے نسخے اور دوا کے بارے میں بتایا۔ میں نے کہا کہ نسخے کی دوائیں خریدنے کا وقت ہی نہیں مل سکا۔ گولیوں کی تین خوراکیں دے چکا ہوں اور کوئی افاقہ نہیں ہوا ہے۔ جیب سے گولیوں کی پڑیا اور نسخہ نکال کے میں نے اسے پیش کردیا۔ اس نے غور سے نسخہ پڑھا، گولیاں دیکھیں اور دونوں چیزیں مجھے لوٹا دیں۔

''دیکھو نوجوان!'' اس نے میرے کندھے پر

ہاتھ رکھ کے کہا۔ اس کا لہجہ خاصا نرم تھا۔ کہنے لگا۔ ''ہم ابھی کچھ کہہ نہیں سکتے۔ یہ اندرونی چوٹ ہے۔ ہمیں بہتری کی امید کرنی چاہیے۔ رات کے لیے ہم ایسی دوائیں دے رہے ہیں جو درد بھی کم رکھیں گی اور مریض کو نیند بھی آجائے گی۔ صبح تک انتظار کرو۔ ہوسکتا ہے، کچھ دن تمہیں یہاں ٹھیرنا پڑ جائے۔ کیا تمہارے لیے یہ ممکن ہے؟''

''میری سب سے بڑی ترجیح ان کا علاج ہے۔'' میری آواز بھرا گئی۔

''ٹھیک ہے۔ یہ لوگ مریض کو ایک آرام دہ کمرے میں منتقل کردیں گے۔ تم بھی وہیں رہ سکتے ہو۔ رات بھر وقفے وقفے سے ڈاکٹر آتا رہے گا اور مریض پر نگاہ رکھے گا۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو، درد زیادہ اٹھنے لگے تو تم ڈاکٹر طلب کرسکتے ہو۔ نرس بھی دیکھ بھال کرتی رہے گی۔''

''مناسب ہے جناب!'' میری آواز دھڑک رہی تھی۔ ''ڈاکٹر صاحب!'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا ''کوئی ایسی بات تو نہیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں؟''

''ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''صبح ہم اور معائنے کریں گے۔ خون کے علاوہ اور کئی ٹیسٹ، ایکس رے بھی لیں گے۔ ضرورت پڑی تو دوسرے ڈاکٹروں کو بھی مشورے کے لیے بلایا جاسکتا ہے۔''

''خدا کے لیے کچھ کیجیے ڈاکٹر صاحب!'' میں نے عاجزی کی۔ ''جو بھی، جس طرح کا علاج ہو، بالکل فکر مت کیجیے۔''

''مجھے بتا دیا گیا ہے کہ تمہارے پاس بہت سونا چاندی ہے۔''

''یہ میں نے روپے پیسے کا ذکر اس لیے کیا تھا کہ علاج میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔'' میں نے معذرت کی۔ ''اس کا مطلب کچھ اور نہیں تھا، اور پیسا پھر کس لیے ہوتا ہے۔''

''میں سمجھتا ہوں۔'' وہ مسکرانے لگا۔ ''پیسا بھی کام آتا ہے مگر ہر موقع پر نہیں۔''

''بس آپ مہربانی کیجیے جناب!''

''ہم اپنی کوشش کریں گے، ہم یہاں اسی لیے ہیں۔''

''مجھے احساس ہے، میں نے آپ کو ناوقت زحمت دی پھر وہی پیسے کا ذکر آجائے گا لیکن وقت کا کوئی تو مول ہوتا ہے۔ آپ کچھ خیال مت کیجیے۔''

''بعد کو دیکھیں گے۔'' ڈاکٹر رائے آنکھیں چڑھا کے بولا۔ ''تم بھی کمرے میں جا کے آرام کرو، ادھر دوسرا بستر بھی ہے اور حوصلہ رکھو۔ تم سے اب صبح بات ہوگی۔ شب بخیر۔'' اس نے میری طرف سے مڑ کے ڈاکٹر گوکھلے کو سرگوشیانہ لہجے میں کچھ ہدایات دیں اور سیدھا دروازے کی جانب چل پڑا۔

آدھ گھنٹے کے اندر ایک کھلے ہوئے، صاف ستھرے، ہوادار اور آراستہ و پیراستہ کمرے میں وہ ہمیں لے آئے۔ ڈاکٹر گوکھلے کے ساتھ دو نوجوان ڈاکٹر بھی آئے تھے۔ انہوں نے بٹھل کو ایک اور سوئی لگائی اور مختلف قسم کی دوائیں دیں۔ بڑی عمر کی ایک فربہ اندام، چاق و چوبند نرس ان کی مدد کرتی رہی۔ کمرے میں کھڑکی کے پاس صوفہ لگا ہوا تھا، کرسیاں بھی تھیں اور مریض سے متعلق ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔

''قریب ہی ادھر دریا ہے۔'' اپنے کام سے نمٹ کے ڈاکٹر گوکھلے میرے شانے پر ہاتھ رکھے مجھے صوفے پر لے آیا اور پوچھنے لگا۔ ''کہیے، کیسا ہے یہ کمرا؟''

میں نے لجاجت سے کہا۔ ''آپ کی بڑی مہربانی۔''

''مہربانی میری نہیں، ڈاکٹر رائے کی ہے۔'' وہ مجھے کمرے کے اوصاف تفصیل سے گنوانے لگا کہ اردگرد کے خاص الخاص لوگوں کے لیے یہ کمرے

مخصوص ہیں۔ گورے مریضوں کو بھی یہیں ٹھہرایا جاتا ہے۔ یہ خالی رہتے ہیں تو بھی ان کی صفائی ستھرائی کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹروں کے لیے لازم ہے کہ ان کمروں میں زیرعلاج مریضوں پر خصوصی توجہ دیں۔ یہاں ماہر نرسوں کا تقرر کیا جاتا ہے۔ دریا رخ ہونے کی وجہ سے یہاں بڑی نرم ولطیف ہوا آتی ہے وغیرہ۔ اسے تعجب تھا کہ ڈاکٹر رائے سے تو میری پہلی ملاقات تھی۔ میں نے کیا جادو کردیا کہ اس نے از خود اس کمرے میں ہمیں قیام کی اجازت دے دی ورنہ وہ تو بہت محتاط ہے۔ ڈاکٹر گوکھلے کو لفظ تلاش کرنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ غالباً وہ یہ کہنا اور جتانا چاہتا تھا کہ مریضوں کا حسب نسب، ان کے زور واثر سے مطمئن ہونے کے بعد ہی انہیں یہاں علاج کے اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔

میں چپ چاپ سنتا رہا۔ کہنے والے کو کچھ تو احساس ہونا چاہیے کہ سننے والا کتنا سن رہا ہے یا کتنا متوجہ ہے۔ بے موقع کلام بھی یاوہ گوئی ہے اور یاوہ گوئی ایک عارضہ ہے اور یہ عارضہ بہت عام ہے۔ لوگ ہر خبر کا حساب رکھتے ہیں۔ یہ حساب کوئی نہیں لگاتا کہ زندگی کا کتنا وقت بے موقع اور غیرضروری باتوں میں گزر جاتا ہے۔ مجھے ڈاکٹر گوکھلے کی باتوں سے چڑ ہورہی تھی۔ میں بٹھل کے پاس بیٹھنا چاہتا تھا۔ اسے بستر پہ بے سدھ پڑا دیکھ کے میرا دل ڈوبا جارہا تھا، جسم کی جان جیسے کھنچی جاتی ہو۔ مجھے تو کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں ڈاکٹر گوکھلے کا منہ کس طرح بند کرسکتا تھا۔ میری بے توجہی سے وہ ناراض بھی ہوسکتا تھا۔ مجھے اس کی ضرورت تھی۔ وہ اگر ساتھ نہ دیتا تو اس وقت ڈاکٹر رائے کی آمد قطعی ناممکن تھی۔ شاید وہ میری توجہ بٹانے کے لیے ادھر ادھر کی باتیں کررہا تھا مگر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ سننے والے کی آمادگی کے بغیر شیریں سخنی بھی فضول گوئی ہے۔ اس نے پھر پائپ سلگالیا۔ لگتا تھا، اسے کوئی کام نہیں ہے۔ میں ہوں ہاں کرتا رہا۔ میری آنکھیں تو بٹھل کے بستر پر ٹکی ہوئی تھیں۔ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ اس نے بار بار پائپ سلگایا اور جب پائپ کا تمباکو راکھ ہوگیا تو اسے کچھ بے چینی ہوئی۔ مزید تمباکو نوشی کے لیے وہ جیبوں میں پاؤچ ٹٹول رہا تھا اسے خیال آیا کہ وہ تو پچھلے کمرے میں چھوڑ آیا ہے مجھے بہت تسلی دلاسے دے کے کہیں وہ رخصت ہوا اور میں نے دانستہ بٹھل کے بارے میں اس کا قیاس جاننے سے اجتناب کیا کہ اس کے منہ سے بے سوچے سمجھے کچھ بھی نکل سکتا ہے۔ میں نے اسے کمرے کے باہر تک رخصت کیا۔

اس وقت ایک بج رہا تھا۔ اس کے جاتے ہی نرس نے آکے کمرے کی روشنی دھیمی کردی۔ بٹھل بالکل غافل تھا۔ اس کی سانسوں کا تواتر معمول کے مطابق تھا۔ باقی رات میں تین بار نرس آئی اور دو مرتبہ ڈاکٹر نے چکر لگایا۔ انہیں میرے جاگتے رہنے سے کیا پریشانی تھی جو ہر بار آکے وہ مجھے اس طرح سمجھاتے تھے جیسے میں کوئی پاگل ہوں یا بچہ ہوں۔ صبح ہونے سے کچھ پہلے نرم گفتار نرس نے بٹھل کا معائنہ کرکے مجھ سے مشفقانہ لہجے میں کچھ دیر کمر ٹکا لینے کو کہا اور میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے کرسی سے اٹھادیا۔ پھر مجھ سے منع نہ کیا جاسکا۔

میں بستر پہ آکے لیٹ گیا اور اس وقت مجھے محسوس ہوا، میرا سارا جسم ٹوٹ رہا ہے۔ اپنا آپا ہی مجھ سے نہیں سنبھل رہا۔ میں نے جان کے آنکھیں بند نہیں کیں کہ کہیں کسی لمحے بٹھل کو میری ضرورت نہ پڑ جائے۔

صبح آٹھ بجے سے منہ ہاتھ دھو کے اور کپڑوں کی شکنیں درست کرکے میں تیار بیٹھا تھا۔ نرس نے مجھے بتایا تھا کہ ڈاکٹر رائے وقت کا بڑا پابند ہے۔ ٹھیک آٹھ بجے اسپتال آجاتا ہے۔ میرے کپڑے خاصے میلے ہوگئے تھے لیکن سامان ہوٹل میں رکھا ہوا تھا اور وہاں جانے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔

فربہ اندام نرس رات کی ڈیوٹی سے فارغ ہونے سے پہلے میرے لیے ہلکا ناشتا خود لائی تھی اور سامنے بیٹھی رہی۔ اس نے اپنے ہاتھ سے توس پر مکھن لگا کے مجھے پیش کیا تو مجھے زہر مار کرنا پڑا۔ وہ کم بولتی تھی اور اس کے انداز میں ایسا شفقت آمیز تحکم تھا کہ انکار آسان نہیں تھا۔ میں نے چند گھونٹوں میں چائے بھی ختم کرلی۔ نرس کا نام ـــــ ایملی ڈینیل تھا۔ یہ نام اس نے خود بتایا اور مجھے شرم سار کیا۔ رات سے وہ متعدد بار کمرے میں آچکی تھی اور میں نے نہ اپنا تعارف کرایا نہ اس کا نام پوچھا تھا۔ اس نے بٹھل کی دیکھ بھال میں مستعد رہنے کے لیے مجھے اپنی حالت درست کرنے کی نصیحت کی۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی، اپنے آپ کو باندھے رکھے بغیر میں مریض، (بٹھل) کے کس کام آسکتا ہوں۔ وہ مجھ سے اس طرح پیش آرہی تھی جیسے ایک زمانے سے واقف ہو یا جیسے بٹھل کے بجائے میں بیمار ہوں۔ گھر کے کپڑے پہن کے وہ مجھے وداعی سلام کرنے آئی اور بٹھل اور میرے لیے چند رسمی دعائیہ جملے کہہ کر رخصت ہوگئی۔ پھر دروازے سے وہ پلٹی اور کہنے لگی کہ اس کی جگہ دن بھر کے لیے اب نرس سیورین کی ڈیوٹی ہے۔ اس نے سیورین کو تاکید کردی ہے کہ وہ اس کمرے کا خاص خیال رکھے۔ کوئی بھی کام ہو، بے جھجک اس سے کہا جاسکتا ہے۔ وہ ایک معاون لڑکی ہے۔

نرس ایمی کو گئے ابھی چند منٹ ہوئے ہوں گے کہ گندمی رنگت، تیکھے نقش ونگار، متناسب قد کی دبلی تپلی ایک نوعمر نرس لپکتی جھپکتی کمرے میں آئی اس کے چہرے پر سب سے نمایاں اس کی بڑی آنکھیں تھیں۔ اس نے سنجیدہ لہجے میں 'صبح بخیر' کہا اور مشاقی سے بٹھل کے بستر کی شکنیں درست کرنے اور چیزیں ترتیب سے رکھنے لگی۔ صوفے کے ساتھ والی کھڑکی کا پردہ بھی اس نے کھول دیا۔ کمرا روشن ہوگیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر رائے اب آیا ہی چاہتے ہیں۔ میں ہڑبڑا کے کرسی سے اٹھ گیا۔ سیورین نے وہ کرسی بھی دیوار کے ساتھ لگادی اور جس تیزی سے آئی تھی، اسی تیزی سے واپس چلی گئی۔

میں کمرے میں دبے قدموں ٹہلتا رہا۔ ٹھیک نو بجے ڈاکٹر رائے دو اور ڈاکٹروں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ ان کے پیچھے نرس سیورین بھی تھی اور اسپتال کے مخصوص لباس میں ایک اور شخص تھی۔ ڈاکٹر رائے نے مجھے سرسری دیکھا، سر کی جنبش سے سلام کا جواب دیتا ہوا وہ بٹھل کے پاس جاکے ٹھہر گیا اور ان سب نے بٹھل کا بستر گھیر لیا۔ پائینتی پر لٹکی ہوئی رپورٹ دیکھ کے ڈاکٹر رائے نے بٹھل کا شانہ ہلایا۔ اس نے بہ مشکل آنکھیں کھولیں۔ ڈاکٹر نے حال پوچھنا چاہا۔ بٹھل دیدے گھما کے رہ گیا۔ اس پر غنودگی کا شدید غلبہ تھا۔ ڈاکٹر رائے کے اشارے پر ایک ڈاکٹر نے بٹھل کی کلائی سے خون کھینچنے کے لیے سوئی پیوست کردی اور حاصل کیا ہوا خون شیشی میں منتقل کردیا۔ اس نے خون کی پھر ایک اور شیشی بھری۔ میں ان کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ ڈاکٹر رائے کو اپنے درمیان میری موجودگی سے جانے کیا خلل پڑ رہا تھا کہ اس نے مجھے دور صوفے پر بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ میں نے مجبوراً تعمیل کی۔ وہ سارے بٹھل کے گرد جمع رہے۔ میں اپنے آپ کو جکڑے ہوئے دور بیٹھا انہیں دیکھتا رہا۔ میں نے ان کی سرگوشیاں سننے کی کوشش کی لیکن کچھ پلے نہیں پڑا۔ مجھے تو چکر آرہے تھے۔

کچھ دیر میں ڈاکٹر رائے میری طرف آگیا اور مجھ سے گزشتہ رات بٹھل کی کیفیت کے متعلق پوچھنے لگا۔ میری آواز ڈول رہی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ ساری رات وہ بے خبر رہا ہے۔ دو ایک بار مجھے اس کی کراہ کا گمان ہوا اور میں نے اٹھ کے اس سے پوچھا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور ادھر ادھر دیکھا کیا۔ اس کی آنکھیں سکڑتی اور پھیلتی رہیں او

وہ کچھ کہے بغیر نیند میں ڈوب گیا۔

ڈاکٹر رائے سوچتا رہا، پھر اکڑی ہوئی آواز میں بولا۔ ''ہم اسے ایکس رے کے لیے لے جائیں گے۔ وہاں کچھ اور ٹیسٹ بھی لیں گے۔''

''آپ کیا سمجھتے ہیں ڈاکٹر صاحب؟'' میں نے ناتوانی سے پوچھا۔

''ٹیسٹ کے نتائج کے بعد ہی یقین سے کچھ کہا جاسکتا ہے اور ان کی رپورٹ آنے میں دو دن لگ سکتے ہیں۔''

''ان رپورٹوں میں جلدی نہیں ہوسکتی؟''

''بعض کے نتائج فوراً سامنے آجائیں گے لیکن تمام میں دیر ہوسکتی ہے۔'' اس کے لہجے میں ذرا سی لچک نہیں تھی۔

''میں اس سے کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا لیکن میں نے خود پر جبر کیا۔

''دو دن میں صورتحال واضح ہوجائے گی۔'' مجھے گم ہم دیکھ کے وہ کہنے لگا۔ ''تمہیں بہتری کی امید رکھنی چاہیے اور یہ یقین بھی کہ تم ایک بہتر جگہ پر ہو۔''

''ڈاکٹر صاحب!'' میں نے ہمت جمع کرکے کہا۔ ''یہ مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہیں۔ باقی چیزیں تو ثانوی ہیں، جان سے زیادہ......''

ڈاکٹر نے میری بات قطع کردی۔ ''ہم اپنی کوشش کررہے ہیں، اپنے امکان بھر۔''

''لیکن میں اپنے امکان سے سوا جاسکتا ہوں اور میرے امکانات محدود نہیں ہیں۔''

''لیکن مرحلے اپنی جگہ ہیں اور ان کے لیے برداشت چاہیے، کسی اور چیز سے زیادہ......'' ڈاکٹر رائے کے لہجے کی تلخی صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔

''ڈاکٹر صاحب! مجھے معلوم نہیں، آپ سے یہ کہنا مناسب ہے یا نہیں مگر از راہِ کرم، اس سے بہتر کوئی صورت، کوئی اور جگہ ہو تو مجھے بتایئے۔ اس شہر میں یا کہیں اور کلکتہ، بمبئی، دلی...... میں کہیں بھی جاسکتا ہوں، ہندوستان سے باہر بھی۔''

''اب اس کا وقت نہیں ہے۔ اس سے بہتر جگہیں یقیناً بے شمار ہیں لیکن مریض کی حالت فی الحال ادھر سے ادھر منتقل کرنے کی نہیں۔'' وہ کسی قدر بے اعتنائی سے بولا۔ ''بہر حال، تم جو چاہو فیصلہ کرسکتے ہو۔ ذمے داری، ظاہر ہے، تمہاری ہوگی۔''

''میرا مطلب غلط نہ سمجھئے۔ میرا مقصود مریض سے اپنے تعلق کا اظہار ہے۔ میری جان، میں جانتا ہوں، کسی کام کی نہیں لیکن ثانوی چیزیں اہمیت رکھتی ہیں اور بہت سے لوگ تو انہیں جان سے زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ میرے لیے میرا مریض ہر چیز سے زیادہ اہم ہے۔ آپ بڑے ڈاکٹر ہیں۔ آپ کے مشوروں کے بغیر میں کوئی فیصلہ کرنے کی جراٗت نہیں کرسکتا بلکہ اس وقت تو مجھ میں کسی نتیجے تک پہنچنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ میرا حال سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ میں ہاتھ جوڑتا ہوں آپ کے آگے......''

''دیکھو نوجوان! اب ہم پر چھوڑ دو، جہاں جاؤ گے، یہی کچھ ہوگا۔ انہی مرحلوں سے گزر کے کوئی رائے قائم کی جائے گی۔ ایلوپیتھی طب کا اپنا ایک منظم طریق کار ہے۔''

میں چپ ہوگیا۔ اتنی دیر میں بٹھل کا بستر گھیرے ہوئے ڈاکٹر رائے کے ماتحت اس کے پاس سے ہٹ چکے تھے۔ ڈاکٹر رائے نے میرا بازو پکڑ کے مجھے حوصلے اور اعتماد کی تلقین کی اور کمرے سے چلا گیا۔

باہر اسے رخصت کرکے نرس سیورین کمرے میں واپس آگئی اور اس نے مجھے بٹھل کی جیبوں میں رکھی ہوئی چیزیں تحویل میں لینے کی تاکید کی۔ بٹھل کو ایکس رے کے لیے لے جانے سے قبل انہیں اسے اسپتال کا رسمی لباس پہنانا تھا۔ میرے تو ہاتھ پاؤں ویسے ہی پھول رہے تھے۔ میں یہ کہنے والا تھا کہ نرس یہ کام خود کرے لیکن معاً مجھے

خیال آیا کہ بٹھل کی جیب میں چاقو بھی ہوگا۔ اسے کرتے کے نیچے بنیان کی جگہ ہلکی بنڈی پہننے کی عادت ہے۔ ہوسکتا ہے، کوئی اور ہتھیار بھی اس کے پاس ہو۔ سیورین کو جلدی تھی مگر وہ سامنے کھڑی تھی۔ جیبوں سے برآمد ہونے والی ہر چیز اس کی نظر میں آسکتی تھی۔ اس کی عدم موجودگی ہی میں مجھے جامہ تلاشی کا یہ اذیت ناک فریضہ انجام دینا چاہیے تھا۔ میں نے ناوقت سہی مگر چائے کی خواہش ظاہر کی تو وہ فوراً کمرے سے چلی گئی۔ بٹھل کے بستر پہ پہنچ کے اس کی جیبوں میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے میں نے اسے آہستہ سے پکارا۔ اس کے پپوٹوں میں کلبلاہٹ ہوئی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ میں نے بے ربطی سے اسے بتایا کہ مجھے اس کی جیبیں خالی کرنی ہیں۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار ہویدا ہوئے۔ معلوم نہیں، اس نے کچھ سمجھا کہ نہیں۔ سیورین کسی لمحے واپس آسکتی ہے۔ میں نے جلدی جلدی باہر سے کپڑے ٹٹول کے پہلے چاقو نکالنا چاہا۔ چاقو کرتے کی جیب ہی میں تھا۔ میں نے اسے واسکٹ کی جیب میں محفوظ کیا اور گریبان کے بٹن کھول کے بنڈی دیکھیں۔ بنڈی کی دونوں جیبوں میں نوٹوں کی دو گڈیاں تھیں۔ کوئی اور ہتھیار کسی جیب میں نہیں تھا۔ کپڑوں میں اور جیبیں بھی تھیں لیکن مختلف مالیات کے نوٹوں کے علاوہ مجھے کچھ اور نہیں ملا۔ کرتے کی جیب میں چاقو کے ساتھ چند سکے بھی پڑے ہوئے تھے۔ سیورین کو باہر گئے منٹ دو منٹ ہوئے ہوں گے کہ واپس آگئی اور اس نے تکیے کے نیچے رکھی ہوئی واسکٹ نکال کے مجھے دی۔ اپنی بدحواسی میں مجھے اس واسکٹ کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں تھا کہ رات کس وقت نرس ایمی یا کسی اور نے یہ واسکٹ اتاری تھی۔ حالاں کہ میں تو رات بھر جاگتا ہی رہا تھا۔ مجھے صرف اتنا یاد تھا کہ اس سے پہلے والے کمرے میں ڈاکٹروں نے بٹھل کے جسم کا معائنہ کرتے ہوئے واسکٹ کے دونوں پٹ کھول دیے تھے۔ اسپتال سے رخصت ہوتے ہوئے شاید، ایمی مجھے واسکٹ کے بارے میں بتانا بھول گئی۔

سیورین سے واسکٹ لے کے میں صوفے پر آگیا۔ اس کی مختلف جیبوں میں بھی سوٹ کیس کی چابیوں کے علاوہ خاصے پیسے تھے۔ سینے کے حصے کی اندرونی جیبیں اندرونی بٹن سے بند تھیں۔ دائیں طرف کی جیب کا بٹن کھولنے پر میری انگلی میں ریشمی ڈوری آگئی۔ ڈوری کا ایک حصہ بٹن سے لپٹا ہوا تھا، اسے کھینچنے پر دوسرے حصے سے ملحق پان کے بٹوے کی شکل کی مختصر سی عنابی مخملی تھیلیا برآمد ہوئی۔ تھیلیا کے سکڑے ہوئے منہ پر ڈوری سے گرہ لگی ہوئی تھی اور آسانی سے نہیں کھل سکتی تھی۔ اس احتیاط سے ظاہر تھا کہ اندر کوئی قیمتی چیز موجود ہے۔ وہ ہیرے ہی ہوسکتے تھے۔ ٹٹولنے سے کچھ یہی اندازہ ہوتا تھا۔ تھیلیا میں روئی بھری تھی۔ روئی کی تہوں میں ہیرے چھپے ہوں گے جو انگلیوں پر ان کی سطح کی سختی محسوس نہیں ہوتی تھی اور نہ تھیلیا گر جانے پر ہیروں کے ٹوٹنے کا امکان رہا تھا۔ بٹن سے لپٹی ڈوری گھمانے پر تھیلیا آزاد ہوگئی۔ میں نے اسے اپنی واسکٹ کی جیب میں ڈال لیا۔

نرس سیورین کے پیچھے پیچھے اسپتال کے دو کارکن بھی کمرے میں آگئے تھے۔ سیورین نے مجھ سے پوچھا کہ آیا میں نے جیبوں کی اچھی طرح تلاشی لے لی ہے۔ نسبتاً بلند آواز کی وجہ یہی ہوسکتی تھی کہ میرے اقرار کے دو آدمی گواہ رہیں۔ دونوں کارکنوں نے اسپتال کا لباس پہنانے کے لیے بٹھل کے جسم پر لمبی چادر ڈال دی۔ نرس سیورین باہر چلی گئی۔ مجھ سے یہ سب کچھ دیکھا نہیں جاتا تھا۔ سیورین کے پیچھے میں بھی باہر نکل آیا۔ کارکن، بٹھل کا پہیوں والا پلنگ باہر لے آئے تو میں نے بھی ان کی پیروی کی...... ان کی رفتار معتدل تھی لیکن میری ٹانگیں ان کا ساتھ نہیں دے پارہی تھیں۔ وہ زیادہ

دور نہیں گئے اسپتال کی خاص عمارت میں داخلے کے دروازے کے قریب ہی ان کی منزل تھی۔ انہوں نے مجھے دروازے پر روک دیا۔ میں نے ان سے حجت کی کہ یہ آپریشن کا کمرا تو نہیں ہے۔ وہ کہنے لگے کہ ایکس رے کے کمرے میں بھی مریض کے لیے حاضر باش شخص کا داخلہ ممنوع ہے۔ ناچار مجھے باہر ہی رہنا پڑا۔ بٹھل کو اندر لے جاکے انہوں نے دروازہ بھی بند کرلیا۔

اسپتال میں مریضوں اور ان کے متعلقین کی تعداد اس وقت اچھی خاصی تھی۔ مجھ سے ٹھیک طرح اپنے پیروں پر کھڑا بھی نہیں ہوا جارہا تھا۔ وہیں دیوار کے پاس لگی ہوئی کرسیوں میں ایک کرسی خالی ہوئی تو میں نے جلدی سے اس پر قبضہ کرلیا۔ کچھ دیر کے لیے میں آنکھیں بند کرلینا چاہتا تھا لیکن مجھے اپنے آپ پر یقین نہیں تھا۔ دماغ میں جالے پڑے ہوئے تھے کہ مجھے اب کیا کرنا چاہیے؟ میں اور کیا کرسکتا ہوں؟ میری استطاعات میں اور کیا ہے؟ مجھ سے کوئی کوتاہی تو نہیں ہورہی؟ جانے ڈاکٹر کیا فیصلہ صادر کرے۔ اب سب کچھ اسی پر ہے۔ ہم دونوں اسی کے شکنجے میں ہیں۔ اگر اس نے زیادہ دن رکنے کو کہا تو میں اکیلا تو پاگل ہوجاؤں گا۔ یہی بہتر ہے کہ مجھے کسی کو بلالینا چاہیے۔ ابا جان کو تار دوں یا جامو کو مطلع کروں یا زریں کو بلالوں۔ جیسے ہی تار ملے گا، وہ پہلی گاڑی سے آجائے گی۔ بٹھل کی صحیح نگہ داشت وہی کرسکتی ہے۔ اس کے آنے سے مجھے بھی آسرا ہوجائے گا۔ اس میں وہ برداشت اور حوصلہ ہے، ڈاکٹر رائے جس کی تعلیم مجھے دے رہا تھا۔ بٹھل بھی زریں کو پاس دیکھ کے بہت مطمئن ہوگا۔ اچھے تیماردار بھی علاج میں کارگر ہوتے ہیں۔ میرا تو کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ میں یوں بھی ایک ناکارہ آدمی ہوں۔ ایسے وقت میرے حواس تو منتشر ہوجاتے ہیں۔ مجھے کچھ دکھائی سجھائی نہیں دیتا۔ میں اکیلا کوئی بھی غلط قدم اٹھا سکتا ہوں۔

آدھ گھنٹا گزرا یا اس سے زیادہ۔ ایکس ر کے کمرے کا دروازہ کھلنے کے انتظار میں مید آنکھیں پتھرانے لگی تھیں، دروازہ کھلا تو چند قدمو کا فاصلہ میں نے بھاگ کے طے کیا۔ ابھی وہ با نہیں نکلے تھے کہ میں نے اکھڑی ہوئی سانسوں پوچھا۔ ''کیا ہے، سب ٹھیک تو ہے نا؟''

اسپتال کا کارندہ مسکرانے لگا اور ہم دردانہ میں بولا۔ ''ابھی کیا بولیں بھیا صاحب! دھیر رکھو۔ پہلے رپورٹ بنے گا پھر ڈاکٹر دیکھے گا۔ و ٹھیک سے بتائے گا۔'' اس نے مجھے سامنے ہٹ جانے کو کہا۔

وہ بٹھل کو واپس کمرے میں لے گئے اور پہ والی جگہ پر لوہے کا پلنگ ٹھیرا کے وہ جانے لگے تو م نے جیب سے چند نوٹ نکال کے ان کی نذر کر چاہیے۔ وہ تو ایسے گھبرائے جیسے میرے ہاتھ م نوٹ نہ ہوں، بچھو ہوں ــــ دونوں نے ا کردیا۔ میرے اصرار پر کہنے لگے ، ہاں جب مریض صحت مند ہو کے یہاں سے رخصت ہ مٹھائی کھلانا مت بھولیے گا۔

بٹھل کے جسم پر چادر ڈھکی ہوئی تھی اور چہرہ کھ ہوا تھا۔ جانے انہوں نے کون سی دوا دی تھی کہ ا اب تک بے خود پڑا ہوا تھا۔ میں کرسی کھینچ کے ا کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ اتنے میں سیورین آگئی۔ ا کچھ فراغت میں نظر آتی تھی۔ میرے قریب ہی بیٹ گئی اور شگفتگی سے بولی۔ ''سسٹر ایمی بتارہی تھی آپ رات بھر ایک پل کے لیے نہیں سو پائے ہیں بہتر ہوگا، اب آپ آرام کرلیں۔ میں یہاں موجو ہوں۔ ڈاکٹر رائے نے میری ڈیوٹی صرف اس کمرے تک محدود کردی ہے۔''

''آپ کی کچھ بات ہوئی ڈاکٹر صاحب سے؟'' میں نے اضطراری آواز میں پوچھا۔ ''کیا کہتے تھے؟''

''انہوں نے مسلسل مریض پر نگاہ رکھنے کی ہدایت کی ہے۔''

''آپ، آپ کیا سمجھتی ہیں؟''

''میں صرف ایک نرس ہوں۔'' وہ انکسار سے بولی۔

''ہاں۔'' میں نے مایوسی سے کہا۔ ''مگر آپ کا تجربہ بھی ہوگا۔''

''میرا کیا تجربہ۔'' وہ شرما سی گئی اور کہنے لگی۔ ''ڈاکٹر رائے مریض کے معالج ہیں۔ وہ ایک تجربہ کار اور باکمال ڈاکٹر ہیں۔ دور دور سے بیمار انہیں دکھانے آتے ہیں۔''

''مگر انہوں نے ......'' میں نے اٹکتی زبان سے کہا۔ ''آپ کو انہوں نے مستقلاً یہاں معین کیا ہے تو کوئی، کوئی بات تو ضرور......'' میری آواز گلے میں رندھ گئی۔

''نہیں نہیں، ایسا مت سوچیے۔'' اس نے بہ شدت تردید کی۔ ''ان کمروں میں مستقل طور پر نرسیں مقرر کردی جاتی ہیں اگر مریض اور اس کے پرسان حال درخواست کریں۔ کیا آپ نے ڈاکٹر رائے سے خصوصی نگہ داری کی درخواست کی تھی؟''

''جی، جی ہاں۔'' مجھے اس کی صراحت سے طمانیت ہوئی۔ ''میں نے کئی بار ان سے یہ التجا کی ہے۔''

سیورین کے چہرے سے بھی تکدر دور ہوا۔ ''آپ کہاں سے آئے ہیں۔'' اس نے سادگی سے پوچھا۔

''فیض آباد سے۔'' میں نے مختصراً اسے اکبر ر کے اسٹیشن کے حادثے کے بارے میں بتایا۔

''یہ آپ کے کون ہیں؟''

مجھے اس سوال کی توقع تھی۔ میں نے کسی توقف کے بغیر کہا۔ ''یہ میرے بھائی ہیں۔'' اس کے ے پر چمک سی پیدا ہوئی۔ ''اور، اور آپ ان کے بہت قریب ہیں۔'' وہ پلکیں جھپکا کے بولی۔

میری آنکھیں جلنے لگیں اور میں نے بہ مشکل اپنے آنسو ضبط کیے۔

''بھائیوں میں ایسی یگانگت دیکھ کے خوشی ہوتی ہے۔ میری دعا ہے، خدا آپ کے بھائی کو جلد صحت یاب کرے۔'' اس کے لہجے میں کوئی بناوٹ نہیں تھی۔

نرس ایمی صحیح کہہ رہی تھی۔ سیورین ایک شائستہ، شگفتہ اور غم گسار لڑکی تھی۔ وہ نرس تو معلوم ہی نہیں ہوتی تھی۔ خوش صورتی پہ خوش سیرتی متزاد خوبی ہے۔ اس کی انگریزی گوئی میں نفاست، سلاست اور روانی تھی۔ دھیمی آواز میں کلام کرنے کے باوجود آواز کھنکتی تھی، کہنے لگی۔ ''آپ کو تنہائی کی ضرورت ہے تو میں کمرے کے باہر سائبان میں بیٹھ جاتی ہوں۔ آپ یہاں آرام کیجیے۔''

""مجھے نیند نہیں آرہی۔"" میں نے پژمردگی سے کہا۔

""ڈاکٹر رائے ٹھیک ڈیڑھ بجے گھر جاتے ہیں۔ ایک بجے کے قریب شاید وہ یہاں آجائیں۔ پھر شام کو پانچ سے سات تک اسپتال میں رہتے ہیں۔ ابھی ساڑھے دس ہورہے ہیں۔ ایک بجنے میں پورے ڈھائی گھنٹے ہیں۔ اس دوران گھنٹے دو گھنٹے کے لیے آپ آرام کرلیں تو مناسب ہوگا۔""

""پہلے تو مجھے یہ لباس تبدیل کرنا چاہیے۔"" میں نے شش و پنج سے کہا۔ ""مجھے کچھ تار بھی دینے ہیں۔""

""آپ کہاں ٹھیرے ہیں؟""

میں نے اسے بتایا کہ گزشتہ رات اسٹیشن سے ہم گرانڈ ہوٹل میں کمرا محفوظ کرانے گئے تھے۔ سامان رکھ کے فوراً یہاں آگئے۔ پھر ہوٹل واپس جانا ممکن نہ ہوسکا۔ ہوٹل والے ابھی کیا کہتے ہوں گے۔

""گرانڈ ہوٹل ایسا دور نہیں ہے۔"" اس نے لپکتی آواز میں کہا۔ ""ڈاکٹر رائے کے آنے تک آپ واپس آسکتے ہیں۔ مجھ پر بھروسا کیجیے۔ میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی۔""

""مجھے آپ پر پورا بھروسا ہے لیکن......"" میں کہنا چاہتا تھا کہ میرا دل نہیں چاہتا۔

""لیکن کیا......؟"" وہ تجسس سے بولی۔

مجھ سے جواب نہ دیا جاسکا۔

""شاید آپ کا دل نہیں مانتا لیکن آپ اتنی دیر میں اپنا کچھ کام بھی کرلیں گے۔ آپ کے ذہن پر کم از کم یہ بار نہیں رہے گا۔ میں یہاں ہوں۔"" اس نے کسی حد تک التجا انداز میں مشورہ دیا۔

""میں کتنی دیر میں واپس آسکتا ہوں؟""

""ڈیڑھ دو گھنٹے میں آپ اطمینان سے واپس آسکتے ہیں۔ اسپتال کے باہر آپ کو سواری مل جائے گی۔ اسے ساتھ ہی رکھیے۔""

بٹھل کے سرہانے جاکے میں نے ایک نظر اسے دیکھا۔ اس کی غفلت جاری تھی۔ کچھ دیر اسی کش مکش میں گزر گئی۔ مجھے جانا چاہیے یا نہیں۔ سیورین کے چہرے پر چھایا ہوا ثبات دیکھ کے میں نے عزم کرلیا۔ لاؤنج عبور کرکے میں چند قدم ہی گیا ہوں گا کہ سیورین کی آواز آئی۔ اس نے کاغذ کا ایک بڑا تھیلا میرے حوالے کیا۔ میں نے کھول کے دیکھا، اس میں اتارے ہوئے بٹھل کے کپڑے رکھے تھے۔۔ اسپتال کے باہر ہی مجھے تانگا مل گیا۔

دن پوری طرح جاگ چکا تھا۔ سڑکوں پر زندگی رواں دواں تھی۔ تانگے کی رفتار بھیڑ کی وجہ سے متاثر ہورہی تھی۔ کئی بار جی میں آئی کہ واپس چلوں لیکن تانگا ہوٹل کا فاصلہ کم کرتا رہا اور جلد ہی ہوٹل پہنچا دیا۔ رات کا عملہ بدل چکا تھا۔ میں نے کمرے کی چابی طلب کی تو کاؤنٹر پر کھڑے خوش پوش، خوش اطوار نوجوان نے متجسس نظروں سے مجھے دیکھا اور خیریت پوچھی۔ میں نے اسے سرسری بتایا کہ میرے ساتھی کی طبیعت خراب ہوجانے کی وجہ سے سامان ہوٹل میں رکھ کے ہمیں اسپتال جانا پڑا۔ رات وہیں گزری۔ اس نے تاسف کا اظہار کیا اور پوچھا کہ اب ساتھی کا کیا حال ہے؟ میں نے بتایا کہ انہیں اسپتال میں روک لیا گیا ہے۔ جب تک ڈاکٹر اجازت نہ دے، ہم وہیں رہیں گے۔ مجھے جلدی واپس جانا ہے اور میں صرف لباس تبدیل کرنے آیا ہوں۔ وہ فکرمند ہونے لگا کہ یہ ہوٹل خاصا مہنگا ہے۔ اس طرح تو مجھ پر بے جا مصارف کا بوجھ ہوگا۔ میں نے کہا کہ اسپتال میں کوئی شناسا نہیں ہے۔ اب جو بھی ہو۔ وہ ایک شریف النفس نوجوان تھا۔ میرے منع کرنے کے باوجود مجھے ہوٹل کے پختہ کار لیکن چست و مستعد منیجر کے پاس لے گیا اور اسے ساری روداد سنائی۔ منیجر بھی خاصا معقول آدمی تھا۔ پہلے کچھ سوچتا رہا، پھر اس نے پیش کش کی کہ مجھے کوئی عار نہ ہو تو ایک دو روز کے لیے وہ میرا سامان محفوظ کرنے کا بندوبست کرسکتا ہے۔ جب

بھی ضرورت پڑے، میں ہوٹل آکے اپنا سامان کھول سکتا ہوں۔ اسپتال میں خدا نہ کرے، زیادہ دن ٹھیرنے کی صورت میں کسی اور تدبیر پر غور کریں گے۔ میں اس کے شہر اور اس کے ہوٹل میں مہمان ہوں اور مجھ پر اچانک یہ افتاد آپڑی ہے۔ سو وہ اپنی بساط بھر مجھ سے یہی سلوک کرسکتا ہے۔ استعمال کیے بغیر کمرے کا گراں کرایہ ادا کرنا کہاں تک درست ہے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ میرے جواب سے وہ جز بز بھی ہوا، متعجب بھی۔ میں نے کہا کہ میرے لیے یہ زیادہ تسلی کی بات ہوگی کہ میں کمرا اپنے پاس ہی رکھوں۔ ڈاکٹر بھی مرض کی نوعیت جاننے کی کوشش کررہے ہیں۔ دو ایک دن میں ساری صورت حال واضح ہوجائے گی۔ منیجر مجھ سے طرح طرح کے سوالات کرنے لگا۔ میں نے معذرت کی کہ مجھے اسپتال پہنچنے کی جلدی ہے۔ میری عدم موجودگی میں کہیں ڈاکٹر نہ آجائے۔ وہ خاموش ہوگیا اور اس نے کرسی سے اٹھ کے مجھے رخصت کیا۔ بٹھل کی صحت یابی کے لیے دعا کی اور کہا کہ ہوٹل کے علاوہ بھی کوئی کام ہو تو میں بے تکلف اس سے کہہ سکتا ہوں۔ میں نے گزارش کی کہ میں اپنے اعزا کو تار بھیج رہا ہوں اور ہوٹل کا پتا دے رہا ہوں۔ میری بات پوری ہونے سے پہلے اس نے پرتپاک انداز میں یقین دلایا کہ جیسے ہی میرا کوئی خط یا تار موصول ہوا، وہ کسی تاخیر کے بغیر اسپتال پہنچا دے گا۔

کمرے میں سامان اسی جگہ رکھا ہوا تھا جہاں رات میں نے چھوڑا تھا۔ بیگ کھولنے پر توشہ دان نظر آیا۔ کھانا اب تو خراب ہوچکا ہوگا۔ خدمت گار کو بلا کے میں نے توشہ دان اس کے سپرد کیا کہ اسے خالی کرکے واپس کمرے میں رکھ دے۔ دس روپے کی بخشش پر اس نے جھک کر سلام کیا اور کوئی اور خدمت بجالانے کے لیے بے قرار ہوگیا۔ وہ چلا گیا تو ایک بیگ خالی کرکے میں نے اس میں بٹھل کا سیفٹی ریزر، صابن، برش، پھٹکری کی ڈلی، منجن، کنگھی، آئینہ، رومال اور اپنا بھی کچھ یہی سامان اور اپنا اور بٹھل کا ایک ایک جوڑا رکھا۔ ہوٹل میں کپڑوں کی دھلائی اور استری کا اہتمام تھا لیکن استری میں دیر لگتی۔ کپڑوں پر ایسی شکنیں بھی نہیں پڑی ہوئی تھیں۔ اسپتال میں مریض کے ساتھ رہنے والے کے لیے بھی کمبل موجود تھا۔ میں نے اپنا کھیس بھی رکھ لیا اور حفظ ماتقدم کے طور پر بمبئی کے بینک میں جمع کرشنا جی کی عطیہ رقم کی چیک بک بھی بیگ میں ڈال دی۔ منہ ہاتھ دھو کے کپڑے بدلنے کا ارادہ تھا۔ غسل خانے میں آکے چپ چپاہٹ کا احساس ہوا۔ نہانا کیا، بس جسم بھگویا اور خشک کرلیا اور خاصی تازہ دمی محسوس ہوئی۔ میلے کپڑوں کی جیبیں خالی کرتے ہوئے اپنی واسکٹ کی نچلی جیب میں چرمی بٹوا دیکھ کے مجھے حیرت ہوئی۔ بٹوا بہت نرم و نفیس تراش خراش کا اور بالکل نیا تھا اور نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ سفر میں کئی بار جیب بھاری بھاری لگی تھی لیکن اس یقین سے میں نے ایسی توجہ نہیں دی تھی کہ زریں کے سوا کون ہوسکتا ہے۔ وہ اسی طرح چونکاتی اور اپنی قدر و منزلت فزوں کرتی ہے، اسی نے کوئی چیز رکھی ہوگی، کسی جگہ ٹھیرنے پہ اطمینان سے دیکھوں گا۔ میرے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ یہ نوٹوں سے بھرا ہوا بٹوا ہوسکتا ہے۔ میری واسکٹ میں، بٹھل کی واسکٹ سے نکالی ہوئی نوٹوں کی دو گڈیاں بھی تھیں، انہیں سوٹ کیس میں محفوظ نہیں کیا جاسکتا تھا اور اتنی رقم مستقل ساتھ رکھنی بھی حماقت معلوم ہوتی تھی۔ ہیروں کی تھیلیا... کا تو کوئی وزن ہی نہیں تھا۔ عجلت کے خیال سے نہ میں نے اس کی گرہ کھولی نہ اپنے پاس موجود رقم گننے اور مالیت کا اندازہ لگانے میں وقت ضائع کیا جس طرح ہیروں کی مخملی تھیلیا اور روپے پرانی واسکٹ کی جیبوں میں رکھے ہوئے تھے، اسی ترتیب سے نئی واسکٹ کی جیبوں میں رکھ لیے۔ بٹھل کا چاقو اس

کے سوٹ کیس کے خفیہ خانے میں چھپایا۔ اسپتال میں اپنا چاقو ساتھ رکھنا غیر ضروری لگتا تھا لیکن میں اسے سوٹ کیس میں رکھتے رکھتے رہ گیا اور کسی نا معلوم اندیشے میں، کرتے کی جیب میں ڈال لیا۔ گھنٹی بجانے پر خدمت گار پھر حاضر ہوگیا۔ میلے کپڑے اس کے حوالے کر کے تیز قدموں سے میں نے کاؤنٹر کا رخ کیا۔ کاؤنٹر کے وسط میں نصب گھڑی میں ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ گویا مجھے ہوٹل میں آئے قریباً آدھ گھنٹا ہی گزرا تھا۔

کاؤنٹر پر تعینات نوجوان نے خندہ پیشانی سے میرا استقبال کیا۔ ہوٹل سے نکلتے نکلتے مجھے خیال آیا، کیوں نہ نوٹوں کی گڈیاں منیجر کے پاس جمع کردوں۔ وہ ذمے دار شخص معلوم ہوتا ہے۔ کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو بعد میں دیکھ لیں گے۔ واپس کاؤنٹر پر آکے میں نے نوجوان سے مشورہ کیا۔ وہ مجھے دوبارہ منیجر کے پاس لے گیا۔ بیس ہزار روپے کی رقم دیکھ کے منیجر مخمصے میں پڑ گیا۔ میرے اصرار پر پس و پیش کے بعد آمادہ ہوا اور خزانچی کو طلب کر کے رقم امانتہً محفوظ کرنے کا حکم دیا۔ وہ تازہ نوٹوں کی گڈیاں تھیں۔ خزانچی نے دو بار نوٹ گنے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس کام میں پندرہ بیس منٹ صرف ہوجائیں گے۔ خزانچی بہت محتاط تھا۔ رسید لکھتے وقت بھی اس نے بڑی دیدہ ریزی کی۔ فیض آباد کا پورا پتا لکھا اور میرا وقت گنوایا۔

باہر تانگے والا میرا منتظر تھا۔ سیورین نے کمرے میں ڈاکٹر کی آمد کا وقت ایک بجے بتایا تھا۔ ابھی سوا گھنٹا باقی تھا۔ تانگے والے نے مجھے کچھ فاصلے پر واقع ڈاک خانے پہنچا دیا۔ یہاں سے تار بھی دیے جاسکتے تھے۔ ڈاک خانے میں اچھی خاصی بھیڑ تھی۔ تار فارم حاصل کر کے پہلے میں نے ابا جان، جامو اور زریں کو بٹھل کی بیماری کا حال لکھا۔ ابا جان کو تار لکھتے ہوئے مجھے کیلاش یاد آیا۔ وہ بھی تو ڈاکٹر ہے بلکہ اس کی بہن رما بھی ڈاکٹر ہے۔ گو ڈاکٹری کرتی نہیں ہے مگر کیلاش تو باقاعدہ اسپتال میں ہے۔ میں اسے کیوں نہ یہاں بلالوں۔ میرا تار ملتے ہی چل پڑے گا۔ بمبئی بہت دور ہے لیکن وہ چاہے تو ڈیڑھ دو دن میں یہاں پہنچ سکتا ہے۔ اس کے آجانے سے مجھے بڑی آسانی ہوجائے گی۔ پھر میں نے تینوں تار فارم تلف کردیے۔

بیماری کی اطلاع سن کے بھی پریشان ہوجائیں گے۔ جب تک ڈاکٹر رائے کسی نتیجے تک نہ پہنچے، مجھے تحمل کرنا چاہیے۔ جامو تو فوراً کلکتے سے نکل کھڑا ہوگا اور جانے اس کے ساتھ اڈے کا کون کون آدمی آجائے۔ تار پہنچنے کے بعد بات چھپی نہیں رہے گی۔ کوئی کتنا ہی انہیں روکے، کلکتے میں بٹھل کے بہت فدائی ہیں، وہ نہیں رکیں گے۔ اسپتال میں ان کی آمد سے ہڑبونگ مچ سکتی ہے۔ ادھر فیض آباد میں زریں کا بھی یہی حال ہوگا۔ وہ بھی وہاں نہیں ٹھیرے گی اور ابا جان کتنے ہی اپنے آسودگی کے معاملات میں گھرے ہوں، بٹھل کا سن کے ذرا بھی دیر نہیں لگائیں گے ...... لوٹا

بھی بٹھل سے پوچھے بغیر کسی کو بھی اس کی حالت کے بارے میں کچھ نہیں لکھنا چاہیے لیکن جامو کو پٹنے میں اپنی موجودی کا تار دینا ضروری تھا۔ بٹھل، فیض آباد میں پولیس افسر ورما کو مطمئن کر کے آیا تھا کہ وہ جہاں بھی ہوگا، پولیس کی طلبی پر ایک دو دن میں فیض آباد پہنچ جائے گا اور یہ اس صورت میں ممکن تھا کہ جامو کو سفر میں ہمارے ٹھکانوں سے آگہی ہوتی رہے۔ پولیس نے ہمیں فیض آباد سے نکلنے دیا تھا اور کوئی شرط بھی عاید نہیں کی تھی لیکن ان کے اطوار سے ظاہر تھا کہ ان کے دل ہماری طرف سے صاف نہیں ہیں۔ ہوسکتا ہے، فیض آباد سے ہمارے چلے جانے کے بعد وہ دیکھنا چاہتے ہوں کہ ہمارے رابطے کہاں کہاں ہیں۔ فیض آباد اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں ایک شخص ہماری نگرانی پر مامور کیا گیا تھا۔ معلوم نہیں وہ ہمارے ساتھ گاڑی میں بھی سوار ہوا تھا یا نہیں یا انہوں نے کسی اور شخص کو ہمارے تعاقب کی ذمے داری سونپی تھی۔ اکبر پور اسٹیشن پر نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ ہمیں نگاہ میں رکھنے والا بھی بہت متاثر ہونے والوں میں شامل ہوسکتا ہے۔ میں نے پھر صرف دو مختصر فارم بھرے، ایک جامو کے نام، دوسرا زریں کے۔ دونوں کا مضمون ایک تھا کہ ہم پٹنے کے گرانڈ ہوٹل میں مقیم ہیں اور تا اطلاع ثانی یہیں رہیں گے۔

تار کی کھڑکی پر قطار لگی ہوئی تھی۔ تار کا مطلب ہے، جلد سے جلد اطلاع کی ترسیل۔ ہر ایک کو جلدی تھی اور مجھے ان سب سے زیادہ، کھڑکی کے پار کوئی سست رو شخص بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ایک ایک لفظ بار بار گن کے حساب لگاتا، پھر پیسے وصول کرتا تھا۔ اسپتال واپسی کا وقت تنگ ہوتا جارہا تھا۔ میں نے تار دیے بغیر واپسی کا قصد کرلیا تھا کہ سوچا، پوسٹ ماسٹر سے بات کر کے دیکھوں۔ شاید کوئی بھلا آدمی ہو۔ اس کے کمرے میں داخل ہوکے میں نے اپنی عجلت اور اس کی وجہ مختصراً بیان کی۔ میں نے کہا کہ میں تار فارم اور مطلوبہ رقم اس کے پاس چھوڑے جاتا ہوں۔ وہ ایک اجنبی سے اتنی مہربانی کرے کہ میرے یہ تار روانہ کروادے۔ میں نے دس روپے کا نوٹ اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں لیکن اس دوران اس نے تار کا مضمون پڑھ لیا تھا۔ ہوٹل کا نام دیکھ کے اس کی آنکھیں چوڑی ہوئیں۔ اس نے سر اٹھا کے مجھے گھور کے دیکھا اور بولا۔ ”مگر یہ پیسے تو زیادہ ہیں۔“ میں نے کہا کہ دونوں تار ارجنٹ کردیے جائیں۔ میں کل پرسوں آکے رسید اور باقی پیسے لے جاؤں گا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اس کا شکریہ ادا کرتا ہوا کمرے سے نکل آیا۔

ابھی میں ڈاک خانے کی عمارت میں تھا کہ گیروے رنگ کے کرتے اور سفید پاجامے میں ملبوس ایک نوجوان نے پیچھے سے ”بابو صاحب۔“ کہہ کے آواز دی۔ میں نے ٹھیر کے اور پلٹ کے دیکھا۔ وہ لپک کے میرے سامنے آگیا اور اس نے ایک تار فارم میری طرف بڑھا دیا اور عاجزی سے بولا۔ ”اپنا ابھی ایک تار بھر دیو بابو صاحب، ہمری ماتا جی......“ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی۔ میں اپنی معذوری کا اظہار کرنا چاہتا تھا کہ پہلو سے ایک دوسرا، اسی قماش کا ایک اور نوجوان تار فارم ہاتھ میں لہراتے ہوئے آموجود ہوا۔ اس کا لہجہ پہلے والے نوجوان سے لجاجت آمیز تھا۔ وہ تو تقریباً مجھ سے چمٹ گیا تھا اور پہلے والے نوجوان سے سبقت لے جانے پر تلا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کے پہلے والے نے میرا بازو پکڑ لیا۔ دونوں اس طرح منتیں کرنے لگے جیسے بھیک مانگ رہے ہوں۔ وہ مجھے کوئی عذر پیش کرنے، یہاں تک کہ فارم بھرنے کی مہلت بھی نہیں دے رہے تھے۔ میں ابھی کچھ سمجھنے کی کوشش کررہا تھا کہ فارم بھروانے کے لیے اتنی منت سماجت کی کیا ضرورت ہے، ڈاک خانے میں اور بہت سے پڑھے لکھے لوگ موجود ہوں گے۔ یکایک مجھے اپنے دائیں طرف، ٹانگ میں چبھن محسوس ہوئی۔ دوسرے لمحے میں اچھل پڑا۔ دوسرا نوجوان چابک دستی سے میری جیب سے کچھ نکالنے میں کام یاب ہوگیا تھا۔ وہ تو جیب میں اس کے ہاتھ ڈالنے پر تہہ میں پڑے ہوئے چاقو کی حرکت کی وجہ سے مجھے احساس ہوگیا ورنہ خبر بھی نہ ہوتی۔ میرا ہاتھ اس کی گردن تک پہنچ جاتا کہ ادھر پہلے والے نوجوان کی عاجزی میں شدت آگئی۔ کچھ اس کی داد فریاد اور بازو جکڑنے کے سبب سے میری توجہ منتشر ہوئی، کچھ میری حواس باختگی۔ اس اثنا میں دوسرے نوجوان نے عمارت کے دروازے کی طرف تقریباً جست لگائی۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز دبی ہوئی ہے۔ اب سب کچھ ذہن میں صاف ہوگیا تھا۔ پہلے والے نوجوان کو دھکا دے

کے میں نے خود سے دور کیا اور دروازے کی جانب دوڑ لگائی۔ دوسرا عمارت سے نکل کے دائیں طرف مڑ گیا تھا۔ میں نے پوری قوت سے اس کا پیچھا کیا۔ کاش میں اس پر لعنت بھیج کے تعاقب چھوڑ دیتا۔ وہ بے تحاشا بھاگتا ہوا پہلی گلی میں مڑ گیا اور اس سے پہلے کہ میں اس کے سر پر پہنچوں، اسے جیب سے چاقو نکالنے اور چشم زدن میں کھولنے کا موقع مل گیا۔

میرا دماغ الٹ گیا تھا میں اندھا ہو گیا تھا۔ مجھے فی الفور وہاں سے واپس ہو جانا چاہیے تھا۔ اس کی بھپکی سے خون کھولنے لگا۔ میں نے بھی پھر اپنی رفتار سست کی اور ٹھیر گیا۔ وہ چاقو گھماتا رہا۔ آہستہ قدموں سے میں نے اس کے قریب ہونا شروع کیا۔ مجھے نہتا اپنی جانب بڑھتا دیکھ کے اسے ہراساں نہیں تو متوحش ہو جانا چاہیے تھا۔ وہ اچکا تھا، ایک نظر میں اس کا تخمینہ ہو گیا تھا کہ چاقو سے اس کی نسبت کس قدر ہے اور وہ کتنی دیر ٹکنے والا ہے۔ بتدریج اپنی جانب میری پیش قدمی سے غیر ارادی طور پر وہ پیچھے ہٹا۔ گلی میں اتنی گنجایش نہیں تھی۔ یقیناً اپنے پاس چاقو کی موجودی سے برتری کا کوئی احساس اس پر غالب ہوا۔ وہ بھپکیاں دیتا ہوا میری طرف بڑھا۔ مجھے معلوم تھا، وہ چاقو مارنے کے بجائے مجھے خوف زدہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ میں نے ایک قدم بڑھ کے فاصلہ اور کم کیا۔ چاقو والا ہاتھ بڑھانے میں اس کا تامل وتردد لازم تھا۔ میں اس کے خاصا قریب ہو چکا تھا اور اسے میرے دماغی توازن پر شبہ ہونا چاہیے تھا۔ ایسی صورت میں، احتیاط کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے۔ اس نے جھجکتے ہوئے پھر چاقو بڑھایا۔ میں تیزی سے دائیں پہلو ہوا پھر بائیں۔ تین چار بار اس عمل کی تکرار سے اسے متذبذب کرنا مقصود تھا۔ وہ کبھی اس طرف ہاتھ بڑھاتا کبھی اس طرف۔ میں نے اسے مزید آزمایش سے دوچار نہیں کیا، ایک بار مجھے دائیں طرف ہوتا دیکھ کے اس نے اسی جانب ہاتھ بڑھایا تھا کہ میں یک دم بیٹھ گیا اور اسی لمحے اٹھا تو اس کے چاقو والے ہاتھ کی کلائی میرے پنجے میں تھی۔ یہ حربہ میں نے پہلے بھی کسی جگہ اختیار کیا تھا اور نتیجہ اچھا ہی نکلا تھا۔ ساتھ ہی میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کے پیٹ پر ضرب لگائی۔ وہ بہت زور سے چیخا اور بلبلانے لگا۔ چاقو اس کی انگلیوں کی گرفت میں قائم نہ رہ سکا۔ اسے پھر میں نے سنبھلنے کی فرصت نہیں دی۔ اس کی گردن اور پسلیوں پر پے در پے ضربیں لگائیں۔ وہ دہرا ہو گیا اور ادھ موا ہو کے پیٹ پکڑے وہیں ڈھیر ہو گیا۔ وہ اب مزاحمت کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ میں نے آسانی سے اس کے کرتے کی جیب سے اپنا بٹوا نکال لیا۔ میری جیب میں کھلے روپے بھی تھے وہ بھی میرے ہاتھ میں آ گئے۔ میرا وزنی چاقو جیب کی تہہ میں پڑا ہوا تھا اس لیے انگلیاں چاقو تک نہ پہنچ سکیں اور اسے میری جیب میں چاقو ہونے کا گمان بھی نہ ہو گا۔

اس سے نمٹنے میں چند منٹ ہی لگے ہوں گے۔ تین چار زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ۔ اس دوران ان گلی میں کئی راہ گیر جمع ہو چکے تھے۔ جیب کترے کی چیخوں اور کراہوں سے آمنے سامنے کے مکانات کے دروازوں کی آڑ اور کھڑکیوں سے عورتیں اور بچے بھی جھانکنے لگے تھے اور شور گونجنے لگا تھا۔ کوئی راہ گیر قریب نہیں آیا۔ انہوں نے درمیان میں پڑا چاقو دیکھ لیا تھا۔

میں نے شکستہ حال نوجوان کا چاقو زمین سے نہیں اٹھایا۔ اس سے نمٹنے میں گو ساری توجہ مرکوز رہی تھی لیکن میں اس کے دوسرے ساتھی سے بھی غافل نہیں رہا تھا۔ ڈاک خانے میں تار فارم پر کرانے کے لیے مجھ سے التجا کرنے والا پہلا شخص یقیناً اسی کا ساتھی تھا۔ جیب کترے عموماً تنہا نہیں ہوتے، یہی ہوا۔ میں جلد سے جلد گلی سے نکل جانا چاہتا تھا۔ ابھی میں مڑے تڑے ہوئے نوجوان کو ٹھوکر مار کے پلٹا ہی تھا کہ ڈاک خانے کی سڑک سے دو آدمی دیوانہ وار گلی میں نمودار ہوئے۔ دونوں نہتے تھے۔ گلی میں داخل ہوتے ہی انہوں نے مجھے آتے دیکھا تو ٹھٹک کے رک گئے۔ راہ گیر اور تماشائی، گھن گھناتا شور اور کچھ فاصلے پر اپنے ساتھی کے حال سے سارا ماجرا انہیں سمجھ جانا چاہیے تھا۔ سامنے کھلا چاقو بھی پڑا ہوا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ایک ساتھ جیبوں میں ہاتھ ڈال کے چاقو نکال لیے اور زقند لگاتے ہوئے بھاگنا شروع کر دیا۔ میں ایک کی توقع کر رہا تھا۔ وہ دو تھے۔ ان کی آمد میں اتنی دیر کی کوئی بھی وجہ ہو سکتی تھی۔ یا تو انہیں اپنے ساتھی کے فرار کی سمت کا علم نہیں تھا یا پھر تیسرے ساتھی کو اطلاع دینے اور اسے ساتھ لانے میں کچھ وقت صرف ہوا۔ میرے لیے مفر کی ایک یہی صورت تھی کہ سڑک پر جانے کے بجائے میں گلی میں مخالف سمت بھاگنے لگوں مگر آگے گلی کے طول عرض کا بھی مجھے کوئی علم نہیں تھا۔ مجھے اب وحشت ہونے لگی تھی۔ مجھے تو اسپتال پہنچنا ہے، وقت تیزی سے گزر رہا ہے اور وہ مجھے اس طرح جانے نہیں دیں گے۔ ایک ہی صورت تھی کہ میں ان سے بات کرنے کی ایک کوشش کروں۔ وہ مان جائیں تو ٹھیک ہے۔ میں بٹوا ان کے حوالے کر دوں گا یا پھر ان سے مڈبھیڑ۔ انہوں نے مجھے زچ ہو جانے کا موقع نہیں دیا۔ وہ چاقو لہراتے، چیخ پکار کرتے ہوئے میری طرف بڑھ چکے تھے۔ ان میں ایک تیس سال کے قریب تھا، دوسرے کی عمر بیس بائیس سال ہو گی۔ یہ وہی نوجوان تھا جس نے ڈاک خانے میں مجھے پہلے روکا تھا۔

میں اپنی جگہ ٹھیر گیا اور میں نے دونوں ہاتھ اٹھا دیے اور بلند آواز سے کہا ”ٹھیرو، ٹھیرو، میری بات سنو۔“ میری صدا کا ان پر کچھ اثر ہوا۔ وہ ٹھیر گئے تو میں نے مفاہمانہ لہجے میں کہا۔ ”میری بات دھیان سے سن لو۔ میں دہراؤں گا نہیں۔ میں تمہارے شہر میں اجنبی ہوں میرا ایک عزیز اسپتال میں ہے۔ مجھے جلد اس کے پاس پہنچنا ہے۔ تم لوگوں سے میری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تمہارے ساتھی نے مجھ سے زیادتی کی تھی اسی لیے مجھے اس کے پیچھے بھاگنا پڑا، اس نے چاقو نکال لیا۔ مجھے اسے بتانا پڑا کہ سبھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ہتھیار ایسے ہی ساتھ نہیں رکھا جاتا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں تمہیں بھی دیکھ لیتا لیکن میں نے تم سے کہا ہے، میرے پاس وقت نہیں ہے۔ اپنی مجبوری کی وجہ سے وہ بٹوا میں تمہارے حوالے کر دوں گا جو تمہارے ساتھی نے میری جیب سے نکالا تھا۔ تم لوگ میرے راستے سے ہٹ جاؤ، کچھ غلط مت سمجھنا۔ تم ایک ساتھی کو دیکھ رہے ہو۔ چاقو کا کھیل اچھا نہیں ہوتا۔ کسی کو نقصان پہنچ سکتا ہے اور یہ کوئی اچھی بات نہیں ہو گی۔ تمہیں پیسا چاہیے۔ وہ میں تمہیں دیے دیتا ہوں۔ مجھے فوراً جواب دو۔“

”یوہ! ای کا بڑبڑ کرت ہے۔“ جواب میں زیادہ عمر کے آدمی نے اپنے ساتھی کو دیکھتے ہوئے نخوت سے کہا۔ اس نے چاقو ہوا میں اچھالا اور مہارت سے اسے اچک لیا۔ بٹوا نکالنے کے لیے میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تھا کہ وہ تیزی سے میری طرف جھپٹا۔ میں بٹوا نکال چکا تھا لیکن اس کے تیور اچھے نہیں تھے۔ بشرے ہی سے وہ ایک شورہ پشت آدمی دکھائی دیتا تھا۔ چہرے کی جلد کھردری، چھوٹی چھوٹی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی، تنگ پیشانی، تیل میں چمکتے بال اور بیچ میں مانگ نکلی ہوئی، دانتوں پر پانوں کی تہہ، ناک، ہونٹ اور دائیں طرف کے گال پر چاقو کے نشانات، دبا ہوا قد، گٹھا ہوا جثہ، لکیر والی مونچھ۔ اپنا ہاتھ کھلا رکھنے کے لیے مجھے بٹوا دوبارہ جیب میں ڈالنا پڑا۔ دونوں مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر آ کے رک گئے اور ہاتھ پھیلائے، جسم مٹکاتے، تھرکاتے ہوئے وار کرنے کا تاثر دیتے رہے۔ ”ہم کا، کا سمجھے ہو بوا! ہم، تم کا بھیک منگا دکھائی پڑت ہے؟“ زیادہ عمر

والے نے دھتکارنے والے انداز میں کہا۔
میرے منہ پہ آیا، کہوں کے چوری سے اچھی بھیک ہوتی ہے۔ میں خاموش رہا۔ حجت میں وقت اور ضائع ہوتا۔ بڑے کی چاقو پر دست رس معلوم ہوتی تھی، چھوٹا نوآموز نظر آرہا تھا۔ میں نے اپنی آواز دھیمی رکھی۔ ''پھر تم کیا چاہتے ہو؟''
''تم ہمرا منئی (آدمی) پہ کاہے ہاتھ اٹھائے؟ اس کو مارن ہو، ہاں!'' وہ گرج کے بولا۔
''اور اس نے کچھ نہیں کیا؟'' اس کی ڈھٹائی پر میرا سر چٹخنے لگا۔
''یہی ٹھورا اپنے میدا استاد راج کرت ہیں۔ دوسر کا کونوں حکم نا ہی چے۔ ہم، تم کا بتائے دے کہ جونوں سر میدا استاد کا آدمی پہ ہاتھ اٹھائے تو سمجھو، وہ اس دھرتی پہ نا ہی رہے۔''
''دیکھو استاد!'' میں نے جکڑی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ایسا ہے تو میں پھر آجاؤں گا۔ تم سے وعدہ ہے۔ مجھے اس وقت جانے دو۔ میں تمہارے میدا استاد کے پاس بھی آجاؤں گا۔ مجھ سے اس وقت مت الجھو۔ تم سمجھتے کیوں نہیں۔''
''ہم سارا سمجھت ہیں۔ تم کا الو کا پٹھا دکھائی پڑت ہیں ہم؟ تم کا ایسا نہیں چھوڑ دہیں۔ ابھئی سبک پڑھائے ویت ہیں۔'' میری خاموشی پر وہ زہریلی آواز میں بولا۔ ''تم کا چپ کاہے لگی ہے؟''
''تم مجھے آدمی نہیں لگتے۔'' میں نے شکستگی سے کہا۔ اس کے چہرے پر کئی نقش تھے۔ جی میں آتا تھا، زندگی بھر یاد رہ جانے والا کوئی نقش میں بھی ثبت کردوں۔ آئینے کی طرف کبھی منہ نہ کرپائے۔
''ابھی تم سول آنا ٹھیک سمجھت ہو۔ ہم اپنا میدا استاد کا تمبرا ایک پالتو ہے۔ سمجھا کہ نئیں۔ اس کا پٹا اپنی گردن میں ہے۔'' وہ جو منہ میں آیا، بکتا رہا۔ کوئی بات کہہ کے وہ اردگرد کھڑے تماش بینوں کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھتا یا جیسے انہیں کچھ جتانا چاہتا ہو۔ لوگوں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں تھی لیکن اب ان پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مجھے احساس ہوگیا تھا کہ میری ہر استدعا بے اثر رہے گی۔ ان سے ایسے چھٹکارا نہیں ملے گا لیکن مجھے پہل کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میری خاموشی نے بڑی عمر والے کا اضطراب اور مہمیز کیا۔ اس نے اپنے کم عمر ساتھی کو کوئی اشارہ کیا اور ہچکچاتی آواز میں بولا۔ ''ابھئی تم کا گلا پکڑائے کے استاد کا دربار میں لیے چلت ہیں۔ اس کے آگے ماتھا رگڑنا اور دکشنا بھی دینا۔''
دونوں نے ہاتھ پھیلائے دو قدم بڑھ کے فاصلہ اور کم کیا۔
میں نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی۔ وہ مجھ سے اور قریب ہوگئے۔ بڑی عمر والا چاقو کبھی اس ہاتھ سے لیتا کبھی اس ہاتھ میں۔ مخالف پر اپنی ہنرمندی کی دھاک بٹھانے کے لیے یہ ایک عام اور موثر شیوۂ اظہار ہے۔ اصل میں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ تک چاقو پھینکنے میں ہاتھوں کے درمیان فاصلے اور پھرتی پر بہت کچھ منحصر ہے، کتنا فاصلہ اور کیسی پھرتی۔ پھرتی سے مراد تکرار کی تیزی و تیز رفتاری ہے۔ بعض مشتاق کا ایک ہاتھ چاقو پھینکتا ہے تو دوسرا ہاتھ بے اختیار اسی سمت اٹھتا ہے اور نگاہ کا اس عمل میں کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ ہاتھ مشین بن جاتے ہیں مگر صرف یہی ہنرمندی نہیں۔ یہ کوئی داؤ نہیں، ایک طرف کی بازی گری ہے۔ چاقو پر گرفت ایک خوبی ہے، دوسری خوبی چاقو اور نگاہ، چاقو اور دماغ، چاقو اور بل کا تال میل یا توازن ہے۔ موقع محل کے اعتبار سے مہارت آزمائی جاتی ہے۔ ضرورت پر مرحلہ در مرحلہ۔ پہلے ہی مرحلے پر اپنے جوہر عیاں نہیں کردیے جاتے۔ بھل تو نیت کی بھی بات کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے، نیت کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے اور کہتا ہے، چاقو تبھی اٹھانا چاہیے جب ذہن صاف، آلودہ نہ ہو، کوئی مقصد ہو، بے مقصدی نہ ہو اور تب جب کوئی چارہ نہ ہو۔
میری جانب سے کوئی مزاحمت نہ دیکھ کے بڑی

عمر والے کا بگڑا ہوا چہرہ اور بگڑ گیا۔ اپنے آیندہ اقدام کے بارے میں اسے کش مکش سے دوچار ہوجانا چاہیے تھا۔ میں اسے بت کی طرح دیکھتا رہا۔ اس کا ساتھی اس سے ڈیڑھ گز کی دوری پر ترچھا کھڑا تھا، پر تولے ہوئے۔ زیادہ عمر کا آدمی ایک قدم اور بڑھ آیا۔ میرا خیال تھا، وہ میری جیبوں میں ہاتھ ڈال سکتا ہے لیکن وہ سیانا آدمی تھا۔ اس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ اس کے بجائے اس نے کسی قدر ہچکچاتے ہوئے اپنا خالی ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ ہمارے درمیان اب گز بھر کی دوری رہ گئی تھی۔ اس نے میری ٹھوڑی پکڑی، پہلے آہستہ، پھر پنجہ ٹھوڑی پر کس دیا اور ناخن گڑو دیے اور چاقو بردار ہاتھ اٹھا کے چاقو کی دھار میری ناک پر پھیری، پھر کان پر اور گالوں پر۔ میں نے اپنا جسم منجمد کیے رکھا۔ مجھ پر لمحہ لمحہ پہاڑ کی طرح گراں تھا۔ اس نے چاقو والا ہاتھ دور کرکے میرے منہ پر زور سے مکا مارا......دوسرا، پھر تیسرا......
میں نے سوچا، اس میں کہیں چھپی ہوئی غیرت وحمیت اجاگر کرنے کی ایک کوشش کیوں نہ کروں۔ اس سے کہوں کہ وہ دو ہیں۔ دونوں کے ہاتھ میں چاقو ہیں۔ ایسے میں، میں کیا اپنا دفاع کرسکتا ہوں۔ بہت ممکن ہے، لوگ اردگرد موجود ہیں، وہ کسی خمار یا غرّے میں آجائے اور ہوسکتا ہے، اپنے ساتھی کو پیچھے ہٹا کے اس کا چاقو بھی میرے حوالے کردے۔ یہ تدبیر طوالت انگیز ہوسکتی تھی۔ ان دونوں پر اعتماد بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ان کا تعلق اڈے سے واجبی معلوم ہوتا تھا۔ چاقو تو ہر کوئی چلانا سیکھ لیتا ہے مگر چاقو بازوں کے اپنے کچھ طور طریقے ہوتے ہیں۔ کم عمر نوجوان سے تو کچھ بعید نہیں تھا کہ اس جلد باز کے سر میں کس وقت کیا سما جائے اور میرے اس مطالبے میں دعوے کا پہلو نکلتا تھا۔ میرے بارے میں ان کا لاعلم رہنا ہی بہتر تھا حالاں کہ ان کا ایک ساتھی ابھی تک اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہوسکا تھا اس کی خستہ حالی میری شد بد کی شہادت تھی۔
کسی شعبدہ کاری ہی سے جلد نجات ممکن تھی۔
بہر حال میں نے فیصلہ کرلیا تھا۔ فیصلہ کرنے کے بعد عواقب و نتائج پر توجہ نہیں دینی چاہیے۔ بڑی عمر والے کے مکے کی چوتھی ضرب بھی میں نے برداشت کرلی۔ میں بے حس و حرکت رہا۔ پھر جیسے ہی اس نے پانچویں مکے کے لیے ہاتھ اٹھایا، اس کی ضرب سے بچنے کے لیے میں مخالف سمت کسی قدر جھکتا ہوا مڑ گیا۔ چار مرتبہ کے تجربے کے بعد اسے یقین ہوگا کہ میں اسی طرح ساکت کھڑا رہوں گا۔ جھک کے مڑتے ہوئے میں نے چیخ جیسی صدا بلند کی اور اچھل پڑا۔ یہ غیر متوقع چیخ اسے مزید منتشر کرنے کے لیے تھی۔ وہ ہاتھ اٹھا چکا تھا اور اس کی ساری توجہ پانچویں ضرب لگانے پر مرکوز تھی۔ آناً فاناً بیک وقت میرے جھکنے، مڑنے، اچھلنے اور چیخ مارنے پر لازماً اپنا اٹھا ہوا ہاتھ پیچھے ہٹانے نہ ہٹانے میں اسے تذبذب و تردد ہونا چاہیے تھا۔ مجھے ضرب کی پروا نہیں تھی کہ یہ چہرے کے بجائے جسم کے کسی حصے پر لگتی ہے۔ اس کا چاقو والا ہاتھ بھی شعوری، غیر شعوری طور پہ متحرک ہوا۔ میں نے بھی کچھ طے کرکے اپنی جگہ سے حرکت کی تھی۔
مڑ جانے سے اس کا چاقو والا ہاتھ پوری طرح میری نظروں اور میرے وجود کی نظروں میں تھا۔ اس کے ہاتھ میں کھلا چاقو تھا اور میری ذرا سی چوک سے کہیں بھی پیوست ہوسکتا تھا۔ ادھر سے اضطراب کے عالم میں اس کا چاقو والا ہاتھ مجھے نشانہ لینے کے لیے قریب ہوا، ادھر میرے دونوں ہاتھ اسے روکنے کے لیے اٹھے ہوئے تھے۔ اس صورت میں اسے خود کو سنبھالنے یا سانس استوار کرکے کچھ سمجھنے کے لیے چاقو والا ہاتھ اضطراری طور پر پیچھے بھی کرنا چاہیے تھا۔ اس پر یہ ہیجان طاری نہ ہوتا تو بھی میں تو اپنے ہاتھ بڑھا چکا تھا۔ پلک جھپکنے کی مدت میں میرے دونوں پنجوں کی گرفت

میں اس کی کلائی تھی۔ مجھے اب فوراً دوبارہ اچھل کے اور ذرا سی ڈھیل دے کے اس کے ہاتھ کو جھٹکا دینا تھا۔ میں نے کوئی لمحہ ضائع نہیں کیا۔ میرے اچھلنے اور جھٹکا دے کے جسم کا سارا وزن، سارا زور ڈالنے سے بازو اکھڑ جانا چاہیے تھا۔

یہی ہوا۔ اس کی کرب ناک چیخ دور تک گونجی ہوگی۔ چاقو پھر اس کے ہاتھ میں برقرار نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ پیر پٹخنے لگا۔ میں اسے مزید بے قابو کرنے کے لیے کسی تاخیر کے بغیر ضربیں لگانا چاہتا تھا کہ میں نے دیکھا، اس کا کم عمر ساتھی چاقو سیدھا کیے میری طرف بڑھ چکا ہے۔ وہ گھوم کے میری پشت پر وار کرنا چاہتا تھا۔ میرے پاس یہی راستہ تھا کہ جیسے تیسے میں اس کے پختہ کار ساتھی سے دست بردار ہو کے اب اس سے بچنے کی راہ ڈھونڈوں۔ اس پر ٹوٹ پڑنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ میرے پاس سنبھلنے کا وقت نہیں رہا تھا۔ نوجوان اپنی جھونک میں تیزی سے بڑھ چکا تھا۔ گو مجھے اس کے ساتھی کو چند ایک آزمودہ ضربوں سے بے حال کر کے اس کی طرف ہی پلٹنا یا اس کی دیوار بھی ہٹانا تھی۔ ظاہر ہے، وہ ہاتھ پیر پسارے تماشا تو نہیں دیکھتا رہتا۔ اپنے ساتھی کو محفوظ کرنے کے لیے کوئی طور تو اسے اختیار کرنا تھا اور جواب میں مجھے یہی کرنا تھا کہ اس کے ساتھی کو ڈھال بنائے رکھوں اور اس کی پس پائی تک مسلسل ضربیں لگاتا ہوں۔ نوجوان نے بڑی جلدی کی۔ اسے ابھی ہتھیار ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے تھا۔ بٹھل کے بہ قول، گھوڑے کی طرح نو مشقوں سے ہتھیار بدکتا رہتا ہے۔ میں نے خود کو اور اپنے قبضے میں آئے اس کے ساتھی کو سامنے سے ہٹانے کی پوری کوشش کی تھی۔ نوجوان چاقو بردار خود کو تھام نہ سکا۔ وہ اندھا دھند پاگلوں کی طرح اپنی جگہ سے انڈا تھا۔ اس کا چاقو اپنے ساتھی کی پسلی میں پیوست ہوا۔ پسلی کی رعایت بھی اس سبب سے ممکن ہوئی کہ میں اسے نشانے سے ہٹانے میں کس حد تک کامیاب رہا تھا ورنہ چاقو اس کے پیٹ میں کھب جاتا۔

راہ گیروں اور دروازوں، کھڑکیوں پر کھڑی عورتیں اور بچوں کی سسکاریاں نکل گئیں۔ نوجوان اس ناگہانی، نادیدنی سے ہکا بکا رہ گیا۔ میں اسے سکتے کی اس لمحاتی کیفیت سے دو چار چھوڑ کے بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ اور دیوانہ ہو سکتا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ میں نے اسی حالت میں اس کے بال پکڑ کے اسے کئی ضربیں لگائیں۔ وہ خود بھی بے خبر ہو جانا چاہتا ہوگا۔ ایسے صدمے میں، آدمی کو اپنے حواس کھو دینے، خود سے بے نیاز ہو جانے کی ایک طلب ہوتی ہے۔ اس نے کوئی مدافعت نہیں کی جیسے سزا کے طور پر یہ ضربیں کھا رہا ہو۔ پھر وہ چکرا کے زمیں پر گر گیا۔

میں نے اپنے کپڑے جھاڑے اور ایک نظر لوگوں کی طرف دیکھا۔ کوئی بھی میرے قریب نہیں پھٹکا بلکہ انہوں نے نظریں جھکا لیں۔ بھاگنا بے محل تھا۔ تیز قدموں سے میں نے سڑک کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ دفعتہً شور اٹھا۔ میں نے پیچھے مڑ کے نہیں دیکھا۔ راہ گیر زخمی نوجوان کو اس حالت میں کیسے چھوڑ سکتے تھے۔ خون نے اسے سرخ کر دیا ہوگا۔ کسی نے میرا تعاقب نہیں کیا۔ تعاقب کرتا تو آہٹ ضرور ہوتی۔ گلی سے نکل کے میں ڈاک خانے والی چوڑی سڑک پر آ گیا۔ کوچوان تانگا لیے ڈاک خانے کی عمارت کے پہلو میں بدحواس کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی پوچھنے لگا کہ خیریت تو ہے۔ میں ڈاک خانے سے اس آدمی کے پیچھے کیوں بھاگا تھا۔ کہنے لگا کہ تانگے میں میرا بیگ رکھا ہوا تھا۔ وہ تانگا چھوڑ کے گلی میں جا بھی نہیں سکتا تھا۔ میں اسے کیا کچھ بتاتا۔ میرا تو سر چیخ رہا تھا۔ میں نے اس سے جلد سے جلد اسپتال پہنچنے کی درخواست کی۔ جیسے ہی میں تانگے پر سوار ہوا، گلی سے چند آدمی بھاگتے ہوئے سڑک پر آتے دکھائی دیے۔ سڑک پہ

آ کے انہوں نے خود کو روکا اور بولائے ہوئے انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ کسی کو تانگا نظر آ گیا۔ اسی شخص نے میری جانب سب کو متوجہ کیا۔ کوچوان نے تانگا چلا دیا تھا۔ کوئی بھی تانگے کے پیچھے نہیں بھاگا۔ میں دیکھتا رہا۔ وہ انگلیاں اٹھا کے ایک دوسرے کو میری طرف اشارے کر رہے تھے۔ آگے کچھ فاصلے پر سڑک گھوم گئی اس لیے وہ سارے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

سڑک پر اب بھیڑ زیادہ ہو گئی تھی۔ دھوپ میں بھی خاصی تیزی تھی۔ کچھ ایسا وقت نہیں گزرا تھا۔ زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس منٹ اوپر ہوئے ہوں گے۔ گھڑی یوں وقت کا مستند پیمانہ ہے لیکن کس پر کب کیسا وقت گزرتا ہے، اس کا شمار کون کرے۔ وقت سب پر یکساں نہیں گزرتا سو ہر ایک کے لیے پیمانے بھی جدا ہونے چاہئیں۔ اسپتال دور تھا اور بھیڑ کی وجہ سے تانگے کی رفتار متاثر ہو رہی تھی۔ اگر وہ تینوں واقعی اڈے سے متعلق آدمی تھے تو اڈے کے دیگر آدمیوں کو کسی وقت بھی خبر ہو سکتی تھی۔ بری خبر بے طرح پھیلتی ہے۔ لوگوں کو اس کی جستجو بھی بہت ہوتی ہے۔ میں نے اسپتال کا ذکر کیا تھا۔ یہ ان کا شہر ہے۔ میری تلاش میں اڈے کے آدمی شہر کا کوئی اسپتال نہیں چھوڑیں گے۔ میں نے اپنے سر سے تمام اندیشے جھٹکنے چاہے۔ بعد کی بات بعد کی ہے۔ اس وقت تو مجھے کسی طرح اسپتال پہنچنا چاہیے۔ مجھی سے غلطی ہوئی۔ اس نرس سیورین کے کہنے پر اتنے کم وقت میں مجھے ہوٹل کا رخ ہی نہیں کرنا چاہیے تھا۔ نہ جانے بٹھل کا کیا حال ہوگا؟ ڈاکٹر رائے کمرے میں نہ آ گیا ہو۔ مجھے وہاں نہ دیکھ کے کیا سوچے گا؟''

یہی بہتر نظر آتا تھا کہ تانگے سے اتر کر سڑک پہ بھاگنا شروع کر دوں۔ اس طرح تانگے سے جلدی اسپتال پہنچ سکتا ہوں مگر لوگ ایک آدمی کو بھاگتا دیکھ کے پاگل ہی سمجھیں گے۔ سڑک پر بہت سے سائیکل سوار تھے۔ کاش کوئی سائیکل ہی مل جاتی۔ بھیڑ میں سائیکل گزارنے کی جگہ جلد مل جاتی ہے۔ کیوں نہ تانگے سے اتر کے کسی سائیکل سوار سے التجا کروں کہ وہ مجھے کیریر پہ بٹھا کے اسپتال پہنچا دے یا کسی موٹر والے کو روکوں۔ یوں یوں کرتی اکا دکا موٹریں بھی گزر رہی تھیں۔ شاید کوئی مہربان ہو جائے۔ میں اسے منہ مانگے معاوضے کی پیشکش کروں گا۔ معاوضے کا سن کے وہ ناراض تو ہوگا لیکن اس طرح اسے میری منت گزاری کی اہمیت کا کچھ اندازہ ہو جائے گا۔ کوچوان بھی میری پریشانی سمجھ رہا تھا۔ وہ کبھی گھوڑے کو چابک مارتا، کبھی لگام کھینچتا، طرح طرح آوازیں نکالتا اور گالیاں بکتا تھا۔ وہ بے چارہ اپنے جتن کر رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو آگے چلنے والی گاڑیوں کے اوپر سے تانگا گزار کے آگے لے جاتا۔

ڈاک خانے سے چلے پندرہ منٹ کے قریب ہوئے ہوں گے۔ تانگے نے ابھی بہت کم فاصلہ طے کیا تھا کہ مجھے اپنے کانوں پہ شبہ ہوا مگر سیٹیوں کی گونج واضح تھی۔ پولیس کی سیٹی کی آواز الگ ہوتی ہے۔ میں نے مضطربانہ اپنی نشست سے اچھل کے دیکھا اور میری آنکھیں دھند لانے لگیں۔ دور خاصے فاصلے پر سائکلوں پر سوار کئی پولیس والے مجھے اپنی طرف آتے نظر آئے۔ سادہ لباس میں چند لوگ بھی ان کے ساتھ تھے۔ انہیں بھی تیز رفتاری سے سائکلیں دوڑانے کے لیے راستہ صاف نہیں مل رہا تھا۔ مسلسل سیٹیاں بجانے کا مقصد رکاوٹ بننے والے راہ گیروں اور سواریوں کو ایک طرف سمٹ جانے اور راستہ دینے کی تاکید کرنا ہی ہوگا۔ پولیس کو دیکھ کے لوگ ویسے بھی کنارے ہو جاتے ہیں۔ وہ کسی وقت بھی مجھ تک پہنچ سکتے تھے۔ میں نے خوش گمانی کی کہ شاید انہیں میری تلاش نہ ہو، مجھے خاطر جمع رکھنی چاہیے اور اگر انہیں میری ہی تلاش ہے تو مجھے اپنے اوسان بجا رکھنے کی ضرورت ہے۔ میری

جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کچھ کرتا۔ مجھے ساری صورت حال ان کے گوش گزار کر دینی چاہیے کہ میں نے تو صرف اپنا دفاع کیا ہے۔ میں نے ان سرکشوں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی۔ انہوں نے میری کوئی بات نہیں سنی اور چاقو نکال لیے۔ میرے ہاتھ میں تو چاقو بھی نہیں تھا۔ اس نے دیکھا ہے کہ بڑی عمر کا نوجوان اپنے ساتھی کی نادانی کی وجہ سے زخمی ہوا ہے۔ میرے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ ہے لیکن......لیکن کوئی سنے بھی تو! وہ پولیس کے آدمی ہیں اور پولیس پہلے پولیس ہوتی ہے، بعد آدمی۔ میں تو یوں بھی شہر میں اجنبی ہوں۔ وہ مجھے روک لیں گے۔ میں کتنی ہی دہائیاں دوں، وہ تفتیش حال کے بغیر مجھے جانے نہیں دیں گے۔ انہیں خانہ پری کی عادت ہوتی ہے، اس کی روزی کھاتے ہیں۔ پھر وہ تھانا، سوال و جواب، حوالات......میرا دل ڈوبنے لگا۔ میرے گواہ بہت سے ہیں لیکن صفائیاں اور گواہیاں پیش کرنے میں ایک وقت چاہیے۔ سارے گواہ اسی شہر کے ہیں اور یہ استاد میدا کے زور واثر کا علاقہ ہے۔ اس کے آدمیوں کے خلاف گواہی دینے کی جرأت کوئی کس طرح کر سکے گا۔ گلی میں بھی وہ سارے سہمے ہوئے کھڑے تھے اور انہی نے پولیس کو تانگے اور اس کی سمت کی نشان دہی کی ہوگی۔

طرح طرح کے سودے میرے سر میں منڈ لا رہے تھے۔ سڑک کے دونوں اطراف گلیاں نکلتی تھیں۔ بس یہی سمجھ میں آتا تھا کہ تانگے سے کسی گلی میں داخل ہو جاؤں۔ ممکن ہے، ابھی ان کی نظر تانگے پر نہ پڑی ہو۔ درمیان میں سواریوں کی نقل و حرکت سے کئی بار وہ بھی میری نظروں سے گم ہو گئے تھے۔ شش و پنج کا وقت نہیں تھا۔ مجھے جلد ہی کچھ طے کرنا تھا۔ میں نے جیب سے کچھ روپے نکال کے اگلی نشست پر بیٹھے کوچوان کی طرف پھینکے۔ اس سے کچھ کہنے سننے میں وقت اور ضائع ہوتا۔ ابھی پولیس دور تھی اور سڑک کے مختصر گھماؤ سے تانگا پولیس سے اوجھل ہو جانا چاہیے تھا۔ یہ ایک مناسب موقع تھا۔ بیگ سنبھال کے میں تانگے سے کود پڑا اور چند گز دور واقع گلی میں داخل ہو گیا۔

دس بارہ قدم تک میری رفتار تیز تھی۔ مجھے جلد سے جلد خاص سڑک سے دور ہو جانا چاہیے تھا لیکن اس خیال سے کہ گلی کے راہ گیر میری اس تیزی سے شبہے میں پڑ سکتے ہیں، میں نے رفتار کم کی۔ گلی دور تک سیدھ میں جاتی تھی اور ایک چھوٹے سے چوراہے سے دائیں بائیں گلیاں نکلتی تھیں۔ دائیں طرف کی گلی سے اسپتال کا فاصلہ کم ہونے کا امکان تھا۔ احتیاطاً میں نے مخالف گلی کا رخ کیا۔ ایک اور گلی میں مڑ جانے سے اب میں پولیس کو خاص سڑک سے نکلنے والی سیدھی گلی میں نظر نہیں آ سکتا تھا۔

یہ مسلمانوں کا کوئی قدیم محلّہ تھا۔ دونوں اطراف مسلمانوں کی خاص طرزِ تعمیر کے حامل اونچے نیچے، چھوٹے بڑے مکانات بنے ہوئے تھے، بیش تر پرانے۔ جہاں بھی موڑ آتا، میں اسی گلی میں مڑ جاتا۔ اندر پیچ در پیچ گلیاں تھیں، کہیں تنگ، کہیں کشادہ۔ لگتا تھا، ایک دو دن پہلے نالیاں صاف کی گئی ہیں۔ نالیوں سے نکالی ہوئی سیاہ کیچڑ اور کوڑے کے ڈھیر جگہ جگہ پڑے ہوئے تھے اور ہر طرف کوئی بو سی بسی ہوئی تھی، کھانا پکنے اور کوڑے کرکٹ سے اٹھتی ملی جلی بو۔ سرسوں کے تیل کی بو ان میں غالب تھی۔ اقامتی علاقوں کی گلیوں میں عموماً ایک دوسرے سے واقف لوگوں کی آمدورفت رہتی ہے۔ فقیر اور پھیری والے بھی شناسا ہوتے ہیں۔ گلیوں میں کھیلتے ہوئے بچے، دریچوں اور دروازوں سے جھانکتی عورتیں اور راہ گیر مجھے متجسس نظروں سے دیکھتے تھے۔ یوں منہ اٹھائے گلی گلی گھومنے کا جواز پیدا کرنے کے لیے مجھے کسی جگہ ٹھہر کے کسی کا پتا دریافت کرنا چاہیے تھا۔ مگر کس کا نام لیتا۔

میرے ہوش وحواس ہی ٹھکانے نہیں تھے۔ ایک جگہ آگے جاکے گلی بند ہوگئی تھی۔ اتفاق سے وہاں نسبتہً سناٹا تھا۔ مجھے سر جھکائے واپس آنا پڑا۔ کسی نے مجھے ٹوکا نہیں تھا۔ مجھے اپنے آپ سے بہت خفت ہوئی۔ اندازاً میں خاص سڑک سے خاصی دور آ گیا تھا لیکن اب بھی محفوظ نہیں تھا، متعدد راہ گیروں نے مجھے دیکھا تھا۔ پولیس اس گلی میں آگے جہاں سے داخل ہوا تھا، کسی کو میرا حلیہ بتا کے میری سمت کے بارے میں معلومات کرسکتی تھی۔ مگر مجھے اپنی جیسی کوشش کرتے رہنا چاہیے تھا۔ میں ایک گلی سے دوسری گلی میں چکر کھاتا رہا۔

گلیوں میں لکڑی کی ٹالوں، چونے کے بھٹوں کے علاوہ پرچون فروشوں اور دیگر گھریلو ضروریات کی چھوٹی موٹی دکانیں قائم تھیں۔ مجھے دیکھ کے دکاندار اور خریدار کچھ کہتے نہیں تو چونکتے ضرور تھے اور ان کی تیکھی نگاہیں مجھے اپنے جسم پر کانٹوں کی طرح چبھتی محسوس ہوتی تھیں۔ ایک خالی دکان دار نے مجھے آواز دے کے روک لیا۔ میں سنی ان سنی کرکے نکل جانا چاہتا تھا لیکن وہ اور مشکوک ہو جاتا۔ وہ پوچھنے لگا کہ مجھے کس کی تلاش ہے اور میں کون ہوں۔ مجھے نام بتانے میں جھجک ہوئی پھر میری زبان پر بے اختیار مولوی صاحب کا نام آیا۔ اس نے حیرانی کا اظہار کیا اور کہنے لگا کہ وہ اس محلے کے ہر مکین سے واقف ہے۔ کسی مولوی محمد شفیق کا نام اس نے آج تک نہیں سنا اور پوچھنے لگا کہ آخر کس نے مجھے اس محلے میں مولوی صاحب کے قیام کے بارے میں رہ نمائی کی ہے۔ میں نے کہا کسی نے بھی نہیں، مجھے تو پٹنا شہر کے بارے میں کسی نے بتایا تھا۔ مجھے ٹھیک پتا نہیں معلوم، سو میں مسلمانوں کے محلوں میں جا بجا انہیں تلاش کررہا ہوں۔ میرے جواب سے اس کی سیری نہیں ہوئی۔ وہ کوئی جزئیات بین، دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑانے والا شخص تھا، سوال پر سوال کرنے لگا۔ میری بے ربطی پر اس نے مجھے خبط الحواس سمجھا یا کچھ اور۔ مجھے سمجھانے لگا کہ بہتر ہے، وقت ضائع کرنے کے بجائے میں کسی اور محلے کا رخ کروں۔ گلی میں آگے جانے کے بجائے میں اس کی ہدایت پر عمل کا تاثر دیتا ہوا وہاں سے لوٹ آیا۔

میری ٹانگیں جواب دینے لگی تھیں۔ خاصا وقت گزر گیا تھا۔ اتنی دیر میں پولیس دور چلی گئی ہوگی۔ پھر بھی احتیاط ضروری تھی۔ پولیس کے ہاتھ پڑ جانے کے بعد اپنی دست و پائی کا مجھے اچھی طرح احساس تھا۔ مجھے خیال آیا، ہوٹل بھی ڈاک خانے سے قریب تھا۔ جس مقام سے میں گلی میں داخل ہوا تھا، وہاں سے اور قریب ہونا چاہیے۔ ہوٹل کے منیجر اور کاؤنٹر پہ تعینات نوجوان نے مجھ سے بڑی ہم دردی کی تھی۔ شاید وہی اس وقت میری کچھ مدد کریں۔ پولیس ہوٹل کی طرف نہیں جائے گی۔ کسی کو نہیں معلوم کہ میں گرانڈ ہوٹل میں ٹھیرا ہوا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان دونوں شہدوں، اچکوں نے ہوٹل سے نکلتے ہی میرا پیچھا شروع کردیا ہو اور ڈاک خانے میں جالیا ہو لیکن کچھ تو ہوٹل میں جانے کا خطرہ تو مجھے مول لینا چاہیے۔ وہاں سے ضرور کوئی راہ نکلے گی۔ یہ سوچ کے میں نے واپس سڑک پر جانے کا قصد کیا اور واپسی کا راستہ کہیں کھو گیا۔ میں اندازے سے چلتا رہا اور چلتے چلتے ایک کھلی جگہ پر آگیا۔ سامنے لوہے کے جنگلے کی فصیل کے اندر اونچے اونچے درختوں سے گھرا ہوا ایک بڑا باغیچہ تھا۔ باغیچے کے چاروں طرف بڑے مکانات کا سلسلہ تھا اور ایک جانب مسجد بنی ہوئی تھی۔ موذن ظہر کی اذان دے رہا تھا۔ گویا ایک بج رہا تھا۔ ڈاکٹر رائے کمرے میں آچکا ہوگا۔ نرس سیورین نے بتایا تھا کہ وہ وقت کا بڑا پابند ہے۔ مجھے نہ پاکے جانے اس نے کیا سمجھا ہو۔ وہ بٹھل کے بارے میں مجھے کیا بتانا چاہتا ہو۔ میرے تو اب ہاتھ پیر ٹوٹے جاتے تھے۔ بس یہی جی کرتا تھا کہ وہیں ڈھیر ہو جاؤں، اپنا سر پیٹوں یا منہ نوچوں۔ میں اب کسی طرح بھی وقت پر اسپتال نہیں پہنچ سکتا تھا۔

موذن اذان ختم کرچکا تو میں نے قریب جاکے دیکھا۔ اس وقت وہاں کوئی نمازی نہیں تھا۔ دروازے کے پاس، مدرسہ حنفیہ کی بوسیدہ تختی آویزاں تھی۔ کوئی طالب علم بھی اندر نظر نہیں آرہا تھا۔ مسجد سے ملحق موذن یا امام کا حجرہ بھی ہونا چاہیے تھا۔ کیوں نہ میں اس کے پاس جاکے اپنا حال بیان کروں اور اس کے حجرے میں کچھ دیر پناہ لوں۔ اس طرح مجھے خود کو بحال کرنے کا کچھ وقت مل جائے گا اور پولیس اگر اس طرف آگئی تو مسجد میں داخل ہونے سے اجتناب کرے گی۔ موذن کو میرے سچ پر یقین آگیا تو وہ بھی میری اعانت سے دریغ نہیں کرے گا۔ جوتے اتار کے میں نے مسجد کے صحن میں قدم رکھا تو موذن چٹائیاں بچھا رہا تھا۔ وہ اڑی اڑی، بکھری بکھری ڈاڑھی کا ایک پستہ قد، اوسط عمر شخص تھا، کرتا اور تہمد پہنے ہوئے۔ چہرے پر درشتی تھی اور خود سے بیزار معلوم ہوتا تھا۔ اس سے کسی نرمی اور مہربانی کی امید بہت کم تھی۔ میں نے پانی طلب کیا تو وہ بے دلی سے کٹورے میں پانی لے آیا۔ ایک سانس میں کٹورا خالی کرکے اور چبوترے کا مختصر زینہ پھلانگ کے میں جلد سے جلد باہر آگیا۔

مسجد سے وابستہ باغیچے کی شکل بیضوی تھی اور اس کے گھماؤ کے ساتھ کسی قدر چوڑی اینٹوں کی سڑک چلتی رہتی تھی۔ سڑک اور باغیچے کے بیچ میں حائل جنگلے کی سلاخیں جگہ جگہ سے اکھڑی یا نکلی ہوئی تھیں جب کہ داخلے کے لیے باقاعدہ دروازے موجود تھے۔ دوسری طرف جانے کے لیے لمبا چکر کاٹنے کے بجائے میں نے مسجد کے نزدیک سلاخوں کے درمیان بنے ہوئے راستے سے باغیچے میں قدم رکھا۔ سبزہ برائے نام تھا۔ بچے شاید یہاں کھیلتے ہوں گے اس لیے زمین پر بچھے سبزے کے بیچ بیچ میں مٹی نمایاں ہوگئی تھی اور دھبے پڑے ہوئے لگتے تھے۔ اطراف میں کنارے کنارے لکڑی کی ٹوٹی پھوٹی بینچیں نصب تھیں۔ اندر خاصا سناٹا تھا۔ اب ایک قدم بھی چلنا دشوار ہو رہا تھا کچھ دیر خود کو استوار کرنے کے لیے میں ایک بینچ پر بیٹھ گیا اور چند لمحوں بعد ہی اٹھ گیا کہ میں کسی طور اس غفلت کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ باغیچے کی دوسری جانب نکلتے ہوئے میں نے خود کو سرزنش کی کہ میں کب تک یوں بے سروپا پھرتا رہوں گا۔ مجھے کوئی پروا کیے بغیر یا تو کسی سے راستہ پوچھ کے اسپتال کا رخ کرنا چاہیے یا پھر پولیس کے سامنے خود کو پیش کردینا چاہیے اور اس سے بہتر ہے کہ مجھے کلکتے میں جامو کو ایک اور تار دینا چاہیے کہ وہ جلد از جلد یہاں پہنچ جائے۔ پہلے مجھے قریب ترین جگہ، گرانڈ ہوٹل پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مجھے خود تار دینے کا موقع نہ مل سکا تو ہوٹل والے یہ کام کرسکتے ہیں۔ یکا یک میرے دماغ میں شرارہ سا کوندا۔ کیوں نہ میں کسی راہ گیر سے استاد میدا کے اڈے کا پتا پوچھوں۔ بمبئی میں اس طرح کئی اڈے میرے قبضے میں آگئے تھے۔ میں براہ راست استاد میدا کے پاس جاکے اڈے کی چوکی کا دعوا کرتا ہوں۔ اڈوں کی روایت یہی ہے کہ چاقو اور زور آزمائی سے دعوے کا فیصلہ ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے، فیصلہ میرے حق میں ہوگا۔ اتنا تو مجھے خود پر اعتماد ہے۔ بٹھل بھی مجھ پر یہ اعتماد کرتا ہے۔ استاد میدا کو اس کے اڈے سے میں نے بے دخل کردیا تو سب کچھ خود بہ خود ختم ہو جائے گا۔ اڈے سے وابستہ ہر آدمی نئے استاد کے زیر نگیں ہوگا۔ وہ تینوں بھی جو ڈاک خانے اور اس سے ملحق گلی میں میرے آڑے آگئے تھے۔ اس وقت اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں ہوسکتی۔ استاد میدا کا اڈا یہیں کہیں آس پاس ہوگا۔

میری رفتار غیر ارادی طور پر تیز ہوگئی اور پھر بہت سے دھندلے اندیشوں نے مجھ پر یورش کی۔ اگر نتیجہ مختلف ہوا! ساری چیزیں موافق ہوں تو بھی

بدقسمتی اور ان ہونی کا ایک فی صدا مکان ہمیشہ موجود رہتا ہے اور ملحوظ رکھنا چاہیے۔ یہاں کے اڈوں کے طور طریقے الگ بھی ہوسکتے ہیں۔ استاد میدا کوئی بہت کمینہ اور سفلہ شخص بھی ہوسکتا ہے۔ ادھر بٹھل اسپتال میں پڑا ہے۔ مجھے پہلے تو اس کی فکر کرنی ہے۔ اس کے لیے خود کو محفوظ کرنا ہے۔ چاقو کے ساتھ کسی کے مقابل ہونے میں یک سوئی شرط ہے۔ اور ناکامی کی صورت میں کچھ بھی ممکن ہے، ذرا سی چوک ہوگئی تو تلافی کی گنجایش نہیں ہوگی۔

مجھے کچھ اور سوچنے، کسی اور طرف غور کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ باغیچے کے اس جانب سامنے پڑنے والی پہلی گلی کے پار کوئی بڑی سڑک تھی۔ وہاں راہ گیروں اور سواریوں کی کثرت سے آمدورفت دکھائی دیتی تھی۔ پہلے تو مجھے گمان ہوا، یہ وہ سڑک تو نہیں جہاں سے میں چلا تھا مگر دور، بہت دور پانی نظر آرہا تھا۔ یہ گنگا ندی ہی ہوسکتی تھی۔ باغیچے سے نکل کے میں سامنے والی گلی کی طرف بڑھ رہا تھا کہ عقب سے بھن بھناتا شور سنائی دیا۔ پیچھے دیکھے بغیر میں ایک جانب ہوگیا پھر ایک درخت کی آڑ سے میں نے دیکھا کہ دوسری جانب، باغیچے کے پار، مسجد سے نزدیک گلی کے دہانے پر کئی سائیکل سوار سپاہی سائیکلیں روک کے ادھر ادھر نظریں گھمارہے ہیں۔ ان کے ساتھ اور لوگ بھی تھے۔ وہ گلیوں کے لوگ ہی ہوں گے۔ تماشا ہونا چاہیے، تماشائیوں کی کمی نہیں۔ مجھے یہی خدشہ تھا، گلیوں میں متعدد لوگوں نے مجھے گھومتے دیکھا تھا۔

میرے اور پولیس کے درمیان باغیچے کا فاصلہ اور باغیچے کے درختوں اور جنگلے پر چڑھی بیلوں کا چھدرا پردہ حائل تھا۔ یہی ایک راستہ رہ گیا تھا کہ اپنے آپ کو چھپاتا ہوا سامنے والی گلی تک پہنچ جاؤں۔ اس گلی میں بھی مکانات کا سلسلہ تھا۔ روپوش ہونے کی وہیں کوئی بہتر جگہ مل سکتی تھی۔

بھاگنا کسی طور مناسب نہیں تھا۔ باغیچے کے ساتھ گھومتی ہوئی نسبتاً چوڑی سڑک پار کرکے میں تیز قدموں سے گلی میں آگیا اور مجھے سیٹیوں کی گونج سنائی دی۔ انہوں نے مجھے دیکھا یا نہیں، مڑ کے دیکھنے کا مجھے یارا نہیں تھا۔ گلی کے نکڑ ہی پہ کسی چھوٹی حویلی کی طرز کا ایک دومنزلہ پرانا مکان بنا ہوا تھا۔ گلی میں سیدھے چلتے رہنے سے نظر آجانے کا امکان تھا۔ نکڑ والے مکان کی ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں اسی میں داخل ہوگیا۔ اندر روشنی کم تھی۔ کسی کمرے کے بہ قدر اس ڈیوڑھی میں تین دروازے تھے، ایک سامنے اور دو دائیں اور بائیں۔ دائیں ہاتھ کا دروازہ نزدیک تھا۔ میں نے آہستہ سے دستک دی۔ کوئی جواب نہیں ملا تو میں نے لپک کے بائیں طرف کا دروازہ کھٹ کھٹایا اور احتیاطاً جیب سے چاقو نکال لیا۔ کسی مردانہ آواز نے اندر سے پوچھا۔ ”کون ہے؟“

میں نے پہلے اپنی آواز پر قابو پانے کی کوشش کی اور دبی زبان سے کہا۔ ”دروازہ کھولیے۔“

”کون......کون ہو میاں؟“ اندر سے وہی بھاری بھرکم آواز آئی۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو میں نے جلدی سے کہا۔ ”ذرا باہر آئیے۔ آپ کے لیے ایک پیغام ہے۔“

میری بات پوری سننے سے پہلے ہی اس شخص نے دروازہ کھول دیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ چونک پڑا اور مضطرب نظروں سے دیکھا کیا۔ کمرا اونچائی پر تھا۔ ایک قدم کی سیڑھی پر پاؤں رکھ کر ہی اوپر جانا ممکن تھا۔ مجھے اسے کوئی وقت نہیں دینا تھا۔ صورت حال سمجھنے اور کوئی نتیجہ اخذ کرنے کا۔ یوں بھی آنے والے لمحے اس کے تصور سے بعید ہوں گے۔ منظر کی اس اچانک تبدیلی سے متوازن آدمی بھی بے توازن ہوجاتا ہے۔ آنکھ جتنی جلد دیکھ لیتی ہے، ذہن اتنی جلد قبول نہیں کرتا۔ میں نے ایک پیر سیڑھی پر رکھا،

دوسرے لمحے اسے پیچھے دھکیلتا ہوا میں کمرے کے اندر تھا۔ میں نے چاقو کھول لیا۔

وہ ترشی ہوئی داڑھی، سرخ وسپید رنگت، طویل قامت، بھاری بھرکم جثے، تیکھے خال وخط، ململ کے مکلف کرتے اور پاجامے میں ملبوس پچاس سے پچپن کی عمر کا ایک وجیہہ شخص تھا۔ بشرے سے کوئی نواب لگتا تھا۔ کمرے میں خاصی روشنی تھی۔ میں نے طائرانہ نظر سے کمرے کا جائزہ لیا۔ فرش کے وسط میں قالین بچھا ہوا تھا۔ اردگرد کرسیاں رکھی اور دیواروں سے پیوستہ شیشے کی الماریوں میں کتابیں سجی ہوئی تھی۔ کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور ان پہ پردے لٹکے ہوئے تھے۔ چوکی پر موجود افراد میں ایک کم عمر لڑکا تھا، بھیگتی مسوں کا۔ دونو جوان لڑکیاں تھیں اور ایک سن رسیدہ عورت تھی۔ مجھے دیکھتے ہی ان کی چیخیں نکل گئیں پھر بدحواسی سے عورتوں نے دوپٹوں سے چہرے چھپالیے اور چوکی کے پاس گھر کے اندرونی حصے میں کھلنے والے دروازے سے بھاگنا چاہا۔ میری دھمکتی آواز نے انہیں ساکت کردیا۔ ”کوئی نہیں، کوئی بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا۔ سب اسی کمرے میں رہیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”کوئی بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔“

دروازہ کھولنے والا شخص میرے چاقو کی زد پر تھا اور بری طرح بوکھلا گیا تھا ”کون، کون ہو تم؟ کیا......کیا چاہتے ہو؟“ وہ ہکلاتی آواز میں بولا۔

میرا چاقو اس کی گردن کے نزدیک تھا اور میں نے اس کا دایاں بازو اپنے بازو میں جکڑ لیا تھا۔ سامنے چوکی پر بیٹھے گھر کے افراد کے آگے دسترخوان بچھا ہوا تھا اور کھانا رکھا تھا۔ میرا وجود ان کے لیے کسی بھیانک خواب کے مانند ہوگا۔ گو میری حالت بھی ان سے کچھ مختلف نہیں تھی۔ میں اندر ہی اندر ہانپ سا رہا تھا۔ انہیں میری کیفیت کا کوئی اندازہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے خود کو مجتمع رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی اور بہ ظاہر دھمکتی آواز میں پوچھا۔ ”گھر میں اندر اور کون کون ہے؟“

”کوئی نہیں، کوئی بھی نہیں، صرف ایک ملازمہ ہے۔“ مرد نے بہ مشکل کہا۔ ”اور......اور......“

”اور کون؟“ میں نے اپنے لہجے میں سفا کی قائم رکھنے کی ڈھٹائی کی۔

”اور میری بیمار والدہ۔“ اس نے بہ عجلت جواب دیا۔ ”وہ......وہ چل پھر نہیں سکتیں۔“

”ملازمہ کو اندر بلاؤ۔“ میں نے سرد مہری سے کہا۔

اس نے پھٹی ہوئی آواز میں چوکی پر بیٹھے ہوئے نوخیز لڑکے کو مخاطب کیا۔ ”زینی، زینی! جاؤ، جا کے رابعہ سے کہو، وہ فوراً یہاں آجائے۔“ ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے تیز اور شستہ انگیریزی میں زینی کو واپس نہ آنے اور پڑوسیوں کو مطلع کرنے کی ہدایت کی۔

زینی کے دیدے باہر نکلے ہوئے تھے اور سکتے کا سا عالم طاری تھا۔ اس کے پہلو سے چپکی ہوئی دہشت زدہ ادھیڑ عورت کے کہنی مارنے پر وہ ہڑبڑا گیا۔ وہ چوکی سے اٹھ پڑا تھا کہ میری آواز پر اس کا سراپا متلاطم ہوا اور وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔

”تم کہیں نہیں جاؤ گے، اپنی جگہ سیدھے بیٹھے رہو گے۔“ میں نے چیخ کر کہا۔ ”ملازمہ کو یہیں سے آواز دو۔“ میں بھی اسے انگریزی میں حکم دے سکتا تھا لیکن میں نے دانستہ اجتناب کیا۔

زینی کے بجائے ادھیڑ عورت نے خفقانی انداز میں ”رابعہ رابعہ“ کی گردان شروع کردی۔

”میں نے کہا نا تم سے، میری والدہ بیمار ہیں۔“ مرد نے سراسیمگی سے کہا۔ ”ملازمہ انھی کے پاس ہوگی۔ وہاں تک شاید آواز......“

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مزید کیا کروں، کون سا حکم دوں۔ میں نے ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لیا۔ کھلی کھڑکیوں پر پردے لٹکے ہوئے تھے۔ چوکی کے برابر گھر میں داخلے کے لیے ایک ہی دروازہ تھا

اور کھلا ہوا تھا۔ دونوں نوجوان لڑکیاں، ادھیڑ عورت، غالباً اپنی ماں سے چمٹی ہوئی تھیں۔ انھوں نے دوپٹوں سے چہرے ڈھانپ لیے تھے اور ان کے بدن کانپ رہے تھے۔ کھلے دروازے سے ملازمہ کسی بھی وقت اندر آسکتی تھی اور کوئی اور بھی...... بہ ظاہر گھر میں کسی اور افراد کی موجودی کا امکان نہیں تھا ورنہ کھانے کے وقت سبھی اس کمرے میں جمع ہوتے۔ میں نے خود کو تسلی دی۔ کوئی اور آ بھی جائے تو کیا ہے۔ اسے بھی روکا جاسکتا ہے۔ جب تک میری گرفت میں گھر کا کوئی ایک فرد ہے، مجھے خاطر جمع رکھنی چاہیے۔ یہ سارا پڑھا لکھا، آسودہ حال گھرانا معلوم ہوتا ہے۔ تعلیم یافتہ اور آسودہ حال نسبتہً ہوش مند ہوتے ہیں۔ طرح طرح کے اندیشے وسوسے ان کے ذہنوں میں نمو پاتے رہتے ہیں۔ جتنی دیر ان پر میری ہیبت رہے گی، یہ کسی نادانی کے مرتکب نہیں ہوں گے۔ اور میرا مقصد کسی کو زک پہنچانا بھی نہیں ہے۔ مجھ سے تو ان کی یہ حالت بھی دیکھی نہیں جاتی۔ میرے لیے اپنی نوعیت کا یہ پہلا واقعہ ہے تو انہیں بھی ایسی ناگہانی سے کہاں واسطہ پڑا ہوگا۔ تاہم مجھے اپنی شقاوت کا تاثر انہیں دیتے رہنا چاہیے۔

چند منٹ کا وقفہ قبرستان کی سی خاموشی کا گزر گیا۔ میری نظریں کمرے میں چاروں طرف بھٹکتی رہیں۔ مجھے احساس تھا کہ سکوت کے یہ لمحے ان پر عذاب کے مانند گزر رہے ہوں گے۔ اس طرح گھر میں داخل ہونے والا شاید ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرتا ہو، میری آمد کا مقصد اور میرے اگلے اقدام کے بارے میں جاننے کے لیے یہ بہت متوحش ہوں گے۔ سکوت کا یہ عرصہ میرے لیے بھی نقصان دہ ہوسکتا ہے۔ ان میں جرات عود کرسکتی ہے۔ یہ مجھے کوئی پاگل دیوانہ نہ سمجھ رہے ہوں۔ یوں مجھے مذبذب و متردد دیکھ کے یہ میرے بارے میں اپنی رائے نہ بدل دیں۔ مجھے کوئی نہ کوئی حرکت کرتے رہنا چاہیے لیکن اور کیا؟ میں اور کیا کرسکتا ہوں؟ مناسب یہی ہے کہ مجھے سب کچھ صاف صاف انہیں بتا دینا چاہیے۔ سب پر ایک عالم ہیجان و اضطراب طاری ہے۔ زندگی بھر کے لیے اس وقت کی دہشت ان پر نقش ہوسکتی ہے۔ آئندہ کوئی کسی نفسی پیچیدگی کا شکار بھی ہوسکتا ہے۔ ایسا کچھ ہوا تو کیا میں خود کو معاف کرسکوں گا۔ لڑکیوں کا حال تو سب سے خراب ہے۔ ان کے چہروں پر بہت سادگی، شائستگی اور معصومیت ہے۔ یہ کیسی سزا، کس جرم کی سزا وہ بھگت رہی ہیں۔ کوئی بھی اوسان کھوسکتی ہے۔ ان کی استطاعت سے سوا مجھے ان کا امتحان نہیں لینا چاہیے۔ کسی اور طرح بھی میں ان سے پیش آسکتا ہوں۔ چاقو تو بہرحال میرے ہاتھ میں ہے اور یہی سب کچھ ہے۔ میری ساری توانائی میرا بالشت بھر ہتھیار ہے۔ ایک ہتھیار بدست کے آگے سو آدمی بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ وہ مجھ پر یقین کریں یا نہ کریں۔ مجھے جتنا وقت مطلوب ہے، وہ تو مل ہی جائے گا۔

میں نے عواقب پر غور کرنے کے بعد مرد کا جکڑا ہوا بازو آزاد کردیا۔ وہ پلکیں جھپکانے لگا اور اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ ''آپ کرسی پر بیٹھ جائیں۔'' میں نے ظاہری رعونت سے کہا۔ ''اور خیال رہے، میرا ہاتھ خالی نہیں ہے اور نشانہ بھی برا نہیں۔ آپ سمجھ دار آدمی ہیں۔ بہتر ہے، جیسا میں کہتا ہوں، سردست اس پر عمل کیجیے۔''

کرسی پر بیٹھ جانے کی رعایت پر اسے مزید حیرت ہوئی۔ اس نے پھیلی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ان میں غصہ بھی تھا، تجسس اور خوف بھی۔ وہ فوراً ہی کرسی پر بیٹھ گیا اور جھکتے ہوئے کرتے کی آستین سے پیشانی کا پسینہ پونچھا۔ میں اس کے قریب ہی رہا۔

''آپ، آپ کیا چاہتے ہیں میاں؟'' اس نے شکست خوردہ آواز میں بہ دقت لب کشائی کی۔

''کچھ نہیں۔'' میرے منہ سے نکل گیا اور میں نے چاقو اچھال کے دوبارہ ہاتھ میں اچک لیا۔ اپنے اس اضطرار اور مشاقی کے بے اختیار اظہار پر مجھے خود سے بیزاری ہوئی۔ ''میری بات دھیان سے سنیے اور اپنے ہوش وحواس قائم رکھیے۔'' کچھ تامل کے بعد میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''میں چوری ڈکیتی کے ارادے سے آپ کے گھر میں داخل نہیں ہوا ہوں۔ مجھے یہاں سے کچھ نہیں چاہیے، صرف تھوڑا سا وقت...... مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو ناحق ایسی بدترین آزمائش سے دوچار کیا ہے۔ یہ جبر، یہ دیدہ دلیری ایک ناقابل معافی جرم ہے بلکہ یہ تو کوئی گناہ ہے لیکن میری کچھ مجبوری ہے جو مجھے آپ کے ہاں اس طور سے پناہ لینی پڑی۔ میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ آپ لوگ خاموشی سے یہ مختصر اور مشکل وقت گزار دیں تو...... تو میں......'' لفظ ذہن میں منتشر ہو گئے۔ ممنونیت اور احسان کے لفظ بہت ہیچ تھے۔ مجھ سے یہ سب کچھ نہ کہا جا سکا۔

''کیا، کیا بات ہے؟'' مرد کی آواز میں پہلی مرتبہ ٹھیراؤ آیا۔

میرے نرم اور ندامت زدہ لہجے سے چوکی پر بیٹھی خواتین اور زینی نامی لڑکے کی بھی یقیناً کچھ تشفی ہوئی ہوگی۔ میں نے ان کی طرف دیکھا۔ ''میں اس شہر میں اجنبی ہوں۔'' میں نے اپنی بکھری ہوئی آواز استوار کرنے کی کوشش کی۔ ''کل رات ہی میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ پٹنے آیا ہوں۔ ہماری منزل بردوان تھی۔ ہم فیض آباد سے ریل میں بیٹھے تھے کہ اکبر پور جنکشن پر انجن میں خرابی پیدا ہو گئی۔ ساری گاڑی یکایک جھٹکے کھانے لگی۔ رات کا وقت تھا اور مسافر ایسے بیدار نہیں تھے۔ کئی مر گئے، بہت سے زخمی ہوئے۔ کسی شدید جھٹکے سے میرے سوئے ہوئے بھائی کا سر بھی ڈبے کی دیوار سے ٹکرا گیا تھا لیکن اس وقت ایسی کوئی فکر کی بات نہیں معلوم ہوتی تھی۔ آگے راستے میں بھائی کے سر کی تکلیف بڑھتی گئی اور سفر ملتوی کر کے ہم پٹنا اتر گئے۔ گرانڈ ہوٹل میں کمرا لے کے اور سامان رکھ کے ہم نے پٹنا میڈیکل کالج اسپتال کا رخ کیا۔ وہاں ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر مرض کی نوعیت نہ سمجھ پائے۔ وہ اسپتال کے بڑے ڈاکٹر، ڈاکٹر رائے کو ناوقت زحمت دینے سے ہچکچا رہے تھے۔ بڑی منتوں کے بعد آمادہ ہوئے۔ ڈاکٹر رائے نے مہربانی کی، اپنے اصول توڑ کے وہ اسپتال آ گیا۔ بھائی کا توجہ سے معائنہ کیا مگر اندرونی چوٹ کی وجہ سے وہ بھی حتمی طور پر کچھ بتانے سے قاصر رہا۔ بہر حال اس نے کچھ دوائیں تجویز کیں۔ اس کی ہدایت پر ہمیں ایک الگ کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔''

''رات بھر بھائی پر غفلت طاری رہی۔ صبح ان کے کئی ایکس رے لیے گئے۔ ڈاکٹر رائے دوپہر ایک بجے دوسری بار معائنے کے لیے کمرے میں آنے والا تھا۔ دوپہر تک میرے پاس خاصا وقت تھا لیکن وہاں سے ہٹنے کو دل نہیں مانتا تھا۔ کمرے میں تعینات مہربان اور مستعد نرس کی مستقل نگہ داشت اور اس کی یقین دہانی پر کہ میں ہوٹل جا کے ڈاکٹر رائے کی آمد سے پہلے واپس آ سکتا ہوں، میں اسپتال سے نکل آیا۔ تانگے والے نے میری توقع سے کم وقت میں مجھے ہوٹل پہنچا دیا۔ جیسا کہ میرا خیال تھا، ہوٹل کا عملہ ہمارے بارے میں فکرمند تھا۔ گزشتہ رات سامان رکھ کے ہم وہاں سے چلے گئے تھے اور اسپتال میں ٹھیرے جانے کی وجہ سے واپسی ممکن نہ ہو سکی تھی۔ ہوٹل میں لباس تبدیل کرنے اور منیجر کو ساری صورت حال سے آگاہ کرنے کے بعد اتنا وقت تھا کہ میں ڈاک خانے بھی ہو آؤں۔ تانگا مجھے ڈاک خانے لے گیا۔ دو ضروری تار دے کے میں وہاں سے نکلا ہی چاہتا تھا کہ ایک نوجوان دیوار بن کے سامنے کھڑا ہو گیا اور تار فارم پر کسی عزیز کے

نام اپنی ماں کی بیماری کی اطلاع لکھوانے کے لیے عاجزی کرنے لگا۔ میرے پاس وقت کم تھا اور صاف انکار بھی نہیں کیا جا رہا تھا۔ اسی شش و پنج میں تھا کہ ایک اور نوجوان سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بھی تار فارم تھا۔ پہلے والے کی طرح وہ بھی میرے پیچھے پڑ گیا۔ وہ تو مجھ سے چمٹ ہی گیا تھا۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ دونوں ساتھی ہیں اور تار فارم پر پیغام نویسی کے لیے اتنی منت گزاری ایک حیلہ ہے، مقصد ان دونوں کا کچھ اور ہے۔ ان سے گلوخلاصی کی کش مکش کے دوران بعد کو آنے اور مجھ سے چمٹ جانے والا نوجوان میری جیب سے بٹوا نکال چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں صفائی نہیں تھی یا گھبراہٹ میں ہاتھ او چھا پڑ گیا تھا کہ دوسرے لمحے مجھے اس دست درازی کا احساس ہو گیا۔ میرا ہاتھ اس کی گردن تک پہنچ جاتا کہ ادھر پہلے والے نوجوان کی عاجزی میں شدت آ گئی۔ اس نے میرا بازو جکڑ لیا تھا۔ اس سے بازو چھڑانے میں کچھ دیر لگی۔ اس اثنا میں جیب کترا نوجوان ڈاک خانے سے بھاگ نکلنے میں کام یاب ہو گیا۔ میں نے اس کا تعاقب کیا۔ وہ بھاگتا ہوا ڈاک خانے سے ملحق گلی میں داخل ہو گیا۔ غالباً یہ جان کے کہ میں اس کے تعاقب سے باز آنے والا نہیں ہوں، گلی میں کچھ اندر جا کے وہ ایک جگہ ٹھیر گیا اور اس نے چاقو نکال لیا۔

''کاش میں وہاں سے لوٹ آتا۔ اس کے ہاتھ میں کھلے چاقو اور مشتعل تیوروں نے مجھے بھی اندھا کر دیا۔ اسے سمجھنا چاہیے تھا کہ چاقو کے معاملے میں مجھے بھی کوئی شد بد ہو سکتی ہے۔ میں نے اسے جلد ہی بے بس کر دیا۔ اپنا بٹوا لے کے میں نے گلی سے باہر نکلنے کا ارادہ کیا۔ کچھ فاصلہ طے کر لیا تھا کہ نوجوان کے دو اور ساتھی چاقو گھماتے ہوئے ڈاک خانے کی سڑک سے گلی میں آتے دکھائی دیے۔ انہوں نے میرے باہر نکلنے کا راستہ بند کر دیا۔ میں نے ان سے بہت کہا کہ مجھے اپنے بیمار بھائی کے پاس اسپتال پہنچنے کی جلدی ہے۔ انہوں نے ایک نہیں سنی، مجھے دھتکار دیا۔ میں نے بٹوا واپس کرنے کی بھی پیش کش کی لیکن وہ تو کچھ طے کر کے آئے تھے اور جانے کس گمان میں تھے، بار بار میدا نامی اپنے کسی استاد کا حوالہ دیتے تھے۔ ان میں ایک نسبتاً مشاق چاقو باز معلوم ہوتا تھا۔ دونوں نے مجھے گھیر لیا۔ قریب ہی اپنے بے سدھ پڑے ساتھی کی شکستہ حالت نے انہیں اور غضب پر آمادہ کیا۔ میرے پاس ان سے نمٹنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ گلی میں کھڑے لوگوں نے کوئی دخل اندازی نہیں کی۔ وہ تماشا دیکھتے رہے۔ میرے پاس بھی چاقو تھا۔ بات بڑھ جانے کے خیال سے میں نے جیب ہی میں رہنے دیا۔ تفصیل سے کچھ حاصل نہیں، مختصر یہ کہ میں نے پختہ کار آدمی کو کسی طرح زیر کر لیا۔ وہ اپنے ہاتھ میں چاقو برقرار رکھ سکا نہ توازن، نہ خود پر اپنا اختیار۔ اس غیر متوقع صورت سے اس کا نوجوان نوآموز ساتھی بے قابو ہو گیا اور چاقو کھولے کسی پاگل کی طرح مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس پر تو جیسے خون سوار ہو گیا تھا۔ اپنی جھوک میں وہ اتنی تیزی سے بڑھا تھا کہ میرے لیے خود کو اور اپنے قبضے میں آئے اس کے بے حال ساتھی کو بچانا مشکل ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے، پہلے مجھے اپنے آپ کو محفوظ کرنا تھا۔ اس نے کچھ نہیں دیکھا کہ اس کا ساتھی بھی زد پر آ سکتا ہے، کیوں کہ وہ میری گرفت میں ہے اور خود کو بچانے کے لیے میں اسے سامنے کر سکتا ہوں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اس کی دیوانگی سے میرے ساتھ اس کا ساتھی بھی محفوظ رہ سکے۔ میری کوشش بس اسی حد تک کارگر رہی کہ چاقو پیٹ میں کھبنے کے بجائے پسلی میں پیوست ہوا۔ نوجوان اپنی نادانی کے اس انجام سے حواس کھو بیٹھا۔ اسے قابو میں کرنا پھر میرے لیے دشوار نہیں رہا۔ چند ضربوں میں وہ چکرا کے زمین پر گر گیا۔ اس سانحے کے بعد کچھ وہ

خود بھی بے خبر ہو جانا چاہتا ہوگا۔"

"دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ کے میں نے دوبارہ واپسی کا ارادہ کیا، پھر کوئی میرے راستے میں مزاحم ہوا نہ میں نے پلٹ کے دیکھا۔"

"تانگا ڈاک خانے کے باہر میرا منتظر تھا۔ پندرہ بیس منٹ کا فاصلہ تانگے نے طے کیا ہوگا کہ پولیس کی سیٹیاں سنائی دیں۔ لوگوں نے مجھے تانگے میں بیٹھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ انھی نے تانگے کی سمت کا بھی اشارہ کیا ہوگا۔ کوئی اور وقت ہوتا اور کوئی جگہ ہوتی تو میں خود کو پولیس کے حوالے کر دیتا لیکن پولیس کے طریق کار کا مجھے تھوڑا بہت علم ہے۔ وہ ایسے، میری روداد سن کے اور میرا بیان لے کے مجھے واپس جانے نہیں دیتے۔ ان کے نرغے میں آ جانے کے بعد میں وقت پر کسی طرح اسپتال نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہاں میرا کوئی واقف کار نہیں۔ اگرچہ گلی کے مکین اور راہ گیر سارے واقعے کے شاہد ہیں لیکن صاف نظر آ رہا تھا، ان پر بھی استاد میدا کے زور و اثر کی ہیبت چھائی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ انہوں نے مداخلت نہیں کی۔ سڑک کے دونوں اطراف گلیاں نکلتی تھیں۔ بس یہی اس وقت دماغ میں آیا کہ تانگے سے اتر کے کسی گلی میں خود کو روپوش کر دوں۔ پولیس ابھی کچھ دور تھی، سڑک کے ایک موڑ پر میں تانگے سے کود پڑا اور چند گز دور دائیں جانب کی پہلی گلی میں داخل ہو گیا۔ ان گلیوں کے طول و عرض کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا لیکن ایسی بھول بھلیاں گلیاں ہر بڑے اور پرانے شہر میں ہوتی ہیں۔ میرا خیال تھا، ان پیچ در پیچ گلیوں میں پولیس کی دست رس سے نسبتاً محفوظ رہوں گا اور کہیں، کسی جگہ اسپتال کی طرف جانے والا راستہ مل جائے گا۔ میں ایک گلی سے دوسری، دوسری سے تیسری میں بھٹکتا رہا اور آپ کے گھر کے قریب مسجد اور باغیچے تک چلا آیا۔ میں نے باغیچہ تقریباً عبور کر لیا تھا کہ دوسری جانب سے سائکلوں پر سوار پولیس اور لوگوں کا شور مچاتا ہجوم دکھائی دیا۔ میرے اور ان کے درمیان باغیچے کا فاصلہ اور باغیچے کے درختوں اور جنگلے پر چڑھی بیلوں کا چھدرا پردہ حائل تھا۔ ان کی نظروں سے بچتا بچاتا باغیچے سے پیوستہ چوڑی سڑک عبور کر کے میں آپ کے گھر والی گلی میں آ گیا۔ گلی سیدھ میں ہے، آگے جانے میں دکھائی دیے جانے کا اندیشہ تھا۔ ناچار میں نے گلی کے نکڑ پر اس پہلے مکان، آپ کے مکان پر دستک دے دی۔"

میرا گلا بری طرح خشک ہو رہا تھا۔ میں نے ان سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ اب باقی ان پر تھا کہ وہ کیا اخذ کریں۔ شاید یہی کچھ جاننے کی غیر شعوری جستجو میں، میں نے تھیر کے چوکی پر بیٹھی خواتین اور لڑکے زینی کو ایک نگاہ دیکھا۔ وہ سب میری طرف متوجہ تھے۔ مجھ سے نگاہیں ملیں تو وہ اپنی اپنی جگہوں پر ڈگمگا سے گئے۔ لڑکیوں نے مضطربانہ سر جھکا لیے اور دوپٹے سروں پر اور کھینچ لیے۔ اب وہ باہم ایسی سکڑی سمٹی ہوئی نہیں تھیں۔ زینی کی آنکھیں بھی حیرتی انداز میں کھلی ہوئی تھیں اور اس کا جسم بھی تنا ہوا تھا۔ میرے مخاطب، کرسی پر بیٹھے گھر کے نگراں مرد کے چہرے پر چھائی زردی کے بجائے سرخی واپس آ گئی تھی۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد میں نے جکڑی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہ گھر نہ ہوتا تو کوئی اور گھر ہوتا اور کچھ اور لوگ ہوتے۔ میرے پاس انتخاب کا وقت نہیں تھا۔ میرے لیے ہر جگہ ایک جیسی تھی۔ مجھے تو ایک پناہ گاہ چاہیے تھی۔ دوسرا کوئی گھر ہوتا تو وہاں بھی مجھے کچھ اسی ناروا، نازیبا سلوک کا مرتکب ہونا پڑتا۔ میں آپ کو بتاؤں، یہ میرے لیے اتنا ہی جبر ہے جتنا آپ کے لیے۔"

میں نے دوبارہ معافی چاہی۔ "میری وجہ سے پردہ نشین خواتین کی بے پردگی ہوئی۔ آپ لوگ کھانے میں مصروف تھے اور کھانے کے بعد جانے آپ کے کیا معمولات ہوں، میں نے آ کے سب درہم برہم کر دیا۔ اطمینان رکھیے، کچھ دیر میں، مجھے یہاں سے چلے جانا ہے۔ امکان یہی ہے، پولیس اس علاقے سے ناکام ہو کے کسی اور طرف نکل گئی ہوگی۔ مجھے بہرحال پولیس کے ہاتھ نہیں آنا، اسپتال پہنچنا ہے۔ ڈاکٹر کے بارے میں نرس نے بتایا تھا، وہ وقت کا بڑا پابند ہے۔ وہ آ کے کب کا چلا گیا ہوگا۔ کمرے میں میری ناموجودی پر اس نے جانے کیا سمجھا ہو۔ گزشتہ رات میں نے اس سے بڑی حجت کی تھی، سارا اسپتال سر پہ اٹھا لیا تھا۔ وہی شخص جو کل رات اور آج صبح اپنے مریض کے لیے اتنا بے قرار تھا، وہی شخص......" میری آواز بھرا گئی۔ "ڈاکٹر کیا کہتا ہوگا اور معلوم نہیں...... ان کا، بٹھل بھائی کا کیا حال ہو۔ ساری غلطی میری ہے۔ میں نرس کے کہنے میں آ کے اسپتال سے نکلتا نہ یہ سب کچھ پیش آتا۔"

"اب تو وقت گزر ہی چکا ہے۔" بہت دیر بعد کرسی پر بیٹھے مرد نے زبان کھولی۔ "مناسب سمجھیں تو آپ بھی بیٹھ جائیں میاں۔"

مجھے اپنے کانوں پر شبہ ہوا مگر یہ اسی کی آواز تھی، نرم اور مشفقانہ۔ مجھے ٹھنڈی ہوا کے کسی جھونکے کا احساس ہوا۔ یعنی میری صراحتیں رائگاں نہیں گئیں۔ مبہم و موہوم سہی مگر مجھے توقع تھی، ان کا جواب یہی ہونا چاہیے۔ اپنا احوال سنا کے میری گراں باری کسی قدر کم ہوئی تھی، اب مجھے اپنی گرہیں کچھ اور کھلتی محسوس ہوئیں۔ تاہم اسی لمحے کوئی تند و پیچیدہ لہر میرے وجود میں در آئی کہ یہ تو میں جانتا ہوں، میرا سچ، کسی سچ کے طور پر کارگر ہونا چاہیے مگر یہ تو اس پر منحصر ہے کہ اپنے گھر میں میری غاصبانہ آمد اور میرے شروع کے سفاکانہ رویے سے یہ کتنا منغض اور متنفر ہو چکا ہے۔ سچ کے پودے کی تخم ریزی کے لیے بھی نرم و نم زمین چاہیے، اور شاید کچھ ایسا ہے کہ آدمی سچ پر اتنا قادر نہیں جتنا جھوٹ پر ہے۔ سچ بہت نایاب ہے، اس لیے اس کی دست یابی پر مشکل سے یقین آتا ہے۔ اور سماعت آلودہ ہو تو سچ بھی دھندلا جاتا ہے، نارسا رہتا اور نامعتبر ٹھیرتا ہے۔ اس نے کسی اور تاثر، میری بابت کسی منفی تاثر میں وہ سب کچھ سنا ہے، جو میں نے کہا ہے تو زہر کی طرح اس کے کانوں میں سرایت ہونا چاہیے۔ مجھے صلہ دینے کا ہر جواز اس کے پاس ہے۔

آدمی تو آدمی ہوتا ہے۔ اس کے سینے میں جتنی تیزی سے آگ بھڑکتی ہے، اتنی تیزی سے بجھتی نہیں۔ مجھے اس کی افتاد طبع اور شخصی پیچیدگیوں کا کچھ علم نہیں تھا۔ آدمی چہرے مہرے، قامت و رنگ میں کتنے ہی مشابہ ہوں، ان کے باطنی خصائل بہت جدا جدا ہوتے ہیں۔ سو لمحے بھر کی بدگمانی نے مجھے منتشر کیے رکھا کہ اس کی خوش خلقی میں بدخوئی کا کوئی پہلو تو مضمر نہیں۔ میں نے ایک اچٹتی نظر سے بہ ہر زاویہ اس کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ اس کی حالت اب پہلے جیسی نہیں تھی، وہ اب خاصا پُراعتماد لگ رہا تھا۔ اس اعتماد کا سبب بھی میں تھا۔ کرسی پر بیٹھ جانے کی اس کی خواہش کی تعمیل میں مجھے ایک ذرا تردد ہوا تھا اور میں نے خود کو سرزنش کی کہ میرا اعتماد کیوں متزلزل ہے۔ یوں بھی مجھے کتنی دیر یہاں ٹھیرنا ہے اور ہتھیار تو اب بھی میری تحویل میں ہے۔ میں اس کے پہلو کی کرسی پر بیٹھ گیا اور مجھے چاقو کھلا رکھنا بھی ناگوار گزرا۔ میں نے اسے بند کر کے جیب میں ڈال لیا۔

اس نے جھرجھری سی لی اور گہری سانس بھر کے کرسی کے سرہانے سے سر ٹکا دیا۔ یقیناً اتنی کشاکش کے بعد دل و دماغ کی یک جائی کے لیے اسے کچھ مہلت درکار ہوگی۔ چند ثانیے اس کی یہی کیفیت رہی پھر چونک کے بولا۔ "آپ نے شروع ہی میں یہ سارا کچھ بتا دیا ہوتا تو شاید......" وہ کہتے کہتے رک گیا۔ "بہرحال......" اس نے پھر آنکھیں میچ لیں۔

’’کاش کہ یہی ہوتا مگر یہ کیسے ممکن تھا۔ میں آپ کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ اتنی جلدی نہ میں اپنا مدعا بیان کرسکتا تھا نہ آپ کو یقین آسکتا تھا۔ پولیس بہت قریب تھی۔ بس یہی ایک صورت مجھے سجھائی دی۔‘‘

’’غالبًا پولیس اس طرف نہیں آئی ورنہ سڑک کا شور یہاں ضرور سنائی دیتا۔ یا تو وہ لوٹ گئی یا کسی اور طرف جانکلی۔‘‘ اس نے الجھے ہوئے لہجے میں قیاس آرائی کی۔

میں خاموش رہا۔

اسے جیسے کچھ یاد آیا۔ ’’مجھے اکبر علی خاں کہتے ہیں۔‘‘ اس نے متانت سے کہا۔ ’’میں ایک وکیل ہوں لیکن اب وکالت نہیں کرتا، لاء کالج میں پڑھاتا ہوں۔‘‘

’’میرا نام بابر زماں ہے۔‘‘ میں نے آہستگی سے کہا۔

’’آپ مجھے تعلیم یافتہ نوجوان معلوم ہوتے ہیں۔‘‘

’’تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا آتا ہے۔‘‘

اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی، پیشانی پر شکنیں نمودار ہوئیں اور وہ کھوئے کھوئے انداز میں سر ہلانے لگا۔ اس کے چہرے سے عیاں تھا کہ اسے کوئی بات کہنے میں دشواری پیش آرہی ہے اور شاید اسے لفظ مل گئے یا سرا مل گیا، ادھر ادھر نظریں گھماتے اور ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ’’یہ، یہ خود کو آزاد سمجھیں؟‘‘ اس نے چوکی پر موجود، اپنے آپ میں بندھی جکڑی خواتین کی طرف اشارہ کیا۔ ’’میرا مطلب ہے۔‘‘ اس نے بہ عجلت وضاحت کی۔ ’’اجازت ہو تو انہیں اندر جانے دیا جائے۔‘‘

میں بیٹھے بیٹھے اچھل پڑا۔ میں نے اس مرحلے کے بارے میں غور ہی نہیں کیا تھا۔ گھر کے افراد کے اندر چلے جانے سے مراد ہے، آنے والے لمحوں میں کوئی بھی ان ہونی صورت پزیر ہوسکتی ہے اور ادھر میرے انکار سے بھی یہ مثبت اور موافق صورت حال قائم نہ رہے گی۔ مجھ میں اب انکار کی جرات نہیں تھی۔ میں نے اسے خود گنوا دیا تھا۔ میرے پاس اس کے سوا شاید کوئی اور جواب ہی نہ تھا۔ ’’جی، جی ہاں۔‘‘ میں نے بھنچی ہوئی آواز میں کہا۔ ’’اجازت لے کے آپ مجھے اور شرم سار کررہے ہیں۔‘‘

’’نہیں نہیں، بخدا نہیں۔‘‘ وہ ہاتھ بلند کرکے بے تابی سے بولا۔ ’’میرا مقصد یہ ہے کہ اب ان کی یہاں کیا ضرورت ہے۔ یہ گھر کے اپنے کام کاج دیکھیں۔‘‘

’’میرا خیال ہے، مجھے اب چلنا ہی چاہیے۔‘‘ میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا۔

’’اطمینان رکھیے۔ میں انہیں کوئی اور ہدایت نہیں دے رہا۔‘‘ اس نے میری دھند دور کرنیکی کوشش کی۔ ’’یہ خود بھی سمجھ بوجھ رکھتی ہیں اور انہوں نے بھی میری طرح سب کچھ دیکھا اور سنا ہے۔ میں سمجھتا ہوں، آپ کو اتنی جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ ڈاکٹر کا وقت تو نکل ہی چکا ہے۔ سوچتے ہیں، آپ کس طرح بہ حفاظت اسپتال پہنچ سکتے ہیں۔‘‘

’’آپ بہت مہربان آدمی ہیں۔‘‘ میرے اظہار ممنونیت میں تصنع کی آمیزش تھی مگر شاید اسے محسوس نہ ہوئی ہو۔

’’یہ بتایئے، آپ کیا پئیں گے؟ صبح سے آپ نے کہاں کب کچھ کھایا پیا ہوگا۔‘‘

’’مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔‘‘

’’ہاں، ایسی صورت میں بھوک پیاس کا کب احساس ہوسکتا ہے۔‘‘

’’آپ، آپ لوگوں کے کھانے میں میری آمد سے رخنہ پڑ گیا تھا۔ اچھا یہی ہوگا کہ میں اب چلوں آپ اپنے معمولات جاری رکھیں۔‘‘

’’ہمارے معمولات کو جانے دیجیے۔ اب نہیں تو کچھ دیر بعد جاری ہوجائیں گے۔ صبح وشام کا یہ چکر تو چلتا رہے گا۔ اس وقت تو آپ کا مسئلہ اہم

ہے۔‘‘ اس کے لہجے میں غیر معمولی سنجیدگی تھی۔ ’’دیکھیے، میں آپ کے کسی کام آسکا تو مجھے خوشی ہوگی، ہم سب کو خوشی ہوگی۔‘‘ اس نے خواتین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’ارے بھئی! تم لوگ اندر جاکے مہمان کی کچھ تواضع وغیرہ کا بندوبست کرو اور ہاں، نہ کوئی باہر جائے نہ آس پڑوس سے واسطہ رکھے۔ درمیان میں کوئی گھر آئے تو اسے یہاں، ہماری طرف نہ آنے دیا جائے۔‘‘

ادھیڑ عورت اور دونوں لڑکیاں سٹ پٹاتی ہوئی چوکی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ انہوں نے جیسے تیسے دوپٹوں سے اپنے بدن اور چہرے چھپالیے اور ایک دوسرے کے پیچھے اندر جانے کے لیے دروازے کی طرف لپک پڑیں۔ زینی بھی اٹھ گیا۔ اکبر علی خاں نے اسے روک لیا اور حکمیہ انداز میں کہا۔ ’’ذرا باہر جاکے دیکھو، ادھر کہیں آس پاس پولیس تو نہیں ہے۔ اور وہاں، کسی سے کچھ پوچھو گے نہ باہر کسی سے بات کروگے۔ اور جلدی واپس آنا ہے۔ سمجھے۔‘‘

زینی تیزی سے باہر چلا گیا۔

کمرے میں ہم دونوں رہ گئے۔ میں خود کو تھپکیاں دیتا رہا۔ امکان تو نہیں ہے لیکن خوش گمانیوں میں احتیاط عین ہوش ہے۔ دروازہ چند قدم کے فاصلے پر تھا اور چاقو جیب میں محفوظ تھا اور میرے اختیار میں کچھ نہیں رہا تھا۔ سب کچھ جیسے میرے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ میں تو دیکھتا اور سنتا رہ گیا۔

زینی کے جاتے ہی اکبر علی خاں نے خوش اطواری سے پوچھا۔ ’’کچھ اپنے بارے میں بتایئے۔ ہاں، کیا مشاغل ہیں آپ کے؟‘‘

’’کیا بتاؤں۔‘‘ میں نے چرمراتی آواز میں کہا۔

’’کچھ بتایئے نا۔ ملازمت تو آپ نہیں کرتے اور تجارت۔‘‘ وہ حتمی لہجے میں بولا۔ ’’یقیناً وہ بھی نہیں۔‘‘

’’آپ کا اندازہ درست ہے۔‘‘

’’پھر وقت کیسے گزرتا ہے؟‘‘

’’سیر وسفر میں۔‘‘

’’سیر وسفر میں؟ پھر تو ضرور گھر کے نواب ہوں گے، زمینیں جاگیریں ہوں گی۔‘‘ اس کی مسکراہٹ میں شائستگی تھی۔

’’تھوڑی بہت زمینیں ہیں۔‘‘ میں نے اس کے بے موقع سوالوں سے بچنے کے لیے اقرار کیا۔

’’فیض آباد میں؟‘‘

’’جی ہاں، وہیں۔‘‘ میں نے سر جھکا کے کہا۔

’’مریض آپ کے سگے بھائی ہیں؟‘‘

’’جی‘‘ میرے لہجے میں ترشی آگئی۔ ’’وہ سگے ہیں، نہ سوتیلے۔ کوئی خونی رشتہ نہیں ہے میرا ان سے۔ کچھ رشتے بے نام ہوتے ہیں اور کبھی سارے رشتوں سے بلند ہوتے ہیں۔‘‘

اس کی آنکھیں سکڑتی پھیلتی رہیں اور وہ سر ہلاتا رہا۔ ’’کیا اسم شریف ہے ان کا؟ یاد آتا ہے، کوئی نام لیا تو تھا آپ نے۔‘‘

’’بٹھل۔‘‘

’’بٹھل!‘‘ اس نے تعجب سے دہرایا۔ ’’صرف یہی نام۔‘‘

’’سب انہیں اسی نام سے جانتے ہیں۔ اب تو شاید خود انہیں بھی اپنا اصل نام یاد نہ ہوں۔‘‘

اچ چھا۔ اچ چھا۔‘‘ اس نے مفاہمانہ لہجے میں کہا۔ وہ ایک نہایت ذہین اور حساس آدمی تھا، کہنے لگا۔ ’’ہوسکتا ہے، آپ میرے ان پے در پے سوالوں سے مکدر ہورہے ہوں۔ اصل میں میرا مقصد یہی نہیں کہ مجھے آپ کے بارے میں کچھ جاننے کی جستجو ہے، ایک قسم کی فطری جستجو۔ میری یہ بھی خواہش تھی اور ہے کہ کچھ اس طرح آپ کی توجہ بٹے لیکن لگتا ہے، آپ کے دماغ پر بہت بوجھ ہے یا آپ، آپ اپنے مخاطب کو اعتبار کے قابل نہیں

سمجھتے۔''

''نہیں نہیں۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، آپ میرے محسن ہیں۔'' میں نے لجاجت سے کہا۔ ''کچھ ناگوارِ خاطر ہوا ہو تو مجھے معاف کر دیجیے۔''

''میں آپ سے پھر کہوں گا، ذرا تحمل کیجیے، دیکھیں، جلد بازی میں خدانخواستہ اور رکاوٹیں نہ کھڑی ہو جائیں۔ آپ نے استاد میدا کا نام لیا تھا نا؟ میں اسے جانتا ہوں۔''

''آپ جانتے ہیں اسے؟'' میں نے بے کلی سے پوچھا۔

''وکالت کے دوران کئی بار اسے کچہری میں دیکھا ہے۔ شہر میں تقریباً سبھی اسے جانتے ہیں۔ وہ ایک شورہ پشت، پرلے درجے کا شیطان آدمی ہے، ایک نمبر کا غنڈا، بہت کٹ کھنا اور خوں خوار۔ بڑے بڑے سرکاری افسر اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے کتراتے ہیں۔ اس کے گرگے، ایک سے ایک منہ مار، ہتھ چھٹ شہر بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں، بس اس کے سر پہ تاج نہیں ہے۔ من مانی، دھاندلی، ہٹ دھرمی۔ شہر میں بیش تر جرائم کے پیچھے وہ ہوتا ہے یا اس کے حاشیہ بردار ہوتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کوئی اس کے آڑے نہیں آتا یا اسے نہیں چھیڑتا تو وہ بھی اس شخص پر ہاتھ نہیں ڈالتا، گویا یا تو اس سے کوئی سروکار نہ رکھیے یا اس کے سائے میں آجایئے، پھر عافیت ہے۔ شہر میں عزت آبرو سے زندگی گزارنے کی یہی ایک بہتر تدبیر ہے۔ اور لوگ عموماً اسی پر عمل پیرا ہیں اور لطف یہ کہ بعض ستم ظریف اس سرکش کی تائید بھی خوب کرتے ہیں۔ کہتے ہیں، شہر میں ہونے والے جرائم کہیں زیادہ ہوں اگر استاد میدا موجود نہ ہوا۔ مراد یہ ہے کہ شہر کا ایک طبقہ اسے اپنا محافظ بھی سمجھتا ہے۔ طرح طرح کے قصے کہانیاں اس کے بارے میں مشہور ہیں۔ اور سنا ہے، اپنے دربار سے وابستہ لوگوں کا وہ بہت خیال رکھتا ہے۔ رکھنا بھی چاہیے کہ یہی تو اس کے دست و بازو ہیں، انہی کی وجہ سے اس کی سرکار قائم ہے۔ ڈاک خانے کی گلی میں زخمی ہو جانے والا نوجوان میدا کا آدمی تھا تو......'' اکبر علی خاں کے ماتھے پر لکیریں ابھر آئیں اور وہ کوئی شدید بات کہنے سے رک گیا۔

''تو کیا؟'' میں نے تلخی سے پوچھا۔

''تو کچھ بھی ممکن ہے۔'' وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔ ''یہ بتایئے، جس آدمی کے چاقو پیوست ہوا تھا، اس کی حالت کیسی تھی؟''

''یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ زخم گہرا ہے اور جلدی ہی مرہم پٹی نہ ہوئی اور خون زیادہ نکل گیا تو کچھ بھی ممکن ہے۔''

''یعنی وہ اپنی جان سے بھی جا سکتا ہے؟'' اکبر علی خاں نے بے ربطی سے پوچھا۔

''یہ بھی ممکن ہے۔'' میں نے کسی جھجک کے بغیر کہا ''اس کا چاقو بردار ساتھی کوئی اچھا چاقو باز نہیں تھا۔ اسی نومشقی کی وجہ سے اس کا وار کاری بھی ہو سکتا ہے۔ اچھے چاقو باز ہاتھ کھینچ کے رکھتے ہیں، چاقو کو لگام دے کے، اور وہ...... میں نے آپ کو بتایا نا، وہ تو مجھے چاقو مارنا چاہتا تھا۔''

''لیکن کون گواہی دے گا؟''

''میں جانتا ہوں، کوئی بھی نہیں دے گا لیکن استاد میدا کو تو اصل بات سے آگاہی ہونی چاہیے۔ گلی کے لوگ اسے سچ کیوں نہیں بتائیں گے؟''

''آپ کا یہ نکتہ اہمیت رکھتا ہے۔'' اکبر علی خاں نے چمکتی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور کہنے لگا۔ ''استاد میدا کو اپنے طور پر بھی واقعے کی نوعیت جاننے کی کوشش کرنی چاہیے اور واقعی گلی کے لوگ اس سے سچ کیوں چھپائیں گے۔''

''گلی سے نکلے ہوئے مجھے دیر نہیں ہوئی تھی کہ پولیس نے میرا تعاقب شروع کر دیا تھا۔ اتنی جلدی استاد میدا کو خبر نہیں ہوئی چاہیے۔ یقیناً گلی کے لوگوں نے پولیس کی توجہ میری جانب مبذول کرائی

ہو گی مگر اب وقت خاصا گزر گیا ہے۔ اتنی دیر میں استاد میدا کو سب کچھ معلوم ہو جانا چاہیے۔''

''اور معلوم ہو جانے کے بعد اس کا ردعمل کیا ہوا ہو گا، کیا ہونا چاہیے؟'' اکبر علی خاں نے جیسے خود سے پوچھا۔

''وہ اڈے کا کوئی مستند استاد ہے تو اپنے آدمیوں کی نادانی اور اچھے پن پر بہت برگشتہ ہو گا اور جیسا کہ آپ بتاتے ہیں، وہ کوئی خودسر، بر خود غلط اور طبعاً کمینہ آدمی ہے تو اس سے کچھ بھی بعید نہیں۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''اسے شہر میں اپنی دھاک، اپنے بھرم کی فکر ہو سکتی ہے۔ وہ خاموش ہو جاتا ہے تو اس شرافت میں اس کی سبکی کا پہلو نکلتا ہے۔ شہر میں کوئی اجنبی اس کے تین آدمیوں پر حاوی آجائے، یہ حقیقت اس کا چین سکون غارت کر سکتی ہے۔ ایسے لوگ اتنے اصول پسند نہیں ہوتے۔ اسے آپ کی تلاش ہونی چاہیے۔ پولیس بھی اسی کا ساتھ دے گی۔ ظاہر ہے، پولیس کے کتنے لوگ، اوپر سے نیچے تک اس کے پروردہ ہوں گے۔'' اکبر علی خاں نے وکیلوں کی طرح نکتہ طرازی کی اور مایوسی سے بولا۔ ''استاد میدا جیسے آدمی سے کسی بہتری کی توقع نہیں۔''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' میری آواز کی تپش اسے اپنے کانوں میں محسوس ہوئی ہو گی۔

''میں امکانات کی بات کر رہا ہوں۔'' پہلی بار اس کے لہجے میں برہمی سی شامل تھی۔

''تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' میں نے سلگتی آواز میں پوچھا۔ ''میرے پاس کون سا راستہ ہے۔ میں استاد میدا کے رحم و کرم پر رہوں اور ہاتھ پیر باندھے انتظار کرتا رہوں؟''

''مجبوری ہے۔ سامنے کوئی ایسا ویسا آدمی نہیں، پیشہ ور مجرم ہے۔ یہی دیکھنا ہے کہ سردست کون سا راستہ آپ کے لیے مناسب ہے اور اس کے لیے آپ کو صبر و ضبط کرنا پڑے گا۔ ذرا سی کوتاہی سنگین رخ اختیار کر سکتی ہے۔'' اکبر علی خاں کے نتھنے پھول گئے تھے اور ہونٹ پھڑک رہے تھے۔ ''آپ کہہ رہے تھے کہ گلی میں بعد کو آنے والے آدمیوں کو آپ نے بتایا تھا۔ آپ ان سے الجھنا نہیں چاہتے کیوں کہ آپ کا ایک عزیز اسپتال میں ہے اور آپ کو جلدی ہے۔ آپ نے انہیں بٹوا واپس کرنے کی پیش کش بھی کی تھی۔ انہوں نے سنی ان سنی کر دی۔ کیا آپ نے اسپتال کا نام بھی لیا تھا؟''

''نہیں، بالکل نہیں۔''

''یہ اچھا ہوا لیکن وہ شہر کے ہر اسپتال میں آپ کو تلاش کریں گے اور ان کے لیے یہ کام مشکل نہیں ہے۔ میدا کے پاس بدمعاشوں کی ایک فوج ہے۔''

''انہی اندیشوں کی وجہ سے مجھے یہاں، آپ کے گھر میں پناہ لینی پڑی اور آپ سب کو......''

اس نے مجھے بات پوری کرنے نہیں دی۔

''ہماری بات جانے دیجیے، جو وقت گزر گیا، گزر گیا۔ اس پر گفتگو کا موقع بعد کو بھی آ سکتا ہے۔ بعد میں ذکر کریں گے اس کا۔'' اس نے ایک آہ سی بھری اور مدھم آواز میں بولا۔ ''اور خدشے تو اب بھی موجود ہیں جناب!''

''مجھے بہرحال اسپتال پہنچنا ہے اور جلد سے جلد۔'' میرے مصمم لہجے میں سرگشتگی نمایاں تھی۔ ''میں بٹھل بھائی کو اس حالت میں ایسے نہیں چھوڑ سکتا۔''

''مگر برادرم کس طرح؟''

''کسی بھی صورت۔''

''وہی تو میں آپ سے پوچھ رہا ہوں۔''

''میں نکل کے دیکھتا ہوں۔''

''اور راستے میں ان لوگوں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ آپ سوچیں، یہ قطعی ممکن ہے۔ راستے میں آپ کو کسی نے پہچان لیا یا آپ پولیس کے ہاتھ لگ گئے؟''

میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ ٹھیک ہی

کہہ رہا تھا۔ راستے میں کہیں بھی کوئی پتھر بن سکتا ہے۔ وہ پولیس ہو یا میدا کے آدمی۔ دونوں صورتوں میں اسپتال پہنچنا ممکن نہ ہو سکے گا۔ باہر آہٹ ہوئی تو بہ یک لمحہ ہم دونوں کی نظریں دروازے کی طرف اٹھیں۔ وہ زینی تھا۔ وہ پھرتی سے اندر آیا تھا۔ ''کیا خبر لائے؟'' اکبر علی خاں نے ہڑک کے پوچھا۔

''اس طرف کوئی نہیں۔'' زینی کی آواز بھی اس کی عمر کی طرح کچی تھی۔

''تم نے کسی سے بات کی؟''

''آپ نے منع جو کیا تھا۔'' زینی نے دبی زبان سے جواب دیا۔

''ہاں ہاں۔'' اکبر علی خاں کچھ خفیف ہوا۔ ''تم نے ٹھیک کیا، اور سنو! تم گھر ہی میں رہو گے۔ ٹیوشن کے لیے ماسٹر ضیاالدین آئیں تو آج کے لیے منع کر دو گے۔'' زینی سر جھکائے واپسی کے لیے مڑ گیا تھا کہ اکبر علی خاں الجھ کے بولا۔ ''یہ لوگ اندر کیا کر رہی ہیں؟ ان سے کچھ کہا تھا میں نے...... جاؤ، اندر جا کے دیکھو۔

زینی کے کمرے سے نکلتے ہی اس نے چھت کی طرف دیکھا۔ ''شکر ہے، پولیس اس علاقے میں موجود نہیں ہے۔''

میں سر ہلا کے رہ گیا۔

''دیکھیے۔'' اس نے ہمکتی آواز میں کہا۔ ''ایک تو یہ صورت ہے کہ آپ خود کو......'' اس نے جلدی سے توضیح کی۔ ''یہ ایک مفروضہ ہے۔ فرض کیجیے، آپ خود کو پولیس کے حوالے کر دیتے ہیں تو، تو کیا ہوگا؟ کل صبح یا اس سے اگلے دن وہ آپ کو عدالت میں پیش کر دیں گے اور کوئی آپ کی ضمانت لے لے گا۔ فرض کیجیے، یہ ضمانت میں لے لیتا ہوں۔ پھر آپ کسی حد تک محفوظ ہو جائیں گیا ورنہ آپ کو اس وقت تک تھانے کچہری کی گردش میں رہنا پڑے گا جب تک معاملہ کسی کروٹ نہ بیٹھ جائے۔ اگر زخمی شخص خدانخواستہ زندگی ہار بیٹھتا ہے تو ضمانت بھی مشکل ہو جائے گی۔ اور یوں عدالت میں آپ کی بے گناہی ثابت کرنے، ثبوت و شواہد جمع کرنے اور چشم دید گواہوں کو حق گوئی پر آمادہ کرنے میں ایک مدت صرف ہو سکتی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کیوں نہ آپ اپنے بیمار بھائی کی دیکھ بھال کے لیے اپنی کسی عزیز کو یہاں بلا لیں۔ تار کے ذریعے یہ اطلاع میں انہیں دے سکتا ہوں۔ فیض آباد سے دوسرے دن کوئی بھی یہاں پہنچ جائے گا اور آپ کو تسلی ہو جائے گی۔ جب تک کوئی فیض آباد سے آ نہیں جاتا، میں اسپتال جا کے آپ کے عزیز کی نگہ داشت کر سکتا ہوں۔ اسپتال والوں سے بھی آپ کی غیر حاضری کا کوئی معقول عذر کیا جا سکتا ہے۔ اس دوران آپ کسی قسم کا تردد کیے بغیر یہاں، اس گھر، میرے غریب خانے میں میرے مہربان کی حیثیت سے ٹھہر سکتے ہیں۔ مجھ پر کوئی بوجھ نہ ہو گا بلکہ مجھے خوشی ہوگی۔ ہمارا خاندان مختصر ہے اور گھر ماشاءاللہ بڑا ہے۔ اوپری منزل تقریباً خالی رہتی ہے۔ یہاں آپ کے قیام کے دورانیے میں کسی طرح چپ چپاتے آپ کی بہ عافیت فیض آباد واپسی کی تدبیر کی جا سکتی ہے۔ آپ شہر میں نہیں رہیں گے تو یہ سب کچھ خود بہ خود دب جائے گا۔ یعنی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کسی بھی حالت میں آپ کا فی الحال اسپتال جانا ممکن نہیں ہے۔ چوں کہ ابھی معاملہ گرم ہے۔ ہو سکتا ہے، جلد ہی ٹھنڈ پڑ جائے۔ خدا کرے، ایسا ہی ہو۔'' وہ پرامید انداز میں بولا۔ امید سے زیادہ اس کے لہجے پر حسرت کا غلبہ تھا۔

مجھے حیرت ہوئی۔ اور پہلوؤں پر اس جزرس کی نگاہ کیوں نہیں گئی۔ میں سنتا رہا اور میں نے اس سے نہیں کہا کہ ڈاک خانے سے بہ آسانی معلوم کیا جا سکتا ہے، میں نے کون کون سے مقامات پر تار دیے تھے۔ جس تانگے پر میں ڈاک خانے آیا تھا، اسے ڈھونڈ لینا ان کے لیے کیا دشوار ہو گا۔ تانگے والے سے انہیں معلوم ہو سکتا ہے کہ میں کون سے

اسپتال سے سوار ہوا تھا اور درمیان میں کہاں ٹھیرا تھا۔ اس تفتیش میں ہوٹل میں ہماری اقامت اور پتے کی معلومات ہو سکتی ہیں۔ تار کے فارم پر میں نے پٹنا شہر میں اپنے پتے کے طور پر گرانڈ ہوٹل کا نام لکھا ہے۔ ہوٹل کے رجسٹر میں اپنی مستقل سکونت کے خانے میں فیض آباد کا پتا لکھوایا ہے۔ سرا پکڑتے پکڑتے وہ بٹھل تک پہنچ سکتے ہیں۔ میں کچھ دیر بعد اپنے آپ کو چھپاتا ہوا اسپتال پہنچنے میں کام یاب بھی ہو جاؤں تو بھی شام کو یا رات کو یا کل کسی وقت وہ اسپتال میں میرے سر پر آدھمک سکتے ہیں۔ اس طرح بٹھل کے میں کیا کام آ سکتا ہوں۔ اکبر علی خاں کا یہ مشورہ ہی صائب معلوم ہوتا ہے کہ کلکتے تار دے کے جامو کو بلا لیا جائے۔ تار میں یہ تاکید بھی ہو کہ وہ اکیلا نہ آئے، جامو، استاد میدا سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور ضرورت پڑنے پر وہ کہیں سے کسی کو بھی طلب کر سکتا ہے۔ کلکتے میں زورا اور جمرو بھی موجود ہیں۔ جامو کے ساتھ وہ بھی یہاں آجائیں تو اور اچھا ہو۔ مگر تار پہنچنے اور کسی کے آنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔ تار کب پہنچے۔ ادھر بٹھل کے لیے سوچ سوچ کے تو میرے اوسان خطا ہو رہے ہیں۔ کچھ خبر نہیں، ڈاکٹر رائے نے کیا تشخیص کی ہے، وہ کس نتیجے پر پہنچا ہے، ایکس ریز میں کیا آتا ہے۔ یہ اکبر علی خاں، ایک شریف النفس اجنبی، بٹھل کی خبر گیری کرنے کی نوازش پر آمادہ ہے تو غنیمت سمجھنا چاہیے۔ اسپتال میں بٹھل کو تنہا چھوڑ دینے سے بہتر ہے، کوئی اجنبی ہی سہی، اس کی پرسش حال کے لیے کوئی تو سرہانے موجود رہے۔ اکبر علی خاں ڈاکٹروں سے عمدگی سے بات کر سکتا ہے۔ میں اپنے پاس محفوظ ساری رقم اس کے حوالے کر دوں گا کہ اسپتال کے اخراجات میں اس کا ہاتھ کھلا رہے لیکن یہ متبادل تجویز کس حد تک قابل عمل ہے، اکبر علی خاں نے اس طرف غور نہیں کیا۔ اگر میدا کے آدمی کھوج لگاتے لگاتے بٹھل تک پہنچ گئے اور انہیں اسپتال کے کسی ذریعے سے معلوم ہو گیا کہ بٹھل کو اسپتال لانے اور اس سے برادرانہ قرابت کا دعویٰ کرنے والا کوئی اور، یعنی میں تھا، اور میں ڈاک خانے سے ملحق گلی میں ہونے والے واقعے کے بعد اسپتال واپس نہیں آیا ہوں تو لازماً ان کی توجہ بٹھل کے تیماردار اکبر علی خاں پر مرکوز ہو جائے گی۔ اس کا گھر ان کا ہدف بن جائے گا جہاں منہ چھپائے واقعتہً میں موجود ہوں گا۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ ایک نہایت خلیق، اعلیٰ ظرف شخص، اپنے محسن کو کسی مصیبت سے دوچار کر دیا جائے۔ اکبر علی خاں کو تو اسی شہر میں رہنا ہے۔ اسے استاد میدا کے آدمیوں کی نظر میں نہیں آنا چاہیے۔

میرا سر پھٹا جا رہا تھا جتنا میں سوچتا، جدھر دیکھتا، اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیتا۔ اسپتال کے بستر پہ بے سدھ پڑے بٹھل کی تصویر میرے سینے، میری آنکھوں، میرے وجود میں سمائی ہوئی تھی۔ بار بار ہڑک سی اٹھتی تھی کہ بس اکبر علی خاں سے رسمی اجازت لے کے اس گھر سے نکل پڑوں۔ آگے جو ہوگا، دیکھا جائے گا، اور اسی لمحے یہ اندیشہ جسم جکڑ لیتا تھا کہ راستے بہت طویل نہ ہو جائے۔ راستوں کی طوالت، فاصلوں سے نہیں، راستوں کی نوعیت سے طے ہوتی رہے۔ راستے میں کوئی دیوار کھڑی ہو گئی تو اس کی بلندی کی انتہا کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ پھر اسی صلاح پر بات تمام ہو جاتی ہے کہ مجھے اکبر علی خاں سے گزارش کرنی چاہیے، وہ فی الفور ڈاک خانے جا کے کلکتے میں جامو کو تار دینے کی زحمت کرے۔ جب تک جامو وغیرہ یہاں آ نہ جائیں، مجھے اکبر علی خاں کے دولت کدے میں زندانی بن کے وقت کاٹنا ہے اور دیواروں سے سر پھوڑتے رہنا ہے۔ ادھر بٹھل کا کچھ بھی حال ہو، مگر میری حالت بھی اس سے کیا جدا ہے۔ وہ اپنے آپ سے بے خبر ہے، میں بہ قائم ہوش و حواس یہاں بے دست و پا پڑا رہوں گا۔

''کیا سوچ رہے ہیں جناب!'' مجھے چپ دیکھ کے اکبر علی خاں نے تیکھے لہجے میں ٹوکا۔

''کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔'' میں نے کٹی پھٹی آواز میں کہا۔

''میں سمجھ سکتا ہوں، میری مانیے تو مجھے پتا دیجیے۔ میں ڈاک خانے جا کے تار بھیج دیتا ہوں۔ جتنا تامل وتذبذب کیجیے گا۔ اتنی دیر ہوتی جائے گی۔ آج کل ان تاروں کا بھی کوئی بھروسا نہیں ہے۔ احتیاطاً میں ارجنٹ تار دوں گا اور وقفے وقفے سے دو مرتبہ۔ باہر نکلنے پر کچھ ادھر ادھر کی سن گن لینے کا بھی موقع ملے گا۔ دیکھتا ہوں، شہر میں اس واقعے کی کتنی گونج ہے اور زخمی ہو جانے والا آدمی کس حال میں ہے۔ بہت کچھ اس کی حالت پر بھی منحصر ہے۔ ہوسکتا ہے، ہم کچھ زیادہ ہی قیاس کر رہے ہوں اور باہر سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو۔ کاش کہ......''

دروازے سے برتنوں کے کھڑکنے کی آواز پر وہ رک گیا۔ سادہ ساڑی میں ملبوس، بوٹے قد، سانولی رنگت کی ایک نوجوان لڑکی ہاتھوں میں تشت اٹھائے، پلو سے آدھا گھونگھٹ کاڑھے ہوئے درّانا اندر آئی۔ گھبراہٹ میں پلو سر سے سرک گیا، وہ اور گھبرا گئی۔ دونوں ہاتھوں میں تشت تھا اور وہ پلو درست نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ملازمہ رابعہ ہی ہوسکتی تھی۔ ابھی وہ اندر داخل ہوئی تھی کہ ایک اور عورت نے کمرے میں قدم رکھا۔ میں اسے فوراً نہ پہچان سکا مگر وہ تو وہی ادھیڑ عورت تھی جو کچھ دیر پہلے دو لڑکیوں اور لڑکے زینی کے ساتھ چوکی پر بے حال بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے لباس تبدیل کر لیا تھا اور لگتا تھا جیسے اپنا سراپا ہی تبدیل کر لیا ہے۔ بادامی رنگت، متوازن قامت اور متوازن بدن، اطوار میں تمکنت، رفتار میں وقار، ناک میں لونگ، کانوں میں چھوٹے بندے، گلے میں چمپاکلی، کلائیاں سنہری چوڑیوں سے آراستہ تھیں۔ میں کرسی پر سیدھا ہو گیا۔ اس نے مجھے آداب کیا تو میرا جسم بل کھا گیا۔ ''یہ بیگم ہیں، نزہت خانم۔'' اکبر علی نے اشتیاق آمیز لہجے میں کہا۔ ''یہ یہاں کالج میں انگریزی ادب پڑھاتی ہیں اور علی گڑھ کی سند یافتہ ہیں۔''

میں نے کرسی سے اٹھ کے تعظیم دی۔ اس سے نگاہیں ملانے کی جرات نہیں ہو رہی تھی لیکن مجھے کچھ تو کہنا چاہیے تھا اور میں بہ مشکل کہہ سکا۔ ''میں بہت نادم ہوں، مجھے معاف کر دیجیے۔''

''نہیں نہیں، ایسا نہ کہیے۔'' نزہت خانم نے کھنکتی آواز میں شائستگی سے کہا۔ ''جو بیت گیا، اس کا کیا ملال اور اس کی کیا خوشی۔ وہ تو ماضی ہوا۔ اسے دہرانے سے کیا حاصل، اور خصوصاً جب کہ وہ ناخوش گوار بھی ہو۔'' اس کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔

''ہاں ہاں، وہ تو کسی خواب کے مانند تھا۔'' اکبر علی خاں شگفتگی سے بولا۔ ''لیکن اس کی تعبیر بالکل مختلف ہے۔''

نزہت خانم کے چہرے پر آگ سی بھڑکی اور غالباً موضوع بدلنے کے لیے تشت کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے وہ زیرلبی سے بولی۔ ''آپ کچھ لیجیے نا۔''

''یہ آپ نے کیا تکلف کر لیا۔'' میں نے بوجھل آواز میں کہا۔

''کچھ نہیں ہے، سب ہلکا پھلکا ہے۔''

''یقین کیجیے۔'' میں نے عاجزی سے کہا ''بھوک ہی نہیں ہے۔'' میں نے اس سے سچ کہا تھا۔ میرا تو جی ہی لوٹ رہا تھا۔

''کوئی اصرار نہیں۔'' اکبر علی خاں نے میری مشکل حل کی۔ ''مگر یہ مشروب خاص۔ بیگم یہ ایک خاص شربت بناتی ہیں۔ آسانی کے لیے اسے لسی کہہ لیجیے، پوربی لسی یا بہاری لسی لیکن یہ لسی ہرگز نہیں ہے۔ یہ تو بہت سے اجزا کا مجموعہ ہے۔ شاید آپ کو

پسند آئے۔'' اس نے گلاس اٹھا کے میری جانب بڑھا دیا۔

انکار اب بدتمیزی کے زمرے میں آتا۔ میں نے گلاس لے لیا۔ ممکن ہے، جیسا کہ اکبر علی خاں دعویٰ کر رہا تھا، مشروب واقعی خوش ذائقہ ہو۔ ذائقے بھی طلب سے مشروط ہیں اور طلب جسم و جاں کی یک سوئی، بے حالی سے۔ میرا جسم جیسے کسی شکنجے میں کسا ہوا تھا، جیسے اندر سے کوئی نوچتا ہو۔ مجھ میں ذائقہ شناسی کی حس ہی نہیں رہی تھی۔ پہلا گھونٹ ہی حلق کاٹتا ہوا گزرا۔ مزید چند گھونٹ زہر مار کر کے میں نے گلاس میز پر رکھ دیا۔ ''کیسا ہے؟'' اکبر علی خاں نے حسرتی انداز میں پوچھا۔ ''کچھ مرغوب ہوا؟''

''بہت عمدہ ہے۔'' شاید مجھے یہی کہنا چاہیے تھا اور وہ دونوں یہی سننا چاہتے تھے۔ داد و ستائش کے طلب گار کو داد و ستائش ہی مطمئن کرتی ہے۔

''نزہت اس کی ماہر ہیں۔ ذرا وقت تو لگتا ہے لیکن یہ اسے تمام اہتمام سے بناتی ہیں۔ یہ ان کا اپنا وضع کیا ہوا عطر مجموعی یا مشروب بے شمار آتشہ ہے۔'' وہ ہنس کے بولا اور اسے خیال آیا۔ اس نے مچلتے ہوئے اپنی بیگم سے پوچھا۔ ''یہ اپنی جوہی اور یکتا کہاں رہ گئیں۔ ٹھیک تو ہیں وہ؟''

''آرام کر رہی ہیں۔ انہیں ابھی اندر ہی رہنے دیجیے۔'' نزہت خانم نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''کیوں، کیوں، کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں، کوئی خاص نہیں۔'' نزہت خانم ایک نظر مجھے دیکھ کے جھجکتے ہوئے بولی۔ ''بچیاں ہیں، ایڈجسٹ منٹ کے لیے کچھ وقت تو چاہیے۔''

''اوہ!'' اکبر علی خاں کی پلکیں پھڑپھڑانے لگیں۔ ''اسی لیے تو میں انہیں یہاں بلانا چاہتا تھا۔''

''دیکھیے، کچھ دیر میں سہی۔'' نزہت خانم نے یاسیت سے کہا۔

یہ سن کے مجھے جھٹکا سا لگا اور میرا سر جھک گیا۔ نزہت خانم کے لہجے میں شکایت نہاں تھی۔ واقعی دونوں لڑکیوں کی عمریں اتنی پختہ نہیں تھیں۔ میں اسی بات سے ڈر رہا تھا۔ اب میرا یہاں سے چلے جانا ہی مناسب تھا۔ اس گھر میں میرا وجود انہیں مضطرب کیے رکھے گا۔ کہتے ہیں، پہلا تاثر ہی آخری تاثر ہوتا ہے۔ بعض داغ مٹائے نہیں مٹتے۔ بعض لمحے نقش ہو جاتے ہیں، پتھروں پر کندہ لکیروں کی طرح۔

''یہ ہمارا گھر ہم دو میاں بیوی، دو بیٹیوں اور ایک بیٹے پر مشتمل ہے۔'' اکبر علی خاں نے لہکتی آواز میں کہا۔ ''شاید یہ آپ کو عام گھروں سے الگ نظر آئے، اور ہے بھی یہی سچ۔ ہم اپنی طرح سوچتے اور اپنے انداز کی زندگی گزارتے ہیں اور کسی دوسرے پر زور نہیں دیتے کہ ہماری روش ہی بہتر ہے۔ میں نے قانون کی تعلیم کے سلسلے میں تین سال انگلستان میں گزارے ہیں۔ نزہت بھی دو سال وہاں رہ کے آئی ہیں۔ انگلستان کے علاوہ ہم نے یورپ کے دوسرے ملک بھی دیکھے ہیں اور قریب سے۔ جیسا یہاں سمجھا جاتا ہے، وہاں ویسا بالکل نہیں ہے۔ یہاں کے لوگوں کو وہاں کے قمار خانے، مے خانے اور عشرت کدے ہی نظر آتے ہیں۔ وہاں علمی ادارے، کتب خانے اور تحقیقی مراکز بھی کثرت سے ہیں۔ وہاں کے علم و فضل، نظم و ضبط سے یہ لوگ قطعی بے خبر ہیں۔ شائستگی اور اخلاق، کاروبار میں دیانت، معاملات میں صاف اور کھرے، وقت کے پابند، وہ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ ہم تو کہیں گم ہو گئے یا راستہ بھٹک گئے ہیں۔ انہوں نے خود کو دریافت کر لیا ہے اور ان کا یہ عمل جاری ہے۔ ہم ماضی میں زندہ رہتے ہیں، انہیں مستقبل کی فکر رہتی ہے۔ وہ گھٹے ہوئے نہیں رہتے، زندگی ڈھونڈتے ہیں۔ روایت پر اصرار، سہل پسندی ہے۔ یہاں ہمارے آس پاس کی بود و باش بڑی روایتی ہے۔ سو یہ لوگ ہم سے قریب

ہونے میں کتراتے ہیں حالاں کہ ہمیں معلوم ہے، انہیں بھی ہمارے طور طریقے پسند ہیں۔ معلوم نہیں، آپ کے کیا خیالات ہیں۔ آپ ہماری یہ روایت شکنی کس طرح دیکھیں مگر ایک گمان ہے۔ آپ بھی بہ قول آپ کے، جگہ جگہ گھومتے رہتے ہیں۔ سفر کرنے والے روایتوں کے معاملے میں اتنے شدید نہیں ہوتے۔ تعلق تو ہمارا بھی روایتی خاندانوں سے ہے لیکن ہم نئی لہروں، نئی چیزوں کو مشکوک نظروں سے نہیں دیکھتے۔ جو اچھا ہے، اس کے لیے دل کشادہ، جو غیر ضروری ہے، اسے ترک کر دینے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔''

اکبر علی خاں اپنی رو میں مغرب کی اوصاف بیانی میں رطب اللسان رہا۔ اسے کچھ خیال نہیں تھا کہ میں کتنا سن رہا ہوں اور مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔ کسی نے کبھی کہا تھا کہ وکیل ہونے کی پہلی شرط شوق کلام ہے۔ نزہت خانم بھی بے آرام سی لگتی تھی۔ ہر چند اسے اپنے شوہر کی خوش گفتاری کا عادی ہونا چاہیے تھا۔ اسی نے قطع کلامی کی اور اندر جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔

''ارے ہاں۔'' اکبر علی خاں کی جیسے کسی نے چٹکی بھر لی ہو، وہ چونک پڑا اور اس نے مجھ سے معذرت کی۔ ''کچھ احساس ہی نہیں رہا کہ بے موقع گفتگو، محض فضول گوئی ہے لیکن...... لیکن شاید ایک جواز بھی تھا۔ آپ یہاں قیام کریں تو آپ کو اس گھر اور گھر کے مکینوں سے تھوڑی بہت شناسائی ہو جائے، مابین کوئی اجنبیت نہ رہے۔'' اس نے منتظر نزہت خانم سے کہا۔ ''بابر میاں آج یہاں، ہمارے گھر مہمان رہیں گے۔ اوپر کی منزل پر انتظام کرا دیجیے۔ ان حالات میں ان کا باہر نکلنا کسی صورت موزوں نہیں ہے۔ مجھے کچھ دیر کے لیے باہر جانا ہے، جلد واپسی ہو جائے گی۔ زینی سے کہیے کہ وہ مہمان کا خیال رکھے۔''

نزہت خانم نے متجسس آنکھوں سے یہ ہدایتیں سنیں اور نپی تلی آواز میں بولی۔ ''مناسب ہے، کوشش یہی ہوگی کہ مہمان کو کوئی شکایت نہ ہو۔'' پھر اس نے میری طرف نگاہ کی۔ ''کسی چیز کی ضرورت ہو تو تکلف نہ کیجیے گا۔'' یہ کہتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور تیز قدموں سے دروازے کی طرف لوٹ گئی۔

''آپ یہاں بیٹھیے، زینی کو آپ کے پاس بھیجتا ہوں۔ میں بھی ذرا حلیہ ٹھیک کرنے کے لیے اندر جاتا ہوں۔'' بیگم کے اوجھل ہو جانے کی دیر ہوئی کہ اکبر علی خاں ایک گوشے میں رکھی ہوئی میز پر گیا اور کاغذ قلم اٹھا کے میرے پاس لے آیا۔ ''تار کے لیے آپ پیغام کا متن اور پتا لکھ دیجیے۔ میں تیار ہو کے ابھی آتا ہوں۔'' اس چستی و مستعدی سے وہ اپنی طول کلامی کی تلافی کرنا چاہتا ہوگا۔

''یہ، یہ میدا استاد کا ٹھکانا کہاں ہے؟'' میں نے آہستگی سے پوچھا۔ وہ دروازے کی طرف جاتے جاتے رک گیا۔ ''کیوں، کیوں صاحب؟''

''آپ جانتے ہیں؟''

''جی، جی ہاں، میں کیا، سارا شہر جانتا ہے مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں میاں؟''

''یہاں سے کتنی دور ہے؟''

''زیادہ، زیادہ دور نہیں۔'' وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''بیس پچیس منٹ پیدل کا راستہ ہوگا۔''

''میں وہاں جانا چاہتا ہوں۔'' میں نے ٹھیری ہوئی آواز میں کہا۔

''کیا، کیا، کہاں جائیں گے آپ؟ کیا آیا ہے آپ کے دماغ میں؟'' اس کی آواز حلق میں پھنس گئی۔ ''میدا استاد کے ٹھکانے پر؟''

''جی ہاں۔''

''میدا استاد کے سامنے! آپ ہوش میں تو ہیں میاں؟ میں نے آپ کو بتایا ہے، وہ کیسا جنگلی آدمی ہے۔ وہاں، بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنا چاہتے ہیں آپ؟''

"میں آپ سے بالکل متفق نہیں، وہ بہت برے لوگ ہیں، بدترین لوگ۔ ان سے کسی بھلائی کی توقع فضول ہے۔"

"دیکھتے ہیں، ورنہ تو ویسے بھی......"

"ویسے بھی کیا؟" اس کا چہرہ بگڑنے لگا۔ "یہ گھر آپ کے لیے بالکل محفوظ ہے۔ تار ملتے ہی آپ کے بھائی کی دیکھ بھال کے لیے کوئی نہ کوئی ضرور آجائے گا۔ ایک رات اور دن بھر کی بات ہے۔ حوصلہ رکھیے میاں! پٹنا میڈیکل کالج کا اسپتال علاج معالجے میں دور دور شہرت رکھتا ہے۔ وہ اپنی جانب سے کوئی کسر نہ چھوڑیں گے۔ انشا اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

"مگر وہ وقت...... یہ ایک رات اور کل کا دن......" میری آواز ڈوبنے لگی اور میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "مجھے اس کے پاس جانا ہی ہوگا۔"

"معاف کیجیے، آپ بچوں کی سی باتیں کررہے ہیں۔ وہاں جاکے ان بے دادگروں کے سامنے آپ دادفریاد کریں گے کیا؟ ان لوگوں کے آگے جو رحم وکرم نام کی کسی شے سے واقف نہیں۔"

"مگر وہ بھی آدمی ہیں۔"

"مگر کیسے آدمی، کیسے آدمی۔" وہ بھڑکتی آواز میں بولا۔ "ان کے آدمی نے آپ کا بٹوا چرایا۔ چاقو نکال کے وہی آپ پر حملہ آور ہوئے۔ انہی کے ایک آدمی کی غلطی یا نادانی کی وجہ سے ان کا دوسرا آدمی زخمی ہوا، اور ستم یہ کہ پولیس آپ ہی کی تلاش میں ہے۔ وہ ایسے لوگ ہیں۔"

"یہی کچھ اسے باور کرانا ہوگا۔"

"کسے؟ استاد میدا کو؟" اکبر علی خاں کے لہجے میں درشتی آگئی۔ "اور آپ کے خیال میں وہ مان جائے گا؟ اچھا ٹھیک ہے۔ اگر وہ نہیں مانا؟ آپ کیسی باتیں کررہے ہیں۔"

"مجھے راستہ بتائیے۔" میں کرسی سے اٹھ گیا۔

"کیا، کیا آپ واقعی؟ نہیں نہیں میاں۔"

"مجھے جانے دیجیے۔ آپ کا بہت احسان ہے، آپ اور آپ کے گھر والوں نے جس اعلیٰ ظرفی کا سلوک کیا ہے، میں اسے کبھی فراموش نہ کرسکوں گا۔ موقع ملا تو ایک بار ضرور آپ کے پاس، آپ سب سے دست بستہ معافی مانگنے آؤں گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر میں آپ کو باہر جانے نہیں دوں گا۔" اس نے عزم سے کہا۔

"ازراہ کرم مجھے اب مت روکیے۔"

"کیسے جانے دوں، میں آپ کو آگ کے حوالے کردوں؟"

میں نے اپنا بیگ اٹھالیا اور باہر جانے والے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ منع کرتا اور منتیں کرتا رہا۔ انکار کی شرمندگی سے بچنے کے لیے مجھے جلد از جلد باہر نکل جانا چاہیے تھا۔ میں نے لپک کے دروازہ کھولا اور باہر آگیا۔ وہ بھی میرے پیچھے پیچھے تقریباً جھپٹتا ہوا آیا اور ڈیوڑھی میں میرا بازو پکڑ لیا۔ "یہ آپ کے سر میں کیا سودا سمایا ہے؟ ایک تو وہاں تک آپ کا پہنچنا ہی مشکل ہے۔ راستے میں پولیس کی نظروں میں آگئے یا اس بدبخت کے آدمیوں کی......"

"وہ مجھے نہیں روکیں گے۔" میں نے وثوق سے کہا۔ "میں انہیں بتاؤں گا کہ میں میدا استاد کے پاس جارہا ہوں تو وہ مجھے نہیں روکیں گے بلکہ میدا تک پہنچانے میں میری مدد کریں گے۔ ان کی نظروں میں، میں میدا کا مجرم ہوں۔ وہ تو اس عجوبے پر خوشی کا اظہار کریں گے کہ میں خود کو میدا کی عدالت میں پیش کررہا ہوں۔ میدا کی خوش نودی حاصل کرنے کے لیے مجھے اس کے روبہ رو کردینے کی انہیں بے چینی ہوگی۔"

"گویا آپ نے طے کرلیا ہے۔" اس کے شانے لٹک گئے، آواز بھی۔

"میرا اسپتال جانا ضروری ہے۔ میں ا

بھائی کو ایسے نہیں چھوڑ سکتا۔"

"یعنی آپ کا مطلب ہے، اس طرح آپ کو اسپتال میں داخلے کی اجازت مل جائے گی؟ میں نے آپ سے کہا ہے میاں کہ میں آپ کے بھائی کی پرسش کے لیے اسپتال چلا جاتا ہوں۔"

"کاش یہ ممکن ہوگا۔"

"یہ ممکن کیوں نہیں ہے؟"

"حیرت ہے، آپ کی نگاہ امکانی نتائج پر کیوں نہیں گئی؟ بٹھل بھائی کے پاس آپ کے چلے جانے سے مراد ہے، اپنے گھر کی نشان دہی کرنا۔ وہ آسانی سے پھر آپ کے گھر پہنچ سکتے ہیں، جہاں میں روپوش ہوں گا۔"

"یہ کیسے؟ مجھے سمجھائیے۔" وہ جزبز ہونے لگا اور میری کسی تشریح سے پہلے ہاتھ بلند کرکے ہیجانی انداز میں بولا۔ "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ یہ ممکن ہے، قطعی ممکن ہے۔ واقعی یہ پہلو میری نظر سے دور رہا مگر...... مگر اس کے باوجود میں آپ کو مشورہ نہیں دوں گا کہ آپ استاد میدا کے ٹھکانے کا رخ کریں۔"

"میں نے ارادہ کرلیا ہے۔" اپنے لہجے کی مغائرت نے خود مجھے آزردہ کیا۔

وہ میری شکل دیکھا کیا اور مایوسی سے بولا۔ "ٹھیک ہے میاں۔ آپ پر میرا کوئی حکم تو نہیں چلتا۔"

"ایسا مت کہیے۔ میں نے آپ جیسے دردمند اور صاحب دل کم دیکھے ہیں۔"

"پھر بھی آپ میری بات نہیں مان رہے۔"

"مجھ سے اب کچھ مت کہیے۔ میری گزارش ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ اکڑی ہوئی آواز میں بولا۔ "پھر ٹھیریے۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔"

"آپ! آپ میرے ساتھ چلیں گے؟" میرا سارا وجود سٹ پٹا گیا۔ "نہیں نہیں۔" میں نے شدت سے انکار کردیا۔

"کیوں نہیں، میں آپ کو اکیلا کیسے چھوڑ دوں؟"

"وہاں آپ کا جانا مناسب نہیں ہے۔"

"جو میرے لیے مناسب نہیں ہے، آپ کے لیے بھی نہیں ہوسکتا لیکن آپ نے ٹھان ہی لی ہے تو مجھے بھی ساتھ رکھیے۔ آپ تھوڑی دیر کے لیے اندر چلیے۔ میں جوتے پہن کر آتا ہوں۔"

"میری خاطر آپ کیوں جوکھم میں پڑتے ہیں۔ آپ کا تعلق اسی شہر سے ہے۔ آپ کو ان لوگوں کے سامنے نہیں آنا چاہیے۔"

"مجھے نہیں آنا چاہیے۔ میں جانتا ہوں لیکن جب آپ ہمت کرسکتے ہیں تو میں بھی کچھ حوصلہ کرنے کی استطاعت رکھتا ہوں۔ چلیے، اندر چلیے، میں تیار ہوکے آتا ہوں۔"

مزید حجت، تکرار، وضع ومروت کے منافی تھی۔ مروت بڑی زنجیر ہے۔ بادل نخواستہ مجھے دوبارہ اندر آنا پڑا۔ وہ عجب قماش کے آدمی تھے۔ ان کا اصرار میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ آدمیوں کی بھی ہزار قسمیں ہوتی ہیں۔ مجھے کرسی پر بٹھا کے وہ فوراً ہی اندر چلے گئے۔ میرے پاس وقت تھا کہ میں چپکے سے نکل کھڑا ہوں۔ دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن اس طرح بھاگ جانا مجھے اچھا نہیں لگا اور وہ میری توقع سے کم وقت میں واپس آگئے۔ ایسے طرح دار، صاحب وضع، ایسے بانکے شخص کی قدر ومنزلت مجھ پر کیا، کسی پر بھی واجب ہوجاتی۔

انہوں نے سلیٹی رنگ کی شیروانی پہن لی تھی۔ مستزاد سلیم شاہی جوتی۔ سر پہ دوپلی ٹوپی تھی۔ اس وضع قطع میں وہ بالکل مختلف نظر آرہے تھے۔ جیسے کسی تقریب میں شرکت کے لیے جارہے ہوں۔ ممکن ہے، باہر جاتے وقت ان کا یہی حلیہ ہوتا ہو۔ میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس اہتمام کے معنی بھی

کسی قدر سمجھ میں آرہے تھے۔ بہرحال وہ ایک جامہ زیب شخص تھے اور اس لباس میں تو ان کی شخصیت اور پروقار ہوگئی تھی۔ "چلیے صاحب!" ان کی آواز میں مضبوطی تھی، ایسی استواری جو ہر قسم کے ایثار پر آمادگی کے بعد ہی ممکن ہوسکتی ہے۔

ہم ڈیوڑھی سے گزرتے ہوئے گلی میں آگئے۔ ڈیوڑھی سے باہر آ کے وہ ٹھہر گئے۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ کیوں نہ میں اپنا بیگ گھر میں چھوڑ دوں، اور مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ کچھ سوچتے ہوئے انہوں نے میری کمر پہ ہاتھ رکھا اور آگے چل پڑے۔ گلی نسبتہً چوڑی تھی۔ راہ گیروں کی تعداد بھی کم تھی۔ جس سمت سے میں یہاں آیا تھا، اکبر علی خاں اس کی مخالف سمت جارہے تھے۔ ان کی رفتار تیز تھی نہ دھیمی۔ گلی میں ملنے والے اکا دکا راہ گیروں نے انہیں سلام کیا۔ وہ خندہ پیشانی سے جواب دیتے ہوئے بڑھتے رہے۔ ان کے پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے مجھے اپنی حیثیت کسی معمول کی سی محسوس ہونے لگی تھی۔ یوں بھی شناسا راستوں میں راہ گیر کا تیور ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ لمبی گلی پار کر کے ہم ایک کشادہ سڑک پر آگئے۔ سڑک کے کنارے قطار سے چند تانگے خالی کھڑے تھے۔ کچھ کہے سنے بغیر وہ پہلے تانگے پر بیٹھ گئے۔

استاد میدا کا پتا بتانے پر خستہ حال، عمر رسیدہ کوچوان کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے لیکن وہ بڑبڑا کے رہ گیا اور چابک بلند کر کے اونگھتا ہوا گھوڑا بیدار کیا۔ کچھ فاصلے پر سڑک کے دونوں اطراف مکانوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس طرف بھیڑ بھی زیادہ تھی۔ اکبر علی خاں نے دیر تک مجھ سے کلام نہیں کیا۔ میں بھی چپ رہا۔ خاصا راستہ خیریت سے گزر گیا لیکن کچھ اور آگے جا کے بائیں جانب جیسے ہی تانگا ایک دوسری سڑک میں داخل ہوا، اس کی رفتار پہلے جیسی نہ رہی۔ تانگے والا چڑچڑانے لگا۔ اکبر علی خاں کے استفسار پر اس نے بتایا کہ دوپہر سے پولیس کسی مجرم کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اس سے زیادہ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ اکبر علی خاں نے بھی کرید نہیں کی۔ ہم دونوں پچھلی نشست پر بیٹھے تھے اس لیے صرف گزرتا ہوا راستہ ہی نظر آتا تھا۔ تانگے نے کچھ اور فاصلہ طے کیا تھا کہ اسے رک جانا پڑا۔ میں نے اچک کے دیکھا اور ایک لمحے میں سارا منظر عیاں ہوگیا۔ آگے مختلف سواریوں کے پار پولیس تھی۔ وہ ہر سواری اور پیدل راہ گیر کا جائزہ لے کے آگے جانے کی اجازت دے رہی تھی۔ اکبر علی خاں کی معنی خیز نظریں مجھ پر منڈلانے لگیں اور میرے سکوت وسکون سے وہ مطمئن ہوگئے۔ ہم تانگے سے اتر کے پیدل واپس ہوسکتے تھے لیکن نہ انہوں نے ایسا کوئی ارادہ ظاہر کیا نہ میں نے۔ آنے والے وقت سے نبرد آزمائی کے لیے میری طرح انہوں نے بھی خود کو جکڑ کے رکھا ہوگا۔ تانگا تقریباً کھسکتا ہوا پولیس کے قریب پہنچ گیا۔

دھوپ میں سہ پہر کی زردی شامل ہوچکی تھی۔ پولیس کے کئی اہل کار وہاں موجود تھے۔ انہوں نے معاندانہ انداز میں ہم دونوں کو نگاہوں میں تولا اور کوئی سوال جواب کیے بغیر ہمیں آگے جانے کی اجازت دے دی۔ میں نے اپنا بیگ نشست کے نچلے حصے میں ڈال دیا تھا۔ تانگے کا یہ حصہ مختصر پردے سے ڈھکا ہوا تھا۔ بیگ بھی میری ایک نشانی تھا۔ اکبر علی خاں کے گھر میں پناہ حاصل کرنے سے پہلے اردگرد کی گلیوں میں گھومتے ہوئے بہت سے راہ گیروں نے مجھے بیگ کے ساتھ دیکھا تھا۔ پولیس اہل کار تھک گئے تھے یا ان کی توجہ اکبر علی خاں کی سحر انگیز شخصیت ہی پر مرکوز رہی یا انہیں میری شکل اور ہونے والے واقعے میں کوئی نسبت دکھائی نہیں دی۔ کچھ بھی ہوسکتا ہے، تانگا اس مرحلے سے بہ خیر و خوبی گزر گیا۔

کچھ دور بعد تانگا ایک گنجان علاقے میں داخل ہوگیا۔ قریب ہی چوراہا تھا۔ وہاں چاروں طرف دو

تین منزلہ عمارتیں بنی ہوئی تھیں۔ فرشی منزلیں تمام کی تمام چھوٹی بڑی دکانوں، چائے خانوں، اشیائے خورد و نوش، بساطیوں اور پان بیڑی کی دکانوں پر مشتمل تھیں۔ وہیں کسی نے مجھے پہچان لیا۔ وہ ڈاک خانے کی گلی کا کوئی عینی شاہد ہی ہوسکتا تھا۔ اس نے دوسرے، دوسرے نے تیسرے کو اشارہ کیا۔ دیکھتے دیکھتے ان کی وحشت فزوں ہوتی گئی اور شور مچنے لگا۔ ان کے اشاروں کنایوں اور غل غپاڑے سے اکبر علی خاں کو بھی اندازہ ہوجانا چاہیے تھا کہ میں پہچان لیا گیا ہوں اور بات کتنی آگے جاچکی ہے۔ حیرت انگیز طور پر ان کا سراپا کھنچا اور تنا ہوا رہا۔ تانگے والا خاصا سراسیمہ ہوچکا تھا، بار بار پیچھے مڑ کے دیکھتا، کبھی انہیں، کبھی ہمیں۔ چوراہے سے چند قدم کی دوری پر تانگے کے پیچھے پیدل اور سائکل سواروں کی تعداد میں اور اضافہ ہوگیا۔ وہ ہمیں نگاہوں میں رکھے تانگے کے ساتھ ساتھ بڑھتے اور شور مچاتے رہے۔ ان میں سے کوئی بھی قریب یا سامنے آنے اور ہم سے بازپرس کرنے کی جرات نہیں کر پا رہا تھا۔ ہمارے سکون نے شاید انہیں باندھے رکھا تھا۔ میں نے اپنے ہوش وحواس متوازن رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ایک اور موڑ پر آ کے تانگا رک گیا۔ پختہ گندمی رنگت اور نیم پختہ عمر کے ایک پستہ قد، گراں ڈیل شخص نے اچانک سامنے آ کے دائیں جانب سے تانگے کا بم پکڑ لیا۔ وہ بم سے تقریباً جھول گیا تھا۔ موڑ کاٹنے کی وجہ سے تانگے کی رفتار بے حد سست تھی۔ تانگے نے کئی جھٹکے کھائے، گھوڑا ہنہنانے، کوچوان چیخنے لگا۔ "کدھر جئی ہو؟" تانگے کو روکنے والے شخص نے دہاڑتے ہوئے پوچھا۔

کوچوان اور میرے بجائے اکبر علی خاں نے جلدی سے جواب دیا۔ "استاد میدا کے پاس۔ ہمیں ان سے ملنا ہے۔" ان کی آواز سنسنا رہی تھی۔

"اِی ہی ہیں او، بیرو بھیا!" تانگے کے پیچھے بڑھتے ہوئے ہجوم میں سے کسی نے ہانک لگائی۔

"ہم بھی سمجھ لیت ہیں۔" گینڈے جیسے جسم والے بیرو نامی شخص نے نخوت سے کہا۔ "اچھا ہوئیو، جو خود ہی ادھر آ گیو۔"

یہ سنتے ہی تانگے سے چھلانگ لگا کے میں سڑک پر آ گیا۔

"ہاں یہ میں ہی ہوں۔" میں نے بلند آواز سے کہا تو مجمع پر سناٹا چھا گیا اور لمحے بھر میں بھن بھناہٹ میں بدل دیا گیا۔ اس دم اکبر علی خاں نے تانگے سے اتر کے زور سے میرا بازو تھام لیا۔

"یہ میں ہی ہوں، اچھی طرح دیکھ لو۔" میں نے اپنی آواز قابو میں کی اور سرد لہجے میں کہا۔ "میں تمہارے استاد، پٹنا شہر کے راجا استاد میدا کو دیکھنے آیا ہوں۔"

"استاد میدا کو وو......؟" بیرو خالص پوربی لہجے میں 'کو' کو کھینچ کے اور بپھر کے بولا۔

"ہاں اسی کو۔ اسے میری تلاش ہے نا۔ تو میں خود اس کے پاس آ گیا ہوں۔ اسی سے تھوڑی بات کرنی ہے۔ مجھے اس کے پاس لے چلو یا اسے ادھر لے آؤ۔ فیصلہ کہیں بھی ہوسکتا ہے۔"

اکبر علی خاں نے مجھے جھنجوڑا۔ "میاں، میاں۔" وہ ہذیانی انداز میں بولے۔ "یہ آپ کیا پاگل پنا کر رہے ہیں۔ ذرا اپنے آپ کو سنبھال کے، دیکھتے نہیں، ہم کہاں ہیں۔"

میں نے آنکھیں میچ کے انہیں خاموش رہنے کی تاکید کی۔ بیرو نامی شخص کی آنکھیں ابل پڑی تھیں، چہرے پر آگ سی بھڑکنے لگی تھی۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ مجھ پر جھپٹ پڑتا لیکن وہ ٹھہر رہا اور پھنکارتی آواز میں بولا۔ "فیصلہ کرنا ہے؟ پہلے تو ہم تمرے آگے کھڑے ہیں۔"

"تم سے کیا بات کریں۔ تم سے اپنا کوئی بیر نہیں ہے اور تم ایسا چاہتے ہو تو تسلی رکھو۔ تمہاری حسرت بھی نکال دیں گے۔ ادھر ڈاک خانے کی گلی

میں استاد کے تین آدمی دیکھے ہیں، تم کو بھی دیکھ لیں گے۔ پہلے اپنے استاد سے پوچھ کے آؤ۔ بعد کو اسے کوئی شکایت نہ ہو۔'' میں نے کہا۔

میں نے اچھی طرح بیرو کی قسم کا تخمینہ کرلیا تھا۔ وہ اڈے ہی سے متعلق آدمی تھا لیکن کچھ لوگوں کی اڈے سے وابستگی اپنے تن وتوش، استاد کی خدمت، مخبری کے کام وغیرہ سے بھی گہری ہوتی ہے۔ بیرو انھی لوگوں میں سے کوئی ایک تھا۔ چاقو بازی میں، ہوسکتا ہے، کبھی کوئی درک رکھتا ہو لیکن اس کا بھاری جثہ اب چاقو بازی کے لیے لازم مستعدی کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ اتنی دیر میں تین اور آدمی سامنے گلی کے اندرونی حصے سے لپکتے بلکہ بھاگتے ہوئے نظر آئے۔ وہ صاف اڈے کے آدمی تھے۔ انہوں نے قریب آکے ہمارا تانگا، تانگے کے پیچھے ازدحام اور اپنے ساتھی بیرو کا غضب آلودہ چہرہ دیکھا تو حیران و پریشان ہوئے۔ بیرو بری طرح بھنایا ہوا تھا۔ اس کے منہ سے گالیاں اُمڈ پڑیں اور گالیوں کے دوران اس نے ان تینوں کو میرے بارے میں بتایا۔ تینوں کو پہلے یقین ہی نہیں آیا۔ پھر ان کی آنکھیں انگارا ہونے لگیں لیکن انہوں نے بیرو کے شانے تھپ تھپا کے اسے پرسکون رہنے کا درس دیا۔ بیرو پیر پٹخنے لگا۔ ان میں سے ایک، زیادہ عمر کے آدمی نے بیرو کا واویلا نظر انداز کرکے حقارت سے مجھے مخاطب کیا ''تو تم ہواو؟''

میں نے سر ہلانے پر اکتفا کی۔

''کا تم اپنے استاد سے ملیو؟''

''ہاں۔'' میں نے تندی سے کہا۔ ''اسی لیے ادھر آیا ہوں۔''

''کاہے کو؟'' اس نے حاکمانہ لہجے میں پوچھا۔

''اسی سے بات کرنی ہے۔''

''ہم کو نا بولیو؟''

''تم اڈے کے مالک ہو کیا؟''

''اور استاد نا ہی مانن تو......؟''

''مان لیں گے۔'' میں نے یقین ظاہر کیا۔ ''مان لیں گے۔ وہ اڈے کی چوکی پر بیٹھے ہیں، اور نہیں مانیں تو ہمیں آکے جواب دو۔ پھر ہم دیکھیں گے۔''

''کا؟ کا دیکھیو؟'' وہ برہمی سے بولا۔

''تمہیں کیا بتائیں۔ اچھا ہے، تم جا کے استاد کو بتاؤ اور وقت برباد مت کرو۔'' میں نے بے اعتنائی سے کہا۔

مجھے اندازہ تھا کہ اڈے سے استفسار کے لیے آنے والے کسی بھی شخص کو صورت حال سمجھنے، اپنے ساتھیوں اور شور مچانے والے لوگوں پر اپنا بھرم قائم رکھنے، مجھے پرکھنے اور خود اپنی تشفی کے لیے کچھ ہی نوعیت کی حجت کرنی چاہیے گا۔ وہ اڈے کا کوئی معتبر، معتمد آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اسے بھی بہر حال اپنے استاد کی خدمت میں مجھے پیش کرنے کی بے قراری ہوگی اور مجھ سے بات زیادہ بڑھ جانے کی صورت میں استاد کی ناراضی کا خدشہ الگ ہوگا لیکن یوں مجھے اچانک سامنے دیکھ کے اور میرا مطالبہ سن کے اسے فوراً ہامی بھی نہیں بھرلینی چاہیے تھی۔ اس کے ساتھ آنے والے دونوں ساتھی دخل اندازی کے لیے پھڑک رہے تھے۔ بیرو بھی پیچ وتاب کھا رہا تھا۔ کسی وجہ سے وہ خود پر جبر کیے ہوئے تھے اور وجہ ایک ہی ہوسکتی تھی کہ اپنے نسبتہً معمر ساتھی کا پاس خاطر مانع تھا۔ معمر ساتھی، استاد میدا کا کوئی مقرب خاص ہوگا یا کوئی مشاق، زور آور اور صاحب الرائے آدمی۔ اس میں کسی حد تک سنجیدگی تھی۔ سنجیدگی اور بردباری کی بھی اپنی ایک فضلیت ہے۔ میں نے استاد میدا کے سوا کسی اور سے بات کرنے سے صاف انکار کردیا تھا۔ میرا عزم، میرے لہجے کی پختگی سے عیاں تھا۔ اس نے مزید تکرار سے اجتناب کیا، ہنکاری بھر کے جلی ہوئی آواز میں بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ جا کے مالک کو بولت ہیں۔ لگے

ہے، تمرے کو سامنے دیکھ کے او کو خوشی ہووے گی۔''

میں نے اپنی زبان بند رکھی۔ اکبر علی خاں کے چہرے پر رنگ آرہے، رنگ جارہے تھے۔ میرے اشارے پر وہ بدحواسی سے تانگے پر سوار ہوگئے، پھر میں بھی۔ اگلی نشست پر ان میں سے دو آدمی کوچوان کے برابر بیٹھ گئے۔ جیسے ہی تانگے نے حرکت کی، پیچھے ہجوم کا شور بڑھ گیا۔ وہ جو کہتے ہیں، کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ گلی میں کچھ دور جا کے مکانوں کا سلسلہ ختم ہوگیا اور گنجانی بھی کم ہوگئی۔ گلی کا یہ حصہ کچھ چوڑا تھا۔ دونوں اطراف اونچے نیچے، کچے پکے مکانات بنے ہوئے تھے اور ان کے دروازوں، چھتوں اور کھڑکیوں پر لوگ جمع ہوچکے تھے۔ ہمیں بہت آگے جانا نہیں پڑا۔ ادھر ادھر پھیلی ہوئی چھوٹی لال اینٹوں سے چنی ہوئی دیوار کے بیچ میں بنے لکڑی کے ایک بلند اور وسیع پھاٹک کے سامنے تانگا ٹھیر گیا۔ پھاٹک کے دونوں طرف کی دیواروں میں درمیانے سائز کی کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں۔ دیوار سے ملحق کمروں کی کھڑکیاں ہی ہوسکتی تھیں۔ کھڑکیوں کے اوپر روشن دان تھے۔ اینٹوں کی بوسیدہ اونچی دیوار، قدیم طرز کی کھڑکیوں اور چھت کی منڈیروں کے نیچے روشن دانوں سے کسی جیل کا گمان ہوتا تھا۔ پھاٹک کے دائیں بائیں دیوار کے ساتھ کوئی سات آٹھ گز لمبے، گز، سوا گز اونچے چبوتروں پر اڈے کے آدمی مضطربانہ ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ ہمارے تانگے کی آمد پر وہ چبوتروں سے کود پڑے اور انہوں نے تانگا گھیر لیا۔ زیادہ عمر کا آدمی تیزی سے تانگے سے اتر کے کسی سے کچھ کلام کیے بغیر سیدھا پھاٹک کے کھلے بغلی دروازے میں داخل ہوگیا۔ ہجوم کچھ فاصلے پر آکے رک گیا تھا اور اس کا شور بھی کم ہوگیا تھا۔ پھاٹک کے باہر موجود اڈے کے آدمی اصل معاملہ جاننے کے لیے وحشت زدہ ہوں گے۔ تانگے میں بیٹھا دوسرا آدمی بھی اتر گیا اور اس نے سرگوشیانہ انداز

میں انہیں کچھ بتایا تو سب کی نگاہیں ہمی پر مرکوز ہوگئیں۔

اکبر علی خاں اور میں تانگے میں بیٹھے رہے۔ یہ وقت مجھ پر تو جیسا گزر رہا تھا، گزر ہی رہا تھا۔ اکبر علی خاں شاید پچھتا رہے ہوں کہ انہوں نے میری ہم رکابی پر کیوں اصرار کیا تھا۔ ہر طرف لوگ ہمی کو گھور رہے تھے۔ یہ نگاہوں کا شکنجہ یا آنکھوں کا حصار بہت اذیت ناک ہوتا ہے۔ اڈے کے آدمیوں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ہم پر ٹوٹ پڑیں۔

یہ شبہ اب محض شبہ نہیں رہا تھا کہ زخمی ہوجانے والے آدمی کی حالت یا تو زیادہ خراب ہے یا وہ ختم ہوگیا ہے۔ کوئی معمولی قسم کا زخم ہوتا تو ہجوم کی کیفیت ایسی اضطراری نہ ہوتی۔ معمر آدمی کو واپسی میں دیر لگ گئی۔ یہ تاخیر میرے لیے تشویش کا باعث ہونی چاہیئے تھی۔ اکبر علی خاں بھی بے دم سے بیٹھے تھے۔ بہتر یہی تھا کہ معمر آدمی کے ساتھ میں بھی تانگے سے اتر کے اس کے پیچھے چل پڑتا۔ اس نے مجھ سے انتظار کرنے کو کہا بھی نہیں تھا، نہ اپنے ساتھ اندر چلنے کا کوئی عندیہ دیا تھا۔ میں خود ہی ٹھیر گیا تھا۔ اندر یا تو میدا سے اس کی ملاقات فوراً نہ ہوسکی یا وہ میرے بارے میں اپنا رویہ معین کرنے اور کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے باہم مشورت میں مصروف ہوں گے۔ انتظار کرانے کی یہ حکمت دانستہ بھی ہوسکتی تھی، اپنا اثر وتسلط قائم کرنے کی ایک کوشش، منتظر شخص کے اعصاب اور حواس کی آزمائش اور یوں اسے نفسی طور پر پسپا کرنے کی تدبیر۔ تانگے سے اتر کے پھاٹک کے بغلی دروازے سے سیدھے اندر چلے جانے کی جسارت اب قریب عقل نہیں تھی۔ جلد یا بدیر کسی کو بہر حال اندر سے آنا تھا اور مجھے انتظار کرتے رہنا تھا۔

پندرہ منٹ گزرے ہوں گے یا بیس۔ میرے لیے تو یہ وقت بہت طویل تھا۔ اندر سے وہی شخص

نمودار ہو اور اس نے قریب آنے کے بجائے پھاٹک کا دروازے پر کھڑے کھڑے جھڑکتے انداز میں ہاتھ ہلا کے مجھے اندر آنے کی دعوت دی۔ دعوت کیا، حکم دیا۔ میں نے اکبر علی خاں کو سوال طلب نظروں سے دیکھا کہ وہ میرے ساتھ اندر چلنے کے لیے آمادہ ہیں یا تانگے میں ٹھیرے رہنا چاہتے ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی، وہ میرے ساتھ ہی تانگے سے اتر پڑے۔ میرے اندر چلے جانے کے بعد ان کا باہر ٹھیرے رہنا مناسب بھی نہیں تھا۔ اتنے لوگوں کی موجودی میں تنہائی اور کشاکش ان پر بڑی گراں گزرتی۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ پھاٹک کے اندر قدم رکھا۔

پھاٹک کا اندرونی حصہ کسی ڈیوڑھی کے مانند تھا۔ اندر یہ ڈیوڑھی پھاٹک کے طول و عرض سے کہیں زیادہ کشادہ تھی۔ دائیں بائیں دو کمروں کے مساوی چھت سے ڈھکی ہوئی جگہ بھی اس میں شامل ہوگئی تھی۔ یہاں چارپائیاں بچھی پڑی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں گھڑونچی پر گھڑے رکھے ہوئے تھے اور پانی پینے کے لیے کلھڑ یا مٹی کے آب خورے۔ دیواروں میں جا بجا بنی طاقوں میں طرح طرح کا سامان بکھرا ہوا تھا۔ فرش صاف ستھرا تھا۔ پھاٹک کے سامنے کا حصہ کھلا ہوا تھا اور خاصی دور تک کچی زمین دکھائی دیتی تھی اور کہیں کہیں سبزہ بھی اگا ہوا تھا۔ تیز قدموں سے ہم نے معمر آدمی کی پے روی میں پھاٹک کا اندرونی حصہ عبور کیا اور اینٹوں سے استوار گزرگاہ پر آگئے۔ گزرگاہ دائیں طرف مڑ جاتی تھی اور بیس پچیس گز کے فاصلے پر قدیم طرز کی ایک چوکور عمارت پر تمام ہو جاتی تھی۔

جیسا کہ میرا قیاس تھا، اندر، گلی کے ساتھ اٹھی ہوئی دیوار سے پیوست کوٹھیوں جیسے کمرے تعمیر کیے گئے تھے۔ عمارت اور ان کمروں کے سامنے کھلی جگہ وافر تھی۔ اسے چھوٹا میدان بھی کہا جاسکتا ہے۔ میدان کے ایک گوشے میں روایتی اکھاڑا نظر آرہا تھا۔ اس کے ارد گرد مگدر، ڈمبلز، وزن اٹھانے، بل کرنے، الٹا لٹکنے اور بازو بنانے کے ساز و سامان کچھ زمین میں نصب، کچھ ادھر ادھر پڑا ہوا تھا۔ گلی کی دیوار کے سوا چار دیواری کی۔۔۔ باقی تین اطراف کی دیواروں سے آگے قریب قریب بلند اور گنجان درخت ایستادہ تھے۔ یہ درخت بھی کسی فصیل کی طرح تھے۔ پھاٹک کے دائیں جانب واقع عمارت، چار دیواری کے رقبے کے اعتبار سے چھوٹی لیکن یوں بہت بڑی تھی۔ رنگ روغن پرانا ہو چکا تھا۔ چھت کے کنگورے آدھے سالم، آدھے ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔ ساری عمارت اونچے اور موٹے موٹے ستونوں پر ٹکی ہوئی تھی اور کسی قدر اونچائی پر تھی۔ اندر تہ خانہ ضرور ہوگا۔ ممکن ہے، کبھی کسی صاحب ثروت، کشادہ دل کی حویلی رہی ہو اور اس نے اڈے کے کسی استاد کے کارنامے پر خوش ہو کے دان کردی ہو اور اڈے کے آدمی بعد میں اپنی ضرورت کے مطابق اکھاڑ پچھاڑ کرتے رہے ہوں۔ میں نے اڈے کی کوئی ایسی عمارت کبھی نہیں دیکھی تھی۔

گزرگاہ ختم ہونے پر چند قدم کا زینہ طے کر کے عمارت کا منقش، سال خوردہ چوبی دروازہ تھا۔ دروازے پر لوہے کے کڑے نصب تھے اور ڈھلی ہوئی نوکیں۔ شاید عرصے سے بند نہیں کیا گیا تھا۔ لکڑی خاک دھول میں اٹی، فرش میں دھنسی ہوئی تھی۔ دروازہ ایک چوڑی اور روشن راہ داری میں کھلتا تھا۔ ایک نظر میں سارا نقشہ سمجھ میں آگیا۔ آمنے سامنے اور دائیں بائیں چلتی ہوئی راہ داری چار حصوں میں عمارت تقسیم کر دیتی تھی۔ چاروں طرف بھی اسی طرح کے دروازے ہوں گے عمارت کے دوسرے سرے پر سامنے کا دروازہ تو نظر آ ہی رہا تھا۔ وہ بھی چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ کچھ دور بعد راہ داری، ایک بڑے صحن میں ختم ہو کے، صحن کے اسی سیدھ میں دوبارہ شروع ہو جاتی تھی اور مقا

دروازے تک جاتی تھی۔ صحن میں پیلی دھوپ کی روشنی افراط سے تھی۔ اس کے اطراف محراب دار دالانوں کا سلسلہ تھا۔ ان کے پیچھے کمرے تھے۔ ستونوں اور محرابوں سے بیلیں لپٹی ہوئی تھیں، انہیں تراشا نہیں جاتا تھا اس لیے خود پر بار لگتی تھیں اور چھت پر چڑھ گئی تھیں۔ عمارت اندر سے اتنی شکستہ نہیں تھی جتنی باہر سے دکھائی دیتی تھی۔ اندر زندگی رواں دواں تھی۔ اڈے کے کئی آدمیوں سے پہلے تو گزرگاہ ہی میں سامنا ہوا تھا، پھر راہ داری میں بہت سے بے تابانہ ہمارے منتظر تھے۔ ہمیں اندر کی جانب بڑھتا دیکھ کے سمٹنے لگے۔ گلی سے بھی کچھ لوگ ہمارے ساتھ پھاٹک میں داخل ہوئے تھے۔ میں نے اور اکبر علی خاں نے پیچھے مڑ کے ان کی تعداد جاننے کی کوشش نہیں کی۔ ان کی چاپوں اور سرگوشیوں سے ایک اندازہ ہی کیا جاسکتا تھا۔

راہ داری سے گزرتے ہوئے لگ رہا تھا جیسے ہم اڈے کے استاد کے سامنے نہیں، کسی سردار کے دربار میں جارہے ہوں۔ راہ داری سے صحن اور صحن کے پار سیدھے ہاتھ کی جانب دالان کے پاس آ کے معمر آدمی پلٹ گیا اور اس نے ہاتھ اٹھا کے عقب میں آنے والے آدمیوں کو روکا اور قریباً سہ گزی چوڑے دالان سے گزر کے پہلے پڑنے والے کمرے میں داخل ہوگیا۔

عمارت کتنی ہی مختلف ہو مگر یہ جگہ کسی اڈے کی بیٹھک ہی تھی، کسی وسیع ہال کے مانند وسیع و عریض کمرا۔ ہر طرف رنگ برنگے شیشوں کی کھڑکیاں، دیواریں گل بوٹوں سے مرصع۔ نقاشی و مینا کاری زوال آمادہ ہوں تو دید باز کا جسم اینٹھنے لگتا ہے۔ دیواروں پہ کندہ گل بوٹوں کو بھی ایک آب یادی چاہیے۔ کسی وقت یہ کمرا شیش محل جیسا کوئی دیوان خانہ ہوگا۔ ستاروں کی طرح چھت اور دیواروں پر جڑے بیش تر آئینہ پارے اپنی جگہیں ترک کر چکے تھے۔ درمیان کی کشادہ جگہ کے بعد، دروازے کے عین مقابل، دیوار کے وسط میں ایک کم قامت مگر بڑی چوکی پر چند آدمیوں کے ساتھ گاؤ تکیے سے کمر ٹکائے جو شخص سب سے نمایاں نظر آرہا تھا، وہی استاد میدا ہوسکتا تھا۔ اس کے دائیں بائیں دو اطراف بھی دیواروں سے پیوست، چوڑائی میں مختصر چوکیوں اور درمیانی فرش کے کھلے حصے پر پہلے سے بہت سے آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ بہت سے ہمارے ساتھ آئے تھے۔ سب کی نگاہیں ہم دونوں پر مرکوز تھیں۔ ان کے چہروں پر چھایا اضطراب درون خانہ کیفیات کا غماز تھا۔ سرگوشیوں کی ایک گونج کمرے میں منڈلا رہی تھی۔ ہمیں بڑھتا دیکھ کے فرش پر بیٹھے لوگ ادھر ادھر سمٹتے گئے۔ سامنے کی بڑی چوکی سے کوئی دو گز کے فاصلے پر ہم ٹھیر گئے۔

درمیان میں بیٹھے ہوئے آدمی نے ہمارے اتنے قریب آجانے اور ٹھیر جانے پر پہلو بدل کے حقے کی نے منہ سے لگائی۔ ایک اضطراری نظر آس پاس موجود لوگوں پر ڈالی اور خاموش رہا۔ اس کا قد متوازن، جسم ٹھکا اور گٹھا ہوا تھا، تانبے جیسی رنگت، گول چہرہ، نقش و نگار بھرے ہوئے، سر کے سیاہ بالوں میں کہیں کہیں سفیدی کی آمیزش، گھنے اور گھنگھریالے، روغن آلود اور سلیقے سے پیچھے کی طرف کڑھے ہوئے، تنگ پیشانی، اتنی تنگ بھی نہیں۔ مٹیالی رنگت کے باریک سلکی کرتے اور چھوٹی مہری کے سفید پاجامے میں ملبوس۔ باریک کرتے سے اندر پہنی سفید بنڈی جھلک رہی تھی۔ گلے میں تسبیح کے دانوں سے مشابہ نیلے پتھروں کی مالا، دائیں کلائی میں چاندی کی مختصر دریا، چہرے پر سب سے نمایاں اس کی آنکھیں تھیں، گہری، کسی قدر اندر دھنسی ہوئیں اور بے حد چمک دار۔ دیدے متحرک تھے۔ خوب چاق چوبند، چالیس پینتالیس عمر ہوگی۔ اپنی ظاہری وضع قطع سے وہ اڈے کے دادا کے بجائے کوئی مستعد، اپنے گاہک دور سے بھانپ لینے والا دکان دار معلوم ہوتا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ یا اس کا کوئی حاشیہ بردار کسی سرگشتگی کی ابتدا کرے، میں نے ہاتھ اٹھا کے اس کی طرف انگلی اٹھا کے کہا۔ ”تمہی استاد میدا ہو؟ ادھر کے دادا؟“

اس کے جسم میں تموج سا نمودار ہوا اور چمکیلی آنکھوں سے مجھے سرتاپا دیکھا گیا اور چپ رہا۔ اس کے پہلو نشیں ایک پختہ کار آدمی نے زبان کھولی۔ ”ایسی کا بات ہے؟“

”تم استاد میدا ہو؟“ میں نے ناگواری سے پوچھا۔

مجھ سے مخاطب آدمی کسمسا گیا، پیشانی پر شکنوں کا جال پڑ گیا اور کوئی جواب نہ دے سکا۔ بے اختیار اس کی نظریں بیچ میں بیٹھے شخص پر اٹھ گئیں۔ ”ہمیں صرف استاد میدا سے بات کرنا ہے۔“ میں نے اپنی آواز تھامے رکھی اور حتمی انداز میں کہا۔

”ایسی...... کا بات ہے؟ ہم کو بولو بھیا۔“ عمر رسیدہ آدمی مصنوعی نخوت سے بولا۔

”تم کو بولا نا، اپنے کو صرف استاد میدا سے بات کرنا ہے۔“ میں نے تلخی سے کہا۔ میرا اندازہ درست تھا۔ چوکی پر سب سے نمایاں شخص ہی استاد میدا تھا۔ اکبر علی خاں، استاد میدا کو پہچانتے تھے۔ وہ بھی مجھے اشارہ کرسکتے تھے، اچھا ہی ہوا، انہوں نے دخل نہیں دیا۔ ان کے لیے یہ جگہ بڑی اجنبی ہوگی۔ اپنے حواس کی بحالی کے لیے لازماً انہیں کچھ وقت چاہیے تھا یا انہوں نے مصلحتاً خاموشی شعار کی۔

استاد میدا کے آزمودہ کار ساتھی کے چہرے پر برہمی ہویدا ہوچکی تھی۔ وہ اشتعال میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ استاد میدا نے اسے روک دیا اور بھنچی ہوئی مسکراہٹ سے بولا۔ ”ہم میدا ہیں۔“

”تمہی ادھر کے استاد ہو؟“ میرے لہجے میں تجسس شامل تھا، طنز بھی۔ ”پٹنا شہر کے راجا؟“

”کام کی بات بولو۔“ میدا اکھڑی ہوئی آواز میں بولا اور گاؤ تکیے پر کمر سیدھی کرلی۔

”کام کی بات ہی بولتے ہیں اور تسلی رکھو، ہم کو زیادہ بات بھی نہیں کرنا۔“ میں نے اونچی آواز میں کہا۔ ”میدا استاد، ادھر اڈے پر بیٹھے سنے تو نہیں لگتے۔ تھوڑا بہت تم کو اڈے کا ریتی رواج بھی معلوم ہوگا۔“

اس کا منہ بن گیا اور بے چینی سے بولا۔ ”گھمائی پھرائی کے کاہی بات کرت ہو؟ صاف صاف بولو۔“

”ہم ادھر پٹنا شہر میں آگئے ہیں۔ تمہارا وقت اب ختم ہوچکا ہے۔ اڈے کی ریت ہے، اڈا اس کے پاس رہتا ہے جو اس کا بل رکھتا ہو۔ تم یہ ریت بھول گئے ہو تو ادھر بہت سے تمہارے پالتو تم کو یاد دلادیں گے۔ اڈا راج پاٹ نہیں ہوتا، راجا مرے تو راج کمار تخت پر بیٹھ جائے۔“

میدا کی دھنسی ہوئی آنکھیں باہر نکل آئیں۔ اردگرد بیٹھے لوگوں کے چہرے بھڑکنے لگے۔ معمر ساتھی کچھ زیادہ ہی نمک خوار، وفا شعار تھا کہ اس کا جسم بل کھانے لگا۔ اوروں کا بھی یہی حال ہونا چاہیے تھا۔ اسی لمحے اکبر علی خاں نے آہستہ سے مجھے کہنی ماری اور ایک آن کے لیے سہی، زیر و زبر کردیا۔ یہ موقع انہیں سرزنش کرنے کا نہیں تھا۔ میں تو انہیں ساتھ آنے سے منع کررہا تھا۔ اب یہاں سے ان کے واپس چلے جانے، مجھے میرے حال پر چھوڑ دینے اور جو کچھ ہے، مجھے اپنے آپ نمٹنے اور بھگتنے کی درخواست کرنے کا وقت بھی گزر چکا تھا۔ یہ خدشہ ہر لمحہ موجود تھا کہ کہیں وہ کوئی الٹی سیدھی بات، منت گزاری وغیرہ نہ کرنے لگیں۔ مجھی سے غلطی ہوئی۔ انہیں ساتھ رکھنے کی کوئی تک نہ تھی۔ وہ کتنا ہی مصر ہوتے، مجھے صاف انکار کردینا چاہیے تھا۔

چند لمحے توقف کے بعد میدا کی ٹھیری ہوئی آواز گونجی۔ ”جانت ہیں، اپنے کو سب پتا ہے مہا

راج! سارے ریتی رواج کا، جونہیں جانے ہیں، ان کوجتوانے تم ادھر آ ہی گیو ہو۔"

مجھے حیرت ہوئی، اس نے خلاف توقع خود کو قابو میں رکھا تھا۔ بٹھل کہتا تھا، اڈے کے استاد کا یہ تحمل دو ہی صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ یا تو وہ صورت حال کی نزاکت بھانپ گیا ہے، اپنے مقابل کی بے باکی اور طنطنہ آمیز تیور کا اسیر ہو گیا ہے یا اسے خود پر حد درجے اعتماد ہے۔ سوا گلا قدم اٹھانے سے پہلے استاد کے سیاہ وسفید کا تعین، اس کی پیمایش کرلینا بہتر رہتا ہے مگر شاید کسی نظر ثانی کا مرحلہ تمام ہو چکا تھا۔

"چاقو نکالو استاد! تم کو بولا نا، اپنے پاس وقت کم ہے۔" میں نے جھڑکتے لہجے میں کہا اور اسی دم جیب سے چاقو نکال کے تیزی سے کھولا اور خاصی بلندی پر اچھال کے چابک دستی سے دوبارہ ہاتھ میں اچک لیا۔ اتنی بلندی پر چاقو اچھال کے دوبارہ گرفت میں لینے کے لیے نگاہ جمائے رکھنی پڑتی ہے۔ بٹھل کے بہ قول، منتظر ہاتھ کو نگاہ کا پابند کر دینا چاہیے۔ اس توازن سے کسی پچھتاوے کا امکان کم سے کم رہ جاتا ہے۔ میں نے بہر حال ہر ممکن احتیاط کی تھی۔ میرے چاقو نکالنے پر سبھی بے قرار ہو گئے تھے، جو بیٹھے تھے، اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک ساتھ بہت سے چاقو کھلنے کی آواز آئی۔ وہ میدا کے اشارے کے منتظر تھے۔ میدا کا سکون سکوت دیکھ کے شاید انہیں مایوسی ہوئی۔ ایک اور وجہ بھی ان کے ٹھٹھر جانے کی ہو سکتی ہے۔ میں نے چاقو واپس اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

"تم اپنے کو یہاں سے باہر کر دینا چاہت ہو؟" میدا نے بہ ظاہر فکر مندی سے کہا۔ "ٹھیک ہے ساب بہادر! لگت ہے، تمہرے پاس سے بہت کمتی ہے پر ابھی تمری عمریا ہی کتنی ہے؟"

"ہماری جانے دو استاد، اپنے لیے سوچو۔" میں نے درشتی سے کہا "تمہاری کتنی رہ گئی ہے، تمہارے دن ضرور پورے ہو گئے ہیں۔"

اس نے سر جھکایا اور لمحے بھر بعد اٹھایا تو اس کی آنکھیں مچی ہوئی تھیں، پھر اسے جھر جھری سی آئی حقے کا ایک کش لے کے مضحکہ آمیز انداز میں بولا۔ "پر ایک بات پوچھت ہیں بوا ساب...... ہم کو ادھر راج سنگھاسن سے ہٹاویکے پیچھے کیوں پڑت ہو۔" یہ کہتے کہتے اس کا لہجہ فہمایشی ہو گیا "کیوں اپنی جان کے بیری بنو ہو۔ الٹ گیو تو سارا...... تم خود ہی بولت ہو، ہم بھی کسی بوتے پر ادھر راج گدی سنبھالے بیٹھت ہیں۔"

"جانتے ہیں اچھی طرح...... ایسے ہی کسی نے تھالی میں رکھ کے اڈے کی گدی تمہارے آگے نہیں کر دی ہو گی۔ بل کا توڑ بل ہی ہوتا ہے۔ دوسرے میں دم ہے تو پہلے کو جانا پڑتا ہے۔ اڈوں پر یہی الٹ پھیر رہتا ہے۔ ایک جاتا تو دوسرا آ جاتا ہے۔" میں نے اکڑی ہوئی آواز میں کہا۔ "اپنے کو تم سے بیر نہیں پر اپنے لیے کوئی راستہ نہیں چھوڑا تم نے۔"

"ہائیں! ہم ایسا کا کیت ہیں؟" اس نے تمسخرانہ لہجے پر کمرے میں موجود ہجوم کی ہنسی چھوٹ گئی۔ میدا نے انہیں ڈانٹا اور پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ "تہاری ماں نے تو کوئی سکایت نہیں لگائی ہمری؟"

"ہمیں تم سے زیادہ بولنا آتا ہے استاد۔" میں نے ضبط کیا اور تھمی ہوئی آواز میں کہا۔ "اچھا ہے، زبان کھینچ کے رکھو۔ ہاتھ پاؤں اور چاقو کا بل ہی نہیں، اڈے کے استاد کے اور بھی بل ہوتے ہیں۔ وہ تم کو بعد میں بتلا دیں گے۔ پہلے تو چاقو نکالو! دیر کرو گے تو تمہارے یہ پٹھو، تمہاری طرف دیکھنے والے کیا سوچیں گے۔"

دھیرج رکھو بلما! یہ اپنے کو آگے پیچھے سے پورا جانت ہیں۔" میدا سر جھٹک کے بولا۔ "تھوڑی جو کمی رہ گئی ہے، او آج جان جاویں گے۔"

میدا کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ عود کر آئی۔ گردن گھما کے اس نے چوکی پر بیٹھے اپنے ساتھیوں کو دیکھا اور کسی قدر ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "تمرا کھیال آوت ہے، آدمی دیکھ کے ہی ہم چاکو کھولت ہیں۔ ادھر بہت سے تہاری جوڑی کے ہیں۔ پہلے ان کو بھگت لیاو، بعد کو ہم، سامنے آ جاویں گے...... جرورت پڑی تب......"

"ٹھیک ہے۔" میں نے جھڑکتی آواز میں کہا۔ ٹھیک ہے، ایسا کہیں نہیں ہوتا۔ پر تم سامنے آنے سے گھبراتے ہو یا تمہاری کمر میں موچ آ گئی ہے تو اپنے کسی سورما کو آگے کر دو جس پر تم کو اپنے سے زیادہ بھروسا ہو...... اور ایک بات جان لو! استاد خود سامنے آئے یا بدلے میں اپنے کسی رستم کو آگے کر دے۔ رستم کے الٹا ہو جانے پر چوکی سے پھر استاد ہی کو نیچے آنا پڑتا ہے۔"

"جانت ہیں، جانت ہیں۔" میدا کی آواز بگڑنے لگی۔ "پر اتنا آگے کا کیوں سوچت ہو۔"

"آگے کا ہم کو معلوم ہے۔ اس لیے ایسا بولتے ہیں۔" اس یقینی لہجے سے اس پر اپنے اعتماد کا اظہار مقصود تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اور بھڑکتا، میں نے کہا۔ "اور ایک بات بولیں استاد!"

وہ پلکیں پٹ پٹانے لگا۔ اس کے نتھنے پھول گئے۔

"اچھا ہو گا، تم خود ہی چوکی سے ہٹ جاؤ۔ ایسے استاد کو چوکی چھوڑ دینا چاہیے جسے اپنے بل پر بھروسا ہی نہ رہا ہو۔ تمہارے اترنے کے بعد تمہارے کسی ہڈ حرام کو لاج آئی، کوئی بھی اپنی جان کا دشمن اٹھا تو فیصلہ ہمارے بیچ ہو جائے گا، ایک ایک کر کے آخری آدمی تک اڈے کے استاد کے سر پہ تلوار لٹکی رہتی ہے۔ باہر کا نہیں، اڈے کے اندر بھی تمہارے کسی سر پھرے کو مستی سوجھ سکتی ہے۔ یہ تمہارے آمنے سامنے بیٹھے، تمہاری مالا جپنے والا میں کسی کا بھی سر کسی وقت لوٹ سکتا ہے، سمجھتے ہو ہماری بات؟"

اتنی دیر یہ لن ترانیاں سن کے اڈے کے استاد کا کوئی بھی شیدائی بے لگام ہو سکتا تھا۔ کلکتے کے اڈے پر بٹھل کے سامنے کوئی اس طرح دعوا زنی کرتا تو ایک نہیں، بٹھل کے کئی پروردہ بے قابو ہو جاتے۔

اکبر علی خاں نے کہنی مار کے ایک بار پھر مجھے منتشر کیا۔ ان کی موجودگی کسی بوجھ کی طرح مجھ پر مسلط تھی۔ انہوں نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ ان کا چہرہ میرے سامنے نہیں تھا لیکن ان کی دگرگوں حالت کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔

میرے ساتھ آنے پر اب شاید انہیں پچھتاوا ہو رہا ہو۔

بے شک ہم چاروں طرف سے اڈے کے سرکش اور مشتعل آدمیوں کے نرغے میں تھے۔ اب تک نہیں تو کچھ بعید نہ تھا کہ دوسرے لمحے استاد میدا کے کسی بہت دیوانے کے دماغ میں اپنے استاد کے سامنے کچھ کر گزرجانے کا سودا سما جائے۔ اڈے پر موجود ہر شخص اس سرخ روئی کے لیے بے تاب ہو گا۔ اکبر علی خاں ایک ذہین، پختہ کار، معاملہ فہم اور اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمی تھا۔ ولایت میں وکالت کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ایک دنیا دیکھی تھی۔ جلد یا بدیر انہیں یہ نتیجہ اخز کر لینا چاہیے تھا کہ میری یاوہ گوئی بے محل ہے کہ بے سبب۔ چاقو پر میری دست رس کا انہیں علم نہ تھا لیکن شناسائی کی اس مختصر مدت میں انہیں اچھی طرح میرے ہوش وحواس کی درستی کا اندازہ ہو جانا چاہیے تھا۔

اصل تو یہی ہوش وحواس کا توازن، ان کی درستی ہے۔ کسی غیر ارادی، ناگہاں لغزش کا امکان تو ہر وقت رہتا ہے۔ یہ اڈا، یہاں کے لوگ، سبھی کچھ میرے لیے اجنبی تھا۔ میدا اور اس کے آدمیوں کی تمکنت سے میرا ارادہ، آیندہ اقدام مشروط تھا اور ایک نہیں، بیک وقت کئی سمتوں اور پہلوؤں پر نظر رکھنی لازم تھی۔ اڈے کے استاد اور اس کے حاشیہ برداروں کو اڈے کی وضع اور طور طریقوں کی تلقین،

ان پر مسلسل اثر اندازی، ایسی دلیلوں کی یورش جو ساختہ اور بے وزن نہ ہوں اور حاصل یہ کہ کسی تاخیر کے بغیر اپنے مقصد کا حصول۔ بٹھل کہتا تھا کہ دلیل کی کاٹ چاقو سے تیز ہوتی ہے اور محض حجت پر مبنی ہو تو کند پھلکے کا کام بھی نہیں کر پاتی۔ وہ کہتا تھا، دلیل کو دہائی نہیں ہونا چاہیے۔ نہ ان کا وار ایسا شدید ہو کہ مخاطب بدحواس ہو جائے یا ہو جائیں، عقل و ہوش سے عاری۔

میدا بہ ظاہر اتنا مضطرب نہیں لگ رہا تھا جتنا اس صورت حال میں اور میری لاف زنی سے ہونا چاہیے تھا۔ اس کا حال کچھ عجیب تھا۔ کبھی چہرہ تمتما جاتا، آنکھیں سرخ ہو جاتیں اور کبھی ایسا لگتا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں اور سنا ہے تو اعتبار کے لائق نہیں سمجھا۔ بیش تر وہ مطمئن اور مستعد نظر آتا رہا تھا۔ یقیناً زور کے علاوہ اپنے دوسرے اوصاف کی وجہ سے وہ اتنے بہت سے لوگوں اور پٹنا ایسے خاصے بڑے شہر میں ممتاز ہوا ہوگا۔ کسی قدر توقف کے بعد وہ تیکھے لہجے میں بولا۔ ''پوری طرح سمجھ میں آوت ہے ساب! ساتھ تہار مان بھی دیکھت ہیں۔''

''نہیں ہوتا تو اس طرح منہ اٹھائے، سینہ پھلائے سامنے نہیں آجاتے۔''

''اچھا ہی ہوا، تم آپ ادھر چلے آئے۔ ہم بھی تہار کو دیکھن چاہت تھے، پر تم اتنی دیر کیوں لگا دیو بھیا ساب، کدھر چھپ گیو تھے؟'' میدا چبلے پن سے بولا۔

''سمجھو جتنی دیر تم کو ادھر گدی پر راج کرنا تھا، اتنی دیر ہم کو بھی لگنی تھی۔ ابھی تم کو بولا نا، تم نے یہی ایک راستہ کھلا چھوڑا تھا، نکلتے دوسرے بھی تھے لیکن اپنے پاس وقت نہیں ہے۔''

''ایس بھی کا جلدی؟ تم تو ادھر چوکی پر راجا بنن واسطے آیو ہو۔''

''اپنا کوئی ارادہ نہیں تھا ادھر آنے کا، تمہاری چوکی، راج گدی سے اپنا کیا بیر، پر اور راستے اسی طرح کھلیں گے۔'' میں نے ایک ثانیے سانس لی اور تند لہجے میں کہا۔ ''اور ویسے بھی ٹھیک ہی ہوا۔ تم جیسے استاد کو شہر کے اڈے کی چوکی پر نہیں ہونا چاہیے۔ اڈوں کے لوگ چوراچکے، اٹھائی گیرے نہیں ہوتے۔ گلی کے کتوں کی طرح انہیں بھونکنے کاٹنے کے لیے چھوڑ نہیں دیا جاتا، گلوں میں پٹا ڈالا جاتا ہے۔ اپنا بھی تھوڑا بہت اڈا گیروں سے ساتھ رہا ہے۔''

''دوسری جگہیہ پہ کا ہووے ہے؟'' میدا نے آنکھیں پھاڑ کے پوچھا۔ میری تلخ کلامی کا اس پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔

''دوسری جگہوں پر ایسا اندھیر نہیں ہوتا۔''

''رستہ کھلا رکھتے پھر تہرے لیے؟ ہاں بھیا جدھر تمرا من کرے، کل پڑیو۔ تم ادھر دن کے اجالے میں اپنے تین آدمی پر ہاتھ اٹھایو، دو کو آدھا کر دیو، تیسرے کو ٹھکانے لگائے دیو۔ ہا آں۔''

''اور اب چوتھے کی باری ہے۔'' میں نے دہکتی آواز میں کہا۔

میدا کا ٹھیراؤ مصنوعی تھا۔ اس کے جسم میں لہریں اٹھیں۔ قریب بیٹھے ساتھی بھی اپنی جگہوں پر سمٹے اور بندھے نہ رہ سکے۔

''میں...... میں...... مجھے کچھ بولنے کی اجازت ہے؟'' یکایک اکبر علی خاں نے ایک قدم آگے آکے جھجکتے ہوئے کہا۔ سبھی چونک پڑے۔ اکبر علی خاں کا لہجہ مفاہمانہ اور ہاتھ احتجاجی اور کسی قدر فریادی انداز میں اٹھا ہوا تھا۔

اکبر علی خاں نے میدا کو مخاطب کیا تھا۔ میدا کی آنکھوں میں چمک ہویدا ہوئی۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے میں نے سختی سے اکبر علی خاں کو متنبہ کیا۔ ''نہ آپ کچھ نہیں بولیں گے۔''

''بولو وکیل ساب!'' میدا فیاضانہ تیور سے بولا۔ ''کا، کا بات ہے؟''

''نہیں جناب، آپ اس بدقماش سے کوئی کلام

نہ کریں۔ یہ اس لائق ہی نہیں۔'' میں نے اکبر علی خاں کو دوبارہ منع کیا۔

''بولو وکیل ساب! بولو۔'' میدا بے چینی سے بولا۔

اکبر علی خاں کی حالت اضطراری ہوگئی، بے چارگی سے میری طرف دیکھا کیے، کبھی میدا کی طرف۔

''یہ عدالت نہیں ہے جناب، ان لوگوں کو آپ کی زبان نہیں آتی۔ آپ اپنا کہا ضائع کریں گے۔'' میں نے تلقینی لہجے میں کہا۔

''میں صرف، صرف حقائق بتانا چاہتا ہوں۔'' اکبر علی خاں گھٹی گھٹی آواز میں بولے۔

''مگر کس سے؟ یہ شخص اندھا بہرا ہے کیا؟ گلی میں بہت سے لوگ موجود تھے۔ انہوں نے اسے آنکھوں دیکھا نہیں بتایا ہوگا کیا؟''

اکبر علی خاں کا جسم بل کھانے لگا۔

میدا غور سے سن رہا تھا۔ ''آپ کا اس اونچا سر والے بوا ساب سے کوئی رشتہ ناتا لاگت ہے کا، وکیل ساب؟''

''نہیں میدا بھائی، ایسا کچھ نہیں ہے۔'' اکبر علی خاں نے نپا تلا جواب دیا۔

''اوہی تو ہم بھی سوچیں ہیں، آپ ان کے ہات کیسے چڑھ گیو۔ ای اک نمبری چاکو باج، پل بھر میں جمین آسمان تل پٹ کر دیویں۔ آپ کچہری عدالت کے بندھو، کھاندانی بھلے مانس، سہر میں آپ کے نام کا ڈنکا بجت ہے۔'' میدا کا طنز مضحکہ آمیز تھا اور کچھ ایسا کاری نہیں تھا۔ اس نے بہ ظاہر حیرانی سے پوچھا۔ ''پھر کا ہے؟''

اکبر علی خاں کچھ کہنا چاہتے تھے کہ میں نے میدا سے کہا۔ ''سارا رشتہ ناتا ابھی صاف کر دیں گے۔ پہلے چاقو نکالو استاد!''

میدا نے میری برہمی پر توجہ نہیں دی اور اکبر علی خاں سے بولا۔ ''ہاں وکیل ساب، ہم آپ سے کچھ پوچھت ہیں۔ کب سے جانت ہو آپ اپنے سیر ببر کو؟''

''زیادہ دیر سے نہیں۔'' اکبر علی خاں نے متانت سے جواب دیا۔ ''ابھی دوپہر سے۔''

''ابھی اسی دوپہر یا سے ے ے......'' میدا پلکیں جھپکانے لگا۔ ''ادھر گلی میں آپ بھی تھے کا؟''

''نہیں صاحب، میں وہاں نہیں تھا۔'' اکبر علی خاں نے مضطربانہ سر ہلایا۔

''پھر آپ...... آپ؟'' میدا کے چہرے پر کش مکش نمودار ہوئی اور چمکارتی آواز میں بولا۔ ''بولا نا وکیل ساب! ہم کا سب، سب کھل بتا دو۔''

''بہتر ہے آپ یہاں سے چلے جائیں۔'' میں نے برگشتگی سے کہا۔ ''اور طمینان رکھیں، میں اس منہ زور، اس بن مانس کو دیکھ لوں گا۔ یقین کیجیے، اس کا وقت آگیا ہے۔ اس کے سامنے کسی وضاحت اور دلیل و حجت سے کچھ حاصل نہیں۔ یہ دوسری طرح کا آدمی ہے۔''

''خدا کے لیے مجھے کچھ بات کرنے دیجیے۔'' اکبر علی خاں نے شکستہ لہجے میں مجھ سے منت کی۔ ان کی عاجزی اور رنجیدگی پہ ناراضی غالب تھی۔ مجھے میری بدکلامی اور تلخ نوائی سے باز رکھنے کے لیے بس ان کا ہاتھ جوڑنا ہی رہ گیا تھا۔ کسی آخر کوشش کے طور پر انہوں نے حتمی انداز میں سرگوشی کی۔ ''بعد کو آپ کو اختیار ہے۔ آپ کہتے ہیں تو چلا بھی جاؤں گا میں۔''

''کا، کا ہے؟ ہم سے بولو وکیل ساب، بے پھکر ہوئی کے ہم کا بولو۔'' میدا بے قراری سے بولا۔

میرے لیے اب خاموش ہو جانا ہی مناسب تھا۔

''میراان صاحب، اس نوجوان سے کوئی تعلق نہیں ہے میدا بھائی۔'' اکبر علی خاں نے میری خاموشی پر گہری سانس بھری اور دو ٹوک لہجے میں

کہا۔ ”میں آپ کو بتاتا ہوں، میں اور بیوی بچے گھر میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ انہوں نے دروازے پر دستک دی اور بتایا کہ یہ اس شہر میں اجنبی ہیں اور بہت پریشانی میں ہیں۔ پیچھے پولیس ہے۔ ساری بات بتائی کے پٹنا شہر میں آنے کا ان کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ یہ تو آگے جا رہے تھے کہ سفر میں کل رات ان کے بڑے بھائی کی طبیعت خراب ہوگئی۔ جلد علاج کے لیے انہیں آگے کا سفر ملتوی کرکے پٹنا شہر رکنا پڑا اور انہوں نے پٹنا میڈیکل کالج اسپتال کا رخ کیا۔ رات بھر بھائی کے سرہانے اسپتال میں رہے۔ آج صبح بڑا ڈاکٹر مریض دیکھ کے جا چکا تھا۔ انہوں نے نرس سے اجازت لی اور رشتے داروں کو بھائی کی حالت کے بارے میں تار دینے کے لیے یہ بڑے ڈاک خانے گئے تھے کہ ان کا بٹوا کسی نے چھین لیا۔ انہوں نے اس کا پیچھا کیا۔ وہ آدمی بھاگتا ہوا ڈاک خانے کی بازو والی گلی میں داخل ہوگیا اور اس نے ایک جگہ ان کے بالکل سر پہ آجانے پر چاقو تان لیا۔ انہوں نے اسے قابو میں کرلیا اور اپنا بٹوا حاصل کرلیا تھا کہ ایک دوسرے آدمی نے ان کا راستہ روک لیا، دوسرا، پھر تیسرا۔

دونوں کے ہاتھوں میں کھلے چاقو تھے۔ وہ اپنے پہلے ساتھی کی ناکامی کا بدلہ لینے کے لیے ان پر وار کرنا چاہتے تھے، انہوں نے اپنا چاقو نہیں نکالا تھا۔ ان کا کہنا ہے، انہوں نے بہت کچھ کہا، کہا کہ انہیں کہیں جلد ہی پہنچنا ہے۔ شاید اسپتال کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ یہ اپنا بٹوا دینے پر بھی تیار ہوگئے تھے۔ وہ دونوں بہت غصے میں تھے۔ انہیں ہر حال میں اپنا بچاؤ کرنا تھا۔ ایک آدمی کو انہوں نے بس میں کرلیا تھا کہ دوسرے نے کچھ نہ دیکھا۔ اس کی ذراسی چوک سے ان کی پکڑ میں آئے اس کے ساتھی کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ کچھ یہی ہوا، وہ آدمی دیوانہ ہو چکا تھا۔ چاقو اس کے ہاتھ میں تھا۔ یہ کہتے ہیں، انہوں نے اس کے وار سے خود بچنے اور اس کے ساتھی کو بچانے کی کوشش کی لیکن وہ بری طرح بڑھ چکا تھا۔ اس کا چاقو اپنے ہی ساتھی کی پسلی میں اتر گیا۔ اپنی نادانی، جلد بازی کا یہ انجام دیکھ کے اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اب وہی ایک آدمی ان کے سامنے رہ گیا تھا اور اس کی حالت خراب تھی۔ تین چار ہاتھوں میں اسے بھی انہوں نے ادھ موا کردیا۔ اس کے بعد ان کا راستہ صاف تھا۔ کوئی چوتھا پھر ان کے آگے نہیں آیا۔

یہ گلی سے نکل آئے اور اسپتال واپس جانے کے لیے تانگے میں بیٹھ گئے۔ کچھ راستہ طے کرلیا تھا کہ دیکھا، پولیس اور بہت سے آدمی ان تک پہنچنے کے لیے بھاگ رہے ہیں۔ سڑک کے کسی موڑ پر وہ لوگ پل بھر کے لیے اوجھل ہوگئے تھے کہ یہ تانگے سے کود کے قریبی گلی میں گھس گئے اور گلی گلی گھومتے، چھپتے پھرے اور مجبوراً انہیں ہمارے گھر کے دروازے پر دستک دینی پڑی۔ انہیں بھائی کے پاس جلد اسپتال پہنچنے کی فکر تھی۔ پولیس کے ہاتھ آجانے اور کسی بڑے جھگڑے میں پڑنے سے وقت اور نکل جاتا۔ ان کی زبانی سارا واقعہ سن کے مجھے ہمدردی ہوئی۔ میں نے مشورہ دیا کہ تین چار دن میں حالات دب جانے یا ٹھیک ہوجانے تک، بہتر ہوگا، یہ میرے گھر ٹھیرے رہیں۔ میں اسپتال جاکے ان کے بھائی کی دیکھ بھال کرسکتا ہوں۔ ان کا کہنا بھی ٹھیک تھا کہ جس تانگے میں انہوں نے اسپتال سے بڑے ڈاک خانے تک سفر کیا تھا، اسی تانگے سے اسپتال واپس جا رہے تھے۔ استاد میدا اور اس کے آدمیوں کے لیے تانگے والے کو ڈھونڈ نکالنا مشکل نہ ہوگا۔ وہ اسپتال پہنچ گئے تو وہاں ان کے بھائی کے پاس مجھے دیکھ کے ان کا شک میرے گھر پہ جا سکتا ہے۔ اس طرح میں خواہ مخواہ کسی پریشانی سے دوچار ہوسکتا ہوں۔ مجھے تو اسی شہر میں رہنا ہے۔ استاد میدا کے سینے میں میری پھانس چبھ سکتی ہے۔ میں نے کہا، پھر یہ ایسا کریں

کہ مجھے اپنے گھر کا پتا بتائیں، میں ان کے رشتے داروں کو پٹنا آنے کے لیے تار دے دیتا ہوں۔ وہ کل یا پرسوں تک آجائیں گے۔ اس وقت تک یہ میرے گھر چھپے رہیں۔ پھر کسی دن، کسی مناسب وقت، اندھیرا ہو جانے کے بعد رات کو کسی وقت چپکے سے یہ پٹنا شہر سے نکل جائیں۔ انہوں نے میرا ہر مشورہ مسترد کر دیا۔

''یہ نوجوان آدمی ہیں۔ اچانک انہوں نے فیصلہ کیا انہیں خود استاد میدا کے پاس جانا چاہیے۔ میں انہیں منع کرتا رہا۔ یہ نہیں مانے۔ مجھے نہیں معلوم یہاں آنے کا ان کا فیصلہ کس قدر جذباتی ہے یا استاد میدا کو اس کی پرانی جگہ سے بے دخل کر دینے کا بھروسا کس حد تک درست ہے۔ میں نے احتیاطاً ان کے ساتھ رہنا مناسب سمجھا، شاید میرے ساتھ ہونے سے بات اتنی نہ بڑھ پائے۔ جو کچھ میرے علم میں ہے، میں نے آپ کو بتا دیا ہے میدا بھائی۔ میں انہیں بالکل نہیں جانتا، آج ہی آمنا سامنا ہوا ہے لیکن میں نے دیکھا ہے، اپنے بھائی کے پاس جانے کے لیے یہ بہت بے چین تھے۔ بھائی کے لیے یہ کچھ بھی کر گزر سکتے ہیں۔''

اکبر علی خاں کو موقع کی نزاکت کا شدت سے احساس تھا۔ انہوں نے خوش وضعی سے جیسے ایک ایک لفظ چن چن کے، آواز کے کسی زیر و بم کے بغیر، بڑی حد تک غیر جانب داری سے ساری روداد گوش گزار کی۔ مدعا کی ترسیل کے لیے سماعت اور گویائی کا توازن لازم ہے۔ انہوں نے اپنے بیان میں مخاطبین کی سماعت کی استطاعات کا خیال رکھا اور عدالتی طرز بیان سے اجتناب کیا۔ عدالتی بیان میں دلیلیں مسلط کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اکبر علی خاں نے سادگی شعار کی تھی، سادگی اور اختصار، جزئیات اور صراحتوں سے پڑھنے اور سننے والے کا تجسس واشتیاق متاثر ہوتا ہے۔ سطور کم، بین السطور زیادہ، یہی بلاغت کا قرینہ ہے۔ نہ کہتے ہوئے بھی انہوں نے سبھی کچھ کہہ دیا تھا۔ وکیل وہ کتنے ہی بڑے ہوں، ان کا بیان ان کی طبعی ذہانت کی آئینہ داری کر رہا تھا۔ ہر فضیلت کی پہلی شرط ذہانت ہے۔ انہوں نے ہر غیر ضروری ذکر سے پرہیز کیا تھا۔ ہوٹل میں ہمارے قیام، چاقو لہراتے ہوئے ان کے گھر میں میری آمد کی ناگہانی، پردہ دار خواتین کی بے پردگی اور انہیں ہیبت میں رکھنے کے جرم کی گفتنی ناگفتنی سے انہوں نے پہلو تہی کی تھی۔

سارے ہال میں خاموشی چھا گئی۔ میدا کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے دخل دیا نہ میں نے۔ اکبر علی خاں کے چپ ہو جانے پر لمحے گزر گئے، میدا بے حرکت بیٹھا رہا پھر اس نے پہلو بدل کے حقے کا لمبا کش لیا، اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور ایک پل کے لیے آنکھیں میچ لیں۔ اس کی پیشانی پر شکنیں گہری ہو گئی تھیں۔

میری خاموشی کا اب کوئی جواز نہ تھا۔ میدا کے منفی، مثبت تاثر کا انتظار کرنا اب بے محل اور بے مصلحت تھا۔ میں نے اونچی آواز میں اسے مخاطب کیا۔ ''وکیل صاحب کو جو بولنا تھا، بول چکے میدا استاد! سمجھو، وکیل صاحب نے تم سے کچھ بولا اور نہ تم نے کچھ سنا۔ ان کے جھوٹ سچ پر دھیان مت دو اور اپنا میرا وقت اور برباد مت کرو۔'' میں نے پھرتی سے چاقو کھول لیا۔ ''اپنا فیصلہ اسی پر ہونا چاہیے۔ تم کو یہی زبان آتی ہے نا۔''

اکبر علی خاں نے مایوسی سے میری طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔

میدا نے میرا کہا درگزر کیا اور ہاتھ اٹھا کے اکبر علی خاں سے پوچھا۔ ''او تو سب ٹھیک ہے۔ جو آپ بولے، ہم پورے دھیان سے سن لیے، پر آپ کا سمجھت ہیں، ہمرا مطلب ہے، آپ کتنا جانت ہیں، ای سارا سیدھا ہی بولت ہیں کا؟''

''میں نے جو دیکھا اور سنا ہے، وہی آپ کو بتایا ہے۔'' اکبر علی خاں الجھی ہوئی آواز میں بولے۔

''ایک بات صاف کر دوں میدا بھائی، میں ان کا وکیل بن کے یہاں نہیں آیا، میں نے آپ سے ان کی کوئی سفارش بھی نہیں کی ہے لیکن کچھ...... کچھ باتیں......'' کہتے کہتے اکبر علی خاں رک گئے۔ ان کے ہونٹ بھنچ گئے، لحظہ بھر تامل کیا اور مایوسی سے بولے۔ ''جانے دیجیے، بہتر ہوگا، آپ دونوں خود ہی نمٹ لیجیے۔''

''او کا...... کا بات؟'' میدا مچل کے بولا۔ ''او تو آپ جیسا بولت ہو، بعد کو ہم دیکھ ہی لیں گے۔ ہم کو ہی سارا دیکھنا ہے، پر آپ بولو، آپ کا...... کا کہنا چاہت تھے؟''

''کچھ نہیں میدا بھائی۔'' اکبر علی خاں کی آواز بھاری ہو گئی۔ ''یہ ہمارے گھر اپنی مرضی سے آئے تھے، ہماری دعوت پر، ہماری خوشی سے نہیں، اور انہوں نے ہمیں کچھ سوچنے سمجھنے، کچھ کرنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔''

میدا اچھل پڑا۔ اس نے اکبر علی خاں کو بات پوری کرنے نہیں دی۔ ''جرور چاقو نکالا ہوئے گا۔ چاقو سے کھیلن کا ان کا بہت چاؤ لاگت ہے۔ ای ہی نا؟''

اکبر علی خاں نے تائید کی، نہ تردید۔ بردباری سے بولے۔ ''شروع میں انہوں نے زور ڈالا تھا، ڈالنا ہی چاہیے تھا لیکن جلد ہی ہماری ساری حیرت دور کر دی، دکھ بھی اور خوف بھی۔ انہوں نے گھر کے کسی فرد کو تنگ نہیں کیا، کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اپنے آنے کی وجہ بتائی اور گھر میں اس طرح داخل ہونے کی معافی چاہی۔ کچھ دیر گھر میں رہنے کی اجازت چاہی۔ اس کے سوا کچھ نہیں...... میں نے بہت کریدی اور ان کے جواب پر کسی اور طرف دیکھنے سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ انہوں نے اسپتال اور ڈاکٹر کا نام بھی بتایا۔ میں نے آپ کو ابھی بتایا ہے کہ یہ دو تین دن ہمارے گھر ٹھہرے رہنے کے مشورے پر راضی نہیں ہوئے۔''

اکبر علی خاں کے لہجے میں پہلے سے کہیں زیادہ اعتماد تھا۔ کہنے لگے۔ ''اتنی عمر میں ہم نے بھی کچھ دیکھا بھالا ہے میدا بھائی، اپنا کام ہی ایسا رہا ہے بھانت بھانت کے لوگوں سے واسطہ پڑا ہے، ایک سے ایک بڑھ کے۔ تھوڑی بہت آدمی کی پہچان ہونی چاہیے۔ آپ کے آدمی اور پولیس والے ان کے پیچھے نہ ہوتے تو یہ ہمارے گھر میں کیوں داخل ہوتے۔ کوئی اور بات، کوئی اور ارادہ ہوتا ان کا تو یہ ہم سے کسی اور طرح پیش آتے۔ میں نے دیکھا ہے، ان میں حوصلے کی کمی نہیں۔ یہ پولیس کے سامنے بھی آ جاتے اگر انہیں کسی جگہ پہنچنے کی بے کلی نہ ہوتی۔''

میدا کی بھویں چڑھ گئیں اور نتھنے پھڑکنے لگے۔ نخوتی لہجے میں بولا۔ ''پولیس کو تو ہم ابھی ادھری بلوا سکت ہیں۔ آپ کو پتا ہے وکیل ساب۔'' اس کی آواز تڑخنے لگی۔ ''اپنا ایک آدمی چلا گیو، بہت پرانا ساتھ تھا اپنا۔ کا چاقو کھاوت تھا، بجلی لپکت تھی اس کے انگ انگ میں۔ اس حرام جادے کا اتنا کھون نکل گیو کہ اسپتال کے رستے میں دم توڑ گیو۔ تمرے اس سکتی وان، سری مان کے کارن اس کی ہتیا ہو گیو۔ ایسو میں کوئی دچھا لاگت ہے وکیل ساب، ہم سے جیادہ آپ جانت ہو۔ ای ہم سے چاقو کی بات کرت ہیں۔ پہلے ہمرے آدمی کا حساب چکتا کر دیں۔ اسارے کا دیر ہووے گی، پولیس ادھر آ جاوے گی۔''

''اشارہ کرو نا، بلاؤ پولیس کو، سوچتے کیا ہو پھر؟'' میں نے پھنکارتی آواز میں کہا۔ ''پر ہم کو معلوم ہے استاد، تم ایسا نہیں کرو گے، اپنے ان پٹھوؤں کو کیا جواب دو گے، کس منہ سے سامنا کرو گے ان کا، کیا سوچیں گے یہ ایسے استاد کے لیے جو چوکی پر بیٹھا اینڈتا رہا، چوکی سے چمٹے رہنے کے لیے استاد کے پاس پولیس کی آڑ رہ گئی تھی۔ تم خوب جانتے ہو گے، ایسے راجا کو پرجا کب تک سہن کرے گی، کب تک پلکوں پہ بٹھائے گی اسے۔''

میدا کا چہرہ سلگ رہا تھا، حقے کی نے اس کی انگلیوں میں لرزاں تھی۔ اس کے ساتھیوں کے پیچ وتاب کا بھی کچھ یہی عالم تھا۔

''ہم تو خود ادھر آئے ہیں حساب صاف کرنے۔'' میں نے دانستہ اپنی آواز کسی قدر مدھم کی۔'' اپنے پرانے آدمی کے بچھڑ جانے پہ تمہارا خون بہت کھولتا ہے۔ بڑا چاقو گھماتا تھا وہ، بڑی بجلی تھی رگ رگ میں۔ اس کو تو پورا دیکھنا بھی نہیں آتا تھا استاد! چاقو کے کھیل میں ہاتھ، آنکھیں اور دماغ باندھ کے رکھنا پڑتا ہے۔ یہ تال میل نہ ہو تو وہی ہوتا ہے جو اس کے ساتھ ہوا۔ اسے تو کب کا ڈھیر ہو جانا چاہیے تھا۔ لگتا ہے، کبھی کوئی اصیل نہیں پڑا تھا اس کے سامنے۔ تم اپنی بات کرتے ہو۔ ہمارے راستے بند کر کے ہمیں کتنا دکھ پہنچایا تم نے، اسے تم کیا جانو گے اور پولیس کی بات کرتے ہو، چوکی سے اتر کے پہلے ہمارے سامنے آؤ۔ اپنا وعدہ سمجھو اسے۔ اتنے لوگوں کے بیچ بولتے ہیں، پولیس کے سامنے ہم خود آجائیں گے۔''

''میری بات سنیے۔'' اکبر علی خاں نے دونوں ہاتھ اٹھا کے بہ شدت تمام رخنہ اندازی کی۔ ''میری بات سنیے میدا بھائی۔ آپ کے آدمی کو انہوں نے نہیں مارا۔''

''نہیں مارا......'' استاد میدا بھڑک اٹھا۔ ''وہ آپ مرگیو سسرا۔ کا بولت ہو۔'' وہ بھن بھناتی آواز میں بولا۔

''میری بات سنیے میدا بھائی۔ لگتا ہے جو کچھ میں نے پہلے کہا ہے، آپ نے اس پر پورا دھیان نہیں دیا۔'' اکبر علی خاں نے ٹھہر ٹھہر کے کہا۔ ''سمجھیے، جیسا یہ کہتے ہیں، ایسا ہی ہوا اگر...... تو آپ ان کا راستہ کھوٹا کرنے کے سوا کچھ نہ کر پائیں گے۔ بعد کو پچھتاوا بھی ہو سکتا ہے آپ کو۔ میں ان کا کہنا دہراتا ہوں۔ ان کا کہنا ہے، انہوں نے چاقو نہیں نکالا تھا۔ آپ کے آدمی کا چاقو اس کے ساتھی کی پسلی میں جا گھسا ہے۔ انہوں نے مرنے والے کو بچانے کی کوشش کی تھی۔ بات کہاں سے شروع ہوئی تھی۔ پہلے آپ کے آدمی نے شہر میں اجنبی اس نوجوان کا بٹوا چوری کیا۔ بٹوا واپس لینے کے لیے انہیں اس کا پیچھا کرنا چاہیے تھا یا دیکھتے رہ جاتے، چپ کھڑے اپنے لٹ جانے کا تماشا دیکھتے رہتے۔ مسافر کا بٹوا، سفر میں اس کی پونجی چھن جائے تو اس کی کیا حالت ہوگی۔ گلی میں جیب کترے کا پیچھا کر کے انہوں نے بٹوا حاصل کر لیا۔ ظاہر ہے، انہیں اپنے آپ پر بھروسا تھا کہ یہ ایسی آسانی سے چور کو فرار ہونے نہ دیں گے۔ نہ ہوتا تو وہیں، ڈاک خانے میں چیختے چلاتے رہ جاتے۔ بٹوا ملنے کے بعد بات ختم ہوگئی تھی لیکن اسی وقت آپ کے دو آدمی ان کے آڑے آگئے...... بتائیے، پھر یہ کیا کرتے۔ آپ ان کی جگہ ہوتے تو کیا کرتے، اور کوئی ہوتا تو......؟ ان کی جیب میں چاقو تھا۔ انہوں نے بات بڑھ جانے کے خیال سے جیب ہی میں پڑے رہنے دیا۔ چلیے، یہ جو کہتے ہیں، اس پر نہ جائیے۔ سب غلط ہے لیکن گلی کے لوگ! انہوں نے بھی کچھ دیکھا ہے۔ وہ آپ سے کتنی دور ہیں اور...... اور یہ کہاں بھاگے جا رہے ہیں۔ پولیس بلوا کے آپ انہیں ہتھکڑیاں ڈلوا سکتے ہیں لیکن پولیس کا کام ایک حد پہ جا کے ختم ہو جاتا ہے۔ کچہری کی بات دوسری ہوتی ہے۔ وہاں شطرنج کی بازی جمتی ہے، بال کی کھال نکالی جاتی ہے۔ پھر ایک جگہ سے دوسری جگہ، تیسری جگہ۔ بات آگے تک چلی جاتی ہے۔ یہ ہار جائیں یا جیت جائیں، آپ کا جانے والا ساتھی کسی صورت واپس نہیں آئے گا۔ جس بیمار بھائی اور اسپتال کے بارے میں یہ کہہ رہے ہیں، وہ بھی کسی دوسرے شہر میں نہیں ہے۔'' اکبر علی خاں نے بے چارگی سے ہاتھ پھیلائے اور تھکے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''میں اس سے زیادہ کیا کہوں۔ آپ سمجھ دار ہیں۔''

شاید میدا کو توقع تھی، اکبر علی خاں اسے کچھ اور قائل کرنے کے لیے نکتہ آفرینیاں کریں گے لیکن یوں اچانک اپنی عرض گزاری سے دست بردار ہو جانے پر وہ چونک سا پڑا اور اس نے اپنے قریب بیٹھے معمر آدمی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ معمر آدمی کے پپڑی جمے سیاہ ہونٹ پھڑ پھڑا کے رہ گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے سے کچھ نہیں کہا۔ غصہ وغضب کے علاوہ اب میدا کے چہرے پر کش مکش وکشاکش بڑی نمایاں تھی۔ حقے کی نے منہ سے چپکائے اس نے جلدی جلدی کئی کش لیے اور نکیلی آواز میں بولا۔ ''اب آپ ان کی وکالت کرو ہو وکیل ساب۔''

''صرف ان کی نہیں، سوچیے تو آپ کی بھی۔'' اکبر علی خاں نے کسی جھجک کے بغیر کہا۔ ''یہ تو میری رائے ہے میدا بھائی۔ میرا کیا زور ہے آپ پر؟ آپ نہ مانیں، حکم ہو تو زبان ہی بند رکھوں۔''

''اپنے لیے بھی کوئی حکم کرو استاد!'' اکبر علی خاں کے چپ ہوتے ہی میں نے کہا۔ لہجے لفظوں کے رنگ بدل دیتے ہیں۔ میرے بہ ظاہر سرد لہجے میں آگ سی لگی ہوئی تھی، میدا کے جسم وجاں میں بھی منتقل ہوئی ہوگی۔ میں نے سختی سے پھر اسے ٹوکا۔ ''چوکی سے نہیں اترنا تو پولیس کو بلواؤ۔ جو کچھ بھی ہے، تھوڑی مہربانی کر دو، جلدی کرو۔''

اکبر علی خاں نے دبے لہجے میں مجھے پولیس کے حوالے کر دینے کی صورت میں طویل اور پیچیدہ مرحلوں کے عواقب سے میدا کو آگاہ کرنا ضروری سمجھا تھا۔ انہیں کیا معلوم تھا کچہری عدالت تو دور کی بات ہے، صرف ایک دن اور مجھے بھُل کے پاس نہ پہنچ پانے کا عذاب بھگتنا ہوگا۔ اتنا وقت میں نے جس طرح گزارا ہے، وہ میں ہی جانتا ہوں۔ میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ یہ ایک دن بھی مجھے جیسے تیسے کاٹنا ہے۔ ایک دن یا ڈیڑھ دن۔ بس اس سے زیادہ نہیں۔ پٹنے سے کلکتا ایسا دور نہیں ہے۔ انہیں خبر ملنے کی دیر ہوگی۔ پہلی گاڑی سے چل پڑیں گے۔ کل تک جامو، جمرو، زورا اور جانے کون کون یہاں پہنچ جائیں گے۔ کل استاد میدا باقی اور شاید یہ اڈا ہی قائم نہ رہے۔ وہ ایسے ہی لوگ ہیں۔ اپنے مربی استاد بھُل کی حالت دیکھ کے تو وہ اور پاگل ہو جائیں گے۔ میدا کے پاس پھر کیا جائے اماں رہ جائے گی۔

میں میدا سے یہی کچھ کہنا چاہتا تھا کہ مجھے پولیس کے حوالے کرنے سے اڈے پر اس کی حکم رانی بے شک جاری رہے گی لیکن تا کجے، صرف ایک رات اور ایک دن کے لیے۔ پھر یہاں سب کچھ بدلا ہوا ہوگا۔ میں نے اس سے کچھ نہیں کہا کہ اب مزید کہنے سننے کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ کچھ ہی دیر جاتی تھی، میدا کو بہرحال کسی نتیجے پر پہنچنا ہی تھا اور یہ آسان کام نہیں تھا۔ مجھے احساس تھا کہ اڈے کے اتنے لوگوں کے درمیان کسی عزت مندانہ فیصلے کے لیے اب اسے میری اعانت کی ضرورت ہے۔ ابتدا ہی میں اس کے پیش وپس سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ چوکی سے دست برداری پر آمادہ نہیں ہے۔ وہ ناپختہ، کچی عقل کا آدمی نہیں معلوم ہوتا تھا کہ ایک اجنبی چاقو بردار کے مطالبے پر سینگ آگے کیے ڈکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہو۔ اڈے کے تین آدمیوں کی پس پائی کا واقعہ اس اجنبی شخص سے منسوب تھا اور جس تیور سے اس نے اڈے کے استاد کی عمل داری میں، اس کے حاشیہ برداروں کے درمیان آکے ایک طرح کی یورش ویلغار کی تھی، اڈے کا کوئی بھی استاد ہوتا تو یہی تحمل وتامل کرتا۔ میدا کو بھی میرا میزان کرنے کے لیے کچھ مہلت مطلوب ہوگی۔ کچھ میں نے بھی درازئ وقت سے عملاً چشم پوشی کی تھی۔ اڈے کے آزمودہ کار استاد کا ارادہ دگرگوں کرنے کے لیے وقت کا اتنا اصراف تو لازم ہی تھا۔ چاقو گھماتے، لہراتے ہوئے میری جانب سے مسلسل دعوت مبارزت اور مسلسل یاد

دہانی سے استاد کی فکر وتشویش میں اضافہ ہی ہوتا رہا ہوگا۔

ادھر اکبر علی خاں نے درمیان کا کوئی فسانوی راستہ نکالنے کے لیے اپنی سی کوشش کی تھی۔ ان کی موجودی سے اتنا ضرور ہوا کہ میدا استاد کی فہمائش وسرزنش کا جو کام مجھے کرنا اور کرتے رہنا تھا، اس کی زحمت نہیں کرنا پڑی۔ اکبر علی خاں نہ ہوتے تو مجھی کو سارا کچھ دیکھنا تھا۔ میں اکیلا ہوتا تو شاید اتنی دیر نہ لگتی مگر وضع ومروت میں جو شخص ساتھ آیا تھا، ایک شریف النفس، تعلیم یافتہ، صاحب دل، صاحب نظر شخص۔ بت کی طرح کھڑے رکھنے کے بجائے اسے بھی اپنی مفاہمانہ، صلح جویانہ کاوش کا کوئی موقع ملنا چاہیے تھا۔

پہلی نظر میں میدا مجھے کوئی مشکل آدمی نظر نہیں آیا تھا۔ ہوتا بھی تو میں تو اس کے اڈے، اس کی قلم رو میں آچکا تھا۔ مجھے ہر حال میں اس سے معرکہ آرائی کرنا تھی۔ واپسی کسی طور ممکن نہیں تھی۔ میرا تخمینہ غلط بھی ہوسکتا تھا۔ بٹھل کے کہنے کے مطابق مقابل کی نادیدہ برتری کی ایک گنجایش ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے اور اپنی کسی اتفاقی کوتاہی کا امکان بھی۔ اور بٹھل ہی کا کہنا تھا کہ چاقو آزمائی سے پہلے مقابل کی نفسی واعصابی شکست اور بخت کے لیے ہر ممکن حربہ آزمانا چاہیے۔ یہ بھی ایک حقیقت تھی، میں ہی جانتا ہوں کہ تمام تر یقین اور خود اعتباری کے باوجود اس دوبدو عداوت سے پہلوتہی کی خواہش مجھے بھی تھی کہ میرا دل دماغ تو بٹھل میں اٹکا ہوا تھا۔ میں کتنا ہی اپنے آپ کو باندھ کے رکھوں، مجھے تو وہاں اسپتال میں بٹھل کے سرہانے ہونا چاہیے تھا۔ پولیس طلب کر کے مجھے اس کے حوالے بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس پہلو پر تو میں نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ اڈوں کو پولیس کی دخل اندازی سے دور رکھا جاتا ہے۔ اڈوں کا تو خود پولیس ایسا نظام ہوتا ہے اور اڈے کے استاد کی پشت پر صرف اس کا بل ہوتا ہے، پولیس کی پشت پناہی نہیں۔ یہ استاد کی پستی وپس ماندگی ہے کہ خود کو محفوظ رکھنے کے لیے پولیس کو آلۂ کار بنائے۔ میدا سے مجھے اس کم ظرفی وکمینگی کی امید نہیں تھی۔ اڈے کے آدمیوں کے لیے بھی ان کے استاد کی یہ ناروا حرکت بڑی سبکی کی بات تھی۔

آئینے پر چھائی دھند ختم ہورہی تھی۔ اب مجھے بہت کچھ صاف نظر آرہا تھا لیکن ایسا تیقن بھی نامناسب تھا۔ میدا نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ جواب خاصا مشکل بھی تھا۔ اس دوران اکبر علی خاں نے چپ سادھے رکھی، مایوسی میں یا میری طرح کسی خوش گمانی میں۔ بہرحال تو تکار اور تاویل وتکرار کا مرحلہ اب تمام ہوچکا تھا۔

استاد میدا مجھے گھورتا اور حقے سے شغل کرتا رہا، پھر اس نے پہلو میں بیٹھے معمر آدمی سے قریب ہو کے کچھ کہا۔ معمر آدمی کی پیشانی سکڑ گئی اور ہونٹ پھیل گئے۔ دونوں چند لمحے ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے رہے۔ معمر آدمی کبھی انکار، کبھی اقرار میں سر ہلاتا رہا اور اس نے میدا کا بازو پکڑ کے کچھ سمجھانے کی کوشش کی، بڑبڑاتے ہوئے نزدیک بیٹھے ساتھیوں کو متوجہ کیا۔ ان کے چہرے بھی سلگ رہے تھے۔ لگتا تھا، معمر آدمی کی ہم نوائی کررہے ہیں۔ میدا کا منہ بگڑ رہا تھا اور یکا یک اس نے جھٹکے سے حقے کی نے فرش پر ڈالی، دونوں بازو سمیٹے، پھیلائے جیسے تازہ دم ہونا چاہتا ہو۔ جیب میں ہاتھ ڈال کے ہاتھ باہر نکالا تو خالی نہیں تھا، بند چاقو ہاتھ میں تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے بھی ہاتھ پیر سیدھے کیے، دائیں بائیں جسم گھمایا، چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور اکبر علی خاں کو اشاروں میں تسلی دی، ان کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ چوکی پر اور آس پاس، آمنے سامنے اور کھڑے ہوئے لوگوں کی بھن بھناہٹ ہال میں گونجنے لگی تھی۔

میدا نے چاقو کھول کے دھار پر انگلی پھیری۔

معمر آدمی کے ہاتھ چومے۔ معمر آدمی نے انکار میں شدت سے سر ہلایا۔ میدا اٹھا ہی چاہتا تھا کہ معمر آدمی نے اس کی کلائی گرفت میں لے لی اور آنکھیں بھینچ کے تنبیہی انداز میں کچھ تاکید کی۔ میدا کے چہرے پر بیزاری اور ناگواری نمایاں تھی۔ ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگ اس کے اور قریب ہوگئے اور گھیرا سا ڈال دیا۔ میدا آمادہ نظر نہیں آتا تھا مگر جیسے زچ ہوگیا ہو، منہ موڑ کے اور سر جھکائے اس نے معمر آدمی کے بڑھے ہوئے ہاتھ کے آگے چاقو کردیا۔ معمر آدمی نے جھپٹنے کے انداز میں چاقو تحویل میں لے لیا۔ ہر طرف شور امڈ پڑا۔ معمر آدمی نے ہاتھ بلند کر کے انہیں خاموش رہنے کی ہدایت کی اور ادھر میدا کی کمر تھپک کے ممنونیت کا اظہار کیا اور میری طرف نگاہیں مرکوز کیں۔ پہلے ایک دوبار، چاقو والا ہاتھ فاصلے کے تعین کے لیے آگے پیچھے کیا۔ میری نظریں بھی اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے ناپ تول کے اتنی اونچائی سے چاقو اچھالا کہ درمیان کی لمبائی مجھی پر ختم ہو۔ چاقو کھلا ہوا تھا۔ چاقو سے اس کی دست برداری اور میری گرفت کا وقفہ لمحوں پر مشتمل تھا۔ میں نے سارا ہوش چاقو کو دستے سے پکڑنے میں صرف کیا اور مجھ سے کوئی چوک نہیں ہوئی۔ معمر آدمی کا منشا میری سمجھ میں آچکا تھا۔ اب میری باری تھی۔ مجھے اپنا چاقو اسی چابک دستی اور مشاقی سے اس کا اور اپنا فاصلہ ذہن میں رکھ کے اچھالنا تھا۔ معمر آدمی بھی منتظر تھا۔ پہلے میں نے میدا کا چاقو سکون سے بند کیا پھر اپنا چاقو پھینکا۔ مجھے حیرت ہوئی اور کسی قدر خوشی بھی۔ اس کبرسنی کے باوجود چاقو پکڑنے میں معمر آدمی سے ذرا سی کوتاہی سرزد نہیں ہوئی۔ احتیاط سے چاقو بند کر کے اس نے میدا کی طرف بڑھایا۔ بادل نخواستہ، لمبی سانس کھینچ کے اور آنکھیں چڑھا کے میدا نے چاقو جیب میں رکھ لیا۔

''تم جاسکتے ہو۔'' معمر آدمی نے دھڑکتی آواز میں مجھے مخاطب کیا۔ ''پر تمرے کو لوٹ کے ادھر آنا ہے۔''

میں نے سر کو خفیف جنبش دی اور حتمی لہجے میں کہا۔ ''تمہاری یہ مرضی ہے تو یہی سہی۔ استاد میدا کا چاقو میرے پاس ہے اور مجھے اپنا چاقو واپس لینا ہے۔ کسی کی بھینٹ ہے وہ، اور اپنے کو بہت راس ہے۔ میں اسے ہر دم ساتھ ہی رکھتا ہوں۔''

معمر آدمی کوئی جہاں دیدا اڈا گیر تھا۔ ہوسکتا ہے، میدا اسی کا پروردہ ہو۔ میدا نے اس کے ہاتھ کو بوسہ بھی دیا تھا۔ جس مہارت سے معمر آدمی نے میری جانب چاقو پھینکا اور میرا چاقو اچکا تھا، کچھ اسی طرح نپا تلا اس کا لب ولہجہ تھا۔ اس ساری حکمت کی صراحت اس نے ضروری سمجھی۔ وہی اس کی مقامی طرز بیان تھی۔ اس نے کہا کہ کسی فیصلے تک پہنچنے میں دیریوں ہوئی کہ اجنبی نوجوان (یعنی میں) مختلف صورت حال میں یہاں آیا ہے۔ اڈے کے تین آدمیوں کے ساتھ پیش آنے والے واقعے میں وہ ملوث ہے۔ ان تینوں میں ایک تو زندگی ہار بیٹھا ہے۔ اڈے کا ہر آدمی اپنے پرانے ساتھی کی ناگہاں موت، اس کی جدائی پر دل گیر ہے۔ خطا کار کو بدترین انجام تک پہنچائے بغیر کسی کو چین نہیں آئے گا۔ نوجوان کی طرف سے اڈے کے استاد سے چوکی سے اتر جانے کا مطالبہ اور اسی کے ہاتھوں یا اس کی وجہ سے چند گھنٹے پہلے اڈے کے سرکردہ آدمی کے خون کا واقعہ دو الگ الگ باتیں ہیں۔ نوجوان کو اس ستم گری کی سزا ضرور ملنی چاہیے اگر واقعی وہ مرتکب پایا جائے۔ رہا اڈے کی چوکی پر قبضے کا معاملہ، تو استاد میدا اڈے کے ریتی رواج سے خوب واقف ہے۔ بے شک کوئی بھی، کسی وقت حاضر استاد کی نااہلی پر انگلی اٹھا سکتا اور اپنی اہلیت کا دعوا کرسکتا ہے۔ ثابت کردینے پر اڈے کی سربراہی اسی کو سزاوار ہے۔

نوجوان محض اڈے کی چوکی پر حق جتانے آتا تو

دکر صورت ہوئی۔ فیصلے میں ایسی دیر نہ لگتی لیکن دو
باتیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ نوجوان کا کہنا ہے کہ اس کا
بھائی شہر کے اسپتال میں زیرِ علاج ہے اور تیماردار
اس کے سوا کوئی نہیں، اور بھائی کے پاس اسپتال
پہنچنا اس لیے ممکن نہیں رہا کہ استاد میدا کے حکم سے
شہر کے راستے اس پر بند کر دیے گئے ہیں۔ استاد
میدا اور اس کی گدی سے اسے ایسا سروکار نہیں۔
مجبوری میں یہی ایک تدبیر اسے سجھائی دی کہ اڈے
کے استاد کو بے دخل کر کے خود اڈے کا استاد بن
جائے۔ سامنے اڈے کا مستند استاد ہو تو ذہنی انتشار یا
کسی بے حد شخصی اعتماد ہی میں کوئی اتنا بڑا دعوا کر سکتا
ہے۔

استاد میدا نے اپنے ساتھیوں کے مشورے اور
شہر کے معزز شخص وکیل اکبر علی خاں کے بیان پر
اعتبار کرتے ہوئے نوجوان کے راستے میں حائل
بندشیں دور کر دی ہیں اور مبارزت سرِدست ملتوی
کر دی ہے۔ میدا استاد اور اس کے ساتھی شقاوت
اور سنگ دلی کا کوئی الزام اپنے سر لینا نہیں چاہتے
اور حقیقت جاننے کے خواہش مند ہیں۔ اس مہلت
سے انہیں حقائق کی چھان بین کا اچھا موقع مل
جائے گا اور جیسا کہ وکیل صاحب کا خیال ہے، وہی
سچ ہوا تو نوجوان خاطر جمع رکھے، اڈے کی طرف
سے وہ ہر قسم کے بغض و عناد سے مبرا ہو گا۔

چاقوؤں کی منقلی سے مراد ہے کہ دونوں
فریقوں کے درمیان پنجہ آزمائی بہ وجوہ ملتوی کی گئی
ہے، ختم نہیں، انکار نہیں کیا گیا۔ التوا کی رعایت
میدا استاد کی کشادہ دلی اور خود اعتمادی پر محمول کی
جائے کہ ذہنی فشار سے دوچار اپنے مقابل سے
معرکہ آرائی وہ اس وقت مناسب نہیں سمجھتا۔ اس
اعتراف کے باوجود کہ اڈے کی چوکی سے نوجوان کو
کوئی واسطہ نہیں، بھائی کی صحت کی بحالی کے بعد
اسے بہر حال اپنے دعوے کی پے روی کے لیے
اڈے واپس آنا ہے۔ اس نے اڈے کے اتنے
لوگوں کے سامنے ان کے استاد کی بھی حیثیت پر
کیچڑ اچھالی ہے۔ اڈوں کی روایت کی تعمیل
استاد میدا پر لازم ہے۔ اسے ثابت کرنا ہے کہ وہی
اڈے کی گدی پر برقراری کا حق رکھتا ہے۔ اس کے
ساتھی بھی اسی کو اڈے کے استاد کی حیثیت سے
دیکھتے رہنا چاہتے ہیں۔ استاد میدا ان پر سایہ بنا رہا
ہے۔ انہیں یقین ہے کہ زور اور چاقو بازی میں دور
دور تک اس کا ثانی نہیں اور وہی ان کے درمیان
رہے گا، اور وہ بھی جانتے ہیں کہ اڈے کے دو طلب
گار ایک دوسرے کے مقابل ہوں تو کسی ایک کو اپنی
توانائی کی قیمت چکانی پڑتی ہے۔ نوجوان نے اپنی
برتری ثابت کر دی تو استاد میدا کے جاں نثار،
اڈے کے یہی لوگ اس کے خیر مقدم میں کوئی بخل
بھی نہیں کریں گے کہ اڈوں کا یہی طور ہے۔ اس
عارضی مدت میں نوجوان خود کو ہر طرح محفوظ سمجھے۔
نگرانی کے باوجود اڈے کا کوئی آدمی اس سے باز
پرس نہیں کرے گا۔ نوجوان بھی گرہ میں باندھ لے
کہ اسے اڈے واپس آ کے مبارزت کا موقوف
معاملہ نمٹانا ہے۔ استاد میدا اس کی جلد واپسی کا منتظر
رہے گا۔ اس دوران اس نے شہر سے فرار کی کوئی
حرکت کی تو وکیل اکبر علی خاں کو ذمے دار سمجھا جائے
گا۔ وہ نوجوان کی ہمدردی میں اس کے ساتھ آئے
ہیں اور انہوں نے اس کے حق میں اڈے کے استاد
کو قائل کرنے کی موثر کوشش کی ہے۔ یہ پہلو وکیل
اکبر علی خاں کے ذہن نشین رہے کہ ان کا واسطہ اسی
شہر سے ہے اور اڈے کے لوگ ایک حد تک ہی
فیاضی اور درگزری کی استطاعت رکھتے ہیں۔

اڈے پر سناٹا چھایا رہا۔ معمر آدمی کا لہجہ اتنا
درشت تھا نہ ایسا نرم۔ سکوت میں اس کی بوڑھی آواز
کی گونج بڑھ گئی تھی۔ میں پورے انہماک سے
سنا کیا۔ عدالت کے کسی جج کے مانند اس نے فیصلہ
سنا دیا تھا۔ میں نے اسے نہیں ٹوکا کہ یہ اکبر علی خاں
بیچ میں کیسے آ گئے۔ میرے ساتھ ان کے آ جانے،

ہم دردی کا اظہار کرنے اور حقیقت حال سے آگاہ کرنے سے مراد میری ضمانت کہاں ہوئی۔ ضمانت وغیرہ کا تو کوئی ذکر ہی نہیں آیا۔ کہنے کو بہت کچھ تھا لیکن نہ معمر آدمی چاہتا تھا نہ میں نے اس کی یا وہ گوئی پر حرف زنی مناسب سمجھی۔ ایسی پیچیدہ اور نازک صورت حال میں گھرا آدمی یہی کچھ کرسکتا تھا، اور مجھے غنیمت جان کے خاموش رہنا تھا۔ مجھے تو اڈے سے نکلنے اور اسپتال پہنچنے کی جلدی تھی۔ اخلاقاً اس کا شکریہ بھی ادا کرنا چاہیے تھا لیکن یہ تشکر میری جانب سے ان ساروں پر مرتب ہونے والے تاثر کی نفی کرتا۔ معمر آدمی کی سوجھ بوجھ سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اڈے پر اسی کا دماغ کام کرتا ہے۔ اس نے اڈے کے لوگوں میں میدا کا وقار اور دبدبہ بحال رکھنے اور دوسری طرف اڈے کو کسی ناخوش گوار واقعے سے محفوظ کرنے کے لیے اپنے جتن خوب کیے تھے۔ اس نے ہر گوشے اور ہر سمت کا خیال رکھا تھا۔ اس کا نام مجھے اب تک معلوم نہیں ہوسکا تھا۔ اڈے سے رخصت کے وقت کچھ رسمی کلمات ادا کرنے ضروری تھے۔ میں نے کھنچی ہوئی آواز میں معمر آدمی کو مخاطب کیا۔ ''میں آؤں گا بڑے صاحب۔ تسلی رکھیں، مجھے اپنا چاقو واپس لینا ہے۔ میں ضرور آؤں گا، پھر دیکھ لیں گے۔''

یہ اختصار ہی اس وقت موزوں تھا۔ معمر آدمی کی بھی یہی خواہش ہوگی۔ میں نے اکبر علی خاں کو اشارہ کیا۔ وہ تو گم سم سے تھے۔ میرے ٹوکنے پر چونک پڑے۔ سامنے چوکی پر بیٹھے اور ادھر ادھر کھڑے اڈے کے لوگوں کو ہم نے پھسلتی نظروں سے دیکھا اور دروازے کی طرف پلٹ گئے۔ پیچھے کھڑے لوگوں نے دائیں بائیں ہٹ کے ہمارے لیے راستہ بنا دیا۔ ہم دروازے سے نکلنا ہی چاہتے تھے کہ معمر آدمی کی بلند آواز پر رکنا پڑا۔ اکبر علی خاں کو اس نے پکارا تھا۔ وہ ان سے معذرت کرنے لگا۔ ''آپ پہلی بار ادھر آیو ہو وکیل ساب، اور ہم تمری کوئی آؤ بھگت نہ کر سکے۔ سمے ہی الٹا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں دھنوا بابو کی لاش آ رہی ہے۔ ادھر سبھی اسی کارن اکٹھے ہیں۔ آپ جانو اس سمے......'' معمر آدمی کی آواز چیخنے لگی۔

اکبر علی خاں نے سر جھکا کے سلام کرنے کے انداز میں ہاتھ اٹھایا، جواب دینے کی کش مکش سے دوچار رہے اور کچھ کہہ نہ پائے۔ معمر آدمی کو بھی احساس ہوگیا تھا۔ اس نے بھی ہاتھ اٹھا کے سلام کا جواب دیا اور اکبر علی خاں کو مشکل سے نکالنے کے لیے لمحے بھر بعد استاد میدا کی طرف متوجہ ہوگیا۔ میں نے آہستہ سے اکبر علی خاں کو ٹہوکا دیا تو وہ گھبرا سے گئے اور کسی معمول کے مانند میرے ساتھ چل پڑے۔

اڈے کی عمارت میں اب شور پھوٹ پڑا تھا۔ میرے جی میں آتا تھا کہ بھاگ کر فاصلہ طے کروں لیکن ہم دونوں متوازن رفتار سے عمارت سے نکل آئے، درمیانی کھلا حصہ اور ڈیوڑھی عبور کرکے سڑک پر آگئے۔ عمارت کی طرف جاتے ہوئے دو تین آدمیوں سے آمنا سامنا ہوا تھا۔ اندر سے کوئی ہمارے پیچھے نہیں آیا۔ چار دیواری کے باہر بھی اکا دکا آدمی موجود تھے۔ تانگے والا قریب ہی گلی میں ایک کنارے کھڑا ہمارے انتظار میں پریشان پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے اضطراب کا سبب یہی ہوسکتا تھا کہ اڈے کے آدمیوں کی زبانی اسے کچھ بھنک مل گئی ہو۔ یہ تو اسے اچھی طرح معلوم ہی تھا کہ یہ جگہ کون سی ہے۔ تانگے کی پچھلی نشست پر ہم دونوں بیٹھ گئے۔ دھوپ کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ آگے چوک کی دکانوں کی چہل پہل بھی کم تھی۔ گلی اور چوک سے گزر کے ہم چوڑی سڑک پر آگئے اور گھوڑے نے سرپٹ بھاگنا شروع کردیا۔

اکبر علی خاں نے شیروانی کے اوپر کے بٹن کھول دیے۔ کئی بار انہوں نے پیشانی پر ابھرنے والی بوندیں رومال سے خشک کیں۔ دور آجانے کے بعد ان کے چہرے پر آتے جاتے رنگ ٹھیر سے گئے تھے۔ دیر تک انہوں نے مجھ سے کوئی کلام نہیں کیا۔ میں نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو جیسے انہیں لب کشائی کا حوصلہ ہوا۔ ان کے ہونٹ کپکپائے، سن سنائی آواز میں بولے۔ ''یہ سب کچھ کیا تھا میاں؟''

''جو آپ نے دیکھا، وہی تھا۔'' میں نے کہا۔

''مگر، مگر یہ کیا ہوا بھائی؟''

''کیا ہوا۔'' میں نے آنکھیں میچ کے کہا۔ ''جو ہونا تھا، وہی ہوا۔''

''آپ، آپ کو اندازہ تھا؟'' وہ حیرانی سے بولے۔

''وہاں جا کے کچھ دیر بعد ہوگیا تھا۔''

''یعنی کہ ہم، ہم اس طرح......''

''اس طرح چلے آئیں گے۔''

''ہاں میاں!...... مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا۔''

''آپ کیا سمجھ رہے تھے؟''

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، دماغ ہی کام نہیں کر رہا تھا۔ ایسی جگہ اور ایسے لوگوں سے پہلی مرتبہ سابقہ پڑا تھا۔'' اکبر علی خاں وحشت زدگی سے بولے۔ ''دل دھڑکتا رہا کہ آنے والا لمحہ کیا رخ اختیار کرلے، کس کروٹ جا بیٹھے۔''

''آپ نے بڑی جرات کی۔'' میں نے کہا۔

''کیسی جرات۔'' اکبر علی خاں ہیجانی انداز میں بولے ''جو منہ آیا، بکتا گیا۔ بس یقین تھا کہ سچ کہہ رہا ہوں۔ جسے آپ جرات کہہ رہے ہیں، اس کی وجہ یہی تھی۔''

''ورنہ یہ سب کچھ مجھے کہنا پڑتا، ویسے میں نہیں چاہتا تھا کہ آپ دخل دیں۔''

''مجھے معلوم تھا لیکن میں کب تک چپ رہتا، سوچا کہ شاید اسی طرح کچھ بات بن جائے۔''

''آپ نے میرا کام آسان کردیا۔''

''کیا کردیا۔'' اکبر علی خاں بکھری ہوئی آواز میں بولے۔ ''ایک بات تو بتایئے میاں، اگر واقعی وہ بدذات مقابلے پر آمادہ ہو جاتا؟''

''نہیں ہوتا۔''

''کیوں، کیسے...... یہ آپ وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟''

''جس وقت اسے ہونا چاہیے تھا، اس نے وہ وقت نکال دیا تھا۔''

''لیکن اگر ہو جاتا، فرض کیجیے، اگر ہو جاتا؟''

''تو میں تو اسی غرض سے گیا تھا۔''

''یعنی آپ......'' وہ سٹ پٹا کے بولے۔ ''آپ!''

''ہاں'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''یوں تو ہو کچھ بھی سکتا تھا لیکن میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔ میں تو وہاں ہوتے ہوئے بھی وہاں نہیں تھا۔ مجبوری کی بات دوسری ہے۔ اس لیے میں بار بار اسے دعوت دیتا رہا۔ ہوسکتا ہے، اس نے مجھے پاگل دیوانہ سمجھا ہو کہ ایسے شخص کے منہ لگنا ٹھیک نہیں۔ ایسا شخص تو کچھ بھی کرسکتا ہے۔''

''مجھے تو یہی دھڑکا لگا ہوا تھا۔'' اکبر علی خاں سراسیمگی سے بولے۔ ''آپ اس کی عزت نفس پر مسلسل وار کر رہے ہیں، اس کے اتنے بہت سے ساتھیوں کے سامنے، کہیں اس کی غیرت کا پیمانہ چھلک نہ جائے۔''

''اور اس کی محتاط روی کی وجہ بھی تو یہی ہوسکتی ہے کہ اڈے کے اتنے لوگوں کے سامنے شرمندگی نہ اٹھانی پڑ جائے۔''

''ہاں ہاں، یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے۔'' اکبر علی خاں اضطراری لہجے میں بولے۔ میرے چہرے پر ان کی بے قرار نظریں منڈلا رہی تھیں۔ ''لیکن ایک بات...... ایک بات سے مجھے آپ نے مطمئن نہیں کیا۔''

''میں آپ کو ہر بات سے مطمئن کردوں گا۔'' میں نے نرمی و شائستگی سے کہا۔ ''مگر اس وقت مجھ

سے کوئی سوال جواب مت کیجیے۔ میں آپ کو ابھی کچھ نہ بتا پاؤں گا۔ اس وقت تو بس کسی طرح جلد سے جلد اسپتال......"

"مناسب ہے۔" وہ کسمسا کے چپ ہوگئے اور کچھ توقف بعد آہستگی سے بولے۔ "گھر نزدیک ہے۔ آپ نے دوپہر بھی کچھ نہیں کھایا۔ کچھ دیر ٹھیر کے کیوں نہ اسپتال چلیے، زیادہ وقت نہیں لگے گا۔"

"نہیں، ابھی نہیں۔" میں نے صاف انکار کردیا۔ "نہ جانے میرے وہاں نہ ہونے پر کیا چہ میگوئیاں ہو رہی ہوں۔ ڈاکٹر رائے کیا سوچ رہا ہوگا اور بُھل بھائی کے ہوش وحواس بحال ہوئے تو مجھے پاس نہ دیکھ کے وہ تو بہت پریشان ہوجائیں گے۔ نرس کتنے ہی عذر کرے لیکن آپ نہیں جانتے، وہ کیسے آدمی ہیں۔ اس حالت میں وہ اٹھ کھڑے نہ ہوجائیں۔ انہیں ذرا بھی شبہ ہوگیا، کتنی ہی حالت خراب ہو، وہ نکل پڑیں گے۔ وہ ایسے ہی ہیں۔"

"ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔" اکبر علی خاں اداسی سے بولے۔ "آپ بھی ٹھیک کہتے ہیں۔ آپ کو پہلے اسپتال ہی جانا چاہیے۔"

"جیسے ہی ان کی طرف سے تسلی ہوئی، میں آپ کے گھر آؤں گا۔ مجھے تو آپ سب سے دست بستہ معافی مانگنی ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب، کیا میں آپ کے ساتھ اسپتال نہیں جاسکتا؟" وہ شکایتی انداز میں بولے۔

"جاسکتے ہیں، کیوں نہیں مگر دیر ہوگئی ہے۔ پہلے آپ کو گھر جانا چاہیے۔ وہاں سب آپ کی راہ دیکھ رہے ہوں گے۔"

"آپ کو مجھے اپنے ساتھ لے جانے میں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟" ان کے شکوے میں ناراضی بھی شامل ہوگئی تھی۔

"نہیں نہیں، آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" میں نے معذرت کی۔ "مجھے تو ادھر گھر والوں کی فکر ہے۔ انہیں مطمئن کرکے کچھ دیر بعد آپ اسپتال آجایئے۔"

"نہیں جناب، میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ یہ کیا بات ہوئی۔" اکبر علی خاں فیصلہ کن لہجے میں بولے۔

انہوں نے کوچوان کو کچھ ہدایت کی۔ ڈیڑھ فرلانگ بعد تانگا دائیں طرف کی سڑک پر مڑ گیا۔ دفتر بند ہونے کا وقت تھا۔ سڑکوں پر سواریوں اور پیدل چلنے والوں کی بھیڑ ہوگئی تھی۔ تانگے کی رفتار میں بھی فرق آگیا تھا۔ جیسے جیسے اسپتال نزدیک آرہا تھا، میرا دل بیٹھا جاتا تھا۔ میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں تھا اور مجھے کسی جرم کا احساس ہو رہا تھا۔ معلوم نہیں، یہ کیسی ندامت تھی جو مجھے ہلکان کررہی تھی۔ غلطی میری ہی تھی۔ اسپتال سے نکلتا، نہ یہ سب کچھ پیش آتا۔ پھر جیب کترے نے بٹوا اڑالیا تو اس کے تعاقب کی حماقت دوسری غلطی تھی۔ اکبر علی خاں کا لہجہ اضطراب بے جا نہیں ہے۔ میں نے انہیں جیسے تیسے چپ کرادیا ہے لیکن استاد میدا کے اڈے پر بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف تھا۔ بہرحال اب پشیمانی سے کیا حاصل تھا۔ آدمی سے غلطیاں ہوتی ہیں۔ زندگی میں غلطیوں کا کتنا دخل ہے۔ غلطیوں سے زندگی کا سلسلہ چلتا ہے، غلطیاں، زیادہ غلطیاں، چھوٹی غلطیاں، بڑی غلطیاں۔ کبھی بڑی غلطی سے کچھ نہیں ہوتا، کبھی ایک چھوٹی غلطی زندگی بھر کا روگ بن جاتی ہے۔ آدمی اشرف المخلوق کہا جاتا ہے۔ آدمی تو بہت ناقص، بہت ادھورا ہے۔ ایک دماغ ہی اس کے قابو میں نہیں تو کس بات کا افتخار، کیسی برتری۔ کہتے ہیں آدمی دماغ کے سوا کچھ نہیں اور دماغ تو بہکتا، بھٹکتا رہتا ہے۔ دماغ کو آدمی کا مطیع ہونا چاہیے نا کہ دماغ آدمی پر حاوی ہو۔ دیکھا جائے تو آدمی سارا گردن سے اوپر ہے، یہ کم قامتی، درازقدی تو ایک گمان ہے۔ آدمی کے قد کی پیمائش تو گردن سے اوپر کے حصے سے ہونی چاہیے۔

ایک جگہ سڑک ٹوٹی ہوئی تھی۔ تانگے کو گھوم کے جانا پڑا۔ دھوپ سمٹنے لگی تھی۔ پانچ بج چکے تھے۔ تانگے والے کو کرایہ ادا کرنے کے لیے میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تھا، اکبر علی خان سامنے آگئے اور انہی نے پیسے ادا کیے۔ تانگے کی نشست کے نیچے رکھا ہوا بیگ بھی انہیں یاد تھا۔ میں تو بھول ہی چکا تھا۔ انہوں نے بیگ بھی مجھے اٹھانے نہیں دیا اور میرا ہاتھ تھامے ہوئے اسپتال میں داخل ہوگئے۔

شام کے وقت اسپتال میں عیادت کاروں کا ہجوم ہوتا ہے۔ ہم نے جلدی جلدی فاصلہ طے کیا۔ بُھل کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے میری سانس پھولنے لگی تھی۔ اسپتال کے اس حصے میں جہاں سب سے کشادہ اور آرام دہ کمرے بنے ہوئے تھے، نسبتہً سکون تھا۔ میں تیزی سے کمرے میں داخل ہوا چاہتا تھا کہ جسم کو جھٹکا سا لگا۔ کئی ڈاکٹر اور نرسیں بُھل کے بستر کے گرد موجود تھے۔ میں نے بے اختیار اکبر علی خاں کو دیکھا۔ انہوں نے بیگ ایک کونے میں رکھ کر میرا شانہ تھپ تھپایا۔ ہم دبے قدموں پلنگ کی طرف بڑھے اور ڈاکٹروں کے پیچھے جاکے کھڑے ہوگئے۔ میں آگے جانے کے لیے بڑھ گیا تھا۔ اکبر علی خاں نے مجھے روک لیا۔

ڈاکٹر نرسوں کو ہدایتیں دیتے اور دھیمی باتیں کرتے رہے۔ ان میں ڈاکٹر رائے بھی تھا۔ میں نے ان کی گفتگو سننے کی کوشش کی لیکن میرے تو حواس ہی منتشر تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ چند منٹ بعد ڈاکٹر رائے، بُھل کے بستر سے ہٹ گیا۔ اپنے ساتھی ڈاکٹروں سے مشورہ کررہا تھا کہ اس کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ چونک پڑا۔ "تم، تم کہاں تھے؟" اس نے میری جانب انگلی اٹھا کے انگیریزی میں پوچھا۔

"کیا، کیا حال ہے ان کا؟" میں نے جھپٹتی آواز میں کہا۔

اس نے شانے اچکائے۔ "ابھی دماغ کے ایک ماہر ڈاکٹر، ڈاکٹر فرینکی کو بلا کے دکھایا ہے۔ اتفاق سے ان دنوں وہ انگلستان سے لیکچر دینے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ایکس ریز دیکھ لیے گئے ہیں، کچھ اور ڈاکٹر فرینکی نے بھی تجویز کیے ہیں۔" اس کے لہجے میں درشتی تھی۔

"سب ٹھیک تو ہے ڈاکٹر صاحب؟" میں نے اٹکتی زبان سے پوچھا۔

اس نے فکرمندانہ انداز میں سر ہلایا۔ "ہم کوشش کررہے ہیں۔"

"یہ تو ایک فرسودہ جملہ ہے۔ اس سے مریض اور تیماردار کی تشفی نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے، آپ اپنی کوشش کررہے ہوں گے لیکن مجھے کچھ اور بتایئے۔"

اس کا جسم تن گیا، چہرے پر رنگ آیا۔ "اس کے سوا بتانے کو ابھی کچھ نہیں۔" وہ بے گداز آواز میں بولا۔

"ایکس ریز میں اور کیا کیا...... اور کیا......؟" مجھ سے پوچھا نہ جاسکا۔

"ابھی کچھ خاص نہیں۔ ٹرین کے جھٹکے سے سر کے اوپر کی جلد پچک گئی ہے۔ سر کا خول کسی حد تک متاثر ہوا ہے اور گردن...... کچھ رپورٹیں اور آنی ہیں۔ ان کا انتظار ہے۔ تمہیں بتایا گیا تھا کہ بعض رپورٹیں آنے میں ایک دو دن لگ سکتے ہیں۔ دوائیں دی جارہی ہیں۔ آپریشن کا فیصلہ نہیں کیا گیا۔" ڈاکٹر نے لگی بندھی آواز میں بتایا۔ "پر تم کہاں غائب ہوگئے تھے؟"

"میں معافی چاہتا ہوں سمجھیے، کوئی ان ہونی پیش آگئی تھی۔" میں نے لجاجت سے کہا۔

"راستہ بھول گئے تھے؟" اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

"کیا بتاؤں ڈاکٹر صاحب۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔ اب میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا، آپ سے وعدہ کرتا ہوں۔"

اس نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"میرے لیے کوئی خدمت ہو تو بتائیے۔" میں نے عاجزانہ کہا۔

وہ مسکرا پڑا اور میرے گال پر ہلکی سی چپت رسید کی۔ "حوصلہ رکھو نوجوان آدمی، رات کو پھر آؤں گا یہاں۔ مریض کو دوسری دواؤں کے ساتھ نیند کی دوا بھی دی ہے۔ انہیں آرام کی ضرورت ہے، اور تمہیں بھی......" وہ میرے سینے پر ٹھونگا مارتا ہوئے بولا۔ "لگتا ہے تم نے بھی اچھا وقت نہیں گزارا، کچھ تازہ دم ہو جاؤ اور تم بھی کچھ دیر کے لیے آرام کر لو۔ نرس تمہارے بھائی کی دیکھ بھال کے لیے موجود ہے اور دیکھو!" اس نے تاکیدی لہجے میں کہا۔ "تیمار دار کی حالت مریض پر اثر انداز ہوتی ہے۔"

اس نے ساتھ رکے ہوئے ڈاکٹروں کو چلنے کا اشارہ کیا۔ دوسرے لمحے وہ سارے کمرے سے چلے گئے۔ صرف ایک نرس رہ گئی۔ معاً مجھے جانے کیا ہوا، کمرے سے بھاگ کے میں نے ڈاکٹر رائے کا تعاقب کیا۔ وہ ابھی چند قدم دور ہی گیا ہوگا کہ راستہ روک کے میں اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس پر حیرانی طاری ہوئی۔ میں نے اس کے ہاتھ، اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے۔ "آپ انہیں ٹھیک کر دیجیے ڈاکٹر صاحب۔" یہ التجا کرتے ہوئے میری آواز بھرا گئی۔

"تمہارے کہنے کی ضرورت نہیں۔" وہ چڑ سا گیا، پھر اس کا لہجہ بدل گیا۔ اس نے مشفقانہ انداز میں کہا۔ "یہ ہمارا پیشہ ہے، فرض بھی۔ ہر مریض ہمارے لیے ایک چیلنج ہوتا ہے میرے بچے، ہماری طرف سے تم کوئی فکر مت کرو۔"

میں نے اپنی پلکیں اس کے ہاتھوں سے مس کیں۔ "اب آپ ہی ہیں ڈاکٹر صاحب۔" میری آواز ڈول رہی تھی۔ "خدا کے لیے......"

جواب میں اس نے میرے سر پہ ہاتھ پھیر کے میرے بال بکھیر دیے اور آگے بڑھ گیا۔

اکبر علی خاں بھی میرے پیچھے پیچھے باہر آ گئے تھے۔ کمرے میں واپس آ کے جھجکتے ہوئے ہم نے بٹھل کے بستر کا رخ کیا۔ میں نے تو آنے کے بعد اس کی شکل ہی نہیں دیکھی تھی۔ وہ گہری نیند میں تھا۔ میں نے اس کے ساتھ بہت سفر کیے۔ وہ تو نیند کی جیسے کوئی رسم ادا کرتا تھا۔ ذرا سی آہٹ پر اس کی آنکھ کھل جاتی۔ وہ تو سوتے میں جاگتا رہتا۔ کل رات ڈاکٹر گھوکھلے بھی ڈاکٹر رائے سے یہی کہہ رہا تھا کہ اس نے نیند کی طاقت ور گولیاں بٹھل کو دی تھیں۔ اس پر اثر ہی نہیں ہو رہا تھا۔ وہی شخص اب بے سدھ پڑا تھا۔ اس طرح بے خبر تو میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ میری آنکھیں بھر آئیں۔ میں نے اس کی کلائی پکڑ کے حرارت دیکھی۔ ہاتھ گرم تھا لیکن اتنا نہیں۔ اکبر علی خاں مجھے اس کے پاس سے ہٹا کے صوفے پر لے آئے اور میرے قریب ہی بیٹھ گئے۔

"اپنے آپ کو سنبھالیے میاں! آپ تو بڑی ہمت والے ہیں۔ اب اندازہ ہو رہا ہے واقعی آپ کیسی اذیت میں تھے۔ وہاں ان لوگوں کے درمیان خود کو کس طرح جکڑ کے رکھا تھا۔ یہاں بھی آپ کو اسی برداشت کی ضرورت ہے۔" وہ آہستگی سے مجھے سمجھاتے رہے، کہنے لگے۔ "اس سے بڑا اسپتال شہر میں نہیں ہے اور دور دور تک نہیں ہے اور یہ جو ڈاکٹر رائے ہے، یہ بھی بہت مشہور ڈاکٹر ہے۔ مزاج کا ذرا سخت ہے، اکھڑی اکھڑی باتیں کرتا ہے لیکن ہاتھ میں شفا ہے۔ یہ کوئی کسر نہیں چھوڑے گا...... یہ دیکھ کے مجھے تو بڑی حیرت ہوئی۔ آپ کی خاصی تیز باتیں اس نے سہ لیں، ورنہ لوگ کہتے ہیں، وہ تو ناک پر مکھی بیٹھنے نہیں دیتا۔ کیا جادو کیا آپ نے؟"

"معلوم نہیں، میں نے تو سیدھی بات کی تھی۔" میں نے پژمردگی سے کہا۔

"آپ بھی جادوگر ہیں میاں، خدا نے آپ کو کیسی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ آپ سے ملاقات میری زندگی کا ایک یادگار واقعہ ہے۔" ان کے لہجے سے وارفتگی جھلک رہی تھی۔

"آپ کیا کہہ رہے ہیں، میں تو......"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔" وہ میری بات کاٹ کر بولے۔ "میں تو بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں، مگر یہ موقع نہیں۔ آپ ڈاکٹر رائے سے کیسی عمدہ انگریزی، کس روانی سے بول رہے تھے۔ میں تو دیکھتا ہی رہا، اور وہاں استاد میدا کے ٹھکانے پر آپ کا تیور کچھ اور ہی تھا۔"

میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔

"خیر جانے دیجیے، پھر بات کریں گے۔ بہت سی باتیں جی میں اُمڈ رہی ہیں، پھر سہی۔ اب آپ ذرا سکون سے بیٹھیے۔" یہ کہتے ہوئے وہ یکایک میرے پاس سے اٹھ گئے۔

نرس سیورین بٹھل کے پہلو میں رکھی تین خانہ کھلی الماری کی چیزیں ترتیب دینے میں مصروف تھی۔ انہوں نے نرس کے پاس جا کے کچھ سرگوشی کی اور آ کے دوبارہ میرے قریب بیٹھ گئے۔ "اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟" وہ کتراتی ہوئی آواز میں بولے۔ "میرا مطلب ہے آپ نے کیا سوچا ہے؟"

میری سمجھ میں نہیں آیا، وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

"کسی کو خبر کیجیے گا؟" انہوں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "مجھے نہیں معلوم، آپ کے کنبے خاندان کی کیا صورت ہے لیکن میرا خیال ہے، بہتر ہوگا، کسی قریبی عزیز، عزیزہ کو بلالیں، اگر کوئی آ سکے۔ آپ کی دوسراہٹ ہو جائے گی۔ آپ کا یہاں سے نکلنا تو مشکل ہے اب، اور کہیں جائیے بھی تو کیوں۔ میں انہیں تار دوں گا۔"

"ہاں ہاں۔" میں نے بے سوچے سمجھے گردن ہلا دی۔

"سوچ لیجیے آپ بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ کس کے آنے سے بھائی صاحب کو تسلی ہو سکتی ہے اور کون آپ کا بوجھ کم کرنے کا سبب بن سکتا ہے۔" ان کے محتاط لہجے میں کسی قسم کی مغائرت نہیں تھی۔

"سوچتا ہوں، کسی کو کیوں پریشان کروں۔ میں اکیلا ہی ان کی دیکھ بھال کر سکتا ہوں۔ مجھے اور کون سا کام ہے، اور اس سے بڑا کام میرے لیے اور کیا ہو سکتا ہے۔"

"یہ کمال کی سعادت مندی اور محبت ہے۔ ٹھیک ہے، کسی کو مت بلائیے اور پھر میں بھی تو ہوں یہاں آپ کے ساتھ۔ مجھے بھی کوئی ایسے کام نہیں۔ ہفتے میں چار دن کالج جاتا ہوں، تین چار گھنٹوں کے لیے۔ چند دن نہیں جاؤں گا۔"

"آپ کی مہربانی ہے مگر آپ اپنے مشاغل جاری رکھیے۔ آپ کو میں نے پہلے ہی کیا کم دکھ دیا ہے۔ اس وقت کا خیال آتا ہے تو اپنے آپ سے چڑ ہوتی ہے۔ آپ سب کو اذیت دینے کے بجائے سیدھا میدا کے اڈے پر چلا جاتا تو......"

"واہ صاحب!" اکبر علی خاں سر تا پا بے قرار سے ہو گئے۔ "اب آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ بے شک وہ ایک بڑی، بہت بڑی اذیت تھی لیکن اس کا صلہ کیسا دل نواز ہے۔ آپ کو ایسی صورت حال میں یہی کچھ کرنا چاہیے تھا۔ بخدا، سوچتا ہوں، آپ کے بارے میں۔ کسی اجنبی گھر کے دروازے پر دستک دینے......اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ......وہ سب کچھ کرتے ہوئے آپ خود کیسی اذیت میں ہوں گے۔ کیا ہی اچھا ہوا، وہ ہمارا گھر تھا، کسی اور کا بھی ہو سکتا تھا۔"

"شکر ہے۔ وہ آپ کا گھر تھا۔ ایک نفیس طبع، معاملہ فہم اور شفیق آدمی کے گھر کے دروازے کی طرف میرے قدم اٹھ گئے۔ گھروں کے انتخاب کا تو موقع ہی نہیں تھا۔ کسی دوسرے گھر میں جانے کیسے لوگوں سے سامنا ہوتا۔"

"اسی کو شاید حسن اتفاق کہتے ہیں۔" وہ مسکرائے بولے۔

اکبر علی خاں نے کسی کو بلا لینے کا نہایت صائب مشورہ دیا تھا۔ میں خود اسی شش و پنج میں تھا، کسے بلاؤں، کسے نہیں۔ بٹھل کی نسبت سے زریں کا چہرہ ہی سب سے پہلے سامنے آتا ہے۔ تار ملتے ہی وہ چل پڑے گی۔ ارشد، تنویر اور جہاں گیر فیض آباد میں ہیں۔ اب تو نصیر بابا بھی وہیں ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کے ہم راہ وہ آسکتی ہے اور نیساں، سلمٰی اور خانم وغیرہ میں کسی کو بھی ساتھ لا سکتی ہے۔ اسپتال میں رات کے وقت ایک ہی تیمار دار رہ سکتا ہے، باقی دوسرے گرانڈ ہوٹل میں رات گزار لیں گے۔ زریں سے زیادہ بٹھل کی خدمت کون کر سکتا ہے۔ مسیحائی تو اس کا ہنر ہے۔ آدمی دھوپ ہوتا ہے آدمی چھاؤں، کبھی دھوپ کبھی چھاؤں۔ زریں تو سر بہ سر کوئی شجر سایہ دار ہے۔ اس گل اندام کا تو وجود ہی شبنم ہے، ریشم سے عبارت ہے۔ آدمیت کا اس سے سوا اعلیٰ ترین وظیفہ کیا ہو سکتا ہے کہ خود کو دوسروں پر ترک کر دیا جائے۔ اس کی مثال تو شمع کے مانند ہے جو روشنی بکھیرتی اور تمام ہوتی رہتی ہے۔ اپنے سرہانے اسے دیکھ کے بٹھل کو بہت سکون ہوگا۔ وہ اس کی بات بہت مانتا، بہت اس کے ناز اٹھاتا ہے۔ اس شیوۂ ناز برداری کے تسلسل کے لیے لازم ہے کہ وہ جلد سے جلد ٹھیک ہو جانے کی کوشش کرے۔ زریں اس کے لیے امید کا درجہ رکھتی ہے۔ امید ہی تو زندگی کی توانائی ہے۔ امید بجائے خود زندگی ہے۔

ادھر کلکتے بھی تار دیا جا سکتا ہے۔ تار پہنچنے کی دیر ہوگی۔ زورا، جمرو اور جامو کو ذرا سی تاخیر گوارا نہ ہوگی۔ ان میں سے کوئی بھی کل رات یا زیادہ سے زیادہ پرسوں صبح تک یہاں آجائے گا لیکن زریں ہو، جامو ہو یا جمرو اور زورا۔ آج صبح ہی ڈاک خانے سے پٹنا شہر پہنچنے کی اطلاع انہیں دی ہے۔ اسی دن دوسرا تار ملنے سے سب کھٹک جائیں گے۔ اور انہیں بلانے کے لیے کوئی تو عذر کرنا ہی پڑے گا۔ کوئی عذر نہ کیا جائے تو بھی انہیں طرح طرح کے وسوسے اور خدشے گھیر لیں گے۔ زریں تو بہت ذہین، بہت حساس ہے۔ تار کا مضمون کیسا ہی گھما پھرا کے لکھا جائے، کتنا ہی ہلکا پھلکا ہو، وہ تو ہراساں ہو جائے گی۔ فیض آباد میں اس کی موجودی بھی ضروری ہے۔ ساری حویلی اس کے دم سے آباد ہے۔ ابھی فروزاں اور یاسمن وہاں نئی نئی ہیں۔ حویلی میں ان کی دل بستگی کے لیے زریں کی ضرورت ہے۔ اور انہیں بے خبر رکھنا بھی مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ بعد کو سبھی شکایت کریں گے کہ بٹھل سے آخر ان کا بھی کوئی رشتہ، ان کا بھی کوئی حق ہے۔

جتنا میں سوچتا، اتنا ہی الجھ جاتا۔ فیصلے کا مرحلہ ہو تو دماغ کبھی بالکل ساتھ نہیں دیتا، کئی حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ ایک ہی بات سمجھ میں آئی تھی کہ ابھی کچھ انتظار کرنا چاہیے۔ خدا کرے، بٹھل جلد ہی ٹھیک ہو جائے۔ کل رات وہ اپنے پیروں سے یہاں آیا تھا۔ ایک رات میں اس کا کیا حال ہو گیا۔ کل اس کی حالت میں بہتری بھی آسکتی ہے۔

میں اسی اندیشہ و فکر میں الجھا ہوا تھا کہ اسپتال کی مخصوص وردی پہنے دو مودب ملازم ہاتھوں میں تشت اٹھائے کمرے میں داخل ہوئے۔ انہیں دیکھ کے نرس سیورین اٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں ملازم بسکٹ، کیک پیسٹری، سموسے اور چائے پر مشتمل ناشتے کا سامان لائے تھے۔ اکبر علی خاں صوفے کے آگے رکھی لمبی میز پر تشتریاں اور چمچے رکھنے میں سیورین کا ہاتھ بٹانے لگے۔ یہ سارا ناشتہ انہیں کے ایما پر آیا ہوگا۔ تھوڑی دیر پہلے اسی مقصد سے وہ سیورین کے پاس گئے ہوں گے۔

''اب آپ انکار مت کیجیے۔ مجھے بھی اب کچھ بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ دیکھئے، سموسے کیسے گرما گرم ہیں۔'' مجھے آمادہ کرنے کے لیے انہوں نے سوداگروں جیسا طریقہ اختیار کیا۔

میری بھوک غائب تھی لیکن منع نہ کیا جا سکا۔ اکبر علی خاں نے سیورین کو بھی شرکت کی دعوت دی اور اس کی معذرت پر اصرار بھی نہیں کیا۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے چائے بنائی اور جیسے میں کوئی مہمان ہوں، میزبانہ برتاؤ کرتے رہے۔ چائے پیتے ہوئے مجھ سے کچھ اور قریب ہو کے وہ رازدارانہ انداز میں کہنے لگے۔ ”ایک بات ذہن میں اٹک رہی ہے میاں۔ اسے میرا وہم ہی جانیے۔ اصل میں قانون کے پیشے سے وابستگی ہے۔ ہر دیدہ و نادیدہ پر نظر رکھنے کا مجھے عارضہ سا ہو گیا ہے۔“

”کیا بات ہے؟“ میں نے تردد سے پوچھا۔

”میرا خیال ہے، یہی مناسب رہے گا آپ کسی کو یہاں بلالیں۔“ وہ رک رک کے بولے۔

”کیوں، کیوں؟“ میں نے الجھ کے پوچھا۔

”دیکھیے، میدا کے ٹھکانے سے ہم بہ سلامت واپس آگئے ہیں۔ بہ ظاہر سب کچھ درست ہو گیا ہے لیکن، لیکن......“ وہ پہلو بدلنے لگے۔

”لیکن کیا؟“

”ایسے لوگوں کا کیا بھروسا۔ بد دماغ لوگ ہیں۔ کسی وقت دماغ پھر جائے۔ مرنے والے کی آخری رسوم کے وقت وہاں موجود لوگ بھڑک نہ جائیں۔ اپنے ساتھی کے اس طرح جدا ہو جانے کا صدمہ انہیں مشتعل بھی کر سکتا ہے، اور کتنے ہی وہ میدا کے فرماں بردار ہوں، برہمی میں اس سے باز پرس بھی کر سکتے ہیں کہ ایسی آسانی سے آپ کو کیسے جانے دیا گیا۔ ٹھیک ہے، وہ لوگ اس وقت خاموش رہے لیکن ضروری نہیں، بعد کو بھی چپ سادھے رہیں۔ بعد کی کیا ضمانت ہے۔ میری مراد ہے، میدا کے ٹھکانے کا کوئی آدمی، مرنے والے سے زیادہ قریب کوئی بھی جنونی آدمی پولیس کا رخ نہ کر لے۔ اور وہی بات ہو گی، پولیس تو تماشے کی منتظر رہتی ہے۔ فرض کیجیے، ایک فی صد بھی میرے اس خدشے کا امکان ہے تو یہاں بھائی صاحب کی تیمارداری کے لیے کوئی عزیز تو موجود ہو گا۔ کم از کم ایک طرف سے سکون رہے گا۔ دوسری جانب رہا پولیس سے نمٹنے کا معاملہ...... دیکھ لیا جائے گا پھر...... مگر کچھ وقت تو قانونی مراحل میں لگ جاتا ہے۔“

میرا لحاظ تھا یا اپنے مدعا پر مبالغے کے شبہے نے انہیں آگھیرا تھا، وہ لفظ چبا چبا کے بول رہے تھے۔ انہوں نے ایک فی صد امکان کی بات کی تھی۔ ان کا اندیشہ ایسا غلط نہیں تھا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”سمجھے آپ؟“ میری خاموشی پر وہ مایوس سے ہو گئے اور کسمسا کے بولے۔ ”میں نے کچھ زیادہ قیاس تو نہیں کر لیا؟“

”نہیں“ میں نے ان کی ہم زبانی کی۔ ”بے شک کچھ بھی ممکن ہے۔“

اکبر علی خاں ان لوگوں سے واقف نہیں تھے اور ان کے سامنے اڈوں کے طور طریقوں کی تشریح بھی مناسب نہیں تھی۔ میں نے انہیں تسلی دی۔ ”آپ کے خدشات بجا ہیں لیکن ایسا ہونا نہیں چاہیے۔“

”نہیں ہونا چاہیے۔ دس از پازیٹو تھنکنگ مگر جناب، میں تو ایک فی صد کی بات کر رہا ہوں۔ نظر تو ہمیں ہر طرف رکھنی پڑے گی، رکھنی چاہیے۔“

”وہ ایسے بدعہد لوگ نہیں ہیں۔“ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

”میر آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ ان کی آنکھیں چندھیا سی گئیں۔

”میں انہیں تھوڑا بہت جانتا ہوں۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔

”یعنی آپ پر امید ہیں کہ اب ان شورہ پشتوں کی طرف سے کسی کینے اور عداوت کا امکان نہیں ہے؟“ اکبر علی خان کے لہجے میں ناراضی بھی تھی، طنز بھی تھا۔

جرح کرنے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ میں نے ان کی دل جوئی کے لیے کہا۔ ”نہیں، پوری طرح

ہیں۔“

”یہی تو میں عرض کر رہا ہوں میاں۔“ وہ زور ے کے بولے۔

”ایک دن اور دیکھتے ہیں، کسی کو بلانے اور ا نے میں اتنی دیر نہیں لگے گی۔“

وہ ایک مہذب آدمی تھے۔ میری تھکی تھکی آواز ے انہوں نے اخذ کر لیا کہ ان کے وہم و قیاس بری ناگواری و ناسازی کا باعث ہو رہے ہیں۔ یک تیز فہم شخص کو سمجھ لینا چاہیے تھا کہ تھل کی ارداری کے لیے کسی کو بلانے میں تامل کی وجہ کوئی بوری اور مصلحت بھی ہو سکتی ہے۔ وہ خاموش و گئے اور انہوں نے موضوع بدل دینے کی بلاغت ی۔ سموسے کا ایک ٹکڑا میرے سامنے کیا۔ ”منہ لونا کر لیجیے۔“

میں نے ان کی خواہش کی تعمیل کی۔

”شیرینی منہ میں گھلی رہتی ہے اور ذائقے بدلتی تی ہے۔ دیر ہو جائے تو منہ کا مزہ کڑوا سیٹھا ہو جاتا ہے۔ اس کا توڑ نمک ہی سے ممکن ہے۔“ انہوں نے ش کلامی کی۔

غذا کی اپنی کرشمہ کاری ہے۔ کہتے ہیں، غذا، غم ا توہین ہے لیکن پھر آدمی کیا کرے۔ اپنے بیمار ے ساتھ بیمار ہو جائے۔ کسی جانے والے کے اتھ خود بھی چلا جائے۔ کیا عجب ہے، دکھ سہنے کے یے بھی توانائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ میں نے ت کم کھایا پیا تھا لیکن مجھے اپنا جی کسی قدر ٹھیرا ہوا لتا تھا، تشنہ شکمی سے دکھ دو چند ہو جاتا ہے اور سیر کمی سے جاتا نہیں۔ شاید کچھ یوں ہے کہ حالت غم ا اشتہا مٹتی نہیں، دبی دبی، چھپی چھپی رہتی ہے ن آدمی کو خود اچھا نہیں لگتا۔ حالت غم میں تو اسے ام ہی عزیز ہوتا ہے۔

اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ سیورین نے کمرا روشن ردیا۔ دوپہر اکبر علی خاں گھر سے نکلے تھے۔ ان ے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔ گئے بھی

وہ میرے ساتھ تھے، ایک چاقو بردار کے ساتھ جو ان کے گھر میں ناگہانی بلا کی طرح وارد ہوا تھا۔ کتنی ہی بات صاف ہو گئی ہو، میری ہیبت تو ان کے دلوں پر نقش ہو چکی ہو گی۔ اکبر علی خاں کو گھر جانے کے لیے میں ٹوکتے ٹوکتے رہ جاتا تھا۔ کہیں وہ برا نہ مان جائیں۔ غالباً میں بھی کچھ یہی چاہتا تھا کہ وہ یہیں میرے پاس بیٹھے رہیں۔

روشنی کو اپنے اظہار کے لیے اندھیرے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اندھیرا جتنا گہرا ہو رہا تھا، کمرے میں جلتے قمقمے اتنے ہی روشن ہوتے جاتے تھے۔ اکبر علی خاں کو خود ہی احساس ہوا، کہنے لگے۔ ”جی تو نہیں چاہ رہا مگر گھر جانا چاہیے۔ مجھے اجازت دیں میاں۔“

”گھر میں سب شدت سے منتظر ہوں گے۔ یہی بہتر ہوتا کہ آپ انہیں بتا کے آتے۔“

”آپ کو نہیں معلوم، نزہت خانم عام قسم کی جذباتی خاتون نہیں۔ ان میں بہت تحمل ہے۔“ اپنی بیگم کا ذکر کرتے ہوئے ان کا لہجہ شیدائیت سے لبریز تھا۔

”مگر دیر تو ہو گئی ہے۔“ میں نے زیر لب کہا۔

”ہاں، لیکن نزہت ہمیں غیر ذمے دار نہیں سمجھتیں۔“ وہ وثوق سے بولے اور صوفے سے اٹھتے اٹھتے مجھے تاکید کرنے لگے کہ رات کا کھانا میرے ساتھ ہی کھائیں گے، وہ گھر سے کھانا لائیں گے۔

میں نے بہت کہا کہ اس زحمت کی ضرورت نہیں۔ ایک تو مجھے بھوک نہیں، دوسرے اب رات ہوا ہی چاہتی ہے۔ گھر جا کے وہ آرام کریں اور تازہ دم ہو کے صبح آجائیں۔

”دل نہیں مانے گا۔ گھر سے یہاں تک کا فاصلہ بھی اتنا نہیں ہے۔ بس میں آرہا ہوں۔ اب آپ کچھ نہ کہیے۔“ انہوں نے فیصلہ سنا دیا۔

دروازہ عبور کرتے ہوئے وہ رک گئے اور

بولے۔ ”گھر تو آپ کو یاد ہوگا؟“

”کیوں؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔ ”آپ تو آ ہی رہے ہیں۔“

”بس یوں ہی۔“ ان کا جسم لہرا سا گیا۔ ”ایسے ہی خیال آیا۔ خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی صورت ہو تو مجھے اطلاع مل سکے۔ احتیاطاً میں گھر کا پتا لکھ دیتا ہوں۔“

”کچھ نہیں ہوگا۔“ میں نے ان کا بازو تھام کے کہا۔ ”آپ اطمینان سے جایئے۔“

وہ مطمئن نہیں ہوئے تھے۔ اسی کیفیت میں دروازے سے نکل گئے۔ کچھ دور تک میں نے ان کا ساتھ دیا پھر ان کے اصرار پر کمرے میں لوٹ آیا اور میرے قدم سیدھے بٹھل کے بستر کی جانب اٹھے۔ اس کی حالت وہی تھی، اپنے آپ سے بے خبر۔ میں نے آہستہ سے اسے آواز دی۔ اس کے جسم میں جنبش نہیں ہوئی۔ ناچار میں نے سیورین کی طرف دیکھا۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے مجھے منع کیا اور جلدی سے اپنے لیے مخصوص کرسی سے اٹھ کر میرے پاس آ گئی اور میرے پہلو میں کھڑی ہوگئی۔ کسی اچھی خبر کے آسرے میں، میں نے اس سے پوچھا۔ ”اب کیا حال ہے ان کا؟“

میرے لہجے میں چھپی حسرت اس پر عیاں ہوگئی۔ وہ ایک خوش طینت لڑکی تھی، مستعدی سے بولی۔ ”حرارت نہیں ہے اور اچھی علامت ہے۔“

”یہ کوئی بات کیوں نہیں کرتے؟“ میں نے شکستہ آواز میں پوچھا۔

”انہیں مسلسل نیند کی دوائیں دی جا رہی ہیں۔“

”ڈاکٹر لوگ کیا کہتے ہیں؟“ میں نے بے چینی سے پوچھا۔

”وہ ہمیشہ پر امید رہتے ہیں۔“ وہ نرمی سے بولی۔

”بتاتے کیا ہیں؟“ میں نے تکرار کی اور اپنے لہجے کی ترشی پر قابو نہ پا سکا۔ ”آپ کو تو کچھ بتایا ہوگا۔“

”ابھی واضح طور پر کچھ نہیں۔“ وہ متانت سے بولی۔ ”لیکن ظاہر ہے، جلد ہی وہ کسی نتیجے پر پہنچ جائیں گے۔“

مجھے اندازہ ہوگیا کہ سادہ و شایستہ سیورین کے پاس میری خوش نودی کے لیے صبح سے کچھ سوا نہیں۔ نرس ایمی کی طرح اس نے بھی مربیانہ انداز میں مجھے آرام کا مشورہ دیا۔ کتنی آسانی سے ایک آدمی، دوسرے آدمی کو سکون و آرام کی تلقین عطا کر دیتا ہے۔ یہ جانے بغیر کے دوسرے کے نہاں خانے میں کیسی شورش بپا ہے سیورین کو یا تو واقعی کچھ معلوم نہیں تھا یا کوئی احتیاط درپیش تھی۔ اس کی اس کم سخنی، رسمی رسمی جواب دہی پر جی میں آتا تھا کہ کسی دوسرے لہجے میں باز پرس کروں مگر میں اسے خشمگیں نظروں سے دیکھا کیا۔ اس کے چہرے پر بڑی معصومیت تھی۔ وہ تو ایسی نازک تھی کہ ذرا اونچی آواز پر کمھلا، مرجھا جائے۔

”گھبرایئے نہیں۔“ وہ نرم و ملائم آواز میں بولی۔ ”ڈاکٹر رائے رات کو آئیں گے۔ رات کو وہ اسپتال نہیں آتے۔ صرف آپ کی خاطر آئیں گے۔ آپ پر وہ بہت مہربان ہیں۔“

”میرے بجائے میرے بھائی پر مہربان ہوں تو بہتر ہوگا۔“

”انھی کی وجہ سے آئیں گے۔“ میرے لہجے کی تیزی سے وہ اداس ہوئی اور کچھ توقف کے بعد میرا دھیان بٹانے کے لیے دل گداز لہجے میں بولی۔ ”آپ کو اتنی دیر کیوں ہوگئی؟ مجھے تو فکر ہو رہی تھی۔ آپ نے کہا تھا، آپ کے لیے شہر نیا ہے۔“

”لمبی داستان ہے۔ بس ایسے ہی۔“ میں نے بیزاری سے کہا۔

”ڈاکٹر رائے وقت پر آ گئے تھے۔ وقت کے وہ بڑے پابند ہیں۔ آپ کے بارے میں پوچھنے پر

میں نے ان سے نہیں کہا کہ آپ کو گئے دیر ہوگئی ہے۔ دوسری بار انہوں نے پوچھا تو مجھے بتانا پڑا، لباس تبدیل کرنے اور کچھ ضروری سامان لانے گرانڈ ہوٹل تک گئے ہیں، بس آتے ہی ہوں گے۔ ڈاکٹر رائے کے مزاج کا کوئی بھروسا نہیں۔ اسپتال میں سبھی ان سے دور دور رہتے ہیں۔“ اس کی پلکیں تھرک رہی تھیں۔ جیسا کہ میں سمجھ رہا تھا، وہ ایسی کم سخن بھی نہیں تھی۔ کچھ ایسے تیور سے باتیں کرتی تھی جیسے پہلی بار نیا کچھ بول رہی اور نیا کچھ سن رہی ہو۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ اکبر علی خاں کے بارے میں پوچھنے لگی۔ ”کیا آپ کا ان سے کوئی رشتہ ہے؟“

”رشتوں کے لیے رشتے داری ضروری ہے اور نہ مدت۔“ میں نے کہا۔

”آپ انہیں پہلے سے نہیں جانتے تھے؟“

”ہاں، کچھ ایسا ہی ہے۔“

وہ حیران ہوئی اور مروۃً اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اسی اثنا میں بٹھل نے لمبی سانس کھینچی اور اس کا جسم بے کل سا ہوا۔ صاف نظر آتا تھا کہ درد و کرب کی کوئی لہر اس کے تن بدن میں اٹھی ہے۔ سیورین متحرک ہوگئی۔ میرا تو سر چکرانے لگا۔ سیورین نے ایک پہلو سے دبا ہوا بٹھل کا ہاتھ رسانی سے باہر نکالا۔ میں نے دھڑکتی آواز میں اسے پکارا۔ اس کے پپوٹے حرکت میں آئے، ایک لمحے کے لیے آنکھیں کھلیں، ماتھے پر سلوٹیں ابھریں۔ دوسرے لمحے وہ غافل ہوگیا۔ سیورین نے اشارے سے مجھے مزید آوازیں دینے سے روک دیا۔ ہوا میں خنکی تھی۔ سیورین نے اس کے جسم پر سلیقے سے چادر ڈھانپ دی۔

میں وہیں بٹھل کی پائینتی کھڑا رہا۔ وہ تو کوئی اور آدمی لگ رہا تھا۔ میرے ہاتھ پیر کھلے ہوئے تھے اور آس پاس کوئی بندش بھی نہیں تھی۔ لگتا تھا جیسے میں کسی شکنجے میں کسا ہوا ہوں۔ میں تو کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ کیسی بے چارگی، ناکارگی ہے کہ میں اس کے کسی کام نہیں آ سکتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مجھ سے اس کی خبر گیری میں کہاں کوتاہی ہو رہی ہے۔ میں پھر کیا کروں، کہاں جاؤں، کون سا ہنر، کون سا داؤ آزماؤں کہ وہ سنبھل جائے اور میری حالت اس سے کون سی جدا ہے۔ وہ سب سے بے گانہ ہو کے بستر پہ پڑ گیا ہے۔ میرا ہوش اور میرے دست و بازو بھی کس کام کے ہیں۔ میرا حال تو اس سے برا ہے۔ اسے میری فکر نہیں کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔ میری تو جان کھنچی جا رہی ہے۔ کسی بیمار کو علم نہیں ہوتا کہ دوسرے ثابت و سالم اس کے مدعی، اسے اپنے آپ سے زیادہ عزیز رکھنے والے کیسے ویران ہو جاتے ہیں۔

جانے کتنی دیر ہوئی، میں بٹھل کے بستر کے سرھانے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ سیورین کب میرے پاس آئی۔ مجھے احساس ہی نہیں ہوا۔ اس کی دھیمی آواز کی دستک پر میں چونک پڑا۔ وہ نزدیک ہی کھڑی تھی۔ اس نے چپکے سے میرا ہاتھ تھاما تو میں سٹ پٹا سا گیا اور مجھے پشیمانی بھی ہوئی۔ کسی معمول کی طرح میں نے اس کی پیروی کی۔ وہ مجھے بٹھل کے بستر سے ہٹا کے صوفے تک لے آئی۔ خوش چہرگی سے خوش اطواری مشروط نہیں ہے۔ اس میں دونوں خوبیاں یک جا ہوگئی تھیں۔ اسپتال کے ان شاہانہ کمروں کے لیے اپنے ہنر میں ماہر نرسوں کا انتخاب کیا گیا ہوگا اور انہیں مریض کے ساتھ ساتھ تیمار دار سے حسن سلوک کی تربیت بہ طور خاص دی گئی ہوگی۔ تیمار داروں کو کچھ کم توجہ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ سیورین کی خوش شعاری میں خوش نہادی کا بھی دخل تھا کہ اس کی راہ و رسم میں تکلف و تصنع کی گرانی نہیں تھی۔ میں نے صوفے کے مونڈھے سے گردن ٹکا کے آنکھیں میچ لیں۔ سیورین بھی شاید یہی چاہتی تھی۔ میری طرف سے مطمئن ہو کے وہ

دروازے کے کنارے رکھی کرسی پر جابیٹھی۔

میں نے طرح طرح کے وہم وگمان کی یورش سے خود کو محفوظ کرنے اور یک سو ہونے کی کوشش کی لیکن آدمی کو اپنے اختیار کا یارا کس قدر ہے۔ میرا سارا جسم ٹوٹ پھوٹ سا رہا تھا۔ اکبر علی خاں کی موجودگی میں ایسی ناتوانی اور بے بسی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ ان کے جانے کے بعد سب کچھ بکھرا ہوا لگتا تھا، بہت شور ہو رہا ہو جیسے، ایک ہاؤ ہو مچی ہو اور ہجوم میں، میں اکیلا کھڑا ہوں، اور کوئی کسی کی نہ سن رہا ہو، کوئی کسی کی طرف نہ دیکھ رہا ہو جیسے۔

میں صوفے پر نیم جاں پڑا تھا کہ کسی کی بہت ہلکی آواز پر آنکھیں بند نہ رہ سکیں۔ وہ نرس ایمی تھی۔ اس کا مطلب تھا، سیورین چلی گئی ہے۔ جاتے وقت اس نے مجھے بتانا مناسب نہ سمجھا ہوگا حالاں کہ میں سو کہاں رہا تھا۔ میں تو اپنے آپ سے دور ہو جانے، اپنے آپ سے اوجھل ہو جانے کے جتن کر رہا تھا۔ ایمی نے مسکراتے ہوئے مجھے سلام کیا، حال پوچھا اور معذرت چاہی کہ ڈاکٹر رائے اسپتال آچکے ہیں اور کسی وقت کمرے میں آسکتے ہیں، اس لیے اسے میرے آرام میں مخل ہونا پڑا۔

میں فوراً اٹھ گیا اور میں نے کمرے سے ملحق غسل خانے میں جلدی جلدی چہرے پر پانی چھڑکا۔ کاش پانی میں آدمی کے درونِ خانہ غبار دھو دینے کی قوت بھی ہوا کرتی۔ اپنا حلیہ کسی قدر درست کر کے میں کمرے میں واپس آیا۔ پندرہ بیس منٹ گزر گئے۔ میری نظریں دروازے پر ٹکی ہوئی تھیں، پھر میں باہر نکل گیا۔ گھومتی ہوئی مختصر راہ داری میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس سرے سے اس سرے تک میں نے کئی پھیرے لگائے۔ ڈاکٹر رائے کا نام ونشاں نہیں تھا۔ اسے دیکھنے کے لیے میں نے اسپتال کی مرکزی عمارت جانے کا ارادہ کیا اور چند ہی قدم چلا ہوں گا کہ دور سے آہٹیں سنائی دیں۔ اس خیال سے کہ ڈاکٹر رائے یوں راہ داری میں مجھے ٹہلتا دیکھ کے مکدر نہ ہو، میں کمرے تک لوٹ آیا۔ وہ ڈاکٹر رائے ہی تھا۔ اس کے استقبال کے لیے میں کمرے سے باہر کھڑا رہا۔ اس کی رفتار اتنی کم تھی نہ اتنی تیز۔ مجھے دیکھ کے اس نے میرے سلام کے جواب میں سر کو خفیف جنبش دی اور اپنے ادھیڑ ساتھی ڈاکٹر سے گفتگو کرتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔ مجھے اس کا یہ مغایرانہ طور اچھا نہیں لگا، سو اس کے پیچھے جانے کے بجائے میں دروازے کے پاس سکڑا سمٹا کھڑا رہا۔

دونوں ڈاکٹر انہماک سے بٹھل کا معائنہ کرتے رہے۔ انہوں نے نبض دیکھی، پیر کے انگوٹھے کھینچے، ڈاکٹر رائے نے اس کا سر ٹٹولا، دبایا اور پپوٹے اٹھا کے آنکھیں دیکھیں اور اپنے ساتھی سے کوئی سرگوشی کی۔ دونوں نے پائینتی سے لٹکے ہوئے احوال نامے پر بار بار نظر ڈالی۔ ڈاکٹر رائے نے بٹھل کو آہستہ سے پکارا تو مجھ سے اپنی جگہ ٹھیرا نہ جاسکا لیکن ایک قدم بعد میں نے خود کو روک لیا۔ میں نے دیکھا، ڈاکٹر رائے کی آواز کے جواب میں بٹھل کے جسم میں کچھ حرکت ہوئی ہے۔ ڈاکٹر رائے نے اس کا حال پوچھنا چاہا، دوبارہ، سہ بارہ۔ بٹھل کے ہونٹ بدبدائے ہوں گے کہ ڈاکٹر نے سر جھکا کے اپنا کان اس کے قریب کر دیا، اتنے قریب کے بٹھل کی گہری سانسیں اس کے گال سے مس ہو رہی ہوں گی۔ بٹھل نے کوئی جواب دیا، یہ میں نہ جان سکا۔ شاید کچھ بھی نہیں۔ ڈاکٹر رائے کچھ سن پاتا تو اتنی جلد وہاں سے نہ ہٹتا۔ لمحوں تک وہ اپنے ساتھی سے مشورہ کرتا رہا اور دوبارہ پہلے کی طرح بٹھل کے سرہانے چلا گیا اور آہستہ آہستہ اس کے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگا۔ ہوسکتا ہے، دبا بھی رہا ہو۔ بٹھل کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوتی ہیں یا کوئی کراہ اٹھتی ہے، وہ یہی جاننا چاہتا ہوگا۔ میری نگاہیں مسلسل ڈاکٹر رائے کے چہرے پر بھٹک رہی تھیں۔ ڈاکٹروں کے چہروں کی بے تاثری ان کی تعلیم کا حصہ ہوتی

ہے یا پھر یہ معمول کی بات ہے۔ صبح وشام طرح طرح کے مریض آزماتے آزماتے وہ ان کی آہ وبکا کے عادی ہو جاتے ہیں۔ معمول کی باتوں اور مناظر سے عام آدمی بھی سرسری گزر جاتا ہے۔ ڈاکٹر رائے نے عقب میں مستعد کھڑی نرس ایمی کو کوئی ہدایت دی۔ ایمی تن دہی سے نوٹ بک میں درج کرتی رہی۔

پھر کہیں ڈاکٹر رائے کو میرا خیال آیا۔ میرے سامنے آکے وہ ٹھیر گیا اور تیز چمکتی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں خاموش رہا۔ ''کیسے ہو تم؟'' اس کا لہجہ اتنا سپاٹ نہیں تھا، لہجہ نہ چہرہ۔

میں نے ہونٹ بھینچ لیے اور کچھ نہیں کہا۔

''ٹھیک تو ہو؟'' وہ اکڑی ہوئی آواز میں بولا۔

''ٹھیک کیسے ہوسکتا ہوں۔''

''ہونہہ!'' اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ در آئی۔ ''کچھ ناراض لگتے ہو، کیا بات ہے؟''

''کوئی بات نہیں...... کچھ نہیں۔'' میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ ''آپ سے کوئی ناراض ہوسکتا ہے۔''

''تم ہوسکتے ہو۔''

''میں کہاں...... میں......'' مجھ سے آگے کچھ نہ بولا جاسکا۔

''تم نے کچھ پوچھا نہیں بھائی کے لیے؟''

''کیا حاصل، معلوم ہے، کیا جواب ملے گا، وہی رٹے رٹائے، گھسے پٹے جملے۔''

''تم کیا سننا چاہتے ہو؟''

''آپ جانتے ہیں۔'' میں نے مختصراً کہا۔

''کہنے کے لیے کچھ ہو بھی تو کچھ کہا جائے۔'' اس کی آواز بھاری ہو گئی۔

''اس لیے میں بھی نہیں پوچھ رہا۔ آپ کو زحمت ہوگی خواہ مخواہ۔''

''اب تم ایک اچھے لڑکے بن گئے ہو۔''

ایک ساتھ بہت سے جواب ذہن میں منڈلائے لیکن نازکی کے احساس نے مجھے باندھے رکھا۔

''کافی پیو گے؟'' اس نے دھیرے سے کہا۔

میں دنگ رہ گیا۔

''کافی یا چائے؟''

''جو...... جو آپ کو پسند ہو۔'' میری زبان ہکلا گئی۔

''تمہیں کیا مرغوب ہے؟''

''کافی ہی ٹھیک ہے۔'' میں نے دبی آواز میں کہا۔

اس نے نرس ایمی سے کافی منگوانے کی فرمائش کی۔ میری طرح ایمی کو بھی یقین نہیں آیا۔ ایک ثانیے کے لیے اس پر سناٹا طاری رہا پھر لپکتی جھپٹتی باہر نکل گئی۔ ڈاکٹر رائے میرا ہاتھ پکڑے پکڑے صوفے پر آگیا اور اس نے اپنے ساتھی ڈاکٹر کو بھی بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

مجھے اپنی کم فہمی، جلد بازی اور بے اعتنائی پر شرمندگی ہو رہی تھی۔

''تم کب آئے تھے یہاں؟'' ڈاکٹر رائے نے چھبتی ہوئی آواز میں یکایک مجھ سے پوچھا۔

''کل...... کل رات......'' میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''گویا ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے۔ سر کی اندرونی چوٹ ہے، چوٹ سے ہونے والے نقصان کی نوعیت جاننے کے لیے چند ٹیسٹ ضروری ہیں۔ ان کا نتیجہ دیکھنے کے بعد ہی کچھ کہنا مناسب ہوگا۔''

''جی، جی ہاں، میں سمجھتا ہوں۔''

''تم نہیں سمجھ رہے۔''

میں چپ رہا۔

''تمہاری عمر ہی ایسی ہے اور یوں بھی تم ایک الگ نوجوان ہو۔ ویسے نوجوانوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔''

''مجھ سے ان کی حالت برداشت نہیں

ہو رہی۔" میں نے تپیدہ آواز میں کہا۔
"یہ تعلق کی بات ہے۔"
"آپ کو کیا بتاؤں، یہ کون ہیں...... آپ نہیں سمجھیں گے، یہ میرے لیے کیا ہیں۔"
"کوئی بھی کسی کے لیے اتنا اہم ہو سکتا ہے۔"
"وہ میری زندگی ہیں۔" اپنے لہجے کی شدت مجھے خود گراں گزری۔
"یہ جذبہ اب کیسا عنقا ہوتا جا رہا ہے۔" وہ دیدے گھما کے بولا۔
"آپ بہت بڑے ڈاکٹر ہیں۔ سب لوگ یہاں یہی کہتے ہیں۔" میں نے اس کی منت کی۔
"بس ڈاکٹر صاحب، آپ انہیں اچھا کر دیجیے۔ میں آپ کا...... آپ کا......"
میری بات ادھوری رہ گئی۔ نرس ایمی تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے ایک باوردی خدمت گار بھی تھا۔ اس نے پیالیاں، دودھ، شکر اور کافی کے برتن میز پر سجانے شروع کر دیے۔ دو سینیوں میں انگریزی بسکٹ، خشک میوہ بھی وہ ساتھ لایا تھا۔
"ایمی! تم بناؤ، دودھ برائے نام، آدھ چمچہ شکر۔" ڈاکٹر رائے نے ایمی کو حکم دیا۔
ایمی تمام تر نفاست سے کافی بنانے لگی۔ ڈاکٹر رائے دوبارہ میری طرف متوجہ ہوا۔ "تم کیا کہہ رہے تھے؟"
"میں کہہ رہا تھا...... مگر نہیں، جانے دیجیے۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "مجھے آپ کو کیا باور کرانا ہے۔"
"ہاں" وہ سر ہلانے لگا۔ "بہتر ہے، کچھ مت کہو اور باتیں کرتے ہیں۔"
"کیسی بات؟ کسی کام میں جی نہیں لگ رہا ڈاکٹر صاحب۔"
"ہشت" اس نے منہ بنایا۔ "تم پڑھے لکھے نوجوان ہو، تمہیں معلوم ہوگا کہ زندگی وقت کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ہر کام میں وقت لگتا ہے۔"
"آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر وقت کا پیمانہ گھڑی نہیں ہونا چاہیے۔ گزشتہ چوبیس گھنٹے آپ نے بھی بتائے ہیں، میں نے بھی، لیکن مجھ پر قیامت کی طرح گزرے ہیں، پہاڑ کے مانند۔ ممکن ہے، آپ پر چوبیس گھنٹے کم گزرے ہوں۔"
اس کے شانے سیدھے ہو گئے۔ "تم نے بڑی اچھی بات کہی لیکن کوئی نہ کوئی پیمانہ تو بنانا ہی پڑتا ہے۔ زندگی محض تصوریت یا عینیت نہیں۔"
"اور زندگی محض مادیت اور حقیقت بھی نہیں ہونا چاہیے۔"
"دو اور دو تو چار ہی ہوتے ہیں عزیز من۔"
"کبھی پانچ بھی ہو جاتے ہیں۔ جناب، مگر یہ پانچ اور چھ ہو جانے والا پیمانہ آپ نے ایجاد نہیں کیا۔"
"کبھی کبھی کی بات ہے نا!......" وہ لطف لیتے ہوئے بولا۔ "اس کے لیے پیمانے کی ایسی کیا ضرورت۔"
"لیکن یہ کبھی کبھی زندگی کا ایک مستقل مظہر ہے، پھر کس طرح اس کی تشریح، کس طرح اسے بیان کیجیے گا؟"
"یہ شاذ و نادر، اوزان و پیمائش سے ماسوا ہی رکھو۔" وہ بے پروائی سے بولا۔
"یعنی آپ ایک ڈاکٹر، پانچ یا چھ یا سات ہو جانے والے مظہر سے انکاری نہیں۔ میں بھی یہی التجا کر رہا ہوں کہ وقت کے ان ٹکڑوں سے کچھ سوا کیجیے، مسیحائی کا کوئی کرشمہ، کوئی اعجاز......"
اس کی آنکھوں کی چمک فزوں ہو گئی۔ "میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔"
"کیسا اندازہ جناب؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔
"یہی کہ تم سے دل چسپ اور معنی آفریں مکالمہ

ہوسکتا ہے۔“ اس نے کافی کی پیالی ختم کرتے ہوئے کہا اور ایمی سے ایک اور پیالی کی فرمائش کی اور میرے آگے بسکٹ کی پلیٹ بڑھائی۔ ”تم نے نہیں لیے۔ یہ تو کھانے پینے کی عمر ہے۔“

”مگر وقت نہیں۔“ میری بڑبڑاہٹ شاید اس نے نہیں سنی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پلیٹ سے بسکٹ اٹھالیا۔

”یہاں اسپتال میں تمہیں خالص چیزیں ہی ملیں گی۔ ذائقے میں مزے دار نہ ہوں مگر ہوتی خالص ہیں۔“

یکایک میرے ذہن میں ایک گمان نے ڈنک مارا اور میرا سارا وجود ہی ڈگمگا گیا۔ مجھ اجنبی سے ڈاکٹر جیسے تندخو شخص کی یہ رغبت اختیاری اور شعوری تو نہیں؟ اسے میری حالت اور وحشت کا احساس ہوگیا ہے۔ کہیں مجھ پر خالص لطف وکرم بٹھل کی طرف سے بے اطمینانی کے سبب سے تو نہیں؟ میری استقامت کے لیے وہ کوئی پیش بندی تو نہیں کر رہا؟ ابھی ابھی تو اس نے بٹھل کا معائنہ کیا ہے۔ اس کے فوراً ہی بعد اس کی مہربانی سوا ہوگئی ہے۔

میرے مساموں سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ میں نے اپنی بدگمانی سر سے جھٹکنے کی کوشش کی لیکن آنکھوں میں اندھیرا اترنے لگا تھا۔ ڈاکٹر رائے کی کہی ہوئی باتوں کی بازگشت دماغ میں گونج رہی تھی۔ میری تشفی کے لیے خوش امیدی کے فراخ دلانہ اظہار میں اسے کیا عار ہے۔ اسے کوئی امید تو مبہم وموہوم۔ بنیادی طور پر وہ ایک اچھا آدمی ہے۔ مجھ پاگل کے لیے زینہ بہ زینہ آمادگی ہی مناسب رہے گی، ایسی کسی تدبیر پہ تو وہ عمل پیرا نہیں؟ مجھ پر نوازش کی ارزانی اور بٹھل کے معاملے میں محتاط بیانی میں دور بینی کا کوئی پہلو تو مضمر نہیں ہے؟

میرا سر گھوم رہا تھا اور شاید کافی کی پیالی میرے ہاتھ سے گر پڑتی کہ نرس ایمی نے سلیقے سے اپنی گرفت میں لے لی۔

”کیا بات ہے؟ تم چپ کیوں ہوگئے؟“ ڈاکٹر رائے نے چونک کے پوچھا۔ میں نے کچھ نہیں کہا مگر وہ ایک تجربہ کار آدمی تھا۔ میری کیفیت اس ہزار چشم سے چھپی کیسے رہ سکتی تھی۔ وہ بے تاب سا ہوگیا۔ ”اوہ، اوہ، یہ بیٹھے بیٹھے تمہیں کیا ہوگیا میرے بچے۔ یقیناً کوئی برا خیال، برے خواب کی طرح تم پر مسلط ہوگیا ہے۔ نا نا...... میرے عزیز، حوصلہ رکھو۔“

میری آنکھیں جل رہی تھی۔ آنکھوں کی آگ پانی بن جاتی ہے۔ میں نے بہت ضبط کیا لیکن آنسو نہ رک سکے۔

ڈاکٹر اور مضطرب ہوگیا۔ اس نے میرے ہاتھ جکڑ لیے۔ ”ایسا کچھ نہیں ہے۔ دو اور دو، پانچ کی کرشمہ کاری کا مرحلہ ابھی نہیں آیا۔ ابھی تو ہم اپنے ناپ تول کی کوشش کر رہے ہیں اور کسی امید ہی میں...... پہلے کسی نتیجے پر تو پہنچیں۔ میں نے وقت کی بات کی تھی، کوئی مایوسی کب ظاہر کی۔“

”ڈاکٹر صاحب۔“ بہ مشکل تمام میں نے کٹی پھٹی آواز میں کہا۔ ”آپ مجھے سچ سچ بتایئے۔“

”کیا سچ؟“ وہ چنچنا کے بولا۔ ”میں نے تم سے کیا چھپایا ہے؟“

”آپ نے صاف کچھ بتایا بھی نہیں۔“ میں نے یاسیت سے کہا۔

وہ اپنا سر تیزی سے ہلانے لگا۔ ”اوہ، نہیں! میں نے تم سے کیا کہا ہے، یہی نا کہ ابھی بعض طبی تجزیوں کا انتظار ہے۔ سہ پہر جب تم یہاں نہیں تھے، میں اس شعبے کے ماہر ڈاکٹر فرینکی کو لے کے آیا تھا۔ انہوں نے بھی یہی کہا۔ میں تمہیں کچھ صاف بتانے کی صورت میں نہیں ہوں، ہم مریض کے عزیزوں سے کوئی الٹی سیدھی بات نہیں کرتے جو بعد کو پشیمانی کا باعث ہو۔ ہم ابھی مشاہدے کے مرحلے میں ہیں میرے بیٹے!

یہ ایلوپیتھی طب ہے، یونانی، آیورویدک اور ہومیوپیتھی نہیں۔ اس کا اپنا طور طریقہ ہے۔ تم کسی وید، سنیاسی بابا، سڑک کے کنارے چوکی پر بیٹھے کسی پہلوان، اطائی اور نبض دیکھ کے جسم کے اندر کا حال، سارا کچا چٹھا جان لینے والے حکیم کے پاس نہیں آئے۔“ اس کی آواز پر کشیدگی بڑھتی جارہی تھی۔ میں نے سر جھکا لیا۔ ڈاکٹر بھی چپ ہوگیا۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر اس نے میری کمر تھپکی۔ ”لگتا ہے، پہلے تمہارا علاج کرنا چاہیے۔ یہ تھڑدلی اور رونا دھونا تمہیں زیب نہیں دیتا۔ چلو، ایک بہار اور حوصلہ مند نوجوان کی طرح اب کھڑے ہوجاؤ اور خوش دلی سے مجھے رخصت کرو۔ اپنے بارے میں میری رائے بدلنے کا دکھ مجھے مت دو۔“

یہ کہتے ہی میرا بازو تھام کے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے بھی اپنے بوجھل جسم کے ساتھ اٹھنا پڑا۔ ابھی وہ کمرے میں تھا کہ دروازے پر اسپتال کے مخصوص لباس میں دبلا پتلا ایک آدمی دکھائی دیا۔ ڈاکٹر رائے کو دیکھ کے وہ پلٹ جانا چاہتا تھا کہ ڈاکٹر کی کڑکتی آواز پر ٹھٹھک کے رک گیا۔ ڈاکٹر کے اشارے پر نرس ایمی نے تیز قدموں سے آگے جاکے اس کی آمد کا مقصد پوچھا۔ اس نے کانا پھوسی کے انداز میں ایمی کو جانے کیا بتایا کہ ایمی جز بز نظر آنے لگی۔ اس دوران ڈاکٹر رائے، اس کا ساتھی اور میں دروازے پر پہنچ گئے۔

”کیا ہے؟“ ڈاکٹر نے رکھائی سے پوچھا۔

”جناب! یہ کہتا ہے، بابر صاحب سے ملنے دو پولیس والے آئے ہیں۔“ ایمی نے جھجکتے ہوئے بتایا۔

”کیا؟“ ڈاکٹر قریباً چیخ کر بولا۔ ”پولیس!“ دوسرے لمحے اس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے بھی سن لیا تھا۔ ایمی نے میرا نام ہی لیا تھا۔ میں تو دم بہ خود ہوگیا تھا۔ ”تمہارے لیے پولیس؟“ ڈاکٹر وحشت آمیز حیرانی سے بولا۔ ”کیوں، کس وجہ سے؟ یہ کیا معاملہ ہے۔“

”میں ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا۔“ اس کے سوا مجھے کوئی جواب نہیں سوجھا۔

”کیا بولتے ہیں وہ لوگ؟“ ڈاکٹر رائے نے ہندوستانی میں براہ راست قاصد سے پوچھا۔

”وہ ساب سے ملنا چاہتے ہیں جناب۔“ قاصد ممیا کے بولا۔

”کس واسطے، کیوں؟“ ڈاکٹر برگشتگی سے بولا۔

”اپنے کو نئیں مالوم جناب۔“ قاصد حواس باختہ ہونے لگا۔ ”وہ لوگ کچھ نئیں بولے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے بے نیازی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ ”آپ جایئے، میں ان سے مل لیتا ہوں۔“

”مگر وہ، وہ کیوں آئے ہیں یہاں؟“ ڈاکٹر کی فکر وتشویش میرے بے پروایانہ لہجے سے بھی کم نہ ہوئی۔ ”یہ اسپتال ہے۔“ وہ بپھر کے بولا۔

”کوئی بات ہی ہوگی۔“ میں نے نچلی آواز میں کہا۔ ”میں دیکھ لیتا ہوں۔“

ڈاکٹر رائے حیرت واضطراب کے عالم میں کھڑا میری شکل دیکھتا رہا۔ اس نے کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں شانے اچکائے۔ ”مناسب ہے، تم دیکھو ان کو۔“ وہ ٹھیر کے بولا۔ ”اور سنو! کوئی ایسی ویسی بات ہو تو مجھ سے مت چھپاؤ۔“

”میں کچھ نہیں چھپاؤں گا آپ سے، مجھ پر بھروسا رکھیے۔ آپ اطمینان سے گھر جایئے۔“ میں نے بہ ظاہر اعتماد سے کہا۔

میری حالت عجیب تھی۔ ڈاکٹر رائے کے سامنے قاصد آیا تھا۔ مجھے ایسا لگا، میری کوئی چوری پکڑی گئی ہے۔ میں ڈاکٹر کے سامنے بے لباس ہوگیا ہوں۔ میں اسے تفصیل کیا بتاتا، میری کوئی غلطی، میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ صفائی پیش کرنے کا وقت نہیں تھا۔ ایک طرف اسے دلاسا دینے کا

فریضہ انجام دینا تھا، دوسری طرف پولیس والے میرے منتظر تھے۔ پولیس کی آمد کا سبب ایک ہی ہوسکتا تھا۔ جس خدشے کا اظہار اکبرعلی خاں نے کیا تھا، وہی ہوا۔

''کدھر ہیں وہ لوگ؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔ اس کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔

قاصد نے اسے بتایا کہ مرکزی عمارت کے ملاقاتی کمرے میں پولیس والوں کو بٹھا دیا گیا ہے۔ وہ سادہ لباس میں آئے ہیں۔ ڈاکٹر نے حکم دیا کہ انہیں کمرے میں نہ آنے دیا جائے۔ کمرے سے باہر سبزہ زار میں کرسیاں لگوادی جائیں۔

ڈاکٹر پھر وہاں نہیں ٹھیرا۔ اس نے شب بخیر کہا نہ میں نے۔ وہ تو گم سا ہوگیا تھا۔ جانے کیسے کیسے شکوک اس کے دل و دماغ میں گھر کرنے لگے ہوں گے۔ میں نے بھی گریز کیا کہ اس صورت حال میں شب بخیر کی رسم ادائی بڑی بے محل معلوم ہوتی تھی۔

ڈاکٹر کے چلے جانے کے بعد کمرے میں آکے میں نے ایک بار پھر بنٹھل پر نظر ڈالی۔ اسے تو کسی بات کا ہوش ہی نہیں تھا۔ نرس ایمی بھی کھوئی کھوئی، سہمی سہمی نظر آتی تھی۔ بار بار اجنبی نگاہوں سے مجھے دیکھتی تھی۔ پولیس ہیبت ودہشت کی علامت ہے۔ آمنا سامنا ہوجائے لوگ تو فرار کے راستے ڈھونڈتے ہیں۔ ہوسکتا ہے، نرس ایمی یہ نہ سوچ رہی ہو کہ میں بھی کچھ یہی کروں گا۔ میں نے غسل خانے جاکے منہ دھویا۔ بال درست کیے، لباس کی شکنیں دور کیں اور خود کو استوار کیا۔ اب جو کچھ بھی ہو۔ تمام بدترین نتائج ذہن میں رکھتے ہوئے مجھے پولیس کے سامنے پیش ہوجانا چاہیے۔ پولیس دروازے پر کھڑی ہے اور میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ اکبرعلی خاں آیا ہی چاہتے ہوں گے۔ دیر ہوگئی ہے مگر وہ آئیں گے ضرور۔ میں ان کی بات مان لیتا تو ارجنٹ تار اب تک کلکتے پہنچ چکا ہوتا۔ میں نے نرس ایمی سے کاغذ اور قلم فراہم کرنے کی درخواست کی۔ اس کے پاس دونوں چیزیں تھیں۔ میں نے کلکتے کے اڈے کا پتا اور پیغام لکھا اور ایمی کو تاکید کی میری عدم موجودی میں اکبرعلی خاں نامی ایک صاحب آئیں تو یہ رقعہ ان کے حوالے کردیا جائے۔ پیغام مختصر تھا کہ تار ملتے ہی پہلی گاڑی سے وہ چل پڑیں۔ پہلے میں نے اسپتال کا پتا لکھا تھا، پھر اسے کاٹ کے ہوٹل کا نام لکھ دیا۔ اسپتال کا پتا دیکھ کے وہ سارے گھبرا جاتے۔ سفر کاٹے نہیں کٹتا۔ تار کے اخراجات کے پیسوں کے لیے میرا ہاتھ جیب میں گیا تھا لیکن اکبرعلی خاں کے شیشہ احساس کے خیال سے میں رک گیا۔

''ان لوگوں کے ساتھ تمہیں بھی جانا ہے؟'' ایمی نے آزردگی سے پوچھا۔

''کیا کہا جاسکتا ہے۔'' میں نے سرسری لہجے میں کہا۔

وہ کچھ اور پوچھتی یا کہتی کہ پولیس کی آمد کی اطلاع دینے والا قاصد دروازے پر نمودار ہوا۔ اس کے کچھ بتانے سے پہلے میں نے دروازے کا رخ کیا۔ کمرے کے آگے چوڑی راہ داری تھی۔ اس کے پار چھوٹے سے قطعے پر گہرا سبزہ بچھا ہوا تھا۔ کنارے کنارے پھلواری سجی ہوئی اور فاصلے فاصلے پر پستہ قد درخت ایستادہ تھے۔ راہ داری میں جلتے قمقموں کی روشنی کسی حد تک سبزہ زار بھی روشن کررہی تھی ہر طرف سکوت چھایا ہوا تھا۔ سکوت، سکون نہیں ہوتا۔ میرے سینے میں تلاطم برپا تھا۔ سامنے سبزے کے بیچ میں بید کی کرسیوں پر دونوں پولیس والے سر جوڑے بیٹھے سرگوشیاں کررہے تھے۔ چند قدم کا فاصلہ طے کرکے میں ان کے پاس پہنچ گیا۔ ان میں ایک کی عمر چالیس پینتالیس، دوسرے کی تیس بتیس کے درمیان ہوگی۔ کوٹ پتلون پہنے ادھیڑ آدمی کا قد درمیانہ، جثہ کسی قدر فربہ تھا۔ مونچھیں ہلکی ہلکی تھیں، رنگت سانولی اور کنپٹیوں پر سفیدی جھلک رہی تھی۔ کرتے پاجامے میں ملبوس نوجوان آدمی کا

جسم چھریرا، قد کھنچا ہوا تھا۔ رنگت اس کی بھی سانولی تھی۔ وضع قطع سے دونوں پولیس والے ہی لگتے تھے۔ مجھے سامنے دیکھ کے دونوں کھڑے ہوگئے۔ چند لمحوں تک نظروں نظروں میں مجھے تولتے رہے۔ میں بھی اس اثنا میں ان کا اندازہ کرتا رہا۔

''کیا بات ہے؟'' سلام کرنے کے بجائے اور ان کے کچھ بولنے سے پہلے میں نے اچٹتی آواز میں پوچھا۔

''آپ ہی ہو، ادھر میدا کے ٹھکانے پر جانے والے؟'' نوجوان شخص تیزی سے بولا۔

میں نے سرہلا کے اقرار کیا۔

''آپ کا نام؟'' لگتا تھا، اپنے لہجے کے تعین میں اسے دشواری ہورہی ہے۔

''کام بتائیں۔'' میں نے سادگی سے کہا۔

دونوں نے بے تابانہ ایک دوسرے کو دیکھا۔ ادھیڑ آدمی کا منہ ٹیڑھا ہوا۔ ''کام بھی بتادیں گے۔''

''کون ہو آپ؟ تھوڑا اپنے بارے میں بتاؤ۔'' میں نے اپنی آواز متوازن ہی رکھی۔

''کوتوالی سے آوے ہیں۔ یہ انسپکٹر شری دھن راج جی ہیں۔ ہمرا نام رام پرساد ہے، سب انسپکٹر رام پرساد۔'' نوجوان نے چستی سے جواب دیا۔ اس چستی میں مناسب کا تکبر و تفاخر نمایاں تھا۔

''پولیس والے ہو آپ؟'' میں نے تعجب کا اظہار کیا۔

''وہ اسپتال کا کبوتر کچھ ناہیں بولس؟'' ادھیڑ شخص نے تنی ہوئی آواز میں کہا۔

''بولا تھا کچھ ایسا، پر آپ وردی بنا آئے ہو۔'' اپنے ہیجان کی پردہ پوشی کے لیے مجھے اپنا لہجہ ٹھیرا ہوا اور دھیما ہی رکھنا چاہیے تھا۔

''ہمرے کو اسپتال کا دھیان تھا۔'' نوجوان نے بہ عجلت عذرخواہی کی۔

''کام بتائیں پھر۔'' میں نے خشک آواز میں کہا۔

''تھوڑی جان کاری لینا ہے اپنے کو۔'' نوجوان بولا۔

''کیسی جان کاری؟'' میں نے تحمل سے پوچھا۔

''میدا کا آدمی دھنوا کا کھون کے بارے میں۔'' نوجوان ادھر ادھر دیکھ کے بولا۔

''پر ہم کیسے جانیں، آپ پولیس ہی کے آدمی ہو؟'' میں نے کسمسا کے کہا۔

''کا...... کا مطلب؟'' نوجوان چڑ سا گیا۔ ''پہچان بنا ہم آپ لوگ سے کیا بات کریں۔ اپنے کو کیا معلوم، آپ......''

''اچ چھا، اچ چھا۔'' ادھیڑ آدمی میری بات کاٹ کے بولا۔ ''ٹھیک ہی بولیس ہیں۔ پہچان کروائے دواپنی۔''

نوجوان نے کرتے کی جیب سے گتے کا شکستہ و بوسیدہ کارڈ نکالا۔ ادھیڑ شخص نے بھی الکساتے ہوئے کوٹ کی اندرونی جیب سے کارڈ نکال کے نوجوان کی طرف بڑھادیا۔ نوجوان نے دونوں پہچان نامے میرے آگے کردیے۔ میں نے انہیں ہاتھ میں لیے بغیر کہا۔ ''ٹھیک ہے۔''

کم ازکم ایک طرف سے اطمینان ہوگیا تھا کہ وہ مجھے ساتھ لے جانے یا گرفتار کرنے نہیں آئے ہیں۔ اس کا اندازہ تو شروع ہی میں ہوچکا تھا۔ ورنہ وہ سیدھے وارنٹ دکھاتے اور اپنے اصلی لب ولہجہ میں مخاطب ہوتے لیکن وہ میری جستجو میں اسپتال آئے تھے اور اپنی آمد کے سبب کا اشارہ نوجوان پولیس والے نے کر بھی دیا تھا۔ ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ دھنوا کے خون کے بارے میں انہیں کس قسم کی معلومات مطلوب ہیں۔ ایسی صورت میں اختصار ایک مجرب تدبیر ہے۔ یوں بھی، کہتے ہیں کہ کم گوئی میں بہت حفظ وامان ہے۔ دھند صاف ہوجانے تک مجھے بہت محتاط رہنا تھا۔ طول کلامی میں زبان بہک سکتی اور انہیں کسی اور طرف سوچنے پر مائل کرسکتی تھی۔ میں نے بوجوہ ایک بات کہہ دینی

ضروری سمجھی۔ ''ایک بات بتادیں آپ کو۔ جو بولنا ہے، کھل کے بولیں تو اچھا ہے، گھما پھرا کے نہیں۔''

''کھلا ہی بولیں گے۔'' ادھیڑ آدمی اینٹھی ہوئی آواز میں بولا۔

کچھ تامل کے بعد اپنے افسر کی طرف دیکھتے ہوئے نوجوان نے تاسف سے ابتدا کی۔ ''ابھی دھنوا کی ارتھی کا کریا کرم اولوگ کردھن ہیں۔''

میں نے کوئی تاثر ظاہر نہیں کیا۔

''آپ بیچ میں تھے، ہم کو بولیں، کیسو ہوگیو ایسا؟''

''ادھر گلی میں بہت سے تماش بین تھے۔ جاکے ان سے نہیں پوچھا؟'' میں نے تندی سے کہا۔

''او تو ہم سارا اونچ نیچ، دایوں بایوں دیکھ ہی رہت تھی۔'' ادھیڑ آدمی کو میری تلخی اچھی نہیں لگی۔

''میدا نے بھیجا ہے آپ کو؟'' میں نے انہیں بھٹکانے کی کوشش کی۔ جلد سے جلد ان کی آمد کی ٹوہ لینے کے لیے مجھے خود بھی سوالوں کی شوشہ طرازی کرتے رہنا چاہیے تھی۔

''او، رنڈی کا جنا۔'' ادھیڑ آدمی کرسی پر مچل گیا۔ ''او ہم کو بھیجتا بھڑوا۔''

نوجوان نے اپنے افسر کی ناگواری کم کرنا چاہی۔ ''پولیس کی اپنی جے داری...... (فرض) بھی ہے۔''

''ادھر تو اپنے کو لگا، شہر کی ساری پولیس میدا کے ہاتھ میں ہے۔'' میں نے کہا۔

''او ادھر کا مہارا جالا گت ہے کا سرا۔'' نوجوان پھنکارتی آواز میں بولا۔

''اس کے اشارے پر پولیس کچھ جانے بوجھے بغیر ہمارے پیچھے پڑگئی اور ہمارے راستے بند کردیے۔''

''پولیس کو اس وگھت کچھ پتا ناہیں تھا نا۔'' نوجوان منہ پھیر کے بولا۔

''اب تو پتا چل گیا۔'' میں نے گویا اپنے آپ سے کہا۔

''جو نا ہیں چلا، جان لیں گے اس کو بھی ترنت ہی۔''

''میدا نہیں تو آپ سرکار کی طرف سے آئے ہو پھر؟'' میں نے نرمی سے پوچھا۔ میرے سوال پر نوجوان نے جھٹ اپنے افسر پہ نظر کی۔ افسر نے ہونٹ سکوڑ کے جواب دیا۔ ''ہم اپنی اور (طرف) سے آوے ہیں۔''

''اپنی اور سے؟'' میں نے تذبذب سے کہا۔

''کھون کا مالا ہے، کیس آگے بھی جاسکے ہیں۔ ہم پہلے آپ سے مل کے آگے پیچھے کا سارا جان لینا چاہیں ہیں۔'' نوجوان نے وضاحت کی۔

''ابھی آپ نے کتنا جانا ہے؟''

''سمجھو، کوچھ بھی نہیں جانا۔'' ادھیڑ آدمی کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

''پر کچھ جان کے ہی آئے ہوں گے ادھر۔ اپنا نام پتا پھر کسی نے بتایا جو ہم تک پہنچ گئے۔''

''سارے سہر کو پتا ہے۔ بچہ بوڑھا جوان، سب کو پتا ہے۔ درسن کرنے کو تڑپیں ہیں سبھی آپ کا۔'' نوجوان کی آواز میں پہلی مرتبہ طنز غالب تھا، استہزا بھی۔

''ایسا کیا کیا ہے ہم نے؟'' میں اب اپنے آپ کو اتنا بندھا ہوا محسوس نہیں کر رہا تھا۔

''ادھر آپ میدا کے ٹھکانے پر کا ہے کو گیو تھے۔ کتا کتا نجر آتا؟ ایک سے ایک حرامی پلا ہے اودھر۔ سہر بھر میں تو پھر ہڑاہڑی ہوبے کرے گی۔ پہلی بار لوگ باگ سنے کہ سہر کے باہر کا کوئی آدمی میدا کو آنکھیں دکھانے آیو تھا۔ سہر کے بھیتر تو کب سے ہر مائی کا لال نے چوڑی پہنا ہوا تھا۔ کلائی میں......اور کسی کو وسواس نا ہیں ہے۔'' نوجوان نے میدا کو غلیظ گالی دی۔ ''کا بولیں، اس کا دھاک سہر میں ایسا جما ہے کہ کسی کو یکین نا ہیں۔'' نوجوان کی آواز سلگ رہی تھی۔ وہ رکا اور کہنے لگا۔ ''ہم آپ کی

جبان سے سننا چاہیں ہیں، ہم کو بولو، کا ہوا تھا ادھر؟''

''ہم نے طے کیا تھا کہ اب کسی سے بات نہیں کریں گے۔ ایسا ویسا کچھ ہوا تو سیدھے کچہری جا کے زبان کھولیں گے۔'' میں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''پر آپ ادھر آئے ہو تو ٹھیک ہے۔ ہم بتاتے ہیں۔''

میں نے گاڑی میں بٹھل کو جھٹکا لگنے، سفر ملتوی کر کے پٹنا اترنے، اسپتال آنے، صبح ڈاک خانے جانے اور وہاں پیش آنے والا واقعہ مختصراً بتایا۔ میں نے کہا کہ اسپتال پہنچنے میں دیر ہو رہی تھی۔ پولیس کے چکر میں پڑ کے جانے کتنا وقت لگ جاتا۔ یہی ایک راستہ رہ گیا تھا کہ میدا کے اڈے پر جا کے بات کی جائے۔ یہ معلوم تو ہو ہی چکا تھا کہ میدا کو کون سی زبان آتی ہے۔ کوئی منت کرنے کے بجائے میں نے اس سے چوکی سے اتر جانے کو کہا۔ اس کے چوکی سے اتر جانے پر سبھی کچھ خود بہ خود ٹھیک ہو جاتا۔ میں نے پھر اسی کی زبان میں بات کی۔

''بعد کا سارا ہم جانیں ہیں۔ اپنے دو چار آدمی بھی ادھر میدا کے ٹھکانے پر رہت ہیں۔'' ادھیڑ پولیس افسر گردن ٹیڑھی کر کے بولا۔

''پھر ہمارا کیا بولنا......'' میں نے کہا۔

''ابھی چاکو بدلی میں بات ٹل گیو۔ ٹھیک ہے پر کل ناہیں تو پرسوں، دس پندرہ دن بعد......''

میں نے ادھیڑ آدمی کی بات مکمل کی۔ ''اس کے پاس جانا ہے۔''

''جانا ہے۔'' نوجوان کی بے قراری دیدنی تھی۔

''اپنا چاقو اس کے پاس ہے، واپس تو لینا ہے اسے۔'' میری آواز میں ذرا سی تپش نہیں تھی۔

''آپ ......آپ۔'' نوجوان نہ جانے کیا پوچھنا چاہتا تھا کہ منتشر ہو گیا بل کھا کے بولا۔ ''وہ بھوتنی کا بہت جمانے سے ادھر راج کرت ہے۔ ایک نمبر کا چاکو باج ہے۔''

''دیکھ لیں گے۔'' میں نے سر ہلا کر کہا۔ ''ہتھیار بیچ میں آتا ہے تو کسی ایک کو زمین دیکھنی پڑتی ہے۔''

''پھر کا آپ اس کے ٹھکانے پر بیٹھنا چاہیں ہیں؟''

''اپنے کو اس کے ٹھکانے، چوکی سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہمیں اس شہر میں نہیں ٹکنا، ہم نے اسے بھی صاف بول دیا تھا۔ ہم نے کہا، اپنے کو آگے جانا ہے۔ پٹنا تو ہم بھائی کی وجہ سے آ گئے۔ اس نے ہماری بات مان لی۔ گلی کے لوگوں نے سارا دیکھا بھالا تھا، انہوں نے بھی کچھ بتایا ہوگا اس کو۔''

میری سادہ بیانی پر وہ اور مضطرب ہوئے۔ ادھیڑ آدمی نے پھر وہ سوال کیا جو اس کے سر میں تنکا بنا ہوا تھا۔ وہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ دیوزاد میدا سے مبارزت کا دعوا میں نے کسی عزم، کسی بل بوتے ہی پر کیا ہوگا۔ اس نے اٹکتی زبان سے پوچھا کہ نتیجہ مختلف نکلا، میں میدا پر قابو نہ پا سکا تو......! مجھے بھی بڑھ چڑھ کے بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ میں نے یہ امکان تسلیم کیا تو دونوں بے مزہ اور بے آرام ہوئے اور جلد ہی انہیں قرار آ گیا۔ انہوں نے میرے سکون سے شاید وہی نتیجہ اخذ کیا جو میں اپنی زبان سے کہتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ پھر انہیں انجام سے غرض بھی کیا تھی۔ انجام کچھ بھی ہو، ان کا کون سا زیاں تھا لیکن ان کے کچھ کہے بغیر اتنا تو نظر آنے لگا تھا کہ نہ تو میدا کے فرستادہ ہیں، نہ اس سے کوئی ہم دردی رکھتے ہیں۔ البتہ اس کی ہزیمت کے مشتاق ہیں اور میرے پاس ان کی آمد کا ایک مقصد مجھے دیکھنا، میرے عزم و ارادہ کا اندازہ کرنا ہے۔

''بہت چربی چڑھ گوی تھی اس سور کو۔ لاگت ہے، او جان لہس، اب اس کا وکھت کھتم ہو چکو ہے۔'' نوجوان نے مجھے مہمیز کرنے کے لیے کہا۔

اس نے کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ میں چپ رہا۔

''پر اپنے کو کوئی بھروسا ناہیں اس پر، اچھی طرح جانیں ہیں ہم اس کو۔ وکھت ناہیں دیو، اس رادن نے سمے لیو۔ من میں اس کے کسی اور پر کارگنوا پکڑن کا بھی ہو سکے ہے۔ ہوسکت ہے کہ نا ہیں؟'' نوجوان نے بڑبڑاتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

''ہوسکتا ہے۔'' میں نے مایوسی سے کہا۔

''اے ہی تو ہم بولیں ہیں۔'' ادھیڑ آدمی اٹد کے بولا۔ ''آپ کو پھر بہت سنبھل کے رہنا ہووے گا۔ اس کے پالتو جناور شہر میں ڈکراتے پھریں ہیں۔''

''ہم کیا کر سکتے ہیں ہمیں تو سب سے پہلے اپنے بھائی کی فکر ہے۔''

''اسی کارن ہم ادھر آئے ہیں، آپ کو دیکھنے بھی......اور اپنی کوئی مدد، سہاتیا کی جرورت ہو تو بھی......''

میں نے پھر ان کا شکریہ ادا کیا۔

''ناہیں ناہیں۔'' نوجوان نے جوشیلے انداز میں اصرار کیا۔ ''کوئی بات، کوئی اپائے من میں ہو تو آپ بولیں۔''

''کیا بولیں، آپ خود ہی سارا دیکھ چکے ہیں۔''

''او بدماس سہر کا سب سے بڑا احرامی ہے۔''

پھر ہم کیا کریں، آپ ہی مشورہ دیں۔''

''اب ہم آ گئے ہیں نا۔'' نوجوان پولیس افسر نے شکر گزاری کے انداز میں کہا۔ ''پر دیکھیں ساب! ایک آدمی کا کھون ہو گیو ہے۔ بہت بڑی بات ہے ای، چھوٹی موٹی ناہیں۔ لاگت ہے، او میدا دگا باج پہلے آپ کو اس چکر میں پھنساوے گا۔ ٹھیک ہے، گلی کے لوگ سارا کچھ دیکھے ہیں، پر ان کا کا بھروسا، او تو سسرے مٹی کے مادھو ہیں۔ بے پیندے کے لوٹے۔ میدا سے دشمنائی کا ہے مول لیں گے۔ ہم کو پتا ہے، آپ اپنا چاکو ناہیں نکالے تھے۔ دھنوا کو اس کے سنگی ساتھی کا چاکو کھبا ہے۔ اور ادھر سارے نہیں، تو پولیس کے بھی کچھ دلال لوگ میدا کا نمک کھاویں اور سسرے سر ملاویں ہیں۔ ٹھکانے سے ملیدہ ماکھن آوے ہے برابر۔ پکا تال میل بنا ہے دونوں میں۔ او بھی اڑچن ڈال سکیں ہیں...... پر آپ......آپ سانت رہو، ہم سوچیں ہیں آگے کا۔''

ہم دردی کی وجہ میری سمجھ میں دیر سے آئی اور مجھے اپنی دیر فہمی پر غصہ بھی آیا۔ اس مہربانی کی وجہ میدا سے عداوت، پیشہ وارانہ فرض شناسی اور دور اندیشی نہیں تھی بلکہ وہ دونوں کچھ زیادہ ہی پولیس والے تھے۔

مجھے ان کا شکریہ ادا کرتے رہنا چاہیے تھا۔ نوجوان کا لہجہ اب خاصا مفاہمانہ ہو گیا تھا، اشتیاق سے بولا۔ ''آپ لوگ، مطلب ہے، آپ کے بھائی اور آپ کا کریں ہیں؟''

میں نے اسے بتایا کہ فیض آباد شہر کے علاقے میں تھوڑی بہت زمینیں ہیں۔

''جمین دار ہیں آپ؟ او تو لاگت ہی تھا اپنے کو۔'' نوجوان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

شہر کے سب سے بڑے اسپتال اور اسپتال کے سب سے مہنگے کمرے میں علاج و معالجے کا حوصلہ کوئی اقبال مند شخص ہی کر سکتا ہے۔ ہوسکتا ہے، انہیں شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں ہمارے قیام کا بھی علم ہو۔ وہ پولیس والے تھے۔ نرس، ڈاکٹر، مجھے ڈاک خانے لے جانے والا تانگا، ہوٹل کا منیجر اور عملے تک ان کی رسائی مشکل نہ تھی۔ میدا کے اڈے، گلی کے لوگوں اور راہ گیروں سے ایک پہر کے عرصے میں انہوں نے اس قدر معلومات حاصل کر ہی لی تھیں۔ وہ پوری تیاری کر کے آئے تھے۔

''اپنی کوشش ہووے گی، آپ ان کٹ کھنا لوگن، ان بجو جنم سے دور دور رہیں۔ ادھر بھائی کی دیکھ بھال میں کوئی کھوٹ نہ پڑے۔''

''آپ کی مہربانی۔'' میں اور کیا کہتا۔

میں نے کہنا چاہا کہ صرف دو دن کی بات ہے۔ بٹھل اور میری پرسش حال کے لیے اتنے لوگ اکھٹے ہو سکتے ہیں کہ وہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میں نے ان سے نہیں کہا کہ وہ غلط جگہ آ گئے ہیں، یہاں سے انہیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔ ان کے گریبان پر ہاتھ ڈالنے، ان کی مذمت کرنے کو بہت جی کرتا تھا لیکن یہی بہتر تھا کہ ان کے فرمودات جوں کے توں قبول کر لیے جائیں۔ انہوں نے بہر حال ایک اعانت ضرور کی تھی، ایک ایسے گوشے کی طرف انہوں نے اشارہ کیا تھا جو مجھ حواس باختہ سے اوجھل رہا تھا۔ میدا اور اس کا سرپرست برجو اپنی عطا کی گئی مہلت میں میرا قصہ ہی پاک کر دینے کی کوشش کیوں نہیں کریں گے؟ میدا اور برجو ایک زمانے سے اڈا چلا رہے ہیں۔ بٹھل کے بہ قول چاقو اور بازو کے زور کے ساتھ اڈا گیری میں دماغ کے زور کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ ان سبھی اڈے کی چوکی سے چمٹے رہنے والوں کو میری موجودی میں اپنا راج پاٹ تمام ہو جانے کا خدشہ بجا طور پر لاحق ہونا چاہیے۔ اڈے کا استاد ہی نہیں، چوکی سے ہٹ جانے پر اس کے نفس ناطقہ، حاشیہ بردار بھی متاثر ہوتے ہیں۔ ان کی عزت و مرتبت، ان کی بقا خطرے میں ہے۔ میں نہیں رہوں گا تو سب کچھ یوں ہی قائم رہے گا۔ ادھر اڈے کے بہت سے لوگوں کے سینوں پر اپنے ہم نشیں دھنوا کی جواں مرگی کا بار ہے۔ دیوانگی کا پورا جواز ہے، عذر بھی بہت معقول ہے کہ دھنوا کا کوئی فدائی، ایک سرکش بے لگام ہو گیا تھا۔ یہ شہران کا، پولیس کی پشت پناہی انہیں حاصل ہے۔ اتنی جلدی اور تیزی مشکوک ہو سکتی ہے۔ سو میری نابودی کے فیصلے میں انہیں کچھ تحمل کرنا چاہیے لیکن کیا عجب، دماغ میں کچھ بھی سما جائے......اور یہ اسپتال کوئی قلعہ نہیں۔ کوئی بھی کسی وقت میرے سر پہ آ دھمک سکتا ہے۔ سامنے سے نہیں تو عقب سے آ سکتا ہے۔ بے وضعی ٹھیری تو کیا جائز و نا جائز۔ حاصل یہ کہ مجھے تو اب اپنے سائے سے بھی محتاط رہنا ہے۔

''آپ سمجھ رہے ہیں نا؟'' مجھے گم دیکھ کے نوجوان افسر نے ٹوکا۔

''جی، جی ہاں۔'' میں نے سانس لے کے کہا۔ ''ہر بات سمجھ میں آ رہی ہے۔''

''کچھ ناہیں ہووے۔ بھگوان کرے، سارا ٹھیک ہی رہے، پر اپنے کو تو آگے پیچھے کا دھیان رکھنا ہے۔'' نوجوان نے مجھے تلقین کی۔

''پولیس باڑھ کا اپنا ایک تریکا ہے۔ کانونا آپ مانگ سکیں ہیں پرنتو کا پتا، پولیس کا او، کوئی بکاؤ آدمی ہوا۔'' ادھیڑ پولیس افسر نے اپنا انتباہ جاری رکھا۔

میں نے کہنا چاہا کہ دعوا تو میری طرف سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ کل صبح عدالت کا دروازہ کھٹ کھٹایا جا سکتا ہے۔ شہر میں ایک اجنبی جس کے ساتھ بیمار بھائی تھا، کیسی کیسی زیادتیوں کا ہدف بنا رہا۔ اس کی جمع پونجی چھینی گئی۔ مزاحمت پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ دھنوا کو چاقو نہیں لگتا تو اجنبی نشانے پر تھا۔ انہوں نے اس کے لیے شہر کے راستے تنگ کر دیے اور اب وہ اسے ختم کر دینے کے درپے ہیں کہ اس نے شہر کے اڈے کے استاد کو اس کی چوکی سے بے دخل کر دینے کی جرأت کی تھی۔ گواہ موجود ہیں، ایک نہیں، بہت سے۔ روپے پیسے کی بات ہے تو سچ بولنے کے لیے انہیں خریدا جا سکتا ہے۔ آج کل سچ بھی خریدا جاتا ہے۔

ایسے ایسے بے سروپا خیال میرے سر میں منڈلا رہے تھے۔ اچھا ہوا جو میں نے اپنی زبان بند رکھی ورنہ وہ میرے متعلق کیا سوچتے۔ عدالت، اس کے مرحلے، الزامات، صفائیاں، پیشیوں پر پیشیاں۔ ہمیں کون سا یہاں ٹھیرے رہنا ہے۔ کچھ عرصے کے لیے عدالت کی طرف سے پولیس کا حفاظتی دستہ تعینات ہو جائے گا اور تاریخیں پڑتی رہیں گی۔ سچ کا اپنا زور واثر کس قدر، عدالت میں اسے ثابت کرنا پڑتا ہے اور آدمی کی عمر صرف ہو جاتی ہے۔ یہ عدالت کی بات جانے کیسے میرے دماغ میں آ گئی۔ آدمی کے پاس دماغ ہونے سے مراد یہ نہیں کہ دماغ ہر وقت اس کا ساتھ دے رہا ہے۔ کہتے ہیں، دو خوبیاں آدمی کو جانور سے ممیز کرتی ہیں۔ بولنے اور سوچنے کی قوت یا صلاحیت مگر دونوں کا کچھ ٹھیک نہیں۔ دونوں کتنا اور کہاں تک آدمی کا ساتھ دیتی ہیں۔ زبان بہک جاتی ہے دماغ بھٹک جاتا ہے۔ دونوں آدمی کا ساتھ دیتے تو دنیا ہی بدلی ہوتی۔ آدمی کے یہ دونوں اوصاف تو بہت خام اور ناتمام ہیں۔

''آپ بولو تو اسپتال اور آس پاس سپھید کپڑواں میں آدمی پھیلا دے ویں؟ او لوگ میدا کا سب آدمی کو جانت ہیں۔ تھوڑا کھرچا پانی ہووے گا پر کام پکو ہو جاوے گا۔'' نوجوان کو حرف مطلب زبان پر لانے میں اتنی دیر لگ گئی۔

مجھے کوئی اچنبھا نہیں ہوا اور شاید جو مجھے کہنا چاہیے تھا، میں نے وہی کہا کہ جو بہتر سمجھیں، کریں۔

میرے اس خسروانہ عندیے سے ان کے چہروں پر سکون و مسرت کے آثار نمودار ہوئے۔ دولت کا عجب کرشمہ ہے۔ آدمی کو آدمی کا اسیر کر دیتی ہے۔ پاس ہو تو گرویدگی میں کمی نہیں آتی، پاس نہ ہو تو دیوانہ بنائے رکھتی ہے۔ جلوہ گری کی تو بات ہی اور ہے، ذکر ہی اس کا مسحور کن ہوتا ہے، جس پر لٹاؤ، اس کا تو عالم ہی کیا، جس سے ہاتھ کھینچے رکھو، وہ ایک نظر عطا، لطف و عنایت کی ایک نظر کے آسرے میں زندگی گزار دیتا ہے یا گنوا دیتا ہے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں دونوں پولیس افسروں کو طمانچے مارتا اور دھکے دے کے باہر نکال دیتا لیکن میرے پاس پیسا تھا، انہیں اس کی ہوس تھی۔ وہ میری ضرورت تھے، میں ان کی ضرورت تھا۔ وہ کتنی دولت کے طلب گار ہوں گے۔ سائل کا ظرف بھی تو کشادہ ہونا چاہیے، اور یہ تو بٹھل کا معاملہ ہے۔ سائل کا ہر ظرف چھوٹا پڑتا۔

بہت دیر سے نرس ایمی خاصی فکر مند نظر آ رہی تھی۔ پولیس سے بڑے بڑے رستم پناہ مانگتے ہیں۔ وہ تو ایک عورت تھی۔ بار بار کمرے سے باہر آ کے وہ ہمیں دیکھ جاتی۔ اس بار وہ مجھے دکھائی دی تو میں نے آواز دے کے اسے روک لیا۔ وہ منتظر ہی تھی۔ لپکتی ہوئی ہمارے قریب آ گئی۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ مہمانوں کی خاطر تواضع کا کچھ انتظام ہو سکتا ہے۔ میں نے اسے انگریزی میں مخاطب کیا تھا، اس لیے کہ اب تک وہ مجھ سے اسی زبان میں ہم کلام رہی تھی۔ اس نے مودبانہ انداز میں سر جھکایا اور راہ داری میں بائیں طرف چلتی ہوئی نظروں سے دور ہو گئی۔

گوروں کی زبان بھی ان کی طرح دولت وحشمت، طاقت و عظمت کی علامت ہے، اسے بولتے ہوئے آدمی زیادہ دانا و بینا، اعتبار کے لائق معلوم ہوتا ہے۔ کچھ شد بد میرے سامنے موجود پولیس افسروں کو بھی تھی۔ ''ای کا، کا جروت ہے۔ اپنے کو پتا ہے، ای اسپتال ہے، کھاتر تواجو کی جگہ ناہیں۔'' نوجوان نے چہکتی آواز میں کہا۔ اس کے بزرگ ساتھی نے بھی ہم نوائی کی۔

''ان کمروں میں انہوں نے مہمانوں کے لیے ایسا کچھ انتظام کیا ہے۔'' میں نے اس کے احترام کی روش ترک نہیں کی۔

''ای کمروں کا، کا بات ہے گورا لوگ بھی ادھر آ کے ٹھیرت ہیں۔'' نوجوان پلکیں پٹ پٹا کے بولا۔ دونوں کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔

خوشامد ہر ایک کو مرغوب ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی وضع و مروت میں قبول کی جاتی ہے۔ آدمی کیا کرے، تعریف و توصیف کرنے والے کو دھتکار دے کہ وہ حد سے تجاوز کر رہا ہے۔ اپنا عرفان، ممدوح کو سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اسی کو سب سے کم ہوتا ہے۔ اس

کے مداح، تعریف و توصیف کی تکرار سے اس کی خود شناسی کی صلاحیت دھندلا دیتے ہیں۔ نوجوان افسر کہنے لگا کہ لگتا ہے، میدا کا وقت آ ہی گیا ہے۔ ہر ایک کے اقبال و اقتدار کا ایک وقت ہوتا ہے۔ خدا نے مجھے اسی لیے شہر پٹنا بھیج دیا ہے۔

میں نے دانستہ شوشہ چھوڑا کہ ایک صورت یہ بھی ہے۔ دیر کیوں کی جائے، کیوں نہ کل صبح سورج نکلتے ہی اپنا چاقو واپس لینے کے لیے اڈے کا رخ کرلوں۔ اڈے کی چوکی پر جگہ بنانے کے بعد خود بہ خود سارا معاملہ نمٹ جائے گا۔

یہ سن کے دونوں کھو سے گئے، پھر ادھیڑ افسر نے اٹکتی زبان سے کہا کہ مجھے ابھی اپنے بھائی کے علاج کی طرف پوری توجہ دینی چاہیے۔ بھائی کی ناگفتہ بہ حالت کے دباؤ میں مبارزت کا مرحلہ متاثر ہوسکتا ہے۔ بہر حال کھلے چاقو درمیان میں ہوں گے۔ ہتھیاروں کی موجودگی میں زندگی اور موت کا فاصلہ کم ہی رہ جاتا ہے۔ ذرا سی چوک سے ایسی غلطی ہوسکتی ہے جس کا ازالہ مشکل ہو جائے۔

وہ کچھ غلط نہیں کہہ رہا تھا لیکن اس کی سچائی نیک نیتی پر مبنی نہیں تھی۔ ہوتی تو محسوس ہو جاتی۔

''ہم کا ہے کو ادھر آئے ہیں۔ ہم ہیں ساب۔ پہلے آپ بھائی کو دیکھو، اپنی سمجھ میں ابھی آوت ہے۔ باقی تو آپ...... آپ جانو۔'' نوجوان نے اپنے افسر کی فہمائش میں اضافہ کیا۔

میری دل جوئی کے لیے انہوں نے بہت سی باتیں کیں۔ مجھے اب وہ بالکل بدلے ہوئے لوگ لگ رہے تھے۔ وہ بیٹھے بیٹھے منقلب ہو گئے تھے۔ یہ وہ لوگ نہیں تھے جن سے کچھ دیر پہلے میرا سامنا ہوا تھا۔ جیب سے خریدی ہوئی چیزوں کی طرح ان پر اب مجھے اختیار حاصل تھا اور میں نے طے کرلیا تھا، جو وہ کہیں گے، اس پر سودے بازی نہیں کروں گا۔ دولت سے کسی پہلو سکون ملتا ہو تو دولت کا اس سے بڑا مصرف کیا ہے۔ دولت کی سب سے بڑی خریداری شاید آدمی کی خریداری ہے۔ یہ آدمی کو موم بنا دے، ریشم بنا دے، آدمی کو آدمی بنا دے اور آدمی کو جانور بنا دے۔ ''آپ لوگ کچھ بتاؤ گے یا مجھ پر چھوڑ دیں گے۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

میری بات ان کی سمجھ میں دیر سے آئی، ادھیڑ آدمی کو پہلے۔ اس کا جسم لہرا لہرا گیا اور اس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ ''کا بات کرت ہو ساب۔''

''نہیں نہیں، کچھ کہنا ہو تو جھجک نہ کریں۔''

''ہم کا بولیں، آپ خود سمجھ دار ہو۔''

''ٹھیک ہے، پھر ہم پر چھوڑ دیں اور کسی بات کی فکر نہ کریں، آپ نے ابھی کہا تھا، ہم ہیں ناں ہم بھی آپ سے یہی کچھ کہتے ہیں۔ ہمیں تو اپنا بھائی سب سے زیادہ عزیز ہے۔''

مجھے ڈر تھا، اس دوران کہیں اکبر علی خاں نہ آجائیں۔ اسپتال کے ملازم چائے اور کھانے پینے کی چیزیں لے آئے تھے اور وہی ہوا۔ راہ داری میں قدموں کی آہٹیں گونجیں۔ وہ اکبر علی خاں ہی تھے۔ کوئی نوعمر لڑکا بھی ان کے ساتھ تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑی مطبخی (ٹفن کیریر) لٹکی ہوئی تھی۔

مجھے سبزے پر بیٹھا دیکھ کر اکبر علی خاں میری طرف ہی آگئے۔ دو اجنبی میرے ساتھ تھے، انہیں پریشان ہو جانا چاہیے تھا۔ یہی حال دونوں افسروں کا ہوا۔ انہوں نے میرے ساتھ کھڑے ہو کے اکبر علی خاں کا استقبال اور ہاتھ جوڑ کے نمسکار کیا۔ ایک کرسی خالی تھی۔ اکبر علی خاں اس پر بیٹھ گئے۔ نوعمر لڑکا ان کی ہدایت پر کمرے میں چلا گیا۔

اس سے پہلے کہ وہ اور مکدر ہوتے، میں نے دونوں افسروں کا تعارف کرایا۔ وہ اکبر علی خاں کو اچھی طرح جانتے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ میدا کے اڈے پر میرے ساتھ جانے والے بھی وہی تھے۔ میں نے چائے کے برتن چھیڑ کے ان تینوں کا دھیان بٹانا چاہا۔ اکبر علی خاں خاصے متوحش تھے کہنے لگے۔ ''خیریت، آپ لوگ کیسے آگئے؟''

''کا بولیں۔'' نوجوان افسر معذرت اور ستایش ملی جلی آواز میں بولا۔ ''ساب کو دیکھن واسطے آگیو بس۔'' اس نے کم و بیش وہی کہا جو مجھ سے کہہ چکا تھا کہ میدا کے اڈے پر جا کے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے والے شخص کا سن کے ان سے برداشت نہیں ہوا۔ وہ مجھے دیکھنے کے لیے آگئے۔ جزوی طور پر اس کا بیان صحیح تھا۔

''وہ تو ان کی مجبوری تھی۔'' اکبر علی خاں نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یہ خواہ مخواہ کسی سے اڑنا نہیں چاہتے تھے مگر کیا کرتے؟''

''ان کی جگہ یو پہ کوئی اور ہوتا تو ایسو ہی تھوڑی چلا جات تھا۔''

ادھیڑ افسر بے ساختہ بولا۔ ''کوئی بات تو الگ ہووے گی وکیل ساب!''

دونوں افسروں نے جلدی جلدی چائے ختم کی۔ میرے اصرار پر رسماً انہوں نے دو ایک بسکٹ لیے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ اکبر علی خاں کے آنے کے بعد وہ کشادگی محسوس کر رہے تھے۔ میں نے بھی انہیں نہیں روکا۔ راہ داری کے آخری سرے تک میں نے اور اکبر علی خاں نے انہیں تپاک سے رخصت کیا۔ یہ تپاک بڑا واجبی تھا۔ چلتے چلتے میں نے جلد ہی دوبارہ ملنے کا اشتیاق ظاہر کر کے ان کی دل جوئی کر دینا ضروری سمجھا۔

مجھے معلوم تھا، اکبر علی خاں ان دونوں کے سامنے چپ ہو گئے تھے، ان کے جانے کے بعد چپ نہ رہ سکیں گے۔ ہم سبزے پر رکھی کرسیوں پر آکے بیٹھے ہی تھے کہ انہوں نے کوئی تامل نہیں کیا۔ ''کیوں آئے تھے یہ؟'' انہوں نے ناگواری سے پوچھا۔

''میں نے نہیں بلایا تھا۔'' میں نے کہا۔

''ظاہر ہے آپ کیوں بلاتے مگر آنے کی وجہ کیا تھی؟''

''انہوں نے بتایا تو تھا آپ کو۔'' میں نے دبی زبان سے کہا۔

''صرف اتنا ہی؟''

''وہ پولیس کے آدمی تھے۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔

''میدا نے انہیں بھیجا تھا؟''

''کس لیے، میدا انہیں کیوں بھیجتا؟''

''سن گن لینے، تاڑ بھاڑ لینے کے لیے۔''

''تو مجھے کیا کرنا چاہیے تھا؟''

''اور کیا کہہ رہے تھے؟ مجھ سے کچھ چھپا تو نہیں رہے میاں۔'' اکبر علی خاں کی آواز میں دل سوزی تھی۔

''پولیس والے تھے، خود کو بیچنے آئے تھے۔''

''بیچنے۔'' وہ اچھل پڑے۔ ''پھر، پھر؟''

''میں نے انہیں خرید لیا۔''

''خرید لیا! کیا مطلب؟''

''میں نے ان سے بات کرلی۔''

''کس سلسلے میں؟''

''ان کا گداز، ان کی ہمدردی خریدنے کے لیے۔ وہ یہی بیچنے آئے تھے۔''

''کتنے میں سودا ہوا؟''

''یہ میں نے ان پر چھوڑ دیا۔ نرخ پوچھنا نامناسب معلوم ہوتا تھا۔ عطیے کی صورت رہے تو اچھا ہے۔''

''گویا ابھی نقد کچھ ادا نہیں کیا؟''

''کچھ ساکھ بن گئی ہے شاید۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''مجھے پوری بات بتایئے۔''

میں سوچتا رہا، انہیں کیا بتاؤں، کیا نہیں مگر چھپانے کو تھا بھی کیا۔ میں نے اختصار سے ساری روداد گوش گزار کر دی۔

وقت گزر گیا۔ انہوں نے کوئی ردعمل ظاہر

نہیں کیا تو میں نے پوچھا۔ ”کس فکر میں، پڑ گئے آپ؟“

”کچھ نہیں۔“ وہ متردد لہجے میں بولے۔ ”سوچ رہا ہوں، بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔ ایک بات انہوں نے بھی غلط نہیں کہی۔ میدا یا اس کے آدمی اس مہلت میں......“ وہ کہتے کہتے رک گئے۔

”وہ مجھے دوبارہ اڈے پر جانے کے قابل ہی نہیں چھوڑیں گے۔ یہی نا؟“

”یہ خیال میرے دماغ میں بھی آیا تھا لیکن ایسی جگہوں اور ان لوگوں کے رسم و رواج پر آپ کا یقین دیکھ کر، میں چپ رہا۔“

”ایسا کہیں ہوتا نہیں ہے۔“ میں نے مایوسی سے کہا۔ ”اور مجھے تو اب بھی شبہ ہے۔“

”یعنی اب تک آپ کو......“ وہ رنجیدہ ہونے لگے۔ ”مگر مجھے ان لوگوں پر کوئی بھروسا نہیں۔ صاف بات ہے۔ آپ مانیں نہ مانیں۔ وہ میدا کا دست راست ہر جو بہت گھاگ اور کائیاں شخص ہے۔ اس نے مہلت لی ہے، دی نہیں ہے اور جیسا کہ آپ کا اعتماد تھا، اسے اپنے پروردہ کا انجام نظر آ گیا تھا۔ اس وقت مجھے یہ مہلت بڑی غنیمت محسوس ہو رہی تھی لیکن اب...... ان سے کچھ بعید نہیں ہے میاں۔“

”پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ میں نے پوچھا۔

”کیا کہوں۔ دماغ کام نہیں کر رہا۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے، وہ پولیس والے ٹھیک کہہ رہے تھے، آپ ہر طرف سے گھرے ہوئے ہیں۔“

”کوئی نہ کوئی راستہ تو نکالنا ہی پڑے گا۔“ اکبر علی خاں بہت گھبرا گئے تھے۔ ان کی پریشانی کم کرنے کے لیے میں نے ہلکی آواز میں کہا لیکن یہ تسلی بڑی مصنوعی تھی۔

”اب تو مجھے اپنا یہ شک بھی درست معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کو کہیں میدا ہی نے نہ بھیجا ہو۔ وہ یہ جاننا چاہتا ہوگا کہ اس کے ٹھکانے سے جانے کے بعد اب آپ کے ارادے کیا ہیں۔“

”ایسی صورت میں تو کچھ بھی ممکن ہے۔“

”انہوں نے آپ سے آپ کے ارادوں کے بارے میں کچھ پوچھا تھا؟“

”ہاں ہاں، پوچھا تو تھا کچھ ایسا۔“

”اور آپ نے کیا جواب دیا؟“

”میں نے وہی کہا جو میرا ارادہ ہے کہ مجھے اپنا چاقو واپس لینے میدا کے اڈے پر جانا ہے۔“

”اوہ!“ انہوں نے شدت سے آنکھیں بھینچ لیں، ماتھے پر شکنوں کا جال پڑ گیا۔ ”معاف کیجیے، کیا ضرورت تھی آپ کو یہ کہنے کی۔“

”ہاں، مجھے شاید اپنا عزم اپنے آپ تک ہی رکھنا چاہیے تھا۔“ میں نے خفت سے کہا۔

”اس کے بعد وہ کیا بولے؟“ انہوں نے تیزی سے پوچھا۔

”انہوں نے میرا ارادہ اور مہمیز کیا اس وقت میں نے جانا کہ وہ میدا کے بھیجے ہوئے نہیں ہیں۔ انہوں نے میدا کو بہت برا بھلا کہا۔ مغلظات سنائیں۔“

وہ خاموش ہو گئے، میں بھی۔

شبنم گرتی محسوس نہیں ہو رہی تھی لیکن سبزہ نم ہو گیا تھا۔ بہت دھیمی دھیمی ہوا چل رہی تھی۔ نرس ایمی نے باہر آ کے ہمیں چونکایا۔ وہ کھانے کے لیے پوچھ رہی تھی۔ اکبر علی خاں ایک دم کھڑے ہو گئے۔

”میں تو بھول ہی گیا۔“ وہ پشیمانی سے بولے۔ ”کھانا ٹھنڈا ہو گیا ہوگا۔“

ہم کمرے میں چلے آئے اور بٹھل کو ایک نظر دیکھ کے پھر باہر آ گئے۔ ایمی کا مشورہ تھا، دیسی کھانوں کی خوشبو۔ کمرے میں رچ بس جاتی۔ ایمی نے کینٹین کے ملازم سے رکابیاں منگوائیں۔ اکبر علی خاں کے ساتھ آنے والے لڑکے نے بھی اس کی مدد کی۔ کھانا ابھی نیم گرم تھا۔ وہ کوئی پانچ چھ آدمیوں کا کھانا لے آئے تھے۔ بھوک نہ ہو تو اشتہا انگیز خوشبو بھی

پھیکی پھیکی لگتی ہے۔ اکبر علی خاں کی وجہ سے میں نے ساتھ دیا۔ کھانا خاصا لذیذ تھا مگر لذت بھی تو نشاطِ خاطر سے مشروط ہے۔ میں لقمے ٹونگتا رہا۔ اکبر علی خاں بھی رسم نبھایا کیے۔ کھانے کے دوران انہیں خیال آیا۔ ''کچھ پیش بندی تو کرنی ہوگی۔''

''دو ہی صورتیں ہیں۔'' میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ایک تو یہ صاحب، کسی طرح جلد سے جلد ٹھیک ہوجائیں۔'' میرا اشارہ بٹھل کی طرف تھا۔

''خدا کرے، آپ کی زبان مبارک ثابت ہو۔'' اکبر علی خاں تڑپ سے گئے۔ ایسی تڑپ جو کسی اپنے ہی میں ممکن ہے۔ ''اور دوسری صورت؟'' انہوں نے بے قراری سے پوچھا۔

''دوسری یہی رہ جاتی ہے کہ آپ پہلی فرصت میں تار دے دیں۔''

لقمہ ان کے ہاتھ میں رہ گیا۔ ''ہاں ہاں، بے شک۔ یہ بھی ایک صورت ہے، ان حالات میں نہایت صائب۔ کاش آپ شام ہی کو ہاں کردیتے۔''

''اب بھی کتنی دیر ہوئی ہے۔ تار گھر تو ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ تار وقت پر مل گیا تو کل رات یا پرسوں صبح تک کوئی نہ کوئی ضرور آجائے گا۔''

''ارجنٹ تار دیا جائے گا۔ رات کو بھی پہنچایا جاتا ہے۔ پھر تو مجھے جلدی کرنی چاہیے۔''

''پہلے آپ کھانا تو ختم کریں۔''

''میرا ارادہ دیر تک بیٹھنے کا تھا۔ آپ کا دل بھی بہلا رہتا ہے۔ مجھے آنے میں وقت لگ گیا۔ آپ کو معلوم ہے، والدہ بیمار ہیں۔ شام کے وقت ان کی طبیعت عموماً بگڑ جاتی ہے۔ آج تو ڈاکٹر کو بلانا پڑا۔''

''پھر تو آپ کو نہیں آنا چاہیے تھا۔''

''کیسے نہ آتا۔ وعدہ جو کیا تھا آپ سے۔ نزہت نے کھانا تیار کرلیا تھا۔ وہ تو سبھی آنا چاہتے تھے۔ میں نے کہا، رات ہوگئی ہے بھئی۔ کل چلیں گے۔ سب آپ سے ملنے کے لیے بے تاب تھے۔''

''میں تو دوپہر ہی ان سے ملا تھا۔'' میں نے اداسی سے کہا۔

''اس وقت کی بات اور تھی۔ میں نے جا کے جب بتایا کہ بابر میاں کی ایک ایک بات حرف بہ حرف درست تھی۔ واقعی ان کے بھائی اسپتال میں ہیں اور علاج...... علاج تشخیص کے مرحلے میں ہے تو سبھی شرمندہ ہوئے۔''

''الٹا شرمندہ ہوئے۔'' میں نے زہر خند سے کہا۔ ''مجھے تو ان کے سامنے جانے کے خیال ہی سے ندامت ہورہی ہے۔''

''واہ صاحب، کیسی ندامت۔'' وہ شکایتی لہجے میں بولے۔ ''خیر چھوڑیے۔ یہ میٹھا لیجیے۔ کھانا تو آپ نے کھایا ہی نہیں۔ نزہت خانم نے یہ حلوہ اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔ تجربے کرتی رہتی ہیں۔ کہیں لبنانی حلوے کی ترکیب پڑھ لی...... تھی، بس طبع آزمائی شروع ہوگئی۔'' اکبر علی خاں نے رکابی میں حلوہ نکال کے میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے ایک چمچہ لیا۔ بہت خوش ذائقہ تھا۔ واقعی نفاست سے تیار کیا گیا تھا۔ ''میری طرف سے شکریہ ادا کردیجیے گا۔'' میں نے کہا۔

''کل وہ آئیں گی۔ آپ خود کہہ دیجیے اور ہاں، اگر آپ کہیں تو تار دے کے میں واپس آجاؤں۔''

''نہیں نہیں۔'' میں نے شدت سے انکار کردیا۔ ''رات اب بھی زیادہ ہوگئی ہے۔ آپ جا کے آرام کریں۔''

''آپ کو نیند نہیں آئے گی اور سچ پوچھیے تو مجھے بھی نہیں آئے گی۔ خدا آپ کے بھائی کو جلد صحت یاب کردے۔ گھر میں سبھی نے دعا کی ہے۔ نزہت تو کہہ رہی تھیں، کل محلے کی عورتیں بلا کے آیتِ کریمہ کا ورد کروائیں گی۔''

ان سے آج دوپہر ملاقات ہوئی تھی۔ جس طرح برسوں کا تعلق لمحوں میں ختم ہوجاتا ہے، لمحوں میں برسوں جیسا تعلق قائم بھی ہوجاتا ہے۔ تعلق خاطر کے لیے وقت کے طول و عرض کی کوئی شرط نہیں۔ کوئی ایک نگاہ کبھی ایسی کارگر ہوتی ہے کہ آدمی زندگی وقف کردے، زندگی تج دے۔ کبھی زندگی بھر کی رفاقت سے کچھ فرق نہیں پڑتا، آدمی کی تنہائی اور تشنہ کامی ختم نہیں ہوتی۔

اکبر علی خاں جلد ہی چلے گئے۔ کچھ دیر میں اکیلا باہر بیٹھا رہا۔ تنہائی سے مراد خاموشی نہیں ہے۔ تنہائی میں آدمی خود سے ہم کلام ہوتا ہے۔ مخاطب کو خاموش کیا جاسکتا ہے، اپنے آپ کو نہیں۔ شبنم سے کپڑے رسمسانے لگے تو میں نے کمرے کا رخ کیا۔ کمرا سنسان تھا۔ میں بٹھل کے بستر پہ نہیں گیا۔ اسے اس طرح بے حال دیکھ کے میرا جی ہولنے لگتا تھا۔ ایمی اپنی مخصوص آرام کرسی سے اٹھ کے میرے پاس آگئی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اسے مجھ سے کیا کام ہوسکتا ہے۔ اس نے وہی سوال کیا جس کا جواب میں دینا نہیں چاہتا تھا۔ میرے جواب سے اس کی بے چینی وحشت میں بدل جاتی۔ ''کچھ خاص نہیں۔'' میں نے سرسری طور پر کہا۔ ''کچھ شبہ ہوگیا تھا نہیں۔ دور ہوگیا تو چلے گئے۔''

ایمی ایک بردبار عورت تھی، اپنی حدود سے واقف، سو اس نے تجاوز نہیں کیا۔ میں بھی کچھ پوچھنا چاہتا تھا، وہی ایک سوال جو کئی بار میں نے کیا تھا۔ اب پوچھنے کی ہمت نہیں ہورہی تھی لیکن مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میرے عاجزانہ لہجے پر مسکرا پڑی۔ ''میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آواز پر یاسیت غالب آگئی۔

''نرس بھی آدھی ڈاکٹر ہوتی ہے۔ تمہارا تجربہ بھی کم نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''کاش میں کچھ بتا سکتی ایک بات ہے۔ مجھے ڈاکٹر رائے پر اعتماد ہے۔ وہ بہت بڑے ڈاکٹر ہیں۔'' اس نے وثوق سے کہا۔

''یہ تو میں کل رات سے سن رہا ہوں۔''

''اور کچھ غلط تو نہیں سن رہے۔ یہ تو اچھی بات ہے۔''

''لیکن ڈاکٹر رائے تو کچھ کہتے ہی نہیں۔''

''وہ ایک ذمے دار ڈاکٹر ہیں۔''

''لگتا ہے، وہ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔''

''ڈاکٹر رائے نے غلط نہیں کہا تھا۔ تم ایک بڑے بچے ہو۔'' اس کے ہونٹوں پر اس کی خاص مشفقانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ میرا کندھا تھپ تھپاتے ہوئے۔ وہ بٹھل کے بستر کی طرف گئی اور کرسی پر بیٹھ کے آنکھیں موند لیں۔ یوں وہ مجھے بھی آرام کی ترغیب دینا چاہتی تھی۔ میں صوفے پر بیٹھا رہا۔ پھر مریض کے ذاتی نگہ دار کے لیے مخصوص بستر پر آکے دراز ہوگیا۔

کھلی آنکھوں کے سامنے موجود افراد، مناظر اور اشیاء، آدمی کے تصور کی بے کرانی محدود کردیتے ہیں۔ بند آنکھوں کے آگے تو ایک جہاں کھل جاتا ہے۔ پھر کوئی حد اور کوئی حساب نہیں۔ بند آنکھیں تو اور بینا ہوجاتی ہیں۔ آنکھ بند کرتے ہی میرے سامنے کوئی فرد ماہ و سال کھل گئی تھی، اپنی عدالت آپ۔ آپ ہی منصف، آپ ہی مدعی۔ کون سی کوتاہی ہوئی، کس کا حق چھینا گیا، کس سے زیادتی کی گئی۔ یہ کون سے گناہوں کی سزائیں ہیں جو ختم ہی نہیں ہوتیں۔ یاسمین اور فروزاں کو اس کمینے سید محمود علی کے چنگل سے چھڑانا کوئی جرم تھا کیا؟ انہیں آباد کرنے کی خاطر فیض آباد جانا ضروری تھا۔ وہاں گئے ہوئے وقت بھی خاصا گزر گیا تھا۔ ایک دن حویلی سے نکلنے کی غلطی کیا ہوئی کہ شہر سے باہر جانے پر پابندی لگادی گئی اور جب اجازت ملی تو...... جہاں اتنے دن ہوگئے تھے، ایک دو دن فیض آباد میں اور گزارے جاسکتے تھے۔ بٹھل نے زریں کا خیال کیا نہ حویلی میں نو وارد فروزاں اور یاسمین

کا۔ حویلی کے ہر مکین کی یہی خواہش تھی کہ ابھی چند دن اور ہم ان کے پاس رہیں۔ جب ہم رخصت ہو رہے تھے، سب کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ میں نہ ہوتا تو بٹھل رک جاتا، میں نہ ہوتا تو بٹھل کہیں جاتا ہی کیوں۔ وہ تو اتنی عزیز از جان، اپنی بیٹی زریں کے پاس ہی رہتا۔ زریں میں تو اس کی جان اٹکی ہوئی ہے۔ بٹھل رک جاتا لیکن میں جو ایک مسلسل مطالبہ، مستقل تقاضا، اس کے سامنے کھڑا تھا۔ روز ہزاروں ریل گاڑیاں ادھر سے ادھر جاتی ہیں۔ اسی دن ہمیں روانہ ہونا اور اسی گاڑی سے سفر کرنا تھا جس کا انجن آگے جا کے خراب ہو جانا تھا اور یہاں پٹنا شہر میں بٹوا چھن گیا تھا تو اس غاصب کے تعاقب کا گناہ کیوں مجھ سے سرزد ہو گیا۔ ایک غلطی کے بعد دوسری غلطی۔ کہتے ہیں، سارا کچھ آسمان کے تیور پر ہے۔ کوئی مصلحت، کوئی اس کی رمز ہوتی ہے۔ آسماں کا یہی طور ہے تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔ آسماں کی نظر میں یہ لغزشیں ہیں تو آدمی سے ہوتی رہیں گی۔ اب تو ہر بات پر شبہ، ہر قدم پر کسی خطا کا گمان ہوتا ہے۔ کیا معلوم، کون پیچھے سے چھرا گھونپ دے، تمنچے کا منہ کھول دے۔ کسے کون سی بات بری لگ جائے، کون سا راستہ کب بند ہو جائے۔ کوئی امتحان ہے یہ......؟ تو کیسا امتحان ہے جو ختم نہیں ہوتا۔ امتحان ہی میں آدمی تمام ہو جاتا ہے کیا!......

میں کروٹیں بدلتا رہا، ایک کے بعد ایک منظر۔ ہوا میں رکھی کتاب کے ورق جیسے پلٹتے جاتے ہیں۔ کہاں سے کہاں تک، کتنے گلی کوچے، کتنے چہرے، کیسے کیسے لوگ، مڑ کے پیچھے دیکھو تو دماغ پھٹ جائے۔ کتنے لوگ لپیٹ میں آ گئے۔ کہتے ہیں، آدمی کے ختم ہو جانے کے بہانے بن جاتے ہیں۔ بہانہ پھر کس کا ہوا؟ اس رات نہ میں اپنا گھر چھوڑ کے کورا کے ساتھ نکل جانے کا ارادہ کرتا نہ اتنے لوگوں کا بہانہ بنتا۔ اب تو کوئی شمار ہی نہیں۔ کورا پناہ لینے گھر آئی تھی اور ابا جان اسے گھر میں رکھنے پر تیار نہیں تھے، تو مجھے ان کے سامنے سینہ سپر ہو جانا چاہیے تھا۔ وہ کیا کر لیتے، گھر سے نکال دیتے تو بات دوسری تھی۔ سب لوگوں کو چھوڑنے کا اتنا بڑا فیصلہ میں نے کیوں کر لیا۔ میں ابا جان کے پیروں پر سر رکھ کے دہائیاں دیتا تو وہ پسیج بھی سکتے تھے۔ امی، فی، کرشنا جی، پیرو دادا، کانتے، مارٹی اور جانے کون کون ...... کہتے ہیں، جو گزر گیا، وہ مٹی ہو گیا، آدمی ہو یا وقت۔ آج جو موجود ہے اس کی فکر کرنی چاہیے...... مگر آدمی کو گزرے ہوئے ماہ و سال سے نجات کہاں ملتی ہے، گزرے ہوئے وقت کی زنجیریں تو اسے جکڑے رہتی ہیں۔ ہر آج، بیتے ہوئے کل کے خمیر سے اٹھتا ہے اور آدمی کو چین لینے نہیں دیتا۔ امی اور فی مٹی ہو گئیں پر سامنے تو اب بھی آ جاتی ہیں، کرشنا جی، پیرو دادا، کانتے، مارٹی، ان کا بھی یہی ہے، جب دیکھو منہ اٹھائے چلے آتے ہیں...... آدمی مٹی ہو جاتا ہے، نقش تو مٹی نہیں ہوتے۔ نقش تو اس وقت تک محفوظ رہتے ہیں جب تک نقش محفوظ رکھنے والا ہی مٹی نہ ہو جائے۔ کاش زندگی بہت مختصر ہوا کرتی، ایک دن، دو دن، ایک پل، دو پل۔ انجام تو ایک ہی ہے۔ وقت زیادہ ملے یا کم پر یہ زیادہ وقت کی زندگی تو بڑی عذاب ہے۔

یکایک ایک ہوک سی اٹھی۔ میں بستر پر اٹھ کے بیٹھ گیا۔ سینہ جیسے کوئی دھنک رہا تھا۔ کمرے میں برائے نام روشنی تھی۔ ایمی آرام کرسی پر نیم دراز تھی۔ بٹھل حسب معمول بے خبر تھا۔ میں نے کمرے پر نظر ڈالی۔ ہر چیز ٹھیری ہوئی، جوں کی توں تھی۔ ایمی نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ ایمی کے منتشر ہو جانے کے خیال سے میں نے اٹھ کے پانی پینے کا ارادہ ملتوی کیا اور دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔

اس وقت دروازے پر دستک کا شبہ ہوا۔ نیم خوابیدہ ایمی مجھ سے پہلے چونک پڑی۔ اس نے

بے کلی سے میری طرف دیکھا۔ لکڑی کے اونچے اور چوڑے دروازے کے بالائی حصے میں چھوٹے چھوٹے چوکور خانے شیشے کے تھے۔ امی نے پردہ کھینچ دیا تھا۔ باہر کا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ دروازے کے قریب ہی تھی۔ دروازہ کھولنے کے بجائے گھبرائی ہوئی آواز میں اس نے انگریزی میں پوچھا۔ ''کون ہے؟''

جواب میں ایک دو لمحے خاموشی رہی پھر کسی نے بے ربطی سے کہا۔ ''بابر صاحب کے کچھ مہمان آوت ہیں۔ ان کو باہر بھیج دیو۔''

میں بستر سے اچھل کے دروازے پر پہنچ گیا۔ میں نے آواز پہچاننے کی کوشش کی۔ بیک وقت بہت سے شکوک ذہن میں امڈے۔ اشارے سے میں نے امی کو اپنے بارے میں کچھ بتانے سے منع کیا۔

دروازے سے ہٹ کے امی کچھ فاصلے پر کھڑکی کی جانب چلی گئی۔ کھڑکی پر باریک جالی نصب تھی۔ اندر عام دروازے کی طرح لکڑی اور شیشے کے پٹ تھے۔ تازہ ہوا کے لیے ایک پٹ کھلا ہوا تھا لیکن کھڑکی پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ میں آڑ میں ہو گیا۔ امی نے پردہ ذرا سا کھسکایا۔ ''بابر ساب ادھر نا ہیں ہے۔'' امی نے پہلے انگریزی پھر ہندوستانی میں جواب دیا۔

''ساب کدھر گیو ہیں؟'' باہر سے کسی نے ہیجانی آواز میں پوچھا۔

''وہ ادھر نا ہیں ہے۔'' امی نے بہ ظاہر بے اعتنائی سے کہا۔ ''ہوٹل گیا ہے۔''

''ہوٹل..... کون سا ہوٹل؟'' یہ آواز پہلے سے مختلف تھی اور جکڑی ہوئی تھی۔

''اپنے کو نا ہیں معلوم، رات ادھر ہی ریسٹ کرے گا۔ سویرے آنے کو بولتا ہے۔'' امی نے اس بار کسی جھجک کے بغیر پوچھا۔ ''آپ کون ہے؟''

ابھی امی نے اتنا کہا تھا کہ راہ داری میں دور سے کہیں بھاگتے قدموں کی چاپیں گونجیں اور بھن بھناتی سرگوشیاں۔ چاپوں اور سرگوشیوں کا ملا جلا شور قریب ہوا اور اسی تیزی سے دروازے سے دور ہوتا گیا۔

امی کھڑکی کے پاس کھڑی رہی۔ کچھ ہی دیر میں سناٹا چھا گیا۔

امی نے کھڑکی کا پردہ ٹھیک کیا۔ میں بھی آڑ سے ہٹ کے صوفے پر چلا آیا۔ اتنی رات گئے آنے والے میری تلاش میں آئے تھے۔ یہی ہو سکتا تھا کہ انہیں اسپتال میں داخل ہوتے ہوئے اسپتال کے عملے اور دربانوں نے کہیں دیکھ لیا تھا اور ان کا تعاقب شروع کر دیا تھا۔ میری جستجو میں آنے والے ہمارے کمرے تک پہنچنے میں کام یاب ہو گئے تھے لیکن انہیں زیادہ دیر دروازے پر ٹکنے کا موقع نہ مل سکا۔ راہ داری میں اسپتال کے دربانوں اور محافظوں کے سر پہ پہنچ جانے کی وجہ سے وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہی کچھ ہو سکتا ہے۔

میرا جسم ڈھیر ہو گیا تھا۔ سانس لینے اور کچھ سوچنے سے پہلے امی کے سوالوں کے جواب کے لیے مجھے تیار ہو جانا چاہیے تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ مجھے بھی اپنے آپ کو جواب طلبی کی بہت بے چینی ہے۔ امی پختہ عمر عورت تھی، اپنے کام میں طاق، پر اعتماد لہجے میں بات کرتی تھی، اپنے کام اور اپنی ذات پر اسے بہت اعتماد تھا۔ اس وقت اس کا حال مختلف تھا۔ بے گانہ نگاہوں سے مجھے دیکھا کہ، میرے سر پر سینگ نکل آئے ہوں جیسے۔ وہ سیدھی میرے پاس آئی اور سامنے کے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ''کون تھے یہ؟'' اس نے دھڑکتی آواز میں پوچھا۔

جواب آسان نہیں تھا۔ رات کو دو پولیس افسروں کی غیر متوقع آمد کے بارے میں اسے کس طرح مطمئن کر دیا تھا لیکن اب میں اسے کیا بتاتا کہ صبح تک سارے اسپتال میں گردش کرنے والی چہ

میگوئیوں کے خیال سے میرے حواس کام نہیں کر رہے تھے۔ بہت کچھ امی پر منحصر تھا کہ وہ اپنی زبان کس حد تک کھولتی ہے۔ ڈاکٹر رائے اور اسپتال کے منتظمین کو کیا کچھ بتاتی ہے۔ رات ہی ڈاکٹر رائے پولیس افسروں کی آمد کی اطلاع پر کھٹک گیا تھا۔ اب اسے میرے اور ٹھل کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے میں کیا دشواری ہوگی۔ وہ ایک سخت مزاج شخص ہے۔ اس کی بدگمانی اور برہمی ..... مشکل صورت حال سے دوچار کر سکتی ہے۔

''کیا بات ہے؟'' نرس امی سراسیمگی سے بولی۔ ''کون تھے یہ؟''

میں نے آنکھیں میچ لیں اور چیختی آواز میں کہا۔ ''مجھے نہیں معلوم..... لیکن وہ میرا ہی نام لے رہے تھے اور میری تلاش میں آئے تھے۔''

امی کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔

''میں تمہیں بتانا نہیں چاہتا تھا کہ اس لیے کہ تمہارا کوئی واسطہ نہیں تھا۔'' میں نے اوسان مجتمع کرنے کی کوشش کی۔ ''لیکن وہ یہاں تک آ گئے۔ تم یقین کرو یا نہ کرو لیکن اب تمہیں بتانا ہی پڑے گا کہ کل رات سے اب تک میرے ساتھ کیا کچھ ہوتا رہا ہے۔ کل رات سے پہلے اس شہر میں مجھے کوئی نہیں جانتا تھا۔ ہمیں یہاں آنا ہی نہیں تھا مگر بھائی کی حالت کی وجہ سے آگے سفر جاری رکھنا ممکن نہیں رہا تھا۔''

شاید یہی مناسب تھا کہ میں اس سے کچھ نہ چھپاؤں اور میں نے کچھ نہیں چھپایا۔ میں نے اس قدر اختصار روا رکھا کہ اسے میرے بیان میں کوئی گرہ اور پیچیدگی محسوس نہ ہو۔ سیاق و سباق کے بغیر اس سادہ شعار کی نظر میں یہ عرض حال نامکمل ہوتا۔ وہ درمیان میں نہیں بولی، ایک بار میری آواز بیٹھ گئی تو اس نے اٹھ کے مجھے پانی پلایا اور مبہوت انداز میں سنتی رہی۔ اس نے وہی سنا جو میں نے کہا تھا اور وہی سمجھا جو میں چاہتا تھا کیوں کہ وہی سچ تھا اور کیوں کہ وہ ایک نیک دل خاتون تھی۔ میں چپ ہوا تو وہ آب دیدہ ہو گئی۔

''ہم کوئی چور اچکے نہیں ہیں۔ ہم نے کسی کا حق غصب نہیں کیا۔ بھائی کی حالت تمہیں معلوم ہے۔ ایسے میں کون کسی جھگڑے نمٹنے میں پڑنا چاہے گا۔ پاگل ہی ہوگا کوئی.....'' میری آواز رندھنے لگی۔

''یہ سارا کچھ ناقابلِ یقین سا ہے۔ ایسے برے، بے ایمان اور بدمعاش لوگ رہتے ہیں اس شہر میں۔'' وہ حیرانی سے بولی۔ ''اور.....اور یہ، یہ لوگ کیا کرنے آئے تھے؟''

''ظاہر ہے، ایک ہی بات ہو سکتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''یعنی وہ تمہیں..... تمہیں.....'' اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے اور آنکھیں بند کر لیں۔ ''اوہ میرے خدا.....''

''ان کی آواز پر میں باہر نکل جاتا، اگر ان سے پہلے وہ پولیس افسر نہیں آتے۔ پولیس افسروں کی آمد کے بعد مجھے چوکنا ہو جانا چاہیے تھا۔''

''اوہ، اوہ.....'' اسے جھرجھری آ گئی۔ ''یعنی وہ پولیس افسر جو تم سے ہمدردی جتانے آئے تھے، یہ انہی کے آدمی تھے۔''

''ہو سکتا ہے۔ وہ میدا کو بری طرح گالیاں دے رہے تھے۔ وہ میدا کے فرستادہ بھی ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے سارا محل وقوع دیکھ لیا تھا۔ اسپتال کے اس حصے میں ویسے بھی سناٹا ہوتا ہے۔ اتنی رات گئے تو انہیں یہ سب کچھ بہت آسان معلوم ہوا ہوگا۔ کچھ مجھ سے بھی غلطی ہوئی۔ پولیس افسروں کی زبانی میدا کے ارادوں کا سن کے میں نے کہا کہ پھر تو مجھے کل سویرے سورج نکلتے ہی میدا کے اڈے کا رخ کرنا چاہیے لیکن صرف غصہ ہی نہیں، یہ جتانے سے مقصد کچھ اور بھی تھا۔ پولیس افسروں کے سامنے اپنے عزم کی پختگی کا اظہار بھی مقصود تھا۔ یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ ان پولیس افسروں کا کوئی ہاتھ نہ ہو۔ جیسا کہ

انہوں نے خدشہ ظاہر کیا تھا۔ جا تو بدلنے کی رسم ادا کرکے میدا نے سر پہ منڈلاتا خطرہ ٹالا ہے۔ اب اسے میرا کام تمام کرنے میں جلدی کرنا چاہیے۔ دھنوا کے جنونی ساتھیوں کے غم وغصہ کا جواز تو موجود ہی ہے۔ دربانوں نے انہیں دیکھ لیا اور ادھر میں کمرے سے باہر نہیں نکلا۔'' میں نے امی کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے میرے کچھ کہے بغیر کمرے میں میری موجودگی سے انکار کردیا۔ ہوسکتا ہے، انہیں یقین آگیا ہو اور وہ مایوس لوٹنا چاہتے ہوں کہ تعاقب میں آنے والوں نے انہیں اور بوکھلا دیا۔

''مجھے کچھ شبہ ہوگیا تھا۔'' امی کی آواز ہانپ رہی تھی، کہنے لگی ''رات وہ پولیس والے آئے تھے، پھر رات گئے، اتنی رات گئے تمہیں پوچھتے ہوئے ان لوگوں کی آمد پر میرا ماتھا ٹھنکا کہ کہیں کوئی گڑ بڑ ہے۔ تم جانتے ہو گے کہ ان خاص الخاص کمروں کے ہر کمرے سے ملحق نرس کا ایک چھوٹا کمرا بھی ہوتا ہے۔ رات بھر نرس وہیں رہتی ہے اور وقفے وقفے سے مریض کو دیکھنے آتی رہتی ہے۔ ضرورت پڑنے پر مریض اور اس کا ساتھی تیماردار بھی گھنٹی بجا کے اسے طلب کرسکتا ہے۔ گزشتہ رات میں اپنے کمرے میں تھی اور شاید تین چار مرتبہ مریض کا معائنہ کرنے آئی تھی۔ آج ڈاکٹر رائے نے خاص طور پر مجھے مریض کے کمرے میں رہنے کی ہدایت کی تھی۔ انہوں نے نیند آور دواؤں میں کمی کی تھی اور مریض کا ردعمل دیکھنے کے لیے میرا اس کے پاس رہنا ضروری تھا۔ عموماً رات کو ہم کمروں میں چٹخنی نہیں لگاتے۔ یہ ایک بڑی محفوظ جگہ ہے۔ ایسی واردات کا تو یہاں کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا۔ دوسرے کسی انتہائی اہم ضرورت میں چٹخنی کھولنے میں وقت صرف ہونے کا بھی احتمال رہتا ہے۔ لیکن چوں کہ آج رات میرا قیام اسی کمرے میں تھا، میں نے چٹخنی لگادی۔ میں کہہ نہیں سکتی، کیوں؟ شاید اس لیے کہ تمہارے پاس آنے والے پولیس افسر دیکھ کے میری چھٹی حس بیدار ہوگئی تھی...... اور یہ لوگ آگئے۔ انہوں نے دروازہ کھول کے اندر آنے کی کوشش کے بجائے دستک دینا مناسب سمجھا۔ وہ خود بھی گھبرائے ہوئے ہوں گے۔ دروازہ کھلا ہوتا اور وہ دھکا دے کے اندر داخل ہوجاتے اور اگر میں نہ ہوتی، کمرے میں صرف تم ہوتے اور اگر ہم دونوں بھی ہوتے تو......'' امی کا جسم لرز گیا۔ اس نے جلدی سے سینے پر کراس بنایا اور خوف زدگی سے بولی۔ ''خداوند نے ہم سب پر رحم کرلیا۔''

''ہاں'' میں نے تھکی تھکی آواز میں اقرار کیا۔ ''پھر تو کچھ بھی ہوسکتا تھا۔''

اس کے ہمدردانہ رویے سے مجھے حوصلہ ہوا۔ اسی لیے میں نے سیاق وسباق کے ساتھ سارا احوال اس کی جناب میں کہہ دینا ضروری جانا تھا۔ اب میں اس سے گزارش کرسکتا تھا۔ میں نے کہا۔ ''سسٹر! تم ڈاکٹر رائے کو کچھ نہ بتاؤ تو بہتر ہوگا۔ کیا ضرورت ہے، انہیں بتایا جائے کہ وہ لوگ ہمارے کمرے پر آکے ٹھیر گئے تھے اور میرا نام لے رہے تھے۔''

''مگر...... مگر ان کا تعاقب کرنے والے دربانوں نے انہیں ہمارے کمرے پر ٹھیرے ہوئے ضرور دیکھ لیا ہوگا۔'' وہ ہچکچا کے بولی۔

''امکان یہی ہے، نہیں دیکھا ہوگا۔ ہمارے کمرے کے دروازے پر موجود لوگ، دربانوں کی بلند ہوتی ہوئی چاپوں پر بھاگ کھڑے ہوں گے۔ انہوں نے پھر کوئی لمحہ نہیں گنوایا ہوگا۔'' میں نے امی کو قائل کرنے کی کوشش کی اور ملتجی لہجے میں کہا۔ ''سسٹر! ڈاکٹر رائے کے مزاج سے تم واقف ہو۔ جانے وہ ہمیں کیا سمجھیں۔ مفرور، جرائم پیشہ، کیا کیا۔ کوئی الٹی سیدھی بات ان کے دماغ میں آگئی تو ہم کیسی مصیبت میں پڑ سکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے، اسپتال سے نکل جانے کا حکم دے دیں۔ پھر ہم کہاں کہاں بھاگتے پھریں گے، کون سے اسپتال کا رخ کریں گے۔ بھائی کی حالت اس دربدری کی

متحمل ہوسکتی ہے؟ یہ تم بہتر جانتی ہو۔ بھائی کی صحت یابی کے بعد تم جو چاہو، ان سے کہہ دینا۔''

وہ چپ ہوگئی اور گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

''تم نزاکت سمجھ رہی ہو؟'' میں نے عاجزی سے کہا۔

وہ گہری سانس بھر کے رہ گئی۔

میں نے پھر اس سے اصرار نہیں کیا۔ بہت دیر خاموشی کے بعد وہ ہڑبڑا کے بولی۔ ''لیکن ناکام ہوجانے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ وہ شیطان دوبارہ یہاں نہیں آئیں گے۔''

''اکبر علی خاں کے ذریعے میں نے تار دلوادیا ہے۔ کل رات یا پرسوں صبح تک کوئی نہ کوئی ضرور آجائے گا۔''

''پھر کیا ہوگا؟''

''پھر میں انہیں دیکھ لوں گا۔''

''کیا...... کیا دیکھ لوگے؟''

''اس عرصے میں بہت محتاط رہنا ہوگا۔'' مجھے خیال آیا اور میں نے بات بدل کے کہا۔ ''اس دوران ہم خود بھی پولیس کی مدد لے سکتے ہیں۔ وہ پولیس والے، اگر واقعی میدا کے آدمی نہیں تھے تو جیسا کہ انہوں نے کہا تھا، روپے پیسے کے عوض ہمارے لیے سپر کا کام کرسکتے ہیں اور اب امید یہی ہے، اس ناکامی کے بعد دو ایک دن تو کوئی بھی اسپتال آنے کی جرأت نہیں کرپائے گا۔ وہ خود بھی ہوشیار ہوجائیں گے اور کیا عجب ہے، اس دوران بھائی ٹھیک ہوجائیں۔ مجھے تو پہلے ان کی فکر ہے، ان کی طرف سے ذرا سکون ہو تو دیکھنا۔ میں انہیں دیکھ لوں گا۔ ایسا اندھیر ہوتا نہیں کہیں۔'' میں نے بٹھل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''انہوں نے مجھے کسی کام کا نہیں......'' میری آواز حلق میں گھٹ گئی۔

''ارے، ارے، سب ٹھیک ہوجائے گا، خدا پر بھروسا رکھو۔'' امی، وہ غم گسار خاتون، سامنے کے صوفے سے اٹھ کے امڈتے ہوئے میرے پاس آگئی اور میرا سر اپنی آغوش میں لے لیا۔ ''سب ٹھیک ہوجائے گا۔ تم ایک ہمت والے نوجوان ہو، اور مرد...... مرد روتے نہیں۔ یہ کام تو ہمارا ہے۔ ہم عورتوں کا۔'' وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی اور خود اس کی آواز چھلکنے لگی۔ میں سسکیاں بھرنے لگا۔

باقی رات بھی آنکھوں میں کٹ گئی تھی۔ جیسے ہی سورج طلوع ہونے کے آثار ہوئے، امی کو بتائے بغیر میں کمرے سے نکل گیا اور سن گن لینے کے لیے راہ داری سے آگے چلا گیا۔ سارا اسپتال جاگ رہا تھا۔ صفائی کرنے والے خاک روب کو کمرے کی طرف بڑھتا دیکھ کے میں فوراً ہی واپس آگیا۔ خاک روب کو آج اپنے کام سے زیادہ رات ہونے والی واردات سے امی کو باخبر کرنے کی فکر تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے پھیلی آنکھوں اور پھٹی پھٹی آواز میں امی کو بتایا کہ رات اسپتال میں ڈاکو گھس آئے تھے۔ ان کے چہرے ڈھاٹوں سے چھپے ہوئے تھے۔ تعداد میں چار پانچ ہوں گے یا اس سے زیادہ۔ اسپتال کے عام دروازے سے داخل ہونے میں انہیں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ ان خاص کمروں کے حصے پر تعینات بوڑھے دربان کو انہوں نے چند ضربوں سے ادھ موا کردیا لیکن رات کی ڈیوٹی پر موجود اسپتال کے ملازمین میں سے کسی نے انہیں دیکھ کے شور مچایا اور تعاقب شروع کردیا۔ کئی اور ملازم بھی اس کے ساتھ ہوگئے۔ ڈاکو پہلے تو ادھر ادھر چھپتے پھرے اور کوئی راستہ نہ دیکھ کے انہوں نے واپس ہوجانے میں عافیت سمجھی۔ وہ بے تحاشا بھاگ رہے تھے۔ انتھونی نامی اسپتال کا ایک نوجوان ملازم تاک لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے اوٹ سے نکل کے کسی کے سر پر لاٹھی ماری اور اسے دبوچ لیا۔ ڈاکو نے اس کے پیٹ میں چھرا گھونپ کے جان چھڑائی۔ زخمی انتھونی نے آدھ گھنٹے میں دم توڑ دیا۔ ڈاکوؤں نے جس بوڑھے دربان کو مارا پیٹا تھا،

اس کی حالت بھی نازک ہے۔ پولیس آچکی ہے اور تفتیش کررہی ہے۔

ایمی نے میری طرف دیکھا اور کچھ نہیں بولی۔ میرے اور ایمی کے لیے ناشتہ لانے اور کمرے میں تولیے چادریں وغیرہ بدلنے والے ملازمین نے بھی کم وبیش یہی روداد دہرائی۔ مبالغہ بہ تدریج نمو پاتا ہے۔ حاشیہ آرائی اور خلاقی کے لیے انہیں وقت ہی کتنا ملا تھا۔ شکر ہے، ان میں سے کسی کو معلوم نہیں تھا کہ، ان کے بہ قول ڈاکو، ہمارے کمرے کے دروازے پر آکے ٹھیرے تھے۔

مجھے شدت سے ڈاکٹر رائے کا انتظار تھا۔ وہ کسی قدر تاخیر سے آیا۔ اس کا چہرہ سلگ رہا تھا۔ میرے سلام کا جواب اس نے سر کی جنبش سے دیا اور کوئی بات نہیں کی۔ میں نے بھی اس کے نزدیک جانے سے پہلو تہی کی۔ اس کے ساتھ دو اور ڈاکٹر تھے۔ ان تینوں اور ایمی نے بٹھل کے بستر کا محاصرہ کرلیا تھا۔ میں دور کھڑا دیکھتا رہا۔ انہوں نے خاصا وقت لیا پھر نرس کو ہدایات دے کے ڈاکٹر رائے میری جانب پلٹا۔ اس کے سامنے آجانے پر میرا جسم غیر ارادی طور پر تن گیا۔ ''کچھ بہتر علامتیں ہیں، شاید آپریشن کی ضرورت نہ پڑے۔'' اس نے بھاری آواز میں مژدہ سنایا اور کہنے لگا۔ ''لیکن اصل فیصلہ دوپہر رپورٹیں آنے پر کیا جائے گا۔''

پرسوں رات سے اب پہلی بار ڈاکٹر رائے کے منہ سے کوئی امید افزا بات سنی تھی۔ میرے ہونٹ کپکپانے لگے اور مجھ سے کچھ کہا نہ جاسکا۔

''رات وہ پولیس والے کیوں آئے تھے؟'' اس نے دھمکتی آواز میں پوچھا۔

''ایسے ہی بس...... کوئی خاص بات نہیں۔ آپ فکرمند نہ ہوں۔ انہیں...... انہیں کچھ شبہ ہوگیا تھا۔'' میں نے بے تعلقی اور بے پروائی کا اظہار کیا۔

''کیسا شبہ؟'' وہ چونک کے بولا۔ ''کوئی اور بات تو نہیں۔''

''اور کیا بات ہوتی۔'' میں نے کسمسا کے کہا۔ ''میں نے آپ سے کہا تھا، میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔''

نرس ایمی بھی قریب کھڑی سن رہی تھی۔

''تمہیں معلوم ہے، رات اسپتال میں کیا ہوا؟'' ڈاکٹر بگڑے تیوروں سے بولا۔

''سنا تو ہے کچھ......'' میں نے پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔

''یہاں پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا۔''

''جواب تک نہ ہوسکا، ضروری تو نہیں کہ آیندہ بھی نہ ہو۔'' میں نے بدبداتے ہوئے کہا۔

''یہ بہت سنگین معاملہ ہے۔'' ڈاکٹر رائے چبھتی آواز میں بولا۔ ''پولیس آگئی ہے۔ مجھے ان سے ملنا ہے۔ تم سے دوپہر کو بات ہوگی۔'' چلتے چلتے وہ رک گیا۔ اس نے ساتھ کھڑے ہوئے معاون ڈاکٹروں کو آگے جانے کا اشارہ کیا۔ نرس ایمی کے دور ہوجانے کے بعد وہ تیکھے لہجے میں بولا۔ ''اگر وہ ڈاکو تھے تو اسپتال میں ان کا کیا کام۔ یہاں سے انہیں کیا مل سکتا تھا؟''

''ہاں۔ لیکن، ممکن ہے، انہیں کسی آدمی کی تلاش ہو۔'' میرے منہ سے نکل گیا۔

''آدمی؟'' وہ اچک کے بولا ''آدمی کی کیوں؟''

''آپ کہہ رہے ہیں نا......'' میں نے اپنی زبان کی لغزش کی تلافی کرنا چاہی۔ ''انہیں یہاں روپیا پیسا تو نہیں مل سکتا تھا۔''

وہ کھوسا گیا پھر جھنجلاتی آواز میں بولا ''تمہارے پاس کوئی بڑی رقم یا کوئی اور قیمتی چیز تو نہیں؟''

میں نے تعجب سے اسے دیکھا۔ ''تھوڑی بہت تو ہے۔''

''کل دوپہر تم کہاں کہاں گئے تھے؟''

''پہلے گرانڈ ہوٹل پھر تار دینے کے لیے بڑے ڈاک خانے۔'' میں نے ہچکچا کے کہا۔ بعد کی مصروفیات کا میں اسے کیا بتاتا۔

''کہیں اور تو نہیں۔ یاد کرو، تم یہاں بہت دیر سے آئے تھے، غالباً شام کے وقت؟''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''مطلب ہے، کہیں تم نے کسی سے اپنے پاس موجود رقم کا ذکر تو نہیں کیا۔ ذرا سوچو، کس کس سے ملے تھے تم؟''

''کسی سے نہیں لیکن...... لیکن ہاں۔ میں نے احتیاطاً ایک معقول رقم ہوٹل میں جمع کرائی تھی۔ یہ رقم بھائی کے کپڑے بدلتے وقت ان کی جیب سے نکلی تھی۔ سفر میں عموماً بھائی اچھی رقم ساتھ لے کے چلتے ہیں۔''

''ہوٹل والوں نے تمہیں کوئی رسید دی تھی؟''

''جی، جی ہاں۔'' میں نے جیب ٹٹولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ رقم ہوٹل میں ہے تو پھر......'' وہ سوچ میں پڑگیا۔

''آپ کیا سمجھ رہے ہیں؟'' میں نے تذبذب سے پوچھا۔

''تم کہتے ہو، تمہیں اس شہر میں کوئی نہیں جانتا۔''

''جی ہاں، بس کل اتفاقاً ایک صاحب سے ملاقات ہوگئی تھی۔ ان کا نام اکبر علی خاں ہے۔ وکیل ہیں اور یہاں کسی کالج میں قانون پڑھاتے ہیں۔ وہ نہایت عمدہ آدمی ہیں۔ شاید آتے ہوں ابھی۔ رات بھی آئے تھے، گھر سے کھانا لے کے۔ پولیس والوں سے رات ان کی ملاقات بھی ہوئی تھی۔'' مجھے یاد آیا، کل شام ڈاکٹر رائے بٹھل کو دیکھنے آیا تھا تو اکبر علی خاں موجود تھے۔ میں نے کہا۔ ''وہی صاحب جو کل شام کمرے میں میرے ساتھ تھے۔ شاید آپ بھول گئے۔''

''رات کو جو پولیس والے آئے تھے، تمہیں یقین ہے وہ پولیس والے ہی تھے؟''

''انہوں نے شناخت نامے دکھائے تھے۔''

''تم نے دیکھے تھے؟''

''نہیں، انہوں نے جیب سے نکالے تو میں مطمئن ہوگیا۔''

''دیکھے نہیں۔''

''ہاں، دیکھے تو نہیں مگر آپ......؟''

''وہ کوئی اور بھی ہوسکتے ہیں، بہروپیے۔'' میری وضاحت سے پہلے اس نے قیاس آرائی کی۔ ''تاڑ بھاڑ لینے آئے ہوں، ہوسکتا ہے بعد کو رات گئے آنے والوں کا ان سے کوئی تعلق ہو۔''

میں نے کوئی رائے ظاہر نہیں کی۔ میرے لیے چپ ہوجانا ہی بہتر تھا۔ تائید سے مراد یہ تھی کہ جس نہج پر ڈاکٹر رائے سوچ رہا ہے، میں اسے مہمیز کروں۔ تردید کے لیے ایک حجت لازم ہوجاتی۔ مجھے حیرت تھی، اس نے کسی طرح تال میل پیدا کرلیا کہ رات کو آنے والے کہیں میری جستجو میں نہ آئے ہوں۔ ڈاکٹر رائے کو تو پولیس میں ہونا چاہیے تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس کے ہونٹ پھیل گئے۔ ''دیکھتے ہیں۔'' اس نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی میں لپک کے چند قدم کے فاصلے پر موجود ایمی کے پاس پہنچا اور اس سے ممنونیت کا اظہار کرنا چاہا لیکن وہ بکھری بکھری سی نظر آرہی تھی۔ مجھے شک ہوا، رات دروازے پر دستک دینے والے حملہ آوروں کے بارے میں اپنے دیرینہ رفیق کار ڈاکٹر رائے کو بے خبر رکھنے کے تاسف اور ندامت سے زیر بار نہ ہو۔ مجھے کچھ پوچھتے ہوئے جھجک ہوئی۔ ''اب پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔'' میں نے اس کی دل جوئی کے لیے کہا۔ ''تم نے سن لیا سسٹر! ڈاکٹر صاحب کیا کہہ رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ بھائی کی حالت میں بہتری نظر آرہی ہے۔ اور، اور شاید آپریشن کی ضرورت نہ پڑے۔''

میری کوشش کارگر ہوئی۔ ایمی کا بجھا ہوا چہرہ کھل اٹھا۔ ''ہاں، وہ پُرامید نظر آ رہے تھے۔''

''تم سے بھی کچھ کہا؟'' میں نے بے چینی سے پوچھا۔

''ڈاکٹر رائے قبل از وقت بڑی بات نہیں کرتے۔''

''اب تک انہوں نے ایک لفظ اطمینان کا نہیں کہا تھا۔ تمہیں کیا بتاؤں سسٹر! ڈاکٹر صاحب کی زبانی اتنا سننے کے لیے مجھ پر کیا عالم گزر رہے ہیں۔''

''بس اب ساری دھند چھٹ جائے گی، ساری رکاوٹیں دور ہو جائیں گی، دیکھنا۔''

میری آواز میرے قابو میں نہیں رہی۔ میں نے تیزی سے ایمی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں جکڑ لیا اور سینے سے لگا کے کہا۔ ''تم نے بہت احسان کیا ہے مجھ پر۔ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔''

''تم آدھے پاگل ہو۔'' وہ ہنس پڑی۔ ''تم منع نہیں کرتے تو بھی میں سوچ سمجھ کے زبان کھولتی اور دیکھو...... یہ شکریہ اب مت ادا کرنا...... یہ اتفاق ہے کہ اسپتال کا کوئی آدمی ان لوگوں کو ہمارے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہوئے نہ دیکھ سکا ورنہ میری خاموشی سے بھی کیا ہوتا۔''

میں نے کئی بار اس کا ہاتھ چوما، آنکھوں سے لگایا۔ مجھے اپنا وجود اب بہت ہلکا ہلکا سا لگ رہا تھا۔

نرس سیورین کے آ جانے پر مجھے دعائیں دیتی ہوئی ایمی رخصت ہوگئی۔ اس دوران میں تین چار مرتبہ بٹھل کے بستر کی جانب گیا اور ہر مرتبہ اس کی بے آرامی کے خیال سے میں نے اسے آواز نہیں دی۔

ٹھیک گیارہ بجے اکبر علی خاں آ گئے۔ میں نے سب سے پہلے انہیں یہی نوید سنائی کہ ڈاکٹر رائے نے صبح کے معائنے میں بٹھل کے لیے کیا کہا ہے۔ ان کی آنکھیں بھی چمکنے لگیں۔ انہوں نے بتایا کہ رات یہاں سے جاتے ہی انہوں نے کلکتے تار دے دیا تھا، ارجنٹ تار۔ عملے سے مستعدی کی درخوا بھی کر دی تھی پھر صبح احتیاطاً یہاں آنے سے ایک اور تار روانہ کر دیا ہے۔

سیورین کمرے میں تھی۔ میں اکبر علی خاں ک داری میں لے آیا اور میں نے رات کا سارا و انہیں سنایا تو وہ ہکا بکا رہ گئے۔ انہیں یقین ہی ن آ رہا تھا کہ میں سچ بول رہا ہوں۔ پھر میں نے ڈاکٹر رائے کے بارے میں انہیں بتایا کہ صبح کے سوال و جواب کی ایک آزمائش سے میں طرح گزرا ہوں۔ ڈاکٹر رائے پھر اس امکا اٹک گیا کہ رات آنے والے پولیس افسر اور کے بعد آنے والے حملہ آوروں میں کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔

یہ سن کے اکبر علی خاں گم سم سے ہوگئے۔ بہر حال ایک وکیل تھے۔ نکتہ چینی روز و شب کا و تھی۔ کہنے لگے۔ ''میاں! آپ کہہ رہے ہر رات کے حیران کن واقعے کی تفتیش کے لیے صبح پولیس اسپتال آئی ہوئی ہے۔ فرض کیجیے، ڈ رائے نے اپنے اس شبہے کا ذکر پولیس سے کرد پولیس تو آپ کی طرف بھی آ سکتی ہے۔ پھر آپ کہیں گے ان سے، رات آپ سے ملاقات کر والے پولیس افسر کون تھے؟''

مجھ سے فوراً کوئی جواب نہ بن پڑا۔ میں تو علی خاں کی صورت دیکھا کیا...... اس نکتے پر نے سوچا ہی نہ تھا۔ بے شک ڈاکٹر رائے کو اسپ میں موجود تفتیش کاروں سے یہ کہنے میں کیا عار کہ گزشتہ رات اس کے زیرِ علاج، شہر میں ا ایک مریض کے تیمار دار بھائی کے پاس توقع خلاف دو پولیس افسر آئے تھے۔ اسپتال دھرنا دیے ہوئے پولیس والے رات کے وا کے اندھیرے میں کسی کرن کی امید میں میر پاس آ سکتے ہیں۔ پھر میں ان سے کیا کہوں گا بتاؤں گا کہ ان کے نام کیا تھے، حلیے کیسے تھے او

کا مقصد کیا تھا۔ یہ مسلسل کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ۔ کیسا یہ جنجال ہے۔ ایک عذاب ختم نہیں ہوتا کہ دوسرا شروع ہو جاتا ہے۔ میں نے کون سا جرم کیا ہے جو مجھ سے جواب طلبی کی جا رہی ہے۔ میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے پولیس والوں کو سچ بتا دیا کہ رات کو ان کے ہم پیشہ، میدا استاد کے سلسلے میں آئے تھے تو میرا یہ اعتراف ڈاکٹر رائے تک منتقل ہو جائے گا۔

وہ مجھ پر دروغ گوئی کے الزامات عائد کرے گا۔ میری تو ہر بات اسے الٹی نظر آئے گی۔ نرس ایمی کی طرح، گزشتہ روز کی ساری روداد اسے سنا دیتا ہوں تو اس کا خلاق دماغ کیا کیا قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ بات پھر بہت دور جا سکتی ہے، فیض آباد، کلکتے، جانے کہاں کہاں۔

''کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی پڑے گا میاں۔'' اکبر علی خاں مجھ سے زیادہ فکر مند لگ رہے تھے۔ ''آپ کہیں کہ آپ یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ رات آنے والے دو آدمی، جیسا کہ ان کا دعوا تھا، پولیس افسر ہی تھے۔ آپ کہیں کہ انہیں آپ کی شکل سے کوئی دھوکا ہو گیا تھا۔ بات صاف ہوگئی تو وہ معذرت کر کے چلے گئے، کچھ ایسی ہی مبہم انداز میں بات کرنا ہوگی۔''

''ظاہر ہے، بات تو بنانا ہی پڑے گی۔'' میں نے بے چارگی سے کہا۔

''آپ کی کوشش ہونی چاہیے کہ پولیس تفتیش کے دوران ڈاکٹر رائے موجود نہ ہوں۔''

''میری کوشش سے کیا ہو سکتا ہے۔'' میں نے ناگواری سے کہا۔ ''میرا بس تو آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔''

اکبر علی خاں مجھے حوصلے کی تعلیم دینے لگے۔ حالاں کہ سر دست خود انہیں اس کی بڑی ضرورت تھی۔ میں نے چڑ کے کہا۔ ''ٹھیک ہے جو ہونے والا ہے، اس پر میرا اختیار ہے نہ آپ کا۔ جو ہوگا، دیکھا جائے گا، اور زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا۔ رات آنے والے لوگ کس ارادے سے آئے تھے، کامیاب بھی ہو سکتے تھے۔ اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے۔''

''توبہ کیجیے میاں۔ میں تو تصور بھی نہیں کر سکتا کہ وہ اتنا آگے جا سکتے ہیں۔ آپ ہی کہہ رہے تھے کہ یہ اڈے ٹھکانے والے ایسے بدعہد نہیں ہوتے۔ اب دیکھ لیا آپ نے۔''

''مجھے اب بھی یقین نہیں کہ انہیں میدا نے بھیجا تھا۔''

''پھر کس نے...... کون بھیج سکتا ہے انہیں اتنے بڑے اقدام پر...... کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' اکبر علی خاں کی آواز کھنچ گئی۔

''وہ مرنے والے دھنوا کے قریبی ساتھی بھی ہو سکتے ہیں۔ میدا اپنے اڈے کے لوگوں کو باندھے رکھنے میں ناکام رہا ہے شاید۔ آپ کو یاد ہوگا، میں نے میدا کے اڈے پر کہا تھا کہ اڈے کے استاد کو اپنے آخری آدمی تک نگاہ رکھنی پڑی ہے...... یا پھر وہ لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو میدا استاد سے بڑی محبت و عقیدت رکھتے ہوں اور انہیں شبہ ہو کہ میدا سے اپنا چاقو واپس لینے کسی وقت بھی میں اڈے آ سکتا ہوں۔ نتیجے میں ان کا محبوب استاد چوکی پر شاید قائم نہ رہ سکے۔ ایسے لوگ میدا کی محبت میں اسے بتائے بغیر میری طرف آ سکتے ہیں۔''

''مجھے نہیں معلوم۔'' اکبر علی خاں کے ماتھے پر سلوٹیں ابھر آئیں۔ ''میرا جرائم پیشہ لوگوں سے بہت واسطہ رہا ہے لیکن اس قماش کے لوگوں سے کچھ کم بلکہ نہ ہونے کے برابر۔ آپ کا یقین بھی بے سبب نہیں ہوگا۔ بہر حال اس سے فرق بھی کیا پڑتا ہے۔ وہ کوئی بھی ہوں، میدا کے اشارے پر آئے ہوں یا اسے لاعلم رکھ کے۔ میں تو سوچتا ہوں...... خدانخواستہ......'' اکبر علی خاں کہتے کہتے رہ گئے۔ انہوں نے آنکھیں بھینچ لیں۔

’’زندگی محض حادثہ ہے۔‘‘ میں نے کہا۔’’زندگی تو ہروقت، ہر لمحے کسی نہ کسی افتاد، کسی ناگہانی کی زد پر رہتی ہے، موت ایک مستقل حقیقت ہے۔ انسانی جسم کے ہزاروں کل پرزوں میں کوئی بھی کسی لمحے مشین کی طرح خاک ہوسکتا ہے اور یہ نہ ہو پائے تو آسماں سے بجلی گر جاتی ہے، چھت ڈھے جاتی ہے، زلزلہ آجاتا ہے۔ زندگی سے موت کا فاصلہ بس لمحے بھر کا ہے، کبھی یہ لمحہ طویل ہوجاتا ہے، کبھی بہت مختصر۔ زندگی ایک عجوبہ ہے۔ اتنی بلاؤں، آفتوں، اتنی دشمنیوں اور اتنی جسمی پیچیدگیوں کے باوجود آدمی بچا رہتا ہے تو ایک کرشمہ ہے۔ زندگی کی سب سے بڑی دشمن موت ہے اور فتح ہمیشہ اسی کی ہوتی ہے۔‘‘ میرے منہ میں جو آیا، کہتا گیا۔

اکبر علی خاں پلکیں جھپکائے بغیر سنتے رہے۔ میں چپ ہوا تو کہنے لگے۔’’آپ خاموش کیوں ہوگئے میاں! کبھی لگتا ہے، آپ نے بہت پختہ کاروں سے زیادہ زندگی برتی ہے اور معاف کیجیے، کبھی لگتا ہے، کوئی معصوم بچے ہیں آپ، جس نے ابھی کچھ دیکھا اور سمجھا ہی نہیں۔‘‘

میں کیا تبصرہ کرتا۔ انہیں کیا بتاتا کہ گھر سے نکلنے کے بعد اب تک کتنی بار موت کندھا چھو کے گزر گئی ہے۔ میں زندہ ہوں، میں زندہ رہا ہوں، یہ محض ایک حادثہ ہے۔

میرے ہذیان سے اکبر علی خاں کی کسی قدر تشفی ہوئی۔ میں نے کہا۔’’آخری واقعہ تو موت ہے جناب! اس سے آگے، اس سے زیادہ کیا؟ اس سے زیادہ آدمی کی آزمایش کیا ہوسکتی ہے۔ اور آدمی موت کے لیے جس قدر آمادہ رہے، موت کی ہیبت اور اس کے مرحلے کی اذیت اتنی ہی کم ہوجاتی ہے۔ اصل میں آدمی تنہا ہو تو موت سے ایسا خوف زدہ بھی نہ ہو مگر آدمی تنہا کہاں ہوتا ہے۔ کوئی آدمی کبھی تنہا نہیں ہوتا۔ جسمی تنہائی تو ایک گمان ہے۔ آدمی بہ ظاہر کتنا ہی تنہا ہو، اس کے پرسان حال، اس کے دوست، دشمن، اس کے حبیب اور اس کے رقیب جو اس کی نس نس سے پیوست ہوتے ہیں۔ وہ ساتھ نہ ہوتے ہوئے بھی ہروقت ساتھ رہتے ہیں۔ کوئی کسی کا رگ جاں نہ ہو، کوئی کسی کے جسم اور روح کا جزو نہ ہو...... سینے میں کوئی جتنا کھبا ہوتا ہے، موت اتنی ہی گراں بار ہوتی ہے۔ آدمی، دوسروں کے لیے بھی اپنی بقا کا خواہاں ہوتا ہے۔‘‘

میں نے شاید کچھ زیادہ ہی یاوہ گوئی کردی تھی۔ اکبر علی خاں کچھ نہیں بولے۔ ان کی خاموشی سے مجھے پشیمانی ہوئی۔ وہ میرے مخاطب تھے لیکن میں بھی تو اپنے آپ سے مخاطب تھا۔ آدمی خود کو بھی کچھ باور کرانا چاہتا ہے۔ اپنی تسلی کے لیے خود مجھے کسی توجیہہ و توضیح کی بڑی ضرورت تھی۔

’’ہے نا کچھ ایسا ہی؟‘‘ میں نے اپنی خفت مٹانے کے لیے ان کی تائید چاہی۔

’’ہاں میاں!‘‘ وہ گہری سانس لے کے بولے۔’’کچھ ایسا ہے لیکن ایک بات اور بھی ہے۔ یہ زندگی بڑی ضدی ہے۔ انجام معلوم ہونے کے باوجود اپنے ہونے پر اصرار کرتی رہتی ہے۔ ٹوٹتی ہوئی سانسوں میں اپنی فتح کی امید سے کنارہ کش نہیں ہوتی۔ اسے ڈھٹائی کہیے یا کچھ اور۔ ہر شخص ختم ہوجاتا ہے مگر کوئی ایسا نہیں چاہتا۔ چیونٹی بھی اپنی سلامتی کے لیے ہاتھ پاؤں مارتی نظر آتی ہے۔ قدرت کا عجیب نظام ہے بھائی۔ موت یقینی بھی... ہے اور زندگی کی حرص اور ہوس بھی خوب ودیعت کی ہے۔‘‘ وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولے۔

’’معلوم نہیں، یہ کیا ہے اور کیوں ہے۔‘‘ میری آواز ڈھلکی ہوئی تھی۔ بے خبری میں ایسی ہی ناتوانی ہوتی ہے۔ میں نے کہا۔’’ہر جان دار موت کے تجربے کے بغیر موت سے کیوں گریزاں رہتا ہے۔ شاید اس لیے کہ موت سب سے بڑا اندھیرا ہے۔ اسے اس اندھیرے میں اپنی بے چارگی، حبس، دم گھٹنے اور چھوٹے موٹے حادثوں کے تجربے تو

مسلسل ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اسے شبہ ہے کہ موت کے بعد احساس کی بھی موت ہوجاتی ہے، جسم ختم ہوجانے کے بعد روح بھی موجود نہیں رہتی۔ اسے بتایا گیا ہے کہ جسم کے ساتھ روح نہیں مرتی۔ روح باقی ہے تو احساس باقی ہے۔ کچھ تو ہے کہ ہر ذی نفس موت سے ہیبت زدہ رہتا ہے۔‘‘

ہم راہ داری میں یہاں سے وہاں تک گھومتے رہے پھر چلتے چلتے راہ داری کے اس حصے میں آگئے جہاں سے عام اسپتال کا راستہ نکلتا تھا۔ اسپتال کے عملے کی چہل پہل رفتہ رفتہ بڑھتی دیکھ کے ہمیں حیرت ہوئی۔ ہم اور آگے چلے آئے۔ مرکزی عمارت کے سامنے پھیلے سبزہ زار میں بہت سے لوگ یا تو بیٹھے یا کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں۔ اکبر علی خاں نے ایک ملازم کو روک لیا اور اس سے اس اجتماع کا سبب معلوم کیا۔ درمیانی عمر کے اس شخص نے دل دوز آواز میں بتایا کہ انتھونی کا تابوت اٹھایا جانے والا ہے۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ انتھونی اسپتال کے عملے کے اقامتی حصے میں رہتا تھا۔ چند مہینے پہلے اس کے بوڑھے باپ کی موت کے بعد اسے اسپتال میں ملازمت دی گئی تھی۔ باپ نے مرنے سے دو تین ماہ پہلے اپنی بساط سے بڑھ کے اس کی شادی کی تھی۔ بہو ایسی جنم جلی آئی کہ چند مہینوں کے لوٹ پھیر میں پہلے سسر گیا پھر شوہر۔ وہ بتا رہا تھا کہ انتھونی کی بیوی امید سے ہے۔ اب بچہ بھی بچے کہ نہیں۔ صبح سے وہ پچھاڑیں کھا رہی تھی، اب سکتے میں پڑی ہے۔

انتھونی گھر میں سب سے بڑا تھا اور دو چھوٹی بہنوں، ایک چھوٹے بھائی کا کفیل تھا۔ بڑا پھرتیلا اور جوشیلا، فرض شناس اور سعادت مند نوجوان تھا۔ ادھیڑ عمر آدمی رو پڑا۔ انتھونی کے باپ سے اس کی قدیم رفاقت تھی۔ اس کے بہ قول، انتھونی اسے اپنے بچوں کی طرح عزیز تھا۔ ہم دیکھتے رہ گئے۔ اسے انتھونی کی تدفین میں شرکت کی جلدی تھی۔ وہ آنسو پونچھتا ہوا چلا گیا۔

ہم موت اور زندگی ہی پر نوک جھوک کر رہے تھے۔ اکبر علی خاں اسپتال کے ادھیڑ عمر ملازم سے یہ سب کچھ سن کے دل گرفتہ ہوگئے۔ میں نے ان سے پوچھنا چاہا کہ انتھونی کی موت کا ذمے دار کون ہے۔ اس کی بدبخت بیوی، میدا، میں یا بٹھل، یا ٹرین کا حادثہ جس کی وجہ سے ہمیں پٹنا آنا پڑا؟ اکبر علی خاں جواب دیتے بھی تو کیا۔ اس لیے میں نے ان سے کچھ نہیں پوچھا۔ موت کے کیسے بہانے ہوجاتے ہیں۔ یہ انتھونی بیچ میں کیسے آگیا۔ بمبئی میں ایک موٹر کے کل پرزے اچانک خراب ہوگئے۔ بھنڈی بازار میں موٹر رو کے نہ رکی۔ فٹ پیری پر چڑھ گئی۔ وہاں چند بچے کھیل رہے تھے۔ تین ختم، چار پانچ زخمی ہوگئے۔ ان بچوں کا کیا قصور تھا۔ انہیں تو گناہ کا شعور بھی نہیں تھا۔ انہوں نے تو زندگی کی ابتدا ہی کی تھی۔ بس ایسے ہی موت کس وقت کسی کو بھی چھن لیتی ہے اور کچھ نہیں دیکھتی کہ مرنے والے پر انحصار کرنے والے کتنے لوگ زندہ درگور ہوجائیں گے اور انحصار کرنے والے نہ ہوں تو لوگ ایک دوسرے سے محبت بھی تو کرتے ہیں، ایک دوسرے کے عادی ہوجاتے ہیں۔ میرے پاس بہت پیسے تھے۔ جی کرتا تھا، ابھی جا کے انتھونی کی بیوہ کو کچھ دوں لیکن ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ اگرچہ اسی وقت تو اسے سہارے کی ضرورت تھی۔ سب سے بڑا سہارا تو مال وزر کا ہوتا ہے۔ اکبر کی موت کا جہاں گیر کو ایسا صدمہ نہیں ہوا ہوگا۔

ہم پھر راہ داری میں آگئے۔ سیورین کمرے کے باہر کھڑی ہماری منتظر تھی۔ مجھے تو خیال ہی نہیں رہا۔ اکبر علی خاں آئے ہیں۔ ان سے کچھ چائے پانی کے لیے پوچھنا چاہیے۔ سیورین نے چائے منگوالی تھی۔ کمرے میں واپس آکے سبھی کچھ منتشر ہوگیا اور اچھا ہی ہوا۔ ہم دونوں جانے کس سمت بھٹک گئے تھے۔ یہ تو بڑی ان جان سمتیں ہیں۔ آدمی کب سے

اپنے آپ کو جاننے کی جستجو میں ہے۔ در ختم ہی نہیں ہوتے۔ سات در کے بعد خزانہ مل جاتا ہے۔ زندگی کے اسرار و رموز کون سے در میں چھپے ہوئے ہیں۔ آدمی در کے بعد در سر کرتا چلا جارہا ہے اور اس کی حیرت کم نہیں ہوتی، بڑھتی ہی جارہی ہے۔

سیورین نے چائے کے برتن سلیقے سے میز پر رکھے اور ہم سے دودھ اور چینی کی مقدار پوچھ کے چائے بنائی۔ اکبر علی خاں ٹھیک ہی کہتے تھے۔ موت کتنی ہی اٹل ہو، زندگی کی ہٹ دھرمی اپنی جگہ ہے۔ زندگی موجود ہے تو آخری لمحے تک خوش فعلیاں، خوش گمانیاں جاری رہتی ہیں۔ موت فراموش کرتے رہنا ہی زندگی ہے۔ موت اور زندگی کی آنکھ مچولی میں زندگی جیت بھی تو جاتی ہے، جیتتی رہتی ہے۔ زندگی کی ان چھوٹی چھوٹی جیتوں پر موت شاید ہنستی ہے۔ زندگی کو معلوم نہیں ہوتا کہ موت اسے ڈھیل دیتی ہے، اس سے کھلواڑ کرتی رہتی ہے اور کسی ایک دن پتنگ کاٹ دیتی ہے، کسی ایک دن پنجے میں بری طرح دبوچ لیتی ہے۔ یہی اس کا شیوہ ہے۔ ایک دن ضرور اس کا ہوتا ہے اور جو دن اس کے نہیں ہوتے، وہ بھی کچھ اس کی چشم پوشی، درگزری کے سبب سے۔

دوپہر تک پولیس کا کوئی آدمی نہیں آیا۔ بٹھل کی بیماری کے دوران پولیس کی تفتیش سے مجھ حواس باختہ کی وحشت میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ کچھ یہی سوچ کے شاید ڈاکٹر رائے نے اپنا شبہ خود تک محدود رکھا ہو اور پولیس کو پہلے اپنے طور پر چھان بین کا موقع دیا ہو۔

ایک بجا ہی چاہتا تھا۔ اکبر علی خاں کا ملازم بڑا سا ٹفن لے کے آگیا۔ ان سے کچھ کہنا کہ اس تکلف کا یہ محل ہے نہ اس کی ضرورت ہے، فضول تھا۔ گزشتہ رات کی طرح بھوک نہ ہونے کے باوجود میں نے رسم نبھائی۔ ہمارے اصرار پر سیورین بھی ساتھ بیٹھ گئی۔ اس نے ایسے خوش ذائقہ کھانے شاید پہلی بار کھائے تھے، مسلسل تعریفیں کرتی رہی۔ اسے کھاتے دیکھ کے بے اختیار مجھے زریں اور فروزاں کی یاد آئی۔ وہ بھی کچھ اسی انداز سے کھانا کھاتی تھیں۔ کھانا پکانا ہی نہیں، کھانا کھانا بھی ایک ہنر ہے۔ نازک اندامی کو نازک خیالی اور نازک اطواری بھی لازم ہے۔ قدرت نے ایسا ریشم، ایسا پھول، اتنا تجل اور تراشا ہوا بنایا ہو تو دیگر شائستہ، نرم و لطیف حرکات و سکنات سے کیا مطابقت ہو جاتی ہے۔ غالباً یہی تکمیل ہوتی ہے۔ کہتے ہیں، کسی شخص کے میزان کے لیے دستر خوان اور سفر سب سے کھری کسوٹی ہوتی ہیں۔ کلیے تو یوں بے شمار ہیں لیکن کلیوں پر زندگی بسر نہیں کی جاسکتی۔ ایک جیسے آدمی بھی ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں۔

کھانا کھاتے ہی اکبر علی خاں ٹفن لانے والے ملازم کو ساتھ لے کے رخصت ہوگئے۔ میں انہیں اسپتال کے مرکزی دروازے تک پہنچانے گیا۔ راستے میں انہوں نے بتایا کہ ان کی والدہ کی طبیعت سنبھلی نہیں ہے۔ ماں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی آواز سوز و گداز سے مغلوب ہو جاتی تھی۔ میں نے کہا کہ والدہ کے پاس رہنے کی ضرورت سمجھیں تو شام کو یہاں آنے کی زحمت کیوں کریں اور براہ مہربانی یہ کھانے وغیرہ کا تکلف نہ کریں تو بہتر ہوگا۔

وہ مسکراتے ہوئے سر ہلانے لگے اور بولے۔ ”زحمت کیسی برادرم۔ خدارا ایسی اجنبیت نہ برتیں۔ آپ کو معلوم ہے، خدا گواہ ہے، لگتا ہے، کوئی بچھڑا ہوا مل گیا ہے۔“

میں ان سے نہ کہہ سکا کہ میرا بھی کچھ یہی حال ہے۔ وہ یہاں آتے ہیں تو ڈھارس سی بندھ جاتی ہے۔ اس شہر میں کوئی ہے اپنا۔ وہ چلے جاتے ہیں تو دل گھبرانے لگتا ہے۔

انہیں رخصت کرکے واپس کمرے میں پہنچا تو بٹھل کے بستر کے اطراف ڈاکٹروں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی، ڈاکٹر رائے اور کئی ڈاکٹر۔ ان میں گورا ڈاکٹر بھی تھا۔ سیورین بھی ان کے ساتھ مصروف تھی۔ میرے آنے کی آہٹ کسی کو نہ ہوئی۔ ان کے منتشر ہو جانے کے خیال سے کچھ دیر تو میں وہیں دروازے کے نزدیک کھڑا رہا۔ بٹھل پر ان لوگوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ مجھ سے یہ دیکھا نہیں جاتا تھا اس لیے میں باہر چلا آیا۔ انہوں نے بہت دیر لگائی۔ کھڑے کھڑے پاؤں اکڑنے لگے۔ دماغ ہی پراگندہ ہو تو دل کیا، آنکھیں کیا اور پاؤں کیا، سبھی بے جان ہیں۔ یہ جسم تو دیکھنے کا ہے۔ وہی بات ہے، آدمی تو بس دماغ ہے، حاکم مطلق۔ باقی سارا جسم تو اس کا محکوم ہے۔ جتنی دیر ہو رہی تھی، میرا دل ڈوبا جاتا تھا دماغ ڈوبا جاتا تھا۔

اندر سے ڈاکٹر رائے کی آواز آئی تو میں نے جھانک کے کمرے میں دیکھا، ڈاکٹر بٹھل کے پاس سے ہٹ گئے تھے۔ میں تیزی سے کمرے میں داخل ہوا۔ ”اوہ میرے ناراض نوجوان دوست!“ ڈاکٹر رائے نے لپکتے ہوئے مجھے پکارا۔ ”کہاں ہو تم؟“

”میں...... میں یہیں تھا، باہر۔“ میری آواز بہکنے لگی۔

”تمہارے لیے ایک اچھی خبر! ہمارے معزز مہمان ڈاکٹر فرینکی نے ساری رپورٹیں دیکھ لی ہیں۔“ اس نے ستائش آمیز انداز میں پہلو میں کھڑے گورے ڈاکٹر کی طرف اشارہ کیا۔ ”شکر کرو کہ صرف اوپر کی جلد متاثر ہوئی ہے۔ وہیں سوجن ہے اور سر کھولنے کی ضرورت نہیں۔“

میں تو سن ہو گیا۔ اپنی سماعت پر مجھے شبہ ہوا اور میری دریدہ آنکھوں میں دریا امڈ آیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہوں، کس طور ڈاکٹر رائے سے شکرگزاری کروں۔

”تمہارا بھائی دوائیں رد نہیں کر رہا۔ یہ ایک اچھی علامت ہے۔“ گورے ڈاکٹر نے سنجیدگی سے ڈاکٹر رائے کی تائید کی۔ ”یہ سر کا معاملہ بہت نازک ہوتا ہے نوجوان!“

میں نے مضطربانہ سر ہلایا۔

”اور سنو!“ ڈاکٹر رائے نے مجھے متنبہ کیا۔ ”بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ سرجری سے جلد نتائج برآمد ہو جاتے ہیں اور جلد نتائج کے لیے سرجری نہیں کی جاتی تاوقتیکہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو، سمجھے۔“

”جی، جی ہاں۔“ میں نے بدحواسی سے کہا۔

”مریض کے بارے میں نہیں معلوم لیکن اس کا یہ چھوٹا بھائی اپنے بڑے بھائی میں خود سے زیادہ شامل ہے۔“ میرا بازو تھام کے ڈاکٹر رائے نے گورے ڈاکٹر سے کہا۔

”اور اسی لیے میں کہتا ہوں، مشرق میں آدمی موجود ہے۔ مغرب میں تو کہیں کھو گیا ہے۔“ ڈاکٹر فرینکی نے پرتمکنت تپاک سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور بولا۔ ”تم سے مل کے خوشی ہوئی۔“

میں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا ہاتھ جکڑ لیا۔

”امید ہے، جلد ہی تم اپنے محبوب بھائی کو صحت یاب دیکھ سکو گے۔“ گوروں کے مزاج اور لہجے کی طرح ڈاکٹر فرینکی کی مسکراہٹ بھی محتاط تھی۔

اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میری آواز بھر آئی۔

”شام کو ملیں گے۔“ ڈاکٹر رائے منمنا کے بولا اور اس نے ہاتھ پھیلا کے گورے ڈاکٹر کو چلنے کا اشارہ کیا، پھر یکایک رک کے مجھ سے پوچھنے لگا۔ ”پولیس تو نہیں آئی یہاں؟“

”نہیں، بالکل نہیں۔“ میرے شانے سیدھے ہوگئے۔ ”کیوں؟“

”آسکتی ہے کسی وقت۔ ہر ایک سے پوچھ رہے ہیں وہ۔ یہ جاننے کے لیے کہ رات آنے والے اسپتال میں زیر علاج مریض یا اس کے کسی نگہ دار کی کھوج میں تو نہیں تھے۔“

”آجانے دیجیے۔“ میں نے بے نیازی ظاہر کی۔

میں نے ان سے کچھ نہیں کہا۔ میری کسی

رائے سے وہ منتشر ہو سکتے تھے۔ اچھا ہے، وہ خود ہی ہاتھ پاؤں ماریں...... دیکھتے ہیں بہر حال......"

مبہم انداز میں یہ کہتا ہوا ڈاکٹر رائے اپنے ساتھی ڈاکٹروں کے ساتھ کمرے سے نکل گیا تھا کہ ان سے معذرت کر کے پھر دروازے کی طرف پلٹا اور سرگوشی میں اس نے مجھے مشورہ دیا۔ "میں سمجھتا ہوں، گزشتہ رات غلط فہمی میں آنے والے پولیس افسران کا ذکر تم بھی ان سے کیوں کرو۔ یقین سے کچھ کہا بھی تو نہیں جا سکتا، کون تھے وہ۔"

میرے کوئی جواب دینے سے پہلے وہ مجھ سے دور ہو گیا۔

میں نے بہ ظاہر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ اسے جلدی تھی۔ اس نے مجھے موقع بھی نہیں دیا۔ اس کے جانے کے بعد دیر تک میں طرح طرح کے واہموں میں گھرا گم کھڑا رہا اور جیسے کسی نے مجھے ٹوکا۔ اس مشفق ڈاکٹر نے ایک اور بات بھی تو کہی ہے۔ جس کے آگے تمام دور دراز اندیشے ثانوی ہیں۔ دوسرے لمحے میرے پاؤں بٹھل کے بستر کی جانب اٹھ پڑے۔ بٹھل کے چہرے پر سکون کے آثار تھے۔ میں نے بہت دھیمی آواز میں اسے پکارا۔ اس کی پیشانی تنگ اور پلکوں میں جنبش ہوئی۔ ادھر سیورین نے آہستگی سے میرا شانہ تھپک کے مجھے منع کیا۔ مجھے اس کی مداخلت بہت بری لگی اور میں پیچ وتاب کھا کے رہ گیا۔ کوئی اور سامنے ہوتا تو شاید میں اس سے جھگڑ پڑتا مگر وہ سیورین تھی، شاخ گل کے مانند، ذرا تیز آواز میں بات کرتے ہوئے ڈر لگے، شاخ ٹوٹ نہ جائے، پھول کمھلا نہ جائے۔

وہاں سے ہٹ کے میں صوفے پر آ گیا۔ کچھ دیر بعد اپنے کاموں سے نمٹ کے وہ بھی میرے پاس آ کے بیٹھ گئی۔ لمحوں تک چپ رہی پھر ہمک کے بولی۔ "آج تو آپ سے کوئی بات ہی نہیں ہو پائی۔"

میں نے مسکرانے کی کوشش کی اور اس شیشہ احساس نے یہ رعایت غنیمت جانی، پہلو بدل کے دل گیر لہجے میں بولی۔ "کل رات اسپتال میں یہ کیا ہو گیا۔ انھونی بے چارہ مارا گیا۔"

"تم جانتی تھیں اسے؟" میں نے پوچھا۔

"اسپتال میں سبھی اسے جانتے تھے۔" اس نے یاس بھری آواز میں بتایا۔ "کل رات ہی تو ملا تھا۔ ڈیوٹی ختم کر کے جا رہی تھی کہ آمنا سامنا ہو گیا۔ بہت منع کیا، نہیں مانا، بڑے دروازے تک مجھے پہنچانے گیا۔ بڑا دل چسپ، زندہ دل نوجوان تھا وہ۔ میری اس کی اچھی دوستی تھی، یوں یہاں وہ سبھی کا دوست تھا۔ ہر کسی کے کام کے لیے تیار، ہر وقت ہنستا، مسکراتا رہتا۔ کل رات وہ اتنا ہی زندہ تھا جتنا کوئی صحت مند اور خوش باش شخص ہو سکتا ہے...... ایک رات میں یہ کیا ہو گیا؟"

"ایک رات کیا، دوسرے پل کی خبر نہیں۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "بس یہی کچھ ہے۔ کوئی ہم سے پہلے چلا جائے گا، کسی سے پہلے ہم چلے جائیں گے۔ پہلے کون، بعد کو کون۔ کچھ نہیں معلوم۔"

"انھونی کی بیوی شیری میری رشتے دار ہے۔ خوب صورت، بڑی اچھی لڑکی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اور دونوں کے خاندانوں میں نزدیک و دور کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ بڑی لمبی کہانی ہے۔" سیورین آہ بھر کے بولی۔

"کیسی کہانی؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"شیری کا باپ تھامس عجیب ضدی طبیعت کا آدمی تھا۔ شیری کے بچپن میں اس کی ماں مر گئی تھی۔ باپ نے اپنی اکلوتی بیٹی کی پرورش کی اور دوسری شادی بھی نہیں کی۔ حسین ہونے کے ساتھ شیری پڑھی لکھی اور بڑی سمجھ دار تھی۔ چھوٹی عمر میں اس کے رشتے آنے لگے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ تھامس بیٹی کو جدا کرنا نہیں چاہتا تھا، رشتے مسترد کرتا رہا۔ اس دوران ایک نوجوان شیری سے کچھ قریب ہو گیا

تھا۔ شیری بھی اسے پسند کرنے لگی تھی۔ وہ تھامس کے گھر آنے جانے لگا تھا۔ شیری سے شادی کے لیے اس نے باقاعدہ درخواست کردی تھی اور تھامس نے انکار نہیں کیا تھا لیکن اچانک ایک روز نوجوان ایسا غائب ہوا کہ آج تک نام ونشان نہیں ملا۔ اس کے والدین گیا شہر میں رہتے ہیں۔ اب تو کئی سال ہوگئے ہیں۔ سنا ہے، آج تک بیٹے کی واپسی کی راہ تک رہے ہیں۔"

"گیا شہر کا تھا وہ؟ کیا نام تھا؟"

گیا کے نام سے میرے ہڑبڑا جانے پر سیورین نے چونک کے پوچھا۔ "آپ کا تعلق بھی گیا سے ہے؟"

کیا ضروری تھا کہ میں اقرار کروں۔ میں نے اچٹتی آواز میں کہا کہ گیا شہر میں میرے عزیز رہتے تھے۔

سیورین ایک صاف دل لڑکی تھی، تکرار نہیں کی اور مجھے بتایا کہ اس نوجوان کا نام کلی فرڈ جون تھا۔ سب اسے جونی کہتے تھے۔

مجھے شبہہ ہوا تھا کہ میرے اسکول اور کالج کے وقت کا کوئی ساتھی نہ ہو۔ وہاں بہت سے عیسائی طلبہ تھے۔ جانے کیوں مجھے اس کا نام جاننے کی بے چینی ہوئی تھی۔ مجھے تو گیا چھوڑے ہوئے زمانہ ہوگیا تھا۔ میری دخل اندازی سے سیورین الجھ سی گئی۔

"پھر نہیں ملا وہ؟ یہاں پٹنے میں کیوں رہتا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ڈاکٹری کی تعلیم کے لیے اسے یہاں داخلہ ملا تھا۔ یہ اسپتال بھی تو اسی کالج سے وابستہ ہے۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر تھامس کے چچازاد بھائی کے بیٹے کا رشتہ آیا۔ اس رشتے کے لیے تھامس پر بڑا دباؤ تھا۔ لڑکا اچھا تھا، تعلیم یافتہ، خوش شکل۔ خاندان بھی ایک ہی تھا، شیری اپنے ہی دوسرے گھر جاتی۔ تھامس ہاں یا ناں میں جواب نہیں دے پا رہا تھا۔ شاید سردی کی ایک رات لڑکے کے گھر میں آگ لگ گئی۔ آس پاس کے کئی مکان لپیٹ میں آگئے۔ لڑکے کے بھرے پرے خاندان میں صرف اس کی ماں بچی جو بری طرح جھلس گئی تھی۔ چھ سات مہینے موت سے لڑتی رہی اور نہیں بچ پائی۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے تھے۔ کوئی شہادت نہیں تھی کہ تھامس اتنا ہول ناک اور سفاک بھی ہوسکتا ہے، وہ بھی اپنے ہی خاندان کے لیے لیکن لوگوں کو وہم ہوگیا تھا اور شیری کے رشتے آنے بند ہوگئے۔ تھامس سے لوگ کنارہ کش ہونے لگے۔"

مجھے چپ دیکھ کے سیورین کو میری گراں خاطری کا احساس ہوا۔ وہ ٹھٹک سی گئی۔ "میں کیا داستان لے بیٹھی۔" وہ شرمندگی سے بولی۔ "آپ بھی کیا کہتے ہوں گے۔"

"نہیں، بالکل نہیں۔ میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔" میں نے سنبھل کے کہا۔ "پھر شیری، انتھونی کو کس طرح ملی؟"

"وہ تو بہت بعد کی بات ہے۔" سیورین اداسی سے بولی۔

میں نے حیرت کا اظہار کیا تو میری غیر دل چسپی کی بدگمانی کہیں اس کے دماغ سے دور ہوئی۔ میں اس سے کیا کہتا کہ میں سن بھی رہا تھا اور جانے کہاں کہاں بھٹک بھی گیا تھا۔

"بس کیا ہوا۔" وہ کہنے لگی۔ "ریاست رام پور کا کوئی نواب زادہ کسی کام سے پٹنا آیا تھا۔ شیری اس وقت کالج میں پڑھتی تھی۔ نواب زادے نے کہیں اسے دیکھ لیا۔ شیری کے کوائف حاصل کرنا نواب کے لیے کیا مشکل ہوں گے۔ کسی طرح اس نے تھامس سے رابطہ کرلیا۔ یہ رابطہ دیکھتے دیکھتے گہرے مراسم میں بدل گیا۔ تھامس کی خوش نودی کے لیے نواب نے تحفے تحائف کی بارش کردی تھی۔ تھامس اتنا خوش حال تھا نہ ایسا بدحال۔ ایک زمانے سے وہ کسی بڑے گورے افسر کا معتمد تھا۔ سنا ہے، گورا افسر اس کی ذہانت اور دیانت کا بڑا قائل تھا، حد سے زیادہ اعتماد کرتا تھا۔ اس کی وجہ سے پٹنا کے نواح میں تھامس کو بڑھاپے میں گزر بسر کے لیے کچھ زرعی زمین مل گئی تھی۔ افسر کی ترقی ہوگئی اور وہ کلکتے چلا گیا۔ اس نے تھامس کو بھی ساتھ لے جانا چاہا۔ تھامس نے معذرت کرلی۔ پٹنا اس کا آبائی شہر تھا۔ اپنے گھر سے اس کی بے شمار یادیں وابستہ تھیں۔ یہاں اس کی عزیز ترین بیوی رہتی تھی۔ ادھر شیری تعلیم حاصل کررہی تھی۔ کلکتا شہر کی گنجانی اور افراتفری اس کے مزاج سے مناسبت نہیں رکھتی تھی۔ اسے اپنی شیری کا بھی خیال تھا، کلکتے میں وہ کہیں گم نہ ہو جائے۔ شیری اس کی زندگی تھی۔

نواب زادے کے پاس کیا کچھ نہیں تھا۔ سنا ہے، اس کی جاہ وحشمت اور اثر ورسوخ سے تھامس بہت متاثر ہوگیا تھا۔ دونوں سیر شکار کو جانے لگے تھے۔ نواب زادہ باپ بیٹی کو اپنی ریاست اور زمینوں پر لے گیا۔ شیری کے کالج کی چھٹیاں انہوں نے رام پور اور نینی تال وغیرہ میں گزاریں۔ شیری نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا باپ نواب کی بہت عزت کرتا تھا مگر ایک دن نواب نے شیری کے لیے اپنے بے پناہ جذبات کا اظہار کردیا اور منت کی کہ زندگی بھر کے لیے وہ شیری سے رفاقت کا آرزومند ہے۔ نواب کو اس حقیقت کا علم تھا کہ تھامس اپنی بیٹی کی جدائی کے خیال سے آزردہ ہوجاتا ہے۔ نواب نے تھامس کو اپنے ساتھ رہنے، شیری کے لیے ایک الگ گھر، محل جیسا ایک گھر بنانے کی پیش کش بھی کی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ یہی اس کی پہلی اور آخری شادی ہوگی۔ تھامس کی کوئی شرط ہو یا وہ کچھ اور تحفظ چاہتا ہو تو کھل کے بتائے۔ مہذب، نفاست پسند، خوش لباس، رفتار گفتار میں خوش ذوق، مصوری اور موسیقی کا دل دادہ، بے اندازہ دولت کا مالک اور نہایت منکسر مزاج نواب زادے نے آکسفورڈ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی اور مشرق کی محبت میں ڈوب کے ولایت سے واپس آیا تھا۔ وجیہہ اور دل کش شخصیت کا حامل تھا۔ کوئی بھی لڑکی اس کی رفاقت پر ناز کرتی۔ نواب سے وابستگی ہر اعتبار سے بہتر زندگی کی ضمانت تھی۔ نواب کا حال یہ تھا کہ وہ شیری اور اس کے باپ کے آگے بچھا بچھا جاتا تھا۔ اتنی نوازشیں، اس قدر تپاک سے کوئی سنگ دل سے سنگ دل بھی پگھل جاتا۔"

سیورین نے رک کے ایک نظر میری طرف دیکھا اور جیسے میرے انہماک سے مطمئن ہو کے ڈوبی ڈوبی آواز میں کہنے لگی۔ "شیری کو توقع تھی کہ اس بار اس کا باپ شاید انکار نہ کرسکے۔ تھامس نے یہ معقول عذر کیا کہ وہ عیسائی ہے اور رتبے میں بھی نواب زادے سے کوئی نسبت نہیں رکھتا۔ نواب نے کہا کہ اس کے مذہب میں عیسائی عورت سے شادی کی اجازت ہے اور وہ کوئی ایسا کٹر مذہبی آدمی بھی نہیں۔ شیری کو اس کے ساتھ زندگی بسر کرنے میں کوئی اجنبیت نہ ہوگی۔ اسے شیری کے مذہبی معاملات ومشاغل سے بھی کوئی غرض نہیں ہے۔ اسے شیری چاہیے۔ اور اگر ایسا ہی ہے تو وہ اپنی ساری دولت شیری کے نام کرنے کے لیے تیار ہے۔ نواب زادے کی تمام تر یقین دہانیوں اور ضمانتوں کے باوجود تھامس لیت ولعل کرتا رہا۔ صاف انکار بھی اس کے بس میں نہیں رہا تھا۔ وہ جتنا نواب سے کترانے کی کوشش کرتا، نواب کی شدت اتنی بڑھتی جاتی تھی۔ تھامس ان دنوں بہت پریشان رہنے لگا تھا۔"

سیورین کہہ رہی تھی۔ "شیری نے اسے بتایا تھا۔ نواب چاہتا تو کسی اور طرح اس کے باپ کو مجبور بھی کرسکتا تھا۔ نواب کی ریاست، اس کے محل میں قیام کے دوران شیری اس کے زور واثر کی شاہد تھی۔ خدام کی ایک فوج اس کے اشاروں کی منتظر رہتی تھی۔ نواب نے ایسی کوئی کارروائی نہیں کی۔ کچھ

اس وجہ سے بھی وہ نواب کا احترام کرنے لگی تھی۔ شیری کے بہ قول، اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی نواب کے ساتھ آنے والے دنوں کے خواب دیکھنے شروع کردیے تھے مگر اس کا باپ جانے کیا چاہتا تھا۔ شیری کے لیے جانے اس نے کیا سوچ رکھا تھا۔ دنیا کا دستور ہے، بیٹیوں کا گھر ماں باپ کا گھر نہیں ہوتا۔ پھر ایک روز تھامس کو کیا سوجھی۔ وہ شیری کو ساتھ لے کے کلکتے چلا گیا اور چند روز بعد واپس آ گیا۔ کلکتے سے آنے کے بعد اس نے نواب سے ہاں کہہ دی اور شیری کا تعلیمی سال مکمل ہو جانے تک کی مہلت مانگ لی۔"

"پھر نواب باقی نہیں رہا۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

سیورین کی بڑی بڑی آنکھیں پھیل گئیں۔ "آپ کو معلوم ہے؟"

"یوں ہی...... پچھلا سارا کچھ سننے کے بعد......" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "اب یہ مت کہنا کہ ایسا ہی ہوا۔"

"مگر یہی ہوا۔" سیورین بجھی بجھی آواز میں بولی۔ "نواب کو اس کی زمینوں والے مکان میں کسی نے گولی ماردی۔ یہاں تو خبر بھی نہیں آتی لیکن پٹنے میں نواب کے چند دوست تھامس اور اس کے روز افزوں مراسم سے واقف تھے۔ تحقیقات کرتے کرتے پولیس تھامس کے پاس آ گئی۔ نواب کی موت کے وقت تھامس، پٹنے میں تھا۔ پولیس نے خاصا وقت صرف کیا اور کچھ حاصل نہ کر سکی۔ نواب زادے کا قصہ جلد ہی پرانا ہو گیا۔"

"پھر یہ انتھونی؟...... اس صورت حال میں انتھونی کس طرح؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"سمجھیے، شیری نے اپنے آپ سے ناتا توڑ لیا۔" سیورین کی آواز اور دھندلا گئی، کہنے لگی کہ شیری نے بالکل اپنے آپ کو ترک کردیا تھا۔ وہ خاموش خاموش رہنے لگی نوجوان لڑکیاں بہت خواب دیکھتی ہیں۔ شیری نے ساری کھڑکیاں دروازے بند کر لیے تھے۔ چپ چپ کالج جاتی اور گھر واپس آ جاتی۔ کسی سے کوئی رسم وراہ نہ رکھتی۔ کالج کے ساتھی جو بھی اس کی ایک نگاہ خوش انداز کے لیے بے قرار رہتے تھے، کھنچے کھنچے رہنے لگے۔ حسین لڑکیوں کے یوں بھی فسانے بن جاتے ہیں۔ آدمی نگاہوں کی زبان زیادہ سمجھتا ہے۔ کالج سے گھر، گھر سے کالج تک گلی کوچوں سے گزرتے ہوئے لوگوں کی نگاہوں سے واسطہ تو پڑتا ہی تھا۔ نواب کی موت کے بعد شیری کئی روز تک کالج نہیں گئی تھی لیکن گھر بھی اسے کاٹ کھانے دوڑتا تھا، تعلیمی مصروفیات کا کوئی بہانہ تو بہر حال تھا۔

دن گزرتے گئے۔ اور ایک روز انتھونی دیوار کی طرح سامنے آ کے کھڑا ہو گیا۔ دلیر، بے باک، سرپھرا انتھونی مالی اعتبار سے کم تر تھا لیکن دل کا بڑا امیر۔ سینیر کیمبرج کے بعد گریجویشن کے لیے اسے شیری کے کالج میں داخلہ مل گیا تھا۔ یہاں اس نے پہلی بار شیری کو دیکھا اور پاگل ہو گیا۔ یقیناً اس کے ساتھیوں نے اسے شیری سے دور رہنے کی تلقین کی ہوگی۔ انتھونی کی وارفتگیاں شیری کو متاثر نہ کر سکیں۔ شیری اپنے آپ سے بھی تو ڈرنے لگی تھی۔ جواں سال انتھونی کو وہ اپنی بدقسمتیوں اور محرومیوں کا حصہ بنانا نہیں چاہتی تھی۔ انتھونی میں دل داری کی بڑی خوبیاں تھیں۔ شیری کی مسلسل پہلو تہی، حد سے زیادہ بے حسی پر دل برداشتہ ہونے کے بجائے وہ کچھ اور دیوانہ ہوا۔ شیری نے ایک بار تو اسے بری طرح دھتکار دیا تھا۔ حالاں کہ یہ تلخی وتندی اس کے مزاج کے برعکس تھی۔ ثابت قدم انتھونی، شیری کو زندگی میں واپس لانے کی کوششوں میں جتا رہا۔ شیری کو خود پر مسلط کیے ہوئے جبر سے تنہائی تو بہت محسوس ہوتی ہوگی۔ جبر شعوری تھا۔ غیر شعوری طور پر کسی پناہ کسی سہارے کی ضرورت تو اسے محسوس ہونی چاہیے۔ انتھونی اپنے گداز، اپنے التفات

پروانہ وار نثار کرتا رہا۔ شیری کب تک اپنے آپ سے روٹھی رہتی۔ انکار کو بھی ایک تاب استقامت چاہیے۔ وہ تو ایک دل گیر، ایک ناتواں لڑکی تھی۔ اس نے انتھونی کے آگے سپر ڈال دی۔

سیورین کہہ رہی تھی کہ شیری کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ناکام ہونے کے لیے انتھونی نے اس کی جانب پیش قدمی نہیں کی ہے اور وہ دوسرے نوجوانوں کی طرح نہیں ہے، وہ تو کچھ اور ہے مگر جیسا کہ لوگ کہتے تھے، شیری کا باپ، اس کا مشفق باپ! کوئی شہادت نہیں تھی کہ اس کا باپ ہی اس کی آرزوؤں اور خوابوں میں رکاوٹ بنا رہا ہے۔ یہ محض ان ہونیوں کا ایک سلسلہ بھی تو ہو سکتا ہے۔ اس کا باپ ایک تجربہ کار، ہوش مند اور پڑھا لکھا شخص ہے۔ شیری کی ماں بچپن میں اسے چھوڑ گئی تھی۔ اس کے باپ نے اسے پیروں چلنا سکھایا، وہ تو شیری کے لیے ایک سایہ، کوئی ستون بنا رہا ہے۔ شیری کی قسمت خراب ہے تو اس کے باپ کا کیا قصور۔ کوئی باپ، اور تھامس جیسا باپ اپنی بیٹی کے لیے کیا برا چاہ سکتا ہے۔ بے شمار تسلی آمیز جوازوں کے باوجود شیری کو چین بھی نہیں آتا تھا۔ اس نے انتھونی سے گزارش کی کہ بہتر یہی ہوگا کہ ان کے مراسم کے احوال سے تھامس بے خبر رہے۔ انتھونی کے لیے یہی کیا کم تھا کہ اس کی کوشش رائیگاں نہیں گئیں۔ شیری کا پتھر کسی طور پگھلا تو سہی۔ بالآخر اس کے اندھیرے وجود میں کوئی جوت جگی تو سہی۔

وہ ایک دوسرے سے ملتے رہے اور انہوں نے جانا کہ وہ دونوں تو ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں، وہ تو کب سے ایک دوسرے کی تلاش میں تھے۔ وہی تو ایک دوسرے کی منزل ہیں۔ وہ انتھونی ہی تھا جسے شیری ڈھونڈ رہی تھی اور وہ شیری ہی تھی جس کے بغیر انتھونی ادھورا تھا۔ یوں سوچیے تو ہر اکیلا آدمی ادھورا ہوتا ہے اور کوئی دوسرا ہی اس کا وجود مکمل کرتا ہے اور وہ دوسرا قسمت سے کسی کسی کو ملتا ہے۔ کبھی کسی کو کوئی نہیں مل پاتا اور زندگی یوں ہی اندھیرے پن میں گزر جاتی ہے۔

شیری بھی سیورین کے کالج میں پڑھتی تھی۔ شیری نے بہت بعد کو کالج میں داخلہ لیا تھا۔ دونوں خاندانوں کا رسمی خاندانی تعلق تھا۔ شیری کے کالج میں آ جانے کے بعد وہ ایک دوسرے سے بہت قریب آ گئی تھیں۔ نواب کے سانحے کے بعد شیری، سیورین سے کنارہ کش رہنے لگی تھی۔ سیورین نے اس کی دل جوئی کی کوشش کی تو شیری سر جھکا کے رہ گئی۔ سیورین نے پہلے تعلیم مکمل کر لی تھی۔ کالج سے رخصت ہونے کے بعد وہ ایک دوبار شیری سے ملنے اس کے گھر گئی لیکن شیری نے بس جیسے پرانے تعلق کی رسم نبھائی اور سیورین نے اس کے گھر جانا بند کردیا۔ وہ تو جب شیری، انتھونی سے وابستہ ہوئی تو اسے سیورین سے اپنی بے وضعی، بے سلوکی کا احساس ہوا۔ وہ خود سیورین کے گھر آئی اور دونوں میں جوش اور جذبے سے پرانا تعلق بہ حال ہوا۔

انتھونی نے شیری کی خواہش کے مطابق ہر ممکن احتیاط کی تھی لیکن کب تک! ایک روز توقع کے خلاف شیری کی تعلیمی رپورٹ لینے کے لیے تھامس اپنے دوست، کالج کے پرنسپل کے پاس پہنچ گیا۔ وہ ایسے وقت کالج پہنچا جب چھٹی ہونے والی تھی۔ شیری اسے وہاں نظر نہیں آئی۔ دن کی آخری کلاس میں اسے کلاس میں ہونا چاہیے تھا۔ پرنسپل سے ملاقات کے بعد تھامس اسے تلاش کرتا ہوا کالج کے اس گوشے میں جا نکلا جہاں شیری اور انتھونی ایک دوسرے میں گم تھے۔ تھامس نے دور سے انہیں دیکھ لیا تھا مگر وہ ان کے قریب نہیں گیا۔ شیری اور انتھونی کو کچھ احساس نہ ہو سکا کہ تھامس ان کا نگراں ہے۔ کوئی اور باپ ہوتا تو وہاں سے چلا جاتا لیکن وہ تھامس تھا۔ وہ ان دونوں کے باہمی روابط کا اندازہ کرنے لیے اپنی جگہ ٹھیرا رہا پھر آہستہ آہستہ ان کے پاس گیا۔ اسے سر پہ کھڑا دیکھ کے دونوں ہڑبڑا

گئے۔ تھامس نے ان سے کچھ نہیں کہا، ایک لفظ بھی۔ وہ شیری کو ساتھ لے کے گھر چلا گیا۔ شیری نے بھی اس سے کوئی کلام نہیں کیا۔ دونوں باپ بیٹی نے ایک دوسرے سے کبھی اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی۔ دوسرے دن تھامس نے شیری کو کالج جانے نہیں دیا لیکن خود کالج جا کے پرنسپل سے انتھونی کو کالج سے نکال دینے کا مطالبہ کیا۔ یہ بات ایسی نہیں تھی کہ انتھونی کو کالج سے نکال دینے کا جواز بنتی۔ پرنسپل نے انتھونی کو متنبہ کرنے کا وعدہ کیا۔ تھامس نے پھر خود شیری کے ساتھ کالج آنا جانا شروع کردیا۔ وہ کالج کھلنے اور بند ہونے تک آس پاس منڈلاتا رہتا۔ عین وقت پر شیری کو گھر لے جانے کے لیے کہیں سے نمودار ہوجاتا۔ اس نے شیری کو پھر نڈھال کردیا تھا۔ شیری نے کسی ذریعے سے کچھ عرصے کے لیے انتھونی کو دور دور رہنے کی ہدایت کردی تھی۔ انتھونی کچھ دنوں تک تو برداشت کرتا رہا پھر اس نے جرأت کی اور ایک شام تھامس کے گھر پہنچ گیا اور اس نے کسی ردوقدح کے بغیر شیری سے شادی کا دعوا کردیا۔ تھامس نے تمام تر بردباری اور تحمل سے سنا اور کسی قسم کے ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ انتھونی نے اسے جتلایا کہ شیری کی مرضی بھی یہی ہے۔ ان دونوں نے ہمیشہ ساتھ رہنے کا عہد کیا ہے اور وہ شیری کے حصول کے لیے کچھ بھی کرگزر سکتا ہے۔ مناسب ہوگا کہ تھامس ان دنوں کی خوشی کی خاطر ہاں کردے۔ انتھونی کا تیور سرکشانہ تھا۔ تھامس کو یقیناً ناگوار ہوا ہوگا۔ جواب میں اس نے متانت سے کہا کہ اسے سوچنے کا وقت دیا جائے۔ انتھونی کے پاس کیا چارہ تھا۔ وہ چھرے اور تمنچے سے تو تھامس سے اقرار نہیں کراسکتا تھا، دوبارہ آنے کا کہہ کے ناشاد و نامراد واپس چلا آیا۔

شیری بہت خوف زدہ تھی کہ اس کے باپ نے ایک بار پھر مہلت طلب کی ہے۔ خدا خیر کرے۔ اس نے اپنی رازداں سیورین کے توسط سے انتھونی کو اپنا خیال رکھنے کی تاکید اور سردست خاموش رہنے کی عاجزی کی۔

انتھونی نے اس کے بعد صبر آزما وقت گزارا۔ تھامس عرصے سے سرکاری ملازمت میں تھا اور اپنے گورے افسر کا کلکتے تبادلہ ہوجانے کے بعد اس نے طویل رخصت لے لی تھی۔ پولیس اور دیگر سرکاری محکموں میں اس کا اچھا اثر و رسوخ تھا۔ سبھی واقف تھے کہ پٹنے میں ایک مدت سے تعینات گورے افسر کا وہ کس قدر پسندیدہ ماتحت تھا۔ تھامس نے انتھونی کو کالج سے نکلوانے کی کوشش جاری رکھی اور ناکام ہوتا رہا، البتہ پرنسپل کو مجبور کرکے شیری اور انتھونی پر طرح طرح کی سختیاں، پابندیاں عائد کروانے میں کام یاب ہوگیا۔ پرنسپل نے دونوں کو خبردار کردیا تھا کہ آیندہ شیری کے باپ تھامس کو کوئی شکایت ہوئی تو دونوں کو کالج سے فارغ کردیا جائے گا۔ دونوں دور دور سے بس ایک دوسرے کی صورت دیکھتے اور دیکھتے رہ جاتے۔ بات کرنا تو دور کی بات ہے، وہ قریب بھی نہیں آتے۔ ان کے گہرے ربط ضبط پر تلملا جانے والے کالج کے بعض شورہ پشت طالب علم ساتھیوں کو انہیں ستانے اور زچ کرنے کا ایک موقع ہاتھ آگیا تھا۔ دونوں کی تعلیم متاثر ہونے لگی۔ کالج میں ان سے ہم دردی رکھنے والے دوست بھی تھے۔ ان کے ذریعے برائے نام نامہ و پیام کا سلسلہ ممکن ہوگیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو آزمائش کا یہ وقت گزر جانے کا آسرا دلاتے اور اپنے عزم، اپنے عہد کا اعادہ کرتے رہتے تھے۔ ان کی ناقص درسی کارکردگی پر ایک دن پرنسپل نے دونوں کو الگ الگ طلب کرکے سخت سست کہا لیکن دونوں کا کہیں دل نہیں لگتا تھا، کلاس میں، کتابوں میں، گھر میں، کہیں بھی۔ دونوں کو گرد و پیش کا کچھ ہوش ہی نہ رہا تھا۔ دور ہوجانے کے بعد وہ ایک دوسرے کے اور قریب ہوگئے تھے۔ چھٹیاں ہوئیں تو اور قیامت

آ گئی۔ شیری گھر میں بند ہوگئی۔ کالج میں دید و باز دید کی ایک رعایت تھی، وہ بھی نہ رہی۔ ناچار انتھونی نے شیری کے گھر کے گرد چکر کاٹنے شروع کردیے۔ کہیں کسی کھڑکی، روزن، کسی اوٹ سے شیری کی جھلک دکھائی دے جائے۔ انتھونی، محلے والوں کی نظروں میں آ گیا تھا۔ تھامس کی شکایت پر پولیس اسے تھانے لے گئی۔ پولیس کو جواز تراشنے کا ہنر آتا ہے اور سوخون بھی معاف ہوتے ہیں۔ کئی دن تک وہ جور و ستم کی مشق کرتے رہے، کئی دن تک انہوں نے انتھونی کو روکے رکھا اور ایسی حالت کردی کہ دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے میں کئی دن لگ گئے۔

انتھونی اپنے آپ سے مجبور تھا۔ اس نے پھر حوصلہ کیا۔ اتنے آزار اور رسوائیوں کے بعد تھامس اسے اپنے گھر دیکھ کے حیران و پریشان تو ضرور ہوا ہوگا لیکن اس نے خود کو قابو میں رکھا اور سنجیدگی و سرد مہری سے پھر انکار کردیا۔ اس مرتبہ اس نے وجہ بھی بتائی کہ انتھونی اس کی ماہ جمال بیٹی کے لیے کسی طور اہل نہیں ہے۔ پہلے وہ کچھ کرکے دکھائے، تعلیم مکمل کرے۔ اچھی ملازمت یا کوئی معقول کاروبار کرے تب تھامس کے پاس آئے، تھامس ہم دردی سے غور کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔ یہ بڑی کڑی شرطیں تھیں۔ دیوانوں سے کہا جائے کہ وہ ایسے ہی دیوانگی چھوڑ دیں۔ دیوانگی کا سبب بھی تو پہلے دیکھا اور دور کیا جائے۔ مایوسی میں انتھونی ہوش و حواس سے اور بے گانہ ہونے لگا۔ بیٹے کی دگرگوں حالت دیکھ کے اس کے باپ نے تھامس کی خدمت میں خود حاضری دی اور تھامس کو راضی کرنے کے لیے پٹنا کے کئی بااثر لوگوں کو بھی بیچ میں ڈالا۔ وہ لوگ تھامس کے پاس گئے اور انتھونی کی شرافت، سچائی، دیانت، جواں سالی اور شیری سے اس کی والہانہ شیفتگی اور شیدائیت کے واسطے دیے۔ تھامس ٹس سے مس نہ ہوا۔

کالج کھلنے پر انتھونی اور شیری نے کالج جانا شروع کردیا تھا۔ تھامس کا وہی معمول تھا۔ صبح بیٹی کو کالج پہنچانے جانا اور کالج بند ہوجانے پر ساتھ لے جانا۔ شیری اور انتھونی کی حالت سے متاثر ہوکے ان کے چند قریبی دوستوں نے کالج کے اوقات کے دوران دونوں کی ملاقات کا بندوبست کردیا۔ شیری اور انتھونی بہت سہہ چکے تھے۔ اب انہیں ایک دوسرے سے جدا ہونے کا یارا نہیں تھا۔ ساتھیوں کے تعاون سے وہ کسی طرح ایک دن کالج سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔

پھر تیسری بار انتھونی، شیری کے ساتھ تھامس کے گھر گیا اور اس نے بتایا کہ انہوں نے چرچ میں شادی کرلی ہے۔ بہتر ہے، تھامس خوش دلی سے انہیں قبول کرلے۔ شیری تو اب انتھونی کے ساتھ اس کے گھر جارہی ہے، اپنے گھر، جو اب اس کا اصل اور مستقل گھر ہے۔ ماں باپ کے گھر سے ہر لڑکی کا تعلق عارضی ہوتا ہے۔

تھامس گنگ رہ گیا، کچھ نہ کہہ سکا، یاس بھری، حسرت بھری نظروں سے بیٹی کی طرف دیکھا کیا۔ شیری کی خاموشی اس کے لیے اور تازیانہ ہوگی۔ شیری، انتھونی کے گھر آ گئی۔ دونوں کو توقع تھی کہ اب تھامس کی باری ہے، وہ ان کے پاس ضرور آئے گا اور آخر کار ان پر اپنی شفقتیں ارزاں کرے گا۔ وہ نہیں آیا۔ دو تین روز ہی گزرے ہوں گے انہیں معلوم ہوا، تھامس ختم ہوچکا ہے۔ اس نے خود کو آگ لگالی تھی۔ اس کے ساتھ مکان کا کچھ حصہ بھی جل گیا ہے۔ جس وقت پڑوسی پہنچے، مکان تو انہوں نے بچالیا، تھامس کو نہ بچا سکے۔

شیری کو اپنے باپ سے ایسی سفاکی کی امید نہیں تھی۔ وہ تو ڈھیر ہوگئی۔ وصیت کے مطابق، آبائی مکان، زرعی زمین، نقدی کی شکل میں عمر بھر کی جمع پونجی، شیری کی ماں کے زیورات، سارا کچھ چرچ کے نام، چرچ کی نذر کردیا گیا تھا۔ پادری کو علم تھا

کہ شیری، تھامس کی اکلوتی اولاد، وہی اس کی جائیداد کی اصل وارث ہے اور شیری کے سسرال کی مالی حالت اتنی اچھی نہیں ہے، شیری کچھ بھی ساتھ لے کے سسرال کے گھر نہیں گئی ہے۔ اسے اختیار تھا وہ تھامس کا عطیہ قبول کرلے یا مسترد کردے۔ اس نے آدھی ملکیت شیری کو واپس کرنا چاہی۔ شیری نے پادری کی پیش کش منظور نہیں کی۔ پادری نے اپنے نائبین سے صلاح و مشورہ کرکے تمام تر جائداد شیری کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا۔ شیری نے اسے بھی مسترد کردیا اور انتھونی کے ساتھ عسرت کی زندگی کو ترجیح دی۔ اب انتھونی کے جانے کے بعد گھر میں صرف ایک مرد رہا ہے، انتھونی کا چھوٹا بھائی، اور وہ ابھی بہت چھوٹا ہے۔

مجھے کیا کہنا چاہیے تھا، کچھ نہیں معلوم تھا۔ سیورین کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی تھی۔ آنسو بڑی راحت ہوتے ہیں۔ میری آنکھیں تو آنسوؤں سے بھی عاری تھیں۔ ایسا لگتا تھا، جیسے سیورین نے جان بوجھ کر مجھے کچھ جتلانا چاہا ہو۔ میں اس سے کیا کہتا، ایک انتھونی اور ایک شیری کیا، جانے کتنے ایسے ہی بس ایک آدمی کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ ایک آدمی، وہی مقصد، وہی محور، وہی منزل۔ ہر راستے میں انہیں وہی ایک شخص نظر آتا ہے۔ وہ ایک آدمی نہ ملے تو کیا مال و زر، کیا طاقت و اقتدار، کیا علم و ہنر، سب ہیچ، سب پتھر، سب مٹی ہے۔ ایک آدمی ہی کبھی کسی کے لیے سب سے بڑا خزانہ ہوتا ہے۔ وہ خزانہ مل جائے تو اسے اپنی زندگی مل جاتی ہے، اسے دنیا مل جاتی ہے۔ ایک آدمی، ایک آدمی کا حاصل، باقی سارا کچھ بے معنی، بے جواز، لاحاصل۔ ایسا کیوں ہے اور کیا ہے یہ سب کچھ۔ یہ کچھ وہی بتاسکتا ہے جو اپنے مطلوب کے زنداں کا اسیر ہے اور مطلوب اس کے زنداں کا۔ وہ جو دو آدمی، الگ چہروں، الگ رنگوں کے نظر آتے ہیں، وہ تو ایک ہی ہوتے ہیں۔ ایک کے بغیر دوسرا نامکمل، پہلا بھی نامکمل، دوسرا بھی نامکمل۔ ان کی تکمیل یک جائی کی صورت ہی میں ممکن ہوتی ہے۔''

''شیری تو مرجائے گی۔'' سیورین بلکتی آواز میں بولی۔ ''اس کا تو اب کوئی نہیں رہا۔ وہ تو لٹ گئی ہے۔''

''تم...... تم اس کے پاس جاؤ تو کہنا کہ زندگی یہی تماشا، یہی شعبدہ بازی کرتی رہتی ہے۔ کچھ نیا نہیں ہے۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''اس کے پاس جانے کی ہمت نہیں ہے مجھ میں۔''

''تمہیں تو زیادہ سے زیادہ اس کے پاس ہونا چاہیے۔''

''میں چلی بھی جاتی لیکن ڈاکٹر رائے...... وہ بہت سخت آدمی ہیں۔ کچھ بھی ہوجائے، زمین ہل جائے، آسماں پھٹ پڑے، ان کا حکم ہے کہ ڈیوٹی پر حاضر رہو۔'' سیورین ناتوانی سے بولی۔ ''اور ان سے اجازت لے بھی لیتی تو وہاں جاکے کیا کرتی، شیری سے کیا کہتی، اسے کیا دلاسا دیتی کہ انتھونی واپس آجائے گا۔''

''کوئی واپس نہیں آتا مگر جو لوگ موجود ہیں، جو اپنے ہیں، وہی دکھ درد بٹاتے ہیں۔ ان کی موجودگی بھی دلاسا ہوتی ہے۔ اور ڈاکٹر رائے ایسے سخت آدمی بھی نہیں ہیں۔''

''مگر میں...... مجھ سے شیری کی حالت دیکھی نہیں جائے گی۔ میں نے وارڈ بوائے سے پوچھا تھا۔ کہتا تھا کہ وہ تو کچھ بولتی ہے نہ سنتی ہے، نہ پلکیں جھپکاتی ہے۔ کسی کو پہچان نہیں رہی ہے، وہ تو......''

سیورین پھر سسکنے لگی۔ ''یہ انتھونی...... کیا ضرورت تھی اسے ان لوگوں کا پیچھا کرنے کی...... بالکل پاگل...... پاگل آدمی تھا وہ۔''

میں چپ رہا۔

''شیری کے لیے انتھونی، تھامس کو پسند نہیں تھا۔ جو تھامس کو پسند نہیں آتا تھا، اس کا یہی انجام

ہوتا تھا۔ تھامس کی روح تو بے کل ہوگی۔"

سیورین نے سارا الزام روح پر ڈال دیا تھا۔ یہ روح کا عذر بھی انسانوں نے خوب وضع کرلیا ہے۔ اسے کیا معلوم تھا، نرس ایمی جانتی تھی کہ وہ لوگ، رات کے آخری پہر آنے والے لوگ کس ارادے اور کس تعاقب سے آئے تھے۔ انتھونی تو چارا بن گیا۔ میں اسپتال میں نہ ہوتا تو وہ لوگ اس طرف کا رخ کیوں کرتے۔ انتھونی میں بڑا جوش اور جذبہ تھا۔ اسے یہی کرنا چاہیے تھا۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو یہی کرتا۔

"تم شیری کے پاس جاؤ تو......"

میری بات پوری ہونے سے پہلے سیورین ڈولتی آواز میں بولی۔ "ہاں میں جاؤں گی اس کے پاس...... مجھے جانا ہی ہوگا۔"

"اس سے کہنا کہ انتھونی واپس نہیں آسکتا۔ انتھونی کی دو بہنوں اور بھائی کی ذمے داری ہے اس پر۔ وہی اب گھر سنبھال سکتی ہے۔ وہ ایک پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ اور......"

"مگر شیری کے پاس اب کیا رہا ہے۔" سیورین مایوسی سے بولی۔ "کچھ بھی نہیں بچا۔"

"ایک بات کہوں تم سے؟" میں نے آہستگی سے کہا۔

"ہاں ہاں" وہ بے تابی سے بولی۔

"ایک صورت ممکن ہوسکتی ہے۔ جو میں کہنا چاہتا ہوں، اسے غور سے سننا اور پہلے سن لینا، پھر کچھ کہنا۔"

"کیا بات ہے؟" وہ ہڑبڑا سی گئی۔

"شیری کو زندگی گزارنے، یہ برا وقت ٹالنے کے لیے اتنی رقم دی جاسکتی ہے کہ اسے کوئی پریشانی نہ ہو۔ یہ اسپتال کا مکان بھی اس سے چھن جائے گا۔ کیوں کہ انتھونی کے چلے جانے کے بعد وہ یہاں زیادہ دیر نہیں رہ سکتی۔ وہ نیا مکان خرید لے۔ کم از کم آیندہ پانچ سال تک کے لیے اس کی بہتر گزر بسر کا انتظام کیا جاسکتا ہے۔ اس مدت میں وہ یقیناً اس قابل ہوجائے گی کہ اپنے آپ بھی کچھ کرسکے، اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرسکے۔ انتھونی کے چھوٹے بھائی کی تعلیم، اس کی بہنوں کی شادی کرسکے۔ یہ مالی قسم کے سہارے بڑی تسلیم ہوتے ہیں۔ ذرا اس کی حالت سنبھلے تو اسے یہ بتادینا اور میرا نام کسی طور نہ آئے تو مناسب ہوگا۔ یہ رقم کسی وقت بھی ادا کی جاسکتی ہے۔ باقی شیری اور اس کے خاندان کو کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو کسی ذریعے سے مجھے مطلع کیا جاسکتا ہے۔ میرے دوست اکبر علی خاں پٹنے ہی میں رہتے ہیں، وہی جن کے ساتھ دوپہر ہم نے کھانا کھایا تھا۔ وہ ایک بڑے وکیل ہیں اور بہت نفیس آدمی۔ میری درخواست پر وہ شیری اور اس کے گھر کی خبر گیری کرسکتے ہیں، اگر تم اس معاملے سے الگ رہنا چاہو۔"

سیورین مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگی۔

"مجھے شبہ ہے، ایک خود دار لڑکی کو یہ سارا کچھ قبول کرنے میں تامل ہوگا مگر اسے یقین دلانا تمہارا کام ہے کہ میری کوئی غرض اس سے وابستہ نہیں ہے۔ میں تو یہاں رہوں گا بھی نہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ آمادہ ہوجائے تو مجھے خوشی ہوگی۔ اس بدنصیب سے کہنا کہ کوئی بھی ایسی اعانت انتھونی کے نقصان کی تلافی نہیں کرسکتی مگر اب انتھونی نہیں ہے۔ اس کے بغیر زندگی تو گزارنی ہے۔ اور سنو! شیری سے ہم دردی اپنی جگہ ہے لیکن یہ میرے اپنے اطمینان، اپنے سکون کی بات ہے۔"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" سیورین سراسیمہ انداز میں بولی۔

"تم نے جو سنا، وہی میں نے کہا۔" میں نے نپی تلی آواز میں کہا۔

سیورین آگے کچھ نہ بول سکی اور مجھ سے بھی کچھ نہ کہا جاسکا۔

اس سے پہلے کہ سیورین مجھ سے غیر ضروری

سوال کرتی، ایک نظر شکل کو دیکھ کے میں کمرے سے باہر آگیا اور اسپتال کے مرکزی عمارت تک چلا گیا۔ شام کو مریضوں سے ملاقات کا وقت شروع ہوچکا تھا۔ صدر دروازے سے مریضوں کے دوست اور اعزا کے دستے اسپتال میں داخل ہورہے تھے۔ عمارت کے سامنے کے سبزہ زار میں دوپہر جیسی بھیڑ نہیں تھی۔ انتھونی کی تدفین میں شریک ہونے والے اب وہاں نہیں تھے۔ انتھونی کا جنازہ اٹھایا جاچکا ہوگا۔ ممکن ہے، انہوں نے اسے خاک کے سپرد بھی کردیا ہو۔ مجھے یاد نہیں، کہیں پڑھا تھا، جو کچھ اس دنیا میں نظر آتا ہے، سب مٹی کی شکلیں ہیں۔ اپنی عمر پوری کرنے کے بعد ساری شکلیں مٹ جاتی ہیں اور سب مٹی ہوجاتا ہے۔ اور کسی نے کہا تھا، آدمی کی ساری زندگی فریب کی زندگی ہوتی ہے، زندہ رہنے کا فریب، دیکھنے، سننے اور بولنے کا فریب۔ جس کا انجام فنا ہے، اس کا دیکھنا، سننا اور بولنا کیا معنی رکھتا ہے۔ سب سنا ہوا مٹی، سارا دیکھا ہوا مٹی، سارا بولا ہوا مٹی ہے۔ انتھونی مرگیا۔ نوجوانی میں مرگیا۔ کچھ اور وقت زندہ رہتا تو بھی مرجاتا۔ لوگ اسے دفنا کے قبرستان سے لوٹ رہے ہوں گے۔ انہیں جلدی بھی ہوگی زندگی کی طرف لوٹنے کی۔ جانے کتنے ادھورے کام یاد آرہے ہوں گے۔ قبرستان سبھی کو برا لگتا ہے حالاں کہ سارے راستے اسی کی طرف جاتے ہیں، قبرستان یا شمشان گھاٹ یا برج خموشاں یا کوئی اور۔ وہی ایک سوال، آدمی پیدا کیوں ہوتا ہے کہ مرجاتا ہے۔ کسی کے پاس اس کا جواب نہیں۔ موت پر سب کا اختتام ہو، اس زندگی پر کیا ناز، کیسا افتخار، کس بات کی تمکنت۔ زندگی سے بڑا طلسم شاید کوئی نہیں، اور کوئی طلسم مستقل نہیں ہوتا۔

مرکزی عمارت سے دائیں طرف راہ داری میں جاتے ہوئے مجھے چند پولیس والے بھی نظر آئے۔ وہ ابھی تک اسپتال کے کونے گوشے ٹٹول رہے ہوں گے۔ کتے ان سے زیادہ چست ہوتے ہیں، بو سونگھ تو لیتے ہیں۔ ان کی نظروں میں آنے سے میں نے پہلو تہی کی اور ادھر ادھر گھومتا رہا۔ میرا دل گھبرا رہا تھا۔ جانے کیوں، جیسے میں کچھ بھول رہا ہوں، مجھ سے کوئی چوک ہورہی ہو، کچھ ہونے والا ہے جیسے۔ دھوپ کے آثار رہ گئے تھے کہ میں کمرے میں واپس آگیا اور یہ دیکھ کے مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ ڈاکٹر رائے اور ایک نوجوان ڈاکٹر بٹھل کے بستر کے گرد موجود تھے اور بٹھل بیٹھا ہوا تھا۔ بستر کے سرہانے، تکیوں سے ٹیک لگائے، آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، سیورین چمچے سے اسے کوئی مشروب پلا رہی تھی۔ میں جھپٹتا ہوا ان کے پاس پہنچا۔ بٹھل نے نگاہیں گھما کے ایک ثانیے کے لیے مجھے دیکھا اور نقاہت سے نظریں جھکالیں۔ میرے جی میں آیا، ڈاکٹر رائے کے ہاتھ چوم لوں، کس طرح اس سے ممنونیت کا اظہار کروں۔ ڈاکٹر رائے بٹھل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے تھا اور تمتماتی آواز میں اس کی استقامت کی داد دے رہا تھا۔ معاً اسے خیال آیا اور اس نے ہندوستانی میں کہا۔ "تم ایک اچھا لڑیا (جنگ باز) ہے، بہت اچھے، بہت اچھے۔ اپنے بھائی کو دیکھا؟ اسے اب بھی شبہ ہے۔" آخری جملہ اس نے پھر انگریزی میں کہا۔

بٹھل کو جواب دہی کا یارا نہیں تھا لیکن اس کا چہرہ میرے سامنے تھا۔ چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ سب کچھ سن رہا اور دیکھ رہا ہے۔ نرس سیورین بہت توجہ اور نفاست سے اسے مشروب پلا رہی تھی۔

"کیا حال ہے اب؟" میری آواز ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ بٹھل نے سن لیا تھا، آنکھوں آنکھوں سے اطمینان کی تلقین کی۔ "ٹھیک تو ہو تم؟" میں نے ہذیانی انداز میں پوچھا۔

بٹھل نے ڈاکٹر رائے کو اشارہ کیا تھا یا ڈاکٹر بٹھل کو کسی اضطراب سے دوچار کرنا نہیں چاہتا تھا، میرا بازو پکڑ کے وہ مجھے اس کے بستر سے دور لے

آیا۔ ڈاکٹر کی ناراضی کے خیال سے میں نے بہ جبر تعمیل کی۔

ڈاکٹر رائے دروازے کے پاس آکے رک گیا اور اس نے پلٹ کے سیورین کو ہدایت کی کہ وہ بٹھل کو دوبارہ لٹا دے۔

سیورین نے پہیا گھما کے بستر کا سرھانا نیچے کر دیا۔

ڈاکٹر رائے پھر میری طرف متوجہ ہوا اور اچکتی آواز میں بولا۔ ''کہاں تھے تم اتنی دیر سے؟''

''کہیں نہیں، یہیں اسپتال میں۔'' میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''ایسے ہی اسپتال کا ایک چکر لگا کے آ گیا...... کیا حال ہے اب ان کا ڈاکٹر صاحب؟''

''تم نہیں دیکھ رہے؟'' وہ مسکرا کر بولا۔

''مجھے تو...... مجھے تو......'' میں نے بے ربطی سے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب آپ فرشتہ آدمی ہیں۔ لوگ سچ کہتے ہیں کہ آپ کے ہاتھ میں......''

''تم فضول باتیں بہت کرتے ہو۔'' وہ میری بات کاٹ کے بولا۔

''آپ کو معلوم نہیں، میں...... میں کس قدر......''

اس نے پھر مجھے کچھ کہنے نہیں دیا۔ ''دیکھ رہا ہوں تمہیں اچھی طرح اچھے لڑکے۔''

اس نے عادت کے مطابق میری کمر تھپکی۔ ''رات کو آؤں گا پھر...... اور سنو! تمہیں پہلے سے بہتر دیکھنا چاہتا ہوں ورنہ تمہیں بھی انجکشن لگانا پڑے گا۔''

''ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر صاحب! آپ کچھ دیر بیٹھیے نا۔'' میں نے وارفتگی سے کہا۔

''نہیں، مجھے جانا ہے، اسپتال میں سب سہمے ہوئے ہیں، مجھے معمول سے زیادہ وقت دینا پڑ رہا ہے اور انتھونی! اس نوجوان کے گھر بھی جانا ہے۔ سنا ہے، اس کی بیوی ٹھیک نہیں ہے، وہ حاملہ ہے، دیکھتے ہیں، اسے شاید اسپتال میں داخل کرنا پڑے۔ بے چارہ انتھونی۔'' ڈاکٹر رائے افسردگی سے بولا۔ ''تم نہیں جانتے، وہ کتنا پیارا لڑکا تھا۔''

مجھ سے سر اٹھایا نہیں گیا۔ ڈاکٹر رائے اپنے نوجوان ساتھی ڈاکٹر کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی سیورین کسی موج کی طرح میری طرف لپکی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں، شگفتہ آواز میں مبارک باد دینے لگی۔ مجھے نہ جانے کیا ہوا، اپنا اختیار ہی نہیں رہا۔ میں نے بڑھ کے ہاتھ پھیلائے اور اسے گلے سے لگا لیا۔ دوسرے ہی لمحے سیورین کی کسمساہٹ سے مجھے احساس ہوا۔ میرے بازو اینٹھنے لگے اور میں فوراً اس سے جدا ہو کے پیچھے ہٹ گیا۔

سیورین کے چہرے پر اچانک آگ سی بھڑک اٹھی تھی اور اس کا دھان پان سراپا لہرا گیا تھا۔ مجھے بڑی خفت ہوئی اور سلیقے سے معافی بھی نہ مانگی جا سکی۔

وہ ایک اعلا ظرف لڑکی تھی، مسکرا کر رہ گئی اور مجھے ندامت سے بچانے کے لیے کہنے لگی۔ ''کیا خیال ہے، گرما گرم کافی پی جائے۔''

میں نے کسی پاگل کی طرح بے تابانہ سر ہلا کے اقرار کیا۔

نرس ایمی وقت پر آ گئی تھی۔ سیورین چلی گئی، ایمی کی آمد کے خاصی دیر بعد بٹھل کے دن بھر کے احوال، ڈاکٹروں کی آمد اور ہدایات، دواؤں کی تبدیلی سے آگاہ کرنے کے بعد۔ چلتے وقت اس نے مجھ شرم سار کو خدا حافظ کہا اور اپنا خیال رکھنے کی رسمی نصیحت بھی کی۔ میں خالی بیٹھا تھا، اسے صدر دروازے تک پہنچانے کا خیال آیا تھا لیکن میرے قدم کسی نے روک لیے۔

آٹھ بجے، رات پوری طرح کھل چکی تھی۔ ایمی جھٹ پٹ اپنے کاموں سے نمٹ کے میرے پاس آ کے بیٹھ گئی اور نکیلی آواز میں بولی۔ ''کیا حال ہے اب؟''

''میرا حال کیا، میں بالکل ٹھیک ہوں مجھے کیا ہوا ہے۔'' میں نے بٹھل کی طرف ہاتھ اٹھا کے کہا۔ ''حال تو ان صاحب کا دیکھو، ان سے پوچھو۔''

''تمہارا حال اس سے بندھا ہوا ہے۔'' وہ چہک کے بولی۔ ''تم دونوں ہم زاد ہو نا۔''

''تو پھر پوچھتی کیوں ہو۔'' میں نے مصنوعی ترشی سے کہا۔

''میں نے سارا کچھ دیکھ لیا اور سیورین نے مجھے بتایا ہے، سب ٹھیک چل رہا ہے۔'' ایمی محتاط انداز میں باتیں کرتی تھی، کہنے لگی۔ ''اب اور بہتری کی امید کی جا سکتی ہے۔''

''شکر ہے، تم بھی پر امید ہو۔'' میں نے مسکرا کے کہا۔

''تم نے ایسا کیوں کہا۔'' اس کی تیوری پر بل آ گئے۔ ''تم سے میں نے کہا تھا، میں ہمیشہ پر امید رہتی ہوں۔''

''مگر اظہار میں خاصی کنجوس ہو۔'' میں نے از راہ لطف کہا۔

''اوہ...... اوہ، تم شرارتی بچے۔ اب تم کیسی بدلی بدلی باتیں کر رہے ہو۔'' وہ میرے شانے پر آہستہ سے مکا مارتے ہوئے بولی اور اچانک سنجیدہ ہو گئی، کہنے لگی۔ ''معلوم ہے، دن بھر میں پریشان رہی ہوں۔ رات کا واقعہ کیسا ہولناک تھا۔ دن بھر تمہارا خیال رہا، پھر تم کسی مصیبت میں نہ گھر جاؤ۔ آتے ہی میں نے سیورین سے خیریت دریافت کی۔ اس نے ایسا ویسا کچھ نہیں کہا تو سکون آیا۔ تم بتاؤ، پھر کوئی ادھر آیا تو نہیں۔''

''ابھی تک تو نہیں، اسپتال میں پولیس بیٹھی ہوئی ہے اور خاک چھان رہی ہے۔'' میں نے تندی سے کہا۔

''تمہارے پاس تو نہیں آئے وہ؟'' ایمی نے فکرمندی سے تکرار کی۔

''نہیں آئے تو آ جائیں گے۔ اس طرف، ان خاص کمروں کی طرف رخ کرتے ہوئے ان کے قدم اکڑتے ہوں گے۔''

''تم نے سیورین کو تو کچھ نہیں بتایا؟''

''اسے کیوں پریشان کرتا، وہ تو تمہاری وحشت دور کرنے کے لیے تمہیں سارا ماجرا بتانا پڑا۔''

''تم نے اچھا کیا ورنہ کیسے کیسے وسوسوں، وہم وگمان میں گھری رہتی۔ ایمی کو جھرجھری آ گئی۔ ''دن بھر سوچتی رہی، اگر مجھ سے غلطی ہو جاتی، دروازہ کھول دیتی میں؟''

''نہیں کھولتیں تم۔''

''اتنے یقین سے تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''چوں کہ میں جاگ رہا تھا۔''

''اور اگر دروازہ کھلا ہوتا؟''

''وہ ایسے اندر نہیں آ جاتے، پہلے پوچھتے ضرور۔ ان کی نیت مجرمانہ تھی۔ ایسی صورت میں پھونک پھونک کے قدم اٹھایا جاتا ہے۔''

''لیکن...... لیکن......'' ایمی کی آواز پر خوف غالب تھا۔ ''بس خداوند نے کرم کیا، میں تو یہی کہتی ہوں۔'' اس نے سینے پر کراس بنایا۔

''چھوڑو بھی اب، کچھ مت سوچو۔'' میں نے بے نیازی سے کہا۔ ''آگے کی طرف دیکھو۔''

''آگے کی طرف!'' ایمی کا چہرہ اور گمبھیر ہو گیا۔ ''آگے کا ہی تو سوچ سوچ کے دل ہولتا ہے۔''

''اور کیا اختیار ہے ہمارا آگے پر؟''

''ظاہر ہے، نہیں ہے۔'' ایمی اضطراری انداز میں بولی۔ ''تو فکر کاہے کی، ہم اپنی طرف سے احتیاط کی پوری کوشش کریں گے۔ یہی کر سکتے ہیں۔''

''تم بہادر بچے ہو۔''

"بہادر وہادر کیا۔ ہتھیلی پر جان تو یوں بھی ہر ایک کی رہتی ہے، میری تمہاری، سبھی کی۔ تمہیں یقین ہے کہ کل تم موجود رہو گی؟"

اس کی آنکھیں بجھ گئیں۔

"تو پھر کیا......" میں نے بےزاری سے کہا۔

وہ چپ ہوگئی اور دیر تک چپ رہی، پھر اس نے خود کو مجتمع کیا کہ سردست تو زندگی حاوی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چمک بحال ہوئی اور وہ پختہ کار عورتوں کی طرح ترچھی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "یہ تم نے سیورین پر کیا جادو کر دیا؟"

"کیسا جادو؟" میں نے تعجب کا اظہار کیا۔

"خبر ہے، وہ کیا کہہ کے گئی ہے۔ کہہ رہی تھی، یہاں دو مریض ہیں۔ حکم دے کے گئی ہیں کہ مجھے دونوں کا خیال رکھنا ہے۔ دونوں پر نگاہ رکھنی ہے، اور بتاؤں کیا کہہ رہی تھی وہ......!" ایمی کہتے کہتے رک گئی۔

"کیا کہہ رہی تھی؟ میری شکایت کر رہی ہوگی، مجھ سے بھول ہوگئی۔" میں نے پشیمانی سے کہا۔

"کیسی بھول؟" اس نے چونک کے پوچھا۔

میں کیا کہتا۔ اس کا مطلب تھا کہ سیورین نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ میں چپ رہا کہ خاموشی ہی سب سے موثر جواب تھی۔

"کیا بتلاؤں، کہہ رہی تھی کہ تم بہت الگ لڑکے ہو، بہت پیارے اور دل کے بڑے۔ وہ کسی کے بارے میں ایسی رائے کم دیتی ہے۔ کافی عرصے سے اسے دیکھ رہی ہوں۔ بہت سنبھلی ہوئی رہتی ہے وہ۔"

"وہ ایک مہربان لڑکی ہے...... سمجھ دار، ہر اعتبار سے اچھی۔"

"اور میں! میں بری لڑکی ہوں؟" وہ ہنس کے بولی۔

"تم......!" مجھے بھی ہنسی آگئی۔ "تم ایک بہت پیاری بچی ہو، گڑیا جیسی۔"

اسی وقت دروازے پر اکبر علی خاں نمودار ہوئے۔ کسی لمحے بھی میں ان کی آمد کی توقع کر رہا تھا۔ آتے ہی انہوں نے جیسے نعرہ بلند کیا۔ "مجھے یقین ہے، کچھ اچھی خبریں سننے کو ملیں گی۔"

میں صوفے سے اٹھ گیا اور لپک کے ان کے پاس جا کے میں نے ان کے ہاتھ جکڑ لیے۔ اور جلدی جلدی ساری روداد سنائی کہ ابھی شام کو ڈاکٹر آیا تھا تو اتنے دنوں میں پہلی بار بٹھل اٹھ کے بیٹھ گیا تھا۔ اس نے کچھ مشروب وغیرہ بھی نوش کیا تھا۔ یہ کہتے ہوئے میری آواز ڈگمگا گئی۔ اکبر علی خاں نے مجھے بازوؤں میں بھر لیا اور میرا حوصلہ فزوں کرنے کے لیے طرح طرح کے لفظ وضع کرتے رہے۔ اکبر علی خاں کے ساتھ ان کا ملازم لڑکا بھی ٹفن اٹھائے ساتھ آیا تھا۔

"آنے میں دیر یوں ہوئی کہ امی جان کی طبیعت شام کو کچھ بہتر ہوگئی۔" اکبر علی خاں کی آواز سے مسرت جھلک رہی تھی۔

"یہ تو بڑی اچھی خبر سنائی آپ نے۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔

"بس بٹھا لیا پاس اپنے۔ میں بھی منتظر تھا کہ کسی طرح ان کی طبیعت کچھ بہتر ہو تو ایک معاملے میں ان کا عندیہ معلوم کروں۔"

"کیسا عندیہ؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

ایمی کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ "بتاؤں گا، میرا خیال ہے، کھانا گرم ہے کیوں نہ پہلے ٹفن کشائی کی جائے......اور آپ اطمینان رکھیں، آج زیادہ کھانا نہیں ہے۔ نزہت کہہ رہی تھیں، سارا تو واپس آجاتا ہے۔"

"آپ یہ زحمت کیوں کرتے ہیں۔"

"واہ صاحب، آپ نے پھر وہی غیریت والی بات کر دی۔ ایسا مت کہیے، دل بوجھل ہو جاتا ہے۔"

میں نے معافی چاہی اور عذر کیا کہ گھر میں

والدہ کی بیماری کی حالت میں یہ تکلفات مناسب نہیں لگتے۔ یہاں اسپتال میں کھانے پینے کے اچھے انتظامات ہیں۔

"ہوا کریں لیکن گھر موجود ہوتے ہوئے آپ باہر کا کھانا کھائیں خواہ کتنا ہی اچھا ہو۔ کم از کم مجھے گوارا نہیں ہے۔"

میرے پاس سر جھکانے کے سوا کیا رہ جاتا تھا۔

"دوپہر آپ نے سادہ میٹھے چاولوں سے رغبت کا ذکر کیا تھا۔ میں نے نزہت سے کہا۔ ان سے بس کہنے کی دیر ہوتی ہے......شاید آپ کو پسند آئیں۔"

مجھی سے غلطی ہوئی دوپہر کسی وقت ایسے ہی میٹھے چاولوں کی بات میرے منہ سے نکل گئی تھی۔

"آپ جانیں، نزہت اختراعات کی ماہر ہیں، سادہ چاولوں میں زعفران کی آمیزش کر دی ہے۔ شکر پسند ہو تو شکر کے ساتھ، ورنہ شہد بھی ہے۔ دودھ اور بالائی تو ہے ہی ایک چمچہ لیا تھا میں نے۔ واقعی، شہد اور بالائی کے ساتھ ذائقہ ہی کچھ اور نکھر آیا۔"

"پھر تو خاصے کی چیز ہوگی لیکن ڈاکٹر رائے نے کہا تھا، رات کو بھی آئیں گے۔ ان کے آنے کے بعد ہی اگر......"

"کوئی مضائقہ نہیں۔" وہ کشادہ دلی سے بولے۔ "اصل میں لڑکا، رات کو اپنے گھر واپس چلا جاتا ہے، اسے واپس بھیج دیتے ہیں۔ یہ ٹفن میں لے جاؤں گا۔"

"آپ کیوں لے جائیں گے، ٹفن صبح بھی واپس جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

ایمی بٹھل کے بستر کے نزدیک چیزوں کی درستی میں مصروف ہوگئی تھی۔ اس نے کچھ دیر کے لیے ہم سے باہر جانے کی درخواست کی۔ یہ معمول کی بات تھی۔ میں اور اکبر علی خاں باہر آگئے۔ ایمی نے کمرا بند کر کے دروازے پر پردہ کھینچ دیا۔ ہم دونوں راہ داری میں ٹہلتے رہے اور اکبر علی خاں شہر کے کشیدہ حالات کے بارے میں بتانے لگے۔ "شہر پہلے جیسا نہیں رہا ہے۔ جانے کیوں لوگ سہمے سہمے سے نظر آتے ہیں یا یہ میرا گمان ہے۔" انہوں نے بھاری آواز میں کہا۔ "میں ہی شاید کچھ زیادہ محسوس کر رہا ہوں، شاید اس وجہ سے کہ شہر میں جگہ جگہ پولیس کی ٹولیاں گھوم رہی ہیں۔ بازار بھی آج جلد بند ہوگئے۔ قسم قسم کی چہ میگوئیاں شہر میں گشت کر رہی ہیں۔ شہر میں عموماً ایسا کچھ ہوتا نہیں، قتل وخون کے واقعات بے شک کبھی کبھار ہو جاتے ہیں لیکن اس بار لوگ کچھ ہراساں سے، حیرت زدہ سے نظر آتے ہیں۔ انتھونی کی موت کا بڑا شہرہ ہے۔ شہر میں عیسائیوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے لیکن یہ نوجوان انتھونی کچھ زیادہ ہی مقبول تھا۔ کچھ اس کی مقبولیت، کچھ اس کی جاں بازی، اس کی دردناک موت کی نوعیت سے لوگوں کو بڑی ہم دردی محسوس ہوئی۔ سنا ہے، اس کے جنازے میں سبھی شریک تھے، کیا ہندو، عیسائی اور کیا مسلمان۔ افواہوں کا تو آپ جانتے ہی ہیں، پر لگے ہوتے ہیں اور سر پیر نہیں ہوتے۔ ہندوستان میں افواہ طرازی سب سے مرغوب مشغلہ ہے۔ ناواقفیت، جہالت اور افواہ کا شاید کوئی گہرا تعلق ہے۔"

میں سنتا رہا۔ جب تک ایمی نے باہر آ کے ہمیں اجازت نہ دی، ہم راہ داری میں گھومتے رہے۔ کمرے میں آ کے صوفے پر بیٹھے ہی تھے کہ باہر ہل چل ہوئی ہم دونوں کھڑے ہوگئے۔ ایمی بھی سیدھی ہوگئی۔ وہ ڈاکٹر رائے ہی تھے۔ اس مرتبہ اس کے ساتھ ادھیڑ عمر ڈاکٹر گوکھلے بھی تھا۔ اسپتال میں پہلی رات میری اس سے اچھی شناسائی ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر رائے نے پرتپاک انداز میں اکبر علی خاں سے مصافحہ کیا۔ جواباً اکبر علی خاں نے میری جانب سے بٹھل پر اس کی خاص توجہ کا شکریہ ادا کیا۔ ڈاکٹر رائے ہنس کے بولا، الٹا وہ اکبر علی خاں کا شکر گزار ہے کہ اس اجنبی شہر میں ان کا ساتھ میرے لیے

استقامت کا باعث بنا رہا۔ دونوں میں چند لمحے نوک جھوک اور خوش گپیاں ہوتی رہیں۔ ڈاکٹر رائے نے اکبر علی خاں سے فراغت میں ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس کی دعوت ایسی رسمی نہیں تھی۔

ڈاکٹر رائے نے بٹھل کا شانہ جھنجوڑ کے اسے بیدار کیا۔ بٹھل کسی قدر اکراہ کے بعد گوکھلے اور امی کے سہارے اٹھ کے بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر رائے نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور گرم جوشی سے حال دریافت کیا تو بٹھل نے سر کی ہلکی جنبش سے جواب دیا۔ اس نے بدبداتے ہوئے کچھ کہا بھی۔ یہ دیکھ کے میں اور اکبر علی خاں اس کے بستر کے پاس پہنچ گئے۔ ڈاکٹر کے خیال سے ہم نے فاصلہ رکھا۔ میں بٹھل سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن اس بار ڈاکٹر گوکھلے آڑے آ گیا۔ بٹھل نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے آنکھیں بند کر کے اس نے مجھے صبر وضبط کی تاکید کی ہے۔

ڈاکٹر رائے کے اشارے کے لیے تیار کھڑی امی نے بٹھل کا سینہ رومال سے ڈھانپ دیا اور بستر کے پہلو میں رکھی کھلی الماری سے پیالہ اٹھا کے چمچہ بھر بھر کے اسے کوئی چیز پلانے لگی۔ مجھے تو گوکھلے نے وہاں سے ہٹا دیا۔ اکبر علی خاں نے بھی گوکھلے کا ساتھ دیا، میری کمر سہلاتے ہوئے وہ مجھے بٹھل کے بستر سے دور لے آئے۔

سب توازن کی بات ہے۔ ایک ذرا توازن منتشر ہو جائے تو آدمی کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ آدمی بچہ ہو جاتا ہے، آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے، آدمی معذور ہو جاتا ہے، آدھا آدمی، پونا آدمی، دیکھنے کا آدمی۔ آدمی ہے اور آدمی نہیں بھی۔ آدمی کا اپنا اختیار نہ رہے تو پھر آدمی ہی کیا ہے۔ بیماری سے بڑی مفاہمت شاید کوئی نہیں ہے۔ کہتے ہیں، سب سے بڑی ذلت غربت ہے لیکن یہ بیماری بھی کچھ کم ذلت نہیں۔ اور ایسی بیماری کہ آدمی بے دست وپا ہو کے رہ جائے۔ آدمی کی اس سے بڑی توہین کیا ہو سکتی ہے۔ بٹھل کو کیا محسوس ہو رہا ہوگا، یہ کچھ وہی جانتا ہوگا۔

''آج رات گہری نیند لینے کا ہے، سمجھا کچھ؟'' میرے کانوں میں ڈاکٹر رائے کی آواز آئی۔ وہ حاکمانہ انداز میں بٹھل سے مخاطب تھا۔ کہہ رہا تھا کہ کل سے دوائیاں کچھ بدل دی جائیں گی اور کچھ کم بھی کر دی جائیں گی۔ اب بٹھل کو آہستہ آہستہ غذا کی طرف لوٹنا ہے کیوں کہ غذا سے بڑی توانائی کوئی نہیں ہوتی۔ زیادہ سوچنا نہیں، وہ خاطر جمع رکھے کہ اس کا محبوب بھائی ہر وقت اس کے پاس ہے۔ یہ شہر کا بہترین اسپتال ہے۔ اسپتال کی تجربہ کار نرسیں اس کی خدمت پر مامور ہیں اور ماہر ڈاکٹر بھی دور نہیں ہیں۔ ڈاکٹر رائے نے مسکراتے ہوئے کہا کہ بٹھل کی بیماری کے دوران دنیا میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا اور اس کی صحت یابی تک وہ اپنے محور سے ہٹ نہیں جائے گی۔ ادھورے کام آنے والے کل پورے ہو جائیں گے۔ زندگی کے سارے معاملات تن درستی سے مشروط ہیں۔ ڈاکٹر رائے نے وہی کچھ کہا جو کل رات ہم، میں اور اکبر علی خاں باتیں کر رہے تھے کہ زندگی سے موت کا فاصلہ بہت قریب ہوتا ہے۔ موت ہر لمحے وار کرتی رہتی ہے اور یہ کیا کم ہے کہ بٹھل زندگی کی طرف بڑھ رہا ہے۔

بٹھل نے منہ پھیر لیا تو امی نے بھی ہاتھ روک لیا اس دوران ڈاکٹر رائے مسلسل بٹھل سے مخاطب رہا اور ایسے ایسے کلمات تراشتا رہا جو بظاہر دواؤں سے زیادہ جاں فزا تھے۔ اس کی ہدایت پر امی نے بٹھل کے بازو میں سوئی گھونپ دی اور ڈاکٹر رائے اس وقت تک ٹھیرا رہا جب تک امی نے بٹھل کا... سرہانا نیچے نہیں کر دیا اور بٹھل کی آنکھیں مندیانے نہ لگیں۔ پھر وہ ایک لمحے بھی وہاں نہیں ٹھیرا۔ اکبر علی خاں نے ازراہِ وضع اسے کھانے میں شرکت کی دعوت دی۔ ڈاکٹر نے شکریہ ادا کر کے معذرت چاہی کہ اسے ابھی آن جہانی انتھونی کی بیوی شیری کو دیکھنے جانا ہے۔ اس کی حالت نہایت شکستہ ہے۔

ڈاکٹروں کی زندگی بھی کیا زندگی ہوتی ہے۔ انہوں نے مسیحائی کا جیسے ٹھیکا لیا ہوتا ہے۔ آندھی ہو یا طوفان، مریض دہائیاں دیتے ہیں، فرض اور انسانیت کا واسطہ دیتے ہیں، ڈاکٹروں کو آنا پڑتا ہے، ڈاکٹر بھی دوسرے جیسے پیشہ ور ہوتے ہیں مگر کسی پیشے میں ایسا جبر نہیں ہوتا یا ایسی مجبوری نہیں ہوتی یا ایسا استحقاق جتایا نہیں جاتا۔

ڈاکٹر رائے کے جاتے ہی اکبر علی خاں نے ٹفن کھول دیا۔ امی نے کسی وارڈ بوائے کو بلا کے رکابیاں وغیرہ میز پر رکھوانے کا اہتمام کیا۔ کھانا ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ وارڈ بوائے کھانا گرم کر لایا۔ میں نے اسے کچھ روپے کی بھینٹ کی تو اس نے صاف انکار کر دیا مگر امی کی سفارش پر آمادہ ہو گیا۔ پھر تو اس کا انداز ہی بدل گیا۔ پیسے کی کیا کرامت ہوتی ہے۔ آدمی موم بن جاتا ہے، آدمی تجلی بن جاتا ہے، آدمی دہرا ہو جاتا ہے۔ امی گھر سے کھانا کھا کے آئی تھی۔ اکبر علی خاں کے اصرار پر ساتھ بیٹھ گئی اور دوپہر جس طرح سیورین پر حیرت طاری ہوئی تھی، امی بھی چند لقموں کے بعد تکلف کی محتمل نہ ہو سکی۔

اکبر علی خاں کا ملازم لڑکا کب کا جا چکا تھا۔ دس بج چکے تھے۔ ان کے بہ قول شہر کے حالات کشیدہ تھے، میں نے ان سے کہا بھی کہ اب وہ گھر چلے جائیں، رات بہت ہو گئی ہے، کچھ وقت راستے میں لگے گا لیکن وہ نہیں مانے، کہنے لگے۔ ''نزہت سے کہہ کے چلا تھا، دیر ہو سکتی ہے۔''

امی نے ان کے لیے کافی منگوالی اور باہر سبزہ زار میں کرسیاں لگوا دیں۔ سبزہ زار میں خوش گوار خنکی تھی۔ ہر طرف سکوت چھایا ہوا تھا۔ رات کی رانی کی مہک سبزہ زار میں گھلی ہوئی تھی۔ اکبر علی خاں گہری گہری سانسیں لے کر تازہ خوشبودار ہوا سینے میں بھرنے لگے۔ امی نے کافی بنائی۔ کافی بنا کے وہ کمرے میں چلی گئی تو اکبر علی خاں کسمساتے ہوئے بولے۔ ''اب آپ نے کیا سوچا ہے۔ آگے سفر کریں گے یا......'' وہ رک گئے اور میری شکل دیکھنے لگے۔

''ابھی کچھ طے نہیں کیا لیکن میرا خیال ہے گھر واپس چلے جانا ہی بہتر ہوگا۔ آگے سفر کی بات بعد میں دیکھی جائے گی۔''

''ہاں مناسب تو یہی معلوم ہوتا ہے۔'' انہوں نے تائید کی۔ ''لیکن میری بات مانیں تو کچھ عرض کروں۔''

''ضرور، ضرور۔'' میں نے کہا۔

''بھائی صاحب کی طبیعت بحال ہو جائے تو سفر کرنے کے بجائے کیوں نہ کچھ دنوں کے لیے غریب خانے پر قیام کریں۔ یہ میری خواہش بھی ہے اور میں سمجھتا ہوں، کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ آپ کو گھر جیسا آرام ملے گا، ظاہر ہے، احتیاطاً کچھ عرصے اسپتال سے قریب ہی رہنا چاہیے۔ گھر میں آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔''

''آپ کی محبت اور مہربانی۔'' میں نے جھجک کے کہا۔ ''دیکھتے ہیں بھائی صاحب کی مرضی کیا ہے۔''

''ہاں، ہاں، بے شک۔''

''آج رات یا کل صبح کلکتے سے ضرور کوئی آ جائے گا۔ تار سے وہ کھٹک تو گئے ہوں گے لیکن شاید بٹھل بھائی یا میری طبیعت کے بارے میں ان کے ذہن میں کچھ نہ آئے۔''

''یہ کون لوگ ہیں؟ آپ کے عزیز یا دوست؟''

''کیا کہوں، اس سوال کا جواب مشکل ہے۔'' میں نے کسمسا کے کہا۔ ''وہ عزیزوں اور دوستوں سے کہیں بڑھ کے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''کیا بتاؤں آپ کو۔''

"کچھ تو...... اگر مناسب ہو۔"
"پھر بھی......" میں نے بے چارگی سے کہا۔
ان کی آنکھوں میں حیرت ہویدا ہوئی اور انہوں نے حجت نہیں کی، کہنے لگے۔ "بہر حال......"
"آپ کیا کہنا چاہتے تھے۔" میں نے ان کا دھیان بٹانے کے لیے کہا۔ "آتے وقت آپ نے کہا تھا، آپ بعد میں کچھ بتائیں گے۔" "خیر تو ہے؟"
"ہاں......" ان کا لہجہ بدل گیا، اداسی سے بولے۔ "آپ سے ایک ذاتی کچھ گھریلو قسم کے معاملے میں بات کرنا تھی۔ کچھ عجب سی کش مکش ہے۔"
"کیا بات ہے؟ مجھے بتائیے۔"
"دو ایک دن کی ملاقات میں جانے کیا کرشمہ ہوا۔ سچ تو یہ ہے، مجھے آپ سے کوئی غیریت محسوس نہیں ہوتی۔ اتفاق سے کل ایک مسئلہ پیدا ہو گیا۔ بات تو دونوں سے چل رہی تھی لیکن کل ان کا تقاضا آ گیا۔" وہ چپ ہو گئے جیسے کھو سے گئے ہوں۔
"کیا تقاضا؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔
ان کا چہرہ بھاری ہو گیا۔ آواز بھی۔ انہوں نے بتایا کہ بھوپال کے ایک صاحب حیثیت اور با اثر نواب خاصے عرصے سے پٹنے میں مقیم تھے۔ کسی تقریب میں نواب کے خاندان والوں نے ان کی بڑی بیٹی سطوت کو دیکھ لیا تھا۔ نواب نے اپنے بیٹے کا رشتہ مانگ لیا۔ ادھر حیدر آباد میں مقیم ان کے بڑے بھائی بھی اپنی بھتیجی کو بہو بنانے کی خواہش کا اظہار کر چکے ہیں۔ بڑے بھائی کے بیٹے کو انہوں نے ایک زمانے سے نہیں دیکھا ہے۔ برس گزرے، وہ حیدر آباد گئے تو بھتیجا تعلیمی سلسلے میں علی گڑھ تھا۔ کہنے لگے کہ انہیں بھتیجے کے مزاج اور عادت اطوار کے متعلق کوئی علم نہیں ہے۔ بڑے بھائی بھی اب غیروں کی طرح ہیں۔ وقت گزر جاتا ہے، ملاقات نہیں ہو پاتی۔ وہ ادھر آتے نہیں اور اکبر علی خاں کا بھی جانا نہیں ہوتا۔ ان کی والدہ کچھ وقت کے لیے بڑے بیٹے کے پاس حیدر آباد گئی تھیں۔ جی نہیں لگا تو جلد ہی واپس پٹنے آ گئیں۔
وہ اپنے گھر کے اتنے ذاتی معاملے پر مجھ تازہ شناسا سے بات کر رہے تھے۔ مجھے سوچ سمجھ کے کوئی ذمہ دارانہ مشورہ دینا چاہیے تھا۔ میں نے دبی آواز میں پوچھا۔ "تو آپ کے خیال میں کہیں اور رشتہ منظور کر لینے سے بھائی صاحب ناراض ہو سکتے ہیں؟"
"یہ ممکن ہے، حالاں کہ بھتیجے کا حال احوال دیکھے بھالے بغیر، چاہے وہ کتنا ہی اپنا خون کیوں نہ ہو، مجھے رشتہ کسی طور منظور نہیں ہے۔ اور یہ۔ بھائی صاحب کی خواہش ہے، ضروری نہیں کہ ان کے فرزند بھی آمادہ ہوں۔"
"تو اس میں ایسی الجھن کیا ہے۔" میں نے شائستگی سے کہا۔ "آپ پہلے بڑے بھائی صاحب کو ترجیح دیجیے کیوں کہ بہر حال وہ آپ کے بھائی ہیں۔ حیدر آباد جا کے بھتیجے کے طور اطوار سے تسلی کر لیجیے۔ تشفی نہ ہو تو پھر نواب صاحب کے رشتے پر غور کیجیے۔"
"یہ اتنا آسان نہیں ہے میاں!" وہ مایوسی سے بولے۔ "میں نے آپ کو پوری بات ابھی کہاں بتائی ہے۔ صرف اتنا تو نہیں ہے، دو جگہ سے لڑکی کے رشتے آئے اور کسی ایک کو منظور کر لیا یا مسترد کر دیا، مسئلہ تو اپنے گھر کا بھی ہے۔"
"اپنے گھر کا؟" میں نے چونک کے پوچھا۔
"بھائی! فریق تو ہم دونوں ہیں۔ ہمیں خود کو بھی تو دیکھنا ہے۔ اپنے گھر، گھر کے مزاج، اپنی بیٹی کی پسند ناپسند، رجحان طبع وغیرہ کو۔ میری بیٹی سطوت عام لڑکیوں سے الگ ایک لڑکی ہے بلکہ ہمارا سارا گھر ہی، ہزاروں لاکھوں، بہت سوں سے مختلف گھر ہے۔ اور یہ سطوت، یہ تو بڑی ذہین اور حساس بچی ہے۔ معلوم ہے، ہمیشہ اول آتی رہتی

ہے۔ اس سے بات کر کے دیکھو، لگتا ہے، کوئی بہروپ بھرے ہوئے ہے۔ ہے کچھ، نظر کچھ اور آتی ہے۔ ایسی بچی عمر میں اتنی گہری باتیں...... اور بتاؤں آپ کو، وہ بڑی سریلی ہے۔ میں نے اس کے ہاں سر کی ایسی فراوانی، قوت اور لگن دیکھی ہے کہ خدا کی پناہ...... اس کا ذوق وشوق دیکھ کے موسیقی کی باقاعدہ تعلیم کے لیے ایک استاد کا بندوبست کر دیا تھا۔ کمرا بند کر کے، آس پاس میں رکاز ہر رسانہ ہو سکے، ایک سنگیت سمراٹ اسے تربیت دیتا رہا مگر روز اس کے گھر آنے جانے سے محلے والے کھٹک گئے۔ انہوں نے جستجو...... شروع کر دی۔ یہ ملازم وغیرہ بھی اچھے خاصے غیبت گو ہوتے ہیں۔ خبر پھیل گئی کہ اکبر علی خاں کی بیٹی موسیقی کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ ایک ہندو پنڈت روزانہ آتا ہے۔ بس صاحب، لاکھ عذر پیش کیے، ایک ہنگامہ ہو گیا۔ استاد کا سلسلہ فوراً بند کر دیا۔ کیا بتاؤں، موسیقی کا شوق کیا ہوا، زندگی اجیرن ہو گئی۔ کیا موسیقی سے رغبت ایسی بری بات ہے؟"
"جو برا سمجھتے ہیں، ان کے لیے تو برا ہی ہوتا ہے۔" میں نے محتاط لہجے میں کہا۔
"آپ نے بالکل سچ کہا۔ یہی بات تو نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ رہنا تو ہمیں اپنے محلے اور انہی لوگوں کے درمیان تھا۔ بہر حال وقت گزرنے کے ساتھ معاملہ دب گیا۔ جیسے واقعی یہ کوئی غیر معمولی مسئلہ تھا۔ آدمی کو یہاں انفرادی آزادی نہیں ہے۔ ہم اپنی پسند، اپنی مرضی کی زندگی نہیں گزار سکتے۔"
"شاید کہیں بھی نہیں۔" میں نے زیر لبی سے کہا۔
"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" وہ بے قرار سے ہو گئے۔ "بے شک، کہیں بھی نہیں لیکن اتنا اور ایسا بھی نہیں تھا۔ ولایت میں کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا ہے۔ وہاں بڑی انفرادی آزادی ہے لیکن مادر پدر نہیں۔ وہاں بھی اپنی روایتیں ہیں اور گورا تو بڑا روایت پرست، قدامت پسند ہوتا ہے لیکن یہ روایتیں آدمی کو اتنا مجبور نہیں کرتیں، اپنی فکر، اپنی رائے، اپنی طرز کی زندگی کی رعایت۔ وہاں ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایسی توجہ نہیں دی جاتی۔ وہ لوگ کام کرتے ہیں اور اسی وجہ سے ایک دنیا پر ان کی حکم رانی ہے۔"
"پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟" میں نے انہیں ٹوکا۔ وہ باتوں باتوں میں بہت دور نکل گئے تھے۔
"معاف کرنا میاں! اتنی باتیں بھری ہوئی ہیں دماغ میں، کچھ خیال ہی نہیں رہا۔ آئی ایم ساری۔" وہ پشیمانی سے بولے۔ "آپ نے اچھا کیا، مجھے ٹوک دیا۔ میں کہہ رہا تھا، ابھی تو سطوت تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ یہ رشتے وغیرہ کی بات تعلیم مکمل ہو جانے کے بعد ہی مناسب ہو گی۔ لیکن ایک مسئلہ اور بھی ہے۔" وہ پژمردگی سے بولے۔
کوئی سوال کرنے کے بجائے میں خاموش رہا۔
کچھ توقف کے بعد وہ خود ہی بولے۔ "اصل میں خوش شکل بچیوں کے رشتے، آپ جانتے ہیں، ان کے رشتوں کی کمی نہیں مگر ہمارے گھر کے معاملے میں ایسی صورت حال نہیں ہے۔"
"مگر کیوں؟" میں نے پوچھا۔
"دیکھیے کچھ عجب معاملہ ہے میں نے آپ سے کہا نا کہ ہمارا گھر اپنی خاص بود و باش بلکہ اپنی فکر، سوچنے کے انداز سے اجنبی ہو گیا ہے۔ خاندان برادری والے ہم سے ملنے میں کتراتے ہیں۔ کچھ آزاد خیال سمجھتے ہیں، کچھ کو ہمارے طور طریقے پسند نہیں، میری اور نزہت کی تعلیم، ولایت میں ہمارا قیام، بے پردگی وغیرہ۔ بہت سی ایسی باتیں ہیں جو ان کے درمیان رہتے ہوئے بھی ہم ان سے دور ہو گئے ہیں۔ بس ایک رسمی سا تعلق رہ گیا ہے۔ اور بات یہ ہے، ہمیں بھی یہ لوگ پسند نہیں۔ ایک تو ان

کی طرف سے کوئی رشتہ آنے سے رہا، دوسرے ہم خود بھی نہیں چاہتے کہ ان کی طرف سے ایسا سلسلہ جنبانی ہو۔ ایسے لوگوں میں بیٹی بیاہی جائے؟ ان گھروں میں تو بچی گھٹ کے رہ جائے گی۔ سطوت کا اپنا ایک وجود ہے، شادی، مرد کی حکم رانی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ کیا ہے۔ شادی کے بعد ایک عورت پر مرد کا تسلط ہو جائے۔ نکاح کے دو بولوں سے عورت کا ثابت وسالم وجود کسی ایک مرد کی قلم رو میں شامل ہو جائے یا اس کے زیرنگیں ہو جائے۔ نہیں صاحب، ہمیں قبول نہیں۔" اکبر علی خاں کی آواز تمتما گئی، کہنے لگے۔ "یہ تو آپس میں محبت بانٹنے، دکھ سکھ میں ساتھ رہنے، ایک دوسرے کا خیال رکھنے، ایک کو دوسرے کی جائز خواہشوں، رغبتوں کو آواز دینے کا تعلق ہے۔ کم از کم میں تو یہی سمجھتا ہوں۔ شادی کی تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجنی چاہیے۔"

"مگر کوئی بھی گھر ہو، بالکل آپ جیسا تو نہیں ہوگا۔ دوسرا گھر تو دوسرا ہی ہوتا ہے۔ لڑکیوں کو نئے گھر سے مفاہمت تو کرنی پڑتی ہے۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"صرف لڑکی ہی کیوں؟ لڑکے اور اس کے گھر والوں کو بھی گھر میں نو وارد لڑکی کے مزاج اور مرضی کا لحاظ رکھنا چاہیے۔" ان کے لہجے میں ترشی آگئی پھر اداسی سے بولے۔ "اصل میں کچھ غلطی ہماری بھی ہے۔ جہاں سارے پڑھے لکھے ہوں، وہاں ایک جاہل، بے گانہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جہاں سارے جاہل ہوں، وہاں ایک پڑھا لکھا عجوبہ بن جاتا ہے۔ سارے امیر ہوں تو ایک غریب خود کو کیسا ناہنجار و نابکار محسوس کرتا ہے۔ سارے غریب ہوں تو ایک امیر اپنے لوگوں سے کٹ جاتا ہے۔ عجب گورکھ دھندا سا ہے۔ شاید ہم اپنے خاندان برادری والوں سے آگے نکل گئے ہیں یا پیچھے رہ گئے ہیں۔ سوچا ہی نہیں کہ گھر میں بچیاں بھی ہیں اور بڑی بھی ہو رہی ہیں اور انہیں مستقل ہمارے ساتھ نہیں رہنا۔ ایک گھر میں لڑکے، لڑکیوں اور خود اپنے لیے الگ الگ روش تو ممکن نہیں ہو سکتی تھی۔"

"پھر آپ کو اپنی طرح، اپنے ماحول اور لوگوں، میرا مطلب ہے، ایسی جگہ رہنا چاہیے جہاں آپ کے ہم ذوق رہتے ہوں اور اس مغائرت کا احساس نہ ہو۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"بے شک، یہی ایک حل تھا اور ہے۔" انہوں نے کسی قدر جوشیلے انداز میں کہا۔ "ہم ولایت میں بھی رہ سکتے تھے لیکن گوروں کا رہن سہن ہمیں گوارا نہ ہوا۔ ہم میاں بیوی کو مشرق ہی پسند ہے لیکن جس مخصوص قسم کے مشرقی ماحول میں ہم نے آنکھ کھولی ہے، یہ لوگ تو...... میں کہوں گا، انہوں نے مشرق کو جانا ہی نہیں، سمجھا ہی نہیں۔ مشرق میں تو بہت رنگ ہیں۔ انہوں نے ہماری کشادہ نظری کو ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھا۔ سمجھ رہے ہیں آپ......؟" وہ الجھے الجھے لہجے میں بولے۔

"جی، جی۔" میں نے کئی بار سر ہلایا۔

"اسی لیے آپ کے سامنے زبان کھولی ہے۔"

"میرا خیال ہے، اگر آپ اجازت دیں تو کچھ کہوں۔"

"ہاں ہاں، کیسی بات کر رہے ہیں آپ۔"

"آپ کو سکونت ترک کر کے بمبئی بنگلور جیسے کسی شہر میں بس جانا چاہیے۔ وہاں شاید آپ کو ایسی گھٹن کا احساس نہ ہو۔ یہ ہجرتیں کوئی نئی بات نہیں، مسلسل ہوتی رہتی ہیں، کچھ تو ضرورۃً اور کچھ اپنی مرضی سے بھی۔ عموماً صاحبِ حیثیت اپنی پسند کے گھر، محلے اور شہر منتخب کر لیتے ہیں۔ میرا بہت سے شہروں میں آنا جانا ہوا ہے اور میں نے دیکھا ہے، بڑے شہروں کے تنگ مکانوں کے باوجود لوگ کھلے کھلے رہتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی تاکا جھانکی نہیں کرتے، غالباً اس لیے بھی کہ انہیں فرصت ہی نہیں ملتی۔ لیکن ایک اور بات بھی ہے۔ محلوں اور

شہروں سے اتنا نہیں، جتنا ان لوگوں سے فرق پڑتا ہے، جن کے درمیان آپ رہتے ہیں اور یہ لوگ ہر جگہ مل جاتے ہیں۔ کبھی قسمت سے، کبھی تلاش کر کے۔"

"آپ تو میری زبان بول رہے ہیں میاں۔" وہ مسکرا کے بولے۔ "اسی لیے تو میں کہتا ہوں، میرا کوئی ہم نفس، ہم زباں، کوئی بچھڑا ہوا مل گیا ہے۔ یقیناً میاں! ہم کہیں بھی رہ سکتے تھے۔ سال میں دو ایک ماہ یہاں سے اکتا کے، کچھ منہ کا مزاہ بدلنے کے لیے بھی، ہم ادھر ادھر چلے جاتے ہیں۔ لیکن کئی باتیں ہیں جو لوٹ کے یہاں آنا پڑتا ہے۔ یہ میرا آبائی شہر ہے۔ ایک خاص لگاؤ ہونا چاہیے مجھے اس شہر سے، پھر والدہ صاحبہ کا دل کہیں نہیں لگتا۔ یہاں انہوں نے ساری زندگی گزاری ہے۔ بچے یہاں پڑھ رہے ہیں۔ ابھی کچھ دنوں پہلے تک میں بھی یہیں وکالت کر رہا تھا۔ وکالت پڑھاتا تو اب بھی ہوں۔ نزہت بھی یہیں پڑھاتی ہیں۔ بھائی صاحب تو حیدر آباد جا کے ہر چیز سے بری الذمہ ہو گئے۔ آبائی زمینیں، جائیداد، اور وہ بھی اچھی خاصی۔ سب کچھ یہیں ہے۔ ان کا انتظام، پھر...... کیا بتاؤں آپ کو۔ ابا جان مرحوم کے زمانے سے بہت سے گھرانے ہمارے گھر سے وابستہ ہیں۔ یہ غریب لوگ، زمینوں پر کام کرنے والے اور ہمارے مکانوں میں رہنے والے۔ ان کی شادی بیاہ، تعلیم، خوشی اور غم، یوں سمجھئے، دادا پردادا کے وقت سے ان کی نگہ بانی ہمارا کام ہے۔ گاؤں میں بچوں کی تعلیم کے لیے ہم نے اسکول بھی کھولا ہے۔ نزہت ہر پندرہ بیس دن بعد وہاں جاتی ہیں...... لمبی کہانی ہے میاں...... کبھی اردگرد کے لوگوں کے رویوں سے تنگ آجاتے ہیں تو باہر نکلنے کی سوچتے ہیں اور یہ زنجیریں،...... زنجیریں ہی ہیں میاں، یہ...... یہ کوئی فیصلہ، حتمی فیصلہ کرنے ہی نہیں دیتیں۔"

میں کیا رائے زنی کرتا، چپ رہا۔

"چھوڑیے ان باتوں کو۔" وہ مایوسی سے بولے۔ "سر دست تو مسئلہ نواب صاحب کا ہے، انہیں کیا جواب دیا جائے۔ ان کا گھرانا شہر میں بڑا باعزت گھرانا ہے۔ بہ ظاہر انکار کی کوئی وجہ نہیں۔ میں نے ساری روداد آپ کو اس لیے سنائی کہ نواب کے گھر میں دنیا کی ہر آسائش میسر ہوگی لیکن سطوت کی شخصی بالیدگی کہیں مرجھا نہ جائے۔ وہ تو رنگوں سے کھیلتی ہے، سروں سے، کتابوں سے کھیلتی ہے۔ وہ تو بہت خواب دیکھتی ہے اور وہ تو سب سے آگے نکل جانے کی جستجو میں رہتی ہے، اور اسے دولت وغیرہ کی کوئی حرص و ہوس نہیں۔ اپنی اولاد کی بات نہیں کہ ہر ایک کو اپنی اولاد عزیز ہوتی ہے۔ میں تو حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ وہ تو ایک مثال ہے۔ نواب صاحب کے محل دو محلوں میں کہیں...... یہ نواب لوگ بڑے روایتی ہوتے ہیں۔ دولت مندی سے مراد روشن فکری نہیں ہے۔ جس طرح روشن فکری سے مراد آوارگی نہیں ہے۔ وہاں جا کے قریب سے ان کے طور طریقے دیکھے بغیر ہاں، کیسے کی جا سکتی ہے اور سطوت کو بھی تو اپنے ہونے والے زندگی بھر کے رفیق کو پرکھنے کا موقع ملنا چاہیے۔ پرکھنے کا نہیں تو کم از کم دیکھنے، اندازہ لگانے کا۔ میری باتیں آپ کو عجیب لگ رہی ہوں گی لیکن کیا ان میں معقولیت نہیں ہے؟ بتائیے۔"

"نہیں بالکل نہیں، پر یہاں ایسا کہاں ہوتا ہے۔"

"نہیں ہوتا، ہونا چاہیے۔ نواب زادے کو بھی آنکھوں پر پٹی باندھ کے ایک ایسی لڑکی سے زندگی بھر کے رشتے کے لیے آمادہ نہیں ہونا چاہیے جسے اس نے کبھی دیکھا اور تھوڑا بہت سہی، جانا بوجھا نہ ہو۔ کہتے ہیں، شادی دو خاندانوں کے درمیان ہوتی ہے لیکن اصل فریق تو دو افراد ہوتے ہیں۔ ان افراد کی نہ بنے تو خاندان والے کیا کر سکتے ہیں۔ یہی ہوتا ہے نا؟"

"ہاں، ہوتا ہے یہی کچھ۔" میں نے کہا۔ "مگر ضمانتیں تو مشکل ہی سے ملیں گی۔ شادی سے پہلے کی پسندیدگی بعد کو ناپسندیدگی میں بھی تو بدل سکتی ہے۔"

"کوئی ضمانت نہیں، بے شک کوئی نہیں۔" اکبر علی خاں تلخی سے بولے۔ "دوستوں کے درمیان کاروباری معاہدے میں بل آجاتا ہے۔ شادی کے معاہدے میں بھی تمام تر اطمینان کے باوجود کشیدگیاں اور کدورتیں ہو جاتی ہیں۔ پھر تو انجام علیحدگی کی صورت برآمد ہوتا ہے یا ساری زندگی کے عذاب کی شکل میں لیکن یہ ملال تو نہیں رہتا کہ فریقین نے ایک دوسرے کو سمجھا بوجھا، دیکھا بھالا نہیں تھا۔ شادی جوے کا کھیل نہیں ہے۔"

"اس صورت میں تو یہی بہتر معلوم ہوتا ہے کہ آپ نواب صاحب کو انکار کر دیں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ آپ ہوتے تو ضرور کہہ دیتے۔ آپ ایک جرأت مند آدمی ہیں، آپ وہ آدمی ہیں جو میں نے ہونا چاہا تھا اور میں ہونا چاہتا ہوں۔ آپ نے استاد میدا کے ٹھکانے پر جانے کا فیصلہ چٹکی بجانے کے دورانیے میں کر لیا تھا۔ نواب صاحب سے مروت کا ایک سلسلہ برسوں سے قائم ہے۔ ان کے گھر سے رشتہ آئے اور منع ہو جائے۔ یہ ان کے لیے بڑی سبکی کی بات ہے۔ جس طرح بھی کہوں، محسوس کر لیں گے۔ وہ ایک با اثر آدمی ہیں۔ با اثر آدمی کے دل میں کینہ جلدی بیٹھتا ہے...... اور سوچتا ہوں، اس شہر سے تو پھر سطوت کے رشتے آنے سے رہے۔ نزہت کے ستار بجانے کا شوق، ان کی اعلا تعلیم، لڑکوں لڑکیوں کے مشترکہ کالج میں درس و تدریس۔ میری ان کی شادی کی بھی ایک داستان ہے۔ یہاں سبھی واقف ہیں۔ وہ یہاں کی نہیں ہیں۔ شادی کے بہت دنوں کے بعد تو آس پاس کے لوگوں نے ان سے بات چیت شروع کی تھی۔"

"انکار کی صورت میں کیا آپ کو نواب صاحب کی جانب سے کسی نقصان کا اندیشہ ہے؟"

"سب سے بڑا نقصان تو تعلق خاطر کا ہے میاں۔"

"کچھ تو آپ کو بھگتنا ہی ہوگا۔ عذر تو بہت سے کیے جا سکتے ہیں اور کیا غلط ہوں گے۔ کہہ دیجیے کہ آپ کو کچھ وقت چاہیے۔ آپ کے بڑے بھائی نے بھی خواہش ظاہر کی تھی۔ پہلے ان کی جانب سے بات صاف ہو جائے۔ ادھوری تعلیم کا بھی عذر کیا جا سکتا ہے کہ سطوت بی بی پہلے تعلیم مکمل کرنا چاہتی ہیں۔"

"نواب صاحب ایک جہاں دیدہ آدمی ہیں، سمجھ جائیں گے۔"

"سمجھا کریں۔ وہ کوئی بادشاہ سلامت ہیں کیا۔ ناآمادگی میں ایسے ہی عذر کیے جاتے ہیں۔ انہیں تسلیم کرنا چاہیے۔ نواب زادے کے لیے لڑکیوں کی کیا کمی ہوگی۔ آپ کو اختیار ہے۔ ہر باپ کو اختیار ہے کہ وہ جہاں چاہے، اپنی بیٹی کے بہتر مستقبل کا فیصلہ کرے۔ رہی پٹنا شہر میں آپ کے خاندان برادری والوں کی طرف سے رشتے آنے کی ناامیدی، تو کیا ہوگا۔ سطوت پڑھتی رہیں، پڑھتی رہیں۔ اس دوران کوئی نہ کوئی انہیں خود بھی پسند آ سکتا ہے...... مگر پھر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہوگا؟"

"بالکل نہیں جناب، قطعاً نہیں۔ ہم سنجیدگی اور کشادہ دلی سے غور کریں گے۔ ہمیں خاندان ذات برادری سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہمیں تو سطوت کے پسند کیے ہوئے فرد سے غرض ہوگی کہ وہ کیسا ہے اور سطوت کی پسند ایسی ویسی نہیں ہوگی۔"

"اور کیا شادی ایسی ہی ضروری ہے؟" میری زبان بہک گئی۔

اکبر علی خاں چونک پڑے اور کچھ توقف کے بعد بولے۔ "ہاں میاں، یہ بھی غور طلب بات ہے"

یہ شادی وادی کا رواج تو ابھی ابھی کا ہے۔ زندگی تو کروڑوں سال کی ہے۔ ہماری تو دس ہزار سال پہلے کی آگہی، وہم وقیاس، آثار وقرائن کی بنیاد پر ہے۔"

"مگر شادی غالباً یوں ضروری ہے کہ اس زمانے کا دستور ہے۔ ہر زمانے کا اپنا ایک دستور ہوتا ہے۔ اور وہی بات ہے، آدمی نہ ماضی میں رہ سکتا ہے نہ مستقبل میں۔ وہ تو محض اپنے حال میں رہتا ہے۔ ہر موجود زمانہ اس کا حاکم ہوتا ہے۔ اس کے قواعد، قوانین، ضابطوں اور مطالبوں کی تعمیل کرنی پڑتی ہے۔ ہر موجود زمانے کے اپنے لہجے، زبان، لباس اور اپنا ایک رہن سہن ہوتا ہے۔ ہر موجود زمانے کی اپنی ایک منطق ہوتی ہے یا یوں کہیے کہ جو کچھ جس عہد میں ہے، وہی منطق ہے۔"

آپ نے خود ہی سوال اٹھایا اور خود ہی جواب دے دیا میاں۔" وہ شگفتگی سے بولے۔ "یہ فکر ہی آدمی کو بھٹکاتی ہے اور فکر ہی راستہ دکھاتی ہے۔ بہر حال آپ کا مشورہ صائب ہے۔ مجھے بوجوہ یہ دونوں رشتے منظور نہیں ہیں تو کوئی عذر تو پیش کرنا ہی ہوگا۔ آپ سے بات کر کے میرا سینہ ہلکا ہوا اور مجھے حوصلہ ملا۔"

انہوں نے کافی کے چند ہی گھونٹ لیے تھے اور اپنی باتوں میں گم ہو گئے تھے۔ کافی ٹھنڈی ہو گئی۔ بہت دیر بعد ایمی نے سبزہ زار کا رخ کیا تو اس نے ہم دونوں کو دوبارہ گرم کافی بنا کے دی۔ مجھے کافی ایسی مرغوب نہیں تھی لیکن اکبر علی خاں کے سامنے منع نہ کیا جا سکا۔ شبنم اب محسوس ہونے لگی تھی۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دور راہ داری میں وقفے وقفے سے قدموں کی آہٹ گونجتی اور خاموشی میں ڈوب جاتی۔ میرا کچھ کہنا مناسب نہیں تھا۔ اکبر علی خاں کو گھر واپسی کا کچھ خیال ہی نہیں تھا۔ کافی ختم کرنے کے بعد جیب سے انہوں نے کڑھا ہوا ریشمی کپڑے کا بٹوا نکالا۔ "بن دھنیے سے شوق کریں گے؟ پان مجھے اچھا لگتا ہے لیکن نزہت کو پسند نہیں...... اور انہیں نہیں تو مجھے بھی......" انہوں نے بٹوا میرے آگے کر دیا۔ "یہاں تو اسے بن دھنیا کہا جاتا ہے، کئی چیزوں کا مرکب ہے، منہ میں خوشبو بکھر جاتی ہے۔ معلوم نہیں، آپ اسے کیا کہتے ہیں؟"

میں نے ایک دو چٹکیاں لیں۔ عموماً شادی کی تقریبات میں جو مہمان پان نہیں کھاتے، انہیں یہ مسالا پیش کیا جاتا ہے۔ واقعی خوش ذائقہ تھا۔

"کیسا لگا؟" انہوں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"دل چسپ ہے۔"

"دل چسپ کی خوب کہی۔" وہ ہنس پڑے۔ "یہ نزہت میری بیوی کے علاوہ، میری نگراں بھی ہیں۔ ایسا خیال رکھتی ہیں کہ خود پر میرا اعتماد متزلزل ہو گیا ہے۔ ہر وقت انہیں یہ خدشہ رہتا ہے کہ مجھ سے کوئی چوک ہو جائے گی، اور ہوتی بھی ہے۔"

"آپ بھی کیا کم ان کا خیال رکھتے ہوں گے۔"

"بھئی سچی بات یہ ہے، بڑے جتن کر کے انہیں حاصل کیا ہے۔ مشکل سے حاصل کی ہوئی چیز کی قدر بھی بہت ہوتی ہے، پھر نزہت تو ہیں ہی قابل قدر، قابل ستائش۔ ان کا بھی یہی حال ہے۔ میرے لیے انہوں نے بڑی دیواریں پھلانگی ہیں انہیں لگتا ہے کہ میرے بغیر وہ، اور ان کے بغیر میں، ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہیں۔"

"ایسا کم کم ہوتا ہے۔" میں نے تعجب سے کہا۔ "اس لحاظ سے آپ بہت خوش قسمت ہیں کہ آپ کو اپنا کوئی مطلوب مل گیا۔ کسی کو اس کا اپنا مطلوب مل جائے تو دنیا مل جاتی ہے۔"

"میں واقعی خود کو خوش قسمت تصور کرتا ہوں۔"

"خدا کرے، آپ دونوں میں یہی یگانگت رہے۔" مجھے شاید یہی کہنا چاہیے تھا۔

"ہاں۔" ان کا لہجہ حسرتی سا ہو گیا۔ "بس دعا کریں، ایسے ہی سارا کچھ بنا رہے۔"

" انہوں نے دستی گھڑی دیکھی اور انگڑائی سی لے کے بولے۔ "میرا خیال ہے، مجھے اب چلنا چاہیے، آج میں سوچ کے آیا تھا کہ دیر تک آپ کے پاس بیٹھوں گا مگر سچ پوچھیے تو جی بھرا نہیں۔"

"تو بیٹھیے نا کچھ دیر اور۔" میں نے بہ ظاہر تکلفاً کہا، خود میرا جی بھی ان کی باتوں میں لگ رہا تھا۔ ان کے چلے جانے کے بعد تو مجھے اپنے ساتھ ہی رہنا تھا اور جانے کیوں میں اپنا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"آپ تو اپنے بارے میں کچھ بتاتے نہیں۔ میں ہی فضول گوئیاں کرتا رہتا ہوں۔" ان کے شکایتی لہجے میں ناز برداری بھی شامل تھی۔

"کیا جاننا چاہتے ہیں آپ؟"

"بہت سے سوال دماغ میں اٹھتے ہیں۔"

"مثلاً کیا کیا؟"

"یہی کہ میاں۔ اب ایسی بھی آپ کی عمر نہیں ہے۔ ماشاءاللہ نوجوان ہیں مگر ایک عجب تپش سی، ایک تلاطم سا کچھ میں نے آپ کے چہرے پر محسوس کیا ہے۔"

"میں...... میں کیا کہہ سکتا ہوں اس خامی پر۔"

"نہیں جناب، یوں نہیں، ایسے مت ٹالیے۔ یہ اضطراب بے سبب تو نہیں ہوگا۔ ہو سکے تو کچھ بتایئے، اور اگر ناگواری کا باعث ہو تو بخدا بالکل نہیں۔ آپ سے میرا تعلق آپ کے بارے میں میری واقفیت سے بندھا ہوا نہیں ہے۔"

"یہ تو آپ کی بڑائی ہے۔"

"بڑائی کیا۔" وہ بے بسی کے سے انداز میں بولے۔ "کوئی اچھا لگ جائے، پھر اور کیا رہ جاتا ہے۔ اچھا لگنے نہ لگنے کا معاملہ تو دل کا ہے، دماغ کا نہیں۔ اور کچھ جاننے کا اشتیاق تو فطری ہے لیکن لازم نہیں، کم از کم میرے لیے۔"

"کیا بتاؤں؟" میں نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

"کچھ نہ بتائیں۔" انہوں نے سر جھٹک کے کہا۔ "جانے دیجیے۔"

"بتانے کو کچھ اچھا نہیں ہے۔"

"برا بھی نہیں ہوگا۔"

"شاید اسی کو حسن ظن کہتے ہیں۔"

"نہیں، یقین ہے، برا کچھ نہیں، مختلف ضرور ہوگا۔ کچھ الگ ہوگا صاحب۔" ان کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ "میں تو کہوں گا، میں نے آپ جیسا نوجوان نہیں دیکھا...... اور ایسا نہیں کہ دنیا نہیں دیکھی، دنیا کو بھی اچھا خاصا دیکھا، پڑھا اور سنا ہے۔ وکالت میں تو آئے دن حیران کن واقعات سامنے آتے رہتے ہیں۔ لیکن......"

میں چپ رہا اور سوچتا رہا، انہیں کیا بتاؤں، کیا نہیں۔

"یہ آپ کے سفر کا مشغلہ بے جواز تو نہیں ہونا چاہیے۔" میری خاموشی پر انہوں نے جیسے مجھے تنکا چبھویا۔

"سیر و تفریح بھی تو ایک جواز ہوتی ہے۔"

"تو کیا بس یہی......؟ نہیں صاحب نہیں۔"

"کسی کی تلاش ہے۔" میں نے سانس بھر کے کہا۔

"تلاش؟" ان کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔

"ایک صاحب کی...... ان کا نام مولوی محمد شفیق ہے۔"

"مولوی محمد شفیق!" انہوں نے تجسس سے دہرایا۔ "کس وجہ سے؟"

"ان کے پاس ایک امانت ہے۔"

"امانت......! روپے پیسے کی تو نہیں ہوگی۔"

ان کے وثوق پر مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے سر ہلا کے تائید کی۔

"کب سے...... وہ کھوئے ہوئے ہیں۔؟"

"دس سال سے اوپر ہو گئے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

”اور ......اور دس سال سے آپ انہیں ڈھونڈ رہے ہیں؟“

”نہیں ......کوئی تین چار سال سے ۔ سات سال میں نے جیل میں گزارے تھے ۔ اس لیے انہیں تلاش نہیں کر سکتا تھا۔“

”جیل میں؟“ ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”کیا، کیا کہہ رہے ہیں میاں آپ......؟ کس جرم میں؟ سات سال کا مطلب ہے کوئی بڑا جرم......؟“

ان کی آواز بدل گئی۔

”دہرے قتل کے جرم میں۔“ میں نے سر جھکا لیا۔

ان کا جسم بل کھا گیا۔ ”آپ مذاق کر رہے ہیں۔“

میں نے قتل کی وجہ اور سزا کاٹنے کے بارے میں مختصراً انہیں بتانا شروع کیا تو ان کے چہرے کا رنگ بدلتا رہا اور وہ گنگ بیٹھے رہے۔ میں نے تفصیل سے اجتناب کیا تھا لیکن ان کی حالت غیر ہو گئی تھی۔

دیر تک وہ گم سم مجھے دیکھا کیے۔ ”آپ کا تعلق کیا شہر سے ہے؟“ انہوں نے مضطرب آواز میں پوچھا۔

”کبھی تھا۔ اب تو کئی شہروں سے ہے۔ اور گھر میں رہنے کا موقع تو کم ہی ملتا ہے۔ بس گھومتے رہتے ہیں، شہروں شہروں، گلی گلی......اور مولوی صاحب کے نام کی صدائیں لگاتے پھرتے ہیں۔“ میری آواز بیٹھنے لگی۔

”اوہ، اوہ۔“ انہوں نے جھرجھری لی۔

”اور......اور ان کا کوئی نام ونشان نہیں ملا؟“

”کئی جگہ، مراد آباد، جیسلمیر، حیدر آباد، ریاست رام پور کے قصبے نگریا سادات......بس آنکھ مچولی سی ہوتی رہی۔ جہاں جہاں بھی ہم پہنچے اس جگہ سے وہ جا چکے تھے۔ حیدر آباد میں یہ اندازہ ہوا کہ وہ مجھ سے ملنا ہی نہیں چاہتے۔ ملنا چاہتے تو ان کے لیے مجھ تک پہنچنا مشکل نہیں تھا۔ میں نے کئی جگہ اپنا پتا چھوڑا ہے۔ کلکتہ جیل سے بٹھل بھائی تک اور وہاں سے مجھ تک......وہ آسانی سے مجھ تک پہنچ سکتے تھے مگر وہ یہ چاہتے ہی نہیں ہیں۔ شاید وہ سمجھتے ہیں کہ میں سزا یافتہ......میں اب اس کے لائق نہیں رہا......اور اب وہی اس کے سب کچھ ہیں......بہرحال کسی دن ہم ان تک پہنچ ہی جائیں گے یا خود ہی تھک کے وہ میرا رخ کریں گے۔ جیسلمیر میں مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے اس کا نام بدل کے نرجس بانو رکھ دیا ہے اور اس کی تعلیم وتربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ وہ تنہا زندگی گزارتے رہے تھے۔ ظاہر ہے، اتنے عرصے اسے اپنی چھاؤں، اپنی پناہ میں رکھنے کے بعد اس سے جدائی کا تصور ہی ان کے لیے عذاب ہوگا۔ کون انہیں بتائے کہ مجھ سے اس کا ملنا، اپنی بیٹی سے ان کی دوری نہیں ہے۔ ان کا تو بڑا احسان ہے کہ وہ اتنے عرصے تک اس کی پاس بانی کرتے رہے۔ وہ اس وقت اس کے سر پر ہاتھ نہ رکھتے تو اس کا کیا حال ہوتا۔ وہ تو شاید زندہ نہ رہتی، پھر میں بھی کہاں جاتا۔ مولوی صاحب اچھی طرح یہ بات جانتے ہیں۔ ان کی نگرانی اور ایثار اپنی جگہ، وہ تو میرے آسرے پر زندہ رہی ہے۔ وہ مسلسل میری تلاش کے بہانے بناتے رہے ہوں گے لیکن کب تک......ایک دن......انہیں سمجھنا چاہیے، ایک دن اس کی امید ٹوٹ بھی سکتی ہے۔ جس دن ایسا ہوا، تب تب......“ میری آواز حلق میں پھنس گئی اور میں نے اپنا منہ چھپا لیا۔

”نانا......نا میاں۔“ اکبر علی خاں کرسی سے اٹھ کے بے تابانہ میرے پاس آگئے اور انہوں نے میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں بھر پالیا۔ ”میرے پیارے، میری جان! آپ تو، آپ تو بہت باہمت نوجوان ہیں۔ یہ کیا، یہ کیا......نہیں میاں، بالکل نہیں یہ آنسو آپ کو زیب نہیں دیتے۔“

ان کی تسلی دلاسے میری آنکھیں اور دھندلانے لگیں۔

انہوں نے راہ داری میں امی کی موجودی کا احساس دلانے کے لیے مجھے کہنی ماری۔ جانے مجھے کیا ہوگیا تھا۔ مجھے خود پر قابو ہی نہیں رہا۔

''کچھ نہیں، کوئی بات نہیں۔'' وہ میری کمر ٹھونکتے ہوئے بولے۔'' دیکھنا، ایک دن بہت جلد...... انشاءاللہ جلد ہی آپ کی مراد بر آئے گی۔ آپ کی لگن سچی ہے، آپ کا ایک عزم ہے تو...... یہ عزم رائگاں نہیں جائے گا میاں۔''

''مگر یہ سفر میں، جگہ جگہ، بار بار یہ رکاوٹیں جو آجاتی ہیں۔ ہم کسی سے سروکار نہیں رکھنا چاہتے مگر اچانک دیواریں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ جیسے یہاں، بتائیے میرا کیا قصور تھا...... کیا کیا بتاؤں آپ کو...... کہاں کیسے کیسے حادثوں، ان ہونیوں سے واسطہ پڑا ہے۔''

''کچھ نہ بتائیے اب...... پھر سہی، کل سہی۔ بخدا مجھے اندازہ نہیں تھا، یہ ذکر آپ کے لیے کتنا تکلیف دہ ہوسکتا ہے۔ یہ سارا کچھ سن کے میری حالت اضطرابی ہے۔ آپ پر کیا گزرتی رہی ہوگی۔ اب میری سمجھ میں بہت کچھ آچکا ہے۔ خدا آپ کو سکون دے۔ میرا قیاس غلط نہیں تھا۔ آپ کی آنکھوں اور چہرے پر یہ غبار خالی از علت نہیں ہوگا۔ لیکن اتنا کچھ...... میرے سان وگمان میں نہ تھا۔ کاش میرے پاس کوئی مداوا ہوتا، میں کچھ کر سکتا مگر...... مگر ہاں، یہ ممکن ہے کہ اب میں بھی آپ کے ساتھ چلوں جیسے بھائی صاحب آپ کے ساتھ رہتے ہیں۔ میں بھی جگہ جگہ، شہر شہر، گلی گلی انہیں تلاش کروں گا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ ایک سمت جائیں، میں دوسری...... نزہت کو میں یہ سارا کچھ بتاؤں گا تو وہ بھی مجھے نہیں روکیں گی بلکہ حوصلہ افزائی کریں گی۔''

میں بھری ہوئی آنکھوں سے انہیں دیکھتا رہا۔

امی نے آکے بتایا کہ ایک بج چکا ہے۔ اس کا اشارہ واضح تھا۔ اکبر علی خاں نے دستی گھڑی دیکھی اور اضطراری لہجے میں بولے۔'' مجھے اب چلنا چاہیے۔ جانے کو جی تو نہیں چاہتا۔ دیر کا کہہ کے آیا تھا، نہ آنے کا کہہ کے آتا تو بات دوسری ہوتی۔ خاصی رات ہوگئی ہے۔ کل صبح جلد ہی آجاؤں گا۔ صبح تک کلکتے سے بھی کوئی نہ کوئی آجائے گا۔ بھائی صاحب بھی، اللہ کا شکر ہے، ٹھیک ہو رہے ہیں۔ اب تشویش کی کوئی بات نہیں۔ کل آپ کو کچھ فراغت ہوجائے گی، پھر بیٹھیں گے اور سوچیں گے۔ میں اچھا منتظم بھی ہوں۔ دیکھیے کیا کچھ کیا جاسکتا ہے۔'' ان کے ساتھ میں بھی کھڑا ہو گیا۔ وہ مجھے سکون کی تلقین کر رہے تھے لیکن خود ان پر ہیجان سا طاری تھا۔ حرکات وسکنات میں بڑی بے قراری تھی۔ وہ منع کر رہے تھے لیکن صدر دروازے تک مجھے ان کے ساتھ جانا چاہیے تھا۔ راستے میں ان کی دل جوئی کے لیے میں نے کہا۔'' آپ یہاں، گردوپیش کے ماحول کے بارے میں شکوہ کر رہے تھے، اس وقت میں کہتے کہتے رہ گیا، چند دنوں کے لیے سہی، آپ بھابی صاحبہ اور بچے فیض آباد آئیں۔ وہاں ہماری حویلی میں شاید وہ لوگ مل جائیں جن کی آپ کو تلاش ہے۔ وہاں آپ کا دل ضرور لگے گا۔''

میری کوشش کام یاب ہوئی، انہوں نے جوشیلے انداز میں ہامی بھری۔

میں نے کہا۔'' وہاں ایک گھر ہے، بہت سے گھروں سے الگ۔ یوں سمجھیے کہ خود بہ خود ایسا کچھ بس گیا یا ہو گیا ہے۔ وہاں ایک زریں ہے۔ میں کہتا رہتا ہوں کہ پھولوں کے خمیر سے اس کا جسم بنا ہے اور نس نس میں اس کی شہد سمایا ہوا ہے۔ اور وہاں ایک زریں ہی نہیں، چھوٹا بھائی جہاں گیر بھی ہے، خانم ہیں اور نیساں ہے۔ دونوں بہت اچھا گاتی ہیں۔ اور سلمٰی ہے، زہرہ ہے، اور فروزاں،

یاسمین ہیں۔ سب کی اپنی ایک داستان ہے۔''

''کیا نام لیا آپ نے؟ آخری نام؟'' وہ چلتے چلتے رک گئے۔

مجھے یاد آیا، فروزاں اور یاسمین کے باپ پٹنے ہی سے آسن سول گئے تھے اور درس وتدریس ہی سے وابستہ تھے۔'' شاید آپ جانتے ہوں۔ وہ پہلے اسی شہر میں رہتی تھیں۔ ان کے باپ یہاں پروفیسر تھے۔''

''ہاں ہاں میاں۔ آپ جمال الدین سیفی کی بیٹیوں کی بات تو نہیں کر رہے۔ ان کے والد ایک جید عالم تھے، فارسی اور مشرقی علوم کے ماہر۔ ان کے گھر تو ہمارا خوب آنا جانا تھا۔ ان کی دو پیاری، بہت پیاری بچیوں سے اپنی بچیوں کا بڑا میل ملاپ تھا مگر وہ آپ کے ہاں، فیض آباد میں......'' وہ جز بز ہونے لگے۔

''ہم انہیں آسن سول سے فیض آباد لے آئے ہیں، بہت لمبا قصہ ہے۔ آپ کو دیر ہو رہی ہے، کل بتاؤں گا۔''

''پروفیسر صاحب کا تو آسن سول میں انتقال ہوگیا تھا۔ ان کے دوست سید محمود علی انہیں آسن سول لے گئے تھے۔ دونوں میں گہری دوستی تھی میں بھی ایک دو روز کے لیے سید صاحب کے مہمان خانے میں مہمان رہا ہوں، کیا مہمان خانہ ہے۔ بہت متواضع آدمی ہیں وہ، بڑے مرنجاں مرنج۔''

''اسی نے اپنے دوست فروزاں اور یاسمین کے باپ کو ختم کردیا تھا۔ اس کے بعد اس نے ان کی ماں خانم فرخ سے شادی کرلی اور اسے بھی ختم کردیا۔''

وہ اچھل سے گئے اور ان کی آواز میں تندی آگئی۔'' کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ مجھے پوری بات بتائیے۔''

''کل صبح، آپ کو بہت دیر ہوگئی ہے۔''

''مجھے اب نیند نہیں آئے گی میاں۔''

کچھ بتائے بغیر چارہ نہیں تھا۔ میں نے تو ان کی دھند دور کرنے کے لیے حویلی کا ذکر چھیڑا تھا۔ کیا معلوم تھا کہ وہ فروزاں اور یاسمین سے واقف ہوں گے۔ میں نے سرسری طور پر آسن سول میں پیش آنے والا احوال بتا کے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ اس اختصار سے وہ اور بے چین ہوگئے۔ میں نے کہا۔'' اب کوئی بات نہیں جو ہونا تھا، ہوچکا ہے۔ پہلے فروزاں اور یاسمین کو سید محمود علی کے چنگل، اس کے زنداں سے نکالنا ضروری تھا۔ اس لیے اسے کچھ مہلت مل گئی۔ اس کا حساب باقی ہے اور ہمیں دوبارہ جانا ہے۔ پروفیسر کے اثاثوں کا حساب لینا ہے کہ وہ فروزاں اور یاسمین کا حق ہے۔ عدالتی کارروائی کی ضرورت پڑی تو فروزاں، یاسمین اور نصیر بابا کے علاوہ کچھ اور شہادتیں حاصل کرنا ہیں۔ سید محمود علی کو اس کے انجام تک نہیں پہنچایا تو فروزاں اور یاسمین سے ناانصافی ہوگی۔ اب وہ ہماری ذمے داری ہیں۔''

دیکھنے، سننے، بولنے اور سوچنے کی ایک استطاعت ہوتی ہے۔ آدمی اتنی حیرتیں ہی برداشت کرسکتا ہے جتنی اس کی سمائی ہے۔ فروزاں اور یاسمین کا واقعہ مستزاد تھا۔ اکبر علی خاں شدید کش مکش سے دوچار نظر آتے تھے۔ اب انہیں سوال کرنے کا بھی یارا نہیں تھا۔ انہیں مجھ پر یقین تھا کہ میں ان سے کچھ غلط نہیں کہوں گا۔ مجھ پر ان کا یہ یقین ان کے لیے مزید رنج اور اضطراب کا باعث ہونا چاہیے تھا۔ کسی جھوٹ اور مبالغے کا شائبہ ہوتو آدمی اتنا حیران وپریشان نہیں ہوتا۔

میری گزارش پر کہ ہم دوبارہ بھی ملیں گے اور کل صبح ہی، انہوں نے صدر دروازے کا رخ کیا اور پھر کچھ نہیں کہا۔ ان کی خاموشی کا تلاطم اور شور میری آنکھیں دیکھ رہی اور میرے کان سن رہے تھے۔

صدر دروازے کے اندر دروازے کے بیچوں

نیچ وردی پوش دربان مونڈھے پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ دور سے اس نے ہماری آہٹیں سن لیں۔ سٹ پٹاتا اٹھ کھڑا ہوا، سیلوٹ کے انداز میں سلام کیا اور دروازہ کھول دیا۔ دروازے کے باہر پولیس کا پہرا تھا۔ بائیں طرف بینچوں پر چار دیواری سے کمر ٹکائے اوندھے بیٹھے ہوئے چند سپاہی بھی مستعد ہوگئے۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ ارد گرد کی عمارتیں بھی جیسے سو رہی ہوں، کچھ فاصلے پر دو تانگے موجود تھے۔ ایک کو میں نے آواز دی تو دوسرا بھی بیدار ہوگیا۔ آس پاس چھائے سکوت سے مجھے گھبراہٹ ہوئی اور میں نے اکبر علی خاں سے کہا کہ میں بھی ان کے ساتھ چلتا ہوں۔ انہیں گھر پہنچا کے اسی تانگے میں واپس آجاؤں گا۔ انہوں نے انکار کردیا، اعتماد سے بولے۔ ''یہ میرا شہر ہے میاں۔''
مجھ سے گلے مل کے تانگے میں بیٹھا چاہتے تھے کہ رک گئے اور میرا ہاتھ تھام کر مجھے ایک قدم دور لے گئے اور سرگوشی میں کہنے لگے۔ ''ایک بات کہنی تھی آپ سے، بس یوں ہی۔ صبح تک کلکتے سے تو کوئی آ ہی جائے گا...... کیا یہ ممکن ہے کہ آپ میدا کے ٹھکانے پر جانے کا خیال ہی چھوڑ دیں۔ میری درخواست ہے یہ......''

''مگر میرا چاقو اس کے پاس ہے۔ اسے واپس لینا ہے۔ یہ اڈوں کی روایت ہے وہ لوگ کیا سمجھیں گے۔'' میری آواز بیٹھ گئی تھی۔

''کوئی اور صورت نکال لیجیے۔ مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ سوچ لیجیے۔''

''نہیں آپ کو میری ناکامی کا اندیشہ تو نہیں...... بے شک یہ بھی ہوسکتا ہے لیکن جانا تو ہے، جانا تو چاہیے......اور ایسا کچھ نہیں ہوگا، آپ اطمینان رکھیں۔''

''ہو سکے تو نظر ثانی کیجیے، میری التجا ہے۔''

''آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، صبح بات ہوگی۔ کسی دوسری صورت پر غور کریں گے۔ انہوں نے میرے گال تھپکے اور تانگے میں بیٹھ گئے۔ سناٹے میں تانگے کی آواز دیر تک گونجتی رہی۔ جب تک تانگا نظروں سے اوجھل نہ ہوگیا، میں وہیں کھڑا رہا۔

امی جاگ رہی تھی اور میرا انتظار کر رہی تھی۔ کمرے میں میرے داخل ہوتے ہی ناراض ہونے لگی۔ ''اب تم بھی کچھ دیر آرام کرلو، میں دیکھ رہی ہوں، تم اپنے آپ سے بہت زیادتی کر رہے ہو۔ نوجوانی کو اتنا زیر بار نہیں کرتے میرے پیارے بچے۔''

صوفے پر بیٹھ کے میں نے پیر پھیلا دیے اور میرا جسم بکھر سا گیا۔ امی بھی میرے پاس بیٹھ گئی اور اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ''سر میں درد تو نہیں؟'' اس کی آواز سے شفقت چھلک رہی تھی۔

''نہیں، بس کچھ تھکن سی ہو رہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ تو ہوگی نا۔ گوشت پوست ہی کے بنے ہو۔ تم ایسے نہیں آرام کروگے۔ میں تمہیں نیند کی گولیاں دیتی ہوں، تمہیں ایک گہری نیند کی ضرورت ہے۔''

جبری آرام، آرام تو نہیں ہوا۔'' میں نے ہنس کے کہا۔

جو بچے کہنا نہیں مانتے، انہیں اسی طرح قابو میں کیا جاتا ہے۔ اب سیدھی طرح اٹھ کے اپنے بستر پر جاؤ...... چلو اٹھو۔'' اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے اٹھا دیا اور بستر تک لے آئی۔ میں بستر پر دراز ہوا تو اس نے میرے پیر چادر سے ڈھانپ دیے اور سرہانے بیٹھ کے میری پیشانی اور بال سہلانے لگی۔ مجھے امی کی یاد آگئی۔ کبھی کبھی بستر پر لیٹا میں چھت اور دیواریں تکتا رہتا تھا۔ رات کو میری کھلی آنکھیں دیکھ کے امی بھی کچھ اسی طرح میرے سرہانے آکے سردبانی اور ڈانٹ ڈپٹ کرتی رہتی تھیں۔ اسی میں مجھے نیند آجاتی تھی۔ آج بھی یہی

ہوا۔ مجھے خبر ہی نہیں ہوئی، کب آنکھ لگی اور کب امی سرہانے سے اٹھی۔

صبح ہونے میں چند گھنٹے رہ گئے تھے۔ نیند کا دورانیہ زندگی میں کیوں شمار کیا جاتا ہے۔ نیند تو نصف موت ہے۔ صبح کمرے میں وارڈ بوائے کی کھٹ پٹ سے میری آنکھ کھلی۔ منہ ہاتھ دھو کے میں باہر آیا تو امی نے ناشتہ تیار رکھا تھا۔ آٹھ بج رہے تھے۔ ابھی تک جامو، جمرو اور زورا میں سے کوئی نہیں آیا تھا۔ شاید انہیں وقت پر تار نہیں مل سکا ہو۔ بہر حال صبح بٹھل کی حالت کچھ اور بہتر نظر آرہی تھی۔ میری آواز پر اس نے آنکھیں کھولیں اور اس کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی۔ میں نے دانستہ اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر رائے کو آنا ہی تھا۔ میں نے بٹھل کو بتانا چاہا تھا کہ کلکتے تار دے دیا ہے، وہاں سے کوئی نہ کوئی آنے والا ہی ہوگا لیکن اس کے دماغ پر زور پڑنے کے خیال سے میں رک گیا۔

ڈاکٹر رائے ٹھیک دس بجے آیا۔ اس کے ساتھ دو نوجوان ڈاکٹر بھی تھے۔ جانے کیوں اس نے کچھ دیر کے لیے مجھے کمرے سے باہر چلے جانے کی ہدایت کی۔ کسی ایک سوال کا محل نہیں تھا، میں خاموشی سے باہر آگیا اور میرے نکلنے کے بعد امی نے کمرے کا دروازہ بند کردیا۔

میں راہ داری کے ساتھ بچھے سبزہ زار پر آکے بیٹھ گیا۔ اکبر علی خاں کسی وقت بھی آسکتے تھے۔ رات انہوں نے کہا تھا کہ ساتھ ہی ناشتہ کریں گے۔ ڈاکٹر رائے کو کمرے میں ٹھیرے پندرہ منٹ ہوئے ہوں گے کہ راہ داری کے کونے پر اکبر علی خاں کا ملازم لڑکا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ خالی تھے اور وہ خاصا بدحواس نظر آرہا تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا اور میں فوراً کرسی سے اٹھ گیا۔ لڑکا کمرے میں داخل ہوا چاہتا تھا کہ دروازہ بند دیکھ کے منتشر ہوا۔ میں نے اسے آواز دی تو وہ بھاگا بھاگا میرے پاس آیا اور اس نے ٹوٹی پھوٹی آواز میں بتایا۔ ''بڑے صاحب کا خون ہوگیا۔'' یہ کہتے ہی وہ رونے اور بلکنے لگا۔

مجھے اپنے ہوش و حواس پر شبہ ہوا، لیکن لڑکے نے وہی کہا تھا جو میں نے سنا تھا اور وہ وہی لڑکا تھا جو اکبر علی خاں کے ساتھ آتا رہا تھا۔

''بڑے صاحب کا خون ہوگیا صاحب!'' وہ بلک رہا تھا اور میری ٹانگوں سے لپٹ کے اس نے واویلا شروع کردیا تھا۔

''کیا...... کیا......؟'' میں نے پھٹی ہوئی آواز میں کہا، ''کیا بک رہے ہو؟ کون بڑے صاحب؟''

اس سے پہلے کہ میں اسے ٹھوکر مار کے خود سے دور کرتا، اپنے پیروں سے اٹھا کے اسے طمانچے مارتا، اس نے ہذیانی انداز میں بتایا کہ صبح نماز کے وقت مسجد جانے کے لیے لوگ باہر نکلے تو انہوں نے مسجد اور اکبر علی خاں کے گھر کے نزدیک باغیچے کی باڑ میں ان کی لاش دیکھی، خون میں لت پت......لڑکے کی زبان اکڑ گئی اور وہ میرے قدموں پر سر پٹکنے لگا۔

وہ جانے کیا کہتا رہا، میں گنگ کھڑا اسے دیکھا کیا۔

''آپ چلو صاحب ابھی۔ بیگم صاحب کی حالت بہت خراب ہے۔'' اس نے گھگھیا کر کہا۔

میں اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ میری رگوں میں خون جم گیا تھا اور آنکھوں پر اندھیرا چھانے لگا تھا۔

اسی لمحے نرس امی کمرے کے دروازے سے مجھے پکارتی ہوئی باہر نکلی اور میرے پاس آکے ٹھٹک گئی۔ اس کی آمد پر لڑکے نے میری ٹانگیں چھوڑ دیں اور مجھ سے دور ہوگیا۔ اس کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔

''کیا......کیا بات ہے؟'' امی نے ہڑبڑا کے پوچھا۔

میں اسے کیا بتاتا۔ میری خاموشی پر وہ لڑکے کا

کندھا جھنجھوڑنے لگی۔ ''کیا ہے؟ کیا بات ہے؟ تم روتا کیوں ہے؟''

لڑکے نے پہلے میری طرف دیکھا پھر سسکتی آواز میں امی کی سماعت کو آزمائش سے دوچار کیا۔

''کا......کا بولتا ہے؟'' امی سراسیمگی سے بولی۔ ''ایسا کیسے؟ نہیں، نہیں۔''

لڑکا سر جھکائے روتا رہا۔ امی نے مجھے ٹہوکا دیا اور تصدیق چاہی۔ میری جانب دیکھ کے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ ایک جہاں دیدہ عورت تھی۔ عمر رسیدگی سے برداشت مشروط ہے۔ اس نے لڑکے کی کمر تھپکی، اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور آدھی انگریزی، آدھی ہندوستانی میں تسلی دلاسے دینے لگی۔ اس نے لڑکے کو گھر واپس جانے کی ہدایت کی۔ لڑکے نے مجھ سے کچھ پوچھنا چاہا۔

''تم ابھی ایدر سے جاؤ۔'' امی نے حکمیہ انداز میں کہا، ''جاؤ ابھی۔''

لڑکا کچھ دیر شاید میرے کچھ کہنے کے انتظار میں کھڑا رہا۔ میرا دماغ ہی کام نہیں کر رہا تھا۔ میں اس کے ساتھ چل پڑا کہ امی نے میرا ہاتھ جکڑ کے مجھے روک لیا اور لڑکے کو چلے جانے کا اشارہ کیا۔

''اپنے کو سنبھالو۔'' خود اس کی آواز بکھری ہوئی تھی۔ ''ایسا کیسے ہوگیا، ابھی رات کو تو وہ......نہیں نہیں۔'' وہ سر جھٹکنے لگی۔ ''ایسا کیسے۔''

میں پتھرائی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کے بے ربطی سے انگریزی میں کہا۔ ''ڈاکٹر رائے تمہیں اندر بلا رہے ہیں۔ تمہارے بھائی کی حالت اس وقت خاصی بدتر ہے۔ اس نے ڈاکٹر سے کچھ باتیں کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ تم ابھی اندر چلو مگر......مگر تمہارا اس وقت اندر جانا......میں ڈاکٹر سے کیا کہوں؟'' وہ بری طرح بدحواس نظر آرہی تھی۔ ''ٹھیک ہے، میں اندر جا کے دیکھتی ہوں۔ کہیں جانا مت......کہیں بھی نہیں۔ سمجھے۔''

مجھے تنہا چھوڑ کے وہ تقریباً بھاگتی ہوئی کمرے کی طرف گئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہوتے اس نے کئی بار مجھے مڑ کے دیکھا۔ مجھ سے اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ میں نے وہیں راہ داری کے چبوترے پر بیٹھنا چاہا لیکن دوسرے لمحے دو تین ڈاکٹروں کے ساتھ ڈاکٹر رائے کمرے کے دروازے پر نمودار ہوا اور میری جانب لپکتا ہوا آیا۔ ''کیا......کیا کہتی ہے یہ امی؟'' اس نے وحشت آمیز لہجے میں کہا اور ایک سانس میں جانے کیا کچھ کہتا اور پوچھتا رہا۔

میں نے کچھ سنا، کچھ نہیں اور کوئی جواب نہ دے سکا۔

''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟'' اس نے جھنجھلاتی آواز میں پوچھا۔

امی بھی کمرے سے آگئی تھی۔ اسکی دخل اندازی پر ڈاکٹر رائے نے پھر مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ امی ہی اس سے کچھ کھسر پھسر کرتی رہی۔ کچھ لمحوں تک ڈاکٹر خاموش رہا پھر میرا بازو تھام کے مجھے کمرے میں لے جانا چاہتا تھا کہ لوٹ پڑا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کے اپنے ساتھی ڈاکٹروں کو آگے چلے جانے کی تاکید کی اور تیز قدموں سے راہ داری میں چلتا ہوا کچھ دیر بعد ایک کمرے میں داخل ہوگیا۔ یہ ایک مختصر اور صاف ستھرا کمرا تھا۔ وہاں موجود نرس اور ڈاکٹر کھڑے ہوگئے۔ ڈاکٹر رائے کے تیور سے انہوں نے اس کا عندیہ سمجھ لیا اور رسٹ پٹاتے ہوئے باہر نکل گئے۔ میز کے اطراف رکھی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر مجھے بٹھا کے ڈاکٹر رائے میرے برابر کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''مجھے معلوم ہے، یہ سن کے تم پر کیا گزر رہی ہوگی۔'' وہ اضطراری لہجے میں بولا ''لیکن یہ ایسا واقعہ نہیں جو تم اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہو۔ مجھے بتاؤ یہ سب کیوں اور کیسے ہوا؟''

''کیا بتاؤں ڈاکٹر صاحب!'' میں نے ٹوٹی پھوٹی آواز میں کہا۔ ''مجھے کچھ نہیں معلوم۔''

''مجھ سے ذرا ہوش میں آکے بات کرو۔'' ڈاکٹر رائے کا لہجہ ترش ہوگیا۔ ''رات کو کتنے بجے تک وکیل صاحب تمہارے ساتھ تھے؟''

''وہ ایک بجے کے بعد یہاں سے اٹھے تھے۔''

''ایک بجے کے بعد؟'' وہ جزبز ہو کے بولا۔

''نرس امی نے آکے ہمیں ٹوکا تھا کہ ایک بج چکا ہے۔ وہ فوراً اٹھ گئے، لیکن اس کے بعد بھی وہ کوئی بیس پچیس منٹ بعد اسپتال سے رخصت ہوئے تھے۔ اس دوران صدر دروازے کے راستے میں وہ رک رک کر باتیں کرتے رہے۔ یہاں سے جانے کو ان کا جی نہیں چاہتا تھا۔ مگر گھر کہہ کے نہیں آئے تھے وہ۔ صدر دروازے پر میں نے ان سے کہا بھی میں ساتھ چلتا ہوں، اسی تانگے سے واپس آجاؤں گا۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ کہنے گے، یہ میرا شہر ہے میاں، بہت اعتماد تھا، انہیں اپنے......'' میری آواز سسکنے لگی۔

''پھر تم اپنے کمرے میں واپس آگئے؟''

''جی ہاں، رات بہت ہوگئی تھی۔ کچھ دیر میں جاگتا رہا، پھر نیند آگئی۔''

ڈاکٹر چند لمحے چپ رہا، پھر بولا، ''انہوں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ وہ اس شہر کے مشہور وکیل تھے، یہیں کے رہنے والے، بہت خاندانی آدمی۔ کون ان کا دشمن ہوسکتا ہے؟''

میرے سینے میں آگ سی بھڑکی۔ میں نے کچھ کہنا چاہا اور مشکل سے اپنی زبان بند رکھی۔

''تمہاری ان سے اس شہر میں آنے کے بعد ملاقات ہوئی تھی؟'' ڈاکٹر کے تند و تیز لہجے سے مجھے اور گھٹن ہونے لگی۔ ''اس سے پہلے تم انہیں نہیں جانتے تھے؟''

''دو دن ہی۔'' میں نے مختصراً کہا۔ ''بس دو دن سے۔''

''رات وہ تم سے کیا باتیں کرتے رہے؟''

''یہی اپنے گھر بیوی بچوں کی۔''

''اور تم کہتے ہو، تمہاری جان پہچان کو دو ہی دن ہوئے تھے۔'' ڈاکٹر کی آواز میں تلخی نمایاں تھی۔

''لیکن اس مختصر مدت میں وہ مجھے بہت قریب سمجھنے لگے تھے۔ وہ بہت اچھے، بڑے صاف دل آدمی تھے میں نے ایسے لوگ بہت کم دیکھے ہیں۔ لگتا تھا، جیسے ہم برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔'' میرا جی امڈنے لگا اور آنکھوں سے آنسو پھوٹ پڑے۔

''نا، نا اس طرح نہیں۔'' وہ تنبیہی آواز میں بولا۔ ''تمہیں اندازہ ہے، پولیس کسی بھی وقت یہاں آکے تم سے تفتیش کرے گی۔ ممکن ہے، راستے میں ہو۔ بہتر ہوگا کہ اس کے آنے سے پہلے مجھے صاف صاف بتاؤ۔ مجھے شبہ ہے، تم نے مجھ سے کچھ چھپایا ہے اور اب بھی یہی کر رہے ہو۔ اصل بات سے واقف ہو کے شاید میں تمہارے کسی کام آسکوں۔''

میں سر جھکائے بیٹھا اپنے آپ کو نوچتا رہا۔

''تمہارا کسی پر شبہ ہو تو بتاؤ۔ تم سے رات انہوں نے اتنی باتیں کی تھیں۔ کسی کی طرف انہوں نے کوئی اشارہ کیا، کوئی ایسی بات؟'' ڈاکٹر کی پیشانی پر شکنیں پھیل گئیں۔

میں اسے کیا بتاتا، کیا نہیں۔ خاموشی کا اب کوئی محل بھی نہیں تھا۔ جلد، یا بدیر، اب تو سب کچھ عیاں ہو جانا تھا۔ میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ''سب کچھ میری وجہ سے ہوا ہے۔''

''کیا؟'' ڈاکٹر رائے اچھل پڑا۔ ''کیا کہتے ہو، تمہاری وجہ سے؟''

''میرا منحوس سایہ جوان پر پڑ گیا تھا۔''

''کیا فضول باتیں کر رہے ہو۔''

''ایک جگہ اور ایک آدمی کی بات نہیں ڈاکٹر صاحب! پہلے بھی کتنی بار ایسا ہو چکا ہے۔ یہاں بھی

یہی ہوا۔"

"تم اپنے ہوش وحواس میں نہیں ہو شاید۔" ڈاکٹر رائے کا چہرہ بگڑ گیا۔

"یہی کچھ ہے ڈاکٹر صاحب! نہ ہم یہاں آتے، نہ انتھونی اپنی جان سے جاتا، نہ اکبر علی خاں اور......اور نہ کوئی اور......"

"انتھونی! انتھونی کا اس سے کیا تعلق ہے؟" ڈاکٹر رائے بپھر کے بولا۔

"آپ نہیں سمجھیں گے۔" میں نے ڈوبتی آواز میں کہا۔ "میں آپ کو کیا بتاؤں، ہم بہت برے لوگ ہیں ڈاکٹر صاحب۔"

ڈاکٹر نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور جبری سا ضبط کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے کھل کے بتاؤ دوست! میں واقعی کچھ سمجھنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں سمجھتا تم کوئی برے آدمی ہو، تم یا تمہارا بھائی...."

"آپ ایک دوسرے، ایک مثبت آدمی ہیں، بہتر ہوگا، آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ آپ بہت الجھ جائیں گے۔ یہاں بہت سے لوگوں کو آپ کی ضرورت ہے۔ ایسی باتیں ہمارے لیے نئی نہیں ہیں۔ ہم بھگتتے رہتے ہیں، لیکن آپ......"

ڈاکٹر جھجکتی نگاہوں سے تا دیر مجھے دیکھتا رہا۔ "تم کون ہو؟"

درشتی کے باوجود اس کے لہجے سے ہیبت عیاں تھی۔ کچھ توقف کے بعد وہ بے اعتنائی سے بولا۔ "ٹھیک ہے۔ مجھے کچھ بتانا چاہتے ہو تو کہو، ورنہ مجھے اور بہت سے کام ہیں۔ میرا کوئی زیاں نہیں کہ میں تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دوں۔ تم یہاں اس اسپتال میں ہو اور کسی طور اس افسوس ناک واقعے کا تعلق اسپتال سے بھی نکل آتا ہے اور اسپتال کا اپنا ایک نام اور اپنی ایک عزت ہے۔ مجھے تم پہلی نظر میں بہت سے نوجوانوں سے ایک مختلف نوجوان نظر آئے تھے، اس لیے......" وہ کہتے کہتے رک گیا اور پہلو بدلنے لگا۔

"ایسی باتیں نہ کیجیے ڈاکٹر صاحب!" میں نے عاجزی سے کہا۔ "آپ نے مجھ ایک اجنبی کو بہت عزیز رکھا ہے، بہت اچھا سلوک کیا ہے مجھ سے، لیکن میری بدقسمتی ہے، عزت مجھے راس نہیں آتی۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ کچھ بھی غلط نہیں تھا۔ بہت سیدھی سی بات ہے۔ اپنے بھائی کے علاج کے لیے مجھے یہاں آنا پڑا تھا۔ بھائی کی کیا حالت تھی اور اب کیا ہے، یہ آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ ہم تو کہیں اور جا رہے تھے۔ بس یہاں آ کے مجھ سے ایک چھوٹی سی غلطی ہو گئی۔ غلطی تھی بھی، یا نہیں۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ ایک ذرا سی بات اتنی دور تک جا سکتی ہے، پھر ایک کے بعد ان ہونی، ناگہانی سے واسطہ پڑتا رہے گا۔ میں آپ کو کیا کیا اور کس حد تک بتاتا کہ پرسوں آدھی رات کے بعد آنے والے لوگ کسی اور کی نہیں، میری جستجو..... میں آئے تھے۔ نرس ایمی نے احتیاط کی، جانے کیا سوچ کے اس نے منع کر دیا کہ میں کمرے میں موجود نہیں ہوں۔ انہیں حجت کرنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ ادھر سے اسپتال کے عملے نے شور مچا دیا۔ ان کے تعاقب سے وہ درندے بوکھلا گئے اور بھاگ کھڑے ہوئے، مگر صدر دروازے پر انتھونی ان کے آڑے آ گیا اور اپنی جان دے بیٹھا۔ وہ لوگ تو مجھے ختم کرنے آئے تھے۔

میں کل صبح بھی آپ کو اصل بات بتا سکتا تھا کہ انتھونی کیوں مارا گیا۔ وہ غریب تو ایک طرح سے چارا بن گیا......اور اس نوجوان سے زندگی چھیننے والے ہی نہیں، اس سے پہلے، آپ کو یاد ہوگا، کمرے میں آپ کی موجودگی کے درمیان جو دو پولیس افسر آئے تھے، وہ بھی اس سلسلے کی کڑی تھے۔ پردہ پوشی بے مصلحت نہیں تھی ڈاکٹر صاحب! آپ میرے بھائی کا علاج جس تن دہی سے کر رہے ہیں، آپ نے میری تلخ باتیں جس تحمل اور ناز سے برداشت کیں، میرا تو رواں رواں آپ کا احسان

مند ہے...... میری جگہ آپ ہوتے تو شاید یہی کچھ کرتے۔ میرے اور بھائی کے بارے میں آپ کے کسی ناخوش گوار تاثر سے بھائی کا علاج متاثر ہونے کا اندیشہ بے جا تو نہیں تھا۔ بھائی بیمار ہے اور آپ ڈاکٹر ہیں۔ کسی اور جانب آپ کی توجہ بھٹک جانے، ان ناگفتنی سے آپ کو دور رکھنے، خواہ مخواہ آپ کے منتشر اور پریشان ہو جانے کے خیال سے میں نے زبان بند رکھی۔ امی کو میں نے سارا کچھ بتا دیا تھا اور بہت کچھ نرس سیورین کو بھی۔ میری التجا پر وہ خاموش رہیں۔"

"تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔" ڈاکٹر رائے الجھ کے بولا۔ اس کے چہرے پر وحشت چھائی تھی۔

"آ جائے گا اب سبھی کچھ۔" میں نے ناتوانی سے کہا۔ "مجھے آپ سے کچھ نہیں چھپانا۔ پردے کا اب کچھ حاصل نہیں۔ آپ جو چاہیں، فیصلہ کریں۔ جو ہو چکا ہے، اس سے بدتر کیا ہو سکتا ہے۔"

"میں، میں جاننا چاہتا ہوں۔" ڈاکٹر حتمی لہجے میں بولا۔

میں نے اسے بٹھل کو اسپتال میں داخل کرنے کے بعد دوسری صبح لباس تبدیل کرنے لیے ہوٹل جانے اور ڈاک خانے جا کے گھر تار دینے، بٹوا چھن جانے پر چور کا پیچھا کرنے اور وہاں پیش آنے والے حادثے کے متعلق بتایا۔ میں نے کہا، "مجھے جلد از جلد اسپتال واپس پہنچنا چاہیے تھا۔ لیکن ادھر پولیس نے تعاقب شروع کر دیا تھا۔ میری کوئی غلطی نہیں تھی، لیکن سامنے آ جانے کے بعد پولیس کے طریق کار، رسمی کارروائیوں، تفتیشی مراحل سے گزرنے میں وقت لگ سکتا تھا۔ شہر میں میرا کوئی شناسا نہیں تھا۔ ایک ہجوم تانگے کے پیچھے تھا، پولیس کے علاوہ، عام لوگ بھی۔ ایک جگہ سڑک کے موڑ پر تانگا ہجوم سے اوجھل ہوا تھا کہ تانگے سے کود کے میں قریب کی ایک گلی میں داخل ہو گیا۔ راستے معلوم نہیں تھے، گلیوں گلیوں بھٹکتا رہا، پھر ایک جگہ ہجوم کا شور سن کے اور کوئی چارہ نہ دیکھ کے میں نے ایک مکان کے دروازے پر دستک دی۔ جواب میں آنے والے شخص کو اپنی مشکل بتانے اور کچھ دیر کے لیے پناہ کی بھیک مانگنے کا نتیجہ بہتر نکلنے کی توقع نہیں تھی۔ اپنی صفائیوں اور صراحتوں کے لیے وقت بالکل نہیں تھا۔ گلی کا کوئی راہ گیر مجھے ایک مکان کے دروازے پر کھڑا، مکان کے مکین سے حجت کرتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ پولیس والوں کو تانگے والے نے یقیناً بتا دیا ہوگا کہ میں کس جگہ، کس طرف کی گلیوں میں گم ہوا ہوں گا جو ان کا رخ اس طرف ہو گیا تھا۔

دستک کے جواب میں دروازے پر نمودار ہونے والے شخص کو مجھے چاقو کی زد پر لینا پڑا۔ اسے گھر میں دھکیلتے ہوئے میں نے دروازے کی کنڈی لگا دی۔ وہ صاحب اکبر علی خاں تھے۔"

"اکبر علی خاں! وکیل صاحب؟" ڈاکٹر رائے حیرانی سے بولا۔

"وہ بیوی بچوں کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ سبھی کا جو حال ہونا تھا، وہ ہوا۔ مکینوں کی بود و باش، طور اطوار اور اپنے لیے اس گھر کی صورت حال سے مطمئن ہو کے میں نے اس طرح ان کے گھر میں گھسنے پر معذرت چاہی۔ اپنی آمد کا مقصد بتایا اور کچھ دیر پہلے ڈاک خانے والی گلی میں پیش آنے والا واقعہ سنایا۔ میں نے گھر کی کسی چیز کو ہاتھ لگایا تھا، نہ کسی کو زک پہنچائی تھی۔ پناہ کے سوا میرا کوئی اور مطالبہ بھی نہیں تھا۔ وکیل صاحب نے میری روداد توجہ سے سنی۔ وہ دنیا دیکھے ہوئے ایک سچے اور کھرے آدمی تھے۔ انہیں مجھ پر یقین آ گیا۔ میں نے بھی پھر ان پر اعتبار کر کے چاقو جیب میں رکھ لیا اور بیوی بچوں کو بیٹھک سے گھر کے اندر جانے کی اجازت دے دی۔"

"تم سچ بول رہے ہو؟"

"میرے پاس یہی کچھ ہے کہنے کے لیے۔" میں نے کشیدہ لہجے میں کہا۔

"تم ہمیشہ چاقو پاس رکھتے ہو؟"

میں نے سر جھکانے پر اکتفا کی۔

"مگر کیوں؟ کس لیے؟"

"ہمیں ایسے واقعات سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

ڈاکٹر کی پھیلی آنکھیں مجھ پر مرکوز ہو گئیں۔ "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" وہ گہری سانس بھر کے بولا۔ "تو تم نے اکبر علی خاں صاحب کو قائل کر لیا۔"

میں نے اسے بتایا، یہ اتفاق تھا، یا یوں کہیے، میری خوش قسمتی تھی کہ میں نے اکبر علی خاں جیسے صاحبِ دل کے مکان پر دستک دی۔ انہوں نے مجھ سے ہم دردی کا اظہار کیا اور مجھے اس عذاب سے نجات دلانے کے لیے طرح طرح کی تدبیروں پر غور کرتے رہے۔ ڈاک خانے کی گلی میں جس آدمی کی پسلی میں چاقو پیوست ہو گیا تھا اور جس بدحواس آدمی نے ناپختگی اور نادانستگی میں اپنے ہی ساتھی کو زخمی کر دیا تھا وہ اور وہ تیسرا بھی، جس نے میری جیب سے بٹوا چرایا تھا، تینوں شہر کے نامی گرامی استاد میدا کے آدمی تھے۔ ان میں سے کسی ایک کی زبانی مجھے میدا استاد سے ان کی وابستگی کا علم ہو چکا تھا۔

ڈاکٹر کچھ بولنا چاہتا تھا، لیکن خاموش رہا۔ میں نے کہا کہ ہر جگہ، شہر کے دادا، یا استاد کے اڈے کی ہیبت چھائی رہتی ہے۔ پولیس بھی کسی سنگین واردات میں دادا اور اس کے ساتھیوں پر ہاتھ ڈالتے ہوئے دس مرتبہ سوچتی ہے۔ ظاہر ہے، میدا استاد کے آدمیوں کے اشارے پر پولیس حرکت میں آئی تھی۔ میدا کا ایک ساتھی زخمی ہو گیا تھا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ زندہ بھی رہ سکے گا یا نہیں۔ میں تو فوراً گلی سے چلا آیا تھا۔ اس تمام واقعے کے گواہ گلی کے مکین اور راہ گیر تھے، لیکن یہ میدا استاد کے اڈے کا معاملہ تھا۔ گلی کے لوگ اور راہ گیر اس کے زور و اثر سے واقف تھے۔ طاقت سب سے بڑا سچ ہوتی ہے۔ اڈے کے ساتھیوں اور عام لوگوں کی نظروں میں اپنی ساکھ برقرار رکھنے کے لیے استاد میدا کو فوراً سرگرم ہو جانا چاہیے تھا۔ پولیس اور شہر میں بکھرے ہوئے میدا کے ساتھیوں سے اپنے آپ کو چھپاتے ہوئے اسپتال پہنچنا ممکن نہیں رہا تھا۔

اکبر علی خاں نے معاملہ دب جانے تک مجھے اپنے گھر میں روپوش ہونے کا مشورہ دیا اور مہربانی کی انتہا کر دی۔ انہوں نے کہا کہ میری عدم موجودگی میں وہ اسپتال جا کے بٹھل کی خبر گیری، نگرانی کرتے رہیں گے۔ اس دوران، بہتر ہوگا کہ میں تار دے کے اپنے عزیزوں اور دوستوں میں سے کسی کو یہاں بلا لوں، مگر ان کا کوئی مشورہ صائب نہیں لگتا تھا۔ مجھے یاد تھا ڈاک خانے والی گلی میں، میں نے میدا کے بددماغ ساتھیوں سے اسپتال کا ذکر کیا تھا۔ تانگے والا بھی مجھے اسپتال سے ہوٹل، پھر ڈاک خانے لے گیا تھا اور واپسی میں بھی اس کا رخ اسپتال ہی کی طرف تھا۔ ان شواہد اور اسپتال سے میرے غیاب اور اکبر علی خاں کی موجودگی سے وہ ساری صورت حال بھانپ لیتے اور یوں اپنے گھر میں مجھے پناہ دینے کی فیاضی اکبر علی خاں کو بڑی مہنگی پڑ سکتی تھی۔ بٹھل کو اس حالت میں تنہا چھوڑا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا کہ مریض کو چھوڑ کے تیمار دار کے غائب ہو جانے پر سب سے زیادہ وحشت اسی کو ہوتی، اس کے دماغ میں جانے کیسے کیسے وہم نمو پاتے، اسپتال کے عملے میں بھی چہ میگوئیاں ہونے لگتیں، ویسے بھی مجھے یقین تھا میں اسپتال پہنچنے میں کام یاب بھی ہو جاؤں تو جلد یا بہ دیر میدا اور اس کے حاشیہ بردار سرا پکڑتے ہوئے میرے سر پر آ دھمکیں گے۔ میں نے اکبر علی خاں کے سارے مشورے مسترد کر دیے اور

میدا استاد سے بہ ذات خود ملنے کا ارادہ کیا۔ اکبر علی خاں نے مجھے بہت سمجھایا بجھایا۔ میدا جیسے خطرناک آدمی سے دور رہنے کی تلقین کی، لیکن پھر اور کیا صورت تھی۔ میرے ارادے میں کوئی لچک نہ دیکھ کہ انہوں نے خود بھی میرے ساتھ چلنے کی جرأت کرلی۔ میں انہیں اس معاملے سے الگ ہی رکھنا چاہتا تھا۔ وہ نہیں مانے اور ہم دونوں میدا کے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔"

"میدا کے ٹھکانے پر؟" ڈاکٹر رائے اچھل پڑا۔ "یہ جانتے ہوئے کہ میدا کون آدمی ہے۔"

"پھر میں کیا کرتا۔ یہی ایک آخری راستہ رہ جاتا تھا۔ میں خود اس کے پاس پہنچ جاؤں اور اسے سچ بتاؤں کہ میں نے اس کا کوئی آدمی زخمی نہیں کیا ہے۔ میں ایسے وقت جب میرا بھائی زندگی کے لیے جدوجہد کررہا ہے، کس طرح کسی عناد و فساد کا خطرہ مول لے سکتا تھا۔ میرا خیال تھا وہ اڈے کے طور طریقوں میں کھرا ہے جیسا کہ اڈوں کی چوکی پر بیٹھنے والے بیش تر دادا، استاد لوگ ہوتے ہیں تو وہ میری بات سنے گا۔ میں میں اس سے کہوں گا کہ گلی کے لوگوں سے تصدیق کیے بغیر اسے کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ میرا بٹوا چھینا گیا تھا۔ چوروں کا تعاقب کرکے اور اسے زیر کرکے میں نے بٹوا حاصل کرلیا تو کیا غلط کیا تھا۔ پھر اس کے دو ساتھی اپنے چور ساتھی کا انجام دیکھنے کے باوجود زیادتی پر کیوں اتر آئے۔ انہیں جاننا چاہیے تھا کہ کوئی آدمی، چور کو قابو میں کرسکتا ہے تو ان کے لیے بھی بھاری پڑسکتا ہے۔ وہ چند ہاتھ کے بھی نہیں تھے۔ بات بڑھ جانے کے خیال سے میں نے ہاتھ باندھے رکھے، اپنا چاقو بھی نہیں نکالا۔ وہ دونوں جانے کس خمار میں تھے، اپنے ساتھی کی ہزیمت سے ہوش وحواس کھو بیٹھے تھے مرنے مارنے پر تل پڑے۔ رفع شر کے لیے میں نے اپنا بٹوا بھی ان کی نذر کرنا چاہا۔ گلی کے لوگوں کو میدا کی ہیبت دہشت سے امان ملے تو ضرور سچ بولیں گے۔ میں نے سوچا، میدا سے کہوں گا کہ میری اس کی کوئی عداوت نہیں ہے۔ مجھے تو اپنے بھائی کی وجہ سے اس شہر میں رکنا پڑا۔ حقیقت اس سے کچھ دور نہیں ہے۔ اسے پٹنا میڈیکل کالج کے اسپتال تک جانے کی زحمت کرنا پڑے گی لیکن میدا کے سامنے جاکے میں نے یہ کچھ نہیں کہا۔ ایک نظر میں اندازہ ہوگیا تھا کہ اسے بہت عرصے سے چاقو اٹھانے کی ضرورت نہیں پڑی ہے۔ جسم پر چربی کی ہلکی سی تہہ جم چکی تھی۔ آدمی کے جسم پر اگتی چربی لوہے سے چمٹنے والے زنگ کے مانند ہوتی ہے۔ میں نے استاد میدا سے کہا، میں اڈے کی چوکی کا دعوے دار بن کے آیا ہوں۔ اڈوں کی جوریت ہے، وہ چوکی سے خود اتر جائے یا پھر چاقو نکال کے تمام ساتھیوں کے سامنے دعوے دار سے زور کرے اور چوکی پر موجود رہنے کا حق ثابت کرے۔"

"تم نے اس کے ٹھکانے پر جاکے اسے چاقو آزمائی کی دعوت دی؟" ڈاکٹر رائے ہیجانی آواز میں بولا، "تم ...... تم۔" وہ ہکلانے لگا اور اس نے پوچھا، "کس اعتماد میں ......؟"

"کہ میں اسے زیر کرلوں گا۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"یعنی تم اسے زیر کرسکتے تھے؟"

"کسی قدر امکان مغلوب ہوجانے کا بھی تھا۔"

"تو، تو کیا ہوتا؟" ڈاکٹر رائے نے تلخی سے پوچھا۔

"میں زیر ہوجاتا۔ یوں بھی تو اس کے شکنجے میں تھا۔"

"تمہیں اپنی چاقو بازی پر اتنا اعتماد کس وجہ سے ہے؟"

"صرف چاقو نہیں، اور بھی ایسی کئی چیزوں کی مجھے تربیت دی گئی ہے۔"

"تربیت دی گئی ہے؟"

"ہاں۔" میں نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اقرار کیا۔ "میری زندگی میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ مجھے یہ سب کچھ سیکھنا پڑا۔"

"تم تو ایک پڑھے لکھے نوجوان معلوم ہوتے ہو۔"

"یہ بھی ایک تعلیم ہے، اپنے آپ کو خطروں سے نمٹنے کے لیے تیار رکھنا۔ یہ بھی تو زندگی کا ایک حصہ ہے۔"

اس کے ہونٹ سکڑ گئے اور اس نے سر ہلا کے تذبذب سے تائید کی "تو میدا چوکی سے اتر آیا؟"

"اتنا آسان نہیں تھا اس کے لیے۔ وہ جانے کب سے اڈے کی چوکی پر بیٹھا ہوا تھا۔" میں نے ڈاکٹر رائے کو ساری تفصیل بتائی کہ اپنے ٹھکانے پر ایک اجنبی کی اس طرح اچانک آمد اور مبارزت کے لیے مسلسل اصرار سے اسے چوکنا اور محتاط ہوجانا چاہیے تھا۔ ڈاک خانے والی گلی کا واقعہ بھی پیشِ نظر ہوگا۔ اڈے پر اس کے تقریباً سارے ساتھی موجود تھے۔ اس کا تو سب کچھ داؤ پر لگ چکا تھا، منصب، عزت، دبدبہ۔ اس نے میرا مذاق اڑانے، پھبتیاں کسنے اور زور آزمائی کے نتیجے میں ذلت و رسوائی سے دوچار ہوجانے، طرح طرح سے میرا عزم شکستہ کرنے اور خبردار کرنے کی کوشش کی۔ اس دوران اکبر علی خاں نے دخل اندازی کی اور جتنے مؤثر انداز میں میری پے روی کرسکتے تھے، انہوں نے اپنا ہنر آزمایا۔ انہیں احساس تھا، یہ عدالت نہیں ہے۔ وہ ایک مختلف جگہ پر اور مختلف لوگوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ انہیں نت نئی دلیلیں تراشنے اور بیان میں سوز وگداز پیدا کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ دلیل وبیان صداقت پر مبنی ہوں تو ان کی توانائی ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ ان کا انداز غیر جانب دارانہ، نپا تلا اور جو کچھ میں نے ان سے کہا تھا اور انہوں نے یقین کرلیا تھا، بجنسہ اسی کے مطابق تھا۔ جو سچ اڈے پر جاکے میں استاد میدا کو باور کرانا چاہتا تھا اور میدا کو دیکھ کے میں نے ارادہ بدل دیا تھا، وہ کام نہایت خوش وضعی سے اکبر علی خاں نے انجام دے دیا تھا۔

اڈے کے لوگوں کے ہجوم میں میدا کو اپنی بات بنی رہنے کی بے چینی شدید ہوگی۔ اکبر علی خاں کے بیان نے اسے کئی جواز فراہم کردیے تھے، مجھ سے کشادہ دلی کا سلوک کرنے اور سر دست یہ نازک مرحلہ حسن وخوبی سے ٹل جانے کے جواز۔ میدا کے پہلو نشیں عمر رسیدہ شخص نے یہ موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اس آزمودہ کار نے دریا دلی کے اظہار میں پہل کی اور درمیان کی راہ نکالی اور میدا کو بظاہر بادل ناخواستہ ایک فیصلہ کرنے پر مجبور کردیا۔ میدا نے اپنے ساتھیوں کی دل جمعی کے لیے چاقو نکال لیا تھا اور چوکی سے اترا چاہتا تھا کہ بزرگ ساتھی نے اس کا ہاتھ پکڑ کے چاقو اپنی تحویل میں لے لیا اور کوئی لمحہ گنوائے بغیر نشانہ لے کے میری طرف اچھال دیا۔ میں نے اسے اچک لیا۔ میں انکار کرسکتا تھا، لیکن میں نے وقت کی یہ رعایت غنیمت جانی کہ مجھے میدا کے اڈے، چوکی سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ مجھے تو اسپتال پہنچنے کا راستہ صاف کرنا تھا۔ جواب میں میں نے بھی اپنا چاقو بوڑھے آدمی کی طرف اچھال دیا جو اس نے مہارت سے گرفت میں لے لیا۔"

"اس کا کیا مطلب ہوا؟" ڈاکٹر نے بے چینی سے پوچھا۔

میں نے اس کنائے کا مطلب اسے سمجھایا کہ سر دست مبارزت ملتوی کی جاتی ہے۔ ایک دوسرے کے چاقو ایک دوسرے کے پاس اس وقت تک امانت رہیں گے جب تک میں اپنا چاقو واپس لینے نہ آجاؤں۔ بزرگ نے میدا کی طرف سے اعلان کیا کہ میدا مبارزت کے لیے آمادہ ہے، لیکن ایسے وقت میں جب اس کی ہم سری کا دعوا کرنے والا، اڈے کی چوکی کا طلب گار اپنے بھائی کی

علالت کی وجہ سے پریشان اور منتشر ہے، معرکہ آرائی مناسب معلوم نہیں ہوتی۔ میدا اپنے مقابل کو ذہنی پراگندگی سے چھٹکارا پانے کی مہلت دیتا ہے کہ اس پر مخالف کی مضطربانہ حالت سے فائدہ اٹھانے کا الزام نہ آنے پائے۔ یہ میدا کے اپنے اطمینان کا معاملہ بھی ہے کہ کسی ایک سو مخالف سے پنجہ آزمائی کر کے ناکامی اور کام یابی، دونوں صورتوں میں اسے خود سے کوئی شکایت اور اپنے ساتھیوں کے سامنے ندامت نہیں ہوگی۔ سن رسیدہ آدمی نے مجھے یہ جتانا ضروری سمجھا کہ یہ مہلت میدا کی اعلاظرفی پر محمول کی جائے۔ میدا مبارزت کے لیے میری جلد از جلد واپسی کا منتظر رہے گا۔

اس التوا میں کئی پہلو مضمر تھے۔ چوکی چھن جانے کا خطرہ میدا کے سر سے ٹل گیا تھا۔ اڈے کے آدمیوں کی نظروں میں بڑی حد تک اس کا وقار بحال رہا تھا۔ اس مہلت میں میری طرف سے چوکی کے مطالبے سے دست برداری اور نظر ثانی کا ایک امکان موجود تھا کہ بھائی کی صحت یابی کے بعد میری جانب سے نرمی و نرم دلی کی توقع بجا طور پر کی جاسکتی تھی۔ میدا کو چوکی بچانے کی تدبیروں پر غور کرنے کا وقت مل گیا تھا۔ اس عرصے میں میرا قصہ تمام کردینے کی ایک کوشش بھی کی جاسکتی تھی۔ اس مہلت کی بڑی اہمیت تھی۔ فیصلے پر میں نے کوئی حجت نہیں کی۔ چاقوؤں کے تبادلے سے میری مراد میرا اقرار ہی تھی۔ ہم دونوں، میں اور اکبر علی خاں پھر وہاں سے چلے آئے اور راستے میں کوئی دیوار نہ بنا۔

ڈاکٹر رائے چند لمحے چپ رہا پھر بھاری آواز میں بولا، ''اگر یہ صورت نہ ہوتی؟ میدا اور تمہارے درمیان ہونے والی زور آزمائی میں تم کامیاب ہو جاتے تو اڈے کے آدمی تمہیں بہ خوشی اپنا استاد قبول کر لیتے؟''

میں نے کہا، ''بہ خوشی تو شاید نہیں، لیکن اڈوں کے لوگ اپنے ریتی رواج کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ اڈوں کا یہی دستور ہے کہ سب سے زیادہ زور آور ہی چوکی کا سزاوار ہوسکتا ہے۔ مستعد، درست اور جلد فیصلے کرنے میں طاق اور اڈے کے آدمیوں پر سایہ بنے رہنے کی خوبیاں مستزاد ہیں۔ کسی ناتواں اور مجہول کو وہ چوکی پر دیکھنا پسند نہیں کرتے لیکن پسند کی بات اور ہے، انہیں یہ اختیار نہیں ہوتا کہ وہ اڈے پر موجود استاد کو چوکی سے ہٹا سکیں۔ انہیں بہ جبر ہی اس وقت تک اسے قبول کرنا پڑتا ہے جب تک اس اڈے سے یا باہر سے چوکی کا کوئی نیا طلب گار نہ آجائے اور چوکی پر بیٹھ نہ جائے۔ اڈے کی چوکی کا فیصلہ فرد، فرد ہی کے درمیان ہوتا ہے۔ اڈے کے لوگ باہمی مشاورت سے کسی ایک کو منتخب نہیں کرسکتے۔ ادھر اڈے کی چوکی پر قائم استاد کے سر پر ہمیشہ تلوار لٹکی رہتی ہے۔ اسے کسی بھی نئے دعوے دار سے مبارزت کے لیے ہر وقت کمربستہ رہنا پڑتا ہے۔ اگر وہ سمجھتا ہے کہ دعوے دار کس بل میں اس سے زیادہ توانا ہے تو بہتر یہی ہوتا ہے، وہ خاموشی سے خود ہی چوکی خالی کردے۔ ضد اور غصے سے ذلت کا بھی سامنا کرنا پڑسکتا ہے، بزرگ آدمی نے میدا کی عزت رکھ لی۔ اس نے اڈے کے لوگوں کے سامنے ظاہر یہی کیا کہ میدا نے اس کی بات مان کے اس کا مان رکھا ہے اور بڑا احسان کیا ہے۔''

''تمہیں ان اڈے پاڑوں کی اتنی معلومات کہاں سے حاصل ہوئیں؟'' ڈاکٹر نے تعجب سے پوچھا۔

''مجھے اسی سوال کی توقع تھی۔'' میں نے کسی تامل کے بغیر جواب دیا۔ ''میرا اڈوں پاڑوں سے تھوڑا بہت تعلق رہا ہے۔''

ڈاکٹر نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ ''تو کام یاب ہو جانے کے بعد تم میدا کے اڈے کے مالک بن جاتے۔'' اس نے تکرار کی۔

''میں نے آپ کو بتایا ہے۔ میدا کو دیکھ کے میں اسی نتیجے پر پہنچا تھا۔ میرا یہی خیال تھا کہ اس پر قابو پایا جاسکتا ہے۔''

''نہیں۔'' اس نے کسمساتی آواز میں کہا، ''میں جاننا چاہتا ہوں۔ اڈے کے چوکی پر تم بیٹھنا نہیں چاہتے تھے، پھر تمہاری کام یابی کے بعد اڈے کی سربراہی کی کیا صورت ہوتی؟''

''میں اپنی جگہ کسی کو بھی عارضی طور پر نام زد کرسکتا تھا۔ اس معمر آدمی کو بھی، جو میدا کا مربی معلوم ہوتا تھا، لیکن وہ اڈے کا سربراہ نہیں ہوتا۔ کسی نئے دعوے دار کے اٹھنے کے...... موقع پر مجھی کو اس سے مبارزت کرنی پڑتی۔ اڈے کے عبوری سربراہ کو نہیں۔''

''میرے لیے یہ سارا کچھ حیران کن ہے۔'' ڈاکٹر رائے آنکھیں چڑھا کے بولا، ''یہ تو ایک دوسری دنیا ہے۔''

''میں اسی لیے آپ کو کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔''

ڈاکٹر نے جھرجھری لی۔ ''تم نے کتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ اگر میدا استاد تیار ہو جاتا اور تم......''

میں نے اس کے اندیشے کی تردید کی۔ ''چاقو آزمائی کے لیے بل کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ حاضر دماغی، نگاہ کی برجستگی، مقابل کو حیلوں سے متذبذب کردینے کی مشاقی اور بہت سی باتیں...... میدا کو مجھ اجنبی کے زور اور مہارت کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی تردد کرتا۔ اپنے تین آدمیوں کا انجام دیکھنے اور اڈے پر میرے اس طرح آدھمکنے کے بعد ذہنی طور پر زچ ہو جاتا، سو اس کے لیے یہی مناسب تھا کہ مجھے مہلت دینے کی فیاضی کے بہانے اسے کچھ مہلت مل جائے۔''

''تم نے پہلے بھی میدا جیسے کسی استاد سے چاقو آزمائی کی ہے؟''

مجھے جھجک ہوئی، ایک لحظے کے توقف کے بعد میں اقرار کرلیا۔

''واقعی؟'' وہ حیرت سے بولا۔ ''اور انجام؟''

''انجام بہتر ہونے کی توقع نہ ہو تو اپنے مخالف کو دعوت نہیں دینی چاہیے۔''

''تو...... تو...... تم کبھی کسی اڈے پاڑے کی چوکی پر بیٹھتے رہے ہو؟''

''نہیں......'' میں نے آہستگی سے کہا۔ ''چند روز...... ایک بار کچھ زیادہ...... اپنا آدمی مقرر کر کے میں ہر جگہ سے چل دیا۔'' ڈاکٹر کے کوئی اور سوال کرنے سے پہلے میں نے صراحت کی۔ ''کئی اڈے حاصل کیے اور اپنی مرضی سے نہیں۔ کسی جگہ اڈے کے استاد نے کوئی رکاوٹ کھڑی کی یا اس نے کسی مظلوم شناسا، کسی دوست سے زیادتی کی ظلم روا رکھا تب......''

''اور اڈا حاصل کرنے کے بعد تم وہاں سے چلے آئے؟''

''جی ہاں۔ اس لیے کہ میرا کام اڈاگیری نہیں ہے۔''

''کتنے اڈوں کے استادوں سے تم نے زور آزمائی کی؟'' ڈاکٹر رائے کی بے قراری بڑھتی جارہی تھی۔

''گنتی یاد نہیں ڈاکٹر صاحب۔''

''یعنی بہت سے......؟''

''بہت زیادہ تو نہیں۔''

''اور سبھی میں تم سرخ رو ہوئے؟''

میں خاموش رہا۔ خاموشی ہی میرا جواب تھی۔

ڈاکٹر رائے کا منہ کھلا ہوا تھا اور اس کی پلکیں پٹ پٹا رہی تھیں۔ ''تمہارا بھائی بھی ان فنون میں کوئی درک رکھتا ہوگا؟'' اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

''جی ہاں۔'' میں نے مختصراً کہا۔

''تم سے زیادہ؟''

''میں کیا۔ وہ تو دوسرے آدمی ہیں۔ میں ان کے لیے کیا کہوں۔ آپ نے تو انہیں صرف اس

حالت میں دیکھا ہے۔ میں نے ایسی بے چارگی، ایسی غفلت میں انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ وہ تو سوتے میں بھی جاگتے رہتے تھے۔ دیوار پار کا انہیں نظر آجاتا ہے۔ دور دور کی آوازیں ان تک رسا ہو جاتی ہیں۔ ان کا سینہ تو کوئی سمندر ہے۔ ان کے بہت سے بازو ہیں...... وہ تو ایک سایہ ہیں بہت سوں کے لیے...... اور وہ تو کسی چٹان کے مانند ہیں۔ اس حال میں انہیں دیکھ کے مجھ پر جو گزرتی ہے، وہ آپ نہیں جان سکتے۔ وہ، وہ ان سارے فنون میں طاق ہیں۔ میں نے سب کچھ انہی سے سیکھا، لیکن ان کی برداشت، ان کا حوصلہ، ان کا عزم...... میں تو کچھ نہیں ہوں ان کے آگے...... میں کیا......" میری آواز رندھنے لگی۔

ڈاکٹر آنکھیں میچے دیر تک چپ رہا، پھر یکا یک ہڑک کے بولا، "تمہارا بھائی بھی کسی اڈے پاڑے کا راجا ہے؟"

"ہاں۔" میں نے کسی اکراہ کے بغیر جواب دیا، "لیکن اب تو بہت دنوں سے وہ میرے ساتھ مسلسل سفر میں رہتے ہیں۔"

"سفر! سفر کیوں، کاروبار کے سبب سے؟"

"نہیں، کاروبار نہیں۔"

"پھر......؟" مجھ سے فوراً کوئی جواب نہ دیا جا سکا۔ مجھے متردد دیکھ کے اس نے کہا، "کوئی ایسی بات ہے جو مجھ سے نہیں کہنی چاہیے؟"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ کچھ اور مت سوچیے۔ اس معاملے کا اڈے پاڑے سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک طویل روداد ہے اور بہت ذاتی ہے۔ اس کی تفصیل پھر کبھی سہی۔ مختصراً یہ کہ ہمیں اپنے کھوئے ہوئے کسی عزیز کی تلاش ہے۔ ہم ہر طرف اسے ڈھونڈ رہے ہیں، گلیوں گلیوں، شہروں شہروں۔"

"کھوئے ہوئے عزیز کی؟" ڈاکٹر کے چہرے پر لکیریں نمایاں ہو گئیں۔ "کون ہے وہ......؟"

"ہے ایک، جو بچھڑ گیا ہے۔ کیا بتاؤں آپ کو۔"

"کب سے یہ تلاش جاری ہے؟"

"کئی برس ہو گئے، اب تو کوئی چار پانچ سال۔" میں نے بجھی ہوئی آواز میں کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! میں بہت کچھ چھپا سکتا تھا، لیکن یقین کیجیے، میں نے کچھ نہیں چھپایا ہے۔ اس لیے کہ آئندہ پیش آنے والے واقعات سے آپ منتشر نہ ہو جائیں اور میرے بھائی کا علاج آپ کے کسی تکدر، برہمی اور تجسس سے متاثر نہ ہو جائے۔"

"ہشت۔" ڈاکٹر رائے دھتکارتی آواز میں بولا، "کیا فضول بات کر رہے ہو۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے اس سے کہا کہ ڈاکٹر کے سامنے اس کا مریض محض انسان ہوتا ہے۔ وہ چور ہو، یا ڈاکو، یا اڈے پاڑے کا آدمی، لیکن ڈاکٹر بھی انسان ہی ہے۔ انسان ناراض بھی ہوتا ہے، اسے غصہ بھی آتا ہے، دل میں گرہ پڑ جاتی ہے۔

میں نے صاف صاف کہا کہ میں اسے یہ سب بتانے کا پابند نہیں تھا۔ اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اسپتال مندر مسجد نہیں ہوتے۔ چھوت اچھوت، سبھی کے لیے دروازے کھلے ہوتے ہیں، میں یہاں ایک مریض لے کے آیا تھا۔ مریض اور ڈاکٹر کا جو تعلق ہوتا ہے، اسے وہیں تک محدود رہنا چاہیے تھا۔ ڈاکٹر رائے نے میرا بڑا لحاظ کیا۔ پہلی رات معمول کے خلاف وہ میری درخواست پر بٹھل کو دیکھنے آ گیا۔ اس نے بدتہذیبی اور گستاخی کی حد تک میری تند و تیز باتیں برداشت کر لی تھیں۔ اس نے اسپتال کے بہترین کمرے میں ہمیں منتقل کیا اور علاج پر ہر ممکن توجہ مرکوز رکھی۔ کئی اور ڈاکٹروں کو بھی مشاورت میں شریک کیا۔ اس کا یہی احسان اتنا بڑا ہے کہ میں تو اس کے سامنے سر بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ پہلے دن اسپتال سے باہر جانے کے بعد میں شام کو واپس آیا

تو اس مشفق اور نیک نفس آدمی کو یہ بتا کے میں کیوں پریشان کرتا کہ میں کیسی دیواریں عبور کر کے اسپتال پہنچ پایا ہوں۔ جس رات انتھونی بے موت مارا گیا، میں اسے کیسے بتاتا کہ وہ لوگ تو مجھے ختم کرنے کے درپے تھے، لیکن اکبر علی خاں کے سانحے کے بعد صورت بدل چکی ہے۔ پولیس آنے والی ہوگی۔ لاعلمی میں ڈاکٹر رائے کے ذہن میں میرے اور بٹھل کے متعلق کیسے کیسے وہم، کیسی کیسی بدگمانیاں نمو پا سکتی تھیں۔

''بس بس، میں، میں سمجھتا ہوں۔'' ڈاکٹر رائے نے ہاتھ اٹھا کے مجھے روک دیا۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو، لاعلمی میں مجھے حیرت بھی ہوتی، اذیت بھی۔ پولیس یقیناً یہاں پہنچتی ہوگی۔ تم نے کیا سوچا ہے پھر؟''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ میرا تو دماغ ہی کام نہیں کر رہا ڈاکٹر صاحب! میں کیا کہہ پاؤں گا، کس طرف اشارہ کروں گا۔ شاید وہ مجھے ساتھ لے جائیں۔ تو ٹھیک ہے، لے جائیں' لیکن پھر یہاں بھائی کے پاس کون ہوگا۔ کوئی تو ہونا چاہیے ان کے ساتھ۔''

''وہ تو ہم لوگ دیکھ لیں گے۔'' ڈاکٹر بے پروائی سے بولا۔

''بھائی پوچھیں تو آپ کیا بتائیں گے؟''

''کچھ نہ کچھ تو کہنا ہوگا۔''

''وہ نہیں مانیں گے۔ آپ انہیں جانتے نہیں۔ وہ بہت سمجھ بوجھ کے آدمی ہیں۔ بے کل ہو جائیں گے۔''

''دیکھ لیں گے۔'' ڈاکٹر اس کے سوا کہہ بھی کیا سکتا تھا۔

میں نے اسے بتایا کہ کل ہی اکبر علی خاں کے مشورے سے انہی کے ذریعے کلکتے تار دیا تھا، ایک نہیں، دو ارجنٹ تار، یہاں کے مشکل حالات دیکھ کے اپنی دسرات کے لیے ایک دو آدمی بلائے تھے۔ اب تک تو کسی کو آ جانا چاہیے تھا۔

''کون ہیں وہ؟'' ڈاکٹر نے چونک کے پوچھا۔

''انہیں بھائی کا خدمت گار سمجھیے۔''

''سمجھیے، کیا مطلب؟'' اس کے لہجے میں ترشی آ گئی۔

''بھائی کے پروردہ ہیں وہ۔''

''ان کا تعلق بھی اڈے پاڑے سے ہے؟''

''جی ہاں۔''

''کلکتے سے آ رہے ہیں وہ۔ کلکتے ہی میں تمہارے بھائی کا اڈا ہے؟''

''کبھی تھا اور ہاں، ہے بھی۔ اڈا تو انہی کے نام سے قائم ہے۔'' میں نے بھنچی ہوئی آواز میں کہا، ''لیکن اب تو عرصے سے وہ وہاں نہیں بیٹھتے۔ میں نے آپ کو بتایا نا کہ وہ عرصے سے میرے ساتھ سفر کرتے ہیں۔''

''یاد پڑتا ہے، تم نے شروع میں کہا تھا کہ تمہارا گھر فیض آباد میں ہے۔''

''میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ ہم فیض آباد ہی سے آ رہے ہیں۔ وہاں سے بھی کسی کو بلایا جا سکتا تھا، لیکن گھر میں اطلاع دینے سے سبھی پریشان ہو جاتے۔''

''یہ آنے والے لوگ بھی چاقو باز ہوں گے؟''

''آپ کی اور میری طرح اڈے کا ہر آدمی، پہلے آدمی ہوتا ہے۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی میرا لہجہ غیر ارادی طور پر تن سا گیا۔

''ہاں، ہاں، پہلے آدمی، بعد کو چاقو باز۔'' ڈاکٹر رائے ناگواری سے بولا۔ ''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔''

اس کے پے در پے سوالوں سے میری رگیں اینٹھنے لگی تھیں، لیکن اس کے ہر سوال کا جواب مجھ پر واجب تھا۔ کہیں ذرا سا ابہام رہ جانے کی صورت میں اس کے دل میں شک کی گرہ پڑھ سکتی تھی۔ وہ کتنا ہی تردید کرے۔ ہر ذہین آدمی کا وتیرہ شک ہوتا ہے۔ وہ تو یوں بھی ایک نکتہ رس اور جزو بیں شخص تھا۔ کوئی معمولی آدمی اتنا بڑا اور کامیاب ڈاکٹر نہیں ہو سکتا۔ میری دانست میں اب بہت کچھ آئینہ ہو چکا تھا۔ مجھے اور کسی معذرت خواہانہ لہجے کی بھی ضرورت نہیں تھی، لیکن اس کے ظرف کا خیال ہر لمحے ملحوظ رکھنا تھا۔ وہ بار بار کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتا۔ اس دوران میں خود کو اس کے کسی ناروا سوال کے لیے آمادہ کرتا رہتا۔ کبھی کبھی تو مجھے ایسا لگتا جیسے میں کسی ممتحن کے سامنے بیٹھا ہوں، یا عدالت کے کسی جج کے روبہ رو۔ اڈے کے کسی استاد سے زور آزمائی کرتے وقت شاید مجھے کسی اتنی کشاکش کا سامنا نہیں کرنا پڑا ہو' جتنی ڈاکٹر رائے کی دھند دور کرنے کے اس مرحلے میں نازکی کا خیال رکھنا پڑ رہا تھا۔ ہر لمحے مجھے خود کو ٹوکنا پڑتا کہ وہ بٹھل کا معالج ہے اور بٹھل ابھی بستر پر ہے۔ ڈاکٹر رائے اس اسپتال کا نگراں ہے۔ اسپتال کے روایتی پرسکون ماحول میں ہماری آمد کے بعد مسلسل کوئی نہ کوئی ان ہونی ہوتی رہی ہے۔ اسپتال میں آدھی رات کے بعد مسلح آدمیوں کی یلغار، انتھونی کی موت، پولیس کی آمد اور اب اکبر علی خاں کی ہلاکت کے بعد ڈاکٹر رائے میرے اور بٹھل کے لیے کوئی بھی انتہائی قدم اٹھانے کا فیصلہ کر سکتا ہے۔

''تم نے کہا ہے، پولیس تمہیں ساتھ بھی لے جا سکتی ہے، مگر کیوں؟'' اس نے تیز آواز میں پوچھا۔

''پولیس کا اپنا طرق کار ہوتا ہے۔ یہاں میں اجنبی ہوں اور بہت بے سہارا بھی۔ وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ پولیس کو اپنے اختیار سے سوا کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ ادھر میدا کے اڈے سے آئے ان کے واسطے کی مروت میں مجھ سے پولیس کا رویہ معاندانہ بھی ہو سکتا ہے۔ پولیس کے جانے کتنے لوگ میدا کے اڈے کا نمک بھی کھائے ہوئے ہوں گے۔''

''اس پیچیدہ صورت حال سے نمٹنے کے لیے تم نے بھی کچھ غور کیا ہوگا؟'' ڈاکٹر کی آواز اکھڑی ہوئی سی تھی۔

''کیا بتاؤں۔'' میں نے بے ربطی سے کہا، ''شاید مجھے ایک وکیل کی ضرورت پڑے۔ وکیلوں کا یہی کام ہوتا ہے۔ آپ شہر کے کسی بہت بڑے وکیل کو ضرور جانتے ہوں گے۔ اطمینان رکھیے، کتنا ہی مہنگا وکیل ہو، میں اس کی فیس ادا کر سکتا ہوں اور واضح رہے، یہ اڈے پاڑے کا پیسا نہیں ہے۔ روپے پیسے کی انہیں ایسی طلب نہیں ہوتی جتنی زور اور اپنی ساکھ کی۔''

''تم...... تم اڈے بازوں کی وکالت کر رہے ہو مجھ سے۔'' ڈاکٹر رائے جھلا کے بولا۔

''میں آپ کو حقیقت حال سے آگاہ کر رہا ہوں۔ آپ نے اتنی باتیں جانی ہیں تو یہ بات بھی آپ پر صاف ہو جائے۔''

وہ بڑبڑاتے ہوئے یکا یک کرسی سے اٹھ گیا۔

''ایک بات کہنی ہے آپ سے۔'' اس کے کمرے سے نکلنے سے پہلے میں نے رکی رکی آواز میں کہا۔

کرسی سے اٹھ کے اس نے اپنا لباس جھٹکا، شکنیں درست کیں اور کسی قدر بے اعتنائی سے بولا، ''بولو، کیا بات ہے؟''

''میں اکبر علی خاں کے گھر جانا چاہتا ہوں۔'' میں نے نظریں جھکا کے کہا۔

''کیا......؟'' اس کا جسم اکڑ گیا۔ ''تم...... تم وہاں جانا چاہتے ہو؟''

''مجھے جانا چاہیے۔ دو تین دن میں سہی، ان سے جو ایک غیر معمولی ربطِ خاطر ہو گیا تھا تو مجھے وہاں جانا چاہیے۔''

''تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟'' وہ درشتی سے بولا۔

''میری وجہ سے وہ اپنی جان سے گئے۔ ان کا ایک آباد گھر تھا۔ میری وجہ سے اجڑ گیا۔ اس دن نہ میں ان کے گھر میں داخل ہوتا نہ اس گھر پہ یہ بربادی

آتی۔ میرے حال پر ترس کھا کے وہ مجھ سے اتنے قریب ہو گئے تھے۔ مجھے اپنا کوئی بہت قریبی عزیز، بھائی سمجھنے لگے تھے اور مجھے بھی یہی محسوس ہوتا تھا۔ کل رات اپنے گھر، بیوی بچوں کی نہایت ذاتی باتیں کر رہے تھے۔ ان کی بیٹی کے لیے کسی نواب کے بیٹے کا رشتہ آیا تھا۔ وہ بہت کش مکش میں تھے۔ صاف انکار بھی نہیں کر پا رہے تھے۔ مجھ سے پوچھتے تھے کہ وہ کیا کریں، کس طرح نواب کو مطمئن کریں۔ وہ اپنی بیوی کے شیدائی تھے، بڑے احترام، بہت محبت سے وہ بیوی کا ذکر کرتے تھے۔ لگتا تھا، دونوں یک جان ہیں۔ وہ تو خود سراپا احترام، سرتاپا محبت تھے۔ میں نے اس گھر کی ایک جھلک ہی دیکھی تھی۔ کیسا مثالی گھر تھا۔ مثالی لوگ وہاں بستے تھے۔'' میری آواز میرے قابو میں نہیں رہی۔ آنکھوں میں جیسے آگ بھڑک اٹھی ہو اور سینہ جیسے ابھی پھٹ جائے گا۔ میں نے اپنا ماتھا جکڑ لیا۔ میرا جی چاہا کہ دیوار سے سر پھوڑ لوں۔

''اوہ، نہیں...... نہیں۔'' ڈاکٹر نے میرا بازو پکڑ لیا۔ ''اپنے آپ کو سنبھالو۔'' وہ میری کمر تھپکنے لگا۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اس نے دوبارہ مجھے کرسی پر بٹھا دیا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ ''تم وہاں نہیں جاسکتے۔'' اس نے حتمی آواز میں کہا۔

''نہیں جاؤں گا تو میرے سینے...... میں خود کو کس طرح......'' میری آواز آنسوؤں میں بہہ گئی۔

''یوں وہ واپس نہیں آجائیں گے۔''

''میں ان کے جنازے میں بھی شریک نہ ہوں؟'' میں نے بلکتی آواز میں کہا، ''میں جانتا ہوں، ان کے بیوی بچوں کے سامنے کس طرح جا پاؤں گا، کس منہ سے ان کے سامنے جاؤں گا، لیکن مجھے......''

''تمہیں دیکھ کے ان کا غم اور بڑھ جائے گا۔'' ڈاکٹر آہ بھر کے بولا، ''اکبر علی خاں مجھے بھی اچھے لگتے تھے۔ وہ ایک عمدہ آدمی تھے۔ ان سے مل کے خوشی ہوئی تھی۔ سوچا تھا، ذرا تمہارے بھائی کے علاج سے فراغت ہو جائے تو ان سے نشستیں ہوں۔''

''بتایئے ڈاکٹر صاحب! ان کا کیا قصور تھا۔ انہوں نے کسی کو کیا ضرر پہنچایا تھا۔ انہوں نے کتنے نادر، کتنے بڑے آدمی کو مار دیا، کس بات پر...... اس بات پر کہ جرأت کرکے وہ میرے ساتھ میدا کے اڈے پر گئے تھے اور میری دل بستگی کے لیے یہاں اسپتال میں صبح شام آنا انہوں نے معمول بنا لیا تھا۔''

''میں بھی یہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔'' ڈاکٹر رائے افسردگی سے بولا، ''وہ لوگ دیوانے ہو گئے تھے کیا۔ وکیل صاحب سے انہیں کیا غرض تھی۔ کیسے ظالم اور درندے لوگ ہیں یہ۔''

میں نے یہ اس سے نہیں کہا کہ اپنا حال کیا بتاؤں۔ میرا خون بہت کھولتا ہے۔ اکبر علی خاں کا خیال آتا ہے تو جسم میں آگ سی لگنے لگتی ہے۔ ایک بھڑک سی اٹھتی ہے کہ میدا کے ٹھکانے پر جا کے اس کے اڈے کو آگ لگا دوں، اس کا جو بھی آدمی سامنے نظر آئے، اس کے سینے میں چاقو بھونک دوں۔

''تم کہتے ہو، اڈے کی کرسی پر بیٹھا آدمی چاقو اور بل ہی میں نہیں، برداشت، سوجھ بوجھ میں بھی دوسروں سے لازماً برتر ہوتا ہے۔ یہ تو نہایت کم عقلی کی بات ہے۔ یہ تو اوچھا پن ہے، پرلے درجے کی ذلالت ہے کہ تم نشانے پر نہ آسکے تو انہوں نے ایک بے گناہ کو ختم کر دیا۔ میدا کیا جتانا چاہتا ہے، تمہیں مشتعل کرنا، یا خوف زدہ کرنا؟ کیا وہ اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ صاف صاف اس پر نگاہ جائے گی۔ اس طرح وہ کیا حاصل کرنا چاہتا ہے؟'' ڈاکٹر رائے بھن بھناتی آواز میں بولا۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں، مگر شاید یہ میدا نہیں ہے۔ اسے اتنا بے دماغ نہیں ہونا چاہیے۔''

''پھر...... پھر کون...... تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''میدا نے آسانی سے مجھے اڈے سے جانے دیا تھا۔ یہ بات ان لوگوں کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگی جو ڈاک خانے والی گلی میں زخمی ہو جانے اور بعد کو مر جانے والے دھنوا نامی آدمی کے نہایت وفادار، جاں نثار ساتھی تھے۔ وہ میدا کے اڈے سے منحرف آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے اڈے کے استاد کا اختیار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ہو سکتا ہے، اسپتال میں آنے والے حملہ آور میدا کے بھیجے ہوئے ہوں، لیکن یہ لوگ...... یہ تو کوئی دوسرے ہی لوگ ہو سکتے ہیں۔''

''کوئی بھی ہو۔'' ڈاکٹر فہمائشی لہجے میں بولا۔ ''میری بات سنو! تم نے اتنا کچھ بتا کے مجھ پر اعتماد کیا اور میں نے اس پر یقین کیا ہے۔ تم اب اپنے آپ کوئی فیصلہ نہیں کرو گے۔ میرے مشورے اور علم میں لائے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاؤ گے۔ سمجھے!''

''آدمی اپنے آپ کو بھی تو جواب دیتا ہے، ڈاکٹر صاحب!'' میں نے یاسیت سے کہا، ''میرے وہاں نہ جانے سے اکبر علی خاں کے گھر والے کیا سوچیں گے، میرے متعلق کیا رائے قائم کریں گے۔''

''ان پر اکبر علی خان کے سانحے سے بڑی قیامت اور کیا گزر سکتی ہے، اور ہاں...... تم...... تم اپنے آنے والے بھائیوں کو بھی منع کر دو گے کہ وہ تمہاری طرف سے کوئی نادانی نہیں کریں گے۔'' وہ کرسی سے دوبارہ اٹھ گیا اور چلتے چلتے رک گیا۔ ''میرا خیال ہے، تم سے کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ کتنا سنگین واقعہ ہے۔ شہر کے ایک نہایت معزز، مشہور، ایک بڑے آدمی کا خون ہو گیا ہے۔ تمہاری ذرا سی غلطی، مشتعل حرکت سے بات کتنی بگڑ سکتی ہے۔ اس معاملے کی تفتیش عام سطح پر نہیں ہوگی۔ وکیلوں کی برادری، شہر کے معززین، اکبر علی خاں کا وسیع اور با اثر حلقۂ احباب، سبھی تشویش ظاہر کریں گے اور تمہارا نام لازماً آئے گا۔''

اس نے مجھ سے پھر کوئی بات نہیں کی، کمرے سے نکل گیا۔ باہر راہ داری میں اس کمرے میں تعینات ڈاکٹر اور نرس اس کی واپسی کے منتظر تھے۔ ڈاکٹر نے رسمی انداز میں ان سے معذرت کی اور بٹھل کے کمرے تک میرے ساتھ آیا۔ سیورین بھی ڈیوٹی پر آگئی تھی اور امی ابھی تک موجود تھی۔ دونوں سراسیمہ سی بٹھل کے کمرے کے باہر ہماری جانب نظریں مرکوز کیے کھڑی تھیں۔ ہمیں آتا دیکھ کر سٹپٹا گئیں۔ ڈاکٹر رائے نے قریب جاکے امی کو اشارے سے پاس بلایا اور سرگوشیانہ کچھ باتیں کیں اور تیز قدموں سے چلتا ہوا راہ داری کے موڑ سے اوجھل ہو گیا۔

ڈاکٹر کے جاتے ہی دونوں لپکتی ہوئی میرے پاس آگئیں۔

''یقیناً تم نے ان سے کوئی بات نہیں چھپائی ہوگی۔'' امی وثوق سے بولی۔

میں نے سر ہلا کے تائید کی۔

''تم نے بہتر کیا۔ تمہیں یہی کرنا چاہیے تھا۔'' وہ تائیدی لہجے میں بولی، ''وہ بہت کھلے دماغ کے آدمی ہیں۔''

میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

''اب مجھے گھر جانا ہے میرے بچے! سیورین آگئی ہے۔ تم کہو تو رک جاؤں۔ میں تمہاری راہ تک رہی تھی۔'' امی دل دوزی سے بولی۔ ''گھر میں میرا جی نہیں لگے گا، تمہاری فکر رہے گی۔''

''نہیں، تم جاؤ۔ میں ٹھیک رہوں گا۔ میں اس کمرے میں قید رہوں گا، کہیں نہیں جاؤں گا۔'' میری آواز بہک رہی تھی۔

''تمہارے لیے یہی بہتر ہے۔ یہ وقت گزر جائے گا۔'' امی مجھے دلاسہ دینے لگی۔

''یہ کیا ہو گیا؟ میں نے آکے امی سے سنا تو یقین نہیں آیا۔ کیا واقعی وہ اتنا شان دار آدمی

ہمارے درمیان نہیں رہا؟'' سیورین نے دھڑکتی آواز میں پوچھا۔

میری خاموشی پر وہ بھی چپ ہوگئی۔ کمرے میں آ کے بے اختیار میرے قدم بٹھل کے بستر کی جانب اٹھے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور سینے کے متوازن اتار چڑھاؤ سے لگتا تھا کہ وہ پُرسکون نیند میں ہے، چہرے پر بھی تازگی پھیلی ہوئی تھی۔ میں دبے قدموں اس کے پاس سے ہٹ آیا اور سوفے پر آ کے بیٹھ گیا اور میرا جسم بکھر سا گیا۔ چند لمحوں بعد سیورین بھی میرے نزدیک بیٹھ گئی۔ کمرے میں خاموشی طاری تھی۔ سیورین دیر تک بت بنی رہی۔ میں نے بھی اس سے کوئی کلام نہیں کیا۔ میرے پاس کہنے کے لیے تھا بھی کیا۔ گزشتہ دو ایک دن میں وہ اکبر علی خاں سے خاصی مانوس ہوگئی تھی۔ کل اس نے ان کے گھر سے آئے ہوئے توشے کا کھانا کھایا تھا اور کہتی تھی کہ اس نے آج تک اتنا نفیس اور لذیذ کھانا نہیں کھایا۔ اکبر علی خاں اس کی تعریف سے بہت خوش ہوئے تھے۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر خوش ہونے والے آدمی تھے۔ انہوں نے بٹھل کی صحت یابی کے بعد سیورین کو گھر آنے کی دعوت دی تھی۔ کہتے ہیں، آدمی کا وقت آ گیا تھا، لیکن ایسے تو وقت نہیں آنا چاہیے تھا۔ کسی بیمار، معذور، سن رسیدہ کی موت کا کوئی جواز تو ہوتا ہے۔ آدمی چپکے سے یوں اچانک غائب ہو جائے تو کوئی کیا کہے۔ سیورین بھی کیا کہہ پاتی...... اور میں کون سا اکبر علی خاں کا رشتے دار، ان کے خاندان کا آدمی تھا۔ اکبر علی خاں سے میری شناسائی سیورین سے ایک دن پہلے کی تھی، بل کہ ایک پہر پہلے کی۔ سیورین سے کچھ کہتے نہ بنا کہ لفظ تو کبھی بہت حقیر اور بے مایہ ہو جاتے ہیں۔ وہ کھسک کے مجھ سے اور قریب ہوگئی۔ اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کے مجھ سے غم گساری کا اظہار کرنا چاہا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ سیورین نے اپنے عالم اضطراب میں میرے ہاتھ پر زور دیا تو میری آنکھیں بھی اُمڈ آئیں۔ آدمی کے پاس کچھ نہیں ہوتا تو آنسو ہی سہارا، آنسو ہی سپر بن جاتے ہیں۔ ''کیا ہو گیا یہ......'' وہ سسکتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے بولی۔

میں نے خود کو بہت روکا، لیکن سیورین کی سسکیوں نے مجھے بھی متلاطم کر دیا۔ میں بھی پھڑکنے لگا۔ مسیحائی اس کا شعار تھی۔ اس بے پناہ مشفق و مہربان لڑکی نے میرا سر اپنے شانے پر رکھ لیا۔ میری تو ہچکیاں بندھ گئیں۔ کبھی اپنے کسی بہت عزیز و محترم، اپنے کسی ہم نفس و ہم دم کے چلے جانے پر حیران اور ہلکان ہو جاتے ہیں، لیکن اس آدمی کی ویرانی کا کون اندازہ کرے، اس آدمی کا دکھ کون جانے جو اپنے عزیز و محترم کے خون کا بار اپنی گردن پر محسوس کرتا ہو۔ سیورین کو کیا معلوم تھا کہ ہر لمحے یہی احساس میرا سینہ دبوچتا، کھسوٹتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں، کہاں جا کے خود کو چھپاؤں۔ میں کیسا بدنصیب، بے بس آدمی ہوں۔ میرا سایہ ہی نحس ہے۔ میں زندہ رہنے پر کیوں مصر ہوں۔

سیورین میرے بالوں میں انگلیاں پھیر کے مجھ سے یگانگت ظاہر کرنے لگی۔ آئینہ مقابل نہ ہو تو بھی ہمہ وقت اپنی صورت آدمی کے سامنے رہتی ہے، میں اپنا چہرہ ہی دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ آدمی کا اپنا وجود بھی اس پر بہت بوجھ ہوتا ہے۔ سیورین، ایک نرم و نازک لڑکی، کسی ستون، کسی دیوار کے مانند مجھے سہارا دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ میرے سر پر اس کی منڈلاتی انگلیاں مجھ سے اپنے دکھ کا اظہار کر رہی تھیں۔ اس کا گداز آفریں پہلو اس کی بے قراری کا مظہر تھا کہ وہ میرے حال سے واقف ہے اور مجھے پناہ میں لینا چاہتی ہے۔ میری آنکھوں سے مسلسل آنسو جاری تھے۔ دل داری و دل دہی سے بھی تو آنسوؤں کی نمو ہوتی ہے۔

مجھے نہیں معلوم، کب وہ میرے پاس سے اٹھی، مجھے تو اپنی سدھ بدھ ہی نہیں رہی تھی۔ جانے کب اس نے میرے شانے پر ٹھوکا دیا تو میں نے دیکھا، وہ میرے سامنے کھڑی ہے، اس کے ہاتھ میں گلاس ہے اور رومال۔ اس نے آنکھیں میچ کے گلاس اور رومال میرے طرف بڑھائے تب مجھے اپنی توانائی اور فرومائیگی کا شدت سے احساس اور ندامت کا غلبہ ہوا۔

آنسوؤں کا بھی بڑا افشار ہوتا ہے۔ بہہ جائیں تو جسم ہلکا ہو جاتا ہے لیکن آنسو تلافی نہیں کر پاتے۔ سیورین دوبارہ میرے پاس آ کے بیٹھ گئی اور چپ رہی پھر جیسے خود کو مجتمع کر کے دھیمی آواز میں اس نے سوال کیا۔ یہ کانٹا اس کے بدن میں چبھ رہا ہوگا۔ کہنے لگی ''اب کیا ہوگا؟''

میں نے استفہامی نگاہوں سے اس کو دیکھا۔ 'کیا ہوگا؟' پھر مجھے خیال آیا، وہ آنے والے وقت سے ہراساں ہے۔ میں نے بہ ظاہر بے پروائی سے کہا ''جو ہونا ہے...... وہ تو ہو کے رہے گا۔''

''تم ان سے زیادہ بات مت کرنا۔'' اس نے دبی آواز میں مشورہ دیا۔

''کس سے؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''پولیس سے۔ ایمی کہہ رہی تھی، پولیس اسپتال آنے والی ہے۔ یہ پولیس والے بال کی کھال نکالتے ہیں اور کسی کا خیال نہیں کرتے۔ وہ تمہیں تنگ کر سکتے ہیں۔''

''وہ اپنی کارروائی تو کریں گے ہی۔ اتنے بڑے واقعے کے بعد کیا وہ گھر بیٹھے رہیں گے۔''

''مگر تمہارا قصور کیا ہے؟''

''اکبر علی خاں سے تعلق خاطر کا، ایسا نہ ہوتا تو وہ کیوں ختم ہو جاتے۔''

سیورین دزدیدہ نظروں سے مجھے دیکھا کی، پھر ٹھٹکی ہوئی آواز میں بولی۔ ''مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے۔''

میں نے اسے تسلی دینی چاہی۔

''خداوندا! سب ٹھیک ہی ہو۔'' وہ سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے بولی۔ ''خداوند سچ کا ساتھ دیتا ہے۔''

وہ ابھی یہ کہہ ہی رہی تھی کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ سیورین گھبرا کے اٹھ کھڑی ہوئی اور دروازے کی طرف لپکی۔

اسپتال کا ایک ملازم پولیس کی آمد اور میری طلبی کی اطلاع دینے آیا تھا۔ میں نے سمجھ لیا تھا۔ سیورین نے سہمے سہمے انداز میں ہرکارے کا پیغام مجھے منتقل کیا۔ سوفے سے اٹھ کے میں نے ایک نظر بٹھل کے بستر کے پاس جا کے دیکھا۔ سیورین سے تشفی کے کلمات کہتا ہوا میں کمرے سے نکل جانا چاہتا تھا کہ اس نے مجھے روک لیا اور غسل خانے کی طرف اشارہ کیا۔ میرا حال واقعی ٹھیک نہیں تھا، اس کا احساس مجھے غسل خانے جا کے ہوا۔ منہ ہاتھ دھو کے اور بال درست کر کے میں باہر آیا تو سیورین مجھے رخصت کرنے کے لیے دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیتے ہوئے اس نے میرے کرتے کا دامن کھینچ کے شکنیں درست کیں۔ نیچے کے تین چار بٹن لگا کے میری کھلی واسکٹ بند کی اور پھیکی مسکراہٹ سے ہاتھ پھیلا کے مجھے کمرے سے جانے کی اجازت دی۔

باہر ملازم منتظر تھا۔ چند قدم کا فاصلہ طے کر کے وہ راہ داری میں دائیں مڑ گیا۔ راہ داری کے اختتام پر سبزہ زار کا وسیع کھلا حصہ تھا اور مختلف امراض کے وارڈ شروع ہو جاتے تھے۔ ایک دو کی ٹکڑیوں میں جگہ جگہ سپاہی موجود تھے۔ ان میں بیش تر سادہ لباس میں تھے۔ سادہ لباس میں بھی پولیس کا آدمی اپنے خاص انداز و اطوار، چھب ڈھب، بالوں وغیرہ سے آسانی سے پہچانا جاتا ہے۔ پولیس سے جس کا واسطہ پڑتا رہا ہو، اس سے تو کسی بہروپ ہی میں چھپ سکتا ہے۔ متعدد مقامات پر تعینات سپاہی

ہمیں سامنے سے گزرتا دیکھ کے زیروزبر ہو جاتے، لیکن کسی نے اسپتال کی وردی میں ملبوس ملازم کی وجہ سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ ان کی مشکوک نظروں کے حصار میں ہم مرکزی عمارت میں داخل ہو گئے۔

عمارت کے بڑے دروازے پر بھی پانچ چھ سپاہی موجود تھے۔ انہوں نے جیسے مجھے پہچان لیا ہو اور میں ہی انہیں مطلوب ہوں۔ مجھے آتا دیکھ کے ان کے ڈھلکے ہوئے جسموں میں ایک ساتھ جیسے کسی نے سوئیاں چبھو دی ہوں، سبھی تچل سے گئے۔ نگاہوں نگاہوں میں انہوں نے ایک دوسرے سے تصدیق چاہی، لیکن میرا ان کا سامنا لمحاتی تھا۔ میرا رہبر، اسپتال کا ملازم عمارت کے بڑے دروازے سے چند قدم بعد دائیں جانب گلی ایسی جگہ میں آ گیا۔ سامنے دروازے پر سادہ لباس میں ایستادہ شخص کا تعلق بھی یقیناً پولیس سے ہونا چاہیے تھا۔ ملازم نے مجھے اس کے سپرد کیا اور وہیں سے لوٹ گیا۔ مجھے باہر ٹھیرا کے دربانی خدمت پر مامور پولیس کے آدمی نے اندر جا کے میری آمد کی اطلاع دی ہو گی۔ جاتے جاتے اس نے دروازہ بند کرنے کی احتیاط بھی کی اور فوراً ہی واپس آ کے اس نے میرے لیے دروازہ کھول دیا۔

وہ اسپتال کے خاص ملاقاتیوں کا کمرا معلوم ہوتا تھا، نہ اتنا بڑا، نہ ایسا چھوٹا، بڑے اسٹیشنوں کے درجہ اول مسافروں کی انتظار گاہ کے مانند سجا ہوا اور صاف ستھرا۔ دیواروں کے ساتھ لگے شاہانہ طرز کے سوفوں کے بیچ شیشے کی چھوٹی میزیں، کمرے کی کشادہ وسطی جگہ گھیرتی ہوئی بڑی چوکور میز، چھت خاصی اونچی، دیواروں پر نیا نیا رنگ روغن، کھڑکیوں پر ہلکے نیلے رنگ کے ریشمی پردے، چھت سے ملحق روشن دان نصف کھلے ہوئے، چھت سے لٹکا ہوا پنکھا تیزی سے گھوم رہا تھا۔ دروازے کے عین مقابل سوفوں پر تازہ وردیوں میں تین پولیس افسر بیٹھے ہوئے تھے، تینوں کم و بیش گندمی رنگت کے تھے، دو ادھیڑ، ایک پختہ کار نوجوان۔ تینوں کے قامت میں تھوڑا بہت ہی فرق تھا۔ نسبتاً بڑی عمر کے شخص کے چہرے پر بردباری جھلک رہی تھی اور وہی ان کا بڑا افسر لگتا تھا۔ اس کی چھوٹی آنکھیں اندر دھنسی ہوئی اور چمکیلی تھیں۔ بھوؤں پر سفید بال غالب تھے۔

حالاں کہ دربان نے انہیں مطلع کر دیا تھا، لیکن میری آمد پر تینوں سنبھل سے گئے۔ میں نے سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا اور ان سے اجازت لیے بغیر قریب کے سوفے پر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں تک ان کی نظریں مجھ پر بھٹکتی رہیں، پھر ادھیڑ افسر نے اپنے بڑے افسر کی طرف اجازت طلب انداز سے دیکھتے ہوئے مجھ سے میرے نام کی توثیق چاہی۔ میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

''تم سے ہم کو انکوائری کرنا ہے۔'' ادھیڑ افسر نے ہندوستانی میں پہل کی۔ ''ٹھیک ٹھیک بتاؤ گے تو ہم دونوں کے واسطے ٹھیک ہوگا۔'' اس کے لہجے کی درشتی قبل از وقت تھی۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''رات کو تم ادھر اسپتال ہی میں تھے جب وکیل اکبر علی خاں صاحب کا مرڈر ہوا۔ وکیل صاحب کتنے بجے تمہارے پاس سے نکلے تھے؟''

''ڈیڑھ دو بجے کے درمیان۔'' میں نے کھنچی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''تم نے ان کو تانگے پر چھوڑا اور لوٹ کے کمرے میں آ گئے، ایسا ہی ہوا؟''

''جی ہاں۔''

''تانگے پر ان کو چھوڑنے اور واپس کمرے تلک آنے میں تم کو کتنا ٹائم لگا؟''

''راستے کا وقت۔'' میں نے سادگی سے کہا۔

''گھر جانے میں اتنی دیر کا ہے لگائی وکیل صاحب نے؟ ہیاں کا کر رہے تھے او؟'' اس بار نوجوان افسر نے بپھرے لہجے میں پوچھا۔

"باتیں کررہے تھے ہم، وقت کا کچھ خیال ہی نہیں رہا۔ چلتے وقت میں نے ان سے کہا بھی کہ رات بہت ہوگئی ہے میں ان کے ساتھ چلتا ہوں، اسی تانگے سے واپس آجاؤں گا۔ انہوں نے ہنس کر منع کردیا۔"

"کا...... کا باتیں کررہے تھے او؟"

"یہی میری، اپنی، اپنے گھر کی...... دنیا بھر کی۔"

"کب سے تم ان کو جانو ہو؟"

"دو تین دن سے، یہاں آنے کے بعد سے۔"

"دو تین دن سے!" ادھیڑ افسر حیرانی سے بولا۔

اس نے وہی سوال کیا جو ڈاکٹر رائے نے کیا تھا کہ اتنی جلد وہ کس طرح مجھ سے گھل مل گئے کہ گھر کی باتوں میں شریک کرنے لگے۔ میں نے جواب میں وہی کہا جو ڈاکٹر سے کہا تھا کہ ایک دوسرے کے قریب آنے کے لیے کسی مدت کی شرط عائد نہیں ہوتی۔

"کدھر، کیسے تمری ان کی پہلی بار بھینٹ ہوئی؟"

"یہ ایک لمبی کہانی ہے۔" میں نے کسی قدر بے رخی سے کہا۔ "آپ کا وقت ضائع ہوگا۔ بس اتفاق سے میری ان کی ملاقات ہوئی۔"

"ہم کو بتادو، ہم اسی کارن ادھر آئے ہیں۔"

"بتانے میں کوئی ہرج نہیں لیکن آپ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پائیں گے، بل کے الجھ سکتے ہیں، کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتے ہیں تو ادھر ادھر مت بھٹکیے۔"

"تم ہم کو ایڈوائز نا ہی کرو تو اچھا ہے۔"

میں نے فوراً کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ بٹھل کہتا تھا، جواب میں تیزی ہر وقت مناسب نہیں ہوتی۔ اس کے بہ قول سامنے موجود زیادہ پولیس افسر یک ساں مزاج کے نہیں ہوتے، چہروں کی طرح ان کی خصلتیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے لیے وہ الٹے سیدھے سوالات بھی کرنے لگتے ہیں۔ شک کی بنیاد پر وہ مفروضے قائم کرتے ہیں اور شک کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ کوئی شک ان کے دل میں بیٹھ جائے تو مشکل ہی سے نکلتا ہے۔ ظاہر ہے، ان میں نہایت ذہین، تعلیم یافتہ اور تجربے کار بھی ہوسکتے ہیں۔ وہ ہوش وحواس کھودینے کی حد تک اپنے مخاطب کو لاجواب اور برہم کرسکتے ہیں، ہمیشہ دشمن کی طرح پیش آتے ہیں اور مشکل سے شکست قبول کرتے ہیں۔ بہت کچھ دلیل پر منحصر ہے، دلیل انہیں غصہ بھی دلاتی ہے، زچ بھی کرتی ہے، متاثر بھی۔ اپنی دلیلیں آہستہ آہستہ ان پر افشا کرنی چاہییں۔ دلیلیں توانا نہ ہوں، یا دلیل ہی نہ ہو تو حجت بھی نہیں کرنی چاہیے۔ چرب زبانی انہیں ناگوار گزرتی ہے۔ ان کے مناصب کی رعایت دہی بہ ہر حال واجب ہے۔ اونچی آواز میں بات کرنے سے پہلے ان کے تیور کا تخمینہ کرلینا چاہیے۔

"ایک بات صاف سن لیجیے صاحب!" میں نے تمام تر احتیاط سے نسبتاً اٹھی ہوئی آواز میں کہا، "میرے پاس جو کچھ ہے، آپ سے کہے دیتا ہوں، ہوسکے تو اس پر دھیان دیجیے اور پہلے اس زاویے سے سوچیے۔ آپ حاکم ہیں۔ بعد کو آپ کی مرضی ہے، جس طرف، جس انداز سے چاہیں کھوج کیجیے۔"

تینوں کے چہرے تمتانے لگے۔ نوجوان افسر زیادہ بے چین نظر آرہا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ بڑے افسر نے ہاتھ اٹھا کے اسے روکا اور طنزیہ مسکراہٹ سے بولا۔ "کا کہنا چاہو ہو تم؟" اس کی آواز بھاری تھی اور منصب کی تمکنت سے آسودہ۔

یہی ایک طور مجھے ٹھیک لگا کہ پٹنا شہر میں آنے کے بعد پیش آنے والے واقعات بے کم وکاست بیان کردوں، لیکن اس سے پہلے انہیں کچھ باور کرادینا بھی ضروری تھا۔ میں نے کہا، "جو میں کہتا

ہوں۔ اچھا تو یہی ہوگا فی الحال آپ اسی پر تکیہ یا اسی پر یقین کریں۔ بعد کو کسی وضاحت کے لیے سوال پیدا ہوتے ہیں تو میں آپ کے سامنے حاضر ہوں۔ آپ کے اطمینان کے لیے جتنا کچھ بھی جانتا اور سمجھتا ہوں، جواب دینے کی کوشش کروں گا لیکن میری بات ختم ہونے سے پہلے کوئی سوال مت کیجیے گا۔ یہ میری گزارش ہے۔ مجھے اس حقیقت کا اچھی طرح احساس ہے کہ آپ پولیس کے آدمی ہیں اور سنجیدگی سے ایک سنگین واقعے کی تفتیش کررہے ہیں۔ بدقسمتی سے جس میں میرا ذکر، میرا نام بھی آتا ہے۔ مجھے معلوم ہے، میری حیثیت بھی آپ کی نظروں میں مشکوک قرار پائی ہے اور میرے خیال میں اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔ آپ کچھ جاننا چاہتے ہیں تو میں دہراتا ہوں۔ میں آپ سے امکان بھر تعاون کروں گا، یا یوں کہیے کہ آپ کی مدد کے لیے میں یہاں موجود ہوں۔ کسی کارنامے کے چکر میں پڑیں گے آپ تو شاید کچھ ہاتھ نہ آئے۔"

"تم...... تم ہمری مدد کروگے۔" نوجوان افسر کی زبان غصے میں ڈگمگا گئی۔ "تم ہم کو کوئی بہت چالو...... پرفیشنل ٹائپ مجرم لگو ہو۔"

"تو ٹھیک ہے...... میں خاموش ہوجاتا ہوں، پھر آپ بھی کیوں یہاں بیٹھے ہو۔" میں نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ "ایک بات دماغ میں رکھ لو صاحب! میں آپ کے ہر سوال کے جواب کا پابند نہیں ہوں۔ آپ مجھے مجرم سمجھتے ہیں تو بات ختم ہوجاتی ہے، پھر دیر کاہے کی، مجھے یہاں سے سیدھے حوالات لے جائیے۔ میں نے ڈاکٹر رائے سے درخواست کی ہے کہ وہ شہر کے کسی اچھے وکیل کا بندوبست کردیں۔ پھر وہی آپ سے بات کرے گا۔"

تھوڑا بہت اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ کچھ طے کرکے، کچھ ٹھان کے نہیں آئے ہیں۔ انہیں کسی نتیجے پر پہنچنے، کوئی رائے قائم کرنے کا موقع ہی کہاں ملا ہوگا۔ اکبر علی خاں کے ملازم کے بہ قول، صبح فجر کی نماز کے لیے مسجد جاتے ہوئے نمازیوں نے ان کی خون آلود لاش جھاڑیوں میں پڑی دیکھی تھی۔ اسی وقت سارے محلے میں کہرام مچ گیا ہوگا۔ پولیس تک بات پہنچنے، پولیس کے آنے اور ابتدائی تفتیش میں کچھ وقت تو ضرور لگنا چاہیے۔ کچھ تگ ودو کے بعد انہیں معلوم ہوگیا ہوگا کہ اکبر علی خاں رات گئے اپنے کسی نئے دوست کے پاس سے گھر واپس آرہے تھے۔ یہ نیا دوست کون تھا۔ اس کا سراغ بھی ان کے لیے معمانہ ہوگا۔ اسپتال آکے انہوں نے صدر دروازے پر رات کی ڈیوٹی کے دربان اور اونگھتے ہوئے سپاہیوں سے بات کی ہوگی اور ممکن ہے انہوں نے اس تانگے والے کو بھی ڈھونڈ لیا ہو جو اکبر علی خاں کو اسپتال سے لے گیا تھا اور ہوسکتا ہے مجھ سے پہلے ڈاکٹر رائے سے بھی ان کی ملاقات ہوچکی ہو۔ اتنی کم مدت میں ان کی معلومات خاصی خام اور ناتمام ہونی چاہییں۔ یہ ساری صورت حال اور ان کی تذبذب و منتشر حالت دیکھ کے ہی میں نے اپنی آواز اور لہجے میں جرأت کی جسارت کی تھی اور مجھے احساس تھا کچھ متجاوز نہ ہوجائے۔ وہ کچھ جاننا چاہتے ہیں تو مجھے بھی اپنی وکالت، اپنی نجات کی کوشش کرتے رہنا ہے۔

بستر پر پڑا بے حرکت، بے دست وپا جیسا بٹھل بار بار میری نگاہوں کے سامنے آجاتا تھا۔ اس شہر میں میری تنہائی اور اجنبیت، سارے فاصلے مٹا کے ایک شخص قریب آیا تھا، اس سے بڑا سہارا ہوگیا تھا، وہ بھی چھن گیا۔

نوجوان افسر کے پہلو میں بیٹھے ادھیڑ پولیس افسر نے میری سچ بیانی، یا وہ گوئی پر محمول کی۔ میں نے کوئی ایسی ناروا، نازیبا بات بھی نہیں کی تھی۔ جانے کیوں وہ بھڑک اٹھا۔ شاید پہلی بار اس کا مجھ ایسے کسی ملزم، یا مجرم سے سامنا ہوا تھا۔ اس نے بگڑے منہ سے پوچھا۔ "تو...... تو...... تم کون ہو؟"

’’میں آپ کو یہی بتانا چاہتا ہوں کہ میں کون ہوں اور مجھ اجنبی کو اس شہر میں آ کے کن حالات سے واسطہ پڑا ہے۔‘‘ میں نے جبری تحمل سے کہا۔ ’’لیکن لگتا ہے، آپ کی نظروں میں اپنی حیثیت جان کے ہی مجھے زبان کھولنی چاہیے۔ مجھے اپنی بات کہنے کا حق ہے تو کھلے دل سے اجازت دو۔ نہیں دینا چاہتے تو میں نے پہلے ہی صاف کہا ہے، آپ اپنی کارروائی کرو۔ میں جانتا ہوں، یہ حق مجھے کہاں سے مل سکتا ہے، آپ پر دنیا ختم نہیں ہو جاتی۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ بڑے افسر نے ٹھیری ہوئی آواز میں کہا، ’’تم بولو، کیا بولنا ہے؟‘‘

مزید کسی حجت کا محل نہیں تھا۔ میں نے اپنی آواز دھیمی رکھی۔ ’’ہم آگے جا رہے تھے۔ اکبر پور اسٹیشن پر انجن خراب ہو گیا۔ ریل گاڑی کے جھٹکوں کی وجہ سے سوئے ہوئے بھائی کے سر پہ اندرونی چوٹ آ گئی......‘‘

میں نے شروع سے آخر تک مختصراً ساری روداد ان کے گوش گزار کر دی۔ درمیان میں کئی بار ادھیڑ اور نوجوان افسر نے مداخلت کرنی چاہی، لیکن بڑے افسر کی طرف دیکھ کے تلملا کے رہ گئے۔ میں نے کوئی غلط بیانی نہیں کی تھی۔ صرف اکبر علی خاں کے گھر میں چاقو کے زور پر داخل ہونے کے واقعے سے اجتناب کیا تھا۔ میرے بیان میں بہ تدریج ان کی بڑھتی دل چسپی اور حیرت کا اظہار ان کی آنکھوں کی چمک اور چہروں کے بدلتے رنگوں سے ہوتا رہا تھا۔ اتنا کچھ جان کے ان کے ذہنوں میں اٹھتے ہوئے سوالات کا مجھے اندازہ تھا۔ انہیں بھی وہی صراحتیں مطلوب ہونی چاہیے تھیں جو کچھ دیر پہلے ڈاکٹر رائے کو ہوئی تھیں۔ گو میں خود ہی ان کی الجھنیں دور کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔

میرے چپ ہو جانے پر وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھا کیے، پھر ادھیڑ افسر نے اسی سوال کی تکرار کی جو ڈاکٹر رائے نے کیا تھا۔ یہ کیا میں ہمیشہ اپنی جیب میں چاقو رکھتا ہوں۔

ڈاکٹر رائے کی بات اور تھی، ان لوگوں کا تعلق پولیس سے تھا، میں نے محتاط لہجے میں کہا، ’’کسی ان ہونے واقعے سے نمٹنے کے لیے چاقو جیب میں رکھنا ہماری ریت ہے۔‘‘

’’چاہے، برسوں اسے کھولنے کی نوبت نہ آئے۔‘‘

یکے بعد دیگرے وہ طرح طرح کے سوالات کی نشتر زنی کرتے رہے، ڈاکٹر رائے سے کچھ زیادہ ہی۔ یہ دوسرا مرحلہ زیادہ اذیت ناک تھا۔ میں جواب دہی کا عذاب سہتا رہا کہ آنے والے وقت کی تنگی و کشادگی اب انہی پر منحصر تھی۔ بہت دیر ہو گئی تھی۔ میرے دست و بازو ٹوٹنے سے لگے تھے۔ کبھی جی میں آتا تھا، انہیں جھڑک دوں کہ میری کیا خطا ہے۔ وہ میری بات کیوں نہیں سمجھ رہے۔ میں نے کیا قصور کیا ہے جو مجھے ان کے سامنے سر جھکائے مجرموں کے مانند بیٹھنا پڑ رہا ہے۔ ایک رکتا تو دوسرا شروع ہو جاتا تھا۔ ان کے سوالوں کا سلسلہ جاری تھا کہ سوفوں کے درمیان بغلی دروازہ کھلنے کی چرچراہٹ ہوئی اور ڈاکٹر رائے نمودار ہوا۔ اسے دیکھ کے مجھے سکون ملا۔ وہ تینوں اٹھ کھڑے ہوئے، میں بھی کھڑا ہو گیا۔ ڈاکٹر رائے نے پرتکلف انداز میں ان سے بیٹھ جانے کی گزارش کی اور ظاہری شائستگی و شگفتگی سے انگریزی میں بولا، ’’میں مخل تو نہیں ہوا؟‘‘

’’نہیں، نہیں ڈاکٹر، کیا کہہ رہے ہیں آپ، خوش آمدید۔‘‘ تینوں افسروں نے تپاک کا اظہار کیا۔

’’کہیے صاحبان! آپ کے مسائل کچھ حل ہوئے؟‘‘ ڈاکٹر نے پرامید لہجے میں پوچھا۔

’’جی ڈاکٹر۔‘‘ بڑے افسر نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ’’ہم یہی کر رہے تھے، کچھ سمجھنے کی کوشش۔‘‘

’’یقیناً ساری بات سے آپ آگاہ ہو گئے ہوں

گے۔‘‘

’’جی ڈاکٹر صاحب، ہم نے پوری توجہ سے ہر بات سنی ہے۔‘‘

’’یہ کیسی افسوس ناک اور حیرت ناک صورت حال ہے۔‘‘ ڈاکٹر رائے نے اداسی سے کہا۔

’’جی ڈاکٹر صاحب؟‘‘ بڑے افسر کی آواز بھاری ہو گئی۔

’’واقعی۔‘‘

’’کیا نتیجہ اخذ کیا آپ نے؟‘‘ ڈاکٹر نے پھیکی مسکراہٹ سے پوچھا۔

’’ابھی یقین سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔‘‘ بڑا افسر سنجیدگی سے بولا۔

’’کیا مطلب؟‘‘ ڈاکٹر رائے نے چونک کے پوچھا۔

’’یہ ایک یک طرفہ روداد ہے۔‘‘ بڑے افسر کا لہجہ بہ ظاہر معذرت خواہا لیکن تندی و ترشی کا حامل تھا۔ کہنے لگا۔ ’’اس نوجوان کا پس منظر صاف نہیں ہے۔ یہ ہر وقت چاقو جیب میں رکھتا ہے۔ اڈے پاڑوں سے بھی اس کی وابستگی رہی ہے۔ یہ ہتھ چھٹ ہے۔ بٹوا چھن جانے پر یہ چور کے پیچھے پڑ گیا۔ ایک ذرا سے بٹوا چوری پر ایک آدمی کا خون ہو گیا۔ اس کا کہنا ہے اس نے اپنا چاقو نہیں نکالا تھا، ایک ساتھی نے نادانی، ناتجربے کاری میں اپنے ہی ساتھی کو خود زخمی کر دیا جو بعد کو مر گیا۔ یہ ایک اور معاملہ ہے، قتل کا معاملہ۔ دیکھنا ہے، اس بات میں کتنی صداقت ہے۔ اس نے مشہور زمانہ چاقو باز میدا جیسے بدمعاش کے ٹھکانے پر جا کے اسے چاقو آزمائی کی دعوت دے ڈالی۔ کس اعتماد میں؟ اس اعتماد میں کہ یہ اسے زیر کر لے گا، ورنہ یہ آدمی ایسا بے وقوف نہیں معلوم ہوتا۔ یہ شہر کے مشہور وکیل کے گھر میں جبراً داخل ہو گیا۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ دو راتیں قبل جو مسلح آدمی اسپتال میں گھس آئے تھے۔ وہ گلی میں زخمی ہو جانے اور بعد میں دم توڑ دینے والے نوجوان کے مشتعل ساتھی ہو سکتے ہیں اور وہ نہیں، تو وہ میدا کے فرستادہ ہو سکتے ہیں۔ یہ ان کے ہاتھ نہ آ سکا اور واپس بھاگتے ہوئے ان لوگوں کے راستے میں اسپتال کا پرجوش ملازم رکاوٹ بن گیا۔ وہ بھی اپنی جان سے گیا۔ یہ دوسرا قتل ہے، پھر آج صبح سویرے تیسرا قتل، شہر کے ایک نام ور وکیل کا خون۔ شہر کی ساری پولیس حرکت میں آ چکی ہے۔ دیر ہو گئی تو ضلع سے صوبے اور پھر مرکزی حکومت تک بات جا سکتی ہے۔ سنا ہے، وکیل صاحب کا بڑا بھائی نظام حیدر آباد کا مقرب خاص ہے، دربار میں کسی بڑے عہدے پر فائز ہے۔ نظام سرکار اور برطانوی حکومت کا تال میل کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ یہ انتہائی نازک معاملہ ہے اور پیچیدہ رخ اختیار کر سکتا ہے۔ ہمیں ہر ممکن قدم اٹھانا اور ہر حال میں محتاط رہنا ہے۔ سمجھ رہے ہیں آپ ڈاکٹر صاحب!‘‘ بڑے افسر نے مایوسانہ، فکر مندانہ انداز میں کہا۔

’’جی ہاں، سمجھ رہا ہوں اور اچھی طرح، جس طرح آپ سمجھا رہے ہیں اسی طرح۔‘‘ ڈاکٹر رائے تیکھے لہجے میں بولا۔

’’ایسی صورت میں یہی مناسب ہے کہ ہم اسے ساتھ لے جائیں۔‘‘

’’کیا......؟‘‘ ڈاکٹر رائے کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ’’آپ ساتھ لے جائیں گے اسے۔ کیوں؟ کس لیے؟‘‘

’’مجبوری ہے ڈاکٹر صاحب!‘‘ بڑے افسر نے متانت سے کہا، ’’ہمیں کچھ اور جاننا بوجھنا ہے۔‘‘

’’کیا اس سے حاصل کردہ معلومات میں کوئی کمی رہ گئی ہے؟‘‘ ڈاکٹر اکھڑی ہوئی آواز میں بولا، ’’مجھے نہیں معلوم اس نے آپ کو کیا بتایا ہے لیکن جو کچھ میں جان پایا ہوں، یقیناً اس سے مختلف نہیں ہونا چاہیے۔‘‘

’’محترم ڈاکٹر!‘‘ بڑے افسر نے مودبانہ کہا۔

’’مجرموں کا ہمیں وسیع تجربہ ہے۔ آپ کو کیا بتائیں کیسے کیسے بہروپیے، تماشا باز سامنے آتے رہے ہیں۔ آپ جیسا ایک مقدس پیشے سے وابستہ شخص ان جرائم پیشہ لوگوں کی شعبدے کاریوں کا تصور نہیں کرسکتا۔ ہمارے روز وشب انہی لوگوں میں گزرتے ہیں۔ ایک نمبر کے چھٹے ہوئے لوگ ہوتے ہیں یہ جناب!‘‘

’’لیکن اس کے بھائی کو اس کی رفاقت کی ضرورت ہے۔ یہ سراسر انسانی ہمدردی کی بات ہے۔‘‘

’’معاف کیجیے ڈاکٹر صاحب! آپ ہمارے لیے نہایت معزز محترم ہیں لیکن پولیس اور قانون کے اپنے کچھ مطالبے ہوتے ہیں۔ میری درخواست ہے آپ سمجھنے کی کوشش کیجیے اس آدمی کی وجہ سے تین آدمیوں کا خون ہوچکا ہے اور یہ اس کا معترف ہے۔‘‘

’’کیا کہا آپ نے؟‘‘ ڈاکٹر برگشتگی سے بولا ’’یعنی اس نے اعتراف کیا ہے کہ تینوں قتل اس نے کیے ہیں۔‘‘

’’نہیں، میں نے یہ کب کہا جناب!‘‘ بڑے افسر نے بہ عجلت صراحت کی۔ ’’میرا مطلب ہے یہی بنائے فساد رہا ہے۔‘‘

’’کیسی بات کررہے ہیں آپ۔‘‘ ڈاکٹر رائے نے برہمی سے کہا۔ ’’دیکھیے آئی جی صاحب! اس کا بھائی میرے زیر علاج ہے اور اس کی حالت سے میں واقف ہوں، آپ نہیں۔ یہاں اس کی ضرورت ہے۔ آپ کہتے ہیں یہ یہاں آکے تین افراد کی موت کا سبب بن گیا، سبب بننا اور قتل کردینا اور قتل کے لیے آمادہ کرنا تین مختلف باتیں ہیں۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کل رات یہ اسپتال میں تھا۔ اکبر علی خاں کو رخصت کرنے کے بعد یہ اپنے کمرے میں آگیا تھا۔ کیا اس نے اسپتال میں گھس آنے والے حملہ آوروں کو آمادہ کیا تھا کہ میرے بجائے انتھونی کو ختم کردو؟ تیسرے کے بارے میں اس نے آپ کو بتادیا ہوگا کہ وہ اپنے ہی ایک اندھے ساتھی کا نشانہ بن گیا۔ ڈاک خانے والی گلی میں چور کا پیچھا کرکے یہ کون سے جرم کا مرتکب ہورہا تھا؟ شہر میں ایک اجنبی مسافر کو اپنی جمع پونجی چھن جانے پر کیا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا چاہیے تھا۔ چور کا پیچھا کرکے اس نے اپنا بٹوا حاصل کرلیا تھا کہ دو آدمی چاقو تانے دیوار بن گئے۔ ان میں سے ایک آدمی سے غلطی ہوئی، کیا یہ اپنے آپ کو اس کے سامنے پیش کردیتا؟ پھر پولیس والے اس کے تعاقب میں دوڑ پڑے۔ پناہ کے لیے یہ ایک شریف الطبع وکیل کے گھر میں جبراً داخل ہوگیا۔ اس نے سارا واقعہ سن کے ہمدردی کا اظہار کیا اور کسی ناخوش گوار صورت سے اسے بچانے کے لیے اس کے ساتھ میدا کے ٹھکانے پر جانے کی جرأت کرلی۔ وکیل صاحب نے میدا کو ہموار کرنے کی اپنی جیسی کوشش کی۔ جس خیال سے اس نوجوان نے میدا کے ٹھکانے پر جانے کا ارادہ کیا تھا، وہ اڈے پاڑوں کی ریت کے عین مطابق تھا اور یقیناً یہ کسی اعتماد ہی میں وہاں گیا تھا۔ اس اعتماد میں کہ یہ میدا کو چوکی سے اتار سکتا ہے۔ چاقو پر کوئی اور اتنی دست رس نہیں رکھ سکتا۔ کیا میدا ہی حرف آخر ہے۔ اس کے پاس کون سا راستہ تھا پھر؟ میدا نے اپنے گرگوں اور پولیس کے سپاہیوں سے مل کے اس کے لیے ہسپتال تک پہنچنے کا ہر راستہ بند کردیا تھا۔ پھر یہ کیا کرتا؟ وکیل کے گھر چھپ جاتا، اپنے بیمار بھائی کو اسپتال میں تنہا چھوڑ کے؟‘‘

ڈاکٹر نے لمحے بھر کے لیے توقف کیا تھا کہ ادھیڑ افسر زہر آلود مسکراہٹ سے بولا، ’’آپ کو تو ڈاکٹر کے بجائے وکیل ہونا چاہیے تھا ڈاکٹر صاحب!‘‘

ڈاکٹر نے اس کی جانب غور سے دیکھا، اس کے چہرے پر آگ سی بھڑکی۔ ادھر بغلی دروازے پر دستک ہوئی۔ ڈاکٹر نے ناراضی سے پوچھا۔ ’’کون ہے؟ اندر آجاؤ۔‘‘

جس دروازے سے ڈاکٹر داخل ہوا تھا، سفید وردیوں میں دو آدمی خوان پوشوں سے ڈھکے تشت اٹھائے اندر آئے۔ انہوں نے سلیقے سے وسطی میز پر تشت رکھ کے خوان پوش ہٹادیے، ایک میں نمکین چیزیں، پیسٹریاں، کیک اور انگریزی بسکٹ وغیرہ تھے۔ دوسرے میں چائے کے برتن، کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ بڑے افسر نے جسے ڈاکٹر رائے نے آئی جی کے خطاب سے مخاطب کیا تھا، اس تکلف کے لیے چند رسمی جملے ادا کیے۔ ڈاکٹر رائے کے اشارے پر خدمت گاروں نے سوفوں کی حاشیہ میزیں نکال کے ہمارے سامنے کردیں اور ان پر چمچوں کے ساتھ تشتریاں رکھ دیں۔ ایک خدمت گار پہلے تشت آئی جی، پھر دوسرے افسروں اور ڈاکٹر رائے کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے میری طرف انگلی سے اشارہ کیا تو خدمت گار ڈاکٹر کو چھوڑ کے میرے پاس آگیا۔ میں نے انکار کردیا۔ ڈاکٹر نے ایک بسکٹ تشتری میں رکھ کے گویا مہمانوں کے ساتھ شرکت کی وضع پوری کی۔ سب کو چائے پیش کرکے ملازم جلد ہی رخصت ہوگئے۔

’’آپ کچھ کہہ رہے تھے۔‘‘ خدمت گاروں کے جانے کے بعد ادھیڑ افسر نے خاموشی توڑنے کی کوشش کی۔

’’مگر مجھے شبہ ہے کہ آپ سن بھی رہے ہیں۔ سنا ہے پولیس ایک کان سے سنتی دوسرے سے اڑادیتی ہے۔‘‘

’’آپ پولیس سے بہت ناراض معلوم ہوتے ہیں۔‘‘ آئی جی زیر لبی سے بولا ’’پولیس میں بھی آدمی ہوتے ہیں جناب اور آدمی سبھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ پولیس میں بھی کالے اجلے لوگ ہوتے ہیں۔ اب یہ معلوم نہیں......‘‘ وہ جھجک کے بولا، ’’آپ ہمیں کیا سمجھتے ہیں؟‘‘

’’ایک خوش فہم کو بہتری ہی کی امید کرنی چاہیے۔‘‘ ڈاکٹر نے پرعزم لہجے میں کہا ’’اور پھر یوں بھی کہ میں اپنی دانست میں کوئی غلط بات نہیں کررہا۔ میں اس نوجوان کی سفارش نہیں کررہا بل کہ حقائق بیان کررہا ہوں۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں، یہ تو اپنے کو داؤ پر لگا کے میدا کے ٹھکانے پر چلا گیا تھا۔ میدا نے چاقو آزمائی سے کیوں پہلو تہی کی۔ وہ اتنا ہی زور آور ہے تو ایک اجنبی کے سامنے سینہ تان کے آجاتا۔ اس نے درمیان کا راستہ اختیار کیا۔ کیوں؟‘‘ ڈاکٹر نے تیز آواز میں آئی جی کو مخاطب کرکے پوچھا۔

تینوں افسر دم سادھے بیٹھے رہے۔

’’اب وہ میدا کے آدمی تھے جو اسپتال میں اسے ختم کرنے آئے تھے یا اس شخص کے پاگل ساتھی جو ڈاک خانے والی گلی میں اپنے ہی ساتھی کی وحشت سے ہلاک ہوگیا۔ کیا یہ واقعہ اسی طرح پیش نہیں آسکتا جس طرح اس نوجوان نے بیان کیا ہے؟ کہیں کوئی بے ربطی، کوئی ابہام نظر آتا ہے آپ کو؟ واقعات کی ترتیب میں کہیں کوئی جھول ہے؟‘‘

’’بہ ظاہر کوئی نہیں، نہایت مکمل خاکہ۔‘‘ آئی جی نے اچٹتی آواز میں کہا۔

’’آپ اسے خاکہ کہیں یا داستان۔ میں اسے تین چار دن سے دیکھ رہا ہوں۔ اس نے مجھ سے بدکلامی بھی کی ہے۔ یہ اپنے بھائی کے لیے جان پر کھیل سکتا ہے۔ اس کا ثبوت بھی دیا ہے اس نے۔ اس صورت حال میں یہ بھائی کو چھوڑ کے فرار بھی ہوسکتا تھا۔ یہ یہاں موجود ہے...... میں اس کے بھائی کا معالج ہوں اور ان دونوں سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ یہ ایک ہوش مند، جرأت مند اور بہت سے اپنے ہم عمروں سے مختلف ہے۔ اسے آگہی ہونی چاہیے کہ سردست یہ کسی غلط بیانی کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ آپ لوگ اسی شہر میں ہیں کچھ بھی آپ سے دور نہیں ہے، نہ میدا کا اڈا، نہ ڈاک خانے والی گلی، وہاں بہت سے راہ گیر اور اقامتی

تھے۔ پہلے ان گوشوں کونوں کو ذرا ٹٹول کر دیکھیے۔"
"وہ تو پولیس ٹیم کر ہی رہی ہے۔ صرف ہم تینوں افسران نہیں، پٹنا شہر کی ساری پولیس جلد از جلد نتائج حاصل کرنا چاہتی ہے۔ یہ محکمے کی کارکردگی اور عزت کا معاملہ ہے۔" ادھیڑ افسر نے بڑی حد تک روکھے انداز میں کہا۔
"تو ٹھیک ہے، پہلے اپنے طور پر تفتیش کر لیجیے۔ ضرورت پڑے تو ضرور یہاں آیئے۔ میں یقین دلاتا ہوں۔ یہ یہیں موجود ہے، کہیں نہیں جا رہا۔ آپ جب چاہیں یہاں آسکتے ہیں اور اس سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو میں خود اسے آپ کے حوالے کر دوں گا۔"
"لیکن ڈاکٹر صاحب مشکوک لوگوں کو ہمارے ہاں ایسی رعایتیں نہیں دی جاتیں۔ ہماری تفتیش کا اپنا ایک طریق کار ہے۔ مجرم کا کھرا کھوٹا ذرا جلدی سامنے نکل آتا ہے۔ ہمیں اس کے شہر فیض آباد کی پولیس سے بھی رابطہ کرنا ہے، اس کے تمام پس منظر اور دیگر حوالوں کی چھان بین کرنی ہے۔ پولیس کو اسے یوں کھلا چھوڑ دینے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہیے، اور آپ بھی جناب! معاف کیجیے، ہماری مخلصانہ صلاح ہے، آپ بھی اس پر اتنا اعتماد نہ کیجیے۔ میدا کے ٹھکانے پر یہ بات الٹی ہو جاتی، یا یہ اسپتال آنے والے سرپھروں کے ہاتھ آجاتا تو بھی تو اس کا بھائی تنہا ہو جاتا۔" ادھیڑ افسر نے کھردری آواز میں کہا۔
"لیکن ایسا نہیں ہوا۔" ڈاکٹر بپھر کے بولا۔ "اس کا مطلب یہ نہیں ہوا کہ اب آپ اس کی خوش قسمتی غصب کر لیں۔"
"ذرا اس پہلو پر بھی غور کیجیے ڈاکٹر صاحب! یہ پولیس کی تحویل میں زیادہ محفوظ رہے گا۔ آپ دیکھ رہے ہیں، یہ ان کے ہاتھ نہ آیا تو انہوں نے اس کے مربی محسن اکبر علی خاں کو ختم کر دیا۔ وہ دوبارہ کچھ اور منصوبہ بندی بھی کر سکتے ہیں۔ لگتا ہے وہ چین سے بیٹھنے والے نہیں، بڑے خطرناک، منتقم مزاج لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے وجود سے ان کے جمے جمائے ٹھکانے، ان کی بادشاہت پر ضرب پڑنے کا خدشہ ہے اور اگر وہ میدا کے آدمی نہیں اور آپ کے اندیشے کے مطابق وہ پاگل ڈاک خانے والی گلی میں مرنے والے کے ساتھی بھی ہو سکتے ہیں تو وکیل صاحب کے خاتمے کے بعد وہ مطمئن ہو گئے ہوں گے کیا؟ کیا انہوں نے اپنے ساتھی کی قیمت وصول کر لی؟ ہماری تفتیش اپنی جگہ، پولیس کی تحویل سے مراد اس کی حفاظت کی ضمانت بھی تو ہے۔ یہ کھلا رہا تو اور خون خرابے کا امکان ہے۔ جو لوگ اس کے دوست وکیل صاحب پر اپنا غضب آزما سکتے ہیں، ان سے کیا بعید ہے کہ وہ اس اسپتال میں پڑے اس کے بیمار بھائی کو بھی......"
میری طرف دیکھ کے ادھیڑ افسر کی آواز بل کھانے لگی۔
"اب آپ نے ایک دوسری بات کہہ دی۔ ایک بات طے کر لیجیے، آپ اسے محض شک کی بنیاد پر ساتھ لے جانا چاہتے ہیں، یا اس کی حفاظت کے لیے، یا دونوں کے لیے؟" ڈاکٹر جھلائے لہجے میں بولا۔ "میں نہیں سمجھتا شک کی کوئی معقول وجہ موجود ہے اور حفاظت تو آپ یہاں بھی کر سکتے ہیں۔ اسپتال کی تاریخ میں پہلی بار پولیس یہاں آچکی ہے۔ کچھ اور نفری بھیج دیجیے۔ یہاں اسپتال میں بھی آپ اس کی حفاظت بہ خوبی کر سکتے ہیں۔ تھوڑا بہت قانون مجھے بھی معلوم ہے۔ اپنی سلامتی کے لیے یہ قانوناً بھی آپ سے مدد طلب کر سکتا ہے اور رہی خانہ خرابی کی بات تو آپ شہر میں کس لیے ہیں آپ کا کیا کام ہے۔ شہر میں تین خونی وارداتیں ہو چکی ہیں اب بھی آپ......" ڈاکٹر کوئی شدید بات کہتے کہتے رہ گیا۔
چند لمحے توقف کے بعد اس نے نرمی سے کہا "آپ اسے یہاں سے لے جانے ہی پر مجبور اور مصر

ہیں تو مجھے بتایئے میں آپ کا بار کم کرنے، آپ کی بریت کے لیے کس حاکم اعلا سے بات کروں۔''

تینوں افسر اضطراری انداز میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

''آپ کی اطلاع کے لیے......'' ڈاکٹر نے روکھی آواز میں کہا، ''کچھ دیر پہلے میں نے بیرسٹر پی ایل بھارگو سے بات کی ہے۔ وہ بہت مصروف ہیں لیکن میری گزارش رد نہ کر سکے، پورا معاملہ سن کے رضا مند ہو گئے۔ انہوں نے ضمانت قبل از گرفتاری کا مشورہ دیا ہے۔ میں اس کی ضمانت لے سکتا ہوں، کوئی بھی ضمانت۔''

یکا یک آئی جی اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں افسر اسے دیکھ کے ہڑبڑا گئے۔ ڈاکٹر رائے نے ان سے چند لمحوں کے لیے بیٹھ جانے کی درخواست کی۔ ڈاکٹر نے اتنی دیر میں پہلی بار مجھے مخاطب کیا۔ ''تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟''

اس نے انگریزی میں مجھ سے پوچھا تھا۔ اس دوران وہ چاروں مسلسل انگریزی میں بات کرتے رہے تھے۔ کوئی جواب دینے کا مطلب تھا کہ میں نے ڈاکٹر کی بات سمجھ لی ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے انگریزی میں بولنا پڑا۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''نہیں ڈاکٹر صاحب! میں کیا کہوں اب۔ سبھی کچھ تو آپ نے کہہ دیا ہے۔ اڈے پاڑوں سے تعلق کی وجہ سے پولیس کا مجھے کسی قدر تجربہ ہے۔ ان کے لیے خانہ پری بہت اہم ہوتی ہے لیکن میں انہیں یقین دلاتا ہوں، میں اس وقت تک یہیں رہوں گا جب تک بھائی یہاں زیر علاج ہے۔ اور شہر سے جاؤں گا تو پولیس کو بتا کے۔''

میرے انگریزی بولنے پر ان تینوں کے جسم کھنچ سے گئے تھے۔ انگریزی زبان کا بھی کیا کرشمہ ہے۔ آدمی کچھ اور نظر آنے لگتا ہے۔ آدمی معتبر ہو جاتا ہے۔ پولیس والے تو وہ تھے ہی، موٹی چمڑی کے سہی، آدمی تو بہرحال ہوتے ہیں۔ اس گمان میں کہ میں کچھ اخذ نہیں کر پا رہا ہوں، میرے بارے میں انہوں نے بڑی ناگواری اور حقارت سے بات کی تھی۔ یقیناً انہیں اب کچھ خجالت ہونی چاہیے۔ خجالت کے بجائے ان کے چہروں سے حیرت جھلک رہی تھی۔

''میری آپ سے التجا ہے۔'' میں نے براہ راست آئی جی کو مخاطب کیا ''پولیس کا ایک اور کام بھی ہوتا ہے۔ جن کا نقصان ہوا ہے، ازالہ ممکن نہیں تو کم از کم ان کی دل دہی، دل جوئی کرنی چاہیے۔ میں نے اکبر علی خاں صاحب کا گھر دیکھا ہے۔ ان کے بچے زیادہ بڑے نہیں، بیوی کو اپنے شوہر سے بہت محبت تھی۔ ایک بوڑھی ماں بیمار ہے۔ ان کے گھر پہ تو قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ مجھ میں وہاں جانے کی ہمت نہیں تھی، کس منہ سے ان کا سامنا کر پاؤں گا لیکن میں وہاں جانا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اجازت نہیں دی۔'' میں نے عاجزی سے تکرار کی ''میں یہیں رہوں گا جناب! اس اسپتال میں، کہیں نہیں جاؤں گا میں۔ بھائی کے ٹھیک ہو جانے پر اس شہر میں مجھے ایک اور بھی کام ہے۔ میدا کے اڈے پر اپنا چاقو واپس لینے بھی جانا ہے۔''

تینوں متلاطم سے ہو گئے۔ نوجوان افسر نے بے کلی سے پوچھا، ''تو...... تو تم وہاں جاؤ گے؟''

''جانا ہے۔ یہ میرا اس کا وعدہ ہے۔ وعدہ تو قرض جیسا ہوتا ہے۔ کم از کم میرے لیے تو ہے۔''

''یعنی تم اسے تم زیر کر کے اس کے ٹھکانے پر قبضہ جمانا چاہتے ہو؟'' نوجوان افسر کی آواز تمتمانے لگی تھی۔

''میں آپ کو شاید بتا چکا ہوں مجھے آگے جانا ہے، لیکن قرض چکا کے، بس چلتا تو میں آج ہی ادھر چلا جاتا لیکن ڈاکٹر صاحب نے مجھے یہاں ایک طرح سے قید ہو جانے کا حکم دیا ہے۔''

''بازی الٹ بھی تو سکتی ہے۔'' نوجوان افسر

ے کہا۔

''بازیوں میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔'' میں نے
پروائی ظاہر کی۔

''دیکھا، دیکھا آپ نے ڈاکٹر صاحب! اس
تیور دیکھے آپ نے؟'' ادھیڑ افسر تیزی سے
ا۔

''یہ سچ بول رہا ہے۔'' ڈاکٹر نے اٹھی آواز میں
ا۔

وہ تینوں اٹھ گئے۔ ڈاکٹر نے بھی پھر ان سے
ئی کلام نہیں کیا، چند رسمی الوداعی فقرے ادا
نے ضروری سمجھے اور دروازے تک ان کا ساتھ
۔

ان کے جانے کے بعد کمرے میں ہم دونوں تنہا
گئے تھے۔ چند ثانیوں تک ڈاکٹر سر جھکائے
وش بیٹھا رہا۔ جیسے سانسیں استوار کرنے کی
ش کر رہا ہو یا بہت تھک گیا ہو اور ایک وقفہ
ن لازم ہو۔ میں اس کے نزدیک گم سم کھڑا رہا۔
ی عقل میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میں اسے کیا
وں۔ ہر لفظ مجھے بے مایہ محسوس ہوتا تھا۔ کچھ کہنے
کوشش میں میری آنکھیں بھر آئیں۔ میں اس
ہاتھ چومنا، اس کے پیر پکڑنا چاہتا تھا۔ وہ یک
کھڑا ہو گیا۔ ایک نظر میری جانب دیکھا اور
ے کچھ کہنے سے پہلے اس نے ہونٹوں پر انگلی
کے حکم دیا، ''تم ایک لفظ نہیں کہو گے۔ میں نے
چھ کہا اور کیا، اسی کو ٹھیک سمجھتا تھا۔ اب جاؤ اپنے
رے میں اور بھائی کو دیکھو۔''

اس نے مجھے زبان کھولنے نہیں دی اور تیز
وں سے کمرے سے نکل گیا۔ میں دیر تک بے
وحرکت وہیں کھڑا رہا۔

کمرے کے باہر سیورین میری منتظر تھی، بے
نیا میری جانب لپکی اور عین میرے سامنے آ کے
تہ روک کے کھڑی ہو گئی۔ ''کیا ہوا، چلے گئے
سب ٹھیک تو رہا؟'' اس نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

میں نے آنکھیں موند کے اور ہاتھ اٹھا کے اسے اطمینان دلانے کی کوشش کی۔

''میرا دل بہت دھڑک رہا تھا۔'' وہ پھولی ہوئی سانسوں سے بولی، ''لگتا ہے، تم ایک طویل مدت بعد قید سے رہا ہو کے آ رہے ہو۔''

''مجھے بھی کچھ یہی لگتا ہے۔'' میں نے زہر خند سے کہا۔ ''مجھے پولیس سے بہت ڈر لگتا ہے۔''

''کس کو نہیں لگتا۔ پولیس کو بھی شاید پولیس سے ڈر لگتا ہے۔'' میں نے کہا ''تسلی رکھو، سب ٹھیک ہی رہا۔''

''شکر ہے، میں دعائیں کر رہی تھی۔ سوچتی تھی، تمہارا آخر کیا قصور ہے۔'' وہ امڈتی آواز میں بولی۔

میں نے اس سے نہیں کہا کہ میرا قصور تو میرا وجود ہے۔ اتنی کشاکش، اتنی آزمائشوں کے بعد بھی یہ وجود اپنے ہونے پر کیوں مصر ہے۔ ہم دونوں راہ داری کا مختصر فاصلہ عبور کر کے کمرے میں آ گئے اور میرے قدم سیدھے بٹھل کی طرف اٹھے۔ وہ جاگ رہا تھا میری آہٹ سے آنکھیں کھل گئیں۔ مجھے دیکھ کے لبوں میں جنبش ہوئی۔ اس نے کچھ کہا تھا جو میں نہ سن سکا۔ اس نے دہرایا بھی نہیں۔ سیورین پاس ہی کھڑی تھی۔ اس نے بٹھل کے جسم پر ڈھلکی دلائی جیسی چادر درست کی، سرہانے جا کے بال سنوارے، پیشانی پر ہاتھ رکھا اور ہندستانی میں نرمی سے پوچھا، ''سر میں درد تو نہیں۔''

بٹھل نے ممنونیت کے انداز میں سر ہلا کے انکار کیا۔

''کچھ چاہیے آپ کو؟'' سیورین نے شگفتگی سے پوچھا۔

بٹھل نے اپنا ہاتھ چادر سے باہر نکالا۔ سیورین بہت ہوش مند اور مستعد لڑکی تھی۔ دوسری جانب جا کے اس نے بٹھل کا اٹھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ ادھر

بٹھل کا دوسرا ہاتھ میں نے پنجے میں جکڑ لیا۔ پنجے پر اس کی گرفت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا ارادہ بحال ہو رہا ہے۔ ارادہ آدمی کی متاع ہے۔ اس کے بغیر آدمی کیا ہے؟ ہے بھی، نہیں بھی۔ اس کی آنکھوں میں چمک بھی تیز تھی۔ سیورین آدھی انگریزی، آدھی ہندستانی میں اسے تشفی دلاسے دینے لگی۔ بٹھل کے ہونٹوں پر اطمینان کی مسکراہٹ چھائی رہی۔ گھڑی دیکھ کے سیورین کے بدن میں جیسے بجلی سی بھر گئی۔ اس نے بٹھل کا بستر سرہانے سے کچھ اونچا کیا اور یکے بعد دیگرے دوائیاں پلانے لگی۔ کچھ دیر بعد بٹھل کے پپوٹے بھاری ہونے لگے اور وہ جلد ہی خود سے بیگانہ ہو گیا۔ سیورین نے مجھے اس کے پاس سے ہٹ جانے کا اشارہ کیا۔ پنجے میں دبا ہوا بٹھل کا ہاتھ آہستہ آہستہ میں نے جدا کیا۔ اس کی گرفت پہلے ہی کم زور پڑ چکی تھی۔ دواؤں میں یقیناً خواب آور دوائیں شامل ہوں گی یا اسے بھی اتنے ہی حوصلے کی توفیق ہو سکی تھی مگر یہ بھی غنیمت تھا۔ گزشتہ کل کی نسبت سے تو بہت غنیمت تھا۔

سوفے پر آ کے میں نے اپنے آپ سے غافل ہونے کی کوشش کی، لیکن آدمی کا اختیار اس کے پاس کس قدر ہے۔ کتنا ہی کوئی ارادے کا پختہ ہو، اس کے دل و دماغ کتنے ہی متوازن ہوں، اسے اپنے دریچے دروازے بند کرنے کی مقدرت نہیں ہے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا، یا سنا تھا کہ آدمی کا سب سے بڑا دوست اس کا ہوش ہے اور سب بڑا دشمن بھی یہی ہوش ہے۔

دروازے پر کسی رفیق کار کی جھلک دکھائی دی تھی کہ اسے کمرے میں بلانے کے بجائے سیورین خود باہر چلی گئی۔ بٹھل کمرے میں موجود تھا، لیکن بے خبر آدمی کی موجودی ایک گمان ہے۔ میں تنہا رہ گیا، اور آدمی تنہا کہاں ہوتا ہے۔ تنہائی تو ایک عددی امتیاز ہے کسی کے ساتھ دوسرا کوئی نہیں ہے، مگر آدمی ہمہ وقت، ہر لمحہ اپنے ساتھ جو ہوتا ہے۔ تنہا آدمی اپنی ذات کے ہجوم میں گھر جاتا ہے، ایک دریچہ بند نہیں ہوتا، دوسرا کھل جاتا ہے، تیسرا، چوتھا...... اور کیسے کیسے بھولے بسرے، دور افتادہ، کیسے مٹی لوگ آ کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

میرا سر دکھ رہا تھا۔ سر کیا، سارا جسم ہی کسی زخم کے مانند تھا۔ آدمی کو اپنا آپا بھی کیسا حقیر، کوڑے کا ڈھیر لگنے لگتا ہے۔ میں بہت نظریں چراتا تھا، لیکن بار بار اکبر علی خاں سامنے آ جاتے تھے، مجھ سے جیسے کوئی سوال کرتے ہوں، ان کی بیوی، ان کے بچے، ان کی بیمار ماں، جنہیں میں نے نہیں دیکھا تھا، لیکن ایک ضعیف و ناتواں عورت...... ان سب کی نظریں کانٹوں کی طرح، میرے جسم میں پیوست ہوتی تھیں اور ہڑک سی سینے میں اٹھتی تھی کہ میں یہاں بیٹھا کیا کر رہا ہوں۔ کیا صرف پشیمانی، ملال اور بے بسی کا احساس اکبر علی خاں جیسے بے بہا، بے پناہ آدمی کا مول ہے۔ دست و بازو اینٹھنے لگتے تھے کہ یہ کیسی مصلحت کوشی، مآل اندیشی ہے کہ میں یہاں ہاتھ پیر توڑے بیٹھا رہوں۔ اکبر علی خاں یوں چلے جائیں اور مجھے معلوم ہو کہ ان کے قاتل کس سمت سے آئے تھے، وہ کون ہو سکتے ہیں۔

مجھ سے بیٹھا نہ جا سکا تو اٹھ کے کمرے میں چکر کاٹنے لگا، اس کونے سے اس کونے تک۔ دروازہ کھلا ہوا تھا، کھڑکیاں بھی کھلی ہوئی تھیں۔ دن کی روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی، لیکن روشنی، ہوا، کھلی کھڑکیاں، کھلے دروازے، سب کچھ آدمی کے اخذ و استنباط کی آمادگی سے مشروط ہے۔ آدمی کے اندر ہی اندھیرا چھایا ہوا اور آدمی کا جسم ہی محبس بنا ہو اور آدمی کو اپنا آپا ہی زہر لگ رہا ہو۔

شکر ہے سیورین جلد واپس آ گئی۔ اس کا چہرہ بجھا ہوا تھا۔ آ کے اس نے وہی شائستگی اختیار کی جو اس لڑکی کے حسن و جمال اور نرم اور نازکی پر مستزاد تھی۔ مجھے بتائے بغیر باہر جانے کی معذرت کی اور کہنے لگی، اس کی رفیق کار دوست اسے بتانے آئی

تھی کہ انتھونی کی بیوی شیری کا بچہ اس کے پیٹ میں مر گیا ہے۔ آپریشن کر کے شیری کو بچا لیا گیا ہے، لیکن اس کی حالت نازک ہے۔ سیورین بہت اداس تھی۔ مجھ میں مزید یاسیت کی تاب نہیں تھی۔ میں خاموش رہا اور دوبارہ سوفے پر آ پڑا۔ اکبر علی خاں کے سانحے سے انتھونی اوجھل سا ہو گیا تھا۔ وہ بھی تو اپنے گھر والوں کو بہت عزیز تھا۔ اس کی بھی بیوی تھی اور متعلقین تھے۔ مرنے والوں کے پس ماندگان اذیتیں جھیلنے کے لیے کیوں زندہ رہ جاتے ہیں۔ ایک آدمی مر جاتا ہے تو کتنے آدمی ویران ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی مر جایا کریں تو کسی کی جدائی کسی کے لیے عذاب نہ رہے۔ کسی آدمی کے مر جانے سے ایک گھر اجڑ جاتا ہے تو گھر ہی کیوں باقی رہے۔

سیورین میرے پاس آ کے بیٹھ گئی اور دیر تک کھوئی کھوئی رہی۔ مجھے وقت کا احساس نہیں تھا۔ کسی لمحے اس کی نظر گھڑی پر گئی ہو گی، یا اسے ویسے ہی خیال آیا کہ چونک کے بولی، ”تم نے صبح سے کچھ کھایا پیا نہیں ہے۔“

میں نے اپنے آپ کو سمیٹ کے کہا، ”بھوک ہی نہیں ہے۔“

”تھوڑا بہت تو کچھ کھا لو۔“

میں نے بیزاری سے انکار کر دیا۔

کل اسی وقت اکبر علی خاں کھانا لائے تھے۔ سیورین بھی شریک ہو گئی تھی۔ وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ یقیناً اسے اکبر علی خاں یاد آ رہے ہوں گے۔ آدمی کتنی جلدی محض یاد ہو جاتا ہے۔ میں سمجھ رہا تھا، میری وجہ سے وہ ان کا ذکر نہیں کر رہی ہے۔

”چائے...... کافی، یا تھوڑا سا رس...... کچھ تو لے لو......“ وہ التجائی لہجے میں بولی۔

”نہیں، اس وقت کچھ نہیں۔ بس تم یہاں بیٹھی رہو۔“

”میں یہیں ہوں۔“ اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے ڈوبی آواز میں کہا، ”مجھے معلوم ہے، تم پر کیا گزر رہی ہے۔ کہتے ہیں بس...... مگر کوئی کسی کا دکھ کیا بٹا سکتا ہے۔“

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی لیکن یہ بھی تو ایک سچ تھا کہ اس کی موجودی سے گھٹن کچھ کم محسوس ہوتی تھی۔

”ایک بات پوچھوں؟“ وہ آہستگی سے بولی۔

میں نے پلکیں جھپکا کے اس کی طرف دیکھا۔

”یہ پولیس افسروں سے تمہاری کیا بات ہوئی۔ مجھے کچھ بتاؤ۔“

”کیا بتاؤں، کچھ خاص نہیں۔“

”سنا ہے، بڑے پاگل لوگ ہوتے ہیں۔ وہ ایسے آسانی سے کسی کو نہیں چھوڑتے۔“

”میں نے جو تھا، انہیں بتا دیا تھا، لیکن وہ میری بات تسلیم نہیں کر رہے تھے۔“

”پھر کیسے تم......؟“ وہ ہونٹ چبانے لگی۔

”پھر ڈاکٹر رائے نے ان سے بات کی۔“

”ڈاکٹر رائے! کیا وہ بھی وہاں موجود تھے؟“

”بعد کو آ گئے تھے اور پھر انہوں نے...... انہوں نے تو......“ میری آواز رندھنے لگی۔ ”کیسے مشفق اور سچے آدمی ہیں وہ۔ اس وقت میں یہاں تمہارے پاس انہی کی وجہ سے بیٹھا ہوں۔“

”وہ تو ایک مکمل آدمی ہیں۔ سبھی ان کی عزت بے وجہ تو نہیں کرتے اور سبھی ان سے بے وجہ خوف نہیں کھاتے۔ وہ تو ایک مثال ہیں۔“

”کون ہوتا تھا میں ان کا؟ ایک اجنبی، ایک بیمار آدمی کا نگہدار...... اور کیا رشتہ ہے میرا ان سے؟“

”صبح جوان سے تمہاری بات ہوئی ہے۔ تم نے ضرور انہیں سب کچھ بتا دیا ہو گا۔“

”میرے پاس چھپانے کے لیے کچھ نہیں تھا...... اور انہوں نے اسی طرح یقین کیا، جس طرح میں نے کہا تھا۔“

”وہ جہاں دیدہ آدمی ہیں۔ صرف ڈاکٹر ہی

نہیں، وہ بہت بڑے مردم شناس اور انسان دوست آدمی ہیں۔''

''وہ تو وہاں میری وکالت کرتے رہے اور میں! میں انہیں دیکھتا رہا۔ میرے ساتھ ہر جگہ کچھ نہ کچھ ایسا ہی اندھیر ہوتا رہتا ہے، اور ایسے ہی لوگ مل جاتے ہیں۔ کس کس کا نام لوں، یہاں اکبر علی خاں مل گئے تھے اور اب...... خدا ڈاکٹر صاحب کو لمبی عمر دے۔ میری عمر بھی انہیں لگ جائے۔''

''اچھے لوگوں کو اچھے لوگ مل ہی جاتے ہیں۔''

''اور اچھے لوگوں کے ساتھ اتنا برا بھی تو ہوتا رہتا ہے...... میں تمہیں کیا بتاؤں ...... کیا کیا بتاؤں۔''

سیورین کے پاس کوئی جواز نہیں تھا، افسردگی سے بولی، ''کہتے ہیں، خداوند کی کوئی مصلحت ہوتی ہے۔''

''انھونی اور اکبر علی خاں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ یہ کیسی مصلحت ہے خدا کی؟''

یہی ایک جواب ہر عاجز اور ناتواں کی سپر ہوتا ہے کہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ سیورین نے بھی یہی کہا۔

''انھونی ان کے راستے کی رکاوٹ بن گیا تھا، لیکن اکبر علی خاں......! صرف اتنی سی بات پر کہ تین چار دن سے وہ میرے بہت قریب ہو گئے تھے اور میں ان کتوں کے ہاتھ نہیں آ رہا تھا، انہوں نے ایک بے گناہ کو ختم کر دیا...... اور کس بات پر......! کہ میں کسی طور پر ان کے ساتھی دھنوا کی موت کا سبب بن گیا تھا لیکن وہ جانتے ہیں، میں نے اسے نہیں مارا تھا۔ اور سبب بھی میں کہاں تھا، انہوں نے ہی زیادتی کی تھی۔''

''وہ آدمی نہیں درندے معلوم ہوتے ہیں۔'' سیورین تلخی سے بولی۔

''ان کا انجام بھی پھر ہولناک ہونا چاہیے۔'' مجھے اپنی آواز پر قابو نہیں رہا۔ ''انہیں ایسے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ ظالم کو اس کے انجام سے دوچار کر دینے میں تامل و تاخیر بڑی اذیت، بہت بڑا جبر ہے۔''

سیورین مجھے صبر و ضبط کی تلقین کرنے لگی۔ وہ یہی کچھ کر سکتی تھی۔

وہ کیا جانتی تھی، میرا سینہ بہت جلتا ہے۔ مجھے تو ایک پل بھی کاٹنا دوبھر ہو رہا ہے۔ ''اتنا وقت نہیں ملنا چاہیے انہیں۔'' میں نے بھنچی ہوئی آواز میں کہا۔

''مگر تم...... تم سر دست کیا کر سکتے ہو۔ شاید کچھ بھی نہیں۔'' وہ تیکھے لہجے میں بولی۔

اس کے غیر متوقع ترشی آمیز لہجے پر مجھے حیرانی ہوئی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ پلکیں پٹ پٹانے لگی اور جیسے اس نے کچھ سوا کہہ دیا ہو۔ وہ خجل سی ہو گئی...... مگر اس نے کیا غلط کہا تھا۔ مجھے تو انتظار کرنا ہے جب تک ان لاٹ صاحب کی طبیعت سازگار نہیں ہو جاتی۔ میرے پیروں میں تو انہوں نے زنجیر ڈال رکھی ہے...... اور یہ سب کچھ ہوا بھی انہی کی وجہ سے ہے۔ نہ وہ اپنی یہ حالت بناتے نہ ہمیں اس شہر میں آنا پڑتا اور نہ یہ وقت دیکھنا پڑتا۔

''تم ٹھیک ہی کہتی ہو۔'' میں نے مایوسی سے کہا، ''لیکن میں کیا کروں اس طرح منہ چھپائے بیٹھا نہیں جا رہا۔ اکبر علی خاں کے گھر والوں کا خیال آتا ہے۔ وہ کیا سوچتے ہوں گے میں کیسا بے حس، بے غیرت ہوں، اپنے محسن کے پُرسے کے لیے نہیں آیا اور دوسرے لوگ...... اکبر علی خاں کے گھر پر ان کے اعزا، احباب، پاس پڑوس والوں کا ایک ہجوم ہو گا۔ وہ لوگ کیسی کیسی چہ میگوئیاں کر رہے ہوں گے۔ انہیں بتایا گیا ہو گا کہ تین چار دن سے ایک اجنبی سے ان کی رسم و راہ بہت بڑھ گئی تھی۔ صبح و شام اسپتال جانا ان کا معمول ہو گیا تھا۔ بہت باتیں ہو رہی ہوں گی وہاں۔''

''وہاں تمہارے جانے کے بعد بھی یہی کچھ ہو گا۔'' سیورین دبی دبی آواز میں بولی۔

''لیکن میرا جی تو مطمئن ہو جاتا۔ اب خیال آتا ہے۔ شاید یہی بہتر تھا کہ پولیس مجھے ساتھ لے جاتی۔ پھر میرے وہاں نہ جانے کا ایک عذر تو معقول ہوتا۔''

''اوہ، نہیں نہیں۔'' سیورین بے قرار ہو گئی۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''میں خود کو بے بس، بہت حقیر محسوس کر رہا ہوں۔''

''کیوں؟'' وہ حیرانی سے بولی، پھر اس کے شانوں کی طرح اس کی آواز بھی ڈھلک گئی۔ کہنے لگی، ''برا نہ مانو تو کچھ کہوں۔''

''اس سے برا کیا ہو گا جو ہو رہا ہے۔'' میں نے پژمردگی سے کہا۔

''معاف کرنا، لگتا ہے تم اپنے حواس میں نہیں ہو اور ذہنی انتشار میں بڑی الٹی سیدھی باتیں کر رہے ہو۔ تم سمجھتے ہو، تم کیا کہہ رہے ہو؟ تم اپنے بھائی کو یہاں چھوڑ کے پولیس کے ساتھ چلے جاتے تو تمہارے پاس اکبر علی خاں صاحب کی تجہیز و تکفین میں شریک نہ ہونے کا ایک عذر ہو جاتا۔ یہی نا؟ تم چلے جاتے ان کے ساتھ۔ تم نے ڈاکٹر رائے کو روک دیا ہوتا کہ وہ اپنا وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں۔ یہ تو تم اب بھی کر سکتے ہو۔ یہاں اسپتال میں بہت سے پولیس والے چوکسی کر رہے ہیں۔ تم اب بھی ان کے سامنے جا کے خود کو پیش کر سکتے ہو۔''

سیورین ایک مختلف لڑکی نظر آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ دہک رہا تھا۔ میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

''ہم یہاں تمہارے بھائی کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ وہ پوچھے گا تو تمہاری یہاں ناموجودی کا کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیا جائے گا۔ وہ مان لے گا تو ٹھیک ہے، نہیں تو......''

مجھے حیرت ہوئی، اسے اس طرح کی نکیلی زہریلی باتیں کرنا بھی آتی ہیں۔ میں نے زبان بند رکھی، اس لیے کہ میرے پاس تردید کے لیے کچھ نہیں تھا۔

''ڈاکٹر رائے ایک دانش مند آدمی ہیں۔ انہوں نے ہر طرف دیکھ کے ہی پولیس سے بات کرنے، ایک اجنبی کے معاملے میں دخل اندازی کا فیصلہ کیا ہو گا۔'' سیورین کی آواز ماند پڑ گئی۔ ''انہوں نے تمہارے باہر جانے پر پابندی عائد کر دی ہے۔ ایسی پابندی جو تم کسی لمحے بھی توڑ سکتے ہو۔ یہ پابندی نہیں۔ ایک بزرگ، ایک مہربان شخص کی تاکید ہے۔ ڈاکٹر رائے کو معلوم ہے کہ شہر کی کیا حالت ہے۔ تین چار دن میں تین قتل ہو چکے ہیں اور تم کسی نہ کسی طور سے ان میں ملوث ہو۔ باہر تمہارے دشمن تمہاری تلاش میں ہیں۔ انہیں یقین ہو گا کہ تم اکبر علی خاں کے پرسے کے لیے ان کے گھر کا رخ ضرور کرو گے۔ ان پاگلوں کے سر پر خون سوار ہے۔ وہ تاک لگائے بیٹھے ہوں گے اور تم ان سے بچ کر اکبر علی خاں کے گھر پہنچ گئے تو وہاں موجود بے شمار تعزیت دار تم سے کوئی باز پرس نہیں کریں گے کیا؟ وہ طرح طرح کے سوالوں سے تمہارا سینہ چھلنی کر سکتے ہیں۔ ایک دور دراز امکان یہ بھی ہے کہ اکبر علی خاں کا کوئی فدائی تمہیں وہاں دیکھ کے اپنے ہوش و حواس میں نہ رہے اور...... اور تم پر کوئی شبہ ہے تو جلد ہی پولیس اور دوسرے ذریعوں سے ہر کسی کو باور ہو جائے گا کہ اکبر علی خاں کی ہلاکت کے وقت تم اپنے بھائی کے پاس اسپتال میں تھے...... تم نے سوچا، ان پے در پے سنگین واقعات کے بعد شہر کے لوگ تمہاری صورت دیکھنے کے لیے کتنے......''

بٹھل کو کچھ تکلیف ہوئی تھی کہ یکایک کمرے میں کراہ جیسی اس کی آواز گونجی۔ سیورین صوفے سے اٹھ کے اس کے بستر کی جانب لپکی۔ میں بھی اس کے پیچھے گیا۔ بٹھل نے کروٹ بدلنے کی کوشش کی تھی۔ سیورین نے اس کی مدد کی، سر اٹھا کے تکیہ درست کیا اور جسم تھپ تھپاتے ہوئے دیر تک

نگہداری کرتی رہی۔ بٹھل غفلت میں تھا۔ اس طرف سے مطمئن ہو کہ وہ دوبارہ سونے پر آ بیٹھی اور معذرت کرنے لگی کہ اس نے اپنی حیثیت سے تجاوز کیا۔ وہ نہ جانے کیا اول فول بکتی رہی۔
"تم نے کیا...... کیا غلط کہا۔" میں نے ہیجانی لہجے میں کہا، "مجھے تو تعجب ہے، تمہیں اتنی باتیں...... اتنی مدلل اور موثر باتیں بھی کرنی آتی ہیں۔"

میں کہہ نہ سکا اور کہنا چاہتا تھا کہ اس کے تخمینے میں مجھ سے کوتاہی ہوئی۔ اس کانچ کی بنی، پھولوں کی طرح نازک، ریشم کی طرح نرم لڑکی کی دانائی اور جزو بینی کا مجھے ایسا اندازہ نہیں تھا۔ وہ مجھے زریں کی مثل لگ رہی تھی۔ کوئی کسی کے بکھیڑے، کسی کے دکھ میں اس قدر سنجیدہ، اتنا شامل کہاں ہوتا ہے۔
"ایک بات بتاؤ، تمہیں اکبر علی خاں کے گھر جانے کی بے کلی ہے۔ یا ان کے قاتلوں کی سرکوبی کی؟"

مجھے جواب دینے میں ہچکچاہٹ ہوئی۔
میرے جواب کے انتظار میں اس نے چند لمحے تامل کیا اور متانت سے بولی۔ "شاید دونوں کی...... ہونی بھی چاہیے، لیکن یہ وجہ نہ اس وقت اکبر علی خاں کے گھر جانا مناسب ہے نہ کسی دوسرے کام سے باہر جانا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ بس تمہارے باہر نکلنے کی دیر ہے، تم ان کے سروں پر پہنچ جاؤ گے جنہوں نے انھوٹی اور اکبر علی خاں سے ان کی زندگیاں چھین لی ہیں۔ تمہارے انتظار میں وہ سر جھکائے کھڑے ہوں گے کہ ہمیں ہمارے انجام تک پہنچاؤ......؟ اور کیا تم اس گمان میں ہو کہ کسی اور طرف جانے کے بجائے تم سیدھے اس بدمعاش کے ٹھکانے کا رخ کرو گے جس کا چاقو تمہاری جیب میں ہے اور جو شہر کے تمام شورہ پشتوں کا سرغنہ ہے۔ تم اسے تخت سے اتار کے اس کی قلم رو کے حاکم بن جاؤ گے، پھر سب کچھ تمہارے زیر نگیں ہوگا اور اس کا ہر آدمی تمہاری دست رس میں...... تمہارے پاس ایسی کوئی ضمانت ہونی چاہیے کہ وہاں پہنچنے کے بعد تم سے بہادروں اور بادشاہوں کا سلوک کیا جائے گا۔"

"لیکن میں...... میں تو یہاں موجود ہوں۔" میں نے کٹی پھٹی آواز میں کہا، "ڈاکٹر رائے کی تنبیہ کے باوجود میں یہاں سے نکل سکتا تھا۔ بے شک میرے ذہن میں یہ خدشات اور اندیشے اتنے واضح نہیں تھے، لیکن تھے ضرور...... اس لیے میں نہ جا سکا میں تو اپنے دل و دماغ کی حالت، اپنی کیفیت بیان کر رہا تھا۔ مجھ پر یہ وقت بہت بھاری گزر رہا ہے۔ یہ کمرا اب مجھے قید خانہ سا محسوس ہوتا ہے۔"
"یہ کرب و اضطراب بڑا فطری ہے لیکن اس نظر بندی کے سوا تمہارے پاس کیا راستہ ہے۔" سیورین دل سوزی سے بولی، "بہادری کو دانائی سے عاری نہیں ہونا چاہیے۔ باہر جا کے تم اپنے مقصد میں کام یاب بھی ہو جاؤ تو اکبر علی خاں اور انھوٹی کو واپس نہیں لا سکتے۔ اس کام یابی کے بعد اور پیچیدگیاں بھی تو پیدا ہو سکتی ہیں۔ پولیس دوبارہ تمہیں ساتھ لے جا سکتی ہے اور تمہیں اندازہ ہوگا کہ اپنی جگہ پر وہ تم سے کس طرح پیش آ سکتے ہیں، پھر ڈاکٹر رائے بھی شاید کچھ نہ کر پائیں۔ اب اس قدر اپنا ذہن مغلوب نہ رکھو تو اچھا ہے۔ اس وقت تمہارے متعلق شہر میں بہت افواہیں گردش کر رہی ہوں گی۔ تم کس کس کی زبان پر تالا لگاؤ گے۔ چند دن میں بہر حال، سب کچھ آئینہ ہو جائے گا۔ پولیس بھی یوں پاؤں پسارے بیٹھی تو نہ رہے گی۔ وکیل، عدالت، قانون، انصاف سب ختم ہو گئے کیا۔ کچھ خداوند پر بھی چھوڑ دو۔ تمہارے کسی غلط قدم سے بہت کچھ غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔ سب سے زیادہ تمہارا بھائی متاثر ہو سکتا ہے۔ وہ صحت یاب ہو رہا ہے۔ اسی پر تمہاری توجہ مرکوز رہنی چاہیے کہ تم اسی لیے یہاں، اس شہر میں آئے تھے۔ بعد کو تمہاری جو مرضی

ہو، کر لینا۔'' وہ چپ ہوگئی۔

سیورین کے لہجے میں بیگانگی کی رمق نے مجھے بہت آزردہ کیا۔ ''میں...... میں کہیں نہیں جا رہا۔'' اسے مطمئن کرنے کے لیے میں نے پرعزم لہجے میں کہا۔

میری طرف دیکھ کے اس نے مسکرانے کی کوشش کی اور میرا ہاتھ تھپکنے لگی۔ میری آنکھوں میں پھر آنسو بھر آئے۔ سوفے سے اٹھ کے وہ حاکمانہ انداز میں بولی، ''میں تمہارے لیے کچھ لاتی ہوں۔ انکار مت کرنا۔ تمھی نے کہا تھا، غم کی توانائی کے لیے غذا کی ضرورت پڑتی ہے۔ کچھ ایسا ہی کہا تھا نا......؟'' یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

معمول کے خلاف دوپہر بٹھل کو دیکھنے کے لیے ڈاکٹر رائے کے بجائے دو اور ڈاکٹر آئے، لیکن شام کے دورے پر ڈوبتے اجالے کے وقت ڈاکٹر رائے ایک نوجوان ڈاکٹر اور ایک عمر رسیدہ نرس کے ساتھ کمرے میں وارد ہوا۔ وہ کچھ عجلت میں معلوم ہوتا تھا، بدحواس سا۔ آتے ہی وہ سیدھا بٹھل کے پاس گیا اور مجھے باہر چلے جانے کی ہدایت کی۔ بٹھل کے معائنے کے دوران اس نے دوسری بار مجھے باہر چلے جانے کا حکم دیا تھا۔ راہ داری میں میں زیادہ دور تک نہیں گیا تھا کہ کچھ فاصلے پر دو بندوق بردار سپاہی گشت کرتے نظر آئے۔ مجھے دیکھ کے وہ چوکنے سے ہوگئے۔ میں نے سوچا کہ آزمائشاً کچھ اور آگے جاؤں، لیکن بے کار منہ لگنے والی بات نہ ہو جائے۔ ادھر کسی وقت ڈاکٹر رائے کی طلبی کا خیال بھی مانع رہا۔ میں نے اپنے قدم روک لیے اور فوراً ہی واپس آ گیا اور کمرے کے آس پاس راہ داری میں ٹہلتا رہا۔ یہی ہوا، کچھ دیر بعد سیورین تقریباً بھاگتی ہوئی باہر آئی اور اس نے ہاتھ ہلا کے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ کسی لمحے کی تاخیر کے بغیر میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ سامنے کا منظر میرے لیے کسی خواب کے مانند تھا۔ بٹھل بستر پر بیٹھا ہوا تھا اور ڈاکٹر رائے اس کے بہت قریب کھڑا سرگوشیاں سی کر رہا تھا۔ بٹھل کبھی زیر لب، کبھی سر ہلا کے اس کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ اس کی آواز پر نقاہت طاری تھی۔ ڈاکٹر رائے نے مجھے پاس بلا لیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے چہکتی آواز میں بٹھل کو مخاطب کیا، ''یہ بہت تنگ کرتا ہے، ہم کو...... اس کے لیے تم کو جلدی ٹھیک ہو جانا ہے، سمجھا۔ نہیں تو یہ بیمار پڑ جائے گا۔''

بٹھل نے پلکیں جھپکیں، میری طرف دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں کوئی حسرت سی اُمڈ آئی۔ اس نے سر ہلا کے ڈاکٹر رائے کو جیسے یقین دلایا کہ وہ اپنی ہمت مجتمع کرنے کے لیے خود فکرمند ہے۔

''سر میں اب تکلیف تو نہیں؟'' میں نے بے تابانہ پوچھا۔

بٹھل نے گہری سانس لے کے اور آنکھیں بند کر کے بدبداتے ہوئے نفی کی۔ ''بس اب تم ٹھیک ہو جاؤ گے جلد ہی۔''

ڈاکٹر رائے میرا بازو تھامے مجھے اس کے پاس سے سوفے پر لے آیا۔ اس کے ساتھ آنے والے ڈاکٹر اور نرس نے سیورین کی اعانت سے بٹھل کا بستر پھر نیچے کر دیا۔

''اکبر علی خاں کی تدفین آج نہ ہو سکی۔'' ڈاکٹر نے یاس بھرے لہجے میں مجھے بتایا، ''اس کا بڑا بھائی حیدرآباد دکن سے آ رہا ہے۔ سنا ہے، تدفین کل کسی وقت اس کے آنے پر ہوگی۔''

میں چپ بیٹھا رہا۔

''شہر کے حالات نہایت کشیدہ ہیں۔ سارے میں سناٹا چھایا ہوا ہے۔ بدقماش لوگ اسے دوسرا رنگ دے رہے ہیں، کیوں کہ ایک عیسائی، دوسرا مسلمان قتل ہوا ہے۔ فرقہ وارانہ فساد کے اندیشے میں پولیس بڑی تعداد میں شہر میں گھوم رہی ہے۔ تم کہیں باہر نہ جانا۔ اسپتال میں بھی پولیس کی بڑی

نفری موجود ہے اور تمہارے اردگرد وہ بہ طور خاص نگرانی کر رہے ہیں۔ آج دن بھر کچھ عجب مصروفیت رہی۔ اتفاق سے آج اسپتال میں کچھ سنگین قسم کے مریض آ گئے۔ دوپہر گھر بھی جانا نہ ہو سکا۔ تھکن سی محسوس ہو رہی ہے۔ رات کو شاید آنا نہ ہو سکے۔ بھائی کے لیے ساری ہدایات میں نے ڈاکٹروں کو دے دی ہیں...... تم بھی اب آرام کرو اور اپنے ذہن پر اتنا زور مت دو۔ ہمیں بہتری کی امید رکھنی چاہیے۔'' مجھے پند و نصائح کرتے ہوئے اس نے کسمسا کے کہا، ''تمہارے آدمی ابھی تک نہیں پہنچے۔''

''جی!'' میں نے واجبی احترام میں اختصار گوئی پر اکتفا کیا۔ ''معلوم نہیں کیوں، اکبر علی خاں صاحب نے تار دیے تھے اور کہہ رہے تھے کہ ارجنٹ تار دیے ہیں، اور احتیاطاً ایک کے بعد دوسرا تار......''

''تم نے انہیں کیوں بلایا تھا؟'' اس کی آواز روکھی تھی۔

''یہی...... یہاں کی...... اور اپنی صورت حال دیکھ کے اکبر علی خاں صاحب نے بھی مشورہ دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ پولیس کا کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ مجھ پر کوئی برا وقت آ سکتا ہے، سو پیش بندی کے طور پر......'' میرا لہجہ غیر ارادی طور پر معذرت خواہانہ ہو گیا۔ وہ ہنکاری بھر کے رہ گیا۔

''آ جائیں گے پھر۔ تم نے بتایا تھا کہ ان کا تعلق بھی...... وہ کیا کہتے ہیں......'' وہ الجھ کے بولا، ''اڈوں وغیرہ سے ہے۔ انہیں بھی پابند کرنا ہے تمہیں...... اور ہاں، وہ دن بھر اسپتال میں رہ سکتے ہیں، رات کو انہیں کوئی اور بندوبست کرنا ہے۔''

''جی!'' میں نے اسی طرح سنا جس طرح اس نے کہا تھا۔

''اور سنو! انہیں روک کے رکھنا ہے۔ وہ یہاں کوئی تماشا نہ کریں۔ تمہاری خوش نودی میں ان کا ایسا خیال ہو تو اس اسپتال کا رخ ہی نہ کریں۔'' اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

''جی، میں سمجھتا ہوں۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔

یہ احکام صادر کر کے وہ سوفے سے اٹھ گیا اور اس نے میرے گال پر ہلکی سی چپت رسید کر کے مسکراتے ہوئے بولا، ''ہوش میں رہنا، کوئی کارنامہ نہیں۔''

''آپ نے ہاتھ پیر ہی باندھ دیے ہیں۔'' میرے منہ سے نکل گیا۔

''ورنہ...... ورنہ تم کیا کرتے؟'' وہ اچک کے بولا۔

مجھ سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ میں نے لکنت سے کہا، ''شاید کچھ بھی نہیں۔ میں نے آپ سے وعدہ کیا ہے۔''

''اچھے لڑکے!'' وہ شاباش کے انداز میں بولا، ''اور سنو! تمہیں رات کو شاید نیند نہ آئے۔ سیورین نے مجھے بتایا ہے کہ تم نے بہت برا وقت گزارا ہے۔ کہو تو نیند کا انجکشن لگا دوں...... گولیوں سے بھی کام چل جائے گا۔''

میں سر جھکائے کھڑا رہا۔ میرے سینے پر مکا مار کے وہ کمرے سے چلا گیا۔

نرس ایمی آ چکی تھی۔ آتے ہی، جیسے کوئی بلائیں لیتا ہے، مجھے پہلو سے لگایا اور کہنے لگی کہ صبح وہ چلی تو گئی تھی، لیکن دن بھر اسے چین نہیں آیا۔ میری طرف دھیان لگا رہا۔ اس لیے اس نے شام کی ڈیوٹی پر آنے میں بھی جلدی کی۔

سیورین کو اب گھر جانا تھا، لیکن نرسوں کے لیے مخصوص پیوستہ کمرے میں لباس تبدیل کر کے وہ واپس آ گئی اور میرے پاس بیٹھ گئی۔ وہ گھر کا لباس پہنے ہوئے تھی اور گھر ہی کی کوئی لڑکی لگ رہی تھی، اجلی اجلی، صاف شفاف، شرمیلی شرمیلی اور اداس اداس۔ لباس کی تبدیلی سے بھی آدمی کیا سے کیا

ہو جاتا ہے۔ اس لباس میں اسے دیکھ کے کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کسی اسپتال میں ایک تربیت یافتہ، ماہر نرس کا کام کرتی ہے۔ ہلکی نیلی رنگت کی ساڑھی میں اس کا ترشا ہوا سراپا نمایاں ہو گیا تھا۔ سر سے گردن تک لپٹے ہوئے اسی رنگت کے اسکارف میں چہرہ کچھ اور کھل اٹھا تھا۔ اسے تو اس اسپتال کے بجائے کہیں اور ہونا چاہیے تھا، کسی محل دو محلے میں...... ایمی کسی کام سے باہر گئی تھی کہ وہ سرسراتی آواز میں بولی، ''میں رات کو رک بھی سکتی ہوں۔''

میں نے بے دلی سے کہا، ''مگر تمہیں...... تمہیں گھر جانا چاہیے۔''

''گھر کہلوایا جا سکتا ہے، کبھی کبھی ایسا ہوتا رہتا ہے۔''

''مگر ایمی تو یہاں موجود ہے، تم بے آرام ہو گی۔''

''گھر میں آرام کہاں ہو گا۔'' وہ آہ بھر کے بولی۔

''کیوں؟'' مجھے تردد ہوا۔ ''کوئی الجھن؟''

''نیند نہیں آئے گی۔''

''ہاں!'' میں نے مایوسی سے کہا۔ ''ان حالات میں نیند کیسے آسکتی ہے مگر تم...... تم تو خود مجھے ہدایات دے رہی تھیں۔''

''لیکن اب لگتا ہے، میرے حالات تم سے مختلف نہیں۔''

''تم یہاں رکنا چاہتی ہو؟'' میں نے سادگی سے پوچھا۔

''تمہیں اگر ضرورت محسوس ہوتی ہو۔'' وہ جھجک کے بولی۔

''میں تو کسی نہ کسی طرح وقت کاٹ ہی لوں گا، کاٹنا ہی ہے۔ چوں کہ آدمی کو زندہ تو رہنا ہی ہوتا ہے، اپنے لیے نہیں تو دوسروں کے لیے۔''

''اور شاید دوسروں کے لیے زندہ رہنا ہی زندگی ہے۔'' اس نے جلتی بجھتی نگاہ سے مجھ دیکھا اور اٹھ گئی۔

''جا رہی ہو۔'' میں نے اسے ٹوکا۔ ''کہیں تم میری نگرانی کے لیے تو......؟ یہ ایمی بھی بڑی چوکی دار ہے، اور میں کہاں جاؤں گا۔''

''تمہارا ہی خیال تھا۔'' اس نے ہمکتی آواز میں کہا۔

''میں ٹھیک رہوں گا۔ تم اپنا خیال رکھنا۔'' وہ دروازے سے نکلا چاہتی تھی، میں نے کہا کہ میرے کپڑے شکستہ ہو گئے ہیں اور ہوٹل میں سارا سامان ہے۔

وہ رک گئی اور سوچ میں ڈوب گئی۔ ''اور نئے کپڑے اتنی جلد تیار نہیں ہو سکتے۔ ہوٹل میں کسی آدمی کو تمہارا خط، تمہارا اجازت نامہ دے کے بھیجا جائے تو......''

''ہوٹل والے انکار کر دیں گے۔''

''پھر تو ایک ہی صورت ہے۔'' وہ رک رک کے بولی، ''کچھ دیر کے لیے تمہیں برابر کے نرسوں والے کمرے میں بیٹھنا ہو گا۔ وہ کمرا اچھا، صاف ستھرا ہے۔ اسپتال میں کئی دھوبی ہیں، جتنی جلد ممکن ہو سکے گا، وہ کپڑے دھو دیں گے۔ بس یہی ہے کہ بارش نہ ہو اور کپڑے سوکھنے میں وقت نہ لگے۔''

''جو تم مناسب سمجھو، کپڑے تو تبدیل ہونے چاہییں۔ مجھے الجھن ہونے لگی ہے ان کپڑوں سے......''

اس نے سر سے پیر تک ایک طائرانہ نگاہ مجھ پر ڈالی۔ ''ایسے میلے تو نہیں ہوئے ہیں ابھی۔ پھر ایک طریقہ اور بھی ہے۔ میں ابھی ٹھہر جاتی ہوں۔ ڈاکٹروں کے دورے کے بعد تم مریضوں والے کپڑے پہن لو، پھر یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ میں یہ کپڑے گھر جا کے دھو دوں گی۔ رات بھر میں سوکھ ہی جائیں گے۔ استری کر کے صبح جلد سے جلد یہاں آجاؤں گی۔''

''ارے نہیں۔'' مجھے ہنسی آگئی۔ ''تم کپڑے دھوؤ گی؟''

''کبھی کبھی اپنے بھی دھوتی ہوں۔''

''نہیں نہیں۔''

''میں سنجیدہ ہوں۔ مجھے خوشی ہو گی۔''

''اور مجھے اچھا نہیں لگے گا۔''

''کیوں اچھا نہیں لگے گا؟''

''بس نہیں۔'' میں نے سر جھٹک کے کہا۔

''اس میں کیا برائی ہے؟'' وہ ناراض سی نظر آنے لگی۔ ''تمہارا کام کر کے مجھے خوشی ہو گی۔''

''میں سمجھتا ہوں۔ لیکن......'' میری سمجھ میں نہیں آیا کہ انکار کے لیے کیا عذر پیش کروں۔

''ٹھیک ہے، تم اچھا نہیں سمجھتے تو ٹھیک ہے۔ پھر کوئی آدمی بھیج کے ہوٹل کے کسی کارندے کو یہاں بلا لو۔ وہ تم سے مل کے تسلی کرلے گا تو آسانی ہو جائے گی۔ بہ ہر حال، اب تو رات ہو چکی ہے، صبح ہی کچھ ممکن ہے۔ کل دیکھیں گے پھر، مگر کل کوئی انتظام نہ ہو سکا تو تمہیں وہی کرنا ہے جو میں اب کہہ رہی ہوں۔''

پہلے برابر والے کمرے تک جا کے اس نے دروازے پر ٹھوکا دیا۔ اندر سے ایمی کی آواز آئی۔ چند ثانیوں بعد وہ باہر آگئی۔ اس جھنجلاتے ہوئے سیورین کو بتایا کہ شانے پر اسپتال کی وردی کی سیون نکل گئی تھی۔ کمرے میں دوسرا لباس موجود نہیں تھا۔ اسپتال کے لباس خانے سے منگوانے میں دیر لگتی۔ اسے خود ہی سینا پڑا۔ ڈاکٹر رائے کی کہیں نظر پڑ جاتی تو قیامت آجاتی۔ ایمی کو 'شب بخیر' کہہ کے سیورین بوجھل قدموں سے میرے ساتھ چلتی رہی، پھر کچھ دور جا کے اس نے مجھے واپس ہو جانے کا اشارہ کیا اور دو چار قدم آگے جا کے لوٹ آئی۔

'صبح تمہارے...... لیے کچھ بنا کے لاؤں؟'' وہ اشتیاق ...... سے بولی، ''زیادہ تو نہیں، ایک دو چیزیں جیسی تیسی بنانی آتی ہیں مجھے بھی۔''

''جو تم بہتر سمجھو لے آنا۔'' میں نے اس کی دل بستگی کے لیے کہا۔ ''مجھے یقین ہے، تم نفیس چیزیں ہی بناتی ہو گی کیوں کہ تم خود بہت نفیس، بہت اچھی ہو۔''

اس کے رخسار کچھ اور گلنار ہو گئے اور وہ ہاتھ ہلاتی ہوئی راہداری سے دور ہو گئی۔

رات کے دورے پر ڈاکٹر رائے کے بجائے دو ڈاکٹر بٹھل کے معائنے کے لیے آئے اور اطمینان کا اظہار کر کے جلد ہی چلے گئے۔ ایمی کے کہنے پر ایک بار پھر مجھے کمرے سے باہر جانا پڑا۔ اب یہ معمول ہو چکا تھا۔ اس دوران یقیناً ایمی نے بٹھل کے لیے نرس کی ذمے داریاں نبھائی ہوں گی۔ میں کرسی ڈال کے دروازے کے باہر بیٹھا رہا۔

آسمان پر بادل بکھرے ہوئے تھے، ہلکے اور گاڑھے بادلوں کی ٹکڑیاں۔ ہوا نم تھی اور کسی قدر سردی سے آلودہ۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ خاموشی میں انتظار کا اضطراب شدید ہو جاتا ہے اور میرے پاس انتظار کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ انتظار شاید سب سے بڑی مصروفیت اور سب سے بڑی اذیت ہے...... اور میں کیا...... ہر شخص ہر وقت کسی نہ کسی انتظار سے دوچار رہتا ہے۔ چھوٹے بڑے انتظار، کسی کے آنے، کسی کی بازیابی، کسی کے صحت مند ہو جانے کا انتظار، کل کا، پرسوں، ہفتوں، مہینوں اور برسوں کا انتظار...... بہ یک وقت کئی کئی انتظار زندگی کا بیش تر حصہ اسی انتظار کی نذر ہو جاتا ہے۔ زندگی مختصر ہوا کرتی تو انتظار کے مراحل بھی کم ہو جاتے۔

کچھ ایسی بے سروپا سی باتیں میرے دماغ میں گردش کر رہی تھیں کہ ایمی نے مجھے اندر بلا لیا۔ وہ بٹھل کو ہلکی پھلکی غذائیں اور کڑوی کسیلی دوائیں کھلا اور پلا چکی تھی۔ ایمی کو باتیں کرنی خوب آتی تھیں۔ کہنے لگی ''اک مریض بھگتا چکی ہوں، دوسرے سے

اب نمٹنا ہے اور یہ دوسرا بہت نٹ کھٹ ہے۔" امی سراپا شفقت، سرتاپا تپاک تھی۔ چہرے مہرے سے تندخو، اندر رس گھلا، موم بھرا ہوا تھا۔

کمرے کے دروازے، کھڑکیوں کی چٹخنیاں اس نے چڑھادی تھیں۔ پردے بھی گرادیے تھے، صرف چھت سے ملحق روشن دانوں سے تازہ ہوا کی آمد ممکن رہی تھی۔ اسے خدشہ ہوگا کہ اس رات آنے والے حملہ آور دوبارہ کمرے میں نقب لگانے کی کوشش کرسکتے ہیں۔ حالاں کہ اسے معلوم تھا کہ اب کسی مشکوک آدمی کا اسپتال میں داخلہ ناممکن ہے۔ اسپتال پولیس نے گھیر رکھا ہے۔ رات گئے تک وہ مجھ سے باتیں کرتی رہی، شہر کے حالات اور طرح طرح کی افواہوں کے بارے میں بتاتی رہی۔ مجھے سلانے کے لیے گزشتہ رات کی طرح وہ میرے سرھانے بیٹھ کے میرے بالوں میں اپنی مومی انگلیوں سے جیسے کنگھی پھیرتی رہی اور مجھے امی کی یاد دلاتی رہی۔ ممی بھی سر سہلانے اور دبانے میں بڑی ماہر تھی، اور نیساں! نیساں تو کمال کرتی ہے۔

امی مجھے ہمت اور حوصلے کی تعلیم دے رہی تھی اور خود باہر ذرا سی آہٹ پر چونک جاتی تھی۔ میں نے اسے سوجانے کا تاثر دیا، کچھ اس خیال سے بھی کہ وہ کمر ٹیک لے۔ جانے کس وقت وہ دبے قدموں میرے پاس سے اٹھی کہ مجھے احساس ہی نہ ہوسکا۔ شاید کسی وقت میری آنکھ لگ گئی تھی۔ صبح سویرے اسپتال میں خاصی چہل پہل ہوجاتی تھی۔ سبزے کی کثرت کی وجہ سے پرندوں کی بہتات تھی۔ منہ اندھیرے وہ صبح کی آمد کی نوید سنا دیتے تھے۔ منہ ہاتھ دھو کے میں باہر آیا تو آٹھ بج رہے تھے۔ امی نے چائے منگوالی تھی۔ ہم دونوں چائے پی رہے تھے کہ کھلے دروازے پر دستک ہوئی۔ چائے ادھوری چھوڑ کے امی فوراً اٹھ گئی۔ باوردی سپاہی کی جھلک پر میں بھی بیٹھا نہ رہ سکا اور اندر دروازے کے پاس جاکے ٹھیر گیا۔

"کا ......کا بات ہے؟" امی نے کڑکتی آواز میں پوچھا۔

"کچھ نہیں مام۔" سپاہی نے کترائے لہجے میں میرے بارے میں تصدیق چاہی کہ رات کو میں کمرے ہی میں رہا ہوں۔

"ادھری اور کاں۔" امی نے تڑخ کے جواب دیا، "تم، تم کیوں پوچھتا ہے؟"

"بس مام، ہم کو اتا ہی پتا کرنا تھا۔"

"پر کیوں؟ ایسا کا بات ہے؟"

سپاہی نے سرگوشی میں امی کو کچھ بتایا۔ امی کی سسکاری نکل گئی۔ "نئیں نئیں، کا بولتا ہے تم؟"

سپاہی زیادہ دیر نہیں ٹھیرا۔ اس نے بھی اپنی آنکھوں سے مجھے کمرے میں دیکھ کے اطمینان کرلیا تھا۔ امی بڑبڑاتی ہوئی میرے پاس آئی اور ہولتی آواز میں بتانے لگی کہ صبح جس وقت لوگ نماز کے لیے گھر سے نکلے، انہوں نے اس باغیچے میں، اس جگہ جہاں کل اکبر علی خاں کی لاش دیکھی تھی، تین لاشیں پڑی ہوئی دیکھی ہیں۔ سپاہی کو پولیس کے صدر دفتر کے حکم پر رات اسپتال میں میری موجودی کی تصدیق کے لیے بھیجا گیا تھا۔

میرا جسم ایک لمحے کے لیے سن ہوگیا۔

"یہ کیا ہوا میرے بچے؟" امی کی آواز سنسنا رہی تھی۔

میں کیا جواب دیتا۔

"یہ کیا ہورہا ہے یہاں؟" وہ سراسیمگی سے بولی۔

"کیا کہا جاسکتا ہے۔" میں نے بہ مشکل کہا، "سپاہی اور کیا بتارہا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"اور کچھ نہیں، بس یہی کچھ......"

امی کا چہرہ اتر گیا تھا۔ میرا حال بھی کچھ اسی جیسا تھا۔ امی سوال پر سوال کیے جارہی تھی جیسے میں وہاں موجود رہا تھا۔ "میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" میں نے اسے جھڑک دیا اور دوسرے ہی لمحے مجھے

ندامت ہوئی۔ میں نے اپنے لہجے پر معذرت چاہی۔

"نانا، ایسی کوئی بات نہیں۔ تمہیں کیا معلوم۔ میں ہی پاگل ہورہی ہوں۔" وہ مہربان عورت فراخ دلی سے بولی۔ "میں باہر جاکے سن گن لینے کی کوشش کرتی ہوں۔ ہوسکتا ہے، خبر ہی غلط ہو۔" امی بہت ہراساں نظر آتی تھی۔

جتنی دیر وہ باہر رہی، میں تانے بانے ملانے کی تگ ودو کرتا رہا۔ امی چند منٹ بعد مایوس واپس آگئی۔ وہ بار بار دہائیاں دینے کے انداز میں ہاتھ پھیلاتی اور سینے پر صلیب کا نشان بناتی رہی۔ میں نے بھی کئی مرتبہ باہر نکل کے دیکھا۔ اسپتال کے عام ملازموں کے سوا مجھے کوئی ایسا آدمی دکھائی نہیں دیا جس سے کچھ معلوم کیا جاسکتا۔

ٹھیک ساڑھے نو بجے ڈاکٹر رائے کمرے میں داخل ہوا۔ میری توقع کے مطابق وہ بہت منتشر لگ رہا تھا۔ اپنے ساتھی ڈاکٹر کو بٹھل کے بستر کی طرف جانے کا اشارہ کرکے وہ سیدھا میرے پاس آیا۔

"تم نے کچھ سنا؟" اس نے سلگتی آواز میں پوچھا۔

"ہاں، کچھ سنا ہے امی کی زبانی۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ اس دوران میں نے اپنے اعصاب پر قابو پالیا تھا۔

"کیا......کیا سنا ہے؟"

میں نے اسے صبح آٹھ بجے کے قریب آنے والے سپاہی کے بارے میں بتایا۔

"ٹھیک ہے، تم سے بات ہوتی ہے ابھی۔" یہ کہہ کے وہ بٹھل کے پاس چلا گیا۔ کشاکش کی اس حالت میں بھی اسے اپنے کام سے علاقہ تھا۔ لوگ صحیح کہتے ہیں، عہدہ ومنصب، علم وفضل اور مال وزر اپنی جگہ، آدمی کی عزت ومرتبت تو اس کی انسان دوستی اور فرض شناسی سے طے ہوتی ہے۔ ڈاکٹر رائے کی ہدایت سے پہلے میں خود ہی باہر چلا گیا۔ مجھے جاتا دیکھ کے اس نے بلند آواز میں مخاطب کیا، "دور کہیں مت جانا۔"

میں دور کہاں جاتا، وہیں دروازے کے پاس دربان بنا بیٹھا رہا۔ اچھا ہوا جو مجھے اس کے ممکنہ سوالوں کی جواب دہی کے لیے خود کو استوار کرنے کا موقع مل گیا۔ اس نے بٹھل کے معائنے میں اپنا وقت لیا۔ وہ باہر آیا تو معاون ڈاکٹر ساتھ نہیں تھا۔ اس کی پے روی میں راہ داری سے گزر کے مرکزی عمارت تک چلا آیا۔ تیز قدموں سے وہ ایک بڑے آراستہ وپیراستہ کمرے میں داخل ہوگیا۔ دروازے پر اس کے نام کی تختی آویزاں تھی۔ جب تک وہ کرسی پر بیٹھ نہیں گیا اور مجھے اس نے بیٹھ جانے کی اجازت نہیں دی، میں کھڑا رہا۔ جگ سے گلاس بھر پانی بھر کے اور ایک گھونٹ لے کے اس نے معتدل لہجے میں پوچھا، "تم کیا سمجھتے ہو؟"

"آپ کیا سمجھتے ہیں؟" میرے لیے شاید یہی مناسب تھا کہ اپنی رائے کے اظہار میں محتاط رہوں۔

"میں......میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پایا ہوں، لیکن ایک بات سمجھ میں آتی ہے۔ ٹھیک اسی مقام پر لاشیں پھنکوانے والے یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ انہوں نے اکبر علی خاں کے قاتل ختم کردیے ہیں۔"

"جی، یہی کچھ سمجھ میں آتا ہے۔" میں نے دھیمی آواز میں تائید کی۔

"تم بھی اسی نتیجے پر پہنچے ہو؟" وہ بے تابی سے بولا۔

"لیکن کیا اکبر علی خاں کے قاتل وہی تھے؟"

"یہ دوسری بات ہے۔" وہ رکھائی سے بولا، "میں نے صرف یہ کہا کہ کوئی کچھ باور کرانا چاہتا ہے۔"

"یعنی اکبر علی خاں کے قاتل دوسرے تھے اور ان قاتلوں کو انجام تک پہنچانے والے دوسرے۔ وہ جانتے تھے کہ قاتل کون لوگ ہیں۔ جس معاملے کی تفتیش میں پولیس بری طرح سر کھپا رہی ہے۔ باور

کرانے والے لوگ اس کی حقیقت سے آشنا تھے۔''
''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' اس نے تجسس سے پوچھا۔
میں نے تمام لحاظ و مروت سے کہا۔ ''دونوں کے درمیان کوئی تعلق ضرور تھا۔''
''یعنی دونوں ایک ہیں؟'' ڈاکٹر نے حیرانی ظاہر کی۔
''دونوں ایک دوسرے سے واقف ہیں۔'' میں نے کہا۔
ڈاکٹر کے ہونٹ باہر نکل آئے۔ ''تمہارا قیاس درست معلوم ہوتا ہے۔'' وہ سر ہلا کے بولا۔
''اور آپ نے غور کیا، وہ کسے یہ باور کرانا چاہتے ہیں؟''
''ہاں۔'' اس نے تذبذب سے دہرایا۔ ''وہ کسے یہ باور کرانا چاہتے ہیں، اکبر علی خاں کے گھر والوں کو کہ وہ بری طرح متاثر ہوئے ہیں، شہر والوں کو کہ وہ شدید خوف و ہراس میں مبتلا ہیں۔ وکیلوں کی انجمن کو، جو کل سے واویلا کر رہی ہے، انہوں نے کل عدالت میں کام بھی بند کر دیا تھا۔ لاکالج کے ان طلبہ کو، جو اپنے بہترین استاد سے محروم ہو گئے ہیں۔ کل دن بھر وہ مظاہرے کرتے رہے۔ ان کا مطالبہ ہے جب تک قاتل پکڑے نہیں جائیں گے، وہ کلاسوں میں واپس نہیں آئیں گے۔ اور پولیس کو کہ وہ سخت بوکھلائی ہوئی ہے، جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے اور کوئی سراغ نہیں مل رہا ہے؟''
''اور کیا اب ان تین آدمیوں کے خون سے اکبر علی خاں کے دکھ کا ازالہ ہو جائے گا؟ شہری، وکیل، طلبہ سکون کا سانس لیں گے اور پولیس کو کوئی سراغ مل جائے گا؟''
ڈاکٹر رائے کچھ سوچتا رہا، پھر مضطرب ہو کے بولا، ''لگتا ہے، تم کچھ جانتے ہو؟''
''ہاں شاید۔'' میں نے تامل سے اقرار کیا۔
''میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔''
''آپ نے توجہ نہیں دی، حالاں کہ آپ ڈاکٹری کے علاوہ زندگی کے دیگر معاملات میں بھی اتنے ہی شامل ہیں۔ دیدہ ریزی، نکتہ بینی میں طاق۔ مجھے اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔'' میرا مقصد مطلق اس کی خوشامد نہیں تھا۔ یہ تو اظہار واقعہ تھا، لیکن میرے اعتراف میں تملق کا پہلو بہر حال نکلتا تھا۔
شکر ہے اس نے میری نیت پہ شبہ نہیں کیا اور وہی ہوا۔ اس جہاں شناس، دور اندیش نے مجھے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ ''ٹھیرو!'' وہ ہاتھ اٹھا کے بولا، ''تم ٹھیک سمجھ رہے ہو۔ وہ صرف تمہیں باور کرانا چاہتے ہیں۔ یہی نا؟''
پھر مجھے ناگفتنی کی تشریح کی ضرورت نہ رہی۔ اسے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں دیر نہیں لگی کہ میدا اور اس کے خاص مقرب ہی اتنا خونی، اتنا منظم اور بڑا قدم اٹھا سکتے تھے۔ انہوں نے ان تین آدمیوں کو بھینٹ چڑھا دیا، جو اصل میں انہی کے اڈے سے وابستہ تھے اور دھنوا سے زیادہ قرب رکھتے تھے۔
اس رات جب مسلح حملہ آور میری جستجو میں اسپتال آئے تھے تو میں نے صبح اکبر علی خاں سے کہا تھا کہ وہ میدا کی حمایت یافتہ آدمی نہیں ہونے چاہئیں، وہ میدا سے برگشتہ دھنوا کے ہم نفس، ہم جاں ہی ہو سکتے ہیں۔ انہیں بہت قلق ہوگا کہ اڈے پر آ جانے کے باوجود میدا نے اتنی آسانی سے مجھے جانے کیوں دیا۔ گو میدا نے اڈے کے استاد کی حیثیت سے دھنوا کے زخمی ہو جانے کی اطلاع پر اپنی ذمے داری اچھی طرح نبھائی تھی۔ اس نے میرے لیے سارے راستے بند کر دیے تھے۔ وہ تو خود میں نے اس کے اڈے پہنچ کے، دانستہ اس کے بے شمار آدمیوں کے نرغے میں جا کے توقع کے خلاف اڈے کی چوکی کا دعوا کر دیا۔ پھر تو بات ہی دوسری ہو گئی تھی۔ میدا کو اپنی عمل داری سے دست بردار ہو جانے کا اندیشہ لاحق ہو گیا۔

میدا کے پختہ کار ساتھی میں نے دیکھے تھے۔ میرا قصہ پاک کردینے کے لیے وہ مسلح آدمی اسپتال بھیجنے کا نامعقول مشورہ نہیں دے سکتے تھے۔ اگرچہ میدا کی عین خواہش یہی ہوگی' میدا کا عندیہ لیے بغیر اسپتال آنے والے حملہ آور کام یاب ہوجاتے تو میدا انہیں پلکوں پر بٹھاتا لیکن وہ ناکام ہوگئے تھے اور ان کے ہاتھوں اسپتال کے ایک ملازم کا خون ہوجانے سے معاملہ اور سنگین ہوگیا تھا۔ میدا کے اڈے پر میرے جانے کی ساری روداد پولیس کے علم میں ہوگی۔ پولیس کے مخبر بھی اڈوں پر موجود ہوتے ہیں۔

پہلی بار شہر کے سب سے بڑے اسپتال میں ڈاکوؤں کی طرح کچھ لوگ گھس آئے تھے۔ اسپتال ڈاکا ڈالنے کی جگہ نہیں ہوتی۔ ایک ذرا سی عرق ریزی سے پولیس کو اسپتال میں موجود اس شخص تک پہنچ جانا چاہیے تھا جو میدا سے مبارزت کے لیے اس کے اڈے گیا تھا اور مبارزت ملتوی ہوگئی تھی۔ سو مراسم کی مروت اپنی جگہ، پولیس نے سب سے پہلے میدا کے اڈے کی راہ لی ہوگی اور میدا نے صاف انکار کردیا ہوگا۔ میدا کو گرفت میں لینے کے لیے پولیس کے پاس کوئی واضح ثبوت نہیں تھا اور میدا ان سے دور ہی کتنا تھا، ارادے کی دوری پر۔ کسی وقت بھی اس کے سر پہ آدھمک سکتے تھے۔

امکان یہی ہے کہ پولیس کے تیور دیکھنے کے بعد میدا نے دھنوا کے ماتم گساروں کو سرزنش کی ہوگی۔ ہوسکتا ہے انہیں اڈے سے خارج کردیا ہو یا کسی بڑے عتاب کی دھمکی دی ہو۔ پہلی ناکامی سے دھنوا کے دل برداشتہ ساتھی ادھر میدا کی سردمہری، اس کے غیظ وغضب، اُدھر دھنوا کی جدائی کے صدمے سے ایسے بے حال، ایسے اندھے ہوئے کہ انہوں نے سارا قہر اکبر علی خاں، ایک بے قصور پر اتار کے دھنوا کے قرض کا بوجھ کسی طور کچھ کم کیا اور مجھے موت سے بڑی سزا سے دوچار کیا۔ وہ اپنے مقصد میں کسی حد تک ضرور کام یاب ہوئے۔

ڈاکٹر رائے وقفے وقفے سے گھونٹ بھر پانی پیتا رہا اور چپ رہا۔ کل صبح اکبر علی خاں کی خبر سننے کے بعد جب وہ مجھے کسی ساتھی ڈاکٹر کے کمرے میں لے گیا تھا، میں نے بہ وجوہ اس سے کچھ ڈھکا چھپا نہیں رکھا تھا۔ وہ سارا کچھ اس کے ذہن میں تازہ ہوگا جو اسے مزید کسی صراحت کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ ''مگر یہ خود میدا کے لیے کوئی بہت محفوظ اور مفید فیصلہ نہیں لگتا۔'' ڈاکٹر نے بھن بھناتی آواز میں کہا۔

''میدا کو مختلف ذریعوں سے معلوم ہوتا رہا ہوگا کہ میں اپنا چاقو واپس لینے کے لیے اس کے اڈے پر آنے کا مصمم ارادہ کیے ہوئے ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا، اسی شام دو پولیس افسر یہاں اسپتال میں میرے پاس آئے تھے۔''

''ہاں، ہاں یاد ہے۔'' ڈاکٹر نے شکایتی لہجے میں کہا'' اور میرے استفسار پر تم نے کچھ بات بنادی تھی یا یوں کہو کہ ٹہلا دیا تھا۔''

''مجھے یہی کرنا چاہیے تھا، اس لیے کہ آپ اس وقت اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔''

میرا عذر اس نے تسلیم کیا کیوں کہ وہ ایک متوازن آدمی تھا۔ ''تم کیا کہہ رہے تھے!'' اس نے بے صبری سے مجھے ٹوکا۔

''اس شام آنے والے پولیس افسروں نے میری جرأت کی بڑی داد دی تھی۔ انہوں نے میدا کے لیے اپنی نفرت کا اظہار کیا اور مغلظات سنائیں۔ کہہ رہے تھے کہ پہلی مرتبہ کوئی رستم سہراب میدا کے سامنے آیا ہے۔ انہوں نے درپردہ مجھے ہر طرح کے تعاون کا یقین دلایا۔ اس تعاون کے بدل میں رشوت طلبی کا ایک اشارہ واضح تھا۔ وہ مایوس نہیں لوٹے میں نے انہیں......''

''تم نے انہیں رشوت دی؟'' میری بات پوری ہونے سے پہلے اس کا لہجہ اکھڑ گیا۔

''میں نے کنایتاً اپنی آسودگی اور کشادہ دلی کا گداز دیا۔''

''تم نے انہیں کوئی نقدی وغیرہ تو نہیں دی؟''

''نقدی دینے سے مراد ہوتی کہ میدا کہ اڈے پر جاکے میں نے بے اساس دعوے کیے ہیں، لیکن پہلے اگر کوئی شبہ تھا تو اب کچھ یقین ہونے لگا ہے، وہ پولیس والے میدا ہی کے فرستادہ نہ ہوں۔ میدا نے انہیں میرے ارادے کی تخمینگی کے لیے بھیجا ہو۔ مبارزت ملتوی کرنے کی تجویز میری نہیں تھی، میدا کے ایک عمر رسیدہ ساتھی کی تجویز تھی یہ......اور میدا نے بہ ظاہر بہ اکراہ اسے قبول کیا تھا۔ یہ حقیقت میدا کے دل پر نقش ہوگی کہ وہ میری تجویز نہیں تھی۔ جو شخص اسی وقت چاقو آزمائی کرنے اور اِدھر یا اُدھر فیصلہ ہوجانے پر تل گیا ہو، اس کا سحر واثر میدا اور اس کے ساتھیوں کے حواس واعصاب پر بری طرح طاری ہونا چاہیے۔ مبارزت ٹل جانے اور اڈے سے میرے جانے کے بعد میری حرکات اور عزائم کا بھی مسلسل جائزہ لیتے رہنا ان کے لیے ضروری ہوگیا تھا۔ میدا مجھ سے مبارزت کے لیے قطعاً آمادہ نہیں تھا کہ اسے اپنا نوشتہ صاف نظر آرہا ہوگا۔ مبارزت کے التوا کی اس مدت میں اسے میرے لیے تپاک اور فراخ دلی کی ارزانی کرنی چاہیے تھی۔ کچھ اسی طرح مبارزت کے لیے میرے عزائم میں نرمی آسکتی تھی، مگر دھنوا کے جفا کار فدائیوں نے سب کچھ درہم برہم کردیا۔ اب ان سے کچھ بعید نہیں تھا کہ آگے وہ کیسی کیسی وحشتوں اور شورشوں کے مرتکب ہوں۔ ابھی پہلے سانحے کی تفتیش شروع ہوئی تھی کہ ایک اور سانحہ ہوگیا۔ انتھونی کی موت اتفاق تھی کہ وہ ناکام لوٹ جانے والوں کے آڑے آگیا تھا۔ پولیس کے لیے یہ اتنا گمبھیر معاملہ نہیں تھا لیکن اکبر علی خاں......وہ کئی حیثیتوں سے ایک ممتاز آدمی تھے۔ ان کے خون کے بعد تو میدا کے اڈے سے پرانی رسم وراہ کی پاس داری اب پولیس کے بس میں نہیں رہی تھی۔''

ڈاکٹر رائے نے خاموشی شعار کی۔ مجھے گمان ہوا، کہیں میرے قیاس اور اندازے ہذیان کی شکل تو اختیار نہیں کررہے۔ مخاطب کی خاموشی بھی بہت ہلکان کرتی ہے۔ خصوصاً ایسے وقت جب کوئی اپنی عرض گزاری میں اس قدر شامل ہو۔ میں نے بے کلی سے ڈاکٹر کو دیکھا۔

اسے بھی احساس ہوا اور اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا، ''تم چپ کیوں ہوگئے؟''

''مجھے گمان ہوا، آپ کہیں اور ہیں۔'' میں نے صاف گوئی اختیار کی۔

''نہیں نہیں، میں توجہ سے سن رہا ہوں۔ تم کیسی منطقی باتیں کررہے ہو، سب کچھ آئینہ کردیا ہے تم نے۔''

مجھے اپنی بات جاری رکھنے میں مشکل پیش آئی۔ میں نے جھجک کے کہا، ''میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ اڈے کی چوکی وراثت میں نہیں ملتی۔ استاد اپنی طاقت کے بل پر چوکی کے منصب کا سزاوار ہوتا ہے اور اس وقت تک اس منصب پر قائم رہتا ہے جب تک اس میں کس بل ہے اور وہ اپنے آدمیوں کی حفاظت کرنے کے قابل ہے۔ وہ مطلق العنان نہیں ہوتا، اڈے کی روایتوں پر عمل پیرا رہتا ہے۔ دھنوا کے سرکش ساتھیوں نے میدا کو کہیں کا نہ چھوڑا تھا، بڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا انہوں نے اڈے کے استاد کو۔ استاد کی ساکھ پر ضرب پڑ رہی تھی۔ اس طرف پولیس نے اس کا ناطقہ بند کر رکھا ہوگا، دوسری طرف، اکبر علی خاں کی ہلاکت پر میرے اشتعال، غم اور غصے کا شدت سے احساس ہوگا اسے۔ اس نازک موقع پر اس کے بہی خواہ نائبین نے ایک ہی مشورہ دیا ہوگا کہ بعد کو کسی بدتر صورت حال کا سامنا کرنے سے بہ تر ہے کہ پیش بندی کرلی جائے۔ سردست تو مجھے یہ باور کرانا لازم ہے کہ اکبر علی خاں کے خون میں میدا کا کوئی ہاتھ نہیں ہے،

جن کا ہاتھ تھا، ان کی سرکوبی کردی گئی ہے۔ اس طرح میدا نے میری خوش نودی کے علاوہ پولیس کو منتشر کرنے، معاملات پیچیدہ کرنے کی بھی کوشش کی اور دھنوا کے ساتھیوں کی بے دردی و بے داد گری پر بھی بند باندھ دیا۔''

ڈاکٹر تا دیر گم بیٹھا رہا اور یکا یک اس کے جسم میں لہر سی اٹھی۔ ''پھر اب ......اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

''ہم کیا کرسکتے ہیں؟'' میں نے پھیکی آواز میں کہا۔

''ہمیں پولیس سے بات کرنی چاہیے۔''

''میری طرف سے پولیس نے بے شک اطمینان کرلیا ہے کہ میں مستقل اسپتال میں ہوں۔ پولیس کی نظریں ایک ہی سمت جاتی ہوں گی، لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں، میدا کو اس کا اندازہ نہیں ہوگا کہ پولیس اس کے ٹھکانے کا راستہ پکڑے گی اور اسے اس دشوار گزار مرحلے سے نمٹنا ہوگا۔ میدا نے سارا کام نہایت سلیقے سے کیا ہوگا۔ ایسے کام خود نہیں کیے جاتے ڈاکٹر صاحب! ارد گرد اور دور دور کے دوستوں سے اعانت کی درخواست کی جاتی ہے، مال وزر اٹھا کے، کچھ نادیدہ لوگوں سے بھی۔ میدا نے گزشتہ رات، ممکن ہے مجرے کی کسی محفل میں گزاری ہو یا اپنے ہی اڈے پر تمام ساتھیوں کے ساتھ کوئی محفل برپا کی ہو۔ قمار بازی کی بزم آرائی کا ڈھونگ رچایا ہو۔ چشم دید گواہان پولیس کو یہ یقین دلانے کے لیے موجود ہوں گے کہ میدا بہ تمام و کمال ان کے درمیان جانِ محفل تھا۔''

''تو ہم تماشا دیکھتے رہیں؟'' ڈاکٹر درشتی سے بولا۔

''ہم کچھ بھی نہیں کرسکتے۔''

''گویا ہم......'' وہ زچ سا ہو کے رہ گیا۔

''ابھی یہیں بات کہاں ختم ہوئی ہے۔''

''کیا......اب کیا؟'' اس نے جھلا کے پوچھا۔

''میرا خیال ہے، آج یا کل میدا یا اس کے قریب ترین معتمد کو یہاں آنا چاہیے۔''

ڈاکٹر رائے ایک لحظے کے لیے بدحواس ہوا۔

''کیا۔ کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''میں صرف امکان کی بات کررہا ہوں۔''

''مگر میدا یہاں کیوں آئے گا؟'' ڈاکٹر نے میرا قیاس مبالغے پر معمول کیا۔ اس کے چہرے کی شکنیں گہری ہوگئیں۔

''پہلے ایک راستہ صاف کرنا چاہیے اسے۔ بعد کو اور راستے اور منزلیں اتنی کٹھن نہیں ہوں گی۔''

''تمہارے لہجے کے تیقن پر مجھے حیرت ہے۔ اگر تم جیسا کہہ رہے ہو تو میں...... میں اس منظر پر موجود رہنا چاہوں گا۔''

''آپ کے لیے مناسب نہیں ہوگا، گو میری خواہش بھی یہی ہے۔''

''نہیں، تم مجھے مطلع کرو گے۔'' اس نے حتمی اور حکمیہ لہجے میں کہا، ''میں جہاں کہیں بھی ہوں۔''

''آپ کو تیار رہنا ہوگا، کسی وقت کے لیے بھی آپ ہی نے یہ ساری صورت حال بدلی ہے۔''

''میں نے؟'' ڈاکٹر کی آواز پھڑپھڑا کے رہ گئی۔

''ڈاکٹر صاحب! کل پولیس کی آمد پر آپ دخل اندازی نہ کرتے اور پولیس مجھے ساتھ لے جاتی تو ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ میدا کو پھر اتنی عجلت پیش نہیں آتی۔ ان تین آدمیوں کو شاید کچھ دن اور زندگی مل جاتی۔ بہت کچھ اس پر منحصر تھا کہ پولیس کتنے دن مجھے روکے رکھتی ہے اور مجھ سے کس طرح کا سلوک کرتی ہے۔''

ڈاکٹر رائے نے گہری سانس بھری۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر منڈلاتی رہیں۔ چند لمحوں وہ بعد کرسی سے اٹھ گیا۔

سیورین آچکی تھی لیکن امی موجود تھی۔ ''میں تمہارا انتظار کررہی تھی۔ سب ٹھیک تو ہے میرے

بیٹے؟'' امی ہاتھ پھیلا کے میری جانب لپکی اور مجھے سینے سے لگالیا۔

''سب ٹھیک ہی ہے۔'' میں نے اداسی سے کہا۔

''ڈاکٹر رائے تمہیں ساتھ لے گئے تھے؟''

''انہی کی حاضری میں تھا۔''

''پولیس تو نہیں آئی تھی؟'' وہ پریشانی سے بولی، ''کوئی نئی خبر......؟''

''ابھی تو دن پڑا ہے۔'' میں نے زہرخند سے کہا۔

''خداوند سب ٹھیک کرے۔'' امی بلکتے لہجے میں بولی، ''سیورین آچکی تھی مگر مجھے تمہاری فکر لگی ہوئی تھی اس لیے رکی رہی...... اچھا چھوڑو، دیکھو! یہ سیورین تمہارے لیے کیسا خوب صورت ناشتا لے کے آئی ہے۔''

سیورین پاس ہی کھڑی تھی۔ اس نے ڈیوٹی والا لباس پہن لیا تھا۔ کچھ بھی کھانے پینے کو جی نہیں چاہ رہا تھا، لیکن انکار کا محل نہیں تھا۔ سیورین نے انگریزی طرز کا ناشتا بنایا تھا۔ خشک میوے کے ریزوں سے ڈھکا ہوا انڈے کا حلوا، انڈوں کی آمیزش سے بنے ہوئے نمکین ٹوسٹ۔ چپاتی جیسے پتلے پتلے پراٹھے۔ آلو، مٹر اور گاجر کی سبزی، ان کی اصل رنگت پکانے سے تبدیل نہیں ہوئی تھی اور تازہ کچی سبزیوں سے بھری تشتری اور پھلوں کا رس۔

''یہ ناشتا ہے؟'' میں نے کہا، ''اور یہ سارا تم نے بنایا ہے؟''

''نہیں، آنٹی بھی ساتھ تھی۔'' سیورین کے لہجے میں حسرت نمایاں تھی کہ میں اس کی تعریف کروں۔ ناشتا واقعی بہت لطیف اور خوش ذائقہ تھا۔ کچھ سیورین کی دل دہی عزیز تھی، کچھ ناشتے کی اپنی خوبی، انہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ امی نے اپنے ہاتھ سے چمچا بھر حلوا بڑی شفقت سے میری جانب بڑھایا۔ میں نے اسی اشتیاق اور احترام سے منہ میں رکھا جس کی اسے توقع تھی۔ یہ عورتیں کیسی دل نواز تھیں۔ میرا دل بھر آیا۔ میری ان کی شناسائی کو وقت ہی کتنا ہوا تھا۔ لطف و عنایت کی اس فراوانی پر آدمی خود کو کیسا بے بس سا محسوس کرتا ہے کہ وہ نہ تو اس کا مستوجب ہے، نہ اسے یہ زیرباری اتارنے کی استطاعت ہے، اور جو مسافر ہو، جسے اس جگہ ٹھیرنا ہی نہ ہو۔ میں ان کے لیے کیسا عارضی رفیق تھا۔ آج نہیں تو کل مجھے چلے جانا ہے اور شاید لوٹ کے کبھی آنا بھی نہ ہو۔

میری پیشانی چوم کے امی رخصت ہوگئی۔ سیورین کو تین آدمیوں کے قتل کی خبر مل چکی تھی۔ وہ مجھ سے ڈاکٹر رائے کے انداز میں باز پرس کرتی رہی اور میں اس کی ہیبت، اس کا غبار دور کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ ڈاکٹر رائے کی اطلاع کے مطابق آج اکبر علی خاں کی تدفین ہوجانی تھی۔ حیدر آباد سے پٹنے کا فاصلہ کم نہیں ہے۔ شام تک کہیں ان کا بڑا بھائی پہنچ پائے گا۔ کیا ظرفگی تھی کہ میں آخری مرتبہ اپنے محسن، اپنے مجی کا چہرہ بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں ان کے جنازے کو کندھا دینے کی توفیق نہیں رکھتا تھا۔ اکبر علی خاں کا خیال آتے ہی ان کا سارا گھر سامنے آجاتا تھا اور جیسے میرا وجود زمین میں دھنسنے لگتا تھا۔

دوپہر کے دورے پر ڈاکٹر رائے تین چار ڈاکٹروں اور نرسوں کے ساتھ بٹھل کو دیکھنے آگیا تھا۔ اس وقت بٹھل کی حالت خاصی بہتر نظر آرہی تھی۔ انہوں نے اسے بٹھا دیا اور اتنے دنوں بعد بستر سے اٹھا کے کمرے کے فرش پر قدم رکھوانے چاہے۔ وہ بہت احتیاط سے کام لے رہے تھے۔ بٹھل کا جسم ایک لمحے کے لیے ڈگمگایا مگر پھر اس نے مضبوطی سے قدم زمین پر جمالیے۔ دو نوجوان ڈاکٹر اسے کاندھوں سے پکڑے ہوئے تھے۔ چند قدم چلانے کے بعد ڈاکٹر رائے نے پوچھا کہ اس کا سر بھاری تو نہیں ہورہا یا اس کے سر میں دھمک تو

نہیں ہو رہی۔ بٹھل کے انکار پر اس نے چٹکی بجا کے خوشی کا اظہار کیا۔ سوفے تک ڈاکٹر، بٹھل کو لے آئے اور واپس چلا کے انہوں نے دوبارہ اسے بستر پر بٹھا دیا۔ انہوں نے بٹھل سے بہت کم بات کی اور لگتا تھا بٹھل خود بھی زیادہ بات کرنے سے گریزاں ہے۔ وہ کچھ مدہوش سا لگ رہا تھا۔ میں تو ایک کونے میں گنگ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ یقین ہی نہیں آ رہا تھا، ڈاکٹر رائے نے بٹھل سے نمٹ کے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو میں اچھل پڑا۔ وہ مسکرانے لگا۔ میں نے بے اختیار اس کے ہاتھ تھام کے آنکھوں سے لگا لیے۔ میرے آنسوؤں سے اس کے ہاتھ بھیگ گئے۔ وہ مجھے تھپکتا رہا، پھر اس نے مجھے پہلو میں بھینچ لیا۔ میں اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ لفظ ہی کھو گئے تھے۔ مجھے چھوڑ کے وہ اپنے ساتھی ڈاکٹروں اور نرسوں کے ہم راہ باہر نکل گیا۔

چار بج چکے تھے۔ میں پاؤں پھیلائے سوفے پر نیم جان سا، بے حس و حرکت بیٹھا ہوا تھا۔ سیورین کہیں باہر تھی، گھبرائی ہوئی میرے پاس آئی اور اس نے بتایا کہ اسپتال کی مرکزی عمارت سے آنے والا ایک کارندہ چند مہمانوں کی اطلاع دینے آیا ہے اور میری اجازت کے لیے باہر کھڑا ہے۔

میں خود ہی اٹھ کے دروازے پر چلا گیا۔ اسپتال کی وردی میں وہ ایک پختہ عمر آدمی تھا۔ اسی لمحے خیال آیا، کلکتے سے کوئی نہ آ گیا ہو۔ جمرو، جامو، زورا کا نام لینے پر اس نے انکار میں گردن ہلا دی اور کہنے لگا، ”آنے والے مہمان لوگ میں سے ایک ہی سجن نے اپنا نام بتایا ہے اور ان کا نام میدا صاحب ہے۔“

”میدا......؟“ میرے منہ میں جیسے ریت بھر گئی۔

”ایہی نام بولت ہیں صاب۔ ساتھ میں دو اور لوگ بھی ہیں۔“ کارندے نے مؤدبانہ کہا۔

مجھے اس سے کچھ کہنے میں دیر لگی۔ میدا کے نام پر سیورین کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں اور اس نے میرا بازو زور سے دبوچ لیا تھا۔ کارندہ جواب کے انتظار میں تھا۔ میں نے خود کو سنبھالا اور تھمی ہوئی آواز میں اسے ہدایت کی کہ ڈاکٹر رائے جہاں کہیں بھی ہوں، انہیں یہاں آنے کے لیے کہا جائے اور میدا کو اس وقت تک مرکزی عمارت میں روکے رکھا جائے جب تک ڈاکٹر رائے میرے پاس نہ پہنچ جائیں۔ میں نے سیورین کو کمرے کے آگے کے سبزہ زار میں کرسیاں لگوانے کی تاکید کی۔

”وہ......وہ کیوں آیا ہے؟“ کارندہ ابھی قریب ہی تھا کہ سیورین بلبلاتی آواز میں بولی۔

”اسے آنا تھا۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

”اسے آنا تھا، مگر کیوں؟“

”یہی ایک راستہ رہ گیا تھا اس کے پاس۔“

”کیا مطلب؟“

”سارے سوال اس وقت نہ کرو تو بہتر ہے۔“

”تمہیں اس سے نہیں ملنا چاہیے۔“

”وہ ملے بغیر نہیں جائے گا۔“

”مگر وہ......وہ کیوں آیا ہے۔ اب کیا رہ گیا ہے کچھ کہنے سننے کو۔“

”دیکھتے ہیں۔“ اس کے سکون کے لیے میں نے بہ ظاہر بے پروائی سے کہا، ”یہ تو اس سے ملنے کے بعد ہی معلوم ہوگا، لیکن تمہیں...... تمہیں یہ کیا ہو گیا ہے؟ تم ایک حوصلہ مند لڑکی ہو، تم پر اس قدر دہشت کیوں چھائی ہے؟“

”معلوم نہیں، مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔“

میں نے اسے مصروف رکھنے کے لیے کسی آدمی کو بلا کے سبزہ زار پر کرسیاں لگوانے کا کام یاد دلا دیا۔ وہ بولائی ہوئی بہ عجلت راہ داری میں ایک طرف مڑ گئی۔ کمرے میں جا کے میں نے ایک نظر بٹھل کو دیکھا پھر اپنے آپ کو۔ ناشتے کے دوران سیورین نے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا تھا کہ کیا

میں دو تین گھنٹے کے لیے مریضوں کا لباس پہن کے ملحق کمرے میں بند ہو جانے کو تیار ہوں۔ میں نے منع کر دیا تھا۔ کپڑے شکستہ ہو گئے تھے، لیکن ایسے میلے نہیں ہوئے تھے اور میدا کے سامنے تو کسی بھی لباس میں جایا جا سکتا تھا۔

دس پندرہ منٹ سے زیادہ وقت نہیں گزرا ہوگا کہ ڈاکٹر رائے آ گیا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت بھری ہوئی تھی اور وہ نوجوانوں کی طرح سرگرم لگ رہا تھا۔ ”وہ آ گئے ہیں؟“ اس کی آواز تمتما رہی تھی۔ ”تم ان سے میرا تعارف نہ کرانا۔“

”وہ آپ کو جانتے نہیں ہوں گے کیا۔ شہر میں آپ کو کون نہیں جانتا۔“

”ضروری نہیں۔ جاننا اور چیز ہے، پہچاننا اور۔“

ادھر سیورین نے آ کے سبزہ زار میں کرسیاں لگ جانے کی اطلاع دی، ادھر اسپتال کا ملازم میدا کے پہنچ جانے کی خبر دینے آیا۔ ڈاکٹر اور میں نے ایک دوسرے کو فکر مندانہ نگاہوں سے دیکھا، دوسرے لمحے ہم باہر آ گئے۔

وہ تین تھے، ایک وہی معمر آدمی، جس کا نام شاید بِرجُو تھا، درمیان میں دوسرا میدا، اور تیسرا بھی عمر میں خاصا پختہ تھا۔ میں نے اسے اڈے کی چوکی پر میدا کے قریب دیکھا تھا۔ وہ کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے، ہمیں آتا دیکھ کے کھڑے ہو گئے۔ تینوں کے چہروں پر سنجیدگی کا غلبہ تھا۔ راہ داری سے چند قدم چل کے ایک فاصلے پر ہم ان کے سامنے رک گئے۔ انہوں نے سلام کے لیے سرسری انداز میں ہاتھ اٹھا کے چھوڑ دیے۔ ہم نے بیٹھ جانے کو نہیں کہا۔ انہوں نے ہماری اجازت ضروری نہیں سمجھی۔ ہمیں بیٹھتا دیکھ کے کرسیاں سنبھال لیں۔ چند لمحے سنسناتی خاموشی رہی۔ شاید ڈاکٹر رائے کی موجودی انہیں کھٹک رہی تھی۔ ان کی آسانی کے لیے میں نے ہی پہل کی۔ ”کیا بات ہے؟“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میدا نے عمر رسیدہ برجو پر نظر کی۔ برجو کی آنکھیں زمین میں گڑی ہوئی تھیں۔ کلبلاتے ہوئے اس نے زبان کھولی، ”ہم کو تمرے سے جروری بات کرنی ہے۔“

”اب کیا بات کرنی ہے؟“ میں نے تلخی سے کہا۔

”ہم کو پتا ہے، ہمرے بولن کے واسطے کچھ ناہیں ہے۔ ہم کو جیادہ بات بھی ناہیں کرنی۔“

میرے نتھنے پھول گئے۔ ”بولو پھر!“

”ہم تمرا چاکو لوٹاوے کو آئے ہیں۔“ میدا سمٹی ہوئی آواز میں بولا۔

یہ کہتے ہی اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کے چاقو نکال لیا۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ دوسرے لمحے وہ میری جانب اچھال دے گا۔ اپنے ذہنی خلجان میں اس کا ہاتھ اوچھا اٹھ گیا تھا۔ جیسے ہی اس نے ہاتھ بلند کیا، مجھے اس کی کوتاہی کا احساس ہوا۔ میں کرسی پر بیٹھا رہتا تو چاقو ڈاکٹر رائے کے دائیں جانب فرش پر گرتا اور کوئی ایسی ندامت کی بات نہ ہوتی۔ کرسی پر نیم ایستادہ ہو کے اور ہاتھ بڑھا کے چاقو اچکنے کا عمل مجھ سے غیر ارادی طور پر سرزد ہوا۔ میرا چاقو اب بہ ہر حال میری گرفت میں تھا۔ ”یہ کیا ہے؟“ میں نے ناگواری سے کہا۔

”اڈا اب تمرا ہے استاد! تمرے ہی کو دیکھنا ہوگا۔“

”پر ایسا کیسے۔“

”تم ہی ادھر اڈے پر بولے تھے، اڈے کی ریت ہے، چوکی پر بیٹھا استاد آپی نیچے کو آ جاوے تو......“ برجو اٹکتی زبان سے بولا ”استاد میدا کو اب تم سے پنجہ ناہیں لڑانا۔“

”کیوں نہیں لڑانا۔“ میرا منہ بن گیا۔

”جو ہوا، اس کے بعد بالکل ناہیں۔“ تیسرے آدمی نے تپی ہوئی آواز میں کہا، ”او حرام جادے

بہت اندھیار کیے۔ تے تے نے پچھے اسپتال کا جوان آدمی مار دیے، پھر وکیل صاب کو۔ وکیل صاب بے چارے کا کا دوش تھا۔ ادھر ایسا کبھی ناہیں ہوا۔ ڈاکٹر صاب ہیاں بیٹھت ہیں۔ انہی سے پوچھ لیو، ایسا کبھی ہوا ادھر کا؟ کیوں ڈاکٹر صاب، مائی باپ!"
اس نے ڈاکٹر رائے سے ہاتھ جوڑ کے پوچھا۔
ڈاکٹر رائے کا چہرہ سرخ ہو گیا۔
ڈاکٹر کی خاموشی اس نے تائید جانی، چلچلاتی آواز میں کہنے لگا۔ "او اپنے اڈے کے ادمن تھے۔ ہمرے ہی سے بندھے تھے رنڈی کے جنے، ہمرے پر جے داری آوت ہے انھاں کی۔ میدا استاد نے اسی کارن اڈا چھوڑن کا پھیسلا کیا ہے۔ اب تمرے ہی کو اڈا دیکھنا ہے۔ میدا استاد اب ای سہر ہی سے چلا جاوے گا، پر ادھر تھوڑی پولیس سے منہ ماری کرن کے باد......"
"ہم کو ماپھی دیو استاد!" برجو نے ندامت زدہ لہجے میں لقمہ دیا، "ہم اور کا بولیں۔"
"میں جانتا ہوں۔ اکبر علی خاں کو تم نے نہیں ختم کیا ہے۔ ان تینوں ہی نے کیا ہوگا۔ ان کی یہی سزا ہونی چاہیے تھی جو انہیں مل چکی ہے، لیکن یہ تو بہت کم ہے۔"
"کم ہے، جانت ہیں، بہت کمتی ہے۔" برجو تڑخ کے بولا، "اسی کارن میدا استاد تمرے پاس......"
"اسی کارن میدا استاد اپنی سزا سنانے کے لیے ہمارے پاس آیا ہے نا!" میں نے برجو کی بات کاٹ کے دھتکارتی آواز میں کہا، "ٹھیک ہے، میدا کو اب اڈے پر نہیں رہنا چاہیے۔ اڈے کا جو استاد اپنے کتوں کے گلے میں پٹا ڈال کے نہیں رکھ سکتا، اڈے کے آخری آدمی تک جس کی نظر نہیں جاتی، اسے چوکی سے اتر ہی جانا چاہیے، لیکن میدا نے اپنی سزا آپ ہی کیسے طے کر لی۔ اس شہر سے راج پاٹ چلا جائے گا تو دوسرے شہر میں جا کے میدا بنسی بجائے گا۔"
"ہمرا چاکو تمرے پاس ہے۔ اسی سے ہمری گدن اتار دیو۔" میدا بھڑک کے بولا، "کوئی اور سجا تمرے من میں ہو تو بولو۔"
"ایسا کر سکتے تو ذرا دیر نہیں لگتی استاد! پر اس سے بھی تسلی نہیں ہوگی اپنی۔" میری آواز گرجنے لگی تھی۔ اسے سامنے دیکھ کے ہی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ کہنے کو بہت سی باتیں سینہ جلا رہی تھیں۔ اب وہ میرا چاقو واپس کرنے آ گیا تھا اور اپنا چاقو طلب نہ کرنے کا مطلب واضح تھا کہ اب اس کے پاس نجات کی ایک ہی صورت رہ گئی ہے۔ پہلی مرتبہ چاقو بدلنے کے حیلے سے مبارزت ٹل گئی تھی اور بعد کو درمیان کی کوئی راہ نکل آنے کی امید کی جا سکتی تھی، لیکن اب اکبر علی خاں کی ہلاکت کے نتیجے میں اڈے پر میری واپسی یقینی ہو گئی تھی اور پھر بھی ایک تدبیر عقل و ہوش کے قریں تھی، چاقو سے میدا کی دست برداری۔
وہ اس حقیقت سے آشنا ہو چکا تھا کہ اڈے پر میرے احوال کے بیان میں کوئی کھوٹ نہیں تھی۔ میرا بھائی واقعی اسپتال میں ہے۔ جو شخص اپنے بھائی کے لیے خود کو داؤ پر لگانے آ جائے، وہ اپنے محبی اکبر علی خاں کا خون ہو جانے پر کیا کچھ کر گزر سکتا ہے۔ مجھے اس کے اڈے پر تو کل صبح ہی اکبر علی خاں کے سانحے کی خبر مل جانے پر پہنچ جانا چاہیے تھا۔ میرے نہ پہنچ پانے کی وجہ بھی اسے معلوم ہو گی۔ سو میرے پاس آنے کے لیے یہی وقت مناسب تھا کہ اسپتال میں بیمار بھائی کی زنجیر میرے پیروں میں پڑی تھی۔ تین آدمیوں کو ختم کر کے اس نے اپنی دانست میں نرمی کا ایک گوشہ ڈھونڈ لیا تھا۔ یہی کچھ صبح میں نے ڈاکٹر رائے سے کہا تھا کہ آج یا کل کسی وقت میدا کو یہاں آنا چاہیے۔
میں خاموش رہا۔ میں نے میدا سے نہیں کہا کہ جب ان تین آدمیوں نے اسپتال میں گھس جانے کا

حوصلہ کیا تھا اور انھونی مارا گیا تھا، میدا اگلے دن صبح ان پر پھندا ڈال دیتا تو نہ اکبر علی خاں جاتے نہ وہ تینوں۔ میدا کو میرے جواب کی آگہی ہوگی اور میرے پاس اس کے سوا جواب بھی کیا تھا کہ اس کا چاقو واپس کر کے اسے اپنے دل و دماغ سے حرف غلط کی طرح مٹا دوں۔ بھُلّن کی صحت یابی تک مجھے خود کو روکے رکھنا تھا، چاہے درونِ خانہ کیسا ہی تلاطم برپا ہو اور کیسا ہی خون کھولتا ہو۔ میرے پاس اسے ٹھوکریں مارنے، اس کا گریبان پکڑ کے لہولہان کر دینے، اس کا خون پینے کی گنجائش کہاں تھی۔ اس سے حاصل بھی کیا ہوتا۔ وہ دونوں، انھونی اور اکبر علی خاں تو جا چکے تھے۔ انہیں واپس لانا میرے اختیار میں تھا نہ میدا کے۔ ادھر بھُلّن بستر پہ تھا۔ کہتے ہیں، تحمل اور برداشت سب سے بڑا انسانی وصف ہے۔ ہر تحمل جبری ہوتا ہے اور ہر برداشت ہوش مندی ہوتی ہے۔ مجھے اسی وظیفے پر تکیہ کرنا چاہیے تھا۔

میدا کو اپنا وزن کرنا آتا ہوگا۔ وہ اپنے بدن پر چڑھتی چربی سے خوب واقف ہوگا، لیکن یہ بھی ایک اتفاق ہے۔ اتنے بڑے اڈے پر اس جیسے زور کا کوئی اور آدمی موجود نہیں تھا۔ ہوتا تو میدا ہی کیوں راجا بنا بیٹھا ہوتا۔ میدا کے چوکی سے اتر جانے کے بعد اڈے کی ریت کے مطابق مجھی کو اڈے کی ذمے داری سنبھالنی چاہیے تھی، کیوں کہ میں ہی ایک دعوے دار بہت عرصے بعد سامنے آیا تھا۔ دوسرا کوئی دعوے دار نظر نہیں آتا تھا۔ ہو بھی جاتا ہے تو چاقو آزمائی میرے اس کے درمیان ہی ہوسکتی ہے اور اس کے لیے میرا اڈے پر موجود رہنا ضروری ہے۔ میدا نے دست بردار ہو کے اڈے کی رسم نبھا دی ہے۔ مجھے آج میدا کی آمد کی توقع تھی اور آمد کے مقصد کی بھی......تو اپنا ردعمل میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اپنا جواب تیار رکھنے کے لیے مجھے خاصا وقت مل گیا تھا۔

اس دوران ڈاکٹر رائے کی نظریں مسلسل مجھے اپنے چہرے پر چبھتی محسوس ہوتی رہی تھیں۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے بے مہری سے کہا، ''مگر میں اس وقت اڈا نہیں سنبھال سکتا۔ وجہ تمہیں معلوم ہے۔ اس وقت اڈے پر تم سے یہی بات ہوئی تھی کہ بھائی کے ٹھیک ہو جانے پر جب مجھے سہولت ہوگی، میں اپنا چاقو لینے آجاؤں گا۔''

''ہاں استاد، یاد ہے ہمرے کو پورا۔'' معمر برجو نے سینے پر ہاتھ رکھ کے جلدی سے اقرار کیا۔ ''پر......پر......''

میں نے اسے روک دیا۔ ''یاد ہے تو اچھا ہے۔ جس مجبوری سے اس شہر اور تمہارے اڈے پر آنا پڑا تھا، وہ ابھی تک ہے۔ بھائی اسپتال میں ہے۔''

''تم مانو، یا نا مانو استاد۔'' تیسرا آدمی مچل کے بولا، ''ایک کارن یہ بھی تھا چاکو بدلی کا......''

''ہنہ۔'' میں نے اسے جھڑک دیا، ''اس بات کو جانے دو۔ کارن اچھی طرح تمہیں معلوم ہے، مجھے بھی......اور اتنا بھی کہ تمہیں ہمارے بھائی سے کتنی دل چسپی ہو سکتی ہے۔''

تینوں بہ یک وقت کچھ بولنا چاہتے تھے لیکن تینوں نے ایک ساتھ خاموش رہنے کا فیصلہ کیا۔

''اب سنو!'' میں نے اونچی آواز میں کہا، ''اڈے کی ایک اور ریت بھی ہے۔ اڈے کا استاد کسی وجہ سے چوکی پر نہ بیٹھ سکے تو اپنی جگہ کوئی بھی آدمی چوکی کے لیے چن سکتا ہے۔ تم لوگ یہ ریت جانتے ہو یا اسے بھی جتانے کی ضرورت ہے؟''

''جانت ہیں استاد۔'' برجو کے لہجے میں کساو آگیا۔ ''تھوڑی بہت جان کاری ہے اپنے کو بھی......تم بولو۔''

''پھر کچھ مدت کے لیے میدا استاد یا برجو دادا اڈا سنبھالیں یا کوئی اور جسے تم لوگ بہتر سمجھتے ہو۔ بھائی کی طبیعت ٹھیک ہونے پر مجھے اسے گھر لے جانا ہے۔ اسے گھر چھوڑ کے تبھی لوٹنا ہو سکتا ہے اپنا۔''

وہ مبہوت سے ہو گئے اور برجو کو جیسے پہلے ہوش آیا۔ عاجزی سے بولا، ''اب تم جانو استاد، اڈا اپنا نا ہیں تمرا ہے۔''

''مجھے نہیں لگتا، میدا جیسا کوئی اور آدمی اڈا سنبھال سکتا ہے۔ میرے لوٹ آنے تک میدا کو چوکی پر بیٹھے رہنا ہے۔''

حالاں کہ میری جانب سے اسی ایک جواب کی توقع انہیں بھی ہونی چاہیے تھی مگر شاید وہ کچھ اور قیاس کر رہے ہوں۔ ان کے چہروں کا رنگ بدل گیا تھا۔

''اب ہمرا جی ناہیں لاگے گا ہواں۔'' میدا نے شکستگی سے کہا۔

ادھر برجو جھجک کے بولا، ''اور میدا استاد اڈے کے سارے ادمن سے بدائی لے کے آیا ہے۔ او سب نئے استاد کے سواگت کے واسطے اسپتال کے بہری کھڑے ہیں۔''

''ادھر اسپتال کے باہر؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''اب جو بولنا ہے، ایک بار ادھری جا کے انھاں کے سامنے بول دیو اُستاد! وہ سارے اسپتال کے بھیتر ناہیں آسکت تھے۔ ہم لوگن کو بھی بھیتر آنے میں بہت جوکھم ہوا۔''

''مجھے ان کے پاس جانا ہے؟ نہیں نہیں۔''

''اب وہ تمرے اڈے کے ادمن ہیں۔''

''لیکن میں ابھی اڈا نہیں سنبھال رہا ہوں۔''

''اسی بات کو جرا انھاں کے سامنے بول دیو۔'' برجو نے لجاجت سے کہا، ''جروری ہے استاد!''

مفر کی کوئی صورت نہیں تھی۔ میں نے متوحش نظروں سے ڈاکٹر رائے کی طرف دیکھا۔ اسے یہ سارا کچھ بہت نیا اور انوکھا لگ رہا ہوگا اور وہ آگے کا تماشا دیکھنے کا بھی مشتاق ہوگا۔ میں نے مزید پیش و پس مناسب نہیں سمجھا اور ڈاکٹر رائے کو اشارہ کر کے کرسی سے اٹھ پڑا۔

خاص کمروں کے اس حصے سے صدر دروازے کا فاصلہ خاصا تھا۔ ڈاکٹر رائے سے میں نے رک جانے کی درخواست کی تھی۔ وہ نہیں مانا تو میں نے اصرار بھی نہیں کیا۔ بہ ہر حال، ایک نہایت معتبر گواہ بھی ہم راہ تھا۔ جہاں جہاں سے ہم گزرتے رہے، ڈاکٹر رائے کو ہمارے ساتھ دیکھ کے راستے میں ملنے والے ڈاکٹروں، نرسوں، اسپتال کے دیگر ملازموں اور سپاہیوں کے جسم تن جاتے تھے اور آنکھیں پھیل جاتی تھیں۔ ہم دونوں آگے، پیچھے وہ تینوں تھے۔ ہماری رفتار تیز تھی۔ سلاخوں والے اونچے ....صدر دروازے ہی سے بہت لوگ مضطرب کھڑے دکھائی دیے۔ سپاہیوں کا ایک دستہ بھی وہاں موجود تھا۔

دربان نے صدر دروازہ کھول دیا۔ اڈے کے آدمیوں کے ہجوم میں شور اٹھا۔ اس لمحے بے اختیار میں نے ڈاکٹر رائے کا ہاتھ تھام لیا۔ مجھے نہیں معلوم اس کی ضرورت مجھے کیوں محسوس ہوئی۔ ہمارے تین اطراف اڈے کے آدمی کھڑے تھے۔ جانے کس کی ہدایت پر کوئی آدمی دربان کی کرسی لے آیا، پھر کوئی اور سپاہیوں کی بینچ۔ سپاہیوں کی کیا مجال تھی کہ اڈے کے آدمیوں کی پذیرائی میں تامل و تردد کریں۔ انہوں نے مجھے کرسی پر کھڑا کرنا چاہا، لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ ڈاکٹر رائے نیچے کھڑا رہے۔ میں نے اسے کرسی کی پیش کش کی۔ اس کے چہرے سے نظر آ رہا تھا کہ وہ کتنے استعجاب اور کشاکش کے عالم میں ہے۔ کسی قدر ردوکد.... کے بعد وہ کرسی پر کھڑے ہو جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ میدا، برجو، ان کا تیسرا ساتھی اور میں بینچ پر کھڑے ہو گئے۔ وہ تینوں سکڑے سمٹے ہوئے تھے۔ ہمارے کھڑے ہوتے ہی شور اٹھنے لگا۔ عمر رسیدہ برجو کو ٹوکنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اتنی عمر میں چہرہ شناسی آ ہی جانی چاہیے۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کے انہیں

خاموش رہنے کی تاکید کی۔
ہر طرف خاموشی چھا گئی تو میں نے بلند آواز میں کہا، ''ہمیں زیادہ لمبی چوڑی بات نہیں کرنی، اس کا وقت بعد کو آئے گا۔ اس وقت جو تم سے کہنا ہے، اسے دھیان سے سنو! میدا استاد نے اڈا چھوڑ دیا ہے۔ اب ہمیں اڈے کی چوکی پر بیٹھنا ہے، لیکن ابھی ہم اڈا نہیں سنبھال سکتے۔ میدا استاد فیصلہ کر چکا تھا۔ ہمارے کہنے پر مشکل سے ہماری جگہ چوکی پر بیٹھنے کو تیار ہوا ہے۔ جب تک ہم واپس نہ آ جائیں، میدا استاد ہی اڈے کا مالک رہے گا۔ بیچ میں کوئی ہماری طرح چوکی کا دعوا کرنے والا آ جائے تو اسے میدا استاد سے نہیں، ہم سے بل کرنا ہوگا۔ ہمارے ٹھکانے کا پتا میدا استاد کے پاس ہوگا، ہم جہاں کہیں بھی ہوں گے، اس کے بلانے پر یہاں آ جائیں گے، پر جب تک ہم آ نہ جائیں، نئے دعوے دار کو انتظار کرنا ہوگا۔''
میرے چپ ہو جانے پر ہجوم میں بھن بھناہٹ ہونے لگی اور مجھے خیال آیا احتیاطاً ایک بات ان سے اور کہہ دینی چاہیے۔ میں نے کہا، ''کسی کو کچھ پوچھنا ہے، یا کوئی اٹکاؤ ہے کسی کے دماغ میں، تو ہم ابھی سامنے کھڑے ہیں۔''
کسی طرف سے کوئی آواز نہیں اٹھی۔
''ہاں ایک بات اور۔'' جیسے ہی میری آواز بلند ہوئی، دوبارہ سناٹا چھا گیا۔ ''کوئی اور دعوے دار ہو تو ابھی ہم شہر میں ٹھیرے ہوئے ہیں، وہ سامنے آ جائے، یہاں ابھی، اس وقت بھی۔ اب نہیں تو دو چار دن بعد، ہفتے بھر میں۔ ہمارے جانے کے بعد پھر، جیسا ہم نے بول دیا ہے، اسے ہمارے لوٹ کے آنے کا انتظار کرنا ہوگا۔''
اپنی بات ختم کر کے میں نے سوالیہ نظروں سے برجو کو دیکھا۔ وہ تینوں ہی جیسے بت بنے ہوئے تھے۔ میں بینچ سے اتر آیا۔ ڈاکٹر رائے نے بھی فوراً میری تقلید کی۔ صدر دروازے پر واپس آ کے میں نے مڑ کے ایک نظر پیچھے کی طرف دیکھا۔ میدا، برجو اور وہی تیسرا آدمی لپکتے ہوئے ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ میں اور ڈاکٹر رک گئے۔ ان تینوں کے ہاتھ جڑے ہوئے تھے، آنکھیں جھلملا رہی تھیں، جیسے بس اُمڈا ہی چاہتی ہوں۔
جیب میں ہاتھ ڈال کے میں نے میدا کا چاقو نکال کے اس کے آگے کر دیا۔ ''اب تمہیں اس کی ضرورت پڑے گی۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔ اس کے چہرے کی کھال پھڑکنے لگی تھی۔ میرے ہاتھ سے چاقو لے کے اس نے آنکھوں سے لگا لیا۔ پھر ہم وہاں نہیں ٹھیرے، صدر دروازہ عبور کر کے اسپتال میں داخل ہو گئے۔
مرکزی عمارت اور اپنے کمرے تک آنے کے دوران ڈاکٹر رائے نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ مجھے اس سے اجازت لے لینی چاہیے تھی، لیکن میں اس کے ساتھ چلتا رہا تھا۔ کمرے میں آ کے وہ تھکے ہوئے انداز میں میز کے قریب رکھی ہوئی آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ لگتا تھا جیسے بہت دور کے سفر سے آ رہا ہو۔ چند لمحے بعد اس نے پلکیں جھپکائیں اور مجھے سامنے کھڑے ہوئے دیکھا تو گڑبڑا کے بولا۔ ''تم...... تم کھڑے کیوں ہو؟''
''میں اب چلتا ہوں۔'' میں نے خمیدہ آواز میں کہا، ''مجھے اجازت دیجیے۔''
''کیوں، کیوں جانا چاہتے ہو؟'' اس نے کھوئے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
''یوں ہی...... کچھ دیر آپ آرام کر لیں۔''
وہ پھر کہیں گم ہو گیا اور لمحے بھر بعد چونک کے بولا، ''مجھے واقعی آرام کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ٹھیک ہے، جاؤ تم۔ کچھ دیر میں شام کے معائنے پر میں اس طرف آتا ہوں۔''
سلام کے لیے ہاتھ اٹھا کے میں دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا کہ اس کی بھاری آواز نے میرا

خاطب کیا۔ ''رات کو تم گھر آ سکتے ہو؟''
میں نے پلٹ کے حیرانی سے اسے دیکھا۔
''رات کا کھانا ساتھ کھائیں گے۔'' اس نے سرسری سے انداز میں کہا۔
میں سوچتا رہا، مجھے کیا کہنا چاہیے۔ اس نے کرسی کے سرہانے سے سر ٹکا کے پھر آنکھیں موند لی تھیں۔ میں دبے قدموں باہر آ گیا۔
راستے بھر گزرتے ہوئے لوگوں اور جگہ جگہ تعینات سپاہیوں کی نگاہیں مجھ پر بھٹکتی رہیں۔ بری خبر ہوا رفتار ہوتی ہے۔ شاید سبھی کو معلوم ہو گیا تھا کہ شہر کے اڈے کے سب سے بڑے استاد، میدا استاد اور اس کے قریب ترین ساتھی مجھ سے ملنے کے لیے اسپتال آئے ہوئے تھے اور یہ حیرت انگیز واقعہ بھی ان کے لیے ناقابل فہم ہوگا کہ ڈاکٹر رائے بھی میرے ساتھ تھا۔ کچھ دیر میں جزئیات سے بھی انہیں آگاہی ہو جانی تھی۔ پھر ہر کوئی اپنے اپنے طور، اپنی اپنی زبان میں انہیں بیان کرے گا۔ میں دائیں بائیں ان کی موجودگی سے بے نیاز سا ان کے سامنے سے گزرتا رہا۔ اتنی نگاہوں کی زد پر آدمی کیسا چور سا بن جاتا ہے۔ بہ حال، کسی طرح میں اپنے کمرے تک پہنچ گیا۔ سیورین مجھے باہر ہی مل گئی۔ اسے چین نہیں ہوگا۔ بار بار کمرے سے راہ داری میں آتی ہوگی۔ اس نے دور سے مجھے آتا دیکھ لیا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ ابھی اس کے سوالوں کی جواب دہی کا ایک مرحلہ باقی ہے۔
''کیا ہوا؟'' اس نے پھٹے ہوئے دیدوں سے پوچھا۔
''چلے گئے وہ۔'' میں نے اس کے اطمینان کے لیے مسکرا کے کہا اور اس کا بازو تھام کے سوفے پر لے آیا۔ ''تم اتنا کیوں گھبرا رہی تھیں؟''
''بات ہی ایسی تھی۔'' وہ ہراساں آواز میں بولی۔
''تم نے غور نہیں کیا۔ اسپتال میں وہ کسی خطرناک ارادے سے کیسے آ سکتے تھے۔ وہ باقاعدہ اجازت لے کے یہاں تک پہنچ پائے تھے۔''
''لیکن ان کا کیا بھروسا۔''
''وہ بھی آدمی ہی ہوتے ہیں، اور آدمی زیادہ تر آدمی ہی رہتا ہے۔''
''لیکن یہ ہوا کیا؟''
''ہوتا کیا۔'' میں نے اسے مختصراً ساری روداد سنانے کی کوشش کی۔ ''اب سب ٹھیک ہو گیا۔'' میں نے رسانی سے کہا۔
''کیا ٹھیک ہو گیا؟'' اس کا اضطرار کم نہ ہوا۔
''میں نے تمہیں بتایا نا، میرا چاقو اب میرے پاس ہے، میدا کا چاقو اس کے پاس۔ میدا استاد اپنی پرانی جگہ جا بیٹھے گا۔ انتونی کو جانا تھا، چلا گیا۔ کہتے ہیں، وقت کو کون ٹال سکتا ہے۔ اکبر علی خاں صاحب کا بھی وقت آ گیا تھا۔ ان کے قاتل بھی چلے گئے۔ پولیس ایک دوسرے کے قاتل تلاش کر رہی ہے۔ کوئی ان کے ہاتھ نہیں آئے گا تو وہ کیا کر سکتی ہے، چپ ہو کے بیٹھ جائے گی اور کسی معاملے میں مصروف ہو جائے گی۔ شیری کو انتونی کے بغیر رہنا ہوگا۔ اکبر علی خاں صاحب کے گھر والوں کو ان کے بغیر زندگی بسر کرنے کی عادت ڈالنی ہوگی اور عادت پڑ ہی جائے گی۔ آدمی کو سب سے عزیز اپنی زندگی ہوتی ہے۔''
''تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟'' وہ آزردگی سے اور روہانسی ہو گئی۔
''کیا غلط ہے اس میں؟'' میں نے بجھی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ سر جھکا کے چپ ہو گئی اور ناخن کریدنے لگی۔ میں بھی خاموش بیٹھا اپنے کو تکتے چھوتا رہا۔ خود آزادی سے بھی تسلی بھی ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ مجھے احساس ہو رہا تھا، دل جوئی کے بجائے میں نے اس سے کیسی شکستہ باتیں شروع کر دی تھیں۔ وہ تو چھوئی موئی کی مانند ہے۔ میری سنگ بیانی سے کیسی کمھلا گئی ہے۔ شیشہ ایسی گرانی کی

تاب نہیں رکھتا۔ اصل میں شاید میں یہ سب کچھ خود سے کہنا چاہتا تھا کہ میں نے اس پر بار کر دیا۔ کچھ دیر بعد میں نے چپکے سے اسے ٹوکا، ''اب کیا سوچ رہی ہو؟''

''کچھ نہیں۔'' اس کی آواز جیسے پاتال سے ابھری۔

''مجھے افسوس ہے۔'' میرا لہجہ بھی معذرتی تھا۔ اس کے گلابی ہونٹوں میں ارتعاش ہوا۔

''ویسے تم تھوڑی سی پاگل بھی ہو۔'' میں نے ہلکی آواز میں کہا۔

اس کی لب ریز آنکھیں مجھ پر منڈ لائیں اور اس کے ابر آلودہ رخسار چنک اٹھے۔ ''ہاں۔'' وہ بے ساختہ بولی۔ ''اور تم نے کیا ہے مجھے پاگل۔''

''میں نے؟''

''معلوم نہیں، تم کیسے آدمی ہو۔''

''بہت برا ہوں نا۔''

''ہاں آں، بہت برے۔'' وہ ہنس پڑی ''یہی تو تمہاری خوبی ہے۔''

میری تدبیر کارگر ہوئی، آخر کہیں اس پر چھائے یاس و حرماں کا غبار چھٹا۔ ''چائے نہیں پلاؤ گی۔'' میں نے اشتیاق آمیز لہجے میں فرمائش کی۔

وہ زریں کی طرح بے تاب ہو گئی، نیساں کی طرح اس کے بدن میں بجلی بھر گئی، جھٹ باہر نکل گئی۔ بٹھل پر ایک نظر ڈال کے میں بھی باہر آ گیا۔ سیورین وہاں نہیں تھی۔ خدمت گار کو طلب کرنے کے بجائے وہ خود احکام صادر کرنے باورچی خانے چلی گئی ہو گی۔ سبزہ زار میں، اسپتال کے آداب کی وجہ سے وہ میرے ساتھ چائے میں شریک نہیں ہو سکتی تھی، اس خیال سے میں دوبارہ کمرے میں آ گیا۔

تھوڑی دیر میں وہ نمودار ہوئی۔ اس کے پیچھے بڑا سا تشت اٹھائے ایک مؤدب خدمت گار بھی تھا۔ چائے تنہا نہیں تھی۔ جانے کیا کیا لوازم ساتھ تھے۔ چائے کا تو بہانہ تھا، میں تو سیورین کو متر
تازہ دم دیکھنے کا آرزومند تھا۔ حسین چہرو
حزن و ملال زیبا نہیں ہوتا۔ پھول کھلے ہو
اچھے لگتے ہیں، ڈھلکے ہوئے ہوں، تیز دھوپ
پر اور تیز ہواؤں کے نرغے میں ہوں تو جی گھبر
لگتا ہے۔ چائے کے دوران وہ خاصی چاق چ
تھی۔ میں نے اسے یاد دلایا کہ یہ وقت منا
ہے۔ وہ کوئی کارندہ ہوٹل بھیجنے کا بندو
کردے۔ میں پرچی لکھے دیتا ہوں تاکہ ہوٹل کا
ذمہ دار شخص یہاں آ کے تصدیق کرے کہ میں ہ
سامان ہوٹل سے منگوانا چاہتا ہوں۔

وہ دنیا جہاں سے باخبر تھی، کہنے لگی کہ سنا ہ
میں سناٹا ہے، بہت کم لوگ آج گھروں سے
ہیں۔ بیش تر دکانیں اور بازار بند ہیں۔

میں نے کہا، ''شہر تو بند نہیں اور ہوٹل تو
ہو گا۔ کیوں نہ ایک کوشش کر لی جائے۔ اب تو
خود بھی جا سکتا تھا، لیکن ڈاکٹر رائے سے بات
بھول گیا۔''

''کیا؟'' وہ برگشتگی سے بولی۔ ''تم جاؤ گے
میں۔ ڈاکٹر رائے کیا، میں بھی تمہیں جانے
دوں گی۔'' اپنے تحکمانہ لہجے کا اسے فوراً احساس
اور وہ ٹھٹک سی گئی۔ ''تمہیں معلوم ہے، تم کیسے عج
بنے ہو شہر میں۔''

''میں اسی لیے تو نہیں گیا۔'' میں نے ملائم
سے کہا۔ ''معلوم تھا، ان حالات میں کوئی بھی جا
نہیں دے گا۔ ان کپڑوں میں ایک دن اور گز
جا سکتا تھا، لیکن آج رات ڈاکٹر رائے کے گھر
ہے۔''

''کیا؟'' اس کا سراپا بل کھا گیا۔ وہ بدحواس ہو کے بولی۔ ''ڈاکٹر رائے نے تمہیں بلایا ہے؟''

''ہاں، انہوں نے حکم دیا ہے، رات کا کھ
میں انہی کے ساتھ کھاؤں۔'' میں نے کہا۔

''کیا واقعی؟ یقین نہیں آتا۔''

کیوں نہیں آتا، اور تم اتنی حیران پریشان
ہو رہی ہو، کوئی نئی بات ہے کیا؟ ڈاکٹر
ایک مہربان اور مشفق بزرگ ہیں۔''

''بے شک، وہ ہر اعتبار سے ایک بڑے اور
آدمی ہیں، وہ اپنے اسپتال کے مریضوں میں
شامل رہتے ہیں لیکن صرف یہیں تک۔ مجھے
آج تک انہوں نے......''

''مگر میں ان کا مریض نہیں، مریض کا نگراں
''

''ایسا کبھی نہیں ہوا۔ گھر جا کے تو وہ بالکل گھر
ہو جاتے ہیں، مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ بہت
ں سے ان کا ملنا جلنا ہوتا ہے۔ انہیں اپنے کام
غرض ہے۔ کام ان کے لیے عبادت ہے۔''

''سچ پوچھو تو مجھے بھی حیرت ہوئی تھی، لیکن جیسا
تی ہو اور جیسی لوگ ان کے بارے میں رائے
ھتے ہیں، شاید ایسا کچھ نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب
گی میں بھی بہت شامل ہیں۔ لوگوں نے طرح
ح کے افسانے یوں ہی ان کے بارے میں
اش رکھے ہیں۔''

''بہرحال، یہ بڑی ان ہونی سی بات ہے۔''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں، انکار بھی تو نہیں کر سکتا
ا۔''

''یہ تو ایک اعزاز ہے۔'' جانے کیوں سیورین کچھ متردد، کسی فکر میں ڈوبی نظر آنے لگی۔

اسی اثنا میں دروازے پر آہٹیں ابھریں۔ اکٹر رائے حسب معمول شام کے معائنے کے لیے آ گیا تھا۔ بٹھل کو آنکھیں کھولنے میں کچھ دیر نہیں لگی۔ انہوں نے اسے بٹھا دیا۔ ڈاکٹر رائے اور اس کا شریک کار ڈاکٹر آہستہ آہستہ اس سے باتیں بھی کرتے رہے۔ بیش تر بٹھل، ہوں ہاں، میں جواب دیتا رہا۔ میرا خیال تھا ڈاکٹر شام کو بھی اسے چہل قدمی کرائیں گے لیکن روزانہ کا طبی احوال نامہ پڑھ کے انہوں نے فشار خون کا معائنہ کیا اور بٹھل کو بستر سے نہیں اٹھایا۔ میری تشویش پر ڈاکٹر رائے نے بے پروائی ظاہر کی۔ ''وہ زندگی ہی کی طرف بڑھ رہا ہے۔'' میں نے کچھ اور پوچھنا چاہا تو اس نے مجھے باہر چلے جانے کا حکم جاری کر دیا۔ میرا دل مطمئن نہیں تھا۔ شاید بٹھل کو چند قدم چلانے کا فیصلہ قبل از وقت تھا جو انہوں نے شام کو نہیں دہرایا۔ ڈاکٹر کے واپس آنے میں دیر ہو گئی تو مجھے اور پریشانی ہوئی۔ میں نے دروازے سے جھانک کے دیکھنا چاہا، مگر دروازہ بھی بند کر دیا گیا تھا۔

سورج کب کا افق پار جا چکا تھا۔ شام تیزی سے اندھیرے میں اتر رہی تھی۔ اسپتال کی روشنیاں جل چکی تھیں تب کہیں دروازہ کھلا اور ڈاکٹر رائے اپنے ساتھی ڈاکٹر کے ساتھ باہر نکلا۔ ہم دونوں جیسے ایک دوسرے کی جانب جھپٹے مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا، وہ بٹھل کے بارے میں تردد کی کوئی بات نہ کہہ دے، لیکن میرا شانہ پکڑ کے اس نے اپنی بات کی۔ ''ساڑھے آٹھ بجے تیار رہنا ہے۔ ملازم گھر لے جانے کے لیے آ جائے گا۔'' یہ کہتے ہی وہ چل پڑا اور میں اسے دیکھتا رہ گیا۔

کمرے میں جا کے جب تک میں نے کرید کرید کے سیورین سے تصدیق نہیں کر لی، مجھے سکون نہیں آیا۔ اس نے بتایا محض احتیاط کی وجہ سے کہ بٹھل پر کوئی دباؤ نہ پڑے، انہوں نے اسے فرش پر چلانے کی زحمت نہیں دی۔

امی آ چکی تھی اور سیورین کے چلے جانے کا وقت آ گیا تھا مگر وہ ٹھہری رہی اور دیر تک امی سے سرگوشیاں کرتی رہی۔ یقیناً وہ اپنی حیرتیں امی کو منتقل کر رہی ہو گی۔ حیرتوں کے اظہار کی آدمی کو بڑی بے چینی ہوتی ہے۔ امی کو سنانے کے لیے سیورین کے پاس بہت کچھ تھا، استاد میدا کی اسپتال میں آمد اور ڈاکٹر رائے کے گھر میری طلبی۔ ان دونوں میں بڑی یگانگت تھی۔ کبھی تو ایسا لگتا جیسے ماں بیٹیاں ہوں۔ معلوم نہیں، یہ کتنی حقیقت ہے، دو عورتیں جتنی

قریب ہو جاتی ہیں، دو مرد اتنے قریب نہیں ہو پاتے۔ دو عورتوں کی ایسی یک جائی دیکھ کے مردوں کو اپنی الگ جنس کا احساس کچھ سوا ہونے لگتا ہے، مغائرت کا سا کوئی احساس۔ گذشتہ شام کی طرح کترائی ہوئی آواز میں سیورین مجھ سے پوچھنے لگی کہ کل صبح وہ میرے لیے کچھ لائے۔ میں منع کرنا چاہتا تھا، لیکن وہی صورت درپیش تھی۔ بہت کچھ دعوت کار پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ کون ہے، کتنا دل کش اور نازک، کتنا عزیز و محترم ہے اور اس کی نیت، اس کی طلب میں شوق کیسا فراواں ہے۔ کل کی طرح مجھ سے انکار نہ کیا جا سکا۔ میرے اقرار پر اس کی آنکھوں کی تابانی فزوں ہوگئی اور وہ سبک خرامی سے چلی گئی۔ رفتار بھی آدمی کی قلبی کیفیت کا مظہر ہوتی ہے۔

گھڑی نے ساڑھے آٹھ بجائے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ڈاکٹر رائے کے ملازم کو پابندیٔ وقت کی غیر معمولی تربیت دی گئی تھی۔ ضرور وہ کمرے کے باہر کھڑا رہا ہوگا کہ ٹھیک وقت پر دستک دے۔ آدمی کو اتنا 'گھڑی' نہیں ہونا چاہیے، آدمی تو پھر آدمی نہ رہا۔

ہوٹل میں کسی کو بھیجنے اور سامان منگوانے کا وقت نہیں تھا۔ کھینچ تان کے میں نے انہی بوسیدہ کپڑوں کی شکنیں درست کیں۔ نہا دھو پہلے ہی لیا تھا۔ نہانے کے بعد باسی کپڑے پہنے رہنا بھی ایک ستم ہے۔ پیشانی پر امی کے بوسے کی نذر لے کے میں باہر آ گیا۔

ڈاکٹر کا گھر دور نہیں تھا۔ پیدل کے فاصلے پر، اسپتال کی چار دیواری سے ملحق ہم گویا کسی جنگل میں داخل ہوئے، تراشا ہوا جنگل۔ ہر طرف سبزے کی خوش بو گھلی ہوئی، کچی کچی سی خوش بو۔ ایک طرف کوٹھیوں کی قطار، بیچ میں سیمنٹ کی پختہ سڑک، سڑک کے اس طرف درخت ہی درخت، باغ ہی باغ، چمن زار، فاصلے فاصلے پر والی بال، ٹینس اور باسکٹ بال وغیرہ کے قطعات۔ سڑک کے کنار ایستادہ کھمبوں پر قمقمے روشن تھے اور پروانے ان یلغار کیے ہوئے تھے۔ کچھ دور سڑک پر چند گور اور کالے بچوں کی ٹولی سائیکلیں دوڑا رہی تھ بچوں کی ہاؤ ہو میں مینڈکوں کی ٹرٹر اور جھینگروں جھنگار بھی شامل تھی۔ ہر کوٹھی گز بھر اونچی لکڑی کی کی چار دیواری میں قائم تھی اور عمارت کے چ اطراف وسیع رقبے پر اونچے نیچے سبزہ زار ہوئے تھے۔

ہمیں زیادہ آگے نہیں جانا پڑا۔ تیسری کوٹھی لکڑی کے چوڑے دروازے پر دربان موجود تھ یہ پرانی طرز کی دو منزلہ کوٹھی تھی۔ نہ اتنی بڑی، ایسی چھوٹی۔ جدید کم، قدیم زیادہ، صاف ستھر رنگ روغن بھی نیا نیا تھا۔ دروازے میں دا ہوتے ہی رات کی رانی سے واسطہ پڑا۔ رات رانی کی بھی کیا مہک ہوتی ہے۔ ادھر زریں۔ حویلی میں رات کی رانی کے پودے بے تحاشا لگا۔ ہیں۔ ساری حویلی معطر رہتی ہے۔ کچھ یہی احوا ڈاکٹر کی کوٹھی کا بھی تھا۔ خوش بو آدمیوں کی طر ہوتی ہے۔ نرم و نازک، اجڈ اور وحشی، الھڑ، شور شرارتی، سنجیدہ، رنجیدہ۔ رات کی رانی کی مہک میں جتنی نفاست اور شائستگی ہے، اتنی ہی شوخی او چہکار سی بھی۔

ڈاکٹر رائے سبزہ زار میں ٹہل رہا تھا۔ میر۔ سلام کا اس نے سر کی جنبش سے جواب دیا۔ ''فاصا زیادہ تو نہیں ہے۔'' وہ نکیلی آواز میں بولا۔

''بالکل نہیں۔'' میں نے مستعدی سے کہا۔ ''کیا مجھے دیر ہوگئی؟''

''آدمی کے پاس سب سے کم کیا چیز ہوتی ہے؟''

دماغ کچھ حاضر تھا۔ ایک لمحے میں اس کا تد رسا ہو گیا میں نے کہا۔ ''جی ہاں! وافر بھی ہو تو کم ہے۔''

"آؤ" میری کمر پر ہاتھ رکھے وہ بید کی کرسیوں کی طرف بڑھ گیا۔ کرسی پر بیٹھ کے اس نے تذبذب سے پوچھا، "یہاں بیٹھو گے، یا اندر چلیں؟ یہاں کچھ خنکی ہے۔"

"جیسا آپ بہتر سمجھیں۔" میں نے مؤدبانہ کہا۔

"پہلے کھانا کھاؤ گے یا......؟"

"آپ کا وقت ہو گیا ہے تو ٹھیک ہے۔"

"میرا خیال ہے، کچھ دیر بعد لگوائیں،" اس نے ہچکچاتے ہوئے فیصلہ کیا اور کرسی سے اٹھ گیا، پھر ایک دو قدم بعد رک کے بولا، "تم یہاں بیٹھنا تو نہیں چاہتے؟"

"یہ بہت خوب صورت اور پرسکون جگہ ہے۔" میں نے کہا، "لیکن یہاں واقعی خنکی ہے۔"

مجھے ساتھ لیے ہوئے وہ عمارت میں داخل ہو گیا۔ دروازے کے سامنے کا وسیع حصہ کسی بڑے ہال کے مانند تھا، سادگی و پرکاری کی مثال، کونے کونے میں لہراتے، بل کھاتے ایک دوسرے میں پیوست اور گم، عورت اور مرد کے عریاں، نیم عریاں قد آدم مجسمے، دیواروں پر بڑی بڑی روغنی تصویریں، ساز و سامان کم اور منتخب تھا۔ ہال میں غنودہ سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر رائے بائیں طرف کے روشن کمرے میں آ گیا۔ یہ نشست گاہ تھی۔ جالی پوش کھڑکیاں کھلی ہونے کی وجہ سے یہاں بھی باہر جیسا موسم تھا۔ اس کمرے کے ساز و سامان میں بھی بڑی سادگی تھی، آرائش تھوپی ہوئی نہیں تھی اور مکینوں کی دولت وحشمت سے زیادہ ان کی نفاست طبع کی غماز تھی۔ ہم دیواری کونے میں جڑے ہوئے سوفوں پر کچھ اس طرح بیٹھ گئے کہ ایک دوسرے کے سامنے بھی تھے، ترچھے بھی۔

"ابھی کوئی دس منٹ پہلے ایک پولیس افسر یہاں سے گیا ہے۔ اصل میں میں نے ہی اسے بلایا تھا۔ اس دوران میں نے پولیس سے تھوڑا بہت رابطہ رکھا ہوا تھا۔" ڈاکٹر رائے نے کسی تمہید کے بغیر کہا، "پولیس افسر بتا رہا تھا، کچھ دیر پہلے، غروب آفتاب کی نماز کے بعد اکبر علی خاں کی تدفین ہو گئی ہے۔ ان کا بڑا بھائی شام کو حیدرآباد دکن سے آ گیا تھا۔ سنا ہے، جنازے میں بہت بڑا ہجوم تھا۔ شہر کے بیش تر مسلمان، عدالت میں اکبر علی خاں کے ساتھی اور لاء کالج کے طلبہ کثرت سے شریک تھے۔ آئی جی سے میں نے درخواست کی تھی کہ جنازے میں تمہاری عدم شرکت محسوس کی جائے گی اور خواہ مخواہ کے وہم و گمان کو ہوا دے گی۔ بہتر ہو گا، اکبر علی خاں کے بھائی اور گھر والوں کو آگاہ کر دیا جائے کہ تمہیں بہ وجوہ شرکت سے روکا گیا ہے۔ پولیس افسر کا کہنا ہے، اکبر علی خاں کا بھائی طویل سفر سے آیا ہے اور چھوٹے بھائی کی ناگہانی پر بہت دل گرفتہ ہے۔ اسے ابھی کسی اور طرف دیکھنے اور سوچنے کا وقت کہاں ملا ہو گا، لیکن پولیس اس کے اثر و رسوخ سے واقف ہے، اس لیے خائف ہے۔ میں سمجھتا ہوں، اکبر علی خاں کا بھائی تم سے ملاقات کرنا چاہے گا۔"

میں چپ رہا۔ میرے پاس کیا جواب تھا۔

"اکبر علی خاں کے قتل کے مقام پر پھینکی گئی تین لاشوں نے خاصی پیچیدگی پیدا کر دی ہے۔ حالاں کہ میرے، تمہارے اور کسی حد تک پولیس کے بھی علم میں ہے کہ یہ کوئی ایسی پیچیدہ بات نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے، جیسا کہ تم کہتے ہو، قاتل اتنی آسانی سے گرفت میں نہیں آ پائیں گے۔ بہ ہر حال، میں نے پولیس کو یقین دلا دیا ہے کہ اس دوران تم ہر وقت اسپتال میں رہے ہو اور پولیس ...... بھی تو تمہاری نقل و حرکت کی نگرانی کرتی رہی ہے۔ ادھر میں احتیاطاً بیرسٹر بھارگو سے بھی مشورے لیتا رہا ہوں۔ ان کا بھی یہی کہنا ہے کہ تم فی الحال اپنے آپ کو اسپتال اور بیمار بھائی کے کمرے تک محدود رکھو۔"

لازم کی مداخلت پر ڈاکٹر رائے کو رکنا پڑا۔ ازم باوردی تھا اور کسی پھل کے رس سے بھرے لاس بہت اہتمام سے لایا تھا۔ یہ انناس کا رس تھا۔ لازم کے جانے کے بعد ڈاکٹر رائے کو توقع ہو گی کہ ں زبان کھولوں گا، لیکن ممنونیت کے اظہار کے سوا برے پاس کچھ نیا نہیں تھا اور ڈاکٹر کا لحاظ بھی مانع ا کہ منہ سے کوئی ایسی ویسی بات نہ نکل جائے۔

"آج شام کا واقعہ میری زندگی کا سب سے نوکھا تجربہ تھا، خاصا سنسنی خیز۔ ہم قاتلوں کے ساتھ بیٹھے تھے اور وہ...... وہ کیسے مطمئن تھے۔"

"آپ اڈے کے لوگوں کے درمیان تھے۔" یں نے تصحیح کی جرأت کی۔

"یعنی وہ قاتل نہیں تھے۔" وہ بگڑ کے بولا، "یہ ن کے لیے کیوں کہ معمول کی بات ہے۔"

"اڈے کے آدمی اس طرح ہر کسی کا خون نہیں کرتے۔"

"مگر وہ قاتل ہیں۔ انہوں نے تین آدمیوں کا خون کیا ہے۔ یہ اعتراف کسی طور ڈھکے چھپے انداز میں انہوں نے خود کیا ہے۔" شدت بیاں میں ڈاکٹر کی آواز حلق میں پھنس گئی۔

"مگر میرے اور آپ کے سامنے اس مجہول و مبہم اعتراف کی کیا حقیقت ہے۔"

"یہ ایک اور بات ہے۔" وہ جھنجلا کے بولا۔

"انہوں نے ان لوگوں کو راستے سے ہٹا دیا جو ان کے لیے مسلسل مصیبتیں کھڑی کر رہے تھے۔"

"تم ان کی حمایت کر رہے ہو؟"

"جن تین آدمیوں نے انتھونی اور اکبر علی خاں کو ختم کیا تھا، آپ کے خیال میں ان کی کیا سزا ہونی چاہیے؟" میں نے تحمل سے پوچھا۔

فوراً کچھ کہنے کے بجائے وہ پہلو بدلنے لگا۔

"نہیں...... نہیں...... مگر یہ عدالت کا کام ہے۔ عدالتیں کس لیے کھلی ہوئی ہیں۔"

"عدالت بھی یہی فیصلہ کرتی...... یا نہیں کرتی...... مگر فیصلہ تو یہی ہونا چاہیے تھا۔ عدالت کو کسی نتیجے پر پہنچنے میں ایک وقت صرف ہو جاتا، گواہیاں، شہادتیں، وکیل، اور ایک عدالت کے بعد دوسری، تیسری اور ایک تاریخ کے بعد دوسری...... ممکن ہے، وہ بچ بھی جاتے۔"

"مگر یہ بھی تو ممکن ہے، اکبر علی خاں کا قتل انہوں نے کیا ہی نہ ہو۔"

"اور اگر واقعی کیا ہو؟"

"مگر اڈے کے لوگوں کو کسی فیصلے کا اختیار نہیں ہونا چاہیے۔ انہیں کیا، کسی کو بھی نہیں۔"

"سارے معاملات میں وہ کہاں دخیل ہوتے ہیں۔ یہ تو ایک بالکل مختلف معاملہ تھا۔ یہ ان کے اڈے کا معاملہ تھا۔ اڈے کے لوگوں پر ضرب آ رہی تھی۔ اپنے ہی آدمیوں کی وجہ سے وہ رسوا ہو رہے تھے اور...... یوں سمجھیے، انہوں نے اچھی طرح خونی تلاش کر لیے تھے۔"

"میں تم سے متفق نہیں ہوں۔"

"میں اصرار بھی نہیں کر رہا۔ میں تو حقیقت واقعہ بیان کر رہا ہوں۔ جو کچھ ہوا، اس کا پس منظر بتانے کی کوشش کر رہا ہوں اور انہوں نے قتل کہاں کیا ڈاکٹر صاحب! یہ تو انہوں نے میرے اور آپ کے سامنے جو ڈھکا چھپا سا سچ بولا تھا، اس کی کیا وقعت ہے۔ انہیں کسی مضبوط شہادت کے بغیر کوئی عدالت سزا نہیں دے سکتی۔ ہاں، میں انہیں سزا دے سکتا ہوں، آپ دے سکتے ہیں۔ آپ نے وہ قول لازماً سنا ہو گا، قانون کی آنکھیں نہیں ہوتیں، صرف کان ہوتے ہیں، چلیے، کل صبح چل کے میں اور آپ عدالت میں اعلان حق کرتے ہیں، ہم سچ بولتے ہیں۔ انہوں نے کوئی کوتاہی نہیں کی ہو گی۔ اگر کی ہے تو اس کا خمیازہ ضرور بھگتیں گے۔ آدمی اپنی غلطیوں ہی سے اپنے لیے کانٹے بوتا ہے۔"

"تم مجھے زچ کر رہے ہو۔"

"مجھ میں یہ حوصلہ نہیں ہے۔"

گویا اب سب کچھ فیصلہ ہو چکا۔"

"باقی پولیس کی سنجیدگی اور دیدہ ریزی پر منحصر ہے۔ اس کے لیے یہ عزت وقار کا مسئلہ ہونا چاہیے۔ پولیس بھی سمت پہچانتی ہے۔ اسے سراتلاش کرنے کی بے قراری ہونی چاہیے۔"

"ہم اس کی مدد تو کر سکتے ہیں۔"

"کس بنیاد پر؟"

ڈاکٹر کا جسم پھڑک کے رہ گیا، اور وہ مرجھائی ہوئی آواز میں بولا، "تم ٹھیک کہتے ہو شاید۔"

اناناس کے رس میں کالی مرچ اور نمک کی آمیزش تھی۔ میں نے لمبا گھونٹ لے کے گلاس تمام کر دیا۔ ڈاکٹر نے بھی اپنے گلاس کا رس حلق میں انڈیل لیا۔ "یہ اس کم عمری میں ایسی جہاں دیدگی تم میں کہاں سے آ گئی؟" وہ کچھ پرسکون سا ہو گیا تھا۔

"شاید میں نے زندگی زیادہ ہی جھیلی ہے۔" میں نے انکسار سے کہا۔

باہر سے آتی کھنکتی نسوانی آواز نے نشست گاہ کا سکون متلاطم کر دیا۔ "پاپا! کھانا لگوائیں۔" ساتھ ہی بادامی رنگت کی سادی سی ساری میں لپٹی ایک نوجوان لڑکی ہوا کے تیز جھونکے کی طرح کمرے میں در آئی۔ مجھے دیکھ کے وہ کسی قدر جھجکی اور جھپکتی پلکوں سے بولی، "آپ ہی بابر صاحب ہیں۔"

میں کھڑا ہو گیا۔

اس نے میری سامنے آ کے جھٹ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور چہکتی آواز میں بولی، "اچھا، تو آپ ہیں۔ پاپا لوگوں کی تعریف کرنے میں بڑے بخیل ہیں، لیکن آپ کا ذکر مسلسل کرتے رہے ہیں۔ مجھے آپ کو دیکھنے کی بڑی آرزو تھی۔"

اس کے نرم ہاتھوں کی حدت اور لپک سے اس کے اشتیاق کی تصدیق ہو رہی تھی۔ اس کی ناگہاں آمد، تپاک اور اس بے ساختگی سے میرے حواس منتشر ہو گئے۔ "یہ بینا ہے، میری بیٹی۔" ڈاکٹر نے افتخار سے کہا۔ "اور اب یہ میرا بیٹا بھی ہے۔" اس کے لہجے میں بے پناہ شیفتگی تھی۔

سونے جیسی اس کی رنگت تھی، سونا جیسے تپا ہوا ہو، چمپا جیسے کندن بن گئی ہو۔ بدن کا ایک ایک انگ ناپ تول کے بنایا گیا ہو، شانوں تک تراشیدہ بال، چہرے پر تابندگی اور تر و تازگی، انداز میں تمکنت اور اعتماد۔ اسے حسن و جمال کا مرقع نہیں کہا جا سکتا تھا، لیکن جاذبیت اور دل کشی میں یک تا، یگانہ۔ آدمی دیکھتا رہ جائے، آدمی کھنچتا چلا جائے۔ یہ خوبی ہر حسین لڑکی میں نہیں ہوتی۔ "میں تو بھول ہی گیا۔" ڈاکٹر خود کو سرزنش کرتے ہوئے لہجے میں بولا، "تم کچھ پیو گے، اسکاچ، وائن، یا کونیک؟ اسکاچ کا تو وقت نہیں رہا۔"

"جی، جی نہیں۔" میں نے اٹکتی زبان سے کہا، "میں کچھ نہیں پیتا۔"

"کوئی تکلف نہیں، میں برا نہیں سمجھتا اور گاہے گاہے تو....." وہ مسکرا کے بولا۔

میں نے شکریہ ادا کیا۔ "بس یوں ہی عادت نہیں پڑی۔"

"اچھا ہے یہ بھی..... مشکل یہ ہے کہ پھر آدمی شرابی ہو جاتا ہے اور شرابی ہو کے آدمی نہیں رہتا۔"

"پاپا! باقی باتیں اب کھانے کی میز پر۔" بینا نے ہٹیلی آواز میں کہا، "کھانا تیار ہے۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، آتے ہیں سرکار۔"

ڈاکٹر کے فدویانہ لہجے پر مجھے تعجب ہوا۔ ایسا لگا کہ بیٹی کے سامنے وہ بے بس سا ہو گیا ہے۔ یوں بھی اولاد کے سامنے آدمی کو اپنی عمر کا احساس کچھ زیادہ ہی ہونے لگتا ہے، اور اولاد جوان ہو تو پس پا سا ہو جاتا ہے۔

بینا چھلاوے کی طرح کمرے سے چلی گئی۔ ڈاکٹر بھی اٹھ گیا۔ ہم دونوں آہستہ آہستہ نشست گاہ سے نکل کے ہال میں اور چند قدم کی دوری پر واقع کھانے کے کمرے میں آ گئے۔ میز پر چینی کی صاف شفاف تشتریاں سجی ہوئی تھیں۔ گلاسوں میں سفید

رومال اڑسے ہوئے تھے۔ کھانے کا یہ اہتمام میں نے کرشنا جی کے ہاں دیکھا تھا۔ جولین اس قسم کی نوک پلک میں بڑی مشاق ہے۔ بینا کی نگرانی میں وردی پوش خانساماں نے خوان اس احتیاط سے میز پر رکھے کہ ایک ذرا سی بھی آواز بلند نہیں ہوئی۔ یہ آداب بھی زندگی کتنی مفید کرتے ہیں۔ درمیان میں ڈاکٹر اور اس کے دائیں بائیں میں اور بینا بیٹھ گئے۔ کھانوں کی اقسام زیادہ نہیں تھیں۔ ڈاکٹر کی دیکھا دیکھی میں نے بھی سبزیوں کی یخنی سے ابتدا کی۔ مچھلی کا سالن، مٹر پلاؤ، پنیر پالک، مسالا مرغ، میتھی کے ساگ ملی مونگ کی دال اور اروی کے پتوں کے کباب۔ سب کچھ ہلکا پھلکا اور لذیذ، کچھ مختلف سا بھی، مرچیں برائے نام اور روغن کم سے کم۔ میں نے ازراہِ وضع تعریف کی۔

"آج اس نے تجربے نہیں کیے، شاید تمہارا خیال رکھتے ہوئے۔" ڈاکٹر رائے نے توصیفی نظروں سے بیٹی کی طرف دیکھا۔ "ورنہ یہ تو روز ہی نت نئے تجربے....."

"آپ کو دل چسپی ہے کھانا پکانے سے؟" میں نے بینا سے پوچھا۔

بینا کچھ کہنا چاہتی تھی کہ ڈاکٹر نے لقمہ دیا۔ "کھانے سے زیادہ تجربوں سے۔ خانساماں کو ہدایتیں جاری کرتی اور سر پہ کھڑی رہتی ہے۔"

"اور تجربے کیا برے ہوتے ہیں پاپا!" بینا نے ٹھنک کے پوچھا۔

"نہیں، بہت اچھے، مگر ہضم بھی تو کرنے پڑتے ہیں۔"

"اوہ پاپا۔" وہ کھل کھلا پڑی۔ طعام گاہ میں گھنٹیاں سی بج اٹھیں۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ کو کھانا پکانے وغیرہ سے بھی رغبت ہو گی۔" میں نے دبی آواز میں کہا۔

"کیوں، اندازہ کیوں نہیں تھا؟" بینا نے چمک کے پوچھا۔

"عموماً جہاں ملازمین اور زندگی کی وافر سہولتیں میسر ہوں، وہاں کھانا پکانے وغیرہ کو ضمنی چیزیں سمجھا جاتا ہے بل کہ فضولیات۔"

"اور وہاں طرح طرح کے کھانوں کے سبھی دل دادہ ہوتے ہیں۔" بینا شگفتگی سے بولی، "کھانے کا تعلق تو زندگی سے بہت ہے، غالباً سب سے زیادہ۔"

"اور یہ تم دیکھ رہے ہو۔" ڈاکٹر رائے سر اٹھا کے گھماتے ہوئے بولا "ان دیواروں پر یہ نقش و نگار، یہ جگہ جگہ، کونے کونے بے حرکت مرد اور عورتیں..... یہ بے جان بھی اسی کی شرارتیں ہیں۔"

"یہ مجسمے، تصویریں آپ کی تخلیق ہیں، یہ سارا کچھ.....؟" میں نے تعجب سے کہا۔

"ہاں۔ بس ایسے ہی کوشش کرتی رہتی ہوں۔" بینا چہکتی آواز میں بولی، "آپ کو مصوری، سنگ تراشی سے کوئی نسبت ہے؟"

"درک نہیں، شوق ضرور ہے۔ آپ نے تو بہت اچھا کام کیا ہے۔ سارا گھر عجائب خانہ لگتا ہے۔ یہ مجسمے اور تصویریں محض صناعی اور مصوری نہیں، ان میں آپ کا خیال، آپ کے احساس، آپ کی فکر کا اضطراب جھلکتا ہے۔ لگتا ہے، درون خانہ کچھ سلگ رہا ہے، کوئی شورش سی بپا ہے۔ کچھ تلاش سی ہے۔ جو کچھ نظر آ رہا ہے، جوں کا توں وہ آپ کو قبول نہیں۔ اس سے کچھ نیا، بدلا ہوا اور سوا ہونا چاہیے۔ مصور اور مجسمہ ساز قدرت جیسا اختیار چاہتے ہیں۔ تجریدی مصوری اس خواہش کی ایک مثال ہے۔ تجریدی مصور ملحد ہوئے بغیر قدرت کے بنائے ہوئے نمونوں سے انحراف کی جرأت کرتے ہیں۔ وہ جیسے کائنات کی یک سانی سے اکتا گئے ہیں اور تغیر و تبدل کے شدت سے خواہش مند....."

میں نے خود کو روک لیا اور معافی چاہی کہ اس موضوع پر کوئی دست رس نہ ہونے کے باوجود میں

کیسی کلیاتی باتیں کررہا ہوں اور ایک باقاعدہ مصور کے سامنے۔

بینا کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔ ''آپ رک کیوں گئے؟'' وہ چھن چھناتی آواز میں بولی، ''بہت عمدہ تجزیہ کررہے ہیں آپ۔''

''کہاں، بس یوں ہی۔''

''آپ تجریدی مصوری کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے۔'' بینا نے مجھے ٹوکا اور اس کا سارا بدن مچل سا گیا۔

''میں ...... میں کہہ رہا تھا۔'' شاید اپنی بے مائیگی، یا تجاوز کے احساس سے میری آواز اینڈنے لگی، میں نے لہجے میں نرمی اختیار کی۔ ''اور ہوا کچھ یہ، بعض مصوروں نے تجرید کے عنوان سے مادر پدر آزادی حاصل کرلی۔ پھر تو کوئی بھی مصوری کا دعوا کرسکتا ہے کہ اشیا و اجسام، مظاہر و مناظر کی مسلمہ اور مستقل شکلیں مسخ کرنے کا کام نہایت آسان ہے۔

تجریدی تخلیقات میں بھی ایک توازن و تناسب بہ ہر حال لازم ہے۔ مراد یہ ہے کہ تجرید کو بھی ایک نظم و ضبط چاہیے۔ تجریدی مصوری کے نسب اور تسلسل سے بالکل جدا نہیں ہوسکتی۔ بھی اثر انداز ہوتی ہے جب تخلیق کار کو مصوری کے آداب و قواعد سے آگہی ہو اور وہ اشیا و مناظر کی بجنسہ تشکیل و تجسیم پر بھی قادر ہو، یعنی انحراف اسی مصور کو زیب دیتا ہے جو مصوری کی بنیاد، اس کے فنی رموز سے آشنا ہو...... اور ہاں رسائی بھی ایک شرط ہے، چاہے وہ معدودے چند تک ہو۔ مشکل رسائی اور چیز ہے، رسائی سے عاری ہونا اور چیز۔ تخلیق رسائی سے عاری ہوگی، یا رسائی صرف تخلیق کار تک محدود رہتی ہے تو حجت محض ہے۔ ہر تخلیق جتنی اپنے لیے، اتنی دوسروں کے لیے ہوتی ہے۔ کوئی صرف اپنے لیے شعر نہیں کہتا اور کوئی صرف اپنے لیے تصویر نہیں بناتا، سو رسائی لازم ہوجاتی ہے۔ تجرید بے دلیل نہیں ہوتی۔ وہ کسی فکر، کسی خیال کی طرف اشارہ کرتی ہو۔ لکیروں، رنگوں اور زاویوں میں فکر و خیال، معانی و مفاہیم کہیں چھپے ہوئے، آنکھ مچولی کرتے محسوس کرتے ہوں تو ان کا تعاقب ضرور کیا جاتا ہے اور تعاقب میں کچھ ہاتھ نہ آئے تو......'' میں پھر بہکنے لگا تھا۔ اپنی رو میں جانے کیا کیا کہتا رہا۔ دونوں باپ بیٹی کی نظریں مجھے نشانہ بنائے ہوئے تھیں۔

بینا کا چہرہ آتے جاتے رنگوں سے تمتمارہا تھا۔ باپ سے وہ شکایت کرنے لگی کہ اس نے میرے بارے میں اتنے بخل سے کیوں بتایا تھا۔

''پھر میں نے اسے مدعو کیوں کیا ہے۔'' ڈاکٹر رائے بچوں کی سی سرخوشی سے بولا۔ ''میں تمہارے لیے کچھ حیرتیں محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔''

بینا نے مصنوعی ناراضی کا اظہار کیا اور لچکتے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئی، ''آپ نے تجرید کی بات کی ہے۔ تاثراتی (impresssionistic) مصوری میں حقیقت سے ایسا انحراف نہیں کیا جاتا، حقیقت ہی بنیاد رہتی ہے۔''

''مصوری کی یہ قسم اس لیے مرغوب بھی بہت ہے کہ حقیقت بنیاد رہتی ہے۔ یوں کہیے کہ بنیاد میں ذرا سا تصرف کیا جاتا ہے، تھوڑا لرزا اور جھن جھنا دیا جاتا ہے۔ یہ ایک معصومانہ انحراف ہے، سرکشانہ اجتہاد نہیں۔''

''آپ تو خاصا جانتے ہیں۔'' بینا کی آواز حیرت آمیز مسرت اور احترام سے مملو تھی۔

''نہیں، بالکل نہیں، کسی خوش فہمی میں نہ رہیے۔ سچ پوچھیے تو مجھے آپ کے سامنے اس موضوع پر بات کرنے کا حوصلہ نہیں کرنا چاہیے تھا، لیکن کچھ تو سفر بہت کیا ہے، اور شہر شہر میں عجائبات و نوادر دیکھنے کا موقع ملا ہے، پھر اصل میں بمبئی میں میرے ایک مربی تھے، راج کرشناجی، مدراسی تھے، پولیس کے بہت بڑے افسر، سفر کے دوران ریل کے ڈبے میں

ان پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ میں نے ان کی جان بچائی تھی۔ مجھ پر ایسے مہربان ہوئے کہ اپنے گھر لے گئے۔ مجھے چھوٹا بھائی سمجھنے لگے۔ پولیس سے وابستگی کے باوصف وہ بہت پڑھے لکھے آدمی تھے، عالم فاضل۔ انہیں فرصت کم ملتی تھی لیکن جب بھی ملتی، مجھ سے ادب، شاعری، فلسفے، مصوری، موسیقی کی باتیں کیا کرتے۔ ان کے پاس کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا۔ میری تربیت کرتے، مجھے اپنا علم منتقل کرتے رہتے تھے۔ دوسری بار ان پر حملہ ہوا تو میں انہیں نہ بچاسکا۔ بدمعاشوں نے انہیں ختم کردیا۔''

''ہائیں......'' بینا کی آنکھیں پھیل گئیں اور اس نے مشرقی لڑکیوں کی طرح سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔

''یہی کچھ ہوا۔'' میں نے اداسی سے کہا۔ ''اور آپ کو بتاؤں، وہ مجھے اتنا اپنا سمجھنے لگے تھے کہ ساری جائیداد میرے نام کرگئے۔ میرے سوا ان کا کوئی تھا ہی نہیں یا ایسا سمجھیے کہ میرے سوا وہ کسی کو اپنا نہیں سمجھتے تھے۔ میں نے مصوری کے بارے میں جو کچھ الٹا سیدھا کہا ہے، وہ میرا دیکھا اور جانا ہوا کم، سنا ہوا زیادہ ہے، یہ تو آموختہ تھا۔''

''آدمی اپنا دیکھا اور سیکھا ہوا ہی دہراتا ہے اور دل چسپی نہ ہو تو کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ کیوں بابا؟'' بینا نے باپ سے حمایت چاہی۔ ڈاکٹر رائے نے سر ہلا کے تائید کی۔

کھانا کب کا ختم ہوچکا تھا۔ خانساماں نے خوان ہٹالیے تھے۔ ڈاکٹر رائے کے اٹھنے پر میں بھی اٹھ گیا، بینا بھی ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ڈاکٹر نے خوشامدانہ سے لہجے میں بینا سے کہا کہ اسے مجھ سے کچھ بات کرنی ہے، بینا اس دوران کافی کا اہتمام کردے تو کیا خوب ہو۔

''کوئی ذاتی قسم کی بات؟'' بینا نے شکایتی لہجے میں پوچھا۔

''نہیں، کچھ ایسی ذاتی نہیں۔''

''تو میں شریک نہیں ہوسکتی؟''

ڈاکٹر رائے نے انکار نہیں کیا، یا انکار کرنہ سکا۔ وہ بیٹی کی پیشانی پر کسی شکن کا متحمل نہیں معلوم ہوتا تھا۔ کہنے لگا کہ ہماری باتوں میں بینا کے ذوق کی شاید کوئی چیز نہ ہو۔

''مگر میں اس منفرد اور شان دار مہمان کے ساتھ بیٹھنا اور بہت سی باتیں کرنی چاہتی ہوں۔'' بینا نے بے باکی سے کہا۔

''میں...... میں تو کچھ بھی نہیں۔'' میں نے ہکلا کے کہا۔

''آپ لوگ بیٹھیے، میں کافی کا انتظام کرتی ہوں۔'' بینا نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ تیز قدموں سے وہ ایک طرف چلی گئی۔

دوبارہ نشست گاہ میں جانے کے بجائے ڈاکٹر رائے ہال کے ایک گوشے میں رکھے صوفوں میں سے ایک پر جا بیٹھا۔ بینا ہال مزید روشن کرگئی تھی۔

''تم کیسی کافی پسند کرتے ہو، بلیک یا سادہ؟ دودھ کے ساتھ یا کریم کے؟''

''میں مشروبات کم پیتا ہوں۔'' میں نے متانت سے کہا۔ ''ویسے کافی کا لطف ہی اس کی تلخی میں ہے۔''

''اور تم سب سے زیادہ تلخ چیز نہیں پیتے۔''

''جی ہاں۔''

''برا سمجھ کے؟''

''کچھ اچھی چیز بھی نہیں ہے۔ میں نے آپ سے کہا تھا، بس عادت ہی نہیں پڑی۔''

''کیا اڈے کے لوگ نہیں پیتے؟''

''پیتے ہیں۔ شراب، افیون، گانجا اور بھنگ بھی، لیکن عام آدمیوں کی طرح، عادی شرابیوں اور نشے بازوں کی طرح نہیں، اور کسی خاص موقع پر۔''

بینا فوراً ہمارے درمیان آگئی اور اپنے باپ کے ساتھ میرے مقابل صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ پہلے سے کچھ زیادہ شاداب لگ رہی تھی۔ ''کیا باتیں کررہے تھے آپ؟'' اس نے شائستگی سے پوچھا۔

"کچھ خاص نہیں۔" ڈاکٹر رائے اچٹتی ہوئی آواز میں بولا "میں نے تمہیں اڈے پاڑوں کے متعلق بتایا تھا نا، اسی کے بارے میں کچھ مزید معلومات......"

"اڈے کے لوگوں کے سینگ نہیں ہوتے، نہ چار آنکھیں، چار کان۔" میں نے کہا۔

"ہاں، ہاں۔" ڈاکٹر کے لہجے میں ترشی آ گئی۔ "مگر وہ اڈے کے لوگ ہوتے ہیں، عام لوگوں سے مختلف۔"

"عام لوگوں میں بھی بہت مختلف لوگ ہوتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" ڈاکٹر رائے مفاہمانہ لہجے میں بولا۔

"معلوم ہے، تمہارے پاس ہر بات کا جواب ہے۔"

"اور بے جواز نہیں۔"

"ہاں ہاں صاحب۔" اس نے الکساتے ہوئے اقرار کیا اور کچھ توقف کے بعد ہمک کے بولا "ایک بات ذہن میں اٹکتی ہے۔ تمہارا کہنا ہے کہ ڈاک خانے والی گلی میں...... کیا نام تھا مرنے والے آدمی کا؟"

میں نے بتایا، "دھنوا۔"

"ہاں دھنوا، دھنوا۔ تمہارے ہاتھوں دھنوا کو زچ ہوتا دیکھ کے اس کا دوسرا ساتھی تمہاری طرف چاقو تانے بڑھا تھا اور تم اس کے نشانے سے ہٹنے میں کام یاب ہو گئے تھے، لیکن چاقو بردار خود کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ اس کا چاقو اپنے ہی ساتھی کی پسلی میں جا کھبا۔"

"جی ہاں، کچھ ایسا ہی۔" میں نے تعجب سے کہا، "آپ کو خوب یاد ہے، جزئیات کے ساتھ۔"

ڈاکٹر نے میری مداحی پر توجہ نہیں دی اور تیزی سے بولا، "مگر وہ آدمی جس کے چاقو سے دھنوا زخمی ہو گیا تھا، اس حقیقت سے تو واقف تھا کہ غلطی اسی کی تھی، پھر اس کے اور دھنوا کے لیے جان پر کھیلنے کو تیار اس کے دو اور ساتھیوں کے قہر و غضب کا کیا سبب تھا۔ ایسا جنون کہ وہ تمہیں ختم کرنے کے لیے اسپتال تک آ گئے اور تم ہاتھ نہ آئے تو انہوں نے اکبر علی خاں کو ہلاک کر دیا؟"

"اس نے اپنے دو ساتھیوں کو اصل حقیقت نہیں بتائی۔" میں نے تامل سے کہا۔

"لیکن راہ گیر...... گلی کے بہت سے مکین بھی تو اس منظر کے گواہ تھے۔"

میری سمجھ میں ڈاکٹر کی الجھن ذرا دیر سے آئی۔ وہ ایک دانا و بینا، نہایت منطقی بات کر رہا تھا۔ مجھے وہ سارا واقعہ اختصار سے دہرانا پڑا۔ میں نے کہا، "اس قسم کی صورت حال میں پلک جھپکنے کی مدت میں منظر بدل جاتا ہے، کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ بے شک راہ گیر گواہ ہیں، لیکن وہ ایک خیرہ کن منظر تھا۔ دھنوا کا ساتھی پاگلوں کی طرح اپنی جگہ سے اُڈا تھا، اور واضح رہے، فاصلہ میلوں کا نہیں، چند قدم کی دوری کا تھا۔ میرے پاس اس وقت یہی ایک راستہ تھا کہ اپنے قبضے میں آئے دھنوا کو ڈھال بنائے رکھوں کہ یہ صورت دیکھ کے چاقو بردار کو شاید کچھ ہوش آ جائے، وہ خود کو تھام سکے۔ لیکن وہ نومشقا تھا اور ادھر دھنوا کو چھوڑ کے الگ ہو جانے کی مہلت میرے پاس نہیں تھی۔ ایک لمحہ، دوسرا لمحہ...... لمحوں کا معاملہ ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب!"

"میں کچھ اور کہہ رہا ہوں۔" ڈاکٹر تندی سے بولا۔ "جب دھنوا کا ساتھی اس حقیقت سے......"

میں نے اس کی بات کاٹ دی، "وہی بتا رہا ہوں آپ کو۔ دھنوا کی پسلی میں چاقو کی رعایت بھی اس سبب سے ممکن ہوئی تھی کہ میں کسی حد تک اسے نشانے سے بچانے میں کام یاب رہا تھا، ورنہ چاقو یا تو اس کا پیٹ چیر دیتا، یا سینہ کھود ڈالتا۔ چاقو بردار نے خود کو یقین دلایا، اس نے یہی جانا کہ میں دھنوا کو چھوڑ دیتا تو دھنوا اس کے نشانے پر نہ آ پاتا، یعنی

میں نے دھنوا کو سیر بنائے کیوں رکھا، یعنی مجھے اس کی خواہش کی تعمیل کرنی چاہیے تھی۔ مجھی کو نشانے پر آجانا یا رہنا چاہیے تھا یعنی میں نے دھنوا کو دانستہ آگے کردیا۔ لازماً اس نے اپنے دو ساتھیوں کو بھی یہی کچھ باور کرایا ہوگا۔ اپنی بجی و نا اہلی کا غم و غصہ اسے بہت ہونا چاہیے تھا۔ گلی کے بوکھلائے ہوئے تماشائیوں میں کچھ دور تھے۔ کچھ قریب۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کس نے دیکھا، کتنا دیکھا، اور کیا جانا، کیا سمجھا اور ایک نے دوسرے کو کیا تلقین کی۔ ہجوم میں ہر ایک اپنی اپنی شہادت الاپتا ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھیے، میں ان کے لیے اجنبی اور اڈے کے آدمیوں سے ان کا روز کا واسطہ تھا، لیکن ان میں کچھ اس موقع پر میری حالت دیکھنے، میری مجبوری سمجھنے اور سچ بیانی کا حوصلہ رکھنے والے لوگ بھی ضرور ہوں گے۔ کسی سے گواہی طلب کی جاتی تبھی کچھ سامنے آتا۔ گلی سے میرے نکلتے ہی ہاہا کار مچ گئی۔ اڈے کے کچھ آدمی شامل ہوگئے اور ہر کوئی اس سمت اشارے کرنے لگا، جدھر میرا تانگا بڑھ رہا تھا۔ انہوں نے پولیس کو بھی ساتھ کرلیا۔ میرا چاقو، میری جیب میں تھا۔ یہی ایک دلیل کافی ہے، لیکن دلیلیں دینے کی نوبت ہی کہاں آئی۔ میدا نے شاید واقعے کی نوعیت سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ اسے چاقو بردار کی ناپختگی کا بھی علم ہوگا۔ جیسا کہ میں نے آپ سے پہلے کہا تھا، ایک اجنبی کے بجائے اڈے کے کبیدہ خاطر آدمیوں کو مطمئن رکھنا میدا کے لیے ضروری تھا۔ اسے اس وقت کوئی اندازہ نہیں ہوگا کہ بات اتنی دور جاسکتی ہے۔ یہی کچھ تو وہ آپ کی موجودی میں کہہ رہا تھا۔"

ڈاکٹر چپ رہا۔ بینا کا بے قرار سراپا ساکت ہوگیا تھا۔ اس دوران خانساماں نے کافی لا کے میز پر رکھ دی تھی۔ چند لمحے گزر گئے تو بینا نے لہکتی آواز میں خاموشی چاک کی۔ "اب تو کوئی کھٹک نہیں رہی پاپا؟ آپ کہیں تو کافی بناؤں۔ آپ لوگ بڑی عجیب قسم کی باتیں کررہے تھے۔ میں نے منتشر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔"

ڈاکٹر نے رسمی انداز میں بیٹی سے معذرت کی۔

پیالی میں کافی لوٹتے ہوئے بینا کہنے لگی، "پاپا کی زبانی میں یہ خوف ناک واقعہ تھوڑا بہت سن چکی ہوں، لیکن اب تو لگ رہا تھا جیسے میں وہاں موجود ہوں، چاقو کھلے ہوئے ہیں، لوگوں کی بھیڑ ہے اور ان میں میں بھی ایک گواہ ہوں۔"

"آپ تو ویسے بھی ایک خیال کار ہیں، پہلے تصور، پھر تخلیق۔ مصور تو تصور کی فراوانی ہی سے بنتا ہے۔"

"لیکن تصور کی کثرت بھی بہت تنگ کرتی ہے۔ آدمی سمتوں میں بھٹک جاتا ہے، یک سو نہیں رہ پاتا اور کہیں مطمئن نہیں ہوتا۔" وہ خواب ناک لہجے میں بولی۔

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ قرار تو استقرار میں ہے۔ زندگی تو یوں منزلیں سر کرنے ہی میں گزر جاتی ہے۔

کافی ٹھنڈی ہوگئی تھی۔ اس نے خانساماں کو آواز دے کے دوسری گرم کافی لانے کی ہدایت کی اور متجسس آواز میں گویا ہوئی "پاپا کہہ رہے تھے، آپ کو چاقو بازی خوب آتی ہے۔"

"یہ کوئی ایسی فضیلت نہیں جس کا ذکر سر اٹھا کے یا اونچی آواز میں کیا جائے۔"

"برا تو نہیں مانا آپ نے۔" وہ گھبرا کے بولی۔ اس کی گھبراہٹ میں بھی کیا دل کشی تھی۔ اس نے جلدی سے وضاحت کی، "اصل میں آپ کو دیکھ کے بہت سے سوال ذہن میں کلبلاتے ہیں۔"

"مجھے اندازہ ہے، لیکن یقین کیجیے، کوئی تہ در تہ...... کوئی سر نہاں نہیں ہے۔"

"پھر بھی کچھ تو ہے، کچھ بتائیے نا۔"

"اگر سامنے کا منظر اتنا ناگوار خاطر محسوس نہیں ہو رہا تو پیچھے کی جانب کیوں نظر کی جائے۔ ماضی کی راکھ میں چنگاریاں بھی چھپی ہوتی ہیں۔"

"وہ تو لگ رہا ہے۔" وہ مسکرا کے بولی۔

"کیا لگ رہا ہے؟"

"چنگاریاں، گھٹائیں، داستانیں، بہت کچھ۔"

"آپ کو مصوری کے ساتھ قلم کاری بھی کرنی چاہیے۔"

"محض قیاس ہے میرا، غلط بھی ہوسکتا ہے۔"

"اور میں کہنا چاہتا ہوں، ماضی سے حال کا کتنا تعلق ہے۔ صرف حال ہی پیش نظر ہونا چاہیے۔ آدمی کا حال ماضی سے بہت مختلف ہوسکتا ہے تو پھر آنے والے وقت میں بھی کیا کچھ بدل سکتا ہے۔ آدمی تو بدلتا رہتا ہے، اور جو سامنے ہے، وہی معتبر ہے۔"

وہ دمکتی نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ "آپ کو انگریزی میں اپنا مدعا بیان کرنے کی کیسی قدرت ہے۔"

"انگریزی تو آپ بولتی ہیں، رواں، سجل، شستہ، صحیح برطانوی طرز کلام، بالکل گوروں کی طرح، بل کہ ان کی اشرافیہ کی طرح۔"

وہ ہنسنے لگی، ہال میں چھنا کا سا ہوا۔ "میں انگلستان میں بہت دن رہی ہوں۔"

"وہی تو......! میں تو ہندستانی لہجے میں انگریزی بولتا ہوں۔ کبھی تو خود مجھے اپنا لہجہ بہت چبھتا ہے۔"

"نہیں، ایسا کچھ نہیں۔" اس نے میری کسر نفسی یک سر مسترد کردی۔

"ان چار پانچ دنوں میں، جب سے اسپتال آنا ہوا ہے، بیش تر انگریزی سے واسطہ پڑتا رہا ہے۔ نرسیں، ڈاکٹر، سبھی انگریزی کے عادی ہیں۔ حالاں کہ اسپتال میں نوے فی صد سے زیادہ مریض ہندستانی ہوں گے۔ وہ جو کہتے ہیں، گٹ پٹ کرتے کرتے جبڑے دکھنے لگے ہیں، کچھ یہی حال ہو چکا ہے میرا۔"

"ہشت!" ڈاکٹر رائے نے بہت دیر بعد جھنجھلاتے لہجے میں مداخلت کی۔ "تم خاص کمروں کی بات کررہے ہو، یہ 'گٹ پٹ' تو انہی کمروں سے مخصوص ہے۔"

خانساماں نے تازہ کافی لا کے رکھ دی تھی۔ بینا نے عجلت کی، اس مرتبہ کافی کو ٹھنڈا ہوجانے کا ذرا سا وقت نہیں دیا۔ مجھ سے مقدار پوچھ کے اس نے شکر تحلیل کی۔ پہلے اپنے باپ کے سامنے پیالی رکھی۔ پھر میرے آگے۔ شکر نے سیاہ کافی کی تلخی خاصی کم کردی تھی۔ کافی کا گھونٹ بھر کے بینا نے گلابی ہونٹوں سے رومال مس کیا اور چہک کے بولی، "پاپا سے معلوم کیجیے، مہم جو لوگ میری کیسی کمزوری ہیں۔"

"پھر آپ اپنی تصحیح کرلیجیے، میں مہم جو قطعاً نہیں۔ مہمیں تو مجھ پر وارد ہوتی رہتی ہیں اور جبراً مجھے ان سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ کہیں خود میری زندگی کا معاملہ ہوتا ہے، کہیں کسی دوسرے کی۔ میں ایک بات صاف کردوں، اڈے پاڑوں سے میرا تعلق بالواسطہ رہا ہے۔ میں اڈے پاڑوں کا آدمی نہیں ہوں۔"

"سمجھتے ہیں ہم۔" بینا کے بجائے ڈاکٹر رائے سرزنش کے انداز میں بولا۔ اس کے لہجے میں بڑا اپنا پن تھا۔ وہ بیٹی سے کہنے لگا، "تم محتاط رہو تو اچھا ہے۔ اندیشہ ہے، تمہارے سوالوں کے جواب میں اس نے سچ بولنا شروع کردیا تو تم سے برداشت نہیں ہو پائے گا۔ یہ کل سے مجھے مسلسل حیران کررہا ہے۔ صبح اس نے یقین سے کہا تھا کہ آج کسی وقت میدا استاد کو اسپتال آنا چاہیے۔ شام کو وہ موجود تھا۔ یہ میرے لیے ایک نیا آدمی ہے، ایک تجربہ، بل کہ ایک معما۔ پھر اس نے میدا استاد، پٹنا شہر کے سب سے بڑے بدمعاش سے جس انداز کا سلوک کیا، وہ دیدنی تھا۔"

"ڈاکٹر صاحب!" میں نے التجا کی، "اتنا

مت کہیے۔ میری جگہ آپ ہوتے، میری طرح اس ساری صورت حال میں شامل، اور میری طرح آپ پر گزر رہی ہوتی تو آپ بھی یہی کرتے، اسی نتیجے پر پہنچتے۔"

"شاید نہیں۔ جزوی طور پر تم درست کہتے ہو۔" ڈاکٹر نے فراخ دلی سے اعتراف کیا، "میں تمہاری جگہ ہوتا تو اتنی استقامت نہ دکھا پاتا۔"

"میری استقامت کی ایک وجہ آپ بھی تھے۔ آپ نے میری بات تحمل سے سنی اور میری پاس بانی کی۔"

"تم اپنے بزرگ کو عزت و تکریم سے نواز رہے ہو۔ یہ اچھی بات ہے۔ لیکن میں نے تو بہت بعد میں یہ سارا کچھ جانا تھا۔ اس سے پہلے تو تم بہت کچھ خود ہی بھگتتے رہے تھے۔ ڈاک خانے والی گلی کا واقعہ، اکبر علی خاں کے گھر میں تمہارا داخلہ اور میدا کے اڈے پر جانے کا حوصلہ...... ان سارے مراحل سے تم گزر چکے تھے۔ میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں، میں نے تو سچ کی اعانت کی ہے۔ چوں کہ تم سچ بولتے رہے تھے، لیکن......" اس کی آواز بھاری ہوگئی۔ "تم نے ایک سچ نہیں بولا......"

"وہ کیا؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"...... کہ مریض تمہارا اصل بھائی نہیں ہے۔"

مجھے جھٹکا سا لگا۔ کئی بار دل میں آیا تھا کہ میں ڈاکٹر پر یہ حقیقت آشکارا کردوں، لیکن کچھ تو بیچ میں اس سچ بیانی کا موقع نہیں آپایا، یا پھر کوئی دور پرے کی احتیاط مانع رہی کہ ڈاکٹر کے ذہن میں پھر کیسے کیسے سوال اٹھنے لگیں، یا پھر مجھے اس وضاحت کی ایسی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ پشیمانی کے چند لمحوں بعد میں نے اس سے یہی کہنا چاہا کہ بھائی کیا، میرے تو بٹھل سے بہت سے رشتے ہیں۔ وہ میرا باپ ہے، دوست، بزرگ، مربی و محسن ہے۔ وہ تو میرا آقا ہے، میرا سایہ، میرا ستون ہے۔ ڈاکٹر کی آسانی کے لیے میں نے 'بھائی' کی نسبت معین کردی تھی۔ کیا ضروری ہے کہ بھائی ہی کا رشتہ مستحکم ہو۔ بھائی تو صرف بھائی ہوتا ہے۔ کیا ڈاکٹر نے بٹھل کے لیے میری نگہداری، میری تشویش، میرے اضطراب میں کوئی کوتاہی دیکھی ہے۔

میرے زبان کھولنے سے پہلے ڈاکٹر نے مجھے روک دیا۔ "جانتا ہوں، تم کیا کہو گے۔ واقعی میں نے اصل رشتوں میں بھی ایسی قربت نہیں دیکھی۔"

ڈاکٹر کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ ایک ملازم نے آکے کسی انسپکٹر کی آمد کی اطلاع دی۔

"دسکسینا؟ ابھی تو وہ یہاں سے گیا ہے۔"

ڈاکٹر رائے الجھ کے بولا، "اب کیا بات ہے؟"

میرا ماتھا ٹھنکا۔ انسپکٹر کا دوبارہ آنا اور اس وقت آنا بے علت نہیں ہوسکتا تھا۔

بینا نے باپ کو مشورہ دیا کہ گھر میں مہمان موجود ہے، انسپکٹر کو منع کردیا جائے۔

ڈاکٹر نے اس کی بات نہیں مانی۔ ملازم منتظر کھڑا تھا۔ ڈاکٹر نے انسپکٹر کو سبزہ زار میں بٹھانے اور کافی پیش کرنے کی تاکید کی۔

میرے لیے اب رخصت کی اجازت لے لینا ہی مناسب تھا لیکن بینا نے کچھ دیر اور ٹھیر جانے کی منت کی، ادھر ڈاکٹر کا بھی یہی حکم تھا۔

جلد آنے کا کہہ کے ڈاکٹر ہمارے پاس سے چلا گیا۔ میں اور بینا تنہا رہ گئے۔ گو میرا دماغ انسپکٹر کی ناوقت آمد کی ادھیڑ بن میں لگا ہوا تھا، لیکن سامنے بینا تھی، ماہ جمال، خوش مقال، خوش خیال بینا۔ میں نے اپنا دھیان بٹانے اور میزبان کی خوش نودی کے لیے اس کی تصویریں اور مجسمے دیکھنے کی فرمائش کی۔ میرے اشتیاق پر اس نے خوشی کا اظہار کیا اور دن میں کسی وقت گھر آنے کی دعوت دی کہ اس کی تخلیقات کی نظارگی کے لیے دن کا وقت ہی موزوں ہوتا۔

"مجھے احساس ہو رہا ہے، میں آپ دونوں کے معمولات میں حارج ہو رہا ہوں۔"

"بالکل نہیں۔" اس نے خوش وضعی سے تردید کی۔ "پاپا تو رات گئے تک مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ پاپا ان ڈاکٹروں میں نہیں جو ایک بار ڈگری لے کے سمجھ لیتے ہیں کہ بس سب کچھ جان لیا، میدان مار لیا۔ پاپا طب کی جدید کتابوں، دواؤں اور امراض کی تازہ ترین تحقیقات سے متعلق کتب ورسائل کا مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ جتنے پرانے ڈاکٹر ہیں، اتنے ہی نئے بھی۔"

"لوگوں کا ان پر بڑا عقیدہ ہے۔ کہتے ہیں، کسی کسی کے ہاتھ میں شفا ہوتی ہے۔ یہاں اسپتال میں ڈاکٹر صاحب کی یہ کرامت بہت مشہور ہے۔"

"شفا تو ڈاکٹر کے علم، اس کی سنجیدگی، صحیح تشخیص، مریض سے ہم دردی، غرض اپنے کام میں دیانت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ پاپا کے لیے ہر مریض یک ساں اہمیت رکھتا ہے، اور وہ اس پر پوری توجہ دیتے ہیں۔ کسی پیچیدہ مرض پر وہ دوسرے ڈاکٹروں سے مشورہ کرنے میں ذرا تکلف نہیں کرتے۔"

"مجھے اس کا تجربہ ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایک بے مثال ڈاکٹر ہیں اور آدمی بھی بہت نادر۔"

میرے اعتراف کی صداقت اس نے محسوس کی کہ اس کی آنکھوں میں شرارے نمودار ہوئے۔

"اور آپ...... آپ کیا کرتی ہیں ان اوقات میں؟" میں نے تمام تر شائستگی سے پوچھا۔

"کوئی ایک کام نہیں۔" وہ خوابیدہ سی آواز میں بولی۔ "کبھی ادھوری تصویر مکمل کرتی ہوں، کبھی گراموفون سنتی رہتی ہوں، کبھی ریڈیو، کبھی ستار بجانے لگتی ہوں، زیادہ تر کتابیں پڑھتی ہوں۔ کتاب بھی کھڑکی کی طرح ہوتی ہے، جھانکو تو کچھ نہ کچھ ضرور نظر آتا ہے، ہر بار نیا منظر۔"

"لیکن بعض کھڑکیوں کے آگے دیوار بھی پڑ جاتی ہے۔"

میری بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ وہ کھل کھلا پڑی۔ "بعض کتابیں بھی ایسی کھڑکیوں کے مانند ہوتی ہیں، یہی کہنا چاہتے ہیں نا آپ۔"

اس نے میری بات سے لطف لیا۔ میرا مقصد بھی یہی تھا۔

"اور ایک مصروفیت تو میں بتانا ہی بھول گئی۔" اپنے مخاطب سے اس کے تکلم کا کلف اب کچھ ٹوٹ رہا تھا۔ کہنے لگی، "کبھی کسی چیز میں جی نہیں لگتا تو پاپا کے کمرے میں چلی جاتی ہوں۔ انہیں دیکھتی رہتی ہوں۔ ان سے زندگی سیکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ وہ بھی کتاب چھوڑ کے مجھ سے باتیں کرنے لگتے ہیں۔ طب کی کتابوں کے علاوہ پاپا کو ادب کا بھی اچھا ذوق ہے۔ دنیا کے مشہور ناول، کہانیاں پڑھنے کے لیے جانے کیسے وقت نکال لیتے ہیں۔"

"آپ اپنے پاپا سے بہت محبت کرتی ہیں۔"

"وہ میرے دیوتا ہیں، میرے باپ اور ماں بھی۔"

"اور آپ کی والدہ......؟"

"وہ اب نہیں ہیں ہمارے درمیان۔" وہ اداس ہوگئی۔ میں نے افسوس کا اظہار کیا تو بولی، "تعلیم مکمل ہوگئی تھی، لیکن آرٹ پر کچھ اور پڑھنے کا ارادہ تھا۔ پاپا کی تنہائی کا سوچ کے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے یہاں چلی آئی۔"

"اب آپ کا یہاں دل لگتا ہے؟"

"یہ میرا وطن ہے۔ یہاں میرے پاپا رہتے ہیں۔"

اس سے پہلے کہ وہ میرے بارے میں سوال کرنے لگتی، میں نے انگلستان کی زندگی کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں نے دیکھا تھا، لوگ کتنے ہی گوروں سے ناراض، ان کے دشمن ہوں، انگلستان کے نظم وضبط کی مدح وثنا کرتے نہیں تھکتے۔ پھر تو جیسے بینا کو موضوع مل گیا۔ ایک دریا رواں ہوگیا۔ وہ پٹر پٹر باتیں کرنے لگی۔ میرے کان ڈاکٹر کی واپسی کی آہٹ کے منتظر تھے۔ میں نے کوشش کی کہ بینا کو میری بے چینی کا احساس نہ ہو پائے۔ یوں اس کی

قربت ہی کچھ کم سحر ناک نہیں تھی۔ کاش، انسپکٹر کی آمد سے یہ رخنہ اندازی نہ ہوتی۔ بعض لوگ بھی رنگا رنگ منظر کی طرح ہوتے ہیں۔ وہ انگلستان میں ایک عرصہ گزار کے آئی تھی اور گوروں کی علوم وفنون سے دل چسپی، کام کی لگن، وقت کی پابندی، نفاست اور سلیقے سے بہت متاثر تھی، لیکن کہہ رہی تھی، یہاں اپنے وطن کی بے اطواری، بے سلیقگی میں بھی ایک رنگ ہے۔ میں نے اس سے بحث نہیں کی کہ اس نے یہاں کیا دیکھا ہوگا۔ یہاں تو بہت اندھیرے ہیں۔ اس نے یہاں کی غربت اور اس کے عذاب کہاں دیکھے ہیں، اور جہالت تو سب سے بڑی غربت ہے۔ ہندستان تو اب اپنی جہالت کا خمیازہ بھگت رہا ہے۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔ میں تو سنتا رہا، اور میری خوش سمعی سے وہ مہمیز ہوتی رہی۔

''آپ آئیں گے نا پھر؟'' اس نے حسرتی لہجے میں کہا۔

''جب تک یہاں ہوں، آتا رہوں گا۔ آپ بلائیں گی اور ڈاکٹر صاحب کا حکم ہوگا تو کیوں نہ آؤں گا۔''

''آپ سے مل کے عجیب سا احساس ہوا۔ بہت دنوں بعد کوئی......''

ڈاکٹر کی آمد پر جیسے کسی خواب سے آنکھ کھل گئی۔

ڈاکٹر کا چہرہ دیکھ کے اندازہ ہوگیا کہ انسپکٹر سکسینا نے اس سے کچھ خوش گوار باتیں نہیں کی ہیں۔ ڈاکٹر کو گئے دیر بھی خاصی ہوگئی تھی۔ میں نے اسے سانس لینے کا وقت دیا، پھر پوچھا۔ ''خیریت تو ہے؟''

''ہاں، ہاں۔'' اس کے تیور کسی حد تک مغائرانہ تھے، معاندانہ نہیں۔ ''یہ ٹھاکر بستی کا کیا قصہ ہے؟'' اس نے ناگواری سے پوچھا۔

میں نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔

میری خاموشی پر وہ ڈپٹ کے بولا، ''چپ کیوں ہو؟''

''سوچ رہا ہوں، کیا بتاؤں آپ کو۔ اس کا مطلب ہے، فیض آباد پولیس سے ان کا رابطہ ہو چکا ہے۔''

''سکسینا یہی بتانے آیا تھا۔''

''اور اس نے خواہ مخواہ آپ کو تنگ کیا۔ اس کے پاس کہنے کے لیے یہی کچھ ہوگا کہ فیض آباد پولیس ٹھاکر بستی میں ہونے والے قتل وخوں کا کوئی سراغ نہیں لگا سکی۔''

''ایسا ہی کچھ کہا اس نے۔''

''تو آپ اتنے فکر مند کیوں ہو رہے ہیں۔ اڈے پاڑوں سے متعلق لوگوں پر سنگین الزامات عائد ہوتے رہتے ہیں۔ کیا میں اور بھائی ٹھاکر بستی کے حادثے میں فیض آباد پولیس کو مطلوب ہو گئے ہیں؟''

''اس نے یہ کچھ نہیں کہا۔''

''تو پھر کیا مسئلہ ہے؟ میں آپ کو بتاتا ہوں، اگر آپ سننا چاہتے ہیں۔''

''میں...... میں جاننا چاہتا ہوں۔''

میں نے اسے بتایا کہ فیض آباد میں قیام کے دوران ایک روز بازار میں اڈے سے وابستہ ہزیانامی آدمی پر زیادتی ہوتی دیکھ کے مجھ سے رہا نہیں گیا، مجھے دخل دینا پڑا۔ یہی ایک واقعہ ہم پر پولیس کے شک کی بنیاد بنا۔

فیض آباد کے قریب واقع ٹھاکر بستی میں ایک خاندانی جاگیر دار ٹھاکر ہر دیو کی علاقے بھر میں دہشت، اس کے بدکار بیٹے ٹھاکر بل دیو کی فیض آباد میں مقیم ایک نوجوان، حسین وجمیل، تعلیم یافتہ اور آسودہ حال لڑکی برکھا پر فریفتگی اور شادی کے لیے پیام۔ برکھا کے باپ کے انکار پر ٹھاکر بل دیو کا عتاب، برکھا کا اغوا اور اڈے کے آدمی کے آڑے آجانے پر ناکامی، انتقاماً اڈے کے دو آدمیوں کا قتل، دوسری کوشش میں برکھا کے گھر پر حملہ، دو ملازموں کی ہلاکت اور برکھا کا اغوا، اور

دوسرے تیسرے روز گھر کے قریب برہنہ اور شکستہ لاش کی صورت میں برکھا کی بازیابی، صدمے سے باپ کے حواس معطل، چند دنوں بعد ایک رات ٹھاکر بستی کی پامالی، ٹھاکروں کی ساری حویلی، کھیت کھلیان نذر آتش، ٹھاکر، خاندان کے دیگر افراد، ملازمین اور مصاحبین پر مشتمل بیالیس آدمیوں کی موت، اڈے کے دو آدمیوں کی ہلاکت سے ہم پر پولیس کے شک کی پختگی، حادثے کی تفتیش کے لیے پولیس کے بڑے بڑے افسروں کی تعیناتی، کوتوالی میں میری، بٹھل اور اڈے کے سارے آدمیوں کی طلبی، سوال جواب اور کوئی ثبوت نہ ملنے پر کوتوالی سے ہماری بہ عافیت واپسی کا سارا واقعہ ڈاکٹر کی شرح صدر کے لیے مجھے سنانا پڑا۔

دونوں باپ بیٹی سن سے ہوگئے۔ بینا کے چہرے کی چمپا زرد پڑ گئی تھی۔ ڈاکٹر بھی گنگ بیٹھا رہا۔ ان کے عالم حیرت کی ایک وجہ مجھ پر ان کا اعتبار تھا' نہ میں کسی غلط بیانی کا مرتکب ہوں گا نہ کسی مبالغے کا۔

میں نے ڈاکٹر کو بتایا، پولیس کے اطمینان کی خاطر ہم نے فیض آباد میں قیام کی مدت بڑھا دی۔ سترہ اٹھارہ روز بعد ہم نے از خود کوتوالی حاضری دے کے پولیس افسروں کو فیض آباد سے اپنی روانگی سے مطلع کیا۔ انہوں نے ہمیں نہیں روکا۔ تاہم ہم نے اپنی جانب سے انہیں یقین دلایا کہ اس خوں ریزی میں ہمارے عمل دخل کا کوئی اشارہ انہیں ملے تو ہم کہیں ان سے دور نہیں ہوں گے۔ پولیس، فیض آباد میں ہمارے گھر، یا کلکتے کے اڈے پر طلبی کا پیغام بھیج دے۔ ہم جہاں کہیں ہوں گے، فیض آباد پہنچ جائیں گے۔

''مگر ٹھاکروں کی بستی میں کس نے آگ لگائی؟'' ڈاکٹر کی آواز دھڑک رہی تھی۔

''کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ٹھاکروں نے گرد ونواح میں جانے کب سے بہت تباہی مچائی ہوئی تھی۔ کسی کی عزت آبرو محفوظ نہیں تھی۔ ظاہر ہے، انہوں نے بہت سے دشمن پیدا کر لیے ہوں گے۔''

''تم کیا سمجھتے ہو؟''

''میں نے اس پر بہت غور کیا تھا، ہر پہلو سے اور میں آپ کو بتاؤں، مجھے بٹھل بھائی پر بھی شبہ ہوا تھا۔ شبہے کی وجہ وہی تھی جو پولیس کی تھی۔ ایک اور وجہ بھی سمجھ میں آتی تھی۔ ٹھاکر بل دیو کو فیض آباد میں ہماری موجودی اور شہر کے اڈے کی پشت پناہی کا علم یقیناً ہوگا۔ اڈے کے بعض آدمیوں کو ہمارے گھر آنے کی اجازت ملی ہوئی ہے۔ یہ خدشہ رد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کسی دن ٹھاکر بل دیو اپنے زور واثر کے نشے میں ہمارے گھر کو نشانہ نہ بنا دے، لیکن پولیس کی طرح میرے پاس بھی کوئی گواہی نہیں تھی۔ جس رات یہ واقعہ ہوا، ہم سب فیض آباد میں تھے۔ میں مسلسل بٹھل بھائی کے ساتھ تھا۔ پولیس کو شہر میں ہماری موجودی کی ساری شہادتیں مل گئی تھیں۔''

''بیالیس آدمیوں کی موت، اتنا سنگین واقعہ! کوئی نقش، نشان، کوئی علامت نہیں۔'' ڈاکٹر کی حیرت بے جواز نہیں تھی۔

''تفتیش کے لیے گورے افسر بھی آئے تھے۔ انہوں نے تو حادثے کی جگہ کا معائنہ بھی کیا تھا، مگر سنا ہے، سب کچھ خاکستر، کھنڈر ہو چکا تھا۔''

''صبح سویرے اکبر علی خاں کے قتل کی جگہ پر تین لاشیں پائی گئیں۔ گمان ہے، انہی تین آدمیوں نے اکبر علی خاں کا خون کیا تھا۔ کسی نے انہیں ان کے انجام تک پہنچا دیا۔ پولیس کو کوئی ثبوت نہیں ملا۔ میدا اپنے اڈے پر آرام سے بیٹھا ہوا ہے، اس کے ساتھی بھی۔ ٹھاکر بستی اور یہاں، پٹنے کے واقعے میں تمہیں کوئی مطابقت نظر نہیں آتی؟'' ڈاکٹر رائے بگڑے تیوروں سے بولا، ''یاد ہے، تمہی نے کہا تھا کہ ان تین آدمیوں کے قاتلوں کی گرفت آسان نہیں ہے۔ کیوں کہ اگر یہ میدا اور اس کے ساتھیوں کا کام ہے تو انہوں نے اپنی گردنیں محفوظ کر لینے کی

ہر تدبیر کرلی ہوگی، یعنی میدا نے یہ کام کسی اور کو سونپا ہوگا۔"

"جی ہاں۔" میں نے اقرار کیا۔ "یہی کہا تھا میں نے اور کچھ ایسا ہی نظر آتا ہے۔"

"پھر......پھر یہ بھی تو ممکن ہے کہ ٹھاکر بستی میں تمہارے۔" ڈاکٹر نے اپنی بات خود ہی ادھوری چھوڑ دی، کیوں کہ اسے میرا جواب معلوم ہوگا۔ وہ خاموش ہوگیا۔

میں نے اس کی دل جوئی کے لیے کہا، "انسپکٹر سکسینا کو اس وقت یہاں آنے کی ایسی ضرورت نہیں تھی۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ آپ کو ابھی اس سے باخبر کرنا لازم ہو۔"

"وہ نہیں آیا تھا۔" ڈاکٹر نے ترشی سے کہا، "اسے ڈی آئی جی نے بھیجا تھا۔ وہ تمہاری نقل وحرکت پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ انہیں معلوم تھا کہ تم اس وقت میرے گھر پہ ہو۔ انسپکٹر سکسینا ڈی آئی جی کی طرف سے مجھے متنبہ کرنے آیا تھا کہ تم پر اور تمہارے بھائی پر اتنی شدید نوعیت کے الزامات ہیں۔"

"محض الزامات نا!" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"کاش، الزامات ہی رہیں۔"

"آپ کا دعائیہ لہجہ شک سے آلودہ ہے۔"

"نہیں نہیں۔" ڈاکٹر کا لہجہ مدافعانہ ہوگیا۔ "پولیس کے پاس فضول قسم کے کام بہت ہوتے ہیں۔"

"ہاں پاپا، کیا غلط ہے، دیکھیے نا پولیس افسر نے ہماری ایک خوب صورت شام بل کہ رات منتشر کردی۔" بینا نے دبے لہجے میں باپ سے شکایت کی "میں اسی لیے آپ کو منع کر رہی تھی۔"

"پھر تم ٹھاکر بستی کے اس عبرت ناک واقعے سے محروم رہ جاتیں۔" ڈاکٹر کی آنکھوں میں خاصی دیر بعد آسودگی نمودار ہوئی۔

"یہ بہت سنسنی خیز تھا۔" بینا نے جھرجھری لے کے کہا، "ناقابل یقین۔"

"مجھے شبہ ہے، اس قسم کے کتنے واقعات اس کے سینے میں دفن ہوں گے۔"

ڈاکٹر کی قیاس آرائی میں طنز کی رمق دانستہ نہیں تھی۔ دانستہ بھی ہوتی تو میں کیا کرسکتا تھا۔ "ان پر مٹی ہی پڑی رہنے دیجیے۔" میں نے پژمردگی سے کہا۔

"دیکھا!" ڈاکٹر نے اچھل کے بیٹی کو مخاطب کیا، "یہ کیسا مختلف نوجوان ہے، اور بھی......اور بھی ایسے واقعات سے اس کا سابقہ پڑا ہے۔"

"میرے لیے تو یہ دریافت کی حیثیت رکھتے ہیں۔" بینا بے اختیار سی ہو کے بولی۔

"میرا خیال ہے، اب مجھے چلنا چاہیے۔" میں نے مسکرا کے کہا، "رات بھی بہت ہوگئی ہے۔"

"بیٹھیے نا، کچھ دیر اور۔" وہ اٹھلاتی آواز میں بولی اور باپ کی طرف حمایت طلب نظروں سے دیکھا۔ "کیوں پاپا! ایک کافی اور نہ ہوجائے......کافی یا کچھ اور......"

کھانا کھائے وقت ہوچکا تھا۔ بینا اٹھ کے ہال سے باہر چلی گئی۔ خانساماں شاید کہیں قریب ہی تھا کہ وہ فوراً واپس آگئی اور تیز سانسوں سے بولی، "کیا آپ نے ابھی ٹھاکر بستی......جس جگہ کا یہ واقعہ بتایا ہے، دوسری جگہوں پر بھی ایسا ہی ہوتا ہے؟"

"یہ کیا، اس سے بڑی حقیقتیں ہیں۔ یہاں صرف گوروں کی حکومت نہیں، بے شمار حکم راں ہیں یہاں، دولت مند، زمیں دار، جاگیر دار، نوابین۔ باقی خلقت تو ان کے پالتو جانوروں کی طرح ہے، ان کے گھوڑوں، ان کے کتوں کی طرح۔ باقی سارے ان کی رعیت ہیں، ان کے غلام۔ یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔" میں نے خود کو تھاما اور اپنے لہجے کی تلخی پر معافی مانگی۔

"میں......میں پاپا، آپ سے کیا کہتی ہوں۔"

بینا جوشیلے انداز میں بولی، ”یہ وہی بات کر رہے ہیں۔ یہاں تو دو قسم کے آدمی رہتے ہیں، ایک حاکم، ایک محکوم، آقا اور غلام۔ نواب راجا لوگ وہاں بھی بہت ہیں، لیکن ایسا کچھ، یہاں جیسا کچھ نہیں۔“

”وہ ایک اور دنیا ہے۔“ ڈاکٹر کے لہجے میں بے چارگی سی تھی۔ ”وہ تین صدیوں سے جاگ رہے ہیں۔“

”اور ہم......؟ ہم سوتے رہے ہیں۔“ بینا تڑاق سے بولی۔

”نہ سو رہے ہیں، نہ جاگ رہے ہیں۔“ ڈاکٹر نے اداسی سے کہا، ”ہم کچھ تھک سے گئے ہیں۔ قوموں پر تکان، اعصاب شکنی اور غنودگی کے یہ دور آتے رہتے ہیں۔“

خانساماں نے بہت عجلت کی۔ کافی کے ساتھ انگریزی بسکٹ، خشک میوہ اور دال موٹھ وغیرہ کے لوازم بھی تھے۔ کافی ختم کر کے میں اٹھ گیا۔ پھر انہوں نے مجھے نہیں روکا۔

ہم ہال سے باہر آ گئے۔ ہلکی سی ٹھنڈی ہوا پر رات کی رانی کا راج تھا۔ دونوں میرے ساتھ دروازے تک بڑھتے اور مجھے شرمندہ کرتے رہے۔ دروازے پر آ کے بینا نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ایک لحظے کے لیے جی میں آیا کہ اس کے ہاتھ کو بوسہ دوں، دوسرا لمحہ بہ ہر حال میرے اختیار میں آ گیا۔ مصافحہ کرتے ہوئے اس کی مخروطی انگلیوں کی گرفت سے اس کی سرخوشی جھلک رہی تھی۔ مجھ سے دوبارہ آنے کا وعدہ لے کے وہ دروازے سے لوٹ گئی، لیکن ڈاکٹر رائے میرے ساتھ باہر آ گیا۔ میں نے اس سے واپس چلے جانے کی عاجزی کی۔

”کچھ چہل قدمی ہو جائے گی۔“ وہ بے نیازی سے بولا۔

ہماری رفتار سست تھی۔ چند قدم آگے جانے پر میں نے خاموشی توڑی اور رکی رکی آواز میں کہا، ”بینا، آپ کی صاحب زادی تو بہت لائق ہیں۔ ان کا کام بہت متاثر کرتا ہے۔“

”اس میں بہت سے گن ہیں۔“

”وہ تو کوئی شہزادی ہیں۔“

”حالاں کہ باپ بادشاہ نہیں۔“ وہ ہنس کے بولا۔

”باپ کا درجہ بادشاہوں سے بلند ہے، باپ تو ایک مسیحا ہے، باپ تو ایک فرشتہ ہے۔“

”اوہ، نہیں نہیں، اتنا مت کہو۔“ وہ ناراض ہونے لگا۔

”میں جو سمجھتا ہوں، جو میں نے دیکھا ہے، وہی کہہ رہا ہوں۔“ میں نے اصرار کیا۔

”ہم کیا بات کر رہے تھے؟“ اس نے اپنے ذکر سے اجتناب کے لیے موضوع بدلنا چاہا۔

”آپ شہزادی کی بات کر رہے تھے۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔

”ہاں، میں کہہ رہا تھا، میرے لیے وہ یہاں آ گئی ہے، لیکن کبھی کبھی مجھے لگتا ہے، اس نے اپنے آپ سے زیادتی کی ہے۔ اسے یہاں بہت گھٹن بھی ہوتی ہوگی۔“

”وہ تو بہت خوش دکھائی دیتی تھیں۔“

”گھر میں کم لوگ آتے ہیں اور بہت کم لوگوں میں اس کا جی لگتا ہے۔ بیش تر اکیلی ہی رہتی ہے۔ تمہارے آنے سے خاصی کھلی کھلی لگ رہی تھی کیوں کہ تم اس کے لیے دوسروں جیسے نہیں تھے، ایک بہت نئے آدمی، ہر اعتبار سے۔“

”میں کیا......“ میرے شانے سکڑ گئے۔ ”آپ جب انسپکٹر سے ملنے باہر چلے گئے تھے تو میری ان سے خوب باتیں ہوئیں ان کے لیے تو سب سے بڑی خوشی یہی ہے کہ وہ اپنے پاپا کے پاس ہیں۔“

”وہ بڑی پگلی ہے۔ سوچو، کب تک میں اس کے ساتھ رہوں گا اور کب تک وہ میرے ساتھ رہ

سکے گی۔ اسے اپنا گھر تو بسانا ہوگا، بسانا چاہیے۔“

”جی ہاں۔“ میں نے ہچکچا کے کہا۔ ”لڑکیوں کے ساتھ یہ کچھ عجب ہے، ان کا گھر بدل جاتا ہے۔“

”پہلے تو شادی ہی سے انکاری تھی۔ کہتی تھی، میں تو آپ کے ساتھ رہوں گی۔ کیا ضروری ہے کہ ہر لڑکی کی شادی ہوا کرے۔ بعد کو میرے سمجھانے بجھانے پر آمادہ ہو گئی۔ پھر یہ شرط عائد کی کہ میں بھی اس کے ساتھ رہوں گا۔ میں نے ہامی بھر لی کہ پہلے وہ اپنے گھر کی تو ہو جائے بعد کو دیکھا جائے گا۔“

”پھر کیا ہے۔ اب تو وہ راضی ہو گئی ہے۔ کوئی ایسا خوش قسمت تلاش کر لیجیے جو آپ کے ساتھ رہ سکے۔“

”لیکن کوئی اسے پسند تو آئے۔ تم نے تو اسے دیکھا ہے، کیسی نفیس طبع، نادرہ کار اور ندرت پسند لڑکی ہے۔ اسے چیدہ چیدہ چیزوں کی عادت ہے۔ کلکتے میں کچھ عزیز رہتے ہیں۔ ان کے نہایت لائق بیٹوں سے ملوایا تھا میں نے اسے۔ اس نے انکار کر دیا۔ میں نے اسے آزادی دی تھی کہ پھر اپنے لیے خود کوئی لڑکا منتخب کرے۔ لندن میں ایک عرصے رہی، وہاں بھی اسے کوئی نہ بھا سکا...... تمہیں ایک دل چسپ بات بتاؤں۔“

”جی......“ میں نے تجسس سے پوچھا۔

”جب مسلسل کئی لڑکے مسترد کر چکی تو تنگ آ کے سارا بار مجھ پر ڈال دیا کہ جو مجھے پسند آ جائے، وہ اسے قبول کر لے گی۔“

”تو سب کچھ اب آپ پر منحصر ہے۔“

”اور ظاہر ہے، مجھے بھی اس کے مزاج، رجحان، طبیعت کا خیال رکھنا ہوگا۔“

”جی ہاں، پھر تو بات وہی کچھ رہی۔“

”وہ بڑی تیز ہے، اسے معلوم ہے، اس کا باپ بھی پسند ناپسند میں کچھ کم حجت نہیں کرتا۔ تم بھی کچھ میری مدد کرو۔“

”جی...... جی ہاں۔“ میں نے تذبذب سے کہا۔

کوٹھیوں کے علاقے کی چار دیواری قریب آ گئی تھی۔ سامنے دروازہ تھا۔ ڈاکٹر رائے ٹھیر گیا۔ میں بھی رک گیا۔

”تم سفر کرتے رہتے ہو۔ کوئی ایسا نوجوان جو ایسا ہی پر خیال، عزم و حوصلے میں یک تا، پڑھا لکھا، ہوش مند، کچھ تمہارے جیسا......“ اس نے سر اٹھا کے آسمان کی طرف دیکھا اور گھر کی طرف واپس ہو پڑا، اور ابھی قدم دو قدم کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ پلٹ کے بولا، ”اور وہ...... وہ تم بھی ہو سکتے ہو۔“

میں اسے دیکھتا رہ گیا۔

ڈاکٹر آہستہ قدموں سے اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ مجھے اپنے حواس کی درستی پر شبہ ہوا اور جی میں آیا، اس کا تعاقب کروں یا اسے آواز دوں کہ کیا اس نے یہی کہا ہے جو میں نے سنا ہے۔

مجھے یہاں لانے والا ڈاکٹر کا ملازم کچھ فاصلے پر ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ ڈاکٹر کے لوٹ جانے کے بعد وہ میرے قریب آ کے ٹھہر گیا اور منتظر رہا کہ کب میں اس کے ساتھ چلتا ہوں مگر میرے قدم تو زمین نے جکڑ لیے تھے۔

جانے کیوں مجھے گمان تھا کہ ڈاکٹر مڑ کر مجھے دیکھے گا لیکن وہ دور ہوتا گیا اور ہیولا سا نظر آنے لگا۔

”چلیں صاحب!“ مجھے بے حس و حرکت دیکھ کے ملازم نے دبی آواز میں ٹوکا۔

میں نے اضطراب سے سر ہلایا اور سٹپٹاتے ہوئے پلٹ کے دروازے کی طرف چل پڑا ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا اور میرے جسم و جاں میں شور مچا ہوا تھا۔ چند قدم بعد اسپتال کی چار دیواری آ جاتی تھی۔ اسپتال کے اس حصے پر تعینات مستعد دربان نے چند لمحوں کے تامل کے بعد پھاٹک کھول دیا۔ سپاہیوں کے انداز میں اس نے مجھے سلام کیا

تھا۔ مجھ سے کوئی جواب دیا جا سکا نہ ہاتھ ہلایا جا سکا۔ سامنے اسپتال کی عمارتیں سکوت میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ راہ داریوں اور مختلف وارڈوں کے درمیان پھیلی ہوئی سڑکوں اور سبزہ زاروں پر نصب روشنیاں ہلکی ہلکی کہر میں ٹمٹمارہی تھیں۔

ڈاکٹر رائے کا خدمت گار میرے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ کمرا نزدیک ہی تھا۔ مجھے اسے لوٹا دینا چاہیے تھا لیکن اس کی ہمراہی میں کوئی سہارا سا محسوس ہورہا تھا۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے دروازے پر ٹھہر کے میں نے غیر ارادی طور پر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ بوکھلا گیا۔ مجھے خیال نہیں رہا تھا کہ خدام اس عزت افزائی کے عادی نہیں ہوتے۔ وہ سرتاپا لہرا گیا اور جسم خم کرکے اس نے مجھے تعظیم دی تو الٹی مجھے پشیمانی ہوئی۔

نرس ایمی جاگ رہی تھی۔ میری آہٹ سن کر لپکتی ہوئی باہر آگئی۔ ایک لمبی سانس کھینچنے کے بعد وہ پلکیں جھپکنے لگی۔ ’’بہت دیر کردی تم نے۔‘‘ وہ شکایتی لہجے میں بولی۔

’’بس‘‘ میں نے سر جھکا کر ناتوانی سے کہا۔ ’’وقت کا کچھ احساس ہی نہیں رہا۔‘‘

’’کیسا رہا؟‘‘ وہ اشتیاق سے بولی۔

’’بہت اچھا‘‘ میں نے بے ربطی سے کہا۔

’’اوہ شکر ہے۔‘‘ وہ جھرجھری لے کر بولی، ’’مجھے تو طرح طرح کے وہم آرہے تھے۔‘‘

’’کیوں...... کیسے وہم؟‘‘ میں نے تندی سے پوچھا۔

’’کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو کہیں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا، ڈاکٹر رائے بہت کم کسی کو اپنے گھر بلاتے ہیں۔ یہ تو بڑی ان ہونی قسم کی بات تھی، خصوصاً تمہارے لیے۔‘‘ ایمی جھجکتے ہوئے بولی۔ ’’ان حالات میں جو تین چار دن سے پیش آرہے ہیں، تمہاری حیثیت کسی سوالیہ نشان کی سی ہوگئی ہے۔ ویسے بھی ڈاکٹر اور تمہاری شناسائی کو وقت ہی کتنا گزرا ہے۔‘‘

میں نے کچھ نہیں کہا۔ ہم دونوں کمرے میں آگئے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میری نظریں بے اختیار کھل کے بستر پر گئیں اور جیسے کسی خواب سے آنکھ کھل جائے میں نے اضطراری آواز میں پوچھا۔ ’’کیا حال ہے ان کا؟‘‘

’’بالکل ٹھیک۔‘‘ ایمی فراخ دلی سے بولی۔ ’’درمیان میں دو ایک بار آنکھ کھلی تھی، تمہیں پوچھ رہے تھے۔‘‘

’’تم نے کیا کہا پھر؟‘‘

’’میں نے بتادیا کہ تمہیں ڈاکٹر رائے نے گھر پہ بلایا ہے۔ کچھ تو کہنا تھا مجھے۔ میں نے بتادیا کہ ڈاکٹر نے تمہیں کھانے پر بلایا ہے۔ یہ واضح کرنا ضروری تھا، کہیں کوئی اندیشہ، وسوسہ مریض کے دماغ میں نمو نہ پالے۔ بیماری بہت حساس کردیتی ہے۔‘‘ ایمی سرگوشیانہ انداز میں بولی۔ ’’خاصی دیر تک جاگتے رہے پھر میں نے سیب کی چند قاشیں کھلائیں، دوائیں دیں، سو گئے۔ خون کا دباؤ، حرارت وغیرہ دیکھی تھی میں نے۔ سب کچھ معمول پر ہے۔ بہ ظاہر فکر کی کوئی بات نہیں۔‘‘

صوفے پر بیٹھ کے میں نے اپنا بکھرا ہوا جسم سمیٹنے کی کوشش کی۔ ایمی بھی میرے برابر بیٹھ گئی۔ لمحوں تک خاموش رہی پھر اپنے گرم ہاتھ سے میری گدی سہلاتے ہوئے وہ بولی۔ ’’کچھ کھوئے کھوئے سے لگتے ہو۔‘‘

’’نہیں تو......‘‘ میں نے تنی ہوئی آواز میں کہا۔

’’نیند آرہی ہے؟‘‘

’’نہیں۔ بالکل نہیں۔‘‘ میں نے اپنا جسم سیدھا کرلیا۔ وہ نیند کو پوچھ رہی تھی۔ نیند تو بڑی مشروط ہوتی ہے۔

’’کیا ہوا وہاں؟‘‘ وہ مچل کے بولی۔

’’کیا ہوتا؟‘‘ میں نے کسمسا کے کہا۔

’’کیا کیا باتیں ہوئیں؟‘‘

’’دنیا بھر کی، ادھر ادھر کی۔ بہت سی باتیں۔‘‘ میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ میں ایمی کو کیا بتاتا۔

’’کیسا لگا ڈاکٹر کا گھر؟‘‘

’’وہ تو کوئی نگار خانہ ہے۔‘‘

’’ہاں، بے شک۔‘‘ عمر رسیدہ ایمی بچوں کی مانند ہمکنے لگی۔ ’’کوئی نگار خانہ یا عجائب خانہ...... مگر تمہیں سارا گھر دیکھنے کا موقع کہاں ملا ہوگا۔‘‘

’’تھوڑا بہت جتنا دیکھا وہی بہت مختلف اور منفرد تھا بہت......‘‘ میری آواز کھوسی گئی۔

’’تم نے غور کیا، کیسا تناسب و توازن ہے اس گھر میں۔ ہر چیز جہاں رکھی ہے، جیسے اسی جگہ کے لیے بنی ہو۔ اس طرح کے اکثر گھروں میں بڑی نادر چیزیں ہوتی ہیں لیکن ایک سلیقہ بھی تو چاہیے۔ بعض جگہوں پر تو چیزیں تھوپی ہوئی، ایلی ہوئی لگتی ہیں۔ جتنے نفیس ڈاکٹر رائے ہیں۔ اتنا ہی اعلیٰ ان کا ذوق ہے...... اور جب سے بیٹا انگلستان سے آئی ہے، گھر کا نقشہ ہی بدل گیا ہے۔ بیٹا تمہارے سامنے آئی تھی؟‘‘

’’ہاں آں۔‘‘ میں نے ہچکچا کے اقرار کیا۔

’’دیکھا تم نے اسے۔ کیسی ترشی ہوئی، سانچے میں ڈھلی ہوئی لڑکی ہے، شگفتہ، شائستہ...... ہزاروں، بلکہ میں تو کہوں گی، لاکھوں میں ایک......‘‘

میں نے آنکھیں میچ لیں۔

’’کیسی لگی وہ تمہیں؟‘‘

’’بہت اچھی، تم ٹھیک کہتی ہو، وہ بڑی نادر لڑکی ہے۔‘‘ میں نے آہستگی سے کہا۔ ’’ڈاکٹر رائے کی بیٹی شاید کچھ ایسی ہی ہونی چاہیے تھی۔‘‘

’’ارے مت پوچھو۔‘‘ ایمی بے تاب سی ہوگئی۔ ’’میں تو اس کی عاشق ہوں۔ ذرا سا بھی تکبر نہیں اس میں۔ جب بھی جاتی ہوں، بہت خوش ہوتی ہے اور میں...... میں تو اسے بس دیکھتی رہتی ہوں۔ جی کرتا ہے آنکھوں میں بسا لوں۔ کبھی لمبا وقفہ ہو جائے تو شکایت کرتی ہے۔ باپ سے کہلوا کر بلاتی ہے۔ جس گھر میں جائے گی بہاریں بکھیر دے گی۔ وہ تو ایک گلستان ہے۔ سوچتی ہوں، کون خوش نصیب ہوگا جس کے گھر اور دل کی زینت بنے گی۔ کوئی شہزادہ ہی ہونا چاہیے اس کے لیے۔‘‘

’’ہاں ہاں۔ وہ خود کسی شہزادی سے کیا کم ہے۔‘‘

’’تم بتاؤ تم نوجوان آدمی، سچ کہنا، تم اس کے سحر کے اسیر نہیں ہوئے؟ ہیں نا!‘‘ ایمی مجھے ٹہوکا دیتے ہوئے بولی ’’لگتا ہے، کچھ ایسا ہی ہے جبھی چپ چپ ہو۔‘‘

’’کیسی باتیں کررہی ہو تم۔‘‘ میں نے زیرو زبر آواز میں کہا اور پہلو بدلا۔

’’سچ بتاؤ، تم نے نہیں چاہا کہ تم اس کے پاس بیٹھے رہو۔ تم سونے کی اس مورتی کو دیکھتے رہو، اس کے پہلو میں، اس کی روشنی اور گداز میں زندگی بسر کردو...... سچ بتانا۔‘‘

’’میں نے ایسا کچھ خیال نہیں کیا۔‘‘ میں نے تلخی سی کہا، ’’حسین لوگ بھی حسین مناظر کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کی نظارگی اور دید و باز دید کے لیے کس کا جی نہیں چاہتا...... مگر تم کچھ زیادہ ہی اس سے متاثر ہو۔‘‘

’’وہ ہے ہی ایسی...... اور یہ تم کیسے نوجوان ہو۔‘‘

’’کیوں، مجھے کیسا ہونا چاہیے۔‘‘

’’تمہیں تو آہیں بھرتے ہوئی واپس آنا چاہیے تھا۔‘‘ وہ شوخی سے بولی۔

’’آدمی کو اپنے آپ کو پہچاننا چاہیے۔‘‘

’’تم...... تم کیا کسی سے کم ہو۔ میں تو زندگی بھر بیٹے کی آرزو کرتی رہی۔ دو بیٹیاں ہوئیں، ایک زندہ نہ رہ سکی، دوسری اپنے گھر کی ہوگئی اور دور چلی گئی، لیکن اگر میری کسی بیٹے کی خواہش تھی جو خداوند نے پوری نہیں کی تو وہ کوئی تمہی جیسا تھا۔‘‘ وہ افسردہ ہوگئی۔

"اوہ۔" میں نے اپنا بازو اس کے شانوں پر پھیلا دیا۔ "مجھے بھی تم اپنا بیٹا سمجھ سکتی ہو۔ مجھے بتاؤ، میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔" میں نے وارفتگی سے کہا۔ "تم جیسی ماں کسی بھی بیٹے کے لیے فخر کا باعث ہونی چاہیے۔"

اس نے میرے ہاتھ کو بوسہ دیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے۔ میں نے اس کا دھیان بٹانے کے لیے دوبارہ بینا کا ذکر چھیڑ دیا۔

"تم بینا کی بات کر رہی تھیں۔ وہ واقعی ایک شاہ کار لڑکی ہے۔"

"اور ایک بہت تنہا اور غریب لڑکی بھی۔" وہ اداسی سے بولی۔

"کیوں، ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟"

"بہت زیادہ حسین اور بہت زیادہ لائق لوگ عموماً تنہا ہو جاتے ہیں، لیکن بینا سے وقت نے مذاق بھی کم نہیں کیا ہے۔"

"ایسی کیا بات ہے؟"

"تمہیں کیا معلوم، اس کی ماں نے اپنی بیٹی کی زندگی کیسی اجیرن کی ہے۔"

"ہاں، وہ کہہ رہی تھی کہ اس کی ماں اب اس دنیا میں موجود نہیں۔" میں نے سادگی سے کہا۔

"موجود نہیں؟ ہاں، اس نے ٹھیک ہی کہا۔" امی تیکھے لہجے میں بولی۔ "اس کے لیے تو واقعی موجود نہیں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"لمبی کہانی ہے میرے بچے!" امی گرفتہ آواز میں بولی، "اس کی ماں خوب زندہ ہے اور بہت زندہ ہے لیکن اس نے سب سے رشتہ توڑ لیا ہے۔ وہ ان سب کے لیے مر چکی ہے۔"

امی نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر رائے کا ایک دوسرا گھر انگلستان میں بھی ہے، اس زمانے سے، جب ڈاکٹر انگلستان میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ ڈاکٹر کے دو بڑے بیٹوں نے بھی وہیں تعلیم حاصل کی اور دونوں گوری لڑکیوں سے شادی کر کے وہیں کے ہو رہے بعد کو ایک بیٹا امریکا میں جا بسا۔ ان کی ماں کامنی زیرِ تعلیم بچوں کی وجہ سے بیش تر انگلستان میں رہنے لگی تھی۔ یوں بھی ایک عرصے سے سارے خاندان کا کثرت سے وہاں جانا ایک معمول تھا۔ بینا سب سے چھوٹی تھی اور ابھی ابتدائی تعلیم حاصل کر رہی تھی کہ کامنی کی ملاقات کسی لارڈ سے ہوئی۔ بہت بڑی جائیداد تھی۔ دارالامرا کا رکن بھی رہا تھا۔ نوادر کا شوقین، فنونِ لطیفہ سے گہرے شغف کی وجہ سے انگلستان کے امرا میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔

کامنی بھی مصوری اور موسیقی کی دلدادہ تھی، مشرقی حسن کی مثال، اپنی بیٹی کی طرح بے حد حسین، نازک اندام عمر گزرنے کے بعد لارڈ نے شادی نہیں کی تھی۔ کامنی سے ملا تو اس کا شیدائی ہو گیا۔ کامنی کے حق میں ساری جائیداد سے دست بردار ہو گیا۔ کامنی نے ڈاکٹر کو طلاق نامہ بھجوا دیا اور لارڈ سے شادی کر لی۔ اس نے اپنے بچوں کی بھی پروا نہیں کی۔ بینا، بھائی کے گھر میں رہتی تھی۔ تعلیم کچھ مکمل کر کے کچھ ادھوری چھوڑ کے وہ اپنے نہایت تنہا باپ کے پاس واپس ہندوستان آ گئی وہ اپنے مزاج، طور اطوار میں ایک سر بہ سر ہندوستانی لڑکی ہے، اپنی ماں سے بالکل مختلف۔ اس نے ان سے ملنا ترک کر دیا۔ سنا ہے ماں کبھی کبھار انگلستان میں مقیم بیٹے سے ملنے آتی تھی۔ بینا اس کے سامنے نہیں آتی تھی۔ ہندوستان واپس آتے ہوئے وہ ماں سے مل کے بھی نہیں آئی اور اب انگلستان لوٹ جانے کا ارادہ بھی نہیں رکھتی۔ ظاہر ہے ایک ذمے دار باپ کی حیثیت سے ڈاکٹر رائے کو اس کے لیے کسی بہتر لڑکے کی تلاش ہو گی لیکن بینا نے شادی سے انکار کر دیا ہے اور اسی صورت میں شادی کی ہامی بھری ہے کہ ہونے والا شوہر اسے اس کے باپ سے جدا نہ کرے۔ وہ ایسی دل برداشتہ ہو گئی ہے کہ بہت کم کسی سے ملتی ہے۔ بس گھر میں بند رہتی ہے۔

مجسمے، تصویریں بناتی رہتی ہے یا پھر مطالعہ کرتی رہتی ہے، موسیقی سنتی ہے اور باپ کی خدمت کے موقعے ڈھونڈتی رہتی ہے۔

امی ایک مہربان اور شفیق عورت تھی۔ ڈاکٹر رائے کے خانگی حالات بتاتے ہوئے اس کا لہجہ بڑا دل گیر تھا۔ کچھ میں نے بھی دیکھا اور اندازہ کیا تھا، کچھ بینا اور ڈاکٹر نے مجھے بتایا تھا لیکن امی کی زبانی یہ سارا ماجرا سن کر میرے سینے میں جلن سی ہونے لگی۔

امی کہنے لگی کہ کسی چون و چرا کے بغیر ڈاکٹر نے دست خط کر کے طلاق نامہ کامنی کو واپس کر دیا تھا۔ امی کو حیرت تھی کہ کامنی نے ایسا کیوں کیا۔ دونوں میں بڑی یگانگت تھی۔ کامنی اپنی زندگی سے بہت مطمئن اور خوش و خرم نظر آتی تھی۔ ڈاکٹر کا بڑا خیال رکھتی تھی اور ڈاکٹر بھی اس کا دم بھرتے تھے۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی کہ ڈاکٹر کا تعلق جدی پشتی امیر کبیر گھرانے سے ہے۔ وہ شروع ہی سے غیر معمولی ذہین طالب علم تھے۔ مختلف امراض اور دواؤں پر ان کے تحقیقی کام سے گورے بہت متاثر ہوئے تھے اور انگلستان کے کئی علمی اور تحقیقی اداروں نے انہیں اعلیٰ ترین اعزازات سے نوازا تھا۔ گورے انہیں وہیں روکنا چاہتے تھے۔ کہتے ہیں، بڑی بڑی پیش کش کی گئیں، لیکن ڈاکٹر وطن لوٹ آئے۔ پہلے سال دلی میں، چند سال کلکتے میں رہے پھر یہاں پٹنے میں انہیں اسپتال کا نگراں بنا دیا گیا اور اب وہ یہیں کے ہو رہے۔ یہاں انہوں نے بڑی تبدیلیاں کیں، اضافے کیے۔ بہت خاندانی زمینیں اور جاگیریں ہیں ان کے پاس۔ ایک چھوٹا بھائی تھا، سیاحت کا شوقین اور بہت بے قرار، ڈاکٹر سے بالکل مختلف۔ پختہ عمر ہو گئی تھی اور شادی نہیں کی تھی۔ سیام میں شاہی خاندان کی کسی تھائی لڑکی سے گہری دوستی ہو گئی تھی۔ دونوں شادی پر آمادہ تھے، ایک روز کشتی الٹ جانے سے دریا میں ڈوب گئے۔ ڈاکٹر کو زمینوں، جاگیروں سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی..... قریبی رشتے دار اور معتمد کارندے دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ڈاکٹر تو وہاں جاتے ہی نہیں۔ بہت بلاوے پر کہیں طبی کانفرنسوں میں شرکت کے لیے سفر کرتے ہیں اور زیرِ علاج مریضوں کے خیال سے جلد واپس آ جاتے ہیں۔ درپردہ بے شمار غریب مریضوں کی اعانت ان کا معمول ہے۔ بیوی سے علیحدگی کے بعد انگلستان نہیں گئے۔ علاج معالجہ، کالج میں تدریس، گھر میں مطالعہ اور بیٹی کی دیکھ بھال ان کے روز و شب ہیں۔ ڈاکٹری کی اس ملازمت کی تو انہیں ضرورت ہی نہیں۔ یہ تو ان کا شوق ہے، یہ مشغلہ تو وہ کسی فرض کے طور پر انجام دیتے ہیں۔ دونوں بیٹوں سے انہوں نے کنارہ کر لیا ہے۔ اب ان کے خاندان میں اگر کوئی ہے تو ان کی بیٹی بینا، اور بینا کا اگر کوئی ہے تو اس کا باپ ڈاکٹر رائے۔

امی بہت عرصے سے ڈاکٹر سے وابستہ ہے اور خوب ان کی زندگی سے آشنا اور تیور شناس ہے۔ کلکتے کے اسپتال سے وہ امی کو پٹنا لے آئے تھے۔ یہاں اسپتال میں پیچیدہ مریضوں کے لیے وہ امی کا انتخاب کرتے ہیں۔ اسپتال میں امی ان کی ایک لائق اور فرض شناس نرس ہے۔ جب وہ ان کے گھر جاتی ہے تو کسی معزز رشتے دار اور دوست کی حیثیت کا رتبہ دیا جاتا ہے۔ کبھی دوپہر کبھی رات کے کھانے میں شریک کیے بغیر ڈاکٹر اور اس کی بیٹی بینا، امی کو واپس آنے نہیں دیتے۔ چھٹی کے دن امی باورچی خانے کا انتظام سنبھال لیتی ہے اور باپ بیٹی کو اپنے ہاتھ کا کھانا کھلاتی ہے۔

وقت کا احساس نہ اسے تھا، نہ مجھے، مگر ہر پہر اپنا سفر مکمل کرتا ہے۔ رات بھی دھیرے دھیرے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ہر پہر کا انجام فنا ہے۔ روز رات مرتی ہے، روز دن مر جاتا ہے، روز رات نمودار ہوتی ہے، اور دن طلوع ہو جاتا ہے۔ ہر

رات نئی رات، ہر دن نیا دن ہوتا ہے۔ آدمی وہی پرانا ہوتا ہے۔ ان پہروں اور موسموں کے طلوع وغروب ہی سے وقت کے پیمانے یا گھڑی کی ایجاد ممکن ... ہوئی ہوگی۔ ایک ہی پہر رہتا، یا ایک ہی موسم تو آدمی ماہ وسال کے اعداد وشمار کے فریب سے دوچار نہ رہتا۔ کسی لمحے امی کی نظر گھڑی پر گئی ہوگی کہ وہ چونک پڑی اور اس نے معذرت چاہی کہ اپنی رو میں جانے کیا کیا دکھڑے، داستانیں لے کے بیٹھ گئی، اس کی یاوہ گوئی مجھے ناگوار خاطر ہونی چاہیے۔ میں نے شدت سے تردید کی کہ میں تو کسی رخنہ اندازی کے خیال سے خاموش رہا ہوں، ایک ہمہ صفت شخص کا احوال دروں جاننے کی جست جو میں۔ ڈاکٹر رائے کا ذکر امی کا جتنا پسندیدہ موضوع ہے، میرے لیے بھی سردست اشتیاق واضطراب کا باعث ہے۔ مجھے تو خلش ہے کہ یہ سارا کچھ میں پہلے کیوں نہ جان سکا۔ ڈاکٹر میرے محسن ہیں اور محبوب بھی۔ انہوں نے جس انہماک سے بُخل کا علاج کیا ہے اور اس شہر میں میرے آنے کے بعد پیش آنے والے پے در پے سنگین واقعات پر، جس میں میرا نام بہر حال ملوث ہے، بل کہ بنائے فساد ہے، ان کا تحمل، ان کی بردباری میرے لیے پہلے ہی ایک ناقابل یقین واقعہ ہے، لیکن جتنا کچھ میں نے یہاں، اسپتال میں اور ان کے گھر جا کے دیکھا اور سمجھا ہے اور اب جتنا کچھ میں نے امی سے سنا اور جانا ہے، مجھے احساس ہو رہا ہے، ڈاکٹر کے لیے واجب مرتبت اور منزلت کے اظہار میں مجھ سے کوتاہی ہوئی ہے۔

امی چپ ہوگئی تھی۔ اس نے مجھے بستر پر لیٹ جانے اور آرام کرنے کی ہدایت کی۔ میں اس کے پاس صوفے پر بیٹھا رہا، پھر امی کی وجہ سے کہ اس عمر گزیدہ کو بھی آرام کا کچھ وقت مل جائے، بستر پر آ کے دراز ہوگیا۔ ڈاکٹر رائے کا وہ آخری کلمہ میرے کانوں میں پیوست ہوگیا تھا۔ مجھے ہر جانب اسی کی گونج سنائی دیتی تھی اور اپنی سماعت پر بار بار شبہ ہوتا تھا۔ ایک بار اپنے خلط حواس میں مجھے یہ بے جواز بدگمانی بھی ہوئی کہ امی ڈاکٹر رائے کی وکالت تو نہیں کر رہی، جیسے وہ مجھے کچھ جتانا چاہتی ہو اور اسے معلوم ہو کہ ڈاکٹر رائے نے اپنے گھر سے وداع کرتے وقت مجھ سے کیا کہا ہے۔ دوسرے لمحے اپنی بے لگامی اور بدحواسی پر مجھے شرم ساری بھی بہت ہوئی۔ امی تو ایک سادہ ومعصوم اور مشفق خاتون ہے۔ ڈاکٹر کی روداد بیان کرتے ہوئے اس کے لہجے میں کرب وسوز شامل تھا، جو کسی شامل شخص ہی میں ہوتا ہے۔ بے شک ڈاکٹر رائے اس کے لیے کسی دیوتا کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ایسے ہی کوئی کسی کا دیوتا نہیں بن جاتا، بہت شہادتوں اور دلیلوں کے بعد پرستش کا یہ مقام آتا ہے۔

بستر پر آ کے میرے جسم وجاں میں تلاطم سا برپا ہوگیا۔ بستر آدمی کو آرام پہنچاتا ہے تو ہلکان بھی کم نہیں کرتا کہ پھر تو بہت سے روزن کھل جاتے ہیں اور روزنوں سے طرح طرح کے حشرات امڈ آتے ہیں۔ آنکھیں بند نہیں ہو پاتی تھیں۔ آنکھیں بند کرتے ہوئے آدمی کو بھی بہت ڈر لگتا ہے۔ کھلی آنکھوں سے نظر آنے والے اشیا وموجودات کوئی رکاوٹ بنے رہتے ہیں۔ بند آنکھوں سے آدمی خود اپنے سامنے آجاتا، اپنے آپ سے نبرد آزما ہو جاتا ہے۔ میں نے اپنی باگیں کھینچے رکھنے کی بڑی کوشش کی، لیکن چھوٹ چھوٹ جاتی تھیں۔ امی بھی جاگ رہی تھی۔ دیر تک مجھے کروٹیں بدلتے دیکھ کر میرے سرہانے آگئی۔ ''نیند نہیں آرہی میرے بچے؟'' اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

میں نے بے چارگی سے سر ہلا دیا۔

''اسی کے متعلق سوچ رہے ہو؟''

''کس کے؟'' میں کھسیا سا گیا۔

''اسی کے۔'' وہ مسکرا کے بولی۔ ''یاد آرہی ہے نا؟''

میرے جی میں آئی، اسے پرے دھکیل دوں۔

"میں جانتی ہوں۔" وہ آنکھیں میچ کے بولی۔ "لیکن نہیں......" یکایک اس کی آواز بھاری ہوگئی۔ "وہ بہت دور کھڑی ہے۔ نہیں پہنچ سکتے تم اس کے پاس۔ بہت فاصلہ ہے درمیان میں، بہ تر ہے، کوئی دیا نہ جلاؤ......اور......" وہ میرے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگی۔ "بہ تر ہے، اچھے بچوں کی طرح سو جاؤ۔"

"کیا کہہ رہی ہو تم؟" میں نے ناتوانی سے کہا۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ وہ کیا سمجھ رہی ہے۔؟

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں...... میں سمجھتی ہوں۔" اس نے میرے گال پر ہلکا سا طمانچہ مارا۔ "مجھ پر بھی تو تمہارے جیسے دن آئے ہوں گے نا کبھی۔"

امی مجھے اور منتشر کر رہی تھی۔ اس کی کسی بات کا جواب دینے اور تکرار کرنے کے بجائے خاموشی ہی مناسب تھی۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ پہلے کی طرح وہ میرے بالوں میں انگلیاں الجھاتی رہی اور میری پیشانی کا بوسہ دے کے چپکے سے اٹھ گئی۔

آدمی کے سرے بکھر جائیں تو بہت ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ ہجوم میں جیسے کوئی بچھڑ جائے، کبھی آدمی اپنے آپ سے بھی بچھڑ جاتا ہے اور خود کو تلاش کرتا رہتا ہے اور ڈھونڈ بھی لیتا ہے تو اپنا سامنا نہیں کر پاتا۔ میری حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ بہت سے سوال و جواب تو مجھے خود سے کرنے اور خود کو دینے تھے۔ میں امی کو کیا مطمئن کر پاتا۔

مجھے دروازے کھلنے اور بند ہو جانے کی آواز آئی۔ میں نے نہیں دیکھا، مگر شاید امی پہلو میں، نرسوں کے لیے مخصوص کمرے میں چلی گئی تھی۔ اس کی ناموجودی سے جانے کیوں کچھ سکون سا ہوا۔ ہر چند رگوں میں چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں اور آنکھوں میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے جیسے کوئی سرا ہاتھ آجائے، کسی سوال کا جواب مل جائے، رات کے آخری پہر میں کہیں مجھے لگا، میں گم گشتہ خود کو نظر آگیا ہوں۔

یقیناً ڈاکٹر رائے نے وہی کہا تھا جو میں نے سنا تھا۔ ڈاکٹر پوری طرح اپنے حواس میں تھا۔ کچھ دیر پہلے اس نے گھر آنے والے پولیس افسر سے گفت گو کی تھی اور میرے بارے میں کچھ اچھی باتیں نہیں سنی تھیں، پھر اس نے مجھ سے تہدیدی و تنبیہی لب و لہجے میں بحث کی تھی اور میری صراحتیں تحمل سے سنی تھیں، وہ نہایت متوازن باتیں کرتا رہا تھا۔ کوئی ابہام نہیں تھا اس کے کلام میں۔ اپنا مدعا بیان کرنے سے پہلے اس نے تمام تر سیاق و سباق کا خیال رکھا تھا اور اس نے مجھے کوئی حکم نہیں دیا تھا، محض ایک امکان ظاہر کیا تھا۔ اس نے پوری نازکی برتی تھی۔ یہی ایک تشبیہی، اشارتی سا قرینہ ہوتا ہے ایسے موضوع پر لب کشائی کا۔ ایک دانش مند، ہر اعتبار سے مکمل، ایک جہاں شناس شخص کی جانب سے ایسی کسی خواہش کا اظہار اچھی طرح عواقب و نتائج پر غور کر کے ہی کیا جا سکتا ہے۔ یہ اس کی عزیز از جاں بیٹی کا معاملہ تھا۔ اس بیٹی کا جو اس کی زندگی کا حاصل ہے۔ سب کچھ بکھر جانے اور لٹ جانے کے بعد اس کے لیے بچی کچی کائنات کے مانند ہے۔ نہ وہ رندی و سرمستی کی کسی کیفیت سے دوچار تھا، نہ میرے اس کے درمیان بے حجابی و بذلہ سنجی کی کوئی رسم و راہ تھی اور ایسی باتوں کا تعلق تو زندگیوں سے ہے۔ زندگی کے اتنے اہم فیصلوں میں یہ شوخیاں نہیں کی جاتیں۔

میرے اس کے مراسم کو دن ہی کتنے ہوئے تھے، ٹھیک سے ہفتہ بھر بھی نہیں۔ اس مختصر دورانیے میں جس بے سروپائی، بے دردی، بے دادگری میں روز و شب گزرے تھے، بے شک مجھے قریب سے جاننے بوجھنے کا اسے موقع مل گیا تھا۔ ادھر اس کے سامنے اپنے مزاج، اپنی روش کی بیٹی تھی، عام لڑکیوں سے یک سر مختلف، پھر شاید کچھ یوں ہوا کہ حجت بسیار کے بعد ڈاکٹر کو اپنی بیٹی اور مجھ ایک خاک بسر، آشفتہ سر کے درمیاں کسی تار و پود کی کوئی صورت دکھائی دے گئی۔

وہ ایک سراپا تمکنت، سرتاپا رعنائی، چہرہ ماہ تاب، بدن کندن، نقش و نگار تراشیدہ، کوئی حسین و جمیل لڑکی کچھ ایسی ہی ہو سکتی ہے اور حسن و جمال کی خوبیاں تو خلقی ہیں۔ خیال کی افراط، ذہانت و فطانت کے اوصاف خداوندی عطیہ ہیں، مگر آدمی ان پر کس قدر داد طلب ہو، ناز تو ان اوصاف پر ہونا چاہیے جو اپنی جست جو، مساعی اور ریاضت کا ثمر ہوں۔ ڈاکٹر رائے کی صاحبِ کمال بیٹی بینا کو اپنی بیش از بیش خلقی صفات کا احساس کچھ زیادہ ہی تھا کہ اس نے اس کی بالیدگی اور افزائش کا ہر جتن کیا تھا۔ وہ پری زاد آسمانی حسن سے آراستہ نہ ہوتی تو بھی علم و فکر، ہنر و فن، نفاست و شائستگی کی اکتسابی اور ارادی خوبیوں میں یک تا و یگانہ تھی۔

تو پھر استرداد کا کیا محل، تردید کا کیا جواز ہے۔ سامنے کون ہیں، دانائے دہر، دانش سرشت، فکر پیشہ، مسیحا نفس، عالی مقام ڈاکٹر رائے اور ان کی نادرہ کار، نادر روزگار بیٹی بینا! کس میں استقامت ہے جو ڈاکٹر رائے کی عزت مآب گھرانے سے وابستگی میں سرتابی کا ارتکاب کرے۔ لازم ہے کہ بیٹی کے اشارہ و عندیہ کے بغیر باپ کو اس قلندری کی جرأت نہیں ہونی چاہیے، تو پھر یہ تصور ہی کیسا جاں گداز ہے کہ ایسا کوئی ریشم و شبنم، شیشہ و شعلہ، گل اندام، ایسا کوئی گلستاں مثال، آمادۂ لطف و نشاط ہے۔ ڈاکٹر رائے اور اس کی بیٹی کا کسی ناآشنا، بے نشاں پر یہ خسروانہ التفات ایک عز و شرت ہے۔ پھر وہ خوش کام و خوش انجام کسی اور کوچے کا رخ کیوں کرے، خود کو پھولوں اور رنگوں کی نذر کیوں نہ کردے۔ آدمی وہیں تمام کیوں نہ ہو جائے۔

رات کے آخری پہر کسی لمحے مجھے نیند آگئی۔ سنا ہے، کسی ارادے کی توانائی نصیب ہو جائے تو نیند آجاتی ہے۔ ارادے کی نوعیت چاہے کیسی کیوں نہ ہو، ارادہ بڑی راحت ہے۔ ہیجان و اضطراب کے ایک گرداب کے بعد مجھے جیسے کوئی کنارہ نظر آگیا۔ میرا ارادہ استوار ہو گیا تھا۔ کمرے میں امی کس وقت واپس آئی، مجھے خبر نہ ہو سکی۔

صبح ابھی اندھیرا ٹوٹ رہا تھا کہ راہ داری میں خاک روبوں کی چہل پہل سے آنکھ کھل گئی۔ پہلے میری نگاہ بٹھل کے بستر پر گئی، وہاں خاموشی تھی، پھر دروازے کے قریب آرام کرسی پر نیم دراز بیگانۂ ہوش امی نظر آگئی۔ میں نے بھی پھر آنکھیں موند لیں، لیکن آدھ گھنٹا نہیں گزرا ہوگا کہ کمرے میں در آنے والا اجالا پھیلتا گیا۔ پھر نیند نہیں آئی۔ امی بھی جاگ گئی تھی۔ اس نے دروازہ کھول دیا اور کھڑکیوں کے پردے ایک طرف سمیٹ دیے۔ ملحق غسل خانے میں منہ ہاتھ دھو کے میں کمرے سے باہر آگیا۔ دن رات کا کوئی پہر صبح سے بہ تر نہیں ہوتا۔ دنیا بدلی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ تازہ تازہ، جیسے آج ہی وجود میں آئی ہو۔ آدمی کیا، پرندوں کو بھی صبح بہت مرغوب ہے، کیسے ناچنے، گانے، اترانے لگتے ہیں۔ کاش ایک پہر ہی ہوا کرتا، مگر صبح کی لطافت دوسرے پہروں سے ممیز کس طرح ہو پاتی، اندھیرے ہی سے روشنی کا مرتبہ ہے۔

امی نے کسی خدمت گار سے چائے منگوالی تھی۔ راہ داری میں کرسی اور میز ڈلوا کے اس نے اپنے ہاتھ سے میرے لیے چائے بنائی اور خود چند گھونٹ پی کے واپس کمرے میں چلی گئی اور دروازہ بند کرلیا۔ اس کا مطلب تھا کہ اب مجھے اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ صبح سویرے وہ زیادہ فعال ہو جاتی تھی۔ ڈاکٹر کے آنے سے پہلے اسے بہت سے کام کرنے ہوتے تھے۔ حرارت، خون کے دباؤ اور نبض کی رفتار کی جانچ پڑتال اور مریض کے کیفیت نامے میں خانہ پری، مریض کے لباس کی تبدیلی، ناشتا کرانا، دواؤں کی خوراک دینا وغیرہ۔

اتنے دنوں میں میں بھی اسپتال ہی کا کوئی آدمی بن گیا تھا۔ اسپتال کے بھی اپنے صبح وشام ہوتے ہیں، باقی دنیا سے الگ تھلگ۔ اسپتال اور قید خانے میں بڑی مماثلت ہے، وہاں جیلر ہوتا ہے، یہاں ڈاکٹر، وہی نظم وضبط، وہی ان کا گشت، وہی پابندیاں۔ یہاں مریض بھی کسی زندانی کی طرح ہوتا ہے۔ میں نے سات سال کاٹے تھے، بٹھل نے بھی جانے کتنی زندگی قید خانوں میں گزار دی تھی۔ اسے اپنی مرضی ومنشا ترک کردینے کی عادت تھی، حالاں کہ زندانی ہونے کے باوجود جیل میں ایک طرح اس کی عمل داری ہوتی تھی۔ یہاں تو وہ کسی محتاج کے مانند ہوگیا تھا۔ قید خانے سے اسپتال کی سزا زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے۔ آدمی آزاد ہے بھی، نہیں بھی۔

ٹھیک آٹھ بجے سیورین آگئی۔ اودی رنگت کے کڑھے ہوئے کرتے، تنگ مہری کے سفید پاجامے اور سفید دوپٹے میں ملبوس۔ نوشگفتہ، کھلی کھلی سی، مسکراتی، لہراتی ہوئی اور کسی قدر گھبرائی گھبرائی سی۔ عقب میں اسپتال کا نوعمر ملازم، توشیدان اٹھائے ہوئے تھا۔ آج وہ کچھ پہلے ہی چلے آئی تھی۔ لگتا تھا، بس صبح ہونے کی منتظر تھی۔ اسے دیکھ کے مجھے اپنے ہی گھر کی کسی لڑکی کا گمان ہوا، شاید اس لیے کہ وہ زریں، فرخ، فریال، سلمیٰ اور نیسان ایسا لباس پہنے ہوئی تھی۔ ڈاکٹر رائے کسی وقت بھی معمول کی گشت پر آسکتا تھا۔ ادھر سیورین ناشتا ٹھنڈا ہوجانے کے اندیشے میں ہلکان نظر آتی تھی۔ اس وحشت کی ایک وجہ یہ بھی ہوگی کہ ہر تخلیق کار کو اپنی تخلیق کی داد طلبی کی بے کلی ہوتی ہے۔ ہنر مند ایمی نے اس کا حل یہ ڈھونڈا کہ وارڈ بوائے کو بھیج کر ڈاکٹر کی نقل وحرکت کا سراغ لگایا، پھر اس اطمینان کے بعد کے ڈاکٹر کے آنے میں کچھ وقت لگنا چاہیے۔ میز پر ناشتا سجا دیا گیا، مجھے اندازہ تھا کہ سیورین نے کیا کیا اہتمام کیا ہوگا۔ رات کو سو بھی سکی، یا نہیں۔ بالشت بھر کی چھوٹی چھوٹی پوریاں، سبھی ایک پیمائش کی، ہلکی ہلکی تلی ہوئی، چنے، آلو، پالک اور پنیر ترکاریاں، مختلف کچی سبزیوں کی قاشیں، ٹوسٹ، مکھن اور شہد، ولایتی قسم کا سیبوں کا میٹھا اور جانے کیا...... وارڈ بوائے چائے لے آیا۔

میرے انکار کے باوجود سیورین کے اشارے پر ایمی بار بار میری تشتری بھرتی رہی۔ میں نے کچھ شکم سیری کی، کچھ وضع نبھائی۔ کچھ مجھے اس تکلف پر خفت بھی بہت ہورہی تھی۔ میری پسندیدگی کے اظہار پر سیورین کے رخساروں کی چمک دیدنی تھی۔ لوگ ایک دوسرے سے شدید نفرت کرتے ہیں تو انہیں ایک دوسرے سے محبت کرنی بھی کم نہیں آتی، اور اس میں عرصہ، وقت اور کسی ایثار و احسان کی بھی شرط نہیں، بس آدمی کو آدمی اچھا لگنا چاہیے، آدمی کو آدمی کی قدر ہونی چاہیے۔ اس کی مجبوری، محرومی اور ضرورت کا احساس، اور آدمی کا دل کشادہ ہونا چاہیے۔ کہتے ہیں، نفرت بخل ہے، محبت سخاوت اور آدمی کا شرف۔

اچھا ہوا جو وارڈ بوائے نے لپکتے جھپکتے آکے ڈاکٹر رائے کے آنے کی اطلاع دی اور سیورین اور ایمی کی خاطر داریوں پر بندش لگی۔ میں نے بھی ان کا ہاتھ بٹانا چاہا تھا۔ انہوں نے گوارا نہیں کیا اور خود ہی لمحوں میں میز صاف کردی اور ناشتے کی کوئی نشانی میز پر باقی نہ رہنے دی۔

روز کی طرح تروتازہ ڈاکٹر رائے دو ڈاکٹروں اور ایک نرس کے ہم راہ تیز قدموں سے کمرے میں داخل ہوا۔ شاید پہلی نظر مجھی پر گئی اور اس کے ہونٹوں پر شائستہ مسکراہٹ کوندگئی۔ اس ایک لمحے میں میرا سارا وجود دھڑک اٹھا۔ دوسرے لمحے وہ قدم بڑھا چکا تھا، لیکن یکا یک درمیان میں ٹھیر گیا اور سر گھماتے ہوئے چونکتی آواز میں بولا۔ ”دیسی قسم کا ناشتا! یہاں اسپتال میں تو نہیں بنتا۔“

سیورین ابھی تک گھر کے لباس میں تھی، وہ تو جھمرا گئی۔ ایمی نے سامنے آکے جھجکتے ہوئے پردہ

پوشی کی کہ سیورین اس کے لیے کچھ گھر سے بنا کے لائی تھی۔

ڈاکٹر نے آنکھیں چڑھا کے سر ہلایا۔ ایک ناگواری چہرے پر ہویدا ہوئی اور وہ آگے چلا گیا۔ بٹھل کے پاس جاکے وہ اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ میں نے اس کے قریب جانے سے دانستہ گریز کیا۔ اور اپنی جگہ کھڑا رہا۔ ڈاکٹر نے بٹھل کی کیفیت نامے پر ایک نظر ڈالی اور اپنے ساتھی ڈاکٹروں سے سرگوشیوں میں مشورے کرتا رہا۔ بٹھل جاگ گیا تھا یا پہلے سے جاگا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کے شانے پر مکا مارتے ہوئے مربیانہ اور مشفقانہ انداز میں حال پوچھا۔ بٹھل نے ہلکی آواز میں کیا جواب دیا تھا کہ بے ساختہ ڈاکٹر کا قہقہہ بلند ہوا۔ دوسرے ڈاکٹر بھی مسکرا اٹھے۔ اس سے پہلے کہ گذشتہ مرتبہ کی طرح ڈاکٹر رائے مجھے کمرے سے نکل جانے کا حکم صادر کرے، میں نے خود ہی کمرے سے نکل جانا مناسب سمجھا۔ باہر آکے مجھے ندامت وملامت کے احساس نے آگھیرا۔ اس طرح میرے چلے آنے کا کیا جواز ہے، صرف اتنا نہیں کہ میں نے خود کو وہاں غیر ضروری جانا، یا جلد، یا بدیر ڈاکٹر کو میری موجودی ناپسند ہوتی، اس کے حکم کے بغیر میرے باہر آجانے کی یہی ایک وجہ ہوسکتی ہے کہ ڈاکٹر سے نظریں ملانے کی مجھے تاب نہیں ہے، اس کا سامنا کرتے ہوئے کوئی ہچکچاہٹ ہورہی ہے مجھے، لیکن یہ گریز واجتناب تو میرے استوار کیے ہوئے ارادے کے منافی ہے۔ اس اعتراف وتلقین کے باوجود کمرے میں واپس جانے کی ہمت نہ ہوسکی۔ راہ داری میں کمرے کے پہلو میں رکھی ہوئی کرسی پر میں کسی دربان کی مانند بیٹھ گیا اور دیر ہوگئی۔

آج کمرے کا دروازہ بند نہیں کیا گیا تھا۔ اندر سے آنے والی تیز آوازوں پر یک بارگی مجھے اٹھنا پڑا اور میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ ایک طرف نرس ایمی، دوسری طرف ڈاکٹر کے ساتھ آنے والی نرس کا ہاتھ تھامے بٹھل اپنے پیروں سے چلتا ہوا باہر کی جانب آرہا تھا۔ تینوں ڈاکٹر اس کے پیچھے تھے اور حوصلہ افزائی کررہے تھے۔ بٹھل نے کمرے کا دروازہ بھی عبور کرلیا اور باہر آکے اس نے دونوں نرسوں سے اپنے ہاتھ چھڑا لیے اور خود اپنے سہارے دائیں طرف بڑھنا شروع کیا۔ ڈاکٹر تالیاں بجانے لگے۔ بٹھل کے پیروں میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی اور جسم بھی ڈگمگا گیا تھا، لیکن وہ گرا نہیں۔ دونوں نرسیں اس کے جسم سے تقریباً چپکی ہوئی ساتھ تھیں۔ ڈاکٹروں کی آنکھوں سے خوشی جھلک رہی تھی۔ چند قدموں کا فاصلہ بٹھل نے خود طے کرلیا تھا۔ وہ اور آگے جانا چاہتا تھا کہ ایک ڈاکٹر نے آگے جاکے اسے روک دیا۔ بٹھل واپس بھی اپنے بل پر آیا اور کمرے کے دروازے پر رکھی جس کرسی پر کچھ دیر پہلے میں بیٹھا ہوا تھا، وہیں ٹھیر کے اس نے بیٹھ جانے کی خواہش کی۔ نرس ایمی نے اس کا بازو تھاما، مگر وہ اپنے آپ ہی کرسی پر بیٹھا تھا۔ تھکن کی ایسی بات نہیں ہوگی، اتنے دنوں تک کمرے کے در و دیوار سے دور ہوکے کھلی جگہ اسے اچھی لگ رہی ہوگی۔ راہ داری کے آگے سبزہ زار تھا، کیاریوں میں رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔ سبزہ زار کے اس پار درخت تھے اور پرندے پھدک رہے، چہچہا رہے تھے۔ کچھ فاصلے پر میں بھی وہاں موجود تھا۔ مجھے دیکھ کے اس نے ایک گہری سانس لی۔ سارے لوگ، ڈاکٹر، نرسیں، سبھی اس کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے تھے۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ کس طرح ڈاکٹر رائے سے احسان مندی کا اظہار کروں، ایمی اور سیورین سے کیا کہوں اور بٹھل کو کیا تسلی دوں۔ میں تو سب کچھ بھول ہی گیا تھا۔ میرا جسم بے وزن ہوگیا تھا۔

ڈاکٹر رائے، ساتھی ڈاکٹروں کے پاس سے ہٹ کے میرے پاس آگیا۔ میں سوچتا رہ گیا۔ اس

کے ہاتھ چوموں، سینے سے لگالوں، یا اس کے پیر پکڑ لوں۔ ڈاکٹر نے میری بھری ہوئی آنکھوں میں ضرور کچھ دیکھ لیا تھا کہ میرے سامنے آکے کھڑا ہو گیا اور مضطرب نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔ ''ٹھیک ہے استاد؟'' چند ثانیوں کے توقف کے بعد اس نے ہندستانی میں کہا۔ اس کی آواز میں رعب، افتخار اور مسرت کا آمیزہ تھا۔

میں نے جھک کے اس کے پیر چھونے چاہے کہ اس نے مستعدی سے میرے شانے پکڑ لیے اور اپنے ساتھی ڈاکٹروں کو اشارہ کیا۔ میرا خیال تھا، ابھی وہ ٹھیرے گا، مجھ سے کوئی بات کرے گا، لیکن جیسے میں تو بس ایک مریض کا نگہدار تھا، گذشتہ رات میں اس کے گھر گیا ہی نہیں تھا اور اس نے مجھ سے کچھ کہا سنا ہی نہ تھا۔ میرے آگے سے ہٹ کے اس نے ایمی اور سیورین کو کچھ ہدایات دیں اور بٹھل کا بازو تھپتھپا کے واپس جانے کا ارادہ کیا۔ بٹھل اٹھنا چاہتا تھا کہ ڈاکٹر نے اس کے گھٹنوں پر زور دے کے اسے بیٹھا رہنے دیا اور چل پڑا۔ جاتے جاتے مڑ کے بولا ''وقت ملے تو ادھر آنا میرے پاس۔'' اس بار اس نے مجھے انگریزی میں مخاطب کیا اور تذبذب سے بولا، ''یا پھر میں خود ہی بلالوں گا، اگر فرصت ملی۔'' پلک جھپکنے کی مہلت میں وہ دور ہو گیا۔

سیورین اور ایمی بٹھل کے پاس کھڑی رہیں۔ انہوں نے اسے کمرے میں واپس لے جانا چاہا، لیکن بٹھل کے منع کرنے پر انہوں نے اصرار بھی نہیں کیا۔ ڈاکٹر نے انہیں ایسی کوئی تاکید نہیں کی ہوگی کہ وہ زیادہ تشویش کرتیں۔ ایمی نے خدمت گار سے کہہ کے وہیں ایک اور کرسی رکھوادی اور کمرے میں جا کے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ سیورین بھی لباس کی تبدیلی کے لیے ملحق کمرے میں چلی گئی۔ بٹھل اور میں وہاں اکیلے رہ گئے اور میں دزدیدہ نظروں سے اس کی صورت دیکھا کیا۔

''کیسا ہے رے؟'' اس نے بدبداتی آواز پوچھا۔

''میں...... میں ٹھیک ہوں بالکل۔'' میرا اکڑ گیا اور زبان لڑکھڑانے لگی۔ ''تم...... تم بتاؤ ہوا ب؟''

اس نے جواب دینے میں تامل کیا، پھر بولا ''کتنے دن ہو گئے؟''

''زیادہ نہیں۔'' میں نے بہ عجلت کہا، ''یہی چار پانچ دن سمجھو، چھ دن۔''

اس کے ہونٹ پھیل گئے اور وہ سر ہلا کے گیا۔

''اب کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہی ہے۔ اچھا ہوا جو ہم یہاں آگئے۔'' اپنی آواز قابو میں ر مجھے مشکل ہو رہا تھا۔ وہ مجھ سے مخاطب تھا، میں بات کا جواب دے سکتا تھا۔ مجھے تو یقین ہی نہ آرہا تھا۔

''خط، تار وار تو نہیں دیا کہیں کو؟'' اس بوجھل آواز میں پوچھا۔

''نہیں۔'' اس کے استفسار پر پہلا خیال زریں کا آیا تھا، اس لیے میں نے انکار کر دیا تھا، میں نے تردید کی۔ ''کلکتے تار دیا تھا جامو بھائی جرو کو بلانے کے لیے۔ انہیں آجانا چاہیے تھا، تک۔''

''کیوں دیا رے۔'' وہ اداسی سے بولا۔

میں اسے کیا بتاتا کہ اس کی بیماری کے ان دنوں میں کیا کچھ ہوتا رہا ہے...... پانچ آدمیوں کا خون ہو چکا ہے۔ سارا شہر ہی متاثر ہوا ہے، میں بس اتفاق سے اس کے پاس موجود ہوں۔ ڈاکٹر رائے پولیس کے آڑے نہ آجاتا تو میں پولیس تحویل میں ہوتا، اور جانے پھر کیا ہوتا۔ میں کہا، ''اکیلا لگ رہا تھا میں خود کو۔''

اس نے ہنکاری بھری اور کچھ نہیں بولا۔

''معلوم نہیں، کیوں نہیں آسکے وہ۔ یہ تو ممکن نہیں کہ تار نہ پہنچا ہو۔ جانے کیا بات ہے؟'' میں نے اسے نہیں بتایا کہ ایک کے بجائے دو تار دیے گئے تھے، اور وہ بھی ارجنٹ۔

اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور پژمردگی سے بولا، ''ابھی اور کتنے دن کا بولتے ہیں ڈاکٹر لوگ؟''

''کوئی بات نہیں ہوئی ابھی، لیکن یہ اسپتال اچھا ہے، ڈاکٹر، نرسیں، سبھی لوگ بہت ذمے دار ہیں۔ اور کچھ دن لگ جائیں تو کیا فرق پڑے گا۔'' میں نے عمداً سرسری طور پر کہا۔

''جگہ تو بڑی ہریالی ہے۔'' ادھر ادھر نظریں گھماتے ہوئے اس نے میری تائید کی۔

''یہ اسپتال کا سب سے خوب صورت حصہ ہے، الگ تھلگ بھی اور اسپتال میں شامل بھی۔ بہت بڑے بڑے لوگوں کو کمرے ملتے ہیں ایسے، گورے، بڑے افسروں اور پیسے والوں کو۔ وہ تو ڈاکٹر نے مہربانی کی۔ کسی جان پہچان، صاحب سلامت کے بغیر ہمیں ادھر جگہ دے دی اور پھر کیسا خیال رکھا، جیسے ہم ان کے کوئی عزیز ہوں۔ کیا کیا بتاؤں تمہیں، اپنے ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر رائے کے بارے میں......''

وہ سر اٹھائے سنتا رہا اور جانے کیا بڑبڑانے لگا۔ میں کچھ سمجھ نہیں پایا۔

اسی لمحے ایمی آکے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میں سفید کپڑے سے ڈھکی ایک مختصر ٹرے تھی۔ ٹرے میں فنجان اور گلاس دیکھ کر بٹھل نے منہ پھیر لیا، مگر ایمی کا انداز نہایت معذرت خواہانہ تھا۔ چہرے پر مادرانہ شفقت چھائی ہوئی تھی۔ شفقت بھی کبھی کیسی گراں گزرتی ہے۔ بٹھل نے فنجان جھٹ ٹرے سے اچک کے حلق میں انڈیل لیا۔ ایمی نے پانی بھرا گلاس بڑھایا تو ایک ہی سانس میں اس نے گلاس بھی خالی کر دیا۔ ایمی شکریہ ادا کر کے چلی گئی۔ بٹھل نے منہ بنا کے میرے گھٹنے پر آہستہ سے ٹھوکا دیا۔ ''بیڑی مل جاوے گی ادھری؟''

''بیڑی؟'' میں چونک پڑا۔

''ہاں رے بیڑی، کبھی دیکھی نہیں؟'' وہ تلخی سے بولا۔

''دیکھی ہے، بہت دیکھی ہے۔'' میں نے زچ ہو کے کہا، ''پر نہ پیو تو اچھا ہے۔ مجھے نرس ایمی سے پوچھنا پڑے گا۔'' میں نے کمرے میں موجود ایمی کے پاس جانے کے لیے اٹھنا چاہا۔ میں نے سوچا تھا، ایمی سے کہہ کے منع کرا دوں گا۔ بیڑی سے کھانسی ہو سکتی ہے۔

''رہنے دے۔'' اس نے جھڑکتی آواز میں مجھے روک دیا۔

بیڑی کی طلب سے مراد تھی کہ واقعی اس کی طبیعت ٹھیک ہو رہی ہے۔ حالاں کہ وہ بیڑی کشی کا ایسا عادی نہیں تھا۔ دن میں چند بیڑیاں اور حقہ سامنے ہو تو قطعاً نہیں۔ یہاں حقے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

اس نے پھر چپ سادھ لی تھی۔ سبزہ زار پر اچھلتی، کودتی اور ٹھونگیں مارتی چڑیاں دیکھتا رہا۔ اور دیر بعد تاسف آمیز درشتی سے بولا، ''الٹا ہو گیا رے سارا۔''

''کیا الٹا ہو گیا۔ یہ تو ہوتا رہتا ہے۔ میرے ساتھ نہیں ہوا تھا؟ آسن سول میں اس بدمعاش سید محمود علی کے گھر کتنے دن ٹھیرنا پڑا تھا۔ مجھے تو بخار تھا...... اور تمہیں......'' مجھے اپنی زبان تھامنی پڑی اور میں نے ملائمت سے کہا، ''تمہارا تو سر کا معاملہ تھا، اور اب، اب تو تم ٹھیک ہو۔''

''ہاں رے، سارا ٹھیک ہی لگتا ہے۔ چل پھر سکتا ہوں اب ایک دم۔''

''چل کے تو تم اپنے پیروں ہی سے یہاں آئے تھے۔ کوئی اٹھا کے نہیں لایا تھا، لیکن ہوا کیا پھر۔'' میرے لہجے میں تیزی آگئی۔ ''ڈاکٹر صاحب کی اجازت کے بغیر کہیں نہیں جائیں گے ہم۔''

سیورین نے ڈیوٹی والا لباس پہن لیا تھا اور ایمی اپنے گھریلو لباس میں گھر جانے کے لیے تیار ہوگئی تھی۔ بتھل کو وہاں بیٹھے قریب آدھ گھنٹا گزرا ہوگا کہ ایمی کسی ناگہانی بلا کی طرح سر پہ آدھمکی۔ اس بار اس کے تیور ہی بدلے ہوئے تھے۔ اس نے بتھل کو اٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ بیمار آدمی سب سے بڑا محکوم ہوتا ہے اور ایمی اچھی طرح جانتی تھی کہ اپنے محکوموں سے کب اور کیسا برتاؤ کرنا چاہیے۔ بتھل کے پاس خشونت بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے اور تعمیل کرنے کے سوا کیا چارہ تھا۔ وہ اٹھ گیا۔ سیورین اور ایمی نے اس کے بازو پکڑ لیے تھے۔ اس نے بازو جھٹک کے دونوں کو ہٹا دیا اور تین قدم کی دوری طے کر کے اپنے کمرے، اپنے زنداں میں داخل ہوگیا۔

ایمی پھر نہیں ٹھیری۔ شام کو جلد ڈیوٹی پر واپس آنے کا کہہ کے اور بتھل کی صحت یابی کے لیے رسمی دعائیہ کلمات ادا کرتی ہوئی رخصت ہوگئی۔

بتھل سیدھا بستر پر جا کے دراز ہوگیا تھا۔ سیورین نے وقفے واری معمول کے مختلف معائنوں کے بعد بستر کے نزدیک الماری میں رکھے ہوئے شیشے کے جگ سے کسی پھل کا مشروب گلاس میں بھر کے بتھل کو پیش کیا۔ اس وقت بتھل کے نتھنے پھولے ہوئے تھے، پیشانی پر شکنوں کا جال بچھا تھا، سانس بھی مجھے کچھ تیز لگ رہی تھی۔ مجھے خدشہ ہوا کہ سیورین کی پیشہ ورانہ تن دہی سے چڑ نہ جائے اور کچھ الٹ سلٹ نہ کر دے، اس لیے میں قریب ہی کھڑا رہا۔ اس نے خاموشی سے مشروب پی لیا۔ سیورین نے پھر چند گولیاں اسے کھلائیں اور اس نے بتھل کے بالوں کی ایک بکھری ہوئی لٹ درست کرنی چاہی کہ بتھل نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، وہ بری طرح گھبرا گئی۔

''بیٹھ جا ری ادھری۔'' بتھل نے ہٹیلی آواز میں فرمائش کی۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات
آٹھویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

...ب نہیں آتی رہے۔"

"اب یہاں سے اُسی کے پاس چلیں گے" فیصلہ کن لہجے میں کہا، "اور بہت دنوں تک تم وہیں فیض آباد میں اپنی بٹیا کے پاس، بل کہ میں تو کہتا کہیں آنے جانے کا سلسلہ ہی بند کر دینا چاہیے اب۔ ... نہیں آتا ہمیں۔ اِتنے زمانے سے خاک چھان رہے ہیں ... حاصل ہوا۔ اُلٹی ہر جگہ یہ دیواریں، خنجر چاقو، خون..."

جی میں آئی، اُسے بتاؤں کہ اُس کی بیماری ہی نے کچھ کم پریشان نہیں کیا تھا کہ اِس دوران مجھ پر جو گزرتی رہی ہے، وہ میں ہی جانتا ہوں۔ بروقت مجھے خیال آ گیا کہ یہ وقت تو اُس کی دل دہی و دل جوئی کا ہے۔ مجھے تو سیورین اور ایمی کو بھی ہدایت کرنی ہے کہ وہ اُس کے سامنے کوئی ایسی ویسی بات نہ کریں۔ پہلے وہ پوری طرح تن درست ہو جائے۔ بعد کو تو اُسے سارا کچھ معلوم ہو ہی جائے گا۔ اکبر علی خاں جیسا نادر اور مہربان آدمی اور انتھونی جیسا جرأت مند اور ایثار پیشہ نوجوان... اُن کے گھر اُجڑ گئے۔ اُن کی طرف دھیان جاتا ہے تو دل ڈوبنے لگتا ہے۔ ہزار تاویلیں ڈھونڈتا ہوں کہ اس میں میری لغزش کیا ہے، لیکن کوئی ایک تاویل ضرور ہے جو کانٹے کی طرح میرے سینے میں چبھتی رہتی ہے اور شاید یہی ہے کہ اگر ہم یہاں، اِس منحوس شہر میں نہ آتے تو..."

بچھل نے یہاں سے فیض آباد واپس جانے اور مستقلاً وہیں رہنے کی بات سن لی تھی، وہ منمناتے ہوئے بولا، "دیکھیں گے رے۔"

"اب اور دیکھنا وکھنا کچھ نہیں... اور کیا، کتنا دیکھنا ہے، میں تمھیں یاد دلاؤں سارا۔"

اُس نے سر اُٹھا کے گھورتی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ "بہت گھوما ہوا لگتا ہے۔ تیرے بارے میں بھی ڈاکٹر صاحب سے بات کرنا پڑے گی۔" وہ تیکھی آواز میں بولا۔

"ہاں ہاں، ٹھیک ہے، کر لینا بات۔ بولنا کہ میرا دماغ چل گیا ہے۔" میں نے جھلّا کے کہا، اور مجھے خود کو باز رکھنا پڑا۔ یہ میں کس زبان اور لہجے میں کس شخص سے ایسی باتیں کر رہا ہوں جو بستر پہ دراز ہے اور خدا خدا کر کے کہیں آج اُس کے بے خبر وجود میں زندگی جاگتی نظر آتی ہے۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہے،

سیورین کی مضطرب نظریں مجھ پر ایک لمحے کے لیے منڈلائی تھیں۔ مجھے پرسکون دیکھ کے وہ بستر کے کنارے پڑ مرا کے بیٹھ گئی۔ اُس کا ریشم ہاتھ بچھل نے سینے سے لگا لیا۔

"یہ تو بالکل اپنی بٹیا کی طرح لگتی ہے۔" اُس کی آواز سے یاسیت اور حسرت اُمڈ رہی تھی۔

سیورین کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ "کون بٹیا؟" اُس نے اٹکتی زبان سے پوچھا۔

"ہے ان کی ایک بیٹی" میں نے اُسے بتایا، "بہت لاڈلی۔"

"تیری کچھ نہیں ہے۔" بچھل چہچہا کے بولا۔

"میری! میری بھی بہت کچھ ہے، مگر تم سے زیادہ نہیں۔" میں نے تیکھی آواز میں کہا، "سوچا تھا، تار دے کے اُسی کو بلا لوں۔ وہ بھی تمھارا ایک علاج ہے۔ لیکن پھر تمھارا ہی خیال آ گیا۔ تم ناراض نہ ہو جاؤ کہ اُسے کیوں پریشان کیا۔"

"ٹھیک کیا تُو نے، وہ تو رستے میں آدھی ہو جاتی۔"

"اُس کی یاد آ رہی ہے تمھیں؟"

خود میری دماغی حالت استوار نہیں ہے، میں بار بار کیوں بھٹک جاتا ہوں۔ اُس کی جمع خاطر کے لیے پھر مجھے دس قسم کی باتیں کرنی پڑیں۔ گو اپنے لفظوں کی بے اثری خود مجھی کو کھٹک رہی تھی۔ میں نے خود کو ترک کر دیا۔ "ٹھیک ہے،" جتنی نرمی سے ممکن تھا، میں نے کہا، "بعد کو بات ہوگی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو قائل کریں گے اور کسی ایک نتیجے پر پہنچ جائیں گے۔"

سیورین اُس کے بستر کے کنارے بیٹھی ہماری نوک جھونک پٹ پٹاتی پلکوں سے سن رہی تھی، اور اب ایسی کھٹی ہوئی نہیں تھی۔ اُس کا ہاتھ دیر سے بھِل کی گرفت میں تھا اور وہ اُس کی پتوں جیسی پتلی پتلی نرم نازک اُنگلیاں چھیڑتا مسکراتا رہا تھا۔ "اتنا کام بیوروئی کے ہاتھوں سے کیسے کر لیتی ہے۔"

سیورین کا سراپا نکھر آیا۔ رُخساروں پر چاندنی سی چٹک اُٹھی۔ اس عالم میں وہ اور دل کش اور معصوم لگ رہی تھی۔ بھِل نے اُس کی گردن میں ہاتھ ڈال کے والہانہ اپنی طرف کھینچ لیا۔ سیورین لوٹتے ہوئے بچے کے مانند اُس کے سینے پر چار کر، یا جاتی، اور پھر جیسے آ... [illegible] بھِل اُس کی مرتے لمحے... [illegible] تو اس سے زیادہ چھوٹی ہوئی ہے۔ کیا ہے دنیا [illegible]... کب سے دھوپ میں کھڑی ہے... [illegible] ... وہ مضطرب ہوتا اور طرح طرح اُس کی دل داری کرتا رہا۔ ناچار اُس نے مجھے اشارہ کیا۔ "سنبھال رہے ... یہ تو موم کی ہی ہے۔"

میں نے سیورین کا ہاتھ تھام کے اُسے بستر سے اُٹھا دیا۔ اُس کی آنکھیں ... ہوری تھیں اور آنسو نہیں ... رہے تھے۔ اپنا چہرہ کاندھی سے چھپائی ہوئی میرے سہارے ... وہ صوفے پر آ کے بیٹھ گئی اور سر جھکائے ... رہی۔ میں جلدی سے پانی لے آیا۔ میرے اصرار پر اُس نے گھونٹ بھر پانی پیا اور اُس کا سر میرے شانے پر ڈھلک گیا۔ ... [illegible] ... اُس کی اُداسی ... بڑی خبر ... ہونے لگی تھی ... [illegible] ... کوئی اندازہ نہیں ہو پاتا کہ سامنے جو آدمی بیٹھا ہے، بظاہر پُرسکون، اندر سے کیسا متلاطم ہے۔ آدمی کے چہرے پر کیسی نادیدہ نقابیں چڑھی ہوئی ہیں۔

کہتے ہیں، آدمی مختلف عناصر کا مرکب ہے، مگر بعد کو، دنیا میں وارد ہو جانے کے بعد تو آدمی کی تشکیل اُس کے خلقی اور طبعی عناصر سے زیادہ اُس کے گرد و پیش اور گزرنے والے لمحوں سے ہوتی ہے اور اختتام تک ہوتی رہتی ہے۔ بامراد لمحے، نامراد لمحے، وصال لمحے، ہجر لمحے، خزاں لمحے اور بہار لمحے۔ آدمی لمحوں کا قیدی اور لمحوں میں بٹا رہتا ہے۔ لمحے، جو جزو ہو جاتے ہیں، رگ و پے میں کھٹکتے، خون میں گردش کرتے رہتے ہیں۔ ہر گزرا ہوا لمحہ پیش آنے والے لمحے پر غالب آ جاتا ہے مگر یہ مٹتا نہیں، دور ہو جاتا ہے، دور ہوتا رہتا ہے۔ اور بے شمار اوجھل، یا گم شدہ لمحے کسی موقع پر نمودار ہو کے آدمی کو زیر و زبر کر دیتے ہیں۔ زندگی بھر یہ سلسلہ جاری رہتا ہے، تاوقتیکہ آدمی کے خلقی عناصر کی ناتوانی اور بے توازنی سے ایک روز سارا کچھ مسمار ہو جاتا ہے۔ پھر آدمی بھی گئی، لمحے بھی گئے، یادیں بھی گئیں۔

سیورین کے جسم و جان میں بھی جانے کتنے محروم اور ویران لمحوں کی گرہیں پڑی ہوئی تھیں کہ بھِل کے ایک ذرا نے سامنے ایک ذرا سی جھڑک سے بے اختیار ہو گئی۔ شاید کچھ بھی ہوا۔ اُس وقت میرا جی چاہ رہا تھا ... آئی۔ کبھی کسی سے سنا تھا، جان سوز کی، جہاں کہ اڑکی کی ایسی حالت میں مکانی تبدیلی کارگر ہو جاتی ہے۔ میں اُسے صوفے سے اُٹھا کے باہر لے آیا اور مریضوں کے لیے مخصوص پیوستہ کمرے تک لے گیا۔ وہ بہرحال ایک ہوش مند لڑکی تھی، جلد ہی سنبھل گئی اور مجھ سے بچتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔ اُس کے انتظار میں، میں راہ داری میں ٹھہرا رہا۔ چند لمحوں بعد وہ واپس آ گئی، بہت سنجیدہ اور شرم سار سی۔ میں نے اُس سے کوئی گلہ کیا، نہ اپنا تک اُس کی شگفتہ خاطری اور دل آشنا دگی کا سبب جاننے کی کوشش کی اور مجھے اس کا موقع بھی نہیں ملا۔

ابھی ہم کمرے میں داخل نہیں ہوئے تھے کہ تیز قدموں سے چلتا ہوا ڈاکٹر راسے کا خاص خادم راستے میں مزاحم ہو گیا۔ ڈاکٹر نے مجھے طلب کیا تھا اور عجلت کی تاکید کی تھی۔ اپنے دفتر میں میری حاضری کی فرمائش تو وہ خود کر کے گیا تھا، اور میں جلد ہی اُن کے پاس جانے کا ارادہ بھی کیے ہوئے تھا، لیکن عجلت کی تاکید نے مجھے متوحش کیا۔ سیورین نے بھی یہ پیغام سن لیا تھا۔ وہ کچھ اور ہراساں ہو گئی۔ میں اُسے حوصلے کی تلقین کرنا چاہتا تھا، لیکن چند رسمی لفظوں کے بجائے خاموشی ہی مناسب معلوم ہوئی، اور بادلِ ناخواستہ میں قاصد کے ہم راہ چل پڑا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ ڈاکٹر راسے رات والی بات کے سلسلے میں کوئی صراحت کرے گا یا

مزید اعتذار یہ جاننے کا خواہاں ہوگا۔ ایسے نازک معاملات کی تکرار اور قلتِ بلاغت کے منافی ہوتی ہے۔ ہر بُردبار شخص کی طرح ڈاکٹر راسے کو اپنا منصب و مرتبہ بہت عزیز ہونا چاہیے۔

درمیان میں کئی وارڈوں سے گزرنے کے بعد مرکزی عمارت آتی تھی۔ پولیس ابھی تک موجود تھی، سرکاری وردی کے ساتھ سادہ لباس میں بھی۔ ہمارے کمرے کے ارد گرد نفری کچھ زیادہ ہی تھی۔ مجھے سامنے سے گزرتا دیکھ کے گزشتہ کل کی طرح اُن کے جسم اکڑتے رہے۔ میری ضمانت اور مہر ڈاکٹر کا خادم میرے پہلو بہ پہلو تھا۔ غالباً اسی لیے کسی نے مجھ سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ راستے میں مَیں نے بھی اپنے تجسس و تردد پر بڑی حد تک قابو پا لیا تھا۔ اب جو کچھ بھی ہو، بھِل تو زندگی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

کچھ دیر کا راستہ طے کرنے کے بعد مرکزی عمارت آتی تھی۔ یہاں بھی اچھی خاصی چہل پہل تھی۔ پولیس کا ایک جتھا یہاں بھی دھرنا دیے ہوئے تھا۔ پولیس کو بعد از وقت احتیاط کا ہنر خوب آتا ہے۔ ڈاکٹر کے کمرے تک پہنچا کے خادم وہیں رُک گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ دستک دیے اور اجازت لیے بغیر میں نے اندر قدم رکھنے کی جسارت نہیں کی۔ ڈاکٹر کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ پہلی نظر میں کچھ منتشر سا نظر آیا۔ میں نے آداب کیا تو سر جھٹک کے جواب دیا اور اضطراری لہجے میں بولا، "بیٹھو، بیٹھو! تم نے دیکھا، یہاں یہ لوگ پھر کیوں جمع ہو رہے ہیں؟"

"کون لوگ، کہاں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"صدر دروازے کے باہر۔" وہ جھنجلا کے بولا، "میں نے معلوم کروایا تھا، یہ وہی لوگ ہیں، اڈّے کے آدمی، جو کل اُستاد میدا کے ساتھ آئے تھے اور باہر کھڑے رہے تھے۔"

میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں وضاحت کی۔ "مجھے نہیں معلوم، میں نے نہیں دیکھا۔ اتفاق سے یہاں آتے ہوئے میری نظر صدر دروازے پر نہیں گئی، مگر... اب کیوں آئے ہیں وہ... کیا چاہتے ہیں؟"

"ابھی وہ کم تعداد میں ہیں، کل کی طرح نہیں، لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ رفتہ رفتہ وہ دروازے کے باہر اکٹھے ہو رہے ہیں، اور مسلسل بڑھ رہے ہیں۔ کوئی مقصد تو ہوگا، دوبارہ اُن کے یہاں آنے کا۔"

"یقیناً۔" میں نے جھجکتے ہوئے تائید کی۔

"اور اب یہ کیا مقصد ہو سکتا ہے تمھارے خیال میں؟"

میں کیا کہہ سکتا تھا۔ ڈاکٹر کے لہجے کی کساوٹ بتاتی تھی کہ اُسے مجھ پر کوئی شبہ ہے، میں کچھ جانتا ہوں اور بتانا نہیں چاہتا۔ "ظاہر ہے تم سے ملنے کا۔" میری بھنچی ہوئی آواز کی برشتگی اُسے محسوس ہوئی ہوگی، اور یہ اچھی بات نہیں تھی۔

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔" وہ بپھر سا گیا۔ "وہ مجھ سے ملنے نہیں آئے ہوں گے، مگر وہ تم سے کیوں ملنا چاہتے ہیں۔ کل میں نے خود سنا تھا، تم نے ہر بات صاف کر دی تھی۔ اب کیا ہے؟"

"بظاہر ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے۔" [illegible] دبے لہجے میں کہا۔ "ہو سکتا ہے، میدا نے میری [illegible] نظرِ ثانی کی ہو اور اڈّے کی چوکی سے دست بردار [illegible] کر دیا ہو، اور نئی صورتِ حال میں وہ مجھ سے مشورہ کرنے آئے ہوں [illegible] استاد کے آخری بات کرنے آئے ہوں۔ کوئی ایسی ہی بات ہو سکتی ہے۔ میدا کی غیرت کسی وقت عود کر آ سکتی ہے کہ وہ اپنے زور پر اڈّے کا داوا نہیں رہا ہے۔ چوکی کا منصب [illegible] اور ایک قسم کی بخشش و عطا ہے، یا پھر اُسے کوئی..."

"ہاں، ہاں، بولو، رُک کیوں گئے؟" وہ بے کلی سے بولا۔

"یا پھر اُسے کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے، اکبر علی خاں کے

مکان کے نزدیک جن تین آدمیوں کا خون ہوا تھا، اُن کے بھی تو کچھ نام لیوا، کچھ قریبی ساتھی اڈّے پر ہو سکتے ہیں۔ انھیں معلوم ہوگا کہ کس نے انھیں اُن کے عزیز سے جدا کیا ہے، دھنوا کے فدائیوں کی طرح۔"

"کیا یہ بھی ممکن ہے؟"

"سب کچھ ممکن ہے۔"

"یعنی وہ میدا کو ختم کر سکتے ہیں؟" اُس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔

"اب ایک سلسلہ شروع ہو گیا ہے تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

میں نے مایوسی سے کہا، "لیکن ابھی کیا کہا جا سکتا ہے، اور کوئی بات بھی ہو سکتی ہے۔ آپ کی اجازت ہو تو میں صدر دروازے پر جا کے دیکھوں؟"

"نہیں۔" اُس نے فیصلہ سنانے میں ایک لمحے تامّل نہیں کیا۔ "تمھارا وہاں جانا ٹھیک نہیں۔"

"مگر جانا تو پڑے گا۔"

"ابھی دیکھتے ہیں۔" اُس نے ہاتھ اٹھا کے کہا۔ "اسپتال کے کئی ملازم باہر ہیں۔ کچھ معلوم ہوا تو آ کے بتائیں گے۔ تم بیٹھتے کیوں نہیں۔" پھر اُسے کچھ خیال آیا، اپنی مخصوص کرسی کے بجائے وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ "کچھ پیو گے؟"

"نہیں شکریہ۔" میں بھی اُس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔

لمحوں تک وہ اپنے آپ میں گم کچھ سوچتا رہا۔ مجھے اپنی جانب سے کچھ کہنا نہیں تھا کہ میرے پاس لب کشائی کے لیے تھا ہی کیا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے آئی جی کا فرستادہ ایک پولیس افسر یہاں آیا تھا۔" ڈاکٹر نے چونک کے کہا۔ "میں تمھیں بتانا ہی بھول گیا۔ جیسا کہ میں نے کل رات خیال ظاہر کیا تھا، اکبر علی خاں کے بڑے بھائی نے تم سے ملنے کا مطالبہ کیا ہے۔ مطالبہ میں یوں کہہ رہا ہوں کہ مجھے یہی بتایا گیا ہے۔ تمھیں معلوم ہے کہ وہ ریاست حیدرآباد میں نظام سرکار کا کوئی بڑا عہدے دار ہے۔ پولیس اُس کے اثر و رسوخ کے دباؤ میں ہے۔ مرکزی حکومت کی طرف سے پٹنا پولیس کو متنبہ کیا گیا ہے کہ اصل مجرم جلد از جلد عدالت کے حوالے کیے جائیں اور مرکزی حکومت کو مرحلہ وار کارروائی سے آگاہ کیا جاتا رہے۔ اکبر علی خاں کی تدفین کے فوراً بعد اُن کے گھر آئی جی سمیت پولیس کے تمام بڑے افسر جمع ہوئے تھے۔ رات گئے تک اُن کے درمیان بات چیت جاری رہی اور تمھارا ذکر بار بار ہوتا رہا۔

میں سنا کیا۔ ایک بھائی کے اس طرح جدا ہو جانے سے کسی بھی بھائی پر کیا قیامت گزر سکتی ہے، اور اگر وہ صاحبِ اثر بھی ہو۔ ڈاکٹر رائے نے مجھے بتایا کہ اسپتال میں مجھ سے مل کے آئی جی پولیس بڑی حد تک مطمئن ہو گیا تھا۔ یہ کمال شرافت، کس درجے کی بزرگی اور شفقتِ خسروانہ تھی کہ ڈاکٹر رائے مجھے کچھ جتا نہیں رہا تھا، لیکن میں جانتا تھا، اپنے اطمینان کے باوجود آئی جی مجھے ساتھ لے جانے کے لیے کس قدر بے چین تھا۔ ڈاکٹر رائے درمیان میں نہ پڑتا تو آج میں پولیس کی تحویل میں ہوتا اور جانے کب تک رہتا۔ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق آئی جی نے اکبر علی خاں کے بھائی کو یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ اسپتال میں کئی دن سے پولیس نے جال بچھا رکھا ہے اور مجھ پر کڑی نظر رکھی جاتی رہی ہے۔ گو میرا تعلق بھی اڈّے سے ہے، لیکن اس معاملے میں میرے کسی تعلق کے شواہد نہیں مل پا رہے۔ ظاہر ہے، آئی جی نے اکبر علی خاں سے میری شناسائی کی تمام رُوداد بھی اُس کے بھائی کو سنائی ہوگی۔ ڈاکٹر رائے کہہ رہا تھا کہ آئی جی نے اکبر علی خاں کے بھائی کو باور کرایا ہے کہ اپنے بھائی کی بیماری کی وجہ سے میں مسلسل اسپتال میں رہا ہوں، اور پولیس نے اچھی طرح تحقیق کر لی ہے کہ ایک اکبر علی خاں ہی تھے جن سے شہر میں میری رسم و راہ ہوئی تھی۔ میں نے فرار ہو جانے کی بھی جستجو نہیں کی ہے۔ شہر آ کے کسی ٹھکانے کے لیے جس ہوٹل میں، میں نے کمرا لیا تھا، وہاں میں ایک رات بھی نہ ٹھیر سکا۔ کمرے میں سامان رکھنے کے بعد ایک لمحہ ضائع نہیں کیا، بھائی کو لے کے سیدھے اسپتال کا رُخ کیا۔ پولیس نے ہوٹل کے کارندوں سے پوچھ گچھ کی ہے۔ میرا سامان وہیں پڑا ہے اور کچھ نقدی منیجر کے پاس امانت رکھی ہوئی ہے۔ پولیس نے اُس تانگے والے کو تلاش کر کے اپنی تسلی کر لی ہے جو مجھے اور مُغل کو اسٹیشن سے ہوٹل اور ہوٹل سے اسپتال لے گیا تھا۔ اسپتال کے ڈاکٹروں نے تصدیق کی ہے کہ میرا بھائی سر کی شدید چوٹ کی وجہ سے ابتر حالت میں اسپتال آیا تھا اور اُس کا علاج خاص توجہ سے کیا جاتا رہا ہے۔ یہ بھی سراغ لگا لیا گیا ہے کہ اکبر پور اسٹیشن پر ریل کا انجن اچانک خراب ہو جانے سے بہت سے مسافر متاثر ہوئے تھے۔ اسی

گاڑی میں میرا بھائی موجود تھا۔

خدمت گار کے چائے لانے کی وجہ سے ڈاکٹر رُک گیا۔ اُس کے اشارے پر خدمت گار نے ہم دونوں کے لیے چائے بنائی اور بسکٹوں کی تشتریاں سامنے رکھ کے چلا گیا۔

"اور اُسے جلدی ہے... اکبر علی خاں کے بھائی کو۔" ڈاکٹر نے بھاری آواز میں کہا اور اُلجھ کے بولا، "کیا نام بتایا تھا پولیس افسر نے اُس کا؟"

میں نے زیرِ لبی سے کہا۔ "شاید سکندر علی خاں۔"

"ہاں، ہاں کچھ ایسا ہی۔" اُس نے تیزی سے سر ہلا کے تصدیق کی۔ "گو یہ اُس کا آبائی شہر ہے، مگر معلوم ہوا ہے، اُدھر حیدرآباد میں اُس کی منصبی ذمّے داریاں یہاں طویل قیام میں حارج ہیں۔ اُس کا ارادہ ہے کہ اپنی بیمار ماں، مرحوم بھائی کی بیوہ اور بچوں کو ساتھ لے جائے۔ حیدرآباد سے بھیجے جانے والے اُس کے معتبر کارندے یہاں کی جائداد، زرعی زمینیں اور دیگر معاملات دیکھتے رہیں۔ پولیس کا قیاس ہے کہ اکبر علی خاں کی بیوہ پٹنا چھوڑنے پر شاید آمادہ نہ ہو سکے۔ یہاں کالج میں وہ پڑھاتی ہے، اپنی زمینوں پر بسنے والے کسانوں کی فلاح و بہبود میں دل چسپی لیتی ہے، گاؤں میں اُس نے ایک اسکول کھولا ہوا ہے۔ بچّے یہاں کی درس گاہوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، اُن کے تعلیمی سال متاثر ہو سکتے ہیں۔ یہی ہو سکتا ہے کہ مستقل طور پر نہیں تو چند ہفتوں، مہینے دو مہینے کے لیے حیدرآباد چلی جائے۔ تمام آسائشوں سے آراستہ نظام اسٹیٹ ریلوے کا ایک سرکاری ڈبا پٹنا ریلوے اسٹیشن پر کھڑا ہوا ہے، لیکن روانگی سے پہلے سکندر علی خاں اپنے بھائی کے قاتلوں کو انجام تک پہنچانے کے لیے خاصا مضطرب نظر آتا ہے۔ اُسے بتایا گیا ہے، پولیس کی تفتیش کے مطابق وہی تین آدمی اُس کے بھائی کے قاتل تھے جن کی لاشیں اُس کے آبائی گھر کے قریب پھینک دی گئی تھیں۔ پولیس کو اب اُن تین آدمیوں کے قاتل، یا قاتلوں کی تلاش ہے، اور اُسے کچھ اندازہ ہے کہ وہ کون لوگ ہو سکتے ہیں، اور یوں محض شبہے کی بنیاد پر کسی کو گرفت میں لینے سے پہلے وہ یقینی ثبوت فراہم ہو جانے کی تگ و دو میں ہے۔"

ڈاکٹر رائے، ایک مصروف ترین ڈاکٹر کس انہماک، کتنی جزئیات اور کیسی یگانگت سے مجھے یہ ساری رُوداد سنا رہا تھا۔ مجھ میں تو ممنونیت کے دو لفظ کہنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ میں سر جُھکائے بیٹھا رہا۔ چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ دونوں کو خیال ہی نہیں رہا تھا۔ اُس کے ٹوکنے پر میں نے ایک گھونٹ میں پیالی ختم کر دی۔ اُس نے گھونٹ لیا تو چہرہ بگڑ گیا۔ ناگواری سے پیالی پرچ پر رکھ کے تازہ چائے کے لیے وہ خدمت گار کو طلب کیا چاہتا تھا کہ پھر جیسے بھول گیا، بے چینی سے کہنے لگا۔

"ہاں... اور سکندر علی خاں نے تمھارے بارے میں بہت سوال کیے، پولیس نے اُسے قائل کرنے کے بجائے محض آثار و شواہد پیش کرنے کی احتیاط کی۔ آئی جی نے اُس سے کہا، یقیناً گھر والوں نے بھی گھر میں جا تو تان کے گھس آنے والے نوجوان کے بارے میں اُسے کچھ بتایا ہوگا۔ جہاں تک آئی جی کی معلومات ہیں، اُس کے بھائی سے نوجوان کی چند روزہ شناسائی کی ابتدا نہایت ناشائستہ اور جارحانہ انداز میں ہوئی تھی، لیکن نوجوان کا ماجرا سن کے اکبر علی خاں نے اُس کی بے چارگی محسوس کی اور ساری اذیّت بھلا کے وہی کیا جو ایک کشادہ دل

کا ذخیرہ ہو سکتا ہے۔ بعد کو نوجوان کے عزم و حوصلے، اُس کی سچ بیانی کے اکبر علی خاں ایسے شیدائی ہوئے کہ اجنبیت کی ساری دیواریں ایک ہی جست میں پھلانگ لیں۔ صبح و شام اسپتال جا کے دوست کی دل دہی، خاطرداری معمول بنالی۔ اُس رات، رات گئے نوجوان نے اُنھیں اسپتال کے صدر دروازے پر رخصت کیا تھا۔ اسپتال کا عملہ گواہ ہے کہ نوجوان واپس اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ اکبر علی خاں کے گھر والے ٹھیک ٹھیک بتا سکتے ہیں کہ اسپتال سے گھر واپس آ کے وہ نوجوان کا ذکر کس اشتیاق سے کیا کرتے تھے۔ سو نوجوان، یا اُس کے ایما پر اُس کے آدمیوں کے ذریعے اُنھیں ختم کر دینے کا کوئی جواز ہونا لازم ہے۔ ایسے سنگین جرم کے ارتکاب کے لیے کوئی بڑی علت پس منظر میں ہونی چاہیے، بہت سی آگ، یا دیوانگی، اس منطق کے باوجود پولیس اپنے اخذ کیے ہوئے نتائج پر مُصر نہیں، ایک ذرا سا اشارہ ملا تو خاطر جمع ہے، نوجوان اور پولیس کے درمیان کوئی حدِ فاصل نہیں ہے۔ نوجوان عملاً پولیس کے حصار میں ہے۔"

ڈاکٹر راے کو از خود کچھ احساس ہوا اور اُس کے لہجے میں کسی قدر بے اعتنائی در آئی، پہلو بدلتے ہوئے بولا، "یہ سارا کچھ اِتنی تفصیل سے میں تمھیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ تم کشاکش سے باہر آ سکو۔"

"میرے لیے اِس وقت سب سے بڑی کشاکش اور کش مکش میرا بھائی ہے۔" اپنی اِس صاف گوئی پر مجھے خجالت بھی ہوئی۔ کہتے ہیں، آدمی کے جسم میں سب سے زیادہ بے قابو چیز دل ہے، لیکن یہ زبان بھی کچھ کم نہیں۔

"اور جو تمھارا بھائی نہیں ہے۔" وہ تیکھی آواز میں بولا۔

"میں نے آپ سے کہا تھا، میرے لیے وہ بھائیوں سے [illegible]ڑھ کے ہے۔ اُس کے میرے بہت سے رشتے ہیں، بھائی کا تو [illegible]یک ہی رشتہ ہوتا ہے۔"

اُس نے لمبی سانس لی اور سر ہلانے لگا، پھر کچھ توقف بعد [illegible]ہم لہجے میں بولا۔ "میں سمجھتا ہوں، یہ اطمینان کی صورت [illegible]۔ مجھے سکندر علی خاں کی طرف سے خدشہ تھا کہ وہ پولیس پر [illegible]بے جا اثر نہ ڈالے اور پولیس بدحواسی میں اُلٹے سیدھے [illegible] نہ کرنے لگے اور تم مزید مصائب میں نہ گھر جاؤ، لیکن وہ ایک تعلیم یافتہ اور جہاں دیدہ آدمی ہے، قاعدے قانو[ن سے] پوری طرح آگاہ۔ کوئی نواب جاگیردار نہیں، جو آدمی کم جاگیردار زیادہ ہوتے ہیں۔ اُس نے پولیس کی دلیلیں تحمل سے سنیں اور اپنے زور و اثر کے غیر ضروری اظہار سے اجتناب [کیا]، مگر وہ تمھیں دیکھنے، تم سے ملنے کے مطالبے، یا خواہش [پر] شدت سے قائم ہے۔ پولیس نے اُس سے درخواست کی کہ تمھارا اُس کے گھر جانا بہ وجوہ سر دست مناسب نہیں۔ یہی سبب تھا کہ تمھیں اکبر علی خاں کی تدفین میں شرکت سے روک دیا گیا تھا۔ سارے شہر میں اُس آدمی کا چرچا ہے، اُستاد میدا جیسے سرکش چاقو باز کے اڈے پر جا کے سینہ سپر ہو گیا تھا اور اُس کے بعد خونی واقعات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ اُس کے بعد پانچ آدمی مارے گئے۔ سکندر علی خاں ذرا زحمت کرے تو بے شک اسپتال میں تم سے ملاقات ہو سکتی ہے، لیکن سکندر علی خاں اِس زحمت پر آمادہ نہیں ہوں۔"

"میرا خیال ہے، اَب ایسی کوئی بات نہیں۔ میں خود اُس کے پاس چلا جاتا ہوں، اور مجھی کو جانا چاہیے۔ حالاں کہ اکبر علی خاں کے گھر والوں کا سامنا کرنے کے تصور سے دل..."

"جانتا ہوں۔ تم جا سکتے ہو۔" اُس کے ہونٹوں پر تلخی عود کر آئی۔ "تم کہیں بھی جا سکتے ہو۔"

"کبھی نہ کبھی تو مجھے باہر نکلنا ہی ہے۔"

"کبھی تو تم ایک چھوٹے بچّے کی طرح معلوم ہوتے ہو اور ویسے یہ... یہ اچھی بات ہے، آدمی کو بچہ بھی ہونا چاہیے۔" وہ مسکرایا پڑا اور مفاہمت کے انداز میں بولا، "تم سمجھتے کیوں نہیں، گزشتہ رات ہی اکبر علی خاں کی تدفین ہوئی ہے، ایک مشتعل ہجوم اس موقع پر موجود تھا۔ شہر میں بڑی کشیدگی ہے، فرقے وارانہ رنگ بھی دیا جا رہا ہے۔ سارا شہر ہی ہراساں ہے۔ بازار بند پڑے ہیں، کاروبار چوپٹ ہے۔ طلبہ نے پروفیسر کے قاتلوں کی گرفتاری تک کلاسوں کا بائیکاٹ کیا ہوا ہے، طرح طرح کی افواہیں پھیلی ہوئی ہیں۔ جگہ جگہ پولیس گشت کر رہی ہے اور حالات معمول پر لانے کے جتن کر رہی ہے، ایسے میں..."

دروازے پر ہلکی دستک ہوئی۔ ڈاکٹر رک گیا۔ "آ جاؤ۔" وہ دھمکتی آواز میں بولا۔ اجازت ملتے پر انگریزی لباس میں، سانولی رنگت کا ایک باوضع ادھیڑ آدمی جھجکتے ہوئے اندر آیا۔ وہ

اکثر معلوم ہوتا تھا، یا اسپتال کا کوئی افسر۔ "ہاں چھاگلا!
کیا ہے؟" ڈاکٹر رائے نے اُچکتی آواز میں پوچھا۔
چھاگلا نے مؤدبانہ جواب دیا۔ "جناب! باہر خاصی بڑی
تعداد میں وہ لوگ جمع ہو چکے ہیں اور منضبط ہیں۔ فی الحال کسی
قسم کا ہنگامہ نہیں۔"

"کیا... کیا چاہتے ہیں؟"

"ابھی کچھ صاف نہیں، لگتا ہے، کسی کا انتظار ہے انھیں۔"

"کس کا... کس کا انتظار؟"

"کچھ دیر میں سب کچھ واضح ہو جائے گا جناب! پولیس
بھی خاصی تعداد میں چاردیواری کے باہر موجود ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" ڈاکٹر جھنجلا کے بولا، "ہم یہیں بیٹھے ہیں،
اُن کا مقصد معلوم کرو... اور ہاں بہ راہِ مہربانی کچھ چائے کافی
وغیرہ کا بندوبست کرواؤ۔"

چھاگلا سر جھکائے واپس چلا گیا۔

"کہیں ایسا تو نہیں۔" میں نے سہمی ہوئی آواز میں کہا،
"پولیس نے میدا ہی کو گرفتار کر لیا ہو۔"

ایک لحظے کے شش و پنج کے بعد وہ بھڑک اُٹھا۔ "نہیں،
پولیس افسر تھوڑی ہی دیر پہلے میرے پاس آیا تھا۔ ایسا کچھ ہوتا
تو اُسے معلوم ہوتا، مگر تمھیں یہ خیال کیوں آیا؟"

"یوں ہی... یوں ہی ذہن میں آیا، کچھ سمجھنے کی جستجو میں،
کہ ایک وجہ یہ بھی تو ہو سکتی ہے، میدا کی گرفتاری کے بعد اڈّے کے
آدمیوں کو نئی صورتِ حال میں میری ہی جانب رُخ کرنا چاہیے۔"

"ہاں، یہ تو ضوابط کی بات ہے۔" اُس کا طنز ڈھکا چھپا
نہیں تھا، اِس لیے ایسا کاری بھی نہیں تھا۔ "مگر تم تو کہتے تھے
کہ میدا پر ہاتھ ڈالنا پولیس کے لیے اِتنا آسان نہیں ہوگا۔"

"ہونا تو یہی چاہیے، مگر چوک تو کسی سے بھی ہو سکتی ہے،
اور گواہ تو کبھی کبھی اندھیرا بھی بن جاتا ہے، اور اپنا سایہ بھی۔
وبا کے ایسے وقت میں پولیس کو اپنی کارکردگی کی بڑی بے قراری
ہوتی ہے۔ شک کرنا، آدمی پکڑنا، کسی معذرت کے بغیر انھیں
چھوڑ دینا، پولیس کا ایک آزمودہ اور فرسودہ مشغلہ ہے۔"

"تمھارا مطلب ہے، وہ کسی کو بھی گرفت میں لے سکتے
ہیں، خواہ متعلق اور مطلوب ہو نہ ہو؟"

"شک کا ایک جواز، اُن کے پاس ہتھیار کے مانند ہوتا ہے۔"

"اُدھر یورپ میں ایسا نہیں ہوتا۔"

"اکبر علی خاں صاحب وکیل تھے اور آپ کی طرح یورپ
میں ایک عرصے رہے تھے۔ وہ بھی یہی کہتے تھے، ناحق کسی کو
گرفتار کرنے پر پولیس کی بن آتی ہے۔ بہت دیکھ بھال کے بعد
پولیس کسی کے گریبان کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے، مگر یہاں کا
معاملہ دوسرا ہے اور شاید یوں کہ یہاں آدمی کی بڑی ارزانی
ہے۔ وہ جو کہتے ہیں، ٹکے سیر ہل جاتے ہیں۔ مغرب میں کسی کو
اِس طرح پکڑ کے خانہ پُری نہیں کی جاتی۔ یہاں تو چوپایوں
سے آدمی کا کوئی ایسا امتیاز نہیں۔ اُن کے بھی ریوڑ ہوتے ہیں،
آدمی بھی یہاں ریوڑوں کی طرح ہنکائے جاتے ہیں، بعض
جگہوں پر تو یہاں آدمی، آدمی سے زیادہ جان ور ہے، جان وروں
سے مشابہ جو اپنے حق سے آگاہ نہیں ہوتے۔"

"اِس کی بنیادی وجہ عمومی جہالت ہے۔" اُس نے
تاسّف سے کہا۔

"اور جہالت کی بنیادی وجہ عمومی غربت ہے۔"

"ٹھیک۔" اُس کے شانے ڈھلک گئے۔

"تم اس وقت کسی کامریڈ کی طرح لگ رہے ہو۔"

"نہیں کیا... میں تو..." میری زبان بل کھا گئی۔ میں نے
ندامت سے کہا۔ "شاید مجھ سے یاوہ گوئی سرزد ہو رہی ہے۔"

اُس نے میری عذر خواہی نظر انداز کر دی اور کہنے لگا،
"لندن میں میرے ایک دوست برِصغیر کے متعلق کچھ اِسی
قسم کی باتیں کیا کرتے تھے، پُرجوش اور شعلہ خو درویش، لیکن
میں سمجھتا ہوں، وہ بہت انتہا پسند تھے۔ اُن میں لچک کی بڑی کمی
نظر آئی مجھے۔ کسی ملک، قوم اور قبیلے کے معروضی حالات، اُس کا
پس منظر اور پیش منظر اور اُس کی نفسی کیفیات کے تجزیے کے بغیر
وہ فیصلے صادر کرتے رہتے تھے۔ بہت عجیب لوگ تھے وہ...."
ڈاکٹر رائے کہیں کھو سا گیا۔ پھر جھرجھری لے کے بولا، "خیر... ہم
بھٹک رہے ہیں۔ مناسب ہوگا، سرِدست یہ فکر انگیزی کسی اور وقت
کے لیے موقوف کی جائے۔ تم میدا اُستاد کی بات کر رہے تھے۔"

میں نے اپنے بھٹک جانے پر معافی چاہی۔ "میں کہہ رہا تھا،"
میں نے نسبتاً دھیمی اور تھمی ہوئی آواز میں کہا، "کچھ ایسا ہے،
میں نے کہیں پڑھا تھا کہ پولیس کا جواز ہی جرم سے ہے۔ جرم
نہ ہو تو پولیس کا یہ لاؤ لشکر کیوں۔ مجرموں کی افزائش سے پولیس کا

کاروبار فروں ہوتا ہے، چشم پوشی سے مراد پشت پناہی ہے۔ سو کبھی پشت پناہی، کبھی سرکوبی، معاملہ حد سے گزر جائے تو آخر پولیس کو وہی کرنا پڑتا ہے جو اُسے ابتدا میں کرنا چاہیے۔ اڈّے اور پولیس کے درمیان ایک ربطِ خاطر تقریباً ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ کسی کو پکڑ کے چھوڑ دیا جائے تو وہ شک سے بری ہو جاتا ہے، اُس کا سینہ چوڑا ہو جاتا ہے۔ اُسے الزامات کے نشتروں اور رُسوائیوں سے نجات مل جاتی ہے۔ اِس باہمی ربط و ارتباط کی وضع میں پولیس کی آبرو بچانے کے لیے کبھی اڈّے کے آدمی خود چارا بن جاتے ہیں، کبھی چارا بنا لیے جاتے ہیں۔ اِس طرح پولیس کی مستعدی، سرگرمی اور اہمیت کا اظہار ہوتا رہتا ہے، میدا کی گرفتاری بھی کچھ اِسی طرح کی ہو سکتی ہے۔ میدا کا اڈّا بُری طرح الزامات کی زد پر ہوگا، کیوں کہ چار مرنے والوں کا تعلق اُسی کے اڈّے سے تھا۔ اِدھر پولیس بھی اڈّے کے آدمیوں، خصوصاً اُستاد سے چشم پوشی پر ملامتوں کا ہدف بنی ہوگی۔"

"تو... تو پھر؟" ڈاکٹر نے سرگرانی سے پوچھا۔

"ابھی کیا کہا جا سکتا ہے، ایک دوسرے کی ضرورت اور معاونت کی بات ہے تو میدا چند دنوں میں باہر آ جائے گا اور واقعی کوئی ہراِل جانے کے بعد اُسے گرفت میں لیا گیا ہے تو اپنے انجام کو پہنچے گا۔ ہر صورت میں پولیس بالا رہتی ہے۔ پولیس کو آنکھیں پھیر لینا بھی خوب آتا ہے۔"

ڈاکٹر کی آنکھیں چڑھ گئیں۔ "تم نے کیا سوچا ہے پھر؟"

"اگر وہ اِسی وجہ سے آئے ہیں تو مجھے کل کا آموختہ دُہرانا ہوگا۔ مجھے اُن میں سے کسی ایک کو منتخب کرنا چاہیے۔"

"اور اگر کوئی تیار نہیں ہوا؟"

"یہ ممکن نہیں ہے، اڈّے کی چوکی ہر کسی کا خواب ہوتی ہے۔"

"اِن حالات میں شاید کوئی تیار نہ ہو۔"

"دیکھتے ہیں" میں نے جز بز ہو کے کہا۔

"مگر ایک بات کا دھیان رکھنا۔ یہ اسپتال ہے۔ ایک بار کی بات ٹھیک تھی۔ وہ دوسری بار آ گئے ہیں۔ میں نہیں چاہوں گا۔ پھر وہ یہاں اِس طرح..."

"آپ کچھ نہ کہیے۔ مجھے اِس کا احساس ہے۔" میں نے لجاجت سے کہا۔ "میں اِس کا انتظام آج کر دوں گا۔"

"کیا کرو گے تم؟ مجھے کچھ بتاؤ۔"

"اُن سے دوبارہ یہاں آنے کو صاف منع کر دیا جائے گا۔ آپ اطمینان رکھیے ورنہ... ورنہ مجھے یہاں سے جانا پڑے گا۔"

اِدھر خدمت گار خورونوش کی چیزوں سے بھرا تشت لے کے آیا، اُدھر چھاگلا بدحواسی کے عالم میں کمرے میں داخل ہوا۔ "جناب! ابھی اُن سے میری بات ہوئی ہے۔ میں صدر دروازے سے آ رہا ہوں۔" چھاگلا کی آواز جھنجھلائی ہوئی تھی۔

"کیا... کیا چاہتے ہیں؟" ڈاکٹر نے کشیدہ لہجے میں پوچھا۔

"اندر آنا چاہتے ہیں جناب!"

"اندر آنا چاہتے ہیں۔" ڈاکٹر نے برہمی سے دُہرایا۔ "تم نے بتایا نہیں کہ اسپتال میں ملاقاتیوں کی آمد و رفت کا وقت مقرر ہے۔ یہ وقت ختم ہو گیا ہے... اور ہم اِتنے لوگوں کو ایک ساتھ اندر آنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ کبھی نہیں۔"

"بتایا، بتایا جناب!" چھاگلا نے جسم سیدھا کر لیا۔ "صدر دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔ وہ سارے کے سارے نہیں، صرف چند آدمی اندر آنے کی درخواست کر رہے ہیں۔ اُن کی خاصی بڑی تعداد کی وجہ سے کچھ شور مچنا شروع ہوا تھا۔ ٹوکنے پر کہ اسپتال کا خیال رکھا جائے، اُنھوں نے احتیاط کی۔"

"کیا کہا تم نے؟" ڈاکٹر براڑے نے چونک کے پوچھا۔ "صرف چند آدمی اندر آنا چاہتے ہیں، مگر کیوں؟"

"وہ اُستاد جھلّ کا نام لے رہے ہیں۔ کہتے ہیں، صرف ایک دو منٹ کے لیے وہ اُستاد جھلّ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔"

ڈاکٹر اور میں نے منتشر نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ "کون ہیں وہ؟"

"اُستاد میدا اور اُس کے چند ساتھی۔"

"اُستاد میدا؟" ڈاکٹر کی نظریں سیدھی مجھ پر منڈلائیں اور اُس نے چھاگلا سے پوچھا۔ "تم پہچانتے ہو اُسے؟"

"جی، جی ہاں، کل بھی تو اُسے دیکھا تھا یہاں۔" چھاگلا نے گھبرائے انداز میں کہا۔ "وہی ہے جناب۔"

"کیا وہ واقعی اُستاد جھلّ کا نام لے رہا تھا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں۔" چھاگلا نے اکڑ کے کہا۔

"اُن سے کہو، اسپتال کے قاعدے کے مطابق اَب شام 4 بجے سے 6 بجے کے دوران ہی ملاقات ہو سکتی ہے۔"

ڈاکٹر براڑے نے بپھری ہوئی آواز میں فیصلہ سنا دیا۔

"میں نے کہا تھا جناب! اُنھوں نے کہا، بس ڈاکٹر صاحب تک ہماری درخواست پہنچا دو۔ وہ مہربان آدمی ہیں۔ نہیں مانے تو ہم چار بجنے تک کا انتظار کر لیں گے۔"

"چار بجے تک وہ یہیں بیٹھے رہیں گے۔" ڈاکٹر برانگیختہ ہو گیا۔ "ٹھیک ہے، بیٹھیں، بیٹھیں۔ اُن سے صاف کہہ دو کہ اُنھوں نے اسپتال کا سکون درہم برہم کرنے کی کوشش کی تو پولیس حرکت میں لائی جا سکتی ہے۔"

"بہتر جناب۔" چھاگلا نے مؤدبانہ سر خم کیا۔

وہ واپس جایا چاہتا تھا کہ میں نے اُس سے ٹھہر جانے کو کہا اور ڈاکٹر راڑے سے گزارش کی۔ "مجھے اجازت دیجیے، میں اُن سے ملتا ہوں۔ یہ کوئی دوسری بات معلوم ہوتی ہے۔ وہ نہیں جو ہم قیاس کر رہے تھے۔ آپ نے غور کیا، میدا اُستاد وہاں موجود ہے اور وہ جھلّ بھائی کا نام لے رہا ہے۔"

ڈاکٹر کو جواب دینے میں تامّل ہوا۔

"یہ بڑے ضدّی اور ڈھیٹ قسم کے لوگ ہوتے ہیں، یہیں بیٹھے رہیں گے۔" میں نے تمام تر متانت سے کہا، حالاں کہ مجھے خود بڑی وحشت ہو رہی تھی۔

"دیکھتے ہیں پھر۔" ڈاکٹر پست آواز میں بولا۔

خدمت گار نے چائے پیالیوں میں اُنڈیل دی تھی۔ چھاگلا بھی منتظر کھڑا تھا۔ ڈاکٹر نے لباس کھینچ کر شکنیں درست کیں، بالوں پر ہاتھ پھیرا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میں لپک کر اُس کے برابر ہوا اور دبی زبان میں مشورہ دیا کہ وہ میرے ساتھ نہ جائے۔

"مجھے معلوم ہے، تمہیں جانا چاہیے، لیکن میں اپنی آنکھوں سے کچھ دیکھنا چاہتا ہوں۔" اُس نے آزردہ مسکراہٹ سے کہا۔ وہ مجھے کہہ رہا تھا، اُس وقت وہ خود بچوں جیسی خواہش کر رہا ہے، یا بار بار اُسے اُن لوگوں کے سامنے نہیں ہونا چاہیے۔ تجسس و اضطراب اپنی جگہ، لیکن اُس کا ایک مرتبہ ہے۔ میں کچھ نہ کہہ سکا۔ یہ ادب کی حدود کا لحاظ کبھی بڑا جبر ہوتا ہے۔

"وہ میرے ساتھ رہنے سے سنبھلے رہیں گے۔" یہ کہتا ہوا سب سے پہلے وہی دروازے سے باہر نکلا، پھر میں اور چھاگلا۔ ہمیں دیکھ کے عمارت کے وسیع استقبالی ہال میں تعینات پژمردہ سپاہیوں

مینارِ پاکستان

برِّصغیر میں عالم گیری مسجد (لاہور) کے میناروں کے بعد جو پہلا اہم مینار مکمل ہوا ہے، وہ مینارِ قراردادِ پاکستان ہے۔ یوں تو مسجد اور مینار آمنے سامنے ہیں، مگر اُن کے درمیان یہ ذرا سی مسافت، جس میں سکھوں کا گردوارہ اور فرنگیوں کا پڑاؤ شامل ہیں، تین صدیوں پر محیط ہے۔ میں مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھا اُن تین صدیوں کا ماتم کر رہا تھا۔ مسجد کے مینار نے جھک کر میرے کان میں راز کی بات کہہ دی۔ جب مسجدیں بے رونق اور مدرسے بے چراغ ہو جائیں، جہاد کی جگہ جمود اور حق کی جگہ حکایت کو مل جائے، ملک کے بجائے مفاد اور ملّت کے بجائے مصلحت عزیز ہو اور جب مسلمانوں کو موت سے خوف آنے اور زندگی سے محبت ہو جائے تو صدیاں یوں ہی گم ہو جایا کرتی ہیں۔

آوازِ دوست، از مختار مسعود ❖ تعاون: ابوالفرح ہمایوں

میں جیسے جان آ گئی۔ چند قدم کی دُوری طے کر کے ہم عمارت سے نکل آئے۔ سامنے ایک بڑے بیضوی دائرے کی شکل میں سبزہ زار پھیلا ہوا تھا، اطراف میں پام کے بلند قامت درخت ایستادہ، سبزہ زار کے اُس طرف صدر دروازہ اور صدر دروازے کے دائیں بائیں لوہے کی سلاخوں کا جنگلا بنا ہوا تھا۔ سلاخوں سے جگہ جگہ مختلف رنگوں کے پھولوں کی بیلیں لپٹی ہوئی تھیں۔ سبزہ زار کے دائرے کے دونوں جانب گھومتی ہوئی لال بجری بچھی گھومتی روِش پر چلنے کے بجائے ڈاکٹر راڑے سبزہ زار کے بیچوں بیچ اینٹوں سے بنے پگ ڈنڈی جیسے راستے پر آ گیا۔ یہ راستہ سیدھا صدر دروازے پر ختم ہوتا تھا۔ اِس طرح فاصلہ مختصر ہو گیا۔

وہ بڑی تعداد میں باہر بکھرے ہوئے تھے۔ چھاگلا تیز قدموں سے آگے چلا گیا تھا۔ ہم سے پہلے دربان کے پاس جا کے اُس نے صدر دروازے کا بغلی دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا۔ ہم پر نظر پڑتے ہی یکایک شور اُٹھا، لیکن چھاگلا کی بروقت مداخلت سے بھن بھناہٹ میں تبدیل ہو گیا۔ دروازہ کھلنے پر ہمیں جگہ دینے کے لیے وہ پیچھے ہٹنے لگے اور چھاگلا کی تقلید میں اور بہت سوں نے ہاتھ اُٹھا اُٹھا کے لوگوں کو خاموش رہنے کی تلقین شروع کر دی۔

اِتنے قریب جانے پر اُن کے چہرے نمایاں ہو گئے اور یہ

میرے ہوش و حواس کی کوئی آزمائش تھی۔ اُستاد میدا، برجو دادا اور اُن کے معتمد ساتھیوں کے درمیان جامو اور زورا بھی موجود تھے۔ پہلے جامو نے مجھے دیکھا، پھر زورا نے، اور وہ اُچھلنے لگا۔ جیسے ہی ہم دروازے سے باہر نکلے، وہ بیچ میں کھڑے لوگوں کو ہٹاتا دیوانہ وار پاس آ کے مجھ سے چمٹ گیا اور میرے سینے سے سر رگڑنے لگا۔ اِدھر جامو نے مجھے پہلو سے دبوچ لیا۔ چند لمحوں تک میں خود سے بیگانہ سا رہا۔ میری آنکھیں جلنے لگیں اور جی چاہا، اپنا سارا وجود اُن کے حوالے کر دوں، میں بے اختیار ہو جاؤں۔ اِسی دوران میری نظر ڈاکٹر رائے پر گئی، اور مجھے اپنے آپ کو پھر سمیٹنا اور باندھنا پڑا۔ میں نے جکڑی ہوئی آواز میں اُن سے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب... ڈاکٹر رائے... اسپتال کے سب سے بڑے ڈاکٹر۔“

اُن دونوں نے مجھے چھوڑ دیا اور سٹ پٹاتے ہوئے ڈاکٹر کو سلام کیا۔

”اُستاد کیسے ہیں۔“ جامو نے بے تابی سے پوچھا۔

”ٹھیک ہیں اَب۔“ یہ بتاتے ہوئے میری آواز حلق میں پھنس گئی۔ میرے تو دست و بازو، سارا جسم ہی دُکھنے، ڈھیر ہونے لگا تھا۔

اِتنے میں اُستاد میدا، برجو دادا میرے سامنے آ گئے۔ دونوں کے ہاتھ جُڑے ہوئے تھے، اور شکل و صورت سے سرگردانی جھلک رہی تھی۔ میدا نے خیال رکھا۔ پہلے ڈاکٹر کے پانو چھوئے، پھر میرے پیر پکڑ لیے۔ ”ہمرے کو ماپھی دے دیو اُستاد!“

مجھے حیرت ہوئی، وہ بلک رہا تھا۔ میں نے اُس کے شانے پکڑ کے اُسے پیروں سے اُٹھایا، لیکن وہ اپنے بال نوچنے کھسوٹنے اور پیشانی کوٹنے لگا۔ میں نے اُسے روکا تو وہ بے طرح میرے سینے سے لگ گیا۔ ”ہمرے کو کچھ پتا ناہیں تھا لاڈلے بابو، کون سامنے ہے، اپنا متھا ہی پھر گیو تھا، کچھ پوچھا، نہ جانا، ایسے کون سینہ تان کے اپنے سامنے آ سکت ہے۔ اُستاد ٹھل کا لاڈلا ہی ہوئے گا، کوئی

الیو۔ اندھا بن گیو تھا ہم... اور تم... تم بھی تو کچھ ناہیں بولے... اُستاد ٹھل اپنے شہر میں ہو اور ہمرے کو بالکل کھبر ناہیں... کیسو گھور پاپ ہو گیو ہمرے سے۔“ میدا کا حال دگر تھا۔

جامو نے اُسے کھینچ کے میرے پاس سے ہٹایا۔ میدا، برجو، زورا اور جانے کون کون، وہ سبھی اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے، اور اُدھر ڈاکٹر رائے موجود تھا۔ میرا دماغ ہی معطل ہو گیا تھا، کس طرف دیکھوں، کس کی سنوں اور کسے کیا جواب دوں۔ ہجوم میں ہر شخص ہم سے قریب ہونے کی کوشش کر رہا تھا اور دھکم پیل سی ہونے لگی تھی۔ میں نے بے چارگی سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا، وہ ذہین و فطین آدمی لمحوں میں ساری صورتِ حال سمجھ گیا۔ اُس نے پہلو میں کھڑے چھاگلا کو سرگوشی میں کوئی ہدایت کی۔ ایک ثانیے کی تاخیر کیے بغیر چھاگلا نے میدا کے بجائے عمر رسیدہ برجو کا بازو تھام کے اُسے ڈاکٹر رائے کا حکم منتقل کر دیا۔

جواب میں برجو منّت سماجت کرنے لگا۔ ”سارے اُستاد ٹھل کے درشن وسطے آیو ہیں مہاراج۔“

”وہ یہاں نہیں آ سکتا۔“ ڈاکٹر رائے نے درشتی سے کہا۔ ”نہ اُس کے کمرے میں اِتنے لوگوں کو جانے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔“

ناچار برجو دادا نے دربان کی کرسی پر کھڑے ہو کے ہجوم کو واپس چلے جانے کی تاکید کی۔ ”بڑے ڈاکٹر ساب کا حکم ناہیں ہے بھیا، ابھی اُستاد ٹھل باہر نا آ سکت ہیں۔ ڈاکٹر ساب کچھ اور اِنتجار کرنے کو بولے ہیں۔“

ڈاکٹر رائے کے ایما سے چند آدمیوں کو اندر جانے کی اجازت دے دی گئی۔

خلافِ توقع ڈاکٹر پھر وہاں نہیں ٹھیرا۔ میرا اشارہ تھیک کے وہ تنہا واپس ہو گیا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا، لیکن مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ کیا کہنا چاہیے۔ چھاگلا نے پھرتی سے کام لیا۔ دربان اور اردگرد کھڑے سپاہیوں نے میرے اور چھاگلا کے علاوہ آٹھ آدمیوں کو اسپتال کی چار دیواری میں داخل کر دینے کے بعد دروازہ بند کر دیا، اندر ہمارے قدم رکھتے ہی ہجوم کی گونج تیز ہو گئی تھی، لیکن ہم اُن سے دور ہوتے گئے، زورا اور میدا میرے دونوں بازو جکڑے، جیسے مجھ میں پیوست ہوئے جاتے تھے۔ سبزہ زار کے بیچ میں تنگ راستے پر چلتے ہوئے ہم مرکزی عمارت

میں آ گئے۔ میدا کے ساتھ کیلے کے تازہ پتوں سے ڈھکی اور کلاوے سے بندھی ٹوکریاں سر پر اُٹھائے تین اَور آدمی بھی تھے۔ ڈاکٹر رائے کے کمرے سے کچھ فاصلے پر ایک بڑے صاف ستھرے اور روشن کمرے میں چھاگلا ہمیں لے آیا۔ کمرے کے دو اطراف دیواروں کے ساتھ صوفے لگے ہوئے تھے اور ایک گوشے میں بڑی گول میز اور اُس کے گرد درجن بھر کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ٹوکریاں میز پر رکھ کے تینوں آدمی باہر چلے گئے۔ کمرے میں میرے اور چھاگلا کے علاوہ صرف پانچ ہی افراد رہ گئے۔ زورا، جامو، میدا، برجو اور ایک پختہ کار آدمی، جو کل بھی میدا کے ساتھ اسپتال آیا تھا اور جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا تھا۔ چھاگلا کی درخواست پر جھجکتے ہوئے وہ پانچوں صوفوں پر بیٹھ گئے۔ میدا اور جامو میرے دائیں بائیں بیٹھے۔ چھاگلا نے مجھ سے کسی خدمت کے لیے پوچھا۔ میں کیا کہتا، مجھے تو اِس کا شکریہ ادا کرنے کا بھی یارا نہیں تھا۔ میرے بجائے اُن سب نے انکار کر دیا، پھر چھاگلا بھی کمرے میں نہیں رُکا۔

☹ کچھ دیر خاموشی رہی، جیسے اُن کے پاس کوئی موضوع ہی نہ رہا ہو، یا پھر احوال بے شمار اور کثرتِ ماجرا اور ناگفتنی کو گفتنی کرنے کی فکر میں بات شروع کرنی مشکل ہو جاتی ہے۔

”کیا ہوا تھا اُستاد کو؟“ جامو نے بوجھل آواز میں پہل کی۔

پھر تو اُن میں سے کسی کو قرار نہیں رہا۔ ایک چپ نہیں ہوتا تھا کہ دوسرا بول پڑتا۔ وہ سارے وضاحتیں، صراحتیں اور تاویلیں کرتے رہے۔ جو گزر چکا تھا، اُس کا ملال، اُس کا تعین۔ اکبر علی خاں کے دونوں تار کلکتے پہنچ گئے تھے۔ اڈّے پر نہ جامو تھا، نہ زورا اور جمرو۔ وہ تینوں اڈّے کے چند اَور ساتھیوں کے ہم راہ اُستاد سامی بابو کی ناگہاں موت پر کھلنا گئے ہوئے تھے۔ سامی بابو کے آبا و اجداد آسام سے آ کے کھلنا شہر میں بس گئے تھے۔ آسام کی نسبت سے سب اُسے سامی کہتے ہیں، میں بھی اُسے خوب جانتا تھا، ہاتھ کا بڑا صاف، جی داری میں یکتا، ٹھل کا مقربِ خاص تھا۔ ایک زمانے سے کلکتے کے اڈّے سے وابستہ تھا۔ جامو کے کہنے کے مطابق ماں کی موت کی خبر ملنے پر عرصے بعد سامی بابو کھلنا گیا تھا کہ وہاں کسی سے لڑائی جھگڑے میں مارا گیا۔ جامو، جمرو، زورا وغیرہ کو

تیسرے چوتھے روز کلکتے واپس آ جانا تھا۔ اڈّے پر سبھی آج کل میں اُن کی واپسی کے منتظر تھے، مگر اپنے اڈّے کے آدمی کے خون کا حساب صاف کیے بغیر، صرف آنسو بہا کر انھیں واپس نہیں آنا چاہیے تھا۔ کھلنا میں ابھی ایک دو روز انھیں اَور ٹھیرنا تھا۔ کلکتے کے اڈّے والوں نے ایک دن اَور اُن کی راہ دیکھی، پھر ہرکارہ بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ ہرکارے کے پہنچتے ہی جامو، جمرو، زورا وغیرہ نے سب کچھ اُدھورا چھوڑ کے فوراً کلکتے روانگی کا قصد کیا۔ شدید بارشوں نے راستے مسدود کر دیے تھے۔ بہرحال، کسی نہ کسی طرح وہ کلکتے پہنچے اور لباس کی تبدیلی کے لیے کچھ دیر اڈّے ٹھیر کے پہلی گاڑی سے پٹنے روانہ ہو گئے۔

بارشوں کی وجہ سے گاڑی کی رفتار سُست تھی۔ تین گھنٹے تاخیر سے پہنچی۔ رات 9 بجے پٹنا اسٹیشن اُتر کے اُنھوں نے سیدھے گرانڈ ہوٹل کا رُخ کیا۔ تار میں اُسی ہوٹل کا پتا مندرج تھا۔ اسٹیشن سے باہر آتے ہی اُن کا ماتھا ٹھنکا تھا، راہ گیروں کی تعداد کم، دکانیں بند، پولیس کا گشت اور سناٹا سا، تھوڑی بہت تانگے والے سے اُنھوں نے سُن گُن لی۔ ابھی وہ کچھ اَور جاننے بوجھنے کی ٹوہ میں تھے کہ پولیس نے تانگا روک لیا، اُنھوں نے احتیاط کی کہ ہوٹل کے بجائے اپنی منزل میدا کا اڈّا بتائی۔ پولیس اُنھیں تھانے لے گئی۔ رات گئے مختلف افسران اُن سے سوالات کرتے، دھمکیاں دیتے اور پولیس والوں کی طرح پیش آتے رہے۔ اُن کی تلاشی لی گئی۔ دونوں کی جیبوں

سے چاقو برآمد ہوئے، لیکن یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ وہ پہلے ہی بتا چکے تھے کہ اُن کا تعلق کلکتے کے اڈّے سے ہے۔ احتیاطاً اُنھوں نے میرا اور بخل کا کوئی حوالہ نہیں دیا، کیوں کہ تار میں طلبی کی وجہ کا ذکر نہیں تھا، اور اب شہر کے حالات کے پس منظر میں وہ یہ نتیجہ اخذ کر سکتے تھے کہ اس اچانک طلبی کی وجہ سنگین ہی ہو سکتی ہے۔ بڑی بحث و تکرار اور سفر کے دوران بعض شہادتوں کی تصدیق کے بعد پولیس کو یقین آ گیا کہ واقعی وہ کلکتے سے تازہ تازہ آئے ہیں اور گذشتہ دنوں شہر میں ہونے والے خوں ریز واقعات میں ملوث نہیں ہیں۔ پولیس نے میدا سے رابطہ کیا تو وہ خود تھانے پہنچ گیا اور اُس نے اپنی ضمانت پر دونوں کو پولیس سے نجات دلائی۔

جامو کے بہ قول، میدا اور اُس کے ساتھی اس انکشاف پر ششدر رہ گئے کہ جامو اور زورا تو بخل کے بلاوے پر یہاں آئے ہیں۔ گویا بخل پہنچے ہیں، گرانڈ ہوٹل میں موجود ہے۔ جامو اور زورا کو ساتھ لے کر میدا اُسی وقت ہوٹل پہنچا۔ وہاں اُنھیں معلوم ہوا کہ بخل تو کئی دن سے اسپتال میں ہے۔

رات بہت گزر چکی تھی۔ ہوٹل سے وہ اسپتال گئے، لیکن اُن کا اندر جانا ممکن نہ ہو سکا۔ اسپتال سکوت میں ڈوبا ہوا تھا، اور بڑی تعداد میں پولیس پہرا دے رہی تھی۔

زنجیر کی کڑیاں پھر ملتی ہی گئیں۔ میدا کہ رہا تھا، اُس پر تو قیامت گزر گئی؛ جو نوجوان اُس کے اڈّے پر اس دیدہ دلیری سے آیا تھا، کوئی اور نہیں، اُستاد بخل کا 'لاڈلا' تھا۔ وہ نوجوان، جس کی وجہ سے بخل عملاً اڈّے سے دست بردار ہو گیا ہے، اور شہروں شہروں اُسی کے ساتھ گھومتا رہتا ہے۔ برجو دادا نے بتایا کہ رات بھر میدا تڑپتا، بلکتا رہا، وہ کیسا بد بخت ہے، اُستاد بخل بیماری کی حالت میں اُس کے شہر میں موجود ہو، اور اُسے خبر نہ ہو پائے۔ صبح ہوتے ہی اُس نے اپنے ذرائع سے بخل کی خیر خبر حاصل کی اور یہ جان کے چین نصیب ہوا کہ بخل رُو بہ صحت ہے اور آج صبح اُس نے کچھ دیر چہل قدمی بھی کی ہے۔

کسی ردّ و قدح کے بغیر میدا اعتراف کر رہا تھا کہ اُس نے اور برجو دادا نے مبارزت ملتوی کرنے کا فیصلہ خوب سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اپنے اڈّے پر بلائے ناگہانی کی طرح وارد ہونے والے نوجوان کے عزم و ہمت سے وہ سحر زدہ ہو چکا تھا۔ اُس وقت یہی ایک تدبیر قرینِ مصلحت تھی کہ

کوئی خطرہ مول نہ لیا جائے اور کسی طور یہ وقت ٹال دیا جائے، اور مبارزت کے التوا کے بعد ملنے والی مہلت کے دوران غیبی نوجوان کے کوائف کے بارے میں آگہی حاصل کی جائے۔ اب اُسے احساس ہو رہا ہے، وہ مبارزت پر آمادہ ہو جاتا تو نتیجے میں کیسی ذلت کا سامنا کرنا پڑتا۔

یہ اتفاق ہے کہ اُسے مجھ سے ملنے کا موقع بھی نہ مل سکا تھا، لیکن وہ مجھ سے اچھی طرح واقف تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ میں بخل کا مقرّب اور تربیت یافتہ ہوں۔ میری نگاہ کی تیزی، بازوؤں کے بل اور چاقو پر دست رس کی بڑی دھوم ہے۔ میں نے بمبئی کے کئی پاڑوں کے داداؤں کو یکے بعد دیگرے بے دخل کر دیا تھا۔ حیدرآباد اور جانے کہاں کہاں اڈّوں پر قبضے کے واقعات اُس کے علم میں تھے، اور یہ بھی کہ سات سال جیل میں مَیں نے تعلیمی سلسلہ جاری رکھا تھا، اڈّے پر جب میں نے کسی موقع پر اکبر علی خاں کو مداخلت سے باز رہنے کے لیے ٹوکا تھا تو اُسے میری انگریزی دانی پر حیرت ہوئی تھی، لیکن اُس کی عقل خبط ہو چکی تھی، اُسے ذرا بھی شک نہیں گزرا کہ میں بخل کا لاڈلا، لاڈلا اُستاد ہو سکتا ہوں۔ ایک ذرا چھو جانے کی حد تک یہ گمان اُس کے دماغ میں در آتا تو ساری صورتِ حال بدلی ہوئی ہوتی۔ میدا اور اُس کے ساتھی گذشتہ رات ماتم کرتے رہے کہ پھر پے در پے یہ سانحے رُونما ہوتے۔

اڈّے کے وہ چند آدمی جو بُری طرح مشتعل تھے کہ ایک اجنبی کی وجہ سے اُن کا عزیز ترین ساتھی دھنوا خیدا ہو گیا اور میدا تماشائی بنا رہا۔ اُنھیں قلق تھا کہ چنگل میں آئے اُس اجنبی کو میدا نے اتنی آسانی سے کیوں جانے دیا... وہ پاگل بھی میری حقیقت سے آگاہ ہو جاتے تو اُن کا جنون کبھی اِس انتہا کو نہ پہنچتا۔ میں بخل کے نام سے وابستہ تھا، اور بخل اُن کے لیے جتنا واجبِ احترام تھا، اُتنا ہی ہیبت کی علامت بھی۔

میدا کے اعتراف میں کوئی کھوٹ نظر نہیں آتی تھی، کیوں کہ اُس کا تعلق نوٹنکی سے شاید کبھی نہیں رہا تھا۔ وہ کہ رہا تھا کہ اُسے مجھ سے کوئی دل چسپی تھی نہ میرے بیمار بھائی سے۔ میرے لیے تو عداوت اُس کے دل میں گھر کر چکی تھی۔ پہلے دن، شام کو جو دو پولیس والے سادہ لباس میں مجھ سے ملنے اسپتال آئے تھے، اُن کا تعلق واقعی پولیس سے تھا، لیکن اصل میں وہ

اُس کے فرستادہ تھے۔ اُنھیں بھیج کر وہ میرا عزم جاننا اور میری میزان کرنا چاہتا تھا، اور یہ سن کے اُس کا اضطراب دوچند ہوا کہ میں اپنے ارادے میں اٹل ہوں اور بھائی کی طبیعت ٹھیک ہوتے ہی اپنا چاقو واپس لینے، یعنی میدا سے پنجہ آزمائی کے لیے اڈّے ضرور جاؤں گا، چناں چہ رات کو جب مجھے ختم کرنے کے لیے میدا کے سرد رویّے سے نالاں دھنوا کے جاں نثار ساتھیوں نے اسپتال میں داخل ہونے کی جرأت کی تھی تو میدا کو اُن کے اِس سفاکانہ اقدام پر کسی قدر تسلی ہوئی کہ اُس کے ایما سے نہ سہی، مگر چند لوگ میرے خاتمے کے تو درپے ہیں، اور میدا کا کہنا تھا کہ اُس سے یہی چوک ہو گئی۔ اُس کی خاموشی اور چشم پوشی نے دھنوا کے دوستوں کا حوصلہ مہمیز کیا۔ اُسے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ مجھ سے نفرت اور اپنے قہر و غضب میں وہ جنگلی حد سے گزر جائیں گے۔ اُن کے ہاتھ میں نہ آ پایا تھا تو کسی طور پر مجھے زک پہنچانے کے لیے وہ میرے مربی، ایک بے گناہ، غیر متعلق شخص کو نشانہ بنا دیں گے۔

اُس رات اسپتال میں ایک نوجوان انتھونی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا، لیکن میدا کی نظر میں یہ اتنا بڑا سانحہ نہیں تھا۔ انتھونی نے خود اپنی موت کو دعوت دی تھی۔ وہ اُن بھاگتے ہوئے لوگوں کے آڑے نہ آ جاتا تو اِس انجام سے دوچار نہ ہوتا۔ بھاگتے ہوئے چور کی راہ میں کوئی رکاوٹ اُسے حیوان بنا دیتی ہے، مگر اکبر علی خاں کس کے آڑے آئے تھے۔ میدا کہ رہا تھا کہ اُسے اکبر علی خاں کی موت کا بڑا صدمہ ہے، اُنھوں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ وہ شہر کے ایک معزز، بڑے نام ور، بہت مہربان آدمی تھے۔ ایسے لوگ تو کم کم پیدا ہوتے ہیں۔ یہ کیا ہو گیا۔ میدا کے بہ قول، اُس کا دماغ ہی پھر پلٹ گیا۔ اُسے اڈّا، اڈّے کی چوکی حقیر لگنے لگی۔ اُسے تو اپنے آپ سے چڑ ہونے لگی تھی۔ اُس نے طے کر لیا تھا کہ اب جو کچھ بھی ہو، وہ اُن تین وحشیوں کو زندہ نہیں رہنے دے گا۔ اِس طرح اکبر علی خاں کی موت کی تلافی تو نہ ہوگی، مگر میدا کو اپنے آپ کو بھی تو کوئی جواب دینا تھا۔ اُسے میری آگ کا بھی احساس تھا کہ بجا طور پر میرا ردِّ عمل اب کتنا شدید ہو سکتا ہے۔ اِس لیے اُس نے کل شام اسپتال آ کر میرا چاقو واپس کر کے اڈّے سے دست برداری کا اعلان کر دیا، اور یہ کوئی اپنے دفاع، اپنی جان بچانے کا کوئی حیلہ و حربہ نہیں

انصاف

عدالتوں میں انصاف رائج کرنے کی ایک انوکھی ترکیب کموجیہ نامی بادشاہ نے نکالی تھی۔ اُس کے عہد سے پہلے کسی کو یہ ترکیب سوجھی نہ اُس کے بعد کسی کو اِس پر عمل کرنے کی توفیق ہوئی۔ بادشاہِ کموجیہ کے حکم کے مطابق بے انصاف اور بے ایمان جج کی کھال بہ طورِ سزا کھینچ لی جاتی۔ چوں کہ یہ کھال یتیم خانے کے کسی مصرف کی نہ ہوتی، اِس لیے اُس سے سرکاری فرنیچر کی پوشش کا کام لیا جاتا۔ جج صاحب کی کھال اُن کی کرسیِ عدالت پر مڑھوا دی جاتی۔ پھر آں جہانی کی جگہ اُس کے بیٹے کا تقرر کیا جاتا تاکہ وہ اُس کرسی پر بیٹھ کر آغوشِ پدر کی گرمی اور انجامِ پدر کی تپش محسوس کرے اور مقدمات کا فیصلہ کرتے وقت انصاف اور صرف انصاف سے کام لے۔

فلوحِ ایام از مختار مسعود ❖ تعاون: اشتیاق خان

تھا۔ وہ اپنے آپ کو ترک کر چکا تھا۔

میدا سے بخل کا واسطہ کوئی نیا نہیں تھا۔ ایک زمانے میں بخل کی قدم بوسی کے لیے مہینے ڈیڑھ مہینے بعد کلکتے جانا اُس کا معمول تھا۔ وہ کہ رہا تھا، بخل بھی کبھی کبھی پٹنے بہت آیا جایا کرتا تھا۔ بخل سے میدا نے بہت ہنر سیکھا تھا۔ پٹنے کے اڈّے کی چوکی کا منصب بھی اُسے بخل کے سائے؛ بخل کی تربیت کے طفیل مل پایا تھا۔ اُس کے چوکی سنبھالنے کی رسم ادائی کی تقریب بخل کی سرپرستی میں ہوئی تھی۔ اب بہت عرصے سے اُس کی ملاقات نہیں ہو پائی تھی، لیکن بخل سے تو اُس کا رشتہ قلبی اور دائمی ہے۔ اِس دوران بھی وہ کئی بار کلکتے گیا اور اپنے ولی نعمت کے دیدار سے محروم لوٹ آیا۔ بخل تو کلکتا شہر جیسے بھول ہی گیا ہے۔ بخل کا نام لیتے ہوئے میدا کا لہجہ محبت و عقیدت سے معمور تھا۔

میں نے کچھ نہیں کہا، کہنے کو اب رہ بھی کیا گیا تھا۔ میری خاموشی پر شاید اُسے گمان ہوا کہ جس صمیمِ قلب سے اُس نے اپنا احوال بیان کیا ہے، میں نے اُس دردمندی سے نہیں سنا ہے۔ مجھے اُس سے کیا کہنا چاہیے تھا، کہ میرا سینہ بہت بھرا ہوا ہے۔ ہزار نظریں چراؤں، اکبر علی خاں کا چہرہ بار بار سامنے آ جاتا ہے، اور ایک ہُوک سی اُٹھتی ہے، اور کچھ بس میں دکھائی نہیں دیتا تو

اپنا وجود ہی زہر لگتا ہے، میدا سے اب کوئی پرخاش رکھنے سے حاصل بھی کیا تھا۔ لوٹ پھیر کے پس ماندگانِ خستگاں کو اِسی ایک سنگ دلانہ قول اور بے رحمانہ ارشاد پر تکیہ کرنا پڑتا ہے کہ جس کی موت جس طرح لکھی ہے، اُسی طرح آئے گی۔

میدا یک لخت اپنی جگہ سے اُٹھ کے میرے سامنے آکے فرش پر بیٹھ گیا اور اُس نے پہلے کی طرح پھر میرے پیر پکڑ لیے اور گھٹنوں پر سر رکھ کے مچلنے بکھرنے لگا۔ وہ رو رہا تھا۔ اُس کے پاس آنسو تھے، مگر جس کے پاس آنسو بھی نہ رہے ہوں؟

جامو نے پھر اُسے میرے پاس سے ہٹایا۔

چھاگلا نے یقیناً ڈاکٹر راے کی ہدایت پر چاے اور دیگر لوازم فراہم کیے تھے۔ خدمت گار مہمانوں کی طرح اُن سب کی خدمت بجالایا تھا۔ وہ بٹھل کو دیکھنے کے لیے بے قرار تھے، اور ڈاکٹر راے کے عندیے کے بغیر یہ ممکن نہ تھا۔ میں نے خدمت گار سے چھاگلا کو بلانے کے لیے کہا۔ وہ کہیں قریب ہی تھا، جلد ہی پُر تپاک انداز میں حاضر ہوگیا۔ میرے استفسار پر اُس نے بتایا کہ ڈاکٹر راے مریضوں کے معائنے کے لیے معمول کی گشت پر ہے اور واپس آیا ہی چاہتا ہوگا۔ ہم انتظار کرتے رہے اور اِس درمیان جامو، برجو دادا، اُس کا ساتھی میدا کی کیفیت کی توثیق و تصدیق کرنے، اور ایک طرح اُس کی وکالت کرنے لگے۔ میدا کو پھر بے کلی سی ہوئی، بھڑکتے لہجے میں خود پر لعن طعن کرنے لگا کہ کل شام وہ سر ہنگوں جب میرے پاس اپنا چاقو لوٹانے اور اڈّے کی چوکی، اڈّے کے ماحول اور اِس شہر ہی سے ہمیشہ کے لیے نکل جانے کا ارادہ کر کے اسپتال آیا تھا، اور اُس نے اپنے آپ کو میری صواب دید پر چھوڑ دیا تھا کہ جو چاہوں، اُس کے لیے سزا تجویز کر دوں، اُس وقت بھی اُس کی آنکھ نہیں کھلی، اُسے مطلق خیال نہیں آیا کہ یہ فیاضی اور دریا دلی تو بٹھل کی کسی نظیر، کسی پرچھائیں ہی کی ہوسکتی ہے جو میں نے اُس سے روا رکھی تھی۔ یہ تو صاف صاف اُس کے آقا بٹھل کے تیور ہیں، یہ تو اُس کا پرتو ہے۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ چھاگلا نے آکے بتایا، ڈاکٹر راے واپس آگیا ہے، اور اپنے کمرے میں میرا منتظر ہے۔ اُن سب کو وہیں چھوڑ کے میں فوراً چھاگلا کے ساتھ کمرے سے باہر آگیا۔ ڈاکٹر کی نظریں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ اُس کی اجازت سے میں اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"ہاں لاڈلے صاحب... راجا... اور بابر اُستاد! کیا حال ہے؟" وہ اینٹھی ہوئی آواز میں بولا۔

"اور بھی ایک دو نام ہیں... ظہیر بھی ایک نام ہے میرا۔ گھر میں امی کبھی 'ببری' اور 'ببر' بھی کہہ دیتی تھیں۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"ہاں، ہاں، تین ہوسکتے ہیں تو چار پانچ بھی۔"

"کیا ایک شخص کا ایک ہی نام لازم ہے؟"

"نہیں، نہیں، بالکل نہیں۔" وہ تیزی سے بولا، "اُس کی مرضی ہے، نام بدلتا رہے، سو نام رکھ لے، جہاں جائے، نیا نام، اور کوئی نام ہی کیوں رکھے، بے نام ہی رہے۔"

"ناموں میں کیا رکھا ہے جناب!"

اچھا ہوا جو اُس نے موضوع بدل دیا، منہ پھلا کے بولا، "تم بتاؤ، کیوں ملنا چاہتے تھے؟"

"کیا آپ کچھ سننا چاہیں گے؟"

"سنانے کے لیے کیا کچھ نیا ہے؟"

"اِتنا نیا تو نہیں، لیکن چوں کہ آپ شامل رہے ہیں... تو شاید دل چسپی کا باعث ہو۔"

"شکر ہے، تشویش کا نہیں کہا تم نے۔"

"مگر مایوسی اور اُداسی سے عاری نہیں۔"

اُس نے سر کو خفیف جنبش دی۔ مجھے معلوم تھا، عمر ڈھل چکی ہے، لیکن وہ پس پا نہیں ہوا ہے۔ اُسے سب کچھ جاننے کی بڑی جست جُو ہوگی۔ وہ صدر دروازے سے واپس چلا آیا تھا، پھر جس کمرے میں چھاگلا نے ہمیں بٹھایا تھا، وہاں بھی موجود نہیں رہا۔ دونوں جگہوں پر اُسے ہونا بھی نہیں چاہیے تھا۔ یہ مرتبہ و مقام بھی دیواروں کی طرح ہوتے ہیں، آدمی کو جکڑے رکھتے ہیں، ڈاکٹر نے خاموشی اختیار کر لی تھی اور بے وجہ نہیں۔ اُسے تردد ہوگا کہ میں اِدھر اُدھر کی کسی بات میں اُلجھ نہ جاؤں۔ میں نے بھی مدّعا بیان کرنے میں دیر نہیں کی اور مختصراً میدا کے اعترافات کے بارے میں بتایا۔ میں نے کہا، "میدا مسلسل خود کو ملامت کر رہا تھا کہ اتنی جراتیں دیکھتے ہوئے اُسے کسی لمحے بٹھل بھائی اور میرا خیال آنا چاہیے تھا۔ کاش کہ ایسا ہوتا، کچھ میری بھی کوتاہی تھی۔ اُس کے اڈّے پر جا کے اُسے زچ کرنے

کے لیے میں نے دانستہ بڑی بڑی باتیں کی تھیں۔ اِنھی دعووں سے وہ متزلزل ہوگیا تھا۔ کہیں اگر بٹھل بھائی سے اپنی وابستگی، اُن کا نام میری زبان سے ادا ہو جاتا، کوئی ایک اشارہ بھی، لیکن جانے کیوں میرے سان و گمان میں نہیں تھا کہ بٹھل سے میدا کا اتنا گہرا ربط ضبط ہوسکتا ہے۔ وہ اِسی کا ماتم کر رہا تھا کہ بٹھل کا تو نام سن کے وہ تینوں پاگل بھی ٹھنڈے پڑ جاتے۔ اُنھیں اچھی طرح علم تھا کہ بٹھل بھائی کون ہیں۔"

"کیا بہت بڑا اُستاد ہے تمھارا بھائی؟ وہ کیا کہتے ہیں، منہ بولا بھائی۔"

"معاف کیجیے، منہ بولا کہہ کے آپ میرے اُس کے تعلق کا درجہ گھٹا رہے ہیں۔ میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ میرے اُس کے..."

"یاد آیا۔ تم نے یہی کچھ کہا تھا۔" اُس نے میری آواز کی تپش پر توجہ نہیں دی اور بڑبڑاتے ہوئے بولا، "ٹھیک ہے۔"

"اور وہ صرف کسی اڈّے، یا اڈّوں کے اُستاد نہیں، ایک بہت مختلف آدمی ہیں۔ میں آپ سے کیا کہوں، اُن جیسا مشکل سے کوئی ہوتا ہے۔"

"ہوں، اُوں... واقعی!" وہ دیدے گھماتے ہوئے بولا۔

اُس کا مضحک انداز میں نے بہ جبر نظر انداز کیا۔ اُسے کچھ میری بے لطفی و دل گیری کا احساس ہوا اور اُس نے لہجے میں نرمی پیدا کی۔ "بہ ہر حال کم ہوتا ہے ایسا۔ یہ یگانگت قابلِ رشک ہے۔ مجھے بتاؤ، اب میدا کیا چاہتا ہے؟ تمھارے بھائی سے ملنا؟"

"جی ہاں۔"

"ٹھیک ہے، مگر بہتر ہوگا، وہ زیادہ دیر وہاں نہ ٹھیرے اور گزرے ہوئے واقعات کی کوئی بات نہ کرے۔"

"ظاہر ہے، وہ ایسا نہیں کرے گا، اور اُسے تنبیہ بھی کر دی جائے گی۔ اڈّے کی چوکی پر بیٹھا آدمی عام آدمی نہیں ہوتا۔"

"بہت خاص ہوتا ہے کیا؟"

"خاص نہیں ہوتا تو اڈّے کی چوکی پر تادیر ٹِک بھی نہیں سکتا۔"

"اُس سے کہہ دینا، کوئی شور شرابا نہیں۔"

"وہ بھی سمجھتا ہے، یہ کون سی جگہ ہے۔" میں اُٹھ گیا اور دروازے سے نکلتے نکلتے بے ارادہ میرے قدم رُک گئے، کچھ تامل کے بعد میں نے پلٹ کے ہچکچاتے ہوئے کہا، "آپ کے لہجے سے کچھ بیزاری اور ناپسندیدگی محسوس ہو رہی ہے، مگر میں کیا کروں، یہی کچھ ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے آپ نے میرے بارے میں نظرِ ثانی کی ہو۔"

ایک پل کے سکوت کے بعد وہ کرسی پر اُچھل سا گیا۔ "نہیں نہیں، مجھے تو تم اور دل چسپ اور عجیب لگ رہے ہو۔" وہ زور دے کے بولا۔

میری آنکھوں کو کیا ہوگیا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر جلنے لگی تھیں۔ دوسرے لمحے میں کمرے سے چلا آیا۔

اُن کی درخواست پر چھاگلا نے اسپتال کے تین ملازموں کا انتظام کر دیا۔ تینوں نے ٹوکریاں سروں پر اُٹھا لیں۔ زورا، جامو، میدا، برجو دادا اور اُن کا ساتھی راہ داریوں، وارڈوں اور جگہ جگہ تعینات سپاہیوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے بٹھل کے کمرے تک آگئے۔ سارے راستے زورا نے میرا پنجہ پکڑ رکھا تھا اور قدم سے قدم ملا کے چلتا رہا تھا، جیسے میرا جزو بن جانا، مجھ میں سما جانا چاہتا ہو۔ اُس کے جسم کی لپک، ہاتھ کی گرمی مجھ سے ہم کلام رہی، اپنی وارفتگی اور شدتوں کا اظہار کرتی رہی۔ اُنھیں کمرے کے باہر روک کے میں نے جھانک کے اندر دیکھا۔ بٹھل بستر پر بیٹھا ہوا تھا، سینے کے آگے چھوٹی میز لگی ہوئی تھی اور وہ اپنے ہاتھ سے کھانا کھا رہا تھا۔ سیورین بستر کے کنارے بیٹھی اُس کی نگرانی کر رہی تھی۔ میں نے اُن سے کچھ توقف کے

لیے کہا اور توقف کی وجہ بھی بتائی۔ وہ کمرے کے دروازے کے ساتھ دم سادھے کھڑے رہے۔ ہیجان اُن کے چہروں سے عیاں تھا۔ اُنھیں باہر ہی ٹھیرا کے کچھ دیر بعد میں نے آہستگی سے کمرے میں قدم رکھا۔ بٹھل اور سیورین چونک سے پڑے۔

''کدھری تھا رے؟'' بٹھل نے شکایتی لہجے میں پوچھا۔

''یہیں تھا، ڈاکٹر صاحب کے پاس۔'' میں نے سادگی سے بتانے کی کوشش کی۔ سیورین نے کچھ نہیں کہا، لیکن اس کی نظریں میرے چہرے پر تنکوں کی طرح چبھتی رہیں۔ اسپتال کے ملازموں کے ذریعے اُسے لمحے لمحے کی خبر ملتی رہی ہوگی۔ ایک بڑا ہجوم اسپتال کے باہر دوسری بار جمع ہوا تھا۔ یہ ایک خلافِ معمول واقعہ تھا۔ اسپتال کے ہر فرد کو مضطرب ہونا چاہیے تھا کہ وہ شہر کے اڈّے کے آدمی تھے، بدمعاش، چاقو باز...

بٹھل نے کھانا ختم کر لیا اور گلاس بھر پانی پی لیا تو میں نے پوچھا، ''طبیعت بہ تر ہے نا؟''

اُس نے مایوسی سے کہا، ''بستر پہ ہوں۔''

''کچھ وقت کی بات ہے۔'' میں نے بے پروائی ظاہر کی۔

''کچھ بات ہوئی ڈاکٹر سے؟''

''کیسی بات؟... مطمئن ہیں وہ۔''

''دن کا پوچھتا ہوں۔''

ابھی صبح تو اسی بات پر اُس سے چخ چخ ہوئی تھی۔ وہ پھر وہی رٹ لگا رہا تھا۔ ''میں نے نہیں معلوم کیا۔'' میں نے صاف کہا، ''وہ کیوں روکیں گے زیادہ، جب سمجھیں گے، خود ہی بتا دیں گے۔''

اُس کی پیشانی پر انتشار کے آثار نمودار ہوئے، لیکن وہ چپ رہا۔

''کوئی تم سے ملنے آیا ہے۔'' موقع دیکھ کے میں نے دھیرے سے کہا۔ قریب موجود سیورین، بٹھل سے زیادہ متعجب ہوئی، چوکنّی سی ہو گئی۔

''کون...؟ کون ہے رے؟'' بٹھل کا دماغ خوب کام کر رہا تھا۔ میرے لیے یہ طمانیت کی علامت تھی۔ ناک چڑھا کے کہنے لگا، ''آ گئے حرام کے...''

''ہاں، لیکن کوئی اور بھی ہے۔''

''پلیا تو نہیں ہے؟'' وہ بُری طرح تلملا اُٹھا۔

میں نے سیورین کو اشارہ کیا کہ وہ باہر کھڑے لوگوں کو اندر لے آئے۔

وہ منظر دیدنی تھا، کاش ڈاکٹر رائے بھی موجود ہوتا اور دیکھتا کہ آدمی سے آدمی کا رشتہ کیسا ہوتا، کیسا ہو سکتا ہے۔ اُنھوں نے بٹھل کا پلنگ گھیر لیا۔ کوئی اُس کے ہاتھ چومتا، کوئی پیر پکڑتا، کوئی پیروں پر سر رکھتا۔ اُنھوں نے بٹھل کا بستر پھولوں سے بھر دیا۔ میدا کا تو بُرا حال تھا، جنون سا طاری تھا اُس پر۔ ''کا ہے اُستاد، ایسا کا کسور ہوگیو ہم سے۔ باتے دن سے ادھری ہو، ہم کو پتا نا ہیں۔ تم کو تو سیدھے ہمرے پاس، اپنے داس کے پاس آنا چاہیے تھا۔'' اُن میں صرف جامو ہی کسی حد تک تھما ہوا تھا۔ بٹھل کو سلام کر کے اور اُس کے سینے سے لگ کے میرے پاس آ کھڑا ہوا۔ کمرے میں ہر طرف پھولوں کی پتیاں بکھر گئی تھیں۔ بٹھل ہر ایک سے حال پوچھتا رہا۔ گلے شکوے، تشفیاں، تسلیاں، دُعائیں، تمنائیں، ہر کوئی حکم سننے کا آرزومند۔ اُن کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بٹھل کو اُٹھا کے کھڑا کر دیں، اُس کی ساری تکلیف اپنے اندر جذب کر لیں۔ دیر ہو گئی تو میں نے جامو کو ٹوکا کہ اتنا ہی کافی ہے۔ مجھے خدشہ تھا، اپنے تجسس میں ڈاکٹر رائے آ گیا تو کمرے کا حال دیکھ کے بہت ناراض ہوگا۔

جامو نے سب کو وہاں سے ہٹا دیا۔ سیورین بھی پھیلی پھیلی آنکھوں سے اُن کی بے قراریاں دیکھتی رہی تھی۔ میں نے فرش پر پڑی ہوئی پتیاں سمیٹنے کی کوشش کی تو بھی میرا ہاتھ بٹانے لگے۔ شاخ سے جدا ہو کے پھول کیسا بکھر جاتا ہے، بے وجود ہی ہو جاتا ہے، کیوں کہ وجود تو انضباط سے عبارت ہے۔ ہم نے بہ عجلت بٹھل کے بستر سے پتیاں چن لی تھیں۔ اُدھر سیورین کمرا صاف کرنے والی ملازمہ لے آئی۔ منٹوں میں اُس نے فرش پہلے جیسا کر دیا۔ اور وہی ہوا، جس کا مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ ملازمہ کمرا صاف کر کے گئی تھی کہ کسی نے آ کے ڈاکٹر رائے کے آنے کی اطلاع دی۔ میں نے اُن سے منت کی کہ اب وہ سارے کمرے سے چلے جائیں۔ کوئی بھی جانا نہیں چاہتا تھا۔ بٹھل کی مرضی بھی نہیں تھی۔ اِس میں کچھ وقت صَرف ہو گیا، اور ڈاکٹر رائے دو مددگار ڈاکٹروں، ایک معمر نرس کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گیا۔ سب نے سٹ پٹاتے ہوئے اُسے سلام کیا، اور ڈاکٹر کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ بٹھل کے پیر چھو کے وہ بھی

کمرے سے چلے گئے۔ میں بھی اُن کے پیچھے باہر آگیا۔
ڈاکٹر زیادہ وقت اندر نہیں ٹھہرا۔ وہ سارے کمرے کے باہر سبزہ زار کے فرش پر بیٹھ گئے تھے۔ ڈاکٹر کو دیکھتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے، ہاتھ باندھے اور سر جھکائے ہوئے۔ ڈاکٹر اُن کے پاس ہی آگیا اور لمحوں تک کچھ سوچتا اور جلتی بجھتی نظروں سے اُنھیں دیکھتا رہا۔ اُس کا چہرہ کبھی تمتما اُٹھتا، کبھی ماند پڑ جاتا۔ وہ مجھ سے مسلسل انگریزی میں بات کرتا تھا لیکن اُس وقت خاصی بے اعتنائی سے ہندستانی میں مخاطب ہوا۔ ''آج اِتنا ہی... سمجھے... ابھی اِسے آرام چاہیے۔''
اس مختصر کلام کے بعد اُسے چلے جانا چاہیے تھا کہ اُس کے ساتھی ڈاکٹر منتظر کھڑے تھے۔ وہ موجود رہا۔ میں نے مناسب جانا کے زورا اور جامو کی طرف انگلی اُٹھائی۔ ''یہ دونوں کلکتے سے آئے ہیں۔''
وہ ایک بیدار مغز، دقیقہ رس شخص تھا، میرا مدّعا بھانپ گیا۔ ''دِن میں تمھارے ساتھ صرف ایک ہی آدمی یہاں ٹھہر سکتا ہے، رات کو صرف تمھی۔'' اُس نے جیسے کوئی حکم صادر کیا، اور فوراً ہی وضاحت کی۔
''ملاقات کے اوقات میں کوئی پابندی نہیں، لیکن زیادہ لوگ بالکل نہیں۔'' یہ کہتے ہی وہ چل پڑا تھا کہ پھر رُک گیا اور میرے عین مقابل ہو کے سرد لہجے میں بولا، ''اُستاد میدا سے کہو، اُسے وکیل صاحب کے خون کا بڑا ملال ہے، اور اُس نے اُن کے قاتلوں کو ختم کر کے قرض چکا دیا، اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا ہے، مگر ابھی وہ خود تو موجود ہے۔''
''جی، جی ہاں۔'' میں نے بوکھلا کے کہا اور میری نگاہیں میدا کی طرف اُٹھ گئیں۔ میدا کا جسم اکڑ گیا۔
''وہ بھی کچھ کم ذمے دار نہیں۔'' ڈاکٹر کی گھٹی ہوئی آواز میں بڑی ترشی اور تلخی تھی۔ میں کیا جواب دیتا، گنگ کھڑا رہا۔
پھر وہ بھی وہاں نہیں ٹھہرا۔
ڈاکٹر کے جاتے ہی میدا نے پاس آ کے میرا بازو پکڑ لیا اور بے تابی سے پوچھنے لگا، ''ڈاکٹر صاحب ہمرے بارے میں کا گٹ پٹ کیو تھے، بھیا؟''
''نہیں نہیں، کچھ نہیں۔'' میں نے گڑبڑا کے کہا۔
''ہمرا نام تو لیو تھے بھیا؟''
''بولتے تھے، اُستاد میدا سے کہو، وہ اسپتال کے باہر اِتنے لوگ لے کے نہ آیا کرے، اپنے آدمیوں کو باندھ کے رکھے۔'' اُس وقت یہی ایک حیلہ میری سمجھ میں آیا۔ میدا تذبذب سے سر ہلانے لگا۔ میرے جواب سے صاف لگتا تھا، اُس کی تشفی نہیں ہوئی تھی۔

زورا کی خواہش تھی کہ اسپتال میں وہی میرے ساتھ رہے۔ جامو نے اُس کا لحاظ کیا۔ میدا، برجو دادا، اُن کا تیسرا ساتھی اور جامو واپس چلے گئے۔ کمرے میں ایک نظر جھانک کے ہم دونوں دروازے کے قریب کرسیاں ڈلوا کے بیٹھ گئے۔
زورا کے پاس حالِ دل بیان کرنے کے لیے ایک انبار تھا۔ سلما کو فیض آباد چھوڑ کے اور کچھ عرصے وہاں قیام کر کے وہ اور جمرو کلکتے چلے گئے تھے۔ کہتا تھا، فیض آباد سے نکلنے کو جی ہی نہیں کرتا تھا، مگر جمرو کی وجہ سے اُسے جانا پڑا۔ اُس نے طے کر لیا تھا، پُھل سے منّت کر کے وہ مستقل طور پر فیض آباد رہنے کی اجازت لے لے گا اور زندگی حویلی کی نذر کر دے گا۔ کلکتے میں سبھی نے اُس کا خیال رکھا تھا، مگر اُس کا دل فیض آباد میں اٹکا ہوا تھا، جہاں زرّیں تھی جس کے پاس بہت چھا تو سے۔ کہ رہا تھا کہ بیشتر وہ فیض آباد کے اڈّے ہی پر رہا تھا، لیکن روز شام کو حویلی جاتا تھا۔ زرّیں اُسے روک لیتی اور رات کا کھانا کھلائے بغیر جانے نہیں دیتی۔ دوپہر کو بھی وہ اُس کے اور جمرو وغیرہ کے لیے اِتنا کھانا اڈّے بھیج دیتی کہ کئی لوگ سیر ہو کر کھاتے۔ زرّیں کے پاس جا کے اُسے لگتا تھا جیسے اُس کی کھوئی ہوئی ماں اور بہن مل گئی ہیں۔
پہلی بار زورا نے مجھے اپنے بارے میں بتایا کہ کبھی بڑودا شہر میں اُس کا گھر تھا۔ اُس کی ایک بہن نزل اُس سے کوئی آٹھ نو برس بڑی تھی۔ پندرہ سال کی ہوئی تو ایک دن اُس کا شرابی جواری باپ بیٹی کو گھر سے لے گیا۔ واپس آیا تو بیٹی ساتھ نہیں تھی۔ ماں نے بہت دُہائیاں دیں، باپ نے کچھ اَتا پتا نہیں دیا۔ بیٹی کی تلاش میں ایک روز ماں گھر سے نکل گئی اور کبھی واپس نہیں آئی۔ اُس وقت زورا کی عمر سات آٹھ برس تھی۔ باپ دن بھر شراب میں ڈوبا رہتا۔ پھر زورا بھی گھر سے نکل کھڑا ہوا اور بے ٹکٹ سفر کرنے پر پکڑا گیا۔ حوالات میں سپاہیوں نے اُس سے بڑی زیادتیاں کیں۔ نئے بھرتی ہونے والے کسی نوجوان افسر کو اُس پر ترس آیا

اور کہیں زورا کی جان چھوٹ پائی۔ پھر وہ واپس گھر نہیں گیا، دوبارہ بے ٹکٹ گاڑی میں سوار ہوا، اس بار بچ رہا اور بمبئی پہنچ گیا۔ بمبئی میں ٹھوکریں کھاتا، اذیتیں سہتا رہا۔ بمبئی شہر کسی پناہ گاہ اور کمین گاہ کی طرح ہے۔ ہر ایک کو اپنے دامن میں سمو لیتا ہے، زورا نے ماں بہن کی تلاش جاری رکھی اور مختلف شہروں کے بازار، گلی کوچے چھان مارے، نہ اُس کی ماں مل پائی نہ بہن۔ باپ کا معلوم نہیں کیا ہوا۔ اُس نے پلٹ کے باپ کی خبر نہیں لی۔ بمبئی میں اُس نے طرح طرح کے کام کیے، مزدوری کی، چھوٹی موٹی چوریاں، جیب تراشی اور چاقو بازی کرنے لگا۔ آخر باڑے کا دادا بن گیا۔ کہہ رہا تھا، اُس کی ماں یا بہن ہوتی تو زرّیں ہی کی طرح پیش آتی۔ زرّیں تو بہت سی ماؤں کی ایک ماں اور بہت سی بہنوں کی ایک بہن ہے۔
زورا کی آنکھیں بھر آئیں۔ میں نے اُس کے گلے میں بانہیں ڈال کے بے کار کی تسلّی دینی چاہی۔ ہر آدمی ہی شاید بہت بہروپ بھرے ہوئے ہوتا ہے۔ دیکھو تو زورا کی طرح ہٹا کٹا، چلتا پُرزہ، کچھ معلوم نہیں ہو پاتا، اندر سے کیسا ٹوٹا پھوٹا، کتنا چھلنی ہے۔
دھوپ زرد پڑ چکی تھی۔ زورا کی باتوں میں کچھ احساس ہی نہیں ہوا، نہ سیورین کے باہر آنے جانے کا۔ بعد کو اُس نے بتایا کہ وہ کئی بار باہر آئی تھی اور اُس نے ہمیں چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا کہ جانے کب کے بچھڑے ہوئے ہیں۔ پھر اُس کے اندر بلانے پر ہمیں اُٹھنا پڑا اور یہ دیکھ کے حیرت ہوئی کہ صوفے کے آگے رکھی ہوئی لمبی میز پہ کھانا سجا ہوا ہے۔ سیورین میں بھی زرّیں کی بڑی خو بو تھی۔ اُسے خیال تھا کہ ہم نے دوپہر کا کھانا کہاں کھایا ہوگا۔ پوچھے بغیر اُس نے یہ اہتمام کیا تھا۔ ہم نے اُسے بھی ساتھ بٹھا لیا۔ زورا کی وجہ سے وہ جھجک رہی تھی، میرے اصرار پر ساتھ بیٹھ گئی۔ ایسا پُرتکلف کھانا نہیں تھا، اسپتال کا سیدھا سادا، ہلکا پھلکا سا، دو تین شریک ہوں تو آدمی کچھ کھا پی ہی لیتا ہے۔ ہم نے ہر ممکن احتیاط کی کہ ذرا سا شور نہ ہو اور پُھل کے آرام میں خلل نہ پڑے۔ دوپہر کے کھانے اور خوراک لینے کے بعد وہ نیند میں ڈوب چکا تھا۔
ڈاکٹر رائے نے مجھ پر پابندی عائد کر دی تھی۔ زورا موجود تھا، لیکن شہر کے دگرگوں حالات میں اُس اجنبی کا تنہا باہر نکلنا اچھا نہیں تھا۔ میرے کپڑے میلے اور شکستہ ہو گئے تھے، مجھے بڑی اُلجھن ہو رہی تھی۔

> **انداز طعام**
>
> ایک اعرابی (دیہاتی) کسی خلیفہ کے دسترخوان پر آیا۔ اُس کے سامنے بکری کا بُھنا ہوا گوشت رکھا گیا۔ اعرابی نے کھانے میں بڑی تیزی دکھائی۔ خلیفہ نے اعرابی سے کہا، ''میں دیکھ رہا ہوں، تم ایسے غصّے سے کھا رہے ہو جیسے بکرے کی ماں نے تمھیں سینگ مارا ہو۔''
>
> اعرابی بولا، ''میں آپ کو دیکھ رہا ہوں، آپ ایسے پیار سے کھا رہے ہیں جیسے اِس کی ماں نے آپ کو دودھ پلایا ہو۔''
>
> [illegible]

پھر ایک تدبیر دماغ میں آ گئی۔ زورا کو وہاں چھوڑ کے میں مرکزی عمارت تک چلا گیا اور چھاگلا کو اپنی مشکل بتائی۔ وہ ایک چست و چابک دست آدمی تھا۔ کچھ وہ ڈاکٹر رائے سے میرے خصوصی مراسم کا گواہ بھی تھا۔ میری خوش نودی بالواسطہ ڈاکٹر کی خوش نودی تھی۔ اُس نے میری گذارش توجہ سے سُنی اور ہوٹل کے مینیجر کے نام مجھ سے ایک رقعہ لکھوایا۔ رقعے میں درخواست کی گئی تھی کہ بھائی کی بیماری کی وجہ سے میرا ہوٹل آنا ممکن نہیں ہو رہا۔ مینیجر میرے لیے محفوظ کمرے میں رکھا کپڑوں کا بکسا حاملِ رقعہ کے سپرد کر دے تو بڑی عنایت ہو۔ ہوٹل میں بہ طورِ امانت خاصی بڑی رقم میں نے محفوظ کرائی تھی، سو ہوٹل کے مینیجر کو کوئی اعتراض یا شبہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے لکھا تھا کہ مینیجر چاہے تو تصدیق کے لیے ہوٹل کے کسی کارندے کو میرے فرستادے کے ساتھ بھیج دے کہ رقعہ میرا ہی نوشتہ ہے اور بکسا میرے ہی حوالے کیا گیا ہے۔ چھاگلا نے اپنا کوئی ماتحت ہوٹل بھیج دیا اور وہ ہوٹل کے کارندے کے ساتھ ہی واپس آیا۔ کارندے نے مجھ سے بکسے کی رسید لینا بھی لازم جانی۔
کئی دن بعد لباس تبدیل کرنے کی صورت پیدا ہوئی۔ نہا دھو کے اور لباس بدل کے آدمی کیسا نیا نیا ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد جیسے ہی شام چار بجے مریضوں سے ملاقات کا وقت شروع ہوا، جامو اور میدا آ گئے۔ اَب کی اُن کے ساتھ کوئی اور نہیں تھا۔ پُھل غفلت میں تھا۔ وہ باہر بیٹھے انتظار کرتے رہے۔ ملاقات کا وقت ختم ہوا چاہتا تھا کہ سیورین نے اُنھیں اندر بلا لیا۔

سب رنگ

بجھل جاگ چکا تھا۔ سیورین نے اُسے جگا دیا تھا۔ جامو اور میدا اُس کے گرد بیٹھے محبتیں نچھاور کرتے رہے۔ ٹھیک پانچ بجے ملاقات کا وقت ختم ہو جانے کا اطلاعی گھنٹا بج جانے پر سیورین نے اُنھیں اُٹھا دیا۔ چند منٹ ہی اُنھیں بجھل کے پاس بیٹھنے اور اپنے گرامی قدر کی دل جُوئیاں کرنے کا موقع مل سکا۔ زورا کو بھی وہ ساتھ لے گئے۔ ڈاکٹر رائے کے حکم کے مطابق زورا رات تک میرے ساتھ رہ سکتا تھا، لیکن شہر کی سڑکوں پر پولیس دندنا رہی تھی۔ رات کو زورا کا اکیلے اڈّے تک جانا کسی پیچیدگی کا سبب بن سکتا تھا۔

بجھل کو پھر نیند نہیں آئی اور اُس کی فرمائش سیورین سے رد نہیں کی گئی۔ بستر سے اُٹھ کے بجھل نے چند پھیرے کمرے کے اندر لگائے، پھر باہر نکل گیا۔ ابتدا میں وہ دائیں بائیں ہم دونوں کے کندھوں پر ہاتھ جمائے چلتا رہا اور چند قدم بعد ہمارے سہارے سے دست کش ہو گیا۔ میں اور سیورین ساتھ ساتھ رہے۔ خود اُسے احتیاط کا احساس تھا کہ سیورین کو عاجزی نہیں کرنی پڑی۔ صبح کی طرح وہ دروازے کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ دن اپنا سفر تمام کر رہا تھا۔ دھوپ سورج کے پاس لوٹ رہی تھی۔ اب سائے ہی رہ گئے تھے۔ سورج کے سائے بھی کیسے روشن ہوتے ہیں۔ مغرب تک بجھل باہر بیٹھا آتی جاتی شام کا نظارہ کرتا رہا، اور خود ہی اُٹھ گیا۔ آدمی بھی کیا تماشا ہے۔ آرام کا مشتاق ہوتا ہے اور آرام سے تنگ بھی آ جاتا ہے۔

اندھیرا ابھی دُور تھا کہ ایمی آ گئی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ سیورین کچھ بدلی بدلی سی ہے، کھوئی کھوئی نظر آ رہی ہے۔ دن میں بارہا اُس کا سامنا ہوا، لیکن آج اطمینان سے بیٹھنے کا کوئی وقت ہی نہیں ملا۔ ایمی کے آ جانے پر اُس نے لباس تبدیل کر لیا تھا، لیکن وہیں موجود رہی اور اُس سے کوئی بات نہ ہو پائی۔ اِس خیال سے کہ اُس کی ژولیدہ ذہنی کا سبب کچھ تو معلوم ہو، وہ جانے لگی تو میں اُس کے پیچھے پیچھے باہر آ گیا اور اُسے روک کے پوچھا کہ اُس کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ وہ کچھ بدحواس ہو گئی، جھجکی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا کی اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی، ''کیوں، مجھے کیا ہوا؟''

''چہرے پر وہ روشنی نہیں ہے۔''

''کیسی روشنی؟'' وہ پٹ پٹاتی آواز میں بولی۔

''جو تم سے مخصوص ہے، روشنی، تازگی، شگفتگی۔''

اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی، آ ورد مسکراہٹ، مصنوعی مسکراہٹ بڑی زہر لگتی ہے۔

''تھکی تھکی سی لگتی ہو۔'' میں نے نرمی سے پوچھا۔

''شاید۔'' وہ ڈوبی ڈوبی آواز میں بولی۔

''یا کوئی اور بات ہے؟''

''کوئی بات نہیں، کیا بات ہوتی۔''

''بہر حال... اب گھر جا کے ساری رات آرام کرنا، اور سنو! صبح ناشتے وغیرہ کی زحمت نہ کرنا۔''

''کیوں، پسند نہیں آتا کیا؟'' اُس کا لہجہ سراسیمہ تھا۔

''نہیں، یہ بات نہیں، مگر تم اہتمام زیادہ ہی کرتی ہو۔''

''کچھ بھی تو نہیں، مجھے تو اچھا لگتا ہے۔''

''تو ٹھیک ہے۔'' مجھے بہر طور اُس کی خاطر عزیز تھی۔ وہ ہر اعتبار سے ایک نفیس لڑکی تھی، شائستہ، نازک طبع، سادہ و معصوم، اور دل کش بھی بے پناہ۔ دوشیزگی کی عمر میں جو کچا پن ہوتا ہے، اور حیرانی سی، اور شرمندگی سی اُس کے سراپا کا خاصہ تھی۔

اِتنے دنوں کے ساتھ میں آدمی ایسا ڈھکا چھپا نہیں رہتا، پھر اُس نے بجھل کا بہت خیال رکھا۔ دن بھر کام کرنے کے بعد وہ ضرور تھک جاتی ہوگی، کام بھی کیسا، بجھل جیسے مریض کی نگرانی، ہمہ وقت نگاہ رکھنے کا۔ فرض شناسی، دیانت ہے، اور یہ دیانت کاری بہت تھکاتی ہے۔ گھر پہنچنے کے بعد وہ ناشتے کے لیے فکر مند ہو جاتی ہوگی۔ یہ سوچ کے میں نے حجت سے اجتناب کیا کہ بہت سی فکروں سے دل کی طمانیت کا پہلو بھی نکلتا ہے۔

جاتے وقت اُس کی مسکراہٹ بے ساختہ تھی۔ میں اُسے راہ داری کے سرے ہی پر رخصت کر سکتا تھا۔ آگے اُس کی ہمراہی بے وجوہ مناسب نہیں تھی۔ وہ ہاتھ ہلاتی ہوئی دائیں جانب مڑ گئی اور نظروں سے دُور ہو گئی۔ کسی کے اوجھل ہو جانے پر اُس کی کمی کے احساس سے مراد ہے کہ وہ شخص نقش گری و اثر پذیری کی نادر صفات سے آراستہ ہے۔ ورنہ کتنے بے شمار روز اوجھل ہوتے اور سامنے آتے رہتے ہیں، جیسے کوئی وجود ہی نہ ہو اُن کا۔

اُس رات ڈاکٹر رائے کے ناغے پر مجھے تعجب ہوا۔ اُس کے بجائے اُس کے مددگار دو اور ڈاکٹر رات کے دورے پر آئے۔ میں نے اُن سے ڈاکٹر کے نہ آنے کی وجہ جاننی چاہی تھی، اُنھوں نے خاطر خواہ جواب نہیں دیا۔ میں نے ایمی سے

پوچھا تو اُس نے بھی خاص توجہ نہیں دی، بے نیازی سے بولی کہ کہیں اور مصروف ہو سکتے ہیں، وہ اپنا کام سمجھتے ہیں کہ کب کہاں اُن کی کس قدر ضرورت ہے۔

مجھے اطمینان نہیں ہوا۔ جیسا کہ دوپہر میں نے ڈاکٹر رائے سے شبہ ظاہر کیا تھا کہ کہیں اُس نے میرے بارے میں نظر ثانی تو نہیں کی ہے، گو اُس نے تردید میں ذرا سا تامل نہیں کیا تھا، مگر اُس وقت اُس کے نہ آنے سے پھر وہی وہم کھٹکنے لگا تھا۔ میں نے اُس سے یہ بھی تو کہا تھا کہ جو بھی ہے، یہی کچھ ہے میرے پاس۔ میں نے اُس سے کیا چھپایا ہے۔ کوئی سے کلی سی رہی اور اُس کی تشریح و تصریح سے میں قاصر رہا۔

ایمی کے التفات کی فراوانی وہی تھی۔ بجھل کے معمولات کی ادائی کے بعد مجھ سے پوچھے بغیر اُس نے کھانا منگوا لیا اور میرے ساتھ ہی بیٹھی رہی۔ میں نے دوبارہ ڈاکٹر کے بارے میں اپنی تشویش ظاہر کی تو اُس نے مجھے تاڑ دیا۔ وہ ایسی ہی تھی۔ اپنی عمر رسیدگی کا خوب فائدہ اُٹھاتی تھی۔ ڈانٹ ڈپٹ کرتی تھی تو اُس کے ہاں رحم بھی بہت تھا، اُس کی تلخی میں بڑی شیرینی تھی۔ کہنے لگی کہ کسی بات پر واقعی ڈاکٹر تم سے کشیدہ ہے تو اِس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ تمھارے بھائی کی طرف سے غافل ہو جائے گا، یا اُس کے کارِ مسیحائی میں بَل آ سکتا ہے۔ میں نے ایمی سے نہیں کہا کہ اِس حقیقت کا مجھے علم ہے، لیکن یہ تو میرا اپنا معاملہ ہے۔ مجھے تو ہلکا سا بھی ایک امکان ویران کیے ہوئے ہے کہ میں نے کب اور کہاں تجاوز کیا ہے، مجھ سے کون سی لغزش سرزد ہوگئی ہے۔ ایمی کی ہدایت پر میں بستر پر آ کے دراز ہو گیا۔ میری آنکھیں کھلی دیکھ کے وہ کلی کا وظیفہ دُہرانے لگی۔ میں نے اُسے بہت منع کیا، نہیں مانی۔ میرے سرہانے بیٹھ کے سر دبانے لگی۔ اُس کی انگلیوں سے شفقت ٹپک رہی تھی۔ پھر میں نے بھی وہی کیا، آنکھیں بند کر لیں۔ تب کہیں وہ بستر سے اُٹھی، پھر جانے کس وقت میرے منتشر حواس پر رات غالب آ گئی۔

اور صبح جلد ہی آنکھ کھل گئی۔ ایمی نے چائے پلائے بغیر مجھے باہر نکلنے نہیں دیا۔ دیر تک میں ننگے پاؤں سبزہ زار پر ٹہلتا رہا۔ سبزے میں شبنم کھلی ہوئی تھی اور اُس کا گداز دو چند ہو گیا تھا۔ سورج رفتہ رفتہ زمین پر اُترتا رہا۔ سورج کو زمین کی توفیق کا اندازہ ہے، سو وہ ایک حد پر آ کے رُک جاتا ہے۔ کسی دن اُس نے اپنا معمول بدل دیا تو زمین کا کیا بنے گا، نام و نشاں ہی شاید باقی نہ رہے، اور کسی دن سورج نے زمین سے مُنھ پھیر لیا تو بھی زمین پر اندھیرے کے سوا کیا رہے گا۔ یوں زمین کا اپنا کیا ہے، اُس کی زندگی تو سورج کی مرہونِ منت ہے۔ میٹھے پانی اور نرم و لطیف ہوا کی کتنی ہی افراط ہو، سورج کی اعانت کے بغیر سب اکارت ہے۔ جب بھی تنہا چہل قدمی کرو، خوابیدگی کے مانند آدمی کو خیال و خواب پر قابو نہیں رہتا، خیال و خواب اُمڈے چلے آتے ہیں۔

صبح کے کاموں پر اسپتال کے کارندوں کی آمد و رفت جاری رہی، اور دن کھلتا گیا۔ پھر بائیں جانب، راہ داری سے سیورین طلوع ہوتی دکھائی دی۔ شہابی رنگت کی ساڑھی میں لپٹی ہوئی، کھلی کھلی، نئی نئی سی۔ اُس کے نمودار ہو جانے کی فرحت، رات اُس کے رخصت ہو جانے کی خلش سے کہیں بیش تھی۔ سیورین آج اِس لیے جلدی آ گئی تھی کہ ڈاکٹروں کی آمد سے پہلے ہم فراغت سے ناشتا کر سکیں۔ میں نے اُسے مشورہ دیا کہ کسی وقت ڈاکٹر کے وارد ہو جانے کا دھڑکا تو برقرار رہے گا، اور ایک ہیڑ دھبڑ رہے گی، ڈاکٹر کو کمرے میں بسی ناشتے کی مہک پر مُنھ بنانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ سیورین کو اُتنی ہی بے چینی ہوگی جتنی کسی تخلیق کار کو اپنی تازہ تخلیق کے اظہار کی، مگر وہ راضی ہو گئی۔ میں اصل بات اُسے کیا بتاتا کہ مجھے تو ڈاکٹر رائے کی آمد کا انتظار ہے، دیکھتے ہیں، وہ اِس وقت بھی آتا ہے کہ نہیں۔ اِس کش مکش میں بے لطفی کیا، ڈھنگ سے سیورین کے لطف و کرم سے انصاف نہ کیا جائے گا۔

نو بجے، پھر ساڑھے نو۔ بجھل بستر پر بیٹھا ہوا تھا اور میری نگاہیں دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ دس بجنے میں ابھی دیر تھی کہ باہر سے مانوس چاپوں کی گونج سنائی دی۔ میں نے شکر کی سانس لی۔ وہ ڈاکٹر رائے ہی تھا جو اپنے ساتھی ڈاکٹروں اور نرسوں کے ایک دستے کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا اور ہم تینوں کے سلام کا سرسری جواب دیتا سیدھا بجھل کے پاس چلا گیا۔ نیم دراز

بچھل کی بحالی پر اُس نے سرخوشی سے داد دی اور بچھل سے طرح طرح کے سوالات کرتا رہا، اُس کے ساتھی نوجوان اور اَدھیڑ ڈاکٹر بھی۔ پھر ڈاکٹر رائے بیش تر اُنھی سے مخاطب رہا۔ وہ طبّی اصطلاحی زبان میں بچھل کے مرض کی نوعیت اور علاج کی نزاکت کے رموز و نکات اُنھیں تعلیم کرتا رہا تھا۔ اِس دوران سیورین نے میرے قریب آ کے سرگوشی کی کہ باہر ملاقاتی موجود ہیں اور اُنھیں روک دیا گیا ہے۔ میری نظر گھڑی پر گئی۔ دس سے چند منٹ اوپر ہو رہے تھے۔ باہر جا کے میں اُن سے ملنے کا ارادہ کرتا ہی رہ گیا۔ ڈاکٹر نے بچھل کو بستر سے اُٹھا دیا تھا۔ بچھل اِس فیاضی کا منتظر تھا۔ تقریباً اُچھل کے ایک دم فرش پہ آ گیا۔ ”میں اب ٹھیک ہوں ڈاکٹر ساب۔“ اُس نے بلند آواز میں کہا۔

ڈاکٹر رائے نے مسکرا کے سر ہلایا اور ہندستانی میں بولا، ”وہ تو میں بھی دیکھتا ہوں، لیکن ابھی تم اُستاد زیادہ نہیں، سمجھے!“

اُستاد کے لقب سے بچھل کے چہرے پر حیرانی ہویدا ہوئی۔ دوسرے لمحے ڈاکٹر کو بھی شاید اپنی بے محل بے ساختگی کا احساس ہوا اور وہ خفیف سا نظر آیا، یا شاید مجھے محسوس ہوا، کیوں کہ اُس نے کوئی وضاحت ضروری نہیں سمجھی اور بچھل کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے دروازے کی طرف لوٹ پڑا۔ اُس سے بات کرنے کا مجھے موقع ہی نہیں مل سکا۔ کچھ اُس نے بھی کمرے میں میری موجودی کا خیال نہیں کیا۔ دانستہ، یا نادانستہ میں بھی پھر اُس کے تعاقب میں کمرے سے نکل گیا۔ باہر کھڑے جامو، زورا، میدا اور بِرجو ڈاکٹر کی تعظیم میں ایک طرف سمٹ گئے تھے۔ اُنھیں دیکھ کے ڈاکٹر ٹھٹکا تھا، مگر فوراً ہی آگے چلا گیا۔ اُس نے اُن کے سلام کا جواب بھی نہیں دیا۔ جیسے اُس نے اُنھیں دیکھا ہی نہ ہو۔ میں نے تیز قدموں سے اُسے جا لیا اور اُسے رُکنا پڑا۔

”ہاں۔“ کسی بات کے اچانک یاد آ جانے پر جو عالم ہوتا ہے، اُس نے چونک کر پوچھا۔ ”کیسے ہو؟“

”آپ کیسے ہیں؟“ میں نے کٹی کٹی آواز میں کہا۔

”مجھے ایک مریض کو دیکھنے کی عجلت ہے۔“ اُس کے ماتھے پر شکنیں اُبھر آئیں۔ اُس کے لہجے سے بھی فکرمندی عیاں تھی۔

میں خاموش رہا۔

”تم آ ؤ گے اُس طرف؟“ اُس نے رسمی انداز میں پوچھا۔

”کہاں؟“

”میری طرف، اُدھر دفتر میں۔“

”کب آنا ہے؟“

”جب، جب تم چاہو۔“

”ابھی آ جاتا ہوں، یا آپ کے ساتھ ہی چلتا ہوں۔“

”ابھی نہیں... تھوڑی دیر بعد... میں نے بتایا نا۔ ایک مریض کو دیکھنا ہے، اُس کی حالت نازک ہے۔“ اُس کی آواز میں تشویش تھی، لمحے بھر کے توقف کے بعد کہنے لگا، ”ارادہ تھا، فارغ ہوتے ہی تمھیں بلاؤں گا۔“

مجھے ہمت ہوئی اور میں نے نپی، تُلی کہ خفگی آواز میں کہا، ”رات بھی آپ کا انتظار...“

وہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا اور بولا، ”وہیں بات ہوگی۔“

وہ چلا گیا۔ میں اُس کے چہرے اور لہجہ و آواز سے کچھ اخذ کرنے کی اُدھیڑبُن میں وہیں کھڑا رہا۔

بچھل اُن چاروں کے درمیان باہر ہی موجود تھا۔ دھوپ سے ابھی سبزہ زار کا بڑا حصّہ محفوظ تھا۔ سیورین نے وہیں کرسیاں لگوا دی تھیں۔ میں اُن کے پاس پہنچا تو سارے میری جانب متوجہ ہو گئے۔ میرا دماغ بھٹکا ہوا تھا۔ اُن کے سوالوں کے جواب میں ہوں، ہاں ہی کرتا رہا۔ پھر ایمی نے باہر آ کے کوئی لحاظ کیے بغیر اعلان کیا کہ ناشتا لگا دیا گیا ہے۔ میں نے ازراہِ وضع اُن سے بھی پوچھا۔ سب نے انکار کر دیا تو میں نے زور بھی نہیں دیا۔ سیورین میرے انتظار میں کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ آج بھی وہ باز نہیں آئی۔ وہی اہتمام تھا۔ ایمی کو بھی اُس نے روکا ہوا تھا۔ اُدھر جلد سے جلد ڈاکٹر رائے کی طرف جانے کی فکر، اِدھر سیورین کی دل شکستگی کا خدشہ۔ وہ دونوں، توشے میرے آگے رکھتی رہیں اور میں نے اُنھیں مایوس نہیں کیا۔ داد و تحسین مروتاً ہو تو بہت گراں ہوتا ہے۔ سیورین نے لطیف اور خوش ذائقہ چیزیں بنائی تھیں۔ نفاستِ طبعی اور جسم و جاں میں رچی ہوئی ہو تو آدمی کے ہر طور، ہر کام، ہر بات میں نظر آتی ہے۔ میری مدح سرائی سے سیورین گلنار ہوتی رہی۔ خوشی میں دل کش آدمی کی دل کشی و دل آویزی سوا ہو جاتی ہے۔

کچھ وقت ناشتے میں گزر گیا۔ گیارہ بجے عیادت کاروں کا وقت تمام ہو جاتا تھا۔ بہ ہر حال کچھ وقت جامو، میدا وغیرہ کے پاس بیٹھنا لازم تھا۔ میرا مچل رہا تھا کہ اسپتال سے فارغ ہو جانے کے بعد

بچھل چند دن اڈّے پر قیام کرے۔ ”ہاں رے، دیکھیں گے۔ ابھی اِدھری سے بیڑی تو کھلے۔“ بچھل اُکتائی آواز میں بولا۔

”نا، میں استاد۔“ میدا بچّوں کی طرح ضد کرنے لگا۔ ”اُو تو جانو، اب کھلے ہی کھلے، پر ہمرے سے ابھی سے پکّا کرو۔“

”بولا نا، آ ئیں گے رے اُدھری۔“ بچھل نے معاملہ ختم کرنے کی بجائے اختیار کی۔ ”اپنا ٹھکانا ہے وہ بھی۔“

”ای ہوئی نا بات اُستاد!“ میدا ہاتھ نچا کے بولا۔

گیارہ بجے سے پانچ منٹ پہلے گجر بج اُٹھا۔ آخری گجر پر اُنھیں اُٹھ ہی جانا تھا۔ میں اُن کے چلے جانے ہی کا منتظر تھا۔ بچھل ابھی باہر بیٹھے رہنا چاہتا تھا۔ زورا اُس کی خدمت میں حاضر ہی تھا۔ ڈاکٹر رائے کی طلبی پر اُس کے پاس جانے کا عذر کر کے میں نے مرکزی عمارت کا رُخ کیا۔ مجھے چھاگلا کے پاس بیٹھنا پڑا، لیکن کچھ ہی دیر بعد مجھے ڈاکٹر کے کمرے میں طلب کر لیا گیا۔ اُس کے چہرے سے ملال مترشح تھا۔

”سب ٹھیک تو ہے ڈاکٹر صاحب؟“ میں نے تشویش سے پوچھا۔

”وہ بے چارہ بے کار کی جنگ کر رہا تھا، آخر ہار گیا۔“ ڈاکٹر اُداسی سے بولا۔

”ہار تو آدمی کا مقدر ہے، آخر ہار ہی جاتا ہے۔“

”مگر اُسے اور وقت مل سکتا تھا، اگر وقت پر یہاں آ جاتا۔“

میں نے رسمی افسوس کا اظہار کیا۔

”خیر، تم بتاؤ، یہاں تو روز ہی یہ تماشا ہوتا ہے۔“

”آپ رات نہیں آئے۔“ میں نے دبی زبان سے کہا۔

”یہ اسپتال ایک بڑا ادارہ ہے۔ یہاں بہت لائق اور تجربے کار ڈاکٹر ہیں۔“ اُس کا لہجہ جھنجلایا ہوا تھا۔ ”میں نہ ہوں گا، تب بھی یہ چلتا رہے گا۔“

”مگر کوئی بات تو ہے جو لوگ آپ کے پاس کھنچے چلے آتے ہیں۔ لوگ آپ سے اِتنی اُمیدیں کیوں رکھتے ہیں؟ اس لیے کہ یہ اُمیدیں آپ ہی کی دی ہوئی ہیں۔“ میں طے کر کے آیا تھا، اِس بار کھل کے بات کروں گا۔ میں نے کہا، ”میری خوش گمانی ہے، آپ نے مجھے بڑی عزت دی ہے۔ دوسروں سے کچھ زیادہ ہی۔ سو آپ سے کچھ ہوا کی توقع بے جا نہیں ہے۔“

اُس نے سکون سے میری بات سنی، چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی، اور نرم روی سے بولا، ”رات کو ذرا مصروفیت رہی۔ آئی جی ملنا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا، یہاں کیا بات ہو پائے گی، گھر پر بلا لیا۔ رات کا کھانا پھر ہم لوگوں نے ساتھ ہی کھایا۔“

میں نے تجسّس ظاہر نہیں کیا۔ حالاں کہ یہ سن کے میری رگیں کھنچنے لگی تھیں۔ اُس نے خود ہی بتایا، بل کہ تکرار کی کہ آئی جی اپنے افسرانِ بالا کے رویّوں سے بہت آزردہ ہے۔ اِدھر اکبر علی خاں کے بھائی سکندر علی خاں کی شہر میں موجودگی سر پر لٹکی ہوئی تلوار کے مانند ہے۔ مرکزی اور صوبائی حکومت کے حکّام اپنے عالی شان ایوانوں میں بیٹھے حکم پر حکم صادر کر رہے ہیں۔ اُن کی تسلّی کے لیے پولیس کی روایتی کارروائیاں جاری ہیں۔ پولیس نے کئی ایسے جرائم پیشہ پکڑ لیے ہیں، بہ ظاہر اِن واقعات سے جن کا کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ شہر کے اڈّے کے بھی بہت سے لوگ گرفتار کر لیے گئے ہیں، لیکن کہیں سے سراغ نہیں مل رہا۔ کسی جانب کوئی شبہ گزرتا ہے تو ثبوت ناپید ہے۔

ڈاکٹر رائے کہہ رہا تھا کہ آئی جی سے اُس کی ایسی کوئی شناسائی نہیں تھی۔ دوستیاں کرنے کا اُسے وقت ہی کہاں ملتا ہے۔ پہلی مرتبہ جب آئی جی مجھ سے بازپُرس کرنے اور ساتھ لے جانے کے ارادے سے اسپتال آیا تھا تو ڈاکٹر سے خاصا متاثر ہو کے گیا تھا۔ ڈاکٹر نے انکسار کیا، اپنی زبان سے کچھ نہیں کہا، لیکن میں تو گواہ تھا۔ اُس کی صاف بیانی، زیرکی، استدلال اور منطقی توجیہات سے کوئی بھی اُس کا اسیر ہو جاتا۔ چناں چہ اِس پیچیدہ اور سنگین صورتِ حال میں آئی جی کو ڈاکٹر رائے کا خیال آنا چاہیے تھا۔ جزرسی اور نکتہ طرازی اپنی جگہ، ڈاکٹر کی طبعی سنجیدگی، متانت، انسانوں سے ہم دردی، چیزوں کی درستی اور تعمیر و اصلاح کی خوبیاں مستزاد ہیں۔ اُس کے لیے زبان پر

آ کے اپنے اِن احساسات کا اظہار کہیں بے موقع نہ ہو، کسی منفی تاثر کے اندیشے میں، میں نے زبان بند ہی رکھی۔

کہنے لگا: "میں نے آئی جی سے کہا، میں تو ایک ڈاکٹر ہوں، لیکن ایک بات بڑی صاف ہے۔ خوں ریز وارداتیں ہو چکی ہیں تو ثبوت بھی کہیں موجود ہونا چاہیے۔ ثبوت تہ خانوں میں چھپا ہوا ہے، یا چھپا دیا گیا ہے۔ پولیس کو حوصلہ رکھنا چاہیے کہ ثبوت اتنی آسانی سے مرتا نہیں۔ اور مرتا نہیں تو دست رس سے کچھ فاصلے ہی پر ہے، کہیں آس پاس، دُور و نزدیک۔ پولیس کو واضح طور پر شبہے کے اہداف متعین کرنے چاہئیں، اور ایک ایک کر کے اُن پر تجربہ۔ مفروضے قائم کیے بغیر نتائج کیسے اخذ کیے جا سکتے ہیں، اور مفروضے قائم کرنے کے بعد ہر قسم کی جراتوں کے لیے آمادگی... کسی رُو رعایت کے بغیر... پولیس کے فرسودہ انداز سے الگ۔"

میرے جسم میں سردی کی ایک لہر آ کے گزر گئی۔

"میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا؟" مجھے خاموش دیکھ کے ڈاکٹر نے ڈنک مارتی آواز میں سوال کیا۔

میں نے سٹ پٹاتے ہوئے ہم نوائی کی، "اور کیا کہ سکتے تھے آپ۔"

"تمھارے دماغ میں کوئی بات ہو تو بتاؤ۔"

"آپ اور میں بہت کچھ جانتے ہیں، یقیناً پولیس بھی کسی حد تک جانتی ہو گی، لیکن مکمل شواہد کے بغیر کوئی اقدام دیواروں سے سر پھوڑنے کے مترادف ہو گا۔"

"اور یہ کیسا المیہ ہے۔" وہ سلگتی آواز میں بولا، "ہم بہت کچھ جانتے ہوئے بھی کچھ نہیں جانتے۔"

"اُوپر رکھی چیز کا حصول دست رس ہی سے ممکن ہے، قامت کی بلندی کے لیے کوئی چیز چاہیے جو اردگرد موجود نہیں ہے۔ یہی صورت کچھ پولیس کے بھی پیشِ نظر ہو گی۔"

اُس نے آہ بھری۔ "رات میں نے سوچا تھا، تمھیں بھی بلا لوں، بینا کی بھی یہی خواہش تھی، لیکن شبہہ تھا، تمھاری موجودی آئی جی کو بارِ خاطر نہ ہو۔"

اُس کے لہجے کی یگانگت اور قربت سے مجھے اپنا غبار چھٹتا محسوس ہوا، کوئی بوجھ سر سے اُتر گیا ہو جیسے۔ "بینا کیسی ہیں؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ٹھیک ہے، اپنے حال میں گم، آئی جی کے جانے کے بعد تمھارا بہت ذکر رہا۔ اِدھر اُدھر رکھی تصویریں جمع کر رہی ہے تمھیں دکھانے کے لیے۔"

"مجھے بھی انھیں دیکھنے کا تجسس ہے، حالاں کہ یقین ہے بڑی نادر چیزیں ہی ہوں گی۔ قلم، مُو قلم پر اُن کی گرفت کیا خوب ہے۔ روانی، بے ساختگی، پھر خیال اور فکر، اور اُن کی نظر، چیزوں کو اپنے زاویے سے دیکھنے اور محسوس کرنے والی نظر۔ اُن کی چند تصویریں ہی دیکھ پایا تھا، لیکن اندازہ ہو گیا تھا کہ اُن کا مشاہدہ کتنا تیز ہے، مشاہدے کے ساتھ مطالعہ ہو تو دو آتشہ ہے۔ اُن کے ہاں کیسی مشاقی ہے، رنگ برتنے کا ایک سلیقہ اور... اور..."

اُس نے ہاتھ اُٹھا کے مجھے روک دیا، "یہ سارا کچھ اُسی کے سامنے کہنا۔ آج تمھیں بلانے کو کہ رہی تھی، لیکن دیکھو، آج نہیں تو کل... وقت تمھارے پاس بھی اب کم ہے۔ تمھارے بھائی کو جلد چھٹی مل جائے گی، اور ظاہر ہے، تم فوراً اُسے گھر لے جانا چاہو گے۔"

اُس کی زبان سے یہ مژدہ سننے کا میں کب سے آرزو مند تھا، یہ بتاتے ہوئے ڈاکٹر کی آواز سُست ہو گئی تھی، گر چیں بی پڑ گئی ہوں۔ میں نے اپنی مسرت بہ مشکل خود تک محدود رکھنے کی کوشش کی اور سر جھکا لیا۔

دیر تک اُس پر سکوت طاری رہا۔ جانے کن خیالوں میں کھویا ہوا تھا، پھر افسردگی سے کہنے لگا، "آج شام اکبر علی خاں کے گھر انتقال کے بعد ہونے والا روایتی اجتماع ہے، تیجا وغیرہ... کیا کہتے ہیں اُسے؟"

"مجھے جانے کی اجازت مل سکتی ہے؟" میں نے زیرِ لبی سے پوچھا۔

"ہا!" وہ بگڑ کے بولا، "تم پاگل ہو گیا؟"

"مجھے بہت بار محسوس ہوتا ہے۔"

"میں نے تمھیں بتایا تھا، آئی جی نے تمھارے بارے میں سکندر علی خاں کو خاصا مطمئن کر دیا ہے۔"

"سکندر علی خاں کا نہیں، یہ میرا اپنا معاملہ ہے۔"

"تم وہاں جا کے کیا کرو گے؟ انھیں اور رُلاؤ گے، اُن کے زخم کریدو گے؟ کیا فضول بات کرتے ہو۔" وہ ناراضی سے بولا۔

وہ ٹھیک ہی کہ رہا تھا، وہاں جا کے میں اس کے سوا کیا کر سکتا تھا۔

"معلوم ہوا ہے، اکبر علی خاں کی بیوی ٹھیک نہیں ہے۔ بار بار اُس پر غشی کے دورے پڑ رہے ہیں۔"

"یہ تو ہو گا ہی۔ اکبر علی خاں نے بتایا تھا، دونوں بڑی آزمائشوں کے بعد ایک ہو سکے تھے۔ بیگم کا ذکر وہ بڑی چاہت سے کیا کرتے تھے، دونوں ہم مزاج تھے۔ ایک ہی جھلک دیکھی تھی میں نے اُن کے گھر کی، دونوں جیسے ایک دوسرے کے لیے..." میری آواز بھرّا گئی اور آگے کچھ نہ کہا گیا۔

ڈاکٹر کرسی سے اُٹھ کے میرے پاس آ گیا اور میری کمر تھپکنے لگا۔ "یہی ہوتا ہے۔ آدمی، آدمی سے ملتا ہے، آدمی، آدمی سے بچھڑ جاتا ہے۔ کسی ایک کو تو پہلے جدا ہونا پڑتا ہے، اُسے خبر نہیں ہوتی، دوسرا کتنا ویران ہو جائے گا۔ یہاں تو بات ہی دوسری ہے۔ ایک کو دوسرے سے چھین لیا گیا ہے، کسی خطا اور گناہ کے بغیر چھین لیا گیا ہے۔ سکندر علی خاں نے درست فیصلہ کیا ہے، بھائی کے بیوی بچوں کو ساتھ لے جائے، یہ گھر اور در و دیوار تو انھیں بہت ستائیں گے۔"

ڈاکٹر نے چائے منگوالی تھی اور ابھی کہیں جانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا کہ چھاگا گھبرایا گھبرایا کمرے میں داخل ہوا اور سرگوشیانہ انداز میں ڈاکٹر کو کچھ بتایا۔ پوری بات تو میری سمجھ میں نہ آ سکی، لیکن کسی مریض کا ذکر تھا۔ ڈاکٹر چائے ادھوری چھوڑ کے مجھ سے معذرت کرتا ہوا اُسی وقت کمرے سے چلا گیا۔ مریض ڈاکٹر کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں تو ڈاکٹر بھی کچھ کم اُن کے تابع نہیں ہوتا۔

اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے موسم جیسے بدلتے رہے، کبھی گرمی، کبھی سردی کا احساس۔ سارے راستے ڈاکٹر مجھ پر مسلّط رہا۔ اُس نے جھٹل کے بارے میں تو یہ سنائی تھی تو گزشتہ رات آئی جی سے ملاقات کا احوال بھی بتایا تھا۔ اُس نے واضح طور پر کچھ نہیں کہا تھا۔ میں جانتا تھا، بہت کچھ وہ مجھے نہیں بتا سکا ہے۔ شاید میں اُسے سننا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اُس کا چہرہ تو میرے سامنے ہی تھا۔ اکبر علی خاں کا نام آنے پر اُس نرم خُو، اُس دَور کے آدمی کی آنکھوں میں وحشت اُتر آئی تھی۔ اُس کا چہرہ ہی کچھ اور ہو جاتا تھا۔ کچھ وقت ہی جاتا ہے، میرا دل دھڑک رہا تھا، جانے کیا دیکھنے اور سننے کو ملے۔

🕔 ٹھیک پانچ بجے جامو اسپتال آ گیا۔ یہی بات مجھے کھٹک رہی تھی۔ وہ تنہا ہی تھا۔ میدا، بر جو دادا میں سے کوئی اُس کے ساتھ نہیں تھا۔ جھٹل کو تعجب ہوا۔ "کدھری گیا رے وہ پیاری جھکرا؟" اُس نے ناگواری سے پوچھا۔

"نہیں آیا اُستاد۔" جامو نے ہلکی آواز میں کہا، "اور دیکھو، ابھی کب آئے۔"

"کیا ہوا احرام کے بچے کو؟"

جامو نے بچی زبان میں بتایا کہ اڈّے پر کسی نومشقے سے چاقو بازی کے دوران معمولی زخمی ہو گیا ہے۔

"وہ بُدھوا بھی ساتھ اُلٹا ہو گیا کیا؟"

"دادا کو میدا کے واسطے پھر ٹھیرنا ہی تھا۔" جامو جھنجلایا ہوا لگتا تھا۔ "میں تو اِدھر ہوں اُستاد۔"

"بُدوا نے کچھ نہیں بولا تجھ کو؟"

"بولتا تھا، اُستاد کے آگے ہاتھ جوڑ دینا۔"

جھٹل نے سر جھٹک کے بے دلی کا اظہار کیا۔

جامو کو فوراً ہی خیال آیا کہ جھٹل کا مطلب کچھ اور ہے،

اور میدا اُس سے کوئی وعدہ کر کے گیا ہے، اُس نے خفا ہو کے کہا، "ڈاکٹر سے پوچھ لیا ہے؟"

"ڈاکٹر اور جیلر ایک ہی گھاٹ کے ہوتے ہیں۔"

"ابھی تھوڑا اپنے کو رو کو اُستاد، نکل کے بیڑیاں ہی بیڑیاں پینا، اور کھانا بھی، کون پکڑے گا تمھارا ہاتھ۔"

"تو اپنے کو ٹھیک نہیں لگتا رے آج۔" بھٹل نے اُس کے چہرے پر نگاہیں جھماتے ہوئے کہا۔

"مجھ کو کیا ہوتا۔" جامو بھن بھنا کے بولا، "تمھارے سامنے بیٹھا ہوں، ٹیڑھا میڑھا دکھائی پڑتا ہوں تم کو..."

بھٹل نے زورا کو مخاطب کیا، "ببیا! اُستاد کو پانی دکھا ذرا۔"

اچھا ہوا، جامو کو خود دھیان آ گیا کہ وہ کس کے سامنے بیٹھا ہے۔ "کیا ہے اُستاد!" وہ چڑتے ہوئے بولا، "کیسی بات کر رہے ہو۔"

"لگتا ہے، اِس کھونٹے کا گھاس پانی راس نہیں آیا تجھ کو۔" بھٹل نے اپنی آواز دھیمی رکھی۔ "بول رے، کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں اُستاد، کیا ہوتا۔" جامو شکستہ لہجے میں بولا۔

"تو پکّی تول کا ہے۔ پورا سیدھا بول رے۔"

"کیا بولوں، پتا نہیں، تم کیا سمجھ رہے ہو۔"

"تو اَب اُدھری لَوٹ جا، بنگلا پاڑے میں۔"

"اِدھر میں تم کو بُرا لگ رہا ہوں۔ تم کو ساتھ لے کے جاؤں گا۔ اپنے کو کیوں بلایا ہے پھر یاں۔ اَب بولو گے تم نے کب بلایا ہے۔"

"ہاں۔" بات بدلنے کے لیے میں نے مداخلت کی۔ "بلایا تو میں نے ہے جامو بھائی کو۔" میں نے بھٹل سے کہا، "اُس وقت تمھاری حالت ہی ایسی تھی۔ اَب تو شکر ہے، سب ٹھیک ہے۔ جامو بھائی آ گئے، بڑی بات ہے اور وہ چاہیں تو جا بھی سکتے ہیں اَب۔"

"اُستاد بولیں گے تو چلا جاؤں گا ابھی۔" جامو تیوری چڑھا کے بولا، "بولو اُستاد!"

"تجھ کو کھا کے لگاؤں کیا۔"

"لگاؤ، ایمان سے، دن بھی بہت ہو گئے۔"

"جا رے۔" بھٹل نے مُنہ پھیر لیا۔ "اپنے سے مستی کرتا ہے۔"

جامو کچھ بولنا چاہتا تھا کہ میں نے اُسے چپ ہو جانے کا اشارہ کیا۔ بھٹل نے بھی دیکھ لیا تھا۔ شاید اُس نے بھی باور کیا کہ کسی وجہ سے جامو اصل بات بتانے سے اجتناب کر رہا ہو گا۔ وہ بھی کچھ سرد پڑ گیا۔ میں نے سیورین سے کہہ کے چائے وغیرہ کا بندوبست کروایا، اور اس دوران کوشش کی کہ کلکتے، فیض آباد کا ذکر ہوتا رہے۔

پانچ بجے جامو اور زورا بھٹل کے پانو چھو کے اُٹھ گئے۔

ہم باہر آ گئے اور کمرے سے چند قدم دُور جا کے میں نے جامو سے پوچھا، "میدا کب پکڑا گیا جامو بھائی؟" وہ چلتے چلتے رُک گیا اور میری صورت دیکھنے لگا۔ "تجھ کو پتا ہے؟"

"نہیں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ "بس اندازہ۔"

"تیرا سچ بول۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو وہ لے گئے ہیں، اُس کو اڈّے سے۔"

"بھٹل بھائی کے سامنے تمھارے اُلجھنے اور میدا، برجو وغیرہ کے ساتھ نہ آنے سے یہی کچھ سمجھ میں آتا ہے۔"

جامو نے پھر سارا واقعہ بتایا کہ تین سوا تین بجے پولیس کی بھاری نفری نے آناً فاناً اڈّے کا علاقہ گھیرے میں لے لیا۔ وہ دندناتے، بندوقیں تانے اندر گھستے ہی چلے آئے۔ اُن کے تیور بہت جارحانہ تھے۔ اُنھوں نے جامو اور زورا کو بھی پکڑ لیا تھا، لیکن بعد کو کسی پولیس افسر کی دخل اندازی پر چھوڑ دیا گیا۔ یہ پولیس افسر یقیناً جامو اور زورا سے پہلے نمٹ چکا تھا۔ جب اُنھیں پٹنا شہر میں داخل ہوتے ہی گرفت میں لے لیا گیا تھا، اور رات بھر اُن سے باز پرس، بل کہ زیادتی کی جاتی رہی تھی۔

پولیس نے اڈّے پر پکڑ دھکڑ کی کارروائی اِتنی تیزی سے کی کہ کسی کو کچھ سوچنے، سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ میدا سے بھی جامو اور زورا کی کوئی بات نہ ہو سکی۔ اتفاق سے اڈّے پر اُس وقت سارے لوگ نہیں تھے، لیکن جتنے بھی تھے، سبھی کو جانوروں کی طرح گاڑیوں میں دھکیل دیا گیا، گردن پکڑ پکڑ کے، بندوق کی بٹوں کی ضربوں سے۔ جامو کہہ رہا تھا کہ اُس نے اڈّے کے آدمیوں سے ایسا معاندانہ سلوک کبھی نہیں دیکھا۔ باہر کے پولیس والے بھی پٹنا پولیس کے ساتھ ہوں گے۔ شہری پولیس سے اڈّے کے آدمیوں کی تھوڑی بہت صاحب سلامت ہوتی ہی ہے۔ کچھ تو یہ مروّت کام آئی۔ باہر کی پولیس کے دباؤ میں شہری پولیس بھی چوکنی رہی۔ پھر جامو اور زورا ہی اڈّے پر باقی رہ گئے۔ بعد کو چھاپے کے وقت اڈّے سے باہر رہ جانے والے لوگ اچھی خاصی تعداد میں اڈّے پر آ گئے، اور اُن میں سے کچھ تو فرار ہو گئے، کچھ نے ہر حالت میں اڈّے پر موجود رہنے کو ترجیح دی۔

"اَب تم نے کیا سوچا ہے جامو بھائی؟" ساری رُوداد سن کے میں نے جامو سے پوچھا۔

"اپنے کو کیا سوچنا لاڈلے۔" جامو بیزاری سے بولا۔

میں نے اُسے مشورہ دیا کہ بہتر ہے، وہ دونوں میدا کے اڈّے واپس نہ جائیں اور کلکتے جانے والی پہلی گاڑی میں سوار ہو جائیں، یا پھر جس ہوٹل میں میرا کمرا ہے، وہیں رہیں۔ آگے جا کے اُن کے لیے مشکلیں ہو سکتی ہیں۔

دونوں نے انکار کر دیا۔ کہنے لگے کہ ایسے وقت اڈّے واپس نہ جانے سے وہاں بچ جانے والوں کی نظروں میں اُن کی کیا وقعت رہ جائے گی۔ کلکتے کے اڈّے کا ایک بھرم ہے دُور دُور تک، اور وہ تو بھٹل کے لیے آئے ہیں۔ اب اُسے ساتھ لے کے ہی جائیں گے۔ اُنھوں نے اِس شہر میں کون سا جرم کیا ہے جو پولیس اُن کے پیچھے پڑی رہے گی۔ اُن کا یہاں سے اِس طرح روانہ ہو جانا فرار کے زمرے میں آ سکتا ہے، اور پولیس کو اور شک میں مبتلا کر سکتا ہے، اور میدا بھی کیا سوچے گا۔ جامو کو توقع تھی کہ میدا جلد واپس آ جائے گا۔ پولیس یہ کارروائیاں کرتی رہتی ہے۔ عرصے سے میدا یہاں راج کر رہا ہے۔ اُس کے ہاتھ بھی لمبے ہونے چاہییں، اُس کی جڑیں ایسی کم زور نہیں ہوں گی۔

"میدا اَب شاید جلد نہ لَوٹ پائے جامو بھائی۔" میں یہ کہنا نہیں چاہتا تھا، زبان سے نکل گیا۔

"کیوں؟" جامو حیرانی سے بولا۔ "ایسا کیوں بولتا ہے۔"

"کسی بنیاد ہی پر اُس پر ہاتھ ڈالا گیا ہو گا۔ پولیس اُسے پہلے کیوں نہیں لے گئی۔ اَب کیوں؟ میدا سے ضرور کوئی چُوک ہو گئی ہو گی۔" میں نے محتاط لہجے میں کہا۔

"کیسی چُوک؟ کیا مطلب ہے تیرا؟"

جامو کو شاید تفصیل سے واقعات معلوم نہیں تھے۔ معلوم بھی ہوئے ہوں گے تو اُس طرح، میدا نے جس طور سے تلقین کیے ہوں گے۔ جامو کے پٹنا آنے کے بعد میری اُس سے کوئی بات ہی کہاں ہو پائی تھی۔ میں نے ترتیب سے مختصراً اُسے ساری رُوداد سنانی چاہی۔ ڈھنوا سے نبرد آزمائی، میرے خاتمے کے لیے اسپتال میں گھس آنے والے حملہ آور اور نوجوان انقونی کی موت، پھر اکبر علی خاں کے خون تک۔ میں نے اُسے بتایا کہ مبیّنہ طور پر وہ تین آدمی تھے، اور ایک دن بعد ہی اُن تینوں کا کام تمام کر کے اُن کی لاشیں اُسی جگہ پھنکوا دی گئیں جہاں اکبر علی خاں کا خون کیا گیا تھا، اور یوں یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ اکبر علی خاں کے خونِ ناحق کی تلافی کر دی گئی ہے، اور یہ تین آدمی میدا کے ہاتھوں، یا اُس کے اشارے پر اپنے انجام سے دوچار ہوئے۔

"میدا کے ہاتھوں۔" جامو پھیلی آنکھوں سے بولا۔

"پر اُس نے بہت بات کی، اپنے کو ایسا کچھ نہیں بولا۔"

"یہ بات کھل کے کہنے کی تھوڑی ہوتی ہے جامو بھائی! آدمی اپنے آپ سے نہیں بولتا۔ میدا کے بہ قول، اُسے بے خطا، بے گناہ اکبر علی خاں کے اِس طرح ختم ہو جانے کا بہت دُکھ تھا، اور وہ اکبر علی خاں کو واپس تو نہیں لا سکتا تھا۔ یہی کچھ اُس کے بس میں تھا۔ لگتا ہے، میدا سے کہیں چُوک ہو گئی۔ ظاہر ہے، انقونی، پھر اکبر علی خاں، پھر اُن تین آدمیوں کے قتل کے بعد پولیس تماشائی تو نہیں بنی رہتی۔"

"میدا نے اِس بارے میں تجھ کو خود بولا؟ میرا مطلب ہے، اُن تین آدمیوں کا صفایا کرنے کا۔" اُس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، اُس نے میرے سامنے اقرار کیا ہے۔"

جامو کے چہرے کا گوشت اُبھرا آیا، کہنے لگا۔ ”پر اُس نے ٹھیک ہی کیا لاڈلے!“

”مگر پولیس کی نظر میں تو خون، خون ہے۔ میدا اکبر علی خاں کے قاتلوں کو پولیس کے آگے ڈال دیتا تو اور بات ہوتی۔ وہ تو عدالت بن بیٹھا۔“

”ایسا تو ہوتا ہے، پولیس، عدالت کی گھما پھیری کا تجھ کو پتا ہے۔ برس لگ جاتے ہیں، اُدھر میدا کو تیرا بھی دھیان ہوگا، تو ذرا اسپتال سے چھوٹنے گا تو آندھی بن کے اُس پر ٹوٹے گا۔“

”تو اُس کے خیال میں اُس نے حساب صاف کر دیا؟ جامو بھائی! میں تمھیں کیا بتاؤں، اکبر علی خاں صاحب کیسے آدمی تھے۔ وہ تین آدمی نہیں، وہ تو بہت سوں سے اُوپر تھے۔ وہ تو بڑے فرشتہ آدمی تھے۔ میں اُنھیں کبھی نہیں بھول سکتا۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کہتا۔ تم نے اُنھیں دیکھا جو نہیں۔“

”سمجھتا ہوں لاڈلے۔“ جامو نے مجھے گلے سے لپٹا لیا۔

”ایک بات بولے راجا بھائی!“ زوراز ہریلی آواز میں بولا، ”اپن ایدر میدا اوادا کا مہمان ہے۔ اپن نے تمھارا پورا بات سن لیا ہے۔ ٹھیک ہے، جو تم بولتا ہے، پر اپن کو یہ میدا دادا سالا، ماں قسم اڈّے کا دادا دکھائی نہیں پڑتا۔“

”تیرا کون سا گاٹو مار لیا ہے اُس نے۔“ جامو نے اُسے ڈپٹ دیا۔

”تمھیں جامو بھائی، تم کچھ بولو، اپن بھی تم لوگ بیچ اُٹھتا بیٹھتا ہے شروع سے۔ یہ آدمی ٹھیک نہیں ہے ایک دم۔“

شام کو اسپتال آنے والے ملاقاتیوں کا وقت کب کا ختم ہو چکا تھا، اس لیے ہم صدر دروازے سے باہر آ گئے اور تا دیر چار دیواری کے جنگلے کے پاس کھڑے رہے۔ دربان اور تعینات سپاہی مجھے پہچان گئے تھے۔ اُنھوں نے ہمارے بیٹھ جانے کے لیے اپنی کرسیاں اور بنچیں خالی کر دیں۔ ہم نے منع کیا، لیکن وہ نہیں مانے، اور ہمیں بیٹھنا پڑا۔ جامو گم سم سا ہو گیا تھا، پھر یکا یک اُس کے جسم میں ہمک اُٹھی، مچل کے بولا۔ ”میدا سے کوئی غلطی نہیں ہوئی چھپے لاڈلے۔ کام بھی اُس نے خود نہیں کیا ہوگا۔ وہ کوئی نیا آدمی نہیں ہے جو اوچھا ہاتھ ڈالے گا۔ اپنے کو لگتا ہے، پولیس دکھاوے کے لیے اُس کو لے گئی ہے۔“

”کام اُس نے کیا، یا اُس کے اشارے پر کسی اور نے، غلطی تو کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ نہیں بھی ہوئی تو اندر باہر کا کوئی آدمی انگلی بھی تو اُٹھا سکتا ہے، میدا کا کانٹا دل میں لیے، یا اُس سے ناراض آدمی۔ پولیس کو شک تو میدا پر پہلے بھی ہوگا، اور شک اور گہرا ہو جائے تو پولیس بال کی کھال نکال لیتی ہے۔ سنتے ہیں، پولیس بڑی کھنکھنی ہو رہی ہے۔ کچھ اُس کی سا کھ کی بھی تو بات ہے۔“

”تو کیسی باتیں کر رہا ہے لاڈلے؟“ جامو کرکری آواز میں بولا۔ مجھے احساس ہوا کہ اتنا کچھ نہیں کہنا چاہیے تھا۔

”تو تیرا خیال ہے، میدا جلدی نہیں آ پائے گا۔“

میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا، ”ایک اندازہ ہے جامو بھائی۔“

”تو کچی بات نہیں بولتا۔“ جامو یقینی لہجے میں بولا، ”میں تو دوسری بات سوچتا ہوں، پھر اڈّے کا کیا بنے گا۔ واں تو اوپر کا کوئی آدمی نہیں بچا۔“

”کسی کو بھی چوکی پر بٹھا دو۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔

”اڈّا تو اپنا ہے۔“

”اپنا کیا، کون سا وہاں بیٹھنا ہے، مجھے، یا تمھیں۔“

”پھر بھی ایسے چھوڑا تو نہیں جا سکتا، بہت بڑا اور پرانا اڈّا ہے، شہر میں ایک ہی۔“

”وہاں جو رہ گئے ہیں، آپ طے کر لیں گے۔“

”واں تو اپنے کو کوئی بھی پورا دکھائی نہیں پڑتا۔“

”اُنھی میں سے کسی کو آگے بڑھا دو جامو بھائی! جان چھڑاؤ، ہمیں تو چلے جانا ہے۔ کتنا ہی بڑا اور پرانا ہو، ایسے اڈّے کی کیا فکر کرنی، جس سے کوئی واسطہ ہی نہیں رکھنا۔ ہمارے، یہاں آنے کا مقصد تو بچھل بھائی کی صحت یابی ہے۔ ابھی تم نے خود ہی کہا تھا، آپ ہی وہاں لوگ چھینا جھپٹی، مارا کوٹی کر کے طے کر لیں گے۔ ہم سامنے نہ ہوتے تو بھی ایسی صورت میں اُنھیں اپنے لیے کوئی راستہ نکالنا ہی پڑتا۔“

جامو کوئی جواب نہ دے سکا۔ اُجالا ڈوبتا جا رہا تھا۔ اُنھیں جانا تھا، اور وہ دونوں مجھ سے گلے مل کے چلے گئے۔

بچھل سبزہ زار میں بیٹھا ہوا تھا اور سیورین سے باتوں میں مصروف تھا۔ نرسیں عام طور سے مریضوں کے ساتھ کسی بے تکلفی سے اجتناب کرتی تھیں، مگر سیورین بچھل کا حکم ٹال بھی نہیں سکتی تھی۔ دوسرے یہ اسپتال کے خاص الخاص مریضوں کا

حصہ تھا۔ یہاں اسپتال کے عام قواعد کا اطلاق نہیں ہو پاتا ہوگا۔ بچھل کے سامنے میز رکھی تھی، میز پر شربت بھرا جگ، گلاس، پھلوں کی تشتری وغیرہ۔ وہ خاصا تن آساں لگ رہا تھا، حویلی کے باغیچے، یا اڈّے کی چوکی پر گاؤ تکیے سے کمر ٹکائے بیٹھا ہو جیسے، بس حقہ ہی وہاں نہیں تھا۔ مجھے دیکھتے ہی سیورین اُٹھ گئی۔

”کیوں ری، کدھری کو چلی؟“ بچھل نے اُسے ٹوکا۔

سیورین نے سعادت مندانہ انداز میں اندر کے کام نمٹانے کا عذر کیا اور چمکتی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی، ”یہ بھی تو آ گئے ہیں۔“

اُن کے درمیان یہ موانست میرے لیے تعجب انگیز تھی۔ اِس کا مطلب تھا کہ میری عدم موجودگی میں وہ ایک دوسرے کو بہت جان چکے ہیں۔

میں بھی وہیں بیٹھ گیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ بچھل مجھ سے میدا کے بارے میں نہ پوچھ گچھ کرے کہ جامو اُس سے کیا چھپا رہا تھا، اور مجھے آنا کانی کرنی پڑے۔ اِس ایک بیچ پر کہ میدا پولیس کے قبضے میں ہے، اُسے قرار نہیں آتا، مگر وہ کسی اور دھن میں تھا، یا اُسے میدا کے زخمی ہو جانے کی بات پر یقین آ گیا تھا۔

دھوپ ٹم ٹمانے لگی تھی۔ تھوڑی دیر میں سیورین نے واپس آ کے کسی پیش و پس کے بغیر بچھل کے بازو کو ٹھوکا دیا۔ بچھل نے ذرا چوں و چرا نہیں کی اور اُٹھ گیا۔ اُجالے کی اب رمق ہی باقی رہ گئی تھی کہ ایکی آ گئی۔ سیورین کو اب گھر جانا تھا، لباس تبدیل کر کے وہ کمرے میں چلی آئی اور بچھل کے بستر کے کنارے بیٹھ گئی۔ ”تجھ کو یہی روپ بجتا ہے، اِسی کو پہنا کر۔“ بچھل نے کہا۔

سیورین کا سراپا دُہرا ہو گیا۔ ساڑھی میں وہ بالکل بدل جاتی تھی۔ لہر کی طرح اُس کے سیدھے ترچھے بدن پر ساڑھی خوب کھلتی تھی۔ بچھل نے اُس کے سر پہ ہاتھ رکھ کے پیشانی کو بوسہ دیا تو اُس کے ہونٹ بھنچ گئے۔ اِس سے پہلے کہ وہ چھلک پڑتی، فوراً ہی باہر نکل گئی۔ اِن لڑکیوں کے پاس آنسوؤں کا ایک دریا چھپا ہوتا ہے۔ مجھے خیال تھا، آج بس ناشتے ہی پر اُس سے کوئی بات ہو پائی تھی، سو میں بھی باہر نکل آیا۔ وہ میری منتظر ہی تھی۔ ”جا رہی ہو۔“ میں نے بوجھل آواز میں کہا، ”آج وقت ہی نہیں مل پایا۔“

”میں دیکھ رہی تھی۔“ اُس کے لہجے میں اُداسی تھی۔

”وہ اُدھر ڈاکٹر صاحب نے بلا لیا۔ اڈّے کے آدمی، زورا

پائے دان پر سفر کرنا ممنوع ہے۔ ٹریفک پولیس

اور جامو وغیرہ آ گئے۔ اور بچھل بھائی... وہ بھی اب موجود ہیں نا... بیدار آدمی موجود ہی ہوتا ہے، اور اب تمھارے جانے کا وقت ہو گیا۔“

”کہو تو میں واپس آ جاؤں۔“ وہ چپکے سے بولی، یہ بات وہ پہلے بھی کئی بار کر چکی تھی۔

”نہیں نہیں۔ تم اب گھر جا کے آرام کرو۔“ ”گھر جا کے تمھیں کل کے ناشتے کی بھی تو تیاری کرنی ہے۔“

وہ کھل کھلا پڑی، موتی سے بکھر گئے۔

”بس صبح بہترین ناشتا لے کے آنا۔ تم مانو گی تو نہیں نا۔“ میں نے مسکرا کے کہا۔ ”اور ہاں، ایک آدمی بڑھ گیا ہے۔ بچھل بھائی کا بھی دھیان رکھنا ہے۔ اسپتال کا کھانا کھاتے کھاتے وہ عاجز آ چکے ہوں گے۔ ویسے بھی تمھاری اُن سے اچھی دوستی ہو گئی ہے۔“

”وہ بہت اچھے ہیں۔“ سیورین وارفتگی سے بولی، ”میرے بابا تو بچپن ہی میں دُور ہو گئے تھے، بعد کو ماں بھی نہیں رہی۔ بابا سے باتیں کر کے ایسا لگا جیسے مجھے میرے بابا مل گئے ہیں۔ ہم دونوں میں بہت باتیں ہوئیں۔ وہ میرے بارے میں پوچھتے رہے، پھر اپنے گھر کی جنت کا حال بتاتے رہے۔ اپنی بٹی زری کا... اور کہنے لگے کہ کبھی وہاں آنا اور دیکھنا کہ وہاں کیسے لوگ بستے ہیں، اور بولے، سب تیرے جیسے ہیں۔ اُنھوں نے

بڑا مان دیا ہے مجھے۔" وہ پٹر پٹر بولتی رہی۔
کل کی طرح راہ داری کے موڑ پر میں نے اُسے رخصت کیا، اور کوشش کی کہ وہ کوئی بار لیے گھر نہ جائے۔

مجھے شبہ تھا، آج رات ڈاکٹر رائے کے گھر جلی نہ ہو جائے۔ دوپہر اُس نے ایسا کچھ اِمکان ظاہر کیا تھا مگر 9 بج گئے۔ نہ ڈاکٹر آیا، نہ معمول کے مطابق رات کے دورے پر اُس کے بجائے کوئی دوسرا ڈاکٹر، نہ کوئی قاصد۔ اِس وقت تک کسی کو آ جانا چاہیے تھا۔ ایمی بھی پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ ڈاکٹر کے دورے کے بعد وہ جیسے کسی اہم کام سے نچنت ہو جاتی تھی۔ بہ ہرحال، میں اپنی جانب سے تیار بیٹھا تھا۔ ضرور اسپتال میں کوئی مریض نازک حالت میں آیا ہوگا۔ وقتی تسلّی کے لیے آدمی طرح طرح کے عذر، قیاس کر لیتا اور امکانات تراش لیتا ہے۔ دیر ہو جائے تو یہی قیاس وسوسوں، واہموں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، اور اُن کی کثرت پریشان بھی بہت کرتی ہے۔ خلّاق آدمی تو یوں بھی اَن ہونیاں تخلیق کرتا رہتا ہے۔

کوئی ساڑھے نو بجے اسپتال کے ایک ملازم نے آ کے ڈاکٹر رائے کی آمد کی اطلاع دی۔ میں راہ داری میں جا کے کھڑا ہو گیا، اور چند ہی منٹ بعد ڈاکٹر رائے، ایک اور ڈاکٹر اور نرس کے ساتھ لپکتے جھپکتے قدموں سے کمرے کی طرف آتا دکھائی دیا۔ مجھے دیکھ کے اُس نے ہاتھ پھیلا دیا، اور میرے شانے پر ہاتھ رکھ کے بڑبڑاتے ہوئے بولا، "تم انتظار کر رہے ہو گے۔"

"جی ہاں۔" میں نے بےتابی سے کہا۔

"پہلے بھائی کو ایک نظر دیکھ لوں، پھر تم سے بات ہوتی ہے۔"

"خیریت تو ہے ڈاکٹر صاحب؟"

"کچھ تو معلوم ہو گیا ہوگا تمھیں۔"

"ہاں، میدا کے بارے میں معلوم ہوا تھا۔ آج شام جب کلکتے سے آنے والے وہ دونوں، جامو اور زورا، میدا کے بغیر بٹھل بھائی کو دیکھنے آئے تھے۔" میں نے اضطراری سادگی سے کہا۔

اِس اثنا میں ہم کمرے تک پہنچ گئے تھے۔ ڈاکٹر بٹھل کے پاس چلا گیا۔ اُس کا روزنامچہ دیکھا۔ بٹھل غنودگی میں تھا، آہٹوں سے جاگ گیا اور اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر نے جگہ جگہ سے اُس کا سر دبا کے دیکھا اور اطمینان کا اظہار کرتا رہا۔ ایمی کو اُس نے دواؤں اور غذاؤں کی تبدیلی کے بارے میں ہدایت کی، ایمی تیزی سے کاغذ پر مندرج کرتی رہی۔ ڈاکٹر نے صبح و شام اسپتال کی حدود میں چلنے پھرنے کی بھی بٹھل کو اجازت دے دی۔ وہ سات آٹھ منٹ سے زیادہ نہیں ٹھیرا۔ میں اُس کے ساتھ ہی کمرے سے باہر آ گیا۔ سبزہ زار میں کرسیاں ابھی تک پڑی ہوئی تھیں۔ وہ اُن کی طرف بڑھا تھا کہ ٹھیر گیا اور اُس نے اپنے ساتھی ڈاکٹر اور نرس کو واپس جانے کا اشارہ کیا اور سبزہ زار میں آ گیا۔ کرسیاں نم ہو چکی تھیں مگر ایسی زیادہ نہیں کہ بیٹھا نہ جا سکے۔ کرسی سنبھالتے ہی ڈاکٹر رائے سر جھکا کے بولا،

"ایک افسوس ناک خبر ہے۔"

"کیا ڈاکٹر صاحب؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"دوپہر میں نے تمھیں بتایا تھا، آج شام اکبر علی خاں کے ہاں روایتی قسم کا اجتماع ہے۔ سنا ہے، ایک خلقت جمع تھی، مرد، عورتیں..."

اور ڈاکٹر نے وہی بتایا جس کی تمہید سے میرے دل میں ہُوک اُٹھی تھی اور میری سانسیں سینے میں رُک گئی تھیں۔

"اکبر علی خاں کی بیوی بھی اُسی کے پاس چلی گئی۔" ڈاکٹر نے کرب سے کہا۔

میں اُسے دیکھتا رہ گیا۔

"ابھی ساڑھے آٹھ بجے ایک پولیس افسر میرے پاس آیا تھا۔ اُس نے بتایا کہ گھر میں عورتوں کا اژدحام تھا، قرآن خوانی کے بعد وہ بین کر رہی تھیں کہ پہلے سے نیم جاں اکبر علی خاں کی بیوہ اِس آہ و بکا کی تاب نہ لا سکی۔ وہ چلی گئی۔"

میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے اپنے ہاتھوں میں میرے ہاتھ جکڑ لیے۔ "تم ٹھیک کہتے تھے، وہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر ادھورے تھے... تمھیں یہ اطلاع دیتے ہوئے مجھے بہت دکھ ہے۔" میں گُنگ بیٹھا رہا۔

"ایک آدمی چلا گیا تھا، دوسرا اُس سے اِس قدر وابستہ تھا کہ زندہ رہنا اُس کے اختیار میں نہیں رہا۔ کوئی کیا کر سکتا ہے۔ اُسے اپنے بچّوں سے زیادہ شوہر عزیز تھا۔" ڈاکٹر نے ڈوبتی آواز میں کہا۔ "سوچتا رہا، کس طرح یہ دل دوز خبر تم تک پہنچاؤں۔ اِسی کشمکش و پیچ میں دیر ہو گئی۔ تم میرا انتظار کر رہے ہو گے۔ بینا سے میں نے کہا تھا کہ آج شام تم گھر آ سکتے ہو، لیکن وہ پولیس افسر آ گیا اور اُس کی زبانی یہ سن کے مجھ پہ سنّاٹے کا عالم رہا۔ میں تو اِن سانحوں کا عادی ہوں۔ روز یہاں تماشا ہوتا رہتا ہے۔ لوگ دَم توڑ دیتے ہیں اور آہ و زاری کرتے ہوئے اُن کے عزیز اُن کی میّتیں لے جاتے ہیں، لیکن اِس حادثے نے مجھے نڈھال کر دیا۔ ایک ذرا سی بات پہ کتنے سانحے ممکن ہو سکتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تم سے کیا کہوں، سوائے اِس کے کہ تم ایک حوصلہ مند آدمی ہو، اپنے آپ کو سنبھالے رکھو، اور ایک بات اچھی طرح سمجھ لو۔ اِس میں تمھاری کوئی غلطی، کوئی قصور نہیں، یہ تو عزیزِ من، تانے بانے کی بات ہے۔"

مجھ سے کچھ بھی نہ کہا جا سکا۔

"میں زیادہ دیر نہیں بیٹھوں گا۔ گھر میں بینا راہ تک رہی ہوگی۔ تم سے ایک اور بات کہنی ہے۔ یہ وقت تو نہیں ہے، لیکن متعلق ہی بات ہے۔ اچھا ہے، تم باخبر رہو۔"

"جی، ڈاکٹر صاحب۔" میں نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"میدا اُستاد کو گرفتار کر کے شہر کی پولیس کے بجائے بیرونی پولیس کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ بیرونی پولیس اپنے انداز سے اُس سے اور اُس کے گُرگوں سے نمٹ رہی ہے۔ تمھیں یہ جان کے حیرت ہوگی، حیرت بھی اور عبرت بھی کہ میدا نے کسی بھی جرم کے ارتکاب سے صاف انکار کر دیا ہے۔ یہی شخص کل ہمارے سامنے اعتراف کر رہا تھا۔ تم شاید مجھ سے متفق نہ ہو، مگر مجھے شبہ ہے، یہی آدمی سارے المیوں کی بنیاد ہے۔ مجھے تو وہ کاذب اور پرلے درجے کا کمینہ آدمی معلوم ہوتا ہے۔ یقیناً اُسی نے تمھیں ختم کرنے کے لیے اسپتال میں مسلح آدمی بھیجے تھے جن کی زد پر انتھونی غریب آ گیا۔ اپنے اِس اقدام میں ناکامی کے بعد تمھیں منتشر و متزلزل کرنے کے لیے اُس نے اکبر علی خاں کو مار دیا۔ یوں اُس کا ایک مقصد بھی حاصل ہوتا تھا۔ اکبر علی خاں اور تمھاری قرابت کی وجہ سے لازماً پولیس سب سے پہلے تمھاری جانب ہی رُخ کرے گی اور حوالات، یا جیل میں آسانی سے تم اُس کا نشانہ بن سکتے ہو، یا پھر ایک لمبی مدت تک پولیس، عدالت کے شکنجے میں جکڑے رہو گے۔ وہ تمھارے خلاف اپنے نمک خوار پولیس والوں کی ڈوریاں ہلاتا رہے گا۔ اُسے توقع نہیں ہوگی کہ پولیس تم پر ہاتھ ڈالنے کے بجائے تمھیں آزاد کیے رکھے گی۔ دوسری بار ناکامی کے بعد پھر یہی ایک صورت، چار و ناچار رہ جاتی تھی کہ وہ دوسرے طور سے تم پر اثر انداز ہو۔ اُس نے اپنے تین آدمیوں کی قربانی دے کے اُن کی لاشیں اکبر علی خاں کے خون کی جگہ پھنکوا دیں اور تمھیں یہ تأثر دینے کی کوشش کہ میدا اُستاد پٹنے کے اڈّے کا ایک بااصول، سچّا اور کھرا آدمی ہے۔ وہ اپنے علاقے میں ایسی دھاندلی اور ظلم و ستم برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اکبر علی خاں کے واقعے پر اُس کا سر جھک گیا ہے اور ندامت کا یہ عالم ہے کہ تمھارے قدموں پہ اپنا چاقو ڈالنے اور اڈّے سے دست برداری کا اعلان کرنے آ گیا ہے۔ اُسے اندازہ تھا، اِس عجز و انکسار، خستگی اور پشیمانی کے اِس اظہار پر اڈّا تم اُسی کے حوالے کر دو گے، نہ بھی کرو تو اُسے تمھارے ممکنہ قہر و غضب سے تو امان مل جائے گی، اور تم نے وہی کیا جو ایک عالی حوصلہ اور کشادہ دل شخص کو کرنا چاہیے تھا۔

"وہ شروع سے تمھارے تعاقب میں تھا اور اچھی طرح جان چکا تھا کہ تم اُس کے اڈّے پہ اپنا چاقو واپس لینے ضرور آؤ گے اور اِس شہر میں اُسے رُسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا، جہاں ایک عرصے سے بلا شرکتِ غیرے وہ حکم رانی کر رہا ہے۔ وہ تو کلکتے سے تمھارے دو ساتھیوں کی آمد کے بعد اُس کی آنکھیں کھلیں کہ تم تو اُستاد بٹھل کے آدمی ہو، وہ کس شخص کی جان کے درپے تھا۔ یہ تو بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے۔ اُستاد بٹھل کے عتاب کے خیال ہی سے اُسے ہَول آنا چاہیے۔ اُسے تو پھر یہ خوف بھی دامن گیر ہوا ہوگا کہ صحت یابی کے بعد اُستاد بٹھل اپنے طور سے حقائق کی تفتیش کر سکتا ہے، اور اُس سے کچھ چھپانا آسان نہ ہوگا۔ اکبر علی خاں کے خون کی حقیقت آشنائی

کے بعد اُس کا غصہ و غم کیسا قیامت خیز ہوسکتا ہے۔ سو اَب اُستاد جُھل کے سامنے میدا بندگی ہی پیش کرسکتا تھا، اور وہ یہی کررہا تھا۔ بہرحال، مآلِ کار وہ گرفت میں آچکا ہے۔ یہ سارے جرائم اُس نے اپنے معتبر ساتھیوں کی مدد کے بغیر نہیں کیے ہوں گے۔ دیکھتے ہیں، کب تک وہ رفاقت کا حق نبھا پاتے ہیں۔ اپنے سرغنہ کی پردہ پوشی کی کتنی استقامت ہے اُن میں۔ پولیس کو اصل صورتِ حال تک پہنچنے میں دیر لگ سکتی ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے، پولیس بھی عزم کیے ہوئے ہے۔ مجرموں کو اپنے انجام تک پہنچنا ہی چاہیے۔"

ڈاکٹر کی آواز جل سی رہی تھی۔ میں نے کوئی دخل نہیں دیا۔ ایک لمحاتی تامل کے بعد اُس نے پوچھا، "تم کوئی تردید... کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

میں تو ششدر رہ گیا تھا۔ کچھ کہنے کا یارا ہی نہ تھا مجھے۔

"ہوسکتا ہے، میرا تجزیہ ایک فسانہ لگتا ہو، لیکن یہی کچھ نظر آتا ہے، اور میں سمجھتا ہوں، اِتنا بے جواز بھی نہیں ہے۔"

"جی، جی ڈاکٹر صاحب۔" میری آواز بیٹھ گئی۔

"سوچنا تم... میں اب چلتا ہوں، میری کمر پر دھپ مارتے ہوئے وہ اُٹھ گیا۔ "یہ دنیا بہت عجیب ہے، جتنی دل کش اور روشن ہے، اُتنی ہی مکروہ اور اندھیری... کل ملیں گے، اور ہاں، سنو! کل صبح میرے سامنے وہی چہرہ ہو، جو تمھارا ہے۔"

میں سبزہ زار ہی میں بیٹھا رہا۔ مجھ سے اُٹھا ہی نہیں جارہا تھا۔ جسم میں جیسے جان ہی نہیں رہی تھی۔ پھر ایمی آگئی اور کھانے کے لیے پوچھنے لگی۔ منع کرنے پر ضد کرنے لگی۔ جی میں آیا، اُسے جھڑک دوں، لیکن یہ بھی نہ ہوسکا۔ میرا ہاتھ پکڑ کے وہ مجھے کمرے میں لے گئی اور صوفے پر میرے پاس ہی بیٹھ گئی۔ "کیا بات ہے میرے بچے!" اُس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دل گیر لہجے میں پوچھا۔ مجھ سے ضبط نہ ہوسکا اور میری سسکیاں نکل گئیں۔ اُسے پریشان ہوجانا چاہیے تھا۔ اُس نے بے قراری سے میرا سر اپنی گود میں لے لیا۔ "نہیں، نہیں۔ یہ کیا۔" وہ مجھے پچکارنے لگی۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ جُھل بھی جاگ سکتا ہے۔ میرے تو بس میں نہیں رہا تھا، اُمڈ اُمڈ کے آنسو آرہے تھے۔ اُس نے مجھے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ "میری جان! مجھے بتاؤ، ڈاکٹر کیا کہہ گئے ہیں۔"

میں نے بہ مشکل اُسے اکبر علی خاں کی بیوی کے متعلق بتایا۔ وہ ہکا بکا رہ گئی۔ "یہ کیا ہوا... نہیں نہیں۔" بہت وہ مجھے دلاسے دے رہی تھی، خود ہی پر قابو نہیں رہا۔

"یہ کیسے ہوا بچے؟" وہ پھٹی ہوئی آواز میں بولی۔

"بس... اُن کے بغیر وہ نہیں رہ سکتی تھیں... سارا گھر ہی برباد ہوگیا... اور کس وجہ سے، کس کی وجہ سے۔" میں نے بلکتے ہوئے کہا۔

"نا نا، تمھاری وجہ سے کیوں، ایسا مت سوچو۔" وہ بکھری ہوئی سانسوں سے بولی، "تم ایسا چاہتے تھے کیا..." وہ مجھے سمجھاتی اور روتی رہی۔ کہنے لگی، "آدمی کسی کی موت سے زیادہ اپنی بے کسی اور مجبوری پر روتا ہے کہ نہ کسی کو جانے سے روک سکتا ہے، نہ کسی جانے والے کو واپس لا سکتا ہے۔" اپنی ہی تلقین وتاکید سے وہ زچ ہوگئی، بولی "رو لو میرے بچے! جتنا رو سکتے ہو۔ ہمارے پاس آنسوؤں کے سوا کیا ہے۔ یہ آنسو بڑا سہارا ہیں۔ یہ نہ ہوں تو آدمی کیا کرے، اُس کا دماغ پھٹ جائے، وہ تو پاگل ہوجائے۔"

بار بار وہ گھر میری آنکھوں کے سامنے آجاتا تھا، جہاں میں چاقو نکالے داخل ہوا تھا، اور سارے گھر والوں کو ہیبت زدہ کردیا تھا۔ اکبر علی خاں، اُن کی بیگم نزہت، اُن کے بچے۔ کیسا بھرا پُرا گھر تھا۔ اکبر علی خاں کس والہانہ انداز میں مجھ سے اپنی بیگم کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔ اُن کی باتیں کانٹوں کی طرح میرے سینے میں چبھ رہی تھیں۔

ایمی بھی میرے ساتھ جاگتی رہی۔ رات گئے اُس نے جھجکتے ہوئے مجھ سے کھانے کے لیے پوچھا تو اُس کے بھوکے رہ جانے کی وجہ سے میں بھی رسمًا اُس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ نہ وہ کچھ کھا پائی تھی، نہ مجھ سے کچھ زہر مار کیا جاسکا۔ میں نے اُسے میدا کے بارے میں نہیں بتایا تھا کہ ڈاکٹر رائے کیا ستم تراشی کرکے گیا ہے۔ ڈاکٹر کا اندازہ درست ہے تو اکبر علی خاں کی بیگم کا قاتل بھی تو وہی میدا ہے۔ ایسے شخص کے لیے سزائے موت تو بڑی حقیر سزا ہے۔

آ گئی تھی، لہلہاتی اور چہچہاتی ہوئی۔ سیورین آج اور سویرے ا[illegible]

[illegible] نے اُس کے داخل ہوتے ہی اُس کی شگفتگی چھین لی۔ ایمی تو بڑی سرد و گرم چشیدہ تھی۔ سیورین کو زندگی کے اِتنے بلوں، اِتنے اُتار چڑھاؤ سے کتنا واسطہ پڑا ہوگا۔ وہ تو کھلا تی جہاں دیدہ بزرگوں کی فعالیت اور ہوش مندی کے اطوار بھی کیسے بے محل، سنگ دلانہ لگتے ہیں۔ ایمی نے کسی سے پوچھے بغیر ناشتا میز پر لگا دیا، جو ناشتا کم، کھانے کی باقاعدہ دعوت کا اہتمام زیادہ ہوتا تھا۔ جُھل پوری طرح بیدار تھا۔ ایمی نے از راہِ وضع اُس سے ساتھ دینے کی درخواست کی۔ سیورین نے آج بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، لیکن ہم تینوں بس ٹُو نگتے رہے۔ جُھل کو دنوں بعد یہ موقع ملا تھا۔ سیورین کے ہاں روغن اور سالوں کی آمیزش برائے نام ہی ہوتی تھی۔ جُھل نے لطف لیتے ہوئے کھایا، اور پھیکی پھیکی مسکراہٹ سے سیورین اُس کی داد و ستائش کا شکریہ ادا کرتی رہی۔ ساری خوش رنگی و خوش ذائقگی، خوش آوازی و خوش شامگی، خوش دلی کی پابند ہوتی ہے۔ جُھل کی ناآگہی اُس کے لیے بڑی آسودگی تھی۔

ایمی نے برتن بھی جلد سمیٹ دیے، اور ڈاکٹر رائے کے آنے سے پہلے میز صاف کردی۔ دس بج رہے تھے، اور چند ہی منٹ اُوپر ہوئے تھے کہ جامو اور زورا نے جھجکتے ہوئے کمرے میں قدم رکھا۔ وہ نو بجے سے اسپتال کے باہر ملاقاتیوں کا وقت شروع ہونے کا انتظار کررہے تھے۔ میری طرح اُن دونوں کو بھی حیرت ہوئی ہوگی کہ جُھل نے اُن سے میدا کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ اُنھوں نے بھی اپنی جانب سے کچھ بتانے سے گریز کیا۔ کسی وقت بھی ڈاکٹر کے آجانے کے خیال سے جُھل کمرے ہی میں موجود اور ناشتے کے بعد صوفے پر بیٹھا رہا۔ اُس کی معتدل حالت، خوش باشی ہی کا اثر ہوگا کہ جامو اور زورا کے چہروں پر چھایا تکدر بڑی حد تک چھٹ گیا تھا۔

وہ دونوں جُھل میں مصروف تھے کہ اُنھیں وہیں چھوڑ کے میں باہر نکل آیا۔ مراد یہی تھی کہ اُن میں سے کوئی جلد، یا بدیر باہر آجائے گا، اور اُسے مجھ سے بات کرنے کا موقع مل جائے گا۔ جتنا میں مضطرب تھا، اُتنے ہی وہ دونوں بھی ہونے چاہیے تھے۔ یہی ہوا، چند منٹ بعد جامو باہر آگیا۔ اُسے اکبر علی خاں کی بیگم کے سانحے کا علم نہیں تھا۔ وہ تو اڈّے کی ویرانی کا حال بتا رہا تھا۔

کل شام اُن کے اڈّے پر واپس پہنچنے کے بعد پولیس دوبارہ عمارت میں گھس آئی، اور بچے کھچے لوگوں کو پکڑ کے لے گئی۔ کل شام ہی سے پولیس نے اڈّے کا علاقہ حصار میں لے رکھا تھا۔ اڈّے کی اِتنی بڑی عمارت میں صرف جامو اور زورا ہی رہ گئے۔ اڈّے سے متعلق کسی بھولے بھٹکے نے آنا چاہا ہوگا تو پولیس کی فصیل عبور کرکے اڈّے تک اُس کا پہنچنا ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ نظر پڑتے ہی پولیس نے اُسے دھر لیا ہوگا، یا پولیس کو دیکھ کے وہ بھاگ نکلا ہوگا۔ جامو اور زورا نے رات بڑے کرب میں گزاری، صبح سویرے ہی اڈّے سے نکل پڑے۔ تھوڑی دُور جا کے ہی اُنھیں اندازہ ہوگیا کہ گلیوں اور سڑکوں پر گشت خطرناک ہے۔ اسٹیشن کے قریب ایک ہوٹل میں کہیں اُنھیں عافیت ملی۔ اُنھوں نے وہیں ناشتا کیا اور خاصا وقت گزار دیا۔ لیکن اُن کی منزل اسپتال تھی، اور جگہ جگہ پولیس موجود تھی۔ کئی مقامات پر اُنھیں روک لیا گیا اور پوچھ گچھ کے بعد چھوڑ دیا گیا۔ کسی جگہ سپاہیوں کو اُن کے بیان پر یقین نہیں آیا۔ وہ اُنھیں ساتھ لے جانے لگے تھے کہ پہلے کی طرح، آگے گشت کرتے ہوئے پولیس کے دستے میں کسی نے پہچان لیا اور نجات دلوا دی۔ اسپتال ابھی دُور تھا۔ وہ تانگے میں بیٹھ گئے۔ باقی راستے میں بھی یہی رکاوٹیں پیش آسکتی تھیں۔ آگے پولیس کا ایک جھنڈ نظر آنے پر وہ تانگے سے اُتر گئے، اور خود پولیس کے سامنے جا پہنچے۔ اُنھوں نے

اپنی مشکل بیان کی۔ یوں ایک مددگار سپاہی کے ہم راہ کہیں وہ اسپتال پہنچ پائے۔

جامو اپنی بیزاری اور وحشت کا ذکر کر رہا تھا کہ راہ داری کے موڑ پر ڈاکٹر رائے آتا دکھائی دیا۔ آج اُس کے ساتھ کوئی ڈاکٹر نہیں تھا، نہ ہی کوئی نرس تھی۔ پیچھے البتہ کچھ دوری پر ایک خدمت گار ساتھ چل رہا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی میں اُس کی جانب لپک پڑا، میری تقلید میں جامو بھی۔ درمیان میں آمنا سامنا ہو جانے پر ڈاکٹر رک گیا۔ ہم بھی ٹھہر گئے۔ ڈاکٹر کا چہرہ گہری سنجیدگی کی غمازی کر رہا تھا۔ ہمارے سلام پر وہ لمحوں تک خاموش رہا، پھر میرے بجائے اُس نے انگلی اُٹھا کے ہندستانی میں جامو کو مخاطب کیا۔ "تمھی کلکتے سے آئے ہو؟" اُس کی آواز دھمک رہی تھی۔

جامو نے اضطراری انداز میں سر ہلا دیا۔

"دوسرا کدھر ہے؟"

جامو کی گردن کمرے کی طرف مڑ گئی۔

"کیا نام ہے تمھارا؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

جامو کے بجائے میں نے جواب دیا، "یہ جامو ہیں، دوسرا اندر کمرے میں زورا ہے۔"

"کدھر ٹھہرے ہو تم لوگ؟"

جامو نے میری طرف دیکھا اور ہکلاتے ہوئے بولا، "وہ اُدھر میدا اُستاد کے ٹھکانے پہ۔"

"وہ جگہ چھوڑ دو۔" ڈاکٹر نے تحکمیہ لہجے میں کہا، "یا تو کلکتے لوٹ جاؤ، یا اپنا کوئی اور ٹھکانا کر لو۔ جس کے لیے تم اِدھر آئے ہو، وہ اب ٹھیک ہے۔ تین چار دن میں تم تک پہنچ جائے گا۔"

جامو نے کچھ کہنا چاہا اور خاموش رہا۔

ڈاکٹر نے اُس سے زیادہ بات نہیں کی، اور ... فاصلہ طے کر کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ بتھل کو ... دیکھ کے اُس کے جسم میں لہری اُٹھی، آنکھوں کی چمک ... بے اختیار اُس نے انگریزی میں کہا، "یہ تم ہو اُستاد!" بتھل فوراً کھڑا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر کی آواز کی لہک سے ... اُس کا مفہوم سمجھ گیا۔ "سارا آپ کا ہے ڈاکٹر ساب۔" اُس ... ممنونیت سے کہا۔

ڈاکٹر نے اُسے بٹھا دیا اور خود اُس کے برابر بیٹھ گیا۔ ... اُسی نے صبح و شام بتھل کے طبی احوال پر مشتمل کاغذات ڈاکٹر کے سامنے کر دیے۔ وہ بہ غور اُن کا جائزہ لیتا رہا اور بتھل سے کہا، "دو، یا تین دن بعد جا سکتے ہو۔"

"اب بھی جا سکتا ہوں۔" بتھل آہستگی سے بڑبڑاتے ہوئے بولا، اور اپنی بے چینی چھپانے میں ناکام رہا۔

"جا سکتے ہو اُستاد، پر ہم جانے دیں تب..." یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر سوفے سے اُٹھ گیا۔ قریب ہی جامو ہاتھ باندھے ہوئے کھڑا تھا۔ ڈاکٹر نے اُس کے پاس رُک کے کہا، "تم اپنے ساتھی کے ساتھ شام تک اِدھر ٹھہر سکتے ہو۔"

جامو کا چہرہ کھِل اُٹھا۔ اُس نے ڈاکٹر کے پیر چھونے چاہے تو وہ پیچھے ہٹ گیا اور دروازے کی طرف جاتے جاتے اُس نے ہاتھ اٹھا کے مجھے اشارہ کیا، "میرے ساتھ آؤ۔" پھر چند قدم آگے جا کے کہنے لگا، "میدا صبح حوالات میں مردہ پایا گیا۔ پولیس نے ابھی تک چھپایا ہوا ہے۔"

بازی گر، سب رنگ کا سب سے مقبول سلسلہ
اُمنگوں، حوصلوں، آنسوؤں اور آہوں کی داستان
ایک سرگرفتہ و جاں سوختہ نوجوان کا سفرنامۂ زندگی
پانچویں درویش کا بیان
باقی واقعات آئندہ شمارے میں

سب رنگ

میرا جسم ڈگمگا گیا اور مجھ سے ڈاکٹر رائے کا ساتھ نہ دیا جا سکا۔

وہ بھی ٹھہر گیا اور میری صورت دیکھنے لگا۔ میرا مُنہ کھلا ہوا تھا، آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ میرا بازو تھام کے اُس نے گہری سانس بھری۔ ''مجھے ابھی کچھ دیر پہلے معلوم ہوا ہے۔'' وہ آہستگی سے بولا، ''چلو، اُدھر چل کے بات کرتے ہیں۔ اپنے آپ کو قابو میں رکھو۔''

مجھے نہیں معلوم، اُس کے ساتھ چلتا ہوا میں کس طرح اُس کے دفتر تک پہنچ سکا۔ دفتر آ کے اُس نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے بے حواسی سے تعمیل کی۔

وہ میرے برابر بیٹھ گیا اور ملازم طلب کر کے مشروبات وغیرہ لانے کا حکم دیا۔ ملازم کے چلے جانے کے بعد وہ بوجھل آواز میں بولا، ''مجھے بھی یقین آنے میں دیر لگی۔ اُسے اِتنا غیرت مند نہیں ہونا چاہیے تھا، مگر شاید یہ غیرت کی بات نہیں۔''

میں بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔

''ارے تم... تمھیں کیا ہوا؟'' میری خاموشی پر اُس نے مجھے ٹھوکا دیا۔

''کچھ نہیں۔'' میں نے ہڑبڑا کے کہا، ''یہ کیا... کیسے ڈاکٹر صاحب؟ آپ کیا...''

''ہاں، یہی کچھ معلوم ہوا ہے۔ اُس نے اپنے آپ کو ختم کر لیا ہے۔'' وہ سرد لہجے میں بولا۔

''اُس نے خود کو ختم کر لیا؟'' میں نے بے ربطی سے کہا۔

''تمھیں دُکھ ہو رہا ہے؟''

اُس کی آواز سینے میں ترازو ہوئی تھی، لیکن اُس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

''مجھے بھی اِسی کا دکھ ہے۔'' وہ تلخی سے بولا، ''سزا بھی اُس درندے نے خود منتخب کی۔''

میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی اور بہ مشکل زبان کھولی، ''آپ کو کیا معلوم ہوا ہے؟''

''کچھ زیادہ نہیں۔'' وہ بگڑ کے بولا، ''صبح سویرے اُس کا بے حرکت جسم دیکھ کے اُس کی کوٹھری پر تعینات پہرے دار نے جانا کہ وہ سو رہا ہے، لیکن پھر پہرے دار کو شبہ ہوا۔ اُس نے آوازیں دیں اور دوسرے سپاہی بلا لیے اور لمحوں میں اُن پر حقیقت کھل گئی۔ اُس نے شیشہ چبا لیا تھا، یا اُس کے پاس زہر تھا۔ گلے میں پڑی مالا کے ٹوٹے پھوٹے دانے فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔ خون کی لکیر ہونٹوں پر جمی ہوئی تھی۔ یہ تو زہر خوری کی علامت لگتی ہے۔ اصل بات تو، بہ ہر حال، تفتیش کے بعد معلوم ہو ہی جائے گی۔ کیا اڈّے کے لوگ زہر بھی اپنے پاس چھپا کے رکھتے ہیں؟'' اُس نے چبھتی ہوئی آواز میں پوچھا، ''میرا مطلب ہے، حفظِ ماتقدم کے طور پر۔''

''مجھے نہیں معلوم، میرا خیال ہے، نہیں۔ میں نے کبھی نہیں سنا۔ اڈّے کے لوگ اتنے بودے نہیں ہوتے۔''

''وہ اڈّے سے اُوپر کا آدمی تھا۔''

''اڈّے کے لوگ تو آخر تک اپنی جنگ لڑتے ہیں۔''

''یا یوں کہو کہ حجت کرتے ہیں، مگر کسی بنیاد ہی پر... جب کہنے کے لیے کچھ رہ ہی نہ گیا ہو...''

ڈاکٹر نرم آواز میں بولا، ''میں نے تمھیں بتایا تھا۔ یہ شہر کی پولیس نہیں تھی۔ تمھارے بہ قول، شہر کی پولیس سے اڈّے کے لوگوں کی ایک رسم و راہ ہوتی ہے۔ یہ دوسرے شہر کے سپاہیوں اور افسروں پر مشتمل پولیس تھی، بالکل اجنبی۔ اُس نے میدا کے بجائے اُس کے قریب ترین ساتھیوں سے بازپُرس کا آغاز کیا۔ انھیں ایک دوسرے سے الگ رکھا گیا تھا۔ تمھیں حیرت ہوگی، مجھے بتایا گیا ہے کہ میدا کا خاص مربی، مشیرِ اوّل اور دستِ راست برجودادا ہی سب سے ناتواں ثابت ہوا، ذرا سی اذیت نہ سہ سکا۔ سنا ہے، پولیس کو زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔ کچھ پولیس کے حصار، اُس کے تیور دیکھ کے برجودادا کا حوصلہ پست ہوا۔ اِدھر پولیس نے وعدہ معاف گواہ کی صورت میں زندگی کی اُمید جگائی تو اُس عمر رسیدہ سے کچھ نہاں نہ رکھا گیا۔ میدا کے دوسرے مقربین کے آگے جب برجودادا کے اعترافات کا گوشوارہ پیش کیا گیا تو تھوڑے بہت ہاتھ پانو مار کے اُنھوں نے بھی سپر ڈال دی۔ پولیس نے پہلے میدا کے وفاداروں، جاں نثاروں سے حاصل کی ہوئی شہادتوں کی راتوں رات تصدیق کی، پھر اُس کی کوٹھری کا رُخ کیا اور ساری رُوداد سامنے رکھ دی۔ بڑے پولیس افسر وہاں موجود تھے۔ احتیاطاً کوئی عدالتی کارندہ بھی طلب کر لیا گیا تھا۔ میدا پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ اُس نے کوئی بحث نہیں کی۔ دستخط کرنے اُسے آتے تھے، انگوٹھا بھی اقرارنامے پر ثبت کرا لیا گیا۔ یاد ہے، میں نے کیا کہا تھا؟''

''جی... جی ہاں۔'' میں نے بوکھلا کے کہا۔

کل ہی ڈاکٹر رائے نے اُستاد میدا کے بارے میں رائے زنی کی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ کوئی اور نہیں، شہر کے اڈّے کی چوکی کا نگراں، وہی ایک آدمی سارے المیوں کی بنیاد لگتا ہے۔ مجھے ختم کرنے کے لیے اُسی نے اسپتال میں مسلح آدمی بھیجے تھے جن کی زد پر اسپتال کا نوجوان ملازم انتونی آ گیا۔ میدا کو باور ہو گیا تھا کہ بھائی کی صحت یابی کے بعد میں اپنا چاقو واپس لینے اڈّے ضرور آؤں گا، اور اُس کی ہزیمت کا نتیجہ رسوائی کے علاوہ اڈّے پر برسوں کی عمل داری کا خاتمہ بھی ہے۔ اپنے پہلے اقدام کی ناکامی پر مجھے منتشر کرنے کے لیے اُس نے اکبر علی خاں کو ختم کر دیا کہ اکبر علی خاں اور میری قرابت کی وجہ سے سب سے پہلے پولیس میری ہی جانب قدم بڑھائے گی۔ کسی طور پر پولیس کے نرغے میں آ جاتا ہوں تو کسی بھی وقت آسانی سے اُس کا نشانہ بن سکتا ہوں، یا پھر ایک لمبی مدت تک پولیس اور عدالت کے شکنجے میں تو جکڑا رہوں گا، اور وہ میرے خلاف اپنے نمک خوار پولیس والوں کی ڈوریاں ہلاتا رہے گا۔ میدا کو توقع نہیں تھی کہ پولیس مجھے آزاد کیے رکھے گی۔ دوسری بار ناکامی کے بعد پھر یہی ایک صورت رہ جاتی تھی کہ وہ کسی اور طرح مجھ پر اثرانداز ہونے کی کوشش کرے۔ اُس نے اپنے تین آدمیوں کی قربانی دے کے اُن کی لاشیں اُسی جگہ پھنکوا دیں جہاں اکبر علی خاں کا خون ہوا تھا اور یوں یہ تاثر دینا چاہا کہ میدا اُستاد پٹنا شہر کے اڈّے کا ایک سچا اور کھرا آدمی ہے۔ اپنے علاقے میں وہ ایسی ہٹ دھرمی، دھاندلی برداشت نہیں کر سکتا۔ اکبر علی خاں کے سانحے پر اُس کا سر جھک گیا ہے، اور ندامت کا یہ عالم ہے کہ اب وہ میرا چاقو واپس کرنے اور

اڈّے سے دست برداری کا اعلان کرنے آ گیا ہے۔ اُسے احساس ہے، یہ کوئی تلافی تو نہیں، لیکن وہ یہی کر سکتا تھا کہ اکبر علی خاں کے قاتلوں کو جتنی جلد ممکن ہو، انجام سے دوچار کردے۔ میدا کو اندازہ ہو گیا کہ اڈّے کی چوکی مجھے مطلوب نہیں ہے۔ اُس کی پس پائی اور پشیمانی کے اِس بے پناہ اظہار پر مجھے پگھلنا چاہیے اور اعلا ظرفی یہی ہے کہ پھر اڈّا بھی اُسی کے حوالے کر دیا جائے۔ میں نے یہی کیا، میں ایسا نہ کرتا تو بھی اسپتال سے فارغ ہو جانے کے بعد میرے ممکنہ قہر و غضب سے میدا کسی امان کی توقع تو کر سکتا تھا۔

ڈاکٹر رائے کی ایک ایک بات مجھے یاد تھی۔ اُس کی دیدہ وری میں کیا کلام تھا۔ گو اُس نے اپنا تجزیہ فسانہ طرازی پر محمول کیا تھا، لیکن جہاں دیدگاں کا یہی شیوہ ہوتا ہے کہ اپنے قیاس اور مفروضوں میں وہ شک کی ایک گنجائش ضرور رکھتے ہیں، اپنے تجزیوں پر اصرار نہیں کرتے اور حتمی، یا آمرانہ انداز سے اجتناب کرتے ہیں۔ کچھ بھی بے تسلسل، بے ربط اور بے جواز نہیں لگتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کی زبانی یہ فسانوی خاکہ سن کے میری رگیں کھنچنے اکڑنے لگی تھیں۔ اُسی وقت سے مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ آنے والے روز و شب میں تصور سے بعید کچھ بھی سننے اور دیکھنے سے واسطہ پڑ سکتا ہے۔

"میدا نے اعتراف کر لیا ہے کہ اُسی نے اکبر علی خاں کو...؟" میں نے پھٹی ہوئی آنکھوں سے پوچھا۔

"اور تم نے کیا سنا؟" وہ برہمی سے بولا، "اُس نے... اُس نے تسلیم کر لیا ہے سبھی کچھ، یہ میں کہہ رہا ہوں۔ اور اَب بھی کوئی شبہ ہے تمھیں؟"

"مگر کیوں؟ کیوں ڈاکٹر صاحب؟ اکبر علی خاں بیچ میں کہاں آتے تھے۔" میری آواز ڈوب رہی تھی۔

"یہ تو اُسی سے پوچھتے۔" ڈاکٹر شکستگی سے بولا۔ "آدمیوں میں سبھی آدمی کہاں اور کتنے ہوتے ہیں۔ وہ آدمی ہی کتنا تھا۔ کچھ لوگ نام کے آدمی ہوتے ہیں، بہ ظاہر آدمی، بہ باطن جان ور، بھیڑیے، گدھ... اُس جنگلی نے ایک بالکل غیر متعلق آدمی کو مار دیا۔ کچھ بھی نہیں سوچا، ذرا سا بھی خیال نہیں آیا اُسے کہ کس کا نشانہ لے رہا ہے... کون ہے، وہ شخص... اُس کا ایک گھر ہے۔ بیوی بچے ہیں۔ کیسا نفیس آدمی ہے وہ..." ڈاکٹر رائے آہیں بھرنے لگا اور بولا، "مجھے اکبر علی خاں سے ملاقات کا بہت کم موقع ملا، لیکن اُنھیں دیکھ کے احساس ہوا تھا، اِس شہر میں رہتے ہوئے کیسے عمدہ شخص سے محروم رہا ہوں۔ میں نے اُن سے کہا تھا کہ اَب ملاقاتیں رہیں گی اور یہ کوئی رسمی بات نہیں تھی۔ وہ اُن لوگوں میں تھے جن سے دوبارہ ملنے کی خواہش ہوتی ہے... اور وہ اپنا انتھونی۔ وہ بھی بہت یاد آتا ہے۔ بڑا پیارا اور جوشیلا لڑکا تھا۔ اُس نادان نے فرار ہوتے ہوئے لوگوں کے آڑے آنے کی حماقت کی تھی، مگر اکبر علی خاں کس کے راستے کی رکاوٹ بنے تھے... دو خاندان اُجڑ گئے اُس کمینے کی وجہ سے... اور وہ آسانی سے مر گیا۔"

ڈاکٹر کی دل دوز باتوں سے میرا سینہ کٹ سا رہا تھا۔ دیر تک ہم دونوں سر جھکائے چپ بیٹھے رہے۔ خدمت گار کی آمد پر ڈاکٹر سیدھا ہو گیا۔ خدمت گار نے چائے بنانی چاہی تھی کہ ڈاکٹر نے اُسے واپس کر دیا اور خود چائے بنانے لگا۔ مجھے اُس کا ہاتھ روک کے یہ خدمت انجام دینی چاہیے تھی، لیکن میرے ہاتھ پیر ہی اینٹھے ہوئے تھے۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" اُس نے آہستگی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے ناتوانی سے کہا۔

"ہاں، اَب کہنے کو رہ بھی کیا جاتا ہے۔ وہ لوگ جو چلے گئے، اُس جان ور کے اُٹھ جانے کے بعد واپس تو نہیں آ سکتے۔"

میں نے کچھ نہیں کہا۔

"آج کسی وقت اکبر علی خاں کی بیگم کی تدفین ہو جائے گی۔" ڈاکٹر یاسیت سے بولا، "اُدھر ڈاکٹری سند اور دیگر تحقیقات مکمل ہونے تک پولیس رازداری برت رہی ہے۔ ظاہر ہے، پولیس کو خدشہ ہوگا کہ اُس پر زیادتی اور ظلم کا کوئی الزام نہ آ جائے حالاں کہ میدا اور اُس کے ساتھیوں کے اعتراف کے وقت اُس نے اپنے طور پر ساری احتیاطیں کر لی تھیں، لیکن میدا کے واقعے سے معاملہ پیچیدگی اختیار کر گیا ہے۔ غفلت اور تشدد کے الزامات پولیس پر عائد کیے جا سکتے ہیں، اور زیادہ دیر تک میدا کی خبر روکے بھی نہیں رکھی جائے گی۔ اکبر علی خاں کی بیگم کالج میں پڑھاتی تھی اور فلاحی کاموں میں بھی حصہ لیتی تھی۔ پولیس کے خیال میں ایک بڑا ہجوم جنازے کے ساتھ ہوگا۔ طلبہ ویسے ہی مشتعل ہیں۔ اکبر علی خاں کے قاتلوں کی گرفتاری تک اُنھوں نے کلاسوں میں جانے سے پہلے ہی انکار کیا ہوا ہے۔ کاروبار کئی دن سے ٹھپ پڑا ہے۔ بیگم کی ناگہانی مستزاد ہوئی، شہر میں سلگتی آگ اور بھڑک سکتی ہے۔ اِسے فرو کرنے، لوگوں کا غم و غصہ اور خوف کم کرنے کے لیے پولیس کو میدا کے اعتراف اور اُس کے انجام کی خبر تدفین سے پہلے عام کرنی ہوگی۔"

ڈاکٹر خود کلامی کے انداز میں جانے کیا کیا قیاس آرائیاں کرتا رہا۔ میں نے کچھ سنا، کچھ نہیں۔ میرے سامنے چائے کی پیالی رکھی تھی۔ "تم نے چائے نہیں لی؟" اُس نے میری کمر تھپکتے ہوئے کہا، "ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

میں نے بہ عجلت پیالی اُٹھا کے مُنھ سے لگا لی۔ ابھی کچھ گرم تھی۔ حلق چیرتے ہوئے دو چار گھونٹوں میں پیالی خالی ہو گئی۔

"ابھی شہر کے معتدل ہونے میں وقت لگنا چاہیے اور میدا کی بات پر یقین آنے میں... افواہوں کا ایک بازار گرم ہوگا۔ ایک عرصے سے یہاں اُس کا راج تھا، شہر میں ایک دوسری حکومت کے مانند۔ کتنے لوگ اِس راج پاٹ سے بالواسطہ طور پہ بھی وابستہ ہوں گے، اُن کا کیا بنے گا۔ گرفتار کچھ لوگ تو جلد ہی چھوڑ دیے جائیں گے... دیکھو، آگے کیا ہوتا ہے۔ پہلے جیسی اڈّے کی سلطنت قائم ہونے میں ایک وقت لگ جائے گا اور شاید کبھی نہ ہو پائے۔ تمھارا کیا خیال ہے؟"

"جی، جی ہاں۔" میں نے کھوئی ہوئی آواز میں کہا۔

"تمھیں کیا ہو گیا ہے؟"

"میں، میں بالکل ٹھیک ہوں ڈاکٹر صاحب!" میں نے خود کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ "یہ سارا کچھ بہت..."

"ہاں، بہت عجیب ہے۔" وہ میری بات کاٹ کے بولا، "عجیب اور حیران کن، اَلم ناک بھی۔ اِتنی تیزی سے صورتِ حال یہ شکل اختیار کر لے گی، اِس کی توقع نہیں تھی۔"

میں نے کہنا چاہا، 'اِتنی تیزی سے تو یہ سارا کچھ اُسی کی وجہ سے ممکن ہوا ہے،' لیکن میں نے زبان بند رکھی۔

"مگر ایسا غلط بھی کیا ہے۔" وہ کسمسا کے بولا، "مآلِ کار تو یہی ہونا چاہیے تھا۔"

"ہونا تو کچھ نہیں چاہیے تھا۔" میں نے اٹکتی زبان سے کہا۔

"بے شک، مگر بدقسمتی سے جو ہو چکا تھا، اور جن لوگوں کی وجہ سے ہوا تھا، اُنھیں باقی رہنے کا کوئی حق نہیں تھا، بہ ہر حال، اَب تمھیں... تمھیں پُرسکون ہونا چاہیے۔"

"جی ہاں۔"

ڈاکٹر ایک حسّاس آدمی تھا۔ میرے لہجے کی تلخی اُسے محسوس ہوئی ہوگی، کہنے لگا، "میری مراد ہے، اَب پولیس وغیرہ کی اُلجھنوں سے تم آزاد ہو۔ گو آزادی کا یہ احساس بہت سے
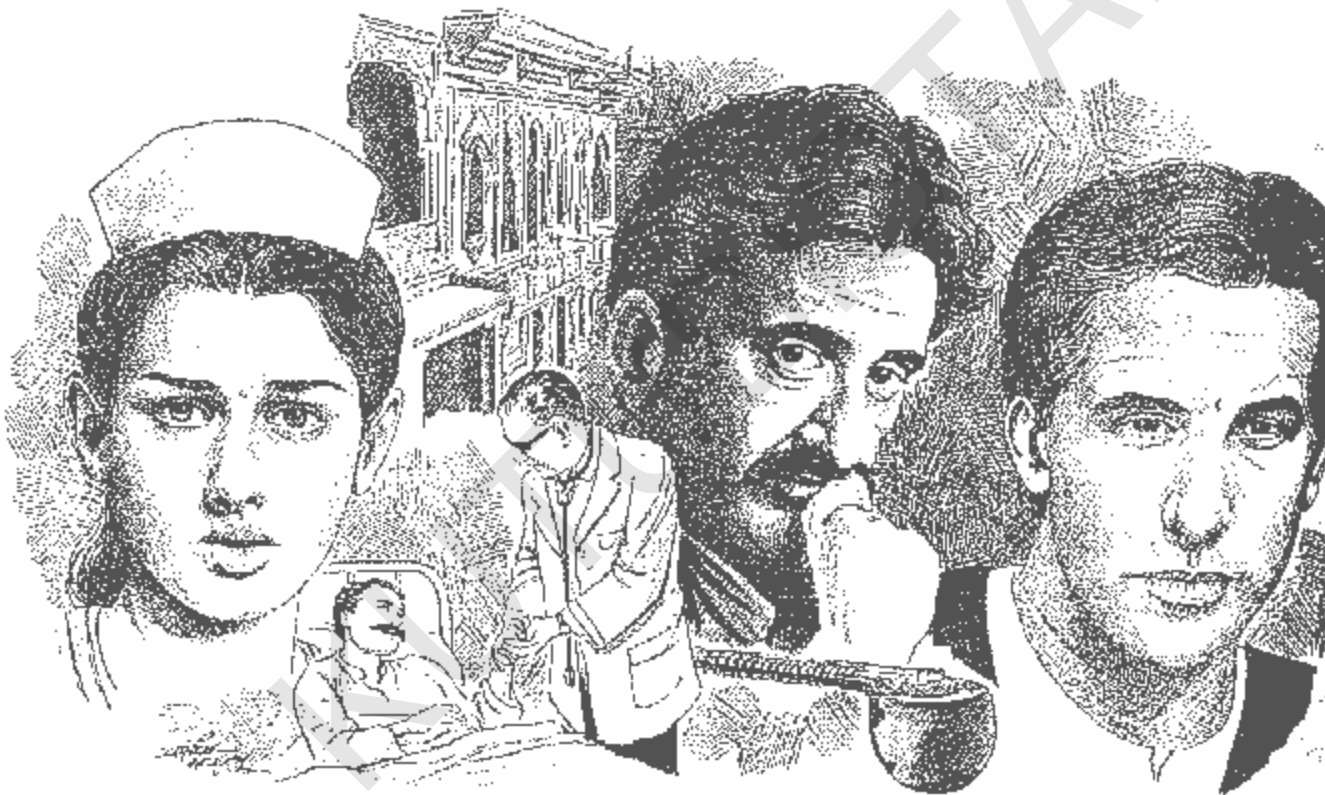
دُکھوں سے آلودہ ہے، مگر تمھاری کوئی لغزش یا نادانی مجھے نظر نہیں آتی۔ تمھیں بھائی کے پاس پہنچنے کی بے چینی تھی، اور راستے بند کر دیے گئے تھے۔ پناہ کے لیے تم کسی گھر میں داخل ہوگئے، بے سوچے سمجھے۔ اتفاق سے وہ گھر اکبر علی خاں کا تھا۔ پھر کوئی چارہ نہ دیکھ کے تم نے انتہا پسندانہ فیصلہ کیا کہ تمھیں خود میدا کے پاس جا کے اُس سے نبرد آزما ہو جانا چاہیے۔ کسی اعتماد ہی میں تم نے یہ قدم اُٹھانے کا ارادہ کیا ہوگا۔ تمھارے نہ چاہتے ہوئے اکبر علی خاں تمھارے ساتھ ہوگئے۔ اُن کی بھی کوئی غلطی نہیں تھی۔ وہ ایک باوضع اور دردمند شخص تھے۔ کاش وہ تمھارے ساتھ نہ جاتے، میدا کے ٹھکانے پر تمھارے ساتھ جو کچھ ہوتا، اُسے تم ہی بھگت لیتے، تم تو اکیلے ہی جانا چاہتے تھے، اور اکبر علی خاں تمھارے وکیل اور طرف دار کی حیثیت سے اُس بدباطن کے سامنے نہ آتے تو اُن کا وقت بھی نہ آپاتا۔ یہ سارا اتفاقات کا سلسلہ ہے عزیزِ من! اِس میں تم سے کہاں کوتاہی ہوئی۔"

"کوتاہی تو میری ذات کی ہے ڈاکٹر صاحب! میں کبھی ایسا نہیں چاہتا، مگر جانے کیا ہو جاتا ہے۔" میری آواز بھرا گئی۔ "لوگ مرجاتے ہیں، گھر برباد ہو جاتے ہیں، ایک جگہ نہیں، کتنی جگہ یہی کچھ ہوتا رہا ہے۔ آپ نے اکبر علی خاں کا گھر نہیں دیکھا، میں نے دیکھا ہے۔ کوئی مثالی گھر ہی ایسا ہو سکتا ہے، کیسے خوش و خرم زندگی کی اُمنگیں لیے ہوئے لوگ، شائستہ، علم دوست، ایک دوسرے پر مرمٹنے والے، لوگوں کے کام آنے والے، بار بار وہ گھر سامنے آ جاتا ہے۔ اور میری آنکھیں بہت جلتی ہیں، کہتے ہیں، بعض لوگوں کے قدم ہی نحس ہوتے ہیں۔ میں اُنھی لوگوں میں ہوں۔"

"ہا، کیا فضول بات کرتے ہو۔" اُس نے مجھے جھڑک دیا، پھر دھیمے لہجے میں بولا، "یہ لغو گوئی تم سے مطابقت نہیں رکھتی۔ تم ایک سچے اور بہادر نوجوان ہو، تم نے کب کسی کا بُرا چاہا تھا۔ وہ تو کڑی سے کڑی ملتی گئی اور جس کی وجہ لازماً تم نہیں تھے۔ تمھارا مقابل تو ایک دوسرا آدمی تھا، وحشی، جنونی۔ یہی افسوس ہے کہ ایسے نیچ کو تو کتوں کے آگے ڈالنا چاہیے۔ میں سوچتا ہوں تو بڑی حیرت ہوتی ہے۔ وہ کتنا بڑا بہروپیا تھا، صرف اپنے آپ سے واسطہ رکھتا تھا، کسی طور سے سہی، اُسے اپنی بالادستی سے غرض تھی۔" میری تائید و تردید سے کیا فرق پڑتا تھا، وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔

"مجھے جانا چاہیے۔" یکایک اُسے بے کلی سی ہوئی۔ اُس نے دستی گھڑی دیکھی اور بولا، "چند مریض دیکھنے ہیں، انتظار کر رہے ہوں گے۔ تم یہاں بیٹھنا چاہو تو بیٹھو۔ مجھے واپس آنے میں ایک ڈیڑھ گھنٹا لگ سکتا ہے۔ صبح آنے والے پولیس افسر سے میں نے کہا تھا کہ وہ تفصیلات سے آگاہ کرنے کے لیے ایک بار پھر زحمت کرے۔ آئی جی کی ہدایت پر صبح وہ بہت کم وقت کے لیے آیا تھا، کسی بھی وقت وہ دوبارہ آ سکتا ہے، لیکن اب کیا، جزئیات سے کیا دل چسپی۔ مجھے تو تمھارا خیال تھا، شکر ہے، بچ شرمندہ نہیں ہوا۔" وہ صوفے سے اُٹھ گیا تھا۔ میں بھی کھڑا ہو گیا۔ "تم جا رہے ہو؟" اُس نے بزرگانہ تیور سے پوچھا۔

"جی ڈاکٹر صاحب!" میں نے مؤدب لہجے میں کہا۔

"ہاں، یہی ٹھیک ہے۔ اُدھر بھائی کے پاس جاؤ، اور دیکھو! اُسے ابھی کچھ نہ بتانا، اُس کے پاس موجود اپنے ساتھیوں کو بھی تاکید کر دینا۔ میں دوپہر آنے کی کوشش کروں گا، یوں اب ایسی ضرورت بھی نہیں۔ وہ تیزی سے صحت کی طرف مائل ہے۔ تم بھی اب اپنا بار کم کرو، یہ شانے سیدھے کرو۔" دروازے سے نکلتے ہوئے وہ بولا، "تمھارے دوسرے ساتھی کو بھی رات تک کمرے میں ٹھیرنے کی اجازت دی گئی تھی، لیکن میں سمجھتا ہوں، اب اُن کا میدا کے ٹھکانے پر واپس جانا مناسب نہیں، کمرے میں رات کو صرف ایک سمجھدار، مریض کے ساتھ رہ سکتا ہے۔"

"آپ بے فکر رہیں، وہ کسی سرائے، ہوٹل میں ٹھیر جائیں گے۔ ایک دو روز کی بات ہے۔"

وہ سوچنے لگا، پھر بولا، "اُن دونوں کے لیے اسپتال ہی میں کوئی انتظام کرنا چاہیے۔ کیا نام بتایا تھا تم نے اُن کا؟"

"جامو اور زورا۔" میں نے نیچی آواز سے کہا۔

"اڈّے ہی کے لوگوں کے نام معلوم ہوتے ہیں۔" وہ پھیکی مسکراہٹ سے بولا، "میرا خیال ہے، وہ اب اُس طرف کا سوچیں ہی نہیں۔ اُن کا جو سامان اسباب وہاں رکھا ہے، اُس پر خاک ڈالیں، میدا کے علاقے میں بڑی کشیدگی ہوگی۔ پولیس سارے شہر میں پھیلی ہوئی ہے۔ وہاں تو چپّے چپّے پر ہوگی، اور وہاں

اُن سے کہنا، وہ آج باہر بھی نہ نکلیں، بیگم اکبر علی خاں کے جنازے پر جانے کیسے حالات ہوں۔ حالاں کہ اُس سے بدتر کیا ہوگا جو گزشتہ دنوں ہو چکا ہے۔"

اسپتال کی مرکزی عمارت کے استقبالی وسیع و عریض ہال میں مجھے چھوڑ کے وہ ہاتھ ہلاتا ہوا ایک جانب چلا گیا۔ کچھ دیر میں وہیں کھڑا رہا۔ اب گنتی کے چند سپاہی وہاں نظر آتے تھے۔ اسپتال کے اندرونی حصّوں میں بھی اُن کی تعداد نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔

سورج آسمان کے وسط میں پہنچ چکا تھا۔

جامو، زورا اور جھمّل کمرے کے باہر راہ داری کے سائے میں کرسیوں پر یوں بیٹھے ہوئے تھے، جیسے اپنے گھر کے کسی گوشے میں۔ کرسیوں کے سامنے رکھی بیضوی میز بسکٹوں، پھلوں کی تشتریوں اور چائے کی پیالیوں سے بھری تھی۔ اسپتال کے مخصوص نئے دُھلے ہوئے لباس میں جھمّل خاصا تر و تازہ نظر آ رہا تھا۔ پہلے زورا نے مجھے دیکھا اور بے قرار ہو گیا۔

"ہے، اپنا راجا بھائی۔" وہ نعرہ لگاتے ہوئے اُٹھا اور آدھے راستے میں مجھے جا لیا، اور بے تحاشا گلے سے لپٹ گیا۔ "ابھی کیدر سے دادا؟ اِتی دیر ہوگئی؟"

"ڈاکٹر صاحب نے روک لیا تھا۔" میں نے اُس کے جوش و خروش کا ساتھ دینے کی کوشش کی۔ "جھمّل بھائی بھی تو بہت ٹھیک لگتے ہیں۔"

"ایک دم فٹ فاٹ، چیچے مافک۔ لگتا ہی نہیں۔ اِتے دن بستر سے چپکا پڑا تھا۔ دیکھا اُنھیں رستے؟" وہ چہک کے بولا۔

چند قدم بعد ہم اُن تک پہنچ گئے۔ زورا سبزہ زار سے میرے لیے کرسی اُٹھا لایا۔ پہلے مجھے بٹھایا، پھر خود بیٹھا۔

ڈاکٹر راے کے پاس سے میرے آنے کے بعد جھمّل کو ایک سوال کی تکرار کا عارضہ ہو گیا تھا کہ ڈاکٹر نے اُس کے بارے میں کچھ نیا تو نہیں کہا ہے۔ میں نے حسبِ معمول اُسے مطمئن کرنا چاہا کہ ڈاکٹر نے اطمینان ظاہر کیا ہے اور ایک دو دن بعد چھٹی کر دی جائے گی۔

"ایک دو دن کیوں؟" وہ خشونت سے بولا۔

میرے بجائے جامو نے رسانی سے کہا، "ٹھیک ہے اُستاد! اپنی کون سی گاڑی چھوٹ رہی ہے سالی۔ کچھ سوچ سمجھ کے ہی ڈاکٹر بولتا ہوگا۔ اُس کو مریض پاس اٹکائے رکھنے کا شوق تو نہیں ہوگا۔"

جھمّل کی پیشانی سکڑ گئی، اور وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا، "تیرا منہ کیوں پھولا ہوا ہے رے؟"

میرا جسم اکڑ گیا۔ "مجھے کیا ہوا ہے؟"

"ہاں راجا بھائی!" زورا نے بے ساختہ جھمّل کی ہم نوائی کی۔ "ماں قسم، ہم کو بھی تھوڑا کھنچا ہوا، بندھا ہوا لگتا ہے۔ بولو، کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے چڑ کے کہا، "کیا بات ہوتی؟"

اُنھیں مجھ پر یقین نہیں آیا۔ تینوں کی نظریں مجھ پر منڈلانے لگی تھیں اور مجھے خود کو چھپانا مشکل ہو رہا تھا۔

"ڈاکٹر نے کچھ بولا؟ ٹھیک ٹھیک بول۔" جھمّل نے دھمکی اور شبہ بھری آواز میں پوچھا، "اپنے کو فرق نہیں پڑتا۔"

"نہیں پڑتا تو کرید کیوں کر رہے ہو؟" میں نے ناراضی سے کہا، "کیا سمجھ رہے ہو تم، میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ شام کو وہ آئے تو خود پوچھ لینا اور کاغذ پر دست خط کروا لینا۔"

آدمی کا اپنے ہاتھ پر، اپنی زبان اور حرکات و سکنات پر قابو ہو سکتا ہے، لیکن چہرے کے آتے جاتے رنگوں پر اختیار کے لیے بہت مہارت اور قدرت چاہیے۔ ہر دانا اور ذہین آدمی میں شک کی ایک خوبی یا خامی بدرجۂ اتم ہوتی ہے۔ میں ڈاکٹر کے پاس سے آ رہا تھا۔ میرے غبار آلودہ چہرے سے جھمّل کے سر میں وہم و گمان کا ریلا آنے چاہیے تھے۔ میرا دماغ بھٹکا ہوا تھا اور جھمّل کی دل جوئی کے لیے کوئی شافی عذر نہیں سوجھ رہا تھا، مگر جامو بلا کا معاملہ فہم تھا۔ بات بدلنے کے لیے اُس نے مجھے چائے کی پیش کش کی۔ مجھے کسی چیز کی خواہش نہیں تھی۔ میرا تو دل ہی لوٹ رہا تھا، لیکن میں نے منع نہیں کیا اور مجھے یاد آیا، ابھی صبح کے دورے پر ڈاکٹر نے از خود جھمّل کو دو تین دن بعد رخصت مل جانے کا مژدہ سنایا تھا۔ جھمّل کے سر دھو جانے کے بعد اب دوبارہ کچھ یاد دلانا، یا یہ ذکر چھیڑنا بے محل تھا۔ ویسے بھی سنگین بیماری سے اُٹھنے اور معمول کے خلاف اِتنے دن کاٹنے کے بعد تنک مزاجی اور زود رنجی کی ایک رعایت رو بہ

صحت شخص کا حق ہوتی ہے، سو میں نے حجت نہیں کی۔ ٹکوزی سے ڈھکی کیتلی سے جامو نے میرے لیے اہتمام سے چائے بنائی، اور زورا نے بسکٹ کی تشتری آگے رکھ دی۔ جھجھل کا تکدر دُور کرنے کے لیے مجھے کچھ اِسی قسم کے مثبت رویّے کا تاثر دیتے رہنا چاہیے تھا۔ میرے آنے سے پہلے جامو کلکتے کی رُوداد سنا رہا تھا۔ زورا کے اشتیاق پر اُسے بات جاری رکھنے کا بہانہ مل گیا۔ زورا کے اشتیاق کا اظہار بھی دانستہ ہوگا۔ دونوں کا مقصد جھجھل کی توجہ مبذول کیے رکھنا تھا۔ ہر چند انھیں میدا کی خبر سنانے کے لیے میں بری طرح مضطرب تھا، لیکن سرِ دست یہ ممکن نہیں تھا۔

میں چوں کہ اُن کے درمیان موجود نہیں تھا، اِس لیے جامو نے مختصر طور پر پس منظر سے مجھے آگاہ کیا۔ اُس نے بتایا، کلکتے میں سنگھا نامی نوجوان ایک روز اڈّے پر وارد ہوا اور اڈّے سے وابستگی کی درخواست کی۔ جے پور کا وطنی تھا، صاف ستھرا شکل و صورت میں اچھا بھلا، قد میں اُٹھا، جسم کا گٹھا ہوا، ہاتھ پیر کا مضبوط، تیوروں میں بانکا، کم گفتار اور کچھا الگ الگ، کھویا کھویا نظر آتا تھا۔ جامو نے قبولیت میں عجلت نہیں کی۔ کئی دن تک اچھی طرح دیکھا بھالا، پرکھا اور چاقو پر گرفت اور تَل کی آزمائش کے بعد ہامی بھر لی۔

عشرے کے قریب گزرا ہوگا کہ ایک رات سوناگاچھی کے بازار کے چودھری کا قاصد ہانپتا کانپتا اڈّے آیا اور دُہائیاں دیں کہ کانتابائی کے بالاخانے میں سنگھا نے اُدھم مچایا ہوا ہے۔ معلوم ہوا، جب محفل گرم تھی اور حسن و جمال میں بے مثال، دُور دُور تک مشہور نینا رقص کر رہی تھی کہ سنگھا نے بالاخانے میں داخل ہو کے نینا کو آغوش میں بھر لیا اور بدسلوکی کی۔ اُسے روکنے کی کوشش کی گئی تو اُس نے چاقو نکال لیا اور محفل میں موجود شائقین کو دھمکی دی کہ وہ سارے وہاں سے چلے جائیں، نینا صرف اُس کی ہے، اور آج کے بعد کسی کے سامنے گائے گی، نہ ناچے گی۔ عام لوگ کانتابائی کے بالاخانے کا رُخ کم ہی کیا کرتے تھے کہ صاحبانِ ثروت ہی نینا کی دل رُبائی اور عشوہ طرازی کے متحمل ہو سکتے تھے۔ محفل میں اُس وقت شہر کے با اثر لوگ موجود تھے۔ سنگھا کی چاقو نمائی پر وہ آگے پیچھے فرار ہو گئے اور اُن میں سے کسی نے بالاخانے سے اُترتے ہی

پولیس کو مطلع کر دیا۔ بازار کے چودھری نے پولیس کے بجائے اڈّے کی طرف قاصد بھیجا تھا کہ یہ جھجھل کے اڈّے کا معاملہ تھا اور سنگھا کا تعلق اڈّے سے مسلّم ہو چکا تھا۔ اُدھر سنگھا کی دیوانگی بڑھتی گئی۔ وہ نینا کو ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ اُس کی دست درازی سے نازک اندام نینا ایسی دہشت زدہ ہوئی کہ بے ہوش ہو گئی۔ اڈّے کے آدمی پہنچنے سے پہلے پولیس بالاخانے پہنچ گئی، بڑی مشکل سے سنگھا کو قابو میں کیا اور ساتھ لے گئی۔

تین چار دن بعد جامو کی سفارش پر سنگھا کو چھوڑ دیا گیا۔ جامو اُسے اڈّے لے آیا اور سورج غروب ہونے سے پہلے شہر سے نکل جانے اور دوبارہ اپنی صورت نہ دکھانے کا حکم دیا۔ جواب میں سنگھا نے چاقو کھول لیا۔ جامو کے کہنے کے مطابق اُس نے ممکنہ پہلو تہی کی اور کہا کہ اڈّے پر اور بھی چاقو باز ہیں، پہلے وہ اُن سے پنجہ آزمائی کر کے حوصلہ نکال لے۔ ضرورت پڑی تو جامو بھی سامنے آ جائے گا، جامو نے جمرو کو اُس کے آگے کھڑا کر دیا تھا، لیکن سنگھا نے جامو کی پیش کش کم زوری پر محمول کی اور کہنے لگا کہ وہ تو اَب اڈّے کی چوکی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جامو نے بہت اُس کی ہرزہ سرائی برداشت کی۔ سنگھا نہیں مانا اور للکارتا رہا تو جامو کو اُٹھنا پڑا اور نتیجہ وہی ہوا، جو ہونا چاہیے تھا۔ زیادہ وقت صَرف نہیں ہوا۔ جامو نے تین چار پھیروں میں سنگھا کو تہی دست کر دیا، اور فرش سے اُس کا چاقو اُٹھا کر اور اُس کی طرف اُچھال کے ایک اور موقع دینا چاہا، لیکن سنگھا نے چاقو گرفت میں نہیں لیا، بل کہ ٹھوکر مار کر جامو ہی کی طرف لوٹا دیا اور سر جھکائے اڈّے سے نکل گیا۔ جامو کے اشارے پر جمرو نے اُس کے پیچھے جا کے کچھ رُپے اُس کی جیب میں ڈال دیے تھے کہ واپسی کے سفر کے لیے اُس کے پاس زادِ راہ ہو، نہ ہو۔ سنگھا نے ایک نظر جمرو کو دیکھا اور جیب سے رُپے نکال کے سڑک پر پھینک دیے اور آہستہ قدموں سے دُور ہوتا رہا۔ جمرو نے پھر اُس کا تعاقب نہیں کیا۔

اڈّے کے آدمیوں نے سمجھ لیا تھا کہ سنگھا کا قصہ تمام ہو گیا ہے۔ رات کی ابھی ابتدا تھی، اڈّے پر کسی نے آ کے اطلاع دی کہ کانتابائی کے بالاخانے پر خون ہو گیا ہے۔ جامو نے صورتِ حال جاننے کے لیے فوراً آدمی دوڑائے۔

ایک ہجوم وہاں موجود تھا اور شور مچا ہوا تھا۔ پولیس نے علاقے کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ اڈّے کے آدمیوں کو اندر جانے سے روک دیا گیا۔ معلوم ہوا کہ ایک نہیں، تین خون ہوئے ہیں۔ بعد کو عینی شاہدوں نے بتایا کہ سورج غروب ہو چکا تھا اور بالاخانے میں موجود ہر کوئی رات کی بزم آرائی کے اہتمام میں مصروف تھا۔ سازندے آ چکے تھے، شمعیں روشن کی جا رہی تھیں اور لڑکیاں سج بن رہی تھیں۔ نینا بھی تیار ہو رہی تھی۔ اچانک سنگھا بالاخانے میں نمودار ہوا، سازندوں نے مزاحمت کی۔ سنگھا انھیں دھکیلتا ہوا اندر بڑھتا گیا۔ پہلے کانتابائی سے اُس کی مڈبھیڑ ہوئی۔ کانتا نے شور مچانا شروع کیا تھا کہ سنگھا کی ضرب سے دُور جا پڑی۔ سنگھا نینا کے پاس پہنچ گیا اور ساتھ چلنے کی عاجزی کی۔ پھر چاقو نکال کے کہا کہ نینا نہیں مانی تو وہ اُسے ختم کر دے گا۔ نینا نے اِدھر اُدھر چھپنے کے جتن کیے، دوسری لڑکیوں کے پاس پناہ حاصل کرنی چاہی، لیکن سبھی کا بُرا حال تھا۔ نینا کا بازو پکڑ کے باہر لے جانے کے لیے سنگھا پلٹ گیا تھا کہ کانتابائی پھر مزاحم ہو گئی۔ سنگھا نے چاقو چلا کے اُسے دُور کیا اور قریب ہی کہیں سے چادر اُٹھا کے نینا کا جسم ڈھانپنے کی کوشش کی اور مچلتی پھڑپھڑاتی نینا اُس کے قبضے سے نکلنے میں کام یاب ہو گئی۔ وہ سیدھی دوسرے کمرے کی طرف بھاگی اور دروازہ بند کیا چاہتی تھی کہ سنگھا وہاں پہنچ گیا اور اندر کمرے میں جا کے اُس نے دروازہ بند کر لیا۔

کچھ دیر نینا کی سسکیاں سنائی دیتی رہیں، پھر خاموشی چھا گئی۔ خاصی دیر بعد پولیس دروازہ توڑ کے کمرے میں داخل ہوئی تو دونوں خون میں لت پت پڑے تھے، دونوں ختم ہو چکے تھے۔

اُس رات جامو اور اڈّے کے کئی لوگوں کو تھانے طلب کر لیا گیا۔ رات بھر تفتیش ہوتی رہی، مگر یہ محض خانہ پُری تھی۔ جامو کے پاس سنگھا کے بارے میں پولیس کو مطمئن رکھنے کے لیے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ صبح کاذب کے وقت انھیں اڈّے واپس جانے کی اجازت مل پائی۔

سنگھا کا لاشہ مُردہ خانے میں رکھ دیا گیا۔ کلکتے میں کوئی اُس کا پُرسانِ حال نہیں تھا۔ پہلے جے پور، پھر پٹیالا پولیس سے کلکتا پولیس کے رابطے کے نتیجے میں سنگھا کے کوائف معلوم

ارشادات

❀: خاموشی بہت بڑی حکمت ہے۔
(حضرت محمد ﷺ)

❀: انصاف کی ایک گھڑی برسوں کی عبادت سے بہتر ہے۔
(حضرت محمد ﷺ)

❀: عاجز ترین شخص وہ ہے جس کا کوئی دوست نہ ہو۔
(حضرت ابوبکر صدیقؓ)

❀: جو شخص اپنا راز چھپاتا ہے، وہ اپنا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔
(حضرت عمر فاروقؓ)

❀: خاموشی غصے کا بہترین علاج ہے۔
(حضرت عثمان غنیؓ)

❀: انسان کی قابلیت اُس کی زبان کے نیچے پوشیدہ ہے۔
(حضرت علی المرتضیٰؓ)

ہو سکے کہ اُس کے محترم و معزز باپ کا تعلق جے پور ہی سے ہے، لیکن ایک عرصے سے وہ پٹیالا کے مہاراجا کے دربار میں اہم منصب پر فائز ہے۔ سنگھا اُس کا اکلوتا بیٹا تھا، بڑے ناز و نعم میں اُس کی تربیت ہوئی تھی۔ جسمی کس بَل اور حربی فنون کے ساتھ اُسے اعلا تعلیم بھی دی گئی تھی۔ ایک روز مہاراجا کے دربار میں رقص و سرود کی محفل برپا کرنے کے لیے کلکتے سے مدعو کی جانے والی نینا کی ایک جھلک دیکھ کے سنگھا ہوش و حواس سے بیگانہ ہوا۔ اُس نے دوبارہ نینا کے دیدار کرنے کی بڑی تگ و دَو کی، لیکن کانتابائی کا طائفہ مہاراجا کا خاص مہمان تھا، رسائی مشکل تھی۔ پٹیالے میں طائفے کا قیام چند روزہ تھا۔ صرف ایک ہی رات مہاراجا کی عشرت گاہ میں نینا کو اپنی آواز اور رقص کے کمالات پیش کرنے کا شرف حاصل ہو سکا۔

پٹیالے سے کلکتا پولیس کو اطلاعات ملیں کہ نینا کے واپس جانے کے بعد سنگھا اپنے متعلقین کے لیے اجنبی اجنبی سا ہو گیا تھا، اور ایک دن کسی کو کچھ بتائے بغیر وہ گھر سے نکل گیا۔ باپ اور اُس کے زیرِ اثر کارندے قرب و جوار میں، جگہ جگہ اُسے ڈھونڈتے رہے۔ ماں اُس کے غم میں پلنگ سے لگ گئی۔

جانے کتنی رقم ببنگھا کے پاس تھی؟ قیاس ہے، کچھ زیادہ نہیں۔ کلکتے آ کے اُس نے سوناگاچھی کا رُخ کیا اور کئی راتیں تو اترسے کانتابائی کے بالاخانے جاتا رہا، اور اُس کے پلّے سے پیسے ختم ہوتے گئے۔ ایک رات وہ پہلے کی طرح نذر نہیں گزار پایا تو سبھی کا رویّہ تبدیل ہو گیا۔ اُس نے کانتابائی سے نینا کی بات کی تو اُسے دُھتکار دیا گیا، اور بالاخانے پر اُس کا داخلہ ہی ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اس کے بعد ہی ببنگھا نے اڈّے کا رُخ کیا تھا۔

جامو دل گیر آواز میں ببنگھا کی رُوداد سنایا کیا۔ سبھی چپ ہو گئے۔ دیر بعد زورا تلملاتی آواز میں بولا، ''یہ کیا ہے دادا؟''

جھّل گہری سانس کھینچ کے رہ گیا۔

''یہ آدمی ایک دم ایسا اُلّو کیوں ہو جاتا ہے؟''

''ہو جاتا ہے رے۔'' جھّل منمناتے ہوئے بولا۔

''وہی اپن بولتا ہے، ایسا کیسے؟''

''تجھ کو کوئی ملتا تو ایسا نہیں بولتا۔'' جامو نے جھینپتی آواز میں کہا، ''تو کیا جانے گا۔''

''اپن کے مستک میں نہیں آتا، قسم سے۔'' زورا مچل کے بولا، ''ابھی ماں باپ اور سارا گھر چھوڑ کے... اُس کا تو گھر بھی بڑا تھا، پڑھا لکھا بھی تھا، کس بات کا گھاٹا تھا اُس کو... ابھی ایک سا ایک...''

''ایک بات کی کمی تھی اُس کو، پڑھائی لکھائی، بڑا گھر، دھن دولت، سارا دھرا رہ جاتا ہے۔'' جامو نے تمتماتی آواز میں کہا، ''کبھی ایک آدمی جب سامنے کو آ جاتا ہے، جان پڑتا ہے، وہی ہے، بس وہی۔ اُسی کی کمی تھی، تو سمجھو، وہی دُنیا ہوتا ہے۔ پھر کچھ اور دکھائی نہیں دیتا، وہی دُنیا، وہی جان مال۔ اپنا آپ بھی دکھائی نہیں دیتا پھر تو...''

''ایسا!'' زورا معصومانہ تعجب سے بولا، اور سر پر اُنگلی گھماتے ہوئے کہنے لگا، ''یہ تو تھوڑا پھریلا ہونے والا بات لگتا ہے اپن کو۔''

جامو نے میری، پھر جھّل کی طرف کترائی نظروں سے دیکھا، اور جھلّا کے بولا، ''تو ایسا ہی بولے گا۔ تجھ کو کیا پتا سالے! اپنے کام سے کام رکھ اور زیادہ چپڑ چپڑ نا کر۔''

جامو کے جھنجھلائے لہجے سے زورا کی سمجھ میں جلد ہی آ گیا کہ سامنے میں بیٹھا ہوں، اور میری موجودگی میں بیہودگی بلاغت سے تجاوز کر رہا ہے۔ وہ پشیمان سا ہو گیا، لیکن میں اُس سادہ دل کا ہدف نہیں تھا، میں خود جو ہدف پر موجود تھا، اور بار ہا میں نے خود کو بھی یہی کچھ باور کرانے کی کوشش کی تھی۔

سیورین اتنی دیر سے کہاں غائب تھی۔ اچھا ہوا کہ اُس نے آ کے سبھی کو منتشر کر دیا۔ اُس وقت اُس کی آمد سے مجھ سمیت اُن تینوں کی بھی تشفّی ہوئی تھی۔ سیورین اپنی رَو میں لپکتی ہوئی آئی تھی۔ مجھے دیکھ کے ٹھٹک سی گئی اور پلکیں جھپکانے لگی۔

''تم کب آئے؟''

''ابھی کچھ دیر پہلے ہی۔'' میں نے مسکرانا چاہا۔

''سب ٹھیک تو ہے؟'' اُس نے تذبذب سے پوچھا۔

ڈاکٹر رائے کے پاس سے میں کسی تازہ اُفتاد کا بار لیے ہی واپس آ تا رہا تھا۔ میں نے آنکھیں میچ کے اُسے تسلّی دی تو اُس کے چہرے پر روشنی سی بکھر گئی۔

اُس نے جھّل سے کمرے میں چلنے کی استدعا کی۔ جھّل کے پیش و پیش پر اُس نے کوئی لحاظ نہیں کیا۔ ''چلیں، اب اُٹھ جائیں۔'' اُس کے لہجے سے نازبرداری عیاں تھی۔ اُس نے اِسی پر اکتفا نہیں کی، جھّل کا ہاتھ تھام کے اُسے اُٹھا دیا۔

''مُورت اُس کی نہیں ہے بس۔'' جھّل کو زریں کی یاد آ رہی تھی۔ اُس کے تیور بھی یہی کچھ تھے۔ ''چل ری۔'' وہ سپر ڈالتے ہوئے بولا اور کسی معمول کی طرح سیورین کے ساتھ کمرے میں چلا گیا۔

جامو اور زورا بھی اُس کے پیچھے اندر جانا چاہتے تھے۔ میں نے انھیں روک لیا۔ کچھ وقت بعد جب مجھے یقین ہو گیا کہ سیورین نے جھّل کو بستر پر دراز کرا دیا ہوگا، میں نے اُن سے بیٹھ جانے کو کہا، اور دھیمے لہجے میں بتایا کہ ڈاکٹر رائے کی زبانی میدا کے بارے میں مجھے کیا معلوم ہوا ہے۔

اُن پر حیرت کا ایک عالم طاری ہوا۔ دونوں کرسی پر سیدھے بیٹھے نہ رہ سکے۔

''یہ کیا... کیا بولتا ہے راجا بھائی؟'' زورا سنسناتی آواز میں بولا، ''نہیں، نہیں۔''

''مجھے بھی یقین نہیں آ رہا تھا، لیکن کسی اور نے نہیں، ڈاکٹر صاحب نے بتایا ہے۔ میدا اب نہیں ہے۔''

''یہ کیسے؟'' جامو کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ''یہ تو کیا بول رہا ہے لاڈلے؟''

صبح اسپتال آنے والے پولیس افسر سے ڈاکٹر کو جو کچھ معلوم ہوا تھا، میں نے سیدھے تلے لفظوں میں دُہرا دیا۔

''اپن تو پہلے ہی بولا تھا۔'' زورا نے بھڑک کے کہا۔ ''بولا تھا نا راجا بھائی! اپن کو میدا ٹھیک آدمی نہیں لگتا۔''

بے شک، زورا نے میدا کے بارے میں کچھ یہی رائے زنی کی تھی، اور جامو نے اُسے لتاڑ دیا تھا۔

میرے بیان سے اُن کی تشفّی ہوا ہو گئی اور وہ پے در پے سوال کرنے لگے۔ میں آموختہ ہی دُہرا اور تکرار ہی کر سکتا تھا کہ اس سے زیادہ میرے علم میں کچھ تھا بھی نہیں۔ ادھوری آگہی وہم و قیاس کا موجب ہوتی ہے۔ وہ اپنے طور پر تبصرے کرنے اور فسانے تخلیق کرنے لگے تھے اور مجھ سے تائید و تردید کے خواہاں تھے۔ میری محتاط روی انھیں زچ بھی کر رہی تھی، برہم بھی۔ جامو کو تسلیم نہیں تھا کہ برجو دادا ہی نے سب سے پہلے میدا کے مختصر انجام پر تصدیق کی مہر ثبت کی ہو۔ اُس کا کہنا تھا کہ برجو دادا اڈّے کا ایک کہنہ مشق آدمی تھا، سرد و گرم چشیدہ، پولیس سے بارہا سامنا ہوا ہوگا، اور وہ میدا کا خاص مربی، اُس کے لیے کسی سائے کے مانند تھا، اور اُس کے پاس زندگی ہی کتنی رہ گئی ہے کہ اُس نے وعدہ معاف گواہ بننا گوارا کر لیا۔ اڈّے کے لوگ اِتنے کچے نہیں ہوتے کہ ہلکی بھاری اذیتوں اور عواقب کے خوف سے زبان کھول دیں، اور نہ اِتنے ناعاقبت اندیش کہ دُور و نزدیک دیکھ بھال کیے بغیر ایسی واردات کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ کل سہ پہر میدا کو پولیس ساتھ لے گئی تھی، رات تک اِس واردات کی تہ تک کس طرح پہنچ گئی؟

''اب کچھ بھی ہو جامو بھائی!'' میں نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا، ''کیا کہا جا سکتا ہے۔ تفصیلات تو ڈاکٹر صاحب کو بھی زیادہ معلوم نہیں تھیں۔ میں نے تمھیں بتایا کہ شہر کی پولیس نہیں تھی۔''

''تو اِس سے کیا فرق پڑتا ہے؟'' جامو منتشر لہجے میں بولا۔

''تھوڑا بہت تو ہونا چاہیے۔'' میں نے نرمی سے کہا۔

''نہیں لاڈلے! کوئی اور بات ہے، کدھر کوئی کالا ضرور ہے۔'' جامو انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا، ''ضرور پولیس کے کان بھرے گئے تھے، مخبری جس کو بولتے ہیں۔''

''ہو سکتا ہے۔'' میں نے بحث مناسب نہیں سمجھی۔ جامو کا تجربہ کم نہیں تھا۔ جو بات میرے دل میں کھٹک رہی تھی، اُس زیرک کے ذہن میں رسا ہو چکی تھی۔ مجھے خاموش ہی رہنا تھا۔ میں نے صراحت نہیں کی کہ اِسے 'مخبری' نہیں کہنا چاہیے، مگر ایک شخص پولیس کے اِس یقین اور اعتماد کا سبب لازماً بنا ہوگا کہ کم از کم تین آدمیوں کو ختم کر دینے کی واردات کے پیچھے کن لوگوں کا ہاتھ ہے۔ اُس دن جب میدا میرا چاقو لوٹانے اور اڈّے سے دست کشی کی پیش کش کرنے اسپتال آیا تھا تو ڈاکٹر رائے ہمارے درمیان موجود تھا۔ میدا اُسے وہاں سے ہٹا نہیں سکتا تھا اور اپنی بے بس پائی اور ندامت کے اظہار کا بھی وہی ایک موقع تھا۔ ڈاکٹر کی وجہ سے اُس نے مبہم انداز میں اُن تین آدمیوں کو انجام سے دوچار کر دینے کا اقرار کیا تھا، جنھوں نے، اُس کے بہ قول، اکبر علی خاں کا خون کر دیا تھا، اور شہر کے اڈّے کی چوکی پر اُس کے ہوتے ہوئے اِس دیدہ دلیری اور ہٹ دھرمی نے اُسے سب کی اور خود اُس کی اپنی نظروں میں رُسوا کر دیا تھا۔ میدا کے اعتراف میں ایسا ابہام بھی نہیں تھا کہ ڈاکٹر جیسا صاحبِ نظر تعبیر نہ کر پاتا، اور ڈاکٹر جیسا انسان دوست آسانی سے درگزر کر دیتا۔ ڈاکٹر کے تکدّر اور رنج کا میں گواہ تھا۔ میدا، ڈاکٹر کو

محض ایک معالج ہی سمجھتا ہوگا، اُسے کیا اندازہ ہوگا کہ ڈاکٹر کیسا ہمہ داں شخص ہے، اُس کی کتنی آنکھیں ہیں۔ میدا کو اِس زعم اور اعتماد سے بھی آسودہ ہونا چاہیے تھا کہ ثبوت تو سات تہ خانوں میں دفن ہیں، ڈاکٹر، میں یا کوئی اور میدا کے موہوم یا علانیہ اعتراف کے باوجود ثبوت و شواہد کے بغیر کیا ضرر رساں ہوسکتا ہے۔ بے دلیل الزام بڑا بے وقعت ہوتا ہے، اڈّے کے زورآوروں پر انگلی اُٹھانے کے لیے ایک رندانہ جرأت چاہیے۔

کل صبح ہی ڈاکٹر نے گذشتہ رات آئی جی سے اپنی گفت گو کے بارے میں مجھے بتایا تھا۔ اُس نے آئی جی سے کہا تھا کہ تسلسل سے خوں ریز وارداتیں ہوچکی ہیں تو ثبوت بھی کہیں موجود ہونا چاہیے۔ پولیس کو حوصلہ رکھنا چاہیے کہ ثبوت مرتا نہیں، اور مرتا نہیں تو دست رس سے کچھ ہی فاصلے پر ہے۔ پولیس کو واضح طور پر شبے کے اہداف معیّن کر کے یکے بعد دیگرے اُن پر تجربے کرنے چاہییں۔ مفروضے قائم کیے بغیر نتائج کیسے اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ میں نے جھجکتے ہوئے کہا تھا، مکمل شواہد کے بغیر پولیس کا کوئی اقدام دیواروں سے سر پھوڑنے کے مترادف ہوگا۔ ڈاکٹر اِس ستم پر دل گرفتہ تھا کہ بہت کچھ جانتے ہوئے بھی ہم کچھ نہیں کرسکتے، اور میں نے کہا تھا، اُوپر رکھی چیز کا حصول دست رس ہی سے ممکن ہے۔ قامت کی بلندی کے لیے بھی کوئی چیز چاہیے جو اردگرد موجود نہیں۔ یہی صورت پولیس کے بھی پیش نظر ہوگی۔

اور پولیس کو مفروضے تراشنے کی کیا ضرورت تھی۔ ڈاکٹر نے اعتبار کمایا تھا۔ اُس کا فرمودہ سند تھا۔ اُس کے اشارے پر پولیس نے ایک ہی سمت کا رُخ کیا ہوگا جہاں نشیب تھا۔ شک، تذبذب ہے۔ ڈاکٹر کے عطا کیے ہوئے یقین سے پولیس کے آگے راہیں کھلتی گئی ہوں گی۔ شہر کی پولیس بھی باہر کی پولیس سے بدل دی گئی تھی۔ نمک کی مروّت، آشنائی کے لحاظ کی کوئی بندش ہی نہیں رہی تھی۔

میں نے جامو اور زورا کو ڈاکٹر کے تلاطم کے بارے میں کچھ نہیں بتایا، خاموش ہی رہا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے اُلجھتے رہے اور آخر اِسی نتیجے پر پہنچے کہ جزئیات سے کیا سروکار ہے۔ اِتنی دیر بعد جامو کو اکبر علی خاں کا خیال آیا، جاں سوز لہجے میں بولا، ”اور وکیل صاحب کو بھی اسی لیے... مطلب، اُنھوں ہی نے...“

”ہاں جامو بھائی! اُنھوں ہی نے...“ میں نے ... آواز میں کہا۔ ”کوئی اور نہیں۔“

”مگر کیوں؟“ جامو کرب سے بولا۔

”یہ تو وہی ٹھیک بتا سکتا تھا جامو بھائی!“

”اپنے پلّے کچھ نہیں پڑ رہا ہے ایمان سے۔“

”اپن کو لگتا ہے، کتیا کا جنا تھا میدا حرام کا۔“ زورا مغلظات بکنے لگا۔

دھوپ ابھی زرد نہیں ہوئی تھی۔ میں نے کرسی سے اُٹھ کے ہاتھ پاؤں سیدھے کیے۔ اپنا ہی جسم بوجھ بنا ہوا تھا۔ وہ بھی اُٹھ گئے۔ بہت دیر سے نہ سیورین باہر آئی تھی، نہ ہم اندر جاسکے تھے۔ جامو اور زورا کے کندھے بھی ڈھلک سے گئے تھے۔ آدمی کا جسم بھی کیسا درختوں کے مانند ہوتا ہے۔ کڑی دھوپ ہو یا تند ہوا، پتے، ڈالیاں خمیدہ ہوجاتی ہیں۔ اُنھوں نے کمرے میں جانے کی جلدی نہیں کی کہ نقل کے سامنے اُنھیں اپنے دست و بازو اور چہروں سے کوئی منفی تاثر نہیں دینا چاہیے تھا۔ مریض کے اردگرد کا خوش گوار ماحول بھی اکسیر کا کام کرتا ہے۔ زورا کو اڈّے واپس جانے کی فکر لاحق ہوئی۔ ”اپن سوچتا ہے، ابھی اُودر جانا ٹھیک نہیں داوا۔“ اُس نے اُکھڑی ہوئی آواز میں جامو کو متنبہ کیا۔

میں نے اُنھیں بتایا کہ ڈاکٹر رائے نے بھی یہی مشورہ دیا ہے۔ کمرے میں مریض کے ساتھ صرف ایک آدمی کے ٹھہرنے کی اجازت ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ وہ یہیں، اسپتال میں ہم میں سے دو کا انتظام کردیں گے۔

زورا کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ جامو بھی اِس مہربانی سے تن آساں نظر آنے لگا۔

”پر اُودر ہی اپن کا تھوڑا بہت سامان بھی رکھا ہے۔“ زورا تردد سے بولا۔

میں نے اُن سے کہا کہ ڈاکٹر نے سامان پر خاک ڈالنے کو کہا تھا۔ اُدھر نہ معلوم کیا حال ہو، پورا علاقہ پولیس کے حصار میں ہے۔ ڈاکٹر کا خیال ہے کہ اب وہاں کا رُخ کرنا مناسب

نہیں، بل کہ اُس نے جامو اور زورا کے اسپتال سے باہر نکلنے پر بھی پابندی عائد کر دی ہے۔ آج اکبر علی خاں کی بیگم کی تدفین کے وقت شہر کے حالات اَور بگڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ پولیس نے تدفین سے پہلے میدا کی خبر عام کر دینے کا ارادہ کیا ہے۔ لوگوں کو اتنی جلد یقین نہیں آئے گا کہ اُنھیں میدا کے زور و اثر کی عادت ہو گئی تھی۔ جس طرح محکوم کسی ایک حاکم کی حاکمیت کے عادی ہو جاتے ہیں۔ کوئی دن میدا کا آخری دن بھی ہو سکتا ہے، یہ حقیقت تسلیم کرنے میں ایک وقت چاہیے۔ گواہی کے لیے پولیس میدا کے لاشے کی سرِعام نمائش نہیں کر سکتی، لیکن کئی دن سے شہر پر چھائی دہشت دُور کرنے اور میدا کے طویل غلبہ و تسلط سے نجات اور امان کے احساس کے لیے ہر حربہ آزمائے گی۔

"اب اُدھر کے اڈّے کا کیا بنے گا لاڈلے؟" جامو نے مضطرب لہجے میں پوچھا۔

"اپن کو کیا دادا، جو بھی ہو سالا۔" زورا چیخنا کے بولا، "اپن کا ٹھیکا نہیں۔"

"ہاں جامو بھائی!" میں نے زورا کی تائید کی۔ "ہمارا کیا واسطہ، جو بچ جائیں گے، وہی لڑ جھگڑ کے چوکی کا فیصلہ کر لیں گے، ہمیں تو جتنی جلدی ہو، یہاں سے چلے جانا ہے۔ اب اِس شہر میں ایک پل کے لیے جی نہیں لگتا۔"

"ہاں لاڈلے! وہ تو ہے، اپنے کو تیرا دھیان آتا ہے۔ تُو نے بُرا وقت بتایا۔" جامو میری گردن دبوچتے ہوئے بولا، "اُستاد کو تو اپنا ہوش ہی نہیں تھا۔ بہت اکیلا تھا تُو۔"

"اِتنا اکیلا بھی نہیں۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "پہلے اکبر علی خاں صاحب تھے، پھر اپنے ڈاکٹر صاحب۔ اکیلے ہونے کی بات نہیں جامو بھائی! پر یہ سارا کچھ..." میرا گلا رُندھ گیا۔

"وہی تو... وہی تو ہم بولتے ہیں لاڈلے! بس جتنا تھا، سُسرا وقت کٹ گیا۔ اَب کوئی دیر نہیں۔ اُستاد کو دیکھا نہیں، بالکل پہلے جیسا ہے۔ بڑی بات تو یہ ہے۔"

ہم ابھی باہر ہی کھڑے تھے اور کمرے میں جانا چاہتے تھے کہ سیورین نے دبے پانو آ کے ہمیں چونکا دیا۔ اُسے سامنے دیکھ کے جامو اور زورا کے جسم بل کھا گئے۔ کسی کو خیال نہیں تھا کہ دوپہر گزر چکی ہے۔ یہ یاد دہانی سیورین کی خدمت گزاری کا حصہ نہیں تھی، مگر وہ کچھ اَور ہی لڑکی تھی۔ گھر کی لڑکیاں جیسی کہ ہوتی ہیں، سمجھدار، خوش شعار۔ جامو اور زورا نے مجھے دیکھا، اُن کی وجہ سے میں نے منع نہیں کیا، اور سیورین تو بس اشارے کی منتظر تھی۔ جُھنل کے آرام کی خاطر اُس نے ہمیں باہر ہی بیٹھے رہنے کی ہدایت کی، اور آدھ گھنٹے میں اسپتال کے طعام خانے سے خدمت گار کھانا لے آئے، ہلکا پھلکا، لیکن بے ذائقہ نہیں۔ زورا اور جامو بھی شاید میری وجہ سے خاموش تھے، وہ بھی بس لقمے ٹونگتے رہے۔ کھانے کے دوران سیورین مسلسل ہمارے اِردگرد منڈلاتی رہی۔

دوپہر کو کوئی ڈاکٹر جُھنل کو دیکھنے نہیں آیا۔ اب اُن کی یہ بے توجہی اطمینان کی علامت تھی۔

خدمت گار کھانے کے برتن میز سے سمیٹ کے واپس جا چکے تھے کہ سیورین گھبرائی ہوئی ہمارے پاس آئی اور کچھ کہنا چاہتی تھی کہ رُک گئی، پھر ہچکچاتے ہوئے انگریزی میں بولی کہ اُسے مجھ سے کوئی ضروری بات کرنی ہے۔ جامو اور زورا سمجھ تو نہ سکے، لیکن سیورین کی سیمابی حالت سے فکرمند ہوئے۔ مجھے اُٹھنا پڑا۔ زورا اور جامو سے کچھ دُور جا کے سراسیمہ لہجے میں اُس نے میدا کے بارے میں بتایا۔

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے آنکھیں بند کر لیں اور شکر کا سانس لیا کہ سنانے کو اُس کے پاس کوئی ایسی ویسی بات نہیں تھی۔

"تمھیں معلوم ہے؟" وہ حیرانی سے بولی۔ "مجھے تو ابھی طعام خانے سے آنے والے خدمت گاروں نے بتایا۔ کہ رہے تھے، سارے شہر میں یہی چرچا ہے۔"

"اور کچھ تو نہیں بتایا اُنھوں نے؟" میں نے تحمل سے پوچھا۔

"کچھ اور بھی ہے؟" اُس نے ہراساں آواز میں کہا،

"جو تمھیں معلوم ہے۔"

"نہیں، اِس سے زیادہ نہیں۔"

"تم نے مجھے نہیں بتایا۔"

"تم سے بات کرنے کا موقع کہاں ملا، اور تم کیا کرتیں جان کر، اَور پریشان ہو جاتیں۔"

"یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں، سنا ہے، شہر میں بہت خوف و ہراس

"آپ یہ اینٹیں پانی میں کیوں پھینک رہے ہیں؟"
"اصل میں، میں یہ معما حل کرنا چاہتا ہوں کہ اینٹیں تو چوکور ہیں..."
"...اور پانی میں جو لہریں پیدا ہو رہی ہیں، وہ گول ہیں۔"

ہے۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ پولیس کہتی ہے، اُس نے خود کو ختم کر لیا۔"

"کچھ بھی ہو، اب وہ نہیں ہے۔" میدا کے لیے میری زبان پر بہت آگ اُمڈی، مگر سامنے سیورین تھی۔ چیزیں ہی نہیں، آدمی بھی کانچ کے بنے ہوتے ہیں۔

"اب کچھ اَور..." وہ بدحواسی سے بولی، "اب کیا ہو گا... میدا کے بعد...؟"

"کوئی اَور آ جائے گا، لیکن وہ میدا نہیں ہو گا۔" میری رَتیلی آواز بھی اُس نازک اندام پر گراں ہو گی۔

اُس کے چہرے پر چھائی کشاکش دیکھ کے میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "تم کیوں پریشان ہوتی ہو؟"

"تمھیں تو کچھ..."

"مجھے کیا ہوتا!" اُس کی خاطر جمعی کے لیے میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "میرا کیا تعلق؟"

"سلسلہ تو تمھیں سے شروع ہوا تھا۔"

"اور سمجھو، اُس پہ ختم ہو گیا۔"

"مگر کیا واقعی اُس نے خود کو...؟"

"ڈاکٹر صاحب کو یہی بتایا گیا ہے۔"

اُس کی بے چینی دُور نہ ہو سکی اور وہ کسی قدر ہیبت زدہ لہجے میں بولی، "لیکن اُس کے لوگ! وہ سب تو بہت خطرناک ہیں۔ ایک ہی آدمی تو گیا ہے۔"

"ہاں، وہ تو ہے۔ اُن میں سے کچھ تو جیل چلے جائیں گے، کچھ چھوٹ جائیں گے۔ کچھ دل برداشتہ ہو کے شاید یا تو یہ شہر ہی چھوڑ دیں گے، یا اڈا گیری کا کام۔"

"میدا اُن کی پشت و پناہ تھا، اُن کا ولی نعمت۔ وہ اُن سے جدا ہو گیا ہے۔"

"میری وجہ سے کیا...؟" میں نے تندی سے کہا۔

"لیکن وہ خطرناک ہی نہیں، پاگل بھی تو ہیں۔"

"تو! تو کیا کیا جائے؟"

وہ جلتی بجھتی نظروں سے مجھے دیکھا کی اور کچھ تامّل کے بعد شکایتی انداز میں بولی، "تم سے تو اب بات کرنی بھی مشکل ہو گئی ہے۔" اُس کی شکایت میں گہری اُداسی تھی۔

"میں تو یہیں ہوں، تم سارا کچھ دیکھ ہی رہی ہو۔"

"میں کچھ کہوں؟" وہ فرش پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔

"کیا بات ہے؟" میں نے چونک کے پوچھا۔

"تم یہیں ہو، اور تم سے بات نہیں ہو پا رہی... تو لگتا ہے، تم بہت دُور ہو، سامنے ہو کے بھی بہت دُور۔"

"تم بھی عجیب ہو۔" بے ارادہ میں نے اُس کے بازو پہ ہلکی سی دھپ لگائی۔ اُس کی آنکھوں میں چنگاریاں سی لپکیں، پھر آنسو چھلک آئے۔ اِن لڑکیوں کے پاس آنسوؤں کی بڑی اِفراط ہوتی ہے۔ قریب ہی زورا اور جامو بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ تیزی سے کمرے میں چلی گئی۔ اُسے آواز دینے اور اُس کے پیچھے جانے کو میرے قدم بڑھے تھے، لیکن میں نے خود کو تھام لیا۔

سہ پہر بعد جُھنل سبزہ زار میں آ کے بیٹھ گیا۔ سیورین نے شام کی چائے کا وہیں انتظام کروا دیا تھا۔ سہ پہر کے بعد شام تھکی تھکی نظر آتی ہے۔ دھوپ ہے بھی، نہیں بھی، یا دھوپ جیسے بوڑھی ہو گئی ہو۔ پھر جب سورج ساری دھوپ سمیٹ لیتا ہے

اوراُجالا بھی نہیں جاتا، جب شام نکھرتی ہے، اور کتنی دیر کے لیے، اِدھر آئی، اُدھر گئی۔

سورج واپس جاچکا تھا۔ بتھل سبزہ زار ہی میں دھرنا دیے رہتا کہ سیورین نے آ کے اُسے اٹھادیا۔ اسپتال کے کسی ملازم نے اُسے ڈاکٹر رائے کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ ایمی بھی آچکی تھی۔ کمرا صاف تھا، مگر دونوں نے ایک بار پھر جلدی جلدی چیزیں درست کردیں۔ ایمی کے اصرار کے باوجود بستر کے بجائے بتھل سوفے ہی پر جم گیا۔ اس میں کچھ زمرّ ڈاکٹر کو اپنی مکمّل بحالی کا تاثر دینے کی بھی ہوگی۔ بستر بڑی راحت ہے، لیکن خواہش اور ضرورت ہو، تبھی۔ راحت کے لیے ایک استطاعت چاہیے۔ ہمہ وقت کی راحت سے جی پھرنے لگتا ہے، اور جبری راحت تو آدمی کو گوارا ہی نہیں۔ آدمی کی مرضی شاید سب سے بڑی راحت اور دولت ہے، اور یہ بات تو کسی خواب کی طرح ہے۔ آدمی کب اور کہاں اپنی مرضی کا مالک ہوتا ہے۔ بس اتنا ہے کہ کسے کتنا اپنی مرضی کا اختیار ہے۔

سب منتظر تھے۔ سورج کا بچا کھچا اُجالا بھی ماند پڑ چکا تھا۔ کمرے کی روشنیاں تو دیر سے جلی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر رائے کی آمد کی خبر سن کے سیورین نے ابھی تک اسپتال کا لباس تبدیل نہیں کیا تھا۔ ایمی نے اُسے گھر چلے جانے کی ہدایت کی تھی، لیکن وہ ٹھیری رہی۔ اندھیرا پوری طرح حاوی ہو چکا تھا کہ ڈاکٹر رائے، مددگار نوجوان ڈاکٹر اور اَدھیڑ نرس کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ ایمی، سیورین، زورا، جامو اور میں تو مستعد ہی تھے، بتھل بھی کھڑا ہوگیا۔ ڈاکٹر پہلے تو کچھ جھجکا، پھر تپاک سے ہاتھ بڑھادیا۔ بتھل نے دونوں ہاتھوں میں اُس کا ہاتھ جکڑ کے سینے سے لگالیا۔

"کیا اُستاد! کیسا لگ رہا ہے؟" ڈاکٹر نے مسکرا کے پوچھا۔

"بتھل نے ممنونیت کی نظروں سے اُسے دیکھا اور زبان سے کچھ نہیں کہا۔

"لگتا ہے، جانے کی بڑی جلدی ہے۔"

بتھل نے ہونٹ بھینچ لیے۔

"ٹھیک ہے، دیکھتے ہیں، کتنا جلدی جاسکنے کا ہے۔"

ڈاکٹر نے اُسے بستر پر لیٹ جانے کا اشارہ کیا۔ بتھل نے بہ اِکراہ تعمیل کی۔ میں، زورا اور جامو باہر چلے آئے۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہی رہا۔ دس بارہ منٹ سے اُوپر نہیں ہوئے ہوں گے کہ ڈاکٹر باہر آگیا۔ دروازے کے پاس ہم تینوں کھڑے ہوئے تھے۔ زورا اور جامو نے اُسے سلام کیا اور دوبارہ ہاتھ باندھ لیے۔

"پرسوں وہ جاسکتا ہے۔" ڈاکٹر نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے انگریزی میں کہا اور مجھے ساتھ آنے کا حکم دیا۔ مجھے یقین تھا، یہی کچھ ہوگا۔

اپنے ساتھی ڈاکٹر اور نرس کو ہاتھ ہلا کر رخصت کرنے کے بعد وہ سبزہ زار میں رکھی ہوئی کرسیوں تک آ گیا۔ جامو اور زورا نے مناسب سمجھا کہ کمرے میں چلے جائیں اور ہمارے سامنے نہ رہیں۔

"جیسا کہ اندازہ تھا۔" اُس نے کسی تمہید کے بغیر کہا، "لوگوں کو یقین نہیں آرہا کہ میدا نے خود کو ختم کیا ہے، یا وہ پولیس کے جبر و تشدد کا نشانہ بنا ہے۔"

مجھے تبصرہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

"بہ ہرحال، پولیس نے یہ اطلاع لوگوں تک پہنچانے کے لیے احتیاطاً سپاہیوں کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کردیا تھا، اور انھیں تلقین کی تھی کہ خود کسی قسم کی قیاس آرائی نہ کریں۔ شہر کی جانب بھیجے جانے والے تازہ پولیس دستوں کو میدا کی لاش بھی دکھادی گئی تھی کہ وہ شہادتوں کے امین رہیں، اچھی طرح جان لیں کہ میدا کے جسم پر تشدد کے نشانات نہیں ہیں، اعترافی کاغذات بھی انھیں دکھائے گئے تھے جن پر میدا کے دستخط اور انگوٹھے کے نشان ثبت تھے۔

"صبح صبح آئی جی نے اکبر علی خاں کے گھر حاضری دے کے اُس کے بڑے بھائی سکندر علی خاں کو تمام حقائق سے باخبر کردیا تھا۔ تمام شہادتیں اور دستاویزات وہ ساتھ لے گیا تھا۔ سکندر علی خاں اپنی بھاوج کی ناگہانی کے صدمے سے نڈھال تھا۔ سوگ واروں میں گھرا ہوا تھا، تدفین کی تیاریاں ہورہی تھیں۔ وہ آئی جی سے کیا جرح کرتا اور جرح کرنے کے لیے رہ بھی کیا گیا تھا۔ چور سے لوٹا ہوا مال برآمد ہوسکتا ہے، قاتل سے کیا برآمد ہو۔ آج جمعہ تھا، جمعے کی فضیلت کے خیال سے بیگم کا جنازہ اُٹھانے میں تاخیر کردی گئی تھی، تاکہ نماز کا مجمع بھی شامل

ہوجائے۔ سنا ہے، ہر قسم کے لوگ جنازے میں شریک تھے۔ بہت بڑا ہجوم تھا۔ بیگم کے شاگرد طلبہ آہ و زاری کررہے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آس پاس کے دیہات میں کسانوں کے بچوں کی تعلیم کے لیے بیگم نے کچی پکی درس گاہیں کھولی تھیں، سو دیہات سے آنے والوں کی بھی ایک بڑی تعداد جنازے کے ساتھ تھی۔ سہ پہر تین بجے کے قریب اپنے شوہر کے پہلو میں بیگم کو آبائی قبرستان میں دفن کردیا گیا۔

"جنازے میں شریک لوگوں میں ہر ایک کو یہی جستجو تھی کہ اصل واقعہ کیا ہے۔ پہلے یہ بات چند لوگوں تک محدود تھی۔ اب قریباً سبھی پر منکشف ہے کہ ایک روز کوئی اجنبی نوجوان چاقو کھولے وکیل صاحب کے گھر میں دندناتا ہوا داخل ہوگیا تھا اور ردِعمل میں اکبر علی خاں اُس کے اِتنے قریب آ گئے تھے کہ میدا کے ٹھکانے پر اُس کے ساتھ چلے گئے۔ وہ نوجوان کس زعم میں میدا جیسے سرکش استاد سے چاقو آزمائی کرنے اور اُسے چوکی سے بے دخل کردینے کے ارادے سے گیا تھا۔ میدا کی نظر میں اکبر علی خاں اِتنے اہم ہوگئے تھے کہ تمھیں متزلزل کرنے کے لیے وہ اکبر علی خاں کا خون کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ اکبر علی خاں کی کوئی مجبوری اُنھیں میدا کے ٹھکانے پر تمھارے ساتھ لے گئی تھی۔ وہ تمھارے کسی دباؤ میں تم سے قریب ہوئے کہ تم ایک بڑے چاقو باز ہو اور اڈّوں سے تمھارا بھی تعلق ہے۔ میدا جیسا اُستاد اسپتال میں تمھارے قدموں پر چاقو ڈالنے اور اڈّا چھوڑ دینے پر کیوں مجبور ہوگیا تھا۔ ظاہر ہے، چیونٹیاں تو رینگنی چاہییں سروں میں۔ لوگ کہانیاں سنا رہے، سن رہے اور کہانیاں بنا رہے ہیں۔ وہ تمھیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ انھیں معلوم ہے، تم اسپتال میں ہو، اور پولیس کی ہدایت پر تمھیں پہلے اکبر علی خاں، اور اب اُن کی بیگم کی تدفین میں شرکت سے روک دیا گیا ہے۔ پولیس تمھاری حفاظت یا تم پر نگاہ رکھنے کی خاطر اسپتال میں تعینات کی گئی تھی۔ پولیس افسر بتا رہا تھا، قسم قسم کی چہ میگوئیاں ہورہی ہیں، اور تمھیں بتاؤں، پولیس نے اب دوبارہ اسپتال میں ایک دستہ تعینات کردیا ہے، اِس کمرے کے اطراف میں..."

"آپ کیوں ڈاکٹر صاحب؟" بہت دیر بعد میں نے زبان کھولی۔

"تم اِسے دُور دراز احتیاط ہی کہہ سکتے ہو۔"

"میرے لیے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"یہی کہا جاسکتا ہے، میرے لیے تو نہیں۔"

"لیکن اڈّے کے سارے لوگ تو بند کردیے گئے ہیں۔"

"ممکن ہے، کچھ باقی رہ گئے ہوں، یہاں کے، یا باہر کے۔ یاد پڑتا ہے تم ہی نے ایسا کچھ بتایا تھا، میدا نے باہر کے چند لوگوں سے بھی تو مدد مانگی ہوگی۔ پولیس نے اُن میں سے دو ایک کو پکڑ لیا ہے، ابھی دو ایک باقی ہیں... اور اکبر علی خاں یا بیگم کا کوئی شیدائی بھی تو پاگل ہوسکتا ہے۔ پولیس نے بہت کچھ صاف کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن پولیس پر یہاں کے لوگوں کا اعتماد نہیں۔ خیر چھوڑو۔" وہ کسی قدر اُکتائے ہوئے لہجے میں بولا، "میں بھی نہیں سمجھتا کہ اب پولیس کے یہاں رہنے کا کوئی جواز رہتا ہے۔ تم بتاؤ، رات گھر آ رہے ہو۔ تمھارے پاس دو ہی راتیں ہیں، آج کی اور کل کی، یہ دو راتیں ہمارے ساتھ گزارو۔ بینا تمھیں پوچھ رہی تھی۔ میں نے کہا، آج رات شاید تم آسکو۔"

"کیسی ہیں وہ؟" میں نے جھکتی آواز میں کہا۔

"ٹھیک ہے، اپنے آپ میں مست، تمھارا ذکر مسلسل کرتی رہتی ہے۔"

"میں نے بھی کئی بار سوچا، آپ کی طرف جاؤں۔ اُن سے وعدہ بھی کرکے آیا تھا۔ اُن کی تصویریں، بل کہ نوادر دیکھنے کا اشتیاق ہے، اور اُنھیں دیکھنے کا بھی۔ وہ خود بہت یکتا اور قابلِ دید لڑکی ہیں۔" میری زبان بس میں نہیں رہی اور

اہتمام

اُردو کے مشہور ادیب کنھیّا لال کپور خاصے طویل القامت تھے۔ دُبلے پتلے ہونے کی وجہ سے اُن کا قد کچھ اور بھی لمبا لگتا تھا۔ وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے میں داخلہ لینے کے لیے آئے۔ انٹرویو بورڈ کے سربراہ پطرس بخاری تھے۔ اُنھوں نے ایک نظر کپور کو سر سے پانو تک دیکھا، اور پھر بے اختیار بولے، "مسٹر کپور، آپ سچ مچ اِتنے لمبے ہیں یا آج انٹرویو کے لیے خاص اہتمام کرکے آئے ہیں؟"

عقیل عباس جعفری کا تعاون

میں نے بہ عجلت کہا۔ ''ایک غیر معمولی، عمدہ اور دل کش خاتون۔'' ڈاکٹر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چھلک پڑی۔ ''اور یہی کچھ وہ تمھارے بارے میں کہتی ہے۔''

''میں کہاں اور کیا ڈاکٹر صاحب۔'' میں نے کھسیانی آواز میں کہا۔ ''میں اتنی عزت اور مسرت کا سزاوار کہاں۔ مجھے اُن کے پاس جانا تھا، لیکن آپ تو دیکھ ہی رہے ہیں۔''

''ہاں۔'' وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اُسے سارا کچھ بتایا... تو آج تو آ رہے ہو، آج رات، بل کہ کچھ دیر بعد؟''

میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''آج رہنے نہ دیں ڈاکٹر صاحب؟''

''کوئی مصروفیت؟''

''بس ڈاکٹر صاحب!''

''طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''جی بالکل۔'' میرا جسم اکڑ گیا۔

''اِن پے بہ پے واقعات سے متاثر ہونا چاہیے۔ میں تمھیں نہیں بتانا چاہتا تھا، لیکن خیال آیا، لاعلمی تمھیں اور بوجھل رکھے گی۔'' وہ یگانگت سے بولا۔ ''آ جاؤ تو اچھا ہے، کچھ وقت گزر جائے گا، ماحول کی تبدیلی بھی ایک علاج ہے۔''

میں چپ رہا۔

اور میرے چہرے پر چھائی کشیدگی اُس صاحب نظر سے چھپی نہ رہ سکی، اُس نے بُردباری سے کہا۔ ''بہ ہر حال، جیسا تم کہتے ہو کل آ جانا۔ میں اُس سے کہہ دوں گا، آج انتظار نہ کرے۔''

میں نے شکریہ ادا کرنا چاہا، اور جانے کیوں یہ ایک لفظ میری زبان پر اٹک کے رہ گیا۔ کچھ مجھے اِس لفظ کی فرسودگی کا گمان ہوا۔

وہ کرسی سے اُٹھ گیا۔ اسپتال کی طرف جانے کے بجائے اُس کا رُخ گھر کی جانب تھا۔ میں نے اُس کا ساتھ دیا، پھر چلتے چلتے وہ ٹھیر گیا اور بھولا ہوا کچھ یاد آ جانے کی اُلجھن چہرے پر ہویدا ہوئی۔ اُس نے جامو اور زورا کی شب بسری کے انتظام کے بارے میں بتایا اور کہنے لگا کہ کل صبح اُس کے شخصی معاملات کے معاون چھاگلا کے ذریعے گرانڈ ہوٹل سے کسی آدمی کو بلا کے وہاں رکھا باقی سامان منگوا لیا جائے اور یہیں پر ہوٹل کے واجبات کی ادائی کر دی جائے۔ ہمارے لیے اسپتال سے بہ راہِ راست اسٹیشن روانگی مناسب رہے گی۔

اسپتال کی چار دیواری تک اُسے رخصت کرنے کے ارادے سے میں اُس کے ساتھ چل پڑا تھا لیکن اُس نے مجھے لوٹا دیا۔

مجھے احساس تھا، وہ کوئی غبار لے کے نہ گیا ہو، مگر میری معذرت اپنے عزم کا حاصل تھی جو میں نے گذشتہ مرتبہ اُس کے گھر سے آنے کے بعد ساری رات ایک ہیجان و اضطراب کے بعد کیا تھا اور مجھے ایک گونہ سکون ہوا تھا، آج نہیں تو کل یہ صورت تو پیش آئی تھی۔

میں اُس کے ساتھ زیادہ دُور نہ جا سکا تھا، اِس لیے جلد ہی واپس آ گیا۔ کمرے میں سیورین کے موجود ہونے پر مجھے حیرت ہوئی۔ اُس نے اپنا گھریلو لباس تبدیل کر لیا تھا اور مُغل کے پاس بیٹھی مشتاقانہ، نیازمندانہ انداز میں باتیں کر رہی تھی، جامو اور زورا بھی قریب ہی موجود تھے۔ لگتا تھا، برسوں سے سیورین سے شناسائی ہے۔ امی بھی وہیں تھی۔ کسی ڈاکٹر کی آمد کا اب امکان نہیں تھا۔ میری آمد دخل اندازی کا باعث ہوئی، جیسے کوئی اجنبی اُن کے درمیان آ گیا ہو۔ مجھے دیکھتے ہی مُغل کو 'شب بہ خیر' کہتے ہوئے سیورین اُٹھ گئی۔

''تم ابھی تک یہیں ہو؟'' میں نے عمداً انگریزی میں پوچھا۔

''تمھارا انتظار کر رہی تھی۔'' وہ دبی زبان سے بولی۔

''مگر بہت وقت ہو گیا ہے۔'' میں نے فکرمندی سے کہا۔

''کبھی کبھی ہو جاتا ہے اتنا وقت بھی۔'' بابا سے دل چسپ باتیں ہو رہی تھیں۔ وقت کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔

''تمھیں اب جانا چاہیے۔''

''سچ کہوں، دل ہی نہیں چاہتا۔''

میں پھر کیا کہتا۔ اُسے دیکھتا رہ گیا۔

''یہ تو بہت الگ لوگ ہیں۔ اِن کا بس نہیں چل رہا تھا کہ میرے لیے کیا کریں۔ بار بار زری کا ذکر کرتے رہے۔ کیا میں واقعی کچھ اُس جیسی ہوں؟'' اُس نے معصومیت سے پوچھا۔

''ہاں، کچھ کچھ، بل کہ بہت کچھ۔'' میں نے بھی سچ کہا۔

''اُس کا نام اِتنی بار سنا ہے کہ اُسے دیکھنے، اُس سے ملنے کے لیے دل مچلتا ہے۔''

''آئینہ تو گھر میں ہے تمھارے، گھر جا کے سامنے کھڑی ہو جانا۔''

میری سخن طرازی لمحوں بعد اُس کی سمجھ میں آئی اور اُس کے رخساروں سے کرنیں سی پھوٹنے لگیں۔ ''شکر ہے، اِس وقت تم کسی کشاکش سے دوچار نہیں ہو، ورنہ تو...''

کمرے میں صرف ایسی ہی میری اُس کی زبان سمجھ رہی تھی اور زیرِ لب مسکرا رہی تھی۔ تادیر اُن لوگوں کی موجودی میں کسی ایسی زبان میں بات کرنا جس سے وہ ناواقف ہوں، آداب کے منافی تھا۔ میں نے ہندستانی میں سیورین سے بات شروع کی تو اُسے بھی نارَوائی کا احساس ہوا۔ میں نے اُسے تاکید کی تھی کہ کل صبح وہ ناشتے وغیرہ کی زحمت نہ کرے۔

''کیوں نہیں۔'' وہ چہک کے بولی، ''آج تو زورا اور جامو بھائی بھی ہیں۔''

''اِسی لیے کہہ رہا ہوں۔ اِتنی دیر سے گھر جا رہی ہو۔ تم اہتمام سے باز نہیں آؤ گی۔ جاتے ہی صبح کی تیاری میں لگ جاؤ گی۔'' میں نے مناہمانہ انداز میں کہا۔ ''یہاں اسپتال میں معقول انتظام ہے، خصوصاً اِن کمروں کے لیے۔''

''کچھ نہیں، میری فکر نہ کرو۔ مجھے کوئی پریشانی نہ ہو گی۔ مجھے تو خوشی ملتی ہے۔''

''ہاں سسٹر! ابھی راجا بھائی ایک دم ٹھیک بولتا ہے۔ ناشتا کا کوئی چکر و گرمت ڈالو۔ گھر جا کے ابھی آکھا رات سونے کا ہے بس!'' زورا نے مشفقانہ تیور سے کہا۔

سیورین نے سنی اَن سنی کر دی۔ سب کو 'خدا حافظ' کہتی، ہاتھ ہلاتی ہوئی تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ اُسے راہداری کے سِرے تک رخصت کرنا میرا معمول ہو گیا تھا۔ زورا اور جامو بھی اُٹھ گئے تھے۔ میں نے اُنھیں روک دیا۔ کمرے سے چند قدم دُور جا کے سیورین ٹھیر گئی اور مضطربانہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ میں نے جانا، کوئی چیز بھول گئی ہے، میں نے وجہ پوچھی۔

''کچھ کہنا ہے تم سے۔'' اُس کی آواز اُمڈ رہی تھی۔

میری سوالی نظریں اُس پر مرکوز ہو گئیں۔ ''کیا بات ہے؟''

''میں واقعی کیسی لڑکی ہوں؟''

''یہ کیا... کیا مطلب، تمھیں کسی سند کی ضرورت کیوں پڑ گئی؟ تم اچھی ہو۔''

''میری کوئی بات تمھیں ناگوار تو نہیں گزری؟''

''یہ خیال تمھیں کیوں آیا، مسئلہ کیا ہے؟''

''تم چاہو تو مسئلہ کوئی بھی نہیں۔''

''میں چاہوں...؟ کیا کہنا چاہتی ہو؟'' میں نے ناگواری سے پوچھا۔ ''کیا ہے؟''

''میں بھی تم لوگوں کے ساتھ جانا چاہتی ہوں۔'' اُس نے رُکی رُکی آواز میں کہا۔ میں گُنگ رہ گیا۔

''یہی بِنتی کرنی تھی تم سے۔'' اُس کے ہونٹ دھڑک رہے تھے۔

''تم اپنے ہوش و حواس میں تو ہو۔'' میں نے اضطراری لہجے میں کہا، ''کہاں، کہاں جانا چاہتی ہو؟''

''تمھارے ساتھ، جہاں تم جاؤ، جہاں بھی۔''

''تمھیں معلوم ہے، تم کیا کہہ رہی ہو؟''

''میرا یہاں کوئی نہیں۔ جو ہیں، دُور دُور کے ہیں۔ بس مجھے ساتھ لے چلو، کسی بھی حیثیت سے، اور کسی حیثیت کے بغیر بھی۔ میں تم پر، یا کسی پر کوئی بوجھ نہیں بنوں گی۔ میرا وعدہ ہے تم سے، میں تمھاری، بابا کی اور اُس کی... زری کی خدمت کرتی رہوں گی۔''

وہ ڈوبتی ڈولتی آواز میں بولی۔

لمحوں تک مجھ سے کچھ کہا نہ جا سکا، پھر میں نے بہ مشکل، اپنی آواز، اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے نرم روی اختیار کی۔

''تم ہمارے بارے میں کتنا جانتی ہو؟''

''جتنا جان چکی ہوں، اُتنا بہت ہے۔''

''تم بچوں کی سی باتیں نہیں کر رہیں؟'' میں نے بھیگی آواز میں کہا، ''اِتنا بڑا فیصلہ تم نے اِتنی آسانی سے کیسے کر لیا؟''

''سوچ سمجھ کر کیا ہے۔'' اُس کے لہجے میں یقین تھا۔

''اور میں نے بابا سے بھی بات کی ہے۔''

''تم نے مُغل بھائی سے بھی کہا ہے یہی کچھ؟'' میں نے بدحواسی سے پوچھا، ''پھر... پھر اُنھوں نے، اُنھوں نے کیا جواب دیا؟''

''اُنھوں نے تمھارے بارے میں کہا ہے۔ کہہ رہے تھے، تمھیں اگر کوئی اعتراض نہ ہو۔''

''یہ کہا اُنھوں نے؟'' مجھے حیرانی ہوئی اور میں نے کسی دلیل سے اجتناب کیا۔ ''پھر میرا کیا ہے۔'' میں نے کہا، ''وہ

آمادہ ہیں تو میرے اعتراض کی کیا گنجائش ہے۔ اصل میں تو وہ
بتھل بھائی اور اُن کی بیٹی ہی کا گھر ہے۔"
"تمھارا کچھ نہیں ہے؟" وہ تیکھی آواز میں بولی۔
"میں کیا! سارا کچھ تو بتھل بھائی کا ہے۔"
"تم نہیں چاہتے، میں بھی وہاں رہوں، اُن لوگوں کے ساتھ۔
کیا میں دوسروں کی طرح اُس گھر کی ایک فرد نہیں بن سکتی؟"
"کیوں نہیں بن سکتیں، مگر کیوں؟ تمھیں اُس گھر میں بسنے
والوں کے واقعات معلوم ہیں؟"
"بابا نے کچھ کچھ اشارتاً بتایا ہے، وہاں کون کون ہے، اور وہ
سارے کس طرح ایک دوسرے کے لیے ایثار پر آمادہ رہتے ہیں۔"
"اُنھوں نے نہیں بتایا کہ وہ سارے کن حالات میں وہاں
آئے ہیں، کس بے چارگی کے عالم میں؟"
"میں بھی کسی بے چارگی میں وہاں جانا چاہتی ہوں۔"
"تم... تم کس مصیبت سے دوچار ہو؟"
"میں بہت اکیلی ہوں۔ میں تمھیں کیا بتاؤں۔" وہ روہانسی
ہوگئی۔ "میرا کوئی نہیں ہے۔"
"لیکن ہمارے یہاں آنے سے پہلے بھی تو تم۔"
"وہ اَور بات تھی۔ جب تم یہاں نہیں آئے تھے... تم، بابا،
زورا اور جامو بھائی۔"

میں نے اُس سے کہا کہ ہمیں یہاں آئے ہوئے دن ہی
کتنے ہوئے ہیں۔ بیش تر بتھل حواس سے بیگانہ رہا، اور
درمیان میں اَن ہونے سانحے پیش آتے رہے۔ اِن دنوں میں
جو کچھ اُسے دیکھنا، سننا اور سہنا پڑا ہے، اُس نے کبھی تصور
نہ کیا ہوگا، اڈّے، چاقو، پولیس، خون... اور میں نے کہا، اُسے
کیا معلوم ہے، خانم، نیساں اور سلما حیدر آباد سے، منیر علی کا
خاندان جیسلمیر سے، فروزاں اور یاسمن آمن سول سے، اور خود
زرّیں کس عذاب سے گزر کے اُس پناہ گاہ تک پہنچ پائی ہے۔
اُن سب کا وہاں اکٹھے ہو جانا ایک اتفاق ہے، یا مجبوری ہے۔
سیورین کی کیا مجبوری ہے؟ وہ ایک منظم زندگی گزار رہی ہے،
نہایت محترم اور مقدس پیشے سے وابستہ ہے، یہاں اُس کا
گھر ہے، یہ گلیاں، محلّے، یہاں کے موسموں کی وہ عادی ہے۔
میں گواہ ہوں، اُس سے ڈاکٹر رائے کا سلوک کس قدر مربّیانہ ہے۔
سبھی اُس کی عزت کرتے ہیں، اور وہ کوئی عام نرس نہیں۔
اِن خاص کمروں میں اُس کی تعیناتی ہے، اپنے کام میں مہارت
اور مستعدی ہی کے سبب سے۔ نئی جگہ تو نئی ہوتی ہے۔ زرّیں کی
حویلی تو ایک چار دیواری ہے۔ اُس چار دیواری میں بے شک
اُن ستم رسیدگاں نے عزت اور عافیت کی ایک دُنیا آباد کرلی ہے،
یہ بھی واقعہ ہے کہ وہاں سب ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں،
اور احسان و ایثار کے لیے آمادہ رہتے ہیں، لیکن وہ اَور
دُنیا ہے۔ یہاں سے کوئی مطابقت نہیں ہے۔

میں نے اُس سے اَور بھی بہت کچھ کہا، مگر اُس نے عزم
کر رکھا تھا۔ کہنے لگی کہ اُس نے پہلی مرتبہ ایسے لوگ دیکھے ہیں
جو دوسروں سے بہت مختلف ہیں۔ دریا دل، اِرادوں کے پختہ،
تحفظ، توانائی اور سلامتی کی علامت۔ اِن کے پاس بڑی چھاؤں ہے۔
اِنھیں دیکھ کے احساس ہوا کہ وہ تو بڑی گھٹی ہوئی زندگی بسر کرتی
رہی ہے۔ وہ تو بہت حریص، بدنگاہ اور سوداگر لوگوں میں گھری
رہی ہے، وقت پر کنارے ہو جانے، آنکھیں چُرا جانے والے
لوگ۔ اسپتال میں طرح طرح کے مریضوں سے اُس کا واسطہ
پڑتا رہا ہے۔ اُن میں سے بیش تر اُسے ساتھ لے جانے کی
کوشش کرتے رہے ہیں، کسی نے اُس کے دام پوچھے، کسی نے اُس کی
قیمت لگائی، کسی نے اپنے راج محل کی زینت بنانا چاہا، کسی نے
دُنیا بھر کی آسائش فراہم کرنے کے دعوے کیے۔ عورت شاید
مرد سے زیادہ حسّاس اور نگاہ شناس ہوتی ہے۔ وہ کیا بتائے،
کس طرح اُس نے اپنا دامن بچائے رکھا ہے۔ سیورین نے
رُندھی ہوئی آواز میں بتایا کہ اُس کی ماں ہے نہ باپ، رشتے کی
ایک مہربان چچی اپنا گھر چھوڑ کے اُس کے گھر آ بسی ہے، اُسی کی
دُسراتھ کے لیے۔ کہنے لگی کہ وہ ڈاکٹر بننا چاہتی تھی، اور بھی
بن جاتی، لیکن کوئی بھی ساتھ نہ رہا تو اُس نے اپنا ساتھ بھی
چھوڑ دیا، اُس نے خود کو ترک کر دیا۔ پر یہ زندگی ہے، کتنی ہی
بیگانہ ہو، آدمی کھینچے، دھکیلے جاتا ہے۔ وہ کہہ رہی تھی، اُس نے
تکرار کی کہ ہمارے یہاں آنے کے بعد اُسے کسی دریچے کے
کھل جانے کا گمان ہوا، کوئی دریچہ کھل گیا ہو جیسے اور تازہ ہوا اور
روشنی در آئی ہو۔ اُس کے ویراں کدے میں کونپلیں سی پھوٹنے
لگیں اور بچھڑے ہوئے خواب اُس کے پاس لوٹ آئے۔

میں نے بہت کچھ کہنا چاہا، لیکن میرے اِدّعا میں کوئی خامی تھی، یا اُس کا ارادہ میری دلیلوں سے زیادہ توانا تھا۔ کہنے لگی کہ کیا اُس نے واقعی کوئی بڑی ناروا بات کہی ہے، جو امکان سے باہر ہے۔ کیا میرے تکدّر کا سبب یہ ہے کہ دوسروں کی طرح اُسے کوئی حادثہ یا سانحہ پیش نہیں آسکتا ہے، وہ بے بسی اور محرومی کے اُس پیمانے پر پوری نہیں اُترتی جو ہم نے زرّیں کی حویلی میں داخلے اور سکونت کے لیے مقرر کیا ہے، یا وہ اُن کی طرح نہیں ہے جو وہاں موجود ہیں، وہ کوئی غیر لڑکی ہے، کوئی اَچھوت، میرے کہنے کے مطابق، وہ ایک چار دیواری ہے، لیکن زنداں تو نہیں ہے۔ اُس کے وہاں چلے جانے سے کچھ منتشر ہو جانے کا اندیشہ ہے، اور کیا اُس زنداں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔ کہنے لگی، کیا آدمی کبھی کچھ وہی ہوتا ہے جو نظر آتا ہے۔ اُس کا دمکتا رنگ، چمکتی آنکھیں، خوش رفتاری، خوش گفتاری، یہ نظم وضبط، سلیقہ شعاری کسی سرایت کیے ہوئے خوف کا مآل بھی تو ہوسکتی ہے۔ آدمی کو کبھی غصہ بھی تو آنا چاہیے، وہ اونچی آواز میں بات کرنے کو ترس گئی ہے۔ ہمیشہ دراز خوش خلقی تو کوئی جبر ہے، یا بے حسی۔ آدمی کا سب سے بڑا دکھ خوابیدگی کے باوجود خوابوں سے محرومی ہے۔

میں نے ہاتھ اُٹھا کے اُسے روک دیا۔ ''خدا کے لیے اِتنا مت کہو۔'' میں نے التجا کی۔ ''میں شاید وضاحت نہیں کر پایا، نہیں کر پا رہا ہوں۔ مجھے بتاؤ، تم نے میری یا مُغل بھائی کی وجہ سے یہ فیصلہ کیا ہے؟ تم چھاؤنی کی بات کرتی ہو، تو ہم وہاں کب اور کتنا رہ پاتے ہیں۔ ہم تو مستقل سفر میں رہتے ہیں، اور سفر میں کیوں رہتے ہیں، یہ تمھیں کیا معلوم ہے۔''

''کچھ کچھ بابا نے مجھے بتایا ہے۔'' وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔

''تمھیں کچھ بتایا ہے اُنھوں نے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا ''کیا... کیا بتایا ہے؟''

''یہی کہ تمھیں کسی کھوئے ہوئے کی تلاش ہے۔'' وہ اُداسی سے بولی۔ ''تمھارا کام بس یہی رہ گیا ہے۔ میری دُعا ہے، کاش، وہ تمھیں جلد مل جائے، لیکن اِس کا یہ مطلب کہاں ہوتا ہے، تمھاری مراد بر آنے کے بعد تم وہ نہیں رہو گے جو تم ہو۔ تمھارے سائے اور روشنی میں کمی ہو جائے گی۔ تمھارا دل تنگ ہو جائے گا۔ تم تو اور سایہ دار اور توانا ہو جاؤ گے۔''

میں نے اُسے غور سے دیکھا، وہ ایک خوش اندام لڑکی، شاخِ نازک کی طرح جس کا سراپا، رنگ شفق گوں، نقش و نگار تراشیدہ۔ وہ کیسی باتیں کر رہی ہے، کسی نے سچ کہا ہے، آدمی تو اپنے ذرّوں سے تشکیل وتجمیل ہوتا ہے۔ سامنے کے، یا نظر آنے والے مظاہر کی دل فریبی کو باطنی اوصاف دو آتشہ کر دیتے ہیں۔ جو آئینے کا شیوہ ہے، وہی آنکھ کا۔ آئینے کو کتنا نظر آتا ہے، اور آنکھ کی رسائی کس قدر ہے۔ اصل تو جوہر نادیدہ ہے، تراشیدہ فکر، شہابی، چمپئی خیال، جذبہ واحساس کی خوش قامتی، نرمی و نازکی اور فراوانی، اور گونا گونی، سراپا تو تبھی مکمل سمجھنا چاہیے۔

بے اختیار میرا جی اُسے سینے سے لگا لینے کو اُمڈا، لیکن پھر میں ٹھٹک کے رہ گیا۔ ہم کمرے کے باہر کچھ فاصلے پر کھڑے تھے۔ اسپتال کے اِس حصے میں بہت سکون ہوتا تھا، اور اُس وقت تو چہل پہل نہ ہونے کے برابر تھی۔ سوئی سوئی سی روشنی ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ رات کی خاموشی میں ہریالی کو بھی جیسے گویائی مل جاتی ہے۔ لگتا تھا، سرگوشیاں کر رہی ہو۔ میں نے کچھ کہنا چاہا، اور نہ کہہ سکا، خاموش کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ لمحے گزر گئے، پھر میں نے تھکی آواز میں اُسے ٹوکا، ''گھر جاؤ اب، دیر بہت ہو گئی ہے۔''

اُس نے بھی پھر زبان نہیں کھولی، راہ داری کے موڑ پر وہ جدا ہو جاتی تھی۔ وقت گزر جانے کی وجہ سے مجھے دُور تک اُس کے ساتھ جانا چاہیے تھا، لیکن اُس نے مجھے روک دیا، اور جاتے وقت اُس کی گراں خاطری کا مجھے شدت سے احساس ہوا، سو اُس کی دل دہی کے لیے میں نے فرمائش کی۔ ''سنو! وقت ملے تو صبح ناشتے میں ذرا سے میٹھے چاول لیتی آنا... زیادہ بالکل نہیں۔'' میرے لہجے میں یقیناً کسی استحقاق کی آمیزش تھی۔

وہ پھر رُک گئی اور اُس کی پلکیں جھکنے لگیں اور اُس کی آنکھوں میں ستارے چمکنے لگے۔ ''تمھیں پسند ہیں؟''

''بس ایسے ہی۔'' میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ''اچھے لگتے ہیں، اب تو دن ہو گئے۔''

میری تدبیر کارگر ہوئی۔ اُس کی رفتار ہی بدل گئی، جیسے تیرنے لگی ہو، یا اُڑنے۔

1.

موٹرسائیکل سوار
کے لیے ہیلمٹ
لازمی

2.

کمرے میں وہ تینوں میرے منتظر تھے۔ مجھے دیکھ کے بے چین سے ہوئے، لیکن کوئی سوال نہیں کیا۔ جھل بستر پر نیم دراز تھا، جامو اور زورا، اس کی پائنتی بیٹھے ہوئے تھے۔ زورا اُس کے پیر دبا رہا تھا۔

صوفے پر میرے بیٹھ جانے کے بعد جھل نے اکساتی آواز میں پوچھا، "کچھ بولی رے تجھ سے؟"

"ہاں۔" میں نے سر جھٹک کے کہا۔

"اُلٹی کھوپڑیا کی ہے۔ تُو نے کیا بولا؟"

"تمھارے بعد میں کیا کہہ سکتا تھا؟" میں نے ترشی سے کہا۔

"نہیں مانتی، اِس واسطے تجھ پر ڈال دیا تھا۔ تُو ہی اُس کی بولی میں سمجھائے گا۔ وہ تو بڑا مان کرتی ہے۔"

"ٹھیک ہے، اُستاد!" زورا مچل کے بولا، "ابھی ایک کے بڑھنے پہ کیا ایدرسے اُودر ہوجانے کا ہے۔"

"بہت پیاری ہے، اُستاد!" جامو نے وارفتگی سے تائید کی، "اُدھراُن بھی جیسی لگتی ہے، قسم سے۔ اُن سے پھُرکی ہوجیسے۔ وہ جو بولتے نا، ایک کو اُٹھاؤ، دوسرے کو بٹھاؤ۔"

جھل کی پیشانی تنگ ہوگئی۔ اُس نے کچھ نہیں کہا۔ مجھے بھی خاموشی ہی بہتر لگی۔

ایمی نے کسی خدمت گار کے ذریعے اسپتال کے طعام خانے سے رات کے کھانے کا انتظام کروا دیا تھا۔ جھل بھی شریک ہوگیا، مناسب ہی کھانا تھا۔ کھانے کے بعد تازہ ہوا کے لیے وہ باہر آ کے بیٹھ گئے۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی کی وجہ سے مینڈک اور جھینگر غل مچانے لگے تھے۔ بارش کا پانی سبزے کی سب سے مرغوب غذا ہے۔ ہرسُو تیز مہک اُٹھنے لگتی ہے۔ خوش بُو کے بھی شاید رنگ ہوتے ہیں۔ سبزے سے اُٹھتی مہک سے ہرے رنگ کا گمان ہوتا ہے، گلاب کی خوش بُو سے گلابی، شہابی، چمپا سے سنہری اور موتیا سے نقرئی رنگت کا۔ جتنے رنگ کے پھول، اُتنے خوش بُو کے رنگ۔ کئی رنگ کے پھول خوش بُوؤں کا آمیزہ ہوتے ہیں؛ عطرِ مجموعہ۔ ہم سائبان میں بیٹھے تھے، سائبان میں بارش کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ راہ داری کی چوڑائی اچھی خاصی اور چھت بھی خاصی اونچی تھی۔ پانی ہم سے دور تھا، لیکن محسوس ہو رہا تھا، ہم بھی بھیگ رہے ہیں۔ بارش سے عجب خوش گوار منظر ہوگیا تھا۔

اچانک جھل کے جسم میں ہڑک اُٹھی۔ جامو اور زورا دن بھر اسپتال میں رہے تھے، اور اب رات کو بھی موجود تھے۔ جامو کے بہ قول، میدا اُستاد زخمی ہوجانے کی وجہ سے نہ آ سکا تھا، لیکن اڈّے کے دوسرے لوگوں کے نہ آنے پر جھل کو کھلنا چاہیے تھا۔ کل اوّل پہر اور اُس سے پچھلے دن جھل کے پاس آ کے میدا کی شیدائیت کا حال ہم نے دیکھا تھا، کیسا بچھا بچھا جاتا تھا، جھل سے اپنی پرانی نیازمندی کا ذکر بار بار کرتا تھا، کچھ یہی کیفیت برجو دادا کی تھی۔ میدا زخمی تھا تو اڈّے کے دوسرے آدمی اُس کی نیابت، میدا کی جانب سے معذرت کرنے اور جھل سے اپنی لگاوٹ کا اظہار کرنے آ سکتے تھے۔ اِدھر اسپتال میں دن بھر ٹکے رہنے کا جواز تو جامو اور زورا کے پاس موجود تھا کہ ڈاکٹر راے کی نوازشِ خسروانہ ہے، لیکن اب رات کو اسپتال کے سخت قواعد کے خلاف وہ ٹھیرے ہوئے تھے، اور کمرے میں مزید صرف ایک بستر کی گنجائش رکھی گئی تھی۔ اِتنا وقت گزر جانے کے بعد اب کہیں اُن کے جانے کے آثار بھی

نظر نہیں آتے تھے۔ جھل نے میدا کے نہ آنے کی وجہ جاننے کے بجائے حتمی انداز میں کہا، "اُلٹا ہوگیا رے حرام کا جنا۔"

جامو اور زورا چونک پڑے۔ وہ کیا جواب دیتے۔ "ہاں اُستاد! لگتا ہے، لگتا ہے، تھوڑا سا اُلٹا سیدھا ہوگیا۔ میدا اُستاد تو خیر آج نہیں آ سکتا تھا، لیکن دوسرے لوگ، برجو دادا...!" جامو نے اُسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

"سیدھا بول رے۔" جھل بگڑ کے بولا۔

"ہم لوگ تو، تم کو پتا ہے، سویرے سویرے واں سے نکلے تھے۔ پیچھے اُدھر کوئی چکر ہوا تو کیا بول سکتے ہیں۔" جامو نے بہ ظاہر سادگی سے کہا۔

جھل کے چہرے سے ظاہر تھا، اُسے یقین نہیں آ رہا ہے۔ اُس کی نظر زورا پر گئی، اور زورا کی بے نیازی سے اُسے اندازہ ہوگیا کہ زورا بھی جامو ہی کی زبان بولے گا۔

میرے جی میں آیا، آج نہیں تو کل اُسے سارا کچھ معلوم ہو ہی جانا ہے۔ کل صبح بھی میدا یا اڈّے کا کوئی اور آدمی اُس کی عیادت کو نہیں آئے گا، اور اسپتال سے چھٹی ملنے تک زورا اور جامو بھی رہیں گے، لیکن میں کہاں سے شروع کرتا۔ اِتنا بتانے سے کہ میدا اب اِس دُنیا میں نہیں ہے، کل تک وہ بے شک ہر طرح چوکس یہاں بیٹھا ہوا تھا۔ پر اب وہ کبھی نہ آ پائے گا، وہ اور فی الحال اُس کے قریب ترین ساتھیوں میں سے کوئی بھی۔ جھل کو میں کیا کیا اور کس حد تک بتا پاتا۔ میں نے خود کو تھام لیا۔ خدا خدا کرکے تو اُس کی بحالی کی صورت پیدا ہوئی ہے۔ ہر بات اپنے وقت پر اچھی لگتی ہے۔ بے محل حقیقت بیانی یاوہ گوئی ہوجاتی ہے۔

جھل نے بھی چپ سادھ لی۔ اُسے احساس ہونا چاہیے تھا کہ اُس کے معتقدوں کی پہلوتہی اور لب بستگی بے سبب نہیں ہوگی۔ جنھیں کسی طرح کی مرتبت نصیب ہے، اُن پر اپنے حلقہ بگوشوں کا لحاظ بھی واجب ہے۔ ارادت مندوں سے اُن کی توفیق اور مقدرت سے سوا کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔ اسپتال میں زیرِ علاج کسی عام مریض سے اُس کے پرسانِ حال باہر کے بکھیڑوں کے ذکر کی احتیاط کرتے ہیں۔

دیر تک وہ راہ داری میں بیٹھے بجلی کی چمک اور بارش کی

پیچھے بیٹھنے والوں
کے لیے بھی
ہیلمٹ لازمی

آنکھ مچولی کا نظارہ کرتے رہے۔ بارش کبھی تیز ہوجاتی، کبھی دھیمی پڑ جاتی۔ بادل مسلسل گرج رہے، یا تڑپ رہے تھے، جیسے آسمان پھٹ پڑے گا اور دُنیا آج ہی تمام ہوجائے گی۔ یوں دُنیا تو روز ہی تمام ہوتی ہے۔ آدمی کے لیے تو اُسی دن ختم ہوجاتی ہے جب وہ دُنیا سے چلا جاتا ہے۔

رات گئے جامو اور زورا کو نرس ایمی اِنھی خاص کمروں کے حصے میں واقع ایک خالی کمرے میں لے گئی، بالکل اُسی طرز کا کمرا جہاں جھل کو رکھا گیا تھا، کشادہ، روشن اور ساز و سامان سے آراستہ۔ معلوم ہُوا، جاتے وقت ڈاکٹر راے، ایمی کو ہدایت کر گیا تھا۔ یہ کیسی اعلاظرفی، کس درجے کی خوش خلقی تھی کہ اُسے دُور افتادگاں جامو اور زورا کی شب بسری کا خیال رہا، اور اُس نے کسی ایسی ویسی جگہ کے بجائے یہ خاص کمرا تفویض کیا۔ ایمی کے فراہم کیے ہوئے مریضوں کے مخصوص کپڑے پہن کے جامو اور زورا بھی مریض نظر آنے لگے تھے۔ ایمی شوخی سے کہنے لگی کہ اب بس انجکشن کے لیے تیار ہوجاؤ۔

کچھ وقت اُن کے پاس بیٹھ کے میں ایمی کے ساتھ اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ دواؤں کا اثر ہوگا کہ جلد ہی جھل کی

آنکھ لگ گئی تھی۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی، ایمی کا تو کام ہی شب بیداری کا تھا، اپنے چھوٹے موٹے کاموں سے نمٹ کے میرے پاس صوفے پر آ کے بیٹھ گئی، دیر تک چپ رہی، پھر سرگوشی میں بولی۔ ”جا رہے ہو میری جان!“

میں نے کہا، ”جانا تو کبھی تھا ہی۔“

حسرتی لہجے میں کہنے لگی، ”کچھ دن اَور رُک جاتے۔“

میں نے کہا، ”یہ بھی بہت دن ہو گئے۔ اَب اَور رُکنے کو مت کہو، جتنے دن ہم یہاں رہیں گے، کچھ نہ کچھ ہوتا رہے گا۔ بہتر ہے، جلد سے جلد ہم یہاں سے چلے جائیں۔“

بھرّائی ہوئی آواز میں بولی، ”بہت یاد آ ؤ گے، خداوند جانتا ہے، تمھیں دیکھ کے لگتا ہے، کوئی کھویا ہوا مل گیا ہے۔ آئے دن یہاں طرح طرح کے لوگ آتے ہیں، آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ اُن کی صورتیں بھی یاد نہیں رہتیں، لیکن تم جیسے لوگوں کے ساتھ وقت گزارنے کا یہ پہلا تجربہ ہے۔ تم تو نقش چھوڑ کے جا رہے ہو۔“ پھر بچّوں کے سے لہجے میں پوچھنے لگی کہ کیا کبھی وہ بھی مجھے یاد آئے گی۔ میں کیا جواب دیتا، میں نے کہا۔ ”بالکل نہیں۔“ وہ کھلکھلا پڑی، مجھے بازو میں سمیٹ لیا، اور میرا ہاتھ آنکھوں سے مَس کرنے لگی، پھر کیا ہوا کہ رونے لگی۔ دُنیا میں لوگ بہت برے ہوتے ہیں تو اچھے بھی بہت ہوتے ہیں۔

رات کے آخری پہر نیند نے آ لیا تھا، لیکن مُنہ اندھیرے آنکھ کھل گئی، بتھل ابھی غافل تھا۔ مُنہ ہاتھ دھو کے میں راہ داری میں آ کے بیٹھ گیا۔ صبح منظر ہی مختلف ہو گیا تھا، آسمان صاف، بادلوں کا نام نشان نہیں۔ بارش کے بعد آسمان بھی دُھل جاتا ہے، اور سبزہ، لگتا ہے، سبزے کے رنگ میں سونا آمیز ہو گیا ہو، اور اِس آمیزش، اِس بہروپ سے سبزہ چمکنے لگا ہو۔ آٹھ بج کر چند منٹ ہی اوپر ہوئے ہوں گے کہ لدے پھندے ایک خدمت گار کے ساتھ سیورین راہ داری میں طلوع ہوئی، اُجلی اُجلی، کِھلی کِھلی، بارش نے جیسے اُسے بھی کچھ اَور نکھار دیا ہو۔ مجھے دیکھ کے رفتار تیز ہو گئی۔ اُس کے ہاتھوں میں بھی سامان تھا۔ میں نے لپک کے اُسے جا لیا اور بہ عجلت سامان اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ نیلی ساری میں ملبوس تھی۔ ساری اُس پر خوب بجتی، بجتی تھی۔ اُس کا دھان پان سراپا اور کشیدہ، اُور کمان ہو جاتا تھا۔ ”جامو اور زورا بھائی کہاں ہیں؟“ کمرے میں آ کے اُس نے گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

میں نے اُسے بتایا کہ ابھی آتے ہوں گے، رات خاصی دیر سے سوئے تھے، اور کیا معلوم، سوئے بھی یا نہیں۔

”اُنھیں بلا لیں، سارا گرم گرم ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے آنے میں بہت دیر ہے۔ اچھا ہے، اُن کے آنے سے پہلے ہم نمٹ جائیں۔ بعد کو یہ کھانوں کی خوش بُو بھی کمرے سے دُور کرنی ہے، دیکھا نہیں اُس دن۔ اُن کی ناک کتنی تیز ہے۔“ وہ تیز تیز آواز میں بولی۔

اُس کی آواز پر بتھل بھی بستر سے اُٹھ گیا۔ سیورین اُمڈتی ہوئی اُس کے سینے میں جا چھپی۔ بتھل نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا اور پیشانی کا بوسہ لیا۔

”بس بابا، آج آپ ہاتھ مت روکنا۔“ اُس نے نازبردارانہ لہجے میں کہا، ”آپ کا سارا کچھ دھیان میں رکھ کے لائی ہوں۔“

”ناری! اَب کیا رکھا ہے۔“ بتھل بجھی ہوئی آواز میں بولا، ”بالکل ٹھیک ہوں میں۔ دیکھنا، کیسا ہاتھ چلتا ہے۔“ بیٹھتے ہوئے جانے کیوں اُس کی نظر مجھ پر، پھر ایمی پر گئی اور اُس کے ہونٹوں پر تبسم کِھل گیا۔

کسی خدمت گار نے جامو اور زورا کے کمرے میں جا کے اُنھیں مطلع کر دیا تھا۔ جتنی دیر میں وہ آئے، ایمی اور سیورین نے میز پر تشتریاں سجا دیں، شکر ہے، جامو اور زورا نے رات والا مریضوں کا لباس تبدیل کر لیا تھا اور اپنے اصل حلیے میں آ گئے تھے۔ ناشتے کے اہتمام میں سیورین شاید رات بھر جاگتی رہی ہو، مگر چہرے پر رتجگائی کے آثار مطلق نہیں تھے۔ خوشی میں آدمی پر تھکن ایسی طاری نہیں ہوتی۔ خوشی بھی تو نیند کے، نشے کے مانند ہے۔ میٹھے چاولوں کا ڈونگا اُس نے چپکے سے میری طرف کھسکا دیا۔ خاصی توجہ سے چاول پکائے گئے تھے، دانہ دانہ الگ تھا، جیسے دانہ دانہ الگ پکایا گیا ہو۔ میٹھا بھی بس میٹھے کی حد تک تھا، چاولوں پر غالب نہیں آیا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ بالائی سے لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ بالائی بھی وافر تھی۔ عورتیں چاہے کتنی ہی زندگی کے دیگر معاملات میں فعال اور سرگرم ہوں، گھر اور گھریلو امور سے اُن کی نسبت طبعی ہوتی ہے۔

چھوٹی چھوٹی پوریاں، ترکاری، انڈے کا حلوہ، ٹوسٹ، مکھن، شہد، میدے کی نمکین اور میٹھی ٹکیاں وغیرہ... جانے کیا کیا، البتہ گوشت کی کوئی چیز نہیں تھی۔ جامو اور زورا بار بار ستائشی نظروں سے سیورین کو دیکھتے تھے اور اُس کے رخساروں پر لالی بکھر جاتی تھی۔

ٹھیک دس بجے ڈاکٹر کی آمد ممکن ہوئی۔ کمرا بالکل صاف تھا۔ ایمی اور سیورین نے تمام کھڑکیاں کھول دی تھیں اور تیز پنکھا چلا دیا تھا کہ کسی قسم کی مہک باقی نہ رہے۔ ڈاکٹر رائے کے ساتھ دو نوجوان ڈاکٹروں کے علاوہ گورا ڈاکٹر بھی تھا۔ وہ پہلے بھی یہاں آ چکا تھا۔ ڈاکٹر کو اشارہ کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ میں، جامو اور زورا اُسے دیکھتے ہی کمرے سے نکل گئے اور راہ داری میں کرسیوں پر بیٹھنے کے بجائے کھڑے رہے۔ دس پندرہ منٹ بعد ڈاکٹر رائے اپنے ساتھیوں سمیت باہر آ گیا۔ کمرے سے نکلتے ہوئے وہ گفت گو میں ایسا محو تھا کہ ہم پر نظر نہ پڑ سکی۔ گورے ڈاکٹر نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے رسمی وداعی انداز میں ہاتھ ہلایا تو ڈاکٹر رائے کو سامنے میری موجودی کا احساس ہوا۔ چند قدم کا فاصلہ طے کر کے ساتھی ڈاکٹروں سے معذرت کرتا ہوا وہ سیدھا میری طرف بڑھا۔ ”گیارہ بجے آئی جی یہاں آئے گا۔“ دستی گھڑی پر طائرانہ نظر ڈال کے اُس نے تنبیہی لہجے میں کہا، ”وہ تم سے ملنا چاہتا ہے۔“

”مجھ سے!“ میں نے چونک کے کہا۔ ”اَب کیوں؟“

”یہ اُسی سے پوچھنا۔“ وہ بے اعتنائی سے بولا۔

”اَب کیا... اَب کیا ڈاکٹر صاحب؟“

”تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔“ اُس نے سرسری طور پر کہا، ”وقت پر اُس طرف آ جانا۔“ یہ حکم دیتے ہی وہ فوراً چل پڑا۔

میں نے پوچھنا چاہا کہ کس طرف، لیکن وہ مڑ چکا تھا۔ ظاہر ہے، اُس کی مراد اُس کا دفتر ہی ہوگی۔ اُسے بہت جلدی تھی، یا گورے ڈاکٹر کی ہمراہی کی وجہ سے وہ زیادہ بات نہیں کر سکا تھا، اور مجھ میں اُسے روک کے وضاحت طلب کرنے کی جرأت نہیں تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا، آئی جی کا مجھ سے ملاقات کا کیا مقصد ہو سکتا ہے، اَب کیا پھر کوئی اَور...

دس بج کر بیس منٹ ہو رہے تھے۔ گیارہ بجنے میں زیادہ وقت نہیں تھا۔ یہ مختصر وقت کاٹنا مشکل ہو گیا۔ ڈاکٹر حسبِ عادت مجھ سے انگریزی میں مخاطب ہوا تھا۔ آئی جی کا ذکر ایک ہی بار آیا تھا، لیکن زورا اور جامو کے کان بھی اُن کے دیدوں جیسے تھے۔ میری وحشت دیکھ کے کرید کرنے لگے۔ میں نے اُنھیں بتایا تو

تعاون

بھارت سے شائع ہونے والا ’پنجابی سماچار‘ اخبار دُنیا کے کئی ملکوں میں جاتا ہے جس میں افریقہ بھی شامل ہے ایک مرتبہ اِس اخبار کے مالک اور ایڈیٹر شری گل اخبار کی سرکولیشن میں اضافے کے لیے دورہ کرتے ہوئے افریقہ بھی گئے اور اپنے ایک عزیز کی معرفت سالانہ خریدار بناتے رہے۔ ایک روز ایک ہندستانی سکھ ٹھیکے دار سے سالانہ ڈھائی سَو رُپے چندہ وصول کر کے اُسے سالانہ خریدار بنایا اور ساتھ ہی یہ گزارش کی کہ اپنے کسی اَور واقف کار، دوست، عزیز، یار رشتے دار کو بھی سالانہ خریدار بننے پر آمادہ کر کے اُسے خریدار بنوا دیں، چناں چہ وہ اُنھیں ساتھ لے کر ایک اَور سکھ دوست کے گھر چلا گیا۔ وہاں جا کر اُس نے دروازے پر لگی گھنٹی بجائی اور ساتھ ہی زور سے آواز دے کر پکارا، ”اوئے نہل سنگھا! اوئے نہل سنگھا!“ گھنٹی اور پکار کی آواز سن کر نہل سنگھ فوراً اوپر کی کھڑکی میں آن کھڑا ہوا اور پوچھا، ”خیریت تو ہے؟ بہت جلدی میں لگتے ہو۔“ شیری گل کے ساتھی سردار نے گل صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ”دیکھو، گل جی آئے ہیں۔ ’پنجابی سماچار‘ اخبار کے ایڈیٹر ہیں۔ فوراً ڈھائی سَو رُپے لے کر نیچے آؤ اور اخبار کے سالانہ خریدار بن جاؤ۔“

نہل سنگھ نے وہیں کھڑے کھڑے اوپر ہی سے جواب دیا، ”مگر مجھے تو پنجابی پڑھنی نہیں آتی، میں پنجابی اخبار کا سالانہ خریدار بن کر کیا کروں گا؟“

”اِس کی تم فکر نہ کرو میرے یار! جہاں سے میں اپنا اخبار پڑھواتا ہوں، وہاں سے تمھارا اخبار بھی پڑھوا دیا کروں گا۔ بس تم جلدی سے ڈھائی سَو رُپے لے کر نیچے آ جاؤ، باقی فکر میری ہے، تمھاری نہیں۔“ گل جی کے سفارشی نے کھٹاک سے جواب دیا۔

’باتیں سکھ متروں کی‘ از افتخار مجاز ☆ مطالعہ: فرحت سپنا

وہ بھی مکدر ہوئے، حیران اور پریشان بھی۔

گیارہ بجنے میں آدھ گھنٹا باقی تھا۔ میں نے کمرے میں جا کے حلیہ درست کیا۔ بتھل بھی میرے ساتھ باہر آ گیا۔ زورا اور جامو کو تو معلوم تھا، بتھل سے کچھ کہے بغیر میں آہستہ قدموں سے چلتا ہوا راہ داری سے دُور ہو گیا۔ پولیس کی نفری موجود تھی، لیکن صرف اِن خاص کمروں کے حصے کے اطراف۔ چند منٹ بعد مرکزی عمارت آ گئی، اور سب سے پہلے چھاگلا سے مڈبھیڑ ہوئی۔ وہ میرے انتظار میں باہر ٹہل رہا تھا۔ اُسی نے مجھے ڈاکٹر کے کمرے میں پہنچایا اور بتایا کہ چند مریضوں سے نمٹ کے کسی بھی لمحے ڈاکٹر پہنچا چاہتا ہے۔ جی میں آیا، چھاگلا ہی سے کچھ معلوم کروں، لیکن اچھا نہیں لگا۔ مجھے صوفے پر بٹھا کے اور رسمی خیر خیریت پوچھ کے چھاگلا چلا گیا۔ میں گُنگ بیٹھا دیواری گھڑی دیکھتا رہا۔ وقت بھی کبھی کیسا بے حس ہو جاتا ہے۔

گھڑی نے گیارہ بجائے تھے، اور ابھی تین ہی منٹ اوپر ہوئے تھے کہ کمرے کے باہر وزنی جوتوں کی آہٹیں گونجیں۔ میں بے ارادہ اُٹھ گیا اور ارادتاً بیٹھ گیا، اور مجھے پھر کھڑا ہونا پڑا۔ پولیس کی یہ پابندیٔ وقت تعجب خیز تھی۔ وہ آئی جی ہی تھا۔ چھاگلا کی معیت میں تیزی سے کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کے ساتھ وہی دو افسر تھے جو پہلے بھی اُس کے ہم راہ آئے تھے۔ تینوں کا رُخ میری طرف ہو گیا۔ آئی جی میرے مقابل آ کے ٹھیر گیا اور اُس کی تیز چمکیلی نظریں میرے چہرے پر جم گئیں۔ پھر اُس نے فوجیانہ انداز میں ہاتھ بڑھایا۔ اُس کا مدعا سمجھنے میں مجھے دیر لگی، لیکن یہ بس چند لمحوں کا تردّد تھا۔ میں نے بھی بدحواسی سے اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھا دیا۔ اُس نے میرا ہاتھ زور سے جکڑ لیا اور جکڑے رہا۔ اُس دم مجھے ایسا لگا جیسے میرے جسم سے بندھی رسّیاں کھل گئی ہوں۔ اُس نے میرا حال پوچھا اور بتھل کا۔ میں نے ہکلاتی زبان میں اُس کا شکریہ ادا کرنا چاہا، اور مجھے نہیں معلوم، میں کچھ کہہ سکا بھی یا نہیں۔

”معذرت۔ میرے پاس وقت کم ہے۔ کل تم جا رہے ہو، تم سے ملاقات نہ ہوتی تو ایک خلش رہ جاتی۔“ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا، یہ کسی پولیس والے کا لہجہ ہے، مگر آئی جی ہی مجھ سے مخاطب تھا۔ کہنے لگا، ”افسوس ہے، زیادہ دیر نہیں ٹھیر سکتا۔ ابھی شہر کے حالات معمول پر نہیں آ سکے ہیں اور ہر طرف نگاہ رکھنی پڑ رہی ہے۔ ہم نے تمھارے بارے میں کلکتّا پولیس سے معلومات حاصل کی ہیں، یہ ضروری تھا، ہماری اپنی تسلّی اور یہاں کے پولیس رِکارڈ کی تکمیل کے لیے۔ تم سے لڑکپن کی عمر میں دو قتل ہوئے تھے؟“ میں نے حیرانی سے اُسے دیکھا تو وہ ہاتھ اُٹھا کے جلدی سے بولا، ”اور وجہ بھی معلوم ہوئی۔ کسی لڑکی کو وحشیوں سے بچانے کے لیے تم نے دو آدمیوں کو چاقو گھونپ دیے تھے۔ سات سال کی سزا کے دوران تم نے تعلیمی سلسلہ جاری رکھا اور ایم اے کی سند حاصل کی۔ تم جیل میں نہایت اچھے قیدی ثابت ہوئے... یہی پوچھنا... تم ظہیر خاں، بابر زماں خاں اور لاڈلے! تم کیسے حیران کُن نوجوان ہو۔ تم بتاؤ، تمھیں کس نام سے پکارا جائے۔“

”جو آپ کو بہتر لگے۔ میرے لیے سبھی ایک جیسے ہیں۔“ اِس اثنا میں مجھے اپنی سانسیں ہموار کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ میں نے ٹھیری ہوئی آواز میں کہا، ”آپ تو سب کچھ جان ہی گئے ہیں، جیل میں نام بدلنا مجبوری تھی۔ میرا خیال ہے، ناموں سے کچھ ایسا فرق نہیں پڑتا۔“

”بے شک، تم ٹھیک کہتے ہو۔“ وہ جوشیلے لہجے میں بولا، ”لیکن ہم یہ نہیں جان سکے کہ وہ لڑکی کون تھی؟ تم کہاں سے آئے تھے؟ اور یہ تم بتاؤ گے بھی نہیں۔“

میں خاموش رہا۔

”معلوم ہوا ہے کہ تم اڈّاگیری کے لیے ہر اعتبار سے مکمّل ہو، چاقو، بلم، لاٹھی، زور، ہر طرح سے لیس۔ تمھارے ہاتھ میں پھرتی ہے، نگاہ تیز ہے، ہوش مندی سے کسی کے سامنے آتے ہو، لیکن اڈّوں سے تمھاری وابستگی واجبی ہے۔ اڈّاگیری سے تمھیں کوئی دل چسپی نہیں۔ عرصے سے تم اپنے مربّی اُستاذ بتھل کے ساتھ مسلسل سفر میں رہتے ہو، کسی کی تلاش میں۔ ہو سکتا ہے، اُسی لڑکی کی تلاش میں... یا کسی اور کی۔ اطمینان رکھو، ہم تم سے پوچھیں گے نہیں۔ کلکتّے میں مقدمۂ قتل کے دوران بھی تم نے اُس لڑکی کا ذکر کرنا اور نام لینا گوارا نہیں کیا اور اپنا مقدمہ کم زور کر لیا۔“

میں ایک مضطرب نگاہ سے اُسے دیکھ کے رہ گیا۔

”بہ ہر حال، اِس وقت ہمارے یہاں آنے کا مقصد تمھیں اپنی معلومات سے متاثر کرنا نہیں، تمھارا اور ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کرنا تھا۔“ وہ سنجیدگی سے بولا، ”تمھاری وجہ سے ہم سُرخ رُو ہو سکے۔“

”میں کیا...“ میرا جسم سکڑ گیا۔ ”میں کہاں... شکریہ ضروری ہے تو اِس کے سزاوار ڈاکٹر صاحب ہیں۔“

”تم نے سچ بولا، ڈاکٹر صاحب سے اور ہم سے... بدترین حالات میں سچ بولا... کوئی افترا، مبالغہ نہیں... اور ڈاکٹر صاحب نے ہماری رہنمائی کی۔“

”مجھے نہیں معلوم، ڈاکٹر صاحب نے آپ کی کیا رہنمائی کی، لیکن میں سمجھتا ہوں، میں نے تو کچھ نہیں کیا۔ آپ سچ کی بات کر رہے ہیں۔ میرے پاس چارہ بھی کیا تھا۔“

”ڈاکٹر صاحب تو ہمارے لیے ایک دریافت ہیں، وہ انسان دوست، حق جُو، جہاں دیدہ اور بے باک شخص... اُن کی بصیرت اور حکمت کے تو ہم معترف ہیں۔ اُنھوں نے ہمارا اعتماد بحال کیا۔ یہ اُنھی کی دلیلوں کا کرشمہ تھا کہ ہم سے، جُرم کہو یا گناہ، سرزد ہوتے ہوتے رہ گیا۔ ہم تو تمھیں ساتھ لے جانے کے ارادے ہی سے آئے تھے، معلوم تھا کہ ڈاکٹر صاحب سے تمھارا کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن وہ تمھارے لیے دیوار بن گئے، اور اُن کی توانائی کا سبب تم تھے، تمھارا سچ۔ اُنھوں نے ہمیں قائل کیا، ہم پر زور دیا کہ پولیس کے روایتی طریقوں سے ہٹ کے کوئی اقدام کرنے کی جرأت کریں۔ اُنھوں نے ہمارے لیے ایک سمت مقرر کی، ورنہ ہم تو بھٹکتے رہتے۔ اپنی روش کے خلاف ہم نے اُن کی ہدایات آزمائیں، اور کسی قدر اپنی حدود سے بھی تجاوز کیا۔ میدا کو چھیڑنے کے بجائے ہم نے اُس کے چھوٹے بڑے ساتھیوں سے بازپُرس کی ابتدا کی۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمیں شہر کی پولیس بدل دینے کا مشورہ دیا تھا۔ ہمارے عزم کی پختگی کی وجہ ڈاکٹر صاحب ہی تھے۔“

ڈاکٹر رائے کی آمد سے آئی جی منتشر سا ہو گیا۔ میرے سامنے سے ہٹ کے اُس نے ڈاکٹر سے ہاتھ ملایا۔

”معافی چاہتا ہوں، کچھ دیر ہو گئی۔“ ڈاکٹر نے متانت سے کہا، ”ایک مریض کی حالت بہتر نہیں تھی... اور یہ کیا؟ آپ لوگ ابھی تک کھڑے ہیں۔“

”کریڈٹ کارڈ کے بڑھتے ہوئے استعمال نے مجھے فکرمند کر دیا ہے۔“

”آپ سے زیادہ وقت نہیں ہوا ڈاکٹر صاحب، اور کھڑے کھڑے ہی آنا تھا۔“ آئی جی نے تمام تر ادب سے کہا، ”آپ اندازہ کر سکتے ہیں، سرِ دست مصروفیت کا کیا عالم ہو گا۔ بس آپ دونوں کا شکریہ ادا کرنا تھا، آپ نے ہمارے لیے...“

ڈاکٹر نے اُسے روک دیا۔ ”چائے کا وقت تو دیجیے۔“

آئی جی نے معذرت کر لی۔ ”آپ سے تو ملاقاتیں رہیں گی ڈاکٹر صاحب... اگر آپ نے وقت دیا؟“ وہ لجاجت سے بولا، ”ہم نے تو آپ کا گھر دیکھ لیا ہے، اور مسائل تو پیش آتے رہیں گے۔ پھر وہ میری طرف مُنہ کر کے بولا، ”اصل میں اِس نوجوان کے پاس آنا ضروری تھا کہ اِسے کل چلے جانا ہے، اور اِس سے تو بہت سی باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔“

”یہ ایسا ہی ہے۔“ ڈاکٹر نے شگفتگی سے کہا، ”کتنی ہی بار ملاقات ہو، تشنگی کا احساس رہتا ہے۔“

میں نے سر جھکا لیا۔ میرے لیے یہ ایک حادثہ ہی تھا کہ ہمکتے ہوئے انداز میں آئی جی مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ ”ہمیں اب اجازت دو۔“ اُس کی آواز پر کوئی بار سا تھا۔

اُس کے ساتھی افسروں نے بھی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ میری تو کچھ عقل میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کہنا اور کس طرح اُنھیں رخصت کرنا چاہیے۔ اُنھیں واقعی جلدی تھی۔ کمرے سے نکل جانے میں اُنھوں نے کوئی لمحہ نہیں گنوایا، اُن کے پیچھے ڈاکٹر، پھر میں بھی باہر آ گیا۔

مرکزی عمارت کے پورچ میں موٹر کھڑی تھی۔ اُن کی رفتار تیز تھی، بالکل سپاہیانہ۔ اُن کا ساتھ دینے کے لیے

ڈاکٹر راے اور مجھے لپکنا پڑا۔ آئی جی موٹر میں بیٹھ گیا تھا کہ مجھے خیال آیا، میں نے ہاتھ اُٹھا کے اُس سے کچھ کہنا چاہا۔

اُس نے ڈرائیور کو موٹر بند کرنے کا حکم دیا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ وہ جھٹ موٹر سے اُتر آیا، اُس کے ساتھ دونوں افسر بھی۔ مذبذب لہجے میں اُس نے مجھ سے پوچھا، ''کوئی مسئلہ؟''

''ایک گزارش ہے۔'' میرا لہجہ عاجزانہ تھا۔ ''کیا یہ ممکن ہے کہ مجھے اکبر علی خاں صاحب کے گھر جانے کی اجازت مل جائے؟''

وہ فوراً کوئی جواب نہ دے سکا، ماتحتوں پر نظر کی، پھر ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

''نہیں، ممکن نہیں۔'' ڈاکٹر نے قطعی آواز میں دخل دیا۔

''ہاں، ڈاکٹر صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔ وہاں تو ہر وقت سوگ واروں کا ہجوم ہے، اور اُن میں طرح طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ بیگم کے چلے جانے پر تو وہ گھر بالکل اُجڑ گیا ہے۔'' آئی جی تأسف سے بولا، ''ہم نے تمھاری طرف سے سکندر علی خاں کو مطمئن کر دیا ہے کہ ہمی نے تمھارا راستہ روک رکھا ہے۔ اُس کی حالت بھی ٹھیک نہیں، تین چار روز اور یہاں رہے گا، پھر بچی کو ساتھ لے کے دکن چلا جائے گا۔''

میں چپ ہو گیا۔

''ہم تمھارا دُکھ، تمھاری خلش محسوس کر سکتے ہیں، اور ہم نے ہر زاویے سے غور کیا، کسی جگہ بھی ہمیں تمھارا دوش نظر نہیں آیا۔ تم سے ایک چوک ضرور ہوئی، اِسے چوک کہنا بھی چاہیے یا نہیں۔ ڈاک خانے میں میدا کا جیب کترا ساتھی تمھارا بٹوا لے کے بھاگ کھڑا ہوا تھا تو تم اُس پر خاک ڈال دیتے۔ پھر کچھ بھی نہ ہوتا۔ ہمیں یہ حقیقت بھی تسلیم ہے کہ تم جیسے نوجوان... اور شاید کسی کے لیے بھی خود کو قابو میں رکھنا مشکل تھا، تمھیں فطری طور پر اُس کا تعاقب کرنا چاہیے تھا... اور ہاں، ایک دوسری چوک، وہ بھی نادانستہ تھی کہ میدا کے ٹھکانے پر جا کے اُستاد بُھلّل کا نام تمھاری زبان پر نہ آ سکا۔ آ جاتا تو صورت بالکل مختلف ہوتی۔ میدا نہایت سفلہ اور چالاک آدمی تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ تم یوں ہی سینہ تان کے اُس کے سامنے نہیں آئے ہو گے۔ کاش، وہ تمھارے مقابل آ جاتا۔ ہمیں یقین ہے، پھر اُس کا کیا حشر ہوتا، لیکن بنیادی طور پر وہ اڈے کا آدمی نہیں تھا، بڑا کمینہ صفت، درندہ خصلت تھا وہ۔ ہمیں صدمہ ہے تو اکبر علی خاں کا۔ اُن کے گھر جا کے دل ڈوبنے لگتا ہے، بچّے دیکھ کے، سکندر علی خاں سے مل کے۔ بچّے تو ٹوٹ پھوٹ سے گئے ہیں، یہی حال اُن کے تایا کا ہے۔''

آئی جی کی آواز بھاری ہو گئی۔

ڈاکٹر نے اُس کی کمر پر ہاتھ رکھ کے موٹر کی طرف اشارہ کیا، اور موٹر جلد ہی دُور چلی گئی۔

میں نے اجازت چاہی تھی، لیکن ڈاکٹر راے مجھے ساتھ لے آیا اور کمرے میں آ کے دیر تک گُم سُم بیٹھا رہا۔ میرا کچھ پوچھنا یا ٹوکنا سُوءِ ادب ہوتا۔ لگتا تھا، مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے اور زبان کھولنے سے پہلے اپنے مدعا کی پیمائش کر رہا ہے، قدر و قیمت، اثری و بے اثری کا تخمینہ، یوں خالی الذہنی میں بھی کچھ یہی کیفیت ہوتی ہے، مگر ڈاکٹر جیسے ایک پُر مایہ شخص کے ذہن میں ہر وقت خیالوں کی یورش ہونی چاہیے۔ آتے وقت وہ خدمت گار سے چائے کے لیے کہہ آیا تھا۔ چند منٹ بعد چائے آ گئی اور ڈاکٹر میز والی کرسی سے اُٹھ کے صوفے پر میرے پاس آ بیٹھا۔ خدمت گار چائے بنا کے چلا گیا تو چند گھونٹ لے کے اُس نے بتایا کہ اُس کا معاون چھاگلا ہمارے جانے تک مسلسل ہمارے رابطے میں رہے گا۔ چھاگلا نے گرانڈ ہوٹل سے ہمارا بقایا سامان لینے اور ہوٹل کا حساب چُکتا کرنے کے لیے اپنا ایک خاص کارندہ بھیج دیا ہے۔ توقع ہے کہ ہوٹل کا مینیجر ہوٹل میں رکھی ہوئی میری نقد رقم حوالے کرنے اور رسید لینے خود آئے گا۔ قبل از وقت ہمارے لیے ریل کے ٹکٹوں اور ڈبے میں جگہ کی فراہمی کے لیے بھی چھاگلا ہی سے کہا جائے۔

اُس نے میرے آگے نمکین بسکٹوں کی تشتری رکھ دی اور ستائے انداز میں بولا، ''تم لوگ کلکتے جا رہے ہو یا فیض آباد؟''

''میری خواہش تو فیض آباد جانے کی ہے، وہاں گھر ہے۔ بُھلّل بھائی کو کچھ دن آرام کرنا چاہیے۔''

''وہ اب بالکل ٹھیک ہے، دماغ پر سُوجن نہیں۔ اُس کی اتنی فکر مت کرو۔''

''لیکن ابھی آرام تو بہتر ہی رہے گا۔''

اُس نے ہنکاری بھری اور کچھ توقف کے بعد آہستگی سے بولا، ''رات کو آ رہے ہو؟ بینا کہہ رہی تھی، کچھ پہلے آ جانا۔''

''جی...'' میری آواز ڈگمگا گئی۔

''اور کہہ رہی تھی، کچھ خاص پسند ہو تو پوچھ لوں۔''

''کیا ڈاکٹر صاحب!'' میں نے کھسیانی آواز میں کہا، ''آپ کے ہاں تو بھی کچھ کسی نعمت کے مانند ہے، لیکن...''

وہ صوفے پر سیدھا ہو گیا۔ ''لیکن کیا؟''

میں نے بہ مشکل کہا، ''مجھے معاف کیجیے۔ مت بلایے مجھے۔''

''کیا... کیا بات ہے؟''

''غالباً میرا گھر نہ آنا ہی بہتر رہے گا۔''

اُس کے ہونٹ کُھل گئے، آنکھیں بھنچ گئیں۔

''آپ نے غور نہیں کیا ڈاکٹر صاحب!'' میں نے بساط بھر انکسار سے کہا، ''اجازت ہو تو جسارت کروں؟''

''ہاں ہاں، کہو، کیا کہنا چاہتے ہو۔''

''آپ نے اُس رات مجھے گھر سے رخصت کرتے ہوئے ایک بات کہی تھی۔ ہو سکتا ہے، آپ نے یوں ہی اپنا ایک خیال ظاہر کر دیا ہو، لیکن مجھے اپنی سماعت پر شبہ ہوتا رہا۔ میں آپ کو کیا بتاؤں، وہ رات کیسی بے چینی سے گزری۔ آپ نے مجھے کیسے مرتبے سے نوازنے کی دریا دلی کی تھی۔ ایک ایسے شخص کے لیے، جس سے آپ کا واسطہ چند روزہ تھا، یہ کیسی وسیع القلبی اور روشن خیالی ہے۔ میں اِس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اُس وقت میں آپ سے کچھ نہ کہہ پایا کہ جو میں نے سُنا ہے، واقعی آپ نے کہا ہے، مجھے تو کسی خواب کا گمان ہوتا تھا، اور میں آپ سے کہہ بھی کیا پاتا۔ شاید آپ کو یاد ہو، میں نے آپ کو پہلے ہی بتایا تھا کہ کوئی مجھ سے بچھڑ گیا ہے۔ روز لوگ ایک دوسرے سے بچھڑ جاتے ہیں، مگر کوئی رگِ جاں ہوتا ہے، حاجِ جاں۔ اُس کے بغیر آدمی ادھورا رہ جاتا ہے۔ مجھے، میری منزل مجھ سے کھو گئی ہے۔ عرصہ ہو گیا، میرا کام شہر شہر، گلی کوچے اُسے ڈھونڈنا رہ گیا ہے، میری وجہ سے میرا آباد گھر ویران ہو گیا، ماں بیٹے کی جدائی میں سو گئی، بہن بھی کوٹھے پر چلی گئی، اور وہ بھی مر گئی۔ پر اَب پھر سے ایک گھر جُڑ گیا ہے، باپ بہنیں اور بھائی ہیں... اور ایک گھر نہیں... دو دو گھر... لیکن میرا تو کوئی بھی

چند پندِ سُود مند

❁ انسان جتنی محنت خامی چھپانے میں صَرف کرتا ہے، اُتنی محنت میں وہ خامی دُور کی جا سکتی ہے۔

❁ اپنی اولاد کو ہم بہت کچھ سمجھانا چاہتے ہیں، لیکن وہ نہیں سمجھتی۔ ہماری اولاد بھی ہمیں بہت کچھ سمجھانا چاہتی ہے، لیکن ہم نہیں سمجھتے۔

❁ کچھ لوگ زندگی میں مردہ ہوتے ہیں اور کچھ لوگ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔

(فرمودات: واصف علی واصف ❁ تعاون: رانا احمد سعید خاں)

گھر نہیں ہے۔ گھر تو گھر میں رہنے سے ہوتا ہے، مجھے اپنے گھر میں رہنے کی سعادت اور مسرت عرصے سے نصیب نہیں ہے کہ میرا کہیں جی نہیں لگتا۔ میں تو کب سے دربدر ہوں۔''

ڈاکٹر بے حس و حرکت آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔

میں نے اُس سے کہا کہ اُس کی بیٹی بینا تو قدرت کے کسی شاہکار کے مانند ہے، ایک بے پناہ لڑکی۔ جس پہلو سے دیکھیے، حُسن و جمال میں یکتا، باطنی صفات میں بہ درجۂ کمال۔ علم، ہنر، سلیقہ، فکر اور رفتار گفتار میں ایک مثال۔ کسی میں اتنی خوبیاں شاذ و نادر ہی یک جا ہو پاتی ہیں۔ اِس پر مستزاد، وہ کس صاحبِ کمال کی بیٹی ہے، ایک مسیحا نفس، فرشتہ خصلت باپ کی۔ کون ناہنجار اُس سے نسبت کا خواہاں نہ ہو گا۔ وہ تو کوئی بدبخت ہی ہو گا۔

''بس کرو۔'' میرے ہاتھ پر زور ڈال کے ڈاکٹر کسی قدر ناراضی سے بولا، ''اِتنا مت کہو۔''

''مجھے کہنے دیجیے۔'' میری آواز کی سوزش اختیاری نہیں تھی۔ میں نے کہا، ''مجھے اندازہ ہے، آپ نے اپنی بیٹی کا عندیہ جانے، یا محسوس کیے بغیر اِتنی بڑی، اِتنی اہم بات مُنہ سے نہ نکالی ہو گی۔ اِس کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے، کوئی دوسرا نہیں۔ کوئی دوسرا تو کوئی نامراد ہی دے سکتا ہے۔''

میں نے کہا، ''رات بھر کے کرب و انتشار کے بعد میں پُرسکون ہو گیا۔ یوں کہیے کہ میں جو آپ کی داد و دہش کے سحر میں اپنا ارادہ کھو بیٹھا تھا، مجھے بازیاب ہو گیا۔ میں نے طے کیا کہ ڈاکٹر راے جیسے زندگی شناس اور زمانہ آشنا سے بات کرنا

ایسا مشکل نہیں۔ میں نے یہ طے کرلیا تھا کہ آپ کے سامنے سارا احوال آئینہ کردوں گا، لیکن آپ کا سامنا ہونے پر ہمت جواب دے جاتی تھی۔ ایک نہایت نازک خیال آدمی کے شیشۂ احساس پر ٹھیس لگ جانے کا اندیشہ گھیر لیتا تھا۔"

وہ مسکرانے لگا اور میرے ہاتھ پر مکا مارتے ہوئے بولا، "وحشت! کیسی باتیں کرتے ہو۔ مجھے تو تمھارا جواب اُسی وقت مل گیا تھا جب تم کوئی جواب نہ دے پائے تھے۔ میں نے ایک خواہش ظاہر کی تھی۔ اِس کا مطلب حکم نہیں تھا۔ بینا کے علاوہ کچھ تمھارا خیال بھی تھا کہ تم اپنے دیگر پس منظر کے باوجود ایک لائق، تعلیم یافتہ، سلیم الطبع، پُر جوش اور جرأت مند نوجوان ہو۔ تم میں بہ قولِ شخصے، سایہ اور ستون بننے کی صلاحیت ہے۔ تمھیں تو کہیں اور ہونا چاہیے۔ خیال تھا، عرصے سے تم کسی سراب کے تعاقب میں ہو تو کچھ زندگی کی طرف بھی دیکھو، زندگی کو زندگی کی طرح برتو۔ یہ اِتنی محدود نہیں ہے، اور تم سے تم تک اور تمھاری کسی معتین منزل تک نہیں ہے۔ بے شک میری تجویز میں بینا کی پسندیدگی شامل تھی، لیکن کیا ضروری ہے کہ تم، بہ ہر حال، مجھ سے متفق ہو، اور کیا ضروری ہے کہ کسی ربط وارتباط کے لیے کوئی ایک مخصوص رشتہ ہی بنیاد بنے۔ تم نے یہ کیوں سمجھ لیا کہ تمھارے پاس مثبت جواب نہیں ہے تو تم کسی احسان فراموشی، محسن کُشی کے مرتکب ہو جاؤ گے۔ میرا تم پر کوئی حق نہیں ہے، اور نہ ہی بینا پر۔ تم بھی ایک اکائی ہو، بینا بھی۔ تمھاری طرح بینا کی بھی ایک ذات ہے۔ اُسے یا تمھیں مشورہ تو دیا جا سکتا ہے، لیکن اپنی خواہش مسلط کرنا انسب نہیں۔ رشتوں میں حق کی بات شدومد سے کی جاتی ہے۔ یہ حق بڑا مبہم لفظ ہے۔ اِس کی پیمائش کسی کو نہیں معلوم۔ حق سے مراد کوئی ضابطہ، قاعدہ، قانون اور روایت ہے، لیکن رشتے تو تعلقِ خاطر سے استوار ہوتے ہیں۔ کون کس سے کتنا مانوس ہے، کسے کون کتنا مرغوب ہے۔ شیدائیت حق پر نہیں، خود رَو ہونی چاہیے، از خود رفتہ۔ بینا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے انگلستان سے اِس لیے آ گئی کہ اُس کا باپ اکیلا ہے اور اُسے اپنے باپ کی خدمت کرنی چاہیے۔ نہیں، قطعاً نہیں۔ وہ اِس لیے یہاں نہیں آئی کہ میں اُس کا باپ ہوں۔ وہ اِس لیے آئی کہ وہ ایک شخص سے محبت کرتی ہے جو اتفاق سے

اُس کا باپ بھی ہے۔ اُس نے میری اپنی چاہتوں میں ایک وقت گزارا ہے۔ میرے بیٹے نہیں آئے، اور مجھے اُن سے کوئی شکایت نہیں۔ بینا نہیں آتی تو مجھے اُس سے بھی کوئی شکوہ نہ ہوتا۔ ذمّے داری، یا ایک روایتی لفظ، فرض کی ادائی سے حق کا جواز نہیں بنتا۔ میں نے، ہر چند، ایک باپ کی حیثیت سے اپنی ذمّے داری پوری کرنے کی کوشش کی ہے۔ فرض کی ادائی اور ذمّے داری کی تکمیل کسی مبادلے، معاوضے، یا حق سے مشروط نہیں کرنی چاہیے۔ سمجھے!" یکا یک اُس نے سر جھٹکا اور خود کو سرزنش کرنے لگا۔ "میں تو بھٹک گیا۔ یہ میں کہاں سے کہاں چلا گیا... میں تم سے کیا کہنا چاہتا تھا۔" وہ اُلجھ کے بولا۔

"آپ بالکل نہیں بہکے اور بھٹکے۔" میں نے ستائشی لہجے میں کہا، "آپ کیسی زندگی آموز باتیں کر رہے ہیں۔"

"میں تمھاری وضاحتوں پر ٹوک رہا تھا اور خود... میں واقعی بوڑھا ہو گیا ہوں۔" اُس نے چند لمحے تامّل کیا۔ حلق میں باقی چائے انڈیل کے وہ نسبتاً پُر سکون آواز میں بولا، "بینا ایک معاملہ فہم اور ہوش مند لڑکی ہے۔ وہ ایسی جذباتی نہیں، عمر چاہے کیسی ہی جذباتی ہو۔ پڑھا لکھا آدمی دلیلیں ڈھونڈ لیتا ہے، یا یوں کہو، دلیلوں میں اُسے پناہ مل جاتی ہے۔

مجھے احساس ہے، میری ایک دُور دراز خواہش کا اظہار تمھارے لیے بہت غیر متوقع ہوگا، اور یقیناً تم نے ایک مشکل وقت گزارا ہوگا۔ خصوصاً اِس صورتِ حال میں کہ تم اپنے ماضی کی کسی گرہ میں بندھے ہوئے ہو، مگر میرے خیال میں یہ کچھ ایسی ناروائی بھی نہیں تھی۔ جب تم گھر آئے تو دونوں ہی میرے سامنے تھے، تمھیں دیکھ کے، تم سے مل کے جانے کتنے زمانوں بعد بینا اپنے اصل روپ میں نظر آئی۔ میری نگاہ سے اگر کوئی لغزش نہیں ہوئی تو تم بھی مجھے خاصے مختلف دکھائی دیے، جیسے نیا ماحول اور نیا منظر تمھارے لیے دل کشی، راحت وسکون کا باعث بنا ہے۔ تم نے بڑی فکر آفریں اور دل نشیں باتیں کیں، اُس رات کچھ دیر کے لیے سہی، مگر تم دونوں کے چہروں پر چمکتی چاندنی کا میں نے نظارہ کیا تھا اور محظوظ ہوا تھا۔ میں تمھیں بتاؤں، میں جانتا ہوں اچھی طرح، میرے سامنے آ کے وہ شعبدے باز بڑی وارفتگی اور سرخوشی کا تماشا کرتی ہے مگر اُس رات واقعی اُس کی

آنکھوں کی تابانی دیدنی تھی، ارادی نہیں، بے ساختہ۔ کتنے آئے اور چلے گئے۔ اُس نے سنگ دلی سے اُنھیں نظر انداز کر دیا۔ وہ ایک مہم جو لڑکی ہے، کج فہم، کم اِرادہ اور کم حوصلہ نہیں۔ وہ خاصی متحمل مزاج ہے، موسموں کے سرد و گرم سے آشنا۔ میں سمجھتا ہوں، تمھارے گھر آنے میں کوئی حرج نہیں۔ وہ خوش ہوگی، اور میں تو بس اُسے خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ اُس کی عمر تو زندگی بسر کرنے کی ہے، اور میں تو بہت کچھ اُسی کے لیے قائم ہوں۔"

"میں آ جاؤں گا، آپ کے حکم سے سرتابی کی مجال مجھ میں نہیں ہے۔" میں نے تمام تر ادب اور احترام سے کہا۔ "جو میں کہنا چاہتا تھا، شاید اُس کے بیان پر قادر نہیں، لیکن آپ نے خود ہی میرے گریز اور امتناع کے اسباب کی نشاں دہی کر دی ہے۔ بے شک اُس رات میرے گھر آنے پہ آپ کا مشاہدہ عین واقعہ ہے۔ وہاں جا کے مجھے ایسا لگا جیسے میں تو کسی طلسم کدے میں آ گیا ہوں، کسی چمن زار میں، نہیں تو روشنیوں میں آ گیا ہوں، مجھ پر تو ساتواں دَر وا ہو گیا ہے، اور چراغ میری دست رَس میں ہے۔ بس ذرا ہاتھ بڑھانے کی دیر ہے۔ میں تو وہاں جا کے خود کو بھول گیا تھا، اور میں تو کوئی اَور آدمی ہو گیا تھا، اور جب آپ نے یہ کہا کہ یہ سارا آئینہ خانہ، یہ رنگ اور روشنیاں، اور یہ گلستان تمھارا ہو سکتا ہے تو میری حالت اُس پس ماندہ، درماندہ، اُس قسمت گزیدہ کی سی ہوئی جس پر قدرت اچانک مہربان ہو جائے۔ لیکن جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا، رات بھر کے گرداب اور ہیجان کے بعد میں، بہ ہر حال، اپنے پاس واپس آ گیا تھا۔ آپ نے بینا کے تحمّل کی بات کی ہے، اور حوصلہ مندی کی، مگر آپ نے میرے لیے نہیں سوچا۔ وہ کتنی ہی مضبوط اعصاب کی ہو، لیکن میرا بھی تو کچھ خیال کیجیے۔ میں تو اپنی بات کر رہا ہوں۔ میں جو اپنے آپ سے ہراساں ہوں۔ نقش جمنے کے لیے وقت کی کوئی شرط نہیں ہوتی۔ ایک لمحہ بھی نقش ہو جاتا ہے اور جزوِ جاں بن جاتا ہے۔ وہ دریچے ہی کیوں کھولے جائیں، جن کے پار کسی مطلوب کے گزرنے کا امکان ہو اور مطلوب کو بھی تو کسی گرہ سے مبرّا ہونا چاہیے، اور مطلوب کو بھی تو کوئی مطلوب ہو سکتا ہے۔ آپ نے ایک زندگی کے تجربے کیے ہیں، ایک منطق ماورائے عقل کی بھی ہوتی ہے،

شوق کی، خود فراموشی کی، خود شکنی کی، ہر عمر اور ہر فرد میں، جس کا درجہ اور پیمانہ مختلف ہوتا ہے۔ آدمی صرف سر ہی نہیں ہوتا، سر کے نیچے بھی بہت کچھ ہوتا ہے، بہت سمندر، آگ اور شور اُٹھائے اور چھپائے ہوئے۔ دو اور دو پانچ کے آپ بھی قائل نظر آتے ہیں، لیکن کبھی حاصل جمع چھ، سات، دس اور بے شمار بھی ہوتا ہے۔ باہم آمادگیاں ہوں تو کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں، دیے خود بہ خود روشن ہو جاتے ہیں۔ وہ نازک اندام، کانچ کا جس کا سراپا ہے، دل بھی اُس کا کانچ کا ہونا چاہیے۔ وہ تو ویسے بھی ایک مصوّر ہے، خوابوں اور خیالوں میں بسنے، رنگوں اور سازوں سے کھیلنے والی لڑکی۔ اُسے کیوں کسی آزمائش سے دوچار کیا جائے... اور میں بھی دو آدمی نہیں ہوں ڈاکٹر صاحب! میں اپنی منزل سے بچھڑ گیا تو میں خود سے نہ بچھڑ جاؤں اور پشیمانی اور پس پائی کے کسی احساس میں تا دیر شاید باقی نہ رہوں۔ مجھے تو آخر دم تک اُسے ڈھونڈنا ہے۔ میرا دل کہتا ہے، وہ میری منتظر ہے، وہ بھی کسی آسرے، کسی یقین میں زندہ ہے۔"

ڈاکٹر راے صوفے سے اُٹھ گیا۔ میں بھی کھڑا ہو گیا۔ اُس نے غور سے میری طرف دیکھا، اور دیکھتا رہا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جھلکنے لگی۔ اُس کی آنکھیں بھی چمک رہی تھیں۔ اُس نے بازو پھیلا دیے، میں بھی اُس کے سینے سے جا لگا۔

❄ میرے پیچھے اُنھوں نے سارا کچھ طے کر لیا تھا۔ یہ ڈاکٹر راے کا دیا ہوا اعتماد ہی ہوگا کہ مغل نے فیض آباد جانے سے انکار کر دیا تھا۔ کمرے میں میرے پہنچنے کے چند منٹ بعد زورا اشارے سے مجھے باہر لے آیا، اور اُس نے ایکی، سیورین، جامو، مغل اور اپنے درمیان ہونے والے فیصلے سے آگاہ کیا۔

اُس کے کہنے کے مطابق، سیورین ہمارے ساتھ نہیں جارہی تھی۔ وہ تو ساتھ جانے ہی پر مُصر تھی، لیکن یہ کسی طور مناسب نہیں تھا۔ جُھنگل کی تاکید پر مان گئی، اور طے یہ ہوا کہ ہمارے چلے جانے کے بعد وہ لمبی چھٹی کے لیے درخواست دے گی، آبائی گھر ساتھ رہنے والی آنٹی کی تحویل میں دینے کے لیے قانونی دستاویز، مختار نامہ وغیرہ تیار کرائے گی، کلکتے میں زورا اور جامو سے خط اور تار کے ذریعے اُس کا رابطہ مستقل رہے گا، اپنے ضروری کاموں سے نمٹ کے وہ جامو اور زورا کو مطلع کردے گی۔ دونوں معیّنہ تاریخ اور وقت پر جس گاڑی سے پٹنا اسٹیشن آئیں گے، سیورین اسٹیشن پر اُن کی منتظر ہوگی اور اُسی گاڑی سے اُن کے ساتھ فیض آباد روانہ ہوجائے گی۔ جامو اور زورا پٹنا شہر میں داخل نہیں ہوں گے۔ دس بارہ یا بیس منٹ جتنی دیر گاڑی اسٹیشن پر رُکتی ہے، اُتنے ہی وقت کے لیے وہ برائے نام پٹنے میں رہیں گے۔

میں نے خاموشی سے سن لیا اور کچھ نہیں کہا۔ سیورین سامنے آئی تو رخسار دمک رہے تھے، بل کہ کرنیں سی پھوٹ رہی تھیں۔ کچھ شرمائی شرمائی اور ہلکی پھلکی بھی لگ رہی تھی۔ مجھے بھی اپنا چہرہ شکنوں سے عاری رکھنا چاہیے تھا کہ اب میرے انگلی اُٹھانے اور مآل اندیشی میں پڑنے کا وقت گزر چکا تھا۔

کوئی ایک بجے کے قریب چھاگلا، گرانڈ ہوٹل کے منیجر اور اُس کے دو کارندوں کے ہم راہ راہ داری میں آتا دکھائی دیا۔ ہم سب باہر ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ منیجر حساب کتاب اور ہوٹل میں رکھا ہمارا مختصر سامان بھی ساتھ لایا تھا۔ بیس ہزار رُپے کی رقم، جو میں نے اُس کے پاس بہ طورِ امانت رکھوائی تھی، اُس نے واپس کردی اور چھاگلا کے دست خطوں کی گواہی کے بعد مجھ سے رسید لکھوالی۔ منیجر افسوس کررہا تھا کہ ایک رات بھی ہم ہوٹل میں قیام نہ کرسکے۔ پہلے دن صرف ایک سوا گھنٹے کے لیے غسل اور لباس کی تبدیلی کے لیے میں نے کمرا استعمال کیا تھا اور ہمیں ایک بڑی رقم ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ میں نے کوئی درخواست نہیں کی تھی، لیکن انتظامیہ نے از خود تھوڑی بہت رعایت کردی تھی۔

دوپہر کو سیورین نے اسپتال کے طعام خانے سے کھانے کا انتظام کردیا تھا۔ بھوک ایسی تھی بھی نہیں، لیکن صبح، دوپہر، رات کھانے کی رسم کی تکمیل بھی تو واجب ہے۔ دوپہر کو ڈاکٹر رائے

جُھنگل کو دیکھنے نہیں آیا۔ اُس کے بجائے ایک اُدھیڑ ڈاکٹر نے خانہ پُری کے انداز میں دورہ کیا اور چند منٹ کے معائنے کے بعد جُھنگل کو سکون و عافیت کی نوید دیتا چلا گیا۔

چھاگلا کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ پولیس نے اڈّے کے بہت سے آدمی رہا کردیے ہیں اور میدا کی میت اُن کے حوالے کردی گئی ہے کہ اُنھی کے ہاتھوں اُس کی آخری رسوم انجام پائیں۔ چھاگلا بتا رہا تھا کہ صبح اِکّا دُکّا دکانیں کھلی تھیں، لیکن اڈّے کے آدمیوں کی رہائی اور اُنھیں میدا کی میت کی تحویل کی خبر سن کے لوگوں نے خود کو گھروں تک محدود کرلیا ہے۔ سارا شہر بند ہے، سڑکوں پر سناٹا ہے اور زیادہ تر پولیس اور افواہیں گشت کررہی ہیں۔ چھاگلا آج کسی ذاتی ملازم کی طرح ہماری خدمت پر مامور تھا۔ ٹکٹوں کی خریداری کے لیے اُس نے اپنا معاون اسٹیشن بھیج دیا تھا۔ شام تک اسپتال کے واجبات بھی ادا ہوگئے۔

شام کی چائے کا اہتمام چھاگلا کی طرف سے کیا گیا تھا۔ جس کمرے میں جامو اور زورا نے شب بسری کی تھی، وہیں میز لگادی گئی تھی۔ چاٹ پکوڑے، دہی بڑے، قسم قسم کے انگریزی بسکٹ اور چائے کی کیتلی، ڈونگوں اور تشتریوں سے میز سجی ہوئی تھی۔ ہمارے اصرار کے باوجود چھاگلا ساتھ نہیں بیٹھا اور ہوٹل کے پیشہ ور خدمت گاروں کی طرح ہمارے آگے چیزیں پیش کرتا رہا۔ سیورین اور اسپتال کے دو ایک کارندے بھی اُس کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ سورج غروب ہونے سے پہلے امّی آگئی تھی اور لباس کی تبدیلی کے باوجود سیورین ٹھیری رہی۔

اندھیرا گہرا ہوگیا تھا اور آہستہ آہستہ رات حاوی آگئی تھی۔ سبھی ڈاکٹر رائے کے منتظر تھے۔ وہ نہیں آیا۔ جیسے جیسے وقت بڑھتا گیا، مجھے تشویش ہونے لگی۔ ایک ہی پہر کی تو بات تھی، کل صبح ہمیں چلے جانا ہے۔ ڈاکٹر کو آنا چاہیے تھا۔ کہیں گھر جا کے اُس نے میری عرض داشت پر نظرِ ثانی تو نہیں کی۔ گھر جا کے اُس کا سامنا بینا سے ہوا ہوگا۔ ڈاکٹر اُس سے کیا کہہ پایا ہوگا۔ وہ کتنا ہی بیٹی سے سچ بولتا ہو، میرے عذر رجّوں کے ٹوں نقل نہ کرسکے گا، پھر بینا کیا مطمئن ہوسکے گی۔ ڈھندلے عذر ذہین آدمی کو اور مضطرب کردیتے ہیں۔ مجھے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ جامو اور زورا میرے ساتھ تھے اور ہم راہ داری میں

ٹہلتے ہوئے ڈاکٹر رائے کی راہ تک رہے تھے۔ ساڑھے نو بجے ہوں گے کہ ایک نوجوان ڈاکٹر کی آمد سے صاف ہوگیا کہ ڈاکٹر رائے اب نہیں آئے گا۔ ڈاکٹر نِل بیر پہلے بھی کئی بار آچکا تھا، کچھ کھلنڈرا اور بے پروا قسم کا نوجوان تھا۔ یہ اُس کی شوخی ہی تھی کہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا، واپس ہوتے وقت اُس نے منکشف کیا کہ ڈاکٹر رائے گھر پر کسی مصروفیت کی وجہ سے اِس وقت نہ آسکے، اُنھوں نے معذرت کی ہے اور کہا ہے کہ صبح وہ جلد ہی یہاں پہنچیں گے۔ جی میں آیا، ڈاکٹر نِل بیر کو طمانچا رسید کروں کہ وہ یہ بات پہلے بھی بتا سکتا تھا، لیکن ہاتھ ملتا رہ گیا۔ آخری دن مجھے کوئی غلط تاثر قائم نہیں کرنا چاہیے تھا۔

دس بجے تک سیورین ٹھیری ہوئی تھی۔ بہ مشکل گھر جانے پر آمادہ ہوئی۔ اُس کے جاتے وقت مجھے یاد آیا کہ میں نے انتونی کے خاندان اور اُس کی بیوی کی اعانت کے لیے سیورین سے کچھ کہا تھا۔ سیورین نے مجھے یاد نہیں دلایا تو اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اِسے کوئی رعایت جانوں۔ ہوٹل سے آنے والے سامان میں چیک بک بھی موجود تھی۔ صبح وقت نہ ملے، اِس لیے میں نے سیورین کو روک لیا اور پوچھا کہ انتونی کے خاندان کے لیے کتنی رقم کا چیک کاٹنا مناسب ہوگا۔ اُس نے بتایا کہ شہر کی عیسائی مشنری اپنے لوگوں کا خیال رکھتی ہے۔ اُس نے شیری کی کفالت کے لیے ماہانہ وظیفہ مقرر کردیا ہے۔ شیری کی حالت بہت خراب ہے۔ اُسے تو اپنا ہی ہوش نہیں۔ خدا ہی اُسے زندگی لوٹا سکتا ہے۔ میں نے لاکھ رُپے کا چیک کاٹنے کی بات کی تو سیورین گُم سُم سی ہوگئی۔ میں نے کچھ اَور سمجھا اور پوچھا کہ کم ہو تو اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ کہنے لگی کہ اِس سے نصف بھی بڑی رقم ہوگی، لیکن ابھی تو وہ یہیں ہے، اِسی شہر میں۔ آنے والے دنوں میں صورتِ حال دیکھ کے وہ مجھے مطلع کردے گی۔ میں نے اُس سے کہا بھی کہ مجھے رُپے پیسے کی کوئی کمی نہیں ہے اور نہ ایسی ضرورت پڑتی ہے۔ پچاس ہزار کا چیک میں لکھے دیتا ہوں۔ اِسے سیورین پاس رکھے۔ چیک میں کوئی نام مندرج نہیں ہوگا۔ سیورین جسے مناسب سمجھے، اُسی کا نام لکھ دے، عیسائی مشنری کا نام بھی لکھا جاسکتا ہے۔ سیورین تیار نہیں ہوئی۔ بحث کا وقت نہیں تھا۔ اُسے بہت دیر ہوگئی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ آج کی

پشتو کہاوتیں

- غریب کو لحاف نہیں ملتا تھا، جب مل گیا تو وہ پہر تک اُس میں لیٹا رہا۔
- غریب کو کمبل نہیں ملتا تھا، جب مل گیا تو کہنے لگا، یہ بارہ گز کا نہیں ہے۔
- جو سوئیں گے، وہ خواب بھی دیکھیں گے۔
- بادشاہ کی شال، دھوبی کی دھوتی۔
- ننگے کو بھیگنے کا کیا ڈر۔
- بجلی کی چمک میں کس نے سوئی میں دھاگا ڈالا ہے۔
- چمار کا گھر ویسے بھی گندا تھا، اوپر سے مینہ بھی برسا۔
- گدھے کی دُم، جس طرف سے بھی ناپو ایک برابر۔
- پت جھڑ میں پتے بغیر ہوا کے گرتے ہیں۔
- بدنصیبوں کا حصہ بھی تھوڑا ہوتا ہے۔
- جوانی کی بے کاری، بڑھاپے کا روگ۔

انتخاب: رفیق احمد نقش

رات وہ شاید سو بھی نہ پائے، میرے کہنے کا کچھ حاصل بھی نہیں تھا۔ کیوں کہ اَب مجھی سے اُس کا واسطہ نہیں تھا، جامو بھائی اور زورا بھائی اور جُھنگل بابا بھی اُس کے نگہدار تھے۔

رات کو دیر تک ہم باہر ہی بیٹھے رہے۔ آسمان صاف تھا اور گذشتہ رات کی مسلسل بارش سے خنکی ہوگئی تھی۔ نیند ہی نہیں آرہی تھی۔ دیر رات گئے جُھنگل کے کسمسانے پر وہ اُٹھے۔ جامو اور زورا اُسی کمرے میں چلے گئے جہاں اُنھوں نے کل رات بسیرا کیا تھا۔ میں اپنے کمرے میں آگیا۔ بستر پر لیٹتے ہی جُھنگل کی آنکھ لگ گئی۔ میں اور امّی چپکے چپکے باتیں کرتے رہے۔ پھر امّی کی خواہش پر میں بھی بستر پر آگیا۔ وہ بہت آزردہ تھی۔ ہلکے ہلکے ہاتھوں سے میرا سر دباتی اور بالوں میں اُنگلیاں پھیرتی رہی۔ اُس کی انگلیوں میں امّی جیسی لپک تھی اور اتنی ہی نرمی۔ جانے کس وقت مجھے نیند آگئی، یا امّی نے مجھے سُلا دیا۔

ساڑھے گیارہ بجے دلّی سے آنے والی گاڑی پٹنا اسٹیشن آتی تھی۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ ساڑھے دس سے پہلے اسپتال سے روانہ ہوجانا چاہیے تھا۔ سفر درپیش ہو تو نیند بھی اُچٹتی ہوئی

آتی ہے۔ کسی کو جگانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ سبھی صبح سویرے اُٹھ گئے، اور آٹھ بجے سے پہلے سیورین بھی آ گئی۔ ناشتے کے سامان کے علاوہ اُس کے پیچھے آنے والے خدمت گار کے ہاتھ میں مطبخی (ٹفن کیریر) بھی تھی۔ یہ مطبخی زریں نے فیض آباد سے چلتے وقت ہمارے سپرد کی تھی اور کل دوپہر ہوٹل میں رکھے سامان میں واپس آ گئی تھی۔ سیورین تو اسے دیکھ کے نہال ہوگئی، کسی سے پوچھے بغیر ساتھ لے گئی اور اَب یقیناً بھر کے لائی ہوگی، حالاں کہ سفر اِتنا طویل نہیں تھا۔ پٹنے سے کلکتے کا فاصلہ تین سو میل کے قریب ہے، زیادہ سے زیادہ بارہ گھنٹے کا سفر۔

کسی بھی وقت ڈاکٹر رائے کی آمد کے اندیشے میں سیورین نے اُسی کمرے میں ناشتا لگوا دیا جہاں کل چھاگلا نے شام کی چائے پر ہمیں مدعو کیا تھا۔ سبھی کو جلدی تھی، لیکن سیورین اپنی ضد کی پکّی تھی۔ رات سبھی نے اُسے منع کیا تھا کہ صبح وہ کچھ بھی نہ لائے۔ اُس نے اپنی آنٹی کو بھی ساری رات جگایا ہوگا۔ ناشتا اِس سے زیادہ کیا ہوسکتا ہے۔ شاید کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ جانے مطبخی میں کیا کیا بھرا ہوگا۔ کسی نے کہا ہے، علم و ہنر، خوش صورتی، خوش نہادی اعلا درجے کی انسانی خوبیاں ہیں، لیکن سب سے بڑی خوبی ایثار پیشگی اور خدمت گزاری ہے۔ آدمی کو پھر آدمی جکڑ سا لیتا ہے۔

جلدی کرتے کرتے بھی نو بج گئے۔ ایمی بار بار باہر جا کے ڈاکٹر کی آمد کے بارے میں سُن گُن لے آتی تھی۔ جامو اور زورا نے میرے اور بجھل کے کپڑے پہن لیے تھے۔ اُن کے ناپ کے تو نہیں تھے۔ مگر کرتے اور پاجامے میں اِتنی گنجائش ہوتی ہے۔ واسکٹ میں عیب اور چھپ گئے۔ بجھل بھی اپنی جُون میں آ چکا تھا۔ اِتنے دنوں بعد اپنے اصل لباس میں وہ عجیب عجیب سا لگ رہا تھا۔ میں نے تو صبح ہی زریں کا سلوایا ہوا نیا کُرتا اور پاجامہ پہن لیا تھا، اوپر سے خاکی رنگت کی کھادی واسکٹ۔ سبھی نئے نئے سے ہوگئے تھے۔

ساڑھے نو بج گئے۔ چھاگلا بھی آ گیا۔ ڈاکٹر رائے نہیں آیا۔ سبھی راہ داری میں کرسیوں پر بیٹھے اُس کا انتظار کھینچ رہے تھے۔ گاڑی کے روانہ ہونے اور وقت پر ہمارے اسٹیشن پہنچ جانے کا ڈاکٹر کو اندازہ ہوگا۔ اور اگر وہ نہیں آ پایا؟ اِس وہم نے میرے سر میں جالا بُننا شروع کر دیا تھا۔ تو کیا ہم اُس سے وداع ہوئے بغیر چلے جائیں؟ چھاگلا کو ڈاکٹر کی آمد کا پورا یقین تھا۔ دس بجنے والے تھے۔ چھاگلا بھی بے چین نظر آنے لگا۔ راہ داری میں ٹہلتے ہوئے دستی گھڑی دیکھتا جاتا۔ میں نے تو اپنے طور پر ارادہ کر لیا تھا، ڈاکٹر کے نہ آنے کی صورت میں ہم سفر ملتوی کر دیں گے، اَور بھی کئی گاڑیاں پٹنے سے کلکتے جاتی ہیں۔ ڈاکٹر رائے سے ملے بغیر یہاں سے چلے جانا نازیبا تھا۔

ابھی دس بج کر تین چار ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ بائیں سمت سے ڈاکٹر رائے متوازن قدموں سے راہ داری میں آتا دکھائی دیا۔ وہ اکیلا تھا۔ اُسے دیکھ کے چھاگلا تیزی سے اُس کی طرف بڑھا اور سبھی کھڑے ہوگئے۔ کمرے میں جانے کے بجائے ڈاکٹر باہر رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ اُس کے بیٹھنے کے بعد بجھل نے بھی کرسی سنبھال لی۔ جامو اور زورا کچھ دُور ہٹ گئے۔ ڈاکٹر کی ہدایت پر میں بھی اُس کے پہلو کی کرسی پر دراز ہوگیا۔ کسی تاخیر کے بغیر ایمی نے طبّی احوال کے کاغذات باہر ہی ڈاکٹر کے ملاحظے کے لیے پیش کر دیے۔ ڈاکٹر انھیں بہ غور دیکھتا رہا، پھر مسکراتے ہوئے بولا، ''وقت پر اسپتال آ گئے تھے اُستاد!''

''اسپتال نہیں، آپ کے پاس۔ اسپتال تو سارا آپ ہی ہیں۔'' بجھل نے ممنونیت سے لب ریز آواز میں کہا، ''آپ نے اپنے سے بہت کیا، ہم کو بولو، ہم کیا کریں؟''

ڈاکٹر ہنسنے لگا۔ ''تم نے ہم کو ایک آدمی دیا... یہ جوان۔'' اُس نے میری جانب انگلی اُٹھائی اور بولا، ''آپ اِس کو ہم سے واپس لے جا رہے ہو۔''

''بس میں ہوتا تو آپ ہی کو دے دیتے۔'' بجھل نے سنجیدہ آواز میں کہا، ''پر کیا بولیں، بہت بگڑا ہے، بڑا نٹ کھٹ صاحب!''

''اِسی واسطے تو اُستاد۔'' ڈاکٹر لطف لے کے بولا، ''لوگ بولتے ہیں، ہر آدمی کا مول ہوتا ہے۔ اِس کا کوئی مول ہو تو بولو۔''

بجھل کے شانے سکڑنے اور پھیل گئے۔ ''اِس کا کوئی مول نہیں۔ ہوتا تو پہلی بولی ہمی لگاتے۔''

''تمھارا ہی تو ہے اُستاد، اوپر سے نیچے تک۔ ہم نے دیکھا ہے، تم کو اِدھر اپنا پتا نہیں تھا تو یہ کیسا لوٹتا تھا۔ اِس نے اپنے سے تھوڑی لڑائی بھی کی ہے۔ تم کو کچھ ہو جاتا تو یہ ہم کو نہیں چھوڑتا۔''

''کیا ڈاکٹر صاحب!'' میں نے تندی سے دخل دیا۔ ''کیسی بات کرتے ہیں آپ۔ میں تو آپ کی منت ہی کرتا رہا ہوں۔ شروع میں ہاں ضرور... کوئی اُلٹی سیدھی بات مُنھ سے نکل گئی ہو تو... اَن جانے میں... آپ معاف کر دیں۔''

''ہاں صاحب! ایسا ویسا کچھ بولا ہو تو معافی دے دیں۔'' بجھل سفارشی انداز میں بولا، ''کبھی یہ بہت اُلٹ سُلٹ کرتا ہے۔ جلدی گھوم جاتا ہے۔''

''اور اِسی کارن اچھا لگتا ہے۔'' ڈاکٹر نے بے تامّل کہا۔

''آپ کی بڑائی ہے صاحب!'' بجھل انکسار سے بولا۔

بجھل کا شانہ تھپ تھپاتے ہوئے ڈاکٹر رائے اُٹھ گیا اور قریب موجود چھاگلا کی طرف متوجہ ہوا۔ اُس نے انگریزی میں چھاگلا سے معلوم کیا کہ کیا طبّی احوال نامہ میرے حوالے کر دیا گیا ہے۔ جواب میں چھاگلا نے کوٹ کی اندرونی جیب سے پھولا ہوا ایک بڑا لفافہ مجھے تھما دیا۔ ڈاکٹر پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ اُس نے بتایا کہ لفافے میں بجھل کی بیماری کی تشخیص اور مرحلے وار علاج کی تفصیل درج ہے۔ کسی جگہ اِس قسم کی شکایت دوبارہ نمودار ہونے کی صورت میں متعلق ڈاکٹر کو لازماً یہ رپورٹ دکھائی جائے۔ یوں شکایت کا اعادہ ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ لفافے میں ایک نسخہ بھی ہے۔ اِس میں لکھی دوائیں ہفتے بھر تک استعمال کرائی جاتی رہیں تو اچھا رہے گا۔ نسخے میں توانائی کی بحالی کی ادویہ بھی ہیں۔

ڈاکٹر کی ابرو کی جنبش پر ہمہ دم مستعد چھاگلا دُور کھڑے خدمت گار کے پاس رکھا ہوا گل دستہ لے آیا۔ ڈاکٹر نے اُسے بجھل کے آگے پیش کر دیا۔

''یہ کیا ڈاکٹر صاحب۔'' بجھل نے جلتی بجھتی آواز میں کہا۔

پیشانی کی خنکی کے سوا ڈاکٹر نے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھی، اور یکایک ہلچل سی مچ گئی۔ میری آنکھوں کے لیے وہ ایک ناقابلِ اعتبار منظر تھا۔ پیازی رنگت کی ساری میں ملبوس ڈاکٹر رائے کی بیٹی بینا کو سب سے پہلے ایمی نے دیکھا اور وہ خود کو روک نہ سکی۔ دیکھتے ہی اُس کی طرف دوڑ پڑی، اُس کے پیچھے سیورین بھی۔ بینا کے عقب کچھ فاصلے پر ایک ملازم کے ہاتھ میں بھی گل دستہ تھا۔ سبھی کی نظریں بینا پر مرکوز ہوگئیں۔ وہ شاہانہ انداز سے نپے تلے قدم اُٹھاتی ہمارے پاس آ گئی۔ پہلے مجھی سے آنکھیں چار ہوئیں تو ایک رنگ سا اُس کے چہرے پر آ کے گزر گیا۔ میرا تو جسم لمحے بھر کے لیے جیسے سُن ہوگیا۔

''میری بیٹی بینا۔'' ڈاکٹر نے بجھل سے کہا، ''اُس کے لہجے میں فخر بھی تھا، ناز بھی۔

بینا نے ہاتھ جوڑ کے نمسکار کیا۔ ملازم نے آگے آ کے گل دستہ اُسے پیش کیا۔ بینا نے تمکنت سے بجھل کے سامنے کر دیا۔ بجھل کی آنکھوں میں خیرگی سی ہویدا ہوئی۔ وہ جھجکتی آواز میں بولا، ''یہ تو کوئی مورتی ہے ڈاکٹر صاحب!''

''تم کو دیکھنا چاہتی تھی، پر ٹائم ہی نہیں ملا۔'' ڈاکٹر نے اشتیاق سے کہا۔

''یہ تو خود درشن کے لیے ہے۔'' بجھل نے بینا کے سر پر ہاتھ رکھا اور ٹھوڑی اُٹھا کے لمحوں تک تکتا رہا، اور اُس نے بے اختیار بینا کو بازوؤں میں دبوچ لیا۔ ''یہ تو آپ ہی کی بٹیا ہوسکتی ہے۔''

بینا کا سراپا دُہرا ہوگیا۔

''آپ ابھی بولتے تھے، ہر آدمی کا مول ہوتا ہے۔ اِس کا کوئی مول ہو تو اپنے کو بولو۔''

''اِس سال ہم ہر گاؤں کے لیے ریفریجریٹر فراہم کریں گے، اگلے سال بجلی کے تار لگائیں گے، اُس سے اگلے سال بجلی مہیا کرنے کی کوشش کریں گے۔''

ڈاکٹر ہنس پڑا۔ ”یہ بھی اِسی کی طرح ہے۔“ وہ میری جانب نگاہ اُٹھا کے بولا، ”تمھارے لاڈلے کی طرح۔“

بنجھل کچھ فکرمند ہوا، پھر شاید اِس مفاہمت سے کہ ڈاکٹر کی زبان سے میرے لیے 'لاڈلے' کا خطاب روانی میں ادا ہوا ہے، اور کوئی معنی خیزی نہیں، وہ استوار ہو گیا، مگر ثانیے بھر بعد پھر مضطرب نظر آنے لگا۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالا اور نکال لیا۔ صبح جب وہ نیا لباس پہن کے تیار ہو گیا تھا، میں نے ہوٹل میں رکھی نقدی اور اپنے پاس محفوظ ہیروں بھری مخملی تھیلیاں اُسے واپس کر دی تھیں کہ پہلے بھی یہ اُسی کی تحویل میں تھیں۔ اور معاً اُسے کیا ہوا۔ پاس کھڑی بینا کی کلائی گرفت میں لے کے اُس نے اُٹھی ہوئی آواز میں کہا، ”اپنے ساتھ آؤ بیٹیا۔“

بینا حیران ہوئی، پہلے ڈاکٹر کو، پھر مجھے دیکھا۔ بنجھل نے تذبذب کی مہلت نہیں دی۔ دو ڈھائی گز کی دُوری عبور کر کے وہ اُسے کمرے میں لے گیا۔ ڈاکٹر میرے ساتھ پُرسکون حالت میں کھڑا رہا۔ منٹ ڈیڑھ منٹ کے عرصے میں دونوں باہر آ گئے۔ بینا کا چہرہ دہک رہا تھا۔ بنجھل کا بازو اُس کے شانے پر تھا اور وہ اُس کے پہلو میں سمٹی ہوئی کمرے سے واپس آئی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں جھلملاتی نمی صاف نظر آ رہی تھی۔

بینا کو یوں اپنے ساتھ کمرے میں لے جانے کی ایک ہی وجہ ہو سکتی تھی کہ وہ بینا کو کچھ نذر کرنا چاہتا تھا۔ سب کے سامنے اِس کا اظہار، جیب سے کچھ نکالنا معیوب بات تھی۔ بنجھل نے کوئی نادر ہیرا ہی اُسے بھینٹ کیا ہو گا۔ نقدی کا تو سوال نہیں پیدا ہوتا تھا۔ بینا نے یقیناً منع کیا ہو گا، لیکن بنجھل کو منع کرنا آسان نہیں تھا۔ میرا خیال تھا، وہ واپس آ کے اپنے باپ کو کچھ بتائے گی، مگر میں بھول گیا تھا، وہ ایک اور قسم کی لڑکی تھی۔ آداب سے بہ تمام و کمال آراستہ اور پُراعتماد۔ اُسے خود بھی فیصلے کرنے آتے تھے۔

”کبھی لوٹیں گے ڈاکٹر صاحب پھر۔“ بنجھل نے اُمڈتی آواز میں کہا۔

”خوشی ہو گی اُستاد۔“ ڈاکٹر شوخی سے بولا، ”مگر پہلے کی طرح نہیں۔“

”نا، نا، صاحب، اَب کے ایسے نہیں۔ اَب آپ کو سلام کرنے آئیں گے، آپ کو پوچھنے، اور بٹیا کو دیکھنے۔“

ڈاکٹر کا جواب مُنہ ہی میں رہ گیا۔ سامنے سے مکلّف وردی میں ملبوس ایک نوجوان پولیس افسر چند سپاہیوں کے ساتھ راہ داری کی طرف بڑھتا نظر آیا۔ میں اُسے پہچان گیا۔ وہی افسر، جو پہلے بھی دو مرتبہ آئی جی کی معیت میں اسپتال آ چکا تھا۔ ہمارے پاس پہنچ کے اُس نے سلیوٹ کے انداز میں ڈاکٹر، پھر مجھے سلام کیا۔ اُس کے پاس بھی گل دستہ تھا۔ ہاتھ اُٹھانے پر ایک سپاہی نے تیز قدموں سے آ کے گل دستہ اُس کے حوالے کیا۔

”یہ آئی جی کی طرف سے ہے۔“ پولیس افسر نے ڈاکٹر رائے سے انگریزی میں کہا۔

ڈاکٹر نے بنجھل کی طرف بازو پھیلا دیا۔ پولیس افسر نے دوسرے لمحے مستعدی سے بنجھل کو سلام کیا اور گل دستہ اُس کی جانب بڑھا دیا۔

”یہ... یہ کیا ہے ڈاکٹر صاحب؟“ بنجھل اُلجھ کے بولا۔

”یہ پھول آئی جی پولیس نے تمھارے واسطے بھیجے ہیں۔“ ڈاکٹر نے زیرِ لب تبسم سے کہا۔

”اپنے واسطے؟“ بنجھل کی پیشانی پہ جال پڑ گیا۔

”ہاں، تمھارے واسطے، میرے واسطے بالکل نہیں۔“

”پر یہ آئی جی سے اپنا کیا...“

بنجھل کی کش مکش دُور کرنے کے لیے ڈاکٹر نے شگفتگی سے کہا، ”آئی جی صاحب اپنے دوست ہیں۔“

”صاف صاف بولو صاحب!“ بنجھل جز بز ہو کے بولا۔

”گاڑی میں تم کو یہ لوگ سارا بول دیں گے۔“ ڈاکٹر نے ہاتھ ہلا کے اُسے تسلّی دینے کی کوشش کی۔ ”اَب چلنے کی تیاری کرو۔ ٹائم تھوڑا رہ گیا ہے۔ شہر کی کنڈیشن ٹھیک نہیں۔ تم کو پولیس کے ساتھ پولیس کی موٹر میں جانا ہے۔“

”پولیس کے ساتھ؟“ بنجھل نے ترشی سے پوچھا۔

”ہاں اُستاد، تمھاری سیفٹی کے لیے۔ ہماری ریکویسٹ پہ آئی جی نے یہ ارینجمینٹ کیا ہے۔“

بنجھل کی حیرت دوچند ہوئی۔ ”کیا صاحب...“

ڈاکٹر نے اُس کی کمر پہ ہاتھ رکھ کے آگے جانے کا اشارہ کیا۔ بنجھل بڑبڑاتا رہ گیا۔ اسپتال کے کارندے ہمارا

مختصر سامان کمرے سے باہر لے آئے تھے۔ بنجھل آگے نہیں گیا۔ اپنے تردّد کے باوجود وہ راہ داری میں تھم کے پاس گُپ چُپ کھڑی ایمی کے پاس گیا۔ اُس نے ایمی کے ہاتھ تھام کے کچھ کہا، پھر وہ سیورین کی طرف پلٹا۔ اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ سیورین سر جھکائے ہوئے تھی، سسکنے لگی۔ بنجھل نے اُسے سینے سے لگا لیا اور پیشانی کو بوسہ دیا۔

پولیس افسر کچھ دُور جا کے ہمارے انتظار میں ٹھیر گیا تھا۔ اُس وقت جیسے کسی نے مجھے ٹھوکا دیا۔ بینا کی طرح بنجھل کو سیورین اور ایمی کا بھی خیال رکھنا چاہیے تھا۔ اسپتال کے ملازم بھی شب و روز ہماری خدمت میں حاضر رہے تھے، لیکن بنجھل کو ٹوکنے کا وقت گزر چکا تھا، اور خود کو دلاسا دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ بنجھل سے ایسی چُوک ممکن تو نہیں ہے۔ اُسے تو نازکی کا بہت خیال رہتا ہے...

بنجھل کے چلنے پر سبھی حرکت میں آ گئے۔ بینا نزدیک ہی تھی، مجھے اُس سے کچھ کہنا چاہیے تھا، لیکن کیا کہوں اور کہاں سے شروع کروں۔ کوئی سرا ہی نہیں مل رہا تھا، چند قدم کا فاصلہ طے کر کے میں اُس کے پاس چلا گیا۔ مجھے اِتنا قریب دیکھ کے وہ پلکیں جھپکانے لگی۔ میں نے آہستگی سے کہا، ”مجھے افسوس ہے، دوبارہ آنا نہ ہو سکا۔“

”آپ کا انتظار رہا۔“ اُس کی آواز کی کھنک یاسیت سے آلودہ تھی۔

”بس، کیا بتاؤں۔“ میں نے پژمردگی سے کہا، ”ارادہ کیا اور رہ گیا۔“

”پاپا نے مجھے کچھ بتایا ہے۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”کیا... کیا بتایا اُنھوں نے؟“ میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

”زیادہ نہیں، اندازہ ہو چلا تھا کہ پورا سچ بتانا اُنھیں دشوار ہو رہا ہے، سو اصرار نہیں کیا۔ باقی پھر خود ہی اخذ کر لینا بہتر تھا۔“

کسی وضاحت کا وقت اور موقع نہیں تھا، اور وضاحت بھی کیا کرتا، میں چپ رہا۔

”آپ کے لیے دُعا کرتے رہیں گے۔ کاش، اِس مرتبہ سفر سے آپ سُرخ رُو واپس ہوں... اور جب ایسا ہو تو ایک بار یہاں ضرور آئیے گا۔“

”ضرور... ضرور۔“ میری آواز دھڑک رہی تھی۔

”بہ ہر حال۔“ وہ ہچکچاتے ہوئے شائستگی سے بولی۔ ”آپ کی آمد یاد رہے گی۔“

میں نے کہنا چاہا، 'مجھے بھی'، لیکن میری زبان اکڑ کے رہ گئی۔ میں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ سراپا بہار تھی۔ میرا جی چاہا، اُسے گلے سے لگا لوں۔ اُس کی آنکھیں بھی چھلک رہی تھیں۔ میں پھر آگے بڑھ گیا۔

وہ مرکزی عمارت کی طرف نہیں گئے۔ پولیس افسر کی رہنمائی میں ہم چاروں اسپتال کے پچھواڑے آ گئے۔ یہاں تین چار قسم کی موٹریں کھڑی تھیں، کچھ اور مسلح سپاہی بھی موجود تھے۔ پہلے ہی کئی حیرانیاں بنجھل کو مکدّر اور مضطرب کیے ہوں گی کہ میدا اور اڈّے کے کسی آدمی نے اسپتال کا رُخ کیوں نہیں کیا اور اِس موقع پر بھی کوئی کیوں موجود نہیں ہے۔ دو دن سے جامو اور زورا بھی اڈّے واپس نہیں گئے تھے، نہ اسپتال سے باہر نکلے تھے، اسپتال کے ضابطے کے خلاف یہاں ٹھیرے ہوئے تھے، اَب پولیس کی نگرانی میں روانگی مزید تشویش اور وحشت کا سبب ہونی چاہیے تھی، لیکن اُس نے کچھ نہیں پوچھا، خاموشی سے موٹر کی اگلی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میں زورا، اور جامو ٹھُس ٹھُسا کے پچھلی نشست پر

جَم گئے۔ ہمارے آگے پیچھے پولیس کی تین موٹریں تھیں۔

ابر چھایا ہوا تھا اور بادل برسا ہی چاہتے تھے۔ سڑکوں پر سناٹے کی وجہ سے موٹروں کی رفتار تیز تھی۔ بازار بند تھے اور ہر طرف کرفیو جیسی ہیبت طاری تھی۔ راہ گیروں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ تھوڑی تھوڑی دُور بعد سڑکوں پر تعینات سپاہیوں کی سیٹیاں گونجتی رہیں اور جلد ہی موٹروں نے ہمیں اسٹیشن پہنچا دیا۔

یہاں بھی اسٹیشن کی عام گذرگاہ کے سامنے موٹریں نہیں رُکیں۔ وہ ہمیں اسٹیشن سے ملحق مال گودام کے راستے سے اندر لے گئے۔ پلیٹ فارم پر بھی بھیڑ بھاڑ خاصی کم تھی۔ ہم وقت سے کچھ پہلے پہنچ گئے تھے، اور معلوم ہوا، گاڑی مقررہ وقت پر نہیں آ رہی، پندرہ منٹ کی تاخیر کا اعلان کیا جا چکا ہے۔ اُنھوں نے ہمیں اوّل درجے کی وسیع اور روشن انتظار گاہ میں پہنچا دیا، جہاں عورتوں مردوں اور بچوں پر مشتمل ایک ہی کنبے کے آٹھ دس افراد خوش گپیوں میں مصروف تھے، اور ایک شور مچا ہوا تھا۔ ہمیں اور ہمارے ساتھ پولیس دیکھ کے سبھی چپ ہوگئے اور جب اُنھوں نے اچھی طرح جان لیا کہ سپاہی باہر چلے گئے ہیں، صرف پولیس افسر رہ گیا ہے اور ہم سے اُس کے تیور مخاصمانہ نہیں، تبھی اُنھیں قرار آیا۔ پولیس افسر نے چائے وغیرہ کا تکلّف کرنا چاہا، سبھی نے منع کر دیا، پھر چند منٹ بعد واپس آنے کا کہہ کے وہ بھی باہر چلا گیا۔ ہم چاروں عملاً ایک دوسرے سے بے حد قریب اور اصلاً ایک دوسرے سے بہت دُور، بیگانہ بیگانہ سے بیٹھے رہے۔ مجھے، زورا اور جامو کو بِتّھل کی کبیدگی کا شدت سے احساس تھا۔ بِتّھل اپنی لاعلمی سے بے چین تھا اور ہمیں اپنی دانستہ زباں بندی سے عجب خجالت اور بے بسی محسوس ہو رہی تھی۔

بیس پچیس منٹ کا وقت کسی طور گزر گیا کہ وقت کا کام گزرنا ہے، اور کبھی یہ بہت غنیمت لگتا ہے کہ وقت ٹھہرتا نہیں، گزر جاتا ہے۔ کاش، وقت آدمی کا تابع ہوا کرتا، گھوڑے کی طرح اور موٹر کی طرح جب چاہا، گھوڑے کو لگام دے دی، جب چاہا، موٹر تیز دوڑا دی۔ دیکھا جائے تو یہی کچھ ہوتا رہا ہے، آدمی ابتدا سے وقت پر غلبہ و تسلّط کی کوشش کر رہا ہے، اور اس کوشش میں بہت کچھ حاصل کر لیا ہے، موٹر، ریل گاڑی،

ہوائی جہاز، لیکن جو وقت آدمی کے دل پر گزرتا ہے، وہ اُسے ٹھیرانے اور جلد سے جلد گزار دینے کی کوئی تدبیر نہ کر پایا۔

گاڑی کی آمد کا گجر بجنے لگا تو پولیس افسر واپس آ گیا، اور جب تک اُس نے ہمیں ڈبّے میں پہنچا اور نشستوں پر بٹھا نہیں دیا، اور گاڑی نے حرکت نہیں کی، وہ مستقل ہمارے پاس رہا، اِدھر باوردی اور سادہ پوش سپاہی ڈبّے کے اردگرد منڈلاتے رہے۔

اوّل درجے کے اِس ڈبّے میں ہمارے سوا کوئی اور مسافر نہیں تھا۔ گاڑی کے رفتار پکڑنے اور شہر سے دُور ہونے پر میری طرح اُنھوں نے بھی سکون کی سانس لی ہوگی۔ میں تو اُوپر کی برتھ پر آ کے دراز ہو گیا۔ مجھ میں بِتّھل کی بے خبری اور بیماری کے دوران ہونے والے سانحوں کی رُوداد دُہرانے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ سارا کچھ بہت کرب ناک تھا۔ گیارہ بارہ دن پہلے ہم فیض آباد سے چلے تھے۔ اور ایک دن، ایک رات بعد، عشرے بھر پہلے پٹنا پہنچے تھے۔ ایک عشرے میں شہر کیسا بدل گیا تھا۔

برتھ پر آ کے میرا تو جسم ہی بکھرنے لگا۔ لگتا تھا، ایک زمانے سے نہیں سو سکا ہوں۔ مجھے کچھ نہیں معلوم، زورا اور جامو نے وہ ساری اذیتیں کس طرح بِتّھل کو منتقل کیں جن سے میرا واسطہ پڑا تھا، اور جن سے بہ وجوہ بِتّھل کو لاعلم رکھا گیا تھا۔ مجھے تو گہری نیند نے آ لیا۔ کتنے اسٹیشن آئے۔ گاڑی کہاں کہاں اور کتنی دیر ٹھیری، مجھے کچھ خبر نہ ہو سکی۔

بازو پر ہلکی دستکیں دے کے زورا نے مجھے ہڑبڑا دیا، گاڑی کسی اسٹیشن پر رُکی ہوئی تھی۔ برتھ سے اُتر کے اور منہ ہاتھ دھو کے پھر میں بھی اُن کے درمیان آ بیٹھا، اور آنکھیں کچھ کھلیں تو نظر سیدھی بِتّھل پر گئی۔ سامنے کی برتھ پر وہ لشت سے کمر لگائے کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجھے دیکھا، اُٹھ کے میرے پاس آنا چاہتا تھا کہ میں خود ہی اُس کے پاس چلا گیا۔ ہاتھ پھیلا کے اُس نے میرے شانے پر رکھا اور خود سے قریب کر لیا، اور اچھا ہوا جو کچھ نہیں کہا۔ میرا بازو دبوچ کے رہ گیا۔ میری آنکھیں سلگنے لگی تھیں، لیکن میں نے آنکھوں ہی میں آنسو گھونٹ لیے۔

زورا نے مطبخی کھول دی تھی۔ سیورین نے التزام رکھا تھا کہ جلد خراب ہو جانے والی کوئی چیز نہ ہو، زیادہ تیل کی پچر نگ

بزی تھی، چنے کی دال کا حلوا تھا اور پوریوں کے علاوہ میدے کی میٹھی ٹکیاں، سفید کپڑے سے بندھی مطبخی میں الگ سے شیشے کا ڈونگا بھی رکھا ہوا تھا۔ اُس میں سادہ میٹھے چاول تھے، پلیٹیں، گلاس اور چمچے بھی ساتھ رکھنا وہ نہیں بھولی تھی۔ تیز بارش ہو رہی تھی۔ زورا نے مجھے بتایا کہ سارے راستے یہی حال رہا ہے۔ اِسی وجہ سے گاڑی کی رفتار متاثر ہوتی رہی ہے، پٹڑیوں اور پلوں پر تو رینگتی ہوئی گزری ہے اور انجن تو مسلسل گرجتا رہا ہے۔ اس وقت نو بج رہے تھے، یعنی ہمیں پٹنے سے چلے ہوئے نو گھنٹے کے لگ بھگ ہو رہے تھے۔ آگے غالباً مزید بارش کی اطلاع پر گاڑی اِس اسٹیشن پہ ٹھیر گئی تھی۔ بہت کم چہل پہل تھی۔ صرف خوانچے والوں کا شور گونج رہا تھا اور اُن کی صدائیں بھی جیسے بھیگ گئی تھیں۔ زورا نے کسی خوانچے والے کے ذریعے پانی اور چائے کا انتظام کر لیا۔ کھانا دیکھ کے بھوک بیدار ہو گئی۔ بارش میں بھوک کچھ بڑھ جاتی ہے۔ چاروں نے مطبخی قریباً خالی کر دی اور سیورین کی باتیں کرتے رہے، اُس کی خوش لباسی، خوش شعاری، سلیقے اور نفاست کی باتیں۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد بارش ہلکی ہو جانے پر گاڑی نے کھسکنا شروع کیا، اور آگے جا کے رفتار پکڑ لی، ابھی کلکتّا دُور تھا کہ بارش پھر شروع ہو گئی۔ شروع ہو گئی، یا پہلے سے جاری تھی۔

دو بجنے میں چند منٹ باقی تھے کہ ہاوڑا اسٹیشن پر گاڑی نے کہیں اپنا سفر تمام کیا۔ بارش اور دیر رات کی وجہ سے سڑکیں سُونی پڑی تھیں۔ پھر بھی اڈّے تک پہنچتے پہنچتے ڈھائی بج گئے۔ ساری عمارت سکوت میں لپٹی ہوئی تھی۔ ہمیں دیکھ کے کہرام سا مچ گیا۔ جامو، جمرو اور زورا کو انھیں پُرسکون رکھنے میں خاصی دُشواری ہوئی۔ وہ کسی کو بِتّھل کی بیماری کے متعلق بتانا نہیں چاہتے تھے اور بِتّھل کو زیادہ سے زیادہ آرام پہنچانے کے لیے بھی فکرمند تھے۔

اڈّے پر موجود سبھی کو تاکید کر دی گئی کہ وہ بِتّھل کی کلکتے آمد کی خبر عام نہ کریں، مگر جنگل کی آگ کی طرح شہر میں خبر پھیل چکی تھی۔ گیارہ بجے تک اڈّے کی عمارت کے اندر اور باہر ایک خلقت جمع ہو گئی۔ بِتّھل نے عرصے بعد کلکتے کا رُخ کیا تھا۔

اڈّے کے آس پاس کے مکین، پرانے واقف کار، دُکان دار، فیکٹریوں والے، بوڑھوں اور جوانوں کی ایک کثیر تعداد اڈّے کی طرف اُمڈتی رہی، اُن میں کچھ عورتیں بھی شامل تھیں۔ عمارت میں شور بہت بڑھ گیا تو بِتّھل کو کمرے سے باہر آنا اور چوکی پر بیٹھنا پڑا۔ لوگ حسبِ استطاعت مٹھائی کے دونوں، پھلوں اور پھولوں کے ٹوکروں سے لدے پھندے آتے رہے۔ سوناگاچی سے بھی کئی پیغام آئے تھے، جمرو کی زبانی معلوم ہوا کہ اِن دنوں بازار کے علاقے میں گلاب بانو شاہ جہاں پور والی کے بالاخانے کی بڑی دھوم ہے۔ اُس کے پاس اپنے فن میں ماہر، ایک سے ایک حسین لڑکیوں کا طائفہ ہے۔ بِتّھل کے لیے گلاب بانو کا ہرکارہ نذرانہ اور پیغام لے کے آیا تھا کہ مناسب ہو تو آج رات اُس کی تربیت یافتہ شاردا پہلی بار بِتّھل کے سامنے محفل آرا ہو، اور بِتّھل کو بالاخانے آنے میں کوئی عذر ہو تو اڈّے پر بھی محفل برپا کی جا سکتی ہے۔ بِتّھل کے بجائے جامو نے اُسی تکلّف سے جواب دیا، جس تکلّف سے پیغام آیا تھا۔ اُس نے گلاب بانو کی نذر اور دعوتِ رقص و سرود پر شکریہ ادا کیا اور کہا کہ چند دنوں کے لیے محفل ملتوی کر دی جائے تو مناسب ہو۔ بِتّھل کے پرانے شناسا لالا شانتی پرشاد نے دیگیں چڑھوا دی تھیں اور دوپہر کو لنگر کا ساسماں ہو گیا تھا۔ بِتّھل کے لیے چوکی سے ہٹنا ممکن نہیں رہا تھا۔ ایک جاتا نہیں کہ دوسرا آ جاتا تھا۔ مجھے بھی اُن سبھوں نے مستقل گھیرے میں لے رکھا تھا، مجھ سے لپٹ لپٹ جاتے تھے۔ کوئی میرے ہاتھ چومتا، کوئی چھو چھو کے دیکھتا۔

شام کو اچانک بِتّھل نے کلکتے سے روانگی کا اعلان کر دیا۔ سبھی نے بڑی منت کی۔ اِس ہجوم سے میرا بھی جی گھبرانے لگا تھا، مگر احتیاطاً ابھی چند دن بِتّھل کا کلکتے ہی میں رہنا بہتر تھا۔

سفر میں تو دباؤ بہت ہوتا ہے۔ بجھل نے طے کرلیا تھا، بہ ہر حال، وہ مزید ایک رات قیام کے لیے راضی ہوگیا۔ رات کو بھانڈوں نے اُچھل کود شروع کردی تھی، مشکل سے نکلے۔ میں نے بجھل کو مشورہ دیا تھا کہ ابھی کسی طرف نکلنے کے بجائے کچھ روز کے لیے فیض آباد چلے جائیں۔ جمرو اور زورا بھی ہمارے ساتھ جانے کو بہ ضد تھے، بجھل نہیں مانا۔ دوسرے دن صبح نسبتاً سکون تھا، پھر بھی نکلتے وقت بہت سے لوگ اڈے پر جمع ہوگئے اور سبھی ہمارے ساتھ اسٹیشن تک آئے۔ ہم نے مرشد آباد آ کے دَم لیا، دو دن وہاں سرائے میں قیام کرکے وہ کرشنا نگر آ گیا، پھر دُرگا پور، بوگرا، کشتیا، پبنا، نصیر آباد، تواکھالی، رنگ پور، کھلنا، باری سال، جیسور، بہادر آباد، راج شاہی، چاٹگام، ڈھاکا، فرید پور، فینی، چالنا، کاکس بازار اور میلا گھر سے ہوتے ہوئے ہم سلہٹ آ گئے۔ گوہاٹی، تن سکھیا، ڈبروگڑھ، سِل گری، لمبڈنگ، علی پور دُوار، بھوبھا نیشور، کوراپٹ، نارتھ لکھیم پور، شیلانگ، دارجلنگ، جگ دل پور، پھل بانی، سمبل پور وغیرہ بستیوں میں مولوی محمد شفیق کے اسم کا وِرد کرتے ہوئے ہم واپس ڈھاکا پہنچ گئے۔

صبح کہیں، شام کہیں، ایک دن یہاں، دوسرا دن وہاں۔ کسی شہر میں دو دن، کبھی تین دن، جس وقت جہاں کی گاڑی مل جائے۔ درمیان میں کئی مرتبہ خراب موسموں نے ہمیں روکے رکھا اور آندھیوں، موسلا دھار بارشوں نے راستے بند کردیے۔ جہاں گاڑی نہیں جاتی تھی، وہاں کشتیوں کے ذریعے، کبھی لاری میں اور کبھی گھوڑا گاڑی میں سوار ہوکے۔ ہاتھ گاڑی بھی اِن علاقوں میں بہت سی جگہوں پر مل جاتی ہے۔ جہاں سواری نہ ملتی، بجھل پیدل ہی نکل کھڑا ہوتا۔ یہ بستیاں ہمارے لیے اِتنی نئی نہیں تھیں۔ ابا جان کی تلاش میں کئی جگہوں پر ہم پہلے بھی آ چکے تھے۔

میں نے ابتدا ہی میں بجھل کو منع کیا تھا کہ بنگال، آسام اور بہار، خصوصاً شہر گیا کے اردگرد مولوی صاحب مستقل، یا عارضی سکونت سے گریز کریں گے۔ یہاں تبت کے بدھ راہبوں کی کثرت سے آمدورفت رہتی ہے، اِس لیے کہ صوبۂ بہار میں واقع بدھ گیا، بدھ عبادت گزاروں اور زائروں کا مرکز ہے۔ بجھل نے میری بات نہیں مانی۔ اُس کے ذہن میں ہوگا کہ مولوی صاحب نے کورا کو برقع پہنا دیا ہے۔ کسی کو بھی شبہ نہیں ہوسکتا کہ اُن جیسی وضع قطع کے کسی شخص کے ہم راہ تبت کے جانگ قبیلے کی ایک نہایت مطلوب شہزادی بھی برقع میں رُوپوش ہوسکتی ہے، اور اَب وقت بھی بہت گزر گیا ہے۔ جانگ قبیلے کے لوگوں نے شہزادی کی بازیابی کی اُمید ترک کردی ہوگی، اور اگر اُن کے نجومیوں نے اُن کی آس ابھی تک بندھائے رکھی ہے تو وہ بیش تر دُور دراز کے علاقوں میں کورا کو تلاش کر رہے ہوں گے۔ کورا تبت سے اِس قدر قریب کے علاقوں میں ہوسکتی ہے، یہ خوش گمانی اُنھیں کم سے کم ہونی چاہیے۔ ایک اَور وجہ سے بھی بجھل نے بہار، بنگال اور آسام کے سرحدی علاقے کھنگالنے کا عزم کیا تھا۔ یہاں مسلمانوں کی بڑی بڑی بستیاں ہیں۔ مسجدوں اور دینی تعلیم کے مدرسوں کی بہتات ہے۔ جامعۂ قاسمیہ مراد آباد اور دارالعلوم دیوبند میں دینی تعلیم کے لیے طالبانِ علم کی ایک کثیر تعداد اِن علاقوں سے جاتی ہے۔ ممکن ہے، کسی عزیز شاگرد، یا مراد آباد میں مولوی صاحب کے ساتھ درس و تدریس میں مصروف کسی دیرینہ رفیق کی موجودی اُنھیں اِن دُور افتادہ علاقوں کی کسی محفوظ اور پُرسکون جگہ کھینچ لائی ہو۔ ایسی کسی جگہ اُن کی پذیرائی خوب ہوسکتی ہے۔ بے شک جامعۂ قاسمیہ اور دارالعلوم کے فارغ التحصیل متعدد لوگوں سے ہماری ملاقات ہوئی۔ خاصے لوگ مولوی صاحب کو پہچانتے بھی، لیکن مولوی صاحب نے ابھی تک اِس طرف کا رُخ نہیں کیا تھا۔ تبلیغی جماعتوں سے وابستہ لوگوں کو تو بہ ہر حال اِن علاقوں میں مولوی صاحب کی آمد کا علم ہونا چاہیے تھا۔

میں نے بعد میں بجھل سے کچھ کہنا سننا ہی بند کردیا تھا۔ میں تو بس کسی ہم زاد کے مانند، کسی سائے کی طرح اُس کے ہم رکاب رہا۔ ہم زاد کی بھی کوئی مرضی ہوتی ہے اور سایہ بھی اندھیرے میں بچھڑ جاتا ہے، مگر مجھے بھی اِس دشت نوردی کی عادت سی ہوگئی تھی۔ صبح اُٹھ کے کام پر نکل جانا، گلیوں، کوچوں، مسجدوں، مدرسوں میں 'مولوی صاحب، مولوی صاحب' کی صدائیں لگانا اور رات کو اپنی قیام گاہ واپس آ جانا۔ کسی جگہ مولوی صاحب کے مل جانے کا ایک امکان تو ہر وقت موجود تھا۔

شاید بھی آسرا مجھے بجھل کی اطاعت گزاری کے لیے مہمیز کرتا تھا۔ ظاہر ہے، مولوی صاحب ہندوستان سے باہر تو نہیں چلے گئے ہوں گے۔ نواب ثروت یار کے سانحے کی خبر سن کے وہ جس طرح حیدرآباد سے روانہ ہوئے تھے، اُنھیں بہت دُور کی کسی جگہ ہی چھپنا چاہیے تھا۔

کھلنا شہر میں بھی اڈے سے متعلق ایک شخص نے بجھل کو پہچان لیا تھا۔ وہ رامو کے نام سے کلکتے میں مشہور تھا۔ کسی جرم میں پولیس کو مطلوب تھا، اِس لیے کلکتے سے فرار ہو کے کھلنا آ گیا اور اڈا جما کے اُس نے اپنے اطراف بہت سے لوگ جمع کر لیے۔ بجھل کو کھلنا میں دیکھ کے وہ تو ریشۂ خطمی ہوگیا۔ بہت مشکل سے بجھل نے اُس سے جان چھڑائی۔ ڈھاکے میں بھی یہی ہوا۔ شابے اُستاد کی بجھل پر نظر پڑ گئی۔ شابے کا کلکتے آنا جانا رہتا تھا اور بجھل سے اُس کی پرانی واقفیت تھی۔ تھوڑا بہت مجھے بھی جانتا تھا۔ شابے کا اصل نام شہاب الدین تھا۔ پہلی بار تو کسی کو علم نہیں ہوسکا، لیکن دوسری بار ہمیں ڈھاکے آئے ہوئے تیسرا دن تھا کہ صدر گھاٹ کے بازار میں شابے اچانک سامنے آ گیا۔ ڈھاکے کے اڈے پر اُس کا بہت اثرورسوخ تھا اور ایک طرح سے وہ نائب کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ بجھل کے پاس اڈے کے نگراں ملہاری کو لے آیا۔ ملہاری نے بجھل کے بہت تذکرے سنے تھے۔ وہ تو بڑی طرح مُصر ہوگیا اور اڈے لے جائے بغیر باز نہ آیا۔ ملہاری جیسور کے ایک گانے والے خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور راگ ملہار پر اُسے ملکہ حاصل تھا۔

جیسور کے کسی جاگیردار نواب نے اُس کی نوجوان بڑی بہن امینہ کو گاتے ہوئے کہیں سن لیا تھا۔ کہتے ہیں، اپنے چچازاد سے امینہ کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ ریاضت کا سلسلہ جاری تھا۔ ایک روز وہ اپنے گوشہ نشیں، سُر سنگیت میں یدِطولا رکھنے والے اُستاد کے ہاں راگ الاپ رہی تھی کہ جاگیردار بھی کسی غرض سے وہاں پہنچ گیا۔ امینہ پردے میں تھی، جاگیردار اُسے دیکھ نہیں سکا، مگر آواز سن کے اُس پر جی جان سے فریفتہ ہوگیا اور اُس نے اپنی حویلی میں امینہ کو مغنیہ کے طور پہ ملازمت پیش کرنی چاہی۔ امینہ کے گھر والوں نے انکار کردیا اور کہا کہ اُن کی عورتیں محض خاندانی ورثے کی حفاظت کے لیے سنگیت سیکھتی ہیں، اصلاً خانہ داری اُن کا شعار ہے۔ چند ہی دن میں امینہ کے نوجوان شوہر کا اچانک انتقال ہوگیا۔ موت کا سبب زہر خوری تھی۔ جاگیردار نے کچھ عرصے بعد پھر سلسلہ جنبانی کی اور اَب کے شادی کا پیغام بھجوایا۔ دونوں میں کوئی نسبت نہیں تھی۔ جاگیردار کی پہلے سے کئی بیویاں تھیں۔ ہر طرف اُس کے رنگ محل کی داستانیں عام تھیں۔ امینہ کے والدین کو یقین تھا کہ جاگیردار ہی کی وجہ سے اُن کی بیٹی کو بیوگی کا صدمہ سہنا پڑا ہے، تاہم اُن کے پاس کوئی شہادت نہیں تھی۔ افلاس سب سے بڑی بدنصیبی ہے۔ شہادت ہوتی بھی تو اُن کی آواز کتنی دُور تک جاتی۔ کسی نے کہا ہے، مفلس آدمی، آدھا آدمی ہوتا ہے۔ اُنھوں نے بہ صد ادب جاگیردار سے معذرت کرلی اور اپنی قدیم بستی سے ہجرت کا فیصلہ کرلیا، لیکن ہجرت سے پہلے ہی ایک رات امینہ بستی سے غائب ہوگئی۔ والدین اپنے رشتے داروں کے ہم راہ جاگیردار کی بارگاہ میں دُہائی دینے پہنچے تو وہ صاف مُکر گیا اور اُلٹا اُن پر برافروختہ ہوا۔ اُس نے اُن ستم رسیدگاں پر زندگی کا میدان تنگ کردیا۔ امینہ کے والدین نے بہت دوڑ دھوپ کی۔ بڑے بڑے لوگوں کے پاس جا کے فریادیں کیں، مگر بے سُود۔ پھر ایک رات ہندو مسلم فساد کے بہانے اُن کی بستی میں آگ لگا دی گئی۔ ملہاری کا سارا خاندان آگ کی نذر ہوگیا۔ اتفاق سے ملہاری اُن دِنوں موسیقی کی تربیت کے لیے کسی اُستاد کے پاس تواکھالی گیا ہوا تھا۔ وہ واپس

آیا تو کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔

وہ دیکھ، بام کے اوپر دُھوئیں کے مرغولے
جلا تو خیر سے کم ہے، بجھا بہت کچھ ہے

ملہاری اُس وقت ایک نوخیز نوجوان تھا۔ اُس نے جاگیردار کے سوا وقفے وقفے سے اُس کے خاندان کا ایک ایک فرد چُن چُن کے ختم کر دیا اور غصہ و غضب کے باوجود اِس مشاقی اور ہوش مندی سے کہ اُس پر کوئی آنچ نہ آئے۔ پھر بھی اُسے جیل ہو گئی۔ کوئی ثبوت نہ ملنے پر وہ جلد ہی چھوٹ گیا۔ شابے کہتا تھا کہ حویلی میں جاگیردار اکیلا رہ گیا تھا۔ سارے خدام خوف سے بھاگ گئے تھے۔ آخر میں جاگیردار پاگل ہو گیا، وہ سڑکوں پر نہایت شکستہ اور ابتر حالت میں پڑا ملتا، پھر ایک دن جانے کہاں چلا گیا اور دوبارہ کسی کو شہر میں دکھائی نہیں دیا۔ ملہاری کو بھی اُس کی بہن امینہ نہیں مل سکی۔

جیل سے واپس آ کے ملہاری مرکھنا بیل ہو گیا تھا۔ پھر وہ ڈھاکا چلا آیا اور یہاں کے لوگوں نے اُس کے لیے اڈّے کی چوکی خالی کر دی۔ وہی پرانی کہانی، لیکن بار بار دُہرائی جاتی ہے۔

ملہاری اَب بچپن سے اوپر کا ہو چکا تھا۔ قد اِتنا زیادہ نہیں تھا، کاٹھی کا مضبوط، ارادے کا پختہ، جسم میں بلا کی پُھرتی، ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ چہرے پر دُھندسی چھائی رہتی۔ سورج ڈوبتے ہی شراب میں ڈوب جاتا، سورج نکلنے سے پہلے راگوں کی ریاضت شروع کر دیتا۔ دن بھر اڈّے پر بیٹھا اڈّے کے معاملات نمٹاتا رہتا۔ اُس سے وابستہ بہت سی کہانیاں مشہور تھیں، لیکن شابے کے بہ قول، ملہاری نہ تردید کرتا تھا نہ تائید۔ یوں وہ ایک خوش خُلق، نرم آواز اور کم آمیز آدمی تھا۔ بڑی بڑی، بل کہ پھیلی پھیلی آنکھیں ہر وقت چڑھی رہتیں۔ لگتا تھا، کچھ سوچ رہا ہے۔ بہت کم اڈّے سے نکلتا تھا۔ ہمارے پاس خود چل کے آیا تھا۔ جھل سے انکار نہیں کیا گیا۔

آدمی کے پیدا ہوتے ہی اُس کی کہانی، ایک کہانی شروع ہو جاتی ہے۔ ہر شخص جانے کتنے تہ خانے لیے پھرتا ہے۔ سمندر کی تہ میں اُترنا آسان، آدمی کا دَرُون کھوجنا بہت مشکل ہے۔ شابے کہتا تھا، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سب کچھ غلط گمانیوں کا شاخسانہ ہے۔ جاگیردار یقیناً ایک آوارہ منش آدمی تھا اور راگ رنگ سے والہانہ شغف رکھتا تھا۔ اگر اُس نے ملازمت پیش کی تھی تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ یہ ضروری نہیں کہ اُسی نے امینہ کے شوہر کو راستے سے ہٹایا ہو۔ کوئی اور بھی ہو سکتا ہے۔ امینہ کے شوہر نے خود کوئی غلط سلط چیز نہ کھا لی ہو۔ نوجوانی زندگی کی شرط نہیں ہے۔ موت ترتیب سے کب آتی ہے؟ کسی کے بھی نام قرعہ نکل آتا ہے۔ کوئی بھی نشانے پر آ سکتا ہے۔ جاگیردار کی طرف سے شادی کا پیغام بھجوانا بھی کوئی مذموم اور سفاکانہ اقدام نہیں تھا۔ یہ رشتہ تو ایک عسرت زدہ خاندان کے لیے عزت کا موجب ہونا چاہیے تھا، خصوصاً ایک بیوہ لڑکی کے لیے۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ ہو سکتا ہے، امینہ اپنی بستی کے، یا آس پاس کے کسی شخص سے دل چسپی رکھتی ہو اور اُسی شخص نے اُس کے شوہر کا پتھر اپنے راستے سے ہٹایا ہو اور امینہ کا ایما بھی جرم میں شامل رہا ہو اور ممکن ہے، بعد میں امینہ اُسی کے ساتھ فرار ہو گئی ہو۔ اُس کے والدین آہ و بکا کرتے ہوئے جاگیردار کی حویلی پہنچے تھے تو جاگیردار سخت مکدر ہوا تھا اور جب انھوں نے اُسے اِدھر اُدھر رسوا کرنا شروع کیا تو جاگیردار کا ردِعمل اشتعال آمیز ہی ہونا چاہیے تھا۔ ہندو مسلم فسادات آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ کیا معلوم، اُس رات آگ لگنے کا سبب واقعی فساد ہو۔ جاگیردار نے امینہ کے لیے اشتیاق ظاہر کیا تھا اور چوں کہ اُس کے پاس بہت ساز و سامان، لاؤ لشکر، بہت اختیار و اقتدار تھا اور اُس کی سرمستیوں کے فسانے ارزاں تھے، اِس لیے کسی اور طرف دیکھا ہی نہیں گیا۔ نواکھالی سے واپس آ کے ملہاری کے سامنے جاگیردار کی حویلی ہی کا ایک راستہ تھا۔ بستی کے بچے کھچے لوگوں نے اُسی جانب اشارہ کیا تھا۔ خون میں حدت بڑھ جائے تو سارے حواس متاثر ہوتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں، بعد میں ملہاری کو اپنی ناپختہ فہمی کا احساس ہو گیا تھا۔ یہ صورت تو ملہاری کے لیے اور عذاب ناک ہو گی، پھر اُسے کسی رات چین سے نہیں سونا چاہیے تھا۔

شابے ایک بسیار گو آدمی تھا۔ طرح طرح کی قیاس آرائیاں گوش گزار کرنے کے بعد کہنے لگا، ''لوگوں کا کام ہی افسانہ سازی و شوشہ طرازی ہے، مگر خود اُسے یقین ہے کہ ملہاری کا خاندان جاگیردار ہی کی ہوس ناکی و ستم رانی کا شکار ہوا۔ [illegible] اور جاگیردار کا یہی انجام ہونا چاہیے تھا۔ جھل اور میں [illegible] سے سنا کیے۔ ہم نے کوئی رائے ظاہر نہیں کی۔ لوگوں کا [illegible] اگر سچ ہے تو یہ کیسا عبرت ساماں سانحہ ہے۔ ناکردہ گناہی کی [illegible] ادائی کو کہتے ہیں۔

ہم سرائے سے اڈّے آ گئے تھے۔ ملہاری اور اڈّے کے تمام لوگ ہماری خدمت کے لیے بے چین رہتے، مگر جھل نے وقت ضائع نہیں کیا۔ ڈھاکا ایک گنجان آباد شہر ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت کی وجہ سے جگہ جگہ مسجدیں اور مدرسے قائم ہیں۔ شہر تو ہم نے پہلے ہی چھان لیا تھا، اَب گرد و نواح کی بستیاں رہ گئی تھیں۔ جھل کو اطمینان نہیں ہوتا تھا۔ شابے کی رہبری میں ایک ایک دن کے لیے ہم ڈھاکے سے دُور بھی جاتے رہے۔ یہاں بیش تر افراد ہندستانی سے ناواقف ہیں۔ بنگال سے باہر تجارت کرنے والے تاجر، نوابین، دوسرے صوبوں کے تعلیم یافتہ، سرکاری افسر اور علماے دین وغیرہ ہندستانی خوب جانتے ہیں، لیکن اُن کی تعداد بہت کم ہے۔ اُن کے علاوہ لوگوں کو کلامِ پاک اور شرعی مسائل کے سبب سے عربی کی واجبی شُد بُد ضرور ہوتی ہے۔ جھل کو روانی سے بنگالی آتی تھی۔ میں نے کلکتا جیل میں سات سال گزارے تھے۔ مجھے بھی کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔ بنگالی بہت بے قرار لوگ ہیں۔ شکوہ کرنا شاید اُن کی سرشت ہے۔ سارا بنگال دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے؛ جہاں مٹی، وہاں سبزہ۔ بعض جگہوں پر تو ایسا لگتا تھا جیسے اونچی نیچی زمینوں پر، پہاڑیوں اور ٹیلوں پر سبز قالین بچھا دیا گیا ہو۔ لوگوں کا کہنا ہے، سبزہ بینائی کے لیے بہت اکسیر ہے اور اِس سے زندگی کا احساس اُجاگر ہوتا ہے، مگر جن کی آنکھیں ہی پراگندہ ہوں؟ ہمیں تو اپنے کام سے غرض تھی، یا یوں کہا جائے کہ فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ بس ایک دن کے لیے جھل نے سُندربَن کی سیر کی عیاشی کی تھی، یا پھر میں جتنے دن بستر پر پڑا رہا، یا کبھی موسم نے پابند کیے رکھا۔

مہینے میں ایک رات، چودھویں کی رات، اڈّے پر رقص و سرود کی محفل آراستہ ہوتی تھی۔ ہماری خاطر ملہاری ہر روز محفل کا اہتمام کرنا چاہتا تھا، جھل کی خواہش پر اُس نے احتیاط کی۔ ہمیں ڈھاکا آئے ہوئے پورا عشرہ گزر گیا تھا۔

''اینٹوں کی سپلائی کی ٹھیکا آپ کے بھائی کو، سیمنٹ کا بیٹے کو، سڑک کی تعمیر کا بھتیجے کو دیا گیا ہے۔ ترقیاتی منصوبے کا ہدف حاصل ہو گیا۔''

اطراف میں شاید ہی کوئی بستی رہ گئی ہو، جہاں ہم نہ جا سکے ہوں۔ آخر جھل نے ڈھاکے سے روانگی کا ارادہ کر لیا۔

اُس رات ملہاری اور شابے نے پُرتکلف دعوت کا انتظام کیا۔ ڈھاکے کے چیدہ باورچیوں سے کھانا تیار کرایا گیا۔ ملہاری نے سرِشام ہی شراب نوشی کی ابتدا کر دی۔ کھانے کے بعد سازندوں اور ناچنے گانے والیوں کے لیے فرش ہم وار کر دیا گیا۔ اگربتیاں سلگ رہی تھیں۔ گلاب پاش سے گلاب کا عرق چھڑکا جاتا رہا۔ شابے کہتا تھا، ملہاری کے سامنے سُر سے اُتری ہوئی گانے والیاں ٹھیر ہی نہیں سکتیں۔ عام ناچنے گانے والیوں کو بلایا ہی نہیں جاتا۔ جنھیں تھوڑا بہت آتا ہے، ملہاری کا نام سن کے وہ مشکل سے تیار ہوتی ہیں اور جنھیں کچھ آتا ہے، دل چسپ بات یہ ہے کہ وہ بلاوے کی منتظر رہتی ہیں اور ملہاری کی محفل میں شرکت افتخار کا باعث سمجھتی ہیں۔ ملہاری کی تحسین اُن کے لیے سند کا درجہ رکھتی ہے۔ ملہاری کا حکم تھا کہ صورت شکل دیکھنے کے بجائے فن آشنا ہی مدعو کیے جائیں۔ اُس رات بھی جو دو لڑکیاں آئیں، وہ تیکھے نقش و نگار، سانولی رنگت، متناسب بدن اور مجموعی طور پر دل کش، لیکن عمر کی پختہ لڑکیاں تھیں۔ دونوں میں ایک ٹھیراؤ، بُردباری، وقار اور اعتماد تھا۔ دونوں سگی بہنیں معلوم ہوتی تھیں۔ لباس بھی سادہ پہن رکھا تھا اور ہار سنگھار بھی اِتنا نہیں تھا۔ شابے کے کہنے کے مطابق پہلے بھی وہ بارہا اڈّے پر

محفل جما چکی تھیں اور ملہاری کی اُن پر خاص توجہ تھی۔ وہ بیش تر اُنھی کو بلاتا تھا۔ اُن کا بھی یہ رویہ تھا کہ پہلے سے کہیں بھی کیسا ہی حتمی وعدہ ہو، وہ ملہاری کے ہاں آنے کو ترجیح دیتی تھیں۔ شابے کا کہنا تھا کہ ایک یہی ہیں جنھیں نغمگی کے دوران زیر زبر کے فرق پر ملہاری ٹوک دیتا ہے اور یہ نہایت تپاک سے اصلاح قبول کرتی ہیں اور حتی الوسع اپنا سقم دُور کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ کئی بار ایسا بھی ہوا ہے کہ ملہاری بھری محفل سے اچانک اُٹھ گیا، یا اُس نے ہاتھ اُٹھا کے محفل برخاست کرنے کا حکم دے دیا۔ اِن دونوں لڑکیوں کو یہ عزت حاصل ہے کہ ملہاری اِن کی محفل میں آخر تک جما بیٹھا رہتا ہے، لیکن ملہاری نے محفل کے سوا اِنھیں کبھی طلب نہیں کیا ہے، اِنھیں کیا، کسی کو بھی طلب نہیں کیا۔ اُس نے اڈّے پر تیس سال کا عرصہ ایک عزلت نشیں اور مجرد شخص کے طور پر گزارا ہے۔

دونوں لڑکیوں نے پہلے ہاتھ جوڑ کے ملہاری کو تعظیم پیش کی۔ اُس کے پیر چھوئے، پھر گانا شروع کیا۔ واقعی اُن کے گلے میں رس تھا، تان خوب اُٹھاتی تھیں۔ راگوں پر ماہرانہ دست رس تھی اور گم ہو کے گاتی تھیں۔ ایک گاتی تو دوسری ناچتی تھی اور بہت سلیقے سے۔ اڈّے پر بیٹھے ہوئے لوگ جھوم رہے تھے اور پھڑک پھڑک اُٹھتے تھے۔ سبھی حسبِ توفیق پیسے لٹاتے رہے، بچھل بھی کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ ملہاری آنکھیں بند کیے، آنکھیں چڑھائے جھومتا رہا اور صرف ایک مرتبہ اُسے مُنہ بنانے اور دخل دینے کی ضرورت پیش آئی۔ اُس وقت وہ کسی اڈّے کا اُستاد نہیں، موسیقی کا کوئی پنڈت، کوئی گرو دیو لگ رہا تھا۔ اُجلے کپڑے، سر پر صافہ، کندھوں پر بسلک کی شال اور گلے میں مالا پڑی تھی۔ میں نے بہت سے اڈّوں اور بالا خانوں پر یہ محفلیں دیکھی ہیں، مگر آج کی بات ہی اَور تھی۔ اصل میں یہ مجرے سے کوئی مختلف محفل تھی۔ غالباً کسی کو بھی رقص اور موسیقی کے اِس ثقہ انداز سے گراں باری محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ دونوں لڑکیوں نے جیسے سب کو بے خود کر دیا تھا۔ آدمی بھی کیا صدف در صدف، تہ در تہ ہوتا ہے، ناچنے اور گانے کے دوران اُن کے جوہر کھل رہے تھے۔ اُن کے رقص میں ذرا بھی وحشت نہیں تھی اور اُن کی آواز جی چاہتا تھا کہ وقت

تھمیں ٹھہر جائے اور جس کے پاس جو کچھ ہو، اُن پر نچھاور کر دے۔ مجھے چاندنی بانو یاد آ رہی تھی۔ کہا نہیں جاسکتا کہ ملہاری کی نظر میں اُس کا کیا مقام ہوتا! اُسے بھی تارا بیگم نے موسیقی کے بڑے بڑے اُستادوں سے تعلیم دلوائی تھی۔ میرا کوئی واسطہ تو نہیں تھا، لیکن اب تک جو کچھ دیکھا اور جاننے والوں سے جو کچھ سُنا تھا، میرا اندازہ ہے کہ چاندنی بانو کی محفل کے دوران بھی ملہاری سے یوں اُٹھا نہ جاتا۔ وہ بھی سرتا پا ئمر تھی۔

دو بج رہے تھے، ملہاری نے سرگوشی میں بچھل سے پوچھا کہ محفل ختم کر دی جائے؟ بچھل نے درخواست کے لہجے میں فرمائش کی کہ کیا ہی اچھا ہو کہ وہ آج خود بھی کچھ سنائے۔ ہمیں معلوم ہو چکا تھا کہ ملہاری نے اڈّا سنبھالنے کے بعد کسی کے سامنے کچھ نہیں گایا ہے۔ وہ بند کمرے میں، یا چھت پر تنہا ریاض کرتا ہے اور دُور ہی دُور سے کسی کو اُس کے ستار بجانے، یا راگ الاپنے کی آواز سنائی دے جائے تو دے جائے۔ شروع میں لوگوں نے اُس سے بڑی منت کی تھی، لیکن وہ کبھی آمادہ نہیں ہوا، بل کہ اُس کی تیوری چڑھ جاتی تھی اور وہ مضطرب ہو جاتا تھا، پھر لوگوں نے کہنا سننا ہی بند کر دیا۔ شہر یا اطراف میں کسی سنگیت سمراٹ کی آمد کی خبر ملتی تو ملہاری وہاں ضرور جاتا اور اپنے آپ کو ظاہر کیے بغیر کسی گوشے میں بیٹھا خاموشی سے سنتا رہتا۔

بچھل کی فرمائش پر ملہاری کی حالت سیمابی ہو گئی، جیسے کسی سانپ نے ڈس لیا ہو، یا بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ وہ عجب بے بسی، بے کسی کی کیفیت سے دوچار ہوا۔ بچھل کے بارے میں شابے نے کچھ کم نہیں بتایا ہوگا۔ اپنے مہمان کی خوش نُودی بھی ملحوظ ہو گی۔ میرا خیال ہے، بچھل کو اُسے ایسی کسی آزمائش میں ڈالنا نہیں چاہیے تھا، یہ مہمانی کی وضع نہیں۔ بچھل کے منت کش لہجے پر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ اُس پر مستزاد بچھل کا اصرار تھا۔ ملہاری نے ہاتھ جوڑ کے معذرت کرنی چاہی، لیکن بچھل کو جیسے ضد ہو گئی۔ اُس نے ملہاری کی معذرت اعتنا کے قابل نہیں سمجھی اور کہنے لگا کہ پھر ہمیں خلش رہے گی کہ ہمارے میزبان نے ہمارا مان نہیں رکھا۔ 'نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن' والی ملہاری کی حالت تھی۔ اِدھر شابے نے اُس کے پیر پکڑ لیے۔ اُدھر دونوں لڑکیاں اور سازندے ہاتھ باندھ کے کھڑے ہو گئے۔

جو اُنھوں نے زبان سے کچھ نہیں کہا، لیکن اِس خموشی سے بڑی فریاد کیا ہو سکتی تھی۔ ملہاری کے سیاہ چہرے پر خون چھلکنے لگا۔ اُس کا رنگ ہی بدل گیا۔ بچھل نے اُس سے کہا کہ فن تو افشا کے لیے ہوتا ہے، اخفا کے لیے نہیں اور یہ تو بخل ہے۔ یہ تو خود غرضی اور خود جبری ہے۔ فن تو دوسروں کے لیے ہوتا ہے، دوسروں کے شوق و اشتیاق سے اِسے نمو ملتی ہے۔ یہ دولت لٹانے کے لیے ہوتی ہے اور دونوں ہاتھوں سے لٹانے کے بعد بھی اِس میں کمی نہیں ہوتی۔ فن کو دُھوپ نہ دکھائی جائے تو یہ گھٹ جاتا ہے۔ بچھل نے بہت سی دل گداز اور دل سوز باتیں کیں۔ کچھ غلط نہیں تھا، مگر خدشہ تھا کہ کہیں ملہاری کو ضبط کا یارا نہ رہے۔ وہ بہ ہر حال اڈّے کا داوا ہے۔ اڈّے کے داوا کے لہجے میں تندی آتے ہوئے دیر کیا لگتی ہے۔ میری توقع کے برعکس ملہاری پر انکسار، انتشار اور اضطراب کا عالم طاری رہا۔ وہ کسمساتا اور بل کھاتا رہا اور آخر اُس نے سر جھکا لیا۔ اُس کے سپر ڈالنے پر ہر طرف سے تحسین و آفریں کی صدائیں بلند ہوئیں۔ دونوں لڑکیوں نے مسرت میں گھنگرو چھنکائے، طبلہ نواز نے دیوانہ وار طبلہ بجا کے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ ایک مرتبہ پھر گلاب کا عرق چھڑکا جانے لگا۔ لوگ ایک دوسرے پر گلاب کی پتیاں پھینکنے لگے اور واویلا مچ گیا۔ ملہاری بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ پھر اُس کے سر اُٹھانے پر ستار نواز، ہارمونیم بردار اور طبلہ نواز چوکی کے قریب آ گئے۔ ملہاری نے ستار نواز کو کوئی اشارہ کیا، اُس نے نہایت ادب سے ملہاری کے پیروں پر ستار رکھ دیا۔ سب کی نظریں ملہاری پر مرکوز ہو گئیں اور ہر جانب سکوت چھا گیا۔ 'تک تک دیدم، دم نہ کشیدم' والا مضمون صادق آتا تھا۔ دونوں لڑکیوں کے چہرے دمک رہے تھے۔ اشتیاق اور تجسس اُن کی آنکھوں سے ہویدا تھا۔

ملہاری نے آہستہ آہستہ ستار کے تار چھیڑے تو ایک جھنکار بلند ہوئی۔ تاروں کو منشا کے مطابق استوار کرنے میں ملہاری کو دیر لگ گئی۔ سبھی آنے والے لمحوں کی صورت گری کے منتظر تھے۔ کسی طرف سے کوئی آہٹ نہیں اُبھری کہ مبادا ملہاری کے ارتکاز میں خلل انداز ہو۔ دھیرے دھیرے ملہاری نے تار جھنجھوڑنے شروع کیے اور راگ پھوٹنے لگے۔ تھوڑی

دیر میں ایسا لگا جیسے ترنم کی مخمل پھریاں چھوٹنے لگی ہوں، موسیقی کے آلات میں بھی کیسا رس بھرا ہوتا ہے۔ نچوڑو تو رس ٹپکے، پر کشید کرنے والا بھی تو چاہیے۔ رس کی شیرینی اور نشے میں ہاتھ کی تاثیر کا بہت دخل ہے۔ تار چھیڑنے ہی سے ملہاری کی مشاقی کا اندازہ ہو گیا تھا، لیکن ایسی نغمگی، یہ فسوں گری غالباً ہر ایک کے گمان و اعتبار سے سوا تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ سارا کمال ہی نظمِ ترتیب، حُسنِ ترتیب میں نہاں ہے اور سارا کمال تناسب و توازن ہی کا ہے۔ کیا شاعری، کیا مصوری اور کیا موسیقی، سب کچھ تو یہ تو ترتیب و ترکیب کا کرشمہ ہے اور بنیادی چیز کسی فن کے مدارج و مراحل سے آگہی اور اُن پر قدرت کا حصول ہے۔ مُدعا یہ ہے کہ ہر فن ایک مخصوص ترتیب اور ضوابط کے دائروں میں اسیر ہے۔ یہ دائرے گھٹتے بڑھتے، سکڑتے، پھیلتے رہتے ہیں، ختم نہیں ہوتے۔ ایک ترتیب کے بعد نئی ترتیب، ایک ہنر کے بعد دوسرا ہنر، جدت، اجتہاد، یعنی خلاقی و تخلیق آفرینی کی بات بھی ترتیب و ترکیب کے کسی نئے زاویے اور پہلو طرازی سے عبارت ہے، اور دائروں سے خارج کچھ نہیں ہے۔ تجرد یا دوسرے لفظوں میں انتہا پسندانہ اجتہاد بھی متعلقہ فن کے کسی روایتی پس منظر ہی میں ممکن ہے۔ خیال کی آمد ہر شخص پر ارزاں ہے، مگر ہر ایک کو ایک نظام، ایک سلیقۂ ہنر لازم ہے۔ موسیقی میں کسی نئے پہلو کی آمد، شاعری میں کسی نئے خیال کا الہام اور مصوری میں کسی نئے زاویے کا ورود متعلقہ فن سے وابستہ شخص ہی کو زیب دیتا ہے، کسی بڑھئی اور لوہار کو نہیں۔ یہی حال بڑھئی اور لوہار کے فنون کا ہے۔ شاعر اور موسیقار اور مصوّر چوب کاری اور آہن گری میں کسی نئے پن کا تصور کر سکتے ہیں اور بس!

مجھے اچھی طرح یاد تھا، گیا کے کالج میں میرے ایک بزرگ اُستاد کبھی کبھی اپنے موضوع سے ہٹ کے اِدھر اُدھر کی باتیں بھی ہمیں تعلیم کیا کرتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ شاعری، مصوری اور موسیقی دو اور دو کا حاصل جمع پانچ کرنے کی کوشش ہے۔ اُس وقت اُن کی بات پلّے نہیں پڑی تھی۔ اب کچھ کچھ سمجھ میں آ رہا تھا کہ 'دو اور دو کا حاصل جمع پانچ' سے اُن کی کیا مراد تھی۔ جو بہ ظاہر ممکن نہ ہو، اُسے کر گزرنا، کوئی معرکہ سر کرنا، کسی نئی منزل، نئی جہت کا سراغ پانا اور کیمیاگری کرنا،

لکیروں، لفظوں، تاروں اور سُروں کی کسی نئی ترتیب سے کوئی اضافہ کرنا، اضافے کا مطلب پانچ نہیں ہوتا کہ حصار سے باہر کچھ نہیں۔ حاصل جمع چار کے خطوط اور زاویے بے شک مختلف ہوتے ہیں اور اِسے پانچ کے مترادف کہنا چاہیے۔ یہ حادثہ بھی کبھی سرزد ہوتا ہے کہ ثمر بار درخت سے گزرتے ہوئے کسی راہ گیر کے دامن میں اچانک کوئی ثمر گر جائے۔ کسی پر اچانک کسی خیال کے وُرود، تگ و دو کے بغیر کسی دفینے کے مل جانے کی ناگہانی شاذ و نادر ہی ممکن ہوتی ہے۔ استثنا پر کُلیے نہیں بنتے۔ فن میں کمال تو ایک مسلسل کوہ کنی، مستقل کاوِ ریاضت کا ثمر ہے۔

ملہاری کو ورثے میں موسیقی کی دولت حاصل ہوئی تھی۔ ورثہ دو بیٹے بیٹیوں میں مساوی تقسیم کیا جائے تو حاصل جمع مختلف کیوں ہوتا ہے اور جواب چار کیوں نہیں آتا؟ تین کیوں ہو جاتا ہے اور پانچ کیوں ہو جاتا ہے؟ یہ کیا شعبدہ ہے کہ ایک درجۂ کمال پر پہنچتا ہے، دوسرا صورت دیکھتا اور آئینے پر شک کرتا رہتا ہے۔ ایک ہی مکتب میں درس حاصل کرنے والوں میں کسی ایک کے امتیاز کا سبب ایک کی بے کلی، دوسرے کی بے حسی۔ ایک کی غرض مندی، دوسرے کی قناعت، ایک کا قرار، دوسرے کی بے قراری، ایک کا قیام، دوسرے کا سفر ہے اور دو بے قراروں میں امتیاز کا پیمانہ بھی یہی ہے۔ کون سرفروشی پر آمادہ رہا، کس نے کتنا خود کو نثار کر دیا۔

ملہاری نے چاقو پر خوب دست رس حاصل کی تھی۔ قریب تیس سال سے وہ اڈّے پر قائم تھا، لیکن یہ اُس کا بہروپ تھا۔ لگتا تھا، وہ تو بس ستار بجاتا رہا ہے اور ستار ہی سوچتا رہا ہے۔ جیسے وہ چپکے چپکے اپنا ورثہ بڑھاتا رہا ہے اور اُس نے کوئی دن، کوئی پہر، کوئی لمحہ نہیں گنوایا۔

سبھی گُنگ بیٹھے ملہاری کا جمال دیکھ رہے تھے، ملہاری کا اصل رُوپ۔ دونوں لڑکیوں پہ وجد کی کیفیت طاری تھی، آنکھوں میں ڈورے پڑے ہوئے، چہرے تمتمائے ہوئے، بدن میں اُن کے بار بار ہُوک سی اُٹھتی۔ ہر ایک کا یہی عالم تھا۔ ملہاری نے ستار خود سے جدا کیا تو لوگوں کو اِس ترنم آفریں سحر سے نکلنے میں لمحے گزر گئے۔ پھر یکایک عمارت میں کان پڑی آواز سنائی دینا مشکل ہو گیا۔ جُھنّل نے ملہاری کے ہاتھ سینے سے لگا لیے۔ ہر شخص ملہاری کے پیر چھونے، اُسے سلام کرنے کے لیے چوکی کی طرف اُمڈ پڑا۔ اُنھیں جیسے آج ہی ملہاری کا عرفان ہوا تھا۔ شابے اور اڈّے کے دوسرے آدمیوں نے اُنھیں روکنے کی کوشش کی اور چیخ چیخ کے کہا کہ دوستو! ملہاری نے تو ابھی ستار نوازی کا مظاہرہ کیا ہے، راگ کہاں سنائے ہیں، یہ محفل کا اختتام نہیں ہے، یہ داد و ستائش قبل از وقت ہے۔ ذرا صبر کرو۔ جُھنّل کو بھی اُٹھنا پڑا۔ اُس نے ہاتھ بلند کر کے لوگوں کو صبر کی تلقین کرنے میں شابے کا ساتھ دیا۔ اُدھر ملہاری اپنے آپ سے بیگانہ سا بیٹھا تھا، کچھ گھبرایا گھبرایا، شرمندہ شرمندہ سا۔ داد سے بڑی لذّت کیا ہوتی ہے، خون سنسنانے لگتا ہے۔ اُس کے لیے یہ ایک نشاط انگیز واقعہ ہوگا۔ ستار نواز نے ستار اور طبلہ نواز نے طبلہ سنبھال کے مشق آزمائی شروع کی تو لوگوں کو احساس ہوا کہ ہاں، ملہاری کا اصل جوہر، اصل کرشمہ سازی تو ابھی رہی جاتی ہے۔ ملہاری نے بھی لوگوں کی وحشت خیز محبت دیکھ کے جلد ہی تان اُٹھائی اور اشاروں اشاروں میں سازندوں کو کچھ ہدایت دی۔

صبح کاذب میں اَب وقت کم ہی رہ گیا تھا، ملہاری نے اُسی نسبت سے راگ مالکونس کا آغاز کیا اور قصداً مختصر، ستار پر اُس کی ساحری، صنّاعی اور کاری گری کی بات تھی تو آواز صاف خداوندی نعمت، کسی خداداد صلاحیت کا مظہر تھی۔ پہلی شرط تو آواز ہے اور آدمی کا نغمگی سے متصف ہونا ہے۔ شاعری کی اصطلاح میں اِسے 'موزوں طبع' کہتے ہیں۔ دو اور دو کا حاصل جمع پانچ غالباً یہی معجز نمائی ہے۔ آواز بھی نشتر مثال ہوتی ہے، اور بہت کاری نشتر۔ سینے میں ترازو ہو جانے اور رگیں کاٹ دینے کی یہ خوبی تو نشتر میں بھی نہیں ہوتی۔ قدیم روایتی موسیقی کا ایسا نظارہ میں نے پہلے نہیں کیا تھا۔ ملہاری کی آواز میں ایسی کسک، خلش اور فریاد تھی، اِتنا کرب تھا کہ آدمی پر گریہ طاری ہو جائے اور وہ گریباں چاک کر دے۔ کہتے ہیں، آواز تو ایک خام چیز ہوتی ہے۔ ہیرے کی طرح اِسے تراشنا پڑتا ہے، مگر نہ ہر پتھر ہیرا بن سکتا ہے، نہ ہیرے جیسی آب و تاب کا متحمل ہو سکتا ہے! اور کہتے ہیں، آواز تو آدمی کا سراپا ہوتی ہے،

آدمی کا آئینہ۔ اندر کچھ کھٹکتا ہے تو بے قراری عیاں ہو جاتی ہے۔ اندر کچھ جلتا ہے تو آواز بھی جاں سوز ہو جاتی ہے۔ لوہا جلتا رہے، جلتا رہے، کُٹتا رہے، اِس ضربت و جراحت کے بعد ہی کوئی شمشیرِ بُرّاں ممکن ہوتی ہے۔

ملہاری کی صحبت میں اڈّے کے لوگوں کو بھی قدیم موسیقی کا اچھا ذوق ہو گیا تھا۔ بنگال کے لوگ یوں بھی موسیقی کے رسیا ہوتے ہیں۔ معلومات بھی اُنھیں خوب ہوتی چاہییں۔ جُھنّل نے تو طرح طرح کا وقت گزارا تھا۔ مجھے بھی راگ راگنیوں سے تھوڑی بہت آشنائی تھی۔ بمبئی میں ایک بار جولین میرے لیے کتابوں کا ڈھیر بازار سے اُٹھا لائی تھی۔ اُس میں ہندستان کی قدیم موسیقی سے متعلق بھی ایک کتاب شامل تھی۔ انگریزی میں تھی اور انگریز محقق ہی کی تالیف تھی۔ مجھے کچھ زیادہ پڑھنے کا موقع تو نہیں ملا، لیکن چند ابتدائی باب نظر سے گزرے تھے۔ کرشنا جی کے پاس بھی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا۔ اُن کی عدم موجودگی میں کبھی کبھی اُن کی کتابیں ٹٹولتا رہتا تھا، ہندستانی موسیقی کسی بڑے خزانے کے مانند ہے۔ ایک دَر کے بعد دوسرا دَر، اور ہر دَر میں ایک خزانہ، دفینے کے راستے، قواعد، اوقات اور آداب مقرر ہیں۔ پہلے اُنھیں ازبر کیجیے اور دَر کھولتے، دَر پار کرتے جائیے اور آنکھیں خیرہ کرتے رہیے۔ ذرا نگاہ چُوکی اور آدمی گم ہوا۔ سارے خزانے تک پہنچنے کے لیے ایک عمر چاہیے اور کسی ذی نفس کے پاس اِتنی عمر نہیں ہوتی۔ جولین کی عطیہ کتاب سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ راگوں کے باقاعدہ اوقات مقرر ہیں... ویسے تو کوئی بھی راگ کسی بھی وقت گایا جا سکتا ہے، مگر اپنے معیّن وقت پر گایا جائے تو تاثر ہی کچھ اَور ہوتا ہے۔ ملہاری نے وقت دیکھتے ہوئے راگ مالکونس منتخب کیا تھا۔ مالکونس کے لیے رات کے دوسرے پہر کا وقت مقرر ہے۔ یہ بھیرویں ٹھاٹھ کی ایک شاخ ہے۔ منتخب سُروں کے الگ الگ نظام اور ضابطوں کی درجہ بندی کر دی گئی ہے۔ سیدھے سادے لفظوں میں راگ راگنیوں کے مختلف گروہ، یا خاندان وضع کر دیے گئے ہیں، اِن گروہوں اور خاندانوں کو 'ٹھاٹھ' کہا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں راگوں، راگنیوں کے بہت سے نظام، یا ضابطے یا گروہ رائج تھے، بل کہ اُن کا شاخ در شاخ سلسلہ بیٹے بیٹیوں، دامادوں، بہوؤں، مؤنث، مذکر وغیرہ سے موسوم اور تعبیر کیا جاتا تھا۔ اس موسیقی کے عالموں نے یہ شاخیں دس ٹھاٹھوں، یا دس حصّوں میں تقسیم کر دیں۔ ہر ٹھاٹھ کا سُروں کی مختلف ترتیب پر مشتمل اپنا ایک نظام اور تشخص ہے اور ہر ٹھاٹھ کی ذیلی شاخوں کا اپنا ایک نظم، اپنی ایک ترتیب ہے۔ مالکونس کو رات کے راگوں میں بہت فضیلت حاصل ہے۔ پانچ سُروں کا یہ راگ نہایت دل نشیں اور دل نواز راگ ہے۔ راگوں سے متعلق ایک اَور دل چسپ بات بھی میں نے پڑھی تھی کہ ہر راگ کی ایک شبیہ قدیم موسیقاروں نے مصوّر کی ہے۔ مالکونس کو اُنھوں نے سفید رنگ کے ایک جوانِ رعنا سے تشبیہ دی ہے۔ دمکتی آنکھیں، چوڑی پیشانی، دراز قد، دست و بازو کا زور آور، شان و شوکت میں یکتائے روزگار، ہاتھ میں زرنگار چھڑی، بدن پہ لاجوردی لباس سجائے اور موتیوں کی مالا زیبِ گلو کیے شہبازوں، شہسواروں کا ہم نشیں ہے۔

مالکونس پر ملہاری کو اِتنی قدرت تھی تو راگ ملہار پر اُس کی گرفت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ دونوں لڑکیوں کے بدن پارہ پارہ

تھے۔ پھر اُن سے برداشت نہیں ہوا، اُنھوں نے اُٹھ کے رقص شروع کردیا۔ ماحول ہی کچھ اور ہوگیا۔ رقص راگوں کی مصوری ہے۔ رقص کی آمیزش سے راگ رنگین ہوجاتے ہیں اور جلد سمجھ میں آتے ہیں۔ ظاہر ہے، ملہاری کے بعد وہی دونوں محفل کے تمام لوگوں سے زیادہ موسیقی کا ورک رکھتی تھیں۔ قدرِ جوہر شاہ داند... اُنھی کو ملہاری کے کمال، اُس کے فنی اسرار، سب سے زیادہ منتقل ہونے چاہیے تھے، اور وہی اُس کی صحیح طور پر پذیرائی کرسکتی تھیں۔

سورج طلوع ہونے میں ابھی دیر تھی اور لوگوں کی شمولیت، اُن کے انہماک و استغراق کا یہ حال تھا کہ بس سانس رُک جائے۔ مگر صیاد خود اپنے دام کا اسیر ہونے لگا۔ پہلے تو ملہاری کی آنکھوں میں آگ سی بھڑکی پھر آنسو اُبلنے لگے اور آواز پر رعشہ سا طاری ہوگیا۔ اُس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی، لیکن جانے کیا ہوا، کچھ بھولا بسرا یاد آگیا۔ کوئی کانٹا رگِ جاں میں اٹکا ہوا تھا، وہ زیر و زبر کرگیا۔ ملہاری بری طرح رونے لگا۔ سازندوں نے فوراً ساز بند کردیے۔ اِس سے پہلے کہ ملہاری غش کھا کے گر پڑتا، بچھل نے اُسے بازو میں تھام لیا۔ بچھل نے جیسے خاکستر میں پھونک ماردی تھی، یا تارِ نفس چھیڑ دیے تھے، اُس کے بازوؤں میں نڈھال ہوتے ہی ملہاری پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ اُس کی تو ہچکیاں بندھ گئیں۔ دونوں لڑکیوں نے دیوانہ وار چوکی پر آکے ملہاری کے پیروں پر سر رکھ دیے، پھر ایک لڑکی پلّو سے پنکھا جھلنے لگی۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ ہر شخص حیران و پریشاں ملہاری کو دیکھنے کے لیے چوکی پر چڑھا جا رہا تھا۔ شابے نے بُرا بھلا کہہ کے، گالیاں دے کے اُنھیں روکا اور کچھ دیر کے لیے پُرسکون ہوجانے کی التجائیں کرنے لگا۔ ملہاری کی آنکھیں چڑھ گئی تھیں۔ آنسوؤں کے ایک سیل کے بعد اُس نے ہاتھ پیر چھوڑ دیے اور خود کو بچھل کی آغوش کے سپرد کردیا۔ لوگوں کی بے چینی، اُن کی سرگوشیوں اور مشوروں کے شور سے گریز کے لیے یہی مناسب تھا کہ ملہاری کو فوراً کسی دوسری جگہ منتقل کردیا جائے۔ بچھل، میں، شابے اور اڈّے کے چند آدمی جیسے تیسے اُسے چوکی کے عقب میں ایک کمرے میں لے آئے اور چارپائی پر لٹا دیا۔

شابے نے دروازے پر کھڑے ہوکے لوگوں کا داخلہ بند کردیا۔

دونوں لڑکیوں کو بھی شابے نے روک دیا تھا، لیکن وہ اَڑ گئیں۔ بچھل کے اشارے پر شابے نے بادلِ ناخواستہ اُنھیں بھی اندر آنے کی اجازت دے دی۔ دونوں کی سراسیمگی میں بہت وارفتگی تھی۔ اضطراری انداز میں وہ ملہاری کی چارپائی پر بیٹھ گئیں۔ ہم پیشگی کے استحقاق کا اعتماد تھا، یا وفورِ پرستش اور بندگی کا جنون کہ ایک نے سرہانے بیٹھ کے ملہاری کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور اُس کے ہاتھ مَلنے لگی۔ دوسری، پائینتی بیٹھ کے ملہاری کے پیر مسلنے لگی۔ بچھل نے ملہاری کے مُنھ پر پانی کے چھینٹے ڈالنے شروع کیے۔ اِسی اثنا میں اڈّے کے آدمی کہیں سے کوئی وید پکڑ لائے۔ وید کی دیکھ بھال اور دوا سے ملہاری کے چہرے کا کھنچاؤ کسی قدر کم ہوگیا۔ عرق میں یقیناً نشے کی کوئی دوا شامل تھی، جبھی ملہاری کی آنکھیں مچنے لگیں اور وہ رہے سہے ہوش سے بھی بیگانہ ہوگیا۔

وید کی ہدایت پر سب باہر چلے آئے۔ دونوں لڑکیاں، چمپا اور چندا وہیں رہنا چاہتی تھیں، لیکن وید نے ایک آدمی کے سوا کسی کو اندر ٹھیرنے کی اجازت نہیں دی۔ سو ملہاری کے ایک سن رسیدہ معتمد کو نگہداری کی خدمت سونپی گئی اور کمرے کا دروازہ بند کردیا گیا۔

تھوڑی دیر میں اندھیرا ٹوٹنے لگا۔ کسی نے بھی وہاں سے جنبش نہیں کی۔ شابے اور بچھل نے بہت کہا تھا، لیکن چمپا اور چندا نے گھر واپس جانے سے انکار کردیا۔ وہ ایک کونے میں تھم سے کمر لگائے خاموش بیٹھی رہیں۔ اُن کی آنکھیں ڈوبی ہوئی تھیں۔ تھم کے سامنے ہی ملہاری کے کمرے کا دروازہ تھا۔ ملہاری کا حال دیکھنے شابے وقفے وقفے سے اندر جھانک کے واپس آتا تو وہ بے تاب ہوجاتیں۔ شابے اُنھیں مژدہ سناتا کہ ملہاری گہری نیند میں ہے اور گویا سب خیریت ہے، راوی چین لکھتا ہے۔ شابے کی بے نیازی اور اطمینان نے اُنھیں آسودہ نہیں کیا، وہ وہیں بیٹھی رہیں۔

دیکھتے دیکھتے اُجالا ہوگیا۔ کوئی آٹھ بجے اڈّے کے آدمیوں کو ناشتے کا خیال آیا اور بھاگ دوڑ ہونے لگی۔ ہماری وجہ سے وہ کچھ زیادہ فکرمند ہوئے۔ خاصی تعداد میں لوگ دھرنا دیے بیٹھے تھے،

تاہم گھنٹے بھر میں اُنھوں نے سب کے لیے ناشتے کا خاطر خواہ انتظام کردیا۔ پوری ترکاری سارے ہندستان کی مقبول عام غذا ہے۔ ساتھ میں دال اور چاول بھی تھے۔ بنگالیوں کو دال بھات نہ ملے تو بھوکے ہی رہیں۔ نو بجے وید نے دوبارہ حاضری دی۔ وہ اکیلا ہی ملہاری کے کمرے میں گیا اور آکے بتایا کہ بظاہر فکر کی کوئی بات نہیں، سرِ دست ملہاری کو دوا سے زیادہ آرام کی ضرورت ہے۔ لوگوں نے وید کو گھیر لیا اور طرح طرح کے سوالات سے اُس کا ناطقہ بند کردیا۔ وید کے پاس کوئی شافی جواب نہیں تھا۔ کسی کے پاس بھی نہیں تھا اور شاید سب جانتے تھے، مگر محض اپنے وہم و قیاس کی تصدیق کے خواہش مند تھے۔

ہمیں بارہ بجے روانہ ہوجانا تھا۔ گیارہ بجے کے قریب ملہاری کی نگرانی پر متعین آدمی گھبرایا ہوا باہر آیا اور اُس نے بتایا کہ ملہاری کی آنکھ کھل گئی ہے اور وہ شدید قسم کے تشنج اور اختلاجی حالت میں ہے۔ سبھی پریشان ہوگئے۔ اِس سے پہلے کہ کوئی اندر جاتا، چمپا اور چندا دروازے کی طرف لپکیں۔ اُنھوں نے کسی کو مداخلت کا موقع ہی نہیں دیا، سیدھی کمرے میں داخل ہوگئیں۔ اِدھر بھی سب اندر جانے کے لیے کمربستہ ہوگئے تھے، مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ بچھل کے ساتھ میرے اور شابے کے سوا کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔

ملہاری چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرے سے وحشت برس رہی تھی۔ بوڑھا خادم اُس کا کندھا پکڑ کے دوائی کا ایک جرعہ لینے کے لیے اصرار کر رہا تھا۔ چمپا اور چندا چارپائی سے کچھ دور ایک جانب ہاتھ باندھے کھڑی کچھ کہہ رہی تھیں۔ ہمیں دیکھ کے وہ چپ ہوگئیں۔ ملہاری بھی حواس باختہ سا ہوگیا اور اُس نے کئی بار سر جھٹکا۔ پہلے ندامت، پھر یاس کا اُس پر غلبہ ہوا۔ بچھل نے اُس کے سرہانے بیٹھ کے اُس کی کمر تھپکتے ہوئے نرم لہجے میں پوچھا، "کیسے ہو مہاراج؟"

کشش و پیچ سے دوچار ملہاری بے چارگی کی ایک نظر بچھل پر ڈال کے رہ گیا،

"وید بولتا ہے، تھوڑے آرام سے سارا ٹھکانے پر آجائے گا۔" بچھل نے بدبداتے ہوئے کہا۔

"کہا تھا کہ میرے سلیپر مت پہننا..."

"میں، میں ٹھیک ہوں۔" ملہاری نے گھٹی ہوئی آواز میں باور کرانے کی کوشش کی اور ہڑبڑا کے پوچھا، "کیا وقت ہوا ہے؟"

شابے نے بہ عجلت اُسے وقت بتایا۔

"اُستاد کو جانا تھا۔" وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

"اپنے کو جلدی نہیں ہے۔" بچھل نے بے پروائی سے کہا۔

"پر میں، میں..." وہ اُٹھنے لگا تھا کہ بچھل نے اُسے اُٹھنے نہیں دیا۔ اُس نے مزاحمت جاری رکھی، اپنا سینہ تانتے اور بازو پھیلانے کی مشق کی اور جلد ہی اُسے اندازہ ہوگیا کہ ابھی اُسے اِس مستعدی کی استطاعت نہیں ہے، سو اُس نے زِچ ہوکے سر جھکا لیا، لیکن دوسرے ہی لمحے اُس کے جسم میں تلاطم برپا ہوا۔ اُسے اپنی دائیں جانب ہاتھ باندھے، مجسّموں کی طرح ایستادہ چمپا اور چندا کی موجودی نے منتشر کردیا۔ "باہر بھی سبھی اِدھری بیٹھے ہیں، تمھارے درشن کو۔" بچھل نے زیرِ لبی سے کہا۔

یہ سُن کے ملہاری کے چہرے پر بل پڑگئے، "میں، میں باہر جاتا ہوں۔" اُس نے بچّوں کی طرح ضد کی اور چارپائی سے اُٹھنے کی کوشش کا اِعادہ کیا۔

"نہیں مہاراج! ابھی ٹھیک نہیں ہے۔" بچھل نے اُس کا زانو دباتے ہوئے کہا، "گاڑی نہیں چھوٹ رہی کسی کی، رساتی سے جانا۔"

تیس سال کے معمول میں یہ بے ضابطگی ملہاری کے لیے مغائرت اور ناگواری، بے زاری اور خِفّت کا باعث ہونی چاہیے تھی اور ہوش و حواس کی بحالی تک اِنھی متضاد کیفیتوں سے نبرد آزمائی لازم تھی۔ فی الحال سکون و سکوت کا جبر ہی اُس کے لیے ایک بہتر نسخہ تھا۔ بچھل نے بھی اشاروں میں

اُسے یہی تلقین کی۔ ملہاری نے دوا پلانے کے لیے منتظر اپنے بوڑھے نگراں کے ہاتھ سے سفوف کی پڑیا جھپٹ لی اور حلق میں لوٹ کے مُنہ بنایا۔ اُس نے ایک ہی گھونٹ میں سارا پانی اُنڈیل کے کٹورا فرش پر پھینک دیا۔ کچھ دیر خاموشی کا حبس رہا۔ پھر بِجّھل نے اُس کی تالیفِ قلب کے لیے آہستگی سے کہا، ”رات جو ہم نے چمتکار دیکھا، ویسا کبھی دیکھا سنا نہیں تھا۔“

ملہاری نے ایک گہری سانس لی۔ شانے اُچکائے، اُس کے ہونٹ پھیل گئے۔ جواب میں کچھ کہہ نہ سکا، اِدھر اُدھر دیدے گھمانے لگا اور اُس کی بھٹکتی ہوئی نگاہیں چمپا اور چندا پر آ کے جم گئیں۔ ”تم گھر جاؤ، تم کیوں، کیوں...“

”یہ اَب کدھری جائیں گی؟“ بِجّھل نے تیکھے لہجے میں کہا، ”کوئی ٹھکانا ہی نہیں چھوڑا مہاد یونے اِن کے لیے۔“

چمپا اور چندا نے بھی سن لیا تھا۔ اُنھیں حوصلہ ہُوا اور اُنھوں نے جھپٹ ملہاری کے پانو پکڑ لیے۔ ”ہم کو اپنے چرنوں میں جگہ دو مہاراج!“ بڑی لڑکی چندا نے جرأت مندانہ عاجزی سے کہا۔

ملہاری نے پیر سکیڑ لیے اور رُخ پلٹا کے بولا، ”جاؤ جاؤ، گھر جاؤ، اَب کوئی تماشا نہیں ہے یہاں۔“

”تماشا تو، لگتا ہے، اَب شروع ہوگا ملہاری بابو!“

ملہاری کو بِجّھل کا مفہوم اَخذ کرنے کی بے کلی ہونی چاہیے تھی۔ وہ چونک پڑا۔ میں نے بھی سمجھنے کی کوشش کی لیکن بِجّھل کا لہجہ رمزیت سے آلودہ تو چہرہ عاری تھا۔ ایسی ناگہاں فقرے بازیاں سینے کی تندی میں اکسیر ہوتی ہیں۔ میں نے اپنی آسانی کے لیے بِجّھل کے فرمودے کو تفننِ طبع پر محمول کیا، ملہاری نے بھی۔

”آپ بھی اُستاد، اب جاؤ، ہماری وجہ سے اپنا وقت برباد مت کرو۔“ ملہاری نے آزردگی سے کہا، ”ہم ٹھیک ہیں بالکل۔“

”ہاں، اب ٹھیک ہی ہونے کا ٹائم آیا ہے، پر اپنا کام ابھی باقی ہے۔ پورا کر کے نہیں جائیں گے تو کانٹا پڑا رہے گا۔“

”ابھی رہ گیا ہے کوئی کام!“ ملہاری نے مضطربانہ سادگی سے پوچھا۔

اُسے جواب دینے کے بجائے بِجّھل نے شابے کو ہدایت کی کہ وہ ملہاری کے لیے مُنہ ہاتھ دھونے، لباس کی تبدیلی اور ہلکے قسم کے ناشتے وغیرہ کا بندوبست کرے۔ اُس نے چمپا اور چندا کو کمرے سے نکل جانے کا حکم دیا اور خود بھی اُٹھ گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اڈّے کا نگراں نہ ملہاری ہے اور نہ شابے کو کوئی اختیار حاصل ہے۔ بِجّھل نے اڈّے کی کمان سنبھال لی ہے۔

دروازے سے نکلتے ہوئے اُس نے مڑ کے ملہاری کو مخاطب کیا، ”پہلے ذرا ٹھیک ٹھاک ہو لو، پھر تسلّی سے بات کریں گے۔“ ... ”باہر آنے کو جی نہ کرے تو ابھی اِدھری آرام کرو۔“

ملہاری ہکا بکا اُس کے احکام سنتا رہا۔ بوڑھے نگراں کے سوا سبھی باہر چلے آئے۔ دھوپ تیز ہو گئی تھی۔ فرش پر اب بھی کہیں کہیں دریاں بچھی ہوئی تھیں اور چارپائیوں پر بھی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ چمپا اور چندا اپنی پرانی جگہ پر آ کے جم گئیں۔ کچھ دیر لوگوں کے درمیان بیٹھ کے بِجّھل نے ملہاری کے بارے میں اُنھیں مطمئن کیا۔ پھر چمپا اور چندا کے پاس جا کے اُنھیں اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ اوپر کی منزل کے جس کمرے میں ہم ٹھیرے ہوئے تھے، بِجّھل نے اُس طرف کا رُخ کیا تھا۔ اُس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا تھا۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی اور ایک کونے میں بیٹھا دری کے دھاگے اُدھیڑتا رہا۔ چمپا اور چندا کے ساتھ وہ جلد ہی نیچے آ گیا۔ مجھے بے چینی ہونے لگی تھی۔ یقیناً بِجّھل کی یہ تن دہی بے سبب نہیں ہوگی، لیکن مجھے کچھ سجھائی نہیں دیا۔

لوگ تتر بتر ہونے لگے تھے۔ اُن کی تعداد میں بھی کمی ہو گئی تھی کہ ملہاری کی طرف سے اَب اُنھیں ایسی فکر نہیں رہی تھی، دوپہر کے کھانے پر البتہ بہت سے لوگ شریک تھے۔ غالباً اُنھیں ملہاری کی موجودی کی توقع تھی، اِس لیے وہ وقت پر واپس آ گئے۔ ملہاری کو نہ دیکھ کے اُنھیں مایوسی ہوئی۔ معلوم نہیں، وہ اب تک کیوں باہر نہیں نکلا تھا۔ اُسے تو بڑی بے تابی ہو رہی تھی۔ ابھی خیر اِتنا وقت نہیں گزرا تھا، لیکن زیادہ دیر تک اُس کی پردہ پوشی سے لوگوں کو منضبط رکھنے کی دشواری پیش آ سکتی تھی۔ شابے اَب تک اُنھیں تھپکتا رہا تھا۔ کھانے کے دوران بھی اُس نے زیرکی سے اُنھیں قابو میں رکھا، کسی قدر رازدارانہ انداز میں اُس نے لوگوں سے کہا کہ ملہاری تو بہت ضد کر رہا تھا، اُسے روک دیا گیا ہے۔ اچھا ہے، کچھ وقت یک سُوئی اور دل جمعی کا اُسے اور مل جائے۔ وہ ہشاش بشاش حالت میں ہم لوگوں کے درمیان آئے۔ وید کی بھی یہی ہدایت ہے، ملہاری نے ویسے بھی کبھی نہ کوئی چھٹی کی ہے، نہ آرام کیا ہے۔ کیا اُسے اِس خلوت کا حق نہیں ہے۔ کیا وہ لوہے کا بنا ہُوا ہے؟

عصر کا وقت ہو رہا تھا۔ دھوپ ابھی باقی تھی کہ مجھے ساتھ لے کے بِجّھل نے ملہاری کے کمرے کی طرف قدم بڑھائے۔ چمپا اور چندا بھی ہماری پیروی میں اندر جانے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی تھیں، بِجّھل نے اُنھیں منع کر دیا۔ اُس وقت کمرے میں کوئی اَور نہیں تھا۔ نیم دراز ملہاری گاؤ تکیے سے کمر لگائے جانے کہاں کھویا ہُوا تھا، ہماری آمد پر سیدھا ہو گیا۔ اُس نے لباس تبدیل کر لیا تھا، بال کڑھے ہوئے تھے۔ خاصا اُجلا ستھرا دکھائی دے رہا تھا۔ بِجّھل نے دروازے ہی سے صدا لگائی، ”کیسے بدلے بدلے لگتے ہو مہاراج!“

ملہاری نے سر جھٹکا، آنکھیں بھینچ لیں اور ہاتھ جوڑ کے شکایتی لہجے میں بولا، ”ہم کو مہاراج کیوں بولتے ہو اُستاد؟“

”پھر کم بولتے ہیں کیا؟“

”جو پہلے بولتے تھے، وہی...“ ملہاری نے گھُٹ کے کہا۔

”پٹّی بھی تو تم ہی نے کھولی ہے۔“

”اَب جانے دو اُستاد!“ وہ اُلجھ کے بولا۔

”کیسے، کیسے جانے دیں۔“

”بھول جاؤ سارا۔“

”تم نے بھلا دیا سارا؟“ بِجّھل نے تنک کے کہا۔

”ہاں۔“ ملہاری کی آواز ڈوب گئی۔ ”ہم نے تو بِنتی کی تھی۔ تم ہی نے زور دیا تھا۔ ہم تو... ہم تو...“

”جانتے ہیں، تم نے بڑا مان رکھا اپنا، پر آنگا پیچھا دیکھے کے ہی ہم نے تکلیف دی تھی۔ تم کو اچھا نہیں لگا تو ہم کو معافی دیو۔“

ملہاری چپ بیٹھا اپنے ہاتھ مسلتا رہا۔

”بُرا نہ مانو تو تھوڑی زبان کھولیں۔“ کچھ توقف کے بعد بِجّھل نے دھیمے لہجے میں کہا۔

ملہاری نے سر گھما کے اُسے متجسّس نظروں سے دیکھا۔

”اَب باہر کیسے جاؤ گے؟“

ملہاری کی پیشانی تنگ ہو گئی، گردن بھی اکڑ گئی۔

”اڈّے کا دادا پتھر کی آنکھیں رکھتا ہے۔“ بِجّھل نے نکیلی آواز میں کہا، ”ہم بولتے ہیں، اَب نہیں چلا پاؤ گے تم۔ بہت

مشغول کر لیا تم نے اپنے آپ سے اور ان حرام خوروں سے۔"

"کیا، کیا بولتے ہو تم..." ملہاری اُکھڑ گیا۔

"اب اپنے کو مکتی دیو بھیا، بہت کاٹ لیا بن باس، یہ تو ڈگنے سے اوپر ہو گیا۔"

ملہاری کا ہیجان نمایاں تھا۔ اُس کی بھویں پھڑک رہی تھیں۔

"اپنی جگہ پر جاؤ مہاراج۔" بھٹل نے تندی سے کہا، "اپنا بھی گھاٹا کیا تم نے، دوسروں کا بھی۔"

ملہاری کو منتشر ہونا چاہیے تھا۔ یہ سب کچھ میری توقع سے بھی بعید تھا۔ اُس کا چہرہ تمتمانے لگا، نتھنے پھول گئے، لیکن وہ خاموش رہا۔ بھٹل کا مدعا، اُس کی غرض سمجھے بغیر اس ناروائی پر برہمی مناسب نہیں تھی۔ مناسب، نامناسب کا شعور ہوش مندی کی دلیل ہے۔ اِس سے مراد ہے کہ آدمی بالکل پتھر نہیں بن گیا ہے۔

"یہ تو ٹھیک نہیں چاہیے تھا، جو سینت کے رکھا تم نے، وہ تو تمھارے تک رہا۔ ایسا نہیں ہوتا ملہاری بابو! ایسا کر کے تم نے اپنے آپ کو شانت رکھا؟ سینے پر ہاتھ رکھ کے بولو۔" بھٹل نے اُس سے پوچھا۔

ملہاری سے کوئی جواب بن نہیں پڑا۔ اُس کے ہونٹ دھڑک رہے تھے۔

بھٹل نے اُس سے کہا کہ اگر اُس نے سماعت کا سلسلہ بند نہیں کر دیا ہے اور حوصلہ دراز کرنے پر قادر ہے تو کچھ کہا جائے۔ کب تک وہ کھنڈروں پر کھڑا اگزرے ہوئے کا نوحہ پڑھتا رہے گا؟ بیتا ہوا لوٹتا نہیں ہے۔ کھنڈر تو کھنڈر ہی رہتے ہیں، اور کھنڈر، اور کھنڈر... بے بسی، بے چارگی، خس و خاشاک، گرد و غبار، گریہ اور سکوت، کھنڈروں کے پاس اِس کے سوا دینے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ ملبہ ہٹائے بغیر زندگی نمو نہیں پاتی اور زندگی کی طلب نہیں ہے تو آدمی خود کو کھنڈروں کا جزو کیوں نہیں بنا دیتا۔ یہ جاں گزاری تو ہمہ وقت اُس کے اختیار میں ہے، یہ دوئی تو خود کو دھوکا دینے کے مترادف ہے کہ ایک طرف آدمی کھنڈروں کا تمنائی ہے، یا کھنڈروں سے آس لگائے ہوئے ہے، دوسری طرف زندگی کا خوگر ہے۔ بے شک جانے والوں کے نقش کبھی رگِ جاں میں پیوست ہو جاتے ہیں، مگر زندگی تو ٹھیرتی نہیں۔ کسی نے کسی کو وقت سے پہلے ختم کر دیا تو اُس قاتل، اُس جفا پیشہ نے کیا ختم کیے جانے والے شخص کی زندگی غصب کر لی، غبن کر لی؟

ملہاری کے ساتھ بہت ستم ہوا اور ہر چند اس میں ملہاری کا کوئی قصور، اُس کی کوئی کوتاہی نہیں تھی، لیکن کیا موقع پر ملہاری کی موجودی اُس کے متعلقین کے لیے بقائے دوام کی ضامن ہوتی؟ راستی کا یہی طور ہے کہ اُسے نوشتے کا المیہ جان کے بکھرا ہوا سمیٹنا چاہیے تھا۔ یہی آدمی کا امکان ہے، ہر آدمی کا ایک ظرف، ایک پیمانہ ہوتا ہے۔ اُس کا سینہ چھلنی ہوتا ہے۔ اُس کی آنکھیں جلتی ہیں، زخم رِستے ہیں، دل روتا ہے، جسم میں آگ لگتی ہے اور روح مجروح ہوتی ہے۔ پھر اس کا مداوا کیا ہو کہ وہ اپنے آپ کو نوچنا کھسوٹنا شروع کر دے۔ جو بھی سامنے آئے، اُسے اپنی آگ میں لپیٹ لے، ساری دنیا کو آگ دکھا دے، یا وہ مرہم کی جستجو کرے۔ پانی کی، پھولوں کی جستجو کرے۔ جواب میں ملہاری نے بھی بہت آگ لگائی تھی۔ بعد کو کسی نے اُس کا مذاق اُڑایا کہ اُس کا ہدف ہی ٹھیک نہیں تھا۔ یہ مذاق پہلے سے بڑا آزار، پہلے سے بڑا ستم تھا۔ پھر اُسے پاگل ہو جانا چاہیے تھا، یا کوئی خنجر سینے کے پار کر لینا چاہیے تھا۔ یہ آشفتگی ممکن نہ ہو سکی تو اُس آسمان گزیدہ کو چربی بڑھانے کی فکر کرنی چاہیے تھی۔ اُس نے کس جرم کی پاداش میں خود کو اس زندان کے سپرد کر دیا۔ اُس کی اگر کوئی خطا تھی تو اُس کے پاس اِس سے آسان سزائیں بھی تھیں، اور وہ کب تک یہ زندان بھگتتا رہے گا۔ کیا اِس طرح اُس کی سیری ہو گئی ہے، یا تلافی ہو گئی ہے اور اَب اُس کا کوئی اِدّعا نہیں رہا ہے۔ اِس زنداں کا کوئی راستہ، کوئی اختتام بھی ہے؟

بھٹل بنگالی میں اُس سے مخاطب تھا۔ ملہاری بت بنا سنتا رہا۔ کئی بار مجھے ایسا لگا، جیسے بھٹل ملہاری سے نہیں، مجھ سے ہم کلام ہے، مگر میری بدظنی کا یہ کوئی محل نہیں تھا۔ یہ میرا اپنا نشیب تھا۔ بھٹل کا مخاطب تو وہ شخص بھی تھا جو وہاں موجود نہیں تھا اور وہ سبھی جو اڈّے پر موجود تھے اور جو نہیں تھے۔

اُس نے نرم لہجے میں ملہاری سے کہا کہ ہم آج ہی اپنا سفر جاری رکھ سکتے تھے۔ ملہاری کے علم میں ہے کہ ہم نے ٹکٹ بھی منگوا لیے تھے۔ ٹھیرے ہوئے پانی میں کنکر پھینک کے

لطف ولذت اخذ کرنے کا وقت نہیں اَب ہمارا، اور ہم نے زمانے بھر کا ٹھیکا نہیں لیا ہے، لیکن کچھ ایسا نظر آیا کہ یہ سکوت، سکون نہیں ہے۔ یہ تو سَراب ہے۔ تہِ آب تو بہت تلاطم ہے اور ہم یوں کھیل تماشا دیکھ کے آگے چلے گئے تو سانس گھٹتی رہے گی۔ بجھل نے کہا کہ رات اُس نے ملہاری سے اِس لیے اصرار کیا تھا کہ کوئی روزن تو کھلے، ہمیں احساس ہے کہ یہ مداخلت بارِ خاطر ہوسکتی ہے، اور ہمیں اِس دخل اندازی کا استحقاق بھی نہیں ہے۔ نہ ملہاری سے ہمارے تلخ وشیریں کا کوئی پس منظر ہے۔ اِدھر اپنے مسائل ومعاملات بھی کچھ کم نہیں ہیں، مگر کوئی تناسب دِگرگوں ہے تو قائم ہوجائے۔ تناسب ہی خیر ہے اور تناسب ہی زندگی ہے۔ ملہاری کی نظر میں بجھل کو کوئی اعتبار حاصل ہے تو اُسے بہ قدرِ امکاں حوصلہ کرنا چاہیے ورنہ ہم تو مسافر ہیں، صبح نہیں تو شام کو چلے جائیں گے۔

کمرے میں شابے کے اچانک وارد ہونے پر بجھل رُک گیا۔ ملہاری بت بنا بیٹھا رہا۔ بجھل نے شابے کو ہدایت کی کہ وہ کچھ دیر کے لیے ابھی باہر ٹھیرا رہے اور کسی کو اندر آنے کی اجازت نہ دے۔ شابے کو کسی قدر تامّل ہوا تھا۔ اُس نے ملہاری کی طرف دیکھا اور سر ہلاتا ہوا باہر چلا گیا۔

بجھل نے کٹورے سے پانی پیا اور آستین سے ہونٹ خشک کرکے کہا، ”دونوں مستانیاں باہر تمھارے لیے دھونی رمائے بیٹھی ہیں۔ بولتی ہیں، وہ تو سارے میں بھٹکتی رہیں۔ سامنے دریا بہتا ہے۔ یہ تو اُن کو دکھائی نہیں دیا۔ بولتی ہیں، اَب وہ اَور کدھر کی جائیں گی؟“

”کون، کون؟“ ملہاری ہڑبڑا کے بولا۔

”وہی تمھاری چمپا اور چندا دیویاں۔ کوٹھے پر ضرور نوٹنکی کرتی ہیں پر مٹکا پن، نین بازی اُن کو نہیں آتی۔ لگتا ہے، کوٹھے پر تو وہ ابھاگن وقت گزاری کو جُٹتی ہیں۔ ہم کتنا بولیں، تم کو اُن سے ہم سے زیادہ جان کاری ہے۔ جانے کیا کیا بکتی ہیں۔ اَب اُن کی کھوج ختم ہوئی، کنارہ مل گیا، اَڑی ہوئی ہیں، دونوں واپس کوٹھے پر نہیں جائیں گی اور مہاراج کی سیوا میں، اُن کے چرنوں میں ساری عمر یا کاٹ دیں گی۔“

”کیوں؟ کیوں؟“ ملہاری کی زبان اٹکنے لگی۔

”کچھ تم بھی اپنے من سے پوچھو۔ یہی تو ہم بولتے ہیں، اُن کو ساتھ لے کے یہاں سے جاؤ۔ اب بہت ہوگیا۔ بہت درپن سے آنکھ مچولی کرلی تم نے! ہم نے تمھارے ہاتھ میں چاقو نہیں دیکھا، سنا ہے، اچھی پکڑ ہے، پر ہم کو معلوم ہے، اچھا نہیں لگتا ہوگا۔“

”لیکن یہ کیا، کیا...“ ملہاری بوکھلا کے بولا۔

”تمھارے من سے اُلٹ تو نہیں بولتے۔ رات تم کو بھی دیکھا تھا، اُن کو بھی۔ تم نے اُن کو کبھی پاس آنے نہیں دیا، پر دُور بھی کتنا رکھا۔ ذرا بھیتر جھانک کے دیکھو، بار بار اُٹھی کو کیوں ہلاتے ہو؟“

”وہ تو اِس لیے... اِس لیے کہ وہ دوسروں سے اچھا جانتی ہیں۔“ ملہاری نے خفقانی انداز میں وضاحت کی، ”اُن کو گُن ہے اُستاد، اِس لیے...“

”تال میل کی بات بھی تو ہے ملہاری بابو۔ دونوں مورتیاں ہیں، وہ جو بولتے ہیں ایک کو اُٹھاؤ، دوسرے کو بٹھاؤ، جی نہیں لگتا اُن میں؟“ بجھل نے بیڑی سلگالی اور کش لے کے بولا، ”اپنی ریت پر جاؤ۔ ہم نے رات تم کو غلط نہیں بولا تھا۔ یہ دھن تو لُٹانے کے لیے ہوتا ہے، پٹلیا میں باندھ کے رکھنے کا نہیں۔ ایک باری کوٹھڑی سے باہر نکل کے دیکھو۔ اڈّے کی چوکی تو سسری بڑی ہرجائی ہوتی ہے۔ دیکھنا! اُدھری آنکھوں پر بٹھائیں گے جَجن کو۔ باہر بھی بُرا نہیں ہے، اور اچھا نہ لگے تو لوٹنے کا راستہ بند نہیں ہوجائے گا، چاقو جیب ہی میں دھرے رکھنا۔“

ملہاری کا جسم پھڑک رہا تھا۔ اُس کی اُنگلیاں کانپ رہی تھیں۔

بجھل نے جانے کیوں یہ صراحت ضروری سمجھی کہ اُسے اڈّے پاڑے سے کوئی دل چسپی نہیں ہے، نہ ملہاری کے اڈّے پر اپنی پسند کے آدمی کو لانے کی۔ اڈّا گیری کے لیے اُسے سیدھا راستہ معلوم ہے کہ وہ ہمیشہ چاقو پاس رکھتا ہے۔ اُسے ملہاری سے واسطہ ہے۔ پچاس برس کی عمر میں بھی ملہاری کسی زور آور، شہ زور سے کم نہیں۔ ابھی ایک زندگی سامنے پڑی ہے اور کسی سرد وگرم چشیدہ کے بہ قول، عمر تو ارادے سے مشروط ہوتی ہے۔ ارادہ تو دیوانگی کی عمر میں بھی مجہول ہوسکتا ہے۔

دونوں لڑکیاں بجگتی، شردھا، اشتیاق اور آرزو سے لبریز ہیں۔ کچھ حاصل کرنے اور کسی منزل پر پہنچنے کی تمنا میں وہ سب کچھ ترک کر دینے، کچھ کر گزرنے کے درپے ہیں۔ دھوپ میں ابھی اُن کے رخساروں کا رنگ اور دمکتا ہے۔ ابھی اُن کی قامتیں کمان کی طرح کھنچی ہوئی ہیں اور اُن پر ہر لباس زیبا ہوتا ہے۔ اُن کے ہونٹوں کا شہد خشک نہیں ہوا اور آنکھوں کا مقناطیس ماند نہیں پڑا ہے۔ اُن کی سانسوں سے خوش بُو جدا نہیں ہوئی۔ ابھی اُن کی خود آرائی و خود پیرائی کے دن ہیں۔ خال خال ہی بالا خانے والیاں، نرت اور بھاؤ کا ایسا شعور رکھتی ہیں۔ اُنھیں حرص و ہوس ہوتی تو دست رس سے دل فروز اور دل خواہ چیزیں اِتنی دُور نہیں رہتیں۔ دُکان تو وہ پہلے ہی سجائے ہوئے ہیں۔

بجھل نے بیڑی بجھانے کے لیے وقفہ کیا۔ میرا جی چاہا کہ میں بھی ملہاری سے کچھ کہوں، اُسے باور کراؤں کہ یہ وہی متاعِ ہنر ہے جسے صحرا نشیں، خاک بسر ملہاری نے تمام اندھیروں کے باوجود سینے میں روشن رکھا ہے۔ ملہاری کو اپنی خوش بختی پر ناز کرنا چاہیے کہ جہتِ تمام اور خرابیِ بسیار کے بعد ایسے طرح دار، ناز بردار اُس کے طلب گار ہیں۔ بے شک وہ اُس کی ریاضت کا نہایت شیریں ثمر ہیں اور گزرے ہوئے دنوں کے قہر و جبر کا بہترین مداوا ہیں، ایسے ہم نوا، ہم نفس، دل ساز و دل آرام چارہ گر کسے میسّر آتے ہیں۔ یہ سب کچھ تو کسی گم گشتہ خواب کی تعبیر کے مانند ہے۔ اِس میں کچھ مبالغہ نہیں۔ ملہاری ذرا تصوّر کرے، ایک ایسا گھر جہاں در و دیوار نغمہ بار رہتے ہوں، جہاں مکینوں کو بس ایک دُھن، ایک ہی لگن ہو کہ کسی طور وہ کوئی جادو، کوئی ایسا کمال، ایسی انتہا کر دکھائیں کہ مثال بنے۔ ملہاری کے لیے اِس سے دل خوش کُن ساعتیں کیا ہوں گی کہ ہر وقت چمپا اور چندا ایسے خوش اندام، خوش کلام رفیق اُس پر سایہ کیے ہوں۔ راگ الاپتے، بدن لہکاتے سراپا، آنکھوں میں چراغ جلائے، پھولوں کے تشت بازوؤں پر اُٹھائے: ہمہ دم اِقرار، ہمہ جاں بندگی؛ اُدھر دروازے کے پار مشتاقانِ دید، سپاس گزاروں کا ہجوم، سائلانِ شوق۔ یہ مرتبہ تو دیوتاؤں کو سزاوار ہوتا ہے۔ اور یہ جو فن کی بات ہے، اِس کی کہانی تو کہیں ختم نہیں ہوتی۔ جتنے فنون ہیں، اُنھیں کسی مہم کی طرح سر کرنا پڑتا ہے۔ پہاڑوں کی چوٹیاں زیر ہو جاتی ہیں، سمندر کی گہرائیاں رسا ہو جاتی ہیں۔ یہ شیشہ و ریشم کی طرح نازک، احساس و وجدان، کیف و خیال والے فنون کا سفر تمام نہیں ہوتا۔ جتنے قریب جاؤ، کنارے اور پھیل جاتے ہیں، پاتال اور گہری ہو جاتی ہے، چوٹیاں اور بلند ہو جاتی ہیں۔ شمشیر زن، شہسوار، غوطہ خور اور کوہ پیما مہم سے کام یاب و ناکام واپس آ جاتے ہیں، لیکن یہ نغما کار، خیال پرداز، یہ صورت گر! کمالِ فن تو اِن کے لیے سراب کی طرح ہے، تعاقب ہے کہ جاری رہتا ہے، سو ہر دم ایک اشتیاق، ایک اضطراب، ایک آزمائش، ایک جیسے لوگ، ایک جیسی نسبتیں، ایک ہی عزم، چمپا اور چندا کی ہم رکابی میں ملہاری کے سفر کی منزلیں کتنی آسان، منزلوں کا تعاقب کیسا رواں دواں ہو سکتا ہے۔

بجھل نے مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ کہنے لگا، رات ہی اُس نے طے کر لیا تھا کہ ملہاری کو اڈّے سے چلے جانے کا مشورہ دے گا۔ چمپا اور چندا تو بعد کو سامنے آئیں اور ملہاری کے اڈّے سے نکل جانے کا امکان تو اُن کے سان و گمان میں نہیں تھا۔ وہ تو یہیں کسی کونے، کسی کوٹھڑی میں رہنے کو مُصر تھیں اور کہتی تھیں کہ وہ تو مہاراج سے کچھ حاصل کرنا، اُن کی خدمت کرنا چاہتی ہیں۔ وہ مہاراج پر بوجھ نہیں بنیں گی۔ اُن کے پاس ابھی اِتنا کچھ ہے کہ عزت سے دو وقت گزر بسر کر سکیں۔ مہاراج کا گیان ہو جانے کے بعد اُنھوں نے بالا خانے سے مستقلاً نجات کا فیصلہ کیا ہے۔ بجھل نے ملہاری سے کہا، گو اِتنا آسان نہیں، لیکن ملہاری کے اختیار میں ہے کہ وہ اُنھیں دھکّے دے کے، اڈّے کے آدمیوں سے کہ کے یہاں سے نکال دے۔ وہ کیا کر سکتی ہیں! اُن کی وحشت دیکھ کے ایک خوش گوار خیال بجھل کے ذہن میں نمو پذیر ہوا کہ اُن کے ساتھ ملہاری اپنی ذات کی تکمیل کر سکتا ہے۔ پھر وہ اِتنا بکھرا بکھرا نہیں رہے گا۔ بجھل نے اُن دونوں کو اچھی طرح کھکھوڑا اور ٹٹولا ہے کہ وہ ارادے کی کتنی پختہ اور شوق کی کتنی صادق ہیں۔

بجھل نے کم و بیش وہی کچھ دُہرایا جو میں نہیں کہہ سکا تھا، اُس نے ملہاری سے پوچھا، اور اِدھر کیا حال ہے؟ کیا یہ واقعہ

نہیں ہے کہ چندا اور چمپا کا نظارہ ملہاری کی بینائی کے لیے بیڑی کا سبب بنتا ہے، اور کیا یہ درست ہے کہ اُن کے اوجھل ہو جانے کے بعد ملہاری کی آنکھیں اُن سے بیگانہ ہو جاتی ہیں؟ پھر کون سی دیوار حارج ہے؟ پھر کیا اُسے اڈّے کی فکر دامن گیر ہے، یا اڈّے کے ساتھیوں کی کہ اُن میں سے بہت سوں کی رفاقت میں اُس نے نصف سے زیادہ عمر گزاری ہے، مگر ملہاری کی ترجیحات میں کبھی اڈّا گیری نہیں رہی ہے۔ وہ اِتنی مدّت اڈّے پر رہتے ہوئے اڈّے پر رہا بھی کہاں ہے۔ اُس نے اڈّے کا حق ہی کتنا ادا کیا ہے۔ اُسے تو اپنا اثاثہ اِس قدر عزیز تھا کہ دونوں وقت خلوت کی جُست جُو کرتا تھا۔ اُسے تو مشق و سخن کی فکر لگی رہتی تھی۔ کسی دن اُس نے ناغہ نہیں کیا، کسی موسم میں، بل کہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ اڈّے کی آڑ میں اپنا ورثہ پرورش کرتا، اپنا سرمایہ بڑھاتا رہا ہے۔ اَب اِتنا کچھ سمیٹ لینے اور بڑی حد تک مطمئن ہو جانے کے بعد اڈّے پر اُس کے برقرار رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اُسے اَب سائلوں میں یہ دولت تقسیم کرنی چاہیے۔ یہی اُس کے آبا کا وتیرہ رہا ہے، اور جیسا کہ رات بجھل نے کہا تھا، ملہاری خاطر جمع رکھے، اُس کی آسودگی میں اِس داد و دہش کے بعد کوئی فرق نہیں آئے گا۔ کہتے ہیں، بہت سے لوگوں کو اپنی ترجیحات کی پوری آگہی ہوتی ہے، مگر عمل نہیں کر پاتے، کچھ اپنی کوتاہی، کچھ بیرونی دباو کے سبب سے۔ آدمی ترجیحات طے کر لیا کرے تو بہت سے دُکھ آدھے رہ جائیں، اور ترجیحات طے کرنے سے مراد اُن پر عمل کی تقدیم بھی ہے۔ اَب آگے کسی عمل میں ملہاری کے لیے پورے سُکھ، یا تلافیوں کی کوئی صورت ممکن ہے تو پیش قدمی میں کیا امر مانع ہے۔ اڈّے پر جمے رہنے کے اصرار کے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ ملہاری کی ترجیحات بدل گئی ہیں۔ یا ہر اُسے خیر کی اُمید نہیں۔ انسانوں پر سے اُس کا اعتبار اُٹھ چکا ہے، یا وہ سب کچھ اپنی ذات میں مقیّد رکھنا چاہتا ہے۔ کسی کو شریک کرنا، کسی کو کچھ دینا نہیں چاہتا۔ وہ اذیّت پسند ہو چکا ہے، یا اُسے اڈّے پر ملنے والے آدھے سُکھ سے بھی چھن جانے کا اندیشہ ہے۔ اُسے اپنے چلے جانے کے بعد اڈّے کا شیرازہ منتشر ہو جانے کا کوئی گمان ہے تو وہ یہ خام خیالی ذہن سے نکال دے، اور فرض کرے، اگر ابھی بجھل چاقو کھول کے اڈّے کی دعوے داری کے لیے کھڑا ہو جائے! کوئی چاقو بردار اَب تک ملہاری کے سامنے یوں صف آرا نہیں ہوا کہ ملہاری سا بے غرض آدمی اُنھیں اور کہاں مل سکتا تھا۔ یہ بے نیازی، نیک نفسی دِلوں میں مروّت کے احساس بیدار کرتی ہے۔ ملہاری اُن کے لیے کبھی کوئی مسئلہ ہی نہیں بنا۔ ممکن ہے، اُنھیں اُس پر ترس آتا ہو اور وہ اُسے اُس کی تشنہ کامیوں کی رعایت دیتے رہے ہوں، اُنھیں خدشہ ہو کہ چاقو میں زبردستی سے ملہاری جاں بر نہ رہ سکے گا، یا بالکل جنگلی ہو جائے گا، زخمی درندے کی طرح۔

بجھل نے بھاری آواز میں کہا، سارے طُولِ کلام اور تاویل و تکرار کا خلاصہ اِتنا ہے کہ ملہاری جیسے خلّاق اور ہنر مند کا انجام اڈّے کی چوکی نہیں ہونا چاہیے۔ باہر نکلنے کے بعد ہی ملہاری کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ کون سی جگہ، کون سی مسند اُس کے لیے موزوں ہے۔ اُس کی صدا ہے والہانہ کتنے لوگ اُس کی جانب کھینچتی ہے۔ شیدائیت، محبوبیت کا یہ لطف اُس نے کہاں چکھا ہے۔

ملہاری کی پیشانی پسینے سے تر ہو گئی تھی۔ بجھل کے چپ ہو جانے پر گہری خاموشی ہو گئی۔ چند لمحوں بعد بجھل نے مجھے اُٹھنے کا اشارہ کیا اور ملہاری سے کہا کہ اُسے کچھ اور نہیں کہنا۔ ملہاری کے چہرے، دست و بازو کے اضطرار سے اُس کی

سرگشتگی ظاہر تھی۔ بجھل کے اُٹھ جانے پر جیسے اُسے ہوش آیا اور وہ گڑبڑا کے بولا، "بیٹھو، ابھی بیٹھو اُستاد، کچھ دیر کے لیے۔"

"اپنے پاس بولنے کو اب کچھ بھی نہیں ہے، اپنا کام ختم ہوا۔" بجھل کے لہجے سے بے اعتنائی جھلک رہی تھی۔

"تم جو بولتے ہو یہ اِتنا... اِتنا، یہ کس طرح، کس طرح..." ملہاری کی زبان اُس کے مدعا کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھی۔

"سمجھتے ہیں" بجھل نے ہاتھ اُٹھا کر ہنکار بھری۔ "پر باقی کام تمھارا نہیں ہے۔"

بجھل نے کہا کہ ملہاری کا کام محض ارادے کی استواری ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اِتنے عرصے سے اڈّے پر بیٹھ کے اُسے اِس آرائش کی ضرورت ہی نہیں پڑی ہے۔ لیکن یہی کچھ تو اُسے تلقین کیا جا رہا ہے کہ وہ خود ایک امیر و کبیر شخص ہے۔ دولت صرف سونے چاندی، زر و جواہر کی نہیں ہوتی۔ بہت سی دولتیں تو آدمی کے اندر ہوتی ہیں، حسنِ تدبیر، خوبیٔ فکر، تن درستی، محنت اور علم و ہنر کی دولتیں۔ سکّے اِنھی کا بدل ہوتے ہیں۔ ملہاری نے عزلت گزینی میں جو کچھ جمع کیا ہے، وہی اُس کا سرمایہ ہے۔ اُس نے یہ ہنڈی ابھی بھنائی کب ہے۔ اِس کی مالیت سکّوں میں اِس قدر نہیں، دیگر شکلوں میں بیش از بیش ہے۔ عقیدت اور احترام کا بھی تو کوئی مول ہوتا ہے۔ سونے چاندی، محل دو محلے کی دولت تبھی نظر نواز ہوتی ہے جب اپنے بَل پر حاصل کی جائے۔ یہ ترکے کی دولت تو سڑک پر پڑی ہوئی زمرّد و یاقوت کی ڈھیری کے مانند ہے جو کسی کے ہاتھ لگ جائے۔ یہ تو طلب کی ہوئی اور نہ طلب کی ہوئی خیرات کے مانند ہے اور اہل و نااہل فرزندوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ اہل فرزندوں کو اِس کی طلب نہیں ہونی چاہیے۔ عالم باپ کے علم و فضل کا ترکہ بیٹے کو کیوں منتقل نہیں ہوتا۔ اپنے باپ کے نقشِ قدم کے اتباع ہی سے بڑھئی کا بیٹا بڑھئی ہوتا ہے۔ ترکہ صرف سونے چاندی، ساز و سامان اور سکّوں ہی کا کیوں ہوتا ہے، چھونے والی چیزوں کا۔ ملہاری نے کبھی اِس دولت کی آرزو ہی نہیں کی ہے، ورنہ کوئی کمی نہ ہوتی۔

ملہاری کا تردّد بے جا نہیں تھا۔ تین دہائیوں کی تنہائی کاٹنے کے بعد اُسے بستیوں اور گھروں کی سمت سے خوف آنا

چاہیے تھا۔ بجھل کو اِسی لیے اِتنا وقت صرف کرنا پڑا۔

سورج چھپ چکا تھا۔ اڈّے کے بہت سے لوگ اُس وقت بھی موجود تھے۔ شابے وقفے وقفے سے اُنھیں مطمئن کرتا رہا تھا، لیکن لوگوں کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ صبح سے شام ہو گئی تھی۔ ملہاری باہر نہیں نکلا تھا۔ مغرب کے بعد جب اندھیرا مسلط ہو چکا تھا، ملہاری آہستہ قدموں کمرے سے باہر آیا۔ اُسے دیکھ کے سبھی نے نعرے بلند کیے اور دیوانہ وار اُس کی پذیرائی کی۔ راستے میں ملہاری کی نظر تھم سے ٹیک لگائے، ہاتھ باندھے کھڑی ہوئی چمپا اور چندا پر گئی۔ وہ ایک لحظے کے لیے ٹھٹکا تھا، پھر سر جھکائے بڑھتا ہوا چوکی تک آ گیا۔ بجھل نے چوکی سے اُٹھ کے اُسے جگہ دی۔ ملہاری ناتواں سا دکھائی دے رہا تھا۔ گُم سُم چوکی کے وسط میں بیٹھ گیا۔ چائے تیار تھی۔ شابے نے اعلان کیا کہ اُس نے رات کے کھانے کا انتظام کیا ہوا ہے، سب یہیں کھانا کھائیں گے۔ چائے کے بعد لوگ اپنی اپنی جگہ نسبتاً سکون سے بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ بجھل چوکی پر کھڑا ہوا اور اُس نے دھمکتی آواز میں کہا کہ کچھ دیر کے لیے خاموشی ہو جائے تو وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔

لوگوں کو اِس طرزِ تخاطب پر حیرانی ہوئی اور بے قرار سرگوشیوں کی بھن بھناہٹ کے بعد آخر سکوت ہو گیا، تب بجھل نے اُن سے کہا کہ وہ اڈّے کے لیے جلد سے جلد نئے داوا کا انتخاب کر لیں۔

سبھی اُلٹ پلٹ سے گئے۔ سبھوں پر جیسے بجھو ٹوٹ پڑے ہوں۔ وہ ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ بجھل نے کہا، "اچھا ہوگا کہ ملہاری اُستاد کے سامنے ہی کوئی آگے آ کے چوکی سنبھال لے۔"

لوگوں کو بجھل کی ذہنی حالت پر شبہ ہوا، یا اُنھوں نے اِسے مذاق پر محمول کیا۔ پہلے سناٹا سا طاری ہوا پھر بھانت بھانت کی آوازوں کا شور گونجنے لگا۔ اُن کی نگاہیں کبھی بجھل پر منڈلاتی تھیں، کبھی ملہاری پر۔ سرنگوں ملہاری ساکت بیٹھا رہا۔ شابے نے پہل کی اور اپنے لہجے کی برہمی زور نہ کر سکا۔ "کیا؟ کیا بولتے ہو اُستاد؟" بجھل نے پھر، ہاتھ بلند کر کے اُنھیں متحمل اور منضبط رہنے

کی تاکید کی۔ "ملہاری اُستاد اِدھری سے جا رہا ہے۔" بجھل نے گونجتی ہوئی آواز میں کہا، "اُس کو یہ کام بہت پیچھے کرنے کا تھا، پر ٹھیک ہے، سمجھو، ٹائم نہیں آیا تھا۔"

"لیکن کیا... کیا ہو گیا اُستاد؟" شابے چیخ کر بولا۔

"تھوڑا نیچے سُر میں آ کے بول۔" بجھل نے ناراضی سے کہا، "رات سارا دھارا دیکھ کے بھی بولتا ہے، کیا ہو گیا!"

"پر اُستاد، ایسا کیا، ایسا کیا...؟" شابے سر جھٹک کے بولا، "وہ تو ٹھیک ہے، اپنے کو اِتنا نہیں معلوم تھا، پر یہ کیا...؟" شابے کی آواز حلق میں پھنس گئی۔ بجھل نے اُسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا، "اب تو ٹیپ لیا ہے آنکھ کے پورے! اور اب بھی پلے نہیں پڑا تو اپنی بات ذرا دھیان سے سن! اور تم بھی..." بجھل نے ترشی سے کہا۔

لگتا تھا، ہر ایک کے لیے یہ خبر کسی حادثے سے کم نہیں، حیرانی، کبیدگی، پراگندگی، ہر ایک انتشار سے دو چار نظر آیا۔ بجھل نے بھی اُنھیں اِس ہیجان کی مہلت دی اور لمحوں تک چپ کھڑا رہا۔ سب کی مضطرب نظریں اُسے ہدف بنائے ہوئے تھیں۔ جلد ہی اُنھیں احساس ہوا کہ ابھی بجھل کی وضاحت باقی ہے اور یہ اُسی طور ممکن ہے کہ وہ اُسے تاویل و تشریح کا موقع دیں، چناں چہ ہر طرف سنسناتی خاموشی چھا گئی۔

بجھل نے لمبی چوڑی تمہید نہیں باندھی، سپاٹ لہجے میں کہا، "ایک باری ہی کان کھول کے سن لو، اپنے کو دُسرا نہیں آتا۔"

اِسے آموختہ کہنا چاہیے۔ بجھل نے سیدھے سادے لفظوں میں وہی کچھ کہا جو سہ پہر ملہاری کے سینہ نشیں کر چکا تھا۔ اُس نے چمپا اور چندا کا ذکر نہیں کیا اور کہا کہ اڈّے کے لوگوں کو ملہاری سے کوئی ربطِ خاطر ہے تو کسی چون و چرا کے بغیر اُسے تمام تر عزت سے وداع کریں۔

سب دم بہ خود سنتے رہے۔ بجھل کا بیان نہ اِتنا مختصر تھا، نہ ایسا مبہم، لیکن ناگہانی کا نقش دیر سے مرتسم ہوتا ہے۔ بجھل کے چپ ہو جانے کے بعد جیسے اُس کی بازگشت جاری رہی۔ تعجب، یقین، بے یقینی کی کیفیت اور غالباً ملہاری کے بعد آنے والے دنوں کے ابہام نے اُنھیں گھیرے رکھا۔ ملہاری اُن کی عادت بن چکا تھا اور اُس کے سوا شاید اُنھوں نے کبھی

اڈّے کی چوکی کا تصور نہیں کیا تھا۔ بجھل نے اُن سے یہاں تک کہا تھا کہ نہ ایک دن تو ملہاری کو اُن سے جدا ہو جانا ہی ہے۔ ملہاری تو اب اپنی بچھڑی ہوئی منزل کی طرف جا رہا ہے۔ وہ تو اپنے پیروں پر قائم، اُمید اور عزم سے معمور ملہاری کو رخصت کر رہے ہیں، یہ کوئی سانحہ نہیں۔ اِس پر تو سب کو مسرّت کا اظہار کرنا چاہیے۔

بجھل نے اچھی طرح جتا دیا تھا کہ کسی بحث و تمحیص کی گنجائش نہیں ہے، اب وہ ملہاری کا باب تمام سمجھیں اور آئندہ کی فکر کریں۔ کچھ دیر کی کش مکش کے بعد بائیں جانب کے ایک گوشے میں بے چینی دکھائی دی۔ لوگوں نے ٹہوکے دے کے ایک ادھیڑ تنومند شخص کو اُٹھا دیا۔ اُس نے جھجکتے ہوئے کہا کہ ملہاری کو کہیں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ یہیں اڈّے پہ رہے۔ اُس کے مشاغل میں ہم پہلے ہی بہت کم حارج رہے ہیں، آئندہ اَور احتیاط کی جائے گی۔ وہ یہیں راگ دربار جمائے۔ اِس طرح نہ ملہاری اُن سے دُور رہے گا، نہ وہ اُس سے۔ ہم اِسے یقین دِلاتے ہیں کہ ملہاری کی مرضی یہ ہر حال مقدّم ہوگی۔ وہ نہیں چاہے گا تو اُسے اڈّے کے معاملات میں نہیں اُلجھایا جائے گا، اور یوں جتنا ہو سکا، وہ سب اُس کی خدمت ہی کریں گے۔

بجھل نے اُسے بات پوری کرنے نہیں دی، "بیٹھا رہ! اونچا سنتا ہے کیا؟" بجھل نے اُسے جھڑک دیا، "کیسا بولتا ہے رے... یہ اڈّا ہے، اِدھری ایک طرف راگ دربار جمے گا، دوسری طرف چاقو، بلم، پتّے، دارو، سر پھٹول کا دھندا چلے گا؟"

اُس شخص نے جرأت کی اور کہا کہ ایسا ہے تو عمارت کا نصف حصّہ الگ کر کے بالکلیہ ملہاری کے تصرّف میں دے دیا جائے۔ یہ کم پڑے تو پوری عمارت اُس کے لیے وقف کی جا سکتی ہے۔ پڑوس میں کہیں اڈّے کی نئی جگہ بنائی جا سکتی ہے۔ ملہاری ہماری نظروں کے سامنے رہے گا اور اِس کی موجودی سب کے لیے تقویت کا باعث ہوگی۔

"ہاں، رکھنا ملہاری اُستاد کو چاقو چھاپ۔" بجھل ترخ کے بولا، "اِدھری باندھ کے ہی رکھنا، عمر پٹا لکھوایا ہے اِس نے؟ بس، آگے کچھ نہیں۔" بجھل نے حتمی لہجے میں کہا کہ

وہ پہلے ہی اُن سے کہہ چکا تھا کہ اُنھیں فیصلہ سنایا جا رہا ہے۔ اُن سے مشورت نہیں کی جا رہی، اِتنی صراحت بھی دیرینہ رفاقت کی پاس داری میں کی جا رہی ہے۔ ملہاری کو کوئی بھی فیصلہ کرنے کا اختیار ہے۔ بھتل نے یہ کہہ کے سارا قصہ ہی ختم کرنا چاہا کہ بہ تر ہے، اَب اِس سلسلے میں کوئی بات نہ کی جائے۔ اپنی سہولت دیکھ کے ملہاری کل، یا پرسوں کسی وقت یہاں سے چلا جائے گا۔

"نہیں استادا!" پیچھے کی طرف بیٹھے ہوئے ایک نوجوان شخص نے تلخی سے کہا، "تمھاری بات اپنی جگہ ٹھیک ہے، پر ہم کو ملہاری اُستاد سے سننا ہے۔"

اِتنی دیر میں پہلی بار ملہاری نے بے تابانہ سر اُٹھایا۔ اُدھر شابے نے نوجوان کو بٹھانے کے لیے بہت ہاتھ چلائے۔ ایک ثانیے کے لیے بھتل کی پیشانی شکنوں سے آلودہ ہوئی تھی، تاہم اُس کی آواز تھمی ہوئی تھی۔ اُس نے نوجوان سے کہا، "اِدھری ملہاری اور شابے اُستاد کے بلاوے پر آئے ہیں۔ تجھ کو تھوڑی چھوٹ ہے۔"

"پر ہم کوئی غلط تو نہیں بولتے۔ ملہاری اُستاد ایسا گپ چپ کیوں بیٹھا ہوا ہے۔" نوجوان کے لہجے میں گرمی بھی تھی، تمسخر بھی۔

اِس سے پہلے کہ بھتل کوئی جواب دیتا، "ہا، ہا، ہُشت، ہُشت!" ملہاری نے جنونی انداز میں نوجوان کو خاموش رہنے اور بیٹھ جانے کے اشارے کیے۔ شابے یک دم چوکی سے کود کے لوگوں کو پھلانگتا ہوا نوجوان کے سر پہ پہنچ گیا اور اُس کے بازو پکڑ کے بُری طرح دھتکارنے لگا۔ نوجوان پہلے بے قابو ہوا تھا، لیکن شابے اور آس پاس کے لوگوں کی مداخلت پر سرد پڑ گیا۔
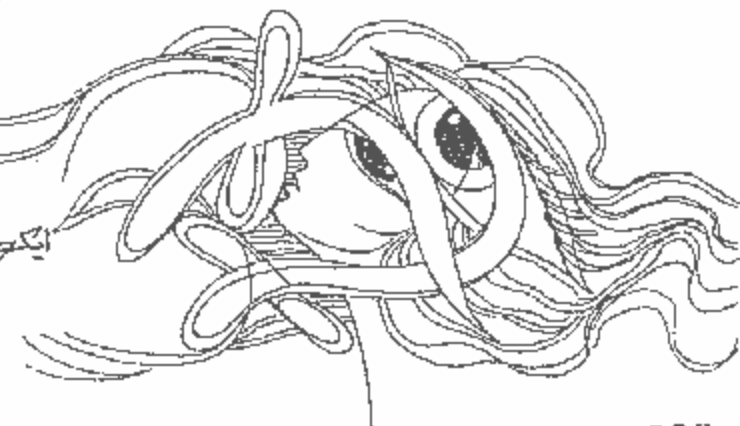
چوکی پر واپس آ کر شابے ہاتھ جوڑ کے بھتل کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ جواب میں بھتل نے آنکھیں میچ لیں۔ ملہاری بھی پشیمانی کے اظہار میں کھسک کے بھتل کے اور قریب آ گیا۔

اچھا ہوا جو بات جلد ہی رفع دفع ہو گئی، ورنہ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کتنی آگے جاتی۔

بھتل چوکی پر کھڑا رہا۔ پھر کسی جانب سے کوئی آواز نہیں اُٹھی۔ لوگوں کے چہرے تمتما رہے تھے، اُن کی آنکھیں دہک رہی تھیں، لگتا تھا، ہر شخص آنے والے لمحے کا بے کلی سے منتظر، یا آنے والے لمحے سے مطمئن نہیں ہے۔

"چوکی کا اَب اپنے ہی کو مالک جانو۔" کچھ توقف کے بعد یکا یک بھتل نے سرد آواز میں کہا، "ملہاری اُستاد نے اِسی ٹائم سے چوکی چھوڑ دی ہے۔ کسی کے گلے میں اٹکتا ہے تو چاقو نکال کے آگے آ جائے۔"

ملہاری بیٹھے بیٹھے اُچھل پڑا۔ بھتل کے قریب ہاتھ باندھے کھڑا شابے بھی لڑکھڑا گیا۔ چوکی پر موجود، آمنے سامنے اور دائیں بائیں بیٹھے ہوئے لوگوں کے لیے یہ ایک دوسری اُفتاد تھی۔ ملہاری کے اُوپر کر دینے کی حیرت سے وہ سنبھل نہ پائے تھے کہ بھتل کی طرف سے اِس منادی اور حکم نامے نے اُنھیں اور بے اوسان کیا۔ سبھی کی نگاہیں ملہاری اور شابے سے سوال کُناں تھیں، مگر خود اُن دونوں کا حال مختلف نہیں تھا۔

"ایک اُستاد کے جانے پر دوسرا آ جاتا ہے۔" بھتل نے پتھریلی آواز میں کہا، "دوسرا یا تو تل پہ آتا ہے، یا سب کی مرضی سے۔ ہمارے لیے تمھاری مرضی نہ ہو تو تل کر کے دیکھ لو، ایک دو، چار پانچ، جتنے بھی ہوں۔" ❁

پولیس کی نگرانی میں انھیں اسٹیشن لایا گیا اور جب تک گاڑی چل نہ پڑی، پولیس اُن کے آس پاس منڈلاتی رہی۔ عیادت کے لیے صبح اِدھر اسپتال آتے آتے میدا کے اچانک غائب ہوجانے کا عذر بنجھل نے بڑا کراو تسلیم کرلیا تھا اور چپ رہا تھا، لیکن اب روانگی کے وقت بھی میدا کی غیر حاضری، دو دن سے اڈّے جانے کے بجائے اسپتال میں قیام، آئی جی کی طرف سے گل دستہ، سڑکوں کا سناٹا، جگہ جگہ پولیس کا گشت، یہ سارے مظاہر بنجھل کے لیے تشویش کا باعث ہونے چاہییے تھے۔ زورا، جاسو اور بابر کو اِس کا احساس تھا، مگر گاڑی کے حرکت میں آجانے کے بعد ہی اُنھوں نے زبان کھولی اور بنجھل کی بیماری اور بے خبری کے دوران پیش آنے والے سانحوں سے آگاہ کیا تو بنجھل بہت حیران ہوا، پشیمان اور آزردہ بھی۔ اُس نے بابر کو بانہوں میں بھینچ لیا۔

کلکتے کے اڈّے کا قیام نہایت مختصر تھا، دو راتیں، ایک دن۔ زورا اور جاسو کو کلکتے چھوڑ کے بابر اور بنجھل مشرقی اور مغربی بنگال کی مختلف بستیوں کی خاک چھانتے ہوئے ڈھاکے پہنچ گئے، اور کسی جگہ شہر کے اڈّے کے ایک آدمی سے اُن کا آمنا سامنا ہوگیا۔ وہ شابے تھا، بنجھل کا شناسا۔ شابے ضد کر کے انھیں اڈّے پر لے آیا۔ یہاں ملہاری نامی ایک شخص عرصے سے چوکی پر بیٹھا ہوا تھا۔ بنیادی طور پر سازو آہنگ سے اُس کا واسطہ تھا۔ مشہور تھا کہ کسی زمیں دار نے اُس کی بہن کا رشتہ مانگا تھا، انکار پر ایسا مشتعل ہوا کہ ملہاری کا گھر برباد کردیا۔ موسیقی کی تعلیم کے سلسلے میں ملہاری کسی دوسری جگہ تھا۔ گاؤں واپس آکے اُس نے زمیں دار اور اُس کے خاندان کے ایک ایک فرد کو ختم کردیا اور ڈھاکے آکے اڈّے کی چوکی پر قبضہ کرلیا۔ اُس کے معمولات عجیب تھے، عموماً گم سُم اور گوشہ نشیں رہتا، بند کمرے میں گھنٹوں ریاض کرتا رہتا۔ بنجھل کی خاطر داری میں اُس نے کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ بنجھل کے لیے مجرے کی محفل برپا کی۔ ملہاری کی محفل میں نرت بھاو سے ناواقف کوئی ایسا ویسا داخل نہیں ہوسکتا تھا۔ اُس رات اپنے فن میں طاق، بالاخانے سے متعلق دو لڑکیاں بزم آرائی کے لیے وہاں آئیں۔ دونوں ملہاری کی عقیدت مند تھیں اور اُس رات بنجھل کے شدید اصرار پر ملہاری کو بادلِ نخواستہ اپنی قسم توڑنی پڑی۔ پہلے اُس نے ستار پر اپنی غیر معمولی مشاقی کا مظاہرہ کیا، پھر راگ مالکونس اور ملہار میں اپنی آواز کا سحر پھونکا۔ اُس کا یہ رُوپ پہلے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ سبھی گنگ ہوگئے۔ جانے کیوں، گاتے گاتے وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا اور اُس پر غشی طاری ہوگئی۔ دوسرے دن کہیں اُس کے ہوش و حواس بحال ہوئے۔ ملہاری کی صحت یابی کے لیے متوحش دونوں لڑکیاں اڈّے پر موجود تھیں۔ اِس موقع پر بنجھل کے اِس اعلان سے سبھی زیر و زبر ہوگئے کہ ملہاری اڈّا ترک کر رہا ہے۔ خود ملہاری کو بھی اِس اعلان پر بڑی حیرت ہوئی۔ بنجھل نے اُسے تلقین کی کہ اڈّا اُس کا مقام نہیں، وہ خود کو فریب میں رکھے ہوئے ہے۔ قدرت نے اُسے فن کی بے پناہ دولت سے نوازا ہے۔ فن تو اظہار کے لیے ہوتا ہے۔ بہت دیر ہوگئی ہے، لیکن اب بھی کچھ نہیں گیا۔ ملہاری راگ رنگ کی اپنی دنیا میں واپس جائے، وہ یہاں بیٹھا کیا کر رہا ہے۔ بنجھل نے پھر اڈّے کے لوگوں سے کہا کہ وہ اپنے لیے کوئی نیا اُستاد منتخب کرلیں یا پھر خود کوئی آگے آکے چوکی سنبھال لے۔ ہر کوئی جز بز ہوا اور کوئی نہیں اُٹھا۔ ایک نوجوان کسی قدر بھڑکا تھا، لیکن اُسے خاموش کردیا گیا۔ نتیجتاً بنجھل کو کہنا پڑا کہ کسی کے آگے نہ آنے کی صورت میں پھر اُسی کو اڈّے کا مختار سمجھا جائے، اور اگر کوئی اِس فیصلے سے متفق نہیں، تو چاقو کھول کے سامنے آجائے۔

پہلے سرگوشیاں گونجیں، پھر ہر طرف آگ سی لگ گئی۔ لگتا تھا، سب چاقو نکال کے بنجھل پر حملہ آور ہوجائیں گے۔ میرے ہاتھ بے اختیار جیب کی طرف گئے۔ چاقو جیب ہی میں تھا، لیکن ابھی اُسے نکالنا قبل از وقت تھا۔ چوکی پر اور نیچے فرش اور چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کوئی نہیں اُٹھا۔ غم، غصّے اور حیرانی سے بھری غراہٹوں جیسی اُن کی صدائیں بلند

ہوتی رہیں۔ ایک آدمی کے کھڑے ہوجانے پر اِدھر اُدھر دو آدمی اور کھڑے ہوگئے۔ تینوں نے ایک دوسرے کو موقع نہیں دیا۔ وہ بہ یک وقت دہاڑنے لگے تھے، مگر وسط میں ایستادہ ایک بلند قامت کی آواز اُن پر غالب آگئی۔ اُس نے براہِ راست ملہاری کو مخاطب کرنے کی کوشش کی اور کہنے لگا کہ یہ سب کچھ کیا ہے۔ ملہاری کی موجودی میں یہ کیسا مذاق ہو رہا ہے۔ ملہاری چپ کیوں بیٹھا ہے۔ کیا واقعی اُستاد بنجھل ہی اب اڈّے کا مختار ہے۔ اب وہ مہمان نہیں رہا ہے، وغیرہ۔

شور کی وجہ سے اُس کی آواز چوکی پر کچھ سنی گئی، کچھ نہیں۔ شابے حیران پریشان کھڑا تھا۔ ملہاری بھی بہت درہم برہم نظر آرہا تھا۔ سبھی تتر بتر سا ہوگیا تھا۔ وہ نوجوان، جس نے کچھ دیر پہلے بنجھل کی دخل اندازی پر اعتراض کیا تھا، پھر دیوانہ ہوا۔ اُس کے پاس بیٹھے ہوئے ساتھیوں نے اُسے روکے رکھا، لیکن نوجوان کی وحشت اُن کی روک تھام سے فزوں ہوئی۔

ہلڑ مچے اتنی دیر نہیں ہوئی تھی کہ بنجھل نے ہاتھ اُٹھایا اور گرجتی ہوئی آواز میں اُن سے پوچھا، ”کوئی نہیں ہے کیا؟“

”یہ کیا، کیا بولتے ہو اُستاد؟“ ایک عمر رسیدہ نے اُٹھ کے ہذیانی انداز میں کہا، ”یہ کیسا اندھیر ہے۔ ایسا کہاں ہوتا ہے۔“

”پھر کیسا ہوتا ہے بابا؟“ بنجھل تحمل سے بولا، ”تم تو پرانے چاول ہو۔ ہم کیا اُلٹا بول رہے ہیں۔ ملہاری اب اڈّے کی چوکی پہ بادشاہ نہیں رہا ہے۔“ بنجھل نے اُس سے سوال کیا کہ ملہاری کی دست برداری کی صورت میں کوئی تو اڈّے کی چوکی سنبھالے گا۔ چوکی پر ملہاری کی موجودی میں بھی کوئی چاقو کھول کے اڈّے کا دعوا کرسکتا تھا۔ بنجھل نے لوگوں کی جانب مُنہ کر کے پوچھا کہ اُس سے زیادہ کوئی اہل آدمی ہے تو سامنے آنے میں کیا قباحت ہے۔ چوکی کی اہلیت کی کسوٹی تو زور ہے۔ کیا اڈّے کے لوگ اِس ریت سے ناواقف ہیں۔ کوئی اور مرحلہ ہو تو اُس کے علم میں اضافہ کیا جائے۔

اِس دوران نوجوان نے اپنے ساتھیوں پر قابو پالیا تھا، یا اُس کے ساتھی شدید مزاحمت سے تنگ آچکے تھے۔ نوجوان چاقو اُچھال کے چیختے ہوئے بولا، ”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے مائی باپ! فیصلہ چاقو کے بل ہی پر ہوگا۔ یہاں سب نامرد ہوگئے ہیں تو ہم ابھی موجود ہیں، ہم موجود ہیں۔“ اُس کا رُوئے سخن واضح طور پر شابے کی جانب تھا۔

”دیکھو، نکالا نا ابھی ایک رُستم کا جنا!“ بنجھل نے بگڑے تیور سے کہا، ”زیادہ بات نہیں اُستاد، اِتنا ہی بول کہ بعد کو شیشہ بھی نہ ڈھونڈھا جائے۔“

نوجوان نے اشتعال میں ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ بنجھل کو یہ مشورہ خود کو دینا چاہیے۔

”بس ایک ہی؟“ بنجھل نے نوجوان کو درگزر کر کے چاروں طرف نظریں گھماتے ہوئے اونچی آواز میں پوچھا۔

”ڈگنڈگی منگوائیں کیا؟“ نوجوان کا اعتماد دیدنی تھا۔ بے سبب بھی نہیں ہوگا وہ بار بار چاقو اُچھال کے گرفت میں لیتا رہا۔ اچھی مشاقی تھی اُسے۔

”بیٹھ جا رامو، بیٹھ جا“ شابے نے آخر زبان کھولی۔ ”اُستاد بنجھل کو نہیں جانتا رے تو! ہوش سے زبان چلا۔ قسم سے، بہت خواری ہوگی۔“

”تم اب بیچ میں مت بولو اُستاد۔ یہ خواری کیا کم ہے کہ یہاں سب نے چوڑیاں پہن رکھی ہیں۔“ نوجوان رامو نے طیش میں کہا۔

”کسی نے چوڑیاں نہیں پہنی ہیں۔ اڈّے پہ یہی ہوتا ہے، تیرا دماغ خراب ہوگیا ہے رامو!“ شابے نے اُسے باز رکھنے کی کوشش جاری رکھی، ”تجھ کو بولتے ہیں آخری بار، ابھی وقت ہے۔“

”اپنے اُستاد کو بول کہ چاقو نکال لے۔“ رامو گرج کے بولا۔ اُس کا جسم پھڑک رہا تھا۔

بنجھل فوراً چوکی سے اُتر گیا۔ شابے نے بہ عجلت کود کے اُسے جالیا اور پانو پکڑ لیے۔ ”جانے دو اُستاد، گرم خون ہے، جان سے جائے گا سالا، معاف کردو، اِسے معاف کردو اُستاد! مرجائے گا بے موت سُور کا بچّہ۔“

”نہیں رے!“ بنجھل نے شابے کا بازو پکڑ کے اُٹھایا، ”اپنا چاقو اِتنا فالتو نہیں ہے۔“

شابے پھر رامو کی طرف لپکا۔ رامو نے اُسے دھکا دے کے خود سے دور کیا تو شابے اُسے بری طرح گالیاں بکنے لگا اور بنجھل سے بولا، ”ٹھیک ہے اُستاد، اِس کتے کے پلّے کو تھی

بتاؤ! ایسے یہ نہیں مانے گا۔ سالا! بالکل پاگل ہوگیا ہے۔“

بتھل کے اشارے پر لوگ دُور دُور ہونے لگے۔

اس اثنا میں ملہاری بھی چوکی سے اُتر گیا۔ وہ رامو کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔ رامو نے بھی اُسے اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھ لیا تھا۔ وہ اُور بدک گیا اور چیخ کے بولا، ”ہٹ جاؤ ملہاری اُستاد! بہت ہوگیا۔ تم اَب اڈّے کے اُستاد نہیں ہو۔ اڈّے کا تاج اَب تمھارے اِس گِدھ کی اولاد اُستاد بتھل کے سر پہ ہے۔ تم اندر جا کے تاتھیا تا تک دِھنا دِھن کرو۔“

لوگوں نے پیچھے ہٹتے ہٹتے دائرہ بنا دیا تھا۔ رامو اُچھل کود تا ہوا دائرے میں آ گیا۔ بتھل پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ اُس نے ابھی تک چاقو نہیں نکالا تھا۔ رامو اُسے للکار رہا تھا۔ ملہاری نے بھی دائرہ پھلانگ لیا اور بتھل کے سامنے دیوار بن کے کھڑا ہوگیا، ”بس بس اُستاد! اِس کو جانے دو۔ یہ نادان ہے۔“

”پھر اِس کو چوکی پہ بٹھا دیں؟“ بتھل نے تنک کے کہا، ”تمھاری مرضی ہو تو...!“

بتھل نے یقیناً ملہاری کو اشارہ کیا تھا کہ وہ سر ہلاتا اور بڑبڑاتا ہوا دائرے سے باہر چلا گیا۔

دونوں آمنے سامنے کھڑے ہوگئے۔ بتھل نے جیب سے چاقو نکال کے آہستگی سے کھولا۔ ”ہاں رے! شروع کریں؟“ اُس نے دھیمے لہجے میں رامو سے پوچھا۔ جواب دینے کے بجائے رامو نے اُچھل کے بتھل کو چاقو سے جھکی دی۔ میں بھی اُن دونوں کے قریب ہوگیا تھا اور میں نے اپنا چاقو جیب سے نکال کے ہاتھ میں دبا رکھا تھا۔

رامو میں خوب پھرتی تھی اور اُس وقت تو، بہ طورِ خاص، اُس کی بوٹی بوٹی تھرک رہی تھی۔ آنکھیں شعلہ بنی ہوئی تھیں۔ جس طرح آنکھوں سے مراد بینائی نہیں ہے، بینائی سے مراد بھی بینا ہونا نہیں ہے۔ اِتنے لوگوں کے سمجھانے، روکنے پر رامو کو کچھ تو غور کرنا چاہیے تھا، مگر وہ تو بالکل وحشی ہو چکا تھا۔ مجھے ایک ہی فکر تھی کہ وہ اپنے اندھے پن میں کوئی بھی اوچھی حرکت کر سکتا ہے۔

بتھل کو بس دیر لگانی نہیں چاہیے تھی۔ اُس نے پیچھے ہٹ کے رامو کو پہل کرنے کی دعوت دی اور پیچھے ہٹتے ہٹتے اُس نے کسی قدر تردّد کا اظہار کیا اور اُس کا چاقو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے زمین پر گر گیا۔ رامو کے لیے اِس سے سنہرا موقع اَور کیا ہو سکتا تھا۔ بتھل نے بہ ظاہر اضطراب کے عالم میں زمین سے چاقو اُٹھانا چاہا تھا کہ رامو بے تحاشا اُس کی طرف جھپٹا۔ اُسے کچھ خیال نہیں تھا کہ بتھل تو شست باندھے ہوئے ہے۔ اُس نے دانستہ چاقو گرایا ہے اور چاقو اُٹھانے میں سُستی بھی دانستہ ہے۔ چاقو اُٹھانے کے لیے جھکنا ایک فریب تھا۔ بتھل کا ارادہ ہی کچھ اَور تھا۔ اُدھر سے رامو بڑھا، بتھل کی نظریں اِدھر اُس کی بائیں ٹانگ سے بندھی ہوئی تھیں۔ دونوں کے درمیان گز بھر سے کم فاصلہ رہ گیا ہوگا کہ بتھل نے جھٹ دایاں ہاتھ بڑھایا اور پنجہ ڈال کے رامو کی بائیں ٹانگ جکڑ لی۔ پنجہ ڈالنے اور اپنی جگہ سے حرکت کرنے کے عمل میں لمحے بھر کا فرق نہیں تھا۔ جس تیزی سے بتھل نے جھٹکے جھٹکے اپنی دائیں جانب جست لگائی، وہ منظر دیکھنے کے لائق تھا۔

رامو توازن کھو بیٹھا، ترچھا ہو کے زمین پر گرا۔ دونوں ٹانگیں چِر گئیں۔ دائرہ اِتنا بڑا نہیں تھا کہ بتھل اُس کی ٹانگ جکڑے جکڑے سیدھ میں دُور جا سکتا ہے۔ رامو کیا، کوئی بھی ہوش و حواس قائم نہ رکھ پاتا۔ دائیں کان کی جانب رامو کا سر فرش سے ٹکرایا تھا۔ فرش بھی ایسا ہموار نہیں تھا۔ اُس نے چاقو جلد ہی چھوڑ دیا ہوتا تو اپنے جسم اور حالی پر توجہ دینے کی مہلت مل جاتی۔ ہاتھ میں دبائے رکھنے سے چاقو کی نوک اُس کی پسلی کے قریب کہیں پیوست ہونی چاہیے تھی۔ بتھل نے بائیں ٹانگ اِس لیے منتخب کی تھی کہ رامو کا چاقو اُس کے دائیں ہاتھ میں تھا۔

بتھل نے دائرے کا ایک چکر بھی مکمل نہیں کیا اور دھکیل کے رامو کو پرے کر دیا۔ اِس جھٹکے کے بعد رامو کو تخمینہ کر لینا چاہیے تھا۔ وہ سمجھ ہی نہ سکا کہ بتھل نے عمداً اُس کی ٹانگ سے ہاتھ اُٹھایا ہے، ورنہ اُس کی کھال اُدھڑ جاتی، چہرہ بگڑ جاتا، جانے کتنی ہڈیوں کے جوڑ کھل جاتے۔ کسی نے کہا ہے کہ ہر شخص ایک گھوڑے پر سوار ہے، دماغ کے گھوڑے پر۔ یہ گھوڑا زور کرتا رہتا ہے اور کبھی یہ آدمی پر سوار ہو جاتا ہے۔ سو ہر وقت لگام پر گرفت مضبوط رکھنی چاہیے۔ رامو کے ہاتھ سے لگام چھوٹ گئی تھی۔ وہ دوبارہ اُٹھ کھڑا ہوا، چاقو تان لیا۔ بتھل کی بھی یہی خواہش تھی۔ اِسی لیے اُس نے رامو کو درمیان میں چھوڑ دیا تھا۔ غالباً اِتنے پر اڈّے کے لوگوں کی سیری نہ ہوتی۔ وہ اِسے ایک آزمودہ کار کی شعبدے بازی پر محمول کرتے۔ یہ بازو کا زور، چاقو میں مشاقی کا کرشمہ نہیں تھا، حالاں کہ کسی کڑیل جوان کی ٹانگ ایک ہاتھ سے جکڑ کے اُسے دائرے کے نصف حصّے میں گھماتے رہنے کی شرط ہی زور تھی۔ ایک لمحے کی تاخیر میں رامو بتھل کے سر پر پہنچ جاتا۔ اُس کے ہاتھ میں کھلا چاقو تھا اور بتھل خود کو نہایت نازک صورتِ حال سے دوچار کیے ہوئے تھا۔ چاقو اُٹھانے کے لیے اُس کا جسم جھکا ہوا تھا۔ یہ ایک باقاعدہ داؤ تھا اور خود کو تشت میں رکھ کے مقابل کی خدمت میں پیش کرنے کے مرادف، یا آ بیل، مجھے مار کی مثل کے مطابق تھا۔ مکمل یقین کے بغیر کوئی بھی ایسی جرأت نہیں کر سکتا۔

بتھل نے دوسری مرتبہ بھی پہل نہیں کی۔ فرش سے اپنا چاقو اُٹھا کے خاموش کھڑا رہا۔ رامو کے کسی دردمند نے اُسے یہیں تک اکتفا کرنے اور ہزیمت قبول کر لینے کی تلقین کی تھی، لیکن رامو نے شاید سنا نہیں، ایسی حالت میں سنائی دکھائی کہاں دیتا ہے۔ بتھل نے دو ایک قدم آگے بڑھ کے دائرے میں اپنے پیچھے گنجائش بنائی۔ رامو نے اُس کے قریب آ کے پھر چاقو اُس کی طرف جھپٹایا۔ دوسری بار اُس کا یہ اعتماد بلا کی خوش فہمی، یا بلا کی خود مائی کے باعث ہی ممکن تھا۔ یہ ایک عام، مگر بہت اہم داؤ ہے۔ مقابل آمنے سامنے ایک دوسرے پر چاقو سے وار کرنے کے لیے پر تولیں اور جھکائی دے کے، پینترے بدل کے، کبھی آگے جا کے، کبھی پیچھے ہٹ کے کلائی پر پنجہ ڈالنے کی جُستجُو کرتے رہیں۔ اِس دوران مقابل کی توجہ بٹانے کے لیے پیروں سے پیروں پر اور خالی ہاتھ سے جسم پر ضرب لگانے کے مواقع بھی ضائع نہیں کیے جاتے۔ نفسی دباؤ، کسی کم زوری سے فائدہ اُٹھانے، غصّہ دلانے، نگاہیں گھما کے مقابل کو مختلف تاثر دیتے رہنے کے حربے بھی بہت سُود مند ہوتے ہیں، لیکن اصل بات تو زور ہے اور مہارت ہے اور تجربہ ہے اور ہوش برقرار رکھنا ہے۔

بتھل نے تیزی سے پینترا بدل کے خود کو بچایا، شاید دس بار، گیارہ بار، پھر یہ چشم زدن کی خبر گئی تھی کہ گیارھویں، بارھویں مرتبہ پینترا بدلنے کے بجائے رامو کی کلائی اُس کے پنجے میں تھی۔ آخری بار، کلائی پر پنجہ ڈالنے سے لحظہ بھر پہلے بتھل نے اپنا چاقو گرا دیا تھا۔ رامو کا چونک پڑنا فطری تھا۔ بتھل اِسی منتشر لمحے کی ٹوہ میں تھا۔ کلائی کا ہاتھ میں آنا تھا کہ بتھل نے اُچھل کے دوسرے ہاتھ سے اُس کی پسلی پر ضرب لگائی۔ رامو کی ہول ناک چیخ بلند ہوئی۔ بتھل کے ہاتھ میں کلائی آ جانے پر جوڑ چیخ جانا لازم تھا۔ پسلی پر ضرب مستزاد تھی۔ رامو فرش پر قدم جمائے نہ رکھ سکا اور گر پڑا۔ تکلیف سے وہ دُہرا ہوگیا اور تڑپنے لگا۔

بتھل نے اپنا چاقو اُٹھا کے دائرے سے باہر آنے کے لیے

قدم بڑھائے تھے کہ شابے نے اُس کے پانو پکڑ لیے۔ ملہاری بھی تیزی سے اندر آ کے گلے لگ گیا۔ پھر تو ہر طرف سے لوگوں نے بجھل کو گھیر لیا اور نعروں جیسی صدائیں عمارت میں گونجنے لگیں۔

بجھل نے چوکی پر جا کے اُنھیں روکنے کی کوشش کی اور کہا کہ یہ کوئی معرکہ نہیں تھا اور اِس قدر تحسین و آفریں کا کوئی جواز نہیں ہے، لیکن لوگ نہیں مانے۔ پہلی مرتبہ اُنھیں نظر کے فریب کا گمان تھا، دوسری مرتبہ تو اعادۂ فریب ممکن نہ تھا۔ سبھی گواہ تھے کہ بجھل نے رامو سے کیا خسروانہ سلوک کیا ہے۔ اُس نے عین وقت پر اپنا چاقو گرا دیا تھا اور رامو کے چاقو پر قبضہ کرنے، اُسے کوئی زک پہنچانے، جسم کا کوئی حصہ کھول دینے سے پہلوتہی کی تھی۔ اب اُنھیں یقین آ گیا ہوگا کہ پہلی مرتبہ بھی بجھل نے رامو کو اُس کی ناپختہ کاری کی رعایت دی تھی۔ ملہاری اور شابے کی منتوں کی وجہ بھی اب اُن کی سمجھ میں آ جانی چاہیے تھی۔

چند منٹ میں سارا معاملہ نمٹ گیا۔ اِسے فیصلہ نہیں کہنا چاہیے۔ سامنے کوئی مقابل ہوتا تو فیصلے کی بات درست ہوتی۔

شابے کے اشارے پر کھانے کا اہتمام ہونے لگا۔ کھانے کے بعد گزرے ہوئے لمحوں پر چہ میگوئیوں کا سلسلہ ایک حد تک کم ہو گیا تھا۔ پہلے ملہاری کے رخصت ہو جانے کا کوئی غبار اور فشار تھا تو اَب بہتر متبادل مل جانے کی آسودگی اُن کے چہروں سے عیاں تھی۔ سودے میں زیاں کے اندیشے اِتنے نہیں رہے تھے۔ رامو کھانے میں شریک نہیں تھا۔ میں نہیں دیکھ سکا، لیکن کسی نے مجھے بتایا تھا کہ لوگ اُسی وقت اُسے اُٹھا کے کسی کمرے میں لے گئے تھے۔ چمپا اور چندا اپنے سازندوں کے ساتھ ابھی تک موجود تھیں۔ کل ساری رات اور آج کے پورے دن اُنھوں نے ایک پل کے لیے آرام نہیں کیا تھا۔ ملہاری بھی اَب بہت پُرسکون نظر آ رہا تھا، یہ خوش دلی، دُھند چھٹ جانے اور کسی نتیجے پر پہنچ جانے کی غماز تھی۔ قہوے کا دَور چلتا رہا اور کسی منچلے نے صدا لگائی کہ چندا اور چمپا موجود ہیں، کیوں نہ کچھ دیر کے لیے اُن سے گھنگھرو باندھنے کے لیے کہا جائے۔ ملہاری نے سنی اَن سنی کر دی۔ کسی اَور نے بھی تائید نہیں کی۔ اڈّے کا موسم دن میں بار بار بدلتا رہا تھا۔ سبھی تھکے ہوئے تھے اور لگ رہا تھا کہ جلد ہی محفل برخاست ہو جائے گی۔

رات ہو گئی، لوگ وہیں جمے ہوئے تھے۔ بجھل حقّہ کشی کرتا رہا تھا۔ آج کی شب کسی اَور مرحلے کی آزمائش شاید کسی کے وہم و خیال میں نہ تھی۔ بجھل نے حقّے کی نے مُنھ سے ہٹائی اور چوکی پر دوبارہ کھڑا ہوا تو سبھی بے چین ہو گئے۔ بجھل نے تنی ہوئی آواز میں اُن سے پوچھا کہ اب اُن کی کیا مرضی ہے؟

سب کے لیے یہ سوال حیران کُن تھا۔ وہ اُس کی شکل دیکھا کیے۔ بجھل نے وضاحت کی کہ فرض کیا جائے، ملہاری کے بعد بجھل بھی اڈّے پر قائم رہنا نہیں چاہتا تو اُن کے پاس اُس کی جگہ کون سا آدمی ہے؟

سب گونگے ہو گئے۔ بجھل نے اُن سے کہا کہ اڈّے پر مستقل قیام سے اُسے کوئی دل چسپی پہلے تھی نہ اَب ہے۔ اُسے تو دُور جانا ہے۔ وہ تو آج ہی چلا جاتا، ملہاری کی حالت دیکھ کے ٹھیر گیا۔ ملہاری خود کو کھو چکا تھا، اُس کی بازیابی، اُسے اپنے آپ سے آگاہ کرانے کے علاوہ بجھل کو احساس ہوا کہ ملہاری کے بعد لوگوں کو چوکی پر کسی نئے نگراں کے تقرر میں دشواری پیش آ سکتی ہے اور بہت افراتفری ہو سکتی ہے۔ اڈّے کے لوگوں نے تیس سال سے کوئی تبدیلی نہیں دیکھی ہے۔ وہ ملہاری کے عادی ہو چکے ہیں، لیکن چوکی پر لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہی کچھ بجھل اُنھیں جتلانا چاہتا تھا اور یہی کچھ سوچ کے اُس نے اڈّے کی کمان سنبھالنے کا اعلان کیا تھا۔ رامو تو خواہ مخواہ آڑے آ گیا اور اُس نے ایک طرح بجھل کا کام آسان کر دیا۔ رامو نے خود کو ضرر پہنچا کے کچھ حاصل ہی کیا اور بالواسطہ لوگوں کو بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے۔ ملہاری کا ارادہ برقرار ہے، وہ جا رہا ہے۔ بجھل کا قیام بھی ملہاری کے رخصت ہونے تک ہے۔ اِس وقت اڈّے سے وابستہ تقریباً سبھی لوگ حاضر ہیں۔ ہو سکے تو رامو کو بھی بلا لیا جائے تاکہ چوکی کے نئے مختار کے مشورے میں وہ بھی شامل رہے۔ جیسا کہ پہلے اُنھیں صلاح دی گئی تھی، اچھا ہوگا، ملہاری کی موجودگی میں کوئی فیصلہ کر لیا جائے، ورنہ ملہاری اور بجھل کو تو ایک دو دن میں یہاں سے چلے جانا ہے۔

بجھل اپنی جگہ بیٹھ کے حقّہ گُڑگُڑانے لگا۔ اِتنی دیر میں شابے اندر سے رامو کو بلا لایا۔ اُس کی حالت نہایت خستہ تھی۔

ٹھیک سے زمین پر قدم بھی نہیں رکھے جا رہے تھے۔ شابے اُسے چوکی پر لے آیا۔ رامو نے چوکی پر آتے ہی بجھل کے پیروں پہ سر رکھ دیا۔ بجھل نے اُس کی کمر پر تھپکی دی، پیروں سے اُس کا سر اُٹھایا اور بازو سے دبوچ لیا۔ "اڈّے پر رہنا ہے تو برف چبانے کی عادت ڈال۔" اُس نے نرم لہجے میں رامو سے کہا اور اُسے پاس ہی بٹھائے رکھا اور چپکے چپکے جانے کیا رموز منکشف کرتا رہا۔

ملہاری کے بازو میں بیٹھے ایک معمر شخص کے اچانک اُٹھ کھڑے ہونے پر سب اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ "میں نے ملہاری اُستاد سے بات کی ہے۔" اُس کی آواز پر عمر غالب نہیں آئی تھی۔ کہنے لگا کہ اڈّے کے لوگوں کو اختیار ہے کہ وہ کل پہ چوکی کے نئے مالک کا فیصلہ کر لیں، یا کسی ایک کو متفقہ طور پر منتخب کر لیں۔ واضح رہے کہ اب اُستاد اور اُس کا ساتھی بابر، دونوں میں سے کوئی بھی چاقو کھول کے سامنے نہیں آئے گا۔ اڈّے کے پُرانے لوگوں ہی کے درمیان زور ہوگا۔ اِس یقین دہانی کے بعد بھی کوئی زور کے لیے آمادہ نہیں ہے تو ملہاری کی تائید سے شابے کا نام تجویز کیا جاتا ہے۔ اڈّے کے لوگوں کی نظر میں شابے سے معتبر کوئی اَور شخص ہے تو، بوڑھے آدمی نے کہا کہ وہ اور ملہاری اُستاد شابے کی نامزدگی پر اصرار نہیں کریں گے۔

سب کسی اشارے کے منتظر تھے۔ سبھوں کو جیسے زبان مل گئی تھی۔ لمحوں سکوت رہا، پھر اُنھوں نے بے طرح شابے کے حق میں نعرے لگانے شروع کر دیے۔ رامو کی آواز نہیں نکل رہی تھی، لیکن ہاتھ اُٹھا اُٹھا کے اُس نے پورے جوش و خروش کا اظہار کیا۔

چمپا اور چندا کو بجھل نے اُسی رات واپس کر دیا تھا کہ بالاخانے جا کے وہ اپنا بکھرا ہوا ساز و سامان سمیٹیں۔ پرسوں ملہاری اُن کے حوالے کر دیا جائے گا، یا وہ ملہاری کے سپرد کر دی جائیں گی۔ یہ سن کے اُن پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہوئی، دونوں کے آنسو نکل آئے۔

دوسرے دن اڈّے پر بہت چہل پہل رہی۔ سارے دن بجھل لوگوں کے درمیان گھرا رہا۔ ہر شخص اُس کی قربت کا

خواہش مند تھا، اور معلوم ہوتا تھا کہ بجھل عرصے سے اڈّے کی مسند پر فروکش ہے۔ میرے وہاں رہنے نہ رہنے سے کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ میری حیثیت تو محض ایک تماشائی کی تھی، سو دوپہر کے کھانے کے بعد اڈّے کے ایک آدمی کے ساتھ میں تو باہر نکل گیا۔ سناو مجھے مختلف جگہوں پر گھماتا رہا۔ مولوی بازار، امام گنج، چوک بازار اور نوابوں کے علاقے اسلام پور، چپیت تلی، قلعۂ لال باغ ہوتے ہوئے وہ مجھے صدر گھاٹ کے علاقے میں لے آیا۔ بابو بازار سے کشتی میں بیٹھ کے ہم بوڑھی گنگا کے اُس پار زنجیرا کے علاقے میں آ گئے۔ زنجیرا اور پوری شور، کچے پکے مکانوں کی یہ بستیاں دیہات کا منظر بھی پیش کرتی ہیں، شہر کا بھی۔ بجھل کے ساتھ بہت سی جگہیں پہلے کی دیکھی ہوئی تھیں۔ چوک بازار کی شاہی مسجد، لال باغ کی مسجد، قلعے والی مسجد بڑے کٹرے اور چھوٹے کٹرے کے مدرسوں میں بجھل اور میں اچھی طرح گھوم بھی چکے تھے۔

سڑکوں کے چکر کاٹتے ہوئے پہلے میری نظریں ہر طرف بھٹکتی رہتی تھیں، کہیں راہ گیروں کے درمیان مولوی صاحب نظر نہ آ جائیں۔ ظاہر ہے، وہ بستیوں ہی میں رہتے ہیں۔ گھر سے کسی وقت تو وہ باہر نکلتے ہوں گے۔ مولوی صاحب سے مشابہ کوئی شخص دکھائی دے جاتا تو دل بُری طرح دھڑکنے لگتا۔ ہاتھ پانو اکڑ جاتے۔ اب ایسا کچھ نہیں ہوتا تھا۔ اَب مجھے نہ کسی پر مولوی صاحب کا شائبہ ہوتا تھا، نہ میری نظریں راہ گیروں پر منڈلایا کرتی تھیں۔ کچھ نصیب کی بھی بات ہوتی ہے۔ لوگوں کو بے طلب بھی مل جایا کرتا ہے۔

بہت عرصے بعد اُس روز نرائن گنج کے بازار میں ناگہاں ایک شخص کے سامنے آ جانے پر میرا وہی حال ہوا، آنکھوں میں اندھیرا اُتر آیا، پانو منجمد ہو گئے۔ وہ مولوی صاحب کی مکمل تصویر تھا، مگر اُن مولوی صاحب کی، جن کے نقوش میرے رگ و ریشے میں پیوست تھے۔ اب گیارہ سال سے اُوپر ہو چکے تھے۔ مولوی صاحب میں تو بہت تبدیلیاں ہو چکی ہوں گی۔ میری حیرت پر اُس شخص نے مجھے گھور کے دیکھا۔ میں بھی سٹ پٹایا، وہ بھی گڑبڑا گیا، بل کہ برگشتہ ہوا۔ وہ تو سلّو کے اُدھڑے ہوئے چہرے کی شکنیں دیکھ کے اُس نے آ گئے

چلے جانے میں عافیت سمجھی۔ کچھ دیر کے لیے اُس نے میرے حواس گم کر دیے تھے۔ مجھے تو پسینا آ گیا تھا۔ میرا رُواں رُواں جسم میں چبھتا رہا۔ اگر واقعی قسمت کبھی یاوری کرے اور مولوی صاحب اچانک کسی چوراہے، کسی موڑ پر نظر آ جائیں تو جانے میرا کیا عالم ہو، میری تو سانس رُک جائے گی۔ بتھل بھی اسی آسرے میں بازاروں اور گنجان آباد علاقوں کا سفر پیدل ہی طے کرنے کو ترجیح دیا کرتا تھا کہ مولوی صاحب یوں بھی تو کہیں مل سکتے ہیں، مگر آدمی کی آنکھیں تو دو ہی ہوتی ہیں، صرف سامنے کا دیکھ سکتی ہیں، اور نظر کی حد بھی کس قدر ہے۔

نرائن گنج میں پرانی چیزوں کی دُکان پر ایک گُل دان کی نفاست اور دل کشی نے مجھے روک لیا۔ عجیب صناعی تھی۔ رنگ برنگے پتھروں کے ٹکڑے جوڑ کے اُسے بنایا گیا تھا۔ بہت سجل اور ہلکا پھلکا تھا، شیشے ایسا نازک۔ موم بتی اندر روشن کردو تو پتھر جگمگانے لگیں۔ پتھر سیپی کی طرح تراشے گئے تھے اور پتر جیسے کر دیے گئے تھے۔ مجھے فوراً رما کا خیال آیا۔ اُسے ایسی چیزوں کا بہت شوق ہے۔ دُکان دار بڑا گھاگ آدمی تھا، قیمت بہت بتائی۔ گُل دان مجھے اچھا لگا تھا، میں نے خرید لیا۔ اڈّے واپسی تک رات ہو گئی تھی۔ وہاں تو کسی تقریب کا سماں تھا۔ روشنیاں، پکوان، لوگوں کا ہجوم، اڈّے پر ملہاری کی یہ آخری رات تھی۔ رات گئے تک کھانے پینے کا شغل رہا۔ گو کسی قسم کی محفل آرائی کا اہتمام نہیں کیا گیا تھا، لیکن تین بجے تک لوگ جمے بیٹھے رہے۔ ملہاری اور بتھل کے اُٹھ جانے ہی پر سب منتشر ہوئے۔

اگلے روز صبح کوئی دس بجے جامنی رنگ کی ساڑھیوں میں ملبوس چمپا اور چندا اڈّے پر آ گئی تھیں، اِس سادگی میں بڑی آرائش تھی۔ کلائیوں میں موتیا کے گجرے اور کانچ کی چوڑیاں، کانوں میں طلائی بالیاں، گلے میں چمپا کلی، جُوڑے میں بھی پھول گندھے ہوئے تھے۔ اُن کے ساتھ دو سازندے بھی تھے اور کئی صندوق سامان الگ تھا۔ اُنھوں نے بتھل سے درخواست کی، اگر ملہاری کو اعتراض نہ ہو تو یہ دونوں سازندے بھی بالا خانے کی زندگی ترک کر کے اُن کے ساتھ جانا چاہتے ہیں۔ دونوں ایک زمانے سے اُن کے ساتھ ہیں، اپنے اپنے فن کے ماہر ہیں۔ ملہاری بھی اُن کا قائل ہے۔ دونوں اپنی خو میں نیاز مند وفا پیشہ ہیں۔ نہ انھیں معاوضے کی خواہش ہے، نہ اُن کا آگے پیچھے کوئی ہے۔ اصل میں بالا خانے ہی پر وہ پلے بڑھے، وہیں اُن کی تربیت ہوئی، اُستادوں سے فن سیکھا اور مہارت حاصل کی ہے۔ اُن کی حیثیت خدمت گار کی رہے گی۔ سنگت کے لیے ملہاری کو بھی اُن کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ چمپا اور چندا کا لہجہ التجا آمیز تھا، مگر بتھل کے پاس جواب دینے کے لیے اِس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ وہ ملہاری سے بات کر کے دیکھتا ہے۔

آخر شب چوکی سے اُٹھ کے ہم نے اپنے کمرے کا رُخ کیا تو ملہاری بھی پیچھے چلا آیا۔ وہ بہت گھبرایا گھبرایا سا لگ رہا تھا۔ آنے والا وقت اُس کے لیے جتنا افسانوی تھا، اُتنا ہی بے یقینی کا بھی۔ ملہاری کے دل میں ایک کھٹک تھی۔ ہیجان میں الفاظ بھی نہیں بن پڑ رہے ہوں گے کہ اب تک چپ رہا تھا، کہنے لگا کہ چمپا اور چندا دونوں ہی ساتھ کیوں جانا چاہتی ہیں، لازماً کسی ایک کو ایثار کرنا پڑے گا۔ دوسری کی حیثیت پھر کیا ہوگی؟ بتھل نے اُسے بتایا کہ کل صبح اُس نے تخلیے میں اُن سے بات کی ہے۔ وہ بھی اُن کی یک جائی، یک جانی پر حیران ہوا تھا، پھر اُسے تسلّی ہو گئی کہ ہاں، یہ بھی تو ممکن ہے، نام مختلف، چہرے مختلف، لیکن دو مختلف آدمی ایک دوسرے کے جزو لازم، لازم و ملزوم بھی تو ہو سکتے ہیں، ایک وجود کے دو حصے، اُن کے کہنے کے مطابق اُنھوں نے خود کو کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں سمجھا ہے اور آئندہ بھی جدائی کا تصور اُن کے لیے محال ہے۔ وہ تو ملہاری کی داسیاں بن کے رہنا چاہتی ہیں۔ دونوں کی طلب ایک، مطلوب ایک ہے۔ اُن کی آرزو ہے کہ ملہاری بھی اُن میں کوئی امتیاز نہ کرے۔ اُن میں کوئی ایک ملہاری کو زیادہ مرغوب ہے تو اطمینان رکھے، دوسری کو کوئی شکایت نہ ہوگی۔ اُن کے بہ قول، دوسری یہی غنیمت جانے گی کہ ملہاری کی چھاؤں میں اُسے امان ملی ہوئی ہے اور اُس کے وجود کا دوسرا حصہ تو شاد آباد ہے، اور دوسری کے لیے ملہاری اپنے ہنر کی خیرات میں بخیلی تو نہیں کرے گا۔ بتھل کی زبانی یہ احوال سن کے ملہاری دیر تک تذبذب میں پڑا رہا۔ بتھل نے اُس کی دل جُوئی کے لیے کہا کہ اُسے یقین ہے، چمپا اور چندا اُس پر کبھی بوجھ نہیں بنیں گی۔

ملہاری تو اُن کی یگانگت کی داد دے۔ یہ تو اُس کے لیے ایک دل چسپ اور دل خوش کُن تجربہ ہو سکتا ہے۔ اور کیا ملہاری کے لیے اُن کا انتخاب آسان ہو گا۔ دونوں ایک دوسرے کا پرتو ہیں۔ کیا کسی مورت کی پوجا کا استحقاق ایک ہی پجاری کو ہے؟ یہ تکون تو بہت جاں فزا ہو سکتی ہے اور باقی کا سارا اختیار تو ملہاری کو ہے۔ اُن کا تو کوئی مطالبہ ہی نہیں ہے۔ پرستش کاروں کو کوئی مطالبہ کہاں زیب دیتا ہے۔

دوپہر کے کھانے پر بہت اہتمام تھا۔ لوگوں کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی۔ محلّے والے، تاجر اور دُور دراز سے آئے ہوئے لوگ، اڈّوں سے وابستہ لوگ بھی شریک تھے۔ ہر کسی نے اپنی توفیق کے بہ قدر تحائف پیش کیے۔ ملبوسات، شیرینی اور پھولوں کی کثرت تھی۔ اڈّے کے لوگوں نے مٹھل کے توسط سے پانچ ہزار روپے کی مشترکہ نذر ملہاری کی جناب میں گزاری تھی۔ علاقے کے تاجروں نے تھیلیوں میں زرِ نقد پیش کیا تھا۔ ملہاری کو پھولوں سے لاد دیا گیا۔ رخصت کے وقت ہر ایک اُس سے گلے مل کے اشک بار ہوا جاتا تھا۔ دُولہا بھی رخصت ہو رہا تھا، دُلہنیں بھی وداع ہو رہی تھیں۔ اِسے ملہاری کی برات ہی کہنا چاہیے۔ تاشے باجے کی کسر رہ گئی تھی، گھوڑا نہیں تھا، اور ڈولی نہیں تھی۔ دیر آید درست آید۔ رات مَیں نے دیکھا تھا، جب ملہاری نے چمپا اور چندا کی یک جہتی پر تجسّس اور تشویش کا اظہار کیا تو اندیشہ و وہم کے باوجود اُس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ آنکھیں چھلک چھلک جاتی تھیں اور بات کرتے کرتے وہ کھو جاتا تھا۔

اڈّے کے تقریباً سبھی لوگ اُسے اسٹیشن چھوڑنے گئے۔ تانگوں اور ہاتھ گاڑیوں کا ایک طویل جلوس تھا۔ اُس کے جانے کے بعد اڈّے پر ویسی ویرانی چھا گئی جو لڑکی کی وداعی پر گھر کی دیواروں، دریچوں پر اُمڈ آتی ہے۔ میں اور مٹھل جلوس کے ساتھ تو نہیں گئے تھے۔ جاتے وقت ملہاری متعدد بار مجھ سے اور مٹھل سے گلے ملا تھا۔ ہم نے اُسے گلی کے موڑ پہ رخصت کیا اور مٹھل نے بند مٹھی سے ایک ہیرا اُس کے حوالے کیا۔ اِن پتھروں کا بھی کیا طلسم ہے۔ حیدرآباد کا واقعہ چشم دید تھا۔ یہ بھی کوئی نادر ہیرا تھا۔ ملہاری کی پلکیں پھڑپھڑانے لگیں۔ تاہم اُس نے ہیرا واپس کرنا چاہا اور کہا کہ مٹھل کے احسانات پہلے ہی کیا کم ہیں۔ زیادہ بات کرنے کا وقت نہیں تھا۔ مٹھل نے ملہاری کی ہتھیلی سے ہیرا اُٹھا کے اُس کے کُرتے کی بغلی جیب میں ڈال دیا اور جیسے کسی بچے کو ہدایت کی جاتی ہے، مٹھل نے تاکید کی، "ٹائم پڑنے پہ بھنا لینا، پتھر ہی ہے سُسرا، ٹھوک بجا کے، تین چار کو دکھا کے۔ اور اچھا ہو گا، تان تمبورا، تین باجا، نرت بھاؤ کے سارے ہتھیار اوزار ایک سے ایک بڑھیا پاس رکھنا۔" مٹھل نے جانے کتنے روپے بھی اُس کی جیب میں ڈالے تھے، معذرت کی کہ وہ سفر کے آخری مرحلے میں ہے۔ نقدی زیادہ بچی نہیں ہے، لیکن ملہاری کو جب بھی اور جتنی بھی ضرورت ہو، کلکتے کے اڈّے پر اُستاد جامو کو خط لکھ دے، منی آرڈر پہنچ جائے گا۔ آخر میں مٹھل نے اُس کا کندھا تھپ تھپاتے ہوئے کہا کہ شروع میں ملہاری کو اُلجھنیں پیش آ سکتی ہیں، مالی رکاوٹوں کا امکان نہیں ہے۔ شروع کے دنوں کے لیے اُس کے پاس معقول پیسے ہیں، بعد کو درخت خود پھل دینے لگے گا۔ بہ صورتِ دیگر، ملہاری کوئی تکلف نہ کرے۔

میرے پاس کرشنا جی کی عطیہ رقم کی چیک بُک سامان میں محفوظ تھی، لیکن مجھے اِس فیاضی کا موقع نہیں ملا۔ گلی میں شور مچا ہوا تھا۔ ملہاری بھیگی آنکھوں سے بہ عجلت تانگے میں بیٹھ گیا۔

"جاؤ مہاراج! مُرلی بجاؤ، ماکھن کھاؤ۔" مٹھل نے بُدبُداتے ہوئے کہا۔ گلی سے پیدل ہجوم اور تمام گاڑیاں گزر گئیں، تب ہم نے بھی اڈّے کا رُخ کیا۔

ملہاری جیسور میں اپنی آبائی بستی کی طرف کوچ کر چکا تھا۔ اُسے پہنچا کے شابے اور اڈّے کے آدمی منہ اندھیرے واپس آئے تو ہم تیار تھے۔ مٹھل نے بہت منع کیا، لیکن ایک اژدحام اسٹیمر پر ہمیں رخصت کرنے کے لیے ساتھ آیا۔ بارک پور اور کشتیا میں ٹھیرتے ہوئے، چوتھے روز دن کے گیارہ بجے ہم کلکتے پہنچ گئے۔

اڈّے پر سبھی موجود تھے، استاد جامو، بھرو، ذورا اور بہت سے نئے پرانے آدمی۔

گذشتہ مرتبہ بہت عرصے بعد ہم ایک دن دو راتوں کے لیے یہاں آئے تھے اور آنا نہ آنا کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا، کوئی کو اطلاع نہیں تھی اور کوئی ڈھائی بجے کے قریب ہم اڈّے پہنچ پائے تھے۔ صبح ابھی پوری طرح بیدار نہیں ہوئی تھی کہ خبر پھیلتی گئی اور مٹھل کو دیکھنے کے لیے اڈّے پر ہجوم اُمڈنے لگا۔ کہرام سا مچ گیا ہو جیسے۔ پٹنے کے اسپتال سے رخصت ہو کے مٹھل سیدھا کلکتے آیا تھا۔ ڈاکٹر نے آرام کی کوئی خاص ہدایت نہیں کی تھی، لیکن آرام تو بہتر ہوتا۔ مٹھل سے زیادہ مجھے اُس کی فکر تھی، وہ دن قیامت تھے جب وہ بے خبر اسپتال کے بستر پر پڑا ہوا تھا، اور میں ڈاکٹروں کی منت کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے عزیز کی دگرگوں حالت سے تیمار دار پر جو گزرتی ہے، وہ مریض، یا کوئی دوسرا کیا جان سکتا ہے۔ بارش کی وجہ سے گاڑی خاصی تاخیر سے کلکتے پہنچی تھی۔ مٹھل بھی اڈّے پر ہجوم کی یلغار سے اُکتا گیا تھا کہ اُس نے جلد سے جلد کلکتے سے نکل جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔

اب تین مہینے سے اوپر ہو چکے تھے، بل کہ سوا تین، کہ ہم کلکتے واپس آئے تھے۔ شام کے ٹھیک ساڑھے چار بجے گاڑی یہاں پہنچی تھی۔ دن کا اُجالا سونا پڑ رہا تھا۔ اسٹیشن سے اڈّے تک کے راستے میں بہت سے لوگوں کی نظروں میں ہم آ چکے تھے، اور رش ہوا، جس کا تجربہ ہمیں پچھلی دفعہ تین ماہ پہلے ہو چکا تھا، کچھ دیر بعد اڈّے کی طرف لوگ ٹوٹنے لگے۔ اندھیرا گہرا ہو جانے تک بڑی تعداد میں لوگ اڈّے پر جمع ہو چکے تھے۔ ہمیں ذرا دیر سانس لینے اور کھل کر بیٹھنے کا بھی موقع نہیں ملا۔ تیار ہو کے اور نئے کپڑے پہن کے مٹھل چوکی پر آ بیٹھا۔ فرش پر سفید بُراق چاندنیاں بچھا دی گئی تھیں اور مٹھل کے لیے حقہ تیار کر دیا گیا تھا۔ میں نے بھی لباس تبدیل کر لیا تھا۔ اِتنے لوگوں کی والہانہ پذیرائی میں سفر کی تھکن محسوس نہیں ہو رہی تھی اور تھکن یوں بھی کیوں ہوتی۔ سفر تو ہمارا معمول تھا، پیشے کی طرح زندگی کا لازمہ۔

کلکتہ بھی ہمارا ایک گھر تھا۔ یہاں آ کے گھر لوٹ آنے کی اپنائیت کا احساس ہوتا تھا۔ چوکی پر بیٹھا مٹھل ایسا لگ رہا تھا جیسے کبھی کہیں گیا ہی نہ ہو۔ تیجا اُس کے پیر دبا رہا تھا۔ ہر ایک کو نثار ہو جانے، ہم پر فدا ہو جانے کی بے قراری تھی۔ بیش تر وہی لوگ رہتے تھے، وہی ایک دوسرے کے مزاج آشنا۔ ہر چرن، پٹن، کرمانڈا، سورج، بھرو، ہریالا، جینی اور بدرو مجھے گھیرے ہوئے سب رنگ تھے۔ سارے تو مجھ سے چپک ہی گیا تھا۔ اُن سب کا بس نہیں چلتا تھا کہ مجھے کندھوں پر اُٹھا لیں، یا پلکوں پر بٹھا لیں۔ گذشتہ مرتبہ ہمارا یہاں آنا ہوا تھا تو نصیب میاں اجمیر گئے ہوئے تھے۔ اب میری بلائیں لیتے نہیں تھکتے تھے۔

ریت کے مطابق دیگیں چڑھوا دی گئی تھیں، اور ابھی تو نہیں بجے تھے کہ کھانا تیار ہو چکا تھا۔ اِس دوران زنانوں کی متعدد ٹولیاں آتی، ٹھٹھول کرتی، شور مچاتی رہیں۔ لوگ اُنھیں چھیڑتے، اُن پر سکے لُٹاتے رہے۔ زنانوں کے لیے الگ ایک گوشے میں کھانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اڈّے پر جو موجود تھے، اُن کے علاوہ جو بھی آتا گیا، کھانے میں شریک ہوتا رہا۔ کتنی ہی تعداد میں لوگ آ جائیں۔ شاید کبھی ایسا ہوا ہو کہ کھانا کم پڑ گیا ہو۔ کچھ بچ ہی جاتا تھا، اور لوگ پیتل، تانبے اور مٹی کے برتنوں میں گھر

لے جاتے تھے۔ مٹھائی کے ٹوکروں اور دونوں کا بھی انبار لگ گیا تھا۔ پھولوں کی پتیاں چاندنی پر بکھر جاتی تھیں۔ جھّل کے آس پاس بیٹھے لوگ انھیں چن چن کر چاندنی کی روشنی برقرار رکھنے کی کوشش کرتے رہے، لیکن پتیوں کا رنگ چھوٹ چھوٹ جاتا تھا۔ گیارہ بجے تک کھانے کا سلسلہ چلتا رہا اور گھنٹے بھر سے زیادہ نہیں لگا کہ اڈّے کے اندر اور باہر کی ہر جگہ صاف کر دی گئی۔ ایسے موقعوں پر کھانے کے بعد عموماً رقص و سرود کی محفل برپا ہو جاتی تھی؛ کبھی زنانوں کی، کبھی بازار سے کوئی طائفہ آ کے رنگ جمانے لگتا۔ یقیناً جھّل کی منشا نہیں ہوگی کہ زنانے لوٹا دیے گئے، اور بازار سے بھی کسی کو طلب نہیں کیا گیا۔

رفتہ رفتہ بھیڑ کم ہوتی گئی اور اڈّے کا سکون واپس آتا گیا۔ جامو، جمرو، زورا اور اڈّے کے تقریباً سبھی لوگ آنے والوں سے سلام دعا کرتے، انھیں منتظم رکھتے، اُن کے لیے کھانے پینے کے انتظام میں ایسے مصروف رہے تھے کہ ذرا دیر تک سے بات کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مجھے سیورین کے بارے میں معلوم کرنے کی بے چینی تھی۔ امکان یہی تھا کہ سیورین ضد پر اڑی رہی ہوگی۔ نرمی و نازکی اور بات ہے، عزم کی پختگی اور۔ سفر کے دوران جھّل کے ٹوکنے پر میں نے کئی خط فیض آباد لکھے تھے۔ ہمارا کوئی مستقل پتا تو ہوتا نہیں تھا، آج یہاں، کل وہاں، اِس لیے کسی جواب کی توقع بھی نہیں کی جاتی تھی۔ شروع کے خط میں، میں نے جھّل کی جانب سے زرّیں کو سیورین کا خیال رکھنے کی سفارش کی تھی، حالاں کہ اِس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ جامو اور زورا کے ساتھ سیورین کا وہاں پہنچ جانا ہی کافی تھا۔ پھر بھی ایک بے کلی سی تھی۔ سیورین کو حویلی جا کے کوئی پچھتاوا تو نہیں ہوا۔ وہاں زیادہ تر عورتیں ہیں۔ مردوں کے بیچ میں کام کرنے والی عورتوں کا تیور کچھ جدا ہو جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے، سیورین کو حویلی کا روایتی قسم کا ماحول موافق نہ آیا ہو۔ میں نے تو بہت منع کیا تھا، اُس نے دلیلیں دے کر مجھے خاموش کر دیا۔ ماں، باپ کے ختم ہو جانے کے بعد وہ اکیلی بھی بہت رہ گئی تھی، اور وہ کتنا ہی مردوں کے درمیان کام کرتی رہی ہو، بہ ہر حال، وہ ایک لڑکی ہے۔ اُس میں ایثار، تحمّل، معاملہ فہمی اور خوش اطواری کی بہت سی خوبیاں حویلی کے مکینوں جیسی ہیں۔ وہ ایک تعلیم یافتہ، سلیقہ شعار اور دوسروں کو اپنی جانب کھینچنے والی لڑکی ہے۔ ممکن ہے، پٹنے سے ہمارے چلے جانے کے بعد اُس نے اپنے ارادے پر نظرِ ثانی کی ہو۔ مجھے حیرت تھی کہ مختصر مدت محض چند دنوں کے ساتھ میں اُس نے خود کو ہم دو را فتادہ اجنبیوں کے سپرد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لگتا تھا، جیسے وہ ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ ظاہر ہے، میں کیا، اُس کے سامنے جھّل ہی ہوگا جو کسی سائبان، کسی ستون کے مانند ہے۔ اُس کے پاس جتنا سایہ اور گداز ہے، مجھ میں تو اُس کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔ میں تو سیورین سے اُلجھتا ہی رہا تھا۔

بارہ بجے تک ہجوم اڈّے کے آدمیوں تک رہ گیا تھا۔ زورا میرے ہاتھ لگ گیا۔ میں نے سیورین کا ذکر چھیڑا تو وہ اُچھل پڑا۔ ”قسم سے راجا بھائی! ابھی کیا بولے، کیسا پاگل چھوکری ہے۔ ابھی اکٹھا پندرہ دن نہیں ہوا کہ اُس کا تار آ پڑا، لکھتا تھا، ٹھیک پانچ دن بعد سوم وار کو دوپہری پٹنا اسٹیشن پے وہ اپنے کو تیار ملے گا۔“

زورا نے بتایا کہ احتیاطاً جامو نے جوابی تار سے سیورین کو مطلع کر دیا کہ اُسے تار مل گیا ہے۔ پنجاب میل سے دونوں مقررہ دن روانہ ہو گئے۔ پٹنا اسٹیشن پر ڈبے سے اُتر کے انھوں نے سیدھے اوّل درجے کی انتظار گاہ کا رُخ کیا۔ انھیں اندر جانا نہیں پڑا۔ سیورین انتظار گاہ کے دروازے پر کھڑی اُن کی منتظر تھی۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ انھیں دیکھ کے اُس کا عجب حال ہوا، مضطربانہ جامو اور زورا سے چمٹ گئی۔ اُس کی بوڑھی آنٹی بھی اُسے وداع کرنے آئی تھی۔ جامو نے سیورین کے لیے اوّل درجے کا ٹکٹ کلکتے ہی سے خرید لیا تھا کہ پٹنا اسٹیشن پر کوئی پریشانی نہ ہو، اور سیورین کو اُن سے الگ زنانہ ڈبے میں سفر نہ کرنا پڑے۔ بوڑھی آنٹی سیورین کو رخصت کرتے وقت بلکنے لگی اور اُس کی سلامتی کے لیے دُعا کیا کرتی رہی، جیسے کوئی بیٹی کو گھر سے وداع کرتا ہے۔ آنٹی نے جامو اور زورا سے فریاد کی کہ وہ اپنی عزیز ترین بچی اُن کے حوالے کر رہی ہے۔ سیورین بہت نازک، دل کی بڑی اُجلی ہے۔ پٹنا اسٹیشن پر گاڑی زیادہ دیر نہیں ٹھیری۔ سیورین اپنے ساتھ جہیز لا کر آنسو بہائیں [illegible]۔ راستے بھر اُس کی آنکھیں دمکتی رہیں۔ فیض آباد اسٹیشن پر آ کے جامو نے اُسے زورا کے ساتھ الگ [illegible] میں بٹھا دیا۔ جامو فیض آباد کے اڈّے کا استاد تھا وہاں کا بچہ بچہ اُس سے واقف تھا۔ ساری میں ملبوس سیورین نے بال لپیٹ لی تھی، لیکن ایک عورت کے ساتھ حویلی کی طرف جانے کی کہانیاں تراش لی جاتیں۔ زورا بھی دو ایک بار فیض آباد آ چکا تھا اور کئی دن قیام کر چکا تھا، مگر اڈّے کے آدمیوں کے سوا اُسے کتنے لوگ یاد رکھ پائے ہوں گے۔ زورا پہلے حویلی میں داخل ہوا۔ کچھ دیر بعد اپنے اڈّے کا ایک چکر لگا کے جامو بھی حویلی چلا آیا۔

زورا کو زبان کھولنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ زرّیں کے دل میں تو ایک دریا رواں رہتا ہے۔ زورا کہہ رہا تھا کہ زرّیں نے بڑھ کر سیورین کو اپنے بازوؤں کی پناہ میں لے لیا۔ زہرہ، چھوٹی اور بڑی سلمیٰ، نیساں، خانم، فروزاں، یاسمن، ہر ایک نے سیورین کو کسی اجنبی جگہ کا احساس ہونے نہیں دیا۔ انھوں نے اُس سے وہی سلوک کیا جو اُن کا خاصہ تھا، اور جو وہ ایک دوسرے سے روا رکھتی تھیں۔ سیورین، سامان میں اپنے خاندانی زیورات کا بکسا بھی ساتھ لائی تھی۔ اُس کے پاس کچھ نقدی بھی تھی۔ وہ سب کچھ اُس نے زرّیں کی تحویل میں دے دیا۔

جامو اور زورا ہفتے بھر فیض آباد میں ٹھیرے رہے۔ یہ اطمینان کر کے کہ سیورین کو کوئی اُلجھن پیش نہیں آ رہی ہے، انھوں نے کلکتے واپسی کا قصد کیا، لیکن جامو پھر بھی متردد تھا۔ مہینا بھر گزرا ہوگا کہ اُس نے زورا اور جمرو کو فیض آباد روانہ کیا، اور دونوں نے تین چار دن ہی وہاں قیام کیا۔ سیورین اِس دوران حویلی کا حصہ بن چکی تھی۔ انھیں اُس کے چہرے پر ملال یا تکدر کی ذرا سی رمق نظر آتی تو جامو کی ہدایت تھی، اُسے فوراً واپس لے جائیں۔ سیورین نے ڈاکٹر رائے کے مشورے پر اسپتال کی ملازمت ترک کرنے کے بجائے طویل رخصت کی اجازت لی تھی۔ درخواست میں اُس نے کلکتے میں اپنے کسی انگریز رشتے دار کے ہاں جانے اور مزید تعلیم حاصل کرنے کا ذکر کیا تھا۔ زورا بتا رہا تھا کہ زرّیں، خانم اور فروزاں کی ہمسری پر اور سیورین کو ڈاکٹری کی تعلیم کا شوق ہوا ہے۔ اپنی اسناد، اسپتال کے [illegible] کے تصدیق نامے اُس کے پاس موجود ہیں۔ اِس سلسلے میں لکھنؤ، یا شاید دلّی جانا پڑے۔ منیر علی کے بیٹے اور بھتیجے نے میڈیکل کالج میں داخلے اور دیگر معاملات سے نمٹنے کے لیے اُسے ہر طرح کی اعانت کا یقین دلایا ہے۔

فیض آباد میں جمرو اور زورا دن بھر بیشتر حویلی میں رہتے، رات کو اڈّے واپس آ جاتے تھے۔ وہ تین دن انھوں نے شہزادوں کی طرح حویلی میں بسر کیے۔ ہر کوئی اُن کی خاطر تواضع کی جستجو میں رہتا تھا۔ زرّیں نے وہاں کچھ ایسا ماحول بنایا ہے کہ ہر کوئی وہاں سرگرم اور مصروف نظر آتا ہے۔ پچھواڑے کے باغ میں وہ شام کو بیڈمنٹن کھیلتی ہیں، دن بھر دوسرے کھیل، مطالعہ: رسالے، کتابیں، اخبار، کھانوں کے تجربے اور مقابلے، موتی پکوان، زورا اور جمرو کا وہاں سے آنے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔

زورا پھر میرے ساتھ ہی رہا اور دیر رات تک حسرت و اشتیاق سے حویلی کے قصے، کہانیاں سناتا رہا۔ یہ سارا احوال سن کے میرے سینے پر چھائی دُھند چھٹ سی گئی تھی۔ اِس سے مراد تھی کہ سیورین کو

واقعی کسی پناہ کی ضرورت تھی۔ وہ محرومی کے کسی شدید احساس میں جکڑی ہوئی تھی۔ چہرے آدمی کے درونِ خانہ تلاطم کی عکاسی کسی قدر کر پاتے ہیں۔ کچھ اندازہ نہیں ہو پاتا کہ سامنے نظر آنے والا آدمی کیسے فشار، کتنی آندھیوں سے دوچار ہے۔ حویلی میں سیدورین کا ماجرا سن کر میرا جی بھی اُمڈتا تھا کہ دو ایک روز کے لیے فیض آباد جا کے اپنی آنکھوں سے اُس کی طمانیت اور شادابی دیکھوں۔ فیض آباد اِتنا دُور بھی نہیں تھا، میں جا کے ہفتے عشرے میں واپس بھی آ سکتا تھا۔

صبح نو بجے آنکھ کھل پائی، وہ بھی سارنگے کے جگانے پر۔ دس بجے تک باہر نکلنا ہو سکا۔ جُھل چوکی پر موجود تھا اور ناشتے پر میرا انتظار ہو رہا تھا۔ لوگوں کی تعداد بہت کم تھی، لیکن جیسے جیسے دھوپ چڑھتی اور اُترتی گئی، لوگ بڑھتے رہے۔ رات کو تو پھر گزشتہ کل جیسا اِزدحام ہو گیا۔

کسی لمحے نصیب میاں سے میں نے یوں ہی ازراہِ لطف اُن کے خاص پانوں کا ذکر کیا تھا۔ وہ تو بسمل ہو گئے۔ رات کو ہجوم کے درمیان سے ہم تین چار کا ایک ساتھ اُٹھنا سب کی نظروں میں آ جاتا۔ نصیب میاں نے موقع دیکھ کر مجھے اشارہ کیا، میں نے پاس بیٹھے جمرو اور زورا کو۔ ایک ایک کر کے ہم چاروں باہر نکل آئے۔ گلی میں موجود سارنگے بھی ہمارے ساتھ ہو گیا۔ نصیب میاں ہمیں سونا گاچھی کے علاقے میں لے آئے۔ وہاں شب بیداری کا وہی عالم تھا، سارا شہر جیسے بازار میں سمٹ آیا ہو، دن پھر طلوع ہو گیا ہو، ہنڈول، رنگ، روشنی اور ساز۔ نصیب میاں بازار کے نشیب و فراز کے پارکھ تھے۔ کون سا نیا طائفہ آیا ہوا ہے اور کس بالا خانے کا سکہ رائج الوقت ہے، کس کے گلے میں نرس و قتی بیٹھی اور کس کے بدن میں پارا

آمیخت ہے، رنگ روپ میں کون شہاب، کون گلاب [illegible] سرتاپا شباب ہے، کس کے شرمگیں چہرے میں کیسی قیامت ہے [illegible] کس کی ادائیں تراز و ہو جاتی ہیں، اور کس کے شیدائیوں کا شمار نہیں۔ ایک تو نصیب میاں کی شیریں سخنی پہلے ہی کیا کم تھی [illegible] اب ترنگ کچھ اور فزوں ہو گئی تھی۔

رات کی ایک خوبی یہ ضرور ہے کہ بے شمار عیب چھپا لیتی ہے۔ عمارتوں، چیزوں اور چہروں کے عیب۔ ہم کسی کوٹھے پر نہیں گئے۔ چھقن صاحب کی پان کی دُکان ہماری منزل تھی مگر اب وہ پہلی والی دُکان نہیں تھی۔ اُس سے کوئی فرلانگ بھر کی دُوری پر چھقن صاحب نے ایک کشادہ دُکان لے لی تھی۔ سجاوٹ میں بڑی نفاست تھی۔ خود چھقن صاحب کا تکلف بھی کچھ فزوں لگتا تھا۔ اُجلا لباس، ہاتھوں پر دستانے، کتھے چُونے کا ایک داغ بھی لباس پر نہیں تھا۔ کتھے چُونے کے پان کے برتن چمک رہے تھے۔ پان لگانے والی ڈنڈیاں کُلیا میں کتھے چُونے کی مقدار کے بہ قدر ہی سَنی ہوئی تھیں۔ چھقن صاحب پان پر کتھا لگا کر ہر بار ڈنڈی قریب رکھے پانی سے بھرے گلاس میں ڈال دیتے تھے۔ چناں چہ ڈنڈی پر کتھے کے پرت جم پاتے تھے، نہ چُونے کی آمیزش ہو پاتی تھی۔ نصیب میاں اور چھقن صاحب کی چونچیں دیکھنے سننے کی ہوتی تھیں۔ دونوں کا سامنا ہو جائے تو کتابوں کے کردار زندہ ہو جائیں۔ پان کا تو ایک بہانہ تھا۔ میں تو یہی کچھ دیکھنے آیا تھا۔ دونوں میں مرصع فقروں کا مچیٹا ہوتا رہا اور ایک ایک فقرے چست کیے جاتے رہے۔ چھقن صاحب نے اپنے بنگالی خدمت گار کو جانے کس لمحے اشارہ کیا تھا کہ وہ جھٹ قریب کی کسی دُکان سے تازہ رس گُلّے لے آیا۔ نصیب میاں پلکیں پٹ پٹا کے پوچھا، "ہائیں! یہ کیا تکلف ہے بندہ نواز؟"

"تکلف کیسا۔" چھقن صاحب نے چہکتی آواز میں کہا۔

"دیکھ نہیں رہے جناب! اتنے عرصے بعد اپنے چھوٹے صاحب نیازمند کے خارزار پہ قدم رنجہ ہوئے ہیں۔ آنکھیں ترستی تھیں، ماشاء اللہ وہی بانکپن، وہی چھب ڈھب، [illegible] بازار میں شہزادے کو زیادہ دیر نہ گھمایئے گا نصیب میاں۔"

"کیوں! کیا تیر چل جائیں گے؟" نصیب میاں

چہک کے بولے۔

"گرہ لگانا تو کوئی آپ سے سیکھے۔" چھقن صاحب نے بل کھا کے کہا، "ارے صاحب! یہی ایک گھڑی تو بازار کے شباب کی ہوتی ہے۔ صاحبِ عالم دو چار گلیوں سے گزر گئے تو ذرا سوچیے، کوئی اِن کا نظارہ کرے کہ اُن...."

"بس بس چھقن صاحب..." میں نے اُن کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

چھقن صاحب نے تشتری اُٹھا کے میرے سامنے کر دی۔

"لیجیے، شیرینی تو نوش فرمایئے۔"

نصیب میاں پہلے سے تاک لگائے ہوئے تھے۔ مجھ سے پہلے اُنھوں نے تشتری سے مٹھائی کا دانہ اُچک لیا اور اُنگلیوں میں گھماتے ہوئے شوخی سے بولے، "میٹھے بھی ہیں؟"

چھقن صاحب نے نظر بھر کے اُن کی طرف دیکھا اور ایک ثانیے کے تأمل کے بعد بولے، "آپ سے زیادہ نہیں میاں؟"

جمرو تو مچل چل گیا۔ زورا کے پلّے کچھ نہیں پڑ رہا تھا، لیکن وہ بھی دیدے پھاڑے چھقن صاحب اور نصیب میاں کے ترشے ہوئے لفظ سُن رہا۔ میرے خیریت پوچھنے پر چھقن صاحب کے چہرے پر دُھواں سا چھا گیا، سینے پر ہاتھ رکھ کے سرد آہ بھری اور کہنے لگے، "کیا پوچھتے ہو بھیا، نہ ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں۔"

"آپ پر یہ بیزاری اچھی نہیں لگتی۔" میں نے اُنھیں اُکسانے کے لیے کہا، "آپ کی زندہ دلی اور بذلہ سنجی کے واقعات تو دُور دُور مشہور ہیں۔"

"فسانے کہو میاں۔"

"طبیعت تو ٹھیک ہے، کاروبار کیسا چل رہا ہے؟"

"بس کاروبار ہی کاروبار ہے۔"

"کیوں، ایسی کیا بات ہے؟" میں نے بے چینی ظاہر کی۔

وہ ٹھنک کے بولے، "نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری! راہ لگ اپنی۔" مجھے دوسرا مصرع یاد تھا۔ میں نے کہا، "یہی تو پوچھتے ہیں، بیزاری کا کوئی سبب تو ہوگا۔"

"اے میاں!" چھقن صاحب کی آواز پر یاسیت غالب آ گئی، "کیا عرض کریں، کس کس چیز کا ماتم کریں۔ یہ نامرادِ شکم ساتھ نہ جُڑا ہوتا تو کب کے اپنے ویرانے میں جا لوٹے ہوتے۔ یہاں تو بس اِسی نابکار کی سیری ہوتی ہے۔ یہ چشم و گوش، یہ سینہ و دل کہاں لے جائیں بھیا! یہاں تو سبھی کچھ بدلا جا رہا ہے۔ پہناوے، ذائقے، گفتار، رفتار، اور رفتار بھی رفتار ہے، جسے دیکھو، سرپٹ بھاگا چلا جا رہا ہے۔ یہ تو کوئی اور جگہ ہے۔ ہم یہاں تو نہیں آئے تھے۔ اپنی زبان ہی اب یہاں کوئی نہیں سمجھتا۔ اب تو ہم پان فروش، محض 'پنواڑی' ہیں۔ پان بیچتے ہیں، پہلے دل والے آتے تھے، دل بیچتے تھے۔ اب تو پان بیچتے ہیں۔ نصیب میاں ایسے تین چار طرح داروں سے کچھ آس بندھی رہتی ہے، اور خاکم بہ دہن..." چھقن صاحب کی طبعی شگفتگی لوٹ آئی، کہنے لگے، "... یہ بھی بھلا کتنے دن کے ہیں۔"

"ارے واہ۔" نصیب میاں نے تیورا کے کہا، "دن گن رہے ہیں ہمارے پیارے صاحب۔"

"سچ بولتے ہیں۔" چھقن صاحب چہک کے بولے، "یوں اپنی بھی آپ کو لگ جائے۔ ہزار برس سلامت رہو، اور وہ جو مرزا نوشہ نے کہا ہے..."

"اب باتوں میں اُڑاتے ہو۔" نصیب میاں نے مصنوعی ناگواری سے کہا، "ارے یہ تین چار بھی نہ رہے تو کندھا بھی کیا غیروں سے دلواؤ گے۔ ہمیں تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ دُکان کی اُلٹ پلٹ کی ترکیب بھی اکارت گئی۔ نوبہار گُل بہاری بی نے پھر کسی آزمائش میں ڈالا ہے جو سب سرو پائی ہانکتے ہو۔"

"ہے ہے، ذری کچھ تو لحاظ مروّت کرو نصیب میاں!" چھقن صاحب نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کے لجاجت سے کہا، "سب کے سامنے رُسوا کرتے ہو۔ تم پر بھی یاں کے پانی نے اثر کر دکھایا۔"

چھنّن صاحب نے حسبِ روایت عطر کی پھریری پیش کی۔ سب کے گلوں میں ہار ڈالے۔ بچھل کو یاد کرتے رہے، "ہائے، سنا ہے اپنے اُستاد بادشاہ بھی آ گئے ہیں۔ جب سے سنا ہے، باریابی کے لیے رسیاں تڑا رہا ہوں۔ کہنا، صبح سلامی کے لیے نیاز مند حاضری دے گا۔" اُنھوں نے بچھل کے لیے گلوریوں کا ایک پُڑا ہمارے ساتھ کر دیا۔

چھنّن صاحب سے رُخصت لے کے ہم آگے چلے آئے۔ اُن کے بارے میں تھوڑا بہت مجھے معلوم تھا لیکن اِتنی جزئیات سے نہیں، جتنا نصیب میاں نے اُس وقت بتایا اور سب کو حیران کیا۔ نصیب میاں کے کہنے کے مطابق چھنّن صاحب کا تعلق بدایوں کے ایک چھوٹے موٹے زمیں دار خاندان سے تھا۔ شروع ہی سے مزاج میں ایک سرمستی تھی۔ لکھنؤ آنا جانا کثرت سے رہتا تھا۔ وہاں کسی طوائف زادی سے آشنائی ہو گئی۔ نام تو اُس کا کچھ اور تھا، شرفن کی عرفیت سے مشہور تھی، چھنّن صاحب اُس کی چوکھٹ سے ایسے بندھے کہ دنیا و مافیہا کا ہوش نہ رہا۔ پھر اُسی پرانی کہانی کی تکرار، ساری زمینیں لد گئیں۔ کہتے ہیں، شرفن اُن کے ساتھ جانے کے لیے تیار تھی، لیکن اُس کی ماں، یا ماں کا وعدے سے پھر گئی اور چھنّن صاحب سے پیچھا چھڑوانے کے لیے راتوں رات لکھنؤ سے غائب ہو گئی۔ چھنّن صاحب جگہ جگہ شرفن کو ڈھونڈتے رہے اور آخر اُنھوں نے اُسے کلکتے میں جا لیا، مگر اُن کے پاس جانِ ناتواں اور قلبِ سوزاں کے سوا کچھ نہیں بچا تھا۔ بالاخانے کے دروازوں کا قفل سونے چاندی کی کنجیوں سے کھلتا ہے۔ سنا ہے، شرفن نے کسی ذریعے سے رُپے بھجوا کے درماندہ چھنّن صاحب کی مدد کرنی چاہی اور قاصد سے کہا کہ جا کے اُن سے منّت کرے، اچھا ہے کہ سب کچھ بھول جائیں۔ وہ بس کوئی خواب تھا۔ ہر خواب کی تعبیر نہیں ملتی۔ اِسی میں اُن کی بہتری ہے، شرفن کی بھی، مگر کوئی خواب ہوتا تو بھول جانا بھی آسان تھا۔ بھول جانا آدمی کے بس میں ہوا کرتا تو اِتنی کہانیاں کیسے تخلیق ہوتیں۔ چھنّن صاحب نے رقم واپس کر دی اور یہی بہت جانا کہ اُن کا نقش تو شرفن کے نہاں خانے میں تابندہ ہے۔ جواب میں قاصد سے کہا کہ یہی انجام نوشتہ ہے تو پھر تم بھی تمھارے آستانے پر نکلنا چاہیے۔ کوئی کام ہنر آتا نہیں تھا۔ کسی دُور افتادہ رشتے دار نے سلوک کیا، یا آباواجداد کی وراثت میں کچھ باقی رہ گیا تھا کہ شرفن کے بالاخانے کے عین مقابل دُکان لے کے پان فروشی شروع کر دی، اس طرح کم از کم ہر وقت شرفن کے دیدار کا تو اہتمام تھا۔

اب بیس سال سے اُوپر ہو رہے ہیں۔ درمیان میں شرفن کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ چھنّن صاحب کا خیال تھا کہ اِس پتھر کے ہٹ جانے پر اُن کی کشتی بھی کنارے پر لگ جائے گی، لیکن شرفن بالاخانے کے شب و روز سے مانوس ہو چکی تھی، یا یوں کہا جائے کہ اُس کے دل میں بالاخانے سے باہر کی زندگی کا کوئی خوف بیٹھ گیا تھا۔ خود اُس کی عمر بھی ڈھل چکی تھی، وہ اپنی جہاں دیدہ ماں کی پیروی کرنے لگی۔ نئی لڑکیوں کی خریداری، اُنھیں رقص و موسیقی کی تعلیم سے آراستہ کرنے اور بناؤ سنگھار، ناز و ادا کے گُر سکھانے کا کام۔ چھنّن صاحب انتظار کرتے رہے۔ گذشتہ دنوں شرفن، پُرانے بالاخانے کی شکستہ عمارت ترک کر کے نئی کشادہ جگہ منتقل ہو گئی۔ چھنّن صاحب کی صبح تو شرفن کے دیدار سے طلوع ہوتی تھی اور رات کو اُس کا چہرہ دیکھ کے وہ حجرے کا رُخ کرتے تھے۔ شرفن اُن کی دکان پر آتی ہے۔ بس صبح و شام اور دن میں کسی وقت بھی شرفن بالکونی پر نمودار ہوتی ہے، چھنّن صاحب کو تسلیمات کرتی ہے، چھنّن صاحب سینے پر ہاتھ رکھ کے سرخم کرتے ہیں۔ روز اُن کی طرف سے ایک گُل دستہ قاصد لے جاتا ہے اور شرفن کے ہاں کوئی بہتر قسم کی چیز پکی ہو تو بالاخانے سے آ جاتی ہے۔ کلکتے آ کے شرفن کی ماں نے اُس کا لقب نوبہار رکھ دیا تھا۔ سوناگاچھی کے مشہور بالاخانوں میں ایک نوبہار کا بالاخانہ بھی تھا۔ بدایوں سے ہجرت کرنے کے بعد چھنّن صاحب کا کبھی اپنے شہر سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ کہیں آتے جاتے نہیں، بس دُکان سے حجرے تک۔ حجرے میں رات کا آخری اور دن کا ابتدائی پہر گزر جاتا ہے۔ باقی پہر تو شرفن اُن کے سامنے رہتی ہے، اُن کے قریب۔ گلی کے اُس پار شرفن اب ایک مال دار نائکہ ہے۔ معلوم نہیں، شرفن کی آسودگی مال و زر کی ہے، یا واقعی وہ بہت آسودہ ہے، مگر شاید مال و زر سے بڑی کوئی آسودگی اور کوئی طاقت نہیں ہوتی۔

میرا جی چاہا تھا، نصیب میاں سے کہوں کہ وہ کچھ دیر کے لیے شرفن یا نوبہار کے بالاخانے پر لے چلیں، لیکن جانے کیوں میں خاموش رہا، غالباً چھنّن صاحب کی وجہ سے۔ نصیب میاں ہمیں مختلف گلیوں میں گھماتے رہے۔ سوناگاچھی میں کوئی جشن برپا تھا، جیسے آج کی رات، آخری رات ہو۔ ہجوم اَور بڑھ گیا تھا۔ گھنگھروؤں، سازوں اور گانوں کی آوازیں ہر سُو گونج رہی تھیں۔

اُس طرف کریمن بیگم کا بالاخانہ بھی تھا۔ نصیب میاں نے بتایا کہ کریمن بیگم ابھی تک کلکتے واپس نہیں آئی ہے۔ وعدے کے مطابق جس رات کانتے شمہ پارہ کے سودے کا بیعانہ لے کے بالاخانے پر گیا تھا، کریمن بیگم شمہ پارہ کو لے کے فرار ہو چکی تھی۔ دوسرے روز ہم جنت کے سفر پر روانہ ہو گئے اور ہمارے جانے کے تیسرے روز شمہ پارہ خود واڑے پر آ گئی تھی۔ بنارس اسٹیشن پہنچتے میں کریمن بیگم کی آنکھ لگی تھی کہ شمہ پارہ کو بھاگنے کا موقع مل گیا اور کانتے اُسے بمبئی میں جولین کے پاس چھوڑ آیا۔ کریمن بیگم کی عہد شکنی پر کانتے بہت طیش میں تھا۔ کہتا تھا، ایک بار اُس کا پتا چل جائے، مگر آدمی کو اپنی خبر نہیں ہوتی، خود اُس کے پاس کتنا وقت ہے، کانتے ہی نہیں رہا۔ کلکتا نہیں تو کریمن بیگم نے کسی اور شہر کا رُخ کر لیا ہو گا۔ ایک شمہ پارہ کا ہیرا ہی راستے میں کھو گیا تھا، باقی سارا کچھ تو اُس کی تحویل میں تھا۔ کلکتے سے چلتے وقت زیور، نقدی کی ڈھیریاں ہوں گی اُس کے پاس۔ کہیں بھی جا کے اُس نے پھر دکان کھول لی ہو گی۔ اب کوئی اور شمہ پارہ ہو گی۔ کسی جگہ نہ سوداگروں کی کمی ہے نہ سودے کی، نہ بازار کی، اور یہ ہنر تو کریمن بیگم کو پہلے ہی خوب آتا تھا۔

چھنّن صاحب کی عطیہ، بارہ مسالوں اور چاندی کے ورق سے مرصع گلوریوں کا لطف اُٹھاتے گلیوں گلیوں گھومتے ہوئے ہم ایک گلی میں آئے تو چلتے چلتے ایک جگہ نصیب میاں ٹھٹک کے رُک گئے اور مجھے ٹہوکا مارتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں بولے، "وہ سامنے کانتی بائی کے بالاخانے کی دہلیز کے ساتھ جو آدمی بیٹھا ہوا ہے، اُسے دیکھتے ہو میاں؟"

میری نظریں سامنے کی جانب گئیں۔ کچھ فاصلے پر بالاخانے کی فرشی منزل کے پہلو میں بڑے سے چبوترے پر ایک سن رسیدہ، مجہول قسم کا شخص اپنے آپ میں گُم بیٹھا تھا۔

"کون ہے یہ؟" میں نے چونک کے پوچھا۔

نصیب میاں آنکھیں چڑھا کے اور شانے اُچکا کے بولے، "خدا ہی بہتر جانتا ہے، کہانیاں بہت مشہور ہیں، ساری کہانیاں..."

تن و توش کا متوازن، نکلتا ہوا قد، چہرے کا بڑا حصہ لمبی کھچڑی داڑھی سے چھپا ہوا، رنگت سانولی، سر کے بال دراز اور بکھرے ہوئے، بازو پوش بنیان اور لنگی میں ملبوس۔ عمر ساٹھ سے کچھ اُوپر ہی ہو گی۔ عمارت کی اُوپری منزل کا چھجا خاصا آگے کو نکلا ہوا تھا اور سائبان کا کام دیتا تھا۔ پرالی بچھے

چبوترے پر ایک جانب دو چار صاف ستھرے برتن رکھے ہوئے تھے، اور کوئی چیز اُس کے پاس نہیں تھی۔

نصیب میاں نے بتایا کہ کسی کو نہیں معلوم، کہاں سے آیا ہے، اور کیوں۔ کوئی تین ماہ سے اِس نے یہاں ڈیرا جمایا ہوا ہے۔ صبح مُنہ اندھیرے نکل جاتا ہے اور ہُگلی کنارے میلوں پیدل چلتا ہوا واپس آ کے یہاں بیٹھ جاتا ہے۔ صرف کچی سبزیاں کھاتا ہے، اور وہ بھی فقط دوپہر کو۔ رات کو دودھ کا کٹورا پیتا ہے۔ آدھی رات تک بازار جاگتا رہتا ہے۔ ہر طرف سے اُٹھنے والے، گھنگھروؤں، سازوں اور من چلے راہ گیروں کے شور کے باوجود اپنے خاص وقت پر چادر تان کے غافل ہو جاتا ہے۔

کامنی بائی نے ایک صبح بالاخانے کے چبوترے پر اُسے بیٹھا دیکھا تو پہلے تو بڑی کبیدہ ہوئی، پھر شاید وہم و گماں نے آ گھیرا، خاموش رہی اور گھر سے کھانے کا تھال بھیجا۔ تھال واپس کر دیا گیا اور صرف اِتنا پیغام قاصد کے ذریعے ملا کہ دودھ اور کچی سبزیاں مرغوب ہیں۔ کامنی بائی نے گاجر مولی، ٹماٹر، کچی کھائی جانے والی طرح طرح کی سبزیاں بھجوائیں۔ اِن میں سے چند دانے روک کے باقی واپس کر دیا گیا۔ ابتدا میں راہ گیروں نے کوئی جنونی، سودائی اور بہروپیا سمجھ کے چھیڑ چھاڑ شروع کی تھی، بعض سرمستوں نے فقروں کی بھی یورش کی اور قریب جا کے حال احوال جاننے کی جستجو بھی، پتھر کنکر بھی اُچھالے۔ یہ شخص بت بنا بیٹھا رہا۔ کسی سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ راہ گیر پھر خود ہی باز آ گئے۔ کہتے ہیں، کسی وقت سر اُٹھا کے ناگواری سے دیکھا تھا کہ لوگ نظروں کی تاب نہ لا سکے۔ اُس کے بعد وہی ہوا، لوگ فریادیں کرنے اور نذریں گزارنے لگے۔ کوئی شہادت نہیں کہ اِس نے کبھی روپیا پیسا قبول کیا ہو۔ یہ اُنھیں پھینک دیتا ہے اور ہاتھ جھٹک کے دھتکار دیتا ہے، جیسے رُپے پیسے نہ ہوں، ٹھیکرے ہوں۔

لوگ دُہائیاں دیتے ہیں تو سر جھکائے سنتا رہتا ہے، کوئی بہت زیادہ تکرار کرتا ہے تو سر اُٹھاتا ہے۔ اِس کی شعلہ بار آنکھیں دیکھ کے فریادی کی زبان ٹھٹھر جاتی ہے۔ کبھی کسی کی منت زاری پر یہ ہاتھ اُٹھا کے اُسے روک دیتا ہے، اور کچھ نہیں بولتا۔ منت گزار اِسے کوئی تائیدی اشارہ سمجھ کے مطمئن ہو جاتا ہے اور خاموشی سے لوٹ جاتا ہے۔

پولیس بھی پہلے پہل کامنی بائی کے چبوترے پر اِس کے مستقل قیام سے مضطرب ہو گئی تھی۔ وہ اِسے وہاں سے ہٹانا اور مزاحمت کی صورت میں ساتھ لے جانا چاہتی تھی، لیکن کامنی بائی آڑے آ گئی۔ کامنی بائی نے نچلی منزل کا ایک کمرا اُس کے لیے مختص کرنے کی پیش کش کی تھی، لیکن یہ آمادہ نہیں ہوا۔ لوگوں کو تعجب ہے کہ اُس نے بازار کی یہ جگہ ہی کیوں منتخب کی۔ بہ ہر حال، لوگ اِسے اب پاگل نہیں سمجھتے۔ قیاس آرائیوں کے زاویے بدل گئے ہیں کہ ضرور یہ کوئی مجرم ہے اور مفرور ہے، پولیس کا مخبر ہے، یا کسی خطرناک ارادے سے یہاں دھرنا دیے ہوئے ہے، اِسے یہاں آنے والے کسی مطلوب کی تلاش ہے، کوئی برگزیدہ بندہ ہے، جانے کیا کیا... پولیس اور چند عیب جُو قسم کے لوگوں نے اِس کا تعاقب کرنے اور اصل حقیقت جاننے کا بہت جتن کیا، کسی کو کوئی سراغ نہ مل پایا۔ ہُگلی کنارے دُور تک چہل قدمی، اور واپسی سے قبل ایک خاص مقام پر غسل، اِس کا معمول ہے، اِس کے سوا کچھ نہیں، نہ مندر نہ مسجد، نہ گردوارا، نہ گرجا۔ وہ صرف کامنی کے قاصد سے مختصر کلام کرتا ہے اور ہندوستانی بولتا ہے۔ اِس کا مطلب ہے، بنگالے سے تعلق نہیں۔

مجھے حیرت تھی، نصیب میاں کو اِس شخص کے بارے میں اِتنی تفصیل اَزبر تھی۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ اِتنا کچھ سن کے اُسے قریب سے دیکھنے کا اشتیاق ہوا۔ چند قدم کا فاصلہ طے کر کے ہم اُس کے پاس پہنچ گئے۔ اُس کا سر جھکا ہوا تھا۔ نصیب میاں نے اپنے مخصوص لپکتے اور لہکتے انداز میں اُسے سلام کیا۔ جواب میں اُس نے سر ہلایا ضرور۔

''اپنے ساتھ ہمارے پیارے، جان سے عزیز میاں ہیں۔ دیواریں ہٹانے، راستے صاف کرنے کی کوئی تدبیر کرو۔ زمانہ ہو گیا، مراد بر نہیں آئی، آخر کب تک...''

اُس شخص نے جھٹکے سے سر اُٹھایا اور لمحوں تک ہمیں گھورتا رہا۔ یکا یک اُس کے جسم میں ارتعاش سا رونما ہوا۔ وہ بے قرار نظر آنے لگا، اور چبوترے سے اُٹھ کر ہمارے سامنے آ گیا۔ نصیب میاں کا سراپا بل کھا گیا۔ سارنگے، جمرو اور زورا کے جسم بھی اکڑ گئے۔ میں بھی خاصا متجسس تھا۔ اُس کا رُخ میری جانب تھا، مجھ سے ایک قدم کی دُوری پر آ کے وہ ٹھہر گیا۔ میں ساکت و جامد کھڑا رہا۔ واقعی اُس کی آنکھیں بڑی گہری تھیں، چہرے پر وحشت چھائی ہوئی تھی۔ میں نے بھی اپنی آنکھیں اُس پر مرکوز رکھیں۔ نہ اُس نے پلکیں جھپکیں، نہ میں نے۔ وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا، حیرت، اضطراب، یاسیت اور حسرت آمیز نظروں سے۔ اُس نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو بے اختیار میرے ہاتھ کو بھی جنبش ہوئی۔ جانے اُسے کیا ہوا، میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں پہلے دبایا، پھر سینے سے لگا لیا، آنکھوں سے مَس کیا، اور پپڑی جمے خشک ہونٹوں سے بوسہ دیا۔ میں نے اپنا ہاتھ کھینچنا چاہا، مگر اُس کی گرفت مضبوط تھی۔ میں نے بھی مزاحمت نہیں کی۔ نصیب میاں اُس سے کچھ اور کہنا چاہتے تھے مگر اُس کا بلند ہاتھ دیکھ کے خاموش رہے۔ اُنھی کے اشارے پر ہم پھر وہاں نہیں ٹھہرے، لیکن مجھے ایسا لگتا رہا، جیسے اُس کی آنکھیں میرا پیچھا کر رہی ہوں۔ مجھ پر پہلی بار منکشف ہوا، نصیب میاں بھی کچھ کم خوش عقیدہ نہیں ہیں، شاید جاتی عمر میں آدمی کی کچھ ایسی کیفیت ہو جاتی ہے۔ لمحوں تک خاموشی رہی۔ کچھ دُور آ کے نصیب میاں پوچھنے لگے، ''کیوں میاں! آپ نے دیکھا؟''

میں نے سر ہلانے پر اکتفا کی۔

''کچھ جی کو لگی بات؟''

''ہاں۔'' میں نے دبی آواز میں کہا، ''خوب آدمی ہے۔''

''آپ 'خوب' کہہ رہے ہیں۔''

''اور کیا کہوں؟''

''آپ نے غور نہیں کیا۔ وہ صرف آپ کی طرف بڑھا تھا، اور اُس کی کیا حالت ہوئی تھی۔ میں نے نہیں سنا، جب سے وہ یہاں آیا ہے، ایسا کبھی ہوا ہو۔''

''شاید اِس لیے کہ میں ہی کچھ طلب گار... حاجت مند نظر آتا تھا۔''

''گویا اُس نے پہچان لیا میاں... صرف آپ کو... آپ ہی کو کیوں۔ حاجت مند تو ہم بھی ہیں، ہم میں ہر ایک...''

''آپ کیا باور کرانا چاہتے ہیں نصیب میاں؟'' میں نے پژمردگی سے کہا۔

''میاں! ہم تو، جیسا کہ ہم نے اُس سے التجا کی تھی، ہم تو وہی چاہتے ہیں۔ ایسے لوگ جہاں ملیں، جب بھی ملیں، ہم تو اپنے شہزادے کے لیے دُہائی دیتے رہیں گے۔ کیا معلوم، کس کی سفارش، کس کے کلام میں زور ہو۔ ہم سے آپ کا دُکھ نہیں دیکھا جاتا... قسم اللہ پاک کی۔''

''دیکھو! یہ دو پنکھے ایر کنڈیشنر کے ساتھ مفت ملے ہیں۔''

''آپ کی محبت ہے نصیب میاں!'' میری آواز بکھرنے لگی تھی، ''سفر میں ایسے لوگ ملتے رہتے ہیں، طرح طرح کے روپ میں، مگر بس... اب تک جو ہوتا رہا ہے، وہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔ اب تو، سچ پوچھیے تو اعتبار ہی اُٹھ گیا ہے۔''

''نا میاں، نا۔'' نصیب میاں نے مجھے پہلو سے دبوچ لیا۔ ''مایوسی نہیں، بالکل نہیں۔ جی تھوڑا مت کیجیے۔ آپ نے سنا ہوگا، دیر ہے، اندھیر نہیں اُس کے ہاں۔''

''مایوسی نہیں نصیب میاں... ایسا ہوتا تو گھر میں کیوں نہ بیٹھ جاتے۔ میں تو سفر میں جگہ جگہ ملنے والے ایسے لوگوں کے بارے میں کہہ رہا تھا۔''

''جہاں بھی ممکن ہو۔ جس رُخ، جس گلی کوچے میں۔'' نصیب میاں حسرتی آواز میں بولے، ''جتن تو اپنی طرف سے کرنے ہی پڑتے ہیں، اور کرتے رہنا چاہیے۔ مجھے تو اُس شخص میں کچھ عجیب صفات نظر آتی ہیں۔ آپ نے دیکھا! اُس نے ہاتھ اُٹھا کے مجھے روک دیا تھا۔ لوگوں کا کہنا ہے، ایسا کم کم ہوا ہے۔ یہ اچھا شگون ہے۔ بس سمجھو، کچھ بہتر ہونے والا ہے، خدا کرے ایسا ہی ہو۔''

میں نے بھی بارہا اپنی ناکامی کو ستاروں اور سیاروں کی گردش پر محمول کیا ہے، لیکن اصل میں تو یہ محض اتفاقات کی کرشمہ کاری ہے۔ اِن کا کبھی ایسا تسلسل ہوتا ہے کہ آدمی دیکھتا

رہ جاتا ہے۔ ہم تو کئی بار اپنی منزل تک پہنچ چکے تھے، جیسلمیر میں، حیدرآباد، مرادآباد اور نگریا سادات میں... بس چند دن آگے پیچھے... اور اِن اتفاقات کی نوبت ہی کیوں آتی، اگر مولوی صاحب کے ہاں گرہ نہ پڑی ہوتی۔ کوئی شخص چھپے رہنے اور سامنے نہ آنے پر مُصر ہو، کسی کے سائے سے بھاگتا ہو، کسی نے کسی کے بارے میں کوئی رائے قائم کرلی ہو، تو وہ طلب گار، وہ ناہنجار کتنا اور کہاں تک جائے۔ کون سی کھوہ میں، کتنے دریا اور پہاڑ عبور کرے۔ کتنے گلی کوچوں کی خاک چھانے۔ بس یہی ہوگا، ہم تو نصیب میاں کے بہ قول، اپنے جتن کر رہے ہیں۔ کسی دن بھاگتے بھاگتے یا تو مولوی صاحب بس یا ہوجائیں گے، یا جیسا وہ چاہتے ہیں، ہمی سپر ڈال دیں گے۔ یہی مولوی صاحب کی نافہمی ہے۔ وہ نہیں جانتے، یہ کوئی ضد نہیں، یہ تو کسی کی متاعِ جاں کی بات ہے، اُس کی روح کی۔ اُس کی سانس تو کسی آس سے بندھی ہے۔ نصیب میاں کی آزردگی کا خیال تھا۔ میں نے دبے لہجے میں کہا، "اُس شخص کی ہیئت کذائی ظاہر کر رہی تھی کہ وہ خود بڑا حاجت مند ہے۔"

"بے شک، بے شک، مگر سنا ہے میاں! اپنی دُعاؤں میں اتنا نہیں، جتنا دوسروں کی دُعاؤں میں اثر ہوتا ہے، پھر صورت دوسری ہوجاتی ہے۔"

میں خاموش رہا۔

"مجھے تو لگتا ہے بھیّا صاحب، اب منزل سے آپ کی آنکھ مچولی والی بات شاید نہ ہو۔ جانے کیوں، دل کہتا ہے، اِس بار مراد بَر آئے ہی آئے۔"

"ہاں، نصیب میاں!" میں نے اُن کی دل جوئی کے لیے نرمی سے کہا، "ہر بار ہم کسی اُمید ہی میں گھر سے باہر قدم نکالتے ہیں... اور جب تک بن پڑا، جہاں تک بس میں ہوا..."

"بس میاں!" نصیب میاں نے مجھے روک دیا۔ "حوصلہ بلند رکھیے۔ اب آپ دیکھیے گا۔"

نصیب میاں کی خوش اُمیدی کی زور اور جمرو نے بھی شدت سے تائید کی۔

میں نے اُن سے جرح نہیں کی کہ اِس سے حاصل بھی کیا تھا۔ سبھی دُعا کرتے ہیں، ایک نہیں، بہت سے، بہت معصوم اور پاک باز لوگ۔ قبولیت کی کوئی گھڑی ہوتی ہے تو معلوم نہیں، وہ کیوں نہیں آتی۔"

ہم ایک اور گلی میں مڑ گئے، اور نصیب میاں نے غالباً میرا اور اپنا غبار دُور کرنے کے لیے کچھ فاصلے پر واقع ایک عمارت کی طرف اُنگلی اُٹھائی۔ "پہلے اِس گلی میں آنا ہوا ہے شہزادے؟" اُنھوں نے چہچہاتی آواز میں پوچھا۔

"کچھ یاد نہیں، یہاں تو سبھی گلیاں ایک جیسی ہیں۔" میں نے کہا، "کیوں، کیا کوئی خاص بات؟"

"ارے میاں، کیا پوچھیے۔ یہاں تو بہار آئی ہوئی ہے۔ اِس گلی کے تو اِن دنوں سارے شہر میں چرچے ہیں۔" نصیب میاں نے بتایا کہ سامنے والی نسبتاً اُونچی عمارت کا بالا خانہ گُلاب بانو کا ہے۔ مجھے یاد آیا، تین مہینے پہلے ہمارے کلکتے آنے پر گُلاب بانو کی دعوت آئی تھی کہ ہوسکے تو آج تجمّل بالا خانے آنے کی زحمت کرے، یا پھر اُس کے طائفے کو اڈّے پر حاضر ہونے کی اجازت دی جائے۔ جامو نے منع کر دیا تھا۔ تجمّل تازہ تازہ اسپتال سے اُٹھ کے آیا تھا۔ رات کو اڈّے پر محفل آرائی ہوتی یا تجمّل بالا خانے جاتا، دونوں باتیں اُس وقت نامناسب تھیں۔ نصیب میاں کے قدم بالا خانے کی جانب اُٹھ چکے تھے۔

"سنتے ہیں، کوئی آفتِ جاں، گُلاب بانو کے جال میں پھنس گئی ہے۔ اتفاق سے اِدھر آنا نہ ہوسکا۔ آج آپ کے ساتھ کیوں نہ جلوہ کرلیا جائے۔" نصیب میاں نے لہک کے کہا۔

گلی میں سب سے ممتاز یہی عمارت تھی، رنگ روغن سے آراستہ، روایتی بالکونی پر سرسراتے ریشمی پردے، پردوں اور جھروکوں کے پیچھے سوئی سوئی سی روشنی۔ زینہ صاف ستھرا اور چوڑا تھا۔ زینہ عبور کر کے ہم ڈیوڑھی جیسے ایک مختصر کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرا کیا تھا، کسی شیش محل سے چرایا ہوا حصہ۔ چھت اور دیواروں پر رنگ برنگے شیشوں کے ٹکڑے جڑے ہوئے تھے، چھت پر لٹکے فانوس کی روشنی سے سارا کمرا جھلمل کر رہا تھا۔ فرش پر بچھے دبیز قالین پر عمر خیام کی کوئی رباعی منقش تھی، کوئی نازنیں، ماہ جبیں، صراحی سے خُم لنڈھانے پر آمادہ، اور دونوں ہاتھ پھیلائے ایک بارِش تشنہ لب سائل کی وارفتگی۔ اردگرد گدّے دار کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ یہاں سے طرب گاہ میں جانے کے لیے ایک لمبے چوڑے دروازے کی دیوار حائل تھی۔ دروازے پر نفاست سے پھول پتّیاں تراشی گئی تھیں۔ مزیّن دُکان میں رکھی چیزوں کی وقعت سوا ہوجاتی ہے۔

عموماً محفل کے وقت دروازے پر پردے پڑے ہوتے ہیں۔ دروازہ بند تھا اور اُس کے پہلو میں چھریرے جسم کا ایک پختہ عمر شخص اسٹول پر بیٹھا نگرانی کر رہا تھا۔ دروازہ بند ہونے کے باوجود اندر برپا محفل کے نغمہ و ساز کی گونج بیرونی کمرے میں چھنک رہی، دھمک رہی تھی۔ سارسے ٹے عرصے تک بازار کے علاقے میں تعینات رہا تھا۔ نگہبان اُسے پہچان گیا اور سٹپٹاتا ہوا اسٹول سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ لمحے بھر کے لیے اُس کا جسم اکڑ سا گیا تھا، پھر اُس نے خفیف مسکراہٹ سے سب کو سلام کیا اور جھجکتے ہوئے بتایا کہ اندر کچھ خاص لوگوں کے لیے محفل جمی ہوئی ہے، اور آج رات گویا اُنھی کے لیے مخصوص ہے۔ گُلاب بانو کی ہدایت ہے کہ آنے والے معززین سے معذرت کرلی جائے۔

"اندر جا کے گُلاب بانو سے عرض کرو کہ کون آیا ہے۔ اپنے اُستاد تجمّل کے لاڈلے میاں آئے ہیں۔ بس ذری تی نشست ہوپائے شاید۔" نصیب میاں نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

"ہیں کون لاٹ صاب؟" سارسے ٹے نے ناگواری سے پوچھا۔

"کچھ پتا نہیں آقا، مگر کوئی بڑے نواب رئیس، راجے مہاراجے لوگ ہی ہوں گے۔" نگہبان نے مؤدّبانہ جواب دیا۔

"کیا نام ہے تمھارا؟" سارسے ٹے نے بگڑے مُنھ سے پوچھا۔

"خوب، سارسے ٹے بھائی!" نگہبان شکایتی لہجے میں بولا، "نام ہی بھول گئے خادم کا۔ اچھو ہوں جناب! آپ کا پرانا خدمت گار، نمک خوار۔"

سارسے ٹے نے ترشی سے اُس کا نام دُہرایا۔ "تم کو بڑے صاحب نے کیا بولا۔ اندر جا کے اُس گُلاب بانو کو بتلاؤ۔"

اچھو کا جسم بل کھانے لگا۔ اُس نے سارسے ٹے سے معافی چاہی اور بولا، "کیا بتاؤں، بی بی نے سختی سے منع کیا ہے۔"

"کون بی بی... کون؟ تیں؟" سارسے ٹے برگشتہ ہونے لگا، "یہ تو سسری کُھلی دُکان ہے۔"

"کیا بول سکتا ہوں سارسے ٹے بھائی! خادم تو..."

سارسے ٹے آگے آ کے اچھو کے سینہ بہ سینہ ہوگیا، اور جھڑکتی آواز میں بولا، "اونچا سنتے ہو کیا، تم کو جیسا بولا ہے، ویسا ہی کرو، یا پھر ہم... ہم دروازہ توڑیں۔"

"نہیں نہیں سارسے ٹے بھائی!" اچھو بری طرح گڑبڑا گیا، "آپ فرماتے ہیں تو جا کے..."

سارسے ٹے نے کش مکش، بل کہ اذیت سے دوچار اچھو کو مزید کچھ نہیں دیا اور اُنگلی اُٹھا کے اندر جانے کا اشارہ کیا، اچھو نے پھر کوئی تاویل و حجت نہیں کی، کمرے کے ایک اور مختصر بغلی دروازے سے لپکتا جھپکتا اندر چلا گیا، میں نے سارسے ٹے کو واپسی کا مشورہ دیا تھا۔ نصیب میاں بھی مکدر نظر آ رہے تھے۔ سارسے ٹے راضی نہیں ہوا، کہنے لگا کہ گُلاب بانو بہت ہوا میں اُڑ رہی ہے۔ آج اِس طرح یہاں سے چلے گئے تو اُس کا دماغ اور پھر جائے گا۔ سارسے ٹے کو اڈّے کا بھرم عزیز ہونا چاہیے تھا۔ میں چپ ہوگیا۔ اچھو جلد ہی لوٹ آیا۔ وہ اکیلا

نہیں تھا۔ اُس کے چند قدم پیچھے زرق برق لباس پہنے، زیورات سے لدی پھندی، ہار سنگھار کیے جو متناسب قامت اور بدن کی اَدھیڑ عورت نمودار ہوئی، وہ گلاب بانو ہی ہو سکتی تھی۔ کبھی اپنے وقت کی خوش جمال عورت ہوگی، بڑی گھبرائی ہوئی تھی، مگر ہمارے رُوبرُو آ کے سنبھل گئی اور دیدے نچاتے ہوئے بولی،

"اخّاہ، بندی یہ کیا دیکھ رہی ہے، کیسے کیسے لوگ آئے ہیں۔ یقیناً راستہ بھول گئے ہوں گے، مگر وہ... اُس کا انداز اضطراری ہو گیا۔ "اپنے بادشاہ سلامت نظر نہیں آ رہے، بخشل دا، خدا اُن کی عمر دراز کرے۔ سنا ہے، کلکتے کی پھر یاد ستائی ہے۔"

"ہاں گلاب بانو! شکر ہے، اُستاد اپنے ٹھکانے پر آ چکے ہیں،" نصیب میاں نے کچی آواز میں کہا، "ابھی بہت سے مشتاقانِ دید ہیں گھر سے ہوئے تھے، ایک خلقت جمع تھی واں، ہم بھی، یوں سمجھیے، چپکے سے نکل آئے۔ شہر میں دھوم تو بس آپ کی عشرت گاہ کی مچی ہوئی ہے۔ سوچا، ذرا ہم بھی تو کچھ دیدہ و دل گرمائیں۔"

اپنے لاڈلے میاں کو اشارہ کیا اور چل پڑے۔"

"ارے، یہ لاڈلے میاں ہیں۔" وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی، "اِن کی تو کیا داستانیں سُنی ہیں۔ خدا جانتا ہے، دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ ماشاءاللہ، چشمِ بددور، جیسا سنا تھا، یہ تو واقعی کسی راج محل سے اُٹھ کے آئے ہیں۔" گلاب بانو نے سر خم کر کے مجھے مخاطب کیا، "آداب۔"

میں نے بھی گردن ہلا دی۔

"ایک ذرا بھنک مل جاتی کہ آپ لوگ یہاں کا رُخ کیا چاہتے ہیں تو بندی کچھ اہتمام کر لیتی۔ اب کیا عرض کروں، اُدھر آگرے کے قرب و جوار میں کسی رجواڑے کے معززین کی فرمائش تھی کہ آج رات صرف اُن کے لیے وقف کر دی جائے، بندی کی تو اِسی نیازمندی و دل داری میں کٹ گئی ہے، ساری زندگی صاحبانِ شوق کے اشاروں کی منتظر، اُن کی خوش نُودی کی جستجو میں..."

"آ ہا ہا، خدا کی قسم کیا کلام ہے!" نصیب میاں پھڑک کے بولے، "اگلے زمانوں کا سارا سنا اَن سنا آئینہ ہو جاتا ہے۔ آپ کو دیکھ کے تو گلاب بانو! ایسا لگتا ہے کہ وقت کی آپ پر خاص مہربانی رہی ہے۔ آپ کے لیے تو وقت اپنی رفتار ہی بھول گیا ہے۔ آپ سے کنارہ کیے گزر رہا ہے۔ خدا نظرِ بد سے بچائے، جب جلوہ کرو، وہی تیور، تمکنت، دل رُبائی اور شیرینی گفتار۔ اللہ اللہ، کیسا ریشم اور پھولوں میں رکھا ہے آپ نے خود کو!"

"کیا نصیب میاں، آپ بھی..." گلاب بانو کا سراپا موج موج ہو گیا۔ "اپنا احوال تو آدمی خود ہی بہتر جانتا ہے۔ اب کیا رکھا ہے، بدن کے قفس سے سارے پرندے اُڑ گئے، لُٹ گئی بہار... وہ کیا کہا ہے، خدا سخن نے:

اب جانِ جسمِ خاک سے تنگ آ گئی بہت..."

"واہ گلاب بانو! کیا بھولا بسرا شعر یاد دلایا، دوسرا مصرع ذہن میں بھٹک رہا ہے... اور کیا خوب ہے۔"

"دوسرا نہ پوچھیے۔ بہت اداس کر دیتا ہے۔"

"ہے کیا؟ بتائیے۔" نصیب میاں مشتاقانہ انداز میں بولے، "ایمان سے سر میں گھوم رہا ہے۔"

"کب تک اِس ایک ٹوکری مٹی کو ڈھوئیے۔" گلاب بانو نے یاسیت سے شعر مکمل کیا۔

نصیب میاں سر جھٹکنے لگے۔ "غزل کے شعر میں مٹی، ٹوکری، ڈھونا... یہ میر صاحب جیسے صاحبِ کمال ہی کا حصہ ہے۔ اپنا بس چلتا تو..." نصیب میاں نے مشکل سے زبان کو لگام دی۔

نصیب میاں کچھ کہنا چاہتے تھے کہ سارنگے نے تلخ لہجے میں دخل دیا۔ "اپنے لیے کیا بولتی ہو گلاب بانو؟"

"کیا مطلب سارنگے بھیا؟" گلاب بانو نے چٹ پٹاتی آواز میں پوچھا۔

"سارنگے میاں! آج گلاب بانو واقعی کچھ مجبور معلوم ہوتی ہیں۔" نصیب میاں نے جھجکتے ہوئے لقمہ دیا۔

"کیوں گلاب بانو؟" سارنگے کا لہجہ کسی رُو رعایت سے عاری تھا۔ "اپنے کو صاف صاف بولو۔"

"بندی نے سارا کچھ عرض کر دیا ہے۔" گلاب بانو نے اَٹکتی زبان سے کہا۔

"مطلب، ہم لوگ چلتے بنیں۔"

"توبہ، توبہ، کیا کہہ رہے ہیں آپ سارنگے بھائی۔" یہ آپ کا گھر ہے۔ کبھی ایسا ہوا ہے؟ بخشل دا کی طرف سے، اُن سے واسطہ رکھنے والا کوئی ادنا سے ادنا اِدھر آیا ہو، دن ہو، یا رات، سب رنگ۔

وازے سے دروازہ بند ملا ہو۔"

"پھر آج کیا ہے؟" سارنگے پھر کے بولا، "آج تو بند ہے۔"

"آج بھی نہیں، آپ اِسی گھر میں ہیں۔ ایک نامراد کمرا نہیں، تو یہ سارا گھر آپ کے لیے کھُلا ہے۔ گلاب بانو کی لجاجت میں وحشت شامل ہوگئی تھی۔ کہنے لگی، "آپ نے پوری بات کہاں سنی، بندی نے عرض کیا، آمد کی ایک ذرا خبر مل جاتی تو اِن موئے اجنبیوں سے کوئی غرض رکھتی، نہ وعدہ کرتی۔ پرسوں رات ہی کی بات ہے کہ اِنھوں نے پہلی بار محفل میں قدم رکھا تھا۔ یہاں اَور بھی گُل رُخ کے شیدائی تمنائی موجود تھے، بڑے بڑے صاحب حیثیت اور صاحب دل۔ اصرار ہوا کہ اب کی آئیں تو محفل اُنھی کے لیے مخصوص ہو۔ اُس رات ایسی داد و دہش کی، جو سنا ہے، راجے مہاراجوں ہی کا شیوہ ہوتا ہے۔ بندی زیر بار تھی، اور سچ پوچھیے تو حیران پریشان بھی۔ اللہ جنت نصیب کرے، نرالی آپا کہتی تھیں، ایسی بخشش و عطا کرنے والوں سے ایک ذرا احتیاط ہی دوراندیشی ہے، مگر کوئی کیا کرسکتا ہے، کس کا ہاتھ روکا جاسکتا ہے کہ بس، یہ اپنی بساط سے زیادہ ہے۔ نذر قبول کرنے والے کی بھی تو ایک بساط ہوتی ہے۔ گُل رُخ تو جب سے آئی ہے، قیامت ہی آگئی ہے۔ ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے، کس دَم کیا تماشا ہو جائے۔ ایک دو ہوں تو سنبھال لیا جائے۔ یہاں تو شمار قطار ہی نہیں۔ حُسن تو چار دن کی چاندنی ہے، اور صرف ایک ہی بار چھٹکتی ہے۔ حُسن کی چاندنی کو کم بخت ایک ہی مہینا ملتا ہے، دوسرا، تیسرا نہیں؛ اور اِن چار دنوں کی رکھوالی کے لیے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں، کیا بتاؤں! انھیں جلدی بھجوا دیتی ہوں۔ اِن گلیوں میں سب سے پہلے اِسی بالا خانے پر رات ہوتی ہے۔ گُل رُخ کی باگیں الگ کھینچے رکھتی ہوں۔ آخر نوعمر ہے۔ اب دیکھیے، یہ آگرے والے بلائے ناگہانی کی طرح وارد ہوگئے..."

"اُوں ہُوں، عطائے ناگہانی کہو بانو!" نصیب میاں طرح دے کے بولے۔

گلاب بانو فقرہ شناس تھی، برملا نصیب میاں کی تائید کی، "ٹھیک ہی کہتے ہیں آپ۔ سخاوت کی ایسی ارزانی کہ لب کشائی کی گنجائش ہی نہیں رہنے دی۔ بندی نے وعدہ کرلیا کہ جیسا منشا ہے تعمیل کی کوشش کرے گی۔ ایسے طلب گار کب کب آتے ہیں۔ زر جواڑوں کے پکھنیں معلوم ہوتے ہیں، اور زمانے کی بدلتی ہوا نے اِن پر بھی اثر کیا ہے۔ راج محلوں میں حکم چلانے والے اِن نوابوں، رئیسوں کو، وہ کیا کہتے ہیں، فیکٹریاں، کارخانے لگانے کا سودا سمایا ہے۔ بتا رہے تھے کہ شہر کے قریب ہی کسی جگہ کارخانے لگا رہے ہیں، کپڑے کے، جُوٹ کے، جانے کیا کیا۔ پھر تو یہیں ٹھکانا ہو جائے گا۔ خُو بُو تو وہی شاہانہ مستانہ ہے۔ آتے جاتے اور بلاتے رہیں گے۔"

سارنگے نے ہاتھ اُٹھا کے گلاب بانو کو روک دیا۔ "اِتنی گھما پھیری کی ضرورت نہیں، اپنے کو بولو، ہم چلے جائیں پھر؟"

"کون بدبخت کہتا ہے، آپ یوں چلے جائیں۔ کس کی مجال ہے جو جُھمل دا کے ہاں سے آنے والوں سے یہ سرتابی کرسکے۔" گلاب بانو کا لہجہ شکوہ کناں ہوگیا۔ "سنیے! بندی نے ساری عرض گزار دی ہے۔ یہ گھر ایسا مختصر نہیں۔ آپ کی دل جوئی کے لیے دوسری بیٹھک کھلواتی ہوں۔ ایک گُل رُخ نہیں، گلاب بانو کے پاس اَور بھی پھُل جھڑیاں، مہتابیاں ہیں۔ کوئی کسر نہیں رہنے دی جائے گی۔ سازندے البتہ سرِ دست گُل رُخ کے ساتھ ہیں، ورنہ وہ بندوبست بھی ہو جاتا؛ اور یہ تو صرف ایک رات کی بات ہے، بندی نے تو خود ہی پچھلی مرتبہ جُھمل دا کی آمد پر حاضری کی درخواست کی تھی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" گلاب بانو کی مرصع تاویل و تکرار سے سارنگے جزبز ہونے لگا تھا، مُنہ بنا کے بولا، "اپنے کو اچھا نہیں لگ رہا، صاف بولے دیتے ہیں۔"

"بندی کو کب اچھا لگ رہا ہے۔" گلاب بانو شُستگی سے بولی۔

"اپنے ساتھ لاڈلے بھائی ہیں... اور لاڈلے بھائی کون؟ اُستاد جُھمل! سمجھیں؟"

"لاڈلے میاں سر آنکھوں پر۔ ایک گُل رُخ کیا، اِن پہ دس گُل رُخ قربان۔ بس ایک رات کی معافی کی دُہائی ہے۔ کل گُل رُخ اِن کی خدمت میں حاضر ہو جائے گی؛ یہاں، یا جہاں یہ چاہیں۔"

سارنگے نے میر سے پیچھے کھڑے جمرو اور زورا کی طرف بے چینی سے دیکھا۔ اڈّے کے آدمیوں کا وتیرہ ہے کہ اُن کا کوئی معتبر ساتھی کسی معاملے میں بڑھ کے کلام کر رہا ہو تو عموماً

وہ مداخلت نہیں کرتے۔

"گل رُخ کی بات کون کرتا ہے گلاب بانو!" تیزی سے آگے آ کے جمرو درشتی سے بولا، "تم سے کسی کا نام لیا، کسی گل رُخ وُل رُخ کا؟ اپنے سے زیادہ چیز چیز مت کرو۔ ہم کو اُسی جگہ جانا ہے، جدھر تمھارے وہ بھٹنیا کے نواب، رئیس لوگ بیٹھے ہیں۔ اُن کو جا کے بولو، کون لوگ آئے ہیں... اور اب کچھ آگے کو زبان مت چلانا... اور اُن حرام کے جنوں کا تم کو اتنا دھیان ہے تو ہم لوٹ جاتے ہیں، پر..."

"نہیں نہیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے۔" گلاب بانو سراسیمہ ہوگئی۔

"پھر دیر مت کرو، دروازہ کھلواؤ۔"

گلاب بانو کے چہرے کی لالی پھیکی پڑگئی۔ اُس کا چہرہ ہی بدل گیا تھا۔ لرزتے ہونٹوں سے کچھ کہنا چاہتی تھی، چپ رہی اور چند لمحوں کے سکوت آمیز تذبذب کے بعد اُس نے اچھو کو اشارہ کیا۔

اندر وسیع و عریض کمرے میں تو منظر ہی دوسرا تھا۔ یہ تو کچھ اور ہی جگہ تھی، کسی نواب، یا راجا کا شبستان، ہال مانند کمرے میں چہار اطراف دیواروں سے ایک ڈیڑھ گز آگے چھوٹی چھوٹی محرابیں، دیواروں میں جا بجا بنے طاقوں پر روشن شمعیں اور محرابوں پہ لٹکے رنگ برنگے پردوں سے چھنتی، چھلکتی روشنیاں، کمرے کے وسط میں ایک بڑا فانوس جگمگا رہا تھا، منقش ستونوں سے لگے ہوئے لکڑی کے آرائشی سامان پر تازہ گل دستے۔ سارا کمرا خوش بوؤں میں بسا ہوا۔ ایک جانب بسنتی لباس میں سازندوں کا ٹولا۔ دو اطراف قالین، بیچ کے فرش پر غالباً لکڑی کی باریک پرت بچھی ہوئی تھی کہ گھنگھروؤں کی چھنک اور رقص کے دوران پیروں کی دھمک قالین کی دبازت سے متاثر نہ ہو۔

دروازے کے دائیں طرف گریبان کڑھے ہوئے ململ کے کرتوں اور سفید پاجاموں میں تین بدمست آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کی وضع قطع سے ظاہر تھا کہ دھوپ سے کنارہ رہا ہے۔ چہرے دمک رہے تھے۔ پختہ عمر کے ایک کم قامت شخص کے جسم پر چربی کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔ دوسرا بھی لگ بھگ اُسی کی عمر کا تھا، قد میں کچھ نکلتا ہوا اور نسبتاً کم فربہ، تیسرے کی عمر چھتیس سال کے قریب ہوگی۔ جسم توانا تھا، لیکن قدرے اُبھرے ہوئے پیٹ نے غیر متوازن کر دیا تھا۔ اُن کی سلکی شالیں پیروں پر گری ہوئی تھیں۔ تینوں کی رنگت کم و بیش گندمی تھی۔ آٹھواں رنگ دولت کا ہوتا ہے، جو اُن کی اصل رنگت پر غالب تھا۔ اُن کی نشست کے پاس ایک گوشے میں شفاف شیشے کی میز پر صراحیاں اور جام رکھے ہوئے تھے۔

تینوں کے پہلو میں نیم عریاں لڑکیاں تھیں، اور وہ اُنھیں تقریباً دبوچے ہوئے تھے۔ اُن کے سامنے لکڑی کے فرش پر تین دل کش، نوخیز لڑکیاں رقص کناں تھیں، دو پیچھے، ایک آگے۔ آگے والی لڑکی تو بہ قول شخصے، چاند کا ٹکڑا تھی، جیسے سونے کی بنی ہو۔ مجرے کی محفلوں میں ایسا لباس میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ ہلکے ریشمی کپڑے میں اُس کا بدن چھپائے نہ چھپ رہا تھا۔ اُس کے عقب میں دونوں لڑکیوں کا بھی کچھ یہی حال تھا۔ سامنے والی لڑکی یقیناً گل رُخ تھی؛ کِتا ہوا، کھنچا ہوا بدن؛ نقش و نگار سے نپی تلی! کمر برائے نام؛ نخوت کی علامت، پھولے ہوئے نتھنے۔ کسی نے کہا ہے کہ حسن و جمال پر ناز و ادا مستزاد ہے۔ عشوہ و غمزے کے بغیر حسن شاید نامکمل رہتا ہے۔ اُس کا بدن خم خم تھا، سیاہ پلکوں کے درمیان بڑی بڑی مسکراتی آنکھیں، پارا بھرا، لچکتا، بل کھاتا سراپا۔

دروازہ عبور کر کے ہم جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئے تو سارا کچھ ٹھہر سا گیا۔ ساز بھی لمحے بھر کے لیے منجمد ہوگئے۔ بائیں طرف کی نشست پر ابھی ہم بیٹھے ہی تھے کہ گلاب بانو کے اشارے پر سازندوں نے پھر ساز بجانے شروع کر دیے۔ لڑکیوں کے رقص میں بھی پہلے سے کہیں زیادہ تیزی آگئی۔ گلاب بانو اپنے تینوں 'خاص مہمانوں' یا 'ممدوحین' کے پاس سر جوڑ کے بیٹھ گئی تھی۔ ہماری ناگہاں آمد پر اُن تینوں کی آنکھیں پھیل گئی تھیں اور چہروں پر خون سمٹ آیا تھا۔ گلاب بانو نے مؤدبانہ، ملتجیانہ انداز میں نوجوان سے کچھ سرگوشیاں کیں۔ نوجوان کے دونوں ساتھی بھی گلاب بانو کی صراحتیں سننے کے لیے قریب ہوگئے اور پہلو میں دبکی لڑکیوں پر اُن کی گرفت ڈھیلی پڑگئی۔ سازندوں نے گلاب بانو کو اُن سے ہم کلام دیکھ کے ساز

دھیمے کر دیے تھے۔ اُن تینوں صاحبانِ زر کے اطوار سے عیاں تھا کہ خاصی دیر سے وہ خُم لنڈھاتے رہے ہیں۔ ہاتھ پیر اُن کے تابع نہیں رہے تھے۔ شراب دماغ کی نفی کرتی ہے، جو بہت اُلجھاتا، تھکا دیتا اور من مانیاں کرتا رہتا ہے۔ گلاب بانو نے ضرور ہمارے بارے میں اُنھیں بتانا چاہا تھا، سُن کے نوجوان نے مشتعل نظروں سے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ وہ بھی برہم تھے۔ گلاب بانو کی گزارش اُنھوں نے سنی اَن سنی کر دی اور کسی تامّل کے بغیر ہمیں محفل سے نکل جانے کا حکم دیا۔ گلاب بانو ہاتھ جوڑ کے بنتی کرتی رہی۔ وہ خاصی حواس باختہ لگ رہی تھی۔ ایسے کسی تجربے سے پہلے کب واسطہ پڑا ہوگا۔ رقص کرتی لڑکیاں بھی رقص کرنا بھول گئی تھیں، تیز قسم کا کوئی پوربی گیت گاتی گل رُخ کی آواز بھی بہکنے لگی تھی۔

اِس دوران کئی مرتبہ گلاب بانو نے بے چارگی سے ہم پر نظر کی۔ ہم بہ ظاہر مطمئن، بہ باطن مضطرب سارا تماشا دیکھ رہے تھے۔ گلاب بانو کی مسلسل التجا پر اُدھیڑ شخص اُوسان کھو بیٹھا۔ طیش میں آ کے اُس نے جام فرش پر پھینک دیا۔ شراب کے چھینٹے اُن تینوں اور گلاب بانو کے کپڑوں اور چہروں پہ جا بکھرے، جا بجا بھٹکے تھے۔ جام چوں کہ قالین پہ پٹخا گیا تھا، اِس لیے کرچیاں دُور تک نہ جاسکیں، گلاب بانو نے دوبارہ اپنے قریب بیٹھے نوجوان کے پیر چھوئے اور دست بستہ تحمّل کی درخواست کی۔ اُس کی منتوں کا اُلٹا اثر ہوا، وہ تو وحشی ہوگیا۔ اُلٹے ہاتھ سے اُس نے گلاب بانو کے مُنہ پر طمانچہ رسید کر دیا۔

ہم میں سے پھر کسی سے ہاتھ پاؤں توڑے بیٹھے رہا نہ جاسکا۔ جمرو اور سارے نے یک لخت اپنی جگہ سے اُٹھ پڑے اور نوجوان کی طرف لپکے۔ اُنھیں بڑھتا دیکھ کے نوجوان نے کمال پھرتی سے کُرتے کے نیچے پیٹی میں اُڑسا ہوا طمنچا نکال لیا۔ گلاب بانو واویلا کرتی ہوئی درمیان میں آگئی تھی، نوجوان نے حقارت سے اُسے ایک طرف جھٹک دیا۔ اُس کے دوسرے ہاتھ میں اُٹھے تمنچے کا رُخ اپنی جانب اُمڈتے ہوئے جمرو اور سارے کی طرف تھا۔ گرنے کے باوجود گلاب بانو فوراً اُٹھ کھڑی ہوگئی تھی۔ نوجوان اور اُس کے معمر ساتھی بری طرح مشتعل تھے اور ایک طرح نوجوان کو مہمیز کر رہے تھے۔ میرا ماتھا ٹھنکا اور اندازہ کرنے میں کوئی دیر نہیں لگی کہ چند لمحوں میں کیا سے کیا ہوسکتا ہے۔ نوجوان نے تمنچے کی زد پر اور گالیوں کے درمیان ہمیں فی الفور دفع ہو جانے کا حکم دیا۔ سارے، جمرو اور زورا کے ہاتھ جیبوں میں چلے گئے تھے۔ میں نے جھپٹ کے اُن دونوں کو پیچھے سے جا لیا اور بہ وقت دائیں بائیں کرنے کی کوشش کی۔ اوھر ہاتھ اُٹھا کے میں نے مفاہمانہ لہجے میں نوجوان سے کہا، "ہم جاتے ہیں... جا رہے ہیں۔"

میری زبان سے یہ سن کے جمرو اور سارے نے کو ششدر ہونا چاہیے تھا۔ اُن کے گلے میں باہیں جکڑ کے میں نے اُن سے پرے ہو جانے کی عاجزی کی کہ کم از کم میری خاطر وہ میری بات مان لیں۔ وہ آپے میں نہیں تھے، اور اُنھیں روکنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ اُن کے پیر پکڑنے کے لیے میرے ہاتھ پنڈلیوں تک گئے تھے کہ زیچ سے ہو کے وہ فرش پر پیر پٹخنے لگے۔ اُس وقت نصیب میاں نے بھی میرا ساتھ دیا۔ زورا کا جسم بھی پھڑک رہا تھا۔ نصیب میاں نے اُسے قابو میں کیا۔

دوسری جانب گلاب بانو دُہائیاں دے رہی تھی۔ لڑکیاں وہاں سے بھاگ چکی تھیں۔ جمرو اور سارے کو دھکیلتا، دھکّے دیتا ہوا نوجوان کے سامنے سے ہٹانے میں، بہ ہر حال، میں کام یاب ہوگیا۔ وہ پلیٹ پلٹ کے نوجوان اور اُس کے ساتھیوں کو خوں بار نگاہوں سے دیکھتے اور مغلظات بکتے باہر نکل گئے۔ ہم نے جیسے تیسے، اُلٹے سیدھے قدموں سیڑھیاں طے کیں اور نیچے گلی میں آگئے۔

جمرو، زورا اور سارے پر سنّاٹا سا چھایا ہوا تھا۔ کچھ دُور قدم سے قدم ملا کے وہ میرے ساتھ چلتے رہے۔ کسی نے زبان

نہیں کھولی۔ ہم جلد ہی بازار کے علاقے سے نکل آئے۔

اُن کی برہمی بالکل بجا تھی، اور مجھے اپنی ڈوں آتی پر کوئی ندامت نہیں تھی۔ اُن کے لیے نوجوان اور اُس کے ساتھیوں پر حاوی ہوجانا کچھ دشوار نہیں تھا۔ گلاب بانو کے زردار ممدوحین کی آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں، لیکن دماغ پوری طرح حاضر نہیں تھے۔ نوجوان کے ہاتھ میں تمنچا تھا، اور وہ اپنے بس میں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ شراب سے تیز مال و زر کا نشہ ہوتا ہے۔ جمرو اور سارنے کے پاس چاقو تھے جو اُنھوں نے بروقت باہر نکال لیے تھے۔ وہ اپنے نئل اور اڈّے سے تعلّق کے زعم سے آسودہ تھے۔ دوسرے ہی لمحے کچھ بھی ممکن تھا۔ ہم میں سے کوئی تمنچے کی زد پر آجاتا، یا اُن میں سے کوئی جمرو اور سارنے کے چاقوؤں کی۔ پھر وہی اذیتیں، وہی معمول! پولیس، بازار بھر میں ہنگامہ، گلاب بانو کے جُبن، شہر میں رُسوائیاں، طرح طرح کے قصّے، کہانیوں، افواہوں کا ایک سلسلہ، اور ایک کے بعد دوسرا خون، دوسرا، تیسرا... جانے کتنے عرصے تک بے دست و پائی، معطّلی۔

جمرو، زورا اور سارنے اِتنا کچھ نہیں جانتے تھے۔ جتنا کچھ میں دیکھ چکا اور آزما چکا تھا۔ بے شک اُنھیں اڈّے کے آدمیوں کی سُبکی، دُور دُور تک بیٹھی اُستاد بُھل کے اڈّے کی ہیبت پر زک آنے کا خیال مضطرب کیے ہوگا۔ اُنھوں نے مطلق نہیں سوچا کہ یوں بُھل کے اڈّے سے متعلق آدمیوں کی برداشت اور ہوش مندی کا پہلو بھی تو نہاں ہے۔ آج کے بعد کل بھی تو آتی ہے۔ آج کی پس پائی ہمیشہ کے لیے نہیں ہے۔ پرورش سے غصہ کچھ پینا ہوجاتا ہے۔ میرے جسم و جاں میں بھی اُن سے کچھ کم آگ نہیں لگی تھی، لیکن کہتے ہیں، غصّے میں نظرِ ثانی کا جبر، یا زہر مفید رہتا ہے۔ برداشت اور ہوش مندی کی بھی اپنی ایک ساکھ ہوتی ہے، وحشت اور غضب سے زیادہ مؤثر۔

بازار کے سِرے پر رات بھر کھلے ایک چائے خانے میں لے جا کے میں نے اُنھیں یہی کچھ، یہی عواقب و نتائج باور کرانے کے اپنے طور پر جتن کیے۔ صاف ظاہر تھا کہ میری حجتوں سے وہ متفق نہیں ہو پائے۔ اُن کی خاموشی محض مروّت ہے، میرا اِتنا نہیں تو اُستاد بُھل کے عزیز از جاں کا لحاظ۔

ہم اڈّے واپس آگئے۔ رات اِتنی زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ اڈّے پر کسی حد تک چہل پہل تھی۔ بُھل چوکی سے اُٹھ چکا تھا۔ جا سوا اڈّے کے لوگوں کے درمیان گھرا کسی معاملے میں اُلجھا ہوا تھا۔ اُن سب کو نظر انداز کرتا ہوا اپنے کمرے میں آکے میں بستر پر دراز ہوگیا۔ جمرو، سارنے اور زورا کی مغائرت سے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے مجھ سے واقعی کوئی کوتاہی ہوگئی ہے۔ خود کو قائل کرتے کرتے کسی وقت آنکھ لگ گئی۔ یہ خوابیدگی بھی کسی اطمینان سے ممکن ہوئی ہوگی۔ جمرو، زورا اور سارنے کو نیند نہیں آئی ہوگی۔

صبح جلدی آنکھ کھل گئی تھی، لیکن اُٹھنے کو جی نہیں چاہا، بستر میں پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ اڈّے کے کسی آدمی کی دستک پر آخر مجھے اُٹھنا پڑا۔ دس بج چکے تھے۔ چوکی پر اچھے خاصے لوگ بُھل کا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔ سارنے، جمرو اور زورا بھی وہاں موجود تھے، چپ چپ اور بجھے بجھے سے۔ میں نے مسکرا کے اُن کی طرف دیکھا تو جواب میں اُنھوں نے بھی وضع نبھائی۔ بُھل کے پرانے شناسا کسی بڑے دُکان دار کی طرف سے ناشتے کا اہتمام کیا گیا تھا، پوری، کچوری، پراٹھے، ترکاری، قیمہ، انڈے، مکھن، ملائی، چائے، ڈبل روٹی وغیرہ۔ اِدھر سے اُدھر خوانوں کا انبار لگا ہوا تھا۔

جمرو اور سارنے سے کوئی بات کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ ناشتا کرتے ہی بُھل مجھے ساتھ لے کے اڈّے سے نکل گیا اور ایک مرتبہ پھر ہم اُس مسجد اور متصل مدرسے میں پہنچ گئے، جہاں میں متعدّد بار سر پھوڑ چکا تھا۔ ایک دفعہ تو میں اور بُھل مولوی صاحب کے چھوڑے ہوئے سامان کی تلاشی میں بھی کام یاب ہوگئے تھے۔ بُھل نے ملحق بازار اور کولوٹولا اسٹریٹ کی دکانوں پر بھی معلوم کیا، خصوصاً مراد آبادی برتنوں کی دکانوں پر۔ اب شہر کے نواحی علاقوں میں جانے کی کوئی تُک نہیں تھی۔ نواحی علاقے میں ٹھکانا کرنے کے بعد شہر میں اپنے جاننے والوں کے پاس ایک بار تو مولوی صاحب کو ضرور پھیرا لگانا چاہیے تھا۔ میں تو معمول کے مطابق کسی بچّے کے مانند اُنگلی پکڑے بُھل کے ساتھ چلتا رہا۔ اُس کی طرح میرا ذہن بھی اِس بعید ترین گمان سے ناآلودہ نہیں تھا کہ نواب ثروت کے سانحے کے بعد بدحواسی میں مولوی صاحب کسی طرف بھی مُنہ اُٹھا سکتے ہیں، کہیں نہ کہیں تو اُنھیں سر چھپانا ہی ہے۔ کلکتے میں اُن کی موجودگی کا ویسے کوئی امکان نہیں تھا، مگر ہوسکتا ہے، دماغ میں کچھ سما گیا ہو کہ یہاں اُن کی واپسی اور قیام کی توقع میرے لیے خارج از تصور ہوگی۔ کبھی چراغ تلے کی جگہ زیادہ محفوظ ہوتی ہے۔ کلکتا سب سے بڑا شہر ہے، بھیڑ میں گم ہوجانے کے امکانات یہاں زیادہ ہیں۔ سارا علاقہ اُن کا دیکھا بھالا ہے۔ شناساؤں کی بھی کثرت ہے۔ ہوسکتا ہے، آپ کے اِس طرف آنے کی اُنھوں نے جرأت کرلی ہو۔ اور کچھ نہیں ہوا، کسی کو مولوی صاحب کی خبر نہیں تھی۔ اندھیرا تو کبھی سمندر سے بڑا، سمندر سے گہرا ہوتا ہے۔ ہمیں اندھیروں میں ہاتھ پاؤں مارتے رہنے کی عادت ہوگئی۔ اپنے معمول کا فریضہ انجام دے کے سہ پہر تک ہم اڈّے لوٹ آئے۔

چار بج رہے ہوں گے، دھوپ بوڑھی ہوچکی تھی۔ ہم ابھی اڈّے پہنچے تھے کہ تیجا نے چوکی پر آکے بُھل کے کان میں سرگوشی کی۔

"اپنا اوم کار، بڑ چھڑ..." بُھل نے حقّے کی مُنال ہونٹوں سے ہٹا کے تعجب سے پوچھا: "اب تک وردی ڈالے ہوئے ہے کیا؟ چھٹی نہیں ہوئی اُس کی؟"

"کب کی اُستاد، اب وردی میں نا ہیں، چار آدمی اور بھی ساتھ ہیں۔" تیجا نے مستعدی سے جواب دیا: "گھوڑا گاڑی میں آئے ہیں۔"

"پورا پولیسیا ہے۔" بُھل نے حقّے کا کش بھرتے ہوئے کہا، "ساری عمر یا ڈنڈا گھماتا رہا ہے، پولیس کا ڈنڈا تو جادو کا ہوتا ہے۔"

بُھل سے اجازت لے کے تیجا فوراً باہر چلا گیا اور قریباً ایک منٹ میں لوٹ آیا۔ اُس کے ساتھ سب سے آگے دراز قامت، سانولی رنگت، گیروے کُرتے، سفید پاجامے اور کھادی کے کوٹ میں ملبوس عمر رسیدہ شخص کا میں چہرہ آشنا تھا۔ وہ کلکتا پولیس میں کسی بڑے عہدے پر فائز تھا۔ جسم کچھ بھاری ہوگیا تھا اور سفید مونچھیں بھی کچھ اور دراز اور گھنی ہوگئی تھیں، اور کوئی شکاری معلوم ہوتا تھا۔ دوسرے لمحے میری آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ اوم کار کے عقب میں جو چار آدمی دروازے سے داخل ہوتے نظر آئے، اُن میں تین وہی مستانے تھے، جنھوں نے گزشتہ رات گلاب بانو کے بالاخانے پر ہم سے بدسلوکی کی تھی۔ میری طرح جمرو، سارنے اور زورا کا حال بھی دگر ہوا۔ اُن تینوں کے ہم راہ اُنھی جیسی چھب ڈھب، بڑی عمر کا ایک بُردبار شخص بھی تھا۔ چاروں کے چہرے تمتما رہے تھے۔ وہ عام، مگر اُجلا لباس پہنے ہوئے تھے اور خاصے چوکنے، گھبرائے ہوئے لگ رہے تھے۔ چاروں نے چوکی پر آکے بُھل کو نمسکار کیا۔ اوم کار کو دیکھ کے بُھل اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ دونوں بغل گیر ہوگئے اور دیر تک ایک دوسرے کو گدگداتے رہے۔ اوم کار کی زبانی معلوم ہوا کہ سال بھر پہلے وہ ملازمت سے سبک دوش ہوا ہے
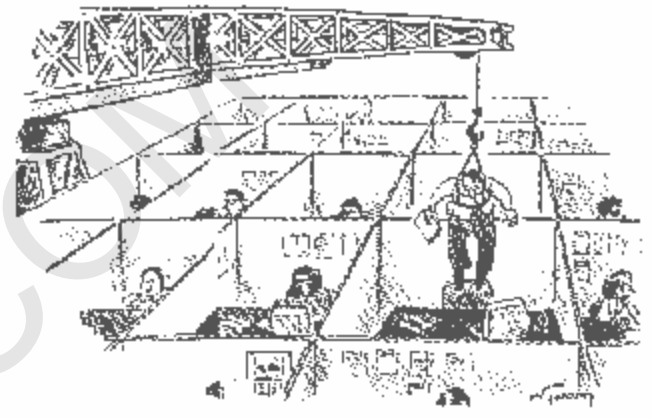
اور اب اپنے کاروبار اور زمینوں کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ ساتھ آنے والے چاروں اشخاص کا تعارف کرانے میں اُس نے بڑی عجلت کی۔ جھل کو بتایا کہ اُن سے اُس کے دیرینہ مراسم ہیں۔ عرصے پہلے آگرے میں ملازمت کے دوران جو تعلق قائم ہوا تھا، وہ آج تک قائم ہے اور دوستی میں بدل چکا ہے، اور اب اُسی کے ایما پر اُس کے صاحبِ حیثیت اور صاحبِ دل دوستوں نے کلکتے میں کارخانے لگانے کا اہتمام کیا ہے۔

میں، زورا، جمرو اور سارنے جھل کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ مجھے اوم کار کی آمد کے مقصد کا کچھ کچھ اندازہ ہو چلا تھا لیکن میرا قیاس غلط بھی ہو سکتا تھا۔ اوم کار پولیس کا آدمی تھا۔ مدعا زبان پر لانے میں بھی اُس نے دیر نہیں کی۔ زبان تو سارے انسانی اوصاف میں سب سے ممتاز ہوتی ہے۔ اُسے بات کرنے کا ہنر بھی آتا تھا۔ گزشتہ رات گلاب بانو کے بالا خانے پر پیش آنے والے واقعے کی سنگینی کو اُس نے خوش اسلوبی سے بدمزگی اور تلخی سے تعبیر کر دیا، کہنے لگا کہ اُس کے مربی سیر سپاٹے، ایک ذرا وقت گزاری کے لیے گلاب بانو کے بالا خانے چلے گئے تھے۔ گلاب بانو نے اِن سے خلوت کا وعدہ کیا تھا۔ وعدے کے مطابق اُس نے دروازہ بند کر دیا تھا اور دربان کو نگرانی کی ہدایت کر دی تھی۔ یہ لوگ اِس اعتماد میں تھے کہ محفل اُنھی کی ہے، اِنھی کے لیے مخصوص؛ سو وہاں تھوڑا بہت شغل بھی جاری تھا کہ اِس دوران اڈّے کے آدمی وارد ہو گئے۔ اُمید کے خلاف اچانک اجنبی آدمیوں کو داخل ہوتا دیکھ کے اِن سے تھوڑی نادانی سرزد ہو گئی۔ گو گلاب بانو نے اِنھیں آنے والوں کے بارے میں بتانے کی کوشش کی تھی، لیکن صاف بات ہے، اِنھیں یہ رخنہ اندازی اچھی نہیں لگی۔ عالم ہی اُس وقت سب کا دوسرا تھا، نہیں سمجھے کہ سامنے کون لوگ ہیں۔ تمنچے، چاقو نکل آئے، لیکن اڈّے کے آدمیوں نے کمال کیا، بہت تحمل اور تدبر کیا، اور بات ٹل گئی۔

اوم کار نے کہا کہ اُسے کچھ علم نہیں تھا۔ صبح گلاب بانو اُس کے پاس فریاد کرتی آئی تھی، کیوں کہ گلاب بانو کو معلوم تھا کہ کلکتے میں یہ معززین اوم کار کے مہمان ہیں، اور اُس کے ایک بنگلے، مہمان خانے میں اِن کا قیام ہے۔ کچھ غلطی گلاب بانو کی بھی تھی کہ خلوت کا وعدہ کرتے وقت اُس نے کسی اہم شخص کی آمد پیشِ نظر کیوں نہ رکھی۔ کوئی بھی سرکاری افسر منہ اُٹھائے وہاں کا رُخ کر سکتا تھا۔ اوم کار کہنے لگا کہ اُسے ساری رُوداد معلوم ہوئی تو اُس نے یہی مناسب سمجھا کہ جھل اُستاد کے پاس اپنے معزز و محترم دوستوں کی سفارش کرے۔

جھل بھی لاعلم تھا۔ زورا، سارنے اور جمرو نے شاید کسی کو نہیں بتایا تھا کہ رات ہم سب کہاں گئے تھے اور کیا اَن ہونی ہو چکی تھی۔ ہم میں سے کسی کے بجائے جھل نے نصیب میاں کو آواز دی۔ نصیب میاں پاس ہی بیٹھے تھے۔ دو قدم کا فاصلہ طے کر کے جھل کے رُوبہ رُو ہو گئے، اور اُنھوں نے صورتِ حال کا تخمینہ لگا کے دبے لہجے، بل کہ رفتِ گزشتہ کے انداز میں سارا ماجرا سنایا اور زیادہ تمہید نہیں باندھی۔ جھل نے خاموشی سے سنا اور سر ہلانے لگا۔ ”ٹھیک ہے اوم کار جی، صاحب بہادر! ان لوگ نے اپن کو کچھ نہیں بولا تھا۔“ اُس نے بھاری آواز میں کہا، ”آپ ساتھ آئے ہو تو ہم کیا بولیں۔ اپنے لوگوں کو کھینچے رکھیں گے۔ یہی چاہتے ہو نا آپ؟“

”بس یہی اُستاد! ہم کو پتا تھا، ہم جھل اُستاد کے پاس جا رہے ہیں۔“ اوم کار تڑپتی آواز میں بولا اور اپنے مہمانوں سے مخاطب ہو کے کہنے لگا، ”دیکھا آپ لوگوں نے، ہم کیا کہے تھے، کس آدمی کے پاس جا رہے ہیں۔ آخر کوا پنا پرانا ناتا ہے۔“

اُن چاروں نے ہاتھ جوڑ کے پھر جھل کو نمسکار کیا اور سب سے معمر آدمی نے واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کے وزنی لفافہ نکالا اور جھل کے آگے رکھ دیا۔

”یہ کیا ہے؟“ جھل نے ترشی سے پوچھا۔

”اِسے رکھ لو اُستاد۔ اِن کی خوشی یہی ہے۔“ اوم کار رازدارانہ انداز میں بولا۔ ”آپ ساتھ آئے ہو، اپنے لیے اتنا بہت ہے۔“ جھل نے کسمسا کے کہا، ”اُٹھا لو اِسے صاحب، اور جا کے کسی مندر پہ چڑھا دو۔ ایک آدھ کی بلی ہونے سے رہ گئی۔ اپنے کو پتا ہے، کس کے کارن۔“

”ٹھیک کہتے ہو اُستاد! بس بھگوان کی کرپا ہوئی۔“ اوم کار نے ہاتھ پھیلا کے فسردگی سے اعتراف کیا اور لفافہ جھل کے پیروں کی جانب کھسکاتے ہوئے بولا، ”پر اِسے... اِسے تو اب سویکار ہی کر لو۔“

”نا نا، زیادہ مت بولو اوم کار جی!“ جھل نے اکھڑی ہوئی آواز میں کہا، ”اب آپ جاؤ۔“

معمر شخص نے اوم کار کے اشارے پر ہچکچاتے ہوئے لفافہ اُٹھا لیا۔

وہ سارے جلد ہی چلے گئے۔

اُن کے جانے کے بعد جھل نے ہم سے کوئی باز پرس نہیں کی۔ وہ حقّے کے کش لیتا گم سم بیٹھا رہا۔ اِس اثنا میں توقع کے مطابق میرے نزدیک موجود جمرو، سارنے اور زورا کچھ اور پاس آ گئے، اور زورا نے میرے ہاتھ پر جسم کا سارا زور ڈال دیا۔ کچھ یہی حال جمرو اور سارنے کا تھا۔ اُنھوں نے میرے دونوں بازو جکڑ لیے، زبان سے کچھ نہیں کہا، لیکن آنکھیں بھی تو کلام کرتی ہیں اور کبھی کبھی تو زیادہ فصاحت اور بلاغت سے۔ لفظ تو لہجے کے محتاج ہوتے ہیں۔ آنکھیں تو بجائے خود لہجہ ہوتی ہیں۔

سورج واپسی کی جلدی میں تھا۔ اوم کار اور اُس کے دوستوں کو گئے گھنٹا، پون گھنٹا گزرا ہو گا کہ سونا گاچھی کے مکھیا اور اُس کے دو حواریوں کے ساتھ گلاب بانو اڈّے پر آن وارد ہوئی۔ واجبی بناؤ سنگھار کیے، نہایت سادہ لباس میں، چوڑی دار پاجامہ، لمبا کرتا، دوپٹے سے سر ڈھکا اور چادر میں بدن لپٹا ہوا۔ مٹھائی اور پھولوں کے ٹوکرے ساتھ لائی تھی۔ گزشتہ رات کی رُوداد سنانا چاہتی تھی کہ جھل نے اُسے روک دیا اور صرف اتنا کہا، ”کوٹھا ہی رہنے دو تو ٹھیک ہے۔“

گلاب بانو کے بدن میں جھرجھری سی آئی، سر جھکا کے لجاجت سے بولی، ”یہی ہو گا اُستاد، بندی کو رات کا سبق یاد ہے، آگے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔“
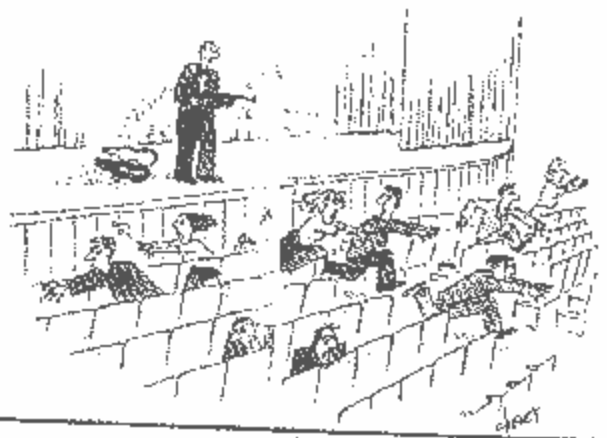
وہ اُٹھ گئی، چلتے چلتے اُس کی نظر مجھ پر گئی اور آ کے میرے عین سامنے بیٹھ گئی۔ اُس نے مخصوص انداز میں مجھے تسلیم کی، اور اِدھر اُدھر اضطراری طور پر دیکھتے ہوئے آہستگی سے بولی،

”بندی کو آپ کا انتظار رہے گا۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اُس کی آواز اور دھیمی ہو گئی، کتراتے ہوئے لہجے میں جھجکتے سے بولی، ”جب آپ اشارہ کریں گے، گل رُخ خدمت میں پیش ہو جائے گی۔“

میں نے آنکھیں میچ لیں۔

گلاب بانو پھر وہاں نہیں ٹھیری۔

مسلسل پانچ دن تک ہم آس پاس کی بستیوں میں جاتے رہے، روز سورج غروب ہوتے وقت اڈّے پر ہماری واپسی ہوتی تھی اور اُس وقت ایک اژدحام جھل کا منتظر ہوتا تھا، دُکان دار، علاقے کے خاص آدمی، پرانی جان پہچان کے لوگ، مختلف اڈّوں کے اُستاد، کئی کارخانے داروں کی طرف سے نذریں آئی تھیں۔ پولیس کے کئی آدمی بھی سادہ لباس میں جھل سے ملنے آئے تھے۔ لوگوں کی بے اندازہ آمد کی ایک وجہ یہ تھی کہ شام سے رات گئے تک صرف جھل چوکی پر بیٹھتا تھا او[ر] اُس نے ساتویں دن اپنی واپسی کا اعلان کر دیا تھا۔ اِدھر اڈّ[ے] کے بہت سے معاملات اُس کی آمد کی وجہ سے رُکے ہو[ئے] تھے۔ علاقے کے بعض لوگ اپنے ذاتی مسائل، مناقشے، قض[یے] لے کے اُس کے پاس آنے لگے تھے۔ جھل کو ساری رُوداد سن[نی] مخالف لوگوں کی طلبی، اُن سے جرح کرنی اور فیصلہ سنانے

ناروا کام بھی کرنا پڑتا تھا۔ اِن میں چند خاندانوں کے طلاق کے معاملات تھے اور کام چوری، کاہلی، گھر کا خرچ ادا نہ کرنے، مار پیٹ، گالم گلوچ، کسی کی جگہ پر ناجائز قبضے کرنے کے چھوٹے موٹے واقعات بھی شامل تھے۔ اِن لوگوں سے بجھل کے پرانے مراسم تھے۔ شادی بیاہ میں بجھل کی مرضی کو دخل رہا تھا۔ علاقے کے لوگوں میں ایسی شناسائی کے لیے جامو کو ابھی بہت زمانہ چاہیے تھا۔ ہفتے کی تقسیم، علاقوں کی حدود کا تعین اور پولیس سے باہمی طور پر نمٹنے کے مشوروں میں باقی وقت نکل جاتا۔ تین دن سے یہی ہو رہا تھا۔ شام کو اڈّے پر آ کے بجھل کو ایک پل کے لیے فرصت نہیں ملتی تھی۔ جامو اور اڈّے کے بہت سے آدمیوں کے کہنے پر بجھل نے دو دن کا اضافہ اَور کر دیا تھا۔ عمارت میں سب کے لیے کھانا تیار ہوتا رہا، لیکن کسی رات محفل نہیں جمی۔ بجھل نے جامو کو سختی سے منع کر دیا تھا۔

پانچویں دن صبح ہی صبح مولوی صاحب کی تلاش کے بجائے بجھل نے جیل خانے جانے کا عزم کیا۔ جامو، سارسے، زورا اور جمرو کے علاوہ میں بھی ساتھ ہو گیا۔ پہلے میرا ارادہ نہیں تھا، پھر میں نے خود کو تلقین کی، اڈّے کے آدمیوں کو جیل خانے سے یہ مغائرت زیب نہیں دیتی۔ ٹنڈا وکیل بھی ہمارے ہم راہ تھا۔ اڈّے کے لوگ چھوٹی بڑی مدّت کے لیے ہمیشہ جیل میں رہتے ہیں۔ اِتنے عرصے بعد جیل کی حدود میں قدم رکھتے ہوئے دل گھبرانے لگا تھا۔ سب کچھ وہی تھا، وہی در و بام، وہی جالے اور دیواروں پر داغ دھبّے اور بوسیدگی۔ جیل میں وقت یوں بھی رینگتے ہوئے گزرتا ہے۔ یہاں میں نے سات سال کے قریب عرصہ گزارا تھا، ایک ایک دن گن گن کے۔ عملے کے بہت سے لوگ بدل چکے تھے، لیکن نچلے درجے کے بیش تر ملازم اپنی جگہوں پر تعینات تھے۔ وہ مجھے پہچان گئے اور مجھ سے لپٹ گئے۔ اِن میں جیلر صاحب کا پرانا خدمت گار رام داس بھی تھا،

وہ تو رونے لگا۔ اُس کی کمر کچھ اَور جھک گئی تھی۔ جن ملازموں نے ساری زندگی جیل کی چار دیواری میں قیدیوں کی نگرانی کرتے گزاری تھی، اُن میں اور قیدیوں میں کتنا فرق ہے۔ رام داس کی پوری زندگی بھی یہیں گزر گئی تھی۔ پُرانے جیلر کے بعد نیا جیلر آ جاتا تھا، رام داس وہیں قائم تھا۔ خاک روب اور سنتری وغیرہ جانے کب سے جیل کی دیواروں کے اندر مستقل ملازموں کے لیے مخصوص مکانات میں مقیم تھے۔ قیدی بدل جاتے تھے، یہ لوگ یہیں رہتے تھے۔ جیل کے اِن ملازموں کو قیدیوں کے ساتھ رہتے ہوئے یقیناً اُنسیت ہو جاتی ہوگی، تو پھر قیدیوں کی رہائی پر بچھڑ جانے کا دُکھ بھی اُنھیں ہونا چاہیے۔ جیل کے اِن مستقل کارندوں کی حیثیت تو در و دیوار جیسی ہے۔ لوگ آتے، کچھ وقت گزارتے اور اپنے راستوں پر چلے جاتے۔ یہاں عمر قید کے لوگ بھی موجود تھے، مگر اُن کی اسیری کی بھی ایک مدّت ہوتی ہے، بچھڑ جانا اُنھیں بھی ہوتا ہے۔ یہ کیسا عجیب ہے کہ ایسی رہائی کسی کے لیے خوشی، کسی کے لیے دُکھ کا باعث ہے۔

سب کو ایک ساتھ دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ بجھل نے ٹنڈے وکیل کو خاص خاص نام بتائے تھے، صرف اُنھی سے ملاقات ہو سکتی تھی۔ ہمیں اندر جانے کی اجازت نہیں مل سکی۔ ملاقاتیوں کے حصّے میں یکے بعد دیگرے لوگ آتے رہے اور بجھل کو دیکھ کے نعرے لگاتے، اُچھلتے کودتے رہے۔ بجھل کو ہر ایک کے جیل جانے کا پس منظر معلوم تھا۔ وہ اُن کی کوتاہیوں کی نشان دہی کرتا اور تسلّی تشفّی دیتا رہا کہ اُن کے پیچھے اُن کے گھروں کی خبر گیری کی جا رہی ہے اور ٹنڈا وکیل اُن کی ضمانتیں، یا سزائیں کم کرانے کی کوششیں کر رہا ہے۔ سب کی زبان پر ایک ہی سوال تھا کہ بجھل آخر کب مستقل طور پر اڈّے کی چوکی سنبھال رہا ہے۔ بجھل نے کوئی حتمی جواب نہیں دیا۔ سب سے یہی کہا کہ دیکھو، ابھی وقت نہیں آیا ہے، ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

...طرف سے لوٹتے میں جیلر صاحب کا مکان تھا۔ ...سونیا رہتی تھی۔ رام داس کو یاد تھا کہ جیلر صاحب کی ...میں نے سونیا کو پڑھانا شروع کیا تھا۔ سونیا کے انجام کا ...اس کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں نے بھی اُسے نہیں بتایا، اپنے ...آنکھوں میں چھپائے رکھے۔ بے ضرورت سچ نہیں بولنا ...ہے۔ سونیا رام داس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ اُسے ’چاچا‘ ...کہتی تھی۔ رام داس سچ جان لیتا تو وہیں ڈھیر ہو جاتا۔ کاش، اُس دن ایک گاڑی کی تاخیر ہو جاتی، ہم دوسری گاڑی بھی ...ہو سکتے تھے۔ یوں نہ سونیا ملتی، نہ وہ سب کچھ پیش آتا جو سینے میں ...بہت ہو چکا تھا۔ جب بھی اُس کا خیال آتا، دل ڈوبنے، دل ...بولنے لگتا۔ جیلر صاحب کا مکان دیکھ کے بھی میرا یہی حال ...ہوا۔ میں نے بہت اُس طرف دیکھنے سے اجتناب کرنا چاہا، لیکن میری نگاہیں بے اختیار اُسی جانب اُٹھتی تھیں۔

بجھل نے نچلے درجے کے ہر کارندے کو کچھ نہ کچھ نقدی ...دی۔ دو پہر کو ہم وہاں سے چلے آئے، جیل خانے سے اور ...الم رضی سے۔

اُس شام بجھل نے آنے والے دن اپنی روانگی کا اعلان کر دیا۔ آخری رات اڈّے پر بہت بھیڑ تھی۔ اُس رات چھٹن صاحب بھی دکان بند کر کے گلوریوں کے پُڑوں، پھولوں کی ٹوکریوں اور مٹھائی کے دونوں سے لدے پھندے اڈّے پر آ گئے اور اُنھوں نے بجھل کی گردن موتیا اور گلاب کے ہاروں سے ڈھانپ دی۔ چھٹن صاحب اور نصیب میاں نے کچھ دیر کے لیے محفلِ زعفران زار بنا دی تھی۔ سارے اور ...اُمڈ رہے تھے کہ ایک بار پھر بازار کی طرف چلیں، لیکن رات گزرتا گیا اور رات ہو گئی۔ بازار کا وقت ہی نکل گیا۔

میرا اندازہ تھا، بل کہ مجھے یقین تھا کہ کلکتے سے بجھل سیدھا فیض آباد کا رُخ کرے گا۔ فیض آباد سے ہمیں روانہ ہوئے ساڑھے تین مہینے سے اوپر ہو رہے تھے۔ وہاں اب فروزاں ...گئی تھی۔ اُسے حویلی میں جا بسے کم و بیش اِتنی مدّت ہو چکی ہے۔ ...اُن کے لیے بھی ہمیں فیض آباد کا ایک پھیرا لگانا چاہیے تھا۔ ...اُن سب کو دیکھنے کو میرا جی بھی بہت چاہ رہا تھا۔ حویلی کی طرف سے بجھل اِتنا بے غم، بے فکر تھا، جیسے وہاں کبھی کسی پیچیدگی کا

امکان ہی نہیں ہے، شاید زرّیں کی وجہ سے بجھل کو یقین تھا کہ جہاں زرّیں موجود ہوگی، وہاں کوئی اُلجھن ہی نہ پیدا ہوگی، لیکن خود زرّیں تو بہت گراں بار ہو سکتی ہے۔ میں نے بجھل سے بات کرنی چاہی، پھر یہ سوچ کے رہ گیا کہ زرّیں کا خیال تو اُسے مجھ سے زیادہ ہونا چاہیے۔ اُسے کوئی فکر نہیں تو مجھے کاہے کی حالانکہ پڑی ہے۔ میری طرح اُس کا دماغ بہکتا بھی نہیں ہے، میں نے چپ سادھے رکھی۔

بجھل نے زورا اور جمرو سے کہا تھا کہ وہ چاہیں تو فیض آباد، یا بمبئی چلے جائیں، لیکن دونوں نے ہمارے ساتھ چلنے کو ترجیح دی۔ دوسرے دن صبح ہمیں رخصت کرنے کے لیے سارا اڈّا ہی ہاوڑا اسٹیشن پر اُمڈ آیا تھا۔ اُنھوں نے اِتنی چیزیں ساتھ کر دیں کہ ڈبے میں رکھنا اور سنبھالنا دشوار ہو گیا۔ جمرو اور زورا نے اگلے اسٹیشن پر بہت سی چیزیں لوگوں میں بانٹ دیں۔ ہم دوبارہ لکھنؤ کی طرف جا رہے تھے۔ کئی دن لکھنؤ کے اطراف، گورکھ پور، اعظم گڑھ، بہرائچ، بستی، گونڈا، ایٹا، اِٹاوہ، فتح گڑھ، بدایوں، فرخ آباد، ہردوئی کے شہروں میں گھومتے رہے اور سیتاپور، فتح پور، بارہ بنکی اور سلطان پور ہوتے ہوئے کان پور آ گئے۔ اِن بستیوں سے کہیں بھی فیض آباد کا فاصلہ سَو، سوا سَو میل سے زیادہ نہیں تھا، لیکن بجھل کا جیسے فیض آباد سے کوئی سروکار ہی نہیں رہا تھا۔ کان پور سے اُس نے سیدھے دلّی آ کے دَم لیا۔

کلکتے سے دلّی پہنچتے پہنچتے پچیس دن لگ گئے تھے۔ دلّی میں مولوی صاحب کی موجودگی ممکن نہیں تھی، اِس لیے کہ سَو میل دُور

مراد آباد میں اُن کے ہم شہروں کو ضرور سُن گُن مل جاتی۔ دلّی کے اطراف گنجان شہر آباد ہیں۔ ہم نے وہاں ایک پہر بھی ضائع نہیں کیا اور روہتک، حصار، سرسا، بھٹنڈا، کرنال، پانی پت، سونی پت اور پٹیالے کا قصد کیا۔ ان شہروں سے واپس دلّی آ کے گڑگانو، فرید آباد، متھرا، علی گڑھ، آگرہ، بھرت پور، جے پور، سوائی مادھو پور، ٹونک، کوٹا، میواڑ، چتوڑ گڑھ، اودے پور، جلور، اجمیر، ناگور، جودھ پور اور باڑمیر کے علاقے سے گزرتے ہوئے میر پور خاص آ گئے۔ ظاہر ہے، ہمارا کام شہر کے تاریخی مقامات اور تفریح گاہیں دیکھنا نہیں تھا۔ شہر میں داخل ہوتے ہی مسلمان آبادیوں میں جا کے گھروں، دُکانوں، مسجدوں اور مدرسوں میں اپنا سبق دُہرانا اور ہر جگہ ایک ہی جواب سننا تھا۔ اس تکرار سے اب ایسی تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ عادت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ آبادی کی نسبت سے بعض شہروں میں ایک دن، بعض میں دو دن لگ جاتے۔ اگلی منزل کے لیے شام کو سواری مل جاتی تو ٹھیک، ورنہ وہیں بسیرا کر لیتے۔ رات کو کسی بستی میں فراغت ہوتی اور نوٹنکی لگی ہوتی، یا سرکس ہو رہا ہوتا تو دو تین گھنٹے یوں گزر جاتے۔ صبح سے شام تک گھوڑا گاڑی، لاری، ریل گاڑی، یا بس پیدل چلتے رہنا۔ کبھی سرائے، کبھی ہوٹل، جہاں جیسی جگہ مل جائے، جس وقت جیسا کھانا مل جائے۔ میر پور خاص سے حیدر آباد (سندھ) پہنچے تو اسٹیشن کی سیڑھیوں پر ایک بچے کو بچاتے ہوئے زورا کا پیر رپٹ گیا۔ ہڈی بھی چیخ گئی تھی۔ باقی ہم تینوں کے پیروں میں بھی بیڑی پڑ گئی۔ تین دن تک زورا کا علاج ہوتا رہا، چوتھے دن بھی وہ سفر کرنے کے قابل نہیں تھا۔ جمرو کو اُس کی نگرانی پر چھوڑ کے میں اور جُھل شہر ٹھٹھا اور سُجاول ہوتے ہوئے کراچی چلے آئے۔ بمبئی کی طرح کراچی بھی ساحلی شہر ہے۔ بمبئی سے بہت ملتا جلتا، لیکن یہاں اُتنی بھیڑ نہیں تھی۔ مسلمانوں کی ایک کثیر آبادی تھی۔ ہمیں دو دن ٹھہرنا پڑا۔ مسلمان آبادیوں میں شاید ہی کوئی جگہ رہ گئی ہو جہاں ہم نہ جا سکے ہوں۔ چار دن کے غیاب کے بعد ہم واپس حیدر آباد آئے تو زورا کے پیر کی تکلیف بڑی حد تک کم ہو گئی تھی، چلنے پھرنے لگا تھا۔ احتیاطاً دو ایک دن کے آرام کی اور ضرورت تھی۔ ان دو دنوں میں میں اور جُھل ہالا، ٹنڈو آدم اور نواب شاہ ہو آئے۔ جُھل کا ارادہ اب حیدر آباد سے کوٹکا شہر جانے کا تھا۔ اُن دنوں امرتسر سے آئی ہوئی گانے بجانے اور کھیل تماشا کرنے والوں کی ایک ٹولی کی بڑی دُھوم تھی۔ واقعی کچھ غلط نہیں تھا۔ انھیں ہنسانا رُلانا خوب آتا تھا۔ وقت کا کچھ احساس ہی نہیں ہوا۔ اُس رات نوٹنکی دیکھ کے واپس آتے ہوئے جمرو نے دبی زبان میں جُھل سے کہا، ”اُستاد! ایک بات بولیں۔“

”کیا ہے رے۔“ جُھل نے ہڑک کے پوچھا۔

”کچھ اور مت سمجھنا اُستاد، ماں قسم۔“ جمرو نے جلدی سے کہا۔ ”اور صرف اپنی طرف سے بولتا ہوں۔“

”پھوٹ بھی تو مُنہ سے۔“ جُھل بگڑ کے بولا۔

”بولتے ہیں، اِدھر سے بمبئی بہت نزدیک ہے اور سید عارج ہے۔ چار پانچ روز اُدھر اپنا چہرہ دکھا کے اور اُن لوگ کا دیکھ کر پھر لوٹ جائیں تو کیسا...“ جمرو نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

جمرو بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ کلکتے سے چلے ہوئے ہمیں تقریباً مہینے کے قریب ہو رہے تھے۔ میرا خیال تھا، جُھل کا دماغ گھوم سکتا ہے، وہ بھڑک کے جمرو سے کہہ سکتا ہے کہ اسے اگر فکر ہے تو خود چلا جائے۔ جُھل کے سکوت پر مجھے حیرت ہوئی، حالاں کہ نہ زورا نے تائید کی تھی نہ میں نے۔ میں نے تو طے کر لیا تھا کہ اِس سلسلے سے میں جُھل سے کبھی کوئی بات ہی نہیں کروں گا۔ وہ رات ہم نے سرائے میں گزار دی۔ دوسرے دن صبح کوٹکا جانے کے لیے حیدر آباد شہر سے جُڑے ہوئے کوٹڑی جنکشن کے بجائے سیدھے حیدر آباد اسٹیشن کا رُخ کیا اور کراچی آ گئے۔ چوتھے دن ہمیں بحری جہاز میں جگہ مل گئی۔

بنگال میں کئی بار ہم اسٹیمر میں بیٹھ چکے تھے، لیکن یہ پورا جہاز تھا۔ یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا، کسی محلّے کی طرح، جس طرف چاہو، گھومو پھرو۔ ہم نے زیادہ پیسے دے کے کیبن میں جگہ محفوظ کرانی چاہی تھی، مگر گورے مسافروں کی تعداد زیادہ تھی۔ جہاز راں کمپنی بھی ولایتی تھی، پہلے گوروں کو ترجیح دی جاتی تھی۔ ہمیں عرشے کے ٹکٹ ملے۔ عرشے کا مطلب ہے، جہاز کا سائبان اور صحن۔ اچھا ہی ہوا جو کیبن کا ٹکٹ نہ مل سکا، عرشے کا لطف کچھ اور تھا۔ جہاں جی چاہے، وہاں ہو۔ یہاں سرگرمی زیادہ تھی، طرح طرح کے مسافر، بیش تر ہندستانی۔ گورے مسافر تمام کے تمام کیبنوں میں مقیم تھے۔ جہاز انگلستان سے آ رہا تھا، اِس لیے سارے کیبن بھرے ہوئے تھے۔ ٹکٹ والے نے ہمیں بتایا تھا کہ خالی کیبنوں کی کثرت ہو، تبھی ہندستانی لوگوں کو ٹکٹ کی فراہمی پر غور کیا جاتا ہے۔ گورے مسافر عرشے پر آ کے بھی ہندستانی مسافروں سے الگ تھلگ ہی رہتے تھے۔ عرشے کے مسافروں کے لیے چائے خانہ بھی الگ تھا۔ کیبن کے مسافروں کے لیے مخصوص چائے خانے میں شراب کا بھی اہتمام تھا۔ ٹھیک ایک بجے دوپہر جہاز نے بندرگاہ سے حرکت کی۔ چال میں میانہ روی تھی، ٹھیک ٹھاک۔ خاصی دُور آنے کے بعد بھی رفتار میں کوئی ایسا فرق نہیں آیا۔ زورا کے پیر میں ہلکی سی لنگ باقی تھی، لیکن جیسے کوئی کھلونا ہاتھ لگ جائے۔ شروع شروع میں وہ عرشے پر دوڑتا رہا۔ جمرو بھی اُس کے ساتھ اِدھر اُدھر قلانچیں بھرتا رہا۔ تھوڑی دیر میں ہم لوگ جہاز سے مانوس ہو گئے تھے۔ اِس سے قبل سفر شاید کوئی اور نہیں ہوتا، جیسے ہنڈولے میں بیٹھے مسلسل کوئی جھولا جھلا تا ہو۔ سمندری لہروں کا بھی کیا زور ہے، اِتنا بڑا جہاز ڈگمگا دیتی ہیں۔

شام ہوتے ہوتے گورے مسافر آگے پیچھے سیڑھیوں سے اُتر کے عرشے کی طرف آنے لگے۔ اُن کے چہروں پر آگ جل رہی تھی، بھبھوکا چہرے، سب کے سب اِتنے تر و تازہ تھے جیسے آج ہی پیدا ہوئے ہوں۔ عورتیں بھی اُن کے ساتھ تھیں، رنگ برنگے لباس سے آراستہ۔ عرشے کے ہندستانی مسافر گوروں کو بڑھتا دیکھ کے اپنی اپنی جگہوں پر سمٹتے گئے۔ وہ دُزدیدہ نگاہوں سے مختصر لباس میں چمکتی دمکتی، اپنے آپ سے بے پروا عورتیں دیکھتے تھے۔ گوری عورتیں اُن پر ایک اچٹتی سی حقارتی نظر ڈال کے سامنے سے گزر جاتی تھیں۔ گورے ہم سے ایسے بھی الگ دکھائی دیتے تھے۔ نسل کا تو فرق تھا ہی، مخلوق بھی کوئی اور معلوم ہوتے تھے۔ اُن کی چال میں ایک تمکنت، تیوروں میں بڑی شان و شوکت تھی۔ اُن کی مجموعی وضع قطع میں بُردباری تھی، محتاط انداز میں ہنستے تھے۔ عورتیں فرش پر پھونک پھونک کے قدم رکھتی تھیں۔ نگاہوں میں تجسس تھا اور تجسس میں

* * * * * * * * *

متانت تھی۔ گوروں کے بچّے بالکل ہوبہو، چلتی گڈّے گڑیا کی مثال ہوتے ہیں۔ جی چاہتا ہے، گود میں بھر کے خوب پیار کرو، گالوں کی چٹکیاں بھرتے رہو۔ اوپر، اپنے اپنے کیبنوں سے نیچے آ کے کچھ گورے چائے خانے کی طرف چلے جاتے تو کچھ جہاز کے سرے والے عرشے کی جانب بڑھ جاتے اور جنگلے سے

ٹیک لگائے لمبی لمبی سانسیں کھینچ کے تازہ دمی کی مشق کرتے رہتے۔ اِدھر سورج ڈوب رہا تھا۔ سمندر میں یہ منظر نہایت سحر انگیز ہوتا ہے۔ مغرب کی جانب اُفق میں شفق کی سُرخی پھیلتی گئی۔ لگتا تھا، سورج رفتہ رفتہ سمندر میں اتر رہا ہے، اور یہ آگ اور خون اُس کی وداعی کا ماتم ہے۔ مغرب میں دُور کہیں آسمان جل اُٹھا تھا۔ جب تک سُرخی پر سیاہی غالب نہ آ گئی، گورے وہیں کھڑے غروبِ آفتاب کا نظارہ کرتے رہے۔ ہرچند غروب اور زوال سے اُنھیں کوئی نسبت نہیں تھی۔ اُنھوں نے داستانیں ہی پڑھی ہوں گی۔ کہتے ہیں، کم یابی و نایابی اشتیاق فزوں کرتی ہے۔ گوروں کے چلے جانے کے بعد عرشے کے کنارے والا حصہ خالی ہو گیا اور دُور دُور کھڑے ہندستانی مسافروں نے پھر وہاں تسلّط جما لیا، مگر اب اندھیرے کے سوا وہاں کیا رکھا تھا۔

ساری روشنیاں جلا دی گئی تھیں اور چاروں طرف سے تاریکی میں گھرا ہوا جہاز اُس وقت روشنی کا جزیرہ بن گیا تھا۔ روشنیاں اُبلتی کوندتی لہروں پر منتشر ہوتیں تو نیچے جلتے بجھتے ستاروں کا گمان ہوتا۔ نچلے عرشے پر ایک معقول جگہ لتا کے میں، زورا اور جمرو چہل قدمی کرتے جہاز کے عقبی حصے کی طرف چلے آئے۔ پاس ہی گوروں کا چائے خانہ، یا عشرت کدہ تھا۔ شیشے، رنگ اور روشنی نے گڈمڈ ہو کے وہ جگہ طلسماتی سی کر دی تھی، خواب کا سا کوئی احساس۔ باہر سے نظر آ رہا تھا کہ زندگی وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کی اسیر ہے۔ دُنیا میں اُنھیں کوئی غم نہیں ہے اور خدا اُن سے بہت خوش ہے۔ اندر سبھی چہک رہے، چہک رہے تھے، شگفتہ اور شاداں۔ میں نے کہیں پڑھا، یا سنا تھا کہ گورے رات کا بہت اہتمام کرتے ہیں، گورے کیا، تقریباً سبھی دولت مند۔ وقت بھی تو خریدا جاتا ہے۔ جن کے پاس دولت ہوتی ہے، وہ اِسے خرید لیتے ہیں۔ وقت خریدنے سے مراد راحت افزا، نشاط انگیز ساعتوں کی خریداری ہے۔ بے شک اِس طرح وقت بڑھایا نہیں جا سکتا۔ یہ میادے کی جنس، یا بکاؤ مال نہیں ہے۔ ورنہ آدمی ساری دولت لٹا کے بس اِسے خریدنے کی جستجو کرتا، اپنا وقت سَو برس سے بڑھا کے دو سَو برس کر لیتا، تین سَو برس، ہزار برس۔ جتنی دولت آ گئے ڈالو، اُتنے ہی ماہ و سال بڑھا لو، مگر وقت عدد اور پیمائش میں نہیں مل پاتا تو

قدر میں ضرور مل جاتا ہے، کیفیت میں ضرور مل جاتا ہے۔ نرم ہو وقت کی خزاں میں پھول، حبس میں دریچے، تاریکی میں چراغ خریدنے کا مطلب بھی وقت میں اضافہ ہے۔ نامہرباں وقت کو مہرباں کرنے، دل چسپ اور دل کشا وقت کا انتخاب تو آدمی کے بس میں ہے۔ یہ کارِ مسیحائی اور کرشمہ کاری بہت کچھ دولت کے پاس ہے۔ جو لوگ چراغاں کر کے، نفیریاں بجا کے اور بام و در سجا کے اشتہا انگیز غذاؤں اور معطر صحبتوں کی دعوت دیتے ہیں، وہ اصل میں وقت بیچتے ہیں۔ وہ گرہیں کھولنے، حبس دُور کرنے کا کاروبار کرتے ہیں۔ جگہ جگہ یہ دکانیں کھلی ہوئی ہیں۔ شرط صرف دولت ہے اور طلب ہے۔ بے شک رسد بھی مشروط ہے کہ صحرا میں سونے کے آدمی کی طلب بھی ریت ہے اور آدمی ہی صحرا ہو تو سب بے کار ہے، لیکن دولت سے چند ایک سرگشتاں، آشفتگاں کی نہیں تو بے شمار تشنہ لباں، ناآسودگاں کی سیری ہو جاتی ہے۔ کیفیت کی زندگی، کمیت کی زندگی کا حساب کتاب کیا جائے تو دولت مند بیش تر اپنے منشا کی اور الغرض بڑی زندگی گزارتا ہے۔

سامنے کے چائے خانے میں گورے باہر کی دُنیا سے بے خبر ایک دوسرے میں گم تھے۔ کاؤنٹر کے گرد بیٹھے بدست جام پر جام لنڈھا رہے تھے۔ میزوں پر بھی پیمانے چھلک رہے تھے۔ موسیقی کی ہلکی ہلکی تانیں باہر تک آ رہی تھیں۔ وسط کی کھلی جگہ پر مرد و عورتیں بانہوں میں بانہیں ڈالے رقص کر رہے تھے۔ ایک جانب کونے میں دیوار پر آویزاں ہدف پر چھوٹے چھوٹے تیر پھینکنے کا مقابلہ جاری تھا۔ جوئے کی گول میز کے اطراف بھی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ریستوراں کے کسی کمرے میں گوروں کے محبوب مشغلوں، بلیرڈ، ٹیبل ٹینس، برج وغیرہ کا اہتمام بھی ہونا چاہیے۔ سارا ماحول خیال آفریں تھا۔ جمروکوں اور شیشوں کے اُس پار ہندستانی مسافر حیرت سے یہ انجمن آرائی دیکھتے تھے۔ میرے لیے یہ سب کچھ نیا نہیں تھا۔ کرشنا جی کے ساتھ بمبئی کے کلب میں مجھے اِن مناظر کا تجربہ ہو چکا تھا، پھر رما کے ساتھ بھی...

جمرو پھڑ کنے لگا، ”تھوڑی دیر کے لیے اندر چلتے ہیں لاڈلے!“

”شاید نہیں جا سکتے۔“ میں نے نرمی سے کہا۔

”کیوں، کیوں نہیں جا سکتے؟“

”یہ ہمارے لیے نہیں ہے۔“

”وہ کیوں نہیں ہے؟“ وہ ...

”بس نہیں ہے۔“ میں نے ناگواری سے کہا۔

”باہر لکھا ہوا ہے؟“

”لکھا ہوا تو شاید کہیں نہیں ہے۔“ میں نے اِدھر اُدھر تاکتے ہوئے کہا، ”لیکن صاف نظر آ رہا ہے، وہاں ہم جیسا بھی کوئی نہیں ہے اور، اور ہم اندر جا کے کریں گے بھی کیا۔ اُن کے درمیان خود کو اجنبی لگیں گے۔ اگر دروازے پر دربان نے روک دیا تو کرکری الگ ہو گی۔“

”کیوں روکے گا حرام کا۔ سارا کھیل دمڑی کا ہے۔ اپنی جیب میں بہت پیسے ہیں، قسم سے۔“ جمرو جیب تھپ تھپاتے ہوئے بولا۔

”ہمارے کپڑے! اُن کے ہاں لباس کا بڑا خیال رکھا جاتا ہے۔ وقت اور موقع کا الگ الگ لباس ہوتا ہے۔“

”پر اُدھر سب کون سے ایک کپڑوں میں ہیں۔“ جمرو اِترا کے بولا، ”ہمارے بھی کپڑے گھٹیا اور گندے نہیں ہیں، ہمارے ہی تو بدلے ہیں۔“

”لیکن اُن جیسے بھی نہیں ہیں۔“

”ابھی ایک بار ٹرائی مار کے دیکھتے ہیں، کیا جاتا ہے راجا بابا۔“ زورا نے جمرو کو اور مہمیز کیا، ”اُو دِرا اپنا ہندستانی ہیرا بھی تو ہے۔ گھومتا پھرتا ہے کیسا کھٹ پٹی کا مافک، اور انڈیا ہے چو والا بھی ایک دم کالا ہے۔ سالا ابھی مدراسی ہے کہ بنگالی۔“

”وہ خدمت گار ہیں، وہاں کے ملازم۔“ میں نے اُنھیں سمجھانے کی کوشش کی۔

”چل کے دیکھتے ہیں لاڈلے!“ جمرو بے پروائی سے بولا، ”وہ دروازے پہ کھڑا تھانے دار زیادہ سے زیادہ کیا کرے گا۔ روک دے گا نا؟“

”ہاں، لیکن یہ اچھا تو نہیں ہو گا۔“

”نیچے پانی میں تو نہیں پھینک دے گا۔“

”او ہو، تم سمجھتے کیوں نہیں۔“ میں نے چڑ کے کہا، ”وہ لوگ ہماری سنگت پسند نہیں کرتے۔“

”تو ہندستانی بیرے کیوں رکھتے ہیں اور اِدھر آتی زور

”میں نے تم سے کہا تھا کہ پلیا پر گاڑی آہستہ چلانا...“

کالوں کے دیس میں آ کے کنڈلی مارے کیوں بیٹھے ہوئے ہیں۔“

”یہ اُنھی سے جا کے پوچھو۔“

”تمھیں نہیں، کیا اُلٹا بولتا ہوں۔“

اُن سے بحث تکرار فضول تھی۔ کچھ ماحول کا اثر تھا، مستی میں آئے ہوئے تھے۔ میں نے بیزاری سے کہا، ”ٹھیک ہے، حسرت نکال لو۔“

میرا خیال تھا، وہ باز آ جائیں گے، مگر مجھے ٹھیلتے ہوئے وہ چائے خانے کی جانب بڑھ گئے۔ چند قدم بعد ہی اندر جانے کا راستہ تھا۔ بند دروازے پر سکھ دربان منڈلا رہا تھا۔

”تم ابھی سردار سے تھوڑا گٹ پٹ کرنے کا ہے راجا دادا! سمجھے گا، آدھا فرنگی ہے۔ کالا تو تم بالکل بھی نہیں ہے۔“ زورا نے سرگوشی میں کہا۔

مجھے ہنسی آ گئی، ”اور اِس پر نہیں مانا تو چاقو کی جھلکی دکھائیں گے۔ تمنچا بھی ہے اپنے پاس۔“

زورا بل کھا گیا۔

وہی ہوا، ہمیں بڑھتا دیکھ کے سکھ دربان دیوار بن کے حائل ہو گیا۔ اُس نے تحکمانہ انداز میں پوچھا کہ ہم کہاں جاتے ہیں۔

”دکھائی نہیں پڑتا کیا۔“ زورا کھردری آواز میں بولا، ”اپن تم کو اچھا لگتا ہے۔ مُفتی میں نہیں جا رہا۔ مال خرچ کرے گا۔ ابھی ایدر کدری لکھا وا ہے اپن کو روکنے کا؟“

سکھ دربان زورا کے لہجے سے متاثر ہوا اور کسی قدر رسائی

سے اُس نے بتایا کہ جہاز کے کپتان کے حکم کے مطابق جب تک گورے چائے خانے میں بیٹھے ہوں تو ہندستانیوں کو، چاہے وہ کیبن کے مسافر ہوں، اندر جانے نہ دیا جائے۔

جمرو اور زورا کا ارادہ اُس سے حُجت کرنے کا تھا، لیکن سردار معاملہ فہم آدمی تھا۔ اُن دونوں کے تیور بھانپ کے بے بسی کا اظہار کرنے لگا۔ جمرو اور زورا کے پاس اب یہی رہ گیا تھا کہ وہ سردار کی گردن پہ دو چار ہتڑ لگائیں، یا چاقو بھونک دیں۔ اُنھوں نے سردار کے ہاتھ پر رُپے رُپے کے دو سکے رکھے اور لوٹ پڑے۔ سردار نے حیرت سے اُنھیں دیکھا، سٹ پٹا کے سلام کیا اور رُپے جیب میں رکھ کے بولا کہ وہ مجبور ہے۔ اُس کا بس چلے تو... وہ ہاتھ جوڑ کے منت کرنے لگا۔

جمرو اور زورا سر جھکائے وہاں سے چلے آئے۔ اُن کی دل جُوئی کے لیے میں اُنھیں عرشے کے مسافروں کے لیے مخصوص چائے خانے میں لے آیا۔ یہاں بہت شور تھا۔ سامنے کاؤنٹر پر کشتیوں میں رات کا کھانا لے جانے والوں کی قطار لگی ہوئی تھی۔ ایک طرف چائے، اُس سے ملحق شراب کا کاؤنٹر تھا۔ مشکل سے ایک کونے میں لوگوں کے اُٹھ جانے پر ہمیں جگہ ملی۔ جمرو اور زورا اپنے برابر والی میز پر ہندستانی مسافروں کے درمیان ایک گورے مسافر کو دیکھ کے اُچھل پڑے، "لاڈے! یہ بندر اِدھر کیوں بیٹھا ہے۔" جمرو پلکیں پٹ پٹا کے بولا۔

"آہستہ بولو۔ بہت سے گوروں کو ہماری زبان آتی ہے۔" میں نے دبے ہوئے لفظوں میں کہا۔

"پہ یہ اِدھر کیوں بیٹھا ہے؟"

"اُس کی مرضی ہے۔"

جمرو اور زورا نے مجھ سے نہیں پوچھا کہ دونوں جگہ اُنھی کی مرضی کیوں ہے، اُن کی نظریں گورے کو حصار میں لیے ہوئے تھیں۔ گورے اِس طرح عام ہندستانیوں سے گھلتے ملتے جو نہیں تھے۔ وہ ایک پختہ عمر شخص تھا۔ وجیہ، چاق چوبند، خوش اطوار، چوڑی پیشانی، سر کے آدھے بال اُڑے ہوئے، خشخشی داڑھی، بھرے بھرے گال، گہری چمکیلی آنکھیں، درمیانہ قد، نہ اِتنا فربہ، نہ ایسا دُبلا۔ ہندستانی مسافروں سے وہ ٹھیر ٹھیر کے، ایک ایک لفظ پہ زور دے کے اپنا مفہوم واضح کرنے کی تگ و دو کر رہا تھا۔

اُس کے مخاطبوں کی انگریزی واجبی تھی۔ مدراسی معلوم ہوتے تھے، تحمل زبان آتی ہوگی۔ کچھ جھجک بھی رہے تھے، جوں کہ بیچ بیچ میں یس، نو نو کر رہے تھے۔ بے قرار انگریز اُن سے ہندستان کی بابت معلوم کرنا چاہتا تھا۔ لوگ اپنی بساط کے مطابق جواب دے رہے تھے۔ وہ اُن کے جواب اخذ کرنے کی کوشش کرتا اور بار بار سر ہلاتا تھا۔ شور کی وجہ سے اُن کی آواز صاف سنائی نہیں دے رہی تھی، حالاں کہ بالکل برابر والی میز تھی۔ گورے کا انداز اپنے ہم وطنوں سے قطعی مختلف تھا، بے ساختہ مشتاقانہ، تصنع سے مبرا۔

"کیا بولتا ہے چقندر کی اولاد؟" جمرو نے بھنچی ہوئی آواز میں پوچھا۔

میں نے آنکھیں بھینچ کے اُسے روکا۔ "ذرا سننے دو۔"

"اپنے کو کچھ کھسکا وا ایسائی دیتا ہے۔"

میں نے اشارے میں تردید کی۔ "بالکل نہیں۔"

"پھر کیا آٹے دال کا بھاو پوچھتا ہے۔ سالا بے مطلب تو اِدھر نہیں بیٹھ سکتا۔"

"کوئی سیاح ہے، شاید سیر کو آیا ہے۔"

"سیر کو!" جمرو تمسخر سے بولا، "اِدھر کیا ملے گا جُوتی والے کو، ٹاٹ کھاٹ، کھپریل، اُپلے..."

"صرف یہی تو نہیں، یہاں تاج محل، لال قلعہ، اجنتا، ایلورا، ٹیکسلا، موئن جودڑو، ہمالہ، دریا، جنگل، شکار، جانے کیا کیا۔ بہت سی چیزوں میں اُن کے لیے کشش ہے۔ ہندستان تو اُن کے لیے جادو نگری، بل کہ کسی سمندر کی طرح ہے۔"

اِس اثنا میں گورے نے ہماری دل چسپی محسوس کر لی تھی۔ اُس نے "ہیلو" کہہ کے اور ہاتھ اُٹھا کے مجھے سلام کیا۔ میں نے بھی مسکرا کے جواب دیا۔ ہماری میز پر ایک کرسی خالی تھی۔ گورے نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں سے معذرت کی اور بہ عجلت ہماری طرف چلا آیا۔ "اگر میں مخل نہ ہوں تو کچھ دیر کے لیے آپ کے پاس بیٹھ سکتا ہوں؟" اُس نے کرسی کا ہتھا پکڑتے ہوئے انگریزی میں پوچھا۔

"ضرور، ضرور۔" میں نے بھی انگریزی میں جواب دیا اور اُٹھ کے اُس کے لیے خالی کرسی پیچھے کر دی۔

اُس نے شکریہ ادا کیا اور ہاتھ بڑھا کے بولا، "میرا نام رابرٹ تھامپسن ہے۔"

اُس کے مصافحے میں بڑی گرم جوشی تھی۔ میں نے بھی اسے اپنا نام بتایا۔

اُس نے زورا اور جمرو سے ہاتھ ملایا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ رسمی فقروں کے بعد اُس نے شائستگی سے کہا، "ہندستان کا یہ میرا پہلا دورہ ہے۔"

"مگر آپ کو تو اچھی ہندستانی آتی ہے۔"

"اوہ!" وہ ہنس کے بولا۔ "ایسی بھی کہاں، یہاں آنے کے لیے تھوڑی شُد بُد حاصل کی تھی۔ میرا خیال ہے، کچھ بھی نہ کر سکا، اور ہندستان میں صرف ہندستانی ہی تو نہیں بولی جاتی۔"

"یقیناً، یہاں تو کہیں کہیں پڑوسی شہر میں بھی زبان بدل جاتی ہے۔" میں نے اُس کی تائید کرتے ہوئے پوچھا، "کیا آپ سیاحت کے لیے آئے ہیں؟"

"ہاں، ایک طرح سیاحت بھی کہ میں اِس دورے کا عرصے سے آرزومند تھا۔ بہت سن رکھا تھا آپ کے اِس طلسم کدے کے بارے میں۔"

میرا جی چاہا، کہوں، "آپ ہمارا کہاں۔" لیکن میں چُپ رہا۔

وہ کہنے لگا، "اب کہیں جا کے موقع ملا۔ سیاحت کے علاوہ اصل میں مَیں حکومتِ برطانیہ کی ہدایت پر ہندستان کے سیاسی اور سماجی رُجحانات کے مطالعے کی غرض سے آیا ہوں۔ یہاں اِن دنوں سیاسی بے چینی شدید ہے۔ انقلابی تحریکیں زور پکڑ رہی ہیں۔ شہر وسعت پا رہے ہیں اور صدیوں کا منجمد وہی معاشرہ نئے صنعتی عہد میں داخل ہو رہا ہے۔ چناں چہ سماجی تغیرات لازم ہیں۔ عموماً تبدیلیاں ابتدا میں اجنبیت اور مغایرت سے دوچار ہوتی ہیں۔ اِن سے مانوس ہوتے ہوتے دیر لگتی ہے۔ حکومتِ برطانیہ کو عظیم ہندستان میں اپنی ذمے داریوں کا احساس ہے۔ مجھے کچھ انھی مسائل، اسباب و علل کی تحقیق، یا یوں کہیے کہ تیزی سے بدلتی ہوئی اِس ساری صورتِ حال پر ایک تجزیاتی مقالہ تیار کرنا ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں، میرا کام جتنا پیچیدہ ہے، اُتنا اہم بھی ہے۔ شاید مجھے سارے ہندستان کا دورہ کرنا پڑے۔ یہ برِصغیر تو بجائے خود ایک دُنیا ہے۔"

"ہاں، کہتے تو یہی ہیں، لیکن یہاں رہنے والوں کو کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ تو دوسرے، سمندر پار سے آنے والے ہی جان سکتے ہیں۔" میں نے متانت سے کہا، "واقعی آپ کا کام آسان نہیں۔ ہندستان بے شمار تہذیبوں، زبانوں اور رجحانات کا مرکب ہے۔"

"کام تو میں نے انگلستان ہی میں شروع کر دیا تھا، جتنی کتابیں، مخطوطے اور دستاویزیں ممکن ہیں، جمع کر لی تھیں۔ سچ تو یہ ہے، جیسے جیسے مطالعہ کرتا گیا، انہماک جنون کی حد تک بڑھ گیا۔ ذاتی طور پہ یہ سفر میرے لیے ایک مہم کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاز پر سوار ہوتے ہی میں نے ہندستانی مسافر تلاش کرنے شروع کر دیے تھے۔ اتفاق ہے کہ مجھے مطلوب آدمی نہ مل سکے۔ جہاز شرقِ اوسط کے کئی ساحلوں پر لنگر انداز ہوا اور ہر جگہ سے ہندستانی مسافر سوار ہوئے۔ گو اُن کی تعداد اِتنی زیادہ نہیں تھی، تاہم تقریباً سبھی سے رابطہ کیا اور خاطر خواہ نتائج نہ مل سکے۔ اب ہندستان کے دروازے کراچی سے سفر شروع کرنے والے مسافر ہی مکمل ہندستانی نظر آئے ہیں، اور

میری خوش قسمتی ہے کہ آپ سے جلد ہی ملاقات ہو گئی۔ یہ کتنی اچھی بات ہے کہ آپ جیسا ہم زباں مل گیا۔"

"میں کیا جانتا ہوں۔ میں تو انگریزی میں اتنی شُد بُد بھی نہیں رکھتا، جتنا آپ ہندستانی سے واقف ہیں۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"کیا میں اِسے مشرقی انکسار پر محمول کروں۔"

"سنا ہے، ہر انگریز غیر انگریز کو اپنی زبان بولتے ہوئے یہی کہتا ہے۔"

اُس نے قہقہہ لگایا، "آپ کے سلسلے میں ایسا نہیں ہے۔"

اُس نے تپاک سے پوچھا، "آپ نے یہ زبان کہاں سے سیکھی؟"

"بس ایسے ہی اسکول کالج میں۔"

"میں آپ کو بتانا بھول گیا، میرا تعلق بھی باقاعدہ کیمبرج یونیورسٹی سے تھا۔ اب میں وزٹنگ پروفیسر ہوں۔ عمرانیات اور سیاسیات میرے موضوعات ہیں۔"

"پھر تو آپ سے مل کے بڑی خوشی ہوئی۔" میں نے اُس سے دوبارہ ہاتھ ملایا۔

"لیکن یقیناً مجھے آپ سے زیادہ..."

میں نے زورا اور جمرو کا تعارف اپنے عزیزوں کی حیثیت سے کرایا اور انھیں پروفیسر ہوبرٹ تھامپسن کے بارے میں مختصراً آگاہ کر دینا ضروری سمجھا کہ وہ کوئی بے احتیاطی نہ کر پائیں۔ ہماری گفت گو کے دوران دونوں گونگے بہرے بن جاتے تھے، لیکن پروفیسر ایک خوش خُلق اور حساس آدمی تھا۔ اُس نے بیچ بیچ میں اپنی شکستہ ہندستانی بول کے انھیں اُکتانے نہیں دیا، شامل رکھا۔

زورا نے مجھے ٹوکا کہ میں پروفیسر سے پوچھوں، وہ عام گوروں سے اِتنا مختلف کیوں ہے۔ مجھے مناسب معلوم نہیں ہوا، سو میں نے اجتناب کیا لیکن پروفیسر کچھ کچھ زورا کا مقصود سمجھ گیا تھا۔ وہ مجھ سے وضاحت کے لیے اِصرار کرنے لگا۔ میں نے اُسے زورا کی بے کلی کی وجہ بتائی تو کھلکھلا پڑا اور کہنے لگا کہ وہ کبھی سرکاری ملازمت میں نہیں رہا ہے۔ تعلیم سے فراغت پا کے وہ لیکچرر ہو گیا۔ اس کے بعد بس کتاب اور طالب علم ہی سے واسطہ رہا۔ یہی کچھ تو جاننے کے لیے اُسے بھیجا گیا ہے کہ انگریزوں کی کون سی ناانصافی، کج روی، کون سے روتوں نے ہندستان کے طول و عرض میں برگشتگی کو ہوا دی ہے۔

میں نے پروفیسر کے جواب کی ترجمانی کی تو پہلی بار جمرو اور زورا کے چہروں کی خشونت دُور ہوئی۔ جمرو کہنے لگا کہ وہ تو سمجھتا تھا، سارے گورے لاٹ صاحب اور صاحب بہادر ہی ہوتے ہیں، کمشنر، ڈپٹی کمشنر، کلکٹر...

میں نے پروفیسر کو بتایا تو بہت محظوظ ہوا۔ چائے آ گئی تھی۔ ساتھ میں پیسٹری اور بسکٹ وغیرہ بھی تھے۔ چائے خانے میں نفری بڑھ جانے سے شور زیادہ ہو گیا تھا، بات کرنے کی دشواری ہو رہی تھی۔ سگریٹ بیڑی کا دُھواں ہر طرف پھیلا ہوا تھا اور جن لوگوں نے شراب پی لی تھی، انھیں اپنی آوازوں پر اختیار نہیں رہا تھا۔ ہندستانیوں کو یوں بھی اُونچی آواز میں بولنے اور غیر ضروری باتیں کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ ہم نے صرف چائے پی۔ پروفیسر نے کچھ کھانے سے پرہیز کیا اور تاویل کی کہ وہ یہاں کی آب و ہوا سے جسمی مطابقت تک کھانے پینے کی چیزوں میں احتیاط کرنا چاہتا ہے۔ اتنی دیر میں ہمارے مابین اجنبیت کا تکدر خاصا چھٹ چکا تھا۔ یکا یک پروفیسر کو جانے کیا سوجھی، اُس نے پوچھا کہ ہم نے ابھی رات کا کھانا تو نہیں کھایا ہوگا۔ میرے سچ بولنے پر اُس نے نہایت ادب اور اشتیاق سے ہمیں آج رات ساتھ کھانا کھانے کی دعوت دی۔ میں نے عذر کیا کہ ابھی ایسی بھوک نہیں ہے۔ اُدھر ہمارا ایک ساتھی عرشے پر آرام کر رہا ہے۔ شاید اُسی کے ساتھ کچھ دیر بعد کھانے کا مرحلہ طے ہو۔ غالباً میرے انکار میں زور نہیں تھا۔ پروفیسر در پے ہو گیا کہ کوئی بات نہیں، ٹھیک ہے، پھر وہیں چلتے ہیں، وہاں وہ بجھل سے خود درخواست کرے گا کہ بجھل بھی ہم سب کے ساتھ ہو۔ میرے تکلف اور معذرت سے وہ مایوس نہیں ہوا، کہنے لگا، "جناب! کھانا تو ایک بہانہ ہے۔ دوسرے چائے خانے میں نسبتاً سکون ہے۔ وہاں اچھا وقت گزرے گا۔ مجھے، جمرو اور زورا کو جلد سو جانے کی عادت نہ ہو تو از راہِ نوازش غیریت نہ برتی جائے۔"

میرا خیال تھا، جمرو اور زورا میری تائید کریں گے۔ وہ فوراً آمادہ ہو گئے، بل کہ جمرو نے صلاح دی کہ وہ کھانے کی کشتی بجھل کو پہنچا کے اور اُسے بتا کے ابھی واپس آتا ہے۔ ہم کچھ دیر

اُن کا انتظار کریں۔ جمرو اور زورا دونوں ہی چلے گئے اور جلد واپس آ گئے۔ بجھل نے کھانے پر آرام کو ترجیح دی تھی۔ زورا اور جمرو کے آ جانے پر پروفیسر اُٹھ گیا۔

چند لمحوں میں ہم دوبارہ سکھ دربان کے سامنے پہنچ گئے تھے۔ وہ چرتی آنکھوں سے ہمیں دیکھا کیا۔ پروفیسر نے دروازے پر اُس کی موجودگی کو کوئی اہمیت نہ دی۔ سکھ دربان کے سلام پر سر ہلاتے ہوئے اُس نے ہمارے لیے دروازہ کھولا، چائے خانے میں ہم تینوں کے اندر داخل ہونے کے بعد ہی وہ اندر آیا۔

شبستاں ایسی ہی کسی جگہ کو کہتے ہوں گے۔ اُس کا احوال دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ باہر سے، شیشوں اور جھروکوں کے اُس پار تو عشر عشیر بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یہاں تو نظارہ ہی کچھ اور تھا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ ہم کسی جہاز پر سوار ہیں۔ کوئی منزل نہ مسافر کل آئے نہ آئے، بس یہی ایک ساعت زندگی کا حاصل ہو۔ چائے خانے کی آرائش و زیبائش شاہانہ تھی اور وہاں رقص کرتے لوگوں کی آب و تاب مستزاد۔ خوش بو، موسیقی اور ٹھنڈک نے ہمارا استقبال کیا۔ سب کی نگاہیں ہم بد نسلوں کی طرف مرکوز ہو گئی تھیں، لیکن پروفیسر ایک معزز و محترم شخص تھا۔ سب نے سر جھکا کے اُسے تعظیم دی اور رسماً سہی، ہمارے لیے بھی ہاتھ اُٹھائے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائی۔ پروفیسر ہمیں ایک پُرسکون گوشے میں لے آیا۔ جمرو اور زورا بے زبان سے ہو گئے تھے۔ پھیلے ہوئے دیدوں سے وسط کی خالی جگہ پر رقصاں جوڑے دیکھتے رہے۔ پروفیسر ہماری خاطر مدارات کے لیے بہت بے تاب تھا۔ خدمت گار جلد، یا بہ دیر خود ہمارے پاس آتا لیکن پروفیسر کو ذرا سی تاخیر گوارا نہ تھی۔ جب تک کاؤنٹر پر جا کے خدمت گار کو اپنی میز پر بھیجنے کی ہدایت نہ کر دی، اُسے چین نہ آیا۔ واپس آ کے اُس نے لہکتی آواز میں کہا، "آپ آپ کھل کے بیٹھیے، میری گزارش ہے کہ کوئی تکلف نہ کیجیے۔"

"تکلف تو آپ کر رہے ہیں جناب!" میں نے کہا، "آپ ہندستان آئے ہیں، آپ کو ہمارا مہمان ہونا چاہیے۔"

"میں نے ابھی ہندستان کی سرزمین پر قدم کہاں رکھا ہے۔ آپ سے وعدہ، کبھی بلائیں گے تو ضرور آئیں گے۔ بمبئی ہی میں قیام ہے آپ کا؟"

"جی ہاں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"اور، اور کیا مشغلہ ہے؟"

میں اُسے کیا بتاتا۔ میں نے سانس بھر کے کہا، "اِن دنوں تو سفر میں گزر رہی ہے۔"

"کاروباری سلسلے میں؟"

میری آواز ٹمٹما گئی، "ہاں یوں ہی کہہ لیجیے۔"

اچھا ہوا کہ اُس نے کاروبار کی نوعیت کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ اِس اثنا میں معمر ہندستانی خدمت گار بھی آ کے مخلل انداز ہو گیا تھا۔ پروفیسر نے جھجکتے ہوئے ہم تینوں سے پوچھا کہ کیا ہم شراب پینا پسند کریں گے۔ جمرو اور زورا نے میری طرف دیکھا اور انکار کر دیا۔ پروفیسر نے خدمت گار کو سنترے کا رس لانے کا حکم دیا اور کھانے کے کارڈ کا بہ غور مطالعہ کرنے لگا۔ "کھانے میں کیا لیجیے گا؟"

"کچھ بھی، مگر سؤر نہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" اُس نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا، "اتفاق ہے، میں بھی نہیں کھاتا، بل کہ سرخ گوشت ہی سے رغبت کچھ کم ہے۔" البتہ سفید، یعنی سمندری گوشت شوق سے کھاتا ہوں۔ کیا خیال ہے، وہی منگوائیں۔"

"یہ تر ہے، سمندر میں ہیں، اِس کا حق بھی ادا ہو جائے گا۔ ہمارے ہاں ایک کہاوت ہے: جیسا دیس، ویسا بھیس۔ مگر ہم چاروں کے لیے ہونا چاہیے۔"

دوسرے لمحے اُس کی سمجھ میں آیا اور وہ شوخی سے بولا، "مگر

انصاف بھی شرط ہے۔"

"ہاں، ہاں۔"

وہ ہنسنے لگا۔ اُس نے طعام نامے پر نشانات لگائے۔

"میں نے خیال رکھا ہے۔ اطمینان رکھیں۔ غذا کا ضیاع اچھا نہیں لگتا، کچھ ندامت سی ہوتی ہے۔"

"ہندستانیوں کو تو دُکھ بھی ہوتا ہے۔"

"اوہ!" وہ پہلو بدل کے بولا "ہماری آپ کی اچھی نبھے گی۔"

"حالاں کہ مابین ایسی نسبتیں نہیں ہیں۔" میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔

وہ چونک پڑا اور ایک ثانیے کے لیے اُس کا چہرہ تمتما گیا، "میں یہی، یہی جاننے کے لیے آیا ہوں۔ نسبتیں کہاں کھو گئیں۔ کیا آپ کے سر پہ سینگ اور میرے عقب میں دُم لگی ہوئی ہے۔"

"کاش کہ ایسا ہوتا! تو امتیاز تو طے ہو جاتا۔"

"ہاں۔" وہ کھو سا گیا۔ "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اِس بات میں خاصا کرب ہے۔"

"میرا مقصد دل آزاری نہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔" وہ تیزی سے بولا، "لیکن جیسا کہ میں نے پہلے ہی وضاحت کی ہے، مجھے اَوروں کے پیمانے سے مت دیکھیے۔"

"تو پھر یہاں کیوں بیٹھے ہوتے۔ یہ تو علاقۂ غیر ہے۔"

"میں آپ سے بہت کچھ اخذ کرنا چاہتا ہوں۔" اُس کے لہجے میں بے کلی تھی، عاجزی بھی۔

"آپ کو شاید مایوسی ہو۔ میں تو کچھ بھی نہیں جانتا، اور یہ انکسار نہیں، واقعہ ہے۔ یوں کہیے کہ مجھے اِدھر اُدھر دیکھنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ جو کچھ جان سکا ہوں، وہ غیر اختیاری ہے۔ کھلی آنکھوں سے اِدھر اُدھر نظر پڑ ہی جاتی ہے۔ بس اسی قدر آتا ہے۔ آپ ایک عالم و فاضل شخص ہیں۔ جہاز سے اُتر کے یقیناً آپ کو اپنے مطلب کے بہت سے لوگ مل جائیں گے۔ شاید میں بھی اِس کام میں کچھ اعانت کر سکوں۔"

"مجھے شبہ ہے، آپ ایسے لوگوں سے آسانی سے ملاقات ہو سکے۔ میرے سامنے ہونے پر مخاطب کو احتیاط مانع ہوگی، ہونی چاہیے۔ شاید میں اِس ذمّے داری کے لیے موزوں نہیں جو مجھے سونپی گئی ہے۔ انھیں فریقین میں سے کسی کا انتخاب کرنے کے بجاے باہر کے آدمی کو اِس فریضے پر مامور کرنا چاہیے تھا۔ حیرت ہے، انھوں نے اِس نزاکت پر غور نہیں کیا۔"

"ہو سکتا ہے، باہر کے آدمی کے سامنے آئینے میں اُنکی شکلیں بھیانک نظر آنے کا خوف ہو۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

خدمت گار پھر مخل ہو گیا تھا۔ ایک نے رَس لا کے رکھا، دوسرے نے پلیٹیں سجائیں۔ پروفیسر لمحوں تک چپ رہا اور رَس کا گلاس خالی کرتا رہا۔ موسیقی کی آواز کبھی ایک دم تیز ہو جاتی، کبھی مدّھم پڑ جاتی تھی۔ لوگ مسلسل ناچ رہے تھے اور کسی کو کسی سے سروکار ہی نہ تھا۔ مجھے اِس عرصے میں خود کو اُستوار کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ میں نے طے کیا کہ پروفیسر سے کسی پیچیدہ معاملے پر بات ہی نہیں کرنی چاہیے۔ اِس سے حاصل بھی کیا ہے۔ میں کیا اضافہ کر سکوں گا۔ مبادا میرے مُنہ سے کوئی بے محل بات نکل جائے اور فضول میں یہ خوش بسری، خوش وقتی منتشر کر دے۔ یہ ہر حال، پروفیسر ایک فریق ہے اور ایک زیرک آدمی۔ زیرکی آدمی کی دولت ہے تو کبھی اُسے بہکا بھی دیتی، اُلجھا بھی دیتی ہے۔ کثرت ہر چیز کی بُری ہوتی ہے۔

خدمت گار نے پروفیسر کے حکم کی تعمیل میں عجلت کی، جلدی جلدی کھانا میز پر لگا دیا۔ کہتے ہیں، ہندو کھانے کی جگہ، مسلمان کھانے کی قسم اور انگریز کھانے کے آداب کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ مجھے ٹھیک طرح یاد نہیں رہا۔ کبھی بچپن میں سنا تھا۔ فرانسیسیوں کی بھی کچھ اسی طرح کی شہرت ہے۔ غالباً اُن کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ کھانے کے وقت کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ کب، کہاں، کیسے اور کیا کی ترتیب سے یہ دل چسپ قول کہیں سنا تھا۔ پروفیسر نے ایک انبار منگوا لیا تھا۔ ساری میز بھر گئی۔ کیکڑے کا سُوپ، کچی اور اُبلی ہوئی سبزیوں کا سلاد، سلاخوں والے بسکٹ، ڈبل روٹی، مکھن، لیموں کا پانی، مچھلی کی کئی قسمیں، جھینگے۔ ڈونگوں میں کھانے ایسی نفاست سے رکھے گئے تھے کہ لگتا تھا، تراشے گئے ہوں۔ اُنھیں چھوتے، چھیڑتے ہوئے جراحت کا احساس ہوتا تھا، کہیں میلے نہ ہو جائیں، ٹوٹ اور بکھر نہ جائیں۔

"مجھے افسوس ہے، اِس جگہ ہندستانی کھانے نہیں ملتے۔"

پروفیسر نے مصنوعی خجالت سے کہا۔ یہ مصنوعی خجالت بھی آداب کا حصہ ہے۔

مجھے کہنا چاہیے تھا کہ ملتے بھی تو ہندستان کی کتنی نمائندگی کرتے۔ میں نے یوں ہی کہہ دیا، "مگر کھانے تو ملتے ہیں۔"

"ہاں" اور ایسے بُرے بھی نہیں۔"

"وہ تو یقینی ہے، کچھ کھانے والوں کا حسنِ ذوق بھی کام دکھاتا ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"حسنِ ذوق تو ہندستانیوں کا بھی خوب ہے۔ لندن میں متعدد ہندستانی ہوٹل ہیں۔ میں وہاں جاتا رہتا ہوں۔ کیا لذیذ کھانے تیار کرتے ہیں ہندستانی۔ اس منصب پر اپنی تعیناتی کے بعد تو میں نے معمول بنا لیا تھا۔ مجھے تو بہت سے کھانوں کے نام بھی آ گئے تھے۔ بریانی، یخنی پلاؤ، کباب اور وہ، وہ میٹ بال... کیا کہتے ہیں اُس کو؟" وہ اُلجھ کے بولا۔

"کوفتے تو نہیں۔"

"جی، جی ہاں وہی۔" وہ اُچھل کے بولا، "اور ہاں، ماش کی دال کا تو جواب ہی نہیں۔ مرغِ مسلّم، تندوری مرغ اور شیرینی میں زردہ، شاہی ٹکڑے وغیرہ بے شمار قسمیں، بے شمار نام۔"

"پھر تو ہندستان آپ کے لیے نیا نہیں ہوگا۔ آپ اپنے آبا و اجداد کے مانند پوری طرح مسلح ہو کے آئے ہیں۔" میں نے خود کو روکا، بس میری زبان سے نکل گیا اور بہت پچھتاوا ہوا۔

"لقمہ لیتے لیتے پروفیسر کا ہاتھ بھی رُک گیا تھا۔ اُس نے منتظرانہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ یہ قدرت ہر کس و ناکس میں نہیں ہوتی کہ ایک آن میں اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چھا گئی، "آپ ٹھیر کیوں گئے؟"

"مجھے اپنے لہجے میں آلودگی کا گمان ہوا۔"

"کیا خوب!"

"آپ کو یقیناً اچھا نہیں لگا ہوگا۔"

"صرف ایک پَل کے لیے، اور میں اسے جہالت پر محمول کرتا ہوں۔" اُس کی آواز میں کوئی بناوٹ نہیں تھی۔

میں نے خاموشی مناسب سمجھی اور کچھ تامّل کے بعد موضوع بدلنے کے لیے زورا اور جمرو سے پوچھا کہ وہ کیسا محسوس کر رہے ہیں۔

"کیا بات ہے لاڈ لے! قسم سے اِدھر تو ہر کوئی ملکہ بادشاہ ہے، جارج بادشاہ، ملکہ وکٹوریا۔" جمرو چہک کے بولا۔

پروفیسر نے بھی سن لیا تھا، اُس نے تجسّس سے اپنی ٹوٹی پھوٹی ہندستانی میں پوچھا، "یہ بادشاہ ملکہ لوگ کا کیا بولتا ہے۔"

"کچھ نہیں، بس ایسے ہی۔" میں نے ٹالنا چاہا پھر پروفیسر کو مسکراتے ہوئے بتایا تو اُس نے بہت لطف لیا۔

"بادشاہ اور ملکہ بھی آدمی ہوتے ہیں۔"

"ہاں، مگر ہر آدمی بادشاہ اور ملکہ نہیں ہوتا، ہو نہیں سکتا۔"

اُس نے سر ہلا کے تائید کی اور مزاحاً بولا، "اگر سبھی بادشاہ اور ملکہ ہو جائیں تو یہ دنیا کیسی ہو جائے۔"

"پھر کوئی بھی بادشاہ اور ملکہ نہ رہے۔"

"ہاں، ہاں، واقعی واقعی۔" وہ اضطراری انداز میں بولا اور اُس کا چہرہ کھِل اُٹھا۔

پروفیسر کے سامنے تشریح کی ضرورت نہیں تھی کہ بادشاہ تو محکوموں سے ہوتا ہے۔ بادشاہت کے لیے لازم ہے کہ محکوم موجود ہوں۔ میں نے کہا، "آپ نے کبھی سوچا کہ بادشاہ کی سب سے بڑی خوبی شاہی خاندان سے اُس کی نسبت ہے۔ میرے ایک اُستاد کہتے تھے، سنار کا بیٹا سنار، لوہار کا لوہار، عالم کا عالم اور نان بائی کا نان بائی نہیں ہوتا۔ وہ کہتے تھے۔ ہر شخص جاہل پیدا ہوتا ہے، مگر بادشاہ کی فضیلت بادشاہ کے خاندان میں پیدائش ہے۔ صرف بادشاہ کا بیٹا بادشاہ ہوتا ہے۔"

"بہت سے بادشاہ شاہی خاندان سے نسبت کے بغیر بادشاہ بن گئے ہیں۔" پروفیسر نے شستگی سے تردید کی، "اپنی قوتِ بازو سے، یا سازشوں سے۔"

"شاذ و نادر ہی۔ وہ استثنا کے ذیل میں آتے ہیں۔ مگر بادشاہ بن جانے کے بعد اُن کے ہاں بھی یہ سلسلہ جاری ہو جاتا ہے۔ تاج اُن کے فرزندانِ دل بند کے سروں پہ سج جاتا ہے۔ تاج خاندان میں گردش کرتا رہتا ہے۔ قوتِ بازو اور سازشوں سے تخت پر متمکن ہونے والے بادشاہوں کی بھی تو یہی آرزو ہوتی ہے۔"

مہذب آدمی کا جو طور ہوتا ہے، کسی طالبِ علم کی طرح پروفیسر سنجیدگی سے سنتا رہا اور کہنے لگا، "ہاں، یہ سچ ہے۔ آپ کے بیان میں کلام کی گنجائش نہیں، ہے تو جزوی۔ کیسا فکر انگیز پہلو ہے یہ۔"

جمرو اور زورا ہماری گفت گو میں شامل نہیں تھے۔ وہ خوش دلی اور خوش سلیقگی سے کھانے میں مصروف رہے۔ پروفیسر چونکتا، یا قہقہہ لگاتا تو بچوں کے مانند اُن کی آنکھیں چوڑی ہو جاتیں اور پلکیں تھرکنے لگتیں۔ کچھ یہی حال پروفیسر کا ہوتا تھا۔ گاہے گاہے میرے، زورا اور جمرو کے درمیان ہونے والی گفت گو میں پروفیسر کش مکش میں نظر آتا۔ اُس کی سیکھی ہوئی ہندستانی بڑی ابتدائی تھی۔

پروفیسر کے بار بار ٹوکنے پر ہم نے بساط سے زیادہ کھا لیا۔ مجھے خوشی ہوئی۔ جمرو اور زورا کو چھری کانٹے سے کھانے میں کوئی زحمت نہیں ہو رہی تھی۔ یہ بمبئی میں جولین، فیض آباد میں زرّیں کی رفاقت اور طویل سفر میں طرح طرح کے ہوٹلوں میں تجربے کا ثمر تھا کہ میز کرسی، چھری کانٹے کی ولایتی، یا جدید طرز میں وہ مشاق ہو گئے تھے۔ آدمی میں اخذ و استنباط کی صلاحیت ہونی چاہیے اور جست جو۔ چاقو کا ہنر بھی امکان اور شوق سے آتا ہے۔ وقت ہی نہیں ملا، کئی بار خیال آیا کہ خالی اوقات میں پھر اُن کے لیے کتاب و قلم سے شناسائی کا بندوبست کروں۔ اُنھیں اپنی اِس کوتاہی کی بے چینی کم نہیں تھی۔ معاملے کی تہ تک پہنچنے، بال کی کھال نکالنے والے کتابوں کے سلسلے میں کیسے فروتر دوڑتے، چاقو کی گرفت میں ماہر کی قلم کی گرفت بھی اچھی ہونی چاہیے۔ جولین نے بھی کئی بار مجھ سے کہا تھا۔ کبھی فراغت سے بیٹھنے کا موقع ہی نہ ملا۔ بمبئی پہنچتے ہی کانتے چلا گیا، پھر پیرو اور ماچھی، پھر مارٹی اور حیدر آباد سے نواب ثروت یار کا خط آ گیا۔ اور یہ سفر... آدمی کو خود سے فرصت ملے تو اوروں کی طرف دیکھے۔

کھانے کے بعد خدمت گار نے شیرینی کے ڈونگے میز پہ رکھ دیے۔ شیرینی کے بغیر دعوت ادھوری رہ جاتی۔ پھر کالی کافی آ گئی۔ انگریز خود گورے ہوتے ہیں، مگر کالی چیزوں سے بڑی رغبت رکھتے ہیں۔ جمرو اور زورا سگریٹ بیڑی نہیں پیتے تھے۔ کبھی کبھی شوقیہ۔ خدمت گار نے تشتری میں رکھا ہوا 'پلیئرز' کا ڈبا ہماری طرف بڑھا دیا۔ انگلستان کے سگریٹ تھے۔ جمرو اور زورا نے کش پر کش لگائے۔

پروفیسر نے اپنی طرح مجھے کوئی کثیر المطالعہ، فلسفی، عالم جانے کیا کیا سمجھ رکھا تھا۔ میں اپنی معلومات کے مطابق اُس کا ساتھ دیتا رہا۔ پھر مجھے ایسا لگا کہ پروفیسر چپکے سے کوئی بات کرکے، کوئی شوشہ چھوڑ کے چُٹکی بھرنے اور ساتھ تنکے چبھونے جیسا کوئی کام کر رہا ہے۔ کافی ختم ہو گئی تو اُس نے کیتلی سے میری اور اپنی پیالیوں میں اور کافی لوٹ لی اور چسکی لیتے ہوئے بولا،

"مجھے محسوس ہوتا ہے، اب انگریزوں کے لیے یہاں پہلے جیسے دن نہیں رہے، جہاز میں جتنے لوگوں سے ملاقات ہوئی، اُنھوں نے انگریزوں کی تعریف و توصیف کی کہ دیہی ہندستان کو شہری ہندستان بنانے میں انگریزوں کا بڑا کردار ہے۔ بجلی، ریل، مواصلات، قانون، صحت اور تعلیم کے شعبوں میں وہ انگریزوں کی کوششوں اور کارکردگی سے متأثر نظر آئے لیکن اِس برملا اعتراف کے باوجود ایسا معلوم ہوا کہ اُن کے اظہار میں توانائی کی کمی ہے، خوردہ اور ترشی ہوئی آوازوں میں فرق کرنا بہت مشکل ہے۔ شہری معاشروں سے وابستہ لوگ بالعموم اپنے بیان و اظہار میں یوں بھی شعوری ہوتے ہیں، اور اتفاق ہے، بیش تر انھی لوگوں سے مڈبھیڑ ہوئی۔"

"آپ کی اجازت ہو تو ایک بات پوچھوں؟" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"ضرور، ضرور" وہ چستی سے بولا۔

"آپ کیا جاننے کے خواہش مند ہیں؟"

"یہ تو میں آپ کو بتا چکا ہوں۔"

"اور جاننے کے بعد آپ کیا کریں گے؟"

"ظاہر ہے، یہ آگہی، نئی پالیسیاں مرتب کرنے میں کارگر ہوگی۔ نظرِثانی اور ترمیم سے مراد صورتِ حال کی بہتری اور خوش گواری ہے۔"

"میرا خیال ہے، شاید دیر ہو چکی ہے۔"

"کیسی دیر؟" وہ اضطراب سے بولا۔

"ایک بات بتائیے۔"

"خدا مجھ پر رحم کرے۔" وہ سیدھا ہو گیا۔

"میں پیشگی معذرت چاہتا ہوں۔"

"بس خنجر مت گھونپ لیجے گا۔"

"خنجر آپ کا کیا بگاڑے گا، آپ تو بارود کے عادی ہیں۔"

"آپ کے تیور خنجر اور بارود سے کیا کم ہیں، کچھ ایسا لگا جیسے آپ آخری خواہش کے بارے میں پوچھتے ہیں۔" پروفیسر چہچہا کے بولا، "زندگی کی تھوڑی بہت خواہش باقی ہے کہ ابھی کچھ کام نمٹانے رہ گئے ہیں۔"

"ایسے موقعوں پر ہم ہندستانی کہتے ہیں، ہماری عمر بھی تمھیں لگ جائے۔"

"ہندستانی بہت رومان پسند، خیال آفریں ہوتے ہیں۔ شاعرانہ بیانات تو اُنھیں خوب آتے ہیں۔"

"یہی تو اُن کی کجی ہے۔ یہ خواب و خیال، شاعرانہ اطوار مجموعی طور پر مبالغہ عام کرتے ہیں۔ آئینے کے دوسرے رُخ پر شکلیں ٹٹولنے کا عمل شاعری ہے اور کسی خاص وقت اور مقام کے لیے مخصوص ہو تو موزوں ہے، یا عمر کے آخری حصے میں۔ آسمان سے شکایت کرنے، چاند سے لَو لگانے اور ریت کے گھروندے بنانے کی جستجو میں گھڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ یہ ہمہ وقت سوز و ساز اور کھلی آنکھوں کے خواب، یہ پھولوں کی حکمرانی اور پانی میں آگ لگانے کی مہم جوئی، اِس سے ہندستان کو کیا حاصل ہوا؟"

وہ مجھے دیکھا کیا۔ اُس سے کچھ کہا نہ گیا۔ چند لمحے تذبذب میں گزر گئے، پھر اُس نے دھندلائی آواز میں کہا، "آپ کیا پوچھ رہے تھے؟"

"میں تو بھول ہی گیا۔ یقیناً کوئی اہم بات نہ ہوگی۔"

"میرے لیے آپ کی ہر بات اہم ہے۔"

"مجھے محتاط ہونا پڑے گا۔"

"مجھے آپ اپنا دوست سمجھیے۔"

"میرے لیے یہ درجہ عزت کا باعث ہے۔"

"اور میرے سفر کا یہ کتنا اچھا آغاز ہے۔"

میرے جی میں بہت سی باتیں آئیں، لیکن میں خاموش رہا۔ اچانک موسیقی تیز ہو گئی تھی اور لوگوں نے ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالنے کے بجائے الگ الگ ہو کے رقص شروع کر دیا تھا۔ مرد و عورتیں آمنے سامنے بے تحاشا بدن لہرا رہے، تھرک رہے تھے۔ سب جیسے دیوانے ہو گئے ہوں۔ اُن کی نگاہیں ساز بجانے والوں کے ہاتھوں میں تھیں، جتنی تیز تانیں، اُتنی بے قراری، اُتنے پارا پارا۔ چند منٹ تک موسیقار یہ شعبدہ کرتے رہے۔ پھر زور زور سے تالیاں بجنے لگیں۔ موسیقاروں نے ساز بند کر دیے۔ رقص کرنے والوں نے اُنھیں ہوائی بوسے نذر کیے۔

یکا یک ایک نوجوان شعلہ اندام، مگر سنجیدہ لڑکی کی آمد پر پروفیسر ہڑبڑا سا گیا، اور ہم سب بھی۔

"ہیلو پروفیسر!" لڑکی نے پروفیسر کو انگریزی میں مخاطب کیا، "کیسے ہیں آپ؟"

"ہا، میری جان! میں ٹھیک ہوں۔" پروفیسر نے شگفتگی سے کہا، "اور تم... تم کیسی ہو؟ اور وہ اپنا جوان کدھر ہے؟"

"کہاں ہوتا ہے۔" لڑکی نے پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔

"وہی حال ہے، تم نے اُسے روکا نہیں؟"

"میری گزارش پر اب وہ چڑنے لگا ہے۔" لڑکی نے اُداسی سے جواب دیا، "میں نے سوچا ہے، اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ کہنے سننے کا حاصل کچھ نہیں۔" پھر وہ مستعد ہو کے بولی، "آپ بتائیں، سفر کیسا گزر رہا ہے؟"

"بہت پُرلطف، اور آج تو اور زیادہ۔"

"کیوں، آج کیا کوئی نئی بات ہوئی؟"

"آج اِس نوجوان سے ملاقات ہوئی، سمجھو ایک دریافت..." پروفیسر نے میری جانب اُنگلی اٹھائی۔ تم سے تعارف کراتا ہوں، یہ نوجوان..." میرا نام لینے کی کوشش میں وہ ہچکچانے لگا۔ میں نے اُس کی مدد کی، "بابر زماں... اور یہ میرے ساتھی جمرو اور زورا۔"

لڑکی نے مصافحے کے لیے تپاک سے ہاتھ بڑھایا، پہلے مجھ سے، پھر جمرو اور زورا سے، "میں مایا البرٹ۔" اُس نے مسکراتے ہوئے رسمی خوشی کا اظہار کیا۔

"تم کھڑی کیوں ہو، بیٹھو نا۔" پروفیسر نے خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا، "ہم نہایت عمدہ باتیں کر رہے تھے، ہندستان سے متعلق۔"

"میں رقص کے دوران آپ کو دیکھ رہی تھی۔ آپ لوگ بہت مصروف نظر آ رہے تھے۔"

"ارے، تم یہیں تھیں۔ میں واقعی تمھیں نہیں دیکھ پایا۔ ورنہ تو تمھیں بلا لیتا۔ تمھیں بھی تو ہندستانیات سے خاص دل چسپی ہے۔" پروفیسر نے سرسری طور پر مجھے مایا کے بارے میں بتایا کہ اِس کی ماں ہندستانی، باپ انگریز ہے، اور وہ دو سال سے پروفیسر کی شاگرد رہی ہے۔ ہندستانیات کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی آمد پر ایک مقالے میں وہ اُس کی نگرانی میں کام کرتی رہی ہے۔ ماں کی وجہ سے کسی حد تک ہندستانی جانتی ہے اور ہندستان کی ابتدائی واقفیت میں اُس نے پروفیسر کی خاصی مدد کی ہے۔ وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا، "اِس لحاظ سے میں بھی مایا کا شاگرد ہوں، اپنی شاگرد کا شاگرد۔"

"کیا پروفیسر!" مایا نے انکسار سے کہا، "میں خود کتنا جانتی ہوں۔"

سازندے دوبارہ مدھم ساز بجانے لگے۔ موسلا دھار بارش کے بعد جیسے پھوار پڑنے لگی ہو۔ وسط کے دائرے میں کچھ لوگ اِدھر اُدھر سے اُٹھ کے ایک دوسرے میں گم ہونے لگے۔

"آج آپ میرے ساتھ..." مایا نے بات ادھوری چھوڑ دی اور فوری عذر تجویز کر کے پروفیسر کے لیے آسانی پیدا کر دی، بات سے یوں لگا کہ مہمانوں کی موجودگی میں پروفیسر کے لیے شاید اُس کی رفاقت مناسب نہیں ہونی چاہیے۔

"ہاں مایا! میں نے تمھیں بتایا نا، ہم بہت دل چسپ، اور میرے خیال میں نہایت اہم مکالمہ کر رہے ہیں۔" پروفیسر نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا، "کچھ دیر بعد سہی... تمھارے ساتھ ناچ کر تو مجھے سکون کا احساس ہوتا ہے۔"

مایا مسکراتی اور ہماری جانب ہاتھ ہلاتی ہوئی چلی گئی۔

میں نے پروفیسر سے رخصت کی اجازت چاہی تو کہنے لگا کہ سچ تو یہ ہے، اُسے رقص وغیرہ، اِس ہاؤ ہُو میں اب ایسا لطف نہیں آتا۔ وہ تو مایا کی وجہ سے شریک ہو جاتا ہے کہ مایا اُسے بے حد عزیز ہے، وہ جتنی حسین ہے، اُتنی ہی ذہین بھی۔ کہنے لگا کہ ہر اعتبار سے وہ ایک غیر معمولی لڑکی ہے۔

مایا کو کوئی اَدھیڑ ساتھی مل گیا تھا۔ وسطی فرش پر دھیمے دھیمے سُروں پر جوڑے رقص کر رہے تھے، جیسے ہواؤں میں اُڑ رہے ہوں، پانیوں میں تیر رہے ہوں، شاید یہی زندگی کی انتہا ہے۔ دولت، طاقت اور اقتدار کے بعد آسودگی کی زندگی کئی گنا ہو جاتی ہے، دس گنا، سو گنا...

"کیسا لگ رہا ہے، میری مراد ہے یہ رقص، رقص کا یہ انداز؟" پروفیسر کے ٹوکنے سے مجھے اپنی محویت پر ندامت ہوئی، "رشک آ رہا ہے۔" میں نے نچلی آواز میں کہا اور خود کو روک لیا۔ دل میں آیا تھا، کہوں کہ حسد بھی کم نہیں ہو رہا۔

"ہندستانی رقص اور موسیقی مغرب سے بالکل مختلف ہے، یہاں تو ایسا رقص نہیں ہوتا؟"

"یہ بے اختیاری تو سرخوشی اور سرشاری ہی میں ممکن ہے۔ یہاں تو سرشاری ہی عنقا ہو گئی ہے۔"

"مگر ہندستانی رقص اور موسیقی تو منتہائے کمال پر ہیں۔ کہتے ہیں، یہ تو ایک باقاعدہ علم، بڑا وسیع اور منضبط علم ہے، یہ تو

ایک کارنامہ ہے، ایک اعجاز...''

''ماضی کا کارنامہ، داستانِ پارینہ۔ ہندستان صرف ماضی تو نہیں ہے۔ کبھی مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے۔ ماضی کی عظمت، آثارِ قدیم ہی کا چرچا کیوں، ہمارے حال کا کوئی ذکر کیوں نہیں ہوتا۔ کیا ہم محض ماضی ہیں۔ ہندستان کا کوئی حال نہیں ہے؟''

پروفیسر کی پیشانی تنگ ہوگئی۔ اُس کی آنکھیں جلنے بجھنے لگیں۔ ہندستان کا ماضی نہایت عظیم ہے۔''

''ماضی ہی نا! ماضی مٹی ہوتا ہے۔ ماضی کی عظمت کا وہ سلسلہ حال تک کیوں جاری نہ رہا؟''

''میں سمجھتا ہوں، بہ ہر حال، اَب ہندستان ایک بڑے مستقبل کی طرف گام زن ہے۔''

''شکر ہے، آپ نے پہلی بار ایک بزرگ کا طور اختیار کیا۔ مجھے بھی آپ سعادت مندی میں کم نہیں پائیں گے۔''

پروفیسر کشش و پیچ کی کیفیت سے دوچار ہوا، پھر جھپٹنے کے انداز میں اُس نے میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے۔ اُس کی گرفت سے اُس کے احساسات کا اندازہ ہوتا تھا۔ ''اپنا اتنا اسیر مت کیجیے مجھے، آگے مشکل ہو جائے گی۔'' وہ ڈوبی ہوئی آواز میں بے ربطی سے بولا اور کہنے لگا، ''اِس عمر میں کیسی پختگی ہے، اور تپش اور کاٹ!'' پروفیسر کی پل پل رنگ بدلتی حالت سے جمرو اور زورا بھی حیران ہوئے۔

''معاف کیجیے۔'' یہ گمان بڑا قبل از وقت ہے۔'' میرے لہجے میں کسی قدر ناتوانی آئی، ''میں تو پہلا آدمی ہوں۔ آگے آپ کو جانے کتنے میرے ہم صورتوں سے واسطہ پڑے۔''

''قطار میں آپ پہلے آدمی نہیں ہیں۔ انگلستان میں متعدد ہندستانیوں سے واسطہ پڑ چکا ہے۔ وہ بھی آپ سے مختلف تھے۔ اَب آپ سے مل کے سوچتا ہوں۔ کیا انگلستان میں اور قسم کے ہندستانی جاتے ہیں؟''

''ہمی میں سے جاتے ہیں، دو ہاتھ دو پاؤں کے، لیکن آپ کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی اُن پر آپ کی بلند و بالا عمارتوں، بنوع بہ نوع اشیا سے بھرے بازاروں، کرشمہ ساز مشینوں، دیوہیکل دانش گاہوں، کتب خانوں، عجائب گھروں، آپ کی سطوت و جلالت کی ہیبت طاری ہو جانی چاہیے۔ وہ کیا زبان کھول سکتے ہیں۔ فرق بھی کچھ کم نہیں ہے، تین سَو سال، چار سَو سال کا بُعد۔ ابھی آپ ہندستان دیکھیں گے تو بین السطور کا لکھا بھی نظر آ جائے گا۔ ہو سکتا ہے ماقبل تاریخ کی زندہ بستیوں سے آپ کا گزر ہو۔ میں کہتا ہوں موئن جو دڑو، ہڑپا وغیرہ کا واویلا کیوں۔ یہاں تو اُس سے پہلے کی تہذیبیں جوں کی توں سلامت ہیں۔''

''مگر، مگر...'' پروفیسر پُرعزم لہجے میں بولا، ''انگریزوں کی خواہش ہے کہ یہ فصل جلد سے جلد کم سے کم ہو جائے۔''

''مگر انھیں یہ خواہش کیوں ہے؟''

پروفیسر کے جسم میں کانٹا سا چبھ گیا۔ ''کیا انھیں نہیں ہونا چاہیے؟'' اُس کی آواز بکھر گئی۔

''کیا ہندستانیوں نے اُن سے منت کی ہے؟''

''مگر کیا یہ ہندستانیوں کی خواہش اور مفاد کے خلاف کوئی اقدام ہے؟''

''بے شک نہیں، لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ ہندستانیوں نے اِس نیکی کے لیے انھیں مدعو کیا ہوتا۔ اُن سے حاجت روائی کی درخواست کی ہوتی۔''

''ہُنہ!'' پروفیسر کا چہرہ بھاری ہو گیا، ہونٹ پھیل گئے۔

''پھر تو داستان لمبی ہو جائے گی۔''

''مگر اپنے موضوع پر تو قائم ہے۔''

''جی، جی ہاں'' اُس کا سر دیر تک ہلتا رہا۔

میں نے بچی کھچی کافی سے حلق تر کیا اور ایک بار پھر ارادہ کیا کہ پروفیسر سے اجازت لی جائے۔ جمرو اور زورا بندھے اور کھنچے ہوئے انداز میں مسلسل سگریٹ پھونک رہے تھے۔ جگہ کا بھی کیا اثر ہوتا ہے۔ آدمی 'جنٹل مین' بن جاتا ہے۔

پروفیسر کچھ سوچتا رہا، پھر ایک مربیانہ لہجے میں بولا ''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، سفر شروع کرنے سے پہلے ہدایات اور اپنے کام کی نوعیت کی صراحت کے لیے جن متعلق افسروں سے انگلستان میں میری بات ہوئی، سبھی نے ہندستان اور ہندستانیوں کے لیے بہترین خواہشات کا اظہار کیا؟''

میں نے دل میں آئی بات خود تک محدود رکھی۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ لفظوں کی یہ ترتیب و ترکیب تکرار و تواتر سے اب افادیت کھو چکی ہے۔ میری خاموشی پر پروفیسر کو خود احساس ہوا
سب رنگ

اور وہ مجوبیت سے بولا، ''مجھے افسوس ہے، میری تاویل بڑی رسمی اور سفارتی قسم کی ہے۔ یہ اُس رسم و راہ سے انحراف ہے جس کے لیے میں نے خود آپ سے گزارش کی تھی۔''

''میں بھی کچھ یہی کہنا چاہتا تھا۔'' میں نے نرمی سے کہا۔

''جواب میں آپ کی خاموشی عین رسمی اور سفارتی تھی۔'' پروفیسر کنکھیوں سے مجھے گھورتا ہوا چہکتی آواز میں بولا۔

''یقیناً آپ کی ذمّے داریوں میں اشک شوئی، وکالت اور تبلیغ کے اُمور شامل نہیں ہوں گے۔''

''یقیناً نہیں، بالکل نہیں۔'' پروفیسر نے شد و مد سے تردید کی۔

''میں بھی وضاحت کر دوں، میرا مقصود بھی جواب طلبی نہیں ہے۔ اپنے علم اور قیاس کے مطابق مبہم و موہوم جواب مجھے معلوم ہیں۔ میرا مقصد ہے کہ سوال آپ کے پیشِ نگاہ رہیں۔''

''بے شک'' پروفیسر پھر منتشر ہونے لگا، ''کیا، کیا آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟''

''ایسا کچھ نہیں'' میں نے اٹکتی زبان سے کہا، ''بہ ظاہر بچّوں کی سی بات ہے۔ بس یوں ہی دماغ بھنکتا رہتا ہے، ریت سی اُڑتی رہتی ہے سر میں۔ کبھی خیال آتا ہے کہ ہندستان میں انگریزوں کے قیام کا اصل میں مقصد کیا ہے؟''

پروفیسر کا جسم تن گیا۔ وہ کسی معقول جواب کے لیے لفظ ڈھونڈ رہا تھا کہ میں نے اُسے زحمت نہیں دی اور کہا کہ کیا انگریز ہندستان کو انگلستان بنانے کے خواہاں ہیں۔ یہاں کی نرم و گرم آب و ہوا اِس قدر مرغوبِ خاطر ہوگئی ہے کہ رفتہ رفتہ انگلستان کی ساری آبادی ہندستان منتقل کر دینے کا عزم ہے، یا پھر ہندستان کی اکثریت کو اقلیت میں بدل دینے کا کوئی خواب شرمندۂ تعبیر کر دینے کی آرزو ہے؟

''نہیں، نہیں۔'' پروفیسر نے بے قراری سے کہا، ''یہ ستم ظریفی انگریزوں سے ممکن نہیں ہے۔''

''ظاہر ہے۔'' میں نے بہ عجلت کہا، ''یہ ممکن نہیں ہے۔ پھر یہاں اُن کے طولِ اقتدار کا کیا جواز ہے؟ یہ جواز کہ ہندستان تو سونے کی کان ہے۔ یہاں زر و جواہر کے انبار ہیں۔ زمینیں لالہ زار، شجر ثمربار ہیں۔ ہر شخص خوش حال، اطلس و کمخواب
سب رنگ

''کچھ بدمعاشوں نے ہماری گاڑی چرالی ہے۔''

میں ملبوس ہے اور جنسی لیے پھرتا ہے۔ فاتحین کو یہ حق حاصل ہے کہ مفتوحوں سے یہ ناز و نخوت، یہ جاہ و حشمت چھین لیں، چھینتے رہیں، یہ تو فاتحین کی ایک پرانی رسم ہے، اور واقعی یہی کچھ ہے تو انگریزوں کو ہندستان میں اپنی قبولیت و مقبولیت کی توقع کیوں کر ہے۔ مفتوحین کا بھی پھر کوئی طور ہوتا ہے۔ کسی اچھی گھڑی، کسی اچھے ہدف کی فکر میں سرگرداں رہنا اور مناسب موقع ملنے پر غاصب سے کوئی رعایت نہ کرنا۔''

پروفیسر پر سکوت طاری رہا۔ میرے چہرے پر اُس کی نگاہیں گڑی ہوئی تھیں، میں نے ٹھیری ہوئی آواز میں کہا، ''کیا ہندستانیوں کی غربت اور ناداری، دیدہ ریزی و جہاں شناس انگریزوں کے علم میں نہیں ہے؟... ہندستان کی بیش تر آبادی دُکھی ہے، جھونپڑیوں میں رہتی ہے۔ جفاکشی و سخت جانی اُن کا شعار ہے، شعار کیا، اُن کے پاس زندہ رہنے کا کوئی اَور قرینہ ہی نہیں ہے۔ اِدھر سرکارِ برطانیہ نے طرح طرح کے محصول اُن پر عائد کیے ہیں، مگر تحصیل کا سزاوار تو وہی ہو سکتا ہے، جس کے پاس نانِ جویں اور تن پوشی سے کچھ بچتا ہو۔ کیا دردمند انگریزوں نے کبھی توجہ کی کہ اُن کے محصولات کا بوجھ لوٹ پھیر کے اُنھی بدبختاں کی کمر پر آتا ہے جو پہلے ہی بہت ناتواں ہیں۔ اُن محل نشیں اقبال مندوں پر نہیں، جن کے شانے بہت مضبوط اور جن کے قدموں سے زمین بیزار نہیں ہے۔ یہ صاحبانِ تدبیر

یہاں انگریزوں کے مفادات کے نگراں بن چکے ہیں، اور اُن کے نائبین کے فرائض نہایت حسن و خوبی سے انجام دیتے ہیں۔ انگریز کہیں انھیں خطابات سے نوازتے ہیں، کہیں منصب و دولت سے، حکم رانی کا یہ بالواسطہ طریقِ کار تو کیمیا کا گُر ثابت ہوا۔ راستے خود بہ خود روشن ہوتے گئے۔ یہی ہنر مستند و معتبر ٹھیرا ہے، تو اب کوئی نیا تجربہ کیوں کیا جائے۔"

"میں... میں سمجھا نہیں۔" پروفیسر اضطراری لہجے میں بولا، "یہ بالواسطہ حکم رانی سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

"کوئی ابہام نہیں، ذرا غور کیجیے تو سارا کچھ آئینہ ہوجائے گا۔" میں نے اپنی آواز دھیمی رکھنے کی کوشش کی کہ لہجے میں میرے کسی درونِ خانہ عناد کی تپش کم سے کم محسوس ہو۔ یہ قابو یافتگی ایک مشکل کام ہے۔ اِس کے لیے آدمی کو پتھر کا ہونا چاہیے، یا لوہے کا۔ میں نے کہا، "پروفیسر صاحب! میں سمجھتا ہوں، یہ نکتہ انگریزوں کو بہت پہلے معلوم ہوگیا تھا کہ ہندستان کے ہُنر مند، کاشت کار، مزدور آخری درجے کی زندگی گزارتے ہیں اور عملاً اپنے اپنے علاقے کے راجے مہاراجوں، نوابوں، سرداروں، جاگیرداروں اور زمیں داروں کے نرغے میں ہیں، چناں چہ یہی قرینِ عقل تھا کہ وہ انھی ذی حشم، عالی مقام لوگوں پر توجہ مرکوز رکھیں۔ کہیں انھیں نوازشوں سے زیر بار کیا جائے، کہیں قوت و قدرت سے اسیر کیا جائے۔ اِن مقتدر امیروں کی تعداد ہندستان کے حقیر غریبوں کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر تھی، اور ہے۔ دولت مند ویسے بھی خزاں سے بہت ہراساں رہتا ہے۔ زندگی بھر وہ پشتے مضبوط کرتا رہتا ہے کہ آندھیاں اُس کی دہلیز نہ چھوسکیں۔ کہتے ہیں، جتنی دولت، اُتنی مضبوطی، پائداری، اُتنا ہی خوف، انگریزوں نے اِنھی ہوش مندوں کو شیشے میں اُتارا اور فرزندانِ دل پذیر دولتِ انگلیشیہ کے خطاب سے نوازا۔ جن چند ایک سے ہوا کا رُخ نہ پہچاننے کی نادانی ہوئی، انھیں کہیں اماں نہ ملی۔ طاقت سے بڑا طاقت کا دبدبہ ہوتا ہے۔ جہاں ضرورت پڑی، وہاں طاقت کا اظہار کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی گئی۔ جو چند ایک عقل دشمن سرکش ثابت ہوئے، انھیں اُن کی زمینوں سے بے دخل کردیا گیا کہ دوسروں کو عبرت ہو۔ جنھوں نے آسمان کے بدلتے ہوئے تیور بھانپ لیے، اُن کے مدارج بلند ہوئے۔ شہ کی اِس مصاحبت میں اپنے ہم رُتبہ، ہم پیشگاں کو مغلوب دیکھنے کی بھی ایک حسرت نہاں تھی۔ کم حیثیت امیر بڑی حیثیت کے امیر کے لیے بہت کینہ دل میں چھپائے ہوتا ہے۔ انگریزوں نے ہندستان کے اِن صاحبانِ زور و اثر کی باہمی رقابتیں تاک لی تھیں۔ انھوں نے ابتدا میں کم رُتبگاں کے مراتب فزوں کیے۔ الغرض، جو اُن کی پناہ میں آیا، وہ سر بلند ہوا، جو کدورت و کبیدگی کا مرتکب ہوا، وہ معتوب و مطعون قرار پایا۔

سامنے رکھے گلاس سے میں نے گھونٹ بھر پانی پیا اور یوں پروفیسر کے چہرے سے کچھ اَخذ کرنے کے لیے تامّل کیا۔ رنجش اور برہمی کے بجائے اُس کی آنکھوں میں تجسس دیکھ کے مجھے حوصلہ ہوا۔ میرے رُک جانے پر وہ پھر مضطرب ہوگیا تھا۔

"مطلب یہ ہے..." میں نے جکڑی ہوئی آواز میں کہا، "کیا یہ ماجرا حکومتِ برطانیہ کے اہل کاروں کے علم میں نہیں تھا کہ اُن کے عائد کیے ہوئے محصول کن لوگوں پر واجب ہوتے ہیں اور اِن کی ادائی کا بار کون اُٹھاتا ہے، اور یہ کہ اُن کے لائق و فائق فرزند گروہ سے کچھ نکالنے کے بجائے اپنے محکومین کے گرد حصار اور تنگ کردیتے ہیں، نتیجے میں غریب اور پس پا ہوجاتے ہیں۔ انگریزوں کو اپنے خزانۂ عامرہ کی لب ریزی سے غرض تھی، 'کہاں سے، کیسے اور کیوں' کی تشویش حجت کے مترادف تھی۔ حاصل یہ کہ چشم پوشی دانستہ تھی۔ دولت صحیح طور پر تقسیم ہوجایا کرے تو سبھی غریب ہوجائیں، یا سبھی مال دار۔ انگریزوں کو ہندستان میں یہ عادلانہ نظام رائج کرنے کی پوری مقدرت تھی، مگر شاید یہ نیکی انھیں راس نہیں آئی۔ گنتی کے رؤسا، اُمرا تک رسائی، یا اُن کی گرفت میں ایسی رکاوٹ پیش نہیں آتی تھی، جیسی تنگ و تاریک، متعفن اور مردم بیزار گلیوں سے گزر کے انبوہ تک پہنچنے میں ممکن تھی۔ یوں دیکھا جائے تو انگریز ہندستان کے عوام کے حاکم ہونے کے بجائے یہاں کے خواص کے حاکم رہے ہیں۔ درمیان کے یہ لوگ دلالی کے لیے آسانی سے دست یاب تھے۔ کھلی چھوٹ، درگزری اور پشت پناہی اِس خدمت کا صلہ طے پائی۔ اصل میں دونوں ہی کو ایک دوسرے کی ضرورت تھی۔ نیت ایک، مقاصد ایک۔ انگلستان کے

آئین کی طرح افہام و تفہیم کا غیر تحریری معاہدہ دونوں کے درمیان ایک زمانے سے عمل پذیر ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ انگریزوں کو آگہی ہے کہ اُن کے یہ پیشہ ور کارندے اپنے محکومین کی محرومیوں کے سبب سے معتبر و مفتخر ہیں۔ اِس کے سوا اُن کی کوئی اور فضیلت نہیں۔ اِدھر یہ نمک خوار و فا شعار بھی کشورِ انگلستان کے رموزِ سلطانی و جہاں بانی سے خوب واقف ہوچکے ہیں۔ انھیں اندازہ ہے کہ ہندستان میں برطانوی حکومت کے لیے اُن کی حیثیت ستون کی ہے، آڑ کی سی ہے، اور وہ تو تاجِ برطانیہ کا ایک جزوِ لازم ہیں۔ اُن کے وسیلے کی سمندر پار کے آقاؤں کو عادت پڑ چکی ہے۔ اِس تن آسانی میں یہ اِتنی دور جاچکے ہیں کہ اب کوئی اور عملی حکمت وضع کرنا اُن کے لیے آسان نہیں۔ اِتنے عرصے میں ایک مروّت بھی آنکھ میں گھر کرلیتی ہے۔ ویسے بھی گورے سگ پروری میں خاصے ماہر ہوتے ہیں، اور یہ ہندستانی تو غراتے بھی نہیں۔"

اپنے لہجے کی کسیاہٹ خود مجھی کو بُری لگی۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ پروفیسر کٹہرے میں نہیں کھڑا تھا، میں کوئی مدعی نہیں تھا۔ سامنے کے دائرے میں لوگ ابھی تک باہم پیوست، مست و بے خود سازوں کے اشاروں پر رقصاں تھے۔ یہ خوش گوار وقت اور سحر آفریں جگہ اِن مباحث کے لیے یک سر ناموزوں اور یہ سنجیدگی سراسر بے ذوقی تھی۔ غالباً یہی بہتر تھا کہ اپنی بات مکمل کرکے میں خاموش ہوجاؤں۔ وہ کیسے لوگ ہوتے ہیں جن کا سینہ، جن کا خون اُن کے اظہار رائے، لہجہ و لب میں شامل نہیں ہوپاتا۔ پہلے مجھے اِس نظم و ضبط کی مشق کرنی چاہیے تھی، مگر وہی ہوا۔ میرے توقف پر پروفیسر پریشان سا ہونے لگا۔ اِس سے پہلے کہ وہ مجھے ٹوکتا، میں نے نسبتاً بے اعتنائی سے کہا، "سنتے ہیں، وقت یک ساں رفتار سے نہیں چلتا۔ وقت کے تیور کچھ بدلے بدلے سے نظر آتے ہیں۔ میرا خیال ہے، یہ سلسلہ تا دیر جوں کا توں قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ خواہش کی بات نہیں۔ وقت کی کروٹیں محسوس کی جاسکتی ہیں۔ کسی انتہا پر تو ہندستان کے پس ماندگاں کا ردِ عمل بھی فطری ہوسکتا ہے۔ انسانوں کے یہ غول ہزار جان وَروں کی زندگی بسر کرتے ہوں، جان وَر تو نہیں ہیں۔ انگریزوں کو بھی شاید یہ آب کسی تلاطم کا احساس ہوچکا ہے۔ آپ کی آمد کی وجہ بھی، جیسا کہ آپ نے خود بتایا، کچھ اِسی سبب سے ہے۔"

"یقیناً یہی، یہی کچھ ہے" پروفیسر نے اُٹھی ہوئی آواز میں تائید کی اور کہنے لگا، "لیکن صورتِ حال پہلے جیسی قطعاً نہیں ہے۔ انگریزوں نے ہندستان میں ریل کا وسیع نظام پھیلایا ہے۔ بجلی، کارخانے، سڑکیں وغیرہ۔ اِن کے فائدے انگریزوں کے منظورِ نظر، مرغوبِ خاطر لوگوں، نواب، راجے مہاراجاؤں ہی کو حاصل نہیں ہوتے۔ کیا یہ حرکت پذیری مجموعی طور پر ہندستانی معاشرے پر اثر انداز نہ ہوگی؟"

"یہ دوائی بھی خوب ہے" میرے ہونٹ پھیل گئے۔ میں نے زہر خند سے کہا، "کوئی انکار نہیں کہ ہندستان میں شہری معاشرے فروغ پارہے ہیں۔ بڑے بڑے کارخانوں کا قیام، نئی سڑکیں، بہتر رہن سہن کی بستیاں، ریلوں کا جال، نلکوں کے ذریعے پانی، ڈاک اور تار کا جدید طریقہ، بڑے شہروں میں آمد و رفت کے لیے لاریوں، ٹراموں، موٹر گاڑیوں کا رواج، جدید طرز کے شفاخانے، نئی تعلیم کے اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں۔ یہ سب کچھ ہوتا دکھائی دے رہا ہے، مگر ساتھ میں کچھ اور اقدام بھی تو ضروری ہیں۔ کیا اُن لوگوں کی سرپرستی سے انگریزوں نے ہاتھ اُٹھالیا ہے جو ہندستان کے عام آدمی کی شکستگی کا بنیادی سبب ہیں۔ یہ دو رنگی تو ایک تماشا ہوئی۔ کیا ایک مقام سے دوسرے مقام تک ہفتوں کے فاصلے پہروں میں سمیٹنے والی ریل اور پلک جھپکنے میں بام و در روشن کردینے والے قمقموں نے دُور افتادگاں کے لیے روز و شب کی منزلیں سہل کردی ہیں۔ اِن سیاہ روزگاراں کی نس نس میں اُترے اندھیرے مٹا دیے ہیں؟ آپ کے ناز بردار مراعات یافتگاں کے تسلط سے انھیں نجات مل گئی؟ میں پوچھتا ہوں، اِس ایک جرأت میں

کیا قباحت ہے۔ آدھی دُنیا پر قائم سلطنتِ برطانیہ عُظمیٰ اپنے کاسہ لیسوں کے غلبہ واثر کے آگے لاچار ہے کیا؟ ضرور کوئی اَور بھید ہے۔ سرکارِ برطانیہ کو اعتماد نہیں ہے کہ اِن سہاروں کے بغیر وہ ہندستان پر قبضہ وتصرّف میں کام یاب رہ سکتی ہے؟ دوسری کسی حکمت میں اُسے بساط بکھر جانے کا اندیشہ ہے۔"

"ابھی میں اِس باب میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔" پروفیسر نے پژمردگی سے کہا۔"بادی النظر میں آپ ہی کا تجزیہ دُرست معلوم ہوتا ہے، تاہم حکومتِ برطانیہ اپنے اِن بہی خواہوں، یا دوستوں کی رفاقت سے یوں ایک جھٹکے میں دست بردار بھی تو نہیں ہوسکتی۔"

"کیوں نہیں ہوسکتی۔ اِن لوگوں کو بے دولت کر دیجیے۔ دیکھیے، کیسے بے دست وپا ہوجائیں گے۔ اِن کی موجودی میں عام ہندستانی کو نئی زندگی دینے کی خواہش، خواب کی حیثیت رکھتی ہے۔ پچاس فی صد، بل کہ نوّے فی صد دیہی آبادی تو آپ کے رفیقانِ خاص کی رعیت ہے، غلام ہی کہیے، یہ اُن کے مالک ومختار ہیں، اَن داتا ہیں۔"

"بات بہت دُور تک جاتی ہے۔" پروفیسر کی آواز کھوسی گئی، "میں سمجھتا ہوں، یہ میری خوش فہمی بھی ہوسکتی ہے کہ ہندستان میں صنعتی رجحانات اور شہروں کے فروغ سے کوئی تبدیلی، بہ ہرحال، لازم ہے۔ سست رفتاری سے سہی، لیکن فرق پڑنا چاہیے۔"

بہت سے جواب میرے ذہن میں گردش کیا کیے۔ میں نے خود کو باز رکھا۔ مجھے کسی اختلاف و انحراف کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے تو اپنے آپ پر حیرت تھی کہ میری زبان کیوں اِس قدر رواں ہے۔ مجھے ان مسائل ومباحث سے کبھی ایسا شغف نہیں رہا۔ سفر کے دَوران کبھی کبھار، اسٹیشنوں کے کتاب فروشوں سے اِکّا دُکّا رسالے، اخبار اور کتابیں خرید کے سرسری نظر ڈالنے سے آدمی عالم فاضل نہیں ہوجاتا۔ کوئی بھی اُلٹی سیدھی بات کسی لمحے مُنھ سے نکل سکتی ہے۔ آدمی کو جس موضوع پر دست رس نہ ہو، اُس پر لب کشائی سے پرہیز ہی کرنی چاہیے، اور میرے لہجے میں تمام تر احتیاط کے باوجود یہ کیسی سوزش عود کرآئی ہے۔ یہ تو ایک نقص ہے۔ میں نے خود کو تلقین کی کہ بس، اِتنا ہی بہت ہے۔ پروفیسر کو زچ کرکے ہندستان کے لیے برطانوی سرکار کی فکری نہج بدل جانے کی کوئی توقع میرے دل میں جاگزیں ہے تو کیسا طفلانہ پن ہے۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا کہ بات بہت دُور تک جاتی ہے۔ شاید مجھ میں کُھل کے اُس کے سامنے مدعا بیان کرنے کی سکت نہیں ہے۔ خود فکری، خودنگری، کوچہ گردی اور چاقو بازی کے سوا مجھے کام بھی کیا رہا ہے۔

ساز دھیمے ہوتے ہوتے ٹھیر گئے اور ہر جانب ہلکا ہلکا شور گونجنے لگا۔ رقص میں مستغرق جوڑے اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ مایا اپنے خوش پوش رقص شریک سے جدا ہوکے لپکتے قدموں سے ہمارے پاس آگئی، اور پروفیسر سے رسمی اجازت لے کے اُس کے پہلو میں رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"تھکی تھکی لگ رہی ہو، کیا پیوگی!" پروفیسر نے مشفقانہ لہجے میں کہا،"تھوڑی سی شراب ایسے وقت اکسیر کا درجہ رکھتی ہے، مگر شراب سے تمھیں بیزاری ہے۔"

"ایسا نہیں کہ کبھی چکھی ہی نہ ہو۔" مایا کے ترشے ہوئے ہونٹ سکڑ گئے۔ "لیکن اب تو اِس کے ذکر ہی سے طبیعت اُلجھنے لگی ہے۔"

"تو کیا پیوگی؟"

"ابھی رہنے دیجیے۔" مایا اپنے دراز سیاہ بال درست کرتے ہوئے بولی،"کچھ دیر بعد..."

وہ مغربی اور مشرقی حُسن کا ایک دل کش امتزاج تھی، سیاہ آنکھیں، گھنی پلکیں، کشیدہ قامت، سجیلے نقش ونگار، ستواں ناک، موتیوں سے دانت، نہ بڑے، نہ چھوٹے، سرخ وسپید رنگت میں جیسے قدرت نے چٹکی بھر سُرمے کی آمیزش کردی ہو۔ الغرض، سانچے میں ڈھلا سراپا۔ جانے کیوں، مجھے ڈاکٹر رائے کی بیٹی بینا یاد آرہی تھی۔ دونوں میں ایسی مماثلت نہیں تھی، مگر حُسن وجمال کی کوئی ایک معیاری مثال نہیں ہوتی، اور کسی کو کسی پر فوقیت نہیں دی جاسکتی۔ دینی بھی نہیں چاہیے، باطنی خوبیاں بھی تو حُسن کا حصّہ ہوتی ہیں۔ مایا کے بارے میں مجھے کیا معلوم تھا، بینا ایک ہمہ صفت لڑکی تھی۔ پروفیسر نے سچ کہا تھا، مایا کی آنکھوں سے ذہانت چھلک رہی تھی۔ رفتار، گفتار، نشست، برخاست سے شائستگی اور نفاست عیاں تھی، اعلا قسم کا سیاہ مغربی لباس پہنے ہوئی تھی۔

"میں پھر مخل ہوئی، آپ کیسی اہم اور دل چسپ باتیں کررہے تھے کہ گردوپیش کا کچھ ہوش ہی نہیں تھا؟"

"ہم تمھارے انگلستان اور تمھارے ہندستان کے بارے میں بات کررہے تھے۔" پروفیسر نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"میں شریک نہیں ہوسکتی؟" مایا اشتیاق سے بولی۔

"کیوں نہیں، تم اُس وقت چلی گئیں۔ کاش، یہیں ہمارے ساتھ موجود رہتیں۔ اِس نوجوان کی زبان سے جیسے سارا ہندستان کلام کررہا تھا، جیسے ہندستان اپنا مقدمہ پیش کرتا ہو۔"

"اور انگلستان کٹہرے میں کھڑا ہو۔" مایا کے رخساروں پر شوخی پھوٹ پڑی، کم کم چہرے ہنستے ہوئے اِس طرح گل زار ہوتے ہیں۔

"برصغیر میں برطانوی راج پر اِس کا تجزیہ کیا فکر انگیز ہے۔"

"کیا کہتے ہیں یہ صاحب؟" مایا خالص ہندستانی انداز میں ٹھنک کے بولی۔ ایک لمحے کے تذبذب کے بعد اُس نے میرا نام لیا،"بابر زماں! یہی نام بتایا تھا آپ نے؟"

"آپ کو بہت یاد رہا۔" میں نے تعجب سے کہا۔

"یہ بڑی حساس، یادداشت کی پختہ ہے۔" پروفیسر ستائشی نظروں سے مایا کو دیکھتے ہوئے بولا، اور والہانہ اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "یادداشت کی پختگی اور حساسیت آدمی کو مضطرب بھی بہت رکھتی ہیں۔"

"کیا کرتے ہیں آپ؟" مایا نے کھنکتی آواز میں پوچھا۔ مجھے تامّل ہوا۔"کیا بتاؤں۔" میں نے مسکرانے کی کوشش کی اور کہا،"سیروسیاحت کرلیجیے۔"

"ظاہر ہے، کسی مقصد سے۔" وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی، "میری مراد ہے، کون سے پیشے سے وابستگی ہے۔"

"سچ پوچھیے تو ابھی کوئی کام شروع نہیں کیا، ابھی تو بس یوں ہی..." میں اُسے کیا بتاتا، میں نے جھجک کے کہا،"مجھے کچھ آتا بھی تو نہیں ہے۔"

میرے جواب سے اُس کا تجسّس فزوں ہونا چاہیے تھا، لیکن اُس کا تعلق پولیس سے نہیں تھا، اُس کی تربیت ایک متمدّن

"تم جیت گئے ناہربرٹ!"

گھرانے اور معاشرے میں ہوئی تھی۔ شاید یہ اخذ کرکے کہ مجھے خود کو افشا کرنے میں کوئی عار ہے، وہ شگفتگی سے کہنے لگی، "یقیناً کسی بڑے گھر سے تعلق ہوگا، میری ماں نے مجھے ہندستانی رئیسوں کے قصّے کہانیاں سنائی ہیں کہ وہ کوئی کام ہی نہیں کرتے، سیروسیاحت کرتے ہیں، شکار کھیلتے ہیں، شطرنج کھیلتے، مرغ بازی، کبوتر بازی کرتے، رنگ رلیاں مناتے ہیں اور ہاں، حکم چلاتے ہیں۔"

"حکم چلانا بھی تو ایک کام ہے۔" جی میں آیا، کہوں، 'اور گورے یہاں کیا کرتے ہیں۔' میں چپ رہا کہ طبعِ نازک پر بَد بیانی بار ہونے کا گمان ہوا۔ میں نے پوچھا،"آپ پہلی بار ہندستان آئی ہیں؟"

"میں ہندستان ہی میں پیدا ہوئی تھی۔ چھ سال کی عمر تک یہیں رہی، پھر انگلستان چلی گئی، بعد کو یہاں آنا ہی نہیں ہوا۔"

"کچھ یاد ہے یہ ہندستان؟"

"صرف پرچھائیاں، دُھندلی دُھندلی سی یادیں۔" مایا خواب ناک لہجے میں بولی،"ماں نے بتایا تھا، شمالی ہند کے ایک پہاڑی علاقے، نہایت خوب صورت مقام شملا شہر میں میری پیدائش ہوئی تھی۔ ہمارے قریبی عزیزوں کا تعلق

ریاست بھوپال سے تھا، لیکن عیش تر دلی میں رہتے تھے۔ شادی کے بعد کوئی واسطہ ہی نہیں رہا ماں کا کسی سے، اس لیے کہ ماں نے سارے خاندان سے جھگڑ کے میرے باپ سے شادی کی تھی۔ لیکن اب میں... مجھ میں انھیں دیکھنے کی خواہش منڈلاتی ہے۔"

"مایا کا باپ ہندستان میں تعینات برطانوی فوج میں بریگیڈیئر تھا، نہایت عمدہ شخص، کم سے کم فوجی اور زیادہ سے زیادہ شاعرانہ خوبیوں کا حامل، کتابوں کا رسیا۔" پروفیسر نے دخل دیا۔ "میرے اُس سے پرانے مراسم تھے۔ عرصے تک وہ مجھ سے دُور ہندستان میں رہا۔ اُس نے کئی بار بلایا، مگر آنا ہی نہ ہو سکا۔ ہندستان میں اُسے ایک ہندستانی لڑکی پسند آ گئی، یہیں شادی کر لی، پھر اُسے انگلستان واپس بلا لیا گیا۔ میجر جنرل کی حیثیت سے ریٹائر ہوا۔ ایک بیٹا ہوا، ایک بیٹی... یہ مایا۔ بیٹا برطانوی شاہی فوج میں پائلٹ ہو گیا تھا۔ دو سال ہوئے، ہوائی حادثے میں زندہ نہ رہ سکا، نوجوان بیٹے کی موت کا صدمہ باپ سے برداشت نہ ہوا، وہ بھی جلد ہی چل بسا۔"

"اوہ۔" میں نے افسوس کا اظہار کیا۔

"وہ سب کچھ نہ دُہرائیے پروفیسر۔" مایا نے آزردگی سے کہا، "لوگ بچھڑ ہی جاتے ہیں، اچھے بُرے سبھی۔"

"ہاں، یہ میں کیا ذکر لے بیٹھا۔" پروفیسر شرمندگی سے بولا، "واقعی میں بوڑھا ہو رہا ہوں۔" پھر موضوع بدلنے کے لیے وہ مجھ سے مخاطب ہو کے تیزی سے بولا، "ہم کیا بات کر رہے تھے؟"

"آپ بھی تو کچھ کہیے، کچھ انگلستان کے بارے میں بتائیے، وہاں کے موسم... کچھ وہاں کی باتیں... سنا ہے، آنکھیں پھٹ جاتی ہیں آپ کے کرشمے دیکھ کے..."

پروفیسر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ "مگر میں استفادہ کر رہا تھا۔" وہ خوش وضعی سے بولا۔

"کچھ مجھے بھی اس کا موقع دیجیے۔ آپ اوکسفرڈ میں اُستاد رہے ہیں۔ استفادے کی گزارش تو مجھے آپ سے کرنی چاہیے۔"

"اس کا بھی وقت آئے گا۔" وہ شوخی سے بولا، "ہر چند مجھے شبہ ہے کہ میں آپ کے لیے کسی اضافے کا موجب ہو سکوں گا۔"

"دیکھیے، آپ نے خود ہی میری فہم کی کجی کی تصدیق کر دی۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

"اوہ نہیں، بہ خدا نہیں۔" وہ بے چین ہو گیا۔

"مگر کچھ غلط بھی نہیں ہے۔"

"ایسا نہیں ہے۔" وہ سر جھٹکنے لگا، "اس طرح نہیں جناب! شرمندہ مت کیجیے۔ میں نے کچھ دیر پہلے آپ سے کہا تھا کہ اب تک جتنے ہندستانیوں سے ملنے کا موقع مل سکا ہے، اُن میں آپ سب سے ممتاز ہیں۔ یاد ہے آپ کو؟"

"جی!" میں نے سر جھکا لیا۔

"ازراہِ کرم مجھے ایک طالب علم سمجھیے۔" وہ منکسر لہجے میں بولا، "میں نے آپ کی ہر بات تحسین کی ہے۔"

"لیکن میں تو... میں تو..." میں نے بھنچی ہوئی آواز میں کہا، "یہ ایک بے خیال اور بے علم کی عزت افزائی ہے۔"

"اور میرے لیے یہ اعتراف طمانیت کا باعث ہے۔" پروفیسر کے لہجے میں ذرا بھی بناوٹ نہیں تھی، کہنے لگا، "آپ کیسی اہم باتیں کر رہے تھے۔ وہ سلسلہ جاری رکھیے۔ ضرور کوئی لحاظ مانع آ گیا۔"

"شاید میری وجہ سے۔" مایا ہمک کے بولی۔

"نہیں، بالکل نہیں۔ شاید پاس کچھ بچا ہی نہیں ہے۔"

"ڈی گریز!" پروفیسر نے بے کلی سے کہا، "میں آپ کو اپنی استقامت کا یقین دلاتا ہوں۔"

"مجھے اندازہ ہو چکا ہے۔"

"اور درخواست بھی تو میں نے ہی گزاری ہے۔"

"اب آپ شرمندہ کر رہے ہیں۔"

"میں تو آپ کا بے حد ممنون ہوں، ایک اجنبی کو آپ نے اتنا وقت دیا۔ یہاں آنے کی زحمت کی۔"

"سچ تو یہ ہے، آپ کے توسط سے ہمیں اس ممنوعہ جگہ باریابی نصیب ہوئی۔ اس طرح انگلستان کی ایک جھلک دیکھ لی۔ یہ سب کچھ کیسا خواب ناک ہے۔ موسیقی، خوش بُو اور اتنے دل کش، خوش منظر لوگ۔ آپ سے ملاقات نہ ہوتی تو اتنے قریب ہو کے بھی ہم اس نظارے سے محروم رہتے۔"

"ہاں۔" اُس کی آواز بجھ گئی، "مجھے معلوم ہے، اُنھوں نے اس جگہ انگریزوں کی موجودی میں ہندستانیوں کا داخلہ بند کر رکھا ہے۔ صرف چند ہندستانی استثنا میں آتے ہیں، وہ لوگ ہیں جو کسی انگریز کے مہمان ہوں۔ یہ ایک عجیب بات ہے۔ میں اس پابندی کی توجیہ نہیں کر سکتا۔ میرے لیے یہ رویہ حیران کُن بھی ہے اور تکلیف دہ بھی۔"

"آپ کا تعلق چوں کہ درس و تدریس سے رہا ہے۔ اس لیے یہ سب آپ کو عجیب سا لگنا چاہیے۔ کچھ دنوں ہندستان میں رہ کے آپ اس تفریق کی توجیہ آسانی سے کر سکیں گے۔ ہم تو اب عادی ہو چکے ہیں۔ ہمارے لیے یہ اتنی اہم بات نہیں رہی۔"

"ہُنہ۔" پروفیسر شانے اُچکا کے رہ گیا۔

"یہ تو خیر انگریزوں کی بات ہوئی۔ وہ بہت دُور سے اپنے خاص مزاج اور رسم و رواج کے ساتھ آئے ہیں۔ یہاں تو آپس میں بھی بڑا بھید بھاؤ ہے۔ نواب راجا اور بلند مرتبت جاگیرداروں اور زمیں داروں کا بھی اپنے ہم وطنوں سے کچھ یہی سلوک ہے، اور اس سے آگے کی منزل بھی ہے۔ یہاں آدمی اچھوت بھی ہوتا ہے۔ ایک کے چھونے سے دوسرا آدمی میلا، ناپاک ہو جاتا ہے۔"

"میں نے پڑھی ہیں اس مسئلے پر کئی کتابیں، لیکن امیری غریبی کے بجائے اس امتیاز کی بنیاد ہندوؤں کی ذات پات کا اٹل قانون ہے۔" پروفیسر کسمساتے ہوئے بولا، "مگر ایک اور بات! کچھ لوگ غریب، کچھ آسودہ حال، کچھ امیر و کبیر، ایسا کیوں ہے کہ ہر معاشرے میں بعض لوگ غریب، بعض امیر، بعض پست، بعض بلند ہوتے ہیں، یا ہو جاتے ہیں، غالباً جسمی، یا دماغی اعتبار سے توانا لوگ آگے نکل جاتے ہیں۔"

"معاف کیجیے، میں آپ سے متفق نہیں۔" میں نے ناگواری سے کہا، "کیا آپ جسمی و دماغی اعتبار سے برتر لوگوں کو ہمارے ہاں کے روایتی زمیں داروں کے مشابہ قرار دے رہے ہیں۔ ہمارے یہ جاگیردار، اپنے آبا و اجداد کے پس خوردے کے سبب سے ممتاز ہیں۔ یہ جدی پشتی ورثے دار دوسرے اور خود اپنے معاشرے کے صاحبانِ علم و فن سے کس طرح مماثل ہو سکتے ہیں۔ خداداد خوبی، اکتسابی خوبی اور ورثے کی خوبی میں کوئی تو ترجیح ہونی چاہیے۔ ترکے کی دولت و امارت کے سوا ہمارے سرفراز لوگوں کی اور کیا خوبی ہے۔"

"ہاں، بے شک۔" پروفیسر مایوس آواز میں بولا، "سب سے قابلِ قدر اکتسابی خوبی ہے۔"

"اس کے لیے بڑی ریاضت کرنی پڑتی ہے، اور کبھی عمر صرف ہو جاتی ہے۔"

"اور کبھی عمر بھر کے ایثار، تگ و دو کے بعد بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ آدمی پیاسا چلا جاتا ہے۔"

"مگر اس تشنہ کامی کی یہ سرشاری اپنی جگہ ہے کہ عمر یوں گنوائی تو نہیں۔"

"میں دیکھ رہا ہوں۔" پروفیسر نے چمکتی آنکھوں سے کہا، "دیکھا مایا؟"

مایا کے رخساروں پر ایک رنگ آ کے گزر گیا۔

"کھلی آنکھوں کے خوابوں نے مشرق کو ایک فسانہ بنا دیا۔ مصوری، شاعری، موسیقی، صناعی و عمارت سازی، تصوریت، عینیت۔" میں نے کہا، "مشرق تو اب محض ایک یادگار ہے۔ مغرب کے عجائب خانوں میں سجائی جانے والی کوئی نادر چیز اور ہندستان تو بہ طورِ خاص..."

"اتنا نہیں۔" پروفیسر نے شکایتی انداز میں ہاتھ اُٹھا کے مجھے روکا، "مشرق کی عظمت ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے، ایک زندہ اور فعال عظمت..."

"مگر حاصل کیا ہے؟"

پروفیسر کے ہونٹ متحرک ہو کے رہ گئے۔

معاً اُسے پھر کسی خیال نے پریشان کیا، بے قراری سے بولا،

"ہم ہندستان کی بات کر رہے تھے اور میں کہنا چاہتا تھا، شجرے سے سربلند، عزّت مآب ہندستانی نوابین، راجے مہاراجے وغیرہ انگریزوں کی تخلیق تو نہیں ہیں۔ یہ نظام تو انگریزوں کی ہندستان میں آمد سے پہلے بھی رائج تھا۔"

"پر انگریزوں نے اسے ختم تو نہیں کیا۔ انھوں نے اس ادارے کو اَور تقویت دی۔ انگریز تو انسانی حقوق کے علم بردار، روشن خیال معاشرے سے آئے تھے۔ انھوں نے عام ہندستانی کو کس انقلاب سے دوچار کیا۔ کون سے اُس کے دن پھیر دیے، وہ زیادہ غریب اَور زیادہ بے وقار ہُوا۔ صدی کے لگ بھگ کا دورانیہ ہے، کوئی مختصر مدّت نہیں ہے۔"

"ہاں، ہاں۔" پروفیسر نے بے تابانہ میری ہم نوائی کی۔

"تو خلاصہ یہ ہے آپ کی رائے میں، عام ہندستانیوں کی شکستگی اور مایوسی کی وجہ انگریزوں کے پروردہ، خطاب یافتہ، بااثر، زورآور لوگوں کا وجود ہے۔ جب تک یہ لوگ انگریزوں کی نگاہوں کا مرکز و محور رہیں گے، ہندستان کے عام آدمی کی زندگی میں تبدیلی نہیں آ سکتی۔"

"صرف یہی نہیں، یہ تو ایک پہلو ہے۔"

"پھر دوسرا! مزید کیا؟ کیا..." پروفیسر بے ترتیبی سے بولا۔

"میری ذاتی رائے کو اجتماعی رائے پر محمول مت کیجیے۔"

"ہر شخص کی رائے کسی ایک طبقۂ خیال کی نمائندگی ضرور کرتی ہے۔"

"ہو سکتا ہے، لیکن میں واضح کر دوں کہ میں کسی خاص گروہ 'طبقے' اور مکتبِ خیال سے کبھی متعلق نہیں رہا۔"

"رائے کے قیام کے لیے یہ الحاق ضروری نہیں ہے۔ بہ ہر حال، اِسے جانے دیجیے، ہو سکے تو اَور اسباب کی نشان دہی کیجیے۔"

"ہاں!" میں نے سر اُٹھا کے کہا، "کوئی ایک وجہ نہیں، صبح ہو جائے گی اور اسباب کا شمار ختم نہیں ہوگا، مگر... مگر سب سے بڑا سبب تو آپ خود ہیں۔"

میری اِس جسارت اور گستاخی پر پروفیسر کے جسم میں کوئی تموّج نمودار نہ ہوتا تو مجھے اُس کے حواس پر ہر قسم کا شبہ کرنا چاہیے تھا، اُس کے دیدے گھوم گئے، چہرے کا رنگ متغیر ہُوا اور وہ عجب بے چارگی کی کیفیت سے نبرد آزما نظر آیا، البتہ اُس کی آنکھوں میں روشنی جیسے پھوٹنے لگی۔

"انگریز اگر نجات دہندہ بن کے آتے تو ہندستان میں اُن کی پذیرائی کسی اَور انداز سے ہوتی۔" میں نے تیز لہجے میں کہا، "دیکھنا یہ ہے کہ حاکمیت کی اِتنی طویل مدّت میں انھوں نے ہندستان کو مکمل طور پر مسخر کیا ہے یا نہیں، اور سیدھی سی بات ہے، ہندستانی اُن سے خوش ہیں، یا ناخوش۔"

"کسی جگہ بھی باہر سے آنے والوں کو پسندیدگی سے نہیں دیکھا جاتا۔"

"نہیں جناب!" میری زبان اُمڈ رہی تھی اور نرمی و گداز میرے بس میں نہیں رہا تھا۔ میں نے پھر اِس جبر کی کوشش ہی ترک کر دی۔ میں نے کہا، "مصلح، مشکل کُشا، نجات دہندہ حاکموں کو سر آنکھوں پہ بٹھایا جاتا ہے۔ ابتدا میں ممکن ہے کہ اُن سے مخاصمت، کدورت برتی جاتی ہو، لیکن یہ انھی پر منحصر ہے کہ اپنی رعایا کا تکدّر وہ کس طرح دُور کرتے ہیں۔ یہی مکمل تسخیر ہے۔ کسی ملک کے حالات سُدھارنے، تاریکیاں دُور کرنے اور محض مہم جوئی، جنگ جوئی، مال و دولت کے لیے آنا دو مختلف باتیں ہیں۔"

پروفیسر نے نہ تائید کی نہ تردید، گُم صُم سا بیٹھا رہا۔

"ساری بات نیت کی ہے۔ آپ کتنی ہی ریلیں چلائیں، قمقمے روشن کریں، دانش گاہیں تعمیر کریں لیکن آپ ہندستان کو اپنا ملک تو نہیں سمجھتے۔ آپ کا ملک انگلستان ہے۔ جب تک آپ ہندستان میں ضم نہیں ہوں گے اور ہندستانیوں کی حیثیت سے اِس خطۂ زمین کی فکر نہیں کریں گے، ہندستانی آپ کو اجنبی ہی سمجھیں گے۔ آپ کہیں گے کہ انگریزوں کا اپنا ایک وطن ہے، ایک عظیم الشان ملک۔ وہ اُس سے نسبت ترک کر کے ہندستانی کیسے بن سکتے ہیں۔ پھر اُن سے یہاں کس نے التجا کی ہے کہ وہ اِتنی دُور آ کے ہندستان کی گرم مرطوب آب و ہوا، اِس گرد و غبار میں بسیرا کریں، اور اُنھیں اپنے وطن سے ایسی ہی وابستگی ہے تو واپس چلے جانے میں کیا پس و پیش ہے۔ وہ آخر یہاں کیوں رُکے ہوئے ہیں۔"

پروفیسر کو خاموش ہی رہنا چاہیے تھا کہ تدبّر اور سنجیدگی کا یہی قرینہ ہے۔ کسی مناسب دلیل، معقول جواب ہی کی صورت

میں لب کشائی اچھی ہوتی ہے۔

میں نے اُس سے کہا، ''آپ کہیں گے کہ انگریز فاتح ہیں اور فاتحین کو اختیار ہے کہ وہ جب تک چاہیں، اپنے مفتوحہ علاقوں میں قیام کریں۔ ہندستان میں فاتحین کی آمد کوئی نیا حادثہ نہیں ہے۔ پہلے بھی یہاں مختلف سمتوں سے یورش و یلغار ہوتی رہی ہے، مگر اُن فاتحین اور آپ میں بڑا فرق ہے۔ چنگیز خاں آئے، لوٹ مار مچا کے چلا گیا۔ سکندر بھی نہ ٹھہر سکا۔ اُنھی جیسے دو ایک اور مہم جوئی کا شوق پورا کر کے آگے بڑھ گئے۔ اُن کے بعد جس نے بھی ہندستان کا رُخ کیا، وہ اِسی سرزمین کا حصہ بن گیا۔ وہ سب کے سب مشرقی تھے اور ہندستانی معاشرت اور مزاج سے ایسی مغائرت نہیں رکھتے تھے، اُن کے مقاصد انگریزوں سے قطعی مختلف تھے۔ اُن کے پاس ہندستان کے پسے ہوئے لوگوں کو مرتبہ دینے کا ہُنر بھی تھا۔ اُنھوں نے اچھوتوں کو اپنے دسترخوان پر ساتھ بیٹھنے کی عزت دی۔ اُنھوں نے ہندستانیوں سے اُنھی کی زبان اور لہجے میں رسم و راہ بڑھانے کی جستجو کی۔ اُنھوں نے ہندستانی بود و باش، موسیقی، ذائقے، تعمیر کے فن کو داد و تحسین دی اور مختلف گوشوں میں اپنی اور ہندستانی تہذیبوں کا ایک ایسا آمیزہ تیار کیا، ایسا امتزاج پیدا کیا جو ہندستانیوں کے لیے نہایت دل پذیر ہوا۔ اُنھوں نے ہندستانی اطوار سے یک سر انحراف نہیں کیا اور عداوت نہیں برتی، اور وہ تو یہیں بس گئے۔ یہیں شادیاں کیں، یہاں کی دولت یہیں پر خرچ کی۔ انھوں نے خود کو ہندستان سے جدا نہیں سمجھا۔

''اور انگریزوں نے کیا کیا؟ ٹائی کی گرہ کھولنی بھی گوارا نہ کی، نہ جوتے کے تسمے کھولے۔ فرش پر بیٹھنا کسرِ شان جانا، ذائقوں پر مُنہ بنایا۔ اپنی زبان پر اصرار کیا۔ اُنھیں ہندستان کی سانولی عورتیں بہت دل کش لگتی تھیں، لیکن اِن عورتوں کو زوجیت میں لینے اور اپنی نسل میں پیوند لگانے سے اجتناب کیا۔ انگریز تو انگریز ہی رہے، لاٹ صاحب، صاحب بہادر، ایک صدی گزر جانے کے باوجود وہ ہندستانی نہ بن سکے، اِس لیے کہ وہ ہندستانی بننا ہی نہیں چاہتے۔ یہ کیسا تماشا ہے؟ بادشاہ اُس کنارے، رعایا اِس کنارے، ایک برِّ اعظم سے دوسرا برِّ اعظم۔ بیچ میں چھ ہزار میل کا فصل، دریاؤں، جنگلوں، پہاڑوں، صحراؤں سب رنگ

اور سمندروں کے پار انگلستان کے بادشاہ، وزیرِ اعظم، ایوانِ بالا، ایوانِ زیریں اور پریوی کونسل قائم ہیں۔ اُن کے فرستادگاں برِّ صغیر کے حکم راں ہیں اور تابعِ فرمانِ فرماں روائے مملکتِ برطانیۂ عظمیٰ بھی۔ اشارے انگلستان سے ہوتے ہیں، کٹھ پتلیاں یہاں شعبدے دکھاتی ہیں، کارندوں کی سُرخ رُوئی کارکردگی پر ہے، اور بہتر کارکردگی سے مراد برِّ صغیر میں برطانوی سلطنت کا پہلے سے زیادہ اور زیادہ استحکام ہے، اور استحکام سے مراد ہندستانیوں کی پہلے سے زیادہ بے ترمال و دولت کی کشید بھی ہے۔ قرائن کہتے ہیں کہ یہ جاں نثار سب خیر ہے کے جاں فزا نامے بالعموم اپنے آقائے ولی نعمت کو ارسال کرتے ہوں گے۔ ممکن ہے، کبھی اُن مراسلوں میں وحشت کا اظہار بھی ہوتا ہو، لیکن سانحوں کی خبر فاصلوں پر بیٹھے ہوئے متعلقین کو اِتنا مضطرب نہیں کرتی جتنا قریب کے لوگوں کو ایذا پہنچاتی ہے۔ مقصود یہ ہے کہ انگلستان میں فرو کش اصل حکم راں اپنے نائبین اپنے عمال کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور شہادتوں کی بنیاد پر نئے فیصلے کرتے، یا سابقہ احکام کی توثیق کر دیتے ہیں۔

پروفیسر اور بابا دونوں کی نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ پیالی میں بچی کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی، اُس کا آخری گھونٹ لے کے میں نے حلق تر کیا، اور کسی قدر تھکی ہوئی آواز میں کہا، ''یہ سلسلہ سَو سال سے کام یابی سے جاری ہے اور ضروری نہیں کہ آئندہ سَو سال تک بھی اِسی طرح جاری رہے۔ چوں کہ یہ عمل بھی عقل اور منطق کی ضد ہے، اِس لیے جلد، یا بدیر اِسے ندامت سے دوچار ہو جانا ہے، برِّ صغیر اُنھی لوگوں کا ہے جو یہاں بستے ہیں اور کسی اَور طرف نہیں دیکھتے۔ اُن کی کثرت کو کوئی قوت نہیں ہے، لیکن ایک قوت ایک حقیقت تو ہے، سنا ہے، ایک بار چیونٹیوں نے کسی بستی پر یلغار کر دی تھی۔ بستی کے سارے مکین بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہندستانیوں کی تعداد ہندستان میں تعینات انگلستانی حکومت کے وفا پیشہ کارندوں سے ہزاروں گنا، لاکھوں گنا بڑی ہے، بل کہ لاکھوں اور کروڑوں کا فرق ہے یہ، اور اِس تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ کسی وقت یہ فتنہ ال بھی ہو سکتی ہے، انگلستان کے زرہ بکتر سجائے حصار بند کارندے اپنے ہتھیاروں، اوزاروں اور مشینوں کے بل پر آج کثرت

پر غالب ہیں تو یہ کوئی مضبوط اساس نہیں۔ ہوسکتا ہے، کل یہ تعداد سنبھالے نہ سنبھلے، سینوں کے آگے ہتھیار کم پڑ جائیں۔ اَب بھی انسانوں کے اِن غولوں کو کھونٹے پر باندھے رکھنا مشکل ہورہا ہے۔ سنتے ہیں، کسی علاقے میں انسانوں کی جتنی بڑی کثرت، اُتنی ہی مسائل و مصائب کی افزائش اور کش مکش و کشاکش کی فراوانی، اور حکم رانوں کے لیے نظم و ضبط، انتظام و انصرام کی دشواری۔ اور کہتے ہیں، آدمی ہتھیار نہیں ہوتا، لیکن ہتھیار سے زیادہ مہلک ہوسکتا ہے۔"

اِس دوران مجھے احساس ہی نہ رہا کہ میں پروفیسر کا مہمان ہوں اور وہ، بہ ہر حال، نسلاً فرنگی ہے اور گوروں کے مفادات کے لیے یہاں آیا ہوا ہے، اور مایا بھی اُس کے ساتھ ہے، جو نصف ہندوستانی ہونے کے باوجود مغربی اطوار میں ڈھل چکی ہے، لیکن اِس ہذیان سے مجھے کوئی تسکین مل رہی تھی۔ دُھندی چھٹ رہی ہو جیسے۔

میں نے پروفیسر سے پوچھا، "اگر یہ تسخیر کا کوئی جذبہ، فتوحات کا شوق اور قوتِ بازو کا اظہار ہے تو اچھا کیا ہے۔ برِصغیر پر حکم رانی سے انگریزوں کی انا کو کوئی آسودگی ملتی ہے تو ہندوستان تو کب سے تسلیم و رضا پر کاربند ہے۔ آپ مزید کیا مطلوب ہے؟ انگریزوں کو خاطر جمع رکھنی چاہیے کہ تاریخ میں مندرج صفِ اوّل کے تمام فاتحین میں اُن کا درجہ بلند ہے۔ اُنھوں نے دارا و سکندر، چنگیز خان و ہلاکو جیسے فاتحین سے بڑی معرکہ آرائیاں کی ہیں، لیکن کیا انگریزوں نے تہذیبوں کے عروج و زوال کے درسِ عبرت المیوں پر مشتمل کتابوں کو اپنے کتب خانوں سے ہٹا دیا ہے۔ کوئی نئی تاریخ مرتب کرنے کا سودا اُن کے سر میں سما گیا ہے۔ برتر تہذیبیں، کم تر تہذیبوں پر غالب آجاتی ہیں، مگر یہ برتری و کم برتری ہمیشہ کیوں نہیں رہتی۔ ہر تہذیب کو ایک زوال کیوں لازم ہے؟ غالباً اِس لیے کہ قومیں اپنے شباب پر پہنچ کے تن آسان ہوجاتی ہیں کہ درختوں پر اُن کے لیے سونے چاندی کے ثمر پیدا ہونے لگتے ہیں۔ پھر وہ اپنی ابتدا کی مشقیں، ریاضتیں بھول جاتی ہیں۔ پھر نئی نسل آجاتی ہے۔ اُن کے طور طریقوں میں نازکی، نفاست آجاتی ہے۔ وہ شیشے کے بن جاتے ہیں اور پھولوں سے اُن کا شغف گہرا ہوجاتا ہے۔ جب موسموں کی نیرنگی اعصاب پر اثر انداز ہونے لگے، ذرا سا شور سماعتوں کو بارِ خاطر ہو۔ ہوا کے کسی تیز جھونکے سے چہرے کُمھلانے لگتے ہوں، جب احتیاطیں حد سے سوا ہوجائیں اور مصوری، شاعری، موسیقی کا غلبہ ہوجائے تو نازک اور لطیف قومیں مراجعت کا سفر کرنے لگتی ہیں اور کہیں سے اُجڈ، گنوار، بے تہذیب لشکر تیر کمان اُٹھائے شیش محل مسمار کرتے، چمن زار روندتے ہوئے نمودار ہوتے ہیں اور شبستانوں کو آگ لگا دیتے ہیں۔

"کتابوں میں کچھ یوں مرقوم ہے کہ ایک غیر معیّن عرصے کی برتری و بالادستی کے بعد اعلا تہذیبیں نیم جاں ہوجاتی ہیں۔ اگر وہ چاق چوبند، منظّم، مربوط اور ہوش مند رہیں تو برتری کی ایک بڑی عمر بھی نصیب ہوسکتی ہے۔ میں کوئی سماجیاتی کلیہ وضع کرنے کا اہل نہیں ہوں، لیکن میرا خیال ہے، اور میں نے کہیں پڑھا بھی تھا کہ تہذیبیں اپنے مختلف اداروں کے توازن و تناسب سے زندہ اور ممتاز رہتی ہیں، اور اداروں کی بے توازنی کی شعوری، غیر شعوری غفلت اور کوتاہی ہر معاشرے سے سرزد ہوجاتی ہے، بل کہ ہوتی رہتی ہے۔"

پروفیسر کے پہلو بدلنے اور گہری سانس بھرنے پر مجھے بھٹک جانے اور اپنے مفروضے کی طوالت کا گمان ہوا، میں ٹھٹک سا گیا۔

"کیا! کیا ہوا؟" پروفیسر گھبرا کے بولا، "پھر کسی غیر ضروری شائستگی یا بے تکیجی کا احساس دامن گیر ہوا؟"

"ہاں، کچھ یہی۔" میں نے بوجھل آواز میں کہا، "شاید میں تجاوز کا مرتکب ہو رہا ہوں۔"

"یقین کیجیے، سب کچھ نہایت متوازی اور پُراثر ہے۔" پروفیسر کے سیمابی لہجے میں بڑی وارفتگی تھی، کہنے لگا، "کئی بار جی کیا، لیکن میں درمیان میں اِس صاف گوئی کی داد و ستائش سے یوں باز رہا کہ دخل در معقولات نہ ہوجائے اور یہ اہم سلسلۂ کلام منتشر نہ ہوجائے۔"

"آپ کتنے اچھے انگریز ہیں۔" میں نے بے اختیار کہا، "کیسی دل جُوئی کرتے ہیں۔"

"اور آپ کتنے دل نشیں ہندوستانی ہیں، کیسا سچ بولتے ہیں۔" اُس نے شیدائیت سے کہا اور خلطِ مبحث کے اندیشے

میں باہمی خوش نودیٔ طبع کی اِس رسمِ ادائی کو سرِ دست موقوف کیا، متجسس لہجے میں بولا، "آپ اداروں کی بے توازنی کی بات کررہے تھے۔ آپ کے خیال میں کیا انگلستان کا سیاسی اور سماجی نظام اداروں کے انتشار کے مرحلے میں داخل ہوچکا ہے؟"

"نظر کچھ یہی آرہا ہے۔" میں نے کسی جھجک کے بغیر کہا، "دُنیا کے طول و عرض میں حکومتِ انگلستان کی توسیع پسندی کی حرص و ہوس بدترین انجام تک لے جاسکتی ہے۔ کچھ ایسا نظر آتا ہے، انگریزوں کو خود نہیں معلوم کہ اُنھیں اور کہاں تک جانا ہے، جتنی دُور وہ جاچکے ہیں، وہاں سے واپسی بھی آسان نہیں رہی ہے۔ آدھی دُنیا رہ جاتی ہے، مگر ساری دنیا پر یونین جیک لہرانے کا خواب شرمندۂ تعبیر کرنے سے وہ کیوں گریزاں ہیں؟ وہ ٹھہر کیوں گئے ہیں؟ قریب قریب ساری دُنیا اُن کے آگے تشتری میں رکھی ہوئی ہے اور ہاتھ بڑھانے کی دیر ہے۔ وہ ارادہ کریں تو دو ایک جگہوں کے سوا کہیں بھی مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ مقبوضہ دُنیا میں حکم رانی کے پیش از پیش مسائل ہی شاید اُنھیں باقی دُنیا پر پیش قدمی سے روکے ہوئے ہیں۔ یہ بھی کچھ انگریزوں کی توفیق سے زیادہ ہے۔ وہ اِدھر سے سرا پکڑتے ہیں تو اُدھر سے سَرک جاتا ہے۔ دُنیا بھی اَب پہلے جیسی نہیں رہی ہے۔ گردش وہی ہے، لیکن تیور بدل گئے ہیں۔ یوں بھی دُنیا کبھی ایک سی نہیں رہتی، یہ ایجادوں کا دَور ہے۔ دُنیا کے دوسرے اقبال مند ملکوں کے مانند انگلستان بھی طرح طرح کی ایجادوں کی تجسیم و تشکیل میں مصروف ہے، اور کیا ایسا نہیں ہے کہ کبھی کوئی ایجاد وقت سے پہلے وجود میں آجاتی ہے اور کسی معاشرے کا سارا نظامِ فکر منتشر کردیتی ہے؟ اور موجد و مولد قوم کا یہ ہے کہ اپنی کسی تخلیق اور ایجاد کے شیریں ثمر اُسے سب سے پہلے نصیب ہوتے ہیں تو زیاں کی آزمائش، یا بدہضمی کے مرحلے سے بھی سب سے پہلے اُسی کا سابقہ پڑتا ہے کہ ایجادوں کے منفی اثرات کبھی اُن کے ثمرات سے کثیر ہوتے ہیں۔ نت نئی اختراعات و ایجادات میں انگلستان صفِ اوّل میں شامل ہے۔ وہاں دوسرے ملکوں کی جدید ترین، محیر العقول مصنوعات حاصل کرنے کی بھی سکت کچھ کم نہیں ہے۔ کہنا یہ ہے کہ ساختۂ انگلستان اور انگلستان کے باہر سے

"جناب! بجٹ کا چالیس فی صد سروے پر، تیس فی صد اشتہاروں پر اور بیس فی صد تقریبات پر... آخر ہم منصوبہ کب شروع کریں گے؟"

آئی ہوئی ایجادیں مل جل کے وہاں کے روایتی معاشرے پر کس قدر اثر انداز ہوتی ہیں، ہوسکتی ہیں، یہ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے۔"

"بے شک۔" پروفیسر نے فکر مندانہ لہجے میں بے دریغ میری حمایت کی۔ "انگلستان کے متعدد سنجیدہ، ثقہ گھرانے اِن کرشماتی مصنوعات کی پذیرائی میں جتنے پُرجوش تھے، اُتنے ہی اَب اِن سے آزردہ، کبیدہ اور ہراساں دکھائی دیتے ہیں۔ کیوں مایا، تم کیا کہتی ہو؟"

مایا اُچھل سی پڑی۔ "میں... میں کیا کہوں۔ آپ ٹھیک کہہ رہے تھے پروفیسر کہ آپ استفادہ کررہے ہیں۔ مجھے احساس ہوتا ہے کہ رقص کے فضول مشغلے میں ایک بہترین تجزیے سے محروم رہی۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔" میں نے عاجزی سے کہا، "میں کیا اور کتنا جانتا ہوں۔ یہ پروفیسر صاحب کی بندہ نوازی ہے کہ وہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو ہمارے لیے ممنوعہ اِس گوشۂ فردوس میں لے آئے، اور جانے کیوں، یہاں آ کے سینے میں کب سے اَٹا ہوا غبار اُمڈ آیا۔ یہ ایک اجنبی اور عام شخص، سڑک پر چلتے ایک راہ گیر کی عزت افزائی ہے۔ میں آپ سے سچ کہوں، میں ایک بہت معمولی آدمی ہوں، میں اور میرے دونوں ساتھی..."

"وہی مشرق، وہی مشرقی انکسار..." پروفیسر نے تکرار کی۔ اُس کے لہجے میں کوئی بناوٹ نہیں تھی۔ "سنا تھا، آج سامنے ہے،

آج نظارہ کرلیا۔“

رفتہ رفتہ ساز پھر بیدار ہونے لگے۔ سازندوں نے اپنے اپنے ساز سنبھال لیے تھے۔ مجھے جمرو اور زورا کا خیال تھا۔ بہت دیر ہوگئی تھی۔ بہ ظاہر اُن دونوں نے کسی تکدر کا اظہار نہیں کیا تھا۔ انگریزی کیا خاک اُن کی سمجھ میں آرہی ہوگی۔ انھیں اُکتا جانا چاہیے تھا، لیکن یہ سحر آفریں ماحول اُن کے لیے کسی خواب کے مانند ہوگا۔ وہ کافی کی چسکیاں لیتے، خشک میوہ ٹونگتے اور سگریٹ پھونکتے رہے۔ پروفیسر کے چہرے پر بدلتے رنگوں، اُس کے اضطراب اور اشتیاق سے وہ کچھ سمجھنے کی کوشش کرتے رہے ہوں گے۔ میرے ہذیان کے دوران مایا کی محویت اُن کی نظر میں میرے لیے داد کی حیثیت رکھتی ہوگی۔ اپنے عزیز کی قدرومنزلت پر اُس کے رفیق جو فخر اور شادمانی محسوس کرتے ہیں، کچھ وہی اُن کی کیفیت تھی۔ ہندستان پر گوروں نے اپنی اعلا دماغی اور بالادستی کی دھاک بٹھا رکھی تھی۔ جمرو اور زورا اِس غلبے سے کس طرح متشنا رہ سکتے تھے۔ وہ گوروں کی نشاط گاہ میں بہ تمام وکمال موجود، ایک گورے اور گوری کی معیت میں، اُن کے مہمان کے رُتبے سے معزز و مفتخر تھے۔ خوش بوؤں سے بسی اِس جگہ کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ اشارے پر مؤدب ہندستانی خدمت گار حاضر ہوجاتے تھے۔ گوروں نے اِن کے امتیاز کے لیے خصوصی لباس مقرر کردیے تھے، بالکل یہاں کے راجاؤں اور اُن کے درباریوں کے لباس کی طرح۔ یہ بھی کیا خوب تماشا تھا۔

”آپ بمبئی میں قیام کریں گے، یا آگے...؟“ مایا نے چھپاتی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ عرصے بمبئی ہی میں رہنا ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”کچھ دن ہمارا قیام بھی بمبئی میں رہے گا، کیا آپ سے دوبارہ ملاقات ممکن ہے؟“ اُس کی پُرتمکنت آواز میں طلب بھی تھی، حسرت بھی، اور بھی کچھ...

”کیوں نہیں، آپ وہاں کہاں ٹھیریں گی؟“

”ابھی کچھ نہیں معلوم۔“ اُس کے چہرے پر کشمکش ہویدا ہوئی۔ ”رابطے کا کوئی ذریعہ معلوم ہوجائے تو میں خود آپ سے رابطہ کرلوں گی۔“

”ضرور، بل کہ آپ ہمارے گھر آیئے گا، وہاں آپ کو دیکھ کر سبھی خوش ہوں گے۔“

”آپ کا گھر بمبئی میں ہے؟“

”بمبئی میں بھی...“

”کیا مطلب؟ اور بھی گھر ہیں دوسری جگہوں پر؟“

”جی... جی ہاں...“

”واقعی! کتنے گھر؟“ وہ حیرانی سے بولی۔

”سو، دو سو نہیں، یہی کوئی دو تین۔“ میں نے ہنس کے کہا۔

”لیکن میں کچھ زیادہ وقت بمبئی میں رہوں گا۔“ پروفیسر اُچکتی آواز میں بولا۔ ”یاد رہے، اگر آپ کو کوئی مصروفیت مانع نہ ہو، اور مناسب سمجھتے ہوں تو مجھے بھی آپ کو زحمت دینی ہے، میری سکونت کا انتظام کسی بنگلے میں کیا گیا ہے۔ نام یاد نہیں آرہا، شاید کولابا نام کی کسی جگہ...“

”ہمارے گھر سے ذرا دور ہے، مگر بڑے شہر میں فاصلے کیا اہمیت رکھتے ہیں... اور یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، مصروفیت اور مناسبت کی بات! آپ سے دوبارہ ملاقات میرے لیے اعزاز ہوگی۔ میں تو کہتا ہوں، آپ ہمارے ہاں ہی مہمان رہیں۔“

پروفیسر نے تپاک سے ہاتھ بڑھایا۔ میں فوراً سمجھا نہیں، لیکن پھر میں نے بھی اُس کی تقلید کی۔ اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں زور سے داب لیا۔

ساز تیز ہوگئے تھے اور مختلف گوشوں میں بیٹھے جوڑے پھر وسطی فرش پر آکے تھرکنے لگے تھے۔

”آپ میرے ساتھ رقص کرنا پسند کریں گے؟“ یکا یک مایا نے تمنائی آواز میں مجھے پیش کش کی۔

”میں... میں کہاں۔“ آواز کے ساتھ میرا جسم بھی سست گیا۔

”مجھے بالکل نہیں آتا۔“

”یہ تو بہت آسان ہے۔“

”ہاں، ہاں بہت آسان، بس ایک ذرا سی توجہ...“ پروفیسر نے مایا کی ہم نوائی کی۔

”ایک قدم آگے، پھر دو قدم... اِن رقصاں جوڑوں کو ذرا غور سے دیکھیے۔“

”پھر کبھی سہی، میرا لباس بھی اِس رقص کے لیے موزوں نہیں۔“

مجھے زیادہ عذر کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ پروفیسر نے مایا کو کہنی ماری۔ دھاری دار سرمئی سوٹ میں ملبوس دو نوجوان سامنے کے دروازے سے داخل ہوئے، دونوں کی عمریں تیس پینتیس سال کے درمیان ہوں گی، چہرے لال بھبھوکا تھے، جیسے آگ جلتی ہو۔ مایا فوراً اُٹھ گئی اور ہم سب سے معذرت کرکے اُنھی کی جانب بڑھ گئی۔

”مایا کا شوہر ہے۔“ پروفیسر چپکے سے بولا۔ ”وہ دائیں طرف لمبوترے چہرے والا دراز قد نوجوان، میجر البرٹ۔ تین چار ماہ میں لیفٹیننٹ کرنل ہوجائے گا۔“

میں نے دیکھا، میجر کے قدم فرش پر ٹھیک طرح جم نہیں رہے تھے۔ اُس کا ساتھی بازو تھامے ہوئے تھا۔ اِدھر مایا نے تیز قدموں سے اُنھیں جالیا تھا۔

پروفیسر نے آہستگی سے بتایا کہ ابھی تین مہینے ہوئے، مایا سے اُس کی شادی ہوئی ہے۔ مایا اُس کی چچا زاد بھی ہے۔ خاندانی طور پر دونوں ہی صاحبِ اقبال ہیں۔ برنارڈ اپنے والدین کا اکلوتا ہے۔ اِدھر مایا بھی بھائی کے چلے جانے سے اپنے گھر کی اکلوتی رہ گئی ہے۔ چار سال سے برنارڈ ہندستان میں تھا، اور چھ مہینے کی چھٹی لے کے شادی کے لیے انگلستان آیا ہوا تھا، اب بیوی کے ساتھ واپس جارہا ہے۔“

”نہایت مکلّف، شان دار نوجوان ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں، بہ ظاہر۔ مایا خوش نہیں ہے۔“

”کیوں؟“ مجھے پوچھنا نہیں چاہیے تھا لیکن رہا نہ جاسکا۔

”مایا کو دیکھا آپ نے! کیسی حسین، نرم و نازک، پھولوں جیسی لڑکی ہے۔ تعلیم بھی اعلا حاصل کی ہے۔ شوہر کا مزاج بالکل جدا ہے۔ برنارڈ کے باپ اور مایا کی ماں کی خواہش یہی تھی کہ اُن کی شادی ہوجائے۔ کئی اور بھی مصلحتیں ہوں گی اِس رشتے کی۔ مایا انکار کرسکتی تھی، لیکن وہ برنارڈ کو ناپسند نہیں کرتی تھی، اور اصل میں وہ اُس برنارڈ سے واقف تھی جو ہندستان نہیں گیا تھا، اُسے کوئی اندازہ نہیں تھا، ہندستان جاکے وہ کتنا بدل چکا ہے، کثرت سے پینے لگا ہے، اُس میں ایک عجب تناؤ اور کھردرا پن آگیا ہے، کوئی وحشت سی۔ انگلستان آکے برنارڈ نے بچپن کے دوست ٹونی کے ساتھ ہی تمام تر وقت گزارا۔ شادی کے

”سنو! میں چلتا ہوں، میری بیوی کہیں فون کرنے کی منتظر ہے۔“

بعد بھی وہ زیادہ تر ٹونی کی رفاقت کی جستجو میں رہا ہے، اور اب اُسے ساتھ ہندستان لے کے آگیا ہے۔ مایا تو پہلے کی طرح تنہا ہے۔ مایا نے کبھی شکایت کی تو کان نہیں دھرے، درشتی پہ اُتر آیا۔ شادی کے اِتنے مختصر عرصے ہی میں دونوں کے درمیان کشاکش شروع ہوچکی ہے، اور آگے بھی کچھ بہتر نظر نہیں آرہا۔ میں تو بہت ہراساں ہوں اور دُعا ہی کرسکتا ہوں دونوں کے لیے۔“ پروفیسر اپنی دُھن میں کہتا گیا۔ اِس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مایا کے لیے کتنا گداز رکھتا ہے۔

مایا نے ایک جانب سے شوہر کا بازو پکڑ لیا تھا، دروازے کے قریب رکھی کرسیوں پر وہ تینوں بیٹھ گئے۔ ٹونی کی طلبی پہ خدمت گار اُن کے لیے شراب لے آئے۔ میں نے دُور سے دیکھا، مایا نے شوہر کو روکنا چاہا تھا، لیکن وہ جام اُٹھا کے ایک گھونٹ میں خالی کرگیا اور رقص میں شامل ہونے کے لیے کھڑا ہوگیا۔ اور کیا دماغ میں آئی کہ لمحے بھر بعد پھر بیٹھ گیا۔ ٹونی نے بازو پھیلا کے مایا کو رقص کی دعوت دی تھی۔ مایا نہیں اُٹھی۔

رقص کرتے جوڑوں کے پانو، اُن کے جسم سازوں کے زیروبم سے بندھ گئے تھے۔ اُن کا اپنا کوئی ارادہ نہیں رہا تھا۔ ساز اُنھیں جہاں چاہتے، لے جاتے اور واپس لے آتے۔ موسیقی میں بھی حکومت کی کیسی خُو ہوتی ہے۔ سننے والے کو اپنا تابع کرلیتی ہے۔ گورے حکم راں بھی اُس کے اسیر ہوجاتے ہیں، مگر وہ اطاعت ہی کیا، جس میں آدمی کی رضا شامل ہو۔

میری اور پروفیسر کی نظریں مایا پر بکھری ہوئی تھیں۔ اُس کا شوہر برنارڈ خاصا خوش نظر آرہا تھا۔ اُس کے پانو تھرک رہے تھے۔ ٹونی بھی وجد کی کیفیت میں تھا۔ کسی لمحے اُس نے برنارڈ کی توجہ

ہماری طرف مبذول کی کہ برنارڈ کی پیشانی پر بل پڑ گئے، اور دیکھتے دیکھتے اُس کا چہرہ بگڑنے لگا۔ اُس نے ناگواری کا اظہار کیا تھا کہ مایا نے اُس کا بازو تھپک کے کچھ باور کرانے کی کوشش کی۔ برنارڈ یک دم اُٹھ گیا۔ مایا نے اُس کا بازو پکڑ لیا تھا، لیکن وہ اُسے روکنے میں ناکام رہی۔ ٹونی بھی برنارڈ کے ساتھ تھا۔ اُن کا رُخ ہماری جانب تھا۔ دونوں کو اِتنا ہوش تھا کہ رقصاں جوڑوں کے انہماک میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔ ہماری میز کے سامنے آ کے برنارڈ رُک گیا اور کسی تمہیدی کلمے کے بغیر اُس نے پروفیسر کو مخاطب کیا: ''آپ کو معلوم ہے پروفیسر! یہ جگہ کن کے لیے مخصوص ہے؟''

پروفیسر نے خوش خلقی سے برنارڈ اور ٹونی کو بیٹھنے کی دعوت دی، اور نرمی سے بولا: ''یہ میرے مہمان ہیں۔''

''صرف منتخب ہندستانی معززین کو یہاں داخلے کی اجازت ہے۔ یہ نظم و ضبط کا معاملہ ہے۔'' برنارڈ نے تلخی سے کہا۔

''یہ نہایت معزز لوگ ہیں۔ میں درخواست کر کے انھیں یہاں لایا ہوں، اور واقعہ یہ ہے، اپنے موضوع پر میں نے اِن سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔'' پروفیسر کے لہجے کی شائستگی جبری تھی۔

''آپ انھیں کتنا جانتے ہیں؟''

''آج ہی، ابھی کچھ دیر پہلے ہم ملے ہیں۔''

''آپ پہلی بار ہندستان آئے ہیں۔ برطانوی حکومت نے ہندستانی رعایا سے رسم و راہ کے کچھ قواعد و ضوابط طے کیے ہیں۔ آپ کو وہاں رہنما ہدایات ضرور دی گئی ہوں گی۔''

''برطانوی حکومت نے مجھے بھی یہاں ایک ذمے داری تفویض کی ہے۔'' پروفیسر کبیدہ ہو کے بولا، ''یہاں ہر طبقے کے لوگوں سے ملاقات میرے کام کا حصہ ہے، اور میجر! تمھیں خیال ہونا چاہیے کہ میرے اِن مہمانوں میں سے ایک انگریزی خوب سمجھتا ہے۔''

''سمجھا کرے، میں ضوابط کی بات کر رہا ہوں۔'' میجر برنارڈ نے زہریلی آواز میں کہا۔

''یہ سلوک ہماری روایات کے منافی ہے۔ مجھے اپنی توہین محسوس ہو رہی ہے۔''

''آپ خود روایت شکنی کے مرتکب ہوئے ہیں پروفیسر! بہتر ہے، انھیں عزت سے رخصت کر دیجیے، ورنہ...''

میں فوراً اُٹھ گیا، میرے ساتھ جمرو اور زورا بھی۔

پروفیسر شدید ذہنی خلفشار سے دوچار دکھائی دیتا تھا۔ اُس نے مجھ سے ٹھیر رہنے کی منت کی، اُدھر سے مایا بھی ہماری طرف بڑھی تھی۔

لمحوں میں ہم نے دروازہ عبور کر لیا۔

دروازے سے باہر آتے ہی جمرو نے میرا کندھا پکڑ لیا، ''کیا بولتا تھا وہ حرام کا جنا... بندر کی اولاد؟''

''جانے دو۔'' میں نے تپیدہ آواز میں کہا۔

''نہیں لاڈ سے، اُس کی تو ماں...''

''میرا ابھی خون کھول رہا ہے۔''

''بپھر جانے دو مجھے...'' جمرو کا جسم پھڑکنے لگا تھا۔ ''کیا ہو گا، زیادہ سے زیادہ؟''

''نہیں، ابھی نہیں... اِس وقت نہیں اور اِس طرح نہیں۔'' میں نے سختی سے کہا، ''دیکھیں گے پھر...''

بازی گر سب رنگ کا سب سے مقبول سلسلہ
ایک بے اختیار بے قرار نوجوان کا افسانۂ زندگی
اُمنگوں، حوصلوں، آنسوؤں اور آہوں کی داستان
پانچویں درویش کا بیان
باقی واقعات آئندہ
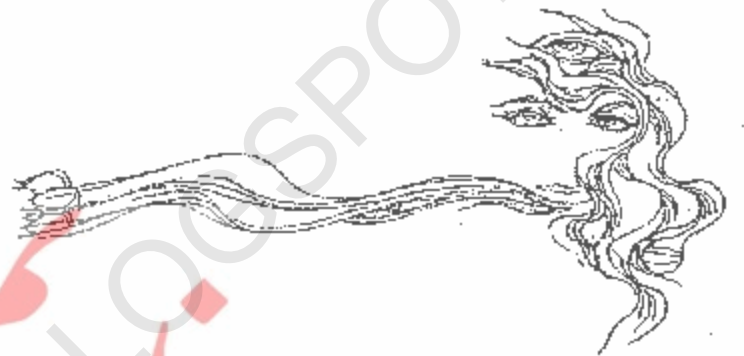
بچھل عرشے کے ایک ستون سے ٹیک لگائے بیڑی سے دھواں کشید کر رہا تھا۔ وہ ایک ماہی خور کی جانب متوجہ تھا، جو اُس کے قریب ہی جہاز کی ریلنگ پر ستانے آبیٹھا تھا۔ بے کراں سمندر پر ڈولتے جہاز اور کشتیاں اِن آبی پرندوں کے لیے کسی نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں ہوتے، جب دل چاہا ستالیا، نہ تھکن سے ڈوب مرنے کا ڈر، نہ بار بار ساحل پر لوٹنے سے وقت کا زیاں! دفعتاً بگلے نے سمندر کی جانب زقند بھری اور اوجھل ہوگیا۔ شاید اُسے شکم پُری کا سامان نظر آگیا تھا۔ جسمانی تناؤ کے اخفا کے لیے میں نے شانے جھکا دیے، اور آنکھیں تو اِدھر سے اُدھر پھیری جاسکتی ہیں۔ بچھل کی آزمودہ کار بر فیلی گولی میں مسلسل چبا رہا تھا، لیکن میجر برنارڈ کی سلگائی ہوئی آگ فزوں تر ہی ہو رہی تھی۔ واقعتاً میری کیفیت زورا اور جمرو سے مختلف نہ تھی۔ میں نے اُن سے کہہ تو دیا تھا کہ میرا بھی خون کھول رہا ہے، مگر خون کھولنا ایک بے محل محاورہ تھا، حال اِس سے کہیں سوا تھا۔

ہم خاموشی سے بچھل کے پاس جا بیٹھے۔ بگلا اپنی چونچ میں استطاعت سے بڑی مچھلی دابے ریلنگ پر پھر فروکش ہوگیا۔ مچھلی بری طرح تڑپ رہی تھی۔ بگلے نے بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھا، اُسے مچھلی کو زمین پر پٹخ مارنے کی مناسب جگہ نظر نہیں آرہی تھی۔ بچھل خوب شوق سے تماشا گیر تھا، اُس کے چہرے پر معصوم بچوں سی مسکراہٹ کھلکھاریاں مار رہی تھی۔ اُس کی بچگانہ محویت دیکھ کے میرا غصہ تمام ہوگیا۔ اُس کے چہرے پر میں نے بہت ہی کم تاثرات کی حکم رانی دیکھی تھی۔ سو خنکی تو اشتہار ہے، کوئی بھلا کب تک چھپائے!

”جا رے ناڑی! بے استاد اشکاری ہے، متیا پاس پچھ عمریا اور گزار جاکے۔“ بچھل نے بگلے کے غم میں سر دھنتے ہوئے کہا، کیوں کہ مچھلی بگلے کی چونچ سے نکلنے میں کام یاب ہوگئی تھی، لیکن بد قسمتی سے جہاز کی اور آگری، اور اچھلتی ہوئی سیدھی بچھل سے آٹکرائی تھی۔ ”اِس کی قسمت اِس کے ساتھ، اور تیرے داو تیرے ساتھ۔“ بچھل نے چشم زدن میں مچھلی کو

پونچھ سے پکڑا اور کلائی کے خفیف جھٹکے سے اُسے سمندر کی طرف فضا میں اچھال دیا۔ ماہی خور مچھلی کے ساتھ ہی فضا میں اچھلا، مگر مچھلی اپنی عمر ساتھ لائی تھی، بگلے کی چونچ خالی گئی اور وہ سمندر میں جا گری۔

"کھانا کیوں نہیں کھایا۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ کھانے کی کشتی میں تمام سامان جوں کا توں تھا، سوائے مچھلی کے ایک آدھ ٹکڑے کے۔

"کھالیں گے رے، اب اُدھری جا کے کھائیں گے۔"

بٹھل نے ہماری طرف نہیں دیکھا۔ وہ پُرشوق نظروں سے ریلنگ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"ابھی استاد گھر جانا مانگتا ہے۔" زورا نے جمرو کی طرف آنکھ مٹکائی۔

"پہنچا دو رے، جدھر سے آئی ہیں۔" بٹھل بڑبڑایا، اُس نے رُخ ہماری طرف پھیر لیا تھا۔ خلافِ طبع اُس کے چہرے کا ہر خط جگمگا رہا تھا، اور کوئی رمق تھی جو خاکستر سینے میں چھپا رہی تھی۔ میں اُس کی بات سمجھ نہیں سکا تھا۔ جمرو نے دیر نہیں لگائی، تلی ہوئی مچھلی اور جھینگوں سے بھری کشتی آناً فاناً اٹھا کے ریلنگ سے باہر اچھال دی۔ جگہ خالی ہوتے ہی بٹھل نے پانو پسار لیے۔ میرے جی میں آئی کہ کچھ کھا مروں، بس اب بمبئی یا فیض آباد، اِسے کہیں نہ کہیں نکلنا ہوگا۔ اِسی کو شوق ہے لاشہ گھسیٹے پھرنے کا... تو جانے تنہا... میجر برنارڈ کے سلگتے ہوئے جملے اور چرمرایا ہوا بٹھل... اچھی کیمسٹری تھی۔ میرے جسم سے پھر آگ نکلنے لگی۔

"تھوڑا کھا کے آئے ہو؟" بٹھل نے چکارتے ہوئے کہا۔ اُس نے ہمارے چہروں پر نوشتے پڑھ لیے تھے۔

"ہاں قسم استاد! اکھا جنت ہے۔ اوور ہور بھی ہے اور..."

"لنگور بھی۔" جمرو نے زورا کے مصرعے پر گرہ لگائی۔

بٹھل جھانسے میں نہیں آیا۔ کچھ دیر ہم تینوں کی طرف بہ غور دیکھا کیا، جیسے اُس نے سب کچھ جان لیا۔ پھر سر کو خفیف جھکایا اور آنکھیں موند لیں، کہ خود ستائی کسی کی دست نگر نہیں ہوا کرتی، خاموشی کریدنے سے گریز، کارِ محال بھی ہے، کارِ خیر بھی۔

"آنکھیں میچ لو رے، بس گھنٹے ہیں۔ اُدھر جلدی سے اینڈنے کو نہیں ملے گا۔" بٹھل نے نیم باز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر آنکھیں میچ لیں۔ مجھے پیرو کی گیتا اُس کی کولی میں جھمکتی دکھائی دی۔ کیا کہے گا اُن سے؟ رانی، گیتا اور پھر پیرو دادا کا خیال چھم سے در آیا، جیسے اندھیری رات میں چاندنی کے ہلکورے، تازہ تازہ، اور جواں جواں۔

جہاز ٹھمک ٹھمک پھسلتا جا رہا تھا۔ سورج دھیرے دھیرے سمندر کی اَور اتر رہا تھا۔ میجر برنارڈ کی شعلہ خیز نگاہیں بھی جاتے دن کے ساتھ ساتھ رخصت ہونے لگیں۔ ہم اَور کر بھی کیا سکتے تھے! زور آزمائی، نتیجہ انگیز داؤ پیچ، چاقو زنی کے حیران کُن کرشمے! زیادہ سے زیادہ میجر برنارڈ اور ٹونی کو پچھاڑ لیتے، مار گراتے، پھر کیا ہوتا، کہاں جاتے؟ اِس جہاز میں کون سے رستے، کون سے دروازے تھے۔ کیا بنگال میں جیسی گوری فوج سے مقابلہ کرتے؟ پھر وہی دنگا، وہی فساد خون سے عبارت، بھاگتے دوڑتے چھپتے پھرتے دن رات!

سب کچھ بے فائدہ اور لاحاصل۔ زورا اور جمرو بھی سوتے چہروں کے ساتھ لیٹ چکے تھے۔ اِنھیں انگریزی کی معمولی سی جانکاری ہوتی تو میرے روکے سے نہ رکتے، مگر میں نے ایسا کیوں کیا؟ میجر کے نوکیلے کاٹ دار الفاظ، آگ برساتی انگارہ آنکھیں مجھے مہمیز کیا کرتیں، خاکستر بھی نہ کر سکیں۔ یکایک میرے اندر وہی پرانا رفیقِ کار، ہم دم، خود آگیں نفرت کا جوالا مکھی پھٹ پڑا۔ پھر نہ جانے کتنا وقت گزر گیا، میں جیسے خلا میں بیٹھا رہا۔ آگ کے گولے مجھ پر برستے بھی رہے اور مجھ پر پھوٹتے بھی رہے اور بجھ بجھ کر مہیب اندھیرے میں گم ہوتے رہے۔

بٹھل، زورا، جمرو سو چکے تھے۔ شام بھی ڈھل چکی تھی، عرشے پر مسافر کیڑوں کی طرح آڑے ترچھے پڑے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں چار یا پانچ کی ٹولیاں جمی تھیں۔ جن کے بیچ

سے چائے کا دھواں اُڑ اُڑ کے اپنی ہم جنس، مگر سرد ہَوا سے گلے مل رہا تھا۔ بھانت بھانت کی بولیوں پر مبنی دھیمی سرگوشیاں، دبے دبے قہقہوں سے بوجھل آوازیں اور جہاز گیر ہَوا کا شور یک ساں و یک رُو معلوم پڑتا تھا، لیکن یہ میرے اندر سر پٹختی چیخوں کے سامنے ہیچ تھا۔ کاش، یہ چیخیں خنجر بدست ہوتیں، ہتھوڑوں، کدالوں، پھاوڑوں، تیز دَم بھالوں سے آراستہ ہوتیں، تو یہ پتھر کا سینہ چیر پھاڑ دیتیں۔ اُن آنکھوں کو پھوڑ کے آزاد ہو جاتیں جن کے سامنے ممی پانو میں گھنگھرو باندھے مجرا کر رہی تھی، اُن راہ گزیدہ قدموں کو چورا چورا کر دیتیں، جن کی راہ تکتے تکتے امّی جان منوں مٹی تلے جا سوئی تھیں۔ ماں کا قاتل!... لیکن امّی جان کو میں نے نہیں مارا تھا۔ صرف ایک بابر کے لیے چھ بچّوں کو بے یار و مددگار چھوڑنا! کیسی ممتا تھی!... نہیں امّی جان یہ آپ کا انصاف نہیں تھا۔ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھے۔ کیا برا تھا جو آپ بابر کی جدائی کو حرزِ جاں نہ بناتیں تو شاید ممی کو ٹھے نہ پہنچتی، جہاں گیر دربدر نہ ہوتا۔ ابّا جان کا غذوں میں چھپے خیرہ کُن پتّھروں کی اوٹ نہ لیتے۔ میری بہنیں، امّی جان میری بہنیں جن کی پرچھائیں کسی غیر نے نہیں دیکھی، اُن پاک باز خان زادیوں کو نظر بازوں کی ہوس ناکی سے چھلنی نہ ہونا پڑتا، فرخ پر مجید سا شہد ادانت تیز نہ کرتا، اگر آپ بابر زماں پر لعنت بھیج دیتیں تو یقیناً ممی کا جنازہ کوٹھے سے اٹھنے کی بجائے گھر سے اُس کی ڈولی اُٹھتی۔ آخر میں ہی کیوں؟ مجھی کو زیرِ بار، مجھی کو گناہ گار کیوں کیا جاتا ہے؟ میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے، مجھے تنہا کیوں نہیں چھوڑ دیا جاتا؟ زندگیاں کیوں مجھ سے وابستہ کی جاتی ہیں؟ میں نے کب کسی سے کہا ہے کہ میرے ساتھ چلو، میرے لیے سب کچھ چھوڑ دو، میری ہم راہی اختیار کرو، مجھ سے محبت کرو۔ میں تو خود تہی دست و تہی داماں ہوں، بھلا کسی کو کیا دے سکتا ہوں۔ میں طلب گار ہوں۔ یہ لوگ کیوں نہیں سمجھتے۔ کیوں میرے لیے کمربستہ و آمادۂ شوق رہتے ہیں۔ جان سے جاتے ہیں۔ میرے ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مجھے مردہ تصور کر لیا جائے تو کیا دنیا رک جائے گی، گردش تھم جائے گی؟ اور اگر میں مر ہی جاؤں تو کیا قیامت ٹوٹ پڑے گی؟ میری بے قراری و بے چینی تو میری ملکیت ہے۔ یہ اَوروں کو کیوں کھلتی ہے۔ بٹھل کو کیا تکلیف ہے جو مجھے لیے دربدر مارا مارا پھرتا ہے۔ یہ لوگ تو مجھے انسانیت کے ادنا ترین درجے میں بھی شمار نہیں کرتے۔ یہ اپنی جاں نثاری پر نازاں رہتے ہیں، مگر میں کس بات پر فخر کروں، کیا ہے میرے پاس؟ یہی کہ سلطان، پیرو دادا، مارٹی، کانتے، سونیا اور نہ جانے کس کس کی موت کے تمغے! اذیتوں کے عذاب! آزردگی کے سونپے گئے سودے!

لیکن نہیں، بھلا کسی کا کیا قصور؟ مثال ہے؟ یہ سب ہیر پھیر تو میرے سبز قدموں کا ہے۔ یہ مصیبتیں مجھی سے پیوستہ ہیں۔ یہ راستے میرے دشمن ہیں، دشمن داری میرے اپنوں سے کرتے ہیں۔ فساد کی جڑ تو میں ہی ہوں۔ جاں نثاری دوسروں ہی کا وطیرہ کیوں ہے۔ میں کیوں نہیں مر جاتا؟ کیا مشکل ہے کہ اِس جہاز سے کود جاؤں! بٹھل بھی رو دھو کے چپ ہو جائے گا، کم از کم اِس دربدری سے گلو خلاصی تو ہو جائے گی۔ زریں کے پاس، مشفق، حسین و جمیل زر جواہر سے مرصّع و باکمال زریں کے پاس جا بسے گا۔ زورا اور جمرو بھی اپنے شہروں کی مانوس گلیوں میں چین سے راج کریں گے۔ کیا اچھا ہوگا جو میرا منحوس سایہ اِس دنیا سے اٹھ جائے! بہن بھائیوں کی زندگی میں سکھ چین آ جائے گا۔ کتنے دن ابّا جان، فرخ، فارہہ، فریال، اکبر اور جہاں گیر سے دُور رہا ہوں، میرے بغیر وہاں راوی نے چین ہی چین لکھا ہوگا۔ میں پھر وہاں جا رہا ہوں، سبز قدم پھر فرخ کے آنگن میں پڑنے والے ہیں۔ نہ جانے اب وہ کس مصیبت سے دوچار ہوں گے، اب کس سے کون جدا ہوگا۔ رانی اور گیتا سے پیرو تو جدا ہو گیا۔ مارٹی بھی نہ رہا، جولین کا راستہ روکنے والا ماسٹر مارٹی! میرے ذہن میں بالترتیب بہت سے چہرے بن اور مٹ

رہے تھے۔ عرصہ ہوا خود کو حالات اور مشغل کے رحم و کرم پر چھوڑے ہوئے۔ بے حسی میں خول بند ہو کے جینا کچھ آسان ہو چلا تھا، مگر آج پھر وہی دورہ! وہی لاحاصل خیالات، لاجواب سوالات کا جھمگھٹا! کورا اِتنی اہم ہے؟ کیا ایک کورا کے لیے متاعِ جاں زندگیاں بھینٹ کی جاسکتی ہیں؟ میں نے خوامخواہ کورا کا ہوّا کھڑا کر دیا ہے۔ کورا کا خیال آتے ہی میری حالت مزید غیر ہوگئی۔ حبسِ دم سے سینہ جکڑنے لگا۔ تڑپتے ہوئے حلق میں گرہوں کا انبار لگ گیا، نہ جانے وہ کس حال میں ہوگی! یہ طے تھا کہ مولوی صاحب نے مجھ سے بہتر اُس کی پاس بانی کی ہے پھر میں کیوں اُس کا دعوے دار بنا پھرتا ہوں۔ وہ مولوی صاحب کے ساتھ سکھ میں ہے، باامان ہے تو رہے۔ میرے سبز قدم تو اُس کا سکھ چین بھی غصب کرلیں گے۔ اُس کے سر سے مہرباں کا سایہ چھن جائے گا۔ میری امان میں اُسے کیا ملے گا؟ میں تو خود بے امان ہوں۔ میں کورا کا اہل نہیں، میں تو چند دن بھی اُس کی حفاظت نہیں کرسکا۔ یہ میری ہی نامرادی تھی جو اُسے مولوی صاحب کی پناہ میں جانا پڑا، لیکن نہیں! کورا نے میری بے تابی وارفتگی بھی دیکھی ہوگی۔ اُسے چھونے والے شہدوں کے لاشے میں نے آن کی آن میں برلبِ راہ بچھا دیے تھے۔ کورا سے میری دُوری ہی اُس کے لیے بہتر ہے۔ خیالات کے بھنور مجھے چکراتے چکراتے مرکز کی طرف لے آئے۔ بنتی مٹتی تصویروں میں پھر ایک صورت ٹھہر گئی۔ میری آنکھیں جلنے لگیں۔ سانس تو گویا تھا ہی نہیں۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے برش تھاما اور لگا تصویر کو دس برسوں کا پھیر دینے۔ دراز پلکیں کچھ اَور لانبی کیں، محرابِ چشم کو کچھ اَور خم دیا، کچھ اَور تراشا، آنکھوں میں کچھ خود سپردگی، کچھ انتظار اور کچھ التماس سمویا، عارض اِس عرصے میں بھر آئے ہوں گے، کچھ مزید ابھارے، ستواں اور ترشیدہ ناک پر مزید نزاکت آزمائی کی، دہکتی پنکھڑیوں کو کچھ اَور سرخ کیا۔ ایک سرگرداں لٹ کشادہ پیشانی پر آراستہ کی، رنگت کے آمیزے میں صندلیں شربت کی مزید آمیزش

کی۔ پھر دیکھا کیا۔ دلِ بے قرار نے اُس کے چہرے پر ماہ و سال کی مشتاقانہ چھیڑ چھاڑ بھی مسترد کر دی۔ اِسے تو وہی کورا درکار ہے، جس کی آخری شبیہہ جس کا آخیر عکس کلکتہ میں راہ نثار کیا تھا۔ پھر کسی نے وہ شاہ کار تصویر مٹا دی۔ مصور نے نہ ماتم کیا نہ احتجاج، بس خاموش تماشائی، محوِ اضطراب محوِ شوق کہ اب پردۂ غیب پر کچھ نمودار ہوا چاہتا ہے۔ اچانک میجر برنارڈ کی حقارت بھری تمسخر آفریں نگاہیں مجھ پر گڑ گئیں۔ میرے ہاتھوں میں برش کی جگہ خنجر کا آنا تھا اور چشمِ زدن میں میجر برنارڈ کی پیشانی پر پیوست ہوتا تھا کہ آنکھ کھل گئی۔ آسمان نے سیاہ چادر اوڑھ لی تھی۔ میرا جسم پسینے سے شرابور تھا اور سانس درہم برہم۔ آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں۔ صورتِ حال سمجھنے میں کچھ وقت لگا۔ اپنی پیمائش کرتے کرتے میری آنکھ لگ چلی تھی۔ زورا اور جمرو میرے بائیں پڑے تھے۔ مشغل دائیں جانب سیدھی کروٹ لیٹا تھا۔ اُس کے سونے کا یہ انداز مخصوص تھا۔ عرشے پر موجود تقریباً تمام مسافر نیند کے مزے لُوٹ رہے تھے۔ میں نے سر کو دائیں بائیں جھٹکا دے کے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی، مگر بے سود، وہاں سر نہیں کوئی پھوڑا تھا۔ میں نے مشغل، زورا اور جمرو کی طرف بہ غور دیکھا۔ آج یہ میرے ساتھ نہ ہوتے تو کم از کم میجر برنارڈ اِس وقت سانس نہ بڑھا رہا ہوتا۔ اچانک ابھر آنے والے اِس گم گشتہ خلجان کی وجہ عقل میں آنے لگی۔ میں آہستہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ عرشے پر نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ سائبان کے ستونوں میں طاقچیاں بنی ہوئی تھیں، جن میں شام ڈھلے قندیلیں رکھ دی گئی تھیں، جو اِس وقت ٹمٹما رہی تھیں۔ کیبنوں والا حصہ جگنوؤں سے چمک رہا تھا۔ گمان پڑتا تھا کہ جہاز کے اِس وسیع و بلند گوشے پر جگنوؤں کا جھنڈ اُتر آیا ہو۔ انجن کی گول چمنی اوپر تک چلی گئی تھی، جس سے نکلتا گاڑھا دھواں رات میلی کر رہا تھا۔ میں بکھرے ہوئے لوگوں سے پیر بچاتا دنبالے کی جانب چلا آیا۔ اندازاً پو پھٹنے تک جہاز بمبئی کے

ساحل پر لنگر انداز ہو جاتا۔ میں ریلنگ سے لگ کے کھڑا ہوگیا۔ یہاں میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ نیچے کالے سیاہ سمندر میں دُور تک ایک سلوٹ دار لکیر تھی، جو جہاز کے پیچھے سرپٹ دوڑ رہی تھی۔ چاروں اُور حدِ نگاہ تاریکی ہی تاریکی تھی۔ جہاز کے انجن کی مدھر گڑگڑاہٹ سناٹے کا وقار مجروح نہیں کر رہی تھی۔ نیم سرد ہَوا کے تھپیڑے بھلے معلوم پڑ رہے تھے۔ میری نظریں سیدھ میں بھٹک رہی تھیں، جہاں گاڑھا اندھیرا تھا۔ میرے ہاتھ سینے پر کچھ ٹٹولنے لگے۔ مالا اُس کے لمس سے معطر تھی۔ جیسے لمحہ بھر پہلے ہی اُس نے چھوا ہو۔ سینہ جیسے زنجیروں کی جکڑ سے آزاد ہوگیا۔ سوتے پھوٹنے لگے، لیکن آنکھوں کے صرف گوشے ہی نم ہوئے۔ سمندر بھی غضب کا جادوگر ہے، جلا دیتا ہے۔ نہ جانے میں کتنی دیر یوں ہی کھڑا رہا۔ دفعتاً کوئی بالکل میرے ساتھ آ کے کھڑا ہوگیا۔ خوش بو بتا رہی تھی کہ وہ کوئی عورت ہے۔ وہ عین میرے برابر، بالکل ساتھ کھڑی تھی۔ میں نے اُس کی جانب متوجہ ہونے اور دیکھنے سے گریز کیا۔ ریلنگ پر جمے میرے دائیں ہاتھ کی پشت پر حرارت آمیز ریشمی لمس کا احساس ہوا تو میں نے دیکھا، اُس کا ہاتھ شفاف چاندنی سے ڈھلا تھا۔

”آپ رو رہے ہیں مسٹر بابر!“ دھیمی اور نغمگیں آواز میرے لیے غیر متوقع نہیں تھی اور نہ ہی غیر شناسا، وہ مایا تھی۔

”اور اِس وقت شرمندگی کا اظہار بے معنی ہے مسٹر بابر۔“ اُس نے میرے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

”آپ کے آنے کی توقع تھی۔“ میں نے شائستگی سے اپنا ہاتھ ریلنگ سے اُٹھاتے ہوئے کہا۔

”اِس کا مطلب ہے کہ آپ تمام انگریزوں کو یکساں نہیں سمجھتے۔“ اُس نے اپنا ہاتھ سرد اور برفیلی ریلنگ پر جماتے ہوئے کہا۔

میں نے وضع دار مسکراہٹ سے اُسے جواب دیا۔ وہ نفی یا اثبات دونوں ہی معنی اخذ کرنے میں آزاد تھی۔

”پروفیسر تھامپسن نہایت افسردہ اور گراں بار ہیں۔ اُنھوں نے کئی مرتبہ آپ سے معافی مانگنے کے لیے آنے کا قصد کیا، لیکن اُن میں آپ کا سامنا کرنے کی تاب نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میرے شوہر نے اُن کی حقیقی شان و شوکت چھین لی ہے۔“ اُس کی آواز آزردہ اور لہجہ پُر ملال تھا، وہ میرے کچھ اَور قریب آ گئی۔

دخل در معقولات مجھے بے طرح کھلی تھیں۔ ”آپ کو کس طرح معلوم ہوا کہ میں جہاز کے اِس حصے میں موجود ہوں مسز برنارڈ۔“ میں نے دانستہ اُسے شوہر کی نسبت سے پکارا، حالاں کہ اُس نے اپنا نام بتایا تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ انگریز خواتین اُدھیڑ عمری سے قبل شوہر کی کنیت سے پکارے جانے کو ناشائستہ سمجھتی ہیں اور ناگوار بھی۔

”برنارڈ نشے میں بہک رہا تھا۔ میں نے زیادہ تر اُسے صلح پسندی اور انصاف کی طرف مائل دیکھا ہے۔“ اُس نے

سفید اسکرٹ اور سفید ہی بلاؤز پر فر کا بھورا کوٹ پہن رکھا تھا۔ شانوں پر جھولتے اُس کے سیاہ بال تیز ہَوا میں لہرا رہے تھے گویا کہ رقص کر رہے تھے۔ گہری لال سرخی سے اُس کے ہونٹ اندھیرے میں بھی خوب چمک رہے تھے۔

"مجھے یاد آیا، آپ پچاس فی صد مشرقی بھی ہیں۔"

"اوہ!... کیا مطلب مسٹر بابر؟"

"مشرق میں عورتیں شوہر پرست ہوتی ہیں، یہاں خاوند کی حمایت و یک جائی عبادت سمجھی جاتی ہے۔"

"آپ بات کرنے کا ہنر جانتے ہیں..." اُس نے جز بز ہوتے ہوئے کہا، "برنارڈ اور میں اکھٹے کھیل کود کے جوان ہوئے، اُس سے خوب واقف ہوں۔ میں آپ کے پاس اُس کی صفائی دینے نہیں آئی، معافی کی خواستگار ہوں۔ برنارڈ نے زیادتی کی ہے۔"

"ایک حاکم دوسرا محکوم، کیسی زیادتی، کیسی معافی؟" میرا لہجہ تلخ ہوگیا تھا۔ "بات تو پورے ہندُستان کی ہے۔ پروفیسر صاحب شاید مزید کسی عقدہ کشائی کے منتظر ہوں گے۔"

"آپ بہت شان دار انسان ہیں، غصّہ آپ کو اور شان دار بناتا ہے۔" اُس نے پُر شوق نگاہوں سے دیکھتے ہوئے مسکراہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ میں نے جواب میں کہنا چاہا کہ جاہ و حشم کا شہرہ ہی تو ہندُستان کی بدقسمتی رہی ہے، جو کشاں کشاں فاتحین کو یہاں کھینچتی رہی ہے، لیکن ناگوارِ خاطر ہُوا، مجھ سے کچھ نہ کہا گیا۔

"برنارڈ آپ کو وہاں سے اٹھانے پر قادر نہیں تھا۔ آپ از خود ہی چلے آئے۔ پروفیسر تھامپسن نہایت قابلِ عزت اور بااثر ہیں۔ اُن کی رسائی کا ہم پلّہ اِس جہاز میں کوئی نہیں۔"

"پروفیسر تھامپسن کی ہماری سماجی حیثیت اور مرتبے تک رسائی نہیں، جبھی وہ ہمیں وہاں لے گئے... لیکن ہمیں اپنی اوقات کا بہ خوبی ادراک ہے۔ تبھی ہم وہاں سے چلے آئے۔" میں جواباً کچھ نہیں کہنا چاہ رہا تھا، لیکن زبان سے جملے خود بہ خود پھسل گئے۔

"آپ شادی شدہ ہیں؟" اُس نے خوش گوار انداز میں گفتگو کا رخ موڑنا چاہا۔

"ہاں... نہیں... ہاں ہاں..." غیر متوقع سوال سے میں ہڑبڑا گیا تھا۔ کیا خوب سوال تھا کہ سوال بھی متاعِ جاں، جواب بھی متاعِ حیات۔

"انگلستان کے مرد شادی چھپانے کے فن سے خوب آشنا ہیں۔" مایا نے اِٹھلا کے کہا۔ وہ میری خاموشی سے من پسند معنی کشید کر رہی تھی۔ خفیف انداز میں وہ میرے کچھ اَور قریب ہوگئی۔ میں چپ ہی رہا، جیسے کسی نے قوتِ گویائی یک دم سلب کر لی ہو۔ چیرے گئے پانی کی چرچراہٹ بھلی لگ رہی تھی۔ دیوہیکل سفینہ تیر کیا رہا تھا، بس پھسلے جا رہا تھا۔ جہاز کسی ساحل کے قریب سے گزر رہا تھا۔ دائیں جانب دُور مدھم مدھم روشنی کے دھبّے نظر آ رہے تھے، بستی تھی یا چھوٹا ساحلی شہر۔ چاندنی مایا کے سراپے کو شرابور کر رہی تھی۔ تیز ہَوا کے تھپیڑوں میں اُس کے تراشیدہ بال مسلسل لہلہا رہے تھے۔ بلا شبہ وہ مشرق اور مغرب کا حسین امتزاج تھی، نغمگیں اور سُریلا۔

"میرے ماں باپ کے درمیان مثالی محبت تھی۔ میرے والد کی والہانہ چاہت اور وارفتگی کے باوجود وہ خود کو کم تری کے احساس سے آزاد نہیں کر سکی تھیں۔" مایا نے کچھ توقف کے بعد خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کے دل نشیں انداز میں بولتی تھی۔ اُس کے شستہ انگریزی لہجے میں پنہاں مشرقیت گو کہ اپنا اظہار نہیں کرتی تھی، لیکن انکار بھی نہ تھا۔ "دل جوئی کی ہر کوشش اُن کی آزردگی میں اضافہ کرتی تھی۔ وہ انگلستان کی ہر چیز پر ہندُستانی تمثیل لایا کرتیں۔ جو والد صاحب کو ناگوار گزرتی، لیکن وہ خندہ پیشاں تھے، گرانیٔ طبع کے باوجود اُن کی 'ہاں میں ہاں' ہی ملاتے۔ مغرب جن طور طریقوں اور رسم و رواج کو فرسودہ اور وقت کا زیاں قرار دیتا ہے، والدہ محترمہ کے نزدیک وہ زندگی کی علامت تھے۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ جدت طرازی کے تعاقب میں اندھا دھند دوڑا جا رہا ہے، انسانی رشتوں کو دقیانوسی قرار دینے کا محض ڈھول پیٹا جا رہا ہے، حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ اُن کے نزدیک ذہنی اختراع سے وقوعات نہیں بدل سکتے، البتہ طرزِ وقوعہ تبدیل ہو سکتا ہے۔ سماج کی قید ہی میں انسان کی اصل آزادی ہے۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ مغرب نے اپنی قید کے لیے جس قفس کا انتخاب کیا ہے اُس سے آزادی نہیں موت ملتی ہے، اور وہ بھی صدیوں کے بعد، صرف نئی تہذیب کی نمو کے لیے، نئے معاشرے کی تشکیلِ نو کے لیے... اوہ، میں آپ کو زحمت دے رہی ہوں؟..." بولتے بولتے، اُسے کچھ احساس ہُوا۔ "دراصل میں آپ کو یہ سب بتانا چاہتی ہوں۔ میں نے آپ کی گفتگو سنی تو یقین جانیے مجھے آپ میں والدہ محترمہ کا عکس نظر آیا، وہی انداز، وہی تلخی، وہی تیکھاپن... پروفیسر تھامپسن تو آپ کی مدح سرائی کرکے نہیں تھک رہے۔ اُن کا خیال ہے کہ آپ کی صورت میں اُنھیں اور اُن کی تحقیق کو گوہرِ نایاب میسّر آ گیا ہے۔ وہ آپ کی قربت سے کسی طور دست بردار ہونے کو تیار نہیں ہیں... اور... اور مسٹر بابر!" میرے نام پر اُس کی زبان لڑکھڑا گئی، وہ اب تک سمندر کے رخ میرے متوازی کھڑی تھی، اپنے جملے کا آخری لفظ ادا کرتے ہوئے وہ یک دم میری جانب مڑی۔ اُس نے ٹھیرے ہوئے اور معنی خیز لہجے میں کہا، "مسٹر بابر! آپ کے بارے میں میرا خیال بھی پروفیسر تھامپسن سے مختلف نہیں ہے۔ آپ بہت شان دار شخصیت کے مالک ہیں مسٹر بابر!" اُس کی سانس میں خفیف لرزش تھی اور آنکھوں میں طوفان۔

"آپ نے بہت اچھے انداز میں میری دل جوئی کی ہے۔ آپ اِس بیکراں سمندر سے پوچھیے کہ اِس دیوہیکل فولادی جہاز کی اوقات اِس کی نظر میں کیا ہے۔ جو جواب بحرِ بے کراں کا ہوگا، وہی مجھ ناچیز کی اوقات و بساط ہوگی۔"

"خوب!... چہ خوب مسٹر بابر... کیا خوب صورت طور سے جواب گو ہوئے ہیں آپ... والدہ کہا کرتی تھیں کہ ہندُستانی مزاج کی بے جا عاجزی و انکسار نے اُس کے گلے میں غلامی کا طوق ڈال رکھا ہے۔" وہ بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے بے ساختہ بولی۔ اُس کی گویائی میں وقار بدرجۂ اتم موجود تھا۔

میں خاموش رہنا چاہ رہا تھا۔ مسلسل پہلوتہی کے باوجود جوابی فقرہ میری زبان سے خود بہ خود ہی پھسل جاتا تھا۔ وہ میرے اندازے سے کہیں بڑھ کر غواص تھی۔ میں اُسے پڑھ رہا تھا، اور وہ مجھے مہمیز کر رہی تھی۔ "جس توجیہ کو آپ کی والدہ عاجزی و انکسار کہتی تھیں، وہ درحقیقت اپنی ذات سے عدم شناسی ہے۔ ہندُستان کے لوگ خود کو فریب دینے کے لیے اِسے عجز و انکسار ہی پر محمول کرتے ہیں، اور یہی بیان ہندُستان کے گلی کوچوں سے پنپ کے مغرب کے در و بام تک پیغام بن کے پہنچ گیا۔"

"وضاحت کریں۔"

"آپ نے سرکس کا شیر دیکھا ہے مسٹر برنارڈ؟" میرا لہجہ کوشش ناتمام کے باوجود تلخ ہوگیا۔

"ہاں... کئی بار۔" مایا نے فوراً جواب دیا۔ اُس کی آنکھیں شوق سے جھپکنے لگی تھیں۔

"سرکس میں شیر کے علاوہ اَور بھی جان وَر ہوتے ہیں۔ ریچھ، کتے، بن مانس، بندر، سانپ، اژدھے، وغیرہ وغیرہ۔"

"ہاں... وہیل اور ڈولفن مچھلیاں بھی اب سرکس کی زینت بننے لگی ہیں۔"

"اِن مختلف النوع جان وَروں کو اشاروں پر نچانے والوں کی ایک ہی قسم ہے اور وہ ہے حضرتِ انسان۔" میں نے دانستہ توقف کیا۔

"آں... ہاں... بات جاری رکھیں۔" وہ مچلتے ہوئے بولی۔

"کیا یہ جان وَر طاقت اور زور میں انسان سے کم ہیں؟ ہم پلّہ ہیں؟"

"بالکل نہیں!"

"عجز و انکساری نے ہندُستانیوں کے گلے میں پٹا نہیں ڈالا۔ ہندُستانی سرکس کے جان وَروں کی مثال ہیں۔ اِنھیں سیلابِ بے اماں کی قوت کا اندازہ نہیں... انگریز کے پاس مداری کی طرح

بہ‌ترین اورانتظامی صلاحیت موجود ہے۔اور ہندُستان کے لوگوں کے پاس اپنی طاقت سے عدم واقفیت! مداری کرتب دکھا رہا ہے اور شیر سرکس میں ناچ رہا ہے۔"

"میں آپ کی اِس رائے سے متفق نہیں ہوں... طاقت تو سامانِ حرب میں پوشیدہ ہے۔ اِس سے ہمارے لوگ مالا مال ہیں... بمبار طیارے، گولہ بارود، خود کار بندوقیں، ٹینک، تربیت یافتہ فوج، بہ‌ترین مواصلاتی نظام، سب سے بڑھ کر سائنس وٹیکنالوجی کی ہزار جہتی قوت انگریزوں کے پاس ہے۔ آپ کس بل پر ہندُستان کے لوگوں کو طاقت وَر کہہ سکتے ہیں۔ مداری اور شیر میں جو فرق ہے، بعینہٖ ہندُستانی عوام اور انگریزی حکومت میں وہی فرق تو ہے۔"

"آپ ایسا کہہ سکتی ہیں۔" میں نے یک دَم قطعی اور اختتامیہ لہجے میں کہا۔ اُس کا جواب مجھے کچھ سطحی سا لگا، اور کچھ اُس کے انداز میں یکا یک دَر آنے والے فخر و انبساط نے طبیعت کو مکدّر کر دیا تھا۔ لطفِ کلام نہ رہے تو دلیل کا حسن ماند پڑ جاتا ہے، اور لطفِ کلام تو مخاطب کی فکری برتری کا محتاج ہوتا ہے۔ ذہانت و فطانت آسمانی عطا ہے، لیکن اس میں پختگی و بالیدگی سِن یا تجربے کی مرہونِ منّت ہوتی ہے۔ زندگی کی اونچ نیچ اور تجربے سے کم مستفید ذہین و فطین لوگ ٹمٹماتے دیے کی مانند ہوتے ہیں، ذرا لَو بھڑکی تو آسمان اٹھا لائے، مدھم ہوئی تو زمین پر چلنے سے محروم۔

"آپ لاجواب ہوئے ہیں، یا جواب نہیں دینا چاہتے۔" وہ گھبراہٹ سے بولی۔ اُس نے میرے چہرے پر نمودار ہونے والی ناگواری بھانپ لی تھی۔ اُس لمحے وہ بہت اچھی لگی۔ میری زبان پھر متحرک ہو گئی، نہ چاہتے ہوئے بھی۔

"لوازماتِ دنیا پر غور کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ سبھی کچھ فطرت کے مسلّمہ اصولوں کے ماتحت ہے۔ فطری اصولوں کی ابدیّت کو آج کا جدید انسان بھی تسلیم کرتا ہے۔ انسان نے اپنے تئیں اب تک تمام تبدیلیاں قانونِ فطرت کے مسلّمہ اصولوں کے ماتحت ہی کی ہیں۔ انسان کے تمام

اکتشافات دریافت محض ہیں۔ لطف کی بات ہے کہ قدرت نے کرۂ ارض پر طاقت کا منبع انسان کو بنایا ہے۔ ارضی مخلوقات میں انسان صرف عقل کی بنیاد پر ممتاز نہیں ہے، بل کہ قدرت نے اُسے یگانگت و یک رُوئی سے بھی نوازا ہے۔ ایک انسان دو انسانوں کے برابر نہیں ہو سکتا۔ اِس رائے کی حمایت میں فوری دلیل لانے سے میں قاصر ہوں، لیکن مشاہدے نے یہی سکھایا ہے کہ ایک انسان دو کے مساوی نہیں ہو سکتا۔ محض اپنی لیاقت کے بل پر وہ دیگر چند انسانوں پر جزوقتی برتری، حکومت ضرور حاصل کر سکتا ہے، لیکن اِس فتح کو دوام حاصل نہیں ہو سکتا۔ فاتح سلطان ہو یا وائسرائے، سبھی کی فتح استقامت کے لیے انسانی سلسلے کی محتاج ہے۔ سلطان کو فاتح بننے کے لیے رعایا نہیں صرف سپاہی اور سامانِ حرب درکار ہوا کرتا ہے، لیکن سلطان کو بادشاہ بننے کے لیے رعایا درکار ہوتی۔ بالکل ایسے ہی پہلے مرحلے پر جنگلی جان وَروں کو طاقت کے بل پر آہنی پنجروں میں جکڑ لیا جاتا ہے، لیکن سرکس تماشے کے لیے مداری کو جان وَر کے دل و دماغ پر حکومت کرنی ہوتی ہے، ورنہ سر پھرے کب زیرِ نگیں ہوتے ہیں۔ اِسی طرح پہلے مرحلے پر سلطان فتح کے لیے کشتوں کے پشتے لگا دیتا ہے، لیکن دوسرے مرحلے میں انسانوں کی فتح ہی اُس کا سب سے بڑا مسئلہ بنتی ہے۔ یہی دائمی وابستگی ہے۔ جو اِس مرحلے میں کام ران ہوا، اُسی کو تاریخ نے عزّت و احترام سے یاد کیا ہے۔ انگریز پہلا مرحلہ تو سامانِ حرب کی برتری کی بدولت سر کر چکے ہیں۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ انگریزوں کو دوسرے مرحلے کا ادراک نہیں ہے، لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ وہ اِس مرحلے پر ناکامی سے دوچار ہیں۔ اُنھوں نے ہندُستان کو طاقت کے بل پر پنجا ڈال کے سرکس میں لا کھڑا کیا ہے، لیکن دل و دماغ کی فتح بہت دُور ہے۔ اِس وقت محض عدم آگہی کی بنا پر شیر بہ جبر و کراہ تماشا دکھا رہا ہے، لیکن جس دن شیر کو احساس ہو گیا کہ اُس کے جبڑے مداری کے

وکیل صاحب... میں نے ناول کے مطابق اپنا کردار ادا کیا

ہنٹر سے زیادہ طاقت وَر ہیں، اُس دن وہ مداری کو مار کھائے گا کہ اُس کے دل میں مداری کے لیے نرم گوشہ نہیں ہے۔ ہندُستانی عوام کا جبڑا اُن کی خوف ناک اور بے پناہ عددی برتری میں پوشیدہ ہے۔ انگریز امتیاز کے ساتھ اپنی فتح کو دوام دینا چاہتے ہیں، جو کہ ناممکن ہے۔ قدرت نے انسانوں کو مساوی بنایا ہے۔" میں نے کچھ توقف کیا۔ وہ گنگ اور سحر زدہ انداز میں مجھے تکے جا رہی تھی۔ میں نے غیر محسوس طریقے سے اُس کے اور اپنے درمیان ختم ہو جانے والا فاصلہ بحال کیا۔ جہاز ساحل سے کچھ اور قریب ہو گیا تھا۔ چمکتے ہوئے دھبے کچھ اور واضح ہو رہے تھے۔ دُور اندھیرے میں چھوٹی چھوٹی کشتیوں کے ہیولے نظر آ رہے تھے۔ ہیولے متحرک تھے یا جامد یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا۔ جہاز سست رَو تھا، ورنہ اِسے اب تک بمبئی پہنچ جانا چاہیے تھا۔ ہو سکتا ہے روشنیوں کے یہ دھبے بمبئی ہی کے قرب و جوار سے ہوں۔ ہوا میں سمندری کراوٹ کے ساتھ ساتھ کچھ فرحت اور تازگی بھی دَر آئی تھی۔ وہ ایک ٹک مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے جھینپ کے نظریں جہاز سے پیوستہ سفید سمندری لکیر پر مرکوز کر لیں۔

"ہندُستانی شریف النفس ہوتے ہیں..." وہ بڑبڑائی، جیسے کوئی نکتہ اُس کی دست رَس میں آ گیا ہو۔ وہ چونک کے بولی، "آپ نے انسان کے مساویانہ درجے اور امتیاز کی بات کی، آپ کے نزدیک فاتح اور حکم ران میں فرق ہے... لیکن حکم ران اور رعایا کے درمیان عدمِ مساوات کا جو وسیع پاٹ ہے اُسے آپ کیا کہیں گے مسٹر بابر!" اُس کے لہجے میں انتہائے دل چسپی اور بکمالِ شوق تھا۔

"انسانی رویّوں کو سمجھنے کے لیے قانونِ فطرت کا تھوڑا بہت ادراک از حد ضروری ہے مسز برنارڈ!"

"مجھے مایا پکارے جانا پسند ہے۔" اُس کے لہجے میں تپش بھی تھی اور لرزش بھی۔

میں نے اُس کے اعتراض پر تبصرہ کرنے کی بجائے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ لطفِ کلام گویا دَر آیا۔ "سلطان اور حکم ران میں بنیادی فرق ہی امتیاز کی نوعیت کو واضح کرتا ہے۔ سلطان اپنی مرضی اور طاقت کے بل بوتے پر قابض ہوتا ہے، اور حکم ران رعایا کی منشا سے عنانِ حکومت چلاتا ہے۔ جو حکم ران اپنی رعایا کو مساوی درجہ نہیں دیتے اُنھیں بہت جلد بغاوت، شورش اور حکم کی غیر مقبولیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مقبول حکم ران اور رعایا کے درمیان امتیاز رضا و رغبت سے جڑا ہے۔ کس میں دَم ہے جو کسی پر حکومت کرے، یہ تو من کے سودے ہیں، جسے من چاہے اپنا حکم ران بنا لے۔ رعایا کا از خود تفویض کردہ انتظامی حق امتیاز کو جنم نہیں دیتا، امتیاز مسلط کی گئی حکم رانی کے بطن سے جنم لیتا ہے۔" اُس کی بڑی بڑی شربتی آنکھیں حیرانی سے گویا پھٹنے کو ہو گئیں۔ وہ مبہوت سکتے کے عالم میں کافی دیر مجھے تکتی رہی۔ پھر خود کار انداز میں بڑبڑائی، "آج سے پہلے ہندُستان میری نظر میں ایک پسماندہ سرزمین تھا... آپ کی نکتہ بیانی نے میری نظر ہی بدل دی۔ من چاہے حکم ران کا انتخاب تفریق کو ختم کرتا ہے۔ بہت خوب مسٹر بابر! بہت خوب! اِس نکتے کی مزید وضاحت کریں گے؟"

"اِس نکتے کو آپ اپنی ذات پر منطبق کیجیے! کیا آپ کی منشا کے بغیر آپ پر کوئی حکومت کر سکتا ہے؟ بہ جبر و کراہ کسی کا کہا ماننے پر آپ کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟ جب آپ کے شوہر نے ہمیں طعام گاہ سے نکال باہر کیا، بہ ظاہر آپ

نے بھی برنارڈ کی تعمیل کی۔ سچ بتایئے! اِس میں آپ کی کتنی
منشا تھی؟...'' اُس کی آنکھیں اُبلنے لگیں۔ آگہی و ادراک کی
لذّت اُس کے چہرے پر نئی مصوری کر رہی تھی۔ ''مایا! میرا
سوال غور سے سنیئے گا۔ میری گفتگو کا خلاصہ اور حاصل ہے۔''

''میں ہمہ تن گوش ہوں!'' وہ بولی، جیسے ہپناٹائز کے
زیرِ مشق بولتے ہیں۔

''میری آپ سے چند گھنٹوں کی ملاقات ہے۔ اِس مختصر
جان کاری کے باوجود یہ سوال میرے ذہن میں کلبلایا ہے۔''
اچانک ایک جھجک مانع ہوئی، اور میں سوال کرتے کرتے ٹھہر گیا۔

اُس نے قطعِ کلامی کو میرے طرزِ بیاں پر محمول کیا،
اور بے تابی سے کچھ دیر میرے بولنے کا انتظار کیا، لیکن
جب خاموشی کئی لمحوں پر محیط ہوگئی تو وہ مضطرب ہو کے بولی،
''بہ راہِ کرم! پوچھیے!''

''از روئے دل بتایئے ماریا! میجر نارڈ آپ پر مزید
کتنے عرصے حکومت کر سکتا ہے؟'' میرے مُنہ سے یک دم
چاقو نکل گیا۔ اُس کا چہرہ دفعتاً تاریک پڑ گیا تھا۔ اُس کی دمکتی
آنکھیں بجھ سی گئیں۔ ''آپ کا جواب ہی ہندوستانی عوام کا
انگریز سرکار کو پیغام ہوگا۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے اپنا
مدعا تمام کر دیا۔ وہ ایک ٹک مجھے تکتی رہی، جیسے کوئی خلا میں
جھانکتا ہو۔ میرے سوال نے اُس کا یقین، اعتماد اور سر سے
سائبان کھینچ لیا۔ مغربی سہی آخر وہ عورت تھی۔ اُس نے کچھ
بولنا چاہا، لیکن اُس کے ہونٹ لرز کے رہ گئے۔ اچانک جیسے
بجلی کوندی۔ وہ مجھ سے لپٹ گئی، اور زار و زار سسکنے لگی،
بھل بھل اُبلنے لگی۔ ''آپ نے یہ کیسے سمجھا! مسٹر بابر!''

میں نے اُسے دھیرے سے علیحدہ کرنا چاہا۔ اُس نے
گرفت مزید مضبوط کر لی۔ ''سامنے کی بات ہے... رات کا
یہ وقت ہے ہی خاوند اور زوج کے لیے... اور آپ اِسے...
آپ اِس کے برعکس خاوند کو چھوڑ کے اُس کے معتوب کی
دل جوئی کرنے چلی آئی ہیں۔''

''میں برنارڈ سے نفرت کرنے لگی ہوں۔ جس کا اظہار و
ادراک آج پہلی مرتبہ ہوا ہے، آج یوم آگہی ہے مسٹر بابر!''
اُس کا لہجہ گلوگیر تھا۔ وہ بدستور سسک رہی تھی۔ میرا دم گھٹنے لگا۔
مجھ پر بھی تو کسی کا سکّہ رواں دواں تھا۔ ایک بلا شرکتِ غیرے
حکومت تھی، نہ ہجر کا گلا نہ وصال کی امید، نہ سود و زیاں کا
حساب، یہی ایک پُر شوق آبلہ پائی ہم رکاب ہے، نہ تشنگی کا
احساس نہ سیرابی کی لذّت۔ کتنی صدیاں بیتیں اُس سیر چشم کو
دیکھے اور کوئی لمحہ تھا جو وہ اوجھل ہوئی ہو۔ کورا کی حکومت کیسی
شان دار تھی۔ پایۂ تخت پر اُس کی گرفت کیسی پُر اَسرار تھی،
جسے نہ سپاہ کی ضرورت نہ انقلاب کا خوف! میں نے ایک
جھٹکے سے مایا کو خود سے علیحدہ کرنا چاہا کہ یک دم جیسے دائیں
کاندھے کا جوڑ کُھل گیا، ضرب نپی تلی اور زوردار تھی۔ شدید
درد نچلے دھڑ تک سرایت کر گیا۔ اِس سے پیش تر میں
صورتِ حال کو سمجھ پاتا، میرے سر پر ایک زوردار دھماکا ہُوا۔
ساتھ ہی مایا کی دل دوز چیخ اُبھری۔ وہ چیختی ہوئی دنبالے کے
فرش پہ جا گری۔ میرے سر میں بڑی زوردار آواز سے گھنٹے
بجنے لگے۔ منظر بری طرح چکرانے لگا۔ میں نے بے اختیار
سر کو تھاما، اور لہرا کے مایا کے اوپر ہی گر پڑا۔

''ہندوستانی کتیا کے بچے! تیری اِتنی اوقات! اِتنی
جرأت!'' وہ میجر برنارڈ کی آواز تھی، غیض و غضب سے بھڑکتی
ہوئی۔ مغلظات کا طوفان اُس کی زبان پر اُمڈ رہا تھا۔ ہیجان،
وحشت، جنون اور بہت کچھ اُس کے لہجے میں عیاں تھا۔
میں نے خود کو دائیں ہاتھ کے زور پر اُٹھا کے مایا پر سے ہٹانا چاہا،
مگر بازو نے بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا۔ دفعتاً بائیں پہلو پر
زوردار ضرب لگی۔ برنارڈ نے پوری قوت سے لات ماری۔ میں
اُلٹ کے فرش پر چت ہوگیا۔ اب سارا منظر میرے سامنے تھا۔
برنارڈ اور ٹونی مایا کے سرہانے کھڑے تھے۔ وہ پھٹ پڑنے کو تھا۔
اُس کے مُنہ سے کف بہہ رہا تھا، چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ وہ
نشے میں جھول رہا تھا۔ مایا اُٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ دفعتاً برنارڈ
نے جھک کے اُسے بالوں سے پکڑ کے اُٹھایا۔

''ہندوستانی کتیا کی بیٹی!...حرام زادی!... گلچھرے اُڑانے

ہندستان جارہی ہے؟" برنارڈ نے مایا کے بال پکڑے پکڑے ہی ڈھیلے ہاتھ کا طمانچہ رسید کردیا۔ میرے لیے حواس بحال کرنے کا یہی موقع تھا۔ بقولِ بجّھل کہ تلوے اور زمین کے گٹھ جوڑ کے ساتھ زندگی جڑی ہے۔ جس کے تلوے نے زمین چھوڑ دی، وہ گیا۔ میں نے سانس روک کے جسم میں اُٹھنے والے شدید درد کو قابلِ برداشت کیا۔ ظالم نے نپی تلی ضربیں ماری تھیں۔ برنارڈ یقیناً لڑائی بھڑائی کے فن میں تربیت یافتہ تھا۔ وہ مایا کو بری طرح تھپڑا رہا تھا۔ مایا اُس کا مُنہ نوچ رہی تھی، اور ترکی بہ ترکی اُسے مغلظات کا جواب دے رہی تھی۔ ٹونی اُن دونوں کو جدا کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ میں نے اپنی دونوں ٹانگوں کو قوس کی مانند اوپر اٹھایا اور پشت کے زوردار جھٹکے سے تلووں کو زمین کی طرف گرادیا۔ اگلے ہی لمحے میں اپنے قدموں پر کھڑا تھا۔ اگر میں کروٹ کے بل کھڑا ہوتا تو ایک لمحہ ایسا ضرور آتا جب وہ تینوں میری نظروں سے اوجھل ہوتے، اور یہ سارا کھیل ہی نظر کی چوکسی کا ہے۔ معمولی سی غفلت مجھے ایک اور نپی تلی ضرب سے ہم کنار کرسکتی تھی، جس کا میں اِس وقت متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ مجھے کھڑا ہوتا دیکھ کے برنارڈ نے مایا کو ٹونی کی طرف دھکیلا اور طمنچہ نکال کے مجھ پر تان لیا۔ شدید غصّے سے اُس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ میرے لیے اندازہ لگانا مشکل نہ تھا، وہ گولی چلانے سے دریغ نہیں کرے گا۔ نشے میں ڈولتے ہوئے جنونی سے کچھ بعید نہیں تھا۔ وہ مجھ سے کم از کم تین گز کے فاصلے پر تھا۔ جیب سے چاقو نکالنے کی مہلت نہیں تھی، چہ جائیکہ کھٹکا دبا کے اُسے کھولا جائے۔

میں نے یک سوئی سے نظریں تمنچے پر جمادیں۔ لبلبے کی خفیف تحریک پر میں حرکت کرنے کے لیے تیار تھا، لیکن گولی سے بچ نکلنے کے آثار مفقود تھے۔

"تیسرے درجے کے شہری! تمھاری اوقات بھوکی مچھلیوں کی خوراک سے زیادہ نہیں... حرامی کتے!" برنارڈ وحشیانہ انداز میں پوری قوت سے چلّا رہا تھا۔ شدتِ جذبات سے اُس کی گردن کی نسیں ابھر آئی تھیں۔

میری کنپٹیاں سلگنے لگیں۔ دماغ میں کچھ پکنے لگا۔ وہ گولی ہی چلاسکتا تھا، لیکن اِس عرصے میں اُس کی گردن کی ہڈی ضرور تڑخائی جاسکتی تھی۔

"کتیا کے بچے... چل پیچھے کی جانب چل۔" اُس نے چیختے ہوئے کہا، اور پستول سے مجھے ریلنگ کے ساتھ لگنے کا اشارہ کیا۔

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ بجّھل کی برفیلی گولی جل کے خاکستر ہوگئی۔ میں نے فیصلہ کرلیا۔ مزید کچھ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اُدھر مایا ٹونی کی گرفت میں بے طرح پھڑ پھڑا رہی تھی۔ اُس کی چیخیں کافی تیز تھیں۔ برنارڈ پر جست لگانے کے سوا چارہ نہ تھا۔ وہ فوجی افسر تھا، اُس کا نشانہ خطا جانے کا امکان ندارد تھا۔ میں نے پنجوں کا دباؤ زمین پر دیا کہ بجّھل نظر آیا۔ وہ برنارڈ کے عقب میں پنجوں کے بل دنبالے کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ بجّھل نے نظریں چار ہوتے ہی مجھے برنارڈ کا حکم ماننے کا اشارہ کیا، میری سانس جہاں تھی وہیں رہ گئی۔ ٹونی کی نظر کسی بھی لمحے بجّھل پر پڑ سکتی تھیں، لیکن وہ مایا سے الجھا ہوا تھا، اور کچھ میری جانب بھی متوجہ تھا۔ وہ برنارڈ کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ میں نے الٹے قدموں دنبالے کی ریلنگ کی طرف کھسکنا شروع کردیا۔ بجّھل دھیرے دھیرے برنارڈ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ گز سوا گز کی دُوری رہی تھی۔ معمولی سے آہٹ یا ٹونی کو موجودی کا احساس بجّھل یا مجھ میں سے کسی ایک کی جان لے سکتا تھا۔ میں چند قدم کھسک کے ریلنگ سے لگ چکا تھا۔

"ریلنگ پر چڑھو اور سمندر میں کود جاؤ... میرے حکم کی فوراً تعمیل کرو!"

برنارڈ کے چہرے پر یکا یک ایک مخصوص اور زہرخند مسکراہٹ نمودار ہوئی، قاتل بھی اور متجسس بھی۔ بلاشبہ بپھرے ہوئے سمندر میں تھک ہار کے ڈوب مرنا گولی کی موت سے زیادہ ہول ناک اور روح فرسا تھا۔ بجّھل اُس کے سر پر آچکا تھا۔

"کود جاؤ سمندر میں۔ ورنہ تمھاری ٹانگوں میں گولیاں مار کے سمندر میں پھینکوں گا... لیکن زندہ ہی..." اُس نے تمنچے سے مجھے ہانکا۔ پھر تضحیکانہ لہجے میں بولا، "پور بندر قریب ہے۔ تیرتے ہوئے اُدھر پہنچ جانا۔"

میں برنارڈ کی جانب پشت کیے بغیر ریلنگ پر چڑھنے لگا تو بجّھل نے سخت نظروں سے گھورا۔ میں الجھ گیا، کچھ تھا جسے میں نظر انداز کررہا تھا۔ دفعتاً بجّھل کا سر برنارڈ کے عقب سے غائب ہوگیا۔ اُس کے عین پیچھے پروفیسر تھامپسن اور زورا نظر آرہے تھے۔ جمرو بھی یقیناً انھی کے ساتھ ہوگا۔ پھر کوندا لپک گیا، اور چشم زدن میں برنارڈ مُنہ کے بل زمین پر آرہا۔ بجّھل نے نیچے بیٹھ کے خاص انداز میں برنارڈ کے دونوں ٹخنے اپنی جانب کھینچ لیے تھے۔ بجّھل نے اُس کے ٹخنوں کو زمین سے اٹھا کے اپنی جانب کھینچا تھا، اگر وہ ایسا نہ کرتا تو برنارڈ کا پلک جھپکتے ہی زمیں بوس ہونا ناممکن تھا، طمنچہ اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کے سیدھا میرے قدموں میں آگرا تھا، لیکن میں نے طمنچہ اٹھانے کی بجائے ٹونی کی فکر کی، جو عرشے کی جانب بھاگنے کو پر تول رہا تھا۔ مجھے بڑھتا دیکھ کے اُس نے مایا کو میری جانب دھکیل دیا۔ میرے لیے فوری طور پر پلٹنا یا دائیں بائیں ہونا ممکن نہیں تھا۔ میں مایا سے الجھ گیا۔ اِس سے پیش تر میں مایا کو ایک طرف کرتا ٹونی نے دنبالے سے عرشے پر چھلانگ لگادی۔ کیبنوں والے حصے تک ٹونی کے صحیح سلامت پہنچنے کا مطلب ہمارے لیے بے پناہ مشکلات تھیں۔ میں نیچے جانے لگا تو بجّھل نے مجھے منع کردیا۔

"مشٹنڈا اِدھری ہے... سنبھال لے گا رے۔" وہ اچھلتا ہوا میری طرف آیا تھا۔ "مُنہ دے آیا تھا تو بتانے میں تیرا ہرج نہیں تھا۔ ایسے نہ ستایا کر۔" بجّھل سیدھا مجھ سے آ ٹکرایا۔ اُس نے دوہتڑ میرے سینے پر مارا۔ پھر جھڑک کے اپنی آغوش میں جکڑ لیا۔

برنارڈ اوندھا پڑا ڈکرا رہا تھا۔ اُس کے مُنہ سے خون کی پتلی لکیر بہتی ہوئی ریلنگ تک چلی گئی تھی۔ نیچے گراتے ہی بجّھل نے دونوں ٹخنے اُس کے کولھوں سے ملادیے تھے۔ پھر اُتنی ہی تیزی سے وہ اُس کی مڑی ہوئی ٹانگوں پر گرا تھا، اور گرتے ہوئے اُس نے کہنی کی کاری ضرب کمر کے عین درمیان میں ریڑھ کی ہڈی پر لگائی تھی۔ برنارڈ کے زمین پر پڑا رہنے کے لیے یہ بہت زیادہ تھا۔

"میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں... یہ سب میری وجہ سے ہوا۔" مایا ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

"کیا گٹ پٹ کررہی ہے رے؟" بجّھل نے مجھ سے الگ ہوتے ہوئے کہا۔ اُس نے معنی خیز نظروں سے مایا کو دیکھا۔

دفعتاً الجھن کا سرا میرے ہاتھ آگیا۔ برنارڈ مجھ سے انگریزی میں کہہ رہا تھا، بجّھل کیسے اُس کی بات سمجھ رہا تھا، اور مجھے تعمیل کرنے کے اشارے دے رہا تھا! میں نے بجّھل کی طرف دیکھا۔

"چوکھٹا پڑھ لیتے ہیں رے۔ اِن کی گٹ پٹ سانجھی ہوتی ہے۔" بجّھل نے میری ٹھوڑی پکڑتے ہوئے کہا، "بابا جی کچھ بولے ہیں اِس کے بارے میں۔" اُس نے پروفیسر تھامپسن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ بھی سہمے ہوئے ہمارے قریب آگئے تھے۔

"خدا کا شکر ہے مسٹر بابر! آپ کی جان بچ گئی۔ متوقع جواب طلبی کی آپ چنداں فکر نہ کریں... حکومتِ برطانیہ کے گراں قدروں میں شمار ہے۔" پروفیسر تھامپسن نے حیرانی سے بجّھل کو دیکھتے ہوئے کہا، جیسے گرُ گانو کے جاٹ بمبئی دیکھتے ہیں۔ "یہ بہت طاقت ور اور حیرت انگیز انسان ہیں۔ آپ کی اور آپ کے دوستوں کی رفاقت مطلوبِ خاطر ہے مسٹر بابر!"

اِس اثنا میں زورا ٹونی کو کاندھے پر ڈالے دنبالے پر چڑھ آیا۔ اچھا خاصا شور و غل مچ چکا تھا۔ میں نے دنبالے سے نیچے جھانک کے دیکھا۔ وہ ایک دوسرے پر چڑھے کھڑے تھے۔ عرشے کے سوئے ہوئے مسافروں کی بڑی تعداد دنبالے کی سیڑھیوں پر جمع ہوچکی تھی۔ سبھی کی نظریں استعجاب اور فکرمندی سے ہماری طرف تنی ہوئی تھیں۔

سرگوشیوں اور چہ مگوئیوں کی بھنبھناہٹ سمندری شور پر حاوی ہو چکی تھی۔ صورتِ حال ہماری توقع سے زیادہ گمبھیر تھی۔ بچھل کی پیشانی پر فکر کی لکیریں نمایاں ہو چکی تھیں۔ ہمارے چاروں طرف سمندر تھا اور جہاز پر ہماری گرفتاری یقینی تھی۔ فوجی افسر پر حملے کو انگریز غداری سمجھتے تھے، جس پر کسی بھی قسم کی رعایت نہیں کی جاتی تھی۔ پروفیسر تھامپسن کو ہندستان کی صورتِ حال کا ذرا بھی ادراک نہیں تھا۔ وہ خلوصِ نیت سے ہمیں بے فکری کی تلقین کر رہے تھے، لیکن ہمارے لیے وہ محض تسلیوں سے بڑھ کر نہیں تھی۔ میں نے اُن کی بات بچھل تک بڑھانی مناسب نہیں سمجھی۔ وہ متفکر کھڑا رہا۔ عرشے پر ہجوم بدستور بڑھ رہا تھا۔ برنارڈ بے ہوش ہو چکا تھا۔ مایا اُسے سیدھا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پروفیسر تھامپسن اُس کی مدد کو بڑھے۔ دونوں نے مل کے برنارڈ کو سیدھا کر دیا۔ اُس کا چہرہ خون سے تر بہ تر تھا۔ دفعتاً بچھل نے آگے بڑھ کے برنارڈ کا گرا ہوا طمنچہ اٹھا لیا۔ طمنچہ میرے حوالے کرتے ہوئے اُس نے سرگوشی میں مجھے کچھ ہدایات دیں۔ خود زورا اور جمرو کی طرف بڑھ گیا، جو دنبالے کی سیڑھیوں پر کھڑے عرشے کے مجمع کو گھور رہے تھے۔ میں نے بچھل کی بات پر پروفیسر تھامپسن اور مایا کو اعتماد میں لیا۔ اُنھوں نے فوراً ہامی بھر لی۔ پروفیسر تھامپسن نے کہا، ”تمھارا ساتھی جہاں دیدہ ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میرا واسطہ عظیم بہادر انسانوں سے پڑا ہے۔ اِس سنگین صورتِ حال میں آپ چاروں کے چہرے پُرسکون ہیں نہ کوئی خوف نہ سراسیمگی۔“

”نہایت افسوس ہے کہ میں آپ کے پاس ایک مصیبت کے ہم راہ چلی آئی۔ آپ گرفتار ہو گئے تو اُس کے بعد برنارڈ کی غضب ناکی کا مجھے بخوبی اندازہ ہے۔ یہ کینہ پرور انسان ہے۔ آپ کو شدید نقصان پہنچائے بغیر چین سے نہیں بیٹھے گا۔ آپ کے ساتھی نے درست فیصلہ کیا ہے۔ میں ہر قیمت پر آپ کا ساتھ دوں گی۔“ مایا نے پروفیسر تھامپسن کی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ اُس کی والہانہ نگاہیں بصد شوق میرا طواف کر رہی تھیں۔

بچھل نے ہر قیمت پر گرفتاری نہ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ ہم آنے والے پل کی نوعیت کا اندازہ لگانے سے قاصر تھے۔ جہاز پر کم و بیش سو کے لگ بھگ مسلح محافظ تو ہوں گے۔ بچھل برنارڈ، ٹونی، مایا اور پروفیسر تھامپسن کو یرغمال بنا کے کسی قریبی ساحل پر اترنا چاہتا تھا۔ فی الحال ہماری بمبئی یاترا ملتوی ہو چکی تھی۔ یہ بہت بڑا اقدام تھا۔ تاجِ برطانیہ سے براہِ راست ٹکر! جہاز سے اترنے کے بعد ہماری مشکلات میں بے پناہ اضافہ ہونے والا تھا۔ کہاں تک چھپتے پھرتے؟ ہمارے حلیے ہندستان بھر میں عام کر دیے جاتے۔ دیس بھر کے تھانوں سے ہماری گرفتاری طلب کی جاتی۔ کھوجی اور ہرکارے طول و عرض میں دوڑ پڑتے۔ ہم بمبئی جا رہے تھے، ہماری تلاش بھی بمبئی سے شروع ہوتی۔ بمبئی میں ہمارے حلیے کا چند گھنٹوں میں سراغ لگا لیا جاتا۔ ابا جان، فرخ، فارہہ، فریال، اکبرا اور ان سب کی زندگی جہنم بننے والی تھی جن کا ہم سے ذرا بھی واسطہ تھا۔ میں وہاں پہنچا نہیں تھا، لیکن میری نحوست پہنچنے والی تھی۔ ہمیں گرفتاری دینی چاہیے۔ بچھل یہ سب کچھ مجھ سے پہلے سوچ چکا ہوگا، یرغمالیوں کے بدلے جہاز والوں سے وہ کیا مطالبہ کرنے والا تھا، اِس سے میں بے خبر تھا۔ دفعتاً انجن نے گڑگڑانا بند کر دیا اور جہاز کی رفتار سست ہو گئی۔ میں نے چمنی کی طرف نظر دوڑائی، وہاں سے دھوئیں کا اخراج تقریباً بند ہو چکا تھا۔ یقیناً جہاز کو روکا جا رہا تھا۔ جہاز کو اِس وقت روکنا بعید از عقل تھا۔ ممکن ہے انجن میں خرابی پیدا ہو گئی ہو یا پھر کسی سگنل کی وجہ سے معمول کے مطابق روکا گیا ہو۔ ہماری وجہ سے جہاز کو ٹھہرانا ناممکن سی بات تھی۔ دفعتاً کیبن والے حصے سے غلغلہ بلند ہوا۔ بھگدڑ کی طرح لوگوں کا ریلہ عرشے کے عقب کی جانب آیا، لوگوں کی بھنبھناہٹ چیخ و پکار میں تبدیل ہو گئی۔ دفعتاً یکے بعد دیگرے کئی طمنچے دھاڑے۔ عرشے پر سناٹا چھا گیا۔ میں نے نیچے جھانکنا چاہا، بچھل نے یک دم میری طرف جست لگائی اور مجھے رگیدتا ہوا فرش پر پڑ گیا۔

"چپکا پڑا رہ رے... مالک نے فرشتے بھیجے لگتے ہیں۔"
میرے نیچے گرتے ہی طمنچہ چلا اور گولی وہیں لگی جہاں کچھ دیر پہلے میرا سر تھا۔ میں نے غیر ارادی طور پر مڑ کے دیکھا، زورا اور جمرو بھی ہمارے ساتھ ہی فرش پر لیٹے تھے۔ عقب میں پروفیسر تھامپسن، ماریا، برنارڈ اور ٹونی لیٹے ہوئے تھے۔

"استاد بڑا الفڑا ہے۔ جہاز کے آجو باجو ڈاکوؤں کی کشتیاں لگ گئی ہیں۔" زورا نے بتھل کے کان میں سرگوشی کی۔ وہ سرکتا ہوا بتھل کے ساتھ آ لگا تھا۔

"ڈاکو نہیں لگتے رے!" بتھل نے دھیمے سے جواب دیا۔ وہ خاصا متفکر دکھائی پڑتا تھا۔ میں نے بہت کم اُسے اِتنا فکر مند دیکھا تھا۔ دفعتاً ہمارے عقب میں ٹن ٹن کر کے کئی مرتبہ لوہا بجا۔ ہم چاروں چشم زدن میں پلٹے، گویا یک جان ہوں۔ ریلنگ کے پائپ پر چاروں طرف آنکڑے پھنسے ہوئے تھے۔ اُن سے بندھی تنی ہوئی سفید رسیاں نیچے کی طرف جا رہی تھیں۔ زورا اور جمرو نے کھٹاکے سے چاقو کھول لیے، آنکڑوں کی رسیاں کاٹنے کی اجازت بتھل سے طلب کی۔

"کتنی کاٹو گے؟ ہزاروں دِکھتے ہیں... آنے دو رے۔" بتھل نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ہم چاروں تن بہ تقدیر اُٹھ کے بیٹھ گئے۔ ہماری دیکھا دیکھی ماریا اور پروفیسر تھامپسن بھی اُٹھ بیٹھے۔

"آپ لیٹ جاؤ... ٹُو گٹ پٹ کر دے رے!"
میں نے بتھل کی ترجمانی کرتے ہوئے اُنھیں بدستور لیٹے رہنے کا کہا۔ ہماری نظریں آنکڑوں اور رسیوں پر جمی تھیں۔ ہم انتہائی چوکنے بیٹھے تھے، حالاں کہ ہماری سلامتی کا انحصار آنے والوں پر تھا۔ نہ جانے یہ کون لوگ تھے، ان لوگوں نے جہاز کس طرح رکوا لیا، اور جہاز کے تربیت یافتہ مسلح محافظوں سے یہ کس طرح نمٹیں گے؟ بحری قزاق عموماً اس طرح کے بڑے جہاز نہیں لوٹا کرتے، اور نہ ہی ایسے منظم بحری قزاقوں کا تذکرہ اب تک سنا تھا۔ دنبالے سے سطح سمندر کا فاصلہ تیس سے پینتیس فٹ تھا۔ دفعتاً پردہ غیب سے کچھ نمودار ہوا۔ جہاز کے بیرونی کنارے پر ریلنگ کے جنگلے کے نیچے دو آنکھیں نمودار ہوئیں۔ ہمیں اپنی جانب متوجہ پا کے غڑاپ سے غائب ہو گئیں۔ لحظہ بھر بعد پورے دنبالے پر تینوں اطراف سے بندوقوں کی نالیاں برآمد ہوئیں، جن کی تعداد پچیس کے لگ بھگ اور سبھی کا رخ ہماری طرف تھا۔

"اے خبردار! ہلنے کا نئیں اے۔" سامنے کی طرف سے چیخ کے کہا گیا۔ ہم تو پہلے ہی بہ رضائے تقدیر بیٹھے تھے۔ "ہتھیار وغیرہ پھینکنے کا ہے۔ باپو کی طرف سے جندگی کی جمانت ہے بھاؤ۔"
بتھل نے چاقو پھینک دیا۔ ہماری تقلید ناگزیر تھی۔ چابک دستی اور تنظیم سے وہ تمام دنبالے پر آ موجود ہوئے۔ اُن میں سے ایک نے آگے بڑھ کے طمنچے اور چاقو سمیٹ لیے اور اپنے میں سے ایک نمایاں شخص کے سامنے پیش کیے، جو یقیناً منصب دار تھا۔ اُن میں بیش تر سیاہ فام اور حبشی رُو تھے۔ چند کی رنگت عام ہندوستانیوں کی طرح نیم سیاہ یا گہری گندمی تھی۔ سبھی کرتے پاجاموں میں ملبوس تھے۔ کڑھے ہوئے کُرتے سیاہ، سرمئی، جامنی، کتھئی اور سبز رنگت کے تھے، جب کہ پاجامے یک ساں طور پر سفید براق تھے۔ کسی کے سر پر رومال بندھا تھا، اور کسی نے مخصوص انداز میں گردن پر لپیٹا ہوا تھا۔ کانوں میں بالیاں اور ہاتھوں میں چاندی کے منقش کڑے تھے۔ "انہاں باندراں کا نئیں کولنا یا... اے بھاؤ... اے گھوڑا سرکاری دِکھتے نا۔" منصب دار نے برنارڈ کا طمنچہ بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ سب اپنی جگہ پر بندوقیں تانیں ساکت کھڑے تھے۔ اُن میں صرف منصب دار ہی حرکت کر رہا تھا۔ اُس نے ہماری طرف خاص توجہ نہیں کی۔ البتہ ماریا کو دیکھ کے اُس کی آنکھیں چمک گئیں۔ "چھوکری سوئی ہے۔" اُس نے ماریا پر ہاتھ چمکاتے ہوئے کہا۔ ماریا بری طرح سہمی ہوئی تھی، اُس کا سینہ دھونکنی کی مانند پھول پچک رہا تھا۔ خوف زدہ ہرنی کی اصطلاح ماریا ہی کے لیے ایجاد ہوئی تھی، پسینے سے شرابور، دیدے پھٹے ہوئے۔

"ابھی میری سکل دیکھنے کا نہیں ہے۔ پکے پکائے چار

"بلیٹے نیچے نہیں آنے کا؟" اُس کے مُنہ سے فقرہ نکلتے ہی چار آدمی مایا اور پروفیسر تھامپسن پر جھپٹ پڑے۔ سوتی ڈوریاں اُن کے پاس تھیں۔ چند ہی لمحوں میں اُن دونوں کے ساتھ ساتھ برنارڈ اور مارٹی کی بھی مشقیں کس دی گئیں۔ پھر ایک نے مایا کو کاندھے پر ڈالا، اور کمالِ مہارت سے ریلنگ پر چڑھ کر رسّی پر جھولتا ہوا سمندر کی طرف اتر گیا۔ پروفیسر تھامپسن مسلسل خاموش تھے کہ اُن کی تحقیق عملی دور سے گزر رہی تھی۔

باقی تینوں کو بھی اسی طرح مہارت سے نیچے اتار دیا گیا۔ اُنھوں نے ہم سے تعلّق محض بندوق تاننے تک محدود رکھا تھا۔ منصب دار چاروں گوروں کو اپنی نگرانی میں نیچے کشتیوں میں اتروانے میں مصروف تھا۔ وہ مسلسل ہدایات دے رہا تھا، اور بل کھاتے ہوئے سانپ کی مانند بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ اُن چاروں کو نیچے پہنچانے کے بعد وہ ہماری طرف متوجہ ہوا۔

"انگریج کو لوٹنے کا تھا بھاوا؟... ابھی اِدھر بھاروٹیہ باپو آ گیا ہے۔ تم لوگ کا کام ختم۔ نیچے جا کے سونے کا ہے۔"

اُس نے انگلی نچاتے اور جھومتے ہوئے کہا۔ اُس کا جملہ مکمل ہوتے ہی بٹھل ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"چلو رے بیٹے! اب اِن کا وقت ہے۔" بٹھل لاتعلّقی سے عرشے کی سیڑھی اتر گیا۔ جیسے اُس نے منصب دار کو دیکھا ہی نہ ہو، اُس آواز تک نہ سنی ہو۔ ہم بھی خاموشی سے نیچے اتر آئے۔ ہمارے پیچھے تمام بندوق بردار بھی اتر آئے، اور منصب دار کی ہدایات پر اِدھر اُدھر دوڑنا شروع کر دیا۔

عرشے کا منظر ہی عجیب تھا۔ پورے عرشے پر قطار باندھے ریلنگ کے ساتھ ساتھ سیکڑوں مسلّح افراد بندوقیں تانیں کھڑے تھے۔ جن کے پاس بندوقیں نہیں تھیں، اُن کے ہاتھوں میں عریاں، چمکیلی تلواریں تھیں۔ کیبنوں کے اوپر جا بہ جا مسلّح افراد تعینات نظر آ رہے تھے۔ یقینی طور پر جہاز پر اُن کا مکمل قبضہ ہو چکا تھا۔ کیبنوں سے منتخب انگریزوں کو نکال نکال کے باہر لایا جا رہا تھا۔ عرشے کے وسط میں بھاری جثّے کا ایک آدمی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اُس نے سیاہ رنگ کی باقاعدہ پگڑی باندھ رکھی تھی۔ اُس کے ساتھ ہی جہاز کے انتظامی عملے کی وردی میں ملبوس ایک شخص کھڑا تھا۔ عرشے پر بکھرے ہوئے مسافر سمٹ کے ایک ستون کے پیچھے بیٹھے محوِ تماشا تھے۔ اُن کے چہروں سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ خوف زدہ ہونے کی بجائے حیران ہیں۔ کیبنوں سے نکال لائے جانے والے انگریزوں کو فرداً فرداً کرسی پر فروکش موٹے آدمی کے سامنے لایا جاتا۔ وہ ساتھ کھڑے جہاز کی انتظامیہ کے فرد سے کھسر پھسر کرتا۔ پھر اُس کے اشارے پر انگریز کی مشقیں کس کے جہاز سے نیچے اتار دیا جاتا، یا پھر کیبنوں کے ساتھ ہی ایک گوشے میں کھڑا کر دیا جاتا۔ البتہ جوان عورتوں کو بغیر کسی صلاح مشورے کے جہاز سے نیچے پہنچایا جا رہا تھا۔ یہ کارروائی کئی گھنٹے جاری رہی، حتّٰی کہ سورج اُگ آیا اور اندھیرا چھٹنے لگا۔ اُنھوں نے عرشے کے دیسی مسافروں سے تعرض نہیں کیا۔ اُن کی زبان، لہجے اور لباس، اُن کا تعلّق کاٹھیاواڑ سے بتا رہے تھے۔ کراچی کے بعد بمبئی تک کاٹھیاواڑ کا ساحل تھا۔ کاٹھیاواڑ میں چھوٹی چھوٹی کئی ہندو مسلم ریاستیں تھیں۔ یہ سرسبز و شاداب علاقہ اپنے جنگلات کی وجہ سے پورے ہندستان میں مشہور تھا۔ دُور دراز کے راجے مہاراجے اور نوابین شکار کی غرض سے عموماً یہیں کا رخ کرتے تھے۔ ہمارے ہم راہ بیٹھے ہوئے ایک کاٹھیاواڑی مسافر نے مسلّح افراد کے بارے میں انکشاف کرتے ہوئے بتایا کہ یہ باروٹیہ باپو کے کرانتی کار ہیں۔ باروٹیہ باپو کی ہیبت گجرات سے نکل کے پوری انگریز سرکار میں پھیل چکی ہے۔ مہان دیالو ہیں۔ مہاجن، ساہوکاروں اور بنیوں کو لوٹتے ہیں، اور غنیم، غربا میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ گجراتی مسافر کرشنا داس پولیس میں نوکر تھا۔ وہ باروٹیہ باپو کا تذکرہ عزّت و احترام سے کر رہا تھا۔ باروٹیہ کے کارندے اپنی کارروائیوں میں مصروف تھے تو وہ گاہے گاہے اپنی معلومات سے اپنے اِردگرد بیٹھوں کو مستفید کر رہا تھا، جن میں ہم بھی شامل تھے۔ اُس کی بتائی ہوئی معلومات کے مطابق گجراتی

میں باپو عزّت و تکریم کی علامت ہے، جب کہ باروٹیہ لٹیرے کو کہتے ہیں۔ باروٹیہ باپو کا مطلب "معزز لٹیرا" ہے۔ باروٹیہ چھلاوا ہے، سیکڑوں کارندوں کے ہم راہ آناً فاناً غائب ہو جاتا ہے، زمین نگل گئی یا آسمان نے اُچک لیا، واردات کے بعد باروٹیہ کا سراغ نہیں ملتا۔ اُس کا عمومی ٹھکانا گر تھ کا گھنا اور خطرناک جنگل تھا۔ گر کے جنگل میں وہ کہاں روپوش ہوتا، یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ باروٹیہ کے گروہ میں شمولیت کے بعد واپسی نہیں تھی، اور یہ بھی دل چسپ بات تھی کہ آج تک کوئی کارندہ گروہ چھوڑ کے نہیں گیا تھا۔ گرفتار ہونے والوں کو حوالات میں قتل کر دیا جاتا۔ انگریز افسروں اور سپاہیوں کو اغوا کرنے کے حوالے سے باروٹیہ باپو کی شہرت ملکہ برطانیہ تک پہنچی ہوئی تھی۔ مشہور تھا، ملکہ گرفتاری کے بعد باروٹیہ سے ملاقات کا اشتیاق رکھتی ہیں۔

انگریز سرکار نے بیسیوں مرتبہ باروٹیہ کے گرد میلوں گھیراؤ کیا، ریاستی ہانکا لگایا، مگر باروٹیہ کا بال بیکا نہ کر سکی۔ اُس کی گرفتاری کے منصوبے ولایت سے بن بن کے آئے، مگر وہ پیش بند بلا کا تھا۔ حملے سے پہلے ہی حملہ کرنے کی کام یاب حکمت عملی اُس کا وطیرہ تھی۔ آندھی کی مانند تند و تیز شب خون مارتا۔ مہمان خانوں، ڈاک بنگلوں، سرکاری دفتروں سے ملحقہ انگریز آبادیوں پر کڑے پہرے دھرے رہ جاتے، اُس کے ہاتھ جو انگریز لگتا، اٹھا لے جاتا۔ اُس کی گرفتاری کے لیے اٹھایا جانے والا ہر قدم جب تک واپس نہ لے لیا جاتا، شب خون بڑھتے ہی جاتے۔ سپاہیوں کے کٹے ہوئے سر اور انسانی لوتھڑے چوراہوں پر پھنکوا دیے جاتے۔ یہاں تک کہ اُسے گرفتار کرنے کا خواہاں نوخیز مہم جو سرد پڑ جاتا، باروٹیہ کی فائل بند کر دی جاتی، لیکن عمل داری کا بھرم رکھنے کے لیے رسمی کارروائیاں جاری رہتیں۔ تبادلے اور تعیناتیاں ہو جاتیں، کوئی سرپھرا گورنر آ جاتا، وہی چکر دوبارہ چل جاتا، لیکن خوش قدمی نے ہمیشہ باروٹیہ ہی کو چوما۔ وہ انگریز سرکار کے لیے مستقل دردِ سر بنا رہا، اور اُس کی گرفتاری انگریز سورماؤں کے لیے خواب۔ اُس نے 'تیری بندوق، تیری چھاتی' کے مقولے پر خوب عمل کیا تھا۔ عام حالات میں وہ اغوا کنندگان کے عیوض بھاری اسلحہ حاصل کرتا، اور یہی اسلحہ بارود اُس کی ہیبت بنائے ہوئے تھا۔ ایک لٹیرے کے لیے فوجی پیش قدمی کو ہتک سمجھنے کے باوجود باروٹیہ باپو کی گرفتاری کے لیے خصوصی فوجی کمپنیاں بھی تشکیل دی گئیں، برما کے محاذ سے نامی گرامی افسروں کو بلوایا گیا۔ گرفتاری پر گراں بہا انعام اور اعلا ترین سول و فوجی اعزازات کا اعلان کیا گیا۔ مقامی افراد کو نتیجہ خیز معاونت پر سو گاؤں تک تفویض کرنے کا لالچ دیا گیا۔ گجرات بھر میں مخبروں کا جال بچھایا۔ معمولی سی مخبری کو بھی ہنگامی اہمیت دی جاتی، مگر باروٹیہ چھلاوا تھا، کبھی ہاتھ نہ آیا۔ البتہ مخبری کے مضبوط نظام کی وجہ سے باروٹیہ کو مسلسل متحرک رہنا پڑتا، جو اُس کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ بھاری جثّے کے ساتھ حرکت کرنا اب آسان نہیں رہا تھا۔ مڈبھیڑوں میں اضافہ ہونے لگا۔ ابتدا میں یہ جھڑپیں صرف فرار حاصل کرنے کے لیے کی گئیں، کام یابی نے ایک دن تن کے کھڑا ہونا بھی سکھا دیا۔ گئے برس شب خون مارنے والے باروٹیہ نے دوبدو لڑائی میں ایک کمپنی کے چیتھڑے اڑائے تو کاٹھیاواڑی عش عش کر اٹھے اور باروٹیہ کو کرانتی کار گردانا گیا۔ انگریز سرکار نے جرائم پیشہ افراد کی فہرست سے اُس کا نام خارج کر کے باغیوں میں شمار کر لیا اور یوں باروٹیہ ایک لٹیرے سے کرانتی کار بن گیا۔ جن اشرافیہ سے وہ بھتّے اور تاوان وصولتا تھا وہ اُسے امداد، نذرانے دینے لگے، کاٹھیاواڑ میں اُسے قبولِ عام کی سند مل گئی۔ اُس کے مقابل ریاستی راجوں، مہاراجوں اور نوابین کی عمل داری مفقود ہو کے رہ گئی۔ ریاستی عمّال باروٹیہ کے کارندوں سے باز پرس بھی گناہ سمجھتے۔ ایک مرتبہ راجوں اور نوابین نے مشترکہ وفد دلّی بھیجا۔ جس نے وائسرائے سے ملاقات کی، اور کہا کہ حکومتِ برطانیہ باروٹیہ سے چھیڑ چھاڑ کر کے اُسے ڈاکو سے کرانتی کار اور مجاہد بنا رہی ہے۔ باروٹیہ کو اُس کے حال پر چھوڑنا ہی مناسب حکمتِ عملی

ہو گی۔ اُسے کرانتی کار کا رتبہ حادثاتی طور پر ملا ہے، ورنہ حقیقت میں وہ ڈاکو ہی ہے۔ اگر انگریز سرکار اُس کی سرکوبی کے لیے فوج بھیجتی رہی تو عن قریب پورے کاٹھیاواڑ پر باروٹیہ کا راج قائم ہو جائے گا۔ وائسرائے نہ صرف مان گیا، بل کہ باروٹیہ کے خلاف ایک نئی چال چلی، وفد کو ڈاکوؤں کا ایک چھوٹا گروہ تشکیل دینے کی صلاح دی گئی، جس پر ریاستوں نے سہاو سے عمل کیا، اور باروٹیہ کی طرز کا ایک جعلی گروہ تشکیل دیا گیا۔ اِس گروہ نے درمیانے طبقے کے لوگوں سے لوٹ مار شروع کر دی۔ باروٹیہ کے خلاف عوامی جذبات بھڑکانے کے لیے خصوصی طور پر عورتوں کو اٹھا لیا جاتا، گانوؤں اور بستیوں کو جلا دیا جاتا۔ باروٹیہ عورتوں کے معاملے میں بدنام تو تھا ہی، چناں چہ انگریز سرکار کا تیر نشانے پر جا لگا۔ باروٹیہ کے بھرم میں گھاٹا پڑنے لگا۔ اُسے باپو کہنے والوں کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ باروٹیہ بھی اِس گمبھیرتا میں ٹِک کے نہیں بیٹھا تھا۔ اُس نے اپنے خطرناک چھاپہ مار مجیدے بھائی کو جعلی باروٹیے کا ہر حال میں قلع قمع کرنے کا ہدف دے دیا، اور دوسری طرف خود اُس نے انگریز خواتین کو اٹھانا شروع کر دیا۔ مہینے بھر میں سات انگریز خواتین کی برہنہ لاشیں مانا ودر، باتوا، جام نگر، کشورم پور، بندو، دھوراجی واساوادر، پراچی، دلوادا کے چوراہوں پر پھنکوا دی گئی تھیں۔ اُن کی موت کی وجہ کثرتِ جماع تھی۔ باروٹیہ نے اِس سے بڑھ کے ایک قدم اَور اٹھا لیا۔ اُس نے گِر کے جنگل کی سیاحت کو آئی ہوئی برطانوی اشرافیہ کی تین انتہائی معزز خواتین کو اغوا کر لیا۔ گِر کا جنگل ببر شیروں سے اٹا پڑا ہے۔ مشہور ہے کہ افریقا کے بعد گِر کا جنگل دنیا کا اکلوتا مقام ہے جہاں ببر شیر پائے جاتے ہیں۔ بمبئی میں مقیم انگریز گاہے گاہے یہاں سیاحت کے لیے آتے تھے۔ اغوا ہونے والی تین معزز برطانوی خواتین میں سے ایک کا تعلق شاہی خاندان سے تھا اور وہ بہت بڑے افسر کی یکتائے حسن و جمال بیوی تھی۔ باروٹیہ کی اِس کارروائی سے پہلو تہی وقتی کے لیے ممکن نہ تھا، لیکن پیش قدمیاں بے سود رہیں۔ چند ماہ بعد خبر مشہور ہوئی شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والی معزز خاتون مادام باروٹیہ باپو کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ وہ باپو پر دل و جان سے فریفتہ ہو چکی ہے، باروٹیہ اُسی کے علم ہوش رُبا میں بری طرح گرفتار ہو چکا ہے اور اُسے اپنے ساتھ چوپال بٹھاتا ہے۔ پھر اطلاع آئی کہ اُس نے باروٹیہ کے نہایت خوب صورت بیٹے کو جنم دیا ہے، یہ اطلاع تھی یا جوالا مکھی، دلی سے لندن تک سب کچھ لرز گیا۔ ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا گیا گِر کا جنگل کھنگال ڈالا گیا، لیکن باروٹیہ کا سراغ نہ ملنا تھا اور نہ ملا۔ جاسوس اِتنا جان سکے تھے کہ باروٹیہ نے زیرِ زمین ٹھکانا بنا رکھا ہے۔ اِس واقعے کے ٹھیک تین ماہ بعد اس سے بڑی خبر کاٹھیاواڑ کے چوراہوں میں سنسنا گئی، مادام مارتھا باروٹیہ کے اکلوتے فرزند کو لے کر فرار ہو گئی تھی۔ باروٹیہ آگ بگولا ہو گیا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو دل و جان سے چاہتا تھا۔ اُس نے پہرے داری پر معمور دس کارندوں کو شیروں کے آگے ڈال دیا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کے فراق میں ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ دلی جب گئی اب گئی، باروٹیہ کسی بھی لمحے قہر و غضب بن کے انگریزوں پر ٹوٹ پڑنے والا ہے۔

کاٹھیاواڑی مسافر وفورِ اشتیاق سے باروٹیہ باپو کے متعلق بتا رہا تھا، اُس کی چمکیلی آنکھیں سامعین سے بار بار ستائش طلب کرتی تھیں، جیسے باروٹیہ وہ خود ہی ہو۔ اُس کی مبالغہ آمیز گفتگو سے صرفِ نظر کیا جائے تو بھی اِس دھڑلے سے برطانوی بحری جہاز سے انگریزوں کو اغوا کرنا کسی قزاق کا کام نہ تھا۔

جہاز سے تمام انگریز عورتیں اتار لی گئی تھیں۔ اِس کے علاوہ پچاس کے لگ بھگ دیگر برطانوی باشندوں کو بھی اتارا گیا تھا۔ انھوں نے دیسی مسافروں سے ذرا بھی تعرض نہیں کیا، بل کہ اُن سے کلام بھی شائستگی سے کیا جا رہا تھا۔ انھوں نے عرشے کے کسی مسافر کو نہیں لوٹا تھا، البتہ کیبنوں

سے صندوق بھر بھر کے لے جا رہے تھے۔ دیسی مسافروں سے اُن کی اُنسیت کی اِس سے بڑھ کے مثال اور کیا ہوگی کہ ہمیں دنبالے سے نیچے اتارنے والوں میں سے ایک ہماری طرف سے گزرا تو اُس نے بے پروائی سے چاقو ہماری طرف اچھال دیے تھے، البتہ طمنچے کی ملکیت اُس نے اپنا ہی حق جانا۔ بُھّل بڑے سکون سے بیٹھا بیڑی پر بیڑی سلگائے جا رہا تھا۔ وہ پھسلتی ہوئی ایک آدھ نظر جہاز پر دوڑتے پھرتے باروٹیہ کے کارندوں پر ڈال لیتا، اور پھر بیڑی کا لمبا کش کھینچ کے مرغولے چھوڑنے میں مگن ہو جاتا۔ عرشے کے بہت سے مسافر بھی کاندھوں پر بندوقیں لٹکائے اِدھر اُدھر لپک رہے تھے۔ یقیناً جہاز پر کمال منصوبے سے قابو پالیا گیا تھا۔ جہاز کے عملے میں باروٹیہ آدمی شامل تھے۔ کراچی سے سوار ہونے والوں میں بھی بیش تر باروٹیہ کے آدمی تھے۔ جو اپنے ساتھ اسلحہ بھی جہاز پر چڑھانے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ جہاز پر عدم مزاحمت باروٹیہ کارندوں کی مشاقی کی گواہ تھی۔ ایسے منظم گروہ کی تشکیل کرنے والا کوئی معمولی انسان نہیں ہو سکتا تھا۔ بُھّل کے وجود سے چھنتی آزاد خشی واقعی بے فکری تھی یا وہ ایسا ظاہر کر رہا تھا۔ معاً ایک خیال کوندے کی طرح لپکا، پھریری سی وجود میں دوڑ گئی۔ بمبئی کی بندرگاہ پر حالات ہمارے لیے سنگین ہو سکتے تھے۔ بُھّل بمبئی کی سوچ رہا تھا۔ یہ معمولی واقعہ نہ تھا۔ وہاں ذرّے کی بھی کھال اتاری جاتی۔ پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ ہم سے تعرض نہ کیا جاتا۔ دنبالے پر میجر برنارڈ اور ہماری جھڑپ کا پورا عرشہ چشم دید گواہ تھا۔ نہ جانے وہ اِس واقعے کو کس تناظر میں لیتے، لیکن یہ بات مترشح تھی کہ بمبئی میں جہاز سے اترتے ہی ہماری گرفتاری یقینی تھی۔ کسے خبر کہ باروٹیہ سے ہی ہمارا تعلق جوڑ دیا جاتا۔ حالات بہرصورت ہمارے خلاف تھے۔

اجالا سمندر پر اتر آیا تھا۔ باروٹیہ کے کارندوں نے جہاز خالی کرنا شروع کر دیا تھا۔ حیرت انگیز طور پر وہ خون خرابے کے بغیر اِتنی بڑی کارروائی کر کے جا رہے تھے۔ بچے کچھے انگریز مسافروں کو اُنھوں نے کیبنوں میں دھکیل کے تالا بند کر دیا تھا۔ بقیہ کو وہ کشتیوں میں لاد کر نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہوگئے تھے۔ اِس کے باوجود اب بھی مکھیوں کے جھنڈ کی طرح کشتیاں جہاز سے چمٹی کھڑی تھیں، دھیرے دھیرے آگے پیچھے ہوتی ہوئیں۔ جہاز کے لنگر نہیں گرائے گئے تھے۔ دفعتاً کسی نے سور پھونک دیا، سوتے پھوٹ پڑے، جہاز پر قابض مسلح افراد ''جے ہند'' کے نعرے لگاتے ہوئے مچلنے تڑپنے لگے۔ سمندر کی کھلی فضا میں بھی کان پھاڑ شور بلند ہو رہا تھا۔ وسط میں کرسی کے تختے پر سے بیٹھا ہوا موٹا بھی جھٹکے سے مؤدب کھڑا ہو گیا۔ دفعتاً عرشے پر ایک قد آور شخص نمودار ہوا، اُسے دیکھتے ہی یوں لگا جیسے جہاز کے در و دیوار رقص اور وجد میں آ گئے ہوں۔ سلامی کو بیک وقت سیکڑوں بندوقیں گرجیں۔ کئی نے گریبان چاک کر لیے۔ وہ دیوانوں اور جنونیوں کی طرح ''جے ہند، جے ہند'' چیختے اور چلاّتے جا رہے تھے۔ نو وارد سے پیوست ہونے کے لیے اُن کی بوٹی بوٹی پھڑک رہی تھی، مگر کوئی اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔ وہ شخص کچھ دیر کھڑا اُن سب کو دیکھا کیا۔ اُس نے سفید کرتا پاجامہ اور گلے میں سرخ اونی مفلر لپیٹ رکھا تھا۔ ہاتھوں میں موٹی موٹی جڑاؤ انگوٹھیاں، پاؤں میں سلیم شاہی کھسے، تیل میں چپڑے کاندھوں تک آتے سپاٹ کالے بال، دائیں کان میں چاندی کا پتلا کڑا، جھلسی ہوئی سانولی رنگت، چہرے کے تیکھے اور جاذب نقوش، بھاری مگر چست ورزشی جسم کا مالک وہ شخص یقینی طور پر ''باروٹیہ باپو'' ہی تھا۔ حلیے بشرے سے وہ ڈاکو دکھائی نہیں پڑتا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک طلسمی شخصیت کا مالک تھا۔ وہ کچھ دیر سنجیدگی سے چاروں اور تڑپتے، پھدکتے اور مچلتے ہوئے اپنے کارندوں کو دیکھتا رہا۔ یکا یک اُس نے قطعی انداز میں اپنا ہاتھ بلند کیا، گویا جسموں سے سانس کھینچ لی ہو، یک دم ایسا ہول ناک سناٹا چھا گیا، جیسے جہاز پر کوئی ذی روح موجود ہی نہ ہو۔ وہ ہاتھ گرا کے کرسی کی جانب بڑھ گیا، اور لوگوں کی بھن بھن پھر شروع ہو گئی۔ اُس کے

دائیں بائیں اور عقب میں دس سے زائد افراد کا جتھا تھا۔ وہ سب کے سب چھٹے ہوئے چنیدہ لوگ نظر آتے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں بندوقوں کی بجائے برہنہ اور چمچماتی دو دھاری تلواریں تھیں، اور چہروں پر زخموں کے مخصوص نشان۔ وہ کرسی پر جا بیٹھا۔ عرشے کے سمٹے اور سہمے مسافر پہلے بھی ہونٹ سیے ہوئے تھے اور اب بھی مہر بہ لب تھے۔ موٹا اُس کے سامنے دست بستہ کھڑا ہو گیا اور اُسے کارگزاری سے آگاہ کرنے لگا، جواب میں وہ صرف گردن ہلاتا رہا۔ پھر اُس نے موٹے سے کچھ کہا، موٹا یک دم پھڑک کے سیدھا ہوا اور دھاڑا، ''مجید بھائی، راموپٹیل، گیگا، کالو نتھا!''

اُس کی آواز گونجتے ہی جہاز کے طرفین میں دوڑ مچ گئی، صرف چند لمحوں میں وہ چاروں باروٹیہ کے سامنے آ موجود ہوئے۔ اُن کی صورتیں شناسا محسوس ہوئیں۔ مجھے گمان گزرا کہ وہ جہاز کے مسافروں میں شامل تھے، اور چلتے پھرتے میری نظروں میں آئے تھے۔ باروٹیہ اُن سے تیز تیز سوال کیے جاتا، اور وہ سر جھکائے جلدی جلدی جواب دیے جاتے، وہ اُسے تفصیل سے آگاہ کر رہے تھے۔ ہم تک اُن کی آوازیں سرگوشیوں کی مانند آ رہی تھیں۔ جن سے کچھ اخذ کرنا ممکن نہیں تھا۔ تاہم وہ یقینی طور پر اپنی کارگزاری سے آگاہ کر رہے تھے کہ کس طرح یہ فتنہ ساماں جہاز قابو کیا۔ دفعتاً اُن میں سے ایک نے بات کرتے کرتے ہماری طرف اشارہ کیا تو پورا جہاز ہمیں دیکھنے لگا۔ میں سمجھ گیا تھا۔ اُنھوں نے دنبالے پر میجر برنارڈ سے ہماری جھڑپ کے بارے میں بتایا ہوگا۔ باروٹیہ نے نظر گھما کے سیدھا میری جانب دیکھا۔ میں اُسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نظریں چار ہونے سے قبل ہی میں نے زاویۂ نگاہ تبدیل کر لیا۔ بُھّل ایک ٹک باروٹیہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کی کنپٹیاں پھڑکتی ہوئی صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ ہمارے نزدیک کھڑے افراد نے اچانک جھپٹا مارا اور مجھے کھینچ لیا۔

''اے تیرے کو دیکھنے کا مَیں ہے، باپو بلانے کا ہے؟''

اُن میں سے ایک نے میرے پہلو میں زوردار لات رسید کرتے ہوئے کہا۔ میں کسی مزاحمت کے بغیر اُٹھ کھڑا ہوا۔ پھر بھی اُنھوں نے پشت پر دو ہتڑ مار کے مجھے دھکیلا۔

''نواب صاحب، اِدھر چلیں گا تیرا باپ۔''

''دھیان سے رے! بھیجا ٹھنڈا رکھ۔'' بُھّل نے سرگوشی کی۔ اُس کی آنکھیں جل کے انگارہ ہو رہی تھیں۔ جمرو اور زورا کے چہرے پھٹ پڑنے کو تھے۔ بُھّل کا ہاتھ جمرو کے پہلو پر مضبوطی سے جم گیا۔ مجھے دھکیلتے ہوئے باروٹیہ کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ اُس نے چمکتی آنکھوں سے میرا اوپر سے نیچے تک جائزہ لیا۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ آنے والے لمحے کا کچھ پتا نہیں تھا۔ کسے خبر کہ وہ میرے متعلق کیا سوچ رہا ہے۔

''نام بول!'' باروٹیہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ اُس کی آواز کاٹ دار اور تیشہ صفت تھی۔

میں نے ایک لمحے کو توقف کیا کہ گُدّی پر کسی نے ہاتھ چھوڑ دیا۔ ''اسکول کا ماسٹر نام پوچھنے کا مَیں اے۔ باپو ہے باپو۔''

''بابر زماں!'' میں نے سر کو جھٹکتے ہوئے کہا۔ ظالم نے بجلی کا ہاتھ مارا تھا۔

”گوری چھلیا سے تیرا کیا ناتا تھا؟“ بار وٹیہ غرّایا۔
”کچھ نہیں! وہ اپنے شوہر کے ساتھ سفر کر رہی تھی۔“
میں نے بغیر کسی توقف کے اُسے جواب دیا۔ سوال سے اندازہ ہو چلا تھا کہ اُسے کسی طرح کی آگاہی دی گئی ہے۔ کاٹھیاواڑی مسافر ہمیں بتا چکا تھا کہ بار وٹیہ باپو انگریز عورتوں کا رسیا ہے۔
”اپنا ناتا بول! تیرا ناتا کیا ہے؟“ بار وٹیہ نے میری پشت پر کسی کو اشارہ کیا۔ معاً میری ریڑھ کی ہڈّی پر کسی نے کہنی ماری۔ پھر فوراً ہی دونوں پہلوؤں پر گھٹنوں کی زوردار ضرب پڑی۔ بیک وقت پڑنے والی دو متوازی ضربوں نے میرے پیٹ کو جیسے چکّی کے پاٹوں میں پیس دیا۔ میرے مُنہ سے پانی نکل آیا۔ دَم سینے میں گھٹتا محسوس ہوا۔ میں نے خود کو گرنے سے بچایا۔
”جہاز ہی میں ملاقات ہوئی تھی۔“
”انگریجی بھی جہاج میں سیکھی تھی؟...“ بار وٹیہ نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ”کیا سمبندھ ہے تیرا انگریجوں سے؟“
”انگریزوں اور انگریز خاتون سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے! تمھیں بتانے والوں کو یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم بمبئی اپنے گھر جا رہے ہیں۔ مسز برنارڈ سے میری جان کاری چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں ہے۔“
”بڈھے انگریج سے بھی جہاج میں ہی جان پہچان ہوئی ہوگی؟“ بار وٹیہ نے تمسخرانہ انداز میں سوال کیا۔
”وہ پروفیسر تھامپسن ہیں۔ میری اُن سے جہاز کے ریستوراں میں ملاقات ہوئی اور اُنھوں نے ہی مجھے مسز برنارڈ سے ملوایا تھا۔“ میں نے جلدی جلدی اُسے جواب دیا۔ میں نے کوشش کر کے اپنا لہجہ فدویانہ ہی رکھا تھا، لیکن صاف محسوس ہو رہا تھا کہ گرہ مضبوط پڑ چکی ہے۔ وہ مجھے انگریزوں کا گماشتہ ہی سمجھ رہا تھا۔
”گھنٹوں کی جان پہچان! گوری شوہر سے بچھڑ گئی۔ چاقو پستول!“ بار وٹیہ نے دیدے گھماتے ہوئے کہا۔
”اے باپو! لے چل اِسے... اے انگریج کا... لگنے کا

ہے۔“ ساتھ کھڑے موٹے نے اُسے مشورہ دیا۔ میرے جسم میں چیونٹیاں رینگ گئیں۔ اگر یہ مجھے لے جاتے تو بٹھل جیتے جی مجھے جہاز سے نیچے نہ اترنے دیتا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اُس کے بعد میرا نام و نشان بھی نہیں رہے گا۔ میرا ہاتھ جیب پر جم گیا جس میں خنجر موجود تھا۔ میں بار وٹیہ سے قریباً ڈیڑھ گز کی دوری پر کھڑا تھا۔ اُس کے دائیں بائیں چار افراد اور چار ہی لمبی اور چمک دار تلواریں اُس کی پشت پر سونتے مستعد کھڑے تھے۔ اگر میں جست لگا کے بار وٹیہ کے سر پر پہنچتا تو اگلے ہی لمحے میرا سر عرشے پر پھڑک رہا ہوتا۔ اُس کے بعد بٹھل، زورا، جمرو... مجھے چند لمحوں میں کچھ کرنا تھا، مگر کیا! سیکڑوں بندوق برداروں کے نرغے میں اور وہ بھی بیچ سمندر کے، کوئی بھلا کیا کر سکتا تھا۔
”اور کتنے بھاڑو تیرے ساتھ ہیں؟“ بار وٹیہ نے گرجتے ہوئے کہا۔
”جہاز پر اور ہندُستانیوں کی طرح ہم چار دوست بھی سفر کر رہے ہیں۔“
”مجیدے بھائی!“ بار وٹیہ نے غالباً اُسے پکارا، جس نے میرے بارے میں جان کاری دی۔
”چار ہی ہیں باپو! یہ اُن کے میل کا نہیں دکھائی پڑتا۔“
مجیدا گھگھیایا۔ بار وٹیہ کرسی سے اچھلا۔ جیسے کوندا لپکا ہو۔ چٹاخ پٹاخ کی آوازیں گونجنے لگیں۔ ”آپ ہی پھسلے کر رہا ہے۔ میں پھالتو ہے کیا؟ جیادا وقت ہے؟“ مجیدے ساکت اور خاموش کھڑا رہا۔ بار وٹیہ کے طمانچوں سے اُس کا دایاں گال پھٹ گیا تھا۔
”بھڑوو! میری سکل ہی دیکھو گے! جہاج پر ہی ٹھکانا بنا لوں... ڈھول پیٹوں۔“ بار وٹیہ چنگھاڑتا ہوا موٹے کی طرف پلٹا۔ وہ مجھ سے صرف ایک ہاتھ کی دوری پر رہ گیا تھا۔ میں اُسے چاقو کی زد پر رکھ لیتا، مگر اُس کے بعد کیا ہوتا؟ اُس کے بعد بھی خلاصی ناممکن تھی، صورتِ حال مکمل طور پر ہمارے خلاف تھی، تاہم میرا ہاتھ جیب میں رینگ گیا، اور

چاقو پر مضبوطی سے جم گیا۔ مجیدے پھدک کے بٹھل کی نشست کی طرف دوڑا چلا گیا۔ اُس کے ساتھ کئی بندوق بردار بھی حرکت میں آ گئے۔ چند لمحوں بعد بٹھل، زورا اور جمرو بھی میرے برابر کھڑے تھے۔ بار وٹیہ کچھ دیر ہمیں گھورا کیا۔ وہ واپس کرسی پر براجمان ہو چکا تھا۔ اُس کی نظریں ہم چاروں کا طواف کرتے کرتے یک دم بٹھل پر ٹھہر گئیں۔
”پلا پلایا سانڈ ہے سالا! تُو بول... انگریج کدھر لے جانے کا ہے؟“
”انگریزوں سے اپنا ناتا رشتہ نہیں ہے! ابھی تیرا وقت ہے، جو مرضی بول۔“ بٹھل نے تن کے جواب دیا، اُس کے جبڑے سختی سے بھینچے ہوئے تھے۔
”رَستے داری! اللہ دے رستے داری تو ہے... کیا لگنے کا ہے۔“ بار وٹیہ نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
”پوچھو کیا نہیں لگتا۔“
”ماں کا یار بھی ہے کیا؟“
”ابھی تیرا وقت ہے! سنبھال کے رکھ۔“
”بڑا جور ہے سیّاں!“ خلافِ توقّع بار وٹیہ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
”جور کاٹنے پہ بولتا ہے، تم زبان سے بولے ہو!“ بٹھل کا لہجہ آگ بھڑکانے والا تھا۔
وہ کچھ دیر پھر بٹھل کو گھورا کیا۔ وہ نظریں تھیں یا پیمانہ، مگر اُس نے کچھ تول لیا تھا۔ پھر وہ زہر خند لہجے میں بولا،
”ٹھکانے پر ہی جورواروں کا جور دیکھنے کا ہے۔“
بٹھل کا تیر خطا نہیں ہوا تھا۔ بار وٹیہ اڈّے پاڑے کا استاد نہیں تھا، لیکن کس بل تو ضرور مشترک تھا، بل کہ بار وٹیہ کو امتیاز حاصل تھا کہ اُس نے کس بل سے چوکی نہیں چھینی تھی، بل کہ بنائی تھی۔ بار وٹیہ حکم دے کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کے مُنہ سے جملہ نکلتے ہی ہمارے اطراف میں کھڑے سورما ہم پر جھپٹ پڑے۔ ہم چاروں کو رسّیوں سے بری طرح جکڑ دیا گیا۔ بار وٹیہ جا چکا تھا۔ جہاز سے کرانتی کاروں کی واپسی

شروع ہو گئی تھی۔ ہمیں گٹھے کی شکل میں جدا جدا باندھا گیا تھا۔ سب سے پہلے مجھے گھسیٹ کے ریلنگ تک لے جایا گیا۔ اُس کے بعد ناف کے پاس لپٹی ہوئی رسّی میں ایک کنڈا پھنسا کے مجھے جہاز سے نیچے لٹکا دیا گیا۔ اچانک جیسے رسّی کو چھوڑ دیا گیا ہو۔ میں جہاز کی بیرونی دیوار سے رگڑتا ہوا تیزی سے نیچے گرا، مگر کسی نے فوراً ہی رسّی کو تھام لیا۔ شدید جھٹکے سے کمر کی ہڈّی جاتی محسوس ہوئی۔ مُنہ سے پانی نکل آیا۔ ہاتھوں میں تھام کے کنڈا نکالا گیا اور مجھے کشتی میں ایک طرف اچھال دیا گیا۔ میرا سر تختے پر دھڑام سے لگا۔ ”دوسرا پھینک؟“ کسی نے چیخ کے کہا۔ اُس کے ساتھ ہی میرے ذہن پر تاریکی چھا گئی۔

نمکین کڑکڑاہٹ سے مُنہ بھرا محسوس ہوا۔ چہرہ سلگتے ہوئے کوئلوں پر رکھا محسوس ہوا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اُٹھنا چاہا، مگر کراہ کے رہ گیا۔ جسم میں پھوڑے پھوٹ رہے تھے۔
”پوری کھینچ!“
”جلدی کرنے کا۔“
”بدھیا ہے کیا چھلکا... سالا سب خود ہی کھانے کا ہے۔“
”دھندا نہیں سرکار۔“
”اچھا! اچھا... ابھی نکل۔“
”اے گیگا... ادھر دوڑ۔“
”سیدھا چلنے کا بھاوا۔“
”آجو باجو چوکس ہے، پھر نہیں کرنے کا۔“
”تلالا پر روک ہے۔“
”ابھی یہ تیرا کام نہیں ہے چل نکل!“
”لے رکھ لے۔“
”نہ باپو، بہت ہے۔“
”باپو کی اچھا ہے۔ رکھ لے... یہ بھی لے... جموں کا ٹھرا ہے...“
”پی پی... سرکار کی جے۔“

"اے پٹلو! جلدی ابھی تیری باری آنے کا ہے۔"

اس طرح کی مختلف آوازیں کان میں چھید کر رہی تھیں۔ میں نے بمشکل زور لگا کے خود کو سیدھا کیا۔ میں کسی تپتی ہوئی ریت پر اوندھا پڑا ہوا تھا۔ میرے ہاتھ پشت پر سختی سے بندھے ہوئے تھے، باقی جسم آزاد تھا۔ ریت منہ میں بھر گئی تھی۔ دانت کرکر چرچر کر رہے تھے۔ شانوں سے رگڑ رگڑ کے منہ صاف کیا۔ آنکھوں میں مرچیں ناچ رہی تھیں، اور حلق میں کڑوے کانٹے اُگے جا رہے تھے۔ یہ کیسی افتاد تھی۔ اب کوئی ستم تھا جو روا نہ کیا جاتا۔ نہ جانے بٹھل، زورا اور جمرو کس حال میں ہوں گے۔ اُن کے ساتھ کیا بیتی ہوگی!

دھیرے دھیرے میری آنکھیں کھل گئیں؛ دن چڑھ آیا تھا، سورج زمین کی طرف لپک رہا تھا۔ ہم ایک ویران ساحل پر غلّے کے ڈھیر کی طرح پڑے تھے۔ کنارے پر دُور تک چھوٹی چھوٹی کشتیاں نظر آ رہی تھیں۔ جن کی تنی ہوئی رسیاں پانی میں گم تھیں۔ میرے دائیں بائیں جہاز سے اتارے گئے انگریز مسافر آڑھے ٹیڑھے پڑے تھے۔ اُن میں سے بیش تر بے ہوش تھے، جب کہ بعض ویران اور متحیر نگاہوں سے ساحل پر دوڑتے بھاگتے مسلح افراد کو دیکھ رہے تھے۔

میں نے دانت بھینچ کے کہنی کے بل خود کو سمیٹا اور اُٹھ بیٹھا۔ بے اختیار میری نظریں چاروں طرف گھوم گئیں۔ اُن میں سے وہاں کوئی نہیں تھا۔ میرے دل کو کسی نے سینے سے نوچا اور حلق میں رکھ دیا۔ تشنج کی سی کیفیت سے میں لرزنے لگا۔ اُن تینوں کو یہیں کہیں موجود ہونا تھا۔ میں ساحل کے رُخ بیٹھا تھا۔ پیچھے مڑ کے دیکھا تو ذرا اونچائی پر دُور تک چھکڑوں کی قطار کھڑی تھی۔ ہر چھکڑے میں دو بیل جتے تھے؛ کالے، سفید، چتکبرے اور گول سینگوں والے، گاڑیوں پر کھلتے رنگوں کی جھولیں پڑی ہوئی۔ گاڑی بان باگیں تھامے ہوئے تھے۔ قطار سے جدا ایک چھکڑا ہمارے بالکل ساتھ چوبی رخ پر کھڑا تھا۔ چھکڑے میں بوریاں لادی جا رہی تھیں۔ کچھ افراد اغوا زدگان کو بوریوں میں ڈال کر اُس کا منہ سُتلی سے سینے میں مصروف تھے۔ بوری بند کرنے کے بعد اُس کے اوپری حصّے سے ایک ٹکڑا کاٹ دیا جاتا۔ یہ سانسوں کی آمد و رفت کا سامان تھا۔ یہ منظر دیکھ کے گونا گوں اطمینان محسوس ہوا۔ بٹھل جمرو اور زورا کو مجھ سے پہلے بیل گاڑیوں میں روانہ کر دیا ہوگا۔ یکایک ایک خیال آنے پر میں نے پھر چاروں طرف نظریں گھمائیں۔ مایا، پروفیسر تھامپسن، میجر البرٹ برنارڈ اور ٹونی میں سے بھی یہاں کوئی موجود نہ تھا۔ انھیں بھی کسی محفوظ ٹھکانے کی طرف بھیج دیا گیا تھا۔ ایک بیل گاڑی میں تین بوریاں لادی جا رہی تھیں۔ اس کے بعد پچھلے حصّے سے کُھلی ہوئی کپڑے کی جھول کو مکمل بند کر دیا جاتا۔ پھر چرخ چوں کی آواز سے چھکڑے کے چوبی پہیے حرکت میں آ جاتے۔ اُس کی جگہ دوسری بیل گاڑیاں آ لگتیں۔ لوگوں کو بوریوں میں بھرنا، بوریاں چھکڑوں میں لادنا، ایک چھکڑے کی جگہ دوسرے چھکڑے کا لگنا اور ہدایات جاری کرنے والے موٹے کی زبان ہنگامی حالت میں متحرک تھے۔ کچھ ہی دیر میں میری باری آ گئی۔ ایک نے گُدّی سے پکڑا اور دوسرے نے شانے سے گھسیٹا اور بوری والے کے پاس پہنچا دیا۔

"رستے میں خاموش رہنے کا ہے۔" بوری والے نے میرے پیروں پہ بوری چڑھاتے ہوئے کہا۔ بوری عام ناپ سے بڑی دکھائی دیتی تھی۔ "پانی، دارو، کھانا سب ملنے کا ہے۔ بس خاموش رہنے کا ہے..." بوری پہلوؤں تک چڑھ گئی تو بولا۔ "میرا باپ اندر جانے کا ہے... چترائی نہیں کرنا۔ رندھاوا قسائی ہے سالا۔ جان جانے کا ہے بھاوا۔"

بوری میں اترنے کے بعد ہی معلوم پڑ سکتا ہے کہ بوری بند ہونا کیسا لگتا ہے۔ گھٹنے اور کہنیاں ساتھ مل گئی تھیں۔ نہ جانے مجھ سے قبل اُس بوری میں کیا بھرا گیا تھا۔ سڑی ہوئی سبزی کی بساند دماغ پھاڑ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد چہرے کے عین سامنے ٹکڑا کاٹ کے بوری میں سوراخ کر دیا گیا۔ اب باہر سے سانس لیا جا سکتا تھا۔ پھر بوری کو اٹھا کے چھکڑے میں پٹخ

دیا گیا۔ پشت کی طرف سے مسلسل بندھے رہنے سے کاندھوں کے جوڑ بری طرح دکھ رہے تھے۔ پہنچوں اور ہتھیلیوں کو مہارت سے جکڑا گیا تھا۔ رسیوں سے ہاتھ آزاد کرنا ناممکن تھا۔ میں خاصی تگ و دو کر چکا تھا۔ بیلوں کے سانسوں کی تیز آواز کے ساتھ گاڑی کے غیر ہم وار پہیے حرکت میں آئے تو احساس ہوا کہ یہ سفر کتنا ہول ناک اور تکلیف دہ ہوگا۔

"ٹن، ٹن، ٹن۔" بیلوں کے گھنٹے بجنے لگے۔

"چیخ چیخ... کک، کک، کک، کک... آ آ میرے شیر ببر۔" گاڑی بان ہشکارے دینے لگا۔ ہمارے نیچے پختہ سڑک نہیں، مسلسل آ رہا رہے پگ ڈنڈی ابھر آئی تھی۔ "چرخ چوں" کے شور کے ساتھ پہیّوں اور پگ ڈنڈی کی ذرہ بھر ناہم واری بھی ہتھوڑے برسا رہی تھی۔

"وحشی سُورا! اِس سے بہتر ہے ہمیں جان سے مار دو!" میرے برابر والی بوری سے کوئی انگریزی میں چیخا۔ اُس کے ساتھ "ٹھک" کر کے دھمک پیدا ہوئی۔ "جندگی پیاری ہے تو بولنے کی نہیں ہے بھاوا۔" توربان کی آواز آئی، غالباً اُس نے مڑ کے چیخنے والے انگریز کو سونٹا مارا تھا۔ میں گاڑی کے دائیں گوشے میں پڑا تھا۔ میرے بائیں طرف بالترتیب دو بوریاں اور پڑی تھیں۔ چھکڑے نامعلوم منزل کی جانب رواں دواں ہو چکے تھے۔ کسے خبر تھی کہ جاں کنی کا یہ سفر کتنا باقی تھا، چند گھنٹے، پورا دن یا پھر کئی دن۔ تکلیف کا بھی عجیب عاشقانہ مزاج ہے، اِسے جتنا سہا جائے اِتنی پُر لطف اور جاں گیر ہو جاتی ہے۔ عدم سے وجود میں آتی ہے اور پھر معدوم بھی ہو جاتی ہے۔ بوری کے حبس میں جکڑا ہوا لاچار جسم، ٹھک چج، چوں چوں کرتا گاڑی کی چولوں کا شور، گرھوں کی ضربیں اور مسلسل زبان چلاتے والے توربان کا شور مل جل کے تکلیف پر حاوی آ گئے۔ کوئی کب تک پڑا رہے۔ میرے ساتھ والا انگریز سسکیوں سے رو رہا تھا۔ میں نے بہ مشکل کروٹ لی، گاڑی کے دائیں تختے سے جا لگا۔ ہوا کے لیے بوری میں بنایا گیا روزن میری گردن پر تھا۔ اگر یہ تھوڑا اوپر ہو جائے کم از کم نظروں کا ساتھ تو ہو جائے۔ پیروں اور دانتوں کی مدد سے ایسا کیا جا سکتا تھا۔ میں نے پانو کی انگلیوں میں بوری کا سوت پکڑنے کی کوشش کی، مگر بوری کی سلوٹ پنجوں کی پکڑ سے موٹی تھی۔ میں نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ آخر کچھ دیر کی مشق کارگر ثابت ہوئی، بوری پنجوں کی گرفت میں آ گئی۔ میں نے کئی بار یہ عمل دہرا کے مشق پختہ کی۔ پانوؤں کی نسبت بوری کا منہ سے پکڑنا آسان رہا۔ متواتر کوششوں سے بالآخر میں بوری کا روزن اپنے چہرے پر لے آنے میں کام یاب ہو گیا۔ میرے عین سامنے تختے میں اچھی خاصی درز تھی، باہر کا منظر صاف نظر آنے لگا۔ سائے ڈھل رہے تھے۔ دُور تک سبزہ اور گھنا جنگل تھا۔ پگ ڈنڈی کے ساتھ ساتھ درختوں کی قطار تھی، جن میں صرف تنے ہی مجھے نظر آ رہے تھے۔ شیشم، جامن اور کہیں کہیں کیکر کے درخت تھے۔ باہر کا منظر نظر آنے سے وقت کچھ سہل ہو گیا تھا۔ میں آنے والے وقت کے بارے میں سوچنے لگا۔ اگر میں کسی طرح اپنے ہاتھ آزاد کر لیتا تو یہاں سے بچ نکلنا کچھ مشکل نہیں تھا، لیکن اِس طرح میں بٹھل، جمرو اور زورا کا نشان گم کر سکتا تھا۔ خاموشی سے پڑے رہنا ہی درست معلوم ہوا۔ میرے ہم سفر انگریزوں نے آپس میں گفتگو شروع کر دی تھی، وہ دونوں

فوجی تھے اور چھٹیاں گزار کے واپس ہندستان آ رہے تھے، وہ ملکہ برطانیہ کو مغلظات سے نواز رہے تھے۔ اُنھیں فوج میں جبری بھرتی کیا گیا تھا۔ ایک نے حالیہ چھٹیوں میں نئی محبوبہ بنائی تھی اور دوسرا اپنی بیوی سے چھٹکارا حاصل کرکے آ رہا تھا۔ اُس کا ارادہ اب ہندستان کے نمکین حسن سے خوشہ چینی کا تھا۔ اُس کا دل اپنے گھریلو خدمت گزار کی بیٹی کستوری پر آ گیا تھا۔ کستوری نے شادی کے بغیر ہاتھ رکھوانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ کستوری کا باپ بھی حکومتِ برطانیہ کا ملازم تھا، اِس لیے اُس نے بھی ہاتھ رکھنے سے گریز ہی کیا۔ اُس کا ارادہ تھا کہ جب تک ہندستان میں نوکری ہے تب تک کستوری سے شادی کر لینے میں کیا حرج ہے۔ کستوری کا ذکر کرتے کرتے اُس نے باروتیہ باپو کو بے دریغ گالیاں بکنا شروع کر دیں۔ میں خاموشی سے بس سنا کیا۔ اُنھوں نے دو ایک مرتبہ مجھے پکارا تھا، جواب نہ پا کے انگریزی سے نابلد سمجھ لیا تھا، اور ایک دوسرے سے بات کرکے اذیت جھیلنے کی کوششیں کرنے لگے تھے۔ باروتیہ نے اُن کی پکی پکائی کھیر کی کھڑونچی الٹ دی تھی۔ محاورے ایجاد کرنے والے بھی خوب تجربہ کار ہوتے ہیں، اُن کی باتیں سنتے اور درخت گنتے گنتے مجھے بھی گویا سولی پر نیند آ گئی۔

دھکّے کی زوردار ضرب سے ہوش آیا۔ اُس درد کی کوئی تعریف ہو تو یہاں کی جائے، معاملہ درد سے کہیں آگے جا چکا تھا۔ جڑے جڑے جسم پتھرا گیا تھا۔ بوری کی قید سے جان نہیں چھوٹی تھی۔ چھکڑے پر سے بوری گھسیٹ کے زمین پر چھوڑی گئی تھی۔ عجلت کار نے دوسری بوری بھی کھینچ کے میرے اوپر ہی پٹخی تھی۔ کسی نے ٹھڈّا مار کے بوری میرے اوپر سے گرائی۔ بوری میں سے دل دوز چیخ ابھری، ”تیری ماں کا... سالے بندر کے تخم چپ! لاڈ ساب... ہونہہ۔“ کسی نے غرّاتے ہوئے پے در پے کئی لاتیں اُسے رسید کیں۔ اِس مرتبہ کوئی چیخ بلند نہ ہوئی۔ کھردری زمین پر بوری گھسیٹی جانے لگی۔ میں باہر کا منظر دیکھنے سے قاصر تھا۔ بوری کا روزن پیچھے کو کھسک چکا تھا۔ چند گز گھسیٹ کے بوری کا منہ کھول دیا گیا۔ پھر تو جیسے ٹھنڈی اور آزاد ہوا والہانہ پن سے سینے میں گھستی چلی گئی۔ بوری کی بساند ناقابلِ برداشت تھی۔ نہ جانے کون سا پہر تھا۔ آسمان پر چاند کے بنا ہی ستارے جھلملا رہے تھے۔ جہاز سے اغوا کیے گئے تمام افراد وہیں آڑھے ترچھے ایک دوسرے پر لدے پڑے تھے۔

یہ گھنے درختوں کے جھنڈ میں ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ درمیان میں الاؤ روشن تھا۔ جلے ہوئے زیتون کی مہک چاروں طرف رچی ہوئی تھی، الاؤ کے قریب ہی کچھ ہرن پڑے تھے۔ کچھ افراد عرق ریزی سے اُن کی کھال اتارنے کا کام کر رہے تھے۔ چند لمحوں تک میں سمجھ نہیں سکا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں یہاں کیوں پڑا ہوں۔ معاً ایک گھٹا گھٹا سا ابال سینے میں اٹھا۔ ایک خیال کے جھماکے نے بدن میں بجلی گرما دی۔ میں نے تڑپ کے نظریں گھمائیں۔ چند گز کے فاصلے پر میجر برنارڈ نظر آیا۔ وہ میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے مسکینی برس رہی تھی۔ کچھ اور آگے پروفیسر تھامپسن بھی نظر آ گئے۔ اُن کی حالت زار دیکھ کر ترس آتا تھا۔ ہندستان اُن پر تحقیق آزما تھا۔ پھر بُتھل پر نظر پڑتے ہی میری اٹکی ہوئی سانس چل پڑی۔ اُس کی آنکھیں مجھے دیکھ کے چمک رہی تھیں۔ زورا اور جمرو بھی وہیں قریب ہی بیٹھے تھے۔ جہاز سے اغوا کی گئی خواتین میں سے یہاں کوئی نہیں تھی۔ لگ بھگ ستّر کے قریب انگریز ایک قطار میں پڑے تھے جن میں سکت تھی، دم خم تھا وہ بیٹھے تھے۔ باقی بے حس و حرکت پڑے تھے۔ سبھی کے ہاتھ پشت سے بندھے تھے۔ جامن، سپیدے، گوندنی اور شیشم کے تناور درخت تیز ہواؤں میں مستا رہے تھے۔ درختوں کے گھیرے کے ساتھ ساتھ مسلح افراد بھی چوکس کھڑے تھے۔ بُتھل بڑے سکون سے جما بیٹھا تھا۔ جیسے چوکی پر بیٹھا ہو۔ کبھی کبھی اردگرد سے کوئی کراہ اُٹھتا، یا گاہے گاہے سیال رو پڑتے، ورنہ سنّاٹا ہی سنّاٹا تھا۔ باروتیہ کے کارندے بالکل خاموشی سے کھڑے تھے۔ ہمیں بھی خاموش رہنے کی تنبیہ کی گئی تھی۔ بندوبست سے یہ عارضی پڑاؤ محسوس ہو رہا تھا۔ لگتا تھا کہ ذرا دم لینے اور شکم پری کے لیے ٹھیرا گیا ہے۔ اُن کی منزل ابھی دُور ہے۔ ایک مرتبہ پھر بیل گاڑی کے اذیّت ناک سفر کے تصور سے دماغ جھنجھنا اُٹھا۔ یوں ہی پڑے پڑے کئی ساعتیں گزر گئیں۔ جنگل کے خطرناک اور موٹے موٹے مچھّر بڑی شان سے ہماری ضیافت اُڑا رہے تھے۔ ہرنوں کو بڑے بڑے پارچوں میں تقسیم کر لیا گیا تھا۔ اُنھیں بھوننے کا انتظام کیا جا رہا تھا۔ ہمارے پیٹ میں خوراک نام کی کوئی چیز گئے ہوئے چوبیس گھنٹوں کے مساوی وقت تو گزر ہی گیا تھا۔ نقاہت فطری امر تھا۔

”پانی پلا دو! خدا کے لیے پانی پلا دو!...“ ٹونی سسکتے ہوئے چیخا۔ ”ایک گھونٹ دے دو، میں مر رہا ہوں۔“

اُس کے قریب ہی کھڑا سیاہ فام بندوق بردار دوڑتا ہوا آیا اور بندوق کا بٹ ٹونی کے پہلو میں دے مارا۔ ”کُپ میں باٹر، گُپ میں باٹر... باٹر پلانے کا ہے... چل تیری ماں کا... سالا۔“

ٹونی کی چیخ پر اُس نے ایک مرتبہ پھر بٹ کی ضرب لگائی۔

”مار دو مجھے... میں تمھاری منت کرتا ہوں۔ صرف ایک گولی میرے سر میں اُتار دو!“ ٹونی بری طرح سے تڑپتے ہوئے چیخنے لگا۔ اُسے ضرب لگانے والا سیاہ فام انگریزی کی شد بد رکھتا تھا۔ اُس نے ایک جھٹکے سے بندوق سیدھی کی اور کھٹکے سے گولی چڑھا لی۔ ٹونی سمیت چاروں طرف سانپ سونگھ گیا۔ کوئی لمحہ تھا کہ لبلبہ دبتا۔ سیاہ فام کچھ دیر ٹونی کو گھورا کیا۔ معاً اُس نے مُنھ بھر کے ٹونی پہ تھوک دیا۔ اور نال اوپر اٹھا دی۔ ”پھکر نہ کر... وکھت آنے پر گولی بھی ملے گی۔“

اچانک درختوں کے درمیان سے وہی موٹا برآمد ہوا جو جہاز پر کرسی جمائے بیٹھا تھا۔ وہ شاید باروتیہ کا نائب تھا۔

”اوکلسا! کون سور مچا رہا ہے؟“ اُس نے سیاہ فام کے قریب پہنچ کے اُس سے استفسار کیا۔

”پانی مانگ رہے ہیں بھاوا۔“ سیاہ فام کلسا کی آواز میں نرمی سمٹ آئی تھی، شاید سفارش بھی کہ پانی پلا دیا جائے۔

”پانی سے کون منع کیا۔ پلاؤ پانی۔ روٹی کھلاؤ... ابھی چندہ رکھنے کا ہے... سور بالکل نہیں۔“ موٹے نے بہ عجلت ہدایات دیں۔ اُس کا گریبان کھلا تھا۔ کُرتے کی شکنوں اور بے ترتیبی سے لگتا تھا کہ بدحواسی میں جسم پر چڑھا کے آیا ہے۔ اُس کے لٹکے ہو گلّے سرخ ہو رہے تھے۔ جیسے کسی نے نوچا کھسوٹا ہو، تھپڑایا ہوا، وہ جتنی تیزی سے آیا تھا اُتنی ہی تیزی سے پھدکتا ہوا چلا گیا۔ کلسا الاؤ کے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں کے پاس چلا گیا۔ نہ جانے وہ وہاں کیا باتیں کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اُس کے ساتھ دو افراد اور چلے آئے۔ اُن میں سے ایک رتبے میں برتر لگتا تھا۔ چہرے کی روشنائی بتا رہی تھی کہ خوب نشیب و فراز سے گزر چکا ہے۔ وہ میرے قریب ہی آ کے کھڑا ہوا، اور بولا، ”ہم آپ سب کی مشکیں کھول رہے ہیں، پانی بھی دیا جائے گا اور کھانا بھی ملے گا۔ جنگل کے چپّے چپّے پر ہمارے آدمی پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر کسی نے ہوشیاری دکھائی وہ خود تو مارا جائے گا ہی، لیکن عتاب کا شکار سب ہوں گے۔ کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہلے گا۔ بصورتِ دیگر زبان سے نہیں گولی سے بات کی جائے گی۔“ اُس شخص نے نہایت شستگی اور روانی سے انگریزی میں کہا۔ پھر اُس نے وہی ہدایات ہمارے لیے بھی ترجمہ کر دیں۔ اپنی بات مکمل کرکے وہ واپس الاؤ کی جانب چلا گیا۔

”دھنکسی آ جاد کرنے کا ہے۔“ کلسا نے ہماری پشت پر کھڑے کسی شخص کو مخاطب کیا۔

تھا ہمارے عقب کے درختوں سے کئی افراد نکل آئے۔
اُنھوں نے بندوقیں درختوں کے ساتھ ہی چھوڑ دی تھیں۔
کچھ ہی دیر میں ہمارے ہاتھ کھول دیے گئے۔ ہاتھ آگے کی طرف لاتے ہوئے میں نے محسوس کیا جیسے کچھ غلط کر رہا ہوں، اُن کی اصل جگہ تو پشت ہی پر ہے۔ کہنیوں سے شانوں تک ہاتھ بالکل اکڑ گئے تھے۔ زورا اور جمرو بتھل کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ میں بتھل سے پچیس سے تیس گز کی دوری پر تھا۔ میں نے سوچا کہ کلسا سے کہوں وہ مجھے میرے ساتھی کے قریب بیٹھنے کی اجازت دے۔ کلسا میرے قریب سے گزرا بھی، لیکن میں اُس سے کچھ نہ کہہ سکا۔ تھوڑی دیر بعد ایک ننگ دھڑنگ شخص کمر سے مشک لپیٹے آن وارد ہوا۔ اُس نے لنگی نام کے چیتھڑے سے مرڑ ڈھانپا ہوا تھا۔ پانی دیکھ کے بے حس و حرکت پڑی ہوئی قطار میں پھریری دوڑ گئی۔ گویا زندگی نے مسکرا کے انگڑائی بھری ہو۔

"چلو چلو پلا دے سب کو" کلسا نے مشک بردار سے کہا۔ اُس نے مشک رچاؤ سے اُٹھا رکھی تھی کہ وہ کہنہ مشق سقہ ہی تھا۔ "پہلے اُس کیکر میں ٹپکا ہے۔" اُسی نے ٹونی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اُس کی آواز میں اطمینان بھری چاشنی کا رچاؤ تھا۔

"ٹھیرو، ٹھیرو... اے بھاوا جرا روکنے کا ہے۔" الاؤ کی طرف سے ایک پستہ قد اچھلتا کودتا ہوا آیا۔ اُس کی آواز سن کے ٹونی کی طرف بڑھتا ہوا پن بارا رک گیا۔

کلسا نے اُسے دیکھ کر منہ چڑھایا، "اوگانجھے! تیرے کو کیا مستی چڑھی ہے؟"

"اِتنا بڑے بڑے لوگ میجر، کرنل، کمشنر، کلکٹر، چلو میں پانی پییں گے کیا؟"

پستہ قد، جسے کلسا نے گانجھے کے نام سے پکارا تھا انے کولھے مٹکاتے ہوئے کہا۔ گانجھے کا قد بمشکل 4 فٹ ہوگا۔ اُس کا سر جسے کی نسبت دگنا بڑا تھا۔ پکوڑا سی ناک کے نیچے دو دھاری تلوار مونچھیں، اُس پر خوب اُس کی چکیلی آواز!

"نوٹنکی لگانے کا نہیں مٹکوا! سور نہیں کرنا!" کلسا نے گانجھے کو ہنستے ہوئے تنبیہ کی، گویا کہہ دیا کہ لگا دو تماشا!

"روکنے کا نہیں کلسا، اپنا گانجھا سیکسپیئر ہے سالا!" ایک دوسرے نے آواز لگائی۔

"گھونٹا تو بھرنے دو، مر رہے ہیں سوَر۔" ایک تیسرے نے گرہ لگائی۔

"پانی تو سیوجی کا ہے... جو رام رام کرے، اُسے پلاؤ!"

"ہر آنے والا آواز کستا ہوا آ رہا۔ اِدھر اُدھر سے کھسکتے ہوئے چار چھ وہاں جمع ہو گئے تھے۔ گانجھا پن ہارے سے چمٹا کھڑا تھا۔ "میں اپنی مرجی سے پانی پلانے کا ہے۔" "اے کلسا! بولے نا اس کو!"

"پانی تو حجرت حسین کی نیاج ہے۔ کربلا والوں کا نجرانہ ہے۔ پانی پلانا کرانتی ہے باپو!" ایک باریش جوان نے اچکتے ہوئے کہا۔ وہ الاؤ سے اُٹھ کے چلا آیا تھا۔

"اے گھپار! ہم سمجھا ہوں کرانتی، سمجھانے کا نہیں ہے۔" رام رام کی صلاح دینے والے نے باریش جوان کی طرف اُنگلی تانتے ہوئے کہا، وہ ایک دم ہتھے سے اکھڑ رہا تھا۔

"ہمارا دھرم سب کی اِجت کرنا سمجھاتا ہے باپو!" باریش جوان نے بھی تنک کے جواب دیا۔

"او گھپارے۔ او سیندو! اِتنے مندر مسجد نکیں ہے۔ کرانتی ہے کرانتی! کاٹھیاواڑ کی کرانتی۔" کلسے نے فوراً بیچ میں پڑ کے دونوں کو جھڑک دیا۔

"تجھے جو کرنا ہے کر پھر اِدھر سے کھسک۔ موج میلہ ٹھکانے پر لے جا لگنے کا ہے۔" کلسے نے گانجھے کی طرف رخ پھیرتے ہوئے اُسے بھی جھڑکا۔ قیدیوں کی نگہبانی کرنے والوں میں کلسا کی ممتاز حیثیت نظر آئی تھی۔ اُس کی نرم گوئی رعب و دبدبے میں حائل نہ تھی۔

گانجھے کی جسمانی ساخت اور چہرے کے نقوش نوٹنکی کے مسخروں جیسے تھے، یہ معمہ ہی رہا ہے کہ انسانی خدوخال مزاج کے تابع ہوتے ہیں، یا مزاج خدوخال اُستوار کرتا

ہے۔ بہ ہرحال، صورتوں کی آئینہ گری کا اقرار سبھی نے کیا ہے۔ پستہ قد، غیر متناسب بڑا سر، اُبلتی آنکھیں، سیاہ رنگ، بھدے ہونٹ اور لڑھکتی ہوئی چال کے مالک یہ مسخرے سرکسی اور نوٹنکیوں کا جزو لاینفک ہوتے ہیں۔ انھیں ٹھگنو، چھوٹا، بغلی، طفیلیہ، پستہ، ناٹا اور اس طرح کے دیگر ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ کہیں سے گزر جائیں تو راہ گیروں کی نظریں لطف کشید کرتی ہیں، دبا دبا استہزا تو کہیں واشگاف ٹھٹھول اِن کے ہم راہ چلتا ہے کہیں بیٹھ جائیں تو تماشا بچ جاتا ہے۔ ان میں اور میرزادیوں میں سرمو ہی فرق ہوتا ہے۔ طوائف کا دھندا بالا خانے میں بیٹھ کے چلتا ہے۔ ہزار حیلوں سے تماش بین سیڑھیاں چڑھتے ہیں، لیکن یہ وہ خوش نصیب ہیں جن کے لیے بستیاں، گانو، شہر، گلی کوچے، دنیا کا چپہ چپہ بالا خانہ ہے۔ سوائے اُس کھولی کے جسے اندر سے بند کر کے یہ خود کنڈی لگالیں۔ ورنہ یہ مانگیں یا نا مانگیں، پائی دو پائی، چونی اٹھنی، خدا کہ زیبا بھی انھیں دیا جاتا ہے کہ کارِ خیر ہے، گویا خالق نے کوئی غلطی کر دی ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ گانجھے کے میدان میں رونما ہوتے ہی دائیں بائیں آگے پیچھے سے پہریدار کشاں کشاں سارس کے گرد کھنچے چلے آئے تھے۔ درختوں کی اوٹ سے بھی نکل نکل کے مسلح افراد آ رہے تھے کہ جمگھٹے کی کوئی صدا نہیں ہوا کرتی، اس کی پُر کشش آوازیں محسوس کر لی جاتی ہیں۔ بس در و دیوار اس سے مستثنیٰ ہیں، اور غول تو سبھی کے خود رو ہوتے ہیں، کیا انسان تو کیا جان ور!

میں بُھل کے قریب جا بیٹھنے کی تدبیر سوچ رہا تھا۔ ہم ایک ناگہانی مصیبت میں گرفتار ہو چکے تھے۔ خاکِ داماں جھٹکنے سے منھ پر ہی آئی تھی۔ اب تک پیش آنے والے حالات سے یہ واضح تھا کہ باروٹیہ اور اُس کا گروہ کاٹھیاواڑی مسافر کے بیان سے کہیں زیادہ منظم اور سریع الحرکت ہے۔ کاٹھیاواڑ کے ساحل پر برطانوی بحری جہاز کا اغوا ہر اعتبار سے ایک غیر معمولی کام تھا۔ اب تک پورے ہندستان کی مشینری میں کھلبلی مچ گئی ہوگی۔ ایک ایک انگریز کی بازیابی تک وائسرائے کی جان پر بن آئے گی۔ بمبئی میں شکلا بابو کے ہاں اخبارات و رسائل پڑھنے کے مواقع بہم رہتے تھے۔ اُن دنوں میں نے پڑھا تھا کہ ہندستان میں ملازمت کے دوران ہلاک یا لاپتا ہونے والے انگریزوں سے متعلق خبریں شائع کرنے کی برطانیہ میں پابندی تھی۔ اخبار کے مطابق انگلستان میں غیر قوموں پر حکومت کا فلسفہ رد کیا جا رہا تھا۔ وہاں کے دانش ور اور اہلِ سخن ایسی مہم جوئیوں کو بے سود اور وقت کا زیاں قرار دے رہے تھے۔ ایسے حالات میں طبقہ اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے کم و بیش سو افراد کا اغوا قیامت خیز ہی تھا۔ نہ صرف دلی کی باج گزار کاٹھیاواڑ ریاستیں ان کی بازیابی کے لیے بھرپور وسائل جھونک دیں گی، بل کہ اس کارروائی میں انگریز براہِ راست ملوث ہو سکتے تھے۔ کاٹھیاواڑی مسافر کے مطابق اگر واقعی باروٹیہ اپنے بیٹے کا حصول چاہتا ہے۔ تو صورتِ حال پریشان کن نہیں تھی۔ ان اغوا زدگان کے تبادلے میں انگریزوں کو باروٹیہ کے سوپوت بھی دینے پڑتے تو وہ بہ رضا و رغبت ایسا کرتے، لیکن اگر معاملہ کچھ اور تھا تو صورتِ حال تشویش ناک تھی۔ کشتیوں کے ایک پورے شہر کے ساتھ جہاز پر دھاوا بولنا اور اِس آسانی سے انگریز افسران کو بوریوں میں بھر کے چھکڑوں پر روانہ کر دینا زور آوری کا بے وقوفانہ گھمنڈ تھا یا پھر باروٹیہ کو ریاست کی پشت پناہی حاصل تھی۔ بوری بند انسانوں سے لدے ہوئے چالیس یا پچاس چھکڑوں کا دھڑلے اور بنا روک ٹوک کے دن بھر سفر کرنا ناممکن بات تھی، لیکن ایک بات میں بھول رہا تھا، اِتنا بڑا واقعہ لامحالہ ایک طویل منصوبہ بندی کا متقاضی تھا۔ پہلے جہاز کا عملہ یقیناً اس واقعے میں ملوث تھا۔ جس وقت باروٹیہ کے کرانتی کار جہاز پر چڑھے تھے تب تک شاید جہاز انتظامیہ کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ مسلح محافظوں سے نامعلوم اور پُر اسرار طریقے سے نمٹا گیا تھا۔ یقیناً باروٹیہ کے

آدمیوں کی بہت بڑی تعداد جہاز میں پہلے ہی سے سوار تھی جن میں بارسوخ افراد بھی شامل تھے۔ جو جہاز کی مکمل جان کاری رکھتے تھے۔ ایسی رسائی راتوں رات کا کھیل تماشا نہیں تھی۔ دو چار روز یا مہینا نہیں، برسوں پہلے قدم اُٹھایا گیا تھا۔ ریاست کی لاعلمی میں کشتیوں کی اتنی بڑی نقل و حرکت ناممکن سی بات تھی۔ ثوربان بھی اپنے لب و لہجے سے گروہ کا حصہ معلوم ہو رہا تھا۔ سامنے کی بات ہے اتنی منظم کامیابی میں اجرتی چھکڑوں کی جگہ موجود نہیں تھی۔ چھکڑے اُن کے اپنے ہی تھے کوئی لُٹیرا یا ڈاکو اتنے وسائل مہیا نہیں کر سکتا تھا۔ معاملہ کچھ اور ہی تھا۔ ان کے تیور بتا رہے تھے کہ یہاں قیام عارضی ہے بس کچھ ستا کے چل دیا جائے گا۔ جھنڈ کے دائیں بائیں سے اُن کی آمد و رفت متواتر تھی۔ یہاں صرف مرد قیدی رکھے گئے تھے۔ قافلے کے کرتا دھرتاؤں، انگریز خواتین کا پڑاؤ ساتھ ہی کہیں تھا۔ ہمیں چھکڑے سے اتارے گئے کئی گھنٹے ہو گئے تھے۔ انگریز قیدی خوف سے گھبرائے ہوئے تھے۔ ان میں سے بیش تر پہلی مرتبہ ہندستان جا رہے تھے۔ اپنی راج بانی میں ایسے سلوک کی توقع انھیں بالکل نہیں تھی۔ نفرت سے بھبکتی، سلگتی انگارہ آنکھیں مسلسل اُن کا طواف کر رہی تھیں۔ قریب سے گزرنے والے تھوکنے اور لات مارنے سے نہیں چوکتے تھے۔ انھوں نے ہمیں توجہ کے قابل نہیں سمجھا تھا۔ البتہ ہمیں دیکھتے ہوئے اُن کی آنکھوں میں اُلجھن اور ٹیڑھ پیدا ہو جاتی اور زاویۂ نگاہ تیزی سے تبدیل کر لیا جاتا جیسے دیکھ کر چوری کر لی ہو۔ صاف لگتا اُن کے لیے انگریز قیدیوں کے درمیان ہماری موجودگی اچنبھا تھی۔ ہم اِس منظر نامے میں موزوں نہیں تھے۔ اہم نہیں تھے، اور قاعدہ ہے کہ اہمیت ہی آپ کو زندہ رکھے ہوئے ہے اور زندہ رکھتی ہے، باروٹیہ نے ہمیں انگریزوں کا کوئی اہم آلۂ کار یا گماشتہ سمجھ کے جہاز سے اُٹھوا لیا تھا، لیکن جب اُس پر اپنی غلطی کا حال کھلتا، جو کہ جلد یا بہ دیر کھلنا ہی تھا۔ تو کیا ہمیں عزت و احترام سے رخصت کر دیتا؟ انگریز کے گماشتہ ہونے کی چھاپ ہی ہماری اہمیت تھی۔ ہماری حیثیت پر شک و شبہ جہاز پر ہی ہمیں فائدہ پہنچا سکتا تھا۔ اب ہمیں چھوڑے جانے کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا۔ تاوقتیکہ انگریزوں کا کوئی فیصلہ نہ ہو جائے، جو گروہ اپنے گرفتار ہونے والے ساتھیوں کو قتل کرنے کی شہرت رکھتا ہو اُس کی طرف سے قیدیوں کو رہا کرنے کی روایت یقیناً نہیں ہوگی۔ ہر چند باروٹیہ کے آدمی جہاز پر ہندستانی مسافروں سے خوش روی سے پیش آئے تھے۔ ہمیں ہمارے چاقو تک لوٹا دیے گئے تھے لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ ہمیں رسیوں سے جکڑ کے اور بوریوں میں ٹھونس کے یہاں تک لایا گیا تھا۔ ظاہر ہے آنے والا وقت ہمارے لیے کسی طور پر اچھا نہیں تھا۔ بُھل اس خوش گمانی میں بیٹھا تھا کہ وہ پُرسکون نظر آ رہا ہے۔ مجھ سے نظریں چار ہوتے ہی وہ بے فکری سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا تھا۔ یا زورا اور جمرو کی طرف کوئی فقرہ اچھال دیتا، لیکن آنکھوں کی سوزش کو کوئی کیا کہے، جو دل کی سوختگی کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ اب کے نظریں چار ہوئیں تو بُھل نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے وہیں ٹک کے بیٹھے رہنے کا اشارہ کر دیا۔ وہ ہمیشہ سے ایسا ہی کرتا ہے۔ "اٹینشن! وائسرائے ہند تشریف لائے ہیں!" گانجھے نے گھن گھرج سے لے اُٹھائی تھی۔ اُس کا مختصر سا سینہ مرغے کی طرح باہر نکلا ہوا تھا۔ ایک تازہ ٹہنی بغل میں دبی ہوئی تھی۔ اُس کے خاکی کرتے کا دامن سفید چوڑی دار پاجامے میں روپوش ہو گیا تھا اُس کی توند خاصی مضحکہ خیز تھی، مانو پیٹ کے آگے بڑی گیند چپکا دی ہو۔ وہ وائسرائے ہند بن کے تشریف لا چکا تھا، آنکھیں پیشانی پر تنی ہوئیں، تھوڑی اوپر اٹھی ہوئی، پن ہارا اُس کے پیچھے مشک کے کھڑا تھا۔

"وائسرائے کی پتلون میں ناڑا ہے۔" کسی نے ہانک لگائی۔ سب نے منھ پھاڑ کے قہقہہ لگایا۔

"ایک مشک کا وائسرائے... ہاہاہا۔" ایک جیسے بالوں

والے نے تان اٹھائی۔ وہ پیٹ پکڑ کے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ واقعی اُسے دیکھ کے مسکراہٹ کلبلانے لگی تھی، چہروں پر معصومیت بھی کوئی چیز ہے۔ گانجھا اس فقرے بازی سے کچھ اَور تن گیا۔ اُس نے نپے تلے قدم اٹھائے اور پہلے قیدی کے پاس لڑھکتا ہوا پہنچ گیا۔ بِین ہارا اُس کے پیچھے پیچھے تھا۔

''تم واٹر مانگتا؟'' اُس نے انگریز کے چہرے پر ٹھنی نکائی اور حیرت انگیز پھرتی سے اچھل کے ہوا میں لوٹ گیا۔ کمال یہ تھا کہ قلابازی کے دوران ٹھنی انگریز کی تھوڑی پر ہی ٹکی رہی، گویا اُس نے اپنا بازو کاٹ کے وہیں رکھ دیا، اور قلابازی لگا کے پھر بازو سے جڑ گیا ہو۔ انگریز قیدی بھی حیرت سے آنکھیں پٹپٹانے لگا۔ اُدھر تماش بینوں نے سیٹیوں سے آسمان سر پر اٹھالیا۔ اچھل اچھل کے اور چیخ چیخ کے داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے جانے لگے۔ سکوت کی ہدایت دینے والا کلسا بھی اُن میں شامل تھا۔ گانجے کی حالت دیدنی تھی وہ فخر و نخوت سے پھٹا جا رہا تھا۔ اُس نے اُسے پانی نہیں پلایا، بل کہ ایک قدم بڑھا کے دوسرے کے پاس پہنچ گیا۔ ''تم شریف آدمی لگتا ہے۔ ہم تم کو پانی جرور پلائے گا۔'' گانجھے نے دیدے نچاتے ہوئے کہا۔ اُس کے کولھے غیر محسوس انداز میں مٹک رہے تھے۔ اور لہجے میں اچانک بے پناہ لوچ، بلا کا درد اور مخاطب سے بے پناہ ہم دردی سمٹ آئی تھی۔ پھر اُس نے جھپٹ کے بِین ہارے سے مٹی کا کٹورا پکڑا۔ ''اس میں پانی ڈالو ظالم لوگ! تم لوگ کو سرم نہیں آئی، اتنا پیارے لوگاں کو پانی نہیں پلاتا۔''

بِین ہارے نے مسکراتے ہوئے مشک کی ڈوری ذرا ڈھیلی کر کے ڈھوبرے میں پانی بھر دیا۔ بہت دور سے پانی کی مترنم چھن چھناہٹ میرے کانوں کو بھی بھلی لگی۔ انگریز کی آنکھوں میں پانی بھر آیا وہ کپکپاتے لرزتے ہونٹوں سے کٹورے کو تک رہا تھا۔ ''تم اچھا دِکھتا ہے، مُنہ کھولو ہم خود تم کو پانی پلائے گا۔'' گانجے نے کٹورا اُس کے مُنہ کے قریب لے جاتے ہوئے کہا۔ کٹورا قریب آ کے دیکھ کے اُس نے جھٹ مُنہ کھولا۔ گانجھا اچانک دھڑام سے زمین پر گرا اور لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا، مگر کٹورا اُس کے دائیں ہاتھ کی انگلی پر ساکت و قائم تھا، جس سے پانی کا قطرہ بھی نہ چھلکا تھا۔ انگلی کی نوک پر کٹورا تھامے رکھنا کوئی کمال نہ تھا، لیکن اِس طرح تڑپتے ہوئے پیالے کو استقرار بخشنا واقعی کمال تھا۔ اِس مرتبہ سیٹیوں کے شور میں پورا جنگل شریک ہو گیا تھا۔ وہ اچھل اچھل کے چیخ رہے تھے۔ بعض ایک ہاتھ کولھے پر اور ایک گردن پر جمائے ٹھمکے لگا رہے تھے۔ وہ اچھل اچھل کے انگریزوں کو چڑا رہے تھے جو انھیں سکتے کے عالم میں ہونقوں کی طرح تک رہے تھے۔ بعض کے چہرے آنسوؤں سے تر تھے۔ گانجھے کے زمین سے اُٹھتے ہی ماحول ٹھنڈا پڑ گیا۔ گانجھا تیسرے کی جانب بڑھ گیا۔ پھر وہ اس طرح مختلف کرتب دکھاتا ہوا چوتھے، پانچویں سے آگے کی طرف بڑھتا گیا، لیکن اُس نے کسی کے حلق میں ایک قطرہ بھی نہ ٹپکایا تھا۔ پیاس کے ماروں نے اُس کی طرف امید بھری نظروں سے تکنا چھوڑ دیا تھا، لیکن وہ مستی اور جنون میں اچھلتا کودتا بڑھتا چلا آ رہا تھا کہ بجھل تک پہنچ گیا۔ میرے جسم پر باریک باریک چیونٹیاں سنسنانے لگیں، زورا اور جمرو کے نتھنے پھڑکتے دکھائی دے رہے تھے۔ بجھل ویسے ہی بیٹھا تھا۔ وہی خالی اور لاپتا چہرہ، کسے خبر تھی کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔

''اے دیس والا باہو ہے نا! ابھی تیرے کو پانی کیا سربت پلانے کا ہے۔'' اُس نے کٹورا گھماتے ہوئے ہوا میں اچھالا اور واپس تھام لیا۔ اُس کے ہاتھوں سے برسوں کی ریاضت چھلکتی تھی۔

''ادھری پیاس نہیں ہے رہے... آگے جا۔'' بجھل کے لب ہلے اور میرا سانس بند ہونے لگا۔

''نہ رے نہ بھگوان! ابھی باپو کو گنگا جل پلانے کا ہے۔'' اُس نے پیالہ بجھل کے مُنہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ بجھل کے ہونٹ سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔ میرا دل بے طرح سے ڈولنے لگا تھا۔ یہاں معمولی سی بھی گڑ بڑ موت کا سیدھا پیغام بن سکتی تھی، لیکن میں اپنی آنکھوں کے سامنے سب کچھ ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میرے ہاتھ چاقو پر جم گئے۔

''دیس والے ناراج ہیں۔'' آخری لفظ ادا کرتے ہوئے اُس کا لوچ دار لہجہ غصّے میں مدغم سا ہوا، ''چل باپو! تو بھی کیا یاد کرنے کا ہے۔ مُنہ کھول ساباس!'' اُس نے پیالہ ہونٹوں کے بالکل قریب کر دیا۔ اُس کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس قطار میں کوئی ایسی کج روی کا مظاہرہ بھی کر سکتا ہے، اور کچھ انگریزوں کی گھگھیاہٹ نے اُس کی آتشِ شوق مزید بڑھکا دی تھی۔ وہ ہٹیلا ہو گیا۔ ''ساباس پانی پی۔'' بیٹھے ہوئے بجھل سے اُس کا قد کوئی سوت دو سوت بھر ہی اونچا ہو گا۔ میں دل میں دعا کرنے لگا کہ بجھل مُنہ کھول کے تھوڑی ہتک برداشت کر لے، مگر اُس پستہ قیامت نے لپک کے بجھل کی گدّی پر ہاتھ جمایا اور اُس کے بال پکڑ کے پیالے کی اور جھٹکا دیا۔

''تیری ماں کی... سالے... اپن کے استاد پر ہاتھ ڈالتا ہے۔'' زورا شیر کی دھاڑ اور بجلی کی طرح تڑپا تھا۔ اُس نے سینے پر ہاتھ جما کے اُسے پرے دھکیل دیا۔ گانجھا گیند کی طرح گھومتا ہوا کئی فٹ دُور جا گرا تھا۔ اس سے پیش تر بجھل اُس کا ہاتھ پکڑتا زورا چاقو لہراتا، تڑپتا، بل کھاتا کھڑا ہو گیا تھا، ''ابھی اپن کھڑا ہے اِدھر... آؤ سالو... کوئی مائی کا لال ہے تو آوے اِدھر، لگاوے اپن کے استاد کو ہاتھ... اپن کاٹ کے پھینک دوں گا۔ تم سمجھتا کیا ہے حرامی لوگ! اپن ان سوّروں کی طرح ہے!'' زورا چیخ چنگھاڑ رہا تھا۔ غیض و غضب سے اُس کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ کلسا پریشان نظروں سے زورا کو دیکھ رہا تھا۔ باقی مجمع کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ یکایک یہ کیا ہو گیا۔ میں نے چاقو جیب سے نکال کے ہاتھ میں دبا لیا تھا، بس کھٹکا دبا کے کھولنے کی دیر تھی۔ مجھے زورا اور جمرو کی طرف سے اِسی بات کا ڈر تھا۔ بجھل کی صورت ویسے ہی تھی، تاثرات سے عاری، مگر آنکھیں اُس کے قابو سے باہر ہو رہی تھیں۔ ہمارے اِرد گرد سیکڑوں کی تعداد میں بندوقیں اور طمنچے موجود تھے۔ یہاں چاقو کا بھلا کیا کام! اس سے پہلے کہ کہیں سے گولی چلتی یا بارودیہ کے آدمی کوئی جوابی قدم اُٹھاتے۔ چشم زدن میں بجھل چیتے کی طرح اچھلا اور زورا پر جا پڑا۔

''اِدھر استاد تمھارا بھڑوا بیٹھا ہے۔ اُس کو نٹھا سمجھ لیا ہے رے!'' بجھل نے زورا کو لاتوں اور ٹھڈّوں پر رکھ لیا، ''صرف چاقو نہیں سکھائے تجھے... چاقو چلانے آ گیا... یہ تیرے باپ ہیں، رشتے دار ہیں۔ حرامی دوسرے بھی مروائے گا۔''

بجھل اُسے بری طرح رگید رہا تھا۔ لاتوں ٹھڈّوں اور ہاتھوں سے اُس تھپڑ رہا تھا، اور زورا تو وارفتگی و عقیدت میں بے سدھ ہوا جا رہا تھا، گویا شادیٔ مرگ سے لرز رہا ہو۔ اُس نے چاقو پھینک دیا تھا۔ اُس نے ایک سسکاری نہیں بھری۔ مجمع اُسے بھی تماشا سمجھ کے دیکھ رہا تھا۔ انھیں ہماری بے کسی کا اپنے وجود کی طرح ہی یقین تھا اور کچھ بجھل اُسے بے طرح کے جنون سے پیٹ رہا تھا۔ پھر جیسے ہی وہ ہانپتے ہوئے رکا۔ زورا نے تڑپ کے اُس کے پاؤں پکڑ لیے۔ اور بچّوں کی طرح بلک بلک کے رونے لگا۔ ''استاد ابھی رکتا کیوں ہے؟ ماں قسم! اکّھا مزا آ رہا تھا، ابھی اپن کی آنکھیں نوچ دے استاد... اپن کا بھیجا پھوڑ دے استاد! یہ سالا تیرے کو ایسے دیکھنا نہیں مانگتا۔'' زورا مچلا جا رہا تھا، اور دیوانوں کی طرح بجھل کے قدموں سے لپٹا انھیں چوم رہا تھا۔

بجھل کی صورت پر زردی کھنڈ گئی تھی، کوئی لمحہ تھا جو ایک سایہ اُس کے آر پار ہوا، اور پھر وہی لاتعلقی، وہی بے اعتنائی۔ وہ زور زور سے سانس بھر رہا تھا۔ اُس کے اندر
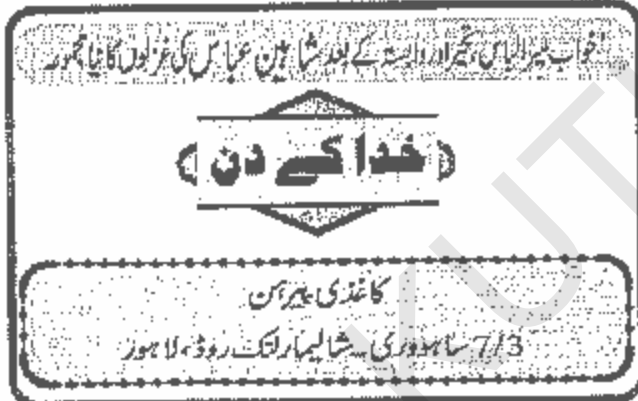
اب کچھ نہیں تھا، کریدی ہوئی راکھ کا ڈھیر تھا، جس نے انگارے کو نہ جانے کہاں چھپایا تھا۔ عجیب نظروں سے بٹھل نے زورا کو گھورا، اِن میں بہت کچھ تھا بھی اور بالکل خالی بھی تھیں۔ ”زندہ ہیں... مرے نہیں رے!“ اُس نے ایک جھٹکے سے زورا سے بازو چھڑوایا اور اپنی جگہ آ کے بیٹھ گیا۔ مجمع کی حیرانی اور سکوت ہویدا ہو گیا۔ اُن کے چہروں سے خشونت تو گویا نوچ لی گئی تھی۔ وہ سب زورا کو ہم دردی سے دیکھ رہے تھے۔ یہ وہی زورا تھا جو اُنھیں کچھ لمحے قبل خنجر لہرا لہرا کے للکار رہا تھا۔ چند لمحوں پہلے میں نے دو چار کو مار کے مرنے کا یقین کر لیا تھا، لیکن اب اُن کے چہروں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ قہر و غضب ٹل چکا ہے۔ یہ بٹھل ہی کا کرشمہ تھا۔ بقول بٹھل کے دماغ کی سرخی ہاتھ پیروں کی سچائی نگل جاتی ہے۔ مشق اور ورزش جسم کی نہیں، دماغ کی ہوتی ہے۔

وہ آپس میں بھنبھنانے لگے تو کلسا کی آواز آئی، ”اِدھر سے اُٹھنے کا ہے۔ ابھی استاد کی گود میں بیٹھو۔“ وہ زورا سے مخاطب تھا۔ اُس کی آواز میں نرمی اور پچکار تھی۔ پھر سبھی کے دوستانہ قہقہے اُمڈ پڑے۔ اُن میں سے بعض ہنستے ہنستے پیٹ پکڑ کے دوہرے ہو گئے۔ پھر تو جیسے قہقہوں کا مقابلہ شروع ہو گیا۔ وہ بڑھ چڑھ کے زور و شور سے چلّانے لگے۔ کافی دیر یہ بہتِ گویائی جاری رہی۔ انگریز قیدی مسلسل حیرانی سے تک رہے تھے، وہ یہ معاملہ سمجھ نہیں پائے تھے۔ معاً ایک گیند لڑھکتی ہوئی آئی اور زورا سے لپٹ گئی۔ وہ گانجھا تھا، وہ زورا سے لپٹ کے بلکنے لگا۔ ”اے استاد! تم تو ایک دم اصیل گھوڑا لگنے کا ہے۔ سیوکی سوگندھ! تم چاقو لہرا کے اپنا دل لُوٹ لیا۔ اِدھر جندگی گجرنے کا ہے۔ استاد کی سیوا کا ایسا نجارا اپن نہیں دیکھنے کا ہے۔ ابھی سو گولی چلتا تیرے اوپر۔“

”واہ استاد نے کیسا سیر پالا ہے۔“ گانجھے نے زورا کی گردن میں ہاتھ ڈالا اور اُس کی پیشانی چوم لی۔ زورا جو اُسے مسلسل گھور رہا تھا یک دم مسکرا دیا۔ اِس مرتبہ سیٹیوں کی چیخ پکار کا شور درختوں کے پتّے پتّے سے اُمڈ پڑا تھا۔

”ارے سجنو! گانجھے نے عاشقی معشوقی سروع کر دی ہے!“ کسی نے راگ چھیڑا اور ٹھمکے لگنے شروع ہو گئے۔ کچھ دیر یہ شور و غل جاری رہا۔ پن بارے نے مشک کا مُنہ کھول دیا۔ اُس نے قیدیوں کو کٹورا بھر بھر کے پانی پلانا شروع کر دیا تھا۔ کئی پہروں کے پیاسے بدحواسی سے پانی پی رہے تھے۔ لرزتے اور پھڑپھڑاتے ہونٹ آدھا گرا رہے اور آدھا حلق میں انڈیل رہے تھے۔ آخر پروفیسر تھامپسن کو بھی پانی پلا دیا گیا۔ وہ اب تک نڈھال پڑے ہوئے تھے۔ میجر برنارڈ خلا میں تک رہا تھا۔ پانی پی کے ٹونی کے چہرے پر رونق اُمڈ آئی تھی۔ بٹھل کو گانجھے نے اپنے ہاتھوں سے پانی پلایا، اور زورا سے لے کے اُس کا بچا ہوا پانی خود پیا۔ انگریز قیدیوں کے چہروں پر بھی رونق اُبھرنے لگی تھی۔ الاؤ والوں نے ہرن بھون لیے تھے۔ بھنے ہوئے قتلوں کو مزید ٹکڑے کر کے پہرے داروں میں تقسیم کیے جا رہے تھے۔ اشتہا انگیز خوشبو تیزی سے ہمارے اردگرد پھیل رہی تھی پھر کلسا کی ہدایت پر ایک ایک ٹکڑا قیدیوں میں بھی تقسیم کیا جانے لگا۔ بٹھل کو قدرے بڑا اور اچھی طرح سِکا ہوا ٹکڑا دیا گیا۔ گوشت باقاعدہ مسالا لگا کے بھونا گیا تھا۔ اُدھر کچھ نے سوڈے کی بوتلیں کھول لی تھیں۔ وہ ٹکڑیوں میں بیٹھ کے گوشت چبا رہے تھے، سوڈے کے جھاگ ایک دوسرے پر اُڑا رہے تھے۔

میرے قریب سے کلسا گزرا تو میں نے اُس سے بٹھل کے قریب جا بیٹھنے کی اجازت طلب کی۔ ”ابھی زیادہ مستی سوجھنے کا ہے، اِدھر ہی بیٹھ، چلنے کا ہے!“ اُس نے درشتی سے مجھے جھڑک دیا اور الاؤ کی طرف چلا گیا۔ کافی دیر یوں ہی گزر گئی، معاً باروٹیہ کی نیابت کرنے والا موٹا نمودار ہوا۔ وہ تازہ دم دکھائی دے رہا تھا اُسے دیکھتے ہی کلسا دوڑتا ہوا، اُس کے قریب چلا گیا۔ شاید اُس نے کلسا کو کوچ کرنے کی ہدایت دے دی تھیں۔ موٹا جہاں سے آیا تھا وہاں واپس چلا گیا۔ کلسا دیگر آدمیوں کو ہدایت دینے میں مصروف ہو گیا۔

کچھ دیر بعد ہمارے ہاتھ دوبارہ پشت پر باندھ دیے گئے۔ دائیں بائیں مشعل برداروں اور بندوق برداروں کے جلو میں ہمیں جھنڈ سے باہر لے جایا گیا تو اندازہ ہوا کہ ہم تقریباً پانچ سو افراد کے نرغے میں گھرے ہوئے تھے۔ جھنڈ میں فرلانگ بھر چلنے کے بعد ایک کھلا میدان آ گیا تھا۔ یہ رات کا غالباً تیسرا پہر تھا۔ ستاروں کی ٹمٹماہٹ میں اردگرد کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ ہمارے وہاں پہنچتے ہی چھکڑوں کی قطار بھی کہیں سے چلی ہوئی وہاں پہنچ رہی تھی۔ یعنی بوریوں میں بند ہونے کا مرحلہ دوبارہ شروع ہونے والا تھا۔ یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ وہ انگریزوں کو زندہ ہی رکھنا چاہتے تھے، ورنہ رسیوں باندھ کے بوری میں ٹھونسنا، چھکڑوں میں لادنا، پھر اتارنا، رسیاں کھولنا اور اب دوبارہ باندھنا کار آساں نہیں تھا۔ اِس مرتبہ پیروں کے ساتھ مُنہ پر بھی کپڑا باندھا گیا۔ شاید وہ اب کسی ایسی جگہ سے گزرنے والے تھے جہاں اُن کے لیے خطرہ تھا۔ رسیاں باندھنے والے کئی کئی مرتبہ تسلی کر رہے تھے۔ اندھیرے میں کچھ دور مزید ہل جل نظر آ رہی تھی۔ شاید وہاں دوسرے پڑاؤ والے سوار کیے جا رہے تھے۔ تیسرے چھکڑے پر ہی میری باری آ گئی۔ بٹھل، زورا، جبرو اور میں پچھلی طرف تھے۔ جسم کا پھوڑا اب کچھ کم دُکھ رہا تھا۔ چند ہی لمحوں بعد میری بوری پھر چھکڑے میں پھینک دی گئی۔ پھر کسی نے اُسے چھکڑے کے بغلی تختے سے ٹکا دیا۔ دو مزید بوریاں پٹخے جانے کے بعد چھکڑا چل پڑا۔ اِس چھکڑے کے پہیے ہم وار تھے اور چولیں بھی مضبوطی سے ٹھکی ہوئی تھیں۔ اِس میں ”چرخ چوں“ کا شور نہ ہونے کے برابر تھا۔ خوش قسمتی سے بوری کا روزن عین میرے مُنہ پر ہی تھا، ورنہ مُنہ پر کسی پٹی کی وجہ سے اُسے موزوں کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ بیلوں کے سُم یکسانیت اور توازن سے کھرکھری زمین پر پڑ رہے تھے، جس سے مدھر آواز پیدا ہو رہی تھی۔ کسے خبر تھی کہ اب یہ سفر کتنا طویل تھا اور کب تک یونہی چھکڑے کے جھٹکے سہنے تھے۔ میں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ قسمت کی یاوری سے ایک مرتبہ ہم ان کے چنگل سے نکل جائیں، میں پھر گھر سے نکلنے کا نہیں تھا۔ کچھ دیر پہلے میں بہت خوف ناک تجربے سے گزرا تھا۔ بٹھل نے ایک داؤ کھیلا تھا جو کارگر ہوا۔ بہت ممکن تھا کہ بٹھل کو ایسا موقع بھی نہ ملتا، پہلے ہی گولی چل جاتی، یا وہ ٹھٹھول مذاق میں زورا اور بٹھل دونوں ہی کو بھون ڈالتے، لیکن میں بھی تیار تھا۔ کوئی نہ مارتا تو خنجر سے اپنا سینہ خود کھول لیتا۔ اب مزید کوئی نہیں... بٹھل ہی خالی نہیں ہوا مجھ میں بھی سکت نہیں تھی، میرے سینے میں بھی خلا بھرتا جا رہا تھا۔ بٹھل نہیں مانتا تو مجھے ہی مان جانا چاہیے۔ کورا کا تو صرف میں سودائی تھا، اُس کے لیے فقط میری جان تھی، کوئی اور کیوں سولی چڑھے۔ زریں بھی تو تھی، وہ بھی تو کسی کا انتظار کر رہی ہے۔ بٹھل زریں کی خوشی میں پگھل جائے گا۔ مجھے بٹھل پر طیش آنے لگا۔ باروٹیہ کے چنگل سے نکلنے کی دیر تھی۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب بہت ہو چکی، مجھی کو کچھ کرنا ہوگا۔

دن چڑھ آیا تھا۔ چھکڑا رات سے مسلسل چل رہا تھا۔ میرے پڑوس کے بوری نشیں چھکڑے کے چلتے ہی خراٹے مارنے لگے تھے۔ جن کی خرخراہٹ اب تک جاری تھی۔ میں تختے کی درز سے باہر کا منظر دیکھنے میں مصروف تھا۔ باجرے کی کچی فصلیں دُور تک نظر آ رہی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی بستیاں گزرتی جا رہی تھیں۔ حیرت انگیز طور پر چھکڑے بغیر کسی روک ٹوک کے اور اطمینان سے رواں دواں تھے، حالاں کہ اغوا کی اِتنی جارحانہ واردات کے بعد ریاستی پولیس کی جگہ جگہ ناکہ بندی ہونی چاہیے تھی۔ چہ جائیکہ چھکڑوں کی قطاریں گزر جائیں۔ باہر کے منظر میں انسانی چلت پھرت کا اضافہ نظر آنے لگا۔ شاید کوئی بڑا قصبہ یا شہر نزدیک تھا۔ کچھ ہی دیر میں چھکڑے کی رفتار سست ہو گئی، کچے پکے مکانات کا سلسلہ شروع ہوا۔ صرف اِتنا اندازہ ہو رہا تھا کہ ہم کاٹھیاواڑ میں ہیں کس ریاست کس علاقے، قصبے میں ہیں اِس کا قطعاً اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ دن چڑھنے کے ساتھ ساتھ گرمی کی

حدّت میں خاصا اضافہ ہو چکا تھا۔ میرا پورا جسم پسینے سے تربتر تھا۔ چھکڑا لاری اڈّے کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ یہ کچّی پکّی سڑک اِس قصبے یا شہر میں داخل ہوئے بغیر ہی دائیں جانب مڑ رہی تھی، اڈّے کے اکلوتے سائبان کے نیچے سرخ رنگ کی لاری کھڑی تھی، اور اُس کے اکلوتے دروازے سے لوگ سوار ہو رہے تھے۔ اجلے لباس اور ہنستے مسکراتے چہروں کے ساتھ ایک بڑھیا دروازے پر رک کے کھڑی ہوگئی۔ وہ کچھ پڑھ کے پھونک رہی تھی۔ جھاڑ پھونک کے بعد نہ جانے کہاں سے اُس نے ایک کبوتر نکالا اور فضا میں چھوڑ دیا۔ اور لرزتی ہوئی لاری میں سوار ہوگئی۔ پھر اچانک میری آنکھیں پتھرا گئیں۔ کوندے لپک لپک کے میرے چہرے پر پڑنے لگے۔ شاید مجھے وہم ہوا تھا۔ میں نے جھٹپٹا کے دیکھا۔ وہ صدفی صدوہی تھے۔ انھیں تو میں کروڑہا کے ہجوم میں شناخت کر سکتا تھا۔ مجھے کوئی دھوکا اور غلط گمانی نہیں ہو سکتی تھی، وہ مولوی صاحب تھے، مولوی محمد شفیق خان! اُن کے ہاتھ میں صندوقچہ تھا۔ اُن کے بالکل ساتھ ایک برقع پوش لرز رہی تھی۔ اُس کے مرمریں ہاتھ میں سرخ رنگ کا مخملیں جزدان تھا۔ وہی تھی وہی تھی، وہی تو تھی، وہی قدوقامت، وہی سراپائے گلِ ناز، وہی خیالِ دل ستاں، وہی اندازِ حجاباں، یہ خواب نہیں ہے، یہ تو ہو بہو وہی ہے۔ میں تو برقع کے آرپار دیکھ سکتا تھا۔ ''کورا! ٹھیرو، رکو میں آرہا ہوں! میں نے چیخ کے اُسے پکارنا چاہا، معاً مجھے احساس ہوا کہ میرا مُنہ رسیوں سے بری طرح جکڑا ہوا ہے، اور چھکڑا اس منظر کو دھندلانے کے لیے سرپٹ دوڑ رہا ہے۔ میرا سانس رک چکا تھا۔ دل سینہ توڑ کے کہیں باہر دھڑک رہا۔ ''مولوی صاحب خدا کے لیے رک جائیے!'' میں نے بری طرح تڑپتے ہوئے چیخنا چاہا، مگر سوائے معمولی سی کھرکھراہٹ کے بوری سے باہر کچھ نہ نکلا۔ پھر مولوی صاحب نے اشارے سے اُسے لاری میں چڑھنے کو کہا، اُس نے شہزادیوں کی سی متانت اور وقار سے یاقوتی پانو لاری کے قدمچے پر رکھا۔ میں نے اپنا سر چھکڑے پر پٹخنا شروع کر دیا۔ میں وحشت اور جنون سے فٹ فٹ بھر اچھل رہا تھا۔ ''بتھل اب کہاں ہے تُو! میں کورا کو تلاش کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا نا! تُو تو طرم خاں ہے۔ کلکتے کا نامی گرامی استاد بتھل! کہاں ہے تُو! آ آ بتھل میرے ساتھ خاک نوردی کا حق ادا کر۔ بتھل یہی ہیں مولوی شفیق خان صاحب! اور اُن کے ساتھ... اُن کے ساتھ۔''

میں رو رہا تھا، گھگھیا رہا تھا، بری طرح چیخ رہا تھا، اور پوری قوت سے اپنا سر چھکڑے کے تختے پر پٹخ رہا تھا، لیکن آوازیں بوری ہی میں گھٹ گھٹ کے مر رہی تھیں، ''او کوئی تو سنے! وہ میری کورا ہے! مولوی صاحب کے پاس میری امانت ہے! خبردار مولوی شفیق احمد خان خبردار! جواب تم نے کورا پر ملکیت جتائی... چھکڑے والے میری بات سنو! میرے پاس جواہرات سے بھرے صندوق ہیں... وہ سب تم لے لو... خدا کے لیے تم ہی چھکڑا روک دو۔'' لیکن چھکڑا تو جیسے میری فریاد سن کے سرپٹ دوڑنے لگا تھا۔ ''کوئی روکے!'' میری ہچکیاں بندھ رہی تھیں۔ آخرِ کار مولوی صاحب بھی لاری میں غائب ہوگئے۔ مجھے اپنا کوئی ہوش نہیں تھا۔ اُس کے مرمریں ہاتھ خم دار لانبی انگلیاں، لاری کے قدمچے پر جمی ہوئی دودھیا پنڈلیاں، قدوقامت! وہ اُس متاعِ جاں کے سوا کوئی اور نہ تھی۔

میں ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ میری آہ و بکا سے آسمان
جھک پڑتا، یا شاید گردش لیل و نہار تھم جاتی، اگر نہیں رکا تو

وہ شور بان نہیں رکا۔ چھکڑے کی چوبی تختوں پر میرا وجود
ماہی بے آب، مرغ بسمل کی طرح پھڑک رہا تھا۔ میں بھول

چکا تھا کہ میں کہاں ہوں اور کن حالات میں گرفتار ہوں۔ میرے ذہن میں تو وہ مرمریں ہاتھ رقصاں تھے جو لاری کے دروازے پر نزاکت سے جمے تھے۔ آہ! بدنصیبی بھی کسی دیس کی باسی نہیں ہوتی۔ اِس کی حکومت تو کرۂ ارض سے ماورا ہے، یہاں بھی چلاتی ہے وہاں بھی چلائے گی۔ کوئی بستی، کوئی قریہ، کوئی شہر ایسا نہیں تھا جہاں میں کورا کی تلاش میں نہیں گیا۔ یہ اَور بات ہے کہ یہ بدبختی سائے کی طرح قدم بہ قدم میرے ہم راہ رہی تھی، اور میں کبھی اِسے ٹھوکر نہیں مار سکا تھا، پاپوش بنائے رکھا تھا۔ آج وہی پاپوش مُنھ پر پڑی تھی۔ قدرت نے میرے ساتھ دشمن داری نبھائی تھی اور وہ بھی بے وضع۔ کیا برا تھا اگر اُس بوری میں سوراخ نہ ہوتا؟ اور کسی کا کیا بگڑ جاتا جو میں اُس سوراخ سے باہر کا منظر دیکھنے کی استطاعت نہ رکھتا؟ اور اِس میں کیا مضائقہ تھا کہ مولوی صاحب کے لاری میں سوار ہونے اور اس طالع خور چھکڑے کے اڈّے کے سامنے سے گزرنے میں یہ ناقابلِ یقیں وقتی مطابقت نہ ہوتی۔ چھکڑا پانچ یا دس منٹ پہلے گزر جاتا یا مولوی صاحب چھکڑا گزرنے کے صرف ایک منٹ بعد ہی اڈّے پر چلے آتے۔ ستم ظریفی کا استعارہ میرے حال پر تمام تھا۔ چند لمحے قبل ہی میں کورا کی تلاش سے حتمی طور پر دست بردار ہوا تھا اور عین اُس لمحے جب میں جھولیوں میں خوشیاں انڈیلنے کی ٹھان چکا تھا، میرے دل میں کورا کی ازسرِ نو جوت جگادی گئی تھی۔ دفعتاً ایک خیال لپک سا گیا اور اس زاویے سے سوچ کے میں نہالوں نہال ہوگیا۔ میں جسے بدبختی سمجھ رہا تھا، وہ خوش بختی تھی۔ دستِ قدرت میری پشت پر تھا، اور یقیناً میرے ساتھ تھا۔ یہ واقعہ محض اتفاق نہیں ہوسکتا تھا، یقیناً اِس سارے منظر کو کہیں دُور ترتیب دیا گیا تھا۔ کوئی تیسرا بھی ہے جو اِس تماشے سے لطف کشید کر رہا ہے، کٹھ پتلیاں تھرک رہی ہیں اور ڈوریوں کے سرے پسِ پردہ ونادیدہ ہیں، گویا ابھی صدق کے اَور امتحان مقصود ہیں، سوختگی کے مزید ثبوت درکار ہیں۔ دفعتاً ایک تیسرے زاویے سے خیال آیا تو میری طفل ہچکیاں باقرار ہوئیں۔ میں کورا کی جستجو سے دست برداری کا ارادہ باندھ چکا تھا، اور عین اُس لمحے بے بسی و بے بضاعتی کے عالم میں یوں سرِ راہ نظر آنے کا مطلب یہ بھی ہوسکتا تھا کہ قدرت اُس کی خاطر داری پر کمربستہ ہے۔ یہ اُسی کی مطلب براری کا اہتمام ہے۔ کسے خبر تھی کہ وہ کس تڑپ سے مجھے مانگتی ہوگی۔ کون جانتا ہے اُس کے سینے میں ابلتے آتش فشاں کو۔ کون سُن سکتا ہے نالہ کے اُس جاپ کو جو وہ میرے نام پر جپتی ہوگی۔ تیسرے خیال پر میری سوچ جم گئی کہ کورا بھی میری تلاش میں ہے اور اُس کی تلاش میرے جان لیوا انتظار کے پنجرے میں بند ہے اور قدرت بھی اِس کھیل تماشے پر گہری نظر رکھے ہوئے ہے۔ انسان بھی عجیب ہے، بندگلی میں نت نئے دروازے تراشتا ہے سو میں نے بھی تراش لیے تھے۔

چھکڑا اپنی رفتار سے چل رہا تھا اور بلکتے تڑپتے گھنٹوں بیت چکے تھے۔ کورا کا نظر آنے کے بعد دوبارہ گم ہوجانا اتنا بڑا سانحہ تھا کہ غم میری جان لے ہی لیتا، لیکن پھر خیالات و تصورات نے اِتنا مضبوط تانا بانا بُنا کہ وہ ہاتھ بھر کی دُوری پر نظر آئی۔ مجھے جلد از جلد بوری اور اس چھکڑے سے گلوخلاصی کرنی تھی، اگر میں آج یا کل تک اُس اڈّے پر پہنچ پاتا تو قوی امکان تھا کہ کچھ سراغ مل ہی جاتا۔ ظالموں نے مشکیں اِس قدر کس کے اور مشاقی سے باندھی تھیں کہ ہزار جتن کے باوجود میں کلائیوں پر سے اُن کی گرفت ذرا بھی ڈھیلی نہ کر پایا تھا۔ بارو ٹیہ نے انگریز سرکار کے ساتھ بہت بڑا ہاتھ کیا تھا۔ دلّی میں بہت بڑا بھونچال آگیا ہوگا۔ اپنے فوجی افسروں کی بازیابی کے لیے انگریز ریاستی عمّال پر اکتفا نہیں کریں گے۔ بہت ممکن تھا کہ وہ ریاست پر فوج کشی بھی کرسکتے تھے۔ بارو ٹیہ مغویوں کو یقینی طور پر انتہائی خفیہ اور دشوار گزار جگہ پر ہی لے جا کر رکھتا اور یہ چھکڑے انتہائی مستعدی سے بلا کسی روک ٹوک اُس منزل کی جانب گامزن تھے۔ بلاشبہ ہمیں ایسی جگہ لے جایا جا رہا تھا، جس کا انتخاب انگریزوں کی مدافعت کو مدِنظر رکھ کے کیا گیا ہوگا۔ بارو ٹیہ کے ایسے خطرناک ٹھکانے پر پہنچ کے بچ نکلنا کوئی کارِ آساں نہیں تھا۔ مجھے جلد از جلد رہائی کی کوئی تدبیر کرنی تھی، اِس مرتبہ کورا کا سراغ گم ہوجاتا تو دوبارہ کبھی ہاتھ نہ آتا۔ دفعتاً کسی نے مجھے ٹوکا کہ بِٹھل، زورا اور جمرو کے بغیر فرار کا سوچنا ہی رذیل کا کام ہے، لیکن میری کلائیاں مخصوص انداز میں مسلسل حرکت کرتی رہیں۔ یہ دل بھی بڑا ہی جواز کار ہے، فوراً ہی ڈھارس بندھائی کہ بِٹھل کے لیے میرا آزاد ہونا اس قید سے زیادہ مفید ہے۔ میں اپنے ہم راہیوں کے لیے آزاد ہو کے ہی کچھ کرسکتا ہوں۔ چاقو میری جیب میں موجود تھا، اُسے بس انگلیوں کی لپک کا انتظار تھا۔ میں نے درز سے جھانکا تو باہر شام سیاہ مور کی طرح پَر پھیلا رہی تھی۔ حیرت انگیز طور پر چھکڑوں کے اِس قافلے کو اب تک کسی نے نہیں روکا تھا، جس کے دو ہی مطلب تھے یا تو اطلاع نہیں پہنچی تھی یا پھر ریاست کے والی درپردہ بارو ٹیہ کی پشت پر تھے۔ بارو ٹیہ، ریاست یا اغوا شدگان سے میری دل چسپی مفقود ہوچکی تھی۔ مجھے ہر حال میں یہاں سے فرار ہونا تھا۔ ثوربان بہت ڈھیٹ واقع ہوا تھا۔ میں نے گھنٹوں اٹھا پٹخ کی تھی، خوب واویلا مچایا تھا، جس کا اُس نے رتّی بھر اثر نہیں لیا تھا۔ مجال ہے جو اُس نے مڑ کے بھی جھول میں جھانکا ہو۔ میرے برابر میں پڑی ہوئی دونوں بوریوں سے آنے والی کراہیں اور انگریزی کھسر پھسر اب بند ہوگئی تھی۔ شاید وہ تکلیفوں اور جھٹکوں کو اوڑھ کے سو چکے تھے یا نڈھال بے سدھ پڑے تھے۔ میں نے کچھ سوچ کے برابر والے بوری نشیں کو ہلایا اور انگریزی میں کہا، ''میری بات سنو! تم جاگ رہے ہو؟'' میں نے دھیمے لہجے میں کہا تھا، ہرچند کہ مجھے صد فی صد یقین تھا کہ ثوربان کو انگریزی کی اتنی ہی شُدھ بُدھ ہوگی جتنی بِٹھل کو تھی، لیکن پھر بھی احتیاط کا تقاضا تھا کہ سرگوشی ہی کی جائے۔ جواب میں میرا پڑوسی کراہ کے معمولی سا کسمسایا تھا۔ غالباً وہ بے ہوش تھا۔ میں نے اس مرتبہ کافی قوت سے گھٹنا مارا اور کہا، ''محترم دوست! میری بات سنو!...'' وہ پہلے کی نسبت زیادہ آواز سے کراہا اور کسمسایا، لیکن جواب ندارد تھا۔ ''محترم ساتھی! اگر آپ میرے ساتھ پر آمادہ ہوجائیں تو ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں۔'' میں نے گھٹنے کی شدید ضرب سے اُسے تیسری مرتبہ ہلاتے ہوئے کہا۔

''وہ ہوش میں نہیں ہے...'' تیسری بوری سے لڑکھڑاتی ہوئی آواز آئی۔ آواز جوان تھی، لیکن وہ میری مدد نہیں کرسکتا تھا۔ ''تمھارے پاس کون سا طریقہ ہے۔ مجھے نکلنا ہے، میں تمھاری ہر ممکن مدد کرسکتا ہوں۔'' اُس نے میرا جواب نہ پاکر دبی دبی، لیکن پُرجوش سرگوشی کی۔ یہاں بھی بدقسمتی آڑے آ رہی تھی، اگر میرے برابر والا اِسی طرح باہوش اور پُرجوش ہوتا تو مجھے یقین تھا کہ اِس قید سے فرار ممکن ہے۔

''میرا نام لیونارڈ ہے۔ میں فوج میں تازہ بھرتی ہوا ہوں۔ میں اب تک کسی لڑکی کو اپنا دوست بنانے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ آغازِ سفر میں گم راہ نہیں ہونا چاہتا۔ مجھے ابھی بہت جینا ہے۔'' وہ دل گیر ہو کے بولا۔

''دوست! تم میری معاونت کی اہلیت نہیں رکھتے۔ تم میرے برابر میں نہیں ہو۔'' میں اُس کے ساتھ باتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ گزرنے والا ایک ایک پل قیمتی تھا، میں یک سوئی سے بچاؤ کا راستہ سوچنا چاہتا تھا۔

''اگر تم پشت سے پشت ملا کے ایک دوسرے کی رسّیاں کھولنے کا کوئی منصوبہ رکھتے ہو تو میں تمھیں آگاہ کرتا ہوں، میں اور میرا ساتھی کئی پہر اِس مشق میں مصروف رہے ہیں۔ ہم دونوں تربیت یافتہ فوجی ہیں، لیکن ناکام رہے ہیں۔'' لیونارڈ کروٹ کے زور پر بے ہوش ساتھی پر چڑھ آیا تھا۔

دفعتاً مجھے خیال آیا کہ معمولی سی جدوجہد سے لیونارڈ یا میں درمیان والے بے ہوش آدمی کی جگہ لے سکتے ہیں۔ ''نہیں، دراصل میری بغلی جیب میں چاقو موجود ہے۔'' میں نے لیونارڈ کی طرف پلٹتے ہوئے کہا۔

"چاقو!... اوہ، یہ تو عمدہ بات ہے، لیکن چاقو سے فائدہ اٹھانا کیونکر ممکن ہے؟"

"ہاں، بہ ظاہر تو ایسا ہی لگتا ہے۔ کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔"

"مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"تم واپس تختے سے چپک جاؤ، میں تمھارے قریب آتا ہوں۔"

"مجھے بتاؤ تو سہی، تم کرنا کیا چاہ رہے ہو۔"

"وقت ضائع نہ کرو۔ مجھے اُس طرف آنے کے لیے کچھ جگہ فراہم کرو۔" مجھے اُس پر طیش آ رہا تھا۔ باہر سورج تھک ہار کے گھر کو لوٹ رہا تھا۔ کیا خبر وہ پھر کہیں پڑاؤ ڈال دیتے۔ لیونارڈ تیزی سے دوسری طرف ہوگیا۔ میں نے پوری طاقت کو دائیں کندھے پر جمع کیا، پھر اُس کندھے کو مرکز مان کے نچلا دھڑ اٹھانے کے لیے زور لگایا۔ دونوں ٹانگوں کی معاونت سے دوسرے ہی لمحے میں برابر کی بوری کے اوپر تھا، اور کروٹ بدل کے تیسرے ہی لمحے میں لیونارڈ اور اُس بے ہوش آدمی کے درمیان میں تھا۔ اب اس درمیانی بوری کو دھکیل کے میری جگہ تک پہنچانے کا مرحلہ تھا۔ یہاں جل کا داؤ کارآمد تھا، بُھل نے اِس داؤ کی خوب مشق کروائی تھی، تاہم کبھی استعمال کا موقع ہی نہیں آیا تھا۔ جل کے داؤ میں ماہی بے آب کی طرح تڑپنا ہوتا ہے۔ جل کا داؤ مٹھری داؤ کا توڑ ہے۔ مٹھری داؤ میں مخالف کی پسلیاں بازوؤں کے مضبوط شکنجے میں کس کے توڑ دی جاتی ہیں۔ مٹھری داؤ میں پھنسا ہوا اَنچھی اگر جل کا مشاق ہے تو مضبوط ترین حلقہ بھی توڑ دیتا ہے۔ مگر وست بہت معمولی جنبش کی ضرورت تھی۔ بہت تھوڑی سی کوشش بارآور ثابت ہوئی۔ لیونارڈ کو بھی خاصی ضربیں آئیں، وہ سخت جان تھا۔ چھکڑے کا تختہ اور دوسری جانب میں اُس کے لیے چکّی کے دو پاٹ بن گئے تھے، تاہم اُس نے ذرا بھی اُف نہیں کی، ذرا دیر بعد میں درمیان میں پڑا تھا اور درمیان والا میری جگہ پہنچ چکا تھا۔

میرا سینہ بری طرح پھولنے پچکنے لگا تھا۔

"اُف میرے خدایا! تم لوہے سے بنے ہوئے ہو، بہت طاقت ور، بہت شان دار۔"

"میرے دائیں پہلو کی جیب میں چاقو ہے۔ تمھیں وہ چاقو اپنے مُنھ کی مدد سے میری جیب سے نکالنا ہے۔" میں نے اوپر کی طرف کھسکتے ہوئے کہا، تاکہ میری جیب کا مقام اُس کے چہرے کے قریب آجائے۔ "تم بھی کچھ نیچے کی طرف کھسکو۔" میں نے جلدی جلدی اُسے کہا۔

"میرے دوست! میں وہ چاقو تمھاری جیب سے کیسے نکال پاؤں گا؟" بوری کی پرت بہت بھاری ہے۔ میں اپنے مُنھ کے ذریعے اُس کے نیچے کسی چیز کو حرکت نہیں دے پاؤں گا۔"

"کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں، ہم یہ ہر طور قید تو ہیں ہی۔" وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ واقعی بوری کی پرت اتنی موٹی تھی کہ اُس کا مُنھ کی گرفت میں آنا بھی کارِ محال ہی تھا، لیکن نہ جانے کیوں مجھے امید تھی، یقین تھا کہ یہاں سے آزادی ممکن ہے، جب کہ بوری میں ذرا بھی گنجائش نہیں تھی کہ آدمی اُٹھ بیٹھے۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا... بالفرض میں چاقو تمھاری جیب سے نکال گراتا ہوں، تب بھی کیا حاصل ہوگا۔ وہ چاقو ہماری مدد کر سکے گا؟"

اُس کی آواز میں مایوسی کا غلبہ میں نے محسوس کر لیا تھا۔ مایوسی اور کام یابی دو متضاد چیزیں ہیں۔

"تم ایک مرتبہ چاقو میری جیب سے نکال کے بوری میں گرا دو۔ میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ ہم یقینی طور پر آزاد ہو سکیں گے۔ یہ ایک کرشماتی چاقو ہے۔" میں نے اُس کے سامنے امید کا چراغ جلایا، حالاں کہ میں چاقو سے متعلق اُتنا ہی فکر مند تھا جتنا لیونارڈ اس وقت بوری کی موٹی پرت کے متعلق تھا۔

"ٹھیک ہے، میں کوشش کرتا ہوں۔" لیونارڈ کا لہجہ یک دَم خوشی اور جوش سے معمور ہوگیا، میں ممکنہ حد تک اوپر

کی جانب کھسک کے سمٹ گیا تھا۔ لیونارڈ بھی نیچے کی طرف کھسک چکا تھا۔ کافی ہل جل کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ اب میری جیب عین لیونارڈ کے مُنھ کے قریب ہے تو میں نے کہا، "میری کہنی کے بالکل ساتھ جیب کا مُنھ ہے۔ اُس سے تھوڑا نیچے تم سخت اُبھار سے چاقو کو محسوس کر لوگے۔ کسی طرح اُسے کھسکا کے میری کہنی تک لے آؤ، یعنی جیب کے مُنھ تک، اس کے بعد جیب سے باہر وہ خود نکل آئے گا۔"

"مجھے یقین نہیں کہ تمھارا چاقو کرشمہ دکھا سکے گا، تاہم میں کوشش ضرور کروں گا۔"

لیونارڈ نے کچھ اِس طرح کہا کہ ان حالات میں بھی میں مسکرا پڑا۔ دوسرے لمحے میرا پورا جسم سنسنا گیا۔ لیونارڈ کا مُنھ عین چاقو کے اوپر پڑا تھا۔ "یہی ہے... اِسے اوپر کھسکاؤ۔" میرے مُنھ سے برجستہ جملہ نکلا تھا۔ جواب میں لیونارڈ صرف "اوغ اوغ" کر کے رہ گیا۔ لیونارڈ نے اپنی کوششوں کا آغاز کر دیا۔ چاقو کبھی دائیں کھسک جاتا کبھی بائیں، لیکن اوپر نہیں آتا۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک مسلسل جُتے رہنے کے بعد لیونارڈ ہانپ گیا۔ "نہیں، یہ ناممکن ہے۔ میری ناک، ہونٹ اور ٹھوڑی بری طرح چِھل چکے ہیں۔ اِن سے خون رسنے لگا ہے دوست۔"

نہ جانے کیوں مجھے کوفت ہونے لگی۔ میں نے ہی اُسے اِس کام پر آمادہ کیا تھا، لیکن جب وہ تگ و دو کر رہا تھا، مجھے اپنا آپ خود غرض لگا، حالاں کہ وہ سب کچھ اپنی آزادی کے لیے کر رہا تھا۔

"ٹھیک ہے، رہنے دو!" میں یہی کہہ سکتا تھا۔

"نہیں میرے دوست! آدھا گھنٹا میں نے ضائع نہیں کیا، کچھ سیکھا ہے، کچھ مشق کی ہے۔ اب میں آسانی سے یہ کام کر لوں گا۔" لیونارڈ نے کچھ دیر خاموشی اختیار کرنے کے بعد کہا۔

"تم اِسے کچھ دیر پہلے ناممکن کہہ رہے تھے۔"

"میں ہانپ گیا تھا، وقتی تھکن غالب آگئی تھی۔ اب مجھے یقین ہے میں یہ کر لوں گا۔"

"تمھاری مرضی!"

لیونارڈ دوبارہ اپنی کوششوں میں مصروف ہوگیا۔ میرے ذہن سے بُھل، جمرو اور زورا کا خیال محو ہو چکا تھا۔ مجھے یہاں سے نکل کر اُس نامعلوم بس اڈّے تک پہنچنے کی جلدی تھی، جہاں ایک کائنات موجود تھی۔ لیونارڈ اِس سے قبل جوش سے کام لیتا رہا تھا، مگر اب وہ ہوش سے کام لے رہا تھا۔ صرف پانچ منٹ بعد چاقو میری جیب سے نکل کر بوری میں گر چکا تھا۔

"وہ مارا... ہندستانی لباس سے واقفیت نہیں ہوتی تو شاید یہ چاقو تمھاری جیب سے نہ نکال پاتا۔ یہ تو بہت آسان کام تھا... کرشمہ دکھاؤ... جلدی سے کرشمہ دکھاؤ..." وہ بچّوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے بولا۔

اب میرا امتحان شروع تھا۔ مجھے اپنا مُنھ چاقو تک لے جانا تھا یا پھر چاقو اپنے مُنھ تک لانا تھا۔ چاقو کا کھٹکا مُنھ سے دبوچ کر کھولنا تھا۔ دستے پر مُنھ جما کر چاقو سے کئی کٹھن کام لینے تھے۔ میں نے چاقو کو مُنھ تک لے آنے کا فیصلہ کیا۔ دونوں ٹانگوں کو اوپر بلند کر کے کئی جھٹکے دینے سے چاقو اوپر تو آگیا تھا، لیکن وہ میرے کندھوں کے نیچے تھا۔ کافی دیر مسلسل کوششوں اور تجربوں کے بعد چاقو میرے مُنھ میں دبا ہوا تھا۔ اسی دوران لیونارڈ مسلسل بولتا رہا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ میں نے جذباتی استحصال کر کے چاقو باہر نکلوایا ہے، لیکن میں خود کچھ کرنے سے قاصر ہوں۔ چاقو کا دستہ مُنھ میں پکڑا تو بُھل کی بات یاد آئی۔ اُس نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ لاڈلے نکانی سے بڑا کوئی کانٹا نہیں اور ارادے سے بڑا کوئی بل نہیں ہوتا۔ یہ بڑے بڑے سورماؤں کو پچھاڑ دیتا ہے، اگر یہ نہ ہو تو سورما تنکے کی طرح گر جاتے ہیں۔ میں نے لیونارڈ کو یک سر نظر انداز کر دیا، اور بھلا دیا کہ اس بوری سے باہر بھی کہیں تِل بستے ہیں۔ چند گھنٹے قبل جو کام ناممکن لگ رہا تھا، وہ ممکن ہو چکا تھا۔ تھوڑے سے محتاط عمل کے بعد ایک کھٹکے سے چاقو کا تیز دھار پَھل باہر آگیا۔ میں نے

دستے کو موزوں کر کے اپنا چہرہ دائیں سے بائیں گھمایا۔ چاقو کا پھل بوری کو چیرتا ہوا باہر نکل آیا۔ کافی دیر تک اور شدید جدّوجہد کے بعد میں بوری کا اِتنا حصّہ کاٹنے میں کام یاب ہو چکا تھا کہ میرا چہرہ بوری سے باہر نکل آیا۔ چاقو کو دانتوں میں دبا کر پاؤں کی رسّیاں کاٹنے کا میرا ارادہ تھا۔ پیروں تک اپنا چہرہ لے جاتے کمر کی تمام ہڈیاں چیخ چیخ گئی تھیں، چاقو میری لیے ایسے ہی تھا جیسے مچھلی کے لیے پانی۔ میں نے بہت آرام سے پیروں کے قریب سے بوری کاٹ لی۔ ذُور اندیشیوں نے رسّی کیا باندھی تھی، پیر جکڑ دیے تھے۔ موٹی رسّی کے بیس سے زائد بَل تھے۔ رسّی کاٹنے میں بھی کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی۔ تھوڑی دیر بعد میرے پیر آزاد تھے اور میں مکمّل طور پر بوری سے باہر تھا۔ لیونارڈ پوری کارروائی اپنی بوری کے سوراخ سے دیکھ رہا تھا۔ وہ حیرت سے گنگ ہو چکا تھا۔

”تم انسان نہیں جادوگر ہو... حیرت انگیز... بہت زبردست!“

”سب سے اہم اور ابتدائی کارنامہ تم نے سرانجام دیا ہے۔“ میں نے تیزی سے سوچتے ہوئے کہا۔ ہاتھوں کو آزاد کروائے بغیر چھکڑے سے کودنا انتہائی بے وقوفی ہو سکتی تھی، کیوں کہ باہر کی صورتِ حال کا مجھے قطعاً اندازہ نہیں تھا۔ انگریز فوجیوں کے اغوا کا معاملہ تھا۔ یقیناً ان چھکڑوں کو سخت حفاظتی حصار میں لے جایا جا رہا ہوگا۔ سڑک کے دائیں بائیں گھنے جنگل میں مسلح گھڑ سوار قافلے کے ہم راہ یقیناً چل رہے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ میرے تمام خدشات عبث ہوں، لیکن جلد بازی نقصان پہنچا سکتی تھی، اور مجھ میں اس وقت کسی نقصان کا تحمّل نہیں تھا۔ توربان غالباً کانوں میں روئی ٹھونس کر بیلوں کو ہانک رہا تھا۔ اب تک کے سفر سے یہ اندازہ لگانا قطعاً مشکل نہیں تھا کہ چھکڑے سے کود جانے پر کم از کم توربان کو کوئی فرق نہ پڑتا۔ آخر کار ہاتھوں کی رسّیاں کاٹنے کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ اِس سے قبل میں نے سوچا تھا کہ چاقو اپنے پیروں میں تھام کے لیونارڈ کو آزاد کراؤں گا، اور پھر لیونارڈ میرے ہاتھوں کی رسّیاں کاٹ ڈالتا، لیکن اِس میں ایک قباحت تھی، ایک لمحہ ایسا ضرور آتا، جب میں مکمّل طور پر لیونارڈ کے رحم و کرم پر ہوتا۔ میں اُس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا۔ اُس پر اعتبار کرنا شدید حماقت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ آخر کار مجھے اُس پر بھروسا کرنا ہی تھا کہ دفعتاً چھکڑے کی درزوں کا خیال آیا۔ میرے پیروں کے درمیان اچھی بھلی درز تھی اور اُس کا حجم بھی معقول تھا۔ چاقو کا دستہ بہ آسانی اُس میں پھنسایا جا سکتا تھا۔ دستے کو درز پر موزوں کر کے میں نے پنڈلی کی ضرب ماری تو درز میں جم گیا، لیکن دوسری ضرب عین پھل پر لگی۔ پیروں میں جوتی نہیں تھی۔ تیز دھار پھل ہڈی تک پہنچ کر ہی رکا۔ زخم لمبا اور گہرا آیا تھا۔ خون پانی کی طرح پھوٹ پڑا، اور یہ وقت خون دیکھنے کا نہیں تھا۔ باہر چاند نمو پر تھا۔ میں نے فوراً دوسری ضرب دستے پر ماری۔ تین چار راست ضربوں سے دستہ درز میں پھنس چکا تھا۔ اس کے بعد ہاتھوں کو آزاد کروانے میں خاص دشواری پیش نہیں آئی۔ تلوے سے خون مُنہ زور نالے کی طرح بہ رہا تھا۔ اب ایک لمحہ بھی اس چھکڑے میں ٹھہرنا میرے لیے ناممکن تھا۔ چند ثانیوں میں لیونارڈ بھی آزاد تھا۔

”تم جادوگر ہو... اگر میں یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتا تو کبھی یقین نہ کرتا۔ اوہ میرے خدا!... اِتنا خون... اِسے روکو فوراً۔“ لیونارڈ کی نظر تختے پر پڑی، جو خون سے تربہ تر تھا۔ اُس کے چہرے سے بھی خون برابر رِس رہا تھا۔

”ابھی اِس کا وقت نہیں ہے۔“ میں نے جلدی جلدی تیسری بوری کاٹ ڈالی، وہ ہنوز بے ہوش تھا۔ پھر میں نے کچھ سوچ کر اُس کے ہاتھ اور پیروں کی رسّی نہیں کاٹی۔ اُس کے لیے ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ کہتے ہیں، سفر کا ساتھ چند لمحوں ہی کا کیوں نہ ہو گہری انسیت پیدا کر دیتا ہے، اُس بے ہوش انگریز سے میرا کوئی تعلّق نہیں تھا، لیکن پھر بھی اُسے چھوڑتے ہوئے مجھے دکھ ہوا۔ لیونارڈ نے جھٹ اپنی قمیص پھاڑ ڈالی۔ وہ میرے پیروں سے لپٹ گیا۔ ”تیزی سے خون بہ رہا ہے۔ تم چند منٹوں میں ہلاک ہو سکتے ہو۔ اِسے روکنا ہوگا۔“

”مجھے کچھ نہیں ہوتا... میں بے حد ڈھیٹ واقع ہوا ہوں۔“

”مانتا ہوں تم سخت جان ہو... بہ ہر حال، ایک انسان ہو۔ ابتدائی طبّی امداد کی فوجی تربیت حاصل کی ہوئی ہے میں نے... ایسے ہرگز نہیں جانے دوں گا۔“ اُس نے بہت تیزی سے اپنی قمیص کو پٹیوں میں تقسیم کرتے ہوئے کہا۔ وہ میرے بالکل سامنے آ گیا تھا۔

”تم اپنا راستہ لو... مجھے بہت جلدی ہے... بے فکر رہو، موت ہی تو ہے جو مجھے نہیں آتی۔“ میں نے اُسے ایک طرف دھکیلنے کی کوشش کی۔ میرے لیے ایک ایک لمحہ کوہِ ندا تھا۔ ہر پَل میں کورا سے دُور ہوتا جا رہا تھا۔ لیونارڈ بیس اکیس برس کا خوش شکل نوجوان تھا۔ خون واقعی آبشار کی مانند بہ رہا تھا۔ ردِّعمل کے طور پر جسمانی نقاہت مجھے محسوس ہو رہی تھی۔ لیونارڈ مچل کے میرے قدموں سے لپٹ گیا۔

”اِسے میری خود غرضی سمجھ لو۔ تم شان دار انسان ہو... مجھے یقین ہے کہ آئندہ درپیش خطرات سے بھی تمھی مجھے بچا سکتے ہو۔ تمھاری زندگی میرے لیے بہت اہم ہے، میرے دوست! یہ چاقو کا کاری زخم ہے۔ نچلا حصّہ ہونے کی وجہ سے تھوڑی ہی دیر میں تمھارے جسم سے خون کی آخری بوند بھی نکل جائے گی۔“ اُس نے گڑگڑا کے کہا۔ مجھے اُس کی بات ماننا پڑی۔ اُسی نے ایک پٹّی کو کئی تہوں میں لپیٹ کر زخم پر رکھا اور پھرتی سے اُس پر گانٹھ باندھ دی۔ اُس نے ہر کام آناً فاناً کیا تھا۔

چھکڑے پر پڑی جھول کو میں نے تھوڑا سا کاٹا۔ باہر اندھیرا تھا۔ چاندنی اپنا تعارف کروانے میں ناکام نظر آ رہی تھی۔ ہمارے چھکڑے کے بالکل پیچھے دوسرا چھکڑا چلا آ رہا تھا۔ اُس کے پیچھے تیسرا، پھر چوتھا اور اِس طرح لمبی قطار تھی، یقیناً ہم سے آگے بھی اِسی طرح قطار تھی۔ ایک چھکڑے میں دو بَیل جتے تھے۔ اگر ہم اِس طرح فوراً دائیں بائیں کود جاتے تو اندھیرے کے باوجود دیکھ لیے جانے کا قوی امکان تھا۔ کچّی سڑک کے دائیں بائیں درختوں کے جھنڈ تھے۔ ہم لاکھ کوشش کرتے، لیکن وہ وسیع الجثہ گھیرا ڈالنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ بہ آسانی دوبارہ پکڑے جاتے یا پھر مار دیے جاتے۔ بہتر یہی تھا کہ بہت دُور تک جانے کے بعد بھی اہلِ قافلہ کو ہماری گم شدگی کی خبر نہ ہوتی، لیکن یہاں سے جانا بہ ہر حال، بہ ہر صورت تھا۔ بائیں جانب درختوں کے جھنڈ چھکڑے سے قدرے قریب تھے، جب کہ دائیں طرف یہ فاصلہ نسبتاً کئی گنا زیادہ تھا۔ مناسب یہی تھا کہ بائیں جانب سے جھول کاٹ کے جھنڈ میں محتاط چھلانگ لگا دی جائے۔ اس کے بعد کے معاملات تن بہ تقدیر چھوڑ دیے جائیں۔ اب سوچنا بے کار تھا۔ میں نے بائیں جانب بہت احتیاط سے جھول میں قدِ آدم نقب لگائی۔ دفعتاً ایک خیال نے مجھے پتھر کر دیا۔ گویا روح سلب کر لی گئی ہو۔ میرے فرار سے جُھنل، زور اور جمرو پر یاروتیہ کا قہر بھی نازل ہو سکتا تھا۔ وہ میرے رفیقوں ہی کی حیثیت سے زیرِ عتاب آئے تھے۔

میرے ساتھ لیونارڈ کا فرار اِس خیال کو مزید تقویت پہنچا سکتا تھا کہ ہم انگریز سرکار کے آلۂ کار ہیں۔ اگر اسی طرح اکا دکا کو فرار ہونا ہوتا تو ہم میں سے ہر کوئی انفرادی طور پر پہلے پڑاؤ سے قبل یا پڑاؤ کے دوران ہی ہوجاتا، اور بہ آسانی۔ یہاں تو ایک سے دوسرے کی سانس جڑی تھی۔ مجھے نہیں جانا چاہیے تھا۔ بتھل کے بغیر یہاں سے جانا مجھے زیب نہیں تھا۔ یک دَم میں نے فیصلہ کرلیا کہ ایسے نہیں، یوں تنہا فرار نہیں ہونا، لیکن پھر کسی غیر مرئی قوت نے مجھے اپنے حصار میں جکڑ لیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں چھکڑے سے زمین پر گرا اور بیلن کی طرح رِڑھتا ہوا درختوں کی اوٹ میں پہنچ گیا۔ کورا یہاں سے بہت قریب ، کہیں نہیں، میرے آس پاس ہی تو تھی۔ تقلیداً مجھ سے ذرا آگے لیونارڈ بھی اوٹ لے چکا تھا۔ کسی کو خبر نہ ہوسکی، جس سے پچیس چھکڑوں کا یہ قافلہ اپنی روانی میں آگے بڑھ گیا۔ ان کے عقب میں خاصی تعداد میں مسلح گھڑ سوار تھے۔ وہ چھکڑوں کی نگرانی پر معمور تھے۔ انھیں یہ گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ ان کے دو قیدی جنگل میں روپوش ہوچکے ہیں۔

جب آخری گھڑ سوار گزرا تو میرے اندر کوئی مچل گیا۔ ایک طوفان میرے در پے ہوا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کوئی بچہ یا شوریدہ سر جوان۔ بس میں تنک کے سڑک پر نکل آیا۔ دایاں پاؤں میرے ساتھ نہیں تھا۔ وہ وہیں درختوں کی اوٹ میں رہ گیا تھا۔ گھڑ سوار خراماں خراماں جا رہے تھے۔ مجھے اپنا دل معدوم ہوتی ٹاپوں سے کھلواڑ کرتا محسوس ہوا۔ ذرا سے فیل پر وہ یقیناً لوٹ پڑتے۔ کسی ایک کو گرا کے بندوق چھیننا کیا مشکل تھا۔ اُس آدمی کا کیا بیاں ہو کہ جو صراط پر ہو اور اس کے دائیں بھی صراط ہو اور بائیں بھی صراط ہو۔ میں نے خنجر کو علم کیا اور گھڑ سواروں کے تعاقب میں لڑھکتا گھسٹتا دوڑ پڑا۔ دفعتاً کسی نے چھلانگ لگائی اور مجھے لپیٹتے ہوئے سڑک سے نیچے اتر گیا۔ لیونارڈ میرے دل و دماغ سے محو ہوچکا تھا۔

"میرے عزیز دوست تم پاگل ہو رہے ہو!" لیونارڈ نے میرے مُنہ پر ہاتھ جماتے ہوئے سرگوشی کی۔

"ہاں، میں پاگل ہوں... تم اپنی راہ پکڑو!" میری آواز میں بے پناہ سفّاکی در آئی تھی۔ وہ میں نہیں کوئی اَور ہی تھا۔ سمتیں چار ہیں، مگر میرا شیرازہ ہزار سمتوں میں بکھر گیا تھا۔ میں نے اُسے روئی کے بے وزن گھٹڑ کی طرح اُچھال پھینکا۔ میں تڑپ کے اُٹھا، لیکن ایک پاؤں سے کیسے اٹھا جاتا، تڑپ کے رہ گیا۔ لیونارڈ اِس مرتبہ میرے پیروں سے لپٹ گیا۔

"مجھے معلوم ہے تمھارے ساتھی اُن کے پاس ہیں... اس وقت تمھاری جان خطرے میں ہے۔ بہت سا خون بہ چکا ہے اور اب بھی رِساؤ جاری ہے۔ میرے عزیز دوست! تمھاری زندگی تمھارے ساتھیوں کے لیے زیادہ اہم ہے۔"

اس دوران ٹاپیں یک سر معدوم ہوگئیں۔ حلق میں ہوا کا گھومتا ہوا گولہ اٹک گیا۔ خنجر آراستہ دست تھا، مگر ہاتھ بے جان اور جسم بے روح ہوچکا تھا۔ میں نے پھر تڑپ کے اٹھنا چاہا۔ اِدھر کچھ تھا ہی نہیں جو اُٹھ جاتا۔ بے بسی آنکھوں میں اتر آئی۔ میں نے لیونارڈ سے کہنا چاہا کہ ازراہِ خدا پند و نصائح کی بجائے اس خنجر سے میرا سینہ چیر ڈالو، میں تمھارا احسان مانوں گا، مگر ہونٹ پھڑ پھڑا کے رہ گئے، لیکن ایک زبان جس کے اشتراک سے کائنات کا خمیر اٹھا ہے، وہ سبھی بولتے، سنتے اور سمجھتے ہیں، لیونارڈ سے کیا ماورا۔ وہ تڑپ کے میرے پیروں سے اُٹھا اور سینے سے ٹکرایا۔ اُس نے میرا سر اپنی گود میں رکھا اور مجھے بھینچ لیا۔

"واقعی مشرقی لوگ محبت کے خوگر ہوتے ہیں... اُن سے تمھارا بہت قریبی تعلق گمان پڑتا ہے، لیکن تم فکر نہ کرو، میری زندگی تمھاری مرہونِ منت ہے۔ میں وائسرائے کا ذاتی محافظ ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ لوگ تاوان وغیرہ کا مطالبہ کریں گے۔ حکومت بہت جلد تمام مغویوں کو بہ خیریت بازیاب کروالے گی، اِس وقت تمھیں فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔ میں اِس ویرانے میں آگ جلا سکتا ہوں...

زخم میں راکھ بھرنے سے خون رک سکتا ہے۔ راکھ میں نقصان دہ جرثومے نہیں ہوتے۔"

کچھ لوگ بس اچھے ہوتے ہیں اِن لوگوں کا تعلّق کسی مخصوص علاقے، رنگ و نسل یا مذہب سے نہیں ہوتا۔ یہ لوگ ہر جگہ، ہر خطے، ہر نسل، ہر مذہب میں پائے جاتے ہیں۔ لیونارڈ سے چند جملوں کی ملاقات تھی، لیکن وہ وارفتگی و بے ساختگی سے مجھے بھینچے ہوئے تھا، گویا جنم جنم کا ساتھ تھا۔ چھکڑے سے ہماری گم شدگی کی اطلاع کسی وقت بھی قافلے میں گردش کرسکتی تھی، وہ اچانک یہاں پلٹ سکتے تھے۔ لیونارڈ کے لیے بہتر یہی تھا کہ وہ مجھے چھوڑ کر فوراً محفوظ ٹھکانے کی تلاش میں نکل جائے، لیکن وہ بھی اَوروں کی طرح مجھ سے چمٹ کے بیٹھ گیا۔ وہ مجھے سہلا رہا تھا، پچکار رہا تھا اور تسلی دے رہا تھا۔ مجھ سے کچھ نہ بولا گیا۔ غشی کی کیفیت طاری تھی۔ سر میں گول گول چمکتے ہوئے دائرے ناچ رہے تھے۔ "ہم اِس وقت راستے پر بیٹھے ہیں۔ کسی پوشیدہ جگہ تک فوری پہنچنا ازحد ضروری ہے۔" لیونارڈ نے مجھے سہارا دے کر کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ زندگی میں اب کیا باقی رہا تھا۔ صرف خون کے سہارے ہی تو نہیں جیا جاتا۔ توانائی کے لوازمات کچھ اَور ہی ہوا کرتے ہیں۔ میں نے پھر بھی ایک مرتبہ اُٹھنے کی کوشش کی، شاید میں کھڑا بھی ہوگیا تھا، مگر پھر لڑکھڑا گیا۔ اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

تلوے کا ناچتا ہوا درد دماغ سے تال میل ملا رہا تھا۔ میری آنکھ کھلی تو لیونارڈ مٹھی میں راکھ بھر کے تلوے پر لگا رہا تھا۔ قریب ہی چند لکڑیاں جل رہی تھیں۔ رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا، لیکن سیاہی بہ دستور جوبن پر تھی۔ وہ کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر کے مجھے سڑک سے دُور لے آیا تھا۔ ہم ایک درخت کے تنے سے لگے بیٹھے تھے: یہ گھنا جنگل تھا، درخت پر درخت اور جھاڑی پر جھاڑیاں چڑھی ہوئی تھیں۔ گادڑ اور گیدڑوں کی چیخیں گاہے گاہے گونج رہی تھی۔

"تم نے ناحق اپنا وقت خراب کیا..." میں نے اُسے بہ غور دیکھتے ہوئے کہا، "میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"بہت مضبوط آدمی ہو... بہ مشکل دو گھنٹے بے ہوش رہے ہو۔ اگر میں تمھارے حلق میں محلول خوراک انڈیلتا رہتا تو تب بھی چوبیس سے چھتیس گھنٹوں تک ہی تمھیں ہوش میں آنا تھا، میرے لیے یہ بہت حیرت انگیز بات ہے۔" اُس کے چہرے سے حیرانی مترشح تھی۔

"تمھیں بتایا تھا؛ میں بہت ڈھیٹ واقع ہوا ہوں۔ موت میرا مذاق اُڑاتی ہے۔"

"تازہ زخم کی وجہ سے تم متحرک تھے، لیکن اب یہ ممکن نہیں۔ آٹھ انچ لمبا اور ایک انچ کے لگ بھگ گہرا زخم ہے۔" لیونارڈ نے سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے کہا۔ وہ بہت مہارت سے کھولی گئی پٹیوں کو دوبارہ لپیٹ رہا تھا۔

"اپنی راہ کھوٹی مت کرو۔ چاقو اپنے پرائے کی شناخت رکھتے ہیں۔"

"زخم کو سیا تو گیا تو مہینوں پڑے رہ سکتے ہو۔" اُس نے عجیب انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ گویا ترازو میں تول رہا تھا۔

لیونارڈ بلاشبہ میرے ساتھ اپنائیت اور ہم دردی کر رہا تھا، لیکن مجھے اُس کی دست گیری سے غیریت کی بُو آرہی تھی۔ کم از کم جنگل میں تو مشرق کو بالادست ہونا چاہیے۔ میری منزل کھوگئی تھی۔ دوراہا ایک جانب لاری کے اڈّے تک جاتا تھا اور دوسری جانب بتھل کے تعاقب میں۔ بتھل صرف میری وجہ سے بوری میں بند اذیتیں سہہ رہا تھا۔ اُس کے لیے ایسی شعبدہ گری بائیں ہاتھ کا کھیل تھی۔ دل بھی عجیب ہے سردار بھی راستے سجھاتا ہے۔ کہنے لگا کہ تمھیں بتھل کی ضرورت رہتی ہے۔ بتھل تمھارا محتاج نہیں، لیکن کورا کا صبر پیمانے سے سوا ہے، اُسے تمھاری ضرورت ہے، وہ منتظر ہے تمھاری۔ میں بڑبڑا کے اُٹھا، شدید درد نے جسم پر قفل ڈال دیے تھے، لہرا کے ہی رہ گیا۔ اُبلتے ہوئے چشمے کی طرح

میرے پورے بدن سے تکلیف پھوٹ پڑی تھی۔ لیونارڈ بے تابی سے سرہانے پر آ گیا۔ اُس نے میرے کندھوں کو تقریباً تھکیلتے ہوئے تنے سے لگا دیا۔

"تمھاری جواں مردی اور بہادری میں کلام نہیں، لیکن میرے دوست یہ زخم جراحت کا متقاضی ہے۔ تمھیں سمجھنا چاہیے کہ ہم کسی قصبے یا شہر میں موجود نہیں ہیں۔ یہ خطرناک جنگل ہے، یہاں سے عمومی طور پر بھی نکل گزرنا کارِ محال ہے، چہ جائیکہ بندہ شدید زخمی ہو۔"

وہ غصّے سے ابلنے لگا۔ اُس کے لہجے میں برہمی، ناراضی، شکوہ اور خلوص سبھی کچھ تھا۔ نہ جانے یہ کیوں میری خاطر اِتنا کشٹ کاٹ رہا تھا۔

"میں ایک لمحہ بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ مجھے جانا ہے، خواہ گھسٹ کے ہی جانا پڑے۔" میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔ میں اُس کے لیے نرمی اور حلاوت کہاں سے لاتا۔

"یہاں کوئی بھی ٹھہرنا نہیں چاہے گا۔ ہندُستانی بے حد جذباتی واقع ہوئے ہیں۔ یہ ٹھنڈے دل سے سوچ کر عمل کرنے کا وقت ہے۔ تدبیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔"

"میں نے تمھیں ٹھہرنے کو نہیں کہا۔ چلے جاؤ یہاں سے۔" آخر میں پوری قوت سے چیخ پڑا۔ سینے سے کچھ نکل کے فضا میں تحلیل ہوا تھا۔

"ٹھیک ہے، تم اِس جھنڈ سے باہر نکل کے دکھا دو۔ میں تمھیں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔" لیونارڈ ہاتھ جھٹک کے کچھ سے دُور جا کھڑا ہوا۔

میں محسوس کر رہا تھا، مجھ میں اُٹھ کھڑے ہونے کی سکت نہیں تھی، لیکن اُس آتشِ غرور کا کیا کیا جائے جو سینے میں دہک رہی تھی۔ میں نے اُٹھنے کی جان توڑ کوششیں کیں، لیکن درد اور نقاہت نے آڑے ہاتھوں لیا۔ لیونارڈ دُور کھڑا مسکراتا رہا، لیکن اُس کے انداز میں استہزا نہیں تھا۔ آخر میں نڈھال ہو کے گر پڑا۔

"اب تم خود کو میرے سپرد کر دو۔ دن کی روشنی میں انسانی آبادی تلاش کریں گے۔ میں خوراک کا بندوبست کرتا ہوں۔ تم جامن کے درخت تلے بیٹھے ہو۔"

وہ چلا گیا۔ میں نے آنکھیں موند لیں۔ میرے پاس مقدر کو کوسنے کے سوا کچھ نہ رہا تھا۔ اِس سے بہتر باروٹیہ کی قید تھی۔ مجھ میں بٹھل کو دوبارہ اپنی منحوس صورت دکھانے کا قطعاً یارا نہیں تھا۔ باروٹیہ کوئی معمولی ڈاکو نہیں تھا۔ گرد و نواح کی بستیوں میں لازماً اُس کا اثر و رسوخ ہوگا۔ تبھی تو وہ اِس آسانی سے گزرتا چلا گیا تھا۔ اب تک ہمارا فرار پوشیدہ نہ رہا ہوگا، اور اصولی طور پر وہ بہر قیمت ہماری تلاش میں نکلے ہوں گے۔ وہ یہاں کے باسی ہیں، چپے چپے سے شناسا ہوں گے۔ وہ جلد یا بہ دیر ہم تک پہنچ سکتے تھے، اور میں اب کورا کا سراغ گنوانے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ کورا کا خیال آتے ہی بٹھل کسی کونے میں جا دبکتا تھا، اور کچھ میں بھی اپنے دوغلے پن سے واقف تھا۔ لیونارڈ نے چھوٹا سا الاؤ روشن کیا تھا، مگر روشنی حسبِ ضرورت تھی، وہ ناشپاتیوں سے لدا پھدا کچھ دیر میں لوٹ آیا۔ قاشیں کاٹ کاٹ کے میرے مُنہ میں ٹھونسنے لگا۔ اُس کا کہنا تھا کہ میں جتنی زیادہ ناشپاتی کھاؤں گا بدن میں اُتنا ہی خون بھرے گا۔ میں اُس کے سامنے سپر ڈال چکا تھا۔ وہ خاصا باتونی اور دل چسپ بیاں تھا۔ اُس کی ذہانت میں سادگی کی آمیزش نمایاں تھی۔ وہ بات بے بات مجھ سے محبت اور عقیدت کا اظہار کرنے سے نہیں چوکتا تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ میری وجہ سے اُسے دوبارہ اپنی محبوبہ سے ملنے کی امید ہو چکی ہے، ورنہ وہ دل چھوڑ بیٹھا تھا۔ اُس کے نزدیک اِس وقت مجھے چھوڑ کے آگے بڑھ جانا محبوبہ سے بے وفائی کے مترادف تھا۔ وہ جینی کا ذکر کرتے ہوئے بچّوں کی طرح خوش ہو رہا تھا۔ اُس نے بتایا کہ جینی لندن پولیس میں افسر ہے وہ آئندہ برس شادی کر رہے تھے۔ جینی ڈھیر سارے بچّوں کی خواہش مند تھی، وہ شادی کے بعد بھرپور گھریلو زندگی کے خواب دیکھتی تھی۔ اُس معاشرے کی فضیلت کا کیا بیاں ہو جس میں عورت گھریلو زندگی کے خواب دیکھ رہی ہو۔ لیونارڈ نے بتایا کہ اُسے جینی کا ڈھیر سارے بچّوں والا منصوبہ بالکل پسند نہیں ہے، لیکن وہ جینی کی خاطر داری کے لیے ہاں میں ہاں ملاتا ہے، تاہم اُس کے منصوبے میں بھرپور ساتھ دینے کا عزم بھی رکھتا تھا۔ لیونارڈ کے بہ قول باروٹیہ نے حماقت کی تھی، کیوں کہ انگریز حکومت کسی صورت معمولی درجے کے ڈاکو کے سامنے نہیں جھکے گی اور نہ ہی اپنے آدمیوں سے دست بردار ہوگی۔ اُس کا خیال تھا کہ آج صبح دلّی حرکت میں آ جائے گا۔ باروٹیہ نے انتہائی غیر محتاط نقل و حرکت کی تھی۔ حکومت آناً فاناً اُس کے ٹھکانے کا کھوج نکال لے گی، لیکن میرے خیال میں ایسا خطرناک قدم اُٹھانے والا غیر محتاط نہیں ہو سکتا تھا۔ لیونارڈ نے میرے اور میرے ساتھیوں کے بارے میں جاننا چاہا، پھر میری خاموشی پر اُس نے اصرار نہیں کیا۔ وہ بہت دیر تک بولتا رہا۔ اُس نے دیومالائی ہندُستان میں ملازمت کے تجربات، مشاہدات اور دل چسپ واقعات سنائے۔ وہ ایک پیشہ ور داستان گو کی طرح گفتگو میں مزاحیہ چٹکلے کا ٹانکا لگانے کا ہنر جانتا تھا۔ اُس کی زبان خوش سلیقگی سے آراستہ تھی۔ وہ میری انگریزی پر حیران تھا۔ اُس نے کسی ہندُستانی کو اِتنی شان دار اور شستہ انگریزی بولتے نہیں سنا تھا۔ وہ نہ جانے کب تک اور کیا کیا بولتا رہا۔ مجھے خبر ہی نہیں ہوئی کہ کب مجھ پر غنودگی طاری ہوئی اور کب میں سو یا۔

تیز چہکار میں میری آنکھ کھلی۔ پرندے بھی صبح صبح گئے دن کی بھڑاس دل کھول کے نکالتے ہیں اور خوب باتیں کرتے ہیں۔ اُن کا نوکیلا شور بہت تیز تھا، لیکن خوش سماعت تھا۔ دھوپ نے گھنے درختوں کے اوپر پہرا بٹھا لیا تھا اور فرحت بخش تمازت کو ملگجی روشنی کے ہم راہ نیچے بھیج دیا تھا۔ چاروں طرف سے نکھرا ہوا سبز رنگ پھوٹ پڑ رہا تھا۔ یہ جامن، ناشپاتی، بیر، زیتون، شیشم اور پیپل کے جنگلی درخت تھے، جن پر چھوٹے چھوٹے رنگ برنگے پھولوں سے لدی بیلیں چکرا رہی تھیں۔ میں نے کچھ ہی دیر میں اندازہ لگا لیا تھا یہ انتہائی گھنا جنگل تھا۔ اِس کے بیچ سفر کرنا ممکن نہیں تھا۔ آگے بڑھنے کے لیے سڑک کے پہلو ہی میں سفر کیا جا سکتا تھا جو بے حد خطرناک تھا۔ لیونارڈ میرے پہلو میں بے خبری کی نیند کر رہا تھا۔ میں اپنے جسم میں خاصی توانائی محسوس کر رہا تھا۔ یہ ناشپاتیوں کا کمال تھا؛ وہ مٹھاس بھری اور رسیلی تھیں۔ میں نے ہاتھ بڑھا کے ڈھیر میں سے ایک اَور ناشپاتی اُٹھالی۔ مجھے بھوک نہیں تھی، تاہم میں نے بالجبر ایک ایک کر کے تمام ناشپاتیاں کھا لیں۔ ہمارے اِردگرد موجود تمام درخت رزق سے لدے ہوئے تھے۔ دفعتاً جھاڑیوں میں سے ایک غزال نے مُنہ نکالا۔ وہ بڑی بڑی آنکھوں میں حیرانی اور معصومیت بھر کے کچھ دیر دیکھا کیا، پھر چھپاک سے غائب ہو گیا۔ سرسراہٹ بتا رہی تھی کہ اُس نے خوب قلانچیں بھری تھیں۔ لیونارڈ بھی بیدار ہو گیا تھا۔ وہ کسل مندی سے کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا، پھر بولا، "کیا محسوس کر رہے ہو دوست!"

"تمھارا بہت شکریہ... بہت بہتر محسوس کر رہا ہوں۔" میں نے اُس سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ جنون کو جواز بنا کر نا روائی کو روا نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ میرا رویہ غیر مہذبانہ تھا اور وہ ایک مہذب دنیا کا نمائندہ۔

"شکر ہے! اب بخار نہیں ہے..." لیونارڈ نے فکرمندی سے میری پریشانی کو چھوا۔ "تم نیند میں رات بھر بولتے رہے ہو۔ تکرار کی وجہ سے ایک لفظ مجھے سمجھ آ سکا۔ تم متواتر کسی کورا کو پکار رہے تھے۔"

"ذہنی خلل کا عارضہ ہے مجھے... ایسا عموماً ہوتا رہتا ہے۔"

"کورا تمھاری جینی کا نام ہے؟" اُس نے آنکھ ماری، اور وفورِ اشتیاق سے نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے... یہاں سے نکلنے کی فکر کرنی چاہیے۔"

"طرح دینے میں ملکہ رکھتے ہو۔"

"تم جب سو رہے تھے تب میں نے کوشش کی تھی۔ میرا خیال ہے کچھ دِقت ہوگی، تاہم میں چل سکتا ہوں۔"

اِسے کیسے بتاتا، کورا کا نام کسی دوسرے کے مُنہ سے ادا ہونا

مجھے کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا۔

"قطعاً نہیں... تمھارا زخم بھرنے تک میں نے یہیں ٹھہرنے کا منصوبہ بنالیا ہے... ذرا سی بے احتیاطی گھاؤ کو ناسور بنا سکتی ہے... بہت خطرناک زخم لگالیا ہے تم نے۔"

لیونارڈ نے میرے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

"گھاؤ میرے جسم کے لیے سوغات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اب میرے لیے ٹھہرنا ناممکن ہے۔ میرا اِتنا خیال ہے تو میں تمھارے سہارے چل سکتا ہوں۔"

"بات سہارے کی نہیں ہے میرے دوست! پانو پر جیسے ہی دباؤ پڑے گا زخم ہرا ہوجائے گا۔ تمھیں کم از کم تین دن یہیں ٹھہرنا ہوگا..." اُسے میری صورت پر کھنڈر تے ہوئے زلزلے واضح نظر آرہے تھے۔ کچھ سوچ کے بولا، "ایک ترکیب یہ ہوسکتی ہے کہ کسی درخت پر مچان بنا کر تمھیں وہاں چھوڑ دوں اور سڑک پر کسی سواری سے امداد طلب کروں۔"

"ایسی غلطی کا سوچنا بھی مت۔ وہ باولے کتوں کی طرح ہمیں تلاش کررہے ہوں گے، اور تم ایک لاکھ افراد کے مجمع میں بھی فی الفور غیر مقامی شناخت کرلیے جاؤ گے۔ مقامی آبادی کی صورتِ حال سے ہم قطعاً ناواقف ہیں۔ ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ ہم کس جگہ پر موجود ہیں۔ مجھی کو آگے چلنا ہوگا۔" وہ ضد کررہا تھا اور مجھے کوفت ہونے لگی۔

"تو پھر تین دن تک تم بلا چوں چراں خاموش پڑے رہو... یہ جنگل رزق سے بھرا پڑا ہے۔ گوشت، پھل اور پانی یہاں وافر مقدار میں موجود ہیں اور دسترس میں بھی ہیں۔"

اُس سے بحث کرنا بے کار تھا، لہٰذا میں نے فی الحال ہتھیار ڈالنا مناسب سمجھا۔ اپنے پانو پر کھڑا ہو کے ہی میں یہاں سے جاسکتا تھا، اور یہی سچ تھا۔ میرے تلوے میں ٹیسیں وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جارہی تھیں۔ کسی غیبی امداد کے آنے سے پیش تر یہاں سے نکلنا ممکن نہیں تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ میں چند قدم بھی نہیں چل سکوں گا۔ یہ آبرومندی کا خلجان تھا جو میں تنہا نکل کھڑے ہونے کے دعوے کررہا تھا، کچھ دیر میں میرے شانے خود بہ خود ڈھلک گئے میں نے خود کو تن بہ تقدیر چھوڑ دیا۔ میں نے سنا تھا جنگل میں زخمی مسافروں کو جڑی بوٹیاں مل جاتی ہیں جن کی جادوئی تاثیر لمحوں میں گھاؤ بھر دیتی ہے۔ امی نے بچپن میں خضرؑ کی کہانیاں سنائی تھیں۔ خضرؑ کی مسیحائی مسافروں ہی پر متصف تھی۔ ستارہ دست پریوں کے قصے بھی بچپن میں بے شمار سنے تھے کہ کس طرح وہ مصیبت زدہ مسافروں کی دست گیری کرتی ہیں۔ حقیقتاً میں نے بھی ایسے ہی کسی کرشمے کے انتظار میں خود کو راضی کرلیا تھا۔ قدرت نے بڑا لطف کیا تھا۔ کورا کو ایک مرتبہ دکھا دینا ہی سیر چشمی تھی۔

لیونارڈ خربوزے سے ملتے جلتے ایک پھل کا ڈھیر اُٹھا لایا تھا۔ میرا چاقو اُس کے پاس تھا، پھر اُس نے ایک قدرے بڑے، لیکن سوکھے ہوئے پھل کو اندر سے خالی کیا اور مجھے بتایا کہ یہاں بالکل قریب ہی شفاف پانی کی ندی ہے۔ وہ اس پھل میں میرے لیے پانی لے آئے گا۔ واقعی وہ چند لمحوں میں پانی بھر کے لے آیا۔ میں اُس کے احسانوں کے بوجھ تلے دبا جارہا تھا۔ وہ خوشی خوشی سب کام کررہا تھا اور مجھے یہ سب زہر لگ رہا تھا۔ اُس کی چابک دستی دیدنی تھی۔ اِس سے بڑھ کے اُس کا وفورِ شوق قابلِ دید تھا۔ وہ پھل میوۂ شیریں تھا۔ لیونارڈ نے بھی طبیعت سے کھایا اور میں نے بھی معدے میں اُسے ٹھونس ٹھونس کے بھرا۔ پانی بھی ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم فارغ بیٹھے تھے۔ مجھے پھر کوفت ہوگئی۔ چل کھڑا ہونے کو جی مچلنے لگا۔ شکم سیری کے بعد میں خود کو توانا محسوس کررہا تھا۔ نقاہت بہ تدریج ختم ہورہی تھی۔ میں نے تنے کا سہارا لے کے اُٹھنے کی کوشش کی۔ لیونارڈ لاتعلق بیٹھا رہا۔ اُسے معلوم تھا میں گر پڑوں گا۔ جب میں بالکل سیدھا کھڑا ہوگیا تو وہ حیرت سے آنکھیں پٹپٹانے لگا۔ میں یکایکی اور آسانی سے کھڑا ہوا تھا۔ یقیناً مجھے خوشی ہوئی۔ لیونارڈ کی نگاہوں میں ستائش ہی ستائش تھی۔

"میں چل سکتا ہوں لیونارڈ۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میرے لہجے میں تفاخر کی معمولی رمق لیونارڈ نے ضرور محسوس کی ہوگی۔

"میں آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں، لیکن یقین نہیں کرسکتا۔ نصف طبیب ہوں۔"

میں نے جیسے ہی قدم بڑھایا۔ درد کا برق رفتار سوتا زانوں سے نکل کے تلوے کی طرف دوڑا۔ پھر تلوے اور دماغ میں بہ یک وقت ایسے شدید دھماکے ہونے لگے کہ بالآخر قوتِ ارادی کو مات ہوئی اور میں خاموشی سے دوبارہ بیٹھ گیا، اور لمبے لمبے سانس بھرنے لگا۔ لیونارڈ نے چاقو بند کرکے میری طرف اچھال دیا۔

"بہت کٹیلی دھار ہے اِس کی۔ تم نے بوری کاٹتے وقت انتہائی مہارت سے چلایا تھا۔ تم چاقو زن ہو۔" لیونارڈ نے میرا دل بڑھانے کو دانستہ نیا موضوع تراشا تھا۔

"خاص مہارت نہیں ہے، البتہ یہ میری انگلیاں پہچانتا ہے، اشارے سمجھتا ہے۔"

"واہ، کیا خوب صورت انداز میں واقعہ بیان کیا ہے۔ کیا ہندستانی، کیا انگریز... مجھے آج تک کسی نے اِتنا متاثر نہیں کیا... میرا دل نہیں مانتا کہ زندگی میں کبھی تم سے رخصت ہوں۔" اُس کے لہجے عقیدت کا شیرہ ٹپکا رہا تھا، حالاں کہ مجھے اُس کا عقیدت مند ہونا چاہیے تھا۔"

"سڑک کتنی دُوری پر ہے۔" میں نے سانس قابو میں کرتے ہوئے کہا۔

"ہم برلبِ سڑک ہی بیٹھے ہیں۔ اُن جھاڑیوں کے دوسری جانب سڑک ہے۔ تمھیں یہاں تک بہ مشکل لاسکا تھا... یہ خود رُو راستہ ہے۔ اب تک یہاں سے کوئی نہیں گزرا۔" لیونارڈ نے دائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

آمد و رفت نہ ہونے سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ یہ راستہ صرف باروتیہ کے لوگ استعمال کرتے ہیں۔ یہ شاہراہِ عام نہیں تھی۔ اِس اعتبار سے ہم باروتیہ کے ٹھکانے کے قریب تھے۔ لیونارڈ نے میری سوچ پڑھ لی تھی۔ بولا، "مجھے بھی یہ شاہراہِ عام نہیں لگتی، البتہ اِس کے ساتھ چلتے چلتے ہم کسی شاہراہِ عام تک پہنچ سکیں گے۔"

"وقت کافی گزر چکا ہے۔ اُن کے مطابق ہمیں اِس علاقے سے نکل جانا چاہیے تھا۔ وہ ہمیں اِس علاقے میں تلاش نہیں کریں گے۔" لیونارڈ نے مجھے خاموش دیکھ کے کہا۔

"میرا قیاس مختلف ہے دوست! اُنھوں نے رسمی تلاش کا کام مکمل کرلیا ہوگا۔ دو افراد کی کمی اُن کے مقاصد کے لیے بے ضرر ہے۔ جیسا کہ تم بتا رہے ہو، ہم برلبِ سڑک ہی پڑے ہیں تو ہمیں کھوجنا نہایت ہی آسان کام تھا۔ غالباً اُنھوں نے ایسا کرنے کی کوشش نہیں کی۔"

"مطلب... نزدیکی بستیوں میں ہمارے لیے خطرہ نہیں ہوگا؟" لیونارڈ نے چونکتے ہوئے کہا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"یہ مختلف قیاس ہیں جو باہم مشروط نہیں ہیں۔ تلاش کے جوکھم سے گریز کرنا اور از خود ہی مطلوب کا حاصل ہوجانا دو مختلف باتیں ہیں۔" میں نے تنے سے سر ٹکاتے ہوئے کہا۔

"تم حیرت انگیز ہو... بے پناہ ذہین... ہندستانی قطعاً پسماندہ نہیں ہیں۔ تم نے میری رائے تبدیل کردی ہے۔"

لیونارڈ کے چہرے پر شوق دیدنی اور بے جا تھا۔ یہ بہت سامنے کی بات تھی۔

ہم بہت دیر تک مختلف تجزیے اور اندازے لگاتے رہے۔ بین السطور ہم دونوں ہی وقت گزاری کر رہے تھے۔ لیونارڈ کو یقین تھا کہ باروثیہ کی سرکوبی کے لیے بڑے پیمانے پر فوجی کارروائی کی جائے گی۔ وہ مجھے بار بار تسلی دے رہا تھا کہ میرے ساتھیوں کا بال بیکا نہیں ہوگا اور یہ کہ حکومتِ برطانیہ انسانی اقدار کی پامالی کو قطعاً برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ ہندستان میں انگریز حکومت کے کارہائے عظیم گنواتا رہا۔ اُس کا کہنا تھا کہ انگریزوں نے پورے جہاں میں انسانیت کا سربلند کرنے اور انصاف پھیلانے کا بیڑہ اٹھایا ہے اور اُسے فخر ہے کہ انسانی تاریخ کے عظیم دور میں اُس کی خدمات بلاواسطہ شامل ہیں۔ مستقبل کا مؤرخ جہاں انگریزوں کی عظمت سنہرے حروف سے رقم کرے گا وہیں کہیں اُس کا نام بھی شامل تحریر ہوگا۔ خواہ بین السطور ہی سہی۔ وہ کہنے لگا کہ ہندستان کے بوسیدہ فرسودہ نظام کو ہم نے یافتگی سے مربوط کر دیا ہے۔ ہم نے یہاں تعلیم، صحت، قانون، آمد و رفت، آسائشات کا صرف فلسفہ ہی نہیں دیا، بل کہ عین وہی نظام یہاں کے لوگوں کو دیا ہے جو مملکتِ انگلستان میں رائج ہے۔ جو نظام انگریزوں کے طویل تجربات اور عظیم اذہان کا نتیجہ ہے۔ ہم نے تعلیم کو نوابوں اور راجوں کے محلات سے نکال کے عوام الناس کی دہلیز تک پہنچایا ہے۔ ہم نے وہ تجربات جن کی قیمت صدیاں نہیں چکا سکتیں یہاں خدمتِ خلق میں فراواں کر دیے ہیں۔ وہ نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا، میں بس خاموشی سے سنا کیا۔ میرے دل نے شمار باشمار کروٹیں بدلیں کہ ہندستانیوں کا موقف بھی اس من چلے انگریز کے روبہ رو رکھا جائے، لیکن نہ جانے کیوں لیونارڈ کی خوش گمانی اور طمانیت چھیننا، سفاکی محسوس ہوئی... کیا برا تھا جو یہ عمر بھر یوں ہی خوش اور مطمئن رہے۔

دوپہر کے وقت وہ ندی پر نہا آیا تھا، اور مزید کچھ پھل توڑ لایا تھا۔ اُس نے شیشم کی سڈول شاخ کو توڑ کے تراش لیا تھا، یوں لکڑی کا ایک بہترین نیزہ تیار ہو گیا تھا۔ چاقو بہت کارآمد رہا۔ تیسرے پہر وہ ایک تڑپتا ہوا خرگوش اٹھا لایا۔ کہنے لگا کہ میں اِسے نیزہ گھونپ کے وہیں مار دیتا، لیکن مجھے معلوم ہے کہ مسلمان اِسے مخصوص طریقے سے ہلاک کرتے ہیں، بہ صورتِ دیگر گوشت کو ناپاک تصور کرتے ہیں۔ میں نے خرگوش ذبح کر دیا، حالاں کہ پھلوں سے عمدہ گزارا ہو رہا تھا۔ دیاسلائی اُس کے لباس میں موجود تھی۔ وہ سگار کا شوقین تھا۔ لیونارڈ نے بتایا تھا کہ انگلستان میں سگار پینے والے مردوں پر خواتین ملتفت رہتی ہیں۔ کچھ ہی دیر میں اُس نے گوشت بھون لیا۔

''ہمیں جنگی میدانوں میں کھانا پکانے کی خاص تربیت دی جاتی... ویسے تمھارا چاقو خوب ہے... ذرا سوچو، اگر یہ نہ ہوتا تو شاید تم سے ملاقات نہ ہوتی۔'' اُس نے چاقو بند کر کے میری طرف اچھالتے ہوئے کہا۔

بھنے ہوئے گوشت میں اگرچہ نمک مسالا استعمال نہیں کیا گیا تھا، تاہم بہت لذت آور تھا۔ تلوے کی تکلیف خاصی کم محسوس ہو رہی تھی۔ شکم سیری اور نیند جنم جنم کی سہیلیاں ہیں۔ مجھ پر بھی غنودگی غلبہ پا رہی تھی اور لیونارڈ تو گوشت چباتے وقت ہی جھوم رہا تھا۔ اُسے نیند میں مگن دیکھ کے میری بھی آنکھ لگ گئی۔ گھور اندھیرا تھا! اِتنی تاریکی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ آنکھ کا کھلنا بے وجہ نہیں تھا، لیکن وہاں سوائے سرسراتی ہَوا کے شور کے اَور کچھ نہیں تھا۔ لیونارڈ میرے برابر پڑا سو رہا تھا۔ میں نے گھور گھور کے چاروں اطراف کا جائزہ لیا، مگر خطرے کی کوئی بات محسوس نہ ہوئی۔ چھٹی حس بھی صاحبانِ قلم نے خوب ایجاد کی ہے، بندے کو پیغمبر بنا دیتی ہے۔ دفعتاً عین سامنے پتوں میں غیر معمولی سرسراہٹ ہوئی۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ جھاڑیوں کے بیچ سے دو سرخ دہکتے ہوئے انگارے اِدھر ہی تکے ہوئے تھے۔ میری آنکھ عین موقع پر کھلی تھی، وہ کوئی درندہ تھا جو حملے کے لیے اپنے قدم جما چکا تھا۔ میرے پورے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ ایسے ظلمات میں اِس آفتِ ناگہانی سے بچاؤ ناممکن تھا۔ میں نے فوراً غیر محسوس انداز میں جیب ٹٹولی۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔ چاقو میری جیب میں نہیں تھا۔ وہ میرے قریب ہی زمین پر کہیں موجود تھا۔ میں نے دائیں بائیں جگہ ٹٹولی، مگر چاقو پر ہاتھ نہیں پڑا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ درندہ گھات لگانے کے بعد شکار کی حرکت کا انتظار کرتا ہے اور ساکت شکار پر عموماً حملہ نہیں کرتا۔ اِس وقت لیونارڈ کو بیدار کرنا آ بیل مجھے مار کے مترادف تھا۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ لیونارڈ نے کروٹ لی۔ اُس کے ساتھ ہی ہیبت ناک غراہٹ بلند ہوئی۔ جیسے برق لپکتی ہے ایک بلائے بے اماں جھاڑیوں میں سے نکلی اور سیدھی لیونارڈ پر آ پڑی۔ جیسے خواب میں ڈر کے بچہ چیختا ہے؛ لیونارڈ نے بھی ویسی ہی مادر سوز چیخ ماری۔ گھبراہٹ اور اچانک افتاد سے میرے ہاتھ پانو پھول گئے تھے۔ اندھیرے میں مجھے صرف دو دہکتے ہوئے انگارے نظر آ رہے تھے۔ میں نے بے قرار ہو کر اپنے زانو کی طرف ہاتھ مارا تو چاقو ہاتھ لگ گیا۔ اِسی اثنا میں لیونارڈ کٹتے ہوئے بکرے کی طرح غرغرایا تھا۔ میرے پاس ایک لمحے کا بھی وقت نہیں تھا۔ دفعتاً جھاڑیوں کی طرف سے غراہٹوں کا طوفان سنائی دیا اور اَن گنت دائروں میں تیرتے ہوئے انگارے دکھائی دیے۔ اُس لمحے مجھے معلوم ہوا کہ درد بھی انسان کی اختراع ہے۔ میں اِس طرح کھڑا ہو گیا جیسے میرے پانو میں زخم کبھی تھا ہی نہیں۔ اگلے ہی لمحے میرا چاقو درندے کی انگارہ صفت آنکھوں میں دستے تک اتر گیا تھا۔ اندھیرے میں اِس سے بہتر ہدف ممکن نہیں تھا۔ میں نے دیر نہیں لگائی۔ اندازے سے ہاتھ مارا اور چاقو کھینچ کے دوسری آنکھ میں گھونپ دیا۔ میں سینے کے بل اُس درندے پر پڑا تھا جو میرے اندازے کے مطابق ایک قوی الجثہ شیر تھا۔ اُس نے ایک وحشیانہ دھاڑ بلند کی اور لیونارڈ کو چھوڑ کے پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ وہ ایسی زور سے دھاڑ رہا تھا کہ زمین دھمکنے لگی تھی۔ میں نے بے تابی سے لیونارڈ کو ٹٹولا، اُس کا بدن بری طرح لرز رہا تھا اور وقفے وقفے سے خرخر کی آواز اُس کے منھ سے نکل رہی تھی۔ اُس کی گردن اور کاندھا تربہ تر تھا۔ اِس گیلے پن کا موجب یقیناً خون تھا۔ میں نے لیونارڈ کو جھنجھوڑ کے پکارا، لیکن جواب ندارد تھا۔ اُس پر غشی طاری تھی۔ اس وقت سب سے بڑی مصیبت اندھیرا تھا۔ اندھیرے کا خیال آتے ہی میں نے ٹٹول کے لیونارڈ کی پتلون سے دیاسلائی نکالی۔ اُس نے خشک لکڑیوں کا ایک ڈھیر جمع کر رکھا تھا۔ میں نے جلدی جلدی اِن میں آگ بھڑکائی۔ یکایک روشنی سے سارا ماحول منور ہو گیا۔ لیونارڈ کے کندھے پر معمولی نوعیت کا زخم تھا۔ البتہ وہ بے ہوش تھا، جس کی وجہ بہ ظاہر بے انتہا اور غیر متوقع خوف ہو سکتا تھا۔ اگر اُس کی ہڈیاں صحیح سالم تھیں تو وہ بالکل صحیح تھا۔ اُس کے گلے سے ''خرخر'' کی آوازیں نکلنا بند ہو گئی تھیں۔ اب وہ متوازن انداز میں سانسیں لے رہا تھا۔ لیونارڈ کے پیروں سے چند ہاتھ آگے وہ عظیم الجثہ موذی بے حس و حرکت پڑا تھا۔ وہ بہت بڑا اور ہیبت ناک تھا۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ببر شیر اِتنا بڑا بھی ہو سکتا تھا۔ اُس کی دونوں آنکھوں سے بھل بھل کرتا خون متواتر بہہ رہا تھا۔ چاقو دماغ تک راستہ بنا گیا تھا۔ تبھی اُسے قدم بھرنے کی بھی مہلت نہیں مل سکی تھی۔ شکار میں حصہ بٹانے والے دوسرے شیر بھاگ نکلے تھے۔ وہ جان گئے تھے شکار اُن سے زیادہ وحشی اور خطرناک ہے۔ میں نے فی الفور کرتا اتارا اور ایک دھجی پھاڑ کے لیونارڈ کے کندھے سے خون صاف کرنے لگا۔ وہ زخم نہیں تھا، معمولی نوعیت کی کھرونچ تھی، جس سے خون کار ساز اُتنا ہی تھا جو میں اُس کے کندھے سے صاف کر چکا تھا۔ اُس کے شدید زخمی ہو جانے کے خوف سے میری روح فنا ہو رہی تھی۔ اُس کی بہتر حالت کو جانچ کے میرے اندر ٹھنڈک چشمے کی طرح اتر گئی۔ دراصل انسان اس شیر کا پہلی

مرتبہ شکار بنا تھا، اور وہ اس نئی جسمانی ساخت سے ناوقف تھا، اسی لیے مطلوبہ نازک مقام تلاش کرنے میں اُسے دیر لگی تھی۔ بہ صورتِ دیگر ایک ضرب میں لیونارڈ کی گردن کی ہڈی توڑنا بہت ہی کم عرصے کا کام تھا۔ پو پھٹ گئی تھی۔ کچھ دیر بعد وہاں روشنی کے لیے آگ کی ضرورت نہیں بچی تھی۔ لیونارڈ کے بدن میں ہل جل کے آثار بتا رہے تھے کہ وہ ہوش میں آنے والا ہے۔ چند لمحوں بعد وہ ایک جھٹکے سے کسمسا کے اُٹھ بیٹھا۔ عین سامنے گوشت پوست کا ہیبت ناک پہاڑ پڑا دیکھ کے اُس کی آنکھیں حیرت سے پھٹنے کو ہوگئیں، پھر اُس نے نظریں گھما کے مجھے دیکھا اور خوابِ غفلت سے یکا یک باہر آ گیا۔ کچھ دیر مبہوت دیکھا کیا۔ اس پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہوگئی۔ تشنج کے مریض کی طرح اُس کے بدن کی بوٹی بوٹی تمازت سے پھڑکنے لگی۔ وہ لرزتا ہؤا اُٹھا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ فرطِ عقیدت سے دیوانہ وار میرے چہرے، ہاتھوں اور پیروں کے بوسے لینے لگا۔ میں نے اُسے روکنے کی بے حد کوشش کی، لیکن وہ تو پارہ صفت ہؤا تھا، بجلی کی طرح مچل رہا تھا۔ ”تم بہت عظیم انسان ہو... دیو مالائی کردار کی طرح دِکھتے ہو، ہرکولیس!... میں عمر بھر تمھاری غلامی میں رہنا پسند کروں گا... مجھے دو مرتبہ جنم دیا ہے تم نے...“ اِسی طرح کے تعریفی کلمات اُس کی زباں سے خودرو پودے کی طرح پھوٹنے لگے۔ وہ بے طرح بھڑک رہا تھا۔ میں نے اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دیا۔ آخر کار وہ میرے پیروں پر نزاکت سے سر رکھ کے رو پڑا۔ اُس کے سوتے بے تابی سے چھوٹے تھے۔ میں اُس کی کیفیت بہ خوبی سمجھ رہا تھا۔ کبیدگی کے باوجود میں نے اپنے پیر نہیں کھینچے۔ اسی لمحے میں نے یہاں سے فوری طور پر نکلنے کا فیصلہ کیا۔ جذباتی تھپیڑوں کی زد سے لیونارڈ جب ذرا باہر نکلا تو میں نے اُسے شیر کی آنکھ میں گھپا ہؤا چاقو نکال لانے کو کہا۔ وہ لپک کر گیا اور چاقو نکال لایا۔ اِس حادثے نے موجودہ مقام کا تعین کر دیا تھا۔ یہ یقیناً ہندُستان کا خطرناک گر جنگل تھا۔ میں نے شکلا جی کے ساتھ قیام کے دوران پڑھا تھا کہ افریقہ کے بعد گر کا جنگل دنیا میں وہ واحد مقام ہے جہاں ببر شیر پائے جاتے ہیں۔ گر کا جنگل سرسبز میدانوں اور مختلف النوع اشجار کے میلوں لمبے جھنڈ پر مشتمل تھا۔ ہم اس وقت یقیناً گر کے جنگل میں موجود تھے۔ یہ جنگل درند و پرند دونوں اقسام کے جان وروں سے اٹا پڑا تھا۔ ہمیں یہاں سے جلد از جلد نکلنا تھا، کیوں کہ جنگل میں جہاں لاش پڑی ہو وہاں میلا لگ جاتا ہے۔

”بلاوجہ متشکر ہو رہے ہو... تم نے اپنی زندگی خود بچائی ہے میں نے نہیں۔“

”ہاں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو... وہ میں ہی تھا جس نے ہول ناک تاریکی میں شیر کی آنکھوں کا اِس قدر سچا نشانہ لگایا تھا... بلاشبہ چاقو زنی میں تم نادرِ روزگار ہو۔“

”مدحت سرائی کی بجائے یہاں سے نکلنے کی فکر کی جائے تو بہتر ہوگا۔“ اُس کا خلوص سر آنکھوں پر، لیکن خود نمائی کا بوجھ بے جان لاشے سے کم نہیں ہوتا۔ میرے لہجے میں اکتاہٹ ایک فطری امر تھا۔

”مقدس باپ کی قسم! چلو... میں تمھارے قدموں میں بچھ جاؤں گا۔“ اُس کی آواز تپش آلود تھی۔ وہ بے چین ہو کے اُٹھ کھڑا ہؤا۔ اس کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے کا سہارا بن کے چل پڑے۔ چلتے چلتے اُس نے شیر کی کھال اتار لے چلنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ جس پر میں بھڑک اٹھا تھا۔ مجھے غصّے میں دیکھ کے وہ پیلا پڑ گیا تھا۔ میرے پانو میں درد کے ناقابلِ برداشت پہاڑ ٹوٹ رہے تھے، لیکن اب قدم رُکنے کے لیے بھی تیار نہ ہوئے۔ ہم نے سڑک کے کنارے کنارے چلنا شروع کر دیا۔ چلنا بھی کیا تھا، ہم دھیرے دھیرے کھسک رہے تھے۔ جہاں دَم ٹوٹتا وہاں پڑ جاتے۔ تحائفِ قدرت سے جو مل جاتا، شکم سیری کر لیتے۔ رات آتی تو باری باری نیند کر لیتے۔ قریباً چوتھے روز ہم ایک پختہ اور بڑی سڑک تک جا پہنچے۔ سرخ اینٹوں سے بنائی گئی سڑک کی دوسری جانب باجرے کی نوخیز فصل ہلکورے

لے رہی تھی۔ صبح نرم کا وقت تھا، سورج کا کاروبار ابھی ماند تھا۔ آثار قریب ہی آبادی کی نوید دے رہے تھے۔ ہم بدحالی و ناتوانی کا مجسّم نمونہ بنے وہیں ڈھے گئے جہاں سے سڑک کے اُس پار کھیت نظر آئے تھے۔

”اب کیا ارادے ہیں دوست!“ لیونارڈ نے ہانپتے ہوئے کہا۔ خوشی اُس کے چہرے سے ابل رہی تھی۔ راہ چلتے گزشتہ تین دن اُس نے دنیا جہان کی باتوں میں گزارے تھے۔

”تقدیر پر منحصر ہے کہ ہمیں پہلا آدمی کس قماش کا ملتا ہے۔ البتہ مجھے قوی امید ہے کہ ہمیں خاص دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔“ میں نے اُسے تسلّی دی، لیکن میرے لیے یہ سڑک کڑا امتحان بن کے کھڑی تھی۔ مجھے اُسی جانب جانا تھا جہاں سے ہم آئے تھے۔ اُس لاری کے اڈّے پر... اس سے آگے کچھ سوچا نہ گیا۔ بہت دیر ہو چکی تھی، مولوی شفیق کے سراغ پر کئی دنوں کی مٹی پڑ چکی تھی۔ بس کا ڈرائیور یا اُس کا گماشتہ ہفتہ بھر قبل کے کسی مسافر کا سراغ نہیں دے سکتا تھا، لیکن نہیں، میں نے خود ہی اپنی رائے مسترد کی۔ وہ لاری اڈّا ایک چھوٹے قصبے کا نظر آتا تھا۔ وہاں سے مولوی صاحب کا سراغ آسانی سے مل سکتا تھا۔ بہت ممکن تھا مولوی صاحب اِس قصبے میں قیام پذیر ہوں۔ وہ کسی کام سے نزدیکی شہر گئے ہوں اور واپس لوٹ آئے ہوں۔ کورا نے بھی ان کے ساتھ جانے پر اصرار باندھا ہوگا یا پھر مولوی صاحب کے لیے کورا سے متعلق قابلِ اعتماد کوئی نہ رہا ہوگا۔

ہم کچھ دیر ستا کے وہاں سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مجھے مغربی سمت کچھ بھینی بھینی محسوس ہوئی۔ ہم نے اُسی جانب سڑک پکڑ لی۔ کچھ ہی دیر بعد سورج نے دھوپ بانٹنی شروع کر دی۔ کچھ وہ سخاوت پر مائل تھا اور کچھ اس راستے پر سایہ مفقود تھا۔ تپش سے جسم پگھلنے لگا تھا۔ چند فرلانگ طے کرنے میں گھنٹوں لگ گئے، لیکن ہم قریب سَو کے لگ بھگ مکانات پر مشتمل بستی میں پہنچ گئے۔ ہمارا حلیہ کسی کو متوجہ کرنے کے لیے کافی تھا، گرد اور میل سے اَٹے ہوئے بے ترتیب بال اور بدن کا بالائی حصّہ ہم دونوں ہی کا برہنہ تھا۔ کرتا اور قمیص دھجیوں کی نذر ہو چکی تھی۔ اِس کے علاوہ ایک گورے انگریز کا دگرگوں حال میں نظر آنا چٹپٹی خبر تھی۔ جو ایک گلیارے میں قدم رکھتے ہی پوری بستی میں سنسنا گئی۔ چند ہی لمحوں میں متجسس نگاہوں سے گھورتے ننگ دھڑنگ بچّوں نے ہمیں گھیر لیا۔ نہ جانے کیوں محسوس ہوا، پسِ دیوار مکانوں میں سرگوشیاں اور قیاس آرائیاں شروع ہوگئی ہیں۔ بستی کیا تھی سڑک کے کنارے دو تین سَو گز تک چلے گئے مکانوں کا سلسلہ تھا۔ سڑک پر اِکّا دُکّا دکانیں بھی تھیں۔ لیونارڈ کا خیال تھا کہ یہاں پولیس کی چوکی یا کم از کم ایک سپاہی ضرور تعینات ہوگا اور وہی فی الفور ہمارے کسی کام آ سکتا تھا۔ ماتھے پر تلک لگائے سرخ اور زرد ساڑھیوں میں ملبوس سانولی عورتیں، گورے انگریز کو دیکھنے کے لیے دروازوں پر جم گئی تھیں، اور چاروں طرف سے مرد نکل نکل کے ہماری طرف بڑھ آئے تھے۔ یہ جنگل سے قریب ترین بستی تھی۔ اگر جنگل میں باروچیہ کا ٹھکانا تسلیم کر لیا جائے تو اِس بستی میں اُس کے گماشتوں اور مخبروں کی موجودی لازم تھی، اور ہمارا سب سے زیادہ انتظار اِسی بستی میں کیا گیا ہوگا۔ ہم برگد کے ایک جسیم درخت کے سائے میں پہنچ کے ٹھہر گئے۔ درخت کا تنا بے حد تناور اور شاخیں لامکاں کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ برگد کے تنے کے ساتھ کرسی میز رکھے حجام ایک بچّے کے بال تراشنے میں مصروف تھا۔ گدلا اور دھندلایا ہؤا شیشہ اُس نے تنے پر ٹانک رکھا تھا۔ وہ سیاہ فام اور منحنی دیہاتی تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی سہم گیا۔ اُس کے ہاتھوں میں مشاقی سے مچلتی ہوئی قینچی دھک سے رک گئی۔ اُس کی آنکھوں میں وحشت سی سمٹ آئی تھی۔ لیونارڈ اناڑی پن سے نلکے کی ہتھی کو ہلانے لگا، جو درخت کے ساتھ ہی لگا ہؤا تھا۔ میں نے حجام سے پوچھا، ”یہ کون سی بستی ہے؟“ مجھے جواب دینے کے بجائے وہ سہم کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ درخت کے چاروں اَور دیہاتیوں نے گھیرا ڈال لیا تھا، اُن کی چہ می گوئیاں اور

پریشان نظریں ہمارا احاطہ کر رہی تھیں۔ لیونارڈ نے مجھ سے کہا، ''اِن سے پولیس چوکی یا کسی سرکاری ملازم کے بارے میں استفسار کرو۔'' لیونارڈ سمجھ رہا تھا کہ یہ لوگ محض متجسس ہو کے ہمارے گرد جمع ہوئے، لیکن میں اُن کی سراسیمگی سے کچھ اور معنی اخذ کر رہا تھا۔ میں نے حجام سے پوچھا ''یہاں کوئی پولیس والا ہے؟'' لیکن وہ میری پشت پر کچھ دیکھنے لگا۔

''کھنڈریں پولس ہے۔ بدھوائی پولس ہے بالک!''

میں نے پلٹ کے دیکھا۔ بھیڑ کو کھدیڑتا ہوا ایک لمبا تڑنگا، کالا بھجنگ میرے مقابل کھڑا تھا: اُس کا قد دو گز سے قدرے نکلتا تھا۔ چندیا پر سے بال اڑے ہوئے تھے۔ بچے کھچے بال تیل میں چپڑے اور سلیقے سے جمے تھے۔ آنکھیں کبوتر کی طرح سرخ تھیں۔ کلّوں کا گوشت لٹکا ہوا تھا۔ اُس کی عمر چالیس سے پینتالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ چہرے کے نشانات سے اُس کی قماش مترشح تھی۔ زرد کرتا، سفید پاجامہ پہن رکھا تھا، اور ماتھے پر سرخ رنگ کا بڑا سا تِلک چمک رہا تھا۔ اُس نے گہری نظروں سے ہمارا طواف کرتے ہوئے کہا، ''پولیس کے نتھو پر جرور چڑھوائیں گے۔ ابھی ہم سے نیاج نجر کرنے کا ہے، کھنڈریں دتوں سے انتجار کرنے کا ہے۔ بڑھیا کرا گر سے نکل کے۔'' اُس نے گلے میں ڈالا ہوا رومال زور سے جھٹکا۔

چاقو نیفے میں اُڑسا ہوا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہ رہا تھا کہ وہ باروٹیہ کا گماشتہ تھا۔ اگر وہ باروٹیہ کا گماشتہ تھا تو باروٹیہ کے گروہ کی تصویر دوسری بن رہی تھی۔ میں پہلی نظر میں اُس کا قبیل جان گیا تھا۔ یعنی باروٹیہ علاقے کے داداؤں اور استادوں کے اکھڑ کو روایت کے برعکس استعمال کر رہا تھا، لیکن قیاس یہاں بھی اُلجھ رہا تھا۔ باروٹیہ نے انتہائی منظم طریقے سے بحری جہاز اغوا کیا تھا اور نہایت آسانی سے مغویوں کی بڑی مقدار کو اپنے ٹھکانے تک پہنچانے میں بھی کامیاب ہوا تھا۔ یہ کام اڈّے پاڑے کے لوگوں کے بس کا روگ نہیں تھا اور نہ ہی اس کے کارندوں میں کوئی شخص ایسا نظر آتا تھا جس پر اڈے پاڑے سے وا... کا شبہہ گزرتا، لیکن میرے سامنے تن کے کھڑا ہوا شخص ہر قسم کے شک و شبہے سے بالا تھا۔

''مسافر ہیں، راستہ بھٹک گئے ہیں۔'' میں نے اُسے رسانی سے جواب دیا۔ دفعتاً ہانپتے کانپتے چار مشٹنڈے اِدھر آن وارد ہوئے۔ وہ کہیں دُور سے دوڑتے ہوئے آئے تھے۔ کالا بھجنگ جو یقیناً اُن کا استاد تھا کو دیکھتے ہی ٹھٹک گئے۔ انھیں دیکھ کے وہ بھڑک اُٹھا۔ ''ماں کا کھسم دیکھنے گئے تھے۔ پچھنے کھاں ادھر سیر سپاٹے کرنے کا نہیں۔ اُن چھنال پر مرے ہوگے۔'' اُس نے آگے بڑھ کے ایک کو ڈھیلا ہاتھ بھی جڑ دیا۔ لیونارڈ نے مجھ سے صورتِ حال کے بارے میں استفسار کیا۔ میں نے اُسے تسلّی رکھنے کا کہا۔ ابھی تک یہ واضح نہیں ہوا تھا کہ وہ ہم سے کیا چاہتا تھا۔ میں نے کرید لگائی۔ ''تمھیں یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں اپنے دوستوں کے ساتھ شکار کی غرض سے آیا تھا۔ ہماری جیپ حادثے کا شکار ہوگئی۔ رات کو ہمارے پڑاؤ پر شیروں نے ہلّا بول دیا۔ ہم بہ مشکل جان بچا کے یہاں تک پہنچے ہیں۔ اگر آپ لوگ ہمیں نزدیکی شہر تک پہنچا دیں تو بے حد مہربانی ہوگی۔''

''چھلیا سے چھل کرنے کا ہے؟...'' وہ وحشت شرابی کی طرح جھوما۔ ''بڑا آیا بر جمان!...'' میں اُس کے مُنھ سے اپنا نام سُن کے بری طرح اُچھل پڑا تھا۔ ''کیوں سندر تا! مکھڑا میلا کرنے کا نہیں ہے۔ بس نام کا چِنتا تھی، تُو نے ٹھپا لگا دیا۔'' وہ ڈولتے ہوئے میرے قریب ہو گیا تھا۔ اُس کے مُنھ سے اپنا نام سُن کے میرا پورا وجود سنسنا گیا تھا۔ اُس نے اب تک لیونارڈ پر ذرا بھی توجہ نہیں کی تھی۔ میں نے دو قدم پیچھے کھسک کے اُس کے اور اپنے درمیان فاصلہ بڑھا لیا۔ اپنا نام سُن کے میں اضطرار پوشیدہ نہیں رکھ سکا تھا۔ اب بات آگے بڑھانا بے کار تھا۔

''معاملہ کیا ہے استاد؟'' میں نے اپنا لہجہ بدلتے ہوئے کہا۔ چاروں مشٹنڈوں نے چاقو نکال لیے تھے۔

''پانچی دھرتی پھاڑنے کا ہے سوامی جی! کشٹ بھر دیا جگرے میں۔ تیرے سانجھیوں نے بڑا اجلم کیا ہے۔''

سانجھیوں کے ذکر پر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ سراسیمگی و وحشت سے میرا چہرہ یقیناً تاریک ہوا ہوگا، عجیب بے بضاعتی کا عالم در پے تھا۔ بٹھل میری گم شدگی سے بپھر گیا ہوگا۔ اُس نے یہ اعتبار تو کیا ہی نہ ہوگا کہ میں فرار ہو گیا ہوں۔ وہ یقیناً آتشِ نمرود میں کودا ہوگا۔ میرے پیروں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔ ''کیا ہوا میرا سانجھیوں کو؟'' میں نے اٹکتے ہوئے اُس سے سوال کیا۔

''وہ ابھی ہونے کا ہے بھڑووں کے ساتھ... کدھر جانے کا ہے چھبر۔ ادھر بستی بستی سور گباشی باپو کے بیروں سے بھری ہے۔ گر کے چاروں اور رکھوالی ہے۔ اُدھر ہی مرنے کا ہے یا پکڑنے کا ہے۔'' وہ شدید غصے میں پھنپھنا رہا تھا۔

''سور گباشی بابو؟'' میری زبان اٹکنے لگی۔

''جرا نشانہ نہیں چوکا۔ دل میں گھسا ہے جا کے چاقو، سیدھم سیدھ... تیرے سانجھی نے باروٹیہ باپو کی ہتیا کر دی، ایک راکھس مارا گیا، دو بھاگ لیے۔ گوری کنہیا کو لے کے۔ کیوں چار جنے تھے نہ تم؟''

وہ اچھل اچھل کے چیخ رہا تھا اور میرا دل بند ہو رہا تھا، دھڑکنے سے انکاری تھا۔ ایک راکھس مارا گیا کا مطلب؟ زورا! جمرو! یا بٹھل! یہ سوچ کر ہی کنپٹیاں سلگنے لگیں۔ نہ جانے کتنوں کا قتل میرے دامن پر تھا، موت بھی عجیب طور سے رسمِ عاشقی نبھا رہی تھی۔ بس میرے گرد ہی پروانہ وار رقص کر رہی تھی۔ مجھے اپنی دل بستگی کی خاطر تماشائے عالم کی خاطر زندہ رکھ لیا تھا۔ دوسروں کو گولیاں، خنجر، زخم اور بیماریاں کیوں لگ جاتی ہیں۔ یکایک میرے ارد گرد کھڑے لوگ دھندلا گئے۔ میں لڑکھڑا کے گرنے لگا تو لیونارڈ نے بڑھ کے تھام لیا۔ ''یار... مجھے کچھ بتاؤ... یہ جاہل شخص کیا بکواس کر رہا ہے۔''

میں اُسے کیا بتاتا۔ یہی کہ میں اپنے پیاروں کے لیے موت کا پیام بر ہوں، دکھ اذیّت اور مصیبت میری طرف سے تحفۂ عام ہے۔ جو چاہے گلے سے لگائے اور وصول لے۔ باروٹیہ کو چاقو بٹھل ہی مار سکتا تھا، لیکن بٹھل نے ایسا کیوں کیا تھا، کیا اُس نے مجھے مردہ سمجھ لیا تھا۔ اگر واقعی ایسا تھا تو باروٹیہ پر چاقو زنی معمولی کام تھا۔ کون سی گوری میم اُن کے ہم راہ نکلی تھی۔ کیا وہ مایا کو نکال لے گئے تھے۔

''ایک بھی انگریج نہیں چھوڑا سارے مار دیے۔ پانچ بچے ہیں جندہ، ایک تُو، یہ، گوری چھنال اور دو تیرے سانجھی!'' چھلیا نے مجھے گردن سے پکڑ کے اُٹھایا۔ ''ابھی رندھاوا تیرے کو جندہ مانگتا ہے۔''

''میں تم سے اُلجھنا نہیں چاہتا۔ میرے راستے سے ہٹ جاؤ!'' میں نے اپنے ذہن پر چھائی اندھیاری کو جھٹکتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ مجھے اُس سے مکمل تفصیل کی حاجت تھی اور وہ اُس لمحے حاکمِ وقت تھا۔

''سنتے ہو بستی والو! چھلیا کو راستے سے ہٹانے کا ہے چھورا! امیا کا دودھ تجھ سے چپکا ہے پچھمن!'' بستی والوں نے قہقہہ لگانا اپنا فرض سمجھا۔ بستی میں اُس کی دہشت ٹھیک ٹھاک لگتی تھی۔

میں نے وقت ضائع کرنا غیر مناسب سمجھا۔ دو دو ہاتھ کیے بغیر چارہ نہیں تھا۔ میں نے نیفے سے چاقو نکال لیا، لیکن چاقو کھولنے سے گریز کیا۔ یہ ایک نفسیاتی حربہ تھا۔ بند چاقو تولنے کا مطلب مقابل پر حملہ نہیں، بل کہ اُسے اپنا چاقو باہر نکالنے پر اُکسانا تھا۔ یہ بات چھلیا بہت بہتر جانتا تھا۔ اُس کے گماشتوں نے یکایک اپنے چاقو کھول لیے۔ لیونارڈ صورتِ حال کو کسی حد تک سمجھ رہا تھا، اُس کے چہرے پر ایک مرتبہ پھر موت کی زردی کھنڈ گئی۔ چھلیا کی آنکھوں میں استہزا اُمڈ آیا۔ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے مشٹنڈوں کو روک دیا۔ کمال چابک دستی سے اُس کا ہاتھ جیب میں گیا تھا، پھر بڑے سبھاؤ سے اُس کی کلائی مچلی تھی۔ چاقو فضا میں اُچھلا اور دوسرے ہاتھ تک پہنچتے ہوئے فضا ہی میں کھٹکے سے کھل گیا تھا۔ یہ انتہائی مہارت کا مظاہرہ تھا۔

”چاقو کی نوک پر چھلیا نہ چاہے تھا چھورے! رندھاوے نے تمھیں جندہ مانگا ہے، پر تجھے مار کے مجا آئے گا۔“ چاقو شرارے کی مانند اُس کے ایک ہاتھ سے دوسرے میں لپک رہا تھا۔ مجمع میں موت کی خاموشی طاری ہوگئی تھی۔

سارا کھیل ہی نظر کا ہے۔ میری نظریں اُس کے ہاتھ سے زیادہ متحرک تھیں۔

”حماقت نہ کرو بابر! وہ چاقو زنی کا بہت بڑا ماہر معلوم ہوتا ہے۔ ذرا دیکھو تو سہی، اُس کے ہاتھ کس قدر چاقو شناس ہیں۔“ لیونارڈ نے سہمی ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔

”بکواس بند رکھو۔ تمھاری وجہ سے میرا ارتکاز خراب ہوسکتا ہے۔“ میں نے سفاکی سے اُسے جھڑک دیا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو مستقل مُصر رہتا۔ میں بہ دستور ساکت کھڑا اُسے تول رہا تھا۔ میرا چاقو بند تھا۔ میں نے ایک اور نفسیاتی داو کھیلا۔ آنکھوں میں بھرپور تمسخر اور تحقیر بھر کے اپنا چاقو گرا دیا۔ یہ منظر دیکھ کے مجمع میں پھریری دوڑ گئی۔ سرگوشیاں بلند ہوگئیں۔ کسی منچلے نے سیٹی بھی ماردی۔ ”چھورے تو گیا!“

چھلیا نے تلملا کے چاقو والا ہاتھ سیدھا کیا اور ایک قدم کا استعمال کرتے ہوئے عین سینے پر وار کیا۔ میں نے ساکت کھڑے کھڑے ٹھیک اُس لمحے اپنی جگہ چھوڑی تھی کہ جھونک میں نکلتے ہوئے اُس کی کہنی میرے شانے کو چھوتی ہوئی نکلی تھی۔ اُسے میرے اندازے سے زیادہ خود پر قابو تھا۔ اگلا قدم زمین پر پڑتے ہی وہ ایڑی کے بل میری جانب گھوما تھا۔ چاقو والا ہاتھ نصف دائرہ مکمّل کرتے ہوئے بالکل میرے پیٹ پر آیا تھا۔ میرے پاس الٹی جست لگانے کے سوا دوسرا داو نہیں تھا اور اُسی کو میں نے آزمایا۔ اُس کا چاقو والا ہاتھ جیسے ہی ہَوا میں گھوم کے واپس ہوا، مجمع نے لمبی سانس بھری۔ گویا وہاں کھڑے تمام افراد کا دل ایک آواز میں دھڑکا تھا۔ میں نے چار قدم کے فاصلے پر برق رفتاری سے کھڑے ہو کے ایک استہزائی مسکراہٹ اُس کی طرف اچھالی۔ وہ بھی گھاگ تھا۔ فوراً میرے حربے کو تاڑ گیا۔

سیخ پائی کے بجائے اُس نے پُرسوچ مسکراہٹ اپنے چہرے پر بکھیری۔

”ارے چھورے، ابھی سے ہے، چاقو اٹھانے کا ہے۔ چھلیا جُلم کرنے کا نہیں ہے۔“

”چھلیا وار کر... بہانے سے وقت حاصل نہ کر۔“ میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ہر چند وہ سمجھ رہا تھا کہ میں اُس طیش دلوانا چاہتا ہوں، لیکن یہ روگ ہی ایسا ہے کہ انسان مزے مزے سے اِسے گلے لگاتا ہے۔ چھلیا کے نتھنے پھڑ کنے لگے تھے۔

”تیری ماں کا... سالے۔“

چھلیا نے لپکتے ہوئے دائیں طرف وار کرنے کا جھانسا دیا۔ میں بہت آرام سے اُس کے دام میں آگیا۔ اگلے ہی لمحے سرعت سے چاقو اُس کے بائیں ہاتھ میں تھا۔ اُس کے خیال میں میرے پاس پہلو بدلنے کی مہلت نہیں تھی۔ اُس کا خیال ٹھیک ہی تھا۔ اگر میں قبل از وقت اُس کا داو بھانپ نہ لیتا تو واقعتاً میرے پاس پہلو بدلنے کی مہلت نہ ہوتی، اور وہ اطمینان سے اوجھڑا نکال باہر کرتا۔ اُس نے اندازاً چاقو چلایا، لیکن میں بائیں طرف پہلو بچانے کے ساتھ ہی نیچے بیٹھ چکا تھا اور کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ہوا۔ چھلیا سیدھا فضا میں اُٹھا اور مُنہ کے بل زمین پر آرہا تھا۔ اُس کا ایک گماشتہ صورتِ حال دیکھ کے تیزی سے میری جانب بڑھا۔ چھلیا نے نیچے گرے ہوئے ہی ٹانگ اڑائی اور اُسے گرا دیا۔

”میرے جیتے اُسے کوئی ہاتھ نہیں لگانے کا ہے۔ جندگی میں پہلی بار چھلیا کا چاقو کسی نے ہَوا میں گھمایا۔ چھورا گھٹ نہیں دِکھنے کا ہے۔“

وہ بڑبڑ کرتا لپک کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے پینترے بدل بدل کے مجھ تابڑتوڑ حملے کیے۔ ہر ممکن داو آزمائے، لیکن میرے جسم پر ایک خراش ڈالنے میں بھی ناکام رہا تھا۔ میں نے محسوس کرلیا تھا، اُس کی آنکھوں میں دہکتے ہوئے الاو کی جگہ مچلتے ہوئے اشتیاق اور حیرانی نے لے لی تھی۔

بستی والوں کے لیے یہ لڑائی کسی دیومالائی قصّے سے کم نہیں تھی۔ وہ یوں محوِ تماشا تھے کہ پرندے سروں پر بیٹھ جائیں، پھر مجھے جیسے ہی موقع ملا میرا ایک ہاتھ اُس کی کلائی پر پڑا اور دوسرا کہنی پر، اگلے لمحے اُس کا چاقو میرے ہاتھ میں چمک رہا تھا۔ چھلیا کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ وہ مبہوت مجھے دیکھا کیا۔ میں نے چاقو واپس اچھال دیا۔ اُس نے چاقو تھام لیا تھا، لیکن بہ دستور خالی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ مشٹنڈوں کے سر جھک گئے تھے۔ مجمع کی بھنبھناہٹ تیز ہوگئی تھی، پیچھے کھڑے ہوئے چلبلے سیٹیوں پر سیٹیاں بجا رہے تھے۔

دفعتاً چھلیا نے چاقو چوما، بند کیا اور میرے قدموں میں ڈال دیا۔ چند لمحوں قبل نفرت، کدورت اور بغض سے بھرا ہوا چھلیا اس وقت سراپائے عجز و محبّت بنا میری سامنے کھڑا تھا۔ اُس کی دیکھا دیکھی اُن چاروں نے بھی اپنے چاقو بند کیے اور میرے قدموں میں ڈال دیے۔

”ماتا پتا کی سوگند! چھلیا آج سے تیرا گلام لگنے کا ہے۔ ایسا مٹّی کسی نے پلیت نہیں کیا۔ ایسا کتا ئی کبھی نہیں پڑا۔“ چھلیا کی آواز رندھ گئی، اُس کا سینہ اُبلنے لگا اور وہ کھڑے کھڑے لرز رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کے چھلیا کو سینے سے لگا لیا اور وہ بلک بلک کے رونے لگا۔ مجمع میں ہاہاکار مچ گئی۔ ایک نے پہل کی پھر سارا مجمع ہی ٹوٹ پڑا۔ لیونارڈ حیرت سے بار بار اپنی انگلی کاٹتا تھا۔ اُنھوں نے مجھے اور چھلیا کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ چھلیا لوگوں کی منّت سماجت کر کے نیچے اتر آیا۔ اُس کا کہنا تھا کہ کندھوں پر اٹھائے جانے کا حق صرف میرے لیے تھا، پھر چھلیا کی رہنمائی میں لوگ بستی کے وسط کی جانب چل پڑے۔ میرے بے حد اصرار کے باوجود اُنھوں نے مجھے نیچے نہیں اتارا۔ عجیب تماشا لگ گیا تھا؛ عورتیں اور لڑکی بالیاں دروازوں پر لدی ہوئی اِس نرالے جلوس کو دیکھ رہی تھیں۔ کچھ دیر چلنے کے بعد چھلیا کا ٹھکانا آگیا۔ وہ چھوٹا سا، مگر پختہ کمرا تھا۔ کمرے جتنا ہی مختصر صحن تھا، جسے باہر سے آئی ہوئی دوفٹ کی شاخوں نے مکمّل چھت

دیا تھا۔ صحن کا فرش کچّا تھا جسے یومیہ لیپا پوتی کے ذریعے ہم وار اور سخت کیا گیا تھا۔ کمرے کے دروازے کے ایک طرف مٹّی کا گھڑونچا رکھا تھا؛ جس پر پانی ٹھنڈا رکھنے کی غرض سے پٹ سن کی بوری لپٹی ہوئی تھی۔ گھڑونچے کا ڈھکن لکڑی کا تھا جس کے وسط میں میخ ٹھکی ہوئی تھی، جس پر سوتی ڈوری سے لکڑی ہی کا پیالا باندھا گیا تھا۔ دروازے کے دوسری جانب چوکی رکھی ہوئی تھی جس پر زرد رنگ کا گاؤتکیہ پڑا تھا۔ صحن میں اِتنی جگہ نہیں تھی کہ ہمارے مجمع کی سمائی ہوتی۔ چھلیا نے اپنے آدمیوں کو چیخ چیخ کے ہدایات دینی شروع کر دیں۔ میں نے اُسے سختی سے منع کیا کہ وہ ہمارے لیے کسی قسم کا اہتمام نہ کرے، لیکن وہ تو گراں گوش ہو رہا تھا۔ ایک کو اُس نے لباس کے لیے دوڑایا تو دوسرے کو بستی کے اکلوتے مولوی صاحب کے پاس روانہ کر دیا کہ اصیل قسم کے دو چار مرغ بسمل کروا آئے اور تاکید کردی کہ رتّی بھر بھوجن سے عمدہ دہی مسالے میں بھنوایا جائے۔ اگر رتّی دین دھرم کی بات کرے تو اُسے چھلیا کا نام لے کے ڈرایا جائے۔ ایک تیسرے کو مختلف النوع ضروریات طعام کا انتظام کرنے کا ذمّے دار بنا دیا۔ صحن میں بھاگم بھاگ ناریل کے پتّوں سے

بنائی گئی چٹائی بچھادی گئی تھی۔ ایک جوان نے مجھے کندھے پر ہنوز اٹھا رکھا تھا۔ دس بارہ اُس کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ لیونارڈ عضوِ معطّل کی طرح حیرانی سے سب کچھ دیکھا کیا۔ آخر چوکی پر سفید چاندنی بچھادی گئی۔ دونوں سروں پر اگروان رکھ کے بتیاں آناً فاناً سلگادی گئیں۔ صحن کے کونوں کھدروں میں بھی جابجا اگربتیاں ٹھونس دی گئیں۔ ایک کارندہ دوڑا دوڑا کہیں سے سرخ مخملیں گاؤتکیہ لے آیا۔ اُسے چوکی پر زرد تکیے کی جگہ رکھ دیا گیا۔ اب چھلیا کے اشارے پر مجھے کندھے سے اترنے کا موقع فراہم کیا گیا۔ تانبے کی چمکتی ہوئی دودھ سے لبالب گھڑیا کو تانبے ہی کے تھال میں رکھا گیا اور اُس تھال کو چوکی پر رکھ دیا گیا۔ چھلیا نے ہاتھ کے اشارے سے چوکی پر بیٹھنے کی مجھ سے بنتی کی۔

"چھلیا بھائی! مجھے چوکی پر بیٹھنے کا ارمان نہیں اور نہ ہی میرے پاس یہاں ٹھہرنے کے لیے وقت ہے۔ تمھاری اِس قدر عزت افزائی نے سچ مانو پانی پانی کر دیا ہے۔ اگر کچھ بھلا ہی چاہتے ہو تو تنہائی میں کچھ وقت دے دو۔" میں نے چھلیا سے صاف صاف بات کی۔ میں نے اب تک انتہائی تحمل کا مظاہرہ کیا تھا۔ میں تحمل کے ساتھ پیش آنے والے حالات کی تفصیل جاننے کے لیے یہ کشٹ اٹھا رہا تھا۔ کوئی کیسے جان سکتا تھا کہ میرا سینہ تیزاب سے لبریز ہانڈی کی طرح ابل رہا تھا۔

"مائی باپ! کھوپڑیاں اتار کے جانے کا ہے۔ بدھوئی ہند کی یاترا کی ہے، ہن کاٹھیاواڑ جھک جھک نمسکار کرنے کا ہے۔ تیس سال میں چاقو پہلی بار گرنے کا ہے۔ مانو تو ادھر رام اُترا ہے۔ ابھی جانے کا بات نہیں بولنے کا ہے۔ تیرے چاقو کا چمکار کھسری کیسا ہوئیں گا۔" چھلیا پھڑک کے پلٹا اور میرے پانو میں حلقہ ڈال دیا۔ اُس کی عمر سے شرم آتی تھی۔ میں ہزار انکار کرتا رہا اور وہ ہزاروں اصرار۔ آخر کار چوکی چڑھنے ہی میں نجات نظر آئی۔ میرے بیٹھتے ہی چھلیا نے اپنا چاقو نکالا اور دودھ سے لبریز گھڑیا میں ڈال دیا۔ چاقو سے

بہ قدر دودھ چھلکا اور تھال میں جمع ہوگیا۔ اُس کے بعد بہت سے آئے اور باری باری اپنا چاقو گھڑیا میں ڈال گئے، پھر وہ سب میری طرف متوجہ ہوگئے۔ میں نے اپنا چاقو سختی سے مٹھی میں بھینچ لیا۔ آخرِ کار چھلیا سراپائے التجا بن کے کھڑا ہوگیا۔ "سوامی جی! ایک گھونٹ داس بھرنے کا ہے۔"

"چھلیا بھائی! میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کرو... مجھے یہاں سے فوراً جانا ہوگا۔"

چھلیا کچھ دیر دل مسوس کے کھڑا رہا، پھر اچانک بگولے کی طرح اُٹھا اور اپنا مُنہ تھپڑانے لگا۔ دامن چیر کے دولخت کرلیا۔ "پاپی مورکھ کے بھاگ ابھی اور جلنے کا ہیں سوامی جی! مہاجن دیالو خالی ہاتھ پھیرے ہیں۔" وہ دیوانہ وار تڑپنے لگا۔ اُس کی دیکھا دیکھی وہاں کہرام مچ گیا، سبھی دامن چاک کرکے صف بستہ ہوگئے۔ چھلیا خوامخواہ مجھے دیوتاؤں اور اوتاروں کا رتبہ دینے پر تل گیا تھا۔ چاقو گھڑیا میں ڈالنے کا مطلب اُن کے ساتھ دودھ ساجھا تھا، پھر میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ میں اُن کی مرضی کے بغیر یہاں سے نکل سکوں۔ چھلیا کے اطوار سے لگتا تھا کہ وہ ہفتہ بھر سے پہلے مجھے نکلنے نہیں دے گا۔ آخر مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ میں نے تیز آواز میں کہا، "ٹھہرو، میری بات سنو!..." میرے بار بار کہنے پر وہ بالآخر تھم گئے۔ میں نے اچانک اپنا چاقو چھلیا کے پیروں میں ڈال دیا۔

"چھلیا اب تم چاہو تو اپنے ہاتھوں سے گھڑیا میں ڈال دو! مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

چھلیا کے چہرے سے یک دم کسی نے خون نچوڑ لیا۔ پوری شکل پر زردی اور ویرانی کھنڈ گئی۔ وہ کچھ دیر سوچا کیا، پھر اُس نے لرزتے ہاتھوں سے چاقو اُٹھایا، کھٹکے سے کھولا، پھل کو بوسا دیا، آنکھوں سے مس کیا۔ وہ مُنہ ہی مُنہ میں کچھ بڑبڑایا، پھر اچانک اُس نے چاقو کو دوبارہ بوسا دیا اور اُسی پھرتی سے کلائی پر لمبی لکیر کھینچ دی، پھر چاقو بند کر، ہتھیلی پر رکھ کے مجھے پیش کردیا۔ "سوامی! آپ رکنے کا نہیں ہے تو اپنے

کو ساتھ لے جانے کا ہے۔"

میری زبان سے بے ساختہ جملہ پھسلتے پھسلتے رک گیا کہ چھلیا بھائی اِس سے بہتر ہے تم آتما تیاگ کرلو۔ میرے چاروں اُور موت گھومتی ہے اور ہر اُس شخص کو لپیٹ لیتی ہے جو میرے دائیں بائیں آگے پیچھے ہوتا ہے۔

"چھلیا بھائی! یہ بھی ممکن نہیں ہے، میں تو بنجارا ہوں، گلی گلی کی خاک چھانتا پھرتا۔ تم کہاں میرے ساتھ دھکے کھاؤ گے؟ شدید غلط فہمی ہوئی ہے چھلیا! وہ محض اتفاق تھا کہ میں تمھارا چاقو گرا سکا، ورنہ تم مجھ سے زیادہ دست رس رکھتے ہو۔" میں نے اُس کے ہاتھ سے چاقو نہیں لیا۔ اُس نے میری ترکیب مجھی پر آزمائی تھی۔

پھر تو چھلیا بچوں کی طرح بلک بلک کے رو پڑا۔ فرش پر لوٹ پوٹ ہوگیا۔ باقی سب لوگ چپ سادھے کھڑے تھے۔ میں نے بہ مشکل چھلیا کو اٹھا کے بٹھایا، پھر اُس نے مجھے ایک عجیب قصہ سنایا۔

چھلیا نے اناتھ آشرم میں ہوش سنبھالا تھا۔ تیرہ سال کی عمر میں وہ وہاں سے بھاگ نکلا۔ بمبئی کی سڑکوں پر آوارہ گردی اور فٹ پاتھ پر سوتے جاگتے اُس کی عمر بیس کے سن جا پہنچی۔ وہ اب تک چھوٹی موٹی چوری چکاری اور چھینا جھپٹی کرتا آیا تھا۔ اُسے چاقو زنی میں مہارت حاصل کرنے کا جنون تھا۔ وہ شوق کی تکمیل میں استاد بدلنے کے لیے علاقے بدلتا رہا، لیکن جب بھی وہ فن کو آزماتا، ایک آنچ کی کمی پاتا، پھر کسی ہم دم کے مشورے پر وہ دلّی جا پہنچا۔ وہاں کلّن خاں کا راج تھا۔ چھلیا نے کلّن خاں کے اڈّے کی ٹھان لی۔ پورا دلّی کلّن خاں کو حصہ پہنچاتا تھا۔ چھلیا نے حوض قاضی کے علاقے میں چھیڑ چھاڑ شروع کردی۔ یہ سلیم سنار کا علاقہ تھا۔ سلیم سنار کلّن خاں کے مُنہ چڑھے کی شہرت رکھتا تھا۔ ایک دن چھلیا سلیم سنار کے اڈّے پر پہنچ گیا اور اُسے للکار بیٹھا۔ سلیم سنار کے ہاتھ میں بجلی چمکتی تھی، لیکن قسمت نے چھلیا کا ساتھ دیا، اور اُس نے سنار کا چاقو گرادیا۔

اُس کے بعد سلیم سنار دلّی میں نظر نہ آیا۔ خدا جانے اُسے زمین نگل گئی یا آسمان نے کھایا۔ حوض قاضی میں دو چار نے اور چاقو اُٹھایا، لیکن چھلیا سب پر بھاری رہا۔ استاد کلّن خاں کے پاس متواتر عرضیاں جا رہی تھیں۔ اِس سے پہلے استاد کلّن خاں کی طرف سے کوئی ردِ عمل آتا چھلیا از خود حصہ لے کر استاد کے اڈّے پر پہنچ گیا۔ استاد کلّن خاں نے حصہ لینے سے انکار کردیا اور چاقو اٹھایا۔ چھلیا نے استاد کے قدموں میں چاقو پھینک دیا اور مافی الضمیر کہہ سنایا۔ پھر استاد نے چھلیا کو اپنے اڈّے پر جگہ دے دی اور سلیم سنار کی ڈھنڈوائی کروادی۔ کہتے ہیں سلیم سنار دریا میں ڈوب مرا تھا۔ استاد کلّن سلیم سنار کو بھلا نہیں پایا تھا، لیکن اِس پر اُس نے چھلیا کو کبھی مطعون نہیں کیا۔ چھلیا استاد کے پاس پانچ سال رہا۔ اُن پانچ سالوں میں اُس نے استاد سے سارا فن نچوڑ لیا تھا۔ استاد کلّن کو غالب مُحلّے کے ایک جولاہے نے دودھ میں زہر دے دیا، جس سے استاد جانبر نہ ہوسکا۔ استاد کے بعد چھلیا دلّی میں نہیں رکا۔ واپس کاٹھیاواڑ آگیا۔ یہاں اُس نے احمد آباد کو اپنا مستقر بنایا۔ مہینے بھر میں پورا احمد آباد اُس کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔ استاد کلّن خاں کی محنت اُس پر خوب چمکی تھی۔ بڑے بڑے نامی گرامی استاد اُس کے سامنے پل بھر سے زیادہ نہیں ٹھہر سکے، لیکن چھلیا نے ہمیشہ اپنے اندر ایک کمی محسوس کی، جسے وہ محسوس ہی کرسکتا تھا، اُس کی نشان زدگی پر قادر نہیں تھا۔ احمد آباد پر پورے دس سال کا راج تھا چھلیا کا۔ اُس کا ڈنکا ہر گلی، ہر محلّے میں بجتا تھا، لیکن چھلیا اب اُکتا گیا تھا۔ کوئی زور آور اُس کے سامنے ٹک نہیں سکا تھا اور یہی بات اُس کی اُکتاہٹ اور بے زاری میں اضافہ کررہی تھی۔ وہ بھیس بدل بدل دوسرے شہروں کو نکل جاتا۔ اڈّے کے استادوں کو للکارتا، اور اگلے ہی لمحے چوکی پر بیٹھا دادودہش وصول کررہا ہوتا۔ وہ پچھاڑ کا متمنی تھا، اُسے جوڑ کی تلاش تھی، جو آج تک اُسے نہیں ملا تھا۔ چھلیا اپنی نوعیت کا عجیب دادا تھا کہ اُس نے

اپنی شکست کے ہزار حربے آزما لیے، لیکن وہ فاتح تھا اور فاتح ہی کہلایا۔ ایک مرتبہ وہ گرناتھ پہاڑی کی یاترا کرکے لوٹ رہا تھا، اُس کا گزر اِس بستی سے ہوا۔ یہاں اُس کی ملاقات ایک مہان گیانی سے ہوئی۔ اُنھوں نے چھلیا کے بتائے بغیر ہی اُس کا مسئلہ پڑھ لیا۔ گیانی نے چھلیا کو گیان دیا کہ اِس بستی سے ایک نوجوان کا گزر ہوگا اور وہ چھلیا کا چاقو آسانی سے گرا دے گا۔ وہی جوان چھلیا کا فن مکمل کرے گا۔ چھلیا تو ویسے ہی اڈّے باڑوں سے بےزار تھا۔ اُس نے اِس بستی میں کچھ زمین خریدی اور یہیں پڑ رہا۔ پہلے سال اُسے واپس لے جانے والوں کا تانتا بندھا رہا، لیکن اُس نے سب سے ہاتھ جوڑ کے بنتی کر لی تھی۔ اِس بستی میں ٹھہرنے کی وجہ اُس نے آج سے پہلے کسی کو نہیں بتائی تھی۔ دو برس پہلے بارو ٹیہ اُسے تلاش کرتا ہوا یہاں تک آیا تھا۔ اُسے بارو ٹیہ بھلے مانس لگا تھا۔ بارو ٹیہ نے اُسے بتایا کہ وہ دیس کی آزادی کی جنگ لڑ رہا ہے۔ کاٹھیاواڑ کے تمام دادا اُس کے مطیع رہے ہیں، اور آج بھی ذاتی طور پر اُس کی برتری کو تسلیم کرتے ہیں، لہٰذا اُسے چھلیا کی وساطت سے کاٹھیاواڑ کے داداؤں کا تعاون درکار ہے۔ چھلیا نے اُسے بتایا کہ کاٹھیاواڑ کے داداؤں پر اُس کا زور نہیں چلتا، تاہم وہ اُن سب تک بارو ٹیہ کا پیغام اپنے الفاظ میں پہنچا دے گا، کیوں کہ چھلیا بھی انگریزوں کی حکومت کو سخت ناپسند کرتا ہے۔ سال بھر بعد اُسے اندازہ ہوا کہ بارو ٹیہ اپنے مقصد سے ہٹ گیا۔ وہ اب آزادی کی آڑ میں لوٹ مار اور عیش و نشاط کشید کر رہا ہے، لیکن اب بارو ٹیہ کا طوطی بول رہا تھا، اِس لیے چھلیا نے چپ رہنے ہی میں عافیت جانی۔ بارو ٹیہ چھلیا کی بےپناہ عزت کرتا تھا۔ اُسے مضبوط کرنے میں چھلیا کا نام بےحد کارآمد ثابت ہوا تھا۔ دو روز قبل بارو ٹیہ نے فتح کی خوشی میں ایک شان دار جشن کا سندیسہ بھجوایا تھا۔ اُس نے چھلیا پر بےحد اصرار باندھا تھا۔ گر جنگل کے بیچوں بیچ سرمئی پہاڑیاں ہیں، اُنھی پہاڑیوں کے غاروں میں بارو ٹیہ نے اپنا ٹھکانا بنا رکھا ہے۔ چھلیا نے بتایا کہ بارو ٹیہ ایک تعلیم یافتہ جوان تھا، اُس نے راج کوٹ سے بارہ جماعتیں پاس کر رکھی تھیں۔ چھلیا اِس سے قبل کبھی بارو ٹیہ کے ٹھکانے پر نہیں گیا تھا۔ بارو ٹیہ نے اُس کے لیے خصوصی تانگا بھیجا تھا، جو خود اُس کے استعمال میں بھی رہتا تھا۔ چھلیا نے انکشاف کیا کہ انگریزوں کو فریب دینے کے لیے ریاست کے نواب اور راجے بارو ٹیہ کی سرکوبی کے لیے دستے روانہ کرتے رہتے تھے، لیکن حقیقتاً بارو ٹیہ ریاستی سرپرستی میں پروان چڑھ رہا تھا۔ گھوڑا جب ایک دوڑ جیت جائے تو اُس کا بھاؤ بڑھ جاتا ہے اور وہ داؤ کے لیے پسندیدہ ترین ٹھہرتا ہے، اور بارو ٹیہ نے بےشمار دوڑیں جیت کر دکھا دی تھیں، اِس لیے ریاستی حکام اُس پر داؤ کھیل رہے تھے۔ بارو ٹیہ نے چھلیا کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اُسے ایک کشادہ غار میں لے جایا گیا۔ غار کا دہانہ تنگ تھا، لیکن وہ اندر سے کسی محل کی طرح کشادہ تھا۔ اُس میں ہوا کا گزر بہترین تھا۔ جگہ جگہ مشعلیں نصب تھیں، پورا غار بقعۂ نور بنا تھا۔ بارو ٹیہ نے چھلیا کو اپنے برابر بٹھایا۔ دو نیم برہنہ انگریز لڑکیاں مورپنکھ جھل رہی تھیں۔ بارو ٹیہ نے بتایا کہ اِس مرتبہ اُس نے وہ کام کر دکھایا ہے جس کا اُس نے برسوں سے خواب دیکھا تھا۔ اُس نے انگریز افسروں کی بہت بڑی تعداد اغوا کر لی ہے، ان کے ساتھ چند مقامی مخبر بھی پکڑے گئے ہیں۔ اُن کا ایک ساتھی انگریز افسر کے ساتھ فرار ہونے میں کام یاب ہوا ہے۔ اُس نے چھلیا کو بہت خاص کام کے لیے بلوایا تھا، تاہم بارو ٹیہ نے وہ خاص کام اب تک اُسے نہیں بتایا تھا۔ البتہ گفتگو کے دوران چھلیا یہ جان چکا تھا کہ اغوا شدگان کے تاوان میں سرِفہرست مطالبہ بارو ٹیہ کے بیٹے اور اُس کی انگریز بیوی کی حوالگی تھی۔ چھلیا کے آنے کے بعد سے احمد آباد میں اُس کا شاگردِ رشید تیتا چوکی سنبھالے ہوئے تھا۔ بارو ٹیہ نے اشاروں کنایوں میں ذکر کر دیا تھا، اُسے تیتا سے ضروری مدد درکار تھی۔ چھلیا کو اُس کے مقاصد کرانتی کاری کی عظیم

جدوجہد سے ہٹ کے ذاتی محسوس ہوئے تھے۔ بارو ٹیہ نے انگریز قیدیوں میں سے ایک دراز قد خاتون کو بلوایا۔ وہ بےحد حسین و جمیل اور باوقار تھی۔ بارو ٹیہ نے بتایا کہ اِس کا شوہر فوجی کپتان ہے اور وہ بھی اُس کی قید میں ہے۔ انگریز عورت کا نام مایا تھا۔ بارو ٹیہ نے رسیوں میں جکڑے ہوئے اُس کے شوہر کو بھی وہیں بلوایا۔ اِس کے بعد اُس نے بےہودہ حرکت کی، یعنی مایا کو بےلباس ہو کے برہنہ رقص کرنے کا حکم دے دیا۔ وہ اُس کے شوہر کو خاص تماشائی بنا کے حظ اٹھا رہا تھا۔ بارو ٹیہ کے ایما پر تینوں ہندُستانیوں کو بھی وہیں بلوایا گیا۔ بارو ٹیہ سمجھتا تھا کہ اِن تینوں کا انگریز عورت سے کوئی تعلّق ضرور ہے۔ اپنی شناسا عورت کی سرِعام برہنگی کوئی برداشت نہیں کرتا۔ ہندُستانیوں کو وہاں بلوانے کا ایک مقصد اور بھی تھا، جس کا عقدہ مجھ پر بعد میں کھلا۔ ہندُستانیوں کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ مایا نے بےلباس رقص سے صاف انکار کر دیا تھا۔ وہ انگریزی میں چیخنے چلّانے لگی۔ بارو ٹیہ کے اشارے پر دو مسٹنڈے آگے اُس سے نوچ کھسوٹ کرنے لگے۔ اُس عورت کے شوہر کا چہرہ تاثّرات سے عاری اور سپاٹ تھا، جب کہ بارو ٹیہ اُسے تکلیف پہنچا کے ہی لذت کشید کرنا چاہتا تھا۔ اپنے مقصد میں ناکامی پر وہ بےچین ہو گیا۔ مسٹنڈوں نے مایا کا بالائی لباس تار تار کر دیا تھا۔ اُس کے شوہر کی نسبت ہندُستانی شدید بےچین دکھائی دیتے تھے۔ آخر اُن میں جو پختہ عمر اور سیانا تھا، اُس سے رہا نہ گیا؛ وہ شیر کی طرح گرج پڑا۔ اُس نے بارو ٹیہ کو سخت لعنت ملامت کی، اُس کے فعل کو گھٹیا قرار دیا اور نامردی سے تشبیہ دی۔ بارو ٹیہ بہت محظوظ ہوا۔ شاید یہی سب دیکھنے کے لیے اُس نے تماشا لگایا تھا۔ دفعتاً ایک مسلح پہرے دار تیز قدموں سے وہاں آیا، اور اُس نے بآوازِ بلند بارو ٹیہ کو بتایا کہ فرار ہونے والا ہندُستانی مخبر بھاگتے ہوئے مارا گیا۔ اُس کے بعد نہ جانے کیا ہوا چھلیا سمجھ نہیں سکا۔ یوں لگا تھا جیسے برق پارے کوندے ہوں اور بہت سے شیر مل کر دھاڑے ہوں۔ پختہ عمر ہندُستانی جسے اُس کے ساتھی بھٹھل کہہ کے پکار رہے تھے، اُس نے نہ جانے کیا عمل دہرایا کہ اُس کے ہاتھ رسیوں سے آزاد ہو گئے، اور وہ آن کی آن میں تڑپتا ہوا بارو ٹیہ کے سر پر آ موجود ہوا۔ اُس نے خنجر کی زد پر بارو ٹیہ کو یرغمال بنا لیا اور اُس کی آڑ لے کر اپنے ساتھیوں اور انگریز خاتون مایا سمیت وہ نہ صرف غار سے نکلنے میں کام یاب ہوا، بل کہ کام یابی سے گر کے جنگل میں روپوش بھی ہو گیا، لیکن اِس سے قبل محافظوں نے اشتعال میں مبتلا ہو کے پیچھے سے گولیاں برسائیں تھیں، جن کی زد میں آ کے ایک ہندُستانی نوجوان جو اُن سب میں قوی الجثہ تھا، ہلاک ہو گیا۔ بھٹھل جنگل میں روپوش ہونے سے قبل بارو ٹیہ کا نرخرہ کاٹ کے اُسے پھینک گیا تھا۔ بارو ٹیہ کی موت پورے گروہ کی موت تھی، وہاں کہرام مچ گیا۔ سخت اشتعال میں آ کے کارندوں نے ایک ایک انگریز قیدی کو گولیوں سے بھون دیا تھا، اب کیا بارو ٹیہ اور کیا اُس کا بیٹا اور کیا کرانتی کاروں کے مطالبات، سب کچھ بارو ٹیہ کے ساتھ ہی مٹی میں مل گیا تھا۔ تب سے کرانتی کار اُن ہندُستانیوں کو باؤلے کتّے کی طرح تلاش کر رہے ہیں۔ اطلاع یہی ہے کہ اب تک وہ جنگل ہی میں روپوش ہیں، کیوں کہ جنگل کے گرد آباد تمام بستیوں میں کرانتی کار کڑی نگرانی کر رہے تھے۔ چھلیا نے بتایا کہ وہ بارو ٹیہ کی حقیقت سے واقف ہو چکا تھا، اِس لیے اُسے اتنا زیادہ دکھ نہیں ہوا، لیکن ریاستی عوام میں وہ ایک دیومالائی ہیرو کا درجہ رکھتا تھا۔ ریاستی عوام بارو ٹیہ کے قاتلوں کے لیے شدید غصہ اور نفرت رکھتے ہیں۔ چھلیا اپنی داستان مکمل کر کے ٹھہر گیا۔ میرا دماغ تو اُس کے ایک جملے پر سائیں سائیں کر رہا تھا کہ ہندُستانیوں کا قوی الجثہ ساتھی ہلاک ہو گیا تو کیا جمرو؟... اِس سے آگے مزید سوچا نہیں گیا۔ آنکھوں میں دھندلکے چھا گئے۔ چھلیا کہہ رہا تھا، ”سوامی جی! ابھی تیرے کو چاپڑ کیا ہوئے گا۔ اِدھر صرف تیرا انتجار کرنے کا ہے... چھلیا پر چاقو پھیر کے چلے جاؤ سوامی جی!... یا چھلیا

کو ساتھ لے جاؤ۔"

چھلیا اپنی بپتا کو لے کے گڑگڑا رہا تھا۔ اِدھر میرا وجود آندھیوں کی زد میں تھا، اور خشک پتّے کی طرح لرز رہا تھا۔ جمرو کی موت! اُس پر میرے مرنے کی اطلاع، بٹھل تو جنگل پر جنگل اکھاڑنے پر تُلا ہوگا۔ ہنر کی سچائی مشق کی یکتائی سے وابستہ ہے تو ہم اہلِ صدمات کے ہنر کا کیا بیاں ہو۔ آخر میں بھی یکتا ئے ہنر تھا، نہ دل پھٹا، نہ لہو اُگلا، بس نمک بھر پانی اُمڈا، سو اُسے اندر ہی جذب کرلیا، یہی کمالِ ہنر ہے۔

"ٹھیک ہے چھلیا۔" میں نے اُس کے ہاتھوں سے جاقو اٹھا کے چوم لیا، پھر تو جیسے در و دیوار سے شور اُمڈ آیا۔ کان پھاڑ فیل مچ گیا۔ چھلیا قہقہے مار کے ہنسنے لگا، وہ ہنس ہنس کے دہرا ہو رہا تھا۔ کسی نے لڈوؤں سے بھرا تشت اچھال دیا۔ میں کچھ دیر خاموشی سے اُنھیں دیکھا کیا۔ بٹھل کا ویران اور خاکستر سینہ مجھ سے اوجھل نہ تھا۔ وہ بارودیہ کا پورا گروہ پھونک دیتا یا پھر جل کے راکھ ہو جاتا، لیکن یہاں سے نہیں جاتا۔ میں نے ذرا سکوت کے بعد تیز آواز میں کہا، "چھلیا! مجھے تیری مدد درکار ہے... مجھے اپنے ساتھیوں کی تلاش اور خیریت و عافیت مطلوب ہے۔"

"پھکر کرنے کا نہیں ہے سوامی جی! چھلیا نے پاپ میں مُنہ کالا نہیں کرنے کا ہے۔ ابھی تیرا ساتھی اپنا ماتا پتا ہے... بس اچھا کرو... او جدھر ہوئیں گا سوامی جی! تیرا آنکھ چھلیا ٹھنڈا کرنے کا ہے۔" چھلیا ایک دَم سینہ ٹھونک کے کھڑا ہو گیا۔

"تمھارا مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا... وہ میرے ساتھی نہیں۔ اُن میں ایک میرا باپ ہے۔" اس کے بعد ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ آنسوؤں کا چوکی سے کیا علاقہ؟ میں تڑپ کے نیچے گر پڑا۔ جمرو ہنستا مسکراتا میرے سامنے کھڑا تھا۔ مجھے خبر نہیں ہوئی کہ کب تک بے سدھ پڑا رہا، اور نادان چھلیا مداوائے آلام کے لیے جانے کیا کچھ کرتا رہا۔ اُنھوں نے کھانے کا انتظام کرلیا تھا۔ چاندنی کا ٹکڑا صحن میں کھینچ دیا گیا۔ اس اثنا میں ہمارے لیے لباس بھی آ گیا تھا، سفید کُرتے پاجامے تھے۔ چھلیا نے منّت سماجت کر کے غسل خانے کی راہ دکھائی۔ لیونارڈ غسل کر آیا تھا۔ وہ سفید کُرتے پاجامے میں خوب وجیہ دِکھتا تھا۔ میں نے تلوے پر لپٹا ہوا کپڑا کھولا، زخم تقریباً صحیح ہو چکا تھا۔ میں غسل کر کے آیا تو چھلیا نے پکڑ کے صحن کے بیچ بٹھا دیا، پھر چاندنی کے اوپر دسترخوان چن دیا گیا۔ قابیں چن دی گئیں۔ بھنے ہوئے مرغ سے بھرا تھال عین میرے سامنے رکھا گیا۔ ایک کارندہ چھلیا کو بتا رہا تھا کہ بھڑ بھوجن نے مہمان کے لیے مونگ پھلی کے تیل اور تِل لگا کے روٹیاں بنا بھیجی ہیں۔ دسترخوان پر دُور تک قابیں اور کھانوں سے بھرے تھال نظر آتے تھے، جن میں ترکاریاں اور مختلف دالیں تھیں۔ ان کے ساتھ ساتھ سفید چاولوں سے بھرے تھال بھی تھے۔ بالوشاہی، امرتی اور گلاب جامن بھری ٹوکریاں بھی آ گئی تھیں۔ چھلیا نے آناً فاناً ایک بھرپور دعوت کا انتظام کرلیا تھا۔ میں نے چھلیا کا دل رکھنے کے لیے دو چار لقمے زہر مار کر لیے، البتہ لیونارڈ نے دل چسپی اور سیری سے کھانا کھایا تھا۔ میں نے اُسے اب تک نہیں بتایا تھا کہ اغوا ہونے والے تمام انگریزوں کو قتل کر دیا گیا ہے۔ لیونارڈ کے بھی کچھ قریبی دوست اغوا شدگان میں شامل تھے۔ کھانے کے بعد بھاپ اُگلتا سماوار لایا گیا۔ میرا دل چاہا کہ اُسے چھلیا کے سر پر اُلٹ دوں، لیکن میں نے خاموشی سے قہوے کی پیالی پیٹ میں انڈیل لی۔ اُس کے بعد دو لڑکیاں لجلجاتی ہوئی وہاں پہنچیں۔ وہ سرو قد تھیں، اور اُن کے رنگ دھوپ نے سینچے تھے۔ پستہ قد سازندہ اُن کے ساتھ کھڑا تھرک رہا تھا، اور وہ دروازے پر کھڑی لچک رہی تھیں۔ اُنھیں دیکھ کے یہ گمان ہوتا تھا کہ قدرت نے اُن کے جسم میں خون کے بجائے رسیلا شہد دوڑا دیا ہے۔

"سوامی جی! اِچھا کی مانگ رکھنے کا ہے۔" چھلیا اُنھیں دیکھ کے میری طرف لپکا اور کان میں سرگوشی کی۔ میں نے اُسے وہ شعلہ بار نظروں سے گھورا کہ اُس نے ذرا چوں چراں نہیں کی۔ اُن لڑکیوں کو دروازے ہی سے لوٹا دیا۔ البتہ سازندے کی جیب میں وہ نوٹ ٹھونسنا نہیں بھولا تھا۔

دل کی کارستانیاں بھی عجیب متلوّن ہیں۔ جب بٹھل بھول گیا تھا اور اب کورا بھول رہی تھی۔ ہر آہٹ پر دل اچھل اچھل کے حلق میں آتا تھا۔ میری شکل نوشتۂ سیاہ بن گئی تھی۔ لیونارڈ نے بارہا مجھ سے حالات جاننے کی کوشش کی، لیکن میں نے اُسے جھڑک دیا تھا۔ میں اِس وقت اپنے گرداب میں مبتلا تھا، کسی اَور کی دل جوئی کیسے کرتا۔ آخر چھلیا سب نمٹا کے میرے پاس آیا۔ اُس نے گھڑیا سے چھلکا دودھ پیالے میں بھرلیا تھا۔ وہ پیالہ لے کے میرے پاس آ گیا۔ میں نے حجت بے کار سمجھی یوں ہی وقت کا ضیاع تھا۔ وہ پھر ہٹیلا ہو جاتا اور لوٹیں لگاتا، ایک ہی سانس میں جتنا دودھ پی سکتا تھا پی لیا۔ بقیہ چھلیا کو دے دیا۔ اُس نے غٹاغٹ پیالہ خالی کر دیا۔ اُس کے بعد وہ عرض پرداز ہوا۔ "سوامی جی بدھائی دینے کا ہے! ابھی تیرے سانجھیوں کی کھوج لگا کے پلٹنے کا ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمھارا؟ کیا میں یہاں بیٹھا رہوں گا۔"

میں طیش میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ابھی کھبر نہیں ہے کہ وہ پورب میں ملے یا پچھم میں... ابھی وہ مل گیا، پھر تیرے کو کھوجنا پڑے گا سوامی جی! تم اِدھر ہی رہنے کا ہے۔ تیرا ساتھی جدھر بھی ہونے کا ہے۔ دو تین دن ماں تیرے پاس لے آنے کا۔"

چھلیا کی بات درست تھی۔ گر جنگل سے کسی بھی سمت نکلا جا سکتا تھا، جب کہ مجھے توقع نہیں تھی کہ بٹھل گر کے جنگل سے باہر نکلے گا۔ اگر میں بٹھل کو تلاش کرتا ہوا مشرق کی جانب نکل جاتا اور بٹھل مغرب میں مل جاتا تو پھر لامحالہ میری تلاش شروع ہو جاتی۔ مناسب یہی تھا کہ میں دو تین دن یہیں بیٹھ کے چھلیا کا انتظار کروں۔ ہم اِس وقت ساسن گیر کے قرب و جوار میں تھے۔ چھلیا نے فی الفور اپنے کارندے دھری، کنڈلا، راجولا، دلواڑا، باگستا، بھسان، واساوور اور پرانچی کے علاقوں میں روانہ کر دیے تھے۔ ان کے ہاتھ مختلف لوگوں کے لیے مختلف پیغامات بھجوائے تھے، اور خود وہ اپنے دستِ خاص تریان کے ہم راہ گر جنگل کے وسط کی جانب روانہ ہو گیا۔ اُن کے گھوڑے تازہ دَم اور چوکس دکھائی دیتے تھے۔ اب مجھے تین دن انتظار کرنا تھا، سولی پر لٹکا ہوا جان لیوا انتظار۔ چھلیا کے نکلتے ہی لیونارڈ میرے سر ہو گیا۔ یہاں جو کچھ ہوا تھا اُسے اِن معاملات کی ذرا سمجھ نہیں آئی تھی۔ وہ بس اِتنا سمجھا تھا کہ چھلیا لڑائی میں مغلوب ہونے کے بعد میرا دوست بن گیا، اور خوب دل و جاں سے مجھ پر فدا ہوا تھا۔ اُسے قطعاً معلوم نہیں تھا کہ چھلیا کہاں گیا ہے۔ میں کمرے میں گھس کے چارپائی پر پڑ گیا۔ مجھے اِس وقت صرف تنہائی درکار تھی۔ لیونارڈ میرے پیچھے پیچھے آ گیا۔

"برائے مہربانی خدا مجھے بتاؤ! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

"تھکے ہوئے ہو آرام کرلو... کل صبح بات کریں گے۔"

میں نے بے زاری سے اُسے جواب دیا۔

"مجھ سے ایسا برتاؤ کیوں کر رہے ہو!" اُس نے کندھے سے پکڑ کے مجھے سیدھا کیا۔

"یہاں سے قریب واساوور کا قصبہ ہے۔ وہاں ریاست کے دفاتر بھی ہیں، تم چاہو تو تمھیں وہاں روانہ کروا سکتا ہوں۔"

"میں تمھارے حالات جاننا چاہتا ہوں، تمھارا چہرہ کیوں سیاہ پڑ گیا ہے۔ تم روئے کیوں تھے... اور تم مجھے تھپڑ مار رہے ہو؟" لیونارڈ نے مجھے جھنجھوڑا۔

"تمھیں بتانے کے لیے میرے پاس کوئی نئی بات نہیں ہے۔" میں نے نظریں چرائیں۔ میں اُسے کیا بتاتا، وہ جہاز میں اپنے چار انتہائی قریبی دوستوں کے ہم راہ سفر کر رہا تھا۔ اُس نے مجھے تفصیل سے اپنے دوستوں اور دوستی کے بارے میں آگاہ کیا تھا۔ میں اُسے کیسے بتاتا کہ میرے پاس تمام انگریز قیدیوں کے مارے جانے کی اطلاع ہے، پھر اُسے کون سنبھالتا۔ اِدھر جمرو کا خیال میرے سینے میں

اُبل رہا تھا۔ بٹھل سے متعلق طرح طرح کے وسوسے ڈنک مار رہے تھے۔ ایسے میں لیونارڈ کی دل جوئی کون کرتا۔

''یار میں معذرت سے کہنا چاہتا ہوں کہ تم مجھے انسانیت سے گرا ہوا سمجھ رہے ہو۔''

''خدا کے واسطے لیونارڈ مجھے تنہا چھوڑ دو۔'' آخر مجھ سے برداشت نہ ہوا اور میں پھٹ پڑا۔

لیونارڈ چند لمحے مجھے دیکھا کیا؛ گم صم ساکت، پھر پھڑک کے مجھ سے لپٹ گیا، یا شاید مجھے لپٹالیا۔ انسان فطرتاً تماش بین ہے۔ اِس نے اپنا معاشرتی ڈھانچہ تماشے کے خمیر سے اُٹھایا ہے، اور یہ اِن تماشوں کو کمالِ خوش سلیقگی سے اجتماعیت کا نام دیتا ہے۔ انسانوں میں غم بانٹنے کا تماشا بھی خوب سجتا ہے کہ غمگین چھوت کا مریض اور غم گسار سماج میں غم کی ترسیل کا ذریعہ۔ مجھے بھی غم گسار فراواں تھے اور غم فزوں تر... میں لیونارڈ کو کمرے ہی میں چھوڑ کے باہر نکل آیا۔ مٹکے سے پیالہ بھر بھر پانی پیا۔ آگ سرد نہ ہوئی تو پیالہ سر پر انڈیل لیا۔ غنیمت تھا صحن میں کوئی نہیں تھا۔ میں ناریل کی چٹائی پر پڑ گیا۔ نہ جانے کتنی دیر یوں ہی بے سدھ پڑا رہا۔ کچھ لوگوں کے آنے جانے کو میں محسوس کرتا رہا، لیکن اِس بات کا ہوش نہیں تھا کہ وہ کون ہیں اور وہاں کیا کر رہے ہیں، پھر سیاہی جوبن پر آئی تو سناٹا ہو گیا، یعنی کہ بہت اچھا ہو گیا۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ سیاہی، تنہائی اور خاموشی عناصر ہیں تو اِن کا مرکب آگہی و ادراک ہے، اور یہی ادراک عرفانِ مجازی سے عرفانِ حقیقی تک لے جاتا ہے۔ گذشتنی کا طوفان ذرا تھما تو مجھ پر بھی یہ منکشف ہوا: یہ سب کچھ لاحاصل نہیں، کہیں کوئی ہے جو میری طرف متوجہ ہے۔ رنج والم، یہ آفت و بلاے ناگہاں منظورِ نظر ہی کے لیے تو ہیں۔ یہ ناظر کا استحقاق ہے کہ نظر شگفتہ رکھے یا انگیختہ۔ ٹھہرے پانی میں ناؤ کھینچنی پڑتی ہے اور بہتا پانی ناؤ کو اُڑا لے جاتا ہے۔ خود کو دھارے پر چھوڑ کے مجھے بھی ڈھارس بندھ گئی۔ میں اُٹھ بیٹھا۔

وہ دو بالشت کے فاصلے پر سر نیہوڑائے بیٹھی تھی۔ پھول کی طرح لرزیدہ اور مورتی سی تراشیدہ۔ میں اس افتاد پر چونک گیا۔ وہ شاید بہت دیر سے مستغرق بیٹھی تھی۔ مجھے اچانک اُٹھتا دیکھ کے دہل گئی۔ ''ہائے رام جی!'' وہ بدکی ہوئی ہرنی کی طرح اچھل کھڑی ہوئی اور جھٹ لمبا سا گھونگھٹ کاڑھ لیا۔ ''بستی میں آپ کی دھوم مچی ہے۔ درشن بنا رہ نہ سکی۔'' اُس کی آواز میں شیرینی، سلیقہ اور لہجے میں تعلیم کی کھنک تھی۔ ''آپ دیوتاؤں سمان دِکھتے ہو!'' اُس نے ذرا سا گھونگھٹ سرکا کے میری طرف دیکھا۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھیں بیضوی اور شفاف، پلکیں لانبی اور گھنی تھیں۔ عنابی رنگ کا گل دار گھا گھرا اور اُسی رنگ کی چولی میں لپٹا اُس کا سراپا شمع دان کی روشنی اجال رہا تھا۔ میں حقیقتاً سٹ پٹا گیا تھا۔ اندازاً نصف رات تو بیت چکی تھی۔ اس چھوٹی سی بستی میں جہاں ہر آدمی پوری آبادی کی نسلوں کو جانتا ہوگا، حسین دوشیزہ کا تنہا آدھے پاڑے جیسی جگہ پر چلے آنا حیرت انگیز تھا۔ بازاری ہوتی تو بھی اچنبھا نہیں تھا۔ وہ چلبلے بشرے سے معقول گھرانے کی لگتی تھی۔ لچکیلی شاخ کی طرح تن کے کھڑی تھی، خفیف جھونکے سے جھولتی ہوئی، لہکتی ہوئی۔ ''آپ کنیاؤں سے نہیں بولتے کیا؟''

میں واقعتاً مبہوت رہ گیا تھا۔ اُس کے وجود نے ماحول کو طلسمی بنا دیا تھا۔ ''کون ہو تم؟ اس وقت یہاں آنا کسی شریف لڑکی کے لیے مناسب نہیں۔'' میں نے سنبھلتے ہوئے اُس سے پوچھا۔ وہ تو گویا میرے بولنے کی منتظر تھی۔ میری آواز سُن کے جیسے اُس کے سارے وہم اور وسوسے دُور ہو گئے۔ اُس نے جس تیزی سے گھونگھٹ کھینچا تھا، اُسی تیزی سے گرا دیا اور چھپاک سے میرے سامنے دوزانو بیٹھ گئی؛ جیسے مینا سے ساغر میں آخری بوند ٹپکی ہو۔ وہ بلاشبہ بے حد حسین تھی۔ دودھ، شہد، صندلیں شربت کے آمیزے سے اُٹھتی ہوئی اُس کی رنگت، اُس پر طرّہ اُس کی تراشیدہ صورت، نین نقش ایسے جیسے چن چن کے ہیرے موتی جڑ دیے ہوں۔

اُس کا لب ولہجہ اور شکل وصورت غیر مقامی تھی۔ میں واقعتاً شدید اُلجھن میں مبتلا ہو گیا تھا کہ وہ کون تھی اور یوں آدھی رات کو یہاں کیا کرنے آ گئی تھی۔ پچھل پائی کا خیال آنے پر میں خود سے جھینپا تھا، لیکن جب وہ کھڑی تھی تو اضطراری طور پر میری نظریں اُس کے پیروں کا جائزہ لے چکی تھیں، اُس کے پانو عین سیدھے تھے۔

''بنوئی ہوں کنہیا جی! دلواڑا شہر سے رکنی کے گھر ٹھہری ہوں۔ بستی میں اودھم پڑا ہے کہ آپ کو مہا تما گیانی نریندر جی نے گیان دے کے چھلیا کے لیے بھیجا ہے۔'' اُس نے جھکی جھکی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اس طرح گویا ہوئی تھی، جیسے برسوں کی شناسا ہو۔

بستی والے مجھے مہان اوتار سمجھ رہے تھے۔ یہ میں ہی جانتا تھا کہ چھلیا کا چاقو گرانے میں کس گیانی کا عمل دخل تھا۔ سرگوشی بھی بیج کی طرح ہوتی ہے اور ہر گوش زمین کی طرح کہ جہاں بیج گرا وہاں پودا نکل آیا، ایک پودے میں ہزاروں پھل اور ہر پھل میں ہزاروں بیج۔ چھلیا جس وقت مجھے اپنی بپتا سنا رہا تھا اُس وقت صحن لوگوں سے کچھا کھچ بھرا تھا۔ یہاں سے نکل کے یہ قصہ چوپال میں پہنچا ہوگا۔ جہاں حیرت انگیز اور ماورا العقل داستان کے متلاشی قصہ گو اس پر مصروفِ کار ہوئے ہوں گے۔ اب جہاں چھلیا ہوگا اور جہاں اُس کا نام لیا جائے گا، وہاں یہ داستان ضرور دہرائی جائے گی اور ہر مرتبہ جدّتِ فسوں کے ساتھ۔ وہ جتنی دیر یہاں رہتی، کسی نئی مصیبت کے نزول کا خطرہ بڑھتا جاتا۔ اگرچہ وہ کچھ دیر بیٹھی رہتی تو کوئی حرج نہ تھا، تاہم میں نے لہجے میں تختی لاتے ہوئے کہا، ''تمھیں اور بستی والوں کو بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں گیانی یا اوتار نہیں ہوں... تم بے شک دن میں آ جانا، لیکن اب جاؤ۔''

''ہائے رام جی، بدھائی ہو! اجالے میں آ سکتی تو اتنا کشٹ نہ اُٹھاتی۔ کنیائیں اِدھر نہیں آتیں۔ میری آپ سے بنتی ہے، کچھ ویر کی آ گیا دیجیے۔ بڑی آس لے کے آئی ہوں۔

''نو پارکنگ''
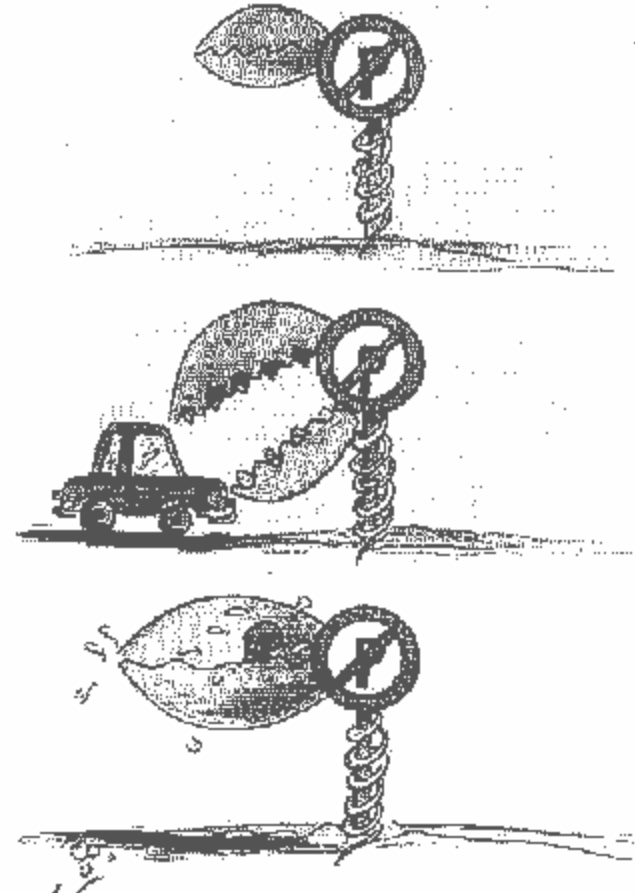
میرا کشٹ آپ کا دُور کر سکتے ہیں۔'' اُس نے ہاتھ جوڑ لیے اور جبڑے تختی سے بھینچ لیے کہ وہ کسی صورت نہیں جائے گی۔ مجھے گمان ہوا کہ مجھ سے دعا وغیرہ کروانے آئی ہے۔ چھلیا اپنے ساتھ تمام کارندوں کو لے گیا تھا۔ اڈّے پر اِس وقت میرے اور لیونارڈ کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اُس نے جوڑے ہوئے ہاتھ میرے گھٹنوں پر رکھ دیے اور ملتجی ہوئی۔ ''بھگوان کے لیے میرے بات سُن لیں، پھر میں چلی جاؤں گی۔''

میں دھیرے سے پیچھے کھسکا، لیکن وہ بہ دستور میرے گھٹنے پکڑے رہی۔ میں نے اُس کے ہاتھ اُٹھانے چاہے تو اُس نے میرے ہاتھ ہی تھام لیے۔ ''بھگوان نے تمھاری صورت بہت سندر بنائی ہے۔ بھگوان جس کا مکھڑا اچھا بنا دے، اُس کے لیے سنسار میں سب کچھ اچھا بنا دیتا ہے۔ تمھارا دل بھی خوب صورت ہی بنایا ہوگا۔'' وہ ایک ہی جست میں آپ سے تم تک آ گئی تھی، لیکن ایسے جیسے بہت سلیقے سے اور قدم بہ قدم یہ سفر اُس نے طے کیا ہو۔ اُس کی

آواز اور آنکھیں اوّل ساعت ہی سے خمار آلود لگی تھیں۔ میں نے آرام سے ہاتھ چھڑائے اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔

”تم بہت اچھی اور خوب صورت لڑکی ہو! اب چلی جاؤ، اگر میں تمھاری کوئی مدد کرسکتا ہوں تو دن میں ملنے کی سبیل کرو!“ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر اب اُس نے مزید ضد کی تو بھاگ کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرلوں گا۔

میری بات سُن کے وہ آب دیدہ ہوگئی، اور گریبان سے ایک پوٹلی نکال کے میرے قدموں میں پھینک دی۔

”اِس میں گہنے موتی ہیں۔ اِتنے ہی اَور ہیں میرے پاس... پتا جی دَھن مان ہیں۔ دَھن سے تمھاری جھولی بھر دیں گے، میری بات سُن لو، پھر ادھیکار ہے چِنتا کرو یا نہ کرو۔“

شدید غصّے نے میرے پیروں میں بیڑی ڈال دی۔ اُس نے یک دَم اوتار کے رتبے پر بٹھا کے لات ماردی تھی۔ میرا بھی دل چاہا کہ پوٹلی پر لات ماروں اور اُسے بھی دفعان کروں، لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی میں بیٹھ گیا، اور پوٹلی اُٹھا کے اُس کی جھولی میں پھینک دی، پھر بھڑکتے ہوئے کہا، ”ادھیکار تو... تم نے اپنے پاس رکھے ہیں۔ اپنی مرضی سے یہاں چلی آئیں۔ یہ بھی نہ سوچا کہ کوئی اِس وقت تم سے ملنا چاہتا بھی ہے یا نہیں، اپنی مرضی سے اوتار بنا دیا کہ کوئی اوتار ہے بھی یا نہیں، اور اب اپنی مرضی سے سوداگر بنا دیا کہ کوئی سوداگر ہے بھی یا نہیں۔ میرے پاس تو اِتنا بھی ادھیکار نہیں چھوڑا کہ میں یہاں سے تمھیں روانہ کرسکوں۔“

اُس نے مسکراتے ہوئے پوٹلی اٹھا کے گریبان میں ڈالی، جیسے صبا و دام سمیت کے گھر لوٹتا ہے۔ اُس نے مجھے واقعی بٹھا لیا تھا۔ ”سوداگر نہ بناتی تو میری بات کون سنتا۔ اگر تم گہنے اٹھانے والے ہوتے موہن جی تو مجھ سی کنّیا کو چھوڑ کے نہ اُٹھتے...“ اُس کی آنکھوں میں معنی خیزی کے علاوہ اَور بھی بہت کچھ اُمڈ آیا تھا۔ قدرت نے صورت کے ساتھ ساتھ اُسے سبک ذہن بھی بنایا تھا۔ ”میری مدد کرنے میں آپ کا اپمان نہیں ہوگا۔“ اُسے بے تکلّف ہونے کا ہنر خوب آتا تھا۔ وہ واقعی من موہنی تھی۔

”میں تمھارے مجبور کرنے پر تمھارا مسئلہ سُن سکتا ہوں، لیکن اِس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ میں تمھاری مدد کرنے پر قدرت بھی رکھتا ہوں۔“ میں نے پیش بندی کرتے ہوئے کہا، کیوں کہ میں اِتنا سمجھ گیا تھا کہ اُسے دعا کے علاوہ کسی اَور قسم کی مدد درکار ہے۔ جس قسم کی مدد عموماً شرفا کو اڈّے پاڑے والوں سے درکار ہُوا کرتی ہے۔ ظاہر ہے میں اِس وقت چھلیا سے بڑا دادا تھا۔ میں یہاں دو ایک دن سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتا تھا۔

”بدھائی ہو موہن جی! میرا گیان کہتا ہے کہ آپ کی یہ اِچھا ہی میرے جیون کو سورگ بنا سکتی۔ نرکھ میں سے بتا رہی ہوں۔ ایک راکھشس جان کو آیا ہے موہن جی۔“

”کون راکھشس؟ اور بھلا میں تمھاری مدد کیوں اور کیسے کرسکتا ہوں۔“

”کیوں کا جواب تو بھگوان ہی دیں گے۔ پرنتو آپ میں شکتی ہے کہ آپ اِس مورکھ کا سروناش کرسکیں۔“

اُس نے رات کا ایک پہر وہاں گزارا، اور تفصیل سے اپنی کتھا سنائی۔ اُس کا نام لکشمی تھا اور وہ واقعی لکشمی تھی۔ وہ ایک مِل مزدور راج پٹیل کے گھر میں پانچ بھائیوں پر پیدا ہوئی۔ صورت دیکھ کے ہی دادی نے کہہ دیا تھا کہ راج پٹیل پر لکشمی برسے گی، چناں چہ اُس کا نام لکشمی رکھ دیا گیا۔ یہ بستی کاٹھیاواڑ کے صنعتی شہر دلواڑا کے مضافات میں آباد تھی۔ راج پٹیل دلواڑا میں تیل کی مِل میں نصب مشینوں کی دیکھ بھال پر معمور تھا۔ ماہ وار اچھے پیسے مل جاتے تھے، اِس لیے وہ بستی کے خوش حال افراد میں شمار ہوتا تھا۔ لکشمی جب دو سال کی تھی تب راج پٹیل نے فصل پر بیج خرید کے ذخیرہ کرنے کا کام شروع کیا۔ اُس کا تعلق زمیں دار خاندان سے تھا۔ اِس کے علاوہ بستی والوں سے راہ و رسم مضبوط تھی، اِس لیے اپنی پونجی کے بقدر اُس نے مناسب دام پر مونگ پھلی خرید لی، اور چند ماہ بعد ایک تہائی منافع پر فروخت کردی، پھر اُس نے

تل خریدے اور چند ماہ بعد چار پیسے منافع پر اُسی مِل کو فروخت کردیے جہاں وہ ملازمت کررہا تھا۔ لکشمی جب چھ سال کی ہوئی تو راج پٹیل نے ملازمت چھوڑ کے دلواڑا میں بروکری کا دفتر بنا لیا۔ تب تک وہ چھوٹا موٹا سرمایہ دار بن چکا تھا۔ لکشمی آٹھ سال کی ہوئی تو راج پٹیل نے دلواڑا میں تیل نکالنے والی فیکٹری لگالی، اور وہ باپوناتھ بستی سے اُٹھ کے دلواڑا جا بسا۔ وہاں اُس نے عالی شان کوٹھی بنائی تھی، جس میں موٹر کھڑی کرنے کا کمرا علیحدہ بنایا گیا تھا، اور ہر کام کے لیے ملازم جدا جدا تھے: مالی، خانساماں، چوکی دار، ڈرائیور، نوکر چاکر۔ بچوں کو راماین پڑھانے کے لیے استاد الگ آتا اور اسکول کا سبق یاد کروانے کے لیے الگ۔ راج پٹیل نے فیکٹری کا نام بھی لکشمی آئل مِل رکھا تھا۔ راج پٹیل پر دَھن چھپّر پھاڑ کے برسا تھا۔ لکشمی اپنے باپ کی اِس قدر منظورِ نظر تھی کہ خواہش زبان پر آتی بعد میں اور پوری پہلے ہوجاتی تھی۔ بمبئی کے پریم بابو نے دلواڑا میں منڈوا کھولا۔ پھر لکشمی منڈوے کے ہو کے رہ گئی۔ ایک فلم دس بار دیکھتی۔ جب وہ بیس کے سن کو پہنچی تو راج پٹیل نے بیٹی کو غور سے دیکھا اور بیاہنے کی فکر کی، مگر بہت دیر ہوچکی تھی۔ لکشمی فیکٹری کے دروازے پر تعینات منشی قاسم میمن سے دل ہار بیٹھی۔ اُسے اِس بات سے مسرت ہوئی کہ اُس کا پریم فلموں سے کم تہلکہ خیز ثابت نہیں ہوگا۔ اُس کا خیال تھا کہ پتا جی کو خود ہی قاسم میمن سے اُس کے پریم کا پتا چل جائے گا، لیکن باپ کی طرف سے مسلسل خاموشی نے اُس کے فلمی پریم کا رنگ پھیکا کر رکھا تھا۔ وہ روزانہ فیکٹری پہنچ جاتی اور کافی دیر دروازے پر رک کے قاسم میمن سے باتیں کرنے لگی۔ اِس سے قبل وہ چھپ چھپا کے ملاقاتیں کرتے تھے۔ البتہ نظروں کا بے باک تبادلہ وہ شروع دن ہی سے علی الاعلان کرتی تھی۔ پھر ایک دن اُس نے سب کے سامنے قاسم میمن کے ہاتھ میں چٹھی پکڑائی، اور اُسی رات وہی چٹھی راج پٹیل نے بیٹی کے سامنے کردی، اور پہلی مرتبہ اُس سے سخت لہجے میں بات کی۔

لکشمی کی کہانی تو شروع ہی اب ہوئی تھی۔ اُس نے باپ سے بغاوت کا اعلان کردیا۔ قاسم میمن کو فیکٹری سے نکال دیا گیا۔ لکشمی اُسے پیسے پہنچانے لگی۔ اُس نے قاسم میمن کے ساتھ جا کے بمبئی بسنے کا منصوبہ بنا لیا تھا؛ جہاں وہ مدھوبالا کو مات دے سکتی تھی، لیکن کہانی اپنی مرضی سے آگے بڑھی۔ راج پٹیل نے دلواڑا کے نامور دادا رگھوبوری والا کو لکشمی اور قاسم میمن کے بیچ لا کھڑا کیا۔ رگھوبوری والا نے قاسم میمن کو دو چار مرتبہ پٹوایا تو قاسم میمن نے راج پٹیل سے دلواڑا چھوڑنے کے لیے تگڑی رقم مانگ لی۔ راج پٹیل نے قاسم میمن کو رقم لکشمی کے ہاتھ ہی سے دلوائی۔ لکشمی کو اِس بے وفائی کا ذرا ملال نہ ہُوا، کیوں کہ اِس طرح کہانی کا انجام دل چسپ اور عام ڈگر سے ہٹ کے ہُوا تھا، لیکن یہیں سے ایک نئی کہانی نے جنم لیا، جس نے راج پٹیل سمیت لکشمی کو بھی ہلا کے رکھ دیا تھا۔ رگھوبوری والا دل و جاں سے لکشمی پر فریفتہ ہوگیا تھا۔ وہ اِس قضیے کے دوران کئی مرتبہ لکشمی سے بالمشافہ ملا تھا۔ اُس نے راج پٹیل سے لکشمی کا ہاتھ مانگنے میں دیر نہ لگائی۔ راج پٹیل نے ہر قسم کے خوف کو بالائے طاق رکھ کے صاف انکار کردیا۔ لکشمی نے بھی یہ کہہ دیا تھا کہ اگر زندگی میں ایسی نوبت آئی جو اُسے رگھوبوری والا کے ساتھ پھیرے لینے پڑے تو زہر کھانے کو ترجیح دے گی۔ اُدھر رگھو پر عشق سات رنگ چڑھ گیا تھا۔ اُس نے اعلان کردیا کہ راج پٹیل کو تیل کی فیکٹری کا گھمنڈ ہے تو وہ بھی فیکٹری لگائے گا۔ اِس کے بعد رگھو دلواڑے سے غائب ہوگیا۔ ٹھیک ایک ماہ بعد وہ دوبارہ دلواڑے میں نظر آیا، جب اُس نے فیکٹری کے لیے زمین خریدی تھی۔ اُس نے فیکٹری کی تعمیر کا کام شروع کروادیا۔ وہ احمد آباد سے کام جاننے والے کچھ لوگوں کو بھی لے آیا تھا۔ رگھو کی فیکٹری بنتی دیکھ کے راج پٹیل کا فیصلہ ڈانواں ڈول ہورہا تھا، لیکن لکشمی زہر خوری کے فیصلے پر مزید پختہ ہوگئی۔ رگھوبوری والا کی فیکٹری تکمیل کے آخری مراحل میں تھی۔ اچانک سورت اور بمبئی کی پولیس رگھو کے وارنٹ

لے کے دلواڑا پہنچ گئی۔ رگھو نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے وہاں کئی ڈاکے مارے تھے اور کئی امرا کو مفلس کر آیا تھا۔ پولیس رگھو کو لے گئی، اور لکشمی نے ماتا جی کے بھجن گائے، دیوالی منائی، سکھ چین کا سانس لیا۔ راج پٹیل نے لکشمی کے لیے جوڑ کا رشتہ تلاش کرنا شروع کر دیا۔ آخر اُس کی نظر اپنے بھائی کے چھوٹے بیٹے وشنو پٹیل پر ٹھہر گئی۔ لڑکا قد کاٹھ، نین نقش کا بھی اچھا تھا، جب کہ راج پٹیل کی کاروباری اٹھان کا اُس کے پورے خاندان نے بھرپور فائدہ اُٹھایا تھا۔ اُس کا بھائی برابر کا نہیں تھا، لیکن پھر بھی شہر کے متموّل لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ سونے پر سہاگہ ہوا، لکشمی اور وشنو کو سُن گن لگی تو تبھی اُسی وقت اُن پر انکشاف ہوا کہ وہ تو بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے، تاہم اوراک ابھی ہوا تھا۔ گھر کی بات تھی فوراً چوبارے چڑھ گئی۔ پجاری سے دن تاریخ نکلوالی گئی تھی کہ رنگ میں بھنگ پڑ گیا۔ پولیس کا پرچہ کچا تھا۔ برامدگی بالکل نہیں تھی۔ رگھو بوری والا جیل سے چھوٹ کے سیدھا راج پٹیل کے پاس آیا اور صاف بول دیا کہ لکشمی اُس کی نہ ہو کوئی غم نہیں، لیکن اگر لکشمی کسی اور کی ہوئی تو رگھو پھانسی چڑھ جائے گا۔ شادی روک دی گئی۔ راج پٹیل تو کیا سارا شہر جانتا تھا کہ رگھو نے ایسا بولا ہے تو وہ کر گزرے گا۔ رگھو نے فیکٹری کی تعمیر دوبارہ شروع کروا دی تھی۔ راج پٹیل کے کاروباری حریف نواب کریم جی نے رگھو سے پتی ملالی۔ ادھر وشنو پٹیل کی ماں نے دوسری لڑکی دیکھنی شروع کر دی تھی۔ لکشمی کی ایک بُوا بستی ہی میں آباد تھی۔ بُوا کی ایک لڑکی رکمنی لکشمی کی سکھی تھی، جس سے راز و نیاز کیا کرتی تھی، اور ساتویں، پندرھویں دن لکشمی بستی کا پھیرا لگا لیا کرتی تھی۔ جب اُس نے سنا کہ ایک چھیل چھبیلے جوان نے چھلیا کو پچھاڑ دیا ہے، اور چھلیا اُس کے پیروں کو چاٹتا پھر رہا ہے تو اُسے لگا کہ اُس کی مراد بر آئی ہے۔ دراصل رگھو بوری والا کو دلواڑا کی چوکی پر چھلیا ہی نے بٹھایا تھا، اور وہ چھلیا کو باپ برابر مانتا تھا۔ راج پٹیل نے چھلیا کے آگے بھی ہاتھ جوڑے، لیکن چھلیا نے رگھو کے اِس معاملے میں ہاتھ ڈالنے سے معذرت کر لی تھی۔ چھلیا نے کہا تھا کہ وہ رگھو کا گلا اپنے ہاتھ سے کاٹ سکتا ہے، لیکن اُسے پیچھے ہٹنے کو نہیں بول سکتا۔

''تو تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟'' اُس نے اپنی داستان ختم کی تو میں نے اُس سے پوچھا۔

وہ کچھ دیر خاموشی سے مجھے دیکھے گئی، پھر ٹھہر ٹھہر کے بولی، ''میری اِچھا، چھلیا سے سہایتا لینے کی نہیں ہے۔''

''کیا اِچھا ہے تمھاری؟''

''کوئی میرے لیے رگھو دادا کے سامنے تن کے کھڑا ہو جائے۔'' اُس نے اِک ادا سے پلکیں جھپکائیں اور اٹھلا کے بولی تھی۔

مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ ''اور تمھارا خیال ہے کہ یہ کام میں کر سکتا ہوں۔''

''ہاں، تم شکتی مان ہو، دکھ اِسی بات کا ہے کہ رگھو کو للکارنے والا کوئی نہیں۔''

''رگھو میں کیا برائی ہے۔''

''مہیلائیں اپنے پریمیوں کو برا نہیں جان سکتیں۔ اُن کے من نے یہ ادھیکار نہیں دیا۔ رگھو مجھے برا نہیں لگتا، بس وہ سندر نہیں ہے۔ میری سندرتا پر نہیں جچتا۔''

''سندرتا عارضی چیز ہے لکشمی! آج ہے تو کل نہیں، اِس پر گھمنڈ مہنگا پڑتا ہے۔''

''وہ چور، ڈاکو، ہتیارا اور اپرادھی ہے۔ اڈّے کا دادا ہے، بھتا کھاتا ہے۔''

''وہ تمھارا پریمی بھی ہے۔ تمھارے بتانے کے مطابق وہ سچا پریم کرتا ہے تم سے۔''

''سچے پریمی اپنی پریمیکا کو کھش دیکھنا چاہتے ہیں۔ پریمیکا کھش ہے تو اُن کا پریم شانت ہے، مگر... مگر اِس پریمی نے میرے جیون سے ہر سکھ چھین لیا ہے۔ بچے بچے کی زبان پہ میرا نام ہے، گلی گلی رسوا کیا ہے۔ اُسے اپنی کھشی،

اپنی جیت کا دھیان ہے۔ پریمیکا مندر کی مٹی مورت ہے، شیشے کے استھان میں رکھنے والی مورت، جس کے پاس نہ من ہو، نہ اِچھا ہو اور نہ ادھیکار۔'' لکشمی کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

''تم وشنو سے شادی کرنا چاہتی ہو؟''

''نہیں، وشنو سے اچھا ہے میں رگھو سے بول پڑھوالوں۔ وہ ڈرپوک، بزدل، کمینہ! میرے لیے بلیدان دینے والا، مجھے دیکھ کے آنکھیں اور راستے بدل لیتا ہے۔''

''تم کیا چاہتی ہو مجھ سے۔ بالفرض میری وجہ سے رگھو پیچھے ہٹ بھی گیا تو پھر کیا ہوگا۔ میں چند دن سے زیادہ ٹھہر نہیں سکتا۔ رگھو پھر آ جائے گا۔ یہ مسئلے کا حل نہیں ہے۔''

''بس یہ کہ جھوٹ موٹ ہی سہی، مگر تم میرے لیے رگھو کے سامنے کھڑے ہو جاؤ۔ ایک بار لکشمی کے نام پر رگھو کا چاقو گرا دو... اُس کے بعد... اُس کے بعد موہن!'' وہ بولتے بولتے یک دم کھو سی گئی۔ کچھ توقف سے دھیرے دھیرے بولی، ''اُس کے بعد مجھی رگھو بوری والا بھی منظور ہے... تم اُس کا چاقو گرا دو، اس کے بعد رگھو آئے، میں اُس کے ساتھ پھیرے دلوا لوں گی۔''

میں چونک پڑا۔ اُس نے عجیب بات کی تھی۔ ''کیا مطلب؟''

''رگھو کو اپنی طاقت پر گھمنڈ ہے اور مجھے اپنی سندرتا پر مان ہے موہن جی! اپنی اِچھا سے اُس کے پیروں میں پڑ جاؤں تو دکھ نہیں، بیکڑی پر زہر کھا مروں گی۔ میری سندرتا کوئی زور نہیں موہنی جی!''

''میرا نام بابر ہے۔'' شاید وہ مجھے ہندو سمجھ رہی تھی۔

''میرے لیے تو موہن ہو، بھگوان نے بہت سندرتا دی ہے تمھیں۔'' اُس کی آنکھیں بارِ خمار سے بوجھل ہو رہی تھیں۔

''میرے بارے میں تمھارے تمام اندازے غلط ہیں۔ اب تم جاؤ... مجھ سے بن پڑا تو تمھارے لیے ضرور کچھ کروں گا۔'' میں نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ رات کسی بھی لمحے جانے والی تھی۔ وہ واقعی دل بر لڑکی تھی، یوں تن تنہا اندھیارے میں اڈّے پر چلی آئی تھی۔ یہ کوئی باقاعدہ اڈّا پاڑا تو نہیں تھا، لیکن ایک کمرے کے اِس مکان کی بستی میں اڈّے ہی کی حیثیت تھی۔ وہ وارفتگی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اُس کا یہاں سے چلے جانا بہت ضروری ہو چلا تھا۔

''موہن جی میں ایسے نہیں جاؤں گی... تم مجھے وچن دو... میری مدد کرو گے!'' وہ یک دم بھڑکی اور مجھ سے لپٹ گئی، پھر شمع کی طرح جلنے لگی، میں نے بہ مشکل اُسے خود سے علیحدہ کیا۔

''موہن تم میری آخری آس ہو... تم وچن نہ دو، لیکن لکشمی کا وچن ہے، تم میری اِچھا کے بغیر جس دن یہاں سے جاؤ گے میں پتھر باندھ کے ندی میں کود جاؤں گی۔''

مجھ سے وعدہ لینے کے بعد ہی وہ وہاں سے گئی۔

میں نے سوچا تھا، چھلیا سے اِس سلسلے میں بات کروں گا، وہی اِس بارے میں درست مشورہ دے سکتا تھا۔ سپیدی نے سیاہی کے شکم سے باہر آنا شروع کر دیا تھا۔ لیونارڈ نے خوب نیند کر لی تھی۔ مجھے امید تھی کہ صبح تک چھلیا کی طرف سے کوئی نہ کوئی خبر ضرور آ جائے گی۔ باروٹیہ کا کردار مجھے بالکل سمجھ نہیں آیا تھا۔ اُس کی کارگزاریوں سے لگتا تھا کہ وہ حادثاتی طور پر کرانتی کار بنا ہے۔ اُس کی چھب ڈھب، خو بُو کچھ اور ہی تھی۔ اُس نے انتہائی منظم طریقے سے بحری جہاز اغوا کیا تھا۔ اِس درجے کی کارروائی ریاستی سپاہ کے لیے بھی کارِ محال تھی۔ اِتنی بڑی کارروائی کا مقصد محض بیٹے کا حصول نہیں ہو سکتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا تھا کہ جہاز کا اغوا اور تاوان کا مطالبہ دو مختلف اذہان کی عکاسی کرتے ہیں؛ کارروائی قوم کے لیے تن من دھن قربان کرنے کی بنیاد پر، جب کہ مطالبہ خود غرضی کی بیّن مثال۔ بھُل کے ہاتھوں باروٹیہ کا قتل اُس کی حیثیت کے منافی تھا۔ بھُل کی لیاقت، شجاعت، معاملہ فہمی اور طاقت میں کلام نہیں، لیکن باروٹیہ کا قتل اِتنا آسان نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اُس نے جہاز کے اغوا سے لے کر اپنے ٹھکانے تک مغویوں کی ترسیل کے بے پناہ منظم انتظامات کیے تھے۔ ایسا آدمی جو تاجِ برطانیہ

سے ٹکرانے چلا تھا اُس کا اپنے ہی ٹھکانے پر یوں آسانی سے قتل ہو جانا مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ ان تمام معاملات میں کہیں نہ کہیں خلا موجود تھا، جو میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ چھلیا کے مطابق تمام انگریز قیدیوں کو شدتِ انتقام میں ہلاک کر دیا گیا ہے۔ یہ بات بھی خلافِ عقل تھی۔ کرانتی کار ہوں یا ڈاکو دونوں ہی صورتوں میں مغوی ان کے لیے انتہائی اہمیت کے حامل تھے۔ وہ جس کارِ شوق میں مبتلا تھے وہاں زندگی اور موت معمول کا حصّہ ہوتی ہیں۔ اپنے سردار کے قتل پر یہ بیخ پائی خلافِ معمول تھی۔ مانا کہ جذبات اپنے حکم ران خود ہوا کرتے ہیں، تاہم یہ حکم ران نہیں ہوتے۔ میرے دل میں خوف لکیریں بڑھا رہا تھا۔ جو لوگ اپنے سردار کے غم میں انگریز قیدیوں کو بے دریغ قتل کر سکتے ہوں، اُن کی دسترس سے بٹھل کیسے نکل آئے گا، جب کہ اس علاقے کا چپّہ چپّہ اُن کا دست نگر ہے۔ مجھے چھلیا میں ذرا بھی کھوٹ محسوس نہیں ہوئی تھی، لیکن وہ کس بل پر میرے ساتھیوں کی حفاظت کا ذمّے لے گیا تھا۔ باروٹیہ نے اڈّے کے لوگوں سے تعاون لیا ہوگا، لیکن اتنے بڑے گروہ کا سردار اُن کا محتاج نہیں ہو سکتا تھا۔ پورے کاٹھیاواڑ کے اڈّے پاڑے کے لوگ یک جان ہو کے بھی باروٹیہ کو منہ نہیں دے سکتے تھے۔ رندھاوے نے اپنے سردار کے غم میں انگریزوں کو چھلنی کروا دیا تھا۔ وہ ہمیں کچلنے کے لیے یقیناً بپھر رہا ہوگا، اور ہماری کھوج کے لیے تمام تر وسائل بروئے کار لائے گا۔ اس ہنگامہ خیزی میں ریاست کا کردار سب سے پیچیدہ رہا تھا۔ کاٹھیاواڑ کی تمام ریاستیں انگریزوں کی باج گزار تھیں۔ دلّی سے فوج آتی جب آتی، لیکن ریاست بھی تو پاسِ وفا کرتی ہے۔ اب تک یہ اور اس جیسی دیگر مضافاتی بستیاں چھاؤنیاں بن جانی چاہیے تھیں، لیکن ہم نے جنگل کا اتنا بڑا حصّہ سڑک کے ساتھ چلتے چلتے گزارا، بستی میں ایک دن گزر گیا۔ سرکار کے نام پر چڑیا کا بچّہ بھی نظر نہ آیا تھا۔

میں جوں جوں سوچ رہا تھا، معاملہ اُلجھتا جا رہا تھا۔ تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھنا چاہیے۔ بہت ممکن ہے بڑے پیمانے پر سرکار حرکت میں آ چکی ہو۔ جنگل کی دوسری اطراف سے گھیرا ڈال دیا گیا ہو۔ بہ ہر حال میری معلومات کا ماخذ چھلیا تھا۔ اس کے علاوہ مشاہدہ تھا۔ مجھے چھلیا پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے۔ دن نکلنے کے بعد میں نے بستی سے سُن گُن لینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ بستی سے مختلف باتیں مل سکتی تھیں۔ میں کمرے میں چلا آیا۔ لیونارڈ اوندھا پڑا تھا، آہٹ پر سیدھا ہو گیا۔

''بابر کچھ دیر نیند کر لو!'' اُس نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

''میں نیند کر چکا ہوں۔'' میں نے لاتعلقی سے کہا۔

''وہ نیند نہیں، یہ نیند کر لو۔'' اُس نے آنکھیں میچ کے دکھاتے ہوئے کہا۔

''نیند ایک ہی طرح کی ہوتی ہے۔'' شاید اُس نے مجھے لکشمی سے باتیں کرتے دیکھ لیا تھا۔ وہ اُس ملاقات کو غلط رنگ دے رہا تھا۔

''ہندُستان کی خوب صورتی فاتحِ عالم ہے۔ دنیا کشاں کشاں یہاں چل کے آتی ہے۔'' وہ مسکرا رہا تھا۔

''شاید تم غلط بول گئے ہو، اصل لفظ ہے مفتوحِ عالم!'' میں نے کچھ ترشی سے کہا۔ اُس نے عذر خوب تراشا تھا۔

''وہ لڑکی بہت خوب صورت تھی بابر! کون تھی۔''

''میں نہیں جانتا۔''

''رات بھر صرف اُس کی صورت تکتے رہے ہو۔ پوچھنے کی مہلت کیا ملی ہوگی۔'' اُس نے زبردستی قہقہہ لگایا، بھلا ایسی آساں ہیں خوش کاریاں۔

''میں بستی میں جا رہا ہوں، تم تازہ دم ہو جاؤ۔ یہاں سے باہر مت نکلنا۔'' اُسے غلط فہمی تھی تو رہے۔

''ایک ہی رات میں دل اِتنا اُلجھ گیا ہے۔ نام تک نہیں بتاتے۔'' لیونارڈ نے دیدے پھیلاتے ہوئے کہا۔

''لکشمی نام تھا اُس کا... اور وہ میری محبوبہ تھی... اب خوش ہو۔'' مجھے غصہ آ گیا تھا۔

لیونارڈ مچل کے آگے بڑھا اور مجھے بازوؤں میں بھینچ لیا۔

''تم غصے میں اور اچھے لگتے ہو، تمھیں دیکھ کے لڑکی دل ہار جائے تو اُس کا دوش نہیں۔ تمھیں خدا نے ہمہ اوصاف و کمال بنایا ہے۔''

صحن میں کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں تو میں باہر نکل آیا۔ چٹائی لپیٹ کے ایک طرف رکھ دی تھی۔ کچّے فرش پر ایک سقّہ چھڑکاؤ کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کے اُس نے میلے چکٹ گرتے سے ہاتھ پونچھے اور نمسکار کیا۔ چلتا پرزہ لگتا تھا۔ دوڑتے قدموں سے اُس نے مٹکے کا پانی کیاری میں اُلٹ کے تازہ پانی بھر دیا۔ پھر مشک کا بچا ہوا پانی پھرتی سے دیواروں پر اچھالا اور یہ جا وہ جا۔ حالاں کہ میں اُس سے بات کرنے کا سوچ ہی رہا تھا۔ لیکن وہ مچھلی کی طرح چھچھل گیا تھا۔ ہر انسان پر ایک نوشتہ ضرور چسپاں ہوتا ہے۔ اُسے پڑھنا قاری کی استعداد پر منحصر ہے۔ بعض کے چہرے چغلی کھاتے ہیں تو کسی کی زبان عرضِ حال کرتی ہے، تو کسی کا لہجہ چغلی کھا جاتا ہے۔ کسی کی چال نوشتہ تو کسی کا لباس نوشتہ اور کوئی سرتاپا نوشتہ۔ بالکل اسی طرح سقّے کے بارے میں گمان گزرا تھا کہ یہ تجربہ کار آدمی ہے۔ اُس کے جاتے ہی دو آدمی صحن چڑھ آئے۔ یہ دونوں کل تمام کاموں میں نمایاں نمایاں تھے۔ ان میں سے ایک وہ تھا جو مرغ بسمل کروا آیا تھا، اور دوسرا لپکا پھرتا تھا۔ وہ دیکھتے ہی بچھ سے گئے۔ ان میں سے ایک کا نام دھیارا اور دوسرے کا نام لنگ چند تھا۔ اُسے لنگو کے نام سے بلایا جاتا تھا۔ یہ دونوں آج کل چھلیا کے آگے پیچھے پھر رہے تھے، پر چھلیا نے اب تک اِن پر ہاتھ نہیں رکھا تھا۔ دھیارا بمبئی جا کے قسمت آزمانا چاہتا تھا اور لنگو کاٹھیاواڑ کے کسی بڑے شہر میں بسنے کا آرزو مند تھا۔ میں کافی دیر اُن سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ وہ اُتنا ہی جانتے تھے کہ جتنا چھلیا مجھے بتا گیا تھا۔ بھوک قطعاً نہیں تھی، لیکن لنگو چکما دے کے نکل گیا۔ وہ باتیں کرتے کرتے ابھی آیا، کہہ کے گیا اور واپسی پر پتیل کی دمکتی ہوئی پیالیوں سے بھرا خوان لادے چلا آیا۔ پراٹھے، باجرے کی روٹی، سرسوں کی ترکاری، دہی کا سالن اور نہ جانے کیا کیا اُس خوان میں بھرا تھا۔ لیونارڈ بھی آ گیا۔ ضروریات سے فراغت کے بعد تھوڑا بہت میں نے بھی کھا لیا، لیکن لیونارڈ آخری لقمے تک جتا رہا۔ اُسے ہندُستانی کھانا بے حد پسند آیا تھا۔

ناشتے کے بعد میں باہر نکل آیا۔ لنگو اور دھیارا میرے دائیں بائیں ہو گئے۔ میں نے اُنھیں واپس کرنا چاہا، لیکن وہ بہ ضد رہے۔ اُن سے لاری کے متعلق دریافت کیا تو اُنھوں نے بتایا کہ یہاں سے تانگے کے ذریعے دلواڑا جایا جاتا ہے۔ دلواڑا سے ہندُستان بھر کے لیے ریل بھی مل جاتی ہے اور لاریاں بھی۔ کچھ ہی دور تانگے نظر آئے جو قطار میں کھڑے تھے۔ جن پر سواریاں لپک رہی تھیں۔ ایک کے پیچھے ایک تانگا روانہ ہو رہا تھا۔ وہیں ساتھ ہی پنساری کی بہت بڑی دکان تھی جس پر خوب ریل پیل تھی۔ لنگو نے بتایا کہ جو سودا دلواڑا سے نہیں مل سکتا وہ بھوّا مہاجن کی دکان میں بھرا پڑا ہے۔ میں وہاں قریب پہنچا تو بھوّا مہاجن مجھے دیکھ کے تھرکتا ہوا دوڑا چلا آیا۔

''رام رام، دھنّے وار، جے ہو سری رام جی... سواگت ہے سرکار... ایں داس کو بھوّا بولتے کا ہے، بھوّا مہاجن۔'' اُس نے ہاتھ جوڑ کے پرنام کیا۔ کاروباری مسکراہٹ تو گویا اُس کے چہرے پر ثبت تھی۔

میں نے جواباً ہاتھ جوڑنے پر اکتفا کیا، اور آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا، لیکن وہ آڑے آ گیا اور منت سماجت کرنے لگا کہ میں اُس کی دکان پر کچھ دیر کے لیے بیٹھوں، اُسے خدمت کا موقع دوں۔ اُسے دیکھ کے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ بستی میں میری متعلق کیا چہ می گوئیاں ہو رہی تھیں۔ وہ کھینچ تان کر کے مجھے دکان میں لے گیا، اور ملازم کو بادام کے شربت کے لیے دوڑایا۔ شربت منگواتے وقت اُس نے بتانا ضرور سمجھا کہ اُس کے ہاں دلواڑے سے روزانہ برف

آتی ہے۔ وہ بستی کا اکلوتا خوش قسمت صاحب عیال ہے جو
برف سے بیختائی کشید کرتا ہے۔ اُس کی دکان خاصی کشادہ
تھی اور اسباب سے لدی پھدی نظر آتی تھی۔ ایک طرف
پٹ سن کی بوریوں کے ڈھیر تھے، جن کے مُنہ کھلے ہوئے
اور گلے گولائی میں مڑے ہوئے تھے۔ اناج، دالیں، چاول،
شکر، گھی، تیل کے پیپے، خوش بودار صابن، دھوبی صابن،
پوجا کا سامان۔ ایک طرف رنگارنگ کپڑوں کے تھان، لٹھا،
بوسکی، سوتی، ریشمی ہر قسم کا کپڑا۔ دوسری طرف شیشے کا
صندوق، چاندی سونے کے زیورات، انگوٹھیاں، قلوبند،
کنٹھے، کڑے، مالا، ٹِپی، سربند، تھلیاں، چوٹی بند، جوڑے،
جڑاؤ ہار اور نہ جانے کیا کچھ اس میں بھرا پڑا تھا۔ ایک طرف
چھریاں، قسم قسم کے چاقو، تلواریں، ترشول، زنجیریں،
درانتیاں، ہتھوڑیاں، چھینیاں اور دوسرا آہنی سامان بھرا ہوا
تھا، تو ایک طرف خوش بویات، عطریات پوجا کا مکمل
سامان، رام، کرشن، ماتا اور دیگر کی مورتیاں آراستہ تھیں۔
لوبان کی سُلگن دکان میں خوب رچی ہوئی تھی۔ ملازم بادام
کا شربت لے آیا۔ وہ سفید چاندی کا منقش کٹورا تھا۔
شربت انتہائی ٹھنڈا، شیریں اور گاڑھا تھا۔ شربت میں ایک
قسم کا بادام کا چورا پڑا تھا۔ بادام کو چاندی کے ورق کے
ساتھ چورا کیا جاتا ہے۔ اِس طرح بادام کا چورا سنہری رنگ
پکڑ لیتا ہے۔ پھر اُسے شربت بادام کے پیالے میں اوپر
سے چھڑک دیا جاتا ہے۔ یہ امرا کا مرغوب شربت تھا۔ مجھے
خیال آیا، لیونارڈ یہ شربت پی لیتا تو خوب خوش ہوتا۔ بھوا
مہاجن نے دھیارا اور لنگو کے لیے شربت نہیں منگوایا تھا۔
"بھوا جی! میرے ساتھ دو مہمان اور بھی ہیں۔" مجھے اچھا
نہیں لگا تھا۔ مہاجن کو یاد دہانی کروائی۔

اُس نے ایک لمحے کو کڑوا سا مُنہ بنایا، پھر وہی
کاروباری مسکراہٹ بکھیر لی۔ "ایں اے تو اپنا دھیارا اور
لنگو ہونے کا ہیں... ایں اپنا بالک ہیں مہمان کائیں کو۔"
لیکن اُس نے ان دونوں کے لیے بھی شربت منگوا دیا، البتہ
مٹی کے پیالوں میں۔ پھر وہ مجھے ہاتھ پکڑ کے زیورات کے
صندوق پہ لے گیا اور بولا، "ایں جس پہ ہاتھ رکھنے کا وہ اپنا
تیرے کو نجر کرنے کا ہے۔ سرمانے کا نہیں اے۔ بس اِشارہ
کرنے کا ہے۔"

میں نے عذر تراشا کہ ابھی جلدی ہے، پھر آ کے لے
لوں گا، لیکن وہ ہٹیلا ہو گیا۔ آخر تنگ آمد بہ جنگ آمد، میں
نے زیورات کے اوپر نظر ڈالی۔ میری آنکھوں کے
سامنے اندھیرا سا آ کے گزر گیا، میں پتھر کا ہو گیا تھا۔
مجھے کچھ ہوش آیا تو میں نے بے اختیار گلے پر
یکایک ہاتھ مارا، کورا کی مالا وہاں موجود تھی۔ بھوا مہاجن مجھے بغور
دیکھ رہا تھا۔ میرے جسم کی لرزش تو اندھے کو بھی نظر آ جاتی۔
زیورات کے بیچوں بیچ ایک سنگِ سفید میں پیوست وہی موتی
جگمگا رہا تھا، جو ہو بہو میری مالا میں پروئے موتیوں جیسا۔ میں
اُسے ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ میری سانس یک دم تیز
ہو گئی۔ یہ ابا جان کی بیچی گئی مالا کا موتی نہیں ہو سکتا تھا۔ کیا کورا
کے پاس بھی ایسی مالا تھی؟ وہ مجھے اِسی علاقے میں نظر آئی تھی۔
یہ سوچ کے میرے جسم کا رُواں رُواں لرزنے لگا کہ یہ موتی
مولوی صاحب نے فروخت کیا ہوگا۔ تو کیا وہ اس بستی میں
آئے تھے۔ اگر وہ اِس بستی میں آئے تھے تو پھر وہ یہاں ممتاز
تھے، پوری بستی کے دل و دماغ میں یقیناً موجود ہوں گے۔

ساتھ ایک انگریز خاتون مایا اور اُس کا ایک ساتھی ہے، جب کہ جمرو ہلاک ہو چکا ہے۔ تمام انگریز مغوی ہلاک کر دیے گئے ہیں۔ چھلیا بٹھل کی کھوج میں نکل پڑا۔ بابر نے بستی ہی میں ٹھہرنا مناسب سمجھا۔ رات کے پچھلے پہر بابر کی آنکھ کھلی تو اُس نے ایک خوب رُو دوشیزہ لکشمی کو سرہانے بیٹھے پایا۔ وہ نزدیکی شہر دیواڑا کے امیر کبیر شخص کی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ بابر سے مصر ہوگئی کہ رگھو بوری والا نامی داداسے اُسے بچا ئے۔ رگھو بوری والا لکشمی پر دل و جاں سے فریفتہ ہو چکا۔ بابر کو وہ کرنے پر ہی بن پڑی۔ تب وہ آفت جاں دوشیزہ اڈے سے نکلی۔ اگلی صبح بابر لنگو اور دھیارا کے ہم راہ بستی کا جائزہ لینے نکلا۔ بھُوا مہاجن نامی ایک ساہوکار نے اُسے اپنی دکان میں بصد اصرار بلا لیا۔ اُس کی دکان ہمہ قسم کے ساز و سامان سے لدی پھدی تھی۔ وہاں بابر کو شیشے کے ایک نمائشی صندوق میں نادر و نایاب موتی نظر آیا۔ یہ موتی ہو بہو کورا کی دی ہوئی بالا میں پروئے موتیوں جیسا تھا۔

"وہ تمھیں کہاں ملے تھے؟" میں نے بے قراری سے پوچھا۔

بھُوا مہاجن نے موتی سے میری جذباتی وابستگی اُچک لی اور محتاط انداز میں بولا۔ "ایں موتی بڑے کھان جی کو پیس کرنے کا ہے۔ ابھی آپ کی اِچھا ہے تو...!"

"تم غلط سمجھتے ہو۔ مجھے موتی نہیں چاہیے۔ براہِ مہربانی جن سے موتی خریدا ہے اُن کا اَتا پتا بتا دو۔ وہ سیکڑوں موتیوں سے بڑھ کے ہیں۔" مجھ سے کہاں صبر ہوتا... میں نے اُس کی بات کاٹ کر فوراً غلط فہمی دُور کرنے کی کوشش کی۔ مجھے تو چکو لگ رہے تھے کہ ابھی بھُوا مہاجن پتا بتائے گا اور ابھی میں اُس کی چوکھٹ پر جا موجود ہوں گا۔ میں اُس کی لب کشائی کا منتظر تھا اور بھُوا کا چہرہ گھٹ بڑھ رہا تھا۔ اُس نے کھوجتی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اپنے کو بھی پورا وسواس ہے اس کے پاس کھنڈریں موتی ہیں، مگر ابھی وہ ملنے کا نہیں ہے۔ سوامی جی! اگر تیرے کو کچھ کھبر ہوئے تو اپنے کو بتانے کا ہے۔ اے انوکھا موتی ہے ایک دم تھوڑا۔"

بھُوا مہاجن نے گرگٹ کی طرح رنگ بدلا تھا، اور کچھ چھپا گیا تھا۔ یقیناً اُس نے آم گٹھلی کے دام خریدا تھا، اور اب پوری فصل خریدنے کا خواہاں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ لازماً مولوی کے پتے سے واقف تھا اور مجھ میں اب صبر کی تاب نہیں تھی۔ میں نے بھڑک کے اُس کا گریبان پکڑا اور پوری وحشت سے جھٹک دیا۔ وہ ہڑبڑا کے اناج کی بوریوں پر جا پڑا۔ دھیارا اور لنگو شاید اشارے کے منتظر تھے۔ چاقو سوت کے لپکنے لگے، لیکن میں نے ہاتھ اٹھا کے انھیں روک دیا۔ یہ بچپن کی حرکت تھی۔ بٹھل ہوتا تو بھُوا کو چھوڑ کے دھیارا اور لنگو کے جماتا، نہ میں بٹھل تھا اور نہ میرے پاس اِتنی فرصت تھی۔ بھُوا ڈگمگاتا ہُوا اٹھ رہا تھا کہ میں نے بڑھ کر گھٹنا اُس کے پیٹ میں مارا۔ وہ ڈکراتا ہُوا پلٹ کے گرا۔ وہاں میرے دوسرے پیر کی ٹھوکر نے اُس کی پشت کا استقبال کیا۔ بھُوا کی لرزہ خیز چیخوں سے دکان پھٹنے لگی تھی۔ کاش کہ میری وحشت کو زبان مل جاتی تو شاید بھُوا کو یہ تشدد نہ سہنا پڑتا۔ آخر بھُوا میری ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

"دیا کرو سوامی جی... چھما کرو... چھما کرو۔"

دکان سے باہر آناً فاناً بھنبھناتا ہُوا ہجوم جمع ہو چکا تھا۔ میں نے گدی سے پکڑ کے بھُوا کو اٹھایا اور اپنے تئیں انتہائی سفاک لہجے میں کہا۔ "بھُوا سیٹھ! دوسری بات نہیں سنوں گا۔ مجھے فی الفور اُن کا پتا بتاؤ، ورنہ تمھاری نسلیں یاد رکھیں گی!"

بھُوا کی حالت دگرگوں تھی۔ اُس کے ساتھ میرا یہ سلوک انتہائی غیر مناسب تھا۔ مروّت بھی کسی شے کا نام ہے۔ بھُوا بے چارے نے بلا کے عزت سے بٹھایا کہ آ بیل مجھے مار۔ اب میرے پاس یہ سب سوچنے سمجھنے کی فرصت کہاں تھی۔ اگر میں یہ کچھ نہ کرتا تو وہ یوں تیر کی طرح نہ سیدھا کھڑا ہوتا۔ وہ خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا، لیکن اُس کی سوچ چہرے پر آ کے صاف بیان کر رہی تھی کہ گویائی کی قیمت جان سے کچھ کم بھی نہیں۔ "اُدھر دلواڑے

میں شاکر بھائی کی علی مسجد تھی۔ وہ اِدھر شاکر بھائی کے گھر میں رہنے کا ہے، پر..." بھُوا نے ڈوبتی آواز نکالی۔ "شاکر بھائی کو لاکھ پورا اور آدھا دینے کا ہے۔" وہ نڈھال ہو کے فرش پر پسر گیا۔ لمحوں میں اُس کا رنگ پیلا زرد پڑ گیا تھا۔ دکان کے اندر کوئی نہیں آیا تھا، لیکن باہر پوری بستی جمع ہوگئی تھی۔ چھوٹے علاقے اِس اعتبار سے بڑے ہوتے ہیں کہ وہاں کوئی بات چھوٹی نہیں ہوتی۔ شہروں کی بڑی بڑی اور امیر و کبیر باتیں ان بستیوں میں سرے سے موجود ہی نہیں ہوتیں اور یہ بھی خوب ہے کہ ان بستیوں کی چھوٹی چھوٹی اور نادار باتیں شہروں میں نہیں ہوتیں، لیکن پھر بھی شہر بستیوں سے قائم ہیں اور بستیاں شہروں سے۔ بھُوا مہاجن کی دکان پر اس ہڑبونگ کو مجھے محض چند لمحے ہوئے تھے، گویا بستی والوں کو گھنٹوں پہلے علم ہو گیا تھا، بس انھیں انتظار تھا کہ کس دم یہاں پہنچا کیے۔ میں بھُوا کے ساتھ مشغول تھا تو دھیارا اور لنگو باہر نکل گئے تھے۔ وہ ننگ دھڑنگ مغلظات سے بستی والوں کو منتشر کرنے میں مصروف تھے۔

"وہ اِس وقت شاکر بھائی کے گھر ہی میں ہے۔" میں نے بے چینی سے پوچھا۔ مجھے یقین کہاں تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے، ورنہ اب وہاں کیا ٹھہرنا۔

"ابھی تم اندر چل کے میری بات سننے کا ہے۔" بھُوا کو پھر حال آ گیا۔ وہ پھر جھٹک کے میرے پیروں سے لپٹ گیا۔

دکان کے عقبی حصے میں دروازہ تھا، جس پر ٹاٹ کا میلا سا پردہ پڑا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ گودام قسم کی کوئی جگہ تھی۔ میرا دل کھولتے ہوئے شوربے کی طرح اُبل رہا تھا۔ میں نے بہ مشکل خود کو سنبھالا۔ جلد بازی ایک مرتبہ پھر منزل کو دھندلا سکتی تھی۔ مجھے ایک مرتبہ پھر پوری شدت سے احساس ہُوا کہ کوئی ہے جو مجھے کورا سے ملانے کے درپے ہے، ورنہ بحری جہاز تو بمبئی جا رہا تھا اور مجھے کیا پڑی تھی جو بھُوا مہاجن کی دکان پر چڑھتا۔ میں نے جھٹک کے اپنے پیروں سے بھُوا کو الگ کیا اور کڑک کے کہا۔ "اندر کیا ہے؟"

"اُدھر یہ سب سننے کا ہے۔ ابھی سارا سچ بتائیں گا۔ یہ سب لوگ میرے کو ختم کرنے کا ہے سوامی جی۔ بڑی راج کی بات ہے۔"

میرا دل ایک بار پھر دھڑک سا گیا۔ مجھے متواتر یہ محسوس ہو رہا تھا کہ میری توقع سے کہیں زیادہ یہ شخص کورا اور مولوی صاحب کے بارے میں جانتا ہے۔ میں نے گریبان پکڑ کے اُسے اٹھالیا اور دروازے کی طرف دھکیلا۔ "چلو، ذرا ہوش یاری دکھائی تو تمھارے ٹکڑے کوئی شمار نہیں کر سکے گا۔"

میرا ذہن بہ سرعت گھوم رہا تھا۔ دروازے کے اُس طرف واقعتاً گودام ہی تھا۔ بھُوا نے ہوش رُبا تفصیل بتائی۔ اُس نے بتایا کہ قریباً ایک ماہ قبل وہ حسبِ معمول دلواڑا خریداری کے سلسلے میں گیا۔ وہاں ایک جوہری اُس کا بے حد گہرا دوست ہے۔ وہ دلواڑا جاتا ہے۔ فارغ وقت اپنے جوہری دوست ہی کے پاس گزارتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ وہ جوہری مسلمان تھا اور اُس کا نام حسین والا تھا۔ بھُوا نے دلواڑا سے میٹرک پاس کیا تھا، جہاں حسین والا اُس کا ہم جماعت تھا۔ دونوں کا تعلق متموّل خاندانوں سے تھا اور دونوں ہی کے خاندان مذہبی انتہاؤں پر اُستوار تھے۔ ایک کٹر ہندو اور دوسرا کٹر مسلمان۔ حسین والا سے بھُوا مہاجن کے خوب لمبے مباحث ہُوا کرتے تھے۔ گزشتہ ایک سال سے تو ان کی ہر ملاقات اسی بحث کی نذر ہو رہی تھی، جب کہ ان فروعات سے جدا ان کی دوستی اٹوٹ تھی۔ اُس دن بھی بھُوا، حسین والا پر یہ ثابت کرنے میں مشغول تھا کہ ہندو مت بے شمار دیوتاؤں کے بجائے ایک بھگوان کی وحدانیت کا پرچاری ہے۔ جب ایک باریش اور چمکتی ہوئی صورت کا مالک، نرم رُو بزرگ حسین والا کے پاس آیا تھا۔ اُس نے اپنا نام مولوی شفیق احمد بتایا اور حسین والا کو اس کے مربی شاکر بھائی کا حوالہ دیا۔ ان کے پاس یہ موتی تھا جسے وہ فوری فروخت کرنا چاہتے تھے۔ حسین والا نے موتی کے دام اُن کی توقع سے کہیں کم لگائے۔ وہ پریشان اور گھبرائے گھبرائے سے لگتے تھے۔ اُنھوں نے معمولی سی جرح کے بعد یہ ان مول موتی حسین والا کو کوڑیوں کے بھاؤ بیچ دیا اور شانِ بے نیازی سے چلتے بنے۔ حسین والا کی طویل رفاقت سے بھُوا کو بھی زر و جواہر کی اچھی خاصی پہچان ہوگئی تھی۔ موتی کی اہمیت اُس سے چھپی نہ رہ سکی۔ اُس نے اپنی دوستی کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے حسین والا پر اصرار باندھ لیا۔ آخرکار

حسین والا کو وہ موتی معقول منافع پر بھُوا کو فروخت کرنے پر ہی بی۔ مولوی شفیق کی بے اعتنائی سے بھُوا نے اندازہ لگایا تھا کہ ان کے پاس یہ دُرِّ ان مول بے بہا ہیں۔ شاکر بھائی سے وہ رسمی طور پر واقف تھا۔ شاکر ویسے تو علی مسجد کے متولّی تھے، لیکن درپردہ اُن کے بیاج کا وسیع لین دین تھا۔ دلواڑا کی کون سی اینٹ اور کون سی دیوار تھی جو شاکر بھائی کے پیسے سے نہ لگی ہو۔ شاکر بھائی کے بزرگوں کی تیسری پشت علی پیر کے ہاتھوں مسلمان ہوئی تھی۔ بیاج کا بیوپار ان کا آبائی پیشہ تھا، جسے ترک کرنے پر وہ قادر نہ تھے، اور نہ ہی وہ ایسا کرنا چاہتے تھے، کیوں کہ ان کے 'کھاتا دفتر' کی الماریاں پشتوں سے مقروض لوگوں کے ناموں سے بھری پڑی تھیں۔ تاہم وہ خود کو سُود خور کہلوانا سخت ناپسند کرتے تھے، اِس لیے پورا دلواڑا ان کے کاروبار سے مکمل واقفیت رکھنے کے باوجود کچھ نہیں جانتا تھا۔ شاکر بھائی کے آبا نے علی پیر کے مزار پر علی مسجد بھی بنوائی تھی، جہاں ہر گیارھویں کو بمبئی سے قوال آتے تھے۔ بھُوا اِس لیے حیران ہُوا کہ شاکر بھائی نے موتی خود کیوں نہیں خرید لیا، لہاذا وہ حسین والا سے موتی لے کر سیدھا شاکر بھائی کی کوٹھی پر پہنچا۔ شاکر بھائی سے بوا کو ایک نسبت اَور بھی تھی۔ شاکر بھائی بھُوا ہی کی ذات برادری کا تھا اور بھُوا کا خیال تھا کہ اُس کے اور شاکر بھائی کے پردادا دُور پرے کے رشتے کے بھائی تھے۔ شاکر کا پردادا جب مسلمان ہُوا تھا تو اُس کے رشتے ناتے تبدیل ہوگئے تھے۔ شاکر بھائی بھُوا کو اپنے در پر دیکھ کے متعجب ہُوا، تاہم اس سے بڑے تپاک سے ملا۔ بیٹھک کے بجائے مردان خانے میں بٹھایا۔ بھُوا نے باتوں ہی باتوں میں مولوی شفیق اور موتی کا تذکرہ کیا تو شاکر بھائی چونک گیا۔ وہ مولوی صاحب سے واقف تھا، تاہم نادر و نایاب موتیوں کے خزانے کا اُسے علم نہیں تھا۔ مولوی صاحب تقریباً ایک ماہ سے علی مسجد کے امام کے گھر میں مقیم تھے۔ اُن کے ہم راہ اکلوتی صاحب زادی تھی۔ وہ امام مسجد کے پرانے واقف کار تھے اور سیر و سیاحت کی غرض سے چلتے چلتے یہاں تک پہنچے تھے۔ شاکر بھائی روئی کا بیوپاری تھا۔ بھُوا کی اطلاع کے بعد ایک پل کی فروگذاشت ناممکن تھی۔ اس کے عین ناک تلے انمول خزانہ کوڑیوں کے بھاؤ بک رہا تھا اور اُسے خبر نہ تھی۔

اُس نے مولوی صاحب کو طلب کرنے کا خطرہ مول نہ لیا اور خود کانپتا لرزتا ہُوا امام صاحب کے دروازے پر پہنچ گیا۔ بھُوا ساتھ ساتھ تھا۔ وہ دستک دیا ہی چاہتے تھے کہ دروازہ عُجلت میں کھُل گیا۔ مولوی شفیق گھبرائے ہوئے نکل رہے تھے کہ اُن سے اُلجھ کر ڈگمگا گئے۔ اُن کی صاحب زادی کی طبیعت اچانک خاصی ناساز ہوگئی تھی، وہ اُسے اسپتال لے جانے کے لیے سواری تلاش کرنے نکلے تھے۔ امام صاحب اس وقت گھر پر نہیں تھے۔ بھُوا کے پاس شان دار موٹر تھی۔ اُس نے اپنی اور موٹر کی خدمات پیش کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ مولوی صاحب کے سہارے لڑکھڑاتی ہوئی ایک برقع پوش لڑکی بھُوا کی موٹر میں آن بیٹھی۔ ان کے ساتھ امام صاحب کی زوجہ بھی تھیں۔ بھُوا نے انھیں اسپتال تو پہنچایا تھا، تاہم وہ اس دوران اپنا سب کچھ ہار گیا تھا۔ اُس برقع پوش لڑکی کا دو ایک مرتبہ نقاب کیا اُلٹا تھا کہ بجلیاں تڑپ کے بھُوا کی آنکھیں خیرہ کر گئی تھیں، سیاہ بدلیوں کی اوٹ میں ایسا ماہ تاب تھا کہ ماہ تاب بھی شرمائے۔ بھُوا نے اِتنا حسین چہرہ کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ ایسی صورت کا تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔ بھُوا نے وہ موتی پایا تھا کہ جس کے سامنے ہیرے کی چمک ماند پڑ جائے۔ بھُوا نے اسپتال کی چوکی سنبھال لی۔ اس کی بے قراری مخفی نہ رہی تھی۔ نہ شاکر بھائی سے اور نہ ہی مولوی صاحب سے۔ ان کی واپسی بھی بھُوا کی موٹر میں ہوئی اور مریضہ کو اسپتال سے افاقہ ہُوا تھا۔ مولوی صاحب بھُوا کی اس ناگہاں دست گیری پر بے حد مشکور ہوئے۔ ہر چند کہ بھُوا ہندو تھا، تاہم اُنھوں نے شاکر بھائی اور اُسے بہ صد اصرار کھانے کے لیے روکا۔ امام صاحب بھی آ چکے تھے۔ وہ شاکر بھائی کے نمک خواروں میں سے تھے، اِس لیے محتاط روی سے مسکرا رہے تھے۔ مولوی صاحب نے کھانے کا کہہ کر گویا بھُوا کے دل کی بات چرائی تھی، لیکن شاکر بھائی کی مداخلت پر یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ وہ اسے گھسیٹ لے گئے۔ بھُوا کی زندگی میں وہ دن قیامت ڈھا گیا۔ اس کے لیے مولوی صاحب کی چوکھٹ چھوڑ کے باقی دنیا بے رنگ و بو ہو چکی تھی۔ اس نے من ہی من میں ہر قیمت پر مولوی صاحب کی صاحب زادی کو حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے رخصت کرتے وقت شاکر بھائی نے کہا تھا

کہ اس وقت مولوی صاحب سے موتیوں کی بابت بات کرنا غیر مناسب تھا، تاہم بھُوا اب خود کو اس معاملے سے دُور سمجھے، لیکن بھُوا دوسرے دن براہِ راست مولوی صاحب کی طرف پہنچ گیا۔ اُس کا خیال تھا کہ آج بھی اُسے کھانے کی دعوت دی جائے گی۔ مولوی صاحب نے اُس کی آرزوؤں پر خاک ڈال دی۔ اُسے گھر میں بٹھانے کے بجائے محلے کے چبوترے پر بٹھایا۔ امام صاحب کے مکان میں بیٹھک کی گنجائش نہیں تھی۔ پہلے پہل مولوی صاحب نے مزید موتیوں کی موجودگی سے انکار کیا، تاہم جب بھُوا نے فی موتی قیمت پچاس ہزار بتائی تو اُنھوں نے تھوڑی سی حیل حجت کے بعد ہتھیار ڈال دیے۔ اُنھوں نے بھُوا کو بتایا کہ اُن کے پاس چند موتی اور ہیں جنھیں وہ مناسب دام ملنے پر فروخت کرنا چاہتے تھے۔ بھُوا کی پیش کش معقول تھی، لہاذا انھیں موتی فروخت کرنے میں کوئی عذر نہ تھا۔ ابھی اُن کے درمیان یہ سودا طے پایا ہی تھا کہ فربہ جسامت کا مالک شاکر بھائی اپنے تین کارندوں کے ہم راہ پھنپھناتا ہُوا وہاں آن دھمکا۔ اُس نے بھُوا سے درشت لہجے میں اپنے ساتھ چلنے کا کہا، جب کہ اُس نے مولوی صاحب فدویانہ انداز اختیار کرتے ہوئے بتایا کہ ان کے لیے علاحدہ مکان کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ پھر اُس نے اپنے ایک ملازم کو حکم دیا کہ وہ نئے مکان میں منتقلی کے لیے مولوی صاحب کی مدد کرے، اور اس نیک کام میں کسی تاخیر کی گنجائش نہیں ہے۔ مولوی صاحب متذبذب حالت میں کھڑے ہی رہ گئے، جب کہ بھُوا کو شاکر بھائی بازو سے پکڑ کے اپنے ساتھ لے گیا۔ بھُوا نے شاکر بھائی کے ساتھ جانے میں ہچکچاہٹ دکھائی، لیکن پھر شاکر بھائی اور اُس کے کارندوں کے کڑے تیور دیکھ کر ٹھنڈا پڑ گیا۔ شاکر بھائی نے اُسے مہمان خانے میں لے جا کے بٹھایا۔ اس کے ہم راہ کھانا کھایا ہے۔ اس کے بعد بھُوا کو مہمان خانے میں قید کر دیا گیا۔ شاکر بھائی نے اِس دوران اُس سے موتیوں اور مولوی صاحب سے متعلق کوئی بات نہ کی۔ کئی گھنٹوں کے بعد شاکر بھائی تالا کھول کے مہمان خانے میں آیا اور اُس نے بھُوا سے کہا کہ وہ جا سکتا ہے اور اسے امید ہے کہ بھُوا زبان بندی کو محترم جانے گا۔ بھُوا نے اندازہ لگا لیا کہ شاکر بھائی مولوی صاحب سے موتی حاصل

کر چکا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اُس نے مولوی صاحب کو یہاں سے روزانہ بھی کر دیا ہو۔ عافیت کی بات تھی کہ بھُوا خاموشی سے نکل جاتا، لیکن کیا کرتا دلِ نادار کا جو نہاں خانے میں مچل رہا تھا۔ بھُوا کو گومگو کی کیفیت میں دیکھ کر شاکر بھائی بول پڑا۔ اُس نے کہا کہ وہ بھُوا کی حالت سے واقف ہے، لیکن بھُوا کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ برہمن ہے اور مسلمانوں کے مذہبی پیشوا کی دختر پر نظر مار رہا ہے، اور یہ ناممکنات میں سے ایک کام ہے۔ شاکر بھائی نے یہ کہہ کر بھُوا کے من میں جوت لگا دی کہ اگر بھُوا اسلام قبول کر لے تو وہ بہ نفسِ نفیس اپنی سرپرستی میں بھُوا کا نکاح اس برقع پوش لڑکی سے پڑھوا دے گا۔ بھُوا کا نیم اثباتی ردِعمل دیکھ کر شاکر بھائی نے کہا کہ ان کی جاتی کے کچھ سرکردہ افراد اسلام سے متاثر ہیں، لیکن ہچکچا رہے ہیں، اگر بھُوا مسلمان ہو جائے تو دوسروں کی راہ آسان ہو سکتی ہے۔ بھُوا نے اس سے سوچنے کا وقت لیا اور چلا آیا۔ بھُوا کے زیرِ بند میں ڈیڑھ لاکھ رُپے بند تھے، جو شاکر بھائی کے کارندوں نے کھول لیے تھے۔ بھُوا نے اُن کا تقاضا کیا تو شاکر بھائی نے اُن کی واپسی اُس کے جواب سے مشروط کر دی۔ بھُوا کے جی میں آئی کہ یہاں سے نکلتے ہی پولیس میں پرچہ دے دے، ایک پولیس افسر سے اُس کی جان پہچان تھی، لیکن اُسے محسوس ہُوا کہ ڈیڑھ لاکھ رُپے کی اُسے اب کوئی خاص فکر نہیں رہی تھی۔ اِتنی بڑی رقم ہاتھ سے نکل گئی تھی اور بھُوا اُس رخِ سہ ناز کے تصور میں غرق تھا۔ وہ اسلام قبول کرنے سے وابستہ خطرات کا احاطہ کر رہا تھا۔ اُسے صاف نظر آیا کہ اُس کا قبولِ اسلام بہت سوں کے لیے قابلِ تقلید مثال تھا اور شاکر بھائی کی مسلم تنہائی کو بھی خاصا افاقہ ہو سکتا تھا، لیکن دوسری طرف اُس کی جان کو لالے بھی پڑ سکتے تھے۔ اُس کا کاروبار تباہ و برباد ہونے کا قوی امکان تھا۔ وہ آج جن میں محترم تھا اُنھی میں اچھوت بن جاتا، لیکن وہ کیا کرتا۔ وہ خانہ برباد تو اُسی لمحے ہو چکا تھا جب اُس کی موٹر مولوی صاحب کے دروازے لگی تھی۔ ہفتے بھر کی سوچ بچار سے اُس نے جانا کہ عافیت مسلمان ہونے ہی میں تھی۔ وہ دوڑا دوڑا شاکر بھائی کے پاس گیا، اُسے مژدۂ جاں فزا سنایا، مگر شاکر بھائی نے اُس کے خواب چکنا چُور کر دیے۔ مولوی صاحب گذشتہ

رات اپنی صاحب زادی کے ہم راہ وہاں سے جا چکے تھے۔ شاکر بھائی نے اُسے بتایا کہ صبح دستک دی گئی تو ان کا دروازہ اندر سے کھلا تھا۔ کئی دستکوں کے بعد جب کوئی نہ آیا تو معلوم ہُوا کہ مکان تو اندر بیا ئیں سائیں کر رہا ہے۔ مولوی صاحب اپنی اکلوتی صندوقچی اور صاحب زادی کے ہم راہ غائب ہیں۔ بھُوا نے اُنھیں بے حد تلاش کیا، لیکن کوئی اتا پتا نہیں مل سکا تھا۔ البتہ اُسے یہ سُن گُن مل گئی تھی کہ شاکر بھائی نے مولوی صاحب سے اپنے بیٹے کے لیے رشتہ مانگا تھا۔ بھُوا کو شک تھا کہ مولوی صاحب کہیں گئے نہیں ہیں، بل کہ شاکر بھائی نے انھیں غائب کروایا ہے، کیوں کہ جس مقام کو اُن کی قیام گاہ بتایا گیا تھا، بھُوا کی اطلاع کے مطابق گذشتہ کئی ماہ سے مسلسل مقفّل تھا۔ بھُوا کے اِستفسار پر شاکر بھائی سیخ پا ہو گیا اور بھُوا پر لاتوں اور گھونسوں کے ہم راہ پل پڑا۔ اُسی دن شاکر بھائی اور اُس کے کارندوں نے مار مار کے بھُوا کو ادھ موا کر دیا۔ اُسے موٹر میں ڈالنے سے پہلے شاکر بھائی نے دھمکا دیا تھا کہ مولوی صاحب کی کھوج میں وہ پھر کبھی دلواڑا میں نظر آیا تو وہ اس کی زندگی کا آخری دن ہو گا۔ بھُوا نے بتایا کہ قریباً بیس روز گزر چکے وہ دلواڑا نہیں گیا۔ مجھے دیکھ کے اُسے کچھ امید ہو چلی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ میں اگر اُس کی مدد پر آمادہ ہو جاؤں تو شاکر بھائی سے مولوی صاحب اور ان کی صاحب زادی کو برآمد کیا جا سکتا ہے، ورنہ دلواڑے کا کون سا بدمعاش تھا جس کا خرچہ شاکر بھائی نہ اٹھاتا ہے۔ اُس کے کاروبار میں شہروں کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ بھُوا کے بقول موتی سے میری جذباتی وابستگی دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ بھُوا نے یہ اندازہ لگانے میں تاخیر نہیں کی تھی کہ میں مولوی صاحب کے واقف کاروں میں سے تھا۔ شاکر بھائی میں کیا کم تھا کہ یک نہ شُد دو شُد۔

بھُوا سے گزشتی سن کر میں سناٹے میں آ گیا تھا۔ بھُوا نے بیس روز قبل تک کے حالات سنائے تھے، جب کہ میں چار دن قبل مولوی صاحب اور کورا کو لاری میں سوار ہوتے دیکھ چکا تھا، تاہم مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ لاری اڈّا کس قصبے یا شہر کا تھا۔ مولوی صاحب کے پاس وہ موتی کہاں سے آئے، جب کہ مجھے واثق یقین تھا کہ کورا کے پاس موتی یا جواہرات نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ اجنبی کی دی ہوئی مالا میرے پاس تھی۔ کورا کی ڈبیا کے جواہرات ابا جان کے پاس رہ گئے تھے۔ بھُوا کا بیان سُن کر مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ مولوی صاحب کے پاس کئی موتی مالا ہی کی صورت میں تھے، اور کورا کی پلکوں کا ایک ایک بال مجھے ازبر تھا تو اتنی بڑی مالا کیسے پوشیدہ رہتی۔ موتیوں کا معمّا میری سمجھ سے بالا تھا۔ بھُوا نے بلکتی ہوئی آواز میں یہ سب کچھ سنایا تھا۔ اس کا بیان اجڑا ہُوا تھا۔ اُسے دیکھ کے میری وحشت خاکستر ہو رہی تھی۔ ''ابھی میری بہت ساری جائیداد ہے گا۔ دکان میں لاکھوں کا مال ہے۔ بیاجار سے لاکھوں کی وصولی ہے۔ تجوری نوٹوں سے بھَکّل بھرنے کا ہے۔ سب تیرے کو دینے کا۔ بس اُس مولوی کو ڈھونڈنے کا ہے۔'' بھُوا ہاتھ جوڑ کر ہڑکنے لگا۔ میرا دل چاہا کہ گریبان چاک کروں اور قہقہوں سے اپنی نسیں پھاڑ ڈالوں۔ طمانچہ بھُوا نے مارا تھا، لیکن ہاتھ غیبی تھا۔ جنوں کا گھمنڈ ہی تو اہلِ جنوں کو سرفراز رکھتا ہے۔ زمانے میں یکتا ہونے کا احساس ہی تو ہے جو قربان پر قربان کیے جاتا ہے، جہاں نسرین ناز آفریں یکتائے چمن ہے تو وہاں بلبل خوش نوا کی مدحت سرائی بھی حسن آفریں ہے۔ نکہتِ بہاری نقوشِ آبلہ پائی ہی پہ سے ٹھک ٹھک کے گزرتی ہے۔ اس لطف کو کیا کہیے گا جو آن ہوتا کرنے سے سر اٹھاتا ہے اور ایک خمار آگیں پندار کو جنم دیتا ہے۔ بھُوا نے ایک جملے سے میرا پندار خاک برد کر دیا تھا۔ اب کیا رہا تھا میرے پاس؟ یہ تو اپنا دھرم تک تیاگ رہا تھا۔

میں بھُوا کو کیا جواب دیتا، میں تو جیسے زلزلوں کی زد میں تھا۔ اُس نے میری لب مہری کا نہ جانے کیا مفہوم اخذ کیا کہ میرے بے حد قریب ہو کے بولا، ''بھگوان نے ایسا کھوب صورت مکھڑا دوسرا نہیں بنایا، ورنہ تیرے کو جورو دکھانے کا تھا۔ جندگی میں ایک بار اسے چومنے کی اِچھا ہے۔ اور بس!''

چٹاخ! مجھے نہیں معلوم کہ میرے ہاتھ میں کتنی قوت تھی، لیکن میری انگلیوں نے بھُوا کے رخسار کی کھال چھیل دی تھی اور ان نشانات پر گوشت پھٹ کے چیتھڑوں کی طرح اُمڈ پڑا تھا۔ اس میں بھُوا کا کیا قصور۔ وہ تو نردوش تھا۔ وہ تھی ہی ایسی کہ فرزانوں کے غول دیوانے ہو جائیں۔ بھُوا کو میں بری طرح پیٹ چکا تھا، مگر لگتا تھا کہ اس تھپڑ کی لذت اس

کی پور پور میں رچ بس گئی ہے۔ اس کے فہم و ادراک نے کچھ شناخت کیا تھا، وہ تہی اور خالی نظروں سے کچھ دیر مجھے دیکھا کیا۔ اُس کی کہانی اس مسودے سے کہیں بڑی تھی جو اُس نے مجھے سنایا تھا۔ باہر شور بڑھتا جا رہا تھا، اب یہاں ٹھہرنا بیکار تھا۔ میں بھُوا کو ساتھ لے دلواڑا جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس اثنا میں دھیارا ہڑبڑاتا ہُوا اندر داخل ہُوا۔

''پولیس، دلواڑا کا پولیس ہے، جیپوں میں...''

دھیارا کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی بھُوا کی گھُٹی گھُٹی چیخ گونج گئی۔ دھیارا کے دوڑتے قدموں ہی نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کروائی تھی۔ مڑنے سے میری پشت بھُوا کی طرف ہو گئی تھی۔ اس دوران اُس نے نہ جانے کہاں سے ایک بڑا چھرا برآمد کر کے اپنا پیٹ چیر لیا تھا اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ چھرا اُس نے اپنے سینے میں اُتار لیا تھا۔ کچھ لوگ کتنے آسان ہوتے ہیں۔ آسانی سے جیتے ہیں، آسانی سے مر جاتے ہیں۔ میں بے حال ہو کے بھُوا کی طرف لپکا۔ اُس کے جسم سے خون فوّارے کی طرح اُبل رہا تھا۔ اُس کی مطمئن آنکھیں چڑھنی شروع ہو گئی تھیں۔ میں نے ہارے ہوئے جواری کی طرح اُسے جھنجوڑا۔ اُس کی آنکھوں نے آخری بار مجھے دیکھا اور اُس کی زبان نے لڑکھڑاتے ہوئے، ڈگمگاتے ہوئے کہا، ''مولبی صاحب کا کھدا (خدا)، میرا کھدا۔ اُس کی ...چھوری کا کھدا۔ میرا کھدا... میں ہندو دھرم چھوڑنے کا..''

وہ اتنا ہی کہہ سکا۔ اُس کے گلے سے ''کھر کھر'' کی نکیلی آوازیں نکلنے لگیں۔ وہ جاتے جاتے بھی مجھے گہری چوٹ لگا گیا تھا۔ صرف ایک جھلک کے عوض جان، مال اور دھرم سبھی کچھ دان کر گیا تھا۔ دھیارا یہ منظر دیکھ کے پتھر کا ہو گیا تھا۔ اُس کے پیچھے لنگو بھی ہوا کے مانند اندر داخل ہُوا تھا، اندر کا منظر دیکھ کے اُس کی آنکھیں بھی پھٹ پڑیں تھیں۔ کوئی دم تھا کہ ڈھیلے نکل پڑے۔ بستی کے امیر ترین ساہوکار بھُوا مہاجن کی خون میں تربہ تر لاش آخری ہچکیاں لے رہی تھی، اور میں اُس کے قریب بیٹھا ہُوا نہ جانے کس کا ماتم کر رہا تھا۔ دھیارا نے بدحواسی سے مجھے جھنجوڑا۔ ایسی ناگہانی کا اُسے گمان بھی نہیں تھا۔ اُس نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا، ''بابر بھائی جونا گڑھ کی پولس دکھنے کا ہے۔ ان لوگ کے ساتھ انگریج بھی چار پانچ ہیں.. ابھی یہ قتل...''

لنگو نے منتشر آواز میں اُس کی بات پوری کی۔

''اپنے کھاتے میں پڑنے کا ہے۔''

پولیس کی آمد میرے لیے غیر متوقع نہیں تھی، لیکن یہ میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ پولیس عین اس وقت آئے گی جب بھُوا کی لاش میرے زانو پر پڑی ہو گی۔ مجھے اور لیونارڈ کو اس بستی میں آئے چوبیس گھنٹے ہو چلے تھے اور کھوجیوں کے لیے یہ خاصا وقت تھا۔ اگر بھُوا کی لاش کو منظر سے ہٹا دیا جائے تو پولیس کے لیے میں اور لیونارڈ انتہائی معزز مہمان تھے، لیکن یہ ناممکن تھا۔ دھیارا، جو اَور اندر کی طرف دوڑ گیا تھا، سرگوشی میں چیخا، ''لنگو، اِدھر دروا جا۔''

اُس نے بوریوں کی اوٹ سے ایک دروازہ کھوج نکالا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ پولیس اب تک نہیں پہنچی تھی، حالاں کہ

باہر سے یہاں تک بیس قدم کا فاصلہ تھا۔ لنگو نے مجھے شانوں سے پکڑ کے اٹھایا اور لاابالی پن پیدا کرتے ہوئے بولا، ”بابر بھائی! آپ دھیارا کے ساتھ نکلنے کا ہے۔ اپنے کو ویسے ہی جیل جانے کا تھا۔“ اُس کی آواز سے تصنع مترشح تھا۔

دھیارا بھی دوڑا ہُوا آن پہنچا تھا۔ اُس نے میرا بازو پکڑ کے کھینچنا شروع کر دیا۔ میں نے بہ مشکل اپنے حواس مجتمع کر لیے تھے۔ بازو چھڑوانے کے لیے میں نے دھیارا کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اُس کا جسم شکار چڑھے خرگوش کی طرح کانپ رہا تھا۔ ان دونوں کا پہلی مرتبہ اس قسم کی صورتِ حال سے سابقہ پڑا تھا۔ جسم نے ان کی تو مشتی کا بھانڈا ضرور پھوڑا تھا، تاہم دل اُن کی آنکھوں میں دلیری سے چمک رہا تھا۔ میں نے دھیارا سے بازو چھڑاتے ہوئے کہا ”یہاں سے نکلنا ممکن ہے تو تم دونوں نکل جاؤ۔ میں یہاں دیکھ لوں گا؟“

”استاد گالی نہیں دینے کا...“ لنگو نے بگڑ کے کہا، ”ابھی چھلیا کو کیا مُنہ دکھانے کا ہے۔“

مجھے معلوم تھا یہ نہیں جائیں گے، تاہم میں نے آخری کوشش کی۔ ”تمھارا پولیس کی پکڑ سے آزاد رہنا میرے لیے بے حد ضروری ہے۔ مجھے کچھ کام لینا ہے۔ میں آسانی سے چھٹ جاؤں گا۔“

”ابھی یہ چھرا ایک اپنے کو بھی مارنے کا ہے۔ ہم نہیں جائیں گا استاد۔“ دھیارا نے اکڑتے ہوئے کہا۔ اُس کا لہجہ اٹل تھا۔ اچانک بھُوا نے زوردار ”کھر کھر“ کی۔ میری دانست میں بھُوا مر چکا تھا، لیکن نہ صرف وہ کھرکھرایا تھا، بل کہ اُس کی چڑھی ہوئی چتلیاں واپس آ گئی تھیں۔ خون خاصا بہہ چکا تھا۔

میں نے دھیارا سے پوچھا، ”یہاں اسپتال ہے۔“

بھُوا نے مجھے اِس طرح دیکھا جیسے اُسے میری ذہنی حالت پر شبہ ہو۔ ”اِدھر ڈاکٹر بھی نہیں ہے۔ بستی والے وید سے دوا لینے کا ہے۔ جیا وہ ہے تو دلوا ڑا۔“

”پولیس اب تک اندر نہیں آئی...“ بھُوا کو اسپتال پہنچانے کا پولیس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

”پہنچتا ہوئینگا۔ ابھی دُور تھا، پر بھیڑ دیکھ کر اِدھری آنے کا تھا۔ بابر بھائی، بھگوان کے لیے ابھی نکلنے کا ہے۔“

”لنگو اور دھیارا۔ اگر ہم یہاں سے نکل بھی جائیں تو بھی پولیس سے نہیں بچ سکتے۔ ان کا سامنا کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ تمھارے لیے مناسب یہی ہے کہ تم اِدھر اُدھر ہو جاؤ۔“

”بابر بھائی! آپ برابر گالی دینے کا ہے۔ ماں قسم! ایں حرامی نہیں ہے۔“ دھیارا نے دُکھی ہو کے کہا۔

”اچھا تو اسے کروٹ دینے میں میری مدد کرو۔“ میں نے جھک کے بھُوا کے بازوؤں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ تیز تیز سانسیں لے رہا تھا۔ میں نے اب دھیان سے دیکھا تھا کہ چھرا دل سے کہیں ہٹ کے سینے میں پیوست ہُوا تھا۔ دھیارا اور بھُوا دونوں ہی نے چوڑے کپڑے کے تہہ کیے ہوئے مفلر گلے میں ڈال رکھے تھے۔ میں ان کا مصرف سوچ چکا تھا۔ میں نے لنگو کا مفلر کھینچ لیا۔ سب سے پہلے چھرے پر رومال جما کے اُسے کھینچ لیا۔ بھُوا نے ایک دردآمیز جھٹکا لیا تھا۔ یہ تسلی بخش بات تھی۔ میں نے چھرا پھینکا تو اِس دوران دھیارا اپنے مفلر کو پھاڑ کے پھویا بنا چکا تھا۔ میں نے وہ پھویا اس کے سینے پر رکھ کے اوپر سے لنگو کا مفلر لپیٹ کے سختی سے گرہ دے دی۔ پیٹ کے زخم کا پھیلاؤ بہت زیادہ تھا، تاہم وہاں سے خون کا رساؤ بہت کم تھا۔ لنگو اور دھیارا کی بے چینی کم ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

”اِس سے پہلے کہ پولیس یہاں آئے، ہمیں اِسے باہر لے چلنا چاہیے۔ اِسے اٹھواؤ!“

”یہ مچنے کا نہیں ہے بابر بھائی!“ دھیارا نے نظریں چُراتے ہوئے کہا۔

میں نے بھُوا کی بغلوں میں ہاتھ ڈالے تو دھیارا اور لنگو نے سبھاؤ سے نچلا دھڑ اٹھا لیا۔

ہم اسے لے کے عقبی گودام سے دکان کے بیرونی حصے میں داخل ہوئے ہی تھے کہ ادھر سے چمکتی ہوئی وردی پہنے دو پولیس افسر، اُجلے اُجلے سے سیاہ کوٹ پتلون میں ملبوس دو بلند قامت انگریز جنھوں نے سیاہ عینک لگائی ہوئی، ان کے عقب میں چار چھ سپاہی چوکنّی حالت میں اندر داخل ہو رہے تھے۔ خون سے تربہ تر چار افراد سے سامنا ان کے لیے غیر متوقع تھا۔ ہڑبڑاہٹ میں ان کے قدم اُلٹے پڑ گئے۔ سپاہیوں نے فوراً ہماری طرف رُخ کر کے بندوقیں تان لیں۔ پولیس افسروں کے ساتھ ساتھ انگریزوں نے بھی طمنچے نکال لیے تھے۔ باہر کھڑا ہجوم تو کھڑا ہی اندر کا ایک ایک منظر حفظ کرنے کے لیے تھا۔ ہمیں دیکھ کے بہت سوں کی چیخیں نکل گئیں۔ ”رام رام، ہائے کھون ہو گیا۔ بھُوا کا کھون!“ اکثریت نے وہاں سے نکلنے ہی میں عافیت جانی تھی۔ جتنی دیر میں پولیس والوں نے بندوقیں سیدھی کیں، اس عرصے میں تماشائی تختۂ سیاہ سے مٹائے گئے لفظوں کی طرح جھڑ چکے تھے۔

”وہیں ٹھہر جاؤ! ورنہ گولیوں سے بھون دیے جاؤ گے!“ نوجوان پولیس افسر نے ہمیں طمنچے کی زد پر رکھتے اور چیختے ہوئے حکم دیا۔ وہ سب سے ایک قدم آگے آ رہا تھا۔ اُس کے کندھے پر تین پھول تھے، یعنی وہی تھانے دار تھا۔

میں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ لہٰذا انگریزی میں کہا، ”یہ شدید زخمی ہے۔ اِسے فوری طور پر اسپتال پہنچانا ازحد ضروری ہے۔“

میری زبان سے شستہ انگریزی جملہ سُن کے دونوں انگریزوں نے بے یقینی سے بھویں سکوڑ کے مجھے دیکھا، جب کہ پولیس افسر نے کچھ لمحے تولتی نظروں سے ہمارا جائزہ لیا۔ پھر قدرے نرم لہجے میں بولا، ”اندر اور کون کون ہے؟ زخمی کو نیچے رکھ دو۔“

میرے جی میں آئی کہ اُسے تیکھا جواب دوں، لیکن اِس طرح بات مزید اُلجھ سکتی تھی اور وقت کا ضیاع الگ ہوتا۔ میں نے تابع دارقسم کے لہجے میں کہا، ”جناب! اندر کوئی بھی نہیں ہے۔ یہ زخمی اِس دکان کا مالک ہے۔ اِس کی حالت انتہائی تشویش ناک ہے۔ فوری طبی امداد نہ دی گئی تو یہ مر جائے گا۔“

میری بات سُن کے دونوں انگریز آپس میں کھُسر پھُسر کرنے لگے۔ نوجوان پولیس افسر پر ناتجربہ کاری کا خوف قابض تھا۔ اُس کے چہرے پر چھانے والی اُلجھن سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اُس کا ذہن صورتِ حال کا فوری تجزیہ کرنے سے قاصر ہے۔

”جینٹلمین! کیا بار وٹیہ ڈاکو کے چنگل سے فرار ہونے والے تم ہی ہو!“ دائیں جانب کھڑے انگریز نے نرم لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔

”آپ کا اندازہ بالکل درست ہے! میرے پاس آپ کے لیے بے حد مفید معلومات موجود ہیں، لیکن ازراہِ مہربانی پہلے اِس زخمی کو اسپتال پہنچوا دیں۔“ میں نے روئے سخن مکمل طور پر اُس انگریز کی طرف موڑ لیا۔ وہ چالیس سے پچاس کے پیٹے میں تھا، لیکن بے حد مضبوط اور بھاری تن و توش کا مالک تھا۔ اُس کی آنکھیں گہری نیلی اور چمکتی ہوئی تھیں۔

پولیس افسر کے چہرے پر خفیف سی ناگواری جھلک آئی، اُسے اپنے گورے رفیق کی مداخلت پسند نہیں آئی تھی۔ اُس نے خشمگیں نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا، ”تمھارے پاس آتشیں یا غیر آتشیں جس قسم کا اسلحہ ہے، فوری پھینک دو۔“

میں نے کلپس و پیش چاقو نکال کے اُس کی طرف پھینک دیا۔ میری تقلید میں دھیارا اور لنگو کے چاقو بھی زمین پر آ رہے تھے۔

”ہاتھ اٹھا کے پیچھے مڑ جاؤ... ستیا! ان کی تلاشی لو۔“

مجھ سے رہا نہ گیا۔ ”کیا آپ نابینا ہو گئے ہیں... اِس انسان کی زندگی کے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔“

”میں نے کہا ہے کہ ہاتھ اُٹھا کے پیچھے مڑ جاؤ۔ پولیس اپنا کام بہتر جانتی ہے۔“ اُس نے درشتی سے طمنچہ دوبارہ تانتے ہوئے کہا۔

میں نے لاچاری سے ہاتھ اٹھا کے مُنہ پھیر لیا۔ دو پولیس والے سرعت سے آگے بڑھے اور ہماری تلاشی لی۔ بھُوا کی کھُسر پھُسر میں اضافہ ہو رہا تھا۔

”سر! کلیئر ہے۔“

”اے تم! تم اِدھر رُخ کرو!“

میں تذبذب سے مڑ کے دیکھا۔ وہ مجھی سے کہہ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میرے لیے شدید ناپسندی بھری ہوئی تھی۔ میں دوبارہ رُو بہ رُو ہو گیا۔ مجھے دیکھ کے دھیارا اور لنگو بھی سامنے رُخ ہونے لگے۔ انسپکٹر انگریزی میں بات کر رہا تھا۔ تلاشی لینے والے سپاہی ہمارے دائیں بائیں ہی کھڑے تھے۔ اُنھوں نے دھیارا اور لنگو کے ایک ایک ہاتھ جڑنے میں دیر نہیں کی۔

”مسٹر اجیت! وقت ضائع نہ کریں۔ اِنھیں لے کر

پولیس اسٹیشن چلیں اور زخمی کو اسپتال پہنچائیں۔ ہمیں اس شخص سے تفتیش کرنی ہے۔" نیلی آنکھوں والے انگریزی نے ناگواری سے نوجوان پولیس افسر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

تو اس کا نام اجیت ہے۔

"مسٹر فرینکلن! یہ انگلینڈ نہیں ہے۔ ہمارا کام کرنے کا اپنا طریقہ ہے، جو یقیناً ہندستانی لوگوں کو قابو کرنے کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتا ہے۔" اجیت نے ناگواری سے فرینکلن کو جواب دیا۔ فرینکلن اور اس کا ساتھی دلّی سے آئے دکھائی دیتے تھے۔ "آپ نے دیکھا، اِن تینوں کے پاس سے چاقو برآمد ہوئے ہیں، یعنی یہ عادی مجرم ہیں۔ جب اِنھوں نے فرار کا راستہ مسدود پایا تو جسے قتل کر رہے تھے اُسی کو ہاتھوں میں اُٹھا کے باہر نکل آئے۔ اب اُسے اسپتال لے جانے کا واویلا کر کے دائرۂ جرم سے باہر کرنے کی چالاک کوشش کر رہے ہیں۔"

"تو آپ کیا چاہتے ہیں مسٹر اجیت!" فرینکلن نے بھڑکتے ہوئے کہا۔

"قریب ترین اسپتال دو گھنٹے کی مسافت پر ہے، جب کہ زخمی کی حالت انتہائی..." انسپکٹر اجیت نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

مجھے سخت طیش آ رہا تھا، مگر کیا کیا جاتا۔ میں نے سلگ کر کہا، "آپ جس دوری پر کھڑے ہیں وہاں سے کسی کی زندگی اور موت کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔"

اِس دوران گودام سے ایک سپاہی چلایا۔ "آلۂ قتل مل گیا ہے جناب!"

انسپکٹر اجیت نے پُرخیال نظروں سے مجھے دیکھا اور بھُوا کے قریب پنجوں کے بل بیٹھ گیا۔

جس کی "کھر کھر" پہلے سے کم ہو گئی تھی۔ "اناڑی پن سے چاقو چلایا ہے۔ پیٹ کی صرف کھال کٹی ہے آنت اوجھڑی سلامت ہے۔ دل کا نشانہ بھی چُوک گیا۔" اُس نے بھُوا کا خون آلود کرتا اوپر اُٹھایا تھا اور چھڑی سے زخموں کی نشاندہی کرنے لگا۔ "مجھے یہ بچتا نظر نہیں آتا مسٹر فرینکلن۔"

فرینکلن نے مجھ سے پوچھا، "ہماری اطلاع کے مطابق تمھارے ساتھ ایک انگریز بھی نکل آیا ہے؟"

"جی ہاں!"

"تو پھر وہ کہاں ہے؟" فرینکلن اور اُس کا ساتھی بے تابی سے میرے قریب آ گئے۔

میں نے کڑے تیوروں سے کہا، "میں آپ کو ایک ایک تفصیل بتا دوں گا، اوّل اِس کا بندوبست کریں۔"

"فرینکلن! ازراہِ مہربانی زخمی کا معائنہ کرو!" اُس نے اپنے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ پھر اجیت سے بولا، جو خون سے لتھڑے ہوئے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ "مسٹر فرینکلن! ڈاکٹری پاس کرنے کے بعد فوج میں بھرتی ہوئے تھے۔"

"ہاں ہاں شوق سے معائنہ کریں۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے تم میں سے چھرا کس نے چلایا تھا؟"

"اس نے خودکشی کی کوشش کی ہے!" میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"کیا! خودکشی؟" فرینکلن اور اجیت بے ساختگی سے بیک وقت بولے۔ واقعی یہ حیرت ناک بات تھی۔

"تم اِس طرح سے خود کو نہیں بچا سکتے مسٹر!... نام کیا ہے؟" اجیت نے چھڑی میری ٹھوڑی سے لگاتے ہوئے کہا، اُس کی آنکھوں میں استہزائیہ مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ واقعتاً ایک تڑپتی ہوئی لاش ساتھ ہی تین قاتلوں کی گرفتاری، آلۂ قتل کی برآمدگی بہت بڑا کارنامہ تھا۔ محکمۂ پولیس میں اُس کی واہ واہ ہونے والی تھی۔

اِس دوران سائمن اُٹھ کھڑا ہوا۔ "جناب! زخم تو کاری نظر نہیں آتے، تاہم خون بہت زیادہ بہہ گیا ہے۔ فوری طور پر اِسے خون نہ دیا گیا تو یہ مر سکتا ہے۔" سائمن نے مؤدبانہ انداز میں فرینکلن سے کہا۔ اُس کے لہجے سے ماتحتی کی بُو آ رہی تھی، پھر اُس نے ہونٹ بھینچ کے اشارتاً نفی میں گردن ہلائی۔ یعنی یہ زخمی مر جائے گا۔

"تم اِس کے لیے فوری طور پر کچھ کر سکتے ہو سائمن؟" فرینکلن نے اجیت کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"اِس کے لیے جراحت گاہ تک رسائی لازم ہے جناب!"

"انسپکٹر اجیت! زخمی کو فوری اسپتال روانہ کرنا مناسب ہوگا۔ سائمن اِن کے ساتھ جا سکتا ہے۔" فرینکلن نے تحکمیہ لہجے میں کہا۔ اُس کے چہرے سے برہمی نمایاں تھی۔

"اپنا کام میں زیادہ بہتر سمجھتا ہوں مسٹر فرینکلن!"

انسپکٹر اجیت نے ترش روئی سے کہا۔ انسپکٹر اجیت کے رویے سے صاف ظاہر تھا اس کا اور فرینکلن کا ساتھ مجبوری کا نام تھا۔ "دلیر سنگھ! اسے کمیونٹی اسپتال پہنچانا تمھاری ذمے داری ہے۔ ڈی ایچ نمبر کی جیپ لے جاؤ۔ اور ہاں... ضرورت پڑنے پر میرا انتظار مت کرنا۔ پوسٹ مارٹم کا بول دینا۔" انسپکٹر اجیت نے آخری جملہ چبا کے بولا تھا۔

اس دوران ہمیں ہتھکڑیاں پہنائی جا چکی تھیں۔ میرے ساتھ کوئی تماشا گیری کر رہا تھا۔ کبھی کورا کو قریب کر دیا جاتا اور مجھے پیچھے گھسیٹ لیا جاتا اور کبھی مجھے آگے بڑھا کے کورا کو غائب کر دیا جاتا۔ اب انسپکٹر اجیت نے قتل کے الزام میں ہتھکڑیاں ڈال دی تھیں۔ حالات، واقعات اور شواہد بھی کچھ تو میرے خلاف تھے۔ بھُوا کی حالت ایسی ہی تھی کہ ایک کم فہم آدمی بھی بتا سکتا تھا کہ وہ نہیں بچ سکے گا۔ شاید سانس کے دوارے کوئی اس کے گلے میں اٹک گیا تھا۔ فرینکلن نے چپ سادھ لی تھی، تاہم خفگی سے اُس کا چہرہ ستا ہُوا تھا۔ اجیت نے سائمن کو بھُوا کے ساتھ نہیں جانے دیا تھا۔ حالات سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ فرینکلن اور سائمن کو دلّی سے جان کاری لینے کے لیے بھیجا گیا تھا، جب کہ انسپکٹر اجیت کا لہجہ ہندستان بھر میں انگریزوں کے خلاف پھیلی ہوئی نفرت کی نمائندگی کر رہا تھا، اور یہی وجہ تھی کہ اجیت نے پہلی نظر میں مجھ پر ناپسندیدگی کی ڈالی تھی، جب کہ اسی بات سے میرے اس خیال کو تقویت مل رہی تھی کہ باروتیہ واقعی مر چکا ہے اور گر کے جنگل میں پیش آنے والے حالات سے وہ کسی نہ کسی حد تک ضرور واقف ہے، اور یہ کہ اِس کی ہمدردیاں باروتیہ کے ساتھ ہیں۔ فرینکلن اور سائمن ایک طرف کھڑے کھسر پھسر کر رہے تھے۔ بھُوا کی دکان کے باہر کھڑے مجمع سے ایک فرد بھی نہ بچا تھا، سوائے پولیس کی جیپوں، سفید موٹر اور ان کے گرد کھڑے چوکس سپاہیوں کے۔ انسپکٹر اجیت، فرینکلن اور سائمن کے لیے کرسیاں ایک طرف رکھ دی گئیں تھیں۔ کچھ اہل کار موقع کی ضروری کارروائیوں میں مصروف تھے۔ ہمیں ایک کونے میں کھڑا کر دیا گیا تھا۔ فرینکلن بار بار چمکتی نظروں سے مجھے دیکھتا تھا۔ میں یقیناً اُس کے لیے کارآمد تھا لیکن انسپکٹر اجیت نے اُسے مجھ سے براہِ راست بات کرنے سے روک دیا تھا۔

"یہ کھانا بادشاہوں کے لیے بہت مناسب ہے"

اجیت خود بھی گاہے گاہے میری طرف دیکھ لیتا تھا۔ دھیارا اور لنگو خاموش کھڑے تھے، تاہم ان کے چہروں پر سراسیمگی نہیں تھی۔ باہر سے بھی کچھ سپاہی آ آ کر انسپکٹر اجیت سے دبے لفظوں میں بات کر رہے تھے اور وہ انھیں مزید احکامات دے کر بھیج رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک حوال دار نے اسے جائے وقوع پر کی جانے والی ضروری کارروائی مکمل کرنے کا مژدہ سنایا تو اُس نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کے کہا، "انھیں لے آؤ۔"

ہم تینوں کو اُس کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔

"ہاں تو محترم بابر صاحب! شروع ہو جاؤ... بھُوا سے کیا تنازع تھا، اور ہاں دھیان رہے۔ میرے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔" انسپکٹر اجیت نے اس توقع سے کہا جیسے میں اُسے سب کچھ فرفر سنانے کے لیے اشارے کا منتظر تھا۔ اُس نے انگریزی سے اجتناب کیا تھا۔

فرینکلن نے بے زاری سے ہیلو بولا، "مسٹر اجیت، آپ کا ملزم شستہ انگریزی جانتا ہے۔"

اجیت نے اُس کی بات کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔

"چلو شروع ہو جاؤ۔ میں اس دکان کو تھانہ نہیں بنانا چاہتا۔" یہ سرزنش انگریزی میں تھی۔

"میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ بھُوا نے اپنے ہاتھوں سے خود کو زخمی کیا ہے، اور یہ محض اتفاق تھا کہ اس موقع پر میں اُس کے سامنے موجود تھا۔" میں نے معتدل مزاجی کو تھامتے ہوئے کہا۔

"تو پھر یہی بتا دوں کہ بھُوا نے ایسا کیوں کیا؟"

"یہ بھوا ہی بتا سکتا ہے...میں نہیں جانتا؟"

"تم اسے لے کر عقبی گودام میں کیوں گئے تھے؟"

"وہ مجھے لے کے گیا تھا، میں نہیں۔"

"وہ تمھیں کیوں لے کے گیا تھا؟"

"یہ بھی وہی بتا سکتا ہے، میں نہیں جانتا۔"

"تمھارا مطلب ہے کہ وہ تمھیں پھنسانے کے لیے اندر لے گیا اور اپنے قتل کا الزام تمھارے سر تھوپنے کے لیے آتماہتیا کر لی۔"

"میں نے ایسا کوئی مطلب ظاہر نہیں کیا۔"

"وہی بتا دو جو تم ظاہر کرنا چاہتے ہو۔"

"میں بتا چکا ہوں!"

"بکواس بند کرو!" کرسی کی ہتھی پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے وہ اُٹھ گیا۔ اُس کا چہرہ غصّے سے لال بھبوکا ہو گیا۔ شکل وصورت کے اعتبار سے وہ خاصا خوب صورت اور وجیہہ تھا "تم پولیس کو احمق سمجھتے ہو۔"

"میں نے کب کہا کہ میں پولیس کو احمق سمجھتا ہوں، جو حقیقت ہے وہی بتا رہا ہوں۔"

"میں نے پوری زندگی میں خودکشی کا یہ طور نہ دیکھا نہ سنا، اور میں پولیس ہی میں پیدا ہُوا ہوں۔"

"تو یہ آپ کی زندگی کا نیا تجربہ ہُوا۔" میں نے اُسے اور سلگایا۔ یہ ہتھل کا ایک تیر بہ ہدف اصول تھا کہ اڈّے پر بل چلتا ہے اور تھانے میں دماغ۔ پولیس افسر جسے مجرم سمجھ لے، اُسے اپنے پاؤں میں گڑگڑاتا دیکھنا پسند کرتا ہے، اور جو نہ گڑگڑائے اُس سے نفسیاتی طور پر مرعوب ہو جاتا ہے۔ اُس نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ خودداری منوانے کے لیے پیروں میں پڑ جانے والے کبھی نامُراد نہیں ہوتے۔ مجھے آئندہ پیش آنے والے حالات کی سنگینی کا بخوبی ادراک تھا۔ معمولی سے گڑبڑ عمر بھر کے لیے جیل میں دھکیل سکتی تھی۔

"ہاں کچھ نئے تجربے دلواڑا جا کے ضرور کروں گا... بھوا مہاجن سے تم کیا معلوم کر رہے تھے؟" انسپکٹر اجیت نے سفاک لہجے میں کہا۔

اس سوال کا جواب تو تھا ہی نہیں، میں اُسے کیا دیتا۔

"انسپکٹر صاحب آپ کو غلط فہمی..."

میرا فقرہ مُنہ ہی میں رہ گیا، وہ جھنجھلاتا ہُوا پلٹا۔ اُس کی چھڑی نے میرے دایاں شانے میں مرچیں بھر دی تھیں۔

"غلط فہمی تمھیں ہے مسٹر بابر!" میرے چہرے پر کامل سکوت دیکھ کے اُسے پتنگے لگ گئے۔ "بڑے بڑے جغادری میرے ہاں پانی بھرتے ہیں۔"

"مسٹر اجیت، غیر اخلاقی رویّے سے گریز کریں۔" فرینکلن نے مجھے پُرشوق نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مسٹر فرینکلن! مجھے مجبور نہ کریں کہ آپ کو یہاں سے جانا پڑے۔" اُس نے سلگتی ہوئی آواز کی آنچ ذرا دھیمی کرتے ہوئے کہا۔

سائمن دھیرے سے کسمسایا، تاہم فرینکلن مسکرا کے خاموش ہو گیا۔ انسپکٹر اجیت فتح مندی کی زہرخند مسکراہٹ لیے دھیارا کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"نام بول؟" اُس نے ہندی میں کہا تھا۔

"دھیارا بولنے کا ہے۔" دھیارا نے سینہ پھُلاتے ہوئے کہا۔

"چھلیا کدھر ہے؟" انسپکٹر اجیت نے چھڑی سے اُس کا پیٹ دباتے ہوئے کہا۔

"چھلیا سے پوچھنے کا ہے۔"

"ابھی تو بول بھڑوے!" انسپکٹر اجیت نے برافروختگی سے دھیارا کا گریبان پکڑا اور طمانچہ جڑ دیا۔

"میّا قسم...ابھی ایک بات بولنے کا نہیں ہے۔" دھیارا نے کھولتی ہوئی آواز میں کہا اور ہونٹ بھینچ لیے۔ انسپکٹر اجیت کو باؤلے کتّے نے کاٹ لیا تھا۔ وہ وحشیوں کی طرح لاتوں اور گھونسوں سے دھیارا پر پل پڑا اور کچھ ہی دیر میں ہانپنے لگا۔ اُس کے ہٹتے ہی دو سپاہی کارِخیر میں مصروف ہو گئے، مگر دھیارا نے ہونٹوں کو فولادی شکنجے میں کس لیا تھا۔ سپاہی لاتوں اور گھونسوں کے ساتھ ساتھ بندوق کا بٹ بھی آزما رہے تھے، مگر دھیارا کی سسکی نہ نکلنی تھی اور نہ نکلی۔

تھوڑی دیر بعد انسپکٹر اجیت نے ہاتھ کھڑے کر لیے۔

"بس بس چھوڑ دو۔ حرام کی چربی ہے کنجر کی۔ اِسے گاڑی میں ڈالو... بتّی بنا کے مرچیں چڑھاؤں گا..." پھر اُس نے لنگو کو گھورا۔ "اِسے بھی ڈالو۔ سوچا تھا سالوں کو اِدھر ہی نمٹا دوں گا... ابھی چالان کٹے گا۔"

دھیارا کو وہی سپاہی گھسیٹ کے باہر لے گئے، جنھوں نے بٹ مار مار کے اُس کے ہڈیاں تڑوا دی تھیں۔

"اے چل!" ایک نے لنگو کو دھکیلا۔

"ابھی صاب سے کچھ بولنے کا ہے۔" لنگو نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"ہاں، بول کیا بولنے کا ہے۔" انسپکٹر نے سپاہی کو رُکنے کا اشارہ کیا۔

لنگو نے چیچمانی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور سانس پھلا کے بولا، "دھیارا اور بابر استاد نِردوش ہیں صاب! بھوا کے چھرا میں مارنے کا ہے۔ بھوا سے بیاج پر رُپیا لیا تھا صاب۔"

"تمھیں معلوم ہے کہ تم کیا بول رہے ہو؟" انسپکٹر اجیت کے لہجے میں تمسخر تھا۔ "میری اطلاعات کے مطابق تم کبھی نہیں مار سکتے لنگو استاد!" انسپکٹر اجیت کے اِس فقرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پوری بستی کو کھنگال چکا ہے۔

"پر ہم بھوا کو مارنے کا ہے صاب!" لنگو کی بات اٹل تھی۔

"شوق سے قبول کرو... لیکن یاد رکھو کے پھانسی یقینی ہے۔ بھوا کی ذات برادری پھندے سے پہلے تمھیں نہیں چھوڑے گی۔"

"ابھی آپ دھیارا اور بابر استاد کو چھوڑنے کا ہے۔" لنگو بولتے ہوئے ناک کی سیدھ میں دیکھ رہا تھا۔

"شریک جرم برابر کا مجرم ہے... اُسے گاڑی میں بٹھاؤ۔" انسپکٹر اجیت نے دوبارہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا، "مفت کے قاتل بنے پھرتے ہیں بھڑوے۔"

سپاہی لنگو کو دھکیلتے ہوئے لے گئے اور وہ آخر تک چیختا چلّاتا رہا کہ صاب تم اچھا نہیں کرنا کا ہے۔ بھوا کو میں مارنے کا ہے۔

"ہاں تو مسٹر بابر! اب تمھاری باری ہے۔ تم یقیناً نہیں چاہو گے کہ تمھارا حال دھیارا کی طرح کیا جائے۔" انسپکٹر اجیت نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ اُس کا غصّہ کسی حد تک ہُوا ہو چکا تھا۔ وہ مجھ سے انگریزی ہی میں بولا۔

"میں اتنی تصحیح کر سکتا ہوں کہ لنگو نے دوست داری نبھائی ہے۔ بھوا نے اپنے اوپر حملہ بھی خود ہی کیا تھا۔" میں نے اپنے لہجے میں مفاہمانہ رچاؤ لانے کی اپنی سی کوشش کی۔

"میں یہ بکواس نہیں سننا چاہتا۔ خودکشی کرنے والے دریا میں کودتے ہیں، راستے پر لٹک جاتے ہیں، پٹڑی پر لیٹ جاتے ہیں اور زہرخورانی کرتے ہیں۔ کونچوں پر چہرہ لگاتے۔ تیل چھڑک کے آگ لگا لیتے ہیں، مگر اپنا پیٹ چیر کے سینے میں خنجر گھونپنا... بہت انوکھا اور ایک دم ناممکن کام ہے۔ اِسے تھانے سے لے کر عدالت تک کوئی تسلیم نہیں کرے گا۔" فرینکلن اور سائمن کی گردنیں خود بخود انسپکٹر اجیت کی تائید میں ہلی تھیں۔

"اِسے میری بدقسمتی کہیے، لیکن حقیقی واقعہ یہی ہے۔" میں نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ انسپکٹر اجیت کی دلیل کو میرے دل نے بھی سو فی صد درست قرار دیا تھا۔

"نہیں، میں نہیں مانتا۔ یہ ناممکن ہے۔"

"دیکھیے انسپکٹر صاحب! ہمارے پاس یہاں سے فرار ہونے کا پورا موقع تھا۔ گودام میں ایک عقبی دروازہ بھی موجود ہے۔ ہم بہ آسانی وہاں سے نکل سکتے تھے، لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا، کیوں کہ ہم قاتل نہیں تھے۔" وہ اِس پہلو کو نظرانداز کر رہا تھا کہ بھوا کے سینے پر پٹّی بھی تو باندھی تھی۔

"میں اِس سوچ کو انتہائی شاطر دماغ کی کارستانی سمجھتا ہوں۔ پہلی بات یہ ہے کہ وہ دروازہ مقفّل تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ پوری بستی تمھیں بھوا سے جھگڑتے دیکھ چکی تھی۔ تمھیں یہ اندازہ ضرور ہو گیا ہو گا کہ بھاگ کر زیادہ دُور نہیں جا سکو گے۔" اُس نے کچھ توقف کے بعد کہا، "ہاں، البتہ میں یہ مان سکتا ہوں کہ بھوا پر قاتلانہ حملہ طے شدہ نہیں تھا۔ یہ ایک اتفاقی حادثہ ہو سکتا ہے۔ آخری بات سن کر تمھارا جواز یک دم زمین بوس ہو جائے گا، شکتی مان بابر صاحب!"

پھر اُس نے مجھے دیکھ کر لذّت کشید کرتے ہوئے کہا، "وہ دروازہ تم سے کیا کھلتا، سپاہیوں نے بہ دِقّت توڑا ہے، لیکن لطف کی بات ہے وہ دروازہ باہر کسی کھلیان میں نہیں کھلتا تھا، بل کہ گودام کے اندر ایک اور گودام تھا۔ ممکن ہے کہ تمھیں اِس بات کی خبر ہو کہ وہاں سے راستہ نہیں ہے۔"

"حالات غیر موافق ہیں، ورنہ میں نے ایک ایک لفظ سچ کہا ہے۔"

"تو پھر بھوا کی آتماہتیا کا محرک بتاؤ۔ اگر تمھاری بات درست تسلیم کر لی جائے تو اس آتماہتیا کا محرک تمھیں معلوم ہونا چاہیے۔ یہ قطعی بات ہے۔"

فرینکلن اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اُس نے انتہائی بےزاری سے کہا، "مسٹر اجیت! آپ کو جس مقصد کے لیے ہمارے ساتھ

بھیجا گیا تھا وہ انتہائی اہم ہے اور آپ اسے غیر اہم بنا رہے ہیں۔"

"آپ بہ صد شوق جا سکتے ہیں مسٹر فرینکلن! لیکن یہ بستی میرے تھانے کی حدود میں شامل ہے اور یہاں کا انتہائی معزز آدمی دن دہاڑے بھرے مجمع میں یقیناً قتل کر دیا گیا ہے۔ میں ایک فرض شناس پولیس افسر کی شہرت رکھتا ہوں۔ میں ملزمان سے متعلق گفتگو بستی میں رہتے ہوئے ہی کرنا ضروری سمجھتا ہوں، تاکہ مجھے بہ وقتِ ضرورت گونا گوں مصروفیات چھوڑ کر یہاں کے چکر نہ لگانے پڑیں۔"

"واہیات بات ہے۔" فرینکلن کندھے اُچکا کے دوبارہ بیٹھ گیا۔ خفت سے اُس کی پیشانی سیاہ پڑ رہی تھی۔

اُس کی خودکشی کا محرک اِتنا آسان کہاں تھا جو بیان ہوتا۔ میری زبان پر تالے پڑ گئے۔ "مجھے نہیں معلوم۔"

"تم کراچی سے بمبئی جا رہے تھے۔ بمبئی میں کہاں؟" انسپکٹر اجیت نے چبھتا ہُوا سوال کیا۔ گویا وہ میرے بارے میں مکمل چھان بین رکھتا تھا۔

"میں اپنے دوستوں کے ساتھ ہندوستان بھر کی سیر کو نکلا ہوں! کلکتہ سے تعلق ہے۔" بمبئی کا تذکرہ میں نے دانستہ گھمایا تھا۔ ابا جان تک پہنچنا ان کے لیے مشکل نہ ہوتا۔

"ہونہہ... مسٹر بابر! تمھاری شخصیت میرے لیے ایک معمّا بن چکی ہے..." اُس نے ایک لمبا سانس بھرا، پھر اُس نے ہندی میں کہا، "تم ایک ایسے جہاز میں کراچی سے سوار ہوئے جسے انتہائی منظّم انداز میں اغوا ہونا تھا۔ اِسے اتفاق نہیں کہا جا سکتا کہ اِنتی کاروں کی اکثریت بھی کراچی ہی سے سوار ہوئی تھی۔ تمھارے سفری ٹکٹ کے نمبر اسی تواتر کا حصّہ ہیں جو ٹکٹ خرید کے کرانتی کار جہاز میں سوار ہوئے تھے۔ تم انتہائی شُستہ انگریزی بولتے ہو، تمھیں جہاز کے اس حصّے میں بھی جاتے دیکھا گیا جہاں ہندوستانیوں کا داخلہ ناممکن ہے۔ مختلف انگریزوں سے تمھاری ملاقاتیں بھی دیکھی گئیں۔ کچھ مسافروں کا بیان ہے کہ ایک انگریز خاتون تمھاری واقف کار تھی، حالاں کہ وہ پہلی مرتبہ ہندوستان آ رہی تھی۔ کرانتی کاروں نے جب جہاز پر قبضہ کیا اُس وقت تم ایک سنسان گوشے میں چار انگریزوں کے ہم راہ اُن کے ہتّھے لگے۔ باروٹیہ نے جہاز کے ہندوستانی مسافروں سے نہایت اچھا برتاؤ کیا، لیکن وہ تمھیں اور تمھارے ساتھیوں کو بوریوں میں بند کر کے لے گیا۔ حیرت انگیز بات ہے۔ انتہائی تربیت یافتہ فوج جہاں فرار نہ ہو سکے، وہاں تم باروٹیہ کی قید سے فرار ہو گئے، پھر تمھیں اِس بستی میں دیکھا گیا۔ یہاں تم نے چھلیا کو زیر کر لیا، حالاں کہ چھلیا کا سکّہ پورے کاٹھیاواڑ میں چلتا ہے۔ اُس کا چاقو کوئی نہیں گرا سکا، لیکن تم نے بہ آسانی ایسا کر لیا، جب کہ ایک انگریز فوجی لیونارڈ تمھارے ساتھ تھا۔ بالکل تمھارے رفیقِ کار کی حیثیت سے، پھر تم بستی میں نکلے تو سیدھے بھُوا مہاجن کی دکان میں دیکھے گئے، وہ بھی اس حالت میں کہ بھُوا اپنی سانسیں گن رہا تھا، اور یہ وہی بھُوا ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ اپنی آمدنی کا بڑا حصّہ باروٹیہ کو تحفتاً دیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم میری تفتیش کا رُخ سمجھ گئے ہو گے۔ میرا خیال ہے کہ بھُوا کے قتل کا محرک بھی واضح ہُوا ہو گا، لہٰذا اب تمھیں بتانا ہو گا... بھُوا سے تمھیں کون سی معلومات درکار تھیں۔ یہاں تک میں جانتا ہوں کہ تم اُس سے کوئی پتا دریافت کر رہے تھے۔ کس کا پتا چاہیے تمھیں؟"

اُس کا تفصیلی تجزیہ مجھے بدحواس کرنے کے لیے کافی تھا۔ اُس کی سوچ دریا کے دو کنارے اُستوار کر رہی تھی۔ ایک جانب وہ باروٹیہ کے ساتھ کھڑا تھا اور مجھے اُس نے انگریزوں کے ساتھ دوسرے کنارے پر کھڑا کیا تھا، البتّہ اُس کی بتائی ہوئی تفصیل میں باروٹیہ کی موت، انگریزوں کی موت اور وہاں سے مایا سمیت بچ نکلنا جیسے اہم واقعات مفقود تھے۔ اِس قدر باخبر پولیس افسر سے، اِن اہم معاملات سے متعلق لاعلمی کی توقع مناسب نہیں تھی۔ اگر وہ یہ سب کچھ جانتا تھا تو اُس نے مجھ سے دانستہ پوشیدہ رکھا تھا۔ میرا دماغ بساط بھر سرعت سے ان باتوں کے اخفا کے پسِ پردہ مقاصد کھوجنے میں مصروف تھا۔ سرِ فہرست مجھے یہی سمجھ میں آیا کہ وہ فرینکلن سے یہ سب پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ میری معلومات ناقص نکلتیں۔ ایسا کچھ سرے سے ہُوا ہی نہ ہو، لیکن یہ خود بہ خود ہی رد ہو گئی تھی، کیوں کہ چھلیا سے دروغ گوئی کی مجھے ایک فی صد بھی توقع نہیں تھی اور نہ ہی اُس کے پاس ایسا کرنے کا کوئی جواز تھا۔ ایک ممکنہ وجہ اور سمجھ آئی تھی۔ اُس نے چوں کہ مجھے انتہائی شاطر اور خطرناک شخص سمجھ لیا تھا، اس لیے مجھے بے خبر رکھنے کا مقصد کسی نئی کہانی کے اختراع سے باز رکھنا بھی ہو سکتا تھا۔

وہ بھُوا مہاجن کی دکان پر جم کے بیٹھا تھا۔ فی الحال اُس کا یہاں سے کوچ کا ارادہ نظر نہیں آتا تھا۔ فرینکلن کی بے زاری عروج پر تھی۔ سورج بڑی سخاوت سے آگ برسا رہا تھا۔ انسپکٹر اجیت کا یہاں ٹھیرنے کا مقصد کچھ اور ہی دکھتا تھا۔

"انسپکٹر صاحب! آپ کی معلومات اِس حد تک درست ہیں کہ ہم چار دوست کراچی سے بمبئی جانے کے لیے جہاز میں سوار ہوئے تھے، لیکن آپ نے بھی بے بنیاد مفروضوں سے ایک غلط رائے قائم کی ہے، بالکل اسی طرح جس طرح خواہ مخواہ باروٹیہ نے ہمیں انگریزوں کا رفیق سمجھ کر جہاز سے اتار لیا تھا۔ اُس کے بعد میں نے جو کچھ بھی کیا اپنے بچاؤ اور دفاع کے لیے کیا۔ رہی بات بھُوا مہاجن کی تو پل پل کی خبروں کے ساتھ آپ کے علم میں یہ اضافہ ضرور کیا گیا ہو گا کہ بھُوا مہاجن مجھے راہ چلتے کو بانہہ سے پکڑ کر از خود دکان پر لے گیا تھا، ورنہ میں اُسے جانتا تک نہیں تھا۔ یہ سچ ہے کہ بھُوا نے خودکشی کی ہے۔ اُس نے ایسا کیوں کیا؟ اِس بارے میں قطعاً کچھ نہیں جانتا۔ یہ میری آخری بات ہے۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے... تم مہمان خانے کے آدمی ہو... وہیں فرفر بولو گے... مسٹر فرینکلن، آپ ملزم سے پوچھ تاچھ کر سکتے ہیں، لیکن جلدی جلدی۔"

"ہاں یقیناً... لیکن تنہائی ضروری ہے۔" فرینکلن نے چونکتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

انسپکٹر اجیت نے اسے مغائرت سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ انتہائی خطرناک مجرم ہے۔ اِسے میں آپ کے پاس تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔"

"مسٹر اجیت، مجھے وائسرائے کے خصوصی ایلچی کے اختیارات حاصل ہیں۔ بمبئی چھاؤنی چوکنّی حالت میں میرے اشارے کی منتظر ہے۔ لیکن مجھے گمان گزرتا ہے کہ آپ صورتِ حال کی سنگینی سے ناواقف ہیں۔" فرینکلن نے جھکتے ہوئے سخت لہجے میں کہا، "آپ کی ریاست پر فوج کشی کا امکان ہے۔ آپ جس کام سے آئے ہیں، اسے پایۂ تکمیل تک پہنچائیں۔"

خلافِ توقع انسپکٹر اجیت اُٹھ کھڑا ہُوا۔ "درست ہے مسٹر فرینکلن! آپ اِس سے بات کریں۔ میں نے ادن دوڑائے ہوئے ہیں، جلد اچھی خبر ملنے کی توقع ہے۔" پھر اُس نے جاتے جاتے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "اگر انگریزوں کے جاسوس نہیں ہو تو ان باتوں سے احتراز کرنا جن سے فوج کشی یقینی ہوتی ہو۔"

انسپکٹر اجیت باہر جا کے جیپ میں بیٹھ گیا۔ ایک سپاہی نے سلور کے پیالے میں آبِ پانی پیش کیا تو

فرینکلن نے بھی پانی کا اشارہ کیا اور بولا، ''ہندوستان کی گرمی ناقابلِ برداشت ہے۔''

میرے مُنہ سے بے ساختہ نکلا، ''تو آپ کو کس نے مجبور کیا ہے برداشت کرنے کے لیے۔ یہاں کے باسیوں کے لیے اِس گرمی میں بھی ایک حُسن ہے۔''

''بہت خوب مسٹر بابر! انسپکٹر اجیت نے آپ کو دِلّی کا جاسوس نامزد کیا ہے۔'' اُس کے چہرے پر بشاشت بکھر گئی۔

''آپ مجھ سے کیا جاننا چاہتے ہیں؟'' میرے ذہن میں واضح نہیں تھا کہ مجھے کن باتوں سے احتراز کرنے کا مشورہ انسپکٹر اجیت دے گیا تھا۔

''آرام سے بیٹھ جاؤ۔''

''ضرورت سمجھوں گا تو بیٹھ جاؤں گا۔''

''ہماری اطلاعات کے مطابق اس بستی میں تم ایک نوجوان انگریز کے ہم راہ دیکھے گئے ہو... وہ کون ہے اور کہاں ہے؟''

''وہ لیونارڈ ہے... میں صبح اُسے بستی کے ایک مکان میں چھوڑ کے آیا تھا۔''

''اوہ میرے خدا! لیونارڈ... وہ دُبلا پتلا سا بھورے بالوں والا نوجوان؟'' فرینکلن نے خوشی سے چہکتے ہوئے کہا۔

''ہاں، وہ اِسی حلیے کا مالک ہے۔''

''اخاہ! وائسرائے کا معتمدِ خاص لیونارڈ، کیا شاندار نوجوان ہے۔ براہِ مہربانی اُس مکان کی نشان دہی کیجیے مسٹر بابر!''

''وہ اس بستی کی مقبول ترین جگہ ہے، چھلیا کا اڈّا۔''

''اوہ سائمن، دیکھا ہمارا اِتنا وقت خراب کیا ہے اس ڈیش بھگت انسپکٹر نے... تم اجیت سے چند سپاہیوں کو اپنے ہم راہ لے لو اور لیونارڈ کو فوری طور پر لے کے آؤ۔''

سائمن اُس کا جملہ مکمل ہونے سے قبل اُٹھ کے چل دیا تھا۔

''ڈاکوؤں کی کتنی تعداد ہو سکتی ہے؟'' فرینکلن نے مجھ سے خاصے دوستانہ مزاج سے پوچھا۔

''اِس بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا، کیوں کہ وہ ہمیں بوریوں میں بند کر کے مسلسل محوِ سفر رہے ہیں۔''

''اُن کا مستقر کہاں ہے؟''

''ہمیں چھکڑوں میں لاد کر غالباً مستقر ہی کی جانب لے جایا جا رہا تھا، تاہم میں اُس راستے میں سے بچ نکلا تھا مگر...''

''اوہ مسٹر بابر! آپ فکر نہ کریں۔ انسپکٹر اجیت آپ کو ایک دن بھی سلاخوں کے پیچھے نہیں رکھ سکتا۔ صرف دلواڑا پہنچنے دیں۔''

''وہ دلواڑا تک پہنچنے نہیں دے گا۔'' آخر میں اس بدترین خدشے کا اظہار کر دیا جو بڑی دیر سے میرے دماغ میں کلبلا رہا تھا۔

اس دوران سائمن واپس آ گیا۔ ''انسپکٹر اجیت کا کہنا ہے کہ وہ پہلے ہی بستی کا کونا کونا چھان چکا ہے، لیونارڈ کہیں نہیں ہے۔ انسپکٹر کا خیال ہے کہ وہ یہاں بیٹھ کر انتظار کرنے کے بجائے از خود سرکاری پناہ کی کھوج میں نکل گیا ہوگا۔''

انسپکٹر اجیت نے سراسر جھوٹ بولا تھا۔ لیونارڈ میرے بغیر کہیں نہیں جا سکتا تھا۔ میرے دل سے بے اختیار لیونارڈ کے لیے سلامتی کی دعا نکلی۔

''اوہ...!'' فرینکلن کا چہرہ بُجھ گیا، پھر اُس نے مجھے استفہامیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا، ''تم کئی دن سے لیونارڈ کے ساتھ ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ جا سکتا ہے۔''

''میں اِس بارے میں واضح رائے نہیں دے سکتا، تاہم وہ جلد از جلد یہاں سے نکل چلنے کا خواہاں تھا۔'' میں نے گول مول جواب دیا، حالاں کہ مجھے یقین تھا کہ لیونارڈ یوں نہیں جا سکتا۔

فرینکلن نے مجھے گھور کے دیکھا اور پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔

''سائمن! ہمیں خود اُس مکان تک جانا چاہیے! انسپکٹر اجیت پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔''

انسپکٹر اجیت اندر اُٹھ آیا تھا ''پیغام آ گیا ہے، مسٹر فرینکلن! باروٹیہ مذاکرات کے لیے تیار ہے۔ کل اُس کا نمائندہ دلواڑا پہنچے گا۔''

باروٹیہ زندہ نہیں تھا تو انسپکٹر اجیت بہت بڑا فن کار تھا۔ اُس کے چہرے نے جھوٹ کی چغلی نہیں کھائی تھی۔

''اوہ، یہ بھی اچھی خبر ہے۔ مسٹر اجیت، میں چھلیا کے مکان تک از خود جانا چاہتا ہوں۔'' فرینکلن نے اجیت کی فراہم کردہ اطلاع پر مبہم سی خوشی کا اظہار کیا تھا۔ وہ اجیت پر اعتماد کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔

''نہیں مسٹر فرینکلن، آپ کی حفاظت میرے فرائض میں شامل ہے۔ اِس بستی کا چپّا چپّا باروٹیہ کا وفادار ہے۔''

''تو پھر میں آپ کی معیت میں وہاں جانا چاہوں گا۔''

''ہم واپس جا رہے ہیں۔ مجھے باروٹیہ کی طرف سے جواب کا انتظار تھا۔''

انسپکٹر اجیت فرینکلن کی بات سُنے بغیر واپس مڑ گیا۔ اُس کے ساتھ آئے دو سپاہیوں نے مجھے بھی اُس کے پیچھے دھکیلا۔ ''صرف اس ہندوستانی افسر پر بھروسا کرنا چاہیے، جس کے ساتھ وقت بِتایا ہو، ورنہ یہ سب ناقابلِ بھروسا ہیں۔'' میں نے اپنے عقب میں فرینکلن کی دبی دبی آواز سُنی۔

چار جیپوں کے علاوہ باہر قیدیوں کو جیل سے عدالت لے جانے والی ویگن بھی کھڑی تھی۔ کلکتہ میں مقدمے کی شنوائی کے دوران مجھے جیل سے عدالت ایسی ہی ویگن میں لے جایا جاتا تھا۔ مجھے لات مار کے ویگن میں دھکیل دیا گیا۔ ویگن میں لنگو اور دھیارا کے علاوہ لیونارڈ بھی موجود تھا۔ ہتھ کڑیوں کے ساتھ ساتھ لیونارڈ کے مُنہ پر بھی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کے اُس کی آنکھوں میں چمک بڑھ گئی تھی۔ وہ لپک کے میرے ساتھ آ لگا تھا اور خوشی سے جھوم رہا تھا۔ میرے سوار ہوتے ہی ویگن چل پڑی۔ تاہم جیپیں وہیں کھڑی تھیں۔ اِس کا مطلب تھا کہ وہ فرینکلن کی لاعلمی میں ہمیں پہنچانا چاہتا تھا، گو کہ کلائیاں ہتھ کڑیوں میں جکڑی تھیں، تاہم میں نے بہ آسانی لیونارڈ کے مُنہ سے لپٹی پٹی کھول دی۔ کپڑے کا ایک گولا اُس کے مُنہ میں بھی ٹھسا ہُوا تھا۔ لیونارڈ نے بتایا کہ میرے جانے کے کچھ دیر بعد ہی پولیس وہاں پہنچ گئی تھی، اور اس سے کچھ پوچھے سمجھے بنا ہی اُنھوں نے ہتھ کڑیاں ڈال دی تھیں۔ لیونارڈ کا خیال تھا کہ پولیس باروٹیہ سے ملی ہوئی ہے اور ہمیں واپس اُس کے پاس لے جایا جا رہا ہے۔ ویگن موٹی فولادی چادر سے مکمل ڈھکی ہوئی تھی، اس کی چھت پر ٹِنچے کی گولیوں جتنے سوراخ ہَوا کی آمد و رفت کے لیے موجود تھے، البتہ اطراف سے مکمل بند تھی۔ ہم باہر کے مناظر دیکھنے سے یک سر عاری تھے۔ لنگو بار بار کہہ رہا تھا کہ وہ جج صاحب کے سامنے انسپکٹر اجیت کی ساری بازی الٹ دے گا۔ جج صاحب لنگو کے علاوہ باقی سب کو رہا کر دیں گے۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد ویگن رک گئی۔ کچھ دیر بعد ہمیں اتارا گیا۔ وہ پولیس کی عمارت تھی۔ لیونارڈ کے مُنہ سے پٹی

غائب دیکھ کے ایک اہل کار نے بے دریغ اُس کی کمر پر کہنی جڑ دی۔ ''ان حرامیوں نے کھول ہوگی... ماں کے۔''

''اِنھیں الگ الگ بند کرنے کا ہے۔'' اندر سے ایک موٹے حوالدار نے برآمد ہوتے ہوئے کہا۔ اُس کے ہاتھ میں رجسٹر تھا۔

''نام بول۔'' اُس نے مجھ سے پوچھا تھا۔

میں بتا دیا۔ ''بابر۔''

پھر اُس نے باری باری باقی تینوں کے نام وہیں کھڑے کھڑے درج کیے۔ اس کے بعد سپاہیوں کو ہدایت دی کہ انگریز کو ''لین'' میں ڈال دو اور باقی تین کو پچھلی کوٹھڑیوں میں الگ الگ بند کر دیا جائے۔ ''لین'' سے مراد غالباً پولیس والوں کی رہائشی کھولیاں تھیں۔ دو سپاہی لیونارڈ کے دائیں طرف جہاں عمارت کے ساتھ آگے تک گھروندے کی جھاڑیاں چلی گئی تھیں، لے گئے جب کہ ہمیں تھانے کا دالان عبور کر کے چھوٹی چھوٹی حوالاتی کوٹھڑیوں میں بند کر دیا گیا۔ ہماری ہتھ کڑیاں کھول دی گئی تھیں۔ کوٹھڑی میں میرے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ مرے ہوئے چوہے اور پیشاب کی سیلن زدہ بساند سے قے مُنہ کو آ رہی تھی۔ میں دروازے ہی سے لگ کے بیٹھ گیا، اور مُنہ سلاخوں میں پھنسا لیا، یوں کچھ قابلِ تنفس ہَوا پھیپھڑوں کو ملنے لگی۔ سامنے دو ہاتھ کی راہداری اور اس کے دوسرے سرے پر قدِ آدم دیوار تھی۔ اس دیوار کے سوا باہر کا کوئی منظر یہاں سے نظر نہیں آ سکتا تھا۔

انسپکٹر اجیت نہ جانے کیا کرنا چاہتا تھا۔ اِس امر میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ اُس کی پشت پر ریاستی عمّال موجود تھے۔ باروٹیہ کا ڈراما ریاست ہی کی ہدایت کاری میں پیش کیا گیا تھا۔ البتہ ریاست اس معاملے میں براہِ راست ملوث ہونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ انسپکٹر اجیت کے مطابق باروٹیہ زندہ تھا، جب کہ چھلیا کے بہ قول باروٹیہ بٹھل کے ہاتھوں ہلاک ہو چکا تھا اور باروٹیہ کے دستِ راست نے تمام مغویوں کو طیش میں آ کے ہلاک کروا دیا تھا۔ دونوں طرف بے پناہ تضاد تھا۔ مجھے ان باتوں سے کیا سروکار تھا؟ بٹھل نہ جانے کہاں سر ٹکرا رہا ہوگا۔ ان الجھاووں میں میری جمرو کی امید زندہ ہوئی تھی۔ مجھے یقین تھا وہ بہ خیر ہوگا، مگر میرے مارے جانے کی اطلاع نے انھیں کہاں جیتا چھوڑا

ہوگا۔ بٹھل مجھے دیکھ کے نہالوں نہال ہوجائے گا۔ بٹھل کا سوختہ چہرہ تصور میں آتے ہی نہ جانے کیا ہوا، آنکھیں بھل بھل بہنے لگیں، سینہ ہانڈی کی طرح اُبلنے لگا۔ نہ جانے وہ اِس وقت کہاں تھے۔ کورا یہیں اِسی شہر میں رہ رہی تھی۔ دو ہاتھ کے فاصلے سے پھر کہیں جا چھپی تھی۔ مجھے شاکر بھائی سے ضرور ملنا تھا۔ کیا خبر وہاں سے کوئی خبر ہی مل جائے۔ وہ بھی تو مولوی صاحب کی تلاش میں سرگرداں ہوگا، لیکن میں یہاں سے نکل سکوں گا!

مجھے جائے وقوع سے رنگے ہاتھوں گرفتار کیا گیا تھا۔ انسپکٹر اجیت خوب ٹھونک پیٹ کے چالان بنائے گا۔ کم سے کم سزا عمر قید تھی۔ چلو اچھا ہے، خس کم جہاں پاک۔ اس طرح ایک عالم سکون میں آجائے گا۔ نہ جانے کتنے ہیں جو میرے شوق میں اذیتوں کی مالائیں پہنے بیٹھے ہیں۔ مالائیں بھی کیا ہیں، طوق ہیں۔ موت کے طوق۔ ایک میرے اِدھر اُدھر ہونے سے کیا قیامت آجائے گی۔ بہت سوں کو دھیرے دھیرے صبر آجائے گا۔ بٹھل کو زریں سنبھال لے گی، مگر کورا! اِس نام پر میری سوچ کے تمام دروازے بند ہوئے تھے، کوئی چپکے سے کھٹکھنایا کہ میں مرتے دم تک تمھارا انتظار کروں گی بابر!

وہ پورا دن یونہی گزر گیا، پھر رات آئی، وہ بھی گزر گئی۔ انسان بھی پانی ہی کی طرح ہے، ہر رنگ قبول کر لیتا ہے۔ کوٹھڑی کے تعفن سے حواسِ خمسہ سے دوستی کر لی تھی۔ اب وہاں تعفن محسوس نہیں ہوتا تھا، کوٹھڑی میں شاید وہ بھول گئے تھے۔ اب تک وہاں سے کوئی پہرے دار بھی نہیں گزرا تھا۔ میں سر نہوڑائے بیٹھا تھا کہ کسی کے قدموں کی چاپ دروازے پر آ کے رکی۔

”اوہیڑ رے۔ پیر ہٹا!“

میں نے سر اٹھا کے دیکھا۔ ایک سپاہی چنگیری لیے بیٹھا تھا، میں نے پیر کھسکا لیے۔ اُس نے دروازے کی نچلی دراڑ سے چنگیری اندر کھسکا دی۔ پتلی سی روٹی میں چنے کی دال چپڑی ہوئی تھی۔ مٹی کے کٹورے میں دو گھونٹ پانی تھا۔ سپاہی جس طرح آیا تھا ویسے ہی چلا گیا۔ چنگیزی اور پانی گھنٹوں یونہی پڑا رہا۔ پھر مجھے خبر نہ ہوئی کہ کب میں نے وہ روٹی زہر مار کی، مگر مجھے اپنی سُدھ بُدھ نہ رہی۔ میں پہروں گھٹنوں میں سر دیے پڑا رہا۔ پہروں دیوار تکتا رہا۔ کوئی دیکھتا تو سنگی مجسمہ مان لیتا۔ میرے دل و دماغ بے خیالی کی آماج گاہ بنے رہے۔ میں دروازے سے لگا بیٹھا رہا۔ کتنے ہی اندھیرے دن اور کتنی ہی سیاہ راتیں گزر گئیں۔ مجھے پتا نہ چلا۔ کبھی امی جان لاڈ سے کہتیں کہ یہ زردہ بابر کے لیے بنایا ہے۔ کبھی منی کے گھنگرو آنکھوں کو اُدھیڑ ڈالتے۔ کبھی کورا کی چیخیں کان پھاڑتیں، کبھی پیرو کی ارتھی سامنے رکھی نظر آتی۔ کبھی مارٹی کا چیختا لہجہ مجھے گرداب میں لے گھومتا تو کبھی کانتے مجھے کندھوں پر اٹھا کے جھومتا۔ کبھی سلطان خاموشی سے میرے سامنے کھڑے ہوجاتا۔ کبھی زریں اپنی پرچھائیں سے مجھ پر سایہ کرتی تو کبھی جولین سر جھکائے سراپائے انتظار نظر آتی۔ اِس بے چہرہ دیوانگی نے کتنے دن اٹھا پٹخ کی، پتا نہ چلا۔ آخر ایک دن جب اجالا دیوار پر آئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ کوٹھڑی کا دروازہ کھولا گیا۔ وہ دو سپاہی تھے ”چنی رام، اٹھو جی اٹھو، ابھی کھلاص ہونے کا ہے۔“

میں نے اٹھنا چاہا، مگر گھٹنے تو پتھر میں ڈھل چکے تھے، بالکل ساکت، جامد!

سپاہی نے میری کسمپرسی محسوس کر لی تھی ”کچھ نہیں کھاؤ گے تو یہی حال ہوگا، اب اٹھا نہیں جاتا؟“

میں نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ خدا ترس لگتے تھے، پھر اُن دونوں نے مجھے کندھوں سے پکڑ کے اٹھایا۔ زنگ آلود قبضوں کی طرح گھٹنے چرچرائے۔ سر بُری طرح چکرایا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ سپاہی پہلے ہی بساط سے بڑھ کے ہم دردی کا مظاہرہ کر چکے تھے۔ تقریباً گھسیٹتے ہوئے مجھے لے چلے۔ تھانے کی عمارت اجلی اجلی اور دھلی ہوئی لگ رہی تھی۔ دالان عبور کر کے پنج سیڑھی آ گئی۔ گیروے رنگ کے بڑے بڑے گملے زوب قطار چاروں طرف رکھے تھے۔ پودوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ وہ سیڑھیوں پر بھی مجھے گھسیٹتے ہوئے اوپر لے گئے۔ جہاں ایک راہداری تھی جس میں دُور تک گہرے سرمئی دروازے چلے گئے تھے۔ ایک دروازے کے باہر سر پر دستار سجائے، بغل میں سنگین والی بندوق دبائے، چمکتی ہوئی وردی میں ملبوس ایک سنتری چاق و چوبند کھڑا تھا۔ مجھے اسی دروازے سے اندر لے جایا گیا۔ وہاں ایک عریض میز کے عقب میں پولیس افسر بیٹھا تھا، جب کہ اُس کے سامنے انسپکٹر اجیت اور ایک دوسرا افسر مؤدب بیٹھا تھا۔

”اوہ! اجیت، تم نے تو نوجوان کا حلیہ بگاڑ رکھا ہے!“ ادھیڑ عمر پولیس افسر نے مجھے دیکھتے ہی کہا، تاہم اُس کا لہجہ سطحی اور جذبات سے عاری تھا۔ کندھوں پر ایس پی کے عہدے کے پھول چمچما رہے تھے۔

”سر! آپ جانتے ہی ہیں، گزشتہ پانچ روز کس قدر مصروفیت کے حامل رہے ہیں۔“ اجیت نے تولتی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ خاصا خوش نظر آ رہا تھا۔

”بے شک! تم نے تاریخی کام کر دکھایا۔ بے حد حیرت انگیز رہے ہو۔“ ایس پی کے چہرے سے بھی خوشی پھوٹ پڑ رہی تھی۔ ”ریاست بہت بڑے کشت و خون سے بچی ہے۔ اِس میں اِس جوان کا اور اِس کے ساتھیوں کا بھی ہاتھ ہے۔“ پھر اس نے روئے سخن مکمل طور پر میری جانب کیا۔ مجھے چونکانے کی بھرپور سعی کرتے ہوئے اُس نے کہا، ”بابر صاحب! حکومت ہندستان نے آپ کی رہائی کے لیے خصوصی سفارش کی ہے حالاں کہ ہمارے پاس آپ کی گرفتاری کا کوئی جواز بھی نہیں رہا تھا۔“

ایس پی مجھے بہ غور دیکھ رہا تھا۔ شاید اُسے میرے چہرے پر خوشی کی کوئی رمق تلاش کرنے میں ناکامی ہوئی تھی۔ اُسے کیا خبر تھی کہ مجھے تو ایک گوشۂ عافیت سے محروم کر دیا گیا تھا۔ میں پتھر بنا کھڑا تھا۔ مُنہ میں تپتی ہوئی گھنگھنیاں ڈالے۔

”پے در پے ناگہانی مصائب حواس سلب کر لیتے ہیں۔ آپ کے ابتلا کا زمانہ ختم ہوا بابر صاحب... آپ کو رہا کیا جا رہا ہے۔“

”ناروا سلوک پر معذرت خواہ ہوں۔ پیشہ ورانہ تقاضے ہمیں مجبور رکھتے ہیں۔“ انسپکٹر اجیت بولا۔ بالکل ایسے جیسے زمین پر تھوک پھینکا ہو۔ اُس کے لہجے میں نفرت کا عنصر چھپائے نہیں چھپتا تھا، جب کہ ایس پی متوازن لہجے میں بات کر رہا تھا۔ اُس نے اجیت کو آنکھوں ہی آنکھوں میں سرزنش کی اور کھنکھار کے بولا ”بھوا مہاجن نے مرنے سے قبل ڈاکٹر کو بیان دیا تھا۔ اُس کے اعترافِ خودکشی سے آپ بالکل صاف ہوگئے ہیں۔“

میرے گھٹنوں میں پھڑکنے والا درد ناقابلِ برداشت ہوگیا تھا۔ میں لڑکھڑا کے گر پڑا۔ ایس پی سپاہیوں کو مغلظات سے نوازتے ہوئے لپکا، اور مجھے سہارا دے کر اٹھایا۔ نقاہت سے میرا سر بُری طرح چکرا رہا تھا۔ اپنے افسر کو لپکتا دیکھ کے اجیت اور اُس کے ساتھی پولیس افسر بھی لپک کے اٹھ آئے تھے۔

”اجیت، تم نے بیلنا چلایا ہے؟“ ایس پی نے ناراضی سے گردن جھٹکتے ہوئے کہا۔

”سر، اِسے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ گرفتار کر کے بند کر دیا تھا۔ آج باہر نکالا ہے۔“ اجیت نے مستعدی سے جواب دیا۔

”کھانا پانی؟“

ایس پی کے سوال پر اجیت نے مجھے لانے والے سپاہیوں کو جواب دینے کا اشارہ کیا۔

”وہ سر! برابر تین وقت بھری پلیٹ کھلائی ہے“ سپاہی نے چور نظروں سے اجیت کو دیکھا۔ ”لیکن...“

”لیکن کیا؟“ ایس پی بولا۔

”اُس نے نہ کھانے کے برابر کھایا ہے“ سپاہی نے دُزدیدگی سے اجیت کی طرف دیکھا۔

”نرائن! تم پانچ دن تک پرچیاں دست خط کرواتے رہے ہو!“ اجیت میز پر ہاتھ مارتے مارتے رہ گیا۔

”کھانا برابر آیا ہے سر!“ سپاہی سہم گیا۔

”بالکل برابر آیا ہوگا، مگر اِس تجری ساوتری کے لیے...“

''ساوتری!'' سپاہی نرائن نے تھوک نگلا۔
''ہاں، وہ کالا چمڑا ساوتری۔ مجھے اپنے ماتحتوں کی مکمل خبر رہتی ہے۔ تم دیوالی سے اب تک جتنا چوبارہ چڑھ چکے، سب پتا ہے، سب جانتا ہوں۔''
''لیکن اپنے تھانے کی خبر نہیں۔ حوالات میں ملزمان کو بھوکا مارا جا رہا ہے، لیکن تمھیں اِس بات کی خبر ہے کہ نرائن کس رنڈی کے پاس جا رہا ہے۔ خوب اجیت! خوشی کی بات ہے۔'' ایس پی نے کہا، جو کچھ دیر پہلے اجیت کی مدحت میں رطب اللسان تھا۔
''جی سر!'' اجیت کے پاس شاید یہی جواب تھا۔
''جی سر سے بات نہیں بنے گی، اجیت! ذرا اِن کا حال دیکھو! اگر دو ایک دن اور گزر جاتے تو ایک مردہ آدمی کی رہائی کے نتائج سے تم واقف ہو؟ پھر ایک ایسا آدمی جس کے لیے وائسرائے کا رُقعہ آیا ہے!''
''جی سر۔''
''مجھے مکمل رپورٹ کرو! جس کی کوتاہی ہے، اُسے سزا ملنی چاہیے۔''
''جی سر۔''
سپاہی نرائن جو کہیں سے پیالے میں دودھ بھر لایا تھا، اُس نے وہ سلور کا پیالہ میرے منہ سے لگا دیا۔ میں نے خاموشی سے پی لیا۔
''بابر صاحب، میں معذرت خواہ ہوں! ورنہ آپ یقین جانیے ریاست کی پولیس انتہائی اعلا اقدار کی حامل ہے۔''
''میں آپس سے انتہائی شرمندہ ہوں۔'' اجیت نے انتہائی سپاٹ لہجے میں کہا۔
''بابر صاحب! دراصل میں نے آپ سے انتہائی اہم باتیں کرنی ہیں۔ ہمیں آپ کی مدد درکار ہے۔''
میں خاموشی سے اُسے دیکھتا گیا، مجھ سا تہی داماں بھی کیا اُس نے دیکھا ہے۔
''ایس پی صاحب! مجھے رہا کرنا ہے تو کردیں یا حوالات میں بند کردیں، لیکن خدارا مجھے تنہا چھوڑ دیں۔'' میں سسک پڑا تھا۔ میرا بند بند ٹوٹ رہا تھا۔
''میں اپنی شرم ساری بیان نہیں کرسکتا۔ ہندستانی ہونے کے ناتے ہماری پوری ریاست کو آپ کی مدد درکار ہے۔ اور کوئی ایسا گراں بار کام بھی نہیں۔ ہمیں امید ہے کہ آپ بہ آسانی کرسکیں گے!'' ایس پی نے انتہائی متانت اور کمال سنجیدگی سے کہا۔ اُس کا لہجہ اپنائیت سے بھرا ہُوا تھا۔
مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ اُنھوں نے کسی خاص مقصد ہی کے لیے مجھے یہاں بلوایا ہے۔ اگر صرف رہا کرنا ہی مقصود ہوتا تو پکڑ کے دروازے کی راہ دکھا دیتے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کام انسپکٹر اجیت سرانجام دے لیتا۔ دودھ سے نقاہت کو کافی افاقہ ہُوا تھا۔ ''مجھ سے محقّق یقیناً آپ کو کوئی شدید غلط فہمی ہوئی ہے، تاہم کہیے کہ میں ہندستانی ہونے کے ناتے کیا کرسکتا ہوں۔'' میں نے اٹکتے ہوئے کہا تھا۔
''مجھے آپ سے اِسی جواب کی توقّع تھی۔ میرا خیال ہے پہلے کھانا کھا لیا جائے۔'' ایس پی نے دروازے سے داخل ہوتے سپاہی کو دیکھ کے کہا، جس کے ہاتھ میں کھانے کے سامان سے لدی پھندی تھال تھی۔ ''بس یہیں رکھ دو۔'' ایس پی ازخود میرے سامنے سے میز پر رکھی فائلیں اور دفتری سامان ایک طرف رکھنے لگا۔
''ارے سر! آپ زحمت نہ کریں۔''
''اوہ نہیں اجیت! یہ بہت خاص مہمان ہیں۔''
سپاہی نے میرے سامنے تھال رکھ دی۔ مجھے بھوک کہاں تھی۔ جو ضرورت تھی وہ دودھ سے پوری ہوگئی۔
''کہیے! میں کیا کرسکتا ہوں؟'' میں نے اجیت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ میری پذیرائی سے ناخوش نظر آ رہا تھا۔ اُس کے کھچاؤ کا سبب واضح تھا۔ وہ مجھے انگریزوں کا گماشتہ سمجھتا تھا۔ اس کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ وہ کرانتی کاروں کے ازحد قریب تھا یا کرانتی کار تھا۔
''بابر صاحب! پہلے آپ کھانا کھائیں، مجھے مزید شرمندہ نہ کریں!'' ایس پی بولا۔
''مزید کی حاجت نہیں، ورنہ بھوک کے ہاتھ کون باندھ سکتا ہے۔'' میرے لہجے میں خود بہ خود اکتاہٹ بھر آئی تھی۔ اس وقت تنہائی سے بڑھ کر مرا چارہ گر کوئی نہ تھا۔ ایس پی اپنے ہی شوق میں مبتلا تھا۔
''میں آپ کے فولادی اعصاب کا قائل ہوگیا ہوں بابر صاحب! پانچ دن کا بھوکا آدمی ندیدوں کی طرح ٹوٹ پڑتا، جب کہ آپ نے دودھ بھی انتہائی متانت سے نوش کیا، لیکن جسم کے تقاضے تو بہ ہر حال، موجود رہتے ہیں۔''
ایس پی کی آواز جذبات سے بوجھل ہوگئی۔
''میرے تقاضے میں جانتا ہوں، آپ کہیے، جو کہنا ہے!'' میں نے بے زاری سے کہا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اٹھوں اور یہاں سے کسی بیاباں کی سیدھ میں دوڑتا چلا جاؤں۔
''ٹھیک ہے بابر صاحب! اگر آپ ہمارا کھانا پسند نہیں کر رہے... تو آپ سے مدد طلب کرنے کا ہمیں بھی کوئی حق نہیں۔'' ایس پی کا لہجہ خلوص سے چھلکنے لگا۔
مقدر کا لکھا بھی تقدیر ہی پڑھتی ہے۔ کل تک انھی لوگوں نے جان وروں کی طرح ایک کوٹھڑی میں مجھے ٹھونس رکھا تھا اور آج پلکوں پر بٹھا رہے تھے۔ میں نے بھی مقدر کا لکھا سمجھ کے دو چار لقمے زہر مار کر لیے اور خاموش ہوگیا۔
ایس پی کچھ دیر مجھے بہ غور دیکھتا رہا پھر بولا، ''بابر صاحب! اِس میں دو رائے نہیں ہیں کہ آپ دلّی سرکار کے خاص آدمی ہیں۔ آپ کے لیے وائسرائے کا ذاتی رُقعہ آیا ہے، جب کہ دیگر شواہد بھی یہ اشارہ کرتے ہیں کہ آپ انگریزوں سے انتہائی قریب ہیں۔''
''ایس پی صاحب! باروٹیہ کی بھی یہ شدید غلط فہمی تھی اور آپ کی بھی ہے۔ چند اتفاقات سے آپ نے افسانوی تانا بانا بن لیا ہے۔''
''باروٹیہ کی یہی سب سے بڑی غلطی تھی کہ اُس نے غلط فہمی کو غلط فہمی میں سمجھا تھا، تبھی مارا گیا...'' ایس پی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''لیکن بابر صاحب، ہم اِس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے۔ بس ایک ہندستانی کے ناتے آپ سے درخواست ہے، یہ آپ پر منحصر ہے کہ اِسے قبول کرلیں یا رد کردیں۔''
''مجھے انگریزوں کا گماشتہ کہلوائے جانے سے انتہائی نفرت ہے۔ گالی مت دیں ایس پی صاحب۔'' اچانک مجھے طیش آ گیا تھا۔
''میں معذرت خواہ ہوں بابر صاحب! تاہم میں یہ سمجھتا ہوں کہ معاملہ آپ کے گوش گزار ضرور کروں...'' مجھے خاموش دیکھ کے وہ گویا رہا۔ ''بابر صاحب، جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ باروٹیہ نے لندن سے بمبئی جاتے مسافر جہاز سے ایک سو دس انگریزوں کو اغوا کر کے ویرادل کی بندرگاہ پر اتار لیا تھا اور وہ انتہائی کام یابی سے مغویوں کو ویرادل سے گر کے جنگل تک لے جانے میں کام یاب ہوگیا تھا۔ دلّی کی سرکار کو ہماری ریاست سے سب سے بڑی شکایت یہ ہوئی کہ آخر باروٹیہ نے ریاست کی نظروں میں آئے بغیر اڑھائی سو میل کا یہ سفر کس طرح کیا، جب کہ کم وبیش ڈیڑھ سو چھکڑوں کا قافلہ ہوگا!... حالاں کہ حقیقتاً ایسا ہی ہُوا تھا۔ ریاست کو بالکل علم نہ تھا، کیوں کہ اس راستے پر چھکڑوں کے قافلے معمول کی بات ہیں، جنگل سے بندرگاہ تک لکڑی، ناریل، اناج، جڑی بوٹیاں وغیرہ انھی چھکڑوں کے ذریعے لائی جاتی ہیں۔ باروٹیہ جس قافلے میں مغویوں کو لاد کے لے گیا تھا وہ بندرگاہ پر شیشم کی لکڑی ڈھو کے واپس ساسن گر کی طرف جا رہا تھا، جب کہ ڈاکوؤں سے بچاؤ کے لیے چند اجرتی گھڑسواران چھکڑوں کے ساتھ ہمیشہ چلتے ہیں، جنھیں مقامی لوگ بندوقچے کہتے ہیں۔ بندوقچوں کو اُجرت بھی وہی دیتا ہے جس کا مال چھکڑوں پر لدا ہوتا ہے، لہٰذا بابر صاحب آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ باروٹیہ کے لیے وہ چھکڑے استعمال کرنا کتنا آسان تھا۔ ہمیں تو اس سانحے کی خبر تیسرے دن ہوئی جب دلّی سے تار آیا۔ بحری جہاز کو بچا کھچا عملہ بلا توقف بمبئی لے پہنچا تھا۔ ہمیں فی الفور اطلاع مل جاتی تو ہم باروٹیہ کو راستے میں جا لیتے، تاہم اس کے تعاقب میں گر کے جنگل میں گھسنا خودکشی تھا۔ گر جنگل کا چپّا چپّا باروٹیہ کا تابع دار ہے اور اس کا مخبر ہے۔ بہ ہر حال، ریاست نے مغویوں کی بازیابی کے لیے اپنی بھرپور کوششوں کا آغاز کردیا، لیکن دلّی حکومت نے اپنے تاثرات سے مسلسل یہی پیغام دیا کہ یہ سانحہ ریاستی مدد کے بغیر ممکن نہیں ہے اور ریاست کو مختلف سفارتی انداز میں دھمکانا شروع کردیا لیکن اِس کے برعکس ریاست نے اپنی فوج کو جنگل میں کارروائی کا حکم دے دیا۔ بابر صاحب، یہ خودکشی تھی، ہم خودکشی پر آمادہ ہوگئے، لیکن ہم نے باروٹیہ سے بات چیت کا راستہ بھی کھلا رکھا۔ باروٹیہ کے دو بڑے مطالبے تھے۔ ایک یہ تھا کہ باروٹیہ کا بیٹا اور اُس کی سابق بیوی حوالے کی جائے، جب کہ دوسرے مطالبے کے مطابق گر جنگل اور اس کے گرد و نواح کے علاقے کو اُس کی ملکیت تسلیم کرتے ہوئے ریاست دست بردار ہو جائے اور جیلوں میں قید اُس

کے تمام ساتھیوں کو رہا کیا جائے۔ پہلا مطالبہ انگریزوں سے متعلق تھا، جب کہ دوسرا ریاست سے تھا۔ انگریزوں نے بیٹا اس کے حوالے کرنے کی ہامی بھرلی، تاہم ان کا قانون باروٹیہ کی سابقہ بیوی کی جبری سپردگی پر مجبور نہیں کرسکتا تھا، جس سے اُنھوں نے کلی معذوری ظاہر کردی اور ساتھ ہی ریاست پر دباؤ دیا کہ باروٹیہ کا مطالبہ فوری طور پر تسلیم کرتے ہوئے گر کا جنگل اُسے دے دیا جائے۔ قیدی رہا کردیے جائیں۔ ادھر خانجی نے باروٹیہ کا مطالبہ اور انگریزوں کا دباؤ دونوں مسترد کردیے۔ ہماری سپاہ جنگل کا گھیراؤ کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھی کہ مخبروں نے باروٹیہ کے ہندستانی مغوی کے ہاتھوں قتل ہونے کی اطلاع دی۔ اِس سے قبل بابر صاحب آپ کے فرار ہونے کی اطلاع بھی ہمیں مل چکی تھی۔ اس کے بعد انسپکٹر اجیت نے انتہائی اہم کردار ادا کیا، چوں کہ باروٹیہ کے گروہ میں ہمارے مخبر براہِ راست انسپکٹر اجیت کی ماتحتی میں تھے، اور یہ ہمارے بے حد ذہین اور قابل افسر بھی ہیں، اِس لیے محکمے نے باروٹیہ کی موت سے فوائد حاصل کرنے کی ذمّے داری انسپکٹر اجیت کو سونپ دی...'' ایس پی دم بھرنے کے لیے لمحہ بھر رکا۔ میں نے دیکھا اُس لمحے اجیت کے چہرے پر ایک رنگ آ کے گزر گیا تھا۔

''بہ ہرحال، آپ کو چھلیا کے ٹھکانے پر دیکھا گیا۔ آپ کو بہ حفاظت دلواڑا لانے کے لیے سپاہی بھیجے گئے تو وہاں بہ ظاہر آپ کو ایک قتل میں ملوث پایا گیا۔ قانونی تقاضے کے تحت آپ کو گرفتار کرنا مجبوری تھی۔''

میں نے اجیت کی طرف دیکھا۔ اُس کا چہرہ سیاہ پڑ رہا تھا۔ اُس نے التجائیہ نظروں سے مجھے دیکھا، گویا اجیت سرکاری طور پر میری گرفتاری سے انکاری تھا۔ یہ بات واضح ہو رہی تھی کہ اجیت کے مقاصد کچھ اور تھے۔ بہ ہرحال، میں خاموش ہی رہا۔

''اس دوران ایک اندوہ ناک خبر نے ریاست کی چولیں ہلا دیں۔ مشتعل گروہ کے ہاتھوں سَو سے زائد انگریزوں کی ہلاکت بہت بڑا واقعہ تھا، تاہم انسپکٹر اجیت اِس اطلاع کے پس پردہ مقاصد کھوجنے میں کام یاب ہوگئے۔ یہ افواہ باروٹیہ کے دست راست گلامی نے جھیل میں پتھر پھینک کے ردِعمل جاننے کے لیے پھیلائی تھی۔ میں اختصار سے یہ بتانا چاہتا ہوں بابر صاحب کہ انسپکٹر اجیت نے روز و شب کی دوڑ دھوپ سے اِس پیچیدہ مسئلے کو سلجھا لیا۔ کثیر زرِ تاوان، اسلحے اور باروٹیہ کے بیٹے کے عوض انگریز قیدیوں کو رہا کروا لیا گیا، تاہم ایک مطالبہ ہم بے پناہ کوششوں کے باوجود تاحال پورا نہیں کرسکے، جس کی ضمانت کے طور پر ریاست کے دس اہم پولیس افسر گلامی کے حوالے کیے گئے ہیں۔ گلامی نے آپ کے بٹھل نامی ساتھی کو زندہ یا مردہ مانگا ہے، لیکن اس کے لیے آپ چنداں فکر نہ کریں۔ آپ کے ساتھی کو ان کے حوالے کرنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں ہے، یہ معاملہ ہم کسی نہ کسی طور سلجھا لیں گے، کیوں کہ گلامی مقامی پولیس افسروں کو بہ ہرحال، گزند نہیں پہنچائے گا۔''

بٹھل کے تذکرے پر میری ریڑھ کی ہڈّی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ بٹھل کے گرد منڈلاتے شدید خطرات معاً میرے سامنے وا ہوگئے۔ ایسا فاش جھوٹ بول رہا تھا۔ یہ یقیناً اب تک بٹھل کو تلاش کرنے میں ناکام رہا ہے۔ اس کا دلاسا طفلِ تسلّی کے سوا کچھ نہ تھا، لیکن میں ایسا اہم کیسے ہوگیا کہ طفل تسلیاں دی جائیں۔ بٹھل کے تصور نے میرا سویا ہُوا دماغ جھنجوڑ جگایا تھا۔ وائسرائے کا میرے لیے سفارشی رُقعہ حیرت انگیز تھا۔ یہ لوازمات اخلاق اور یہ خاطر داری اس سے بڑھ کے حیرت انگیز تھیں۔

''بٹھل اور میرے دیگر ساتھی کہاں ہیں؟'' میرے زبان سے خود بہ خود پھسلتا ہُوا سوال نکلا۔

''بابر صاحب! یقین جانیے کہ ہم تاحال اُنھیں تلاش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اُنھیں زمین نگل گئی یا آسمان نے اُچک لیا، کچھ خبر نہیں، لیکن ہمیں اس سے بڑھ کے مسئلہ درپیش ہے۔ اگر آپ وہ مسئلہ حل کروا دیں تو میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے ساتھی جہاں کہیں بھی ہوں گے، ہمیں جب بھی ملیں گے، بہ خیر و عافیت آپ تک پہنچ جائیں گے۔ تاہم میں یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ریاست ہی میں موجود ہیں۔ باہر نہیں نکل سکے۔'' میں نے غور سے دیکھا تو ایس پی کے چہرے سے مکروہ نقاب کھسکتا دکھائی دیا۔ اُس نے کسی مجبوری کے تحت اقرار نہیں کیا تھا، تاہم اُس نے مجھے باور کروا دیا تھا کہ بٹھل، زورا اور جمرو اُس کے پاس زیرِ حراست ہیں۔ انکار کی صورت میں ہمیشہ کے لیے لاپتا کیے جاسکتے ہیں۔ جمرو کے خیال سے میرا ذہن پھر بھٹکنے لگا تھا۔

''بٹھل کے ساتھ کون کون غائب ہیں؟'' میں نے تجاہلِ عارفانہ... تسلی خاطر کو پوچھا اور دل میں ہزار دعائیں پڑھنے لگا کہ یہ جمرو سے متعلق کوئی اچھی خبر سنائے۔

''ایک انگریز خاتون ہیں، جب کہ بٹھل سمیت تین افراد اور ہیں، وہ تینوں آپس میں ساتھی بتائے جاتے ہیں۔''

میری سولی چڑھی سانس گویا پھر سے سینے میں لوٹ آئی۔ گویا چھلیا نے غلط بیانی کی تھی، مگر کیوں؟ اُس کے پاس ایسا کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

''آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟'' اب میرے پاس اس کی پوری بات توجّہ سے سننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

''ہاں میں اسی طرف آ رہا ہوں۔ آپ بے حد عقل مند اور معاملہ فہم انسان ہیں بابر صاحب!'' ایس پی نے مسکرا کے میری طرف دیکھا، میرا خون کھول رہا تھا کہ چاقو سے یہ مسکراہٹ ہمیشہ کے لیے اُس کے چہرے پر ثبت کر دیتا۔

''اس تمام قضیے کی براہِ راست نگرانی کے لیے دلّی سے دو انگریز افسر بھیجے گئے تھے۔ مسٹر فرینکلن اور ان کے دست راست! لیکن ہماری بد قسمتی سے مسٹر فرینکلن اور ان کا دست راست موٹر کے حادثے میں جان گنوا بیٹھے۔ یہ حادثہ گر جنگل جاتے ہوئے پیش آیا۔ جس پر دلّی کی حکومت کافی برافروختہ ہے۔ اُنھوں نے یہ نہیں دیکھا کہ ہم نے اُن کے سیکڑوں افراد صحیح سلامت پہنچا دیے۔ وہ ناگہاں موٹر حادثے میں ہلاک ہونے والے دو افراد کو لے بیٹھے ہیں۔''

میں نے بہ طورِ خاص اجیت کی طرف دیکھا۔ وہ دُزدیدہ مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ گویا اجیت نے یہ سب بالا ہی بالا کیا تھا، مگر کیوں؟ یہ اندازہ میں نہیں لگا سکا تھا۔

''حکومتِ ہندستان نے بطور سزا، کاٹھیاواڑ تاجروں کے لیے پورے ہندستان کے دروازے بند کرنے کا فیصلہ کیا ہے، جب کہ ہماری ریاست تمام کاٹھیاواڑ سے تجارت میں کئی قدم آگے ہے۔ بابر صاحب! ہم چاہتے ہیں کہ آپ وائسرائے تک اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں اور اُسے مجبور کریں کہ اِس طرح ہمارا معاشی قتل نہ کیا جائے۔''

میں اور وائسرائے تک اثر و رسوخ! اِس گمبھیر تناؤ کی کیفیت میں بھی میرا قہقہے مارنے کو دل چاہا۔

''جی آپ بابر صاحب! وائسرائے کی ذاتی مہر لگا ہُوا آپ کے لیے سفارشی رُقعہ آیا ہے۔''

معاً مجھے یاد آیا کہ لیونارڈ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ وائسرائے کے معتمدِ خاص کا رُتبہ رکھتا ہے۔

اوہ! وہ میرے ساتھ ایک انگریز؟

''ہاں ہاں، سر لیونارڈ نام تھا اُن کا۔ وہ بھی دلّی پہنچ چکے ہیں۔ تمام مغویوں کی منزل گو کہ بمبئی تھا، مگر اُنھیں سرکار کے ایما پر دلّی پہنچایا گیا ہے۔''

''تو گویا آپ نے لیونارڈ کو میرا اثر و رسوخ گردانا ہے؟''

"لیونارڈ کا ایک تار آپ کے نام بھی ہے۔" ایس پی نے اپنے سامنے رکھا کاغذ میرے طرف بڑھا دیا۔

اس نے لکھا تھا:

میرے پیارے دوست بابر!

تمھارے ساتھ گزرے چند دن سرمایۂ حیات ہیں۔ میری آئندہ زندگی کا ہر پل تمھارا ودیعت کردہ ہوگا۔ میں بہ عافیت اپنی منزل پہنچ گیا ہوں۔ میں نے وائسرائے سے متعلق تم سے ایک تذکرہ کیا تھا، وہ ادھورا تھا۔ بابر، وائسرائے ہندستان میرے انتہائی قریبی رشتے دار بھی ہیں۔ میرا احوال سن کے تم سے ملنے کے مشتاق ہیں۔ تم بے فکر رہو۔ جلد ملاقات ہوگی، جس کا اہتمام میری ذمے داری ہے۔

تمھارا احسان مند

لیونارڈ

تار پڑھ کے واقعی وائسرائے تک میری پہنچ کا بہ خوبی اندازہ ہو رہا تھا۔ اب اُس سے کٹ حجتی بے کار تھی۔ "ٹھیک ہے۔ میں لیونارڈ سے بات کروں گا۔" میں نے بے دلی سے کہا۔

"بابر صاحب، صرف بات نہیں، بل کہ پوری تن دہی سے آپ کو ہمارا کام کرنا ہوگا۔" ایس پی نے کچھ توقف دے کر معنی خیزی سے کہا۔ "ہم آپ کے ساتھیوں کی تلاش کا کام پوری تن دہی سے کریں گے۔"

"لیکن یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ میں اپنے ہم راہیوں کے بغیر یہاں سے چلا جاؤں گا؟"

"بابر صاحب! آپ تن تنہا ہیں، یہاں ریاست کی پوری مشینری پوری تن دہی سے انھیں تلاش کر رہی ہے۔ آپ بے کار وقت کا ضیاع کیوں کریں گے۔"

"لیکن میں اُن کے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔" میں نے حتمی اور دو ٹوک لہجے میں کہا۔

ایس پی کچھ دیر ساکت مجھے دیکھا کیا، پھر کسی نتیجے پر پہنچ کے گویا ہُوا۔ "اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کے ساتھی ہماری حراست میں ہیں تو میں وضاحت کرنا چاہوں گا، بابر صاحب! ایسی کوئی بات نہیں ہے، تاہم یہ یقینی ہے کہ وہ نہ صرف ریاست سے، بل کہ گڑھ کے گرد و نواح سے باہر نہیں نکلے ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے آپ کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی، وہ حراست میں ہیں، تاہم وہ تا حال پُر اسرار انداز میں غائب ہیں۔"

"ٹھیک ہے، ان کی تلاش کے بعد ہی میں آگے کا کچھ سوچ سکتا ہوں۔ ورنہ میری جان ہتھیلی پہ ہے۔ ایس پی صاحب!" میں نے غرا کے کہا۔ ایس پی بے حد کائیاں اور چالاک تھا، وہ پینترے بدلنے پر مکمل قدرت رکھتا تھا۔

"ٹھیک ہے بابر صاحب! جیسے آپ کی مرضی! ہم بھی تلاش کر رہے ہیں، آپ بھی کیجیے! لیکن بُھل کو بہ ہر صورت یہاں چھوڑ کے جانا ہوگا۔ تاوقتے کہ ہمارا کام نہ ہو جائے۔ آپ جا سکتے ہیں بابر صاحب! لیکن خیال رہے کہ آپ اپنی جائے قیام سے آگاہ رکھیں گے۔"

"فی الحال میری کوئی جائے قیام نہیں!"

"آپ کے خیر مقدم کے لیے آیا ہُوا ہے وہ... کیا نام ہے اُس غنڈے کا..." ایس پی نے استفہامیہ انداز سے اجیت کو دیکھا۔

"سر! چھلیا۔"

"ہاں چھلیا چھلیا! وہ آپ کے لیے اتاولا ہو رہا ہے۔ چکر پہ چکر لگا رہا ہے۔"

"انسپکٹر اجیت! چھلیا کو بابر صاحب کی رہائی کے متعلق اطلاع دے دی تھی۔"

"جی سر! بالکل وہ تو صبح سے ہی دروازے سے لگا بیٹھا ہے۔"

"اور ہاں، مسٹر بابر! ایک اور اہم اطلاع آپ کو دینا میں بھول گیا، حالاں کہ خاصی اہم بات ہے۔ میرا دماغ آج کل غیر حاضر رہنے لگا ہے۔"

"جی کہیے! ایس پی صاحب!" مجھے شدید بے چینی محسوس ہونے لگی۔ نہ جانے یہ شعبدہ باز ایس پی اب کون سا پینترا بدلے گا۔

"بھوا اسپتال پہنچ کے پورے ایک دن زندہ رہا۔ اُس کے وکیل اور کھاتے دار اسپتال ہی میں بلوا لیے تھے۔" اُس نے بدمزگی سے گویا کڑوا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ "بھوا مہاجن مجرد زندگی گزار رہا تھا۔ ویسے بھی اُس کا کوئی اتنا قریبی عزیز نہیں تھا جو وارث بنتا، تاہم مسٹر بابر! بھوا مہاجن اپنی تمام جائیداد، مال و متاع، نقدی وغیرہ سب تمھارے سپرد کر گیا ہے۔ وصیت میں اُس نے لکھا ہے کہ تم بہتر جانتے ہو کہ اُس کا مال کس کے سپرد کرنا ہے۔"

ایس پی نے منوں وزنی گولا میرے سر پر دے مارا تھا۔ بھوا نے جان دے کے بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ اشتعال تھا یا جنون یا کم مائیگی کا احساس۔ میرے اندر دہکتا ہُوا آتش فشاں یک دم پھٹ پڑا۔ کیا اوقات ہے اُس کی... وہ کیا سمجھتا تھا خود کو۔ میں تھوکنا بھی پسند نہیں کرتا اُس کی جانے واد پہ۔ ایک بھوا کیا میں اس جیسے ہزار خرید سکتا ہوں۔ نہ جانے وہ طوفان کہاں سے امڈ آیا تھا میں نے شعلے کی طرح لپک کے ایس پی کا گریبان پکڑ لیا۔ میری اس اچانک حرکت سے وہاں تھرتھری مچ گئی۔ ایک طرف سے اجیت مجھ پر آ رہا تو دوسری طرف سے وہاں کھڑے سپاہیوں نے مجھے دبوچ لیا۔ "میں تھوکتا ہوں بھوا کی دولت پر اور وہ بھی تھوک دے گی۔" میں حالتِ جنوں میں چلا رہا تھا کہ ایس پی کے جملے سے مجھ پر سکتہ طاری ہوگیا۔

اُس نے کہا، "کون تھوک دے گی بابر صاحب!" اُس نے مجھ سے متواتر یہ سوال کیا، مگر پھر مجھ سے کچھ بولا نہ گیا، بل کہ مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے میں نے سرِ بازار اُس کا آنچل کھینچ لیا تھا۔

آخر وہ مجھے پیار محبت سے سمجھاتے بجھاتے باہر دروازے تک لے آئے۔ وہاں چھلیا مجھے دیکھ کے آب دیدہ ہوگیا اور بھڑک کے لپٹ گیا۔ دھیارا اور لنگو اُس کے ہم راہ تھے۔ چند صورتیں بھی اُس کے ہم راہ تھیں۔ اُس نے جدا ہوتے ہی گلاب کی لڑیاں میرے گلے میں ڈال دیں۔ دھیارا کے ہاتھ میں مٹھائی کا ٹوکرا تھا۔ چھلیا نے لپکتے ہوئے ٹوکرے پر چڑھا چمک دار کاغذ پھاڑا اور لڈو نکال کے میرے منہ میں ٹھونس دیا اور دھیارا کو گویا وہ ٹوکرا وہیں لٹ جانے کا اشارہ کر دیا۔ میں اپنے ہی حال میں ساکت کھڑا تھا کھڑا ہی رہا۔ چھلیا نے اپنے پیچھے کھڑے ایک لمبے تڑنگے جوان کو بازو سے پکڑ کے آگے کر دیا۔ "سوامی جی! اسے اپنا رگھو سے، ایک دم رگھو بوری والا۔ ادھر دلواڑا کی چوکی پہ اس حرامی کو بٹھانے کا ہے۔"

"رگھو بوری والا!" نام جانا پہچانا اور سنا ہُوا لگا۔ معاً مجھے لکشمی یاد آ گئی، وہ اسی رگھو بوری والا کا چاچا تو اپنے قدموں میں دیکھنے کی خواہش مند تھی۔ میری نظریں بے ساختہ اُس کی طرف اٹھیں۔ لمبا سفید کُرتا، کالا پاجامہ، گلے پر لپٹا ہُوا پیلا زرد رومال، کانوں میں ننھی ننھی سی بالیاں، گندمی، مگر اُجلی رنگت، بغیر تیل کے سیدھے کنگھائے ہوئے بال۔ سرخ ڈوروں سے بھری ہوئی وحشی آنکھیں، چوڑا اور چوکور چہرہ۔ بالوں کے پیچھے میں چھپی ہوئی پیشانی، اُس کی کاٹھی لمبی چوڑی اور کسرتی تھی۔ اُس نے میرے سامنے دونوں ہاتھ جوڑے اور کہا، "ابھی استاد تو تمھارا مالا جپتا ہے اور میں استاد کا۔" اُس کی آواز نہ بھاری تھی اور نہ ہلکی، بل کہ متناسب تھی اور لہجہ صاف ستھرا۔ مجھے وہ پہلی نظر میں اچھا لگا، اُس کے اندر ایک غیر مرئی چیز ایسی تھی جو خوامخواہ اور بلا وجہ اچھی لگتی ہے۔

"چھلیا بھائی ہیں اس قابل کے اُن کے نام کی مالا جپی جائے۔" میں نے پھنسے پھنسے لہجے میں کہا، اور وہ میں کہاں تھا، وہ تو ایک زندہ درگور لاش تھی۔ چھلیا اپنے ساتھ اچھا خاصا ہجوم اٹھا لایا تھا۔

"یہ دروازہ تمھارے باپ کا نہیں ہے۔ ہٹو یہاں سے۔ صاب آنے کا ہے۔" ایک توندل سپاہی بید گھماتے نہ جانے کہاں سے آن دھمکا۔

"اے کا ہے کو استاد استاد لگانے کا ہے۔ تیری ماں کا.. سالے۔ اڈے پر کون جانے کا؟" چھلیا نے فوراً ہی رگھو بوری والا کی گدی پہ ہاتھ چھوڑ دیا۔

"ابھی یہ پریشان دکھنے کا ہے استاد!" رگھو نے چھلیا کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے دھیمے سے کہا۔

"ابھی اپنا تو بڑا بند کر۔ سوامی جی کا سارا پریشانی ادھر اڈے پر ختم ہونے کا ہے۔ ابھی چل۔"

اس کے بعد رگھو کے آدمیوں نے نا نا کرنے کے باوجود مجھے ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ دھیارا اور لنگو بھی پیش پیش تھے۔ میں نے گردن گھما کے دیکھا۔ اجیت برآمدے میں کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ چھلیا کی سربراہی میں جلوس مجھے کندھوں پر اٹھائے چل پڑا۔ وہ ڈھول اور کھلواڑ کرتے اور نعرے لگاتے ہوئے سڑک پر آ گئے۔ راہ گیر اشتیاق اور خوف کا آمیزہ آنکھوں میں سجائے ہمیں رک رک کے دیکھتے۔ کچھ فوراً ہی اپنی راہ لیتے اور کچھ اس وقت تک وہیں کھڑے اِس جلوس کو دیکھتے رہتے، جب تک نظروں سے

اوجھل نہ ہو جاتا۔ جلوس سے الگ تھلگ اور غیر محسوس طریقے سے ساتھ چلنے والے دو سادہ لباس والے میری نظروں سے اوجھل نہ تھے۔ میرا دل چاہا کہ چھلیا سے چیخ کے کہوں بند کرے یہ تماشا گیری اور دفع ہو جائے مجھے تنہا چھوڑ کے۔ مگر لفظ تو ہمیشہ میری دسترس سے دور ہی رہے تھے۔ سو خاموش رہا۔ کئی سڑکیں اور گلیاں عبور کر کے ایک گلیارے اور بہت سے لوگ منتظر ملے۔ ایک آواز میرے کانوں تک بھی پہنچی تھی کہ چھلیا کا استاد آیا ہے۔ پھر تو جیسے جادو کی چھڑی گلیارے میں گھومی اور آخری سرے تک مکانوں میں پھریری سی دوڑ گئی تھی۔ دریچے کھل گئے اور مرد باہر نکل آئے۔ بعض دوڑے چلے آتے اور مٹھی بھر سکے میری اور اچھال کے ہم جلوس ہو جاتے۔ یہ رگھو اور چھلیا سے لوگوں کی بے پایاں الفت تھی، جس کا اظہار وہ مجھ پر سکے بندوں کر رہے تھے۔ بالآخر ایک پھاٹک نما دروازے پر جلوس ٹھہر گیا۔

پھاٹک کھول دیا گیا تھا۔ یہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا ہر علاقے میں ایک نہ ایک ضرور ہوتا ہے، جس کے سامنے سے گزرتے ہوئے بہت سوں کے دل تیز ہو جاتے ہیں اور بہت سوں کے دل مدھم پڑ جاتے ہیں۔ غیر متعلقہ افراد دروازے پر ہی روک دیئے گئے۔ یہ خصوصی حکم چھلیا یا رگھو ہی نے دیا ہوگا، ورنہ ریت کے خلاف تھا۔ مجھے عین چوکی کے سامنے اتارا گیا۔ مجھے ٹھٹکتا دیکھ کے چھلیا اچھلتا ہوا آگے آیا اور ہاتھ جوڑ کے بولا: ”ابھی تیرے آگے کسی کا مجال تھا سوامی جی! پر ابھی ادھر جمانے کا استاد آنے کا اے۔“

چھلیا کے اس جملے نے مجھے برف کر دیا۔ میں نے بے تابی سے مڑ کے اس کا گریبان پکڑنا چاہا، مگر اس سے پہلے بھادوں کی گھٹاؤں کی طرح گرجتا اور شیر کی طرح دھاڑتا ہوا وہ مجھ پر آ پڑا تھا۔ وہ کوئی اور نہیں بٹھل تھا۔ ایسی ویران آنکھیں کہ موت بھی دہل جائے، ایسا اجاڑ چہرہ کہ شہر خموشاں آہ و بکا کرے۔ ایسی وارفتگی کہ بجلیاں کوندنا بھول جائیں۔ مجھ پر تو گویا شادی مرگ کا لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ کیسی ناامیدی کے وقت چلا آیا تھا، ہمیشہ کی طرح۔ اس نے پوری قوت سے میرا منہ تھپڑایا کہ طمانچے کے زور سے خود جھوم گیا۔

”بڑا ظالم ہے رے!“ بٹھل نے جھومتے ہوئے اُلٹا ہاتھ چھوڑ دیا۔ گال اندر سے پھٹ گیا تھا۔ پھر تو جنون طاری ہو گیا۔ تھپڑ، لاتیں، گھونسے، جو اُس کے جی آیا وہ اُس نے چلایا۔ چھلیا، رگھو اور دیگر گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ زورا اور جمرو بھی جگہ سے آگے نکل آئے تھے۔ اُن کی آنکھوں سے موسلا دھار بارش برس رہی تھی۔ اسے دیکھ کے میرا کلیجا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ میں لڑکھڑا کے گر پڑا۔ بٹھل نے گریبان سے پکڑ کے اٹھایا۔ وہ تن کے کھڑا تھا۔ بھلا دیمک زدہ پیڑ بھی اکڑتے ہیں۔ پُکالی آنکھوں سے اُس نے مجھے گھورا اور بولا: ”تیرے مرنے کے نہیں تھے رے... مونگ دلنے کو زندہ ہیں۔“

اُس کی آنکھیں اتنی سفاک نہیں تھیں، جتنا وہ خود تھا۔ گوشوں میں نمی کے قفل پڑے صاف دکھ رہے تھے۔ پھر اُس نے جھپٹ کے مجھے بھینچ لیا۔ سارے بند ٹوٹ گئے۔ سبھی کچھ بہہ گیا۔ میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ زورا اور جمرو بھی دائیں بائیں سے آ کے چمٹ گئے۔ پھر تو یوں لگا جیسے اڈے کے در و دیوار بھی سسکیاں بھر رہے ہوں، پھر بٹھل دیوانہ وار قہقہے لگانے لگا۔ اُس نے مجھے ہاتھوں میں بھر کے دیوانہ وار چومنا شروع کر دیا۔ ہاتھ تھما تھما کے گالوں پر چٹکیاں بھرنے لگا، پھر یکایک سبھی مسکرانے لگے۔ برسات میں نکھری نکھری، کھلی کھلی، کچی اور چمکیلی دھوپ نکل آئی تھی۔

”یہ کیا بھوت بن گیا ہے رے۔ چھلیا! اوچھل چھل چھلیا۔“ بٹھل نے انگلی سے میری ٹھوڑی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”حکم بول استاد!“ چھلیا صدقے واری ہو کے بولا۔

”تیرے پاس کال پڑ گیا ہے کیا؟ نکھٹو ہی لا بٹھائے ہیں یا تجھیں دکھائی پڑتا ہے!“

”ابھی ادھر رگھو کا کاٹا ہے استاد۔“

”آنکھوں میں بٹن ٹنکے ہیں تو بولو۔ لاڈلا آیا ہے رے چھلیا، اپنا لاڈلا راجا۔“ بٹھل کے منہ سے پیاسی اور ترسی ہوئی آواز نکلی تھی۔

”ابھی ایسا کیسا ہونے کا ہے استاد۔ ابھی ایک دم کورا لٹھا لفافے میں بند رکھنے کا ہے۔ ابھی سوامی جی کو استاد پھارگ کرنے کا اے تو چھلیا کا سیوا سروع ہونے کا ہے استاد۔“

چھلیا کے اشارے پر ایک نے کونے میں دھرے

خاکی لفافوں میں سے ایک اٹھا کے بڑھا دیا۔ چھلیا نے وہ چپٹ کے مجھے پیش کر دیا۔

میں غسل کر کے اور چھلیا کا دیا ہوا بوسکی کا کرتا پاجامہ پہن کے باہر آیا تو بٹھل چوکی پر جما بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ زورا، چھلیا اور جمرو اُس کے ساتھ جُڑے بیٹھے تھے۔ اِس کے علاوہ اڈے پر صرف چیدہ چیدہ افراد ہی موجود تھے۔ دروازہ سختی سے بند تھا۔ شور مچاتے بیش تر افراد کو باہر دھکیل دیا گیا تھا۔ چھلیا کے اِس فعل کی وجہ سمجھ آتی تھی۔ اُس نے بٹھل زورا اور جمرو کو یہاں چھپا رکھا تھا۔ یقیناً اڈے میں انتہائی بھروسے ہی کے آدمی موجود تھے۔ مجھے دیکھ کے زورا اور جمرو ایک بار پھر بے تابی سے میری طرف اٹھ آئے اور بغل گیر ہو گئے۔ بٹھل میری موجودگی سے لاتعلق بیٹھا چھلیا سے ٹھٹول کر رہا تھا۔ اُس کے شکستہ حال چہرے پر زندگی کی کچھ رمق پھر یریاں لیتی صاف دکھ رہی تھی۔ وھیارا اور لنگو بل بل کے بٹھل کے پاؤں گھوٹ رہے تھے۔

"تیرے پیچھے استاد تو گیا تھا لاڈلے... اب کیا ٹھٹھے اُڑا رہا ہے۔" جمرو نے میرا پیٹ گدگداتے ہوئے کہا۔ وہ خود بھی کھِلا جا رہا تھا۔

"ماں قسم لاڈلے! اکھا زندگی میں کسی کا ایسا گمتائی نہیں پڑا۔ ابھی کل تک میرے کا خبر تھا۔ ابھی سالا ایک دم چاند کا موافق تم ہمارے سامنے چمک رہا ہے۔ ایک دم سپنا ہے۔ لاڈلے ایک دم سپنا۔" زورا نے باقاعدہ آنکھیں پٹپٹا اپنی انگلی دانتوں چبائی۔

"تُو نے کل کا تماشا نہیں دیکھا لاڈلے؟" جمرو نے میرا شوق اُبھارتے ہوئے کہا۔ بٹھل نے تو میری طرف نہ دیکھنے کی گویا قسم کھائی تھی۔ سدا کی طرح بے پروائی کی چادر اوڑھے بیٹھا تھا۔

"کیسا تماشا؟"

"چھلیا سے کل ہی پہلی میل ملاقات ہوئی تھی۔ چھلیا نے استاد کو بھی تمھارے بارے میں بتایا کہ تم زندہ ہو تو یقین کر لاڈلے استاد کو میں نے اپنی آنکھوں سے ناچتے ٹھمکے لگاتے دیکھا۔ چھلیا کو بچوں کی طرح ہاتھوں پر اٹھا کے استاد نے بڑی دیر تک پھرکنی دیا۔ ابھی صبح تک بیٹھے بیٹھے ہنس رہا تھا..." جمرو نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "ابھی تیری جان پہچان سے مکر رہا ہے۔"

میں مسکرا کے چپ ہو رہا، کیوں کہ مجھ سے زیادہ اُس کا واقفِ حال کوئی اور نہ تھا۔ میں انھی کے بیچ جا بیٹھا۔ چھلیا بٹھل کو میری چاقو زنی کے کرشمے بڑھا چڑھا کے بتا رہا تھا۔ بٹھل کلے بھر بھر کے دھواں کشید کرنے میں مگن دکھائی دیتا تھا۔ تاہم وہ "ہوں ہاں" باقاعدگی سے کر رہا تھا۔ اب تک مایا نظر نہیں آئی تھی۔ اطلاع کے بہ موجب اُسے ان کے ساتھ ہونا تھا۔ میں نے اس سے متعلق استفسار غیر مناسب سمجھا۔ میرے اندر خوب کھد بد مچی ہوئی تھی۔ میری طرح ہی زورا اور جمرو بھی کچھ جاننے کے لیے بے چین تھے، مگر یہ سب تنہائی کی دست یابی ہی پر منحصر تھا۔ میں نے اپنی گذشتنی میں سے مولوی شفیق اور کورا کا تذکرہ حذف کر لیا تھا۔ سینے سے باہر اُبلتے دل کو میں نے ہزار رسیوں میں جکڑ لیا تھا اور یہ کوئی کارِ آساں نہیں تھا۔ انھیں بمبئی پہنچا کے چھپ چھپاتے نکالا جا سکتا تھا۔ ایس پی کے بقول ریاست کی حدود سے چڑیا کا بچہ بھی ان کی نظروں میں آئے بغیر نہیں نکل سکتا تھا۔ مجھے کامل یقین تھا کہ اجیت جیسا بدماغ پولیس افسر جاں فشانی سے بٹھل کی تلاش میں مصروف ہوگا۔ رگھو بوری والا اور چھلیا کا حسنِ انتظام ستائش آفریں تھا، ورنہ کون سی پولیس تھی جو اڈے پاڑوں کے شب و روز کے ایک ایک پل کی جان کاری نہ رکھتی ہو! میری نگرانی پر مامور سادہ لباس والے باہر یقینی طور پر موجود تھے۔ ان کے لیے بیاچنبھے کی بات ہی ہوگی کہ جلوس کے لیے اڈے کے دروازے بند کر دیے گئے تھے، ورنہ اس وقت وہ بھی کسی گوشے میں دبکے کھڑے ہوتے۔ ایک منچلا دوڑا ہوا آیا اور رگھو کے کان سے چپک گیا۔ اُس کی بات سن کے رگھو نے بٹھل اور ہمیں اندر چل کے کھانے کی دعوت دی، جہاں دسترخوان چن دیا گیا تھا۔ بٹھل کے اشارے پر ایک شوخے نے حقہ اٹھا لیا۔ اندر ایک کشادہ کمرے میں چاندنی بچھی تھی۔ اُس پر پیلے زرد ململ کا دسترخوان۔ رگھو بوری والا نے شاید پورا دلواڑا یہاں لا کے رکھ دیا تھا۔ نہ جانے کیا کیا اَلم غلم بھرا پڑا تھا۔ کھانے کے بعد ٹھرے کی بوتلیں کھل گئیں۔ میرے احتراز پر خوب قہقہے اڑے۔ بٹھل نے رسمِ محفل نبھائی تھی۔ اُس کے ہاتھ کا ایک پوا چسکیوں پر چسکیوں کے باوجود کم نہ ہوتا تھا۔ باقی سب کا

ہاتھ بھی کھچا کھچا تھا، سوائے رگھو بوری والا کے۔ وہ بوتل پر بوتل پانی کی طرح چڑھا رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں چڑھتا نشہ کسی اور ہی ساخت کا تھا۔ جلا جلا اور بجھا بجھا۔

میں باہر آ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ جمرو یا زورا میں سے کوئی ایک میرے پیچھے ضرور آئے گا۔ وہ دونوں ہی چلے آئے۔ بٹھل تو ایسے بیٹھ گیا تھا جیسے اب ساری زندگی یہیں رہے گا۔ بات بے بات کے ٹھٹوں سے صحن میں بھی مفر نہ تھا۔ میں نے زورا اور جمرو کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا، اور دائیں طرف سیڑھیاں چڑھ گیا۔ چھت پر کسی قسم کی تعمیر نہیں تھی، بس دو ہاتھ کی چار دیواری کر کے چھوڑ دی گئی تھی۔ اطراف کے مکانات زیادہ بلند تھے۔ دُور تک کہیں قندیلیں، کہیں قمقمے ٹمٹما رہے تھے۔ چھت کے وسط میں کھڑے ہو کے بھی گلیارا صاف نظر آتا تھا۔ ہوا ٹھنڈی چل رہی تھی، میں پاؤں پسار کے بیٹھ گیا۔ نیچے کے شور وغل سے چھت دھمکتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں جمرو اور زورا سے تفصیل سننے کے لیے بے چین تھا۔ اُدھر بھی کچھ کم بے تابی نہ تھی، وہ لپکے چلے آئے تھے۔ ''قسم سے، چاند چھت پر اتر آیا ہے۔'' جمرو ناچتا ہُوا میری طرف آیا۔ وہ خوشی سے تھرک رہا تھا۔

زورا نے اُسے دھکیلتے ہوئے ہانک لگائی ''ابھی چندرا وندرا کے بول پرانا ہو گئے ہیں۔ اپنا راجا ایک دم ہیرو ہے۔'' زورا نے چھلانگ لگائی اور مجھ سے لپٹ کے لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ اوپر سے جمرو بھی آ پڑا۔ پھر تو بہت دیر تک دھما چوکڑی مچی۔ وہ مجھے گدگداتے رہے۔ آنکھیں مل مل کے دیکھتے رہے۔ حلق پھاڑ پھاڑ کے ٹٹول کرتے رہے۔ آس پاس کی دریچے وا ہو گئے تھے۔ چھتوں سے جھانکے پڑنے لگے، لیکن یہاں تو مدہوشی کا عالم تھا۔ آخر کافی دیر بعد جب پپوٹے پانی سے بھر گئے، زورا میری پیشانی چوم کے بولا، ''تو اپن کے لیے مر گیا تھا لاڈلے۔ سالا سپنا لگتا ہے۔''

''تجھے جیتا دیکھ کے ابھی بھی بھروسا نہیں پڑتا۔'' جمرو کی آواز گلوگیر ہو گئی۔

میری حالت بھی عجیب ہو رہی تھی۔ سینہ پھٹا جا رہا تھا۔ میں نے لپک کے جمرو کو کھینچ لیا۔ ''جمرو بھائی! چھلیا نے مجھے آپ کے...'' میری آواز رُندھ گئی۔ میں جملہ پورا نہ کر سکا۔

''چھلیا بولا تھا، اُسے غلطی لگی تھی۔ وہ جمرو نہیں تھا لاڈلے۔'' جمرو نے مجھے اور زور سے بھینچا۔ اُس کی آواز بھرا رہی تھی۔

''جمرو بھائی! آپ کو دیکھنا نظروں کا دھوکا لگتا ہے۔ میری وجہ سے آپ لوگ مصیبت میں مبتلا ہیں۔''

''لاڈلے! جی کرتا ہے تیری زبان گدی سے کھینچ لوں...'' جمرو نے ایک جھٹکے سے الگ ہوتے ہوئے کہا۔ ''ابھی سالہ بالشیا ترازو کر دیتا۔ ایسا نہ بولتا۔ ہم تیرے کچھ نہیں لگتے؟'' وہ یک دم غصّے سے لال بھبوکا ہو گیا۔ میں کیا جواب دیتا۔ کیا اشک شوئی کرتا، میری بات بھلا اُنھیں کیسے سمجھ آتی۔ یہ بھی ٹھیک ہی کہتے تھے۔ میں خاموشی سے اُنھیں دیکھا کیا۔

''اپن تیری وجہ سے مشکل میں نہیں ہے راجا۔ اُکھا زندگی تیرے سے زیادہ کوئی نہیں مانگا اور تُو ایسا بولتا ہے۔'' زورا نے بھنچی ہوئی آواز میں کہا۔ پھر اُس نے چشم زدن میں ڈولتے ہوئے چاقو نکالا اور بائیں بازو ایک لکیر کھینچ دی۔ اس سے پہلے کہ میں اُسے روکتا، وہ چاقو بائیں ہاتھ کی طرف لوٹا چکا تھا، اور دائیں ہاتھ پر بھی لکیر کھینچ چکی تھی۔ دریچوں سے اُبھرتی ہوئی نسوانی سسکیاں واضح طور پر سنائی دی تھیں۔

''ابھی دوبارہ ایسا بولا تو کھرو نیچا دل پر پڑے گا راجا! طعنہ سننے کو زندہ نہیں رہے گا اپن۔'' زورا کے دونوں بازو سرخ ہو گئے تھے اور انگلیوں سے خون ٹپاٹپ چھت پر گرنے لگا۔ چاقو وہ پہلے ہی گرا چکا تھا۔

پھر نہ جانے مجھے کیا ہُوا۔ میں نے مچل کے زورا کا گریبان پکڑ لیا۔ ''زورا بھائی! کیا سمجھتے ہو آپ لوگ مجھے! میں انسان نہیں ہوں؟ میرے سینے میں دل نہیں ہے، پتھر ہے؟ آپ کے ایسا کرنے سے میں بہت خوش ہو گیا ہوں؟ میری چھاتی فخر سے پھول گئی ہے کہ ایسے ایسے میرے جاں نثار ہیں! یہی سمجھتے ہیں نا آپ؟ آپ لوگ مجھے تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے، کیوں کہ آپ مجھے اپنا سمجھتے ہیں، مجھے بے پناہ چاہتے ہیں، میرے پسینے پر اپنا لہو نچھاور کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں، اس لیے کہ آپ کے سینے میں ایک دل ہے۔ کبھی یہ بھی سوچ کے دیکھیں کہ میں بھی آپ سے محبت رکھتا ہوں۔ آپ کی تکلیف پر تڑپ سکتا ہوں۔ زورا بھائی! میں بھی اتنا ہی انسان ہوں جتنے آپ ہیں، جتنے جمرو بھائی ہیں۔ جتنا بٹھل ہے۔'' میں نے سسکتے ہوئے زورا کا گریبان بری طرح جھنجوڑ ڈالا تھا۔

''راجا!'' زورا کے ہونٹ بس لرزے تھے۔

جمرو نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ اُس کی کپکپاہٹ میرے وجود میں اترنے لگی۔ کبھی بھی سامنے کا دکھائی نہیں پڑتا۔ ہم تینوں ایک بار پھر ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ گویا غم بھی مدغم ہو گئے۔

''ہائے دیّا! کھون!'' کسی دریچے سے ایک کھنکھناتی ہوئی نوخیز آواز آئی۔

چاندنی کے اجالے میں سب اڑوس پڑوس چھت کے منظر کو آنکھیں پھاڑے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ کھڑکیوں کی آڑ سے، طاقچوں میں آنکھ لگائے، منڈیروں کے پیچھے دبکے ہوئے۔ مجال ہے کہ بہ غور دیکھے پر بھی کوئی نظر آ جائے۔ معاً سیڑھیاں قدموں کی دھمک سے گونجنے لگیں۔ میں نے گھبرا کے دیکھا تو سب سے پہلے بٹھل چھت پر قدم رکھتا نظر آیا۔ اُس کے پیچھے چھلیا، رگھو اور بہت سارے لوگ۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ تاکا جھانکی کرنے والوں ہی کی کارستانی تھی۔ مرچ مسالے کے ساتھ اڈّے کے دروازے تک چھت کا احوال پہنچنا ہی تھا۔ ممکن تھا کہ خبر میں ایک آدھ قتل بھی شامل ہو گیا ہو۔ زورا کے بازو سے کافی خون بہہ گیا تھا۔ جمرو اور میری قمیص بھی سرخ دھبّوں سے پٹ گئی تھی۔ بٹھل کے لیے یہاں کی کارگزاری سمجھنا چنداں دشوار نہ تھا۔ اُس نے تو پہلی نظر میں منظر پی لیا ہو گا۔ وہ جھنجھناتا ہُوا آیا۔ ''ادھری تو ٹنکی کا دھندا کر لو۔ بہت چلے گا رے۔ ایک توشہ دو براتی۔'' بٹھل نے اِردگرد سے جھانکتے ہوؤں کو یقیناً تاڑ لیا تھا۔

مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے کسی نے غسل کرتے ہوئے پردہ کھینچ لیا ہو۔ پورا اڈّا چھت پر اُمڈ آیا تھا۔

''ابھی سب کھیر ہے نا سوامی جی!'' چھلیا نے حیران پریشان ہوتے ہوئے کہا۔ ہم تینوں کے لباس خون آلود تھے۔ یہ اندازہ کرنا ممکن نہیں تھا کہ صرف زورا ہی زخمی ہے۔

''ہاں، سب خیریت ہے چھلیا! زورا نے میرے ملنے پر قسم اٹھائی تھی، وہ پوری کی ہے۔'' میں نے بٹھل سے نظریں کھسکاتے ہوئے بات بنائی۔ وہ کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔

''اس کی ماں کا یار ملا دِکھتا ہے حرامی! ٹھکانے سے پہنچ گئی تیری قسمیا۔ باہر پھولوں کے ہار لیے بیٹھے ہیں نہ وہ حرام کے جنے!'' بٹھل نے پھرتے ہوئے زورا کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

میں نے تو چھلیا اور رگھو کے لیے بات بنائی تھی، ورنہ وہ اسے ہمارا باہمی جھگڑا گردانتے، لیکن بھرے میں بٹھل بھی آ گیا تھا۔

''تُو بھی کندھے چڑھ جا۔ ادھری دم ہے دو چار کا اور بوجھا اٹھانے کا...'' بٹھل نے زورا کے بازو سے خون کا تیز رساؤ محسوس کر لیا تھا۔ ''اور تو نے مارنے کی قسم اٹھالی ہے۔ سُور نے آج ہی پیٹ میں کچھ ٹھونسا تھا۔ کلیجے کو کچھ تو بنانے دیتا رے۔'' بٹھل نے بیک وقت مجھے اور زورا کو مخاطب کیا تھا۔

میرے حرکت میں آنے سے پہلے جمرو زورا کی قمیص کھینچ کر اتار چکا تھا۔

''چھلیا تیرے کھونٹے سے نہیں بندھے؟'' بٹھل اب چھلیا کی اور پلٹ پڑا تھا۔ وہ غصّے سے باؤلا ہو رہا تھا۔ چھلیا گڑبڑا گیا۔ بٹھل کا اشارہ وہ کچھ تاخیر سے سمجھا۔ رگھو فوراً چلّا کے بولا، ''پھڑ دوں تمھاری میا ناچ رہی ہے کیا۔ جاؤ اپنے ٹھکانے سے لگو... اوئچو، ادھر مرنے کا ہے۔''

''استاد! اچھو بکسا لینے جانے کا ہے۔'' جاتے ہوؤں میں

''تم اپنے آپ کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہو، ہے نا؟''

سے کسی نے جواب دیا۔

رگھو کے چلانے پر سب ہڑبڑا کے نیچے اتر گئے۔ اُس لمحے ایک پستہ قد چھوٹی سے صندوقچی لیے دوڑتا چلا آیا۔ اُس کا جسم ٹھوس اور گٹھا ہُوا تھا۔ اُس کی ناک چپٹی اور رنگت توے کی طرح سیاہ تھی، جب کہ سر پر زرد رنگ کا پھندنے والا رومال لپٹا ہُوا تھا۔ اڈّوں میں جراحت کے لیے کوئی ایک آدھا ضرور مخصوص ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ جرّاح زخم سینے کے ہنر میں بھی طاق ہوتے ہیں۔ زخم کے معاملے میں آخری حد تک ڈاکٹر کے پاس یا اسپتال جانے سے گریز کیا جاتا ہے۔ زورا نے کمالِ صفائی سے چاقو چلایا تھا۔ زخم کی دھار کندھے کے قریب سے سیدھی کلائی تک چلی آئی تھی۔ اُس نے دانستہ زخم گہرا لگانے سے گریز کیا تھا۔ بٹھل بھن بھن کرتا واپس چلا گیا تھا۔ جاتے جاتے چھلیا سے کہہ گیا تھا کہ ان کے بستر الگ الگ جگہ لگواتے ہیں، ورنہ یہ سونے کے نہیں۔ لجّو اپنے فن میں طاق تھا۔ زخم کا معائنہ کرتے ہی بولا ''ابھی چاقو کس نے چلایا ہے؟ اس کو چومنے کا ہے۔''

استاد! ابھی تم پٹّی کردو بس!'' جمرو بولا۔

''ایسا برابر لکیر پھٹّا رکھ کے کھینچنے کا ہے... نہ کم نہ جیادہ، نہ اندر نہ باہر...'' لجّو کی آنکھوں میں ستائش تھی۔ ''ماں قسم! چتّر پنچارا پھیرنے کا ہے۔''

اُسے کام کی شُدبُد خوب لگتی تھی۔ صندوقچی میں رکھی شیشیاں اور ڈبیاں سب انگریزی تھیں۔ میں حیران ہو رہا تھا۔ لجّو نے قاعدے کے مطابق جراثیم کش پانی سے جب زخم صاف کیا تو میں چپ نہ رہ سکا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''ابھی سپھائی کرنے کا ہے۔ استاد اپن کو کیڑے آج تک دکھائی نہیں دینے کا ہے۔ پر ڈاکٹر نے بولا کہ زخم کھلنے کا ساتھ ہی چھوٹا چھوٹا کیڑا اس میں بھرنے کا ہے۔ ابھی سب کیڑا مر گیا۔'' لجّو نے اٹک اٹک کے وضاحت کی۔ ڈاکٹر کے تذکرے سے معاملہ سمجھ آ گیا تھا۔ لجّو کے ہاتھ زبان کے برعکس خاصے تیز اور مہارت سے چل رہے تھے۔ اُس نے لال دوائی کا پھویا بھر بھر کے زخم پر رکھا۔ پٹّی باندھنے کے مرحلے پر زورا نے پس و پیش سے کام لیا، مگر میرے اور جمرو کے اصرار پر اُس نے پٹّی لپٹوالی۔ لال دوائی کے لگاتے ہی خون کا رساؤ مکمل رک چکا تھا۔ میں نے لجّو کو کچھ دینے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالے تو جیب میں پھوٹی کوڑی نہ تھی۔ میرا ہاتھ وہیں اٹک گیا۔ لجّو اور جمرو نے بہ یک وقت معاملہ فہمی کا مظاہرہ کیا۔ جمرو نے پیسوں کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا اور لجّو نے لجاجت سے آواز نکالی۔ ''اپنا ٹھکانا رگھو استاد کے ساتھ ہی ہے۔ ایسے بڑھیا زخم کی سیوا کا نجرانہ ابھی اپنی طرف بنتا ہے۔ شرمندہ نہ کرنے کا ہے استاد!''

مجھے ندامت محسوس ہوئی۔ بھلا یہاں کے نرالے طور طریقے مجھ سے بہتر کون جان سکتا تھا۔ جمرو کا ہاتھ بھی جیب سے خالی ہی لوٹا، مگر اس دوران چھلیا پلٹ آیا۔ اُس نے لجّو کی کمر پر لات جماری۔ ''کنجری کی اولاد! حرام کھور! اِدھر دہاڑی لگانے کا ہے۔''

''ارے نہیں نہیں چھلیا استاد! ہم ہی اِسے کچھ دینے کی کوشش کر رہے تھے اور یہ نہ لینے کے لیے ہماری منت سماجت کر رہا تھا۔'' میں نے مداخلت ضروری سمجھی تھی۔

چھلیا نے ناقابلِ یقین انداز سے میری طرف دیکھا، پھر جیسے بادلِ ناخواستہ میرا بیان درست مان لیا۔ ''سوامی جی! ابھی استاد بڑی گرمی کھانے کا ہے۔ آپ لوگوں کو بستر پر پہنچانے کا ہے۔''

ہم چھلیا کے ساتھ اتر آئے۔ بٹھل کسی خاص وجہ سے ہی ہمیں سونے پر مجبور کر رہا تھا۔ شاید اُس کا صبح دم یہاں سے کوچ کا ارادہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں زورا اور جمرو سے پوری داستان سننے کے لیے اتاولا ہو رہا ہوں گا۔ اِس خیال کاری میں رات آنکھوں میں کٹ جاتی تو کوئی بڑی بات نہیں تھی۔

''من موہنا ہے۔''

''ہا! چھیل چھبیلا۔''

''وہ جا رہا ہے۔''

''ہائے۔''

پڑوس کے بائیں چوبارے کی نسوانی سرگوشیاں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ہم نیچے اتر آئے، پیچھے مترنم اور شوخ ساز دھیرے سے مسکرائے تھے۔ بٹھل سامنے غصّے میں بھرا پھونکیں مار رہا تھا۔ حقّے کی گڑگڑ ضرورت سے زیادہ تیز تھی۔ اُسے دیکھ کر خود بہ خود میرا مسکرانے کو جی چاہا۔ اُس نے بھی میری شکل پڑھ لی تھی، مگر اَن جان بن گیا اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ چھلیا نے مجھے رگھو کے حوالے کیا اور خود داہنی طرف زورا اور جمرو کو لے کر بڑھ گیا۔ دالان سے کمروں کی طرف جاتے ہوئے میں نے بٹھل کی آواز سنی۔ وہ زورا کو بلا رہا تھا۔ بٹھل میں اب دم خم کہاں رہا تھا۔ بس ایک تصویر تھی، شکستہ حالی اور ویرانی کی۔

رگھو نشے میں سنسنایا ہُوا اچل رہا تھا۔ وہ زینے کے نیچے سے نکل کے ایک تنگ راہداری میں گھسا۔ وہ چھریرے اور تراشیدہ جسم کا مالک تھا۔ کسی لڑکی طرف سے اُسے مسترد کرنے کی ایک ہی وجہ ہو سکتی تھی کہ وہ اڈّے پاڑے کا آدمی تھا۔ اُس سے اب تک براہِ راست میری کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ میں خاموشی سے اُس کے پیچھے چلتا رہا۔ اڈّے کی عمارت خاصی وسیع و عریض تھی۔ ایک دروازے پر رُک کر اُس نے جیب سے چابی نکالی! اور میری طرف مڑے بغیر بولا۔ ''بابر بھائی! ابھی آپ میرے کمرے میں رہو۔ اُدھر ستھرائی نہیں ہوگی۔'' اُس نے تالا کنڈی سے نکال کے دروازہ کھول دیا۔ وہ میرے لیے راستہ چھوڑ کے ایک طرف ہٹ گیا۔ کمرا دیکھ کے حیرت سے میری آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ اڈّے کا کمرا نہیں تھا، بلکہ اُس کا تعلق تو کسی راجا کے محل سے تھا۔ دیواریں سرخ مخملیں پردوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ ان پر اطلسی کام کے بیل بوٹے کڑھے تھے۔ فرش پر قالین ایسا کہ پاؤں دھنستے تھے۔ چھت کے انتہائی وسط میں ایک پنکھا ساکت تھا۔ چار پائی پر کم خواب کا گدّا اور گلابی مخملیں غلاف چڑھا تکیہ تھا۔ دیواروں کے ساتھ بانس کی کھپچیوں سے بنے نازک موڑھے جن کی گولائیوں پر شیشے کی گیندیں جھول رہی تھیں۔ رگھو نے ایک ڈوری کھینچی جو دروازے کے ساتھ ہی نیچے تک چلی آئی تھی۔ پنکھا ٹھمک ٹھمک کے چل پڑا۔ اڈّے پاڑے میں بجلی کا پنکھا میں نے پہلی مرتبہ ہی دیکھا تھا۔ رگھو ڈوری کھینچتے ہی سیدھا افقی دیوار کی جانب گیا۔ وہ سنگھاسن ہی تھا، جس پر ایک لجائی ہوئی حسینہ کی قدِ آدم مورتی رقص کر رہی تھی۔ رگھو نے اُسے جھک کے پرنام کیا۔ وہ بلاشبہ لکشمی تھی۔ وہی نین نقش، وہی قد کاٹھ، وہی اٹکھیلیاں کرتی زلفیں۔ وہی شربتی رنگت، وہی بدن کے دل نشین نشیب و فراز۔ لکشمی کو سامنے بٹھائے بنا وہ مورتی تراشنا ناممکن تھا۔ رگھو بہت دیر تک ہاتھ جوڑے سر جھکائے کھڑا رہا۔ میں ایک موڑھے پر بیٹھ گیا۔ چندن کی دھیمی دھیمی خوش بُو نے ماحول رومان پرور بنا رکھا تھا۔ میں نے ناقدانہ نظروں سے کئی بار جائزہ لیا، مگر کوئی عطردان یا خوش بُو کا ماخذ دکھائی نہیں دیا۔ رگھو آچاریوں کی طرح ہاتھ جوڑے کوئی پاٹھ پڑھتا رہا۔ کمرے کے تمام خدوخال مجھے ازبر ہو چلے تھے اور اب بے زاری سی ہونے لگی تھی۔ رگھو مجھے کمرے میں لا کے بھول گیا تھا، لیکن نہ جانے کیوں مجھے اُس کا استغنا مصنوعی معلوم نہیں ہُوا۔ وہ آپے میں نہیں تھا۔ وہ دن بھر اڈّے پر مصروف رہا، لیکن وہ وہاں تھا ہی نہیں۔ مجھے لکشمی یاد آئی۔ واقعی وہ حسن و جمال میں یگانہ تھی۔ کسی بھی فرزانے کو دیوانہ کرنے کے کمال سے متصف۔

بہت دیر بعد رگھو کی پرارتھنا ختم ہوئی۔ وہ پلٹتے ہی بولا۔ اُس کا لہجہ صاف تھا۔ ''بابر بھائی! لکشمی دیوی کے بعد آپ پہلے آدمی اس پوتر استھان میں داخل ہوئے ہو۔'' رگھو کی آواز سوز سے بوجھل تھی۔ وہ بہت بڑی بات کہہ گیا تھا۔ ایسا فراخ دل بے حد تعلیم یافتہ ہندو ہی ہو سکتا تھا۔ وہ خاموش نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

''رات ہی گزارنی ہے۔ کسی اَور کمرے میں گزار لوں گا، صفائی ستھرائی کا تمھیں اندازہ ہونا چاہیے۔'' میری زبان مَن بھر کی ہو رہی تھی۔ خجالت سے جسم گرا جاتا تھا۔

''نہیں نہیں، ایسی بات نہیں ہے بابر بھائی! میں اپنی چاہت سے آپ کو یہاں لے کر آیا ہوں۔'' وہ بے چین ہو کے میری راہ میں کھڑا ہو گیا۔

''لیکن مجھے اچھا نہیں لگا۔'' میں نے نظریں کچھ اَور جھکاتے ہوئے کہا۔ اُس کی اس کمرے سے وابستگی، دھرم کے وچار، مورتی کا حجاب، اس کے آتشیں جذبات، سبھی کچھ تو مانع تھا میرے یہاں آنے میں، مگر وہ پھر بھی لایا تھا۔ نہ جانے کیوں۔

''بابر بھائی! جب آپ پہلی مرتبہ دکھائی پڑے تھے، تبھی یہاں بڑی ہلچل مچی تھی...'' رگھو نے دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''بابر بھائی! بہت اپنے اپنے لگتے ہو! معلوم نہیں کیوں لگتے ہو، پر سچ مانیں کچھ ہے جو مجھے آپ کی طرف دھکا دیتا ہے۔ استاد نے بول دیا، ورنہ میں خود موقع ڈھونڈ رہا تھا کہ

آپ سے کہوں، آپ کچھ وقت مجھے دیں۔"

"میرے لیے حیرت کی بات ہے، مگر یہ بتاؤ کہ تم پریشان کیوں لگتے ہو؟"

"ابھی آپ اِدھر بیٹھیں، پھر سوال کریں۔" رگھو نے مجھے ہاتھ سے کھینچ کے چارپائی پر بٹھا دیا۔ خود چشم زدن میں نیچے بیٹھ گیا۔

"ارے نہیں نہیں۔ اِدھر، اوپر بیٹھو۔ شرم سار نہ کرو۔"

میں جس طرح بیٹھا تھا، اسی طرح کھڑا ہو گیا۔

"بابر بھائی! آپ استاد ہیں۔ بڑے کلاکار ہیں۔ چھلیا استاد تو آپ کو دیوتاؤں کے سنگھاسن پر بٹھاتا ہے۔"

رگھو نے میرے پیر چھونے کی کوشش کی۔ مجھے اِس منصب داری سے چڑ ہونے لگی تھی۔ کبھی تو ایسی عزت اور کبھی یہ حال کہ بول و براز کے ساتھ کال کوٹھڑیوں میں عزلت نشینی۔ میں نے رگھو کی ایک نہ چلنے دی۔ اُس کے ساتھ قالین پر بیٹھ گیا۔

"یہ اچھی بات نہیں ہے۔" رگھو شاکی ہو کے بولا۔

"چھوڑو اچھی یا بری بات کو۔ یہ سب کیا ہے، یہ کمرا، اڈّا اور تم؟"

"بابر بھائی! یہ اڈّا میرا بدن ہے۔ یہ کمرا میرا دل... اور اپنے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" رگھو نے دھیرے سے مسکرا کے کہا۔ میں اُس کے اِس فلسفیانہ طرزِ استدلال پر حیران ہی رہ گیا۔ وہ تو ہر لمحے مجھے چونکا رہا تھا۔

"تمھاری تعلیم کتنی ہے؟"

"جونا گڑھ سے بی اے پاس کیا تھا۔"

"اوہ! پھر یہاں، یہ سب؟"

"یہ لمبی داستان ہے بابر بھائی! رات بہت چھوٹی، پھر کبھی۔" رگھو کی آنکھوں میں دیے جلتے بجھتے لگے تھے۔

"یہ مورتی لکشمی دیوی کی نہیں لگتی!" میں نے دانستہ اُس کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔

"سنتیا ماں کی قسم! یہ لکشمی ہی ہے۔ لکشمی دیوی!" رگھو یک دم طیش میں آ گیا۔

"کسی سچے سنگ تراش کا کمال ہے۔"

"میں نے تراشی ہے!" رگھو نے جواب دے کر مجھے اچھلنے پر مجبور کر دیا۔

میں بے اختیار ہو کے اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک غیر مرئی قوت مجھے سحر زدہ کیے مورتی کے قریب لے گیا۔ انگ انگ تخلیقِ خالق کی گواہی دے رہا تھا۔ میرے دل میں کہیں یہ خواہش مچل کہ کاش لکشمی ایک بار خود کو مجسّم دیکھ لے۔ سبھی کچھ ہار جائے گی۔

"کتنا عرصہ لگا؟" میں نے رگھو سے پوچھا۔ میں واپس آ بیٹھا تھا۔

"چھ مہینے تو لگے ہی تھے۔" رگھو کے چہرے پر کچھ بشاشت نمودار ہو رہی تھی۔

"تم اعلا پائے کے سنگ تراش ہو۔ کیسے اور کس سے سیکھا؟"

"چھیتل بابو سے۔ ہائی اسکول میں استاد تھے۔ اب بھی ہیں۔ ہمارے پڑوس میں رہتے تھے، وہ وہیں رہتے ہیں۔ پر ہمارا گھر وہاں نہیں ہے۔" رگھو کی آواز جیسے منجدھار میں ڈوبنے لگی تھی۔

میں نے خاموشی سے اُس کی طرف دیکھنا ہی مناسب سمجھا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر کسی خود کار آلے کی طرح بولتا چلا گیا کہ میری ماں کا احمد آباد میں بڑا نام تھا۔ جتنا بڑا نام ہندستان میں کسی پیشوا کا ہو سکتا تھا، اس سے بڑا نام میری ماں کا احمد آباد میں تھا۔ شوبھا بائی۔ وہ ساتویں دن گھنگرو باندھتی تھی۔ تب سب چوبارے بند ہو جاتے۔ بمبئی کے بہت بڑے صنعت کار مدن لال تک شوبھا بائی کے گھنگروؤں کی جھنکار پہنچی تو وہ احمد آباد دوڑا چلا آیا، اور جب شوبھا بائی کے اعضا کی شاعری دیکھی تو سبھی کچھ ہار بیٹھا۔ اُدھیڑ عمر کالے کلوٹے مدن لعل نے مُنہ مانگی بولی دے کر شوبھائی بائی کو چھڑوا لیا۔ اُس کا دلواڑا شہر میں آنا جانا رہتا تھا، کیوں کہ اُس کی ایک مِل وہاں بھی تھی۔ شوبھا بائی کو دلواڑا میں مکان لے دیا۔ اپنے قابلِ اعتماد نوکروں کا جوڑا شوبھا بائی کی خدمت اور نگرانی کے لیے وہاں چھوڑ دیا۔ شوبھا بائی کو اگرچہ مدن لعل پسند نہیں تھا، لیکن اُسے چار دیواری کی زندگی بھلی لگی۔ جب اُس کا پاؤں بھاری ہُوا تو اُس نے مدن لعل کو نہیں بتایا۔ آخر کب تک! مدن لال کو معلوم ہوا اُس نے سر پیٹ لیا، مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ شوبھا بیٹا پا کر ساری دنیا سے بیگانی ہو گئی۔ اُدھر مدن لعل بھی بیٹے کو دیکھ کے پسیج گیا۔ کنڈلی بنوائی۔ جیون لعل نام تجویز ہُوا۔ جیون لعل بہت بھاگوان ثابت ہُوا۔ مدن لعل کا کاروبار اور پھیل گیا۔ آ مدن دُگنی ہو گئی۔ اُدھر مدن لعل کا دل بھی جیون لعل میں اٹکا رہتا۔ جیون لعل کی تعلیم کی خاطر شوبھا جونا گڑھ اٹھ آئی۔ سوامی اسکول میں داخلہ کروایا۔ جیون لعل نے جب دسویں پاس کی تو ایک اندوہ ناک خبر اُس کے پیچھے آئی۔ مدن لعل رات اچھا بھلا سویا تھا، مگر صبح اپنے بستر پر مردہ پایا گیا۔ مدن لعل کے مرنے کی اطلاع شوبھا کے پاس قریب مہینے بعد آئی تھی۔ وہ بولائی ہوئی بمبئی پہنچی۔ مدن لعل کے خاندان نے اُسے دھکے دے کر نکال دیا۔ اُس کے بیٹے اپنے باپ کی کسی دوسری بیوی سے واقف نہ تھے۔ جیون لعل کا نام سُن کے تو وہ بتھے سے اُکھڑ گئے۔ شوبھا نے کچہری کر لی، مگر ان جھمیلوں سے واقف نہ تھی۔ وکیلوں کو پیسے وہ دیتی، مگر وکیل دم مدن لعل کے بیٹوں کا بھرتے۔ آخر تھک ہار کے جونا گڑھ جا بیٹھی۔ سال بھر جمع پونجی سے گزر بسر ہوتی رہی... مگر کب تک! جیون لعل کے تربیتی اخراجات نوابوں سے کم نہ تھے۔ شوبھا چند دن ہی غربت سے گزار سکی۔ وہ بیٹے پر اُٹھنے والے اخراجات میں کسی طور کمی کرنے پر آمادہ نہ ہوئی۔ ابھی آتش جوان تھا۔ اُس نے راتیں رنگنی شروع کر دیں۔ امرا شرفا پچھلے پہر خاموشی سے آتے اور خاموشی سے چلے جاتے۔ مدن لعل سے کچھ بھی چھپا نہ رہا تھا۔ وہ چودھویں پاس کر کے اب گھر میں پتھروں کی تراش سے وقت گزاری کرتا۔ اُس نے کلکٹری کے لیے درخواست دے دی تھی۔ جیون لعل ماں کے لچھن جانتا تو تھا، مگر سب کچھ واضح نہ تھا۔ وہ اسے بتاتی تھی کہ اُس کے باپ کا دیا سونا توڑ توڑ کے گاڑی چلا رہی ہے، لیکن ایک دن ہونی ہو کے رہ گئی۔ اُس نے ماں کو سیٹھ گردھاری چند کے ساتھ بستر پر پڑے دیکھ لیا تھا۔ شوبھا کو زخم کاری پڑا تھا۔ وہ وہیں مر گئی، البتہ گردھاری کو اسپتال والوں نے بچا لیا۔ جیون لعل بھاگ کے دلواڑا چلا آیا۔ یہاں اُسے چھلیا مل گیا۔ چھلیا نے اُسے پورے دو سال اڈّے پر چھپائے رکھا۔ آخر پولیس بھی اُسے بھول بھال گئی۔ پرچہ داخلِ دفتر کر دیا گیا۔ ان دو سالوں میں چھلیا نے اپنا سارا فن اُس کی ہتھیلی پر رکھ دیا تھا۔ اِدھر جیون لعل پیدائشی فن کار تھا۔ استاد کو پیچھے چھوڑ گیا۔ چھلیا اُسے اولاد کی طرح رکھتا تھا، پھر ایک دن چھلیا اپنا چاقو چوکی پر رکھ کے کھڑا ہو گیا۔ اُس کی برہمی کے باوجود جیون لعل نے چھلیا کا چاقو اٹھا لیا۔ دو ایک شوخ طنطنا کے اٹھے تھے کہ کل کا چھوکرا ہے، لیکن جیون لعل نے اس تیزی سے اُنھیں بٹھایا کہ اُس کا نام ہی رگھو پڑ گیا، جب کہ شہر کی ایک مشہور شخصیت سیٹھ رگھو بوری والا سے رگھو کی عرفیت کیا ملی، لوگوں نے اُسے بھی رگھو بوری والا کہنا شروع کر دیا، حالاں کہ بوری والا خاندان سے اُس کا دُور دُور تک کوئی رشتہ نہیں تھا۔ چھلیا احمد آباد چلا گیا۔ وہاں سے بمبئی، پھر وہاں سے مانا ورو۔ آخر گر کے مضافات میں گوشہ نشین ہو گیا۔ رگھو کا نام اُس وقت دور تک سنا گیا جب اُس نے دلواڑے کے تمام بالا خانے بند کروا دیے۔ شرفا میں کھلبلی مچ گئی۔ آخر چھلیا نے معاملہ نبٹایا۔ اُس کی مداخلت پر رگھو چپ کر گیا۔ اُس کی زندگی سیدھی سادی ڈگر پر چلنے لگی، پھر ایک دن سیٹھ راج پٹیل نے اپنی لڑکی کا معاملہ اُس کے سپرد کیا۔ لکشمی فیکٹری کے معمولی ملازم قاسم میمن پر فریفتہ ہو گئی تھی۔ رگھو نے قاسم میمن کو دھمکایا تو اُس نے رقم کا تقاضا کر دیا۔ اس قضیے کے دوران رگھو کئی مرتبہ لکشمی سے بالمشافہ مل چکا تھا۔ اس چھیل چھبیلی حسینہ کی کج ادائیاں اُسے گھائل کر رہی تھیں۔ رگھو بھی بات بے بات سیٹھ راج پٹیل کی کوٹھی کے چکر لگانے لگا۔ اُس نے لکشمی کو متنفر کرنے کے لیے بتایا کہ قاسم میمن دام مانگ رہا ہے تو لکشمی نے اِٹھلا کے کہا کہ وہ بھی دل بستگی کو کھیل تماشا کر رہی تھی۔ اِٹھلانے کو تو وہ اِٹھلا گئی تھی، مگر رگھو کا قرار لوٹ لے گئی۔ رگھو نے براہِ راست راج پٹیل سے لکشمی کا ہاتھ مانگ لیا، مگر راج پٹیل نے یہ کہہ کر جھٹک دیا کہ اس سے اچھا تو قاسم پٹیل تھا۔ راج

پٹیل کو اپنی مل کا گھمنڈ تھا۔ رگھو نے بھی مل لگانے کی ٹھان لی۔ چھلیا کے علاوہ کوئی نہیں مانتا تھا کہ رگھو ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہے۔ اس کے لیے اُسے کثیر سرمایہ درکار تھا۔ اُس نے پہلی مرتبہ اپنے باپ کی جائیداد میں سے حصہ مانگنے کی سوچی۔ وہ سیدھا جمبئی پہنچ گیا۔ اُس کی ماں ایک اَن پڑھ اور کم زور عورت ہونے کے ناتے ڈر دُبک کے بیٹھ گئی تھی۔ رگھو نے کاغذ ٹٹولے تو بے شمار ثبوت اُس کے ہاتھ لگ گئے۔ تعلیم، طاقت اور سچ کی سہ آتشہ قوت نے اُس کے سوتیلے بیٹوں کو سر جھکانے پر مجبور کر دیا۔ اُس کے حصے میں چھتیس لاکھ کی خطیر رقم آئی۔ دینے کو رقم تو اُسے دے دی گئی تھی مگر وہ سانپ کی طرح پھنکار رہے تھے۔ رگھو کا کام دھندا بھی اُن سے چھپا نہیں رہا تھا۔ وہ اصل سے کہیں کم حصہ لے گیا تھا۔ وہ بارہ پلٹ سکتا تھا۔ ادھر رگھو نے دلواڑے میں مل کی بنا ڈال دی تھی۔ فیکٹری بہت تیزی سے تکمیل کے مراحل میں تھی کہ ڈکیتی کے دو مختلف مقدمات میں سورت اور ممبئی کی پولیس اُس کے وارنٹ لے کر پہنچ گئی۔ دلواڑے میں مشہور ہو گیا کہ رگھو ڈاکا مار کے فیکٹری بنا رہا ہے۔ رگھو کے سوتیلے بھائیوں نے پولیس کی ملی بھگت سے یہ ڈراما رچایا تھا۔ سورت کی ڈکیتی کے ساتھ ایک قتل بھی تھا۔ پھانسی نہ سہی، عمر قید ضرور ہوتی، مگر رگھو نے اپنے وکیل کے ساتھ مل کے جھوٹے مقدمے کے پرخچے اُڑا دیے۔ خوش قسمتی اُس کے ساتھ تھی۔ واردات کے اصل مجرم کلکتہ میں گرفتار ہو گئے۔ اُنھوں نے سورت کی ڈکیتی اور قتل بھی قبول لیا اور یوں رگھو صاف بچ آیا۔ ادھر دلواڑا میں سب تیاپانچ ہو رہا تھا۔ لکشمی کی سگائی تھی۔ رگھو اب زندگی سے بے زار ہو چکا تھا۔ اُس نے لکشمی کے متوقع پتی وشنو پٹیل کو علی الاعلان قتل کرنے کی بات کہہ دی۔ وشنو پٹیل پیچھے ہٹ گیا۔ حالات واقعات اُسے جس قدر لکشمی سے دُور کرتے رہے، اسی قدر لکشمی اُس کے نزدیک ہوتی رہی۔ اُس کی مانگ شدید محبت اور پھر جنوں میں ڈھل گئی، پھر ایک دن لکشمی نے بھرے بازار میں رگھو پر تھوک دیا اور چیخ چیخ کے کہا کہ وہ بھنگی چمار سے شادی کرے گی، مگر رگھو سے نہیں۔ ایسا کبھی ہوا تو زہر کھا مرے گی۔ تب سے رگھو پاش پاش ہو گیا تھا۔ تیل کی فیکٹری ادھوری اور اجاڑ پڑی تھی، لاکھوں رُپے بینک میں پڑے گل سڑ رہے تھے، لیکن رگھو کو اب کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی۔ اڈّے سے بھی بس وہ راہ و رسم نبھا رہا تھا۔

رگھو نے اپنی بات مکمل کی تو میں نے کہا، ”تو لکشمی جس سے بیاہ کرے گی تم اسے مار دو گے؟“

”ہاں۔“ رگھو نے یک دم بھڑکتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے، اس پر قائم رہنا۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔ میرا ذہن کہیں الجھا ہوا تھا، پھر میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اُس سے پوچھ لیا۔ ”تم کسی شاکر بھائی کو جانتے ہو؟“

”ہاں اچھی طرح۔ اُس کا سارا کام اِدھر ہی ہوتا ہے۔ آپ کیوں پوچھتے ہو!“

”بس یوں ہی۔ گذشتہ دنوں اُس کا کوئی کام کیا تھا؟“

”ہاں۔ اُس کے مہمان تھے ایک مولوی صاحب۔ دوسرے اُن کی لڑکی کو تلاش کرتا تھا، وہ گم گئے تھے۔“

میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا، ”تو پھر؟“

”اِدھر تو اُن کا پتا نہیں چلا، پھر شاکر بھائی...“

میری دھڑکن بے قابو ہو گئی۔ ”شاکر بھائی؟“

”شاکر بھائی کو ممبئی میں اُن کا اتا پتا ملا ہے۔“

رگھو میری طرف بہ غور دیکھ رہا تھا، اور میرا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ معاً دوڑتے قدموں کی آواز آئی۔ کسی نے دروازہ بے طرح پیٹنا شروع کر دیا۔

”استاد! پولیس اڈّے پر گھس آئی ہے۔ پکا گھیرا ہے۔ بولتے ہیں وارنٹ ہے، تلاشی لینی ہے۔“

پولیس کی آمد میرے لیے غیر متوقع نہیں تھی۔ بتھل انھیں مطلوب تھا۔ مطلوب بھی ایسا کہ جس کے مول پر پوری ریاست چڑھی ہو۔ اڈّے والوں کی مقدور بھر احتیاط چور دروازے بند نہیں کر سکتی۔ اڈّے والے ہزار ہاتھ پاؤں رکھتے ہیں۔ پولیس والے ہزاروں آنکھیں رکھتے ہیں۔ رگھو کے اڈّے پر بتھل کو اس رسانی سے دیکھ کے مجھے عجیب گمان ہُوا تھا۔ جسے میں نے اگلے ہی لمحے جھٹک دیا تھا۔ جو خیال مجھے آ سکتا ہے وہ بتھل کو مجھ سے کہیں پہلے آ گیا ہوگا۔ اس کے پاؤں کی زنجیر پولیس نہیں کوئی اور ہی چیز تھی۔ کوئی 'ے' ایسا بھی رقم ہو جاتا ہے کہ 'الف' پر مقدم ٹھیرتا ہے۔ بتھل کا 'ے' بھی 'الف' پر ہمیشہ مقدم ہی ٹھیرا تھا۔ عجب نہیں تھا کہ پولیس کی آمد شاکر بھائی کے تذکرے سے میرا ارتکاز منتشر نہیں کر سکی۔ میں نے تسلسل میں کہا، اس طرح ڈوبتے ابھرتے بے قابو دل سے۔ ''میں ابھی اور اسی وقت شاکر بھائی سے ملنا چاہتا ہوں۔''

رگھو مجھ سے اس سوال کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ کچھ پولیس کی اُفتاد نے اُسے سٹپٹا دیا تھا۔ اُس نے لہجے میں ترش اور طنز کی آمیزش دانستہ نہیں سموئی تھی۔ ''کمال کرتے ہو بابر بھائی! ابھی استاد پولس کے ہتھے چڑھ گیا تو واپسی نہیں ہے۔ شاکر بھائی کو گولی مارو۔'' رگھو نے طوفان کی طرح چڑھ کے دروازے کھول دیا۔ آنے والا بھی سیلاب بلا کی طرح دروازہ پیٹ رہا تھا۔ دروازہ کیا کھلا بند ٹوٹ گئے اور وہ منہ زور اپنی ہی لہر میں اندر گھستا چلا آیا۔ ''چھلیا استاد، بتھل استاد، جورا استاد اور جمرو استاد کو لے کے باؤلی سے نکلنے کا ہے۔ رگھو کو بولنے کا ہے بابر استاد پولس بھگتا لے گا۔ تو رپھڑا نہیں کرنے کا۔ شانت رہنے کا ہے۔'' ٹھگنے کی طرح دبلے منحنی اور ایستادہ کارندے نے پھولے ہوئے سانسوں سے جلدی جلدی اپنا مدعا اُگلا۔ ''استاد چرِیا ہو گیا... سالا رگھو بتاتی نہیں ہے۔ پولس کی ماں کا۔ چوکی پر آ گئے ہیں یا دروازے پر کھڑے ہیں۔'' رگھو چھلیا کا پیغام سُن کے طیش میں آ گیا۔

مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ یہ پیغام چھلیا کا نہیں، بتھل کا تھا۔ میں پولیس سے نمٹنے کی صلاحیتوں سے مالا مال نہیں تھا۔ بتھل نے سیدھے سادے الفاظ میں مجھے تنبیہ کی تھی کہ معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹانا ہے۔ کسی طور پر بات بڑھنی نہیں چاہیے۔ بتھل جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ اور میرے سر میں شاکر بھائی کا سودا سمایا ہُوا تھا۔ راہ داری سے افراتفری کی سرگوشیاں یہاں تک آ رہی تھیں۔ پولیس کے لیے ماحول یقیناً ساز گار بنایا جا رہا تھا۔ رگھو نے مجھے کمرے میں ٹھیرنے کا کہا اور خود باہر جانے لگا۔ میں اس سے پہلے قدم اٹھا چکا تھا۔ نتیجتاً دونوں لُڈ مُڈ گئے۔

''بابر بھائی آپ یہیں ٹھیرو۔ مجھے کتے سدھانے آتے ہیں۔'' رگھو نے ناگواری سے کہا۔ ہر چند کہ اُس نے اپنے تاثرات چھپانے کی کوشش کی تھی۔

لیکن میں نے اُس کی سنی نہیں اور باہر نکل آیا۔ پولیس معمول کی کارروائی پر نہیں آئی تھی۔ معاملہ دگرگوں تھا۔ رگھو بھی جھلایا ہُوا میرے پیچھے لپک آیا۔ صحن کے پورے حصے میں ایک دالان چھتا ہُوا تھا۔ اُس کے پیچھے چوکی تھی۔ چھت، کمروں اور نہ جانے کس کس کونے کھدرے سے نکل کے اڈّے کے مکین وہاں جمع ہو رہے تھے۔ سب کے کرتے سیدھے تھے۔ کندھے شریفوں کی طرح ڈھلکے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں سے اضطراب جھلک رہا تھا۔ سب کے سب بیرونی چوکھٹ کی طرف رُخ کیے ہوئے دست بستہ کھڑے تھے۔ جیسے پولیس بھی جانتی تھی کہ یہ شرفا کا ٹھکانا ہے ویسے ہی وہ بھی شرفا ہی تھے۔ دروازہ بے طرح سے پیٹا جا رہا تھا۔ دروازہ کیا تھا شیشم کے بڑے بڑے جناور تھم تھے۔ جنھیں توڑنا پولیس کے لیے سردست ممکن نہ تھا۔ ہمارے صحن میں پہنچتے ہی سب کی حکم طلب نظریں رگھو کی طرف اُٹھ گئیں۔ رگھو نے میری طرف ایک نظر اٹھا مجھے ان سب کا مرکز بنا دیا۔ میرے پاس سوچنے کی فرصت نہیں تھی۔ میں کسی ہچکچاہٹ اور تردّد کے بغیر چوکی پر جا کے بیٹھ گیا۔ ایسی سسکاری اُبھری، گویا سب نے ایک ہی منہ سے سانس بھرا ہو۔ اس طرح اور اس وقت چوکی پر بیٹھنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

''رگھو دروازہ کھلواؤ!'' میں نے سکون سے کہا۔

''او چڑی مار سنگل گرا دے۔'' رگھو نے دروازے کے پاس کھڑے دو تین میں سے ایک کو کہا۔

دروازہ کھلتے ہی پولیس گرتی پڑتی اندر کی اور چڑھ دوڑی۔ پہلے ہلّے میں پندرہ کے قریب سپاہی اندر گھس آئے، ان میں کوئی افسر شامل نہیں تھا۔ پولیس والے اپنی جھونک میں لاٹھیاں سونتے سیدھے چوکی ہی کی طرف آئے۔ گویا شدید ردِعمل کی توقع تھی۔ اڈّے میں اس وقت کم و بیش بارہ سے پندرہ کارندے موجود تھے۔ اور وہ بھی سب کے سب صحن میں۔ عموماً پولیس اڈّوں میں اس طریق داخل نہیں ہوتی۔ پولیس والے دو مقامات ہی سے متعلق کاربند ضوابط ہُوا کرتے ہیں۔ اول تھانا دوم اڈّا۔ کامیاب پولیس افراد اور اڈّے کے درمیان خوب چھنتی ہے، مگر ادب آداب کے ساتھ ہر لحاظ مراتب ''وہ اپنی ماں کو تجر خانے چھوڑ گئے تھے۔'' رگھو دانت پیستے ہوئے زیرِ لب بڑبڑایا۔ وہ چوکی کے پہلو میں کھڑا تھا۔ میں نے تنبیہ کے طور پر ترچھی نظر کی تو اُس نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے۔ میرا ذہن بہت تیزی سے حالات کا تجزیہ کرنے میں مصروف تھا۔ پولیس بتھل کی برآمدگی کے لیے اڈّے پر چڑھ دوڑی تھی۔ لامحالہ وہ پکّی مخبری کے ساتھ آئے تھے، آسانی سے ٹلنے والے نہیں تھے۔ رگھو کی بڑائی بھی بجا تھی۔ اڈّے کا بھرم ہی تو سب کچھ ہُوا کرتا ہے۔ بھرم نہ رہا تو پھر کیا رہا۔ تحفظ، رُعب اور طاقت ہی تو اڈّے کی علامت ہے۔ یہ علامت نہ رہے تو اڈّا کہاں رہا کرتا ہے۔ پولیس آتی ہے اڈّوں سے لوگوں کو گرفتار بھی کر کے لے جاتی ہے، مگر سج اور سبھاؤ سے۔ داخل ہونے سے پہلے اجازت طلب کی جاتی ہے۔ شرافت سے آئے اور شرافت سے چلے۔ ایسے نہیں کہ تھم بلم لے کے چڑھ دوڑے چاچا کے چبوترے پر۔ اب کئی دن تک رگھو کے گزرے پیچھے لوگ کن سوئیاں کریں گے۔ معنی خیز مسکراہٹیں رگھو کے پیچھے دوڑائی جائیں گی، مگر مجال ہے کہ اس کے مڑنے پر سوائے سناٹے اور جھکی ہوئی گردنوں کے کچھ باقی ہو۔ بہ ہرحال، اس موسم تک رگھو کا بھرم رخصت ہو گیا تھا۔ پولیس کا بات چیت کا قطعاً کوئی ارادہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ سپاہیوں نے اندھا دھند لاٹھیاں چلانی شروع کر دیں تھیں۔ پھر تو جیسے چوکی کے گرد پروانے جمع ہو گئے۔

لاٹھیوں سے جل جل کے گرنے والے۔ ان کے پیچھے مزید دس پندرہ سپاہی اور اندر گھس آئے۔ وہ سیدھے کمروں کی طرف دوڑ گئے۔ اُن کی بھاگ دوڑ سے بٹھل کی شدید طلب عیاں تھی۔ رگھو چٹان کی طرح منہ بھینچے ساکت وجامد کھڑا تھا۔ اور میں بھی مضبوطی سے جما بیٹھا تھا۔ چوکی کے گرد شیدائیوں نے دو گھیرے ڈال رکھے تھے۔

پہلا گھیرا پانچ افراد کا تھا، جب کہ اُس کے اوپر دس جنے جڑے کھڑے تھے، سپاہی وحشیانہ انداز میں لاٹھیاں گھما رہے تھے، مگر ادھر نہ کوئی آہ تھی نہ کراہ اور نہ کوئی شگاف۔ پولیس کا طرزِ عمل ناقابلِ سمجھ تھا۔ انھیں ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے اب اُٹھ جانا چاہیے تھا۔ کسی بے ضبطے نے اگر چاقو کھول لیا تو بات سنبھالنی مشکل ہو جائے گی۔ رگھو نے خود پر مکمل لاتعلقی ظاہر کر رکھی تھی۔ میرا ذہن خالی خالی سا ہو گیا تھا۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ آخر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ادھر انسپکٹر اجیت اڈے کے دروازے پر نمودار ہوا۔ باروٹیہ کے قاتل پکڑنے کے لیے وہ خاصی دل جمعی سے کام کر رہا تھا۔ انسپکٹر اجیت کی نظریں مجھی پر پیوستہ تھیں۔ شاید اُسے گلاّ ی سے زیادہ بٹھل مطلوب تھا۔

”رُک جاؤ! رک جاؤ۔ یہ کیا کر رہے ہو!“ اجیت سپاہیوں کی ٹھم بھی دیکھ کے چلاّیا۔ کچھ اس طرح جیسے کہہ رہا ہو اس سلسلے کو اور تیز کرو۔

حسبِ توقع لاٹھیوں کی گردش کچھ اور تیز ہو گئی۔ بہت سوں کی چمڑی لاٹھیاں اتار لائی تھیں، بازوؤں کی ہڈیاں بھی کچھ ضرور ٹوٹی ہوں گی۔ یہ دیکھ کے اڈے کے درودیوار بھی حیران ہوں گے کہ کسی تختہ مشق نے آہ تک نہیں کی۔ آخر کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے گالیاں اور لاٹھیاں دونوں تھم ہی گئیں تاوقتیکہ انسپکٹر مجھے دیکھ کر دو تین مرتبہ چلاّیا نہیں۔

”ابھی تھکنے کا نہیں اے صاب۔ جورو کھانے کا ہے۔ ادھر جورو کھانے کا ہے۔“ ایک لمبے تڑنگے کھردرے سے کارندے نے بپھر کے کہا۔ میں جب اڈے میں آیا تھا وہ اس وقت بھی پیش پیش تھا۔ اسے چھلیا نے کاٹو کے نام سے دو ایک مرتبہ بلایا تھا۔

اجیت نے اُسے کینہ توز نظروں سے گھورا اور کہا۔

”اُسے گاڑی میں بٹھاؤ، اس کی سیوا کمرے میں ہوگی۔ حوالدار شرما!“

”جی سرکار!“ چمکتی ہوئی وردی میں ملبوس ایک نوجوان پولیس والے نے مستعدی سے جواب دیا۔

”یہاں سے بٹھل اور اس کے ساتھی کی ہر حال میں برآمدگی چاہیے۔ یہ سوچ کے تلاشی لینا کہ تم چیونٹیوں کو ڈھونڈ رہے ہو۔ وہ دیوار کی اینٹوں اور پتھروں سے پیچھے سے بھی برآمد ہو سکتی ہیں۔“ اجیت نے میری طرف دو قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ میری آنکھوں سے انگارے نکلتے ہوئے اسے یقیناً نظر آ رہے ہوں۔ میں ابھی تک اپنی جگہ پر ساکت بیٹھا تھا۔ اجیت کے حکم کی تعمیل میں دو سپاہیوں نے کاٹو پر ہاتھ ڈالا۔

”ان سے کہو کہ کاٹو سے دُور ہو جائیں۔“ دفعتاً میں نے بھڑکتے ہوئے کہا۔ میں چوکی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

”پولیس کے کام میں جو رکاوٹ ڈالے گا، وہ تھانے جائے گا۔“ اجیت نے کہا۔

”پولیس کی آمد کا سبب جان سکتا ہوں میں انسپکٹر اجیت صاحب!“ میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔

”مسٹر بابر آپ کو اس وقت کیمپ میں ہونا چاہیے تھا۔ آپ ابھی تک یہیں ہیں۔“

”میں وضاحت کر چکا ہوں اور میں اپنے ساتھیوں کے بنا یہاں سے نہیں جاؤں گا۔“

”وضاحت تو آپ کو پولیس نے بھی کر دی ہے کہ آپ کے ساتھی اجازت کے بنا یہاں سے نہیں جا سکتے۔“

”میرے ساتھی مجھے مل جاتے تو میں اب تک یہاں نہ ہوتا۔“

”ٹھیک ہے، کچھ دیر میں پتا چل جائے گا۔ ہمیں پکا بھید ملا ہے۔ باروٹیہ کا قاتل یہاں آپ کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں بابر صاحب؟“ انسپکٹر اجیت نے جس انداز میں باروٹیہ کا قاتل کہا تھا یوں لگتا تھا جیسے اس نے کہا ہو کہ میرے ”باپ کا قاتل“۔ باروٹیہ سے اس کی وابستگی شدید تھی۔ اس سے قبل بھی کئی مرتبہ وہ اپنے طرزِ عمل سے اس کا اظہار کر چکا تھا۔

نوجوان حوالدار اندر سے آ کے اجیت کے کان میں کھسر پھسر کرنے لگا۔

”میں بتا چکا ہوں وہ مجھے مل جاتے تو میں تمھیں یہاں نہ ملتا۔“ میں نے لہجے میں ذرا نرمی پیدا کی۔

سپاہی لاٹھیاں جھٹک کے ایک طرف ہو گئے تھے۔ مضروب اور ضارب دونوں ایک دوسرے کو پیغام رساں نظروں میں تول رہے تھے کہ کبھی تو اکیلے ملو گے۔ میرا خیال تھا کہ انسپکٹر اجیت کا اڈے پر دھاوا اپنے افسروں سے بالا ہی بالا کوئی کام ہے۔ وہ خاصا خود اعتماد قسم کا پولیس افسر دکھتا تھا۔ اس نے حکومت برطانیہ کے دو اہم نمائندے خاموشی سے راہِ عدم پہنچا دیے تھے۔ وہ یہاں کچھ بھی کر سکتا تھا۔ وہ انگریزوں سے انتہائی نفرت کرنے والوں میں سے دکھتا تھا۔ شاید یہی نفرت اسے باروٹیہ سے بہت قریب کرتی تھی۔ مجھے علم نہیں تھا بٹھل کس طرف سے نکلا ہے اور کہاں گیا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ آئندہ اس سے کہاں ملاقات ہوگی۔ میں تو اس پر گزری بھی نہ جان سکا تھا۔ موقع ہی نہیں ملا۔ وہ بھی اپنے مزاج کا آدمی ہے، مرضی سے بتائے تو بتا دے، ورنہ مجال ہے جو کوئی بات بانٹ لے۔ میں نے باروٹیہ کے قتل سے متعلق جو کچھ سنا دوسروں سے سنا۔ اور اس میں سے نصف معلومات ناقص ثابت ہوئی اور نصف مبہم گڈمڈ تھی۔ میری تمام معلومات مبنی بر اندازہ ہی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میرے پیچھے بٹھل، زورا اور جمرو پر کیا بیتی۔ زورا اور جمرو سے ضرور مکمل احوال مل جاتا مگر شومیٔ قسمت وہاں محبت پروان ہی نہ چڑھ سکی۔ میں دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ خدایا، چھلیا بٹھل کو لے کر جس راستے سے نکلا ہے وہ راستہ اس مرنج نظر پولیس والے کو دریافت نہ ہو ورنہ آج کچھ بھی ممکن تھا۔ اس شخص سے کچھ بعید نہیں تھی۔ اس نے جس طرح لاٹھی چلوائی تھی اس سے اُس کے انتہائی جارحانہ عزائم مترشح تھے، ورنہ اسے یہاں ایسے طور کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔

”مجھے تمھارے ساتھیوں کا پتا چاہیے۔ ابھی اور اسی وقت۔“ انسپکٹر اجیت نے حوالدار کی کھسر پھسر کے پچھتاتے ہوئے کہا۔ حوالدار نے اُسے سرخ جھنڈی دکھا دی تھی۔

”انسپکٹر صاحب تم اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔“ میں نے اطمینان کی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

”ایک ایک کی کھال کھنچوا کے گوبر بھروا دوں گا۔ کہاں چھپایا ہے ان حرامیوں کو۔“ انسپکٹر اجیت نے روئے سخن اڈے کے دوسرے لوگوں کی طرف کر لیا۔ وہ سب تو منہ میں گھنگنیاں ڈال کے کھڑے تھے۔ ”رگھو تو بول۔ چھلیا کدھر ہے... میری اطلاع کے مطابق وہ کچھ دیر پہلے اِدھر ہی تھا۔“

”استاد بابر بھائی کو چھوڑ کے چلا گیا تھا۔ کدھر گیا پتا نہیں ہے۔“ رگھو نے اکھڑے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ اُس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اُس کا بس نہیں چل رہا۔ انسپکٹر اجیت کو پل کے پل میں بھنبوڑ دے۔

”میں یہاں سے انھیں برآمد کیے بغیر نہیں جاؤں گا۔ اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا اس عمارت کی۔“ طیش میں اجیت کے حواس اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ جو میرے لیے خوش آئند بات تھی۔

”رگھو تجھے شرم آنی چاہیے۔ دھرتی کے غداروں کو چھپا رہا ہے۔ انھیں کدھر چھپایا ہے وہ ادھر ہی ہیں۔ تجھے جیل پہنچنا نصیب نہیں ہوگا۔ بتا کدھر ہیں۔“ اجیت غصّے سے کانپتا ہوا رگھو کے قریب آ کے بولا۔

”جو کرنا ہے کر لے۔ بول دیا وہ ادھر نہیں ہے۔“ رگھو نے اپنی ٹھوڑی پر سے اُس کی چھڑی ہٹائی۔

”مسٹر بابر! تم میرے لیے انتہائی ناپسندیدہ شخصیت بن چکے ہو۔ تمھاری قسمت اچھی ہے جو بچ رہے ہو۔“

”پسند ناپسند ہر کسی کی اپنی صواب دید پر ہے۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔ مجھے معلوم تھا وہ مجھے یہاں سے تھانے نہیں لے جا سکتا۔ تحمل اور معتدل مزاج ہی سے وہ ٹل سکتا تھا۔

”میری صواب دید پر اور بہت کچھ ہے۔“ اجیت نے زہریلے لہجے میں کہا۔

”میں نے کہا ہے کہ ہر آدمی اپنی صواب دید پر بااختیار ہوتا ہے۔“

”بھلائی اسی میں ہے کہ بتا دو بٹھل کہاں ہے۔“

”ایسی بات ہے تو سنو! مجھے علم ہوتا میں تب بھی نہ بتاتا۔“ میں نے آخرکار حتمی لہجہ اختیار کر لیا۔

”جانتے تو تم ہو۔ یہاں پر تم نے اور اُس نے دھما چوکڑی مچائی ہے۔ پل پل کی خبر ہے۔“

”پل پل کی خبر ہے تو مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو۔ اسی سے پوچھو جو تمھیں پل پل کی اطلاعات فراہم کر رہا ہے۔“

بس وہ ایک ساعت تھی، جس کا دورانیہ کم مائیگی کی بدولت ماپا نہیں جا سکتا تھا۔ اجیت کی نگاہیں ایک کارندے سے ٹکرائی تھیں۔ پھر دونوں کی نظریں ایسے جدا ہوئیں جیسے کبھی ملی ہی نہیں، مگر وہ میری نظر میں آ گیا تھا، وہ پچھیے تھا۔ چھوٹے قد، مگر گٹھے ہوئے جسم کا مالک پچھیے۔ اُس آنکھیں چندھیائی ہوتی تھیں۔ چہرے کی رنگت توے کی طرح سیاہ تھی۔ پچھیے اس موقعے پر انسپکٹر اجیت کو کسی بھی قسم کی معلومات نہیں فراہم کر سکتا تھا۔ ایک ہی راستہ تھا، پچھیے کو گرفتار کر کے باہر لے جایا جاتا اس کے بعد ہی راز و نیاز ممکن تھا۔ وہی ہوا جس کا مجھے خدشہ تھا۔ اجیت نے رگھو

سمیت دو چار کو تھانے لے جانے کا حکم دے دیا۔ یقیناً ان دو چار میں اہم ترین آدمی جھیمے ہی تھا۔

"یہاں سے کوئی نہیں جائے گا۔ اجازت نامہ ہے گرفتاری اور تلاشی کا؟" میری کنپٹیاں سلگنے لگی تھیں۔ صورت حال اس سے کہیں زیادہ گھمبیر تھی جتنی نظر آ تی تھی۔ بٹھل کو دیکھنے کے بعد وہ بات بعد میں کرتا گولی پہلے چلاتا۔ اس کی جذباتی کیفیت کچھ اسی طرح کی نظر آ رہی تھی۔

"یہ ہے نا میرے پاس!" اُس نے طمنچہ نکال لیا۔ دیگر سپاہیوں نے اُس کی دیکھا دیکھی لٹکائی ہوئی بندوقیں فوراً تان لیں۔

"تو پھر چلاؤ گولی۔ یہاں سے کوئی نہیں جائے گا۔" میں نے خواہ مخواہ مسکراتے ہوئے کہا۔ رگھو مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔

"یہاں وائسرائے یا اس کا کوئی گماشتہ نہیں آئے گا۔" اجیت نے طمنچہ سیدھا میری طرف تان لیا۔ اُس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔

"انگریزوں سے تعلق کی گالی مجھے بار بار مت دو! اس سے بہتر ہے گولی چلاؤ!" میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چٹختے ہوئے اعصاب سلب کرتے جا رہے تھے۔

"جذباتی داؤ پیچ مت آزماؤ بابر صاحب! وائسرائے کا رُقعہ تمھاری جیب میں ہوگا۔"

آخر مجھے طیش آ گیا۔ بقول بٹھل کے شکست کی پہلی علامت غصہ اور جھنجھلاہٹ ہے۔ مجھے بہت آسان لگ رہا تھا کہ وہ ایک گولی چلائے جو سیدھی پیوست خاطر ہو۔ "تم کسی کراتی اور آزادی کے بھگت ہو، تم نے اپنے آپ کو از خود قید کر رکھا ہے۔ تم نے ایک دانا اور تعلیم یافتہ شخص پر ایک عقل سے عاری اور متشدد شخص مسلط کر رکھا ہے۔ تمھارے نزدیک مجھے انگریزی آتی ہے، اس لیے میں انگریزوں کا گماشتہ ہوں۔ تم کیا ہو؟ کیا تمھیں انگریزی نہیں آتی۔ کیا تم انگریزی تعلیم کے بل بوتے پر یہ وردی زیب تن نہیں کیے ہوئے۔ کیا اس بنا پر تم انگریزوں کے گماشتے نہیں کہلا سکتے؟ تمھیں پہلی مرتبہ دو انگریزوں ہی کے ساتھ دیکھا تھا۔ کیا میں تمھیں صرف اس بنا پر انگریزوں کا گماشتہ مان لیتا کہ تم دو ذی وقار انگریز افسروں کے ہمراہ آئے تھے۔ انسپکٹر اجیت حالات کا تجزیہ کرنے کے لیے انسان کو عقل کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ باروٹیہ، میں اور تم میں فرق ہونا چاہیے تھا۔" میں اپنی روانی میں بولتا چلا گیا۔ اجیت خاموشی سے طمنچہ تانے بس مجھے دیکھا کیا۔

"بولتے جاؤ۔ میں ہمیشہ سچ کے لیے لڑنا پسند کرتا ہوں۔" اُس کی آواز میں ٹھیراؤ تھا۔

"اجیت صاحب! سامنے کی بات ہے۔ باروٹیہ کیا تھا؟ باروٹیہ کیا ہے؟ ہم بالکل نہیں جانتے۔ وہ جہاز کہاں سے آ رہا تھا اور کہاں جا رہا تھا۔ اس میں سوار ہونے سے قبل ہم بالکل نہیں جانتے تھے۔ بالکل اس طرح جس طرح تم نہیں جانتے کہ تم کتنی بدگمانی میں مبتلا ہو۔"

"بابر صاحب! میں کیا ہوں اور کیا نہیں ہوں، یہ مجھ پر رہنے دیں۔ اپنی بات پوری کریں۔"

"میرا قصور صرف اتنا ہے کہ میں بھی بالکل اسی طرح تھوڑا بہت لکھ پڑھ لیتا ہوں، جس طرح تم انگریزی جانتے ہو، ورنہ میرے ساتھی اپنا نام لکھنے کی سدھ بدھ بھی نہیں رکھتے۔ ہم جہاز میں بمبئی جانے کے لیے کراچی سے سوار ہوئے تھے۔ ایک انگریز محقق کو ایسے ہندوستانی کی تلاش تھی جو انگریزی جانتا ہو۔ ہماری اُس سے عرشے پر ملاقات ہوئی۔ وہ میری باتوں سے بے حد متاثر ہوا اور ہمیں جہاز کے ریستوراں میں لے گیا، جو جانے ممنوعہ تھی ہندوستانیوں کے لیے۔ تمھیں جہاز میں کسی نے یہ بھی بتایا ہوگا کہ ہمیں ریستوراں سے محض ہندوستانی ہونے کی وجہ سے نکالا گیا۔ انگریز محقق ہی نے میری ملاقات مایا سے کروائی تھی۔ ہمیں ریستوراں سے باہر کرنے والا متعصب کپتان مایا کا شوہر تھا۔ وہاں ہماری مایا کے شوہر سے جھڑپ ہوئی، جو خالصتاً نسلی تعصب کی بنیاد پر تھی۔ اسی دوران باروٹیہ جہاز پر چڑھ آیا۔ ہمیں فی الفور انگریزوں کا گماشتہ تصور کر لیا گیا۔ ہمیں بوریوں میں بھر دیا گیا۔ اس کے بعد ہماری ہر کوشش خود کو باروٹیہ کے چنگل سے آزاد کروانے کی تھی، نہ کہ انگریزوں کے دفاع میں کیا جانے والا کوئی اقدام۔ میں وہاں سے بھاگا، اس لیے کہ اپنی جان بچانا میرا حق تھا۔ میرے ساتھ ایک انگریز قید تھا۔ اُس کی حیثیت محض ایک شریک دردکی سی تھی۔ اس کی جگہ کوئی ہندوستانی، فرانسیسی، انگریز خواہ کوئی بھی ہوتا میری ہم دردی حاصل کرتا، لیکن لیونارڈ کو اپنے ساتھ فرار کروانے کی بنیادی وجہ کچھ اور بھی تھی۔ وہ یہ کہ میں وہاں سے نکلنے میں لیونارڈ ہی کی بدولت کام یاب ہو سکا تھا۔ تنہا آدمی کے لیے ایسا ناممکن تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ بٹھل کے ہاتھوں، باروٹیہ ہلاک ہوا بھی ہے یا نہیں، تاہم دو اور دو چار کی طرح یہ واضح بات ہے کہ بٹھل نے اگر کوئی ایسا قدم اٹھایا ہوگا تو محض اپنے دفاع کے لیے اور اسے ایسا کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں بنتا کہ ہمارا تعلق انگریزوں سے ہے۔"

"تم کراچی کس لیے گئے تھے؟"

"ہمارا تعلق زمیں دار گھرانے سے ہے۔ گاؤں گاؤں، قصبے قصبے اور شہر در شہر ہم گھومتے پھرتے ہیں۔ بس شوقیہ!"

"بھوا مہاجن کا معاملہ کیا ہے؟ وہ اپنی ساری دولت تمھارے حوالے کیوں کر گیا ہے۔" انسپکٹر اجیت کا لب و لہجہ معقولیت کی شاہراہ پر لوٹ آیا تھا، لیکن طمنچے کی نال ذرا بھی ترچھی نہ ہوئی تھی۔

"مجھے تمھارے ذریعے ہی معلوم ہوا کہ بھوا مہاجن باروٹیہ کی مالی معاونت کرتا تھا۔ ورنہ میں بھوا کا اس حادثے سے قبل محض چند ساعتوں کا شناسا ہوں۔"

"نہیں بابر صاحب! تمھاری پہلی گفتگو دلیل کی حامل تھی، جب کہ کراچی اور بھوا والا معاملہ تم آگے پیچھے کر رہے ہو۔ تمھاری حیثیت مشکوک ہے۔" وہ پھر ہتھے سے اکھڑنے لگا۔

"تم گولی چلا سکتے ہو، مگر یہاں سے کوئی آدمی نہیں لے جا سکتے۔" اس سے مغز مارنا بے سود تھا۔ بھوا کے تذکرے نے میرے اضمحلال کو دو آتشہ کر دیا تھا۔

"میں باروٹیہ کے قاتل کو کسی صورت نہیں چھوڑ سکتا۔ میں اُسے بھیانک انجام سے دوچار کر کے رہوں گا۔ دیکھو، رگھو بات یہیں ختم ہو سکتی ہے۔ تم جانتے ہی ہو کہ تھانے کی سیر سے بہت سے فر فر بول پڑتے ہیں گے۔" اُس نے اچانک رگھو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ابھی بابر بھائی نے بول دیا ہے گولی چلاؤ ادھر سے کوئی نہیں جانے کا۔" رگھو نے سرد اور ٹھیرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ اور ایک جھٹکے سے چاقو کھول لیا۔ رگھو کی دیکھا دیکھی کھٹا کھٹ مچ گئی۔ سبھی کے چاقو ہاتھوں میں چمکنے لگے۔ اڈّے یاڑوں سے وابستگی کی قدامت اپنی جگہ، مگر ایسی صورت حال سے پالا کبھی نہ پڑا تھا۔ ایک طرف وہ ضدی پولیس والا تھا جو دماغ استعمال کرنے کی سوچ بھی نہیں رہا تھا اور دوسری طرف میں تھا جس کا سب کچھ داؤ پر لگا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ جھیمے بٹھل کے یہاں سے کوچ کے بارے میں کسی حد تک جانتا تھا، تاہم میں یہ فیصلہ کر چکا تھا۔ جھیمے کسی طور یہاں سے نہیں جائے گا۔ چاقو اور گولی اگر چلتے ہیں تو صورت حال اس سے زیادہ گھمبیر ہو جاتی، لیکن اس کے سوا کوئی دوسری راہ بھی سامنے نہ تھی۔

"ٹھیک ہے انسپکٹر اجیت! رگھو تمھارے ساتھ جانے کے لیے تیار ہے، مگر اور کوئی نہیں جائے گا۔" میں نے ایک نیا پانسہ پھینکا۔ رگھو کے چہرے پر ناگواری صاف مترشح ہوئی تھی۔

"نہیں رگھو نہیں، دو چار آدمی اور جائیں گے!" اجیت نے سوچتے ہوئے کہا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ شاید میرے مقصد تک پہنچ رہا ہے۔

"ٹھیک ہے، چار نہیں تم پانچ آدمی لے جاؤ۔ کاٹو، باٹلے، اور تم اور تم اور تم۔" میں نے فوراً اس کا یہ تقاضا پورا کر دیا اور پانچ کی بجائے چھ آدمیوں کو اُس کے ہمراہ جانے کا اشارہ بھی دے دیا۔

"نہیں، آدمی میں اپنی مرضی سے لے کر جاؤں گا۔"

انسپکٹر اجیت کی آنکھوں میں اُلجھن تیرگئی۔ اور چھیمے سے متعلق میرا شک پختہ ہوگیا۔ چھیمے جس قدر اخفا میں رہتا اِتنا ہی ہمارے لیے سود مند تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں رگھو اس معاملے کی تہہ تک نہ پہنچ جائے اور ضبط نہ ہاتھ سے گنوادے۔ چھیمے کی نظروں میں چوری پھیلتی جارہی تھی۔ یا شاید مجھے ایسا محسوس ہورہا تھا۔

"ٹھیک ہے پھر یہاں سے کوئی نہیں جائے گا۔" میں نے بھی زچ ہوکر کہا۔

رگھو اور سب کی شکلوں پر تناؤ سکڑا اور پھیل رہا تھا کہ اس اثنا میں باہر ہلکا سا غلغلہ بلند ہُوا اور دوڑتے قدم اندر کی طرف آئے۔ وہ چند اہلکار ہی تھے، سادہ لباس والے بھی اور باوردی بھی۔ ان کی باچھیں کھلی جارہی تھیں۔ انھیں دیکھتے ہی میرا دل بے طرح سے دھڑکا۔ وسوسوں پر وسوسے اٹھنے لگے۔ اور وہی ہُوا جس کا مجھے خدشہ انھیں دیکھتے ہی ہُوا تھا۔ وہ بٹھل، چھلیا، جمرو اور زورا، دھیارا اور لنگو کی گرفتاری کی خبر لائے تھے۔ اُنھوں نے آتے ہی واشگاف انداز میں بتایا کہ اڈے سے ملحقہ مکان سے مطلوبہ افراد کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔ ملزمان اڈے میں موجود خفیہ راستے سے وہاں پہنچے تھے۔ اجیت یہ اطلاع سن کر کھل اٹھا تھا۔ میں خود ہی سوچ رہا تھا کہ انھیں اڈے پر لایا جائے، حالاں کہ یہ احمقانہ سوچ تھی۔ اجیت باہر جانے کے لیے گھوما تو میں کسی خودکار آلے کی طرح حرکت میں آگیا۔ وہ مجھ سے تین قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ میں نے نپی تلی چھلانگ لگائی۔ درمیانی فاصلے پر میرا پنجہ مجھے دوبارہ اچھالنے کے لیے زمین پر لگا۔ اور اسی لمحے میں اجیت کے اُوپر تھا، مگر میں اُسے لے کر نیچے نہیں گرا۔ میں نے اپنی جھونک میں اُس کے دائیں کندھے پر اشارتاً ضرب لگائی۔ وہ زور میں آکے گھوما۔ اُس کی پشت میری جانب ہوگئی۔ اسی اثنا میں مَیں چاقو نکال چکا تھا۔ یہ وقوعہ پلک جھپکنے سا ہی تھا۔ اجیت کی گردن میرے بازو کے شکنجے میں تھی اور میرے چاقو کا تیز دھار پھلکا اس کے نرخرے سے لگا ہُوا تھا۔ ایسے اقدام کی توقع وہاں کوئی خواب میں بھی نہیں کرسکتا تھا۔ سپاہی بندوقیں تانے کے تانے ہی رہ گئے۔ میں اجیت کو لے کر دیوار سے لگ گیا۔ میں نہیں جانتا تھا میرے اس قدم سے کیا نتائج برآمد ہوں گے، لیکن مجھے اِتنا اندازہ ضرور تھا کہ اجیت بٹھل سے 'خون کا بدلہ خون' سے کم پر سلوک نہیں کرے گا۔ مجھے بچاؤ کا دُھندلا سا راستہ یہیں نظر آیا تھا۔ اجیت نے جوابی طور پر کوئی حرکت نہیں کی۔ پھلکا اُس کے نرخرے میں تقریباً گڑا ہُوا ہی تھا۔

"اس سے تم کوئی فائدہ حاصل نہیں کرسکتے۔" اجیت نے بھنچے بھنچے لہجے میں کہا۔

"سپاہیوں سے کہو بندوقیں گرادیں۔" میں نے چاقو کا دباؤ بڑھایا۔ سپاہی چند لمحوں کے لیے سٹپٹا گئے تھے۔ اڈے پاڑے کا کوئی شیدا اُن کے افسر کو پولیس کی بھاری جمعیت کے بیچوں بیچ یرغمال بناسکتا تھا۔ یہ تو اُنھوں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ جب تک وہ معاملے تک پہنچے اجیت میرے شکنجے میں کسا جاچکا تھا، تاہم غیر ارادی طور پر سب کی سب بندوقوں کا رُخ میری طرف ہوگیا تھا۔ اِس قدر قریب سے میری کنپٹی کا نشانہ باندھنا خاص مہارت کا متقاضی نہیں تھا۔ بہت آسانی سے ایک گولی مجھے ٹھنڈا کرسکتی تھی۔ جس پر مجھے اجیت کا نرخرہ کاٹنے کی مہلت قطعاً نہیں ملتی۔ اور میں آنے والی گولی کے لیے بالکل تیار تھا۔ سپاہیوں کی بندوقیں بدستور میری طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔ انھیں اب تک سنگینیں سرنگوں کرنے کا نہیں کہا گیا تھا۔ اجیت سمجھ رہا تھا اٹھی ہوئی بندوقیں بازی اس کے حق میں کیے ہوتے تھیں۔ پلڑا اُس کا بھاری تھا، تاہم وہ زبان سے اپنے ماتحتوں کو گولی چلانے کا حکم نہیں دے سکتا تھا۔ زبان کے ساتھ ساتھ میرا چاقو بھی چل سکتا تھا۔ رگھو بھی ہکّا بکّا کھڑا تھا۔ میں نے اُسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کسی قسم کی حرکت نہ کرنے کی تنبیہہ کردی تھی۔ شکر ہے کہ اُس نے اشارہ سمجھ لیا تھا۔ اجیت کی زبان نے حرکت نہ کی۔ میں نے دھار کھال میں اتار دی بس آلو کے چھلکے کی بقدر۔ اجیت نے سسکاری بھری۔ نوجوان حوالدار سے رہا نہ گیا اُس نے بندوق زمین پر رکھ دی۔ پھر گویا جھڑی لگ گئی۔ آن کی آن میں سب بندوقیں زمین پر آرہیں۔ کالو لپک کے بندوق اٹھانے کے لیے بڑھا۔

"کالو ٹھیر جاؤ! اڈے کا کوئی آدمی اس لفڑے میں نہیں الجھے گا۔" میں نے اجیت کو لے کر باہر کھسکتے ہوئے کہا۔ مجھے کم از کم دروازے تک جانا تھا۔

"ابھی چوڑی پہنانے کا ہے استاد! قسم! اکھا جندگی میں کالو نے ایسا مائی کا لال نہیں دیکھا۔ ابھی استاد تیرے کو چومنے کا ہے۔ کلیجا کاٹنے کا ہے استاد۔" کالو نے پھڑکتے ہوئے کہا۔ اُس کی آنکھیں پانی چھوڑ رہی تھیں۔

"بابر بھائی۔ ابھی زندگی بیکار ہے۔ جو کچھ ہے آپ کے قدموں میں ہے۔" رگھو بھی بول پڑا۔ اُس کی آواز بھی ڈبڈبا رہی تھی۔ اُس نے آگے بڑھ کر ایک بندوق اٹھالی۔ اُس کی دیکھا دیکھی پورا اڈا بندوق بردار بن گیا۔

میں یہ نہیں چاہتا تھا۔ وہ شاید انجام سے واقف نہیں تھے۔ جو ہونا ہو وہ ہوکر ہی رہتا ہے، انسان کی سب تدبیریں بے کار ہی جاتی ہیں۔ رگھو نے سب سپاہیوں کو ایک قطار میں کھڑا کروادیا تھا، تاہم میں نے اجیت کو اپنی گرفت سے آزاد نہیں کیا تھا۔

"بٹھل کو اندر بلواؤ۔" میں نے آئندہ کے بارے میں سوچتے ہوئے کہا۔ ہمیں یہاں سے نکلنا تھا۔

"بابر صاحب! اِس کے اچھے نتائج برآمد نہیں ہوں گے۔" اجیت نے کسمساتے ہوئے کہا۔

"نتائج پہلے بھی اچھے نہیں تھے۔ انھیں بلواؤ فوراً۔" میں نے درشتی سے کہا۔

"انسپکٹر اجیت نے اس نوجوان حوالدار کو اشارہ کیا اور وہ دوڑتا ہُوا باہر نکل گیا۔ اس موقع پر تنبیہ بے سود تھی۔

"اب بھی وقت ہے بابر صاحب! یہ بات یہیں پر دفنائی جاسکتی ہے۔ پولیس بھول جائے گی کہ اڈے کے آدمیوں نے پولیس کو یرغمال بنایا تھا۔ یہ بات چھوٹی نہیں ہے، مگر میں اسے ختم کرسکتا ہوں۔" اجیت نے جھنجھناتے ہوئے کہا۔ چاقو اس کی گردن پر باریک لکیر بناچکا تھا۔ میں نے اُسے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔

"باہر پولیس کا کڑا پہرا ہے۔ یہاں سے نکل نہیں سکو گے۔" میں نے خاموشی ہی بہتر سمجھی۔ میں تو واقعی نہیں جانتا تھا۔ یہاں سے کیسے نکلا جاسکتا ہے۔ کچھ دیر خاموشی میں گزری۔ سب ہونقوں کی طرح گھڑیاں گن رہے تھے۔ تھوڑی دیر گزری کہ وہ آگئے۔ ان کے ساتھ صرف وہی نوجوان حوالدار تھا۔ اس نے اندر کی کارگزاری ستادی ہوگی اور باہر والوں کو بتادیا ہوگا کہ ان کا باہر رہنا ہی مناسب ہے۔ بٹھل ان میں سب سے آگے تھا۔ چھلیا، جمرو، زورا، لنگو دھیارا سب آگے پیچھے آرہے تھے۔ سب کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ حوالدار کے ہاتھ میں ایک زنجیر تھی، جس میں ان سب کی زنجیریں پروئی ہوئی تھیں۔ بٹھل کو دیکھ کے گویا میرے سر سے فولاد کا پہاڑ سرک گیا تھا۔ جیسے ہی وہ صحن میں داخل ہوئے میں نے اجیت کی گردن چھوڑ دی۔ وہ گردن مسلتا ہُوا سامنے کو ہو رہا۔ بٹھل ایک گرگِ باراں دیدہ تھا۔ لمحوں میں اُس نے صورتِ حال بھانپ لی ہوگی۔ یکا یک اُس کی پیشانی پر گہری سلوٹیں اور تردّد نمایاں ہوگیا۔ "یہ کیا ہے لاڈلے؟" وہ حلقۂ زنجیر کو کھینچتے ہوئے میری طرف آیا۔ اس کے ساتھ بقیہ پانچوں بھی کھنچے چلے آئے۔ بٹھل برہم ہورہا تھا۔ اُسے غصّہ تھا۔

"انسپکٹر صاحب یہ ہتھکڑیاں کھلواؤ۔" رگھو نے اب بندوق اجیت کی گردن سے لگادی تھی۔

بٹھل مجھے گھورتا ہُوا شدید غصّے میں پلٹا۔ وہ ایسے زور اور غصّے میں تھا کہ زنجیریں بری طرح جھنجھنا گئیں۔ دھکّے میں چھلیا اور زورا تو تقریباً گر ہی گئے تھے۔ بٹھل نے ہاتھ مار کے رگھو سے بندوق چھین لی اور اسی زور میں گھومتے ہوئے دیوار پر دے ماری۔ وہ پھر میری طرف پلٹا۔ میری سانس خشک ہونے لگی۔ میں نے کچھ غلط نہیں کیا تھا۔ وہ اجیت کو پولیس سمجھ رہا تھا۔ اجیت پولیس نہیں تھا اُس کا جانی دشمن تھا۔

"ادھری باغ میں چھوڑ آیا تھا... ٹھکانے کا تول پورا نہیں ہے۔ رے، کچھ نہیں ہے۔" بٹھل تپتی ہوئی آواز میں بولا۔ اُس کے منہ سے تپش کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ "رشتے داری رکھنی تھی تو پوری کرتا... یار بنا کے چھوڑ دیے۔ ادھری کھونٹے سے بھیا کھڑے ہیں نہ باجے لے کے۔ لاڈلے بھیا کا استقبال بولیں گے۔" بٹھل چنگھاڑ رہا تھا۔ صحن میں سناٹا گونج رہا تھا۔ اجیت آنکھیں پھاڑے بٹھل کو دیکھ رہا تھا۔ اُس نے بٹھل کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

"چھوڑ دو رے یہ بملیاں۔ اِنھی کو بھائیں گی جن کی ہیں... پتا نہیں ڈالا ان حرام کے جنوں کو چھلیا بھیاں!" بٹھل آپے سے باہر ہورہا تھا۔ حوالدار نے زنجیر کا کنڈا چھوڑ دیا تھا، ارادی یا غیر ارادی طور پر کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا۔ رگھو کے اشارے پر بندوقیں واپس پھینک دی گئی تھیں۔ باقی سب پیچھے کو سمٹ گئے تھے۔ رگھو اپنی جگہ پر ساکت نظروں سے زمین یا خاک کرید رہا تھا۔ بہت سارے استادوں کے درمیان وہ تنکو بن رہا تھا۔ یہ اضطراب اس کے چہرے پر متواتر نمایاں تھا اور مسلسل بڑھ رہا تھا۔ چھلیا نے کچھ نہیں کہا، وہ خاموش کھڑا دیکھ رہا تھا۔ شاید ایسی پیچیدہ صورتِ حال سے اُس کا واسطہ پہلی مرتبہ ہی پڑا ہوگا۔ کبھی یوں گمان پڑتا تھا کہ وہ اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھا ہے۔ اجیت حیرت سے آنکھیں پٹپٹائے بٹھل کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے

اُس کی حیرت سمجھ میں آ رہی تھی۔ عام صورتِ حال میں یہ حیرت ہی نہیں تھی کوئی بھی شاطر اسی طرح اپنے لیے فضا ہموار کرتا ہے۔ بٹھل نے صحیح ہی تو کہا تھا۔ ہم اس طرح کیا کر سکتے زیادہ سے زیادہ اس گلی محلے ہی سے باہر نکل پاتے۔ پھر دھر لیے جاتے یا مارے جاتے، لیکن اب کوئی مناسب راہ بن سکتی تھی۔ اس پینترے کو معمولی سوجھ بوجھ والا مقابل بہ آسانی سمجھ سکتا تھا۔ اس میں حیرانی کی بات نہیں تھی، لیکن اجیت کا معاملہ کچھ مختلف تھا۔ وہ بٹھل کے لیے جو کچھ سوچ چکا تھا۔ اس تناظر میں اس منظر حیران کو دیکھ رہا تھا۔ لاشعوری طور پر وہ اس شخص کو سیخ پا دیکھ رہا تھا۔ جو اپنے سامان قتل کے بہم نہ ہونے پر جھگڑا کر رہا تھا۔ یہ میرا قیاس تھا، ممکن ہے کچھ اور وجہ ہو۔ اجیت آنکھیں پھاڑے بٹھل کو تک رہا تھا۔ معاً اسے ہوش آ گیا۔ اُس نے چلّا کر کہا۔ ”بندوقیں اٹھانے کے لیے بھی اجازت چاہیے۔ شرما۔“

سپاہی بھی خاموش تماشائی بنے کھڑے تھے۔ معاً صحن میں دونوں طرف بھنبھناہٹ شروع ہوگئی۔ اجیت کی آواز سن کر جیسے سپاہی چونک پڑے اور کھٹا کھٹ سب نے بندوقیں اٹھا کر کندھوں پر ٹانگ لیں۔

”ابھی صاحب آپ بولو! ادھری بہت ساٹنٹا پورا نہیں ہے۔ حساب چکتا کرنے کا تھا، مگر اپنے لڑکے نے کچھ بچتا نہیں چھوڑا جو ہم بولتے۔ ابھی آپ بولو صاحب!“ بٹھل نے درمیان میں کھڑے ہو کے کہا۔ عجیب ہی منظر بنا تھا۔ ایک طرف قطار میں پولیس کی جمعیت کھڑی تھی۔ دوسری طرف ہڑبڑاتے سینوں کے ساتھ اڈّے کے آدمی چپ سادھے کھڑے تھے۔ ان سے کچھ آگے رگھو چبھتی نظروں سے چاروں اور گھور رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی چھلیا کھڑا تھا۔ چھلیا کی نظریں ایسی بھاری ہو رہی تھیں جیسے منوں وزنی پتھروں سے لپیٹ دی گئی ہیں۔ وہ کچھ کر ہی نہ بیٹھتا۔ وسط میں بٹھل کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے کنگر دار چھجے کے پاس زورا، جمرو، لنگو اور دھیارا۔ مجھ سے آگے انسپکٹر اجیت کھڑا تھا جو بٹھل کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”بٹھل صاحب! آپ کو تھانے جانا ہوگا۔ باقی سے مجھے کوئی تعرض نہیں۔ یہاں جو کچھ ہوا میں اسے فراموش کر کے جا رہا ہوں۔“ اجیت نے دھیمے اور ٹھیرے ہوئے لہجے میں کہا۔ وہ شانت ہو چکا تھا۔ اس کے تاثرات یکسر تبدیل ہو چکے تھے۔ میں وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

”بٹھل تنہا نہیں جائے گا۔“ مجھے معلوم تھا کہ میرے جملے سے بٹھل تلملا جائے گا، مگر کیا کیا جائے۔

”بٹھل اپنی ماں کے ساتھ جائے گا۔ بول اور بول رے... کلیجے میں کچھ بچا نہیں ہے رے۔“ حسبِ توقع بٹھل تھک کے پڑا۔

”بابر صاحب! آپ بھی ان کے ساتھ جا سکتے ہیں۔ آپ کے علاوہ جو آنا چاہے وہ تھانے آ سکتا ہے، مگر اپنی سواری پر۔“ اجیت کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ حیرت انگیز طور پر اُس نے بابر کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”بٹھل صاحب چلیں! حوالداران کی ہتھکڑی کی ضرورت نہیں، کھول دو۔“

حوالدار نے لرزتی ہوئی انگلیوں سے ہتھکڑی میں کھڑ پیچی گھمائی اور کھٹاک کر کے ہتھکڑی کھل گئی۔ بٹھل میری طرف دیکھے بنا انسپکٹر اجیت کے پیچھے بڑھ گیا۔ حوالدار نے زورا، جمرو، چھلیا، دھیارا اور لنگو کی ہتھکڑیاں بھی کھول دیں۔ رگھو وہیں سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔ چھلیا اب بھی ویسے ہی کھڑا تھا، اسے اپنی سدھ بدھ نہیں تھی۔ اڈّے کے آدمی بکھرے چلے گئے تھے۔ میں بھی فوراً بٹھل کے پیچھے لپک گیا۔ گو اُس نے جان لیا تھا کہ میں اُس کے عقب میں آ رہا ہوں، مگر انجان بنا ہوا تھا۔ اڈّے کے دروازے کے بالکل سامنے پولیس کی جیپ کھڑی تھی۔ گلی کے دونوں سروں پر لوگوں کے ٹھٹھ کھڑے تھے۔ چھتوں سے جھانکنے والوں کی کوئی کمی نہ تھی، تاہم اڈّے کے سامنے کوئی نہیں تھا۔ وہاں پولیس کا سخت پہرا تھا۔ اجیت جیپ میں آگے جا کے بیٹھ گیا۔ بٹھل پچھلی طرف چڑھ گیا۔ میں بھی دوسری طرف سے لپک کے بٹھل کے ہمراہ بیٹھ گیا۔ زورا اور جمرو بھی دوڑتے ہوئے آئے تھے۔ بٹھل نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے روک دیا، تاہم اُس نے مجھ سے کوئی تعرض نہیں کیا، وہ میری موجودگی ہی سے انکاری تھا۔ یہ بھی خوامخواہ ہی جھنجھناتا رہتا ہے۔ اسے صحیح صورتِ حال کا علم نہیں تھا۔ میں نے درست قدم اٹھایا۔ سوائے اس کے کوئی اور چارہ جو نہ تھا۔ نہ جانے بٹھل کو دیکھ کے اجیت پر کیا جادو ہوا کہ وہ یک دم رام ہو گیا۔ اور پولیس پر حملے، پولیس کو یرغمال بنانے جیسے سنگین مقدمات سے بہ آسانی دست بردار ہو گیا۔ جیپ کا انجن جیسے ہی غرغرایا گلی محلے کے لوگ سمٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔ جیپ جب گلی سے موڑ کاٹ

کے باہر نکل رہی تھی تو چھلیا اور رگھو بھی اڈّے سے باہر نکلتے نظر آئے تھے۔ لوگ بھاگ گھروں میں دبک گئے تھے، جب کہ بچے آخری دم تک جیپ کے پیچھے دوڑیں لگاتے ہوئے آئے تھے۔ بچپن خوب ہوتا ہے، ہر چیز کھلونا لگتی ہے۔ اس کی وجہ کسی نے درست ہی بتائی ہے کہ بچپن خود ہی کھلونا ہوتا ہے۔

راستے بھر کسی نے کوئی کلام نہیں کیا۔ حالاں کہ یہ رات کا کوئی پہر تھا، مگر لوگوں کی چہل پہل دن سے بڑھ کے تھی۔ خبر بڑی ہی تھی۔ رگھو استاد کے اڈّے کو پولیس نے گھیرے میں لے لیا ہے۔ کون ہوگا جو یہ سن کر متجسس نہ ہوا ہو۔ اب تک اس واقعے کی ہزار داستانیں بن چکی ہوں گی۔ اور لوگ بڑھ چڑھ کے اپنی اختراع کو راہِ حق ثابت کرنے کے لیے بحث و مباحثے سے لطف کشید کر رہے ہوں گے۔ اڈّے باڑے کے نام سے جہاں لوگ خوف زدہ ہوتے ہیں وہیں اس کے تذکرے میں بے پناہ طلسم بھی محسوس کرتے ہیں۔ اڈّے کو چھو کر گزر جانے والی ہوا بھی قصۂ پارینہ بن جاتی ہے۔

تھانے تک کا سفر خاموشی سے گزرا۔ بٹھل گہری سوچ میں مستغرق تھا۔ یہ وہی عمارت تھی جہاں سے آج دن میں میں رہائی پا کر نکلا تھا۔ عمارت کی کھڑکیوں سے ملگجی روشنی باہر آ رہی تھی۔ دروازے پر تعینات سنتری کھڑا اُونگھ رہا تھا۔ یہاں اِرد گرد سناٹا تھا۔ کہیں کہیں کتّوں کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میرے اندر پھر سے شاکر علی تک پہنچنے کی ہوک جاگ رہی تھی۔ سنتری کو سوتا دیکھ کے ڈرائیور نے جیپ کی رفتار کم زیادہ کرنے والے قدمچے پر پاؤں کچھ زیادہ ہی جوش و خروش سے رکھ دیا۔ انجن تیز آواز سے بول اٹھا۔ سنتری نے سٹپٹا کے خراٹا بھرا اور جیپ کو سلام جڑ دیا۔ اس اثنا میں اجیت جیپ سے اتر کے اندر بڑھ چکا تھا۔ بٹھل اس کے پیچھے اور میں ان دونوں کے پیچھے پیچھے تھا۔ اجیت کے استغنا کا عالم میرے چودہ طبق روشن کیے دے رہا تھا۔ اُس نے پیچھے مڑ کے دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ مختلف راہ داریوں اور عمارتی تقاضوں سے گزر کے ہم اجیت کے کمرے میں پہنچے۔ اجیت اپنی کرسی پر جا کے بیٹھ گیا۔ بٹھل اُس کے سامنے جا کے کھڑا ہو گیا۔ بٹھل کی شکل سے صاف لگ رہا تھا کہ اس کے لیے بھی یہ اچنبھے سے کم نہیں ہے۔

”بیٹھیں آپ! یہاں سامنے والی کرسی پر بیٹھیں!“ اُس نے بٹھل سے اپنے مقابل بیٹھنے کو کہا۔

”نہیں صاحب! ادھری ٹھیک ہے۔ ابھی آپ بولو!“ بٹھل نے سنتے ہوئے لہجے میں کہا۔ میں بٹھل کے عقب میں دروازے کے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا تھا۔

”بٹھل بھائی آپ بیٹھیں! یہ ماحول دوستانہ ہے۔“ اجیت لپک کے اُٹھ آیا تھا اور بٹھل کے شانوں پر ہاتھ رکھ کے اُسے بیٹھنے کو کہا۔

بٹھل خاموشی سے بیٹھ گیا۔ میں وہیں دروازے کے ساتھ لگی ہوئی بینچ پر بیٹھ گیا۔ اجیت کا رویّہ ناقابلِ فہم تھا۔

”ابھی بھید بھاؤ بولو صاحب! سارا اسی اونچ نیچ میں اندر باہر گزر رہا ہے۔ سیدھ نہیں پڑ رہی صاحب!“ بٹھل نے رسان سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں شدید اُلجھن تھی۔ اجیت کے چہرے پر پھیلنے والی مسکراہٹ گہری ہوتی جا رہی تھی۔

”بٹھل بھائی کلکتہ میں ایک علاقہ ہے اشوک نگر... اشوک نگر کے دو علاقے ہیں قاضی پاڑا اور صندل پاڑا...“ اجیت لطف اٹھانے کے سے انداز میں بٹھل کی طرف دیکھنے لگا۔

بٹھل کی آنکھوں میں اندھیرا تھا۔ وہ خاموشی سے اجیت کو دیکھا کیا۔ اشوک نگر کا علاقہ کلکتہ کے مضافات میں تھا۔ میرا ایک دو بار ہی ادھر سے گزر ہوا تھا۔

”بٹھل بھائی! منڈل پاڑا کا شرلی رام آپ کو یاد ہے، جس کی اشوک نگر چوک پر پان بیڑی کی دکان تھی۔“

معاً بٹھل کی آنکھوں کے دیے روشن ہو گئے۔ وہ زیرِ لب کچھ بدبدانے لگا۔ ”ہاں یاد ہے۔“

”میں اسی شرلی رام کا بیٹا ہوں اجیت رام۔“ اجیت نے مختصر جملہ ادا کیا، مگر اس میں بھی اُس کی آواز رندھ گئی۔ وہ ہڑکنے لگا۔ بٹھل حیرت سے آنکھیں پھاڑے اُس کے نقوش پڑھ رہا تھا۔ معاً بٹھل وارفتگی سے اُٹھا۔ پھر تو گویا کمرے کی دیواریں لرز گئیں۔ بٹھل نے کچھ ایسے زور سے اجیت کو کرسی سے کھینچ کے بھینچا تھا کہ مجھے بھی اجیت پر رشک آ گیا۔ میری آنکھوں کے کونے چرمرانے لگے۔ اجیت بچوں کی طرح بٹھل سے چمٹا ہوا بلک رہا تھا۔ بٹھل

برف کی طرح چپ چاپ پگھل رہا تھا۔ کچھ دیر اُس نے اجیت کو یونہی لپٹائے رکھا۔ اجیت کے باپ شرلی رام سے بٹھل کا کوئی خاص تعلق ہی تھا، تاہم میں شرلی رام سے متعلق نہیں جانتا تھا۔ یہ قصہ بٹھل سے میری ملاقات سے قبل کا لگتا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ہم یوں بیٹھے تھے جیسے صدیوں سے ایک دوسرے سے واقف ہوں۔ بٹھل اس کی بلائیں لیتا نہ تھکتا تھا۔ بٹھل اس سے اس کے بارے میں پوچھتا رہا۔ وہ بٹھل سے سوالات کرتا۔ میں بھی بیچ بیچ میں گاہے گاہے ان کی گفتگو میں شریک ہوجاتا۔ گھنٹوں گزر گئے پتا ہی نہ چلا۔ ان کی گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ شرلی رام شیام بازار کا نامی گرامی دادا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب بٹھل ابھی استادوں کی بجا آوری میں مشغول تھا اور کلکتے میں دھیرے دھیرے اپنا نام بنا رہا تھا۔ شرلی کے ایک آدمی سے بٹھل کا تنازعہ ہوگیا۔ بٹھل نے اس کی ران کھول دی۔ بٹھل کا نام اس سے قبل کئی مرتبہ شرلی رام تک پہنچ چکا تھا۔ شرلی اس نورسیدہ شعلے سے ملاقات کا خواہش مند تھا، تاہم پہل کرنا خلافِ شان سمجھتا تھا۔ بٹھل نے اب اس کے آدمی کو لٹا دیا تھا۔ بٹھل سے جواب طلبی اب چوکی کا استحقاق بن گئی تھی۔ بٹھل تھا کہ چھلاوے کی طرح غائب تھا۔ شرلی رام کے آدمی بٹھل کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ ایک دن بٹھل خود شرلی رام کے پاس پہنچ گیا۔ بٹھل نے چاقو کھول لیا۔ شرلی رام کی شاتی کا زمانہ معترف تھا اور بٹھل گلی کا لونڈا تھا۔ شرلی رام کو چھوکرے کے تیور شاہانہ لگے تھے۔ وہ میدان میں اتر آیا۔ شیام بازار کے اڈے والوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، جب کلکتہ کے نامی گرامی استاد کو بٹھل نے اپنے داؤ کی زد سے دانستہ رعایت دی تھی۔ ایک مرتبہ تو شرلی رام فاش خطا کھا گیا تھا اور اپنے جھونک میں آگے گزر گیا تھا۔ اس کی پشت بٹھل کی طرف تھی اور بٹھل کے پاس مہلت ہی مہلت تھی۔ بٹھل نے کمالِ بے نیازی سے چاقو فضا میں اچھال کے دوسرے ہاتھ میں دبوچ لیا تھا۔ چھوکرے کے ہاتھ برق کی طرح لپکتے تھے۔ جب شرلی رام پلٹا تو بٹھل نے اپنا چاقو اُس کے قدموں میں پھینک دیا۔ بٹھل کے انداز ہی نہیں اطوار بھی شاہانہ تھے۔ بٹھل پلٹ کے جانے لگا تو شرلی رام ایک نعرہ مستانہ مار کے اُس سے لپٹ گیا۔ اس جوان نے اُسے پچھاڑا کیا تھا، بس جیت لیا تھا۔ شرلی رام اُسی وقت چوکی چھوڑنے پر مصر تھا، مگر بٹھل نے اُسے جتا دیا کہ

اُس کا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا۔ وہ استاد شرلی رام کی دل سے قدر کرتا تھا۔ استاد کا نیاز مند ہی رہنا چاہتا ہے۔ بٹھل کا مقصد بس یہ باور کرانا تھا کہ استاد کے آدمی کی غلطی تھی۔ ادھر استاد بٹھل کو نظروں سے دُور کرنے پر آمادہ ہی نہ تھا۔ ایسے شاہ کار قدرت کم ہی بناتی ہے۔ یوں بٹھل اور استاد شرلی رام کی واقفیت ہوئی۔ بہت تھوڑے ہی عرصے میں دونوں کے تعلقات گہری انسیت میں تبدیل ہوگئے۔ مجرے سانجھے ہونے لگے۔ اس دوران بٹھل کے علاقے بڑھتے چلے گئے۔ اس کی قلم روعلی پور سے لے کر سامن گھاٹ تک پھیل چکی تھی۔ اِردگرد کا پورا علاقہ بٹھل کے نام سے لرزنے لگا۔ بٹھل کا شرلی رام سے میل ملن ذرا کم ہوگیا۔ ایک دن بٹھل کو اطلاع ملی شرلی رام قاضی پاڑے کی ایک ودوا اُستانی کو دل دے بیٹھا ہے۔ چوکی چھوڑ کے دن رات قاضی پاڑے کے پھیرے لگا تا رہتا ہے۔ قصہ کچھ یوں تھا، ایک دن شرلی حسبِ معمول اڈے کے باہر چارپائی لگا کے بیٹھا ہی تھا کہ سرخ وسپید رنگت، گداز بدن اس پر سپید ساڑھی میں ملبوس ایک جوان خاتون طنطناتی ہوئی وہاں وارد ہوئی۔ وہ غصے سے بھری ہوئی تھی۔ وہ سیدھی شرلی کے پاس پہنچی اور باوقار انداز میں اُسے لتاڑنا شروع کردیا۔ کلکتہ میں سرخ وسپید رنگت شاذ و نادر ہی نظر آتی تھی۔ وہ حسن وجمال کا باوقار پیکر بنی تھی، مگر اس کی اصل خوب صورتی جو شرلی کو بھائی تھی وہ اس کا طنطنہ تھا۔ غصے میں لال بھبوکا چہرہ، پیشانی پر خطاطی کا شاہ کار باریک سلوٹیں۔ بھرے بھرے بدن پر کسی ہوئی ساڑھی۔ اُس نے بھری گلی میں شرلی رام کو ننگ خاندان جیسے القابات سے نوازنا شروع کر رکھا تھا۔ وہ شیام بازار اپنے رشتے دار کے ہاں آئی تھی۔ ایک اچکا اُس کا بٹوا لے اڑا تھا۔ وہ پوچھتے پچھاتے یہاں تک پہنچی تھی۔ بٹوے میں نقدی، گہنے اور کچھ اہم کاغذات تھے۔ اُس نے سرِعام شرلی رام کو دھمکی دی کہ اگر اس کا بٹوا واپس نہ لوٹایا گیا تو یہیں آتما ہتیا کرلے گی۔ اڈے والوں کے نتھنے پھٹنے لگے تھے، مگر شرلی رام اسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ شرلی رام کے کہنے پر پوچھ تاچھ شروع ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ خاتون اپنا نام پتا بتائے بغیر وہاں سے اپنا بٹوا لے کر جارہی تھی، مگر اس کے ساتھ بٹوے کے علاوہ ایک قیمتی چیز شرلی رام کا دل بھی تھا جو اس کے قدموں سے لپٹا ہوا ساتھ ساتھ چلا جارہا تھا۔ شرلی رام نے اُس کے پیچھے ایک آدمی دوڑا دیا۔ جو بات

جیے واپس آیا۔ وہ اس خاتون کا نام پتا نکال لایا تھا۔ وہ قاضی پاڑے میں رہتی تھی، ایک جولاہے کی بیٹی تھی۔ منڈل پاڑے کے سرکاری اسکول میں پڑھاتی تھی۔ دو برس قبل اس کا بیاہ منڈل پاڑے کے رہائشی سریش کرور سے ہوا تھا جو صرف چھ مہینے بعد ہی چل بسا تھا۔ استانی کا نام روپا کرور تھا اور وہ قاضی پاڑے میں اپنے باپ کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔ بہت سے اس سے بیاہ رچانے کے آرزومند تھے، مگر روپا کرور سچی دھرم داسی تھی۔ وہ اگلے جنم میں بھی سریش کرور کے ساتھ ہی جیون بتانے پر یقین رکھتی تھی۔ شرلی رام نے یہ کھاسی تو سلگتے ہوئے دل کو بجھانا چاہا، مگر دل تھا ہی نہیں۔ دہکتا آتش فشانی خلا تھا۔ شرلی رام نے وہاں کے پھیرے لگانے شروع کردیے۔ روپا کرور نے اُسے بری طرح جھڑک دیا۔ وہ دوسرے بیاہ کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی اور وہ بھی ایک لچے لفنگے بدمعاش سے۔ ادھر شرلی رام کی آگ بھڑکتی چلی گئی۔ وہ دیوانہ ہوکے قاضی پاڑے اور منڈل پاڑے کے درمیان گھومنے لگا۔ اڈے کے آدمی اس کے آگے پیچھے رہتے تھے، اس بنا پر اس سے کوئی تعرض نہیں کرتا تھا۔ اُس نے اپنے کارندوں کو ہاتھ جوڑ جوڑ کے کہا وہ اس کے پیچھے نہ آیا کریں۔ اپنا کوئی اَور استاد ڈھونڈ لیں۔ شرلی رام میں کوئی بات تو تھی، بٹھل نے یونہی اُس کے سامنے چاقو نہیں پھینک دیا تھا۔ اڈے والے اُس کے پیچھے دیوانے ہورہے اور وہ روپا کرور کا دوانہ ہورہا تھا۔ آخر ایک دن روپا کرور کا دل پسیج گیا۔ وہ بھی جہاں دیدہ خاتون تھی۔ اس نے شرلی سے کہا کہ اگر وہ شرافت کا کوئی کاروبار کر دکھائے تو وہ اس کے بارے میں سوچ سکتی ہے۔ کاروبار سے مراد یہ ہے کہ اس میں اڈے پاڑے کی کمائی کا ایک دھیلا بھی نہیں ہونا چاہیے۔ خواہ وہ چھابڑی ہی کیوں نہ لگالے۔ شرلی کی دیوانگی کا روپا کرور نے غلط اندازہ لگایا تھا۔ شرلی رام کے ہاتھ میں ماں کا دیا ہوا کڑا تھا۔ وہ اُس نے اونے پونے بیچا اور روپا کرور کے اسکول کے سامنے پان بیڑی کی دکان کھول لی۔ یہی وہ دورانیہ تھا جب بٹھل کو اس معاملے کی بھنک پڑی تھی۔ وہ دوڑا دوڑا منڈل پاڑے پہنچا۔ استاد شرلی رام کو گلوریاں بناتے دیکھ کر بٹھل آب دیدہ ہوگیا۔ کہاں وہ ذی شان، ذی وقار رعب دار استاد شرلی رام جس کے نام کی گونج سے پورا کلکتہ دھمکتا تھا اور کہاں یہ تانبے کی کھرونچوں میں شاخیں تھمانے والا شرلی پان بیڑی والا۔

بٹھل نے استاد شرلی رام کی صورت دیکھ کر ہی تمام محبتیں اپنے سینے میں دفن کرلی تھیں۔ استاد کے پاس کچھ دیر بیٹھ کے واپس آگیا تھا۔ البتہ جب استاد نے بنارسی پان بنا اُس کے کلّے میں مشاقی سے ٹھونسا تو بٹھل سے رہا نہ گیا۔ بلک بلک کے رو پڑا۔ روپا کرور نے استاد سے بیاہ کرلیا اور وہ بھی منڈل پاڑے میں شرلی کے ساتھ کرائے کے مکان میں اُٹھ آئی۔ بٹھل گاہے گاہے چکر لگایا کرتا تھا۔ استاد کے بیٹا پیدا ہوا تو بٹھل مٹھائی کے ٹوکروں سے لدا پھندا وہاں پہنچا تھا۔ روپا کرور نے وہ سارے ٹوکرے گلی میں پھنکوا دیے تھے۔ بٹھل استاد کو دیکھ کر چپکا ہو رہا۔ بٹھل بھی آتا جاتا رہا اور یوں کئی سال بیت گئے۔ شرلی رام اپنی دنیا میں مگن ہوگیا تھا۔ بٹھل کو شرلی رام کی یہ ادائے دل ستانی خوب بھائی تھی۔ استاد سے اس کا دل لگ گیا۔ استاد کا بیٹا اجیت بٹھل کو چاچا کہہ کر بلاتا تو بٹھل کو بھلا لگتا تھا۔ روپا کرور کو بٹھل اور اڈے کے دوسرے افراد کا استاد کی مزاج پرسی کو آنا سخت ناپسند تھا۔ ایک دن صبح استاد کی دکان جب نہیں کھلی تو لوگوں کو پتا چلا کہ شرلی رام پان بیڑی والا اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ دکان مکان چھوڑ کے نامعلوم منزل کی طرف نکل گیا ہے۔ اس کے بعد بٹھل کو شرلی رام کا پتا نہیں چلا کہ اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ اجیت نے بتایا کہ ولواڑا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ اس کے قریب ہی ایک شہر ہے اُنّا، وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ وہیں مقیم ہے۔ اس کی ماں حال ہی میں پنشن پر آگئی۔ یہ عشق بھی کیا کیا کام کروا دیتا ہے۔ شرلی رام نے گزارے لائق لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا اور ڈاکیے کی سرکاری نوکری کر رہا تھا۔ اجیت کا کہنا تھا کہ پوچھتے ہی وہ انھیں گھر لے چلے گا۔ جیپ میں گھنٹے بھر کا سفر بھی نہیں ہے۔ اس کا باپ بٹھل کو دیکھ کر باغ باغ ہوجائے گا، تاہم بٹھل نے جواب میں ہنکارا ہی بھرا تھا۔ باروٹیہ کا قصہ چلا تو بٹھل نے بتایا کہ باروٹیہ کو انھوں نے زندہ سلامت واپس کیا تھا، تاہم اجیت نے اس بات کی تصدیق کی کہ باروٹیہ ہلاک ہوچکا ہے۔ اجیت نہ صرف بہ حیثیت پولیس آفیسر باروٹیہ کے بارے میں اچھی رائے رکھتا ہے، بلکہ اجیت کی اخلاقی ہم دردیاں باروٹیہ کے ساتھ ہیں۔ اجیت کا کہنا تھا کہ بدیشی لوگوں سے دھرتی کو آزاد کروانے کی جنگ میں وہ باروٹیہ کے ساتھ ہے۔ اجیت نے اعتراف کیا کہ وہ بٹھل کو بالا ہی بالا ہلاک کرنے کا منصوبہ بنا چکا تھا۔ گڑائی کے

مطالبے والی کہانی اجیت کی اپنی ہی گھڑی ہوئی تھی۔ پولیس اور گلامی کے درمیان رابطہ اجیت ہی تھا۔ اجیت نے اپنے افسران کو باور کروایا تھا کہ بٹھل کی گرفتاری ازحد ضروری ہے، جب کہ بابر کی رہائی کے لیے براہِ راست دلی سے دباؤ ڈالا گیا تھا۔ اس حوالے سے مزید گفتگو کرنے میں اجیت نے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ ہم نے بھی کریدنا مناسب نہ سمجھی۔ اُس کی جانب سے ہم دلواڑا میں آزادانہ نقل و حرکت کے اور یہاں سے جانے کے لیے آزاد تھے، تاہم ہمیں دلواڑا میں گلامی کے لوگوں سے محتاط رہنا ہوگا۔

باتوں میں خبر بھی نہ ہوئی اور صبح ہوگئی۔ اجیت بجھا جا رہا تھا۔ گفتگو کے دوران اُس نے نہ جانے کیا کیا الم غلم منگوا لیا تھا۔ جو ہم دھیرے دھیرے ٹونگتے رہے تھے۔ اجالا ابھی پھیلا نہیں تھا کہ اجیت اُٹھ کھڑا ہوا۔

"بٹھل چاچا، اب باقی باتیں پتاجی کے ساتھ کریں گے۔ یقین جانیں وہ باغ و بہار ہو جائیں گے۔"

"نہیں رہے۔ پھر کبھی آئیں گے تو ادھر بھی جھانکا ماریں گے۔ ابھی جانے دے۔" بٹھل نے اجیت سے نظریں پھیرتے ہوئے کہا۔

"نہیں چاچا یہ کیسے ممکن ہے۔" اجیت اُچھل پڑا۔ اس کے پاؤں میں پھلجھڑیاں الجھ گئیں۔

"ممکن وہ بھی نہیں تھا جو شرلی استاد نے ٹھونک دیا رے۔" بٹھل نے دھیرے سے کہا اور باہر نکلنے کے لیے مڑ گیا۔ اجیت دوڑ کے سامنے آ گیا۔ "پتاجی کو پتا چلے گا تو وہ مجھے گھر میں گھسنے نہیں دیں گے۔" اجیت مچل مچل رہا تھا۔

بٹھل نے شگفتگی سے راستہ بنایا اور پیچھے مڑے بنا کہا۔

"ہمیں تیری ماں نہیں گھسنے نہیں دے گی رے۔" بٹھل کے لہجے کا کرب تھا کہ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ عجیب دیوانگی سے اپنا سر جھرجھراتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ اجیت کو سکتہ ہو گیا تھا۔ اُس کی زبان کسی نے نوچ لی تھی۔ مجھ سے ٹھیرا نہ گیا کہ اجیت کی دل جوئی کرتا۔ میں بھی بٹھل کے پیچھے آ گیا۔ منشی کے کمرے میں چھلیا، رگھو، جمرو اور زورا بیٹھے تھے۔ ان کی شکلوں پر رت جگے کا نوشتہ سجا تھا۔ چھلیا لپک کے اُٹھا اور بٹھل سے لپٹ گیا۔ بٹھل اسے لے کے خاموشی سے باہر نکل گیا۔ وہ بے جان مٹی کے پتلے کی طرح چل رہا تھا۔ بٹھل کے شانے کتنے ڈھلک گئے تھے۔ میں اس سے کہنا چاہتا تھا۔ شاید میرے ہی ادّعا میں کوئی نقص تھا۔ میں اس سے کہہ نہیں پاتا تھا۔ سائلوں کی طرح یوں گلی کوچوں میں اس کی خواری مجھ پر بھی گراں بار ہے۔ ایک حد تک ہی آدمی آدمی کے ساتھ چل سکتا ہے۔ ایک حد تک ہی کسی کو دوسرے کے بوجھ میں شریک ہونا چاہیے۔ میں غلط ہی کیا سوچ رہا تھا۔ میں نے دیکھا تھا زریں کے پاس پہنچ کے بٹھل کے چہرے پر کیسا سکون چھا جاتا ہے۔ زریں تو واقعی کوئی شجرِ سایہ دار ہے۔ وہاں جا کے بٹھل زریں کے اشاروں کا منتظر رہتا تھا۔ آدمی کو جہاں تعمیلِ حکم میں آسودگی ملے، بٹھل کے لیے زریں کی حویلی بھی ایسی ہی جگہ تھی۔

وہاں جا کے وہ کوئی دوسرا آدمی ہوتا۔ اس درخت میں ایک نئی کونپل پھوٹ جاتی۔ اُس نے اڈا ترک کر دیا تھا۔ جہاں ایک عرصے سے اُس کی حکومت قائم تھی۔ ایک نظرِ غلط پر پروانے فدا ہو جاتے تھے۔ اس نے اڈے کے ان ساتھیوں سے کنارہ کر لیا تھا جو غلاموں کی مانند اُس کی جنبشِ ابرو کے اسیر تھے۔ اپنے ساتھ مجھے اُس کی ہمہ وقت بے آرامی کا احساس رہتا تھا۔ مجھے بھی تو اُس کا خیال کرنا تھا، اُس کی خاطر داری میری لیے بھی مطلوبِ خاطر تھی۔ میں بہی کچھ اُس سے کہنا چاہتا تھا، مگر لفظ کہیں کھو گئے تھے۔ شاید مجھے اس کی دل برداشتگی اور ناراضی کا خدشہ تھا۔ مجھ پر تو خود یہ واضح نہیں تھا کہ میری منشا کیا ہے؟ میں چاہتا کیا ہوں؟ میری امید میں اب پہلے سا اضطراب نہیں رہا تھا۔ وہ یقین اب بہت سوں میں تقسیم ہو گیا تھا، مگر ایسا بھی نہیں تھا۔ یہ مولوی صاحب ہی تھے جو مجھ سے دامن کشا رہنا چاہتے ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ جہاں جہاں ہم اُن کے قریب ہوا چاہتے ہیں وہ ہم سے دُور چلے جاتے ہیں۔ وہ کسی ایک جگہ کے ہو کر بھی نہیں رہتے۔ نہ جانے اُن کے ساتھ کیا مسئلہ درپیش ہے جو ہر وقت اڑے اڑے پھرتے ہیں۔ ہاں، ان میں ان کا بھی کیا قصور۔ اُن کے تو ہوائے بہار ہم رکاب تھی۔ جس کی خوش بو بھلا چمن سے چھپائے کہاں چھپتی ہے۔ یہ بھی نہیں تھا کہ ہم ناکام رہے ہوں۔ کئی جگہ بس آگے پیچھے کی بات ہو گئی۔ ہم اُن کے گھروں تک پہنچ گئے تھے جہاں اُن کا قیام رہا تھا۔ مراد آباد، نگریا سادات، صدر آباد اور اب یہ دلواڑا۔ انھیں دلواڑا جیسے الگ تھلگ مقام پر آنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ یہاں بھی نہیں تھا۔ پھر یہاں بھی بس نہیں کی کہیں اور نکل گئے۔ اب بمبئی کی خبر ہے۔ وہاں بھی کہاں ہوں گے، وہاں کی کھوج بھی نکل ہی

جائے گی، وہ وہاں سے آگے نکل جائیں۔ بس وہ آگے آگے دوڑتے رہیں گے اور ہم ان کے پیچھے پیچھے۔ بٹھل کو میں کیسے بتاتا کہ اس کے ساتھ رہتے ہوئے بھی میں کیسا تنہا رہتا ہوں۔ کیسی آگ میرے اندر بھڑکتی ہے۔ کیسے کیسے انگارے مجھے دہکاتے رہتے ہیں۔ میرے سینے میں مسلسل ہوک سی اٹھتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ دیواروں سے سر پھوڑ لوں۔ اپنا منہ نوچ لوں۔ کسی ویرانے میں گھر کر لوں۔ کوئی میری پرسش نہ کیا کرے۔ کوئی زخموں پر مرہم نہ رکھا کرے۔ میں کب چاہتا ہوں کہ کوئی میری آگ میں جلے۔ میں کوئی پاگل نہیں ہوں۔ میرے حواس میرے ساتھ ہیں جو میرے ساتھ دیا جائے۔ نہ پنگوڑے میں کھیلتا کوئی بچہ ہوں جسے بروقت نگہداشت کی ضرورت ہو۔ میں مخبوط الحواس تو نہیں ہوں۔ مجھے اپنے اچھے برے کی خوب تمیز ہے۔ کالا پیلا رنگ پہچان لیتا ہوں۔ صحیح دیکھتا ہوں۔ صحیح سنتا ہوں، لیکن میں کیا کروں سب کچھ میری استعداد میں بھی تو نہیں ہے۔ میں خود کو بہت روکتا ہوں، خوب ٹوکتا ہوں، خود کو سمجھاتا ہوں۔ میری استطاعت بس اس قدر ہے۔ آدمی بہت محدود ہے، بس ایک دائرے میں سننے اور سمجھانے کی توفیق رکھتا ہے۔ یہ دنیا آدمی سے بہت بڑی ہے۔ ایک دنیا میں پرکیا مستزاد یہاں تو ہر چیز آدمی سے بڑی ہے۔ یہاں کی بڑائی کا کوئی شمار نہیں، کوئی حد و حساب نہیں۔ بے شمار اس کی سمتیں ہیں۔ بے پناہ اس کے فاصلے۔ کون ہے جو ان فاصلوں اور سمتوں کو عبور کر سکتا ہے۔ جنبش تو بقدرِ استطاعت ہی کی جا سکتی ہے۔ جیل سے آنے کے بعد میں نے کوئی لمحہ نہیں گنوایا۔ میں تو بھاگتا ہی رہا، میں جو نظر آتا ہوں وہ بھلا کہاں ہوں۔ ایک آدمی کا اندرون کسی کو کیا نظر آ سکتا ہے۔ بٹھل کو جو نظر آتا ہے وہ اتنا نہیں جتنا میں خود سے نبرد آزما ہوں۔ میں اُس سے کہنا چاہتا تھا کہ بے شک زریں کا خیال میرے لیے لطف و راحت کا باعث بنتا ہے، لیکن جانے کیوں جب وہ سامنے آتی ہے تو کہیں سے کورا بھی چپکے سے اس کے پہلو میں آ کے کھڑی ہو جاتی ہے۔ پھر میری آنکھیں کہاں میری رہتی ہیں۔ انھیں کوئی انگاروں کے دام خرید لیتا ہے۔ میرا سینہ گھٹنے لگتا ہے۔ بٹھل سے میں کیا کہوں، فیض آباد میں زریں کی حویلی ہو یا بمبئی میں ابا جان کا عالی شان مکان، میں اُس کے ساتھ ہلکورے لیتی کشتی میں سوار ہوں اور وہ دل نشین نہایت بلیغ، شائستہ اور اثر آفریں پیرائے میں گفتگو کر رہی۔ وہ جو لین ہو جس کی معیت میں زریں جیسی ٹھنڈک اور جذب و کیف ہے، میں کسی سراپا عنایت لطف و کرم شخصیت کے سامنے ہوں یا کسی حقیر نظر اور خوش نما نظر کے سامنے میرا دل بہت جلد گھبرانے لگتا ہے۔ میں تو مسلسل اُس کی آوازیں سنتا ہوں۔ جیسے وہ مجھے پکار رہی ہو۔ میری طرح سے وہ آزردہ ہو۔ کوچہ گردی کے اس کارِ دگر میں ایک طمانیت تو ہے۔ ایک امید پوشیدہ تو ہے کہ ایک نہ ایک دن میں اُس کے پاس پہنچ سکتا ہوں، لیکن یہ بٹھل آخر کب تک اپنی جان جلائے گا۔ جیسے میں جل رہا ہوں، کیا یہ بھی جل رہا ہے؟ اِسے کسی چیز کی جلن ہے۔ اسے اب کیسا ٹھکانا کرنا ہوگا۔ مجھے خبر ہی نہ ہوئی کہ کب ہم منزلیں مارتے ہوئے اڈے پر پہنچ چکے ہیں۔ گلی محلے کے معززین اڈے کے دروازے پر ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔ بٹھل پژمردگی سے بے حال ہوا جاتا تھا۔

لوگ اچھل اچھل کے مبارک بادیں دے رہے تھے۔ اچھا بھلا ہجوم اُمڈ آیا تھا۔ اڈے کے اثر و رسوخ کی دھاک سب کے دلوں میں بیٹھ گئی تھی۔ پولیس کا اتنا بڑا چھاپا اور وہ بھی ناکام۔ لوگ خوش تھے، لوگ تب بھی خوش تھے جب ہمیں لے جایا جا رہا تھا۔ لوگ اب مسرت آگیں جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔ لوگوں کا کام ہی خوش ہونا ہے۔ کسی کا غم ہو یا دکھ یہ اس میں سے مسرت کشید کرنا جانتے ہیں۔ ہمیں دروازے پر ہی روک لیا گیا تھا۔ کچھ منچلے ہار لے آئے تھے۔ کوئی پل تھا کہ میں برافروختہ ہو جاتا۔ بتھل کو تنہائی درکار تھی اور کچھ مجھے بھی۔ رو یا کرور کے تذکرے پر اسے چرکا خوب لگا تھا۔ گھر کی قدر و قیمت تو بے گھر ہی جانتے ہیں۔ جب اُس نے کہا تھا کہ تیری ماں ہمیں گھر میں نہیں گھسنے دے گی تو کم مائیگی کا احساس کیسے چھلکتے ہوئے زردی کی طرح چھلکا تھا۔ زبان سے کہا حقیر نہیں ہوتا۔ بادشاہ سے فقیر ملنے سے انکار کر دے تو بادشاہ دو کوڑی کا نہیں رہتا۔ خواہ وہ فقیر کے ٹکڑے چیل کوّوں کو کھلا دے، بادشاہ کم مائیگی کا احساس مٹا نہیں سکتا۔ بتھل کو اس احساس نے توڑ دیا تھا۔ کیسی زردی سمٹ آئی تھی اس کے نقوش میں، بانس کا سلگتا ہوا جنگل نظر آتا تھا۔

ہم بہ مشکل اندر پہنچے۔ بتھل کے لیے دالان میں چارپائی کھینچ دی گئی۔ چھلیا نے اندر پہنچتے ہی چیخ و پکار شروع کر دی تھی۔ رگھو بہ دستور بجھا بجھا اور پژمردہ تھا۔ بتھل چارپائی پر بس گر ہی گیا۔ دھیارا دوڑا دوڑا گیا اور حقہ سلگا لایا تھا۔ تازہ خمیر کی وہ مہک جس کا بتھل شیدائی تھا خوب اٹھ رہی تھی۔ دھیارے نے منقش نَے بتھل کی طرف بڑھائی، مگر اُس نے بے دلی سے دھیارا کا ہاتھ جھٹک دیا۔ بتھل کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تنہائی کا کوئی رفیق تو اُسے رکھنا تھا اس وقت حقہ پی لینا چاہیے تھا، مگر وہ کسی اور ہی دنیا میں پہنچا ہوا تھا۔ شاید اپنا گھر دیکھ رہا تھا۔ زریں کا گھر۔ جو اُس کے بازوؤں میں شیرخواروں کی طرح تھی۔ مجھ سے اور دیکھا نہ گیا۔ میں اندر کی طرف بڑھا تو رگھو میرے پیچھے آ گیا۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں لے آیا۔ میں اندر جا کے ایک طرف پڑ گیا۔ اُس نے بھی مجھ سے معترض نہیں کیا۔ درد مشترک ہو تو زبان عذر لنگ کی سی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ کبھی کچھ خود بہ خود بنا کہے، بنا سنے ہو جاتا ہے۔ سن بھی لیا جاتا ہے، سنا بھی لیا جاتا ہے۔ رگھو مجھے کمرے میں چھوڑ کے خاموشی سے باہر نکل گیا۔ اور اس کے باہر نکلتے ہی دروازہ کھول کے چھن سے وہ در آئی۔ وہ صد فیصد کوراہی تھی۔ میں اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھا تھا۔

دن ڈھلے تک میں بے خبر پڑا رہا۔ دھیارا نے مجھے آ کے اٹھایا۔ بتھل نے بلوایا تھا۔ دھیارا نے بتایا کہ میں بخار میں پھنک رہا تھا۔ میں نے اُسے منع کیا کہ بخار کا تذکرہ باہر کسی سے نہ کرے۔ میں اُس کے ساتھ باہر نکل آیا۔ صحن کا رنگ روپ ہی بدلا ہوا تھا۔ گلاب کی خوش بو چار سو پھیلی ہوئی تھی۔ صحن میں سفید چاندنی بچھی تھی۔ دیوار کے ایک طرف عنابی گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے تو دوسری دیواروں پر سنہری پنیوں کی بل کھاتی ہوئی جھالریں جھول رہی تھیں۔ قندیلوں سے روشنی فیاضی سے پھوٹ رہی تھی۔ اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر کارندے دوڑے دوڑے پھر رہے تھے۔ درمیانی تکیے پر ٹیک لگائے بتھل راجا بنا بیٹھا تھا۔ یہ وہ صبح والا بتھل نہیں تھا۔ پژمردہ ویران کھنڈر۔ بتھل نے کورے لٹھے کا سفید کرتا پاجاما زیب تن کر رکھا تھا۔ خوب نکھرا اور اُجلا اُجلا لگ رہا تھا۔ نوابین کے سے وقار سے سنہری نے بار بار منہ سے لگاتا چھوڑتا بھلا لگ رہا تھا۔ اس کے برابر میں چھلیا تھا۔ سرخ بھڑکیلے کرتے اور سفید پاجامے میں ملبوس۔ اس کے دائیں رگھو بیٹھا تھا کھویا کھویا سا۔ بائیں طرف ایک تکیہ خالی تھا۔ غالباً مجھے وہاں بیٹھنا تھا۔ سامنے ہی جمرو، زورا، لنگو بیٹھے تھے۔ دھیارا بتھل کے پاؤں داب رہا تھا۔ بتھل عالم استغنا میں یوں بیٹھا تھا جیسے دھیارا اس کے پاؤں دبا ہی نہیں رہا۔ کسی بھگوان کے پوتر قدموں کو دھو رہا ہے۔ ان کے سامنے میووں سے بھرے تشت رکھے تھے۔ بادام، پستے، الائچیاں، سونف، بتاشے، ایک تھال میں چاندی کے ورق میں لپٹی گلوریاں پڑی تھیں۔ ان سے آگے ساز اور کلاونت شوخ زرد رنگ کے کرتوں پاجاموں اور سیاہ رنگ کی واسکٹ میں ملبوس بے چین و مضطرب بیٹھے تھے۔ سارنگی نواز سوت سے زخمہ صاف کر رہا تھا۔ یہیں تیرگی میں ایک چاند بھی چمک رہا تھا۔ تکلف میں کاڑھے گئے گھونگھٹ سے جھلکتا سفید چہرہ۔ تیکھی اور کجلائی آنکھیں، ابیض پیشانی، اس پر چھیڑ چھاڑ کرتی ایک آوارہ لٹ، خط کشیدہ مژگان کے درمیان ایک ننھی سی بندیا۔ مؤدبانہ خم سے جھکی ہوئی گردن، وہ بڑے رچاؤ سے بیٹھی تھی۔ نہ جانے کس نے بالا خانوں میں یہ اُڑا دی تھی کہ غزال سہما ہوا زیادہ حسین لگتا ہے۔ وہ بھی سہمی سہمی سی لجائی بیٹھی تھی۔ چھلیا نے بازار گرم کر رکھا تھا۔ جسے دیکھ کر سب کے چہرے کھل پڑے۔

دم بھی سوامی جی ادھر آنے کا ہے۔'' میں زورا کے پاس بیٹھنے لگا تو چھلیا نے آواز لگائی۔ وہ خوب ترنگ میں تھا۔ میں بتھل کے برابر جا کے بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھتے ہی چھلیا نے پاس بیٹھے ایک بڑے میاں کو اشارہ کیا تو انھوں نے بانسری اٹھائی کہ بانسری گنگنانے لگی۔ نہ جانے وہ کون سی دھن تھی جو بڑے میاں نے بانسری سے چھیڑی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں تماشا بین بے حال ہونے لگے۔ ایک سانس گرتا تو وہ دوسرا اٹھا دیتے، دوسرے پر تیسرا۔ بتھل بھی سر دھننے لگا۔ چھلیا تو گھٹنوں کے بل کھڑا ہو کر جھوم رہا تھا۔ بڑے میاں کی آنکھوں سے پانی رسنے لگا تو انھوں نے دھیرے دھیرے بانسری کو زمین پر اتارنا شروع کر دیا۔ پھر تو جیسے سب کچھ طے تھا۔ ڈھولچی نے تھاپ دی اور وہ شرمیلی ادا سے بل کھاتی ہوئی اٹھی۔ اُدھر ڈھولچی نے ہاتھ روکے اِدھر اُس کے پیروں میں گھنگھرو چھنا چھن، چھن چھن، چھنا چھن چھن کرنے لگے۔ رقص کر رہی تھی کہ شاعری۔ اُس کے اعضا کی حرکت میں بے باکی اور شرماہٹ کا عجیب توازن تھا۔ اُس نے مقامی زبان میں نغمہ چھیڑا۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ موسیقی کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔ یہ ہر زبان کی زبان ہے۔ اسے سب سمجھتے ہیں۔ یہ سب کو ہنساتی ہے، یہ سب کو رلاتی ہے۔ کچھ دیر قبل بانسری نواز بڑے میاں کا طوطی بول رہا تھا اور گمان تھا کہ اس سے خوب بھی بلا کیا ہوگا۔ اب لگتا تھا کہ بڑے میاں نے وقت ہی گنوایا۔ وہ مغنیہ ایسی تھی کہ سنا کیے، رقاصہ ایسی کہ بس دیکھا کیے۔ ڈھولچی کی تھاپ سے تو گویا اُس کے قدموں کی ڈور بندھی تھی، مجال ہے کہ تھاپ سے ایک جھنکار کم یا زیادہ ہو جائے۔ وہاں تو ہنگامہ بپا ہو گیا۔ سب سے پہلے جھومتا ہوا چھلیا اٹھا۔ پھر تو سبھی مچلنے لگے۔ زورا تڑپ تڑپ جا رہا تھا۔ نوٹوں کی گڈیوں پر گڈیاں کھلنے لگیں۔ خدام سے زیادہ سمیٹا نہیں جا رہا تھا۔ آخر چھلیا نے ہاتھ پکڑ کے بتھل کو بھی گھسیٹ لیا۔ بتھل نے بھی ٹھمکے لگانے شروع کر دیے۔ رات گئے تک ہنگامہ چلتا رہا۔ رقاصہ انا سے بلوائی گئی تھی۔ وہ جس تانگے میں آئے تھے واپسی کے لیے بھی اسی کو پابند کر لیا گیا تھا۔ اب اس تانگے والے کو جلدی تھی، ورنہ یہ مجرا صبح تک ہی چلتا۔

میں صبح تک جاگتا ہی رہا۔ میں نے رگھو سے شاکر بھائی کا پتا سرسری طور پر پوچھ لیا۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ نما شہر ہی تھا، بلکہ یہ قصبہ ہی تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ شاکر بھائی کو تلاش کرنے کے لیے یہاں کسی سے پتا پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اڈے میں سب سوئے پڑے تھے۔ دوپہر سے پہلے کسی کے جاگنے کا امکان نہیں تھا۔ میں خاموشی سے باہر نکل آیا۔ بس ایک جگہ مجھے پوچھنا پڑا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد میں شاکر بھائی کے دروازے پر کھڑا تھا۔ گلیارے کا سب سے نمایاں مکان یہی تھا۔ بیرونی دیوار سرخ بیل سے ڈھکی ہوئی تھی۔ دروازے پر ایک ڈشکرا کھڑا مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ اُس نے سرتاپا میرا بہ غور جائزہ لیا اور حقارت سے منہ بگاڑ کے بولا۔

''اے کیا رے، تیرے کو دِکھتے کائیں اے کیا۔''

اُس نے نہ جانے مجھے کیا سمجھ لیا تھا۔ یا ہو سکتا ہے شاکر بھائی خود کو لوگوں کی دست رس سے دُور رکھتا ہو۔ میں نے اُسی کے لہجے میں جواب دیا۔

''شاکر بھائی نے پتا نہیں ڈالا لگتا۔ اسے جا کے بول راجا استاد آیا ہے۔''

''اے چھٹنے کا ہے ادھر سے۔ چل نکل سالا... راجا استاد...!'' اُس نے دیدوں کے ساتھ ساتھ ہاتھ بھی نچاتے ہوئے کہا۔ ''ساکر بھائی اور نئیں اے بھاوا۔''

''شاکر بھائی کے بھلے کی بات ہے اسے بولو بمبئی سے راجا استاد آیا ہے۔'' میں نے اپنا غصہ دباتے ہوئے کہا۔ وہ بھی کوئی افلاطون ہی تھا۔

''اور چونا لگانے کا نئیں ساکر بھائی نئیں اے... ابھی نکلنے کا ہے ادر سے۔''

''تو پھر کدھر ہے شاکر بھائی۔'' میں نے تیور ذرا تیکھے کر لیے۔

وہ ایک دم ہتھے سے اُکھڑ گیا۔ ہاتھی کی طرح قد آور تھا۔ اُس نے اچانک میرے سینے پر دو ہتڑ جمایا۔ مجھے اِس قدر جلدی اُس سے یہ توقع نہیں تھی۔ میں لڑکھڑا کے پیچھے الٹ پڑا۔

''تیرے باوا کا نوکر نئیں اے..... ساکر بائی کدر ہے... بڑا آیا سالا... ابھی نکل ادر سے۔'' مجھے دھکا دے کے اُس نے اطمینان سے ہاتھ جھاڑا اور کرسی پر جا کے بیٹھ گیا۔

کوئی خاص وجہ لگتی تھی۔ دروازے پر آئے ہوئے ہر آدمی سے ایسا سلوک نہیں کیا جاتا۔ ممکن ہے شاکر بھائی کی طرف سے ہنگامی حکم دیا گیا ہو۔ اُسے میرے بارے میں کوئی سن گن کہاں سے مل سکتی تھی۔ معاً مجھے خیال آیا۔ بھُوا نے اپنی جائیداد میرے نام کر دی تھی، اس علاقے میں کوئی چھوٹی موٹی بات نہ تھی۔ کسی کو خبر ہو جاتی اور یہ بھی ممکن ہے کہ بھُوا نے دم آخر کوئی پیغام شاکر بھائی کے لیے بھی چھوڑا

ہو۔ بہرحال، اس ڈشکرے کے رویے سے گمان یہی پڑتا تھا
کہ شاکر بھائی نے ہر عام کے لیے دروازہ بند کر رکھا ہے۔
میں نے نہایت اطمینان سے اٹھ کر کرتا جھاڑا اور ایک مرتبہ
پھر دروازے کی طرف قدم اٹھا دیا۔ وہ ٹپٹپا کے اٹھ کھڑا ہوا۔
''اوئے اوئے... ابھی تین سال بجنور میں کاٹنے کا
ہے۔'' اُس نے چاقو کھول لیا۔ ''تُو اندر کا نئیں پڑتا... میرے
کا جانتے کا نئیں اے... اسے دکھائے گا نئیں چلانے کا
ہے... جان بچا... نکلنے کا ہے۔'' اُس نے چاقو کو مشاقی سے
دونوں ہاتھوں میں تولا، استاد والا لگتا تھا۔ میں نے اُس کی
بھبکیوں کو یکسر نظرانداز کر دیا اور بے نیازی سے قدم اٹھا
دیے۔ اُس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ بڑی
مستعدی سے اُس نے ایک قدم بڑھا کے چاقو کو میرے
چہرے کے ساتھ ساتھ گھمایا۔ اتنے قریب سے کہ چاقو بس مجھے
چھوا نہیں اور وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ یہ ایک قسم کی تنبیہ تھی اور
اپنی ماہرانہ قوت کا خوب صورت اظہار تھا۔ اس کے خیال میں
اس حرکت پر مجھے سرپٹ دوڑ جانا چاہیے تھا۔ میں نے قدم
آگے کی طرف اٹھایا تو اُسے معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا۔
''اے بول کون ہے تُو... ساکر بائی سے کیا کام پڑنے کا ہے۔''
''کام تیرے کو بولنے کا نہیں ہے تُو شاکر بھائی کو
جا کے بول بمبئی سے راجا استاد آیا ہے۔ تیرا کام جو ہے تُو وہ
کر۔'' میں نے اگلا قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ مجھے بُھل
کے بیدار ہونے سے قبل اڈے پر پہنچنا تھا۔ بہت ممکن تھا کہ
ہم آج ہی بمبئی کے لیے روانہ ہو جاتے۔
''تیری تُو سالے... ابھی ڈاکٹر سے ملنے کا ہے۔'' اُس
نے چابک دستی سے چاقو دائیں ہاتھ میں تولا اور میرے
دائیں پہلو میں گھونپنے کے لیے آگے بڑھایا۔ اگر میں اُس
کی مہارت کا اندازہ نہ کر چکا ہوتا تو چاقو میری ایک آدھ
انتڑی باہر نکال لاتا۔ اُس نے دائیں طرف کا جھانسا دے
کر بجلی کی سی تیزی سے چاقو بائیں ہاتھ میں تھاما اور نشانے پر
گھونپ دیا۔ وہ بھی مقابل کو کسی درجے میں رکھ رہا تھا، ورنہ
ایسا پُرپیچ داؤ نہ آزماتا۔ بُھل کی تربیت کا بنیادی جزو ہی یہ
تھا کہ بدن کا ہر جزو نظر کے تابع ہونا چاہیے۔ حرکت نظر کے
اشارے پر حرکت کرنے لگ جائے تو شاگرد استاد ہو جاتا
ہے۔ اُس نے جیسے ہی بائیں ہاتھ میں ترازو تولا، میرا جسم
خود بہ خود ہی بل کھا گیا۔ اب اُس کے پاس دوسرے موقع
کی گنجائش نہیں تھی۔ میرا دایاں ہاتھ اُس گھماؤ کے زور میں
اُس کی کلائی پر پڑا۔ اگلے ہی لمحے اُس کا چاقو میرے ہاتھ
میں تھا۔ وہ اپنی جھونک میں آگے نکل رہا تھا، لیکن اُس کا
ہاتھ میری گرفت میں تھا۔ جوابی جھٹکے سے اُس کے کندھے کا
جوڑ ضرور ہل گیا ہو گا۔ وہ گھومتا ہوا واپس میری طرف آ گیا،
مگر اب میں اپنی جگہ پر نہیں تھا، نتیجتاً منہ کے بل زمین پر گر
پڑا۔ کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوا وہ تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔
بکھری ہوئی نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔ میں نے چاقو بند
کر کے واپس اُس کی طرف اچھال دیا۔
''ابھی چلانا سیکھ... جا کے شاکر بھائی کو میرا بول۔''
میں نے اُس کی کیفیت سے دانستہ اغماز برتتے ہوئے کہا۔
وہ ہوش و حواس سے بیگانہ بس مجھے گھورا کیا۔ کبھی اپنے
ہاتھ کو تو کبھی چاقو کو دیکھتا۔ پھر اُس نے اپنی کلائی پر پوری
شدت سے دانت گاڑ دیے۔ اُس کے لیے یہ انہونی تھی۔ معاً
اُسے کچھ ہو گیا۔ اُس نے دیوانوں کی طرح سر دائیں بائیں
جھٹکا، چاقو وہیں پھینکا اور سیدھا میرے پیروں میں پڑ گیا۔
''مائی باپ میرے کو ماپھی دینے کا ہے۔ ابھی تیرے
سے سیکھنے کا ہے استاد۔ تُو مل گیا استاد! تُو مل گیا۔'' وہ پیروں
سے لپٹ کے ہڑکنے لگا۔
میں نے بہ مشکل اُسے اٹھایا۔ ''استاد بولتے ہو تو مجھے
جلدی بتاؤ۔ شاکر بھائی سے ملنا ہے جلدی۔''
''مائی باپ ابھی تیرے کو اپن جانے دینے کا ہے۔ ایسا
استاد جندگی میں نہیں ملا...... ماں قسم جندگی میں نہیں ملا۔'' وہ
دونوں کان ہاتھوں سے پکڑنے لگا۔ ''اپنا نام سر پہ ہے۔''
''دیکھو، مجھے بہت جلدی ہے، یہ باتیں میں تم سے
بعد میں کر لوں گا۔ مجھے شاکر بھائی سے بہت ضروری ملنا ہے۔''
''استاد ابھی ساکر بھائی نے سختی سے منع بولا ہوا
ہے۔ پر اپن تیرے کو بتانے کا ہے۔ ساکر بھائی تین دن
پہلے ہڑا ہڑی میں ادھر سے بمبئی گیا۔ ابھی اور سب کو اے ای
پتا ہے کہ وہ دلواڑا میں ہونے کا ہے۔''
شریف نے فوراً اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے رازدارانہ لہجے
میں کہا۔
''بمبئی میں وہ کدھر گیا ہے۔'' میں نے سنسناتے ہوئے
اُس سے پوچھا۔ میں وہیں کھڑا کھڑا بمبئی پہنچ چکا تھا۔
''ابھی اپن کو اُس کے ٹھکانے کا تو نہیں پتا پر ادھر لکھمی
مل کا مالک دوست ہونے کا ہے۔ بمبئی میں اس کا بنگلہ ہے۔
بس ادری رہنے کا ہے۔''

"بنگلے کا پتا ہے تمھیں۔"

"ابھی اسے لکشمی مل والے کو پتا ہونے کا ہے۔"

شریف مجھ سے غلط بیانی نہیں کرسکتا تھا۔ اُس کی بات مکمل ہونے سے قبل میں وہاں سے مڑ آیا۔ شریف دُور تک میرے پیچھے آیا۔ گڑگڑاتا رہا، منتیں کرتا رہا کہ مجھے ساتھ رکھ لیا جائے۔ میں نے اُس سے دوبارہ آنے کا وعدہ کرکے بہ مشکل جان چھڑائی۔ میں کس کس کو اپنے ساتھ لیتا جاؤں گا۔ یہاں تو جو ساتھ ہوتا ہے وہ مارا جاتا ہے۔ بٹھل اٹھ گیا ہوگا۔ مجھے وہاں نہ پاکر اُس نے سر پکڑ لیا ہوگا، لیکن میرے میرے کہاں رہے تھے۔ خود بہ خود ہی لکشمی مل کی طرف قدم اٹھ رہے تھے۔ ایک راہ گیر نے تفصیلی پتا سمجھا دیا۔ وہ جگہ لکشمی مل آبادی سے قدرے ہٹ کر تھی، وہاں تک تانگے جاتے تھے۔ دن کی چہل پہل خوب جم چکی تھی۔ لوگ باگ سائیکلوں پر اور پیدل اوزار اپنے کندھوں سے ٹانگے رواں دواں دکھائی دیتے تھے۔ ولواڑا کا اکلوتا بازار سڑک کے دونوں اطراف بنائی گئی چوبی دکانوں پر مشتمل تھا۔ چھابڑیوں اور ٹھیلے والوں کی وجہ سے بازار تنگ لگ نظر آتا تھا۔ وہیں اس ہجوم کے بیچ تانگے بھی کھڑے تھے۔ نہ جانے وہ یہاں کیسے آئے تھے اور نہ جانے وہ یہاں سے نکلیں گے کیسے۔ میں ایک تانگے کے پچھلے حصے میں بیٹھ گیا اور کوچ وان سے کہا کہ لکشمی مل چلو۔ وہ آنکھیں چڑھا کے بولا۔

"بابو صاحب دو آنے سے ایک پائی کم لینے کا نئیں اے۔ تانگا بھرنے کا ہے تو چلنے کا ہے۔"

میں نے خاموشی سے ایک رُپیا نکال کے اُسے دیا تو وہ حیرت سے پھٹنے لگا۔ "ابھی چار آنے ٹوٹا نئیں اے صاحب۔"

"رُپیا سارا رکھ لو، مگر جلدی چلو۔"

اس کے بعد وہ بھیڑ تو وہاں تھی ہی نہیں۔ وہ تیر کی طرح بیچ سے تانگا نکالتا چلا گیا۔ میں لکشمی کے بارے میں سوچنے لگا۔ ممکن ہے وہ مل میں آئی ہوئی ہو اور اُس سے ملاقات ہوجائے۔ لکشمی کو سمجھایا جاسکتا تھا، رگھو سے بہتر اُسے کیا ملتا، لیکن مجھے ان جھمیلوں میں الجھ کر پھر کوئی نئی مصیبت مول نہیں لینی تھی۔ ہوسکتا ہے شاکر بھائی سیٹھ کو تفصیل بتا کر گیا ہو۔ ہوسکتا ہے سیٹھ بمبئی میں اپنے بنگلے کے وجود ہی سے انکار کردے۔ ایسا سوچنا ہی بیکار تھا۔ کسے خبر تھی کہ وہاں معاملہ کس طرح نبٹنا تھا۔ اب تک ہوتا تو یہی آیا ہے کہ سیدھی سی بات بھی الجھ جاتی ہے۔ بہتر یہی تھا کہ میں پہلے لکشمی سے مل لوں اور اسی کے ذریعے اس کے باپ سے بات کروں، لیکن نہ جانے کیوں مجھے ایسا کرنا مناسب نہیں لگا۔ کچھ غلط تھا۔ پہلے لکشمی کے باپ سے ملنا مناسب ہوگا۔

"ساب آپ ناراج نہیں ہونے کا ہے... ابھی میرا تانگا بھاڑے کا ہے۔ بیاج کا قرجا ہے۔ سام کو روٹی پانی کے پیسے نہیں بچتے ساب۔" کوچ وان نے گھوڑے کو چابک رسید کرتے ہوئے کہا۔ تانگا بازار سے نکل کے کھلی جگہ پر آ گیا تھا۔

"قرضہ کیوں لیا تھا۔"

"قرجے سے اپنا تانگا بنانے کا تھا۔ گھوڑے کو جہر دے دیا، پتا نہیں کس نے۔ گھوڑا نہیں تو نہیں چلنے کا تھا۔ بیاج میں تانگا بیچنے کا تھا۔ بس ابھی سام کو آنے دو آنے بچوں کے لیے لے جانے کا ہے ساب... سواری لوگ پیسا نہیں دینے کا ہے ساب... ابھی دو آنے مانگے تو ایک آنا ملنے کا ہے۔" کوچ وان دکھیارے لہجے میں بولا۔ اُس نے کھینچ کھینچ کے گھوڑے کو چابک رسید کیے۔

"اس غریب کو کیوں مارتے ہو! بیاج کا قرضا کتنا ہے۔"

میں نے اس سے پوچھا۔ میری پشت بہ دستور اس کی طرف تھی۔

"ابھی پورے تین سو ہونے کا ہے ساب... اپنا جھونپڑی بکنے کا ہے اب۔"

"اس تانگے کی کتنی قیمت ہے جو تم چلا رہے ہو۔"

"ساب یہ پورے ساڑھے پانچ سو کا ہے۔ بھگوان کرپا کرنے کا ہے ساب... آپ کاہے چنتا کرنے کا ہے۔"

"نہیں، میں ویسے ہی پوچھ رہا تھا... لکشمی مِل کتنی دور ہے۔"

"یہ آ گیا ساب... آپ بھی اچھا پوچھنے کا ہے۔ مِل تو آ گیا ساب۔"

میں نے مڑ کے دیکھا مِل واقعی آ گئی تھی۔ چمنیوں سے گاڑھے سیاہ رنگ کا دھواں نکل رہا تھا۔ کوچ وان نے تانگا عین مِل کے دروازے پہ روکا۔ میں نے اُسے وہیں ٹھیرنے کا کہا۔ معاً مجھے کچھ خیال آیا۔ بٹھل نے کچھ پیسے میری جیب میں ٹھونسے تھے۔ جانے اُس کے پاس کہاں سے آئے۔ شاید چھلیا سے لیے ہوں، مگر وہ کافی رُپے تھے۔ سو سو کے کئی نوٹ تھے۔ میں نے جیب سے نکال کے دیکھے تو دو ہزار سے زیادہ کی رقم لگتی تھی۔ کیا خبر اندر سے واپس کس حال میں آنا ہو، میں نے ایک ہزار رُپے گن کے کوچ وان کو دیے۔

"یہ رکھ لو! قرضہ سمجھی لوٹا دینا، تانگا اپنا خرید لینا۔"

کوچ وان کھڑا کھڑا لرزنے لگا۔ اُس کی آنکھیں جھر جھر بہنے لگیں۔ وہ زیرِ لب کچھ بدبدا رہا تھا۔ میں نے رُپے اُسے تھمائے اور مِل کی طرف چل دیا۔ بے رنگ زنگ آلود فولادی دروازہ بند پڑا تھا۔ بغل میں ایک چھوٹی سی طاقچی کھلی تھی، سڑک کی مٹی بھی تیل میں چپڑی ہوئی سیاہ ہو رہی تھی۔ فضا میں مرداری بساند رچی ہوئی تھی۔ میں طاقچی کے قریب گیا تو اندر سے ایک پیر مرد نے جھانکا۔ اُس نے قلم کان میں اُڑس رکھا تھا۔ وہ منشی وغیرہ لگتا تھا۔

"ہاں بھائی صاحب فرمائیں۔" اُس نے شستہ لہجے میں دریافت کیا۔

"سیٹھ سے ملنا ہے۔" میں نے وضع دارانہ مسکراہٹ اپنے چہرے پر سجاتے ہوئے کہا۔

"کیا کہا؟ کس سے ملنا ہے؟" اُس نے مصنوعی حیرانی سے پوچھا۔

"سیٹھ سے ملنا ہے۔" میں نے اُسی کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"دلّی سے آئے لگتے ہو... اماں سٹھیا گئے ہو بھیّے۔ یہاں چار دن پہلے نام لکھاتے میں چڑھوانا پڑتا ہے۔"

"بڑے میاں، میں دلّی سے نہیں آیا۔ مجھے آج اور ابھی ملنا ہے۔"

"بڑے میاں ہو ویں گے تمھارے باوا حضور۔ سیٹھ ایرے غیرے نتھو خیرے نہیں ہیں۔ نام چڑھوا جاؤ، چار دن بعد آ جانا۔" بڑے میاں یک دم ہتھے سے اُکھڑ گئے۔

بٹھل کہتا تھا کہ جیت کا پہلا دروازہ اسی وقت کھل جاتا ہے جب مقابل کی کوئی کم زوری تمھارے ہاتھ لگ جائے۔ جسمانی کم زوری سے کہیں زیادہ سود مند نفسیاتی کم زوری ہوتی ہے۔ کم زوری دریافت ہوتے اسے مقابل پر آزمانے کے طریقے پر غور شروع کر دینا چاہیے۔ بڑے بڑے سورما صرف زبان سے چت ہو جاتے ہیں۔

"حضور، آپ دلّی کے لگتے نہیں۔ ہم نے سنا تھا کہ ادھر بڑے میاں عزت اور احترام کے القابات میں سے ایک ہے۔ بڑے میاں نوابوں کو بھی بولتے ہیں۔ آپ غلط سمجھے ہیں ہماری بات۔ آپ اور ہم برابر ہی کے دِکھتے ہیں۔"

میری بات سن کے بڑے میاں کی آنکھیں مسکرائیں، مگر انھوں نے اپنے لہجے میں تیکھٹ برقرار رکھی، بولے۔

"بھیّے، سیٹھ صاحب کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔ باہر کھڑے دیکھتے رہو۔ مان جاویں تو مل لیو۔ باقی اپن کی طاقت میں کچھ ہے نہیں۔" یہ کہہ کے بڑے میاں نے چھپاک سے طاقچی بند کر دی۔ اپنے تئیں انھوں نے بڑی فراخ دلی کا ثبوت دیا تھا کہ سیٹھ صاحب کی آمد کا بتا دیا۔ کوئی اور چارہ کار بھی نہ تھا۔ میں وہیں ایک طرف کو کھڑا رہا۔ سر اندر سے جی متلا رہا تھا۔ کوچ وان نے مجھے یوں کھڑا دیکھا تو گرتا پڑتا بھاگا آیا۔ اُس پر ابھی تک لرزہ طاری تھا۔ اُس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ اُس نے قریب آتے ہی بڑے سبھاؤ سے اپنے کندھے کا رومال کھولا اور میرے سر پر سایہ کرنے لگا۔

"ساب، آپ اور کھڑا ہونے کا نہیں ہے۔ تانگے میں بیٹھنے کا ہے۔ ساب دھوپ ہے۔" کوچ وان بچھا جا رہا تھا۔ مجھے کوفت ہونے لگی، مجھے اسے ابھی رُپے نہیں دینے چاہیے تھے۔ رخصت کرتے وقت دیتا تو بہتر تھا۔ میں اُس کے بے حد اصرار پر تانگے میں آ کے بیٹھ رہا۔ گھنٹے دو گھنٹے، کئی گھنٹے گزر گئے۔ دوپہر ڈھلنے کو آ رہی تھی، مگر سیٹھ کی کار نہیں آئی۔ میں کئی مرتبہ طاقچی میں بڑے میاں کے پاس بھی گیا۔ انھوں نے بڑے پیار اور خلوص سے کہا کہ اس سے زیادہ انھیں بھی کچھ نہیں معلوم۔ البتہ وہ یہ بات پوری دیانت داری سے رہے تھے کہ سیٹھ اس وقت کارخانے میں نہیں ہے۔ بٹھل جھلا رہا ہوگا۔ مجھے کسی نہ کسی کو بتا کے آنا تھا۔ آخر

نے سیٹھ کی کوٹھی پہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں لکشمی کا سامنا کرنے سے احتراز کر رہا تھا، مگر اب کوئی اور چارہ کار بھی نہ تھا۔ اسے کم سے کم اپنے باپ کے بمبئی کے بنگلے کا ضرور علم ہوگا۔ کوچ وان کو سیٹھ کی کوٹھی کا علم تھا، میرے اشارے کی دیر تھی اُس نے تانگا ہوا کر دیا۔ یہ دیکھ کے میری حیرت کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا کہ شاکر بھائی کے عین برابر میں سیٹھ کی کوٹھی تھی... شاکر بھائی کے مکان پر شریف اس وقت نظر نہیں آ رہا تھا۔ سیٹھ کی کوٹھی کی... کیا عالی شان محل تھا۔ پوری عمارت پر سنگ ابیض برتا گیا تھا۔ خشبی دروازے پر چوب داری کا خوب کام کیا گیا تھا۔ جس پر روپہلا روغن خوب بھلا لگ رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر دستک دی۔ ایک بندوق بردار سکھ باہر آیا۔ وہ چوکی داروں کی انگریزی وردی میں ملبوس تھا۔ میں نے اُس سے بلا جھجک کہا کہ مجھے لکشمی دیوی نے بلوایا ہے۔ اُن سے کہنا باہر زمان آیا ہے۔" اُس نے بہ غور میرا جائزہ لیا اور مجھے وہیں کھڑا رہنے کی تاکید کر کے چلا گیا۔ وہیں کھڑا رہنے کی تاکید وہ یوں کر گیا تھا جیسے میں نے ایک قدم بھی ہلایا تو اندر ہی سے ایک گولی داغ دے گا۔ میں ابھی اس کی ہدایات پر سختی سے عمل کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ سوئی ہوئی کوٹھی جاگ اٹھی۔ گمان پڑتا تھا کہ دیواروں کے پیچھے ہڑبونگ مچی ہے۔ بہر تیز لوگ ادھر اُدھر دوڑ رہے ہیں۔ پھر دھم سے وہ روپہلا پھاٹک کھلا۔ لکشمی ننگے پیروں بنا آنچل کے دوڑی چلی آ رہی تھی۔ اُس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ وہ زخمی نظروں سے مجھے دیکھے گئی۔ وہ سادگی میں بھی بے پناہ حسین لگ رہی تھی۔ اُس کی پھیلی ہوئی آنکھوں میں زخموں کے ساتھ ساتھ بے اختیاری بھی جھلک رہی تھی۔ اس کے اطوار بتا رہے تھے کہ وہ مجھ سے لپٹنے کے لیے آئی تھی، مگر لجا گئی۔

"موہن جی، وشواس نہیں پڑ رہا۔ بھگوان سے دن رات پراتھنا کی تھی آپ کو بلانے کی۔"

میں نے کہنا چاہا کہ میں تمھاری وجہ سے نہیں آیا۔ تمھارے پتا سے ملنے آیا ہوں، ایک کام ہے ان سے، مگر میں کچھ کہہ نہ سکا۔

"میں نے کہا تھا دلوا لوٹ آؤں گا تو تم سے ضرور ملوں گا۔" نہ جانے کیوں میں نے وہی کہا جو وہ سننا چاہتی تھی۔

"میں نے پتا جی سے آپ کا ذکر کیا تھا۔ وہ آپ کی چنتا میں بیٹھے ہیں۔ بستی بھی ایک سورکھ کو دوڑایا تھا جو دل جلانے والی [illegible] لے آیا تھا۔ آپ ٹھیک تو ہیں نہ

موہن جی۔ بھوا جی کی ہتیا۔" معاً اُسے بہت کچھ یاد آ گیا۔ اُس تک ساری خبریں پہنچ چکی تھیں۔ وہ اُچک کے محتاط نظروں سے میرے عقب میں دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔

"آپ جلدی سے اندر آ جائیں، چنتا کی کوئی بات نہیں، سب خیر ہو جائے گا۔ پولیس اس دروازے کا پالن نہیں کر سکتی۔"

"تم غلط سمجھ رہی ہو۔ نہ ہی میں مفرور ہوں اور نہ ہی پناہ..."

اُس نے مچل کے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "دوشی نہ کرو موہن جی، داسی ہوں آپ کی۔ آپ آئے نہیں ہیں، میں نے بھگوان سے کہہ کر بلوایا ہے۔" وہ وہیں پر مجھ سے بے اختیار لپٹ گئی۔ میں گھبرا گیا اور آہستہ سے علاحدہ کیا۔ لکشمی نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے اندر کھینچ لیا۔

"مویا! مویا!" وہ چلّانے لگی۔ وہ گھر کی منہ چڑھی دِکھتی تھی۔ وہ بلا کسی خوف و خطر اور بلا کسی حیل و حجت کے میرا ہاتھ پکڑ کے اندر کو دوڑی جا رہی تھی اور میں چل نہیں رہا تھا گویا پھسل رہا تھا۔ بیرونی دیوار اور عمارت کے درمیان باغیچہ تھا جس کے پودے رنگ بارنگ کے پھولوں اور بھانت بھانت کی خوش بوؤں سے اَٹے پڑے تھے۔ مہک کی لپٹیں پوری کوٹھی کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ کوٹھی ولایتی طرز پر بنی ہوئی تھی۔ مہمان خانے میں پہنچ کے اندازہ ہوا کہ تزئین و آرائش بھی ولایتی طرز پر کی گئی ہے۔ نرم نرم گدوں والی مخملیں کرسیاں تھیں، جنھیں انگریز سوفا کہتے تھے۔ برقی قندیلیں ہر محراب پر تھیں اور ایک بیضوی قمقمہ عین وسط میں لٹک رہا تھا۔ نہ جانے کہاں کہاں سے یہ بجلی حاصل کر رہے تھے۔ بمبئی میں بھی ہما شما کی بجلی تک رسائی نہیں تھی۔ مہمان خانے کی پشتی دیوار پر ایک قدِ آدم تصویر ٹنگی ہوئی تھی۔ یہ یقیناً سیٹھ ہی تھا۔ اتنے میں سرخ ساڑھی میں ملبوس ایک باوقار خاتون بوکھلائے قدموں سے اندر داخل ہوئیں۔ لکشمی انھی کا پرتو تھی۔

"مویا، یہ موہن جی ہیں ہم نے جن کا بتایا تھا۔ رگھو کا سرو ناش کرنے آئے ہیں۔" لکشمی نے میرا ہاتھ نہیں چھوڑا... ان کا ماحول خاصا آزاد لگتا تھا۔

"موہن جی، یہ مویا ہیں ہماری ماتا جی۔"

میں نے انھیں ہاتھ جوڑ کے نمسکار کیا۔ جواباً انھوں نے بھی نمسکار کیا۔

"لکشمی آپ کا بہت جکر کرتی ہے۔ رگھو پاپی نے ہمارا جیون ناس کر رکھا ہے۔ لکشمی کا وچار ہے کہ رگھو کا سرو ناس آپ ہی کر سکتے ہو۔"

"یہ لکشمی کی ذاتی رائی ہے۔ مجھ میں ایسا کوئی گن نہیں ہے۔" میں انھیں کیا بتاتا کہ میں رگھو کے اڈّے ہی پر رہائش پذیر ہوں۔

"مویا! پتا جی کدھر ہیں، موہن جی کو پتا جی سے ملوانا ہے۔"

"بابر جمان نام ہے تمھارا..." لکشمی کی ماں نے بڑی محبت سے کہا۔ انھوں نے لکشمی کے سوال کو سنا اَن سنا کر دیا تھا۔

"جی بابر زمان!" مجھے وہاں گھٹن ہونے لگی۔ مجھے بٹھل کی فکر کھا رہی تھی۔ وہ سو سو گالیاں بک رہا ہوگا۔

"موہن جی آپ مویا جی سے باتیں کریں، ہم پتا جی کو بلا کے لاتے ہیں۔" لکشمی نے اب جا کے میرا ہاتھ چھوڑا تھا۔ وہ جانے لگی تو اُس کی مویا جی نے اُسے منع کرتے ہوئے کہا۔ "تمھارے پتا جی آج سویرے بمبئی گئے ہیں۔ اُدھر سے مستری لینے گئے ہیں۔"

لکشمی کی ماں کا یہ جملہ سن کے میرے تو گویا قدموں سے کسی نے زمین کھینچ لی۔ بمبئی میں ایسا کیا تھا کہ سب وہاں دوڑے جا رہے تھے۔ ممکن ہے مولوی صاحب کی مالا میں سیٹھ بھی دل چسپی لے رہا ہو، لیکن مجھے شاکر بھائی اور سیٹھ کا بہت گہرا یارانہ لگتا تھا۔ دونوں کے مکان بھی پہلو بہ پہلو تھے۔

"مجھے تانگے والا بتا رہا تھا کہ بمبئی میں تمھارے پتا کا اپنا بنگلا ہے۔ بمبئی میں میرا گھر بھی ہے۔"

"ہائے رام تانگے والے کو کیسے پتا چل گیا۔ لکشمی کو بھی نہیں پتا۔ اُس کے پتا جی نے مجھے بھی چند دن پہلے اِتنا بتایا تھا کہ اُنھوں نے بمبئی میں مکان لیا ہے۔ ابھی کسی کو بولنا نہیں۔ بالکوں کو بھی نکیں۔ ہائے رام تانگے والے کو بھی... لکشمی تانگے والے کو بلوا ذرا پوچھوں... اور راجا... تانگے والا باہر کھڑا ہو تو بلا لاؤ اسے۔" لکشمی کی مویا یک دم بوکھلا گئی اور اس سے زیادہ میں بوکھلا گیا۔ میں نے روا روی میں ایسے ہی جھوٹ بولا تھا اور وہ تانگے والے کو بلوا رہی تھی۔ کوچ وان یقیناً باہر ہی کھڑا ہوگا۔ وہ میرے بغیر کہاں ٹلنے والا تھا۔ راجا نامی ملازم بھی چلا آیا۔ اُس نے بتایا کہ تانگے والا مجھے چھوڑتے ہی چلا گیا تھا۔ وہ باہر نہیں ہے۔ مویا جی میرے پیچھے پڑ گئیں کہ اتنی راز کی بات تانگے والے کو کیسے پتا چل گئی۔ ان کی باتوں سے مجھے اِتنا پتا چل گیا تھا کہ بمبئی میں سیٹھ کے بنگلے کا ان میں سے کسی کو علم نہیں ہے۔ سیٹھ عن قریب بمبئی میں ایک بڑی مل لگانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اب میرا یہاں رُکنا بے کار تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھے اجازت دیجیے۔ میرے کچھ دوست راہ تک رہے ہوں گے۔"

"ہائے ہائے... دیا کرو موہن جی... ایسے کیسے چلے جاؤ گے۔" لکشمی مچل کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگی۔ غضب کا سحر تھا اُس کی آنکھوں میں۔

"مجھے ابھی جانا ہے لکشمی۔ میں دوبارہ آؤں گا۔ تمھارے پتا جی سے کچھ ضروری کام بھی ہے۔"

"بتایا ہوتا۔ مجھے بتاؤ کیا کام ہے۔ سمجھو موہن جی کام ہو گیا، مگر جانے نہیں دوں گی۔" وہ سامنے آ کے کھڑی ہو گئی اور گھورنے لگی۔

اُس کی بلا خیز آنکھوں میں کچھ تھا۔ مجھے از خود ہی خیال آیا۔ "میں اپنے دوستوں کو بتا کے واپس آ جاؤں گا۔"

"نہیں موہن جی، میں جانے نہیں دوں گی۔" وہ اپنی مرضی پر اڑ گئی۔

"تو پھر ساتھ چلو... میں ساتھ ہی واپس آ جاؤں گا۔" میرے دل میں خواہش اُٹھی کہ وہ انکار نہ کرے۔

"راجا ڈرائیور سے کہو موٹر نکالے... چلیں موہن جی۔"

وہ جھٹ تیار ہو گئی۔ اُس نے ماں سے اجازت لینے کا تکلف بھی روا نہیں رکھا۔ جو کھڑی اُسے تذبذب سے دیکھ رہی تھی۔ پھر شانے اچکا کے اندر چلی گئی۔ اُس نے لکشمی سے کسی قسم کا استفسار نہیں کیا۔ مجھے اُن کی معاشرت کا بہ خوبی اندازہ ہو رہا تھا۔ لکشمی پھر میرا ہاتھ پکڑ کے باہر کو آ گئی۔ مہمان خانے کے دروازے سے ڈرائیور نے موٹر لگا دی تھی۔ سفید رنگ کی چمچماتی موٹر اور سفید چمچماتی وردی میں ملبوس ڈرائیور خوب بھلے لگ رہے تھے۔ مؤدب ڈرائیور نے آگے بڑھ کے پچھلا دروازہ کھولا۔ میرے ایما پر لکشمی سوار ہو گئی۔ ڈرائیور بھاگتا ہوا آ گیا، اُس نے جھٹ دوسری طرف کا دروازہ کھول دیا۔ مجھے خواہ مخواہ ہنسی آ گئی اور میں مسکراتا ہوا موٹر میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیور تیزی سے موٹر کوٹھی سے نکال لے گیا۔ تانگے والا بہ دستور باہر جما کھڑا تھا۔ راجا نے کام چوری دکھائی تھی یا پھر اس وقت کچھ دیر کے لیے کوچ وان اِدھر اُدھر سرک گیا ہوگا۔ کوچ وان نے مجھے موٹر میں بیٹھا دیکھ لیا تھا اور ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ اس سے آگے کا منظر میں نہیں دیکھ سکا۔ ڈرائیور موٹر تیزی سے بڑھا گیا تھا۔ یہ چھوٹا سا قصبہ تھا، میں نے رگھو کے اڈّے کا پتا بتا دیا۔ ڈرائیور نے جھٹکے سے موٹر روک دی۔ وہ ٹپٹا گیا تھا۔

"صاحب آپ نے واقعی اُدھر جانا ہے...؟ مالکن اُدھر رگھو دادا کا اڈّا ہے۔" ڈرائیور نے عقبی شیشے میں دیکھتے ہوئے کہا۔ اُس کے ماتھے سے پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔

"جدھر موہن جی بول رہے ہیں اُدھر ہی چلو۔" بس میرے کسی جواب سے پیش تر لکشمی نے بڑے اطمینان سے کہا۔ اس کے انداز میں کوئی تلاطم نہیں تھا، کوئی ہیجان، کوئی طوفان کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ ایسے بیٹھی تھی جیسے اُسے توقع ہو کہ میں اُسے وہیں لے جاؤں گا۔

چند منٹوں میں موٹر رگھو کے اڈّے کی گلی میں داخل ہو گئی۔ ڈرائیور کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ دھیارا اور کالو گلی کی نکڑ پر کھڑے تھے۔ دھیارا نے مجھے دیکھ لیا تھا اور شور مچا دیا۔ دوڑتا ہوا موٹر کے پیچھے آنے لگا۔ پھر تو گویا رے ہی نے انگڑائی لی اور جاگ پڑا۔ موٹر جب رگھو کے دروازے سے لگی تو ستے ہوئے چہرے کے ساتھ سب سے پہلے بٹھل آیا پھر چھلیا اور پھر رگھو!

ڈرائیور نے دروازہ کھولا تو لکشمی شانِ بے نیازی سے نیچے اتر گئی۔ میں خود ہی دوسری طرف کا دروازہ کھول کے اتر آیا تھا۔ رگھو پتھر کا ہو گیا تھا۔ لگتا تھا کہ وہاں بیش تر لوگ لکشمی کو پہچانتے تھے۔ میرے آنے سے جو تھرتھل مچی تھی وہ یک دم تھم گئی تھی۔ رگھو کی آنکھیں پھٹتے پھٹتے باہر نکلنے کو آ رہی تھیں، مگر اس کے جسم میں ذرا بھی حرکت نہ ہوئی تھی۔ چھلیا نے دو قدم پیچھے ہٹ کے رگھو کے کان میں سرگوشی کی، مگر رگھو کچھ کہاں سن رہا تھا۔ وہ تو بس دیکھ رہا تھا۔ لکشمی نے یہاں آنے سے متعلق پہلی مرتبہ زبان کھولی۔

"موہن جی، یہاں کیوں لے آئے ہو۔"

"رگھو کا سرو ناش کرنے۔ آؤ میرے ساتھ، ڈرو نہیں۔" میں نے ڈپٹ کے کہا اور تیز آواز میں کہا، تاکہ سب سُن لیں۔

"آپ کے ساتھ تو سوامی جی میں نرکھ میں بھی چلی جاؤں گی، چلیے۔" اُس نے بھی تیز ہی آواز میں جواب دیا۔ وہ رگھو کو ڈھونڈ رہی تھی۔

میں نے از خود اُس کا ہاتھ پکڑا اور اندر لے چلا۔ بٹھل مجھے کینہ توز نظروں سے گھور رہا تھا۔ اُس کے پلے جو کچھ نہیں پڑ رہا تھا۔

"موہن جی ادھری نرکھ ہی میں آ رہے ہیں۔" بٹھل نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔ غصّے میں اُس کا چہرہ ستا ہوا تھا، مجھے ڈر لگنے لگا۔

"تم راستے سے ہٹ جاؤ، اِس لفڑے سے تمھارا کوئی واسطہ نہیں استاد۔" میں نے بٹھل کو مخصوص انداز میں آنکھ سے اشارہ کیا۔

"تیرے راستے کی متا... ذرا خوش نہیں دیکھ سکتا رے... بول کے چلا جاتا۔" بٹھل یک دم مدھم پڑ گیا۔

"سوامی جی، استاد سویرے سے پریشان بیٹھے کا ہے۔ ابھی سارا دلواڑا ڈھونڈنے کا تھا۔ تانگے والا بھی غائب سوامی جی غائب۔" چھلیا دھیرے سے بولا۔

"کدھری گیا تھا۔" بٹھل نے سوچتی نظروں سے لکشمی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ بعد میں بتاؤں گا..." پھر میں نے ذرا تیز آواز میں کہا۔ "ابھی رگھو دادا سے دو دو ہاتھ کرنے کا ہے۔" بٹھل کھلکھلا کے ہنس پڑا اور راستہ چھوڑ دیا۔ سب دائیں بائیں سمٹ گئے، مگر رگھو وہاں تھا ہی نہیں۔ وہ کہیں پہنچا ہوا تھا۔ میں نے چاقو کھول لیا اور لکشمی کا ہاتھ پکڑ کے اڈّے میں داخل ہو گیا۔ بٹھل مسکرا رہا تھا، باقی سبھی ایک دوسرے کو حیران و پریشان نظروں سے گھور رہے تھے۔ میں لکشمی کا ہاتھ پکڑ کے سیدھا رگھو کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ ایک بھیڑ ہمارے ہمرکاب تھی۔ اب لکشمی بھی کچھ کچھ گھبرانے لگی تھی۔ رگھو کے کمرے تک پہنچنے میں مجھے شدید کوفت کا سامنا کرنا پڑا۔ دروازہ مقفل تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کے دیکھا تو دھیارا پیچھے آنے والی بھیڑ میں سب سے آگے تھا۔ ان کی

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کہیں میرا دماغ تو نہیں چل گیا ہے۔ چاقو کھول کے شہر کے امیر کبیر شخص کی بیٹی کو میں یہاں کھینچتا ہوا کیوں لایا ہوں۔ میں نے دھیارا سے رگھو کے کمرے کی تالی لانے کا کہا تو کاٹو تو جواب دیا۔

"استاد کے کمرے میں کوئی اور نہیں جاتا، تالی وہ کسی کو نہیں دیتا۔"

"استاد کو میرا نام بولو اور تالی مانگ لاؤ۔" میرے منہ سے الفاظ نکلتے ہی دھیارا دوڑتا چلا گیا۔

اتنے بہت سارے لوگ اور وہ بھی اڈے پاڑے کے آدمی۔ وہ لکشمی گھبرانے لگی ہو، "تم لوگ یہاں کیوں کھڑے ہو، جاؤ اپنا کام کرو۔" میں نے درشتی سے کہا تو ایک ایک کر کے سب دائیں بائیں ہو گئے، مگر اپنی نظریں وہیں چھوڑ گئے تھے۔ دھیارا تالی لے آیا تھا۔ لکشمی سن چکی تھی کہ دھیارا اس کمرے میں کسی کو داخل نہیں ہونے دیتا۔ مجھے خود سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں۔ میں جو کچھ کر رہا تھا از خود مجھ سے سرزد ہو رہا تھا۔ میں نے تالی سے دروازہ کھولا اور لکشمی کو ہاتھ کے اشارے سے اندر داخل ہونے کا کہا۔ وہ ذرا جھجکی، مگر اندر داخل ہو گئی۔ سامنے ہی لکشمی دیوی کی مورتی تھی۔ وہ اس شاہ کار کو دیکھ کے مبہوت ہو گئی اور کچھ دیر دیکھتی رہی۔ میں نے دھیرے سے کہا۔ "مورتی کیسی ہے؟"

"سندر ہے موہن جی، کیا میں اتنی سندر ہوں۔" اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"تم سندر ہو، مگر اس مورتی کی سندرتا اسے بنانے والے ہاتھ ہیں۔"

"میں نے سنا تھا کہ مورتی بنانے والے کے لیے مہینوں مورت گر کے سامنے بیٹھنے کی تپسیا کرنی ہوتی ہے۔ یہ کیسی مورتی بنا لی۔"

"مجھے نہیں معلوم کیسے بنائی ہے، مگر اتنا معلوم ہے کہ اسے رگھو کے ہاتھوں نے بنایا ہے۔ آؤ میرے ساتھ آج رگھو سے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔" مجھ پر جنون سوار ہو گیا تھا۔ لکشمی کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا اور میرے ذہن میں بھی سب کچھ واضح تھا۔ میں لکشمی کو لے کے چوکی پر چلا آیا۔ دالان میں لوگ جمع تھے۔ ایک طرف چارپائی پر بٹھل پڑا تھا۔ دھیارا اس کے پاؤں داب رہا تھا۔ میں نے باآوازِ بلند کہا۔

"ریت کے مطابق اڈے کا راج بل سے ہے۔ پیڑھی پر وہی بیٹھے گا جو دم رکھتا ہوگا۔" میری آواز سن کے کچھ ہڑبڑا کے کچھ ٹھٹکا کر مجھے دیکھنے لگے۔ رگھو ایک کونے میں گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا۔ اس طرح بیٹھنے سے کسی کو تشویش لاحق نہیں تھی جس کا مطلب یہی تھا کہ رگھو کا یہ طور ان کے لیے نیا نہیں تھا۔ میری بات سن کے بٹھل کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ چھلیا کے چہرے پر تردّد آیا تھا، مگر وہ بٹھل کو دیکھ کے شانت ہو گیا تھا۔ بٹھل نے اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا تھا۔

"جیسا کہ آپ لوگ جانتے ہیں کہ لکشمی دیوی اور رگھو دادا کے درمیان کیا تنازع چل رہا ہے۔ لکشمی دیوی میرے پاس فریاد لے کر آئی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ رگھو دادا نے دھمکی لگائی ہے جو لکشمی سے شادی کرے گا رگھو اُسے مار دے گا۔ لکشمی نے مجھے مجبور کیا ہے کہ میں اس سے شادی کر لوں اور میں نے ہامی بھر لی ہے۔" میں نے رگھو کی طرف دیکھتے ہوئے ذرا توقف کیا۔ رگھو نے ایک جھٹکے سے گھٹنوں میں دیا ہوا سر اٹھایا اور مجھے خشمگیں نظروں سے گھورا۔ میں نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔ "میں رگھو سے معاملہ صاف کرنے آیا ہوں۔" میں نے انداز سے سے چاقو فضا میں اُچھالا اور اندازے ہی سے لپک کے پکڑ لیا۔ اس دوران میری نظر ایک پل کے لیے بھی رگھو سے نہیں ہٹی تھی۔ میں نے رگھو سے دیانت داری سے لڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ محبت کرنے والوں سے کیا بعید۔ میرے ذہن میں اب تک یہی تھا کہ رگھو سے دانستہ شکست کھاؤں، لیکن جب رگھو چاقو کھول کر دیوانگی سے اٹھا تو میرے اندر ایک شخص رشک و حسد میں تلملا اٹھا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ رگھو کو زیادہ دیر تک کھڑا رہنے نہیں دوں گا۔

"بازی گر" سب رنگ کا سب سے مقبول سلسلہ

انگوٹھی، حوصلوں، آنسوؤں اور آہوں کی داستان

پانچویں درویش کا بیان

ایک سرفراز سینہ فگار نوجوان کا سفر نامۂ زندگی

باقی واقعات آئندہ